معالم القرآن

جلد اول

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

علم و کتاب واٹس ایپ گروپ

دور حاضر کی سب سے زیادہ مستند اور عام فہم تفسیر

تفسیر

معالم القرآن

اردو

مصنف:- مولانا محمد علی الصدیقی کاندھلوی مدظلہ العالی

جلد اول

ناشر

مکتبۃ الغزالی دیوبند یوپی ۲۴۷۵۵۴

نام کتاب ــــــــــ تفسیر معالم القرآن جلد اوّل

تالیف ــــــــــ مولانا محمد علی الصدیقی کاندھلوی

صفحات جلد اوّل ــــــــــ ۶۳۲

طباعت ــــــــــ کلاسیکل پرنٹرس دہلی

سال اشاعت ــــــــــ جولائی سنہ ۱۹۸۶ء

باہتمام ــــــــــ واصف اختر

سرِ ورق و ٹائیٹل ــــــــــ قمرالدین الاعظمی

ناشر

مکتبہ الغزالی دیوبند پن ۲۴۷۵۵۴

MAKTABA AL-GHAZALI
DEOBAND-247554 (U.P.)

دریا بحباب اندر

سورۂ فاتحہ

حرفِ آغاز

باسمہ سبحانہ

۱۹۳۶ء سے "دار العلوم الشہابیہ" میں قرآن حکیم کے ترجمہ و تشریح کے کام پر لگا ہوا ہوں، اس عرصہ میں ایک بار پورے قرآن سے گزر کر دوسری بار آٹھویں پارے تک پہنچا ہوں۔

ایک مدت سے محسوس کر رہا تھا کہ اپنے مطالعہ قرآنی کے نتائج منظرِ عام پر لاؤں لیکن اتنے عظیم کام کے لیے ہمت ساتھ نہیں دیتی تھی۔

انجمن دار العلوم شہابیہ نے "رشاد" نامی ماہنامہ شروع کیا اس میں دعوتِ قرآنی کے عنوان سے تفسیر قرآن کا آغاز ہوا۔ احباب نے اسے بہت پسند کیا لیکن "رشاد" ابھی اپنی زندگی کے ابتدائی مراحل میں تھا کہ بعض ناگزیر وجوہ کی بنا پر بند کر دینے کا ارادہ کر لیا اور ارادے کے ساتھ ہی 'رشاد' کے حلقۂ احباب کو خطوط کے ذریعے اس کی اطلاع کر دی۔ احباب نے 'رشاد' کے بند ہونے پر افسوس کا اظہار کیا اور دعوتِ قرآنی کا سلسلہ جاری رکھنے کا مشورہ دیا۔

کام کی عظمت اور اپنی علمی بے مائیگی کے پیشِ نظر طبیعت اس کے لیے تیار نہ تھی لیکن اس خیال سے طبیعت کو بہت بڑی ڈھارس ملی کہ پاک و ہند میں جن بزرگوں نے تفسیری خدمت کی ہے اور جن کی علمی حیثیت مسلّم ہے اور جن کی خدمات وقت کی بے رُخی کے ہاتھوں گوشۂ گمنامی کی نذر ہو چکی ہیں۔ اگر سب کی نہیں تو کچھ کی عظیم تفسیری خدمت کو یکجا کر کے نئے انداز میں حالات اور تقاضوں کے مطابق گوشۂ گمنامی سے نکال کر شاہراہِ عام پر رکھ دیا جاتے۔ تو یہ نہ صرف قرآن حکیم کی عظیم خدمت ہو گی بلکہ ان بزرگوں کی خدمات کی بہت بڑی قدردانی ہو گی۔

پیشِ نظر کتاب میں تفسیر و تشریح کی جو کوشش کی گئی ہے اس کی بنیاد یہی ہے اس سلسلے میں اوّلیت حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن رحمۃ اللہ علیہ اور حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی رحمۃ اللہ علیہ کے افادات کو دی ہے اور میں نے کوشش کی ہے کہ ان بزرگوں کے تفسیری افادات پورے کے پورے اس میں آ جائیں۔

ان دو بزرگوں کے علاوہ میں نے جن کے علوم سے استفادہ کیا ہے ان کی کچھ تفصیل یہ ہے :

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ	شاہ عبدالعزیز محدثؒ	شاہ عبدالقادرؒ
مولانا عبدالحق حقانیؒ	مولانا حسین علیؒ	مولانا اشرف علی تھانویؒ
مولانا احمد علی لاہوریؒ	مولانا احمد سعید دہلویؒ	مولانا ابوالکلام آزادؒ
مولانا ثناء اللہ امرتسریؒ	مولانا مفتی محمد شفیع	مولانا محمد ادریس کاندھلویؒ
مولانا عبدالماجد دریاآبادیؒ	مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی	مولانا امین احسن اصلاحی
مولانا نعیم الدین مرادآبادیؒ	پیر محمد کرم شاہ بھیروی	

جس مقام پر تلاش و جستجو کے باوجود ان بزرگوں سے کوئی خاص بات نہ ملی تو پھر جن اعاظم مفسرین سے میں نے استفادہ کیا ہے ان کے نام یہ ہیں :

محمد بن جریر طبریؒ	محمود بن عمر زمخشریؒ	فخرالدین رازیؒ
محمد بن احمد قرطبیؒ	حسین بن مسعود بغویؒ	عمادالدین بن کثیر دمشقیؒ
ابوالبرکات محمود نسفیؒ	قاضی ناصرالدین بیضاویؒ	ابوحیان اندلسیؒ
ابوسعود العمادیؒ	محمود آلوسی بغدادیؒ	محمد بن علی شوکانیؒ
حسن بن محمد نیشاپوریؒ	نواب صدیق حسن خانؒ	قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ
علامہ رشید رضاؒ	علامہ مصطفیٰ المراغیؒ	سید قطب مصریؒ

اسلامی زندگی میں پیش یا افتادہ مسائل کی تحقیق کے لیے جن بزرگوں کے علوم سے خوشہ چینی کی گئی ہے ان کے اسمائے گرامی یہ ہیں :

ابوبکر الجصاص رازیؒ	ابوبکر بن العربیؒ	حافظ ابن تیمیہؒ
حافظ ابن القیمؒ	حضرت شاہ ولی اللہؒ	مولانا محمد اسماعیل شہیدؒ
علامہ شاطبی غرناطیؒ	مولانا محمد قاسم نانوتویؒ	مولانا بدرعالم میرٹھیؒ
مولانا سید سلیمان ندویؒ	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ	مولانا ابوالحسن علی میاں ندویؒ
مولانا منظور نعمانیؒ	مولانا حفظ الرحمان سیوہارویؒ	

اللہ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس نے میری علمی بے مائیگی کے باوجود کتاب کی پہلی جلد کی تکمیل کا سامان بہم پہنچایا اور مجھ گنہگار کو توفیق بخشی کہ ان اوراق کو ترتیب دے کر اپنے سیاہ نامۂ اعمال کے دھونے کے لیے آبِ رحمت کے چند قطرے فراہم کر سکوں۔

کام کا نقشہ

قفسِ عنصری میں اگر انفاسِ حیات رواں رہے تو ارادہ یہی ہے کہ ان شاء اللہ معالم القرآن کی ایک پارے پر مشتمل ایک جلد ہر چار ماہ کے بعد تیار ہو کر ہدیۂ ناظرین ہوتی رہے گی۔

اس کی ترتیب و تالیف میں جو محنت کی گئی ہے اس کا بڑا صلہ یہی ہے کہ صواب کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹا ہو اور حقیقت کی منزل سے بُعد نہ ہوا ہو۔

میں نے اپنے علم کی حد تک اس کی پوری احتیاط کی ہے کہ کسی مسئلہ میں قلم صراطِ مستقیم سے تجاوز نہ کرے لیکن عالم الغیب جانتا ہے کہ قلم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے اس لیے اس کی بارگاہ میں نہایت عجز سے دُعا ہے کہ خداوندا میری لغزشِ قلم کو دوسروں کے قدم کی لغزش کا سبب کا نہ بنا۔ اہلِ علم سے التماس ہے کہ اگر کوئی قابلِ اصلاح چیز نظر آئے تو اس خطاکار کو مطلع کر کے جزائے خیر کے مستحق ہوں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؕ

مقدمہ

الحمد للہ رب العالمین والسلام علی سید المرسلین وخاتم النبیین وعلی آلہ واصحابہ اجمعین

موضوع :۔

قرآن کا اصل موضوع انسان کے لئے ایسی رہنمائی فراہم کرنا ہے جس کے ذریعے وہ ایسی زندگی گذار سکے جو موجودہ زندگی کے بعد آنے والی دائمی زندگی میں اس کے لیے سودمند ہو اور اس کے نتیجے میں رضائے الٰہی حاصل ہو ــــــــ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے الفوز الکبیر میں یہ بات صراحت کے ساتھ بتائی ہے۔

قرآن حکیم کے نزول کا مقصد اصلی انسانوں کی تہذیب وتربیت اور ان کے عقائد باطلہ اور اعمال فاسدہ کی اصلاح ہے۔

اسی مفہوم کو شاہ صاحبؒ نے تفہیمات الٰہیہ میں اس طرح پیش فرمایا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے مجھے تفسیر کا علم مختصر الفاظ میں عنایت فرمایا جس کی حقیقت یہ ہے کہ ایمان حقیقی ہر انسان کے دل میں اللہ کی جانب سے ودیعت کیا گیا ہے۔ لیکن مادی زندگی کی چیرہ دستیوں نے انسان پر قبضہ کر لیا ہے اسی کی خاطر اللہ نے قرآن عزیز نازل فرمایا تاکہ اس کے ذریعے ان کی طبیعتوں کو تبدیل کرے۔ (صــ ۱۲۴، ۲۰ج)

اسی لئے قرآن قوموں کے عروج وزوال سے بحث کرتا ہے۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کے قوانین، عبادات واخلاق، معاملات وحقوق اور آداب سے متعلق بنیادی اور اساسی ابواب کو پیش کرتا ہے۔

اس کتاب کی جامعیت کا عالم یہ ہے کہ یہ مبارک صحیفہ بندوں سے اللہ کے دوگونہ تعلقات کا استوار کرتا ہے۔ حاکمانہ تعلقات اور محبوبانہ تعلقات۔

حاکمانہ تعلقات یہ ہیں کہ انسان اس کے بندے اور محکوم ہیں اور اللہ کی ذات حاکم اعلیٰ ہے بندوں کا کام حاکم کی اطاعت ہے

محبوبیت یہ ہے کہ اللہ کی ذات محبوب ہے بندے اس کے عاشق ومحب ہیں عاشقوں کا کام محبوب کی عبادت ہے۔

قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کی نسبت کا نتیجہ یہ ہے کہ کلام محبوب ہونے کی وجہ سے اس میں شانِ تعبد ہے اور پیغام حاکم ہونے کی وجہ سے اس میں شانِ تدبر ہے۔

شانِ تعبد کی خاطر قرآن کی تلاوت کتنا بہت بڑی عبادت ہے تلاوت کو نبوت کے مقاصد میں ایک مقصد قرار دیا ہے۔ قرآن نے متعدد آیات میں اس کا تذکرہ یتلو علیھم آیاتہٖ کے عنوان سے کیا ہے۔ تلاوت کی بنا پر اہلِ ایمان کی ایک سے زیادہ مقام پر مدح کی گئی ہے اور ان سے تلاوت کا مطالبہ کیا ہے۔

شانِ تدبر کی خاطر تعلیم و تدریس قرآن کو ربانی ہونے کا معیار قرار دیا ہے اور امت سے تفقہ، تدبر اور تفکر کا مختلف عنوانوں سے مطالبہ کیا ہے اور نبوت کے مقاصد میں سے ایک مقصد یہ بتایا ہے کہ یعلمھم الکتاب والحکمۃ تعلیم کتاب سے معانی کتاب اور حکمت سے اسرار کتاب مراد ہے۔ اگرچہ قرآن کے اولین مخاطب عرب تھے مگر کسی کتاب کے سمجھنے کے لئے صرف زبان دانی کافی نہیں ہے جتنی بلند پایہ کتاب ہوتی ہے اتنی ہی شرح و بسط کی محتاج ہوتی ہے۔ اسی لئے قرآن کی تبیین کو نبوت کے فرائض میں شمار کیا ہے۔

انزلنا الیک الذکر لتبین للناس

ہم نے قرآن آپ پر اس لئے نازل کیا ہے تاکہ آپ اسے لوگوں کے سامنے کھول کر پیش کریں

تلاوتِ قرآن اگر قرآن خوانی ہے تو تدبر قرآن قرآن دانی ہے۔ قرآن خوانی اور ہے اور قرآن دانی اور۔ یہ قرآن دانی ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمر جیسے جلیل القدر صحابی کے بارے میں آیا ہے کہ۔

آپ پورے آٹھ سال تک سورۃ بقرہ کو سیکھتے رہے۔

ظاہر ہے کہ یہ فہم معانی اور درک مقاصد کی منزل ہونے کی وجہ سے قرآن خوانی نہیں قرآن دانی ہے تابعی کبیر مفسر جلیل حضرت امام مجاہدؒ فرماتے ہیں۔

میں نے اپنے استاد حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کو تیس بار قرآن بیان کر کے سنایا۔

حضرت انس بن مالکؓ نے معاشرہ صحابہ کا یہ عام تاثر بیان کیا ہے۔

جب کوئی سورۃ بقرہ اور سورۃ آل عمران پڑھ لیتا تو ہماری نگاہوں میں اس کی قدر و منزلت قائم ہو جاتی۔

مشہور تابعی ابو عبد الرحمٰن سلمی کہتے ہیں کہ جن صحابہ نے ہمیں قرآن پڑھایا ہے جیسے حضرت عثمان بن عفانؓ اور حضرت عبد اللہ بن مسعودؓ ان کا اپنی قرآنی تعلیم کے بارے میں انکشاف ہے کہ۔

جب وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی تعلیم حاصل کرتے تھے تو طریق کار یہ تھا کہ دس آیتوں کی تعلیم ہوتی اور اس وقت تک ان دس آیتوں کی تعلیم سے فراغت نہ ہوتی جب تک ان کا علم و عمل

مکمل نہ ہو جاتا ــــــ اور فرماتے ہیں کہ اس طریق تعلیم کے ساتھ ہم نے قرآن کا علم اور اس پر عمل کیجا حاصل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو ایک ایک سورت کی تعلیم میں ایک مدت درکار ہوتی۔

الحمدللہ قرآن کی شان تعبد اس دور میں بھی جب کہ ہم دورِ تنزل میں ہیں۔ اور اسلامی زندگی میں ترقی کی منزل کی طرف قدم بڑھانے کی جگہ بچے کھچے اسلام کو بچانے کی فکر میں ہیں۔ تلاوت قرآن کی گرمی کچھ مسلمانوں میں موجود ہے ــــــ لیکن یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ مسلمانوں کی عمومی زندگی کا تدبر قرآن سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔ یہ صورتِ حال فی الحقیقت زندگی کی عام شاخوں میں نبوت سے تعلقات منقطع ہونے کا قدرتی نتیجہ ہے۔

اللہ سبحانہٗ ان علماء کو جنت کی مسرتوں سے ہمدوش کرے جنہوں نے امت کے اس ٹوٹے ہوئے رشتہ کو جوڑنے کی علمی اور عملی تدبیریں کی ہیں۔ علمی یہ کہ تشریح و تفسیر کے ذریعے قرآن کا پیغام لوگوں تک پہنچایا اور عملی یہ کہ مدارس میں عربی زبان اور اس کے متعلقات کی تعلیم کی راہ سے لوگوں کو قرآن آشنا بنایا ــــــ لیکن اجتماعی مقاصد کبھی انفرادی فیاضیوں سے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچتے ہیں۔ اجتماعی مقاصد کی پشت پر جب تک اجتماعی محنت نہ ہو گوہر مقصود ہاتھ نہیں آتا۔

پارہ اوّل ایک نظر میں

اسلامی دعوت، احکام و قواعد کا خلاصہ

اللہ کی ذات:-

چونکہ اللہ کی ہستی کا علم انسان کے لئے خود اپنی ہستی کے علم کی طرح بالکل فطری اور بدیہی ہے جس کیلئے دلیل اور برہان کی ضرورت نہیں ہے اور نبوت کی مخاطب قومیں اللہ کی ہستی کو ماننے والی ہیں اس لیے قرآن نے اپنی دعوت میں اس مسئلہ پر براہ راست بحث نہیں کی ہے لیکن جا بجا اس نے اس موضوع پر اشارات کئے ہیں۔

۔ یہ بات کون نہیں جانتا ہے کہ ہم پر ایک دور نیستی اور عدم کا گذر چکا ہے۔ اور دوسرا دور آنے والا ہے کہ ہم پھر پردہ عدم میں چلے جائیں گے ——— ہمارا وجود دو ہستیوں اور دو عدموں کے مابین اس طرح ہے جیسے دن کی تابانی دو تاریکیوں کے درمیان محصور ہے۔

یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کائنات کا وجود ذاتی نہیں ہے بلکہ جس طرح زمین کی روشنی آفتاب کا فیض ہے اور پانی کی گرمی آگ کا فیضان ہے ——— اسی طرح دو ہستیوں کے درمیان ہمارا وجود بھی ایسی ذات کا فیض ہے جس کا وجود اصل اور خانہ زاد ہے اور وجود اس کے لئے ایسا ہے جیسے آفتاب کے لئے نور، آگ کے لئے حرارت، چار کے لئے جفت ہونا اور تین کے لیے طاق ہونا ——— یہی وجود اصل اسلام کی زبان میں اللہ کی ہستی، واجب الوجود اور خدا ہے۔ آیت نمبر ۲۸ میں اسی کی طرف اشارہ ہے (شرح العقیدۃ الاصفہانیہ، حجۃ الاسلام)

اللہ کی صفات:-

قرآن نے اپنی دعوت کے ذریعے قوموں کی جن سنگین غلطیوں کی اصلاح کی ہے ان میں سے ایک صفات الٰہی کا مسئلہ بھی ہے۔ خدا کو ماننے کے باوجود کچھ لوگ سمجھ رہے تھے۔ کہ جس طرح دنیا میں ایک بادشاہ ہوتا ہے اور حکومت کا کام خود نہیں کرتا بلکہ اس کے وزراء کرتے ہیں اور جس طرح چاہتے ہیں اسی طرح کرتے ہیں۔ اللہ کا معاملہ بھی یہی ہے ——— کچھ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ خدا بھی ویسے ہی طبعی حالات سے دوچار ہوتا ہے جیسے انسان۔ قرآن نے صفات کے موضوع پر اس طرح اصلاح کی کہ بتایا کہ

۱۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں ۲۰
۲۔ وہی سب کا خالق، رزاق، پروردگار اور کارساز ہے۔ ۲۲
۳۔ وہی ساری کائنات کا بادشاہ اور حاکم ہے سب کچھ اسی کے اختیار میں ہے۔ ۱۰۷
۴۔ کسی اور کے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔ ۱۰۷
۵۔ اللہ تعالیٰ بڑی رحمت والا نہایت مہربان گناہوں کا بخشنے والا اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔ ۳۷
۶۔ علم و حکمت کا خزانہ اللہ ہے۔ ۳۲
۷۔ انسانوں کی ہدایت اللہ کے قبضے میں ہے۔ ۳۸
۸۔ آسمان و زمین میں اللہ کے سوا مددگار نہیں ہے کوئی۔ ۱۰۷
۹۔ قیامت کے روز فیصلہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ ۱۱۲
۱۰۔ اللہ کی ذات مکان جہت کی قید سے پاک ہے اس کی تجلیات ہر جگہ ہیں۔ خود بے پایاں وسعتوں والا ہے۔ اس کا علم کامل ہے۔ ۱۱۵
۱۱۔ ہر قسم کی بشری رشتہ داریوں سے پاک ہے۔ تمام مخلوقات کا تعلق اس سے مملوک ہونے کا ہے۔ سب کے سب بلند و پست، کبیر و صغیر، زندہ و بیجان اس کے آگے جھکے ہوئے ہیں اور اس کی مشیت سے وابستہ ہیں۔ ۱۱۶
۱۲۔ غیب دان صرف اللہ کی ذات ہے۔
۱۳۔ نیست سے ہست کرنا، عدم محض سے وجود میں لانا بغیر کسی مثال اور نمونے کے اور بغیر کسی مادے کے زمین کا بنانا۔ اسی کا کام ہے اللہ کی ذات صاحب ارادہ، ذی حیات، صاحب اقتدار ہے اس کی شان یہ ہے کہ اِدھر ارادہ ہوا اُدھر معاً اور بلا توسط و توقف، اس کا عملی ظہور ہو جاتا ہے۔ ۱۱۷
۱۴۔ سب کچھ سننے والا ہے سب کچھ جاننے والا ہے۔ ۱۲۷
۱۵۔ عزت و حکمت کا مالک ہے۔ ۱۲۹
۱۶۔ انسانوں کے اعمال سے باخبر ہے۔ ۱۴۰

توحید

۱۔ عبادت صرف اللہ کی کرنی چاہیئے۔
۲۔ تسبیح و تقدیس اور تحمید اللہ کی کرنی چاہیئے۔ ۳۰

رسالت

آخرت کی زندگی

قرآن کا تعارف

صحابہ کا چہرہ

دستوری قواعد

اولی الامر کی صفات

نیابت الٰہی کا نظام چلانے کے لئے صاحب امر میں جن امور کو ملحوظ رکھنا چاہیئے یہ ہیں۔

قوانین کلیہ (یا) قواعد عامہ

۲۔ جو شخص اپنے کاموں سے برائی کماتے گا اس طرح کہ گناہ اس کی پوری زندگی کا گھیراؤ کر لیں تو وہ دوزخ میں جائے گا۔ ۸۱
۳۔ جو شخص بھی نبوت کی ہدایت کے مطابق اللہ سبحانہٗ پر ایمان اور آخرت پر یقین رکھے گا اور عمل صالح کی صورت میں اس ایمان ویقین کے تقاضے پورے کرے گا تو اسے اپنے ایمان وعمل کا ضرور اجر ملے گا۔ ۶۲
۴۔ جو شخص نعمتِ ایمان پاکر اسے کفر سے تبدیل کرے گا۔ یقیناً وہ سیدھے راستے سے بھٹک جائے گا۔ ۱۰۸
۵۔ جو شخص اپنا دین وایمان بیچ کر شعبدہ بازیوں اور جادوگری کا خریدار بنتا ہے اس کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔
۶۔ نجات متوارث کا نظریہ غلط ہے بلکہ نجات کا دروازہ ہر اس شخص کے لئے کھلا ہے۔ جو اللہ سبحانہٗ کے سامنے سرِ طاعت خم کر دے اور محسن ومخلص ہو۔ ۱۱۲
۷۔ مساجد میں لوگوں کو خدا کی یاد سے روکنے والا کوئی ہو وہ ظالم ترین انسان ہے۔ ۱۱۴
۸۔ قرآن کا منکر خواہ کوئی ہو وہ سرتاسر نقصان میں ہے۔ ۱۲۱
۹۔ قرآن کے ایک حصہ کا انکار بھی ویسا ہی کفر ہے جیسے سارے قرآن کا ۸۵
۱۰۔ ایک نبی کا انکار بھی ویسا ہی کفر ہے جیسے سارے انبیاء کا۔ ۱۳۱

اجتماعی قوانین

امتوں میں فساد کن کن راہوں سے آتا ہے یا جیں جادۂ تقوٰی سے کیسے کر جاتی ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں روحانی تباہیوں سے محرومیوں کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اس موضوع پر کچھ قرآن نے اجتماعی قوانین کی نشاندہی کی ہے۔ یہ گویا قرآن کا پیش کردہ ایک آئینہ ہے اس میں نبی کی امت ہونے کی حیثیت سے ہم اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں اور اپنے چہروں کو داغوں سے پاک کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

۱۔ دین کی زندگی دینداری کی نہیں بلکہ کاروباری ہو جاتی ہے۔ ۴۱
۲۔ حق فروشی کے ساتھ حق پوشی کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ ۴۲
۳۔ حق کو حق کے نام پر نہیں بلکہ باطل کی آمیزش کر کے حق کے نام پر پیش کیا جاتا ہے۔ ۴۲
۴۔ حق کے علمبرداروں کی زبان پر حق ہوتا ہے۔ مگر ان کی زندگیاں خود حق سے محروم ہوتی ہیں۔ ۴۴
۵۔ نماز جیسی عبادت ان کے لئے سب سے بڑی سرگرانی ہوتی ہے۔ ۴۶

اصطلاحاتِ قرآنی

احیاء زندہ کرنا۔ مادہ حیاۃ ہے۔ قرآن میں حیاۃ کا استعمال مختلف معانی میں ہے۔

۱۔ قوتِ نامیہ جو نباتات و حیوان میں ہوتی ہے۔

۲۔ قوتِ احساس جس کی وجہ سے حیوان کو حیوان کہتے ہیں۔ زمین کی زندگی سے اس کی شادابی اور روئیدگی یعنی قوتِ نامیہ مراد ہوتی ہے اور مُردوں کے زندہ کرنے سے قوتِ احساس کا عطا کرنا مقصود ہوتا ہے

۳۔ عقل کی قوت کارکردگی جیسے اَوَمَن کَانَ مَیتاً فاحییناہ میں زندگی سے مراد عقل کی قوت کا ہے

۴۔ بقا فہم کے ساتھ لذت اندوزی جیسے شہدا میں زندگی سے مراد یہ ہے کہ ان میں فہم باقی ہے اور وہ اللہ کی نعمتوں سے لطف اندوز ہو رہے ہیں۔

۵۔ آخرت کی دائمی زندگی یا لیتنی قدمت لحیاتی۔ اس آیت میں حیات سے حیاتِ اُخروی مراد ہے۔

۶۔ ہلاکت سے نجات دینا جیسے قصاص کو حیاۃ کہا گیا ہے۔ یہاں حیات سے مراد ہلاکت سے بچانا ہے۔

۷۔ حیات جب اللہ سبحانہٗ کی صفت ہو تو سے مراد وہ ذات قدوس ہے جس کے متعلق کبھی موت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔

احسان نیکی کرنا بروزن افعال مصدر ہے۔ احسان دو معنی کے لئے آتا ہے ایک غیر کیساتھ بھلائی کرنا، دوسرے اچھی بات معلوم کرنا اور نیک کام انجام دینا۔ یہ خاص قرآنی اصطلاح ہے۔ ہماری زبان میں احسان کے معنے کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنا ہیں لیکن قرآن میں جس احسان کا ذکر ہے وہ اس کے علاوہ ہے اس کی حقیقت وہی ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی یعنی خدا کی بندگی اس طرح کرنا چاہیے کہ وہ قہار و قدوس اور ذوالجلال والجبروت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور گویا ہم اس کو دیکھ رہے ہیں۔

اخلاص خالص کر دینا۔ صاف کر دینا۔ ممتاز کر دینا بروزن افعال مصدر ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اخلاص قرآن کی زبان میں نفاق کے عمل کا مقابل ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاقِ عمل

اور اخلاص دونوں کی علامات بتاتی ہیں
مثلاً اخلاص کی علامات یہ تین بتاتی ہیں ۔
اول یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو سب
سے زیادہ محبوب ہو۔ دوم یہ کہ جس سے
بھی محبت کرے تو اللہ کی خاطر کرے
سوم یہ کہ کفر اس کے لئے ایسا ہی ناگوار
ہو جیسے جسم کے لئے آگ (حجۃ اللہ
البالغہ صر ۱۶۲) یاد رہے کہ نفاق عملی
نفاق کی کوئی علیحدہ قسم نہیں ہے بلکہ اصل
یہ ہے کہ جب منافقین کے اعمال
مسلمانوں سے بھی سرزد ہونے لگے ۔
تو مجبوراً علماء کو نفاق کی تقسیم کرنی پڑی ۔
وہی اعمال جو نفاق اعتقادی کے ثمرات
کہلاتے ہیں اگر تصدیق قلبی کے ساتھ بھی
نظر آنے لگیں تو اسی کا نام نفاق عملی ہے
اسی کا مقابل اخلاص ہے ۔

اسلام تابعداری کرنا ۔ لغت میں اصل معنے اپنے
آپ کو کسی کے سپرد کر دینے اور بالکل
اس کے تابع فرمان ہونے کے ہیں ۔ اللہ
کے بھیجے ہوئے اور اس کے رسولوں
کے لائے ہوئے دین کا نام اسلام اسی
لئے ہے کہ اس میں بندہ بالکل اپنے
آپ کو اللہ کے سپرد کر دیتا ہے اور
اس کی مکمل اطاعت کو اپنا دستور حیات
قرار دے لیتا ہے اور دین اسلام کی بھی
اصل حقیقت ہے اور اسی کا مسلمانوں سے
مطالبہ ہے فرمایا ہے الٰھکم الٰہ واحد
فلہ اسلموا تمہارا معبود یگانہ معبود ہے
لہٰذا تم اسی کے فرمانبردار ہو جاؤ اور اسی
اسلام کے بارے میں ارشاد ہے ۔ ومن
احسن دینا ممن اسلم وجھہ
للہ اور اس سے بہتر کس کا دین ہو سکتا ہے
جس نے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دیا
بہر حال اسلام کی اصل روح اور حقیقت یہی
ہے کہ بندہ کامل طور پر اپنے آپ کو اللہ
کے سپرد کر دے اور ہر پہلو میں نبوت کے
لائے ہوئے علم و عمل کے مطابق اس کا
مطیع فرمان ہو جائے (معارف صر ۶)

انفاق خرچ کرنا ۔ بروزن افعال مصدر ہے ۔ انفاق
میں جان مال کا ہی نہیں بلکہ اللہ کی عطا ہوئی
ساری نعمت کا خرچ کرنا آجاتا ہے کبھی
واجب ہوتا ہے کبھی مستحب ۔ صرف زکوٰۃ کی
ادائیگی کا نام انفاق نہیں ہے ۔ اس کے علاوہ
بھی قرآن میں انفاق کے اور مطالبات بھی
ہیں ، زکوٰۃ وہی دے گا جو صاحب نصاب
ہو اور ایک شخص خوشحال ہے اور اس کے
رشتہ دار تنگی و محتاجی میں مبتلا ہیں تو بحیثیت
مسلمان ہونے کے اس کا فرض ہے کہ ان
پر انفاق کرے فقہاء نے اس کے لئے
نفقات کے نام سے پورا نظام انفاق پیش

کیا ہے۔

ایمان باللہ بروزن افعال مصدر ہے اس کے معنے تصدیق کرنے کے ہیں یعنی خبر دینے والے کے حکم کا یقین کرنا اس طرح کہ حکم قبول کیا جائے۔ اور بتلانے والے کو سچا قرار دیا جائے۔ یہ امن سے بنا ہے گویا ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ جس پر ایمان لایا جائے، اس کو تکذیب و مخالفت سے امن دے دی جائے۔ اس کے ساتھ کبھی حرف بار آتا ہے اور کبھی لام۔ اوّل صورت میں اذعان و یقین کے معنے ملحوظ ہوتے ہیں اور دوسری صورت میں اعتراف و تسلیم کے جس سے اس طرف اشارہ ہوتا ہے کہ بغیر اعتراف تصدیق کا اعتبار نہیں ہے کبھی باعتبار حقیقت عرفیہ یا بطور مجاز وثوق کے معنے میں بھی ایمان آتا ہے یہ اس حیثیت سے کہ وثوق کرنے والا امن میں ہو گیا اور قانون کی زبان میں ایمان نام ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ان تمام تعلیمات کی تصدیق کرنے کا جن کے متعلق بالضرورت یہ معلوم ہو کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم ہے جس چیز کا تفصیلی علم ہے اس کی تفصیلی طور پر اور جس کا اجمالی علم ہے اس کی اجمالی طور پر تصدیق کرنا۔ جمہور محققین کا یہی مذہب ہے (روح المعانی)

حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ زبان نبوت میں ایمان کے ایک سے زیادہ اطلاقات پائے جاتے ہیں۔

۱۔ ایمان ظاہری یعنی وہ ایمان جس پر اسلامی مملکت کی شہریت کے حقوق ایک مسلم سوسائٹی کے فرد ہونے کی حیثیت سے حاصل ہوں۔ شہادتین کا اقرار، نماز اور زکوٰۃ کو عملاً قبول کر لینا اس بات کی قانونی ضمانت ہے کہ اب اسلامی قانون میں اس کی جان، مال اور آبرو محفوظ ہے

۲۔ دوسرے وہ ایمان جس پر نجات اخروی موقوف ہے، اسلامیات میں ہر اسلامی عقیدے، ہر اسلامی عمل و کردار اور ہر اسلامی اخلاق پر زبان نبوت میں ایمان اسی معنے میں آیا ہے۔ اسی ایمان کو درخت سے تشبیہ دی گئی ہے۔ درخت میں تنا، ٹہنیاں، پتے، پھول اور پھل سب کچھ ہوتا ہے ——— لیکن ٹہنیاں کٹ جانے پر درخت ناقص ہو جاتا ہے۔ یہی حال تنے، پھول اور پھل کا ہے۔

جب تک تنا جڑ کے ساتھ ہے درخت
ہے لیکن تنا ہی جڑ سے الگ ہو جائے
تو پھر درخت نہیں رہے ایمان کے مقابلے
میں لفظ کفر آتا ہے جب کہ دوسرے
معنے کے مقابلے میں کفر نہیں بلکہ نفاق
ہوتا ہے اور نفاق اگر اندرونی تصدیق
یعنی جڑ ہی ختم ہو جاتے تو اس میں اور
کافر میں کوئی فرق نہیں۔ لیکن اگر تصدیق
موجود ہے اور اس کے تقاضے ناپید
ہیں تو یہ نفاق عمل ہے۔

ایمان بالیوم الآخر یہ ہے کہ اس حقیقت کا یقین
کیا جائے کہ یہ دنیا ایک دن قطعی طور پر
فنا کر دی جائے گی اور اس کے بعد
اللہ تعالیٰ اپنی خاص قدرت سے پھر
سارے مردوں کو جلائے گا۔ یہاں جس
نے جیسا کچھ کیا ہے اسی کے مطابق
جزا اور سزا اس کو دی جائے گی۔
چونکہ دین و مذہب کی سارے نظام
کی بنیاد اس حیثیت سے جزا و سزا
ہی کے عقیدے پر ہے کہ اگر آدمی
اس کا قائل نہ ہو تو پھر وہ کسی دین و مذہب
اور اس کی تعلیمات و ہدایات کو ماننے
اور اس پر عمل کرنے ہی کی ضرورت کا
قائل نہ ہوگا اس لئے ہر مذہب میں چاہے
وہ خود انسانوں کا خود ساختہ ہو یا —
اللہ سبحانہ کا بھیجا ہوا جزا و سزا کو بطور بنیادی
عقیدے کے تسلیم کیا گیا ہے پھر انسانی
دماغوں کے بنائے ہوئے مذاہب میں
اس کی شکل تناسخ وغیرہ گھڑ لی گئی۔ لیکن
اللہ سبحانہ کی طرف سے آئے ہوئے
ادیان کل کے کل اس پر متفق ہیں کہ اسکی
صورت وہی حشر و نشر کی ہوگی جو قرآن
نے بتائی ہے۔

اس کا نام اس پارے میں الیوم الآخر
اور الآخرۃ آیا ہے آخرۃ کے معنے پچھلی
کے ہیں اور یہ لفظاً صفت ہے عربی میں
اوصاف کو موصوف کا قائمقام کر کے اکثر
موصوف کو حذف کر دیتے ہیں۔ مثلاً دنیا
کے لفظی معنے قریب ترین کے ہیں اور
یہ صفت ہے اس کا موصوف الحیاۃ ہے
یا الدار اس لئے الدنیا کا مفہوم الحیاۃ الدنیا
قریب ترین زندگی یعنی اس عالم کی موجودہ
زندگی یا الدار الدنیا قریب ترین گھر یعنی
موجودہ عالم ہے اسی طرح الآخر اور الآخرۃ
ہے اس کا مفہوم الیوم الآخر و الحیاۃ الآخرۃ
اور الدار الآخرۃ ہے پچھلا دن پچھلی زندگی
اور پچھلا گھر یعنی موجودہ زندگی کے بعد
آنے والی دوسری زندگی۔ قرآن میں یہ
لفظ ان ہی معنوں میں ۱۱۴ مقام پر آیا ہے
اسلام میں اس آئندہ زندگی کو دو ادوار

میں تقسیم کیا ہے ایک موت سے لے کر قیامت تک دوسرے قیامت سے لیکر ابد تک ۔ پہلے دور کا نام برزخ ہے اور دوسرے کا نام بعث حشر و نشر اور قیامت ہے اس طرح انسانی زندگی کی تین منزلیں ہیں ایک دنیا دوسرے برزخ اور تیسرے قیامت ۔ ان تینوں میں جو جوہری فرق ہے وہ یہ ہے کہ اس موجودہ دنیا میں جسم نمایاں ہے اور روح پوشیدہ ہے دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہتے ہیں ، روح نمایاں ہے جسم پوشیدہ ہے ، لیکن تیسرے عالم یعنی قیامت میں جہاں سے حقیقی اور غیر فانی زندگی شروع ہوتی ہے روح و جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی لذت و تکلیف کے مظاہر بالکل الگ الگ ہوں گے ۔

ایمان بالکتب کتاب الہی پر ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے جو اسمیں مذکور ہیں ، یہ گویا پوری شریعت مطہرہ کو قبول کر لینے کا مختصر ترین طریقہ تعبیر ہے اور اس لئے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقعہ پر ضروری نہیں ہے اس ایک فقرے کے تحت آجاتی ہیں ۔ قرآن پر ایمان لانے کے معنے یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام و مذکور ہیں ان سب کو بے کم و کاست ہم تسلیم کرتے ہیں ۔ قرآن نے ایمان بالکتب کو ضروری قرار دیا ہے یعنی قرآن کے ساتھ دوسرے پیغمبروں کے صحیفوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم کیا جائے نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے تورات جس کو ایک جگہ صحف موسیٰ بھی کہا ہے اور حضرت داؤد علیہ السلام کی زبور ، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل اور خود قرآن ، ان کے علاوہ سورۂ اعلیٰ میں صحف ابراہیم کا بھی تذکرہ ہے ۔

یہود تورات کے سوا کچھ نہیں مانتے عیسائی تورات کے احکام نہیں مانتے ۔ لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں ، پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتے اور ہندو ویدوں کے باہر خدا کے فیضان کا تصور بھی نہیں کر سکتے لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحیفۂ ابراہیم ، تورات ، زبور اور انجیل کو خدا کی کتاب یقین کرے اور دوسری اگلی آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیات پائی جاتی ہوں

تکذیب نہ کرے کہ ان کا کتب الٰہی ہونا ممکن ہے۔ قرآن کی یہ تعلیم صرف نظریہ کی حیثیت نہیں رکھتی بلکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قانونی حیثیت سے اسی بنیاد پر دنیا کی قوموں کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق مقرر کئے ہیں۔ ۱۔ مسلمان ۲۔ اہل کتاب۔ ۳۔ شبہ اہل کتاب ۴۔ عام کفار۔

ایمان بالرسل اللہ سبحانہ کے رسولوں پر ایمان لانا یہ ہے کہ اس واقعی حقیقت کا یقین کیا جائے کہ اللہ سبحانہ نے اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً اور مختلف علاقوں میں اپنے برگزیدہ بندوں کو اپنی ہدایت اور اپنی رضامندی کا دستور دے کر روانہ کیا ہے اور انہوں نے پوری دیانت و امانت کے ساتھ خدا کا پیغام بندوں تک پہنچا دیا۔ یہ عقیدہ اسلام کی خصوصیات میں سے ہے کیوں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو یہ خیال تھا کہ وہ ہی اللہ تعالیٰ کی خاص محبوب اور پیاری ہے تمام دنیا کی قوموں میں ہدایت ربانی کے لئے وہ ہی خاص ہیں اس کے علاوہ دنیا کی ساری قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں لیکن قرآن نے تنگ خیال کے اس محدود دائرے کو دنیا کی عظیم الشان وسعت سے بدل دیا۔ قرآن نے بتایا کہ دنیا کی تمام قومیں خدا کی نظر میں یکساں ہیں ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں خدا کی مخلوق ہیں۔ اس نے بتایا کہ روئے زمین کی ہر آبادی میں ہر قوم اور اور ہر زبان میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی راہ دکھانے والے اور اس کی آواز پہنچانے والے اور انسان کو غفلت سے چونکا دینے والے آئے ہیں اور یہ سلسلہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک برابر جاری رہا اور آپ اس سلسلہ کی آخری کڑی ہیں

امام پیشوا، مقتدا، رہنما، بروزن فعال اسم ہے جس کی اقتدا کی جائے۔ ام سے بنا ہے عربی میں ام کا اطلاق ایسی تمام چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں یا بہت سی چیزوں میں مقدم اور نمایاں ہوں یا پھر کوئی ایسی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں جو انہیں سر کے درمیانی حصہ کو ام الراس کہتے ہیں فوج کے جھنڈے کو ام کہتے ہیں جس کی پیروی کی جائے اور جس کے گرد لوگ طاعت و اقتدا میں جمع ہوتے ہوں وہ امام ہے

چاہے وہ انسان ہو کہ لوگ اس کے قول و فعل کی اقتدا کریں یا کتاب کہ اس کے احکام و ہدایات پر عمل کریں۔ اسلام کی اصطلاحی زبان میں امامت، خلافت اور امارت کا قریب قریب تصور ہے امام ہو یا خلیفہ، امیر ہو یا عامل سب کی ذمہ داریوں کا وزن یکساں ہے۔ امام رسول کا نائب اور امامت سایہ رسالت ہوتی ہے۔ نائب ہونے کی حیثیت میں امام کے احکام اپنے نہیں۔ بلکہ منیب کے ہوتے ہیں۔

مولینا شہیدؒ نے امامت کی ابتدائی تقسیم امامت حقیقیہ اور امامت حکمیہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ

حقیقی اور واقعی امامت یہ ہے کہ زندگی کے ہر کمال میں نبوت سے مشابہت نمایاں ہو جائے۔

زندگی کے شعبے ان گنت ہیں اس لئے ہر شعبے کی امامت بھی الگ ہے مثلاً فقہ میں امام، عدالت میں امام اور دوسرے شعبوں میں امامت الگ الگ ہے۔

فقہا نے امامت کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ امامت صغریٰ اور امامت کبریٰ صغریٰ سے مسجد میں نماز کی یا زندگی کے خاص شعبہ کی امامت مراد ہے جب کہ کبریٰ سے مراد نظام حیات انسانی شرعی ہے۔

بغی سرکشی، زیادتی، ضد، مصدر ہے۔ جہاں میانہ روی چاہیئے وہاں میانہ روی سے بڑھنے کی خواہش کو بغی کہتے ہیں۔ خواہ میانہ روی سے تجاوز عمل میں آیا ہو، یا نہ آیا ہو، بغی کا استعمال کمیت کیفیت یعنی مقدار اور وصف دونوں کے متعلق ہوتا ہے اس کی دو قسمیں ہیں ایک محمود جیسے عدل کے بجائے احسان کرنا اور فرائض کے علاوہ نوافل کا بھی پابند رہنا، دوسرے مذموم جیسے حق سے تجاوز کر کے باطل کو اختیار کرنا یا شبہات میں پڑنا۔ قرآن عظیم میں اکثر مواقع پر بغی کا استعمال مذموم مواقع پر ہوا ہے۔

لغت میں یہ لفظ حد سے تجاوز اور ایسی چیز کی تلاش جو اس کا حق نہ ہو، اسی سے زخم کے خراب ہونے اور خرابی میں بڑھ جانے کو بغی الجرح بولا جاتا ہے۔ اسی لئے قرآن میں بغی آیا ہے۔ یبغون فی الارض بغیر الحق جب اس کے مفعول پر علیٰ آتے تو اس کے معنے لوگوں کی جان، مال اور آبرو پر دست درازی کے آتے ہیں، اسی سے بغا زنا اور بدکاری کو کہتے ہیں۔ کبھی اس کے دو مفعول آتے ہیں اغیر اللہ

ابغیکم الٰہا (کیا میں اللہ سبحانہ کے علاوہ کو تمہارے لئے الٰہ تلاش کروں) اس سے معلوم ہوا کہ بغی حرام وہ گناہ ہے جس میں حدودِ حق کو پامال کر دیا گیا ہو۔ یا انسانوں میں افراد یا جماعتوں کے حقوق پر غاصبانہ قبضہ کیا جا رہا ہو بغی میں بغیر حق کی قید قرآن میں تاکید کے لئے آتی ہے۔ حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں۔ کہ بغی زیادہ تر حقوق العباد میں دست درازی پر بولا جاتا ہے۔ اگر لفظ عدوان کے ساتھ استعمال ہو تو بغی کے معنے بالذات حرام کے ذریعے ظلم کاری کے آتے ہیں جیسے چوری جھوٹ وغیرہ۔ سوسائٹی کے حقوق میں بغی و عدوان کی وہی حیثیت ہے جو حقوق اللہ میں اثم و عدوان کی ہے۔ اللہ سبحانہ کا حق ہو یا بندوں کا یعنی ان دونوں میں حق سے تجاوز اور حق میں کوتاہی پر بولا جاتا ہے۔

تحریف اصل مادہ حرف ہے جس کے معنے کنارے کے ہیں۔ یہ مصدر ہے اس کے معنے بگاڑ دینے کے اور بدل دینے کے ہیں عام اہل تفسیر نے لکھا ہے کہ یہودی تورات میں تحریف کرتے تھے۔ قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی ہے لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں رہا اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر بنتے بنتے قالب میں بدلتا رہا ہے۔ تورات جل جل کر خاکستر ہوئی ہے پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی۔ انجیل میں تحریف و جعل تو اسی زمانہ میں شروع ہو چکا تھا۔ پھر ترجموں کی کثرت ہونے نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی۔ تحریف کی دو قسمیں ہیں۔ لفظی اور معنوی۔ لفظی تحریف کا مطلب یہ ہے کہ اصل الفاظ میں تبدیلی کر دی جائے خواہ ایک لفظ کی جگہ دوسرا لفظ رکھ کر یا کسی لفظ کو حذف کر کے یا کوئی لفظ بڑھا کر۔ اور تحریف معنوی کا مطلب یہ ہے کہ الفاظ میں تو کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔ مگر عبارت کی کوئی من مانی تفسیر کر دی جائے جو اصل معنے کے خلاف ہو۔

مولانا رحمت اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ـــــ دوسری قسم کی نسبت پر تو ہمارے اور عیسائیوں میں کوئی جھگڑا نہیں ہے۔ کیونکہ وہ سب تسلیم کرتے ہیں کہ عہد عتیق کی وہ آیات جن میں عیسائیوں کے خیال کے مطابق

حضرت مسیح علیہ السلام کی جانب اشارہ تھا اور وہ احکام جو یہودیوں کے نزدیک دائمی اور ابدی ہیں ان کی تفسیر میں یہودیوں کی جانب سے تحریف معنوی کا صدور ہوا ہے اور علماء پروٹسٹنٹ یہ بھی اعتراف کرتے ہیں کہ پاپا کے معتقدین کی طرف سے دونوں عہد ناموں میں اس قسم کی تحریف ہوئی ہے اب تحریف لفظی رہ جاتی ہے جس کا علماء پروٹسٹنٹ بظاہر عام مسلمانوں کو دھوکا دینے کے لئے سختی سے انکار کرتے ہیں اس لئے اس کے ثابت کرنے کی ضرورت ہے ہمارا دعویٰ ہے کہ تحریف لفظی اپنی ساری قسموں سمیت ان کتابوں میں موجود ہے۔

عہد عتیق یعنی تورات کے تین نسخے ہیں۔ ۱۔ عبرانی نسخہ جو یہودیوں کے نزدیک بھی معتبر ہے اور ملت پروٹسٹنٹ کے نزدیک بھی۔ ۲۔ یونانی نسخہ جو عیسائیوں کے نزدیک ساتویں صدی تک معتبر تھا۔ اس وقت عیسائی حضرات عبرانی نسخہ کو تحریف شدہ مانتے تھے۔ ۳۔ سامری نسخہ جو سامریوں کے نزدیک معتبر ہے۔ یہ نسخہ دراصل عبرانی نسخہ ہے مگر عہد عتیق کی صرف سات کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس میں عبرانی نسخہ کی نسبت بہت سے الفاظ زائد ہیں جو آج کل اس میں موجود نہیں ہیں۔ اکثر محققین اس کو معتبر مانتے ہیں۔ عبرانی نسخہ کو تسلیم نہیں کرتے ان کا اعتقاد ہے کہ یہودیوں نے عبرانی نسخہ میں تحریف کر دی ہے اور تقریباً سارے علماء پروٹسٹنٹ بعض موقعوں پر اس کے ماننے پر مجبور ہو جاتے ہیں اور عبرانی نسخہ پر اسے ترجیح دیتے ہیں (اظہار الحق ج۲ صفحہ ۲۴۲)

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ یہودی تحریف لفظی ترجمہ تورات میں کرتے تھے اور فرماتے ہیں کہ میرے نزدیک یہی حق ہے اور تحریف معنوی اس طرح کرتے تھے کہ معنی میں دور دراز کی تاویلات کے ذریعے مطالب بدل ڈالتے تھے۔ حافظ ابن القیمؒ نے حدیث، تفسیر اور کلام کے آئمہ کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ تحریف تبدیل تاویل میں کرتے تھے اور بتایا ہے کہ امام بخاریؒ کا بھی یہی مذہب ہے شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں احکام الدین من التحریف کا عنوان قائم کر کے تحریف کی حقیقت، تحریف کی صورتیں، تحریف کے اسباب سے تفصیلی بحث کی ہے۔

تفریق بین الرسل اس کا مطلب یہ ہے کہ خدا
کے رسولوں میں باعتبار تصدیق تفرقہ و
امتیاز کرنا یعنی یہ سمجھنا کہ ان میں سے
فلاں سچا تھا۔ فلاں سچا نہ تھا یا کسی ایک
کی تصدیق کرنی باقی سب کا انکار کر
دینا یا سب کی تصدیق کرنی کسی ایک
کا انکار کر دینا کوئی شخص اس وقت تک
مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک وہ دنیا
کے سارے پیغمبروں کی یکساں صداقت،
حقانیت، راستبازی اور معصومیت
کا اقرار نہ کرے اور یہ یقین نہ کرے
کہ ان کے ذریعے اللہ تعالیٰ نے عرب
کی طرح ہر قوم کو اپنی ہدایت اور رہنمائی
سے سرفراز کیا ہے اور ان کا ماننا ایسا
ہی ہے جیسا کہ خدا کا ماننا غرض تفریق
یہ ہے کہ انبیاء میں سے کچھ کو ماننے
اور کچھ کو نہ ماننے، قرآن نے اس کی
مخالفت کی ہے۔ اور عام حکم دیا ہے
کہ دنیا کے تمام پیغمبروں اور رسولوں کو
یکساں خدا کا رسول صادق اور راستباز
تسلیم کیا جائے۔ یہودی حضرت عیسیٰ ؑ
کو نعوذ باللہ جھوٹا اور کاذب سمجھتے تھے
اور ان پر طرح طرح کی تہمتیں لگاتے
تھے اور اب بھی ان کا یہی عقیدہ ہے
یہودیت اور اسلام میں جو اشتراک ہے
وہ مسیحیت سے زیادہ ہے اس لئے اگر اسلام
کی راہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کا نام نہ آتے
تو بہت سے یہود مسلمان ہونے کو تیار ہو
جائیں مگر اسلام نے کبھی یہ تنگ نظری
گوارہ نہیں کیا اور جب تک یہودی سے
حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت عصمت
اور تقدس کا اقرار نہیں لے لیا اس کو اپنے
دائرے میں داخل ہونے کی اجازت
نہیں دی چنانچہ خود زمانہ نبوت میں بہت
سے یہود آپ کی نبوت پر ایمان لانے
کو تیار تھے مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو
ماننے کے لئے تیار نہ تھے۔ حضور انور صلی
اللہ علیہ وسلم نے ان کی دوستی کے عظیم الشان
فائدوں سے محروم رہنا گوارہ کیا مگر حضرت
مسیح علیہ السلام کی سچائی سے محروم رہنا گوارا
نہ فرمایا (ابن جریر صفحہ ۱۶ ج ۸)

تسبیح یہ مصدر جعل ہے اس کے معنے سبحان اللہ
کہنا ہے اور اللہ سبحانہٗ کی پاکی بیان کرنا ہے
یعنی اس کی پاکی اور ہر عیب و نقصان سے
اس کی برائت ظاہر کرنا۔ امام راغب فرماتے
ہیں کہ سب چیزیں اللہ سبحانہٗ کی تسبیح کرتی
ہیں۔ بعض کی تسبیح تسخیری ہوتی ہے۔
اور بعض کی اختیاری۔ آسمان و زمین
اور رینگنے والے جانوروں کے بارے میں
تو کوئی اختلاف نہیں کہ وہ بالتسخیر تسبیح

گناہ ہیں کیونکہ ان کے احوال اللہ تعالیٰ کی حکمت پر دال ہیں البتہ اس میں اختلاف ہے کہ آسمان و زمین آیا اپنے اختیار سے بھی اللہ سبحانہٗ کی پاکی بولتے ہیں یا نہیں۔

علامہ مرتضیٰ زبیدیؒ تاج العروس میں رقمطراز ہیں۔

کبھی تسبیح بول کر اس سے نماز اور ذکر اور تحمید و تمجید مراد لی جاتی ہے اور نماز تسبیح اس لئے کہا گیا ہے کہ تسبیح کے معنے اللہ سبحانہٗ کی تعظیم کرنے اور ہر برائی سے اس کی تنزیہہ کے آتے ہیں اللہ سبحانہٗ کی ذات کی معرفت میں سب سے پہلا درجہ تنزیہہ کا ہے اور قرآن کی زبان میں تنزیہہ کو تسبیح کہتے ہیں شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ ایمان کی زندگی میں اللہ سبحانہٗ کی معرفت صرف تسبیح اور تحمید کے ذریعے حاصل ہوتی ہے۔ تسبیح یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی طرف انسان کی توجہ اس طرح ہو کہ اسے احاطہ و ادراک سے بالا تصور کرے۔ اس کے لئے صفات دائمہ کو بغیر احاطہ اور ادراک کے ثابت کرے اور یقین کرے کہ وہ سنتا ہے لیکن اس کا سننا ہمارے سننے کی طرح نہیں ہے وہ دیکھتا ہے۔ لیکن اس کا دیکھنا ہمارے دیکھنے کی طرح نہیں ہے وہ جانتا ہے لیکن اس کا جاننا ہمارے جاننے سے مشابہ نہیں ہے۔ اس طرح صفتوں کو ثابت کرنا تحمید اور صفتوں میں اس کی بے نیازی کی شان کو برقرار رکھ کر ہر قسم کے عیب سے اسے پاک سمجھنا تسبیح ہے امام غزالیؒ نے الجام العوام میں تسبیح کو تقدیس کے نام سے موسوم کیا ہے۔ تسبیح کے ذریعے قرآن نے تنزیہہ کی تکمیل کی ہے تنزیہہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی پہنچ ہے صفات الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک رکھا جائے۔ قرآن کی تسبیح تنزیہہ کی تکمیل ہے۔

تقویٰ

پرہیزگاری بچنا وقایہ سے بنا ہے اصل میں وقوی ہے عربی زبان میں اس کے لغوی معنے بچنا۔ پرہیز کرنا۔ احتیاط کرنا اور لحاظ کرنا ہیں لیکن قرآن کی اصطلاح میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ سبحانہٗ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کرتی ہے۔

دوسرے لفظوں میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ تقویٰ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے۔ جس کی بنا پر ہر کام میں اللہ سبحانہٗ کے حکم کے مطابق کام کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے سخت نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہ بات کہ تقویٰ دل کی

اس کیفیت کا نام ہے قرآن کی اس آیت سے ثابت ہے جو ارکان حج کے موقع پر ہے۔ مَنْ يُّعَظِّمْ شَعَآئِرَ اللّٰهِ فَاِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوْبِ۔ اس آیت سے واضح ہے کہ تقویٰ کا اصل تعلق دل سے ہے اور وہ سلبی کیفیت کی بجائے ایجابی اور ثبوتی کیفیت اپنے اندر رکھتا ہے۔ اور وہ امور خیر کی دلوں میں رغبت اور برائیوں سے نفرت کی تحریک سے ان کو معمور کرتا ہے۔

قرآن کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہم اگر ایک لفظ میں کرنا چاہیں تو ہم اسے تقویٰ کہہ سکتے ہیں۔ قرآن کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے۔ قرآن میں سورۂ بقرہ کا تو موضوع ہی تقویٰ ہے اس نے سورت کے آغاز ہی میں اعلان کیا ہے کہ قرآن کی تعلیم سے فائدہ اٹھانے کی بنیادی شرط ہی تقویٰ ہے هُدًى لِّلْمُتَّقِيْنَ۔ اسلام میں عبادات کا سرتاسر منشا تقویٰ ہے۔ روزے سے بھی یہی مقصود ہے۔ حج کا منشا بھی یہی ہے۔ قربانی بھی اسی غرض کے لئے کی جاتی ہے۔ ایک مسلمان کی پیشانی جس جگہ اللہ سبحانہ کی عبادت کے لئے جھکتی ہے اس کی بنیاد تقویٰ پر ہونی چاہیے۔ حج کے سفر اور زندگی کے مختلف مراحل میں مال و دولت سے زیادہ راستہ کا زادِ راہ تقویٰ ہونا چاہیے۔ آب و زینت کا سامان ظاہری لباس سے زیادہ تقویٰ کا لباس ہونا چاہیے۔ اسلام کا تمام اخلاقی نظام بھی اسی تقویٰ کی بنیاد پر قائم ہے۔ فوجداری ضابطہ کی تمام دفعات کا دارومدار تقویٰ ہے۔ دیوانی قوانین کی اصل روح تقویٰ ہے۔ اجتماعی قوانین میں دنیا میں امتوں کی تمام تر کامیابیوں اور کامرانیوں کا مدار اسی تقویٰ پر ہے۔ بلائیں یا مصائب خواہ کتنے سنگین ہوں لیکن نتائج کے لحاظ سے اہل تقویٰ ہی کامیاب ہیں۔ آخرت کی ساری سرفرازیاں متقیوں کے لئے ہیں جنت کی ساری نعمتوں کی حقداری تقویٰ کے لئے ہے۔ اللہ سبحانہ کی محبت، اللہ سبحانہ کی معیت کا شرف تقویٰ کو حاصل ہے۔ قبولیت اہل تقویٰ ہی کو حاصل ہے

خلافۃ عربی زبان کا مصدر ہے اس کا مادہ خلف ہے اسی سے خلیفہ ہے۔ خلیفہ کے لغوی معنی نیابت اور قائمقامی کے ہیں۔ یعنی جو شخص کسی کا نائب و قائمقام ہو تو اس کو لغت میں خلیفہ کہیں گے چاہے یہ نیابت موت و عزل کی وجہ سے ہوئی ہو یا غیبت کی وجہ سے یا اکرام کی خاطر یا اپنا اختیار

سپرد کردینے کی وجہ سے۔ امام راغبؒ کہتے ہیں کہ خلافت کے معنے نیابت کے ہیں۔ یہ نیابت غیبت کی وجہ سے ہو یا موت اور عاجزی کی وجہ سے ہو یا پھر نائب کے اکرام و اعزاز کی وجہ سے ہو۔
(صفحہ ۵۰)

یہ لفظ بھی قرآن حکیم کے اختیارات لغویہ میں سے ہے یعنی عربی زبان کے ان الفاظ میں سے ہے جن کو لغت میں عام معانی کے لئے استعمال کیا جاتا تھا۔ لیکن قرآن حکیم نے اپنے خاص اصطلاحی معنے میں استعمال کیا ہے قرآن کی زبان میں خلافت سے مقصود زمین میں اللہ سبحانہٗ کے احکام اختیاری کو تمکن حکومت کے وسیلے نافذ کرنا ہے۔ قرآن کے نزدیک اس کا مقصد یہ ہے کہ دُنیا میں نوع انسانی کی ہدایت و سعادت کے لئے ایک خاص ذمہ دار حکومت قائم ہو وہ اللہ سبحانہٗ کی عدالت کو دنیا میں نافذ کرے ظلم و جور اور ضلالت و طغیان سے اس کی زمین پاک ہوجائے۔ ایک عام امن و سکون اور رحمت و طمانیت دنیا میں پھیل جائے۔ اور اللہ سبحانہٗ کا وہ ہمہ گیر قانون عدل جو تمام کائنات ہستی میں سورج سے لے کر زمین کے ذرات تک قائم و نافذ ہے۔

اور جسے قرآن اپنی زبان میں صراطِ مستقیم کہتا ہے زمین کے چپے چپے میں جاری ہوکر زمین کے گہوارہ کو سعادت و امن کی بہشت بنا دے۔ سب سے پہلے خلافت کا یہ منصب اللہ سبحانہٗ کی جانب سے حضرت آدم علیہ السلام کو ملا۔ وہی زمین میں واقعی خلیفہ ہیں اور آپ کے بعد ہر نبی اپنے سابق کا نائب ظہور اسلام کے ساتھ جب جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نبوت کے ختم ہونے کا اعلان ہوا تو قرآن نے خلافت کا یہ منصب امت مسلمہ کے سپرد کردیا۔ یہی تمکین فی الارض ہے یہی استخلاف فی الارض ہے اور اسی کا نام امامت ہے۔

آلوسیؒ خلافت پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ ہر نبی زمین کی آبادکاری، سیاست، انتظام اور اللہ سبحانہٗ کے قانون کے نافذ کرنے میں بواسطہ آدم اللہ سبحانہٗ کا خلیفہ ہے بشاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ نظام خلافت دو وجہ سے ضروری ہے ایک ملکی و قومی دوسرے دینی و ملی۔ ازالۃ الخفاء میں خلافت کی یہ تعریف کی گئی کہ - - - - - وہ عمومی ریاست جس میں اسلامی علوم کے ذریعے زندگی میں دین کو قائم رکھا جائے۔ ارکان

اسلام پر داں چڑھیں اور جہاد اور
اس کے وسائل کی بہم رسانی یعنی نظام
دفاع مرتب ہو۔ عدالت میں اللہ سبحانہٗ
کے قوانین نافذ ہوں اور شہریوں میں نیکی
کی تلقین اور برائی پر گرفت کی جائے اور
یہ سارے کام ملکی و قومی تقاضے سے
نہیں بلکہ نبوت کی نیابت میں ہوں۔

دین
لغت میں یہ لفظ ایک سے زیادہ معنے
میں استعمال ہوتا ہے۔ الشیخ محمد اعلیٰ التھانوی
نے کشاف اصطلاحات الفنون میں دین
کے لغوی اطلاقات یہ بتلائے ہیں:

عادت، سیرت، حساب، دبدبہ
فیصلہ، حکم، طاعت، حالت، بدلہ،
سیاست، ضابطہ۔

یہ لفظ بھی ان الفاظ میں سے ہے
جن کو قرآن نے اصطلاحی معنے کا جامہ
پہنا دیا ہے۔ قرآن نے قیامت کو یوم
الدین معنی لغوی کے لحاظ سے کہا ہے
یعنی وہ دن مکافاتِ عمل اور بدلے کا
دن ہوگا۔

قرآن نے دین کا وہ اعلیٰ تصور پیش
کیا ہے جس سے پوری دنیا نا آشنا تھی۔
اب تک دین کے بارے میں جو تصورات
علمی طور پر قائم ہوئے ہیں، ان کا حاصل
یہ ہے کہ دین بندے اور خدا کے درمیان
ایک خاص رابطہ کا نام ہے۔ آج بھی دین
کے بارے میں عالمانہ انداز میں جو کچھ کہا
جاتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ غیبی اور ان
دیکھی قوتوں سے تعلقات کا نام دین ہے
کوئی بتاتا ہے کہ ایسی معلومات جن کا علم عقل سے حاصل
نہ ہو سکے اس کا نام دین ہے ــــــ
یگانے بھی بیگانوں کی دیکھا دیکھی کہہ رہے
ہیں کہ دین نام ہے خدا اور بندے کے
درمیان خاص تعلقات کا ــــــ مگر قرآن
نے دین کا جو تصور پیش کیا ہے وہ اس
سے اعلیٰ ہے قرآن کے پیش کردہ تصور دین
کے لئے ضروری ہے کہ اولاً قرآن کے
مبادی اور مقاصد پر نظر ہو۔ اور پھر قرآن
کے بنیادی کام سے بھرپور
واقفیت ہو قرآن کے پیش نظر دو اہم بنیادی
کام ہیں:

ایک یہ کہ انسانی زندگی میں پھیلی ہوئی غیر
معقول رسوم اور بعید از عقل عادات کیخلاف
احتجاج کیا جائے۔

دوسرے یہ کہ پوری انسانی سوسائٹی کی
ہمہ پہلو اور ہمہ گیر اصلاح کی جائے۔

ان دو کاموں کی بجا آوری کے لئے قرآن
نے اپنے اصلاحی نقشہ میں چار مقاصد مقرر
کئے ہیں:

افکار و نظریات کی اصلاح۔

عابدانہ تعلقات کی ذمہ داریاں اور شعائر۔
سیرت و اخلاق کی درستگی، فضائل کی بہم رسانی اور رذائل سے دوری۔
اجتماعی مالیاتی، سیاسی حقوق کی نگرانی۔

قرآن اپنے کام اور اپنے مقاصد کو جن ذرائع سے حاصل کرنا چاہتا ہے۔ وہ صرف یہ ہیں۔ زندگی کی حفاظت، خیر کی دعوت، نیکی کی تلقین، برائی پر تنقید، علم وعقل کی پذیرائی۔ اپنے کام اور مقاصد میں ان مبادی کا لحاظ کرنے میں قرآن نے اپنی وضع، اپنے اسلوب، اپنے انداز بیان، اپنے طریق خطاب اور اپنے طریق استدلال غرضیکہ اپنی ہر بات میں منظر کشی سے کام لیا ہے۔ قرآن کا یہ انداز کہ منظر کشی کے ذریعے اپنے مخاطب کو تاثر دیتا ہے۔ معجزانہ اسلوب ہے۔ اور قرآن کے ساتھ مخصوص ہے ـــــ یہ قرآن کی معجزانہ منظر کشی ہے کہ اس نے قرآن کو پذیرائی دینے والوں یعنی اہل ایمان کے دلوں میں زندگی اور خیر کی طرف پوری انسانیت کو بلانے کی اس انداز سے تخم ریزی کی ہے اور دنیا میں معروف کو پھیلانے کی اس طریق پر تکوین کی ہے کہ ان میں اس کی لگن اور اس کا شوق پیدا ہو گیا۔ اور وہ دنیا کے سامنے ایک عالمگیر تخیل کے داعی کی حیثیت سے آ گئے اور ان میں ایسی شدید محبت پیدا کر دی کہ اس کے لئے کوئی قربانی نہ تھی جسے انہوں نے گوارا نہ کیا ہو اور کوئی مشقت نہ تھی جو انہوں نے برداشت نہ کی ہو۔ اس مقصد کی خاطر انہوں نے علم کی روشنی حاصل کی، جاہلیت کی رسوم و عادات کو یکدم ترک کر دیا اور چند سال کے عرصہ میں وہ ساری صفات حاصل کر لیں جو دنیا کی ترقی پذیر قوموں میں نمایاں ہوتی ہیں۔ اور اس کے نتیجے میں قرآن کے مخاطب پوری انسانی زندگی اور ساری دنیا کے لئے خیر امت بن کر امامت وقیادت کے منصب پر آ گئے اور قرآن کے پیش کردہ تصور دین نے ان کی اس انداز سے تربیت کی کہ ان میں وضعیت اور صناعیت کی جگہ فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت اجاگر ہو گئی۔ نتیجہ یہ نکلا کہ ان کو قرآنی کام قرآنی مقاصد کو سمجھنے میں کوئی دشواری نہ ہوئی اور قرآن کے مطابق دین یعنی نظام تمدن اور طرز زندگی کی تخلیق میں علم وعقل کی حاکمیت بروئے کار آ گئی ـــــ قرآن کے پیش کردہ کام، مقاصد اور مقاصد کی بازیابی کے لئے مبادی اور اس کی بنیاد پر چلتے ہوئے نظام تمدن اور طرز زندگی کی روشنی میں جب ہم دین کے مفہوم تک رسائی کرتے ہیں۔

تو اس نتیجے پر پہنچتے ہیں کہ دین قانون الٰہی کو کہتے ہیں جو انسانی زندگی میں عقل اور عمل تمیز کے ذریعے خیر اور سراسر خیر کی آبیاری کرتا ہو۔ قانون کی بنیاد تعزیر و سیاست پر ہوتی ہے اس میں مکافاتِ عمل اور طاعت کے معنے موجود ہوتے ہیں۔

سورہ یوسف میں جہاں یہ واقعہ بیان کیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے چھوٹے بھائی کو اپنے پاس روک لیا تھا۔ وہاں فرمایا کہ مَا كَانَ لِيَأْخُذَ فِيْ دِيْنِ الْمَلِكِ یہاں بادشاہِ مصر کے دین سے اس کا قانون مراد ہے۔ دین کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے جو قانون انسان کے لئے نبوت کی وساطت سے روانہ کیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک طاعت کی جائے اور صرف طاعت ہی نہیں بلکہ مخلصانہ طاعت کی جائے اور سب سے ہٹ کر کی جائے۔ قرآن میں دین کیلئے مخلص اور حنیف کو بطور شرط قرار دیا ہے۔ یعنی زندگی کے تمام گوشوں، عقائد، تعلقات بندگی، اخلاق اور حقوق کے لئے جو ضابطہ مقرر کیا ہے اس کا نام ہی دین ہے۔ اس کی پوری طاعت و انقیاد کے علاوہ دین کا ایسا کوئی پیشہ اللہ سبحانہٗ کے یہاں قابلِ قبول نہیں ہے جس میں محبوبیت کے درجہ میں عبادت کی حد تک اللہ سبحانہٗ سے تعلقات ہوں اور حاکمیت کے درجہ میں طاعت کی حد تک اور وں سے تعلقات ہوں۔ اسی کی اقامت کا اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ میں حکم ہے۔ گویا قرآن کے نزدیک مقاصد قرآن کی روشنی میں دین نام ہے بندے کے اللہ سبحانہٗ سے تعلقات اور بندوں سے بندوں کے اُن تعلقات کا جو نبوت نے مقرر کئے ہیں اور ان میں اللہ سبحانہٗ کی رضا یا ناراضگی کی پاسبانی کا ——— اس میں سراسر علمیت اور عقلیت ہے کوئی عقیدہ ایسا نہیں جو عقل کے لئے بوجھ ہو۔ اور کوئی عمل ایسا نہیں جو طبیعت کے لئے شاق ہو۔ ہر طرح کے پیچ و خم سے پاک۔ ہر معنے میں علم و عمل کی سیدھی سے سیدھی شاہراہ۔ دین کی اسی حقیقت کا ہمارے محققین نے اقرار کیا ہے اور بتایا ہے۔ کہ دین الٰہی قانون کا نام ہے چنانچہ صاحبِ دستور العلماء نے دین کی اصطلاحی تعریف یہی کی ہے کہ انسانوں کے لئے اس ضابطہ خداوندی کا نام ہے جو ان کو بالذات خیر کی طرف مائل کرنے جاتا ہے۔ الشیخ محمد اعلیٰ تھانوی نے کشاف اصطلاحات الفنون میں اسی کے قریب قریب تعریف نقل کی ہے اور بالآخر علامہ یمانی صاحب

اشارات الزام نے کھول کر بتایا ہے۔ کہ دین اہل عقل و خرد انسانوں کے لئے اس قانون الٰہی کا نام ہے جسے لوگ اپنے ارادے سے اختیار کریں اور خیر تک رسائی حاصل کر سکیں جن لوگوں کے پیش نظر قرآن کا بتایا ہوا دین کا یہ تصور نہیں ہے وہ اسے دوسرے مذاہب پر قیاس کر کے عظیم غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں اور انہوں نے دین کی حیثیت سے اسلام پر جمود اور انسانی زندگی کے تقاضوں سے ناموافقت کی پھبتی کسی ہے

وہ سمجھتے ہیں کہ دنیا جن انقلابی قوتوں کے تصادم اور کشمکش کی آماجگاہ ہے۔ اسلام میں ان کا حریف بننے کی قوت نہیں ہے اس میں تطور اور ترقی کی صلاحیت نہیں ہے

رسول رسالت سے بنا ہے رسالت کی تعریف یہ ہے کہ وہ اللہ سبحانہ اور اس کی مخلوق کے درمیان خدائی سفارت ہے۔ تاکہ اس کے ذریعے ان کی ان بیماریوں کا ازالہ ہو سکے جن میں ان کی عقلیں دنیا و آخرت کی مصالح میں ناکام ہو جاتی ہیں اس لئے رسول گویا اللہ سبحانہ کا سفیر بندوں کی طرف ہوتا ہے۔

مولانا بدر عالم فرماتے ہیں۔

اسلام میں رسول نہ خدا کا اوتار ہو سکتا ہے کہ خدائی اس میں حلول کر سکے اور نہ خود خدا ہو سکتا ہے کہ ہیکل انسانی میں جلوہ نما ہو۔ رسول کے بارے میں خدائی کا تصور عیسائیت کا راستہ ہے اور خدا کے متعلق یہ عقیدہ کہ وہ رسول کی صورت میں بروز کرتا ہے۔ براہمہ کا عقیدہ ہے۔ اسلام کی تعلیم ان دونوں سے علیحدہ ہے بلکہ یہ دونوں تصور اسلام میں بے مصداق۔ ناممکن اور محال ہیں۔ رسول ایک انسان ہوتا ہے اور عام انسانوں سے اس کی برتری سمجھنے کے لئے یہ کافی ہے کہ وہ خدا کا فرستادہ اور اس کا پیغمبر ہے اس کی جانب سے منصب اصلاح پر کھڑا کیا گیا ہے اس لئے اس کا کمال یہ ہے کہ وہ انسان ہو کیونکہ اصلاح کے لئے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے بلا علم نہیں کہا تا وہ ایک عنصر کی پوری تسلی نہیں کر سکتا۔ اسی لئے قرآن نے جابجا بعثت کے ساتھ رسولوں کا انسان ہونا ایک مستقل انعام قرار دیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب بنی اسماعیل میں ایک رسول کے لئے دعا فرمائی تو انہوں نے خاص طور پر دعا میں یہ بات فرمائی کہ اے اللہ رسول بنی اسماعیل میں ان میں سے روانہ فرما۔ پھر جب اس مقبول دعا کے ظہور کا وقت آیا تو رسول کے بنی اسماعیل میں سے ہونے کا تاکید کیا تھا

ذکر کیا یعنی فرمایا رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ مطلب یہ ہے کہ یہ رسول انسان ہونے کے ساتھ عربی بھی ہے۔ عربوں میں قریشی اور قریش میں ہاشمی۔

رسول کے انسان ہونے کا عقیدہ ابتداء ہی میں اولادِ آدم کو بنیادی طور پر بتا دیا گیا ہے۔ اسی عقیدے کے مطابق دنیا میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک رسول آتے رہے ہیں اور اس سلسلہ کو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر کے بسا طِ عالم لپیٹنے کا اعلان کر دیا۔

آپ کی سب سے بڑی عظمت لفظ رسول میں ہے۔ اس لفظ سے محبت اور تعظیم کے وہ سارے تقاضے پورے ہو جاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے لئے فطرتِ انسانی میں موجزن ہیں اور عبد و معبود کی وہ ساری حدیں بھی محفوظ ہو جاتی ہیں جو کفر و ایمان کے مابین خطِ فاصل بن سکتی ہیں۔ صوفیاء کی خوشنما اصطلاحی تعبیرات وجود کا نقطۂ اوّل، حقیقۃ الحقائق، برزخیۃ الکبریٰ سے آپ کے صحیح مقام کی قطعاً نشاندہی نہیں ہوتی۔ لفظ رسول سے انسانی ذہن نہایت بے تکلفی کے ساتھ اس کے لوازم، اس کے فرائض، اس کی شخصیت سے آشنا ہو جاتا ہے۔ قرآن کریم نے بتایا کہ نسبت رسالت کے بعد رسول کی اطاعت اللہ سبحانہٗ کی اطاعت ہو جاتی ہے بلکہ اس طاعت و محبت کے بغیر اللہ سبحانہٗ کی محبت و طاعت کا کوئی دوسرا راستہ نہیں ہے جیسے رسول اللہ تعالیٰ کا ہر فقرہ اوتار اور اس کا بیٹا نہیں ہوتا ایسے ہی وہ وکیل و مختار بھی نہیں ہوتا عربی میں دوسرے کی خدمت انجام دینے کے لئے دو لفظ ہیں، رسول اور وکیل۔ ان کے دونوں کے تصرفات اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے ہوتے ہیں۔ مگر دونوں میں ایک جوہری فرق ہے۔ وکیل کا تصرف بہ نسبت رسول کے زیادہ وسیع اور زیادہ طاقتور ہوتا ہے وکیل اپنے موکل کی جانب سے مختار ہوتا ہے۔ جو چاہے بطورِ خود بھی کر سکتا ہے رسول صرف اس امانت کو پہنچا دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے۔ جو اس کے سپرد ہوتی ہے قرآن نے بتایا ہے کہ آپ اللہ سبحانہٗ کے رسول ہیں وکیل نہیں ہیں مَآ اَرْسَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ وَكِيْلًا۔ وکالت تو بڑی بات ہے رسولوں میں یہ حوصلہ بھی نہیں ہوتا کہ بے محابا جب چاہیں اللہ سبحانہٗ سے بات کر لیں اس لئے ان کی برداشت کے بقدر اپنے ہم کلامی کی صورتیں مقرر کر دی ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کی سُنت

یہی ہے کہ رسولوں کو وحی کے ذریعے عالم غیب کی باتوں سے مطلع کرتا ہے ۔

جس طرح رسول مختار اور وکیل نہیں ہوتا، اسی طرح وہ صرف ایک مصلح اور ریفارمر بھی نہیں ہوتا۔ ایک ریفارمر اور رسول میں بڑا فرق ہوتا ہے۔ ریفارمر کی پرورش عام انسانوں کی طرح ہوتی ہے۔ جب کہ رسولوں کی تربیت صفت اصطفار و اجتبار کے ماتحت ہوتی ہے۔ ان کی نشست و برخاست اور ہر قول و فعل کی اللہ سبحانہٗ نگرانی فرماتا ہے اسی حفاظت کی وجہ سے ان کو مقام عصمت حاصل ہوتا ہے

رسالت بندوں کی طرف اللہ سبحانہٗ کی سفارت ہے۔ پیغمبر کے لئے قابل ہونا تو ضروری ہے۔ مگر ہر قابل کے لئے پیغمبر ہونا ضروری نہیں ہے یہ سرکار کی اپنی مصلحت اور صوابدید پر موقوف ہے کہ وہ کس کو اس کا اہل سمجھتا ہے۔ خدا کی زمین پر جس قدر رسول آتے ہیں۔ آپ سب کی سیرت کا بالتفصیل مطالعہ کیجئے لیکن آپ کو یہ کہیں ثابت نہیں ہوگا کہ کسی کو منصب رسالت کسی رسول کی اتباع کے صلہ میں ملا ہو۔ لفظ رسول کی معنویت بھی یہ بتاتی ہے کہ وہ اس لئے آتا ہے کہ لوگ اس کے توسل سے شریعت پر عمل کرنا اور اللہ سبحانہٗ کی عبادت کرنا سیکھیں اس لئے نہیں کہ شریعت پر عمل کر کے یہ خود خدا کے رسول بن جائیں ۔

خلافت و رسالت میں فرق ہے رسول اپنا خلیفہ خود بنا سکتا ہے مگر رسول کسی کو رسول نہیں بنا سکتا مطلب یہ ہے کہ رسالت نہ پہلے کسب و ریاضت کا نتیجہ تھی نہ اب ہے ہاں پہلے منصب نبوت باقی تھا۔ اس لئے دعا کا موقعہ بھی تھا۔ اب چونکہ منصب نبوت ہی نہیں رہا اس لئے رسالت کی دعا بھی نہیں کی جا سکتی ہاں اس کی جگہ خلافت باقی ہے اور وہ تا قیامت رہے گی۔

ظن گمان، خیال، اٹکل، تخمینی بات، علم یقین، شک، وہ اعتقاد راجح جس میں اس کے خلاف ظہور پذیر ہونے کا بھی احتمال ہو۔ قاضی ابوبکر بن العربیؒ نے احکام القرآن میں ظن کی جو تعریف کی ہے وہ منطقی ہے۔ جسے اصولیین نے اختیار کیا ہے۔ لیکن قرآن حکیم میں ظن کا استعمال ہر جگہ اس معنے میں نہیں ہے چنانچہ حافظ سیوطیؒ الاتقان میں فرماتے ہیں:۔

ظن کے معنے اصل میں اعتقاد راجح کے ہیں یعنی گمان غالب اور کبھی یقین کے معنے میں بھی آتا ہے جیسے اَلَّذِیْنَ یَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ۔ ابن ابی حاتمؒ

نے امام مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ قرآن میں ظن کا استعمال یقین کے معنے میں ہوا ہے۔ لیکن یہ کلیہ نہیں ہے۔ زرکشیؒ نے برہان میں لکھا ہے کہ قرآن میں اس فرق کو سمجھنے کے لئے ظن کہاں یقین کے معنے میں ہے اور کہاں شک کے معنے میں ہے دو ضابطے یاد رکھنے چاہئیں۔

۱۔ جہاں ظن کی تعریف آئی ہے اور اس پر ثواب کا وعدہ فرمایا گیا ہے وہاں یقین مراد ہے اور جہاں اس کی مذمت ہو اور اس پر عتاب کی دھمکی ہو وہاں شک کے معنے ہیں۔

۲۔ ہر وہ ظن جس کے بعد ان خفیفہ ہوگا وہاں شک کے معنے ہوں گے اور ہر وہ ظن جس کے بعد انّ مشددہ ہوگا وہاں یقین کے معنے ہوں گے۔

علامہ سید مرتضیٰ زبیدیؒ تاج العروس میں لکھتے ہیں کہ:۔

بصائر میں ہے کہ ظن قرآن میں چار طرح استعمال ہوا ہے۔ یقین کے معنے میں۔ شک کے معنے میں۔ تہمت کے معنے میں اور گمان کرنے کے معنے میں

امام راغب اصفہانیؒ فرماتے ہیں نشانات اور علامات سے جو کچھ حاصل ہو اس کا نام ظن ہے جب علامات طاقتور ہوں تو اسی کا نام علم ہے اور اگر علامات کمزور ہوں تو اس کا نام وہم ہے پھر جب ظن قوی ہوتا ہے یا قوی کی طرح اس کا تصور کیا جاتا ہے تو اس کے بعد انّ مشددہ اور وہ ان آتا ہے جس کو مشددہ سے مخفف کیا گیا ہو۔ اور اگر ظن ضعیف ہوتا ہے۔ تو پھر اس کے ساتھ ان کا استعمال ہوتا ہے۔ غرض ظن قرآن میں صرف گمان، شک کے معنے میں نہیں بلکہ علم و یقین کے معنے میں بھی آتا ہے

عمل صالح قرآن کا بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ انسان کی نجات دو چیزوں پر موقوف ہے۔

ایک ایمان اور دوسرا عمل صالح۔ ایمان بنیادی اصولوں پر یقین رکھنے کا نام ہے اور عمل صالح ان اصولوں کے مطابق عمل کا۔ کسی بات کا تنہا علم و یقین کامیابی کے لئے کافی نہیں ہے۔ جب تک اس علم و یقین کے مطابق عمل بھی نہ ہو۔ قرآن نے نجات کا مدار صرف ایمان پر نہیں بلکہ ایمان کے ساتھ عمل صالح پر بتایا ہے اور یہی سب سے بڑی صداقت ہے۔

ہر قسم کی کامیابی کا دار و مدار ان ہی دو باتوں پر ہے کوئی بیمار صرف اصول طب کی صحت ماننے سے بیمار یوں سے

نجات نہیں پاسکتا جب تک وہ ان اصولوں کے مطابق عمل بھی نہ کرے۔ اسی طرح صرف اصولِ ایمان کو تسلیم کر لینا انسانی فوز و فلاح کے لئے کافی نہیں ہے جب تک ان اصولوں کے مطابق پورا پورا عمل نہ کرے اس دنیا میں ہر چیز کو ہمارے مادی اسباب کے تابع فرمایا ہے۔ یہاں کی کامیابی صرف دینی عقیدے سے حل نہیں ہو سکتی جب تک اس عقیدے کے مطابق عمل بھی نہ ہو۔ صرف اس یقین سے کہ روٹی ہماری بھوک کا قطعی علاج ہے ہماری بھوک اس وقت تک رفع نہیں ہو سکتی جب تک اس کے لئے جدوجہد نہ کریں۔ اس عقیدے سے کہ ہماری ٹانگیں ہم کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لے جاتی ہیں۔ ہم ایک جگہ سے دوسری جگہ نہیں پہنچ سکتے جب تک ہم اس یقین کے ساتھ خود ہی حرکت نہ کریں اسی طرح اس دنیا میں عمل کے بغیر تنہا ایمان کامیابی کے حصول کے لئے بیکار ہے البتہ اس قدر درست ہے کہ جو ان اصولوں کو صرف صحیح باور کرتا ہے۔ وہ اس سے بہرحال بہتر ہے جو ان کو سرے سے مانتا ہی نہیں ہے کیونکہ اوّل بالذکر کے کبھی نہ کبھی راہ راست پر آنے کی توقع ہو سکتی ہے اور دوسرے کیلئے تو ابھی پہلی ہی منزل باقی ہے۔ اس لئے آخرت میں بھی وہ منکر کے مقابلے میں انشاء اللہ تعالیٰ کے کرم و فضل کا زیادہ مستحق قرار پائے —

عمل صالح کا مفہوم ذرا بہت وسیع ہے۔ اس میں انسانی اعمال خیر کی تمام جزئیات داخل ہیں۔ فقہا نے اصطلاحاً اعمال صالح کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک وہ جس کا تعلق خاص اللہ سبحانہٗ سے ہے اس کو عبادات کہتے ہیں۔ دوسری جس کا تعلق اس کے بندوں سے ہے اس کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جس کی حیثیت صرف انسان کے ذاتی فرض کی ہے اور دوسری وہ جس کا تعلق دوسرے کے حق سے ہے۔ پہلے کا نام اخلاق اور دوسرے کا حقوق ہے - - - افکار و نظریات اور اعمال صالح کی ان تینوں اقسام کے مجموعہ کا نام دین ہے۔ یہ ہماری شومئی قسمت ہے کہ عبادات، اخلاق اور حقوق میں ہمارے روابط دین سے ٹوٹ چکے ہیں اور اب ہم اس کوشش میں ہیں کہ اس دین سے جو روابط ہمارے بچے ہوئے ہیں ان کو بچا لیں اور باقی سے دین کے تقاضے کہہ کر پیچھا چھڑا لیں۔

ہمارے ایک معاصر دین کی حقیقت

سمجھاتے ہوئے رقمطراز ہیں:۔
اصل دین اللہ سبحانہٗ کے آگے جھکنا
اور جزا و سزا کے اعتقاد کے ساتھ
اللہ رب العزت کے لئے اپنے دل
میں اشتیاق و محبت کی ایک کیفیت
پیدا کرنا ہے۔

یہ صورتِ حال فی الحقیقت ہمارے
دماغی تنزل کا قدرتی نتیجہ ہے ہم نے
جب دیکھا کہ قرآن کے مطالبہ ایمان
عمل صالح اور عمل میں اعمال، اخلاق اور
حقوق کا ساتھ نہیں دے سکتے تو
کوشش کی کہ قرآن کو اس کی بلندیوں
سے نیچے اتار لیں کہ ہماری پستیوں
کا ساتھ دے سکے۔ انا للہ والی اللہ
المشتکیٰ۔

غیب پوشیدہ ہونا، غیر حاضر ہونا۔ انسان
کے علم و احساس سے بالا ہونا۔ وہ چیزیں
جو آدمی کی حس اور عقل رسائی سے خارج
ہیں اور جن کا علم انبیاء کی اطلاع کے
بغیر نہیں ہو سکتا۔ قرآن کی اصطلاح
میں غیب اجمالی اور تفصیلی معنے میں
استعمال ہوا ہے۔ اجمالاً اس کا اطلاق
ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان اپنے
علم کے عام اور طبعی و فطری ذریعوں سے
حاصل نہیں کر سکتا۔ انسانی علم کے
طبعی ذریعے وجدان، حواس، عقل و استدلال
وغیرہ ہیں۔ ان طبعی ذریعوں سے جو ہر انسان
کو ملے ہیں جو علم حاصل نہیں ہوتا اس کو علم
غیب کہتے ہیں یعنی اس شے یا ان اشیاء
کا علم جو انسان کے ظاہری و باطنی حواس اور
دماغی قویٰ کی نگاہوں کے سامنے سے غائب
ہیں اور اس کا مقابل لفظ شہادت ہے جس
کے معنے حاضر ہونے کے ہیں۔ یعنی وہ
اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے
دماغی کے سامنے ہیں اسی لئے قرآن
میں بار بار اللہ تعالیٰ نے اپنے کو عالم
الغیب والشہادۃ کہا ہے۔ یعنی انسان
کے طبعی ذرائع علم کے سامنے جو حاضر ہے
اور جو غائب ہے ان سب کا عالم اور
واقف کل وہی ہے۔ الغرض اجمالاً علم
غیب اسی غیبی طریقۂ علم کا نام ہے جو عام
انسانوں کو نہیں ملا ہے۔ تفصیلی حیثیت سے
قرآن میں غیب کا اطلاق چار چیزوں پر
ہوا ہے۔

۱۔ زمانہ ماضی کے واقعات جن کا علم بعض کو
نہ تو حواس کے ذریعے ہو سکتا ہے اور نہ
عقل و فکر کے ذریعے۔ اگر ہو سکتا ہے تو
تحریر و روایت کے ذریعے۔ لیکن جس کے
لئے خود تحریر و روایت کا ذریعہ یقینی طور
پر مفقود ہو تو اس کے لئے ان کا علم صرف

طبعی ذریعہ ہی سے ہو سکتا ہے ۔ اور بس
قرآن میں حضرت نوح علیہ السلام، حضرت
مریم علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ
السلام کے واقعات بیان کرنے کے بعد
ذٰلِكَ مِنْ اَنْبَآءِ الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ
اِلَيْكَ میں اسی طرف اشارہ ہے ۔
۲ اسی طرح آئندہ جو واقعات ہونے والے
ہیں ان کو بھی غیب کہا گیا ہے ان کا علم
دلائل و قیاس کے طبعی ذرائع کے علاوہ
غیر طبعی ذریعہ سے ہوا ہو تو اس کو بھی
علم غیب کہیں گے ۔ قرآن میں ایک
موقعہ پہ ان کفار کے جواب میں جو نشانیوں
کے طالب ہیں یہ کہا گیا فَقُلْ اِنَّمَا
الْغَيْبُ لِلّٰهِ ۔ اسی طرح قیامت کو بار
بار غیب کہہ کر غیر خدا سے اس کے
علم کی نفی کی گئی ہے ۔
۳۔ ان چیزوں پہ بھی غیب کا اطلاق
کیا گیا ہے جو اگرچہ ماضی اور مستقبل
میں نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود ہیں
تاہم انسان کے حواس خمسہ اور عقل کی
محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہو
سکتا اس لئے زمانہ حال کے علم کے
لئے جو طبعی شرائط اور قیود ہیں ۔ ان
کے بغیر جو علم حاصل ہوگا وہ غیب ہوگا
۴۔ عالم غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں
جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے
حواس اور عقل کے تنگ دائرہ عمل سے
قطعاً باہر ہیں۔ ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے
خدا کی روئت کی صلاحیت نہیں رکھتے ۔
جنت و دوزخ ہم کو یہاں نظر نہیں
آتی ہیں، یہ تمام امور بھی غیب ہیں ۔
رسول کو اللہ سبحانہٗ غیب کی جن
باتوں سے وحی کے ذریعے آگاہ کرتا ہے
وہ ان چاروں قسم کے امور غیب ہوتے ہیں
اور ان کا علم رسول کو وحی کے مختلف اقسام
کے ذریعے عطا کرتا ہے ۔ قرآن غیب کے
علم کی خدا کے سوا سب سے نفی کرتا ہے
قرآن میں بار بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس
اعلان کی ہدایت ہوئی ہے ۔
فَقُلْ اِنَّمَا الْغَيْبُ لِلّٰهِ کہہ دو کہ غیب
خدا کے لئے ہے ۔
رسول کہتا ہے ۔
لَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ میں غیب داں نہیں
ہوں ۔ لیکن اسی کے ساتھ دو موقعوں پر
یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہاں ہم خدا اپنے
برگزیدہ پیغمبر کو غیب کی اطلاع دیتا ہے
لَا يُظْهِرُ عَلٰى غَيْبِهٖۤ اَحَدًا اِلَّا مَنِ
ارْتَضٰى مِنْ رَّسُوْلٍ ——— اس
سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے
برگزیدہ پیغمبروں کو غیب کی باتوں کی

اطلاع دیتا ہے اس سے جن آیات میں غیب داں کی نفی کی گئی ہے ان سے مراد یہ ہے کہ پیغمبروں کو خود بخود غیب کا علم نہیں ہے البتہ اللہ سبحانہٗ وحی کے ذریعے پیغمبر کو اس کا علم عطا ہوتا ہے اور وحی پیغمبر کی اختیاری چیز نہیں ہے بلکہ یہ اللہ سبحانہٗ کے صوابدید پر موقوف ہے کہ اپنے غیب میں سے جتنا چاہے اور جب چاہے وحی کے ذریعے بتا دے۔ باقی ہم بعض باتوں کے بارے میں یہ قطعی طور پر فیصلہ کر دیا ہے کہ ان کا علم کسی کو نہیں ہے۔

نسخ لغت میں زائل کرنے اور مٹانے کو کہتے ہیں ـــــــ نسخ دو طرح کا ہے۔ نسخ شرائع۔ نسخ احکام۔

نسخ شرائع کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریعت کو اس کے غلط ہونے یا غیر مفید ہونے کی وجہ سے سرے سے مٹا کر کسی دوسری شریعت کو نافذ کر دیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ صرف احکام کی جگہ پر اصل احکام کے دوبارہ نازل ہونے اور دنیا کے حسب حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلے کامل تر تعلیمات دینے کے ہیں۔ اس لئے قرآن پاک کے ناسخ کتب ہونے کے معنے ان کو مٹا دینے والے کے نہیں بلکہ ان کی تکمیل کرنے والے کے ہیں ـــــــ مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوتی ہے ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہے اور قرآن میں اس عروج و ترقی کی وہ انتہائی منزل مقصود ہے جس کے بعد تکمیل دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ جب کہ خود قرآن کا دعویٰ ہے اور اس دعوے میں کوئی اور کتاب اس کی شریک نہیں ہے۔ ذَالِكَ الْكِتَابُ لَا رَيْبَ فِيْهِ۔

نسخ احکام سے مقصود اصطلاح میں کسی عملی حکم کی مدت کی انتہا بیان کرنا جو تمام خرد کو جامع ہو کیونکہ عقائد و قصص یا امور قطعیہ و عقلیہ میں نسخ ممکن نہیں ہے مثلاً یہ کہ اللہ سبحانہٗ موجود ہے اس کا نسخ نہیں ہے۔ ایسا ہی امور حسیہ میں نسخ نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح دعاؤں میں اور ان احکام میں جو اپنی ذاتی حیثیت سے واجب ہیں۔ ایسے ہی ان احکام میں بھی نسخ ممکن نہیں جو دائمی اور ابدی ہیں اور ان احکام

ہیں جن کا وقت مقرر ہے اس مقررہ وقت سے پہلے نسخ ممکن نہیں ہے بلکہ نسخ صرف ان احکام میں ہو سکتا ہے جو عمل اور وجود و عدم دونوں کا احتمال رکھتے ہوں، نہ دائمی ہوں اور نہ کسی وقت کے ساتھ مخصوص کیے گئے ہوں۔ ایسے احکام کو احکام مطلقہ کہتے ہیں۔ ان میں یہ بات ضروری ہے کہ زمانہ اور مکلف اور صورت متحد نہ ہوں بلکہ بعضوں میں اختلاف ہو بعض میں۔

نسخ اصطلاحی کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ پہلے خدا نے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دے دیا مگر خدا کو اس کا انجام معلوم نہ تھا پھر خدا کی رائے اس کے خلاف قائم ہوئی اس لئے پہلے حکم کو ختم کر دیا۔ یا پہلے کسی کام کے کرنے کا حکم دیا۔ پھر اس کو تینوں باتوں میں اتحاد کے باوجود منسوخ کر دیا۔ ایسا نسخ ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی شان اس عیب سے بلند و بالا ہے۔ نسخ کا مطلب صرف یہ ہے کہ خدا کو پہلے یہ بات معلوم تھی کہ یہ حکم انسانوں میں فلاں وقت تک باقی رہے گا پھر ختم کر دیا جائے گا۔ وقت ختم ہونے پر دوسرا حکم آ جاتا ہے۔ جس سے کمی بیشی ہوئی یا حکم کے بالکلیہ ختم ہونے کا علم ہو جاتا ہے تو درحقیقت نسخ صرف پہلے حکم کی مدت اور انتہا کا نام ہے۔ چونکہ ہمیں پہلے حکم کی مدت کے اختتام کا علم نہیں ہوتا اس لئے دوسرا حکم آنے پر ہم خیال کرتے ہیں کہ حکم تبدیل ہو گیا ہے۔ حالانکہ واقع میں حکم نہیں بدلا بلکہ حکم کی مدت ختم ہوئی ہے۔ (اظہار الحق ۹۸/۲۴)

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں نسخ کے عنوان پر تفصیلی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ قرآن کے زمانہ نزول میں نسخ دو طرح سے ہوا ہے۔ ایک یہ کہ نگاہ نبوت عمومی نظام طاعت کے پیش نظر قانون الٰہی کے مناہج کے مطابق عمل کا ایک پیمانہ تجویز کرتی ہے اور اس کا مبنیٰ خود نبوت کا اپنا اجتہاد ہوتی ہے۔ بعد ازیں اللہ سبحانہ مسئلہ میں اصل حکم سے نبوت کو مطلع فرماتے ہیں اور اس کے نتیجہ میں نبوت کے اجتہاد پر مبنی سابقہ حکم ختم ہو جاتا ہے۔

دوسرے یہ کہ کوئی حکم مصالح

اور مفاسد کو پیش نظر دیا گیا ہے
وقت گذرنے کے ساتھ مصالح
یا مفاسد تبدیل ہو جاتے ہیں اس
کے ساتھ پہلے حکم کی مدت ختم ہو
جاتی ہے اور دوسرا حکم آجاتا ہے
دونوں کی شاہ صاحبؒ نے مثالیں
بھی دی ہیں۔ یہاں تک جو کچھ بتایا
گیا ہے اس کا تعلق پورے نظام
شریعت سے ہے اور اس میں
ابو مسلم اصفہانی کو چھوڑ کر امت میں
کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ سب
مانتے ہیں کہ شریعت میں نسخ ہوا ہے
باقی رہا موجودہ قرآنی آیات میں
نسخ کا مسئلہ۔ تو اس میں البتہ علماء کا
اختلاف ہے۔ کچھ کے خیال کے مطابق
پانچ سو آیات تک منسوخ ہیں لیکن محققین
نے اس کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ علامہ ابن
العربیؒ نے اس کا انکار کیا ہے اور
آخر میں صرف بیس آیات کو منسوخ
قرار دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ
رحمۃ اللہ علیہ نے ان بیس آیات کے
نسخ کو بھی ناقدانہ بصیرت سے
محل نظر بتایا ہے اور لکھا ہے
کہ:۔

وعلی ما حررنا لا
يتعين النسخ الا في
خمس آيات

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۂ فاتحہ کی رُوح

یہ سُورت خُدا تعالیٰ نے بندوں کی زبان سے فرمائی کہ جب ہمارے دربار میں حاضر ہو تو ہم سے یُوں سوال کیا کرو۔ اس لیئے اس سُورت کا نام تعلیم مسئلہ بھی ہے۔ اس سُورت کے آخر میں آمین کہنا مسنون ہے۔ اور یہ لفظ قرآن شریف سے خارج ہے۔ معنے اس لفظ کے یہ ہیں کہ الہٰی ایسا ہی ہو۔ یعنی مقبول بندوں کی پیروی اور نافرمانوں سے علیحدگی میسر ہو۔ اس سُورت کے اوّل نصف میں اللہ تعالیٰ کی ثنا و صفت اور دوسرے حصہ میں بندہ کی دُعا ہے۔[1]

سورۂ فاتحہ میں پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا ہے پھر صرف اللہ ہی کی عبادت کا اقرار اور اس کا اظہار ہے کہ اس کے سوا کسی کو اپنا حاجت روا نہیں سمجھتے یہ گویا حلف وفاداری ہے جو انسان اپنے رب کے ساتھ کرتا ہے۔ اس کے بعد ایک اہم دُعا ہے جو تمام انسانی مقاصد و ضروریات پر حاوی ہے۔[2]

دراصل یہ ایک دُعا ہے جو خدا نے ہر اس انسان کو سکھائی ہے جو اس کتاب کا مطالعہ شروع کر رہا ہو۔ کتاب کی ابتداء میں اس کو رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم واقعی اس کتاب سے فائدہ اُٹھانا چاہتے ہو تو پہلے خداوندِ عالم سے یہ دُعا کرو ——— سورۂ فاتحہ ایک دُعا ہے بندے کی جانب سے اور قرآن اس کا جواب ہے اللہ تعالیٰ کی جانب سے۔[3]

سورۂ فاتحہ ایک دُعا ہے، فرض کرو ایک انسان کے دل و زبان سے یہی دُعا شب و روز نکلتی رہتی ہے اس صُورت میں اس کے فکر و اعتقاد کا کیا حال ہوگا۔ وُہ خدا کی حمد و ثنا میں نغمہ سنج ہے پھر اسے اس کی صفتوں سے پُکارنا چاہتا ہے لیکن اس کی تمام صفتوں میں سے صرف رحمت، عدالت ہی کی صفتیں اسے یاد آتی ہیں۔ پھر وُہ اپنا سرِ نیاز جھکاتا اور اس کی عبودیت کا اقرار کرتا ہے پھر وُہ خدا سے سیدھی راہ چلنے کی توفیق مانگتا ہے۔ لیکن کون سی سیدھی راہ وُہ راہ جو تمام دُنیا کے مذہبی رہنماؤں اور

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص۱ [2] معارف القرآن م ش ص۱۸ [3] تفہیم القرآن ص۴۲

تمام راست باز انسانوں کی راہ ہے اسی طرح وُہ محرومی اور گمراہی سے پناہ مانگتا ہے [1]

یہ دُعا، اسلام کی تمام تعلیمات کا عطر اور خلاصہ ہے۔ خدا کی حمد وستائش ہے، توحید ہے، اعمال کی جزا و سزا کا یقین ہے۔ عبادت کی مخلصانہ ادائیگی کا اقرار ہے، توفیق و ہدایت کی طلب ہے، اچھوں کی تقلید کی آرزو اور بُروں کی پیروی سے بچنے کی تمنا ہے جس وقت اس دُعا میں خدا کی پہلی صفت کُل جہانوں کا مربی زبان پر آتی ہے تو اس کی تمام قدرتیں اور بخششیں سب سامنے آجاتی ہیں۔ جہانوں کی وسعت کے تخیل سے اس کی عظمت و کبریائی کی وسعت کا تخیل پیدا ہوتا ہے۔ سارے جہانوں کے ایک ہی پروردگار کے تصور سے کل کائناتِ ہستی کی برادری کا مفہوم ذہن میں آتا ہے۔ انسان ہوں کہ حیوان پھر انسانوں میں امیر ہوں یا غریب، مخدوم ہوں یا خادم بادشاہ ہوں یا گدا کالے ہوں یا گورے عرب ہوں یا عجم کُل مخلوقات کی برادری کی حیثیت یکساں معلوم ہوتی ہے۔ خدا کو رحمان ورحیم کہہ کر پکارنے سے اس کی بے پایاں رحمت اور ناقابلِ بیان کیف و محبت کا سمندر دل کے کوزے میں موجزن ہوجاتا ہے۔ روزِ جزا کے مالک کا خیال ہم کو اپنے اپنے اعمال کی ذمہ داری اور مواخذہ سے مرعوب کر دیتا ہے ہم تجھی کو پُوجتے ہیں کہہ کر ہم اپنے دل کی زمین سے ہر قسم کے شرک کو بیخ و بُن سے اُکھاڑ دیتے ہیں۔ "ہم تجھی سے مدد چاہتے ہیں" کہہ کر ہم تمام دنیوی سہاروں کو حقیر سمجھتے ہیں اور صرف خدا کا آسرا تلاش کرتے ہیں۔ سب سے آخر میں ہم سیدھی راہ پر چلنے کی توفیق چاہتے ہیں۔ [2]

---

[1] ترجمان القرآن صفحہ ۱۲۳ [2] سیرۃ النبیؐ ص۹۹

سورۃ فاتحہ کی عظمتِ شان

نام

یہ قرآن کی سب سے پہلی سورت ہے اس لیئے اس کا نام فاتحہ ہے کیونکہ قرآن کا آغاز اس سے ہوتا ہے ـــــ اس کے علاوہ بھی اس کے بہت سے نام احادیث میں آئے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اُم القرآن، کنز القرآن، وافیہ، شافیہ، کافیہ، سورۃ الحمد، سورۃ الصلاۃ، سورۃ الشفا، الاساس، سورۃ الشکر اور سورۃ الدعار لکھے ہیں۔

اُم القرآن اسے کیوں کہتے ہیں اس لیئے کہ ہر وُہ شئے اُم کہلاتی ہے جس کی طرف اس سے تمام چیزیں ملا دی جائیں۔ چونکہ قرآن کی تمام سورتیں نماز میں اُٹھ اُٹھ کر سورہ فاتحہ سے ملتی ہیں اور سورہ فاتحہ اپنی جگہ قائم رہتی ہے اس لیئے اسے اُم القرآن کہا گیا ہے۔

اور اس لیئے کہ

عربی میں اُم کا اطلاق ایسی تمام چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں یا بہت سی چیزوں میں مقدم ہوں یا پھر کوئی ایسی اُوپر کی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں چنانچہ سر کے درمیانی حصے کو اُم الراس کہتے ہیں، فوج کے جھنڈے کو اُم کہتے ہیں اور مکہ کو اُم القریٰ کہتے تھے۔ پس اس سورت کو اُم القرآن کہنے کا یہ مطلب ہوا کہ یہ ایک ایسی سورت ہے کہ جس میں مطالب قرآنی کی جامعیت ہے۔[1]

اور اس لیئے کہ

یہ سورت ایک حیثیت سے پورے قرآن کا متن ہے اور سارا قرآن اس کی شرح ہے کیونکہ پورے قرآن کے مطالب ایمان اور عمل صالح میں دائر ہیں اور ان کے بنیادی اصول اس سورت میں بیان کر دیئے ہیں۔[2]

---

[1] ترجمان القرآن ص۲۹ [2] معارف القرآن ش ص۱۵

قرآن نے سورۂ فاتحہ کا ذکر ایسے لفظوں میں کیا ہے جس سے اس کی عظمتِ شان کا پتہ چلتا ہے
ولقد اتینٰک سبعًا من المثانی والقرآن العظیم۔
اے پیغمبر ہم نے تم کو سات دُہرائی جانے والی چیز اور قرآنِ عظیم دیا ہے۔
احادیث و آثار سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت میں سات دُہرائی جانے والی چیز ملے مُراد یہی سُورت ہے کیونکہ یہ سات آیتوں کا مجموعہ ہے اور ہمیشہ نماز میں دُہرائی جاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس سُورت کو السبع المثانی بھی کہتے ہیں۔

ابوسعید بن المعلّٰی کہتے ہیں کہ میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پُکارا۔ میں نے جواب نہ دیا۔ (نماز پوری کر کے حاضر ہوا اور) عرض کیا یا رسول اللہ میں نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے فرمایا کیا اللہ سبحانہٗ کا یہ ارشاد نہیں ہے استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم۔ اللہ اور اس کا رسول جب پُکاریں تو ان کو جواب دو پھر آپ نے فرمایا میں تمہیں قرآن کی ساری سورتوں میں عظیم تر سُورت مسجد سے باہر جانے سے پہلے بتاؤں گا۔ پھر آپ نے میرا ہاتھ پکڑ لیا جب مسجد سے باہر تشریف لے جانے لگے میں نے عرض کیا آپ نے مجھے قرآن کی عظیم تر سورت بتانے کو فرمایا تھا۔ ارشاد ہوا الحمد للہ رب العالمین۔ یہی سبع مثانی ہے اور وُہ قرآنِ عظیم ہے جو مجھے دیا گیا ہے [1]

---

[1] ترجمان القرآن صلا۲

سورۂ فاتحہ کا تقابلی مطالعہ

سورۂ فاتحہ ایک خالص دُعائی پیمانہ ہے اور دُعاؤں کی دُنیا میں تکمیلِ شکل کی آئینہ دار ہے۔ وُہ مختصر ہے اور تاثیر سے لبریز ہے۔ اللہ کی تمام صفاتِ کاملہ کا مرقع ہے۔ تمام مقاصد اور احکامِ شریعت کی جامع ہے۔ اس کے الفاظ میں ایسی عالمگیری ہے جو ہر وقت ہر حالت میں ہر انسان کے دِل کی نمائندگی کر سکتی ہے۔ ایسے استعارات سے پاک ہے جو ظاہر بینوں کی لغزش کا باعث ہوں۔ اور اللہ کو انسانوں سے رحم و کرم کی صفت قرض لینے پر آمادہ کرتے ہوں۔ نیز وُہ اللہ کی رحمتِ عام کو ایسے عنوان سے ادا کرتی ہے جس میں کائنات کا ایک ایک ذرہ داخل ہے۔ اللہ تعالیٰ کی وُہ تین صفتیں جن کا تصور کیے بغیر اللہ کی معرفت پوری نہیں ہو سکتی — یعنی ربوبیت، رحمت اور مالکیت۔ یہ سورت ان سب کی جامع ہے۔ ربوبیت میں وُہ تمام صفتیں داخل ہیں جن کا تعلق پیدائش سے لے کر موت تک ہر مخلوق کے ساتھ قائم رہتا ہے۔ رحمت اس کی وُہ عالمگیر صفت ہے جس میں اس کی تمام اجمالی صفتوں کی نیرنگیاں ظاہر ہوتی ہیں۔ مالکیت اس کی تمام جلالی صفتوں کا مظہر ہے۔ اور پُوری سُورت دُعا، کے اغراض ثلاثہ حمد، اچھائیوں کے لیے درخواست اور بُرائیوں سے بچانے کی التجا پر مشتمل ہے۔ طرزِ بیان خدا اور بندے کے شایانِ شان ہے۔ درخواستیں حد درجہ مؤدبانہ ہیں۔ اوصافِ الٰہی وُہ ہیں جو ایک دُعا کے مناسب ہو سکتے ہیں۔ دُعا میں عموم ہے وُہ ذاتیات تک محدود نہیں ہے۔ للّٰہیت اور روحانیت کا کمال منتہائے نظر ہے۔ اس لیے دُنیا کی چیزوں کا ذکر نظر انداز کر دیا گیا ہے۔ اللہ کے اوصاف اور بندے کی التجاؤں میں کمیت اور کیفیت دونوں حیثیتوں سے تناسب موجود ہے — یعنی دونوں حصوں نے مناسب جگہ گھیری ہے اور دونوں ٹکڑوں کے مضامین میں ربط اور تعلق قائم ہے۔ اللہ کی عظمت و جلال، رحم و کرم، قدرت و شوکت، شفقت و رافت اور بندے کے خشوع و خضوع، بلند حوصلگی، صداقت طلبی کا ایسا جامع، مختصر اور پُر اثر بیان سورۂ فاتحہ کے سوا کہاں مِل سکتا ہے۔[1]

---

[1] سیرت النبی صفحہ ۱۰۳ ج ۵

یہ خوش عقیدگی نہیں اظہارِ حقیقت ہے کہ جس حیرت انگیز ایجاز و جامعیت کے ساتھ سورۃ فاتحہ کی سات مختصر آیتوں میں توحیدِ الٰہی اور صفاتِ کمالیہ کو بیان کیا ہے اس کی نظیر سے مذاہبِ عالم کے دفتر خالی ہیں اور اس سے بڑھ کر تو کیا اس کے برابر بھی مثال پیش کرنے سے دُنیائے مذاہب عاجز ہے۔ مسیحی دُنیا کو بڑا ناز اپنی انجیلی دُعا پر ہے۔ یہاں اس کے الفاظ سورۃ فاتحہ کے مقابلے میں درج کیے جاتے ہیں۔ ہر منصف مزاج خود فیصلہ کر سکتا ہے کہ قرآن کی فاتحۃ الکتاب اور اس انجیلی دُعا کے درمیان کیا مناسبت ہے۔

سورۃ فاتحہ	انجیلی دُعا (متی)
۱۔ ساری کی ساری تعریف اللہ کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مربی ہے۔	اے ہمارے باپ تو جو آسمانوں پر ہے تیرا نام پاک مانا جائے۔
۲۔ وُہ نہایت مہربان اور بے حد رحم کرنے والا ہے۔	
۳۔ مالک روزِ جزا ہے۔	تیری بادشاہت آئے تیری مرضی جیسے آسمانوں پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی پوری ہو
۴۔ بس ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں۔	
۵۔ چلا ہم کو سیدھے راستے پر۔	ہماری روز کی روٹی آج ہمیں دے دے۔
۶۔ ان لوگوں کا راستہ جن پر تُو نے انعام کیا۔	جس طرح ہم نے اپنے قرضداروں کو معاف کیا ہے تو ہمارے قرض ہمیں معاف کر دے۔
۷۔ وُہ انعام یافتہ ایسے ہوں جو نہ تیرے معتوب ہوئے ہوں اور نہ گمراہ ہوں [۱]	اور ہمیں آزمائش میں نہ لا بلکہ بُرائی سے بچا۔

زمانۂ نزول

یہ پُوری سُورت مکمل طور پر نازل ہوئی ہے اور اس کا زمانۂ نزول آغازِ نبوت کا دور ہے۔ اگرچہ

---

[۱] تفسیر ماجدی

سورۂ اِقْرَاْ کی چند آیات پہلے غارِ حرا میں نازل ہو چکی تھیں۔ لیکن چند روز کے بعد پوری سورۂ فاتحہ مع بسم اللہ کے نازل ہوئی۔ اس وقت نبوت کو دو ساتھی ایک مرد اور ایک عورت مل چکے تھے۔

ابن ابی شیبہ نے مصنف میں، ابونعیم اور بیہقی نے دلائل النبوت میں بتایا ہے کہ آغاز میں جب حضرت ابوبکرؓ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ورقہ کے پاس لے گئے۔ ورقہ نے آپ سے صورتِ حال دریافت کی تو آپ نے فرمایا کہ:

> جب میں تنہا ہوتا ہوں تو پیچھے سے غیبی آواز سنتا ہوں یا محمد یا محمد جس کی وحشت سے میں بھاگتا ہوں۔ ورقہ نے کہا ایسا نہ کرو ٹھہر کر اس کی بات سنو اور پھر جو کہے اس کی آکر مجھے خبر دو چنانچہ اس کے بعد آپ ایک جگہ تنہا تھے کہ آواز آئی اے محمد! یہ پڑھیے۔ بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ، اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعَالَمِيْنَ تا آخر سورت۔ اس کے بعد کہا کہ لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ کہو۔ آپ یہ سن کر ورقہ کے پاس آئے اور سارا واقعہ بتایا۔ ورقہ نے کہا کہ اے محمد تم کو بشارت ہو اور پھر بشارت ہو۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ تم وہی نبی ہو جس کی بشارت حضرت مسیح ابن مریم نے دی ہے۔ اور تمہاری شریعت حضرت موسیٰ کی شریعت کی طرح ہے اور میں گواہی دیتا ہوں کہ تم یقیناً نبی مرسل ہو۔

یہ روایت بتا رہی ہے کہ سورۂ فاتحہ کا زمانہ نزول ابتدائے نبوت کے چند روز بعد ہے۔ جب کہ حضرت صدیق اکبرؓ اور حضرت خدیجہؓ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے اور ورقہ ابن نوفل زندہ تھے۔[1]

گویا اقرأ باسم ربك والی وحی غارِ حرا میں تکوینِ علم اور راہی میں تخلیق قرأت کے لیے آئی تھی۔ اور سورۂ مدثر کی ابتدائی آیتیں بارِ نبوت کی ذمہ داریوں کو بتانے کے لیے آئیں اور سورۂ فاتحہ کا نزول اسی زمانے میں دینِ حق کا تمام خلاصہ سمجھانے کے لیے ہوا۔

---

[1] معارف م اصلہ ج ۱

آیاتہا ۷	(۱) سُوْرَۃُ الْفَاتِحَۃِ مَکِّیَّۃٌ (۵)	رکوعہا ۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان، نہایت رحم کرنے والا ہے۔

○ قرآن حکیم کا یہ افتتاحی فقرہ بجز ایک سُورت کے ہر سُورت کی ابتدا میں دُہرایا گیا ہے۔ یعنی ایک سو تیرہ بار۔ اور سُورۂ نمل میں عبارت کے اندر بطور آیت قرآنی بھی آیا ہے۔ اس کے قرآن میں سے ہونے نہ ہونے کی بابت تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ البتہ گفتگو اس میں ہوئی ہے کہ آیا ہر سُورت کی ابتدا میں اس کی حیثیت بطور ایک مستقل آیت کے ہے یا نہیں[1] امام اعظم ابوحنیفہؒ کا مذہب یہ ہے کہ بسم اللہ بجز سُورۂ نمل کے اور کسی سورت کی آیت نہیں ہے بلکہ ایک مستقل آیت ہے جو ہر سورت کے شروع میں دو سورتوں کے درمیان فرق و تمیز کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے[2]

سُنن ابی داؤد میں باسنادِ صحیح حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ

حضرت رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم دو سورتوں کے فرق نہ جانتے تھے، یہاں تک کہ بسم اللہ نازل ہوئی۔

اسی وجہ سے بسم اللہ کو نماز میں احناف سورۂ فاتحہ کے ساتھ بآوازِ بلند نہیں پڑھتے، تاکہ جُزوِ فاتحہ ہونے کا خیال نہ ہو۔ اور اسی لیے بسم اللہ کو کسی سُورت کے ساتھ ملا کر نہیں لکھتے بلکہ ہمیشہ علیحدہ دو لائنوں کے درمیان لکھتے ہیں تاکہ سُورت کا حِصّہ ہونے کا شُبہ نہ ہو[3]

آغاز قرآن میں بسم اللہ

قرآن کا آغاز بسم اللہ سے کیوں ہوا؟

[1] تفسیر ماجدی۔ [2] معارف القرآن م ش [3] معارف القرآن م ا

اس لیے کہ اہلِ جاہلیت کی عادت تھی کہ اپنے کاموں کو بتوں کے نام سے شروع کرتے تھے۔ اس رسمِ جاہلیت کو مٹانے کے لیے قرآن کی سب سے پہلی آیت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اُتری اس میں قرآن کو اللہ کے نام سے شروع کرنے کا حکم دیا گیا۔ اقرأ باسم ربك ۔ علامہ سیوطیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کے سوا دوسری تمام آسمانی کتابیں بھی بسم اللہ سے شروع کی گئی ہیں ——— لیکن کچھ علماء فرماتے ہیں کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم قرآن کی خصوصیات میں سے ہے[1]

ہر کام کا آغاز

یہی وجہ ہے کہ اسلام جو تہذیب سکھانا چاہتا ہے اس کے قواعد میں سے ایک قاعدہ یہ بھی ہے کہ وُہ اپنے ہر کام کی ابتدا، اللہ کے نام سے کرے۔ اس کی پابندی اگر شعور و اخلاص کے ساتھ کی جائے تو اس سے تین فائدے ضرور حاصل ہوتے ہیں۔

ایک یہ کہ آدمی بہت سے بُرے کاموں سے بچ جائے گا کیونکہ اللہ کا نام لینے کی عادت اسے ہر کام شروع کرتے وقت یہ سوچنے پر مجبور کر دے گی کہ کیا واقعی میں اس کام پر اللہ کا نام لینے میں حق بجانب ہوں؟

دوسرے یہ کہ جائز اور صحیح کاموں کی ابتدا کرتے ہوئے اللہ کا نام لینے سے آدمی کی ذہنیت بالکل ٹھیک سمت اختیار کرے گی اور وُہ ہمیشہ صحیح ترین نقطہ سے کام کا آغاز کرے گا۔

تیسرا اور سب سے بڑا فائدہ یہ ہے کہ جب وُہ اللہ کے نام سے اپنا کام شروع کرے گا تو اللہ کی تائید اور توفیق اس کے شاملِ حال ہو گی۔ اس کی سعی میں برکت ہو گی[2]

گویا بسم اللہ سے قرآن کا آغاز ہمیں اس کی ہدایت دے رہا ہے کہ ہم ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کریں ——— اور اس طرح

اسلام نے ہر کام اللہ کے نام سے شروع کرنے کی ہدایت دے کر انسان کی پُوری زندگی کو ایسا بنا دیا ہے کہ وُہ قدم قدم پر اس حلف وفاداری کی تجدید کرتا رہے کہ میرا وجود اور میرا کوئی کام بغیر اللہ تعالیٰ کی مشیت و ارادے اور اس کی امداد کے نہیں ہو سکتا۔ اس ہدایت کے ذریعے اسلام نے انسان کی ہر نقل و حرکت اور تمام معاشی اور دُنیوی کاموں کو بھی عبادت کا رنگ دے دیا۔ عمل کتنا مختصر ہے لیکن فائدہ

---

[1] معارف القرآن م ش [2] تفہیم القرآن

کس قدر بڑا ہے۔ کہ دُنیا بھی دین بن جاتی ہے۔ ایک کافر بھی کھاتا اور پیتا ہے اور ایک مسلمان بھی لیکن مسلمان لقمہ سے پہلے بسم اللہ کہہ کر یہ اقرار کرتا ہے کہ یہ لقمہ زمین سے پیدا ہونے سے لے کر پک کر تیار ہونے تک آسمان و زمین، سیاروں، فضائی قوتوں پر انسانی محنتوں سے گزر کر مجھ تک پہنچا ہے۔ اس کا حاصل کرنا میرے بس میں نہ تھا۔ یہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے ان تمام مراحل سے گزار کر یہ لقمہ مجھے عطا کیا ہے ——— غور فرمایئے کہ اسلام کی اس ایک ہی تعلیم نے انسان کو کہاں سے کہاں پہنچا دیا۔ اس لیئے یہ کہنا صحیح ہے کہ بسم اللہ ایک نسخہ اکسیر ہے جس سے تانبے کا نہیں بلکہ خاک کا سونا بنتا ہے[1]

رحمٰن و رحیم میں فرق

۲ ——— رحمٰن و رحیم دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں اور رحمٰن میں رحیم سے زیادہ مبالغہ ہے۔ ترجمہ میں ان سب باتوں کا لحاظ ہے (شیخ الہندؒ) یہ دونوں اللہ تعالیٰ کی صفات ہیں۔ رحمٰن کے معنے عام الرحمۃ کے اور رحیم کے معنے تام الرحمۃ کے ہیں۔ عام الرحمۃ یہ ہے کہ اللہ کی رحمت سارے عالم اور ساری کائنات اور جو کچھ اب تک پیدا ہوا ہے اور جو کچھ ہوگا سب کو حاوی اور شامل ہے۔ اور تام الرحمۃ یہ ہے کہ اس کی رحمت کامل و مکمل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ لفظ رحمٰن اللہ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہے کسی مخلوق کو رحمٰن کہنا جائز نہیں ہے ——— اور اسی لیئے جیسے لفظ اللہ کی جمع اور تثنیہ نہیں آتا لفظ رحمٰن کا بھی تثنیہ اور جمع کا صیغہ نہیں آتا کیونکہ یہ لفظ ایک ہی ذاتِ پاک کے لیئے مخصوص ہے دوسرے اور تیسرے کا وہاں احتمال ہی نہیں ہے۔ بخلاف لفظ رحیم کے کہ اس کے معنے میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کا پایا جانا مخلوق میں محال ہو کیونکہ یہ ممکن ہے کہ کوئی شخص کسی سے رحمت کا پُورا پُورا معاملہ کرے۔ اسی لیئے لفظ رحیم انسان کے لیئے بولا جاتا ہے۔ قرآنِ حکیم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیئے یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ بالمؤمنین رؤف رحیم[2]

رحمٰن و رحیم دونوں رحمت سے مشتق ہیں اور دونوں مبالغہ کے صیغے ہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ مبالغہ کس میں زیادہ ہے۔ رائے عام یہ ہے کہ رحمٰن میں بہ نسبت رحیم کے زیادہ مبالغہ ہے۔ اس لیئے کہ رحمٰن اللہ کے ساتھ مخصوص ہے اور رحیم اللہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اور بعض علماء یہ کہتے ہیں کہ دونوں ہم معنیٰ ہیں جیسے ندمان اور ندیم تاکید کے لیئے دونوں جمع کر دیئے گئے ہیں[3]۔ اگرچہ دونوں اسم

---

[1] معارف القرآن م ش [2] معارف القرآن م ش [3] معارف القرآن م ا

رحمت سے ہیں لیکن رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو نمایاں کرتے ہیں۔ عربی میں فعلان کا باب عموماً ایسی صفات کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ جو محض صفاتِ عارضہ ہوں۔ فعلی ظہور ان کے لیے ضروری نہیں ہوتا جیسے پیاسے کے لیے عطشان۔ غضب ناک کے لیے غضبان۔ سراسیمہ کے لیے حیران مست کے لیے سکران ——— لیکن فعیل کے وزن میں صفات قائمہ و فاعلہ کا خاصہ ہے یعنی عموماً ایسی صفات کے لیے بولا جاتا ہے جو جذبات و عوارض ہونے کی جگہ صفاتِ قائمہ ہوتے ہیں اور اپنا فعلی ظہور بھی رکھتے ہیں۔ مثلاً کریم کرم کرنے والا۔ عظیم بڑائی رکھنے والا۔ علیم علم رکھنے والا۔ حکیم حکمت رکھنے والا۔ پس الرّحمٰن کے معنے یہ ہوئے کہ وُہ ذات جس میں رحمت ہے اور الرّحیم کے معنے یہ ہوئے کہ وُہ ذات کہ جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس کی رحمت اپنا فعلی ظہور بھی رکھتی ہے اور تمام کائنات خلقت اس سے فیض یاب ہو رہی ہے[1]۔

رحمت کے لیے دو لفظ لانے کی وجہ

اس لیے کہ انسان کا خاصہ ہے کہ جب کوئی چیز اس کی نگاہ میں بہت زیادہ ہوتی ہے تو وُہ مبالغہ کے صیغوں میں اس کو بیان کرتا ہے۔ اور اگر ایک مبالغہ کا لفظ بول کر وُہ محسوس کرتا ہے کہ اس شے کی فراوانی کا حق ادا نہیں ہوا تو پھر وُہ اسی معنے کا ایک اور لفظ بولتا ہے تاکہ وہ کمی پُوری ہو جائے جو اس کے نزدیک مبالغہ میں رہ گئی ہے۔ اللہ کی تعریف میں رحمٰن کا لفظ استعمال کرنے کے بعد پھر رحیم کا اضافہ کرنے میں یہی نکتہ پوشیدہ ہے[2]۔

اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تخلیقِ عالم اور تمام کائنات کو پیدا کرنے اور ان کو پالنے وغیرہ کا منشاء اللہ تعالیٰ کی صفت رحمت ہے۔ نہ اس کو ان چیزوں کی خود کوئی ضرورت تھی نہ کوئی دوسرا ان چیزوں کے پیدا کرنے پر مجبور کرنے والا تھا۔ صرف اس کی رحمت کے تقاضے سے یہ ساری چیزیں اور ان کی پرورش کے سارے انتظامات وجود میں آئے ہیں[3]۔

رحمت کو دو صیغوں سے اس لیے تعبیر کیا ہے کہ قرآن اللہ تعالیٰ کے تصور کا جو نقشہ ذہن نشین کرانا چاہتا ہے اس میں سب سے نمایاں اور چھائی ہوئی صفت رحمت ہی کی صفت ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ تمام تر رحمت ہی ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن　[2] تفہیم القرآن　[3] معارف القرآن م ش

وَرَحْمَتِیْ وَسِعَتْ كُلَّ شَیْءٍ۔ اور میری رحمت دُنیا کی ہر چیز کا احاطہ کئے ہوئے ہے۔

پس ضروری تھا کہ خصوصیت کے ساتھ اس کی صفتی اور فعلی دونوں حیثیتیں واضح کر دی جائیں۔ یعنی اس میں رحمت ہی رحمت ہے کیونکہ وُہ الرحمٰن ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ہمیشہ اس سے رحمت کا ظہور بھی ہو رہا ہے کیونکہ الرحمٰن کے ساتھ وُہ الرحیم بھی ہے [1]

تین نام لانے کی وجہ

ابتدا میں ان تین ناموں یعنی اللہ، رحمٰن، رحیم کو خاص طور پر لانے کی وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ انسان پر تین حالتیں گزرتی ہیں۔ ایک عدم سے وجود میں آنا۔ دُوسری وجود میں آنے کے بعد باقی رہنا اور زندگی کی مقررہ مدت پُوری کرنا۔ تیسری موت کے بعد کی حالت —— ابتدا میں تین ناموں سے تینوں حالتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ لفظ اللہ میں پہلی حالت کی جانب اشارہ ہے اس لیے تخلیق و تکوین بارگاہِ الوہیت سے مشتق ہے۔ اور لفظ رحمٰن سے دُوسری حالت کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ دُنیا دارِ ابتلا، اور دارِ امتحان ہے جو یہاں سیدھے راستہ پر چلا اس کے لیئے آخرت کی ساری منزلیں آسان ہیں۔ نفس و شیطان ہر وقت انسان کی تاک میں ہے اس لیئے بندہ ایسی حالت میں بے پایاں اور بے انتہا رحمت کا محتاج ہے۔ اور لفظ رحیم تیسری حالت یعنی آخرت کو یاد دلانے کے لیئے لایا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ لفظ اللہ میں جس کے معنے اس ذات کے ہیں جو تمام صفات کمال کی جامع ہو اور تمام نقائص و عیوب سے پاک ہو۔ تمام مباحث الٰہیات کی طرف اشارہ ہے۔ اور لفظ رحمٰن میں مباحث نبوت و شریعت کی طرف اشارہ ہے۔ اور لفظ رحیم میں اجمالاً تمام امورِ آخرت کی طرف اشارہ ہے۔ اور یہی تینوں دُنیا میں آنے والے تمام پیغمبروں کی تعلیمات کا لُبِ لباب اور خلاصہ ہیں۔

اسلام کے اس خالص توحیدی کلمہ کے مقابلے میں اب مسیحیت کا فقرۂ افتتاحیہ ملاحظہ ہو۔

شروع باپ بیٹے اور روح القدس کے نام سے

کوئی نسبت ہے اس شرکِ جلی کو اسلام کی توحیدِ خالص سے؟ راقم آثم کے خیال میں یہ بات آتی ہے کہ عجب نہیں جو خالقِ اکبر کی یہی صفات رحمانیت، رحیمیت مسخ ہو کر مسیحیت میں بیٹا اور رُوح القدس

---

[1] ترجمان القرآن

بن گئی ہوں[1]

قریش کی رحمان سے بے خبری

معاملہ کے اس پہلو پر بھی غور کرنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کے لیئے رحمٰن کا لفظ اسلام سے پہلے عام طور پر عربوں میں مستعمل نہ تھا۔ اصل میں یہ عبرانی لفظ ہے اور صرف یہود و نصاریٰ اور بعض دیگر ارباب مذاہب اس کو برتتے تھے چنانچہ یمن کے آخری کتبات میں رحمٰن ہی کا نام ملتا ہے۔ سدعرم کے عیسائی کتبات کا آغاز بنعمۃ الرحمٰن الرحیم سے ہوتا ہے اسی لیئے اسلام نے جب ابتدا میں رحمٰن کا نام لیا تو قریش کو تعجب ہوا کہ یہ نیا[2] نام کیا ہے۔ صلح حدیبیہ میں جب حضرت علی رضی اللہ عنہ نے عہد نامہ کی پیشانی پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم لکھا تو قریش نے ماننے سے انکار کر دیا کہ ہم رحمٰن کو نہیں جانتے[3]۔ قرآن میں اس کی تصریح موجود ہے۔

جب ان سے کہا جاتا ہے کہ رحمٰن کو سجدہ کرو تو کہتے ہیں رحمٰن کیا ہے؟ کیا تو جسے بھی کہے گا ہم اس کو سجدہ کریں گے اس سے ان کی نفرت میں اور ترقی ہوئی ہے۔

ایک دوسری جگہ ہے۔

رحمٰن کی یاد سے وہ منکر ہیں۔

قرآن نے ان کو بتایا کہ اللہ کے لیئے تمام اچھے نام بولے جا سکتے ہیں اللہ اور رحمٰن ایک ذات کے مختلف نام ہیں۔

قُلِ ادْعُوا اللّٰهَ اَوِ ادْعُوا الرَّحْمٰنَ اَيًّا مَّا تَدْعُوْا فَلَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى۔

کہہ دو کہ اللہ کہہ کر پکارو یا رحمٰن کہہ کر۔ جو کہہ کر پکارو اس کے لیئے اچھے اچھے نام ہیں۔

قرآن کا آغاز بسم اللہ سے ہوتا ہے۔ ہمارے مفسرین نے رحمٰن و رحیم میں دو ہم معنی صفتوں کی یکجائی کی متعدد تاویلیں کی ہیں۔ اور ان دونوں کے معانی کے درمیان نہایت نازک اور دقیق فرق نکالے ہیں لیکن ہمارے نزدیک یہ سب کوہ کادی و موشگافی ہے۔ قرآن کے استعمال سے صاف ظاہر ہوتا ہے

---

[1] تفسیر ماجدی [2] سیرت ابن ہشام [3] صحیح بخاری

کہ اس نے رحمٰن کا لفظ بطور صفت نہیں بلکہ بطور علم استعمال کیا ہے۔ چنانچہ تمام قرآن میں ۵۷ بار یہ نام اللہ کے لیئے آیا ہے۔ اس بنا پر اس کو صفت قرار دینا درست نہیں ہے۔ سورۂ اسرائیل کی اُوپر والی آیت سے یہ سمجھا جاسکتا ہے کہ رحمٰن اللہ کی صفت نہیں بلکہ علم ہے۔

ہم سمجھتے ہیں کہ عرب میں دو متضاد جماعتیں تھیں جس میں سے ایک اپنے معبود کو اللہ اور دوسری الرحمٰن کہتی تھی۔ اسلام ان دونوں کو کہا کرتا ہے کہ تم جس کو اللہ کہتے ہو اور وہ جس کو الرحمٰن کہتے ہیں۔ درحقیقت ایک ہی ذات کی دو تعبیریں ہیں اور یہ باہمی اختلاف محض نزاعِ لفظی ہے[1]

اَلۡحَمۡدُ لِلّٰهِ رَبِّ الۡعٰلَمِيۡنَ ۝ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ ۝

ساری کی ساری تعریف، ستائش صرف اللہ ہی کے لیئے ہے جو تمام کائنات کا مربی ہے (جس کی تربیت ہر وجود کے لیئے زندگی اور بقا کا سامان کرتی ہے۔ اور تربیت کی ساری ضرورتیں فراہم کرتی ہے)، جو بے حد مہربان ہے (جس کی مہربانی سب کو بلا تمیز اپنی رحمتوں سے مالا مال کرتی ہے) جو نہایت رحم کرنے والا ہے۔ (جس کی رحمت سب کے لیئے لگاتار ہوتی رہتی ہے)

ا۔ یعنی سب تعریفیں عمدہ سے عمدہ اوّل سے آخر تک جو ہوئی ہیں اور جو ہوں گی اللہ ہی کو لائق ہیں کیونکہ ہر نعمت اور ہر چیز کا پیدا کرنے والا اور عطا کرنے والا وہی ہے خواہ بلا واسطہ عطا فرمائے یا بالواسطہ جیسے دھوپ کی وجہ سے اگر کسی کو حرارت یا نور پہنچے تو حقیقت میں آفتاب کا فیض ہے۔

حمد را با تو نسبتے ست درست بر در ہر کہ رفت بر در تست

تو اب اس کا یہ ترجمہ کرنا کہ ہر طرح کی تعریف خدا ہی کو سزاوار ہے بڑی کوتاہی کی بات ہے جس کو اہلِ فہم خوب سمجھتے ہیں[1]

الحمد میں ال استغراق کے لیئے ہے یعنی جمیع حمد کوئی سی بھی ہو، کسی قسم کی ہو بظاہر کسی کے لیئے بھی ہو۔ حمد کا درجہ لغوی اعتبار سے مدح اور شکر دونوں سے بلند تر ہے۔ شکر تو کسی متعین نعمت ہی کے

[1] حاشیہ شیخ الہند ص۱

مقابلے میں بولا جاتا ہے صرف حمد ہی ایسی چیز ہے جو محمود کی عام اختیاری خوبیوں اور فضیلتوں کی بنا پر کی جاتی ہے۔[1]

عربی میں حمد کے معنے ثنائے جمیل کے ہیں یعنی اچھی صفتیں بیان کرنے کے۔ اگر کسی کی بری صفتیں بیان کی جائیں تو یہ حمد نہ ہوگی۔[2]

حمد کے معنے

الحمدللہ کے معنے یہ ہیں کہ سب تعریفیں اللہ ہی کے لیے ہیں۔ یعنی دُنیا میں جہاں کہیں کسی چیز کی تعریف کی جاتی ہے وُہ درحقیقت اللہ ہی کی تعریف ہے کیونکہ اس جہانِ رنگ و بُو میں جہاں ہزاروں حسین مناظر اور لاکھوں دلکش نظارے اور کروڑوں نفع بخش چیزیں انسان کے دامن دل کو ہر وقت اپنی طرف کھینچتی رہتی ہیں اور اپنی تعریف پر مجبور کرتی ہیں۔ اگر ذرا غور کیا جائے تو ان سب کے پردے میں ایک ہی دستِ قدرت کی کارفرمائی نظر آئے گی اور دُنیا میں جہاں کہیں بھی کسی کی تعریف کی جاتی ہے اس کی حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں جیسے کسی نقش و نگار یا تصویر کی یا کسی صنعت کی تعریف کی جائے کہ یہ سب تعریفیں درحقیقت نقاش و مصور یا صناع کی ہوتی ہیں۔ اس جملے نے کثرتوں کے تلاطم میں پھنسے ہوئے انسان کے سامنے ایک حقیقت کا دروازہ کھول کر یہ دکھلا دیا کہ یہ ساری کثرتیں ایک ہی وحدت سے مربُوط ہیں اور ساری تعریفیں درحقیقت اسی ایک قادرِ مطلق کی ہیں۔[3]

حمد کے دواعی

تعریف ہم جس کی بھی کرتے ہیں دو وجوہ سے کیا کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ وُہ بجائے خود حُسن و خوبی اور کمال رکھتا ہو۔ قطع نظر اس سے کہ ہم پر اس کے ان فضائل کا کیا اثر ہے۔ دوسرے یہ کہ وُہ ہمارا محسن ہو اور ہم اعترافِ نعمت کے جذبے سے سرشار ہو کر اس کی خوبیاں بیان کریں۔ اللہ تعالیٰ کی تعریف ان دونوں حیثیتوں سے ہے۔ یہ ہماری قدر شناسی کا تقاضا بھی ہے اور احسان شناسی کا بھی کہ ہم اس کی تعریف میں رطب اللسان ہوں۔ اور بات صرف اتنی نہیں ہے کہ تعریف اللہ کے لیے ہے بلکہ صحیح یہ ہے کہ تعریف اللہ ہی کے لیے ہے۔ یہ بات کہہ کر ایک بڑی حقیقت سے پردہ اُٹھایا گیا ہے اور وُہ

---

[1] تفسیر ماجدی صـ۱ ۔ [2] ترجمان القرآن صـ۶ ۔ [3] معارف القرآن م ش صـ۱۰

حقیقت ایسی ہے جس کی پہلی ہی ضرب سے مخلوق پرستی کی جڑ کٹ جاتی ہے۔ دُنیا میں جہاں جس چیز اور جس شکل میں بھی کوئی حُسن، کوئی خوبی، کوئی کمال ہے اس کا سرچشمہ اللہ ہی کی ذات ہے۔ کسی انسان، کسی فرشتے، کسی سیارے غرض کسی مخلوق کا بھی کمال ذاتی نہیں ہے بلکہ اللہ کا عطیہ ہے۔ پس اگر کوئی اس کا مستحق ہے کہ ہم اس کے گرویدہ اور پرستار، احسان مند، شکر گزار، نیاز مند، اور خدمتگار بنیں تو وہ خالق کمال ہے نہ کہ صاحبِ کمال[۱]۔

حمد سے سورت کی ابتدا

معرفتِ الٰہی کی راہ میں انسان کا پہلا تاثر یہی ہے یعنی جب کبھی ایک صادق انسان اس راہ میں قدم اُٹھائے گا تو سب سے پہلی حالت جو اس کے فکر و وجدان پر طاری ہوگی وُہ قدرتی طور پر وہی ہوگی جسے یہاں تحمید و ستائش سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کے لیے معرفتِ حق کی راہ کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ صرف ایک ہی راہ ہے اور وُہ یہ ہے کہ کائنات خلقت میں تدبر و تفکر کرے مصنوعات کا مطالعہ اسے صانع تک پہنچا دے گا۔

اَلَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيَامًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى جُنُوْبِهِمْ
وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِىْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ۔

ارباب دانش جو کسی حال میں بھی اللہ کی یاد سے غافل نہیں ہوتے کھڑے ہوں، بیٹھے ہوں، لیٹے ہوں ہوں لیکن ہر حال میں اللہ کی یاد ان کے اندر بسی ہوتی ہے اور جن کا شیوہ یہ ہوتا ہے کہ آسمان و زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں۔

اب غور کرو ایک طالب صادق اس راہ میں قدم اُٹھاتا ہے اور کائنات خلقت کے مظاہر و آثار کا مطالعہ کرتا ہے تو سب سے پہلا اثر جو اس کے دماغ پر طاری ہوگا وُہ کیا ہوگا! وُہ دیکھے گا کہ خود اس کا وجود اور اس کے وجود سے باہر کی ہر چیز ایک صانع حکیم اور مدبر قدیر کی کارفرمائیوں کی جلوہ گاہ ہے اور اس کی ربوبیت اور رحمت کا ہاتھ ایک ایک ذرہ حقیقت میں صاف نظر آرہا ہے۔ بس قدرتی طور پر اس کی رُوح جوشِ ستائش اور محویتِ جمال سے معمور ہو جائے گی اور وُہ بے اختیار پکار اُٹھے گا کہ الحمد للہ رب العلمین۔ ساری حمد و ستائش اس ذات کے لیے ہے جو اپنی کارفرمائی کے

---

[۱] تفہیم القرآن صلا

ہر گوشہ میں سرچشمہ رحمت و فیضان اور معنے حسن و کمال ہے۔[۱]

لفظ اللہ کی تحقیق

۲ — اللہ - یہ اس ذات واجب الوجود کا علم ہے جو تمام صفات کمال کی جامع ہے اور ہر قسم کے عیب اور نقص کے شائبہ اور واہمہ سے پاک اور منزہ ہے - اور اسی وجہ سے لفظ جلالہ ہمیشہ موصوف ہی واقع ہوتا ہے اور اسمائے حسنیٰ کو بطور صفت اس اسم عظیم کے بعد ذکر کیا جاتا ہے اور یہ اسم عظیم رب اعلیٰ کے ساتھ مخصوص ہے - اس کا اطلاق ہمیشہ سے صرف اسی ذات پاک کے لیے ہوا ہے - جس طرح کوئی اس کی ذات اور صفات میں اس کا شریک اور سہیم نہیں ہے اسی طرح اس اسم عظیم میں بھی کوئی اس کا قسیم نہیں - اسی وجہ سے تمام اولیاء اللہ کا مسلک یہ ہے کہ اسم ذات ہی اسم اعظم ہے - امام اعظمؒ نے لفظ اللہ ہی کو اسم اعظم قرار دیا ہے جیسا کہ امام طحاویؒ نے بیان کیا ہے -

امام محمد بن الحسنؒ نے امام اعظمؒ کے حوالے سے بتایا کہ اسم اعظم لفظ اللہ ہے - امام محمدؒ فرماتے ہیں اس لیے کہ رحمٰن مشتق ہے رحمت سے رب مشتق ہے ربوبیت سے - اور اس قسم کی مثالیں دے کر فرمایا کہ لفظ اللہ کسی سے مشتق نہیں ہے۔[۲] (مشکل الآثار طحاوی)

لفظ اللہ: اللہ سبحانہ کے ناموں میں سے سب سے بڑا اور سب سے زیادہ جامع نام ہے - بعض علماء نے اسی کو اسم اعظم قرار دیا ہے - اور یہ نام اللہ کے سوا کسی دوسرے کا نہیں اس لیے اس لفظ کا تثنیہ اور جمع نہیں آتے - کیونکہ اللہ واحد ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔[۳]

اللہ خدا کے لیے اسم ذات ہے کسی اور ہستی پر اس کا اطلاق ہو ہی نہیں سکتا - فارسی کے خدا یا انگریزی کے گاڈ کی طرح اسم نکرہ نہیں کہ معبود واحد کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی بولا جا سکے - اس کی نہ جمع آتی ہے نہ یہ کسی سے مشتق ہے اور نہ اس کا ترجمہ کسی زبان میں ہو سکتا ہے۔[۴]

تصویر کا دوسرا رُخ

کیا قرآن نے لفظ اللہ محض اس لیے اختیار کیا ہے کہ زبان کا مقتضا یہی تھا یا اس سے بھی زیادہ کوئی معنوی موزونیت اس میں پوشیدہ ہے -

---

[۱] ترجمان القرآن - [۲] معارف القرآن م ا - [۳] معارف القرآن م ش صك [۴] تفسیر ماجدی صك

سامی زبانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف و اصوات کی ایک خاص ترکیب ہے جو معبودیت کے معنے میں مستعمل رہی ہے۔ اور عبرانی، سریانی، حمیری، عربی وغیرہ تمام زبانوں میں اس کا لغوی خاصہ پایا جاتا ہے۔ یہ الف لام اور ہ کا مادہ ہے اور مختلف شکلوں میں مشتق ہوا ہے۔ کلدانی و سریانی کا الاہیا، عبرانی کا الوہ اور عربی کا الٰہ اسی سے ہے۔ بلاشبہ یہی الاہ ہے جو حرفِ تعریف کے اضافہ کے بعد اللہ ہوگیا ہے اور تعریف نے اسے صرف خالقِ کائنات کے لیئے مخصوص کردیا ہے۔ لیکن اگر اللہ الٰہ سے ہے تو الٰہ کے معنے کیا ہیں؟ علمائے لغت و اشتقاق کے اقوال مختلف ہیں مگر سب سے زیادہ قوی قول یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل الٰہ ہے اور الٰہ کے معنے تحیر اور درماندگی کے ہیں۔ بعضوں نے اسے ولہ سے ماخذ بتایا ہے اور اس کے معنے بھی یہی ہیں۔ پس خالقِ کائنات کے لیئے یہ لفظ اس لیئے اہم قرار پایا ہے کہ اس بارے میں انسان جو کچھ جان سکتا ہے اور جانتا ہے وُہ عقل کے تحیر اور ادراک کی درماندگی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وُہ جس قدر بھی اس ذاتِ مطلق کے بارے میں غور کرے گا اس کی عقل کی حیرانی اور درماندگی بڑھتی ہی جائے گی یہاں تک کہ وُہ معلوم کرے گا کہ اس راہ کی ابتدا بھی عجز و حیرت ہے اور انتہا بھی عجز و حیرت ہی ہے۔

اے بروں از وہم و قال و قیلِ من خاک بر فرقِ من و بر تمثیلِ من![1]

علمی تجر کی شرمناک مثال

لفظ اللہ کے متعلق مارگولیتھ کی تحقیق کہ یہ اصل میں قریش کے خاندانی دیوتا کا نام تھا اس لیئے محمدؐ کی توحید پرستی کے معنے یہ ہیں کہ انہوں نے دوسرے قبائل کے دیوتاؤں کو مٹا کر اپنے خاندانی دیوتا کو منوایا۔ یورپ کے مشرقی تبحرِ علمی کی شرمناک مثال ہے۔ سب سے پہلا سوال یہ ہے کہ اس عظیم الشان عربی زبان میں حقیقی خدا کے مفہوم کے لیئے کوئی لفظ موجود نہ تھا۔ تم کہتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے عرب میں موحدین موجود تھے۔ بہتر ہے لیکن وُہ اپنے خدا کے لیئے اللہ کے سوا کوئی اور لفظ بولتے تھے؟ موجودہ عیسائی ادبائے عرب کے بیان کے مطابق عرب میں عیسائی شعراء بکثرت ہوئے ہیں۔ ہاں سچ ہے عرب میں عیسائی شعراء ہوئے ہیں لیکن کیا ان کی زبان سے لفظ اللہ تم نے نہیں سُنا۔ قرآن نے اللہ تعالیٰ کی صفات خود مشرکین کے اقرار کے مطابق جو بیان کیئے ہیں وہ کیا کسی دیوتا پر صادق آسکتے ہیں؟

سب سے آخر یہ کہ اللہ کی اصل الالٰہ ہے۔ الٰہ تو صرف عربی زبان میں نہیں بلکہ تمام زبانوں میں

---

[1] ترجمان القرآن

خدا تعالیٰ ہی کے لیئے بولا جاتا ہے۔ کم از کم الٰہ الوہیم سے تو نا واقفیت نہ ہو گی۔ قریش اپنے دیوتاؤں کے مجسمے بنا کر پوجتے تھے کیا اس سب سے بڑے قریشی دیوتا کا بھی کہیں کوئی مجسمہ تھا[1]۔

۳۔۔۔ ربّ العٰلمین۔ رب کے معنے عربی لغت کے اعتبار سے تربیت و پرورش کرنے والے کے ہیں۔ اور تربیت اس کو کہتے ہیں کہ کسی چیز کو اس کے تمام مصالح کی رعایت کرتے ہوئے درجہ بدرجہ آگے بڑھایا جائے یہاں تک کہ وُہ حدِ کمال کو پہنچ جائے۔ یہ لفظ صرف اللہ تعالیٰ کی ذات پاک کے لیئے مخصوص ہے کسی مخلوق کو بغیر اضافت کے رب کہنا جائز نہیں ہے کیونکہ ہر مخلوق خود محتاج تربیت ہے[2]۔

رب کا لفظ تین معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک مالک اور آقا۔ دوسرے مربّی اور پرورش کرنے والے خبر گیری اور نگرانی کرنے والا، تیسرے فرمانروا، حاکم، مدبّر اور منتظم ـــــــ اللہ تعالیٰ ان سب معنوں میں کائنات کا رب ہے[3]۔

اُردو میں اس کا ترجمہ پروردگار ہے۔ یہی صحیح ہے لیکن قریب ترین لفظ اس مفہوم کے لیئے مربّی کا ہے اور یہی مترجم تھانوی قدس سرہٗ نے اختیار کیا ہے[4]۔

والدین کی تربیت مجازی ہے

تربیت اگرچہ والدین سے بھی ظہور میں آتی ہے مگر والدین کی تربیت نورِ آفتاب کی طرح اصلی اور ذاتی خانہ زاد نہیں ہے بلکہ نورِ زمین کی طرح مستعار اور عطائے غیر ہے۔ جس طرح نورِ زمین آفتاب کا فیض اور عطیہ ہے اسی طرح والدین کی تربیت بھی عطیہ الٰہی ہے۔ واقعی تربیت کے لیئے ضروری ہے کہ کسی چیز کو نیست سے ہست کیا جائے اور پھر اس کے لئے تمام اسبابِ تربیت کو پیدا کیا جائے اور پیدا کرنے کے بعد انتفاع کی تمام رکاوٹیں دُور کی جائیں۔ والدین اولاد کی تربیت کرتے ہیں لیکن اولاد کو نہ یہ عدم سے وجود میں لاتے ہیں اور نہ وُہ سامانِ تربیت کے خالق ہیں بلکہ اولاد بھی خدا کی پیدا کی ہوئی ہے اور سامانِ تربیت کا بھی خالق اللہ ہے۔ اس لیئے والدین کی تربیت مجازی ہے[5]۔

ربوبیت کی ہمہ گیری

عربی میں ربوبیت کے معنے پالنے کے ہیں لیکن پالنے کو اس کے وسیع معنے میں لینا چاہیئے اسی لیئے بعض

---

[1] ارض القرآن ص۲۲۲ ج ۲۔ [2] معارف القرآن م ش۔ [3] تفہیم القرآن [4] تفسیر ماجدی [5] معارف القرآن م ا

ائمہ لغت نے اس کی تعریف ان لفظوں سے کی ہے کہ کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ اپنے حدِ کمال کو پہنچ جائے۔ اگر ایک شخص بھوکے کو کھانا کھلا دے یا محتاج کو روپیہ دے دے تو یہ اس کا کرم ہوگا جود ہوگا لیکن وُہ بات نہ ہوگی جسے ربوبیت کہتے ہیں۔ ربوبیت کے لیئے ضروری ہے کہ پرورش اور نگہداشت کا ایک جاری اور مسلسل اہتمام ہو اور ایک وجود اس کی تکمیل و بلوغ کے لیئے وقتاً فوقتاً جیسی کچھ ضرورتیں پیش آتی رہتی ہیں سب کا سروسامان ہوتا رہے۔ نیز ضروری ہے کہ سب کچھ محبت و شفقت کے ساتھ ہو کیونکہ جو عمل محبت و شفقت کے عاطفہ سے خالی ہو گا ربوبیت نہیں ہو سکتا[1]

العلمین - مجموعہ مخلوقات کو عالم کہتے ہیں۔ اسی لیئے اس کی جمع نہیں لاتے مگر یہاں عالم سے مراد ہر جنس مثلاً عالمِ جن، عالمِ ملائکہ، عالمِ انس وغیرہ ہیں اس لیئے عالم کی جمع لائے ہیں تاکہ جملہ افراد عالم کا مخلوق بجناب باری ہونا خوب ظاہر ہو جائے[2]

اس میں دُنیا کی تمام اجناس انسان، آسمان، چاند، سورج اور تمام ستارے اور ہوا، فضا، برق، باراں، فرشتے، جنات، زمین اور اس کی تمام مخلوقات، حیوانات، نباتات، جمادات سب داخل ہیں اس لیئے ربّ العلمین کے یہ معنے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ تمام اجناسِ کائنات کی تربیت کرنے والے ہیں۔ اور یہ بھی کوئی بعید نہیں کہ جیسا یہ ایک عالم ہے اسی جیسے اور ہزاروں عالم ہیں جو اس ہمارے عالم سے باہر کی خلا میں موجود ہوں۔ امام رازیؒ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ اس عالم سے باہر ایک لامتناہی خلاء کا وجود دلائلِ عقلیہ سے ثابت ہے اور یہ بھی ثابت ہے کہ اللہ کو ہر چیز پر قدرت ہے اس کے لیئے کیا مشکل ہے کہ اس نے اس لامتناہی خلا میں ہمارے عالم کی طرح کے اور بھی ہزاروں عالم تیار کیئے ہوں[3]

ربّ العلمین کا لفظ لا کر قرآن نے گویا بتا دیا کہ ہر صنفِ موجودات کا ایک مستقل نظامِ تربیت ہے اور سب کا آخری سرا اسی قادرِ مطلق، واحد و یکتا کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی بھی صنفِ موجودات اس کے ہمہ گیر نظامِ تربیت سے آزاد و مستغنی نہیں۔ یہ تعلیم بھی اسی ایک لفظ سے مِل گئی کہ اسلام کا خدا کسی مخصوص نسل، مخصوص قوم، مخصوص قبیلہ کا خُدا نہیں ہے۔ یہ حقیقت تاریخِ مذاہب میں بیحد اہمیت رکھتی ہے اسلام سے پہلے جس قدر مذہب جس صورت میں موجود تھے وُہ اس وسیع تخیل ہی سے آشنا نہیں رہے تھے۔ ہر قوم خدا کو صرف اپنا خُدا سمجھتی تھی۔ گویا خدا کی حیثیت محض قومی خدا کی رہ گئی تھی۔ اہلِ مصر، ہند، یونان، روما، عرب وغیرہ کی مشرک قوموں کا ذکر نہیں۔ بنی اسرائیل جیسی موحد قوم بھی خُدا کے خدائے کائنات ہونے کی

---

[1] ترجمان القرآن [2] حاشیہ شیخ الہندؒ [3] معارف القرآن م ش

پُوری طرح قائل نہیں رہی تھی۔ قرآن نے ایک لفظ رب العٰلمین لا کر ان سارے مشرکانہ وگمراہانہ عقائد کی تردید کردی ہے[1]

۴ــــ اس آیت میں صفت رحمت کا ذکر دوبار کرنے میں شاید اس طرف اشارہ ہے کہ تمام کائنات کی ذمہ داری جو اللہ نے اپنے لیئے رکھی ہے وُہ اپنی کسی ضرورت، دباؤ یا مجبوری سے نہیں بلکہ یہ سب کچھ اس کی صفتِ رحمت کا تقاضا ہے۔ اگر پُوری کائنات نہ ہو تو اس کا کوئی نقصان نہیں اور ہو جائے تو اس پر کچھ بار نہیں ہے[1]

صفات کے بیان میں صفتِ ربوبیت کو سب سے پہلے لانا اور اس کے مابعد صفاتِ رحمانیت ورحیمیت پر زور دینا خود اس امر کی واضح شہادت ہے کہ عقائد اسلام میں ان صفات کا مرتبہ کس قدر بلند ہے اور ان کا درجہ کیسا اہم ہے۔ ان تصریحات کی موجودگی میں اور ان کے تکرار کے بعد مسیحی پادریوں کا یہ کہے جانا کہ اسلام کا خدا صرف قوت اور قہرمانی کا خُدا ہے حقیقت پر کیسا ظلم ہے[2]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول وعمل سے اسلام کی جو حقیقت ہمیں بتلائی ہے وُہ تمام تر یہی ہے کہ اللہ کی موحدانہ پرستش اور اس کے بندوں پر شفقت و رحمت ـــــ ایک مشہور حدیث جو ہر مسلمان و واعظ و معلم کی زبان پر ہے ہمیں بتلاتی ہے کہ خدا کی رحمت ان ہی بندوں کے لیئے ہے جو اس کے بندوں کے لیئے رحمت رکھتے ہیں۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا مشہور وعظ ـــــ زمین پر رحم کرو تا کہ وُہ جو آسمان پر ہے تم پر رحم کرے ـــــ بجنسہٖ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان پر بھی طاری ہوا ہے۔ اتنا نہیں بلکہ اسلام نے انسانی رحمت و شفقت کی جو ذہنیت پیدا کرنی چاہی وُہ اس قدر وسیع ہے کہ بے زبان جانور اس سے باہر نہیں ہیں[3]

مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ

جو جزا اور سزا کے دن کا مالک ہے (اور جس کی عدالت نے ہر کام کے لئے بدلہ اور ہر بات کے لیئے نتیجہ مقرر کر دیا ہے)

---

[1] معارف القرآن م ش [2] تفسیر ماجدی [3] ترجمان القرآن

۵ — مالک اور ملک آیت میں دو قرأتیں ہیں۔ اور دونوں صحیح اور متواتر ہیں ایک ملک یوم الدین یعنی روزِ جزا کا بادشاہ۔ دوسرے مالک یوم الدین یعنی روزِ جزا کا مالک۔ مالکیت اور بادشاہت کے لیئے روزِ جزا کو اس لیئے خاص کیا ہے کہ اس کے جلال و جمال کا بلا واسطہ ظہور پورا اور کامل عالم کے ہر ہر فرد کے سامنے ہوگا۔[1]

روزِ جزا کے خاص کرنے کی اوّل وجہ تو یہی ہے کہ اس دن بڑے بڑے امور پیش آئیں گے۔ ایسا خوفناک روز نہ پہلے ہوا نہ آگے کو ہوگا۔ دوسرے اس روز بجز ذاتِ پاک حق تعالیٰ کے کسی کو ملک و حکومت ظاہری بھی نصیب نہ ہوگی۔[2]

اللہ کی صفتِ عدالت

اللہ کی تعریف میں رحمٰن و رحیم کہنے کے بعد مالک روزِ جزا کہنے سے یہ بات نکلتی ہے کہ وُہ نرا مہربان ہی نہیں ہے بلکہ منصف بھی ہے اور منصف بھی ایسا با اختیار ہے کہ آخری فیصلے کے روز وہی پُورے اقتدار کا مالک ہوگا نہ اس کی سزا میں کوئی مزاحم ہو سکے گا اور نہ جزا میں مانع۔ لہٰذا ہم اس کی ربوبیت اور رحمت کی بنا پر اس سے محبت ہی نہیں کرتے بلکہ اس کے انصاف کی بناء پر اس سے ڈرتے بھی ہیں اور یہ احساس بھی رکھتے ہیں کہ ہمارے انجام کی بھلائی اور بُرائی بالکلیہ اسی کے اختیار میں ہے۔[3]

حاکم یا قاضی خواہ کیسے ہی وسیع اختیارات رکھتا ہو۔ بہر حال اس کے اختیارات محدود ہی ہوتے ہیں۔ اور وُہ مجرم کو حسبِ ضابطہ سزا دینے پر مجبور ہوتا ہے۔ گویا خود حاکم پر حکومت ضابطہ یا قانون کی ہوتی ہے۔ برخلاف اس کے مالک وُہ ہوتا ہے جسے پُورے اختیارات حاصل ہوں۔ مجرم کو چاہے وُہ بخش دے چاہے سزا دے کوئی اس سے بازپُرس کرنے والا اور کوئی اس پر حاکم نہیں۔ حدیثِ مسلم میں آچکا ہے کہ لا مالك الا الله۔ اور محققین کا قول بھی ایسا ہی ہے کہ بجز اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو مالک کہنا یا پکارنا جائز نہیں ہے۔ اس لفظ کا فارسی ترجمہ بھی اسی لیئے سفیان تابعی سے شہنشاہ مروی ہے۔ اور مفسرین نے بھی معنے مُطلق الاختیار کے لیئے ہیں ہندوستان کی بعض مشہور مشرک قوموں کا عقیدہ ہے کہ قانونِ مکافاتِ عمل کے خلاف خدا بھی نہیں کرسکتا۔ اور کسی خطاوار کو معاف نہیں کرسکتا۔ عیسائیوں کا بھی عقیدہ ہے کہ اللہ انصاف کرنے پر مجبور ہے اور اسی لیئے صفتِ عفو و کرم کے اظہار کے لیئے اسے اپنے اکلوتے بیٹے کو بطور کفارہ کے سب گنہگاروں کی طرف سے پیش کرنا پڑا۔ قرآنِ حکیم کے ایک

---

[1] معارف القرآن م ا صلا۔ [2] حاشیہ شیخ الہند صلا۔ [3] تفہیم القرآن صلا

لفظ مالک میں ان سب عقائدِ باطلہ کی تردید ہے[1]

لفظ دین کے معنے

سامی زبانوں کا ایک قدیم مادہ دان اور دین ہے جو بدلہ اور مکافات کے معنے میں بولا جاتا تھا اور پھر آئین وقانون کے معنوں میں بولا جانے لگا چنانچہ عبرانی اور آرامی میں اس کے مشتقات ملتے ہیں۔ آرامی زبان ہی سے غالباً یہ لفظ قدیم ایران میں پہنچا اور پہلوی میں دینیہ نے شریعت اور قانون کا مفہوم پیدا کر لیا۔ خود اوستا میں ایک سے زیادہ مواقع پر یہ لفظ مستعمل ہے اور زردشتیوں کی قدیم ادبیات میں انشاء و کتابت کے آئین و قواعد کو بھی "دین دیرہ" کے نام سے موسوم کیا ہے۔ علاوہ ازیں زردشتیوں کی ایک مذہبی کتاب کا نام دین کارت ہے جو غالباً نویں صدی مسیحی میں عراق کے ایک مؤیدنے مرتب کی تھی۔ بہرحال عربی میں الدین کے معنے بدلہ اور مکافات کے ہیں۔ خواہ اچھائی کا ہو یا برائی کا۔ بہرحال مالک یوم الدین کے معنے ہوتے روزِ جزا کا مالک[2]

دعوٰی اور دلیل

الحمد للہ کے بعد اللہ تعالیٰ کی جن صفات ربوبیت، رحمانیت و رحیمیت اور مالک یوم الدین کا ذکر کیا گیا ہے ان میں باہم ایک خاص منطقی ربط ہے۔ یہ اوصاف دراصل الحمد للہ دعوٰی کے لیے دلائل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

خصوصیت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے حمد ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کی ہر قسم کی پروردگاری، نگرانی اور نگہداشت فرما رہا ہے۔ لیکن اس کی یہ پروردگاری غرض مندوں کی طرح کسی غرض کی وجہ سے نہیں ہے کہ اسے کسی کے ناراض ہونے یا پبلک کے باغی ہونے یا شہریوں سے استحصال نہ ہونے کا اندیشہ لاحق ہے بلکہ اس کی پروردگاری صرف اس لیے ہے کہ وُہ رحمٰن و رحیم ہے۔ یعنی اگر پردہ ہستی کے پیچھے صرف خالقیت ہوتی رحمت نہ ہوتی تو بلاشبہ کائنات میں فضل و احسان کا یہ عالمگیر نظام نہ ہوتا۔ مگر اس کی رحمت عام انسانوں کی طرح نہیں ہے جس میں توازن نہ ہو بلکہ اس میں سر تا سر اعتدال اور توازن ہے۔ مالک یوم الدین میں اسی اعتدال کی طرف اشارہ ہے۔

---

[1] تفسیر ماجدی صـ۳ [2] ترجمان القرآن صـ۹

تین حالتیں

انسان پر تین حالات گزرتے ہیں۔ ماضی، حال اور مستقبل پچھلی تین آیتوں میں انسان کو اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ وُہ اپنے ماضی اور حال میں صرف اللہ کا محتاج ہے کہ ماضی میں اسے عدم سے وجود عطا فرمایا اور حال میں اس کی تربیت کا سلسلہ جاری فرمایا اور مالک یوم الدین میں یہ بتا دیا کہ مستقبل میں وُہ اللہ تعالیٰ ہی کا محتاج ہے اور جب یہ واضح ہو گیا کہ انسان اپنی زندگی کے تینوں دوروں میں اللہ ہی کا محتاج ہے تو اس کا عقلی اور طبعی تقاضا یہی ہے کہ صرف اس کی عبادت کی جائے[1]

اِیَّاکَ نَعۡبُدُ وَ اِیَّاکَ نَسۡتَعِیۡنُ

(اے اللہ) ہم تیری ہی عبادت[6] کرتے ہیں (تیرے سوا کسی کی عبادت نہیں کرتے) اور تیرے ہی سے مدد[7] چاہتے ہیں (تیرے سوا کوئی نہیں جس سے ہم مدد مانگیں)

---

۶ ـــــ عبادت نام ہے تذلل، انکسار، افتقار کے آخری درجے کا۔ عبودیت اظہارِ فروتنی کو کہتے ہیں اور عبادت اس سے بھی بلیغ ہے کیونکہ اس کے معنے انتہائی فروتنی کے ہیں۔ جو فروتنی اختیاری نہ ہو بلکہ اضطراری ہو عبادت نہ کہلائے گی۔ اور اسی طرح جو عاجزی و تذلل کسی کے جبر اور دباؤ سے ہو وُہ بھی عبادت نہ کہلائے گی۔ اور جس تذلل سے مقصود تعظیم نہ ہو وُہ استہزاء ہو گا[2] ـــــ اُردو میں عبادت کے ان معنی کے لیے پُوجا، پرستش، طاعت و فرمانبرداری، بندگی اور غلامی کی تعبیرات ہیں۔ اس جگہ تینوں معنے درست ہیں یعنی ہم تیرے پرستار بھی ہیں مطیع و فرمانبردار بندے اور غلام بھی[3]

توحید کے چار درجے

مشرکینِ مکہ عبادت میں توحید کے قائل نہ تھے وُہ اوروں کی بھی عبادت کرتے تھے اس لیے یہاں،

---

[1] معارف القرآن م ش [2] معارف القرآن ص۱ [3] تفہیم القرآن ص۱

ایک مؤمن اقرار کرتا ہے کہ ہم مشرک نہیں ہیں کہ تیری بھی عبادت کریں بلکہ موحد، حنیف اور مسلم ہیں ہم تیری ہی عبادت کرتے ہیں۔ توحید کے چار درجے ہیں ایک یہ کہ واجب الوجود اللہ کی ذات ہے اس کے سوا کوئی نہیں۔ دوسرے یہ کہ پوری کائنات کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ توحید کے ان دو درجوں سے آسمانی کتابوں میں کوئی بحث نہیں کی جاتی۔ کیونکہ نبوت کا اس موضوع پر مشرکین اور یہود و نصاریٰ سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ قرآن گواہ ہے کہ یہ ان کے مسلمات میں سے ہے۔ تیسرے یہ کہ اس کائنات کا مدبر اور چلانے والا اللہ ہے۔ اور چوتھے یہ کہ اس کائنات میں عبادت کا مستحق صرف اللہ ہی ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ ان آخری دونوں درجوں میں لوگوں کا نبوت سے اختلاف ہے۔ نجومی کہتے ہیں کہ نجوم اور ستارے بھی عبادت کے مستحق ہیں۔ مشرکین تیسرے درجۂ توحید میں نبوت کے ہمنوا ہیں لیکن چوتھے درجہ میں انبیاء سے اختلاف کرتے ہیں۔ مشرکین کا موقف یہ ہے کہ کچھ نیک لوگوں نے اللہ تعالیٰ کی بہت عبادت کی ہے اللہ تعالیٰ نے ان کی عبادت سے خوش ہو کر ان کو معبودیت کا خلعت عطا کر دیا ہے اس لیے وہ بھی عبادت کے مستحق ہیں۔ یہی آخری درجہ توحید کا توحیدِ عبادت کہلاتا ہے۔ نبوت اسی کی دعوت لے کر آتی ہے اور قرآن اسی کا منادی ہے۔[1]

عبادت کے اصطلاحی معنے

اصطلاحِ شریعت میں عبادت نام ہے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کے نذرانے کو پیش کرنے اور اس کے احکام کو بجا لانے کا۔ اسی لیے قرآن میں عبادت کا مقابل استکبار آیا ہے۔ اگر استکبار کے معنے اللہ کے مقابلے میں اپنے کو بڑا سمجھنا، اپنی ہستی کو ہی کوئی چیز جاننا اور خدا کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنا ہے تو عبادت کے معنے اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنی عاجزی اور بندگی کا اظہار اور اس کے احکام کے سامنے گردنِ طاعت خم کرنا ہے۔ اس بنا پر صحیفۂ محمدی کی زبان میں عبادت بندے کا ہر وہ کام ہے جس سے مقصود خدا کے سامنے گردن خم کرنا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو۔ اگر کوئی بظاہر کیسا ہی اچھا کام کرے لیکن اس سے مقصود اپنی بندگی کا اظہار اور خدا کے حکم کی طاعت نہ ہو تو وہ عبادت نہ ہوگی۔[2]

عبادت صرف نماز روزے کا نام نہیں۔ امام غزالیؒ نے اپنی کتاب اربعین میں عبادت کی دس قسمیں لکھی ہیں نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، تلاوتِ قرآن، ہر حالت میں اللہ کا ذکر، حلال روزی کے لیے کوشش کرنا، پڑوسی اور ساتھی کے حقوق ادا کرنا، لوگوں کو نیک کاموں کا حکم کرنا اور بُرے کاموں سے روکنا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ　[2] سیرت النبی ص۲۶۹

وسلم کی سنت کی پیروی کرنا۔ اس لیے ایاک نعبد کے معنے ہم صرف تیری ہی عبادت کرتے ہیں اور تیری عبادت میں کسی کو شریک نہیں کرتے کا مفہوم یہ ہوا کہ نہ کسی کی محبت اللہ کے برابر ہو نہ کسی کا خوف اس کے برابر ہو نہ کسی سے اُمید اس طرح ہو نہ کسی پر بھروسا اللہ جیسا ہو، نہ کسی کی اطاعت کو اتنا ضروری سمجھے جتنا اللہ کی عبادت کو نہ اللہ کی طرح کسی کی نذر و منت مانے۔ نہ اللہ کی طرح کسی دوسرے کے لیے اپنی مکمل عاجزی اور تذلل کا اظہار کرے۔ نہ وُہ افعال کسی کے لیے کرے جو انتہائی تذلل کی علامات ہیں جیسے رکوع، سجدہ[۱]۔

۷ — آیت کے جزو اوّل میں بیزاری اور تبرّی ہے شرک سے۔ اس آخری جُز میں بندے کی زبان سے اقرار ہے اپنی بے بساطی، بے قدرتی کا۔ اور اقرار ہے اپنے کو حفاظت اور نُصرت کے لیے اللہ کے ہاتھ میں سپرد کردینے کا۔ نعبد کے بعد نستعین لاتا گویا بندوں کی زبان سے یہ کہلانا ہے کہ ہم عبادت تک میں تیری ہی توفیق تیری ہی اعانت تیری ہی دستگیری کے محتاج ہیں۔ آیت نے جڑ کاٹ دی ہر قسم کی مظاہر پرستی اور مخلوق پرستی کی۔ شرک کی خفی سے خفی راہیں بھی بند کردی ہیں اور کوئی خفیف سی گنجائش بھی پیر پرستی، پیغمبر پرستی، فرشتہ پرستی، وغیرہ کی باقی نہیں چھوڑی ہے[۲]۔

اس آیت شریفہ سے معلوم ہوا کہ اس کی ذاتِ پاک کے سوا کسی سے حقیقت میں مدد مانگنی بالکل ناجائز ہے۔ ہاں اگر کسی مقبول بندے کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے ہے[۳]۔

اس میں انسان کو تعلیم دی گئی ہے کہ حقیقی طور پر اللہ کے سوا کسی کو حاجت روا نہ سمجھے اور کسی کے سامنے دستِ سوال دراز نہ کرے۔ کسی نبی اور ولی کو وسیلہ قرار دے کر اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگنا اس کے منافی نہیں ہے[۴]۔

تیرے ساتھ ہمارا تعلق محض عبادت کا نہیں ہے بلکہ استعانت کا تعلق بھی ہم تیرے ہی ساتھ رکھتے ہیں۔ ہمیں معلوم ہے کہ ساری کائنات کا رب تو ہی ہے اور ساری طاقتیں تیرے ہی ہاتھ میں ہیں۔ اور ساری نعمتوں کا تو ہی اکیلا مالک ہے۔ اس لیے ہم اپنی حاجتوں کی طلب میں تیری طرف ہی رجوع کرتے ہیں۔ تیرے ہی آگے ہمارا ہاتھ پھیلتا ہے اور تیری مدد ہی پر ہمارا اعتماد ہے۔ اسی بنا پر ہم اپنی درخواست لے کر تیرے حضور میں حاضر ہوئے ہیں[۵]۔

---

[۱] معارف القرآن م ش ص۲۹ [۲] تفسیر ماجدی ص۸ [۳] حاشیہ شیخ الہندؒ
[۴] معارف القرآن م ش ص۲۹ [۵] تفہیم القرآن ص۱۱

استعانت کی قسمیں

اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ سوائے خدا کے کسی سے مدد نہ مانگنی چاہیئے حالانکہ قرآن وحدیث میں جابجا اس کا ذکر ہے کہ ایک دوسرے کی مدد کرو۔ بیمار ہو تو علاج کرو۔ آخر یہ طبیب اور دوا سے استعانت نہیں تو اور کیا ہے؟ لہٰذا یہ بتلایا جائے کہ وُہ کونسی استعانت ہے جو اللہ کے سوا کسی اور سے ناجائز ہے اور کون سی کفر وشرک ہے؟

استعانت کی دو قسمیں ہیں۔ ایک استعانت ماتحت الاسباب یعنی ظاہری اسباب کے تحت کسی سے مدد مانگی جائے۔ یہ وُہ امداد ہے جو تمام انسانوں کو روزمرہ کی زندگی میں ایک دوسرے سے حاصل ہوتی ہے یہ جائز ہے اور ایاک نستعین میں اس استعانت کا حصر مقصود نہیں اور نہ ہی اس کی قرآن میں ممانعت ہے۔ دوسری استعانت مافوق الاسباب یعنی اسباب عادیہ کے بغیر کسی کو دُور و نزدیک سے غائبانہ پکارا جائے اور اس سے استمداد کی جائے۔ یہ استعانت اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے اور ماسوا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی سے جائز نہیں ہے[1]

حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں:-

یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ اللہ کے سوا کسی اور سے مدد چاہنا اس وقت حرام ہے جب کہ اعتماد اور بھروسہ اس پر ہو اور اس کو اللہ کی مدد کا مظہر نہ جانتا ہو۔ اگر توجہ و نظر اللہ پر ہو اور کسی کو محض اللہ کی اعانت کا مظہر جان کر عالم اسباب میں مدد مانگے تو نہ خلاف طریقت ہے اور نہ خلاف شریعت ـــــ انبیاء اور اولیاء نے بھی اس قسم کی مدد لی ہے۔

اور دوسرے مقام پر فرماتے ہیں:-

جس چیز سے مدد لی جاتی ہے اگر وُہ ایسی ہے کہ مومن وکافر میں سے کسی کو اس میں مستقل ہونے کا شبہ نہیں ہوتا۔ جیسے بھوک دُور کرنے کے لیئے غلہ اور نان سے مدد۔ پیاس بجھانے کے لیئے پانی اور شربتوں سے مدد۔ بیماری دُور کرنے کے لیئے دواؤں سے مدد اور معاشی امور میں سرکار سے مدد۔ یا اطباء اور ڈاکٹروں سے مدد۔ ان تمام میں کسی کو ان کے مستقل ہونے کا وہم بھی نہیں ہوتا۔ اس قسم کی استعانت بلا کراہت جائز ہے کیونکہ یہ حقیقت میں استعانت نہیں ہے محض ظاہری استعانت ہے۔

ہاں اگر استعانت کسی ایسی چیز سے کی جائے جس کا تاثیر میں مستقل ہونا مشرکین کے ذہنوں میں ہو، جیسے

---

[1] جواہر القرآن صفحہ ا

ارواح سے یا فلکی روحانیات سے مدد چاہنا یا چلنے پھرنے والی ارواح سے مدد طلب کرنا جیسے شیخ سدو؛ اس قسم کی استعانت بھی شرک ہے اور اسلام کے منافی ہے[1]

فیصلہ کُن بات

فیصلہ کُن بات یہ ہے کہ اسباب کے دائرے میں ایک دوسرے سے مدد لینا تعاون ہے اور جائز ہے اور عالمِ اسباب سے بالا میں مدد لینا اللہ کے سوا کسی سے جائز نہیں ہے لیکن اس کی چند صورتیں ذہن میں رکھیے ہر ایک کا حکم جُدا ہے۔

اوّل عالمِ اسباب سے بالا میں اللہ کے علاوہ کسی کو فاعل مستقل اور قادر بالذات سمجھ کر اس سے مدد مانگے اس کے شرک ہونے میں تو کسی کو شُبہ نہیں ہے۔

دوسری کہ اللہ کے سوا کسی کو قادر بالذات تو نہیں بلکہ قادر بعطائے الٰہی سمجھے اور یُوں خیال کرے کہ اس کو خدا تعالیٰ نے قدرت و اختیار عطا کیا ہے کہ امورِ اسباب سے بالا میں ان میں جس طرح چاہے تصرّف کرے جیسے بادشاہ اپنے وزراء، احکام کو کچھ اختیارات عطا کر دیتا ہے۔ اسی طرح معاذ اللہ خدا تعالیٰ نے بھی کچھ اختیارات اس کو دیدیے ہیں اور وُہ بعد عطائے الٰہی مستقل اور مختار ہے۔ مشرکین مکہ اپنے بزرگوں، ملائکہ اور جنات کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے تھے۔ قرآنِ حکیم میں اس عقیدے کو جا بجا باطل قرار دیا ہے یہ بھی شرک ہے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کو نہ تو مستقل بالذات سمجھے نہ مستقل بالعرض۔ لیکن معاملہ اس کے ساتھ خدا جیسا کرے مثلاً اس کو یا اس کی قبر کو سجدہ کرے یا اس کے نام کی نذر مانے۔ یہ بھی حرام اور شرک ہے۔ اس کا مرتکب حرام کا مرتکب ہے۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ غیرِ خدا جس سے مدد مانگی جارہی ہے اس کے مستقل ہونے کا ایہام ہوتا ہو جیسے روحانیات سے مدد مانگنا چاہے مانگنے والا ان کو مستقل بالذات نہ سمجھتا ہو لیکن مشرکین چونکہ ارواح کو مستقل سمجھ کر مدد مانگتے ہیں اس لیے ارواح سے مدد مانگنا بھی حرام ہے اور شرک ہے[2]

اسبابِ عادیہ اور اسبابِ شرعیہ

یاد رہے کہ اسبابِ شرعیہ کا بھی استعانت میں

---

[1] معارف القرآن م ا ص ۱۵ [2] معارف القرآن م ا

وُہ ہی حکم ہے جو اسباب عادیہ کا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ اسباب عادیہ کا اسباب ہونا عادت سے معلوم ہوتا ہے اور اسباب شرعیہ کا سبب ہونا شریعت سے معلوم ہوتا ہے۔ جیسے اسباب عادیہ سے استعانت جائز ہے ایسے ہی عالم اسباب میں اسباب شرعیہ سے بھی استعانت جائز ہے جیسے دُعا، رقیہ، صبر اور نماز کیونکہ ان کا اسباب ہونا شریعت اور نبوت کی راہ سے معلوم ہوتا ہے۔ لہٰذا جیسے اسباب عادیہ سے استعانت جائز ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے اسی طرف اشارہ فرمایا ہے۔

ہاں اگر کسی مقبول بندہ کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری کرے تو یہ جائز ہے کہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے[1]

اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ دُعا اسباب شرعیہ میں سے ہے اس لیے کسی مقبول بندے کو محض واسطہ رحمت الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر اس سے دُعا کی درخواست کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔

اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيْمَ ۝

اے اللہ تو ہمیں چلا سیدھے راستہ پر (جس میں کجی نہ ہو اور اونچ نیچ نہ ہو)

---

۸ ـــ بندہ جب جناب الٰہی میں یہ کہہ چکتا ہے کہ اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَ اِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ تو خود بخود یہ سوال اُبھر کر سامنے آتا ہے کہ مدد کیسے ہو؟ گویا حق سبحانہٗ بندے سے دریافت کرتا ہے کہ اے بندے میں تمہاری کیسے مدد کروں؟ بندہ اس کے جواب میں کہتا ہے کہ

اے اللہ تو ہمیں سیدھی راہ دکھا اور اس پر ہمیں چلا۔

اس سے معلوم ہوا کہ انسان اپنی عابدانہ زندگی میں اللہ کی مدد کے بغیر ایک قدم بھی نہیں چل سکتا۔ اس کی دو وجہ ہیں۔

ایک یہ کہ عابدانہ زندگی میں قدم قدم پر انسان کو نفس کے تقاضوں کے خلاف جنگ کرنا پڑتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ماحول کے جھمیلوں اور حالات کے گوناگوں چکروں میں عابدانہ زندگی کے لیے انسان کو ناحول اور حالات کا

---

[1] حاشیہ شیخ الہند صلا

مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔

ہدایت کے معنے

علامہ قرطبیؒ کہتے ہیں کہ ہدایت لغت میں ہٹانے اور جھکانے کو کہتے ہیں۔ ہدیہ کو ہدیہ اس لیے کہتے ہیں کہ وُہ ایک کی ملکیت سے ہٹ کر دوسرے کی ملکیت میں چلا جاتا ہے۔ آیت کے معنے یوں ہوں گے کہ خداوندا تو ہمارے دلوں کو صراطِ مستقیم پر جھکا دے اور دوسری راہوں سے ہٹا دے۔

لفظ ہدایت کی بہترین تشریح امام راغبؒ نے فرمائی ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ہدایت کے اصل معنے ہیں کسی شخص کی منزلِ مقصود کی طرف مہربانی کے ساتھ رہنمائی کرنا ——— اور ہدایت کرنا حقیقی معنے میں صرف اللہ تعالیٰ کا کام ہے جس کے مختلف درجات ہیں لے

حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ ہدایت کے مفہوم میں بتانا، دکھانا، چلانا، اسباب مہیا کرنا، دل میں ڈالنا سب داخل ہیں۔ لیکن ان میں باہم مراتب ہیں۔ بتانا اور چلانا اگر پہلا مرتبہ ہے تو اسباب کی فراہمی کرنا دوسرا مرتبہ ہے۔ صراطِ مستقیم معلوم ہو جانے اور اس پر لگ جانے کے بعد اس کی دل میں محبت پیدا کرنا، اسے چاہتوں کا مرکز بنانا اور دوسری تمام راہوں کے مقابلے میں اسے پسندیدہ بنانا اللہ کی جانب سے وُہ ہدایات ہیں جن کا بندہ قدم قدم پر محتاج ہوتا ہے۔ ان ہی ہدایات کے ذریعے بندہ فلاح و سعادت سے ہمدوش ہوتا ہے۔

یہ اللہ سبحانہٗ کی ہدایت ہی ہے جو ہم میں اجمالی اور تفصیلی حق شناسی کے وسائل مہیا کرتی ہے جن کے ذریعے ہم اخلاق، معاملات، عقائد اور سیاسیات میں اللہ سبحانہٗ کی رہنمائی کے مطابق سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔ اور بالآخر علم و عمل کی اس سرگرمی و سرشاری کو وُہ مقام نصیب ہوتا ہے جس کی طرف قرآن میں اشارہ ہے۔

أُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ۔

یہی لوگ اپنے مولا کی جانب سے ہدایت پر ہیں۔

اس آیت میں صرف ہدایت کی عظمت نہیں بتائی گئی ہے بلکہ ہدایت کی قسموں کی طرف بلیغ اشارہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہاں اقسامِ ہدایت میں وُہ قسمیں مراد نہیں ہیں جن کا تعلق ہمارے وجدان، حواس و مشاعر اور قوتِ ادراک و عقل سے ہے۔ کیونکہ یہ ہدایات تکوینی ہیں۔ آیت میں تشریعی ہدایات مراد ہیں۔

لے معارف القرآن م ش ص۳۱

تشریعی ہدایات کیا ہیں؟

چونکہ ہدایت کے معنے بتانے اور دکھانے کے ہیں لیکن راہ معلوم ہو جانے کے بعد راستہ کا علم نہ تو انسان کو راستہ پر چلاتا ہے اور نہ راستہ میں بھٹکنے سے بچاتا ہے۔ نہ منزل پر پہنچاتا ہے اور نہ راستہ پر چلتے رہنے کی ہمیشہ کے لیے کوئی ضمانت دیتا ہے۔ اس لیے راستہ پر چلنے، راستہ میں محفوظ رہنے، منزل پر پہنچنے اور اسی پر ہمیشہ چلتے رہنے کے لیے ان گنت ہدایات کی ضرورت ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:۔

حق شناسی کے بعد حق کی پیروی کا ارادہ رونما کرنا، ارادے کو عزم بنانا، عزم کو عمل کا جامہ پہنانے کے لیے حالات کو سازگار کرنا اور پھر اس پر ثابت قدم رکھنا اللہ کی ہدایت ہے

اس سے یہ بات بالکل صاف اور واضح ہو کر سامنے آگئی کہ انسان کو ہدایت کی ضرورت صرف راہ شناسی کے لیے نہیں ہے بلکہ راہ شناسی کے بعد اس پر چلنے، راہ سے نہ بھٹکنے اور اسی پر تادم زیست چل کر منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے ہے۔ اور انسان کی یہ ضرورت تمام ضرورتوں سے بالا ہے۔ لوگوں کی یہ سوچ بالکل بے وزن اور مہمل ہے کہ ہدایت یافتہ ہو کر ہم خود ہدایت کے طلبگار کیوں؟ شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے ہیں:۔

مراتب ہدایت بہت ہیں اس لیے کوئی شخص بھی کسی وقت ہدایت سے بے نیاز نہیں ہو سکتا۔[1]

ہدایت ایسی چیز ہے جو سب کو حاصل بھی ہے اور اس کے مزید درجاتِ عالیہ حاصل کرنے کے لیے کسی بڑے سے بڑے انسان کو استغنا نہیں ہے اسی لیے سورۂ فاتحہ کی اہم ترین دعا میں ہدایت کو مانگا ہے جو ایک ادنیٰ مومن کے بھی مناسبِ حال ہے اور بڑے سے بڑے رسول اور ولی کے لیے بھی اتنی ہی اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی آخری عمر میں جب سورۂ فتح نازل ہوئی تو فتح مکہ کے فوائد بتلاتے ہوئے یہ بھی ارشاد ہوا کہ

وَيَهْدِيَكَ صِرَاطًا مُّسْتَقِيمًا

اور دکھائے گا تجھے سیدھی راہ

ظاہر ہے کہ سید الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم پہلے سے نہ صرف ہدایت یافتہ بلکہ دوسروں کے لیے مجسم ہدایت تھے۔ اس لیے اس موقع پر آپ کو صراطِ مستقیم کی ہدایت دینے کے اس کے سوا کوئی معنے نہیں کہ ہدایت کا

---

[1] تفسیر عزیزی

کوئی نسبت اعلیٰ مقام آپ کو اس وقت حاصل ہوا؟[1]

چونکہ روحانی ترقیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے اس لیے جو جس مرتبہ پر ہے اس کی دعا اس سے بھی بلند تر درجہ کی ہوتی ہے اور مومن کی ہوس ہدایت طلبی کبھی نہیں بجھتی۔ یہ اعتراض محض طفلانہ ہے کہ ہدایت یاب کو ہدایت کے لیے درخواست کی ضرورت نہیں ہے۔[2]

۹ — ابھی بات پوری نہیں ہوئی۔ یہ بھی معلوم کر لیجئے کہ مانگنے والا کیا مانگ رہا ہے؟ مانگنے والا صراطِ مستقیم کی درخواست پیش کر رہا ہے۔

صراطِ مستقیم کیا ہے؟ یعنی زندگی کے ہر شعبے میں خیال اور عمل اور برتاؤ کا وہ طریقہ جس میں بتا چلے بالکل صحیح ہو جس میں غلط بینی، غلط کاری اور بدانجامی کا خطرہ نہ ہو جس پر چل کر ہم سچی فلاح و سعادت حاصل کر سکیں۔[3]

لغت میں صراط سیدھے اور آسان راستہ کو کہتے ہیں۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:۔

صراط اصل میں اس راستہ کو کہتے ہیں جس میں پانچ باتیں ہوں۔ ایک سیدھا ہو۔ دوسرے منزل تک جاتا ہو تیسرے سب سے قریب ہو۔ چوتھے کشادہ ہو۔ پانچویں مقصد تک پہنچنے کے لیے اس کے سوا راستہ کوئی نہ ہو۔[4]

صراطِ مستقیم

مستقیم استقامت سے بنا ہے اس کے معنے ٹھیک اور سیدھا ہونا ہیں پس صراطِ مستقیم ایسا راستہ جو ٹھیک ہو سیدھا ہو، جس میں اعتدال ہو، افراط و تفریط نہ ہو، زندگی کے تمام گوشوں میں کام آنے والا ہو، فرد اور جماعت دونوں کے حق میں صلاح اور فلاح کی ضمانت دیتا ہو۔ اس میں کجی نہ ہو اور کوئی اونچ نیچ نہ ہو زندگی کے ہر موقعہ پر اور ہر گوشہ کے لیے رہنما ہو۔ منزل تک پہنچانے والا ہو، کشادہ ہو، مقصد تک جانے کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو۔

چنانچہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے جب صراطِ مستقیم کی اس تفسیر پر نظر ڈالی جائے جو خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے:۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی سے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا یوں سمجھو کہ یہ لکیر اللہ کا ٹھہرایا ہوا راستہ ہے بالکل سیدھا۔ اس کے بعد اس لکیر کے دونوں طرف ترچھی

---

[1] معارف القرآن ج ۱ ص ۱۳ [2] تفسیر ماجدی ص ۷ [3] تفہیم القرآن ص ۴۰ [4] معارف القرآن ج ۱ ص ۱۲

لکیریں کھینچ دیں۔ اور فرمایا کہ یہ طرح طرح کے راستے ہیں جو بنائے گئے ہیں۔ اور ان میں کوئی راستہ نہیں جس کی طرف بلانے کے لیئے ایک شیطان موجود نہ ہو۔ پھر یہ آیت تلاوت فرمائی۔ وَاَنَّ هٰذَا صِرَاطِی مُسْتَقِیْمًا[1]

واقعہ یہ ہے کہ نبوت کی تعلیمات کو ظاہر کرنے کے لیئے صراطِ مستقیم سے بہتر کوئی تعبیر نہیں ہو سکتی۔ نبوت کی راہ کا سیدھا ہونا اور انسانوں کی بنائی ہوئی راہوں کا ٹیڑھا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر شخص بلاتکلف معلوم کرے سکتا ہے۔ نبوت اگر انسان کی ہدایت کے لیئے ضروری ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی ہدایات بھی صاف اور واضح ہوں۔ اس میں گھنگ نہ ہو، نا قابلِ حل معمہ نہ ہو، اعتقاد میں سہل اور عمل میں آسان ہو

گویا یہ ہے وُہ درخواست جو بندہ اپنے خدا کے حضور پیش کرتا ہے اور اس کی گذارش یہ ہے کہ آپ ہماری رہنمائی فرمائیں اور ہمیں بتائیں کہ قیاسی فلسفوں کی اس بھول بھلیوں میں حقیقت کیا ہے۔ اخلاق کے ان مختلف نظریات میں صیح نظامِ اخلاق کون سا ہے۔ زندگی کی ان بے شمار پگڈنڈیوں کے درمیان فکر و عمل کی صاف اور سیدھی شاہراہ کون سی ہے۔

مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ مطلب و مقصود صراطِ مستقیم تشریعی ہے نہ کہ تکوینی جو ساری مخلوق کے لیئے خود بخود عام ہے۔[2]

چونکہ دُنیا میں صراطِ مستقیم کا پہچاننا ہی سب سے بڑا علم اور بڑی کامیابی ہے اور اسی کی پہچان میں غلطی ہونے سے اقوامِ عالم تباہ ہوتی ہیں۔ ورنہ خدا طلبی اور اس کے مجاہدات کی تو کافروں میں بھی کمی نہیں۔ اس لیئے قرآن نے صراطِ مستقیم کو پوری وضاحت کے ساتھ ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں سے واضح فرمایا ہے[3]

صِرَاطَ الَّذِیْنَ اَنْعَمْتَ عَلَیْهِمْ ۵

ان لوگوں کی راہ جن پر تو نے انعام فرمایا ہے (یعنی جن پر ہمیشہ سے تیرے منظورِ نظر لوگ چلتے رہے ہیں)

۱ــــ یہ صراطِ مستقیم کا وُہ چہرہ ہے جو خود قرآن نے پیش کیا ہے یعنی صراطِ مستقیم انعام یافتہ

---

[1] ترجمان القرآن ص۱۹۱ [2] معارف القرآن م ش ص۲۵

انسانوں کا راستہ ہے۔

یہ انعام یافتہ کون ہیں؟

جن پر انعام کیا گیا وُہ چار فرقے ہیں۔ نبیین، صدیقین، شہدار، صالحین۔ کلام اللہ میں دوسرے موقع پر اس کی تصریح ہے[1]

مَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰٓئِكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَآءِ وَالصّٰلِحِيْنَ وَحَسُنَ اُولٰٓئِكَ رَفِيْقًا۔

جو کوئی حکم مانے گا اللہ اور اس کے رسول کا تو بلاشبہ وُہ ان لوگوں کے ساتھ ہوگا۔ جن پر خُدا نے انعام کیا ہے یعنی انبیار، صدیقین، شہدار اور صالحین کے ساتھ۔ اور اس کو ایسے لوگوں کا ساتھ مل جائے تو ایسے ساتھی کیا اچھے ساتھی ہیں۔

اس آیت میں انبیار، صدیقین، شہدار اور صالحین کا ذکر کیا گیا ہے اور ان کو انعام یافتہ قرار دیا ہے ان پر اللہ سبحانہٗ نے کیا انعام فرمایا ہے؟

علم وعمل کی نعمتیں

ظاہر ہے کہ یہاں انعام سے وُہ عارضی اور نمائشی انعامات مراد نہیں جو پہلے بھی فرعونوں، نمرودوں اور قارونوں کو ملتے رہے ہیں اور اب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے ظالموں اور بدکاروں اور گمراہوں کو مل رہے ہیں۔ نعمت دراصل اس حالت کو کہتے ہیں جس میں دل خوشی محسوس کرے۔ ان کو اللہ نے دو قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے ایک علم اور دوسرا عمل۔ اسی لیے یہاں چار طبقوں کا ذکر کیا گیا ہے۔ دو طبقے یعنی انبیار اور صدیقین علم کا اور شہدار و صالحین عمل کا کامل نمونہ ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتویؒ فرماتے ہیں۔

دونوں میں ایک باریک سا فرق ہے جیسے انبیار کی حیثیت علم میں فاعل اور منبع کی ہے صدیقین کا مقام مفعول اور مجمع کا ہے۔ ایسے ہی شہدار کی حیثیت عمل میں فاعل کی اور صالحین کا درجہ مفعول اور مجمع کا

---

[1] حاشیہ مولانا عثمانیؒ

ہے۔[۱]

بہرحال انبیاء و صدیقین علم کا اور شہداء و صالحین عمل کا نمونہ ہیں۔ قرآن نے علم و عمل کے اسی مجموعہ کو نعمت قرار دیا ہے اور اس کے حامل بزرگوں کے راستہ کو صراطِ مستقیم بتایا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن تمام انبیاء کی ہدایات کا مجموعہ دیا گیا ہے اس لیئے آپ کمالِ علم اور کمالِ عمل لے کر تشریف لاتے ہیں۔ آپ کے کمالِ علم اور آپ کے کمالِ عمل کا مجموعہ ہی صراطِ مستقیم ہے۔ اسی بناء پر صراطِ مستقیم کی تفسیر میں کچھ علمائے صحابہ نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نامی پیش فرمایا ہے اور حضور علیہ السلام کی ذاتِ گرامی کو صراطِ مستقیم کا مصداق قرار دیا ہے۔ اور چونکہ آپ کی دعوتِ اسلام اسی کمالِ علم اور کمالِ عمل کے مجموعہ کا نام ہے اس لیئے کچھ علماء نے صراطِ مستقیم سے اسلام مراد لیا ہے۔ اور پھر چونکہ اس مجموعۂ علم و عمل کی تشکیل سیاسی حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کے ذریعے ہوئی ہے اس لیئے کچھ بزرگوں نے صراطِ مستقیم حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کو بتایا ہے۔ اور جن کی نظر اس مجموعۂ علم و عمل میں سے صرف علم پر تھی انہوں نے صراطِ مستقیم کا مصداق قرآن کو قرار دیا ہے۔ ان میں باہم کوئی تعارض نہیں ہے مقصد ایک ہے عنوان مختلف ہیں۔

فضل و رحمت

یہ بات بھی پیشِ نظر رہے کہ قرآن نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ علم اور کمالِ عمل کو رحمت اور فضل سے تعبیر کیا ہے۔

إِلَّا رَحْمَةً مِّن رَّبِّكَ وَكَانَ فَضْلُهُ عَلَيْكَ كَبِيرًا۔

مگر مہربانی تیرے مالک کی جانب سے اور اس کی بخشش تجھ پر بڑی ہے۔

فضل کہتے ہیں ان خوبیوں کو جو انسان کی ذات میں ایسا جلا پیدا کریں جس سے دوسرے متاثر ہو سکیں اور رحمت نام ہے اس شرف کا جو آدمی کو بغیر محنت خود بخود حاصل ہو جائے۔ نبوت کا علم سرتاسر رحمت ہے کیونکہ وہبی ہے اور عمل اللہ کا فضل ہے کیونکہ محنت اور مشقت کے ذریعے عطا ہوا ہے۔ اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ علمِ وحی اور کتاب کا آنا اگر اللہ سبحانہٗ کی رحمت ہے تو اسی کے نتیجے میں آپ کی محنتوں، مشقتوں کے ذریعے آپ کے دامن میں عمل کا ظہور صرف اللہ کا فضل نہیں فضلِ کبیر ہے۔ آپ کے علم میں اگر شانِ اعجاز ہے تو آپ کے عمل میں شانِ تعبد ہے۔ علم اگر پڑھنے کی چیز قرآن ہے تو عمل برتنے کی چیز سنت ہے۔

---

۱ قبلہ نما

قرآن نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مقاصد بعثت میں سب سے اہم اور بنیادی مقصد ہی یہ بتایا ہے کہ آپ لوگوں کو اللہ سبحانہٗ کی جانب سے لائے ہوئے علم و عمل کی تعلیم دینے آئے ہیں۔ قرآن میں یہ بات بہ تکرار کہی گئی ہے

يُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

کتاب سے مراد اگر علم نبوت ہے تو حکمت سے مقصد عمل نبوت ہے۔ آپ کے علم و عمل یعنی اللہ کی رحمت اور فضل ہی پر قرآن میں خوشیاں منانے کا حکم ہے۔

قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا۔

کہہ دو کہ یہ اللہ کے فضل اور اس کی رحمت سے ہے بس اس پر خوشی منانی چاہیے۔

اِسلام میں دو عیدیں

اسلام میں دو عیدیں قرآن کے اسی مطالبے کو پورا کرنے کا عملی شاہکار ہیں۔ ایک نبوت کے کمالِ علم اور دوسری نبوت ہی کے کمالِ عمل کی یادگار میں منائی جاتی ہے۔

علم و عمل میں رشتہ

آیئے قرآن ہی کی روشنی میں نبوت کے لائے ہوئے اس علم و عمل کا باہم رشتہ بھی معلوم کیجیے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ نبوت کا لایا ہوا کمال علم اگر ما انزل الله عليك اللہ کا اُتارا ہوا ہے تو نبوت ہی کا کمالِ عمل ان علم کا پرتو اور نقش ما اراك الله اللہ کا دکھایا ہوا اور بتایا ہوا ہے۔ اس لیے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا۔ ان میں باہم اگر کچھ فرق ہے تو صرف نامہ اور پیام کا ہے۔ علم نبوت اگر نامۂ خداوندی ہے تو عملِ نبوت پیامِ خدا ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نبوت محمدیہ اسلام کے نام پر جو سرمایہ لے کر آئی ہے وُہ سب اللہ کی جانب سے ہے۔ اور دونوں اُمت کو بطریقِ تواتر ملے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ علم نبوت کا تواتر کتابی ہے اور عملِ نبوت کا تواتر عملی ہے۔ اسلام میں جیسے علم نبوت کے لیے قراء سبعہ کی روایات ہیں ایسے ہی عملِ نبوت کے لیے محدثین کی روایات ہیں۔ نہ تو قرآن کا قرآن ہونا روایات قراء پر موقوف ہے اور نہ سنت کا عملِ نبوت ہونا محدثین پر منحصر ہے وُہ تاریخ علم نبوت ہے اور یہ تاریخ عملِ نبوت

برہانِ علم اور برہانِ عمل

برہانِ علم کو انسانیت میں اُجاگر کرنے کے لیے علم کا نزول حوادث و واقعات کے تحت بتدریج ۲۳

سال کے عرصہ میں ہوا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ سینۂ قرآن سے اُبلی ہوتی صدا یہی ہے۔

لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ الْقُرْاٰنُ جُمْلَةً وَّاحِدَةً ۚ كَذٰلِكَ ۚ لِنُثَبِّتَ بِهٖ فُؤَادَكَ ۔

کیوں نہیں اُترا اس پر سارا قرآن یکبارگی۔ اسی طرح ہم نے اُتارا تاکہ جمائے رکھیں اس سے تیرے دل کو۔

تو پھر اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ نبوت کے کمالِ علم کا ظہور اس لیئے آہستہ آہستہ ہوا ہے کہ اعمال و مظاہر کی تشکیل ساتھ ساتھ ہو کر علم کے حقائق دل میں پُوری طرح جم جائیں۔

جب علم کے ہر گوشہ کی پُشت پر ایک مقررہ نظامِ عمل کے مظاہر موجود ہوں تو قدرتی طور ہر شخص کو اس سے متمتع ہونے کا موقعہ مِل سکتا ہے۔ اور ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے کہ علم کے ساتھ عمل یا رحمت کے ساتھ فضل کی کارفرمائیاں کام کر رہی ہیں۔ چنانچہ وُہ تمام اعمالِ نبوت۔ جن میں مقامِ نبوت کے افادہ و فیضان اور زینت و جمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ درحقیقت اسی استدلال پر مبنی ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ صرف نظریاتی طاقت سے دُنیا میں اس وقت تک کوئی مؤثر تبدیلی نہیں آسکتی جب تک نظریات کی پُشت پر عمل و کردار کی قوت نہ ہو۔ دُنیا میں کوئی اصول و نظریہ، کوئی دعوت اور دعوٰی عمل میں آئے بغیر کوئی محسوس حقیقت نہیں بنتا۔ علم کے ساتھ عمل کا نمونہ ہی قوت کا ایسا سرچشمہ ہے جس کے ذریعے تاریخ میں عظیم انقلابات آئے ہیں۔ اگر صرف نظریات میں افادی طاقت ہوتی تو کتاب کے ساتھ نبی کی شخصیت نہ ہوتی۔ اور اگر محض عمل ہی میں اصلاح کی ضمانت ہوتی تو نبوت کے ساتھ علم کا نام و نشان نہ ہوتا۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ علم بغیر عمل کے اور عمل بغیر علم کے یا نظریہ بغیر واقعہ کے اور واقعہ بغیر نظریہ کے اصلاح کی راہ میں ادھوری اور نامکمل ہدایت ہے۔ ہدایت کی جامعیت کے لیئے ضروری ہے کہ علم و عمل کی دونوں قوتیں کارفرما ہوں۔

جیسے علم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بھرپور صداقت ہو ایسے ہی عمل کی سب سے اُونچائی یہ ہے کہ اس میں حُسن ہی حُسن ہو۔ اسی بنا پر قرآن میں علمِ نبوت کے لیئے صداقت اور عملِ نبوت کے لیئے حُسن کی تعبیر آئی ہے۔ کیونکہ نبوت کا حُسن و جمال افادہ و فیضان ہے نبوت صرف بناتی اور سنوارتی نہیں بلکہ اس طرح بناتی اور سنوارتی ہے کہ اس کے عمل کی ہر کروٹ میں حُسن کی جلوہ آرائی اور اس کے ہر گوشہ میں نظر افروزی کا سامان ہوتا ہے۔ وُہ خود حسین ہے دوسروں کے لیئے حُسن کار ہے۔ عملِ نبوت کے ایک ایک گوشہ کو دیکھو

یا اس کے مجموعہ پر نظر ڈالو۔ اس کی زندگی کا کوئی موڑ بھی ایسا نہیں ہے جہاں حُسن و جمال بے نقاب نہ ہو۔ عبادت کا نظام اور اس کا اہتمام، تقویٰ اور خشیتِ الٰہی کا چہرۂ خنداں، استقامت و عزیمت کا جلوہ، تواضع و احتسابِ نفس کی پہنائی، شوقِ آخرت اور لقائے الٰہی کا سماں، جذبۂ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا منظر، دُعاء و مناجات الٰہی کا زمزمہ، اخلاق کی رعنائی اور عبدیت کی عطر بیزی، تلاوتِ قرآن کی نغمہ بجی، علم و عرفان کی بوقلمونی۔ غرضیکہ نبوت کی ذات اپنے کردار، اخلاق و احوال میں حُسن کی نمائش گاہ ہوتی ہے اس لئے عملِ نبوت کے لیے قرآن میں حُسن کی تعبیر ایک واقعی اور سچی تعبیر ہے۔

گویا نبوّت نے دُنیا کو جو کچھ دیا ہے۔ وُہ سچے علمی حقائق اور اچھے عملی نظام کے سوا کچھ نہیں ہے اور کیوں نہ ہو جب یہ حقیقت ہے کہ نبوّت نام ہے اللہ تعالیٰ کی نمائندگی کا۔ اللہ کی ذات اگر جامع الکمالات ہے تو ضروری ہے کہ جو جامع الکمالات کا نمائندہ ہو وُہ بھی مجمع الکمالات ہو۔

کمالِ علمی کی حد تک اگر قرآن حکیم ایک جامع کتاب ہے تو قرآن کے نقش کو بھی مجمع ہونا چاہیئے تاکہ نمونہ کو مکمل نمونہ اور عمل کو نقشِ قرآن کہا جا سکے۔ بہرحال اسی کمالِ علم اور کمالِ عمل کے مجموعہ کو قرآن میں نعمت کہا گیا ہے اور جن کو یہ نعمت ملی ہے ان کی راہ کو صراطِ مستقیم بتایا ہے۔ اب یہ آپ کے صوابدید پر موقوف ہے کہ آپ اسے اللہ کا دین کہیں، اسلام کہیں، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہیں، کتاب اللہ کہیں، یا آخر حضرت ابوبکرؓ و حضرت عمرؓ کہیں۔ جو کچھ بھی کہیں درست ہے۔

لیکن اتنی بات ضرور یاد رکھیں کہ علم و عمل کو خود صراطِ مستقیم نہیں کہا گیا ہے بلکہ علم و عمل والے بزرگوں انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی راہ کو صراطِ مستقیم بتایا ہے۔

ان کی راہ صرف علم و عمل کو مان لینا اور اپنی ذات کی حد تک اپنانا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ان کا بنیادی کام علم و عمل کی اس نعمت کو دوسروں تک پہنچانا اور دُنیا کو اس کی دعوت دینا ہے۔ اس کو تمام نبیوں کی بعثت کا مقصد اور مشن قرار دیا ہے۔ اس میں وُہ کامیابی اور ناکامی کے نتائج سے بے پروا ہو کر زندگی بھر لگے رہنے پر مامور تھے۔

اس کام کو تمام نبیوں نے قاطبۃً امیروں میں، غریبوں میں، دُکانداروں میں، دستکاروں میں، کاشتکاروں میں، زمینداروں میں، مزدوروں میں، کارخانہ داروں میں، نوکروں میں، آقاؤں میں، شوہروں میں، بیویوں میں، اولاد میں، والدین میں، شاگردوں میں، استادوں میں، گھر باہر ہر جگہ کیا ہے۔ اور اس میں جان کھپائی ہے، عزت کو تج کیا ہے، مال لٹایا ہے، رشتہ داروں کو چھوڑا ہے، وطن کو خیرباد کہا ہے۔

امام غزالیؒ فرماتے ہیں دین کا یہ مدار اعظم ہے یہی وُہ مہم ہے جس کے لیے تمام انبیاء روانہ کئے گئے۔ اگر اس کی بساط اُلٹ دی جائے اور اس کے علم و عمل کو چھوڑ دیا جائے تو کارِ نبوت معطل ہو کر رہ جائے۔ دین کی

چولیں ہل جائیں اور اللہ کے بندے تباہ ہو جائیں۔

یہی وُہ اصلِ عظیم ہے جو قرآنی دعوت کی اولین بنیاد ہے وُہ اُمت کو جو کچھ بتلانا چاہتا ہے اس کا دارو مدار اسی پر ہے۔

قرآن میں انبیاء کے واقعات اور ان کی قوموں کے قصص کی روح یہی ہے اگر اس اصل سے نظر ہٹالی جائے تو قرآنی دعوت کا سارا کارخانہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے لیکن دُنیا کی ساری عجیب باتوں میں سب سے زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ قرآن نے جس قدر اس پر زور دیا ہے اسی قدر دُنیا نے اس سے بے رُخی اختیار کی حتیٰ کہ اب کہا جاسکتا ہے کہ آج کوئی بات بھی دُنیا کی نظروں سے اس قدر اوجھل نہیں جس قدر انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین کی یہ صراطِ مستقیم ہے۔

آپ غور کریں اگر صرف ذاتی اور انفرادی اصلاح ہی صراطِ مستقیم ہے یا اگر صرف نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو ماننا اور اس پر ذاتی طور پر عمل پیرا ہونا ان بزرگوں کی صراطِ مستقیم ہے تو پھر چہرہ نبوت کو دیکھنے والے مسلمان کس مقصد کی خاطر وطن سے بے وطن ہوئے، اپنے کاروبار کو نقصان پہنچایا، اپنا عمر بھر کا اندوختہ لُٹایا، اپنی جمی ہوئی تجارتوں پر پانی پھیرا، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کیا، اپنے عیش و تنعم کو خیرباد کہا، دُنیا کی تمام کامیابیوں اور خوشحالیوں سے آنکھیں بند کرلیں، پانی کی طرح اپنا خون بہایا، اپنے بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ کیا۔ اگر صرف ذاتی علم و عمل ہی کا نام صراطِ مستقیم ہے تو اس ہنگامہ آرائی اور اس محشر خیزی کی کیا ضرورت تھی۔ اس کے حصول کا راستہ تو بالکل بے خطر اور آسان تھا۔ یہ تو مدینے میں مسجد نبوی کے زیرِ سایہ اور مکہ میں بیت اللہ کی ہمسائگی میں اچھی طرح آرام سے مل سکتی تھی کیونکہ وہاں کی ایک نیکی پچاس ہزار اور ایک لاکھ نیکیوں کے ہم وزن ہے۔

اس بناء پر یہ کہنا بہت بڑی خوش فہمی ہے کہ ان بزرگوں کے علم و عمل کو صرف ماننا اور اپنانا ہی صراطِ مستقیم ہے۔ صراطِ مستقیم دراصل نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو ماننا، اپنانا اور سماجی زندگی میں اسے پھیلانے اور نافذ کرنے کے لیے محنت کرنا ان بزرگوں کی وُہ راہ ہے جس کی ہر نمازی نماز کی ہر رکعت میں اللہ سے درخواست کرتا ہے ——— خداوندا مجھے علم و عمل نبوت کو جیسے تونے ماننے کی اور ماننے کے بعد ذاتی طور پر اپنانے کی توفیق دی ہے ایسے ہی نبوت کے علم و عمل کی خاطر جان کھپانے جان لگانے اور قربانیاں کرنے کی نبیوں والی راہ بتا دے۔ اور ہمیں بھی ان کی طرح قربانیاں کرنے والا بنا دے

غَيْرِ الْمَغْضُوبِ عَلَيْهِمْ وَلَا الضَّآلِّينَ ۝

جو تیرے حضور میں معتوب[11] نہیں ہوئے اور گم کردہ[12] راہ نہیں ہیں ۔

۱۱ ـــ غیر المغضوب الخ الَّذِينَ کا بدل ہے یا اس کی صفت ہے اس لیے اس کے مناسب ترجمہ کیا گیا ہے ۔ بعض تراجم دہلویہ میں جو اس کا ترجمہ کیا ہے خلاف ترکیب و خلاف مقصود ہے[1] مطلب یہ ہے کہ یہ فقرہ الذین انعمت علیھم کی صفت یا بدل ہے صراط کا مضاف الیہ نہیں ہے ۔ صفت ہونے کی صورت میں معنے یہ ہیں ۔ ان انعام یافتہ لوگوں کی راہ جن پر نہ اللہ کا غضب ہوا اور نہ وُہ گمراہ ہیں ۔ اور مضاف الیہ ہونے کی صورت میں معنے یہ ہیں کہ ان لوگوں کا راستہ نہیں جن پر تیرا غضب ہوا اور نہ ان کا جو بھٹکے ہوئے ہوں ۔ پہلے معنے عربی زبان کے قواعد کے اعتبار سے زیادہ صحیح اور مقصود سے ہم آہنگ ہیں ۔ دوسرے معنے نہ قوانین زبان کے لحاظ سے صحیح اور نہ مقصود سے ہم آہنگ ہیں ۔

غضب لغت میں سخت ہونے کو کہتے ہیں ۔ سخت چٹان کو غضبة ۔ سخت زہر والے سانپ کو غضوب کہتے ہیں ۔ اسی سے غصہ کو غضب اور غصہ والے کو غضبان کہتے ہیں ۔

غضب ایک اضافی کیفیت ہے اپنے اپنے حالات کے مطابق ہر ایک میں غضب کی کیفیت جُدا ہے ظاہر ہے چٹان میں جو غضب ہے وُہ سانپ میں نہیں اور سانپ میں جو غضب ہے وُہ انسان میں نہیں ہوتا ہے ۔

اللہ سبحانہٗ کی ذات احساسات سے بالا و بالاتر ہے جیسے ہماری عقلیں اس کی ذات کے ادراک سے عاجز ہیں ایسے ہی اس کی صفت غضب کو بھی ہم نہیں سمجھ سکتے ۔ اس موضوع پر ہماری ہر تعبیر میں خود ہمارے محسوسات کی جھلک آجائے گی ۔ قاضی بیضاویؒ کا یہ کہنا دماغی سکون کے متلاشیوں کے لیے بالکل بجا ہے کہ ایسے مواقع پر ہم بات کو ذہن سے قریب کرنے کے لیے کہہ سکتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ کی صفات میں صرف نتائج ہوتے ہیں وُہ مبادی نہیں ہوتے جن سے مخلوق دوچار ہوتی ہے لیکن دل کے اطمینان کے لیے وُہ ہی بات اچھی ہے جو علامہ محمود آلوسیؒ نے سلف و ائمت کی طرف نسبت کرکے لکھی ہے کہ یہاں غضب کا ترجمہ

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ

مگر جناب باری میں اس کی حقیقت کا پتہ نہیں ہے اُس کا غضب ذاتِ قدوس کے جلال کے مطابق ہوگا جیسے بھی اس کی شانِ عظمت وجلال کا تقاضا ہو۔

۱۲ــــ ضَالِّيْنَ جمع ضَالّ کی ہے ضلالة سے بنا ہے۔ عربی زبان میں لفظ ضلالت ایک سے زیادہ معانی پر بولا جاتا ہے۔ علامہ جمال قریشی فرماتے ہیں:۔

ضلال کے معنے ضائع ہونا، گم ہونا اور مغلوب ہونا ہے عربی میں دودھ میں اگر اتنا پانی ملا دیا جائے کہ دُودھ میں اس کا اثر نمایاں نہ ہو تو بولا جاتا ہے ضَلَّ الماء فی اللبن گویا پانی مغلوب ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی طرف ضلالت کی نسبت اسی معنے میں کی تھی۔ اِنَّ اَبَانَا لَفِیْ ضَلٰلٍ مُّبِیْنٍ۔ یعنی ہمارے ابا تو یوسف اور اس کے بھائی کی محبت میں مغلوب ہیں۔ اور یہی مطلب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے اس ارشاد کا فَعَلْتُهَآ اِذًا وَّاَنَا مِنَ الضَّآلِّيْنَ۔ یعنی میں نے یہ کام اس وقت کیا تھا جب میں عصبیت میں مغلوب تھا۔ اور ضلال رشاد کی بھی ضد ہے۔

امام راغب اصفہانیؒ لکھتے ہیں:۔

ضلال کے معنے راہِ راست سے ہٹ جانے کے ہیں۔ ہدایت اور ضلالت ایک دوسرے کی ضد ہیں۔

ماحصل جب نبوت اللہ سبحانہ کی جانب سے علم وعمل کی صورت میں ہدایت لے کر آتی ہے اس کے سامنے تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔

کچھ اس سے واقف ہوتے ہیں اور کچھ ناواقف۔ واقف کاروں میں دو قسم کی طبیعتیں ہوتی ہیں۔ کچھ طبیعتیں چوکنی اور حِس ہوتی ہیں اور عمل کی سرشاریوں سے بہرہ ور ہوتی ہیں۔ اور کچھ طبیعتیں سرکش ہوتی ہیں جاننے اور ماننے کے باوجود عمل کی محرومیاں ان کی زندگی کا نشان بن جاتی ہیں اور صرف محرومی ہی نہیں بلکہ اس سے آگے ان میں علم وعمل سے ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہوجاتی ہے اور ارباب علم اصحاب عمل کی اپوزیشن بن جاتے ہیں۔

قرآن حکیم علم نافع اور عمل صالح کی سرشاریاں رکھنے والوں کو انعام یافتہ قرار دیتا ہے اور علم رکھتے ہوئے عملی زندگی میں باغیانہ میلانات رکھنے والوں کو مغضوب بتاتا ہے اور علم سے بے بہرہ لوگوں کو قرآن کی زبان میں ضالین کہا جاتا ہے۔ گویا جیسے زندگی میں نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل سے رشتوں کی مضبوطی انعام یافتہ گروہ کی نشانی ہے اور جیسے نبوت کے علم وعمل کو مانتے ہوئے زندگی میں انکار وسرکشی، بے رُخی اور اجنبیت مغضوبیت

کی علامت ہے ایسے ہی نبوت کے لائے ہوئے علم سے بے خبری اور ناواقفیت ضلالت کی راہ ہے بالفاظ دیگر نبی کی اُمت کا علم نبوت سے رشتہ ٹوٹ جاتا اگر ضلالت ہے تو عملِ نبوت سے زندگی میں بے رُخی غضب الہٰی کو دعوت دینا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:۔

مغضوب وہ لوگ ہیں جن کے ارادوں میں فساد ہو، حق شناس ہونے کے باوجود اس سے رُوگرداں ہو گئے ہوں۔ اور ضالّین وہ ہیں جو راستہ ہی سے بے خبر اور ناواقف ہونے کی وجہ سے سرگرداں و حیراں ہیں۔

علامہ رشید رضاؒ فرماتے ہیں:۔

غیر المغضوب الخ الذین انعمت کی صفت ہے یعنی انعام یافتہ لوگ ایسے ہونے چاہئیں جو غضب الہٰی اور ضلالت کا شکار نہ ہوں۔ اللہ کا غضب ان پر ہوتا ہے جو حق سے حق آشنائی کے بعد رُوگرداں ہو جائیں۔ اور جو اللہ کی نعمتوں سے مالا مال ہو کر اُسے چھوڑ دیں۔ اس کا سبب چاہے کچھ ہو ——— اور ضالّین سے مراد وہ لوگ ہیں جن کو راہِ حق کا علم ہی نہ ہو ——— مولانا محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:۔

مغضوب علیہم سے وُہ لوگ مُراد ہیں جو دین کے احکام کو جاننے پہچاننے کے باوجود شرارت یا نفسانی اغراض کی وجہ سے اُن کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ یا دوسرے لفظوں میں احکامِ الہٰیہ کی تعمیل میں کوتاہی کرتے ہیں ——— اور الضالّین سے وُہ لوگ مراد ہیں جو ناواقفیت اور نادانی کے سبب دین کے معاملہ میں غلط راستہ پر پڑ گئے ہیں اور دین کی مقررہ حدود سے نکل کر افراط اور غلو میں مبتلا ہو گئے۔

مولانا محمد ادریس صاحب فرماتے ہیں:۔

مغضوب علیہم سے وُہ فریق مراد ہے جو دیدہ و دانستہ راہِ راست کو چھوڑ دے اور علم صحیح کے باوجود ہوائے نفس کی پیروی میں غلط راستہ اختیار کرے ——— اور ضالّین سے وُہ گروہ مراد ہے جو سواء السبیل سے ہٹ کر غلط راستہ پر پڑ جائے۔

مولانا آزادؒ فرماتے ہیں:۔

مغضوب علیہ گروہ بالکل منعم علیہ کی ضد ہے کیونکہ انعام کی ضد غضب ہے اور فطرت کائنات کا قانون یہ ہے کہ راست باز انسانوں کے حصے میں انعام آتا ہے نافرمانوں کے حصے میں غضب۔ گمراہ وُہ ہیں جو راہِ حق نہ پا سکے اور اس کی جستجو میں بھٹک گئے پس

مغضوب وُہ ہوئے جنہوں نے راہ پائی اور اس کی نعمتیں بھی پائیں لیکن پھر اس سے منحرف ہوگئے اور نعمت کی راہ چھوڑ کر محرومی و شقاوت کی راہ اختیار کرلی۔ گمراہ وُہ ہوئے جو راہ ہی نہ پا سکے اس سے اِدھر اُدھر بھٹک رہے ہیں اور صراطِ مستقیم کی سعادتوں سے محروم ہو رہے ہیں۔ مغضوب علیہ کی محرومی حصول و معرفت کے بعد انکار کا نتیجہ ہے۔ اور گمراہ کی محرومی جہل کا نتیجہ۔ پہلے نے پاکر رُوگردانی کی اس لیے محروم ہوا۔ دوسرا پا ہی نہ سکا اس لیے محروم ہے۔ محروم دونوں ہوئے مگر یہ ظاہر ہے کہ پہلے کی محرومی زیادہ مجرمانہ ہے۔ کیونکہ اس نے نعمت حاصل کر کے پھر اس سے رُوگردانی کی اس لیے اُسے مغضوب کہا گیا اور دوسرے کی حالت کو صرف ضلالت سے تعبیر کیا گیا۔

ان اقتباسات کے پیش کرنے سے میرا مقصد یہ بتانا ہے کہ قرآنِ حکیم کی سورۂ فاتحہ میں یہ فقرہ غیر المغضوب علیھم کوئی نئی بات بتانے کے لیے نہیں بلکہ انعام یافتگان کی ایک محسوس نشانی بتانے کے لیے لایا گیا ہے اور اس کے ذریعے ان لوگوں کی جن پر انعام ہوا ہے اور جن کی راہ صراطِ مستقیم ہے نشانی یہ بتائی گئی ہے کہ ان میں مغضوبیت اور ضلالت نہ ہوگی۔ آیت کا مطلب صاف لفظوں میں یہ ہے کہ ہمیں ان انعام یافتہ لوگوں کی راہ پر چلا جو تیرے حضور نہ مغضوب و معتوب ہوئے اور نہ گمراہ ہیں اور معلوم ہے کہ انعام یافتہ وُہ ہیں جن کا رشتہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے استوار ہو۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ دُنیا میں ہدایت و سعادت سے ہمیشہ دو قسم کے آدمی فائدہ نہیں اُٹھاتے۔ جان بُوجھ کر انکار کرنے والا اور ناواقف۔

جو لوگ علمِ نبوت کو مانتے ہوں، جانتے ہوں پھر ان کی عملی زندگی غلط ہو، ان میں ردّ و انکار پایا جاتا ہو، استکبار اور سرکشی ان کی سرشت ہو، ان کی حالت اس شخص کے مقابلے میں بلحاظ جرم زیادہ سنگین ہے جو علمِ نبوت سے بے خبر اور ناواقف ہے —— اس موقعہ پر حافظ ابن القیمؒ کی یہ تحقیق بے حد وزنی ہے۔

حق کے علم اور اس پر عمل کے لحاظ سے قرآن نے لوگوں کی تین قسمیں بتائی ہیں۔ ایک وُہ جو حق کا علم رکھتے ہوں اور اس پر عمل پیرا ہوں۔ دوسرے وُہ جو علم رکھتے ہوں مگر اس پر عمل پیرا نہ ہوں۔ تیسرے وُہ علم ہی نہ رکھتے ہوں۔

پُوری انسانیت میں یہی تین قسمیں پائی جاتی ہیں اور قرآن کے قصص اور واقعات میں ان تینوں کا چہرہ پیش کیا گیا ہے۔

اسی بنا پر قرآن ہدایت کی ان تمام صورتوں سے یک قلم انکار کرتا ہے جو نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے ہٹ کر طرح طرح کی فکری گمراہیوں اور عمل کی بے راہ رویوں سے پروان چڑھتے ہیں چاہے اس کا عنوان کتنا ہی خوبصورت کیوں نہ ہو۔ قرآن کے نزدیک جیسے نبوت کے علم سے ہٹ کر انسانی تصور و تخیل کی اساس ہدایت کی راہ نہیں ہے ایسے ہی نبوت کے عمل سے منحرف ہو کر عملی زندگی کا کوئی سانچہ بھی ہدایت کی راہ نہیں ہے۔ ہدایت کی راہ تو صرف علم و عمل نبوت کی راہ ہے۔ اسی کا نام قرآن کی اصطلاح میں الاسلام ہے۔

اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ الْاِسْلَامُ

دین تو خدا کے نزدیک اسلام ہے۔

جادۂ عمل کے لحاظ سے اللہ کو یہی پسند ہے۔

رَضِيْتُ لَكُمُ الْاِسْلَامَ دِيْنًا

میں نے تمہارے لیے اسلام کو دین پسند کیا۔

اس کے علاوہ ہر جادہ، ہر شاہراہ، ہر نظامِ زندگی، ہر دستورِ حیات، ہر آئینِ بندگی اور ہر قانون اللہ کے یہاں ناقابلِ پذیرائی ہے۔

مَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ۔

جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا وہ اس سے ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔

قرآن نے دُنیا کو اسی کی دعوت دی ہے۔ اس کی تمام پکاروں، تمام خطبوں، تمام وعظوں اور تمام تقریروں کا لب لباب یہی ہے۔ اس موضوع پر قرآن نے جو کچھ بتایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ دُنیا میں جس گوشے میں بھی اسلام کے نام پر ہدایت آئی ہے اور جہاں بھی حق کی رہنمائی ہوئی ہے وہاں نبوت کے علم و عمل ہی کی صورت میں آئی ہے۔ علم وحی کی صورت میں اور عمل نبوت کی ذات کی صورت میں آیا۔ ایسا کبھی نہیں ہوا کہ علم آیا ہو اور عمل نہ ہو یا عمل آیا ہو اور علم نہ ہو۔

فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ۔

پس خدا نے ان کی طرف بشارت دینے والے اور ڈرانے والے پیغمبر بھیجے اور ان پر سچائی کے ساتھ کتابیں نازل کیں۔

تمام اولادِ آدم کے لیے اللہ سبحانہٗ کی یہی سنت رہی ہے اور تمام انبیا نے اسی کی تعلیم دی ہے۔ ان ہی کے ماننے اور اپنانے کا نام قرآن کی زبان میں ایمان اور عملِ صالح ہے۔ قرآن اسی کا داعی ہے۔ اسی کا نام صراطِ مستقیم ہے یہ دُنیا کے ہر گوشے میں ایک رہی ہے چاہے وُہ کسی زمانے اور کسی ملک میں ہو۔ اس پر چلنا ہی اللہ کے قانونِ سعادت کے تقاضوں کا جواب ہے یہ راہ نظریاتی طور پر فکری زندگی میں نبوت کے علم کی اور عملی طور پر زندگی کے سارے گوشوں میں نبوت کے عمل کی راہ ہے۔ اسی پر انسان کی نجات کا دارومدار ہے۔ یہ روزِ اوّل سے قائم ہے اس میں کمیت اور کیفیت کے لحاظ سے تو مرورِ زمان و مکان کی تبدیلی کی وجہ سے اختلاف ہوا ہے۔ لیکن حقیقت سب جگہ ایک ہے کہ نجات کی راہ نبوت کی پیش کردہ علم و عمل کی راہ ہے۔ اسی سلسلے کی آخری کڑی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

إِنَّا أَوْحَيْنَا إِلَيْكَ كَمَا أَوْحَيْنَا إِلَىٰ نُوحٍ وَالنَّبِيِّينَ مِن بَعْدِهِ ۔

(اے محمدؐ) ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی جس طرح نوحؑ اور ان سے پہلے پیغمبروں کی طرف بھیجی تھی۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہمیشہ سے ہدایت ایک ہی ہے۔ ہر دور، ہر زمانے، ہر ملک اور ہر قوم میں اللہ کی ہدایت نبوت کے علم و عمل کی صورت میں آئی ہے ——— دُنیا میں جو بگاڑ، جو فساد بھی آیا ہے اسی سے انحراف اور روگردانی کا نتیجہ ہے۔ کوئی بات بھی قرآن میں اس درجہ واضح اور صاف نہیں ہے جس قدر یہ بات کہ دین نام ہے نبوت کے علم و عمل کا۔

اسی وجہ سے قرآن کی دعوت کی پہلی بنیاد یہ ہے کہ علم کے نام پر اللہ سبحانہٗ کی جانب سے آئی ہوئی کتابوں کی اس طور پر تصدیق کی جائے یعنی یقین کیا جائے کہ جہاں جو پیغام بھی آیا ہے وُہ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہے۔

الَّذِينَ يُؤْمِنُونَ بِمَا أُنزِلَ إِلَيْكَ وَمَا أُنزِلَ مِن قَبْلِكَ ۔

جو کتاب (اے محمدؐ) تم پر نازل ہوئی اور جو کتابیں تم سے پہلے پیغمبروں پر نازل ہوئیں سب پر ایمان لاتے ہیں۔

اور عمل کی حد تک کسی ایک پیغمبر کا انکار سب کے انکار کے مترادف ہے۔ ایمان یہ ہے کہ عمل کی روشنی نبوت کے نام پر جہاں بھی رُونما ہوئی ہے اس کو مانا جائے اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کیا جائے ——— اقرار یہ ہونا چاہیے۔

لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّن رُّسُلِهِ ۔

ہم اس کے پیغمبروں سے کسی میں کچھ فرق نہیں کرتے۔

کتابوں میں سے کسی ایک کتاب کا انکار اگر نبوت کے لاتے ہوئے علم کا انکار ہے تو کسی نبوت کا انکار نبوت کے عمل کا انکار ہے کیونکہ حقیقت کے لحاظ سے دونوں کا مبدا ایک ہے ـــــ اسی بنار پر قرآن دونوں کو نور قرار دیتا ہے۔

علم نبوت کو اگر وُہ کتاب مُبین اور نُورِ مبین کہتا ہے :۔

اَنْزَلْنَآ اِلَيْكُمْ نُوْرًا مُّبِيْنًا۔

ہم نے (کفر وضلالت کا اندھیرا دور کرنے کو) تمہاری طرف چمکتا ہوا نُور بھیج دیا ہے۔

تو عمل نبوت کو بھی وُہ بُرہان اور نُور کہتا ہے :۔

قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ۔

بیشک تمہارے پاس خدا کی طرف سے نُور اور روشنی آچکی ہے۔

قرآن نجات وسعادت کی ان تمام راہوں سے انکار کرتا ہے جو ان دونوں روشنیوں سے مستفید نہ ہوں۔ ان کے بغیر انسانی زندگی کے ارد گرد اندھیرا اور تاریکی ہی تاریکی ہے۔

اتباعِ ظن اور اتباعِ ہوٰی

پھر یہی وجہ ہے کہ قرآن نے علمِ نبوت سے رشتہ ٹوٹنے کے لیے اتباعِ ظن اور عملِ نبوت سے منحرف ہو جانے کے لیے اتباعِ ہوٰی کی تعبیرات اختیار کی ہیں ـــــ عالمِ غیب کے بارے میں ساری فکری گمراہیوں کا سرچشمہ اتباعِ ظن ہے۔ علم نبوت سے ہٹ کر جو عقیدہ، جو تخیل، جو تصور بھی پیدا کیا جائے وُہ حقیقت سے دُوری ہے۔ چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں عیسائیوں کی ساری فکری گمراہیوں کو وُہ اتباعِ ظن قرار دیتا ہے۔ اور کہتا ہے :۔

مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ۔

پیروئ ظن کے سوا ان کو اس کا مطلق علم نہیں۔

راہ کی تمام درماندگیوں کا ایک ہی حل ہے کہ علم نبوت کو مانا جائے اور گمان، خیال، ظن، تخمین اور قیاس سے بالکل کنارہ کش ہو جائے ـــــ عالمِ شہادت میں ساری بداعمالیوں، بداخلاقیوں، آوارگیوں اور بے راہ رویوں کا اصل باعث اتباعِ ہوٰی ہے۔ قرآن نے یہودیوں کی زندگی میں عصیان، عدوان اور

طغیانی کی تاریکی داستان کا سرچشمہ صرف یہ بتایا ہے کہ ان میں اتباع ہوٰی کی بیماری رونما ہو گئی تھی۔

قرآن ایسے تمام مواقع پر جہاں نبوت کے علم سے قطع تعلقات کی شکایت کرتا ہے کتاب کا عنوان استعمال کرتا ہے اور جہاں عمل نبوت سے رشتہ توڑنے پر فردِ جرم عائد کرتا ہے وہاں رسول کا عنوان لے کر آتا ہے

اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰۤى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ۔

توجب کوئی پیغمبر تمہارے پاس ایسی باتیں لے کر آئے جن کو تمہارا جی نہیں چاہتا تھا تو تم سرکش ہو جاتے رہے۔

یہ اتباع ہوٰی ہی ہے جو صرف انکار پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اس میں نبوت کے خلاف ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بغض و عناد اور ظلم و فساد کی سخت سے سخت صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ اتباع ہوٰی کا مریض صرف نبوت سے اختلاف نہیں کرتا بلکہ اس کے اندر نبوت کے خلاف ایک غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے وہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ نبوت کی ہلاکت اور بربادی کے درپے ہو جاتا ہے۔

فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ

توجس چیز کو وہ خوب پہچانتے تھے جب ان کے پاس آپہنچی تو اس سے کافر ہو گئے

اس کے نتیجے میں ان کا عزور یہاں تک بڑھ جاتا ہے کہ اپنے علاوہ اور اپنے سے باہر وہ نہ نبوت کو مانتے ہیں اور نہ اپنے سے باہر کسی کو تسلیم کرتے ہیں بلکہ اپنے سے باہر وہ کسی شخص کی راستی اور بزرگی کا بھی اعتراف نہیں کرتے اور اس کے نتیجے میں

فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ۔

تو وہ اس کے غضب بالائے غضب میں مبتلا ہو گئے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ بیماری نبوت کی زندگی کے ہوتے ہوئے کیوں رونما ہوتی ہے کہ انسان کے سامنے جب راہِ حق اور نبوت کا لایا ہوا عمل سامنے آتا ہے تو دو قسم کی رکاوٹیں اس کا راستہ روک لیتی ہیں پہلی رکاوٹ خود اس کی طبیعت ہے انسان کی اپنی خواہشیں، اپنے میلانات، اپنے رجحانات نبوت کی پیروی سے روکتے ہیں۔

دوسری رکاوٹ آدمی کا غلط گرد و پیش ہے اس کی سوسائٹی، اس کی مجلس، اس کا حلقۂ احباب، اس کا حلقۂ فکر، اس کی علمی اور ادبی تنظیم، اس کی تہذیبی و ثقافتی زندگی، اس کی اجتماعی اور سیاسی دنیا اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو جاتی ہے اور عملِ نبوت سے اس کا رشتہ توڑ دیتی ہے۔ قرآن کی زبان میں ان

دونوں کا تام اتباعِ ہویٰ ہے۔

بہرحال علمِ نبوت سے رشتہ ٹوٹتا ہے تو انسان اتباعِ ظن کا شکار ہو جاتا ہے اور عملِ نبوت سے بیگانگی ہوتی ہے تو آدمی اتباعِ ہویٰ کا بیمار ہو جاتا ہے۔

دین کی زندگی میں ساری خرابیوں اور ساری گمراہیوں کا سرچشمہ یہی ہیں۔ عقائد کی ساری بدعتیں اتباعِ ظن اور اعمال کی ساری بدعتیں اتباعِ ہویٰ کے پستانوں سے دُودھ پی کر پلتی، بڑھتی اور جوان ہوتی ہیں۔

یہ جو قرآن جا بجا اس بات پر زور دیتا ہے کہ دین میں غلو نہ کرو اور اہلِ کتاب سے کہتا ہے۔

لَا تَغْلُوْا فِیْ دِیْنِكُمْ

اپنے دین (کی بات) میں ناحق مبالغہ نہ کرو اور اتباعِ ہویٰ نہ کرو۔

لَا تَتَّبِعُوْٓا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا۔

ایسے لوگوں کی خواہشوں کے پیچھے نہ چلو جو خود بھی گمراہ ہوتے۔

تو اس سے مقصود اسی حقیقت پر زور دینا ہے کہ علمِ نبوت سے رشتہ ٹوٹتا ہے تو دین میں غلو، افراط اور زیادتیاں رُونما ہوتی ہیں۔ اور عملِ نبوت سے اجنبیت ہوتی ہے تو زندگی نافرمانی، بے راہ روی، فسق و فجور، ظلم و عدوان اور فساد و طغیان کا گہوارہ بن جاتی ہے۔

سُورۃ البقرۃ

سُورت کا نام

اس سُورت کا نام البقرہ ہے یعنی وُہ سورت جس میں گائے کا ذکر ہے۔ چونکہ یہ واقعہ قرآن میں صرف اسی سُورت میں آیا ہے اس لیے دوسری سُورتوں سے ممتاز کرنے کے لیے یہی نام تجویز ہوا۔

سُورت کا موضوع

اس سُورت کا موضوع 'اجتماعی تقویٰ' ہے۔

تقویٰ اصل میں وقویٰ ہے۔ عربی میں اس کے لغوی معنے بچنے، پرہیز کرنے اور احتیاط کرنے کے ہیں۔ لیکن اصطلاحِ قرآن میں یہ دل کی اس کیفیت یا ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہو جائے۔

اس سُورت کا بیشتر حصہ مدنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوا ہے۔

نبوت کی دونوں زندگیوں مکی زندگی اور مدنی زندگی میں بہت بڑا فرق ہے ـــــ مکی زندگی میں قرآن کی ہدایات عقائد کی اصلاح، انفرادی اعمال کی دُرستگی اور شخصی نجات کے گرد گھومتی نظر آتی ہیں اسی بنا پر مکی زندگی میں ایمانیات پر زیادہ زور ہے۔ ایمان باللہ، ایمان بالرسالت، ایمان بالملائکہ اور ایمان بالیوم الآخر کو تکرار کے ساتھ پیش کیا گیا ہے ـــــ لیکن مدنی زندگی میں شخصی نجات، انفرادی اصلاح سے آگے مسلمانوں کو تمام انسانوں کی بھلائی اور بُرائی کا ذمہ دار قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ

اے ایمان والو! انصاف قائم کرنے والے اور اللہ کے لیے گواہ بنو۔

انصاف کے علمبردار بنو۔ تمہارا کام اب صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ انصاف کا جھنڈا لے کر اُٹھنا ہے۔ تمہیں اس بات پر کمربستہ ہو جانا چاہیئے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو

عدل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے مومن ہونے کی حیثیت سے تمہارا اہتمام یہ ہے کہ وُہ سہارا تُم بنو۔

سُورۃ فرقان مکی ہے اس میں اوّلاً یہ بتایا ہے کہ اگر ہم چاہتے تو ایک ایک بستی میں ڈرانے والا روانہ کر دیتے۔ لہٰذا آپ ان کافروں کی اطاعت نہ کیجیے اور اسلام کی خاطر زور شور اور پُوری طاقت سے محنت کیجیے۔ یہ فرمانے کے بعد اہلِ ایمان کی یہ دُعا بتائی ہے کہ

وَاجْعَلْنَا لِلْمُتَّقِيْنَ إِمَامًا۔

اور ہمیں متقیوں کی امامت عطا فرما۔

یعنی ہم تقویٰ و طاعت میں سب سے بڑھ جائیں۔ خود ہی نیک نہ ہوں بلکہ ہماری بدولت پُوری دُنیا نیک بن جائے۔ اور ہم کو تقویٰ میں اس درجہ کمال عطا کر پُوری دُنیا تقویٰ میں ہماری کاپی کرے۔ اس سے ضمناً یہ بات بھی نکل آتی ہے کہ مسلمان کا بجائے خود نیک ہونا کافی نہیں ہے اپنے گرد و پیش اور پُورے عالم کی دینداری کی دیکھ بھال ان کے ذمے ہے۔

مدنی زندگی کے اسلام کو مکی زندگی کے اسلام سے یہی چیز ممیز کرتی ہے کہ ان میں پورے عالم کی ہدایت کی لگن اور عشق تھا۔ وُہ اب ایک عالمگیر تخیل کے داعی تھے اور اس تخیل سے ان میں شدید محبت تھی اس نصب العین کی کامیابی اسی وقت ممکن ہے جب خیر و شر کا وُہ تصور اور حق و باطل کا وُہ معیار عملاً کارفرما ہو جس کی طرف انہیں دُنیا کو دعوت دینی ہے۔ جہاں باطل نظام نے غلبہ پا کر معیار ترک و اختیار اور اقدارِ حیات کو اُلٹ کر رکھ دیا ہو وہاں نیکی کی طرف دعوت دینا ایک فعلِ عبث ہے۔ جو نظام تمدن دُنیا پر غالب ہوگا۔ اور جس قوم کی تہذیبی برتری عملاً قائم ہوگی اس کے اقدار و غایات دوسرے تمام انسانوں کے اقدار و غایات کا ماخذ و منبع ہونگی اور اسی کا معیارِ خیر و شر دُنیا میں رائج ہوگا۔

البقرہ میں پہلے یہ اعلان کہ اس مقصد کی خاطر اتقیاء کی ضرورت ہے اتقیاء کا چہرہ پیش فرمانے کے بعد اتقیاء کی دو متقابل جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔

اس کے بعد پُوری انسانیت کو متقی بننے کا تیر بہدف نسخہ بتایا یعنی عبادت خُدا۔ اور چونکہ اللہ کی عبادت انسان اپنی رائے اور قیاس سے نہیں کر سکتا اس کے لیے نبوت کی ضرورت کی طرف متوجہ کیا۔ نبوت کے سلسلہ میں انسانیت میں تاریخ نبوت بتلاتے ہوئے تخلیق آدم اور خلافت کا ذکر فرمایا۔

اس کے بعد پورے پارے میں بلکہ دوسرے پارے کے دوسرے رکوع کے خاتمہ تک ان نقاط کی نشان دہی کی گئی ہے جو اجتماعی زندگی میں تقویٰ کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں اور اس کے لیے یہودیوں کی تاریخ

ملت سے ایسے چیدہ چیدہ واقعات پیش فرمائے جس نے ان کو اللہ کی نظروں میں گرا دیا اور تقویٰ سے محروم ہوگئے۔ تاکہ قرآن کے ماننے والوں کو معلوم ہو جائے کہ اس راہ کی ٹھوکریں کیا ہیں اور پھر ان کے نتائج کیسے ہوتے ہیں! ـــــــ اسی بنا پر ان پر فردِ جرم لگا دینے کے بعد یہ ارشاد ہوا ہے۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ آمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ۔

اور اگر وہ ایمان لاتے اور تقویٰ اختیار کرتے تو بدلا پاتے اللہ کے ہاں سے بہتر

اور اسی بنا پر ان کے واقعات کے پھیرے کا آغاز بھی تقویٰ سے فرمایا اور اس کا انجام بھی تقویٰ پر فرما کر بتایا کہ چونکہ تم متقیانہ سیرت کھو چکے ہو اس لیے اب تمہیں امامت کے منصب سے معزول کیا جاتا ہے اور اب ان لوگوں کو یہ منصب دیا جاتا ہے جن کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دعا فرمائی تھی یعنی اُمتِ مسلمہ۔

اُمتِ مسلمہ کی تاسیس کے سلسلہ میں امامت ابراہیم علیہ السلام، بنائے کعبہ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا تذکرہ آیا ہے۔

اس کے ساتھ یہودیوں اور یہودیوں کے ساتھ پوری دُنیا کے لیے ہدایت و سعادت کا دروازہ بند نہیں کیا بلکہ یہ کہہ کر سب کو دعوت دی ہے کہ:

فَاِنْ آمَنُوْا بِمِثْلِ مَا آمَنْتُمْ بِهٖ فَقَدِ اهْتَدَوْا

سو اگر وہ بھی ایمان لائیں جس طرح پر تم ایمان لائے ہدایت پائی انہوں نے بھی۔

دوسرے پارے میں اہلِ ایمان کو تقویٰ کی تعمیری اہمیت بتائی ہے۔ انشاءاللہ اس کا تعارف آپ دوسرے پارے کے مقدمہ میں پڑھیں گے۔

اٰيَاتُهَا ۲۸۶ (۲) سُوْرَةُ الْبَقَرَةِ مَدَنِيَّةٌ (۸۷) رکوعاتہا ۴۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ لَا رَيْبَ ۛۚ فِيْهِ ۛۚ

اللہ کے نام سے جو بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والا ہے۔

الف لام میم۔ یہ کتاب[1] ہے کہ جس کے خدا کی طرف سے ہونے میں کوئی شبہ[2] نہیں ہے۔

قرآن میں حروفِ مقطعات

الٓمّٓ۔ ان حروف کو مقطعات کہتے ہیں۔ ان کے اصل معنے تک اوروں کی رسائی نہیں ہے بلکہ یہ بھید ہے اللہ اور اس کے رسول کے درمیان جو بوجہ مصلحت وحکمت ظاہر نہیں فرمایا۔ اور بعض اکابر سے جو ان کے معنے منقول ہیں اس سے صرف تمثیل وتنبیہ وتسہیل مقصود ہے۔ یہ نہیں کہ مراد حق تعالیٰ یہ ہے تو اس کی اب شخصی رائے کہہ کر تغلیط کرنا محض شخصی رائے ہے جو علماء کی تحقیق کے بالکل خلاف ہے[1]۔

حروفِ مقطعات جو سورتوں کے شروع میں آئے ہیں ان کے بارے میں بعض مفسرین کی رائے ہے کہ یہ سورتوں کے نام ہیں۔ بعض حضرات کے خیال میں اسمائے الٰہیہ کے رموز ہیں[2]۔

خطباتِ عرب کے دستور کے مطابق یہ حروف محض افتتاحِ کلام کے لیے لائے گئے ہیں اور یہ بات اس لیے زیادہ دل کو لگتی ہے کہ عرب اگر اس طرزِ خطاب وخطابت سے آشنا ومانوس نہ ہوتے تو تو اس پر اعتراض ضرور کرتے۔ اعتراض کے لیے مخالفین بہانے ڈھونڈھتے رہتے تھے لیکن ایسا اعتراض

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص۳ [2] معارف القرآن ج۱ ص۱۰۵

منقول نہیں ہے[1]۔

جس زمانے میں قرآن نازل ہوا اُس دور کے اسالیب بیان میں اس طرح کے حروف مقطعات کا استعمال عام طور پر معروف تھا۔ خطباء اور شعراء دونوں اس انداز بیان سے کام لیتے تھے۔ چنانچہ اب بھی کلام جاہلیت کے جو نمونے محفوظ ہیں ان میں اس کی مثالیں ملتی ہیں۔ اس استعمال کی وجہ سے یہ مقطعات کوئی چیستان نہ تھے جس کو بولنے والے کے سوا کوئی نہ سمجھتا ہو بلکہ سامعین بالعموم جانتے تھے کہ اس سے مراد کیا ہے۔ بعد میں یہ اسلوب بیان عربی زبان میں متروک ہوتا چلا گیا[2]۔

یہ سورتوں کے نام ہیں

قرآن کی انیس سورتیں ایسی ہیں جن کی ابتداء میں حروف مقطعات آئے ہیں۔ منجملہ ان کے سورۂ بقرہ ہے۔ ان حروف کو ان سورتوں کا نام یا عنوان سمجھنا چاہیئے جن میں ان کے مطالب کی طرف اشارہ کیا گیا ہے[3]۔

بعض سلف جمہور متکلمین، خلیل اور سیبویہ نحوی کی رائے یہی ہے کہ یہ سورتوں کے نام ہیں۔ جو مضامین اس سورت میں بالتفصیل موجود ہیں یہ حروف اس تفصیل کا اجمال ہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ نے الفوز الکبیر میں اسی مسلک کو اختیار فرمایا ہے[4]۔

لیکن مشاہیر صحابہ تابعین میں سے اکثر کا اور جمہور مفسرین کا مسلک یہ ہے کہ یہ حروف ان متشابہات قرآنی سے ہیں جن کا علم عام بندوں کو نہیں دیا گیا ہے۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ، حضرت عمر فاروقؓ، حضرت عثمان غنیؓ، حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور شعبیؒ، سفیان ثوریؒ، ربیع بن خثیمؒ، اور ابوحاتمؒ سب کا یہی مذہب ہے (قرطبی، ابن کثیر)

یہ کہنا کچھ زیادہ بادلیل نہیں ہے کہ قرآن کے مطالب جب ہم میں تو ان حروف کو ہمارے لیئے قابل فہم ہونا چاہیئے۔ قرآن حکیم کے اندر اور جتنے مضامین ہیں کیا وہ سب ہر کس و ناکس کی سمجھ میں آگئے ہیں؟ —— یا کائنات خارجی میں جو کچھ موجود ہے کیا ان موجودات میں سب کا معرف بڑے بڑے فاضلوں اور ماہروں کی سمجھ میں آگیا ہے[5]؟

قرآن میں بہت سے مقامات ایسے ہیں جہاں فقط ایمان مطلوب ہے۔ اسی طرح حروف

---

[1] تفسیر ماجدی ص۵ [2] تفہیم القرآن ج۱ ص۴۹ [3] ترجمان القرآن ج۲ ص۱ [4] معارف القرآن ج۱ ص۱۰۳ [5] تفسیر ماجدی ص۵۔

مقطعات کے نازل کرنے سے مقصود یہ ہے کہ لوگ ان پر ایمان لائیں اور ان کے اللہ کی جانب سے ہونے کا یقین کریں[1]

یہ ظاہر ہے کہ نہ تو ان حروف کا مفہوم سمجھنے پر قرآن سے ہدایت حاصل کرنے کا انحصار ہے۔ اور نہ یہ بات ہے کہ اگر کوئی شخص ان کے معنے نہ جانے گا تو اس کے راہِ راست پانے میں کوئی کمی رہ جائے گی۔ لہٰذا ایک عام ناظر کے لیئے کچھ ضروری نہیں ہے کہ وُہ ان کی تحقیق میں سرگرداں ہو[2]۔

قرآن کا پہلا تعارف

۱۔ ذٰلِكَ الْكِتٰبُ ۔ یہی کتاب فی الواقع کتاب ہے جو کتبِ الٰہیہ اور آسمانی صحیفوں کے متفرق علوم اور مضامین کی جامع ہے۔ زمخشری کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ کتاب تو بس یہی کامل کتاب ہے اور اس کے سامنے جس قدر کتابیں لائی جائیں گی ناقص ہوں گی ۔بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہی وُہ کتاب کامل ہے جس میں کتاب کے نام سے موسوم ہونے کی صلاحیت ہے محض زبانی یادداشتوں یا روایتوں کا مجموعہ نہیں بلکہ باضابطہ و مستند نوشتہ، ایک صحیفہ مکتوب ہے ــــــ قرآن مجید نے اپنا پہلا تعارف اسی حیثیت سے پیش کیا ہے کہ وُہ ضبطِ تحریر میں آیا ہوا مرتب ایک کتابی صورت میں صحیفہ آسمانی ہے۔ دوسرے مذہبوں کی الہامی کتابوں کی طرح نہیں کہ صاحبِ مذہب کے دماغ میں ان کے صرف معانی و مطالب ہوں۔ اور کوئی راوی ان سے کوئی ٹکڑا نقل کرے اور کوئی کچھ اور ۔ یہاں تک صدیوں بعد جب جمع و کتابت کی نوبت آئے تو صحتِ لفظی اور استنادِ حرفی تو خیر بہت دور کی بات ہے نفسِ مفہوم اور معنے تک مسخ ہو کر رہ جائے۔ اور نام تو ایک کتاب کا ہو لیکن اس کی ترتیب و تالیف میں خدا معلوم کتنے انسانی دماغ اور کتنے قلم شریک ہو جائیں۔ دلائل و شواہد کو جانے دیجیے محض دعویٰ کی حد تک بھی دُنیا کی حریف و مقابل کوئی الہامی کتاب نہیں ہے۔ توراۃ، انجیل ــــــ وید کسی کا بھی یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وُہ لفظ بلفظ، حرف بحرف نازل شدہ کتاب ہے اور نہ ان کے پیرو انہیں اس حیثیت سے پیش کر رہے ہیں[3]۔

۲ــــ اس کے خدا کی جانب سے ہونے میں کوئی شُبہ نہیں ہے۔ یعنی اس کے کلامِ الٰہی ہونے اور اس کے جملہ مضامین کے واقعی ہونے میں کوئی شُبہ نہیں ہے۔ جاننا چاہیئے کہ کسی کلام میں اشتباہ کی

---

[1] معارف القرآن م ۱۵ [2] تفہیم القرآن ۴۳ [3] تفسیر ماجدی ج ۲

هُدًى لِّلْمُتَّقِينَ ۝

پرہیزگار اور محتاط انسانوں کو فلاح اور کامیابی کی راہ بتانے والی ہے۔

دو صورتیں ہیں۔ یا تو خود اس کلام میں کوئی غلطی اور خرابی ہو۔ یا سُننے والے کی سمجھ میں خلل ہو۔ پہلی صُورت میں ریب اور شک کا محل یہ کلام ہے اور دُوسری صورت میں شک کا مقام خود سمجھنے والے کی اپنی سمجھ ہے۔ یہ کلام بالکل حق ہے خواہ کسی کو اپنی کم فہمی سے یہ کلام محلِ شک معلوم ہو۔ اس آیت میں پہلی صُورت کی نفی فرمائی ہے۔ لہٰذا اب یہ شبہ کہ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے میں تو سب کا فروں کو شک و انکار تھا بے محل ہے۔ باقی رہی دوسری صُورت کہ سُننے والوں کی سمجھ میں کمی کی وجہ سے سُننے والوں کو اس کے کلامِ الٰہی ہونے میں شُبہ ہے اس کا جواب آگے تیسرے رکوع میں آرہا ہے یعنی وَاِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ آیت میں[1]۔

اس حقیقت کو ایک اور پہلو سے دیکھیے کہ قرآن بجائے خود ایک عالم ہے۔ اس عالمِ قدس کے اندر نہ کسی شک و تردّد کی گزر ہے۔ نہ خلجان و اضطراب کا۔ یہاں تو جو کچھ ہے تسکین و اطمینان ہے، علم و ایقان ہے، بصیرت و اذعان ہے، ہر دعوٰی مدلّل ہے اور ہر حقیقت ثابت شدہ ہے۔ اب اگر کسی بدنصیب کو اس کے خلاف نظر آتا ہے تو گناہ چشمۂ آفتاب کا نہیں بلکہ قصور اس کی شپرہ چشمی کا ہے[2]۔

اس آیت کا ایک سیدھا سادا مطلب تو یہ ہے کہ بے شک یہ اللہ کی کتاب ہے۔ مگر ایک مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ یہ ایک ایسی کتاب ہے جس میں شک کی کوئی بات نہیں ہے۔ دُنیا میں جس قدر کتابیں امورِ بعد الطبیعت اور حقائق ماوراء ادراک سے بحث کرتی ہیں وہ سب قیاس، گمان پر مبنی ہیں اس لیے خود ان کے مصنف بھی اپنے بیانات کے بارے میں شک سے پاک نہیں ہو سکتے چاہے وہ کتنے ہی یقین کا اظہار کریں۔ لیکن یہ ایسی کتاب ہے جو سرتاسر علمِ حقیقت پر مبنی ہے۔ اس کا مصنف وُہ ہے جو تمام حقیقتوں کا علم رکھتا ہے۔ اس لیے فی الواقع اس میں شک کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ دوسری

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ صہ [2] تفسیر ماجدی ج۱ ص۳

بات ہے کہ انسان اپنی نادانی کی بنا پر اس کے بیانات میں شک کرے۔

۲ یہاں سے آخر قرآن تک بندے کی جانب سے کئے گئے سوال اھدنا الصراط المستقیم۔ کا جواب ہے۔ اسی لیئے فاتحہ کے بعد یہ سورت آئی ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ جس راہ نمائی کی تلاش میں ہو وُہ یہ ہے۔ بندہ دُعا کرتا ہے کہ اے اللہ میری رہنمائی فرما۔ جواب میں اللہ سبحانہٗ پورا قرآن اس کے سامنے رکھ دیتا ہے کہ لو یہ ہے میری رہنمائی جس کی تو نے مجھ سے درخواست کی ہے۔ لیکن جواب میں یہ شرط ہے کہ یہ کتاب متقیوں کے لیئے رہنمائی کا کام کرے گی۔[1]

یعنی جو بندے اپنے خدا سے ڈرتے ہیں ان کو یہ کتاب راستہ بتلاتی ہے کیونکہ جو اپنے خدا سے خائف ہو گا اس کو امور مرضیہ اور غیر مرضیہ یعنی طاعت و معصیت کی مزید تلاش ہو گی اور جس نافرمان کے دل میں خوف ہی نہیں اس کو طاعت کی کیا فکر اور معصیت سے کیا اندیشہ ہے۔[2]

مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب کوئی تاریخ کا دفتر نہیں کہ اس میں کسی وار ترتیب کے ساتھ گذشتہ زمانے کے واقعات درج ہوں یہ کوئی سائنس کی کتاب نہیں کہ علوم طبعی کے مسائل کا حل اس کے اوراق میں ڈھونڈھا جائے، کوئی فلسفے کا معارہ نہیں کہ اس کے پڑھنے والے اشراقیوں اور مشائیوں، یونانیوں اور ہندیوں کے ظنون و نظریات میں اُلجھے رہیں، افسانے اور محاضرات کی کتاب نہیں کہ پڑھنے والے اسے تفریح اور دل بہلاوے کے لیئے پڑھیں۔ اس کی اصل اور بنیادی حیثیت صرف یہ ہے کہ وُہ ہدایت نامہ ہے، دستورِ حیات ہے، مکمل اور مفصل نقشۂ زندگی ہے۔[3]

اجتماعی زندگی میں تقویٰ

لیکن اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیئے ضروری ہے کہ آدمی میں چند صفات پائی جاتی ہوں۔ ان میں سے اوّلین صفت یہ ہے کہ آدمی متقی ہو، پرہیزگار ہو، بھلائی اور بُرائی میں تمیز کرتا ہو، بُرائی سے بچنا چاہتا ہو، بھلائی کا طالب ہو اور اس پر عمل کرنے کا خواہش مند ہو۔ وُہ لوگ جو دُنیا میں جانوروں کی طرح جیتے ہیں۔ جنہیں کبھی یہ فکر لاحق نہیں ہوتی کہ جو کچھ وُہ کر رہے ہیں وُہ صحیح بھی ہے یا نہیں۔ تو ایسے لوگوں کے لیئے قرآن میں کوئی رہنمائی نہیں۔[4]

بہر حال قرآن حکیم سے استفادہ کے لیئے اوّلین شرط دل کے اندر کا تقویٰ ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۴۹ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۴ [3] تفسیر ماجدی ص ۱۰ [4] تفہیم القرآن ص ۴۹

اَلَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِالْغَیْبِ

(متقی وُہ ہیں) جو بن دیکھی حقیقتوں پر ایمان رکھتے ہیں یعنی جو حقائق ان کے حواس و عقل سے بالا ہیں ان کا یقین کرتے ہیں۔

لغت میں تقویٰ کے معنے حفاظت کے ہیں اور اصطلاحِ شریعت میں ان چیزوں سے بچنے کو تقویٰ کہتے ہیں جو آخرت کے لحاظ سے مضر رساں ہوں چاہے ان کا تعلق عقائد و اخلاق سے ہو اور اقوال، افعال اور احوال سے ہو[1]۔

گویا متقی ایسا آدمی ہوتا ہے جو اپنے فکر و عمل میں بے پروا نہیں ہوتا۔ ہر بات کو درستگی کے ساتھ سمجھنے اور کرنے کی کوشش رکھتا ہے۔ بُرائی اور نقصان سے بچنا چاہتا ہے اچھائی اور فائدے کی جستجو رکھتا ہے۔ قرآن کہتا ہے ایسے ہی لوگ تعلیم حق سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں۔

حضرت عمرؓ نے حضرت ابی بن کعبؓ سے دریافت کیا تھا کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ اُنہوں نے کہا کہ تم کبھی ایسے راستہ پر نہیں چلے جس میں کانٹے ہوں۔ فرمایا ہاں۔ کہا کہ اس حالت میں تم نے کیا کیا۔ فرمایا میں نے کوشش کی کہ کانٹوں سے بچ نکلوں کہا کہ بس یہی تقویٰ کی حقیقت ہے[2]۔

قرآن میں ایک اور موقع پر هُدًى لِّلنَّاسِ (یعنی قرآن ہدایت ہے انسانوں کے لیے) بھی فرمایا ہے یہ گویا اس طرف اشارہ ہے کہ جو متقی نہیں ہیں وُہ درحقیقت انسان ہی نہیں۔ انسانیت اور آدمیت کا تقاضا یہ ہے کہ اپنے خالق اور مالک سے ڈرے اور جو نہیں ڈرتا وُہ انسان نہیں ہے جانوروں کی طرح ہے۔ سفرِ آخرت کے لیے تقویٰ کا زادِ راہ اور تقویٰ کا لباس ہی کارآمد اور مفید ہے۔ بغیر زادِ راہ کے جیسے ایک مسافر کا سفر ناممکن ہے اسی طرح بغیر تقویٰ کے توشہ کے آخرت کا سفر ناممکن ہے۔

وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَیْرَ الزَّادِ التَّقْوٰی۔

---

۱ معارف [illegible] ۲ ترجمان القرآن ج ۱ ص ۲۱۰ ۳

اور جیسے ایک معمولی راستے سے برہنہ گزرنا خلافِ حیا اور بے شرمی ہے ایسے ہی صراطِ مستقیم پر لباسِ تقویٰ کے بغیر چلنا بے حیائی اور بے شرمی ہے[۱]۔

ایمان بالغیب

۴ــــ اسلام کی قانونی زبان میں ایمان انقیاد و طاعت کی اُس آخری منزل کا نام ہے جس کے بعد اوامرِ الٰہیہ اور منہیاتِ شرعیہ کے قبول کرنے سے دل میں کوئی کمی باقی نہ رہے۔ مُخبرِ صادق پر وُہ اعتماد ہو جائے کہ دل کی تمام خوش حالی اور رُوح کی کامل مسرت اس کے باور کرنے مان لینے میں منحصر نظر آنے لگے۔ گویا جذبہ وفاداری طلب دلائل کی مہلت ہی نہ دے۔ راہِ حق میں ہر نئی قربانی ایک نئی لذت کا سامان ہو۔ اور ایک ادنیٰ نافرمانی وُہ تلخ گھونٹ بن جائے جو گلے سے نہ اُتر سکے۔ اس آیت میں ان سرفروشوں کی اسی سرمستی کا ذکر کیا گیا ہے یعنی متقیوں کی وہ جماعت ہے جو محض جذبہ فرمانبرداری میں دیکھی اور ان دیکھی باتوں کی یکساں تصدیق کرتی ہے آنکھ اگر دیکھتی ہے اور تصدیق کرتی ہے، کان اگر سنتے اور مان لیتے ہیں تو یہ ان کا طبعی تقاضا ہے۔ لیکن آنکھیں اگر نہیں دیکھتی ہیں، کان اگر نہیں سنتے ہیں تو پھر اِن پر اعتماد کر کے مان لیتے ہیں جن کی صداقت پر سارا جہان قربان ــــــ یہی وثوق و اعتماد ایمان کی جان ہے۔ اس لیے اصطلاح میں خبرِ رسول کو رسول کے اعتماد پر یقینی طور پر مان لینے کا نام ایمان ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ عقلِ انسانی جب نشۂ یقین سے مخمور ہو جاتی ہے تو قلب و نفس بھی اس قدر متاثر ہو جاتے ہیں کہ پھر عالمِ غیب پر ان کو محسوسات کی طرح یقین نصیب ہو جاتا ہے۔ غیب سے مُراد وُہ چیزیں ہیں جو عقل و حواس سے مخفی ہوتی ہیں جیسے جنت و دوزخ ملائکہ۔ ان سب کو اللہ اور رسول کے ارشاد کی وجہ سے حق اور یقینی سمجھتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ ان امورِ غائبہ کا منکر ہدایت سے محروم ہوتا ہے[۲]۔

مطلب یہ ہے کہ ان حقائقِ غیبیہ کو بغیر دیکھے ماننا اور اس اعتماد پر ماننا کہ زبانِ نبوت خبر دے رہی ہے ایمان بالغیب ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ان غیر محسوس حقیقتوں کو ماننے کے لیے تیار ہو صرف وہی قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھا سکتا ہے[۳]۔

---

[۱] معارف القرآن م افشاں ص۳۹ [۲] حاشیہ شیخ الہند ص۳ [۳] تفہیم القرآن ج ۱ ص۴۸

ایمان کے معنے

دراصل ایمان کا لفظ امن سے مشتق ہے اس لیئے امانت و اعتماد کے معنے اس میں بہرحال میں موجود ہونے ضروری ہیں۔ محسوسات و مشاہدات میں کسی کی بات مان لینے کو ایمان نہیں کہتے۔ اگر ایک شخص طلوعِ آفتاب کی خبر دیتا ہے تو آپ اس کے جواب میں آمنت نہیں کہہ سکتے۔ ایمان کا تعلق ہمیشہ غائبات سے اور ان حقائق سے ہوتا ہے جو انسان کے حواس سے پوشیدہ اور کبھی براہِ راست عام انسانوں کے مشاہدے میں نہیں آتے۔ غائبات اور ایمان کی اسی خصوصیت کو یؤمنون بالغیب میں بتایا گیا ہے۔ یہاں غیب کا لفظ صرف بطور بیان نہیں آیا ہے بلکہ اس حقیقت کو واضح کرنے کے لیئے کہ ایمان کا تعلق صرف غائبات کے ساتھ ہے۔ مشاہدات کے ساتھ ایمان کا کوئی تعلق نہیں ہے — اگر یہ حقیقت پورے طور پر سمجھ لی جائے تو یہ بات سمجھ لینے میں کوئی دشواری نہ رہے گی کہ دلائل سے گذر کر صرف رسول کے اعتماد پر اس کے اقوال و افعال کو تسلیم کر لینے کا نام ایمان ہے۔ اسی میں انسانی عقول کی آزمائش ہے۔

اگر نبوت اللہ تعالیٰ کی نمائندہ ہے اور نبی جو کچھ کہتا ہے خدا کی طرف سے کہتا ہے تو اس کے اعتماد پر اس کے تمام دین کو تسلیم کر لینا طبیعت کا ایک تقاضا ہونا چاہیئے۔ کسی حقیقت کے مسلّم ہو جانے کے بعد دلائل کی تلاش روشن خیالی نہیں ہے۔ ایمان بالغیب کا راستہ ہی ایک راستہ ہے جس میں روح کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے اس لیئے اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ —— ایمان ایسے عالم پر رکھتے ہیں جو محسوسات و معقولات سے ماوراء ہے اور جس کی بابت خبریں صرف نبی کے ذریعے معلوم ہو سکتی ہیں۔ غیب لغت میں شہود کی ضد ہے۔ ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو نظر سے چھپی ہوئی ہو یا مشاہدہ و تجربہ سے باہر ہو۔ آیت میں الغیب سے مُراد ائمہ تفسیر نے وُہ عالم لیا ہے جو حواس و عقل سے ماوراء ہے اور جس کی بابت جو کچھ بھی علم ہوتا ہے وُہ نبوت پر آئی ہوئی وحی کے ذریعے ہوتا ہے[1]

لفظ غیب کے معنے

لفظ غیب پورے قرآن میں بصورت نکرہ کہیں نہیں آیا ہے۔ ہر جگہ

---

[1] تفسیر ماجدی ج ۱ صلا

معرفہ ہے۔ اس جگہ بھی معرفہ آیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جن چیزوں کا صحیح علم بغیر وحی کے نہیں ہو سکتا۔ احساس اور ادراک کی وہاں تک رسائی نہیں ہوتی ہے اور نبوت وحی کے ذریعے ان کو اطلاع دیتی ہے وُہ نبوت کے بتانے سے مانتے اور یقین رکھتے ہیں۔[1]

حقائق غیبیہ جو مخلوق کی علمی رسائی اور حس سے بالا ہیں۔ ان کا علم اللہ تعالیٰ کو خود بخود ہے یعنی وُہ اپنے علم میں کسی ذریعہ اور وسیلہ کا محتاج نہیں ہے۔ زمخشری نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غیب سے وُہ مخفی اور پوشیدہ چیزیں مراد ہیں جن تک بلا واسطہ اللہ کے سوا کسی کے علم کی رسائی نہیں ہے۔ المراد به الخفی الذی لا ینفذ فیه ابتداء الا علم اللطیف الخبیر۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ ہمیں تو ان حقائق غیبیہ میں سے صرف ان کا علم ہوتا ہے جو ہمیں بتلائی جاتی ہیں۔ اس لیے کسی شخص کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ فلاں غیب داں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کے لیے غیب داں بولنا جائز نہیں ہے۔ اور میر سیدؒ نے اس کی عقلی وجہ یہ بتائی ہے کہ کسی کو دانائے غیب کہنا اس لیے درست نہیں ہے کہ اس سے بلا واسطہ اس کی علمی رسائی کا دعویٰ ہوتا ہے۔ یہ کہنا تو درست ہے کہ اللہ نے فلاں کو غیب کی بات بتا دی ہے لیکن یہ کہنا ٹھیک نہیں ہے کہ فلاں غیب داں ہے۔ پہلی بات میں ذریعہ کا اقرار ہے اور دوسرے پیمانہ میں واسطہ اور ذریعہ کا انکار ہے۔

اگر یہ حقیقت ہے کہ نبی وُہ ذاتِ گرامی ہے جس کا علمی ذریعہ اللہ کی وحی ہو تو پھر یہ کہنا کہ نبی غیب داں ہے میر سیدؒ کے لفظوں میں صریح تناقض ہے کیونکہ نبی کے لیے وحی کو علمی ذریعہ مان کر نبی کو غیب داں کہنے والا اس ذریعہ کی نفی کرتا ہے۔ میر صاحبؒ کے الفاظ یہ ہیں:

لانه یتبادر منه تعلق علمه به ابتداء فیکون تناقضاً[2]

بہرحال آیتِ قرآنی میں غیب سے مُراد اس عالم کے حقائق ہیں جو حواس و عقل انسانی سے ماوراء ہے یُوں سمجھئے کہ

انسان کے علم و ادراک کا ذریعہ حواسِ خمسہ ہیں یعنی دیکھنے، سننے، سونگھنے، چکھنے اور چھونے کی قوتیں۔ جو کچھ ان کے ذریعے معلوم ہو سکتا ہے وُہ اس کے لیے محسوس ہے اور جو معلوم نہیں ہو سکتا غیر محسوس ہے۔ قرآن نے اس مطلب کے لیے غیب اور شہادت کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔

---

[1] لغات القرآن ص۲۸ [2] حاشیہ کشاف ج ۱ ص ۹۵

وَيُقِيمُونَ الصَّلٰوةَ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُونَ ۝

اور وُہ نماز قائم کرتے ہیں۔ اور جو کچھ ہم نے ان کو (نعمتیں) دی ہیں اس میں سے وُہ خرچ کرتے ہیں۔

عالم غیب یعنی غیر محسوسات، عالم شہادت یعنی محسوسات فرمایا۔ خدا پرستی کی بنیاد یہ ہے کہ ان حقائق پر یقین رکھے جو اگرچہ اس کے لیے غیر محسوس ہیں لیکن وجدان ان کی شہادت دیتا ہے اور وحی نے ان کی خبر دی ہے مثلاً خدا کی ذات وصفات ملائکہ، وحی ونبوت، مرنے کے بعد کی زندگی، عذاب وثواب، دُنیا کی ابتدائی پیدائش، عالم آخرت کے احوال وواردات[1]۔

اقامتِ صلوٰۃ

۵ — اقامت صلوٰۃ کا مطلب یہ ہے کہ ہمیشہ رعایت حقوق کے ساتھ وقت پر نماز ادا کرتے ہیں[2]۔ قائم رکھنا یہ بھی ہے کہ اس کو پابندی سے ہمیشہ ادا کرتے ہیں اور اس کے شرائط اور ارکان پورے بجالاتے ہیں[3]۔

اقامتِ صلوٰۃ کے معنے صرف نماز پڑھنے کے نہیں ہیں بلکہ نماز کو ہر جہت اور ہر حیثیت سے درست کرنے کا نام اقامت صلوٰۃ ہے اور صحیح یہ ہے کہ اس جگہ نماز سے کوئی خاص نماز مُراد نہیں ہے۔ بلکہ فرائض، واجبات اور نفلی نمازوں کو یہ لفظ شامل ہے[4]۔

یہ قرآن سے فائدہ اُٹھانے کی تیسری شرط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ صرف مان کر بیٹھ جانے والے ہوں وُہ قرآن سے فائدہ نہیں اُٹھا سکتے۔ اس سے فائدہ اُٹھانے کے لیے ضروری ہے۔ کہ آدمی ایمان لانے کے بعد فوراً ہی عمل طاعت کے لیئے آمادہ ہو جائے اور عمل طاعت کی اولین علامت اور دائمی علامت نماز کی ادائیگی ہے۔ ایمان لانے کے بعد چند گھنٹے بھی نہیں گذرتے کہ موذن نماز کے لیئے

[1] ترجمان القرآن ج ۱ ص ۳۰۳۔ [2] حاشیہ شیخ الہند ص ۳۔ [3] بیان القرآن ج ۱ ص ۷۔ [4] معارف القرآن ج ۱ ص ۹۵

پکارتا ہے اور اس وقت فیصلہ ہوجاتا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے والا اطاعت کے لیے بھی تیار ہے یا نہیں پھر یہ مؤذن پانچ وقت پکارتا رہتا ہے۔ اور جب بھی انسان اس کی پکار پر لبیک نہ کہے اسی وقت ظاہر ہوجاتا ہے کہ مدعی ایمان میں طاعت کا مادہ کس قدر ہے۔

صلوٰۃ کے معنے

صلوٰۃ کے لفظی معنے دُعار کے ہیں۔ امام راغبؒ کا بیان ہے کہ بہت سے اہلِ لغت کا بیان ہے۔ کہ صلوٰۃ کے معنے دُعار کرنے، برکت مانگنے اور بزرگی سے یاد کرنے کے ہیں۔ اور وُہ صلوٰۃ جو عباداتِ مخصوصہ ہے یعنی نماز، اس کی اصل بھی دُعار ہے۔ جس طرح کسی چیز کو اس کے بعض اجزار کے نام پر موسوم کر دیتے ہیں اسی طرح یہ عبادت بھی صلوٰۃ سے موسوم ہوئی ہے کیونکہ یہ دُعار پر مشتمل ہے۔ نماز ان عبادات میں سے ہے جس سے کوئی شریعت خالی نہیں رہی۔ گر اس کی صُورتیں ہر شریعت میں مختلف رہی ہیں۔ اور بعض علمار کا خیال ہے کہ صلاۃ کی اصل صلا ہے ان کا بیان ہے کہ صلّٰی کے معنے ہیں عبادت کے ذریعے صلا کو جو اللہ کی سلگائی ہوئی آگ ہے اپنے اُوپر سے ہٹا دیا[1]

بعض علمار کے نزدیک اگرچہ اس مقام پر صلاۃ سے مطلق نماز مراد ہے فرض ہو یا نفل۔ لیکن امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ فرض نماز مُراد ہے کیونکہ اولٰئک ھم المفلحون میں جس فلاح کی خبر دی گئی ہے وُہ صرف فرض نماز پر موقوف ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے کہ ایک اعرابی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اسلام کے کچھ مسائل اور احکام دریافت کیے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ نے دن رات میں پانچ نمازیں تم پر فرض کی ہیں۔ اعرابی نے دریافت کیا کہ کیا اور بھی کوئی نماز فرض ہے۔ آپ نے فرمایا نہیں اس کے بعد اس شخص نے زکوٰۃ اور روزے کے بارے میں دریافت کیا اور یہ کہتا ہوا چل دیا کہ خدا کی قسم میں زیادتی اور کمی نہ کروں گا حضور پُرنور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعرابی کی یہ بات سُن کر ارشاد فرمایا کہ،

افلح الرجل ان صدق۔

اگر اس نے سچ کہا ہے تو فلاح پائی[2]

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اقامتِ صلاۃ نماز قائم کرنا عربی زبان کے محاورے قامت السوق سے بنا ہے یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب بازار میں خوب چہل پہل ہوجائے اور کاروبار عام ہوجائے

---

[1] لغات القرآن ج ۳ ص ۲۳۱ [2] معارف القرآن م ا ج ا ص ۵۵

اس لیئے اقامتِ صلاۃ کے معنے صرف یہی نہیں ہیں کہ آدمی پابندی کے ساتھ نماز ادا کرے بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اجتماعی طور پر نماز کا نظام باقاعدہ قائم کیا جائے۔ اگر کسی محلہ یا بستی میں ایک شخص نماز کا انفرادی طور پر پابند ہو لیکن جماعت نہ ہوتی ہو تو یہ نہیں کہا جاسکتا کہ وہاں نماز قائم کی جارہی ہے[1]۔

بہرحال ان دیکھے خدا کے سامنے جُھکنے، سرِ عبودیت خم کرنے، اس سے گہرا ربط و تعلق پیدا کرنے اور خود افرادِ اُمت میں باہم نظم پیدا کرنے کا بہترین ذریعہ نماز ہے۔ اور بدنی عبادتوں میں یہی فریضہ سب سے اعلیٰ اور ایمان و توحید کا سب سے بڑا عملی مظہر ہے فرد کے لیئے اسلامی نماز باجماعت کے جو اخلاقی، طبی، مادی فائدے ہیں۔ نیز ملت کے لیئے جو معاشرتی، اجتماعی مصلحتیں ہیں ان کی جھلک کہیں دُور سے دیکھ کر یہود، مسیحی اور منکرین تک اس کے دلدادہ ہو گئے ہیں۔ اور ان کے اہلِ علم اپنی تحریروں میں بار بار اس کا ذکر داد اور مدح کے لہجے میں کر چکے ہیں[2]۔

انفاقِ رزق

۴۔۔۔ رزق کلامِ عرب میں بڑے وسیع معنے رکھتا ہے۔ اس کے اندر ہر قسم کی نعمتیں آجاتی ہیں خواہ ظاہری و مادی ہوں مثلاً مال، صحت، اولاد، یا معنوی و روحانی مثلاً علم و حکمت، فہمِ سلیم وغیرہ۔ رزقنٰھم میں ہر رزق کو اپنی طرف منسوب کر کے بتا دیا کہ جو نعمت جتنی اور جس قسم کی بھی انسان کو ملتی ہے سب اللہ تعالیٰ کے فیض و عطا کا ثمرہ ہوتی ہے انسان کی اپنی کوئی چیز نہیں ہوتی[2]۔

یہ قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھانے کی چوتھی شرط یہ ہے کہ آدمی تنگ دل نہ ہو، زرپرست نہ ہو۔ اس کے مال میں خدا اور بندوں کے جو حقوق مقرر کیئے جائیں انہیں ادا کرنے کے لیئے تیار ہو۔ جس چیز پر ایمان لایا ہے اس کی خاطر مالی قربانی کرنے میں دریغ نہ کرے[3]۔

سب طاعتوں کی اصل تین ہیں۔ اول جو باتیں دل سے تعلق رکھتی ہیں۔ دوسری بدن سے تیسری مال سے۔ اس آیت میں تینوں کو بالترتیب بیان کر دیا ہے[4]۔

انفاق سے مُراد

صحیح اور تحقیقی بات جسے جمہور مفسرین نے اپنایا ہے یہی ہے کہ اس آیت میں ہر قسم کا وہ خرچ شامل

---

[1] تفہیماتِ الٰہیہ [2] تفسیر ماجدی صلہ [3] تفسیر ماجدی صلہ [4] تفہیم القرآن صلہ [5] حاشیہ شیخ الہندؒ صلہ

وَالَّذِیْنَ یُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَیْكَ وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ ۚ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ یُوْقِنُوْنَ ۝

اور وُہ لوگ جو اس صداقت پر ایمان رکھتے ہیں جو تم اللہ کی جانب سے لے کر آئے ہو اور ان تمام سچائیوں پر بھی جو تم سے پہلے دوسرے انبیاء لاتے رہے ہیں۔ اور اس زندگی کے بعد آنے والی زندگی پر بھی بھرپور یقین رکھتے ہیں (نہ کہ موجودہ عارضی زندگی پر)

ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے خواہ فرض زکوٰۃ ہو یا دوسرے صدقات، واجب یا نفلی صدقات وخیرات۔ کیونکہ قرآن حکیم میں جہاں بھی لفظ انفاق آیا ہے عموماً نفلی صدقات میں یا عام معنے میں استعمال ہوا ہے فرض کے لیے عموماً لفظ زکوٰۃ ہی آیا ہے۔ اس مختصر جملے میں لفظ مما رزقناھم پر غور فرمایئے کہ ایک طرف اس کے ذریعے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنے کا ایک قوی داعیہ انسان کے دل میں اس تأثر کے ساتھ پیدا کیا ہے کہ جو کچھ مال ہمارے پاس ہے یہ اللہ تعالیٰ ہی کا دیا ہوا اور اسی کی امانت ہے۔ اگر ہم تمام مال کو بھی اس کی راہ میں اس کی رضا کی خاطر خرچ کر دیں تو حق اور بجا ہے ــــــ اور دوسری طرف مِمَّا کا اضافہ کر کے یہ بھی فرما دیا کہ اللہ کی راہ میں سب نہیں بلکہ کچھ دینا ہے[1]۔

یہ آیت دراصل دورِ نبوت کے صحابہ کی مدح میں آئی ہے۔ صحابہ کا حال یہ تھا کہ وُہ بھی جن کے پاس کچھ نہ تھا اللہ کی راہ میں کچھ نہ کچھ دینے کے لیے بے قرار رہتے تھے۔ چنانچہ جب یہ حکم ہوا کہ مسلمان پر صدقہ دینا واجب ہے تو غریب و نادار صحابہ نے آکر عرض کی کہ اے خدا کے رسول! جس کے پاس نہ ہو وُہ کیا کرے۔ فرمایا وُہ محنت مزدوری کر کے اپنے ہاتھ سے پیدا کرے خود بھی فائدہ اٹھائے اور دُوسروں کو بھی صدقہ کرے۔ انہوں نے پھر گزارش کی کہ جس میں اس کی بھی طاقت نہ ہو تو وُہ کیا کرے

---

[1] معارف القرآن م ش ع ا ص ۸

فرمایا کہ وُہ فریاد خواہ حاجت مند کی مدد کرے۔ انہوں نے دریافت کیا کہ اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو ارشاد ہوا کہ وُہ نیکی کا کام کرے اور بُرائی سے بچے یہی اس کا صدقہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا یہ اثر ہوا کہ صحابہ بازار جا کر مزدوری کرتے اور جو کچھ ملتا اس کو اللہ کی راہ میں خرچ کرتے

اللہ کی کتابوں پر ایمان

۷ ـــ پہلی آیت میں ان لوگوں کا بیان تھا جن مشرکین مکہ نے ایمان قبول کیا۔ اور اس آیت میں ان کا بیان ہے جو اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ سے مشرف باسلام ہوئے[1] ـــ مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں متقین کی باقی صفات کی نشاندہی کی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ زمانۂ نبوت میں متقین دو طرح کے حضرات تھے۔ ایک وُہ جو پہلے مشرکین میں سے تھے پھر مشرف باسلام ہو گئے تھے۔ دوسرے وہ جو پہلے اہل کتاب یہودی یا نصرانی تھے پھر مسلمان ہو گئے تھے۔ اس سے پہلی آیت میں پہلے طبقہ کا ذکر ہے اور اس آیت میں دُوسرے طبقہ کا۔[2]

یہ فرمایا کہ وُہ رسول کے لائے ہوئے ہر پیغام پر ایمان رکھتے ہیں۔ آیت کی عبارت سے یہ مسئلہ صاف ہو جاتا ہے کہ تین چیزیں الگ الگ ہیں۔ ایک کلام کا نازل کرنے والا یعنی اللہ تعالیٰ، دوسرے وُہ جس پر کلام نازل ہوا یعنی اللہ کا رسول، تیسرے خود کلام۔ بروز، تمثل اور حلول و وحدت سب مشرکانہ و نیم مشرکانہ خیالات کی جڑ اس آیت نے کاٹ ڈالی۔ نہ کلام متمثل ہوا ہے نہ رسول اللہ کا اوتار انسانی قالب میں خدا ہے۔ بلکہ خدا خدا ہے اور رسول ایک مستقل عظیم المرتبت انسانی شخصیت ہے اور انسانی شخصیت پر اللہ کا کلام بذریعہ وحی اُتارا گیا ہے۔[3]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے قرآن کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھانے کی پانچویں شرط یہ بتائی ہے کہ آدمی ان تمام کتابوں کو جو خدا نے وحی کے ذریعے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور ان سے پہلے کے انبیاء پر مختلف زمانوں اور ملکوں میں نازل کیں ایمان لائے ـــ اس شرط کی بنا پر قرآن کی ہدایت کا دروازہ ان سب لوگوں پر بند ہے جو سرے سے اس کی ضرورت ہی کو نہ مانتے ہوں یا اس کی ضرورت کو تو مانتے ہوں مگر اس کے لیے وحی و رسالت کی طرف رجوع کرنا غیر ضروری سمجھتے

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص۵ [2] معارف القرآن م ش ص۹۵ [3] تفسیر ماجدی ص۴

ہوں اور خود کچھ نظریات قائم کرکے انہی کو خدائی ہدایت قرار دے بیٹھیں۔ یا آسمانی کتابوں کو مانتے ہوں مگر صرف ان کتابوں کو مانیں جن کو ان کے باپ دادا مانتے چلے آئے ہیں اور اسی سرچشمہ سے نکلی ہوئی دوسری ہدایات کے منکر ہوں۔ ایسے سب لوگوں کو مخاطب کرکے قرآن بتا رہا ہے کہ قرآن اپنا چشمۂ فیض صرف ان کے لیے کھولتا ہے جو اپنے آپ کو خدائی ہدایت کا محتاج مانتے ہوں اور یہ بھی تسلیم کرتے ہوں کہ اللہ سبحانہٗ کی یہ ہدایت ہر انسان کے پاس الگ الگ نہیں آتی بلکہ انبیاء کے ذریعے ہی خلق تک پہنچتی ہے۔ اور پھر وُہ کسی نسلی اور قومی تعصب میں بھی مُبتلا نہ ہوں اس لیے حق جہاں آیا ہے اور جس شکل میں آیا ہے اس کے آگے سر جُھکا دیں[1]۔

۸۔۔۔آپ سے پہلے انبیاء خواہ وُہ کسی ملک کسی قوم اور کسی زمانہ کے ہوں اور کوئی زبان بولتے ہوں۔ قرآن نے اس آیت کے ذریعے یہ بات صاف کر دی ہے کہ سلسلہ ارشاد و ہدایت کوئی نو پید چیز نہیں بلکہ اس وقت سے قائم ہے جب سے انسان دُنیا میں آیا بسلسلۂ وحی کی عمر اتنی ہی قدیم ہے جتنی کہ انسان کی۔ اور مومن کے لیے تصدیق صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی کافی نہیں بلکہ سارے انبیاء و رسل اور ان کی وحی کی ضروری ہے خواہ وُہ درجہ اجمال میں ہو[2]۔

ختمِ نبوت کی طرف بلیغ اشارہ

آیت کے اس اندازِ بیان نے اس اہم اور ضروری مسئلہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم آخری نبی ہیں اور آپ کی وحی آخری وحی ہے۔ کیونکہ اگر قرآن کے بعد کوئی اور کتاب یا وحی آنے والی ہوتی تو جس طرح اس آیت میں پہلی نبوتوں اور کتابوں پر ایمان ضروری قرار دیا گیا ہے اسی طرح آئندہ نازل ہونے والی کتاب اور وحی پر ایمان لانے کا بھی ذکر ضروری ہوتا۔ لیکن قرآن سب کے سامنے کھلا ہوا ہے دُنیا دیکھ سکتی ہے کہ قرآن نے جہاں ایمان کا ذکر کیا ہے وہاں صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے نازل ہونے والی وحی اور پہلے انبیاء کا ذکر کیا ہے آپ کے بعد آنے والی کسی وحی یا نبی کا کہیں قطعاً ذکر نہیں ہے پھر صرف اسی ایک پر منحصر نہیں بلکہ قرآن نے چالیس پچاس جگہ پر جہاں جہاں یہ تذکرہ چھیڑا ہے وہاں صرف حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے انبیاء پہلی وحی، پہلی کتابوں کا ذکر ہے ہر مقام پر اس کے لیے من قبل اور من

---

[1] تفہیم القرآن ص۴۸ [2] تفسیر ماجدی ص۸

قبلك کی تعبیر اختیار فرمائی ہے کہیں بھی من بعد — من بعدك نہیں آیا ہے۔ اگر نبوت ختم ہونے کا قرآن میں صراحۃً ذکر نہ بھی ہوتا تو قرآن کا یہ اندازِ بیان کافی ہوتا۔[1]

۹ — اس زندگی کے بعد آنے والی زندگی۔ لفظ الآخرۃ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے اس سے مُراد وُہ دارِ آخرت ہے جس کو قرآن دارالقرار، دارالحیوان اور عقبیٰ کے نام سے پکارتا ہے۔ پُورا قرآن اس کے ذکر اور اس کے ہولناک حالات سے بھرا ہوا ہے۔ آخرت پر ایمان لانا اگرچہ ایمان بالغیب میں موجود ہے لیکن اسے خصوصیت کے ساتھ صراحۃً اس لیے ذکر کیا گیا ہے۔ کہ یہ اجزائے ایمان میں اس حیثیت سے بہت زیادہ اہم ہے کہ اس سے ایمان کے تقاضے پورا کرنے کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔[2]

دُنیا کی زندگی کے بعد آنے والی زندگی کو آخرت اسی اعتبار سے کہا جاتا ہے کہ وُہ اس ناسوتی زندگی کے بعد پیش آئے گی۔ قرآنِ عزیز میں اس کا ذکر کہیں الدارالآخرۃ سے آیا ہے اور کہیں صرف الآخرۃ سے۔ جزا و سزا کے لیے ایک مستقل آنے والی زندگی پر یقین رکھنا دین حق کے لوازم میں سے ہے۔[3] یہ چھٹی اور آخری شرط ہے۔ آخرت ایک جامع لفظ ہے جس کا اطلاق بہت سے عقائد کے مجموعے پر ہوتا ہے۔ اس میں حسب ذیل عقائد شامل ہیں۔

۱۔ یہ کہ انسان اس دُنیا میں غیر ذمہ دار نہیں بلکہ اپنے تمام اعمال کے لیے اللہ کے حضور میں جوابدہ ہے۔
۲۔ یہ کہ دُنیا کا موجودہ نظام ابدی نہیں بلکہ ایک وقت پہ جسے اللہ ہی بہتر جانتا ہے یہ ختم ہو جائیگا۔
۳۔ یہ کہ اس دُنیا کی زندگی کے خاتمہ کے بعد اللہ تعالیٰ ایک دُوسرا عالم بنائے گا اور سب کو بیک وقت دوبارہ زندگی دے کر ان کے اعمال کا حساب لے گا۔
۵۔ یہ کہ کامیابی اور اصلی معیار موجودہ زندگی کی خوشحالی اور بدحالی نہیں ہے بلکہ درحقیقت کامیاب وُہ انسان ہے جو اللہ تعالیٰ کے آخری فیصلے میں کامیاب ہوگا اور ناکام وُہ ہے جو وہاں ناکام ہوگا۔

عقائد کے اس مجموعے پر جن لوگوں کو یقین نہ ہو وُہ قرآن سے کوئی فائدہ نہیں اُٹھا سکتے کیونکہ ان باتوں کا انکار تو درکنار ان میں شک و تذبذب کرکے بھی کوئی انسان وُہ راستہ نہیں چل سکتا جو قرآن نے تجویز کیا ہے۔[4]

---

[1] معارف القرآن مدش ج ۱ ص[illegible] [2] معارف القرآن م ش ج ۱ ص[illegible] [3] تفسیر ماجدی ص[illegible] [4] تفہیم القرآن ص[illegible]

ایمان بالآخرۃ

اسلامی عقائد میں یہی وُہ انقلابی عقیدہ ہے جس کے نتیجے میں اسلام کے دورِ اوّل میں ایسا پاکباز معاشرہ منصۂ وجود میں آگیا کہ مسلمانوں کی صورت اور ان کا چال چلن دیکھ کر لوگ دل وجان سے اسلام کے گرویدہ ہو جاتے تھے۔

اس پہلو پر غور فرمائیے کہ اس آیت میں بالآخرۃ کے لیے یومنون نہیں فرمایا یعنی یہ نہیں فرمایا کہ وُہ آخرت کی زندگی پر ایمان رکھتے ہیں بلکہ یہ فرمایا کہ بالآخرۃ ھم یوقنون یعنی وُہ آخرت کی زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ کیونکہ ایمان کے مقابلے میں تکذیب آتا ہے اور یقین کے مقابلے میں شک وتردد ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ آخرت کی زندگی کے لیے صرف تصدیق کرنا مقصد کو پورا نہیں کرتا بلکہ اس کا ایسا یقین ضروری ہے جیسے کوئی چیز آنکھوں کے سامنے ہو متقین کی یہی صفت ہے کہ آخرت میں حق تعالیٰ کے سامنے پیشی اور حساب کتاب پھر جزا وسزا کا نقشہ ہر وقت ان کے سامنے رہتا ہے۔[1]

زمخشری مفسرِ قرآن جن کو اللہ نے عربی زبان شناسی اور قرآنی بلاغت کا عجیب ذوق عطا فرمایا ہے اس موقعہ پر بڑے پتے کی بات فرما گئے کہ عبارت تو بات کو بتانے کے لیے صرف یوقنون بالآخرۃ ہوتی تو بات کا پتہ لگ جاتا۔ لیکن عبارت میں دو تبدیلیاں کی گئی ہیں ایک یہ کہ بالآخرۃ کو پہلے لائے ہیں اور دوسری یوقنون کی پیشانی پر مسند الیہ ھم کا اضافہ کیا ہے۔ پہلی تبدیلی یعنی بالآخرۃ کو پہلے لا کر یہ جتانا مقصود ہے کہ ان کے یقین واذعان کے دائرے میں آخرت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ زندگی کے مختلف اعمال میں آخرت ہی ان کا مرکزی نقطہ ہے اور ان کے مدِ مقابل آخرت کی زندگی کے بارے میں بے حقیقت ہیں ان کے سامنے صرف دُنیا کی زندگی اور اس کا عیش وعشرت ہے۔ دوسری تبدیلی یعنی ھُم کے اضافہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہی لوگ یعنی صحابہ کرام ہی اس یقین کی دولت سے مالا مال ہیں۔ ان کے مدِ مقابل آخرت پر یقین کی اس نعمت سے قطعاً محروم ہیں[2] ــــــ بعض جدید اہلِ باطل نے الآخرۃ کا ترجمہ زمانۂ آخر کی وحی سے کیا ہے تاکہ اس سے ان کی خود ساختہ نبوت کا اجراء قرآن سے ثابت ہو

---

[1] معارف القرآن ج ۱ ص۱۱۰ [2] کشاف ج ۱ ص۱۰۱

أُولَٰئِكَ عَلَىٰ هُدًى مِّن رَّبِّهِمْ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝

یہی لوگ اپنے پروردگار کی جانب سے ہدایت پر ہیں۔ اور یہی دُنیا و آخرت میں اپنی مُراد سے ہمدوش ہونے والے ہیں۔

لیکن یہ نہ ترجمہ ہے اور نہ تفسیر۔ یہ صرف قرآن میں تحریف اور اس سے تمسخر ہے۔

۱۰۔ یعنی اہلِ ایمان کے دونوں گروہ مذکورہ بالا دُنیا میں ان کو ہدایت نصیب ہوئی اور آخرت میں ان کو ہر طرح کی مراد ملے گی۔ جس سے معلوم ہو گیا کہ جو نعمت ایمان سے محروم رہے ان کی دُنیا و آخرت دونوں برباد ہیں۔

سُورۃ فاتحہ میں دُعا بندوں کی زبان سے طلب ہدایت کی تھی۔ دُعا معاً قبول ہوئی کتاب ہدایت نازل ہو گئی۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ یہ علامات اور شرائط جن میں ہوں گی وُہ ہی ہدایت یاب ہوں گے۔ ان ہدایت یاب لوگوں کی خصوصیات و علامات یہ ہیں۔

۱۔ ان کا ضمیر زندہ ہوتا ہے اور دلوں میں خوفِ خُدا ہوتا ہے اس لیئے زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہیں یعنی متقی ہیں۔

۲۔ اس مادی دُنیا سے آگے ان کا اعتقاد عالم غیب پر ہوتا ہے یعنی ایمان بالغیب رکھتے ہیں۔

۳۔ ان کے تعلق مع اللہ کا عملاً یوں اظہار ہوتا ہے۔ کہ وُہ نماز قائم کرتے ہیں۔

۴۔ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ کی مخلوق پر صرف کرتے ہیں۔

۵۔ یہ رسول کے رسولِ برحق اور بہترین معلم و ہادی ہونے اور قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے کا یقین رکھتے ہیں۔

۶۔ پُورے سلسلہ وحی اور نظامِ نبوت کی تصدیق کرتے ہیں۔

۷۔ ان کا کامل اعتقاد یوم آخرت پر ہوتا ہے۔

---

۱ تفسیر ماجدی ص ۳ حاشیہ شیخ الہند ص ۳ تفسیر ماجدی ص

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَوَاءٌ عَلَيْهِمْ أَأَنذَرْتَهُمْ أَمْ لَمْ تُنذِرْهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ۝

بلاشبہ وُہ لوگ جنہوں نے (ایمان کی جگہ) کُفر ہی اختیار کرلیا (اور تسلیم کی جگہ انکار کی راہ کو اپنا لیا) ان کے حق میں آپ کا خبردار کرنا —— نہ کرنا دونوں یکساں ہیں (کیونکہ انہوں نے سچائی کو قبول کرنے کی استعداد کھو دی ہے ان کے لیئے ہدایت کی ساری کوششیں بیکار ہیں) وُہ ماننے والے نہیں ہیں۔

صحابہ کا چہرہ

اولین قرآن کے مخاطبوں میں یہ صفات موجود ہیں۔ اس کے نتیجے میں ان لوگوں کو یہ انعام ملا ہے کہ یہی لوگ اپنے پروردگار کی جانب سے ہدایت پر ہیں۔ اور ان کا ہدایت پر ہونا محض وقتی اور ہنگامی نہیں بلکہ دائمی ہے اور اضطراری نہیں بلکہ اختیاری ہے کیونکہ انہوں نے اپنی فکری صلاحیتوں کے ذریعے اوّل اسے دلائل سے حاصل کیا اور پھر عملی زندگی میں نفس کے سارے تقاضوں کو پامال کرکے اس پر کاربند ہو گئے۔ گویا ہدایت پر ہونا ان سات شرائط، علامات اور خصوصیات کا لازمی نتیجہ ہے۔

۱۱ —— اُولٰئِكَ اسمِ اشارہ یہی لوگ دوبارہ اس لیئے لاتے ہیں کہ یہ ظاہر ہو جائے کہ جس طرح متقین کو ہدایت پر قابو اور قرار حاصل ہے اسی طرح ان کو فلاح کی بھی خصوصیت حاصل ہے اور یہ لوگ دوسروں سے اپنی ان خصوصیات کی وجہ سے ممتاز ہیں[1]۔

مطلب یہ ہے کہ ان کو دُنیا و آخرت میں فلاح کامل ہی ملے گی۔ دُنیا کی تو یہ کہ انفرادی و اجتماعی،

---

[1] معارف القرآن ج ۱ ص ۱۴۳

شخصی اور قومی ہر حیثیت سے جامع ترین و بہترین دستور زندگی کے گذارنے کا حاصل ہو گیا۔ اور آخرت کی فلاح یہ کہ وہاں پورا پورا صلہ مل کر رہے گا

فلاح عربی زبان میں بڑے وسیع معنے رکھتا ہے۔ دُنیا و آخرت کی ساری خوبیوں کا جامع ہے۔ اس لیۓ المفلحون کا پورا ترجمہ کامیاب، بامراد وغیرہ کسی اُردو لفظ سے ہونا دشوار ہے۔ امام لغت زبیدی کا قول ہے کہ زبان ادب کے ماہروں کا اس پر اتفاق ہے کہ عربی زبان میں جامعیت خیر کے لیۓ فلاح سے بڑھ کر کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔ مولانا تھانویؒ نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ حصر کا تعلق فلاح کامل سے ہے نہ کہ فلاح مطلق سے[1]۔

کُفر کی تعریف۔

۲۱۔ کفر کے معنے لغت میں کسی چیز کو چھپانے کے آتے ہیں۔ عربی میں رات کو اسی لیۓ کافر کہتے ہیں کہ وہ لوگوں کی پردہ پوشی کرتی ہے۔ اور کاشتکار کو اس وجہ سے کافر کہا جاتا ہے کہ وہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ اسی اعتبار سے کفر نعمت اور کفران نعمت کے معنے شکر ادا نہ کر کے نعمت کے چھپا دینے کے ہیں۔ اور اسی لحاظ سے وحدانیت شریعت اور نبوت کے انکار کو اس کی تصدیق کے ظاہر نہ کرنے کو کفر کہا جاتا ہے[2]۔

امام غزالیؒ نے کفر کی قانونی تعریف یہ کی ہے کہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایات میں سے کسی ایک کا انکار اور اس کی تکذیب کا نام کفر ہے۔

اور امام رازیؒ نے اس سے زیادہ واضح تعریف کی ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی ہدایات کی تصدیق نہ کرنا جن کا بدیہی اور قطعی طور پر آپ کی لائی ہوئی ہدایات ہونا معلوم ہو کفر ہے[3]۔

انذار کے معنے ایسی خبر دینا جس سے ڈر پیدا ہو جیسے تبشیر ایسی خبر دینے کو کہتے ہیں جس سے خوشی ہو۔ اُردو زبان میں اس کا ترجمہ ڈرانے سے کیا جاتا ہے لیکن صرف ڈرانے کو انذار نہیں کہتے بلکہ اس ڈرانے کو کہتے ہیں جس کا منشاء رحمت و شفقت ہو جیسے والدین بچوں کو آگ، سانپ

---

[1] تفسیر ماجدی [2] لغات القرآن ج ۱ صفحہ ۱۲ [3] معارف القرآن م ۱ ج ۱ صفحہ ۸

اور بچھو سے ڈراتے ہیں۔ جو ڈاکو انسانوں کو دھمکاتے اور ڈراتے ہیں اس کو انذار نہیں کہتے۔ انبیاء کو خاص طور پر نذیر کہا گیا ہے کیونکہ وُہ ازراہِ شفقت آئندہ آنے والے مصائب سے ڈراتے ہیں اور اس میں اشارہ ہے کہ مصلح، مبلغ اور واعظ کے لیئے ضروری ہے کہ اس کے دل میں مخاطبوں کی خیر خواہی اور ہمدردی کا جذبہ موجزن ہو[1]

ان کافروں سے خاص وہ لوگ مُراد ہیں جن کے لیئے کُفر مقرر ہو چکا ہے جیسے ابوجہل اور ابولہب وغیرہ۔ ورنہ ظاہر ہے کہ بہت سے جو لوگ کافر تھے مشرف باسلام ہوتے اور ہوتے رہتے ہیں[2]

خاص لوگ اس وقت مراد ہوں گے جب اس فقرے میں سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم کو خبر بنایا جائے اور اس کے بعد آنے والے جملہ کو اسی کی تاکید قرار دیا جائے۔ اکثر ائمہ تفسیر نے یہی راہ اختیار کی ہے اور لایؤمنون کو تاکید و تفسیر بتایا ہے لیکن ایک دوسری ترکیب بھی ان ہی بزرگوں سے یہ منقول ہے کہ سواء علیھم الخ جملہ معترضہ ہے جو اپنے پہلے فقرے کی حالت کو بیان کرنے کے لیئے آیا ہے۔ اس صُورت میں معنے یُوں ہوں گے کہ جنہوں نے کفر کیا اور ایسا کفر کہ ان پر تیرا ڈرانا نہ ڈرانا برابر رہا ہے وُہ ایمان نہیں لاتے ہیں۔ اور یہ حقیقت ہے کہ جس کے دِل میں دغدغہ، اندیشہ اور خطرہ نہ ہو وُہ کبھی فائدہ نہیں اُٹھا سکتا۔ ہاں جب دِل کی حالت تبدیل کر لیتا ہے تو وُہ بھی فائدہ اُٹھا لیتا ہے۔ اس طرح یہ حکم خاص حالت کے بارے میں ہے۔ یہ درست ہے کہ اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینے کے لیئے یہ بتلایا گیا ہے کہ یہ ضدی اور معاند کفار جو حقیقت کو پہچاننے کے باوجود کُفر و انکار پر جمے ہوئے ہیں یا اپنے تکبر اور گمراہی کی بناء پر کسی حق بات کو سُننے کے لیئے تیار نہیں ہیں ان کی اصلاح اور ایمان کے متعلق جو آپ کوشش فرما رہے ہیں اس کے کوشش ہونے میں کوئی کلام نہیں لیکن ان کے لیئے مؤثر ثابت نہ ہوگی[3]

کیونکہ جو لوگ دلائل حق پر غور نہیں کرتے اور باطل پر جمے رہتے ہیں ان کی دل سے قبول حق کی استعداد روز بروز کم ہوتی جاتی ہے یہاں تک کہ بالکل مُردہ ہو جاتی ہے جو اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں اس کی پیدائش کے ساتھ رکھی ہوتی ہے ——— ترکیب خواہ کوئی ہو مطلب ایک ہی ہے خاص افراد ہوں یا خاص احوال، مآل ایک ہی ہے۔

یہاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ بات بتلائی گئی ہے کہ آپ کچھ بھی کر ڈالیئے ان کے حق میں

---

[1] معارف القرآن م ش ص۶۱ [2] حاشیہ شیخ الہند ص۶ [3] معارف القرآن م ش ص۹۲

خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ ۭ وَعَلٰٓى اَبْصَارِهِمْ غِشَاوَةٌ ۡ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝

(وُہ ایمان کیوں نہیں لاتے ؟ اس لیئے کہ) اللہ نے ان کے دلوں پر کانوں پر مُہر لگا دی ہے ـــــ اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ اور ان کے لیئے سخت سزا ہے۔

سب یکساں ہے۔ یہ بدبخت اپنی حق شناسی کی صلاحیت کو ضائع کر چکے ہیں۔ ظاہر ہے فرد سے متعلق ہو یا فرد کی حالت سے یہ خبر ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو دی ہے۔ مرضیٔ الٰہی سے اس کا دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ علم اور مرضی کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہے۔ طبیب حاذق اپنے علم کی رُو سے مدتوں پیشتر خبر دے دیتا ہے کہ فلاں بدپرہیز خود راستے مریض اچھا نہ ہوگا۔

حضرت تھانویؒ نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی ہے ان کافروں کا ناقابلِ ایمان ہونا اللہ تعالیٰ کی اس خبر کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ خود اللہ تعالیٰ کا یہ خبر دینا ان کافروں کے ناقابلِ ایمان ہونے کی وجہ سے ہوا۔ اور ناقابلِ ایمان ہونے کی صفت خود ان کی شرارت عناد اور مخاصمتِ حق کے سبب پیدا ہوئی ہے۔[1]

اس لیئے اگر یُوں کہہ دیا جائے کہ ڈر نہ ہونے کی وجہ سے جنہوں نے چھ شرطیں جن کا اُوپر ذکر ہوا ہے پُوری نہ کیں ان سب کو یا ان میں سے کسی ایک کو بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا وُہ اس نعمت سے محروم رہیں گے اور اس کتابِ الٰہی سے کوئی فائدہ نہ اُٹھا سکیں گے۔ کیونکہ اس کتابِ الٰہی سے فائدہ اُٹھانے کی لازمی شرط یہ ہے کہ دِل میں ڈر ہو بھلائی اور بُرائی میں تمیز کرتا ہو، بُرائی سے بچنا چاہتا ہو بھلائی کا طالب ہو۔ اور جس میں ان باتوں میں سے کوئی نہ ہو وُہ اس کتاب سے فائدہ نہ اُٹھائے گا اور

[1] تفسیر ماجدی مش

نبوت کی دعوت پر ایمان نہ لائے گا۔

انکار و کفر کی یہ حالت کب اور کہاں رُونما ہوتی ہے۔ اسی سوال کا جواب اگلی آیت میں ہے۔

۱۳ــــ ان کے دلوں پر مُہر کر دی یعنی حق بات کو نہیں سمجھتے اور کانوں پر مُہر کر دی یعنی سچی بات کو متوجہ ہو کر نہیں سنتے۔ اور آنکھوں پر پردہ ہے یعنی راہِ حق کو نہیں دیکھتے۔[۱]

ایمان نہ لانے کی وجہ

ایمان نہ لانے کی وجہ اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مُہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کے جتنے راستے تھے وہ سب بند ہیں۔ اس لیے ان سے اصلاح کی توقع رکھنا درست نہیں ہے۔[۲]

اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد پہلے جملے کی دلیل ہے یعنی ان کافروں کے حق میں ڈرانا یا نہ ڈرانا اس لیے برابر ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کے تمرّد اور عناد کی سزا میں ان کے دلوں اور کانوں پر مہر لگا دی ہے اور ان کی آنکھوں پر ایک خاص قسم کا پردہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ان کی سرکشی اور عناد کی سزا میں ان پر علم اور ہدایت کے دروازے بند کر دیئے نہ آنکھ کے راستے سے ہدایت پہنچ سکتی ہے نہ کان کے راستے سے۔[۳]

مطلب یہ ہے کہ جب انہوں نے ان شرطوں کو رد کر دیا جن کا قرآن سے فائدہ اُٹھانے کے لیے اُوپر ذکر کیا گیا اور اپنے لیے قرآن کے پیش کردہ راستہ کے خلاف دوسرا راستہ پسند کر لیا تو اللہ نے ان کے دلوں اور کانوں پر مُہر لگا دی۔ اس مہر لگنے کی کیفیت کا تجربہ ہر اس شخص کو ہوگا جسے کبھی تبلیغ کا اتفاق ہوا ہو۔ جب کوئی آپ کے پیش کردہ طریقے کو جانچنے کے بعد ایک دفعہ رد کر دیتا ہے تو اس کا ذہن کچھ اس طرح مخالف سمت میں چل پڑتا ہے کہ پھر آپ کی کوئی بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ آپ کی دعوت کے لیے اس کے کان بہرے، آپ کے طریقہ کی خوبیوں کے لیے اس کی آنکھیں اندھی ہو جاتی ہیں اور صریح طور پر محسوس ہوتا ہے کہ فی الواقع اس کے دل پر مہر لگ گئی ہے۔[۴]

جمہور مفسرین اور متکلمین یہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں دلوں، کانوں پر مہر لگانے اور آنکھوں پر پردہ ڈالنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع ان کے دلوں اور کانوں پر کوئی مہر اور آنکھوں پر

۱؎ حاشیہ شیخ الہند ص۵ ۲؎ معارف القرآن ص۱۲۶ ۳؎ معارف القرآن ج۱ ص۸۷ ۴؎ تفہیم القرآن ج۱ ص۴۹

کوئی پردہ ڈال دیا ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ متکبرین، معاندین، ہوا پرست اور دشمنانِ دین اپنی طبیعت کجی کی وجہ سے اس درجہ اور اس حالت کو پہنچ گئے تھے کہ ہر برائی ان کو اچھی نظر آتی تھی۔ اور اللہ کی نافرمانی میں ان کو مزہ آتا تھا۔ اخلاقِ ذمیمہ اور رذائل ان کی طبیعتوں کا تقاضا بن کر رہ گئی تھی۔ ان کی حالت اس نجاست کے کیڑے کی طرح تھی جسے گندگی سے طبعاً رغبت اور خوشبو سے نفرت ہو جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کافروں کی اس حالت کو بطور استعارہ ختم اور غشاوۃ سے تعبیر فرمایا ہے اور مطلب یہ ہے کہ جیسے مہر اور پردہ بیرونی اشیاء سے مانع ہوتا ہے اسی طرح ان کی یہ حالت ایمان و ہدایت سے ان کے لیے رکاوٹ بنی ہوئی ہے[1]

در اصل انہوں نے شرارت اور عناد سے خود ہی اپنی صلاحیتوں کو تباہ کر لیا تھا۔ اس استعداد و صلاحیت کی بربادی کا کام خود انہوں نے کیا ہے اور بالارادہ کیا ہے۔ لیکن چونکہ ہر چیز کا خالق اللہ تعالیٰ ہے اس لیے اس آیت میں ختم کی نسبت اپنی طرف کر کے خلق و تکوین کا اظہار فرمایا ہے یہ دنیا دار اسباب ہے جو کچھ ہوتا ہے اسباب کے تحت ہوتا ہے یہاں بھی ان کا ہی کردار ختم کا سبب ہے ورنہ اللہ کا مہر لگانا ان کے کام کا سبب نہیں ہے[2]

اللہ کی طرف سے مہر لگ جانے کا عمل بندہ کے کفر اختیاری کے بعد ہوتا ہے اس کا نتیجہ ہوتا ہے نہ اس کا سبب۔ فطرتِ سلیم ہر انسان کو عطا ہوتی ہے اور اس میں دلائلِ حق پر غور و فکر کی استعداد بھی شامل ہے۔ لیکن انسان جب ارادہ و عقل کا غلط استعمال کرنے لگتا ہے اور آسمانی ہدایتوں اور خدائی نشانیوں سے لگاتار منہ موڑتا ہوا شیطانی قانون پر ہی چلنے کی ٹھان لیتا ہے تو سلسلۂ غضبی کے تحت آجاتا ہے۔ انبیاء کے سلسلۂ رحمت سے خارج ہو جاتا ہے اور نصرتِ الٰہی اس کا ساتھ چھوڑ دیتی ہے اب ہر روشنی اسے تاریک اور ہر تاریکی اسے روشن نظر آتی ہے۔ اس نے اپنے لیے جو کچھ اختیار کیا وہی اللہ تعالیٰ بھی اپنے قانونِ تکوین کے تحت دینے لگتا ہے یہی معنے انسان کے عقل و حواس پر مہر لگ جانے کے ہیں[3]

کفر کا خاصہ

ان دونوں آیتوں سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ کفر اور گناہ کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ اس

---

[1] معارف القرآن ج ۱ ص ۱ [2] بیان القرآن ملخصاً ج ۱ ص ۱ [3] تفسیر ماجدی ص ۱

سے اصلاحِ حال اور نیکی کی توفیق سلب ہو جاتی ہے۔ انسان آخرت کے حساب و کتاب سے بے پروا ہو کر اپنی نافرمانیوں اور گناہوں میں بڑھتا جاتا ہے اور گناہ میں سے گناہ ہونے کا احساس بھی اس کے دل میں مر جاتا ہے۔

حدیث میں ہے کہ انسان جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے قلب پر ایک سیاہ نکتہ پڑ جاتا ہے اور جس طرح سفید کپڑے پر ایک سیاہ نکتہ انسان کو ناگوار نظر آتا ہے اسی طرح انسان کو پہلے گناہ کے نکتہ سے بھی پریشانی اور ناگواری ہوتی ہے۔ لیکن اگر وُہ گناہ سے توبہ نہیں کرتا اور دُوسرا گناہ کر لیتا ہے ایک اور سیاہ نکتہ اس کے دل پر پڑ جاتا ہے اور اسی طرح گناہوں سے نکتوں میں اضافہ ہوتا رہتا ہے یہاں تک کہ گناہ سے لگے ہوئے نکتوں کی سیاہی کی لپیٹ میں پورا دل آ جاتا ہے اور حال یہ ہو جاتا ہے کہ نیکی اور بدی کا امتیاز اس کے دل سے اٹھ جاتا ہے۔ دل کی اسی سیاہی کا قرآن نے ان لفظوں میں پتہ دیا ہے ران علیٰ قلوبھم ما کانوا یکسبون[1]۔

کُفر کے درجے

دونوں آیتوں پر ایک بار مجموعی نظر ڈالو اور اسلوبِ بیان پر غور کرو۔ اگرچہ قرآن نے یہاں محض کُفر کا لفظ استعمال کیا ہے اور کُفر کے معنے انکار کے ہیں۔ لیکن انکار دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک انکارِ محض ہو۔ ایک انکار جارحانہ ہو۔ اس آیت میں اِنکار جارحانہ ہے۔

اِنکارِ محض سے مقصود یہ ہے کہ ایک شخص نبوت کی تعلیم قبول نہیں کرتا اس لیے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی۔ یا اس لیے کہ اس میں طلبِ صادق نہیں ہے۔ یا اس لیے کہ جو راہ چل رہا ہے اسی پر قانع ہے۔ بہر حال کوئی وجہ ہو لیکن وُہ نبوت سے متفق نہیں ہے۔

جارحانہ انکار سے مقصود وُہ حالت ہے جو صرف اسی پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اس میں نبوت کے خلاف ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی سخت سے سخت صورتیں اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح کا مخالف صرف یہی نہیں کرتا کہ وُہ نبوت سے اختلاف رکھتا ہے بلکہ اس کے اندر نبوت کے خلاف بغض و عناد کا ایک غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ وُہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ نبوت کی بربادی و ہلاکت کے درپے

---

[1] معارف القرآن م ش ص۶۵

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّقُوْلُ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَبِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَمَا هُمْ بِمُؤْمِنِيْنَ ۞

کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو کہتے ہیں کہ ہم اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں (لیکن) وہ قطعاً ایمان دار نہیں ہیں۔

ہو جاتا ہے۔ نبوت کتنی ہی اچھی بات کہے وہ جھٹلاتا ہے کتنا ہی اچھا سلوک کیا جائے وہ اذیت پہنچاتا ہے۔ روشنی کو تاریکی کہا جائے تو وہ کہتا ہے کہ تاریکی سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔ کہا جائے کہ کڑواہٹ سے مٹھاس اچھی ہے تو اسے کڑواہٹ میں دنیا کی سب سے بڑی لذت محسوس ہوتی ہے۔

یہی حالت ہے جسے قرآن انسانی فکر و بصیرت کے تعطل سے تعبیر کرتا ہے اور اسی کے لیے وہ دلوں پر، کانوں پر مہر لگانے کا استعارہ بلیغ استعمال کرتا ہے اسی کو شارحین قرآن نے کفر جحود کہا ہے۔

دنیا میں جب کبھی سچائی کی کوئی دعوت ظاہر ہوئی ہے تو کچھ لوگوں نے اسے قبول کر لیا ہے کچھ نے انکار کیا ہے لیکن کچھ ایسے لوگ ہوئے جنہوں نے اس کے خلاف طغیان و جحود اور ظلم و شرارت کی جتھہ بندی کر لی۔ قرآنی دعوت کے ظہور کے وقت بھی تینوں جماعتیں سامنے آئیں اس نے پہلی جماعت کو اپنی آغوش لے کر اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ کا مژدہ سنایا۔ دوسری جماعت کو دعوت و تذکیر کا مخاطب بنایا۔ اور تیسری جماعت کے ظلم و طغیان پر حسب حالت و مذمت زجر و توبیخ کی۔ ان دو آیتوں میں قرآن نے اسی تیسری جماعت کا چہرہ پیش کیا ہے۔ اگر ایسے گروہ کے لیے اس کے لب و لہجہ کی سختی رحمت کے خلاف ہے۔ تو بلاشبہ اس معنے میں قرآن رحمت کا معترف نہیں ہے یقیناً اس ترازو سے اس کی رحمت نہیں تولی جا سکتی۔[۱]

---

[۱] ترجمان القرآن ج ا ص۱۲۲

جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینے پہنچے تو اسلامی دعوت ایک نئے مرحلے میں داخل ہو چکی تھی مکہ میں تو معاملہ صرف اہلِ مکہ سے تھا مگر مدینے میں اہلِ کتاب یہودی اور عیسائی بھی تھے یہ دونوں جماعتیں ایمان و خدا پرستی کی مدعی تھیں۔ اتباعِ شریعت کا دم بھرتی تھیں، تورات و انجیل کو کتابِ الٰہی مانتی تھیں اور اپنے سوا سب کو دین کی صداقت سے محروم سمجھتی تھیں مگر دونوں نے دین داری کی حقیقت کھو دی تھی اور اعتقاد و عمل کی تمام سچائیوں سے محروم ہو گئے تھے۔

اس گروہ کی حالت کو نفاق سے تعبیر کیا گیا ہے لیکن اس نفاق سے وُہ نفاق مقصود نہیں ہے جو مکہ اور مدینہ کے بعض منافقوں کا تھا کہ بظاہر مسلمان ہو گئے دل میں منکر تھے۔ وُہ دوسرا گروہ ہے اور اس کا ذکر آلِ عمران اور نساء وغیرہ میں آئے گا۔[1]

مدینہ منورہ میں یہودیوں کی آبادی تھی۔ یہاں ان کا بیت المدارس تھا جہاں علمائے یہود اپنی مذہبی کتابیں عربی زبان میں ترجمہ کرکے لوگوں کو سناتے تھے۔ مدینہ میں یہودیوں کے تقدس کا اتنا اثر تھا کہ اوس و خزرج کے قبیلوں میں لوگ نذر مانتے تھے کہ بچہ اگر زندہ رہا تو اس کو یہودی بنائیں گے۔ شہر مدینہ سے شام تک کے اکثر سبز باغات یہودیوں کے قبضے میں تھے بنو قریظہ، بنو قینقاع اور اہلِ خیبر تمام کے تمام یہودی تھے۔[2]

قرآن نے شروع سے ان آیات تک تین جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔

۱۔ طالب حق اور اللہ کی عبادت کی سرشاریاں رکھنے والے۔

۲۔ عام مشرکین عرب جن کے پاس ایمان و خدا پرستی کی کوئی تعلیم موجود نہ تھی محض رسوم و اوہام کے پجاری اور آباء و اجداد کی ریت پر مٹنے والے۔ ان میں سے اکثر کی طبیعتیں گمراہی و فساد کی پختگی سے اس قدر مسخ ہو گئی تھیں کہ کتنی ہی اچھی بات کہی جائے ماننے والے نہیں تھے۔ چنانچہ وُہ خود کہتے تھے تمہاری دعوت کے لیے نہ تو ہمارے دلوں میں جگہ ہے نہ کانوں میں سماعت۔

۳۔ اہلِ کتاب یعنی الہامی کتابوں کے پیرو۔

قرآن نے تینوں کا چہرہ بیان کرنے کے بعد سب سے پہلے یا ایھا الناس کہہ کر دوسری جماعت کو دعوت کا مخاطب بنایا۔ بعد ازیں یا بنی اسرائیل کے عنوان سے تیسری جماعت

---

[1] ترجمان القرآن [2] ارض القرآن ج ۲ ص ۱۰۹

يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۚ وَمَا يَخْدَعُوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۹﴾

(یہ مدعیانِ ایمان) اللہ کو اور اہلِ ایمان کو دھوکا دیتے ہیں حالانکہ (فی الواقع وُہ کسی کو بھی دھوکا نہیں دے رہے ہیں) وُہ خود ہی دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں لیکن وُہ اسے بُوجھ نہیں سکتے (یعنی انہیں اس کا شعور نہیں ہے) ۱۵

کی طرف رُخ کیا۔ اور سب سے آخر میں یا ایھا الذین آمنوا سے پہلی جماعت کو ہدایات دی ہیں اور یہ ہدایات سیاسی، معاشی، معاشرتی اور اجتماعی احکام پر مشتمل ہیں۔

۱۴۔۔ اب منافقوں کا حال اس کے بعد تیرہ آیتوں تک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن دِل سے ایمان نہیں لاتے جو حقیقت میں ایمان ہے۔ صرف زبان سے فریب دینے کے لیے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔[1]

یعنی ان کے دِل میں ایمان کا ذرہ برابر گذر نہیں ہے ایمان ان کو چھو بھی نہیں گیا۔ ظاہر سیاق کا تقاضا تھا کہ آمنّا کی تردید میں ما آمنوا کہا جاتے لیکن یہاں تاکید کے لیے بجائے فعل کے اسم فاعل لائے ہیں تاکہ ان لوگوں سے ایمان کی نفی ماضی، حال اور مستقبل ہر زمانہ سے متعلق نکل آئے۔[2]

پہلی آیت میں ان کے دعویٰ ایمان کی نفی کی گئی تھی۔ ان آیات میں اس کی وجہ بیان کی ہے گویا اس اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب دیا جا رہا ہے کہ ان مدعیانِ ایمان کے بے ایمان ہونے کی وجہ کیا ہے۔ زمخشری نے اس کو استناف قرار دیا ہے۔

فریب کاری

۱۵۔۔ یعنی ان کی فریب کاری نہ خدائے تعالیٰ کے اُوپر چل سکتی ہے کہ وُہ عالم الغیب ہے اور نہ

---

[1] حاشیہ شیخ الہند صـ۵ [2] تفسیر ماجدی صـ۳

اہلِ ایمان پر کہ اللہ تعالیٰ مؤمنین کو بواسطہ پیغمبر اور دیگر دلائل و قرائن سے ان کے فریب سے آگاہ کر دیتا ہے۔ بلکہ ان کی فریب کاری کا وبال اور اس کی خرابی درحقیقت ان ہی کو پہنچتی ہے مگر وُہ اس کو اپنی غفلت اور جہالت اور شرارت سے نہیں سوچتے اور نہیں سمجھتے۔ اگر غور کریں تو سمجھ لیں کہ اس فریب کاری سے مسلمانوں کو نقصان نہیں پہنچا بلکہ اس کا نتیجہ خراب ہم کو پہنچ رہا ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ کے فہم کی یہ نزاکت ہے کہ یہاں یشعرون کا ظاہر ترجمہ چھوڑ کر بوجھنا فرمایا ہے[۱]۔

آیت میں بجائے یعلمون کے یشعرون لائے ہیں۔ شعور عربی زبان میں علمِ حسی کو کہتے ہیں۔ اور اسی کا نام اُردو میں احساس ہے۔ مشاعر انسان کے حواس کو کہتے ہیں، اس لفظ کے لانے میں نکتہ بلاغت یہ ہے کہ ان کو اس مکروفریب سے جو نقصان پہنچ رہا ہے اور پہنچے گا وُہ بالکل مادی ہونے کی طرح صاف اور صریح ہے۔ لیکن یہ احمق فرطِ غفلت سے اس کا احساس بھی نہیں رکھتے[۲]۔

مطلب یہ ہے کہ وُہ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر رہے ہیں کہ ان کی یہ منافقانہ روش ان کو مفید ہوگی حالانکہ دراصل یہ ان کو دُنیا میں بھی نقصان پہنچائے گی اور آخرت میں بھی[۳]۔

آیت میں اہلِ ایمان کو دھوکہ دینا یہ ہے کہ مادی اور سیاسی فوائد حاصل کرنے کے لئے اپنے آپ کو اسلامی سوسائٹی کا فرد ظاہر کرتے ہیں۔ اس قدر گراوٹ کے شکار ہیں کہ اپنے خیال میں اللہ کو بھی دھوکہ دینے کی جُرأت کر رہے ہیں۔

آیت سے معلوم ہوا کہ جو لوگ آج حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت کے جاری ہونے کے معتقد ہیں اور آپ کے بعد کسی شخص کو نبی مانتے ہیں اور اس کے باوجود مسلمان ہونے کا اقرار کرتے ہیں یہ مُسلمانوں کو دھوکہ دے رہے ہیں اور اس اقرار کے ذریعے سیاسی، معاشی اور مادی فوائد حاصل کرنا ان کے پیشِ نظر ہے۔

امام مالکؒ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں جو منافق تھا وُہ اس زمانہ میں زندیق ہے یعنی زندیق وُہ ہے جو منافقوں کی طرح دعویٰ تو مسلمان ہونے کا کرے اور اندر سے کافر ہو۔

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۔ [۲] تفسیر ماجدی ص۔ [۳] تفہیم القرآن ج ۱ ص۔

فِیْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ ۙ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِیْمٌ ۢ ۙ۬ بِمَا كَانُوْا یَكْذِبُوْنَ ۝

ان کے دلوں میں ایک بڑی بیماری ہے سو اللہ نے (اسلام کو سربلند کرکے) ان کی بیماری میں اور اضافہ کردیا اور ان کے لیئے دردناک سزا ہے اس لیئے کہ وُہ جھوٹ کہتے تھے یعنی اپنی نمائش میں سچے نہ تھے۔

۱۶ — یعنی ان کے دلوں میں نفاق اور دینِ اسلام سے نفرت اور مسلمانوں سے کینہ اور عناد۔ یہ مرض پہلے سے موجود تھے اب نزولِ قرآن اور ظہور شوکتِ اسلام اور ترقی و نصرت اہلِ اسلام کو دیکھ کر ان کی وُہ بیماری اور بڑھ گئی۔[1]

دِل کی بیماری

یہ بھی ایک اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ پیچھے فرمایا کہ وُہ فریب خوردہ ہیں لیکن ان کو اپنے فریب خوردہ ہونے کا احساس نہیں ہے سوال ہوا کیوں احساس نہیں ہے؟ جواب میں ارشاد فرمایا کہ ان کو اس لیئے احساس نہیں ہے کہ وُہ بیمار ہیں اور بیماری نے ان کی قوت ادراک کو ختم کردیا ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی بیماری میں جھوٹ، فریب، دھوکہ کی وجہ سے اور اضافہ ہوگیا۔

یہ بیماری منافقت کی بیماری ہے اور اس بیماری میں اللہ کے اضافہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وُہ ان کو فوراً سزا نہیں دیتا بلکہ ان کو ڈھیل دیتا ہے اور اس ڈھیل کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ لوگ اپنی چالوں کو بظاہر کامیاب ہوتے دیکھ کر اور زیادہ منافق بنتے چلے جارہے ہیں ——— اور اس کے ساتھ یہ بھی کہ

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ صفحہ

منافقوں کی بیماری میں اضافہ دو طرح سے ہوتا رہا ہے ایک یہ کہ جوں جوں اسلام کو غلبہ ہوتا رہا ان لوگوں کے دلوں کی کڑھن اور جلن بڑھتی گئی۔ اور دوسرے یہ کہ کلام الٰہی کی ہر ہر آیت کے نزول کے ساتھ ان کے غیظ و غضب میں اور اضافہ ہوتا گیا۔ شارحینِ قرآن نے یہ دونوں پہلو اختیار کیے۔ فَزَادَهُمُ میں حرفِ فا بُعث اہم ہے۔ یہ گویا اس کا اعلان ہے کہ آگے جس بات کا ذکر ہے وُہ محض بطور ثمرہ اور نتیجہ کے پیدا ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی طرف بیماری میں اضافہ کرنے کی نسبت صرف مجازی حیثیت کی ہے یعنی اللہ نے وُہ حالات و اسباب پیدا کر دیئے جن سے ان بدنصیبوں نے اپنی بیماری بڑھانے کا کام لیا۔ اگر وُہ عقل و ارادے سے صحیح کام لیتے تو اُن ہی اسباب و حالات سے ہدایت بھی پا سکتے تھے۔ یہ سزا بھی جو کچھ ملی ٹھیک جُرم کے مناسب حال ملی[1]۔

بیماری اور مرض اصل میں اعتدال سے ہٹ جانے کا نام ہے۔ قرآن و سُنّت میں ان نفسانی کیفیات کو بیماری بتایا گیا ہے جو خود انسان کے کمال (نوعی) میں رکاوٹ بن جائیں اور جن کی وجہ سے انسان انسانیت سے ہٹ کر حیوانیت اختیار کر لیتا ہے۔

حضرت جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ دلوں کی بیماریاں نفسانی خواہشات کی پیروی سے رُونما ہوتی ہیں جیسے جسمانی بیماریاں اخلاط کی بے اعتدالی سے پیدا ہوتی ہیں[2]

اس آیت میں دلوں میں پوشیدہ کُفر کو ان کے دلوں کی بیماری بتایا ہے[3]۔

دِل سے مُراد سینہ کے اندر کا وُہ مضغہ گوشت نہیں ہے جو طبی اصطلاح میں دِل کہلاتا ہے بلکہ وُہ دِل مُراد ہے جو محاورہ زبان میں احساس عقل اِرادہ سب کا مرکز ہے انسانی بول چال میں دِل اسی کو کہا جاتا ہے اور افعال ارادی کا صدور اسی سے ہوتا ہے۔

۱۷ــــ اس جھوٹ کہنے سے وُہ اسلام کا جھوٹا دعویٰ آمنا الخ مراد ہے یعنی دردناک سزا ان کے نفاق کی سزا ہے نہ مطلق جھوٹ بولنے کی۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ کو اسی باریک فرق کو بتانا منظور ہے جو یکذبون کا جھوٹ بولنے کی جگہ جھوٹ کہنا ترجمہ فرماتے ہیں فجزاہ اللہ ما ادق نظرہ یہ عذاب الیم جس کا یہاں ذکر ہے ان کو مطلق کُفر پر نہیں بلکہ ان کی منافقت اور ایمان کی جھوٹی نمائش پر ہوگا۔ کافروں کے لیئے جس عذاب کی خبر دی گئی ہے وُہ عظیم ہے اور ان کے لیے جس کی وعید آئی ہے وُہ الیم ہے اور الیم کے معنے دردناک کے ہیں۔ خوب سمجھ لیا جائے جو منافق تھے وُہ کافر

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۹ [2] معارف القرآن م ش صفحہ ۴۹ [3] حاشیہ شیخ الہندؒ صفحہ ۵

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ قَالُوْٓا اِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُوْنَ ۝ اَلَآ اِنَّهُمْ هُمُ الْمُفْسِدُوْنَ وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ ۝

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ ملک میں دنگا اور ابتری نہ ڈالو (اور اپنی بدعنوانیوں اور غنڈہ گردیوں سے باز آجاؤ) تو کہتے ہیں کہ اجی ہم ہی تو (ملک کی ترقی اور عوام کی) اصلاح کا کام کر رہے ہیں[18] ـــــ یاد رکھو یہی لوگ (ملک میں) فسادی ہیں لیکن ان کو اپنے فسادی ہونے کا احساس نہیں ہے[19]۔

تو تھے ہی۔ لیکن کافر ہونے کے علاوہ کچھ اور بھی تھے یعنی دھوکہ باز، فریب کار اور جھوٹے عذابِ عظیم ان کو ان کے کفر کی وجہ سے ہوگا اور عذاب الیم ان کی منافقت کی وجہ سے ہوگا۔ گویا منافقوں کو دونوں عذابوں کا مجموعہ ہوگا[1]۔

اس سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے کہ آیت میں منافقین کے عذاب کی وجہ بما کانوا یکذبون جھوٹی نمائش بتائی ہے۔ حالانکہ ان میں کفر اور حسد اور دوسرے جرائم بھی موجود تھے۔ اس میں یہ اشارہ پایا جاتا ہے کہ دین کی زندگی کی جھوٹی نمائش ان کا اصلی جرم تھا اور اس بری عادت نے ان کو کفر و نفاق تک پہنچا دیا تھا۔ یہ جھوٹی نمائش ابتداءً کم ہوتی ہے مگر آہستہ آہستہ اس کا دائرہ بڑھتا جاتا ہے اور اس کی شدت بھی زیادہ ہوتی جاتی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے جو ہمیشہ جاری رہتی ہے[2]۔

آیتِ گرامی کا حاصل یہ ہے کہ ان کا دل بیمار ہے البتہ ان کی زبانیں تندرست نظر آتی ہیں۔ قلب کے بیمار پڑ جانے کے بعد صرف اعضاء و جوارح کی صحت کار آمد نہیں ہوسکتی۔ چونکہ ان کا قلب بیمار ہے اور باہر سے تندرست نظر آتے ہیں اس لیے ان کی بیماری کا ظاہری صحت کی وجہ سے

---

[1] تفسیر ماجدی صفحہ ۹ [2] معارف القرآن ج ۱

ادراک نہیں ہو سکتا۔ اور جب دل بیمار ہو تو جوارح کی سلامتی بے سود ہے۔ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اس جماعت کے دل کفر، اعتقادِ بد اور حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عداوت کے مریض تھے۔

شہری زندگی کا فساد

جو لوگ اللہ سبحانہٗ کی ذاتِ گرامی کے بارے میں مخلص نہ ہوں ان میں فساد و صلاح کی قوت تمیز ملیا میٹ ہو جاتی ہے وہ خیر و شر اور صلاح و فساد کا پیمانہ اپنی خواہشات، اپنے ذہنی رجحانات کے تابع رکھ کر بتاتے ہیں۔

۱۸۔۔۔منافقین چند وجوہ سے فساد کرتے ہیں۔ اوّل نفسانی خواہشات میں منہمک تھے اور انقیاد و احکامِ شرعیہ سے کاہل اور متنفر تھے۔ دوم مسلمانوں اور کافروں دونوں کے پاس جاتے تھے اور اپنی قدر و منزلت بڑھانے کو ہر ایک کی باتیں دوسروں تک پہنچاتے تھے۔ سوم کفار سے نہایت مدارات اور ملاطفت سے پیش آتے تھے اور امورِ دین کی مخالفت پر کفار سے اصلاً مزاحمت نہ کرتے تھے۔ اور کفار کے اعتراضات و شبہات کو جو دین کی باتوں پر ہوتے تھے مسلمانوں کے روبرو نقل کرتے تھے تاکہ ضعیف الاعتقاد اور کمزور احکامِ شرعیہ میں متردد ہو جائیں۔ اور جب ان باتوں سے ان کو کوئی روکتا تو جواب دیتے کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تمام قوم و ملک مثل زمانہ سابق شیر و شکر ہو کر رہیں اور نئے دین کی وجہ سے جو مخالفت بڑھ گئی ہے وہ بالکل جاتی رہے۔ چنانچہ ہر زمانہ میں دُنیا طلب اور ہوا پرست ایسا ہی کرتے ہیں[1]۔

یعنی ان کے منافقانہ کردار کی وجہ سے قسم قسم کے فسادات اور طرح طرح کے فتنے رُونما ہونے لگے اور کسی خیر اندیش نے ان کو فہمائش کی کہ اس قسم کی کارروائی ملک میں فساد کا باعث ہوتی ہے۔ اسے چھوڑ دو۔ تو اس کے جواب میں کہتے ہیں کہ ہم ہی تو مصلح ہیں۔ غرض ان کی غباوت یا شرارت اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ فساد کو اصلاح سمجھتے ہیں[2]۔

اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ ایک یہ کہ منافقین کی حرکات فی الواقع ملک میں فتنہ و فساد کا باعث بنی ہوئی تھیں۔ دُوسری یہ کہ منافقین یہ حرکات فتنہ و فساد کی نیت سے نہ کرتے تھے بلکہ ان کو یہ معلوم بھی نہ تھا کہ فتنہ و فساد ان کے کردار کا نتیجہ ہے وَلٰكِنْ لَّا يَشْعُرُوْنَ[3]۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۲ [2] بیان القرآن ص۸ [3] معارف القرآن۔

اس سے معلوم ہوا کہ اسلامی قانون کے علاوہ کسی جاہلی دستور پر قائم رہنا اس کے طور و طریقوں کی اشاعت کرنا فساد فی الارض کے مترادف ہے۔ امن عالم اور نظامِ اقوام قائم اسی وقت ہو سکتا ہے جب انسانی زندگی نبوت کے لائے ہوئے نظامِ حیات کو اپنائے اس سے انحراف بلکہ سرِ مُو تجاوز کرنا بھی دُنیا کو بدنظمی، ابتری، کشت و خون اور ہر قسم کی طبقاتی جنگ کو دعوت دیتا ہے چنانچہ دُنیا اس کا بارہا تجربہ کر چکی ہے۔ اسلام کے اس پہلو پر کہ وُہ نظامِ عالم کا بہترین ضامن ہے ہمارے زمانے میں علامہ اقبالؒ نے شاعرانہ زبان میں خوب لکھ دیا ہے۔[1]

وُہ چاہتے ہیں کہ سب شیر و شکر ہو جائیں آپس میں کوئی اختلاف نہ رہے۔ اس نئے نظامِ حیات کی وجہ سے جو جھگڑا اور اختلاف پیدا ہو جائے وُہ ختم ہو جائے اور ملک اپنی پہلی حالت پر لوٹ آئے اور سلسلہ معاش و تجارت حسبِ سابق جاری ہو جائے[2] ——— اسی کا نام ان کی سیاسی زبان میں اصلاح ہے۔ گویا ان سے جب مطالبہ کیا جاتا ہے کہ زندگی کی درستگی کے لیے نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو دُنیا میں قائم ہونے دو، اس کی راہ میں رُکاوٹ نہ بنو اور اس کے خلاف لوگوں کو نہ اُکساؤ۔ کیونکہ یہی وُہ نظامِ حق ہے جس کے ذریعے ہر قسم کا فساد اور معاشرے کا ہر طرح کا بگاڑ درست ہو سکتا ہے۔ یہ قائم ہو گا تو بگاڑ ختم ہو گا، افتراق کے جراثیم مر جائیں گے، اوہام و رسوم کی بندگی مٹے گی، انسان حریتِ ضمیر، حریتِ فکر اور حریتِ رائے سے مالا مال ہو گا۔ ان کا جواب یہ ہوتا ہے کہ ہم ہی تو لوگوں کی اپنے سربراہوں، اپنے لیڈروں اور اپنے رہنماؤں کی ہدایات کے مطابق اصلاح کر رہے ہیں۔

۱۹ ——— یہ جواب بعینہٖ وُہ ہے جو آج بھی خدا معلوم اُمت کے اندر کتنے منافقوں کی زبان پر ہے دین میں قدم قدم پر رخنے ڈالتے جاتے ہیں اور زبان پر وہی دعویٰ اصلاح اور تعمیر کا۔ محض مصلحون کے معنے یہی ہیں کہ یہ لوگ مُفسد ہونے کے باوجود مصلح ہونے کے مُدعی ہیں سیاسی اصلاح، تہذیبی اصلاح، معاشرتی اصلاح اور دُوسری وُہ تمام اصلاحیں جن کا دعویٰ آج بھی ہر در و دیوار سے ہوتا رہتا ہے وہاں بھی اصلاح کے یہی نعرے تھے۔ دونوں جگہ ایک نُدرح کام کر رہی ہے۔

حکیم الاُمت حضرت شاہ ولی اللہؒ نے شہری زندگی کے جس فساد کی نشاندہی کی ہے وُہ اس نظامِ حیات ہی سے انحراف کا نتیجہ ہے جسے نبوت علم و عمل کی شکل میں لے کر آئی ہے شاہ صاحبؒ

---

[1] تفسیر ماجدی ص۹ [2] معارف القرآن ج ۱ ص۹

وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ آمِنُوا كَمَا آمَنَ النَّاسُ قَالُوا أَنُؤْمِنُ كَمَا آمَنَ السُّفَهَاءُ ۗ أَلَا إِنَّهُمْ هُمُ السُّفَهَاءُ وَلَٰكِن لَّا يَعْلَمُونَ ﴿۱۳﴾

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم بھی ایمان لے آؤ جیسے اور لوگ ایمان لے آتے ہیں۔ تو کہتے ہیں کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں اور نبوت کی لائی ہوئی دعوتِ حق کا ساتھ دیں جیسے یہ کم عقل لوگ ایمان لے آئے ہیں اور ہم بھی بیوقوف ہو جائیں۔ یاد رکھو فی الواقع یہی لوگ بیوقوف ہیں (اگرچہ اپنی جہالت اور بڑائی کی وجہ سے) ان کو اس کا علم نہیں ہے۔

فرماتے ہیں۔

شہری زندگی کا سب سے بڑا فساد یہ ہے کہ بالا دست طاقت عمدہ عمدہ زیور، اچھی پوشاک، بہترین مکان، لذیذ خوراک اور عورت کی نازک اندامیوں میں لگ جاتی ہے۔

اور یہ بھی بتایا ہے کہ

جب بالا دست طاقت یہ مشغلہ اختیار کرے گی تو لوگوں میں معاشی فساد پیدا ہو جائے گا اور اصلاح ناپید ہو جائے گی۔

اور پھر یہ بھی لکھا ہے کہ

بالا دست طاقت کا یہ میلان پوری شہری زندگی میں پھیل جائے گا اور اس طرح پھیلے گا جیسے ہڑکلائے کتے کے کاٹنے سے ہڑک پھیل جاتی ہے۔

اس سے بڑا فساد اور کیا ہو سکتا ہے۔

اصلاح تو حقیقت میں یہ ہے کہ دینِ حق جملہ ادیان پر غالب ہو اور تمام دنیوی اغراض اور منفعتوں کے مقابلے میں احکامِ شرعیہ کی زیادہ رعایت کی جائے۔ اور دین کے بارے میں کسی کی موافقت و

مخالفت کی پروانہ ہو ؎ خاک بر دلداری اغیار باش ——— کا مصداق بن جائے ۱؎

کج فکری

پہلی آیت میں اہل ایمان نے ان کو رذائل سے بچنے کی تلقین کی تھی اور بتایا تھا کہ شہری زندگی میں برائیوں سے بچ کر رہنا چاہیئے۔ اور زمانۂ جاہلیت کے رسوم و دستور کو چھوڑ دینا چاہیئے۔ اس سے ملک و عوام میں بدنظمی، ابتری، کشت و خون اور ہر قسم کی طبقاتی جنگ کو پنپنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اس آیت میں ان کو ایمان کی دعوت دی جا رہی ہے گویا پہلی آیت میں منکرات سے بچنے کا مطالبہ کیا اور اس میں فضائل فراہم کرنے کی پیش کش کی گئی ہے۔ اس سے اشارتاً یہ بھی معلوم ہوا کہ اجتماعی زندگی میں اصلاح کی اصل ترتیب یہی ہے کہ پہلے برائیوں کو ختم کرنے کی فکر کی جائے پھر خوبیوں کو فراہم کرنے کی تدبیر کی جائے۔ فقہا نے بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے کہ مفاسد کے دور کرنے کے لیے پہلے کوشش کی جائے مصالح کی فکر نہ کی جائے۔

۲۰— ایمان کا دعویٰ تو وہ پہلے بھی کرتے تھے کہنے والوں کا مطلب یہ تھا کہ ایمان دل سے لاؤ، دیانت اور راستی کے ساتھ رسول کی رسالت کو تسلیم کرو۔ انقیاد باطن، التزام طاعت، عہدِ وفاداری وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر ایمان صرف علم ہی کا ایک درجہ رہتا ہے۔ ایمان کے لیے ضروری ہے کہ یہ علم ایسی صفت نفس بن جائے کہ دل اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے۔ ان کو نبوت کا، قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کا، آخرت میں مجازات کا علم تھا۔ لیکن انقیاد قلبی اور التزام طاعت نہ تھا۔ ایمان صرف اس کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے آراستہ ہوں اور عہدِ وفاداری کرتا ہو اگر قلب تصدیق کے لیئے آمادہ نہیں تو صرف زبان کا اقرار کسی کو ایماندار نہیں بناتا۔ کہنے والوں نے کہا کہ آمِنُوْا ایمان لاؤ ——— لیکن من گھڑت اور خود ساختہ ایمان نہیں بلکہ کَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ ایسا ایمان لاؤ جیسا لوگ سچائی اور خلوص کے ساتھ ایمان لاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کے دعوے کے صحیح یا غلط ہونے کے لیئے اصلی معیار صرف صحابۂ کرام کا ایمان ہے۔ جو اس کے مطابق نہیں وہ اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نزدیک ایمان نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص قرآنی نظریات کا مفہوم قرآنی بیان یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریحات کے خلاف پیش کرے

۱؎ حاشیہ شیخ الہندؒ ۱۲

اور یہ کہے کہ میں تو یہ مانتا ہوں تو یہ ماننا شرعاً معتبر نہ ہوگا۔ جیسے قادیانی گروہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین ماننے کا دعویٰ کرتا ہے لیکن اس کا مفہوم قرآن کے بیان حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریح کے خلاف ایسا پیش کرتا ہے جس سے مرزا قادیانی کے لیے نبی ہونے کی گنجائش نکل آئے۔ قرآن کی تصریح کے مطابق وُہ ہرگز مؤمن نہیں ہو سکتے ــــــ خلاصہ یہ کہ ایمانِ صحابہ کے خلاف کسی کا ایمان قابلِ اعتبار نہ ہوگا ــــــ اور اس سے آج بھی یہی کہا جائے گا کہ آمِنُوْا كَمَآ اٰمَنَ النَّاسُ۔

۲۱ــ اور لوگ ایمان لائے ہیں۔ النّاس سے ساری نوعِ انسانی مُراد نہیں بلکہ وُہ متعین و مخصوص افراد مراد ہیں جو مخاطبوں کے لیے جانے پہچانے تھے یعنی مہاجرین و انصار۔

۲۲ــ سچے مسلمانوں کو کم عقل اور بیوقوف کہا ہے۔ کیونکہ وُہ یعنی مُسلمان اللہ کے احکام پر دل و جان سے ایسے فدا تھے کہ ان کو اس معاملہ میں لوگوں کی مخالفت اور اس کے نتائج بد کی کوئی پروا نہ تھی۔ اور وُہ زمانے کے بوقلموں انقلابات کو ہیچ سمجھتے تھے۔ برخلاف منافقین کے کہ وُہ مُسلمان اور کافروں سے ظاہرداری کا معاملہ کرتے تھے اور اغراضِ نفسانی کی وجہ سے آخرت سے بالکل بےفکر تھے۔ یہ ابن الوقتی اور مصلحت بینی اس درجہ غالب تھی کہ ایمان اور اسلامی قانون کی پابندی کو ضروری نہ سمجھتے تھے صرف زبانی دعوے پر قناعت کر رکھی تھی[۱]۔

سفہاء کہہ کر اُس وقت کے پکے اور سچے مسلمانوں پر طنز کی ہے یعنی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر۔ یہی سُنّت آج تک چلی آرہی ہے۔ ترقی پسندوں، روشن خیالوں کے دربار سے آج بھی جمود پسند، رجعت پسند، تاریک خیال وغیرہ کیسے کیسے خطابات ہیں جو اہلِ حق کو دیئے جاتے ہیں۔ کیا کہنے ہیں ان کی کم فہمی کے پہلے افساد کو اصلاح کہہ رہے تھے اب احمق بالائے حمق یہ ہے کہ عقل اور دُور اندیشی کو بے عقلی بتا رہے ہیں۔ سفیہ اس کم عقل کو کہتے ہیں جسے اپنے نفع و نقصان کی تمیز نہ ہو[۲]۔

گویا وُہ اپنے نزدیک ان لوگوں کو بیوقوف سمجھتے تھے جو سچائی کے ساتھ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو تکلیفوں، مشقتوں اور خطرات میں مبتلا کر رہے تھے۔ ان کی رائے میں یہ سراسر احمقانہ فعل تھا کہ محض حق پرستی کی خاطر تمام ملک کی دُشمنی مول لی جائے۔ ان کے خیال میں عقل مندی یہ

---

[۱] معارف القرآن ص۸۱ [۲] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۸ [۳] تفسیر ماجدی ص۹

وَاِذَا لَقُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا قَالُوْٓا اٰمَنَّا ۚۖ وَاِذَا خَلَوْا اِلٰى شَيٰطِيْنِهِمْ ۙ قَالُوْٓا اِنَّا مَعَكُمْ ۙ اِنَّمَا نَحْنُ مُسْتَهْزِءُوْنَ ۝

اور جب یہ لوگ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے ہیں[۲۲] لیکن جب اپنے سرغنوں[۲۳] کے ساتھ تنہائی میں ہوتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم تو تمہارے ساتھ[۲۴] ہیں۔ ہم تو ان کے ساتھ (اظہارِ ایمان کرکے) صرف تمسخر[۲۵] کر رہے ہیں۔

تھی کہ آدمی حق اور باطل کی بحث میں نہ پڑے بلکہ ہر معاملے میں صرف اپنے مفاد کو دیکھے۔[۱]

۲۳ یعنی یہی فی الواقع بیوقوف ہیں کہ دُنیوی پادر ہوا، اغراض اور وقت کی مصلحتوں کی وجہ سے آخرت کا خیال نہیں کرتے۔ فانی کو لینا اور باقی کو چھوڑنا کتنی بڑی حماقت ہے؟ اور مخلوقات سے ڈرنا اللہ علام الغیوب سے نہ ڈرنا کتنی بڑی جہالت ہے؟ لوگوں کی خاطر احکم الحاکمین اور اس کے مقبول بندوں کی مخالفت کرنا اور اپنے تئیں صُلح کُل قرار دینا کیسی نادانی ہے لیکن یہ اس درجہ بیوقوف ہیں کہ ایسی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے۔[۲]

اس آیت سے منافقین کی کج فکری ہی کا پتہ نہیں چلتا بلکہ جواب کے اس پیمانہ سے سماجی زندگی میں ان کی برتری کی بھی بُو آتی ہے۔ ریاست اور سرمایہ کے نشے میں وہ یہ بات کہہ رہے ہیں یہ بے باکانہ گفتگو غریب مسلمانوں سے کرتے تھے۔

آوارگی

ان کی اخلاق باختگی کا یہ حال ہے کہ اپنے کمینہ پن، دھوکہ اور فریب کاری کو ذہانت تصور کرتے ہیں۔ حالانکہ درحقیقت یہ ذلت اور کمزوری ہے۔ بااخلاق کبھی دھوکہ باز اور سازشی نہیں ہوتا لیکن

[۱] تفہیم القرآن [۲] حاشیہ شیخ الہندؒ

ان میں اس قدر اخلاقی پستی ہے کہ ان کی ایک ذہنیت یہ تھی کہ

۲۴ــــ یہ عام مسلمانوں کے مقابلے میں تو اکڑتے رہتے تھے لیکن مسلمانوں میں جو صاحب اثر و اقتدار ہوتے ان کے آگے خود جھک جاتے اور ان سے خُلق سے پیش آتے۔ پہلی آیت میں ان کے کردار کا اکڑنے کا نقشہ ہے اور اس آیت میں ان کے جھک جانے اور تملق کا تذکرہ ہے۔ آغاز میں بھی ان کا دعویٰ آمنا باللہ نقل فرمایا۔ اس جگہ پھر نقل کیا ہے یہ تکرار نہیں ہے پہلے صرف ان کا عقیدہ بیان کرنا مقصود تھا اور اب ان کا اخلاق و کردار بتانا پیشِ نظر ہے[1] ــــــ یا یُوں کہہ دیجئے کہ آمنا سے یہ لوگ مسلمانوں کو اس بات کا یقین دلانا چاہتے تھے کہ اب ہم نے دو رُخی اور نفاق کی زندگی چھوڑ دی ہے کیونکہ ان کا زبانی ایمان تو پہلے بھی معلوم تھا[2] ــــــ مگر پہلی بات جو حضرت تھانویؒ نے فرمائی ہے سیاق کے زیادہ مناسب ہے۔

۲۵ــــ سرغنوں یعنی شیاطین۔ مراد ان سے یا تو وُہ کُفار ہیں جو اپنے کُفر کو سب پر ظاہر کرتے تھے اور یا وُہ منافقین مُراد ہیں جو ان میں رئیس سمجھے جاتے تھے[3]۔

شیطان عربی زبان میں سرکش، متمرد اور شوریدہ سر کو کہتے ہیں۔ انسان اور جن دونوں کے لیئے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن میں یہ لفظ زیادہ تر شیاطین جن کے لیئے آیا ہے لیکن بعض مقامات پر شیطان صفت انسانوں کے لیئے بھی استعمال کیا گیا ہے اور سیاق و سباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں شیطان سے انسان مُراد ہیں اور کہاں جن۔ اس مقام پر شیاطین کا لفظ ان بڑے بڑے سرداروں کے لیئے استعمال ہوا ہے جو اس وقت اسلام کی مخالفت میں پیش پیش تھے[4]۔

یہاں شیاطین سے مُراد رؤسائے یہود لیئے گئے جو اپنی سرکشی و طغیانی کے لحاظ سے خود ہی شیطان بنے ہوئے تھے نیز ان کے کاہن جن کے یہ لوگ بہت معتقد تھے[5]۔

۲۶ــــ ہم تو تمہارے ساتھ ہیں یعنی کفر و اعتقاد دین کے معاملہ میں ہم بالکل تمہارے ساتھ ہیں تم سے کسی حالت میں جُدا نہیں ہو سکتے۔ مسلمانوں کے ساتھ تو محض ظاہرداری کے طور پر مصلحتاً اپنا مُسلمان ہونا ظاہر کرتے ہیں ورنہ حقیقتاً تو ہم تمہارے ہی ہم خیال، ہم عقیدہ اور ہم مذہب ہیں[6] انا معکم۔

۲۷ــــ یعنی ظاہری موافقت ہم جو مسلمانوں سے کرتے ہیں اس سے یہ نہ سمجھنا کہ ہم واقع میں ان کے موافق ہیں۔ ہم ان سے تمسخر کرتے ہیں اور ان کی بیوقوفی سب پر ظاہر کرتے ہیں کہ باوجودیکہ ہمارے

[1] بیان القرآن ص۹ [2] جواہر القرآن ص۲۳ [3] حاشیہ شیخ الہند ص۵ [4] تفہیم القرآن ج ۱ ص۵۳ [5] تفسیر ماجدی ص۱۰

اَللّٰهُ يَسْتَهْزِئُ بِهِمْ وَيَمُدُّهُمْ فِي طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُونَ ﴿۱۵﴾

(حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ وہ نہیں بلکہ) اللہ ان کو بنا رہا ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ نے سرکشی میں ان کی رسی ڈھیلی چھوڑ رکھی ہے۔ اور ان کا حال یہ ہے کہ وہ عقل کے اندھے ہیں۔

افعال ہمارے اقوال کے مخالف ہیں مگر وہ اپنی بیوقوفی سے صرف ہماری زبانی باتوں پر ہمیں مسلمان سمجھ کر ہمیں کچھ نہیں کہتے۔ مال غنیمت میں حصہ دیتے ہیں اور ہم سے شادیاں کرتے ہیں اور ہم ان کے راز کی باتیں اُڑا لاتے ہیں اور وہ اس پر بھی ہماری فریب کاری کو نہیں سمجھتے ——— گویا دل وجان سے تو آپ پر فدا ہیں باقی مسلمانوں کو بنانے کے لیے ان کی سی کہہ دیتے ہیں۔

آیت میں فِی طُغْیَانِهِمْ کا تعلق یَمُدُّهُمْ سے ہے۔ بعض تراجم جدیدہ میں اس کو یَعْمَهُوْنَ کے متعلق کر کے ترجمہ اس طرح کیا کہ ——— وہ اپنی سرکشی میں سرگرداں ہو رہے ہیں ——— یا وہ اپنی سرکشی میں اندھوں کی طرح بھٹکتے چلے جاتے ہیں ——— یا وہ اپنی سرکشی میں حیران و سرگرداں ہو رہے ہیں۔ یہ معنے معتزلہ کے موافق اور اہل السنت کے خلاف ہیں۔ اور اہل عرب کے استعمال میں بھی اس کے جواز کی سند نہیں ہے۔ شاہ عبدالقادرؒ نے یہ معنے کئے ہیں ——— ڈھیل چھوڑتا ہے ان کو تکبری اور گمراہی میں حیران، بہکے ہوتے ——— شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ نے اس پر متنبہ فرمایا ہے۔

۲۸ ـــ چونکہ اللہ سبحانہ نے مؤمنین کو فرمایا کہ منافقین کے ساتھ مسلمانوں جیسا برتاؤ کریں ان کے مال وجان سے ہرگز تعرض نہ کریں۔ اس سے اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ ایمان لانے سے جو فائدہ مسلمانوں کو ہوتے ہیں وہ سب فائدے ہیں بھی صرف زبانی دعوئ اسلام سے حاصل ہو گئے۔ اس بنا

پر وُہ بالکل مطمئن ہو گئے حالانکہ انجام کے اعتبار سے یہ معاملہ منافقین کے لیے خطرناک اور ان کو بلاؤں میں پھنسانے کے لیے ہے۔ اس کا انجام نہایت خراب ہے۔ تو اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ یہ تمسخر حقیقت میں کس سے ہوا مسلمانوں سے یا منافقوں سے۔ اور یہ تمسخر کرنے اور بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس تمسخر کا بدلہ اور سزا ان کو دے گا۔[1]

یا یُوں سمجھئے کہ اللہ کا دُنیا میں استہزا یہ ہے کہ

ان کو خوب مال و دولت دیا تاکہ خوب مغرور اور بدمست ہو جائیں اور پھر دفعۃً ان کو پکڑ لیا جائے لوگ اس قسم کی دولت کو نعمت سمجھتے ہیں اور درحقیقت وُہ عذاب و نقمت ہے۔[2]

یا یُوں کہہ دیجئے کہ

ان کو مہلت دی گئی ہے جب خُوب کُفر میں کامل ہو جائیں گے اور جُرم سنگین ہو جائے گا یکبارگی پکڑ لیے جائیں گے۔ چونکہ اللہ کا یہ معاملہ ان کے استہزاء کے مقابلے میں تھا اس لیے اس کو بھی استہزاءً کہہ دیا گیا۔ —— کیونکہ مجازات، سزا، معاوضہ کے موقعہ پر لغت عرب میں یہ محاورہ عام ہے کہ فعل کی جزا کو اصل فعل ہی کے نام سے پکارتے ہیں جیسے نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ۔[3]

۲۹ —— اللہ نے ان کی سرکشی میں ان کی رسی ڈھیل چھوڑ رکھی ہے۔ یہ اللہ کا قانون تدریج، قانون امہال اور قانونِ مد ہے۔ اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کے بارے میں مسلمانوں کو خبر دی ہے کہ جزائے عمل کا قانون ان کی طرف سے غافل نہیں ہے وُہ بتدریج اس نتیجہ تک پہنچیں گے جو سرکشی کا لازمی نتیجہ ہے۔ اگر یہ قانون یہاں کام نہ کرتا تو دُنیا میں ایک وجود بھی فرصت حیات سے فائدہ نہ اُٹھاتا۔ ہر غلطی، ہر کمزوری، ہر فساد اچانک بیک دفعہ بربادی و ہلاکت کا باعث ہو جاتا۔ یہ اللہ کے قانونِ امہال کی دی ہوئی ڈھیل ہے اس لیے —— تاکہ متنبہ و خبردار ہو کر اصلاح و تلافی کا سامان کریں۔[4]

۳۰ —— عقل کے اندھے ہیں۔ یہ ترجمہ ہے يَعْمَهُوْنَ کا۔ یہ عمہ سے بنا ہے اس کیفیت کو کہتے ہیں کہ انسان کو راستہ سُجھائی نہ دے۔ اور وُہ اِدھر اُدھر اندھوں کی طرح ٹٹولتا اور ہاتھ پاؤں مارتا پھرے۔ وحی کی روشنی سے محرومی کے بعد انسان کی واقعی یہی حالت ہوتی ہے۔ اپنی محدود عقل کے سہارے وُہ چاروں طرف ہاتھ پاؤں مارتا ہے۔ طرح طرح کے نظریے قائم کرتا ہے اصول

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص۵ [2] معارف القرآن ج۱ ص۱۰۷ [3] بیان القرآن ج۱ ص۱ [4] تفسیر ماجدی ص۵ [5] ترجمان القرآن ص۵

اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى۪ فَمَا رَبِحَتْ تِّجَارَتُهُمْ وَ مَا كَانُوْا مُهْتَدِیْنَ۝

(یقین کرو کہ) یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی مول لی ہے لیکن نہ تو ان کی تجارت[۱] سُود مند نکلی اور نہ ہدایت پر قائم رہے[۲]۔

وکلیت بناتا ہے ہر طرف ظن و تخمین کے گھوڑے دوڑاتا ہے کھلا ہوا راستہ کوئی نہیں سُجھائی دیتا ہے۔ شک، ارتیاب، بے اطمینانی کے دلدل میں اور زیادہ پھنستا ہے[۳]۔

خسارے کی تجارت

یہ سرکشی میں ڈھیل ہی کا نتیجہ ہے کہ ان لوگوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی خرید لی ہے۔ ہدایت کی راہ ان کے سامنے واضح تھی۔ یہ اگر چاہتے تو ہدایت کو اپنا سکتے تھے لیکن انہوں نے جان بُوجھ کر ہدایت کے بدلے گمراہی کو خریدا۔ اور ایسا کاروبار کیا جیسے کوئی بیوقوف تاجر کرتا ہے۔

۲۱۔ تجارت سے مراد گمراہی کا ہدایت کے بدلے مول لینا ہے[۴] ـــــ گویا ان کو تجارت کا بھی سلیقہ نہیں ہے کہ ہدایت جیسی اچھی چیز چھوڑی ہے اور گمراہی جیسی بُری چیز لے لی ـــــ یعنی یہ ان کی بدبختی کی انتہا ہے کہ انہوں نے ہدایت و ایمان جیسی جنس بے بہا قیمت میں دے کر خریدی بھی تو کیسی نکمی اور بے حقیقت چیز گمراہی و کفر۔ عرب کے باشندوں کا خوب کاروبار پھیلا ہوا تھا اور تجارت کی اصطلاحیں ان کی زبان و ادب کا ایک جُزو بن گئی تھیں جیسا کہ آج انگریزوں کا کاروبار خوب پھیلا ہوا ہے اور کاروباری اصطلاحیں انگریزی زبان و ادب کا جُزو بن چکی ہیں۔

---

[۱] تفسیر ماجدی [۲] حاشیہ شیخ الہندؒ [۳] بیان القرآن [۴] تفسیر ماجدی

مَثَلُهُمْ كَمَثَلِ الَّذِي اسْتَوْقَدَ نَارًا فَلَمَّا أَضَاءَتْ مَا حَوْلَهُ ذَهَبَ اللَّهُ بِنُورِهِمْ وَتَرَكَهُمْ فِي ظُلُمَاتٍ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٧﴾ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَرْجِعُونَ ﴿١٨﴾

ان کی حالت اس شخص جیسی ہے[1] جس نے (رات کی تاریکی میں) آگ روشن کی ہو اور جب اس کے ارد گرد میں اُجالا ہو گیا تو ایسا ہوا کہ اللہ نے ان کی روشنی چھین لی[2] (آگ بجھ گئی اور روشنی جاتی رہی) اور ان کو تاریکیوں میں چھوڑ دیا کہ ان کو کچھ بھی نظر نہیں آتا ہے۔ بہرے، گونگے اندھے ہو کر رہ گئے[3] ان سے واپسی کی کوئی توقع نہیں[36] ہے۔

۳۲— انہوں نے بظاہر ایمان قبول کیا اور دل میں کفر کو رکھا جس کی وجہ سے آخرت کی زندگی میں خرابی اور دُنیا کی زندگی میں خواری سے دوچار ہوتے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے کلام پاک میں ان کے حالات سب کو بتا دیئے۔ ایمان لاتے تو دارین میں سُرخرو ہوتے۔ اس لیئے ان کی تجارت سے ان کو کوئی فائدہ نہیں نہ دُنیا کا نہ آخرت کا۔ اور ان کو یہ احساس نہ ہوا کہ صرف دعویٰ ایمان کو کافی سمجھ کر اس خرابی اور رسوائی کا شکار نہ ہوتے ——— اور راہ یابی سے محروم کیسے نہ ہوتے جب کہ قوتِ ارادہ سے صحیح کام نہ کر کے خود ہی گمراہی خرید رہے تھے۔ تجارت سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ اصل سرمایہ محفوظ رہے اور نفع اس پر بڑھتا رہے۔ یہاں نفع کا کیا ذکر عقلِ سلیم کے سرمایہ کو بھی اُلٹا برباد کر ڈالا۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۵ [2] تفسیر ماجدی ص۱۔

دراصل یہ آیت ایسے ہی بطور نتیجہ آئی ہے جیسے مومنین مخلصین کا اوصاف وخصائص کے ذریعے تعارف کرانے کے بعد فرمایا تھا کہ ـــــ اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ اور دوسرے طبقہ کے معاندانہ کفر کو ذکر کرنے کے بعد بتلایا تھا کہ ـــــ خَتَمَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ وَعَلٰى سَمْعِهِمْ الخ ٹھیک ٹھیک اسی طرح اس طبقہ کے سارے خصائص ذکر کرنے کے بعد ان کے بارے میں فرمایا ـــــ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الضَّلٰلَةَ بِالْهُدٰى الخ

یعنی اس طبقہ کے ایمان کا جھوٹا دعوٰی کرنے، فریبی، دغاباز ہونے، دل کا بیمار ہونے، غدار ہونے اور فسادی ہو کر مصلح بننے کا دعوٰی کرنے، راست بازی کو بیوقوفی اور نفاق وعیاری کو دانشمندی سمجھنے، راست بازوں کی تحقیر اور اہلِ ایمان کا مذاق اُڑانے کی اصلی اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ ان کو ہدایت کے مقابلے میں ضلالت پسند ہے اس لیئے ساری برائیوں کی آماجگاہ بنے ہوئے ہیں حقیقت میں انہوں نے منافع اور مصالح کے پیشِ نظر ایک کاروبار کیا ہے لیکن یہ کاروبار ان کو راست نہیں آیا۔ نفع تو درکنار زبانی اقرار کا اصلی سرمایہ بھی گیا۔ یا یوں کہہ دو کہ عقلِ سلیم کا سرمایہ بھی کھو بیٹھے۔

نفاق کی نفسیاتی کیفیت

نفاق کی نفسیاتی کیفیت کو دو مثالوں سے واضح کیا ہے۔ یہ دو مثالیں دو جماعتوں کے احوال وظروف کی تشریح کرتی ہیں۔ دونوں ایمان کی مدعی ہیں۔ اتباعِ شریعت کا دم بھرتی ہیں لیکن دونوں ایمان سے محروم اور علم وعمل سے بیگانہ ہیں۔ دونوں کی محرومی الگ الگ ہے ایک کی محرومی حصول ومعرفت کے بعد انکار وسرکشی کا نتیجہ ہے اور دوسری کی محرومی نادانی اور جہل کی وجہ سے ہے۔ ایک نے پا کر رُوگردانی کی ہے اس لیے محروم ہے اور دوسرا پا ہی نہ سکا۔ اس لیے محروم ہے۔ محروم دونوں ہیں مگر پہلے کی محرومی زیادہ مجرمانہ ہے کیونکہ اس نے نعمت پا کر اس سے رُوگردانی کی ہے۔ اس لیئے یہ مغضوب اور معتوب ہے اور دوسرے کی حالت محض ضلالت کی ہے۔ غضب اور ضلالت دونوں کے لیئے دو مثالیں پیش فرمائی ہیں۔ ایک آگ کی اور دوسری پانی کی

۴۳ ـــ جو لوگ علم ومعرفت کی جگہ جہل وکوری اور روشنی کی جگہ تاریکی پر قناعت کرتے ہیں اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ نامرادی ومحرومیوں کی وادیوں میں گم ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس حالت

کہ ان لوگوں کے مشابہ بتایا ہے جو بیابان کی سخت تاریکیوں میں ہوں وہاں کوئی بندۂ خدا آگ روشن کرے تاکہ لوگوں کو راستہ نظر آئے۔

جب آگ روشن ہو جائے اور آس پاس میں اُجالا ہو کر راستہ نظر آنے کو ہو۔ یکایک آگ بُجھ جائے اور تاریکی چھا جائے، راستہ بالکل نظر نہ آئے، اندھیرا ہی اندھیرا ہو جائے اور لوگ اندھیرے میں ٹھوکریں کھانے لگیں۔ یہی حال ان کا ہے کفر و جہالت کی اٹاٹوپ تاریکیوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایمان کی آگ روشن کی جس سے گرد و پیش کی ہر چیز نظر آنے لگی۔ وحی کے ذریعے عقائد، اعمال، اخلاق خوب واضح ہو کر سامنے آ گئے۔ یہ ان کی شقاوت اور محرومی ہے کہ اس عالمِ نور میں بھی ان پر منزل گم ہی رہی اور ان کی گوہرِ مقصود تک رسائی نہیں ہوئی۔

دراصل فضا میں تاریکیاں چھائی ہوئی تھیں۔ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اندھیرے میں ایمان کی آگ روشن کی۔ اس روشنی سے آپ کا اردگرد منور ہو گیا۔ لیکن منافقین اس عالمِ نور میں اندھے ہو گئے اور راہِ عمل مفقود ہو گئی یعنی جب ہدایت کا نور ہر طرف پھیل گیا تو بجائے اس کے کہ اس سے مستفید ہوتے انہوں نے خود اپنی اندرونی بصیرت کو ضائع کر دیا لہٰذا اس روشنی سے محروم ہو گئے۔[1]

شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں:۔

اللہ نے نبی سے دینِ اسلام روشن کیا اور خلق نے اس میں راہ پائی اور منافق اس وقت اندھے ہو گئے۔ آنکھوں میں روشنی نہ ہو تو مشعل کیا کام آئے۔[2] ——— اس مثال کو یوں بھی سمجھایا گیا ہے کہ منافقوں کی مثال ایسی ہے کہ کوئی شخص اندھیری گھنگھور رات میں آگ روشن کرے جنگل میں راستہ دیکھنے کی خاطر۔ اور جب آگ روشن ہو جائے اور راستہ نظر آنے کو ہو تو خدا تعالیٰ نے اسے بجھا دیا اور اندھیری رات میں جنگل میں کھڑا رہ گیا کہ کچھ نظر نہیں آتا۔ ایسے ہی منافقین نے مسلمانوں کے خوف سے کلمۂ شہادت کی روشنی سے کام لینا چاہا مگر سرِ دست معمولی فائدہ اُٹھانے پائے تھے کہ نورِ کلمۂ شہادت اور منافع سب نیست و نابود ہو گئے اور مرتے ہی عذابِ الیم میں مبتلا ہو گئے۔[3]

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ

جس طرح یہ شخص اور اس کے ہمراہی روشنی ہونے کے باوجود اندھیرے میں رہ گئے۔ اسی طرح منافقین حق واضح ہونے کے بعد ظلمتِ ضلالت میں جا پھنسے۔ اور جس طرح اس اندھیرے میں ان

---

[1] حاشیہ جواہر القرآن ص۳۳۔ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۵

آگ جلانے والوں کے چشم و گوش و زبان سب بیکار ہو گئے اسی طرح ظلمت ضلالت میں پھنس کر ان لوگوں کی یہ حالت ہو گئی صُمٌّ بُکْمٌ الخ[1]

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے اسلام کی مشعل کو روشن کیا جس کی وجہ سے حق و باطل اور ہدایت و ضلالت خوب روشن ہو گئے اور تمام مخلوق نے اس میں راہ پائی۔ لیکن منافق اندھے ہو گئے۔ اللہ نے ان کے نورِ بصیرت کو سلب کر لیا۔ آفتاب نبوت و ہدایت نے اگرچہ تمام عالم کو روشن کیا مگر جب تک آنکھ میں نور اور بینائی نہ ہو تو آفتاب کی روشنی کیا کام آئے؟[2]

مطلب یہ ہے کہ جب ایک اللہ کے بندے نے روشنی پھیلائی اور حق کو باطل سے، صحیح کو غلط سے، راہ راست کو گمراہیوں سے چھانٹ کر بالکل نمایاں کر دیا تو جو لوگ دیدۂ بینا رکھتے تھے ان پر ساری حقیقتیں کھل گئیں۔ مگر یہ منافقین جو نفس پرستی میں اندھے ہو رہے تھے ان کو اس روشنی میں کچھ نظر نہ آیا۔[3]

یہاں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ جب حقانیت کی آگ خوب روشن ہو گئی اور ہدایت کا نور ہر طرف پھیل گیا تو بجائے اس کے کہ اس سے مستفید ہوتے منافقین نے خود اپنے اندرونی حاسہ بصارت کو ضائع کر دیا اور اس روشنی سے محروم ہو گئے۔[4]

۳۴ ــــ اللہ لے ان کی روشنی چھین لی ــــ روشنی چھین لینے کی نسبت اللہ تعالیٰ کی جانب محض تکوینی حیثیت سے ہے یعنی جب منافقوں نے گمراہ رہنا چاہا اور دعوتِ حق کو قبول و توجہ کے کانوں سے نہیں سنا تو اللہ کی مشیت نے بحیثیت علۃ العلل کے اس پر نتیجہ بھی وہی مرتب کر دیا۔ رضائے الٰہی کو اس میں مطلق دخل نہیں ہے۔[5]

روشنی چھین لینے کے الفاظ سے کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ ان کی تاریکی میں بھٹکنے کی ذمہ داری خود ان پر نہیں ہے۔ اللہ نورِ بصارت اسی کا سلب کرتا ہے جو خود حق کا طالب نہیں ہوتا، خود ہدایت کی جگہ گمراہی کو اپنے لیے پسند کرتا ہے خود صداقت کا روشن چہرہ نہیں دیکھنا چاہتا جب انہوں نے نورِ حق سے منہ پھیر کر ظلمت باطل ہی میں بھٹکنا چاہا تو اللہ نے انہیں اسی کی توفیق عطا فرما دی۔[6]

۳۵ ــــ بہرے ہیں یعنی صدائے حق گویا سنتے ہی نہیں ہیں۔ گونگے ہیں کلمہ حق و ایمان ادا کرنے

---

[1] بیان القرآن صلا [2] معارف القرآن م ۱۴۲ [3] تفہیم القرآن [4] تفسیر ماجدی صلا [5] تفسیر ماجدی صلا [6] تفہیم القرآن صلا

سے ان کی زبانیں گنگ ہیں اور دیدِ حق کی طرف سے ان کی آنکھیں اندھی ہو چکی ہیں[۱] ——— کیونکہ جب ان کی روشنی چھین لی گئی تو ایسے مدہوش ہو گئے کہ سارے حواس کھو بیٹھے لہٰذا اب حق کو نہ دیکھ سکتے ہیں اور نہ سن سکتے ہیں اور نہ کسی سے دریافت کر سکتے ہیں[۲] ——— اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ بہرے ہیں جو حق بات نہیں سنتے، گونگے ہیں جو سچی بات نہیں کہتے، اندھے ہیں جو اپنے نفع و نقصان کو نہیں دیکھتے۔ سو جو شخص بہرا بھی ہو گونگا بھی ہو وُہ کس طرح راہِ راست پر آئے۔ صرف اندھا ہو تو کسی کو پکارے یا کسی کی بات سُنے تو اب ان سے ہرگز توقع نہیں ہے کہ حق کی طرف آئیں[۳]۔

۳۶ ——— دراصل جو اللہ کی دی ہوئی عقل کو تاراج کر کے تاریکیوں میں گم ہو جاتا ہے اس کے لیئے بڑی سے بڑی مشعل بھی سود مند نہیں ہوتی۔ فی الواقع یہ لوگ علم آنے کی ساری راہوں پر پہرہ بٹھا دیتے ہیں نہ آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ نہ کانوں سے سُنتے ہیں اور نہ مُنہ سے بولتے ہیں۔

انصاف سے بتایئے کہ ایسا بے خبر اور گمراہ شخص جو آنکھوں سے نہ دیکھتا ہو، زبان سے نہ بولتا ہو اور کسی کی نہ سُنتا ہو اسے راہ کیونکر مل سکتی ہے۔ تم راہ دکھانے کے لیئے اشارہ کرو وُہ دیکھتا نہیں ہے۔ پکارو وُہ سُنتا نہیں ہے۔ خود پکارنا چاہے تو پکار سکتا نہیں۔ نہ اس کے پاس حق گو زبان ہے نہ حق نیوش کان ہے اور نہ حق شناس نگاہ ہے۔ اس سے ہرگز ہرگز یہ توقع نہیں ہے کہ باطل سے حق کی طرف، کفر سے ایمان کی طرف، شرک سے توحید کی طرف، بدعت سے سُنت کی طرف، ظلم سے عدل کی طرف اور بُرائیوں سے نیکیوں کی طرف پلٹ آتے اور واپس ہو جائے۔ ہاں یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اسے جبراً اُٹھا کر روشنی میں پھینک دے۔ تو ہدایت ایسی چیز نہیں کہ جبراً کسی کے حلقوم میں اُتار دی جائے۔

یہ ان لوگوں کی ضلالت اور گمراہی کے لیئے مثال ہے جو حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے ایمان کے مدعی تھے لیکن نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو جہل و کوری پر قناعت کی وجہ سے قبول نہ کرتے تھے۔ اس میں ان لوگوں کے لیئے بڑی عبرت ہے جو ایمان کے مدعی ہو کر نہ قرآن سنتے ہیں نہ قرآن پڑھتے ہیں اور نہ قرآن دیکھتے ہیں۔ عقائد میں چند توہمات، اعمال میں چند رسوم کی حد تک دین کے نام پر قناعت کیئے ہوئے ہیں۔

---

[۱] تفسیر ماجدی ص[۲] معارف القرآن م ا ص[۳] حاشیہ شیخ الہند ص

اَوْ كَصَيِّبٍ مِّنَ السَّمَآءِ فِيْهِ ظُلُمٰتٌ وَّ
رَعْدٌ وَّبَرْقٌ ۚ يَجْعَلُوْنَ اَصَابِعَهُمْ فِيْٓ اٰذَانِهِمْ مِّنَ الصَّوَاعِقِ
حَذَرَ الْمَوْتِ ۭ وَاللّٰهُ مُحِيْطٌۢ بِالْكٰفِرِيْنَ ۞ يَكَادُ الْبَرْقُ
يَخْطَفُ اَبْصَارَھُمْ ۭ كُلَّمَآ اَضَاۗءَ لَھُمْ مَّشَوْا فِيْهِ ڎ وَاِذَآ
اَظْلَمَ عَلَيْهِمْ قَامُوْا ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَذَھَبَ بِسَمْعِهِمْ وَ
اَبْصَارِهِمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞

یا (پھر ان لوگوں کی مثال ایسی سمجھو) جیسے بارش آسمان سے برس رہی ہو اور اس کے ساتھ کالی کالی گھٹائیں، بادلوں کی گرج اور بجلی کی چمک بھی ہو۔ (ایسے سمے میں) ان کا یہ حال ہے کہ موت کے اندیشہ سے کڑک اور گرج کے سبب اپنی انگلیاں کانوں میں ٹھونس رہے ہیں حالانکہ اللہ نے تو منکرین کو ہر طرف گھیرا ڈال رکھا ہے (اس کی گرفت سے کیسے بچ سکتے ہیں) جب بجلی زور سے چمکتی ہے تو ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ (گویا) قریب ہے کہ وہ ان کی بینائی اُچک لے جائے۔ جب (فضا میں) ذرا چمک ہوتی ہے تو چل پڑتے ہیں اور جب تاریکی چھا جاتی ہے تو ٹھہر جاتے ہیں۔ اللہ اگر چاہے تو یہ بالکل اندھے اور بہرے ہو جائیں یقیناً اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

پہلی مثال آگ کی تھی۔ یہ دوسری پانی کی ہے پہلی مثال ان لوگوں کی نفسیات کو واضح کرنے کے

لیئے بیان فرمائی ہے جو دعوتِ حق کو نادانی کی بنا پر نہیں اپناتے۔ یہ دوسری مثال ان لوگوں کے لیئے جو انکار و سرکشی سے دعوت کا مقابلہ کرتے ہیں۔ تمثیل میں آگ اور پانی کو اختیار کیا گیا ہے۔ آگ جیسے مادۂ نور ہے پانی ایسے ہی مادۂ حیات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اسی تعلق سے قرآن کو اور قرآن کی حامل ذات کو نور کہا ہے۔ اَنْزَلْنَا اِلَیْكُمْ نُوْرًا مُّبِیْنًا۔ اور قَدْ جَآءَكُمْ مِّنَ اللّٰهِ نُوْرٌ۔ اور ایسے ہی قرآن کو روح اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ذریعۂ حیات بتایا ہے۔ اَوْحَیْنَآ اِلَیْكَ رُوْحًا مِّنْ اَمْرِنَا۔ اور اِسْتَجِیْبُوْا لِلّٰهِ وَلِلرَّسُوْلِ اِذَا دَعَاكُمْ لِمَا یُحْیِیْكُمْ۔ گویا جیسے قرآن اور نبوت دلوں میں روشنی اور نورانیت کا ذریعہ ہے ایسے ہی قرآن اور نبوت مُردہ دلوں کی زندگی کا سامان ہیں۔ جو لوگ اس سے فیض یاب ہوں وُہ نورانی ہیں۔ ہمیشہ ان کی روشنی ان کے آگے رہنمائی کے لیئے موجود ہوگی۔ یَسْعٰی نُوْرُهُمْ بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ۔ اور جو ان دونوں کی روشنی سے رُوگرداں ہوں وُہ تاریکیوں میں ہوں گے۔ ایسے ہی جو لوگ قرآن اور صاحبِ قرآن سے استفادہ کرتے ہیں وُہ زندہ ہیں اور جو ان سے روگرداں ہیں وُہ موت کا شکار ہیں اس لیئے گمراہوں کے لیئے آگ کی مثال اور سرکشوں کے لیئے پانی کی مثال اظہارِ واقعہ اور حقیقت ہے۔ آیئے شارحینِ قرآن سے استفادہ کیجئے اور اس پر علیحدہ علیحدہ نہیں مجموعی نظر ڈالیے۔

۷۳ — آسمان سے مینہ شدت کے ساتھ پڑ رہا ہو، کئی طرح کی تاریکیاں بھی اس میں ہوں مثلاً بادل بھی تہ بر تہ ہو، خطراتِ باراں کی بھی بُہتات ہو اور رات بھی اندھیری ہو، شدید تاریکی کے ساتھ بجلی کی کڑک اور چمک بھی ایسی ہولناک ہو کہ وُہ لوگ موت کے خوف سے کانوں میں اُنگلیاں دیتے ہیں کہ آواز کی شدت سے دم نہ نکل جائے۔ اسی طرح پر منافقین تکالیف و تہدیداتِ شرعیہ کو سُن کر اور اپنی خواری و رُسوائی کو دیکھ کر اور اغراض و مصالحِ دنیوی کو خیال کر کے عجیب کشمکش اور خوف و پریشانی میں مُبتلا ہیں اور اپنی بیہودہ تدبیروں سے اپنا بچاؤ کرنا چاہتے ہیں مگر حق تعالیٰ کی قدرت سب طرف سے کُفار کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔ حاصل یہ ہے کہ منافقین اپنی ضلالت اور ظلماتی خیال میں مُبتلا ہیں لیکن جب غلبہ نورِ اسلام اور ظہورِ معجزات کو یہ دیکھتے ہیں اور تاکید و تہدیدِ شرعی سُنتے ہیں تو متنبہ ہو کر ظاہر میں صراطِ مستقیم کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں۔ اور جب کوئی اذیت و مشقت دنیوی نظر آتی ہے تو کفر پر اڑ جاتے ہیں۔ جیسے شدتِ باراں اور تاریکی میں بجلی چمکی تو قدم رکھ لیا پھر کھڑے ہو گئے۔ مگر چونکہ اس کو سب کا علم ہے اور اس کی قدرت سے کوئی چیز باہر نہیں ہے تو ایسے حیلوں اور تدبیروں سے کیا کام نکل سکتا ہے[1]۔

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۶

جس طرح یہ لوگ بارش کے طوفان اور بادل کے اندھیرے میں کبھی چلنے سے رُک جاتے ہیں کبھی موقع پاکر چلنے لگتے ہیں۔ اسی طرح یہ شک و تردد میں پھنسے ہوئے ہیں۔ منافقین بھی کبھی غلبہ اسلام کے آثار و علامات اور ان میں حقانیت اسلام کی جھلک دیکھ کر اس طرف کو بڑھنے لگتے ہیں۔ اور کبھی نفسانی اغراض کی اندھیری میں پڑ کر پھر قبولِ حق سے رُک جاتے ہیں[1]۔

ان آیات شریفہ میں دین اسلام کو بارانِ رحمت کے ساتھ تشبیہ دی ہے اور ان کے شبہات اور نفسانی اغراض کو ظلمات کے ساتھ۔ اور عذاب الٰہی سے ڈرانے والی آیات کو رعد کے ساتھ اور غلبۂ اسلام اور فتوحات کو برق کے ساتھ تشبیہ دی ہے۔ جب عذاب سے ڈرانے والی آیات نازل ہوتی ہیں تو یہ منافق ان کو سننا نہیں چاہتے۔ کانوں میں اُنگلیاں دیتے ہیں اور جب کبھی غلبۂ اسلام کی برق کوندنے لگتی ہے اور اسلام کا نُور چمکنے لگتا ہے تو اسلام کی طرف جھک جاتے ہیں اور جب اغراض نفسانی کی ظلمت اور تاریکی کا غلبہ ہوتا ہے تو رُک جاتے ہیں[2]۔

بارانِ رحمت سے اشارہ ہے طلوعِ اسلام کی طرف۔ تاریکیوں، گرج اور بجلی سے اشارہ ہے ان شدائد کی طرف جو آغازِ اسلام میں اُمت کو برداشت کرنے پڑتے تھے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ شرعی پابندیاں مُراد ہوں جو اظہارِ اسلام کے بعد منافقین پر بھی عائد ہوجاتی تھیں۔ مثلاً ادائے نماز، فریضۂ جہاد، ترکِ امارت قدیم، اطاعتِ رسول وغیرہ۔ کانوں میں اُنگلیاں ٹھونسنے کا مطلب یہ ہے کہ منافقین اپنی بُزدلی، پست ہمتی، دُوں فطرتی کی بنا پر اسلام لانے میں ہر وقت خطرے ہی دیکھ رہے ہوں۔ ایک معنے یہ بھی بتائے گئے ہیں کہ منافقین قرآن مجید کے بیانات اور احکام و مواعید کی تصریحات سننے ہی سے بچنا چاہتے تھے اور کانوں میں اُنگلیاں دے لیتے تھے۔ اس ڈر سے کہ کہیں یہ کلام اثر نہ کر جائے اور انہیں اسلام لاتے ہی نہ بن پڑے۔ بجلی کے بینائی کو اُچک لینے میں یہ بتایا جارہا ہے کہ غلبۂ اسلام کی قوت و شدت کے آثار منافقین کی آنکھوں کو خیرہ کرنے کے لیے کافی ہیں[3]۔

اس مثال میں بارش سے مُراد اسلام ہے جو انسانیت کے لیے رحمت بن کر آیا ہے۔ اندھیری گھٹا، کڑک اور چمک سے مُراد مشکلات و مصائب کا وہ ہجوم اور وہ سخت مجاہدہ ہے جو تحریکِ اسلامی کے مقابلے میں اہلِ جاہلیت کی شدید مزاحمت کے سبب پیش آرہا تھا۔ مثال کے آخری حصے میں ان منافقین کی اس کیفیت کا ذکر کیا گیا ہے کہ جب معاملہ ذرا سہل ہوتا ہے تو یہ چل پڑتے ہیں اور

---

[1] معارف القرآن م ش ص۲۷ [2] معارف القرآن م ا ص۹۶ [3] تفسیر ماجدی ص۱۱

جب مشکلات کے بادل چھا جاتے ہیں یا ایسے احکام دیئے جاتے ہیں جن سے ان کی خواہشاتِ نفس اور ان کے تعصباتِ جاہلیت پر ضرب پڑتی ہے تو ٹھٹک کر کھڑے ہو جاتے ہیں[1]

بارش میں زمین اور زمین کی تمام مخلوقات کے لیئے زندگی ہے لیکن جب برستی ہے تو بادل گرجتے ہیں، بجلی چمکتی ہے، گھٹاؤں سے تاریکی چھا جاتی ہے۔ مستعد طبیعتیں یہ حالت دیکھ کر گھبراتی نہیں ہیں اور سمجھ جاتی ہیں کہ یہ بارانِ رحمت کی برکتوں کا پیش خیمہ ہے وُہ کوشش کرتی ہیں کہ وقت کی برکت سے جس قدر فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے اُٹھالیں لیکن جو لوگ دِل کے کچے اور استعداد سے محروم ہوتے ہیں وُہ بارش کی برکتوں کو تو بھول جاتے ہیں۔ اس کے ظہور کے ہنگاموں سے ڈرنے لگتے ہیں۔

فرمایا یہی حال ان محروموں کا ہے یہ مدعیانِ ایمان وشریعت دعوتِ حق کے منتظر تھے لیکن جب ظاہر ہوئی اور قدرتی طور پر اس کے ساتھ ابتدا ظہور کے مصائب ومحن بھی نمودار ہوئے تو ان کی نظر اس کی برکتوں کی طرف نہیں گئی۔ مصائب ومحن کی آزمائشوں سے سہم کر رہ گئے ٹھیک اسی طرح جیسے ایک بدبخت بارش کے موسم میں کاشت کاری کرنے کی جگہ بادل کی گرج سے ڈر سہما کسی کونے میں دُبکا پڑا ہو۔

فرض کرو ایک شخص اسی عالم میں جا رہا ہے جب بجلی کی چمک سے راستہ نظر آتا ہے تو وُہ ایک دو قدم چل لیتا ہے۔ جب غائب ہو جاتی ہے تو ٹھٹک کر رہ جاتا ہے۔ اس کے پاس نہ تو اس کی کوئی روشنی ہے جو راہ دکھائی دے نہ عزم وہمت ہے جو بڑھائے لے چلے۔

فرمایا یہی حال ان لوگوں کا ہے جو دینِ حق کی روشنی کھو چکے ہیں اور جن کے دلوں میں خدا پرستی کی رُوح باقی نہیں رہی۔ یہ بات نہیں ہے کہ دوسرے گروہ کی طرح چلتے نہ ہوں۔ چلتے ہیں مگر اس طرح کہ جب کبھی بجلی کوند گئی دو چار قدم اُٹھا دیئے پھر وہی تاریکی اور وہی سراسیمگی[2]

دراصل یہ مثال ایک تشبیہ مرکب ہے یعنی حالات کے ملے جُلے مجموعہ کو ایک دوسرے حالات کے مجموعہ سے تشبیہ دی ہے۔ اس مثال میں بارش، تاریکی، گرج، بجلی اور کڑک کے الفاظ، کانوں میں اُنگلیاں ٹھونسنے، آنکھوں کے خیرہ ہونے، روشنی ہونے پر چل دینے، تاریکی چھا جانے پر ٹھہر جانے کی تعبیرات سب ایسی تعبیرات ہیں جن کے ساتھ حالات کو تشبیہ دی گئی ہے۔ جب تک ان کے مشبہات معین نہ ہوں اس مثال کا حُسن نکھر کر سامنے نہیں آسکتا ہے۔ بارش سے مُراد وحی و

---

[1] تفہیم القرآن ص۵۶ [2] ترجمان القرآن ص۳۰۶

نبوت اور ایمان کی دعوت ہے۔ تاریکی، گرج اور کڑک سے وُہ مشکلات مُراد ہیں جو ایمان و نبوت کی راہ میں مخالفین کی مزاحمت سے پیش آرہی تھیں۔ یہ سمجھایا گیا ہے کہ جس طرح مُردہ زمینوں کو بارانِ رحمت نئی زندگی بخشتی ہے اسی طرح نبوت مُردہ دلوں کو نئی زندگی مرحمت کرتی ہے۔ جس طرح بارش کا گرمیوں کی بے قراریوں میں انتظار ہوتا ہے اسی طرح نبوت کا کفر و ظلم کی اٹاٹوپ تاریکیوں میں انتظار ہو رہا تھا۔ یہودی صدیوں سے ایک جانے ہوئے نبی کا انتظار کر رہے تھے۔ آخری نبی اور آپ کی نبوت کی علامتوں سے اپنے ہی دینی نوشتوں کے ذریعے خوب واقف تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری بالکل اچانک نہیں ہوئی بلکہ آپ کی آمد کی پہلے سے انتظار ہو رہی تھی۔ اس مثال میں آپ کی تشریف آوری کو بارانِ رحمت سے تشبیہ دی ہے ظاہر ہے کہ جب بارش آتی ہے تو اپنے ساتھ بادلوں کی گرج، بجلی کی چمک، خوفناک کڑک اور ہولناک تاریکیاں لے کر آتی ہے۔ نبوت کی بارانِ رحمت اس لیئے آتی ہے کہ مُردہ دلوں میں رُوحِ حیات پیدا ہو۔ لیکن اس کے ساتھ مشکلات کے جھکڑ، تکالیف کی تاریکیاں اور مصائب کی ہولناک گرج بھی آتی ہے۔ مشکلات و مصائب دیکھ کر گھبرا جانا اور ان سے سہم کر نبوت کی آئی ہوئی بارانِ رحمت سے محروم ہونا بہت بڑی بدبختی ہے۔ نبوت کی کامیابی دیکھ کر نبوت کی طرف مائل ہو جانا اور حالات کی تبدیلی سے گھبرا کر پیچھے ہٹ جانا ابن الوقتی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کبھی منافع کی توقع میں اور کبھی مصالح کے چکر میں قدم اُٹھانا اور راہ کی مشکلات سے گھبرا کر ٹھہر جانا محرومی کی نشانی ہے۔ جب نبوت کو مادی کامیابی ہوتی ہے اور راحت و آرام کے آثار نظر آتے ہیں اور مادی، معاشی، سیاسی اور اجتماعی فوائد نبوت سے وابستہ ہو جاتے ہیں تو نبوت کی طرف مائل ہو کر نبوت کو زندہ باد کہنے لگتے ہیں۔ لیکن جب حالات میں ذرا تبدیلی آتی ہے اور راحت و آرام کی جگہ مشکلات سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو نبوت کی طرف اُٹھتے ہوئے قدم یکایک رُک جاتے ہیں اور خالص کافرانہ زندگی شروع ہو جاتی ہے۔ اس مثال میں بجلی کی خیرہ کُن چمک سے اسلام کی صداقت و حقانیت کے تابناک دلائل کی جانب اشارہ کیا گیا ہے۔ اور برقی روشنی میں ان کی رہبری اور اس کے غائب ہو جانے کے بعد ان کے توقف سے اس حقیقت کی جانب توجہ دلائی گئی ہے کہ یہ محض مادہ پرست، ابن الوقت اور مصلحت کوش ہیں۔ جب اسلام کی مادی فتح مندیاں اور کامیابیاں دیکھتے تو ان کے حلقوم اضطراراً اسلام کی حمایت میں نعرے لگا لگا کر خشک ہو جاتے ہیں۔ حق کی طلب سے ان کے دل خالی ہیں مصلحت، منفعت یا پھر مرعوبیت کچھ دیر کے لیئے ان کو نبوت کا ہمنوا بنا دیتی ہے اب بھی اگر مشیت الہی

یہی ہوتی تو ان کو بینائی اور شنوائی سے محروم کردیا جاتا مگر اللہ کی یہ سنت نہیں ہے جو کسی حد تک دیکھنا اور سُننا چاہتا ہے اسے دیکھنے اور سننے نہ دے۔

ان آیات میں آج کل کے ان روشن خیال مذبذبین اور متشککین کے لیئے بڑی عبرت ہے جو حق کے حق ہونے کے لیئے مادی غلبہ، ظاہری شوکت، معاشی خوش حالی اور سیاسی برتری کو بمنزلہ شرط سمجھتے ہیں۔ دنیوی کامیابیاں، معاشی خوشحالی اور سیاسی برتری کی حیثیت مقصود کی نہیں بلکہ ذریعہ کی ہے ورنہ یہ چیزیں حق کے حق ہونے کا معیار نہیں ہیں۔ نبوت، اسلام، قرآن اپنی جگہ حق ہیں چاہے ان کے ساتھ مصائب، دشمن ہوں، تکالیف و شدائد ہوں۔

غالباً وہ مثال جو ارشادِ نبوت میں نبوت ہی کے علم و عمل کی نگرانی اور حفاظت کے لیئے حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے صحیحین میں آئی ہے اسی آبی مثال سے مستنبط ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ باطل قوتوں کے طوفان میں نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کے بقا کا کیا قانون ہے۔ مثال میں بارش، زمین، زمین کی قسمیں مشبہ بہا ہیں۔ نبوت کا لایا ہوا علم و عمل، اس کی روایت، اس کا حفظ اور اس کی درایت و فقہ کو ان سے تشبیہ دے کر سمجھایا ہے۔ ارشاد ہے:-

جو علم و عمل اللہ نے مجھے دے کر روانہ فرمایا ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے جو زمین پر برستی ہے زمین کے ایک حصہ نے جو بہت اچھا تھا خوب پانی چوسا، گھاس اور سبزہ اُگایا۔ اور ایک حصہ جو بنجر تھا اس نے پانی کو سمیٹ لیا۔ اس کے ذریعہ اللہ سبحانہ نے دوسروں کو فائدہ پہنچایا۔ خود پانی پیا اور دوسروں کو پلایا۔ لیکن زمین کا ایک حصہ جو چٹیل تھا۔ اس نے نہ پانی روکا اور نہ گھاس اُگایا۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ کے دین میں تفقہ پیدا کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے فائدہ دیا۔ اس نے خود سیکھا دوسروں کو سکھایا اور یہ اس شخص کی مثال ہے جس نے ادھر سر اُٹھا کر نہیں دیکھا اور اس ہدایت کو نہیں اپنایا جسے مجھے دے کر روانہ کیا گیا ہے۔[1]

اس مثال کے ذریعے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو سمجھایا ہے کہ جب بارش ہوتی ہے اور زمین کے لیئے شادابی اور گل ریزی کا سامان ہونے لگتا ہے تم دیکھتے ہو کہ زمین بارش کے پانی کے فائدہ کے لحاظ سے تین حصوں پر منقسم ہو جاتی ہے۔ ایک پانی کو چوس کر پیداوار کرنے

---

[1] صحیح بخاری ج ۱ ص ۱۶

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ ٱعْبُدُوا۟ رَبَّكُمُ ٱلَّذِى خَلَقَكُمْ وَٱلَّذِينَ مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلْأَرْضَ فِرَٰشًا وَٱلسَّمَآءَ بِنَآءً وَأَنزَلَ مِنَ ٱلسَّمَآءِ مَآءً فَأَخْرَجَ بِهِۦ مِنَ ٱلثَّمَرَٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۖ فَلَا تَجْعَلُوا۟ لِلَّهِ أَندَادًا وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

اے انسانو! تم اپنے رب کی بندگی کرو جس نے تم کو اور ان سب کو جو تم سے پہلے گذر چکے ہیں پیدا کیا ہے تاکہ تم متقی بن جاؤ (وہ رب جس نے صرف پیدا ہی نہیں کیا بلکہ) جس نے (تمہیں عدم سے وجود میں لانے کے لیئے) زمین کو بچھونا اور آسمان کو چھت بنایا۔ اور اسی نے آسمان سے پانی برسایا۔ پھر پانی کے ذریعے طرح طرح کے پھل تمہاری غذا کی خاطر بنائے (جب تم کو عدم سے وجود میں وہی لایا ہے اور تمہاری بقا کا سارا سامان اسی کی پروردگاری کر رہی ہے) تو تم یہ جانتے ہوئے کہ (تخلیق اور ربوبیت میں) اس کا کوئی ہمسر نہیں ہے اللہ کی عبادت میں اللہ کا کسی کو ہمسر و ہم پلہ اور مقابل نہ بناؤ۔

والی۔ دوسری پانی کا ذخیرہ رکھنے والی تیسری ناقابلِ کاشت اور ناقابل ذخیرہ۔ ایسے ہی نبوت کے علم و عمل کی بارش کے لیے انسانی قلوب کی زمین بھی تین حصوں میں منقسم ہے۔
۱. وہ جو قرآن وسنت کا ذخیرہ رکھتے ہیں۔
۲. وہ جو قرآن وسنت سے مسائل کا اخراج کرتے ہیں۔
۳. وہ جو نہ ذخیرہ رکھتے ہیں اور نہ ہی استنباط و استخراج کرنے والوں میں سے ہیں۔

پہلی قسم کا مصداق حفاظِ قرآن، مجوّدین، اصحابِ حدیث اور محدثین ہیں۔
دُوسری قسم کا مصداق مجتہدین اور فقہاء ہیں۔
تیسری قسم کا مصداق اُمت کا وُہ طبقہ ہے جو مسلمان ہونے کے باوجود علمِ نبوت سے بہرہ ور نہیں ہے۔ یہ مثال اُمتِ اجابت کے لیے ہے ——— جبکہ
قرآن میں مثال اُمتِ دعوت کے لیے ہے۔

دعوتِ عبادت

اس سے پہلے آیات میں قرآن نے نبوت کے مخاطبوں کو تین قسموں میں تقسیم کرکے یہ دعویٰ کیا تھا کہ نبوت کی تعلیمات سے زندگی میں صرف وُہ فیض یاب ہو سکتے ہیں جو متقی ہوں، سمجھ کر قدم اُٹھاتے ہوں اچھے بُرے، نفع و نقصان، نشیب و فراز کا خیال رکھتے ہوں۔ ان کے لیے فلاح و ہدایت کی ضمانت دی اور تقویٰ کے عملی نمونے پیش کئے۔

ان آیات میں بلا تمیز پُوری انسانیت کو مخاطب کرکے متقی بننے کا عملی پروگرام اور بے خطا نسخہ بتایا ہے کہ اللہ کی عبادت کرو۔ امام محی السنہ بغویؒ معالم التنزیل میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ناقل ہیں کہ قرآن میں جہاں بھی عبادت کا ذکر ہے اس سے توحید مُراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ توحیدِ عبادت مُراد ہے۔ اس آیت میں جیسا کہ آگے بزرگوں کی تشریح میں پڑھیں گے توحیدِ عبادت کی دعوت دی ہے اور اس پر توحیدِ خالقیت اور توحیدِ ربوبیت کو بطورِ دلیل پیش کیا ہے۔ یعنی فرمایا یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کرو کیونکہ وُہ تمہارا اور سب کا خالق اور رب ہے اس لیے تمہاری عبادت کا مستحق بھی وہی ہے۔

ذرا ٹھہر جائیے ان اصطلاحات کا مطلب سمجھ کر قرآنی آیات کی تشریحات پڑھیے۔
جیسا کہ سورۂ فاتحہ کی تشریح میں تین اشارات میں بتایا گیا ہے کہ توحید کے چار درجے ہیں:
۱۔ توحیدِ وجود یعنی واجب الوجود ایک ہی ذات ہے اللہ کی ذات کے سوا جو کچھ جتنا اور جیسا کچھ کائنات میں ہے مخلوق ہے اور ممکن ہے۔ خود بخود واجب صرف اللہ کی ذاتِ گرامی ہے۔ اسی کا وجود اصلی اور اپنا ہے باقی کا وجود عارضی اور عطیہ خداوندی ہے۔
۲۔ توحیدِ خالقیت یعنی عرش و فرش اور تمام کائناتِ ہستی کا اللہ ہی خالق ہے اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی خالق نہیں ہے۔

۳۔ توحیدِ ربوبیت یعنی ساری کائنات کو پیدا کرنے کے بعد باقی رکھنے والا اور اس کے نظام کو چلانے صرف اللہ ہی ہے۔

۴۔ توحیدِ عبادت یعنی ہمارے نیاز مندانہ اعمال اور عابدانہ عجز و نیاز کا مستحق صرف اللہ سبحانہ ہے۔ دُعاؤں، طلب گاریوں، نذروں اور نیازوں میں اس کا کوئی ساتھی اور ساجھی نہیں ہے۔ عظمتوں اور کبریائیوں، کارسازیوں اور بے نیازیوں کا ہر اعتقاد اس کے لیئے ہے۔

توحید کے پہلے دو درجوں میں نبوت کا کسی سے کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ خود قرآن گواہ ہے کہ یہ دونوں درجے مشرکین، یہودی اور عیسائیوں کے مانے ہوئے مقدمات ہیں۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:۔

توحید کے ان دونوں درجوں کو نہ تو آسمانی کتابیں موضوعِ بحث بناتی ہیں اور نہ ان میں مشرکین یہودی اور عیسائی مخالف ہیں بلکہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ ان کے تسلیم شدہ مقدمات ہیں۔[1]

توحید کے دو درجے یعنی توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ عبادت دونوں لازم و ملزوم ہیں ـــــ هما متشابكتان متلازمتان ـــــ دونوں میں فرق یہ ہے کہ توحیدِ ربوبیت ایک فکری اور اعتقادی پیمانہ ہے جب کہ توحیدِ عبادت فکر و عمل دونوں کا پیمانہ ہے۔

توحیدِ عبادت میں نبوت کا عیسائیوں، یہودیوں اور مشرکوں سے اختلاف ہے۔ تمام انبیاء اسی کی دعوت لے کر آئے ہیں۔

انبیاء کے مخاطبین عبادت میں اشخاص پرستی، آثار پرستی اور مظاہر پرستی کر رہے تھے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:۔

مشرکینِ عرب زیادہ تر اشخاص پرست تھے۔ اس بارے میں ان کا ذہنی رُجحان یہ تھا کہ ربوبیت کے سلسلہ میں نظامِ کائنات کے اہم اور بزرگترین کام اللہ تعالیٰ انجام دے رہے ہیں لیکن کچھ کام اللہ تعالیٰ نے ان شخصیتوں کے سپرد کر دیئے ہیں جو دُنیا میں اللہ کی عبادت کر کے اللہ کے مقرب ہو گئے تھے اللہ نے ان سے خوش ہو کر ان کو الوہیت کی خلعت عطا فرما دی ہے۔

اس ذہنی رُجحان کی بنیادوں پر ان کا کہنا بقول شاہ صاحب یہ تھا۔

یہ بزرگ ہستیاں ہمارے عابدانہ اور نیاز مندانہ اعمال کی مستحق ہیں۔ اللہ کی کوئی عبادت ان کی

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۵۹

عبادت کی آمیزش کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔ اللہ کا تقرب ان شخصیتوں کی عبادت کے ذریعے ہوتا ہے یہ سُنتے دیکھتے اپنے عابدوں کی مدد کرتے اور شفاعت کرتے ہیں[1]۔

ان ہستیوں کی حجری تصاویر بنا رکھی تھیں اور ان کے ساتھ عابدانہ تعلقات تھے۔

چونکہ عبادت کے اس پیمانہ میں دو چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔ ایک حجری اشخاص یعنی ان کے مجسمے ان کی تصویریں۔ دُوسرے ان اشخاص کی شخصیتیں۔ اس بنا پر قرآن نے دونوں کی رعایت سے تعبیر کا پیمانہ بنایا ہے۔ جب وُہ اشخاص یعنی مجسموں اور تصاویر و تماثیل کا ذکر کرتا ہے۔ تو اس کے لیے ایسے الفاظ لاتا ہے جو عربی زبان میں غیر ذوی العقول کے لیے بولے جاتے ہیں جیسے مؤنث کے صیغے اور لفظ ما بمعنیٰ وُہ چیز۔ جیسے لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ (میں نہیں عبادت کرتا ان چیزوں کی جن کی تم عبادت کرتے ہو) اور جب ان مجسموں کی شخصیتوں کا ذکر کرتا ہے تو ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو مذکر کے ہوں اور ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ جیسے لَآ اَعْبُدُ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ (میں نہیں عبادت کرتا ہوں ان ہستیوں کی جن کو تم اللہ سے ورے ورے پکارتے ہو)[2] ان تمہیدی فقرات کے بعد اب آیت کی تفسیر پڑھیے۔

۲۸ اے انسانو! قرآن کا مخاطب سارا عالمِ انسانیت ہے کوئی مخصوص نسل جیسے بنی اسرائیل اور کوئی مخصوص قوم جیسے عرب نہیں۔ یہ طرزِ خطاب خود ایک دلیل ہے تخاطب کے عام ہونے پر[3]۔

اب سب بندوں کو مومن ہوں یا کافر یا منافق، خطاب فرما کر توحید جناب باری سمجھائی جاتی ہے خلاصہ معنے یہ ہے کہ اللہ نے تم کو اور تم سے پہلوں کو سب کو پیدا کیا اور تمہاری ضروریات اور کل منافع کو بنایا پھر اس کو چھوڑ کر دوسرے کو معبود بنانا جو تم کو نہ نفع پہنچا سکے نہ مضرت۔ کس قدر حماقت اور جہالت ہے حالانکہ تم یہ بھی جانتے ہو کہ اس جیسا کوئی نہیں ہے[4]۔

اگرچہ قرآن کی دعوت تمام انسانوں کے لیے عام ہے مگر اس سے فائدہ اُٹھانا یا نہ اُٹھانا لوگوں کی اپنی آمادگی پر اور اس آمادگی کے مطابق اللہ کی توفیق پر منحصر ہے۔ لہٰذا پہلے انسانوں کے درمیان فرق کر کے واضح کر دیا کہ کس قسم کے لوگ اس کتاب کی رہنمائی سے فائدہ اُٹھا سکتے ہیں اور کس قسم کے نہیں اُٹھا سکتے۔ اس کے بعد تمام نوعِ انسانی کے سامنے وُہ اصلی بات پیش کی جاتی ہے جس کی طرف بُلانے کے لیے قرآن آیا ہے[5]۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص۵۹ [2] تفسیر ماجدی ص۱۱ [3] حاشیہ شیخ الہند ص۶ [4] تفہیم القرآن ص۵۵

اس آیت میں تینوں گروہوں کو خطاب کرکے وُہ دعوت پیش کی گئی ہے جس کے لیے قرآن نازل ہوا۔ اس میں مخلوق پرستی سے باز آنے اور ایک خدا کی عبادت کرنے کی دعوت ایسے انداز سے دی گئی ہے کہ اس میں دعوے کے ساتھ اس کے واضح دلائل بھی موجود ہیں جن میں ادنیٰ سمجھ بُوجھ والا انسان بھی ذرا سا غور کرے تو توحید کے اقرار پر مجبور ہو جائے[1]۔

۳۹۔۔ عبادت مصدر سے بنا ہے۔ بندگی اور پرستش کو کہتے ہیں ۔۔۔۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں ۔۔۔۔ عبودیت اظہارِ فروتنی کا نام ہے اور عبادت اس سے بھی بلیغ ہے اس کے معنے انتہائی فروتنی کے ہیں۔ قاموس میں عبادت کے معنے طاعت کے بیان کیے گئے ہیں لیکن ابن الاثیرؒ کے نہایہ میں یہ الفاظ ہیں کہ لغت میں عبادت نام ہے اس طاعت کا جو عاجزی کے ساتھ ہو۔ علامہ ابن الاثیرؒ کی یہ تعریف بُہت جامع ہے۔ امام راغب اصفہانیؒ اور مجدالدین فیروز آبادیؒ نے اس کے صرف ایک جُز کو بیان کیا ہے۔ قاضی شوکانیؒ نے فتح القدیر میں حافظ ابن کثیرؒ کے حوالہ سے شرعی تعریف یہ کی ہے۔ شریعت میں عبادت وُہ ہے جو انتہائی محبت، عاجزی اور خوف پر مشتمل ہو[2]۔

اُردو میں طاعت کے لیے بندگی اور عاجزی کے لیے پرستش اور پُوجا کے الفاظ بولے جاتے ہیں۔ قرآن میں یہ دونوں معنے مقام کے تقاضے سے الگ الگ ہوتے ہیں۔ اور اس کا لحاظ شاہ عبدالقادرؒ نے اپنے ترجمہ قرآن میں رکھا ہے۔ وُہ کہیں ترجمہ کرتے ہیں کہ پُوجا کرو۔ اور کہیں فرماتے ہیں کہ بندگی کرو۔ ترجموں میں یہ فرق غالباً شاہ ولی اللہؒ کے بتائے ہوئے اشخاص اور شخصیتوں کے ضابطے پر مبنی ہے۔

۴۰۔۔ تخلیق کام خالص خدائی کارنامہ ہے ہمسر و مساوی تو درکنار تخلیق کے کام میں اللہ کا کوئی معاون اور ماتحت بھی نہیں ہے ۔۔۔۔ یہ توحید خالقیت سے توحید عبادت پر استدلال ہے مطلب یہ ہے کہ چونکہ اللہ کے سوا خالق کوئی نہیں اس لیے ۔۔۔ تمہاری عاجزانہ نیازمندیوں اور تمہاری طاعت و فرمانبرداریوں کا مستحق بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اور اس سے پہلے لفظ رب کہہ کر توحید ربوبیت کی طرف اشارہ کیا ہے گویا کہا جا رہا ہے کہ تمہیں یگانہ اللہ کی بندگی اور پرستش اس لیئے کرنی چاہیئے کہ تمہیں نیست سے ہست اسی نے کیا ہے اور ہست بنانے کے

---

[1] معارف القرآن ص۴، [2] لغات القرآن [3] تفسیر ماجدی ص۱۱

بعد تمہاری بقا کا سامان بھی اسی نے کیا ہے۔ اور صرف تمہیں ہی نیست سے ہست نہیں کیا تم سے پہلے اَلَّذِیْنَ مِنْ قَبْلِکُمْ کو بھی نیست سے ہست کرنے والا وہی ہے۔ یہ لفظ لا کر قرآن نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ توحید کا سبق ماضی، حال، تاریخ اور مشاہدہ دونوں سے حاصل کیا جا سکتا ہے۔

۴۱ — تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ لَعَلَّ کا یہ ترجمہ شاہ عبدالقادرؒ نے کیا ہے اور حضرت شیخ الہندؒ نے بھی یہی ترجمہ فرمایا ہے۔ لیکن دوسرے بزرگوں نے اس ترجمہ سے پرہیز کیا ہے اور تاکہ سے ہٹ کر عجب نہیں، توقع ہے، اُمید ہے، کیا ہے۔ غالباً اس کی وجہ یہ ہے کہ "تاکہ" سے ان بزرگوں نے اللہ کے حکمِ عبادت میں غرض کی آمیزش محسوس کر لی ہے۔ یہ درست ہے کہ اللہ کا کوئی حکم غرض پر مبنی نہیں ہوتا اور اس کا ہر حکم عبادت میں غرض کی آمیزش سے بالا ہوتا ہے۔ ——————

—————— اور اس کا ہر حکم ہر قسم کی غرض کی آلودگی سے پاک ہے لیکن جن بزرگوں نے "تاکہ" اختیار کی ہے ان کی دقیق نظر اس پر ہے کہ اللہ کا کوئی حکم غرض کی آلودگی کا داغ تو یقیناً نہیں رکھتا۔ لیکن اس کا کوئی حکم مصلحت سے خالی نہیں ہوتا۔ اس کے سارے احکام مبنی بر مصالح ہوتے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہؒ نے اس پر سیر حاصل بحث فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عبادت کا حکم اس مصلحت کی خاطر دیا جا رہا ہے کہ اس کے ذریعے تم متقی بن جاؤ گے۔ ابن جریرؒ نے انہیں معنی کو یہ بتا کر اپنایا ہے تکونوا من المتقین۔ گویا متقی بننے کا طریقہ یہی ہے کہ —————

تم ہر وقت یہ بات پیشِ نظر رکھو کہ اللہ تمہارا پروردگار ہے ایک لمحہ کے لیے بھی تم اس کی پروردگاری سے بے نیاز نہیں ہو، اسی نے تم کو اور تم سے پہلوں کو محض اپنی قدرت سے عدم سے نکال کر وجود کا لبادہ پہنایا ہے اپنی زندگی میں اس سے نیازمندی اور فرمانبرداری کے تعلقات استوار کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو متقی بن جاؤ گے۔

۴۲ — آیت کے اس ٹکڑے کی جان جَعَلَ لَکُمْ ہے۔ زمین یا آسمان کی ہیئت بیان کرنا یا ان کی ارضیاتی یا فلکیاتی ماہیت کو بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ زمین ہو یا آسمان کچھ بھی از خود نہیں بنا ہے بلکہ جو کچھ، جیسا کچھ اور جتنا کچھ بھی ہے اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ اور اسی قادرِ مطلق کے زیرِ فرمان ہے اور لَکُمْ کہہ کر یہ بتایا ہے کہ زمین و آسمان انسان کے لیے بنے ہیں۔ انسان زمین و آسمان کے لیے نہیں بنا ہے مقصود اس کائنات کا انسان ہے باقی کائنات اس کی خادم ہے پھر یہ کیسی شدید حماقت ہے کہ انسان عابدانہ تعلقات اللہ سے توڑ کر مخلوق سے قائم کرے۔

۴۳ــــ اس نے آسمان سے پانی برسایا یعنی کسی اور نے نہیں۔ مقصود اس حقیقت کی تسلیم ہے کہ آسمان و بارش سب اللہ کی مخلوق ہیں۔ نہ کوئی اکاش دیوتا ہے نہ اندر دیوتا۔ نہ ہوا کوئی چلاتا ہے نہ بارش کوئی برساتا ہے بلکہ یہ کلدانیوں، مصریوں، ایرانیوں، ہندیوں، یونانیوں اور رومیوں کی گھڑی ہوئی خرافات ہیں۔ عربی میں السماء اس بلند چیز کو کہتے ہیں جو انسان کے سر کے اُوپر ہو۔ یہ بادل سے پانی کے اُترنے، بخارات کے منجمد ہوتے اور پھر گرمی پاکر برس پڑنے کے یا اور اسی طرح کے اور درمیانی واسطوں کے ہرگز منافی نہیں ہے۔[۱]

۴۴ــــ تم یہ جانتے ہوئے یعنی جب تم خود بھی اس بات کے قائل ہو اور تمہیں معلوم ہے کہ یہ سارے کام اللہ ہی کے ہیں تو پھر تمہاری عبادت اسی کے لیے خاص ہونی چاہیئے۔ دوسرا کون اس کا حقدار ہوسکتا ہے کہ تم اس کی بندگی بجا لاؤ۔[۲]

تم خوب جانتے ہو کہ تمہارا اور سب چیزوں کا پیدا کرنے والا صرف ایک وہی وحدہٗ لاشریک لہٗ ہے اور ان انعامات و انتظامات میں کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے بس ان انعامات کے شکر میں خاص اسی کی عبادت کرو کسی دوسرے کو شریک نہ کرو۔[۳]

یعنی اس بات کو جانتے ہو کہ ان تصرفات کا اللہ کے سوا کوئی کرنے والا نہیں ہے تو اس صُورت میں تمہیں یہ کب زیب دیتا ہے کہ اللہ کے مقابلے میں دوسروں کی عبادت کرو۔[۴]

۴۵ــــ ہم پلہ، ندِ مقابل۔ دوسروں کو اللہ کا ندِ مقابل بنانے سے مراد یہ ہے کہ عبادت کے مختلف اقسام میں سے کسی قسم کا رویہ خدا کے سوا دوسروں کے ساتھ برتا جائے۔ آگے چل کر خود قرآن ہی میں تفصیل سے معلوم ہو جائے گا کہ عبادت کی وُہ اقسام کون کون سی ہیں۔ جنہیں صرف اللہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیئے اور جن میں دوسروں کو شریک کرنا وُہ شرک ہے جسے قرآن روکنے آیا ہے۔[۵]

نِدّ عربی زبان میں مثل اور مشابہ کو اور مخالف اور مقابل کو کہتے ہیں۔ چنانچہ انداد کے معنے اضداد اور اشباہ دونوں کئے گئے ہیں۔ ہم نے ترجمہ میں دونوں کو سمو دیا ہے۔ لفظ کی جامعیت میں نکتہ یہ ہے کہ شرک دُنیا میں دو قسموں کا رائج رہا ہے۔ کچھ قوموں نے اپنے معبودوں کو محض خدائے اصغر یا ماتحت خُدا تسلیم کیا ہے جیسے مشرکینِ عرب اور مجوسیوں نے اہرمن کو یزداں کے حریف اور

---

[۱] تفسیر ماجدی ص۱۔ [۲] تفہیم القرآن ص۵۔ [۳] معارف القرآن ج ۱ ص۸۔ [۴] بیان القرآن ص۱۳۔ [۵] تفہیم القرآن۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ ۖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا وَلَنْ تَفْعَلُوْا فَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِيْ وَقُوْدُهَا النَّاسُ وَالْحِجَارَةُ ۖ اُعِدَّتْ لِلْكٰفِرِيْنَ ۝

اور اگر تمہیں (اس کلام کے خدا کی طرف سے ہونے میں) کوئی تردد ہے جو ہم نے اپنے بندےؐ پر آہستہ آہستہ اُتارا ہے (تو آؤ اور اس کا فیصلہ کرلو اگر یہ خُدا کا کلام نہیں ہے اور کسی شخص کا خود ساختہ و پرداختہ ہے آؤ زیادہ نہیں) اس جیسیؐ ایک ہی سُورت بنالاؤ اور اس کے لیے اللہ کو چھوڑ کر اپنے تمام حمائتیوں اور ہم نواؤں کو بُلالو۔ اگر تم سچےؐ ہو (تو آؤ یہ کام کرکے دکھاؤ) لیکن اگر تم نے ایسا نہ کیا اور حقیقت یہ ہے کہ تُم ایسا قطعاً نہ کرسکو گے تو اس آگؐ سے ڈرو جس میں ایندھن کا کام انسانوں اور پتھروں سے لیا گیا ہےؐ اور نبوّت کے منکروں کے لیے تیار کی گئی ہے۔

اور مدمقابل کی حیثیت سے پیش کیا ہےؐ۔

رسالت اور اس کی دلیل

آغازِ قرآن میں قرآن کے بارے میں یہ دعویٰ کیا گیا ہے کہ لاریب فیہ اس کتاب کے کتاب

ؐ تفسیر ماجدی ۱۲

الٰہی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ فی الواقع یہ کلام الٰہی ہے اور چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس لیے یقیناً اللہ کے نام سے لوگوں کے سامنے پیش کرنے والی ہستی اللہ کی فرستادہ ہے۔

تمام اولادِ آدم کی ساری علمی طاقتوں کو مخاطب کرکے کہا ہے کہ اگر کسی کے دل میں اس کلام کے کلام الٰہی ہونے میں شبہ ہے تو اس کا حل یہ ہے کہ سارا قرآن نہ سہی صرف ایک سورت ہی بنا کر لاؤ جس میں قرآن جیسی معانی کی بلندی، مطالب کی جامعیت اور مضامین کی ندرت ہو۔

قرآن نے اوّلاً مکہ میں یہ چیلنج دیا تھا کہ

اگر تمام انسان اور جن اکٹھے ہو کر چاہیں کہ اس قرآن کے مانند کوئی کلام پیش کریں تو کبھی پیش نہیں کرسکیں گے (سورہ اسراء)

اس کے بعد مکہ ہی میں فرمایا کہ اگر پورے قرآن کا نہیں تو دس سورتیں اس جیسی بنا کر لاؤ۔ (سورہ ہود)

اس کے بعد مکہ ہی میں فرمایا کہ

قرآن جیسی ایک سورت ہی بنا کر پیش کردو۔ (سورۂ یونسؑ)

اس کے بعد سورۂ طور مکہ ہی میں نازل ہوئی۔ آخری طور پر جو بات کہی گئی یہ تھی اور ہے۔

فَلْيَأْتُوا بِحَدِيثٍ مِّثْلِهِ إِن كَانُوا صَادِقِينَ۔

اگر سچے ہیں تو اس جیسی ایک بات ہی لا کر پیش کریں۔

یہ سب مخاطبات مکہ میں مشرکین سے تھے۔ سورۂ بقرہ مدینہ میں نازل ہوئی ہے اور مدینہ میں زیادہ تر خطاب یہودیوں سے ہے وہ بھی قرآن کے کتاب الٰہی ہونے سے اپنے علم کے غرّے میں منکر تھے۔ ان کی خاطر یہاں اس چیلنج کو دُہرایا ہے تاکہ ثابت ہوجائے کہ قرآنِ حکیم وہ کتاب ہے۔ جس میں تہذیب، اخلاق، تمدن، معاشرت، حکومت و سیاست، معرفت و روحانیت، تزکیۂ نفوس، تنویرِ قلوب غرض کہ وصولِ الٰہی اور تنظیم و رفاہیتِ خلائق کے وہ تمام قوانین و ضوابط موجود ہیں جن سے تخلیق دُنیا کی غرض پوری ہوتی ہے۔ اور جن کی ترتیب و تدوین کی ایک اُمی قوم کے اُمی فرد سے کبھی توقع نہیں ہوسکتی۔ گویا یہاں قرآن کے تمام وجوہ اعجاز میں سے قرآن کے علمی اعجاز کو اُجاگر کرکے یہ جتانا مقصود ہے کہ اس جیسی کتاب کو ایک ایسے شخص نے دُنیا کے سامنے پیش کیا ہے جو زندگی میں کبھی ایک دن بھی کسی مدرسہ کا طالب علم نہیں رہا۔ بلکہ ایسی بستی میں پیدا ہوا ہے جہاں کوئی مدرسہ اور مکتب نہ تھا۔ نہ علمی چرچے تھے اور نہ علمی صحبتیں تھیں۔ عمر کے چالیس سال

سال پورے ہونے پر اچانک اس کی زندگی میں ایک غیر معمولی تبدیلی آگئی اور اس نے نبوت کا اعلان کر دیا۔ اس نے قرآن سنانا شروع کیا اور دعویٰ کیا کہ یہ میرا کلام نہیں اللہ کا کلام ہے۔ اور جس طرح اللہ کی زمین جیسی زمین، اللہ کے سورج جیسا سورج اور اللہ کے چاند جیسا چاند بنانے سے دُنیا عاجز ہے اسی طرح اللہ کی کتاب جیسی کتاب بنانے سے بلکہ اس جیسی ایک سورت بنانے سے بھی دُنیا عاجز رہے گی۔

قرآن کے وجوہ اعجاز اگرچہ مختلف ہیں لیکن یہاں ان میں سے صرف قرآن کے اعجاز علمی کو سامنے رکھ کر یہ چیلنج دیا گیا ہے کیونکہ مخاطب وُہ لوگ ہیں جو سلسلہ وحی و نبوت کے قائل ہیں۔ علوم انبیاء اور معارف اولیاء کی علم برداری کا دعویٰ کرتے ہیں، مالدار ہیں، ساہوکار ہیں، تجارت کے بڑے ماہر ہیں، حجاز کی آبادی میں بیت المدراس کے نام سے علمی مرکز چلا رہے ہیں، ملک کی عام آبادی ان کے علم و فضل کی قائل اور ان کی دینی واقفیت سے مرعوب ہے۔

علمی اعجاز تمام نبیوں میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز کا حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے علمی اعجاز پر یہ بیان بے حد اہمیت رکھتا ہے۔

اعجازِ علمی میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا نمایاں مقام اس بات کی صاف طور پر نشان دہی کر رہا ہے کہ کمال کے سارے مراتب آپ پر ختم ہو چکے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ تمام صفات کمال کی آخری سرحد صفت علم ہے۔ کیونکہ عمل کے سارے کمالات علم کے محتاج ہیں۔ محبت، شوق، ارادہ، قدرت، سخاوت و شجاعت، حلم اور حیا وغیرہ سب علم کے نتائج و ثمرات ہیں۔ جیسے کمالِ علم کا مقام کمالِ عمل سے اونچا ہے اسی طرح وُہ ذاتِ گرامی جو کمالِ علم سے آراستہ ہو دوسروں سے درجہ، مرتبہ میں بلند تر، بزرگ تر اور بالاتر ہو گی۔ یہ ایک ٹھیٹھ عقلی بات ہے اس میں کوئی کلام نہیں۔ کلام اگر ہو سکتا ہے تو صرف کمال کے ثبوت میں ہو سکتا ہے۔ نبوت کی جانب سے اسی ثبوت کا نام اعجازِ قرآن ہے۔ اگر کسی خوشنویس کے مقابلے میں کوئی نہ آئے تو یہ اس کے بے نظیر اور یکتائے روزگار ہونے کی علامت ہے۔ جب قرآن جیسی پہلے کوئی کتاب نہ تھی۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کو تحدی کے ساتھ پیش کیا اور پوری انسانیت اس کے مقابلے میں عاجز ہو کر رہ گئی تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم اس کمالِ علمی میں یکتا اور بے نظیر ہیں نہ پہلے کوئی شخص کمالِ علمی میں آپ کا ہمسر ہوا اور نہ بعد میں کوئی ہمتا۔ یہ اعجاز علمی آپ کی یکتائی

برتری اور آپ کی خاتمیت کی سب سے زیادہ واضح اور روشن دلیل ہے۔

۴۶ — یعنی اگر تمہیں قرآن کے کلام بشری ہونے کا خیال ہے تو تم بھی ایک سُورت ایسی فصیح وبلیغ تین آیت کی مقدار بنا دیکھو۔ اور جب تم باوجود کمال فصاحت وبلاغت چھوٹی سی سُورت کے مقابلہ سے بھی عاجز ہو جاؤ تو پھر سمجھ لو کہ یہ اللہ کا کلام ہے کسی بندے کا نہیں۔ اس آیت میں آپ کی نبوت کو مدلل فرما دیا[۱]۔

یہ خطاب یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ کے تحت ساری دُنیا سے ہو رہا ہے صرف اہلِ عرب یا قریش سے نہیں۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ اگر تمہارے خیال میں یہ کلامِ الٰہی نہیں تو یقیناً ایک انسانی تصنیف ہوگی۔ اور جب ایک انسان ایسی تصنیف پر قادر ہے تو دوسرا بھی ہو سکتا ہے چہ جائیکہ لاکھوں فائق انسانوں کا ایک پورا مجمع۔

کلمہ اسلام کے اجزائے ترکیبی دو ہیں۔ ایک توحید باری دوسرے رسالت محمدی۔ توحید کا بیان اُوپر کی دو آیتوں میں ہو چکا اب دعوت تصدیق رسالت کی دی جا رہی ہے[۲]۔

معنے یہ ہیں کہ اگر تمہیں اس قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے میں کوئی تردد ہے اور یہ سمجھتے ہو کہ یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خود بنا لیا ہے تو اس کا فیصلہ بڑی آسانی سے اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم بھی اس قرآن کی چھوٹی سے چھوٹی سورت جیسی بنا لاؤ۔ اگر تم کامیاب ہو گئے تو پھر تمہیں یہ حق ہوگا کہ تم اس کو بھی کسی انسان کا کلام قرار دو۔ اور اگر عاجز ہو گئے تو سمجھ لو کہ یہ انسان کی طاقت سے باہر ہے۔ اللہ ہی کا کلام ہے[۳]۔

کیونکہ آخر تم بھی عربی داں ہو بلکہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم تو مشاق بھی نہیں اور تم تو مشاق ہو جب اس کے باوجود نہ بنا سکو گے تو فیصلہ ہو جائے گا کہ یہ اللہ کی جانب سے معجزہ ہے اور بلاشبہ آپ پیغمبر ہیں[۴]۔

اس سے پہلے مکہ میں کئی بار یہ چیلنج دیا جا چکا تھا کہ اگر تم اس قرآن کو انسان کی تصنیف سمجھتے ہو تو اس کے مانند کلام تصنیف کر کے دکھاؤ۔ اب مدینے پہنچ کر اس کا پھر اعادہ کیا جا رہا ہے[۵]۔

۴۷ — اپنے بندے پر جن کا نام گرامی محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ مقامِ حضرت انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قُرب و اختصاص کو ظاہر کرنے کا ہے۔ کیونکہ آیت میں نہایت پُر زور اور دائمی چیلنج منکرین کو

---

[۱] حاشیہ شیخ الہند صد [۲] تفسیر ماجدی ص۱ [۳] معارف القرآن م ش ص [۴] بیان القرآن ص [۵] تفہیم القرآن ص

دیا جارہا ہے۔ لیکن اس انتہائی زور اور اہمیت کے موقعہ پر بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن عبد کے معزز لقب سے نواز رہا ہے۔ نہ خدا کا بیٹا نہ خدا کے مثل نہ خدا کے بروز و اوتار اور نہ خدا کے وزیر و مشیر۔ بلکہ محض عبد اور محض بندے[1]۔

۴۸ — قرآن حکیم اپنی زبان کی فصاحت اور حسن انشاء کے لحاظ سے بھی یقیناً بے نظیر ہے۔ جیسا کہ عرب کے بڑے بڑے زبان و ادب کے ماہر تسلیم کر چکے ہیں۔ لیکن یہاں جو تحدی کی جارہی ہے اس کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ سارا عالم ہے اس لیے قرآن مجید کے اعجاز کو یہاں صرف انشاء و فصاحت تک محدود رکھنا اس کے عام اور عالمگیر چیلنج کو محدود کرنا ہے۔ قرآن نے آغاز میں اپنا تعارف یہ پیش کیا ہے کہ یہ کتاب ہدایت ہے یعنی انفرادی، اجتماعی دونوں زندگیوں کا جامع نظام نامۂ مکمل ہمہ گیر ہر جہتی دستور العمل۔ یہ اس کی اصل حیثیت ہے اس کے علاوہ اور جس قدر حیثیتیں ہیں تبعی اور ضمنی ہیں وہ یہاں اپنے اسی سب سے بڑے وصف کو پیش کر رہا ہے اور پکار کے کہہ رہا ہے کہ جو ہدایات و بصائر میری ایک سورت کے اندر موجود ہیں۔ تم اگر اپنی متحدہ کوشش سے بھی اس کے مقابلے کی کوئی چیز لا سکتے ہو تو لاؤ پیش کرو۔

۴۹ — یعنی اگر اپنے دعوے میں سچے ہو کہ یہ بندے کا کلام ہے تو جس قدر قابل اور شاعر فصحاء و بلغاء موجود ہیں خدا تعالیٰ کے سوا سب سے مدد لے کر بھی ایک چھوٹی سی سورت ایسی بنا لاؤ۔ یا یہ مطلب ہے کہ اللہ کے سوا تمہارے جتنے معبود ہیں سب سے تضرع و زاری کے ساتھ دعا مانگو کہ اس مشکل کام میں تمہاری کوئی مدد کریں[2]۔

اس جگہ شہداء سے مراد یا تو عام حاضرین ہیں کہ سارے جہان میں جس جس سے تم اس کام میں مدد لینا چاہو لے سکتے ہو۔ اور یا اس سے مراد ان کے معبود ہیں[3]۔

قرآن کا سیدھا سادا دعویٰ یہ ہے کہ وہ انسان کا نہیں خدا کا کلام ہے اور اپنے اس دعوے پر دلیل اس نے کیسی قطعی اور عام و خاص کی سمجھ میں آنے والی پیش کر دی ہے کہ اگر کوئی اسے امکان بشری کے اندر سمجھتا ہے۔ تو ذرا اس کا ہلکا اور ادنیٰ نمونہ ہی سب کی متحدہ کوشش سے پیش کر دکھائے۔ قرآن کے چیلنج کو ساڑھے تیرہ سو سال سے اوپر ہو چکے ہیں اور دنیا کے کتب خانے اس کتاب سازی کے عہد میں قرآن کے برابر کیا معنی۔ تقریباً برابر کتاب سے بھی یکسر خالی ہیں[4]۔

۱؎ تفسیر ماجدی ص۱۲ ۲؎ حاشیہ شیخ الہند ص۹ ۳؎ معارف القرآن ص۵۳ ۴؎ تفسیر ماجدی ص۱۲

۵۰ — پو اور ڈرو دوزخ کی آگ سے جو سب آگوں سے تیز ہے ۔ اس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں ۔

اس میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ وہاں صرف تم ہی دوزخ کا ایندھن نہ ہوگے بلکہ تمہارے وہ بت بھی وہاں تمہارے ساتھ ہی موجود ہوں گے جنہیں تم نے اپنا معبود بنا رکھا ہے ۔ اس وقت تمہیں خود ہی معلوم ہو جائے گا کہ خدائی میں یہ کتنا دخل رکھتے ہیں ۔

اعجازِ قرآنی پر بحث انشاء اللہ پارہ ۱۲ میں آئے گی ۔ یہاں ہم اس موضوع پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کے علوم سے خوشہ چینی کرتے ہیں ۔

معجزاتِ علمیہ کا معجزاتِ عملیہ سے افضل ہونا

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ معجزہ اور انبیاء کے معجزات سے کس قدر بڑھا ہوا ہے ؟ سب جانتے ہیں کہ علم کو عمل پر شرف ہے یہ ہی وجہ ہے کہ ہر فن میں اس فن کے استادوں کی تعظیم کی جاتی ہے ۔ ہر ہر سر رشتہ میں افسروں کو باوجود یکہ ان کے کام بمقابلہ خدمات اتباع بہت کم محنت ہوتی ہے ۔ تنخواہ زیادہ دیتے ہیں ۔ یہ شرف علم کو نہیں تو اور کیا ہے ؟ خود انبیاء ہی کو دیکھو امتی بسا اوقات مجاہدہ و ریاضت میں ان سے بڑھے ہوئے نظر آتے ہیں مگر رتبہ میں انبیاء کے برابر نہیں ہو سکتے ۔ وجہ اس کی بجز شرف علم و تعلیم اور کیا ہے ؟ الغرض بوجہ علم و تعلیم ہی انبیاء امتیوں سے ممتاز ہوتے ہیں بوجہ عبادت و ریاضت ممتاز نہیں ہوتے ۔ اگر یہ ہے تو پھر علم عمل سے بالضرور افضل ہو گا ۔ اس لیئے معجزات علمیہ معجزات عملیہ سے کہیں زیادہ ہوں گے ۔

معجزاتِ علمیہ و عملیہ کی تفسیر

معجزات عملی اس کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص دعویٰ نبوت کر کے ایسا کام کر دکھائے کہ اور سب اس کام کے کرنے سے عاجز آجائیں ۔ اس صورت میں معجزاتِ علمی اس کا نام ہوگا کہ کوئی شخص دعویٰ نبوت کر کے ایسے علوم ظاہر کرے کہ اور اقران و امثال اس کے مقابلے میں عاجز آجائیں ۔

تفاضلِ علوم باعتبار تفاضلِ معلومات

مگر علوم میں بھی فرق ہے یعنی جیسے گلاب ہو یا پیشاب ہو دیکھنے میں دونوں برابر ہیں مگر جس

کو دیکھتے ہیں اس میں اتنا تفاوت ہے کہ اس سے زیادہ اور کیا ہو گا۔ ایک پاک اور خوشبودار دوسرا ناپاک اور بدبودار۔ ایسے ہی علم وصفات خداوندی اور علم اسرار احکام خداوندی اور علم معلومات باقیہ میں یہ بھی فرق ہے بلکہ غور سے دیکھئے تو اس سے زیادہ فرق ہے اس لیے گلاب و پیشاب میں اتنا تو اتحاد ہے کہ یہ بھی مخلوق وُہ بھی مخلوق۔ خالق اور مخلوق میں تو اتنا بھی اتحاد اور مناسبت نہیں۔

باعتبار حاوی علوم کثیرہ ہونے کے قرآن شریف کا اعجاز

علاوہ بریں قرآن شریف جو معجزات علمی میں بھی افضل و اعلیٰ ہے ایسا بُرہان قاطع کہ کسی سے کسی بات میں اس کا مقابلہ نہ ہو سکا۔ علوم ذات وصفات وتجلیات و آغاز آفرینش وعلم برزخ وعلم آخرت وعلم اخلاق وعلم احوال وعلم افعال وعلم تاریخ وغیرہ اس قدر ہیں کہ کسی کتاب میں اس قدر نہیں کسی کو دعویٰ ہو تو لاتے اور دکھاتے۔

باعتبار فصاحت وبلاغت قرآن شریف کا اعجاز

فصاحت وبلاغت کا یہ حال کہ آج تک کسی سے مقابلہ نہ ہو سکا مگر ہاں جیسے اجسام و محسوسات کے حُسن وقبح کا ادراک تو ایک نگاہ اور ایک تزجہ میں بھی متصور ہے اور روح کے کمالات کا ادراک ایک بار متصور نہیں۔ ایسے ہی ان معجزات علمی کی خوبی جو متضمن علوم عجیبہ ہوں ایک بار متصور نہیں۔ مگر ظاہر ہے کہ یہ بات کمال لطافت پر دلالت کرتی ہے نہ کہ نقصان پر۔

قرآن شریف کی فصاحت وبلاغت صاحب ذوق سلیم بداہتہً سمجھ سکتا ہے

بالجملہ اگر کسی بلید کم فہم کو وجوہ فصاحت وبلاغت قرآنی ظاہر نہ ہوں تو اس سے اُس کا نقصان لازم نہیں آتا کمال ثابت ہوتا ہے۔ علاوہ عبارت قرآنی ہر کس وناکس رند بازاری کے نزدیک بھی اسی طرح اور عبارتوں سے ممتاز ہوتی ہے جیسے کسی خوشنویس کا خط بدنویس کے خط سے پھر جیسے تناسب خط وخال معشوقاں اور تناسب حروف خوشنویساں معلوم ہو جاتا ہے اور پھر کوئی اس کی حقیقت اس سے زیادہ نہیں بتا سکتا کہ دیکھ لو یہ موجود ہے۔ ایسے ہی تناسب عبارت قرآنی جو وُہی فصاحت وبلاغت ہے ہر کسی کو معلوم ہو جاتا ہے پر اُس کی حقیقت اس سے زیادہ کوئی نہیں بتلا سکتا کہ دیکھ لو یہ موجود ہے۔

وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اَنَّ لَهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ؕ كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ رِّزْقًا ۙ قَالُوْا هٰذَا الَّذِيْ رُزِقْنَا مِنْ قَبْلُ ۙ وَاُتُوْا بِهٖ مُتَشَابِهًا ؕ وَلَهُمْ فِيْهَاۤ اَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۙ وَّهُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵﴾

اور ان لوگوں کو جو کفر سے ہٹ کر ایمان کی راہ پر لگ گئے اور نیک عمل کئے ہیں ان کو (آگ کی جگہ) ایسے باغوں کی بشارت دیدیجئے جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔ جب کبھی ان باغوں کا کوئی پھل ان کے حصے میں آئے گا تو بول پڑیں گے یہ تو وُہ ہی ہے جو ہمیں اس سے پہلے مل چکا ہے (اور یہ اس لیئے کہیں گے کہ) واقعی ان کے سامنے ملی جُلی چیزیں آئیں گی۔ اور مزید برآں۔ ان کے لیے نیک اور پاکیزہ بیویاں ہوں گی۔ اور ان کی راحت ہمیشہ کی راحت ہو گی۔

قرآن شریف کلامِ الٰہی ہے اور تورات و انجیل کتابِ الٰہی

الغرض معجزاتِ علمی میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب سے زیادہ ہیں کیونکہ کلامِ ربانی اور کسی کے لیئے نازل نہیں ہوا۔ چنانچہ خود اہلِ کتاب اس بات کے معترف ہیں کہ الفاظِ تورات و انجیل منزل من اللہ نہیں۔ وہاں سے فقط الہامِ معانی ہوا اور یہاں اکثر انبیاء یا حواریوں نے ان کو اپنے الفاظ میں ادا کر دیا۔

اور شاید یہ ہی وجہ ہو کہ دعویٰ اعجاز تورات و انجیل نہ کیا گیا۔ ورنہ ظاہر ہے کہ اس معجزہ سے بڑھ کر اور کوئی معجزہ نہ تھا۔ چنانچہ اُوپر معروض ہو چکا۔

صاحبِ اعجازِ علمی کا صاحبِ اعجازِ عملی سے افضل ہونا

اور بایں وجہ کہ علم تمام اُن صفات سے اعلیٰ ہے جو جو مربّیِ عالم ہیں یعنی ان صفات کو عالم سے تعلق ہے جیسے علم و قدرت ارادت مشیت کلام کیونکہ علم کو معلوم اور قدرت کو مقدور اور ارادہ کو مراد اور مشیت کو مرغوب اور کلام کو مخاطب کی ضرورت ہے اس لیے وُہ نبی جس کے پاس معجزۂ علمی اور تمام اُن نبیوں سے اعلیٰ درجہ میں ہوگا جو معجزہ عملی رکھتے ہوں گے۔ کیونکہ جس درجہ کا معجزہ ہوگا وُہ معجزہ اس بات پر دلالت کرے گا کہ صاحبِ معجزہ اس درجہ میں یکتائے روزگار ہے۔ اور اس فن میں بڑا اسرار ہے اس لیے ہمارے حضرت رسول اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کا اقرار بشرطِ فہم و انصاف ضرور ہے۔

قرآن کا یہ عام اسلوب ہے کہ وہ مسئلہ کی توضیح کے لیے تصویر کے دونوں رُخ پیش کرتا ہے۔ تصویر کا یہ رُخ دکھانے کے بعد کہ نبوت کی دعوت کو قبول نہ کرنے پر سزاؤں کے مستحق ہیں فوراً تصویر کا دُوسرا رُخ بھی پیش فرما دیا کہ جو لوگ نبوت کو مان چکے ہیں اور جو کچھ مان چکے ہیں اس کی ہدایات کے مطابق اپنی اجتماعی، انفرادی زندگی بنا رہے ہیں اور اس طرح ایمان و عملِ صالح میں باہم رشتہ مضبوط کر رہے ہیں وُہ قابلِ مبارکباد ہیں۔

۱۵ بَشِّرْ تو بشارت دے تَبْشِیْرٌ سے ہے ۔ نسانی طبیعت کا خاصہ ہے کہ جب اس کو کوئی خوش کن خبر پہنچتی ہے تو وفورِ مسرت سے اس کے جسم میں خون دورہ کرنے لگتا ہے اسی لیے ایسی خبر سُنانے کو جس کو سُن کر انسان کے چہرے پر فرحت و انبساط کے آثار نمودار ہو جائیں تبشیر کہتے ہیں۔ یہ بھی واضح رہے کہ تبشیر کے لفظ میں کثرت سے بشارت دینے کے معنے ملحوظ ہیں۔[1]

آیت میں ایمان اور عملِ صالح والوں کو بشارت دی گئی ہے۔ قرآن میں عملِ صالح کو ایمان کے ساتھ ذکر کیا ہے۔ اس سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ عمل کے صالح ہونے کی بنیادی شرط ایمان ہے۔ کوئی عمل اگر ایسا کیا جاتا ہے کہ جس کی تہ میں جذبہ ایمانی نہ ہو تو وُہ عملِ صالح نہیں عملِ صالح کی نقل ہے۔ اور جس طرح نماز کی نقل محض نماز نہیں ایسے ہی نیکی اور عملِ صالح کی نقل بھی عملِ صالح نہیں ہے۔ عملِ صالح یہی ہے کہ ضابطۂ شریعت کے مطابق ہو۔

---

[1] لغات القرآن

فقہاء نے آیت میں عطف سے جو یہ بات سمجھی ہے کہ ایمان و عمل دو الگ الگ چیزیں ہیں بالکل درست ہے لیکن ان دونوں میں الگ الگ ہونے کے باوجود باہم جو رشتہ ہے اسے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ

ایمان و عمل میں باہم اصل و فرع کا رشتہ ہے۔

یعنی ایمان صرف اس خشک تصدیق کا نام نہیں ہے جس میں عملِ صالح کی شاخیں نہ ہوں بلکہ ایمان اُس تر و تازہ ایقان و اذعان کا نام ہے جس میں اعمالِ صالحہ کی بے شمار شاخیں ہوں۔ اس پر رنگ برنگ کی عبادات کے پھول کھلیں اور ایسے ایسے اعمال کی بہار آئے کہ راستہ سے کانٹا ہٹا دینا ان میں ایک ادنیٰ ترین عمل شمار ہو۔ یوں سمجھو کہ اصل ایمان ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمالِ صالحہ کی آبیاری سے ہوتی ہے۔ اگر ایمان ہو اور اعمالِ صالحہ نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی اور نشوونما کی اُمید نہیں ہے۔ اور اگر صرف عملِ صالح ہے اور ایمان نہیں تو ریگ میں پانی کی روانی ہے جس کا وجود و عدم یکساں ہے۔

۵۲ — باغات اور ان کے نیچے نہریں۔ باغات جنات کا ترجمہ ہے۔ جنات جنۃ کی جمع ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ قرآن میں جنات جمع کے لفظوں سے اس لیے آیا ہے کہ جنتیں سات ہیں۔ جنت الفردوس، جنت عدن، جنت النعیم، دارالخلد، جنت الماویٰ، دارالسلام اور علیین[1]۔

جنت لغت میں جن سے بنا ہے جس کے معنے کسی چیز کا حواسِ ظاہری سے پوشیدہ رکھنا ہے اور جنت اُس باغ کو کہتے ہیں کہ درختوں نے اس کی زمین کو ڈھانپ لیا ہو۔

اس کا تعلق عالمِ غیب سے ہے اسے جاننے کا نہیں بلکہ ماننے کا مطالبہ ہے۔ اس لیے آیات قرآنی اور ارشاداتِ نبوت میں اس کے اور دوزخ کے بارے میں جو کچھ بتایا گیا ہے اسے مان لینا چاہیئے۔

۵۳ — ہمیں اس سے پہلے مل چکا ہے یعنی جنتیوں کو جب کوئی پھل پھلواری کھانے میں آئے گا تو انہیں پچھلا مزہ بھی تازہ ہو جائے گا اور اس کی شکل دیکھتے ہی وہ بول اُٹھیں گے کہ یہ تو وہ ہی لذیذ میوہ ہے جس کا مزہ ہمیں خوب یاد ہے۔ یہ قبل والے پھل دُنیا کے باغوں کے بھی ہو

---

[1] مفردات القرآن راغب

سکتے ہیں اور آخرت کے باغوں کے بھی۔ اہلِ تفسیر سے دونوں منقول ہیں۔[۱]

۵۴ ــــ مِن ثَمَرَةٍ ــ یہ ترجمہ ہے متشابھا کا۔ جنت کے میوے دُنیا میووں سے شکل صورت میں ملتے جُلتے ہوں گے مگر لذت میں زمین و آسمان کا فرق ہوگا۔ یا جنت کے میوے باہم ایک شکل و صورت کے ہوں گے اور مزہ جُدا جُدا۔ تو جب کسی میوے کو دیکھیں گے تو کہیں گے وُہ ہی قسم ہے جو پہلے دُنیا میں یا جنت میں کھا چکے ہیں اور چکھیں گے تو مزہ اور ہی پائیں گے۔[۲]

یہ تشابہ محض اہلِ جنت کے خیال کے مطابق نہ ہوگا۔ واقعہ اور نفس الامر بھی یہی ہے۔ یہ کس لیے ہوگا؛ بعض نے کہا کہ دُنیا کے پھل پھلواریوں۔ اور بعض کا قول ہے کہ جنت ہی کے میوے ایک دُوسرے کے مشابہ ہوں گے۔ لیکن اگر دُنیا ہی کے پھلوں سے تشابہ مُراد لی جائے تو یہ لحاظ رکھنا ضروری ہوگا کہ مشابہت صرف صوری اور ظاہری ہوگی۔ ورنہ اصل لذت، ذائقہ، خوشبو وغیرہ کے لحاظ سے جنت اور دُنیا کی نعمتوں میں آسمان و زمین کی نسبت ہے۔ چنانچہ محققین نے کہہ دیا ہے کہ دونوں میں اشتراک صرف نام کا ہوگا۔[۳]

یعنی نرالے اور اجنبی پھل نہ ہوں گے جن سے وُہ نامانوس ہوں شکل میں انہی پھلوں سے ملتے جُلتے ہوں گے جن سے وُہ دُنیا میں آشنا تھے۔ البتہ لذت میں وُہ ان سے بدرجہا بہتر ہوں گے۔ دیکھنے میں مثلاً آم، انار اور سنترے ہی ہوں گے ہر پھل کو دیکھ کر پہچان لیں گے کہ یہ آم ہے اور یہ انار ہے اور یہ سنترہ ہے مگر مزے میں دُنیا کے آموں، اناروں اور سنتروں کو ان سے کوئی نسبت نہ ہوگی۔[۴]

یہ جو فرمایا ہے کہ ان کو ملتا جُلتا پھل ملے گا سو اکثر لُطف کے واسطے ایسا ہوگا کہ دونوں بار کے پھلوں کی صُورت ایک سی ہوگی جس سے وُہ بعد میں سمجھیں گے کہ یہ پہلی ہی قسم کا پھل ہے مگر کھانے میں مزہ اور ہوگا جس سے حظ و سرور مضاعف ہو جائے گا۔[۵]

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ یہ تشابہ اور تماثل صرف رنگ اور صُورت میں ہوگا۔ مزہ اور لذت میں ایک دُوسرے سے بالکل جُدا ہوں گے۔[۶]

۵۵ ــــ عربی متن میں ازواج کا لفظ آیا ہے جس کے معنے جوڑے کے ہیں۔ اور یہ لفظ شوہر

---

[۱] تفسیر ماجدی ص۱۳ [۲] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۷ [۳] تفسیر ماجدی ص۱۳ [۴] تفہیم القرآن ص۵۹۔
[۵] بیان القرآن ص۱۳ [۶] معارف القرآن م ا ص۱۲۷۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا یَسْتَحْیٖۤ اَنْ یَّضْرِبَ مَثَلًا مَّا بَعُوْضَةً فَمَا فَوْقَهَا ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا فَیَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ وَ اَمَّا الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فَیَقُوْلُوْنَ مَا ذَاۤ اَرَادَ اللّٰهُ بِهٰذَا مَثَلًا ۘ یُضِلُّ بِهٖ كَثِیْرًا ۙ وَّ یَهْدِیْ بِهٖ كَثِیْرًا ؕ وَ مَا یُضِلُّ بِهٖۤ اِلَّا الْفٰسِقِیْنَ ۙ

بیان حقیقت میں اللہ اس بات سے نہیں شرماتا ہے کہ کسی (حقیقت کو ذہنوں میں اُتارنے کے لیے) مچھر کی یا اس سے بڑھ کر کسی اور چیز کی مثال بیان کرے۔ جو لوگ ایمان لے آئے ہیں وہ تو بس جانتے ہیں کہ یہ حق ہے ان کے پروردگار کی جانب سے۔ لیکن جن لوگوں نے حق سے انکار کیا تو وہ کہتے ہیں کہ اس مثال سے اللہ کا کیا مطلب ہے؟ بہتوں کے حصے میں اس سے گمراہی آئے گی اور بہتوں کے سامنے اسی کے ذریعے سعادت کا راستہ کھل جائے گا (لیکن یاد رکھو) گمراہی ان ہی کے حصے میں آتی ہے جو ہدایت کی تمام حدیں توڑ کر حکم عدولی کرتے رہتے ہیں۔

اور بیوی دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے مگر وہاں یہ انداج پاکیزگی کی صفت کے ساتھ ہوں گے۔ اگر دنیا میں کوئی مرد نیک ہے اور اس کی بیوی نیک نہیں ہے تو آخرت میں ان کا رشتہ کٹ جائے گا اور اس نیک مرد کو کوئی دوسری بیوی دے دی جائے گی۔ اگر یہاں کوئی عورت نیک ہے اور اس کا شوہر بد ہے تو وہاں اس بُرے شوہر کی صحبت سے خلاصی پا جائے گی۔ اور کسی نیک مرد کو اس کا شریکِ زندگی بنا دیا جائے گا۔ اور اگر یہاں دونوں نیک ہیں تو وہاں

ان کا رشتہ ابدی و سرمدی ہو گا۔[۱]

بعض روشن خیالوں کو پاکیزہ بیویوں سے نہ معلوم اتنی شرم کیوں آئی کہ انہوں نے اس معنے ہی کا انکار کر دیا۔ اور "ازواجِ مطہرہ" کی تفسیر عجیب توڑ مروڑ کر کی ہے گویا بہشت میں رضائے الٰہی کے مقام میں ہر قسم کی انتہائی لذت، مسرت اور راحت کے موقعہ پر بیویوں اور پھر پاکیزہ بیویوں کا ملنا کوئی بڑی ہی شرم و غیرت کی بات ہے۔ جنت کے نفسِ وجود ہی سے اگر کسی کو انکار ہے تو بات اور ہے لیکن اگر جنت کا اقرار ہے تو پھر وہاں کی کسی لذت، کسی نعمت، کسی راحت سے انکار کے کوئی معنے نقلاً اور عقلاً درست نہیں ہیں۔ جنت نام ہی مادی اور روحانی ہر قسم کی لذتوں، مسرتوں اور راحتوں کے گھرانے کا ہے۔ یا پھر یہ کہ بیوی کے نعمت اور اعلیٰ نعمت ہونے سے انکار ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس عقیدے کا رشتہ اسلام سے نہیں بلکہ مسیحیت سے ہے۔ زوجیت جب اللہ کا ایک اعلیٰ انعام ہے تو آخر جنت میں کس جرم کی پاداش میں اس سے محرومی ہو گی۔[۲]

قرآن نے آغاز میں یہ دعویٰ کیا کہ یہ کتاب بلا شبہ اللہ کی جانب سے ہے اور اس پر قرآن نے لوگوں کے سامنے استدلال پیش کیا۔ استدلال اس قدر سادہ، اس قدر فطری اور اس قدر مؤثر اور دل آویز ہے کہ ایک ان پڑھ عامی، ایک عالم اور ایک محقق سب اس سے یکساں طور پر مستفید ہو سکتے ہیں۔

قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کے بارے میں چیلنج آپ پڑھ چکے ہیں۔ یہی قرآن کا کلامِ الٰہی ہونے پر استدلال ہے۔ مدعی کی دو ذمہ داریاں ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے دعوے پر دلیل پیش کرے دوسرے یہ کہ مخالف کی دلیل کا جواب دے۔ قرآن کے کلامِ الٰہی ہونے پر دلیل پیش کرنے کے بعد ان آیات میں مخالفین کی جانب سے اٹھنے ہوئے سوال کا جواب دیا جا رہا ہے۔ یہ مخالف کون تھے؟ یہودی، منافقوں اور مشرکین تینوں کا نام لیا گیا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تینوں ہوں لیکن چونکہ سورۃ البقرہ کا زمانۂ نزول حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی ہے اس لیے قرینِ قیاس یہی ہے کہ اصل اعتراض اٹھانے والے یہودی ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی یہی رائے ہے۔

اعتراض یہ تھا کہ چونکہ قرآن میں بہت سی حقیر چیزوں کا ذکر ہے جیسے مکھی اور مکڑی۔ اس لیے قرآن کلامِ الٰہی نہیں ہے۔

---

[۱] تفہیم القرآن [۲] تفسیر ماجدی ص۱۳

اس اعتراض کا پس منظر یہ تھا کہ قرآن حکیم نے جب مسائل کی وضاحت کے لیے اپنے اپنے موقع پر انسانی بول چال کے مطابق مثالیں پیش کیں۔ ضلالت اور سرکشی کے لیے آگ اور پانی کی مثال دی۔ بڑی بڑی اور چھوٹی سے چھوٹی چیز کا ذکر کیا۔ جانوروں میں ایک طرف ہاتھی، اونٹ، شیر اور دوسری طرف چیونٹی، مکھی، مچھر کا — مثال میں چونکہ زبان استعارے، تشبیہ اور کنایہ کی ہوتی ہے اس کی مخاطب کو چوٹ زیادہ لگتی ہے اس لیے دُکھن زیادہ ہوتی ہے۔ یہودیوں کی بے عملی کے لیے بھی قرآن نے سورۂ جمعہ میں گدھے کی مثال دی تھی۔ سُنی تو چمک پڑے اور تڑپ گئے لیکن کھل کر سامنے نہیں آئے مشرکین کا سہارا لے کر کھڑے ہو گئے کہ یہ کلام الٰہی کیونکر ہو سکتا ہے اس میں تو خسیس چیزوں کا ذکر ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :-

کافراں چوں ذکر ذباب وعنکبوت در قرآن شنیدند طعن کردند

کافروں نے جب قرآن میں مکھی اور مکڑی کا ذکر سُنا تو طعنہ زنی کی۔

ان آیات میں قرآن نے ماحول میں اُٹھتے ہوئے اسی سوال کا جواب دیا ہے۔

۵۶ — اس آیت میں اس معارضہ کا جواب دیا گیا ہے جو کفار کی طرف سے پہلی آیت پر ہوا۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ جب چھوٹی سی سورت بھی ان سے اس جیسی نہ بن سکی تو انہوں نے کہا کہ اگرچہ ہم اس کے مقابلے میں عاجز ہیں لیکن ہم ایک دوسری دلیل سے قرآن کا کلام الٰہی نہ ہونا ثابت کریں گے۔ اور وُہ یہ کہ بڑے لوگ اپنے کلام حقیر چیزوں کے ذکر سے دامن بچا کر رکھتے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ جو سب سے برتر ہیں وُہ اپنے کلام میں مکھی اور مکڑی کا ذکر کیسے کر سکتے ہیں — ان کے اس معارضہ کا جواب یہ دیا ہے کہ اس میں کوئی شرم اور عار کی بات نہیں کہ حق تعالیٰ مچھر یا اس سے بڑی چیز جیسے مکڑی مکھی کی مثال بیان فرمائے۔ کیونکہ مثال کا مقصد تو صرف بات کی توضیح ہوتا ہے اور یہ مقصد جبھی حاصل ہوتا ہے کہ مثال اور ممثل لہٗ میں پوری مطابقت ہو۔ ممثل لہٗ حقیر ہوگا تو مثال بھی حقیر ہوگی ورنہ تمثیل ہی بے ہودہ سمجھی جائے گی۔ ہاں اگر تمثیل میں یہ ہوتا کہ مثال اور مثال دینے والے میں موافقت ضروری ہے تو اس اعتراض کی کوئی گنجائش ہوتی لیکن اس کا کوئی بیوقوف بھی قائل نہیں ہے۔ تورات، انجیل اور کلام حکماء میں ایسی مثالیں بکثرت موجود ہیں کہ اس کے خلاف مُنہ پر بات لانا کفار کی حماقت اور فساد کی بات ہے۔ مَا فَوْقَهَا کے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مچھر سے حقارت اور چھوٹائی میں زیادہ ہو جیسے مچھر کے بازو کہ بعض حدیثوں میں اس کا دُنیا کی تمثیل میں ذکر آیا ہے۔[1]

[1] حاشیہ شیخ الہند ؒ

قرآن میں متعدد مقامات پر توضیح مدعا کے لئے مکڑی، مکھی اور مچھر کی جو تمثیلیں دی گئی ہیں۔ ان پر مخالفین کا اعتراض تھا کہ یہ کیسا کلام الٰہی ہے جس میں ایسی حقیر چیزوں کی تمثیلیں ہیں وہ کہتے تھے کہ اگر یہ خدا کا کلام ہوتا تو اس میں یہ فضولیات نہ ہوتیں ہیں[1]

حالانکہ مثال کی غایت ہی یہ ہے کہ وہ مسئلہ کو ذہن کے سامنے زیادہ کھول کر اور زیادہ وضاحت کے ساتھ لے آئے۔ اب یہ مقصد جس مثال سے بھی پورا ہو سکے اسی کو بہترین کہا جائے گا چاہے مثال میں پیش کی جانیوالی چیز بجائے خود کیسی ہی ہو۔ مچھر بظاہر ایک حقیر اور بے حقیقت سی مخلوق ہے۔ اب جہاں مخلوق کی بے حقیقی بیان کرنا ہوگی وہاں موزوں مثال مچھر ہی کی ہوگی۔ امام رازیؒ نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ صانع عالم۔ خلاق علیم کی بنائی ہوئی چیز بھی در حقیقت حقیر و بے حقیقت نہیں ہے۔ بلکہ جو چیز بظاہر جتنی چھوٹی ہوگی اسی قدر اس کا بیان کمال علم۔ کمال حکمت کی کچھ اور زیادہ دلیل ہوگا[2]

ف۔ یعنی ایمان والے تو ان مثالوں کو حق اور مفید سمجھتے ہیں اور کفار بطور تحقیر کہتے ہیں کہ ایسی حقیر مثالوں سے خدا کی کیا غرض ہے؟ جواب دیا گیا ہے کہ اس کلام سراپا ہدایت سے بہتیروں کو گمراہی میں ڈالنا اور بہتوں کو راہِ راست دکھلانا مقصود ہے یعنی اہل حق اور اہلِ باطل میں تمیز تام منظور ہے جو نہایت مفید اور ضروری ہے[3]

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ بات کو سمجھنا نہیں چاہتے حقیقت کی جستجو ہی نہیں رکھتے۔ ان کی نگاہیں تو بس ظاہری الفاظ میں اٹک کر رہ جاتی ہیں اور وہ ان چیزوں سے الٹے نتائج نکال کر حق سے اور زیادہ دور چلے جاتے ہیں۔ برعکس اس کے جو خود حقیقت کے طالب ہیں اور صحیح بصیرت رکھتے ہیں ان کو انہی باتوں سے حکمت کے جوہر نظر آتے ہیں اور ان کا دل گواہی دیتا ہے کہ ایسی حکیمانہ باتیں اللہ ہی کیطرف سے ہو سکتی ہے۔

قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ہدایت وسعادت کی راہ عقل و علم کی راہ ہے اور گمراہی و شقاوت کا سرچشمہ جہل و کوری ہے اور حواس و تفکر کو بے کار کر دینا ہے۔ جو لوگ خدا کی دی ہوئی عقل سے کام نہیں لیتے یا ہوائے نفس سے اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ذہن و ادراک کی قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتے[4]

قرآن نے ان کے اس اعتراض کا ایسا معنی خیز جواب دیا ہے کہ جس سے اللہ سبحانہٗ کا

---

[1] تفہیم القرآن ص ۵۹، ج ۱ [2] حاشیہ شیخ الہند ص ۷، [3] تفہیم القرآن ص ۶۰۔ [4] ترجمان القرآن۔

قانون ہدایت و سعادت کھل کر سامنے آگیا ہے۔ دنیا کی زندگی میں ہر گوشے کی طرح ہدایت و ضلالت کا بھی ایک قانون ہے جو ہر عہد اور ہر ملک میں ایک جیسے نتائج رکھتا ہے اس کے احکام میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی۔ طالبینِ ضلالت کے لئے ضلالت کے دروازے اور ہدایت کے طلبگاروں کے لئے ہدایت کی راہیں کھولنا اللہ کا قانون ہے۔ گمراہی صرف ان کے حصے میں آتی ہے یا گمراہ وہ ہوتے ہیں جو خود گمراہ رہنا چاہتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کسی پر گمراہی کو چپکاتا نہیں ہے۔ بار بار کی ارادی نافرمانیوں اور عدول حکمیوں سے اندر کا نور بجھ جاتا ہے اور طبیعت میں حق کی طلب اور صداقت کی تلاش جاتی رہتی ہے بلکہ اس کے برعکس باطل پر جمود پیدا ہو جاتا ہے۔ وَمَا يُضِلُّ بِهٖٓ اِلَّا الْفٰسِقِيْنَ کا یہی منشا ہے۔

آیت میں دونوں جگہ اضلال اور ہدایت کے تذکرے کے ساتھ کَثِيْرًا کا لفظ لا کر بتا دیا کہ اہل ضلالت تو فی الواقع عددی اعتبار سے اکثریت میں ہوتے ہیں اور اہل حق اگرچہ عددی لحاظ سے اکثریت میں نہیں ہوتے کیونکہ ایک کی زیادتی دوسرے میں کمی کی علامت ہے لیکن عددی قلت کے باوجود اہل حق اپنی معنوی خوبیوں، اخلاقی بزرگیوں، ایمانی قوتوں اور روحانی نورانیتوں کی وجہ سے ان سے زیادہ نفع رساں اور نفع بخش ہوتے ہیں۔ گویا اگر اہلِ باطل میں مادی کثرت ہوتی ہے۔ تو اہل حق میں معنوی۔ اسی بنا پر جنگ میں تخفیف کے بعد ایک حق پرست کو دو کے مقابلے میں اور تخفیف سے پہلے ایک حق پرست کو دس کے مقابلے میں کافی بتایا گیا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ اہل حق کی معمولی سی تعداد نے دنیا کی امامت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔

دراصل جو لوگ اللہ کی دی ہوئی عقل سے کام نہیں لیتے ان کے ساتھ یہی معاملہ ہوتا ہے اور اللہ کی دی ہوئی عقل سے کام لے کر جو یقین کی بنیاد پر دلائل کی عمارت اٹھاتے ہیں۔ ان کا نعرہ یہی ہوتا ہے کہ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ۔ جب کسی حقیقت تک یقین کے ساتھ رسائی ہو جاتی ہے تو پھر دلائل کا راستہ خود بخود مختصر ہو جاتا ہے۔ امام شعرانی رح لکھتے ہیں کہ مومن کامل وہ ہے جس کے نزدیک عالم غیب یقین میں عالم شہادت کے برابر ہو جاتے علامہ اقبال مرحوم نے اسی صفت یقین کو اس شعر میں پیش کیا ہے ؎

غلامی میں نہ کام آتی ہیں تدبیریں نہ شمشیریں
جو ہو ذوقِ یقیں پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں

الَّذِيْنَ يَنْقُضُوْنَ عَهْدَ اللّٰهِ مِنْۢ بَعْدِ مِيْثَاقِهٖ ۠ وَيَقْطَعُوْنَ مَآ اَمَرَ اللّٰهُ بِهٖٓ اَنْ يُّوْصَلَ وَيُفْسِدُوْنَ فِى الْاَرْضِ ۭ اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ۝

فاسق کون ہیں؟ ـــــــ فاسق[58] وہ لوگ ہیں جو اللہ کے عہد[59] کو اپنی زندگی کی مختلف شاخوں میں اپنی بدعملی سے باوجود اس کے استحکام[60] کے توڑتے رہتے ہیں ـــــــ اور ان تعلقات کو جن کے جوڑنے کا اللہ نے حکم دیا ہے، کاٹنے[61] میں بے باک ہیں اور ملک میں اپنی بدعملیوں[62] سے فساد برپا کرتے ہیں۔ فی الواقع یہی لوگ سراسر نقصان[63] اٹھانے والے ہیں۔

---

[58] فاسق فسق سے بنا ہے۔ ائمہ لغت لکھتے ہیں کہ فاسق کے استعمال کی اسلام سے پہلے عربی زبان میں عادت نہ تھی۔ فیروزآبادیؒ فرماتے ہیں کہ عرب جاہلیت کے نثر اور نظم میں عربی ہونے کے باوجود لفظ فاسق استعمال نہیں ہوا ہے اور ابن الاعرابیؒ نے کہا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے ادبی ذخیرے میں لفظ فاسق نہیں ہے۔ فسق بحیثیت فعل بے جان چیزوں کے سلسلے میں ضرور مستعمل تھا۔ لیکن بحیثیت اسم فاسق کا استعمال کلام عرب میں انسان کے لئے نہیں ملتا ہے۔ گویا اس اصطلاحی معنے میں جس میں اس کا استعمال اب عربی بلکہ اردو میں عام ہے یہ تمام تر ایک اسلامی لفظ ہے اور ان چند لفظوں میں سے ہے جو قرآن نے آکر عربی زبان کو دیئے۔ علامہ زبیدیؒ نے تصریح کی ہے کہ اس کا اطلاق عربی میں اسلام سے پہلے نہیں ہے۔ اس لئے فاسق کے اسلامی اطلاق کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیئے

اسلام کی اصطلاحی زبان میں شریعت کی حدود سے باہر ہو جانے والے کو فاسق کہتے ہیں۔ یہ لفظ اگرچہ دونوں یعنی کافر اور مومن عاصی پر قرآن میں بولا گیا ہے۔ لیکن کافر کا فسق مومن عاصی کے فسق سے زیادہ سنگین ہوتا ہے۔

[59] بادشاہ اپنے ملازموں اور رعایا کے نام فرمان یا ہدایت جاری کرتا ہے ان کو عربی محاورے میں عہد سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کیوں کہ ان کی تعمیل رعایا پر واجب ہوتی ہے یہاں عہد کا لفظ انہی معنی میں استعمال ہوا ہے۔ اللہ کے عہد سے مراد اس کا وہ مستقل فرمان ہے جس کی رو سے تمام

نوعِ انسانی صرف اسی کی بندگی و طاعت کرنے پر مامور ہے[1]

عہد سے اس جگہ وہ وصیت مراد ہے جس کی حق تعالیٰ نے اپنے تمام پیغمبروں کے ذریعے تاکید کی کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو اور اس کے پیغمبروں کی تصدیق کرو۔ کچھ کے خیال میں عہد سے مراد وہ عہد ہے جو اللہ تعالیٰ نے تورات میں یہودیوں سے لیا تھا کہ نبی آخر الزمان پر ایمان لانا۔ کچھ کہتے ہیں کہ عہد سے عہدِ الست مراد ہے[2]

اس عہد کا ذکر قرآن میں دوسری جگہ آیا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پشت سے سب کو نکال کر توحید کا اقرار لیا تھا[3]

معاہدہ طاعت، عہدِ ایمان، توحید کا حاسہ فطری۔ اقرار توحید در بوبیت تو ایسا سیدھا سادہ صاف مسئلہ ہے کہ ہر انسان کی فطرتِ سلیم اس عقیدہ پر گواہ ہے[4]

[5] ۔ باوجود اس کے استحکام کے۔ اس سے اس طرف اشارہ ہے کہ آدم کی تخلیق کے وقت تمام نوعِ انسانی سے اس فرمان کی پابندی کا اقرار لیا گیا ہے۔

اسی عہدِ فطرت کی توثیق ہر دَور اور ہر زمانہ میں انبیا کے ذریعے سے ہوتی رہی ہے۔ گویا یہ عہد اتنا مضبوط اور مستحکم ہے کہ فطرتِ انسانی میں ودیعت کر دیا گیا ہے اور فطرتِ انسانی کی اصلی آواز تصدیق و ایمان ہے انکار و کفر نہیں ہے۔ اس بنا پر کوئی انسان اپنی غفلت کے لئے معذور نہیں ہو سکتا اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ آباؤ اجداد کی گمراہی سے میں گمراہ ہو گیا ہوں۔ کیوں کہ اس کے باوجود کہ باہر گمراہی کے کتنے ہی عوامل جمع ہو جائیں۔ لیکن اس کی فطرت کی اندرونی آواز (عہد اللہ) کبھی دب نہیں سکتی بشرطیکہ وہ خود اس کے دبانے کے درپے نہ ہو جاتے اور اس کی طرف سے کان بند نہ کرلے۔

[6] اس میں تمام تعلقات شرعیہ جو درمیان عبد اور رب کے ہیں یا باہم اقارب میں ہیں یا عام اہلِ اسلام یا بنی آدم سے ہیں یا باہم انبیا علیہم السلام میں ہیں داخل ہو گئے[5]

آیت کے وسعتِ مفہوم میں سارے حقوق اللہ اور حقوق العباد داخل ہیں۔ یعنی وہ سارے فرائض جو ہر انسان پر خالق و مخلوق دونوں سے متعلق رہتے ہیں۔ جیسے قطع رحم کرنا۔ انبیاء، علما، واعظین اور مومنین نماز اور دیگر جملہ امورِ خیر سے اعراض کرنا[6]

---

[1] تفہیم القرآن ص۶۱ ج۱ [2] معارف القرآن ص۱۰۱ [3] بیان القرآن ص۱۵ [4] تفسیر ماجدی ص۷۱
[5] بیان القرآن ص۱۵۔ [6] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۷۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن روابط کے قیام و استحکام پر انسان کی اجتماعی و انفرادی فلاح کا انحصار ہے اور جنہیں درست رکھنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔ ان پر یہ لوگ تیشہ چلاتے ہیں۔ اس میں دریا کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔ گویا انسانی تمدن و اخلاق کی پوری دنیا پر جو دو آدمیوں کے تعلق سے لے کر عالمگیر بین الاقوامی تعلقات پر پھیلی ہوئی ہے صرف یہی ایک جملہ حاوی ہو جاتا ہے۔ روابط کو کاٹنے سے مراد محض شہری زندگی میں معاشرتی تعلقات کا انقطاع نہیں ہے بلکہ تعلقات کی صحیح اور جائز صورتوں کے علاوہ جو صورتیں بھی اختیار کی جائیں گی۔ وہ سب اسی ذیل میں آ جائیں گی۔ کیونکہ ناجائز اور غلط روابط کا انجام وہی ہے جو قطع روابط کا ہے۔ یعنی بین الانسانی معاملات کی خرابی اور نظام اخلاق و تمدن کی تباہی [1]

اللہ سبحانہ کے اوامر دو طرح کے ہیں۔ تکوینی اور تشریعی۔ نتائج کا مقدمات عقلیہ پر مرتب ہونا دلائل کا اپنے مدلولات سے لگاؤ رکھنا۔ اسباب کے ذریعے مسببات تک رسائی ہونا۔ غایات کے وسیلے سے منافع اور مضار کا پتہ لینا ———— وہ تکوینی اوامر ہیں جن کی تعمیل انسان کی فطری ذمہ داریوں میں داخل ہے۔ اور تشریعی اوامر وہ ہیں جن کی اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی طرف وحی فرمائی ہے۔ اگر ایک شخص نبی کی صداقت کو دلائل سے ثابت ہو جانے کے بعد نہیں مانتا یا مقدمات تسلیم کر کے نتائج کے سامنے سر تسلیم خم نہیں کرتا۔ حق کو حق کی راہوں سے حاصل نہیں کرتا یہ شخص فی الواقع فطرت کا اوامر کی قطع و برید کر رہا ہے

فساد سے مراد یہ ہے کہ لوگوں کو ایمان سے نفرت دلاتے تھے اور مخالفین اسلام کو وہ خلاف اہل ایمان سے مقابلہ کراتے اور حضرات صحابہؓ اور صلحائے امت میں عیوب نکال کر تشہیر کرتے تھے تاکہ آپ کی اور دین اسلام کی بے وقعتی لوگوں کے ذہن نشین ہو جاتے اور مسلمانوں کے راز مخالفوں تک پہنچاتے اسی طرح کی رسوم و بدعات خلاف طریقۂ اسلام پھیلانے میں سعی کرتے تھے [2]

ظاہری فساد یہ کرتے کہ کسی پر ظلم کرتے۔ کسی کی آبروریزی کرتے کسی کی حق تلفی کرتے اور باطنی یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کفر کرتے۔ آپ سے عداوت اور کینہ رکھتے۔ [3]

اس فساد کے اندر روحانی، مادی ہر قسم کے عناصر شامل ہیں۔ اسلام کی حقیقت چونکہ یہ ہے کہ وہ زندگی کا ایک مکمل دستور العمل ہے اور ایک ہمہ گیر نظام حیات ہے اس لئے اس کی موجودگی میں اس سے اعراض و انحراف کے کھلے معنی یہ ہیں کہ کسی ناقص دستور زندگی کو قبول کر لیا گیا ہے۔ اس ناقص نظام زندگی کا قدرتی نتیجہ انفرادی انتشار اور اجتماعی اختلال کے سوا کچھ نہیں ہے آج سب کا مشاہدہ ہے کہ دنیا اپنی ترقیوں

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۱ ، [2] حاشیہ شیخ الہند ص ۷ ، [3] بیان القرآن ص ۳۵ -

كَيْفَ تَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَكُنْتُمْ أَمْوَاتًا فَأَحْيَاكُمْ ۖ ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ ثُمَّ إِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۞ هُوَ الَّذِي خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ثُمَّ اسْتَوَىٰ إِلَى السَّمَاءِ فَسَوَّاهُنَّ سَبْعَ سَمَاوَاتٍ ۚ وَهُوَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۞

لوگو! ——— تم اللہ (کی عبادت میں یگانگت) کا کیسے[۶۴] انکار کر سکتے ہو؟ جب کہ صورت حال یہ ہے کہ تم موجود نہ تھے[۶۵] اس نے بلا شرکت تم کو وجود بخشا پھر وہی تم کو زندگی کے بعد مارتا ہے[۶۶] اور پھر وہی موت[۶۷] کے بعد تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا پھر اس کے حضور میں تمہیں پیش[۶۸] ہونا ہے (اور صرف یہی نہیں بلکہ) وہی ہے جس نے زمین کی ساری کی ساری چیزیں تمہاری خاطر پیدا کی ہیں[۶۹]۔ پھر وہ آسمان کی طرف متوجہ[۷۰] ہوا۔ اور سات آسمان ٹھیک بنا دیئے (جن میں کہیں کوئی رخنہ نہیں ہے) اور وہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔

۶۲ اور علمی کمالات کے باوجود کیسے فسادوں کا گہوارہ بنی ہوئی ہے۔

۶۳ مطلب یہ ہے کہ ان حرکات ناشائستہ سے اپنا ہی کچھ کھوتے ہیں توہین اسلام اور تحقیر صلحائے امت کچھ بھی نہ ہوگی۔ صرف یہ ہی ہوا کہ دنیا کی راحت اور آخرت کی نعمت سب سے ہاتھ دھو بیٹھے۔[۱]

گروہ پیش میں اٹھے ہوئے سوال کا جواب دینے اور قرآن کے کلام اللہ ہونے کے دلائل پیش فرمانے کے بعد پھر اصل مسئلہ کی طرف لوگوں کو متوجہ کیا ہے کہ نبوت اصل میں یہی دعوت لے کر آئی ہے یہی تمام نبیوں کی پکار رہی ہے۔ میری مراد ہے یگانہ خدا کی عبادت۔ اسی مسئلہ میں نبوت کا اپنے مخاطبوں سے

[۱] حاشیہ شیخ الہند رحمہ۔

اختلاف ہے ۔ حافظ ابن کثیرؒ نے تَکْفُرُوْنَ کی یہ تشریح کر کے کہ اللہ کے ساتھ اوروں کی کیسے عبادت کرتے ہو۔ اسی طرف اشارہ کیا ہے ۔ مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے یہی بات سمجھی ہے فرماتے ہیں کہ اس کے احسانوں کو بھلا دیتے ہو اور غیروں کا کلمہ پڑھتے ہو ———— جن بزرگوں کی نظر اس پہلو پر نہیں ہے ان کو کفر و انکار کی توجیہات کرنی پڑی ہیں ، مثلاً یہ کہ ان لوگوں نے بظاہر خدا کا انکار نہیں کیا مگر رسول اور خدا کے انکار کو خدا ہی کا انکار قرار دے کر ایسا خطاب کیا گیا ہے ———— ان کے پیش نظر یہ بنیادی حقیقت ہوتی تو کبھی تاویل کی ضرورت ہی پیش نہ آتی ۔ دراصل کہا یہ جا رہا ہے کہ دلائل واضحہ اور براہین قاطعہ کی موجودگی میں تمہارا اللہ کی عبادت میں شرک کرنا اور اس سے کافرانہ تعلقات رکھنا بڑا ہی عجیب ہے ۔

۶۴ یعنی کفر و انکار کی جرأت کیسے کرتے ہو ۔ سوال سے مقصود ان کی اس سفاہت پر استعجاب ہے کہ اللہ کو خالق کائنات مانتے ہو ۔ رب مانتے ہو اور سب کچھ مانتے ہو لیکن عابدانہ تعلقات دوسروں سے قائم کرتے ہو ۔ حیرت ہے کہ اللہ کی مخلوق ۔ مملوک اور مرزوق ہو کر بندگی اور پرستش میں اللہ کے ساتھ دوسروں کی ملاوٹ کرتے ہو ۔ یہ ان کی سفاہت پر تنبیہ اور توبیخ ہے اور بتانا یہ ہے کہ اس کے احسانوں کو بھلا دیتے ہو غیروں کا کلمہ پڑھتے ہو حالانکہ اس کے استحقاق عبادت میں یکتا ہونے پر دلائل قائم ہیں[۱]

۶۵ کہ تم موجود نہ تھے ۔ اس نے تم کو وجود بخشا ۔ اموات میت کی جمع ہے مردہ اور بے جان کو کہتے ہیں مراد یہ ہے کہ انسان اپنی حقیقت پر غور کرے تو معلوم ہوگا کہ اس کے وجود کی ابتداء وہ بے جان ذرات ہیں جو کچھ منجمد چیزوں کی شکل میں کچھ بہنے والی چیزوں میں ، کچھ غذاؤں کی صورت میں تمام دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ نے ان بے جان ذرات کو کہاں کہاں سے جمع فرمایا ۔ پھر ان میں جان ڈالی ۔ ان کو زندہ انسان بنا دیا[۲] ———— اور یا مطلب یہ ہے کہ تم صلب پدر میں تھے تمہاری تشکیل بھی نہ ہوئی پھر رحم مادر میں تمہیں حیات عطا فرمائی ۔ نعمتوں میں سب سے مقدم حیات ہے کہ دوسری تمام نعمتوں سے استفادہ اس کے بعد ممکن ہے[۳]

۶۶ یعنی جس نے پہلی بار تمہارے بے جان ذرات کو جمع کیا ان میں جان ڈالی ہے وہ اس عالم میں تمہاری عمر کا وقت مقررہ پورا ہونے پر تمہیں مارے گا[۴]

---

۱ بیان القرآن ص۲۶ ج۱ ۔ ۲ معارف القرآن مح ص۱۱۵ ج۱ ۔ ۳ تفسیر ماجدی ص۱۴ ج۱ ۔ ۴ معارف القرآن کش ص۱۱۵

مطلب یہ ہے کہ تم بے جان اجسام تھے، جس میں حرکت کچھ نہ تھی۔ اصل عناصر تھے اس کے بعد والدین کی غذا بنے۔ پھر نطفہ، پھر خون بستہ، پھر گوشت پھر روح ڈال گئی جس سے تم ماں اور اس دنیا میں زندہ رہے پھر دنیا میں جب مرنے کا وقت آئے گا، وہ تمہیں مار ڈالے گا[1]

مقصد یہ ہے کہ خلق، احیاء، افناء کی سب طاقتیں اللہ تعالیٰ کے پاس ہیں یہ نہیں جیسا کہ بعض مشرک قوموں کا عقیدہ ہے کہ موجد و خالق برہما جی ہیں۔ قائم اور باقی رکھنے والے وشنو جی اور موت و ہلاکت دینے والے شیو جی ہیں[2]

ف۲۷ تمہیں دوبارہ زندہ کرے گا۔ یعنی پھر ایک عرصہ کے بعد قیامت کو اسی طرح تمہارے جسم کے بیجان ذرات کو جمع کر کے تمہیں زندہ کرے گا۔ اس طرح ایک موت تمہاری ابتدا میں تھی دوسری موت دنیا کی عمر پوری ہونے کے وقت اور دوسری زندگی قیامت کے روز ہوگی۔ پہلی زندگی اور موت کے درمیان چونکہ کوئی فاصلہ نہ تھا اس لیے حرفِ فاء استعمال کیا اور فرمایا فَأَحْيَاكُمْ اور چونکہ دنیا کی حیات اور موت کے درمیان اسی طرح اس موت اور قیامت کے روز کی زندگی کے درمیان کافی فاصلہ تھا اس لیے ثُمَّ استعمال کیا گیا ثُمَّ يُمِيتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيكُمْ[3]

ف۲۸ پھر اسی کے حضور میں تمہیں پیش ہونا ہے۔ یعنی قبروں سے نکل کر اللہ تعالیٰ کے روبرو حساب و کتاب کے واسطے کھڑے کیے جاؤ گے۔ لہٰذا اب خود ہی انصاف کرو کہ جب تم اوّل سے آخر تک مرہون ہو اور ہر حالت اور ہر حاجت میں اس کے محتاج ہو پھر اس پر بھی کفر کرنا اور اس کی نافرمانی کرنا کس قدر تعجب خیز ہے[4]

ف۲۹ اس آیت میں دوسری نعمت بیان فرمائی ہے یعنی اللہ نے تم کو پیدا کیا ہے اور تمہارے انتفاع کے لیے زمین میں ہر قسم کی چیزیں بکثرت پیدا فرمائی۔ مطعومات۔ مشروبات اور ملبوسات اور ہر چیز کے لیے آلات و سامان[5]

یہ آیت ہر قسم کے شرک کی جڑ کاٹنے کے لیے کافی ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ تم خود ساری کائنات ارضی کا مقصود ہو۔ پھر یہ کیسی حماقت ہوگی کہ جو کچھ تمہارے لیے ہے تم اسی کو اپنا مقصود و مطاع بنا لو۔ اس فرش زمین پر جو کچھ ہے سب انسان ہی کے لیے ہے نہ یہ کہ انسان کسی اور مخلوق کے لیے ہے اور مشرک اس فطری اور قدرتی ترتیب کو الٹ دیتا ہے[6]

---

۱ حاشیہ شیخ الہند صـ۹ ۲ حاشیہ شیخ الہند صـ۹ ۳ معارف القرآن م ش صـ۱۱
۴، ۵ حاشیہ شیخ الہند صـ۹۔ ۶ تفسیر ماجدی صـ۲۳۔

قرآن کے بیان کردہ اس دعویٰ سے کہ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِى الْأَرْضِ سے جلدی نہ گذر جائیے۔

ماحصل انسانی زندگی کا نقطۂ آغاز اور انجام بیان فرمانے کے بعد زمین کی گود میں انسان کی حیثیت اور مقام کو بیان فرمایا ہے اور اس کے لئے بطور تمہید یہ پرشوکت تعبیر اختیار فرمائی اس میں تمام انسانوں کو خطاب ہے کہ زمین میں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہے وہ انسان کے لئے ہے۔ انسان ان کی خاطر نہیں ہے انسان کی حیثیت اس مکان میں خادم کی نہیں بلکہ مخدوم کی ہے۔ انسان اس ساری کائنات ارضی کے لئے مطاع و مقصود ہے یہی اس ساری ہدایات کا دولہا ہے۔ مافی الارض اس لئے ہے کہ انسان اپنے مقصد زندگی کی کامیابی کے لئے اس سے فائدہ اٹھائے۔ انسان کا مقصدِ حیات اللہ کی عبادت ہے اور ما فی الارض کا مقصد تخلیق انسان کی خدمت ہے۔ جب تک یہ کائنات انسان کے مقصد کی تکمیل، اس کی بجا آوری کا ذریعہ ہے تو یہ پوری کائنات انسان کے لئے رحمت ہے۔ اللہ کا انعام ہے اور جب بھی مافی الارض خود مخدوم اور انسان کو اپنا خادم بنا کر انسان کے مقصدِ حیات کی تکمیل میں رکاوٹ بن جائے تو یہی زحمت ہے۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز نے اسے جس انداز سے سمجھایا ہے اس کا قریبی مفہوم یہ ہے کہ آیتِ گرامی وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ (میں نے انسانوں اور جنات کو اپنی عبادت کے لئے پیدا کیا ہے) کا یہ صاف اعلان ہے کہ انسان کا مقصد حیات اللہ سبحانہٗ کی عبادت ہے اور عبادت نام ہے بندگی اور پرستش کا۔ اگر دنیا اور اس کی ساری موجودات اس آیت خَلَقَ لَكُم مَّا فِى الْأَرْضِ جَمِيعًا کی وجہ سے انسان کے لئے ہے اور یقیناً ہے تو بلاشبہ یہ سب سامان عبادت ہے اگر یہ سامان عبادت فراہم نہ کیا جاتا تو انسان فی الواقع فرض عبادت کے لائق ہی نہ ہوتا۔ حاصل یہ ہے کہ فرش زمین کی ساری تخلیقی غرض اللہ سبحانہٗ کی عبادت ہے فرق صرف یہ ہے کہ انسان کی تخلیق عبادت کے لئے ہے اور ما فی الارض کی تخلیق انسان کے لئے ہے یعنی انسان کے مقصدِ تخلیق کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے۔ جیسے روٹی کھانے کے لئے پکائی جاتی ہے لیکن اس کی خاطر چولہا، چمٹا، چکنی اور توا مہیا کئے جاتے ہیں یہ سب پکانے کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے کھانے کے لئے ہے۔ ٹھیک ٹھیک ایسے ہی فرش زمین کی ساری چیزوں کی تخلیق کو بھی عبادت کے لئے کہا جائے گا۔ اگر فرش زمین کی موجودات انسان کے مقصد تخلیق عبادت کو پورا کر رہے ہوں اور عبادت کا ذریعہ نہ ہوں تو اللہ سبحانہٗ کی نظر میں اس کی کوئی قیمت نہیں ہے اور یہ سب کچھ انسان کے لئے نعمت ہونے کی بجائے سرتا سر زحمت ہے۔

<u>زمین سے انتفاع کی صورتیں</u> ما فی الارض سے فائدہ اٹھانے کی قرآن نے دو صورتیں بتائی ہیں، ایک یہ کہ جسمانی

' نشو و نما کے لیے خود اس کی ذات سے فائدہ اٹھاتے۔ غذائی مواد کے ذخیرے حاصل کرے۔ طاقتور بننے کے وسائل مہیا کرے۔ دوسرے یہ کہ عقلیت کو فروغ دینے کے لئے ما فی الارض کو فکر و نظر اور استدلال و اعتبار کا مرکز بنائے۔ اس سے معرفت کے دروازے کھلتے ہیں اور یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ یہ تمام کارخانہ ہستی اور اس کا عجیب و غریب نظام بغیر کسی اعلیٰ مقصد کے نہیں ہے اور جب یہ حقیقت کھلے گی تو روح عبادت کے جوش سے معمور ہو جائے گی۔

آیئے اب ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمایئے کہ علماء نے سرزمین کی تخلیق کے سلسلہ میں لکھم کے زور سے یہ بھی معلوم کیا ہے کہ دنیا کی تمام چیزوں میں اصل یہ ہے کہ وہ انسانوں کے لئے حلال اور مباح ہیں۔ کیونکہ وہ انہی کے لئے پیدا کی گئی ہیں بجز ان چیزوں کے جن کو اللہ نے حرام کر دیا ہے اس لئے جب تک کسی چیز کی حرمت اللہ کے قانون سے ثابت نہ ہو وہ انسانوں کے لئے حلال ہے۔

اس طرح گویا اس آیت میں مذہب کے اس تصور کا رد ہو رہا ہے کہ روحانی سعادت اور قرب الٰہی اس وقت نصیب ہو سکتا ہے جب زمین اور زمین کی چیزوں کو چھوڑ دیا جائے قرآن لکم کے زور سے بتا رہا ہے کہ زمین کی چیزیں اور اس کی آسائشیں، سعادت اور روحانیت کے خلاف نہیں ہیں۔ بلکہ ان کو کام میں لانا عین منشاء ایزدی کی تعمیل ہے۔ زمین کی چیزیں اس لئے ہیں کہ کام میں لائی جائیں۔ یہ آیت قرآن کا ایک انقلاب انگیز اعلان ہے۔ جس نے انسان کی دینی ذہنیت کی بنیادیں پلٹ دی ہیں۔ وہ ما فی الارض جسے نجات و سعادت کی خاطر چھوڑا جا رہا تھا۔ اب اسی میں نجات و سعادت کو تلاش کرنے کا حکم ہو رہا ہے

ثم پھر آسمان کی طرف متوجہ ہوا۔ اسْتَوَىٰ کے معنی قصد کیا توجہ کی، التفات کیا آتے ہیں۔ السماء آسمان، ابر، بارش۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں ہر چیز جو بالا ہے وہ سماء ہے۔ بعض نے کہا ہے کہ ہر سماء اپنے نیچے کے اعتبار سے سماء ہے اور اپنے اوپر کی نسبت سے ارض ہے۔ نیز بارش کو سماء کہا گیا ہے۔ اور گھاس کو بھی سماء کہتے ہیں۔ وہ سماء جو ارض کے مقابل ہے مؤنث ہے اور کبھی مذکر بھی آتا ہے واحد اور جمع دونوں کے لئے استعمال ہوتا ہے اور کبھی اس کی جمع سموات بھی آتی ہے۔ جو سماء بمعنے بارش ہے وہ مذکر ہی استعمال ہوتا ہے۔ ابن فارس کہتے ہیں کہ وہ چیز جو تمہارے اوپر ہو سماء ہے اسی لئے قرآن میں گھر کی چھت کو بھی آسمان کہا گیا ہے۔[1]

سات آسمانوں سے کیا مراد ہے؟ اس کا تعین مشکل ہے انسان ہر زمانے میں آسمان یا بالفاظ

---

[1] لغات القرآن

دیگر مادرا سے زمین کے متعلق اپنے مشاہدات یا قیاسات کے مطابق مختلف تصورات قائم کرتا رہا ہے جو برابر بدلتے رہتے ہیں۔ لہٰذا ان میں سے کسی تصور کو بنیاد قرار دے کر قرآن کے ان الفاظ کا مفہوم متعین کرنا صحیح نہ ہوگا۔ بس اتنا سمجھ لینا چاہیئے کہ اس سے یا تو یہ مراد ہے کہ زمین سے ماورا جس قدر کائنات ہے۔ اسے اللہ نے سات محکم طبقوں میں تقسیم کیا ہے یا یہ کہ زمین اس کائنات کے جس حلقے میں واقع ہے وہ سات طبقوں پر مشتمل ہے۔[۱]

موجودہ زمانے میں اجرام سماویہ کی ابتدائی تخلیق کے بارے میں جو نظریے تسلیم کئے گئے ہیں۔ ان کی بنیاد پر کوئی فیصلہ صحیح نہیں ہے۔ یہ نظریے کتنے ہی مستند کیوں نہ ہوں اور نظریات سے جزم و یقین کے ساتھ حقائق کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ پھر اس کا کیا فائدہ کہ ان کی روشنی میں قرآن کے مجملات کی تشریح کی جائے قدیم اہل ہیئت نے سات آسمانوں سے مراد سات مشہور سیاروں کے مدار لئے ہیں یعنی کرہ قمر کرہ عطارد کرہ زہرہ، کرہ شمس، کرہ مریخ، کرہ مشتری اور کرہ زحل۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ:۔

اس آیت میں زمین کی پیدائش پہلے اور آسمانوں کی بعد میں ہونا بلفظ ثم بیان کیا گیا ہے اور یہی صحیح ہے۔ اور سورہ والنازعات میں جو یہ ارشاد ہے وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا یعنی زمین کو آسمانوں کے بعد بچھایا اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمین کی پیدائش آسمانوں کے بعد ہوئی ہو بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی درستگی اور اس میں سے پیداوار وغیرہ نکالنے کا کام آسمان کی تخلیق کے بعد ہوا ہے اگرچہ زمین کی تخلیق آسمانوں سے پہلے ہو چکی تھی (بحر محیط قرطبی)[۲]

[۱] صفت خلق کے بعد صفت علم کو بتایا ہے، اس فقرے میں دو اہم حقیقتوں پر تنبہ فرمایا گیا ہے ایک یہ کہ تم اس خدا کے مقابلے میں کفر و بغاوت کا رویہ اختیار کرنے کی جرأت کیسے کرتے ہو جو تمہاری تمام حرکات سے باخبر ہے۔ جس سے تمہاری کوئی حرکت چھپی ہوئی نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ جو خدا تمام حقائق کا علم رکھتا ہے، جو درحقیقت علم کا سرچشمہ ہے۔ اس سے منہ موڑ کر بجز اس کے کہ تم جہالت کی تاریکیوں میں بھٹکو اور کیا نتیجہ نکل سکتا ہے جب اس کے سوا علم کا اور کوئی منبع ہی نہیں ہے۔ جب اس کے سوا اور کہیں سے علم کی وہ روشنی نہیں مل سکتی جس میں تم اپنی زندگی کا راستہ صاف دیکھ سکو تو اس سے روگردانی میں تمہیں کیا فائدہ ہے۔[۳]

---

[۱] تفہیم القرآن ص ۶۱ [۲] معارف القرآن ج۱ ص ۱۵۸ [۳] تفہیم القرآن ج۱ ص ۶۱

وَإِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلَٰٓئِكَةِ إِنِّى جَاعِلٌ فِى ٱلْأَرْضِ خَلِيفَةً ۖ قَالُوٓا۟ أَتَجْعَلُ فِيهَا مَن يُفْسِدُ فِيهَا وَيَسْفِكُ ٱلدِّمَآءَ وَنَحْنُ نُسَبِّحُ بِحَمْدِكَ وَنُقَدِّسُ لَكَ ۖ قَالَ إِنِّىٓ أَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

اور اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ جب تمہارے پروردگار نے فرشتوں سے کہا میں زمین میں ایک جانشین اور نائب بنانے والا ہوں۔ انہوں نے عرض کیا کہ کیا آپ زمین میں ایسی ہستی کو نائب بنانے والے ہیں، جو اس میں خرابی پھیلائے گی اور خون ریزیاں کریگی حالانکہ ہم آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح کرتے رہتے ہیں اور آپ کی پاکی کا اقرار کر رہے ہیں۔ اللہ نے فرمایا کہ میری نظر جس حقیقت پر ہے تمہیں اس کی بالکل خبر نہیں ہے۔

آدم کی خلافت کا اعلان

انسان صرف جسم کا نام نہیں ہے بلکہ جسم اور روح دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔ گذشتہ آیات میں انسان کی جسمانی زندگی کے بنانے، اس کے باقی رکھنے کا ذکر تھا۔ اس آیت میں انسان کی حیاتِ روحانی کے لئے سامان کا تذکرہ ہے۔ جیسے جسمانی ہونے کی وجہ سے انسان جسم کی ضرورتیں رکھتا ہے۔ اور ان ضرورتوں کو پورا کرنے کے لئے عناصر اور فرشِ زمین کی تمام چیزیں اللہ نے انسان کے لئے بنائی ہیں۔ ایسے ہی روحانی ہونے کی وجہ سے انسان روح کے تقاضے رکھتا ہے اور ان تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اس کی روح بیتاب ہوتی ہے۔ ان روحانی تقاضوں کو پورا کرنے کے لئے اللہ نے وحی کا انتظام کیا ہے۔

انسان اگر جسمانی حیثیت سے فرشِ زمین اور یہاں کی موجودات سے فائدہ اٹھا سکتا ہے تو روحانی

حیثیت سے نبوت کے فیضے عالم غیب کی چیزوں سے متمتع، اخلاق الٰہیہ سے مستفید اور صفات ربانیہ سے آراستہ ہو سکتا ہے۔ جیسے انسان کا جسمانی کمال زمین سے انتفاع اور استفادے کے بغیر ادھورا اور ناکمل رہتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسان کا روحانی کمال نوامیس الٰہیہ اور نبوت سے استفادے کے بغیر ناقص اور ادھورا ہے ان آیات میں روحانی ارتقاء کے اسی نظام کو بیان فرمایا ہے اور انسان کی حقیقت اور کائنات میں اس کی حیثیت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی ہے اور نوع انسان کی تاریخ کا وہ باب پیش کیا گیا ہے جس کے معلوم ہونے کا کوئی دوسرا ذریعہ انسان کو میسر نہیں ہے۔

ت۲ ملائکہ جمع ملک کی۔ الوکۃ سے بنا ہے۔ جس کے معنے پیام رسانی کے ہیں۔ فرشتوں کو ملائکہ کہتے ہی اس لئے ہیں کہ ان کا اصل کام پیام رسانی ہے اور یہ خالق کائنات کے پیغامات مخلوق تک پہنچاتے ہیں فرشتے نوری مخلوق ہیں وجود خارجی رکھتے ہیں۔ عادتاً انسانوں کے لئے غیر مرئی ہیں جب ضرورت مختلف شکلیں اختیار کر سکتے ہیں ان کی تعداد اللہ ہی کے علم میں ہے وجود میں انسان پر تقدم زمانی رکھتے ہیں۔[۱]

یہ محض مجرد قوتیں نہیں ہیں جو تشخص نہ رکھتی ہوں بلکہ یہ شخصیت رکھنے والی ہستیاں ہیں جن سے اللہ تعالیٰ اپنی اس عظیم الشان سلطنت کے تدبیر و انتظام میں کام لیتا ہے یوں سمجھنا چاہیئے کہ یہ سلطنتِ الٰہی کے اہل کار ہیں جو اللہ کے احکام نافذ کرتے ہیں۔ جاہل لوگ انہیں خدائی میں حصہ دار بنا بیٹھے ہیں اور بعض نے ان کو خدا کا رشتے دار سمجھا۔ ان کو دیوتا بنا کر ان کی پوجا شروع کر دی[۲]

تیرے پروردگار نے فرشتوں سے کہا۔ تاکہ وہ اپنی رائے ظاہر کریں ورنہ اللہ تعالیٰ کو تو ان کے باطن کا علم ہے اور حقیقت میں ان سے مشورہ لینا نہ تھا۔ اس کی حاجت ہی کیا ہے بلکہ اس کا احتمال بھی محال ہے[۳]

یہ بات فرشتوں سے اس لئے فرمائی کہ کائنات ارضی و سماوی کے منافع فرشتوں کے ہاتھ میں ہیں۔ اس لئے جب تک فرشتے اللہ تعالیٰ کے خلیفہ کی طاعت نہ کریں اس وقت تک خلافت کا کام سرانجام نہیں پا سکتا۔[۴]

درحقیقت یہاں مشورہ لینا مقصود نہیں ہے مگر صورت مشورے کی بنائی گئی جس میں مخلوق کو سنت مشورہ کی تعلیم کا فائدہ ہو سکتا ہے[۵]

---

[۱] تفسیر ماجدی ص ۱۵۱، [۲] تفہیم القرآن ص ۶۲ ج ۱، [۳] بیان القرآن ص ۱۸۱
[۴] معارف القرآن م ۱ ص ۸۵۔ [۵] معارف القرآن ش ص ۱۲۱

دراصل یہ معاملہ ایک ایسے عالم سے تعلق رکھتا ہے جس کے لئے ہماری تعبیرات کام نہیں دے سکتی ہیں۔ ہماری ہر تعبیر کسی ایسی حالت کا تصور پیدا کرتی ہے جو عام طور پر ہمیں پیش آتی ہیں لیکن اللہ سبحانہٗ اور اس کی صفات تو اس کی نوعیت ہی دوسری ہے اور وہ ہمارے محسوسات اور معقولات کے دائرے سے بالکل باہر ہے۔ اس بارے میں ہماری کوئی تعبیر بھی حقیقت حال کی کامل تعبیر نہیں ہو سکتی۔

فرشتوں سے کہنے کی نوعیت کا بھی معاملہ کچھ ایسا ہی ہے کیونکہ ہمارے عرف و تخاطب کے اعتبار سے اگر یہ مشورہ ہے تو اس کا اللہ کے بارے میں ہماری عقل تصور بھی نہیں کر سکتی اس کا احتمال بھی محال ہے اور اگر فرشتوں کو خبر دینا ہے اور فرشتوں کی جانب سے اعتراض ہے تو یہ نہ جناب الٰہی کے شایان شان اور نہ فرشتوں کے اس مقام کے مناسب ہے جس کا قرآن نے پتہ دیا ہے۔

دراصل اس سارے معاملہ کا خلقت و تکوین سے تعلق ہونے کی وجہ سے عالم غیب سے رابطہ ہے اور عالم غیب کے بارے میں ہماری معلومات کا ذریعہ صرف نبوت ہے اور اس موضوع پر کوئی ارشاد نبوت نہیں ہے۔

جسمانی حیات کے تذکرے میں ربکم تم سب کا رب فرمایا اور یہاں حیات روحانی کے سلسلے میں ربک تیرا رب فرمایا، اس میں بڑی گہری معنویت ہے۔

حیات جسمانی کے سامان سے بالذات انسانوں کا ہر ہر فرد استفادہ کر رہا ہے لیکن حیات روحانی سے استفادہ ہر شخص بالذات نہیں بلکہ بواسطہ نبوت کرتا ہے۔ بالذات صرف نبوت کی ذات کرتی ہے باقی نبوت کے ذریعے سے کرتے ہیں، اس لئے دونوں حالتوں میں ربکم اور ربک سے فرق کر دیا اور تعبیر کا یہ اختلاف بتا رہا ہے کہ فی الواقع کائنات میں خلافت عظمیٰ کا اصل مقام آپ کو ملا ہے۔

ﷺ ایک جانشین اور نائب بنانے والا ہوں۔ عربی میں لفظ خلیفہ ہے اور خلیفہ اسے کہتے ہیں جو کسی کے ملک میں اس کے سپرد کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشاء کو پورا کرنا ہوتا ہے اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو

من مانے طریق پر استعمال کرنے لگے تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے[1]۔

یہ ایک بڑی نعمت کا ذکر کیا جارہا ہے جو تمام بنی آدم پر کی گئی اور وہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا قصہ ہے اور ان کو خلیفہ بنایا گیا۔ پہلی آیت میں خَلَقَ لَكُم مَّا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا فرمایا تھا اس میں کسی کو انکار پیش آئے تو قصہ آدم سے اس کا جواب بخوبی مل گیا[2]۔

یہیں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انسان کو جو قوتیں ملیں گی وہ اس منصب خلافت کے مطابق ہی ملیں گی۔ انسان خود اپنے نوعی ارتقا، اپنی صلاح و فلاح کے لئے اس کا محتاج تھا کہ اپنے کسی ہم جنس کے واسطے سے شریعت الٰہی کا استفادہ کرے۔ سلسلۂ نبوت اسی غرض کے لئے قائم ہوا تھا۔[3]

اس فقرے کے ذریعے کہ میں ایک جانشین بنانے والا ہوں یہ بتایا گیا ہے کہ میں زمین میں اپنا ایک نائب بنا رہا ہوں جو میرے نائب ہونے کی حیثیت سے زمینی کائنات پر حکومت کریگا اور میرے احکام نافذ کرے گا۔ اس فقرے کے ذریعے موجودات میں انسان کی حیثیت اور اسکا مقام بتایا گیا ہے کہ وہ فرش زمین پر اللہ کا نائب ہے۔ انسان سے پہلے دو قسم کی مخلوق کا ہونا قرآن سے معلوم ہوتا ہے ملائکہ اور جنات۔ اگر فرشتے ایک نوری مخلوق ہیں تو جنات ناری ہیں اور ان دونوں میں زمین سے استفادے کی صلاحیت نہیں ہے۔ انسان ان تمام چیزوں سے فی الواقع استفادے کی صلاحیت رکھتا ہے اس لئے خلافت کے لئے انسان کو منتخب فرمایا جسمانی ہونے کی وجہ سے وہ تمام عناصر اور فرش زمین کی ہر چیز سے استفادہ کر سکتا ہے اور روحانی ہونے کی وجہ سے نہ صرف عالمِ بالا کی تمام چیزوں سے متمتع ہو سکتا ہے بلکہ اخلاقِ الٰہیہ اور صفاتِ الٰہیہ سے آراستہ ہونے کی پوری پوری قابلیت اس میں موجود ہے اور عشقِ خداوندی اور اس کی محبت کے جوش و ولولہ کی سرشاریوں میں اس قدر بلند مرتبہ طے کرتا ہے کہ اسے دیکھ کر فرشتے بھی عش عش کرتے ہیں۔

[4] فرشتوں نے عرض کیا، یہاں عموماً ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ فرشتوں کے اس کہنے کی نوعیت کیا تھی۔ علماء نے بتایا ہے کہ ملائکہ کو جب یہ علم ہوا کہ ایسی مخلوق جس میں مفسد اور خونریز بھی ہوں گے۔ ہم ایسے مطیع اور فرمانبردار کے ہوتے ہوئے ان کو خلیفہ بنانا۔ اس کی وجہ کیا ہوگی بطریق استفادہ یہ سوال کیا اعتراض ہرگز نہ تھا[5] ——— یہ فرشتوں کا اعتراض نہ تھا۔

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۱/۱، [2] حاشیہ شیخ الہند ص ۸، [3] تفسیر ماجدی ص ۱۵۔ [4] حاشیہ شیخ الہند ص ۸

بلکہ استفہام تھا۔ فرشتوں کی کیا مجال کہ اللہ تعالیٰ کی کسی تجویز پہ اعتراض کریں[1]۔

مطلب یہ ہے کہ ہم تو سب آپ کے فرمانبردار ہیں سو اگر یہ کام ہمارے سپرد کیا جائے تو ہم سب لگ لپٹ کر اس کو انجام دیں گے اور وہ لوگ سب اس کام کے نہ ہوں گے۔ البتہ جو مطیع ہوں گے وہ تو جان و دل سے اس میں لگ جائیں گے مگر جو مفسد و ظالم ہوں گے ان سے کیا امید ہے کہ وہ اس کام کو انجام دیں۔ خلاصہ یہ کہ جب کام کرنے والوں کا ایک گروہ موجود ہے تو ایک نئی مخلوق کو جن میں کوئی کام کا ہوگا کوئی نہ ہوگا۔ اس خدمت کے لئے تجویز فرمانے کی کیا ضرورت ہے ——— یہ نہ بطور اعتراض کے کہا اور نہ بطور استحقاق کے۔ بلکہ یہ ایسی بات ہے کہ کوئی حاکم نیا کام تجویز کر کے اس کے لئے مستقل عملہ بڑھانا چاہے اور اپنے پرانے عملے سے اس کا اظہار کرے وہ لوگ اپنی جان نثاری کی راہ سے عرض کریں کہ حضور جو لوگ اس کام کے لئے تجویز ہوتے ہم کو معلوم ہوا ہے کہ کچھ تو اس کو بخوبی انجام دیں گے اور کچھ بالکل ہی کام بگاڑ دیں گے ہم کس بیماری کی دعا ہیں حضور کے اقبال سے اس کام کو انجام دے سکتے ہیں۔ کبھی کسی خدمت میں ہم غلاموں نے عذر نہیں کیا اگر یہ نئی خدمت بھی ہمارے سپرد ہوگی تو ہمیں کوئی عذر نہ ہوگا اس طرح فرشتوں کا یہ کہنا اظہار نیازمندی کی خاطر تھا[2]۔

فرشتوں نے اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً سے یہ سمجھا کہ جب وہ خلیفہ زمین سے پیدا ہوگا۔ تو اس میں لذات سفلیہ سے منتفع ہونے کی خواہش اس کی جبلت میں مرکوز ہوگی۔ جب ان لذتوں کی اس کو ضرورت ہوگی۔ تو قوت شہویہ جوش میں آئے گی اور جو شخص ان لذتوں میں مانع ہوگا۔ تو قوتِ غضبیہ جوش میں آئے گی اور مدافعت کے لئے جنگ و جدال ہوگا۔ اس لئے فرشتوں کو شبہ ہوا کہ زمین کی عمارت و آبادکاری کے لئے ایسے شخص کو خلیفہ بنانا خلاف حکمت معلوم ہوتا ہے[3]

اور واقعہ یہ ہے کہ اِنِّیْ جَاعِلٌ فِی الْاَرْضِ خَلِیْفَۃً کی تجویز سامنے آتے ہی فرشتوں کی نگاہ خلافت کی حقیقت اور اس کے ذاتی لوازم تک پہنچ گئی۔ خلافت کا لفظ سنتے ہی وہ سمجھ گئے کہ یہ نیابت احوال ذاتی افعال لازمہ میں نہ ہوگی بلکہ ان اعمال و افعال میں ہوگی جو دوسروں سے تعلق رکھتے ہیں مثلاً ہدایت، اصلاح، عدل، قضا وغیرہ وغیرہ۔ ہدایت ہو نہیں سکتی جب تک کہ ضلالت کا وجود نہ ہو اور اصلاح کے لئے ضروری ہے کہ فساد ہو اور عدل کے لئے ضروری ہے کہ ظلم ہو۔ اضداد کے اس ہنگامہ میں خلافت کا کام ہوگا اور خلیفہ اپنے فرائض انجام دے گا۔ یہ سمجھ کر انہوں نے اس ہنگامہ

---

[1] تفہیم القرآن ج۱ ص۶۲، [2] بیان القرآن ص۱۸، [3] معارف القرآن ج۱ ص۸۶۔

اصنساد بپا کرنے کی حکمت دریافت کی ۔

یہاں اس سوال کو بے حد اہمیت حاصل ہے ۔ کہ فرشتوں کو اس کی کیسے خبر ہوئی کہ انسان خونریزی کرے گا ۔

اس کا جواب جمہور محققین کے نزدیک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو انسان کے حالات اور اس کے ہونے والے معاملات سے باخبر کر دیا تھا[1]

یہ بات کسی طرح ان کو اللہ تعالیٰ نے معلوم کرا دی ہوگی کہ بنی آدم میں برے بھلے سب ہی طرح کے ہوں گے [2]

بنی آدم کے بارے میں فساد بپا کرنے اور خونریزی کرانے کا نظریہ انہوں نے جنات پر قیاس کر کے قائم کیا تھا کیوں کہ پہلے زمین پر جن آباد تھے اور ان کا فساد فی الارض اور خون خرابہ فرشتے دیکھ چکے تھے [3] ـــــ رہا یہ امر کہ ملائکہ کو بنی آدم کا حال کیوں کر معلوم ہوا - اس میں بہت سے احتمال ہیں جنات پر قیاس کیا یا حق تعالیٰ نے پہلے بتا دیا تھا یا لوح محفوظ پر لکھا دیکھا یا سمجھ گئے کہ حاکم و خلیفہ کی ضرورت جبھی ہوگی کہ غیب ظلم و فساد ہوگا یا حضرت آدم علیہ السلام کے قالب کو دیکھ کر بطور قیافہ سمجھ گئے ہوں [4]

[5] یہ فقرہ کہ ہم آپ کی حمد و ثنا کے ساتھ تسبیح کرتے ہیں ۔ فرشتوں کی جانب سے اقرار ہے کہ ہم خدام تو اپنی سرشت کے لحاظ سے بجز حضور والا کی تسبیح و تقدیس کے اور کچھ کر ہی نہیں سکتے ۔

اس سے فرشتوں کا مدعا یہ نہ تھا کہ خلافت ہمیں دی جائے ہم اس کے مستحق ہیں بلکہ ان کا مطلب یہ تھا کہ حضور کے فرامین کی تعمیل ہو رہی ہے آپ کے احکام بجا لانے میں ہم پوری طرح سرگرم ہیں مرضی مبارک کے مطابق سارا جہان پاک صاف رکھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ آپ کی حمد و ثنا اور آپ کی تسبیح و تقدیس بھی ہم خدام ادب کر رہے ہیں [5]

[6] فرشتوں کو اللہ سبحانہٗ کی جانب سے سردست یہ بالاجمال جواب دیا گیا کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ اس کے پیدا کرنے میں جو حکمتیں ہیں تم کو ابھی تک وہ حکمتیں معلوم نہیں ہیں ، ورنہ اس کی خلافت اور افضلیت میں شبہ نہ کرتے [6]

یہ فرشتوں کے شبہ کا جواب ہے یعنی فرمایا کہ خلیفہ مقرر کرنے کی ضرورت و مصلحت میں جانتا

---

[1] معارف القرآن ص۱۲۳ ، [2] بیان القرآن ص۱ ، [3] جواہر القرآن ص۲۲ ، [4] حاشیہ شیخ الہند ص۸
[5] تفہیم القرآن ص۹۱ ، [6] حاشیہ شیخ الہند ،

ہمیں تم اسے سمجھ نہیں سکتے۔ اپنی جن خدمات کا تم ذکر کر رہے ہو وہ کافی نہیں ہیں بلکہ ان سے بڑھ کر کچھ مطلوب ہے اسی لئے زمین میں ایسی مخلوق پیدا کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ جس کی طرف کچھ اختیارات منتقل کئے جائیں۔

مطلب یہ ہے کہ تمہیں اس کی کیا خبر کہ عبدیت کے علاوہ نیا کام خلافت الٰہی کا جو اس نئی مخلوق سے لیا جانے والا ہے۔ اور اس کے لئے جن صلاحیتوں اور جس قسم کی استعداد کی ضرورت ہے وہ تمہارے اندر کہاں تک موجود ہیں (ابن کثیر)

یعنی تم کو معلوم نہیں ہے کہ منصب خلافت کے لئے ایسی ہی حقیقت جامعہ مناسب ہے جو جسمانیت اور روحانیت دونوں کی جامع ہو اور قوت عقلیہ کے ساتھ اس میں قوت شہویہ اور غضبیہ بھی ہو۔ جس نوع کا مزاج ان مختلف قوی سے مرکب ہو گا وہی عالم کے انتظام اور تدبیر و تصرف پر قادر ہو گا۔

وَعَلَّمَ اٰدَمَ الۡاَسۡمَآءَ كُلَّهَا ثُمَّ عَرَضَهُمۡ عَلَى الۡمَلٰٓـئِكَةِ فَقَالَ اَنۡۢبِـُٔوۡنِىۡ بِاَسۡمَآءِ هٰٓؤُلَآءِ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ ۞ قَالُوۡا سُبۡحٰنَكَ لَا عِلۡمَ لَنَآ اِلَّا مَا عَلَّمۡتَنَا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ الۡعَلِيۡمُ الۡحَكِيۡمُ ۞ قَالَ يٰٓـاٰدَمُ اَنۡۢبِئۡهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۚ فَلَمَّآ اَنۡۢبَاَهُمۡ بِاَسۡمَآئِهِمۡ ۙ قَالَ اَلَمۡ اَقُلۡ لَّكُمۡ اِنِّىۡٓ اَعۡلَمُ غَيۡبَ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ ۙ وَاَعۡلَمُ مَا تُبۡدُوۡنَ وَمَا كُنۡتُمۡ تَكۡتُمُوۡنَ ۞

اور آدم علیہ السلام نے اللہ کی تعلیم سے تمام کی تمام چیزوں کے نام سیکھ لیے تو اللہ نے پھران کو فرشتوں کے رُوبرو پیش کیا اور فرمایا کہ اگر تم اپنے شبہ میں سچے ہو تو مجھے بتلاؤ ان کے نام کیا ہیں؟ فرشتوں نے عرض کیا کہ خدایا ساری پاکیاں تیری ہیں ہم تو اتنا ہی جانتے ہیں جتنا تُو نے ہمیں علم دیا ہے، علم تو تیرا ہی ہے اور حکمت کا خزانہ تُو ہی ہے۔ جب فرشتے اظہارِ عجز کر چکے تو حکمِ الٰہی ہوا کہ اے آدم تم اب فرشتوں کو ان کے نام بتا دو جب آدم علیہ السلام نے ان کے سامنے اپنی معلومات کا اظہار کر دیا تو اللہ نے فرمایا کہ کیا میں نے تم سے یہ نہ کہا تھا کہ میں آسمانوں اور زمین کے تمام غیب جانتا ہوں۔ اور جو کچھ تم ظاہر کرتے ہو وہ بھی میرے علم میں ہے اور جو کچھ تم چھپاتے ہو وہ بھی میرے علم سے باہر نہیں ہے۔

علمی کمال کی نمائش

فرشتے اللہ سبحانہٗ کی صفتِ قدرت کا مظہر ہیں اور انسان اللہ کی صفتِ علم کا۔ اور معلوم ہے کہ قدرت علم کے توابع میں سے ہے کیونکہ علم کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سب سے بالا اور سب سے مستغنی ہے۔ سب صفتیں اس کے نیچے اور اس کی محتاج ہیں۔ اگر کسی چیز کا علم نہ ہو تو نہ اس کا ارادہ

ہو سکتا ہے اور نہ اس پر قدرت ہو سکتی ہے۔ علم اپنے ہونے کے لیے نہ ارادے کا محتاج ہے اور نہ قدرت کا۔ اس لیے مدارِ خلافت علم کو قرار دے کر فرشتوں کے سامنے حضرت آدم علیہ السلام کی شانِ علمی اور کمالِ علمی کی نمائش کی ہے۔ چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، تعلیم، ان کا مسجودِ ملائکہ ہونا اور ان کے ہبوط کے معاملات کا تعلق عالمِ شہادت سے نہیں بلکہ عالمِ غیب سے ہے۔ اس لیے ہم اپنے ادراک کے وسائل سے کوئی خاص روشنی نہیں ڈال سکتے۔ جو کچھ، جیسا کچھ اور جتنا کچھ اس موضوع پر زبانِ وحی اور ناموسِ نبوت کی جانب سے رہنمائی حاصل ہوگی۔ اسی پر ایمان لائیں گے۔

اس راہ میں تاویل نہیں بلکہ سلف صالحین کے مسلک کے مطابق تفویض ہی میں سلامتی ہے یعنی جو کچھ فرمایا جا رہا ہے اسے مانا جائے کیونکہ اس کی کیفیت اور نوعیت تک ہمارے علم کی رسائی نہیں ہے۔

عام لوگ یہاں مغالطہ کے شکار ہیں وہ خلافِ عقل اور ماوراءِ عقل میں فرق نہیں کرتے۔ عالمِ غیب ماورائے عقل تو ہے لیکن خلافِ عقل نہیں ہے۔ خلافِ عقل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ عقلِ انسانی اس کو محال سمجھتی ہو اور ماوراءِ عقل یہ ہے کہ عقل کی رسائی سے باہر ہو۔

ش۔ خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کو ہر چیز کا نام مع اس کی حقیقت اور خاصیت کے اور نفع و نقصان کے تعلیم فرمایا۔ اور یہ علم ان کے دل میں بلاواسطہ کلام القاء فرما دیا۔ کیونکہ بدون اس کمالِ علمی کے خلافت اور دُنیا پر حکومت کیونکر ممکن ہے۔ اس کے بعد ملائکہ کو اس کی حکمت پر مطلع کرنے کی وجہ سے ملائکہ سے سوال کیا کہ اگر تم اپنی اس بات میں کہ تم کارِ خلافت انجام دے سکتے ہو سچے ہو تو ان چیزوں کے نام و احوال بتاؤ۔ لیکن انہوں نے اپنے عجز و قصور کا اقرار کیا اور خوب سمجھ گئے کہ اس علمِ عام کے بغیر کوئی خلافت کا کام نہیں کر سکتا۔ اور اس علمِ عام سے قدرِ قلیل ہم کو اگر ملا بھی ہے تو اتنی بات سے ہم خلافت کے قابل نہیں ہو سکتے۔ یہ سمجھ کر بول اُٹھے کہ تیرے علم و حکمت کو کوئی نہیں پہنچ سکتا[1]

گزشتہ آیت میں فرشتوں کے شبہ کا اجمالی جواب تھا۔ اس آیت میں تفصیلی جواب ہے۔ یا یوں کہو کہ پہلا جواب حاکمانہ تھا اور یہ جواب حکیمانہ ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو صرف نام نہیں بلکہ ان چیزوں کے نام اور ان کی حقیقت اور اوصاف و خواص اور آثار اور طریقۂ استعمال بتایا[2]

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۸ [2] معارف القرآن ج ۱ ص ۸۹

فرشتوں کو تفصیل علم کرانے کے لیے ایک خاص واقعہ کا اظہار کیا گیا کہ تمام کائنات عالم کے نام اور ان کے خواص و آثار جن کے علم کی صلاحیت صرف آدم علیہ السلام ہی میں ودیعت کی گئی تھی فرشتوں کی فطرت و جبلت اس کے مناسب نہ تھی وہ سب حضرت آدم علیہ السلام کو سکھاتے مثلاً دنیا کی نافع و مضر چیزیں اور ان کے خواص و آثار، ہر جاندار اور ہر قوم کے مزاج و طبائع اور ان کے آثار۔ ان چیزوں کے معلوم کرنے کے لیے طبیعت ملکی متحمل نہیں تھی۔ فرشتہ کیا جانے کہ بھوک کیا ہوتی ہے، پیاس کی تکلیف کیسی ہوتی ہے، نفسانی جذبات کا کیا اثر ہوتا ہے۔ یہ علم صرف آدم علیہ السلام ہی کو سکھایا جا سکتا تھا ان ہی کو سکھلایا[1]

یعنی حضرت آدم علیہ السلام کو اشیاءِ کائنات کے اسماء اور آثار و خواص کا علم دے دیا۔ حضرت آدم علیہ السلام ہی پہلے انسان تھے اس لیے ابوالبشر کہلاتے ہیں۔ حافظ بدالدین عینیؒ نے یہی کنیت بتائی ہے۔ علامہ بغویؒ نے حضرت ابن عباسؓ سے آپ کی کنیت ابو محمد روایت کی ہے۔ حضرت قتادہؓ کا بیان ہے کہ جنت میں حضرت آدم علیہ السلام کے علاوہ اور کسی کو کنیت سے یاد نہیں کیا جائے گا۔ آپ کی کنیت جناب رسالتمآب صلی اللہ علیہ وسلم کا شرف ظاہر کرنے کے لیے ابو محمد ہوگی ۔۔۔ لفظِ آدم کے متعلق علمائے لغت میں اختلاف ہے کہ عجمی ہے یا عربی۔ ابو منصور جوالیقیؒ نے کتاب المعرب میں تصریح کی ہے کہ انبیاء کے سارے نام عجمی ہیں البتہ چار نام اس سے مستثنیٰ ہیں۔ آدم، صالح، شعیب اور محمد علیہم السلام۔ جوہریؒ نے بھی اس کو عربی نام بتایا ہے۔ لیکن علامہ زمخشریؒ نے کشاف میں تصریح کی ہے کہ آدم عربی نہیں قطعاً عجمی نام ہے[2]

اسماء جمع اسم کی ہے۔ اسم کا مفہوم عربی زبان میں اردو کے نام سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ اسم وہ ہے جس کے ذریعے سے کوئی چیز پہچانی اور جانی جائے۔ اسم کے ساتھ اگر مسمّٰی کا علم نہ ہو تو محض اسم ایک آواز کانوں تک رہے گی اور ذہن کے سامنے کوئی مفہوم نہ ہوگا۔ امام راغبؒ نے اسی لیے اس پر شرح و بسط سے کلام کرکے آخر میں لکھا ہے کہ اسم کی معرفت بغیر مسمّٰی کے نہیں ہو سکتی۔ آیت کی تفسیر میں محققین نے معلومات اشیاء مراد لی ہیں اور اسماء کے ساتھ مسمیات اور ذوات و خواص اشیاء کو شامل کیا ہے اور اشیاء کے اسماء سے مراد ان کے آثار و خواص کا علم لیا ہے[3]

انسان کے علم کی صورت صرف یہی ہے کہ وہ ناموں کے ذریعے سے اشیاء کے علم کو اپنے

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۱۲۳ [2] لغات القرآن ج ۱ ص ۵۷ [3] تفسیر ماجدی

ذہن کی گرفت میں لاتا ہے۔ لہٰذا انسان کی تمام معلومات دراصل اسمائے اشیاء پر مشتمل ہیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کو سارے نام سکھانا گویا ان تمام اشیاء کا علم دینا تھا۔[۱]

۷۸ ف ۔ فرمایا کہ اگر تم اپنے شبہ میں سچے ہو یعنی اپنے اس خیال میں کہ ہم اصلاح طبائع و انتظام شرائع کی خدمت جس کے لیے نائب کی تجویز ہو رہی ہے انجام دے سکیں گے۔[۲]

سوال یہ ہے کہ فرشتوں کے سامنے کیا چیز پیش کی جا رہی ہے۔ اگر چیزوں کے محض نام ہوتے تو لفظِ قرآنی عرضھا ہوتا۔ ضمیر ھم ذوی العقول کے لیے آتی ہے اور غیر ذوی العقول ضمناً اور تبعاً داخل ہیں۔ یہ دلیل ہے اس بات کی کہ پیش صرف نام نہیں ہوئے بلکہ اصل موجودات۔ گویا پہلے صورتِ مثالی سے حضرت آدم علیہ السلام کو تمام مخلوقات کے نام و خواص بتائے گئے۔ پھر خود ان مخلوقات و موجودات کو فرشتوں کے سامنے پیش کیا گیا۔[۳]

۷۹ ف ۔ فرشتوں کے اس جواب سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہر فرشتے اور فرشتوں کی ہر صنف کا علم اسی شعبے تک محدود ہے جس سے اس کا تعلق ہے مثلاً ہوا کے انتظام سے جو فرشتے متعلق ہیں وہ ہوا کے متعلق سب کچھ جانتے ہیں مگر پانی کے متعلق کچھ نہیں جانتے۔ یہی حال دوسرے شعبوں کے فرشتوں کا ہے۔ انسان کو ان کے برعکس جامع علم دیا گیا ہے۔ ایک ایک شعبے کے متعلق چاہے وہ اس شعبے کے فرشتوں سے کم جانتا ہو مگر مجموعی حیثیت سے جو جامعیت انسان کے علم کو بخشی گئی ہے وہ فرشتوں کو میسر نہیں ہے۔[۴]

یعنی اللہ! اس سے پاک ہے کہ تیرا کوئی کام عبث اور خلافِ حکمت ہو۔ ہمارا علم ہماری استعداد کے مطابق ہے اور حضرت آدم علیہ السلام کا علم اُن کی استعداد کے مطابق ہے اور استعدادوں اور صلاحیتوں کا تفاوت اور اختلاف تیرے علم اور حکمت پر مبنی ہے۔ آپ مالکِ مطلق ہیں جس میں جو استعداد چاہیں وہ پیدا کر دیں۔[۵]

۸۰ ف ۔ اے آدم تم اب ان فرشتوں کو ان کے نام بتلا دو۔ یہاں اس شبہ کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ جب فرشتوں میں اس علمِ خاص کی مناسبت ہی نہ تھی تو بتلانے سے کیا فائدہ۔ اگر بتلانے سے وہ سمجھ سکتے ہیں تو یہ دعویٰ صحیح نہ رہا کہ ان کو اس سے مناسبت نہ تھی۔ بات یہ

---

[۱] تفہیم القرآن ص ۶۴ [۲] بیان القرآن ص ۱۹ [۳] تفسیر ماجدی ص ۱۶۔ [۴] تفہیم القرآن ص ۶۴
[۵] معارف القرآن ج ۱ ص ۹۰

ہے کہ بعض اوقات خود تو ایک آدمی ایک علم کو نہیں سمجھتا مگر دوسرے کو تقریر کرتے ہوئے قرآن سے سمجھ لیتا ہے کہ یہ شخص واقعی اس علم میں بڑا ماہر ہے لہٰذا بتلادو کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ان کے ذہن میں اتار دو اور سمجھا دو بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کے روبرو اس کا اظہار کرو ۔[1]

یہ مظاہرہ فرشتوں کے پہلے شبہ کا جواب تھا گویا اس طریقے سے اللہ تعالیٰ نے ان کو بتا دیا کہ آدم کو صرف اختیارات ہی نہیں دے رہا ہوں بلکہ علم بھی دے رہا ہوں۔ اس کے تقرر سے فساد کا جو اندیشہ تمہیں ہوا وہ اس معاملہ کا صرف ایک پہلو ہے ، دوسرا اصلاح کا بھی ہے اور وہ فساد کے پہلو سے زیادہ وزنی اور زیادہ بیش قیمت ہے۔ حکیم کا یہ کام نہیں ہے کہ چھوٹی خرابی کی وجہ سے بڑی بہتری کو نظر انداز کر دے ۔[2]

۸۱ ۔ یعنی جب آدم علیہ السلام نے ملائکہ کو اشیا کے عالم کے متعلق سب اُمور بتا دیے ۔ تو فرشتے دنگ رہ گئے اور حضرت آدم علیہ السلام کے احاطۂ علمی پر عش عش کرنے لگے تو اللہ تعالیٰ نے ملائکہ سے فرمایا کہ میں نہ کہتا تھا کہ میں جملہ اُمور مخفی آسمان وزمین کا جاننے والا ہوں ۔[3]

آیت اِنِّیْٓ اَعْلَمُ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ میں جو بات اجمالی طور پر بتائی گئی تھی اب اس کی تفصیل ہو گئی اور ضمناً ان مسائل کی تعلیم آ گئی کہ علمِ کل صرف ذات باری کا خاصہ ہے اور خالق کے لامحدود نامتناہی علم سے اعلیٰ سے اعلیٰ مخلوق کے علم کو بھی کوئی نسبت نہیں ہے۔ اور اس سے علم کی فضیلت عبادت پر ثابت ہوئی۔ دیکھئے عبادت میں فرشتے اتنے بڑھے ہوئے ہیں کہ معصوم ہیں مگر چونکہ انسان کی تربیت اللہ کی صفتِ علم نے کی ہے اس لیے مرتبۂ خلافت انسان ہی کو عطا ہوا اور ملائکہ نے اسے تسلیم کیا ۔

گویا اس مظاہرہ سے علم کی فضیلت اور بزرگی معلوم ہوئی۔ فرشتوں نے تسبیح وتقدیس پیش کی تو اللہ سبحانہٗ نے اس کے جواب میں حضرت آدم علیہ السلام کے علمی کمال کو ظاہر فرمایا اس سے معلوم ہوا کہ علمی کام کرنا تسبیح وتحمید سے افضل ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ تسبیح وتقدیس عبادت ہے اور عبادت اللہ کی صفات میں سے نہیں بلکہ مخلوق کی صفت ہے برخلاف علم کے کہ وہ اللہ سبحانہٗ کی صفات میں سے ہے۔ اگرچہ اللہ سبحانہٗ کو ہم معلّم نہیں کہہ سکتے کیونکہ اسمائے الٰہیہ توقیفی ہیں لیکن تعلیم کی نسبت فعل اللہ سبحانہٗ کی طرف آئی ہے مگر بطور صفت معلّم نہیں آیا ہے۔ اس

---

[1] بیان القرآن ص ۱۲ [2] تفہیم القرآن ص ۶۴ [3] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۸

لحاظ سے معلم اللہ سبحانہ' کی نیابت کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ عالم کا درجہ عابد سے اونچا مانا گیا ہے۔
مسند احمد بن حنبلؒ میں کثیر بن قیسؓ کے حوالے سے ایک مبسوط حدیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے کہ طالب علم کے لیے اللہ کے فرشتے اپنے بازو بچھا دیتے ہیں۔ علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ فرشتوں کی جانب سے خصوصیت سے اہل علم اور علم کی خاطر تواضع اور نیازمندی کا یہ مظاہرہ صرف اس لیے ہوا ہے کہ فرشتوں سے اللہ سبحانہ' نے آدم علیہ السلام کے علمی کمال کی نمائش کے بعد تواضع اور نیازمندی کا بھی مظاہرہ کرایا تھا۔ علم اور اہل علم کی خاطر فرشتوں میں یہ ادب اسی کی یادگار ہے۔ اب بھی جب اور جہاں کہیں علم کی نمائش ہوتی ہے فرشتوں میں وہی انکسار و تواضع آجاتا ہے۔ طلب علم اور علمی مشغولیتوں پر فرشتے جھومتے اور خوشیاں مناتے ہیں۔
علم کی بندگی کی ایک وجہ عبادت کے مقابلے میں یہ بھی بتائی گئی ہے کہ علم ایک فعل متعدی ہے۔ اور عبادت ایک لازمی افعال میں سے ہے۔ افعال متعدیہ میں دوسروں کا فائدہ اور اجتماعی و عمومی منفعت ہوتی ہے۔ اور افعالِ لازمہ میں خود ذاتی صلاح و فلاح کی ضمانت ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ افعالِ متعدیہ کا مقام افعال لازمہ سے بزرگتر ہے۔ علماء نے عبادات میں نافع ترین عبادت کو افضل ترین عبادت قرار دیا ہے۔ اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ عابد کا عمل ذاتی ہوتا ہے اور دوسروں کو فائدہ پہنچانے کا عمل متعدی ہوتا ہے اور دونوں میں کوئی نسبت نہیں ہے۔ اسی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے بلکہ یوں کہا جائے تو بیجا نہیں ہے کہ آپ کا ارشاد قرآن کے انداز بیان سے مستنبط ہے۔ آپ نے فرمایا ہے کہ عالم کی فضیلت عابد پر ایسی ہے جیسے چاند کی فضیلت ستاروں پر۔ حضرت علیؓ بن ابی طالب سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ ایک شخص کا تیرے ذریعے ہدایت پر آجانا تیرے لیے سُرخ اونٹوں سے بہتر ہے۔ یہ قاطبتہً سب انبیاء کا کام ہے۔ انبیاء اسی لیے آتے ہیں کہ علم خداوندی کے ذریعے لوگوں کی ہدایت کا کام کریں اور اللہ کے بندوں کے اللہ سبحانہ' سے تعلقات استوار کریں۔
علم کی اسی فضیلت کی وجہ سے خلافت حضرت آدم علیہ السلام کو ملی ہے اور اسی کو مدارِ خلافت قرار دیا گیا ہے۔ مولانا محمد قاسمؒ فرماتے ہیں،
علم میں انسان نمبر اول ہے اس لیے خلافتِ خداوندی کا مستحق اس کے ہوتے ہوتے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔
شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ جس طرح جہاد اور اقامتِ عدل کے شعبوں کو سنبھالنا حضور انورؐ

وَإِذْ قُلْنَا لِلْمَلٰٓئِكَةِ اسْجُدُوْا لِاٰدَمَ فَسَجَدُوْٓا إِلَّآ إِبْلِيْسَ ؕ أَبٰى وَاسْتَكْبَرَ ۫ وَكَانَ مِنَ الْكٰفِرِيْنَ ۝

اور پھر اس پر غور کرو کہ جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ وہ سب سجدہ ریز ہو گئے لیکن ابلیس نے سجدہ نہیں کیا۔ اس نے ہمارا کہنا نہیں مانا اور اکڑ گیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ وہ منکروں میں سے تھا۔

کی خلافت ہے اسی طرح کارِ نبوت کے دوسرے شعبوں مثلاً تعلیم و تربیت، دعوت و ارشاد کا سنبھالنا اور اس راہ میں اخلاص سے رضائے الٰہی کی خاطر محنت کرنا بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت ہے۔

یاد رکھئے جیسے علم مدارِ خلافت ہے ایسے ہی علم ہی انسان کے اشرف المخلوقات ہونے کی وجہ ہے۔ شرف دو طرح کا ہوتا ہے۔ ایک وہ جو قرب کی وجہ سے ہو دوسرے وہ جو فضل کی وجہ سے ملے۔ فرشتوں کو عبادت میں قرب کا اور آدم علیہ السلام کو فضل کا شرف حاصل ہے۔ اسی پیمانے سے حضرت عائشہؓ اور حضرت فاطمہؓ کو ناپ لیجئے۔ حضرت فاطمہؓ کو اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قربِ نسل حاصل ہے تو حضرت عائشہؓ کو فضلِ علمی کا شرف حاصل ہے۔ حضرت صدیق اکبر اور حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما کے بارے میں بھی آپ اسی طرح معاملہ کو سلجھا سکتے ہیں کہ حضرت علیؓ کی بزرگی کا مدار قربِ نسب ہے اور یہ بھی ایک بڑا شرف ہے اور حضرت ابوبکرؓ کی فضیلت کا مدار ان کا فضلِ علم ہے۔ ظاہر ہے کہ جب فضل اور قرب میں آمنا سامنا ہوگا تو پلڑا فضل ہی کا بھاری ہوگا۔ مسئلہ کی قرآن کی روشنی میں اس واقعی نوعیت کو سمجھ لینے کے بعد بہت سے مسائل میں آپ مفاہمت کی راہ معلوم کر سکتے ہیں۔

وفاداری کا مظاہرہ

حضرت آدم علیہ السلام کی علمی توانائی منظرِ عام پر آنے کے بعد صلاحیتِ خلافت ثابت

ہو چکی تو ضرورت محسوس ہوئی کہ فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کے لیے وفاداری اور طاعت شعاری کا ایک عام مظاہرہ کیا جائے۔ اس آیت میں وفاداری کے اسی مظاہرے کا تذکرہ ہے۔

مولانا محمد قاسمؒ فرماتے ہیں:

خلافت خداوندی اس کا حصہ ہے جو علم میں اوروں سے ممتاز ہو۔ یہ بات سوائے حضرت آدم کے اور کسی میں نہ تھی اس لیے یہ دولت ان کے حصے میں آئی۔ لیکن جب خلافت ملی تو جیسے جانشینانِ شاہی کے لیے بعد جانشینی آدابِ شاہی بجالانے ضروری ہوتے ہیں ایسے ہی اللہ سبحانہٗ کے جانشین کے لیے آدابِ خداوندی بجالانے کا حکم ہوا۔

۸۲۔ جب حضرت آدم علیہ السلام کا خلیفہ ہونا مسلم ہو چکا تو فرشتوں اور ان کے ساتھ جنات کو حکم ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی طرف سجدہ کریں اور ان کو قبلہ سجود بنائیں جیسا کہ سلاطین اپنا ولی عہد مقرر کرتے ہیں۔ پھر ارکانِ دولت کو نذریں پیش کرنے کا حکم ہوتا ہے تاکہ کسی کو سرتابی کی گنجائش نہ رہے۔ چنانچہ سب نے سجدہ مذکور کیا سوائے ابلیس کے۔ کیونکہ وہ اصل میں جنات سے تھا۔ اور فرشتوں سے میل ملاپ زیادہ رکھتا تھا۔ اور سبب اس سرکشی کا یہ ہوا کہ جنات چند ہزار سال سے زمین میں کارفرما تھے اور آسمان پر بھی جاتے تھے ——— جب ان کا فساد اور خون ریزی بڑھی تو ملائکہ نے بحکم الٰہی کچھ کو مار ڈالا اور کچھ کو جنگل، پہاڑ اور جزائر میں منتشر کر دیا۔ ابلیس ان جنات میں بڑا عالم و عابد تھا۔ اس نے جنات کے فساد سے اپنی بے لوثی ظاہر کی۔ فرشتوں کی سفارش سے بچ گیا اور ان ہی میں رہنے لگا اور اس لالچ سے کہ اب جنات کی جگہ صرف اسے زمین میں کارفرما بنایا جائے گا عبادت میں بہت کوشش کرتا رہا اور زمینی خلافت کا منصوبہ بناتا رہا۔ جب حکمِ الٰہی حضرت آدم علیہ السلام کی نسبت خلافت کا معلوم ہوا تو ابلیس مایوس ہو گیا اور ریاکاری کی عبادت کے رائیگاں جانے پر جوشِ حسد میں سب کچھ کیا اور ملعون ہوا[1]

اس کا مطلب یہ ہے کہ زمین اور اس سے تعلق رکھنے والے طبقۂ کائنات میں جس قدر فرشتے مامور ہیں ان سب کو انسان کا مطیع ہو جانے کا حکم دیا گیا۔ چونکہ اس علاقہ میں انسان کا خلیفہ بنایا جا رہا تھا اس لیے فرمان جاری ہوا کہ صحیح یا غلط جس کام میں بھی انسان اپنے ان

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۸

اختیارات کو جو ہم نے اس کو عطا کیے ہیں استعمال کرنا چاہے اور ہم اپنی مشیت کے تحت اُسے ایسا کرنے کا موقع دیں تو تمہارا فرض ہو گا کہ تم میں سے جس جس کے دائرہ عمل سے وہ کام متعلق ہو وہ اپنے دائرے کی حد تک اس کا ساتھ دے۔ وہ چوری کرنا چاہے یا نماز پڑھے، نیکی کرنا چاہے یا بدی کے ارتکاب کے لیے جاتے، دونوں صورتوں میں جب تک ہم اسے اس کی پسند کے مطابق عمل کرنے کا اذن دے رہے ہیں تمہیں اس کے لیے سازگاری کرنی ہوگی۔

مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک فرمانروا جب کسی شخص کو اپنے ملک کے کسی صوبے یا ضلع کا حاکم مقرر کرتا ہے تو اس علاقے میں حکومت کے جس قدر کارندے ہوتے ہیں ان سب کا فرض ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت کریں۔ اور جب تک فرمانروا کا منشا یہ ہے کہ اسے اپنے اختیارات کا موقعہ دے اس وقت تک اس کا ساتھ دیتے رہیں۔ البتہ جب اور جس کام کے بارے میں بھی فرمانروا کا اشارہ ہو جائے کہ اسے نہ کرنے دیا جائے تو وہیں ان حاکم صاحب کا اقتدار ختم ہو جاتا ہے اور انہیں محسوس ہوتا ہے کہ سارے علاقے کے اہل کاروں نے گویا ہڑتال کر دی ہے۔ فرشتوں کو آدم علیہ السلام کے لیے سربسجود ہو جانے پر جو حکم دیا گیا تھا اس کی نوعیت کچھ اس قسم کی تھی۔ ممکن ہے کہ صرف مسخر ہو جانے کو سجدہ سے تعبیر کیا گیا ہو مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس انقیاد کی علامت کے طور پر کسی ظاہری فعل کا بھی حکم دیا گیا ہو اور یہی زیادہ صحیح ہے[1]

کیونکہ سجدہ کے لفظی معنے محض تواضع اور تذلل کے ہیں۔ سجدہ نماز کو بھی سجدہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ تواضع اور تذلل کا بہترین مظہر ہے۔ خود محاورۂ قرآن میں سجود کا اس معنی میں استعمال عام ہے اور یہاں بھی صحیح بات یہی ہے کہ یہ سجدہ اپنی ہیئتِ معروفہ کے ساتھ زمین پر پیشانی کے ساتھ نہ تھا بلکہ صرف جھکنے کے معنے میں ہے۔ لیکن جن لوگوں نے اسے سجدہ متعارف کے معنے میں لیا ہے۔ انہوں نے بھی تصریح کر دی ہے کہ یہ سجدہ عبادت نہیں بلکہ سجدہ تعظیمی ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ واقعہ عالمِ ارواح کا ہے عالمِ ناسوت کا ہے ہی نہیں ہے اور تکلیفاتِ شرعیہ کا تعلق اسی عالمِ ناسوت سے ہے۔ عالمِ ارواح عالمِ غیب ہے اور عالمِ غیب کے حالات کے بارے میں ہم اپنی رائے سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ اور اس سارے معاملہ کا تعلق اسی عالم سے ہے۔ ہم خدا کے فرشتوں سے کہنے، فرشتوں کے پوچھنے، اللہ کا

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۵

جواب دینے، آدم علیہ السلام کو تعلیم دینے، تعلیم کے بعد ملائکہ کے رُوبرو پیش کرنے جیسے سارے اعمال کی جب کوئی نوعیت اور کیفیت اس بنا پر مقرر نہیں کر سکتے کہ ان ہونے والے احوال کا تعلق عالم غیب اور عالم ارواح سے ہے تو پھر سجدہ کی کیفیت سے بحث کا دروازہ کیونکر کھول سکتے ہیں۔

آئیے اس مسئلہ کے اس پہلو پر بھی غور فرمائیے۔

ہم یہ ضرور مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فرشتوں سے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدہ کرایا گیا اور اس سجدہ کی کیفیت کے لیے نہ ہم آدم علیہ السلام کو قبلہ بنانے کی تاویل کرتے ہیں اور نہ ہم لام کو الیٰ کے معنے میں بتاتے ہیں۔ ہم مانتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو فرشتوں نے سجدہ کیا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ سجدہ کی نوعیت کیا تھی؟ یہ کس قسم کا سجدہ ہے؟ وہ بات جو حضرت شیخ الہندؒ نے فرمائی کہ اس کی نوعیت نذرانہ پیش کرنے کی ہے یا وہ جو مولانا مودودی نے بتائی کہ جب صدر مملکت گورنر یا ڈپٹی کمشنر مقرر کرتا ہے وہ علاقہ کی تمام مشینری کو حکم دیتا ہے کہ اس کی طاعت کی جائے۔ سجدہ کی نوعیت کچھ اسی قسم کی تھی۔ یا جو نکتہ مولانا مفتی محمد شفیع نے پیدا فرمایا کہ یہ سجدہ تعظیمی تھا۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ دُرست ہیں لیکن حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اس بات کو جس لطیف انداز میں پیش فرمایا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ فرماتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ، سجدۂ عبادت نہیں بلکہ سجدۂ خلافت ہے۔

سجدۂ خلافت کیا ہے؟ یہ بھی حضرت مولانا ہی کی زبانی سنیے، فرماتے ہیں کہ:

سجدے کی دو قسمیں ہیں۔ سجدۂ عبادت اور سجدۂ خلافت۔ دونوں میں مسجود اور مسجود لہٗ ہوتا ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ سجدہ عبادت میں مسجود واقعی اور بالذات ہوتا ہے اور سجدۂ خلافت میں مسجود عرضی اور مجازی ہوتا ہے۔

لیکن یہاں شاید آپ ذہن میں یہ خلش ضرور محسوس کریں گے کہ یہ سجدہ واقعی سجدہ عبادت نہیں بلکہ سجدۂ خلافت ہے۔ مگر سوال یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے وفاداری کے مظاہرے کی یہ صورت کیوں اختیار کی۔ اس کا جواب اوروں نے بھی دیا ہے لیکن جو حسن حضرت نانوتوی قدس اللہ سرہٗ العزیز کے جواب میں ہے وہ کہیں دیکھنے میں نہیں آیا۔ فرماتے ہیں کہ جب حضرت آدم علیہ السلام خلیفہ اور قائم مقام خداوند ذوالجلال ہوئے تو جیسے جانشینانِ شاہی کے لیے جانشینی کے بعد آدابِ شاہی بجا لانے ضروری ہوتے ہیں۔ خصوصاً ان کے ذمہ جن کو اس معاملہ میں شبہ کی نظر سے دیکھا جاتا ہو۔ فرشتوں نے چاہے کسی وجہ سے کہا تھا لیکن خلافت آدم علیہ السلام کے اعلان پر یہ کہا تھا کیا آپ

اس ہستی کو خلیفہ بنائیں گے جو زمین میں فساد مچائے گی، خون ریزی کرے گی۔ اب خلافت کی تاجپوشی کی رسم میں ان ہی کو مخاطب کر کے کہا اُسْجُدُوْا لِاٰدَمَ - یہ ان کا آدم علیہ السلام کی خلافت میں نیک نیتی پر مبنی شبہ تھا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ فرشتے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدۂ خلافت کریں تاکہ ان کا انکار عملاً اقرار بن جائے۔ اور یہ بھی معلوم ہو جائے کہ اگرچہ فرشتے معصوم ہیں اور انسان سراپا گناہ ہیں۔ لیکن چونکہ فرشتے مظہرِ قدرت ہیں اور انسان مظہرِ علم ہے اور قدرت علم کے توابع میں سے ہے اس لیے فرشتوں کا فرض ہے کہ وہ انسان کے فرمانبردار بن کر رہیں۔ الغرض مسجودیتِ آدم وہ حقِ خلافت خداوندی ہے اور خلافتِ خداوندی علم کا نتیجہ ہے۔

قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں اور والدین کا مصر پہنچنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو جس سجدہ کرنے کا ذکر ہے وہ بھی سجدۂ خلافت ہے۔ آدم علیہ السلام کی خلافت میں ملائکہ اور جنات کو کلام تھا۔ وہاں دونوں کو سجدہ کرنے کا حکم ہوا۔ صراحتاً اگرچہ صرف فرشتوں کا ذکر ہے لیکن ابلیس کے استثناء نے یہ بات کھول دی ہے کہ سجدہ کا حکم اس وقت کی تمام ذوی العقول مخلوق کو ہوا تھا۔ فرشتے اور جنات سب داخل تھے لیکن ذکر صرف فرشتوں کا ہے کیونکہ وہ سب سے اشرف تھے۔ اور قاعدہ ہے کہ جب حکم اعلیٰ کو دیا جائے تو ادنیٰ خود بخود داخل ہو جاتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی خلافت میں برادرانِ یوسف کو کلام تھا اس لیے مناسب معلوم ہوا کہ برادرانِ یوسف ان کو سجدہ کریں تاکہ وہ سرکشی نیاز و اطاعت میں تبدیل ہو جائے اور یہ معلوم ہو جائے کہ ہر چند برادرانِ یوسف صاحبِ انوار و برکات ہیں مگر یوسف علیہ السلام میں کوئی اور ہی حُسن کارفرما ہے۔ جیسے حضرت آدم علیہ السلام میں تسبیح و تحمید کے مقابلے میں علم بنائے خلافت تھی ایسے ہی حضرت یوسف علیہ السلام میں بھی بھائیوں کی بزرگی کے مقابلے میں علم ہی کو مدارِ خلافت بنایا گیا۔ قرآنِ حکیم کا یہ اعلان

ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ

اور

وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ

اس پر گواہ ہے

شاید آپ یہ خلش محسوس کریں کہ اگر بنائے خلافت علم ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

کو اس بنیاد پر مسجودِ کائنات ہونا چاہیے کیونکہ آپ کی ذاتِ گرامی منبع العلوم ہے اور آپ کو قرآن نے عَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ کے خطاب سے نوازا ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ علم میں تمام انبیاء میں کوئی آپ کا ہمسر نہیں ہے۔ واقعی آپ کو مسجودِ ملائکہ، مسجودِ خلائق ہونا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوا کیونکہ حضرت آدم علیہ السلام کی خلافت میں ملائکہ اور جنات کو کلام تھا۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کی خلافت میں یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو کلام تھا۔ گویا دونوں کی اپوزیشن موجود تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی علم و کمال میں چونکہ کوئی اپوزیشن موجود نہ تھی۔ اس لیے سجدۂ خلافت کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی اور آپ کی ہمسری کا مدعی کون ہو سکتا ہے۔ مولانا محمد قاسمؒ فرماتے ہیں کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء اور ملائکہ میں فرق وہی ہے جو بادشاہ اور اس کے خادموں میں ہوتا ہے۔ جیسے خادموں کو بادشاہ کی ہمسری کا خیال نہیں آسکتا ایسے ہی بمقابلہ رسولِ عربی اگر گزشتہ انبیاء موجود بھی ہوتے تو ان کو اس کا وسوسہ تک نہ آتا۔ اور یہ ممکن ہی کیونکر ہے۔ قمر اور کواکب میں آفتاب عالمتاب کی ہمسری کا یارا کب ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا جو مخلوق بھی ہے فرشتے ہوں یا جنات یا پھر اولادِ آدم، سب کے سب کمالاتِ علمی و عملی میں سرکار محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازے کے دریوزہ گر ہیں۔

چونکہ عالمِ وجود میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمسری کا مدعی کوئی نہ تھا اس لیے سجدۂ خلافت کی ضرورت پیش نہ آئی اور عالمِ غیب میں اگر ہمسری نہ ہونے کی وجہ سے سجدۂ خلافت کی ضرورت نہ تھی تو ادھر عالمِ شہادت میں کمالِ عبدیت کی وجہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ادا پسند نہ تھی اس لیے نہ اُدھر سے حکم آیا اور نہ ادھر سے اپنے لیے سجدۂ خلافت کو پسند کیا گیا۔

دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے توحیدِ عبادت کے بارے میں فکرِ انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوا تھا کہ مجاز کا پردہ ہٹا کر حقیقت کا جلوہ دیکھ لیتا۔ اس لیے مراسمِ عبادت میں خالق اور مخلوق کے درمیان ایجابی خط کے علاوہ کوئی سلبی امتیازی خط نہیں تھا۔ مثلاً صفاتِ الٰہی کی بنیاد تمام تر تشبیہ و تمثیل پر تھی۔ تورات کو دیکھئے کہ ایک طرف زبور کے ترانوں میں اللہ سبحانہٗ کے لیے شائستہ صفات کا تخیل موجود ہے لیکن دوسری طرف کوئی مناجات اور دعا نہیں جو انسانی اوصاف سے خالی ہو حتیٰ کہ حضرت مسیح

علیہ السلام نے رحمتِ الٰہی کے تصور کے لیے بھی باپ کی تشبیہہ اختیار کی۔ قرآن آیا تو جیسے تصورِ توحید کے بارے میں اس نے تشبیہہ و تمثیل کے تمام پردے ہٹا دیے اور انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت سے ایک طرف ہو کر توحید کے ہر گوشے میں مجاز کی جگہ حقیقت کا جلوہ پیش کیا۔ ٹھیک ایسے ہی اس نے توحیدِ عبادت کے لیے عمل کی ٹھوس بنیاد فراہم کی۔ عبادت کے ایجابی پہلو پر تو سب نے زور دیا تھا لیکن عمل میں اسلام سے پہلے سلبی پہلو نمایاں نہ ہوا تھا۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ عبادت و نیاز مندی کے سارے اعمال اللہ کے لیے ہونے چاہئیں۔ اور سلبی یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے ساتھ عمل میں کسی کی عبادت نہ ہونی چاہیے۔ ایجابی پہلو میں کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی، عظمت پرستی نمودار ہوتی تھی۔ قرآن نے سلبی پہلو پر زور دے کر عبادت کا ایسا کامل نقشہ کھینچ دیا کہ شخصیت پرستی اور عظمت پرستی کے تمام دروازے بند ہو گئے۔ دُنیا میں قدیم سے یہ دستور چلا آرہا تھا کہ حکمرانوں اور پیشواؤں کے آگے سجدے کرتے اور اسے تعظیم و احترام کی خاص علامت سمجھتے۔ قرآن نے توحیدِ عبادت کا جو نقشہ پیش کیا ہے وہ اس قسم کے رسوم کو برداشت نہیں کرتا۔ اس نے سجدے کی ہر قسم کو چاہے وہ سجدۂ عبادت ہو یا سجدۂ خلافت۔ اللہ کے لیے خاص کر دیا ہے اور سب سے اس کی نفی کر دی۔ نفی اور اثبات میں توحیدِ عبادت کا یہ تصور اس قدر کامل اور بے لچک ہے کہ اس کی کوئی نظیر ملنی ناممکن ہے۔

فرشتوں کے حضرت آدم علیہ السلام کو اور برادرانِ یوسف کا حضرت یوسف علیہ السلام کو سجدۂ خلافت کا بے شک قرآن میں تذکرہ ہے لیکن یہ محض ایک گزشتہ واقعے کی ایک حکایت ہے۔ یہ اسلامی احکام کی تشریع نہیں ہے۔ یہاں بھی حضرت نانوتویؒ نے جو بیش قیمت رہنمائی فرمائی ہے اس سے چشم پوشی کرنا بے انصافی ہے۔

جیسے فرشتوں کے حضرت آدم علیہ السلام کو سجدے میں کمالِ معرفت کے لیے شرک ایک آہنی دیوار ہے۔ ایسے ہی برادران و والدینِ یوسف میں کمالِ نبوّت شرک کے وسوسے سے مانع ہے۔ کمالِ معرفت اور کمالِ نبوّت ہوتے ہوئے ان ہستیوں کے بارے میں شرک کا خیال بھی نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن چونکہ بعد میں نہ فرشتوں جیسی معرفت کا کمال اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری نبی ہونے کی وجہ سے نبوّت کا کمال متصوّر نہیں ہے اس لیے سجدے کی ہر نوع حرام اور سرمایۂ شرک ہے۔

اسلامی شریعت میں دونوں سجدے اللہ کے سوا کسی کے لیے حرام ہیں۔ سجدۂ عبادت

ہو یا سجدۂ خلافت۔ لیکن دونوں میں ایک باریک قانونی فرق ہے۔ سجدۂ عبادت کفر ہے اور سجدۂ خلافت حرام ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ سجدۂ عبادت شرک اعتقادی ہے اور سجدۂ خلافت شرک عملی ہے۔ اور یا حافظ ابن القیمؒ کی زبان میں اس طرح تعبیر کر دیجئے کہ سجدۂ عبادت شرک اکبر ہے اور سجدۂ خلافت شرک اصغر ہے۔

حافظ ابن القیمؒ نے مدارج میں اما الشرك الاصغر کے عنوان کے تحت جہاں مشرکانہ فہرست میں غیر خدا کی قسم، جو اللہ اور تو چاہے، اللہ اور تمہاری مہربانی، میرا تو تمہارے اور اللہ کے سوا کوئی نہیں، جیسی تعبیرات کو شمار کیا ہے وہاں یہ بھی لکھا ہے کہ و من انواع الشرك سجود المرید للشیخ۔ الغرض یہ شرک ہے اور اسلامی قانون میں حرام ہے اور اس کا ارتکاب ایک سنگین جرم ہے۔

۸۳۔ مگر ابلیس۔ اس کے لفظی معنے یاس زدہ ہیں۔ قرآن میں مصدر ابلاس مختلف موقعوں پر اسی مفہوم میں آیا ہے۔ ابلیس فرشتہ نہیں جیسا کہ یہودیوں اور عیسائیوں کے تتبع میں ایک خیال پھیل گیا ہے بلکہ جنات سے تھا جیسا کہ قرآن حکیم میں تصریح ہے کَانَ مِنَ الْجِنِّ۔ نور کا بنا ہوا یہ فرشتہ نہیں جو نافرمانی پر قادر ہی نہیں ہے بلکہ آگ کا بنا ہوا جن تھا۔ خود قرآن میں اس کا اقرار ہے خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ۔ اور جنات کے بارے میں اللہ سبحانہ نے یہ فرمایا کہ جنات کی تخلیق آگ سے ہوئی ہے وَ خَلَقَ الْجَآنَّ مِنْ مَّارِجٍ مِّنْ نَّارٍ۔ ان صریح نصوص کے مقابلے میں کسی کی بات قابلِ اعتنا نہیں ہے [1]

لفظی ترجمہ تو انتہائی مایوس ہے لیکن اصطلاح میں وہ جن ہے جس نے اللہ کے حکم کی نافرمانی کر کے آدم علیہ السلام اور بنی آدم کے لیے مسخر ہونے سے انکار کر دیا۔ اور اللہ سے قیامت تک کے لیے مہلت مانگی کہ اسے نسلِ انسانی کو بہکانے اور گمراہی کی طرف ترغیب دینے کا موقعہ دیا جائے۔ اسی کو الشیطان بھی کہا جاتا ہے۔ درحقیقت شیطان و ابلیس محض کسی مجرد قوت کا نام نہیں وہ انسان کی طرح ایک صاحبِ تشخص ہستی ہے [2]

بالفاظ دیگر جب تک وہ انکار کرتا ہے ابلیس ہے اور جب دوسروں کو ورغلاتا ہے تو شیطان ہے۔ بلحاظِ لغت یہی درست ہے کیونکہ ابلیس وہ ہے جو رحمتِ الٰہی سے

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۷ [2] تفہیم القرآن ص ۶۵

وَقُلْنَا يٰٓاٰدَمُ اسْكُنْ اَنْتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ وَكُلَا مِنْهَا رَغَدًا حَيْثُ شِئْتُمَا ۠

وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

اور ہم نے کہا کہ اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور جہاں سے چاہو با فراغت کھاؤ (لیکن دیکھو) اس درخت کے قریب نہ جانا اگر جاؤ گے تو ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو نقصان اٹھانے والے ہیں ۔

مایوس ہے اور شیطان وہ ہے جو دوسروں کو رحمتِ الٰہی سے دُور کرتا ہے ۔ جس طرح ملائکہ کو محض قوائے عالم یا قوائے روحانیت بتانا غلط ہے ایسے ہی ابلیس اور اس کی ذریت کو محض انسانی یا قوتِ وہمیہ قرار دینا غلط ہے ۔

۸۴ ۔ وہ منکروں میں سے تھا ۔ اس کا ترجمہ کئی طرح کیا گیا ہے ۔ ایک یہ کہ وہ کافروں میں سے ہو گیا ۔ دوسرے یہ کہ وہ نافرمانوں میں شامل ہو گیا ۔ جو لوگ تھا سے ترجمہ کرتے ہیں ان کا مطلب یہ ہے کہ علمِ الٰہی میں پہلے ہی کافر تھا ۔ اوروں کو اگرچہ اس کا علم اب ہوا ۔ یا یوں کہو کہ اب کافر ہو گیا اس وجہ سے کہ حکمِ الٰہی کا بوجہ تکبر انکار کیا اور حکمِ الٰہی کو خلافِ مصلحت اور حکمت سمجھا یہ نہیں کہ فقط سجدہ نہیں کیا [1]

اور ہو گیا کا یہ مطلب بھی بتایا ہے کہ نافرمانی نے کافروں میں داخل کر دیا ۔ یہ معنے نہیں کہ وہ پہلے کافروں میں سے تھا ۔ جن مترجمین نے کان کو تھا کے معنے میں لیا ہے انہوں نے فی علم اللہ محذوف مانا ہے ۔ ابلیس پر کفر کا اطلاق حکم کے ردّ و انکار کی بنا پر ہوا محض ترکِ عمل کی بنا پر نہیں ۔ ترک چاہے کیسا ہی گناہ ہو ایمان سے خارج کر دینے اور کفر تک پہنچا دینے کے لیے اہل السنت کے نزدیک کافی نہیں ہے [2]

نیز اس تعبیر سے کہ وہ منکروں میں سے تھا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ غالباً ابلیس سجدہ سے انکار کرنے میں اکیلا نہ تھا بلکہ جنوں کی ایک جماعت نافرمانی پر آمادہ ہو گئی تھی اور ابلیس

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۸ [2] تفسیر ماجدی ص ۱۷

کا نام صرف اس لیے لیا گیا کہ وہ ان کا سردار اور اس بغاوت میں پیش پیش تھا[1]

ذمہ داری کی نمائش

اس سے پہلی آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کے لیے فرشتوں کی وفاداری کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے حضرت آدم علیہ السلام کی تکلیفی ذمہ داریوں کا عملی مظاہرہ بتایا ہے اور یہ مظاہرہ بھی ایک امتحان کے ذریعے ہوا۔ انسان دنیا میں اس لیے آیا ہے کہ ایک ذمہ دار اخلاقی وجود کی حیثیت سے ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو جو اس کے مالک کی جانب سے اس پر عہد ہونے کی حیثیت میں ڈالی گئی ہے۔ ذمہ داری کے اسی بوجھ کا نام قرآن کی زبان میں امانت ہے۔ امانت کا حاصل یہ ہے کہ انسان اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں یہاں آزاد نہیں ہے بلکہ اس پر اللہ سبحانہ کی جانب سے اوامر اور نواہی کی ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ طاعت کی صورت میں جزا اور معصیت کی صورت میں اس کے لیے سزا ہے.... ان ذمہ داریوں کی پا بجائی میں عملی زندگی کی تشکیل کا نام عبادت ہے۔ انسان کو اللہ سبحانہ نے جو مزاج عطا فرمایا ہے اور جن صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے اس کی تکمیل چونکہ اس کے بغیر ممکن نہ تھی اس لیے سب سے پہلے اسی کے مظاہرے کے لیے جنت کا مقام تجویز ہوا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ

حضرت آدم علیہ السلام کی ذات ایک ایسی حقیقت جامعہ ہے جو جسم و روح دونوں کے ساتھ رابطہ رکھتی ہے اور ساتھ ہی عقلی قوتوں کے ساتھ دو مثبت و منفی طاقتوں کا سرچشمہ ہے۔ جو مزاج ان مختلف قوتوں سے مل کر بنا ہے وہ ہی عملی زندگی میں امانت کی ذمہ داریوں کو پورا کر کے فرائض خلافت انجام دے سکتا ہے اور زمینی کائنات کے حقائق معلوم کر سکتا ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ خلافت کے کاروبار کے وجود میں آنے سے پہلے کوئی ایسی تجربہ گاہ ہو۔ جہاں حضرت آدم علیہ السلام کو اپنی قوتوں کو ظاہر کرنے کا موقع ملے تاکہ خلافت سے پہلے آدم علیہ السلام کی صلاحیتیں قوت سے نکل کر فعلیت کا لباس پہن لیں۔ گویا اب تک جو کچھ نظریہ تھا اب اسی نظریہ کے مطابق پہلا عملی نمونہ ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۶

۸۶ ـ لفظی معنے ہر اس باغ کے ہیں جس کے درخت زمین کو چھپالیں۔ اصطلاحِ شریعت میں وہ باغ مراد ہے جو بے شمار نعمتیں لیے ہوئے عالمِ آخرت میں نیکوکاروں کے لیے ہے اور آج نظروں سے پوشیدہ ہے۔ آیت میں اَنتَ تو مخاطب سے معلوم ہوتا ہے کہ اصلی مخاطب آدم علیہ السلام تھے حضرت حوا علیہا السلام کی حیثیت تابع کی سی ہے [1]

حضرت آدم علیہ السلام کو جس جنّت میں رہنے کے لیے کہا گیا ہے وہ جنّت کون سی ہے؟ جنّت الماویٰ جو بعد قیامِ قیامت اہلِ ایمان کا مستقر ہے۔ یا جنّتِ ارضی جو اسی سرزمین میں کسی بلند پُر فضا مقام پر حضرت آدم علیہ السلام کی حکومت کے لیے بنائی گئی تھی۔ جمہور علمائے اسلام کا مسلک یہ ہے کہ یہ جنّت الماویٰ ہی تھی جس کا وعدہ آخرت میں مسلمانوں سے کیا گیا ہے وہ کہتے ہیں کہ آیات و احادیث کا ظاہر یہی چاہتا ہے۔ اس آیت میں الجنۃ الف لام کے ساتھ لانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ اُسی مشہور جنّت کا ذکر ہے جس کو جگہ جگہ قرآن میں قیامِ قیامت کے بعد اہلِ ایمان کا وطن بتایا ہے۔ ورنہ اگر کسی نئے مقام کا تذکرہ ہوتا تو پہلے اس کا تعارف ہوتا پھر جانی پہچانی چیز بنا کر الجنۃ کہا جاتا۔ قرآن میں آگے اس جنّت سے نکلنے کا حکم ہے اور نکلنے کے لیے ہبوط (اترنا) بولا گیا ہے۔ ہبوط بلندی سے پستی کی طرف ہوتا ہے اس لیے یہ جنّتِ ارضی نہیں ہو سکتی بلکہ جنّتِ ماویٰ ہے ــــ صحیح مسلم میں ایک طویل حدیث ہے جس میں یہ جملہ موجود ہے۔

اللہ تعالیٰ لوگوں کو جمع کرے گا، اہلِ ایمان کھڑے ہوں گے۔ جنّت ان کے قریب ہوگی وہ حضرت آدم علیہ السلام کے پاس آئیں گے اور کہیں گے اے ہمارے باپ ہمارے لیے جنّت کو کھولئے۔ اس پر حضرت آدم علیہ السلام فرمائیں گے کیا جنّت سے تم کو تمہارے باپ کی خطاکاری نے ہی نہیں نکالا ہے؟ اس کے برعکس علما کی ایک جماعت کہتی ہے کہ یہ جنّت دُنیا ہی کے مقامات میں سے کسی مقام پر تھی۔ جنّۃ الماویٰ نہ تھی۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ آیاتِ قرآنی بتاتی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے آدم و حوا کو وہاں کھانے پینے کا مکلف بنایا۔ آدم علیہ السلام وہاں خوابِ استراحت میں رہتے تھے۔ وہاں ابلیس بھی جاتا تھا اور اس نے حضرت آدم علیہ السلام کو بہکایا اور پھر سب وہاں سے نکالے گئے۔ یہ تمام وہ حالات ہیں جو دُنیا کے ساتھ مخصوص ہیں اور جنّت الماویٰ میں ان کا وجود نہیں ہے۔

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۰

بہرحال بحث بڑی طویل ہے۔ حافظ ابن القیمؒ نے حادی الارواح میں اور حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ والنہایہ میں اس پر مبسوط بحث فرمائی ہے۔ امام ابو منصور ماتریدیؒ اپنی تاویلات میں رقم طراز ہیں کہ:

ہمارا اعتقاد ہے کہ یہ ان باغوں میں سے کوئی باغ ہے جس میں آدم اور حوا رہتے تھے۔ ہم نہ اس کی تعیین کرتے ہیں اور نہ اس کے مقام کی جستجو کرتے ہیں۔ سلف کا یہی مذہب ہے۔ اہل السنت میں سے جن لوگوں نے اس کی تعیین کی کھوج لگائی ہے ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔

بلکہ کچھ بزرگوں نے تو امام ابو حنیفہؒ کو بھی ان میں شمار کیا ہے جو اس جنت کے جنتِ ارضی ہونے کے قائل ہیں۔ اور خود تاویلات اہلِ السنت کے مشہور مصنف ابو منصور ماتریدیؒ کا بھی میلان اسی طرف ہے اس لیے راہ صواب یہی ہے کہ اس معاملہ میں توقف کیا جائے اور سکوت کر کے معاملہ کو خدا کے سپرد کر دینا چاہیے۔

آیت میں اسکن فرمایا ہے اس کے معنے ہیں رہو تم۔ یہ نہیں فرمایا کہ داخل ہو جاؤ یا چڑھ جاؤ۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ تخلیق، تعلیم، فرشتوں سے مقابلہ اور آدم علیہ السلام کو فرشتوں کا سجدہ، یہ سارے کوائف اسی الجنۃ میں یا اس کے قریب پیش آئے ہیں۔

۸۷ ۔ با فراغت رَغَدًا کا ترجمہ ہے اس کے معنے وسیع، اچھی طرح —— یہ اصل میں مصدر ہے بمعنے بہت نعمت ہونا۔ اور صفت مشبہ ہو کر استعمال ہوتا ہے نیز راغد کی جمع بھی ہے جیسے خدم خادم کی۔ آیت کلا منھا رغدا حیث شئتما اور کھاتے پھرو اس میں سے جہاں سے چاہو محفوظ ہو کر —— میں رغداً بمعنے صفت بھی ہو سکتا ہے اور جمع بھی [1]

اس آیت میں دو امر آئے ہیں ایک کا تعلق رہائش سے اور دوسرے کا خوراک سے ہے۔ اور رہائش بھی انفرادی نہیں بیوی کے ساتھ ہے اور خوراک کا بھی کوئی پیمانہ مقرر نہیں بلکہ ان دو رخصتوں کے ساتھ ہے کہ با فراغت کھاؤ اور جہاں سے چاہو کھاؤ۔ اجتماعی رہائش سے لباس کی طرف بھی اشارہ ہے جیسا کہ آپ آٹھویں پارے میں پڑھیں گے۔ گویا رہنے کے لیے مکان، پہننے کے لیے کپڑا، کھانے کے لیے خوراک اور رفاقت کے لیے بیوی زندگی کے بنیادی تقاضے ہیں۔ ان ہی تقاضوں کے جھمیلے میں انسان کو یہ کہا گیا ہے کہ لا تقربا ھذہ الشجرہ۔

۸۸ ۔ اس درخت کے قریب نہ جانا۔ دونوں سے کہا گیا ہے۔ لوگ یہاں معنے یہی کرتے ہیں کہ نزدیک

---

[1] لغات القرآن ج ۳ ص ۹۰

نہ ہوتم یعنی اس کو نہ کھانا. جب کسی کام سے روکتے ہیں تو اس کام تک پہنچنے کے وسائل پر بھی پابندی لگانے کے لیے یہ تعبیر اختیار کرتے ہیں۔ اور کچھ ارباب معانی کا خیال ہے کہ یہ تعبیر ایسے موقعہ پر زور پیدا کرنے کے لیے اختیار کی جاتی ہے جہاں روکے گئے میں پڑ جانے کا اندیشہ قوی ہو۔ گویا واؤ کے ذریعے اس فقرے کو پہلے فقرے کے ساتھ جوڑ کر پہلے ہی اشارہ فرما دیا کہ اگر ایسا واقعہ ہو گیا کہ تم نے اس ممانعت کو اپنے عمل سے توڑ دیا تو اس کے نتیجے میں تمہیں جنت کی رہائش، اس کی پوشاک سے محروم ہونا پڑے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمین یعنی جائے تقرر پر خلیفہ کی حیثیت سے بھیجے جانے سے پہلے ان کو امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا تاکہ ان کے رجحانات کی آزمائش ہو جائے۔ اس آزمائش کے لیے ایک درخت کو چن لیا گیا اور حکم دیا گیا کہ اس کے قریب نہ پھٹکنا۔ اور اس کا انجام بھی بتا دیا گیا۔ اس امتحان کے لیے جنت ہی کا مقام سب سے موزوں تھا۔ دراصل اسے امتحان گاہ بنانے کا مقصود یہ حقیقت انسان کے ذہن نشین کرنی تھی کہ تمہارے لیے تمہارے مرتبہ انسانیت کے لحاظ سے جنت ہی لائق و مناسب مقام ہے۔ لیکن شیطانی ترغیبات کے مقابلے میں اگر تم اللہ سبحانہ کی فرمانبرداری کے راستہ سے منحرف ہو جاؤ گے تو جس طرح ابتدا میں اس سے محروم ہو گئے ہو اسی طرح آخر میں بھی محروم رہو گے[1]

جس درخت کے قریب جانے سے روکا گیا ہے یہ کونسا درخت ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ درخت جنت کے درختوں میں سے کوئی متعین اور حضرت آدم علیہ السلام کے لیے معلوم و معروف درخت تھا لیکن اب اس کی تعیین سے کوئی نتیجہ نہ تھا۔ اس لیے قرآن حکیم جو کبھی بے نتیجہ بات نہیں کہتا اس کی تعیین سے خاموش ہے اور حدیث صحیح میں بھی اس موضوع پر کچھ نہیں آیا ہے۔ اس لیے محققین کا مسلک بھی اس باب میں خاموشی ہے[2] مشہور ہے کہ درخت گیہوں کا تھا یا بقول بعض انگور، انجیر وغیرہ واللہ اعلم[3]

۸۹ ۔ ان لوگوں میں سے ہو جاؤ گے جو نقصان اٹھانے والے ہیں۔ ظلم کے معنے نقصان، ستم، بے انصافی، زبردستی، گناہ، تقصیر۔ اصل معنے غیر کی ملک میں تصرف کرنا اور حد سے گزر جانا۔ اسی لیے علماء نے تصریح کی ہے کہ ظلم کا صدور ذات باری سے محال ہے کیونکہ کائنات تمام تر اسی کی

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۶ [2] تفسیر ماجدی ص ۱۷ [3] حاشیہ شیخ الہندؒ

ملکیت ہے۔ لہٰذا وہ اپنی ملک میں جو بھی کرے بجا ہی بجا ہے۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ اہلِ لغت اور بہت سے علماء کے نزدیک ظلم کہتے ہیں۔ کسی چیز کو اس کی مخصوص جگہ سے ہٹا کر نقصان کے ساتھ یا زیادتی کے ساتھ یا وقت بدل کر یا جگہ بدل کر بے محل رکھ دینے کو۔ اسی سے عربی کا محاورہ ہے ظلمت السقاء میں نے مشکیزے کے دودھ کو بے وقت استعمال کیا۔ اور یہ استعمال شدہ دودھ ظلیم کہلاتا ہے۔ اسی طرح ظلمت الارض کے معنے ہیں میں نے زمین کو ایسی جگہ سے کھودا جہاں کھودنے کی جگہ نہ تھی۔ وہ جگہ مظلوم کہلاتی ہے اور جو مٹی نکلی ہے اس کو بھی ظلیم کہتے ہیں۔ یہاں ظلم کے معنے نقصان اٹھانا ہیں۔ اللہ کی نافرمانی سے بڑھ کر کونسا ظلم اپنے آپ پر ہوگا۔ اس تصریح سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جنت کی حیثیت اس وقت تک دارالجزا یا دارالخلد کی نہ تھی جیسا کہ اب ہے بلکہ اس وقت وہاں تکلیفاتِ شرعیہ تھیں، اوامر اور نواہی تھے اور جب جنت کی ماہیت اس وقت یہ تھی تو کوئی اشکال نہیں رہتا[1]

ظالم کا لفظ نہایت معنے خیز ہے۔ ظالم وہ ہے جو کسی کا حق تلف کرے، جو شخص اللہ سبحانہٗ کی نافرمانی کرتا ہے وہ درحقیقت تین بڑے بنیادی حقوق تلف کرتا ہے۔ اولاً خدا کا حق کیونکہ وہ اس کا مستحق ہے کہ اس کی فرمانبرداری کی جائے۔ ثانیاً ان تمام چیزوں کے حقوق جن کو اس نے اس نافرمانی کے ارتکاب میں استعمال کیا۔ اس کے اعضائے جسمانی، اس کے قوائے نفس، اس کے ہم معاشرت انسان، وہ فرشتے جو اس کے ارادے کی تکمیل کا انتظام کرتے ہیں اور وہ اشیاء جو اس کام میں استعمال ہوتی ہیں ان سب کا اس پر حق یہ تھا کہ وہ صرف ان کے مالک ہی کی مرضی کے مطابق ان پر اپنے اختیارات استعمال کرے۔ مگر جب اس کی مرضی کے خلاف اس نے ان پر اختیارات استعمال کیے تو درحقیقت ان پر ظلم کیا۔ ثالثاً خود اپنا حق کیونکہ اس پر اس کی ذات کا یہ حق ہے کہ وہ اسے تباہی سے بچائے مگر نافرمانی کر کے جب وہ اپنے کو اللہ کی سزا کا مستحق بناتا ہے تو دراصل اپنی ذات پر ظلم کرتا ہے۔ ان ہی وجوہ سے قرآن میں جگہ جگہ گناہ کے لیے ظلم اور گنہگار کے لیے ظالم کی اصطلاح استعمال کی گئی ہے[2]

آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ ان کی اہلیہ کا ذکر ہے یعنی حضرت حوا علیہا السلام۔ ان کی تخلیق پر بحث آپ کو انشاء اللہ سورۂ نساء میں ملے گی۔

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۷ [2] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۶۷

فَاَزَلَّهُمَا الشَّيْطٰنُ عَنْهَا فَاَخْرَجَهُمَا مِمَّا كَانَا فِيْهِ ۪ وَقُلْنَا اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝

پھر شیطان کی وسوسہ اندازی نے اس درخت کے ذریعے ان دونوں کے قدموں میں لغزش [۹۰] پیدا کر ڈالی۔ اور اس لغزش کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان دونوں کو اس زندگی سے نکال ڈالا [۹۱] جس میں وہ بس رہے تھے۔ اور ہم نے حکم دیا کہ تم یہاں سے اُتر جاؤ تم ایک دوسرے کے [۹۲] دُشمن ہو۔ اور اب تمہارے لیے زمین میں ٹھہرنا ہے اور وہیں ایک خاص وقت تک گزر [۹۳] بسر کرنا ہے۔

امتحان کی اصل غرض یہ تھی کہ حضرت آدم علیہ السلام شیطان کی ترغیبات کے مقابلے میں کس حد تک حکم کی پیروی کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لیے جنت میں درخت منتخب کیا گیا۔ اس لیے درخت کے نام اور اس کی خاصیت کا کوئی ذکر نہیں فرمایا۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ انسان کی اصل فطرت تو نیکی ہے لیکن اصل فطرت کی راہ میں جب رکاوٹیں آجاتی ہیں تو انسان نافرمانی کر گزرتا ہے اور یہ رکاوٹیں تین قسم کی ہیں طبعی، رسمی اور بے خبری۔ طبعی رکاوٹ یہ ہے کہ آدمی کی طبیعت کی افتاد غلط ہو۔ خواہشوں، ولولوں اور چاہتوں کا رُخ غلط ہو جائے، جذبات میں بہہ جائے۔ علمی قوتیں طبعی تقاضوں کے سامنے بے دست و پا ہو جائیں۔ اسی کو نفس کہتے ہیں۔

رسمی رکاوٹ یہ ہے کہ ماحول غلط ہو، گرد و پیش میں گاڑی ایسی چل رہی ہو اور حالات کا دھارا ایسا ہو کہ اس میں آدمی کی فطرت دب کر رہ جائے۔

بے خبری یہ کہ آدمی کو پتہ ہی نہ ہو۔ اور یہ تینوں رکاوٹیں صرف شیطنت کے زیر سایہ پروان چڑھتی ہیں۔ فقط ماحول اور بُری صحبت کا جال شیطان کے جالوں میں سب سے سنگین ہے اور جب یہ دام ہمرنگ زمین بن کر آئے اور زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔

۹۰۔ شیطان وہ ہے جو خیر اور رحمتِ الٰہی سے دُور ہو۔ ابلیس کا ذکر اُوپر آچکا ہے۔

اب یہاں اسے اس کے وصفی نام سے یاد کیا جا رہا ہے۔ نافرمانی کی پاداش میں وہ جنت سے نکالا جا چکا ہے۔ اب اس کا نام شیطان ہے۔ اس کے پاس انسان کو مجبور کرنے کی کوئی طاقت نہیں ہے البتہ وہ پروپیگنڈے کے فن کا امام ہے۔ ترغیب خوب دے سکتا ہے سیاہ کو سفید کر کے خوب دکھا سکتا ہے اور وسوسہ اندازی کی طاقت غضب کی رکھتا ہے۔ نزدیک اور دُور اپنا عمل سب جگہ سے کر سکتا ہے فاصلہ اس کے لیے کوئی معنے نہیں رکھتا اور مادی رکاوٹیں اس کی راہ میں حاصل نہیں ہو سکتی ہیں[1]

اس مقام پر ازلال بولا گیا ہے اس کے معنے ہیں بغاوت، سرکشی یا لازمی نافرمانی کا کوئی منہوم نہیں۔ اس کے معنے ڈگمگا دینے، پھسلا دینے اور ہٹا دینے کے ہیں۔

زلت کیا ہے؟ یہ ایسی حالت پر بولا جاتا ہے کہ جہاں نہ عمل اور کردار میں تمرد ہو اور نہ ارادی طور پر حکم کی خلاف ورزی ہو اور ساتھ ہی وہ عمل اپنی حقیقت اور ماہیت کے اعتبار سے قبیح نہ ہو۔ ان تمام امور کے پیشِ نظر وہ اپنی ذات میں اباحت اور جواز کا درجہ رکھتا ہو مگر کرنے والے کی ہستی کے شایانِ شان نہ ہو بلکہ اس کا اس طرح کرنا خدائے تعالیٰ کی مرضی کے خلاف ہو۔ لیکن نبی پر چونکہ اللہ تعالیٰ کی مستقل حفاظت ونگرانی ہوتی ہے اس لیے فوراً ہی اسے متنبہ کر دیا جاتا ہے کہ یہ عمل تمہاری جلالتِ قدر اور عظمتِ مرتبہ کے شایانِ شان نہیں ہے۔

اس حقیقت کے واضح ہو جانے کے بعد اب اس واقعہ پر نظر ڈالیے تو آپ معلوم کریں گے کہ اس واقعہ کے اظہار کے لیے ایسی تعبیر اختیار کی گئی جس میں حضرت آدم علیہ السلام کی لغزش کو نہیں بلکہ شیطان کے ازلال کو واضح کیا اور بتا دیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی یہ غلطی نہ گناہ تھی اور نہ نافرمانی بلکہ معمولی قسم کی لغزش بن گئی۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۂ طٰہٰ میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنا سمجھ لیجئے کہ حضرت آدم علیہ السلام نے کسی قسم کا کوئی گناہ نہیں کیا اور جس حد تک معاملہ پیش آیا اس میں ان کے قصد و ارادے کو خلاف ورزی میں کوئی دخل نہیں ہے۔ بلکہ وہ ایک وسوسہ تھا جو لغزش کی شکل میں ان سے صادر ہو گیا اور وہ بھی بھول چوک کے ساتھ۔ اور وہ اس طرح ہوئی ہے کہ خدا تعالیٰ کی جنت میں دائمی زندگی کا ان کو فریب دیا گیا اور اس کی توثیق و تصدیق کے لیے خدا تعالیٰ کا نام لے کر ان کے سامنے قسم کھائی۔ پھر جس طرح ہر شخص اپنی کسی انتہائی کامیابی اور بے نہایت فوز و فلاح کے تصورات، تمناؤں میں پڑ کر دوسری

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۷

جانب سے ذہول میں پڑ جایا کرتا ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام کو قرب ایزدی کی تمناؤں پر شیطان کی قسموں کے سامنے یہ خیال نہ رہا کہ مجھ سے کیا کہا گیا تھا بس اس فریب میں آکر پوری فراموشی کے عالم میں ان سے خلاف ورزی کا ارتکاب ہو گیا۔ قرآن کریم نے اسے صدور عصیان کہا ہے لیکن اس کی تشریح جو خود اس نے بیان کی ہے اس کے بعد کسی انسان کو ایک لمحہ کے لیے بھی اس پر معصیت کا لفظ بولنے کا حق نہیں رہتا یعنی یہاں معاملہ کی نوعیت ہی اتنی نازک ہو گئی تھی کہ اس کے سامنے کسی فرد سے صبر و تحمل کرنا مشکل تھا۔

۹۱۔ کہتے ہیں کہ حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام جنت میں رہنے لگے اور شیطان کو اس کی عزت کی جگہ سے نکال دیا شیطان کو اور حسد بڑھا بالآخر مور اور سانپ سے مل کر بہشت میں گیا اور حضرت حوا علیہا السلام کو طرح طرح سے ایسا پھسلایا اور بہکایا کہ انہوں نے وہ درخت کھالیا اور حضرت آدم علیہ السلام کو بھی کھلایا اور اُن کو یقین دلا دیا تھا کہ اس کے کھانے سے اللہ سبحانہٗ کے ہمیشہ کو مقرب ہو جاؤ گے اور حق تعالیٰ نے جو ممانعت فرمائی ہے اس کی توجیہہ گھڑ دی[1]

یعنی شیطان نے دھوکا اور لغزش کے ذریعے حضرت آدم علیہ السلام اور حضرت حوا علیہا السلام کو ان نعمتوں سے نکال دیا جن میں وہ آرام سے گزر بسر کر رہے تھے۔ یہ نکالنا اگرچہ بحکم خداوندی ہوا مگر سبب اس کا شیطان تھا، اس لیے نکالنے کی نسبت اس کی طرف کر دی گئی[2]

اتر جانے کے حکم سے معلوم ہوا کہ یہ جنت زمین کے کسی حصہ پر نہیں آسمان پر تھی۔ قول محقق یہی ہے اور اتر جانے کے حکم کا تقاضا بھی یہی ہے جب تک اور کوئی قرینہ نہ ہو۔ ہبوط کے معنے بلندی سے پستی میں اترنے ہی کے لیے جائیں گے[3]

اگر جنت سے مراد دُنیا کا کوئی باغ ہوتا تو یہ کوئی اتنی اہم بات نہ تھی جس کا تذکرہ قرآن میں آتا پھر جب وہیں ان کی صورت بنی تو یقیناً وہیں ان کی سکونت بھی ہو گی اور اسی وقت جنت کو حضرت آدم علیہ السلام کی وراثت کہنا بھی صحیح ہو سکتا ہے۔ قرآن کریم کی کسی آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ کوئی دُنیا کا باغ تھا۔ حضرت آدم علیہ السلام کی سرگزشت مختلف مقامات پر ذکر کی گئی ہے مگر کسی مقام پر بھی اس کی طرف اشارہ نہیں کیا گیا۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ [2] معارف القرآن ج ۱ ص ۱۳۵ [3] تفسیر ماجدی ص ۱۸

یہ شبہ نہ کیا جائے کہ دو آدمیوں کے اتر جانے کو جمع کے ساتھ کیوں تعبیر کیا؟ اس لیے کہ حضرت آدم و حوا علیہما السلام کے ساتھ ان کی آئندہ ہونے والی اولاد کو بھی شامل کر لیا گیا۔ ان دونوں کو نیچے اتر جانے کا حکم دینا جملہ بنی نوع انسان کو نیچے اترنے کا حکم دینا ہے۔

۹۲ ۔ اس کی سزا میں حضرت آدم و حوا علیہما السلام اور جو اولاد پیدا ہونے والی تھی سب کی نسبت حکم ہوا کہ جنت سے زمین پر جا کر رہو۔ باہم ایک دوسرے کے دشمن ہو گے جس کی وجہ تکلیفیں پیش آئیں گی۔ جنت دار العصیان اور دار العداوت نہیں ہے۔ ان امور کے مناسب دار دنیا ہے جو تمہارے امتحان کے لیے بنایا گیا ہے[1]

بَعۡضُكُمۡ لِبَعۡضٍ عَدُوّٞ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو۔ یہ مختصر لفظوں میں کل زمینی زندگی کا نقشہ ہے یعنی یہاں کشمکش، بغض، حسد، نفسانیت، خود غرضی کا دور رہا کریگا۔[2]

اس حکم کے مخاطب حضرت آدم و حوا علیہما السلام ہیں۔ اور اگر شیطان کو اس وقت تک آسمانوں سے باہر نہیں کیا گیا تھا تو وہ بھی اس خطاب میں شامل ہے۔ اس صورت میں باہم عداوت ہونے کا مطلب یہ ہوگا کہ شیطان کے ساتھ تمہاری عداوت کا سلسلہ دنیا میں بھی جاری رہے گا اور اگر اس واقعہ کے رونما ہونے سے پہلے ہی شیطان جنت بدر ہو چکا تھا تو پھر اس کے مخاطب حضرت آدم و حوا علیہما السلام ہوں گے۔ ان کو بطور عتاب یہ جتلایا گیا ہے کہ ایک سزا تو یہ ہے کہ جنت سے زمین پر اتارا گیا۔ دوسری سزا اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ اولاد میں باہم عداوت ہو گی اور ظاہر ہے کہ اولاد میں باہم عداوت ہونے سے والدین کی زندگی کا مزا کرکرا ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ بھی ایک قسم کی معنوی اور روحانی سزا ہے[3]

زیادہ قرینِ قیاس یہی ہے کہ مخاطب حضرت آدم و حوا علیہما السلام ہیں۔ کیونکہ قرآن میں دوسرے موقعہ پر اس کے لیے تثنیہ کا صیغہ آیا ہے "قلنا اھبطا منھا جمیعاً"۔

اگر پہلی بات ہو یعنی آدم اور شیطان سے یہ کہا گیا ہے کہ انسان کا دشمن شیطان اور شیطان کا دشمن انسان ہے تو شیطان کا دشمنِ انسان ہونا تو ظاہر ہے کہ وہ اسے اللہ سبحانہ کی فرمانبرداری کے راستہ سے ہٹانے اور تباہی میں ڈالنے کی کوشش کرتا ہے۔ رہا انسان کا دشمنِ شیطان ہونا تو فی الواقع انسانیت تو اس سے دشمنی کی مقتضی ہے مگر خواہشاتِ نفس کے لیے جو ترغیبات

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹ [2] تفسیر ماجدی ص ۱۸ [3] معارف القرآن م ش ص ۶۴

وہ پیش کرتا ہے ان سے دھوکہ کھا کر آدمی اسے دوست بنا لیتا ہے۔ اس طرح کی دوستی کے معنے یہ نہیں ہیں کہ فی الواقع دشمنی دوستی میں تبدیل ہو گئی بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ ایک دشمن دوسرے دشمن سے شکست کھا گیا اور اس کے خیال میں پھنس گیا [1]

۹۳ ۔ نہیں زمین میں رہنا ہے اور ایک خاص وقت تک گزر کرنا ہے یعنی دنیا میں ہمیشہ نہ رہو گے بلکہ ایک وقتِ معین تک رہو گے اور وہاں کی چیزوں سے بہرہ اندوز ہو گے اور پھر ہمارے رُوبرو پیش ہو گے اور وقتِ معین ہر شخص کی حد تک تو اس کی موت کا وقت ہے اور پورے عالم کے لیے قیامت کا [2]

آیت کا یہ حصہ خود اس کی دلیل ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو پہلی بار زمین پر بھیجا جا رہا ہے اور اب تک وہ جس جنت میں تھے وہ زمین پر نہیں آسمان پر تھی۔ یہاں سے ان کی زندگی کا نیا دَور شروع ہو رہا ہے۔ نئی زندگی اور نیا ماحول اور اب ان کو یہیں رہنا ہے لیکن یہاں قیام دائمی نہ ہوگا صرف ایک مقررہ وقت تک رہنا ہوگا۔ متاع اور الی حین دونوں سے زمینی زندگی کا عارضی اور بے ثبات ہونا بالکل ظاہر ہو رہا ہے۔

آیت میں زمین میں رہنے کو استقرار سے تعبیر کیا ہے یہ قرار سے بنا ہے اس کے معنی ٹھہرنا ہیں اور مستقر کے معنی ٹھہرنے کی جگہ کے ہیں یعنی وقتی اور عارضی ٹھہرنے کی جگہ۔ گویا یہ زمین انسانی زندگی کے لیے واقعی رہنے کی جگہ نہیں بلکہ اسے کچھ وقت کے لیے ٹھہرنے کی جگہ بتایا گیا ہے۔ اس کے مقابلے میں آخرت دار القرار ہے یعنی رہنے کا واقعی گھرانہ۔ اس لفظ کے ساتھ متاع اور الی حین کی قید نے یہ بات کھول دی ہے کہ زمین انسانی معیشت کے لیے ہے اور اس کی نعمتوں سے انسان کو بہرہ مند ہونا ہے لیکن یہاں کی زندگی دائمی نہیں ہے۔ اس لیے حضرت آدم علیہ السلام کی زمین میں آمد نہ تو زمین کی بربادی کے لیے ہے اور نہ زمین میں ہمیشہ رہنے کے لیے ہے۔ گویا حضرت آدم علیہ السلام کا ارضِ راحت سے نکل کر ارضِ عمل میں آنا اس لیے نہیں ہے کہ اللہ سبحانہٗ ان کو تباہ کرنا چاہتا ہے اور نہ اس لیے ہوا ہے کہ اللہ سبحانہٗ ان کو زمینی نعمتوں سے محروم رکھنا چاہتا ہے اور نہ مقصد یہ ہے کہ زمین میں ہمیشہ ہمیشہ رہنا ہے۔ پھر آمد کا مقصد کیا ہے؟ آنے والی آیات میں اسی کا تذکرہ ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۵ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹

فَتَلَقّٰۤی اٰدَمُ مِنۡ رَّبِّهٖ كَلِمٰتٍ فَتَابَ عَلَيۡهِ‌ؕ اِنَّهٗ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيۡمُ‏

پھر آدم علیہ السلام کو اپنے رب کے الہام سے چند باتیں معلوم ہوگئیں (جن کے ذریعے آدم علیہ السلام نے اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں معذرت پیش کردی) اللہ سبحانہٗ نے آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی۔ اللہ سبحانہٗ ہی توبہ قبول کرنے والا اور مہربان ہے۔

حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ

غلطی، بھول چوک اور گناہ کے بعد اگر ندامت کا احساس اندر سے جاگتا ہے تو یہ آدمیت ہے اور اگر بجائے احساسِ ندامت کے تناؤ، تمرد اور سرکشی رونما ہو تو یہ آدمیت نہیں ابلیسیت ہے۔ انسان کو اللہ سبحانہٗ کا پہلا تعارف اگرچہ صفتِ ربوبیت کے ذریعے ہوا ہے مگر ربوبیت کی اصلی روح رحمت ہے۔ اگر رحمت نہ ہوتی تو تربیت بھی نہ ہوتی بلکہ تمام جہان کی پیدائش ہی اسی رحمت کا نتیجہ ہے۔ رحمت ہی کا یہ جوش تھا کہ بلا مطالبہ، بلا استحقاق توبہ و انابت کے الفاظ اپنی جانب سے تلقین کردیے۔ اور یہاں اس سے بھی زیادہ مہربانی اور رحیمیت کا کمال یہ ہے کہ اس تعلیم کی نسبت بھی اپنی جانب نہیں فرمائی۔ یوں نہیں فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ نے حضرت آدم علیہ السلام کو توبہ کے کلمات سکھا دیے بلکہ یوں فرمایا ہے کہ آدم علیہ السلام نے سیکھ لیے۔

۹۴۔ جب حضرت آدم علیہ السلام نے حق تعالیٰ کا حکم عتاب آمیز سنا تو بحالت ندامت انفعال گریہ وزاری میں مصروف تھے۔ عین اس حالت میں اللہ تعالیٰ نے ان کو چند کلمات القاء اور الہام کے طور پر بتلائے جن سے ان کی توبہ قبول ہوئی۔ وہ کلمات یہ ہیں رَبَّنَا ظَلَمۡنَاۤ اَنۡفُسَنَا وَاِنۡ لَّمۡ تَغۡفِرۡ لَنَا وَتَرۡحَمۡنَا لَنَكُوۡنَنَّ مِنَ الۡخٰسِرِيۡنَ [1]

مطلب یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کو جب اپنے قصور کا احساس ہوا اور انہوں نے نافرمانی

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹

سے پھر فرمانبرداری کی طرف رجوع کرنا چاہا اور ان کے دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ اپنے رب سے اپنی خطا معاف کرائیں تو انہیں وہ الفاظ نہ ملتے تھے جن کے ساتھ وہ خطا بخشی کے لیے دُعا کر سکتے۔ اللہ سبحانہٗ نے ان کے حال پر رحم فرما کر وہ الفاظ بتا دیے۔

۹۵ ۔ توبہ کے اصل معنے رجوع کے اور پلٹنے کے ہیں۔ بندہ کی طرف سے توبہ کے معنے یہ ہیں کہ وہ سرکشی سے باز آگیا۔ طریق بندگی کی طرف پلٹ آیا۔ اور خدا کی طرف سے توبہ کے معنے یہ ہیں کہ وہ اپنے شرمسار غلام کی طرف رحمت کے ساتھ متوجہ ہوگیا پھر سے نظرِ عنایت اس کی طرف مائل ہوگئی[1]

تاب علیہ۔ لفظ توبہ کے ساتھ عربی میں اگر عَلیٰ آتا ہے تو اس کے معنے ہیں رحمت کے ساتھ رجوع کیا، توجہ کی اور توبہ کی توفیق دی یا توبہ کے اسباب فراہم کر دیے۔ یہ اللہ سبحانہٗ کی صفت ہے اسی سے تَوَّاب آتا ہے لیکن اگر اس کے ساتھ اِلیٰ کا حرف آئے تو اس کے معنے ہیں بندہ نے اللہ سبحانہٗ کی طرف توجہ کی اور توبہ کی۔ اور اگر اس کے ساتھ عَلیٰ ہو تو توبہ قبول کرنے کے معنے میں آتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول فرمائی۔ اور اس کی وجہ یہ بتاتی ہے کہ اِنَّہٗ ھُوَ التَّوَّابُ الرَّحِیْمُ کیونکہ اللہ سبحانہٗ ہی توبہ قبول کرنے والا ہے اور رحیم ہے۔ تواب تو یہ ہے کہ خطاؤں سے درگزر کرنے والا ہے لیکن صرف خطاؤں ہی سے درگزر نہیں کرتا بلکہ وہ اپنی طرف سے اور بھی مہربانی کرنے والا ہے۔

۹۶ ۔ آیت میں رحیم اور تواب دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔ ان کے ذریعے ہم دیکھ سکتے ہیں کہ قرآن نے نوعِ انسانی کے سامنے اللہ سبحانہٗ کو کس طرح پیش کیا ہے۔ ان دو صفتوں میں تفکر سے ہم اللہ سبحانہٗ کے اس کے بندوں کے ساتھ تعلقات کی نوعیت معلوم کر سکتے ہیں۔ بندوں سے اللہ تعالیٰ کا تعلق صرف غضبناک اور سخت گیر مالک کا نہیں ہے بلکہ اس کا اپنے بندوں سے رشتہ محبت اور رحمت کا رشتہ ہے۔ فلاسفہ کو صرف عادل مالک و آقا چاہتا ہے لیکن گنہگاروں کو وہ عادل چاہتا ہے جس کے غصے پر اس کی رحمت غالب ہو۔ یہی وجہ ہے کہ معصوم موجود تھے لیکن ان کی جگہ خالی تھی جو گناہ کر کے ندامت محسوس کریں۔ رحمت چاہتی تھی کہ ان کو بخشے جن پر فردِ جرم لگ چکی ہے۔ یہ رحمت ہی ہے جس نے بندوں کے لیے توبہ و انابت کا دروازہ کھول

---

[1] تفہیم القرآن ص ۶۸

دیا ہے۔ کوئی بدعملی، کوئی گناہ، کوئی جرم، کوئی فساد ہو اور نوعیت میں کتنا ہی سخت اور مقدار میں کتنا ہی عظیم ہو۔ لیکن جونہی توبہ وانابت کا احساس انسان میں پیدا ہوتا ہے رحمتِ الٰہی قبولیت کا دروازہ کھول دیتی ہے اور اشکِ ندامت کا ایک قطرہ بدعملیوں، گناہوں کے ان گنت داغ اس طرح دھو دیتا ہے گویا اس کے دامنِ عمل پر کوئی داغ لگا ہی نہ تھا۔

یہاں حافظ ابن القیمؒ کا ایک بیان بڑا ہی رقت انگیز ہے وہ اسلامی نظامِ حیات میں اللہ سبحانہٗ کا اپنے بندوں سے تعلق سمجھنے میں بیحد مفید ہے۔ فرماتے ہیں:

اللہ سبحانہٗ اپنے بندوں کو کسی حال میں اپنی رحمت سے مایوس نہیں کرتا اس کا اپنے بندوں سے خطاب ہے اے بندے جب بھی تو میری طرف آئے گا میری طرف سے تیرے لیے رحمت کا دروازہ کھلا ہے۔ نافرمانوں کو اپنی رحمت سے مایوس نہیں کرتا۔ اگر وہ گناہ کرکے توبہ کرتے ہیں تو میں ان کا حبیب ہوں، میں توبہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہوں۔ اگر وہ توبہ نہیں کرتے تو پھر میں ان کے لیے طبیب ہوں۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن میں اللہ سبحانہٗ نے جہاں کہیں گنہگاروں کو مخاطب کیا ہے یا ان کا ذکر کیا ہے تو عام طور پر اپنی طرف نسبت کرکے کہا ہے۔ مثلاً

یَا عِبَادِیَ الَّذِیْنَ اَسْرَفُوْا عَلٰٓی اَنْفُسِھِمْ

یا ءَاَنْتُمْ اَضْلَلْتُمْ عِبَادِیْ؟

اس کی مثال بالکل ایسی ہے جیسے ایک باپ جوشِ محبت سے اپنے بیٹے کو پکارتا ہے تو خصوصیت کے ساتھ اپنے رشتۂ پدری پر زور دیتا ہے اے میرے بیٹے! اے میرے فرزند! امام جعفر صادقؒ نے کیا خوب فرمایا ہے۔ جب ہم اپنی اولاد کو اپنی طرف نسبت دے کر مخاطب کرتے ہیں تو وہ بے خوف و خطر ہماری طرف دوڑنے لگتے ہیں کیونکہ سمجھ جاتے ہیں ہم ان پر غضبناک نہیں ہیں۔ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے بیس سے زیادہ موقعوں پر ہمیں عبادی کہہ کر اپنی طرف نسبت دی ہے اور سخت سے سخت گنہگار انسانوں کو بھی یا عبادی کہہ کر پکارا ہے۔ یہ اس بات کی کھلی نشانی ہے کہ گنہگاروں کو تواب و رحیم کی اتنی تلاش نہیں ہے جتنی تواب و رحیم کو گنہگاروں کی تلاش ہے

قرآن کی یہ آیت اس نظریے کی تردید کرتی ہے کہ گناہ کے نتائج لازمی ہیں اور وہ بہرحال انسان کو بھگتنے ہی پڑیں گے۔ یہ انسان کے اپنے خودساختہ گمراہ کن نظریات میں سے ایک گمراہ کن نظریہ ہے کیونکہ جو شخص ایک مرتبہ گنہگارانہ زندگی میں مبتلا ہو گیا اس کو یہ نظریہ ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیتا ہے

اور اگر اپنی غلطی پر متنبہ ہونے کے بعد وہ سابق کی تلافی اور آئندہ کے لیے اصلاح کرنا چاہے تو یہ اس سے کہتا ہے کہ اب تیرے بچنے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ جو کچھ تو کر چکا ہے اس کے نتائج بہرحال تیری جان کے لیے لاگو ہی رہیں گے۔ قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ بھلائی کی جزا اور بُرائی کی سزا دینا اللہ سبحانہٗ کے اختیار میں ہے تمہیں جس بھلائی پر انعام ملتا ہے وہ تمہاری بھلائی کا طبعی نتیجہ نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ کا فضل ہے چاہے عنایت فرمائے چاہے نہ فرمائے۔ اسی طرح جس بُرائی پر تمہیں سزا ملتی ہے وہ بھی بُرائی کا طبعی نتیجہ نہیں ہے کہ لازماً مرتب ہو کر رہے بلکہ اللہ سبحانہٗ پورا اختیار رکھتا ہے کہ چاہے معاف کر دے چاہے سزا دے۔ البتہ اللہ سبحانہٗ کا فضل اور اس کی رحمت اس کی حکمت کے ساتھ ہم رشتہ ہے۔ وہ چونکہ حکیم ہے اس لیے اپنے اختیارات کو اندھا دھند استعمال نہیں کرتا۔ جب کسی کی بھلائی پر انعام دیتا ہے تو یہ دیکھ کر ایسا کرتا ہے کہ بندے نے سچی نیت کے ساتھ اس کی رضا کے لیے بھلائی کی تھی۔ اور جس بھلائی کو رد کر دیتا ہے اسے اس بنا پر رد کرتا ہے کہ اس کی ظاہری شکل پہلے کام کی سی تھی مگر اندر اپنے رب کی رضا جوئی کا خالص جذبہ نہ تھا۔ اسی طرح وہ سزا اس قصور پر دیتا ہے جو باغیانہ جسارت کے ساتھ کیا جائے اور جس کے پیچھے شرمساری کے بجائے مزید ارتکاب جرم کی خواہش موجود ہو اور اپنی رحمت سے معافی اس قصور پر دیتا ہے جس کے بعد اپنے کیے پر شرمسار اور آئندہ کے لیے اپنی اصلاح پر آمادہ ہو۔ بڑے سے بڑے مجرم کٹے سے کٹے کافر کے لیے بھی خدا کے ہاں مایوسی و ناامیدی کا کوئی موقع نہیں بشرطیکہ وہ اپنی غلطی کا معترف، اپنی نافرمانی پر نادم اور بغاوت کی روش چھوڑ کر اطاعت کی روش اختیار کرنے کے لیے تیار ہو[1]

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ قبول کرنے اور گناہ معاف کرنے کا اختیار سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کو نہیں۔ یہود و نصاریٰ اس قاعدہ سے غفلت کی بنا پر سخت فتنہ میں مبتلا ہو گئے کہ پادریوں اور پیروں کے پاس جاتے اور ان کو کچھ ہدیہ دے کر اپنے گناہ معاف کرا لیتے اور سمجھتے تھے کہ انہوں نے معاف کر دیا تو اللہ سبحانہٗ کے نزدیک بھی معاف ہو گیا۔ آج بھی بہت سے ناواقف مسلمان اس طرح کے غلط اور خام عقیدے رکھتے ہیں جو سراسر غلط ہیں۔ کوئی عالم یا مُرشد کسی کے گناہ کو معاف نہیں کر سکتا زیادہ سے زیادہ دُعا کر سکتا ہے[2]

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۶۸ [2] معارف القرآن م ش ص ۱۴۲

قُلْنَا اهْبِطُوا مِنْهَا جَمِيعًا ۚ فَإِمَّا يَأْتِيَنَّكُم مِّنِّي هُدًى فَمَن تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۳۸﴾

(پھر جب ایسا ہوا کہ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ قبول ہوگئی تو) ہم نے حکم[97] دیا کہ تم سب یہاں سے اُتر جاؤ[98]۔ (اور جس زمینی زندگی سے تم دوچار ہوگے وہاں) ضرور میری جانب سے تمہارے پاس ہدایت[99] آئے گی تو جو شخص اس ہدایت کی پیروی کرے گا اُسے[100] کوئی اندیشہ نہ ہوگا اور نہ وہ کبھی غمگین ہوگا۔

سعادت وشقاوت کا قانون

یہ آیت پہلی آیات کے ساتھ گہرا ربط رکھتی ہے۔ پہلے حاکمانہ انداز میں زمین میں اُترنے کا حکم دیا تھا اب حکیمانہ طرز پر ارشاد ہو رہا ہے تاکہ زمین میں پہنچ کر منصبِ خلافت پر متمکن ہوں اور مقصدِ تخلیق پورا ہو۔

ف ۹۷۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ تو قبول فرمائی مگر فی الفور جنت میں جانے کا حکم نہ فرمایا بلکہ دُنیا میں رہنے کا جو حکم ہوا تھا اسی کو برقرار رکھا کیونکہ مقتضائے حکمت و مصلحت یہی تھا۔ ظاہر ہے کہ زمین کے لیے خلیفہ بنائے گئے تھے نہ کہ جنت کے لیے۔ اور اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ جو ہمارے مطیع و فرمانبردار بن کر رہیں گے ان کو دُنیا میں رہنا مضر نہ ہوگا بلکہ مفید ہوگا۔ ہاں جو نافرمان ہیں ان کے لیے جہنم ہے اور اس تفریق و امتحان کے لیے بھی دُنیا ہی مناسب ہے[1]

ف ۹۸۔ یہ اتر جانے کا حکم بطور سزا اور عتاب نہیں مل رہا ہے اس لیے کہ خطا تو اب معاف ہو چکی ہے بلکہ یہ محض نتیجہ طبعی کا ظہور ہے۔ شجرِ ممنوعہ کا پھل کھا لینے سے جو اثرات مرتب ہو رہے تھے ان کے لحاظ سے اب جنت میں قیام کی گنجائش نہ تھی[2]

اس جگہ پھر اس کو مکرر لانے میں حکمت یہ ہے کہ پہلی آیت میں زمین میں اُترنے کا حکم بطور سزا آیا تھا اور اس آیت میں زمین میں اُترنے کا حکم خلافتِ الٰہیہ کی تکمیل کے لیے ہے۔ اسی لیے اس کے

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۹ [2] تفسیر ماجدی

ساتھ ہدایت بھیجنے کا ذکر بھی ہے جس کا تعلق سرتاسر خلافت کے فرائض سے ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اگرچہ زمین پر اُترنے کا حکم ابتدائی بطور سزا و عتاب تھا مگر بعد میں جب خطا معاف ہو گئی تو خلافت کی مصالح اور حکمتوں کے پیشِ نظر زمین پر پہنچنے کے حکم کو اس کی حیثیت تبدیل کر کے برقرار رکھا گیا۔ اب حضرت آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا زمین کے حاکم اور خلیفہ کی حیثیت سے ہوا۔ یہ وہی حکمت ہے جس کا صراحتہً پہلے بھی اعلان ہو چکا ہے[1]

چونکہ حضرت آدم علیہ السلام کے روئے زمین پر آنے میں اور بھی ہزاروں حکمتیں اور مصلحتیں جیسے اقامتِ حدودِ الٰہیہ و اجراء احکامِ شرعیہ پوشیدہ تھیں ۔۔۔۔ اس لیے معاف فرمانے کے بعد بھی اس حکم ہبوط کو منسوخ نہیں فرمایا البتہ طرز تبدیل کر دیا پہلے اُترنے کا حکم حاکمانہ تھا اور اب حکیمانہ ہے[2]

اس فقرے اهبطوا منها کا اعادہ معنے خیز ہے۔ اُوپر کے فقرے میں یہ بتایا گیا تھا کہ حضرت آدم علیہ السلام نے توبہ کی اور اللہ سبحانہٗ نے توبہ قبول کر لی۔ اس کے معنے یہ ہوتے کہ حضرت آدم علیہ السلام اپنی نافرمانی پر عذاب کے مستحق نہیں رہے گنہگاری کا جو داغ ان کے دامن پر لگ گیا تھا وہ دھو ڈالا گیا نہ یہ داغ ان کے دامن پر رہا نہ ان کی نسل کے دامن پر اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی کہ معاذاللہ خدا کو اپنا اکلوتا بیٹا بھیج کر نوعِ انسانی کا کفارہ ادا کرنے کے لیے سُولی پر چڑھوانا پڑتا۔ برعکس اس کے اللہ سبحانہٗ حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ ہی قبول کرنے پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اس کے بعد انہیں نبوت سے بھی سرفراز فرمایا کہ وہ اپنی نسل کو سیدھا راستہ بتائیں۔ اب جو اُترنے کا حکم پھر دُہرایا گیا تو اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ قبولِ توبہ کا یہ مقتضا نہ تھا کہ آدم علیہ السلام کو جنت ہی میں رہنے دیا جاتے اور زمین پر نہ اُتارا جاتے۔ زمین ان کے لیے دارالعذاب نہیں وہ یہاں سزا کے طور پر نہیں اُتارے گئے بلکہ ان کو زمین میں خلافت ہی کے لیے پیدا کیا تھا۔ جنت ان کے لیے اصلی جائے قیام نہ تھی وہاں سے نکلنے کا حکم ان کے لیے سزا کی حیثیت نہ رکھتا تھا۔ اصل تجویز ان کو زمین ہی پر اتارنے کی تھی۔ البتہ اس سے پہلے ان کو اس امتحان کی غرض سے جنت میں رکھا گیا تھا[3]

۹۹ ۔ میری جانب سے تمہارے پاس ہدایت آئے گی۔ اس ہدایت سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی ابتدا میں جن باتوں کی اولادِ آدم کو بنیادی طور پر تعلیم دی گئی تھی ان میں ایک نبوت کی بعثت

---

[1] معارف القرآن ج ۱ ص ۱۴۲ [2] بیان القرآن ج ص ۲۵ [3] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۶۹

دوسرے رسُولوں کے انسان ہونے کا اعلان تھا۔ اسی اعلان کے مطابق دُنیا میں اللہ سبحانہٗ کے سارے پیغمبر آئے جن کی صحیح تعداد کا اللہ سبحانہٗ ہی کو علم ہے مگر قرآن سے جس قدر اجمالاً معلوم ہو سکا ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے منصبِ نبوّت کے لیے دو انسان منتخب ہوتے تھے۔ پھر افراد و اشخاص کی جگہ خاندانوں کا انتخاب کیا گیا۔ اس کے بعد خاندانوں نے انحراف اور کفرانِ نعمت شروع کیا تو بنی اسماعیل کا انتخاب عمل میں آیا اور اس خاندان میں سے آخری پیغمبر روانہ کر کے سلسلۂ نبوّت ختم کر دیا اور بساطِ عالم لپیٹ دینے کا اعلان کر دیا۔ اس تمام سلسلے میں جو حضرت آدم علیہ السلام سے شروع ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو جاتا ہے۔ کوئی پیغمبر ایسا نہ تھا جو انسان نہ ہو۔ اگر رسُول انسان نہ ہوتا تو نسلِ انسانی پر یہ ایک بدنما داغ ہوتا کہ اشرف المخلوقات کا مصلح و مربّی کسی اور نوع میں پیدا کیا جائے اس لیے خود رسُول اور نوعِ انسانی کا شرف و کمال یہی تھا کہ رسُول انسانوں میں سے ایک انسان ہو۔ اس آیت میں حضرت آدم علیہ السلام کو نبوّت مرحمت فرما کر انسانی کمال کا نقطۂ آخر ظاہر فرما دیا۔

زمینی زندگی میں انسانی ضروریات اور اس کے احوال و ظروف کے مطابق انسانوں میں علمی طلبگاروں کا عموم عقل و ادراک کے فیضان کا نتیجہ ہے۔ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں،

انسان چونکہ عقل کی نعمت سے مالا مال ہے اس لیے اس میں اس کے احوال و ظروف کے مطابق علمی طلب گاریوں کی جھلک ہے۔

لیکن ان علمی طلب گاریوں کی راہ میں سب سے زیادہ کٹھن اور سب سے زیادہ نازک راہ عالمِ غیب سے استفادے کی راہ ہے۔ عام انسانوں میں اس کی صلاحیت نہیں ہے اور اس سے استفادے کے بغیر نوعِ انسانی کا وہ کمال ناتمام رہتا ہے جو حکمتِ الٰہی نے اس کے لیے مقدر کیا ہے اس لیے جیسا کہ حکیم الامتؒ نے بتایا ہے کہ حکمتِ الٰہیہ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ اپنے غیب پر مطلع کرنے کے لیے انسانوں میں سے سب سے زیادہ پاک نفوس منتخب کرے اور ان پر وحی کا فیضان فرمائے۔

گویا انسانوں میں سے کچھ انسانوں کو اللہ سبحانہٗ نے فیضانِ وحی قبول کرنے کی صلاحیت و استعداد پیدا فرمائی اور اُن کو عہدۂ نبوّت سے سرفراز فرمایا۔ چونکہ وحی سب انسانوں کو ملنے والی نہ تھی اس لیے یہاں اولادِ آدم کو خصوصیت سے مخاطب کر کے فرمایا کہ تمہارے پاس میری جانب سے ہدایت آئے گی ــــ لفظ اِمَّا اِن اور مَا سے مل کر بنا ہے۔ مَا کلام میں زور پیدا کرنے کے لیے ہے اور اِن کے معنے اگر ہیں۔ اگر کہہ کر یہ اشارہ فرما دیا کہ نبوّت کا روانہ کرنا ہمارے ذمّہ واجب نہیں ہے۔ یہ محض اللہ سبحانہٗ کا فضل ہے۔ اسی مہربانی اور فضل کو یقینی بنانے کے لیے لفظ مَا اور نون تاکید لائے ہیں اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ

نبوّت کسب و اکتساب کا نتیجہ نہیں ہے ۔

۱۰۰ ۔ جو شخص میری ہدایت کی پیروی کرے گا۔ اس پورے جملہ میں آسمانی ہدایت کی پیروی کرنے والوں کے لیے وہ انعام بتائے گئے جو نبوّت کے ذریعے اللہ سبحانہ کی جانب سے اولادِ آدم کے نام آئے گی۔ ایک یہ کہ ان پر کوئی اندیشہ نہ ہوگا دوسرے یہ کہ وہ غمگین نہ ہوں گے ۔

جو صدمہ اور اندیشہ کسی مصیبت پر اس کے ہونے سے پہلے ہوتا ہے اس کو خوف کہتے ہیں اور اس کے واقع ہو چکنے کے بعد جو غم ہوتا ہے اس کو 'حزن' کہتے ہیں۔ اس آیت میں جو خوف و حزن کی نفی فرمائی اس سے اگر خوف و حزن دنیوی مراد لیا جائے تو معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ ہماری ہدایت پر چلیں گے اس میں اس اندیشے کی گنجائش نہیں کہ شاید یہ ہدایت حقہ نہ ہو۔ شیطان کی طرف سے دھوکہ اور مغالطہ ہو۔ اور نہ وہ اس وجہ سے کہ ان کے باپ سے بالفعل جنت چھوٹ گئی محزون ہوں گے کیونکہ ہدایت والوں کو عنقریب جنت ملنے والی ہے ۔ اگر خوف و حزنِ آخرت مراد ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ قیامت میں اہلِ ہدایت کو خوف نہ ہوگا نہ حزن مگر حزن کا نہ ہونا تو بے شک مسلّم لیکن خوف کی نفی فرمانے پر ضرور یہ خلجان ہوتا ہے کہ اس روز تو حضرات انبیاء علیہم السلام تک کو ہوگا ۔ کوئی بھی خوف سے خالی نہ ہوگا۔ تو بات یہ ہے کہ خوف دو طرح کا ہوتا ہے ۔ کبھی تو خوف کا مرجع ڈرنے والے میں پایا جاتا ہے جیسے مجرم شاہی جو بادشاہ سے ڈرتا ہے تو موجب خوف جرم ہے ۔ اور کبھی مرجع خوف اس میں ہوتا ہے جس سے آدمی ڈرتا ہے مثلاً اگر کوئی شخص کسی بادشاہ صاحب جاہ و جلال کے سامنے یا شیر کے رُوبرو ہو تو ڈرنے کی یہ وجہ نہیں ہوتی کہ ڈرنے والے نے بادشاہ یا شیر کا کوئی جُرم کیا ہے بلکہ ڈر کا اصلی باعث قہر و جلالِ بادشاہی اور شیر کی درندگی اور اس کا غضبناک ہونا ہے ۔ آیت سے پہلی قسم کی نفی ہوئی نہ کہ دوسرے قسم کے خوف کی ۔ یہ شبہ اس وقت درست ہوتا جب تعبیر لاخوف فیھم یا لا یخافون ہوتی [1]

حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی شقاوت کی ساری سرگزشت ان ہی دو لفظوں پر مشتمل ہوتی ہے ۔ خوف اور غم۔ جونہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں۔ زندگی کے جتنے بھی کانٹے ہو سکتے ہیں سب کو ایک ایک کر کے چنو۔ اور دیکھو خواہ جسم میں چبھتے ہوں خواہ دماغ میں، خواہ

۱؎ حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹

موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں خواہ آخرت کی۔ تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے باہر نہیں ہیں۔ یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا۔ قرآن کہتا ہے ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے جس کے قدم اس راہ میں جم گئے اس کے لیے دونوں کانٹے بے اثر ہو جائیں گے۔ اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی [1]

اسلام میں نبوت کا تصور

قرآن نے نبوت کا تصور تمام مذاہب سے بالکل جداگانہ پیش کیا ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق نبی نہ اللہ سبحانہ کا اوتار ہوتا ہے کہ اس میں اللہ سبحانہ حلول کر جائے اور نہ خود اللہ ہوتا ہے کہ صورت انسانی میں جلوہ گر ہو جائے۔

رسول میں الوہیت کی جھلک دیکھنا عیسائیت کی دعوت ہے اور اللہ سبحانہ کے متعلق یہ خیال کہ وہ رسول کی صورت میں بروز کرتا ہے برامہر کا عقیدہ ہے۔ قرآن کا تصور نبوت ان دونوں سے علیحدہ ہے بلکہ قرآن کے نقطہ نظر سے یہ دونوں تصور بے مصداق، ناممکن اور محال ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب اللہ سبحانہ نے عام حیوانات میں ہر نوع کی الگ الگ خصوصیات اور جدا جدا صورتیں بنائی ہیں ان میں سے کسی نوع کی یہ مجال نہیں ہے کہ دوسری نوع کی کسی خصوصیت کو اپنا سکے اور ہزار ترقی کے باوجود ایک نوع دوسری نوع کی صورت کا لبادہ پہن سکے۔ جب مخلوقات میں یہ سرحدیں اتنی مضبوط ہیں تو مخلوق کے متعلق یہ خیال کہ کوئی اپنے دائرے سے ترقی کر کے خالق کی سرحد میں داخل ہو جائے یا خالق کے بارے میں یہ گمان کہ وہ مخلوق میں حلول کر جائے احمقانہ خوش فہمی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے؟ اور اگر تھوڑی دیر کے لیے مسئلہ ارتقاء کو مان بھی لیا جائے پھر بھی مخلوقات کی کسی کڑی کے عالم قدس سے ملنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس لیے نبی کے بارے میں قرآنی تصور بلا کسی ادنیٰ شائبۂ تنقیص یہ ہے کہ وہ ایک عظیم المرتبت اور جلیل القدر انسانی شخصیت ہوتی ہے اور اپنی تمام عظمتوں اور مراتب قرب کے باوجود الوہیت کے تصور سے یکسر خالی ہوتی ہے۔

قرآن کی روشنی میں رسول کی عام انسانوں میں سب سے بڑی برتری یہ ہے کہ وہ اللہ سبحانہ کا

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۱۸۲

رسول ہے اور اس کی مرضی کی غمائندگی کرتا ہے اس لیے رسول کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ ایک انسان ہو۔ کیونکہ انسانی اصلاح کے لیے صرف علم ہی کافی نہیں ہے۔ علم کے ساتھ احساس کی بھی ضرورت ہے۔ اسی لیے قرآن نے جابجا رسولوں کی روانگی کے سلسلے میں رسولوں کے انسان ہونے پر خاص طور پر زور دیا ہے۔ پیشِ نظر آیت میں اگرچہ تصریح نہیں ہے لیکن دوسری آیت میں اولادِ آدم کو مخاطب کر کے یہ بات بنیادی طور پر بتا دی گئی ہے اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ ضرور آئیں گے۔ تمہارے پاس رسول تم میں سے۔ ایک اور موقعہ پر رسول کے انسان ہونے کو بہت بڑا انعام قرار دیا ہے لَقَدْ مَنَّ اللّٰہُ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ اِذْ بَعَثَ فِیْھِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِھِمْ ایمان والوں پر اللہ سبحانہٗ کا احسان ہے کہ اس نے ان میں سے ہی رسول ان میں روانہ کیا۔ الغرض آغازِ آفرینش میں جن باتوں کی اولادِ آدم کو تعلیم دی گئی تھی ان میں سے ایک رسولوں کی روانگی اور دوسرے رسولوں کے انسان ہونے کا عقیدہ تھا۔ اسی عقیدے کے مطابق دُنیا کے تمام رسول آئے ہیں۔

نبوّت کیا ہے؟

صوفیائے کرام اسے وجود کا نقطۂ اوّل، حقیقۃ الحقائق، برزخیۃ الکبریٰ کہتے ہیں۔ اس کی فلسفیانہ حقیقت کی بہترین تشریح امام غزالیؒ نے معارج القدس میں اور حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں کی ہے۔ امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ نبوت انسانیت کے مرتبے سے کچھ بالاتر ہے۔ جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے وہ عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی ہے۔ اور المنقذ میں امام موصوفؒ نے نبوّت کی حقیقت پر جو عقلی بحث کی ہے وہ اس سے زیادہ لطیف ہے۔ ان کی بحث کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے انسان کو مختلف اطوار میں مختلف نعمتوں سے مالا مال کیا ہے۔ سب سے پہلے انسان کو حواس کی نعمت دی حواس کے ذریعے انسان کو دیکھنے، سننے، سونگھنے، چھونے اور چکھنے کی قوتیں ملی ہیں اور ان کے ذریعے ہی انسان کو خارج کا علم ہوتا ہے۔ حواس کے بعد انسان کو قوتِ تمیز عطا کی جاتی ہے انسان اس کے ذریعے محسوسات سے باہر کا پتہ لیتا ہے۔ بعد ازیں انسان کو ایک اور نعمت ارزانی کی جاتی ہے اسے، عقل، کہتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کے اس انعام و فیضان نے انسان کے لیے غیر محدود ترقیات کا دروازہ کھول دیا ہے۔ اس کے ذریعے انسان واجبات، ممکنات اور مستحیلات کا ادراک کرتا ہے اور اسی کی بنیاد پر انسان کو تمام کائناتِ زمینی کا خلاصہ کہا گیا ہے

عقل کے بعد اللہ سبحانہ، کی جانب سے ایک اور نعمت ملتی ہے اس نعمت کا نام ہے نبوت۔ اس کے ذریعے وہ عالمِ غیب کا ادراک کرتاہے اس کے سامنے عقل ایسے ہی بے دست و پا ہوتی ہے جیسے عقل کے سامنے حواس سب بے دست وپا ہوتے ہیں۔ جیسے عقل والے اگر عقلی معلومات کو محسوسات کے متوالوں کے سامنے پیش کریں وہ ان کو مستبعد سمجھ کر انکار کر دیتے ہیں۔ ایسے ہی نبی جب نبوّت کی معلومات عقل والوں کے سامنے پیش کرتا ہے تو عقل والے بھی استبعاد کی وجہ سے اسے نہیں مانتے۔

حضرت مجدد الف ثانیؒ نے بھی اس کے قریب قریب ہی نبوّت کی حقیقت بتائی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ جیسے عقل کا مرتبہ احساس سے بالا ہے ایسے ہی نبوّت کا مقام عقل سے اونچا ہے۔ "ہم چنیں طورِ نبوّت ورائے طورِ عقل است" ہمارے زمانے کے مشہور فلاسفر علّامہ اقبالؒ نے نبوّت کو اپنے مخصوص فلسفیانہ انداز میں اس طرح سمجھایا ہے:

ایک اعتبار سے نبوّت کی تعریف یوں بھی کی جا سکتی ہے کہ یہ شعورِ ولایت کی وہ شکل ہے جس میں وارداتِ اتحاد اپنی حدود سے تجاوز کر جائیں اور ان قوتوں کی پھر سے رہنمائی یا از سرِ نو تشکیل کے وسائل ڈھونڈتی ہیں جو حیاتِ اجتماعیہ کی صورت گری میں گویا انبیاء کی ذات میں زندگی کا نامتناہی مرکز اپنے لامتناہی اعماق میں ڈوب جاتا ہے تو اس لیے کہ پھر ایک تازہ قوت اور زور سے ابھر سکے۔ وہ ماضی کو مٹاتا ہے اور پھر زندگی کی نئی نئی راہیں اس پر منکشف کر دیتا ہے۔

جس چیز کو امام غزالیؒ عقل سے ماوراء، مجدد الف ثانیؒ نورِ نبوّت کہتے ہیں۔ علّامہ اقبالؒ اسی کو شعورِ نبوّت کہتے ہیں۔ عنوانات مختلف ہیں لیکن حقیقت ایک ہے۔ اختلافِ تعبیر سے یہ غلط فہمی نہ ہو کہ نبوّت ان بزرگوں کے نزدیک انسان کے ممکن الحصول ارتقائی کمالات میں سے کوئی کمال ہے۔ ان بزرگوں کا ہرگز یہ مقصد نہیں ہے بلکہ وہ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ نبوّت ایک منصب ہے لیکن اس منصب کے کچھ کمالات ہیں۔ ان کمالات کی عقلی توجیہ یہ ہے ورنہ خود اس کمال کا نام نبوّت نہیں ہے۔ امام غزالیؒ نے تصریح کی ہے۔

ایسی راہ کا وجود ممکن ہے جس کے ذریعے ان امور کا ادراک کیا جا سکے جن کا عقلِ انسانی ادراک نہیں کر سکتی۔ نبوّت سے مراد یہی ہے یہ مطلب نہیں کہ نبوّت اس کا نام ہے۔

بہر حال نبوّت ایک منصب ہے اور نبی اگرچہ عام انسانوں کے ساتھ بشریت اور انسانیت

وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

اور جو لوگ اس ہدایت کے منکر ہوں گے[100] اور ہماری آیات کو جھٹلائیں گے[101] وہ دوزخی ہیں۔ ہمیشہ دوزخ کے عذاب میں رہیں گے۔

میں شریک ہوتے ہیں مگر نبوت میں وہ انسانوں سے بالکل الگ ہوتے ہیں کیونکہ اس میں نبوت کی وجہ سے وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں ہرگز نہیں ہوتی۔

اس آیت میں تصویر کا دوسرا رُخ پیش فرمایا ہے۔ متبعینِ ہدایت اور مصدقین کا مقام بتانے کے بعد یہ بتایا جا رہا ہے کہ منکرین اور مکذبین کا انجام کیا ہوگا؟ دو لفظوں میں حقیقتِ حال کی کیسی کامل تصویر کھینچ دی ہے جس سے کوئی گوشہ بھی باہر نہیں رہا۔ ساتھ ہی آیاتنا میں ضمیر متکلم لا کر اس کے تمام دلائل بھی واضح کر دیے۔ نبوت سے تعلق نہ رکھنے والوں کی دو حالتیں پیش کی ہیں۔

ایک یہ کہ وہ انکار کرتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ وہ تکذیب کرتے ہیں

قرآن کے نزدیک دونوں صورتیں ناپسندیدہ ہیں۔ ان میں ہر بات نہ صرف بیانِ حال ہے بلکہ بجائے خود ایک دلیل بھی ہے اور یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔

[101] ۔ آیات جمع آیت کی۔ آیت کے اصل معنے اس نشانی یا علامت کے ہیں جو کسی چیز کی طرف رہنمائی کرے۔ قرآن میں یہ لفظ چار مختلف معنوں میں آیا ہے۔ کہیں اس سے مراد محض علامت یا نشانی ہے، کہیں آثارِ کائنات کو اللہ سبحانہٗ کی آیات کہا گیا ہے کیونکہ مظاہرِ قدرت میں سے ہر چیز اس حقیقت کی طرف اشارہ کر رہی ہے جو اس ظاہری پردے کے پیچھے پوشیدہ ہے، کہیں ان معجزات کو آیات کہا گیا ہے جو انبیاء علیہم السلام لے کر آئے تھے کیونکہ یہ معجزے دراصل اس بات کی علامت ہوتے تھے کہ یہ لوگ فرمانروائے کائنات کے نمائندے ہیں، کہیں کتاب اللہ کے فقروں کو آیت کہا گیا ہے کیونکہ وہ صرف حق وصداقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں بلکہ فی الحقیقت اللہ سبحانہٗ

کی طرف سے جو کتاب بھی آتی ہے اس کے صرف مضامین کی ہی نہیں اس کے الفاظ اور انداز بیان اور طرز عبارت بھی بلکہ اس کے جلیل القدر مصنف کی شخصیت کے آثار نمایاں طور پر محسوس ہوتے ہیں۔ ہر جگہ عبارت کے سیاق و سباق سے بآسانی معلوم ہو جاتا ہے کہ کہاں آیت کا لفظ کس معنے میں آیا ہے [1]

آیت کے معنے نشانی اور علامات کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم و احساس کے جو ذرائع عطا کیے ہیں وہ حقیقت میں صرف آیات و علامات کی شناخت اور یاد ہے۔ دُنیا میں جس قدر چیزیں ہیں تم ان کو کس طرح جانتے ہو۔ صرف علامات و آیات سے۔ کلیات سے لے کر جزئیات تک جو کچھ ہمیں خارج سے علم حاصل ہوا ہے اس کا ذریعہ محض علامات و آیات ہیں۔ ہم جانتے ہیں کہ یہ گھوڑا ہے۔ لیکن ہم کیونکر جانتے ہیں اس طرح کہ ان چیزوں کی جو مخصوص نشانیاں ہیں وہ الگ ہمارے ذہن میں محفوظ ہیں۔ انہی کی مدد سے ہم کہتے ہیں کہ یہ فلاں چیز ہے۔

ہمارا تمام ترفنِ استدلال دراصل علامات و آیات ہی پر موقوف ہے۔ اگر چیزوں سے علامات و آیات محو کر دی جائیں تو نہ کسی چیز کو پہچان سکیں اور نہ کسی دعوے پر کوئی دلیل قائم کر سکیں۔

۱۰۲ ۔ یہ نسلِ انسانی کے حق میں ابتدائے آفرینش سے لے کر قیامت تک کے لیے اللہ سبحانہٗ کا مستقل فرمان ہے اور اسی کو تیسرے رکوع میں اللہ سبحانہٗ کے عہد سے تعبیر کیا گیا ہے۔ انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں ہے بلکہ بندہ اور خلیفہ ہونے کی دوگونہ حیثیتوں کے لحاظ سے وہ اس پر مامور ہے کہ اس راستے کی پیروی کرے جو اس کا رب اس کے لیے تجویز کرے اور اس راستے کے معلوم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو کسی شخص کے پاس براہِ راست اللہ سبحانہٗ کی وحی آئے یا پھر وہ اس انسان کا اتباع کرے جس کے پاس وحی آئی ہو۔ ان کے علاوہ کوئی صورت یہ معلوم ہونے کی نہیں کہ اللہ سبحانہٗ کی رضا کس راہ میں ہے ان کے ماسوا ہر صورت غلط ہے بلکہ غلط ہی نہیں سراسر بغاوت بھی ہے جس کی سزا جہنم کے سوا کچھ نہیں ہے [2]

قرآن مجید میں تمام نبیوں میں سے سب سے پہلا تذکرہ حضرت آدم علیہ السلام کا ہے اور حسب ذیل سورتوں میں بیان کیا گیا ہے۔

سورۃ بقرہ، اعراف، اسراء، کہف اور طٰہٰ میں نام اور صفات دونوں کے ساتھ اور سورۃ حجر اور صٓ میں فقط ذکرِ صفات کے ساتھ۔ اور آلِ عمران، مائدہ، مریم اور یٰس میں صرف شخصی طور پر نام آیا ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۶۹ [2] تفہیم القرآن ص ۶۹

يٰبَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ اذْكُرُوا نِعْمَتِيَ الَّتِيٓ أَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَأَوْفُوا بِعَهْدِيٓ أُوفِ بِعَهْدِكُمْ وَإِيَّايَ فَارْهَبُونِ ۞

اے بنی اسرائیل! تم میرے وہ احسان یاد کرو جن سے میں نے تمہیں نوازا ہے۔ اور تم میرا وہ عہد پورا کرو جو تم نے مجھ سے کیا ہوا ہے میں تمہارا وہ عہد پورا کروں گا جو میں نے تم سے کیا ہوا ہے اور دیکھو سب سے ہٹ کر بس میرے ہی سے ڈرو۔

یہ واقعہ قرآن کی مذکورہ بالا سورتوں میں اگرچہ اسلوب بیان، طرز ادا اور لطیف تعبیر کے لحاظ سے مختلف نظر آتا ہے لیکن مقصد اور واقعہ کے اعتبار سے ایک ہی حقیقت ہے جو مختلف تعبیرات میں موعظت و عبرت کے پیش نظر حسب موقعہ بیان کی گئی ہے۔

قرآن عزیز ان تاریخی واقعات کو اس لیے بیان نہیں کرتا کہ وہ واقعات ہیں بلکہ قرآن کا مقصد یہ ہے کہ ان واقعات سے پیدا شدہ نتائج کو انسانی رشد و ہدایت کے لیے موعظت بنائے۔ اور انسانی عقل سے اپیل کرے کہ وہ نوامیس و قوانین فطرت کے سانچے میں ڈھلے ہوئے ان تاریخی نتائج سے سبق حاصل کریں اور ایمان لائیں کہ یگانہ اللہ سبحانہٗ کی ہستی کے علاوہ عبادت و نیازمندی کی مستحق کوئی نہیں ہے۔ اس کی اطاعت اور اس کی ہدایات کی پیروی میں فلاح و نجات اور ہر قسم کی ترقی کا راز مضمر ہے۔

بنی اسرائیل سے خطاب

قرآن نے سب سے پہلے یہ بتایا تھا کہ قرآن کے کلام الٰہی اور اس کے جملہ مضامین کے واقعی ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس کے بعد بتایا کہ قرآن کی دعوت کے سامنے قبولیت حق کی استعداد کے لحاظ سے تین قسم کے مخاطب ہیں:

۱۔ طالب حق اور خدا پرست لوگ جنہوں نے صدائے حق سنتے ہی اسے پہچان لیا اور قبول کر لیا ان میں کچھ عرب کے موحدین، کچھ یہودی اور کچھ عیسائی تھے۔

۲۔ عام مشرکین عرب جن کے پاس ایمان و عمل کی کوئی تعلیم نہ تھی۔ محض رسوم و اوہام کے پجاری اور آباؤ اجداد کی تقلید کی مخلوق تھے۔ ان میں اکثر کی طبیعتیں گمراہی اور فساد کی پختگی سے اس درجہ مسخ ہو گئی تھیں کہ کتنی ہی اچھی بات کہی جائے ماننے والے نہ تھے۔

۳۔ عام اہلِ کتاب یعنی الہامی تعلیمات کے پیرو، ان میں سربرآوردہ گروہ یہودیوں اور عیسائیوں کا تھا۔ یہ دونوں جماعتیں ایمان کی مدعی تھیں لیکن ایمان کی حقیقت گم ہو چکی تھی اور اعتقاد و عمل کی تمام سچائیوں سے محروم ہو گئے تھے۔

قرآن نے متقین کے نام سے پہلے گروہ کا ذکر کیا۔ الذین کفروا کے عنوان سے دوسرے کا اور من الناس کی سرخی سے تیسرے گروہ کا تعارف کرایا۔

تیسرا گروہ چونکہ مدعی ایمان تھا اس لیے اس کی نفسیات، اعتقادی اور اخلاقی کمزوریوں کی نشاندہی کی اور اس کی حقیقت کی توضیح کے لیے دو مثالیں دی ہیں۔

اس کے بعد پوری انسانیت کو توحیدِ عبادت کی دعوت دی ہے اور اس پر خالقیت و ربوبیت سے استدلال کیا ہے اور توحیدِ عبادت کے ساتھ ہی ساری نسلِ انسانی کو رسالت کا پیغام بھی یہ کہہ کر دے دیا کہ ہمارے پیغمبر جو پیغام پیش کر رہے ہیں اگر تمہارے خیال میں یہ کلامِ الٰہی نہیں ہے تو پھر تم بھی اس جیسی ایک صورت بنا کر لاؤ۔ اس طرح کلمہ کے دونوں حصوں ایک توحید دوسرے رسالت کی دعوت پیش کر دی۔ تیسرا رکوع ختم ہوا تو چوتھے رکوع میں تاریخ نسلِ انسانی بیان ہوئی۔ اس میں بتایا گیا کہ انسان کی اصلی غرضِ آفرینش دنیا میں اللہ سبحانہٗ کے قانون کی تنفیذ ہے اور خلافت۔

اب اس پانچویں رکوع میں بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا ہے۔ یہ لوگ اہلِ کتاب تھے۔ نبوتِ انبیاء کے ماننے والے اور ایمان باللہ والیوم الآخر کے مدعی تھے۔ اور بتایا جا رہا ہے کہ جو قوم اللہ سبحانہٗ کی رضا کی ہوئی کتاب سے منہ موڑ لیتی ہے خواہ وہ نسب کے اعتبار سے کتنی ہی اونچی ہو اس کا انجام کیا ہوتا ہے۔ اس داستان سے اہلِ ایمان کو یہ سبق دینا مقصود ہے کہ نرا زبانی دعویٰ اور صرف نسلی انتساب کی اللہ سبحانہٗ کے یہاں کوئی قیمت نہیں ہے۔ چنانچہ اس مقصد کی خاطر یہودیوں کی اخلاقی کمزوریاں، مذہبی غلط فہمیوں اور اعتقادی و عملی گمراہیوں میں سے ایک ایک کی نشاندہی کر کے اس کے بالمقابل دینِ حق کے مقتضیات بیان کیے گئے ہیں تاکہ اہلِ ایمان اپنا راستہ صاف دیکھ سکیں اور غلط راہوں سے بچ سکیں۔

ف ۱۰۳۔ اوّل یاایھا الناس اعبدوا ربکم خطاب عام تھا اور ان نعمتوں کا ذکر فرمایا تھا جو تمام بنی آدم پر عام تھیں۔ مثلاً زمین و آسمان و جملہ اشیاء کا پیدا کرنا۔ پھر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا کر کے ان کو خلیفہ بنانا اور بہشت میں داخل کرنا وغیرہ۔ اب ان میں سے خاص بنی اسرائیل کو خطاب کیا گیا اور خاص نعمتیں جو وقتاً فوقتاً پشت در پشت ان پر ہوتی چلی آئیں اور انہوں نے جو کفرانِ نعمت

گیا ان سب باتوں کا مفصل ذکر کیا جاتا ہے۔ کیونکہ بنی اسرائیل تمام فرقوں سے بنی آدم میں ممتاز اور اہل علم و کتاب و نبوت اور انبیاء کو پہچاننے والے سمجھے جاتے تھے کیونکہ حضرت یعقوب علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک چار ہزار نبی ان میں آ چکے تھے۔ تمام عرب کی نظریں ان کی طرف تھیں کہ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق کرتے ہیں یا نہیں۔ اس لیے ان انعامات اور خرابیوں کا بسط کے ساتھ ذکر فرمایا کہ شرما کر ایمان لائیں۔ ورنہ دوسرے لوگ ان کی حرکات سے واقف ہو کر ان کی بات کا اعتبار نہ کریں[1]

بنی اسرائیل مشہور نامور پیغمبر حضرت ابراہیم علیہ السلام (۲۱۶۰ تا ۱۹۸۵ قبل مسیح) سے مشہور و نامور دو نسلیں چلیں۔ ایک بی بی ہاجرہ مصری کے بطن کے فرزند حضرت اسماعیل علیہ السلام سے۔ یہ نسل بنی اسماعیل کہلائی اور آگے چل کر قریش کی ایک شاخ پیدا ہوئی، ان کا وطن عرب رہا۔ دوسری بی بی سارہ عراقی کے بطن کے فرزند حضرت اسحاق علیہ السلام کے فرزند حضرت یعقوب علیہ السلام عرف اسرائیل سے۔ یہ نسل بنی اسرائیل کہلائی۔ اس کا وطن شام رہا۔ قدیم جغرافیہ میں فلسطین کوئی الگ ملک نہ تھا شام ہی کا جزو تھا۔ ایک تیسری نسل قطورا سے چلی اور بنی قطورا کہلائی لیکن اسے تاریخ میں اس درجہ اہمیت حاصل نہیں۔

بنی اسرائیل کا صدیوں تک عروج رہا۔ توحید کی علمبردار دنیا میں یہی قوم رہی، انبیاء ان میں آتے رہے۔ بڑے بڑے عابد و زاہدان میں پیدا ہوتے۔ حکمران، سلاطین اور فوجی جنرل ان میں بڑے بڑے ہوئے۔ نزول قرآن کے وقت ان کا اقتدار مدت ہوئی رخصت ہو چکا تھا۔ اپنے وطن سے نکل کر عراق، مصر وغیرہ اطراف و جوانب میں پھیل گئے تھے اور ان کے کچھ قبیلے اطراف حجاز اور حجاز خصوصاً مدینہ طیبہ میں آباد ہو چکے تھے۔ بنی اسرائیل تو ایک قومی اور نسلی اصطلاح ہے۔ مذہبی حیثیت سے یہ لوگ یہود تھے۔ سلسلۂ وحی و نبوت اور عقیدۂ جزا و سزا کے قائل تھے۔ علوم انبیاء اور معارف اولیاء کے حامل تھے۔ مالدار تھے، ساہوکار تھے، ساتھ ہی سفلی عملیات، سحر و کہانت نیز تجارت کے بھی بڑے ماہر تھے۔ حجاز کی آبادی میں اس دینی و دنیوی تفوق کی بنا پر اہمیت انہیں اس وقت اچھی خاصی حاصل تھی۔ ملک کی عام آبادی مشرکوں اور بت پرستوں کی تھی۔ وہ لوگ ایک طرف تو یہود کے علم و فضل کے قائل اور ان کی دینی واقفیت سے مرعوب تھے[2]

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۹ [2] تفسیر ماجدی ص ۱۹

ف ۱۰۴۔ اس نعمت کا اللہ سبحانہ نے دوسری جگہ اس طرح ذکر فرمایا ہے۔ اِذْ جَعَلَ فِیْکُمْ اَنْبِیَآءَ وَ جَعَلَکُمْ مُّلُوْکًا۔ یعنی اعلیٰ سے اعلیٰ روحانی نعمتوں سے اور اچھی سے اچھی مادی نعمتوں سے مالامال فرمایا۔ اس انعام بے پایاں کا تقاضا یہ ہونا چاہیے تھا کہ اُس نبوت کو اپنائیں جو اللہ سبحانہٗ نے ان کی ہدایت کے لیے روانہ فرمائی۔ لیکن اس نعمت ہی کو انہوں نے نبوت سے روگردانی اور نبوت کی ایذارسانی کے لیے دلیل بنالیا اور اس کی وجہ ان کی یہ غلط فہمی یا بدفہمی ہے کہ وہ اپنی جگہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اللہ سبحانہٗ کے انعامات اور اس کی مہربانی کے بس وہی مستحق ہیں۔ اور ان کی نسل سے باہر اللہ سبحانہٗ کوئی نبی نہیں بھیجے گا۔

علامہ قرطبیؒ نے یہاں یہ لطیفہ خوب لکھا ہے کہ اللہ پاک نے بنی اسرائیل سے نعمتوں کے یاد کرنے کا مطالبہ کیا ہے اور اہلِ ایمان یعنی مسلمانوں سے اپنے کو یاد کرنے کا۔ اذکروني اذکرکم۔ فرق ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کی نظر نعمت پر ہے اور اہلِ ایمان کی نظر نعمت سے گزر کر منعم پر ہے۔

انعامات کی تفصیل یہاں بھی قرآن میں آگے آرہی ہے۔ ہزاروں انبیاء ان میں روانہ کیے گئے تورات وغیرہ کتابیں نازل فرمائیں۔ فرعون سے نجات دے کر ملک شام میں تسلط دیا۔ من وسلوٰی نازل ہوا۔ ایک پتھر سے بارہ چشمے جاری کیے جو نعمتیں اور خوارقِ عادات کسی فرقہ کو نصیب نہیں ہوئیں۔[1]

ف ۱۰۵۔ تم میرا عہد پورا کرو یعنی تمہارا وہ عہد جو میرے ساتھ ہے۔ طاعتِ الٰہی اور طاعتِ انبیاء کا۔ (کشاف) تورات میں اس عہد کا ذکر جا بجا ہے اور تمہارے عہد کا مطلب یہ ہے کہ جو عہد اللہ سبحانہٗ نے تم سے تمہارے ایمان وطاعت پر بطورِ انعام کر رکھا ہے۔

تورات میں یہ اقرار کیا تھا کہ تم تورات کے حکم پر قائم رہو گے اور جس پیغمبر کو بھیجوں گا اس پر ایمان لاکر اس کے رفیق رہو گے تو ملک شام تمہارے قبضہ میں رہے گا۔ بنی اسرائیل نے اس کو قبول کرلیا تھا مگر پھر اپنے اقرار پر قائم نہ رہے۔ بدنیتی کی رشوت لے کر مسئلے غلط بتائے حق کو چھپایا۔ اپنی ریاست جمائی، پیغمبر کی طاعت نہ کی بلکہ بعض پیغمبروں کو قتل کیا۔ تورات میں جہاں حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت تھی اس کو بدل ڈالا۔[2]

اللہ سبحانہٗ نے بنی اسرائیل سے دو عہد لیے تھے ایک عام اور دوسرا خاص۔ عام عہد تو یہی تھا کہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت کریں گے، شرک نہ کریں گے، اس کے رسولوں پر ایمان لائیں گے۔ اور عہدِ خاص یہ تھا کہ اللہ سبحانہٗ نے بنی اسرائیل سے کہا تھا کہ میں ان کے لیے اُن کے بھائیوں میں

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹

وَاٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُوْنُوْٓا اَوَّلَ كَافِرٍۭ بِهٖ ۠ وَلَا تَشْتَرُوْا بِاٰيٰتِىْ ثَمَنًا قَلِيْلًا ۡ وَّاِيَّاىَ فَاتَّقُوْنِ ۝

اور ایمان لے آؤ اس کتاب[۱۰۸] پر جو میں نے نازل کی۔ یہ تصدیق[۱۰۸] کرتی ہے اس کتاب کی جو تمہارے پاس ہے۔ اور دیکھو اس کتاب الٰہی کے پہلے منکر[۱۰۹] تم ہی نہ بنو۔ اور تھوڑی قیمت پر میری آیات[۱۱۰] کا سودا نہ کرو۔ میرے سوا کوئی نہیں بس میری ہی نافرمانی[۱۱۱] سے بچو۔

تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا اس کے منہ میں کلام ڈالوں گا اور جو کچھ میں اس سے کہوں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سُنے گا تو میں اس کا حساب اس سے لوں گا۔ (استثنا ۱۸۔۱۹)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کی آخری وصیت جس پر ان کی تورات اور ان کے صحیفۂ حیات دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے بنی اسرائیل کو یہ فرمائی۔

یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مردِ خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔ ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت کرتا ہے۔ اس کے سارے ساتھی تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری باتوں ..... کو مانیں گے (استثنا ۳۳۔۱۔۲۔۳)[۱]

[۱۰۶] بس میرے ہی سے ڈرو یعنی دنیوی منافع کے فوت ہونے کا اندیشہ نہ کرو[۲]

اس میں اشارہ شرکِ جلی سے زیادہ شرکِ خفی کی طرف ہے۔ بنی اسرائیل جو ضعفِ ایمان کا شکار تھے اخلاقی بیماری سارے اسرائیلیوں کی قوم میں پھیل چکی تھی اور اللہ سبحانہٗ کی رضا و عدمِ رضا کی جگہ

---

[۱] سیرت النبی ج ۳ ص ۲۱۴ [۲] حاشیہ شیخ الہندؒ

انسانوں کو راضی رکھنے کی پروا اور ان کی ناخوشی سے بچنے کی اہمیت اچھے اچھے علماء و مشائخ کے دل میں گھر کر چکی تھی[1]

دعوتِ ایمان

ان آیات میں خاص طور پر یہودیوں کو دعوت دی گئی ہے۔ مدینہ کی زندگی میں انہوں نے اسلامی دعوت کا پوری قوت سے مقابلہ کیا اور درون خانہ اس کے ختم کرنے کے درپے تھے۔ ان کو یقین ہو گیا تھا کہ اب اقتدار مکمل طور پر اسلام کے ہاتھوں میں منتقل ہو رہا ہے۔ قرآن کی بنیاد پر نئی زندگی کی تشکیل سے ان کو یہ تلخ احساس ہوا کہ قرآنی دعوت ان کو ادب و ثقافت، معیشت و معاشرت غرض زندگی کے ہر شعبے سے باہر نکال دے گی۔

توقع یہ تھی کہ یہود مدینہ اس نئے رسُول اور اس نئی دعوت کو سب سے پہلے قبول کریں گے کیونکہ ان کو ایک نبی کی آمد کا انتظار تھا جس کے اوصاف سے وہ باخبر تھے اور ان کی کتابوں میں اس کا تذکرہ موجود تھا۔ لیکن انہوں نے اس توقع پر پانی پھیر دیا اس لیے قرآن نے خاص طور پر ان کو ایمان کی دعوت دی ہے۔

۱۰۷ - کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے۔ قرآن پر ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے جو اس میں مذکور ہیں۔ یہ گویا پوری اسلامی شریعت کو قبول کا مختصر ترین طریقہ تعبیر ہے۔ اور اس لیے ایمانیات کی بہت سی باتیں جن کی تفصیل ہر موقعہ پر ضروری نہیں۔ اس ایک فقرے کے تحت میں آجاتی ہیں۔ قرآن پر ایمان لانے کے معنی یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام مذکور ہیں۔ ان سب کو بے کم و کاست تسلیم کر لیا جائے۔ اگر کوئی ان کو تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تعمیل و پیروی کا اس سے کیونکر مطالبہ کیا جا سکتا۔ اس بنا پر اسے ما انزلت سے تعبیر کیا گیا ہے اور جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے الفاظ میں ماجئت بہ فرمایا ہے یعنی جو کچھ میں لے کر آیا ہوں اس پر ایمان لاؤ۔

۱۰۸ - یہ تصدیق کرتی ہے۔ یعنی قرآن حکیم تورات کا مصدق ہے۔ تصدیق کے معنے ہیں

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۹

کسی کو سچا قرار دینا - یعنی قرآن حکیم ہی ایسی کتاب ہے جو پچھلی تمام صداقتوں کی تصدیق کرنے والا ہے اور اس کے نتیجے میں ان صداقتوں کے علمبرداروں کو سچا قرار دیتا ہے اور ان پر ایمان لانا ضروری بتاتا ہے - قرآن کا یہ وصف اس بات کی دلیل ہے کہ وہ انسانی بناوٹ نہیں ہے بلکہ خدائی کام ہے

مصدق لما معکم کے ایک اور معنے بھی بتلائے گئے ہیں یعنی تورات میں بتا دیا گیا تھا کہ اگر آنے والا پیغمبر تورات کی تصدیق کرے تو اس کو سچا مان لینا - اور اگر نہ کرے تو جھوٹا ہے - قرآن کہتا ہے کہ میں تورات کا مصدق ہوں اس لیے مجھے ماننے میں تمہیں کوئی تامل نہ ہونا چاہیئے - یہ بات یاد رہے کہ احکامِ قرآنی دربارہ اعتقادات، اخبارِ انبیاء و احوالِ آخرت و اوامر و نواہی تورات وغیرہ کتبِ سابقہ کے موافق ہیں - ہاں بعض اوامر و نواہی میں نسخ بھی کیا گیا ہے مگر وہ تصدیق کے مخالف نہیں - تصدیق کے مخالف تکذیب ہے اور تکذیب کسی کتابِ الٰہی کی بالکل کفر ہے - منسوخ تو بعض آیاتِ قرآنی بھی ہیں لیکن اسے تکذیب نہیں کہتے [1]

مصدقا لما معکم کا مطلب یہ بھی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی پیش گوئیاں ان کی کتاب میں تھیں - آپ کی تشریف آوری سے اس کی تصدیق ہوئی اور قرآن ان کی تصدیق کر رہا ہے اگر قرآن نہ آتا تو ان کے غلط ہونے کا اندیشہ تھا - لیکن عام مفسرین پہلی بات کو ترجیح دیتے ہیں کہ قرآن تورات کی تصدیق کرتا ہے مگر عام طور پر اگر تورات سے مراد بائیبل کے پرانے عہدنامے کی پانچ کتابیں لیتے ہیں اس وجہ سے یہ الجھن پیش آتی ہے کہ کیا فی الواقع یہ کتابیں کلامِ الٰہی ہیں اور کیا قرآن واقعی ان کا مصدق ہے ؟ لیکن اصل بات یہ ہے کہ تورات سے مراد وہ احکام ہیں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی نبوت سے لے کر ان کی وفات تک چالیس برس کے دوران ان پر نازل ہوئے - ان میں سے دس احکام تو وہ تھے جو اللہ تعالیٰ نے پتھر کی تختیوں پر کندہ کرکے ان کو دیے تھے - باقی ماندہ احکام کو حضرت موسٰی علیہ السلام نے لکھوا کر اس کی بارہ نقلیں بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کو دیں اور ایک نقل بنی لاوی کے حوالے کر دی تھی - اسی کتاب کا نام تورات تھا - اس کی تاریخی حیثیت پر انشاء اللہ مستقل بحث آئے گی - قرآن اسی کو تورات کہتا ہے اور اس کی وہ تصدیق کرتا ہے -

سلے ۱۰۹ - اور اس کتابِ الٰہی کے پہلے منکر تم نہ بنو - یعنی قرآن کی دیدہ و دانستہ تکذیب کرنے والوں میں پہل مت کرو کہ قیامت تک کے منکرین کا وبال تمہاری گردن پر ہو - مشرکین مکہ کا انکار

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹

دیدہ و دانستہ نہیں بلکہ بے خبری اور نادانی کا نتیجہ ہے اس لیے انکار میں تمہارا اوّل نمبر نہ ہونا چاہیے۔ یہ کفر پہلے کفر سے بھی سخت ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ تمہاری دیکھا دیکھی جو لوگ انکار کریں گے ان سب میں اوّل تم ہو گے تو قیامت کے دن سب کے انکار کا وبال تمہارے نامۂ اعمال میں ہوتا رہے گا [2]

ان کو پہلا منکر اس لحاظ سے کہا گیا ہے کہ مشرکینِ عرب یہود کے تسلیم و اقرار کے بعد جس طرح اس باب میں ان کی تقلید کرتے اسی طرح یہود کے انکار و مخالفت کے بعد اسے بھی سند میں پیش کرتے اور خود بھی ان کی راہ چلتے۔ یہود بہرحال اہلِ کتاب تھے۔ آسمانی کتاب کی قدر انہیں کو ہونا چاہیے تھی اور بطورِ مقتدائے عرب انہی کی ذمہ داری بڑھی ہوئی تھی [3]

۱۱۰۔ تھوڑی قیمت پر میری آیات کا سودا نہ کرو۔ یعنی نبوّت پر ایمان لانا اور قرآن کو ماننا بہت ہی بڑی نعمت ہے۔ اس عظیم نعمت کے مقابلے میں دُنیا کی حقیر منفعتوں کو نہ لو۔ دُنیا کی تمام نعمتیں، تمام دولتیں، تمام ریاستیں اور ساری منفعتیں اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں —
تھوڑی قیمت سے مراد وہ دنیوی فائدے ہیں جن کی خاطر یہ لوگ اللہ سبحانہٗ کے احکام اور اس کی ہدایات کو رد کر رہے تھے۔ حق فروشی کے معاملے میں خواہ انسان دُنیا بھر کی دولت لے لے بہرحال وہ تھوڑی ہی قیمت ہے [4]

اللہ سبحانہٗ کے احکام چھوڑ کر ان کو بدل کر اور چھپا کر لوگوں سے حقیر و ذلیل دُنیا نہ وصول کرو جیسا کہ یہود کی عادت تھی [5]

یا یہ کہ دُنیا کی مادی مصلحت کی بنا پر آخرت کی ابدی دولت کو نہ چھوڑو یعنی آخرت کی زندگی بہت ہی عظیم ہے اور اس کے مقابلے میں دُنیا بہت ہی حقیر ہے۔ تم اعلیٰ کا ادنیٰ سے تبادلہ نہ کرو۔ گویا استعارے کی زبان میں ان کو سمجھایا گیا ہے کہ دنی اغراض کی خاطر اور کمترین منافع کی وجہ سے ان پیش گوئیوں کا غلط مطلب نہ بتاؤ جو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں تمہاری کتاب میں موجود ہیں۔

اللہ سبحانہٗ کی آیات کے بدلے ثمنا قلیلا لینے کا مطلب صرف یہی نہیں ہے کہ یہودی علماء

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۹ [2] بیان القرآن ص ۲۶ [3] تفسیر ماجدی ص ۱۹ [4] تفہیم القرآن
[5] بیان القرآن ص ۲۶

وَ لَا تَلْبِسُوا الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَ تَكْتُمُوا الْحَقَّ وَ اَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۲﴾

اور حق میں باطل کی آمیزش نہ کرو اور حق کو نہ چھپاؤ حالانکہ تم جانتے ہو کہ یہ میری بات ہے۔[۱۱۲]

لوگوں کی مرضی اور ان کی اغراض کی خاطر اللہ تعالیٰ کی آیات کا مطلب غلط بتلا کر لوگوں سے پیسے لیتے تھے۔ بلکہ اس تعبیر سے یہ بتانا مقصود ہے کہ انہوں نے پورے دین کو ایک قلم دکانداری اور پیشہ بنا لیا تھا اور ان کی دینی زندگی ہر معنے میں دکانداری کی زندگی ہو گئی تھی۔ علماء ہونے کے معنے ہی یہ ہو گئے تھے کہ دین اور خدا کے نام سے پیشہ کی روٹی کھانے والے، علم دین کا پڑھنا پڑھانا، مسائل دین کی تعلیم، فتویٰ نویسی، ہدایت و وعظ، قرأت و ذکر کوئی کام ایسا نہ تھا جو بغیر معاوضہ کے انجام دیتے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ سورۃ توبہ میں آئے گی —— قرآن نے یہاں ان کی اس گمراہی کی طرف اس لیے اشارہ کیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ یہودیوں کا ایمان سے محروم ہو جانا دراصل ان کے علماء کی اس گمراہی اور دنیا پرستی کا نتیجہ تھا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے الفوز الکبیر، میں بڑے درد اور دلسوزی کے ساتھ یہ بات لکھی ہے کہ اگر علمائے یہود کی حالت دیکھنی چاہتے ہو تو آج کل کے علماء کو دیکھ لو۔

[۱۱۱] ۔ اور میری نافرمانی سے بچو۔ پہلی آیت کا خاتمہ رہبت پر اور اس کا خاتمہ تقویٰ پر کیا ہے۔ رہبت مطلق ڈر کو کہتے ہیں اور اتقاء محتاط ہونے کو۔ پہلی آیت میں ایفائے عہد کا ذکر تھا اس لیے لفظ رہبت یہ بتانے کے لیے لائے کہ لوگوں کی رائے عامہ کے اندیشے سے بالا اور مالی منفعتوں کے خطرے میں پڑنے کے خیال سے بے خوف ہو کر صرف اللہ سبحانہٗ سے ڈر کر ایفائے عہد کرو اور یہاں لفظ اتقاء لا کر بتایا ہے کہ بالادست زیردست کا اور زیردست بالادست کے غضب سے بے فکر ہو کر دل سے اللہ سبحانہٗ کی نافرمانی سے بچنے کا عہد کرو ۔ لوگوں کے قلوب و جوارح پر اللہ سبحانہٗ کا قبضہ ہے۔ دلوں کی تسخیر کرنا اسی کا کام ہے اس لیے ہر قدم پر اللہ سبحانہٗ کی نافرمانی سے بچنا چاہیے اور اس کتاب الٰہی پر ایمان لانا چاہیے ۔

علامہ آلوسیؒ نے یہاں یہ نکتہ خوب بیان فرمایا کہ پہلی آیت میں بنی اسرائیل کے عوام سے

خطاب تھا اس لیے رہبت آیا ہے اور یہاں ان کے علما سے خطاب ہے اس لیے اتقا استعمال ہوا ہے۔

حق میں باطل کی آمیزش

ادھوری بات کہنا کہ مطلب کچھ کا کچھ ہو جائے، جھوٹ کو نفطی اور ظاہری سچائی کا رنگ دے دینا بالکل گھڑے ہوئے جھوٹ سے کہیں بڑھ کر دھوکے اور مغالطے کا سبب بن جاتا ہے۔ اسی سے ملتی جلتی چیز کا نام آج کی اصطلاح میں پروپیگنڈا ہے۔ موجودہ مغربی سیاست کاروں کے یہود اس فن میں امام رہ چکے ہیں۔

خود غرض لوگ احکامِ شرعیہ کو دو طرح تبدیل کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ اصل بات ہی کو ظاہر نہیں کرتے اسے کتمان کہتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ ظاہر تو کرتے ہیں مگر اس میں خلط ملط کر دیتے ہیں۔ اسے لبس کہتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے دونوں سے منع کر دیا ہے [1]

لبس کے اصلی معنے چھپانے کے ہیں لیکن اگر یہ باب سَمِعَ سے ہے تو اس کے معنے پہننا ہیں۔ اور اگر ضَرَبَ سے ہو تو اس کے معنے ملاوٹ کے ہیں۔ اسی سے تلبیس ہے جس کے معنے دھوکہ دینے کے ہیں۔

احکامِ الہٰی کو بدل دینے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ ایک ان میں اندرونی تخلیط و تلبیس ہے دوسرے ان کا اخفاء کتمان۔ یہودیوں نے اپنے دینی نوشتوں میں دونوں طرح کے عمل جاری کر رکھے تھے۔ تورات کے تلف ہو جانے سے اوّل تو یوں ہی کتنے ہی احکام سرے سے غائب ہو گئے۔ پھر جو باقی رہ گئے تھے ان کو حاملانِ تورات نے اپنے اپنے اغراض و مصالح کے ماتحت خدا معلوم کہاں سے کہاں پہنچا دیا تھا [2]

۲۱۱ ۔ اس آیت میں دو باتوں سے روکا ہے۔ ایک یہ کہ حق میں باطل کی ملاوٹ نہ کریں۔ دوسرے یہ کہ جان بوجھ کر حق کو نہ چھپائیں۔

علماءِ یہود عوام کو گمراہ کرنے کے لیے یہ دونوں حربے استعمال کرتے تھے۔ جن لوگوں کو تورات میں بیان شدہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیش گوئیوں کا کچھ علم ہوتا

---

[1] بیان القرآن ص ۲۷ [2] تفسیر ماجدی ص ۱۹

ان کے دلوں میں شبہات پیدا کر کے ان کو یقین دلا دیتے کہ یہ صفات و علامات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر منطبق نہیں ہیں۔ ایسے لوگ اپنی جگہ سے رل جاتے یہ تو لبس الحق بالباطل ہے اور اس سے ان کو منع کیا گیا ہے۔ اور جو لوگ بالکل بے خبر ہوتے ان سے وہ اصل بات ہی کو پوشیدہ رکھتے تاکہ وہ اندھیرے میں رہیں اور راستہ پر آنے کی کوئی صورت نہ ہو سکے یہ کتمانِ حق ہے اور وانتم تعلمون کا مطلب یہ ہے کہ تم خوب جانتے ہو کہ تم لبس و کتمان کے ذریعے لوگوں کو گمراہ کر رہے ہو اور یہ بھی تمہیں معلوم ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے بندوں کو گمراہ کرنا کتنا بڑا جرم ہے [1]

شاہ عبدالقادرؒ نے آیت کا یہی مطلب اس طرح بیان فرمایا ہے کہ مت ملاؤ سچی بات کو جو تورات میں صفت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لکھی ہے اس جھوٹ کے ساتھ جو تم نے خود بنایا ہے اور تم جانتے ہو کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ سبحانہٗ کے برحق رسول ہیں [2]

دراصل جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مدینے میں اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو یہ قدرتی بات تھی کہ ان پڑھ عرب اہلِ کتاب سے پوچھتے کہ آپ بھی نبی کے پیروکار ہیں اور کتاب کو مانتے ہیں آپ ہمیں بتائیں کہ یہ صاحب جو مدعیٔ نبوت ہیں ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟ یہودی علماء اس سوال کا جواب لوگوں کو کبھی صحیح نہ بتاتے۔ ان کے لیے یہ کہنا تو بے حد مشکل تھا کہ توحید کا جو درس محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم دے رہے ہیں غلط ہے یا انبیاء، ملائکہ اور آخرت کے بارے میں آپ کے نظریات صحیح نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ سب وہ خود مانتے تھے۔ انہوں نے طریقہ یہ اختیار کیا کہ ہر پوچھنے والے کے دل میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کوئی نہ کوئی شبہ ڈال دیتے۔ کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے جس سے لوگ شکوک کے شکار ہو جائیں اور طرح طرح کے الجھن میں ڈالنے والے سوالات چھیڑ دیتے تاکہ لوگ ان میں خود ہی الجھیں اور دوسروں کو بھی الجھانے کی کوشش کریں۔ ان کا یہی رویہ تھا جس کی بنا پر ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ حق پر باطل کے پردے نہ ڈالو اپنے جھوٹے پروپیگنڈے اور شرارتانہ شبہات سے حق کو دبانے اور چھپانے کی کوشش نہ کرو اور حق و باطل کو خلط ملط کر کے دنیا کو دھوکہ نہ دو [3]

بہرحال یہ آیت یہودی علماء کے اندازِ غوایت اور اغواء پر ایک سخت تنقید ہے اور دین کی زندگی میں عقائد کی حدود کے اندر خود ساختہ اوہام اور اعمال کی حدود میں گھڑی ہوئی رسوم کو داخل کرنے، ان پر دین کا لیبل لگانے کے خلاف ایک بہت بڑا چیلنج ہے۔ اگر آج ہم اپنے ایمان و عمل کا احتساب کریں

---

[1] جواہر القرآن ص ۲۴ [2] موضح القرآن [3] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۳،

وَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ وَارْكَعُوْا مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ﴿۴۳﴾

اور نماز قائم کرو (اس سے تمہارے اندر رُوحِ عبادت تازہ ہوگی) اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرو (اس سے تمہاری رُوح میں پاکیزگی آئے گی) اور اللہ کی بارگاہ میں جھکنے والوں کے ساتھ تم بھی سرِ نیاز خم کر دو۔

تو ہمیں معلوم ہو جائے کہ لبس الحق بالباطل اور کتمان کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے اور کسی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ اس دور کے یہودی علماء کا چہرہ ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے منبر پر فرمایا تھا تمہارے متعلق مجھے سب سے زیادہ خطرہ اس شخص کا ہے جو منافق علیم ہو۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ منافق ہو کر پھر علیم بھی کیسے؟ فرمایا کہ اس کی باتیں بڑی پُر حکمت ہوں گی مگر اس کا عمل حق کے خلاف ہوگا

اسلام کی دعوت

دعوتِ ایمان کے بعد ان آیات میں اسلام یعنی ایمان کی بنیاد پر اُٹھتے ہوئے عمل کی یہودیوں کو دعوت دی ہے اور تمام اسلامی احکام میں سے خاص طور پر نماز اور زکوٰۃ کا مطالبہ کیا ہے۔ اس سے یہ بات قطعی طور پر واضح ہو گئی کہ جس بات کے بعد ایک جماعت مسلمانوں کی جماعت تسلیم کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ ایمان کے بعد عمل میں دو باتیں ضرور آجائیں۔ نماز کی جماعت کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی۔ اگر یہ دو باتیں ایک جماعت میں مفقود ہوں تو اس کا شمار مسلمانوں میں نہ ہوگا۔

یہ سوال کہ تمام اعمال میں سے نماز و زکوٰۃ کا خصوصیت سے ذکر کیوں کیا گیا ہے؟ اس لیے کہ نماز سے ان میں حبِ جاہ کم ہوگی اور زکوٰۃ سے حبِ مال دور ہوگی۔ ان میں یہی دو بیماریاں ساری نافرمانیوں اور سرکشیوں کا باعث ہیں [1]

---

[1] بیان القرآن ص ۲۷

ف ۱۱۳ . نماز کے لیے عربی لفظ صلاۃ ہے ۔ صلاۃ کے معنے عربی اور عبرانی زبانوں میں دعا کے آتے ہیں ، اس لیے نماز کی لفظی حقیقت اللہ سبحانہ سے درخواست اور التجا ہے اور اس کی معنوی حقیقت بھی ہے ۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار فرمایا کہ اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ دعا ، عبادت کا مغز ہے ۔ اور نعمان بن بشیرؓ کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اَلدُّعَاءُ هُوَ الْعِبَادَةُ فرماکر یہ آیت پڑھی کہ اُدْعُوْنِیْ اَسْتَجِبْ لَكُمْ اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ سَیَدْخُلُوْنَ جَهَنَّمَ دَاخِرِیْنَ ۔

لفظ اقامت کے معنے سیدھا کرنا اور ثابت کرنا ہیں اور چونکہ استقامت اور اقامت ہونے کی صورت میں گر جانے کا خطرہ کم ہوتا ہے اس لیے اقامت کے معنے ہمیشہ کرنے کے ہیں ۔

ف ۱۱۴ . لفظ زکوٰۃ کے لغوی معنے دو آتے ہیں پاک ہونا اور بڑھنا ۔ اسلامی عبادات کا دوسرا رکن زکوٰۃ ہے جو آپس میں انسانوں کے درمیان ہمدردی اور باہم ایک دوسرے کی امداد اور معاونت کا نام ہے ۔ زکوٰۃ کا دوسرا نام صدقہ ہے جس کا اطلاق تعمیم کے ساتھ ہر مالی اور جسمانی امداد اور نیکی پر ہوتا ہے لیکن اسلام کی قانونی زبان میں زکوٰۃ صرف اس مالی امداد کو کہتے ہیں جو ہر اس مسلمان پر واجب ہے جو دولت کی ایک مقدار کا مالک ہے ۔

نماز ہو یا زکوٰۃ تمام آسمانی صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے ۔ قرآن کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز مذہب کا جزو لاینفک بنی اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ ضروری جزو رہی ہے ۔ بنی اسرائیل سے اللہ تعالیٰ کا جو عہد تھا اس میں نماز اور زکوٰۃ دونوں تھیں ۔

لَئِنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَیْتُمُ الزَّكٰوةَ ۔

ف ۱۱۵ . جھک جاؤ جھک جانے والوں کے ساتھ ۔ یعنی باجماعت نماز پڑھا کرو ۔ پہلے کسی دین میں باجماعت نماز نہ تھی اور یہود کی نماز میں رکوع نہ تھا ۔ آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ صرف امور مذکورہ بالا نجات کے لیے تم کو کافی نہیں بلکہ تمام اصول میں نبی آخر الزماں کی پیروی کرو ۔ نماز بھی ان کے طور پر پڑھو جس میں جماعت بھی ہو اور رکوع بھی [1]

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ نماز کے حکم کے باوجود علیحدہ رکوع کا کیوں حکم دیا ہے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۰

شیخ الہندؒ کا جواب آپ پڑھ چکے ہیں۔ دوسرے علماء کی رائے بھی سنیے۔

خضوع وخشوع کا عمل باطنی تواضع میں اہلِ تواضع کی معیت کو بہت بڑا دخل ہے اس لیے مع الراکعین کا اضافہ نہایت برمحل ہے[1]

یہاں نماز کا ایک جز بول کر کل نماز مراد لی گئی ہے جیسے قرآن میں ایک جگہ قرآن الفجر فرما کر پوری نمازِ فجر مراد ہے اور بعض احادیث میں سجدہ کا لفظ بول کر پوری رکعت مراد لی گئی ہے اس لیے مراد آیت کی یہ ہو گئی کہ نماز پڑھو نماز پڑھنے والوں کے ساتھ۔ اور رکوع کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ یہودیوں کی نماز میں سجدہ وغیرہ تو تھا مگر رکوع نہیں تھا۔ رکوع اسلامی نماز کی خصوصیت ہے اس لیے راکعین کے لفظ سے اُمتِ محمدیہ کے نمازی مراد ہوں گے اور معنی یہ ہوں گے کہ تم بھی اُمتِ محمدیہ کے نمازیوں کے ساتھ نماز ادا کرو[2]

اصل بات یہ ہے کہ چونکہ نماز یہودیوں میں بھی تھی اور صرف یہودیوں میں نہیں بلکہ عیسائیوں میں بھی تھی۔ چنانچہ حدیث میں یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے تذکرے ہیں مثلاً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نماز پڑھو تو تہبند باندھ لو یا چادر اوڑھ لو یہودیوں کی طرح ننگے نماز نہ پڑھو (کنز العمال ص ۴۲) تم یہودیوں کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر نہ ڈال لو بلکہ اس کو باندھ لیا کرو (ص ۱۰۴) نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھومو (ص ۱۱۲) تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں موزے پہنے رہو (۱۱۲) میری اُمت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں کی تقلید میں صبح کی نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے۔ (ص ۸۴)

ان حوالوں سے ثابت ہوتا ہے کہ یہودی نماز ادا کرتے تھے۔ لیکن یہودیوں کی نماز میں رکوع نہ تھا اور نظامِ جماعت اُن کی بدعملی سے درہم برہم ہو چکا تھا۔ اس آیت میں چونکہ قرآن ایمان کی دعوت کے بعد عملی اسلام کی طرف یہودیوں کو دعوت دے رہا ہے اس لیے خاص طور پر یہ کہا گیا ہے کہ اس نماز کی ادائیگی کرو جو رکوع والی ہے اور با جماعت ادا کی جاتی ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اسلام کے علم وعمل کو اپناؤ۔ اسلام سے پہلے دُنیا میں کوئی ایسا مذہب نہ تھا جس میں نماز کو اہمیت نہ دی گئی ہو لیکن وہ مذہب چونکہ خاص خاص قوموں اور وقتوں تک محدود تھے اس لیے

---

[1] بیان القرآن ص ۷۰ [2] معارف القرآن ج ۱ ص ۱۵۶

ان کے اندر سے عملاً اس کی اہمیت جاتی رہی چنانچہ اسلام سے پہلے دنیا کے کسی مذہب میں آج تک نماز کو واضح، معین اور تاکیدی حیثیت حاصل نہیں یعنی کسی مذہب کے پیروں کے عمل سے بھی اس کی صورت نمایاں نہیں ہوتی ورنہ جیسے پہلے بتایا جاچکا ہے کہ قرآن کی رُو سے انبیاء علیہم السلام نے اپنی اُمتوں کو نماز کا حکم دیا ہے۔ لیکن موجودہ حیثیت یہ ہے کہ اسلام کے سوا نماز کہیں نمایاں، واضح اور مؤکد صورت میں باقی نہیں رہی ہے اور اس کا سبب یہ ہے کہ چونکہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خاتم الانبیاء۔ اور قرآن خاتم الکتب ہو کر آیا ہے اس لیے اس فریضہ کو دین کامل میں ایسی واضح، مؤکد اور نمایاں صورت دی گئی ہے کہ وہ قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے۔ یہ اسلام کا وہ فریضہ ہے جس سے کوئی مسلمان متنفس جب تک اس میں کچھ بھی ہوش و حواس باقی ہے کسی حالت میں سبکدوش نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں سو مرتبہ سے زیادہ اس کی تعریف، اس کی بجا آوری کا حکم اور اس کی تاکید آئی ہے۔ اس کے ادا کرنے میں سستی نفاق کی علامت اور اس کا چھوڑ دینا کفر کی نشانی بتائی گئی ہے۔ یہ فرض ہے جو اسلام کے ساتھ پیدا ہوا اور اس کی تکمیل اس شبستانِ قدس میں ہوئی جس کو معراج کہتے ہیں۔

یہاں یہودیوں کو دعوت اسلام و ایمان کی آیات پڑھتے ہوئے بہ خلش بے معنی ہے کہ رسالت کی دعوت کیوں نہیں دی گئی۔ مَآ اَنْزَلْتُ جو کچھ میں نے اتارا۔ پر ایمان کی دعوت میں ایمان باللہ، ایمان بالرسول، ایمان بالیوم الآخر، ایمان بالکتب، ایمان بالملائکہ سب ہی آگئے ہیں۔ بلکہ اس میں سب سے واضح طور پر رسالت کی دعوت ہے کیونکہ مَا انزلت یعنی قرآن دعوائے رسالت کی دلیل ہے دلیل کو منوانے کا مقصد ہی یہ ہے کہ اس کے مدلول کو تسلیم کرو۔ اس کا مدلول حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اللہ کا رسول ہونا ہے۔ کون ہے جو علت کو مان کر معلول کا۔ دلیل کو مان کر مدلول کا، کارسازی کو دیکھ کر کارساز کا، حکمت کو دیکھ کر حکیم کا اور عمل کو دیکھ کر عامل کا انکار کرے۔

قرآن اگر نبوت کا معجزہ اور اس کی دلیل ہے تو اس کو منوانے کا مطالبہ کرنا نبوت ہی کو منوانا ہے کیونکہ انسان کی فطرت یہ کبھی باور نہیں کر سکتی کہ دلیل موجود ہو اور مدلول نہ ہو۔ اس کا وجدان پکارتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

یہ بات انسان کے وجدان اذعان کے خلاف ہے کہ قرآن کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کو کلام رب العالمین نہ مانتے اور جناب محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی نبوت کا یقین اس کے اندر جاگ نہ اُٹھے۔

أَتَأْمُرُونَ النَّاسَ بِالْبِرِّ وَتَنْسَوْنَ أَنْفُسَكُمْ وَأَنْتُمْ تَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ۝

کیا تم لوگوں کو ایسی حالت میں نیکی کا حکم دیتے ہو کہ تمہیں خود اپنا پتہ نہیں ہے کہ تمہاری عملی زندگی کیسی ہے۔ حالانکہ تم کتابِ الٰہی کی تلاوت کرتے رہتے ہو کیا تم گفتار و کردار کے اس تضاد پر غور نہیں کرتے ہو۔ اتنی موٹی سی بات بھی تمہاری عقل میں نہیں آتی ہے؟

بہرحال یہودیوں کو حکم ہو رہا ہے کہ وہ اپنی فتنہ انگیزیاں چھوڑ کر ایمان و اسلام کو اپنا ئیں اور اعمالِ اسلامی میں نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں۔ اگر وہ ایسا کریں تو مسلمان جماعت کے فرد ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مدینہ کی زندگی میں جو اعمال اہلِ کتاب اور اہلِ ایمان کے درمیان حدِ فاصل تھے وہ یہی اعمال تھے۔ ایمان کے علاوہ ان دونوں کی دعوت اس لیے ہے کہ دو نظام ہائے زندگی میں امتیاز اس کے الگ الگ شعائر کے ذریعے ہی ہو سکتا ہے۔ اسلامی شعائر میں انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جیسے نماز سب سے زیادہ امتیازی عمل ہے۔ ایسے ہی سیاسی زندگی میں زکوٰۃ سب سے زیادہ اہم رُکن ہے۔ لہٰذا اگر عبادات میں وہ ہماری نماز قائم کر لیتے ہیں اور سیاسی لحاظ سے ہماری اتنی برتری تسلیم کر لیتے ہیں کہ زکوٰۃ دینے کو تیار ہو جاتے ہیں تو یہ اس بات کی کھلی شہادت ہوگی کہ اب وہ دل سے نبوتِ محمدیہ کو مان چکے ہیں۔

فنِ دینداری

ان کے اخلاق کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ علم کی حد تک وہ کتاب اللہ کا مطالعہ کرتے تھے اور دوسروں کو اس کی دعوت دینے میں بہت باک اور دلیر تھے لیکن خود فراموشی کا شکار تھے یعنی علم رکھتے ہوئے خود علم کے تقاضوں کو عملی زندگی میں نہ اپناتے تھے۔ دین سے دینداری کا نہیں بلکہ فنِ دینداری

اور پیشہ دینداری کام لیتے۔ پہلی آیت میں پیشہ دینداری سے روکا گیا ہے اور اس آیت میں فنِ دینداری پر زجر و توبیخ فرمائی ہے۔ دونوں کے درمیان دینداری کی تلقین ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ کا یہ تشریحی نوٹ پڑھیے کہ یہ آیت یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ یہ لوگ اپنے ان رشتہ داروں کو جو اسلام لا چکے تھے کہتے تھے کہ تم دینِ اسلام پر قائم رہو، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نبی برحق ہیں لیکن خود دعوتِ اسلام قبول کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے۔

۱۱۶ نیکی بِر کا ترجمہ ہے۔ یہ ہر قسم کی نیکیوں کے لیے ایک جامع لفظ ہے۔ بڑی نیکی کو کہتے ہیں کیونکہ بر خشکی کے وسیع رقبہ کو کہتے ہیں۔

بعض علمائے یہود یہ گمان کرتے تھے کہ اپنے لوگوں سے کہتے کہ یہ دینِ اسلام اچھا ہے اور خود مسلمان نہ ہوتے اور نیز علمائے یہود بلکہ ظاہر بینوں کو اس موقعہ پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ جب ہم احکام شریعت کی تعلیم میں کوئی کوتاہی نہیں کرتے ہیں تو اس کی چنداں ضرورت نہیں ہے کہ ہم خود بھی احکام شرعیہ پر عمل کریں۔ جب ہماری ہدایت کے مطابق بہت سے لوگ اعمالِ شرعیہ بجا لا رہے ہیں تو بحکم قاعدہ اَلدَّالُّ عَلَى الْخَيْرِ كَفَاعِلِهٖ وہ ہمارے ہی اعمال ہیں۔ تو اس آیت میں دونوں کا ابطال ہو گیا۔[1]

یہود اپنے صاحب علم و کتاب ہونے کی وجہ سے اہلِ عرب کی نظر میں محترم تھے۔ مدینہ کے شہری اکثر ان سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی دعوت کے موضوع پر مشورے کرتے کہ اس مدعیٔ نبوت کے دعوے میں کہاں تک صداقت ہے؟ علمائے یہود ایسے مواقع پر لوگوں کو یہی کہتے کہ واقعی اللہ کے پیغمبر ہیں۔ ہماری پیش گوئیوں کے مطابق ان میں یہ علامات پائی جاتی ہیں لیکن اپنے عمل کے وقت ہوائے نفس حائل ہو جاتی اور یہ خیال آتا کہ اسلام لانے کے بعد ماتحتی اور پابندی کی زندگی گزارنی ہوگی۔ سیادت کے یہ مالی اور جاہی مزے نہ رہیں گے۔[2]

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ مدینہ کے علمائے یہود اپنے اپنے رشتہ داروں کو جو مسلمان تھے نصیحت کرتے تھے کہ تم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرتے رہو۔ اس آیت میں ان کی اس بدکرداری پر ملامت کی گئی ہے کہ دوسروں کو پیروی کی تلقین کرتے ہو اور اپنی خبر نہیں لیتے کہ کفر پر ڈٹے ہوئے ہو۔ (قرطبی)

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۰ [2] معارف القرآن م ش ص ۱۵۷

اَلْبِرُّ نیکی کو کہتے ہیں۔ لیکن لغت میں اس کا اطلاق عام ہے اور ہر قسم کی نیکی کو شامل ہے۔ یہاں بِر سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ماننا ہے۔

ف ۱۱۷۔ خود کا پتہ نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ علم رکھتے ہوئے خود اس کے تقاضوں پر عمل نہ کرنا۔ یہ جانتے ہوئے کہ نماز فرض ہے نماز نہ پڑھنا، جھوٹ حرام ہے اور جھوٹ سے نہ بچنا۔ اس آیت میں دھمکی اسی بات پہ ہے کہ علم اور دوسروں کو تعلیم کے باوجود خود عمل نہیں کرتے ہیں۔

علمائے تابعین نے اسی سلسلے میں ان کے کردار کا جو چہرہ پیش کیا ہے یہ ہے،

حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ علمائے بنی اسرائیل لوگوں کو نیکی، تقویٰ اور طاعت کی تلقین کرتے لیکن خود نیکی، تقویٰ اور طاعت سے گریزاں رہتے۔

حضرت ابن جریج رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہ لوگوں کو نماز روزے کو کہتے مگر یہ خود نماز روزے کے پاس نہ جاتے۔

حضرت زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ یہودی علماء سے جب کوئی شخص ایسا معاملہ دریافت کرتا جس میں کسی کا حق وابستہ نہ ہو اور نہ اس کے ساتھ کوئی رشوت ہو تو وہ اسے حق اور سچی بات بتلاتے۔

ان بزرگوں کی یہ تشریحات بتا رہی ہیں کہ ان یہودی علماء میں پیشہ ورانہ دینداری نے ایک سے زیادہ اخلاقی بیماریاں پیدا کر دی تھیں۔ یہ علمی زندگی میں سوسائٹی میں اتنا اونچا مقام رکھتے تھے کہ کتاب اللہ کے عالم تھے اور ان کے علم پر لوگوں کو اس قدر اعتماد تھا کہ عام شہری زندگی کی دینی ہدایت میں قیادت ان کے ہاتھ میں تھی۔ لیکن یہ خود بے عملی کا شکار تھے۔ اپنی ذات کی حد تک ان کا علم بے سود، کتابِ الٰہی ان کے حق میں ایک آرٹ اور علمِ دین ان کی زندگی کا کاروبار ہو کر رہ گیا تھا۔ قرآن ان کو اسی پر ملامت کر رہا ہے۔

ف ۱۱۸۔ کتاب اللہ سے اتنا گہرا تعلق کہ صرف اس کے عالم ہی نہ تھے بلکہ اس کا پڑھنا پڑھانا ان کی زندگی کا خاص مشغلہ تھا۔ مدینہ شہر میں اس کی تعلیم و تعلم کے لیے بیت المدارس کے نام سے دینی درس گاہ قائم تھی۔ اس کے باوجود خود کامل علم رکھتے ہوئے ثمرۂ علم یعنی عمل سے محروم تھے۔ ان کی حیثیت اس راہ گیر سے مختلف نہیں ہے جو صحیح راستہ کو چھوڑ کر غلط راہ پر چل پڑے اور راستہ میں ملنے والے ہر شخص کو نصیحت کرتا جائے کہ یہ راستہ غلط ہے اس پر نہ چلنا۔

آپ یہاں شاید ذہنوں میں یہ خلش محسوس کریں کہ آیت کی روشنی میں بے عمل یا بدعمل شخص کو

دوسروں کو نصیحت کرنے، وعظ کرنے، نیکی کا راستہ بتانے کی افادیت نہیں ہے ـــــ یہ خلش بالکل بیجا ہے کیونکہ آیتِ قرآنی کا یہ مقصود نہیں ہے۔ قرآن کا مطالبہ یہاں صرف یہ ہے کہ واعظ، ناصح، معلم، مبلغ کو اپنے کہے پر عمل کرنا چاہیے اور اپنی زندگی کو اپنے علم کے تقاضوں کے مطابق بنانا چاہیے دین کو دینداری کا فن اور دینداری کا پیشہ نہ بنائے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ بے عمل یا بدعمل کسی کو نصیحت کرنے، نیکی کی تلقین کرنے کا مجاز نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:

آیت سے مقصود یہ ہے کہ واعظ کو اپنے وعظ پر عمل کرنا چاہیے یہ غرض نہیں ہے کہ فاسق کسی کو نصیحت نہ کرے۔

مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

اس سے یہ نہیں نکلتا کہ بے عمل کو واعظ بننا جائز نہیں ہے بلکہ یہ نکلتا ہے کہ واعظ کو بے عمل بننا جائز نہیں ہے۔ دونوں باتوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔

مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں:

یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ بے عمل کے لیے دوسروں کو وعظ و تلقین کرنی ناجائز ہے اور جو شخص کسی گناہ میں مبتلا ہو وہ دوسروں کو اس گناہ سے باز رہنے کی تلقین نہ کرے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بے عمل کو وعظ کہنا جائز نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ واعظ کو بے عمل نہ ہونا چاہیے اور دونوں میں فرق واضح ہے۔

لیکن یہاں یہ سوال بھی ہوتا ہے کہ بے عمل نہ ہونے پر زور دینا اگر آیت قرآنی کا مقصود ہے تو پھر اس میں واعظ کی تخصیص کیوں ہے۔ بے عملی تو واعظ اور غیر واعظ دونوں کے لیے ناجائز ہے۔ واقعی ناجائز تو دونوں کے لیے ہے مگر واعظ کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ واعظ کا جرم غیر واعظ کے مقابلے میں زیادہ سنگین ہے۔ کیونکہ واعظ جرم کو جرم سمجھتے ہوئے جان بوجھ کر کرتا ہے اس کے پاس ناواقفیت کا عذر نہیں ہوتا برخلاف غیر واعظ اور ان پڑھ کے کہ اس کو چاہے نہ جاننے کی پاداش میں باز پرس ہو لیکن ارتکابِ گناہ کی حد تک اس کے پاس ناواقفیت کا عذر ہے۔

قرآن میں عام شہریوں کی گنہگارانہ زندگی کو بدعملی کہا ہے۔ لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ۔ لیکن علمائے کرام اور مشائخِ طریقت کی گنہگارانہ زندگی کو بدعملی نہیں بلکہ بدکاری کہا ہے لَبِئْسَ مَا كَانُوا يَصْنَعُونَ۔ عمومی کردار عمل ہے اور علماء کا کردار نہیں بلکہ صنعت ہے، فن کاری ہے، آرٹ ہے ـــــ بہرحال مقصد یہ بتانا ہے کہ معلم اور واعظ کے علم و عمل اور قال و حال میں

وَاسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ ؕ وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ ۝

الَّذِيْنَ يَظُنُّوْنَ اَنَّهُمْ مُّلٰقُوْا رَبِّهِمْ وَاَنَّهُمْ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ ۝

اور صبر و نماز کی قوتوں سے اپنی اصلاح میں مدد لو[119]۔ اور بلاشبہ نماز[120] ایک ایسا عمل ہے جو آرام پسند طبیعت کے لیے بہت ہی بھاری ہے۔ لیکن جن کے دل اللہ کے لیے عاجزی سے شرمسار ہیں اور جن کو یقین[121] ہے کہ ان کو اللہ سے ملنا ہے اور اس کے حضور میں پیش ہونا ہے تو ان پر نماز کا عمل بھاری نہیں ہے۔

ہم آہنگی ہونی چاہیے۔

اس موضوع پر جب احادیث میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سامنے آتے ہیں تو اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایمان کی ساری کمزوریوں کے اعتراف کے ساتھ صرف اپنی کہتا ہوں کہ میں کہہ نہیں سکتا۔ دل و دماغ پر کیا گزرتی ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے تفسیر میں بڑی دلسوزی کے ساتھ ارشادات لکھے ہیں۔ آئیے آپ بھی سن لیجیے اور عبرت حاصل کیجئے۔

حضرت جندب بن عبداللہؓ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ وہ عالم جو لوگوں کے لیے معلمِ خیر ہوتا ہے اور خود باعمل نہیں ہوتا اس چراغ کی طرح ہے جو لوگوں کے لیے روشنی کا سامان کرتا ہے لیکن خود جلتا رہتا ہے۔

حضرت انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ شبِ معراج میں میرا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جن کے ہونٹ آگ کی قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں؟ جواب دیا کہ دنیا میں آپ کی اُمت کے واعظ، خطیب اور لیکچرار ہیں جو لوگوں کو نیکیوں کی تلقین کرتے تھے اور خود عمل نہیں کرتے تھے حالانکہ کتاب الٰہی پڑھتے تھے۔

بہرحال یہ آیت ان علماء کی مذمت کر رہی ہے جن کا عمل ان کے علم سے ہم آہنگ نہ ہو۔ یہ صرف یہودی علماء کے کردار کی کہانی نہیں ہے بلکہ ان تمام لوگوں کے لیے اس میں بہت بڑی

عبرتیں ہیں جو ایمان کے مدعی ہو کر علمِ نبوت کے سرمایہ کے محافظ ہیں لیکن ان کی زندگی کا کوئی گوشہ علمِ نبوت سے ہمنوا نہیں ہے۔ وہ مطمئن ہیں کہ ہم قرآن کی تبلیغ کر رہے ہیں، سنت کی تعلیم میں مشغول ہیں، ہماری تعلیم و تبلیغ ہی ہمارے لیے سامانِ نجات کافی ہے۔ ہمیں خود احکام پر عمل پیرا ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔

دو نفسیاتی بیماریوں کا علاج

یہودی علماء کی زندگی پر اب تک جو تنقیدی تبصرہ قرآن نے کیا ہے اور جن جن اخلاقی کمزوریوں کی نشاندہی کی ہے یعنی حق سے روگردانی اور انکار میں سبقت، دینی زندگی میں کاروباری اور پیشہ ورانہ ذہنیت، کلامِ الٰہی میں تحریف، دعوتِ حق کے خلاف پروپیگنڈا، گفتار و کردار میں تضاد اور علم رکھتے ہوئے بے عملی کا مظاہرہ۔ ان سب اخلاقی کمزوریوں کا باعث صرف ان میں دو بدترین عادتوں کا ظہور تھا۔ ایک مال سے محبت اور دوسرے جاہ سے پیار۔ اور یہ دو محبتیں اگر یک جا ہوں تو حاصل جمع حسد ہوتا ہے۔

قرآن بڑی خیر خواہی، ہمدردی اور دلسوزی سے ان آیات میں ان کو ان بیماریوں کو دور کرنے کی تدبیر اور ان کا علاج بتا رہا ہے پہلے حبِّ مال کا اور دوسرے نمبر پر حبِ جاہ کا علاج تجویز کیا ہے۔

۱۱۹ مدد لینا استعانت کا ترجمہ ہے۔ اور اسلامی قانون میں اسباب کو اسباب سمجھ کر مدد لینا جائز ہے۔ اگر اسباب کو علت سمجھے تو پھر ناجائز ہے۔ علتِ دنیا میں ہونے والے تمام کاموں کی اللہ کی ذات ہے۔ آفتاب کی روشنی سے یہ سمجھ کر فائدہ اٹھانا کہ روشنی کا سبب ہے اور اس میں روشنی کا خالق اللہ سبحانہٗ ہے جائز ہے اور یہ سمجھنا کہ آفتاب خالقِ نور ہے ناجائز ہے۔ اسباب بھی دو قسم کے ہیں مادی اور عادی۔ دوسرے شرعی اور روحانی۔ مادی جیسے دوا اور ڈاکٹر بیماری دور کرنے کا سبب ہیں۔ شرعی جیسے صبر اور نماز، دعا۔ ان کو شرعی کہنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا سبب ہونا عادت سے نہیں بلکہ شریعت سے معلوم ہوا ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ نے سورۂ فاتحہ کی تفسیر میں اسی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ

اگر کسی مقبول بندے کو محض واسطہ رحمتِ الٰہی اور غیر مستقل سمجھ کر استعانت ظاہری کرے تو یہ جائز ہے۔

اس میں مقبولیت ہونا واسطہ، غیر مستقل اور ظاہری کی شرطوں سے اپنے مخاطبوں کے کوزۂ ذہن

میں یہ بات آتارنا چاہتے ہیں کہ اسباب شرعیہ کے تحت ایسی امداد میں کوئی مضائقہ نہیں ہے جیسے کسی سے دُعا کی درخواست کرنا کہ آپ میرے لیے اللہ سبحانہٗ سے دُعا فرمائیے کہ اللہ پاک میرا یہ کام کر دے کیونکہ یہ استعانت درحقیقت حق تعالیٰ ہی سے استعانت ہے۔

آیت میں ایمان کی ثابت قدمی اور شعائرِ کفر کو چھوڑ دینے کے لیے ایک محسوس علاج یہ بتایا جا رہا ہے کہ مدد لو صبر اور نماز سے۔

عُلمائے اہلِ کتاب حق کے نمایاں ہونے کے باوجود بھی آپ پر ایمان نہ لاتے تھے۔ اس کی بڑی وجہ حبِ جاہ اور حبِ مال تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کا علاج بتایا ہے۔ صبر سے مال کی طلب اور محبت جائے گی اور نماز سے عاجزی اور انکساری پیدا ہو کر حبِ جاہ کم ہو گی[1]

مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں نیکی کے راستہ پر چلنے میں دشواری محسوس ہوتی ہے تو اس کا علاج صبر اور نماز ہے۔ ان دو چیزوں سے تمہیں وہ طاقت ملے گی جس سے یہ راہ آسان ہو جائے گی[2]

یہودی علماء جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام کو قبول نہ کرتے تھے اس کے دو سبب تھے۔ ایک یہ کہ ان کے دلوں میں گداز اور تاثر نہ تھا۔ اور دوسرے یہ کہ پیغامِ حق قبول کرنے کے بعد اُن کو جو جانی اور مالی دشواریاں پیش آتیں یہ عیش و عشرت اور ناز و نعمت کے خوگر ہونے کی وجہ سے ان کو برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ اسی لیے قرآن نے ان کی بیماری کے لیے صبر اور نماز کا نسخہ تجویز کیا ہے۔ نماز سے ان کے دل میں اثر طبیعت میں گداز پیدا ہوگا۔ صبر کی عادت سے قبولِ حق کی راہ کی مشکلیں دُور ہوں گی۔

صبر کی حقیقت پر ہمارے عوام کی غلط فہمی نے پردے ڈال رکھے ہیں۔ ان کے خیال میں بے کسی اور بے بسی کا نام صبر ہے لیکن کیا واقعی یہی ہے؟ صبر کے لغوی معنے روکنے اور سہارنے کے ہیں۔ اور اس سے مراد ارادے کی وہ مضبوطی، عزم کی وہ پختگی اور نفس کی خواہشوں کا وہ انضباط ہے جس سے ایک شخص نفسانی ترغیبات اور بیرونی مشکلات کے مقابلے میں قلب و ضمیر کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثباتِ قدم کا مظاہرہ کرتا ہے۔ قرآن میں صبر کا لفظ اسی معنے میں استعمال ہوا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مدینہ کے لوگوں کے سامنے توحید کی دعوت اور اسلام کی سوغات پیش کی تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپؐ کی مخالفت میں سرگرم جولان ہو گیا۔ ہر طرف سے عداوات اور دُشمنی کے مظاہرے ہونے لگے اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر رکاوٹیں نمودار ہو گئیں۔ ایسے حالات

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۰ [2] تفہیم القرآن ص ۷۳

میں دعوت کو قبول کرنا جان کو جوکھوں میں ڈالنے کے مترادف تھا۔ قرآن نے اس ارشاد کے ذریعے بتایا کہ ان حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے اس اخلاقی صفت کو اپنے اندر پرورش کرو۔ اس کی پوری تفصیل انشاء اللہ دوسرے پارے میں ملے گی۔

۱۲۰۔ نماز کا حکم پہلی آیت میں مل چکا ہے۔ یہاں نماز کے آسان ہونے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔ پہلے یہ بات فرمائی ہے کہ نماز بہت بھاری ہے اور بھاری ہونے کا مطلب یہ ہے کہ انسان میدان خیال میں آزاد ہے اور انسان کے جوارح اسی آزاد خیالی کے نتیجے میں آزاد رہنے کے خوگر ہیں۔ نماز وقت کی، نہ سوچنے، نہ ہنسنے، نہ کھانے، نہ پہننے، نہ چلنے، پاک صاف رہنے، اذکار مخصوصہ پڑھنے کی پابندی عائد کرتی ہے۔ اس لیے انسان کی آزادئ خیال اور آزادئ عمل ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ بس یہی نماز کا بھاری ہونا ہے۔

اس آیت میں نماز کے ثقل، دشواری اور بھاری پن کو دور کرنے کا یہ علاج بتایا گیا ہے کہ صفتِ خشوع اپنے اندر پیدا کرنی چاہیے اس کے ذریعے نماز کی دشواری ختم ہو جائے گی۔

یعنی نماز حضورِ دل سے بہت بھاری ہے مگر ان پر آسان ہے جو عاجزی کرتے ہیں اور ڈرتے ہیں۔ جن کا خیال اور دھیان یہ ہے کہ ہم کو خدا کے روبرو پیش ہونا اور اس کی طرف پھر جانا ہے یعنی نماز میں خدا کا قرب اور گویا اس سے ملاقات ہے یا قیامت میں حساب کے لیے اس کے روبرو جانا۔[1]

خشوع لغت کی زبان میں پست ہونے، نیچا ہونے کو کہتے ہیں۔ ریت کا ایسا ٹیلا جو دوسرے ٹیلوں کے مقابلے میں پست ہو عربی میں خشعہ کہلاتا ہے۔ آواز کی پستی پر بھی خشوع بولا جاتا ہے۔ نگاہوں کے نیچا ہونے کو بھی خشوع کہتے ہیں۔ ہری بھری کھیتی کے مقابلے میں زمین کے اس حصے کو بھی خشوع کہا جاتا ہے جس میں روئیدگی نہ ہو۔ چہروں کی پستی اور تذلل کو بھی خشوع کہا گیا ہے اور بالآخر دلوں کے جھک جانے اور پست ہو جانے پر بھی خشوع بولا گیا ہے۔

یہاں الخاشعین میں دل کا خشوع مراد ہے اور دل کی اسی کیفیت کی اعضاء و جوارح پر نمائش ہوتی ہے۔ جنید بغدادیؒ فرماتے ہیں کہ خشوع دراصل اللہ سبحانہ کے حضور میں دلوں کی عاجزی کو کہتے ہیں۔ دل میں اگر خشوع ہوتا ہے تو آدمی ذہن و دماغ کے پورے شعور کے ساتھ حق کے سامنے سرنگوں ہو جاتا ہے۔ اس کی نماز اسی احساس سے دب جاتی ہے بلکہ اس کی پوری زندگی میں نبوت کے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۰

لائے ہوئے علم وعمل کے لیے یہی کیفیت رونما ہوجاتی ہے۔ ہر موقعہ اور ہر حال میں وہ نبوت کے علم وعمل کے سامنے اپنے آپ کو پست، نیچا اور دبا ہوا رکھتا ہے۔ منفعتوں اور مصلحتوں کے مقابلے میں اُصول و صداقت کو اور دُنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دیتا ہے۔ وہ نبوت کے لائے ہوئے نظامِ حیات کے لیے بے اُصول، ناقابلِ اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت کیش نہیں بلکہ با اُصول، بلند اخلاق اور مضبوط سیرت کا مالک بن کر رہتا ہے۔

اس آیت میں پوری زندگی کو خشوعی بنانے کا مطالبہ ہے۔ یہ آیت پکار کر کہہ رہی ہے کہ الخٰشعین یعنی جن کی زندگی خشوعی ہے ان پر نماز بھاری اور گراں نہیں ہوتی اور یا ان کو نماز میں گرانی نہیں ہوتی ہے۔ بلاشبہ جس کی زندگی اسلام کیلئے خشوعی نہ ہو اس پر نماز جیسا عمل اور اس کی ادائیگی گراں ہوتی ہے۔ لیکن جو لوگ خشوعی زندگی رکھتے ہیں اور جن کی رگ رگ میں اسلام سے وفاداری، اسلام سے محبت پیوست ہوتی ہے ان کے لیے نماز دشوار، گراں اور بھاری نہیں ہے۔

خشوعی زندگی کن کی ہوتی ہے؟ اسی اُٹھے ہوئے سوال کا جواب دوسری آیت میں دیا ہے۔

ف ۱۲۱ ۔جن کو یقین ہے۔ یہ ترجمہ ہے الذین یظنون کا۔ ظن لغت میں شک اور یقین دونوں معنی میں آیا ہے اور کلامِ عرب میں ظن بمعنی یقین کے استعمال کی نظیریں بہت سی ہیں۔ یہاں اکثر مفسرین نے یقین ہی کے معنے میں لیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خشوعی زندگی ان کی ہوتی ہے جن کو یقین کی دولت نصیب ہوتی ہے اور یقین بھی ایسا کہ ایک طرف ان کو یہ فکر دامن گیر ہو کہ ان کو اللہ سبحانہٗ کے حضور میں حساب کے لیے پیش ہونا ہے۔ اور دوسری طرف یہ شوق غالب ہو کہ ان کو اپنے محبوب سے ملنا ہے۔ شوق اور خوف کے ملے جلے جذبات پر مبنی یقین کی یہی عظمت اور مطلوب کی یہی لگن زندگی کو خشوعی بنا دیتی ہے۔ ان کو یہ دھیان لگا رہتا ہے کہ زندگی میں کی ہوئی عبادتیں رائیگاں جانے والی نہیں ہیں اپنے شفیق و کریم آقا کے حضور میں بہرحال حاضر ہونا ہے اُس وقت زندگی کی ساری محنتیں وصول ہو جائیں گی۔ اس یقین سے خشوعی نماز پیدا ہو جانا یقینی ہے۔ نماز میں اس طرح خشوع آئے گا تو نماز ہی پوری زندگی کو خشوعی بنائے گی۔ نماز میں بندہ اپنے مولیٰ کے حضور میں کھڑا ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ سے زیادہ پُر ہیبت اور پُر جلال ذات کون ہو سکتی ہے۔ ضروری ہے کہ نمازی کے قلب و دماغ اور اعضاء و جوارح پر خشوع کی کیفیت ظاہر ہو، عجز و نیاز ہو، تواضع و انکسار ہو، آنکھ، زبان، کان، دل، دماغ اور تمام اعضاء و جوارح پورے طور پر نماز میں لگے ہوئے ہوں۔ محبوب سے ملنے کا شوق اور

اس کی ناراضگی کا خوف جب سر پر سوار ہوتا ہے تو محبوب کی طلب میں کوئی مزاحمت نہیں رہتی اور شوق انسان کو راہ کی تمام دشواریوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ شوق و خوف کی یہی شمع ساربان دورِ نبوت کے مسلمانوں کی نمازوں میں کھلم کھلا نظر آتی ہیں اور تاریخ نے ہمارے لیے محفوظ رکھی ہوئی ہیں۔

جب بھی نمازوں کا رشتہ شوقِ ملاقات انھم ملاقوا ربھم اور خوف حضوری انھم الیہ راجعون سے ٹوٹ جائے گا تو نمازیں بے جان ہو کر رہ جائیں گی۔ حضرت حذیفہؓ نے اس اندیشہ کا اظہار ان لفظوں میں فرمایا ہے

مسلمانو! تم اپنے دین سے سب سے پہلے چیز جو ضائع کرو گے وہ نمازوں کا خشوع ہے اور آخری چیز جو تمہارے ہاتھ سے نکل جائے گی وہ نماز ہے۔ اس کے بعد اسلام کی تمام کڑیاں کا رشتہ تمہاری زندگی سے ایک ایک ہو کر ٹوٹ جائے گا

آیت میں ان دو فقروں کا مختصر لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ

جو شخص خدا کا فرمانبردار نہ ہو اور آخرت کا عقیدہ نہ رکھتا ہو اس کے لیے تو نماز کی پابندی ایک ایسی مصیبت ہے جسے وہ کبھی گوارا ہی نہیں کر سکتا مگر جو برضاء و رغبت خدا کے آگے سرِ اطاعت خم کر چکا ہو اور جسے یہ خیال ہو کہ مر کر اللہ سبحانہٗ کے سامنے جانا ہی ہے اس کے لیے نماز ادا کرنا ہی نہیں چھوڑنا بھی مشکل ہے لے

اس کا حاصل بھی یہی ہے کہ زندگی میں خشوع پیدا کرنے کا ذریعہ نماز ہے اور نماز میں خشوع آخرت کے فکر اور اللہ سبحانہٗ کی محبت کے ولولے پیدا کرتا ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ سوال اُبھر کر آئے کہ اب تک جو کچھ بتایا گیا ہے اس سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نماز خشوع رکھنے والوں کے لیے گراں نہیں ہوتی ہے اور خشوع ان میں ہوتا ہے جن کو اللہ سبحانہٗ سے ملنے کا شوق اور اس کی بارگاہ میں پیش ہونے کا خوف ہو۔ لیکن سوال یہ ہے کہ خود خشوع کیا ہے! یہ دل کا خشوع، اعمال میں خشوع آخر کیا چیز ہے؟

دراصل ہر جاندار کے لیے جیسے جسم کے ساتھ رُوح کا ہونا ضروری ہے ایسے اعمال کے لیے بھی جسم کے ساتھ رُوح کا ہونا ناگزیر ہے۔ اعمال کے مظاہر تو اعمال کے ڈھانچے اور ان کے جسم ہیں اور اعمال کی رُوح کا نام خشوع ہے۔ جیسے اگر کوئی جسم رُوح نہیں رکھتا ہے تو اس کی کوئی قیمت

لے تفہیم القرآن ص ۷۴

نہیں ہے۔ ٹھیک ٹھیک اسی طرح اگر کوئی عمل مظہر اور ڈھانچہ رکھتا ہے مگر اس میں رُوحِ خشوع نہیں ہے تو اس کی بازارِ قیامت میں کوئی قیمت نہیں ہے۔ حیوان اور انسان کے افعال میں یہی جوہری فرق ہے کہ حیوانات کے تمام افعال طبعی ہوتے ہیں۔ قانون اور ضابطے سے ان کو کوئی سروکار نہیں ہوتا اس لیے ان کے افعال میں رُوح ہونے یا نہ ہونے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسان چونکہ ایک ذمہ دار اخلاقی وجود ہے اس لیے اس کے اعمال کی وہ نوعیت نہیں ہے۔ اس کا ہر فعل قانون کی پابندیوں سے جکڑا ہوا ہے۔ اس لیے اس کے اعمال میں ڈھانچے کے ساتھ رُوح کا ہونا ضروری ہے۔ نماز ایک قانونی مطالبہ اور اس کا ایک قانونی پیمانہ ہے۔ اس کا بھی ایک مظہر اور ڈھانچہ ہے اور اس کے ساتھ اس کی رُوح بھی ہے۔ رُوح کا ڈھانچے کے ساتھ گہرا لگاؤ ہے۔

اسلامی قانون کے شارحین میں سے جن بزرگوں کی مرکزی توجہ نماز کی رُوح تک محدود رہی اور خشوع ہی ان کو نماز کی رُوح ہونے کے علاوہ کوئی دوسرا پہلو نظر نہ آیا۔ انہوں نے یہ فیصلہ فرمایا کہ بغیر خشوع کے نماز نہیں ہوتی اور نہ ہونے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ آخرت میں اس نماز پر کوئی اجر و ثواب نہ ملے گا۔ چنانچہ حنابلہ میں سے ابوعبداللہ بن حامدؒ اور شوافع میں سے امام غزالیؒ نے ایسی نماز کو بے ثواب بتایا ہے ان کا موقف یہ ہے کہ

خشوع نماز کی رُوح ہے ایسے جسم کی کیا قیمت ہو سکتی ہے جس میں رُوح نہ ہو۔

نماز کے واجبات، فرائض، ارکانِ نماز کے جسم و ڈھانچہ کے ترکیبی اعضا ہیں۔ اس جسم میں سے اگر صرف واجب ہی رہ جاتے تو سب کا فیصلہ یہی ہے کہ سجدۂ سہو کیا جائے ورنہ نماز لوٹائی جائے اور جسم میں سے اگر رُوح ہی پرواز کر جائے تو پھر نماز کیسے ہو سکتی ہے۔ لیکن یہ ان بزرگوں کا انتہا پسندانہ نظریہ ہے۔ اور اسلام کی اس جامع پالیسی کے سراسر خلاف ہے جو اسلام نے رُوح و جسم کے بارے میں مقرر کی ہوئی ہے۔

ہمیں اس معاملہ پر دقتِ نظر اور گہرے فکر کے ساتھ اسلام کی جامع پالیسی کی روشنی میں غور کرنا چاہیے اور تجزیہ کرنا چاہیے کہ اسلامی قانون میں عمل کے لیے جو نقشہ ترتیب دیا ہے اس کے کیا کیا پہلو ہیں۔

اسلام کے بتائے ہوئے نقشہ میں اعمال کی دو تصویریں ہیں۔ ایک تصویر وہ ہے جسے ہم جسم، ڈھانچہ اور مظہر کہتے ہیں۔ دوسری تصویر وہ ہے جسے ہم باطن، رُوح اور مصدر کہتے ہیں۔

اسلام کا قانون یہ ہے کہ وہ اس دُنیا میں اعمال کی صحت کا معاملہ اور ان کی درستگی اور

پذیرائی کا فیصلہ مصادر سے نہیں بلکہ مظاہر سے، رُوح سے نہیں جسم سے، باطن سے نہیں بلکہ ظاہر سے کرتا ہے۔ پوری اسلامی زندگی کے لیے ایمان کی حیثیت رُوح کی ہے۔ کسی کے مسلمان ہونے کا فیصلہ دنیوی زندگی اور قانون کی نپی تلی زبان میں باطن کی گہرائیوں سے نہیں بلکہ ظاہر سے، مصادر سے نہیں بلکہ مظاہر سے کیا جاتا ہے۔ قرآن کہتا ہے:۔

لَا تَقُوْلُوْا لِمَنْ اَلْقٰٓى اِلَيْكُمُ السَّلٰمَ لَسْتَ مُؤْمِنًا

اور ارشادِ نبوت ہے:

اُمِرْتُ اَنْ اُقَاتِلَ النَّاسَ حَتّٰى يَقُوْلُوْا لَا اِلٰهَ اِلَّا اللّٰهُ

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ اسلام کسی کے مسلمان ہونے کا فیصلہ اس کے مظاہر سے کیوں کرتا ہے!
اس کا جواب حافظ ابن تیمیہؒ نے یہ دیا ہے۔

اسلام کے ثبوت کا دار و مدار کسی ایسی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم سب کو یکساں طور پر ہو سکے اس کلمہ کا زبانی اقرار ہی مسلمان ہونے کا معیار قرار دیا گیا۔ اور اسی ایک کلمہ کو جنگ کے آغاز اور خاتمہ کا معیار بنا دیا۔

معاملہ کی یہی صورت نماز میں ہے۔ نماز بھی اسلامی زندگی کی طرح جسم و رُوح، ظاہر و باطن کے مجموعہ کا نام ہے۔ اسلام کا قانون دان طبقہ قانون کی نپی تلی زبان میں نماز کی صحت کا فیصلہ نماز کے مصادر سے نہیں بلکہ نماز کے مظاہر کو دیکھ کر کرتا ہے۔ نماز کے فرائض، نماز کی شرطیں، ارکان واجبات کی اگر ایک شخص تکمیل کر رہا ہے تو بلا ریب اس کی نماز درست ہے۔ اگر قانون کی نظر میں ایک منافق کی نماز صحیح ہے تو وہ مسلمان جو دل کی گہرائیوں میں سب کچھ مانتا ہے لیکن طبیعت کی غلط اُفتاد یا نادانی کی وجہ سے، غفلتوں، وسوسوں اور بے پروائیوں کا شکار ہو کر خشوع کی پوری کیفیت اور حضورِ قلب سے محروم رہے یقیناً اس کا مستحق ہے کہ اس کی نماز بدرجہ اولیٰ صحیح ہو۔

اس موقعہ پر حافظ ابن القیمؒ نے یہ بات خوب فرمائی ہے کہ

دل کے وسوسوں اور غفلتوں میں مبتلا مسلمانوں کی نماز یقیناً منافق کی نماز سے زیادہ صحیح ہے۔

ہمیں چاہیے کہ معاملہ کے اس پہلو پر بھی غور کریں۔

بلاشبہ خشوع دل کی خاص کیفیت کا نام ہے لیکن قرآنی اطلاقات اور نبوت کے ارشادات میں خشوع کی محسوس صورت کی اعضاء و جوارح میں بھی نشاندہی کی گئی ہے۔ قرآن میں آواز کی پستی، نگاہوں کے نیچے ہونے اور چہروں کے تذلل پر خشوع کا اطلاق آپ سن چکے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے قرآن کے ان ہی اشارات سے یہ بات معلوم کرلی کہ نماز کے خشوع کے درجات میں دل کے خشوع کی حالت تو بے شک اللہ سبحانہٗ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن خشوع کا ایک درجہ وہ ہے جو آنکھوں سے نظر آتا ہے یہ اعضاء کا خشوع ہے

ایک بار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جماعت سے نماز ادا فرما رہے تھے کہ کچھ لوگوں سے نماز میں ایسی حرکات سرزد ہوئیں جو خشوع کے منافی تھیں۔ آپ نے فرمایا

بخدا مجھ سے تمہارا خشوع پوشیدہ نہیں ہے۔

اسی درجہ خشوع کی خاطر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں آتے وقت بھگدڑ مچانے سے منع فرمایا ہے۔ اور اسی کی خاطر مساجد میں آواز بلند کرنے اور شور و ہنگامہ سے روکا ہے اور اسی کی وجہ سے نماز میں تسویۂ صفوف کا حکم دیا۔ اور اسی بنا پر نماز میں اِدھر اُدھر دیکھنے کی ممانعت آئی ہے۔

امام مجاہدؒ، ابراہیم نخعیؒ اور امام زہریؒ نے قرآن کی آیت فِي صَلَاتِهِمْ خَاشِعُونَ کے معنے سکونِ اطراف بتائے ہیں۔ اسی خشوع کی کیفیت کو برقرار رکھنے کی خاطر نماز میں انگلیاں چٹخانا پسند نہیں کیا گیا۔ ارشاد ہے کہ انگلیاں نہ چٹخاؤ ـــــــ اس کی وجہ صاحب بدائع نے یہ لکھی ہے کہ یہ حرکت خشوع کے خلاف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نماز میں خشوع کی کیفیت تمام اعضاء و جوارح پر طاری ہونی چاہیے۔ ذہن حاضر ہو، نظریں نیچی ہوں، اعضاء پُرسکون ہوں۔ غرضیکہ سارے بدن سے ذلت، پستی، مسکنت، عاجزی اور خاکساری کے آثار نمایاں ہوں یہ خشوع کا وہ درجہ ہے جس کا ہر نمازی سے مطالبہ ہے اور اسی کے ذریعے ہم کسی کے دل کے خشوع کا فیصلہ کر سکتے ہیں۔ جیسے ہم کلمہ کے زبانی اقرار سے ایمان اور دل کی تصدیق کا فیصلہ کرتے ہیں ایسے ہی آواز کی آہستگی، نگاہوں کی پستی اور اعضاء کے سکون سے ہم یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ دل میں خشوع کی کیفیت موجود ہے۔ گویا شریعت نے ان مظاہر کو کسی کے خشوع جاننے کا پیمانہ مقرر کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے ان مظاہر کو لوازم خشوع میں شمار کیا ہے۔ علامہ شامیؒ لکھتے ہیں:

خشوع کے لوازم میں سے عجز کا اظہار، نگاہ کی پستی، آواز میں آہستگی اور اعضاء کا سکون ہے۔

بلکہ بعض علماء نے خشوع کے مظاہر پر خشوع کے اطلاقات دیکھ کر خشوع کو اعضاء و جوارح ہی کا عمل کہا ہے۔

خشوع کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ دل اللہ سبحانہٗ کی جناب میں عجز، جمعیت اور سکون کی سوغات لے کر پیش ہو۔ اور اللہ سبحانہٗ کی محبت اور عظمت کا چراغ قلب میں روشن ہو۔

یہ درجہ اونچے لوگوں کے لیے ہے۔ یہ مقام محض طاعت، محض تذلّل، محض فرمانبرداری اور محض نگاہوں کے نیچے کرنے اور آواز پست کرنے کا نہیں ہے۔ یہ وجدان سے گزر کر عرفان کا درجہ ہے جو یہاں تک پہنچتا ہے اس کے مقام کی بلندیوں کو بحث و نظر اور علمی کاوشوں سے ناپا نہیں جا سکتا۔ یہ خود کرنے اور پانے کا معاملہ ہے بتلانے اور سمجھانے کا معاملہ نہیں ہے۔

قانونی نقطۂ نظر سے اس درجہ کا عوامی زندگی کی نماز میں صرف اسی قدر حصّہ ہے جس کی طرف فقہا میں سے علامہ شامیؒ نے اشارہ کیا ہے۔

دل کا سب سے یکسو ہو کر نماز میں لگ جانا اس طرح کہ جو کچھ کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے اسے اس کا علم ہو۔ یہ فرقِ مراتب اور درجات کا تفاوت رکھ کر اسلام نے مختلف استعدادوں اور صلاحیتوں کے لیے درجہ بدرجہ سیرابی کا سامان کر دیا ہے۔ عوام کے لیے خشوع کا پہلا مرتبہ کافی ہے خواص کے لیے دوسرا مرتبہ ضروری ہے جیسے حیوان اور انسان کے افعال میں فرق ہے اور جیسے مومن و کافر کے اعمال میں تفاوت ہے، ٹھیک اسی طرح استعداد، صلاحیت، طلب اور محنت کے لحاظ سے عام مومنین اور خاص مومنین کے درمیان فرق ہے۔ نماز سب کی ایک ہے۔ لیکن نیت سب کی الگ الگ ہے۔ ہر طالب کے حصّے میں اس کی استعداد اور محنت کے مطابق خشوع اور اس کی سرشاری کی کیفیت آتی ہے۔

اس آیت کا مقصد مخاطبوں کو یہ بتانا نہیں ہے کہ نماز میں خشوع ہو گا تو زندگی خشوعی ہو جائے گی بلکہ لوگوں کو یہ سمجھانا ہے کہ اسلام کے لیے زندگی خشوعی ہو گی تو نماز آسان ہو جائے گی۔ اس میں زور زندگی کے خشوعی بنانے پر ہے۔ اسی بنا پر خاشعین کی تشریح یہ کی ہے کہ جن کو اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں حضوری کا خوف ہو اور اللہ سبحانہٗ سے ملنے کا شوق ہو۔

خشوعی زندگی کا یہ مطالبہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اسلام سیاسی حیثیت سے اس کے ذریعے مخلصین اور منافقین کے درمیان امتیاز پیدا کرنا چاہتا ہے۔ قانون ان دونوں میں کوئی امتیاز نہیں کر سکتا تھا۔ نماز کو خاص طور پر پیش کیا اس کے ذریعے ان دونوں گروہوں میں حدِ فاصل قائم ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اسی فریضہ میں سستی کو منافقین کی خاص نشانی بتایا ہے اور اسی بنا پر یہاں فرمایا:

وَاِنَّهَا لَكَبِيْرَةٌ اِلَّا عَلَى الْخٰشِعِيْنَ

يٰبَنِىٓ اِسْرَآءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِىَ الَّتِىٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ۝

اے بنی اسرائیل! میری نعمتیں یاد کرو جن سے میں نے تمہیں نوازا تھا۔ اور اس بات کو کہ میں نے دُنیا کی ساری قوموں پر تمہیں فضیلت[۱۲۲] دی تھی۔

انعام کی تفصیل

اب تک جو کچھ اجمالاً کہا گیا ہے یہاں سے اس کی تفصیل ہے۔ یہاں انعام کے ساتھ بنی اسرائیل کی فضیلت بھی بیان کی گئی ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ بنی اسرائیل کا تعارف یہاں مذہب یہود کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک مخصوص قوم اور نسل کی حیثیت سے پیش ہو رہا ہے۔ بنی اسرائیل کسی مذہب یا فرقہ کا نام نہیں۔ اس لیے یہاں یہودی مذہب کی فضیلت نہیں اسرائیلی نسل کی ہو رہی ہے۔

۱۲۲ چونکہ تقویٰ اور کمالِ ایمان کا حاصل کرنا صبر و حضور استغراقِ عبادات کے ذریعے سے دُشوار تھا اس لیے اس کا آسان طریقہ تعلیم فرماتے ہیں اور وہ شکر ہے۔ اس بنا پر حق تعالیٰ اپنے احسانات اور انعامات جو اُن پر وقتاً فوقتاً ہوتے تھے ان کو یاد کراتے ہیں اور ان کی بدکرداریاں بھی ظاہر فرماتے ہیں۔ انسان بلکہ حیوان تک میں یہ صفت موجود ہے کہ اپنے منعم کی محبت اور اس کی اطاعت دل نشین ہو جاتی ہے اور چند رکوع میں اس کی شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے[۱]

یہ اس دور کی طرف اشارہ ہے جب کہ تمام دُنیا کی قوموں میں ایک بنی اسرائیل کی قوم ہی ایسی تھی جس کے پاس اللہ کا دیا ہوا علم تھا اور جسے اقوام کا امام و رہنما بنایا گیا تھا تاکہ وہ بندگیٔ رب کے راستے پر سب قوموں کو بلائے اور چلائے[۲]

---

۱ حاشیہ شیخ الہندؒ ص۱۰　۲ تفہیم القرآن ج ۱ ص ۷۴

اس آیت میں اگرچہ خطاب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے کے یہودیوں کو ہے مگر عموماً ایسا ہوتا ہے کہ باپ دادا پر جو احسان واکرام کیا جاتے اس سے اس کی اولاد بھی فائدہ حاصل کرتی ہے اس لیے ان کو ہی اس آیت میں مخاطب بنا لیا ہے [1]

معیارِ فضیلت

سوال یہ ہے کہ اس نسل کی فضیلت کا اعلان سارے عالم پر کس معنے میں ارشاد ہوا ہے اور وہ کون سی ایسی نعمت تھی جو بحیثیت نسل بنی اسرائیل کے ساتھ بلا شرکت غیرے مدتوں مخصوص رہی۔ اگر دولت، حکومت، تجارت یا کثرتِ آبادی اس کی بنیاد ہے تو اوّل تو یہ انعام خود اس درجہ کے نہیں ہیں کہ ان کا ذکر اس اہتمام سے کیا جاتے اور اسی کو معیارِ فضیلت قرار دیا جاتے: ثانیاً یہ نعمتیں اور بہت سی قوموں کو اپنے اپنے وقت میں نصیب ہو چکی ہیں۔ کلدانیہ، مصر، ہندوستان، ان سب ملکوں کا تمدن اپنے زمانے میں اسرائیلیوں سے پہلے عروج پر رہ چکا ہے۔ اور تاریخ کا بیان ہے کہ ان قوموں کا دنیوی جلال اسرائیلیوں سے کچھ زیادہ ہی رہا ہے۔ پھر آخر اسرائیلیوں کی وہ مخصوص فضیلت کیا تھی؟ تاریخ کی زبان سے جواب ایک ہی ملتا ہے کہ وہ دولت صرف اللہ کی توحید کی نعمت تھی۔ دنیا کی تاریخ کے جس دور میں ساری قومیں اور ساری نسلیں کم وبیش شرک میں مبتلا تھیں۔ یا اس کی طرف سے ہٹی چلی جارہی تھیں۔ یہ نسلِ اسرائیل ہی ایک ایسی قوم تھی جو من حیث القوم توحید کی علمبردار تھی۔ عقیدۂ توحید اور عقیدۂ رسالت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ رسالت کی قائل صرف وہی قوم ہوگی جس کا عقیدۂ توحید واضح و پختہ ہوگا۔ اور انبیاء ورسل جہاں تک کسی نسل کا تعلق ہے نسلِ اسرائیل ہی میں مسلسل پیدا ہوتے رہے۔ ہاں متفرق طور پر کسی دوسری نسل میں بھی کبھی کبھی پیدا ہو گئے ہوں تو وہ اس کے منافی نہیں۔ یہاں ذکر افراد کا نہیں بلکہ نسل وقوم کا ہو رہا ہے۔ دنیا کی ساری قوموں میں جس وقت اوتاروں کا ظہور ہو رہا تھا اور دنیا کی قومیں عناصر پرستی، مظاہر پرستی، دیوتا پرستی، بت پرستی غرض شرک ہی کی کسی نہ کسی شکل میں گرفتار تھیں۔ بنی اسرائیل اس وقت دنیا میں توحید کے علمبردار تھے [2]

دوسرے مفسرین کا بھی اس معاملہ میں اسی طرف میلان ہے۔ مصر کے مشہور مفسرِ قرآن

---

[1] معارف القرآن م ش صفحہ ۱۹۶ [2] تفسیر ماجدی صفحہ ۳۰

رشید رضا کہتے ہیں ا،

قوموں پر فضیلت کی بنیاد اگر انبیاء کی کثرت ہے تو یہ بنی اسرائیل کی وہ خصوصیت ہے کہ دنیا کی کوئی قوم اس معاملہ میں بنی اسرائیل کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی. لیکن یہ فضیلت اس معاملہ میں فیصلہ کن نہیں ہے کہ نسلِ اسرائیل کا ہر ہر فرد اس کی وجہ سے فضیلت سے ہمدوش ہو گیا ہے۔ اور اگر تفضیل کی بنیاد قربِ الٰہی ہے تو پھر یہ فضیلت صرف بنی اسرائیل کے انبیاء اور ان لوگوں کی ہوگی جو ان کے زمانے اور ان کے بعد ان کے نقشِ قدم پر چلے ہیں۔

اہلِ عالم پر فضیلت کا یہ مطلب ہے کہ جس وقت سے بنی اسرائیل کا وجود ہوا تھا اس وقت سے لے کر اس خطاب کے نزول تک تمام فرقوں سے افضل رہے ہیں۔ کوئی ان کا ہم پلہ نہ تھا جب انھوں نے نبی آخر الزماں اور قرآن کا مقابلہ کیا تو وہ فضیلت ختم ہو کر مغضوبیت میں تبدیل ہو گئی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کو خیرِ اُمّت کا لقب ملا۔

تفضیل کو یہاں پیش کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ ان کو سمجھ لینا چاہیے کہ جس ذاتِ کبریا نے ان کو ماضی میں فضیلت دی تھی وہ ذاتِ قدوس اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اُمّت کو فضیلت دے رہی ہے۔

اور یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ ان کو حاملِ علومِ نبوت کی حیثیت سے نبوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کرنا چاہیے۔ ماضی میں استقبال ہی ان کی فضیلت کی بنیاد رہی ہے۔ دنیا کی قوموں کے مقابلے میں تمہیں قرآن کی آیات اور نبوت کی پیش کش پر زیادہ غور و فکر سے کام لینا چاہیے اور ایمان میں سبقت کرنی چاہیے کیونکہ بزرگی اور فضیلت کا تقاضا یہی ہے کہ فضائل کی طرف قدم اٹھیں اور نیکیوں میں پیش پیش ہوں۔

لہ حاشیہ شیخ الہند صلا

وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَيْئًا وَّلَا يُقْبَلُ

مِنْهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ

اور دیکھو اللہ کے حضور میں پیش ہونے والے دن سے ڈرو جب کہ کوئی کوشش انسان کو اللہ کی گرفت سے نہ بچا سکے گی۔ نہ تو کوئی شخص دوسرے شخص کے کام آئے گا اور نہ کسی کی کوئی شفاعت قبول ہوگی اور نہ کسی سے کوئی بدلہ قبول کیا جائے گا اور نہ کہیں سے کوئی امداد دستیاب ہوگی [۱۲۳]

آخرت کی باز پرس

یہودیوں کی جماعتی سرگرانی زیادہ تر نسلی غرور کا نتیجہ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ہیں اور تورات میں ہے کہ خدا نے ان کی نسل کو برکت دی۔ قرآن اس آیت میں بتانا چاہتا ہے کہ یوم الجزا میں یہ غرور کام نہ آئے گا۔ آیت کے ایک ایک فقرے میں کسی نہ کسی اسرائیلی عقیدے کا رد ہے۔ یہودی مصریوں اور یونانیوں کی طرح آخرت کی زندگی کو دنیا پر قیاس کرتے تھے اور اس غلط فہمی کا شکار تھے کہ آخرت میں مجرم کو کچھ دے دلا کر یا کسی کی سفارش کرا کے چھڑایا جا سکتا ہے —— قرآن نے ان آیات میں ان کی اسی غلط فہمی کا ازالہ کیا ہے۔

[۱۲۳] جب کوئی کسی بلا میں گرفتار ہوتا ہے تو اس کے ساتھی اکثر یہی کیا کرتے ہیں کہ اول تو اس کے ادائے حق لازم میں کوشش کرتے ہیں۔ یہ نہیں ہو سکتا تو سعی و سفارش کرتے ہیں۔ یہ بھی نہ ہو سکے تو پھر تاوان، جرمانہ اور فدیہ دے کر چھڑاتے ہیں۔ اگر یہ بھی نہیں ہو سکتا تو بالآخر اپنے مددگاروں کو جمع کر کے اس کی نجات کی فکر کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اسی ترتیب کے موافق ارشاد فرمایا کہ کوئی شخص گو کیسا ہی مقرب خداوندی ہو مگر کسی نافرمان عدو اللہ کا ذکر منجملہ چاروں صورتوں کے کسی صورت سے نفع نہیں پہنچا سکتا۔ بنی اسرائیل کہتے تھے کہ ہم کیسے ہی گناہ

کریں ہم پر عذاب نہ ہوگا۔ ہمارے باپ دادا جو پیغمبر ہیں ہمیں بخشوالیں گے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ خیال تمہارا غلط ہے۔ اس سے اس شفاعت کا انکار نہیں نکلتا جس کے اہل السنت قائل ہیں اور جو دیگر آیات میں مذکور ہے[1]

اس دن سے مراد یوم قیامت ہے۔ قیامت کی یاد بڑے حکیمانہ موقع پر دلائی گئی ہے۔ حشر و نشر، جزا و سزا کا عقیدہ جو انسان کے دل میں مسئولیت اور ذمہ داری کی روح ہے۔ اسرائیلیوں کے دلوں ہی سے نہیں بلکہ ان کی مقدس کتابوں اور نوشتوں تک سے بھی مٹ چکا تھا۔ روزِ قیامت کے یہاں جو اوصاف بیان کیے گئے ہیں سب میں کسی نہ کسی اسرائیلی عقیدے کا رد ہے۔ کوئی شخص کسی شخص کے کام نہ آئے گا۔ اس میں اس اسرائیلی عقیدے کی تردید ہے جو آج تک جیوش انسائیکلو پیڈیا میں ان الفاظ میں لکھا ہوا ہے۔ بہت سے لوگ اپنے اسلاف کے اور بہت سے اپنے اخلاف کے اعمالِ حسنہ کی بنا پر بخش دیے جائیں گے۔ (ج ۶ ص ۶۱) اور کوئی سفارش قبول نہ کی جائے گی۔ اس میں بھی اس اسرائیلی عقیدے کی تردید ہے کہ عمل اور عقیدے کیسے ہی ہوں پھر بھی اپنے بزرگ سفارش کر کے بخشوا ہی لیں گے۔ شفاعت اور ایک شفیع منتقل کا بھی مبالغہ آمیز تخیل ہے جس نے عیسائیوں میں آکر انتہائی شکل اختیار کر لی اور کفارے ہی کی طرح شفاعت پر بھی مسیحیت کی بنیاد ہے۔ اور کسی سے کوئی معاوضہ نہ لیا جائے گا۔ اس میں بھی اصلی ضرب یہودی اور مسیحی عقیدہ کفارہ پر ہے۔ مسیحیوں کے یہاں عقیدۂ کفارہ کی اہمیت تو ظاہر ہی ہے لیکن خود یہودی بھی ایک بڑی تعداد میں اسی عقیدۂ کفارہ سے متاثر ہو کر اس کے قائل ہو گئے تھے[2]

آیت میں جس یوم کا ذکر ہے اس سے قیامت کا دن مراد ہے۔ مطالبہ ادا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً کسی کے ذمہ نماز، روزے کا مطالبہ ہے اور دوسرا کہہ دے کہ میری نماز لے کر اس کا حساب بے باق کر دیا جائے اور معاوضہ یہ کہ کچھ مال وغیرہ دے کر بچا لادے۔ دونوں باتیں نہ ہوں گی اور سفارش میں بغیر ایمان کی قید اس لیے ہے کہ دوسری آیتوں سے معلوم ہوا ہے[3]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ صلا [2] تفسیر ماجدی صلا [3] معارف القرآن م ش ص ۱۶۶

نجاتِ متوارث کا عقیدہ

بنی اسرائیل کی گمراہی کی ایک بہت بڑی وجہ یہ تھی کہ آخرت کے متعلق ان کے عقیدے میں خرابی آگئی تھی۔ اور اس قسم کے خیالاتِ خام میں مبتلا ہوگئے تھے کہ ہم جلیل القدر انبیاء کی اولاد ہیں۔ بڑے بڑے اولیاء صلحاء اور زہاد سے نسبت رکھتے ہیں۔ ہماری بخشش تو ان ہی بزرگوں کے صدقے میں ہو جائے گی۔ ان کا دامن گرفتہ ہو کر بھلا کوئی سزا کیسے پا سکتا ہے۔ ان ہی جھوٹے بھروسوں نے ان کو دین سے دور اور گناہوں کے چکر میں مبتلا کر دیا تھا۔ اس لیے انعام یاد دلانے کے ساتھ فوراً ان کی غلط فہمیوں کو دُور کیا گیا ہے[1]

آیئے پوری آیت پر ایک جامع نظر ڈال لیجئے۔

آیت میں چار باتیں بتائی گئی ہیں۔

اوّل روزِ قیامت میں فیصلے کا مدار ایمان و عمل ہوگا۔ کوئی شخص کسی شخص کے کام نہ آئے گا۔ دُنیا میں اگر کوئی شخص مبتلا ہوتا ہے یا کسی جُرم کی پاداش میں مجرم کی حیثیت سے قانون کے سامنے آتا ہے تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اگر مجرم کا باپ دادا یا اوپر کا کوئی اور دور نزدیک کا رشتہ دار یا دُنیا کے لحاظ سے بڑا با اثر با رسُوخ آدمی، کہ لوگ اس کے دنیوی کارناموں سے متاثر ہوں تو ایسے شخص سے تعلق رکھنے والے کو اس انتساب اور تعلق کی بنا پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص کسی شخص کے کام نہ آئے گا اور کسی کو کسی کی وجہ سے نہ چھوڑا جائے گا۔ اور کسی کو کسی کی پاداش میں سزا نہ دی جائے گی۔

دوم یہ کہ اس روز کسی کے بارے میں کوئی شفاعت قبول نہ کی جائے گی۔ یعنی کسی با اثر اور صاحبِ اقتدار کی سفارش سے مجرم کی سزا اس دن معاف نہ ہوگی۔ یہودی آخرت کے معاملات کو دُنیا پر قیاس کرتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جیسے بادشاہ دیگر اُمراء کا کہنا مان لیتا ہے کیونکہ وہ اراکینِ سلطنت ہیں اور ان کے ناراض ہونے سے حکومت کا نظم و نسق تباہ ہونے کا اندیشہ ہے۔ اسی طرح اللہ سبحانہٗ بھی یہ خیال کر کے کہ ان کو ناراض نہ کرنا چاہیے انبیاء اور اولیاء کی شفاعت مان لے گا۔ اس قسم کی شفاعت کو شفاعتِ وجاہت کہتے ہیں۔ یعنی انبیاء اور اولیاء کی جاہ

---

[1] تفہیم القرآن ص۸۲

کی وجہ سے ان کی بات مانی جائے۔
شفاعت کی دوسری صورت وہ یہ سمجھے ہوئے تھے جیسے دُنیا میں بادشاہ کسی کی محبت کی وجہ سے اُسے ناراض کرنا نہیں چاہتا۔ اللہ سبحانہٗ بھی انبیاء اور اولیاء کو ناراض کرنا گوارا نہیں کرے گا اور ہماری اس طرح بخشش ہو جائے گی۔ قرآن نے شفاعت کی ان دونوں قسموں کی اس آیت میں نفی کی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کے دربار میں نہ وجاہت کی شفاعت قبول کی جائے گی اور نہ محبت کی۔

شفاعت کا اسلامی تصور

اسلام نے شفاعت کا جو تصور پیش کیا ہے وہ ان دونوں سے جُداگانہ ہے اور اس کا آیت میں کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اس کے تفصیلی مباحث تو آپ کو سولہویں پارے میں ملیں گے۔ مگر یہاں اتنا سمجھ لیجئے کہ قرآن یہ تسلیم کرتا ہے کہ خدا کے نیک بندے اپنے دوسرے گنہگار بھائیوں کے حق میں بشرطیکہ وہ گنہگار ہوں، کافر و مشرک نہ ہوں، شفاعت کریں گے۔ قرآن نے اس کی دو اہم اور بنیادی شرطیں بتائی ہیں۔
ایک یہ کہ شفاعت وہ کرے گا جسے اللہ شفاعت کا حکم دے گا۔
دوم یہ کہ شفاعت ان کے حق میں ہو سکے گی جن کے حق میں اللہ شفاعت کی اجازت دیں گے بلکہ خود انبیاء بھی شفاعت ان ہی کی کریں گے جن کی شفاعت خدا خود چاہے گا
وَلَا يَشْفَعُوْنَ إِلَّا لِمَنِ ارْتَضٰى
دربارِ خداوندی میں اسی قسم کی شفاعت ہوگی۔ قرآن حکیم میں جس نبی یا ولی کی شفاعت کا ذکر ہے وہ یہی شفاعت ہے۔
جب صورتِ حال یہ ہے کہ وہی شفاعت کریں گے جن کو اللہ تعالیٰ اس کی اجازت دیں گے اور وہ ان کی ہی شفاعت کریں گے جن کی شفاعت کرانا خود اللہ کو منظور ہوگا تو حقیقت میں خود اللہ سبحانہٗ اپنے دربار میں آپ شفیع ہوگا۔ یا صوفیا کی زبان میں یوں کہو کہ جلالِ الٰہی کی بارگاہ میں اللہ کی صفت کریمی و رحیمی خود شفیع بن کر کھڑی ہو جائے گی۔
سوم یہ کہ کسی سے کوئی بدلہ قبول نہ کیا جائے گا۔ بعض اوقات کچھ دے دلا کر مجرم کو بری کرا لیا جاتا ہے۔ قرآن نے اس نظریہ کی بھی تردید کر دی ہے کہ وہاں کسی مجرم کو

رشوت یا نذرانہ لے کر نہ چھوڑا جائے گا۔ اس کی بارگاہ میں کوئی رشوت نہ چلے گی خواہ اس کی مقدار کچھ ہو۔

فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْ اَحَدِهِمْ مِّلْءُ الْاَرْضِ ذَهَبًا

روئے زمین بھر کر بھی سونا فدیہ میں دے گا تو قبول نہ کیا جائے گا۔

"لَا يُؤْخَذُ مِنْهَا عَدْلٌ" میں اسی کا ذکر ہے۔

چہارم یہ کہ طاقت کے بل بوتے پر کوئی آکر چھڑا لے گا۔ آخری فقرے میں اس کی بھی نفی فرما دی کہ وہاں کہیں سے کسی قسم کی مدد پہنچنے کا کوئی امکان بھی نہیں ہے۔

وَإِذْ نَجَّيْنٰكُم مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُومُونَكُمْ سُوٓءَ الْعَذَابِ يُذَبِّحُونَ اَبْنَآءَكُمْ
وَيَسْتَحْيُونَ نِسَآءَكُمْ ۚ وَفِىْ ذٰلِكُم بَلَآءٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَظِيمٌ

اور اپنی تاریخ کا وہ واقعہ بھی یاد کرو جب ہم نے تمہیں فرعونیوں[124] سے بچا لیا تھا جو تمہیں نہایت سخت عذاب[125] میں ڈالے ہوتے تھے۔ تمہارے لڑکوں کو بے دریغ ذبح[126] کرتے تھے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رہنے دیتے تھے اور اس میں تمہارے پروردگار کی جانب سے بہت ہی بڑی آزمائش تھی[127]۔

غلامی سے نجات

یہاں سے جن واقعات کی طرف اشارات کیے گئے ہیں وہ سب بنی اسرائیل کی تاریخ کے مشہور واقعات ہیں اس لیے تفصیل بیان کرنے کے بجائے ایک ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ میں دو قسم کے واقعات ہیں۔ ایک وہ جن کا تعلق ان ایام و وقائع سے ہے جو اُن کے اور فرعون کے درمیان گزرے۔ دوسرے وہ جو اُن کے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے درمیان گزرے۔ یہاں دونوں ملے جلے پیش کیے گئے ہیں۔ پہلی قسم کے واقعات میں یہ بتانا مقصود ہے کہ تم پر اللہ کے یہ یہ احسانات ہیں۔ اور دوسری قسم کے واقعات میں یہ جتانا ہے کہ تمہارے یہ کرتوت ہیں جو تم ان احسانات کے جواب میں کرتے رہے۔ اور مدینہ کی ابتدائی زندگی میں مسلمانوں کو یہ داستان اس لیے سنائی جا رہی ہے کہ ان پر یہ حقیقت واضح ہو جائے کہ دعوت حق کی مخالفت ہمیشہ طاقتور جماعتوں نے کی ہے اور ہمیشہ ناکام رہی ہیں اور اس کا بھی پتہ لگ جائے کہ ایک نئی ہدایت یافتہ جماعت کو راہِ عمل میں کیسی کیسی لغزشیں پیش آ سکتی ہیں تاکہ پیروانِ دعوت ان سے اپنی نگہداشت کر سکیں۔

[124] آلِ فرعون کا ترجمہ ہم نے اس لفظ سے کیا ہے۔ اس میں خاندانِ فراعنہ اور مصر کا

حکمران طبقہ دونوں شامل ہیں[1]

آل لغت میں اہل کا مترادف ہے۔ اس سے مراد اہل وعیال، اتباع، ہم مذہب، ہم خیال اور ہم نسب ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ اہل کا استعمال عام ہے اور آل صرف خصوصیت اور اہمیت رکھنے والوں کے لیے آتا ہے[2]

فرعون۔ یہ کسی متعین بادشاہ کا ذاتی نام نہیں ہے۔ یہ قدیم شاہان مصر کا لقب ہے۔ تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہو کر عہد سکندر تک فراعنہ کے اکتیس خاندان مصر پر حکمران رہے ہیں۔ سب سے آخری خاندان فارس کی شہنشاہی کا تھا جو ۳۳۲ قبل مسیح سکندر کے ہاتھوں مغلوب ہوا۔ ان میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون عمالقہ کے خاندان سے تھا جو دراصل عرب خاندانوں کی ایک شاخ ہے۔ مشہور مؤرخ ابن قتیبہ لکھتا ہے،

اہل عرب ہی میں سے عمالیق ہیں۔ یہ متعدد قوموں کے مجموعہ تھے جو ممالک میں منتشر ہو کر پھیلے۔ منجملہ ان کے مصر کے فراعنہ ہیں۔

ابن خلدون کا بیان ہے؛

ان قوموں میں بہت سے بادشاہ ہوئے ان کی عرب میں حکومتیں تھیں جن کے کچھ قبائل کا سلسلہ حکومت مصر اور شام تک وسیع ہو گیا تھا۔

زمانۂ موسیٰ علیہ السلام کا فرعون

یہ سوال کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا فرعون کون ہے؟ بے حد اہمیت رکھتا ہے ——
عام مؤرخین عرب اور مفسرین قرآن اس کو بھی عمالقہ ہی کے خاندان کا فرد بتاتے ہیں۔ لیکن انگریز مؤرخین کا خیال ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم عصر کوئی ایک بادشاہ نہیں ہوا۔ یکے بعد دیگرے دو بادشاہ ہوئے ہیں۔ اگر یہ صحیح ہے تو اسے قرآن کا اعجاز کہیے کہ وہ بجائے شخصی نام کے عمومی لفظ لایا ہے جس کے بعد شخصیتوں کے ایک یا دو ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ لیکن یہ بھی ان کی رائے ہے۔ اب جدید مصری اثری تحقیقات اور حجری کتبات کے پیش نظر اس سلسلے میں جو انکشاف ہوا ہے یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام

---

[1] تفہیم القرآن ص۵، [2] تفسیر ماجدی ص۲۱

کے زمانے کا فرعون رعمسیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے۔ اس تحقیقی روایت کے بارے میں احمد یوسف احمد آفندی نے ایک مستقل مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔ یہ مصری دارالآثار کے مصوّر ہیں اور اثری تحقیقات کے بہت بڑے عالم ہیں۔ ان کے اس مقالہ کا خلاصہ علامہ عبدالوہاب نجار نے قصص الانبیاء میں نقل کیا ہے جس کا حاصل یہ ہے۔ جس فرعون نے بنی اسرائیل کو مصائب میں مبتلا کیا وہ یہی رعمسیس ثانی ہے۔ یہ مصر کے حکمرانوں کا انیسواں خاندان تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے زمانے میں پیدا ہوئے اور اسی کی آغوش میں پرورش پائی۔ تاریخِ اثریات سے پتہ چلتا ہے کہ اسیوی قبائل جو مصر کے قریب آباد تھے۔ ان کے اور فراعنہ کے اس خاندان کے درمیان پیہم نو سال تک سخت پیکار رہی۔ بدیں وجہ یہ قرینِ قیاس ہے کہ رعمسیس دوم نے اس اندیشہ سے کہ کہیں اسرائیلی قیادت پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ اسرائیلیوں کو ان مصائب میں مبتلا کرنا ضروری سمجھا جن کا ذکر توریت اور قرآن میں ہے۔ رعمسیس دوم اس زمانے میں بہت بوڑھا ہو چکا تھا اس لیے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے منفتاح کو شریکِ حکومت کر لیا تھا۔ رعمسیس کی اولاد میں سے یہ تیرھواں لڑکا تھا۔ لہٰذا منفتاح ہی وہ فرعون ہے جس کو حضرت موسیٰ و ہارون علیہما السلام نے دعوتِ اسلام دی اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیا[1]

غالباً من آلِ فرعون کی تعبیر میں بھی قرآن کا اعجازی اشارہ یہی ہے۔ قرآن اس آیت میں اسی سے بنی اسرائیل کو بچا لینے کے انعام کو یاد کرا رہا ہے۔ مؤرخین کا خیال ہے کہ سارے اسرائیل مصر سے دفعۃً نہیں نکلے تھے۔

۱۲۵ بلکہ رفتہ رفتہ اور مختلف ٹولیوں میں نکلے تھے۔ اور ان کا سب سے آخری اور بڑا دستہ وہ تھا جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں روانہ ہوا۔ اگر تاریخ نے کبھی مورخین کے اس خیال کی تصدیق کر دی تو قرآن کے لفظ نَجَّيْنَا کے باب تفعیل سے لانے کی اعجازی شان کا ظہور ہو گا۔ سید انور شاہؒ نے صحیح لکھا ہے کہ قرآن حکیم کا اعجاز صرف مقاصدِ حقائق ہی میں نہیں بلکہ مفردات میں بھی ہے۔ مفردات میں وہ لفظ اختیار کرتا ہے جس سے ادنی بالحقیقۃ اور ادنی بالمقام کوئی پیش نہیں کر سکتا[2]

---

[1] قصص القرآن ج ۱ ص ۳۳۱ [2] مشکلات القرآن ص ۶۷

فرعون کے مظالم

۱۲۶ نہایت سخت عذاب میں ڈالے ہوئے تھے۔ یہ یَسُوْمُوْنَکُمْ سُوْٓءَ الْعَذَابِ کا ترجمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظالم و جابر حکمرانوں کی طرح تمہیں رعایا بناتے ہوئے تم سے اوپر طرح طرح کی سختیاں کرا رہے تھے۔ دراصل مصر کے لوگ اپنے آپ کو متمدن اور ترقی یافتہ سمجھتے تھے اور سب کو حقارت کی نظر سے دیکھتے تھے۔ خصوصاً اسرائیلی ان کی نگاہوں میں بڑے ہی ذلیل تھے۔ انہیں چرواہا کہہ کر پکارتے تھے اور اس قابل نہ سمجھتے کہ اپنی مجلسوں میں جگہ دیں۔ یہ بات بھی ان میں عام تھی کہ کوئی مصری اسرائیلی کے ساتھ ایک دستر خوان پر کھانا نہ کھائے۔ اور مصر کے دیہاتی بھی انہیں اس درجہ بُرا سمجھتے کہ اپنی آبادیوں میں ان کا بسنا گوارا نہ کرتے تھے[1]

(پیدائش ۴۶-۳۴، ۴۳-۳۲)

توریت میں ہے مصریوں نے خدمت کروانے میں بنی اسرائیل پر سختی کی اور انہوں نے سخت محنت سے گارے اور اینٹ کا کام کیا اور سب خدمت کھیت کی کروا کے ان کی زندگی تلخ کی۔ ان کی ساری خدمتیں جو وہ ان سے کراتے تھے مشقت کی تھیں۔ (خروج ۱۲-۱۴)

قرآن حکیم اور تورات کے بیان کا یہ فرق قابلِ غور ہے کہ تورات نے حاکمانہ سخت گیریوں کو سارے مصریوں کا کام بتایا ہے جبکہ قرآن اسے محتاط اور صادقانہ لہجے میں صرف فرعونیوں کا کردار بتا رہا ہے۔ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں۔[2]

فرعون نے خواب دیکھا تھا۔ نجومیوں نے اس کی تعبیر دی کہ بنی اسرائیل میں ایک شخص پیدا ہوگا جو تیری سلطنت کو غارت کر دے گا۔ فرعون نے حکم دیا کہ بنی اسرائیل میں جو بیٹا پیدا ہو اُسے مار ڈالو اور جو بیٹی پیدا ہو اُسے خدمت کے لیے رہنے دو۔ خداتعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیدا کیا اور زندہ رکھا۔[3]

تورات میں یہ اور اضافہ ہے کہ فرعون نے دایہ مقرر کر دی تھی کہ قلمرو مصر میں جس اسرائیلی کے یہاں لڑکا پیدا ہو اُسے قتل کر دیا جائے مگر ان عورتوں کے دل میں ایسی ہمدردی پیدا ہوئی کہ انہوں نے اس عمل کے لیے کوئی اقدام نہیں کیا اور جب فرعون نے باز پرس کی تو یہ معذرت

---

[1] ترجمان القرآن صـ۲۵۰ [2] تفسیر ماجدی صـ۲۱ [3] حاشیہ شیخ الہندؒ صـ۱۰

پیش کر دی کہ اسرائیلی عورتیں شہری عورتوں کی طرح نازک اندام نہیں ہیں۔ وہ خود ہی بچہ جن لیتی ہیں، اور ہمیں مطلق خبر نہیں ہوتی ہے۔ اس پر فرعون نے ایک جماعت کو اس لیے مقرر کیا کہ وہ تفتیش و تلاش کے بعد اسرائیلی لڑکوں کو قتل کریں اور لڑکیوں کو چھوڑ دیں [1]

[۲۱] اس میں تمہارے پروردگار کی جانب سے بڑی آزمائش ہے۔ آزمائش بلا کا ترجمہ ہے۔ بلا ایک سے زیادہ معنی میں بولا جاتا ہے۔ اگر ذالکم کا اشارہ ذبح کی طرف ہو تو اس کے معنی مصیبت کے ہیں۔ اور اگر اشارہ نجات کی طرف ہے تو یہ نعمت کے معنی میں ہے اور اگر اشارہ دونوں کی طرف ہو تو آزمائش کے معنی لیے جائیں گے [2]

یعنی آزمائش اس بات کی کہ اس بھٹی سے تم خالص سونا بن کر نکلتے ہو یا نری کھوٹ بن کر رہ جاتے ہو۔ اور آزمائش اس امر کی کہ اتنی بڑی مصیبت سے اس معجزانہ طریق پر نجات پانے کے بعد بھی تم اللہ کے شکر گزار بندے ہوتے ہو یا نہیں [3]

اس سارے واقعہ کو قرآن نے مضارع کے صیغوں کے ذریعے بیان کر کے اس طرح منظر کشی کی ہے گویا بنی اسرائیل فرعونی حکمرانوں کی سختیوں کا تختہ مشق بن رہے ہیں۔ ان کے بچے بے دریغ قتل ہو رہے ہیں۔ ان کی لڑکیاں زندہ ہیں اور فرعونوں کی خدمت انجام دے رہی ہیں۔ منظر کشی کے ذریعے اپنے مخاطبوں کو تاثر دینا معجزانہ انداز بیان ہے۔ اور قرآن کے ساتھ مخصوص ہے۔

---

[1] خروج ع ۱ آیات ۱۵۔ ۲۳

[2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۰ [3] تفہیم القرآن ص ۷۵

وَاِذۡ فَرَقۡنَا بِكُمُ الۡبَحۡرَ فَاَنۡجَيۡنٰكُمۡ وَاَغۡرَقۡنَاۤ اٰلَ فِرۡعَوۡنَ وَاَنۡتُمۡ تَنۡظُرُوۡنَ ۝

اور اس واقعہ کو یاد کرو جب[۱۲۸] ہم نے تمہاری خاطر سمندر[۱۲۹] کو پھاڑ کر راستہ بنایا تھا۔ پھر اس طرح تمہیں بچا لیا تھا۔ اور فرعونیوں کو تمہاری دیکھتی آنکھوں دریا بُرد کر دیا تھا۔[۱]

عظیم الشان معجزہ

اس آیت میں دوسرے انعام کا ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعون اور اس کی قہرمانیت کے مظالم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کو ایک عظیم الشان معجزے کے ذریعے نجات دی۔ فرعون اور فرعونیوں کے مظالم سے تنگ آکر بالآخر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قیادت میں بنی اسرائیل نے مصر کی سکونت ترک کر کے اپنے آبائی وطن شام و فلسطین کو جانا طے کر لیا۔ سفر مصری حکومت سے چھپ چھپا کر رات کے وقت شروع کیا۔ شب کی تاریکی میں بنی اسرائیل راستہ بھول گئے۔ بجائے اس کے کہ شمال کی طرف کچھ اور آگے بڑھ کر اپنے دائیں پر مشرق کی طرف مڑتے پہلے ہی اوپر گھوم پڑے۔ ادھر فرعون کو خبر ہو گئی وہ اپنے لشکر کی خود کمان کرتا ہوا تیزی سے تعاقب میں پہنچ گیا۔ اب اسرائیلیوں کے سامنے سمندر تھا۔ اور پشت پر فرعونی لشکر۔ قرآن نے اس آیت میں اسی تاریخی واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ سورۂ بقرہ سے پہلے نازل ہونے والی سورتوں میں اس کی تفصیلات آچکی ہیں۔

[۱۲۸] یعنی اے بنی اسرائیل اس انعام عظیم کو یاد کرو جب تمہارے باپ دادا فرعون کے ڈر سے بھاگے اور آگے دریا پیچھے فرعون کا لشکر تھا۔ اور ہم نے تم کو بچا لیا۔ فرعون اور اس کے لشکر کو غرق کر دیا۔ یہ قصہ آئندہ مفصل آئے گا۔[۱]

[۱۲۹] ۔ بحر سے مراد یہاں دریائے نیل نہیں بلکہ بحرِ قلزم یا بحرِ احمر ہے۔ دریائے نیل تو

---

[۱] حاشیہ شیخ الہند ص۱

بنی اسرائیل کے مسکن سے مغرب کی طرف واقع تھا۔ اور اسرائیلیوں کا راستہ شام کے لیے مشرق کی طرف تھا۔ مصر سے شام کی راہ کے قریب بحرِ قلزم ہے۔ اسی کے تنگ شمالی سرے کی جانب یہاں اشارہ ہے۔ اسرائیلیوں نے اسی کو عبور کرکے جزیرہ نمائے سینا میں قدم رکھا تھا۔

مقامِ عبور کیا تھا؟

اس بات کا فیصلہ قطعاً ناممکن ہے مقامِ عبور کیا تھا جس سے بنی اسرائیل گذرے اور دریا کو عبور کر گئے۔ کیونکہ اس سلسلے میں تاریخ کا پرانا ذخیرہ تورات ہے۔ البتہ قرآن اور تورات کی مشترک تصریحات سے یہ قطعی متعین کیا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل نے بحرِ قلزم کو کسی کنارے یا دہانے سے عبور کیا یا درمیانی کسی حصہ سے۔ اس کے لیے ایک مرتبہ نقشہ میں اس حصہ پر نظر ڈال لیجئے جہاں بحرِ قلزم یا بحرِ احمر واقع ہے۔ دراصل یہ بحرِ عرب کی ایک شاخ ہے جس کے مشرق میں سرزمینِ عرب واقع ہے اور مغرب میں مصر۔ شمال میں اس کی دو شاخیں ہو گئی ہیں۔ ایک شاخ خلیج عقبہ جزیرہ نمائے سینا کے مشرق میں اور دوسری شاخ خلیج سویز اس کے مغرب میں واقع ہے۔ یہ دوسری شاخ پہلی شاخ سے بڑی ہے اور شمال میں دور تک چلی گئی ہے۔ اس شاخ کے شمالی دہانے کے سامنے ایک سمندر واقع ہے جس کا نام بحرِ روم ہے۔ اور بحرِ احمر کے اس شمالی دہانے کے درمیان تھوڑا سا خشکی کا حصہ ہے۔ یہی وہ راستہ ہے جہاں سے مصر والوں کو فلسطین جانے کے لیے بحرِ احمر کو عبور نہیں کرنا پڑتا تھا اور اس زمانے میں یہ راستہ قریب ترین تھا۔ اسرائیلیوں نے یہ راستہ بحکمِ الٰہی اختیار نہیں کیا تھا۔ اب اسی خشک راستہ کو کھود کر بحرِ احمر کو بحرِ ابیض سے ملا دیا گیا ہے اور اب اس ٹکڑے کا نام سویز ہے[1]۔

اسرائیلیوں کے سمندر عبور کرنے کی زمانے کی تاریخ یقین کے ساتھ تو نہیں بتائی جا سکتی لیکن جدید تحقیقات کے مطابق پندرہویں صدی قبل مسیح کا وسط قرار دیا جا سکتا ہے بلکہ بعض نے جرأت کرکے ۱۴۴۷ قبل مسیح متعین کر دیا ہے۔

لشکرِ فرعون کی غرقابی

[130] تمہاری دیکھتی آنکھوں یعنی یہ سب کچھ تم دیکھ رہے ہو۔ یہاں بھی منظر کشی کی خاطر

---

[1] قصص القرآن ج ۱ ص ۳۶۲

مضارع کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ گویا سمندر آنکھوں کے سامنے پھٹ رہا ہے۔ سمندر کا پانی سمٹ کر دونوں طرف پہاڑ کی طرح دیوار بن کر کھڑا ہے۔ درمیان میں خشک راستہ ہے اور تم اس راستہ میں چل کر سمندر عبور کر کے سمندر کے کنارے کھڑے ہو۔ فرعون کی فوجیں فرعون کی قیادت میں سمندر میں داخل ہوتی ہیں لیکن ابھی درمیان ہی میں تھے کہ پانی کی کھڑی ہوئی دیواریں آناً فاناً آپس میں مل گئیں اور سمندر کا پانی پہلے کی طرح رواں ہو گیا اور تمہاری آنکھوں کے سامنے دیکھتے دیکھتے فرعون مع اپنے لاؤ لشکر کے غرق ہو گیا۔

آیت کا مقصود اس انعام الٰہی کی یاد دہانی ہے۔ یہ ایک انعام نہیں ہے۔ اس میں ایک سے زیادہ انعامات ہیں۔ سمندر کا پھٹنا، سمندر میں خشک راستہ نمودار ہونا، تمہارا بچ نکلنا، فرعونیوں کا غرق ہو جانا اور یہ سب کچھ تمہارے سامنے ہونا اللہ کے تم پر انعامات ہیں۔

اس موضوع پر دوسرے تفصیلی مباحث کے لیے آپ کو سورۃ الشعراء تک انتظار کی زحمت برداشت کرنی پڑے گی۔ بشرطِ حیات انشاءاللہ وہاں اس اعجازِ موسوی کے سارے پہلوؤں کو کھول کر بتایا جائے گا۔

بہر حال یہ ایسا عظیم معجزہ ہے جس نے وقت کی تمام مادی استبدادیت کو ایک لمحہ میں شکست دے کر مظلوم قوم کو ظالم کے پنجے سے دستگاری دلائی۔

وَاِذْ وٰعَدْنَا مُوْسٰٓى اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ۞ ثُمَّ عَفَوْنَا عَنْكُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۞ وَاِذْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَالْفُرْقَانَ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۞

اور وہ واقعہ بھی یاد کرو جب ہم نے موسیٰ[۱۳۱] سے چالیس[۱۳۲] راتوں کا وعدہ کیا تھا۔ تم نے ان کی غیر موجودگی میں بچھڑے کی پرستش کو اپنا لیا تھا اور تم جادہ حق سے ہٹ گئے تھے۔ لیکن اس کے باوجود ہم نے پھر بھی تم کو معاف کر دیا تھا تاکہ تم اللہ کے شکر گزار بن کر اس کے احسان کی قدر کرو اور جب موسیٰ نے چالیس راتوں کا وعدہ پورا کر لیا تو ہم نے موسیٰ کو کتاب یعنی تورات دی[۱۳۳] اور حق و باطل میں امتیاز[۱۳۴] کرنے والی قوت عطا فرمائی تاکہ تم کو طاعت و فرمانبرداری کی راہ معلوم ہو جائے۔

نظام شریعت

جب موسیٰ علیہ السلام اپنی قوم کو مصری حکومت کے پنجۂ غضب سے نکال لائے تو اب مشیت ایزدی یہ ہوئی کہ اس قوم کو پورا نظام شریعت اور دستور زندگی عطا ہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جزیرہ نمائے سینا کے ایک پہاڑ کی چوٹی کوہ طور پر نوشتہ غیبی لینے کی خاطر ایک چلہ کے لیے بلائے گئے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب نامہ

[۱۳۱] حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام سے جا ملتا ہے۔ سلسلۂ نسب یہ ہے۔ موسیٰ بن عمران بن قاہت بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام۔ تورات میں ہے کہ آپ کی عمر ایک سو بیس برس کی تھی۔ (استثنا ۳۴ : ۷-۱۲) آپ کا زمانہ مورخین اور اثریین کے تخمینہ کے مطابق پندرہویں اور سولہویں صدی قبل مسیح کا ہے۔ سال ولادت

غالباً سنہ ۱۵۲۰ قبل مسیح اور سالِ وفات سنہ ۱۴۰۰ قبل مسیح ہے۔

۱۳۲؎ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ سبحانہٗ کا وعدہ تھا کہ جب بنی اسرائیل مصری حکومت کی غلامی سے آزاد ہو جائیں گے تو تم کو شریعت دی جائے گی۔ اب وہ وقت آگیا کہ اللہ کا وعدہ پورا ہو اس لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام وحیٔ الٰہی کے اشارے سے طور پر پہنچے اور وہاں عبادتِ الٰہی کے لیے اعتکاف کیا۔ اس اعتکاف کی مدت ایک ماہ تھی مگر بعد میں چالیس کر دی گئی۔ چالیس سے چالیس رات دن مراد ہیں۔ اسلامی روایتوں میں آتا ہے کہ یہ زمانہ ذیقعد کے پورے مہینے اور ذی الحجہ کے دس روز کا تھا۔

احکامِ عشرہ یا تورات

۱۳۳؎ یہ قصہ کہ ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے تورات عطا کرنے کا وعدہ کیا۔ اور ان کے کوہِ طور پر تشریف لے جانے کے بعد بنی اسرائیل نے بچھڑے کی پرستش شروع کر دی۔ مفصّل سورۂ اعراف اور سورۂ طٰہٰ میں آرہا ہے۔ اس کے تفصیلی مباحث کا وہاں مطالعہ کیا جائے۔ اس جگہ یہ بات ضرور سمجھ لیجئے کہ اس واقعہ میں کوہِ طور پر حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جن احکام کا نزول ہوا وہ تورات ہے۔ لیکن مسیحی علماء کی موجودہ جماعت کہتی ہے کہ اس سے مراد وہ دس احکام ہیں جو مذہبِ موسوی میں شریعت یا احکامِ عہد کے نام سے موسوم ہیں۔ یعنی خدا کے سوا کسی کو نہ پوجو۔ زنا نہ کرو۔ چوری نہ کرو وغیرہ۔ اور تو اور حضرت مولانا ابوالکلام آزادؒ نے بھی ترجمان القرآن میں کتاب کا مصداق احکامِ عہد ہی کو قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:۔

یہاں شریعت سے مقصود وہ دس احکام ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے وحیٔ الٰہی سے پتھر کی دو تختیوں پر کندہ کیے تھے اور جنہیں تورات میں عہد کے احکام سے تعبیر کیا گیا ہے۔ (خروج ۳۴ - ۲۹) لیکن یہ رائے قرآن عزیز اور تورات دونوں کی شہادت کے خلاف ہے۔ کیونکہ قرآن نے اس آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے چلّہ کا ذکر کرتے ہوئے جب نزولِ احکام کا ذکر کیا ہے تو اسے کتاب اور فرقان کہا ہے۔ اور یہ دونوں صفات قرآن میں تورات کی آئی ہیں۔

اگرچہ تورات موجودہ بائبل کے سفرِ خروج استثنا اور کتاب یسوع میں حضرت موسیٰ

علیہ السلام کے چلہ کے بعد احکام عہد یا شریعت کا لفظ پایا جاتا ہے۔ لیکن مولانا رحمت اللہ کیرانوی نوراللہ مرقدہٗ نے اپنی شہرہ آفاق تصنیف اظہار الحق میں فارسی، عربی اور اُردو تراجم قدیم کے حوالہ سے ثابت کیا ہے کہ تورات کے ان نسخوں میں ان ہر دو الفاظ کی جگہ تورات لکھا ہوا پایا جاتا ہے ـــــ مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہٗ العزیز فرماتے ہیں :

کتاب استثناء باب ۲۷ آیت ۸ میں ہے

اور ان پتھروں پر شریعت کی باتیں صاف صاف لکھنا۔

اس میں شریعت کا لفظ آیا ہے لیکن یہی آٹھویں آیت فارسی ترجمہ نسخہ مطبوعہ ۱۸۳۵ء میں اس طرح ہے ،

برآں سنگہا تمامی کلمات ایں تورات بحسن وضاحت تحریر نما

اور ۱۸۴۵ء کے فارسی ترجمہ کے الفاظ یہ ہیں ،

و برآں سنگہا تمامی کلمات ایں تورات را بخط روشن بنویس

اور کتاب یوشع میں ہے کہ

اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے حکم کے مطابق ایک مذبح بنایا اور اس پر تورات لکھی۔ اسی باب کے ۳۲ ویں آیت کا فارسی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۳۹ء اس طرح ہے کہ

در آنجا تورات را برآں سنگہا نقل نمود کہ آنرا پیش روئے بنی اسرائیل بہ تحریر آورد۔

اور فارسی ترجمہ مطبوعہ ۱۸۴۵ء میں یہ الفاظ ہیں ،

در انجا براں سنگہا نسخہ تورات موسیٰ را کہ در حضور بنی اسرائیل نوشتہ بود نوشت [1]

ان حوالوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو جو تختیاں کوہ طور پر دی گئی تھیں وہ تورات کی تختیاں تھیں۔ احکام عہد کی تختیاں نہ تھیں اور انگریزی نسخوں میں "لا" عربی اور اُردو نسخوں میں شریعت کو بھی صحیح مان لیا جائے تو یہ لفظ بھی اپنے معنے کی وسعت میں تورات پر صادق آتا ہے۔ اور تورات، شریعت اور قانون سب کا مصداق ایک ہی چیز ہے۔ قدیم عیسائی دنیا میں یہی معنے سمجھے جاتے رہے ہیں۔ اور احکام عہد اسی کا ایک جز ہیں اور اس کو مستقل قرار دینا بعد کی پیداوار ہے۔

---

[1] اظہار الحق ج ۱ ص ۳۲۲

۱۳۴؎ فرقان ان احکام شرعیہ کو فرمایا جن سے جائز ناجائز معلوم ہو یا فرقان حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزوں کو فرمایا جن سے جھوٹے سچے اور مومن و کافر کی تمیز ہوتی ہے یا خود تورات ہی کو بطور عطفِ تفسیری فرمایا کہ اس سے حق اور ناحق کا فیصلہ ہوتا ہے۔[۱]

فرقان کیا ہے؟

فرقان اپنے لفظی معنے میں ہر وہ چیز ہے جس سے حق و باطل کے درمیان فرق کیا جا سکے۔ قرآن کا بھی نام ہے اس مناسبت سے کہ قرآن حق و باطل، حرام و حلال کے درمیان فارق ہے اور اسی تعلق سے اس کا اطلاق تورات پر بھی ہوا ہے کہ یہ بھی فارق ہے بلحاظِ عقائد حق و باطل کے درمیان بلحاظِ گفتار صدق و کذب کے درمیان اور بلحاظِ اعمال نیک اور بد کے درمیان۔ اس مقام پر فرقان کی متعدد تفسیریں کی گئی ہیں:-

۱۔ الکتاب اور الفرقان میں عطفِ تفسیری ہے اور دونوں سے تورات ہی مراد ہے۔

۲۔ اس سے مراد تورات اپنے قوانین کے لحاظ سے ہے۔

۳۔ اس سے مراد وہ معجزات ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا ہوئے۔

۴۔ اس سے مراد وہ فتح و غلبہ ہے جو بنی اسرائیل کو فرعونی حکومت کے مقابلہ میں ہوا۔

یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ لکھی ہوئی کتاب کے علاوہ زبانی بھی بہت سے اسرار و مسائل کی تعلیم حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ہوئی تھی اور ان کے بعد سینہ بہ سینہ نسلاً بعد نسلٍ ان کی قوم میں منتقل ہوتی رہی ہے لہٰذا یہود کے نقطہ نظر سے فرقان سے مراد اس علم سینہ کے علاوہ یہ علم سینہ ہے۔[۲]

فرقان وہ چیز جس کے ذریعے حق اور باطل کا فرق نمایاں ہو۔ اردو میں اس کے مفہوم میں لفظ کسوٹی ہے۔ یہاں فرقان سے مراد دین کا وہ علم و فہم ہے جس سے آدمی حق اور باطل میں تمیز کرتا ہے۔[۳]

نزولِ کتاب کا مقصد

۱۳۵؎۔ آخر میں فرمایا تاکہ تمہیں طاعت کی راہ معلوم ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا میں اللہ سبحانہٗ

۱؎ حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۱ ۲؎ تفسیر ماجدی ص ۲۲ ۳؎ تفہیم القرآن ص ۷۰

کی جانب سے کتابوں کے نزول کا مقصد یہ اور صرف یہ ہے کہ لوگ اس کی روشنی میں اللہ کی طاعت کر سکیں، اور اپنی زندگیوں کو من چاہی نہیں رب چاہی بنائیں۔ قرآن نے اپنے بارے میں بھی اعلان آغاز میں کیا ہے کہ ھُدًی لِّلْمُتَّقِیْنَ ۔

اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جہاں تک انسان کی عملی زندگی کا تعلق ہے عقل کی رہنمائی نہ تو ہر حال میں کافی ہے نہ ہر حال میں موثر، نفسِ انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں سے کچھ اس طرح متھور واقع ہوا ہے کہ جب کبھی عقل اور جذبات میں کش مکش ہوتی ہے تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات کی ہوتی ہے۔ بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں کام نقصان دہ ہے لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں اور ہم اس کے ارتکاب سے اپنے آپ کو روک نہیں سکتے۔ عقل کی بڑی سے بڑی دلیل بھی ہمیں ایسا نہیں بنا سکتی کہ غصہ کی حالت میں بے قابو نہ ہو جائیں اور بھوک کی حالت میں محض غذا کی طرف ہاتھ نہ بڑھائیں ۔

اس لیے ضروری ہوا کہ انسان کی عملی زندگی کی رہنمائی کا کام خود اللہ ہی کا ہو۔ اللہ کی رہنمائی کو قرآن کی زبان میں الھدیٰ کہا گیا ہے۔ یہ الھدیٰ یعنی انسان کی عملی زندگی کے لیے حقیقی روشنی وحی کی روشنی ہے۔ انسانی زندگی میں اجالا اسی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اس لیے ہدایت کی وہ تمام صورتیں جو نبوت کی لائی ہوئی ہدایت سے الگ ہو کر بنائی جائیں حرف غلط ہیں۔ نبوت کی لائی ہوئی ہدایت میں علم وعمل کی دونوں نعمتیں ہمدوش ہوتی ہیں۔ ان سے انحراف شقاوت اور ضلالت کا سبب ہے ۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں کتاب دی ہے اور کتاب بھی ایسی جو تمہیں علمبردار حق ہونے کی حیثیت سے دنیا کے تمام باطل عقائد، باطل اقوال، باطل اعمال اور باطل اخلاق میں ممتاز کر سکے۔ اور اس لیے دی ہے کہ اس کے ذریعے تمہیں منزلِ مقصود تک پہنچنے کا راستہ مل جائے یا تم اس پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچ جاؤ۔ اور راستہ میں نہ بھٹکو اور شقاوت وضلالت کا شکار نہ ہو۔

یہ بات سید رشید رضا مرحوم یہاں خوب لکھ گئے کہ ہدایت یابی کا استعدادی کمال یہ ہے کہ بنی اسرائیل کو یہ معلوم ہو جائے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے جو علم وعمل لے کر آئے ہیں یہ وہ نورِ ہدایت ہے جو ان کو اصل مقام تک پہنچانے کا ضامن ہے ۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَٰقَوْمِ إِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ أَنفُسَكُم بِٱتِّخَاذِكُمُ ٱلْعِجْلَ فَتُوبُوٓا۟ إِلَىٰ بَارِئِكُمْ فَٱقْتُلُوٓا۟ أَنفُسَكُمْ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ عِندَ بَارِئِكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ ۚ إِنَّهُۥ هُوَ ٱلتَّوَّابُ ٱلرَّحِيمُ

اور پھر واقعہ بھی یاد کرو جب ہم نے چالیس راتوں والا وعدہ پورا کیا اور موسیٰ علیہ السلام کتاب الٰہی لے کر واپس آتے اور تمہیں گوسالہ پرستی میں مبتلا دیکھا اور یہ صورت حال دیکھ کر اس وقت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم[۱۳۶] یعنی تم سے کہا کہ اے میری قوم افسوس تمہاری احسان فراموشی پر۔ تم نے بچھڑے کو معبود[۱۳۷] بنا کر خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ لہٰذا تم اپنے مولیٰ کے حضور توبہ کرو[۱۳۸] اور اس گوسالہ پرستی کے جرم کی پاداش میں اپنے آپ کو قتل کرو[۱۳۹] اسی میں تمہارے خالق کے نزدیک تمہارے لیے خیر[۱۴۰] کا سامان ہے۔ چنانچہ اس وقت تم نے توبہ کی۔ اس لیے اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی اور اللہ ہی معاف[۱۴۱] کرنے والا اور مہربانی والا ہے۔

گوسالہ پرستی

اس آیت میں قرآن نے اپنی معجزانہ بلاغت سے منظر کشی کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ بڑا ہی دلآویز ہے۔ پہلے ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ میں گناہ کی طرف اشارہ کیا اور اس کے بعد معافی اور قبولِ توبہ کی نعمت کا تذکرہ کیا۔ کتاب الٰہی اور آسمانی دستورِ حیات کے انعام کا ذکر کرکے ان کی زندگی کے نقشہ سے ایک سیاہ دھبے کو نہیں بلکہ دو کو پیش کر دیا۔ ایک گوسالہ پرستی دوسرے رحمت الٰہی۔

[۱۳۶] یہاں قوم سے مراد خاص وہ لوگ ہیں جنہوں نے بچھڑے کو سجدہ کیا[ل]

یہ واقعہ مفصل سورۂ اعراف اور طٰہٰ میں آرہا ہے۔ انشاء اللہ اس کے تفصیل مباحث وہاں آئیں گے۔

گوسالہ پرستی کا مبدا

[۱۳۷] یہ سوال کہ بنی اسرائیل میں گوسالہ پرستی کہاں سے آئی۔ اس کے علماء نے مختلف جوابات

[ل] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۱

دیے ہیں۔
ایک رائے یہ ہے کہ یہ مصریوں کی گاؤ پرستی کا اثر تھا۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ مشرک کنعانیوں اور فلسطینیوں کا اثر تھا۔ بہرحال یہ شرک جہاں سے بھی آیا قرآن نے اسے شرک ہی قرار دیا ہے[1]

دراصل بنی اسرائیل مصر کی بت پرستی سے اس درجہ مالوف ہو گئے تھے کہ رہ رہ کر انہیں اس کا شوق ابھرتا تھا جونہی حضرت موسیٰ علیہ السلام چالیس دن کے لیے الگ ہوتے انہوں نے گائے کے بچھڑے کی طلائی مورتی بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی۔ تورات میں ہے کہ مورتی حضرت ہارون علیہ السلام نے بنائی تھی۔ (خروج ۳۱-۳۲) لیکن قرآن نے دوسرے مقام پر واضح کر دیا ہے کہ یہ سامری نامی ایک شخص کی کارستانی تھی اور حضرت ہارون علیہ السلام کا دامن اس دھبّے سے پاک ہے[2]

گائے اور بیل کی پرستش کا مرض بنی اسرائیل کی ہمسایہ اقوام میں ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ مصر اور کنعان میں اس کا عام رواج تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل جب انحطاط میں مبتلا ہو گئے اور رفتہ رفتہ قبطیوں کے غلام بن گئے تو انہوں نے منجملہ اور امراض ایک۔ یہ مرض بھی اپنے حکمرانوں سے لے لیا تھا[3]

گوسالہ پرستی کے واقعات کے تفصیلی مباحث تو آپ آئندہ سورۂ اعراف اور طٰہٰ میں پڑھیں گے۔ یہاں حضرت شاہ عبدالقادر دہلویؒ کی زبانی اس کا خلاصہ سُن لیجئے۔

جس وقت بنی اسرائیل بیتے دریا میں داخل ہوتے پیچھے سے فرعون بھی اپنی فوج کے ساتھ آگیا۔ حضرت جبریل علیہ السلام بیچ میں ہو گئے کہ ان کو ان تک نہ پہنچنے دیں۔ سامری نے پہچانا کہ یہ جبریل ہیں۔ ان کے پاؤں کے نیچے سے مٹھی بھر مٹی اٹھائی۔ اب سونے کے بچھڑے میں ڈال دی۔ سونا تھا کافروں کا مال لیا ہوا۔ قریب سے اس میں مٹی پڑی برکت کی۔ حق و باطل مل کر ایک کرشمہ پیدا ہوا کہ رونق جاندار کی اور آواز اس میں پڑ گئی۔ ایسی چیزوں سے بچنا چاہیے اسی سے بُت پرستی بڑھتی ہے۔

فی الواقع گوسالہ پرستی افسوسناک ہی نہیں بلکہ حیرت زا بھی ہے۔ اس سے بنی اسرائیل کی ذہنیت اور اخلاقی پستی بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اُدھر جبل طور پر تو حضرت موسیٰ علیہ السلام مناجاتِ الٰہی اور راز و نیاز میں مشغول ہیں۔ اور بنی اسرائیل کے لیے آئینِ الٰہی تورات حاصل کر رہے

---

[1] تفسیر ماجدی [2] ترجمان القرآن [3] تفہیم القرآن ص ۷۶

ہیں۔ اور نیچے بنی اسرائیل اپنے مشرکانہ جذبات کی تسکین کا گوسالہ پرستی کے ذریعے سامان کر رہے ہیں۔

نبی کی اُمت میں بگاڑ

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ نبی کی اُمت میں اسی طرح نبوت کی لائی ہوئی ہدایت سے انحراف پیدا ہو جاتا ہے۔ بنی اسرائیل صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اُمت نہیں بلکہ پہلے سے نبیوں کے ماننے والے نبیوں سے نسلی تعلق رکھنے والے ہیں۔ برکتوں کو دیکھ کر فریفتہ ہو جانا اور سمجھ بوجھ کر خیر باد کہہ دینا اُمتوں کی عام کمزوری ہے۔ اس بدعملی کا باعث اللہ کی عبادت کا انکار نہیں بلکہ عقیدت اور عظمت کا وہ بوجھ ہے جو عام ذہنوں میں برکت کے نام پر پیدا ہو جاتا ہے۔ قربان جائیے قرآن کے لطیفانہ اندازِ بیان کے یا نبوت کے اسلوبِ دعوت کے کہ شرک جیسے سنگین گناہ میں مبتلا دیکھ کر حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔ اِنَّكُمْ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ بِاتِّخَاذِكُمُ الْعِجْلَ تم نے بچھڑے کو اپنا کر اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ یعنی اپنا نقصان کیا ہے۔ یہ نہیں فرمایا اشرکتم باللہ یا عبدتم العجل من دون اللہ یعنی تم نے اللہ کے ساتھ شرک کیا، تم نے بچھڑے کی عبادت کی۔ بلکہ آیت میں اتخاذ کے مفعول ثانی کو بھی حذف کر دیا۔ حالانکہ ایسے مواقع پر اتخاذ کے دو مفعول آتے ہیں۔ قرآن میں اتخاذ مشرکین کے لیے اسی طرح بولا گیا ہے۔ یعنی دو مفعولوں کے ساتھ۔ جیسے اِتَّخَذَ اِلٰهَهٗ هَوٰىهُ۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ چونکہ اُمت میں مشرکانہ عمل برکتوں کی فریب کی وجہ سے پیدا ہوا تھا۔ اللہ کی عبادت سے انکار اس کا باعث نہ تھا اس لیے اندازِ خطاب یہ اختیار کیا گیا اور اگر یہی مشرکانہ عمل مشرکین مکہ کی طرح عبادت کے نتیجے میں ہوتا تو اندازِ خطاب ظلمتم نہ ہوتا بلکہ اشرکتم ہوتا۔

۱۳۸ ۔ اپنے مولیٰ کے حضور توبہ کرو یعنی چونکہ بچھڑے سے عابدانہ تعلق پیدا کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے اور اس طرح تم توحید عبادت جیسی بیش بہا دولت کو چھوڑ کر مخلوق پرستی کی گندگی میں ملوث ہو گئے ہو۔ اس لیے اپنے خالق کی بارگاہ میں حاضر ہو کر اپنے اس جرمِ عظیم کی معافی مانگو۔ لیکن چونکہ توبہ کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ دل میں ندامت محسوس ہو اور اپنے کیے پر پچھتا کر اللہ کی ہیبت و جلال سے سرشار ہو کر آئندہ گناہ نہ کرنے کا پختہ ارادہ کرے۔ اس لیے اس عزم کے بعد یہ کرو کہ

۱۳۹ ۔ اپنے آپ کو قتل کرو یعنی جنھوں نے بچھڑے کو سجدہ نہیں کیا تھا وہ سجدہ کرنے والوں کو

قتل کریں۔ اور بعض کی رائے ہے کہ بنی اسرائیل کے تین گروہ تھے۔ ایک وہ جنہوں نے گوسالہ پرستی نہ کی اور دوسروں کو بھی روکا۔ دوسرے وہ جنہوں نے گوسالہ پرستی کی۔ تیسرے وہ جنہوں نے خود تو گوسالہ پرستی نہ کی لیکن دوسروں کو نہ روکا۔ فریق دوم کو یہ حکم ہوا کہ مقتول ہو جاؤ۔ تیسرے فریق کو یہ حکم ہوا کہ ان کو قتل کرو تاکہ ان کی خاموشی اختیار کرنے کی توبہ ہو جائے۔ اور فریق اوّل کو اس میں شریک نہیں کیا گیا کیونکہ اسے توبہ کی ضرورت ہی نہ تھی[1]

شرک شریعتِ موسوی اور آئینِ اسرائیلی میں علاوہ معصیت کے فوجداری جرم تھا۔ جرم بھی مستوجبِ قتل۔ تورات کی قانونی عبارتوں میں مشرک اور مشرکہ کے لیے یہ تصریح ہے۔ اس مرد یا عورت پر یہاں تک پتھراؤ کرو کہ وہ مر جائیں۔ گواہوں کے ہاتھ اس پر پہلے اٹھیں تاکہ اس کو قتل کریں اور ان کے بعد باقی سب لوگوں کے ساتھ تم یوں ہی اپنے بیچ سے شرارت کو نیست و نابود کیجیو۔ (استثنا ۱۷ - ۵،۷)

شرک کے مجرمین سامنے پکڑ کر لائے گئے اور اپنے ہی بھائی بندوں کے ہاتھوں موت کے گھاٹ اترے۔ تورات میں ہے۔ تم میں ہر مرد اپنی کمر پر تلوار باندھے اور ہر ایک دروازے سے دوسرے دروازے تک تمام لشکرگاہ میں گزرتا پھرے اور ہر مرد تم میں سے اپنے بھائی کو ہر ایک آدمی اپنے قریب کو قتل کرے۔ اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے مطابق کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے تقریباً تین ہزار آدمی مارنے پڑے۔ (خروج ۳۲ - ۲۷، ۲۸)

سب کو معافی کا پروانہ

[140] اس میں تمہارے لیے خیر کا سامان ہے۔ یعنی ایسا کرنا تمہارے لیے بہتر ہے۔ اس سے تمہارے دامن کی آلودگی کے دھبے مٹ جائیں گے اور آخرت کی ابدی زندگی میں تمہاری سرخروئی ہو گی۔ اور یا مطلب یہ ہے کہ توبہ کا یہ عمل مظاہرہ گناہ اور گناہ پر اصرار سے تمہارے لیے بدرجہا بہتر ہے۔ پہلی صورت میں یہ فقرہ پہلے حکمِ توبہ اور قتل کی علت بنا رہا ہے۔ اور دوسری صورت میں اس فقرے کے ذریعے توبہ کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ اس سے اگلا فقرہ اللہ نے تمہاری توبہ قبول کر لی۔ یعنی فَتَابَ عَلَيْكُمْ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کا حصہ ہے تو مطلب یہ ہے

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۱

کہ اگر تم نے حکم کی تعمیل کرکے توبہ کا یہ عملی مظاہرہ کر دیا تو سمجھ لو کہ اللہ نے تمہاری توبہ قبول کرلی ہے۔ اور اگر یہ فقرہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کا حصہ نہیں اور اللہ سبحانہٗ کی جانب سے بنی اسرائیل کو خطاب ہے تو پھر مطلب یہ ہے کہ تمہیں جو کچھ حکم دیا گیا تھا تم نے چونکہ تعمیل کرلی ہے اس لیے اللہ سبحانہٗ نے تمہاری توبہ کو شرفِ قبول عطا فرمادیا۔ اور اس اندازِ بیان سے یہ بتانا مقصود ہے کہ تمہاری توبہ من حیث القوم قبول کرلی گئی۔ سزا صرف ان افراد کو ملی جو شرک کے مجرم تھے اور معافی کا پروانہ سب کو عطا ہوگیا۔

۱۴؎ اس آخری فقرے کے ذریعے یہ بات سمجھادی کہ ان کی توبہ کی قبولیت دراصل اس لیے ہوئی ہے کہ اللہ کی شان ہی گنہگار بندوں کی توبہ قبول کرنا ہے اور صرف قبول کرنا ہی نہیں بلکہ بندوں کو توفیق عطا فرمانا اسی کا کام ہے کیونکہ بندوں سے خدا کا رشتہ رحمت کا رشتہ ہے اور سچی عبودیت اسی کی ہے جس کے لیے معبود صرف معبود نہ ہو بلکہ محبوب ورحیم بھی ہو۔

اس فقرے میں اللہ کی رحمت کی وسعت اور اس کی مغفرت کی فراوانی کا جو دلکش منظر پیش کیا ہے اس کی حد وانتہا نہیں ہے۔ کتنے ہی گناہ ہوں، کتنے ہی سخت گناہ، کتنی ہی مدت کے گناہ ہوں لیکن ہر اس شخص کے لیے جو اس کے دروازۂ رحمت پر دستک دے رحمت وقبولیت کے سوا کوئی صدا نہیں ہوسکتی۔ دُنیا کی بہت سی گمراہ قوموں کا عقیدہ ہے کہ اللہ کو معاف کرنے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ کیونکہ وہ خود قانونِ مکافاتِ عمل کا پابند ہے۔ عیسائیت اسی بنیادی گمراہی کا شکار ہے۔ چونکہ خدا از خود کسی کو معاف نہیں کرسکتا اور معاف کرنا چاہتا ہے اس لیے اس نے اپنے بیٹے کو سب کی طرف سے بطورِ کفارہ سزا دے کر دوسروں کو معاف کردیا۔ قرآن نے توبہ، قبولیتِ توبہ اور اس کے بعد صفتِ رحیمی پیش فرما کر اس گمراہی کی تردید کردی۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يٰمُوسٰى لَنْ نُّؤْمِنَ لَكَ حَتّٰى نَرَى اللّٰهَ جَهْرَةً فَاَخَذَتْكُمُ الصّٰعِقَةُ وَ اَنْتُمْ تَنْظُرُوْنَ ۞ ثُمَّ بَعَثْنٰكُمْ مِّنْ بَعْدِ مَوْتِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۞

اور وہ واقعہ[۱۴۲] بھی یاد کرو جب تم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم تمہاری بات ہرگز نہ مانیں گے جب تک کھلم کھلا اللہ کو نہ دیکھ لیں گے۔ اس وقت تمہارے دیکھتے دیکھتے تمہیں اچانک بجلی کے کڑاکے نے آ پکڑا تھا۔ پھر ہم[۱۴۳] نے اس ہلاکت کے بعد تم کو دوبارہ اٹھا کر کھڑا کیا تاکہ تم اللہ کے شکرگزار بندے بن جاؤ۔

دیدارِ الٰہی کا مطالبہ

جب بنی اسرائیل کا گوسالہ پرستی کا سنگین جرم معاف ہو گیا تو اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے فرمایا کہ میرے پاس جو یہ تختیاں ہیں۔ یہ کتاب ہے جو اللہ نے تمہاری ہدایت دینی اور دنیوی زندگی کی فلاح کے لیے مجھ کو عطا فرمائی ہے۔ یہ تورات ہے اب تمہارا فرض ہے کہ اس کو اپنی زندگی میں اپناؤ اور اس دستورِ حیات کے ذریعے زندگی کے سارے گوشوں میں تبدیلی پیدا کرو۔ بنی اسرائیل بہرحال بنی اسرائیل تھے کہنے لگے کہ موسیٰ ہم کیسے مانیں کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ صرف تیرے کہنے سے ہم نہیں مانیں گے۔ ہم تو اس وقت مانیں گے کہ اللہ کو بے حجاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں وہ ہم سے یہ کہے کہ یہ تورات میری کتاب ہے۔

[۱۴۲] یعنی اس وقت کو بھی یاد کرو کہ باوجود اس قدر احسانات کے جب تم نے کہا تھا کہ اے موسیٰ ہم ہرگز تمہارا یقین نہ کریں گے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ جب تک آنکھوں سے صریحاً خدا کو نہ دیکھ لیں۔ اس پر بجلی نے تم کو ہلاک کیا۔ اس کے بعد موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے ہم نے تم کو زندہ کیا اور یہاں اس وقت کا ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ستر آدمیوں کو منتخب کیا اور کوہ طور پر کلامِ الٰہی سننے کی غرض سے لے گئے تھے۔ پھر جب انہوں نے کلامِ الٰہی کو سنا تو انہی ستر آدمیوں نے کہا کہ اے موسیٰ پردے میں سننے کا ہمیں اعتبار نہیں، آنکھوں سے خدا کو دکھاؤ۔ اس پر ان ستر آدمیوں کو بجلی نے ہلاک کر دیا تھا[۱]

[۱] حاشیہ شیخ الہند، ص ۱۱

بے ادبی و گستاخی

یہ اشارہ جس واقعے کی طرف ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ چالیس شبانہ روز کی قرارداد پر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور پر تشریف لے گئے تھے تو آپ کو حکم ہوا تھا کہ بنی اسرائیل کے ستر نمائندے بھی اپنے ساتھ لے کر آئیں۔ پھر جب اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اور فرقان عطا کی تو آپ نے ان نمائندوں کے سامنے اسے پیش کیا۔ اس موقع پر قرآن کہتا ہے کہ ان میں سے بعض شریر کہنے لگے کہ ہم محض تمہارے بیان پر یہ کیسے مان لیں کہ خدا تم سے ہمکلام ہوا ہے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کا غضب نازل ہوا اور انہیں سزا دی گئی۔ لیکن بائبل کہتی ہے،

انہوں نے اسرائیل کے خدا کو دیکھا۔ اس کے پاؤں کے نیچے نیلم کے پتھر کا چبوترہ سا تھا اور آسمان کی مانند شفاف تھا۔ اور اس نے بنی اسرائیل کے شرفاء پر اپنا ہاتھ نہ بڑھایا۔ سو انہوں نے خدا کو دیکھا اور کھایا پیا۔ (خروج باب ۲۴ آیت ۱۰-۱۱)[1]

اس عبارت سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ مولانا مودودی اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ اتارنا چاہتے ہیں کہ یہ ستر آدمی حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پورے چلہ میں کوہ طور پر رہے اور بلا کسی پس منظر کے پہلے ہی اللہ پاک نے ستر آدمی منتخب کر کے ساتھ لانے کا حکم دیا تھا۔ اگرچہ مفسرین میں سے کچھ کی رائے بھی یہ ہے۔ لیکن مولانا شبیر احمد عثمانیؒ فرماتے ہیں۔ راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ میقات اس میقات کے علاوہ ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا کرنے کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ نیز سورۃ اعراف میں بیان کی ترتیب سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ گوسالہ پرستی اور سزایابی کے بعد پیش آیا۔ لیکن سورۃ نساء کی آیت

فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰہَ جَھْرَۃً فَاَخَذَتْھُمُ الصّٰعِقَۃُ بِظُلْمِھِمْ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْھُمُ الْبَیِّنٰتُ ط

زیادہ صفائی سے بتلاتی ہے کہ گوسالہ پرستی اس واقعہ کے بعد ہوئی ہے۔ لیکن حضرت مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر ثُمَّ کا ترجمہ واقعات کی ترتیب کے لیے نہیں ہے بلکہ استبعاد کے لیے ہے۔ اور مولانا مودودی بھی فرماتے ہیں کہ یہاں یعنی سورۃ نساء میں واقعہ کی تفصیل بیان کرنا مقصود

---

[1] تفہیم القرآن ص ۷۷

نہیں ہے بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست پیش کرنی مقصود ہے۔
بہرحال رائیں دونوں ہیں کہ طور پر ایک ہی میثاق ہے یا دو میثاقیں ہیں۔ تورات میں کسی دوسری میثاق کا ذکر نہیں ہے اور عام مفسرین کی بھی یہی رائے ہے لیکن سورۃ اعراف میں ترتیب مضامین اس خیال کے منافی ہے۔

حیات بعد الموت

۱۴۳ لفظ موت سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ اس بجلی سے مرگئے تھے۔ سورۃ اعراف میں صاعقہ کی جگہ رجفہ آیا ہے اور دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔ بجلی بھی کڑکی اور زلزلہ بھی آیا۔ اس حادثہ کے ذریعے ان لوگوں کی موت واقع ہوئی۔ آیت میں موت اور بعث دونوں لفظ موجود ہیں اور اسی کی تائید کرتے ہیں اور اکثر مفسرین نے یہی بیان کیا ہے بلکہ یہاں تک لکھ گئے کہ بعد موت کی قید بھی اس لیے لگائی گئی ہے کہ اٹھائے جانے کو کوئی نیند یا غشی کے بعد نہ سمجھے۔ لیکن روح المعانی میں یہ بھی ہے کہ کچھ کی رائے میں یہ موت نہیں بلکہ بے ہوشی کی قسم کیلئے موت مجازی ہے۔

قرآن نے حیات بعد الممات کا قانون عام تو یہی بتایا ہے کہ اس دنیوی موت کے بعد پھر عالم آخرت ہی کے لیے دوبارہ زندگی ملے گی۔ لیکن قانونِ خاص یہ ہے کہ کبھی کبھی حکمت و مصلحت کی خاطر اللہ تعالیٰ اس دنیا ہی میں مردے کو زندگی دے دیتا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی معجزانہ زندگی میں خود قرآنی شہادت کے مطابق اس حقیقت کا متعدد بار ظہور ہو چکا ہے۔
قرآنِ عزیز نے اس آیت میں بھی بنی اسرائیل کے نمائندوں کی موت و ہلاکت کے اور اس کے بعد ان کے جی اٹھنے کا ذکر کیا ہے اور لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ کہہ کر اس واقعہ کی اصلی حقیقت کو اور زیادہ واضح کر دیا ہے کہ بے شبہ صورت یہ پیش آئی کہ ان کی نامعقول اور گستاخانہ اصرار پر صاعقہ کے عذاب نے ان کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور پھر حضرت موسیٰ علیہ السلام کی عاجزانہ دعا پر خدا کی وسعتِ رحمت نے ترس کھایا اور ان سوختہ جان انسانوں کو دوبارہ زندگی دی تاکہ یہ شکر گزار ہوں اور آئندہ اس قسم کی بے جا ضد سے کام نہ لیں اور خدا کے سچے فرمانبردار بن جائیں۔
تورات میں ہے کہ

وَظَلَّلْنَا عَلَيْكُمُ الْغَمَامَ وَأَنزَلْنَا عَلَيْكُمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوَىٰ ۖ كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ ۖ وَمَا ظَلَمُونَا وَلَٰكِن كَانُوا أَنفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝

اور پھر ایسا ہوا کہ ہم نے دھوپ کی شدت سے بچانے کے لیے تمہارے اوپر ابر کا سایہ کیا۔ اور بھوک کی شدت سے بچانے کے لیے ہم نے من و سلوی کی غذا تمہارے لیے فراہم کر دی اور تم سے کہہ دیا تھا کہ جو صاف ستھری چیزیں ہم نے تم کو عطا کی ہیں انہیں کھاؤ۔ لیکن اس کے باوجود بھی وہ اپنی بدعملیوں سے باز نہیں آتے۔ انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

اور یوں ہوا کہ تیسرے روز صبح کو بادل گرجے اور بجلیاں چمکیں اور پہاڑ پر کالی گھٹا اٹھی اور قرنائی کی آواز بہت بلند ہوئی۔ چنانچہ سب لوگ ڈیروں میں کانپ گئے۔

(خروج ۱۹-۱۶)

توراۃ میں ہے کہ

سرداروں کی ایک جماعت نے حضرت موسیٰ کی بزرگی و پیشوائی سے انکار کیا تھا۔ اس پر حکم الٰہی سے ایک وقت مقرر کیا گیا اور سرکش گروہ جمع ہوا۔ اس وقت زلزلہ آیا، زمین پھٹی اور سب اس میں مدفون ہو گئے۔ (۱۶-۳۱ گنتی)

ابر کا سایہ اور من و سلویٰ

اسرائیلی زندگی کے دو تلخ اور ناگوار واقعات بیان فرمانے کے بعد ان آیات میں پھر دو نعمتوں کا تذکرہ کیا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ تمہارا ہمارے ساتھ تعلق یہ تھا اور ہمارا تمہارے ساتھ معاملہ یہ ہے۔ ان آیات میں اپنے انعامات کو کھول کر بیان کیا ہے لیکن ان کی سرکشی کو کھول کر نہیں بلکہ اشارے میں پیش کیا ہے۔ انعام کی صراحت اور تفصیل میں ان کو مخاطب کیا ہے لیکن سرکشی کے اشارے میں صیغۂ غائب استعمال کیا ہے۔ تذکرہ میں قرآن کا یہ انداز بیان بھی اپنے اندر ایک اعجازی شان رکھتا ہے۔ بلاغت

میں یہ ایجاز کی وہ قسم ہے جو قرآن سے باہر آپ کو کہیں نہیں مل سکتی۔

۱۴۳ جزیرہ نما سینا میں جہاں دھوپ سے بچنے کے لیے کوئی جائے پناہ تمہیں میسر نہ تھی ہم نے ابر سے تمہارے بچاؤ کا انتظام کیا۔ اس موقع پر یہ خیال رہے کہ بنی اسرائیل لاکھوں کی تعداد میں مصر سے نکل آئے تھے اور سینا کے علاقے میں مکانات کا تو کیا ذکر، سر چھپانے کے لیے ان کے پاس خیمے تک نہ تھے۔ اس زمانے میں اگر اللہ کی طرف سے ایک مدت تک آسمان ابر آلود نہ رکھا جاتا تو یہ قوم دھوپ سے ہلاک ہو جاتی[1]

جزیرہ نما سینا جیسے ریگستانی ملک اور چٹیل میدان میں سایہ میسر آجانا واقعی سایۂ رحمت سے کم نہیں۔ تورات میں ستونِ ابر اور ستونِ زمرد دونوں کا ذکر بطور معجزہ کے ہے۔ سیاقِ قرآنی سے معجزہ کا پہلو منظر نہیں آتا۔ ذکر عام نعمتوں کا ہو رہا ہے جو بنی اسرائیل پر ان کی تاریخ کے اہم دور میں نازل ہوتی رہی ہیں اور قرآن نے عام مستقل اور بظاہر طبعی اسباب سے پیدا شدہ نعمتوں کو کہیں بھی معجزانہ اور خارقانہ عادتوں سے کم اہمیت نہیں دی ہے۔ تورات میں ہے۔ اور خداوند دن کو بدلی کی صورت میں آیا تاکہ انہیں راہ بتلائے اور رات کو آگ کے ستون میں ہو کے آیا تاکہ انہیں روشنی بخشے۔ ان کے آگے چلا جاتا۔ تاکہ دن رات چلے جائیں اور بدلی کا ستون دن کو اور آگ کا ستون رات کو ان کے آگے سے ہرگز نہ اُٹھاتا۔ (خروج ۱۳-۲۱، ۲۲) روایاتِ یہود میں حسب بیان جیوش انسائیکلوپیڈیا ج ۴ ص ۱۲۳ یہ تصریح موجود ہے کہ بنی اسرائیل جب کثرتِ معاصی میں مبتلا ہو جاتے تو یہ ابر ان پر سایہ کرنا چھوڑ دیتا[2]

خلاصہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے بحرِ قلزم کو پار کر کے جس سرزمین پر قدم رکھا یہ افریقہ نہیں بلکہ عرب کی سرزمین تھی جو بحرِ احمر کے مشرق میں واقع ہے۔ یہ لق و دق بے آب و گیاہ میدان سے شروع ہوتی ہے جو تورات کی زبان میں بیابانِ شور، سین، وادیٔ سینا کے نام سے مشہور ہے۔ اسی میں وادیٔ تیہ واقع ہے اور طور تک اس کا دامن وسیع ہے۔ یہاں شدید گرمی پڑتی ہے دُور دُور تک پانی اور سبزے کا پتہ نہیں ہے۔ بنی اسرائیل اس لق و دق میدان میں پہنچے تو گھبرا اُٹھے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام سے فریاد کرنے لگے کہ گرمی کی شدت اور سایہ دار درخت نہ ہونے کی وجہ سے ہم بہت پریشان ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تسلی دی اور اللہ کی بارگاہ میں دُعا کی کہ اے اللہ

---

[1] تفہیم القرآن ص ۷۵ [2] تفسیر ماجدی ص ۲۳

اس سخت تکلیف سے نجات عطا فرما۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی اور آسمان پر بادلوں کے پرے کے پرے بنی اسرائیل پر سایہ فگن ہو گئے۔

۱۲۵۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے یہ بھی درخواست کی کہ زندگی کے لیے صرف سایہ ہی کافی نہیں ہے زندہ رہنے کے لیے کھانے کی بھی ضرورت ہے۔ اس بے آب و گیاہ زمین میں تو کہیں کوئی ذریعہ نظر نہیں آتا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سے دعا کی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کا بھی انتظام کیے دیتے ہیں۔ رات گزری، صبح کو اٹھے تو بنی اسرائیل نے دیکھا کہ زمین پر ہر جگہ سفید اولے کی طرح کے دانے شبنم کی صورت میں آسمان سے کوئی چیز برس کر گری ہوئی ہے۔ کھایا تو نہایت میٹھی حلوے کی مانند تھی۔ یہ من تھا۔ دن میں تیز ہوا چلی اور تھوڑی دیر میں بٹیروں کے غول کے غول زمین پر پڑنے لگے۔ بنی اسرائیل نے باسانی ان کو ہاتھوں سے پکڑ لیا اور بھون کر کھانے لگے یہ سلویٰ تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت بنی اسرائیل کو تنبیہہ کر دی تھی کہ ضرورت کے مطابق من و سلویٰ کو کام میں لائیں دوسرے دن کے لیے ذخیرہ نہ کریں [۱]

من ایک چیز تھی شیریں دھنیے کے سے دانے ترنجبین کے مشابہ۔ رات کو اوس برسنے کی طرح لشکر کے گرد ڈھیر لگ جاتے۔ صبح کو ہر ایک اپنی ضرورت کے مطابق اٹھا لیتا۔ اور سلویٰ ایک پرندہ ہے جس کو بٹیر کہتے ہیں، شام کو لشکر کے گرد ہزاروں جمع ہو جاتے [۲]

من و سلویٰ دونوں قدرتی غذائیں تھیں جو بنی اسرائیل کو مہاجرت کے زمانے میں ملتی رہیں۔ دونوں کی خدا کے فضل سے اتنی بہتات تھی کہ ایک پوری کی پوری قوم صرف ان ہی غذاؤں پر زندگی بسر کرتی رہی اور اسے فاقہ کشی کی مصیبت نہ اٹھانی پڑی۔ حالانکہ آج کسی نہایت متمدن ملک میں بھی اگر چند لاکھ مہاجر یکایک آ پڑیں تو ان کی خوراک کا انتظام مشکل ہو جاتا ہے [۳]

بہر حال یہ غذائیں بنی اسرائیل کو مہاجرت کے زمانے میں بلا مشقت و تعب مل جاتی تھیں۔ تورات کی تصریحات اس بارے میں یہ ہیں:

صبح کو لشکر کے پاس اوس پڑی۔ اور جب اوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی سفید جیسے برف کا چھوٹا ٹکڑا زمین پر پڑی ہے اور بنی اسرائیل نے دیکھ کر آپس میں کہا کہ من ہے کیونکہ انہوں نے نہ جانا وہ کیا ہے، تب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے

---

[۱] ابن کثیر ج ۱ ص ۹۵ [۲] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۱ [۳] تفہیم القرآن ص ۸۰

اُن کو بتایا کہ یہ روٹی ہے جو خدا نے تمہیں کھانے کو دی ہے۔ (خروج ۱۶، ۱۴، ۱۵)

اسرائیل کے گھرانے نے اس کا نام من رکھا۔ وہ دھنیئے کے بیج کی طرح سفید تھی اور اس کا مزہ شہد میں ملی ہوئی پھلودی کا تھا۔ خروج ۱۶-۳۱)

اور من سوکھے دھنیے کی مانند تھا اور اس کا رنگ موتی کے دانے کی طرح تھا۔ لوگ اِدھر اُدھر سے اُسے جمع کرتے اور چکی میں پیستے تھے یا اوکھلی میں کوٹتے تھے اور تنوروں پر پکاتے تھے اور پھلکیاں بناتے۔ اس کا مزہ تازہ تیل کا سا تھا اور رات کو جب اوس پڑتی تو من پڑتا تھا (گنتی ۱۱-۷-۱۱) سلویٰ ایک قسم کا بٹیر ہے۔ بٹیر جزیرہ نما سینا کا خاص جانور ہے۔ بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ گرمی میں شمال کی طرف چلا جاتا ہے جاڑے میں جنوب کی طرف واپس آجاتا ہے۔ اڑتا اونچا نہیں بہت نیچا رہتا ہے۔ تھک بہت جلدی جاتا ہے اور اس کا شکار بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے (جیوش انسائیکلوپیڈیا ج ا ص ۲۸۵)

واضح رہے کہ سارے رکوع میں اور اس کے بعد بھی بنی اسرائیل پر انعامات کا تذکرہ ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ یہ سارے واقعات اپنے عام طبعی اسباب سے ہٹ کر بصورت معجزات ہی پیش آئے ہیں اصل مقصود بیان اللہ سبحانہٗ کے انعامات کی یاد دہانی ہے چاہے وہ حسب عادت ہوتے ہوں یا بطور خرق عادت۔ مفسرین نے عموماً ابر کی سایہ افگنی اور من و سلویٰ کے نزول کو معجزات میں شمار کیا ہے۔ لیکن اگر کسی کی تحقیق میں یہ دونوں باتیں عام واقعات میں داخل ہوں تو اس کا اثر قرآن کی تذکیر پر نہیں پڑتا ان کی انعامی حیثیت بہرحال قائم رہتی ہے اور یہی قرآن کا مقصود ہے [1]

۱۴۷ انہیں کھاؤ۔ یہ ہماری دین ہے، ہمارا عطیہ ہے۔ کھانے پر خصوصی طور پر زور دینے سے بزرگوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ ان چیزوں کا ذخیرہ نہ کرو۔ گویا حکم یہ ملا تھا کہ روز کے روز خرچ کرتے رہو اور بلا ضرورت ان غذاؤں کا ذخیرہ نہ کرو۔ معلوم ہوتا ہے کہ ذخیرہ اندوزی کی عادت یہودیوں کی آج کی نہیں بہت پرانی ہے۔ آج دنیا میں معاشی پریشانیوں کا واحد سبب یہودی ساہوکاروں کی یہی ذخیرہ اندوزی بنی ہوئی ہے۔ یہ اگر اشیاء و اجناس میں ہو تو احتکار ہے اور دولت و مال میں ہو تو اکتناز ہے۔ اور یہودی احتکار و اکتناز ہی کا آج ردعمل سوشلزم کی صورت میں پیدا ہوا ہے یعنی وہ نظام صرف دولت کے اکتناز اور اجناس کے احتکار ہی کو نہیں بلکہ دولت اور اشیاء کی

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۳

انفرادی ملکیت کو بھی ختم کر دینا چاہتا ہے۔ بہرحال اس فقرہ میں یہ بتانا مقصود ہے کہ اس لطیف و لذیذ غذا کو کھاؤ اور اسی پر اکتفا کرو۔ آگے کے لیے ذخیرہ جمع کر کے نہ رکھو اور نہ دوسری غذا سے مبادلہ کی خواہش کرو[۱]

بنی اسرائیل نے اس حکم کی تعمیل نہیں کی اور باوجود اس کے کہ اللہ کی رحمت کا کرشمہ روزانہ اپنی آنکھوں سے دیکھتے تھے پھر بھی اللہ پر بھروسہ نہیں کیا اور ذخیرہ اندوزی میں لگ گئے[۲]

۱۴۷۔ اس صورتِ حال کا لازماً یہ نتیجہ نکلا کہ وہ اللہ کے حکم سے باغی ہو گئے اور ہدایتِ الٰہی کی تعمیل نہیں کی۔ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے فَتَعَدَّوْا وَكَفَرُوْا۔ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ اس اگلے فقرے وَمَا ظَلَمُوْنَا کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ پوری بات اس طرح ہے کہ بنی اسرائیل نے اس انعامِ الٰہی کی قدر نہیں کی۔ انہوں نے ہماری نافرمانی کی اور اس طرح انہوں نے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا۔ قرطبیؒ نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ انہوں نے اللہ کی نافرمانی کی اور اللہ کی نعمت اور احسان کا شکر سے جواب نہیں دیا اور انہوں نے یہ کردار اختیار کر کے ہمارا کوئی نقصان نہیں کیا بلکہ نعمتوں کا معصیتوں سے مقابلہ کر کے اپنا ہی کچھ کھویا۔ ابن جریرؒ نے بھی یہی تشریح کی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اُن کو کھانے کو کہا تھا۔ انہوں نے اللہ کے حکم سے سرتابی کی اور نافرمانی کی اور اس طرح انہوں نے ہمارا کچھ نقصان نہیں کیا۔

الغرض شارحینِ قرآن نے اس فقرے وَمَا ظَلَمُوْنَا کو محذوف پر معطوف کر کے اس کو بنی اسرائیل کی آپ بیتی کا حصہ سمجھا ہے اور بتایا ہے کہ واقعہ کے ان ہی افراد کا یہ کردار بھی ہے اور اس فقرے کا تعلق اُن ہی کے کردار سے ہے۔ پتہ نہیں کہ بعض معاصرین نے عام مفسرین کی اس تشریح کو چھوڑ کر ترجمہ میں یہ اضافہ

مگر تمہارے اسلاف نے جو کچھ کیا۔

کیا بتانے کے لیے ضروری سمجھا ہے۔ اگر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ یہ اصحاب موسیٰ علیہ السلام کے اسلاف کے کردار کا ذکر ہے تو یہ قرآن کی مراد نہیں ہے۔ اور اگر یہ بتانا چاہتے ہیں کہ زمانۂ نبوت کے یہودیوں کے اسلاف نے ایسا کیا ہے تو مرلو کی حد تک تو یہ درست ہے لیکن جس معنویت کی خاطر قرآن نے یہ بلیغانہ فقرہ بولا ہے اس کی روح پامال ہو جاتی ہے۔

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص۱۱ [۲] معارف القرآن ص ۱۳۰

یہاں یہودیوں کی طرف آیت کے اس ٹکڑے وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ (لیکن وہ خود اپنا نقصان کرتے تھے) میں نقصان کی جو نسبت کی گئی ہے اس نقصان میں خدا معلوم لغات مفسرین کو ان کے گوشت کے سڑجانے کا نقصان اتنا عظیم کیوں محسوس ہوا ہے کہ وہ اس کا تذکرہ کیے بغیر آیت کی تشریح نہیں کرتے۔ نقصان کے لیے مولانا محمد ادریس کی یہ تشریح بڑی برمحل ہے کہ ایسا رزق کھویا کہ جس میں نہ دُنیا کی منفعت تھی اور نہ آخرت کا حساب ہے۔ محمود آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ ان کی بدکرداری اور نافرمانی کا نقصان خود اُن ہی کو تھا۔ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ نافرمانی کرکے انہوں نے اپنا ہی نقصان کیا ہے۔ قرطبیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ کی نعمت کا معصیت سے مقابلہ کرکے خود ہی نقصان اٹھایا ہے۔ قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ میرے عذاب کو نافرمانی کے ذریعے دعوت دے کر اور آسمانی رزق کو بند کرکے وہ اپنا ہی نقصان کرتے تھے۔

اس آیت میں دراصل ایک طرف اگر یہ بتایا ہے کہ

دین کے سارے مطالبات اور اللہ سبحانہ کے سارے اوامر و نواہی کا رشتہ بندوں کی منفعتوں اور مضرتوں سے وابستہ ہے۔ اللہ اگر کسی کام کے کرنے کو کہتا ہے تو اس میں خود بندوں کا فائدہ ہے اللہ کا کوئی فائدہ نہیں۔ اور اگر وہ کسی کام سے روکتا ہے تو اس میں بندوں کا اپنا نقصان ہے۔ اللہ کا کوئی نقصان نہیں ہے۔

صحیح مسلم کی ایک حدیث قدسی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اے میرے بندو! اگر تم میں سے سب انسان اگلے، پچھلے اور انسان و جن سب مل کر نیک ترین اور متقی ہو جائیں تو یاد رکھو کہ اس سے میرے ملک میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا۔ اے میرے بندو! اگر سب اگلے پچھلے انسان اور جن بدترین اور فاجر سے فاجر تر بن جائیں تو میرے ملک میں کوئی کمی نہیں آتی۔

اگر اللہ کا دین، اللہ کی وحی، اللہ کا رسول نیک عمل کی ترغیب دیتا ہے اور بدعملی سے روکتا ہے تو یہ صرف اس لیے کہ انسان اپنے نقصان اور اپنی ہلاکت سے بچے۔ یہ بات نہیں ہے کہ اس میں خدا کا کوئی فائدہ یا نقصان ہے۔ گویا قرآن نے اس بلیغ فقرے مَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا کے ذریعے اپنے مخاطبوں، یگانوں اور بیگانوں کے ذہن میں یہ بات اتاری ہے کہ گنہگار اگر گناہ کرتا ہے تو جان لے اس کی مضرت اسی کے لیے ہے۔ عابد اگر عبادت کرتا ہے تو سمجھ لے کہ اس کا نفع اسی کی ذات تک محدود ہے۔ اس کی بے نیازی کا عالم یہ ہے کہ تمام مجرمین کو بخش دے تو پروا نہیں۔ فیاضی کی یہ انتہا کہ اگر ایک ایک کو منہ مانگی مراد دے دے تو اس

خزانۂ غیب میں کوئی نقصان نہیں۔ سبحان اللہ مَا ظَلَمُوْنَا کا مدلول کس قدر بلند ہے۔

دوسری طرف وَلٰكِنْ كَانُوْا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ کے ذریعے یہ اشارہ کر دیا کہ اللہ سبحانہٗ کی گوناگوں نعمتوں کا اور بار بار کی درگزر کا بنی اسرائیل کی مادہ پرست فطرت پر کوئی اثر نہ تھا۔ نعمتوں کی فراوانی کے باوجود یہ نافرمانیاں کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ فرعون کی غلامی اور اس کے جابرانہ نظام نے ان کی فطرت کو مسخ کر دیا تھا۔ کیونکہ جب بھی کوئی نظام جبر کسی سوسائٹی پر عرصہ دراز تک مسلط رہتا ہے تو وہ لوگوں کی فطرتِ سلیمہ کو مسخ کر ڈالتا ہے۔ اس سوسائٹی کی ساری خوبیاں اور اس کے افراد کے سارے فضائل ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے ہیں۔ غلامی انسان کی فطری خوبیاں اور طبعی صلاحیتیں برباد کر دیتی ہے اور غلامی ان کے مزاجوں میں اس قدر راسخ ہو جاتی ہے کہ جب اُن پر ظلم و ستم ہوتا ہے تو وہ سیدھے ہو جاتے ہیں اور جوں ہی آزادی ملتی ہے وہ ہر قید سے آزاد ہو جاتے اور سرکشی پہ اتر آتے ہیں۔ یہی حال بنی اسرائیل کا تھا کہ طویل غلامی نے ان کی فطرت کو بگاڑ کر رکھ دیا تھا[1]

اس موقعہ پر حافظ ابنِ کثیرؒ نے یہ بات بالکل برموقعہ فرمائی ہے کہ

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ فضیلت میں حضرات صحابہ دوسرے انبیاء کے حواریوں اور ساتھیوں کے مقابلے میں گوستے سبقت لے گئے ہیں۔ کیونکہ صحابہ کرامؓ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں دھوپ کی شدت اور گرمی کی تمازت میں دین کی سربلندی کے لیے غزوات اور سرایا میں سفر کیے لیکن اس قسم کے خوارق و معجزات کا مطالبہ نہیں کیا۔ نہ غیبی خوراک مانگی اور نہ دھوپ سے بچاؤ کی درخواست کی۔ اگر کبھی کچھ مانگ پیش بھی کی تو صرف یہ کہ یارسول اللہ کھانا تھوڑا ہے برکت کی دعا فرما دیجئے۔ اگر پیاس کی شدت نے ستایا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دعا فرما دی۔ بدلی اُٹھی، برسی اور چل دی۔ اتباع کا یہ کامل ترین، مؤثر ترین اور محبوب ترین نمونہ صحابہ کے سوا کہیں دیکھنے میں نہیں آتا[2]

---

[1] فی ظلال القرآن　[2] ابنِ کثیرؒ ج۱ ص۹۰

وَاِذْ قُلْنَا ادْخُلُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ فَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ رَغَدًا وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُوْلُوْا حِطَّةٌ نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطٰيٰكُمْ ۭ وَسَنَزِيْدُ الْمُحْسِنِيْنَ ۞ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ قِيْلَ لَهُمْ فَاَنْزَلْنَا عَلَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۞

اور اس واقعہ کو بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے کہا تھا کہ اس بستی[۱۴۹] میں داخل ہو جاؤ۔ پھر کھاؤ پیو اور آرام کی زندگی بسر کرو۔ اور ہم نے تم سے کہہ دیا تھا کہ جب شہر کے دروازے[۱۵۰] میں قدم رکھو تو بستی کے دروازے[۱۵۱] میں سجدہ ریز ہوتے ہوئے اور زبانوں[۱۵۲] سے حِطّہ کہتے ہوئے داخل ہونا۔ اگر تم نے ایسا کیا تو ہم تمہاری خطاؤں کو معاف[۱۵۳] کر دیں گے۔ اور حسنِ کار لوگوں کو مزید فضل و انعام سے نوازیں گے۔ لیکن پھر ایسا ہوا کہ تم میں سے ظلم کار لوگوں نے اسے ایسی بات[۱۵۴] سے بدل ڈالا جو اُن سے کہی نہ گئی تھی۔ اس کے نتیجے[۱۵۵] میں ہم نے ظلم کار لوگوں پر آسمان سے اُن کی نافرمانیوں اور بدکاریوں کی پاداش میں عذاب[۱۵۶] نازل کیا۔

فتح کا نشہ

یہاں اللہ تعالیٰ ان کی یہ تاریخی نافرمانی اس لیے بیان فرما رہے ہیں کہ ان کی زندگی کی تصویر کے دونوں رُخ سامنے آ جائیں۔ محکومیت اور حاکمیت کے یا غلامی اور آقائی کے۔ زمانۂ غلامی میں اگر قبولِ حق کے لیے تیار نہ ہوسکے تھے تو قبول کے بعد زمانۂ آقائی میں اقتدار کے نشہ میں سرکشی اور معصیت پر اصرار کرتے ہیں۔ قوموں پر اللہ کی جانب سے دونوں قسم کے ابتلا آتے ہیں غلامی کا اور آقائی کا۔ غلامی میں اگر مصائب سے دوچار ہوتے ہیں تو اقتدار کی بے راہ روی معاصی سے ہمدوش کر دیتی ہے۔

چونکہ تاریخی لحاظ سے یہ واقعہ خروج کے بعد پیش آیا تھا۔ اس لیے اس کا ذکر یہاں مناسب ہوا۔ اور انداز یہ بتا رہا ہے کہ قرآن تمام تاریخ بنی اسرائیل کو ایک وحدت بنا کر پیش کر رہا ہے جو اپنے آغاز سے آخر تک یکساں اور ملتی جلتی ہے۔ اس لیے بیانات میں تسلسلِ زمانی اور ترتیبِ تاریخی

ہرگز ضروری نہیں ہے۔ قرآن کا مقصود تو نتائج و عبر ہیں اخلاقی، روحانی، سیاسی اور اجتماعی سبق نہ کہ واقعات کی روداد۔

۱۴۸ اس بستی میں داخل ہو جاؤ۔ اصل عربی میں لفظ قریہ آیا ہے اور وہ بھی الف لام کے ساتھ جو خصوصیت کے معنے بتاتا ہے لوگوں کے مقام اجتماع کو کہتے ہیں۔ کیڑیوں کے مسکن کو بھی عربی اجتماع کے پیش نظر قریہ کہتے ہیں۔ لفظ کے اصل معنے لغت میں جمع ہیں۔ اہل عرب جب پانی حوض میں اکٹھا کرتے تھے اس وقت بولتے ہیں قریت الماء فی الحوض۔ یہاں گاؤں نہیں شہر ہے کیونکہ رغداً چین و آرام کی زندگی گاؤں میں نہیں شہر ہی میں میسر آسکتی ہے جہاں شہری زندگی کی ساری ضروریات فراہم ہوتی ہیں۔

یہ شہر کونسا تھا؟ یہ سوال بیحد اہمیت کا حامل ہے۔ اصل تو یہی ہے کہ اس کی تعیین میں ہمیں راہ سکوت اختیار کرنی چاہیے جن میں خود قرآن خاموش ہے۔ خدا معلوم بنی اسرائیل کی تاریخ میں کتنے شہر ہیں جن میں داخل ہوتے وقت ان کو عاجزی اور نیاز مندی کے مظاہرہ کا حکم ہوا ہے مگر انسانی طبیعت ہمیشہ نامعلوم کی طلب میں کوشاں رہتی ہے۔ اس لیے مختلف علماء نے یہاں بھی شہر کی تعیین میں دادِ تحقیق دی ہے۔ تحقیق کی حد تک آپ بھی لطف اندوز ہو جائیے۔

جب بنی اسرائیل کو ایک شہر میں داخل ہونے کا حکم ہوا اس شہر کا نام اریحا تھا۔ اس میں قوم عمالقہ جو قوم عاد سے تھی، اور بعض نے بیت المقدس کہا ہے [۱]

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں قریہ سے بیت المقدس مراد ہے [۲]

غالباً یہ وہ شہر ہے جسے تورات میں یریحو کہا گیا ہے۔ اور جو یردن پار سرزمینِ کنعان کی پہلی آبادی تھی جس کے حصول کی بنی اسرائیل کو بشارت دی گئی تھی [۳]

یہ ابھی تک تحقیق نہیں ہو سکا ہے کہ اس بستی سے مراد کون سی بستی ہے۔ جس سلسلۂ واقعات میں یہ ذکر ہو رہا ہے وہ اس زمانے سے تعلق رکھتا ہے جب کہ بنی اسرائیل ابھی جزیرہ نمائے سینا میں تھے۔ لہٰذا اغلب یہ ہے کہ یہ اسی جزیرہ کا کوئی شہر ہو گا۔ مگر یہ بھی ممکن ہے کہ اس سے مراد شطیم ہو جو یریحو کے بالمقابل دریائے اُردن کے مشرقی کنارے پر تھا۔ بائیبل کا بیان ہے کہ اس شہر کو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زندگی کے آخر زمانے میں فتح کیا اور وہاں بڑی

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۱ [۲] معارف القرآن ج ۱ ص ۱۳۹ [۳] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۳۹

بدکاریاں کیں جس کے نتیجے میں خدا نے ان پر وبا روانہ کی اور چوبیس ہزار آدمی ہلاک ہو گئے۔[1]
(گنتی باب ۲۵ آیت ۱-۸)

ممکن ہے کہ فلسطین کا شہر اریحا ہو جو موجودہ نقشوں میں یریحو کے نام سے ملے گا۔ یہ بحرِ مردہ کے شمالی ساحل سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسے اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کے زمانے میں فتح کیا تھا۔ قدیم ائمہ تفسیر کا رُخ بیت المقدس کے بعد پھر اسی شہر کی جانب ہے۔ اس کے علاوہ بھی متعدد شہروں اور مقامات کے نام لیے گئے ہیں۔ بعض شہروں کے اب نام بھی بدل گئے۔ مثلاً ایلہ کہ اب اسے عقبہ کہتے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ شہر شطیم مراد ہو۔ یہ علاقہ موآب میں واقع ہے جو بحرِ مردہ کے مشرق میں واقع ہے۔ شہر دریائے یردن کے مشرقی کنارے پر ہے۔ بحرِ مردہ کے شمال و مشرق میں۔ بنی اسرائیل کی دشت پیمائی کے زمانے میں یہ شہر گویا ان کا سرحدی ناکہ تھا۔ عربی میں اسے وادی انار بھی کہتے ہیں۔ بعض مفسرین نے جو درمون کا نام لیا ہے اس سے بھی مراد یہی ہے[2]

۱۴۹ سجدہ ریز ہوتے ہوئے۔ مطلب یہ ہے کہ اس شہر کے دروازے میں سجدہ شکر کرتے ہوئے جاؤ۔ اور یہ شکر بدنی ہو۔ اور بعض کہتے ہیں کہ براہِ تواضع کمر کو جھکاتے ہوئے جاؤ[3]

یعنی حکم یہ تھا کہ ظالم و جابر فاتحوں کی طرح اکڑتے ہوئے نہ گھسنا بلکہ خدا ترسوں کی طرح منکسرانہ حالت میں داخل ہونا جیسے محمد صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقعہ پر مکہ میں داخل ہوئے[4]

اصل میں حکم یہ ہوا کہ شہر کے دروازے میں سجدہ شکر کرتے ہوئے داخل ہونا۔ حضور نبی صلی اللہ علیہ وسلم مکہ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو غسل فرمایا اور آٹھ رکعت نماز پڑھی۔ کچھ علماء نے اسے صلوٰۃ الفتح کا نام دیا ہے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص رضی جب ایوانِ کسریٰ میں فاتحانہ داخل ہوتے تو محل میں پہنچ کر آٹھ رکعت نماز پڑھی[5]

۱۵۰ زبانوں سے حِطّہ کہتے ہوئے۔ یعنی زبان سے استغفار اور اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہوئے داخل ہونا۔ قرآن میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو فتح کے وقت یہی حکم آیا تھا۔

إِذَا جَاءَ نَصْرُ اللَّهِ وَالْفَتْحُ ۝ وَرَأَيْتَ النَّاسَ يَدْخُلُونَ فِي دِينِ اللَّهِ أَفْوَاجًا ۝ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ وَاسْتَغْفِرْهُ ۚ إِنَّهُ كَانَ تَوَّابًا ۝

---

۱ تفہیم القرآن ص ۸۸ ۲ تفسیر ماجدی ص ۲۲ ۳ حاشیہ شیخ الہند ص ۱۱ ۴ تفہیم القرآن ص ۸۸ ۵ معارف القرآن ج ۱ ص ۱۴۰

جب اللہ کی مدد اور فتح آجائے اور آپ لوگوں کو فوج در فوج اللہ کے دین میں داخل ہوتے دیکھیں تو اپنے پروردگار کی تسبیح و تحمید کیجئے اور اس سے استغفار کیجئے یقیناً وہ بہت توبہ قبول کرنے والا ہے۔

فتح کی سرشاریوں میں یہ ہدایت نہیں دی جارہی ہے کہ جشن دھوم دھام سے منانا، جلوس نکالنا، نقارے بجانا، چراغاں کرنا اور زندہ باد کے نعرے لگانا۔ بلکہ حکم یہ ہو رہا ہے کہ اللہ کی طرف متوجہ ہونا اور استغفار کرنا۔ یہاں حِطّہ کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ سے اپنی خطاؤں کی معافی مانگتے ہوئے جانا۔ دوسرے یہ کہ لوٹ مار اور قتل عام کے بجائے بستی کے باشندوں میں درگزر اور عام معافی کا اعلان کرتے جانا۔[1]

پہلے بدنی شکر ادا کرنے کو کہا اب ان سے کہا جارہا ہے کہ زبان سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہوئے جاؤ۔ یہ شکر زبانی ہوا۔ جو یہ دونوں باتیں کرے گا اس کی خطائیں ہم معاف کر دیں گے اور نیک بندوں کے لیے ثواب بڑھائیں گے۔[2]

یہ فرق ہے اللہ والوں کے لشکر اور دُنیادار بادشاہوں کے لشکروں کے داخلہ میں۔ دُنیادار فاتح کے ہاں قومی بینڈ اور ترانے بجتے ہیں، وقتی نعرے لگتے ہیں۔ یعنی قدم قدم پر قومی، شخصی اور وطنی بڑائی کا اظہار کرتے ہیں۔ اس کے برعکس جب نبوت کے علوم کے علمبردار فاتح کی حیثیت سے کسی ملک میں داخل ہوتے ہیں اور ان کو جب سیاسی کامیابی سے ہمدوش ہونے کا موقعہ ملتا ہے ان کا دل خشوع سے لبریز اور زبان پر تسبیح ہوتی ہے۔ قُوْلُوْا حِطَّةٌ سے یہ مراد نہیں ہے کہ بعینہٖ لفظ حِطّہ کا تلفظ ادا کرتے جاؤ۔ یہ لفظ تو عربی ہے اور عبرانیوں کی زبان عربی نہیں۔ عبری یا عبرانی تھی۔ مراد یہ ہے کہ ان کو زبان سے بھی کلمات توبہ و استغفار ادا کرتے رہنے کا حکم ملا تھا۔

۱۵۱ تو ہم تمہیں معاف کر دیں گے۔ یعنی اگر تم نے شہر میں داخل ہوتے وقت ہماری ہدایات پر عمل کیا تو ہم تمہاری غلطیوں کے نتائج سے تمہاری نگرانی کریں گے اور گناہوں کے اثرات سے تمہاری حفاظت کریں گے۔ اور اس پر اکتفا نہیں بلکہ آگے فرمایا ہے کہ حسن کار لوگوں کو مزید نوازیں گے۔ یہاں تعمیل احکام میں بھی درجہ بندی ہے۔ پہلا درجہ عام عمل کا ہے کہ اللہ کی

---

[1] تفہیم القرآن ص ۷۹ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۱

بات مان لی اور اس کے مطابق زندگی میں عمل کیا۔ یہ درجہ جس نے حاصل کرلیا اس کے لیے مغفرت کا پروانہ ہے۔ دوسرا درجہ اس سے آگے ہے اور اس کا نام احسان ہے۔ احسان کے معنے نیکی کرنے کے نہیں بلکہ نیکوکاری کرنے کے ہیں۔ ایک نیک ہے دوسرا نیکوکار ہے۔ دونوں میں بہت فرق ہے۔ جب بندہ وادیٔ محبت طے کرتا ہوا اپنے مولیٰ کی رضا و تسلیم میں فنا ہوجاتا ہے اور اللہ کے حکموں کا اس طرح فرمانبردار ہوجاتا ہے جیسے ایک شائستہ گھوڑا اپنے سوار کے اشارات کا۔ تو یہ حسن کار ہے۔ گویا المحسنین اسرائیلی مسلمانوں کا وہ طبقہ تھا جو زندگی کے تمام مختلف شعبوں میں حسن پسند نہیں بلکہ حسن کار واقع ہوا تھا۔ یہاں کام کرنے کے دو رتبے ہیں۔ ایک یہ کہ سر کا بوجھ اتارنے کے لیے قانون کا گھر پورا کردیا جائے۔ اس میں نہ مشقت ہوتی ہے نہ وقت لگتا ہے لیکن اگر یہ ارادہ کرلیا جاتے کہ جو کام بھی کیا جائے پورے حسن و خوبی سے کیا جائے تو اس کے لیے سب کچھ کرنا پڑتا ہے پھر ان حسن کاروں کو اگر زہد و فضل کی محبوبیت کا مقام حاصل ہو تو اپنی محنت و مشقت کی بنیاد پر یقیناً وہ اس کے مستحق ہیں۔

۱۵۲ ظلم کار لوگوں نے اسے بدل ڈالا۔ ان سے کہا گیا تھا کہ عجز و نیاز کے ساتھ شہر میں داخل ہونا، زبان پر استغفار ہو۔ قرآن کا منطوق تو یہی ہے کہ ان کو استغفار کرنے کا حکم ملا تھا لیکن غَيْرَ الَّذِي قِيلَ لَهُمْ کے مفہوم سے معلوم ہوتا ہے کہ استغفار کے لیے ان کو خالص دعائی پیمانے کی تلقین ہوئی تھی۔ یہ پیمانہ کیا تھا؟ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ پیمانہ "حِطَّةٌ" کا تھا۔ یہ کلمہ استغفار ہے اس کے معنے ہیں، خدایا گناہوں سے پاک کردے۔ عربی کا شاعر کہتا ہے:

فاز بالحطة التی جعل اللہ   بہا ذنب عبدہ مغفورا

وہ اس توبہ پر فائز ہوا جس کے ذریعے اللہ نے اپنے بندے کے گناہ کو بخش دیا

یہ کہنا کہ یہ عربی لفظ ہے اور اسرائیلیوں کی زبان عربی نہیں عبرانی ہے زیادہ وزن نہیں رکھتا جبکہ سامی زبانوں کی علماء السنہ ہم آہنگی ثابت کرچکے ہیں۔ آخر لفظ دین کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ عبرانی اور آرامی زبانوں میں اس کے مشتقات ملتے ہیں۔ لہٰذا اگر عبرانی میں بھی یہی دعائی پیمانہ ہو تو اس میں کیا استبعاد ہے۔ صاحب ترجمان القرآن کا میلان اسی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو دعائی پیمانہ زبان سے کہنے کے لیے ان کو بتایا گیا تھا انہوں نے اسے چھوڑ کر کچھ اور کہنا شروع کر دیا۔ اسے چھوڑ کر انہوں نے کیا کہا؟ اس میں آراء مختلف ہیں لیکن امام بخاریؒ نے جو مرفوع حدیث حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے پیش کی ہے اس میں خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس تبدیل شدہ پیمانے کی نشاندہی کی ہے کہ انہوں نے "حِطَّةٌ" کی جگہ حَبَّةٌ فِي شَعِيرَةٍ کہا تھا

یعنی غلط جو ہیں — یہ بات انہوں نے ازراہِ تمسخر کہی۔ اور یہ ان لوگوں سے قطعاً بعید نہیں ہے جن کی طبیعتوں میں اللہ کی نافرمانی رچی بسی ہو۔ جو اپنے نبی سے استہزاء کرتے ہوں۔ اور جن کی قومی سیرت میں نبیوں پر قتل اور تہمتوں کے دھبے ہوں۔ اب آئیے یہ بھی معلوم کر لیجئے کہ اس کا نتیجہ کیا ہوا؟ قرآن نے بتایا ہے کہ

۱۵۳ ان ظالموں پر آسمان سے عذاب نازل کر دیا۔ ظالموں کے اضافہ سے اشارہ فرمادیا کہ یہ نافرمانی سب نے نہیں کی تھی۔ اور یہ بھی بتایا کہ یہ عذاب صرف ظالموں پر نازل ہوا تھا اَلَّذِیْنَ ظَلَمُوْا سے صرف یہی بتانا مقصود نہیں ہے کہ یہ عذاب سب پر نہیں آیا تھا بلکہ یہ جتانا مقصود ہے کہ اس عذاب کا سبب عالم طبیعت میں صرف طبعی مؤثرات نہیں تھے بلکہ عالم غیب میں ان کا ظلم کار ہونا اس کا سبب بنا تھا۔ کیونکہ قاعدے کے مطابق جب کسی حکم کو کردار کے حوالہ سے پیش کیا جاتا ہے تو کردار حکم کی علت ہوتا ہے۔ قرآن میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں مثلاً اَلسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوْا اَیْدِیَهُمَا میں ہاتھ کاٹنے کی علت چوری کا کردار ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو یہ سزا ان کے ظلم کی پاداش میں ملی تھی۔ معاً یہ سوال یہاں ذہن میں ابھرتا ہے کہ ایسے نازک موقعہ پر ان کو یہ کیا سوجھی۔ تمسخر کا بھی کوئی موقعہ ہوتا ہے اور نافرمانی کا بھی کوئی محل ہوتا ہے۔ اسی اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ میں دیا گیا ہے۔ یعنی ان میں اس موقعہ پر یہ ظلم کاری فسق و فجور کی عادت بنانے کی وجہ سے نمایاں ہوئی تھی۔

آیت کی تشریحات ختم ہو چکی ہیں لیکن ابھی دو باتیں بحث طلب ہیں۔

اوّل یہ کہ رجزؔ، عذاب کی نوعیت کیا تھی۔ ہمارے ہاں روایتیں طاعون کی نقل ہوئی ہیں۔ تاریخ بنی اسرائیل میں آتا ہے کہ طاعون اس قوم پر بار بار آیا ہے۔ اور بائبل میں اس کا ذکر متعدد مقامات پر ہے۔ اس کے علاوہ بھی بنی اسرائیل طرح طرح کی بلاؤں کا نشانہ بنتے رہے ہیں اس لیے ایسی بات کی تعیین کی کوئی خاص اہمیت نہیں ہو سکتی جسے قرآن نے خود ہی پوشیدہ رکھا ہے۔

دوسری بحث اس آیت میں یہ بھی ہے کہ اس آیت میں ذکر کے پیمانہ کو بدلنے کو ظلم اور فاسقوں کا شیوہ بتایا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ذکر کے جو پیمانے نبوت کی راہ سے آئیں ان میں تبدیلی جائز نہیں ہے۔

دراصل نبوت کی جانب سے جو ہدایات آتی ہیں ان کی دو صورتیں ہوتی ہیں

۱۔ جن ہدایات میں معانی مقصود ہوں الفاظ کو درجہ مقصودیت حاصل نہ ہو ان میں اگر ایسی تبدیلی

کردی جائے جس سے معنے پر کوئی اثر نہ پڑے تو یہ جائز ہے لیکن اس میں شرط یہ ہے کہ بیان کرنے والا حافظ اور عارف ہو۔ اگر بیان کرنے والا حافظ اور عارف نہ ہو تو اس کے لیے الفاظ بدلنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ حافظ ابن الصلاحؒ نے مقدمہ میں، حافظ نوویؒ نے تقریب میں تصریح فرمائی ہے کہ ایسے شخص کے لیے تبدیلی کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس حد تک مسئلہ سب کے یہاں اتفاقی ہے لیکن علماء کا اس موضوع پر اختلاف ہے کہ اگر کوئی شخص حافظ اور عارف ہو تو اس کے لیے تبدیلی کرنے کی گنجائش ہے یا نہیں۔ ابوبکر الخطیبؒ نے الکفایہ فی علوم الروایہ میں اکثر سلف کی طرف نسبت کرکے لکھا ہے کہ وہ اسے ناجائز کہتے ہیں۔ حافظ سیوطیؒ نے اسی کو سلف میں قاسم بن محمدؒ، امام ابن سیرینؒ اور رجاء بن حیوہؒ کا مسلک قرار دیا ہے۔ امام ذہبیؒ نے صحابہ میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کو اسی نظریے کا علمبردار بتایا ہے۔ اگرچہ امام رازیؒ نے محصول میں، امام غزالیؒ نے المستصفیٰ میں، علامہ قرافیؒ نے شرح تنقیح الفصول میں، حافظ سیوطیؒ نے تدریب الراوی میں اور علامہ الجزائریؒ نے توجیہ النظر میں یہ بتایا ہے کہ امام ابوحنیفہؒ تبدیلی کے قائل ہیں۔ لیکن مشہور محدث ملا علی قاریؒ نے شرح مسند امام اعظمؒ میں امام اعظمؒ کے بارے میں حافظ ابوجعفر طحاویؒ کی ایک روایت کی وجہ سے دعویٰ کیا ہے کہ امام اعظمؒ کسی درجہ میں لفظی تبدیلی کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔ بہرحال امام اعظمؒ، امام مالکؒ اور خطیب بغدادیؒ کے الفاظ میں سلف کی اکثریت کا مذہب یہی ہے۔ لیکن بعد میں آنے والے محدثین احادیث کی روایت میں اس کی پابندی نہ کرسکے انہوں نے پہلے کتابت کے سہارے حفظ کی گرفت کو ڈھیلا کیا۔ بعد ازیں راوی سے معرفت کی قید کو یہ کہہ کر ہٹا دیا کہ عارف ہو یا نہ ہو حدیث بیان کرسکتا ہے۔ اور معلوم ہے کہ الفاظ کی نگرانی اگر حفظ کے ذریعے ہوتی ہے تو معانی کی حفاظت کا واحد ذریعہ معرفت ہے۔ لیکن محدثین کو اس میں شدت محسوس ہوئی تا آنکہ سیوطیؒ نے برملا اس کی سنگینی کی یہ کہہ کر شکایت کی کہ یہ مذہب بڑا ہی سخت ہے اور عمل اس پر نہیں ہے[1]

۲۔ وہ ہدایات جن کے معنے ہی میں نہیں بلکہ الفاظ میں بھی تعبد ہے اور الفاظ بھی معنے کی طرح مقصود ہیں جیسے قرآن حکیم، اذکار نماز۔ ان کو ان ہی لفظوں میں ادا کرنا ضروری ہے۔ دوسرے الفاظ میں تبدیل کرنا قطعاً جائز نہیں ہے۔ قرآن کا ترجمہ اگر آپ پڑھیں گے تو یہ تلاوت قرآن نہیں ہے۔ شوافع میں سے حافظ سیوطیؒ نے لکھا ہے کہ الاذکار توقیفیۃ اذکار کے الفاظ سرکاری ہیں۔ احناف

---

[1] اس پر مبسوط بحث کے لیے ہماری کتاب دیکھیے "امام اعظم اور علم الحدیث" از ص ۵۶۰ تا ۵۰۶

وَاِذِ اسْتَسْقٰى مُوْسٰى لِقَوْمِهٖ فَقُلْنَا اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۗ فَانْفَجَرَتْ مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۗ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۗ كُلُوْا وَاشْرَبُوْا مِنْ رِّزْقِ اللّٰهِ وَلَا تَعْثَوْا فِى الْاَرْضِ مُفْسِدِيْنَ ۞

اور وہ واقعہ بھی یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی مانگا[۱۵۴] اور ہم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ اپنی لاٹھی چٹان پر مارو[۱۵۵] موسیٰ علیہ السلام نے ہمارے حکم کی تعمیل میں اپنی لاٹھی چٹان پر ماری تو بارہ[۱۵۶] چشمے اس چٹان سے پھوٹ نکلے اور سب لوگوں کو اپنا اپنا پانی لینے کی جگہ کا علم ہو گیا۔ (اسی وقت تم سے ہم نے کہا تھا کہ) کھاؤ پیو[۱۵۷] اللہ کی دین سے فائدہ اٹھاؤ اور اس ملک میں جھگڑا و فساد نہ کرو[۱۵۸]

ہیں سے ابوبکر الجصاص نے قرآن کی اسی آیت سے اس کی ممانعت پر استدلال کیا ہے۔ احناف کے مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین الشامی نے رد المحتار میں نماز کے بعد ۳۳ بار تسبیح، ۳۳ بار تحمید اور ۳۴ بار تکبیر پر عدد کی زیادتی کے بارے میں بحث کو اس فیصلہ پر ختم کر دیا ہے کہ اگر کسی شک کی بنا پر زیادہ بار پڑھا پھر تو معذور ہے اور اگر ثواب کی خاطر زیادہ کیا تو معذور نہیں ہے کیونکہ شارع کی قائم کردہ حد سے آگے بڑھنا ہے۔ ملا علی قاری نے علامہ جزری کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ نماز کے بعد ذکر مسنون اللّٰھم انت السلام ومنک السلام کے ساتھ والیک یرجع السلام کے اضافہ کی کوئی اصل نہیں ہے۔ امام عینی نے حضرت براء بن عازب کی اس روایت پر جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو سونے کے وقت دعا سکھائی تھی اور حضرت براء کی غلطی پر جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اصلاح فرمائی۔ یہ نوٹ لکھا ہے کہ ثواب کی مقدار اور الفاظ کی تعیین کی حد تک اسلام میں اذکار توقیفی ہیں۔ ان تصریحات سے آپ جِطر کی تبدیلی کی سنگینی کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔

بارہ چشمے

وادیٔ سینا میں شدید گرمی پڑتی ہے۔ دُور دور تک پانی کا نام و نشان نہیں ہے۔ بنی اسرائیل نے حضرتِ موسیٰ علیہ السلام سے مطالبہ کیا کہ پانی کہاں سے پئیں ہم تو پیاس سے تڑپ تڑپ کر مر جائیں گے۔

سایہ کے لیے ابر، کھانے کے لیے من وسلویٰ کی فراہمی کے ساتھ پینے کے لیے پانی کا بھی انتظام کرو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہ الٰہی میں ہاتھ اٹھا دیے۔ وحی الٰہی نے ان کو حکم دیا کہ اپنا عصا پتھر پر مارو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے تعمیلِ حکم کی تو فوراً بارہ چشمے اُبل پڑے۔

آیت کی تشریح سے پہلے ذرا اس پس منظر پر ایک نگاہ ڈال لیجیے جو اس واقعہ کے سلسلے میں تورات میں بیان کیا گیا ہے اور اس پس منظر کے آئینے میں بنی اسرائیل کے کردار کا چہرہ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

تب سارے بنی اسرائیل کی جماعت نے اپنے سفروں میں خداوند کے فرمان کے مطابق سین کے بیابان سے کوچ کیا اور رفیدیم میں ڈیرا کیا۔ وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا سو لوگ موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دیں کہ پیویں۔ موسیٰ نے خداوند سے فریاد کر کے کہا ان لوگوں سے کیا کہوں وہ سب تو مجھے سنگسار کرنے کو تیار ہیں۔ (خروج باب ۱۷ آیت ۱-۴)

اور قدیم ترین یہودی مورخ جوزیفس کی تاریخ آثارِ یہود میں ہے۔ وہ مقام رفیدیم میں پہنچے جہاں پیاس کی شدت سے بیتاب ہو رہے تھے۔ یہاں کی سرزمین میں پانی کا ایک قطرہ نہ پایا۔ اس پر یہ لوگ غصہ میں بھر کر پھر موسیٰ پر ٹوٹ پڑے .... لیکن وہ خدا کے آگے دعا میں زاری کے ساتھ مشغول ہو گیا۔ (باب ۳ فصل ۲)

تورات میں ہی ایک دوسری جگہ مقام کا نام رفیدیم کے قادس درج ہے۔ (گنتی ۲۰-۱-۲)

اس بنا پر علمائے اہلِ کتاب میں باہم سخت اختلاف ہو گیا ہے کہ اس واقعہ کا مقام وقوع کیا ہے؟ وہ مقام کوئی ہو قرآن نے خود مقام کا نام نہیں لیا خود واقعہ کا ہونا اہلِ کتاب کو مسلم ہے اور واقعہ کے ہونے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔[1]

۱۵۴ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم کے لیے پانی طلب کیا۔ عربی میں استسقاء کا لفظ آیا ہے اس کے معنے پانی مانگنا ہے۔ پانی مانگنے کا مطلب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ سبحانہ سے پانی کے لیے دعا فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ استسقاء کی اصل دعا ہے۔ غالباً امام ابوحنیفہؒ جو اسلامی قانون کے اپنے دور میں بہت بڑے نکتہ داں ہوئے ہیں انہوں نے اسی سے اندازہ کیا ہے کہ اصل میں استسقاء دعا ہے اور شریعت اسلامیہ میں نماز کی صورت میں دعائی پیمانہ اسی کا مسنون عمل ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کبھی بارش کی طلب گاری کے لیے نماز ادا کی ہے اور کبھی ایسا بھی کیا ہے کہ خطبہ کی حالت میں صرف دعا فرما دی اور نماز ادا نہیں کی۔ چنانچہ صحیحین میں حضرت

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۲۲

انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ خطبہ جمعہ ہی میں آپ نے دعا فرمائی اور اللہ سبحانہ نے بارش نازل فرمادی۔ [له]

یہاں سے یہ بھی معلوم ہوا کہ توبہ و استغفار اور اللہ کی جناب میں دعاء بارش برسانے اور ابر لانے کے لیے ایک آلہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اُمت کو اسی کو بارش لانے کے لیے استعمال کرنے کا حکم دیا تھا۔

يَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُمْ مِدْرَارًا:

حضرت نوح علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو یہی مشورہ دیا ہے۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ آخری پیغمبر ہیں اس لیے آپ نے اس کا کامل نمونہ پیش فرمایا اور زمانۂ نبوت میں اس عملی تجربہ کا لوگوں نے مشاہدہ بھی کیا۔

آج تو شاید اس عملی تجربہ کو کوئی ماننے کے لیے تیار نہ ہو لیکن اللہ کے رسولؐ کا بیان ہے جسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں روایت کیا ہے۔

ایک شخص کسی میدان میں جا رہا تھا کہ اس نے بادل کے ٹکڑے میں سے آواز سنی فلاں شخص کے باغ کو سیراب کرو۔ آواز کے بعد دیکھا کہ بادل کا وہ ٹکڑا ایک کنارے کی طرف ہٹ گیا اور برس گیا۔ اس کا پانی ایک سنگلاخ زمین میں جمع کیا پھر چند نالیوں میں سے ایک نالی میں سارا پانی سمٹ کر آگیا۔ اور ایک طرف بہنے لگا۔ آواز سننے والے کا بیان ہے کہ میں اس پانی کی روانی کے پیچھے پیچھے چلا۔ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی ایک باغ میں کھڑا پانی لگا رہا ہے۔ میں نے اس سے دریافت کیا کہ اسے اللہ کے بندے بتا تیرا نام کیا ہے؟ اس نے بتایا کہ فلاں نام ہے۔ یہ وہی نام تھا جسے میں نے ابر سے سنا تھا۔ تب باغبان نے میرے سے پوچھا کہ تم نے میرا نام کیوں دریافت کیا ہے۔ میں نے کہا کہ جس بادل کا یہ پانی ہے میں نے اس سے آواز سنی تھی کہ فلاں کا باغ سیراب کرو۔ یہ تمہارا ہی نام ہے۔ اب بتاؤ کہ تمہارا کردار کیا ہے۔ اس نے کہا۔ اچھا تم نے پوچھا ہے تو بتا دیتا ہوں۔ سنو میں اس باغ کی پیداوار کے تین حصے کرتا ہوں۔ ایک حصہ صدقہ کرتا ہوں ایک حصہ اپنے اہل و عیال کے لیے رکھ لیتا ہوں اور ایک حصہ پھر اسی باغ میں لگا دیتا ہوں۔

گویا آب پاشی کی بے شمار تدبیروں میں سے قرآن کی رُو سے ایک اہم تدبیر توبہ، استغفار، دعا اور صدقہ ہے۔ جس کی تصدیق انبیاء کے تجربے سے ہو چکی ہے۔

له معارف القرآن م س ص ۱۶۸

یاد رہے کہ اس تجربہ کے مؤثر ہونے کے لیے گناہوں سے بیزاری، فقر و مسکنت اور عبودیت کا اظہار ضروری ہے۔ گناہوں پر اصرار اور اللہ کی نافرمانیوں پر قائم رہتے ہوئے تاثیرِ دُعا کے انتظار کا کسی کو حق نہیں ہے۔

۱۵۵۔ ہم نے کہا کہ اپنی لاٹھی چٹان پر مارو۔ دُعا قبول ہونے پر پانی حاصل کرنے کی یہ تدبیر بتائی کہ چٹان پر لاٹھی مارو، پانی اُبلنے لگے گا۔ یہ چٹان کون سی تھی۔ بیضاویؒ اور رازیؒ نے لکھا ہے کہ یہ خاص چٹان تھی۔ تورات میں ہے کہ یہ چٹان جبلِ حورب میں تھی۔ (خروج ۱۷: ۶) حورب سے وہ سلسلہ کوہ مراد ہے جو وادی لجاس میں واقع ہے۔ وہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔ سیاح اسے جاکر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اب بھی اس میں پاتے جاتے ہیں[۱]

۱۵۶۔ اس چٹان سے بارہ چشمے پھوٹ نکلے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبیلے تھے اس لیے چشمے بھی بارہ نکلے۔ کسی قبیلہ میں آدمی زیادہ کسی میں کم۔ ہر قبیلہ کے موافق ایک چشمہ تھا[۲]۔ بعض نادان مسیحیوں نے اس تعداد پر بھی اعتراض کر دیا ہے کہ یہ توراتیبل میں موجود نہیں ہے۔ اللہ نے جواب بھی مسیحیوں کی زبان سے دلایا۔ جارج سیل انگریزی میں قدیم مترجم قرآن ہے۔ اس آیت کے حاشیہ پر لکھتا ہے۔ ایک مسیحی جو وہاں سے ہو آیا ہے بتصریح بیان کرتا ہے کہ چٹان میں بارہ مقامات سے پانی نکلتا تھا۔ اور ایک دوسرے مسیحی سیاح کا مشاہدہ بیان کرتا ہے کہ چٹان میں اس وقت چوبیس سوراخ ہیں جو بآسانی شمار کیے جا سکتے ہیں۔ بارہ ایک طرف اور بارہ دوسری طرف۔ سب سے پہلے قرآن نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لیے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے۔ یہ اشارہ ان ہی شگافوں کی طرف ہے[۳]

۱۵۷۔ کھاؤ پیو۔ اس زور نے معاش گریز رجحانات کی تردید کر دی ہے اور بتا دیا کہ عالم کا نظام ناسُوتی بکفہ دری کا نظام ہے۔ یعنی اللہ نے اس نظام کو اسی لیے قائم کیا ہے تاکہ اپنی معاشی سہولتوں کے لیے بالواسطہ یا بلاواسطہ آدمی اس سے استفادہ کرے اور نفع اٹھائے۔ اس لیے نہیں ہے کہ اس سے گریز اختیار کرے۔ رزق اللہ میں رزق کی نسبت کرکے جتا دیا کہ جو کچھ مل رہا ہے وہ سب اللہ کے فضل و کرم سے ہے۔ تمہارے زورِ بازو کا ہرگز نتیجہ نہیں ہے۔

۱۵۸۔ ملک میں جھگڑا و فساد نہ کرو۔ جب قوم کی قوم قانونِ الٰہی کو چھوڑ کر اپنے ہوائے نفس

---

[۱] تفہیم القرآن ص ۹۹ [۲] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۲ [۳] تفسیر ماجدی ص ۲۵

کے مطابق کوئی روش اختیار کر لیتی ہے تو اس کا نتیجہ دُنیا میں لازمی طور پر فتنہ و فساد، حرب و ضرب اور کثرتِ جرائم کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور انفرادی و اجتماعی امن اٹھ جاتا ہے۔ فضل و انعام سے نواز کر بنی اسرائیل سے کہا جا رہا ہے کہ جو فارغ البالی کی اللہ کی جانب سے نعمت ملی ہے۔ اس کو غنیمت سمجھو اور اس کی قدر کرو۔ اللہ کے قانون کی نافرمانی کر کے ملک کے امن و نظم کو خراب نہ کرو۔ امن اور نظم اسی وقت قائم رہ سکتا ہے جب اللہ کے بھیجے ہوئے قانون پر عملدرآمد ہے۔ اللہ کے دستور کے علاوہ کسی جاہلی دستور پر قائم رہنا، اس کے طور طریقوں کی دعوت دینا فساد فی الارض کے مترادف ہے۔ اس سے انحراف بلکہ سرمو تجاوز دُنیا کو بدنظمی، تباہی، ابتری، کشت و خون، بداخلاقی، قطع ارحام، نسل کشی اور طبقاتی جنگ کو دعوت دیتا ہے۔

بہرحال آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی دُعا سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ضرب کے ذریعے اللہ سبحانہٗ نے بنی اسرائیل کے لیے چٹان سے بارہ چشمے نکال کر پانی کا انتظام فرمایا۔

یہ واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ایک حیثیت سے نہیں بلکہ متعدد حیثیتوں سے معجزہ ہے۔ پانی کا پتھر سے نکلنا، پتھر سے بارہ چشموں کا نکلنا، لاٹھی کی ضرب سے نکلنا، بقدرِ ضرورت نکلنا ——— ضرورت پوری ہو جانے پر بند ہو جانا، الغرض یہ واقعہ قدرتِ الٰہی کا ایک خاص کرشمہ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کا عظیم معجزہ تھا ——— اور جو کوتاہ منظران معجزات کا انکار کرتے ہیں ———

نیستند آدم خلاف آدم اند

دیکھو مقناطیس تو لوہے کو اپنی طرف کھینچ لیتی ہے اس پتھر نے پانی کھینچ لیا تو انکار کیوں ہے۔[1]

قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ ایسے خوارق کا انکار کرنا بڑی غلطی ہے۔ جب بعض پتھروں میں خلافِ قیاس اللہ تعالیٰ نے یہ تاثیر رکھی ہے کہ لوہے کو جذب کرتا ہے تو اگر اس پتھر میں یہ تاثیر پیدا کر دی ہو کہ اجزائے زمین سے پانی جذب کر لے تو کیا بعید ہے۔ ہمارے زمانے کے عقلاء کو اس سے سبق حاصل کرنا چاہیے۔ یہ منظیر بھی سطحی نظر والوں کے لیے ہے ورنہ خود اگر اس پتھر کے اجزاء ہی میں پانی پیدا ہو جائے پھر بھی کونسا محال ہے۔ جو لوگ ایسی باتوں کو محال کہتے ہیں تو واللہ وہ محال کی حقیقت ہی نہیں سمجھتے[2]

علامہ زملکانی سے حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ میں نقل کیا ہے کہ عصائے موسیٰ کے ذریعے پتھر سے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۲ [2] بیان القرآن ص ۴۵

پانی کا نکلنا بلاشبہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا اعجاز ہے اور یقیناً بہت بڑا اعجاز ہے لیکن اسی اعجاز کی ایک جھلک ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات میں جب نظر آتی ہے تو دونوں میں یعنی اعجاز موسوی اور اعجاز محمدیؐ میں زمین و آسمان کا فرق نظر آتا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ بیان فرماتے ہیں کہ ہم معجزات کو برکت سمجھتے ہیں اور تم ان کو خوف کی چیز سمجھتے ہو۔ ہم ایک سفر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے۔ پانی کی کمی ہو گئی۔ آپؐ نے فرمایا کہ دیکھو کسی کے پاس کچھ پانی ہو تو لے آؤ۔ لوگ ایک برتن لے آئے جس میں ذرا سا پانی تھا۔ آپؐ نے برتن میں اپنا دست مبارک ڈالا اور فرمایا چلو اور وضو کا پانی اور خدا کی برکت لو۔ بخدا میں نے بچشم خود دیکھا کہ پانی آپ کی انگلیوں سے چشمہ کی طرح اُبل رہا تھا۔ اور آپ کے زمانۂ مبارک میں ایسا ہی ہوتا تھا کہ ہم کھانا کھاتے تھے اور کھانے کی تسبیح اپنے کانوں سے سنتے تھے۔

یہ بھی ایک معجزہ ہے اور وہ بھی ایک معجزہ تھا۔ لیکن ذرا غور فرمائیے کہ پانی پتھر سے نکلا اور لاٹھی کی ضرب کے ذریعے نکلا۔ پانی طبعاً زمین اور پتھر ہی سے نکلتا ہے اور پہاڑوں میں چشمے چٹانوں ہی سے نکلے ہوتے ہیں۔ اور پانی کسی ذریعہ ہی سے باہر آتا ہے چاہے یہ پھاوڑے اور کدال کی ضرب ہو اور چاہے کسی اور چیز کی۔ یہاں اعجاز صرف یہ ہے کہ جس راہ سے پانی آتا ہے اور جس ذریعے سے آتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے عصا کے ذریعے پانی نکال دیا۔ لیکن اعجازِ محمدیؐ کا معاملہ اس سے بالا ہے۔ انگلیوں کی راہ سے پانی آنا اللہ کی عادت اور عالم تکوین کا قانون نہیں ہے۔ صرف لگن میں ہاتھ رکھتے ہی انگلیوں سے پانی کی آبشاریں اُبل آنا بہت بڑا اعجاز ہے۔ یوں سمجھئے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا پتھر سے پانی نکالنا اگر اعجاز ہے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا انگلیوں سے پانی نکالنا کمالِ اعجاز ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ کو اللہ سبحانہٗ نے دوسرے انبیاء کے مقابلے میں ہر پہلو میں شان کمال عطا فرمائی ہے۔ مولانا محمد قاسمؒ نے کیا خوب فرمایا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی برکت سے اگر پتھر میں سے پانی نکلتا تھا تو یہاں دست مبارک میں سے نکلتا تھا اور ظاہر ہے کہ پتھروں سے پانی نکلنا اتنا عجب نہیں جتنا گوشت و پوست میں سے پانی کا نکلنا عجب ہے۔ اس پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں پتھر میں سے پانی کے نکلنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ جسم مبارک موسویؑ کا یہ کمال تھا۔ اور یہاں یہ ثابت ہوتا ہے کہ دست مبارک محمدیؐ منبع فیوض الانہار ہے۔ بلکہ جب یہ دیکھا جائے کہ کسی پیالہ میں تھوڑا سا پانی لے کر اس پر آپؐ نے ہاتھ پھیلا دیا جس سے اس قدر پانی نکلا کہ تمام لشکر سیراب ہو گیا اور لشکر کے جانور سیراب ہو گئے۔

وَإِذْ قُلْتُمْ يَٰمُوسَىٰ لَن نَّصْبِرَ عَلَىٰ طَعَامٍ وَٰحِدٍ فَٱدْعُ لَنَا رَبَّكَ يُخْرِجْ لَنَا
مِمَّا تُنۢبِتُ ٱلْأَرْضُ مِنۢ بَقْلِهَا وَقِثَّآئِهَا وَفُومِهَا وَعَدَسِهَا وَبَصَلِهَا ۖ قَالَ
أَتَسْتَبْدِلُونَ ٱلَّذِى هُوَ أَدْنَىٰ بِٱلَّذِى هُوَ خَيْرٌ ۚ ٱهْبِطُوا۟ مِصْرًا فَإِنَّ لَكُم
مَّا سَأَلْتُمْ ۗ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ ٱلذِّلَّةُ وَٱلْمَسْكَنَةُ وَبَآءُو بِغَضَبٍ مِّنَ ٱللَّهِ ۗ ذَٰلِكَ
بِأَنَّهُمْ كَانُوا۟ يَكْفُرُونَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَيَقْتُلُونَ ٱلنَّبِيِّۦنَ بِغَيْرِ ٱلْحَقِّ ۗ
ذَٰلِكَ بِمَا عَصَوا۟ وَّكَانُوا۟ يَعْتَدُونَ ﴿٦١﴾

اور اپنی تاریخ حیات کے اُس واقعہ کو بھی یاد کرو جب تم نے موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ ہم ایک ہی کھانے پر[159] صبر ہرگز نہ کریں گے یہ ہم سے نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا آپ اپنے پروردگار سے ہمارے لیے دُعا فرمایئے کہ ہمارے لیے وہ تمام چیزیں پیدا کی جائیں جو زمین کی پیداوار[160] ہیں۔ ساگ، ترکاری، گیہوں، لہسن، دال، پیاز۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کیا تم ایک بہتر چیز کے بدلے ادنیٰ درجے کی چیز لینا چاہتے ہو[161] اچھا اگر تم یہی چاہتے ہو تو کسی شہری[162] آبادی میں جا رہو۔ جو کچھ تم مانگ رہے ہو وہاں تمہارے لیے موجود ہوگا۔ اور اس قسم کی گستاخیوں کی پاداش میں بالآخر اُن پر ذلت[163] و خواری کی مار پڑ گئی اور اللہ کے غضب میں آ گئے۔ یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ وہ اللہ کی آیات[164] کا انکار کرتے تھے اور ناحق اللہ کے پیغمبروں کو قتل کرتے تھے[165]۔ اور گمراہی کی اس منزل پر وہ اس لیے پہنچے کہ وہ اطاعت کی جگہ سرکشی اور قانون کی بغاوت کے عادت مجرم تھے[166]۔

تو یہ بات بحکم فہم سلیم سمجھ میں آتی ہے کہ جیسے آئینہ وقت تقابل آفتاب فقط قابل و منفعل ہوتا ہے اور نور فشانی فقط آفتاب ہی کا کام ہے اور یہ کمالِ نور اُسی کی طرف سے آیا ہے آئینہ کی طرف سے نہیں یا کائنات الجو اور حوادث مابین ارض و سما میں فاعلیت آسمان کی طرف ہے۔ زمین فقط قابل ہے دوسروں کا کمال لے کر ظاہر کرتی ہے۔ ایسے ہی اس وقت جس وقت آپ نے دستِ مبارک اُس پانی پر رکھا اور یہ معجزہ تکثیر آب نمایاں ہوا تو یوں سمجھو کہ پانی محض قابل تھا فاعلیت اور ایجاد آپ کی طرف سے تھا یعنی فاعلیت فاعلِ حقیقی اور ایجاد موجدِ حقیقی کے سامنے آپ کا دستِ مبارک ایک واسطہ فیض اور آلہ ایجاد تھا گو اُس خدا کو بے ان وسائط کے بھی بنانا آتا ہے۔ لیکن اس میں شک نہیں کہ اس طور سے پانی کا پیدا ہونا صاف اس

بات پر دلالت کرتا ہے کہ جو کچھ ہوا وہ آپ کے دستِ مبارک کی تاثیر سے ہوا اور ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ میں یہ خوبی نہیں نکلتی بلکہ فقط ایک قدرتِ خدا ثابت ہوتی ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ انبیائے عالم میں صرف حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ذاتِ گرامی ہے جن کے لیے ایک دفعہ چٹان کی رگیں پانی کی سوتیں بنی ہیں۔ لیکن رسولِ عرب کے لیے صرف گوشت و پوست کی انگلیاں نہیں بلکہ مشکیزہ کا چمڑا، خشک چشموں کے دہانے، سوکھے ہوئے کنوؤں کی سوتیں، دہانِ مبارک کی کلیاں متعدد بار پانی کا چشمہ ثابت ہوتی ہیں۔ گویا ؎

نہ دانم آں گل رعنا چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغ ہر چمنے گفتگوئے او دارد

فکری پستی اور طبیعت کا فساد

وادی سینا کی گرم و خشک فضاؤں اور پتھریلی زمین میں اللہ نے بنی اسرائیل کے لیے سائے کا، پینے کے لیے پانی کا اور کھانے کے لیے غذا کا انتظام فرمایا اور ایک عظیم مقصد کی خاطر نبوت کی رہنمائی میں ان کی تربیت کا اہتمام کیا مگر اُن کی فاسد طبیعت، فکری پستی اور فطرت کی دناءت قدم قدم پر ان کے راستہ میں حائل رہی۔ اپنی فکری پستی اور طبیعت کے فساد کی وجہ سے اُن کو مقصد کی عظمت کا کوئی احساس نہ تھا۔ وہ تکلیفیں برداشت کرنے سے گھبراتے اور شہری زندگی کی راحتوں کو رہ رہ کر یاد کرتے تھے۔ حد یہ کہ وہ اس عظیم مقصد کی خاطر کھانا چھوڑنا اور بھوکا مرنا تو در کنار کھانے پینے کی اشیاء میں کسی تبدیلی کو بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ وہ کسی طرح تیار نہ تھے کہ عزت و اقتدار اور آزادی کے لیے اپنی زندگی کو کسی نئے سانچے میں ڈھالیں۔ ان آیات میں ان کی اسی نیرنگئ طبع اور فکری پستی کا تذکرہ ہے۔

۱۵۹ یہ واقعہ اسی وادیٔ سینا کا ہے۔ بنی اسرائیل آسمانی طعام کھاتے کھاتے اکتا گئے تو کہنے لگے کہ ہم سے ایک طرح کے کھانے پر صبر نہیں ہوتا ہم کو تو زمین کا اناج، سبزی، ساگ، ترکاری چاہیے[۱]

قرآن حکیم یہاں واقعات میں ان کی تاریخی ترتیب اور تسلسل کا ہرگز پابند نہیں ہے۔ بنی اسرائیل عرصہ دراز تک ایک ہی غذا کھاتے کھاتے اکتا گئے تھے اور اب اپنے پیغمبر سے فرمائش کر رہے

---

۱ حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۲

تھے کہ اس بیابان سے نکال کر کسی دوسری جگہ لے چلئے جہاں طرح طرح کے شہری کھانے موجود ہوں۔[1]

۱۶۰۔ اپنے پروردگار سے دعا کیجئے کہ وہ ہمارے لیے زمین کی پیداوار مہیا کرے۔ دراصل مصریوں کی مرغوب غذا اکثر زراعت پیشہ قوموں کی طرح زمینی پیداوار تھی۔ مصر میں آج کی طرح اس وقت بھی بڑی مانگ سبزی، پیاز، ہلدی وغیرہ کی تھی اور یہی چیزیں اسرائیلیوں کی بھی اصل غذا بن چکی تھیں۔ اسرائیلیوں کی اصل غذا سبزی تھی خصوصاً غلہ کی اقسام (جیوش انسائیکلو پیڈیا ص ۴۳) قدیم اسرائیلی سبزیوں، ترکاریوں اور پھلوں پر گزر بسر کرتے تھے۔ (ج ۵ ص ۵۹۶)

توراۃ میں یہ بات ذرا مختلف انداز میں پیش کی گئی ہے۔

بنی اسرائیل روتے ہوئے بولے کون ہے جو ہمیں گوشت کھانے کو دے گا۔ ہم کو وہ مچھلی یاد آتی ہے جو ہم مفت مصر میں کھاتے تھے اور وہ کھیرے اور وہ خربوزے اور وہ گندنا اور وہ پیاز اور وہ لہسن۔ پر اب تو ہماری جان خشک ہو چلی ہے۔ یہاں تو ہماری آنکھوں کے سامنے کچھ بھی نہیں ہے مگر یہ من۔ (گنتی ۱۱-۴-۶)[2]

۱۶۱۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کیا ایک بہتر چیز کے بدلے ادنیٰ چیز لینا چاہتے ہو مطلب یہ ہے کہ جس بڑے مقصد کے لیے یہ صحرا نوردی تم سے کرائی جا رہی ہے اس کے مقابلے میں کیا تم کو کام و دہن کی لذت اتنی مرغوب ہے کہ اس مقصد کو چھوڑنے کے لیے تیار ہو اور ان چیزوں سے محرومی کچھ مدت کے لیے بھی برداشت نہیں کر سکتے ہو۔[3] جب محکومی و غلامی سے اخلاق پست ہو جاتا ہے۔ اور بلند مقاصد کے لیے جوش و عزم باقی نہیں رہتا تو صورتِ حال یہی ہو جاتی ہے جس کا نقشہ ان آیات میں پیش کیا گیا ہے۔ بنی اسرائیل فراعنہ مصر کی غلامی سے آزاد ہو گئے تھے اور قومی عظمت کا مستقبل ان کے سامنے تھا لیکن وہ حقیر راحتوں کے لیے ترستے تھے جو مصر کی غلامانہ زندگی میں ان کو میسر تھیں۔ اور وہ چھوٹی چھوٹی تکلیفیں شاق گزرتی تھیں جو آزادی اور عظمت کی راہ میں پیش آتی ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام ان کو بتا رہے ہیں کہ افسوس تمہاری غفلت اور بے حسی پر۔ کیا تم چاہتے ہو کہ ادنیٰ سی بات کے لیے یعنی غذا کی لذت کے لیے اس مقصد عظیم سے دست بردار ہو جاؤ جس میں بڑی ہی خیر اور برکت ہے یعنی قومی آزادی اور سعادت سے۔ اچھا اگر تمہاری بدبختی کا حال یہی ہے تو

۱۶۲۔ کسی شہری آبادی میں جا رہو، وہاں یہ تمام چیزیں مل جائیں گی۔ کیونکہ بڑے شہروں میں

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۵ [2] تفسیر ماجدی ص ۲۵ [3] تفہیم القرآن ص ۸۰

سبزیاں اور پھل علاوہ موسم کے بے فصل اور بے بہارے مل جایا کرتے تھے۔ شہر کے لیے مصر کا لفظ بولا گیا ہے یہاں مراد جزیرہ نما سینا یا اس کے مضافات کا کوئی شہر ہے۔ یہ اس وقت ہے جبکہ لفظ مصر نکرہ ہو اور تنوین کے ساتھ ہو اور اگر یہ علم اور نام ہے اور بغیر تنوین کے ہو جیسا کہ زمخشری کی تصریح کے مطابق حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی روایت میں ہے اور امام اعمشؒ کی قرأت ہے تو مطلب یہ ہے کہ اس کے لیے دُعا کی ضرورت نہیں ہے تم دوبارہ مصر ہی چلے جاؤ جہاں سے آتے ہو۔ اپنی اسی ذلت آمیز غلامی کو دوبارہ اختیار کر لو وہاں تمہیں کافی مقدار میں ساگ، ترکاریاں مل جائیں گی اور اس بلند نصب العین کو چھوڑ دو جس کے لیے تمہارا انتخاب ہوا ہے۔ اگر یہ دوسرا مطلب ہو تو یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے ایک قسم کی سرزنش ہے۔ حافظ ابن جریرؒ نے ابوالعالیہؒ اور ربیعؒ کی طرف منسوب کر کے یہی مطلب بتایا ہے۔ اگرچہ ابن جریرؒ کی رائے میں نہ یہ معنی دُرست ہیں اور نہ یہ قرأت۔ مصر کے بعض جدید مؤلفین کی جانب سے اس کی ترجیح بے وزن ہے۔ میری مراد سید قطب مرحوم سے ہے۔

ف ۱۶۳ ۔ اور ان پر ذلت و خواری کی مار پڑ گئی۔ ذلت یہ کہ ہمیشہ مسلمان اور عیسائیوں کے محکوم رہتے ہیں۔ کسی کے پاس دل ہوا تو کیا۔ حکومت سے محروم ہو گئے جو موجب عزت تھی۔ اور محتاجی یہ کہ اوّل تو یہود میں مال کی قلت ہے اور جن کے پاس ہو بھی تو حکام وغیرہ کے خوف سے اپنے آپ کو مفلس اور حاجت مند ہی ظاہر کرتے تھے۔ شدتِ حرص اور بخل کے باعث محتاجوں سے بدتر نظر آتے ہیں لہ

اس موضوع کے تفصیلی مباحث تو چوتھے پارہ میں آئیں گے لیکن یہاں یہ نکتہ ضرور پیش نظر رہے کہ پچھلے پارہ میں یہود کا ذکر نہیں ہے ذکر بنی اسرائیل کا ہو رہا ہے۔ یعنی ایک معین نسل و قوم کا نہ کہ کسی مسلک کے ماننے والوں کا۔ اس لیے جو ذلت و نکبت چودہ سو سال گزرنے پر اس کی مصداق ایک مخصوص نسل و قوم ہے۔ خود ANTI-SAMITISM کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہود سے جو مستقل عداوت جرمنی کو خصوصاً اٹلی، ہنگری، رومانیہ وغیرہ یورپ اور امریکہ کی اکثر ولایتوں کو عموماً ہے اس کی بنا نسلی یا قومی ہے نہ کہ دینی و اعتقادی ۔۔ تنگدستی اور مفلسی کی بات پر شاید آپ کو حیرت ہو اور سوچیں کہ سرمایہ داری تو یہود کی ضرب المثل ہے لیکن یہ محض فریب اور ایک عمومی مغالطہ ہے۔ دولت و ثروت جتنی بھی ہے وہ یہودیوں کے صرف چند مشاہیر و اکابر تک ہے ورنہ عوام یہود کا

لہ حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۲

شمار تو دنیا کی مفلس ترین قوموں میں ہے۔ یہ خود محققین یہود کا فیصلہ ہے۔ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں ہے۔
اگرچہ یہود کا تمول ضرب المثل ہے لیکن اہلِ تحقیق کا اتفاق ہے کہ یہود یورپ کے جس ملک میں آباد ہیں
وہاں کی آبادی میں انہیں کے مفلسوں کا تناسب بڑھا ہوا ہے (ج ۱ ص ۱۵۱) عوام یہود دوسری قوموں
سے کہیں زیادہ غریب ہیں یہ اور بات ہے کہ ان کے چند افراد بہت زیادہ دولتمند ہیں (ج ۱ ص ۱۶)

۱۶۴ یہ اس بات کا نتیجہ تھا کہ وہ اللہ کی آیات کا انکار کرتے تھے۔ یعنی اللہ کا غضب اور
ذلت و مسکنت ان پر اس لیے پڑی ہے کہ وہ زندگی میں ان سنگین جرائم کے مرتکب تھے۔ اوّل اللہ
کی آیات کا کفر، دوسرے انبیاء کا قتل۔

اس موقعہ پر سید قطب مرحوم کی یہ بات بالکل برمحل ہے کہ ان پر ذلت و خواری کا ہمیشہ کے لیے مسلط
ہونا تاریخی لحاظ سے اس مرحلہ پر نہیں ہوا۔ یہ لوگ ذلیل و خوار اس وقت ہوئے جب وہ عادی مجرموں
کے زمرہ میں آ گئے تھے۔ قرآن کی اس آیت میں اسی کی طرف کانوا یکفرون سے اشارہ کیا گیا ہے۔
ان برائیوں کا ارتکاب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کافی بعد ہوا لیکن چونکہ انہوں نے ساگ، ترکاری
کا مطالبہ کیا تھا اس لیے ان کے اس مطالبہ کے پیشِ نظر یہیں بتادیا۔ دوسرے بزرگوں نے بھی یہی
سمجھا ہے۔

یہاں کانوا یکفرون استعمال ہوا ہے۔ اس میں ان کی خاص مستقل قومی خصلت کا ذکر کیا ہے کہ انکا
کرتے ہی رہتے تھے، انکار کو شعار ہی بنا لیا تھا[1]

آیات سے کفر کی مختلف صورتیں مراد ہیں۔ مثلاً ایک یہ کہ خدا کی بھیجی ہوئی تعلیمات میں سے جو بات
اپنے خیالات اور خواہشات کے خلاف پائی اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ایک
بات کو یہ جانتے ہوئے کہ اللہ نے فرمائی ہے پوری ڈھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی
کی اور حکمِ الٰہی کی کچھ پروانہ کی۔ تیسرے یہ کہ ارشادِ الٰہی کے مفہوم کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے
باوجود اپنی خواہش کے مطابق اسے بدل ڈالا[2]

۱۶۵ ۔ ناحق اللہ کے پیغمبروں کو قتل کرتے تھے۔ یعنی دوسری بیہودگیاں، شرارتیں تو تھیں،
حد یہ ہے کہ قتل تک سے بھی نہ چوکے۔ اور یہ بھی اگر کانوا یکفرون ہی پر عطف ہے جیسا کہ عبارت
کا تقاضا ہے تو مطلب یہ ہے کہ قتل نبی کا ایک واقعہ نہیں بلکہ ان کی پوری زندگی نبیوں کے قتل

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۶ [2] تفہیم القرآن ص ۸۰

جیسے سنگین جرم سے آلودہ تھی اور قومی حیثیت سے وہ اس کے مجرم عادی تھے۔

یسعیا نبی کا قتل، یرمیاہ نبی کا قتل، ذکریا نبی کا قتل، یحییٰ نبی کا قتل اور حضرت مسیح کے لیے اقدامِ قتل، یہ اسرائیل کی تاریخِ جرائم کے چند جلی عنوانات ہیں۔ یہ قوم اس قابل رہ گئی تھی کہ اس کے ساتھ کچھ بھی رعایت نہ رکھی جائے۔

آیت میں قتلِ انبیاء کا جرم بیان کرتے ہوئے بغیرحق (یعنی ناحق) کی قید لگائی ہے۔ نبی کا قتل تو ہمیشہ ہی ناحق ہوتا ہے۔ نبی کے قتل کے جائز ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں۔ قرآن کا مقصود اس اضافہ سے یہ بتانا ہے کہ خود ان قاتلوں کے معیار سے بھی یہ قتل ناحق اور ناجائز ہے۔ یعنی خلافِ عدل تو تھا ہی بلکہ قانون، وقت اور ضابطہ بھی اس کی اجازت نہ دیتا تھا۔

۱۹۶ ۔ قانون کی بغاوت اور سرکشی کے مجرم عادی تھے۔ ایک گناہ دوسرے گناہ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ آیت میں بتایا ہے کہ کفر اور قتلِ انبیاء جیسے جرائم ان میں اس لیے پیدا ہو گئے تھے کہ وہ عصیان اور عدوان یعنی خلوت و جلوت میں خدا کی نافرمانی میں بے باک ہو چکے تھے۔ ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب بن جاتا ہے۔ عصیان و عدوان نے ان کو کفر اور قتلِ انبیاء تک پہنچا دیا۔ قاضی بیضاویؒ نے لکھا ہے کہ جس طرح چھوٹی طاعت بڑی طاعت کی طرف لے جاتی ہے۔ چھوٹی معصیت بھی بڑی معصیت تک پہنچا دیتی ہے۔

عصیان کا اطلاق قرآن میں بالعموم حقوق اللہ پر ہوا ہے جبکہ عدوان زیادہ تر حقوق العباد کے لیے بولا جاتا ہے۔ اعتداء، تعدی اور عدوان ایک ہی مادہ سے بنے ہیں اور سب کے معنے حد سے گزرنا ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان میں دونوں قسم کے گناہوں کی فراوانی ہو چکی تھی۔ اللہ سے نیاز مندانہ تعلق ٹوٹ چکا تھا اور اللہ کے بندوں سے معاملات غلط ہو چکے تھے۔

یہ فقرہ دراصل یہ بتانے کے لیے ہے کہ جس طرح صحتِ بدن کی ایک نشانی یہ ہے کہ زبان کا ذائقہ دُرست ہو اور اس میں میٹھی چیز میٹھی اور کڑوی چیز کڑوی معلوم ہو۔ ایسے ہی صحتِ ایمان کی علامت یہ ہے کہ ایمان کا ذائقہ دُرست ہو۔ اس میں طاعت و عصیان کا صحیح صحیح امتیاز باقی ہو۔ اگر یہ امتیاز باقی نہ رہے تو سمجھ لو بیماری آ لپٹی ہے۔ یہاں حال اس شخص کا ہے جو گناہوں کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اب اس میں طاعت و عصیان کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ احساس کی پامالی سنگین گناہوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ :

مومن اپنے گناہوں سے اس طرح ڈرتا ہے جیسے وہ پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہوا ڈر رہا ہو کہ وہ

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَادُوا وَالنَّصَارَىٰ وَالصَّابِئِينَ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿۶۲﴾

بلاشبہ مسلمان ہوں یا یہودی، اور عیسائی ہوں یا صابی۔ سب کی نجات وسعادت کا مدار دعویٰ اور نسبت سے ہٹ کر یہ ہے کہ جو بھی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہوتے عمل صالح کرے گا۔ ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس ان کے ایمان وعمل کا اجر ہے اور ان کو نہ کوئی ڈر ہو گا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔

اب گرا اور فاجر آدمی ان کو اس طرح حقیر سمجھتا ہے جیسے مکھی اس کی ناک کے پاس سے گزری ہے اور اس نے اپنے ہاتھ کی حرکت سے اڑا دی۔ (بخاری)

آیت کا حاصل یہ ہے کہ

اس ذلت ومسکنت وغضبِ الٰہی کا باعث ان کا کفر اور انبیاء علیہم السلام کا قتل کرنا تھا اور اس کفر وقتل کا باعث احکام کی نافرمانی اور حدودِ شرع سے خروج تھا[1]

مدارِ نجات وسعادت

آیت کا آغاز اِنَّ سے کیا ہے اور بغیر کسی رابطہ کے بات کہی گئی ہے۔ بلاغت کی زبان سے اس قسم کا اندازِ بیان ماحول میں یا مخاطبوں کے ذہنوں میں کسی اٹھتے ہوتے سوال کا جواب دینے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے اور اِنَّ بات کی پیشانی پہ اس وقت لگایا جاتا ہے جب مخاطب میں بات کے لیے انکار کی خلش ہو۔ بنی اسرائیل ان ساری شقاوتوں کے باوجود اس بات کے مدعی تھے کہ نجات صرف یہودیت میں ہے اور بنی اسرائیل خواہ کچھ کریں ان کو بہرحال جنت میں جانا ہے۔ قرآن ان

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۳

کے ذہنوں میں اس اُٹھے ہوئے سوال کا جواب اس آیت میں دے رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ مدارِ نجات دعویٰ اور نسبت نہیں بلکہ مدارِ نجات صرف ایمان اور عملِ صالح ہے خواہ کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو۔ایک مسلمان اگر ایمان و عمل کی نعمت نہیں رکھتا ہے تو وہ بھی اسی طرح نجات سے ہمدوش نہ ہوگا۔جیسے ایک یہودی، ایک عیسائی اور ایک صابئی۔

یعنی کسی خاص فرقہ پر موقوف نہیں یقین لانا شرط ہے اور عمل نیک ہو جس کو یہ نصیب ہوگا ثواب پایا۔ یہ اس واسطے فرمایا کہ بنی اسرائیل اس پر مغرور تھے کہ ہم پیغمبروں کی اولاد ہیں، ہم ہر طرح اللہ کے نزدیک بہتر ہیں[1]

ف ۱۶۷ جو مسلمان ہیں الذین آمنوا قرآن میں جہاں بھی مطلق صورت میں آیا ہے اس سے مراد مسلمان ہی ہیں ۔یہاں بھی مسلمان ہی مراد ہیں۔ قرآن نے مواقع خطاب میں یہی لفظ بولا ہے گویا مومنین اور الذین آمنوا مسلمانوں کا نام ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متبعین کے لیے خاص ہے ۔

یہاں مسلمانوں کا ذکر کیوں کیا گیا ہے ؟ ـــــ اس لیے تاکہ دُنیا کو یہ پتہ لگ جائے کہ نجات کا یہ قانون عام یگانوں اور بیگانوں سب کے لیے ہے ۔ صرف دعویٰ اور نسبت کا غرۃ ایمان و عمل کے بغیر مسلمان کے لیے بھی کافی نہیں ہے۔ نیز الذین آمنوا کے ذکر سے بات میں ایک وزن پیدا ہو گیا ہے ۔

اس کی مثال ایسی ہے کہ کوئی حاکم یا بادشاہ یوں کہے کہ ہمارا قانون عام یہ ہے خواہ کوئی موافق ہو یا مخالف ۔ جو بھی طاعت کرے گا وہ موردِ عنایت ہوگا ۔ ظاہر ہے کہ موافق تو طاعت کر ہی رہا ہے سنانا اصل میں مخالفین کو ہے ۔لیکن اس میں نکتہ یہ بتانا ہے کہ موافقین پر ہماری عنایت کی وجہ کوئی ذاتی خصوصیت نہیں بلکہ ان کی طاعت ہی ہماری عنایات کی علت ہے ۔ اگر مخالف بھی اس کو اختیار کرے تو وہ بھی ان کے برابر ہو سکتا ہے[2]

ف ۱۶۸ ۔ جو یہودی ہیں۔ عربی میں لفظ الذین ھادو ہے ۔ھاد اور ھود دونوں کے معنے یہودی ہونے کے ہیں ۔ ہود مصدر سے بنا ہے جس کے معنے پشیمان ہونا، حق کی طرف لوٹ آنا ہے۔ یہ لوگ چونکہ بچھڑے کی پوجا سے توبہ کرکے حق کی طرف لوٹنے تھے اس لیے یہود کہلائے ۔اور ھادوا کے معنے ہوتے دینِ یہود کے پیروکار ۔

ف ۱۶۹ ۔ نصاریٰ ۔ جمع نصرانی کی ۔ فلسطین میں ایک قصبہ ناصرہ ہے ۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳ [2] بیان القرآن ص ۳۶

کا آبائی وطن ہے اور آپ کو یسوع ناصری اسی نسبت سے کہا جاتا ہے۔ نصرانی کا انتساب اسی قصبہ کی طرف ہے۔ یا نصرانی کی وجہ تسمیہ شاید یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں نے انصار اللہ کہا تھا۔ تو جو لوگ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب کے مدعی ہیں وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب ہو گئے۔ (قاموس)

یہاں بعض معاصر مفسرین ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں کہ قرآن یہاں مسیحوں کا نہیں بلکہ نصاریٰ کا ذکر کر رہا ہے۔ مسیحی وہ ہیں جو اناجیل اربعہ پر یقین رکھتے ہیں۔ حضرت مسیح کو خدا کا نبی نہیں بلکہ خدا کا بیٹا مانتے ہیں۔ آخرت میں نجات دینے والا خدا کو نہیں بلکہ مسیح کو مانتے ہیں۔ اور خدائی کو تین اقنوموں میں تقسیم کر کے ایک ناقابلِ فہم فلسفہ بیان کرتے ہیں۔ اس کھلے ہوئے شرک کا ذکر ہرگز اس مقام پر مقصود نہیں ہے۔ اس لیے نام نصاریٰ بولا گیا ہے۔ نصرانی حضرت مسیح کے سچے پیروئی کو نبی ماننے والے ابتدائی زمانہ میں کہلاتے تھے۔ یہ توحید کے قائل تھے اور بجائے اناجیل اربعہ کے صرف انجیل متی کو مانتے تھے۔

ہمیں افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ یہ تفصیل خود معاصر کے ذہن و فکر کی اختراع ہے۔ ورنہ قرآن و سنت میں ایسی کوئی تفصیل موجود نہیں۔ قرآن اپنے زمانہ نزول میں نصاریٰ کو مخاطب کر رہا ہے۔ قرآن نے نصاریٰ کے عقیدوں کی جن مقامات پر تردید کی ہے وہاں انہیں کو نصاریٰ کا نام بنا کر تردید کی ہے۔

قَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيْحُ ابْنُ اللّٰهِ

سورۃ مائدہ میں ـــــ مِنَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى کہہ کر ان کے اس عقیدے کو کفر قرار دیا ہے۔ سورۃ توبہ میں ان کے مشرکانہ عقائد کا تذکرہ کیا ہے۔ اس لیے نصرانی اور مسیح کی یہ تفریق قرآن کی بیان کردہ تحقیق کے سراسر خلاف ہے۔ خبر نہیں اس تفصیل سے موصوف کا مقصد کیا ہے؟

۱۷۱۔ صابی۔ فرقہ صابی۔ دینِ حنیف اور ملتِ ابراہیمؑ کا متبع۔ یعنی حنفاء کے مقابل فرقہ کا نام ہے۔ صابی کی جمع صابئون اور صابئین آتی ہے۔ اس لفظ کے عربی ہونے میں اختلاف ہے۔ امام ابوالقاسم سہیلیؒ نے روض الانف میں اس کو عجمی بتایا ہے۔ اگر یہ عربی ہو تو یہ صباء سے ہے جس کے معنے صابی ہونے اور ایک دین سے دوسرے دین میں ہونے کے ہیں۔ علامہ شوکانیؒ فتح القدیر میں رقم طراز ہیں۔ صابئین صابی کی جمع ہے اور بعض نے صاب کی جمع کہا ہے۔ اور قاریوں نے اس میں اختلاف کیا ہے۔ چنانچہ بجز امام نافع قاریؒ کے سب نے اس کو ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے۔

جس نے اسے ہمزہ سے کہا ہے اس نے صبأت النجوم سے قرار دیا ہے جو ستاروں کے طلوع ہونے کے لیے بولا جاتا ہے۔ اور جس نے بغیر ہمزہ کے پڑھا ہے وہ اسے صبیٰ سے بناتے ہیں جس کے معنے مائل ہونا ہیں۔ لغت میں صابی وہ شخص ہے جو ایک دین سے نکل کر دوسرے دین کی طرف مائل ہو۔ اس لیے جب کوئی شخص اسلام لاتا تھا تو عرب کہتے تھے کہ قد صبا وہ بے دین ہوگیا۔ فرقہ صابیہ کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ وہ یہود اور نصاریٰ کے دین سے ہٹ کر ستاروں کے پرستار ہو گئے۔ (فتح القدیر ج ۱ ص ۹۰)

اور مولانا سید سلیمان ندویؒ فرماتے ہیں کہ:

لفظ صابئی کی لغوی تشریح بھی کسی قدر تفصیل طلب ہے۔ کہتے ہیں کہ صبا عبری لفظ صبع کا آرامی تلفظ ہے۔ صبع عربی لفظ صبغ کے ہم معنی ہے جس سے عربی میں دوسرا لفظ اصطباغ بنا ہے اس کے اصلی معنے دھونے اور نہانے کے ہیں اور اصطلاحاً بپتسمہ کے معنے میں بولا جاتا ہے۔ چونکہ یہ فرقہ مذہباً دن میں کئی مرتبہ غسل کرتا تھا اس لیے ان کا آرامی نام صابئی پڑا اور اسی سے عربی میں آیا۔ یہاں تک تو اس لفظ کی تشریح لغوی کا تعلق تھا۔ باقی رہی تاریخی تشریح کہ صابئین کون تھے۔ اور اُن کے عقائد کیا ہیں؟ اس کے متعلق سید صاحبؒ رقمطراز ہیں کہ:

حافظ ابن تیمیہؒ نے صابئین کی تحقیق پر الرد علی المنطقیین میں جو کچھ لکھا ہے وہ محققانہ ہے۔ ہم اس کا لفظ بہ لفظ ترجمہ کر دیتے ہیں۔

ان صابئین کا خاص مرکز حران تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام یہیں پیدا ہوئے تھے یا عراق سے یہاں آئے تھے۔ دونوں قول ہیں۔ یہاں علت اولیٰ، عقل اول اور نفس کلیہ کے ہیکل تھے۔ نیز زحل، مریخ، مشتری، شمس، زہرہ، عطارد اور قمر کے ہیکل تھے۔ عیسائیت سے پہلے ان کا یہی مذہب تھا۔ عیسائیت کے بعد ان میں عیسائیت پھیلی۔ یہاں تک کہ اسلام آیا اور یہ صابئین فلاسفہ حکومت اسلامی میں آخر وقت تک موجود رہے۔ ان ہی میں سے وہ صابئین تھے جو بغداد وغیرہ میں طبیب و منشی تھے۔ ان میں سے اسلام نہ لائے۔ چوتھی صدی ہجری میں جب فارابی حران گیا تو ان ہی سے فلسفہ سیکھا۔ اہل دمشق کا مذہب بھی عیسائیت سے پہلے یہی تھا۔ ان کی نماز کا قبلہ قطب شمالی تھا۔ اسی لیے دمشق میں بہت سی پرانی مسجدیں ہیں جن کا ایک قبلہ قطب شمالی بھی ہے۔ دمشق کی جامع مسجد کے پاس ایک بہت بڑا معبد ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اس کے بعد صابئین کی دو قسمیں کی ہیں۔ ایک موحدین، یہ وہ ہیں جنہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ملت کی پیروی کی۔ دوسری جماعت وہ تھی جو مشرک تھی۔ قرآن حکیم نے

حیثیتوں سے ذکر کیا ہے۔ ایک میں اوّل کا ذکر ہے اور دوسرے میں دوم کا۔[1]

اس موضوع پر ابوبکر الجصاص نے بھی تفصیلی بحث کی ہے لیکن ہم اسے پارہ چہر کے لیے اُٹھا رکھتے ہیں۔ یہاں دائرۃ المعارف الاسلامیہ کا اقتباس پیش کرتے ہیں۔ دائرۃ المعارف کے مؤلفین کی اس موضوع پر تحقیق نہ صرف یہ کہ حافظ ابن تیمیہ کی تحقیق سے ہم آہنگ ہے بلکہ کچھ اضافہ بھی ہے۔

صابیہ دو فرقوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔

پہلا فرقہ مندیا۔ انگریزی میں MANDIAN کہتے ہیں۔ یہ فرقہ یہودیت اور نصرانیت کا ایک معجون ہیں۔ اگرچہ نصرانی نہیں لیکن بپتسمہ کو مانتے ہیں اور عراق میں حضرت یحییٰ علیہ السلام کے پیروکار ہیں۔

دوسرا فرقہ صابیہ حران ہے۔ یہ فرقہ ستارہ پرست ہے۔ اس کو ایک عرصہ دراز تک اسلام کے ساتھ میں وقت گزارنے کا موقعہ ملا ہے۔ ان میں سے بہت ارباب فن اور اہل علم ہوئے ہیں۔ یہ بات صاف ہے کہ قرآن میں یہود و نصاریٰ اور صابئین کا جس مقام پر ذکر ہے وہاں فرقہ مندیا مراد ہے۔ اور اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ صابیہ عربی لفظ صباً سے بنا ہے جس کے معنے نہانے کے ہیں۔ عربی میں اگر عین گر گیا اور صبارہ گیا ہے تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ قطعاً معمدانیین ہی ہیں۔ صابیہ مشرکہ نے یہ نام محض یہود و نصاریٰ کے ساتھ اسلام کی فراخ حوصلگی کو دیکھ کر اپنے لیے استعمال کیا ہے ورنہ اصل میں صابی معمدانیین ہی ہیں۔

عرب مصنفین نے جن صابیہ کے حالات بیان کیے ہیں وہ صابیہ حران ہیں۔[2]

تاریخ ایران پر ایک مستند مستشرق کی کتاب کا اُردو ترجمہ حال ہی میں نکلا ہے (انجمن ترقی اُردو دہلی)، اس کے صفحہ ۲۷۴ پر فاضل مترجم ڈاکٹر شیخ محمد اقبال اورینٹل کالج لاہور مینڈین (MANDIAN) پر حاشیہ دیتے ہیں کہ:

مینڈین بزبان آرامی ماوالعلم۔ اس فرقہ کے لوگ اب بھی موجود ہیں اور صابئین کہلاتے ہیں۔ وہ لوگ اگرچہ عیسائی نہیں تاہم جان دی بپٹسٹ کو مانتے ہیں۔ عراق میں عوام الناس ان کو حضرت یحییٰ علیہ السلام کی اُمت کہتے ہیں۔ (ایران بہ عہد ساسانیاں)

نمبر ۱۷۰۔ جو بھی اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہوئے عمل صالح کرے اس کو ایمان و عمل کا اجر ضرور ملے گا۔ مطلب یہ ہے کہ نجات کا ضابطہ سب کے لیے ایک ہے۔ دعویٰ اور نسبت پر کسی کی نجات

---

[1] مشات القرآن [2] دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱ ص ۸۶

نہ ہوگی۔ نجات سب کی ایمان اور عملِ صالح سے ہوگی۔ یہ یہودیوں کے اس دعوے کا جواب ہوا کہ ہم تو نیکوں کی اولاد ہیں یا ہم تو اللہ کے لاڈلے ہیں۔ یا ہم تو صرف چالیس دن دوزخ میں جائیں گے۔ ان کو بتا دیا کہ اعتقاد صحیح اور عمل صحیح بس یہی دو نجات کی شرطیں ہیں گویا انسان کو یہ بشارت پہلی بار کھلے لفظوں میں پہنچی ہے کہ اصل شے عقیدہ اور عمل ہے اور ان دو کی تصحیح کے بعد قوم، نسل، نسب اور نسبت سب ہیچ ہیں۔

آیت میں ایمان باللہ کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ خدا کو ایک مان لیا جائے اور بس۔ بلکہ اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ اللہ کو الٰہ تسلیم کیا جائے اور اللہ کے سوا کسی کو الٰہ نہ مانا جائے۔ ایمان کی یہی دعوت دُنیا میں آنے والے پیغمبروں کا سب سے پہلا دعوتی کلمہ اور سب سے پہلا مطالبہ ہے۔ اور اللہ کو الٰہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی کی مرضی کی اطاعت اور اس کی بندگی و عبادت کو اپنے وجود کا آخری مقصد اور اپنی پیدائش کا نصب العین یقین کیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اگر ایمان یہی ہے جس پر نسلِ انسانی کی نجات اور کامیابی موقوف ہے تو پھر اللہ کو الٰہ بنانے کے لیے اللہ کی مرضی کا صحیح علم جب تک حاصل نہ ہو ایمان باللہ کا وجود کیسے ہوگا۔ اور خدا کی مرضی کا علم حاصل ہونے کا واحد ذریعہ اللہ کی وحی ہے اور جن پر خدا کی وحی آتی ہے اُن کو ہی قرآن کی زبان میں نبی اور رسُول کہتے ہیں۔

جو لوگ ایمان باللہ کا مطلب خدا کو ایک ماننا سمجھتے ہیں پتہ نہیں ان کی مراد کیا ہے؟ کیا وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر وہ شخص جو خدا کو ایک مان لے بس موحد ہے۔ اور اگر ایمان باللہ کا مطلب یہ ہے کہ عالم کو پیدا کرنے اور اس کے نظم و ترتیب کو قائم رکھنے والے کو ایک مانا جائے اور یہی ایمان مطلوب ہے تو پھر قرآن کی ان آیتوں کا کیا مطلب ہے جن میں بار بار مسلسل اور مختلف طریقوں سے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اس کے ماننے والے مشرکینِ مکہ بھی ہیں۔

اس آیت کا ہرگز یہ مقصد نہیں کہ صرف خدا کو مان کر عملِ صالح کرنے والا نجات یافتہ ہے۔ نہ سیاق و سباق اس کی اجازت دیتا ہے اور نہ نبوت کی دعوت اس کی ہمنوائی کرتی ہے۔

سلسلۂ عبارت کو پیشِ نظر رکھنے سے یہ بات خود بخود واضح ہو جاتی ہے کہ یہاں ایمان کی تفصیلات بیان کرنا مقصود نہیں ہے۔ یہاں تو یہودیوں کے اس زعمِ باطل کی تردید مقصود ہے کہ وہ صرف یہودی گروہ کو نجات کا اجارہ دار سمجھتے تھے۔ وہ اس خیالِ خام میں مبتلا تھے کہ ان کے گروہ سے اللہ کا کوئی خاص رشتہ ہے جو دوسرے انسانوں سے نہیں ہے۔ لہٰذا جو ان کے گروہ سے تعلق رکھتا

ہے وہ خواہ اعمال و عقائد کے لحاظ سے کیسا ہی ہو بہر حال نجات اس کے لیے مقدر ہے۔ اور باقی تمام انسان جو ان کے گروہ سے باہر ہیں وہ صرف جہنم کا ایندھن ہیں۔ اس غلط فہمی کو دُور کرنے کے لیے فرمایا جارہا ہے کہ اللہ کے یہاں اصل چیز تمہاری گروہ بندی نہیں بلکہ وہاں جو کچھ اعتبار ہے وہ ایمان اور عملِ صالح کا ہے۔ جو انسان بھی یہ چیز لے کر آئے گا وہ اپنے رب سے اجر پائے گا[1]

اور ایمان بھی وہ لے کر آئے گا جس کا مطالبہ بنی اسرائیل سے آغاز ہی میں آمِنُوا بِمَا اَنْزَلْتُ مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ وَلَا تَكُونُوا اَوَّلَ كَافِرٍ بِهٖ میں کیا ہے۔ اپنا مفروضہ ایمان نہیں۔ مطلب صاف ہے کہ جو قوم مسلمان کہلاتی ہے یا یہود و نصاریٰ یا صابی یا کچھ اور۔ تمثیلاً چند مذاہب کا ذکر کیا گیا ہے۔ کوئی شخص ان ناموں کی بدولت یا نسل، رنگ، پیشہ، وطن وغیرہ احوال و خصائص کے لحاظ سے حقیقی فلاح و کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ کامیاب، مامون، مصئون ہونے کا صرف ایک اور صرف ایک معیار ہے۔ ایمان اور عملِ صالح۔ جس طبقہ کو اپنے مقرب الٰہی یا کامیاب ہونے کا دعویٰ ہو وہ اسی کسوٹی پر اپنے کو کس کر دیکھ لے۔ اگر اس پر کھرا اُترے تو بے خوف و خطر مفلح و کامیاب ہے ورنہ ہر وقت اپنے کو خدا کے قہر و غضب کے نیچے سمجھے۔ پچھلی آیات میں خاص یہودیوں کو دعوتِ ایمان کے بعد ان پر انعامات کا ذکر اور ان کی قومی سیرت کے دھبوں کا تذکرہ تھا۔ اس آیت میں تمام اقوام و ملل کے سامنے بلا رو رعایت ایسا عجیب و غریب معقول اور منصفانہ ضابطہ پیش کیا گیا ہے جس کے بعد کسی سلیم الفطرت انسان کو اسلام کی صداقت اور ہمہ گیری میں شبہ نہیں رہ سکتا۔ ایک شخص جب تک خدا پر ایمان نہ لائے اور روزِ جزا کو نہ مانے اور نیکی اختیار نہ کرے کیا عقلِ سلیم قبول کر سکتی ہے کہ وہ نعیم دائم رضائے حق اور سرورِ ابدی سے ہمکنار ہو سکتا ہے۔ ایمان باللہ کے تحت میں اللہ کو الٰہ ماننا اور الٰہ ماننے کے ساتھ اس کے لوازم کو قبول کرنا داخل ہے۔ جو شخص کسی ایک پیغمبر کی تکذیب کرتا ہے اور اس کو قبول نہیں کرتا وہ فی الحقیقت اللہ کو نہیں مانتا ہے۔ اس کے ایمان باللہ کا دعویٰ جھوٹا ہے۔

قرآن نے اسی سورت میں ایمان کی راہ یہ بتلاتی ہے۔

وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَا اُنْزِلَ اِلَيْكَ وَمَا اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَبِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوْقِنُوْنَ ۔

اور اسی ایمان کے بارے میں یہ اعلان کیا ہے کہ

اُولٰٓئِكَ عَلٰى هُدًى مِّنْ رَّبِّهِمْ

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۰

اور اسی ایمان میں دنیا و آخرت کی فلاح و سعادت کو مقصور کیا ہے۔ یعنی اس سے باہر فلاح و سعادت کا کہیں تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اور اسی لیے تفریق بین الرسل کو ایک بہت بڑی گمراہی قرار دیا ہے۔

قرآن نے تفریق بین الرسل کو انکار کی راہ قرار دیا ہے اور ایمان کی راہ یہ بتلائی ہے کہ بلا تفریق سب کی تصدیق کی جائے۔ وہ کہتا ہے کہ یہاں راہیں صرف دو ہیں تیسری نہیں ہو سکتی۔ ایمان کی راہ یہ ہے کہ سب کو مان لو۔ انکار کی راہ یہ ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا انکار کر دو۔ یہاں کسی ایک کا انکار بھی وہی حکم رکھتا ہے جو سب کے انکار کا ہے[1]

۱۷۲ ف۔ نہ ان کو ڈر ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے اس آیت میں دونوں جملوں کے تفنن سے بڑا ہی لطیف استنباط فرمایا ہے۔ آیت میں پہلا جملہ لَاخَوْفٌ عَلَيْهِمْ ہے جس کے معنے ہیں ان کو کوئی ڈر نہیں ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ لَا يَخَافُونَ وہ نہیں ڈریں گے۔ اور دوسرا فقرہ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ وہ غمگین نہ ہوں گے۔ یہ نہیں فرمایا لَاحُزْنَ لَهُمْ ان کو کوئی غم نہیں ہے۔ پہلے جملہ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ روزِ قیامت اُن کو اللہ کا ڈر ہوگا۔ حساب کا اندیشہ ہوگا۔ اس لیے حال کی نفی فرمائی ہے مستقبل کی نفی نہیں فرمائی ہے۔ اور دوسرے جملہ میں غم کے مستقبل میں نہ ہونے کی خبر دی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ ان کو کسی حال میں غم سے دوچار نہیں ہونا پڑے گا، نہ قبر میں نہ میدانِ حشر میں۔

یاد رہے کہ قرآن میں یہ پیرایۂ بیان بارہ مقام پر آیا ہے۔ سب سے پہلے اسی سورت میں فَمَنْ تَبِعَ هُدَايَ فَلَا خَوْفٌ ..... الخ وہاں اس سے پہلے انبیاء کی آمد کا تذکرہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو پیامِ ہدایت اللہ کی جانب سے رسولوں کے ذریعے آئے گا جو شخص اس کی پیروی کرے گا اُسے نہ ڈر ہے اور نہ رنج ہوگا۔ دوسرا یہ موقعہ ہے مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا ..... الخ تیسرے آیت ۱۱۲ البقرہ میں بَلٰى مَنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ مُحْسِنٌ فَلَهٗ اَجْرُهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ وَلَاخَوْفٌ ..... الخ یعنی اسلام اور احسان دونوں جمع ہوں تو اس کو نہ کوئی ڈر ہے اور نہ غم ہوگا۔ ۴۔ آیت ۲۶۲۔ اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا مَنًّا وَّلَآ اَذًى لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَاخَوْفٌ ..... الخ یعنی راہِ خدا میں کسی کو کچھ دیتے ہیں اور دے کر احسان نہیں جتاتے اور اپنے برتاؤ سے تکلیف نہیں دیتے ان کو نہ ڈر ہے اور نہ غم ہوگا۔ ۵۔ آیت ۲۷۲ البقرہ۔ اِنَّ

---

[1] ترجمان القرآن ص ۸۷

اَلَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَقَامُوا الصَّلٰوۃَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوۃَ لَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ...الخ یعنی جو لوگ ایمان لاتے اور عمل صالح کے ساتھ اقامت صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی ادائیگی کرتے ہیں ان کو نہ ڈر ہے اور نہ غم ہوگا۔ ۲۔ اور اسی رکوع کی آیت ۲۷۴ اَلَّذِیْنَ یُنْفِقُوْنَ بِالَّیْلِ وَالنَّھَارِ سِرًّا وَّعَلَانِیَۃً فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ عِنْدَ رَبِّھِمْ وَلَاخَوْفٌ... الخ یعنی جو لوگ خلوت و جلوت میں خرچ کرتے رہتے ہیں ان کو نہ ڈر ہے اور نہ غم ہوگا۔ ۷۔ آیت ۱۷۰ آل عمران میں شہدار کے بارے میں ہے اَنْ لَّاخَوْفٌ...الخ۔ ۸۔ آیت ۶۹ مائدہ میں ہے مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰہِ وَالْیَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَھُمْ اَجْرُھُمْ...الخ۔ ۹۔ آیت ۴۸ سورۃ انعام میں انبیاء کی بعثت کا ذکر کر کے فرمایا مَانُرْسِلُ الْمُرْسَلِیْنَ اِلَّا مُبَشِّرِیْنَ وَمُنْذِرِیْنَ فَمَنْ اٰمَنَ وَاَصْلَحَ فَلَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ...الخ یعنی جو اللہ کے رسولوں پر ایمان لائے گا اور عمل صالح کرے گا اس کو نہ ڈر ہے اور نہ غم ہوگا۔ ۱۰۔ آیت ۳۵ سورۃ اعراف میں انبیاء کی روانگی کے موضوع پر آیا ہے یَا بَنِیْ اٰدَمَ اِمَّا یَاْتِیَنَّکُمْ رُسُلٌ مِّنْکُمْ یَقُصُّوْنَ عَلَیْکُمْ اٰیَاتِیْ فَمَنِ اتَّقٰی وَاَصْلَحَ فَلَاخَوْفٌ...الخ یعنی جو شخص رسول کی نافرمانی سے بچ کر رہے اور اپنی اصلاح کرے گا تو اُسے نہ ڈر ہے...الخ۔ ۱۱۔ اولیاء اللہ کے بارے میں ہے لَاخَوْفٌ عَلَیْھِمْ وَلَاھُمْ یَحْزَنُوْنَ۔ ۱۲۔ آیت ۱۳ سورہ احقاف میں ہے اِنَّ الَّذِیْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰہُ ثُمَّ اسْتَقَامُوْا فَلَاخَوْفٌ یعنی جن لوگوں نے اللہ کے رب ہونے کا اعلان کیا اور اس پر قائم رہے اُن کو نہ ڈر ہے اور نہ غم ہوگا۔

اس آیت کا مطلب مقرر کرنے کے لیے ان سب آیات کو پیش نظر رکھئے۔ ان آیات کی روشنی میں مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ جو شخص نبوّت کی وساطت سے نبی کو مان کر اللہ کی وحی کی روشنی میں زندگی ایسی بنالے کہ اس میں ایمان کے ساتھ طاعت کی سرشاریاں ہوں اور طاعت میں حُسن ہو، سرسے ٹالنے والی بات نہ ہو، سراپا اخلاص ہو۔ اللہ کے راستہ میں خلوت و جلوت میں خرچ کرتا ہو۔ خرچ کر کے احسان نہ جتاتا ہو۔ نماز قائم کرتا ہو، زکوٰۃ کی ادائیگی کرتا ہو۔ نبوّت کی نافرمانی سے بچ کر رہے اور توحید کے اقرار و عمل پر آخر وقت پر قائم رہے، نجات اس کی ہوگی۔

ان بارہ آیتوں میں سے ڈر نہ ہونے کی بشارت تین آیتوں میں نبوّت ماننے والوں کو دی گئی ہے — اسی لیے حافظ ابنِ تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ،

ایمان باللہ اور ایمان بالرسل دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ جو لوگ رسول کی تصدیق نہیں کرتے وہ یقیناً مشرک ہوتے ہیں اور جو مشرک ہوتے ہیں وہ بلاشبہ رسولوں کی تکذیب کرتے ہیں۔ اس

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّوْرَ ۭ خُذُوْا مَآ اٰتَيْنٰكُمْ بِقُوَّةٍ وَّاذْكُرُوْا مَا فِيْهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ مِّنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ ۚ فَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهٗ لَكُنْتُمْ مِّنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝

اور اپنی تاریخ حیات کا وہ واقعہ بھی یاد کرو جب ہم نے تم سے عہد و پیمان لیا تھا۔ حالت یہ تھی کہ کوہ طور تم پر ہم نے بلند کر رکھا تھا اور تم نیچے کھڑے تھے کہ ہم نے جو کتاب تمہیں دی ہے اُسے پوری مضبوطی اور قوت سے اپناؤ اور جو کچھ ان ہدایات میں ہے اس کو یاد رکھو تاکہ تم میں باغیانہ میلانات ختم ہوں اور متقیانہ سیرت آئے۔ لیکن اس کے باوجود تم اس پر قائم نہ رہ سکے اور اپنے عہد سے پھر گئے۔ پس اگر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت تمہاری دستگیری نہ کرتی تو تم تو تباہی کا نشانہ بن چکے ہوتے۔

یعنی جو شخص شرک کی کسی نوع میں مبتلا ہوگا وہ ان کا دشمن اور ان کے پیغام کا مخالف ہوگا۔
(الصارم المسلول)

اور الرد علی البکری میں ایمان باللہ اور ایمان بالرسول کا خلاصہ ان لفظوں میں بیان کیا ہے دین اسلام کے دو اصول ہیں۔ اوّل یہ کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں۔ دوسرے یہ کہ ہم اس طریقے سے عبادت کریں جو نبوت کے بتائے ہوئے طریقے ہوں۔ یہی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی حقیقت ہے جو شخص ان میں سے کسی ایک کو چھوڑ دے گا اس کا نہ دین معتبر ہے اور نہ کوئی عمل۔
(الرد علی البکری ص ۵۲)

اللہ سے عہد شکنی

پچھلی آیات میں بنی اسرائیل کی مسلسل نافرمانیوں کی داستان سنانے کے بعد نہایت حکیمانہ بلیغ انداز میں یہ بتایا تھا کہ ساری برائیوں کے باوجود رحمت و مغفرت کی راہیں سب کے لیے کھلی ہوئی ہیں

ضرورت صرف ایمانِ صحیح اور عملِ صحیح کی ہے۔ اس خوشخبری کے بعد اس آیت میں ایک ایسے واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے جس میں ان کی بدکرداری نے عقوبت و عذاب کو دعوت دے دی تھی لیکن اللہ کی رحمت عذاب کی راہ میں آڑے آگئی۔ یہ واقعہ قرآن میں مختلف مقامات پر بیان کیا گیا ہے۔ تورات میں اس واقعہ کی کچھ مجمل سی کیفیت درج ہے۔ وہ پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہِ سینا پر زیر و بالا دھواں تھا۔ کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اس پر اترا اور شور کا سا دھواں اس پر اٹھا اور پہاڑ اسرائیل کے سروں پر ہل گیا۔ اور تالمود جو توریت کی مشہور و مستند شرح یہود کے ہاں موجود ہے۔ اس میں اس اجمال کی تفصیل میں اقوال ذیل درج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے اوپر کوہِ سینا کو الٹ دیا جس طرح کوئی بڑا ظرف الٹ دیا جاتا ہے۔ اور کہا کہ اگر تم تورات کو قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ سب یہیں دفن کر دیے جاؤ گے (جیوش انسائیکلوپیڈیا ج ۴ ص ۳۲۱)؛ خدا نے پہاڑ کو ان پر الٹ کر اوندھا کر دیا اور ان سے کہا کہ اگر تورات کو قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ یہیں تمہارا مدفن بن کر رہیگا۔ (ایضاً)[1]

۱۷۳ - طور۔ عربی زبان میں طور کے معنے پہاڑ کے ہیں لیکن بعض اہلِ لغت نے تصریح کی ہے کہ مطلق پہاڑ کو طور نہیں کہتے جب تک وہ درختوں سے ہرا بھرا نہ ہو۔ عرب کے مشہور جغرافیہ نویس اور ادیب علامہ یاقوت حموی رومی، (وفات ۶۲۶ھ) اپنی کتاب معجم البلدان میں لکھتے ہیں۔ طور عربی زبان میں پہاڑ کو کہتے ہیں اور بعض اہلِ لغت نے بیان کیا ہے کہ جب تک پہاڑ میں درخت نہ ہو طور نہیں کہتے۔ امام بخاریؒ نے امام مجاہدؒ سے نقل کیا ہے کہ سریانی زبان میں طور پہاڑ کو کہتے ہیں۔ اور ضحاکؒ کہتے ہیں کہ نبطی زبان میں طور کے معنے پہاڑ کے ہیں۔ ان تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ عربی، سریانی اور نبطی زبانوں میں طور کا استعمال یکساں ہے۔ قرآن میں طور کا استعمال ایک مخصوص پہاڑ کے لیے ہوا ہے۔ چنانچہ الطور میں الف لام اس کی دلیل ہے۔ جدید جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ طور کا اطلاق جزیرہ نما سینا کے متعدد پہاڑوں پر ہوا ہے لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام اور بنی اسرائیل کے سلسلے میں جبلِ طور سے مراد جبلِ سینا ہے۔ لیکن خود سینا کی کوئی ایک چوٹی نہیں ہے متعدد چوٹیاں ہیں انہی میں سے کسی کا نام طور ہے[2]

۱۷۴ - ہم نے کوہِ طور تم پر بلند کر دیا تھا۔ کہتے ہیں کہ تورات نازل ہوئی تو بنی اسرائیل نے شرارت

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۸   [2] لغات القرآن ج ۴ ص ۲۲

سے کہنے لگے کہ تورات کے حکم تو مشکل اور بھاری ہیں ہم سے نہیں ہو سکتے تب اللہ تعالیٰ نے ایک پہاڑ کو حکم کیا جو ان سب کے سروں پر اترنے لگے اور سامنے آگ پیدا ہوئی سرتابی کی گنجائش بالکل نہ تھی مجبوراً تورات کے احکام کو قبول کر لیا [1]

اس واقعہ کو قرآن میں مختلف مقامات پر جس انداز سے بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ اس وقت بنی اسرائیل میں یہ ایک مشہور واقعہ تھا لیکن اب اس کی تفصیلی کیفیت معلوم کرنا مشکل ہے۔ بس مجملاً یوں سمجھنا چاہیے کہ پہاڑ کے دامن میں میثاق لیتے وقت ایسی خوفناک صورتِ حال پیدا کر دی گئی تھی کہ ان کو ایسا معلوم ہوتا تھا گویا پہاڑ ان پر آ پڑے گا [2]

ایک شبہ کا ازالہ

باقی رہا یہ شبہ کہ پہاڑ سروں پر معلق کر کے تسلیم کرانا یہ تو صاف اکراہ و اجبار ہے جو قرآن کی آیت لا اکراہ ... الخ اور نیز قاعدہ تکلیف کے خلاف ہے۔ کیونکہ بنائے تکلیف تو اختیار ہے اور اکراہ و اختیار میں تضاد ہے۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ اکراہ در بارہ قبول ہرگز نہیں ہے۔ دین تو بنی اسرائیل پہلے سے قبول کیے ہوئے تھے اور بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام سے تقاضہ کرتے تھے کہ کوئی کتاب متضمن احکام ہم کو لا کر دو اس پر عمل کریں اور اس پر معاہدہ کر چکے تھے۔ جب تورات ان کو دی گئی تو عہد شکنی پر کمربستہ ہوئے تو اب پہاڑ کا معلق کرنا نقضِ عہد سے روکنے کے لیے تھا نہ کہ قبولِ دین کے لیے [3]

مطلب یہ ہے کہ ایمان لانے پر اکراہ نہیں بلکہ اوّل اپنی خوشی سے ایمان و اسلام قبول کر لینے اور اس کے خلاف بغاوت کرنے کی وجہ سے ہے۔ باغیوں کی سزا تمام حکومتوں میں بھی عام مخالف اور دشمن قوموں سے الگ ہوتی ہے۔ ان کے لیے ہر حکومت میں دو ہی راستے ہوتے ہیں۔ یا اطاعت قبول کر لیں یا قتل کیے جائیں۔ اسی وجہ سے اسلام میں مرتد کی سزا قتل ہے۔ کفر کی سزا قتل نہیں ہے۔

اس کا بہترین جواب مفتی محمد عبدہٗ نے دیا ہے۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ دراصل یہ جبر و اکراہ کا معاملہ نہیں تھا بلکہ آیتُ اللہ کا یہ آخری مظاہرہ تھا جو ان کی رُشد و ہدایت کی تقویت و تائید میں

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳ [2] تفہیم القرآن ص ۸۲ ۔ [3] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳

کیا گیا اور اس لیے یہ واقعہ میثاق کے بعد پیش آیا جیسا کہ سیاقِ کلام سے ظاہر ہے۔

۱۷۵ ۔ جو کچھ ہم نے تم کو دیا ہے اسے مضبوطی سے اپناؤ۔ جو کچھ دیا سے مراد تورات ہے۔ احکام تورات کیلئے اس اخذ و تمسک کی تاکید اور اس کے ترک پر وعید خود تورات میں بھی جا بجا مذکور ہے۔ مثلاً۔

جو کوئی اس شریعت کی سب باتوں پر قائم نہ رہے کہ ان پر عمل کرے اس پر لعنت سب جماعت کہے آمین (استثنا ۲۷-۲۶) اگر تو کوشش کرکے خداوند اپنے خدا کی آواز سُنے تاکہ ان سب پر جو آج کے دن میں تجھ سے فرماتا ہوں دھیان رکھ کر عمل کرے تو خداوند تیرا خدا زمین کی قوموں کی نسبت تجھے سرفراز کرے گا۔ (استثنا ۲۸-۱) یہ پورا مقولہ اسی وقت کا ہے جب کتاب نازل ہوئی تھی۔ کتاب ہدایت کے نزول اور رفع طور کے ساتھ ساتھ ہدایت اس کی بھی ہوتی تھی کہ اس کتاب کی حفاظت کرنا اور اس کے احکام پر مداومت کرنا[1]

۱۷۶ ۔ اور یاد رکھو ان ہدایات کو جو اس میں ہیں۔ یعنی اس کے مضامین کو یاد رکھو تاکہ ان پر عمل کر سکو — احکامِ الٰہی کا یاد رکھنا اصلاً اسی غرض سے ہوتا ہے کہ ان پر عمل کیا جا سکے۔ اس حکم کے تحت حفظ و قرآت بھی داخل ہیں لیکن اصل مقصد عمل ہے۔ امام راغبؒ لکھتے ہیں کہ ذکر بول کر کبھی تو نفس کی وہ حالت مراد ہوتی ہے جس کے ذریعے انسان جو کچھ معرفت حاصل کرتا ہے اس کا یاد رکھنا ممکن ہو اور یہ حفظ ہی کی طرح ہے اور کبھی ذکر کسی چیز کے دل میں استحضار پر بولا جاتا ہے۔ اس لیے ذکر کی دو قسمیں ہیں۔ قلبی اور لسانی۔ یہاں یاد رکھنے سے مقصود ان پر عمل کرنا ہے۔ حفظ بھی اسی استحضار کا ذریعہ ہے۔ اگر معاملہ ذکر سے ہٹ کر صرف حفظ ہی تک رہ جائے تو اس کی امام غزالیؒ نے بہترین مثال دی ہے۔ آقا نے نوکروں کی تحویل میں باغ دیا ہے اور باغ کی اصلاح، تعمیر، آبادکاری کا کام اُن کے سپرد کیا ہے اور باغ کی اصلاح و تعمیر سے متعلق ہدایات کتابی صورت میں نوکروں کو دی ہیں اور ان کو اس کتاب میں بتایا ہے کہ باغ کی اصلاح و تعمیر کیسے کی جائے گی۔ حسنِ کارکردگی کی صورت میں ان سے انعامات کا وعدہ کیا ہے۔ غلط کاری، بدکاری اور ناکاری کی صورت میں گرفت اور سزا کی دھمکی دی ہے۔ نوکروں نے آقا کی دی ہوئی کتاب کو زبانی یاد کر لیا ہے۔ اس کو بار بار پڑھتے ہیں۔ مختلف نغموں اور لہجوں میں مزے لے لے کر

---

[1] تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۲۷

پڑھتے ہیں مگر کتاب میں لکھی ہوئی ہدایات کے مطابق باغ کی تعمیر و اصلاح کا کوئی کام نہیں کرتے بلکہ باغ میں ادھم مچاتے ہیں۔ بوٹوں کو پیروں سے روندرہے ہیں، درختوں کی افزائش ختم ہو چکی ہے۔ سبزی و شادابی ختم ہو چکی ہے۔ لیکن باغ کے نوکر صرف آقا کی دی ہوئی کتاب کو پڑھ پڑھ کر مزے لے رہے ہیں اور سُن کر سر دُھن رہے ہیں — جو حیثیت ان نوکروں کی آقا کی نظر میں ہوگی۔ ٹھیک ٹھیک وہی حیثیت اس اُمت کی اللہ کی بارگاہ میں ہوگی جو کتاب الٰہی کو پڑھتی ہے، یاد کرتی ہے، سُن کر مزے لیتی ہے لیکن اس پر عمل نہیں کرتی ہے۔

ف۱۷۷ ۔ تاکہ تم میں متقیانہ سیرت پیدا ہو جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ متقی بننے کا واحد راستہ نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل سے علمی اور عملی طور پر رشتہ جوڑنا ہے۔ قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ اگر تم کتابِ الٰہی کے اوامر کی نگرانی کروگے اور اسے طاقِ نسیان نہیں بناؤگے اور اسے ضائع نہیں کروگے تو متقی بن جاؤگے۔ کیونکہ کتاب کی رہنمائی میں عملی زندگی پر مواظبت سے انسان میں اللہ سے لگاؤ پیدا ہو جاتا ہے اور یہ لگاؤ نفسانیت کو دبا کر روحانیت سے دوچار کرتا ہے۔

ف۱۷۸ لیکن اس کے باوجود تم اس کے عہد سے پھر گئے۔ یعنی عہد و پیمان کرکے پھر پھر گئے۔ اگر اللہ کا فضل نہ ہوتا تو بالکل تباہ ہو جاتے۔ یعنی اسی وقت ہلاک کر دیے جاتے یا یہ کہ توبہ و استغفار بھی کرتے اور نبی آخرالزمان کی متابعت بھی کرتے تو بھی تمہاری تقصیرات معاف نہ کی جاتیں [1]

ان کو بتایا جا رہا ہے کہ تم نے اس وقت وقتی خوف و دہشت سے یا علی رؤس الاشہاد خدا کے عظیم الشان نشان کا مشاہدہ کرکے تورات کی طرف متوجہ ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اس کے احکام کی تعمیل کا اقرار کیا۔ مگر افسوس کہ تمہارا یہ عہد و پیمان ہنگامی ثابت ہوا اور تم زیادہ عرصہ تک اس پر کاربند نہ رہ سکے اور حسبِ عادت اس کی پھر خلاف ورزی شروع کر دی۔ لیکن اللہ نے تمہارے جرائم سے چشم پوشی کی اور اللہ کے فضل و رحمت نے تمہیں تباہی سے بچا لیا۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳

وَلَقَدْ عَلِمْتُمُ الَّذِيْنَ اعْتَدَوْا مِنْكُمْ فِي السَّبْتِ فَقُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ۝

فَجَعَلْنٰهَا نَكَالًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهَا وَمَا خَلْفَهَا وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ ۝

اور تم خوب واقف ہو اپنوں ہی میں سے ان لوگوں کے کردار[179] سے جنہوں نے سبت[180] کے دن کے بارے میں قانون شکنی[181] کی تھی۔ (یعنی اللہ کے حکم سے بچنے کے لیے تدبیریں سوچیں) اس کے نتیجہ میں ہم نے اُن سے کہا کہ ذلیل[182] و خوار بندر ہو جاؤ۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور ہم نے اس واقعہ کو اس زمانے کے لوگوں اور بعد میں آنے والی نسلوں کے لیے تازیانۂ عبرت[183] اور متقیوں کے لیے سامانِ نصیحت بنا دیا۔

قانونِ الٰہی کے خلاف حیلہ سازی

اس سے پہلی آیت میں عہد و پیمان کے تذکرے میں یہ بتایا کہ تمہارے اندر اس قدر گراوٹ آ چکی ہے کہ تم عہد و میثاق کے باوجود اس سے پھر گئے اور بجائے اللہ کی کتاب پر عمل کرنے کے تم نے عملی زندگی میں عہد و پیمان سے بے پرواہ ہو کر اس کی دھجیاں اڑا دیں۔ اس آیت میں اس کی واقعاتی مثال پیش فرمائی ہے اور بتایا کہ قانونِ الٰہی کے خلاف تمہاری غداری، عہد شکنی اور حیلہ سازی اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ میں قسم کھا کر کہتا ہوں کہ یہ واقعہ تمہارے علم میں ہے کہ

[179] ان لوگوں کے کردار سے تم خوب واقف ہو۔ عربی زبان میں لام اور قد کا استعمال قسم کے موقعہ پر ہوتا ہے اور اس سے مقصود بات میں زور پیدا کرنا ہوتا ہے گویا قرآن بنی اسرائیل کو ان کی تاریخ کا کوئی ایسا واقعہ یاد دلا رہا ہے جو ان کا خوب اچھی طرح سے جانا بوجھا ہے۔ اور ان سے کہہ رہا ہے کہ اے بنی اسرائیل جس واقعہ کا آگے ذکر آ رہا ہے وہ تمہاری تاریخ کا ایک مسلّم اور جانا پہچانا واقعہ ہے اور تم اس سے خوب واقف ہو۔

[180] سبت کے دن۔ سبت کے لفظی معنے ہیں ہفتہ کا ساتواں دن یعنی سنیچر، ہفتہ، شنبہ، یہودیوں کی شریعت کی اصطلاح میں یہ ایک مقدس دن ہے۔ یہ دن صرف یادِ خدا اور عبادت کے لیے

مخصوص ہے اور اس روز تجارت، زراعت، شکار وغیرہ ہر قسم کے دنیوی کام ممنوع تھے اور ممانعت بھی اتنی سخت کہ جو کوئی اس کی خلاف ورزی کرے اس کی سزا قتل تھی۔ چنانچہ تورات میں ہے کہ سبت کو مانو اس لیے کہ وہ تمہارے لیے مقدس ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے گا۔ پس جو کوئی سبت کو کام کرے وہ ضرور مار ڈالا جائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ

بنی اسرائیل کے لیے یہ قانون مقرر کیا گیا تھا کہ وہ ہفتہ کے دن کو آرام اور عبادت کے لیے مخصوص رکھیں۔ اس روز کسی قسم کا دنیوی کام حتیٰ کہ کھانا پکانا بھی نہ خود کریں اور نہ اپنے خادموں سے کام لیں۔ لیکن جب بنی اسرائیل پر اخلاقی و دینی انحطاط کا دور آیا۔ تو وہ علی الاعلان سبت کی بے حرمتی کرنے لگے حتیٰ کہ ان کے شہروں میں کھلے بندوں سبت کے روز تجارت ہونے لگی بلہ

۱۸۱ ۔ سبت کے اسی دن میں قانون کی خلاف ورزی کو اعتداء کہا ہے یعنی ان کو حکم تھا کہ شنبہ کا دن خالص عبادت کے لیے مقرر ہے۔ اس روز مچھلی کا شکار نہ کرو۔ وہ لوگ حیلہ سے ہفتہ کے روز شکار کرنے لگے ۲ہ

شکار کی داستان یہ ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام کے زمانے میں یہود کی ایک بڑی آبادی مقام ایلہ میں تھی۔ یہ ذکر انہی کا ہے۔ حضرت داؤد علیہ السلام کا زمانہ حکومت ۱۰۱۳ تا ۹۷۳ ق م ہے — مقام ایلہ اگر وہی ہے جس کا ذکر تورات میں ایلات کے نام سے آتا ہے (استثناء ۲۔ ۸) تو یہ فلسطین کے جنوب میں عرب کی عین شمالی سرحد پر بحرِ قلزم کی مشرقی خلیج میں لب ساحل واقع ہے۔ موجودہ جغرافیہ نویس اس کو عقبہ کے نام سے پکارتے ہیں۔ اور عقبہ خلیج عقبہ کی مشہور بندرگاہ ہے۔ ایلہ کے یہودی اپنی شریعت کے قانون کے پے در پے اور پیہم خلاف ورزی کرتے۔ مچھلی کا شکار ایک خاص حیلہ سے اور اسے ظاہری صورت جواز دے کر سبت کے دن کیا کرتے ۳ہ

۱۸۲ ۔ ہم نے ان سے کہا کہ بندر ذلیل و خوار ہو جاؤ۔ یعنی جب وہ لگاتار نافرمانی کرتے رہے تو پھر ہم نے ان کو اس مسلسل نافرمانی کی پاداش میں سزا دی۔ کیا سزا ملی؟ یہ کہ بندر ہو جاؤ ذلیل۔ جمہور مفسرین اس کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ اللہ نے ان کو مسخ کر کے ان کی صورت بندر کی سی کر دی فہم و شعور انسانی موجود تھا۔ ایک دوسرے کو دیکھتا اور روتا مگر بات نہ کر سکتا تھا۔ تین دن کے بعد سب مر گئے ۴ہ اس کے ساتھ یہ بھی تفسیر کی گئی ہے کہ مسخ صرف معنوی ہوا صوری نہیں۔ یعنی ان کی عادات و اخلاق

۱ہ تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۰ ۲ہ حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳ ۳ہ تفسیر ماجدی ص ۲۸ ۴ہ حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳

بندروں کے سے کر دیے گئے تھے اور بندر کا اطلاق ان پر مجازاً ہوا ہے ورنہ حقیقتہً وہ بندروں کے قالب اور جسم میں تبدیل نہیں کیے گئے تھے۔ چنانچہ امام راغبؒ نے بعض علماء کا یہ قول نقل کیا ہے کہ ان کے اخلاق و عادات بندروں ایسے ہو گئے تھے۔ بندروں کی صورت نہیں بنی تھی۔ پروفیسر عبدالرؤف نے معجم القرآن میں اسی تاویل کو پسند کیا ہے۔ قرطبیؒ نے امام مجاہدؒ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ ان کی صورتیں مسخ نہیں ہوئی تھیں بلکہ دلوں کو بندروں کے دلوں کی طرح بنا دیا گیا تھا۔ لیکن حافظ ابنِ کثیرؒ نے اس رائے پر سیاقِ قرآن کے خلاف ہونے کی وجہ سے ندرت اور غرابت کا فتویٰ لگایا ہے۔

بہرحال ان کے بندر بنائے جانے کی کیفیت میں اختلاف ہے۔ بعض یہ سمجھتے ہیں کہ اُن کی جسمانی ہیئت بگاڑ کر بندروں کی سی کر دی گئی تھی۔ اور بعض اس کے یہ معنے لیتے ہیں کہ ان میں بندروں کی سی صفات پیدا کر دی گئی تھیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ اور اندازِ بیان سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ مسخ اخلاقی نہیں بلکہ جسمانی تھا۔ میرے نزدیک قرینِ قیاس یہ ہے کہ ان کے دماغ بعینہٖ اسی حال پر رہنے دیے گئے ہوں گے جس میں وہ پہلے تھے اور جسم مسخ ہو کر بندروں کے سے ہو گئے ہوں گے [1]

اس تفسیر پر کہ ان کو حقیقت میں بندر بنا دیا گیا تھا عقلاً کوئی استحالہ نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کے قانونِ تشریعی کو توڑنے میں اتنی جری اور بے باک ہوں ان کے حق میں خالقِ کائنات اپنے قانونِ تکوین کو کسی حد تک اگر بدل دے اور بجائے ارتقاء کے اگر کہیں ترقی معکوس ہو جائے تو یہ ناممکن کیا میرے خیال میں مستبعد بھی نہیں ہے۔

۱۸۳۔ ہم نے اس واقعہ کو موجودین اور بعد میں آنے والوں کے لیے تازیانہ عبرت بنا دیا۔ سزا کچھ بھی ہو قرآن کا مقصود سزا کی تفصیل بیان کرنا نہیں ہے بلکہ اس کی عبرت انگیزی اور موعظت آموزی کے پہلو کو واضح کرنا ہے۔ اس واقعہ اور اس عقوبت کو ہم نے باعثِ خوف و عبرت بنا دیا۔ اگلے اور پچھلے لوگوں کے واسطے یعنی جنہوں نے اس عذاب کا مشاہدہ کیا اور جو آئندہ پیدا ہوں گے یا جو بستیاں شہر کے آگے اور پیچھے آباد ہیں سب کے لیے عبرت ہے[2] ـــــ گویا سزا ایسی تھی کہ مدتوں تک اس کا چرچا رہے اور لوگ اس کا تذکرہ سن کر ڈرتے رہیں۔ یہ تو نافرمانوں اور گنہگاروں کی حد تک اس سزا کا فائدہ ہے باقی رہے نیکوکار تو ان کے لیے اس واقعہ میں سامانِ نصیحت ہے کہ اسے سن کر ان میں راہِ تقویٰ کی ترغیب اور زیادہ ہو گی۔ یہاں صاحبِ روح المعانی نے یہ نکتہ بڑا عجیب لکھا ہے اور مولانا اشرف علی تھانوی

---

[1] تفہیم القرآن ص ۸۴، [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳

قدس اللہ سرہ العزیز نے اسے مسائل السلوک میں ممتاز جگہ دی ہے کہ ارباب معرفت کو یہ بات سمجھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے عبادات کو خاص خاص ہیئت کے ساتھ خاص اوقات میں متعین کیا ہے تاکہ طبعی غلطیں دُور ہوں۔ لہٰذا جو شخص ان ہیئتوں کی رعایت نہیں کرتا اس کا نُور استعداد ضائع ہو جاتا ہے اور وہ سبت والوں کی طرح مسوخ ہو جاتا ہے۔ یعنی جس جانور کے اوصاف اس میں راسخ ہیں انہی کی طبیعت ان میں پیدا کر دی جاتی ہے۔ اگرچہ اس اُمت کے لیے مسخ صوری نہیں ہے۔ انسان کو چاہیے کہ ادویہ شرعیہ کے مطابق اپنی انسانیت کو محفوظ رکھنے کی کوشش میں لگا رہے۔

اس واقعہ میں یہودیوں کے جس اعتداء کا ذکر کیا ہے اور جس پر عذاب آیا ہے۔ روایات سے معلوم ہوا ہے کہ وہ یہودیوں کی صاف طور پر قانون کی خلاف ورزی نہ تھی بلکہ قانون کی زد سے بچنے کے لیے ایسے شرعی حیلے گھڑ لیتے تھے جن سے قانونِ الٰہی کا ابطال لازم آتا تھا۔ یعنی محض نمائشی طور پر قوان کی تعمیل کرتے لیکن جو حقیقی مقصد تھا وہ پورا نہ کرتے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے حضرت ابوہریرہؓ کے حوالہ سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان لکھا ہے کہ وہ کام نہ کرنا جو یہودی کرتے تھے کہ اللہ کے محرمات کو معمولی حیلوں سے حلال سمجھنے لگو اور لکھا ہے کہ ھذا اسناد جید

یاد رکھنا چاہیے کہ حیلے بھی دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ آپ ایسے ذرائع تلاش کریں جن سے حکمِ الٰہی کی پابجائی ہو۔ حرام سے بچاؤ، ظالم سے حق حاصل کیا جائے اور مظلوم کی دادرسی ہو۔ حرام سے بچاؤ کی مثال یوں خیال فرمایئے کہ ایک سیر عمدہ کھجور کے بدلے میں دو سیر خراب کھجور خریدنا منع ہے کیونکہ یہ جنس کا جنس سے تبادلہ ہے اور اس میں کمی بیشی سُود ہے۔ ایسے موقعہ پر حرام سے بچنے کے لیے اگر کوئی یہ تدبیر کرتا ہے کہ دو سیر خراب کھجور کو بازار میں فروخت کرتا ہے اور اس کی قیمت سے پھر ایک سیر اچھی کھجور خریدتا ہے۔ اگرچہ یہ بھی حیلہ ہے لیکن چونکہ اس کا مقصد حرام کرنا نہیں بلکہ حرام سے بچنا ہے اس لیے حرام سے بچنے کی تدبیریں اس کی زد میں نہیں آتی ہیں۔

حیلہ کی دوسری قسم یہ ہے کہ ایسے ذرائع تلاش کیے جائیں جن سے فرائض و واجبات سے چھٹکارا، محرمات کی حلت، مظلوم کو ظالم، ظالم کو مظلوم، حق کو باطل، باطل کو حق قرار دے سکے۔

حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ حیلوں کی یہی وہ قسم ہے جس کی بُرائی پر سلف کا اجماع ہے۔ تفصیلی بحث تو انشاء اللہ سورۃ اعراف میں آئے گی مگر اتنی بات ذہن نشین کر لیجیے کہ یہودیوں میں اخلاقی، معاشرتی، معاشی ساری بیماریوں کی قرآن نے نشاندہی کی ہے۔ مثلاً سُود لینا، لوگوں کے اموال ناجائز کھانا، لیکن آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ ان جرائم میں سے کسی جُرم پر مسخ جیسی سنگین

وَاِذْ قَالَ مُوْسٰى لِقَوْمِهٖٓ اِنَّ اللّٰهَ يَاْمُرُكُمْ اَنْ تَذْبَحُوْا بَقَرَةً ۭ قَالُوْٓا اَتَتَّخِذُنَا
هُزُوًا ۭ قَالَ اَعُوْذُ بِاللّٰهِ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۶۷﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا
مَا هِيَ ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ لَّا فَارِضٌ وَّلَا بِكْرٌ ۭ عَوَانٌۢ بَيْنَ ذٰلِكَ ۭ فَافْعَلُوْا
مَا تُؤْمَرُوْنَ ﴿۶۸﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا لَوْنُهَا ۭ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا بَقَرَةٌ
صَفْرَاۗءُ ۙ فَاقِعٌ لَّوْنُهَا تَسُرُّ النّٰظِرِيْنَ ﴿۶۹﴾ قَالُوا ادْعُ لَنَا رَبَّكَ يُبَيِّنْ لَّنَا مَا هِيَ ۙ
اِنَّ الْبَقَرَ تَشٰبَهَ عَلَيْنَا ۭ وَاِنَّآ اِنْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَمُهْتَدُوْنَ ﴿۷۰﴾ قَالَ اِنَّهٗ يَقُوْلُ اِنَّهَا
بَقَرَةٌ لَّا ذَلُوْلٌ تُثِيْرُ الْاَرْضَ وَلَا تَسْقِي الْحَرْثَ ۚ مُسَلَّمَةٌ لَّا شِيَةَ فِيْهَا ۭ
قَالُوا الْـٰٔنَ جِئْتَ بِالْحَقِّ ۭ فَذَبَحُوْهَا وَمَا كَادُوْا يَفْعَلُوْنَ ﴿۷۱﴾

اور اپنی زندگی کا وہ واقعہ بھی یاد کرو جب موسیٰ علیہ السلام نے اپنی قوم سے یہ بات کہی تھی کہ اللہ کا تمہیں یہ حکم ہے کہ تم ایک گائے ذبح کرو۔ بجائے راست باز انسانوں کی طرح عمل کرنے کے کہنے لگے آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا کہ اللہ کی پناہ کہ میں جاہلوں میں سے بنوں۔ میں تو حکمِ الٰہی پہنچا رہا ہوں۔ بولے اگر ایسا ہی ہے تو پھر اپنے پروردگار سے درخواست کرو کہ وہ کھول کر بتائے کہ کس طرح کی گائے ذبح کی جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا اللہ کا ارشاد ہے کہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ بالکل بوڑھی ہو اور نہ بالکل بچھیا۔ درمیانی عمر کی ادھیڑ ہو۔ تمہیں جو کچھ حکم مل رہا ہے اس کی بجا آوری کرو۔ لیکن وہ بولے کہ موسیٰ اپنے رب سے ہماری خاطر درخواست کر کہ وہ یہ بتائے کہ اس کا رنگ کیا ہو۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا حکمِ الٰہی یہ ہے کہ اس کا رنگ ایسا خوب گہرا زرد ہو کہ دیکھنے والوں کو بھائے۔ پھر بولے کہ ان ساری باتوں کے باوجود اپنے رب سے صاف صاف پوچھ کر بتاؤ کہ گائے کیسی ہو ہمارے لیے گائے کی پہچان مشکل ہے انشاءاللہ ہم ضرور پتہ لگالیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جواب دیا اللہ فرماتا ہے کہ ایسی گائے ہونی چاہیے جو نہ تو کبھی ہل میں جوتی گئی ہو نہ کہیں آب پاشی کے کام میں لائی گئی ہو۔ پوری طرح صحیح وسالم اور بے داغ ہو۔ اس پر وہ پکار اٹھے ہاں اب تم نے پتے کی بات کہی ہے۔ چنانچہ اس کے بعد انہوں

نے گائے ذبح کی، اگرچہ وہ ایسا کرنے کو تیار نہ تھے۔

سزا نہیں ملی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قانونِ الٰہی کے اوامر سے بچنے کے ذرائع تلاش کرنا قرآن کی نظر میں کتنا سنگین جرم ہے۔

واقعہ کے بالکل آخر میں وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِيْنَ فرماکر اس طرف اشارہ کردیا کہ اجتماعی زندگی کے اس دورِ انحطاط اور برائیوں کے اس سیلاب میں اسی معاشرے میں ایک طبقہ ایسا بھی موجود تھا جو اس کام سے ان کو باز رکھنے کی کوشش کرتا تھا۔ یہ طبقہ اس کوشش میں لگا ہوا تھا کہ شاید ہماری محنت سے اجتماعی تقویٰ میں بہار آجائے۔ سورۂ اعراف میں ہے لَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ قرآن کی نظر میں اپنے دوسرے بھائیوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا کتنا اہم ہے اور اس کے اخلاقی فرائض کا یہ کیسا ضروری حصہ ہے کہ اگر اس کو ادا نہ کیا جائے تو وہ بھی ایسا ہی گنہگار رہے جیسا وہ اس فعل کا مرتکب ہوا۔ البتہ بھائی کا فرض اسے سمجھا دینے اور بتا دینے کے بعد ختم ہو جاتا ہے۔ زبردستی منوانا اس کا فرض نہیں ہے۔ اور اس کا کیا بلکہ خود رسول کا بھی یہ فرض نہیں ہے۔ اگر یہ فرض ادا ہو گیا تو اس کے سر سے ذمہ داری کا بوجھ اتر گیا۔ تفصیل سورۂ اعراف میں آئے گی۔

کثرتِ سوال اور تعمق

دل جب اخلاص سے خالی ہوں تو احکامِ الٰہی کی سیدھی سادھی اطاعت کرنے کی جگہ رد و کد کرنا، طرح طرح کے سوالات کرنا، بلا ضرورت باریک بینیاں اور دقیقہ سنجیاں کرنا اور قانونِ الٰہی کی سادگی اور آسانی کو سختی اور پیچیدگی سے تبدیل کردینا، انسان کی بہت بڑی کمزوری ہے۔

نبوت کے علم و عمل سے اُمتوں کا رشتہ تین وجہ سے ٹوٹتا ہے۔ ایک بے خبری، دوسرے طبیعت کی غلط اُفتاد اور تیسرے گردو پیش اور ماحول کا اثر۔ طبیعت کی غلط اُفتاد سے انسان میں طاعت کی سرشاریاں ختم ہو کر نافرمانی کے جذبات جنم لیتے ہیں۔ طاعت سے گریز کے لیے نفسِ انسانی قسم قسم کی راہیں تلاش کرتا ہے۔ ان ہی راہوں میں ایک کثرتِ سوال اور تعمق فی الدین ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے اسے نبوت کے علم و عمل سے اُمتوں کا رشتہ ٹوٹنے کا سبب بتایا ہے۔ یہی بیماری یہودیوں میں عصیان و عدوان کی وجہ سے پیدا ہوئی اور اسی کے نتیجے میں اُن کی اجتماعی زندگی متقیانہ سیرت

سے محروم ہو گئی۔ تفصیلی بحث تو آپ نے اس موضوع پر اسی پارہ کی آیت نمبر ۱۰۸ میں پڑھی۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ ایک بار ایک خالص فوجداری کیس بنی اسرائیل میں پیش آگیا۔ یعنی ایک قتل ہو گیا۔ مگر قاتل کا پتہ نہ چلا آخر شبہ نے تہمت کی شکل اختیار کر لی اور باہمی اختلاف سے تنازع و جدال کی خوفناک صورت رونما ہو گئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بارگاہ میں جب یہ فوجداری مقدمہ آیا تو آپ نے نبی ہونے کی حیثیت سے اللہ کی بارگاہ میں درخواست پیش کی کہ میری مدد فرما۔ وحی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رہنمائی فرمائی کہ ان سے کہو ایک گائے ذبح کریں اور اس کے بعد گائے کے حصے کو مقتول کے حصے سے مس کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ہم مقتول کو زندہ کر دیں گے اور معاملہ واضح ہو کر سامنے آ جائے گا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے جب بنی اسرائیل سے کہا تو انہوں نے اپنی طبیعت کی غلط افتاد کی وجہ سے سوالات شروع کر دیے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر بنی اسرائیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرماتے ہی گائے ذبح کر دیتے تو ان کے لیے گائے کے معاملہ میں کسی قسم کی مطلق قید نہ ہوتی۔ وہ کوئی سی گائے بھی ذبح کر دیتے تعمیلِ حکم ہو جاتی مگر انہوں نے بیہودہ سوالات کر کے اپنے اوپر پابندیاں لگائی ہیں۔

۱۸۴ف اور اپنی زندگی کا وہ واقعہ بھی یاد کرو۔ یہ زمانہ وہ ہے کہ صدیوں تک مصر میں اور مصر والوں میں رہتے رہتے بہت سی مشرکانہ رسمیں بنی اسرائیل میں گھر کر چکی تھیں۔ اور مصریوں کی صحبت سے گائے کی تقدیس ان کے دلوں میں رچ چکی تھی۔ گائے کی تقدیس کا خیال مصریوں میں تھا۔ مصری اپنے دیوتا حورس کا چہرہ گائے کی شکل کا بناتے تھے اور خیال کرتے تھے کہ کرہ ارض ایک گائے کی پشت پر قائم ہے۔ ہندوستان کی طرح گائے کی تقدیس مشرکانہ مذہب کا ایک جزو تھا۔

۱۸۵ف۔ تورات میں بھی ایسے حادثہ میں جب کہ قاتل کا پتہ نہ ہو یہ حکم اب بھی موجود ہے کہ ۔ ۔ اگر اس ملک میں جسے خداوند خدا تجھ کو قبضہ کرنے کو دیتا ہے کسی مقتول کی لاش میدان میں پڑی ہوئی ہے اور یہ معلوم نہ ہو کہ اس کا قاتل کون ہے تو تیرے بزرگ اور قاضی نکل کر اس مقتول کے گرد اگرد کے شہروں کے فاصلے کو ناپیں اور جو شہر اس مقتول کے سب سے نزدیک ہو اس شہر کے بزرگ ایک بچھیا لیں جس سے کبھی کوئی کام نہ لیا گیا ہو اور نہ جوئے میں جوتی گئی ہو۔ اور اس شہر کے بزرگ بہتے پانی کی وادی میں جس میں نہ ہل چلا ہو اور نہ اس میں کچھ بویا گیا ہو لے جائیں اور وہاں اس وادی میں اس بچھیا کی گردن توڑ دیں۔ تب بنی لاوی جو کاہن ہیں نزدیک آئیں کیونکہ خداوند تیرے خدا نے ان کو چن لیا ہے کہ

خداوند کی خدمت کریں اور اس کے نام سے برکت دیا کریں اور ان ہی کے کہنے کے مطابق ہر جھگڑے اور مار پیٹ کے مقدمہ کا فیصلہ ہوا کرے۔ پھر اس شہر کے سب بزرگ جو اُس مقتول کے سب سے نزدیک رہنے والے ہوں۔ اس بچھیا کے اوپر جس کی گردن اس وادی میں توڑی گئی اپنے اپنے ہاتھ دھوئیں اور یوں کہیں کہ ہمارے ہاتھ سے یہ خون نہیں ہوا اور نہ یہ ہماری آنکھوں کا دیکھا ہوا ہے۔ تو اے خداوند اپنی قوم اسرائیل کو جسے تو نے چھڑایا ہے معاف کر اور بے گناہ کے خون کو اپنی قوم اسرائیل کے ذمہ نہ لگا۔ تب وہ خون اُن کو معاف کر دیا جائے گا۔ (استثناء ۲۱ - ۱ تا ۹)

قرآن میں جو واقعہ بیان ہو رہا ہے وہ اسرائیلی زندگی کا اس موضوع پر پہلا واقعہ ہے۔ اگر یہ قانون پہلے سے موجود ہوتا تو سوالات کی گنجائش ہی نہ ہوتی۔ اوّل وہلہ میں اگر وہ گائے کے ذبح کا حکم پاکر ذبح کر دیتے تو یہ قیدیں اور شرطیں جو ان کی کج بحثی سے اور سوالات کی کثرت سے نمودار ہوتی ہیں نہ ہوتیں اور قانون اپنی اصلی اور سادہ شکل میں ہوتا۔

ہمارے مفسرین نے مقتول کے نام کی بھی نشاندہی کی ہے کہ بنی اسرائیل میں ایک عامیل نامی مارا گیا تھا۔ اور اس کا قاتل معلوم نہ تھا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ حکم دیتا ہے کہ گائے ذبح کرو۔[1]

۱۸۶ۛ۔ کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں؟ گائے کا تقدس اُن کے دلوں میں اس قدر پیوست ہو چکا تھا کہ ان کو گائے کے ذبح کا حکم سُن کر یقین ہی نہ آیا کہ فی الواقع ایسے مقدس جانور کے ذبح کر ڈالنے کا حکم ملا ہوگا۔ اپنی گستاخانہ ذہنیت کی وجہ سے نبوت کی ذاتِ گرامی کو اپنے نفس کے چوٹ جانے کا نشانہ بنا بیٹھے اور بولے کہ کیا آپ ہم سے مذاق کرتے ہیں؟ یعنی کیا آپ گائے ذبح کرنے کا حکم دل لگی، ہنسی اور تفننِ طبع کی راہ سے دے رہے ہیں یا اس میں کوئی حقیقت ہے؟ اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ اَعُوْذُ بِاللّٰہِ اَنْ اَکُوْنَ مِنَ الْجٰھِلِیْنَ۔ نعوذ باللہ کہ میں ایسی جہالت آمیز انسانوں کا وطیرہ اختیار کروں کہ حکمِ خداوندی کی تبلیغ و اشاعت میں ہنسی اور تفننِ طبع سے کام لوں۔ اور میں دل لگی اللہ کے پیغام کے پہنچانے میں کروں۔ اس کی تو وہی شخص جرأت کر سکتا ہے جو خود اللہ سے بے خبر اور نادان ہو۔ یا وہ کر سکتا ہے جو اُمورِ دینی میں استہزاء کے نتائج و عواقب سے بے خبر ہو۔ میں تو اللہ کا پیغمبر ہوں۔ میرے بارے میں تمہارا یہ گمان خود تمہارے مقامِ نبوت سے بے خبر

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۳

وَإِذْ قَتَلْتُمْ نَفْسًا فَادّٰرَءْتُمْ فِيهَا ۖ وَاللّٰهُ مُخْرِجٌ مَّا كُنْتُمْ تَكْتُمُونَ ۞ فَقُلْنَا اضْرِبُوهُ بِبَعْضِهَا ۚ كَذٰلِكَ يُحْيِ اللّٰهُ الْمَوْتٰى وَيُرِيكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۞

اور پھر غور کرو اس پر کہ جب تم نے ایک شخص کی جان لی تھی اور اس کے بارے میں تمہارے درمیان باہم اختلاف رونما ہو گیا تھا اور معاملہ کو تم باہم ایک دوسرے کے سر تھوپ رہے تھے۔ حالانکہ جو کچھ تم چھپا رہے تھے اللہ اسی کو منظرِ عام پر لانے والا تھا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ ہم نے حکم دیا کہ مقتول کی لاش کو گائے کے ایک حصے سے ضرب لگاؤ دیکھو اسی طرح اللہ سبحانہٗ مُردوں کو زندگی بخشتا ہے اور تمہیں اپنی قدرت کی نشانیاں دکھاتا ہے تاکہ تم سمجھ بوجھ سے کام لو۔

ہونے کی علامت ہے۔ قرطبیؒ نے آیت سے استنباط کیا ہے۔ دین، اُمورِ دین کے ساتھ استہزاء جہالت اور گناہِ عظیم ہے۔ اور اس کا مرتکب مستحقِ وعید ہے اور لکھا ہے کہ آج اگر کوئی شخص حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات کے بارے میں یہ رویہ اختیار کرے تو کفر ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے انہوں نے کہا کہ کھول کر بتایئے کہ گائے کیسی ہونی چاہیے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کی جانب سے اُن کو بتایا کہ گائے ایسی ہونی چاہیے جو بڑی عمر کی بوڑھی اور بہت چھوٹی عمر کی بچھیا نہ ہو بلکہ ان دونوں کے درمیان ادھیڑ عمر کی ہو اور آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے یہ کہہ کر پھر تنبیہ فرمائی فَافْعَلُوا مَا تُؤْمَرُونَ۔ تمہیں کو حکم کی بجا آوری کرنی چاہیے۔ اور سرکشی سے بچنا چاہیے۔ زیادہ سوالات نہ کرنے چاہئیں۔

لیکن چونکہ ان لوگوں کو اپنی ہمسایہ قوموں سے گائے کی عظمت و تقدیس اور گاؤ پرستی کے مرض کی چھوت لگ گئی تھی۔ اس لیے اُن پر گائے کے ذبح کرنے کا معاملہ شاق گذر رہا تھا۔ مگر چونکہ ان کے ایمان کا امتحان ہی اس طرح ہو سکتا تھا کہ اگر وہ واقعی خدا کے سوا کسی کو معبود نہیں سمجھتے تو یہ عقیدہ اختیار کرنے سے پہلے جس کو وہ معبود سمجھتے رہے اسے اپنے ہاتھ سے ذبح کریں یہ امتحان بہت کڑا امتحان تھا۔ دلوں میں پوری طرح ایمان اُترا ہوا نہ تھا۔ اس لیے انہوں نے ٹالنے کی کوشش کی اور تفصیلات پوچھنے لگے۔ مگر جتنی جتنی تفصیلات وہ پوچھتے گئے اتنے ہی گھرتے

چلے گئے یہاں تک کہ آخر کار اسی خاص قسم کی سنہری گائے پر جسے اس زمانے میں پرستش کے لیے رکھا جاتا تھا گویا انگلی رکھ کر بتا دیا گیا کہ اسے ذبح کرو[1]

قاتل پکڑا گیا

واقعہ کا اصل حصہ یہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ ان سے کہو کہ گائے ذبح کر کے گائے کے ایک حصہ کو مقتول کے جسم پر ضرب لگائیں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو مقتول زندہ ہو کر خود قاتل کو بتائے گا۔

اس موقعہ پر ذہنوں میں یہ خلش ضرور پیدا ہوتی ہے کہ ذبح بقرہ اور مقتول کی زندگی میں کیا مناسبت ہے۔ قاتل کا پتہ لگانے کے لیے یہ غیر معمولی صورتِ حال کیوں اختیار کی گئی؟

اللہ سبحانہٗ کی حکیمانہ بلندیوں تک پہنچنا تو انسان کے بس میں نہیں ہے لیکن جن لوگوں نے بنی اسرائیل کی تاریخ حیات کا مطالعہ کیا ہے وہ یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ گائے کی عظمت اور تقدیس ان کے دلوں میں جس قدر پیوست ہو چکی تھی کہ قدم قدم پر ان کی راہ میں آڑ بن رہی تھی۔ آپ پڑھ چکے ہیں کہ گوسالہ پرستی کے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے تورات کی تعمیل کے لیے کہا تو انہوں نے اس وقت بھی حیلہ جوئیوں سے کام لیا۔ اگر رفع طور کا نشان ان پر ظاہر نہ ہوتا تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تکذیب میں پس و پیش نہ کرتے۔ ابھی تک قانونِ الٰہی کی پذیرائی کے باوجود قانون پر عمل کے لیے ان کی بے باک طبیعتیں آمادہ نہیں ہیں۔ اور ان کے دلوں سے گائے کی تقدیس کا عقیدہ دور نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ان کی حالت سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ گائے کی تقدیس کی گرفت نے ان کو پکڑ رکھا تھا۔ اس موقعہ پر ان کی اصلاح کے پیشِ نظر اللہ کی حکمت نے فیصلہ یہی فرمایا کہ بنی اسرائیل کی اس گمراہی کا کسی ایسے طریق سے علاج کیا جائے جس کا مشاہدہ خود ان کی آنکھیں کر لیں۔

چنانچہ گائے ذبح کرا کے ان کو دکھا دیا کہ جس کی تقدیس تمہارے دل میں اس قدر پیوست ہو چکی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ تم نے خود اپنے ہاتھوں سے اس کو فنا کے گھاٹ اتار دیا اور وہ تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکی۔ اور یہ بھی جتا دیا کہ یہ خیال نہ کرنا کہ گائے کے پارۂ گوشت سے مردہ میں

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۵

زندگی آنا گائے کا کمال ہے۔ اگر یہ گائے کا کمال ہوتا تو جس کے پارۂ گوشت سے مُردہ زندہ ہوا ہے وہ خود کیوں زندہ نہیں ہوا۔ بلکہ یہ اللہ کا کام ہے کہ وہ کس سے کیا کام لیتا ہے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ موت وحیات کا معاملہ اللہ کے قبضے میں ہے۔

قرآن عزیز نے غالباً اسی حکمت کے پیشِ نظر ذبح بقرہ کے واقعہ کو دو حصّوں میں تقسیم کیا ہے۔ پہلے حصّہ میں بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی کی تائید میں بقرہ کا یہ واقعہ بیان فرمایا کہ جب ایک مقصد کے تحت بنی اسرائیل سے گائے ذبح کرنے کو کہا گیا تو گوسالہ کی عظمت ان کی طاعت میں حائل ہو گئی اور انہوں نے قسم قسم کے سوالات کیے لیکن بالآخر ان کو مجبور ہو کر تعمیل حکم کرنی پڑی۔ اس مرحلہ پر سامعین کے ذہن میں یہ سوال اُبھرا اور شوق پیدا ہوا کہ وہ یہ معلوم کریں کہ گائے ذبح کرنے کا واقعہ اور کس طرح پیش آیا ہے۔ چنانچہ قرآن نے دوسرے حصّہ کے اسی سوال کا جواب ایک واقعہ کی صورت میں ان آیات میں دیا ہے۔

۱۸۷ اس آیت سے قصّہ کا رُخ قدرتِ خالق، حقیقتِ بعثت اور موت و حیات کی ماہیت و کیفیت کی طرف ہو جاتا ہے۔ اور اندازِ بیان غائب سے خطاب کی جانب منتقل ہو جاتا ہے اور اصل واقعہ کے نمایاں پہلو کو واضح کیا جاتا ہے کہ تمہارے بزرگوں میں سے عامیل نامی شخص کو قتل کر دیا تھا۔ تم میں سے ہر ایک دوسرے پر الزام دھرنے لگا اور تم جس چیز کو چھپاتے تھے، یعنی صفتِ ایمانی یا قاتل کے حال کو۔ اللہ تعالیٰ اس کو ظاہر کرنا چاہتا ہے [۱]

اصل میں قاتل کا پتہ نہیں لگ رہا تھا۔ کوئی کہتا تھا کہ فلاں قاتل ہے اور کوئی کہتا تھا کہ فلاں۔ ایک دوسرے پر الزام لگا رہے تھے [۲]

۱۸۸ ۔ ہم نے حکم دیا کہ مارو اس مقتول پر گائے کا ایک ٹکڑا۔ یعنی جب گائے کا ٹکڑا اس مقتول کے جسم پر مارو گے تو مقتول زندہ ہو جائے گا اور اپنے قاتل کا نام بتائے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا [۳]

اس مقام پر یہ بات تو بالکل صریح ہے کہ مقتول کے اندر دوبارہ اتنی دیر کے لیے جان ڈالی گئی کہ وہ قاتل کا پتہ بتا دے۔ لیکن اس غرض کے لیے جو تدبیر بتائی گئی یعنی لاش کو اس کے ایک حصّہ سے ضرب لگاؤ اس کے الفاظ میں کچھ ابہام معلوم ہوتا ہے تاہم اس کا قریب ترین مفہوم وہی ہے جو قدیم مفسّرین نے بیان کیا ہے یعنی یہ کہ اوپر جس گائے کے ذبح کرنے کا حکم دیا تھا اسی کے گوشت سے مقتول کی لاش پر

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۴ [۲] تفسیر ماجدی ص ۲۹ [۳] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۴

ضرب لگانے کا حکم ہوا۔ اس طرح بیک کرشمہ دو کار ہوئے۔ ایک یہ کہ اللہ کی قدرت کا ان کو ایک نشان دکھایا گیا۔ دوسرے یہ کہ گائے کی عظمت و تقدیس اور اس کی معبودیت پر بھی ایک ضرب کاری لگی کہ اس نام نہاد معبود کے پاس اگر کچھ بھی طاقت ہوتی تو اسے ذبح کرنے سے ایک آفت بپا ہو جاتی نہ کہ اس کا ذبح ہونا اُلٹا مفید ثابت ہو[1]

یہ حقیقت ہے کہ گائے کے ٹکڑے کے ذریعے مقتول کا زندہ کر کے قاتل کا پتہ بتانا اللہ تعالیٰ کی شانِ قدیری کا ایک عجیب و غریب نشان ہے جو یہود کی سخت جبلت اور متمردانہ خصلت کے مقابلے میں حق کی تائید کے لیے حکمتِ الٰہی کے پیشِ نظر ظہور میں آیا۔ اور جو نشان ہونے کے علاوہ اپنے اندر متعدد مصالح رکھتا تھا۔ خود قرآن کا سیاق و سباق اسی کی تائید کرتا ہے۔ چنانچہ اسی جگہ فرمایا ہے كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰى اسی طرح اللہ مُردوں کو زندہ کرے گا اور اسی کے سیاق میں ارشاد ہے وَيُرِيكُمْ اٰيَاتِهٖ تاکہ دکھا دے تم کو اپنی نشانیاں۔ گویا ذبح بقرہ کا قصّہ نقل کرنے سے پہلے بار بار بنی اسرائیل کو آیاتِ الٰہیہ دکھانے کا ذکر اور پھر واقعہ کے ساتھ ہی آخرت میں احیاء موتیٰ پر اس سے استشہاد اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کسی تاویل اور دور از کار باتوں کی پناہ لیے بغیر ان آیات کی صاف اور واضح تفسیر وہی ہے جو سطور بالا میں پیش کی گئی۔

یہ کہنا قطعاً بے وزن ہے کہ اس واقعہ کا تورات میں جب کوئی ذکر نہیں ہے تو قرآن نے یہ واقعہ کہاں سے پیش کیا ہے اور معلوم ہے کہ اسرائیل کی تاریخ حیات کے لیے سب سے مستند ذریعہ تورات ہے۔

یہاں مفتی محمد عبدہٗ کا جواب بہت خوب ہے کہ قرآن یہ واقعہ اسی علمی مرکز کی جانب سے پیش کر رہا ہے جس نے اسرائیل کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ نَسُوا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوا بِهٖ اسرائیل اللہ کی جانب سے آئی ہوئی باتوں میں سے ایک حصّے کو بھول چکے ہیں اور یہ کہ اُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ جنہیں کتاب اللہ کے علم ہی سے ایک حصّہ دیا گیا ہے۔ بلاشبہ تورات میں یہ حکم موجود ہے اور قرآن نے اس کے فراموش شدہ حصّہ کا انکشاف کیا ہے۔ اس ایک واقعہ پر اور اس ایک حکم پر کیا منحصر ہے۔ بہت سے واقعات اور احکام میں قرآن نے اُن کی تحریفات اور تلبیسات کی نشاندہی کی ہے۔

اس سلسلے میں گائے حاصل کرنے سے متعلق تفسیری کتابوں میں جو عجیب و غریب قصّے بیان کیے گئے ہیں ان سب کا سرچشمہ اسرائیلی افسانے ہیں۔ یعنی یہ وہ قصّے ہیں جو یہود کے ذرائع سے مشہور ہو گئے اور تفسیروں

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۶

میں درج کردیے گئے۔ لیکن محققین نے ان کو قرآن کی تشریح میں کبھی قبول نہیں کیا۔ حافظ عمادالدین ابن کثیرؒ جو نقد و روایت میں مثالی بلکہ استدلالی شخصیت ہیں فرماتے ہیں کہ

یہ سلسلۂ بیانات جو عبیدہ ابوالعالیہ اور سدی وغیرہ سے مروی ہے ان میں باہم اختلاف ہے اور صاف بات یہ ہے کہ یہ اسرائیلی ذرائع کی تخلیق ہیں۔ اگرچہ ان کو نقل کرنا درجہ جواز میں آسکتا ہے مگر ہم ان کی تصدیق و تکذیب کے مکلف نہیں ہیں۔ اسی بنا پر ان روایات کا قطعاً کوئی اعتبار اس وقت تک نہیں جب تک قرآن و سنت سے ان کی تائید نہ ہو جائے۔

اور خاص اس واقعہ کے متعلق لکھتے ہیں:

گائے کا وہ حصہ جو مقتول کے جسم سے مارا گیا تھا کونسا تھا؟ کوئی بھی حصہ ہو واقعہ میں جس قدر مذکور ہے معجزہ ہونے کے لیے وہی کافی ہے۔ اگر اس حصہ کا تعین بھی ہماری معلومات کے لیے ضروری ہوتا تو اللہ سبحانہٗ اسے ضرور واضح فرما دیتے مگر اللہ نے اسے مبہم ہی رکھا ہے۔ اگرچہ اصل حقیقت کے لحاظ سے وہ بہرحال متعین ہے۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بھی اس کے تعین کے متعلق کوئی صحیح روایت ثابت نہیں ہے لہٰذا ہمارے لیے بھی یہی مناسب ہے کہ ہم بھی اسے اسی طرح مبہم رہنے دیں جس طرح اللہ نے مبہم رکھا ہے۔ (البدایہ والنہایہ ج ۱ ص ۱۱۳)

ایک شبہ کا ازالہ

اس تفسیر کے بعد اس سوال کا جواب بھی مل گیا کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ واقعہ کے اس حصے کو پورے واقعہ سے علیحدہ کرکے کیوں بیان کیا۔ یہ واقعہ کے بیان کرنے کا مؤثر دل نشین فنی پہلو ہے جس سے یہ واقعہ اپنے سیاق و سباق سے خوب ہم آہنگ ہے۔

یہ تفسیر سامنے رکھ کر معاملہ کے سارے پہلوؤں پر نظر ڈالو، ہر بات اس طرح واضح ہو جاتی ہے گویا تمام قفلوں کے لیے صرف اسی ایک چابی کی ضرورت تھی اضربوہ ببعضھا کا مطلب بھی ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کسی دور از کار توجیہہ کی ضرورت باقی نہیں رہی کیونکہ اس طرح ہی حقیقت حال بتانے کی گائے کے عقیدت کیشوں کو ضرورت تھی۔ گائے سے عابدانہ تعلقات رکھنے والوں کی عقیدت پاش پاش ہو گئی۔ واللہ مخرج ما کنتم تکتمون کا عملی مظاہرہ سامنے آگیا اور وہ تمام بے معنی توجیہیں غیر ضروری ہو گئیں جن کی وجہ سے بعض جدید ارباب تفسیر یہ ترجمہ کرنے پر مجبور ہو گئے۔

ہم نے حکم دیا کہ اس شخص پر جو فی الحقیقت قاتل تھا مقتول کے بعض اجزائے جسم سے ضرب لگاؤ۔

ثُمَّ قَسَتْ قُلُوْبُكُمْ مِّنْ بَعْدِ ذٰلِكَ فَهِيَ كَالْحِجَارَةِ اَوْ اَشَدُّ قَسْوَةً ؕ وَاِنَّ مِنَ الْحِجَارَةِ لَمَا يَتَفَجَّرُ مِنْهُ الْاَنْهٰرُ ؕ وَ اِنَّ مِنْهَا لَمَا يَشَّقَّقُ فَيَخْرُجُ مِنْهُ الْمَآءُ ؕ وَاِنَّ مِنْهَا لَمَا يَهْبِطُ مِنْ خَشْيَةِ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۞

پھر تمہارے دل اس کے بعد سنگین ہو گئے، سنگین بھی کیسے؟ ایسے جیسے پتھر ہوتے ہیں بلکہ سنگینی میں پتھروں سے بھی زیادہ۔ کیونکہ پتھروں میں تو کچھ پتھر ایسے بھی ہیں جن میں سے نہریں بہہ کر آتی ہیں اور ان پتھروں میں کچھ پتھر ایسے بھی ہیں جو پھٹ جاتے ہیں تو ان میں سے پانی نکل آتا ہے اور انہیں میں وہ چٹانیں بھی ہیں جو خدا کے خوف سے گر جاتی ہیں اور یاد رکھو کہ اللہ تمہارے کاموں سے بے خبر نہیں ۔

اگر تم ایک لاش پر کھڑے ہو اور قاتل کا پتہ نہ ہو، صورت حال اتنی سنگین ہو گئی ہو کہ ایک دوسرے پر الزام لگایا جا رہا ہو تو ایسی حالت میں مسئلہ کا حل کیا ہوگا جبکہ معاملہ بھی اس کی بارگاہ میں ہو جو موت و حیات کا مالک ہے۔ اگر مردہ خود بول پڑے تو معاملہ پل جھپکنے میں ختم ہو جائے گا۔

چونکہ معاملہ کا تعلق مالک موت و حیات سے تھا اس لیے مُردے کو زندہ کر کے اس نے اپنی الحیائی شان کا مظاہرہ کر دیا اس لیے اب کذالک یحیی اللہ الموتیٰ کی تفسیر میں کسی تکلف کی احتیاج باقی نہ رہی۔ یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات نہیں بلکہ اللہ کی بات ہے ۔ ایسے ہی اللہ مُردے زندہ کرے گا یعنی جیسے یہ مُردہ زندہ کیا ہے ایسے ہی روزِ قیامت سب کو زندہ کرے گا اور تم بھی ان میں ہو گے۔ اور اس تشریح سے اس سوال کا جواب بھی خود بخود سمجھ میں آ گیا کہ آخر میں دیرکم آیاتہ کیوں فرمایا۔ کیونکہ یہ اللہ کی قدرت کی نشانی تھی کہ دیکھنے والوں نے مُردہ زندہ ہوتے دیکھا اور قاتل کا نام اس کی زبان سے کانوں نے سُنا۔ اور لعلکم تعقلون کے ذریعے متنبہ کر دیا کہ معلوم کے ذریعے وہ کچھ جان سکتے ہو جو ابھی تک تمہارے لیے مجہول ہے یعنی سمجھ لو کہ جو ذات ایک جان کے زندہ کرنے کی قدرت رکھتی ہے وہ سب کے زندہ کرنے پر بھی قادر ہے۔ اگر یہ قانون اور مسئلہ سمجھنے کی بات ہوتی تو تعبیر عقل سے نہیں تذکر، تفکر، تدبر اور تفقہ سے ہوتی ۔

دراصل یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے جب تک یہ حقائق پیشِ نظر نہ ہوں اصلیت کا سراغ نہیں

حل سکتا۔ سب سے پہلے یہ حقیقت سمجھنی چاہیے کہ جو واقعہ ان آیات میں بیان کیا گیا ہے وہ کس دَور کا ہے یہ بات اس وقت کی ہے جب تورات کا نزول نہیں ہوا۔ پھر یہ بات سامنے لانی چاہیے کہ یہ واقعہ گائے پرست قوم کا ہے اور جنہیں پیش آیا تھا وہ یہودی تھے اور فرعون کی غلامی سے نئے نئے آزاد ہوئے تھے اور دلوں میں گائے کی عبادت کی چسک تھی۔ صرف اتنی سی بات پر غور کرنے سے سارا معاملہ حل ہو جاتا ہے۔

قلبی قساوت

یہاں تک اسرائیلی تاریخ حیات کا چہرہ بیان فرمایا اور بتایا ہے کہ مال و دولت کا حصول، حق اور باطل میں التباس، کتمانِ حق، دین کا کاروبار، شخصی مسؤلیت سے بے پروائی، غلامی سے آزادی کے بعد سرکشی، گوسالہ پرستی، گستاخی اور بے ادبی، ظلم کاری اور معصیت پر اصرار، فطرت کا فساد اور اخلاقی بگاڑ، قتلِ انبیاء، اللہ کی آیات کا کفر، عہد و پیماں کے بعد اس سے روگردانی اور انحراف، غداری، عہد شکنی، حیلہ سازی، تعمق اور کثرتِ سوال اور نبوت کی شان میں گستاخیاں ان کے مزاجوں میں راسخ ہو گئی تھیں۔
یہاں پہنچ کر قاری اور سامع کے ذہن میں معاً یہ سوال ابھرتا ہے کہ اس کے بعد پھر کیا ہوا۔ یا یہ کہ اس طرزِ عمل اور زندگی کو اس انداز پر ڈھالنے کا نتیجہ پھر کیا ہوا۔ اسی سوال کا جواب ان آیات میں دیا ہے کہ پھر تمہارے دل سنگین ہو گئے یعنی دلوں میں سنگینی آنے کا باعث یہ اعمال بنے ہیں۔ یہاں ثُمَّ نہ استبعاد کے لیے ہے اور نہ استعجاب کے لیے بلکہ صرف ماقبل سے مابعد کو متاخر بتانے کے لیے آیا ہے اور ذالک کا اشارہ اس پوری عملی زندگی کی طرف ہے جس کا چہرہ دُور سے بیان ہوتا آ رہا ہے۔ قرآن میں دوسرے مقام پر قساوت کو ان کی ایسی زندگی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔ سورۂ مائدہ کی آیت نمبر بارہ۱۲ دیکھیے:

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنَّاهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قَاسِيَةً

اُن کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان پر لعنت کی اور اُن کے دلوں کو سنگین کر دیا۔

یعنی عہد شکنی اور غداری کی وجہ سے ہم نے ان کو اپنی رحمت سے دُور کر دیا اور اُن کے دلوں کو سنگین کر دیا۔ اس تعبیر سے یہ ظاہر فرما دیا کہ ان کے ملعون اور سنگدل ہونے کا سبب عہد شکنی اور بے وفائی ہے جو خود اُن کا کردار ہے۔

قربان جائیے اس بلیغانہ انداز بیان کے ۔منظر کشی میں قرآن اپنی مثال نہیں رکھتا ۔
۱۸۹ - تمہارے دل سنگین ہو گئے ۔ یہ قساوت سے بنا ہے ۔ قساوت عربی میں ہر چیز کی سختی اور شدت کو کہتے ہیں ۔ سخت پتھر کو حجرِ قاس اور ایسی زمین کو جس میں پیداوار کی صلاحیت نہ ہو ارضِ قاسیہ کہتے ہیں ۔ قساوت یہ ہے کہ حق قبول کرنے اور نصیحت سے اثر پذیری کی اس میں کوئی صلاحیت نہ ہو ۔ مطلب یہ ہے کہ قبولِ حق کے باب میں تمہارے دلوں میں سختی آگئی ہے ۔ قساوت کے بالکل رقت ، لین اور اخبات آتا ہے ۔ احادیث میں اہلِ یمن کے دلوں کی رقت کا ذکر اسی معنے میں ہے ۔ صحیح مسلم میں ہے ۔
فرمایا ۔ یمن کے لوگ آئے ہیں یہ لوگ بڑے رقیق القلب ہوتے ہیں ۔ ایمان و دین کی حکمت تو یمن ہی کا حصہ ہے ۔
حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ نے تین قسم کے دل قرآن میں ایک مقام پر بتائے ہیں ۔ قلبِ مریض ، قلبِ قاسی اور قلبِ مُخبت ۔ دل کی بیماری یہ ہے کہ اس میں حق کا جماؤ نہیں ہوتا ۔ اور دل کی قساوت یہ ہے کہ اس میں حق کے لیے پذیرائی نہیں ہوتی ۔ اور قلب کا اخبات یہ ہے کہ حق کے سامنے عجز و نیاز کا اظہار کر کے اسے قبول کر لیں اور اس پر جم جائیں ۔ ہدایات کو فراموش کر جانا ، ہدایات کے معانی اور مطالب کو بگاڑ دینا قساوت کی خاص علامات ہیں ۔
۱۹۰ - ایسے سنگین جیسے پتھر ہوتے ہیں بلکہ سنگینی میں پتھروں سے بھی زیادہ ۔ اس میں قلوب کی قساوت اور اس کے مختلف مدارج کو ایک بلیغ تشبیہ دے کر سمجھایا ہے کہ قلب کی قساوت یہ ہے کہ اس میں اثر پذیری اور تاثر کی کوئی صلاحیت نہ رہے دین کی فہم کے لیے اس میں کوئی حرکت نہیں ہے اور اللہ کے خوف سے وہ یکسر خالی ہو چکے ہیں ۔ یہ بے حس قلوب جن سے ہدایت کے چشمے تو کیا ابلیں گے ہدایت کا کوئی قطرہ بھی ان میں نہیں ہے ۔ قلوبِ قاسیہ ہیں جو سختی میں پتھروں سے بھی بڑھ کر ہیں کیونکہ پتھروں میں کچھ نہ کچھ آثارِ تاثر کچھ نہ کچھ حرکت تو نظر آتی ہے ان میں وہ بھی نہیں ہے ۔ آیت میں حرف اَوْ کے دو معنے کئے گئے ہیں ۔ رازیؒ کہتے ہیں کہ بل کے معنے میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ پتھر جیسے سخت ہیں بلکہ پتھر سے بھی زیادہ سخت ہیں ۔ لیکن قرطبیؒ اور آلوسیؒ نے سے تنویع کے لیے بتایا ہے اور معنے یہ ہیں کہ اُن کے دل دو قسم کے ہیں کچھ تو پتھر جیسے سخت اور کچھ پتھروں سے بھی زیادہ سخت ۔ اور یہی زیادہ اچھا ہے ۔
۱۹۱ - پتھروں میں کچھ پتھر ایسے بھی ہیں جن سے نہریں بہہ کر آتی ہیں ۔ یعنی سنگینی کی وجہ سے

زمین کی طرح ان میں پیداوار تو نہیں ہوتی۔ لیکن ان سے چشمے نکلتے ہیں اور چشموں سے نہریں جاری ہوتی ہیں اور نہروں سے پوری زمین سیراب ہوتی ہے اور زمین کی سیرابی سے انسانی معیشت کے لیے رحمتوں کے دروازے کھلتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سنگینی کے باوجود پتھروں میں یہ تأثر موجود ہے۔ لیکن ان میں کسی درجے میں اثر پذیری کی صلاحیت نہیں ہے اور اس سے نیچے درجے میں کچھ پتھر ایسے بھی ہیں جن سے دریا تو نہیں مگر کچھ پانی ضرور نکلتا ہے۔ اور کچھ پتھر ایسے بھی ہیں جو اللہ کی ہیبت سے نیچے گر جاتے ہیں۔ پتھروں میں اپنی طبیعت کے خلاف یہ انفعالات موجود ہیں۔ لیکن ان میں گناہوں، بدکرداریوں اور بدعنوانیوں کی وجہ سے انسانی طبیعت رکھتے ہوئے اثر پذیری کا کچھ بھی مادہ نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پتھروں میں بھی کسی درجہ میں تأثر پایا جاتا ہے مگر ان میں کسی درجہ میں حق کے قبول کرنے کا کوئی اثر نہیں ہے۔ شیخ الہندؒ فرماتے ہیں:۔

بعض پتھروں سے بڑا نفع ہوتا ہے کہ انہار اور پانی بکثرت ان سے جاری ہوتے ہیں اور بعض پتھروں سے پانی کم نکلتا ہے اور پہلی قسم کے مقابلے میں نفع کم ہوتا ہے اور بعض پتھروں سے گو کسی کو نفع نہ پہنچے مگر خود ان میں ایک اثر اور تأثر ہوتا ہے۔ لیکن ان کے دل ان تینوں قسموں کے پتھروں سے سخت تر ہیں۔ نہ ان سے کسی کو نفع اور نہ ان میں کوئی مضمونِ خیر موجود ہے [۱]

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس مقام پر تین قسم کے پتھروں کے ذکر میں خاص بلیغانہ انداز میں یہ بتایا ہے کہ بعض پتھروں میں تأثر اتنا قوی ہوتا ہے جس سے نہریں جاری ہو جاتی ہیں جس سے مخلوقِ خدا فائدہ اُٹھاتی ہے اور ان یہودیوں کے دل ایسے بھی نہیں ہیں کہ مخلوقِ خدا کی تکلیف میں پگھل جائیں۔ اور بعض پتھروں میں گو اس درجہ کا اثر نہیں مگر پھر بھی ایک اثر تو ہے کہ خوفِ خدا سے گر جاتے ہیں مگر ان کے دلوں میں اتنا بھی جذبہ انفعالی نہیں ہے [۲]

افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہ جانتے ہوئے کہ مشبہ بہ پتھر ہیں اور یہودیوں کی قساوتِ قلبی کو پتھروں سے تشبیہ دی گئی ہے۔ بعض اہلِ قلم نے پتھروں کی ان اقسام پر یہ نوٹ سپردِ قلم فرمادیا کہ

بعض پتھروں سے دریا پھوٹ نکلتے ہیں اور ان سے عالم سیراب ہوتا ہے۔ اس قسم کے پتھروں کی مثال انسانی آبادی میں انبیاء ورسل ہیں۔ ان کے چشمۂ فیض سے ایک عالم اپنی روحانی پیاس

---

[۱] حاشیہ شیخ الہند ص [۲] معارف القرآن م ش ص ۱۰۱

بجھاتا اور سیراب ہوتا رہتا ہے۔

ایسے پتھر بھی ہیں جن سے پانی نکلتا ہے اور ان سے بھی کسی درجہ میں اللہ کی مخلوق سیراب ہوتی ہے اس نوعیت کے پتھروں کی مثالیں اولیاء امت اور ابرار و متقین ہیں۔

اور کچھ پتھر اللہ کی ہیبت سے گر جاتے ہیں اس طرح کے پتھروں کی مثال مومنین و صالحین ہیں (تفسیر ماجدی ص ۳۰) خبر نہیں کہ موصوف اس کے ذریعے قرآن کے قاریوں کو کیا سمجھانا چاہتے ہیں؟ اگر وہ جانتے ہیں کہ پتھروں سے یہودیوں کو تشبیہ دی جا رہی ہے تو کیا وہ یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ اس مشبہ بہ کا عکس ان میں جن کو تشبیہ دی گئی ہے یہ ہے کہ یہودیوں میں کچھ انبیاء و رسل کے مقام کی، کچھ اولیاء و ابرار کی حیثیت کی اور کچھ عام مومنین جیسی شخصیتیں موجود ہیں۔ اگر یہ کچھ سمجھانا ہو تو یہ مراد قرآنی نہیں ہے۔ قرآن کی مراد تو یہ جتانا ہے کہ یہودیوں کی قلبی و اخلاقی حالت انتہائی تنزل کی وجہ سے ایسی حالت رونما ہو گئی ہے کہ عبرت پذیری اور تنبیہ کی استعداد یک قلم معدوم ہو گئی ہے اور وہ اپنی اس تباہ شدہ حالت پر قانع ہیں۔ ذرا خیال فرمائیے کہ جب تشبیہ برائی میں ایسے آخری درجہ کی دی جا رہی ہو اور تشبیہ بھی پتھروں سے سنگینی میں دی جا رہی ہو وہاں انبیاء و رسل و ابرار و متقین کے ذکر کا کونسا محل ہے؟ یہ موصوف کی خالص اپنی ذہنی اختراع ہے۔ ورنہ جو لوگ قرآن کی بلاغت کا ذوق رکھتے ہیں اور جن کو اللہ نے فہم قرآن کی نعمت سے مالا مال کیا ہے ان میں سے کسی نے یہ بات نہیں کہی ہے۔ اور یہ بات کسی کی زبان پر آ کیسے جائے جبکہ ان آیات میں جو بات کہی جا رہی ہے وہ صرف یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے قلوب کی سختی اور قبولِ حق میں بے اثری کا عالم یہ ہے کہ اگر محاورہ اور بول چال کی زبان میں یوں کہہ دیا جائے کہ ان کے پہلو میں دل نہیں بلکہ پتھر کے ٹکڑے ہیں۔ پھر بھی ان کی شدت و صلابت کی صحیح تصویر سامنے نہیں آسکتی۔ اس لیے کہ پتھر اگرچہ سخت ہے مگر ناکارہ نہیں ہے۔ کیا تم نے پہاڑوں کو نہیں دیکھا یہ پہاڑ ہی تو ہیں کہ ان ہی کے سخت پتھروں سے دریا اور نہریں نکل کر بہہ رہی ہیں۔ اور کہیں ان ہی سے شیریں اور خنک پانی کی سوت جاری ہے۔ اور اگر زلزلہ آ جائے یا اللہ کی مشیت کا کوئی اور فیصلہ ہو جائے تو پہاڑوں کی یہی دیو پیکر چٹانیں ٹوٹ کر سرنگوں ہو جاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ کے خوف و خشیت کا زبانِ حال سے اقرار کرتی ہیں، مگر بنی اسرائیل پر نہ اللہ کی آیات کا اثر ہوتا ہے اور نہ نبوت کی شیریں اور دل پسند نصیحتوں کا۔ اور نہ نافرمانی کے وقت خدا کا خوف ان پر طاری ہوتا ہے۔

أَفَتَطْمَعُونَ أَن يُؤْمِنُوا لَكُمْ وَقَدْ كَانَ فَرِيقٌ مِّنْهُمْ يَسْمَعُونَ كَلَامَ اللَّهِ ثُمَّ يُحَرِّفُونَهُ مِن بَعْدِ مَا عَقَلُوهُ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿٧٥﴾

اے مسلمانو! کیا تمہیں ان سے توقع ہے کہ یہ تمہاری[۱۹۲] بات مان لیں گے حالانکہ ان میں سے ایک گروہ[۱۹۳] کا یہ شیوہ رہا ہے کہ اللہ کا کلام سنتا، اس کا پورا مطلب سمجھتا لیکن پھر بھی جان بوجھ کر اس میں تحریف کر دیتا۔

جان بوجھ کر حق سے انحراف

پہلی آیت میں بنی اسرائیل کے دلوں کا نقشہ بیان کیا گیا تھا کہ ان کے دل پتھروں سے بھی زیادہ سخت ہیں ان میں کوئی نرمی نہیں، کوئی احساس نہیں، زندگی کی کوئی رمق نہیں۔ ان کی طبیعتیں کھوکھلی، جامد اور بے حس ہیں۔ اب ان سادہ دل مسلمانوں کو سمجھایا جا رہا ہے جو دوسروں تک حق پہنچانے کے لیے بے چین ہیں، اس کے لیے اپنے کاروبار کو نقصان پہنچا چکے ہیں، اپنی عمر بھر کا اندوختہ لٹا چکے ہیں، اپنی چھوٹی موٹی تجارتوں پر پانی پھیر چکے ہیں، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کر کے، وطن سے بے وطن ہو کر دنیا والوں سے سفہاء کی پھبتی سن چکے ہیں کہ جن لوگوں کی داستان یہ ہے ان سے تم کچھ زیادہ لمبی چوڑی توقعات نہ رکھو۔ ورنہ جب ان کے پتھر دلوں سے تمہاری دعوتِ حق ٹکرا کر واپس آئے گی تو دل شکستہ ہو جاؤ گے۔ یہ لوگ تو صدیوں سے عصیان و عدوان کے خوگر ہیں۔ ایمان کی طبیعت ان کی طبیعتوں سے مختلف ہے اور ایمان کی پیداوار کے لیے جو ... ہیج زمین درکار ہے یہ وہ زمین نہیں ہے۔ یہ بات نہیں کہ حق میں قوتِ فاعلی نہیں ہے۔ بلکہ اصل بات یہ ہے کہ مفعول میں قوتِ قابلی نہیں ہے۔ اللہ کی جن آیات کو سن کر تم پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے، رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے، دلوں میں عجز و نیاز آجاتا ہے۔ ان ہی آیات سے کھیلتے اور تمسخر کرتے ہیں۔ اہلِ حق کو یہ بیوقوف کہتے ہیں اور زندگی میں خدا ناشناسی بلکہ خدا کی کھلم کھلا بغاوت کو اصلاح سمجھتے ہیں۔ ان سے یہ توقع رکھنا بے کار ہے کہ حق کی آواز پر لبیک کہیں گے۔

۱۹۲ ــــہ۔ اے مسلمانو! کیا تمہیں ان سے یہ توقع ہے کہ وہ تمہاری بات مان لیں۔ یہاں عربی لفظ یومنوالکم ہے یہاں ایمان کے ساتھ لام آیا ہے۔ عموماً اس کے ساتھ حرف باآتا ہے۔ دونوں میں باریک سا فرق ہے اگر با کے ساتھ لفظ ایمان استعمال ہو تو اس کے معنے اذعان اور یقین کے آتے ہیں اور اگر لام کے ساتھ ہو تو اس کے معنے اعتراف و تسلیم اور انقیاد کے آتے ہیں۔ چونکہ علماء نے ایمان کی تعریف میں عموماً تصدیق ہی کا لفظ ذکر کیا ہے اس لیے عام طور پر غلط فہمی یہ پیدا ہو گئی ہے کہ ایمان گویا تصدیق کے ہم معنی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ قرآن میں ہر جگہ ایمان کو تصدیق کے معنے میں سمجھ لیا گیا۔ حالانکہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اگر یہ ملحوظ نہ ہو تو آیات قرآنی کی مراد مقرر کرنا دشوار ہو جائے گا۔

ایمان کے معنے

حافظ ابن تیمیہؒ نے یہ بات کھول کر بتائی ہے۔ ان کی تحقیق کا خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کا لفظ امن سے بنا ہے۔ اس لیے امانت و اعتماد کے معنے اس میں ہونے ضروری ہیں چاہے یہ با کے ساتھ استعمال ہو یا لام کے ساتھ۔ ایمان صرف ان خبروں میں مستعمل ہو گا جو اپنی چشم دید نہ ہوں بلکہ عدم موجودگی کی ہوں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے واپس آکر حضرت یعقوب علیہ السلام کی خدمت میں جب حضرت یوسف علیہ السلام کے قتل کا غلط افسانہ پیش کیا تو ما انت بمؤمن لنا کہا۔ کیونکہ یہ واقعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی غیر حاضری میں ہوا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کو ان پر اعتماد و اطمینان نہ تھا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی حضرت لوط علیہ السلام نے تصدیق کی۔ حضرت لوط علیہ السلام کی تصدیق کو بھی قرآن نے آمن لہ لوط سے تعبیر کیا ہے کیونکہ انہوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اعتماد پر ان کے ایمان کی تصدیق کی تھی۔

اس تحقیق کی روشنی میں آیت کے معنے یہ ہوں گے۔ تمہارے اعتماد پر یہ لوگ تمہاری باتوں کی تصدیق کیونکر کریں گے اور تمہاری بات کیسے مان لیں گے؟

یہ خطاب ہے ان مسلمانوں سے جو زمانے میں نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے تھے۔ ان لوگوں کے کان میں پہلے سے نبوت، کتاب، ملائکہ، آخرت، شریعت وغیرہ کی جو باتیں پڑی ہوئی تھیں، وہ سب انہوں نے ہمسایہ یہودیوں ہی سے سنی تھیں۔ اور یہ بھی انہوں نے یہودیوں ہی سے سنا تھا کہ دنیا میں ایک پیغمبر اور آنے والے ہیں اور یہ کہ جو لوگ ان کا ساتھ دیں گے وہ ساری دنیا پر چھا جائیں گے۔ یہی معلومات تھیں جن کی بنا پر اہل مدینہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کی نبوت کی جو چاشنی کر آپ کی طرف خود متوجہ ہوئے اور جوق درجوق ایمان لائے۔ اب وہ متوقع تھے کہ جو لوگ پہلے ہی انبیاء اور کتب آسمانی کے پیرو ہیں اور جن کی دی ہوئی خبروں کی بدولت ہی ہم کو نعمت ایمان میسر ہوئی وہ ضرور ہمارا ساتھ دیں گے بلکہ اس راہ میں پیش پیش ہوں گے۔ چنانچہ یہی توقعات لے کر یہ پُرجوش مسلمان اپنے یہودی دوستوں اور ہمسایوں کے پاس جاتے تھے اور ان کو اسلام کی دعوت دیتے تھے۔ پھر وہ اس دعوت کا جواب انکار سے دیتے تھے تو مخالفین اس سے یہ استدلال کرتے تھے کہ معاملہ کچھ مشتبہ ہی معلوم ہوتا ہے ورنہ اگر واقعی یہ نبی ہوتے تو آخر کیسے ممکن ہے کہ اہلِ کتاب کے علماء اور مشائخ اور مقدس بزرگ جانتے بوجھتے ایمان لانے سے منہ موڑتے اور خواہ مخواہ اپنی عاقبت خراب کر لیتے [1]

۱۹۲ ف ۔ حالانکہ ان میں سے ایک گروہ کا یہ شیوہ رہا ہے۔ گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو کوہ طور پر حضرت موسٰی علیہ السلام کے ساتھ کلام الٰہی سننے گئے تھے۔ انہوں نے وہاں سے آکر یہ تحریف کی کہ ہم نے یہ بھی ساری بات ختم ہونے پر سنا کہ کر سکو تو احکام پر عمل کر لینا ورنہ ان کے ترک کا بھی اختیار ہے۔ اور بعض نے فرمایا کہ کلامِ الٰہی سے مراد توارت ہے اور اس کی تحریف سے یہ مراد ہے کہ اس میں لفظی اور معنوی تبدیلی کر لیتے تھے۔ کبھی آپ کی نعت کو بدلا، کبھی آیت رجم کو اڑا دیا [2]

اصل عربی میں وَ قَدْ كَانَ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ہے۔ اس میں کَانَ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں اور لغت و نحو دونوں اس کی اجازت دیتے ہیں۔ ایک یہ کہ ایک ایسا فریق تھا اسرائیلیوں میں۔ گویا ذکر ماضی کا اور موجودہ یہودیوں کے اسلاف کا ہو رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ ایسا فریق ہے یعنی ذکر حال کا اور ہم عصر یہودیوں کا ہو رہا ہے۔ ائمہ تفسیر سے دو قسم کے اقوال منقول ہیں لیکن سیاق دوسرے معنے کے زیادہ موافق ہے کیونکہ حجت معاصرین پر قائم ہو رہی ہے اور ملزم ان ہی کو قرار دینا زیادہ مناسب ہے [3]

ایک گروہ سے مراد ان کے علماء اور حاملینِ شریعت ہیں۔ کلام اللہ سے مراد توارت، زبور اور وہ دوسری کتابیں ہیں جو ان لوگوں کو انبیاء کے ذریعے پہنچی ہیں۔ تحریف کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اصل معنے و مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق کچھ دوسرے معنے پہنا دیا جو قائل کے منشا کے خلاف ہوں۔ نیز الفاظ میں تغیر و تبدل کو بھی تحریف کہتے ہیں۔ علمائے بنی اسرائیل نے دونوں طرح

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۴ [2] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۵ [3] تفسیر ماجدی ص ۳۱

کی تحریف، کلام اللہ میں کی ہیں[1]

یہودی علماء کی یہ بہت بڑی شقاوت تھی کہ کتاب اللہ کی اطاعت کرنے کی جگہ کتاب اللہ کو اپنی خواہشوں اور رایوں کے مطابق کام میں لانا چاہتے ہیں وہ اس کی آیتوں میں تحریف کرتے تھے۔ اور تحریف بھی فکر اور سوچ کی غلطی سے نہیں بلکہ مانتے ہوئے کہ یہ غلط ہے اور سمجھتے ہوئے کہ ایسا کرنا سنگین گناہ ہے یعنی یا تو کسی آیت کا مطلب اس طرح ٹھہراتے کہ بات کچھ سے کچھ ہو جاتی یا کتاب اللہ کی آیتیں سناتے ہوئے اپنی طرف سے گھٹا بڑھا دیتے کہ اصل مطلب ظاہر نہ ہو اور جو بات بتانی چاہتے ہیں کسی نہ کسی طرح بن جائے۔

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں دین میں تحریف کے موضوع پر جو مقالہ سپرد قلم فرمایا ہے اس میں تحریف کی حقیقت، تحریف کے اسباب اور تحریف کی صورتوں کا احاطہ فرمایا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔ انشاءاللہ سورۃ توبہ میں یہ بحث آئے گی۔

نیز تورات اور انجیل میں تحریف کا موضوع قرآن کے خاص مباحث میں سے ہے۔ قرآن نے جس تحریف کا دعویٰ کیا ہے اس کی حقیقت کیا ہے اور تاریخی طور پر اس کی حیثیت کیا ہے؟ اس کے لیے بھی آپ کو سورۃ مائدہ کے انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہوگی۔

یہاں صرف یہ بات سمجھنے کی ہے کہ قرآن نے ان پر صرف تحریف ہی کا الزام نہیں لگایا بلکہ اس کے ساتھ یہاں یہ بھی فرمایا ہے کہ وہ یہ کام دیدہ ودانستہ کرتے تھے اور اس کے لیے تعبیر یہ اختیار فرمائی ہے مِنۡ بَعۡدِ مَا عَقَلُوۡهُ وَهُمۡ يَعۡلَمُوۡنَ یعنی کلام اللہ میں مطالب کو بگاڑنے کا یہ کام دو باتوں کے باوجود کرتے تھے۔

اول یہ کہ وہ کلام اللہ کو پورے طریقے پر سمجھ لیتے، اس کے مطالب کو عقل کی گرفت میں لیتے اور حقیقت کا پورے طور پر ادراک کر لینے کے بعد کرتے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ یہ کام وہ کسی غلط فہمی، کج فہمی اور کسی سوچ بچار کی غلطی سے کرتے تھے بلکہ بالارادہ پورے فکر و شعور کے ساتھ یہ کام انجام دیتے تھے۔

دوم یہ کہ وہ جانتے ہوئے کرتے تھے کہ جو کچھ کر رہے ہیں یہ غلط ہے ہمیں یہ کام نہ کرنا چاہیے اور یہ کام کرتے وقت ان کو یہ حکم ہوتا تھا کہ حقیقت یہ ہے اور ہم اسے اس طرح بگاڑ رہے ہیں یعنی ان کا یہ کام کسی بھول، خطا اور ذہول کا نتیجہ نہ تھا۔

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۷

یہ دو قیدیں لگا کر قرآن نے اُن کے عمل کی بُرائی اور گندگی کو صرف نمایاں نہیں کیا بلکہ اُن کے عصیان و فسق پر مُہر لگا دی ہے۔

اس آیت میں تحریف سے کیا مُراد ہے؟ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ یہاں مطالب اور معانی کی تحریف مراد ہے۔ اگر لفظی تحریف کو بتانا یہاں مقصود ہوتا تو آیت میں يَسْمَعُوْنَ كَلَامَ اللّٰهِ نہ ہوتا اور مِنْ بَعْدِ مَا عَقَلُوْهُ کی قید نہ ہوتی۔ آلوسیؒ نے بھی ابن جریرؒ کی ہمنوائی کرتے ہوئے آیت کا مطلب یہی بتایا ہے کہ وہ تورات کی آیات سنتے ہیں لیکن ان میں اپنے اغراض کے مطابق تاویلات فاسدہ کرتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے بھی اسی کی تائید نقل کی گئی ہے۔

اس تشریح سے ان علماء کی تائید ہوتی ہے جنہوں نے یہاں فریق سے زمانہ نبوت کے یہودی علماء اور حاملینِ شریعت مراد لیے ہیں اور پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم ان لوگوں سے ایمان کی توقع لگائے ہوئے ہو جن کے علماء اور حاملینِ شریعت کلامِ الٰہی اور تورات کو سُن کر اس کی آیات کو مطالب کا غلط جامہ پہنا دیتے ہیں۔ اور یہ غلط جامہ پہناتے ہوئے وہ جانتے ہیں کہ یہ غلط ہے لیکن ان کی طبیعت کی کجی، خواہشات کی پیروی اور اپنے مفادات کی تکمیل ان کو اس تحریف پر آمادہ کرتی ہے۔ ایسی صورت میں ان سے یہ کیسے توقع رکھی جا سکتی ہے کہ وہ اس دعوتِ ایمان کو قبول کر لیں جو تم پیش کر رہے ہو۔

اور اگر آیت میں فریق سے مراد گزشتہ زمانہ میں یہودیوں کا وہ گروہ ہو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ کوہِ طور پر تھا تو آیت میں تحریف سے مطالب کی تحریف نہیں بلکہ الفاظ کی تحریف مراد ہوگی اور آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ تو وہ لوگ ہیں جن کے اسلاف اصل کلام سُن کر اس کو بدل دیتے تھے ان کو سرکشی و انکار اور تحریف وراثت میں ملی ہے۔ ان سے ایمان کی توقع بیکار ہے۔ ان کا قرآن کی دعوت کو قبول نہ کرنا اس لیے نہیں کہ قرآن کی دعوت مشتبہ ہے بلکہ اس لیے ہے کہ یہ لوگ تو صدیوں کے بگڑے ہوئے ہیں۔ اللہ کی آیات کو بدل ڈالنا، حق سے انحراف اور اس کا انکار ان کا آبائی پیشہ ہے۔ اگر وہ اب اس دین کو نہیں مانتے تو اس پر حیرت نہ ہونی چاہیے جس کے دلائل ٹھیٹھ عقلی اور حس کا اعجاز علمی ہے۔ قرآن علومِ ہدایت، دقائقِ بلاغت کا شاہکار ہے۔ اس کی جن آیات کو سُن کر تم پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے ان ہی سے کھیلتے اور تمسخر کرتے ان کی نسلیں بیت گئی ہیں۔

وَإِذَا لَقُوا الَّذِينَ آمَنُوا قَالُوا آمَنَّا ۚ وَإِذَا خَلَا بَعْضُهُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ قَالُوا أَتُحَدِّثُونَهُم بِمَا فَتَحَ اللَّهُ عَلَيْكُمْ لِيُحَاجُّوكُم بِهِ عِندَ رَبِّكُمْ ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿۷۶﴾ أَوَلَا يَعْلَمُونَ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ﴿۷۷﴾

اور دیکھو ان کا حال تو یہ ہے کہ جب اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو اپنے تئیں مومن[۱۹۴] ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں اور باہم تنہائی میں مسلمانوں سے الگ ہو کر ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں[۱۹۵] تم ان مسلمانوں کو وہ باتیں کیوں بتاتے ہو جن کا علم اللہ نے تمہارے لیے کھولا ہے۔ کیا اس لیے بتاتے ہو کہ وہ تمہارے خلاف[۱۹۶] تمہارے پروردگار کی عدالت میں حجت پیش کر سکیں۔ کیا اتنی سی موٹی بات بھی تمہاری عقل میں نہیں آتی۔ افسوس ہے ان کے دعوی ایمان پر۔ کیا ان کو اتنا بھی پتہ نہیں[۱۹۷] ہے کہ ان کا معاملہ کسی انسان سے نہیں بلکہ اس اللہ سے ہے اور اللہ کے علم سے کوئی بات بھی چھپی نہیں ہے نہ وہ جو چھپا کر کرتے ہیں اور نہ وہ جو ظاہر کرتے ہیں۔

عقیدے کا فساد

یہ آیت بھی پہلی آیت کا تتمہ ہے اور یہ بتایا جا رہا ہے کہ کیا تم ان سے ایمان کی توقع رکھتے ہو جن کی اخلاقی گراوٹ اس درجہ میں پہنچی ہوئی ہے کہ ابن الوقتی کو شیوہ بنا رکھا ہے اور پوری زندگی دوغلی بنی ہوئی ہے۔ ان کے دوغلے پن اور ابن الوقتی کا حال یہ ہے کہ اہلِ ایمان سے ملتے ہیں تو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر جب اپنی مجلسوں میں پہنچتے ہیں اور ان سے پوچھا جاتا ہے تو ان کا رنگ کچھ اور ہوتا ہے ابن الوقتی کا عالم یہ ہے کہ اہلِ ایمان سے مل کر یہ بھی کہتے ہیں کہ تورات میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق بشارت آئی ہے اور اپنی خلوتوں میں باہم ان باتوں کے بتانے پر منع کرتے ہیں۔

۱۹۴ یہود میں جو لوگ منافق تھے وہ بطورِ خوشامد اپنی کتاب میں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی باتیں مسلمانوں سے بیان کرتے۔ دوسرے لوگ ان میں سے ان کو اس بات پر ملامت کرتے

کہ اپنی باتیں ان کو کیوں بتاتے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ مسلمان تمہارے پروردگار کے آگے تمہاری خبر دی ہوئی باتوں سے تم پر الزام قائم کریں گے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچان کر بھی ایمان نہ لاتے اور تم کو لاجواب ہونا پڑے گا۔

یہ آیت دراصل دعوتِ اسلامی کے ایک نئے مرحلے کی نشاندہی کر رہی ہے۔ اصلاح و دعوت کے بارے میں کمزوری یہ ہے کہ عام لوگ نئی دعوت اور پرانی ڈگر کے معاملے میں ایک قسم کی حیرت کا شکار ہو جاتے ہیں۔ وہ یہ نہیں دیکھتے کہ حق کیا ہے اور کدھر ہے بلکہ یہ سوچتے ہیں کہ ہمارا فائدہ کس چیز میں ہے، اگر دعوت کو قبول کرتے ہیں تو پارٹی سے علیحدگی کا اندیشہ ستاتا ہے۔ اور اگر پرانی ڈگر پر قائم رہتے ہیں تو ہدایتِ حق سے محرومی کا دھبہ لگتا ہے۔ ایسے لوگ اپنی موقع پرستی، ابن الوقتی کا مظاہرہ کرنے کے لیے سب سے تعلقات استوار کر لیتے ہیں تاکہ حالات کے ہر موڑ سے استفادہ کر سکیں۔ اس قسم کا مدینہ کے یہودیوں میں بھی ایک طبقہ تھا۔ ان آیات میں قرآن نے ان کا چہرہ پیش کیا ہے۔

۱۹۵ – اور جب باہم تنہائی میں ایک دوسرے سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں۔ اس فقرے میں کہنے والے اور ہیں اور پہلے فقرے میں کہنے والے اور ہیں۔ دونوں جگہ قالوا آیا ہے۔ جو ایمان کا دعویٰ کرنے والے ہیں ان کو دوسرے لوگ کہتے تھے اور تنہائی میں کہتے ہیں یعنی یہ دیکھ کر کہتے کہ اس پاس کوئی مسلمان تو نہیں ہے۔

کیا کہتے تھے؟ یہ بات کہ اتحدثونھم بما فتح اللّٰہ علیکم ان مسلمانوں کو تم وہ باتیں کیوں بتلاتے ہو جن کا علم اللہ نے تمہارے لیے کھولا ہے۔ یعنی وہ اسرار و تعلیمات جو تمہاری مقدس کتابوں اور آسمانی صحیفوں میں محفوظ ہیں۔ مثلاً آخری نبی کی بشارتیں جو تمہاری مقدس کتابوں اور آسمانی صحیفوں میں محفوظ ہیں۔ مثلاً آخری نبی کی بشارتیں اور علامتیں۔ یہود جب باہم ملتے تو ایک دوسرے کو قائل کرتے کہ تم اپنے ہاں کی پیشین گوئیاں اور خاص تعلیمات مسلمانوں کو کیوں بتاتے ہو[1]

اللہ نے جن کا علم تمہارے لیے کھولا ہے، جو کچھ کھولا ہے سے مراد شریعت اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت کا وہ انعام ہے جو بنی اسرائیل پر ہوا ہے۔ اس میں حاملِ شریعت کو قیدی سے تشبیہہ دی ہے اور اس کے بتانے کو اس تعلق کی بنا پر کھولنے سے۔ یا جو کچھ کھولا سے مراد یہ ہے کہ اللہ نے تم سے آنے والے نبی کے ماننے اور اُس کی نصرت کرنے کا جو عہد لیا ہوا ہے اس کا

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۳

تم مسلمانوں سے نہ کرو۔ گویا وہ آپس میں ایک دوسرے کو کہتے کہ تورات اور دیگر کتب آسمانی میں جو پیش گوئیاں اس نبی کے متعلق ہیں یا جو آیات اور تعلیمات ہماری مقدس کتابوں میں ایسی ملتی ہیں جن سے ہماری موجودہ روش پر گرفت ہو سکتی ہے انہیں مسلمانوں کے سامنے بیان نہ کرو۔

۱۹۶۔ تمہارے خلاف تمہارے پروردگار کے حضور میں حجت پیش کریں۔ یعنی تمہارے رب کے سامنے تمہارے خلاف حجت کے طور پر پیش کریں گے۔ یہ تھا اللہ کے متعلق ان ظالموں کے فساد عقیدہ کا حال۔ گویا وہ اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ اگر دنیا میں وہ اپنی تحریفات اور اپنی حق پوشی کو چھپا لے گئے تو آخرت میں ان پر کوئی مقدمہ نہ چل سکے گا۔[1]

لیحاجوکم بہ عند ربکم کا ایک مفہوم تو یہی ہے کہ یہ لوگ قیامت میں اللہ کے حضور میں تمہیں قائل کر لیں گے لیکن زیادہ جی لگتے ہوئے معنے یہ ہیں کہ اسی دنیا میں تم پر حجت قوی قائم کر دیں گے اور عند ربکم یہاں عند اللہ کی طرح حجت قوی کے معنے میں ہے۔ اس لیے کہ آخرت میں حجت قائم کرنے کے لیے کسی ایسے ظاہری سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہاں تو کشف حقائق از خود ہو کر رہے گا اس لیے احتجاج بکتاب اللہ کے لیے یہاں عند اللہ کی تعبیر آئی ہے۔ زمخشری، بیضاوی، آلوسی، نسفی کے اشارات بھی ایسے ہی ہیں۔

۱۹۷۔ کیا ان کو اتنا بھی پتہ نہیں ہے۔ یعنی اللہ کو تو ان کے سارے معاملات ظاہر ہوں یا مخفی بالکل معلوم ہیں ان کی کتاب کی ساری دلیلیں مسلمانوں کو بتا سکتا ہے اور جا بجا بتا بھی دیا۔ آیت رجم کو انہوں نے چھپایا مگر اللہ نے ظاہر فرما کر ان کو رسوا کر دیا۔ یہ ان کے علماء کا حال ہے۔ یہ عقل مندی اور کتاب دانی کے مدعی تھے[2]

اللہ جب چاہے اپنے رسولؐ اور اہل ایمان کو مطلع کر سکتا ہے موٹی سی بات ہے کہ اللہ کے لیے ایسے امور کی اطلاع اپنے پیغمبر کو دے دینا مشکل ہی کیا تھا لیکن بے مغز اس امکان کی طرف اپنا ذہن ہی نہ لاتے تھے کہ شاید اس مدعی نبوت کا تعلق خدا تعالیٰ کے ساتھ واقعی کچھ ہو۔ ٹھیک اسی طرح جیسے آجکل مغربی قومیں اس امکان ہی کو قبول کرنے کو تیار نہیں ہیں کہ کہیں واقعی قرآن خدا ہی کی کتاب نہ ہو۔[3]

---

[1] تفہیم القرآن ص ۸۸ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۵ [3] تفسیر ماجدی ص ۳۱

وَمِنْهُمْ اُمِّيُّوْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ الْكِتٰبَ اِلَّآ اَمَانِيَّ وَاِنْ هُمْ اِلَّا يَظُنُّوْنَ ﴿۷۸﴾

اور ان میں سے وہ لوگ بھی ہیں جو بالکل اَن پڑھ ہیں۔ اور کتاب اللہ سے اُن کا تعلق خوش اعتقادی کے ولولوں اور آرزوؤں کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور عقائد کی جگہ صرف وہم و گمان ان کا سرمایہ نجات ہے۔

عوامی زندگی میں دین کا سرمایہ

امتوں میں انحطاط و زوال کا نقطۂ آغاز نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے رشتہ ٹوٹنا ہے۔ جب یہ رشتہ ٹوٹتا ہے تو زندگی کے ہر گوشہ میں انحطاط آجاتا ہے۔ دین کی قدریں مٹ جاتی ہیں، دینداری کی ہیبت دلوں میں نہیں رہتی۔ اور عوامی زندگی نبوت کے لائے ہوئے علوم ہدایت سے قطعاً بے بہرہ ہو کر ایک طبقہ کی رعیت بن کر رہ جاتی ہے اور یہ طبقہ عوامی استحصال کو اپنی زندگی کا منتہائے نظر بنالیتا ہے۔

اس آیت میں عوامی زندگی کا جو چہرہ پیش کیا جا رہا ہے اس میں تنقید اُن کی خوش فہمی پر ہے مفروضات کی پیروی پر ہے، خواہشات کے مطابق من گھڑت افسانوں پر ہے۔ بغیر سند اور دلیل، جھوٹے ولولوں اور بلند بانگ نعروں پر ہے۔

بتایا جا رہا ہے کہ یہ اَن پڑھوں کا وہ گروہ ہے جنہیں کتاب الٰہی سے ولولوں سے زیادہ کوئی تعلق نہیں اور جن کا اعتقادی سرمایہ صرف اوہام اور عملی سرمایہ صرف چند من گھڑت رسُوم ہیں۔

۱۹۸ ۔ ان میں سے وہ لوگ بھی جو بالکل اَن پڑھ ہیں۔ اصل لفظ اُمِّیُّوْنَ ہے۔ یہ اُمّی کی جمع ہے جو نہ لکھ سکے اور نہ پڑھ سکے۔ زجاج نے تشریح کی ہے کہ اُمّی وہ ہے جو اُمتِ عرب کی صفت پر ہو۔ ان پڑھ ہونا عرب کی خاص صفت تھی جس میں وہ دوسری قوموں سے ممتاز تھے۔ صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انا امۃ اُمیۃ لا نکتب ولا نحسب ہم اُمّی جماعت ہیں نہ لکھنا جانیں نہ حساب کرنا۔ اس کا مطلب یہ نہیں کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے اُمتِ اسلامیہ کی خصوصیت بیان ہو رہی ہے یعنی رسُول اللہ ہونے

کی حیثیت میں آپؐ یہ نہیں فرما رہے ہیں کہ ان پڑھ ہونا مسلمانوں کی خصوصیت ہے بلکہ عربی کی حیثیت سے یہ فرما رہے ہیں کہ ہم یعنی عرب کی آن پڑھ ہونا صفت ہے۔ کیونکہ رسُول ہونے کی حیثیت میں آپ کی تشریف آوری کا تو مقصد ہی قرآن نے یہ بتایا ہے کہ يُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ - پیغمبر تعلیم دیتا ہے تم کو کتاب و حکمت کی۔ ظاہر ہے کہ اس کے بعد اُمّی ہونے کا سوال ہی بے محل ہے۔ خیر یہاں یہ تو جملہ معترضہ درمیان میں ویسے ہی آگیا۔ اگر قفسِ عنصری میں انفاسِ حیات کا سلسلہ قائم رہا تو انشاء اللہ اس کے تفصیلی مباحث آپ کو سورۃ یونس میں ملیں گے۔ بہرحال اگر اُمّی کے معنے اَن پڑھ کے ہیں تو اُمّی کو ہمارے محاورات میں عامی کی طرح سمجھنا چاہیے کیونکہ عامی وہ ہے جو عوام الناس کی صفت پر ہے۔

قرآن میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اُمّی کہا گیا ہے۔ آپؐ کے اُمّی ہونے سے ایک طرف قرآن اپنے اعجاز کو ثابت کر رہا ہے اور دوسری طرف آپؐ کے اس معجزہ کی جانب توجہ دلائی جارہی ہے کہ باوجود اُمّی ہونے کے کمالِ علوم سے سرفراز ہیں۔ پس اس لحاظ سے لفظ اُمّی آپؐ کے حق میں صفت مدح ہے اور غیر کے لیے مذموم۔

۱۹۹ - یعنی ان کو تو کچھ بھی خبر نہیں مگر چند آرزوئیں۔ اصل عربی لفظ امانی ہے جھوٹی آرزوئیں۔ خیالات کے اندازے، اُمیدیں ٹھہرائی ہوئیں، امنیۃ کی جمع ہے جس کے معنے کسی ٹھہرائی ہوئی تمنّا اور اندازہ کی ہوئی چیز کے ہیں۔ بعض مفسرین نے امانی کے معنے جھوٹی باتوں کے اور بعض نے بے سمجھے بوجھے پڑھ لینے کے بتائے ہیں۔ چونکہ جھوٹی بات میں ایک بے حقیقت چیز کا ٹھہرانا ہوتا ہے اور بے سمجھے پڑھنا اندازے پر چلنا ہے۔ اس لیے یہ دونوں معنی امنیۃ سے مراد ہو سکتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ یہ تو ان کو بالکل پتہ نہیں تورات میں کیا لکھا ہے مگر چند آرزوئیں جو اپنے عالموں سے جھوٹی باتیں سُن رکھی ہیں مثلاً بہشت میں یہودیوں کے سوا کوئی نہ جائے گا اور ہمارے باپ دادا ہمیں بخشوا لیں گے۔ اور یہ ان کے خیالات بے اصل ہیں جن کی ان کے پاس کوئی دلیل نہیں ہے۔[1]

یہ اُن کے عوام کا حال ہے۔ علمِ کتاب سے کورے ہیں کچھ نہیں جانتے کہ اللہ نے اپنی کتاب میں دین کے کیا اُصول بتائے ہیں، اخلاق اور شرع کے کیا قواعد ہیں اور انسان کی فلاح و خسران کا مدار کن چیزوں پر ہے۔ اس علم کے بغیر وہ اپنے مفروضات اور خواہشات کے مطابق گھڑی ہوئی

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۵

باتوں کو دین سمجھے بیٹھے ہیں اور جھوٹی توقعات پر جی رہے ہیں[1]

گویا ان کی عامی زندگی میں ایمان و عمل نام کی کوئی چیز باقی نہ تھی۔ عقائد کی حدود میں وہ سُنے سنائے قصوں اور توہمات پر ایمان رکھتے تھے اور یہ سمجھے ہوتے تھے کہ بنی اسرائیل کا گھرانہ اللہ کا خاص کنبہ اور خاندان ہے اور ان کے خاندان کے پیغمبر اور نبی چونکہ خدا کے پیارے اور محبوب ہیں اس لیے ان کی اولاد اور نسل بھی دُنیا و آخرت میں یہی درجہ رکھتی ہے۔ اگر ان پر کوئی مصیبت بھی پڑے گی پھر بھی ان کے خاندان کے بزرگ جو خدا کے بزرگ اور برگزیدہ ہیں وہ ہر طرح ان کو اس سے بچا لیں گے ان کا دعویٰ تھا نَحْنُ اَبْنٰٓؤُا اللّٰهِ وَاَحِبَّآؤُهٗ۔

عوامی زندگی کا نبوت کی راہ سے آتے ہوئے علم سے رشتہ ٹوٹنے کا نتیجہ یہ نکلا۔

اوّلاً۔ خدا کی کتاب جو اس غرض سے آئی تھی کہ لوگ اسے پڑھیں اور اس پر عمل کریں یک قلم عام زندگی میں بے کار ہو گئی۔

ثانیاً۔ ہدایت کا مرکز اللہ کی کتاب نہ رہی بلکہ توہمات ہو گئے۔

ثالثاً۔ انسان کی عقلی ترقی کی تمام راہیں بند ہو گئیں۔

رابعاً۔ توہم پرستی، جہل و کوری کا دروازہ کھل گیا کیونکہ جب نجات کا مدار ایمان پر عقائد کی جگہ توہمات اور اعمال کی جگہ رسُوم پر آٹھہرا، تو ظاہر ہے کہ عقل و بینش کی جگہ جہل و کوری پھیلے گی۔

یہ سرگزشت تو یہودی دُنیا کی ہے جسے قرآن نے مخاطب کیا تھا لیکن خود مسلمانوں کا کیا حال ہوا جنہیں اس دعوت کی تبلیغ سپرد کی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ وہ خود بھی اس گمراہی سے نہ بچ سکے اور ان کی عوامی زندگی کا رشتہ نبوت کے لاتے ہوئے علم و عمل سے ٹوٹ چکا۔ نتیجہ نکلا کہ وہ تمام خرابیاں ظہور میں آگئیں جن کا دروازہ قرآن نے بند کرنا چاہا تھا۔ اور سب سے بڑا فساد یہ پیدا ہوا کہ ان کی علمی و عملی ترقی یک قلم رک گئی اب معاملہ یہاں تک پہنچ چکا ہے کہ ایک طرف عقائد کی جگہ چند من گھڑت افسانوں اور اعمال کی جگہ چند رسُوم نے لے لی ہے۔ اور دوسری طرف تمام اقتصادی، سیاسی اور اخلاقی زندگی میں اسلامی قوانین پر عملدرآمد ختم ہو کر رہ گیا ہے، اور پوری اجتماعی زندگی اس اُمیت کے نتیجہ میں اختلال کا شکار ہو کر رہ گئی۔ یہ انبوہِ عظیم جسے مسلمان قوم کہا جاتا ہے اس کا حال یہ ہے کہ اس کے ۹۹۹ فی ہزار نہ کتاب و سنت کا علم رکھتے ہیں، نہ حق و باطل کی تمیز سے

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۸۶

فَوَيۡلٌ لِّلَّذِيۡنَ يَكۡتُبُوۡنَ الۡكِتٰبَ بِاَيۡدِيۡهِمۡ ثُمَّ يَقُوۡلُوۡنَ هٰذَا مِنۡ عِنۡدِ اللّٰهِ لِيَشۡتَرُوۡا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيۡلًا‌ؕ فَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا كَتَبَتۡ اَيۡدِيۡهِمۡ وَوَيۡلٌ لَّهُمۡ مِّمَّا يَكۡسِبُوۡنَ ﴿۷۹﴾

پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جن کا شیوہ یہ ہے کہ اپنے ہاتھوں سے کتاب لکھتے ہیں پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی طرف سے ہے یعنی اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ اللہ کے احکام ہیں اور یہ اس لیے کرتے ہیں تاکہ اس کے معاوضہ میں دُنیا کا حقیر فائدہ حاصل کر لیں پس ان کے ہاتھوں کی لکھائی بھی ان کی تباہی کا اور ان کی کمائی بھی ان کی بربادی کا سامان ہے۔

آشنا ہیں۔ نہ ان کا اخلاقی نقطۂ نظر اور ذہنی رویہ اسلام سے ہم آہنگ ہے۔ باپ سے بیٹے اور بیٹے سے پوتے کو بس مسلمان کا نام وراثت میں ملتا آرہا ہے اس لیے یہ مسلمان ہیں۔

انشاء اللہ ہم اس موضوع پر دوسرے پارے میں جہاں قرآن نبوت کے مقاصد سے بحث کرے گا تفصیلی بحث کریں گے اور بتائیں گے کہ نبوت کے علم و عمل سے اُمت کے تعلقات کیسے بحال ہو سکتے ہیں۔ اس سلسلے میں نبوت کا پیغام کیا ہے۔ خلافتِ راشدہ نے کیا کام کیا ہے اور انھوں نے کیا تجاویز پیش کی ہیں۔

یہودی علماء اور دین کا کاروبار

پہلے بتایا تھا کہ عوام کی دین کی زندگی چند توہمات اور رسوم کا نام ہو کر رہ گئی ہے اب بتانا چاہتے ہیں کہ یہ صورتِ حال اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ ان کے علماء نے دین کی زندگی کا کاروبار شروع کر دیا تھا اور اس کاروبار میں وہ اپنے عوام کو دین سے بے بہرہ رکھ کر ان کا استحصال کر رہے تھے۔ ان کا استحصال کیا تھا؟ ان آیات میں علماء کے اسی کردار کی نقاب کشائی کی ہے اور بتایا ہے کہ انہوں نے دین کی ساری باتوں کو یکسر قلم دکانداری اور پیشہ بنا لیا تھا۔ اور ان کی پوری زندگی ہر معنے میں دکانداری

زندگی ہو گئی تھی۔ علم دین کا پڑھنا، پڑھانا، مسائلِ دین کی تعلیم، فتویٰ نویسی، ہدایت و وعظ، قرأت و ذکر کوئی کام ایسا نہ تھا جو بغیر دنیوی معاوضہ کے کیا جاتا ہو۔

۳۰ ۔ پس ہلاکت ہو ان لوگوں کے لیے۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ان عوام جاہلوں کے موافق باتیں اپنی طرف سے بنا کر لکھ دیتے تھے اور خدا کی طرف ان باتوں کو منسوب کر دیتے۔ مثلاً توراۃ میں لکھا تھا کہ پیغمبر آخر الزمان خوبصورت، پیچواں بال، سیاہ آنکھیں، میانہ قد، گندمی رنگ کے ہوں گے۔ انہوں نے بدل کر یوں لکھ دیا کہ لامبا قد، نیلی آنکھیں، سیدھے بال ہوں گے تاکہ عوام آپ کی تصدیق نہ کریں اور ہمارے کاروبار میں فرق نہ آجائے [۱]

یہ اُن کے علماء کے متعلق ارشاد ہے ان لوگوں نے صرف اتنا ہی نہیں کیا کہ کلامِ الٰہی کے معانی کو اپنی خواہشات کے مطابق بدلا ہو بلکہ یہ بھی کیا کہ بائبل میں اپنی تفسیروں کو اپنی قومی تاریخ کو، اپنے اوہام اور قیاسات کو، اپنے خیالی فلسفوں کو اور اپنے اجتہاد سے وضع کیے ہوئے فقہی قوانین کو کلامِ الٰہی کے ساتھ خلط ملط کر دیا اور یہ ساری چیزیں لوگوں کے سامنے اس حیثیت سے پیش کیں کہ گویا یہ سب اللہ ہی کی طرف سے آئی ہوئی ہیں۔ ہر تاریخی افسانہ، ہر مفسر کی تاویل، ہر متکلم کا الٰہیاتی عقیدہ اور ہر فقیہ کا قانونی اجتہاد جس نے مجموعہ کتب مقدسہ میں جگہ پالی۔ اللہ کی بات بن کر رہ گیا۔ اس پر ایمان لانا فرض ہو گیا اور اس سے پھر جانے کے معنے دین سے پھر جانے کے ہو گئے [۲]

۲۰۱ ۔ اس میں جو کچھ لکھا ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے۔ یعنی لکھتے خود ہیں اور نام اللہ سبحانہٗ کے لگاتے ہیں۔ امام نوویؒ فرماتے ہیں کہ اس میں دو حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے۔ ایک یہود کی انتہائی شقاوتِ قلب کی جانب کہ کلامِ ربانی میں بھی تحریف سے نہ چوکے۔ دوسرے اس بات کی طرف کہ اس تحریف سے ان کا مقصود کوئی خدمتِ دین نہ تھا تمام تر تحصیل مال و جاہ ہی تھا۔ علامہ قرطبیؒ یہاں بڑے پتے کی بات فرما گئے کہ اللہ کے دین میں ہر قسم کی تبدیلی، تغیر، زیادتی ایک سنگین جرم ہے اور اس آیت کی وعید میں داخل ہے۔

یہاں سوچنے اور سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس آیت میں جس چیز کو بطور سنگین جرم پیش کیا جا رہا ہے یہ ہے کہ لکھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ خدا کی جانب سے ہے۔ اس کی چند صورتیں ہو سکتی ہیں۔
۱۔ خود ہی باتیں گھڑتے ہوں اور ان گھڑی ہوئی باتوں کو اپنے عوام میں گرمی مجلس کی خاطر

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۵ [۲] تفہیم القرآن ص ۸۹

اللہ کے نام پر پیش کرتے ہیں جیسے عام دُنیادار اور پیشہ ور واعظوں کا قاعدہ ہے۔

۲۔ اپنے خیالات کو کتاب اللہ کے ساتھ ملا کر خلط ملط کر کے لکھتے ہوں اور اس طرح لوگوں کی نادانی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنے خیالات کو بھی کتاب اللہ کے درجے میں بتاتے ہوں۔

۳۔ کتاب اللہ کی بیان شدہ باتوں کو تبدیل کر کے ان کو کتاب اللہ کی بات بتاتے ہیں۔

آیت میں سارے احتمالات ہیں اور سب از روئے قرآن حرام ہیں۔

پہلی بات کو بھی قرآن نے سنگین جُرم قرار دیا ہے اور اسے قول علی اللہ بغیر علم کہتے ہیں۔ اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔

دوسری بات سے بھی منع کیا ہے۔ یہودیوں نے بائبل میں اپنی تفسیروں کو، اپنی تشریحات کو اور اپنی قومی تاریخ کو اس طرح خلط ملط کر دیا کہ لوگ اسے بھی کتاب اللہ ہی سمجھنے لگے بلکہ انہوں نے خود ان کو لوگوں کے سامنے کتاب اللہ ہی کی حیثیت سے پیش کیا۔

تیسری بات بھی شریعت میں منع ہے۔ ان تینوں راہوں سے اللہ کے دین میں فساد اور کتاب اللہ میں تحریف کو آنے کا موقعہ ملتا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ قرآن سے پہلے کوئی کتاب دانستہ و نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے محفوظ نہیں رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے کسی کا صحیفہ چند کے سوا دُنیا میں باقی نہیں۔ اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب بدلتا رہا ہے۔ تورات کی حقیقت کو ترجموں کی کثرت بیونت نے بالکل مشتبہ کر دیا۔

غالباً تاریخ مذاہب کے اسی تجربہ کے پیشِ نظر قرآن کی حفاظت کی خاطر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی تلاوت کو تعبد قرار دیا ہے اور تعبد کے طور پر قرآن کے علاوہ کسی دوسری چیز سے قرآن جیسا معاملہ کرنے سے منع فرمایا۔ قرآن کی شانِ تعبد کا اظہار اس حدیث میں ہے جو صحیح مسلم میں ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھ سے نہ لکھو اور جس نے مجھ سے قرآن کے علاوہ کچھ لکھا وہ اسے مٹادے مجھ سے حدیث بیان کیا کرو۔ اس میں کوئی حرج نہیں ہے اور جس شخص نے میرے بارے میں ارادتاً جھوٹ بولا اسے چاہیے کہ اپنا ٹھکانہ بس دوزخ بنالے۔

اگرچہ امام بخاریؒ اور دیگر محدثین کے نزدیک یہ روایت معلول ہے یعنی ان کی تحقیق میں یہ الفاظ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے نہیں بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی حضرت ابوسعید خدریؓ کے ہیں جن کو غلطی سے راوی نے حضورؐ کا نام لے کر پیش کر دیا ہے لیکن اگر بالفرض یہ ارشادِ نبوت بھی ہو تو اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآن کے الفاظ میں تعبد ہے۔ قرآن سے الگ ہو کر

کوئی عبارت نہیں جس کے الفاظ میں تعبّد ہو۔ اور تعبدی طور پر جس کی تلاوت کی جاتی ہو۔ خود انداز بیان بتا رہا ہے کہ مقصدِ نبوت یہی ہے۔ ارشاد کے الفاظ یہ ہیں لا تکتبوا عنی غیر القرآن۔ لفظ غیر عربی اسالیب میں اپنا موصوف چاہتا ہے اس لیے اصل عبارت یوں ہے لا تکتبوا عنی قولاً غیر القرآن۔ یعنی تلاوت کی کوئی چیز میرے سے قرآن کے علاوہ نہ لکھو۔ اس کی تائید خود حضرت ابو سعید خدری کے ان بیانات سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابن عبد البرؒ نے جامع بیان العلم میں درج کیے ہیں۔

ابو نضرہؒ کہتے ہیں کہ میں نے حضرت ابو سعید خدریؓ سے دریافت کیا کہ آپ سے سنی ہوئی چیزیں قلم بند کرنے کی اجازت ہے؟ فرمایا کیا تم ان کو مصاحف بنانا چاہتے ہو؟

ابو نضرہؒ ہی نے حضرت ابو سعید خدریؓ کے حوالہ سے اس سوال کے جواب میں ہمیں لکھنے کی اجازت دیجیے۔ یہ بھی نقل کیا ہے۔ نہیں نہیں کیا تم اسے قرآن بنانا چاہتے ہو؟۔

اس دور میں اگر قرآن کے ساتھ کچھ اور لکھنے کی اجازت دے دی جاتی تو کتاب اللہ اسی اختلاط کا نشانہ بن جاتی جس سے تورات کے دامن پر تحریف کا دھبہ لگا ہے ـــــ معالم السنن میں علامہ خطابیؒ نے بتایا ہے کہ قرآن کے مقابلے میں حدیث کو نہ لکھنے کی ممانعت کا پس منظر یہی اختلاط ہے فرماتے ہیں کہ ایک ہی صحیفہ قرآن کے ساتھ کچھ لکھنے سے اس لیے منع فرمایا ہے تاکہ التباس نہ ہو اور قاری اشتباہ کا شکار نہ ہو۔ رامہرمزیؒ نے المحدث الفاصل میں یہی بات لکھی ہے۔ بہرحال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ یہ نبوت کی جانب سے قرآن کی حفاظت کا عملی اہتمام صرف اس لیے ہوا کہ قرآن بھی کہیں مخلوط ہو کر نہ رہ جائے۔

ورنہ جہاں تک حدیث کے بیان کرنے کی اجازت کا تعلق ہے وہ اس میں صاف اور صریح موجود ہے۔ امیر یمانیؒ نے یہ بات خوب فرمائی ہے کہ

آغاز میں ممانعت اختلاط کے اندیشہ کے پیشِ نظر تھی۔ کیونکہ ابھی لوگوں کے سینوں میں قرآن محفوظ نہ ہوا تھا اور حفاظِ قرآن خال خال تھے۔ جب قرآن سے عوامی زندگی میں لگی پیدا ہو گئی اور قرآن کے اسالیب، کمالِ بلاغت اور حسنِ نظم سے تعلق پیدا ہو کر ایسا امتیازی ملکہ پیدا ہو گیا اور غیر قرآن کا ذوقِ تمیز پیدا ہو گیا اور التباس کا اندیشہ جاتا رہا تو ممانعت ختم ہو گئی۔[1]

الغرض قرآن کو غیر قرآن سے خلط ملط سے بچانے کے لیے نبوت کا یہ اقدام تھا اور اس کی

---

[1] توضیح الافکار ص ۲۶۵

حیثیت انتظام کی خاطر سدِّ ذرائع سے زیادہ کچھ نہ تھی۔

اسلام بڑے فخر سے گردن اونچی کرکے کہہ سکتا ہے کہ اس نیلگوں چھت کے نیچے دنیا میں آسمانی کتابوں میں قرآن کے سوا کوئی کتاب محفوظ نہیں ہے۔

۲۰۲ ۔ ان کے ہاتھوں کی لکھائی ان کی تباہی کا سامان ہے۔ قرآنی اور اسلامی معیارِ صداقت پر تحریف و تصحیف اور اللہ کے نام پر گھڑی ہوئی ہر بات موجب لعنت ہے اور حد سے بڑھی ہوئی جسارت ہے اسی لیے یہ بات مسلمانوں کی سمجھ میں نہیں آتی کہ کوئی شخص کسی کلام کو کلام الٰہی مان کر اس میں دخل و تصرف کیسے کر سکتا ہے۔ لیکن دوسری قومیں اس معیار ہی سے ناآشنا ہیں بلکہ بعض اہل کتاب کے ہاں تو بھلائی کے لیے بُرائی درست اور خدا کی سچائی کی خاطر ہر جھوٹ جائز ہے۔ آج مسیحیت کے نام سے جو تثلیثی شرک پھیلا ہوا ہے اس مذہب کے بانی پولوس اسرائیلی ہیں۔ آپ کا یہ مقولہ آج تک انجیل میں لکھا ہوا ہے کہ اگر میرے جھوٹ کے سبب سے خدا کی سچائی اس کے جلال کے واسطے زیادہ ظاہر ہوئی تو پھر کیوں گنہگار کی طرح مجھ پر حکم دیا جاتا ہے اور ہم کیوں نہ برائی کریں تاکہ بھلائی پیدا ہو[1]

۲۰۳ ۔ ان کی کمائی ہی اُن کی بربادی کا سامان ہے۔ یعنی جو مالی فوائد اپنی غرض مندانہ اور بقول خود دروغ، مصلحت آمیز خرافات، دینی افسانوں، اپنی خود ساختہ عقیدوں کی ترویج سے حاصل کرتے ہیں وہ یہاں مراد ہیں۔ اسی میں رشوت، سُود، ناجائز طریقے سے حاصل کیا ہوا سرمایہ سب داخل ہیں۔ پوری آیت پر ذرا غور فرمائیے بتایا یہ گیا ہے کہ

اپنی خود ساختہ اور من گھڑت باتوں کو خود اپنے آپ لکھتے ہیں اور اسے اللہ کی بات اور دین بتاتے ہیں۔ چاہے یہ عقائد ہوں چاہے اعمال اور چاہے یہ اذکار و وظائف ہوں، قومی رسوم ہوں، ان سب کو وہ لوگوں کے سامنے بلاشبہ اللہ کا دین بنا کر پیش کرتے ہیں اور اس سے ان کی غرض اللہ کی رضا، دین کی برتری، آخرت میں سرخروئی نہیں بلکہ یہ اور صرف یہ ہوتی ہے کہ مادی منافع اور مالی فوائد حاصل کیے جائیں۔ قرآن نے اسی کاروبار کے لیے یشتروا بہ ثمنا قلیلا کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اس کاروبار کی صورتیں کس قدر وہاں مروج تھیں اس کی تفصیل کا یہ موقعہ نہیں یہ ان شاء اللہ سورۂ مائدہ میں آرہی ہے۔ دراصل یہ کاروبار اور استشراء بول کر قرآن یہود کے تاریخی واقعہ کی طرف مسلمانوں کو متوجہ کر رہا ہے۔ ان کی تاریخ پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے نام نہاد مذہبی پیشواؤں

---

[1] تفسیر ماجدی

وَقَالُوا لَنْ تَمَسَّنَا النَّارُ اِلَّآ اَيَّامًا مَّعْدُوْدَةً ؕ قُلْ اَتَّخَذْتُمْ عِنْدَ اللّٰهِ عَهْدًا فَلَنْ يُّخْلِفَ اللّٰهُ عَهْدَهٗٓ اَمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۸۰﴾

اور وہ کہتے ہیں کہ ہمیں دوزخ کی آگ ہرگز نہ لگے گی، لیکن صرف چند روز گنے چنے۔ یعنی اگر ہمیں کوئی سزا ملی بھی تو صرف چند روز ملے گی۔ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دو کہ تمہاری یہ بات دو حال سے خالی نہیں ہے یا تو تم نے اللہ سے کوئی عہد لیا ہوا ہے کہ وہ اس کی خلاف ورزی نہیں کر سکتا اور یا پھر تم اللہ کے نام پر ایسی بات کہہ رہے ہو جس کے متعلق تمہیں علم نہیں ہے۔

نے مختلف ترکیبوں سے عوام کو اپنے قبضہ میں کر رکھا ہے کہ ان کی گرفت سے وہ کسی طرح باہر نہیں ہو سکتے تھے اللہ کی رحمت کا عام بیوپار یہودی معاشرے میں عام طور سے رائج تھا۔ آٹھ آٹھ آنے سیر یہودی علماء اللہ کی رحمت کو بیچتے تھے۔ من مانے طور پر جس کسی سے جب چاہتے اور جس قدر چاہتے لوگوں سے وصول کرتے اس میں ایک ان کا کردار تھا اور دوسرا ان کے کردار کا ہنگامی نتیجہ۔ قرآن نے یہاں دو بار ویل بولا ہے پہلی تباہی ان کے کردار پر ہے اسے ان کے ہاتھوں کی کمائی کہا ہے دوسری تباہی اس کردار کے نتیجے پر ہے اور اسے ان کا اختیاری عمل قرار دیا ہے اور اس کے لیے کسب اور کمائی کا عنوان اختیار فرمایا ہے۔

نجات یافتہ ہونے کا نعرہ

اُمتوں کا تعلق جب نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے زندگی کے مختلف گوشوں میں رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو اُمتوں میں اپنی نجات کے لیے طرح طرح کے ولولے اور خوش فہمیاں پیدا ہو جاتی ہیں۔ آیت میں جو بات یہودیوں کی طرف منسوب کر کے کہی گئی ہے اور اسے بذریعہ عطف پہلی بات کے ساتھ جوڑا گیا ہے اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ عوامی زندگی کا رشتہ جب اللہ کی ہدایت سے ٹوٹ گیا اور عام

زندگی دین سے نا آشنا ہو گئی تو اس کے نتیجہ میں ایک استحصالی طبقہ علماء کے نام سے پیدا ہو گیا تو دوسری طرف عوامی زندگی آخرت سے بے فکر ہو کر آخرت کی نجات کے لیے خوش کن ولولوں، اُمیدوں، آرزوؤں اور نعروں کی مخلوق بن کر رہ گئی۔

ف ۲۰۴ - یہ یہودیوں کی عام غلط فہمی کا بیان ہے جس میں ان کے عامی اور عالم سب مبتلا تھے وہ سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کچھ کریں بہرحال چونکہ ہم یہودی ہیں لہٰذا جہنم کی آگ ہم پر حرام ہے اور بالفرض اگر ہم کو سزا دی بھی گئی تو بس چند روز کے لیے وہاں بھیجے جائیں گے اور پھر سیدھے جنت کی طرف پلٹا دیے جائیں گے[1]۔

ف ۲۰۵ - چند روز گنے چنے۔ بعض نے کہا سات دن اور بعض نے چالیس روز جتنے روز بچھڑے کی پوجا کی اور بعض نے کہا چالیس سال جتنی مدت تیہ میں گزاری اور بعض نے کہا جتنی مدت دنیا میں زندہ رہے[2]۔ سات روز کی وجہ خود یہودیوں کی بتائی ہوئی یہ ہے کہ دُنیا کی ساری عمر سات ہزار سال ہے لہٰذا جس اسرائیلی کو کوئی شفاعت دستیاب نہ ہو سکے گی وہ ہزار کے پیچھے ایک روز دوزخ میں رہے گا۔ اور چالیس روز کی مدت پادری راڈول نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں اکابر یہود کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جن دنوں میں قوم اسرائیل گوسالہ پرستی میں مبتلا رہی تھی بلکہ بعض یہودی ماخذوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسرائیل اپنے کو آتشِ دوزخ سے بالکل ہی باہر اور محفوظ سمجھ رہے تھے۔ چنانچہ جیوش انسائیکلوپیڈیا میں یہ عقیدہ یوں نقل کیا ہے۔ "آتشِ دوزخ گنہگارانِ یہود کو چھوئے گی بھی نہیں کیونکہ وہ جہنم کے دروازے پر پہنچتے ہی اپنے گناہوں کا اقرار کر لیں گے اور خدا کے پاس واپس آجائیں گے (ج ۵ ص ۵۸۳) اور تالمود میں ہے کہ قیامت کے دن ابراہیم دوزخ کے دروازے پر تشریف فرما ہوں گے اور کسی مختون اسرائیلی کو دوزخ میں نہ گرنے دیں گے۔ ا ص ۲۰۴[3]۔

ف ۲۰۶ یہودیوں کا یہ نعرہ کہ ان کی اُمت نجات یافتہ ہے اس لیے ممکن نہیں کہ کوئی یہودی ہمیشہ کے لیے دوزخ میں ڈالا جائے۔ اس فقرے کے ذریعے قرآن ان کے اس زعمِ باطل کی تردید کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ جنت و دوزخ کی تقسیم قوموں کی تقسیم کی بنا پر نہیں ہے کہ کسی خاص قوم کے لیے جنت ہو اور باقی کے لیے دوزخ۔ ان سے بطور حجت الزامی دریافت کرتا ہے کہ تمہارا یہ عقیدہ دو حال سے خالی نہیں ہے۔ ایک یہ کہ تمہارے پاس اس کے لیے تمہارے مقدس نوشتوں میں کوئی سند ہو اور اللہ نے تم سے کبھی یہ

---

[1] تفہیم القرآن ص ۹۰ [2] حاشیہ شیخ الہند ص [3] تفسیر ماجدی ص ۲۲۔

معاملہ کر لیا ہو کہ وہ تمہیں دوزخ میں ہرگز نہ ڈالے گا اور اس معاملہ کی وجہ سے اللہ سبحانہ اس کے ایفا کا پابند ہے اور اس کی خلاف ورزی نہ کرے گا۔ استفہام انکاری ہے۔ یعنی کیا تمہیں خدا نے نجات کا غیر مشروط پٹہ لکھ کر دے دیا ہے کہ جہاں ایک شخص یہودی ہوا آتش دوزخ اس پر حرام ہو گئی۔ اگر نہیں دیا ہے اور یقیناً نہیں ہے تو پھر بتاؤ کہ تمہارا ایسا اعتقاد رکھنا اللہ پر افتراء نہیں تو اور کیا ہے؟ اس دوسری بات کو قول علی اللہ بغیر علم سے تعبیر کیا ہے۔ کیا یہ اللہ پر بہتان نہیں ہے اور اللہ پر بہتان طرازی سے زیادہ سنگین جُرم کیا ہو سکتا ہے۔ یہ اُصول محرمات میں قرآن کے نزدیک وہ عظیم جُرم ہے اللہ نے بلا تمیز سب انبیاء کی زبانی جس کی سنگینی کا اعلان کیا ہے۔ دُنیا میں ادیانِ باطلہ کی یہی جُرم اصل واساس ہے۔ اسی کی پستان سے دودھ پی پی کر اللہ کے دین میں تحریف کو پلنے کا موقعہ ملا ہے اور اسی راہ سے سنّت کے مقابلے میں بدعت اور توحید کے مقابلے میں شرک اللہ کے دین میں پہنچا ہے۔

اُمتوں میں عقائد کا بگاڑ، اعمال کا فساد اور اخلاق کا انحطاط جب بھی رونما ہوا ہے اسی راہ سے ہوا ہے آپ جس بُرائی کی طرف اشارہ کریں گے اسی کا شجرہ نسب بالواسطہ یا بلا واسطہ اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ سے وابستہ ہوگا۔ نبوّت کے لائے ہوئے علم وعمل اور قرآن وسنّت سے اُمتوں کا تعلق ٹوٹنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ علم وعمل عام شاہراہ سے ہٹ کر ان افراد کی ملک بن جاتا ہے جن کی عام شہریوں کی نظر میں کوئی قدر وقیمت نہیں ہوتی۔ شہریوں میں پست ترین، کمترین طبقہ پیشہ ورانہ طور پر اس کا اجارہ دار بن جاتا ہے۔

اللہ اکبر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اعجاز آفرین زبان نے اُمت کو یہی بات کیسے شاندار انداز میں سمجھائی ہے۔ ابن ابی خیثمہؒ نے حضرت انسؓ کے حوالہ سے یہ ارشادِ نبوت روایت کیا ہے اور حافظ عسقلانیؒ نے اسے بلا چون وچرا فتح الباری میں جگہ دی ہے۔

یا رسُولَ اللہ! یہ ارشاد فرمایئے کہ شہری زندگی میں نیکی کا پرچار اور بُرائی پر روک ٹوک کب ختم ہو گی؟ فرمایا جب تم میں وہ ساری بُرائیاں رونما ہو جائیں گی جن سے بنی اسرائیل دوچار ہو چکے ہیں اور جب تمہارے نیکو کار لوگوں میں مداہنت اور غنڈوں میں بدکاری کھلم کھلا ہو گی۔ حکومت واقتدار کم مایہ لوگوں کے ہاتھ میں ہوگا اور علمِ دین رذیل لوگوں میں محدود ہو جاتے گا۔

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اس وقت عام شہریوں کی دینی زندگی اَنْ تَقُوْلُوْا عَلَى اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی گرفت میں آجائے گی۔

غور فرمایئے کہ یہودیوں کے اس نعرے کا یا قرآن کے لفظوں میں اس نعرے کا بنیادی سبب ان کے

بَلٰى مَنْ كَسَبَ سَيِّئَةً وَّاَحَاطَتْ بِهٖ خَطِيْٓـــَٔتُهٗ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

جیسا تم نے سمجھا ہے ایسا ہرگز نہیں ہے[25] بلکہ نجات کا قانون یہ ہے کہ جس نے بھی گناہوں[28] کی کمائی کی اور اس کے گناہوں نے اس کو گھیرے[29] میں لے لیا تو وہ دوزخی ہے ہمیشہ اسی میں رہے گا۔ اور جو لوگ ایمان[30] لاتے اور انہوں نے کام بھی اچھے کیے تو وہ جنتی ہیں جنت ہی میں رہیں گے۔

سوا کیا ہے کہ وہ شفاعت کے بارے میں غلط جراثیم کا شکار ہو گئے تھے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں شفاعت کے موضوع پر حسب ذیل الفاظ میں تنبیہہ فرمائی ہے۔

اہل باطل کی گمراہی کی اصل حقیقت یہی تھی کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سفارش کا معاملہ بھی مخلوقات کی سفارش پر قیاس کر رکھا تھا جیسے دنیا میں ایک انسان اپنی سفارش کے لیے ایسے شخص کا انتخاب کر لیتا ہے جس کے متعلق وہ یہ سمجھتا ہے کہ اس کی سفارش کا اثر پڑے گا یا تو اس لیے کہ اس سے اس کا کوئی تعلق ہے یا وہ اس سے ڈرتا ہے۔ جس نے اللہ کی بارگاہ میں اس نوع کی سفارش سمجھی اس نے خطرناک غلطی کی۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ حق تعالیٰ کی بارگاہِ عالی میں سفارش کا معاملہ بندوں کی مرضی پر نہیں بلکہ اللہ کی مرضی پر موقوف ہے۔ شفاعت میں بندوں کی مرضی آتے ہی ایمان ٹیپ ٹاپ اور آرزوؤں کا نام ہو کر رہ جاتا ہے۔ امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں۔

ایمان ٹیپ ٹاپ ظاہرداری اور خوش آئند تمناؤں کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان اسے کہتے ہیں کہ اللہ کی محبت دل میں سرایت کر جائے اور اعمال اس کی تصدیق بھی کریں۔ (کتاب الایمان ص ۱۱۷)

نجات کا قانونِ کلی

اس آیت میں صاف صاف لفظوں میں قانونِ نجات کا اعلان کیا ہے۔ نجات نسلوں، نسبتوں اور

خوش آئند نعروں اور دعووں سے نہیں ہوگی بلکہ اس کا قانون سب کے لیے عام ہے۔ جس طرح سنکھیا کھانے سے ہر کھانے والا ہلاک ہو جاتا ہے چاہے یہودی ہو یا غیر یہودی، اور دودھ پینے سے صحت و توانائی ملتی ہے خواہ پینے والا کسی نسل سے تعلق رکھتا ہو، اسی طرح عالم معنویات میں بھی ہر عمل کا خاصہ ہے اور وہ اس لیے نہیں بدلا جا سکتا کہ عمل کرنے والے کی نسل یا قوم کیا ہے۔

۲۰۷ ۔ ایسا ہرگز نہیں۔ یعنی یہ بات غلط ہے کہ یہودی دوزخ میں نہ جائیں گے کیونکہ خلود فی النار اور خلود فی الجنۃ کا جو قاعدہ کلیہ اس آیت میں بیان فرمایا ہے اسی کے مطابق سب سے معاملہ ہوگا۔ یہودی اس قاعدے سے مستثنیٰ نہیں ہو سکتے[1]

۲۰۸ ۔ جس نے گناہوں کی کمائی کی۔ آیت میں گناہ کو کمائی قرار دیا ہے۔ یہ تعبیر ایک معروف نفسیاتی حالت کی طرف اشارہ کرتی ہے کیونکہ جو شخص گناہ کا ارتکاب کرتا ہے وہ اس سے لطف اندوز اور لذت یاب ہوتا ہے اور اسے اپنی کمائی تصور کرتا ہے۔ اگر یہ گناہ اس کے مذاق پر گراں ہوتا تو وہ یقیناً اس کا مرتکب نہ ہوتا۔ اور اگر اسے وہ خسارہ اور نقصان سمجھتا تو اس پر خوش دلی سے آمادہ نہ ہوتا۔ بلکہ وہ اس گناہ سے نفرت کرتا۔

نیز گناہ کے لیے لفظ کسب لاکر اس طرف اشارہ کر دیا کہ نیکی انسان میں اصل ہے گناہ انسان کی اپنی کمائی اور محنت ہے۔ اس کے لیے بننے اور تکلف کرنے کی ضرورت ہے۔

۲۰۹ ۔ اور اس کے گناہوں نے اسے گھیر لیا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ گناہ اس پر ایسا غلبہ کر لیں کہ کوئی جانب ایسی نہ ہو کہ گناہ کا غلبہ نہ ہو۔ حتیٰ کہ دل میں ایمان و تصدیق باقی ہوگی تو بھی احاطہ مذکور محقق نہ ہوگا۔ تو اب کافر پر ہی یہ صورت صادق آسکتی ہے[2]

گھیر لینے سے مراد یہ ہے کہ پوری زندگی میں نیکی کا کہیں نام و نشان ہو اور اس طرح بدی کو اختیار کرے اور گناہوں میں پڑ جائے کہ خود ایمان کے لیے گنجائش ہی باقی نہ رہے۔ ایسا صرف وہ ہی لوگ کر سکتے ہیں جو سرے سے باطل پرست ہوں۔

گھیر لینے کی تعبیر میں معنوی حالت کو مجسم بنا کر پیش کیا ہے اور یہ قرآن حکیم کا خاصہ ہے اور اس کا مخصوص اندازِ بیان ہے۔ اس اندازِ بیان کی خوبی یہ ہے کہ معنوی کیفیت ایک مجسم صورت بن کر احساسات پر اثر انداز ہوتی ہے۔ غرض اس تعبیر کے ذریعے گنہگار کو گناہوں میں گھرا ہوا بتایا

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۶ [2] ایضاً

گیا ہے جیسے وہ گناہوں کی جیل میں زندگی گزار رہا ہے۔ اس کے افکار و نظریات، اس کے اعمال و اخلاق اور اس کے احوال و آداب سب پر گناہ چھائے ہوئے ہیں اور اس کا ہر سانس گناہ بن کر خارج ہو رہا ہے ایسے شخص کے لیے فیصلہ کن انداز میں کہا گیا ہے کہ یہ صرف دوزخی نہیں بلکہ اس کو دوزخ میں خلود حاصل ہو گا۔

سے ۲۱ - اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے یعنی جو شخص اپنے ارادہ و اختیار سے ایمان اور عملِ صالح کو اپنائے گا اس کی منزل جنت ہے۔

اس آیت میں بھی ایمان و عملِ صالح کو مدارِ نجات بتایا گیا ہے۔ ایمان اگرچہ تصدیقِ قلبی کا نام اور یہ دل کا عمل ہے لیکن جب دل کی یہی تصدیق رسوخ و پختگی اختیار کر لیتی ہے تو یہی ایمان جو اب تک ایک معنے تھا اب ایک شکل و صورت اختیار کر لیتا ہے۔

اربابِ حقائق کے نزدیک معانی کی جسمانیت ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور جدید تحقیقات کے مطابق حرارت کو تولا جا سکتا ہے اور تولا جا رہا ہے بلکہ اس کے لیے مقیاس الحرارت بھی بازار میں ملتا ہے ایسے ہی آواز کو مدت تک ایک بے جسم معنے تصور کیا گیا مگر حال کی تحقیقات نے ثابت کر دیا ہے کہ عالم کی پیدائش سے لے کر آج تک جس قدر آوازیں اس فضا میں بلند ہوئیں سب محفوظ ہیں اور ان سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔ ریڈیو کی محیّر العقول ایجاد کی بنیاد یہی انکشاف ہے۔ آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ تحقیقاتِ جدیدہ کی ساری تگ ودو کے باوجود ابھی وہاں تک رسائی نہیں ہوئی جہاں ہمارے اربابِ حقائق کی نظریں سینکڑوں سال پہلے پہنچ چکی تھیں۔ شیخ محی الدین بن عربیؒ فتوحاتِ مکیہ میں آوازوں کے لیے صرف جسم کو ثابت نہیں کرتے بلکہ ان اشباہ اور اشکال کے بھی مدعی ہیں یعنی آوازوں کا صرف جسم نہیں بلکہ جسم کے ساتھ ان کی شکل و صورت بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جب شکل و صورت ہے تو صورت کے ساتھ رنگ بھی ضرور ہو گا۔

ایسے ہی ایمان بھی ابتداءً اگرچہ تصدیقِ قلبی کا نام ہے مگر یہ تصدیق اعمالِ صالحہ کی آبیاری سے نشوونما پا کر ایک نور کی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یہی نور فی الواقع ایمان ہے۔ یہ نور جس قدر پختہ ہوتا جاتا ہے اتنے ہی خواہشاتِ نفس کے حجابات اُٹھتے جاتے ہیں اور جیسے جیسے یہ حجابات اُٹھتے جاتے ہیں اسی قدر یہ نور پھیلتا جاتا ہے۔ اس قدر پھیل جاتا ہے کہ انسان کی پوری زندگی کو اپنی آغوش میں لے لیتا ہے اور مومن گویا خود ایمان مجسم ہو جاتا ہے۔

اسی نور کی رہنمائی کے مطابق زندگی میں اوامرِ الٰہیہ کے لیے امتثال اور محرمات کے لیے اجتناب کا

جذبۂ عمل پیدا ہو جاتا ہے۔ اخلاقِ رذیلہ زائل ہو جاتے ہیں اور اخلاقِ فاضلہ کے زیور سے آراستگی ہو جاتی ہے۔ یہی ایمان دعوتِ انبیاء کا مقصد ہے اور اسی پر نجات اور فلاحِ ابدی کا مدار ہے۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرہ حیات کا ہر خط اسی پر جاکر ختم ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عملِ صالح سے پہلے کیا ہے اور ان کو اس طرح پیش کیا ہے جیسے ایک موصوف کے لیے دو صفتیں ہوں۔ اس طرح نہیں جیسے دو صفتوں کے لیے الگ الگ موصوف ہوں۔ یہاں یہ نہیں فرمایا کہ والذین آمنوا اور والذین عملوا الصلحت بلکہ فرمایا والذین آمنوا و عملوا الصالحات۔ اس کا مطلب یہ اور صرف یہ ہے کہ مدارِ نجات ایمان و عمل صالح ہے۔ قرآن نے ان لوگوں کے اعمال کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں اس راکھ سے دی ہے جسے ہوا اڑا کرلے جائے۔

غرض ایمان تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر وہ بے بنیاد ہے۔ وہ ہماری سیرابی کا اصلی سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ اللہ کا اقرار اور اس کی رضا کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے۔ یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام ہو کر رہ جائیں۔ وہ ہمارے دل کا نور ہے وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے۔

ایمان و عمل کو ایک ہی موصوف کی صفت بنا کر قرآن نے علم و عمل، تصوّر اور عقلیت و عملیت میں لزوم ثابت کیا ہے مگر اصل زور انسان کی عملیت پر دیا ہے اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا جو دل کی اصلاح کرے اور اعمالِ اخلاق کی بنیاد قرار پا سکے۔ عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات و نظریات کی تشریح کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا۔

آپ آیت کی معجزانہ بلاغت پر غور کریں کہ لفظ اُولٰئِكَ دونوں جگہ لائے ہیں۔ لیکن ایک دقیق سا فرق بھی ہے۔ گنہگاروں کی سزا کا ذکر کیا تو فاولئك اصحاب النار اور جب ایمان و عمل صالح والوں کی جزا کا ذکر کیا تو اولئك اصحاب الجنۃ فرمایا۔ پہلے فقرہ پر حرف فا لائے اور دوسرے فقرے کو اس سے محروم کر دیا۔ اس میں بلیغانہ معنویت ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت عام اعتقاد یہ تھا کہ جزا و سزا محض خدا کی خوشنودی اور اس کے قہر و غضب کا نتیجہ ہے۔ اعمال کے نتائج کو اس میں دخل نہیں ہے۔ الوہیت اور شاہیت کا تشابہ تمام دینی تصورات کی طرح اس معاملے میں بھی فکری گمراہی کا سبب بنا۔ لوگ دیکھتے تھے کہ ایک مطلق العنان بادشاہ کبھی خوش ہو کر انعام و اکرام دینے لگتا ہے کبھی بگڑ کر سزائیں دینے لگتا ہے۔ اس لیے سمجھتے تھے کہ خدا کا معاملہ بھی ایسا ہی ہے۔

قرآن نے اس فکری گمراہی کی اصلاح کی اور بتایا کہ جیسے اس مادی دنیا میں قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ یہاں کوئی چیز نتائج کی گرفت سے آزاد ہو۔ جیسے اللہ سبحانہ نے اجسام میں خواص رکھے ہیں اسی طرح اعمال کا رشتہ بھی نتائج سے وابستہ ہے اور جس طرح جسم انسانی کے قدرتی اثرات ہیں اسی طرح روح انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی مؤثرات کا ظہور جسم پر ہوتا ہے۔ معنوی مؤثرات سے روح متاثر ہوتی ہے۔ اعمال کے لیے بھی اللہ کی مقرر کردہ نتائج ہیں جنہیں وہ جزا و سزا سے تعبیر کرتا ہے۔ ایمان و عمل کا نتیجہ اچھائی ہے اور یہ ثواب ہے گناہوں کا نتیجہ برائی ہے اور یہ عذاب ہے۔ ثواب و عذاب کے ان اثرات کی نوعیت کیا ہو گی۔ قرآن کہتا ہے جنت اور دوزخ ہوگی۔ جنت کی نعمتیں ان کے لیے ہیں جن کے اعمال جنت والوں کے ہوں گے دوزخ کی عقوبتیں ان کے لیے ہیں جن کے اعمال دوزخیوں کے ہوں گے۔ حافظ ابن القیمؒ نے اس موقعہ پر بڑی اچھی بات لکھی ہے۔

اللہ سبحانہ نے دنیا اور آخرت میں کامیابی اور ناکامی کا مدار قرآن میں اعمال کو اس طرح قرار دیا ہے جیسے جزا کے لیے شرط معلول کے لیے علت اور مسبب کے لیے سبب ہوتا ہے اور اعمال کا یہ قانون مکافات قرآن میں ایک ہزار سے زیادہ مقامات پر ہے۔ غرض دنیا و آخرت کی مصالح و مفاسد، سعادت اور شقاوت، فلاح و خسران قرآن میں معنوی مؤثرات کے روحانی انفعالات ہیں ——— اس سے آگے فرماتے ہیں کہ

جو شخص قرآن کے پیش کردہ اس قانون پر تفقہ حاصل کرے گا اور اس میں پوری بصیرت پیدا کرے گا تو اسے بہت زیادہ فائدہ ہوگا اور نادانی کا شکار ہو کر عجز و بیچارگی، کوتاہی اور تہی دامنی کے لیے تقدیر کا سہارا نہ لے گا۔ صحیح معنے میں کامل ترین فقیہ وہ ہے جو تقدیر کا تقدیر سے مقابلہ کرتا ہے جس طرح اس حیات میں بھوک، پیاس، سردی سب اللہ ہی کی تقدیر ہیں لیکن ان کو دور کرنے کا طریق بھی اللہ کی تقدیر ہے۔ ایسے ہی معنویات آخرت کی سزا و جزا کا معاملہ بھی ایمان اور عملِ صالح کی باقی ہوتی تقدیر الٰہی ہے۔ دونوں جہانوں کا مالک اللہ ہے اور دونوں جگہ اس کی حکمت ایک ہے۔ آیت میں دونوں جگہ اسی ترتیب کو بتانے کے لیے ایسے جملے لائے گئے جو معنے شرطی کو متضمن ہیں۔ علمائے نحو و بلاغت کا فیصلہ ہے کہ الذین اور اس قسم کے دوسرے موصولات پر مشتمل جملے معنے شرطی کے حامل ہوتے ہیں۔ شرط و جزا کی صورت میں لاکر یہ بتایا ہے کہ گناہ اور احاطہ خطیئات دوزخ میں جانے کی اور ایمان و عملِ صالح جنت میں جانے کی ناگزیر شرط ہے۔ اور پہلے فقرے میں

فا اس لیے لگائی ہے کہ پہلا موقعہ وعید کا تھا اور وعید میں نہ ہونے کا امکان ہے اس لیے وہاں فا کا اضافہ کر دیا۔ دوسری آیت میں وعدہ تھا جس میں خلف کا کوئی امکان نہیں اس لیے فا ہٹا دی۔

یہ بات بھی سمجھ لیجئے کہ بدکاروں کے لیے دوزخ اور ایمان وعمل صالح کے لیے جنت کا ذکر آیا ہے اور دونوں آیتوں میں دونوں کے لیے ھم فیھا خالدون کی تعبیر آئی ہے۔ خلود کے معنے اگرچہ مدت طویل کے ہیں لیکن دوزخیوں اور جنتیوں کے لیے قرآن میں جہاں آیا ہے اس سے مراد دوام اور ہمیشگی ہے اس کی تائید وتاکید میں قرآن میں کئی جگہ ابداً بھی آیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے جیسا کہ امام غزالیؒ نے لکھا ہے کہ انسان اگرچہ ازلی نہیں مگر ابدی ضرور ہے۔ اس لیے اس کو ایک ابدی مستقر کی ضرورت ہے۔ دُنیا اس کا ابدی مستقر نہیں صرف عارضی مستقر ہے۔ اس کا دائمی مستقر جنت یا دوزخ ہیں۔ قادرِ مطلق نے اس کی تقسیم ایمان وکفر پر رکھی ہے۔ گناہ کی آلودگیوں کے باوجود مومن کا ابدی مستقر جنت اور اچھے اچھے کاموں کے باوجود کافر کا ابدی مستقر جہنم ہی رہے گا۔ اب رہی یہ بات کہ یہاں ایمان وکفر کی جزا خلود کیوں رکھی گئی ہے تو میرے علم میں اس کا سب سے بہتر جواب وہ ہے جو ابنِ قتیبہؒ نے دیا ہے۔ اسی کا خلاصہ حافظ بدرالدین عینیؒ نے شرح بخاری میں اور عبدالوہاب الشعرانیؒ نے الیواقیت میں ذکر کیا ہے۔ آپ بھی سن لیجئے، فرماتے ہیں:۔

جنت میں خلود اور ابدی زندگی کی بنیاد عمل پر نہیں بلکہ نیت پر رکھی گئی ہے۔ اگر اس کی بنیاد عمل پر ہوتی تو آخرت کی زندگی بھی اتنی ہونی چاہیے تھی جتنی کہ اس کے عمل کی تھی یا بہت سے بہت اس سے دوگنی۔ لیکن چونکہ اس کی بنیاد نیت پر رکھی گئی ہے اور نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ ہمیشہ زندہ رہے گا تو خدا کی اطاعت کرے گا۔ اس نیت میں موت اگر حائل ہو جاتی ہے اس کا اپنا کوئی قصور نہیں ہوتا اس لیے اس کو اپنی نیت کے مطابق دوام وخلود کا بدلہ مل جاتا ہے۔ یہی حال دوزخ میں کافر کے خلود کا ہے۔ (عمدۃ القاری)

جنت کی حد تک تو یہ بات بالکل دُرست ہے لیکن یہ بات کہ بُرائی اور بُرائی کی جزا دوزخ میں بھی ابدیت ہے۔ اس میں علماء کے خیالات مختلف ہیں۔ اگرچہ اہل السنت کی اکثریت دوزخ کی ابدیت ہی کو مانتی ہے۔ اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں۔ انشاء اللہ یہ بحث سورۂ ہود میں آئے گی۔

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَ بَنِي إِسْرَائِيلَ لَا تَعْبُدُونَ إِلَّا اللَّهَ وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا وَذِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسَاكِينِ وَقُولُوا لِلنَّاسِ حُسْنًا وَأَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ إِلَّا قَلِيلًا مِنْكُمْ وَأَنْتُمْ مُعْرِضُونَ ﴿۸۳﴾

اور وہ وقت یاد کرو جب ہم نے بنی اسرائیل سے ایمان وعمل کا یہ عہد لیا تھا کہ اللہ کے سوا[۲۱۱] کسی کی عبادت نہ کرنا، والدین[۲۱۲] سے سلوک میں حسن کاری کرنا، عزیز و اقارب سے نیکی سے پیش آنا، یتیموں اور مسکینوں کا خیال رکھنا اور تمام انسانوں سے خواہ کوئی ہو اچھی بات[۲۱۳] کہنا، [۲۱۴] نماز قائم کرنا اور زکوٰۃ[۲۱۵] کی ادائیگی کرنا۔ ایمان وعمل کی ان بنیادی سچائیوں پر تم سے عہد لیا تھا لیکن تم اس سے پھر[۲۱۶] گئے اور اس پر تم میں سے ایک تھوڑی تعداد کے علاوہ کوئی قائم نہ رہا، اور حقیقت یہ ہے کہ تم عمل سے وقتی طور پر نہیں ہٹے تھے بلکہ تمہارے اندر اس سے بےرخی اور روگردانی ہمیشہ کے لیے رونما ہو گئی ہے۔

احکام پر عمل سے انحراف

گذشتہ آیات میں اسرائیلی تاریخ ملی کے انعامات اور انعامات پر ان کی ناشکری اور اس کے نتائج کو بیان کیا تھا۔ ان آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کی جانب سے آئے ہوئے احکام علیہ عبادات اور معاملات میں ان کی زندگیوں کا رخ کیا تھا۔ اور اسی مناسبت سے ان کی کج فہمی، قساوت قلوب کے اشارات بھی دوبارہ آئے ہیں اور اس مقام پر تفصیل نہیں اشارات ہی ضروری ہیں۔ یہ گویا عملی احکام میں ان کی گناہوں سے بھرپور زندگی ان کے انحراف اور ان کی بدعہدی کی تاریخ ہے۔

یاد رہے کہ عہد کا تعلق جب اللہ تعالیٰ سے ہوتا ہے تو محاورۂ تورات میں حکم کے معنے میں آتا ہے۔ بعض شارحین قرآن نے بھی یہاں عہد بمعنی حکم بتایا ہے اور معنے یہ کیے اَمَرْنَا بِذٰلِکَ ہم نے اس کا حکم دیا۔

۲۱۱ - اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا، ہمیشہ سے دین انبیاء میں توحید کے دو پہلو نمایاں اور

نمایاں رہے ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کی عبادت کرو اور دوسرے یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔ توحید کا پورا نقشہ صرف زبان سے کلمہ توحید پڑھ لینے سے عیاں نہیں ہوتا جب تک وہ انسانی زندگی کے ہر گوشے میں نمایاں نہ ہو جائے۔ مثبت اور منفی پہلو جدا جدا ہو کر ممتاز نظر نہ آنے لگیں۔ توحید کے دعویٰ کے ساتھ جہاں پہنچ کر مداہنت کی ادنیٰ سے ادنیٰ گنجائش بھی ختم ہو جاتی ہے وہ توحید کا یہی منفی پہلو ہے، اور اسی پہلو کے نمایاں ہونے سے اسلام و کفر میں کھلا امتیاز ہوتا ہے۔ شرک کی عام فضاؤں میں جب خدا کے برگزیدہ نبی آئے تو ان کا مقصد صرف اعبدوا اللہ سے پورا نہیں ہوا جب تک اس کے ساتھ لا تعبدون الا اللہ کا علم بلند نہیں کیا یعنی جب تک توحید کے مثبت پہلو کے ساتھ منفی پہلو کو نمایاں نہیں کیا جتنا توحید کا مثبت پہلو اہم ہے اتنا ہی اس کا منفی پہلو اہم ہے۔ ایک مسیحی صرف اللہ کی عبادت کا اعلان کر کے مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک اس کا بھی صاف اور صریح اقرار نہ کرے کہ حضرت مسیح الٰہ، ابن اللہ نہیں بلکہ اللہ کے بندے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ توحید کے دونوں پہلوؤں کا مظاہرہ شرطِ ایمان ہے۔

قرآن کا اعلان ہے کہ محبوب کے متلاشی کہاں مارے مارے پھرتے ہیں ان کے لیے اس کی ملاقات کا صرف ایک راستہ ہے کہ اللہ کی عبادت کریں اور اس کے علاوہ کسی کی عبادت نہ کریں۔ اللہ تعالیٰ کی توحید اس وقت تک خالص نہیں ہو سکتی جب تک اعبدوا اللہ کے ساتھ لا تعبدون الا اللہ کا اعلان صاف صاف نہیں کر دیا جاتا۔ آج مسلمان بھی اگر اپنے ایمانوں کا جائزہ لیں تو اس میں توحید کا جس قدر مثبت پہلو صاف نظر آتے گا اتنا واضح اس کا دوسرا منفی پہلو نظر نہ آئے گا۔

یاد رکھیے جب تک کہ اس کا یہ پہلو بھی اتنا ہی واضح نہ ہو جائے اس وقت تک آپ کی توحید کا نقشہ مکمل نہ ہوگا۔ مشکل اعبدوا اللہ نہیں اس میں تو اکثر قومیں آپ کی ہم آہنگ ہیں۔ جو مرحلہ مشکل ہے وہ تمام شرکاء اور باریک سے باریک شرکوں سے بیزاری کا اعلان کر کے لا تعبدون الا اللہ کو عملی زندگی میں جگہ دینا ہے۔ اسی لیے کلمہ طیبہ لا الٰہ الا اللہ میں مثبت پہلو کی بنیاد منفی پہلو پر قائم کی گئی ہے۔

غالباً اب آپ خوب سمجھ گئے ہوں گے کہ قرآن جس توحید کی طرف دعوت دیتا ہے اور جس کی بلا تمیز تمام انبیاء نے دعوت دی ہے اور جس پر عمل پیرا ہونے کا اللہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا ہے وہ اللہ کی عبادت کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کرنا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں وحدتِ ادیان کے موضوع پر منجملہ دوسری باتوں کے یہ بھی لکھا ہے،

انبیاء کی اس پر پوری اجتماعی طاقت صرف ہوتی ہے کہ عبادت اور استعانت میں اللہ کی توحید کا اعلان کیا جائے۔ یہ گویا دینِ انبیاء کی اصل اوّل ہے۔ اعمال، اخلاق، آداب اور احوال کے لیے اوّلین اساس ہے۔

۲۱۲
۵۔ والدین سے سلوک میں حسن کاری کرنا۔ یہ دوسرا اخلاقی فریضہ ہے جس کی ادائیگی پر بنی اسرائیل کو متوجہ کیا گیا۔ والدین کے حقوق کی پاسداری اور ان کے احترام و بزرگی کو برقرار رکھنا۔ انسان کے لیے عقلاً اور واقعۃً ضروری ہے کہ اپنے والدین کا اچھی طرح خدمت گزار ہو۔ ان سے تواضع اور نرمی سے پیش آئے۔ ان کو جہاں تک ہو سکے آرام پہنچائے۔ ان کے ہر حکم کی تعمیل کرے بشرطیکہ کوئی حکم الٰہی سے نہ ٹکراتے اور ان کی تمام ضروریات پوری کرے، اذیتوں سے بچاتے اور ہر طرح مطمئن اور خوش رکھنے کی کوشش کرے چاہے وہ عقیدے کے اعتبار سے کچھ ہوں۔

اس حکم کی اہمیت کا اندازہ لگانے کے لیے اس فقرے کا بلیغانہ انداز جان لینا کافی ہے۔

اوّل اس فقرے بالوالدین احسانا میں فعل کو چھوڑ کر صرف مصدر لائے ہیں۔ اصل عبارت یوں تھی و تحسنون بالوالدین احسانا۔ فعل کو اس لیے ہٹایا ہے کہ فعل میں زمانہ پایا جاتا ہے اور قرآن والدین کے برو احسان کو کسی زمانے میں مقید کرنا نہیں چاہتا ہے ان کی جوانی کا زمانہ ہو اور چاہے بڑھاپے کا اور چاہے ان کی جانب سے مطالبہ ہو یا نہ ہو۔ بہر حال اولاد کا کام ہے والدین سے احسان کرنا۔

ثانیاً برتاؤ اور سلوک کے لیے لفظ احسان لائے ہیں۔ عربی میں احسان ان جگہوں پر نہیں بولا جاتا جہاں ہم اردو میں بولتے ہیں۔ عربی میں احسان کے معنے حسن کاری کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مطلق خدمت، مطلق احترام اور ان کے حقوق کی مطلق پاسداری نہ ہونی چاہیے بلکہ اس فرض کی ادائیگی میں تمہیں حسن کار بننا چاہیے۔

اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے جن کی سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا ہے کہ انسانیت کی تکمیل اور اس میں حسن و جمال پیدا کرنے والا انسان سے کیا چاہتا ہے۔ اگر صحیح مسلم کی یہ مشہور روایت صحیح ہے کہ

اللہ نے حسن کاری ہر چیز میں واجب فرمائی ہے۔ اس لیے جب تم ذبح کرو تو ذبح میں بھی حسن کار بنو اور جب تم قتل کرو تو قتل میں بھی حسن کاری کرو۔

اور صحیح نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ صحیح مسلم میں ہے۔ تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ قرآن حسن و جمال کے قالب میں ڈھالے بغیر کسی مسلمان سے کوئی فعل صادر ہوتا دیکھنا نہیں چاہتا۔

ثالثاً احسان کا صلہ با آیا ہے حالانکہ احسان خود متعدی ہے۔ علمائے بلاغت نے تصریح کی ہے کہ متعدی کا صلہ اگر لایا جائے تو اس میں گہری معنویت ہوتی ہے۔ دیکھئے عربی میں لفظ اخذ پکڑنے لینے کے معنے میں خود متعدی آتا ہے۔ اگر آپ یہ کہنا چاہیں کہ رشید نے میرا ہاتھ پکڑا تو آپ یوں کہیں گے اَخَذَ رَشِیْدٌ یَدِیْ۔ لیکن اگر آپ یہ بتانا چاہیں کہ میرے ساتھ اور بھی موجود تھے ان سب میں سے رشید نے میرا ہاتھ پکڑا تو آپ با استعمال کریں گے اور یوں کہیں گے کہ اَخَذَ رَشِیْدٌ بِیَدِیْ۔ بتانا یہ ہے کہ صرف والدین کے حقوق کی پاسداری نہیں، بلکہ دوسرے افراد کے حقوق کی پاسداری کرتے ہوئے والدین کے حقوق کی نگرانی کرنا ہے۔

عام قرابت داروں کے ساتھ بھی تمہارا رویہ بہتر ہونا چاہیے۔ یتیموں کی ہمدردی، ان کے حقوق کا دھیان رکھنا، ان کی بے دریغ اعانت و حاجت روائی کرنا انسان کا اخلاقی فرض ہے اور پھر ان مسکینوں اور غریبوں کی دلجوئی اور دامے درمے ان کی اعانت بھی انسانوں کے واجبات میں سے ہے۔ یعنی معاشرے کے ایسے تمام افراد جو اپنی ضروریات پوری کرنے کے سہارے اور معاشی بے فکری اور فارغ البالی سے محروم ہو چکے ہوں اس کی ذمہ داری اہلِ ثروت پر ہے کہ ایسے حاجت مندوں کی اعانت اور ان سے فیاضانہ سلوک کرنا ضروری ہے۔ بنی اسرائیل سے چوتھا عہد اسی کا لیا گیا تھا۔

۲۱۳ ۔ اور تمام انسانوں سے اچھی بات کہنا۔ اس فقرے میں حسن خلق کے اس جامع پہلو پر زور دیا گیا ہے جس کے بغیر زندگی اخلاقی خوبیوں سے آراستہ نہیں ہو سکتی اسی لیے انسانی برتاؤ کے باب میں اسے دوسرے نمبر پر پیش کیا ہے کہ انسان کے کردار و اخلاق کی تکمیل اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک وہ خوش کلامی اور بات چیت کا انداز غایت درجہ نرم اور شگفتہ اختیار نہ کرے۔ و قولوا للناس حسنا کے الفاظ بھی کہہ رہے ہیں کہ حسنِ کلام کا طریقہ یہ اختیار کرو کہ بات چیت میں خوش بیانی اور شیریں کلامی کے ساتھ آواز میں بھی نرمی اور آہستگی اختیار کرو۔ قرطبیؒ نے اس موقعہ پر کیا اچھی بات لکھی ہے۔ انسان کو سب کے لیے نرم خو اور شیریں زبان ہونا چاہیے چاہے نیک ہو یا بد، سُنی ہو یا بدعتی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت ہارون علیہ السلام سے کہا تھا کہ فرعون کے پاس جاؤ تو زبان میں شیرینی اور نرمی رکھ کر بات کرنا۔ آج نہ تو کوئی متکلم موسیٰ و ہارون سے برتر ہے اور نہ آپ کا کوئی مخاطب فرعون سے بدتر ہے۔

حضرت طلحہ بن عمرؓ کہتے ہیں کہ میں نے امام عطاءؒ سے کہا کہ آپ کی شخصیت بڑی عظیم ہے کہ آپ کے پاس غلط خیال لوگوں کا ہجوم رہتا ہے۔ میرے مزاج میں ذرا تیزی ہے۔ میں تو ڈانٹ ڈپٹ

سے پیش آتا ہوں۔ حضرت عطاءؒ نے ان کو بتایا کہ ایسا نہ کیا کرو۔ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے قولوا للناس حسناً اس میں تو یہود و نصاریٰ بھی داخل ہیں۔ مسلمان اس میں کیوں داخل نہ ہوں[1]

ایک بار مدینہ طیبہ کی حرمِ نبوی میں نمازِ عصر سے فراغت کے بعد میں ایک مولوی صاحب کے پاس بیٹھا تھا۔ مولوی صاحب کے مزاج میں ان مسلمانوں کے بارے میں بڑی تیزی تھی جن کے دامنوں پر دین کی زندگی میں نت نئی ایجادوں کے دھبے ہیں۔ ان کو مسلمان سننا بھی گوارا نہ کرتے تھے۔ میں نے ادبا عرض کیا کہ ایک مسئلہ بتائیے بولے وہ کیا۔ میں نے عرض کیا کہ یہودیوں اور عیسائیوں پر قرآن نے شرک و کفر کا الزام بھی کہیں لگایا ہے یا نہیں۔ فرمایا کیوں نہیں قرآن میں موجود ہے اور سورۂ مائدہ اور سورۂ توبہ کی آیات تلاوت کر دیں۔ میں نے عرض کیا کہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ شرک اور کفر کے ان سنگین الزامات کے باوجود قرآن ہی میں ان کا کھانا اور ان کی عورتوں سے شادی کرنا جائز بتایا گیا ہے اور ان کو مشرکین سے الگ کر کے یہ رعایت صرف اس لیے دی ہے کہ یہودی اور عیسائی نبوت کو ماننے والے ہیں۔ یہودی حضرت موسیٰ علیہ السلام اور عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ نبوت کی برادری میں سب سے اعلیٰ اور سب سے افضل جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ قرآن اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ماننے والوں کو یہ رعایت دیتا ہے تو ہم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں کو اتنی رعایت بھی دینے کو تیار نہیں ہیں کہ ان کے ذبیحہ کو جائز قرار دیں اور ازدواجی تعلقات کو صحیح سمجھیں۔ نہ تو ہم قرآن کے ماننے والوں میں صحابہ سے بلند ہیں اور نہ یہ مسلمان جن کے دامنوں پر قسم قسم کے دھبے ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں سے بدتر ہیں۔

بہرحال آیتِ قرآنی کا مخاطبت میں تمام انسانوں کے لیے شیریں کلام ہونے کا مطالبہ ہے۔

۲۱۴ ۔ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ ادا کرنا، اجمالی طور پر لَا تَعْبُدُوْنَ اِلَّا اللّٰهَ میں حکم عبادت یہ بتانے کے لیے آیا ہے کہ ہر شخص پر اپنی اپنی جگہ عبادت کی ذمہ داری کا بوجھ ہے۔ لیکن یہاں یہ بتانے کے لیے کہ خاص عبادتیں ایسی بھی ہیں جو انسان بغیر وحی کی رہنمائی کے انجام نہیں دے سکتا۔ دو عبادتوں نماز اور زکوٰۃ کو مثالاً پیش کیا ہے۔ اس سے یہ نہ سمجھا جائے کہ بنی اسرائیل کو نماز اور زکوٰۃ کے احکام انہیں مخصوص ہیئتوں اور انہیں متعین قیود کے ساتھ ملے تھے۔ اقامت سے نماز میں قیام، رکوع اور سجدہ کا پتہ چلتا ہے۔ زمانۂ نبوت میں جو یہودی نماز کے پابند تھے وہ بھی ان ارکان کو ادا کرتے تھے۔ کھڑے

---

[1] قرطبی ج۱ ص ۱۶

ہوکر تورات اور زبور کی آیات تلاوت کرتے تھے اور سجدہ بھی کرتے تھے۔ قرآن کی شہادت یہ ہے کہ

مِنْ اَهْلِ الْكِتَابِ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيَاتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ الَّيْلِ وَهُمْ يَسْجُدُوْنَ

روایات میں ہے کہ رکوع میں یہودیوں کی طرح دونوں ہاتھ نہ جوڑے ہوں[1] —— اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہودی نمازمیں یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے۔ اسلام کی نماز بھی ان ہی قدیم ارکان اور فطری شکل وصورت کے ساتھ فرض ہوئی ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کے عہد سے چلی آرہی تھی۔ چنانچہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مصنفین نے بھی اس حقیقت کو تسلیم کیا ہے۔

اسلامی نماز اپنی ترکیب میں بہت حد تک یہودیوں اور عیسائیوں کی نماز کے مشابہ ہے۔

(دائرۃ المعارف الاسلامیہ ج ۱۲ص ۲۷۸)

حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے بھی وحدتِ ادیان کے موضوع پر اس کی ہمنوائی کی ہے[2]

زکوٰۃ بھی ان عبادات میں سے ہے جو تمام آسمانی مذاہب کے صحیفوں میں فرض بتائی گئی ہے لیکن ان کے پیروں نے محبتِ مال کی وجہ سے اس کو ایسا فراموش کردیا کہ بظاہر ان کے مذہبی احکام میں اس کا نام بھی نظر نہیں آتا۔ قرآن پاک کا دعویٰ ہے اور اس کی تائید مختلف آسمانی صحیفوں سے ہوتی ہے کہ جس طرح نماز مذہب کا جزو لاینفک تھی اسی طرح زکوٰۃ بھی تمام مذاہب کا ہمیشہ جزو رہی ہے۔

نماز و زکوٰۃ کے موضوع پر نبوتِ محمدیہ کا تکمیلی کارنامہ کیا ہے؟ اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے اس کے لیے پارہ نمبر ۲ ہے۔

۲۱۵

ف۔ پھر تم اس سے پھر گئے۔ یعنی اس معاہدہ کے ساتھ معاملہ یہ تھا کہ تم نے اس پر عمل سے گریزپائی اختیار کی۔ اللہ کے ساتھ اپنی عبادتوں میں انبیاء اولیاء کو شریک کرلیا۔ والدین کے گستاخ اور نافرمان ہوگئے۔ اقارب سے قطع رحمی اختیار کرلی۔ یتیموں کے اموال مختلف بہانوں سے کھاتے مساکین اور غریبوں کی ہمدردی سے تمہارے دل خالی ہوگئے۔ لوگوں سے برتاؤ میں تمہاری زبانیں تلخ ہوگئیں۔ تم ریاست کے غرور میں انسانوں کو حقیر سمجھنے لگے۔ نماز کو تمہارے معاشرے کے افراد چھوڑ بیٹھے اور زکوٰۃ کا نام ونشان تمہاری زندگی میں باقی نہ رہا۔ اس کی جگہ طاعت میں تم نے اللہ سے رشتہ توڑ کر اس کی مخلوق سے جوڑلیا اور اب تمہاری دینی زندگی دین کی یہاں تک سے سمٹ کر چند خود ساختہ رسموں اور من گھڑت مجالس کی ہوکر رہ گئی۔ ہاں تم میں سے چند افراد اس سیلاب سے

---

[1] فتح الباری ج ۲ ص ۲۲۱ [2] حجۃ اللہ البالغہ ج ۱ ص ۸۷

وَاِذْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَكُمْ لَا تَسْفِكُوْنَ دِمَآءَكُمْ وَلَا تُخْرِجُوْنَ اَنْفُسَكُمْ مِّنْ
دِيَارِكُمْ ثُمَّ اَقْرَرْتُمْ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ﴿٨٤﴾ ثُمَّ اَنْتُمْ هٰٓؤُلَآءِ تَقْتُلُوْنَ اَنْفُسَكُمْ
وَتُخْرِجُوْنَ فَرِيْقًا مِّنْكُمْ مِّنْ دِيَارِهِمْ تَظٰهَرُوْنَ عَلَيْهِمْ بِالْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ؕ
وَاِنْ يَّاْتُوْكُمْ اُسٰرٰى تُفٰدُوْهُمْ وَهُوَ مُحَرَّمٌ عَلَيْكُمْ اِخْرَاجُهُمْ ؕ

اور وہ معاملہ یاد کرو جب ہم نے تم سے یہ عہد[٢١٦] لیا تھا کہ باہم ایک دوسرے کا خون نہ بہانا اور نہ باہم ایک دوسرے[٢١٧] کو گھر سے بے گھر کرنا۔ اور تم نے اس کا اقرار کیا تھا[٢١٨]۔ اب بھی تو تم اس کو مانتے ہو لیکن تم ہی اس اقرار[٢١٩] اور ماننے کے باوجود باہم ایک دوسرے کو بے دریغ قتل کرتے ہو اور اپنی برادری کے ایک طبقہ کے خلاف ظلم و معصیت[٢٢٠] پر مبنی یونین قائم کرکے اسے جلاوطن کرتے ہو۔ لیکن پھر جب ایسا[٢٢١] ہوتا ہے کہ وہی جلاوطن کیے ہوئے آدمی قیدی ہو کر تمہارے سامنے آتے ہیں تو تم فدیہ دے کر ان کو چھڑا لیتے ہو اور کہتے ہو کہ شریعت کی رو سے ایسا کرنا ضروری ہے حالانکہ شریعت میں ان کو گھروں سے نکالنا بھی تم پر حرام تھا۔

ضرور بچے رہے لیکن یہ ملٹ کی دال میں سفیدی کے برابر تھے۔ اجتماعی زندگی کے فیصلے اجماع کی یا فرادی قوت سے ہوتے ہیں اور تمہارا دین کی زندگی سے یہ ہٹنا بھی واپسی کے ارادے سے اور کسی وقتی اور ہنگامی حالات کے تحت نہ تھا بلکہ اس لیے تھا کہ تم میں دین ہی سے اعراض، روگردانی اور بے رخی کی عادت پیوست ہو گئی تھی۔

دینداری کی نمائش

بنی اسرائیل میں اتباع دین کی روح یک قلم معدوم ہو گئی اور دینداری کی نمائش اس لیے ہونے لگی تاکہ نفسانی خواہشوں اور مقصد برآری کے لیے اسے آلہ کار بنایا جائے۔ اس صورت حال کا لازمی نتیجہ یہ نکلا کہ شریعت کے بنیادی اور اصولی احکام پر کوئی توجہ نہ رہی لیکن چھوٹی چھوٹی باتوں پر جو دینداری

اور ریاکاری کا ذریعہ ہو سکتی ہیں اور جن کے کرنے میں کچھ چھوڑنا اور کھونا نہیں پڑتا علم و عمل کی قوتیں لگ گئیں۔ ساری توجہ اور عملی جد و جہد ان کے حصول پر مرکوز ہو گئی اور اسی میں خدا کی رضا اور خوشنودی تلاش کی جانے لگی۔ علمائے یہود اسی گمراہی میں مبتلا تھے۔ قرآن نے ان آیات میں ان کی اسی گمراہی کا نقشہ عجیب انداز میں پیش کیا ہے اور اس کی دلکشی میں اس بات نے اور اضافہ کر دیا کہ پہلی آیت میں مامورات میں ان کی بے رُخی کو بے نقاب کیا تھا اور اس آیت میں ان کی کام جوئیوں کا تذکرہ ہے۔

ف ۲۱۶۔ اس جگہ بھی عہد لیا بمعنے حکم دیا ہے۔ خونریزی کی ممانعت تورات مروجہ میں بھی متعدد مقامات پر آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے تمہیں حکم دیا تھا کہ آپس میں ایک دوسرے کا خون نہ بہانا۔ خونریزی تمام آسمانی مذاہب میں منع رہی ہے اور ظلم و سفاکی سے تمام نبیوں نے روکا ہے بلکہ قرآن نے انکشاف کیا ہے کہ بنی اسرائیل کو اللہ سبحانہ، نے قتل نفس سے باز رہنے کی سخت تاکید کی تھی اور اپنے فرمان میں یہ الفاظ لکھ دیے تھے کہ جس نے کسی انسان کو غیر قانونی طور پر یعنی بغیر خون کے بدلے یا ملک میں فساد پھیلانے کے جرم کے بغیر قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کیا۔

ف ۲۱۷۔ قرآن کے نزدیک یہ بھی قتل ہی کے ہم پلہ سنگین جرم ہے کہ بلا وجہ اور بلا قصور کسی کو گھر سے نکال دیا جائے۔ پہلا جرم اگر صرف فوجداری تھا تو یہ جرم فوجداری اور دیوانی دونوں قسم کا ہے۔ فوجداری اس لیے کہ اس میں دوسرے پر اس کی مرضی کے خلاف جبر ہو رہا ہے، اور دیوانی اس لیے کہ کسی کو ملکیت سے محروم کر کے غاصبانہ قبضہ کیا جا رہا ہے اسی لیے قرآن نے اس کو مظلومی کی نشانی قرار دیا ہے۔ اخرجوا من دیارھم بغیر حق۔

ان دونوں فقروں کے ذریعے قرآن نے علم الاجتماع کے اس قانون کی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ جماعت میں فرد کی ہستی کوئی نہیں اصل ہستی جماعت کی ہے اور جماعت کا فرد ہونے کی وجہ سے ایک کا دوسرے کو نکالنا خود اپنے کو نکالنا ہے اور ایک کا دوسرے کو مارنا خود اپنے کو مارنا ہے۔ گویا پوری اُمت اجتماعی زندگی میں ایک جان ہے۔ جماعت کے ہر فرد میں یہ احساس شدید ہونا چاہیئے کہ ایک کی جان سب کی جان ہے اور ایک کا مال سب کا مال ہے۔ ایک شخص کے بدن میں جو رُوح گھوم رہی ہے اور اس کی رگوں میں جو خون دوڑ رہا ہے اس میں اور جماعت کے دوسرے افراد کے خون اور جان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ افراد کا یہی تصور ان میں عدل و انصاف کو پرورش کرتا ہے اور اسی کے احساس سے دب کر ہر شخص دوسرے کی جان، مال اور آبرو کا محافظ بن کر رہتا ہے اسی کو قانونی تکافل کہتے ہیں۔ اللہ اکبر جس قانون کے ذریعے اللہ کی وحی نے جماعت کی

فرد کی جان مال کا محافظ قرار دیا اسی کا سہارا لے کر آج مساوات کے علمبرداروں سے ہر شخص کی جان اور ہر شخص کا مال معرضِ خطر میں ہے۔ غصب، چوری، ڈکیتی، لوٹ مار کوئی عیب نہیں ہے۔ اناللہ فالی اللہ المشتکی۔

ف ۲۱۸ - تم نے اقرار کیا تھا اور تم مانتے ہو۔ یعنی ان احکام کا تم نے اقرار کیا تھا۔ یہاں حافظ ابن تیمیہؒ ایک مفید تحقیق فرما گئے ہیں وہ بھی گوش گزار فرما لیجئے کہ اقرار کے دو معنے ہیں۔ ایک زبان سے تصدیق کرنا، دوسرے التزامِ طاعت اور عہد عمل و فرمانبرداری۔ اس آیت میں دوسرے معنے مراد ہیں کیونکہ معنے تو وانتم تشھدون سے منہوماً سمجھ میں آرہے ہیں جس کے لیے ہم نے ترجمہ میں تم مانتے ہو کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہاں اس حکم کی تصدیق مطلوب نہیں ہے بلکہ اس کا اظہار کیا جارہا ہے کہ تم نے اس میثاق کی طاعت کرنے اور اپنانے کا عہد کیا تھا۔ التزامِ طاعت کا یہی مفہوم ہے۔ مفسرین نے دو مطلب بتاتے ہیں۔ ایک یہ کہ تمہارے اسلاف نے میثاق کو طاعت کو قبول کیا تھا اور وہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ہم اس کی وحی کر رہے تھے وہاں موجود تھے۔ دوسرے یہ کہ اے مخاطبو تم نے اس میثاق کا اقرار کیا ہوا ہے اور تمہارا اعتقاد بھی یہی ہے تم اسے مانتے ہو اس کے منکر نہیں ہو۔ دونوں باتیں صحیح ہیں اور دونوں صورتوں میں ان کے خلاف حجت قائم کی جارہی ہے۔

ف ۲۱۹ - تم ہی باہم ایک دوسرے کو قتل کرتے ہو۔ میثاق کا ذکر کر لے اور بتانے کے بعد کہ تم اسے مانتے ہو اس آیت میں اس میثاق کی خلاف ورزی کی داستان بیان کرتے ہیں یعنی اے مخاطبو یہ جاننے اور ماننے کے باوجود تم باہم قتل و خونریزی میں کتنے بے باک اور دلیر ہو۔ تمہارا حال یہ ہے۔

مدینہ میں یہود کے دو قبیلے بنو قریظہ اور بنو نضیر تھے۔ دونوں کی لڑائی تھی۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نیچا کرنے اور شکست دینے کے لیے مشرکین کے دو قبیلوں سے اتحاد کر رکھا تھا۔ بنو قریظہ اوس کے اتحادی تھے اور بنو نضیر نے خزرج سے دفاعی پیکٹ کر رکھا تھا۔ جب جنگ کا بازار گرم ہوتا تو بنو قریظہ اوس کی حمایت میں خزرج سے نبرد آزما ہوتے اور بنو نضیر خزرج کی دوستی کی خاطر اوس سے لڑتے۔ نتیجہ میں بنو قریظہ اپنے بھائی، ہم مسلک اور ہم نبی امت بنو نضیر کے افراد کے خون سے ہاتھ رنگین کرتے اور یہی بنو نضیر بنو قریظہ کے ساتھ کرتے جب ایک دوسرے پر غلبہ ہوتا تو کمزوروں کو جلا وطن کرتے[1]

واضح الفاظ میں اسے یوں کہہ دیجئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے مدینہ کے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۶

اطراف میں یہودی قبائل نے اپنے ہمسایہ عرب قبیلوں اوس اور خزرج سے حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے۔ جب ایک عرب قبیلہ دوسرے قبیلے سے برسرِ جنگ ہوتا تو دونوں کے حلیف یہودی قبیلے بھی اپنے اپنے حلیف کا ساتھ دیتے اور ایک دوسرے کے مقابلے میں نبرد آزما ہو جاتے تھے[1]

ان کا یہ کردار کھلے طور پر قرآن میں بیان شدہ اس معاہدے کے خلاف تھا اور وہ بالارادہ جان بوجھ کر اللہ کے حکم کی بغاوت کر رہے تھے۔ یہاں زمانۂ نبوت کے معاصر یہودیوں کی یہی خصوصیات بیان کی جا رہی ہیں۔

۲۲۰؎۔ ظلم و معصیت پر مبنی یونین یعنی تَظَاهَرُونَ عَلَيْهِمْ بِالْإِثْمِ وَالْعُدْوَانِ - یہ فقرہ بڑھا کر قرآن نے بتا دیا کہ اس جنگ، امداد اور اتحاد کے پسِ منظر میں کوئی جذبہ صادقہ، حسنِ نیت اور اخلاص نہ تھا بلکہ اس جنگ، اتحاد اور تظاہر و تعاون کی تمام تر بنیاد خالصتاً اخلاقی کمزوری تھی جس میں دُنیادار اہلِ سیاست ہمیشہ مبتلا رہتے ہیں یعنی ظلم و معصیت۔ اس کا قریب ترین مفہوم یہی ہے کہ مطلق جنگ مذموم نہ تھی بلکہ اس خبیث بنیاد نے اسے خبیث بنا دیا۔ اگر یہی یہودی باہم متحد ہو کر عدل و طاعت کو قائم کرنے اور ظلم معصیت کو مٹانے کے لیے کھڑے ہوتے تو قرآن کو کوئی اعتراض نہ ہوتا لیکن پھر ان کا بھائی چارہ مشرکین سے نہ ہوتا بلکہ باہم اعتصام بحبل اللہ کی بنیاد پر تنظیم قائم کرتے۔ اس سے مدلولاً یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآن کی نگاہ میں علی الاطلاق اتحاد اور امداد کی کوئی قیمت نہیں ہے جب تک اس کی اساس عدل و تقویٰ پر نہ ہو۔ ہمارے فقہا نے قرآن کی روشنی میں یہ ضابطہ لکھا ہے کہ الامور بمقاصدھا۔

۲۲۱؎۔ پھر وہی جلا وطن قیدی بن کر آتے تو تم فدیہ دے کر چھڑا لیتے ہو۔ یعنی اگر قید ہو کر آتے ہیں تو سب رل مل کر مال جمع کر کے اس کا بدلہ دے کر قید سے اس کو چھڑا لیتے ہو[2]

مطلب یہ ہے کہ جب ایک یہودی قبیلے کے اسیرانِ جنگ دوسرے یہودی قبیلے کے ہاتھ آتے تھے تو غالب قبیلہ فدیے کر انہیں چھوڑتا اور مغلوب قبیلہ فدیہ دے کر ان کو چھڑاتا تھا۔ اس فدیہ کے لین دین کو جائز ٹھہرانے کے لیے کتاب اللہ سے استدلال کرتے تھے۔ گویا وہ کتاب اللہ کی اس اجازت کو تو سر آنکھوں پر رکھتے تھے کہ اسیرانِ جنگ کو فدیے کر چھوڑا جائے مگر اس حکم کو ٹھکراتے تھے کہ باہم جنگ نہ کی جائے[3]

---

[1] تفہیم القرآن ص ۹۱۔ [2] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۶ [3] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۹۲

گویا اس موضوع پر ان کو تین حکم دیے گئے تھے کہ اپنی قوم میں

۱۔ باہم قتل و خونریزی نہ کرنا
۲۔ کسی کو جلاوطن نہ کرنا
۳۔ کسی کو اگر قید و بند میں مبتلا دیکھیں تو فدیہ دے کر رہا کرانا۔

بنی اسرائیل نے اپنے سیاسی مفادات اور مصالح کی خاطر پہلے دو حکموں کو پس پشت ڈال دیا اور تیسرے حکم پر عمل کرنے کا اہتمام کیا[1]

ان دونوں آیات سے سرسری طور پر نہ گزر جائیے ان پر ایک نظر ڈال کر دیکھئے کہ ان میں کیا کہا گیا ہے یہ اور صرف یہ

۱۔ اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی سے عابدانہ تعلقات قائم نہ کرنا۔
۲۔ والدین کے ساتھ صرف سلوک ہی نہیں کرنا بلکہ اس میں حسن کاری کرنا۔
۳۔ اہلِ قرابت کے قرابت کی بنا پر حقوق ادا کرنا۔
۴۔ یتیموں کی پوری طرح پاسداری کرنا۔
۵۔ مسکینوں، غریبوں اور اہلِ حاجت کی ہر حال میں خبرگیری کرتے رہنا۔
۶۔ انسانی زندگی میں انسانوں سے برتاؤ میں نرم گفتاری اور شیریں زبان اختیار کرنا۔
۷۔ اللہ سے تعلقات استوار کرنے کے لیے نماز قائم کرنا۔
۸۔ اللہ سے تعلقات بندگی کی خاطر مال قربان کرکے زکوٰۃ کی ادائیگی کرنا۔
۹۔ باہم قتل و خونریزی اور جنگ و جدال سے بچ کر رہنا اور ایک دوسرے کی جان کی حفاظت کرنا۔
۱۰۔ باہم ایک دوسرے کی ملکیت پر ناجائز قبضہ نہ کرنا اور ایک دوسرے کو گھر سے بے گھر کرکے اس کے اموال کو نہ چھیننا۔
۱۱۔ آپس میں اگر کوئی قید ہو جائے تو قیدی کو فدیہ دے کر رہا کرانا۔

یہ تمام احکام جن کا بنی اسرائیل کی تاریخ ملی میں میثاق لیا گیا ہے اور جن احکام میثاق کو بنی اسرائیل نباہ نہ سکے صرف بنی اسرائیل ہی کے لیے نہ تھے ان میں سے ہر ایک حکم اس اُمت کے لیے بھی واجب العمل ہے۔ علماء نے تصریح کی ہے کہ ان منہیات میں ساری باتیں ہمارے لیے بھی ویسے ہی حرام ہیں جیسے

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۱۹۶

اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْكِتٰبِ وَتَكْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ فَمَا جَزَآءُ مَنْ يَّفْعَلُ ذٰلِكَ مِنْكُمْ اِلَّا خِزْيٌ فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۞ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ فَلَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْصَرُوْنَ ۞

کیا یہ طرزِ عمل تم نے اس لیے اختیار کیا ہے کہ تم کتابِ الٰہی کا کچھ حصہ مانتے ہو اور کچھ حصے کا انکار کرتے ہو[۲۲۲] تم یاد رکھو تم میں سے جن لوگوں نے یہ کردار ادا کیا ہے ان کو اس کی پاداش[۲۲۳] میں دُنیا کی ذلت و رسوائی ہی مل سکتی ہے اور قیامت[۲۲۴] کے دن ان کو سخت سے سخت عذاب ہوگا اور اللہ تمہارے کردار[۲۲۵] سے بے خبر نہیں ہے۔ یہی لوگ ہیں[۲۲۶] جنہوں نے آخرت کی زندگی کے بدلے دنیوی زندگی مول لی ہے لہٰذا ان کے عذاب میں کوئی کمی نہ کی جائے گی اور نہ ان کی کوئی مدد کی جائے گی۔

بنی اسرائیل پر حرام تھیں۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں ھذا کلہ محرم علینا۔ یہ سب ہم پر بھی حرام ہیں اور مامورات میں بھی سب باتیں ہمارے لیے ویسے ہی واجب العمل ہیں۔ مامورات کے سلسلے میں قرآن کو بنی اسرائیل سے شکایت ہے کہ ثُمَّ تَوَلَّيْتُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْكُمْ۔ آئیے قرآن کے پیش کیے ہوئے اس آئینے میں ہم بھی اپنا چہرہ دیکھیں اور محرمات کے بارے میں قرآن کو بنی اسرائیل سے شکایت ہے کہ اپنی مطلب برآری کی حد تک حرام سے بچتے ہو۔ آئیے ہم بھی اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں کہیں ہم بھی اسی راہ پر تو نہیں چل رہے ہیں۔

ایمان و کفر میں مصالحت کے نتائج

ایک نہایت اہم اور گہری اور انقلاب انگیز تبدیلی جو بنی اسرائیل کی ذہنیت و نفسیات میں واقع ہو گئی تھی وہ یہ ہے کہ آخرت پر ان کا ایمان فی الواقع ختم ہو چکا تھا اور اس کے نتیجے میں ان میں اصول و عقائد

کے مقابلے میں منافع و مصالح، آجل کے مقابلے میں عاجل کو ترجیح دینے کی بیماری پیدا ہو گئی تھی اس سے بنی اسرائیل ایک بے اصول، ناقابل اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی سطح پر آگئے تھے۔ ان کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں بلکہ صرف منافع و مصالح اور اغراض و مقاصد رہ گئے تھے۔ قرآن ان آیات میں ان کو بتا رہا ہے کہ منافع اور اغراض کی خاطر کفر و ایمان کی ضدین کا اجتماع دُنیا میں ذلت اور آخرت میں سنگین عذاب کی دعوت ہے۔ اب بھی وقت ہے سنبھل جاؤ۔

... تم کتاب الٰہی کا ایک حصہ مانتے ہو اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو۔ یعنی کیا تمہارے اس طرز عمل کا نتیجہ یہ نہیں ہے کہ کتاب اللہ کے کچھ حصہ پر ایمان ہے اور کچھ حصہ کا انکار کرتے ہو کیا ایمان و کفر کا یہ اجتماع ممکن ہے اور کیا اس سے بڑی کوئی حماقت ہو سکتی ہے کہ ایمان ہی میں تجزیہ کر رہے ہو۔ حالانکہ تم جانتے ہو کہ کتاب اللہ کے ایک حصہ کا انکار ساری کتاب کے انکار کے مترادف ہے۔

آیت میں بے عملی اور گناہ کو کفر بتایا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جو شخص گناہ کرتا ہے اور اس کے لیے کرنے سے پہلے اپنے اندر خلش نہیں رکھتا اور گناہ کرنے کے بعد کسی قسم کی ندامت محسوس نہیں کرتا بلکہ بے باکانہ انداز میں آگے ہی بڑھتا جاتا ہے۔ قرآن کی نظر میں اس کا یہ اقدام التزام طاعت کے منافی ہے۔

مدینہ کی ابتدائی زندگی میں اسلامی دعوت سے برسرِپیکار یہودی علماء تھے یہودی علمائی ہیں جن کے بارے میں جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ

اگر مجھ پر یہود کے دس بڑے علماء ایمان لے آتے تو تمام یہود ایمان لے آتے۔

یہ حضرت ابو ہریرہؓ کی حدیث مسند احمد، ابو داؤد میں موجود ہے۔ امام بخاریؒ نے بھی بحوالہ حضرت ابو ہریرہؓ اسے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے فتح الباری میں مدینہ کے مشاہیر علمائے یہود کے یہ نام لکھے ہیں۔ عبداللہ بن سلام، ابو یاسر بن اخطب، حی بن اخطب، کعب بن الاشرف، رافع بن ابی الحقیق، عبداللہ بن حنیف، فنحاص، رفاعہ بن زید، زبیر بن بالمیا، کعب بن اسد، شمویل بن زور، ان میں صرف عبداللہ بن سلام کا مسلمان ہونا ثابت ہے۔ حافظ ابوالقاسم سہیلیؒ نے عبداللہ بن صوریا کا اسلام لانا بھی لکھا ہے مگر حافظ عسقلانیؒ کو اس میں تامل ہے۔ ارشادِ نبوت کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ دس علماء یہود اسلام لے آتے تو مدینہ کی یہودی دُنیا جو ان کو ارباب سمجھے بیٹھی تھی سب حلقہ بگوش اسلام ہو جاتی مگر چونکہ اس قوم کے حق میں من حیث القوم اسلام مقدر نہ تھا اس لیے

ان کے علماء کو بہت کم اسلام لانے کی توفیق ملی ـــــ قرآن کا مخاطب علماء کا یہی گروہ ہے۔
یہاں کچھ علماء کو یہ وسوسہ ہوا ہے کہ آیت میں احکام پر عمل نہ کرنے کو کفر سے تعبیر کیا ہے حالانکہ آدمی جب تک حرام کو حرام سمجھے کافر نہیں ہوتا۔ انہوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ـــ جو گناہ بہت شدید ہوتا ہے اس پر محاوراتِ شرعیہ میں اس کی شدت کے پیشِ نظر کفر کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔
یہ جواب اس شخص کے بارے میں تو دُرست ہے جس نے انفرادی طور پر گناہ کیا ہو اور اسے اپنے گنہگار ہونے کا احساس ہو یعنی فرد کی حد تک تو مسئلہ یہی ہے کہ گناہ سے گنہگار کافر نہیں ہوتا لیکن یہ بات جماعت کی حد تک دُرست نہیں ہے۔ جماعت کو ایماندار اس وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے جب وہ زبان سے اقرار کرے اور من حیث الجماعت اس اقرار پر عمل پیرا ہو۔ اگر ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی مفقود ہو جائے گی تو اس کا شمار اہلِ ایمان میں نہ ہوگا۔ اس اعتبار سے ایک فرد کی حالت میں اور ایک جماعت کی حالت میں جو فرق ہے اسے نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ فقہانے بھی ترکِ صلوٰۃ میں اسے ملحوظ رکھا ہے۔ اگر ایک فرد قیامِ صلوٰۃ میں کوتاہی کرتا ہے تو گنہگار ہے لیکن اگر ایک جماعت بحیثیتِ جماعت ترک کر دیتی ہے تو ایمان کی متاع کھو بیٹھتی ہے، اور اس سے قتال واجب ہے۔
ان آیات میں خالص اجتماعی قانون کے تحت پوری جماعت مخاطب ہے اور اس پر قومی اغراض کے سنگین الزام قائم کرنے کے بعد اثم و عدوان کا مجرم گردانا ہے۔ بلاشبہ جن دلوں میں ایمان کی رتی ہو وہاں یہ صورتِ حال نہیں ہوتی یہ ان کا من حیث الجماعت کردار تھا اور من حیث الجماعت قانون کی کھلم کھلا بغاوت تھی۔ یہ کفر سے بھی زیادہ سنگین جرم تھا۔ جرم کی سنگینی کا اندازہ سزا کی سنگینی سے ہو سکتا ہے۔ ارشاد ہے -

۲۲۳
۵۔ تم میں سے جن لوگوں نے یہ کردار ادا کیا ہے، جن کو اس کی پاداش میں دُنیا کی ذلت و رُسوائی ہی مل سکتی ہے۔ دو قسم کے عذابوں سے دوچار ہوں ایک عاجل اور دوسرا آجل۔ عذاب عاجل دُنیا میں ذلت و رسوائی کی صورت میں ہوگا۔ عقل بھی گواہ ہے اور واقعات بھی بتا چکے اور بتا رہے ہیں کہ دُنیا میں جو اُمت بھی فسق و بدکاری میں مبتلا ہوتی ہے اور اللہ کے مقرر کردہ قوانین سے کھیلتی ہے وہ اسی دُنیا میں ذلت و رُسوائی کا نشانہ بن جاتی ہے۔ اس پیشین گوئی کا بنی اسرائیل کے حق میں پوری دُنیا نے چند ہی روز میں تماشا دیکھ لیا۔

حجاز میں یہود کے تین زبردست قبیلے رہتے تھے۔ بنی نضیر، بنی قریظہ، بنی قینقاع، تینوں دولت، وجاہت، قوت اور علم و ہنر میں ممتاز تھے۔ تینوں ہی چند سالوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات میں تہس نہس ہو کر رہ گئے [1]

ان کا کردار کیا تھا؟ یہی کہ کچھ احکام کو مانتے اور کچھ کا انکار کرتے۔ ایمان کا تجزیہ تو ممکن نہیں ہے تو اب محض احکام کا انکار کرنے والا ہی کافر مطلق ہوگا۔ صرف بعض احکام پر ایمان لانے سے ایمان نصیب نہیں ہوتا۔ آیت نے صاف صاف یہ اعلان کر دیا کہ اگر کوئی شخص بعض احکام شرعیہ کی تو متابعت کرے اور جو حکم کہ اس کی طبیعت یا عادت اور یا غرض کے خلاف ہو اس کے قبول کرنے میں کوتاہی کرے بعض احکام کی متابعت سے اسے کچھ فائدہ نہ ہوگا [2]

۲۲۴ ۔ قیامت کے دن ان کو سخت سے سخت عذاب ہوگا۔ جب اُمت کے تمام معاملات میں دُنیا کی زندگی میں فسادِ اخلاق کی وجہ سے بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور اس گہوارۂ عمل میں نیکیوں اور خوبیوں کی جگہ برائیاں ہی برائیاں پھیل جاتی ہیں تو آخرت کی زندگی میں اللہ نے جو نعمتیں ارواحِ عالیہ اور پاک ہستیوں کے لیے مقرر کی ہیں ان سے محرومی ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ وہ عذاب اور آلام سے دوچار ہو جاتا ہے۔

قیامت آخرت کی زندگی کی دوسری منزل کا نام ہے اور یہی حقیقی منزل ہے۔ اس کا سب سے پہلا نام قرآن میں یوم الدین ہے یعنی بدلے کا دن جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ عمومی جزا اور ربانی عدالت کا دن ہوگا۔ یہاں اس کا نام یوم القیامۃ رکھا گیا ہے۔ قیامت کے دن چونکہ سب یکبارگی اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ دوبارہ صور پھونکا جائے گا تو سب زندہ ہو کر قبروں سے اُٹھ کھڑے ہوں گے۔ اس لیے یہ یوم القیامہ ہے۔ قیامت کے قرآن میں نام، قیامت کے اوصاف اور قیامت کے امکان و وقوع پر طویل مباحث ہیں۔ اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے مگر یہاں اتنی بات ضرور سمجھ لیجئے کہ دُنیا کے تمام دینوں میں اس زندگی کے بعد دوسری زندگی کا عقیدہ رہا ہے۔ قرآن میں بھی ایمان کا ایک بنیادی عقیدہ یہی مسئلہ ہے۔

صرف قرآن ہی نے یہودیوں کے لیے آخرت کی زندگی میں ہونے والے عذاب کی خبر نہیں دی ہے بلکہ حضرت مسیح کی زبانی بھی ان کیلئے جہنم کی وعید انجیل میں موجود ہے "تم اپنی نسبت گواہی

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۴۴ [2] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۱

دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں، غرض اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھر دو۔ اے سانپو! اے افعی کے بچو تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے"۔ (متی ۲۳-۲۴)

۲۲۵ ف - اللہ تمہارے کردار سے بے خبر نہیں ہے اس کے علم محیط سے تمہاری زندگی کی کوئی حرکت باہر نہیں ہے لہٰذا وہ ضرور تمہیں تمہارے کرتوتوں کی سزا دے گا اور اس معاملہ میں تمہارا کوئی دعویٰ یا غرہ نسب کا نسبت کا آڑ نہ بن سکے گا۔ اس میں یہودیوں کی ان سازشوں اور ریشہ دوانیوں کی طرف بھی اشارہ ہے جو یہودی اسلام کے خلاف کر رہے ہیں ۔

۲۲۶ ف - یہی لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کی زندگی کے بدلے دنیوی زندگی خریدی ہے۔ یعنی مفادِ دنیوی کو آخرت کے مقابلے میں قبول کیا اس لیے کہ جن لوگوں سے عہد لیا تھا اس کو دُنیا کے خیال سے نبھایا اور اللہ کے احکام کی کوئی پرواہ نہیں کی تو پھر ایسوں کی اللہ کے ہاں کون سفارش یا حمایت کر سکتا ہے۔

اس موقعہ پر آخرت کے بدلے دُنیا خریدنے سے یہودیوں کے اس طریقۂ کار کی جانب اشارہ ہے کہ وہ دو گروہوں میں بٹ کر مشرکین سے معاہدے کر لیتے جبکہ یہ معاہدے ان کے دین و ایمان کے خلاف ہوتے تھے اور دو متحارب قبیلوں سے معاہدے کرنے سے ان کا منشا یہ ہوتا تھا کہ جو بھی قبیلہ کامیاب ہو وہ بہرحال فائدے میں رہیں گے۔ اور کسی بھی قبیلے کی شکست سے یہودی مفادات پر کوئی زد نہ پڑے۔ یہ رویہ وہی لوگ اختیار کر سکتے ہیں جن کا اللہ پر اعتماد نہ ہو بلکہ ان کا سارا اعتماد اپنی ہوشیاریوں پر ہو۔ گویا سیاسی مفادات، قومی منافع اور ملکی مصلحتوں کی خاطر انہوں نے اللہ کے احکام کو جو پس پشت ڈالا ہے اور اس حقیر دُنیا کے مفادات کی خاطر آخرت کے عظیم منافع کو برباد کیا ہے۔ یہ قرآن کی زبان میں آخرت کے بدلے دُنیا خریدنا ہے۔ اور یہ بُرائی اُمتوں کی زندگی میں اُس وقت رونما ہوتی ہے جب وہ ایک با اصُول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے گر کر ابن الوقتی اور مصلحت پرستی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتی ہے۔ اس مقام پر یہودیوں کی اس کہانی میں ہمارے لیے بہت بڑی عبرت ہے۔ ہمارے اندر ایک نہایت اہم اور گہری اور انقلاب انگیز تبدیلی جو مسلمانوں کی ذہنیت و نفسیات میں اس پچاس سال کے اندر اندر واقع ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ آخرت پر ایمان عملاً کمزور ہوتا جا رہا ہے اور اس کے نتیجہ کے طور پر اُصول و صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا ہے۔ یہ تبدیلی اس وقت شروع ہوئی جب تقریباً تمام اسلامی ممالک میں مسلمانوں کو مغربی تہذیب، مغربی فلسفۂ اخلاق اور

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ وَقَفَّيْنَا مِنْ بَعْدِهٖ بِالرُّسُلِ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ اَفَكُلَّمَا جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ فَفَرِيْقًا كَذَّبْتُمْ وَفَرِيْقًا تَقْتُلُوْنَ ﴿۸۷﴾

اور ہم نے موسٰی علیہ السلام کو تمہاری ہدایت کی خاطر کتاب[۲۲۷] دی۔ اور حضرت موسٰی علیہ السلام کے بعد پے در پے رسُول روانہ کر کے ہدایت کا سلسلہ جاری رکھا۔ اور بالآخر حضرت عیسٰی بن مریم علیہما السلام کو روشن نشانیاں[۲۲۸] دیں اور روح القدس[۲۲۹] کی تائید سے اسے نوازا۔ لیکن ان میں سے ہر دعوت کی تم نے مخالفت کی۔ تو کیا یہی تمہارا کردار رہی ہے کہ جب بھی کوئی رسُول ایسی دعوت[۲۳۰] لے کر آئے جو تمہاری نفسانی خواہشوں کے خلاف ہو تو تم اس کے مقابلے میں تن گئے۔ کسی کو جھٹلایا[۲۳۱] اور کسی کو قتل کر دیا۔

مغربی معیاروں کے قبول کرنے کی دعوت دی گئی۔ مغربی اخلاق، فلسفہ، علوم اور سیاست کا ہر طالبعلم جانتا ہے کہ یورپ کا سارا نظامِ زندگی تمام تر مادہ پرستی اور مصلحت جوئی پر مبنی ہے۔ مسلمانوں میں اس دعوت کے علمبرداروں نے ترقی پر اتنا زور دیا کہ آخرت اور امورِ آخرت کی اہمیت نگاہوں میں گر گئی۔ اور اس کا نتیجہ وہ کچھ نکل آیا جس کی قرآن اس آیت میں نشاندہی کر رہا ہے۔

داعیانِ حق کی مخالفت

قدیم ترین زمانے سے دُنیا میں دو متقابل دعوتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک پیرویٔ نفس اور انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمہ داری کی دعوت۔ دوسرے انسان کی عبدیت، اس کی خدا کے سامنے ذمہ داری و جوابدہی کی دعوت۔ پہلی دعوت کا نام جاہلیت ہے دوسری دعوت اسلام ہے یہودی علماء پہلی دعوت کے علمبردار تھے اور انبیاء دوسری دعوت کے۔ یہودی پیرویٔ نفس اور خواہشوں کے اس قدر دلدادہ تھے کہ انبیاء کی دعوت کا مذاق اڑاتے، ان کی تعلیمات پر حملے کرتے، اور ان کی دعوت کو اس حد تک اپناتے جہاں تک ان کی سیاسی، قومی، ملکی، تمدنی خواہشیں

اور غرضیں پوری ہوتی نظر آتیں۔ اور جو نہی انبیاء کی دعوت کا ان کے قومی مفادات، ان کی سیاسی اغراض، ان کے ملکی مصالح اور ان کی اقتصادی اور معاشی منفعتوں سے تصادم ہوتا تو انبیاء کے سامنے ایک حریف کی حیثیت سے کھڑے ہو جاتے اور ان کو ناکام بنانے کے سارے حربے استعمال کرتے۔ جہاں تکذیب سے کام چلتا تکذیب کرتے اور تکذیب سے دعوتِ انبیاء ختم نہ ہوتی تو ان کے قتل کے درپے ہو جاتے۔

۲۲۷ ۔ ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی یعنی اولاً تمہاری رہنمائی کے لیے ہم نے موسیٰ علیہ السلام کو تورات دے کر روانہ کیا یعنی ایک مستقل دستورِ زندگی سے بنی اسرائیل کو ہم نے نوازا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تمہاری ہدایت کے لیے رسُولوں کا سلسلہ جاری کیا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مابین ہر دور میں انبیاء آتے رہے۔ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بھی انبیاء کا متواتر آنا تاریخ کا ایک مشہور اور مسلّم واقعہ ہے۔ متعدد انبیاء کے صحیفے عہد نامہ قدیم میں موجود ہیں۔ سلسلۂ انبیاء کی خبر دے کر قرآن یہ جتانا چاہتا ہے کہ زمانۂ نبوت سے دُوری کے نتیجے میں دینی قدریں بدل جاتیں اور شریعت طاقِ نسیان ہو جاتی ہے لیکن اے بنی اسرائیل تم یہ عذر بھی پیش نہیں کر سکتے کیونکہ تمہارے بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد انذار و تبشیر کے لیے نبیوں کی ایک بڑی تعداد آتی رہی ہے۔ اسی کے ہم معنی قرآن میں یہ بلیغ فقرہ آیا ہے ثُمَّ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا تَتْرَا پھر ہم نے رسُولوں کا تانتا باندھ دیا۔ اور یہ سب انبیاء تورات ہی کی دعوت لے کر آئے تھے اس لیے تم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہمیں یاد نہیں رہا ہے۔

۲۲۸ ۔ اور بالآخر عیسیٰ علیہ السلام کو ہم نے روشن نشانیاں دیں۔ اس میں روشن نشانیوں سے مراد دلائل، خوارق اور معجزات ہیں۔ ترجمہ میں لفظ روشن بیّنات کا ترجمہ ہے۔ اس کا موصوف محذوف ہے الآیات البیّنات روشن دلائل۔ قرآن میں آیت کی صفت بیّنۃ اس کثرت سے آئی ہے کہ محض صفت بول کر ہی اس کا موصوف مراد ہو جاتا ہے۔ قرآن نے انبیاء کے معجزات کو عموماً آیت یعنی نشانی کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ جن نبیوں کا قرآن میں تذکرہ ہے۔ ان میں سے کم و بیش حسب ذیل انبیاء کے آیات و دلائل بیان ہوئے ہیں۔ حضرت نوحؑ، حضرت لوطؑ، حضرت صالحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت شعیبؑ، حضرت زکریاؑ، حضرت یونسؑ، حضرت عیسیٰ علیہم السلام اور حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم۔ ایسے انبیا بھی ہیں جن کی آیات کے ذکر سے قرآن خاموش ہے مثلاً حضرت اسحاق، حضرت اسماعیل، حضرت ذوالکفل، حضرت الیسع علیہم السلام وغیرہم لیکن

اس خاموشی سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ ان کو کوئی آیت نہیں دی گئی۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں ہے کہ آپؐ نے فرمایا:

"ہر نبی کو کچھ ایسی نشانیاں دی گئیں جن کو دیکھ کر لوگ اس پر ایمان لاتے۔"

البتہ انبیاء کرام کے حالات پر منظر ڈالنے سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ غیر معمولی آیات و دلائل ان ہی انبیاء کو مرحمت ہوئے جن کو سخت و شدید معاندین اور منکرین کا سامنا کرنا پڑا اور ضرورت بھی ان ہی کو تھی۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ذات گرامی ان انبیاء میں سے ہے جن کو وقت کی شدید ترین قوتوں سے مقابلہ کرنا پڑا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام انبیائے بنی اسرائیل کے خاتم ہیں۔ آپ کے بعد صرف نبوت محمدی ہوئی ہے۔ مشہور یہی ہے کہ آپ کا ملک شام کے علاقہ ارض گلیل میں ایک قصبہ ناصرہ نامی ہے وہاں آبائی وطن تھا۔ لوگوں کا یہ خیال غلط ہے کہ قرآن میں مسیحوں کے لیے نصاریٰ کا لفظ ناصرہ سے ماخوذ ہے۔ دراصل اس کا ماخذ نصرت ہے اور اس کی بنا وہ قول ہے جو حضرت مسیح علیہ السلام کے سوال مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ خدا کی راہ میں کون لوگ میرے مددگار ہیں کے جواب میں حواریوں نے کہا تھا کہ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ۔ اس کی تفصیل سورۃ مائدہ کے نوٹ میں آرہی ہے۔

۲۲۹ ۔ اور ہم نے رُوح القدس کی تائید سے اسے نوازا۔ روح القدس، روح پاک، جان پاک، پاک فرشتہ، موصوف کی اضافت صفت کی طرف ہے جیسے حاتم الجود اور رجل صدق، امام بغویؒ اس آیت کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔ روح القدس کے بارے میں علماء مختلف ہیں لیکن حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے ابن ابی حاتمؒ نے اور محمد بن کعب قرظیؒ سے طبریؒ نے روایت کیا ہے کہ روح القدس سے مراد جبریلؑ ہیں۔ ابو عبیدہؓ اور بہت سے علماء کا اس پر یقین ہے۔ امام بخاریؒ نے بھی سورۃ نحل کی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اپنی تخلیق میں نہ صرف انسانوں سے ممتاز بلکہ تمام نبیوں سے الگ ہیں۔ سب مذکر و مؤنث دو صنفوں سے پیدا ہوئے ہیں مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایک ایسے انسان ہیں جن کی تخلیق صرف ایک صنف انسانی سے وجود میں آئی ہے۔ پھر اس میں تمثل جبرئیلی، نفخہ ملکی اور تکلم فی المہد کے واقعات اور بھی عجیب تر ہیں۔ ان کے معجزات میں بھی نرالی شان ہے کہ قدم قدم پر باذن اللہ کی قید لگانی پڑتی ہے۔ ملکیت کا اتنا غلبہ ہے رہنے سہنے اور شادی بیاہ کا کوئی تنظم و نسق ہی نہیں ملتا۔ ان سب ضروریات سے منزہ ہو کر واقعی وہ ایک فرشتہ ہیں۔ اگر اس وجہ سے آپ کو ملائکہ سے مناسبت

زیادہ رہی ہو اور اسی مناسبت سے ملائکہ سے استفادہ بھی زیادہ ہوتا رہتا ہو تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے
عالمِ بشری میں فرشتہ سے اسی غیر معمولی استفادے کو قرآن نے تائیدِ روح القدس سے تعبیر کیا ہے۔
پاک کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی تعلیم سے انسانوں میں تقدس آتا ہے یا اس لیے کہ اس کی تعلیم ہی
سرتاسر مقدس ہے اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ آپ کی اعانت اللہ سبحانہ نے ایک فرشتہ کے
ذریعے کرائی تھی۔

ف ۲۳۰ - جب بھی کوئی رسول ایسی دعوت لے کر آتا جو تمہاری نفسانی خواہشوں کے خلاف ہوتی
تم اس کے مقابلے میں ڈٹ جاتے۔

انسانی طبیعت کی یہ کمزوری شروع سے رہی ہے کہ وحیِ الٰہی کے مقابلے میں بالآخر وہ اپنے ہوائے نفس کو رکھنا چاہتا ہے اور وحی کے ذریعے آتے ہوئے جو احکام اسے اپنی خواہشوں یا اپنی ناقص عقل یا اپنی محدود معلومات کے خلاف نظر آتے ہیں ان سے انکار کر دیتا ہے اور ان کے مقابلے میں علمِ بغاوت بلند کر دیتا ہے۔ ہمیشہ سے یہ مسئلہ بے حد اہم رہا ہے کہ انسان کے تعلقات کی بنیاد کیا ہونی چاہیے اور انسانی تمدن کن بنیادوں پر تعمیر ہونا چاہیے۔ اس ضروری اور فیصلہ کن سوال کا جواب انبیاء نے یہ دیا ہے کہ انسانی اُمور معاملات اور تمدنی مسائل میں نبوت کی رہنمائی پر پورا اعتماد کیا جائے۔ نبوت کے مقابلے میں بنی اسرائیل کا جواب یہاں قرآن نے یہ بتایا ہے کہ صرف ہمارے ماحول اس کی ذہنی خصوصیات اور جماعتی جذبات و میلانات کی بنیاد پر ہماری رہنمائی ہونی چاہیے۔

جس قوم کے افراد میں مذہب کا یہ تصور ہو اس کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی ایسے نظام کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔ جو لوگ شب و روز اپنے ذاتی اغراض، خاندانی مفاد کی فکر میں ہوں ان کو اس سے کیا بحث کہ کون آیا ہے اور زندگی کی تعمیر نو کس طرز پر ہونے والی ہے۔ جس جماعت کے افراد اپنی خاندانی بزرگی اور بزرگوں کی وجاہت سے نجات حاصل کر سکتے ہوں اسے میدانِ عمل میں آکر زندگی کی نئی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی کیا ضرورت ہے۔ جہاں چند نعروں اور تجویزوں سے جنت حاصل ہو سکتی ہو وہاں نبوت کا استقبال کرنے کا جذبہ کیونکر پیدا ہو۔ آج جس چیز کا نام نیشنلزم، سوشلزم ہے اگر غور سے دیکھا جائے تو اس کی تہ میں صرف یہی استکبار اور اتباعِ نبوت سے عار کی روح کارفرما نظر آئے گی۔
ـــــــ اسی کا نتیجہ ہے کہ

ف ۲۳۱ - نبیوں میں سے کسی کو تم نے جھٹلایا اور کسی کو قتل کیا۔ اپنی رائے، خواہش، جذبات اور

وَقَالُوْا قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ؕ بَلْ لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَقَلِيْلًا مَّا يُؤْمِنُوْنَ ۝

اور یہ لوگ آپ سے کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلافوں میں لپٹے ہوئے ہیں (نہیں) بلکہ اللہ نے ان کو ان کے کفر کی وجہ سے اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ بہت کم حق کو مانتے اور قبول کرتے ہیں۔

میلانات کو اصل اور معیار بنانے کا نتیجہ یہ نکلا کہ انہوں نے انبیاء کے لیے بڑی سے بڑی سزا تجویز کی۔ تکذیب کی اور ان کے خون سے ہاتھوں کو رنگین کیا۔ مولانا اشرف علی تھانوی نے یہاں یہ خوب نکتہ نکالا ہے کہ استکبار ہی اکثر گناہوں کی جڑ ہے۔ قرآن نے یہاں تکذیب اور قتلِ انبیاء جیسے جرائم کو اسی کا نتیجہ قرار دیا ہے۔

بنی اسرائیل کی تاریخ ملی کی داستان بیان کرنے سے مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ اگر وہ اللہ کے بتائے ہوئے منہاجِ زندگی اور دستورِ حیات سے روگرداں ہو گئے اور اس کے قانون کو چھوڑ کر اپنے میلانات اور مفادات کے پیچھے پڑ گئے تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو بنی اسرائیل کا ہوا اور وہ بھی خلافت و امامت کے منصب سے اسی طرح ہٹا دیے جائیں گے جس طرح یہودی ہٹا دیے گئے اور اس طرح ذلت و رسوائی، بدبختی و بے نصیبی ان پر بھی مسلط کر دی جائیگی! اللہ اکبر! دنیا نے اس کا تماشہ دیکھ لیا اور مسلمان دُنیا کی امامت سے محروم ہو گئے۔

حق پر ثبات اور باطل پر جمود میں فرق

اُمتوں میں جب راستی اور حق پرستی کی جگہ نفسانی خواہشوں کی پرستش ہونے لگتی ہے اور اُصول کی جگہ اغراض پر لوگوں کی جماعتی قوت بنتی ہے تو دعوتِ حق کی مخالفت ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کا محبوب ترین مشغلہ بن جاتا ہے۔ حق کی پیاس اور طلب سے ان کے دل خالی ہو جاتے ہیں، اپنی ذہنی کاوشوں، قیاس آرائیوں، عقلی اور علمی امانتوں پر اس قدر مغرور ہو جاتے ہیں کہ داعیِ حق کی بات سننا بھی گوارا نہیں کرتے۔ مدینہ کے علماءِ یہود ایسے ہی جمود میں

مبتلا تھے اور اعتقاد کی پختگی سمجھ کر فخر کرتے تھے۔

۲۳۲
ـــہ ۔ ہمارے دل غلافوں میں ہیں۔ یعنی یہ لوگ اپنے باطل پر جماؤ اور بے حسی کی حالت پر فخر کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں یعنی اب کسی نئی بات کا اثر ہم پر ہو نہیں سکتا۔ یا تو اس لیے کہ علمی طور پر تشنہ کام نہیں ہیں۔ یا اس لیے کہ تمہاری بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ حالانکہ یہ اعتقاد کی پختگی اور حق کا ثبات نہیں بلکہ حق کے خلاف عصبیت ہے۔ یہود اپنی تعریف میں کہتے تھے کہ ہمارے دل غلافوں میں محفوظ ہیں۔ بجز اپنے دین کے کسی کی بات کا ہم پر کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ہم کسی کی چاپلوسی، سحر بیانی یا کرشمے اور دھوکے کی وجہ سے ہرگز آپ کی متابعت نہیں کر سکتے۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ بالکل جھوٹے ہیں۔ بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کو ملعون اور اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے اس لیے کسی طرح دینِ حق کو نہیں مانتے اور بہت کم ایمان سے مشرف ہوتے ہیں [۱]

مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے عقیدہ وخیال میں اس قدر پختہ ہیں کہ آپ خواہ کچھ کہیں آپ کی بات کا ہم پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ یہ وہی بات ہے جو ان ہٹ دھرم لوگوں کی زبانوں پر آتی ہے جن کے دل و دماغ میں جاہلانہ تعصب کا غلط ہوتا ہے وہ اسے عقیدے کی پختگی کا نام دے کر ایک خوبی سمجھتے ہیں حالانکہ اس سے بڑھ کر آدمی کے لیے کوئی عیب نہیں ہے کہ وہ اپنے موروثی عقائد پر جم جانے کا فیصلہ کرے چاہے ان کا غلط ہونا کیسے ہی طاقتور دلائل سے ثابت ہو جائے [۲]

حافظ ابن القیمؒ نے قلوبنا غلف کی معنویت سے جو نقاب کشائی کی ہے وہ قابلِ شنید ہے۔ اس فقرے کے ایک معنے یہ ہیں کہ ہمارے دل تو علم وحکمت یعنی نقلی اور عقلی علوم وفنون کے گہوارے ہیں۔ پتہ نہیں آپ کی دعوت کیا ہے؟ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گنجینۂ علوم ہونے کی وجہ سے آپ کی دعوت ہماری جماعتی، قومی ضرورت کی چیز نہیں ہے۔ اس صورت میں غلف غلاف کی جمع ہے۔ اکثر مفسرین کی رائے میں معنے یہ ہیں کہ تمہاری دعوت ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اس صورت میں غلف کو اغلف کی جمع کہا جائے گا۔ ابوعبید کہتے ہیں غلاف میں محفوظ چیز کو اغلف کہتے ہیں جیسے میان میں محفوظ تلوار کے لیے سیف اغلف بولا جاتا ہے۔ ابنِ عباسؓ، قتادہؒ، اور مجاہدؒ نے دلوں کے غلافوں میں ہونے کا مطلب یہی بتایا ہے کہ آپ کی دعوت ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے اور یہی مطلب درست

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۷ [۲] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۹۲

ہے کیونکہ علوم و حکمت کے خزانہ ہونے کے لیے عربی میں یہ پیمانہ نہیں ہوتا ہے اور قرآن میں بھی اس کی کوئی نظیر نہیں اور کوئی شخص اپنے علمی مقام کو اس انداز میں کبھی ظاہر نہیں کرتا۔

بہرحال معنے دونوں ہیں اور دونوں اکابر نے اختیار کیے ہیں۔ اور خود حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے یہی دونوں معنے منقول ہیں۔ مجاہدؒ اور قتادہؒ کا بیان ہے کہ ابن عباسؓ غلُف لام کے پیش کے ساتھ پڑھتے اور معنے یہ بتاتے کہ ہمارے دل تو علوم کا خزانہ ہیں ہمیں آپ کے علم کی ضرورت نہیں ہے۔ زمخشری نے بھی یہی معنے لکھے ہیں اور بتایا ہے کہ وہ لوگ اس کا دعویٰ کرتے تھے کہ ہم تو علم کے کوٹھے ہیں ہمیں کسی علم کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۲۲ ۔ بلکہ اللہ نے ان کو اُن کے کفر کی وجہ سے اپنی رحمت سے دُور کر دیا۔ پہلے فقرے کا جو مطلب بھی لیا جاتے اسی کے اعتبار سے لفظ بل اپنے معنے میں ہے۔ اگر پہلے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو خزانہ علوم ہیں ہمیں آپ کی دعوت کی ضرورت نہیں ہے۔

قرآن نے اس فخریہ نعرے اور دعوے کا جواب یہ دیا ہے کہ جس علم کے خزانہ ہونے کا تمہیں دعویٰ ہے یہ کوئی عزہ کی چیز نہیں ہے بلکہ یہ تو تمہارے صداقت سے دُور ہو جانے کی نشانی ہے۔ اور صداقت سے یہ دُوری تمہارے کفر اختیار کرنے کی وجہ سے ہوئی۔

مطلب یہ ہے کہ صورت حال وہ نہیں ہے جو تم کہہ رہے ہو بلکہ اصل معاملہ یہ ہے کہ تمہارے دلوں پر اللہ کی جانب سے تمہاری کافرانہ زندگی کی وجہ سے مُہر لگ چکی ہے۔

اور اگر پہلے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری دعوت ہماری سمجھ میں نہیں آتی تو پھر اس فقرے کا مقصد یہ ہے کہ یہ بات نہیں کہ دعوت کی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی بلکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں تمہارے انبیاء سابقین سے کفر اور کتاب الٰہی کی مسلسل بغاوت اور تحریف کی وجہ سے اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے۔ یہ ہے واقعی سبب اس کا کہ تم خاتم الانبیاءؐ کی دعوت کو قبول کرنے سے محروم ہو گئے۔

۲۲۴ ۔ بہت کم ایمان لاتے ہیں۔ قلیل ایمان کی صفت ہے۔ جو ایمان نجات کے لیے ضروری ہے اس میں عقائد کے ساتھ معاملات، اخلاق اور اجتماعی و انفرادی زندگی کے متعدد اجزاء ہیں۔ بنی اسرائیل دینی زندگی کے سارے اجزاء میں سے صرف چند اجزاء پر نام و نمود کے لیے کار فرما تھے۔ یا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کو اجمالاً مانتے تھے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے لیکن زندگی کے مختلف موڑوں اور گوشوں میں کتاب اللہ کے برتنے، اپنانے اور قبول کرنے کی حد تک ایمان نہیں رکھتے تھے۔

وَلَمَّا جَآءَهُمْ كِتٰبٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ وَكَانُوْا مِنْ قَبْلُ يَسْتَفْتِحُوْنَ عَلَى الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَلَمَّا جَآءَهُمْ مَّا عَرَفُوْا كَفَرُوْا بِهٖ فَلَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿۸۹﴾

اور جبکہ ان کی ہدایت کے لیے اللہ کی طرف سے ایک ایسی کتاب نازل ہوئی جو تصدیق[۲۳۵] کرنے والی ہے اس کتاب کی جو پہلے سے ان کے پاس موجود ہے۔ باوجودیکہ وہ تورات کی پیشین گوئیوں کی بنا پر اس نبوت[۲۳۶] کے منتظر تھے اور کافروں کے مقابلے میں اس کا نام لے کر فتح ونصرت[۲۳۷] کی دعائیں مانگا کرتے تھے، مگر جب وہی ان کی جانی بوجھی[۲۳۸] نبوت آ گئی تو صاف انکار کر دیا۔ اللہ کی لعنت ان لوگوں پر[۲۳۹] جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔

آخری نبی کا انتظار اور اس کا انکار

یہ آیت پہلی آیت سے مربوط ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ یہ مدعیانِ علم ایمان کی نعمت سے ان حالات میں محروم ہو رہے ہیں جب کہ ان کے پاس اللہ کی جانب سے خالص علمی کتاب آئی ہے اور کتاب بھی وہ آئی جو ان کے علمی صداقتوں کو مانتی ہے۔ اب یہ کہتے ہیں کہ ہمارے قلوب گنجینۂ علوم ہیں ہمیں کسی نئے علم کی ضرورت نہیں لیکن یہی بے چینی سے نبی آخر الزماں کا انتظار کر رہے تھے جس کی آمد کی پیشین گوئیاں ان کے انبیاء نے کی تھیں۔ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو دین حق کا بول بالا ہو اور پھر ہماری ترقیوں کا وقت آئے۔ خود مدینہ والے اس بات کے گواہ تھے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے یہودی آنے والے نبی کے منتظر تھے۔ ابن اسحاق، ابن سعد، مسند احمد، تاریخ بخاری، مستدرک حاکم، دلائل بیہقی، معجم طبرانی اور دلائل ابونعیم میں متعدد روایتیں ایسی ہیں جن سے مجموعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے مدینہ کے یہودیوں میں ایک آنے والے پیغمبر کے جلد ظاہر ہونے کے چرچے رہا کرتے۔ اور ان ہی سے سن سن کر اوس و خزرج کے کانوں میں پیغمبر کی آمد کی خبر پڑی ہوتی تھی۔ اور اکثروں کے لیے

یہ خبر ہدایت کا باعث بنی چنانچہ ابن سعد کے علاوہ دیگر کتب مذکورہ میں ایک نوجوان انصاری کا واقعہ بسند صحیح مذکور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ میں چھوٹا تھا تو مدینہ میں ایک یہودی واعظ آیا۔ دوران وعظ اس نے ایک پیغمبر کے ظہور کی بشارت دی۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ وہ کب تک ظاہر ہوگا۔ اس نے اُن انصاری کی طرف جو اس مجمع میں سب سے چھوٹے تھے اشارہ کرکے کہا کہ اگر یہ لڑکا جیتا رہا تو وہ اس کا زمانہ پائے گا۔ ابنِ اسحاق نے سیرت میں لکھا ہے کہ حضرت صفیہؓ فرماتی ہیں کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لاتے تو میرے باپ اور چچا دونوں آپؐ سے ملنے گئے۔ یاد رہے کہ حضرت صفیہؓ کے والد اور چچا دونوں بہت بڑے یہودی علماء میں سے تھے۔ دونوں نے بڑی دیر تک آپؐ سے گفتگو کی جب گھر واپس آتے تو میں نے اپنے کانوں سے ان کی باتیں سنی ہیں وہ کہہ رہے تھے کہ کیا واقعی یہ وہی نبی ہے جس کی خبریں ہماری کتابوں میں ہیں"۔ میرے چچا نے والد سے دریافت کیا ہاں خدا کی قسم۔ یہ والد صاحب کا جواب تھا۔ چچا بولے کیا تم کو اس کا یقین ہے؟ ہاں والد نے کہا۔ چچا نے دریافت کیا کہ پھر کیا ارادہ ہے؟ والد نے کہا کہ جب تک جان میں جان ہے مخالفت کروں گا۔ بیہقی میں حضرت انس بن مالکؓ سے روایت ہے کہ ایک یہودی کا لڑکا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں رہا کرتا تھا۔ اتفاق سے وہ بیمار پڑ گیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس کی عیادت کو تشریف لے گئے اور آپؐ نے اس کے باپ سے پوچھا کہ کیا میرا ذکر تم تورات میں پاتے ہو؟ اس نے کہا کہ نہیں۔ لڑکے نے فوراً جواب دیا ہاں یا رسول اللہ ہم نے آپ کا ذکر تورات میں پڑھا ہے۔

قرآن نے اس آیت میں ان کے ان دو عقیدوں کو دہرا کر ان کے اسلام قبول نہ کرنے پر اُن کی ملامت کی ہے۔

ف ۲۳۵۔ اوّل تو اللہ کی جانب سے تمہاری ہدایت کے لیے کتاب آنا ہی اس کی مقتضی ہے کہ تم اسے بلا چون وچرا مانو۔ اور پھر جب کہ یہ کتاب تمہارے مقدس نوشتوں اور تمہارے علمی سرمایہ کے خلاف کوئی بات نہیں کہتی بلکہ توحید، اُصولِ دین اور مقاصد میں سرتاسر مصدق اور مؤید ہے تو پھر نہ ماننے کی کیا وجہ ہے اور اس مخالفانہ تگ ودو کا منشا کیا ہے؟

ف ۲۳۶۔ بنی اسرائیل کے پاس جو کتاب آئی ہے وہ قرآن ہے اور جو کتاب ان کے پاس پہلے سے تھی وہ تورات ہے۔ قرآن کے نازل ہونے سے پہلے جب یہودیوں کا کفار سے مقابلہ ہوتا اور مقابلے میں مغلوب ہو جاتے تو اللہ سے دُعا کرتے کہ ہم کو نبیِ آخر الزماں اور جو کتاب ان پر نازل

ہو گی ان کے طفیل کافروں پر غلبہ عطا فرما۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہوئے اور سب نشانیاں بھی دیکھ چکے تو منکر ہو گئے اور ملعون ہوئے[1]

مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے یہودی بڑی بے چینی کے ساتھ اس نبیؐ کے منتظر تھے جس کی بعثت کی انبیاء نے بشارت دی تھی۔ دعائیں مانگا کرتے تھے کہ جلدی سے وہ آئے تو کفار پر غلبہ ملے اور ہمارے عروج کا دَور شروع ہو۔ خود اہلِ مدینہ اس بات کے شاہد تھے کہ بعثتِ محمدیؐ سے پہلے بھی ان کے ہمسایہ یہودی آنے والے نبی کی اُمید پر جیا کرتے تھے اور ان کا آئے دن کا تکیہ کلام تھا کہ اچھا اب تو جس کا جی چاہے ہم پر ظلم کرلے۔ جب وہ نبی آئے گا تو ہم سب ان ظالموں کو دیکھ لیں گے۔ اہلِ مدینہ یہ باتیں سنے ہوئے تھے اس لیے جب ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے آپس میں کہا کہ دیکھنا کہیں یہ یہودی تم سے بازی نہ لے جائیں۔ چلو پہلے ہم ہی اس نبی پر ایمان لے آئیں مگر ان کے لیے یہ عجیب ماجرا تھا کہ وہی یہودی جو آنے والے نبی کی انتظار میں گھڑیاں گن رہے تھے اس کے آنے پر سب سے بڑھ کر اس کے مخالف ہو گئے[2]

استفتاح

[illegible] و نصرت کی دعائیں مانگا کرتے۔ عربی لفظ یستفتحون علی الذین کفروا ہے۔ استفتاح کے معنے فیصلہ طلب کرنا۔ فتح مانگنا اور مدد چاہنا کے ہیں۔ قرآن میں اس مصدر سے تین مواقع پر مختلف الفاظ آتے ہیں۔ سورۃ انفال میں ہے ان تستفتحوا فقد جاءکم الفتح اگر تم فتح چاہتے ہو تو فتح تمہارے پاس آگئی۔ سورۃ ابراہیم میں ہے واستفتحوا وخاب کل جبار عنید اور انبیاء نے اللہ سے دُعا مانگی اور فیصلہ چاہا۔ آیاتِ قرآنی میں اس لفظ کا استعمال بتاتا ہے کہ اس کے معنی فیصلہ طلب کرنے اور دُعا مانگنے کے ہیں۔ ابنِ جریرؒ جو لغت اور زبانِ عربی کے بھی امام ہیں انہوں نے بھی اسے استنصار مدد چاہنے کے معنی میں لیا ہے۔ اصل معنے کے ہوتے ہوئے بلاوجہ مجازی معنے لینا اور اسے یفتحون کا مرادف بنانا تقاضائے تحقیق نہیں ہے۔ ائمہ تفسیر کی اکثریت نے معنے یہی بتائے کہ یہودی اس پیغمبر کا واسطہ دے کر کافروں پر غلبہ اور برتری کی اللہ کی جناب میں دُعائیں مانگتے تھے۔ قرطبی نے ان ہی معنے کی تائید ایک حدیث سے کی ہے۔ حدیث میں ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یستفتح بصعالیک المہاجرین غریب مہاجروں کی دُعاؤں کے ذریعے اللہ سے مدد چاہتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ خیبر کے یہودیوں کا قبیلہ غطفان سے

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۷ [2] تفہیم القرآن

مقابلہ ہوا۔ مقابلہ میں یہود شکست کھا گئے تو یہود نے اس دُعا کا سہارا لیا۔

اللھم انا نسالک بحق النبی الذی وعدتنا ان تخرجہ لنا فی آخرالزمان ان تنصرنا علیھم۔

(قرطبی ج ۲ ص ۲۷)

حافظ بدرالدین عینیؒ کعب احبارؓ سے روایت کرتے ہیں کہ نبی کے دسیلے سے دُعا مانگنا بنی اسرائیل میں رائج تھا۔ حافظ ابوالقاسم سہیلیؒ لکھتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نبوت سے پہلے بھی قریش مکہ میں مبارک سمجھے جاتے تھے اور اسی لیے ایک مرتبہ قحط کے موقعہ پر عبدالمطلب نے قریش کے ساتھ جبل ابی قبیس پر چڑھ کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے توسل سے بارش کی دُعا مانگی تھی اور وہ قبول ہو گئی تھی۔ خواجہ ابوطالب نے اسی قصہ کی طرف اپنے مشہور قصیدے میں اشارہ کیا ہے جس کے کچھ اشعار صحیح بخاری میں بھی منقول ہیں۔ شرح مواہب میں ہے کہ ایک بار مدینہ میں قحط پڑا تو لوگ حضرت عائشہؓ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مزار اقدس کی چھت کو اتنا کھول دو کہ آسمان نظر آنے لگے۔ گویا یہ بھی ایک قسم کا توسل تھا۔ لوگوں نے ایسا ہی کیا، بارش ہوئی اور اتنی زور سے آئی کہ ہر جگہ سبزہ اُگ آیا اور جانوروں کے جسم چربی کی وجہ سے پھٹ گئے وہ سال عام الفتق کے نام سے تاریخ میں مشہور ہے

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس انداز پر دُعا کہ یا اللہ رسولؐ کے طفیل میرا یہ کام کر دے۔ کا اسلام میں قانونی مقام کیا ہے؟ اگرچہ قرآن کی اس آیت کے منطوق، مدلول سے اس معاملہ کا کوئی تعلق بظاہر نہیں ہے لیکن اتنا اشارہ ضرور معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کا یہ دُعا کا عمل قرآن کی نظر میں قابلِ گرفت نہیں ہے۔ گرفت اور تنقید اس پر ہے کہ اس کے باوجود پیغمبر نبوت سے آنے کے بعد رشتہ نہیں جوڑتے۔ اگر دُعا کا یہ پیمانہ قرآن کی نظر میں غلط ہوتا تو قرآن کی نگاہِ تنقید سے نہ بچتا۔

جہاں تک اس دُعائی پیمانے کے بارے میں اسلام کے قانونی موقف کا تعلق ہے تو یہ ایک درازدامن بحث ہے یہ اس کا محل نہیں ہے۔ ہاں چند ارشادات بطورِ سوغات پیشِ خدمت ہیں۔

توسل چار طرح کا ہے۔ ایمانِ نبی کا توسل، اتباعِ نبی کا توسل، دُعاءِ نبی کا توسل اور ذاتِ رسولؐ کا توسل۔

ایمان کے توسل کے بغیر تو کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا۔ ایمانِ نبوت کا وسیلہ تو مدارِ نجات ہے۔ قرآنی آیات میں جہاں صرف توحید کو مدارِ نجات بتایا گیا ہے ان سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ

صرف توحید موجب نجات ہو سکتی ہے۔ قرآن حکیم میں تصنیف کی جگہ خطابت کا انداز بیان ہے اس لیے اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے ایک خطیب کے انداز بیان کا تصور رکھنا چاہیے۔ جب وہ کسی خاص ماحول میں گفتگو کرتا ہے تو بہت سی باتیں اس کے ماحول میں اور بہت سی متکلم اور مخاطب کے دماغوں میں موجود ہوتی ہیں اور کچھ اس کے طرز کلام سے سمجھ میں آتی ہیں۔ اگر ان سب باتوں کو پیش نظر رکھا جائے تو قرآن کے سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ اللہ کا رسول خود خدا کی جانب سے بات کرتا ہے۔ جب وہ بولتا ہے تو اللہ سبحانہ کا ترجمان بن کر بولتا ہے اس لیے وہ اپنے بیان میں زور ان باتوں پر دیتا ہے جو غائب اور غیر محسوس ہیں۔ جب وہ آمنوا باللہ کہتا ہے تو یہ جانتا ہے کہ یہ حکم میری آواز پر جو مانے گا اس کو پہلے مجھے ماننا لازم ہوگا۔ مخاطبوں کو اگر ضد ہوتی ہے تو دراصل اس کی شخصیت سے ہوتی ہے وہ بہت جانی بوجھی اور مانی ہوئی باتوں کا صرف اس لیے انکار کرتے ہیں کہ اس کے منہ سے نکل رہی ہے اسی لیے ایمان بالرسول خود ایک رکن اور اصل بن جاتا ہے۔ پتے کی بات یہ ہے کہ جس طرح ایمان میں اللہ اور رسول کے درمیان فرق کی گنجائش نہیں ہے یعنی ایک کا منکر دوسرے کا منکر سمجھا جاتا ہے۔ ایسے ہی رسولوں میں بھی باہم یہی نسبت ہے۔ یوں سمجھیے کہ گفتار، کردار اور نظریات کی صداقت ایمان کی صداقت پر موقوف ہے اور ایمان کی صداقت اللہ اور اس کے رسول کے ماننے سے مربوط ہے۔ اس لیے نبوت پر ایمان کا توسل نجات کے لیے ایک مرکزی نقطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں

دوسرا اطاعت اور اتباع نبی کا توسل۔ یہ توسل بھی اسلام میں شرط فلاح، شرط محبت اور شرط کامیابی ہے۔ زبان سے اگر اقرار کرے مگر طرز عمل کھلے منکروں جیسا رکھے تو اگرچہ زبان سے اقرار کر رہا ہے لیکن نافرمانی میں زبان سے انکار کرنے والے کے برابر ہے تو ایک نظر میں یہ بھی گویا منکر ہے لہذا اسے بھی منکرین کے ساتھ دوزخ میں ایک وقت تک رہنا ہوگا۔ رسول کے پیغام کو ماننا ایمان ہے اور اس کی طاعت کرنا اسی ایمان کی علامت ہے۔ اس توسل کی فرضیت میں بھی کسی کو کوئی کلام نہیں ہے۔

تیسرا دعا کا توسل ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کرانا ایک امر استحبابی اور پسندیدہ معاملہ ہے۔ معاشرہ صحابہ میں صحابہ کا اس پر عمل تھا قرآن میں اس کی تصریح ہے۔ اور آپ کے وصال مبارک کے بعد آپ سے دعا کی درخواست کے بارے میں دو مختلف رائیں ہیں۔ جو لوگ آپ کی موت کو آپ کی نیند پر قیاس کر کے آپ کی موت کو

عام انسانوں کی موت نہیں سمجھتے ہیں اور برزخ حیات کے قائل ہیں وہ جائز کہتے ہیں اور جن کو حیات سے اختلاف ہے وہ ناجائز بتلاتے ہیں۔ یہ موضوع تفصیل طلب ہے انشاء اللہ سیر حاصل تبصرہ سورۂ احزاب میں آئے گا۔

چوتھا ذاتِ نبی کا توسل ہے۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ جمہور اہلِ السنت اسے جائز کہتے ہیں اور حافظ ابن تیمیہؒ اسے ناجائز بتاتے ہیں۔ لیکن یاد رہے کہ یہ اختلاف فرضیت، سنیت اور استحباب میں نہیں بلکہ جواز میں ہے یعنی اس طرح دُعا مانگنے کو نہ کوئی فرض کہتا ہے نہ کوئی سنت اور نہ کوئی مستحب کہتا ہے بلکہ جو کہتے ہیں وہ صرف جائز کہتے ہیں۔

۲۴۸ سے - جب وہی ان کی جانی بوجھی نبوت آگئی۔ اصل لفظ ما عرفوا جانی پہچانی چیز ہے اس سے مراد نبوت بھی ہوسکتی ہے قرآن بھی ہوسکتا ہے اور خود ذاتِ رسالت بھی۔ حاصل سب کا ایک ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہود اس آخری نبیؐ اور اس کی نبوت کی علامتوں سے اپنے دینی نوشتوں اور اپنے علمی سرمایہ کے ذریعے خوب واقف ہو چکے تھے۔ نبوت کا ظہور بالکل اچانک اور ان کے علم و واقفیت کے بغیر نہیں ہوا۔ ان کو پہلے ہی سے خبر تھی کہ نبی آنے والا ہے۔ انجیل یوحنا میں ہے۔ جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن یہ پوچھنے کو اس کے پاس روانہ کیے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ پھر کون ہے کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں نہیں ہوں کیا تو وہ نبی ہے اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پھر انہوں نے اس سے کہا کہ پھر ہے تو کون؟ (یوحنا ۱۹ - ۲۲) اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہود صدیوں سے ایک جانے بوجھے ہوئے نبی "وہ نبی" کے منتظر تھے لے

یہاں یہ خلش بالکل بے محل ہے کہ حق کی معرفت کے باوجود ان کو کافر کیوں کہا گیا۔ صرف علم و معرفت نہ تو شرعی نظر میں کوئی اہمیت رکھتا ہے اور نہ یہ مدارِ نجات ہے۔ ایمان صرف معرفت کا نام نہیں ہے۔ یہ فرقہ جہمیہ کے سرغنہ جہم بن صفوان کی رائے ہے کہ ایمان صرف معرفت قلبیہ کا نام ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ کتاب الایمان میں فرماتے ہیں کہ اس مسئلہ میں امام اعظمؒ نے اس کی تردید فرمائی ہے۔ امام صاحبؒ کا اس موضوع پر جہم سے مناظرہ دیکھنا ہو تو ہماری کتاب امام اعظمؒ اور علم الحدیث پڑھیے۔ ایمان کے لیے قلب کی تصدیق، زبان کا اقرار ضروری ہے۔ مطلب یہ ہے کہ

لے تفسیر ماجدی ص ۳۵

بِئْسَمَا اشْتَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ اَنْ يَّكْفُرُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بَغْيًا اَنْ يُّنَزِّلَ اللّٰهُ
مِنْ فَضْلِهٖ عَلٰى مَنْ يَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ فَبَآءُوْ بِغَضَبٍ عَلٰى غَضَبٍ ۭ
وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝۹۰

بدترین ہے وہ قیمت[۲۴۰] جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کا سودا کیا ہے یعنی یہ کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب سے صرف[۲۴۱] اس ضد سے کفر اختیار کیا کہ وہ جس پر چاہتا ہے اپنا فضل نازل فرماتا ہے۔ اس بنا پر وہ اللہ کے غضب[۲۴۲] بالائے غضب کی آماجگاہ ہو گئے اور حق سے سرکشی اختیار کرنے والوں کو ہمیشہ ذلت آمیز[۲۴۳] عذاب ہوتا ہے۔

نجات کے لیے جاننے کے ساتھ ماننا بھی ضروری ہے حق کی معرفت ابلیس کو بھی حاصل تھی۔

۲۳۹ ۔ اللہ کی لعنت ان پر جو کفر کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ یعنی چونکہ انہوں نے جانی بوجھی حقیقت کا انکار کیا ہے اس لیے اللہ نے اپنی رحمت سے دور کر دیا ہے۔ گویا نبوت کا کفر و انکار ان کی طبیعت بن چکا ہے اس لیے وہ لعنت کے مستحق ہو گئے۔ اس موقعہ پر صرف یہ حقیقت بتانے کے لیے لایا گیا ہے کہ رحمت سے دوری کا باعث قوم، نسل، زبان، ملک اور پیشہ نہیں ہے بلکہ نبوت کے ساتھ ان کا کافرانہ طرزِ عمل ہے۔ یہ قرآن کا بلیغانہ انداز ہے کہ فقروں کی ساخت ہی میں وہ اجتماع کے بنیادی اور اہم مسائل کی طرف اشارات کر دیتا ہے۔ خوب یاد رکھئے یہاں کفر کا مجرم ان کو انکارِ توحید، انکارِ آخرت کی وجہ سے نہیں بلکہ انکارِ نبوت کی وجہ سے بتایا گیا ہے۔

نسلی اور جماعتی حسد اور کینہ

ان آیات میں نبوت سے کفر کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ان کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے حسد اور کینہ اور یہ کد تھی کہ آنے والا پیغمبر بنی اسمٰعیل میں سے کیوں آیا ہے وہ خیال یہ کر رہے تھے کہ آنے والا پیغمبر ان ہی میں سے ہوگا۔ لیکن اللہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو رسالت کے لیے منتخب فرمالیا۔

اس پر یہودیوں کے سینے نفرت و عداوت کے سنڈاس بن گئے۔ تعصب کی وجہ سے انہوں نے پوری انسانیت سے رشتہ توڑ لیا تھا اور وہ انسانیت کی بربادی اور تباہی کے لیے جال بچھاتے رہتے ۔ وہ تفرقوں کے بیج بوتے رہتے تھے۔ کینے اور حسد کو پروان چڑھاتے رہتے۔ یہ ساری برائی اس ضد اور کینے کی بنا پر تھی جو ان کو نسلی غرور کی وجہ سے پوری انسانیت سے تھی ۔

۲۴۰ - بدترین ہے وہ قیمت جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کا سودا کیا۔ یہ عوض اور قیمت قرآن کا کفر ہے اور کفر بھی محض ضد اور حسد کے سبب[1]۔

مطلب یہ ہے کہ جس قیمت کو لے کر وہ اپنی جگہ مگن ہیں اور اپنے اس کارنامہ پر نازاں ہیں وہ دُنیا میں متاعِ دُنیا کی حیثیت سے چاہے کتنی ان کی نظر میں عظیم ہو لیکن آخرت میں نتیجے اور عقوبت کے لحاظ سے بدترین ہے ۔

۲۴۱ - صرف اس ضد سے - اصل میں لفظ بغی استعمال ہوا ہے۔ سرکشی ، زیادتی ، ضد مقصود ہے ۔ جہاں میانہ روی چاہیے وہاں میانہ روی سے بڑھنے کی خواہش کو بغی کہتے ہیں۔ خواہ میانہ روی سے تجاوز عمل میں آیا ہو یا نہ آیا ہو۔ بغی کا استعمال کمیت اور کیفیت یعنی مقدار اور وصف دونوں کے متعلق ہوتا ہے۔ اصل لغت میں بغیر حق کے کسی چیز کی طلب کو کہتے ہیں اسی بنا پر زانیہ کو بغی کہتے ہیں۔ یا پھر کسی چیز کے بگاڑ اور حد سے تجاوز کو کہتے ہیں۔ اسی بنا پر زخم کے خراب ہونے پر بغی بولا جاتا ہے یہاں بغی کے معنے علماء نے حسد کے کیے ہیں اور مطلب یہ بتایا ہے کہ ان کے قرآن اور نبوت کے انکار کا باعث یہ حسد ہے کہ نبوت بنی اسرائیل سے ہٹ کر بنی اسمٰعیل میں کیوں آئی ہے۔ ہمارے خاندان میں سے نبی کیوں نہیں آیا یعنی اس حسد اور جلن کی وجہ سے وہ نہیں مانتے اور انکار کر رہے ہیں کہ اللہ اپنا فضل اور اپنی رحمت یعنی وحی اپنے بندوں میں سے جس پر چاہتا ہے کیوں نازل کرتا ہے ہم پر ہی اس فضل و رحمت کا نزول کیوں نہیں ہوا۔ اس طرزِ فکر میں بھی نسلی اور خاندانی عصبیت کی روح کام کر رہی ہے ۔ قرآن نے یہودیوں کے اس کردارِ حسد کو دوسرے مواقع پر حسد ہی کے نام سے پیش کیا ہے ۔

اَمْ یَحْسُدُوْنَ النَّاسَ عَلٰی مَآ اٰتٰھُمُ اللّٰہُ مِنْ فَضْلِہٖ

کیا یہ لوگ خدا کے دیے ہوئے فضل پر حسد کرتے ہیں ۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۰۔

لیکن اس صورت میں حسد کو چھوڑ کر لفظ بغی کے استعمال میں کوئی بلیغ معنویت معلوم نہیں ہوتی۔ اگر پیرایۂ بیان حسداً ان ینزل اللّٰہ من فضلہٖ ہوتا تو یہی معنے ہوتے ـــ حسد کو مجازاً بغی اس لیے کہتے ہیں کہ وہ محسود پر زیادتی کرتا ہے۔ بغی اگر اپنے ہی معنے زیادتی، سرکشی اور ضد کے معنے میں ہو تو بات میں زیادہ حسن نمایاں ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کا انکار اور نبوت کا کفر اس سرکشی کی وجہ سے کررہے ہیں کہ اللہ کا یہ فضل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر کیوں ہوا ہے۔ اور اس سے بڑی سرکشی کیا ہوسکتی ہے کہ اللہ پر فضل و رحمت کی بخشش کے لیے پابندی لگا کر اور اس کی بے پایاں رحمت کی آزادی کو مقید کرکے یہ مطالبہ کیا جائے کہ اللہ کی وحی بنی اسمٰعیل میں نہیں بنی اسرائیل میں ہونی چاہیے۔ حسد اس کا باعث تو ہوسکتا ہے مگر یہ خود حسد نہیں بلکہ کھلم کھلا سرکشی اور بغاوت ہے۔

قرآن نے اس حقیقت کو بار بار صاف کیا ہے کہ یہود کا یہ کفر و انکار کسی اجتہادی غلطی کی بنا پر فکر و نظر کے کسی دھوکے یا مغالطہ کی بنا پر نہیں تھا بلکہ اس غصہ اور عناد کا نتیجہ تھا کہ نبوت خاندانِ اسرائیل سے نکل کر بنی اسمٰعیل کے ایک فرزند کو کیوں ملی؟ نسلیت اور قومیت کی ملعون عصبیت جو آج تک دنیا پر مسلط ہے اور یہودی دسیسہ کاری نے پوری دنیا کو اس کا بیمار بنا دیا ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں کہ یہود نبوت کو اپنا موروثی حق سمجھتے تھے۔ ایک عربی کو نبوت کا علمبردار دیکھ کر بغاوت و سرکشی پر اتر آئے۔ اللہ اکبر کیا حد ہے اس ضد اور سرکشی کی کہ قومیت کے چکر میں پڑ کر نبوت ہی کا انکار کر دیا ہے۔ یاد رہے قومیت چاہے نسل کے نام پر ہو یا وطن کے اور زبان کے نام پر ہو یا رنگ کے قرآن کی نظر میں سب کا حکم ایک ہے۔

۲۴۲ ـــ وہ اللہ کے غضب بالائے غضب کی آماجگاہ ہو گئے۔ ایک غضب یہ کہ قرآن بلکہ اس کے ساتھ اپنی کتاب کے بھی منکر ہو گئے۔ دوسرا غضب یہ کہ محض سرکشی اور ضد کی وجہ سے نبوتِ محمدیہ سے منحرف ہو گئے [1]

غضب علیٰ غضب کی تفسیر میں کئی تشریحات آئی ہیں ان میں سے ایک تشریح یہ ہے کہ یہود کی پہلی مغضوبیت کی بنیاد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی نبوت کا انکار ہے اور دوسری مغضوبیت کی بنیاد نبوتِ محمدیہ کا انکار ہے۔ اور یہ کہا گیا ہے کہ مقصدِ تکرار سے صرف غضب کی تاکید اور اس

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۸

وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ اٰمِنُوْا بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ قَالُوْا نُؤْمِنُ بِمَآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَيَكْفُرُوْنَ بِمَا وَرَآءَهٗ ۗ وَهُوَ الْحَقُّ مُصَدِّقًا لِّمَا مَعَهُمْ ۗ قُلْ فَلِمَ تَقْتُلُوْنَ اَنْۢبِيَآءَ اللّٰهِ مِنْ قَبْلُ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۹۱﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب کو مانو[۲۴۴] اور قبول کرو تو کہتے ہیں ہم تو وہی کتاب مانیں گے جو ہم پر یعنی[۲۴۵] بنی اسرائیل پر اُتری ہے اور اس کے سوا[۲۴۶] جو کچھ ہے اس کا وہ انکار کرتے ہیں۔ حالانکہ وہ خدا کا سچا[۲۴۷] کلام ہے اور وہ اس تعلیم کی تصدیق و تائید[۲۴۸] کرتا ہے جو ان کے پاس موجود ہے۔ اگر واقعی تم اپنی کتاب[۲۴۹] پر ایمان رکھتے ہو تو پھر ماضی میں خدا کے نبیوں کو کیوں قتل کرتے رہے ہو؟

میں زور پیدا کرتا ہے۔ موقعہ محل کے لحاظ سے اگر یہ کہا جائے کہ چونکہ بنی اسرائیل حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے قبل تورات میں پیشین گوئیاں پڑھ کر اس نبوت کے توسل سے دعائیں مانگتے تھے اور اب اس جانی پہچانی نبوت کا انکار کر بیٹھے اس لیے وہ اس کفر کی وجہ سے اللہ کے ایک غضب کے مستحق ہو گئے —— اور پھر اللہ سبحانہٗ پر یہ اعتراض کر کے کہ بنی اسمٰعیل میں سے نبی کیوں بنایا سرکشی اور بغاوت کا مظاہرہ کیا۔ دوسرا غضب اس وجہ سے ہوا تو بیجا نہیں ہے بلکہ سیاقِ قرآنی اور حرف فا۔ کا استعمال یہی چاہتا ہے۔

۲۴۳ - کافروں کو ذلت آمیز عذاب ہو گا۔ کافروں کا لفظ لا کر بتا دیا کہ یہ عذاب قوم اور نسل کی وجہ سے نہیں بلکہ کفر کی وجہ سے ہے اور اللہ کا قانون یہی ہے کہ انکارِ حق کرنے والوں کو انکار کی پاداش سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔

لفظ مھین یعنی توہین آمیز کے اضافہ سے ایک طرف یہ اشارہ فرمادیا کہ ہر عذاب تذلیل کے لیے نہیں ہوتا کبھی گناہوں سے تطہیر کے لیے بھی ہوتا ہے عذاب گنہگار مسلمانوں کو معاصی پر گناہوں سے تطہیر کے لیے ہوگا نہ بغرضِ تذلیل[۱]

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۸

اور دوسری طرف بتا دیا کہ یہ عذاب چونکہ یہود کی قومی منافرت و نسلی عصبیت کی وجہ سے ہوگا اس لیے کہ یہ عذاب اُن کے غرور کو توڑنے والا، اُن کی توہین کرنے والا اور اُن کو ذلیل کرنے والا ہوگا [1]

ایمان کی دعوت

یہود کو یہ کہہ کر یہ کتاب سب کے لیے آئی ہے اور ہمیشہ کے لیے آئی ہے۔ دعوتِ ایمان دی ہے اور یہودیوں کے اس اعتذار کا کہ ہمارے پاس ہماری کتاب موجود ہے ہمیں کسی نئی تعلیم کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے واضح الفاظ میں جواب دیا ہے کہ جس کتاب کو تم اپنی کتاب کہتے ہو اس پر تمہارا عمل کب ہے؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی کتاب سب کے لیے ہے اور اس کی بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ یہ ان تمام صداقتوں کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو مختلف قوموں، مختلف زبانوں اور مختلف ملکوں میں اللہ کے پیغمبروں کے ذریعے آتی رہی ہیں۔ اس تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے پیغمبر اللہ کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے۔ اسلام اسی دین کا نام ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک باری باری انبیاء کے ذریعے آتا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم ملتی رہی۔

نبوتِ محمدیہ کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہ ہی ہدایت ہے اور اس کے سوا نبیوں کی دعوت، ضلالت اور گمراہی ہے بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ وہی کامل ہدایت ہے اور باقی مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں۔ یعنی وہ ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے ہیں چونکہ ان کے پیرو اپنی تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اسے برباد کر چکے تھے اس لیے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کو کامل ترین صورت میں لے کر آخری نبی کی حیثیت سے تشریف لائے ہیں۔ اب یہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی کیونکہ تحریف و اختلاف اور تصرف سے محفوظ رہے گی یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنے بارے میں یہاں قصر کے ساتھ

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۳۶

یہ اعلان کیا ہے کہ ھوالحق بس یہی حق ہے یا حق اسی میں منحصر ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اس سے باہر جو کچھ بھی ہے وہ سراپا حق نہیں بلکہ اس میں باطل کی ملاوٹ ہے۔ اسی بات کو وہ نبوت کی حد تک ھوالھدیٰ کہتا ہے یعنی نبوتِ محمدیہ کی رہنمائی ہی اللہ کی رہنمائی ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے وہ ضلالت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جہاں نبوتِ محمدیہ کی دعوت دی گئی ہے ہدایت کی بشارت بھی سنائی گئی ہے۔ عیسائی ہوں یا یہودی۔ ان کو دعوت اسی ہدایت کے پانے کے لیے ہے جس کا نام اسلام ہے اور جس کو لے کر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لاتے ہیں اور اب انسانیت کی فلاح اسی کے ماننے پر منحصر ہے۔

ف۲۴۴ - اللہ کی نازل کردہ کتاب پر ایمان لاؤ۔ یہودیوں سے کہا جا رہا ہے کہ جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر ایمان لاؤ مگر اندازِ دعوت کس قدر بلیغ ہے۔ فرمایا جا رہا ہے کہ اللہ کی نازل کردہ کتاب پر ایمان لاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل شدہ کتاب پر ایمان لاؤ۔ پہلی تعبیر دعویٰ مع دلیل ہے کیونکہ اللہ کو وہ مانتے ہیں اور سلسلۂ وحی کے بھی قائل ہیں اس لیے فرمایا کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ کیونکہ یہ اللہ کی نازل کردہ ہے۔ خواہ کسی پر نازل ہو۔ نازل کرنا بھی اللہ کا کام ہے اور جس پر نازل کیا جائے اس کا انتخاب بھی اللہ ہی کا کام ہے۔ بندہ ہونے کی حیثیت میں تمہارا کام تو بس ایمان لانا ہے۔ اگر یہ قرآن آپ پر نازل نہ ہوتا کسی اور پر نازل ہوتا پھر بھی تمہیں ایمان لانا ہی پڑتا کیونکہ مقصود بالذات تو اللہ کی وحی ہے اور انبیاء اسی وحی کے داعی اور مبلغ ہوتے ہیں۔ لہٰذا تمہاری جانب سے یہ قید کہ فلاں شخص پر فلاں خاندان کے فرد پر وحی آئے تو مانیں گے اللہ کے خلاف فیصلہ، اللہ پر اپنی مرضی چلانے اور اللہ کی رحمت کو اپنی ہوائے نفس اور میلانِ طبیعت کا محکوم بنانے کے مترادف ہے۔

ف۲۴۵ - ہم تو وہ کتاب مانیں گے جو ہم پر اتاری گئی۔ ایمان کی دعوت میں ما انزل اللہ مطلق پیش فرمایا اور ان کے جواب میں یہ اضافہ فرمایا کہ کتاب وہ مانیں گے جو ہم پر اتاری گئی۔ حجتِ دعوت کو طاقتور بنانے کے لیے کیا ہے اور یہ بتانے کے لیے کہ جواب کی پوری عمارت کمزور بنیاد پر کھڑی کی گئی ہے۔ ایمان کی دعوت دینے والا اللہ کی بات کہہ رہا ہے اور یہ اس کے جواب میں اپنی بات کہہ رہے ہیں اور اس سے اشارتاً یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت یہودیوں میں دلائل سے ثابت اور شواہد سے روشن ہو چکی تھی۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ نہ کہتے۔ ان کو آپ کی نبوت میں کوئی شبہ نہ تھا ان کو تو صرف اپنی قومی عصبیت کی بیماری تھی اور یہی بیماری روپ بدل بدل کر آ رہی تھی۔

کہنا یہ چاہتے ہیں کہ ہم کوئی سلسلۂ وحی اور مسئلہ نبوت کے منکر تھوڑے ہی ہیں ہم بھی مومن ہیں اور اپنی نسلِ اسرائیل کے انبیاء کو مانتے ہیں۔

۲۴۶ - اور اس کے سوا جو کچھ ہے اس کا انکار کرتے۔ اصل الفاظ عربی قرآن کے یہ ہیں۔ وَیَکْفُرُوْنَ بِمَا وَرَاءَهٗ - عربی میں لفظ وراء اضداد میں سے ہے۔ قاضی بیضاویؒ لکھتے ہیں کہ وراء اصل میں مصدر ہے جسے بطور ظرف استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی اضافت فاعل کی طرف بھی ہوتی ہے اور مفعول کی طرف بھی۔ پہلی صورت میں مطلب ہوتا ہے چھپانے والی چیز یعنی ایسی چیز جس کی آڑ میں کوئی پوشیدہ ہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس وقت وہ چیز آگے اور چھپنے والا شخص پیچھے ہوگا۔ اس لیے وراء کے معنے پیچھے کے ہوں گے۔ دوسری صورت میں اس کے برعکس ہے۔ آدمی اس چیز کے آگے ہوگا اور وہ چیز پیچھے اس لیے وراء کے معنے اس وقت آگے کے ہیں۔ لیکن قاضی بیضاویؒ نے اس کی توجیہہ نہیں کی کہ وراء کے معنے علاوہ اور سوا کیوں آتے ہیں۔ اس فقرے کا ترجمہ اس طرح کیا جائے کہ وہ انکار کرتے ہیں اس چیز کا جو اس کے پہلے ہے یا اس چیز کا جو اس کے بعد ہے یا اس کا جو اس کے علاوہ ہے۔ پیچھے اور پہلے کے معنے تو یہاں یقیناً نہیں البتہ بعد اور سوا کے معنے بنتے ہیں۔ یعنی تورات کے سوا یا تورات کے بعد جو قرآن اور انجیل میں ہے اس کا انکار کرتے ہیں۔ یہودی تورات کے ساتھ جن صحیفوں کو مانتے ہیں ان کی تعداد ۲۲ ہے۔

تورات دراصل پانچ کتابوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ ۱۔ سفرِ تکوین، ۲۔ سفرِ خروج، ۳۔ سفرِ احبار، ۴۔ سفرِ عدد، ۵۔ سفرِ استثناء۔ یاد رہے کہ لفظ سفر بکسرِ سین ہے اور فا ساکن ہے۔ عربی میں صحیفہ اور کتاب کو کہتے ہیں۔ اس کے علاوہ دوسرے انبیاء کے صحیفے یہ ہیں۔ کتاب یوشع بن نون۔ کتاب القضاۃ۔ کتاب راعوت۔ سفرِ سموئیل اوّل۔ سفرِ سموئیل ثانی۔ سفرِ ملوک الاوّل۔ سفرِ ملوک الثانی۔ السفر الاوّل من اخبار الایام۔ السفر الثانی من اخبار الایام۔ السفر الاوّل لعزرا۔ السفر الثانی لعزرا۔ کتاب ایوب۔ زبور۔ امثالِ سلیمان۔ کتاب الجامعہ۔ کتاب نشید الانشاد۔ کتاب اشعیا۔ کتاب ارمیاء۔ مراثی ارمیا۔ کتاب خرقیل۔ کتاب دانیال۔ کتاب ہوشع۔ کتاب یوایل۔ کتاب عاموس۔ کتاب عبدیاہ۔ کتاب یونان۔ کتاب میخا۔ کتاب ناحوم۔ کتاب حیقوق۔ حلقونیا۔ کتاب حجی۔ کتاب زکریا۔ کتاب ملاخیا۔ ان صحیفوں کی تعداد ۲۲ ہے۔ تورات کی پانچ کتابوں کو کیتیم اور انبیاء کے ان صحیفوں کو نبیم کہتے ہیں۔

ان دونوں کی جو تفسیر و توضیح ائمہ یہود نے انبیاء کی زبانی یادداشت کی بنا پر کی ہے اس کا نام ترگوم یا ترجوم ہے۔

یہاں یہ بحث نہیں ہے کہ ان کتابوں کی تاریخی حیثیت کیا ہے اس کا محل سورۂ مائدہ ہے۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ ما انزل علینا میں یہودیوں کا یہ سارا ذخیرہ داخل ہے۔

یہ فقرہ ویکفرون بما وراءہ اور انکار کرتے ہیں اپنے اوپر نازل شدہ چیز کے علاوہ کا ــــ نہ یہودیوں کا مقولہ ہے اور نہ یہود کے قول کا تتمہ جیسا کہ بعض معاصر مفسرین کی رائے ہے بلکہ درحقیقت یہاں سے حق سبحانہٗ تعالیٰ شانہٗ یہودیوں کو جواب دے رہے ہیں ــــ دراصل ان کو دو جواب دیے ہیں ایک تحقیقی اور دوسرا الزامی۔ اور دونوں جوابوں کے درمیان قرآن کی حقانیت اور ہدایت کا اعلان کیا ہے۔

اس فقرے میں تحقیقی جواب یہ دیا گیا ہے کہ نؤمن بما انزل علینا میں جو انہوں نے ایمان کا دعویٰ کیا ہے یہ صرف زبانی جمع خرچ ہے ورنہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ تورات پر ایمان رکھتے ہوتے بھی وہ تورات کے منکر ہیں۔ کیونکہ تورات میں صراحتہً نبوتِ محمدیہ کی بشارات موجود ہیں۔ ان بشارات کے ہوتے ہوئے اور آپ کی نبوت کو پہچانتے ہوئے تورات کے علاوہ کا انکار کرنا اور تورات پر ایمان کا دعویٰ کرنا ایمان کا کھوکھلا نعرہ ہے۔ جن دلائل سے تورات کا حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اللہ کی جانب سے نازل ہونا ثابت ہے اس سے کہیں زیادہ طاقتور دلائل سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر قرآن کا نازل ہونا ثابت ہے تو تورات کے علاوہ کے لیے کافرانہ طرزِ عمل اختیار کر کے تورات پر ایمان کا دعویٰ مضحکہ خیز ہے۔

۲۴۷ - وہ خدا کا سچا کلام ہے۔ وھو الحق۔ اس میں قرآن کی حقانیت کا اعلان ہے اور جملہ کی اس ساخت کے ذریعے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمہاری جانب سے کفر کا ظہور اب ہوا ہے لیکن قرآن کی حقانیت تو تمہارے کافرانہ طرزِ عمل کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ثابت ہے۔ معنے میں یہ لطافت جملہ حالیہ آنے کی وجہ سے پیدا ہوئی ہے۔ دلائل الاعجاز میں عبدالقاہر نے اس کی تصریح کی ہے اور اس کے ساتھ دوسری معنوی لطافت یہ رکھی گئی ہے کہ جملہ ایسا لاتے ہیں کہ جس کے دونوں حصے معرفہ ہیں۔ عربی میں اس قسم کی ترکیب قصر کا فائدہ دیتی ہے۔ قصر کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے بس یہی ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ قرآن میں حق ہی حق ہے حق کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور عربی میں لفظ حق کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے یعنی جو بات ثابت ہوا ٹل ہو، امنٹ ہو اسے حق کہیں گے۔ اور یہ لفظ دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ مصدر اور صفت مشبہ۔ اگر یہاں مصدر ہے تو مطلب یہ ہے کہ قرآن سراپا حق ہے اور اس کی حقیقت میں زمانہ کی کوئی قید نہیں ہے اور اگر صفت مشبہ ہے تو مطلب یہ ہے کہ اس کی حقیقت میں دوام اور ثبوت ہے۔ دنیا میں ایسی

کوئی کتاب نہیں جو اس کی ہمسر و ہم پلہ ہو۔

۲۴۸ ـــــہ ۔ اور وہ اس تعلیم کی تصدیق و تائید کرتا ہے جو ان کے پاس موجود ہے۔ اس کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ قرآن کا تعلق اس علمی سرمایہ کے ساتھ جسے تم ما انزل علینا۔ کہہ رہے ہو منافات کا نہیں بلکہ اس کا رشتہ ان سے اتحاد و تصدیق کا ہے۔ یہ کہہ کر قرآن نے جتایا ہے کہ تمہارا قرآن سے کفر کرنا اس بنا پر تورات سے کفر کے مترادف ہے۔

یہاں بھی زمخشریؒ نے بتایا ہے کہ جملہ اسمیہ کے بعد جو حال لایا جاتا ہے وہ سابقہ جملہ کے مضمون میں زور اور تاکید کے لیے لایا جاتا ہے۔ پہلا جملہ ھو الحق کا مضمون قرآن کی حقانیت ہے۔ اس جملہ میں یہ کہہ کر کہ قرآن تمہارے علمی سرمایہ کی تصدیق کرتا ہے قرآن کی حقانیت میں اور زیادہ قوت پیدا کر دی ہے اور قرآن کے یہ دو وصف کہ وہ حق ہے اور مصدق ہے ان دونوں نے الگ الگ بھی اور مل کر اپنے سے پہلے جملہ کے مضمون یعنی یہودیوں کے کفر کو سنگین بنا دیا ہے۔

۲۴۹ ـــــہ ۔ یہ قرآن نے یہودیوں کو اس بات کا کہ ہم تو وہ کتاب مانتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی ہے دوسرا جواب دیا ہے۔ پہلا جواب تحقیقی تھا یہ جواب الزامی ہے۔ فرمایا کہ اچھا اگر واقعی تم اپنی کتاب پر ایمان رکھتے ہو تو بتاؤ کہ تم پر نازل شدہ کتاب میں کہاں یہ تم کو کہا گیا ہے کہ انبیاء کو قتل کیا کرو۔ تمہارا نبیوں کو قتل کرنا ہی اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ تم کتاب پر ایمان کے دعوے میں جھوٹے ہو۔

اس جواب کو الزامی ہونے کی وجہ سے پہلے جواب سے الگ کر دیا اور فرمایا کہ قُل اے پیغمبر ان سے کہو کہ اگر تم تورات پر ایمان رکھتے ہو تو پھر تم نے انبیاء کو کیوں قتل کیا کیونکہ تورات میں یہ حکم ہے کہ جو نبی تورات کو سچا کہنے والا ہو اس کی نصرت کرنا اور اس پر ضرور ایمان لانا۔ اور قتل بھی ان انبیاء کو کیا جو پہلے گزر چکے ہیں جو تورات پر عمل کرنے تھے اور اس کی ترویج کے لیے مبعوث ہوئے تھے ان کے مصدق ہونے میں تو بیوقوف بھی تامل نہیں کر سکتا۔ یہ بات لفظ قبل سے ٹپک رہی ہے[1]

گویا قرآن نے یہود کو یہ جواب دیا ہے کہ خود یہی دعویٰ تمہارا کب صحیح ہے کہ تم اپنی قوم کے انبیاء پر ایمان رکھتے ہو جیسا کہ ما انزل علینا کے مدلول سے معلوم ہو رہا ہے۔ ایمان تو الگ رہا تم نے

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۱۸

وَلَقَدْ جَآءَكُمْ مُّوْسٰى بِالْبَيِّنٰتِ ثُمَّ اتَّخَذْتُمُ الْعِجْلَ مِنْۢ بَعْدِهٖ وَ اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ ﴿۹۲﴾

اور پھر دیکھو یہ واقعہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام سچائی کی روشن دلیلوں[۲۵۰] کے ساتھ تمہارے پاس آئے پھر بھی تم نے[۲۵۱] موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد بچھڑے کو اختیار کر لیا اور تم تو ہو ہی[۲۵۲] ظلم پیشہ لوگ۔

خود اس زور شور سے ان کی تکذیب کی اور ان کی مخالفت و عداوت پر اس حد تک اتر آئے کہ ان کو قتل کر ڈالا اور تمہاری قومی تاریخ کے صفحات تو اس سے رنگین ہیں[۱]

حق گریز ایمان

اس آیت میں یہودیوں کے اس موقف کا کہ ہم تو اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتارا گیا ہے یہ تیسرا جواب ہے۔ پہلے بھی یہ واقعہ آچکا ہے وہاں انعامات پر ناشکری جتانے کے لیے یہ واقعہ آیا تھا اور یہاں اس شبہ کا جواب دینے کے لیے یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے کہ ہم تو بس اسی قومی اور علمی سرمایہ کو مانتے ہیں جو ہم پر نازل کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں الزاماً کہا گیا ہے کہ تمہارے ایمان کے کھوکھلے پن کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ تم اپنے علمی سرمایہ کے لانے والوں کو قتل کرتے رہو۔ یہ تو اس علمی سرمایہ لانے والوں کے ساتھ معاملہ تھا خود تمہارا اپنے پیغمبر کی تعلیمات کے ساتھ کیا برتاؤ تھا اس کا اندازہ اس کردار سے ہوتا ہے جو یہاں پیش کیا جا رہا ہے۔

۲۵۰۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام روشن دلیلوں کے ساتھ تمہارے پاس آئے۔ یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام جن کی شریعت پر تم قائم ہو اور جن کی شریعت کی وجہ سے دوسری سچی شریعتوں کا انکار کر رہے ہو خود انہوں نے تمہیں کھلے کھلے معجزے دکھائے مگر جب چند دن کے لیے کوہ طور پر گئے

---

[۱] تفسیر ماجدی ص ۳۶

تو اتنے ہی میں تم نے بچھڑے کو معبود بنا لیا تھا حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے درجہ نبوت پر فائز زندہ موجود تھے تو اس وقت تمہارا حضرت موسیٰ علیہ السلام کی شریعت پر ایمان کہاں جاتا رہا تھا یعنی اب تو ما انزل علینا کا بے جان نعرہ لگا رہے ہو اور دعویٰ کر رہے ہو اُس وقت تمہارے اس دعوے کو کیوں گھن لگ گیا تھا) اور اب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے بغض و عناد، شریعتِ موسوی کی پیروی اور ما انزل علینا پر ایمان کا کس مُنہ سے دعویٰ کرتے ہو؟

حضرت موسیٰ علیہ السلام کھلی نشانیاں کیا لے کر آئے تھے؟ عام مفسرین کی رائے یہی ہے کہ ان نشانیوں سے مراد عصا، ید بیضا اور دریا کا پھاڑنا وغیرہ ہے۔ آلوسیؒ، قرطبیؒ، ابن جریرؒ اور ابن کثیرؒ کی بھی رائے ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان واضح نشانیوں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا رسُول ہونا تمہیں معلوم ہو چکا تھا اس کے باوجود تم نے جادۂ توحید چھوڑ کر گوسالہ پرستی شروع کر دی تھی۔ کیا یہ کام تم نے اس لیے کیا تھا کہ یہ ما انزل علینا پر ایمان کا مطالبہ تھا ظاہر ہے کہ یہ معجزات حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کے مقابلے میں تھے اور یہاں جاءکم بالبینات سے یہ اشارہ نکلتا ہے کہ یہ معجزاتِ موسوی خود بنی اسرائیل کے لیے ہی تھے اس لیے اگر معجزات سے وہ آیات مراد ہوں جو وادی تیہ میں خالص بنی اسرائیل کے لیے ظاہر ہوئے مثلاً بادلوں کا سایہ کرنا، من و سلویٰ کا اترنا اور پانی کی فراہمی جن کا ذکر پہلے آ چکا ہے تو بات میں زیادہ وزن پیدا ہو جاتا ہے۔

نیز لفظ بینات صفت ہے اس کا موصوف آیات ہے دونوں کو ملا کر روشن دلائل معنے ہیں لیکن آیات کے معنے صرف ان دلائل کے ہی نہیں جو دعویٰ نبوت کے مؤید ہوں آیات بمعنی احکام بھی آتا ہے اور یہ قرآن کا عام استعمال ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ نے تم سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وساطت سے دیے گئے احکام عشرہ میں اللہ کی عبادت کرنے اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنانے کا عہد لیا تھا لیکن تم نے اس کے باوجود پھر بھی یہ مشرکانہ طرزِ عمل اختیار کیا تھا۔ اب تم خود بتاؤ کہ تمہارے ایمان کی قیمت کیا ہے؟ اور یہ کہنا تمہارا کہاں تک درست ہے کہ ہم تو صرف اسی بات پر ایمان لائیں گے جو ہم پر اُتری ہے۔ کیا البینات کی صورت میں جو احکام لاتے تھے وہ تم پر نہیں اترے تھے؟

لے حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۸

۲۵۱
سے ۔ موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد ۔ یہ من بعدہ کا ترجمہ ہے ۔ عام مفسرین نے اس کے معنے یہی بتائے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کوہ طور پر جانے کے بعد یعنی ان کی غیر حاضری کے زمانہ میں ۔ لیکن آلوسیؒ نے روح المعانی میں بتایا ہے کہ اس آیت سے مراد یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے آنے کے بعد یہ کام تم نے کیا ہے ۔ یعنی باوجودیکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام تمہارے پاس اللہ کا یہ حکم لے کر آچکے تھے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرنا ۔ پھر تمہارا کردار یہ تھا ۔ اس صورت میں ثُمَّ (پھر) صرف وقت کے تاخر کو بتانے کے لیے نہیں بلکہ یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ تم کیسی پستی میں اتر گئے اور یہ جتانے کے لیے کہ یہ کام تم نے اس وقت کیا جب تمہارے پاس اس کرتوت کے نہ کرنے کے پورے دلائل اور شواہد موجود تھے ۔ آلوسی بغدادیؒ نے اسی معنویت کو ظاہر کرنے کی خاطر لکھا ہے کہ یہاں ثُمَّ استبعاد کے لیے ہے ۔

۲۵۲
سے ۔ اور تم تو ہو ہی ظلم پیشہ لوگ ۔ شرک سے بڑا ظلم اور کون سا ہوگا؟ جملہ کی موجودہ ساخت یہ بتانے کے لیے ہے کہ جو کچھ اس وقت کیا کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی نبوت کو مان کر گوسالہ پرستی کی ، یہ بھی ظلم تھا اور جو کچھ اب کر رہے ہو کہ تورات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارتیں پڑھنے اور پڑھنے کے بعد آپ کو پہچان لینے کے باوجود آپ کی نبوت کا اور قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا انکار کر رہے ہو یہ بھی ظلم ہے ۔ گویا اس قسم کا طرزِ عمل تمہاری تاریخ ملی میں تمہارا آخری نشان ہے ۔

اس تیسرے جواب کا حاصل یہ ہے کہ نبوت کو نہ ماننے کے لیے تمہارا یہ عذر کہ ہم تو صرف وہی بات مانیں گے جو ہم پر اتری ہے عذر لنگ ہے ۔ کیونکہ تم اپنے قومی اور نسلی پیغمبر حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ یہی سلوک کر چکے ہو ۔ ان کو نبی مان کر ان کے احکام کو پائے استحقار سے ٹھکرا چکے ہو ۔ اس لیے تمہارے اس کہنے کی اس کردار کی موجودگی میں اس کے سوا کوئی عقلی توجیہہ نہیں ہے کہ وہ بھی ظلم تھا اور یہ بھی ظلم ہے ۔ اُس ظلم کی پاداش میں تمہارے اسلاف سزا بھگت چکے ہیں اور اس ظلم کی پاداش میں تمہیں بھی سزا بھگتنے کے لیے تیار ہو جانا چاہیے کیونکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ ظلم کے حصہ میں فلاح و کامیابی نہیں ہے یعنی ظلم کرنے والوں پر کامیابی و سعادت کی راہ نہیں کھلتی ہے پہلے بھی تم سے کہا گیا تھا کہ ظَلَمْتُمْ اَنْفُسَكُمْ فَتُوْبُوْا اِلٰى بَارِئِكُمْ اور آج بھی تم اَنْتُمْ ظٰلِمُوْنَ کا مصداق ہو اور تم سے کہا جا رہا ہے اٰمِنُوْا بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ اللہ کی نازل کردہ کتاب پر ایمان لاؤ ۔ توبہ اور انابت کا دروازہ کھلا ہوا ہے ۔ توبہ و انابت کا احساس اپنے اندر اجاگر کرو اور اللہ کی نازل کردہ

وَإِذْ أَخَذْنَا مِيثَاقَكُمْ وَرَفَعْنَا فَوْقَكُمُ الطُّورَ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم بِقُوَّةٍ وَ
اسْمَعُوا ۖ قَالُوا سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا وَأُشْرِبُوا فِي قُلُوبِهِمُ الْعِجْلَ بِكُفْرِهِمْ ۚ
قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُم بِهِ إِيمَانُكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٩٣﴾

اور دیکھو جب ہم نے تم پر کوہِ طور کو بلند کر کے عہد لیا تھا کہ جو کتاب ہم نے تم کو دی ہے اس پر مضبوطی سے جم جاؤ اور اس کے حکموں پر دھیان دو۔[253] تمہارے اسلاف نے اس کے بعد کیا کیا یہی نا کہ زبانِ قال سے کہا کہ ہم نے مان لیا۔[254] اور زبانِ حال سے کہا کہ ہم نے نہیں مانا۔ اور اُن کے کفر کی وجہ سے اُن کے دلوں میں بس بچھڑا ہی[255] رچ بس گیا تھا۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم جس ایمان[256] کا دعویٰ کرتے ہو اگر یہی وہ ایمان ہے تو تف ہے اس ایمان پر کیسی بدترین راہ پر تمہیں لے جا رہا ہے۔

کتاب پر ایمان لے آؤ۔ رحمتِ الٰہی قبولیت کا دروازہ کھول دے گی اور تمہارے اشکِ ندامت کا ایک قطرہ بدعملیوں، گناہوں کے بے شمار داغ اور دھبے اس طرح دھو دے گا گویا تمہارے دامنِ عمل پر کوئی دھبہ لگا ہی نہ تھا۔

مسندِ احمد میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ حضرت عمرو بن العاصؓ کہتے ہیں کہ جب اللہ نے میرے دل میں اسلام کی حقانیت ڈال دی تو میں آپؐ کی خدمت میں حاضر ہوا کہ آپؐ مجھے حلقہ بگوش اسلام کر لیں۔ آپؐ نے اپنا ہاتھ بیعت کے لیے میری طرف کیا۔ میں نے عرض کیا میں اس وقت تک آپ سے بیعت نہ کروں گا جب تک میرے پچھلے گناہ معاف نہ ہو جائیں۔ آپؐ نے فرمایا اے عمرو کیا تمہیں پتہ نہیں ہے کہ اسلام پچھلے تمام گناہوں کا نقشہ پاک کر دیتا ہے۔

قرآن نے بھی عفو و کرم کے اس قانون کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَا قَدْ سَلَفَ۔ اگر وہ باز آ جائیں تو پچھلے گناہ سارے معاف ہو جائیں گے۔

جو نبوت سب کے لیے آئی تھی اور ہمیشہ کے لیے تھی یعنی رسالتِ محمدیہ اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ تمام مذاہب کی سب سے زیادہ مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے۔ اس لیے

نبوّتِ محمدیہ کا اعلان ہے کہ ہر ملک و ملت، ہر نسل و رنگ کا جو گنہگار بھی اس کی آغوش میں آجائے گا وہ اس کے گناہوں کی مغفرت اور نجاتِ ابدی کے لیے ضامن ہو گی۔

بدترین ایمان

یہ یہودیوں کے اس موقف کا کہ ہم تو صرف وہ کتاب مانیں گے جو ہم پر اُتری ہے چوتھا جواب ہے اور اس جواب میں ان کے اس دعوے کا پورا پوسٹ مارٹم کرکے بتایا ہے کہ اس ایمان پر نازاں ہو جس کے ساتھ تاریخ کی ساری بُرائیاں چپکی ہوئی ہیں۔ قرآن نے اس آیت میں بتایا ہے کہ تمہارا تو خود اپنی کتاب کے بارے میں یہ روّیہ رہا ہے کہ تم اسے صرف زبان کی حد تک مانتے تھے اور زندگی کے احوال و ظروف میں اس کی کھلم کھلا نافرمانی اور بغاوت کرتے تھے۔ اس طرح ایمان و کفر کی دو متضاد حقیقتیں تم اپنے دامن میں جمع کرکے زبانِ قال سے ایمان کا دعویٰ کرتے اور زبانِ حال سے اس کا انکار کرتے تھے۔ اسی کافرانہ طرزِ عمل کے نتیجہ میں تمہارے دلوں میں گوسالہ پرستی نے گھر کر لیا تھا اور بچھڑے کی محبت تمہاری پوری زندگی کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکی تھی جن کا روّیہ ما انزل علینا کے بارے میں یہ ہو ان کو نبوّتِ محمدیہ کے مقابلے میں یہ کہنا کب سجتا ہے کہ ہم صرف وہ کتاب مانیں گے جو ہم پر اتاری گئی ہے۔

۲۵۴ ۔ تورات کی حد تک ان کے ایمان کا حال یہ ہے کہ احکامِ تورات دیتے وقت ان سے کہا گیا تھا کہ اس کو پوری قوت اور ہمت سے مضبوط پکڑو۔ چونکہ پہاڑ سر پر معلق تھا، جان کے اندیشہ سے تو زبان سے کہہ لیا سَمِعْنَا یعنی تورات کے احکام ہم نے سُن لیے اور دل سے مابعد میں کہا عَصَيْنَا یعنی ہم نے قبول نہیں کیا۔ اور وجہ اس کی یہ تھی کہ صورت پرستی ان کے دل میں راسخ ہو چکی تھی ان کے کفر کے باعث۔ وہ زنگ ان کے دل سے زائل نہیں ہوا بلکہ رفتہ رفتہ بڑھتا گیا[1]

آیت میں اسمعوا آیا ہے۔ یہ سمع سے بنا ہے اس کے معنے صرف سننے کے نہیں بلکہ ماننے، قبول کرنے اور عمل کرنے کے بھی ہیں۔ اسی لیے نماز میں سمع اللّٰہ لمن حمدہ ہے اس

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۸

کے معنے ہیں جس شخص نے اللہ کی حمد نماز میں بحالتِ قیام کی ہے امام سر اُٹھا کر مقتدیوں کو یہ خوش خبری سناتا ہے کہ اللہ نے اس کی حمد قبول فرمالی ہے۔ حافظ ابن القیمؒ نے بدائع الفوائد میں یہی معنے بتائے ہیں۔ شاید یہ علمی لطیفہ آپ یہاں سُن کر خوش ہوں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نماز باجماعت میں امام اور مقتدی دونوں کے لیے ذکر کا پیمانہ الگ الگ مقرر فرمایا ہے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے۔

اذا قال الامام سمع اللہ لمن حمدہ فقولو ربنا لک الحمد

جب امام سمع اللہ لمن حمدہ کہے تو تم ربنا لک الحمد کہو۔

یعنی امام کو سمع اللہ لمن حمدہ کہنا چاہیے اور مقتدی کو ربنا لک الحمد۔ امام جس حمد کے اللہ کے یہاں مقبول ہونے کی بشارت دیتا ہے وہ وہی ہے جو امام نماز میں بحالتِ قیام سورۂ فاتحہ کی شکل میں اللہ کی جناب میں پیش کرتا ہے۔ لطیفہ کی بات یہ ہے کہ اگر نماز میں سورۂ فاتحہ پڑھنے کا مطالبہ مقتدیوں سے بھی ہوتا تو پھر سمع اللہ لمن حمدہ کہنے کا صرف امام کو حکم نہ ہوتا بلکہ مقتدیوں سے کہا جاتا کہ جب تم رکوع سے سر اُٹھاؤ تو سمع اللہ لمن حمدہ کہو لیکن ایسا کیونکر ہوتا۔ مقتدی یہ کہہ کر مژدہ کسے سناتا؟ مقتدی امام سے یہ جانفزا مژدہ سنتے ہیں تو ربنا لک الحمد کہتے ہیں۔ بہرحال یہاں اسمعوا کے معنے قرطبی نے ماننے اور قبول کرنے کے بتائے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کتابِ الٰہی پر عمل کرنا، اطاعت کرنا اور زندگی میں عمل کی پذیرائی دینا۔

۲۵۴ ۔ زبانِ قال سے کہا کہ ہم نے مان لیا اور زبانِ حال سے کہا کہ ہم نے نہیں مانا۔ ایمان و کفر کا یہ اجتماع یہودیوں کی پوری تاریخ میں موجود ہے لیکن قرآن ان کی قومی تاریخ کے منبع کی نشاندہی کر رہا ہے۔

آیت سے یہ لازم نہیں آتا کہ عصینا (ہم نے نہیں مانا) ان لوگوں نے زبان سے کہا ہو بلکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ آیت میں قالوا (انہوں نے کہا) بھی مجازی معنے میں زبانِ حال سے کہنے کے معنے میں ہے۔ قول کا لفظ عربی زبان میں وسیع معنے رکھتا ہے۔ زبان سے بولنا اس کے لیے ضروری نہیں ہے۔ امام راغبؒ نے مفردات میں خود قرآن سے اس کے ایک سے زیادہ معانی کی نشاندہی کی ہے لیکن ان سرکشوں اور گستاخوں نے یہ لفظ زبان سے ہی بول دیا ہو تو حیرت کی کوئی بات نہیں ہے[1]۔

قرطبیؒ نے لکھا ہے کہ اس کے ذریعے قرآن یہودیوں کے اس دعویٰ کو کہ ہم صرف وہ مانیں گے جو ہم پر اتاری گئی ہو۔ تار تار کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ ان کی تاریخ گواہ ہے کہ انہوں نے کبھی بھی ما انزل علینا

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۲۰۴

کو قبول نہیں کیا ۔

۲۵۵ ۔ ان کے دلوں میں بس بچھڑا رچ گیا ہے ۔ اصل عربی اُشْرِبُوا فِیْ قُلُوْبِهِمُ الْعِجْلَ ہے مطلب یہ ہے کہ بچھڑے کی محبت ان کی رگ رگ میں رچی گھلی ہوئی اور دل کی گہرائیوں میں بسی ہوئی ہے جیسے پانی رگ رگ میں پہنچ کر جزو بدن بن جاتا ہے ایسے ہی بچھڑے کی محبت ان کے دلوں میں رچ کر ان کے جسم قومیت کے لیے جزو بدن بن گئی ہے اور اس کے بعد بکفرھم کا اضافہ یہ بتانے کے لیے کہ گوسالہ پرستی سے یہ شدید تعلق نتیجہ ہے مصر میں فراعنہ کے تحت کافرانہ زندگی بسر کرنے کا ۔ یہ قرآن کی ایک انوکھی اور بڑی ہی دلکش تعبیر ہے ۔ اس میں کہا گیا ہے کہ ان کے دلوں کو بچھڑے کی محبت پلادی گئی ۔ اس تعبیر کے ذریعے ان پر ایک شدید طنز کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان کو بچھڑے سے ایسا شدید لگاؤ ہے کہ گویا اُن کے دلوں کو اس کی محبت پلا کر سیراب کر دیا گیا ہو ۔ یہ تعبیر ایک بلیغ اعجاز اور انداز بیان کی ایک دلکش مثال ہے[1]

۲۵۶ ۔ کہہ دو کہ جس ایمان کا تم دعویٰ کرتے ہو اگر وہ ہی ایمان ہے تو تف ہے اس ایمان پر کیسی بدترین راہ پر تم کو چلا رہا ہے ۔ آیت کا یہی حصہ سارے جواب کی جان ہے ۔ یعنی اگر تمہارے اس دعویٰ میں کہ نؤمن بما انزل علینا ہم تو اس کتاب پر ایمان لائیں گے جو ہم پر اتری ہے ۔ یہی ایمان مراد ہے تو ایسے ایمان کی قیمت کیا ہے جو تم کو قتل انبیا ۔ اور گوسالہ پرستی جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب کرنے کی ہدایت کرتا ہے ۔ ایمان وعمل میں تو ہم آہنگی اور ربط ضروری ہے ۔ باطن وظاہر بالکل جُدا گانہ عالم نہیں کہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں ۔ اگر اعتقاد باطن اعمال ظاہر چاہتا ہے تو اعمال ظاہر اعتقادِ باطن کے ممد ومعاون ہوتے ہیں ۔ دیکھو اگر ایک شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ یتیم پر رحم انسانی فرض ہے تو اس کے اس عقیدہ کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ وہ یتیم کے لیے مجسم ہمدردی ودلسوزی بن جائے ۔ پھر اس کے اعضا وجوارح اس دلسوزی کے لیے حرکت کرنے لگتے ہیں تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے دل میں ایک روحانیت داخل ہو رہی ہے اور جتنا جتنا اس کا یہ مہربانی وکرم گستری کا عمل ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر اس کے دل میں شفقت ورحمت کی نورانیت رونما ہوتی جاتی ہے ۔ الغرض تمام صفات قلبیہ کا یہی حال ہے کہ وہ انسان کو جنبش عمل کے لیے بے چین کر دیتی ہیں ۔ اور جب انسان معروف ... ن ہو جاتا ہے تو اس کے آثار لوٹ کر پھر ان صفات کو اور روشن کرتے ہیں ۔ ایمان

---

[1] فی ظلال القرآن ص ۱۱۶

بھی دل کا ایک عمل ہے۔ اس کا تقاضہ یہ ہے کہ انسانی زندگی توحیدِ خالص اور تصدیقِ رسالت کی اپنے عمل سے گواہی دے۔ صرف زبانی دعویٰ اور بلند بانگ نعرہ اس گواہی کے لیے کافی نہیں ہے۔ امام حسن بصریؒ نے کیا اچھی بات فرمائی ہے۔

ایمان صرف ارادوں، ولولوں اور ظاہری ٹیپ ٹاپ کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان یہ ہے کہ بات دل میں سرایت کر جائے اور اعمال اس کی گواہی دیں۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ عمل انسان کی قلبی کیفیت کا آئینہ ہوتا ہے۔ اگر وہ نیک عمل کرتا ہے تو یہ اس کے ایمان کی دلیل ہوگی ورنہ بدعملی خود اس کی بے ایمانی کی شاہد بن جاتے گی۔

عبدالملک بن مروان نے سعید بن جبیرؓ سے دریافت کیا کہ ایمان باللہ کیا ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ایمان تصدیق کو کہتے ہیں مگر تصدیق کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے حرف حرف پر عمل ہو اور جتنی کوتاہی رہ جاتے وہ گناہ منظر آئے اس پر استغفار کرے اور آئندہ اصرار نہ ہو۔ ایسا نہ ہو۔ ایمان کا امتحان عمل میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے۔ امام زہریؒ فرماتے ہیں کہ اسلام اقرار کا نام ہے اور ایمان عمل کا۔ یہ دونوں آپس میں رفیق ہیں۔ ہر شخص کا قول و عمل تولا جائے گا۔ اگر اس کا عمل وزنی ہو تو ہر قول مقبول ہوگا اور اگر بات وزنی ہو تو عمل کو شرفِ قبول نہ ملے گا۔ ایسا ایمان جو انسان کو برائیوں پر ابھارتا ہو، ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت کو تعلیم دیتا ہو، انبیاء کا گستاخ اور بے ادب ہو، ان کی تکذیب کرتا ہو حتیٰ کہ اپنے مفادات سے تصادم کے وقت انبیاء کے قتل پر بھی ابھارتا ہو، ہرگز ایمان نہیں ہے۔ اگر یہ ایمان ہے تو پھر کائنات میں بے ایمانی کا کوئی وجود نہیں ہے۔ قرآن نے اسی صورتِ حال کا جس دلکش انداز میں نقشہ پیش کیا ہے وہ قرآن ہی کا حصہ ہے

قُلْ بِئْسَمَا يَأْمُرُكُمْ بِهِ إِيمَانُكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ

یہ وہ انفرادی عصیان نہیں ہے جو ایمان کے مقابلے میں فسق کہلاتا ہے۔ یہ وہ اجتماعی عصیان ہے جس کی بادِ صرصر شمعِ تصدیق کو گل کر دیتی ہے۔ یہودی اجتماعی طور پر خیال کرتے تھے کہ ہماری نسبتیں، ہمارے انبیاء سے نسلی رشتے، ہماری رسمیں اور ہمارا یہودی ہونا بس ہماری نجات و فلاح کے لیے کافی ہے۔ اور اس غرّے میں ایسے بدمست ہو گئے تھے کہ دنیا کی ہر برائی من حیث القوم ان سے وابستہ ہو کر رہ گئی تھی۔ اور اس حالت میں وہ دعویٰ کر رہے تھے کہ نؤمن بما انزل علینا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اگر یہی کچھ ایمان ہے جو زندگی کی ساری برائیو کی تمہارے لیے گنجائش پیدا کرتا

قُلْ اِنْ كَانَتْ لَكُمُ الدَّارُ الْاٰخِرَةُ عِنْدَ اللّٰهِ خَالِصَةً مِّنْ دُوْنِ النَّاسِ
فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۹۴﴾ وَلَنْ يَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًۢا بِمَا قَدَّمَتْ
اَيْدِيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿۹۵﴾ وَلَتَجِدَنَّهُمْ اَحْرَصَ النَّاسِ عَلٰى
حَيٰوةٍ ۚ وَمِنَ الَّذِيْنَ اَشْرَكُوْا ۚ يَوَدُّ اَحَدُهُمْ لَوْ يُعَمَّرُ اَلْفَ سَنَةٍ ۚ وَمَا هُوَ
بِمُزَحْزِحِهٖ مِنَ الْعَذَابِ اَنْ يُّعَمَّرَ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۹۶﴾

ان سے کہو اے پیغمبر! اگر واقعی اللہ کے نزدیک آخرت[۲۵۷] کا گھر تمام انسانوں کو چھوڑ کر صرف تمہارے ہی لیے ہے پھر تمہیں موت[۲۵۸] کی تمنا کرنی چاہیے۔ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ آخرت صرف تمہارے ہی حصے میں آئی ہے۔ یقین[۲۵۹] مانو کہ یہ لوگ کبھی اپنی پیش رفت بدعملیوں کی وجہ سے اس کی تمنا نہ کریں گے۔ اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے۔ اور پھر اتنا ہی نہیں بلکہ ان کو زندگی کا لوگوں میں سب[۲۶۰] سے زیادہ حریص پاؤ گے حتیٰ کہ مشرکین سے بھی زیادہ۔ ان میں سے ایک ایک شخص یہ چاہتا ہے کہ کاش اسے ہزار[۲۶۱] سال کی عمر مل جائے حالانکہ عمر کی درازی انہیں عذاب آخرت سے نجات نہیں دلائے گی۔ اور اللہ ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

ہے تو اس سے بدتر اور کیا چیز ہو سکتی ہے۔

بنی اسرائیل کو دعوتِ مباہلہ

دلائل کی ہر قسم پیش کرنے اور ان کے ایمان کے دعوے، نعرے کا پورے طور پر کھوکھلا پن کھلم کھلا ظاہر کر دینے کے بعد اب مرحلہ ایسا آ گیا کہ قرآن نے ان کے ایمان کے دعویٰ کا آخری اور فیصلہ کن طریقہ استعمال کرنے کی نبوت کو ہدایت کی ہے اور یہ ہدایت بالکل اس نوع کی ہے جیسے اس سے پہلے قرآن کے کتابِ الٰہی ہونے کے لیے پیش کی تھی کہ

وَإِن كُنتُمْ فِي رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلَىٰ عَبْدِنَا فَأْتُوا بِسُورَةٍ مِّن مِّثْلِهِ

اور دُنیا اس کے مقابلے میں نہ صرف یہ کہ خود ہی عاجز آگئی تھی بلکہ قرآن نے دُنیا کے عجز کی یہ کہہ کر پیش گوئی کردی کہ لَن تَفعَلُوا کہ تم ایسا ہرگز نہ کر سکو گے۔ ٹھیک ایسے ہی یہاں بھی جب قرآن نے ان کو سمجھانے کے لیے اقناعی اور الزامی جوابات دیے اور اس کے باوجود ان کے کفر میں سرمو کوئی فرق نہ آیا تو بات آخری منزل پر پہنچ گئی۔ بالکل آخر میں قرآن نے اپنے مخاطب بنی اسرائیل کو نبوت کی زبان سے مباہلہ کی دعوت دے دی۔ آؤ دلائل سے نہیں مانتے تو ایمان ویقین کی صداقت پر مباہلہ کر لو تاکہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم ہو کر دُودھ کا دُودھ اور پانی کا پانی ہو جائے۔ مباہلہ کا موضوع یہودیوں کا یہ دعویٰ تھا کہ پوری کائناتِ انسانی میں اللہ کے دوست صرف یہودی ہیں اور کوئی نہیں۔ وہ اللہ کے چہیتے ہیں اور اللہ کے دوست ہیں۔ وہی جنت میں جائیں گے اور کوئی نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ دُعا اس پر ہونی تھی کہ جو بھی جھوٹا ہو وہ موت کی تمنا کرے یعنی اللہ سے اپنے لیے موت مانگے۔ اس چیلنج کے لیے قرآن نے فیصلہ کن انداز میں یہ بھی بتا دیا کہ وہ کبھی بھی اس مباہلہ کو تسلیم نہیں کریں گے اور موت کی ہرگز تمنا نہ کریں گے کیونکہ ان کو خوب معلوم ہے کہ وہ جھوٹے ہیں۔ ان کو ڈر ہے کہ کہیں اللہ ان کی دُعا کو قبول ہی نہ کرلے۔

ان آیات کی بیک وقت دو حیثیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ آیات تحدی ہیں کیونکہ ان میں یہودیوں کو چیلنج کیا گیا ہے کہ اگر وہی خدا کے چہیتے ہیں اور جنت ان کے لیے مخصوص ہے تو وہ ہمت سے کام لیں اور مرنے کی تمنا کریں اور اللہ سے موت مانگیں۔ چونکہ جنت صرف مرنے کے بعد نصیب ہو سکتی ہے اور جن لوگوں کو اس کے ملنے کا یقین ہو وہ اس کے لیے جان دینے سے دریغ نہیں کر سکتے۔ لیکن باوجود اس کے کہ یہودی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کے لیے ہر ممکن کوشش کرتے اور آرزوئے موت ان کے لیے ممکن تھی تاہم قرآن کی پیش گوئی پوری ہوئی اور آج تک کسی یہودی نے لقائے الٰہی کی آرزو میں جان نہیں دی۔

دوسرے یہ کہ آیات مباہلہ ہیں۔ کیونکہ ان آیات میں یہودیوں کو مباہلہ کی دعوت دی گئی ہے مگر انہیں مقابلہ کی جرأت نہ ہوئی۔ اس طرح ان کے جھوٹ کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ گیا۔

۲۵۷ ؎۔ یہود کہتے تھے کہ جنت میں ہمارے سوا کوئی نہ جائے گا اور ہم کو عذاب نہ ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر یقینی بہشتی ہو تو مرنے سے کیوں ڈرتے ہو۔ ؎

؎ حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۸

بنی اسرائیل کے اس بنیادی عقیدہ کہ آخرت ان ہی کے لیے ہے کا ابتدائی خاکہ تو خود تورات میں موجود ہے مثلاً تم خداوند خدا کے فرزند ہو۔ (استثناء ۱۴-۱) تو خداوند اپنے خدا کے لیے مقدس قوم ہے اور خداوند نے تجھے چن لیا ہے۔ تاکہ سب قوموں کی بہ نسبت جو زمین پر ہیں تو اس کے لیے خاص قوم ہو (استثناء ۱۴-۲) رفتہ رفتہ یہ عقیدہ ترقی کرکے اس درجے تک پہنچ گیا کہ یہود اپنے سوا کسی کو جنت کا مستحق ہی نہیں سمجھتے تھے اور نجاتِ اخروی کو اپنا خاص حق سمجھنے لگے۔ اپنے کو خدا کا محبوب خدا کا لاڈلا اور چہیتا فرزند قرار دینے لگے تھے اور خیال یہ جما لیا تھا کہ خداوند خدا کا جو معاملہ ہماری قوم و نسل کے ساتھ ہے وہ دُنیا میں کسی اور کے ساتھ نہیں ہے۔

۲۵۸۔ تمہیں موت کی تمنا کرنی چاہیے۔ اصل میں فَتَمَنَّوُا الْمَوْتَ کا فقرہ آیا ہے۔ تمنّی کے معنے خیال باندھنے اور آرزو کرنے کے ہیں۔ امام راغبؒ کہتے ہیں کہ تمنّی کے معنے دل میں اندازہ کرنا اور اس کا خیال باندھنا۔ اس کے معنے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے موت کی دُعا مانگنے کے منقول ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آؤ دونوں مل کر جھوٹے کے لیے موت کی دُعا کریں۔ اگر تم مقبولِ الٰہی ہو جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے تو اللہ تعالیٰ تمہاری دُعا قبول کرے گا۔ بعض نے فتمنوا الموت میں موت کی آرزو کرنے سے اپنی ہی موت کی آرزو مراد لی ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ مومن موت سے خائف نہیں ہوتا مگر تم موت سے خائف ہو۔ اسی مطلب کی تائید میں مولانا عثمانی "فرماتے ہیں کہ اگر واقعی دل میں یہی یقین ہے اور اپنے دعوے میں سچے ہو تو پھر دُنیا کے مکدر عیش سے دل برداشتہ ہو کر محبوبِ حقیقی کے اشتیاق اور جنت الفردوس کی تمنا میں مرنے کی آرزو کیوں نہیں کرتے۔ جس کو یقینا معلوم ہو جائے کہ میرا اللہ کے یہاں بڑا درجہ ہے اور کوئی خطرہ نہیں ہے وہ یقیناً مرنے سے خوش ہوگا۔ اس کے مقابلے میں ان مدعیانِ پارسائی اور مغرورینِ ولایت کا حال یہ ہے کہ ان سے زیادہ موت سے ڈرنے والا کوئی نہیں۔ وہ موت کا نام سن کر گھبراتے ہیں کیونکہ دُنیا کی حرص سے ان کا کبھی پیٹ نہیں بھرتا۔

اس معنے پر حافظ ابن کثیرؒ نے یہ شبہ پیش کیا ہے کہ کسی شخص کے اپنے دعویٰ میں صداقت کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ موت کی بھی تمنا کرے۔ موت کی تمنا اور یہودیوں کے منکر ہونے میں کوئی لزوم نہیں ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر نیک انسان موت کا متمنی ہو اور اس میں جواباً یہی کہا جا سکتا ہے کہ تم بھی تو حق پر ہونے کے باوجود صحت کی حالت میں متمنی نہیں ہو۔ علماء نے اس کے جوابات دیے ہیں اور اپنے اپنے مذاق پر دیے ہیں۔ کچھ آپ بھی سن لیجئے۔

یہ مطالبہ ان یہودیوں سے تھا جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے۔ ہر زمانے کے یہود سے یہ خطاب نہیں ہے [1]

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ دراصل اس قسم کے شبہات کا سرچشمہ یہی موقف ہے۔ اگر آیت کی وہ تشریح اپنائی جائے جو حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے پیش کی ہے پھر کوئی شبہ نہیں ہے۔ یہودیوں سے اس آیت میں یہ کہا گیا ہے کہ اگر تمہارا دعویٰ ہے کہ اللہ کے پیارے ہو اور کوئی نہیں۔ اور تم ہی جنتی ہو اور تمہارے سوا جنتی کوئی نہیں تو آؤ اس پر مباہلہ کر لو اور جھوٹے کے لیے مر جانے کی دعا کرو۔ مباہلہ سے ایسے حالات میں فیصلہ کن نتائج سامنے آجاتے ہیں۔

فیصلہ کی یہ صورت پیش کرنے سے دراصل یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ یہودی جان بوجھ کر ہٹ دھرمی سے کام لے رہے ہیں۔ قرآن نے جس قدر جوابات دیے ہیں ان میں سے کسی کا جواب بھی ان کے پاس نہ تھا۔ ان جوابات میں بیان شدہ حقائق کے خلاف وہ اپنے سارے علمی سرمائے میں ایسی کوئی چیز نہ پاتے تھے جس کی بنا پر یہ کہہ سکتے کہ قرآن کے بیان کردہ دلائل واقعات کے خلاف ہیں۔ انبیاء کی تکذیب، انبیاء کا قتل، گوسالہ پرستی، قومی زندگی میں اللہ کے حکم کے خلاف باغیانہ اقدامات میں سے کون سی بات حقیقت کے خلاف ہے۔ اور پھر تورات میں بشارتیں پڑھ کر دلوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اقرار اور آپؐ کی پوری معرفت کے باوجود کفر و انکار۔ ان حالات میں جب ان سے کہا گیا کہ اچھا اگر تمہیں اپنی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے ساتھ مقابلے میں دعا کرو۔ جو جھوٹا ہو اس کو موت آجائے۔ چونکہ ان کو اپنے جھوٹے ہونے کا یقین تھا اس لیے مقابلہ کے لیے تیار نہ ہوئے۔ اس طرح یہ بات سارے عرب کے سامنے کھل گئی کہ یہودی علماء جو اپنے تقدس کا سانس سانس میں دعویٰ کرتے ہیں دراصل ایسا نعرہ، ایسا دعویٰ کر رہے ہیں جس کی صداقت پر خود ان کو اعتماد نہیں ہے۔

۲۵۹۔ یہ لوگ کبھی اپنی پیش رفت بدعملیوں کی وجہ سے موت کی تمنا نہ کریں گے۔ یعنی ان کا دل خود چور ہے۔ ان کا ضمیر اس پر ملامت کر رہا ہے اور جانتے ہیں کہ جو کرتوت کیے ہیں یہاں سے چھوٹتے ہی ان کی سزا میں پکڑے جائیں گے۔ غرض ان کے تمام افعال و اطوار سے روزِ روشن کی طرح واضح ہے کہ وہ ایک لمحہ کے لیے موت نہیں مانگ سکتے۔ حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ ہمیں

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۰۸

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد پہنچا ہے کہ اگر یہود موت مانگ لیتے تو موت کا شکار ہو جاتے اور جہنم میں اپنے ٹھکانے دیکھ لیتے۔ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مباہلہ کرنے والے میدان میں آجاتے تو اپنے گھروں کو ان کی واپسی اس طرح ہوتی کہ نہ اولاد ہوتی نہ مال ہوتا۔

گویا قرآن نے حتمی طور پر یہ بھی بتا دیا کہ وہ کبھی اس مباہلہ کو قبول نہ کریں گے۔ ایک تو وجہ اس کی یہ بیان کی گئی ہے کہ انہیں یہ معلوم ہے کہ جو کارنامے انہوں نے انجام دیے وہ ان کو آخرت کا مستحق نہیں بناتے۔ دوسری وجہ اس فقرے میں بتائی گئی ہے کہ واللہ علیم بالظالمین۔ اللہ ان ظالموں کے حال سے خوب واقف ہے یعنی ان لوگوں سے جو اپنے ہتھکنڈوں سے خود اپنے حق میں ظلم کرتے رہے ہیں۔

۲۶۰ ۔ ان کو لوگوں میں زندگی کا سب سے زیادہ حریص پاؤ گے۔ یہ مباہلہ کی دعوت قبول نہ کرنے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے پر نہ آنے کی تیسری وجہ ہے۔ یہودیوں میں مادیت کے غلبہ کی وجہ سے دُنیا پرستی مقصود بالذات بن گئی تھی۔ اس کے نتیجہ میں وہ آخرت کے ایمان و یقین سے محروم ہو چکے تھے۔

اصل میں علیٰ حیٰوۃٍ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنے ہیں کسی طرح کی زندگی۔ یعنی ان کو محض زندگی کی حرص ہے خواہ وہ کسی طرح کی زندگی ہو، عزت و شرافت کی ہو یا ذلت اور کمینہ پن کی[1] ۔۔۔ اور تو اور مشرکین سے بھی زیادہ زندگی کے حریص ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین مرنے کے بعد آخرت کی نعمتوں کے لذت شناس ہی نہیں۔ وہ اگر آخرت سے رُخ پھیر کر اپنا مرکز توجہ اور محور زندگی اسی مادی زندگی کو بنالیں تو حیرت کی بات نہیں ہے۔ غضب تو یہ یہود کر رہے ہیں جو اپنے آسمانی صحیفوں اور نبوت کی راہ سے آئی ہوئی ہدایات کے باوجود بھی مشرکوں سے بڑھ کر دُنیا سے لپٹے ہوئے ہیں[2]

۲۶۱ ۔ کاش ہزار سال جیتے۔ حقیقت یہ ہے کہ جب انسان کا آخرت پر یقین نہ ہو تو دُنیا کی طویل سے طویل زندگی بھی اسے تھوڑی معلوم ہوتی ہے۔ آخرت پر ایمان ایک نعمت ہے جس سے صرف مومن کا دل ہی فیضیاب ہو سکتا ہے۔ ہمیشگی کی زندگی کا دروازہ اپنے اوپر وہی بند کر سکتا ہے جو زندگی کی حقیقت سے بے خبر ہو لیکن کیا عمر کی درازی اللہ کی گرفت سے بچا سکتی ہے!

---

[1] تفہیم القرآن ص ۹۶ [2] تفسیر ماجدی ص ۳۷

قرآن کہتا ہے کہ ہرگز نہیں۔
مطالب کی حد تک تو آیات کی تشریحات یہی ہیں جو پیش کر دی گئی ہیں لیکن بعض مفسرین نے اس آیت پر ایک دوسرے پہلو سے بھی غور کیا ہے وہ بھی سن لیجئے۔

دراصل اس آیتِ قرآنی میں تمام ایمان کے مدعیوں سے یہ کہا جا رہا ہے کہ ایمان کی صداقت اور اس کے خلاف واقعہ ہونے کا معیار یہ ہے کہ ہر مدعیٔ ایمان کو اپنے ایمان کا امتحان اس طرح لینا چاہیے کہ وہ دیکھے کہ اس کے دل میں اللہ کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی تمنا کتنی ہے کیونکہ یہی ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ کتنے اسرائیلی ہیں جو آخرت کی زندگی اور جنت کو اپنی میراث سمجھتے ہیں اور ان کے دلوں میں اللہ کی راہ میں جان کھپانے اور مرمٹنے کی تمنا ہے۔ ان کے علماء و احبار کا جائزہ لیجئے کہ ان میں اللہ کی خاطر سرفروشی اور جان نثاری کی آرزو کہیں جھلکتی نظر آتی ہے اور وہ لوگ اللہ کی راہ میں قربانیاں کرنے کی تمنا کیوں کریں گے جو زندگی کی آسائشوں اور نعمتوں اور مال حرام کے منافع سے استفادہ کر رہے ہوں نہ استفادے کو برا سمجھتے ہوں اور نہ زندگی کی منفعتوں سے باہر نکلنا چاہتے ہوں۔ جو لوگ باطل افکار و اقدار کی خدمت کرنے اور ان سے نفع حاصل کرنے کے بعد محض اپنے خاندان میں انبیاء ہونے کی بنا پر اپنے تئیں نجات کا مستحق سمجھتے ہوں اور جنت کو اپنے نام الاٹ کرا چکے ہوں ان کو کیا پڑی ہے کہ اللہ کی خاطر جان و مال کی قربانیاں دینے کی تمنا کریں اور حق کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کرنے کی تمنائیں کریں۔ اللہ کے لیے قربانیاں کرنے کا جذبہ تو اس جماعت میں پیدا ہو سکتا ہے جو موت کو ایک پُل سمجھے جو دوست کو دوست سے ملنے کا ذریعہ ہے اور جو خالص لقاءِ الٰہی اور جنت کی خاطر موت کی تمنا کرے۔ اس کے افعال اور حرکات خود گواہی دیتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں قربان ہو جانا ان کو دنیا کی تمام لذتوں سے زیادہ لذیذ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لوددت ان اقتل فی سبیل اللہ ثم احیٰ ثم اقتل۔ میری تمنا ہے کہ اللہ کی راہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔ اللہ کی راہ میں قربانیاں کرتے وقت موت کے لیے ان کی سرشاریوں کی کیفیت کا اندازہ کرنا ہو تو رومیوں سے جنگ میں حضرت عبداللہ بن رواحہ کے یہ اشعار پڑھیے۔

یا حبذا الجنۃ واقترابھا　　طیبۃ و بارد شرابھا

والروم روم قد دنا عذابھا

قُلْ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّجِبْرِيْلَ فَاِنَّهٗ نَزَّلَهٗ عَلٰى قَلْبِكَ بِاِذْنِ اللّٰهِ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَهُدًى وَّبُشْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ۝ مَنْ كَانَ عَدُوًّا لِّلّٰهِ وَمَلٰٓئِكَتِهٖ وَرُسُلِهٖ وَجِبْرِيْلَ وَمِيْكٰىلَ فَاِنَّ اللّٰهَ عَدُوٌّ لِّلْكٰفِرِيْنَ ۝

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ جو بھی جبرئیل[۲۶۲] سے عداوت رکھتا ہے اسے معلوم ہونا چاہیے کہ جبرئیل ہی نے اللہ کے حکم[۲۶۳] سے یہ قرآن تمہارے قلب پر اتارا ہے اور یہ اس کلام کی تصدیق و تائید کرتا ہے جو اس[۲۶۴] سے پہلے نازل ہو چکا ہے۔ اس میں ان لوگوں کے لیے جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت اور بشارت ہے۔ اگر جبرئیل[۲۶۵] سے ان کی عداوت کا سبب یہی ہے (تو بتا دو کہ) جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کے رسولوں اور جبرئیل و میکائیل کا دشمن ہے تو اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔

جنگ صفین میں حضرت عمار بن یاسرؓ کی ولولہ انگیز تمنا یہ تھی۔

غدا نلقی الاحبۃ　　　محمدًا وصحبہ

حضرت حسنؓ نے حضرت علیؓ کو دیکھ کر فرمایا کہ یہ سپاہیوں اور فوجیوں کی وردی نہیں۔ کیا بات ہے جواب میں فرمایا بیٹا تیرے باپ کو اس کی پروا نہیں ہے کہ وہ موت پر گرتا ہے یا موت اس پر پڑتی ہے یعنی مجھے تو بس اللہ کی راہ میں جان دینے کا شوق ہے۔

بس یہی ایمان کے سچے اور جھوٹے ہونے کا معیار ہے۔ پہلا طبقہ ایمان کا، نجات کا، جنت کا اور آخرت کا جھوٹا مدعی ہے۔ اور دوسرا طبقہ کے ایمان میں صداقت ہے۔

اس تشریح کو آیت کی تفسیر تو نہیں کہا جا سکتا لیکن یہ آیتِ قرآنی کا مدلول ضرور ہے۔ اور اس میں ہمارے لیے بہت بڑی عبرت ہے۔ اس وقت میرے حافظہ میں ابوداؤد کی وہ حدیث گھوم رہی ہے جس میں آپؐ نے فرمایا۔ قریب ہے کہ تم پر قومیں حملہ آور ہوں اور حملہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کو اس طرح پکاریں گے یعنی تم پر متحدہ حملہ کریں　جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالے پر گرتے ہیں۔ حاضرین میں سے ایک نے دریافت کیا یا رسول اللہ کیا یہ اس لیے کہ اس زمانے میں ہماری تعداد کم ہو جائے گی۔ فرمایا نہیں بلکہ تمہاری تعداد ان دنوں سے زیادہ ہو گی لیکن تم ایسے ہو جاؤ گے جیسے سیلاب کی سطح پر کف

اور خس و خاشاک ہوتا ہے کہ سیلاب ان کو بہا کرلے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رُعب ہٹا دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا۔ کسی نے پوچھا یا رسول اللہ وہ کمزوری کیا ہوگی؟ فرمایا دُنیا اور فوائدِ دُنیا کی محبت اور موت سے کراہت۔ موجودہ دُنیائے اسلام کی پیشِ نظر تاریخ میں کیا حرف بحرف اس کی تصدیق نہیں ہے؟ اور کیا یہ صورتِ حال و لتجد نھم احرص الناس علی حیٰوۃ کی واقعاتی تفسیر نہیں ہے ـــ انا للہ فالی اللہ المشتکیٰ۔

فرشتوں سے دُشمنی

جب یہودیوں کے ترکش میں میدان جیتنے کے لیے دلیل کا کوئی تیر نہ رہا اور قرآن نے ان کے ہر عذر لنگ پر ان کو ان کے گھر سے دلائل دے کر رگید ا تو کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے انداز پر بول پڑے کہ جو فرشتہ جبریل نامی آپ پر وحی لے کر آتا ہے چونکہ یہ ہمارا دُشمن ہے اس لیے ہم نہ آپ کو مانیں گے اور نہ قرآن پر ایمان لائیں گے۔ اس پر تمام اہلِ علم کا اتفاق ہے جیسا کہ ابن جریرؒ سے حافظ ابن کثیرؒ نے نقل کیا ہے کہ یہ یہودیوں کے اسی اعتراض کا جواب ہے۔

مسند ابی داؤد طیالسی میں ہے کہ ایک بار چند یہودی خدمتِ اقدس میں آئے اور کہا کہ ہم آپ سے چند باتیں دریافت کرنا چاہتے ہیں جن کا جواب پیغمبر کے سوا کوئی اور نہیں دے سکتا۔ آپؐ نے فرمایا جو چاہو پوچھو۔ لیکن یہ وعدہ کرو کہ جوابات صحیح ہونے کی صورت میں اسلام قبول کرنا ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ ہاں ہم کو یہ شرط منظور ہے۔ آپؐ نے فرمایا پوچھو جو کچھ پوچھنا چاہتے ہو۔

یہودی عالم: حضرت یعقوب علیہ السلام نے تورات اترنے سے پہلے جو کھانا اپنے اوپر حرام کیا تھا اس کا واقعہ کیا ہے؟

حضورِ انورؐ: ایک بار سخت بیمار ہوئے انہوں نے نذر مانی کہ اگر میں اچھا ہوگیا تو کھانے اور پینے کی جو چیز مجھے سب سے زیادہ پسند ہے وہ چھوڑ دوں گا۔ ان کو کھانے میں سب سے زیادہ پسند اونٹ کا گوشت اور پینے میں سب سے زیادہ اونٹ کا دودھ مرغوب تھا۔ چنانچہ صحت کے بعد انہوں نے دونوں چیزیں چھوڑ دیں۔

یہودی عالم: خدایا سچ ہے۔

حضورِ انورؐ: اے اللہ گواہ رہ

یہودی عالم ، یہ بتائیے کہ ایک ہی نطفہ کبھی نر اور کبھی مادہ کیونکر ہو جاتا ہے ؟

حضور انورؐ ، میں تم کو اُس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی تم کو یہ پتہ ہے کہ مرد کا نطفہ گاڑھا اور سفید ہوتا ہے اور عورت کا پتلا اور زرد ۔ ان میں جو جنس غالب ہوتی ہے وہ نطفہ ہی خدا کے حکم سے وہی ہو جاتا ہے اور اسی کے مشابہ ہوتا ہے ۔

یہودی عالم ؛ خدایا دُرست ہے ۔

حضور انورؐ ، اے اللہ گواہ رہ

یہودی عالم ، تورات میں نبی اُمی کی پہچان کیا بتائی گئی ہے ؟

حضور انورؐ : میں تم کو اُس خدا کی قسم دیتا ہوں جس نے موسیٰ علیہ السلام پر تورات نازل کی تم کو یہ معلوم ہے کہ اس نبی کی آنکھیں سوئیں گی اور دل نہیں سوئے گا ۔

یہودی عالم : خدایا ہاں

حضور انورؐ : اے اللہ گواہ رہ

یہودی عالم ، یہ بتائیے کہ فرشتوں میں سے تمہارا دوست اور نگہبان کون ہے ؟

حضور انورؐ ، میرا رفیق فرشتوں میں سے جبریل ہے ۔

یہودی عالم ، پھر ہم آپ کے ساتھ نہیں ہو سکتے کیونکہ جبریل تو ہمارا دُشمن ہے ۔

۲۶۲ ۔ جو بھی جبریل سے عداوت رکھتا ہے ۔ جبریل عبرانی لفظ ہے جس کے لغوی معنے مردِ خدا کے ہیں ۔ لیکن اصطلاحِ شریعت میں اس فرشتے کا نام ہے جو خدا اور خاصانِ خدا کے درمیان پیامبری کی خدمت انجام دیتا ہے ۔ تورات اور انجیل میں بھی یہ نام اسی حیثیت سے استعمال ہوا ہے ۔ چنانچہ دانیال (۸ ۔ ۱۶ ۔ ۱۹ ۔ ۲۱) میں اس کی پیامبری کا بیان ہے ۔ اسی طرح انجیل لوقا (۱ ۔ ۱۹ ۔ ۲۶) میں مذکور ہے کہ وہ حضرت زکریا علیہ السلام کے پاس حضرت یحییٰ علیہ السلام کی بشارت اور حضرت مریم علیہا السلام کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت لے کر آیا تھا ۔ یہاں قرآن نے بتایا ہے کہ وہ پیامبر جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور اللہ سبحانہ کے درمیان وحی الٰہی کا ایلچی تھا وہ بھی جبریل تھا ۔ اور کہیں اسی کو الروح الامین سے تعبیر کیا ہے ۔ سورۂ نحل میں اس کو روح القدس کہا گیا ہے ۔ رسول کا لفظ بھی اس کی شان میں استعمال کیا گیا ہے ۔ سورۂ تکویر میں اس رسول کی متعدد صفات کا ذکر ہے اور سورۂ نجم میں اس کے کچھ اور اوصاف مذکور ہیں ۔ آغازِ وحی کے واقعہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جبریل کے لیے لفظ ملک فرمایا ہے اور ورقہ نے اس کو ناموس

کے لفظ سے ادا کیا ہے۔

قرآن حکیم میں جبریل کا نام تین مقام پر آیا ہے دو دفعہ سورۂ بقرہ میں اور ایک دفعہ سورۂ تحریم میں۔ لیکن اس خصوصیت کے ساتھ کہ وہ وحی محمدی کے پیامبر اور قرآن کے حامل ہیں صرف اسی آیت میں آیا ہے۔ دوسری آیتوں میں قرآن نے حاملِ قرآن فرشتہ کی ذات کی تعبیر رُوح الامین، روح القدس اور رسُول کریم کے الفاظ سے کی ہے لیکن احادیث میں ان الفاظ کے بجائے جبریل ہی کا لفظ عام طور سے مستعمل ہوا ہے۔ ایک پیامبر کی حیثیت سے جبریل کی سب سے پہلی آمد اُس وقت ہوئی جب آپ غارِ حرا میں معتکف تھے۔

یہود نے اپنی نادانی سے یہ خیال جما لیا تھا کہ جبریل ایک فرشتۂ عذاب ہے ان کا کام وحی لانا نہیں عذاب لانا ہے اور وحی لانا ایک دوسرے فرشتہ کا کام ہے۔ اپنے ان مفروضات کے بعد ان کو جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم پر اعتراض تھا کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم اپنی وحی کے سلسلے میں جبریل کا نام کیوں لیتے ہیں؟ یہ اعتراض دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم پر نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ پر ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ پر یہ اعتراض کیا تھا کہ بنی اسرائیل کو چھوڑ کر بنی اسماعیل میں سے نبی کیوں بنایا ہے؟ اور اب یہ اعتراض ہو رہا ہے کہ نئے مدعیٔ نبوت پر وحی جبریل نامی فرشتہ کیوں لاتا ہے بات کا پیرایہ مختلف ہے ورنہ رُوح دونوں کی ایک ہے اور وہ یہ کہ اللہ سبحانہٗ کو اپنی مرضی، اپنے صوابدید اور اپنے میلانِ طبع کے تحت کر کے فیصلہ کرانا چاہتے ہیں۔ اللہ اکبر ذات کبریا اپنے بندوں پر کس قدر رحیم وشفیق ہے اور انداز دعوت بھی کیسا شفقت سے لبریز ہے پہلے اعتراض کے جواب میں نہایت شفقت سے سمجھایا کہ اس قسم کا اعتراض اللہ کی جناب میں بغاوت اور سرکشی ہے بندے کو یہ نہیں جچتا یہ اللہ کا کام ہے کہ ینزل اللہ من فضلہ علیٰ من یشاء من عبادہ۔ دوسرے اعتراض کے جواب میں ارشاد فرمایا کہ جبریل تو خود کچھ نہیں۔ وہ آپ پر وحی خود نہیں لاتے وہ تو اللہ کی جانب سے خدمتِ سفارت پر مامور ہیں۔

۲۶۳ - اس نے اللہ کے حکم سے تمہارے قلب پر قرآن اتارا ہے۔ وہ تو صرف اللہ کے حکم سے (باذن اللہ) وحی لانے کا کام کرتے ہیں۔ تمہیں تو بندے ہونے کی حیثیت سے اللہ کے حکم کو ماننا چاہیے۔ کون لاتا ہے کس کی وساطت سے آتا ہے یہ دیکھنا تمہارا کام نہیں ہے۔ یہاں قرآن نے یہ بتایا ہے کہ جبریل نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے قلب مبارک پر قرآن اتارا ہے۔ قرآن کی یہ تنزیل جبریل کی وساطت سے بذریعہ وحی ہوئی۔ وحی کیا ہے اور اس کا علمی ذرائع میں مقام کیا

ہے۔ اس پر ہم یہاں چند اشارات کرتے ہیں۔ اس کے تفصیلی مباحث کے لیے پچیسویں پارے کے انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہوگی۔

علمی ذرائع میں وحی کا مقام

وحی علم کا ایک ذریعہ ہے جو اللہ سبحانہٗ کی جانب سے انبیاء کو عطا کیا جاتا ہے یہ نہ تخلیقی ہے اور نہ کسبی ــــ عام انسانوں میں حواس اور مشاعرِ علم کا ذریعہ ہوتے ہیں لیکن انبیاء میں حواس اور مشاعر سے بالا وحی علمی ذریعہ ہوتا ہے۔

یوں سمجھو کہ مخلوقات میں جیسے علمی ذرائع کا ایک ارتقائی سلسلہ قائم ہے، جمادات بے حس ہیں لیکن نباتات میں قوتِ احساس موجود ہے، حیوانات میں احساسات کے ساتھ کچھ مشاعر بھی کارفرما ہیں۔ انسان احساس اور شعور کے کمالات کا نمونہ ہے۔ ایسے ہی انسانوں میں انبیاء کو حواس اور مشاعر سے بالا ایک ایسی قوت دی جاتی ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملتی۔ حواس صرف مادیات کی دریافت کا ذریعہ ہیں۔ مشاعر مادیات سے آگے ذہنیات اور عقلیات کا ادراک کرتے ہیں اور وحی ذہنیات اور عقلیات سے بالا حقائقِ غیبیہ معلوم کرنے کا راستہ ہے۔

اس ذریعۂ علم میں غور و بحث منطقیانہ فکر و نظر اور ترتیبِ مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی۔ بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جیسے وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات۔

چونکہ اللہ سبحانہٗ انبیاء کو ایک نئے ذریعے سے علم عطا کرتا ہے اس لیے اس کا نام بھی عام ذرائع سے الگ وحی رکھا ہے۔ وحی کے معنے لغت میں اشارہ، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، چھپا کر بولنا ہیں۔ وحی کے ان متفرق معنوں میں ایک مفہوم مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ مُنہ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے شخص کو مفہوم سمجھا دینا۔ یہ گویا اللہ سبحانہٗ کا وہ اشارہ ہے جو نبوت پر حقائقِ غیبیہ کی راہ کھولتا ہے۔ اسے امام رازیؒ کی زبان میں ملکۂ نبوت، مجدد الف ثانیؒ کی اصطلاح میں نُورِ نبوت اور علامہ اقبالؒ کی تعبیرات میں شعورِ نبوت کہتے ہیں۔ مجدد الف ثانیؒ فرماتے ہیں:۔

جیسے عقل کا مقام حواس سے بالا ہے کہ جن چیزوں تک رسائی ہم حواس کے ذریعے نہیں کر سکتے عقل کے ذریعے کر سکتے ہیں۔ ایسے ہی نبوت کا مقام عقل سے بالا ہے جہاں عقل کی رسائی نہیں ہوتی نُورِ نبوت کے ذریعے سے اس کا ادراک ہو سکتا ہے۔ اور اس کے ساتھ مجدد صاحبؒ نے یہ انکشاف بھی فرمایا ہے کہ جو شخص عقل و حواس ہی کو علمی ذریعہ مانتا ہے اور اس کے سوا کسی علمی ذریعہ کو نہیں

مانتا وہ درحقیقت منکرِ نبوت ہے۔ علامہ اقبالؒ نے اسے اپنے مخصوص انداز میں یوں پیش کیا ہے کہ جسے ہم نے شعورِ نبوت سے تعبیر کیا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ اس شعور کی موجودگی میں نہ تو افراد کو خود کسی چیز پر حکم لگانا پڑے گا نہ ان کے سامنے یہ سوال ہوگا کہ ان کی پسند کیا اور ناپسندیدگی کیا ہے؟ ان کو یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ وہ اپنے لیے کیا راہِ عمل اختیار کریں۔ یہ سب باتیں گویا پہلے ہی سے طے شدہ ہوں گی۔ یہ نہیں کہ ان کو اس بارے میں خود اپنے فکر اور انتخاب سے کام لینا پڑے گا۔ شعورِ نبوت کو گویا کفایتِ فکر اور انتخاب سے تعبیر کرنا پڑتا ہے[1] ——— کیونکہ فی الواقع وحی عقلیت سے بالا ایک ایسے ذریعہ کا نام ہے جس میں وجدان نہیں بلکہ سرتاسر عرفان ہوتا ہے خواہ یہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ۔ آواز کے ساتھ ہو یا بغیر آواز کے حصولِ علم کی حد تک نبوت کے عرفان کی دُنیا ایسی ہی حقیقی اور واقعی ہوتی ہے جیسے ہمارے مشاہدات کی۔ اسے صرف اس لیے نظرانداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی ابتدا ہمارے ادراک یا حس سے نہیں ہوتی ہے یہ کوئی غیر شعوری قسم کا وجدان نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی عرفان کا نام ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں:

آدمی کے اطوار میں سے جیسے عقل معقولات کے ادراک کا ایک ذریعہ ہے ایسے ہی نبوت بھی ایک طور ہے جس کے نور سے صاحبِ نبوت حقائقِ غیبیہ اور عقل سے بالا امور کا ادراک کر لیتا ہے[2]

حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ کی ژرف نگاہی اس قسم کے مواقع پر بہت بڑی رہنمائی کا کام کرتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ——— انسان کا مزاجی اعتدال صورتِ نوعیہ کے لحاظ سے معارفِ الٰہیہ کے بغیر پایۂ کمال کو نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے حکمتِ الٰہی نے کچھ شخصیتوں کی عقلیت کو ایسا صاف، پاکیزہ اور بلند تر بنایا ہے کہ جن میں حقائق کے ادراک کی پوری پوری قابلیت رکھی ہے۔ یہ عظیم المرتبت شخصیت بارگاہِ الٰہی سے علوم کا فیضان لے کر آتی ہے اور انسانوں تک پہنچاتی ہے اس کی حیثیت انسانوں میں ٹھیک ٹھیک وہی ہے جو شہد کی مکھیوں میں یعسوب کی ہوتی ہے۔ اگر سلسلۂ وحی نہ ہوتا تو نوعِ انسانی اس درجۂ کمال کو نہ پا سکتی جو تقدیرِ الٰہی نے اس کے لیے مقرر کیا ہے۔ گویا انسانوں میں وحی نوعِ انسانی کے ارتقار کی آخری کڑی ہے[3]

الغرض وحی کا مقام عقل سے بالا ہے اور جیسے وحی کا مقام عقل سے بالا ہے ایسے ہی نبوت کا مقام ولایت سے بالا ہے۔ ولایت میں صرف وجدان ہوتا ہے اور اس میں غلطی کا احتمال ہے۔ اسی بنا پر ولی

---

[1] تشکیل جدید الٰہیات ص ۱۹۲ [2] المنقذ من الضلال۔ [3] حجۃ اللہ البالغہ

کا الہام دلیل و حجت کے طور پر پیش نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے برعکس نبوت مقامِ عرفان پر کامزن ہوتی ہے جس میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔

وحی کی اگرچہ متعدد صورتیں ہیں اس کے تفصیلی مباحث تو پارہ ۲۵ سورۃ الشوریٰ میں انشاءاللہ بشرطِ حیات آئیں گے۔ ان صورتوں میں سے ایک صورت یہ ہے کہ فرشتہ مجسم ہو کر آنکھوں کے سامنے نہ آئے بلکہ براہِ راست نبی کے قلب پر نزول کرے اور نبی کو قلب ہی سے فرشتہ کا اور اس کی آواز کا ادراک ہو۔ حواس ظاہرہ کو اس میں کوئی دخل نہ ہو۔ میرے خیال میں یہی صورت ہے۔ جیسے حدیثِ عائشہؓ میں،

یاتینی مثل صلصلۃ الجرس میرے پاس گھنٹے کی آواز کی طرح آتی ہے۔

سے تعبیر فرمایا ہے۔ اسی کو آپؐ نے فرمایا کہ یہ صورت مجھ پر بہت سخت ہوتی ہے۔ قرآن کی اس آیت میں فانہ نزلہ علیٰ قلبک سے اسی طرف اشارہ ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وحی اترنے کی حالت میں آپؐ کو میں نے دیکھا کہ جب یہ کیفیت ختم ہو جاتی تھی تو سخت سردی کے زمانے میں بھی جبین مبارک عرق آلود ہو جاتی تھی[1] صحابہ کا بیان ہے کہ اس حالت میں جسم مبارک بہت بھاری ہو جاتا تھا۔ سواری کے اونٹ بیٹھ بیٹھ جاتے تھے[2] اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جبریل سے عداوت رکھنے والے یہ سن لیں کہ جبریل کا کام اللہ پاک کی سفارت ہے۔ سفارت کے فرائض انجام دیتے ہوئے جبریل نے یہ قرآن حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم پر اتارا ہے۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ کلام اور پیغام کس کا ہے۔ تو یہ اللہ کا کلام ہے اور اللہ کے حکم سے جبریل نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر اتارا ہے۔

آیت میں اس فقرے نے فانہ نزلہ علیٰ قلبک یہ بات کھول دی ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر قرآنی علوم و معارف کے فقط معانی نہیں اتارے گئے کہ پیغمبر نے ان کو اپنے الفاظ کا جامہ پہنا دیا ہو بلکہ قرآن کی اصل عبارت آپؐ کے قلب مبارک پر نازل کی جاتی تھی۔ اگر قرآن صرف ایک انسانی (INSPIRED) کتاب ہوتی تو اس کے نزول کے لیے کسی زبان کی تخصیص نہ ہوتی۔ مگر قرآن نے اپنی اس تنزیل کے لیے عربیت کو بار بار دہرایا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مبارک پر عربی کے یہی الفاظ نازل کیے گئے تھے۔ اور یہ اس امر کی کھلی شہادت ہے کہ یہ محض ایک انسانی کتاب نہیں ہے۔ اسی بنا پر اصولیین نے قرآن کی یہ تعریف کی ہے۔

---

[1] صحیح بخاری [2] مسندِ احمد

ھو اسم للنظم والمعنی جمیعاً ۔ قرآن نظم و معنی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

فقہاء میں سے علامہ شامی لکھتے ہیں :

قرآن اس کتاب کا نام ہے جو عربی الفاظ میں اس خاص نظم و ترتیب سے اتاری گئی ہے جو مصاحف میں ہے اور جو ہم تک تواتر کے ذریعے پہنچی ہے۔ (رد محتار ج ۱ ص ۳۵۰)

فقیہ کبیر علامہ برہان الدین المرغینانی صاحب ہدایہ التجنیس میں لکھتے ہیں ۔

قرآن حکیم کو غیر عربی میں لکھنا بالاجماع ممنوع ہے کیونکہ ایسا کرنا قرآن کی حفاظت پر اثر انداز ہوگا۔ ہمیں قرآن کے الفاظ و معنی دونوں کی حفاظت کا حکم ہے کیونکہ یہ دلیل نبوت ہے۔ (رد محتار ج ۱ ص ۳۵۰)

قرآن مجید کے غیر عربی میں لکھنے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی عربی عبارت کو حذف کر کے پورے قرآن کو کسی اور زبان میں لکھا جائے۔ کسی عبارت کے ضمن میں ایک دو آیتوں کا ترجمہ لکھنا اور ان کو مجازاً آیت کہنا ہرگز منع نہیں ہے اور پورے قرآن کو غیر عربی میں لکھنا بھی اس وقت منع ہے جب اصل عبارت ساتھ نہ ہو۔ اگر اصل عربی رکھ کر اس کا ترجمہ یا تفسیر لکھیں تو کوئی حرج نہیں ہے ـــــ محقق ابن الہمام لکھتے ہیں :

اگر کوئی شخص قرآن کو فارسی میں لکھنے کا ارادہ کرے تو اسے روک دیا جائے لیکن اگر الفاظِ قرآن بھی ساتھ لکھتا جائے تو پھر اس کا ترجمہ کرنا اور دوسری زبان میں تفسیر کرنا جائز ہے۔ ہاں ایک دو آیت غیر عربی میں لکھ سکتا ہے ۔ (النفحۃ القدسیہ ص ۱۳)

ایک شخص نے شیخ ابو محمد بن فضل سے دریافت کیا تھا کہ ہمارے زمانے میں بچوں کو عربی پڑھنا دشوار ہے کیا ہمیں ان کو فارسی میں قرآن پڑھانے کی اجازت ہے۔ شیخ نے اس کا جو جواب اُس پوچھنے والے کو دیا وہ قابلِ شنید ہے۔ فرمایا کہ یہ شخص اللہ کی کتاب کو دنیا سے ناپید کرنے کے درپے ہے اور پھر فتویٰ لکھا کہ

جو شخص قرآن کو عربی کے سوا کسی اور زبان میں عمداً لکھے وہ یا زندیق ہو سکتا ہے یا مجنون۔ اگر دیوانہ ہے تو اس کا علاج کرایا جائے اور اگر زندیق ہے تو اس کو فوجداری کے سپرد کر دیا جائے۔

اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ قرآن ہم جسے کہتے ہیں وہ منزلہ علیٰ قلبک ہے یعنی جسے جبریل آپ کے قلب مبارک پر لے کر اترے ہیں۔ یہاں سے بعض متنورین کی یہ غلطی بھی بے جان ہو کر رہ گئی کہ نماز میں قرآن اردو پنجابی میں ہونا چاہیے۔ نماز میں قرآن پڑھنے کا مطالبہ ہے اور قرآن نام ہے نظم و معنی دونوں کے مجموعہ کا۔ کیونکہ جبریل نے جو چیز آپؐ کے قلب پر اتاری ہے وہ صرف

معنی نہیں ہیں بلکہ نظم و معنی دونوں ہیں۔ اس نظم و معنی کے مجموعہ ہی میں شانِ اعجاز ہے اور اسی میں شانِ تعبّد ہے۔ یہ بات نزلہ علی قلبک کی رعایت سے یہاں ضمناً آگئی۔ اس بحث کا اصل مقام پارہ ۹ سورۂ اعراف ہے وہاں اس موضوع پر انشاء اللہ تفصیل آ رہی ہے۔

۲۶۴۔ یہ قرآن اس کلام کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکا اور اس میں اہلِ ایمان کے لیے ہدایت اور بشارت ہے۔ اس میں قرآن کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ خدائی پیغام ہے جو تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کا مصدق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے بلکہ تمام انبیاء کی دعوت ہے۔ تمام رسولوں اور ان کے صحیفوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم یہ ہو کہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے سچے مذاہب خدا کی طرف سے آئے وہ سب ایک تھے۔ چنانچہ قرآن اسی کا اعلان کرتا ہے۔ اسلام اسی دین کا نام ہے جو حضرت آدم علیہ السلام سے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک باری باری پیغمبروں کے ذریعے ایک خدا کی جانب سے بذریعہ جبریل اترتا رہا ہے۔ اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔ مطلب یہ ہے کہ اصل میں دین ایک ہی ہے جو تمام انبیاء کا دین رہا لیکن وہ بعد کو ان کے پیروکاروں کی کتابوں میں تحریف و تصرف کی وجہ سے بگڑتا رہا اسی دینِ ازلی کو لے کر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اسی کا نام اسلام ہے۔ جو اپنے صحیفہ کے بقاء و حفاظت اور دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کی وجہ سے ہمیشہ قائم و باقی رہے گا۔ اسی لیے قرآن بار بار تصدیق کو بنیاد بنا کر یہودیوں اور عیسائیوں کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دیتا ہے۔ دوسری بات جو قرآن نے اپنے تعارف میں یہاں پیش کی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن انسانی زندگی کو سعادت اور فلاح کی راہ بتانے والی کتاب ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہی ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہ ایک کامل ہدایت ہے اور بقیہ ادیانِ سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی اور کامل ہدایت جس کی منادی سب انبیاء کرتے رہے اسے جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آخری نبی کی حیثیت سے تشریف لائے اب یہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی اور اہلِ ایمان کو ان کے اعمالِ نیک کی بشارت دیتی رہے گی۔

۲۶۵۔ اللہ، اللہ کے رسول، اللہ کے فرشتے اور فرشتوں میں جبریل و میکائیل، ان میں سے کسی ایک کی دشمنی سب کی دشمنی ہے۔ یعنی اللہ کے رسولوں کی دشمنی اللہ کی دشمنی ہے۔ فرشتوں سے دشمنی بھی اللہ سے دشمنی ہے اور وہ سنگین کفر ہے جس کی عداوت کا اللہ نے یہاں اعلان کیا ہے۔

وَلَقَدْ اَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ اٰيٰتٍ بَيِّنٰتٍ ۚ وَمَا يَكْفُرُ بِهَآ اِلَّا الْفٰسِقُوْنَ ۞ اَوَكُلَّمَا
عٰهَدُوْا عَهْدًا نَّبَذَهٗ فَرِيْقٌ مِّنْهُمْ ۭ بَلْ اَكْثَرُهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۞

اور ہم نے اے پیغمبر تمہاری طرف سچائی کی روشن آیات[۲۶۶] اتاری ہیں۔ اور ان کا کوئی انکار نہیں کر سکتا مگر صرف وہی لوگ جو فاسق ہیں[۲۶۷]۔ کیا ان کی تاریخ یہ نہیں ہے کہ کفران کی سرشت ہے اور جب[۲۶۸] بھی انہوں نے کوئی عہد کیا تو ان میں سے ایک گروہ نے اسے پس پشت ڈال دیا اور حقیقت یہ ہے کہ ان کی اکثریت ایسی ہے جو نعمت ایمان سے محروم ہے۔

عہد شکنی کی عادت

روشن اور واضح دلائل جواب تک پیش کیے جا چکے ہیں ان کا انکار کوئی سلیم الفطرت انسان کر نہیں سکتا۔ ان روشن اور صاف دلائل کے باوجود بھی اگر یہ نہیں مانتے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ کی جانب سے دعوت میں کوئی کمی ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ ان کی طبیعتیں بے ایمانی، نافرمانی اور عہد شکنی کی عادی ہو چکی ہیں اور شرائع ربانی سے بغاوت ان کی طبیعتوں کا تقاضا بن چکا ہے۔ اب جو کچھ قرآن اور نبوت کے مقابلے میں یہ کافرانہ طرز عمل اختیار کر رہے ہیں اسی افتادِ طبع کے نتیجے میں کر رہے ہیں۔

۲۶۶ ہم نے تمہاری طرف روشن آیات نازل کی ہیں۔ آیات سے مراد آیات تشریعی ہیں یعنی قرآن کی آیات اور روشن ہونے سے مراد یہ ہے کہ یہی ایک کتاب الٰہی ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اور اخلاق و موعظت بھی۔ مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی اور پہلی تمام آسمانی کتابوں کی مجموعی صفتوں کی حامل بھی، خطابت بھی ہے اور استدلال و فکر بھی، اظہارِ غیب اور پیش گوئیوں سے لبریز بھی ہے اور دقائق حکمت و اسرارِ ایمان و عمل سے معمور بھی۔ اصولِ قانون، مبادی اخلاق اور محاسن علم و عمل کا غلغلہ اس کی آیات کے ہر گوشہ سے بلند۔ اس سے زیادہ روشن اور کس کتاب کی آیات ہو سکتی ہیں۔ تورات قانون ہے لیکن اخلاق و موعظت نہیں ہے۔ انجیل اخلاق و موعظت ہے لیکن قانون نہیں ہے۔ زبور مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا مجموعہ ہے لیکن دیگر صفات سے خالی۔ یہ صرف قرآن ہے جس کی آیات میں ہر پہلو کے لیے

وضاحت اور روشنی ہے، اس کے دلائل میں قوت ہے۔ اس کا جواب لانے کی دُنیا میں کسی کو طاقت نہیں ہے۔ ان آیاتِ بیّنات کا کوئی سلیم الفطرت انسان تو انکار نہیں کر سکتا ہے صرف وہی لوگ انکار کر سکتے ہیں جو قانونِ الٰہی کے توڑتے رہنے اور شرائع ربانی کی بغاوت کے خوگر ہو چکے ہیں۔

حافظ ابن جریرؒ لکھتے ہیں کہ اے اللہ کے پیغمبر ہم نے آپ کی نبوت کے روشن دلائل آپ پر اتارے ہیں یعنی یہ کہ قرآن کی آیات میں ان تمام علوم کا ذخیرہ سمو دیا ہے جو یہودیوں کا سرمایۂ علم ہے۔ بنی اسرائیل کے گزشتہ احوال و وقائع اور وہ تمام حالات جن سے صرف یہودی علماء ہی باخبر تھے۔ اور کتابِ الٰہی میں یہودی علماء کے تصرفات اور تحریفات سے قرآن نے آپؐ کو باخبر کیا ہے۔ ان کو سُن کر ہر منصف مزاج انسان کے لیے یارائے تسلیم کے بغیر چارہ نہیں ہے۔ ان آیات کا ایک اُمّی سے سُن کر تصدیق نہ کرنا اور اس کی نبوت کو نہ ماننا جو اُمیوں ہی کی گودوں میں پلا اور پل کر جوان ہوا۔ اس نے ہوش سنبھالا تو گرد و پیش میں تاریکیوں اور ظلمتوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن سے ایک عاری شہر اور عاری خاندان اور اس کے ہم وطن نوشت و خواند سے ناآشنا تھے۔ گزشتہ صحفِ انبیاء اور افکارِ عالیہ کا ایک حرف اس کے کان میں کبھی نہیں پڑا۔ علماء اور دانش وروں کی صحبت اس نے نہیں اُٹھائی۔ اصولِ قانون اور مبادی اخلاق کی کوئی ظاہری تعلیم اس کو نہیں ملی۔ اس طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس برس پورے کرتا ہے کہ دفعتہً غارِ حرا میں علمِ نبوت اور علمِ قرآت کی تکوین ہوتی ہے اور غار کے دہانے سے باہر علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا چشمہ اُبلتا ہے۔ ظاہری نوشت و خواند کے نقوش و حروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے صحفِ انبیاء اور افکارِ عالیہ کے اوراق اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ ان کی اس روشنی میں اگر کسی کو حق نظر نہیں آتا ہے تو وہ آنکھوں کا اندھا ہے۔ غالباً اسی بات کو سمجھانے کے لیے آیاتِ بیّنات سے پہلے الیکَ (تیری طرف) پر زور دیا ہے۔

۲۶۷ - وہی لوگ فاسق ہیں۔ قرآن کا چہرہ اور قرآنی آیات کا مقام بتانے کے بعد اب اس آیت میں یہودیوں کے انکار کی وجہ پیش کرتے ہیں کہ اس کے باوجود اگر وہ نہیں مانتے تو یہ کفر و جحود کا ان کی جانب سے کوئی نیا مظاہرہ نہیں جس پر حیرت کی جائے۔ اس سے پہلے بھی اُن کا طرزِ عمل یہی رہ چکا ہے۔ اُن کی پوری تاریخ غداری، عہد شکنی، نافرمانی، سرکشی کی ایک مستقل تاریخ ہے۔ تورات کے صفحات اور انجیل کے ورق اسی سرگزشت سے لبریز ہیں۔ یہاں بتایا کہ انکار تو وہی کرتے ہیں جن کی بار بار کی نافرمانیوں اور عدول حکمیوں سے اندر کا نور بجھ چکا ہے۔ اور طبیعت میں حق کی طلب اور صداقت کی تلاش باقی نہیں رہی بلکہ اس کے برعکس باطل اور ضلالت پر جمود نمایاں ہو گیا۔ اس کا

انجام کفر کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے وما یکفر بھا الا الفاسقون۔ فاسق نافرمان اور طاعت سے نکل جانے کو کہتے ہیں قرآن کا عام اسلوب بیان یہ ہے کہ وُہ اللہ سبحانہٗ کے ٹھہرائے ہوئے قوانین و اسباب کو اسی انداز سے پیش کرتا ہے۔ مثلاً اس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ سمجھ بوجھ سے کام لینے کی بجائے رُسوم کے دلدادہ ہوتے ہیں اور ہر بات کو رُسوم کے پیمانے سے ناپتے ہیں اور اسی پر اڑے رہتے ہیں رفتہ رفتہ اُن کا نورِ قابلیت ختم ہو جاتا ہے اور ان کی عقلیں ملری جاتی ہیں۔ کتنی ہی صاف بات کہی جائے اُن کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کتنی ہی ان کی بھلائی چاہو وہ اور زیادہ مخالفت کرتے ہیں۔ قرآن اس حالت کو فسق سے تعبیر کرتا ہے اور اس کی بنا پر کفر کا پیدا ہونا، ضلالت کا آنا اور ہدایت سے محروم ہو جانا اللہ کے ٹھہرائے ہوئے قانون کا قدرتی نتیجہ ہے جب کبھی کوئی یہ چال چلتا ہے اللہ کا مقررہ قانون مؤثر ہو کر اسے اپنے مقام پر پہنچا دیتا ہے۔

اسی بات کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے خالص علمی انداز میں اس طرح سمجھایا ہے۔

ہر فعل اپنی تاثیر کے لیے ایک فاعل یعنی مؤثر اور ایک مفعول یعنی متاثر چاہتا ہے اور متاثر وہی ہو سکتا ہے جس میں اثر پذیری کی قابلیت ہو۔ ہاں یہ ہوتا ہے کہ جیسے فاعل میں قوتِ تاثیری کم اور زیادہ ہوتی ہے ایسے ہی مفعول میں باعتبار اثر پذیری یعنی قابلیتِ قبول کم اور زیادہ ہوتی ہے۔ اور جیسے مفعول میں قابلیت نہ ہونا فاعل میں قوتِ تاثیر کے نہ ہونے کا سبب نہیں ہے۔ ٹھیک ایسے ہی فاعل میں تاثیر نہ ہونا مفعول میں قابلیت نہ ہونے کا سبب نہیں ہوتا ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے۔ روشنی پہنچانے میں آفتاب مؤثر ہے اور اس کے سامنے آئینہ ہو تو وہ متاثر ہے۔ آفتاب فاعل اور آئینہ مفعول ہے اور دونوں میں اثر اندازی اور اثر پذیری کی پوری قابلیت موجود ہے لیکن اگر آفتاب کے سامنے آئینہ نہیں بلکہ توا ہو یا پتھر تو آفتاب کی قوتِ فاعلی میں کوئی نقصان نہیں لیکن پتھر اور توے میں نورِ آفتاب سے اثر پذیری کی قابلیت نہیں۔ اسی طرح سمجھ لیجئے آفتابِ نبوت اور قرآن کی قوتِ فاعلی میں کوئی نقصان نہیں ہے وہ تو آیاتِ بینات کی صورت میں چمک رہی ہیں لیکن اس آفتاب کے سامنے پتھروں سے زیادہ سخت دل ہیں۔ ان میں قسارت، عدوان اور سرکشی کی وجہ سے یہ قابلیت نہیں ہے کہ آفتابِ نبوت کے انوار سے فیضیاب ہوں۔ قرآن میں ایسے تمام مقامات پر جہاں فاسقین کے لیے ضلالت، ہدایت کی محرومی، کفر، افترا ثابت کیا گیا ہے وہاں یہی بتانا مقصود ہے کہ ان کے اندر کی روشنی بجھ چکی ہے مثلاً ما یضل بہ الا الفاسقین اور لا یکفر بھا الا الفاسقون اور ان اللہ لا یرضیٰ عن القوم الفاسقین اور واللہ لا یھدی القوم الفاسقین۔

۲۶۸

ہے۔ اور جب بھی انہوں نے کوئی عہد کیا۔ قرآن میں دوسری جگہ اس بات کو ان قوموں کے بارے میں جنہوں نے انبیاء کی تکذیب کی ایک ضابطہ عام کی صورت میں اس طرح پیش کیا ہے۔

وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ وَاِنْ وَّجَدْنَا اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ہ

ہم نے ان میں سے اکثر میں پاسِ عہد نہیں پایا اور ہم نے ان میں سے اکثر کو فاسق ہی پایا ہے۔

ان کی عادت قدیم ہے کہ جب اللہ یا رسُول یا کسی شخص سے کوئی عہد مقرر کرتے ہیں تو ان ہی میں ایک جماعت اس عہد کو پس پشت ڈال دیتی ہے بلکہ بہت سے یہودی ایسے ہیں جو تورات پر ایمان ہی نہیں رکھتے ہیں ایسے کو عہد شکنی میں کیا باک ہو سکتا ہے[1]۔

یہاں عہد سے مراد وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل نے تورات پر عمل کرنے کا اللہ سے یکے بعد دیگرے کیا تھا۔ یا وہ عہد مراد ہے جو یہودی مدینہ کی زندگی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے رہے اور قدم قدم پر غداری اور بدعہدی کرتے رہے ہیں۔ یا عام زندگی میں جو وعدہ اور عہد کسی سے کرتے ہیں اس کو پورا نہیں کرتے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ غداری اور بدعہدی ان کا قومی نشان بن کر رہ گیا ہے۔ فاسقانہ زندگی کا عہد شکنی ایک ناگزیر نتیجہ ہے۔ جب زندگی میں نافرمانیاں اور اللہ سے سرکشی رونما ہو جاتی ہے تو عبادت کا عہد، طاعت کا عہد اور ایمان کا عہد سب ختم ہو کر رہ جاتے ہیں۔ یہاں عہد کی تنکیر بتاتی ہے کہ ہر قسم کے عہد میں یہود کی غداری بتانی پیش نظر ہے۔ بتانا یہ ہے کہ جب بھی کوئی عہد من حیث الجماعت کرتے ہیں خواہ یہ سیاسی ہو یا اقتصادی، جنگی ہو یا معاہدہ ان کی ایک جماعت اس کی دھجیاں اڑا دیتی ہے اور غداری کرتی ہے۔ عہد و میثاق کے معاملہ میں سب سے زیادہ اہم اور سب سے زیادہ نازک معاملہ جماعتوں کے معاہدوں کا ہے اور اسی میں اس کی آزمائش ہے ان میں بحیثیتِ قوم عہد شکنی اور بد معاملگی بڑی دانشمندی سمجھی جاتی تھی۔

آیت میں لفظ فریق سے یہ وہم ہوتا تھا کہ تھوڑے عہد شکنی کرتے ہوں گے اس لیے فرمایا نہیں بلکہ ان کی اکثریت ایمان نہیں رکھتی تھی ––– اور اگر مطلب یہ ہے کہ اس بنا پر ان کی اکثریت ایمان نہ لائے گی تو یہ قرآن کی پیش گوئی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ یہودیوں سے بہت کم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے ہیں۔

یہاں یہودیوں کے بارے میں بات کے خاتمہ پر ان کی بے ایمانی پر لا یومنون کہہ کر اعلان

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۹

وَلَمَّا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ مُصَدِّقٌ لِّمَا مَعَهُمْ نَبَذَ فَرِيْقٌ مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ ۙ كِتٰبَ اللّٰهِ وَرَآءَ ظُهُوْرِهِمْ كَاَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝

اور دیکھو جب اُن کے پاس اللہ کی جانب سے عظیم الشان پیغمبر اس کتاب کی تصدیق و تائید کرتا ان کے پاس آیا تو اُن لوگوں میں سے جن کو کتاب دی گئی تھی ایک گروہ نے کتابِ الٰہی کو اس طرح پسِ پشت ڈال دیا گویا وہ اسے جانتے ہی نہیں ہیں۔

کرنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ یہودیوں نے سب سے زیادہ اہمیت زندگی کی رسموں اور رواجوں کو دے رکھی تھی۔ قرآن نے یہاں اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ ایفائے عہد تو درکنار ان میں سے اکثریت یہی نہیں مانتی کہ کبھی اطاعت کا عہد و پیمان بھی ہوا تھا۔ گویا ایمان لا یؤمنون اپنے اصطلاحی معنے میں نہیں لفظی معنے میں ہے اور اگر اصطلاحی معنے میں ایمان ہو تو فقرے کا مطلب یہ ہو گا کہ ان لوگوں کی اکثریت دینی کتابوں پر ایمان نہیں رکھتی ہے۔ حاصل دونوں کا یہی ہے کہ ان میں پاسِ عہد نہیں ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہودیوں کی تین بستیاں تھیں۔ بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے صلح و امن اور باہم دیگر اعانت کا معاہدہ کیا۔ معاہدہ کی ایک شرط یہ تھی کہ تمام جماعتیں متحد ہو کر رہیں گی اور کسی فریق پر اس کا دشمن حملہ آور ہو گا تو سب اس کی مدد کریں گے[1] ــــــ ابھی معاہدے کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ یہودیوں نے خلاف ورزی شروع کر دی اور قریشِ مکہ سے مل کر مسلمانوں کی تباہی کی سازشیں کرنے لگے۔ قرطبیؒ نے حضرت عطاءؒ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اس آیت میں ان ہی معاہدات کا ذکر ہے۔

---

[1] سیرت ابنِ ہشام

نبوتِ محمدیہ اور یہود کی عہد شکنی

پہلی آیت میں ان کی عام زندگی میں عہد شکنی کا ذکر تھا۔ اس آیت میں اس خاص عہد شکنی کی نشاندہی کی جا رہی ہے جس کا تعلق نبوتِ محمدیہ سے ہے۔ تورات میں جہاں اللہ نے ان سے دوسرے عہد لیے تھے ایک خاص عہد یہ بھی لیا تھا کہ وہ اللہ کی جانب سے آنے والے رسُول کی مدد کریں گے۔ اور اس کا احترام کریں گے۔ بلکہ آپ کی پیشین گوئی، علامتیں اور آپ پر ایمان لانے کی تاکید تورات میں درج تھی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی زندگی کی آخری وصیت جس پر اُن کی تورات اور اُن کے صحیفۂ حیات دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے بنی اسرائیل کو یہ فرمائی:

یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مردِ خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا، اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔ ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے۔ اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری شریعت کو مانیں گے۔ (استثناء ۳۳-۱-۲-۳)

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا آخری کلام ہے جس میں آخری نبوت کی خبر دی گئی ہے۔ بہر حال تورات میں اس قسم کی بشارتیں اور بھی موجود ہیں۔ (دیکھو استثنا ۱۸-۱۷ اور ۲۲-۲۱ وغیرہ)

۲۶۹ ۔ آیت میں رسُول سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ابن جریرؒ رقمطراز ہیں، جب عُلمائے یہود کے پاس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ ابن کثیرؒ، قرطبیؒ بھی ابن جریرؒ کے ہم زبان ہیں کہ رسُول سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے۔

رسُول سے مراد حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ما معھم سے تورات اور کتاب اللہ سے بھی تورات ہی مراد ہے۔ یعنی جب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے حالانکہ وہ تورات کے مصدق تھے تو یہودیوں کی ایک جماعت نے خود تورات کو پسِ پشت ڈال دیا کہ گویا جانتی ہی نہیں ہے کہ یہ کیا کتاب ہے اور اس میں کیا کیا حکم ہیں لہٰذا جب اُن کا اپنی کتاب ہی پر ایمان نہیں ہے تو ان سے اور کیا توقع ہو سکتی ہے[1]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۹

۲۷۰ف پہلی آیت میں تصدیق و تائید قرآن کے تعارف میں آئی تھی اور یہاں یہی بات نبوت کی تعریف میں دُہرائی گئی ہے۔ یعنی یہ پیغمبر تمہارے خدا کی جانب سے آئے ہوئے علمی سرمایہ کی تصدیق و تائید کے لیے آئے ہیں۔ اس کے مختلف مطلب ہو سکتے ہیں۔

ایک یہ کہ میری تعلیم تمہارے نوشتوں کے خلاف نہیں ہے بلکہ سرتاسر مصدق و مؤید ہے۔ اس لیے تمہیں میری دعوت کو قبول کر لینا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ تمہارے مقدس نوشتوں میں پیغمبر آخر الزماں کے آنے کی خبر دی گئی ہے اور اس کی علامات بتائی گئی ہیں۔ میری آمد تمہارے مقدس نوشتوں میں اس پیش کی ہوئی خبر کی عملی تصدیق و تائید ہے۔ گویا اب تک تورات میں جو بات ایک نظریہ تھی میری آمد اسی نظریہ کی عملی شہادت ہے تمہیں تو خوش ہونا چاہیے کہ میری آمد سے تمہاری کتاب کی تصدیق ہو گئی۔

تیسرے یہ کہ میرا یہ کہنا کہ تورات اللہ کا وہ کلام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر اترا۔ یہ میری جانب سے تورات کے کلامِ الٰہی ہونے کی تصدیق ہے۔

چوتھے یہ کہ دین کے جو اُصول اور توحید کے جو ضوابط تورات میں پیش کیے گئے ہیں میں اُن کا مُنکر نہیں بلکہ مصدق و مؤید ہوں۔

سوال یہ ہے کہ اللہ کی جانب سے جب ان کے پاس عظیم الشان رسُول آیا جو ان کی کتاب تورات کا مُنکر نہیں بلکہ مصدق و مؤید تھا تو اُن لوگوں نے کیا کیا؟ قرآن نے اسی سوال کا جواب آگے دیا ہے۔

۲۷۱ف۔ اُن لوگوں نے کتابِ الٰہی کو پسِ پشت ڈال دیا۔ اصل ارشاد میں نبذ آیا ہے۔ عربی میں پھینکنے اور ڈالنے کو نبذ کہتے ہیں۔ اسی سے اُفتادہ بچے کو منبوذ کہتے ہیں۔ اور جب پانی میں کھجور یا کشمش ڈال دی جائے تو اُسے نبیذ کہتے ہیں۔ ابنِ کثیرؒ نے ابوالاسود کا ایک شعر اس کی تائید میں پیش کیا ہے۔

نظرت الی عنوانه فنبذته كنبذك نعلاً اخلقت من نعالكا

مطلب یہ ہے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تورات کی بشارتوں کے مطابق تشریف لائے تو ان کینہ پرور یہودیوں نے اس حسد میں کہ نبوت بنی اسماعیل میں کیوں آئی ہے خود تورات کے احکام کو ہی پسِ پشت ڈال دیا۔ اور طرّہ یہ ہے کہ اسے کتاب اللہ جانتے ہوئے اور خود اہلِ کتاب ہوتے ہوئے انہوں نے یہ کام کیا۔ پسِ پُشت ڈالنے کا یہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے تورات کے کتاب اللہ ہونے کا انکار کر دیا تھا یا ساری تورات سے بے رُخ ہو گئے

وَاتَّبَعُوْا مَا تَتْلُوا الشَّيٰطِيْنُ عَلٰى مُلْكِ سُلَيْمٰنَ ۚ وَمَا كَفَرَ سُلَيْمٰنُ وَلٰكِنَّ
الشَّيٰطِيْنَ كَفَرُوْا يُعَلِّمُوْنَ النَّاسَ السِّحْرَ ۗ وَمَآ اُنْزِلَ عَلَى الْمَلَكَيْنِ بِبَابِلَ
هَارُوْتَ وَمَارُوْتَ ۭ وَمَا يُعَلِّمٰنِ مِنْ اَحَدٍ حَتّٰى يَقُوْلَآ اِنَّمَا نَحْنُ فِتْنَةٌ فَلَا تَكْفُرْ ۭ
فَيَتَعَلَّمُوْنَ مِنْهُمَا مَا يُفَرِّقُوْنَ بِهٖ بَيْنَ الْمَرْءِ وَزَوْجِهٖ ۭ وَمَا هُمْ بِضَاۗرِّيْنَ بِهٖ مِنْ
اَحَدٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَيَتَعَلَّمُوْنَ مَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ ۭ وَلَقَدْ عَلِمُوْا لَمَنِ اشْتَرٰىهُ
مَا لَهٗ فِي الْاٰخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۭ وَلَبِئْسَ مَا شَرَوْا بِهٖٓ اَنْفُسَهُمْ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۰۲﴾

اور کتاب اللہ کی پیروی چھوڑ کر اُن غیروں کے پیروکار بن گئے جو شیاطین[۲۷۲] سلیمانؑ
کے دورِ حکومت کا نام لے کر پیش کرتے تھے حالانکہ سلیمانؑ[۲۷۳] نے کفر نہیں کیا بلکہ
کفر کے مرتکب[۲۷۴] تو شیاطین تھے جو لوگوں کو جادوگری[۲۷۵] کی تعلیم دیتے تھے۔ اور وہ پیروکار
بن گئے ان چیزوں کے جو بابل[۲۷۶] میں ہاروت اور ماروت نامی دو فرشتوں پر اتاری
گئیں۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی کسی کو بتلاتے تھے یہ کہہ کر[۲۷۷] بتلاتے تھے کہ ہمارا
وجود تو ایک آزمائش ہے تم کفر میں مبتلا نہ ہو۔ اس کے باوجود لوگ اُن سے وہ عمل
سیکھتے تھے جن کے ذریعے شوہر اور بیوی[۲۷۸] میں جدائی ڈال دیں حالانکہ وہ اللہ کے حکم کے
بغیر کسی شخص کو نقصان نہیں[۲۷۹] پہنچا سکتے تھے لیکن اس کے باوجود ایسی باتیں سیکھتے ہیں[۲۸۰]
جو ان کو سرتاسر نقصان رساں ہیں اور کسی درجہ میں ان کے حق میں نفع بخش نہیں ہیں
اور اُن کو خوب معلوم ہے کہ جو شخص کتابِ الٰہی چھوڑ کر جادو کا خریدار بن جاتا ہے اس کے
لیے آخرت کی زندگی میں کوئی حصہ نہیں[۲۸۱] ہے۔ افسوس ان کے اس کاروبار پر کتنی بری
ہے وہ متاع جس کے عوض انہوں نے اپنے آپ کو بیچ ڈالا۔ کاش اُن کو حقیقتِ حال
کا علم ہوتا۔

تھے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے تورات کی ان آیات کو جن میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارتیں تھیں، آپ کی علامات تھیں، آپ پر ایمان لانے اور آپ کی پیروی کا حکم تھا پس انداز کر دیا تھا۔ یہاں ان آیات کے عملی تقاضے پورے نہ کرنے کو اس شخص سے تشبیہہ دی ہے جو کسی چیز کو پس پشت ڈال دیتا ہے اور اس سے بے رُخ ہو جاتا ہے۔ اس طرح دلوں سے وحی کا احترام اٹھ جاتا ہے اور انسان دلیر ہو جاتا ہے اور کتاب اللہ کے ساتھ ان کا معاملہ یہ ہو گیا کہ گویا وہ کتاب الٰہی کو جانتے ہی نہیں ہیں «کانهم لا یعلمون» یعنی انہوں نے اسے اس طرح پس پشت ڈالا ہے کہ گویا ان کو یہ پتہ نہیں ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ کتاب اللہ سے ان کی بے رُخی اور بے توجہی پر طنز مقصود ہے ایسے ہو گئے جیسے ان کو خبر ہی نہیں ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور اللہ کی کتاب ہے۔ اس انداز بیان میں بھی ایک لطیف اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص طبیعت کی غلط اُفتاد سے یا ماحول کے دباؤ سے یہ جانتے ہوئے کہ یہ اللہ کا حکم ہے نافرمانی کا کوئی قدم اٹھا لیتا ہے تو اس سے واپسی کی توقع ہوتی ہے کہ جب طبیعت کی اُفتاد صحیح ہو گی توبہ کے لیے آمادگی رونما ہو جائے گی۔ لیکن اگر ایک شخص اصل سے ہی بے خبر ہو جائے اور کتاب الٰہی کو کتاب الٰہی نہ جانے تو پھر اس سے واپسی کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اس کی حیثیت بالکل اس گنہگار کی ہے جو گناہ کو نیکی کا لباس پہنا کر کرے۔ جیسے اس کو گناہ سے توبہ کی توفیق نہیں ہوتی ایسے ہی اس شخص کو بھی کبھی کتاب الٰہی پر عمل کی توفیق نہ ہو گی جو کتاب کو کتاب اللہ ہی نہیں جانتا ہے۔

کتاب اللہ کو چھوڑ کر جادوگری سے دلچسپی

جب یہودیوں پر اخلاقی و مادی انحطاط کا دور آیا اور غلامی، جہالت، نکبت و افلاس اور ذلت و پستی نے اُن کے اندر کوئی بلند حوصلگی، اولوالعزمی باقی نہ چھوڑی تو اُن کی توجہات جادو ٹونے، اور طلسمات و نیرنجات عملیات اور تعویذ گنڈوں کی طرف مبذول ہونے لگی۔ اور بجائے اللہ کی کتاب کے ان کے فکر و نظر اور ان کے مطالعہ و جستجو کا مرکز یہ چیزیں بن گئیں۔ وہ ایسی تدبیریں ڈھونڈنے لگے جن سے کسی مشقت کے بغیر محض ٹونوں، ٹوٹکوں، پھونکوں اور منتروں کے زور سے سارے کام بن جائیں۔

اس دورِ انحطاط میں ایسی شخصیتوں کی ہمیشہ اُمتوں میں رونمائی ہو جاتی ہے جو بقول علّامہ اقبال انحطاط خویش را تہذیب گفت۔ انحطاط کی ساری صورتوں کے لیے حسین لبادے تلاش کر لیے ہیں چنانچہ

ان ہی شیطانی ہستیوں نے معاشرے میں اپنے کردار کی یہ توجیہہ پیش کی کہ سلیمان علیہ السلام کی حکومت کا سارا کاروبار اور آن کی تمام حیرت انگیز طاقتیں، جادو، منتر اور نقش کا نتیجہ تھیں۔ قوم کی قوم بہکاوے میں آگئی اور نعمت غیر مترقبہ سمجھ کر ان چیزوں پر ٹوٹ پڑے۔ پھر نہ کتاب اللہ سے ان کو کوئی دلچسپی رہی اور نہ کسی داعی کی آواز کا ان پر کوئی اثر ہوا۔ گویا اب قرآن نے یہود کے فرد جرم میں ایک اس عنوان کا بھی اضافہ کر دیا کہ یہ لوگ وحیٔ الٰہی کی اتباع کی جگہ ایک دوسرے سفلی علم پر فریفتہ ہو گئے اور اس ضمن میں قرآن بعض اہم تاریخی اور علمی حقیقتوں کو خاص طور پر پیش کر رہا ہے۔ فنِ سحر و کہانت یہود کی تاریخ میں مسلم ہے۔ ان کے اکابر اور مشاہیر اس کا برابر اعتراف کرتے آئے ہیں۔ پروفیسر مارگولیتھ آنجہانی اپنی انگریزی سیرتِ رسولؐ میں یہودِ مدینہ کے بارے میں رقم طراز ہے کہ یہ لوگ فنِ سحر کے ماہر تھے اور بجائے میدانِ جنگ میں آنے کے سفلی عملیات کو ترجیح دیتے تھے۔

۲۷۲
ف۔ ان چیزوں کے پیروکار بن گئے جو شیطان سلیمان کے دورِ حکومت کا نام لے کر پیش کرتے تھے۔

شیاطین سے شیاطین الانس اور شیاطین الجن دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ امام محمد بن جریر طبریؒ فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں ہر سرکش شیطان ہے۔ جنات میں سے ہو یا انسانوں میں سے یا چوپایوں میں سے ہو غرض ہر شے سے شیطان ہو سکتا ہے۔

اس کے بعد قرآن نے شیاطین کا یہ کردار پیش کیا کہ وہ سلیمان کے دورِ حکومت کے بارے میں کچھ افسانے بیان کرتے۔ اصل ارشاد عربی الفاظ یہ ہیں تتلوا علی ملک سلیمان۔ حافظ ابن جریرؒ نے یہاں علیٰ کو فی کے معنے میں بتایا ہے لیکن حافظ ابن کثیرؒ کو ان کے اس خیال سے اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ علیٰ اپنے ہی معنے میں ہے اور معنویت یہ ہے کہ اس کے آنے کی وجہ سے تلاوت میں جھوٹ کے معنے کی جان پڑ گئی ہے اور پورے فقرے کا مطلب ابن کثیرؒ یہ بتاتے ہیں کہ یہ یہودی کتاب اللہ سے بے رخ ہو کر اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت میں سرگرم ہو کر ان افسانوں، کہانیوں اور روایتوں کے پیروکار بنے ہوئے ہیں جو سرکش قسم کے لوگوں نے حضرت سلیمان کے زمانۂ حکومت کے بارے میں بنا رکھے ہیں اور جن کی تاریخ میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ یعنی نبوت کی ہدایات پر چلنے کے بجائے سفلی مشغلوں میں پڑے ہوئے ہیں۔ خبر نہیں لوگ اس سیدھے سادے مطلب کے ہوتے ہوئے علیٰ کو فی کے معنے میں لے کر آیت کا مطلب یہ کیوں بتاتے ہیں کہ یہود کے باپ دادا حضرت سلیمان کے زمانے میں شیطانی مشغلوں میں لگے رہے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ،

یعنی ان احمقوں نے کتاب الٰہی تو پسِ پشت ڈال دی اور شیطانوں سے جادو سیکھا اور ان کی متابعت کرنے لگے[1]

قرطبیؒ نے بھی آیت کا یہی مطلب بتایا ہے کہ یہ ان لوگوں کے بارے میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے انکشاف ہو رہا ہے جو کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال کر جادو کے پیچھے پڑ گئے تھے۔

سلیمان علیہ السلام

ف ۲۷۳ . سلیمان بن داؤد (۹۹۰ تا ۹۳۹ قبل مسیح) سلسلۂ اسرائیلی کے نامور پیغمبر گزرے ہیں حضرت داؤد کی وفات کے بعد اُن کے جانشین ہوئے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے آپ کی ذات بابرکات میں نبوت اور حکومت دونوں کو مکمل طور پر جمع فرمایا۔ شام وفلسطین کے علاوہ آپ کے حدودِ حکومت مشرق کی سمت میں عراق میں دریائے فرات کے ساحل تک اور مغرب میں سرحدِ مصر تک وسیع تھے۔ آپ کی شوکت وعظمت پر دوست ودشمن سب کا اتفاق ہے۔ حضرت سلیمان کو نبی ماننے والی دو قومیں اسلام سے پہلے موجود تھیں۔ یہ دونوں یہود ونصاریٰ ہیں۔ ان دونوں کے اکابر نے ستم ظریفی کا کمال یہ دکھایا ہے کہ ایک طرف تو ان کی عظمت اور پیغمبری کے قائل ہیں دوسری طرف آپ کے نامۂ اعمال میں گندے سے گندے جرائم بھی ڈال دیتے ہیں۔ یہاں تک کہ کفر وشرک سے بھی اُن کے دامن کو آلودہ کر دیا۔ یہودی قصص وحکایات اور عیسائی آثار وروایات میں نہیں بلکہ بائبل کے عہدِ عتیق کے صحائف میں یہود اور عیسائی دونوں کا ایمان ہے۔ اس میں یہ تصریحات موجود ہیں،

جب سلیمان بڈھا ہوا اس کی جورؤں نے اس کے دل کو غیر معبودوں کی طرف مائل کر دیا۔ اور اس کا دل اپنے خدا کی طرف کامل نہ تھا۔ (سلاطین ۱۱۔ ۴۰۔ ۹۔ ۱۰)

سو ازبس کہ اس کا دل خداوند اسرائیل کے خدا سے برگشتہ ہوا۔ اس لیے خداوند سلیمان پر غضبناک ہوا کہ اس نے اسے حکم دیا تھا کہ وہ اپنی معبودوں کی پیروی نہ کرے پر اُس نے اپنے خداوند کے حکم کو یاد نہ رکھا (سلاطین ۱۱۔ ۹۔ ۱۰) معاذاللہ اللہ کا پیغمبر اور کفر وشرک جیسے سنگین جرائم میں مبتلا۔ اللہ اکبر ہزارہا سال تک دنیا اس معصوم پیغمبر کو یہودیوں کی ان تحریفات کا شکار ہو کر مشرک وکافر سمجھتی رہی یہاں تک کہ قرآن آیا اور اس نے اعلان کیا کہ سلیمان کو کافر کہتے ہو وہ تو کفر کے قریب ہی نہیں گیا ما کفر سلیمان[2]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ [2] تفسیر ماجدی ص ۴۰

زمانۂ نبوت ہی میں علمائے یہود کو یہ کہتے سنا گیا جیسا کہ ابنِ جریرؒ اور ابنِ کثیرؒ نے لکھا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھو کہ سلیمان کو اللہ کے نبی کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ حالانکہ بخدا وہ نبی نہیں وہ تو ایک جادوگر تھا۔ ذہن کی اس گندگی اور عقیدے کے اسی فساد کے جواب میں قرآن نے ماکفر سلیمان کہا ہے۔

۲۷۴۔ بلکہ کفر کے مرتکب تو شیاطین تھے۔ یہ شیاطین انسان ہوں یا جن۔ قیاس یہی ہے کہ انسانوں کی بات ہو رہی ہے۔ آج بھی یہ سارا کام اگر انسان ہی کر رہے ہیں تو اس وقت انسانوں کو اس میں کیا تکلف تھا۔ بہر حال کافرانہ کردار شیاطین کا تھا۔ یہ شیاطین اپنے اس کافرانہ کردار کا شجرہ نسب حضرت سلیمانؑ سے ملاتے تھے۔ آج بھی ہم میں جو اس قسم کی خرافاتی بیماریوں میں مبتلا ہیں وہ بھی ان برائیوں پر نیکیوں کا ملمع چڑھانے کے لیے ان کی نسبت گزرے ہوئے بزرگوں کی طرف کرتے ہیں۔ اس قسم کی سینکڑوں برائیاں ہیں جن کے گناہ کا وزن ہلکا کرنے یا ان کو نیکی کا لباس پہنانے کے لیے ان کا نسب نامہ ہم نے بزرگوں سے ملا رکھا ہے وہ بھی اپنے اس کافرانہ طرزِ عمل کو عوام میں مقبول بنانے کے لیے یہ شہرت دیتے تھے کہ ہم تو جو کچھ کر رہے ہیں ان کی رضامندی اور اُن کے اشارے سے کر رہے ہیں۔

۲۷۵۔ وہ لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے۔ اس فقرے کے ذریعے یہ بات کھول دی کہ اُن کا کافرانہ کردار کیا تھا۔ فرمایا کہ وہ جادو کی تعلیم کا کام تھا۔

سحر کیا ہے؟ لغت میں سحر کے معنے ارخفی اور پوشیدہ چیز کے ہیں چنانچہ صبح کے اول وقت کو سحر کہتے ہیں کیونکہ ابھی دن کی روشنی پوری طرح نمودار نہیں ہوتی۔ قدرے تاریکی ہوتی ہے اور علمی اصطلاح میں ایسے عجیب و غریب کاموں کا نام ہے جن کے وجود کے اسباب نظر سے اوجھل ہوں اور بادی النظر میں محسوس نہ ہوتے ہوں۔ امام رازی رقم طراز ہیں۔

لفظ سحر اصطلاحِ شریعت میں ایسی ہر حالت اور کام کو کہتے ہیں جن کا سبب پوشیدہ ہو اور اصل حقیقت کے خلاف نظر آئے۔

سحر کی کچھ حقیقت ہے یا محض نظر کا دھوکا ہے۔ اس کے متعلق جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ سحر واقعی ایک فن ہے اور نقصان وہ اثرات رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ بالغہ اور مصلحتِ کاملہ کے پیش نظر اس میں نقصان وہ اثرات رکھ دیے ہیں جس طرح زہر اور دوسری اشیا میں۔ یہ نہیں ہے کہ سحر قدرتِ الٰہی سے بے نیاز ہو کر خود مؤثر بالذات ہے۔ لیکن ابوبکر، جصاص رازی، ابواسحاق السفرائینی، حافظ ابن حزم ظاہری اور معتزلہ کہتے ہیں کہ سحر کی حقیقت شعبدہ، نظر بندی اور فریبِ خیال کے علاوہ اور کچھ نہیں

ہے۔ ایک باطل اور بے حقیقت شے ہے۔

ابوبکر جصاص کہتے ہیں،

جب سحر کو بلا قید بولا جائے تو اس کے معنے دھوکہ، باطل، ملمع کاری اور بے حقیقت چیز کے ہوتے ہیں۔

اور حافظ عماد الدین ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

ابوعبداللہ قرطبی فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سحر حقیقت ہے اور اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے معتزلہ اور ابواسحاق اسفرائنی کا خیال ہے کہ سحر محض فریب نظر اور خیال بندی کا نام ہے۔

علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں یہ تعریف کی ہے۔

استعداد کی ایسی کیفیت جاننے کا نام ہے جس کے برتنے پر انسان عالم عناصر میں اثر انداز ہو سکے۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ کبھی آسمان کے کواکب وغیرہ کی مدد سے ہوتا ہے کبھی بغیر مدد کے۔ پہلے کو سحر اور دوسرے کو طلسمات کہتے ہیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

سحر کے بارے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ صرف فریب نظر اور بے حقیقت ہے۔ یہ ابوبکر رازی، ابوجعفر شافعی اور ابن حزم ظاہری کا خیال ہے اور نووی کہتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ سحر میں واقعیت ہوتی ہے۔ جمہور اور عام علماء کا یہی مسلک ہے۔

حافظ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں:

سحر کی حقیقت کیا ہے اس بارے میں مختلف خیالات ہیں۔ اوّل یہ کہ واقعیت اور حقیقت ہے جیسے ہوا میں اڑنا اور ایک رات میں مسافتوں کا قطع کر لینا۔ دوم یہ کہ دھوکہ بازی، بازی گری اور ملمع سازی ہے اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ سوم یہ کہ اس میں حیلہ و تدبیر سے نظر بندی ہو جاتی ہے۔ حیلہ گروں، شعبدہ بازوں میں اس طرح کی چیزیں ہوتی ہیں۔ کتاب الدک والشعوذہ، ایضاح الشک اور کتاب ارخاء الستور میں اس طرح کی چیزیں مذکور ہیں۔

چہارم یہ کہ جنات کی ایک قسم ایسی بھی ہے جو یہ کام کرتے ہیں۔ انہوں نے اسے اپنے جسم کی جنس لطیف اور اس کی کیفیات سے نکالا ہے۔ اسی لیے سحر دقیق، لطیف اور خفی ہوتا ہے۔

پنجم یہ کہ اس کی ترکیب ان اجسام سے ہوتی ہے جن کو جلایا جاتا ہے اور ان کی راکھ بنا کر ان پر نام اور عزائم پڑھے جاتے ہیں۔ اور پھر جہاں سحر کی ضرورت ہوتی ہے وہاں ان کو استعمال کرتے ہیں۔

ششم یہ کہ اس کی اصل طلسمات اور نیرنجات ہیں جو ستاروں کی خاصیت کی تاثیر پر بنائے جاتے ہیں

جیسے فرعونی لاٹھیوں کے بارے میں دھوپ کی تاثیر تھی۔

ہفتم یہ کہ یہ کلمات کفریہ سے مرکب ہوتا ہے۔ ہمارے ایک معاصر کا بیان ہے کہ یہ سب اقوال جو سحر کی حقیقت کے بارے میں بیان کیے جاتے ہیں سحر کی قسموں میں سے کچھ قسمیں ہیں۔ اس نے ان کے ساتھ دوسرے انواع شعبدہ، نیز نیرنجات، اوفاق، عزائم اور روحانوں کا ڈالنا اور اختلال حواس کو بھی شمار کیا ہے۔[1]

جو علماء سحر کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں ان کے درمیان پھر یہ اختلاف رائے ہے کہ کیا واقعی سحر میں یہ تاثیر ہے کہ وہ حقائق اور ماہیات کو تبدیل کر دے۔ ایک چھوٹے گروہ کی یہ رائے ہے کہ اس میں انقلاب کی تاثیر ہے لیکن جمہور علماء کا خیال ہے کہ اس میں یہ تاثیر نہیں ہے اور سحر کے ذریعے کسی بھی ماہیت کا انقلاب نہیں ہو سکتا۔ بلکہ اس مرحلہ پر وہ محض نظر بندی اور قوت متخیلہ کی شعبدہ بازی کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا۔ چنانچہ حافظ ابن حجر اس مسئلہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

لیکن محل نزاع یہ بات ہے کہ سحر سے ذات کا انقلاب ہو جاتا ہے یا نہیں۔ جو شخص یہ کہتا ہے کہ یہ محض خیال بندی ہے وہ انقلاب حقیقت کو نہیں مانتا۔ اور جو سحر کو واقعی اور حقیقت کہتے ہیں وہ اس میں مختلف الخیال ہیں کہ کیا سحر کی تاثیر صرف یہی ہوتی ہے کہ مزاج میں ایسا تغیر پیدا کر دے جیسا تغیر بیماری میں ہو جاتا ہے اور یہ بھی ایک بیماری کے درجہ میں ہے یا اس کی تاثیر اس سے زیادہ ہوتی ہے کہ ایک چیز کی حقیقت ہی کو بدل ڈالے مثلاً گھوڑے کو آدمی اور آدمی کو گدھا بنا دے۔ جمہور پہلی بات کے مدعی ہیں اور دوسری بات مرجوح ہے[2]

علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج الدین السبکی کے حوالے سے بتایا ہے کہ سحر، کہانت اور نجوم، رمل، جفر وغیرہ سب ایک ہی ہیں[3]

سحر اور اعجاز میں فرق

یہاں یہ بحث بے حد اہمیت رکھتی ہے اور اس میں اہمیت کی وجہ یہ ہے کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ سحر میں واقعیت اور حقیقت ہے تو پھر معجزہ اور سحر میں کیا فرق ہے؟ ایک شخص یہ کیسے اندازہ لگائے کہ یہ نبی اور رسول کا معجزہ ہے یا ساحر کا سحر، اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔ مباحث میں بہت زیادہ پھیلاؤ ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے النبوات میں شیخ محمد سفارینی نے شرح عقیدہ سفارینی میں علمی دلائل

---

[1] البحر المحیط ج ۱ ص ۳۲۷ [2] فتح الباری ج ۱ ص ۱۸۴ [3]

اور براہین کا انبار لگا دیا ہے لیکن موضوع کا تقاضا ہے کہ کچھ مختصر اشارات یہاں پیش کر دیے جائیں۔ تفصیل انشاء اللہ بشرط حیات پارہ ۱۶ سورۂ طٰہٰ میں آئے گی۔

بنیادی طور پر یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ سحر بھی من جملہ دیگر فنون کے ایک فن ہے اور جس طرح دُنیا میں دوسرے فنون انسانوں میں وہبی نہیں کسبی ہیں اسی طرح سحر بھی کسبی ہے۔ اور یہ کام بھی ایک فن کار ہی کر سکتا ہے۔ دُنیا میں جس قدر علوم و فنون ہیں قانون و حکمت، اخلاق و موعظت، فلسفہ و کلام، بلاغت و ادب، نثر و نظم، تاریخ و جغرافیہ، سب کسبی ہیں۔ ان میں مہارت اور فنکار بننے کے بعد ہر شخص امام بن سکتا ہے۔ یقیناً ایک قانون داں بیرسٹر قانون پر، ایک حکیم و ڈاکٹر بیماری کے لیے دواؤں پر، ایک نفسیات کا پروفیسر علم النفس کی باریکیوں پر، ایک فلاسفر فلسفہ کے رموز پر، ایک متکلم کلامی موضوعات پر، ایک ادیب بلاغت کے اطوار پر، ایک شاعر عروض قافیہ پر اور ایک مورخ گزری ہوئی دُنیا کے وقائع پر اور بالآخر ایک نجومی، ایک رمّال، ایک جفار اور ایک مسمریزر اپنے اپنے علم کے موضوعات پر اپنے فن کے سہارے اپنی قابلیت کے جوہر دکھا سکتا ہے لیکن معجزہ کو ان سے جو چیز ممتاز کرتی ہے وہ یہ اور صرف یہ کہ

۱۔ معجزہ قدرت کا فعل اور ایک آیت ربانی ہوتا ہے اور اسباب کی دُنیا سے بے نیاز ہو کر رونما ہوتا ہے۔ ساحر کا سحر اپنا کرتب اور اپنا فن ہوتا ہے۔

۲۔ معجزہ نبی کے اپنے فن تو درکنار اپنے ارادہ کے بھی تابع نہیں ہوتا کہ وہ جب چاہے دکھا سکے۔ برخلاف ساحر کے سحر اور دوسرے فن کاروں کے کہ ان کا سحر اپنے ارادہ کے تابع ہوتا ہے اور اپنے فن میں فنکار ہونے کی وجہ سے جب چاہیں دکھا سکتے ہیں۔

اس لیے نبی کے اعجاز اور ساحر کے سحر میں کوئی اشتباہ اور التباس نہیں ہے۔ معجزہ تو کہتے ہی اس کو ہیں کہ

۱۔ جس کے وجود میں اسباب کا کوئی تعلق نہ ہو۔
۲۔ صاحب معجزہ کی اپنی کسی قوت کا اس میں کوئی دخل نہ ہو۔
۳۔ مدعی رسالت اس کے ساتھ یہ دعویٰ کرتا ہو کہ اللہ تعالیٰ یہ کام کر دے گا۔
۴۔ مدعی رسالت اس کو اپنی رسالت کے لیے بطور دلیل پیش کرے۔
۵۔ مقابلہ میں کوئی شخص اس جیسا عمل نہ دکھا سکے۔

اسی بنا پر جب کہنے والوں نے حضرت موسیٰؑ کو فنکار ساحر سمجھا تو ان کا مقابلہ کرنے کے لیے جادو

کے فن کاروں کو بلایا گیا۔ جب ساحرین نے مقابلہ پر یہ جان لیا کہ موسیٰ فن کار نہیں ہیں بلکہ اس کا کارنامہ طاقت بشری سے بالا ہے۔ تو وہ فوراً رب موسیٰ و ہارون پر ایمان لے آتے اور اس فیصلہ میں کوئی وقت بھی نہیں لگا۔ اعجاز و سحر کا آمنا سامنا ہوتے ہی دونوں ممتاز ہو گئے اور معلوم ہو گیا کہ یہ فن کاری ہے اور یہ قدرتِ الٰہی کی جلوہ نمائی ہے۔

۲۷۶ ۔ اللہ پروردگار نے جو بابل میں ہاروت ماروت دو نامی فرشتوں پر اتاری گئی۔ اس فقرے میں یہ باتیں تشریح طلب ہیں۔

۱۔ بابل کیا ہے؟

۲۔ ہاروت و ماروت کون ہیں؟

بابل ایک عظیم الشان شہر کا نام ہے جو قدیم زمانے میں فرات کے دونوں جانب واقع تھا اور دریائے فرات اس کے درمیان سے گزرتا تھا۔ آج بھی فرات کے دونوں طرف اس کے کھنڈرات موجود ہیں۔ عراق کا پایۂ تخت یہی رہا ہے۔ موجودہ بغداد سے کوئی ۶۰ میل جنوب میں ہے۔ شہر بہت بڑا تھا۔ رقبہ میلوں کا تھا۔ اپنے زمانۂ عروج میں بڑا سرسبز و شاداب، خوشحال و مہذب و متمدن رہ چکا ہے۔ نہروں، پانی کے نلوں، شاہی قصر و ایوان، زبردست قلعوں کے آثار اب بھی موجود ہیں۔ ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس میں ماہر انجینئروں کی کمی نہ تھی۔ سلطنت کے عروج کا زمانہ ۲۰۰۰ قبل مسیح بتایا جاتا ہے۔ شہر کی خاص شہرت علوم سحر، سفلی عملیات اور جنتر منتر میں بہت زیادہ تھی۔ اس کی عظمت اور عظمت کے ساتھ اس شہر کی برائیوں اور تباہ کاریوں کا تذکرہ یہودیوں اور عیسائیوں کی کتابوں میں موجود ہے۔ بائبل میں ہے۔ تیرے سوداگر زمین کے امیر تھے۔ تیری جادوگری سے زمین کی ساری قومیں گمراہ ہو گئیں۔ اور نبیوں، مقدسوں اور زمین کے اور سب مقتولوں کا خون اس میں بہایا گیا (مکاشفہ ۱: ۵۔ ۱۸، ۲۰) پرانے کتبے اور نوشتے جو دریافت ہوتے ان کی گواہی بھی یہ ہے کہ بابلی مذہب کا خیر و اعظم سحر و کہانت، منتر اور ٹونے ٹوٹکے تھے۔ ایک اور فاضل کی تحقیق ہے کہ یہ سحر پیشہ و کہانت دوست قوم جب ۵۳۸ قبل مسیح میں تاجدار ایران کے ہاتھوں برباد و منتشر ہوئی تو جہاں جہاں گئی اپنے ساتھ اپنے فنونِ سحر و کہانت کو بھی لیتی گئی۔ تاریخ کا بیان ہے کہ یہ لوگ جہاں بھی گئے اپنے ان علوم کو اپنے ساتھ لیتے گئے۔ ان کی تعلیم دیتے رہے اور ضعیف العقیدہ لوگ ان کو ہاتھوں ہاتھ لیتے گئے۔

ہاروت و ماروت کون ہیں؟ دو فرشتوں کے نام ہیں۔ دونوں اپنی اصلیت کے لحاظ سے فرشتے

تھے۔ لیکن جب ایک غرض خاص کے ساتھ انسانوں کے درمیان رہنے بسنے کے لیے روانہ کیے گئے تو ان کی شکل وشباہت، رنگ وروپ، جسم وقالب انسانوں کا دیا گیا اور اُن کی عادتیں اور جذبات بھی بالکل بشری ہوتے [1]

اصل ارشاد میں عربی ملکین ہے۔ اس کو دو طرح سے پڑھایا گیا ہے لام کے زبر کے ساتھ اور لام کے زیر کے ساتھ دونوں صحیح ہیں۔ زبر کی صورت میں ملک فرشتے کو کہتے ہیں اور زیر کی صورت میں ملک بادشاہ کو کہتے ہیں۔ یہ دونوں بادشاہ جادوگر تھے۔ حسن بصریؒ کہتے ہیں دو عجمی جادوگر تھے کیونکہ فرشتے سحر سے واقف نہیں ہوتے۔ آئیے اب ارشاد پڑھئے۔ ما انزل علی الملکین ببابل ھاروت و ماروت ایک ترجمہ تو وہ ہی ہے جو آپ پڑھ چکے کہ جو کچھ اتارا گیا دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر بابل میں اس صورت میں ما موصولہ ہے اور ہمارے مفسرین کو یہی پسند ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ ہاروت و ماروت کو آسمانی فرشتہ بتاتے ہیں اور اس کے پس منظر کے لیے کچھ توجیہات پیش کرتے ہیں۔

مثلاً یہ کہ جب بابل کی سرزمین میں عملیاتِ سفلہ اور سحری فنون کا زور حد سے بڑھ گیا اور عوام کے ذہن میں ہادیانِ حق انبیائے کرام اور اولیائے صالحین کی حیثیت خلط ملط ہو گئی اور دُنیا کاہنوں، شعبدہ بازوں کی ہو کر رہ گئی تو مشیتِ الٰہی، حکمتِ ربانی نے حق و باطل کے ان دو گروہوں کے درمیان نمایاں فصل و امتیاز کرانے اور لوگوں کی اصلاحِ خیال کی خاطر دو فرشتوں کو انسانی صورت و قالب میں روانہ کیا [2]

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ

ایک زمانہ میں جس کی پوری تعیین میں کوئی محققانہ رائے اس وقت سامنے نہیں۔ دُنیا میں اور خصوصاً بابل میں جادو کا بہت چرچا تھا اور اس کے عجیب اثرات کو دیکھ کر جاہلوں کو اس کی حقیقت اور انبیائے کرام کے معجزات کی حقیقت میں اختلاط ہو گیا اور بعض لوگ جادوگروں کو بزرگ، مقدس اور قابلِ اتباع سمجھنے لگے اور بعض لوگ جادو کو نیک کام سمجھ کر اس کو سیکھنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے اس اشتباہ اور غلطی کو دُور کرنے کے لیے بابل میں دو فرشتے ہاروت و ماروت روانہ کیے کہ لوگوں کو سحر کی حقیقت اور اس کے شعبوں سے مطلع کر دیں تاکہ اشتباہ جاتا رہے [3]

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۱۴۰ لغات القرآن ج ۱ ص ۲۲ [2] تفسیر ماجدی ص ۱۴۱۔
[3] بیان القرآن و معارف م س ص ۲۱۵۔

جس زمانے میں بنی اسرائیل کی پوری قوم بابل میں قیدی اور غلام بنی ہوئی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے دو فرشتوں کو انسانی شکل میں ان کی آزمائش کے لیے بھیجا جس طرح قوم لوط کے پاس فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں گئے تھے۔ اسی طرح ان اسرائیلیوں کے پاس وہ پیروں اور فقیروں کی شکل میں گئے ہوں گے۔ وہاں ایک طرف انہوں نے بازارِ ساحری میں اپنی دکان لگائی ہوگی۔ دوسری طرف وہ اتمام حجت کے لیے خبردار کردیتے ہوں گے کہ دیکھو ہم تمہارے لیے آزمائش ہیں۔ اپنی عاقبت خراب نہ کرو۔ مگر اس کے باوجود لوگ ان کے پیش کردہ عملیات اور نقوش اور تعویزات پر ٹوٹے پڑتے ہوں گے [1]

یہ دو فرشتے تھے شہر بابل میں بصورت آدمی رہتے تھے۔ ان کو علم سحر معلوم تھا، جو کوئی طالب اس کا جاتا اول اس کو روک دیتے کہ اس میں ایمان جاتا رہے گا۔ اس پر بھی باز نہ آتا تو اس کو سکھا دیتے۔ اللہ تعالیٰ کو ان کے ذریعے بندوں کی آزمائش منظور تھی سو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے علموں سے آخرت کا کچھ فائدہ نہیں ہے بلکہ سراسر نقصان ہے اور دنیا میں ضرر ہے۔ اور بغیر حکم خدا کے کچھ نہیں کر سکتے اور علمِ دین اور علمِ کتاب سیکھتے تو اللہ کے ہاں ثواب پاتے [2]

یہ تمام داستان اس لیے سنائی گئی ہے تاکہ آپ جان لیں کہ ما انزل علی الملکین میں جو لوگ ما کو موصولہ بتاتے ہیں ان کا موقف کیا ہے؟

آئیے اب ان کی بھی کچھ سنیئے جو آیت میں ما کو موصولہ نہیں بلکہ نافیہ قرار دیتے ہیں وہ ترجمہ اس طرح کرتے ہیں کہ بابل میں ہاروت ماروت نامی شخصوں پر کچھ نہیں اتارا گیا ہے اور اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن یہودیوں کی برائی کر رہا ہے کہ انہوں نے کتاب اللہ کو چھوڑ کر ان افسانوں اور روایات کو اپنایا ہے جو شیاطین الانس سلیمانؑ کے دورِ حکومت کے بارے میں من گھڑت اور بناوٹی بیان کرتے اور پیش کرتے ہیں۔ حالانکہ سحر کفر ہے اور سلیمانؑ کا دامن کفر کے دھبے سے پاک ہے نہ اس سحر کی جو شیاطین پیش کرتے ہیں۔ سلیمان کی طرف نسبت درست ہے اور نہ یہ دعویٰ درست ہے کہ سحر اللہ نے دو فرشتوں پر اتارا ہے۔ یہ دونوں باتیں جھوٹ اور غلط ہیں۔ بابل میں بھی یہ شیاطین ہی کام کرتے تھے اور ان کا نام ہاروت و ماروت تھا۔ بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ لوگ ان دونوں حضرات سے عملیات سیکھتے تھے۔

علامہ قرطبیؒ فرماتے ہیں کہ آیت میں ما نافیہ ہے اور اس کا عطف ما کفر سلیمان پر ہے۔ اصل واقعہ یہ ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ اللہ نے جبریل و میکائیل کے ذریعے سحر کو نازل فرمایا ہے۔ اللہ نے

---

[1] تفہیم القرآن ص ۹۸ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۰

ان کے اس زعم فاسد کی تردید کی ہے اصل عبارت یوں ہے ماکفر سلیمان وما انزل علی الملکین ولکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر ببابل ھاروت وماروت یعنی نہ سلیمان نے کفر کیا اور نہ دو فرشتوں پر سحر اتارا گیا بلکہ یہ کافرانہ کام شیاطین یعنی بابل میں ہاروت ماروت نامی دو شخص کرتے تھے۔ وہ لوگوں کو جادو کی تعلیم دیتے تھے۔ آیت کی یہی بہترین تفسیر ہے اور اس آیت کی تشریح میں اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس میں سب سے زیادہ اچھی تشریح یہی ہے۔ اس کے علاوہ کوئی تشریح قابل التفات نہیں ہے[1]

حافظ ابن کثیرؒ کو بھی امام قرطبیؒ کی تشریح پسند ہے۔ انہوں نے اسی کو اپنایا ہے اور حافظ ابن جریرؒ کے اس موقف کو کہ ما موصولہ ہے غریب قرار دیا ہے ہذا الذی سلکہ غریب جداً[2] اور ابن کثیرؒ نے عبداللہ بن عباسؓ کا یہ تشریحی نوٹ بھی سپرد قلم فرمایا کہ ما انزل علی الملکین میں ما نافیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ نے کوئی جادو نہیں اتارا۔

لیکن صاحب روح کو امام قرطبی کی اس تشریح سے اتفاق نہیں ہے اور صرف اختلاف ہی نہیں بلکہ ان کو قرطبی پر غصہ بھی ہے اور غصہ میں وہ اس امام التفسیر پر یہ پھبتی کس گئے ہیں مفاسد قلۃ البضاعۃ لا تحصی یعنی علمی بے مائگی جن خرابیوں کو جنم دیتی ہے وہ ان گنت ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ امام قرطبیؒ اس میدان میں علم کی نعمت سے تہی دامن ہیں۔ لیکن یہ بہت بڑی زیادتی ہے۔ اگر قرطبیؒ کا بتایا ہوا مطلب بقول علامہ آلوسی کتاب اللہ کو مسخ کر دینے کے مترادف ہے تو اس میدان میں قرطبی تنہا نہیں ہے اور بھی ارباب تفسیر قرطبی کے ہم خیال ہیں۔

شاید آلوسی جیسے حضرات کی قرآن کی اس آیت کی تشریح میں انتہا پسندانہ پالیسی سے گھبرا کر دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مصنفین آیت کی تشریح کے متعلق یہ کہنے پر مجبور ہو گئے۔

وترکیب ہذہ الآیۃ غضاض، وثمۃ عدۃ مواضع فی ترجمتہا غیر محققۃ۔

دراصل ان بزرگوں نے قرآن میں سحر کی بات پڑھ کر یہ خیال کر لیا ہے کہ قرآن تاریخ سحر بیان کر رہا ہے۔

تفسیر حقانی کے مصنف نے بھی امام قرطبیؒ کی ہمنوائی کی ہے وہ فرماتے ہیں:

ان آیات میں اللہ تعالیٰ یہود کو ایک تاریخی واقعہ سے الزام دیتا ہے کہ یہ لوگ علم دین اور احکام تورات چھوڑ کر لغو باتوں میں مصروف ہو گئے یعنی وہ جو شیاطین سلیمان کے عہد حکومت میں جادو

---

[1] الجامع لاحکام القرآن ج ۲ ص ۵۰۔ [2] ابن کثیر ج ۱ ص ۱۳۷

سکھایا کرتے تھے اور اس کو سلیمان کی طرف منسوب کرتے تھے اور دراصل سلیمانؑ اس کفر کے مرتکب نہیں ہوئے تھے بلکہ وہی شیاطین اس کفر کے مرتکب ہوئے جو لوگوں کو جادو سکھایا کرتے تھے۔ یہ لوگ اس کے تابع اور معتقد ہو گئے اور اس پر بھی بس نہ کی بلکہ جب بخت نصر کے زمانے میں یہ لوگ بابل شہر میں گئے تو بجائے اس کے کہ اپنے گناہوں سے توبہ کرتے، نادم ہوتے، شریعت کو یاد کرتے اُلٹے وہاں کے شعبدہ بازیوں میں مصروف ہو گئے یعنی وہاں ہاروت و ماروت جو دو شخصوں کو سحر معلوم تھا اسی کے سر ہو گئے۔ اور اسی کو سیکھ کر اپنی دینی اور دُنیوی ترقی کا باعث سمجھنے لگے[1]

اس تفصیل سے میرا مقصد تصویر کے دونوں رُخ آپ کے سامنے پیش کرنا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ عام طور پر مفسرین نے یہ بات تسلیم کر لی ہے کہ

۱۔ آیت کے پہلے حصہ میں شیاطین سے جنات مراد ہیں اور قرآن یہاں تاریخ سحر بیان کر رہا ہے فرق صرف یہ ہے کہ یہودی اسے سلیمانی کارنامہ سمجھتے تھے اور قرآن تاریخی طور پر اسے زمانۂ سلیمان میں جنات کا کارنامہ بتا رہا ہے۔

۲۔ یہودی کہتے تھے کہ سحر اللہ کی جانب سے جبریل و میکائیل کے ذریعے نازل ہوا ہے اور قرآن تاریخِ سحر بیان کرتے ہوئے یہودیوں کے اس بیان کی صرف اس قدر تصحیح کرتا ہے کہ سحر نازل تو فرشتوں کے ذریعے ہوا ہے لیکن تم نام غلط بتا رہے ہو ان کے اصلی نام ہاروت اور ماروت ہیں۔ ان پر بابل میں سحر نازل کیا گیا تھا۔

اس بارے میں استدلال کسی صحیح روایت سے نہیں بلکہ صرف قیاس و رائے سے کیا جاتا ہے جیسا کہ بزرگوں کی زبانی پیش کردہ پس منظر میں دیکھ چکے ہیں۔ لیکن قیاس رائے سے پہلے ہمیں غیرجانبدار مبصر کی حیثیت سے اس مقام پر غور کرنا چاہیے کہ کیا فی الحقیقت قرآن سحر کی تاریخ بیان کر رہا ہے یا بنی اسرائیل کے کردار کا تذکرہ کر رہا ہے اور کیا فی الواقع قرآن کو فرشتوں کے موضوع پر یہودی افسانہ نویسوں سے ناموں میں اختلاف ہے اور بس

حقیقت یہ ہے کہ قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو لیکن یہ تکلف صرف اس لیے کیا جا رہا ہے کہ اسرائیلی روایات کے ذریعے جو جراثیم پھیل چکے ہیں کسی نہ کسی طرح ان کے مطابق قرآن کے مطالب ڈھل جائیں۔ غور فرمائیے کہ زمانۂ سلیمان میں جنات کے ذریعے معاشرے

---

[1] تفسیر حقانی ج ۱ ص ۵۶

کو سحر کی تعلیم و تلقین اور نشر و اشاعت کی یہ معصومانہ اور مبارک کوشش کیوں کی جا رہی ہے ؟ صرف اس لیے کہ یہودیوں کی حضرت سلیمان کے مبارک زمانے کے بارے میں خرافات موجود ہیں اور ان خرافات نے ہماری تفسیر کی کتابوں میں روایات کی صورت اختیار کر لی ہے ۔ حافظ ابن کثیر نے ان روایات کو تفسیر میں یکجا کر دیا ہے اور آخر میں لکھ دیا ہے لا تعارض بین السیاقات علی اللبیب الفہیم ۔

اب غور کرو یہاں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ خود قرآن کے صاف صاف لفظوں میں کیا ہے ؟

یہودی اخلاقی اور مادی انحطاط میں مبتلا ہیں ، غلامی جہالت ، نکبت و افلاس اور ذلت و پستی نے ان کی توجہات جادو ٹونے ٹوٹکے ، طلسمات عملیات اور تعویز گنڈوں کی طرف لگا دی تھی اور اپنی اس برائی پر پردہ ڈالنے اور اس کو نیکی کا مقدس جامہ پہنانے کے لیے اُن کے رہنما ، اُن کے علماء اور ان کے لیڈروں کا دعویٰ تھا کہ یہ عملیات منزل من اللہ اور شہر بابل میں فرشتوں کے ذریعے ان کا نزول ہوا تھا ۔ اور یہ کہتے تھے کہ سلیمان علیہ السلام کی حیرت انگیز حکومت کی طاقتیں اسی کے سہارے تھیں ۔

اب قرآن ان کی ذہنیت اور اُن کے علم کی تردید کرنا چاہتا ہے ۔ عام مفسرین کہتے ہیں کہ قرآن نے یہودیوں سے صرف سلیمان کی ذات اور فرشتوں کے ناموں میں اختلاف کیا ہے ، باقی سحر کے فرشتوں پر نازل ہونے اور زمانۂ سلیمان میں جادوگری کے ہونے میں قرآن کا نقطہ نظر یہودیوں سے مختلف نہیں ہے ۔

خود قرآن جو کچھ کہتا ہے یہ ہے کہ

یہودیوں نے کتابِ الٰہی کی تعلیم فراموش کرکے جادوگری کے ان مشرکانہ عملوں کی پیروی کی جنہیں شیطان صفت لوگ سلیمان کی عہد کی طرف منسوب کرکے پڑھا کرتے تھے ۔ حالانکہ سلیمان نے کبھی کفر نہیں کیا ۔ دراصل یہ انہی شیطانوں کا کفر ہے کہ لوگوں کو جادو سکھاتے تھے اور یہ بھی درست نہیں ہے کہ بابل میں دو فرشتوں ہاروت و ماروت پر اس طرح کی کوئی بات نازل ہوئی ہے جیسا کہ ان لوگوں میں مشہور ہے ۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ جو کچھ بھی کسی کو سکھاتے تھے تو یہ کہے بغیر نہیں سکھاتے تھے کہ دیکھو ہمارا وجود تو ایک فتنہ ہے پھر تم کیوں کفر میں مبتلا ہوتے ہو یعنی جادوگری کی باتوں کا برا ہونا ایک ایسی مانی ہوئی بات ہے کہ جو لوگ اس کے سکھانے والے تھے وہ بھی تسلیم کرتے تھے کہ یہ بات خدا پرستی کے خلاف ہے لیکن اس پر بھی لوگ ان سے ایسے عملیات سیکھتے ۔

قرآن صاف کہہ رہا ہے کہ یہ شیاطین صفت انسان جادو کے متعلق زمانۂ اقتدارِ سلیمان کے بارے میں افتراء پردازیاں کرتے تھے ۔ یہ غلط ہے ، جھوٹ ہے نہ یہ کام سلیمان نے کیا ہے اور نہ سلیمان کے زمانۂ اقتدار میں ہوا ہے ۔

دوسری بات یہ بتائی ہے کہ یہ بھی غلط ہے کہ سحر فرشتوں پر اللہ کی جانب سے نازل کیا گیا ہے۔ ہاروت و ماروت پر ایسی کوئی چیز نازل نہیں ہوئی یہ محض افتراء ہے اور اپنی بدکرداری کے لیے غلط سہارا ہے۔

تیسری بات یہ کہ ہاروت ماروت نامی اشخاص بابل میں جادو کے معلم ضرور تھے لیکن جادو کی قباحت کے پیشِ نظر وہ اس سے لوگوں کو ضرور روکتے تھے لیکن اس کے باوجود لوگ سیکھتے تھے۔

لہٰذا یہودیوں کا یہ خیال کہ جادو اللہ کی جانب سے نازل ہوا ہے، سلیمانؑ بھی جادو کرتے تھے یا سلیمان کے زمانے میں جادو کا کاروبار ہوتا تھا بالکل بہتان ہے۔ صرف اتنی سی بات ہے کہ بابل میں ہاروت و ماروت دو نامی شخص یہ کام کرتے تھے لیکن لوگوں کو وہ بھی اس کے سیکھنے سے روکتے تھے۔ اس میں نہ خدا کی رضا ہے نہ خدا کے نبیوں کا یہ کام اور نہ ان کے مبارک عہد میں یہ ہوا ہے اور نہ اللہ نے اسے نازل کیا ہے۔ یہ تو سرتاسر کفر ہے اور اسے وہ قومیں اپناتی ہیں جو ناخداشناس بلکہ خدا کی کھلم کھلا باغی ہوں اور جن کے زندگی میں نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے روابط ٹوٹ چکے ہوں۔

ہمارے خیال میں قرطبیؒ کی تفسیر عام تشریحات سے زیادہ بہتر ہے کیونکہ عام تفسیر کے مطابق ماکو بمعنی الذی مان کر یہ مطلب لینا کہ بابل میں ہاروت و ماروت دو فرشتے بنی اسرائیل کی آزمائش کے لیے اللہ تعالیٰ کی جانب سے نازل ہو کر سحر سکھلاتے اور ساتھ ہی یہ تنبیہہ بھی کرتے جاتے تھے کہ ہم سے یہ علم نہ سیکھو کافر ہو جاؤ گے بے وجہ متعدد اشکالات کو دعوت دینا اور سحر اور ما انزل کو بے دلیل ایک ہی چیز ماننا ہے۔

دراصل قرآن نے اس واقعہ کو جس غرض سے بیان کیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ بنی اسرائیل کا حضرت سلیمان اور سلیمان کے دورِ حکومت کی جانب جادو منسوب کرنا بہتان اور افتراء ہے، یہ کام شیاطین کا ہے۔ حضرت سلیمان کا دامن دونوں حیثیتوں سے اس سے پاک ہے۔ ذاتی حیثیت سے بھی اور سربراہ مملکت ہونے کی حیثیت سے بھی۔ اور یہ کہ بابل میں دو شخص نامی ہاروت اور ماروت جادوگر تھے۔ یہ فرشتے نہ تھے۔ فرشتوں پر اللہ نے جادو بالکل نازل نہیں کیا ہے۔ یہ ابن کثیرؒ اور امام قرطبی کی تفسیر ہے۔ اس کی تائید بعض دوسرے محققین نے بھی کی ہے جس میں شیخ الاسلام ابنِ تیمیہؒ اور ابوحیان اندلسی خصوصیت سے قابلِ ذکر ہیں۔

۲۷۷ ۔ وہ جو کچھ بھی کسی کو بتلاتے تھے یہ کہہ کر بتلاتے کہ ہمارا وجود تو ایک آزمائش ہے تم کفر میں مبتلا نہ ہو یعنی وہ جادو سکھلاتے تو بنی اسرائیل کی مذہبی زندگی پر طعن کرتے ہوئے یہ کہتے جاتے کہ دیکھو اگر تم نے ہم سے یہ سحر سیکھا تو تم کافر ہو جاؤ گے مگر بنی اسرائیل کی گمراہی کا یہ عالم تھا کہ وہ اس پر بھی باز نہ آتے تھے اور اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جادو کی برائی اس قدر کھلی ہوئی ہے کہ جو

اس کے فن کار اور معلم تھے وہ بھی جانتے تھے کہ یہ بات خدا پرستی اور ایمان کے خلاف ہے۔ اس میں بھی بنی اسرائیل کے ایمان پر لطیف طنز ہے۔ المراغی نے یہاں ایک لطیف نکتہ لکھ دیا کہ ان کا عوام اور طلبگاروں سے ایسا کہنا دراصل عقیدت کو قائم رکھنے اور دکانداری کے نقطۂ نظر سے تھا۔ آج کل بھی دجاجلہ اپنے کاروبار کو چمکانے کے لیے ایسے ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں۔ اور یہ انداز اپنے فن کی مقبولیت بڑھانے کے لیے اختیار کیا جاتا ہے۔

جن لوگوں نے اس کو فرشتوں کا کردار بتایا ہے ان کو یہاں بھی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا کہ ملائکہ اور سحر کا سبق اور درس معاذاللہ استغفراللہ۔ لاچار تاویل کرنی پڑی اور تعلیم کو اپنے اصلی معنے سے ہٹانا پڑا اور کہنا پڑا کہ تعلیم یہاں اعلام کے معنے میں ہے یعنی وہ آگاہ کرتے تھے، بتلا دیتے اور جتا دیتے۔ لیکن جو مطلب ابنِ کثیر اور قرطبی نے بتایا ہے اس کے لیے کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔

۲۷۸ ۔ اس کے باوجود لوگ ایسے عمل سیکھتے جن کے ذریعے میاں بیوی میں جدائی ڈال دیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس منڈی میں سب سے زیادہ جس چیز کی مانگ تھی وہ یہ تھی کہ کوئی ایسا عمل یا تعویذ مل جائے جس سے ایک آدمی دوسرے کی بیوی کو اس سے توڑ کر اپنے اوپر عاشق کرے۔ یہ اخلاقی زوال کا وہ انتہائی درجہ تھا جس میں وہ لوگ مبتلا ہو چکے تھے۔ پست اخلاقی کا اس سے زیادہ نیچا درجہ کوئی نہیں ہو سکتا کہ ایک قوم کے افراد کا سب سے زیادہ دلچسپ مشغلہ پرائی عورتوں سے آنکھ لڑانا یا پرسکون زندگی میں رگ پھڑکانا ہو جائے [1]

قرآن نے اس فقرے کے ذریعے یہودیوں کے تذکرے میں اشارتاً سمجھایا ہے کہ ان کا ایمان سے محروم ہو جانا اور کتاب اللہ پر عمل چھوڑ دینا دراصل ان کے ان اعمال کا نتیجہ تھا۔

خوشتر آں باشد کہ سرِ دلبراں　　گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

آج ہم اپنی حالت پر نظر ڈالیں اور غور کریں کہ کیا ہم بھی ٹھیک طلسمات، نیرنجات، عملیات اور تعویذ گنڈوں کے معاملہ میں بنی اسرائیل کے قدم بہ قدم نہیں چل رہے ہیں اور کیا عملیات، طلسمات کی یہ تمام صورتیں کسی نہ کسی بھیس میں یہاں بھی کام نہیں کر رہی ہیں۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

یہ صرف قرآن ہی نہیں کہہ رہا ہے بلکہ خود بیسویں صدی کے علمائے یہود کا بھی یہودیوں کے بارے میں یہی اقرار ہے کہ ”سحر کی سب سے زیادہ عام اور متداول صورت اس نقش کی تھی جو عشق و محبت کے لیے

---

[1] تفہیم القرآن ج ا ص ۹۹

دیا جاتا تھا۔ خاص کردہ نقش جو ناجائز آشنائیوں کے لیے لکھا جاتا تھا اس قسم کے فن کی ماہر عورتیں زیادہ ہوتی تھیں۔ چنانچہ ذکر ہی سحر اور حرام کاری کا ساتھ ساتھ آیا ہے۔ جیوز انسائیکلو پیڈیا ص ۲۵۵ [1]

قرآن نے یفرقون بین المرء وزوجہ کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا ہے کہ تفریق بہت بڑا سنگین جرم ہے اور اللہ کے نزدیک بے حد ناپسندیدہ ہے۔ سحر کے ذریعے ہو یا ہمزاد کے اور نقش و تعویز کے ذریعے ہو یا وظیفہ اور ورد کے، سب حرام ہے۔ اور اس موضوع پر مسلمانوں میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔

۲۷۹ ۔ وہ اللہ کے حکم کے بغیر کسی کو کوئی نقصان نہیں دے سکتے۔ یعنی اسباب سے بالا۔ ان کے پاس کوئی غیبی قوت نہیں ہے، اگر کسی کو کوئی نقصان ہوتا ہے تو ان اسباب کے تحت ہی ہو رہا ہے جو اللہ کے قانونِ مشیت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ اسلام کے بنیادی مقاصد میں سے توحید کو اوّلین مقصد کی حیثیت حاصل ہے۔ ارشاد ہے کہ مؤثر اور فاعل حقیقی اللہ کی ذات ہے۔ جہاں جو کچھ ہے جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہے اس کی حیثیت سبب اور بہانہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ قرآن کسی موقعہ پر صرف ضرورت ہی کے تحت نہیں بلکہ معمولی سے مناسبت کے تحت بھی اس بنیادی مسئلہ کو بیان کر دیتا ہے۔ کیونکہ واقعات کی آغوش میں احکام کے بیان ہونے سے مسائل اعتقادی دل میں بیٹھ جاتے ہیں اور ہر قسم کی تاویل و تحریف کے احتمال سے بالا ہوتے ہیں۔ زہر کا اثر یے گناہوں کی ہلاکت، کافروں کے ہاتھوں سے انبیاء اور اولیاء کی اہانت جس قانونِ تکوینی اور ارادۂ الٰہی کے تحت ہوتی ہے اسی کے زیرِ اثر سحر بھی اپنا اثر دکھاتا ہے۔

۲۸۰ ۔ اس کے باوجود وہ ایسی باتیں سیکھتے ہیں جو ان کے لیے نفع بخش نہیں ضرر رساں ہیں۔ یہ بدبخت بنی اسرائیل ان علوم و فنون کے سیکھنے میں اپنی قوتیں کیسے ضائع کر رہے ہیں جو ان کے حق میں نافع نہیں ضرر رساں ہیں۔ کیونکہ یہ لوگوں کی ایذاء رسانی کا ذریعہ بن رہی ہیں اور لوگوں کی ایذاء رسانی بہرحال حرام ہے۔ آخرت میں اس عمل کے نتیجہ سے یقیناً دوچار ہونا ہے۔ چونکہ نقصان رساں چیزوں کسی درجہ میں نفع کا پہلو ضرور ہوتا ہے اور کبھی منفعت بہ نسبت مضرت کے زیادہ ہوتی ہے اس یہ بتانے کے بعد کہ ضرر رساں ہے کھول کر بتا یا کہ کسی درجہ میں نفع بخش اور سودمند نہیں ہے۔ علامہ نسفی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ اس سے علومِ سحریہ کے ساتھ ان علومِ عقلیہ کے سیکھنے کی بھی ممانعت نکل آئی جن کا انجام ضلالت غوایت اور گمراہی ہو۔

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۴۲

اللہ کے سوا جن غیبی اسباب وعلل یعنی سحر وطلسم جنات وشیاطین اور ارواح خبیثہ اور دوسری قسم کی قوتوں کی غیبی قدرت ونصرت کا اعتقاد لوگوں میں رائج ہے اور ان سے بچنے کے لیے ان کی دھائی دی جاتی ہے نذر چڑھائی جاتی ہے۔ قربانی کی جاتی ہے قرآن کی اس آیت نے ان تمام خرافات کا قلع قمع کر دیا اور خدا کے سوا تمام دوسری مخفی اور پوشیدہ قوتوں کا ڈر انسانوں کے سینوں سے ہمیشہ کے لیے نکال دیا۔ اور دعاء وکلماتِ الٰہی کے علاوہ ہر نوع کی جھاڑ پھونک، منتر، تعویذ، گنڈے ٹوٹکے جن میں کسی غیر خدا سے غیبی استمداد یا شرک کا کلمہ ہو کفر قرار دیا۔ بعض صحابہ نے ان مکار جادوگروں کے قلع قمع کے لیے ان کے قتل تک کا حکم دے دیا تاکہ انسانوں کے دلوں میں ان کا جو خوف وہراس بیٹھا ہوا ہے وہ دور ہو اور ان کے اس عاجزانہ قتل ہونے سے یہ بات ثابت ہو جائے کہ ان میں کوئی غیر معمولی طاقت نہیں ہے وہ بالکل بے بس ہیں۔ مسلم میں ہے کہ ایک صحابی نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں عرض کی کہ یا رسول اللہ ہم جاہلیت میں جھاڑ پھونک کیا کرتے تھے۔ اب آپ کیا فرماتے ہیں۔ ارشاد فرمایا کہ تم اپنے منتر ہمارے سامنے پیش کرو۔ اگر ان میں شرک کی کوئی بات نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ ایک اور صحابی روایت کرتے ہیں کہ حضور نے فرمایا ہے کہ

ان الرقی والتمائم والتولہ شرک۔ جھاڑ، گنڈا اور میاں بیوی کے لیے تعویذ شرک ہیں میں ہے کہ عرب چند منکے لے کر اپنے بچوں کے گلوں میں نظر گزر کے خیال سے ڈال دیا کرتے تھے۔ ان کا گمان تھا کہ اس عمل سے نظر نہیں لگتی۔ قرآن چونکہ وہم پرستی کی بنیاد اکھاڑنے آیا تھا اس لیے اس خیال کی بھی تردید کی اور بتایا کہ ایک مخلوق کو دوسری مخلوق میں بالذات کوئی تاثیر نہیں ہے۔ تولہ بھی اسی کی دوسری شکل تھی۔ ان کا خیال تھا کہ اس عمل سے تقدیر الٹ پلٹ جاتی ہے۔ اس طرح اس بے بنیاد جھاڑ پھونک کا مقصد ہونا وہم پرستی ہے۔

غرض قرآن کی یہ آیت اپنی معنوی جامعیت کی وجہ سے زندگی کے تمام گوشوں پر حاوی ہے۔

ف ۲۸۱ ۔ ان کو خوب معلوم ہے کہ جو شخص جادو کا خریدار ہوتا ہے اس کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔

یہ علم ان کو خود اپنے مذہبی نوشتوں کے ذریعے حاصل ہے اور وہ خوب جانتے ہیں کہ سحر وساحری کیسی بری چیز ہے۔ تورات نے ان کو اس سے منع کیا تھا۔ آج بھی تورات میں یہ ممانعت موجود ہے۔ دیکھو خروج ۲۲ : ۱۸ احبار ۱۹ : ۲۶ استثنا ۱۸ : ۱۰، ۱۲) یعنی ان کو پتہ ہے کہ جو شخص اصولِ دین اور احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر اس کو اختیار کرے گا اس کا آخرت کی زندگی میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔

وَلَوْ اَنَّهُمْ اٰمَنُوْا وَاتَّقَوْا لَمَثُوْبَةٌ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ خَيْرٌ ۭ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

اور اگر وہ ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو اللہ کے یہاں اس کا جو بدلہ ملتا وہ ان کے لیے زیادہ بہتر اور اچھا تھا، کاش ان کو پتہ ہوتا۔

اور ان کا یہ علم آنے والی آیت لو کانوا یعلمون کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ علم کے دو درجے ہوتے ہیں ایک علم تفصیلی یعنی حقیقت کا شعور و ادراک اور اس کی وجہ سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا احساس دوسرا علمی اجمالی ذہن میں رسمی نقوش۔ اس میں بروقت تحریف و تاویل ہو سکتی ہے اور اس میں عمل کے انگیخت کا کوئی سامان نہیں ہوتا۔

وہ اسی علمِ اجمالی کے ذریعے سُود اور رشوت کو تاویل کر کے حلال سمجھتے ہیں۔ لیکن اگر ان کو علم تفصیلی ہوتا اور حُرمت کی علت سے واقف ہوتے اور دل سے یقین ہوتا کہ اس کا ارتکاب آخرت میں کیسے سنگین نتائج پیدا کرے گا اور عمل کے وقت میں ان کو اس کا احساس ہوتا کہ محرمات کی حد تک ذمہ داری کیا ہے تو ان کا یہ کردار نہ ہوتا لیکن وہ علم تفصیلی سے اور اس کی حقیقت کے شعور سے بالکل بیگانہ ہو چکے تھے۔ گویا پہلی آیت میں ان کے علمِ تصوری کا اثبات ہے اور دوسری آیت میں علم تصدیقی کا انکار ہے۔

ایمان و تقویٰ کی راہ

چونکہ سُورت کا اصل موضوع اجتماعی تقوی کی ضرورت ہے اس لیے بنی اسرائیل کی قومی اور ملی تاریخ میں ان وقائع اور احوال و ظروف کی نشاندہی فرمانے کے بعد جن سے اجتماعی تقوی کی زندگی ان میں ختم ہو کر رہ گئی تھی۔ یہاں اچانک ان کو خبردار کیا اور آگاہ کیا کہ اگر ان کی زندگی تقوی کی نعمت سے مالا مال ہوتی تو جو کچھ ہو چکا کچھ بھی نہ ہوتا اور جس اخلاقی و روحانی انحطاط سے تہی دامن ہو کر وہ جہالت نکبت و افلاس اور ذلت و پستی کا شکار ہوئے ہیں ان میں سے کوئی بات نہ ہوتی۔

یاد رہے کہ یہاں ایمان و تقویٰ لغوی معنے میں نہیں خالص نبوت کی زبان میں اصطلاحی معنے ہیں

استعمال ہوا ہے۔ اجتماعی زندگی میں ایمان و تقویٰ کی حیثیت بس کی گانٹھ اور ریڑھ کی ہڈی کی ہے۔ ان کی درستگی پر پورے انسانی تمدن، پوری معاشرتی زندگی، پوری اخلاقی اور تہذیبی زندگی اور پوری معاشی اور سیاسی زندگی کی درستگی اور ان دونوں کی خرابی پر ہر قسم کی زندگی کی خرابی کا مدار ہے۔ ایمان و تقویٰ درحقیقت اُمت کی حیات کی جڑ ہے۔ لہٰذا وہ قوم بدترین مفسد ہے جو اس درخت کی جڑ پر تیشہ چلاتی ہو جس کے قیام پر خود اس کا اور پوری اجتماعی زندگی کا قیام و بقا موقوف ہے۔

۲۸۲ ۔ اگر وہ ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کرتے۔ ایمان ایک نبوی اصطلاح ہے۔ جب تک تصدیق کے ساتھ التزامِ طاعت اور انقیادِ قلبی نہ ہو ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ انقیادِ باطن، التزامِ طاعت، عہدِ وفاداری ایمان کے وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا ایک مرتبہ ہے۔ اس علم کے لیے ضروری ہے کہ یہ ایسی صفتِ نفس بن جائے کہ قلب اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے پر مجبور ہو جائے۔ اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہدِ وفاداری نہیں کرتا وہ مومن نہیں کہلا سکتا اور اسی طرح اگر فرمانبرداری کے لیے تو آمادہ ہے مگر قلب و زبان سے تصدیق کے لیے تیار نہیں تو وہ بھی مومن نہیں ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ زبان و قلب تصدیق سے مزین ہوں اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی مصمم ہو۔

دُنیا میں انسانوں کی دو قسمیں ہیں۔ خدا پرست اور مادہ پرست۔

مادہ پرست تمام عالم کو صرف اپنے دائرہ محسوسات میں محدود تصور کرتا ہے۔ اس کے نزدیک کسی اور عالمِ بالا کا تصور صرف ایک وہم پرستی، مذہبی خوش اعتقادی سے زیادہ نہیں ہے۔ اس لیے وہ دعوتِ انبیاء میں ایمان کا نام سنتا ہے تو بے ساختہ اس کا مذاق اڑاتا ہے کیونکہ وہ ایمان کو صرف ایک جہالت یا جبری انقیاد سمجھتا ہے۔

اس کے مقابلے پر دوسری قسم خدا پرستوں کی ہے۔ ان کے نزدیک موجودات کو محسوسات کے دائرے میں محدود سمجھنا، ایک بنیادی غلطی ہے۔ وہ انبیاء کی فہم و فراست اور ان کی امانت و صداقت پر اعتماد کرکے عالم بالا پر ایمان لے آنا عین تقاضائے عقل سمجھتے ہیں۔

ایمان کی تمام روح صفت یقین ہے اور یقین اسی صورت قابلِ اعتماد ہے جبکہ عالمِ غیب پر ہو ورنہ مشاہدات پر یقین کرنا ایمان نہیں کہلاتا۔

خدا پر یقین، خدا کے رسُولوں کا یقین، خدا کی کتابوں پر یقین، خدا کے فرشتوں پر یقین، اعمال کی جزا و سزا پر یقین۔ یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا، زبان سے اقرار کرنا اور عہدِ وفاداری کرنا

ضروری ہے - اس یقین کے بغیر عمل خالص نہیں ہو سکتا -
اللہ تعالیٰ پر یقین کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وہی ہمارے کاموں کا قبلہ مقصود بن سکے - اسی کی رضا جوئی اسی کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض ہو اور ہم جلوت کے سوا خلوت میں بھی گناہوں سے بچ سکیں ــــــــــ اور ہر برائی سے اس لیے بچیں کہ اس سے ہمارے مالک و مولیٰ نے منع کیا ہے - جس طرح ہمارے جسمانی اعضا گناہوں سے پاک ہوں ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور وسوسوں کی آمیزش سے پاک ہو - اس کے احکام اس کے پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک خیالات، ہمارے غلط استدلالات، ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک و تذبذب پیدا نہ کر سکیں -
خدا کے رسولوں پر ایمان لانا ضروری ہے کہ خدا کے ان احکام اور ہدایات اور اس کی مرضی کا علم ان ہی کے واسطے سے انسانوں کو پہنچا ہے - اگر ان کی صداقت کو کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغام ربانی اور احکامِ الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جاتے اور انسانی زندگی کے سامنے نیکی، نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے جو انسانوں کے قوائے عمل کی تحریک کا باعث بن سکے - پھر اچھے برے، صحیح، غلط کے درمیان ہماری عقل کے سوا ہمارے جذبات کی تحکم ہے - کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لیے نہ رہے گی -
خدا کے فرشتوں پر ایمان لانا ضروری ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور سفیر ہیں - مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں - مخلوقات کو قانونِ الٰہی کے مطابق چلاتے ہیں -
خدائی احکام و ہدایات جو رسولوں کے ذریعے انسانوں تک پہنچے ہیں ان کو کتاب اور صحیفہ کہتے ہیں - ان کی صداقت پر اور ان میں جو کچھ ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے -
اعمال کی باز پرس اور جوابدہی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا و سزا کا تصور نہ ہو تو دنیوی قوانین کے باوجود دنیا کے انسانیت سراپا درندگی اور بہیمیت بن جائے - یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو خلوت و جلوت میں ان کی ذمہ داری کا احساس دلاتا ہے اور اسی لیے روزِ جزا اور یومِ آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ممکن نہیں ہے اسی بنا پر انبیاء نے اپنی تعلیمات میں اس پر زور دیا ہے -
یہی پانچ باتیں ایمان کے اصلی عناصر ہیں - یعنی اللہ تعالیٰ پر ایمان، اس کے تمام رسولوں پر ایمان، اس کی کتابوں پر ایمان، اس کے فرشتوں پر ایمان، روزِ جزا پر ایمان - آئیے ان عقائدِ خمسہ کو بنی اسرائیل

کی اس زندگی میں دیکھیئے جو سورۃ بقرہ میں اب تک پڑھ چکے ہیں تاکہ آپ کو قرآن کے اس فقرے لو انہم آمنوا کاش وہ ایمان لے آتے واقعاتی طور پر مشاہدہ ہو جائے ۔

ایمان باللہ کا حال یہ ہے ۔

لن نومن لك حتی نری اللہ جہرۃ

ایمان بالرسول کا حال یہ ہے

ففریقا کذبتم وفریقا تقتلون

ایمان بالکتاب کا حال یہ ہے

افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض

ایمان بالملائکہ کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ

من کان عدوا للہ وملائکتہ ورسلہ وجبریل ومیکائیل فان اللہ عدو للکافرین

ایمان بالیوم الآخر کی داستان یہ ہے کہ

لن تمسنا النار الا ایاما معدودۃ

قرآن نے یہاں لفظ ایمان بول کر تمام ایمانیات مراد لی ہیں بلکہ اس میں اشارۃً یہ بھی بتا دیا ہے کہ جب ان کے ایمان ہی کی زمین بنجر تھی تو اعمالِ صالحہ کے کسی پودے کا وہاں کوئی امکان ہی نہ تھا۔ کیونکہ اعمال کے پودے تو ایمان کی زمین پر اگتے ہیں۔ قرآن حکیم نے اپنے بلیغ انداز میں ایمان کو درخت سے تشبیہ دی ہے۔

کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلہا ثابت وفرعہا فی السماء توتی اکلہا کل حین باذن ربہا ۔

کلمہ طیبہ اس پاکیزہ درخت کی طرح ہے جس کی جڑ مضبوط ہے اور اس کی شاخیں بہت اونچی ہیں وہ اپنا پھل ہر وقت اللہ کے حکم سے دیتا رہتا ہے۔

آیت میں ایمان کو ایک درخت سے تشبیہ دی ہے مگر اس درخت سے نہیں جس پر پھل اور پھول کی رونق نہ ہو۔ یا بہار آئے تو سال میں ایک بار آئے بلکہ اس درخت سے تشبیہ دی ہے جو سدا بہار ہو۔ اور اس پر کبھی خزاں نہ آئے۔ وہ دوسرے درختوں کی طرح سال میں صرف ایک ہی بار پھل نہ لائے۔ بلکہ موسم کی قید سے بے نیاز ہو کر پھولوں اور پھلوں سے لدا رہے۔ قرآن کہتا ہے کہ

بنی اسرائیل کے ایمان کے درخت پر ہمیشہ خزاں ہی طاری رہی، اعمالِ صالحہ کا کوئی پھول اور پھل تو درکنار سبز پتہ بھی نہ اگا۔

آیت کا دوسرا لفظ واتقوا ہے جس کے معنے ہیں کاش وہ تقویٰ کی راہ اختیار کرتے۔ تقویٰ بھی نبوت کی اصطلاحی زبان کا لفظ ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ بندہ اللہ اور یوم آخرت پر یقین رکھتے ہوئے اللہ کی ناراضی اس کی پکڑ، آخرت کے عذاب اور پکڑ سے ڈرتے ہوئے فکر اور بچاؤ کی زندگی گزارے۔ ایمان کے بعد انبیا نے جس چیز کی دعوت زیادہ اہمیت کے ساتھ دی ہے اور جس کو گویا انسان کی فلاح و سعادت کا مدار بتایا ہے وہ تقویٰ ہے۔

انبیا کی دعوت میں دو چیزوں کو بنیاد کی حیثیت حاصل ہے۔ عبادت اور تقویٰ۔ عبادت اگر فضائل کی بہم رسانی اور اوامر کی پابجائی ہے اور سب سے ہٹ کر سب سے کٹ کر اپنے نیازمندانہ اعمال کا رُخ صرف اللہ کی طرف پھیر دینے اور ہر بندگی اور ہر پرستش اسی کی کرنے کا نام ہے تو تقویٰ اسی عابدانہ زندگی میں بُرائیوں سے اور محرمات سے بچنے کو کہتے ہیں۔ قرآن کا مطالعہ کرو حضرت نوحؑ سے لے کر حضرت عیسیٰؑ تک کی قوموں میں پکار ان دو کے گرد گھوم رہی ہے۔ ہر نبی کی زبان پر یا قوم اعبدوا اللہ ہے یا پھر الا تتقون اور واتقوا اللہ ہے۔ یہی بات جو بنی اسرائیل کے بارے میں اس آیت میں کہی گئی سورۂ مائدہ اس سے زیادہ بلیغ انداز میں فرمائی گئی ہے۔

ولو ان اھل الکتاب آمنوا واتقوا لکفرنا عنھم سیاٰتھم ولادخلنٰھم جنّٰت النعیم۔ اگر یہودی اور عیسائی ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو ضرور ہم ان سے ان کی بُرائیوں کو ہٹا دیتے اور ان کو نعمت کی جنتوں میں داخل کر دیتے۔

سورۂ اعراف میں اسے قانونِ عام کی صورت میں پیش کیا گیا ہے۔

ولو ان اھل القریٰ آمنوا واتقوا لفتحنا علیھم برکات من السماء والارض

اگر بستیوں والے ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو ہم زمین و آسمان سے ان پر برکتوں کے دروازے کھول دیتے۔

یعنی اگر کسی ملک اور علاقہ کے لوگ اجتماعی زندگی میں ایمان اور تقویٰ والی زندگی اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر برکتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے ہیں۔ پھر جن نعمتوں کا تعلق آسمان سے ہے وہ ان پر آسمان سے برستی ہیں اور جن کا تعلق زمین سے ہے وہ زمین سے ان کے لیے اُبلتی ہیں۔

قرآن نے یہاں تقویٰ بول کر پورا نظامِ رذائل مراد لیا ہے یعنی وہ تمام اخلاقِ ذمیمہ جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند فرماتا ہے اور جن سے بچنے کا اس نے اپنے بندوں کو حکم دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہگار رہتے ہیں۔ جن کی بُرائی ہر عقل مند آدمی جانتا ہے اور جن کی بدولت افراد اور جماعتوں کو نقصان

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَقُوْلُوْا رَاعِنَا وَقُوْلُوا انْظُرْنَا وَاسْمَعُوْا ۗ وَلِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝

اے اہلِ ایمان تم راعنا[۲۸۳] نہ کہا کرو بلکہ اُنظرنا[۲۸۴] کہا کرو اور پھر وہ جو کچھ فرمائیں اسے جی لگا کر سنو[۲۸۵] اور یاد رکھو کہ ان کافروں[۲۸۶] کے لیے دردناک عذاب ہے۔

پہنچتا ہے اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی قوم تباہ ہو جاتی ہے یعنی اس کی دینی، دنیوی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ ان رذائل میں سے قرآن نے جن کی بنی اسرائیل کے وقائع میں یہاں تک نشاندہی کی ہے ان کی اجمالی فہرست یہ ہے۔
شرک، کفر، اللہ کی آیات کا کاروبار، حق و باطل کی ملاوٹ کتمانِ حق، عملی زندگی میں خود فراموشی، ظلم، بے ادبی و گستاخی، فسق و نافرمانی، فساد، عصیان، عدوان، قانون کی زد سے بچنے کے لیے حیلہ گری، عمل سے گریز کے لیے باریک بینی اور دقت سنجی، کتاب اللہ سے عام شہریوں کی ناواقفیت، اپنی باتوں اور اپنے افکار کی اللہ کے نام پر تشہیر، نسلی برتری کا گھمنڈ، اپنے نجات یافتہ ہونے کا غرور، غریب سے بدسلوکی، یتیم پر ظلم اور والدین کا عقوق، عام انسانوں سے بات چیت میں زبان کی تلخی، باہم خونریزی اور اپنے بھائیوں کو شہر بدر کرنا، انبیاء کی تکذیب اور ان کا قتل، خیالات میں جمود، نفسانی خواہشوں کی پرستش، حسد، ملائکہ سے عداوت، دُنیا اور اس کے مفادات کی حرص، کتابِ الٰہی کو پس پشت ڈالنا، مشرکانہ عملیات کا مشغلہ، اور عملیات میں عشق و محبت اور ناجائز آشنائیوں کے لیے جھاڑ پھونک، تعویز گنڈوں کی تلاش۔ ان میں سے کوئی ایک نہیں بلکہ قرآن کا بیان ہے کہ یہ سارے رذائل ان کی قومی اور ملی تاریخ کا حصہ تھے۔ ان کو ذہن میں رکھ کر اب قرآن کی آیت پڑھنے اور بلاغتِ قرآنی کا مزہ لیجیے۔
ولو انھم آمنوا واتقوا کاش وہ ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کرتے۔
اگر یہ راہ اختیار کرتے تو ان کو کیا ملتا۔ قرآن نے بتایا ہے لمثوبۃ من عند اللہ خیر۔ ان کے لیے اللہ کی بارگاہ میں بہترین اجر تھا یعنی علم دین اور علم کتاب حاصل کرتے تو اللہ کے ہاں ثواب پاتے۔ اللہ اکبر کیا حد ہے اس رحمت و شفقت کے انداز کی۔

شانِ نبوت میں گستاخی

بنی اسرائیل کے جرائم کی فہرست میں من جملہ دوسرے جرائم کے ایک سنگین جرم انبیاء کی شان میں گستاخی اور بے ادبی ہے۔ اس آیت میں قرآن ان کی اسی مجرمانہ ذہنیت کو بتانا چاہتا ہے۔ لیکن چونکہ یہاں اُن کی گستاخی کا نشانہ خود ذاتِ نبوت ہے اس لیے قرآن نے عنوان بدل دیا پہلے سے انداز بیان یہ آرہا ہے کہ تم نے ایسا کیا تم نے یوں کیا تم نے خون بہایا، تم نے انبیاء کی تکذیب کی وغیرہ وغیرہ۔ اور اب عنوان بدل کر بات کو اس طرح پیش کیا کہ اے اہلِ ایمان تم راعنا نہ کہا کرو۔ یعنی جنابِ نبوت میں گستاخی اتنا سنگین جُرم ہے کہ اس کا مرتکب اللہ کے لیے قابلِ خطاب بھی نہیں ہے۔ یہاں ان کی گستاخی کیا تھی۔ شاہ عبدالقادر صاحبؒ فرماتے ہیں کہ یہود پیغمبر کی مجلس میں بیٹھتے اور حضرت کلام فرماتے بعضی بات جو نہ سنی ہوتی چاہتے کہ پھر تحقیق کریں تو کہتے راعنا یعنی ہماری طرف بھی متوجہ ہوں۔ ان سے مسلمان بھی کسی وقت یہ کلمہ کہتے اللہ تعالیٰ نے منع فرمایا کہ یہ لفظ نہ کہو اگر کہنا ہو تو اُنظرنا کہو اس کے معنے بھی یہی ہیں اور آگے سنتے رہو کہ پوچھنا ہی نہ پڑے۔ یہود کے اس کہنے میں دغا تھی اس کو زبان دبا کر کہتے تو راعینا ہو جاتا یعنی ہمارے چرواہے اور ان کی زبان میں راعن احمق کو بھی کہتے تھے۔ قرآن میں دوسری جگہ یہ تصریح کہ راعنا لیّا بالسنتھم یعنی راعنا کا لفظ اپنی زبان کو مروڑ کر کہتے یعنی راعنا کو راعینا کہتے۔ بات پہلے سے مسلسل چلی آرہی ہے۔ پہلے بھی یہودیوں کی شناعتوں کا تذکرہ ہے۔ یہاں بھی ان کی اس خاص شرارت کا ذکر ہے۔ مولانا عثمانی فرماتے ہیں۔ یہود حضورؐ کی خدمت میں آتے تو راعنا کہتے اس کے بھی دو معنے ہیں ایک اچھے اور دوسرے بُرے۔ اچھے معنے تو یہ کہ ہماری رعایت کرو اور بُرے معنے یہ کہ یہود کی زبان میں یہ کلمہ تحقیر ہے یا زبان دبا کر راعینا کہتے یعنی تو ہمارا چرواہا ہے اور یہ ان کی شرارت تھی۔ آیت میں ان کی شرارت اور گستاخی ہی کو بیان کرنا مقصود ہے۔

۲۸۳ ۔ راعنا۔ تو ہماری رعایت کر، ہمارا خیال کر، ہماری طرف کان لگا۔ اس صورت میں یہ مراعات سے امر بنا ہے جس کے معنے کسی کی بات پر کان رکھنے اور دوسرے کے حق کی رعایت کرنے کے ہیں۔ دراصل بنی اسرائیل حضورِ انورؐ کی مجلس میں اپنے سلام اور کلام میں ہر ممکن طریقہ سے اپنے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے تھے۔ ذو معنی الفاظ بولتے۔ زور سے کچھ کہتے اور زیر لب کچھ اور کہہ دیتے۔ اور ظاہری آداب برقرار رکھتے ہوئے درپردہ آپؐ کی توہین کرنے میں کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھتے تھے۔ اس خاص لفظ کے استعمال سے مسلمانوں کو روکا گیا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ذو معنی لفظ تھا۔ اس لفظ کا ظاہری مفہوم

تو یہ تھا کہ ذرا ہماری طرف توجہ کیجیے یا ہماری بات سن لیجیے۔ مگر اس میں کئی احتمالات اور بھی تھے۔ مثلاً عبرانی میں اس سے ملتا جلتا ایک لفظ تھا جس کے معنے تھے سن تو بہرہ ہو جائے اور خود عربی میں راعن کے معنے صاحب رعونت اور جاہل واحمق کے بھی تھے۔ اور گفتگو میں یہ ایسے موقعہ پر بولا جاتا تھا جب یہ کہنا ہو کر ہماری بات سنو تو ہم تمہاری سنیں اور ذرا زبان کو لچکا دے کر راعینا بھی بنا لیا جاتا تھا جس کے معنے اے ہمارے چرواہے کے تھے۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ تم اس لفظ کے استعمال سے پرہیز کرو[1]

۲۸۴ ۔ بلکہ انظرنا کہا کرو۔ یعنی راعنا کے بجائے انظرنا کہا کرو۔ اس کے معنے بھی وہی ہیں۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ مسلمانوں کو حضور انور کو عزت واکرام سے مخاطب کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم پر نظر فرمایئے اور ہماری طرف توجہ فرمایئے۔ پہلے لفظ میں ذو معنی ہونے کی وجہ سے توریہ ہوسکتا ہے اور اس میں توریہ نہیں ہو سکتا۔ توریہ بلاغت کی اصطلاحی زبان میں یہ ہے کہ متکلم ذو معنے لفظ بولے متکلم کی مراد کچھ اور ہو اور مخاطب کچھ اور سمجھے اور بات میں جھوٹ نہ آنے پاتے مثلاً ہجرت کے موقعہ پر حضرت ابوبکرؓ اور حضورؐ دونوں سفر میں تھے۔ راستہ میں ایک شخص ملا۔ ابوبکرؓ نے بات چیت کی، بات چیت ہی کے دوران ملنے والے شخص نے حضورؐ کی طرف اشارہ کرکے پوچھا کہ یہ کون ہیں۔ ابوبکرؓ یہ راز اس پر کھولنا نہ چاہتے تھے اس لیے ایسے ذو معنی الفاظ بولے کہ مخاطب کو جواب مل گیا اور راز ظاہر نہ ہوا۔ فرمایا رجل یہدینی السبیل مجھے راہ بتانے والا شخص ہے۔ راہ سے مراد ابوبکرؓ کی راہِ نجات تھی اور سمجھنے والے نے سمجھا کہ اس سفر میں راستہ کا کوئی واقف کار ہے۔ اس قسم کی تعبیر کو بلاغت کی زبان میں توریہ کہتے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ بنی اسرائیل راعنا بطور توریہ حضور انورؐ کی شانِ اقدس میں استعمال کرتے تھے۔ حافظ ابن تیمیہؒ کہتے ہیں کہ یہودی راعنا سے رعونت کے معنے مراد لیتے تھے۔ گفتگو میں یہ الفاظ بولتے اور باہم ایک دوسرے کو دیکھ کر ہنستے۔ سعد بن معاذؓ اس حرکت کو تاڑ گئے۔ بول پڑے بخدا اب اگر تم میں سے کسی کو یہ لفظ بولتے سنا تو گردن اڑا دوں گا[2]

۲۸۵ ۔ پھر جو کچھ کہیں کان لگا کر سنو۔ یعنی ابتداء ہی سے متوجہ ہو کر سنو تاکہ مکرر پوچھنا نہ پڑے۔ یعنی رسولؐ کے ارشادات ادب وتعظیم کے ساتھ توجہ سے سنو۔ یہودیوں کو تو بار بار یہ کہنے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ نبی کی بات توجہ سے نہیں سنتے مگر تمہیں اللہ رسولؐ کی بات غور سے سننی چاہیے۔

---

[1] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۰۰　[2] الصارم المسلول ص ۲۳۲

آیت کا حاصل یہ ہوا کہ جنابِ نبوّت میں راعنا نہ بولو کہ یہ ذو معنے لفظ ہے۔ اس سے علامہ ابوبکر ابن العربی نے یہ بات خوب سمجھی ہے کہ جن الفاظ میں اہانت اور بے ادبی کا احتمال بھی ہو بارگاہِ رسالت میں ان کے استعمال سے بھی پرہیز کرنا چاہیے۔ قرطبی بھی یہ بات کہنے میں ابن العربی کے ہم زبان ہیں۔ اور حافظ ابن تیمیہؒ اس سے دو قدم آگے بڑھ کر فرماتے ہیں کہ دل میں رسالت کی تصدیق بالذات استخفاف و استہانت سے مانع ہے۔ الفاظ کا ایسا پیمانہ جس سے نبوّت کی جناب میں گستاخی کی بو بھی آتی ہو ایمان سے خارج کر دیتا ہے۔

اس آیت سے علامہ قرطبی نے اسلامی آئین کی وہ دستوری دفعہ بھی معلوم کی ہے جس پر بہت سے اسلامی زندگی کے قوانین کا مدار ہے اور اسلامی مملکت میں جس کی اساس پر قانون سازی کی جاتی ہے آئینِ اسلامی کی اس دستوری دفعہ کو سد ذرائع کے نام سے پکارتے ہیں۔ اس پر تفصیلی بحث پارہ سورۂ انعام میں آئے گی۔ یہاں چند اشارات پر اکتفا کیا جاتا ہے۔

ذرائع کی حقیقت یہ ہے کہ اگر اسلام کسی کام کی لوگوں پر ذمہ داری ڈالتا ہے تو اس کے حصول کے تمام وسیلے مطلوب ہوں گے اور ایسے ہی اگر اسلام کسی کام سے روکتا ہے تو ہر وہ راستہ جو اس کے کرتے میں معاون و مددگار ہو حرام ہوگا۔ یہ اسلام میں قانون سازی کی اہم دفعہ ہے۔ احناف مالکیہ اور حنابلہ نے اس پر کافی اعتماد کیا ہے۔ اس کی روشنی میں اگر کوئی امر اسلام میں مطلوب ہے تو دوسرے درجہ میں اس کے حصول کا ذریعہ بھی مطلوب ہوگا اور ہر ناجائز چیز کے حصول کا ذریعہ بھی ناجائز اور حرام ہوگا۔ اس لیے یہ ذریعہ یا وسیلہ مامور بہ یا منہی عنہ چیز تک رسائی کا سبب بن سکتا ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ

یہ آیت بتا رہی ہے کہ لفظ راعنا کا استعمال چونکہ جنابِ نبوّت میں گستاخی اور بے ادبی کا ذریعہ ہے اس لیے اس لفظ کے استعمال پر اللہ سبحانہٗ کی جانب سے قدغن قائم کر دی گئی ہے بعض معاصر مفسّرین کی حسِ توحید اس قدر تیز ہے کہ انہوں نے اس لفظ سے بُوئے شرک سونگھ کر یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ

اس لفظ سے یہودیوں کا مقصد مسلمانوں میں غیر اللہ کے حافظ و ناصر ہونے کا خیال ڈالنا تھا تاکہ مسلمانوں میں غیر شعوری طور پر شرک کا عقیدہ راسخ ہو جائے تو اللہ تعالیٰ نے ایسے موہم شرک لفظ سے منع کر دیا۔ شرک کی قباحت اپنی جگہ مسلم ہے لیکن اس آیت میں تاویل و توجیہہ کا یہ انداز نہ صرف یہ کہ منقول نہیں ہے بلکہ آیت کے مطالب کو مضحکہ خیز بنانے کے مترادف ہے۔ آیت میں راعنا کے استعمال

سے جس بنیاد پر رد کیا گیا ہے وہ ایہامِ شرک نہیں بلکہ ذریعہ استخفاف شانِ نبوت ہے۔ قرطبی لکھتے ہیں: لانہ ذریعۃ للسب، کیونکہ یہ لفظ حضور کی شان میں گستاخی کا ذریعہ ہے۔ آلوسی فرماتے ہیں و نھی المومنون سد الباب۔ نبوت کی شان میں گستاخی کے دروازے بند کرنے کے لیے راعنا کے استعمال سے منع کیا ہے۔ ابنِ کثیرؒ لکھتے ہیں نھی المومنین عن مشابھۃ الکافرین قولا و فعلا اللہ نے مومنین کو گفتار و کردار میں کافروں کی کاپی کرنے سے منع فرمادیا ہے۔ حافظ ابن جریر رقم طراز ہیں۔ دُرست یہی ہے کہ اللہ پاک نے اہلِ ایمان کو راعنا کے لفظ استعمال کرنے سے اس لیے روکا ہے کہ اللہ کو اپنے نبی کے لیے یہ گوارا نہ تھا۔ ابوحیان اندلسی نے جمہور مفسرین کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ راعنا کے استعمال سے اس لیے روکا گیا ہے کہ اس میں بہت بڑا مفسدہ ہے۔ یہ مفسدہ کیا ہے سب کا فیصلہ یہی ہے کہ شانِ نبوت میں گستاخی۔ بہرحال بتانا یہ ہے کہ چونکہ اس لفظ کا استعمال ذریعہ ہے۔ شانِ نبوت میں گستاخی کا اور نبوت کا مقام اتنا ارفع اور اتنا اعلیٰ اور اولیٰ ہے کہ گستاخی تو درکنار ان کی جناب میں آواز کا بلند کرنا بھی تمام اعمالِ حیات کو رکاوٹ کر دیتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شانِ گرامی میں بے ادبی بنیادی طور پر اللہ کے دین کے منافی ہے بے ادبی سے احترام اور تعظیم پامال ہو جاتا ہے۔ احترام نہیں تو جو کچھ نبوت لے کر آئی ہے اس کا بھی کوئی مقام نہیں رہتا ہے۔ پورا دین، پورا ایمان حرف غلط ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی بنا پر ان کی مدح سرائی، آپ کی تعریف، آپ کی تعظیم، آپ کی توقیر سے ہی سارے دین کا قیام وابستہ ہے اور اس سے محرومی درحقیقت پورے دین سے محرومی ہے۔[1]

اور یہ بھی لکھا ہے کہ

یہ ناممکن ہے کہ جس قلب میں آپ کا احترام ہو اس کی زبان پر گستاخی اور بے ادبی ہو۔ احترام اور توہین کبھی یکجا نہیں ہو سکتے ہیں۔

بہرحال بتانا یہ ہے کہ رسالت کی ذات سے محبت، آپ کی تعظیم ایمان کا لازمہ ہے۔ شانِ نبوت میں بے ادبی بقول حافظ ابن تیمیہؒ کفرِ ابلیس سے زیادہ سنگین جرم ہے۔ قرآن اسی جرم کی طرف جانے والے ذریعہ پر پابندی لگا رہا ہے۔ ذرائع کا یہ زریں اصول اسلام کی قانون سازی میں بے حد قیمتی ہے۔ اس کی کچھ قیمت کا اندازہ کرنا ہو تو اعلام میں حافظ ابن القیم کا یہ بیان پڑھیے:

---

[1] الصارم المسلول ص ۲۰۳

اس میں شبہ نہیں کہ مقاصد تک پہنچنے کے ذرائع اور راستے ضرور ہوتے ہیں اور ان کا حکم بھی مقاصد ہی کا ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ معاصی اور محرمات سے روک دیتا اور گناہ کی طرف جانے والے راستے کھلے رکھتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ایک طرف معاصی سے روکا اور دوسری طرف معاصی پر آمادہ کرنے والی چیزوں کو بحال رکھا۔ اور اس طرح تحریم کے حکم کو توڑ دیا۔ ظاہر ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کاملہ اور اس کے علم محیط کے سراسر منافی ہے۔

اس موضوع پر ابن القیم نے اعلام میں سیر حاصل بحث کی ہے اور اغاثۃ اللہفان میں مختصر۔ اور عملی زندگی میں اسلامی قانون میں سے چن چن کر مثالیں پیش کی ہیں۔ آپ بھی کچھ مثالیں سن لیجئے۔

فتنہ و فساد کے زمانہ میں اسلحہ جنگ بیچنا حرام ہے اس لیے کہ ایسے موقع پر ان کا فروخت کرنا شر کی ترویج کا ذریعہ ہے کیونکہ جب فساد ممنوع ہے تو اس کے ذرائع بھی ممنوع ہیں۔

معاشیات کے طالبعلم یہ سن کر حیران ہوں گے کہ اسی اصل کی بنا پر امام احمدؒ نے یہ فتویٰ دیا ہے کہ اگر کوئی شخص کھانے پینے کا ضرورت مند ہے اور یہ چیزیں اس کے پڑوسی کے پاس موجود ہیں اور وہ دیتا نہیں ہے یہاں تک کہ وہ بھوک اور پیاس سے مرجاتا ہے تو کھانے یا پانی کے مالک پر اس کا خون بہا واجب ہوگا حالانکہ اس نے غلطی سے یا عمداً قتل نہیں کیا ہے مگر چونکہ اس کی ذخیرہ اندوزی ایک شخص کی موت کا ذریعہ بنی ہے اس لیے اس پر دیت واجب ہوگی۔

امام احمد اس تاجر سے خریدنا ناجائز سمجھتے تھے جو اپنے پڑوسی تاجر کو نقصان پہنچانے کے لیے قیمت گھٹا کر فروخت کرے۔ یہ فتویٰ اسی اصل پر مبنی ہے۔

اگر کسی جائز کام سے دوسروں کو ناجائز کاموں کی گنجائش ملتی ہو تو یہ جائز فعل بھی ناجائز ہوگا۔

۲۸۶ ـ ان کافروں کے لیے دردناک عذاب ہے۔ آلوسی کہتے ہیں کہ لام عہد کے لیے اور کافرین سے مراد وہ یہودی ہیں جنہوں نے شانِ نبوت میں گستاخی کی ہے۔ اصول کے مطابق بات کا اندازہ تو یہ ہونا چاہیے کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ لیکن ارشاد یہ ہوا ہے کہ ان کافروں کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ شانِ نبوت میں گستاخی اور بے ادبی اتنا سنگین کفر ہے کہ جس کا نتیجہ عذاب الیم ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں ،

حضور انورؐ کی شان میں گستاخی کا درجہ ہرگز وہ نہیں ہے جو امت کے اہل ایمان کی گستاخی کا ہے۔ کیونکہ آپؐ کی ذات گرامی امت کے تمام افراد سے حقوق میں ایک نمایاں امتیاز رکھتی ہے۔ آپؐ کی شان میں گستاخی کفر ہے جب کہ دوسرے اہل ایمان میں سے کسی

مَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَلَا الْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يُّنَزَّلَ عَلَيْكُمْ مِّنْ خَيْرٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ ۞

نبوت کے منکر اہلِ کتاب ہوں یا مشرکین اُن کو یہ بات پسند نہیں ہے کہ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر وحیٔ الٰہی کی خیر و برکت نازل ہو۔ لیکن اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے اور اللہ بہت ہی بڑے فضل والا ہے۔

مومن کی بے ادبی صرف گناہ ہے اور قانون میں سزائیں جرائم کے مطابق ہوتی ہیں۔ (الصارم المسلول)، گستاخی تو بڑی بات ہے شانِ نبوت میں تعریض بھی کفر ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے عذابِ الیم کی تشریح کرتے ہوئے دُنیا میں گستاخِ نبوت کی سزا اس کے وجود سے زمین کو پاک کرنا بتایا ہے۔ اس پر تو ائمہ کا اتفاق ہے۔ احناف، موالک، شوافع اور حنابلہ سب ایک زبان ہیں۔ اختلاف اس میں ہے کہ حضور انورؐ کے گستاخ کو یہ سزا کفر کی بنا پر دی جا رہی ہے یا یہ حضورؐ کی شان میں گستاخی کی قانونی سزا یہی ہے اس کی تفصیلات انشاء اللہ پارہ ۲۶ سورۂ حجرات میں آئیں گی۔

کفر پر یہودیوں اور مشرکین کی یونین :

یہودیوں کی برائیوں کے سلسلے میں بتایا جا رہا ہے کہ شانِ نبوت میں اُن کا یہ گستاخانہ انداز اس لیے نہ تھا کہ نبوت کی ذات اپنی زندگی کے کسی پہلو میں کوئی [illegible] رکھتی ہے۔ آپؐ کی کتابِ زندگی کے اوراق کھلے ہوئے ہیں۔ اس پر آج تک آپؐ کے معاصر مخالفین [illegible] سے کسی نے کبھی کوئی نکتہ چینی نہیں کی ہے آپؐ کی ذات سب کے نزدیک جملہ اخلاقِ فاضلہ سے [illegible] اور اخلاقِ رذیلہ سے معرّیٰ، جوانی میں عفت و عصمت کے مثالی نمونہ، پیری میں وفا اور رُعب کا پیکر [illegible]ل بال سے حسن ٹپکتا، بات بات سے پھول جھڑتے

روئیں روئیں سے فہم وفراست ٹپکتی، سب سے زیادہ راست گو، سب سے بڑھ کر امانتدار، احبار و رہبان یہود آپؐ کے نبی موعود ہونے پر متفق، مشرکینِ عرب آپؐ کی صفات کے معترف۔ اس کے باوجود اگر آپؐ کی مجلس میں آنے والے یہودی بے ادبی کرتے ہیں تو کیوں؟ فرمایا اس لیے اور صرف اس لیے کہ آپؐ کی نبوت کی وجہ سے چاہے یہودی ہوں یا عیسائی اور یا پھر مشرکین ان میں سے کسی کو یہ بات پسند نہیں کہ وحیٔ الٰہی کی خیر و برکت آپؐ کے پاس ہو۔ تمہارے پاس وحی کے نہ ہونے میں ان سب کا ایکا ہے اور سب نے یونین بنا رکھی ہے۔ اس آیت میں قرآن نے اسی سوال کا جواب دیا ہے۔

۲۸۷ ۔ پسند نہیں ہے اصل ارشاد میں مایود ہے ود سے بنا ہے اس کے معنے چاہت، پسند اور ہونے کی آرزو کے ہیں۔ الذین کفروا سے نبوت اور قرآن کے منکر مراد ہیں۔ چاہے یہ کفر کسی قسم کا ہو۔ قرآن کا انکار بھی کفر ہے اور قرآن میں بیان شدہ مضامین میں سے کسی ایک بات کا انکار بھی کفر ہے اور جیسے قرآن کا انکار کفر ہے ایسے ہی رسولؐ کی شخصیت کا انکار بھی کفر ہے اور رسولوں میں سے کسی ایک رسول کا انکار بھی کفر ہے۔ قرآن اور رسول کی شخصیت تک ایمان کی حدود میں تفریق بھی کفر ہے۔ قرآن کے بتائے رسول کے مقامات کا انکار کرنا رسول کے انکار کے مترادف ہے۔ الغرض اس میں ہر قسم کا کفر داخل ہے۔ نبوت کے منکروں کے دو طبقے زمانۂ نبوت میں پیش پیش رہے۔ ایک اہلِ کتاب دوسرے مشرکین۔ اہلِ کتاب سے مراد تورات و انجیل کے ماننے والے ہیں۔ یہ دونوں توحید و نبوت کے قائل تھے اور خدا کی وحی اور آخرت پر ایمان کے مدعی تھے معنوی تاویلات اور لفظی تحریفات کرکے نبیوں کی تعلیمات مسخ کر چکے تھے۔ آلوسی لکھتے ہیں کہ یہاں اہلِ کتاب لاکر دونوں پر تعریض کی گئی ہے کہ اُن کی کتاب تو اُن سے کہہ رہی ہے کہ حق کی آواز پر لبیک کہو مگر ان کا کفر رکاوٹ بنا ہوا ہے اور کفر ایک جو ہر خبیث ہے کہ جس زمین میں یہ پیدا ہو جاتا ہے چاہے وہ زمین علم ہی کیوں نہ ہو اس کو بھی پامال کر دیتا ہے کیونکہ کفر حسد کو جنم دیتا ہے اور حاسد غیر کا بیری اور دشمن ہوتا ہے۔ علمائے یہود اس بیماری کے مریض رہے ہیں۔

۲۸۸ ۔ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر خیر نازل کی جائے۔ خیر سے مراد یہاں اللہ کی وحی ہے مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہودی ہوں یا عیسائی اور یا مشرکین ان کو یہ کسی درجہ میں پسند نہیں ہے کہ تم اللہ کی وحی کی نعمت سے مالا مال ہو۔ یہود تو اس لیے نہیں چاہتے کہ ان میں عرب کے خلاف تعصب ہے اور وہ اس سے جلتے ہیں کہ دُنیا کی امامت و قیادت اللہ کی جانب سے ان کو کیوں ملی ہے اور مشرکین اس لیے کہ اُن کے رؤسا کا اقتدار و بالادستی اس کے نتیجے میں ختم ہو رہا ہے اور

اگر خیر سے صرف وحی نہیں بلکہ اس سے ہر قسم کی فلاح دُنیوی و اُخروی مراد لی جائے اور اس کے تحت میں علم و حکمت نصرتِ غیبی، فتوحاتِ ملکی اور سیاسی برتری کو شامل کر لیا جائے تو مطلب یہ ہے کہ چاہے وہ اہلِ کتاب ہوں یا مشرکین اُن کو یہ کسی طرح گوارا ہی نہیں ہے بلکہ اُن پر یہ بات شاق گذر رہی ہے کہ مسلمانوں پر خیر و برکت کا نزول ہو۔ قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ وہ مسلمانوں پر کسی نوعِ خیر کا نزول دیکھنا گوارا نہیں کرتے ہیں۔
یہاں خیر نکرہ ہے اور نفی کے تحت آیا ہے اور نفی میں مبالغہ کے لیے اس کی پیشانی پر من لگا ہے۔ پہلی آیت نے بتایا تھا کہ اُن کا نبوت کے ساتھ معاملہ گستاخانہ ہے۔ اس آیت نے یہ بات کھول دی کہ اس گستاخی اور بے ادبی کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب کُفر کی برادری ہے اور اس برادری میں مشرک اور کتابی کی کوئی تمیز نہیں۔ اس موضوع پر ان سب کا ایکا ہے اور ان میں یہ ذہن بنی ہوئی ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کی برتری کو کسی درجہ پسند نہیں کرتے۔ اور جب ان کو تمہاری عزت، تمہارا علم، تمہاری سیادت، تمہاری سیاست، تمہارا انتظامِ زندگی، تمہارے نظریات اور تمہارے اعمال و اخلاق پسند نہیں ہیں اور اس ناپسندیدگی کا باعث اُن کا کُفر ہے تو پھر ان سے بارگاہِ نبوت میں ادب و احترام کی کیا توقع ہو سکتی ہے اور کُفر کی اس برادری میں یہودی ذہن تو یہ ہے کہ یہ نبوت تم سے چھین کر ان کو ملے، اور خدا کی جانب سے آنے والی خیر ان کے مشورے سے تقسیم ہو اور تقسیم بھی ایسی کہ اُن کے سوا کسی کو نہ دی جائے۔

۲۸۹ - اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ جسے چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے۔ یہود یہ تمنا کرتے تھے کہ نبی آخر الزماں بنی اسرائیل میں پیدا ہو لیکن یہ تو اللہ کے فضل کی بات ہے کہ اُمی لوگوں میں نبی آخر الزمانؐ پیدا فرمایا[1]

یعنی یہود کو اصل حسد اس کا تھا کہ نعمتِ نبوت اور نبوت کے نام پر اللہ کی جانب سے اُترنے والی ہر خیر کے تو ہم حقدار ہیں۔ اہلِ عرب کو کہ بنی اسماعیل ہیں یہ نعمت کیوں ملی ہے۔

اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے یہودیوں کے اسی مزعومہ کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ یہودیوں کی انتہائی غباوت اور طبیعت کے فساد کی نشانی ہے کہ وہ تقسیمِ رحمت پر اللہ سے ناراض اور اس پر اعتراض کر رہے ہیں۔ لیکن اللہ کو نہ کسی کی ناراضگی نقصان پہنچاتی ہے اور نہ کسی کا حسد اللہ کا کچھ بگاڑتا ہے۔ اس کا قانون یہی ہے کہ جب چاہتا ہے اور جسے چاہتا ہے اپنی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ رحمت و فضل دونوں کے تذکرے میں لفظ اللہ خاص طور پر لائے ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ یہ دونوں بالذات اللہ کا حق ہیں بندوں میں سے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۰

مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا ؕ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۞ اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَمَا لَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ۞

ہم اپنے احکام میں جس حکم کو بھی منسوخ کرتے ہیں یا بھلا دیتے ہیں[۲۹۱] تو ہم اس کی جگہ اس سے بہتر[۲۹۲] یا اسی جیسا حکم لاتے ہیں۔ کیا تم جانتے[۲۹۳] نہیں ہو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ زمین[۲۹۴] و آسمان کی سلطنت اللہ کی ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں جو تمہارا مددگار اور حمایتی ہو۔

کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اس کی داد و دہش یا اسکی روک اور ممانعت پر کسی طرح اثر انداز ہو سکے۔ اللھم لامانع لما اعطیت ولا معطی لما منعت۔

قرآن میں فضل و رحمت کا کیا مفہوم ہے۔ اس پر کچھ اشارات فاتحہ کی تفسیر میں گزر چکے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ فضل سے ہدایت اور رحمت سے انعام مراد ہوتا ہے۔ قرآن میں آغاز بقرہ میں اتقیا کے بارے میں اس خبر اولٓئک علی ھدی من ربھم واولٓئک ھم المفلحون۔ کا یہی مطلب ہے کہ اس جماعت پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت ہوئی ہے۔ قرآن کے اوصاف میں یہ دو لفظ ہدایت اور رحمت بار بار آئے ہیں ھدی وَّرحمۃ لقوم یومنون، ھدی ورحمۃ وبشری للمسلمین، ھدی ورحمۃ للمومنین۔ فضل ہو یا رحمت یہ اللہ کی صفتِ عطاء سے تعلق رکھتا ہے اور اس کے مقابلے میں اضلال اور عذاب اس کی صفت منع سے اپنی دینے اور اپنی نہ دینے میں ہر قسم کے تصرف کا صرف وہی مالک ہے۔ اس کی حکمتِ بالغہ، ملکیت تامہ اور علمِ محیط کے تحت سب کچھ ہوتا ہے کوئی نہیں جو اس پر قدغن قائم کرے۔

نسخِ شرائع یا نسیانِ شرائع

یہ ایک خاص شبہ کا جواب ہے جو یہودی مسلمانوں کے دلوں میں ڈالنے کی کوشش کرتے تھے ان کا اعتراض یہ تھا کہ اگر پچھلی کتابیں بھی اللہ سبحانہٗ کی جانب سے آئی ہیں اور یہ قرآن بھی خدا ہی کی طرف

سے ہے قرآن کے بعض احکام کی جگہ دوسرے احکام اس میں کیوں دیے گئے ہیں؟ یہودیوں کو یہ اعتراض نماز میں سمتِ قبلہ بنی اسرائیل کی ربانی مسجد بیت المقدس کی جگہ ابراہیمی خانہ کعبہ کے مقرر ہونے اور خانہ کعبہ کا حج فرض ہونے پر ہوا کہ یہ دونوں باتیں یہودیوں میں نہ تھیں۔ یہ اعتراض وہ تحقیق کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کرتے تھے کہ مسلمانوں کو قرآن کے من جانب اللہ ہونے میں شک ہو جائے۔ ان آیات میں یہودیوں کے اسی اعتراض کا جواب ہے۔ قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ نسخ کے معنے کسی حکم کو اس کے غلط ہونے یا غیر مفید ہونے کی بنا پر ہٹانے کے نہیں ہیں بلکہ محرف احکام کی جگہ پر اصل احکام دوبارہ نازل ہونے اور دُنیا کے حسبِ حال ناقص کی جگہ کامل اور کامل کے بدلے کامل تر تعلیمات لانے کے ہیں۔ قرآن کے ناسخِ کتب اور اسلام کے ناسخِ یہودیت و عیسائیت ہونے کے معنے ان کے مٹا دینے کے نہیں بلکہ ان کی تکمیل کرنے کے ہیں۔ مذاہب کی تاریخ جب سے شروع ہوئی ہے ہر مذہب اور اس کی کتاب انسانی عروج و ترقی کی ایک ایک منزل ہے۔ اور اسلام اس سلسلۂ ارتقاء کی وہ کامل ترین انتہائی منزلِ مقصود ہے جس کے بعد تکمیلِ دین کی سرحد ختم ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ خود اسلام کا دعویٰ ہے اور اس دعویٰ میں کوئی اور دین اس کا شریک نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں اس پر یقین کرنا چاہیے۔ کہ آدم سے لے کر حضرت عیسٰی تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا، ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا۔ اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی۔ لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی رہی، گم ہوتی رہی اور آخری بار دُنیا کے کمالِ بلوغ کے زمانے میں وہ پوری حفاظت کے وعدہ کے ساتھ محمد رسول اللہ کے ذریعہ سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی ہے۔ اور قیامت تک محفوظ رہے گی۔ گویا قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ ایک شریعت کے بعد دوسری شریعت اس لیے آتی ہے کہ یا تو نسخ کی حالت طاری ہوئی یا نسیان کی۔ نسخ یہ ہے کہ ایک بات پہلے سے موجود تھی لیکن موقوف ہو گئی۔ اور اس کی جگہ دوسری بات آگئی۔ نسیان کے معنے بھول جانے کے ہیں۔ بعض حالات میں ایسا ہوا کہ پچھلی شریعت کسی نہ کسی شکل میں موجود تھی لیکن انسانی زندگی کے احوال و ظروف بدل گئے تھے یا اس کے پیروکاروں کی عملی روح معدوم ہو گئی تھی اس لیے ضروری ہوا کہ نئی شریعت ظہور میں آئے۔ بعض حالتوں میں ایسا ہوا کہ امتدادِ زمانہ سے پچھلی تعلیم بالکل فراموش ہو گئی اور اصلیت میں سے کچھ باقی نہ رہا۔ اس لیے تجدیدِ ہدایت ضروری ہوئی۔ سنتہ الٰہی یہ ہے کہ نسخِ شرائع ہو یا ان کا نسیان۔ لیکن ہر نئی تعلیم پچھلی تعلیم سے بہتر ہو گی یا اس جیسی ہو گی۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کمتر ہو کیونکہ مقصود تکمیل و ارتقا ہے اور بس۔

۲۹ ـــ اپنے احکام میں سے جس حکم کو بھی ہم منسوخ کرتے ہیں۔ اصل ارشاد میں ما ننسخ من آیۃ

ہے۔ نسخ کے معنے عربی زبان میں ہٹا دینے کے ہیں، یہ ہٹانا چاہے بالذات ہو، جیسے بولتے ہیں سورج نے سایہ کو ہٹا دیا نسخت الشمس الظل یعنی ایک جگہ سے سایہ کو دوسری جگہ ہٹا دیا۔ کتاب کو نقل کرنے کو بھی نسخت الکتاب اس وقت کہتے ہیں جب کتاب بعینہٖ نقل کی جائے یعنی ایک جگہ سے ہٹا کر دوسری جگہ لائی جائے اور اس میں ابدال کے معنے ہیں۔ نیز اس کے معنے مٹانے کے بھی ہیں۔ جیسے نسخت الریح الاثر ہوا نے نشان مٹا دیا۔ اس طرح عربی میں نسخ کے تین معنے ہوئے۔ ہٹانا، بدل دینا اور مٹا دینا۔ آیت کے معنے میں عربی زبان میں بڑی گنجائش ہے۔ لکھی ہوئی آیت کو بھی آیت کہتے ہیں، نبی کے معجزہ اور نبوت کی دلیل کو بھی آیت کہتے ہیں۔ لکھی ہوئی آیت میں بھی عموم ہے۔ قرآن کی آیت بھی آیت ہے اور کتبِ سابقہ کی آیات بھی آیات ہیں۔ یہاں تک تو مطلب صاف ہے کہ ہم جب بھی کسی آیت کو مٹاتے یا ہٹاتے یا بدل دیتے ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ آیت سے یہاں کیا مراد ہے، دلائل، معجزات، کتبِ سابقہ کی آیات، یا قرآن کی آیات۔

دلائل و معجزات اگر مراد ہوں تو پھر بھی بات میں کوئی گنجلک نہیں ہے اور اس میں کوئی کلام نہیں کہ نبوت کو ثابت کرنے کے لیے دلائل و معجزات کی بارش ہوتی رہتی ہے لیکن جس سیاق و سباق میں یہ بات کہی وہ اس کا محل نہیں ہے۔

کتبِ سابقہ کی آیات مراد ہوں تو اس میں بھی بات واضح ہے کہ اللہ کی سنت یہ رہی ہے کہ ہر قوم کی زمانی و مکانی خصوصیات کی وجہ سے احکام و آیات بدلتے رہے ہیں۔ اب آخری بار انسانیت کے کمال کے زمانہ میں قرآن کی صورت میں احکام نازل ہوئے۔

اگر آیاتِ قرآنی مراد ہوں جیسا کہ جمہور مفسرین کا خیال ہے تو اہلِ سنت میں اس موضوع پر کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ امام رازی نے یہ بات بڑی پتے کی لکھی ہے اجمع الجمہور من المسلمین علی جواز النسخ و وقوعہ اس کو مانتے ہوئے یہاں سوال یہ اُبھرتا ہے کہ قرآن کی اس آیت میں کون سا نسخ بیان کیا جا رہا ہے ہماری رائے میں آیت میں اصلاً نسخ شرائع اور ضمناً نسخ احکامِ قرآنی کا ذکر ہے۔ اصلاً قرآن میں احکام و آیات کے نسخ کو پارہ ۱۴ میں بیان کیا گیا ہے۔ یہاں معترض یہودی ہیں۔ ان کے اعتراض کا جواب دیا جا رہا ہے۔ یہودی نسخ کے قائل نہ تھے۔ نسخ کیا ہے؟ کہاں ہوتا ہے؟۔ اس کے لیے ہم مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی کتاب اظہار الحق، سے ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں

لغت میں نسخ کے معنے زائل کر دینا، مٹا دینا ہیں۔ مسلمانوں کی اصطلاح میں کسی عملی حکم کی مدت کی انتہا بیان کرنا جو تمام شرائط کو جامع ہو نسخ کہلاتا ہے۔ کیونکہ ہمارے نزدیک واقعات و قصص

میں نسخ نہیں ہوتا۔ نیز اُمورِ قطعیہ میں نسخ ممکن نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ خداوند عالم موجود ہے اس کا نسخ نہیں ہو سکتا اسی طرح اُمورِ حسیہ میں نسخ نہیں ہو سکتا۔ مثلاً دن کی روشنی، رات کی تاریکی، اسی طرح دعاؤں میں اور ان احکام میں جو اپنی ذاتی حیثیت سے واجب ہیں۔ مثلاً آمنوا۔ لا تشرکوا، اسی طرح ان احکام میں بھی نسخ نہیں جو دائمی اور ابدی ہیں جیسے لا تقبلوا لھم شھادۃ ابداً اور ان احکام میں جن کا وقت مقرر ہے۔ اس وقت معین سے پہلے نسخ کا امکان نہیں ہے جیسے فاعفوا واصفحوا حتی یاتی اللہ بامرہ۔ بلکہ نسخ صرف ان احکام میں ہو سکتا ہے جو عملی ہوں اور وجود و عدم دونوں کا احتمال رکھتے ہوں نہ دائمی ہوں اور نہ کسی وقت کے ساتھ مخصوص کیے گئے ہوں۔ ایسے احکام کو احکامِ مطلقہ کہا جاتا ہے۔ ان میں یہ بھی ضروری ہے کہ زمانہ اور مکلف اور صورت متحد نہ ہو بلکہ تینوں میں اختلاف ہو یا بعض میں مطلب یہ ہے کہ جس زمانہ میں جس شخص کو جس صورت کے ساتھ ایک کام کا حکم دیا گیا ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ اسی زمانے میں اسی شخص کو اسی صورت میں منع کر دیا جائے بلکہ نسخ میں یا زمانہ بدلے گا یا وہ شخص یا صورت یا تینوں۔[1]

نسخِ اصطلاحی کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ پہلے خدا نے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا۔ مگر اس کا انجام اللہ کو معلوم نہ تھا۔ پھر خدا کی رائے اس کے خلاف قائم ہوئی۔ اس لیے پہلے حکم کو ختم کر دیا کہ نعوذ باللہ خدا کا جاہل ہونا لازم آئے یا پہلے کسی کام کے کرنے نہ کرنے کا حکم دیا پھر اس کو تینوں باتوں میں اتحاد کے باوجود منسوخ کر دیا۔ اگر ہم یہ کہیں کہ خدا کو انجام معلوم نہیں تب بھی اس سے خدا کی شان میں قباحت لازم آتی ہے۔ العیاذ باللہ۔ چنانچہ ایسا نسخ ہمارے نزدیک جائز نہیں ہے۔ اللہ کی شان اس عیب سے بلند و بالا ہے بلکہ نسخ کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اللہ کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ یہ حکم انسانوں پر فلاں وقت تک باقی رہے گا پھر منسوخ کر دیا جائے گا۔ پھر جب وہ وقت آجاتا ہے تو اللہ تعالیٰ دوسرا حکم جس سے کمی بیشی یا بالکل کسی حکم کا ختم ہونا معلوم ہو جاتا ہے۔ تو درحقیقت یہ صرف پہلے حکم کی مدت کا بیان ہوتا ہے مگر چونکہ بندوں کے سامنے پہلے حکم میں مدتِ حکم کو بیان نہیں کیا گیا تھا اس لیے دوسرا حکم لوگ اپنی کوتاہیِ فہم کی بنا پر خیال کر لیتے ہیں کہ حکم میں تبدیلی ہوئی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نسخ کے معنے صرف یہ ہیں کہ کسی حکم کے بدلے یہ اعلان ہو کہ اس حکم کی مدت ختم ہو چکی ہے یا اس میں عموم و اطلاق کا زمانہ ختم ہو گیا ہے اور بس۔

---

[1] اظہار الحق ج ۲ ص ۹۷-۹۸-۹۹۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے مسئلہ نسخ کو اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں اس طرح پیش فرمایا ہے ۔
اللہ کے احکام میں اگر تبدیلی خلافِ عقل ہے تو بلا شبہ ارادہ خداوندی میں بھی تبدیلی خلاف عقل ہے حکم کی تبدیلی میں اگر یہ خرابی ہے کہ اللہ پاک کی طرف غلط فہمی کی نسبت ہوگی تو ارادے کے بدلنے میں بھی خرابی ہے ۔ ارادہ کا بھی حکم ہی کی طرح سمجھ سے تعلق ہے ۔ حکم دیتے وقت بھی دل میں کچھ سوچ لیتے ہیں ۔ ارادہ بھی کسی کام کا اسی وقت ہوتا ہے جب پہلے دل میں سمجھ لیا جائے ۔ اگر صورتِ حال یہی ہے تو پھر پیدا کرنے کے بعد ناپید کرنا ، زندگی دینے کے بعد مارنا ، عطائے صحت کے بعد بیمار بنانا اور آرام کے بعد تکلیف میں ڈال دینا بھی اللہ سے ممکن نہ ہونا چاہیے کیونکہ صحت اگر بارادہ خداوندی ہے تو بیماری بھی اسی کے ارادے سے ہے ۔ ایک ارادے کے بعد دوسرا ارادہ اگر شانِ خداوندی کے خلاف نہیں ہے اور اس سے اس کے علم و فہم پر کوئی اثر نہیں پڑتا تو اسی اللہ کے ایک حکم کے بعد دوسرے حکم سے اس کے علم و فہم پر کیوں حرف آتا ہے ۔
بالفاظِ دیگر جس طرح موسموں کے بدلنے میں کبھی سردی کبھی گرمی ، کبھی خزاں کبھی بہار ، دن رات کی تبدیلی اور انسان کے روز مرہ حالات کے تغیر و تبدل میں تنگدستی و دولتمندی ، صحت اور بیماری میں آپ کو کبھی حیرت نہیں ہوتی ہے اور آپ مانتے ہیں کہ ان میں اللہ کی بے شمار حکمتیں اور مصلحتیں ہیں ۔ پھر آپ کو شریعتوں کے بدلنے اور احکام کے تغیرات میں حیرت کیوں ہے ؟ جیسے وہاں خدائی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں ایسے ہی یہاں بھی مکلفین اور زمان و مکان کے حالات کے پیشِ نظر اللہ کی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں ۔
حکمت اور مصلحت کے تحت قادرِ مطلق بندوں کے احوال و ظروف کے مطابق احکام نازل کرتا ہے ۔ ان میں تبدیلی کرتا ہے ۔ لیکن اس کی جانب سے یہ تبدیلی غلطی یا بے خبری کی وجہ سے نہیں ہے یہ تبدیلی کیوں ہے ؟ اس کا جواب بھی مولانا محمد قاسم کی زبانی سنیے ، فرماتے ہیں ۔
حکم اوّل کہیں بوجہ غلطی بدلا جاتا ہے اور کہیں بوجہ تبدلِ مصلحت تبدیل کیا جاتا ہے ۔ طبیب کبھی تشخیص میں غلطی کرتا ہے اور اس وجہ سے بعد اطلاعِ غلطی نسخۂ اوّل کو بدل دیتا ہے اور کبھی بیمار کے حالات کی تبدیلی کے پیشِ نظر ، یا دوا کا وقت ختم ہونے کی بنا پر پہلی دوا کو تبدیل کرتا ہے ۔ اثنائے بخار میں اگر سرسام ہو جاتے تو بیمار کی حالت بدل جانے کی وجہ سے نسخہ تبدیل کیا جاتا ہے اور منضج کی میعاد ختم ہونے پر جو مسہل لکھا جاتا ہے تو یہ پہلی دوا کا وقت ختم ہونے کی وجہ سے لکھا جاتا ہے ۔ دونوں صورتوں میں حکم کی تبدیلی غلطی کا نتیجہ نہیں بلکہ مریض کی حالت تبدیل ہونے کے باعث

ہے۔ اللہ کے احکام میں تغیر و تبدل اسی قسم کا ہوتا ہے۔
مطلب یہ ہے کہ ایک سمجھدار آدمی اس حکیم مطلق کے بارے میں جو اپنے قدیم ازلی وابدی علم کی بدولت اشیا کے سہارے اصول کو جانتا ہے یہ تصور کیسے کر سکتا ہے کہ حکم کی یہ تبدیلی بے خبری یا غلطی کا نتیجہ ہے۔
اسی بنا پر نسخ کا مسئلہ اُمت میں ہمیشہ اتفاقی رہا ہے۔ لوگوں کو غلط فہمی اس کے لغوی معنی سے ہوئی ہے وہ نسخ کے معنے مٹانا اور ہٹانا ہی سمجھتے ہیں لیکن یہ اس کے لغوی معنے ہیں۔ اصطلاحی معنے یہ نہیں ہیں۔ اصطلاحی معنے وہ ہیں جو مولانا کیرانوی کی زبانی آپ کے گوش گزار ہو چکے ہیں۔ حکیم الاُمت شاہ ولی اللہ نے اصطلاحی معنی میں بھی متقدمین اور متاخرین کی اصطلاحات کا فرق بتایا ہے۔
شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ صحابہ اور تابعین لفظ نسخ کو ایک سے زیادہ مطالب کے لیے استعمال کرتے تھے۔

الف۔ آیت میں حکم کی مدت عمل ختم ہو جانا۔
ب۔ آیت کو متبادر معنی سے ہٹا کر غیر متبادر معنے میں لینا۔
ج۔ آیت میں کسی قید اتفاقی کا اضافہ کرنا۔
د۔ آیت میں کسی عام کی تخصیص کرنا۔
ہ۔ عادتِ جاہلیت کو ہٹانا
و۔ سابقہ شرائع کو ہٹانا۔
ز۔ آیت میں بیان شدہ منطوق اور اس سے مستنبط شدہ مسئلہ میں وجہ فاصل بتانا۔

صحابہ و تابعین ان سب مفہومات و مطالب کے لیے لفظِ نسخ استعمال کرتے تھے جب کہ متاخرین کے یہاں نسخ کا اس کے علاوہ اصطلاحی پیمانہ ہے۔
حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ صاحب ہی نے ایک باب میں اس پر بحث کی ہے کہ ایسے دین کی ضرورت کیوں پیش آئی جو پہلے تمام ادیان اور تمام شریعتوں کا ناسخ ہو۔ اس کے بعد ایک باب میں اسلام کے قانون میں تکوینِ اُمت کے زمانہ میں نسخ کی صورتیں بیان فرمائی ہیں۔
فرماتے ہیں کہ اسلامی قانون میں نسخ دو قسم کا ہے۔ ایک یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے معاشرہ کے احوال و ظروف کی خاطر اپنے اجتہاد سے قانون کی دفعہ پیش فرمائی لیکن اللہ سبحانہ نے اسے ہٹا کر اپنا فیصلہ فرما دیا۔ اس فیصلہ کا اعلان یا تو قرآن کے ذریعے ہوا اور یا جبریل کے ذریعے آپ کے

اظہار کو بدل کر۔ اس کی مثال بیت المقدس کی جگہ بیت اللہ کو قبلہ بنانا ہے۔

دوسری قسم یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مصالح اور مفاسد کے پیش نظر اولاً اُمت کو کسی کام کو کرنے کا حکم دیا یا کسی کام پر پابندی لگائی۔ وقت گزرنے پر مصلحت یا مفسدہ جس کے پیش نظر قانون بنا تھا موجود نہیں رہا۔ اس کے نتیجے میں حکم تبدیل ہو گیا۔ اس کی بہترین مثال مدینہ کی زندگی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے خاص مصلحت کے پیش نظر مہاجرین کے درمیان مواخات ہے۔ قرآن نے اس مصلحت کو قائم رکھا اور اسی پر وراثت کی بنیاد رکھی اور ان لفظوں میں اس کا فائدہ بیان فرمایا۔

الا تفعلوہ تکن فی الارض وفساد کبیر۔

اگر تم ایسا نہ کرو گے تو ملک میں فتنہ پیدا ہو جائے گا اور بڑا فساد ہو گا۔

یعنی اسی بھائی چارے پر تمہاری ساری کامیابیوں کا دارومدار ہے۔ اس کے بعد جب حالات یکسر بدل گئے، مکہ فتح ہو گیا۔ مہاجرین کے رشتہ دار آ ملے۔ وراثت کا مسئلہ صاف کر دیا کہ وراثت کی تقسیم اب مواخات کی بنا پر نہیں بلکہ قرابتِ نسب کی بنا پر ہو گی۔

مکی زندگی میں نبوت دوسرے انبیاء کی طرح صرف ایک روحانی واخلاقی نظام تھا۔ مدنی زندگی میں جب نبوت نے روحانی واخلاقی نظام کے ساتھ ایک سیاسی واجتماعی نظام کی حیثیت اختیار کر لی۔ تو اب دوسرے انبیاء کی شریعتوں کے برعکس مالِ غنیمت کی حلت کا اعلان ہوا۔ اسی نظامِ سیاسی کے تقاضوں کے پیش نظر فوجی نظام ظہور میں آیا اور مکی زندگی کا وہ حکم ختم ہو گیا جس میں کہا گیا تھا، کفوا ایدیکم اپنے ہاتھ روک لو۔ اب مدنی زندگی میں فوجی سرگرمیوں کی اجازت مل گئی۔

اس کے بعد شاہ صاحب نے زیرِ نظر آیت کے متعلق اسی قسم سے بتاتے ہوئے آیت کی یہ تشریح فرمائی ہے کہ

ہم جب بھی منسوخ کرتے کسی کو یا بھلاتے ہیں اس کو تو ہم اس کی جگہ اس سے بہتر یا اُس جیسی لے آتے ہیں۔ اس سے بہتر کا مطلب یہ ہے کہ پہلے آپ کی نبوت صرف روحانی واخلاقی نظام کی حامل تھی اب اس کو سیاسی، اجتماعی نظام کا علمبردار بنا کر پہلے سے بہتر بنا دیا ہے اور اسی جیسی آیت کا مطلب یہ ہے کہ چونکہ مقاصد کے اختلاف سے احکام مختلف ہوتے ہیں اس لیے مقاصد کے پیشِ نظر اس جیسی آیت لے آتے ہیں۔

علامہ الشیخ محمد علی تھانوی نے کشافِ اصطلاحات الفنون میں نسخ پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور نسخ کی اصولی نقطہ نظر سے جو تعریف فرمائی ہے وہ بے حد جامع ہے فرماتے ہیں:

ایسا حکمِ شرعی جس میں ابدیت اور وقت کی قید نہ ہو اس کے بعد میں آنے والے حکم کے ذریعے مدت بنا دینا قانون کی زبان میں نسخ کہلاتا ہے۔

یہ تعریف بے حد جامع ہے اور تمام اطراف وجوانب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ علامہ موصوف نے اس کے فوائد وقیود بھی بتائے ہیں۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ تکوینِ امت اور تخلیقِ دعوت کے زمانہ میں تو امت کے احوال وظروف کے مطابق تبدیلیاں اور تغیراتِ اجتماعی، سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی زندگی میں ناگزیر ہیں لیکن کیا اب بھی موجود صورت میں قرآن میں کچھ آیات ایسی ہیں جن کے بارے میں ہم کہہ سکیں کہ یہ منسوخ ہیں تو اصل اس باب میں یہی ہے کہ ہاں قرآن میں کچھ آیات ایسی ہیں جو امت کے احوال وظروف تبدیل ہو جانے کے بعد اپنا قانونی مطالبہ نہیں رکھتی ہیں۔

متقدمین کے یہاں چونکہ نسخ کا معنوی دامن بے حد طول طویل تھا اس لیے ان کے یہاں بقول شاہ ولی اللہ ایسی آیات کی تعداد پانچ سو تک ہے لیکن متاخرین نے نسخ کی تعریف کا دائرہ بہت تنگ کر دیا ہے اس لیے ان کی تعداد بہت کم ہو گئی۔ ابوبکر بن العربی نے تعداد ۲۰ بتائی ہے لیکن شاہ صاحب نے ان بیس۲۰ کو بھی گھٹا کر ۵ کر دی ہے۔ اور جن پانچ کو شاہ صاحب نے منسوخ کیا ہے ممکن ہے کہ آئندہ اس کے احوال وظروف کا نقشہ بھی سامنے آجائے۔

۲۹۱ - یا بھلا دیتے ہیں ہم اس کو۔ اصل ارشادِ عربی او ننسھا ہے۔ اس میں دو قرأتیں ہیں۔ ایک تو یہی ہے اور دوسری اس طرح ہے او ننساھا۔ دونوں کا مادہ نسیان ہے۔ پہلے کے معنی بھلا دینا اور دوسرے کے معنی بھول جانا ہے لیکن عبداللہ ابن عباسؓ سے بھول جانے کا مطلب چھوڑ دینا ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ بعض آیات ایسی ہیں جن کو علی حالہ چھوڑ دیتے ہیں ان کو تبدیل نہیں کرتے اور بھلا دینے کا مطلب یہ ہے کہ ہم فراموش کرا دیتے ہیں یا اسے ترک کرنے کا حکم دیتے ہیں یا بقول امام بغوی یہ مطلب ہے کہ ہم بالکل ترک کرا دیتے ہیں یا خود ترک کر دیتے ہیں یعنی منسوخ حکم کے عوض کوئی جدید حکم بھی نازل نہیں کرتے۔ اس صورت میں نسخ سے مراد یہ ہو گی کہ ہم ایک حکم کو منسوخ کر کے اس کے عوض کوئی دوسرا جدید حکم نازل کر دیتے ہیں اور نسیان کا مطلب یہ ہو گا کہ ایسا نسخ جس کا عوض بھی نازل نہیں کیا جاتا ہے۔ لیکن یہ مطلب درست نہیں ہے کیونکہ نأت بخیر منھا او مثلھا بتا رہا ہے کہ نسخ بالعوض ہو یا بلا عوض دونوں صورتوں میں بدل آنا ضروری ہے چاہے جدید قدیم سے بہتر ہو یا اسی کی طرح۔ اور ایک قرأت میں اسے ہمزہ کے ساتھ پڑھا ہے

یعنی ننسئھا۔ اس کا مادہ نسیان نہیں بلکہ نسأ ہے اور اس کے معنے موٴخر کرنے کے ہیں۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوسکتا ہے کہ

نسخ سے مراد الفاظ اور حکم دونوں کو ہٹا دینا اور نسأ سے مراد صرف الفاظ کو ہٹا لینا اور حکم کو باقی رکھنا اور موٴخر کر دینا۔ بہرحال اگر یہ نسیان سے ہے جیسا کہ ہم نے ترجمہ میں بتایا ہے تو اس کے معنے یہ ہی ہیں کہ نسخ آیت کی ایک صورت یہ ہے کہ وہ آیت ذہنوں ہی میں محفوظ نہ رہے۔

۲۹۲ ۔ ہم اس کی جگہ اس سے بہتر یا اس جیسا حکم لے آتے ہیں۔ بہتر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جب دوسرا حکم پہلے حکم کی مدت کا خاتمہ بتائے گا تو دوسرا ناسخ اور پہلا منسوخ کہلائے گا۔ ناسخ کے لیے ضروری ہے کہ اس میں کوئی ایسی مصلحت ہو جو پہلے حکم میں موجود نہ تھی۔ کیونکہ احکام میں تنوع اور بوقلمونی مصالح سے وابستہ ہے اور احکام کی تبدیلی کا مدار اصلی مصالح ہی کی تبدیلی ہے۔ اوقات، احوال بدلتے ہیں تو مصالح بدل جاتی ہیں۔ مصالح تبدیل ہوتی ہیں تو احکام بدل جاتے ہیں لہٰذا دوسرا حکم یقیناً نفع میں پہلے حکم سے زیادہ بہتر اور اچھا ہونا چاہیے۔ الجصاص نے عبداللہ بن عباسؓ سے اس کی مثالیں نقل کی ہیں۔ پہلے یہ حکم تھا کہ ایمان کا خاصہ یہ ہے کہ ایک مسلمان دس دشمنوں پر بھاری ہو بعد میں اس میں تخفیف کر دی گئی کہ کم از کم اپنے دگنی تعداد کا مقابلہ کرو۔ ارشاد ہے الآن خفف اللّٰہ عنکم۔ یہ تو آسانی میں خیر کی مثال ہے اور مثلیت میں آسانی و سہار کی مثال یہ ہے کہ پہلے نماز میں قبلہ بیت المقدس تھا بعد میں بیت اللہ کو قبلہ بنا دیا گیا۔

یاد رہے خیریت کا مدار صحابہ اور تابعین اور بعد میں آنے والے مفسرین میں صرف دو چیزیں ہیں ایک مصلحت دوسری سہولت۔ لیکن کسی کے نزدیک مدارِ خیریت تلاوت نہیں ہے یعنی یہ بات نہیں ہے کہ پہلی آیت کی تلاوت میں ثواب کم تھا اور آنے والی آیت میں ثواب زیادہ ہوگا۔ الجصاص لکھتے ہیں کہ یہ بات کسی نے نہیں کہی ہے۔ آلوسی نے بھی الجصاص کی یہ کہہ کر ہمنوائی کی ہے کہ خیریت اور مماثلت سے لفظ میں خیریت مراد نہیں ہے۔

۲۹۳ ۔ کیا تم جانتے ہو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہود یہ کہتے تھے کہ قرآن میں کچھ آیات منسوخ ہوئی ہیں۔ اگر یہ کتاب اللہ کی طرف سے ہے تو جس عیب کی وجہ سے اب منسوخ ہوئی ہیں اس کی خبر کیا اللہ کو پہلے نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے جواب میں فرمایا کہ عیب نہ پہلی آیت میں تھا نہ پچھلی میں لیکن اللہ حاکم ہے اور حاکم مناسب وقت دیکھ کر جو چاہے حکم کرے۔ اُس وقت وہی مناسب تھا اور اب دوسرا حکم مناسب ہے [1]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۰

اس آیت میں مخاطب حضور انورؐ ہیں لیکن سنایا ان مسلمانوں کو جا رہا ہے جو یہودیوں کی باتیں سنتے تھے اور جن کے یہودیوں کے جال میں پھنس جانے کا اندیشہ تھا کہ احکام کی تبدیلی اور ان کے منسوخ کرنے پر اللہ کو پوری قدرت حاصل ہے اس کے دائرہ قدرت سے کچھ بھی باہر نہیں ہے۔ نسخ کا انکار کرنا قدرتِ الٰہیہ کے انکار کے مترادف ہے۔ علامہ آلوسی نے یہ لطیف نکتہ خوب بیان کیا ہے کہ احکام میں ردوبدل کرنا ان چیزوں میں ہے جو اللہ سبحانہٗ کی قدرت کے زیر نگین ہیں جو شخص اللہ کے احاطہ قدرت اور اختیار تام کو مانتا ہے وہ احکام میں ردوبدل کے مسئلہ کو کس دلیل سے اللہ کی مقدورات اور مقہورات سے نکال سکتا ہے۔

۲۹۴ کیا تم نہیں جانتے کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ کی ہے۔ یعنی میں مالک ہوں، میرے اختیارات غیر محدود ہیں۔ اپنے جس حکم کو چاہوں منسوخ کر دوں اور جس چیز کو چاہوں حافظوں میں محو کر دوں [1]

اس جواب میں بھی مخاطبوں کو درسِ توحید دیا جا رہا ہے کہ آسمانوں کی ایک ایک چیز اور زمین کا ایک ایک ذرہ اللہ کی ملک ہے، اور یہاں جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے وہ اللہ کا ملک ہے جب ملک بھی اس کی اور ملک بھی اس کا یعنی مالک بھی وہی اور شہنشاہِ جہاں بھی وہی ہے تو پھر اسے اپنی ملک میں پورا تصرف حاصل ہے اور اپنے ملک میں حکم کے نافذ کرنے سے کون روک سکتا ہے؟ اعلانِ قدرت کے بعد اپنی شہنشاہیت کا اعلان یہ بتانے کے لیے ہے کہ بندوں کے نفع و نقصان کا رشتہ اسی کی قادر و توانا ذات کے ساتھ وابستہ ہے۔ اگر بندے کے اس اعتقاد میں کہیں کمزوری کو گھس آنے کا موقعہ مل جاتا ہے تو اس کا اللہ سے رشتہ بندگی اتنا ہی کمزور ہو جاتا ہے۔ اور بندہ اب بندۂ خدا ہونے کی جگہ بندۂ اسباب ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس کی زبان پر اسباب ہی کا ذکر ہوتا ہے۔ اس کے دل میں اسباب ہی بس جاتے ہیں۔ اس کے تمام عواطف و میلانات کا رُخ اسباب کی طرف ہو جاتا ہے اور بالآخر نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اللہ سے ایسی بیگانگی ہو جاتی ہے کہ اس کے تذکرے سے بھی کوئی لگاؤ نہیں ہوتا۔

ان مسلمانوں سے کہا جا رہا ہے جو اسباب کی دنیا میں یہودیوں سے حلیف ہونے کی بنا پر توقعات رکھتے ہیں کہ وما لکم من دون اللہ من ولی ولا نصیر

اور مسلمانو! تمہارا اللہ کے سوا کوئی مددگار اور حمایتی نہیں۔

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۰۰

اَمْ تُرِيْدُوْنَ اَنْ تَسْـَٔلُوْا رَسُوْلَكُمْ كَمَا سُئِلَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ؕ وَمَنْ يَّتَبَدَّلِ الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ فَقَدْ ضَلَّ سَوَآءَ السَّبِيْلِ ۝

کیا تم چاہتے[۲۹۵] ہو اپنے رسولؐ سے بھی ویسے ہی سوالات کرو جیسے اس سے پہلے موسیٰ[۲۹۶] سے کیے جا چکے ہیں۔ یاد رکھو جو کوئی بھی ایمان[۲۹۷] کی نعمت پا کر پھر اُسے کفر سے بدل دے گا تو یقیناً وہ راہِ راست سے بھٹک جائے گا۔

تمہاری اُمیدوں کا مرکز اجتماعی، سیاسی اور معاشی زندگی میں اللہ ہونا چاہیے۔ یہی تمہارے ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے۔

یعنی ادھر تو اللہ کی قدرت و ملکیت سب پر شامل اُدھر اس کے اپنے بندوں پر اعلیٰ درجہ کی عنایت۔ تو اب مصالح اور منافع بندوں کی اطلاع اور ان پر قدرت کس کو ہو سکتی ہے اور اس کے برابر بندوں کی خیر خواہی کون کر سکتا ہے[۱]

کثرتِ سوال اور بارگاہِ نبوت

بات مسلسل ہے یہودیوں کی داستانِ شناعت تار تار کر کے منظرِ عام پر لائی جا رہی ہے لیکن چونکہ بات کا رُخ حضور انورؐ کی شانِ گرامی سے ہے اس لیے اندازِ خطاب بدل دیا ہے۔ بے ادب اور گستاخوں کو مخاطب نہیں کیا بلکہ ان بیگانوں کو کہا جو با ادب ہیں تاکہ وہ اس پُرخطر وادی میں محتاط ہو کر رہیں۔ اور ان کو گویا سکھایا جا رہا ہے کہ آدابِ رسالت کیا ہیں۔ پہلی آیت میں حضورؐ کی مجلس کے آداب میں یہ باتیں بتائی گئی تھیں کہ

۱۔ جنابِ نبوت میں با ادب ہو کر رہو
۲۔ جو کچھ فرمائیں کان لگا کر پوری توجہ سے سنو۔

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۱

۳۔ توہین آمیز انداز، توہین آمیز لہجہ تو در کنار بات چیت میں وہ الفاظ بھی استعمال نہ کرو جو توہین کے تو نہ ہوں مگر ان میں اس کا احتمال ہو۔

۴۔ تمہیں جو کچھ، جتنی کچھ اور جیسی کچھ خیر کی بھیک اللہ کے گھر سے ملی ہے یہ سب حضور انور کی رسالت کا صدقہ ہے۔ اگر نبوت کے وفادار رہو گے تو اللہ کے فضل و رحمت کی کوئی کمی نہیں ہے۔

۵۔ آپ کی رسالت ہی کا یہ بھی صدقہ ہے کہ بنی اسرائیل کو ہٹا کر دنیا کی امامت کا کام تم سے کیا جا رہا ہے۔

۶۔ تمہیں بارگاہِ نبوت میں ضرورت سے زیادہ سوالات نہ کرنے چاہئیں۔ باریک بینی اور کاوشیں ایک سیدھے سادے معاملہ کو پیچیدہ بنا دیتی ہیں۔

یہودیوں کی تاریخ تمہارے سامنے ہے کہ راست بازی کی جگہ کٹ حجتیاں اور بارگاہِ نبوت میں بے ادب اور گستاخانہ طرز پر سوالات کی بہتات ایمان سے محرومی کا باعث بن چکی ہے۔

۲۹۵ ف۔ یہودیوں کی باتوں پر ہرگز اعتماد نہ کرنا۔ جس کسی کو یہودیوں کے شبہ ڈالنے سے شبہ پڑ گیا وہ کافر ہو گیا۔ اس کی احتیاط رکھو اور یہودیوں کے کہنے سے تم اپنے نبی کے پاس شبہ نہ لاؤ جیسے وہ اپنے نبی کے پاس لائے[1]

مطلب یہ ہے کہ یہودی موشگافیاں کر کر کے طرح طرح کے سوالات مسلمانوں کے سامنے پیش کرتے تھے اور ان کو اکساتے کہ اپنے نبی سے یہ پوچھو اور یہ پوچھو۔ اس پر اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو متنبہ فرما رہا ہے کہ اس معاملہ میں یہودیوں کی روش اختیار کرنے سے بچو۔ اسی چیز پر خود جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بھی مسلمانوں کو متنبہ فرمایا کرتے تھے کہ قیل و قال سے اور بال کی کھال نکالنے سے پچھلی امتیں تباہ ہو چکی ہیں۔ تم اس سے پرہیز کرو۔ جن سوالات کو اللہ و رسول نہیں چھیڑا ان کی کھوج میں نہ لگو۔ بس جو حکم تمہیں دیا جاتا ہے اس کی پیروی کرو اور جن امور سے منع کیا جاتا ہے ان سے رک جاؤ۔ دور از کار باتیں چھوڑ کر کام کی باتوں پر توجہ صرف کرو[2]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں آیت میں مخاطب اہل ایمان اور مسلمان ہیں۔ ابن کثیرؒ نے اسی کو اپنایا ہے لیکن جو لوگ ہر آیت کو اس کے سبب نزول کے آئینے میں دیکھنے کے خوگر ہیں وہ اس جگہ کچھ پریشانی سے دوچار ہو گئے ہیں۔ کسی نے آیت کا مخاطب قریش کو اور کسی نے یہود کو بنایا لیکن

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۲ [2] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۰۲

قرآن کا سیاق وسباق یہی بتا رہا ہے کہ خطاب اہلِ ایمان سے ہے۔ امام رازیؒ نے اسی کو اولیت دی ہے۔

۲۹۶ہ۔ سوال اگر کسی مسئلہ کی سنجیدہ تحقیق کا ہو تو باعثِ رحمت ہوتا ہے لیکن جب ضد، نفسانیت اور شرارت سے ہو اور اعتراض محض اعتراض کی غرض سے ہو تو وہی سوالات ایک لعنت بن جاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ سے جیسے جیسے گستاخانہ سوالات کیے گئے ان کے تذکرہ سے بنی اسرائیل کی تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں۔ قرآن کا اس کو اس طرح پیش کرنا بجائے خود اس کی دلیل ہے کہ اسرائیلی تاریخ کی گہرائیوں سے قرآن بھیجنے والا خوب واقف ہے۔ موسیٰ علیہ السلام سے بنی اسرائیل کے گستاخانہ سوالات کا تذکرہ خود قرآن میں جا بجا ہے۔ پہلے آپ یہ مطالبہ بنی اسرائیل کی زبانی پڑھ چکے ہیں کہ

اے موسیٰ ہم اس وقت تک ایمان نہ لائیں گے جب تک خدا کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں۔

بنی اسرائیل نے فرعون کی غلامی سے نجات حاصل کرنے کے بعد وادیٔ سینا میں قیام کے دوران موسیٰ سے سوال کیا کہ

ہمارے لیے بھی ایسا ہی ایک معبود بنا دے جیسا کہ ان لوگوں کے لیے ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مطالبات کی بوقلمونی اور نبوت کی لائی ہوئی ہدایت پر یقین سے محرومی اُن لوگوں کا شیوہ ہے جو حق کے طالب نہیں ہوتے ہیں اور جن کی طبیعتیں ناحق شناسی اور حق کی کھلم کھلا بغاوت کی خوگر ہوتی ہیں۔ یہ لوگ صرف ایسی درخواستیں کرتے ہیں جن سے صرف رسول پر اعتراض کرنا اور الٰہی مصلحتوں میں مزاحمت ہی مقصود ہوتی ہے۔

۲۹۷ہ۔ ایمان کی نعمت پاکر پھر اسے کفر سے بدل دے گا۔ اس فقرے میں ایک ضابطہ کلیہ ارشاد ہو رہا ہے کہ مومن ہونے کے باوجود جو بھی یہودیوں کی کاپی کرے گا اور بارگاہ نبوت میں ان کی طرح بے ادب اور گستاخ ہو کر سوالات کرے گا تو ایسا اقدام ایمان کو برباد کرنے کے مترادف ہوگا اور اس کا شمار صراطِ مستقیم سے بھٹک جانے والوں میں ہوگا۔ حافظ ابنِ کثیرؒ نے اس ضابطہ کلی سے یہ نتیجہ خوب نکالا ہے کہ ایمان کا کفر سے تبادلہ کرنے والا شخص صراطِ مستقیم سے ہٹ کر جہالت وضلالت کا شکار ہو جاتا ہے۔ اور اس کے وہ تمام لوگ مصداق ہیں جو زندگی میں نبوت کی تصدیق، پیروی اور طاعت سے گریزپا ہو کر نبوت کی مخالفت، تکذیب اور بلاضرورت ضد اور کد میں سوالنامہ پیش کرتے ہیں۔ جن لوگوں کا نبوت کے ساتھ یہ معاملہ ہو کہ بقول علامہ زمخشری کہ ان کو بنی پرلائی ہوئی آیات اور احکام پر اعتماد نہ ہو اور اس بارے میں ان کے دل شک وتذبذب کے مریض ہوں۔ آیات منزلہ کو چھوڑ کر

وَدَّ كَثِيرٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ لَوْ يَرُدُّونَكُم مِّن بَعْدِ إِيمَانِكُمْ كُفَّارًا حَسَدًا مِّنْ عِندِ أَنفُسِهِم مِّن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمُ الْحَقُّ ۖ فَاعْفُوا وَاصْفَحُوا حَتَّىٰ يَأْتِيَ اللَّهُ بِأَمْرِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

اہل کتاب[۲۹۸] میں سے اکثر لوگوں کی یہ خواہش ہے کہ تمہیں ایمان کے بعد پھر کافروں میں واپس لوٹا دیں۔ اگرچہ اُن پر حق ظاہر ہو چکا ہے لیکن اس حسد[۲۹۹] کی وجہ سے جو تمہارے خلاف اُن کے اندر ہے وہ ایسا ہی پسند کرتے ہیں۔ (فی الحال) تم عفو[۳۰۰] و درگزر سے کام لو یہاں تک کہ وحی کے ذریعہ اللہ کا فیصلہ[۳۰۱] آئے اور یقین کر لو کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے

اور آیات کا مطالبہ کرتے ہوں ان کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ نبوت کے لائے ہوئے نظام کی تعمیر میں حصہ لیں گے۔ گویا آیت میں نبوت کی پیروی، طاعت اور تصدیق کو ایمان اور نبوت کو سوالات سے پریشان کرنے میں یہودیوں کی پیروی کو کفر قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ جو بھی یہودیوں کی پیروی کرے گا وہ صراطِ مستقیم سے نکل جائے گا۔ یہاں بنی اسرائیل ہی کی تاریخ کا تذکرہ ہے اس لیے یہودیوں کا ذکر ہے اور اس موضوع پر احادیث میں نبوت کا لب و لہجہ بے حد سنگین نظر آتا ہے۔ یہ تو صرف سوالات میں یہودیوں کی کاپی ہے لیکن ذرا وہ واقعہ مسند دارمی میں پڑھیے جو حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی آیا ہے کہ

> عمر بن الخطابؓ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تورات کا ایک نسخہ لے کر آئے اور بولے یارسول اللہ۔ یہ تورات کا نسخہ ہے۔ آپؐ خاموش ہو گئے۔ یہ ناگواری کی خاموشی تھی۔ عمرؓ اسے پڑھنے لگے اُدھر آپؐ کے چہرۂ مبارک کا رنگ بدلنے لگا۔ ابوبکرؓ نے کہا اے عمرؓ حضور انورؐ کے چہرۂ اقدس پر ناگواری کو تم نہیں دیکھتے؟ حضرت عمر کی نگاہ چہرۂ اقدس پر پڑی تو فوراً بولے، میں خدا کے غصہ اور اس کے رسولؐ کے غصہ سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں۔ ہم اللہ کو رب، اسلام کو دین اور محمد مصطفیٰؐ کو رسول مان کر راضی ہو چکے ہیں۔ آپؐ نے فرمایا اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر آج موسیٰ کا بھی ظہور ہو جائے

اور مجھے چھوڑ کر تم ان کی پیروی کرنے لگو تو لضللتم عن سواء السبیل، تم سیدھی راہ سے بھٹک جاؤ گے۔
آپ نے دیکھا کہ معاملہ کس قدر سنگین ہے۔ یہودی تو مدینہ کی زندگی میں مسلمانوں کے حلیف ہیں۔ تو اُن کی پیروی، اُن کی ہمنوائی کی نبوت کے مقابلہ میں اللہ کی بارگاہ میں کیا قیمت ہو سکتی ہے۔

اہل ایمان کو کافر بنانے کی خواہش

یہ بھی ایک اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ علمائے بلاغت کی زبان میں اسے استیناف بیانی کہتے ہیں۔ اس مرحلے پر پہنچ کر ہر قاری اور سامع کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اہلِ ایمان میں یہ شک اندازی کی مہم شروع کیوں کر رکھی تھی۔ اُن کا اس سے مقصد کیا تھا اور اس سرگرمی کے پیچھے اُن کے عزائم کیا تھے۔ اسی سوال کا ان آیات میں جواب دیا ہے اور ان کے اندر کی بات کو بے نقاب کیا ہے کہ اُن کا حسد ان کو چین سے نہیں بیٹھنے دیتا اور ان کی ساری دسیسہ کاریوں کا واحد سبب اسلام اور مسلمانوں سے شدید جذبہ حسد ہے۔ اسی حسد کی بنا پر وہ چاہتے ہیں کہ مسلمان دوبارہ کافر ہو جائیں۔ ان سے نعمتِ ایمان چھن جائے اور اللہ سبحانہٗ کا فضل و انعام ان سے سلب کر لیا جائے۔ زمانۂ تنزیلِ قرآن میں یہ یہودی علماء کا خصوصی مشن تھا۔ شارحینِ قرآن نے ان یہودی علماء کے نام بھی بتائے ہیں۔ کعب بن الاشرف، حیی بن اخطب، ابو یاسر، پیچھے تشریحات میں ہم مدینہ کے مشاہیر علماءِ یہود کے نام حافظ ابنِ حجر عسقلانی کی زبانی بتا چکے ہیں۔

۲۹۸۔ اہلِ کتاب سے قرآن کی اصطلاحی زبان میں مراد وہ ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو مانتے ہیں اور آسمانی کتابوں تورات و انجیل کے حامل ہیں۔ توحید، رسالت، ملائکہ، آخرت جیسے بنیادی حقائق کو لفظاً مانتے ہیں اور عملاً و معنیً ان میں سے ہر حقیقت کو مسخ کر چکے ہیں اور اس کا اطلاق یہود و نصاریٰ پر ہوتا ہے۔ حضور انورؐ کی نبوت کے انکار میں دونوں ایک پلیٹ فارم پر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بہت سے یہودیوں کو آرزو ہے کہ کسی طرح تمہیں اے مسلمانو! پھیر کر کافر بنا لیں۔ حالانکہ ان پر واضح ہو چکا ہے کہ مسلمانوں کا دین، ان کی کتاب، ان کا نبی سچے ہیں [1]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۲

بعض یہود شب و روز مختلف تدبیروں سے دوستی اور خیر خواہی کے پردے میں مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی کوشش کرتے تھے اور باوجود ناکامی کے اپنی حرکتوں سے باز نہ آتے تھے۔ حق تعالیٰ نے اس پر متنبہ فرمایا کہ ان اہلِ کتاب میں بہت سے دل یہ چاہتے ہیں کہ تم کو تمہارے ایمان لائے پیچھے پھر کافر کر ڈالیں [1]

۲۹۹ ۔ اس حسد کی وجہ سے یعنی یہ کوششیں اور سرگرمیاں اخلاص و ہوا خواہی کی وجہ سے نہیں بلکہ رشک اور حسد سے پیدا ہوتی رہتی ہیں۔ اور حسد بھی کسی شبہ یا حق کی غیرت کی بنا پر نہیں بلکہ ذاتی خباثت، فسادِ اخلاق اور باطل پر جمود جو ان کی طبیعتوں کا خاصہ بن گیا ہے وہ اس کا منبع ہے۔

مفسرینِ قرآن نے اس آیت میں اہلِ کتاب سے مراد علماء یہود لی ہے لیکن لفظ قرآنی عام ہے اور یہود و نصاریٰ دونوں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ یہودیوں اور نصرانیوں کی جانب سے جو کھلا ہوا منظم پروپیگنڈا اسلام کے خلاف سیاسی، معاشرتی، تاریخی اور جغرافی تحریروں کے ذریعے سے جاری ہے وہ سب اسی کے مظاہر ہیں۔ غایت ان سب سرگرمیوں کی یہ اور صرف یہ ہے کہ مسلمان اسلام کی طرف سے بدگمان اور برگشتہ ہو جائیں۔ یہ بھی قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ اس کارنامہ کے لیے اہلِ کتاب کی ایک بڑی تعداد کہہ رہا ہے اور اس کارگزاری کا پس منظر سیاسی، معاشی، مذہبی مفاد نہیں بلکہ خالص حسد کو بتا رہا ہے۔ یہ موضوع قرآن کے مہماتِ معارف میں سے ہے۔ اس پر تفصیل کا تو یہ محل نہیں لیکن ضروری ہے کچھ اجمالی اشارات کر دیے جائیں تاکہ ناظرینِ قرآن کے اعجاز کا کچھ اندازہ کر سکیں۔ اس وقت یہودی اور مسیحی دنیا اسلام کے خلاف علمی میدان میں جس انداز سے مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی منظم تحریک چلا رہی ہے۔ ان کی علمی ذہنیت کی یہ کیسی مکمل تعبیر ہے جو چند لفظوں میں یہاں بیان کر دی گئی ہے۔

وددا کثیر من اھل الکتاب لو یردونکم من بعد ایمانکم کفارا حسدا من عند انفسھم

نزولِ قرآن کے وقت یہودی دنیا کے علماء کا یہی حال تھا اور اب بھی دیکھ لو یہودی اور مسیحی علماء کا یہی حال ہے۔ مسلمان نوجوانوں، مسلمان حکمرانوں، مسلمان سیاست کاروں اور مسلمان طالب علموں کے دماغ میں اسلام کے ماضی کی طرف سے بدگمانی، اس کے حال کی طرف سے بیزاری، اس کے مستقبل کی طرف سے مایوسی اسلام، پیغمبرِ اسلام اور اسلام کے علمی سرمایہ کے بارے میں شکوک و شبہات

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۳۱

پیدا کرنے میں بہت بڑا ان یہودی اور مسیحی علماء کا ہاتھ ہے جنہوں نے اسلامیات کے مطالعہ کے لیے اپنی زندگیاں وقف کی ہیں اور ان کو عام طور پر مستشرقین کہا جاتا ہے جو اپنے علمی تحقیقی انہماک اور مشرقیات کی گہری واقفیت کی بنا پر مشرق و مغرب کے علمی حلقوں میں بڑی عظمت و احترام کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں [۱]

فتنۂ استشراق

اس فتنہ کی تاریخی قدامت کی تواصل میں قرآن کی یہ آیت نشاندہی کر رہی ہے کہ اصل میں اس کا شجرہ نسب زمانۂ نزولِ قرآن میں مدینہ کے اُن علمائے یہود سے ملتا ہے۔ لیکن ڈاکٹر مصطفیٰ سباعی نے اس موضوع پر جو مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ مغربی دُنیا میں اس کا آغاز اس وقت ہوا ہے جب ۹۹۹ء میں فرانسیسی پادری مسٹر جیبرٹ TERBERT بطور پاپائے روم منتخب ہوئے۔ اس کے بعد ۱۰۹۲ء میں جناب پطرس اور ۱۱۴۳ء میں جناب جرارڈی کریون روم پہنچے ہیں۔ ان لوگوں نے عربی ثقافت اور عرب علماء کی تصانیف کو موضوع بنا کر اس مہم کا آغاز کیا۔ اور یہ سلسلہ اٹھارہویں صدی تک برابر آہستہ آہستہ آگے بڑھتا رہا۔ اٹھارہویں کا زمانہ یورپ کے استعماری دور کا نقطۂ آغاز ہے۔ اس زمانہ میں متعدد علمائے مغرب نے منظم طریقہ پر اس کام کو ہاتھ میں لیا اور ممالکِ اسلامیہ میں عموماً اور عربی ممالک میں خصوصاً عربی مخطوطات پر شب خون مارا۔ نادان مالکوں سے کتابیں خرید کے اور پبلک لائبریریوں سے چوری کر کے عربی مخطوطات یورپ پہنچائے گئے۔ انیسویں صدی کے آغاز تک ان مخطوطات کی تعداد بارہ ہزار پانچ سو کتابوں تک پہنچ گئی۔ انیسویں صدی کے آخر میں پیرس میں ۱۸۷۳ء میں اس موضوع پر سب سے پہلی کانفرنس منعقد ہوئی۔

میدانِ استشراق

اس کا آغاز تو عربی زبان اور اسلام پر تحقیقات کے نام سے ہوا لیکن انجام میں اس کی آغوش میں اگرچہ مشرق کے سارے مذاہب، مشرقی تمدّن، جغرافیہ، تاریخ اور مشرقی زبانیں تک آگئیں

---

[۱] اسلام اور مغربیت کی کشمکش ص ۱۷۸

لیکن اصلی پیش نہاد اور سطح نظر عربی ادب، اسلامی تمدن اور اسلام رہا اور اب تک ہے۔ مستشرقین کی بڑی تعداد اصلاً پادری ہے ان میں سے ایک بڑی تعداد نسلاً اور مذہباً یہودی ہے۔

استشراق کے محرکات

استشراق کے محرکات دینی بھی تھے سیاسی استعماری اور اقتصادی بھی اور کم سے کم تر علمی بھی۔ دینی محرک واضح ہے۔ اس کا آغاز پادریوں سے ہوا ہے اور تا حال وہ ہی یہ کام کر رہے ہیں ان کے پیشِ نظر صرف یہ مقصد ہے کہ اسلام کی ایسی تصویر پیش کی جائے جس سے اس کے محاسن کو بُری سے بُری شکل میں پیش کیا جائے اور اسلامی حقائق میں تحریف کی جائے، تاکہ نئے تعلیم یافتہ اصحاب اور نئی نسل میں اسلام بیزاری کے جراثیم پھیل سکیں اور لوگوں کا یہ ذہن بن سکے کہ اسلام میں انسانی زندگی میں پھیلنے کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ اور مسلمان ایک خونریزا ور ڈاکوؤں، قزاقوں کا وہ گروہ ہے جس کی منزل اخلاق و روحانیت نہیں بلکہ صرف جسمانی لذت ہے۔ دینی محرک کی نوعیت کا اندازہ کرنا ہو تو ایک مصری فاضل ڈاکٹر محمد البہی کا وہ بیان پڑھیے جو انہوں نے اپنی مایۂ ناز کتاب "الفکر الاسلامی الحدیث" میں پیش کیا ہے اور جو اکثر و بیشتر مستشرقین کی کتابوں کا قدرِ مشترک اور ان کے خیالات کا عکس ہے۔

اسلامی تعلیمات کا نافذ نہ کر سکنا اجتماعی ضرورت کا عین تقاضا ہے اور یہ نتیجہ ہے۔ روز بروز بدلتی ہوئی زندگی کے ان حالات کا جن کو اسلام اپنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مطابق نہیں بنا سکا اور ان کے اور اسلامی تعلیمات کے درمیان ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکا۔ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور دینے کے معنی اس زمانے میں اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ تمدنِ جدید کے وسائل سے فائدہ اٹھانے میں دُنیا سے پیچھے رہ جائیں۔ مسلمان ممالک میں غربت، بیماریوں اور جہالت کو بخوشی گوارا کیا جائے جیسا کہ اس وقت سعودی حکومت میں حال ہے۔ یہ وہ تنہا اسلامی ملک ہے جس نے سرکاری طور پر عمل کیا ہے اس لیے وہ اس بات کا نمونہ ہے کہ اسلام پر عمل کرنے سے کیا نتائج پیدا ہو سکتے ہیں [1]

دیکھ لیجئے کہ مانتے کی کیسی شاندار صفائی ہے اور کس خوبصورت طریقہ پر مسلمانوں کے ذہن میں اسلام کے

---

[1] الفکر الاسلامی الحدیث ص ۱۸۴

خلاف باغیانہ میلانات پیدا کیے جا رہے ہیں ۔

سیاسی محرک یہ ہے کہ عالم اسلامی اور عربی ممالک کی آزادی کے بعد ان اسلامی اور عربی ملکوں میں مغربی حکومتوں کی جانب سے جو سفارتخانے کھولے جاتے ہیں ان میں سیکرٹری کے درجے کے لوگ وہ ہوتے ہیں جو عربی زبان پر پورا عبور رکھتے ہیں تاکہ وہ اس ملک کے مفکرین، صحافیوں اور سیاسی لیڈروں تک رسائی حاصل کر سکیں۔ یہ گویا مغربی حکومتوں کا ہراول دستہ ہوتے ہیں۔ مغربی حکومتوں کو علمی کمک اور رسد پہنچانا ان کا کام ہے۔ وہ ان مشرقی اقوام و ممالک کے رسم و رواج، طبیعت و مزاج، طریق بود و باش اور زبان و ادب بلکہ جذبات و نفسیات کے بارے میں صحیح اور تفصیلی معلومات بہم پہنچاتے ہیں تاکہ ان میں مغربی حکومتوں کو اپنے جراثیم فساد پھیلانا آسان ہو۔ عربی ممالک کی باہمی آویزش اور اسلامی ملکوں کی شکر رنجی اسی دسیسہ کاری کا نتیجہ ہے۔

استعماری محرک یہ ہے کہ ماضی میں صلیبی جنگوں کا انجام عیسائیت کی شکست پر ہوا تھا۔ اس ہزیمت کے بعد پوری صلیبی دنیا نے ان عربی اور اسلامی ملکوں کے حالات کا ہر پہلو سے جائزہ لینا شروع کیا تاکہ اس کے ذریعے ان پر اہل مغرب کو حکومت کرنا آسان ہو اور اس کے ساتھ ان حالات اور تحریکات، عقائد، خیالات کا توڑ کر سکیں جو حکومتوں کے لیے دردِ سر بنے ہوئے ہیں اور ایسی ذہنی اور علمی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں جس میں مغربی استعمار کی مخالفت کا خیال نہ پیدا ہو۔ اس کے بالمقابل ان کی تہذیب کی عظمت اور ان کی خدمات کی وقعت پیدا ہو۔ اور اپنے ملک کی اصلاح و ترقی اور ان کو مغرب کے نقش قدم پر لے چلنے کا ایسا جذبہ پیدا ہو کہ ان مغربی حکومتوں کے مٹ جانے پر بھی ان کا ذہنی اور تہذیبی اقتدار قائم رہے۔

اسی بنا پر مغربی حکومتوں نے مستشرقین کی اہمیت و افادیت کو پوری طرح محسوس کیا ہے اور ان کے سربراہوں نے ان کی پوری سرپرستی کی اور اسی مقصد کے تحت مختلف رسائل و مجلات شائع کرتے ہیں جن میں عالم اسلام کے مسائل اور رجحانات پر مبصرانہ تبصرہ اور ماہرانہ مضامین شائع ہوتے ہیں۔ مٹی ہوئی قوموں کی تاریخ مرتب کرنا، عربوں کی زبان اور نظریہ کی وحدت پر قوتیں صرف کرنا، مصر میں فرعونیت کا، شام، لبنان، فلسطین میں فینیقیت کا اور عراق میں آشوریت کا احیا صرف اسلامی امت کو پارہ پارہ کرنے کی خاطر کیا جاتا ہے۔ اور اسی مقصد کی خاطر مختلف ممالک کے مستشرقین عالم اسلام سے متعلق مختلف رسائل اور مجلات شائع کرتے ہیں۔ جن میں عالم اسلام کے مسائل اور رجحانات پر مبصرانہ اور ماہرانہ مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ اس وقت بھی رسالہ شرق اوسط

اور مجلہ عالم اسلامی امریکہ سے اور فرانس سے نکل رہے ہیں۔
ان دینی، سیاسی اور استعماری دواعی اور محرکات کے علاوہ استشراق کا ایک محرک اقتصادی بھی ہے۔ بہت سے فضلاء اس کو ایک کامیاب کاروبار کے طور پر اختیار کرتے ہیں۔ بہت سے ناشرین اس بنا پر کہ ان کتابوں کی جو مشرقیات اور اسلامیات پر لکھی جاتی ہیں۔ یورپ اور ایشیا میں بڑی منڈی ہے۔ اس کام کی ہمت افزائی اور سرپرستی کرتے ہیں اور بڑی تیزی کے ساتھ یورپ اور امریکہ میں ان موضوعات پر کتابیں شائع ہوتی ہیں جو بڑی مالی منفعت اور ترقی کا ذریعہ ہیں۔
بالکل آخری درجہ پر بعض فضلاء اسلامیات اور مشرقیات کو اپنے علمی ذوق و شغف کے تحت بھی اختیار کرتے ہیں اور اس کے لیے محنت، تن دہی اور جانفشانی سے کام لیتے ہیں لیکن اوّلاً یہ بہت کم ہیں اور ثانیاً یہ اس دسیسہ کاری سے محفوظ ہیں جو عام مستشرقین میں پائی جاتی ہیں۔ ان کی مساعی سے بہت سی کتابیں زیور طباعت سے آراستہ ہوئی ہیں۔

استشراق کے مقاصد

اس علمی اعتراف کے باوجود مستشرقین اہل علم کا وہ بدقسمت اور کم نصیب گروہ ہے جس نے قرآن وحدیث، سیرت نبویؐ، فقہ اسلامی اور اخلاق و تصوف کے سمندر میں بار بار غوطے لگائے اور بالکل خشک دامن اور تہی دست واپس آئے بلکہ اس سے اس کے عناد، اسلام سے دوری اور حق کے انکار کا جذبہ بڑھ گیا۔ اس کی بڑی وجہ یہ ہے کہ نتائج ہمیشہ مقاصد کے تابع ہوتے ہیں۔
عام طور پر ان مستشرقین کے مقاصد یہ ہوتے ہیں۔
ان کا اوّلین اور بنیادی مقصد یہ ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں اپنے مخاطبوں کے ذہن میں زیادہ سے زیادہ تشکیکی مواد فراہم کریں اور اللہ کی وحی کو طاقتور دلائل کے ذریعے مشتبہ بنائیں۔ ان کی رائے عامہ نہ حضورؐ کو نبی مانتی ہے اور نہ آپ پر اللہ کی وحی تسلیم کرتی ہے۔ وحی آنے کے ان مظاہر کو جو کبھی صحابہ کے مشاہدے میں آتے نہایت مہیب صورت میں پیش کرتے ہیں۔ وحی الٰہی کو کبھی مرگی کا نام دیتے ہیں، کبھی حضورؐ کے ذہنی تخیلات بتاتے ہیں اور کبھی نفسیاتی مرض کہہ ڈالتے ہیں۔ اور سارے معاملہ کو اس طرح پیش کرتے ہیں کہ گویا نبوت کا یہ معاملہ دُنیا میں کہیں نہیں ہوا۔ اور محمد عربی نے دُنیا میں کوئی نرالا دعویٰ کیا ہے۔ اور مزہ یہ ہے کہ یہ کہنے والے یہودی اور مسیحی ہیں جو نبوت کے، وحی کے اور کتاب الٰہی کے قائل ہیں۔ اور یہ بھی مانتے ہیں کہ تاریخ،

تاثیر اور نبوت کے مبادی میں ان کا مقام محمد رسول اللہ سے کم سے کمتر ہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ تمام صلاحیتوں کو معقول اور غیر معقول طریقہ پر ان کمزوریوں کی نشان دہی اور ان کو نہایت بھونڈی شکل میں پیش کرنے میں تعنت، تعصب اور اس حسد کی وجہ سے صرف کرتے ہیں جس کا قرآن نے اس آیت میں آج سے چودہ سو سال پہلے انکشاف کیا حسداً من عند انفسھم اور مقصد یہ نہیں ہوتا کہ مسلمان، یہودی یا مسیحی ہو جائیں بلکہ یہ اور صرف یہ مقصد ہوتا ہے کہ ایمان سے ہٹ کر کسی طرح مسلمان کفر کی سڑک پر آجائیں۔ اللہ اکبر یہ قرآن کا کتنا بڑا اعجاز ہے کہ عالم الغیب نے چودہ سو سال پہلے اُمّی کی زبان سے یہ انکشاف پیش فرمادیا کہ یردونکم من بعد ایمانکم کفاراً

رائی کا پربت بنانا ان کا ادنیٰ کام ہے۔ وہ خورد بین سے دیکھتے ہیں اور اپنے قارئین کو دور بین سے دکھاتے ہیں۔ وہ پہلے طے کر لیتے ہیں کہ قرآن اللہ کی کتاب نہیں ہے۔ پھر اس کے لیے رطب و یابس، مذہب و تاریخ، افسانہ و شاعری مستند و غیر مستند ذخیرے سے مواد فراہم کرتے ہیں اور جب قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کے ثبوت میں وہ تاریخی حقائق ان کے راستہ میں آڑ بنتے ہیں۔ جن کا انکشاف ایک اُمّی کے ذریعے ہوا تو ان کے منہ میں زمانۂ جاہلیت کی زبان آجاتی ہے اور بول پڑتے ہیں کہ یہ معلومات تو آپ نے فلاں سے حاصل کیں۔ گویا جاہلیت کی پرانی روح استشراق کے قالب میں آگھسی ہے انما یعلمہ بشر اور جب ان کو قرآن کے علمی حقائق کا حوالہ دیا جاتا ہے تو یہ کہہ کر طرح دے جاتے ہیں کہ حضور انور بہت سمجھدار، ذکی، ذہین ہیں۔ داد دیجئے اس سبک دستی اور ہنرمندی کی کہ اپنے تعصب و عناد اور کینہ و حسد پر ذکاوت، ذہانت اور فطانت کا پردہ ڈال دیتے ہیں۔

وحی و نبوت کی بنیادیں ہلا دینے کے بعد اب بڑی آسانی سے قاری کے ذہن میں یہ بات اتارنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں کہ اسلام الٰہی دین نہیں ہے بلکہ یہودیت اور مسیحیت کے سرمایۂ علمی کا مال مسروقہ ہے۔

ایک طرف وحی، نبوت اور اسلام پر حملہ آور ہوتے ہیں تو دوسری طرف اسلام کے سرمایہ علمی میں ایک ایک کو اپنے جرح و تنقید کے تیروں سے زخمی کرتے ہیں۔ تفسیر قرآن، سیرۃ نبوی، حدیث، فقہ و کلام، صحابہ و تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین فقہاء کرام، مشائخ و صوفیہ، رواۃ حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، حدیث کی حجیت، تدوین، حدیث، فقہ اسلامی کے ماخذ، فقہ اسلامی کا ارتقاء ان میں سے ہر موضوع کے متعلق مستشرقین کی کتابوں اور تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے جو ایک ایسے ذہین و حساس آدمی کو جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو پورے اسلام

سے منحرف کر دینے کے لیے کافی ہے۔

السباعی کی زبان میں مستشرقین کی دعوت کا خلاصہ یہ ہے۔

۱۔ نبوت، وحی، قرآن، حدیث، قانون کی حد تک مسلمانوں کے ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا کرنا۔

۲۔ مسلمانوں کو اپنے ماضی سے بدگمان، اپنے حال سے بیزار اور مستقبل سے مایوس کرنا۔

۳۔ اسلام کے علمی سرمایہ سے مسلمانوں کا اعتماد ہٹانا۔

۴۔ مسلمانوں میں اُخوت کی رُوح کو کمزور کرنا اور ان میں زمانۂ جاہلیت کی قومیتوں کو جنم دینا۔

مقاصد کے حصول کے وسائل

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے وہ جن ذرائع اور وسائل کو اپناتے ہیں وہ صرف ایک نہیں بلکہ ان میں تعدد بھی ہے اور تعدد کے ساتھ تنوع بھی ہے۔

۱۔ اسلام، قرآن، نبوت، وحی جیسے موضوعات پر ان کا راہوار قلم میدانِ تصنیف میں خوب جولانیاں دکھاتا ہے۔ اس میدان میں اُن کا کمال یہ ہے کہ وہ اکثر ایک بُرائی بیان کرتے ہیں اور اُس کو دماغوں میں بٹھانے کے لیے بڑی فیاضی کے ساتھ اپنے ممدوح کی دس خوبیاں بیان کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کا ذہن اُن کے انصاف، وسعتِ قلب اور بے تعصبی سے مرعوب ہو کر اس ایک بُرائی کو قبول کرے۔ اکثر مستشرقین اپنی تحریروں میں زہر کی ایک خاص مقدار رکھتے ہیں اور اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ تناسب سے زیادہ نہ ہونے پائے اور اُن کے قاری کو متنفر نہ کرے۔

۲۔ اسلام، اسلامی اقوام، اسلامی ممالک کے موضوعات پر ماہانہ رسالے جاری کرتے ہیں۔

۳۔ اسلامی ملکوں میں مشنریاں روانہ کرتے ہیں۔ یہ مشنریاں شفاخانے، سکول، کالج، یتیم خانے، مہمان خانے اور کلب قائم کرتے ہیں اور ان کے ذریعے مسلمانوں میں کفر کے وہ سارے جراثیم نہایت خوش اسلوبی سے پھیلاتی ہیں جو ان کو یہ مستشرقین فراہم کرتے ہیں۔

۴۔ علمی مجلسوں، اور کالجوں میں اس کے لیکچروں کا انتظام کیا جاتا ہے۔ السباعی نے یہ بات نہایت افسوس اور درد سے بتائی ہے کہ عربی اور اسلامی یونیورسٹیوں اور کالجوں میں ان کو مدعو کیا جاتا ہے اور اسلام کے موضوع پر اُن کے خطابات ہوتے ہیں۔ اس میں قاہرہ، دمشق، بغداد، رباط، کراچی، لاہور، علی گڑھ سب برابر کے حصہ دار ہیں۔

۵۔ یہ مستشرقین مقامی اخبارات میں اسلامی موضوعات پر مضامین لکھتے ہیں اور جن اخباروں میں ان کے مضامین آتے ہیں ان کو کافی تعداد میں بصرف زر کثیر خرید تے ہیں۔ بلکہ بسا اوقات مقامی اخبارات پر زر کی طاقت سے پورا قبضہ کر لیتے ہیں۔

ڈاکٹر عمر فروخ اور مصطفےٰ خالد نے اپنی مشہور اور معرکۃ الآراء تصنیف میں ان مستشرقین کی استعماری خدمات کو بے نقاب کیا ہے۔ ان کا یہ بیان پڑھیے کہ

مشنریاں کھلم کھلا اعلان کرتی ہیں کہ مسیحیت کی نشر و اشاعت کے لیے دوسرے اسلامی ملکوں کے مقابلے جس قدر دسترس ہمیں مصری صحافت پر ہے اور کہیں نہیں۔ مصر کے ان گنت جرائد میں ان کے مقالات شائع ہوتے ہیں۔ مفت بھی اور اُجرت دیکر بھی۔

۶۔ کسی موضوع پر عام بحث کے لیے مختلف علاقوں میں کانفرنسیں منعقد کرتے ہیں ۱۸۸۳ء سے ان کانفرنسوں کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔

۷۔ خاص اسلامی انسائیکلو پیڈیا، دائرۃ المعارف کی اجتماعی تالیف ان کا کارنامہ ہے۔ مختلف زبانوں میں اس کے تراجم ہوتے ہیں۔ اس میں ان مستشرقین جن اہل قلم کی خدمات حاصل کی گئی ہیں وہ اسلام دشمنی میں ممتاز حیثیت کی مالک ہیں۔ وہ ایک بات پہلے طے کر لیتے ہیں کہ یہ ثابت کرنا ہے اور اس کے بعد اس مقصد کے لیے ہر اچھا بُرا مذہب، تاریخ، ادب، افسانہ، شاعری کے مستند و غیر مستند ذخیرے سے مواد فراہم کرتے ہیں۔ اور جس سے ذرا بھی ان کی مطلب برآری ہوتی اس کو بڑی آب و تاب سے پیش کرتے ہیں

میرے کتب خانہ میں اسی دائرۃ المعارف الاسلامیہ کا مصر سے آیا ہوا عربی ایڈیشن ہے۔ ابھی میرے پاس اس کی پندرہ جلدیں آئی ہیں۔ اس کا مطالعہ قاری کو بتاتا ہے کہ اسلام پر اُن کا مطالعہ کتنا بودا اور اُن کی تحقیقات میں کس قدر چھچھورا پن ہے۔ اور یہ بڑے درد کی بات ہے کہ ہمارے حلقوں میں اس کی حیثیت با اعتماد علمی ذریعہ کی ہے اور اس کی شخصیت استدلالی تصور کی جاتی ہیں اور پاکستان میں اسی کو بنیاد بنا کر عربی اور اُردو میں منتقل کیا جارہا ہے [1]

ڈاکٹر محمد البہی نے المبشرون والمستشرقون وموقفہم فی الاسلام کے عنوان سے ایک یونیورسٹی میں ایک بہت بڑے علمی اجتماع میں ایک مقالہ پیش کیا تھا۔ اس مقالہ میں انہوں نے مستشرقین کے

---

[1] الاستشراق والمستشرقون ص ۱۵، ۳۰

اخبارات ورسائل، کتابوں اور ان کے مشاہیر کی فہرست دی ہے۔ اور ڈاکٹر مصطفیٰ السباعی نے اپنی بیش قیمت کتاب الاستشراق والمستشرقون میں اس کو بسط کے ساتھ نقل کیا ہے۔ ہم یہاں اس تفصیل کو بالارادہ چھوڑتے ہیں۔

مولانا ابوالحسن علی میاں نے اسلامیت اور مغربیت میں کشمکش نامی کتاب میں جس کا عربی ترجمہ بھی شائع ہو چکا ہے اس کے چہرے سے پورے درد و سوز کے ساتھ نقاب اٹھایا ہے۔ نوجوان طلبہ کے لیے اس کتاب کا مطالعہ بے حد مفید ہے۔

افسوس کہ تفسیر معالم القرآن کے صفحات اس سے زیادہ تفصیل کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ہم یہاں قلم کو روکتے ہیں اور اس کی مزید مباحث انشاء اللہ چوتھے پارے میں آئیں گے۔

۳۰۰ ۔ تم عفو ودرگزر سے کام لو۔ یعنی جب تک ہمارا حکم نہ آئے اس وقت تک یہود کی باتوں پر صبر کرو۔ سو آخر کو حکم آگیا کہ یہود کو مدینہ کے گرد سے نکال دو[1]

عفو ودرگزر سے کام لینے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے عناد اور حسد کو دیکھ کر مشتعل نہ ہوں۔ ان سے بحثیں نہ کرو اور مناظرے اور جھگڑے میں اپنے قیمتی وقت اور اپنے وقار کو ضائع نہ کرو۔ صبر کے ساتھ دیکھتے رہو کہ اللہ کیا کرتا ہے۔ فضولیات میں اپنی قوتیں صرف نہ کرو۔[2]

اس وقت کے حالات کا یہی تقاضا تھا۔ پھر حق تعالیٰ نے اس وعدہ کو پورا فرمایا اور جہاد کی آیات نازل ہوئیں، جس کے بعد یہود کے ساتھ قانونی برتاؤ کیا گیا۔ اور ناشائستہ افراد سے حسب حیثیت ان کے فساد کے بدلے قتال، جلاوطنی یا جزیہ پر عمل کیا گیا۔[3]

چونکہ یہ مدینہ کی ابتدائی زندگی تھی۔ ابھی تک طاقت کے ذریعے مسلمانوں کو فساد کے مٹانے اور دشمن کو جواب دینے کی اجازت نہ آئی تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ مسلمان کمزور رہے، قرآن کی آیت فاعفوا واصفحوا خود بتا رہی ہے کہ مسلمان کمزور نہ تھے بلکہ طاقتور تھے۔ اگر کمزور ہوتے تو عفو ودرگزر کا حکم نہ ہوتا بلکہ صبر کی تلقین ہوتی۔ عفو ودرگزر کا مطالبہ تو طاقتور ہی سے ہو سکتا ہے۔ گویا یوں کہا جا رہا ہے کہ مسلمانو! تمہیں اہل کتاب کی عددی کثرت سے دھوکا نہ ہو جائے کیونکہ تم عددی قلت کے باوجود ان سے زیادہ طاقتور ہو۔ لہٰذا تمہیں اس وقت ان کے ساتھ طاقتور عادل کا معاملہ کرنا چاہیے۔ اور اہل کتاب کو عددی کثرت کے باوجود کمزور اور اہل ایمان کو عددی قلت کے باوجود طاقتور کہہ کر

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۱۱، [2] تفہیم القرآن، [3] معارف القرآن م ش ص ۲۳۲

اس طرف اشارہ کیا ہے کہ اہلِ حق کے ساتھ عددی قلت کے باوجود اللہ کی بے پایاں عنایات کی تائید ہوتی ہے اور عزت و وقار ان ہی کا حصہ ہے جب تک ان کے قدم حق پر جمے رہیں اور حق و باطل کے معرکے میں مٹنا باطل کا حصہ ہے۔ باطل کی عمر ہمیشہ اہلِ حق کی حق سے بے رُخی کا نتیجہ ہوتی ہے۔

ف۳۰۱۔ یہاں تک کہ اللہ کا فیصلہ آئے۔ یعنی صبر کے ساتھ دیکھتے رہو اللہ کیا کرتا ہے۔ اکثر مفسرین نے فیصلہ کی تفسیر جہاد و قتال سے کی ہے اور امر کو اوامر کا واحد بنایا ہے اور اسی بنا پر کچھ نے اسے منسوخ بھی قرار دے دیا ہے۔ لیکن اگر اسے اوامر کی بجائے اُمور کا واحد مانا جائے اور مطلب یہ ہو کہ تم عفو و درگزر سے اس وقت تک کام لو جب تک اللہ کی غیبی مدد اور نصرت ہم رکاب نہ ہو جائے اور اللہ حق کو فتح مند کرکے بتلا دے کہ کون حق پر تھا اور کس کی جگہ باطل پرستی تھی۔ نصرت و اعانت کے اسی وعدہ کی وجہ سے آیت کے آخر میں ان اللہ علی کل شئ قدیر آیا ہے۔ اگر جنگ و قتال کی بات اس کی غایت ہوتی تو ان اللہ لقوی عزیز جیسی کوئی تعبیر ہوتی۔ قتال تو اللہ کی شانِ حکیمی کا مظہر ہے نہ کہ اس کی شانِ قدیری کا۔ شانِ قدیری کے اظہار کے مواقع پر اللہ کے اوامر نہیں اللہ کے اُمور کا ذکر ہوتا ہے اور شانِ حکیمی کے تذکرے میں اللہ کے اُمور و شئون نہیں بلکہ اللہ کے اوامر و احکام کا تذکرہ کیا جاتا ہے۔

آیت کی تشریح ختم ہو چلی ہے لیکن اہلِ کتاب کی جانب سے پیروانِ اسلام کو اسلام سے ہٹانے اور کفر میں لوٹانے کی یہ ساری کوششیں، تگ و دو محمد رسول اللہؐ کے بارے میں اُن پر حق ظاہر ہونے کے باوجود ہو رہی ہے۔ قرآن کا یہ فقرہ اعجازی فقرہ ہے من بعد ما تبین لھم الحق باوجودیکہ ان کے لیے حق نمایاں ہو چکا۔ اس فقرے کا اعجاز آج بھی ہم آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ یگانوں کو چھوڑ کر بیگانوں کی زبانی سنیے کہ ان کے سامنے حق کی نمائش کیونکر ہوئی ہے۔

گبن لکھتا ہے:

"ایک منصف شخص یقین کرے گا کہ محمدؐ کے اصل ارادے خالص اور اصلی خیر خواہی کے تھے، آپؐ شاہی شان و شوکت کو حقیر سمجھتے تھے، گھر کے ادنیٰ ادنیٰ کام کرتے تھے۔ آگ سلگاتے، جھاڑو دیتے، دودھ دوہتے، اپنی جوتیاں گانٹھتے، کپڑوں میں اپنے ہاتھ سے پیوند لگاتے، جَو کی روٹی کھاتے، مہمانوں کو اچھا کھلاتے، مگر آپؐ کے گھر اکثر مہینوں آگ نہ سلگتی۔ دودھ اور شہد بہت بھاتا تھا۔ معمولی خوراک کھجوریں اور پانی۔"

گلمن اپنی کتاب "تاریخ اسلام" میں لکھتا ہے:

"کیا ہم اس حالت کو تصور میں لا سکتے ہیں جو عربوں کی ہوئی، جب انہوں نے سنا کہ رسول اللہؐ

صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کیا، ہم بتا سکتے ہیں کہ اُن کی اور اُن کی رسالت کی بابت وہ دل میں کیا کچھ نہ خیال کرتے تھے، دس برس تک مدینہ کے لوگوں کے سامنے چلتے پھرتے رہے اور پھر وہ ان کی زندگی کے ہر بھید سے واقف تھے۔ اُن کے سادہ لباس سے، ان کی سادہ خوراک سے، نمود نہ کرنے کی عادت سے ان کی پرہیزگاری سے، ان کے تقویٰ سے، اُن کے روزے نماز سے، ان کے نیک مشوروں سے، ان کے حلم و تحمل سے، خوش صحبتی سے بخوبی واقف تھے۔ انہیں یاد تھا کہ کس طرح اپنی دائی حلیمہ کے ساتھ جب وہ ان کی جوانی میں آئی تھی، مہربانی کی تھی اور کس طرح اپنی والدہ ماجدہ حضرت آمنہ کی قبر پر روئے تھے۔ جبکہ مکہ سے آتے ہوئے ان کی قبر کے قریب سے گزرے تھے۔ آپ بچوں کو سمجھاتے تھے کہ اپنے ماں باپ سے محبت کرو، ان کی عزت کرو اور ان سے نرمی سے پیش آؤ، ماں کے پاؤں کے نیچے بہشت ہے۔ آپ کس کس طرح سے سمجھاتے تھے کہ زن و شوہر کے ایک دوسرے پر برابر حقوق ہیں، محبت اور اُلفت کرتے۔ عورتوں کی عزت افزائی کی، اس ذلیل حالت سے نکال کر جو اُن سے پہلے تھی، اور تعداد ازواج کی حد مقرر کردی۔ عرب جو بُت پرستی میں مبتلا تھے اُنہیں ایسی خُدا پرست قوم بنادیا اور انہیں بتادیا کہ خدا ایک ہے کوئی اس کا شریک نہیں، کیا وہ ان کی معزز اور وجیہ صورت کو بھول سکتے تھے۔ جب وہ بازاروں میں سے گزرتے تھے یا مسجد میں آتے تھے ان کی غمخوار سیاہ آنکھ جو ایک ہی ملاقات میں مسخر کرلیتی تھی، وضعدار مسکراہٹ یا مسکرانے کی ادا، بڑی ہلتی ہوئی داڑھی، تیز اور غواص منظر ان کے آبرو کامل کیا یہ سب باتیں ان کے دل پر نقش نہ تھیں، ان کی دینداری ٹکسالی تھی۔ کیا ہم محمدؐ میں یہ نقص نکال سکتے ہیں کہ اس نے اللہ کو کریم و رحیم بتایا اور عرب کے سینکڑوں بتوں کے مقابلے میں خدا کو وحدہٗ لاشریک جتایا، کیا اس سے محمدؐ کی بزرگی اور عظمت ظاہر نہیں ہوتی کہ اس نے ایسا اعلیٰ درجہ کا خیال ظاہر کیا، کیا اس سے اس کی سچائی ثابت نہیں ہوتی کہ مرتے دم تک اپنی تمام زندگی کے اس بڑے اعلیٰ خیال پر مستقل طور سے جما رہا۔"

مورس اپنی کتاب مذاہب الدنیا، میں لکھتا ہے کہ:

"محمدؐ نے ایک بکھری ہوئی قوم کو جس کا صدیوں سے کوئی خاص معبد یا دارالحکومت نہ تھا جس کو تمام قومیں نفرت اور حقارت کی نظروں سے دیکھتی تھیں، اتحاد کی رسی میں باندھ کر ایک کردیا تھا اور ان کو ایسا کردیا تھا کہ وہ اپنا مال و جان تک اس کی مدد کو قربان کرنے کو تیار تھے۔ کیونکہ ان کے دل میں یہ بات اُتر گئی تھی کہ خدا ہی نے ہم کو اس کام کا حکم دیا ہے۔"

ڈاکٹر اوگسٹ ویل لکھتا ہے:

"بطورِ مصلح قوم کے جو کہ اصل میں محمدؐ تھا اور ہونا چاہیے تھا، وہ ہماری تعریف و توصیف کا مستحق ہے، وہ رسُول کے نام کا سزاوار ہے۔"

اے اے فری مین اپنی تاریخ فتوحاتِ اسلام میں لکھتا ہے:

"اس میں کوئی شک نہیں کہ سوائے سچے راست باز کے ارادوں کے جو کہ اُن کے دل میں تھے، محمدؐ ہرگز اس قدر مستقل استوار اور ثابت قدم نہیں رہ سکتے، کہ ان کے قدم کو کبھی لغزش نہیں ہوئی۔"

جان ڈیون پورٹ اپنی کتاب "اپالوجی فور محمدؐ" میں لکھتا ہے کہ،

"محمدؐ کی صداقت اور خلوص کا یہ پکا ثبوت ہے کہ سب سے اوّل جو ایمان لانے والے ہیں وہ اس کے گھر والے اور اس کے ہمدم و دوست ہیں۔ یہ سب ان کے خانگی طریق زندگانی سے بخوبی اور پورے پورے واقف تھے۔ اگر ان میں خلوص نہ ہوتا تو وہ ضرور ان اختلافات پر گرفت کرتے جو ہمیشہ کم و بیش ریاکار فریبی نبیوں کے دعووں اور ان کے خانگی کاموں میں ہوا کرتے ہیں۔"

سر ولیم میور لکھتے ہیں کہ:

"کتبِ مقدسہ سماویہ میں انبیائے بنی اسرائیل میں سے کوئی نبی بھی بجز ایک کے آپ سا عالی مرتبہ اور جلیل الشان معلوم نہیں ہوتا۔"

سیل "مقدمہ ترجمہ قرآن" میں لکھتا ہے کہ،

"میں نے کبھی کسی کتاب میں نہیں پڑھا کہ خدیجہؓ کو محمدؐ کی رسالت کے دعوٰی میں کبھی شبہ ہوا ہو۔"

ٹامس کارلائل لکھتا ہے کہ،

"صحرا کا غواص طبیعت والا باشندہ (محمدؐ) اپنی چمکتی ہوئی کالی آنکھوں اور کھلی صاف ملنسار اور وسیع رُوح کے ساتھ بلند نظری اور مراد ہوس کے نہیں بلکہ کچھ اور ہی خیال رکھتا تھا، کم سخن، گمبھیر، اعلیٰ درجے کی رُوح، وہ ضرور نہایت سرگرم پُرجوش لوگوں میں سے تھا، جن کو خدا ہی نے خلوص اور صداقت کے ساتھ پیدا کیا ہے۔"

باسورتھ سمتھ رقمطراز ہے:

"وہ ریاست اور مذہب کے سربراہ تھے وہ بیک وقت قیصر اور پوپ دونوں تھے۔ لیکن شان میں پوپ کی جھوٹی مشیتیں تھیں نہ قیصر کی جیوش و عساکر ان کے پاس تھے۔ نہ کوئی حراس اور پاسبانوں کا گروہ تھا، نہ کوئی محل تھا اور نہ کوئی مقررہ آمدنی تھی، اگر کبھی کسی انسان کو حکومت کرنے کا خدائی حق،

نصیب ہوا ہے تو وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم تھے کیونکہ اگرچہ ان کو انفذارِ مطلق حاصل تھا مگر اسی کی ظاہری اشکال اور مادی سہارے مفقود تھے۔"

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خراجِ عقیدت پیش کرتے ہوئے فرانسیسی مورخ لامارٹن (LA MARTIN) اپنی کتاب تاریخ ترکیہ جلد اوّل صفحات ۲۷۶ - ۲۸۰ (HISTOIRE DE LA TURKIE, TOME I, PP. 276 - 80) بحوالہ کتاب ڈاکٹر محمد حمید اللہ کی کتاب (LE PROPHET DE L'ISLAM, TOME II PP. 668-669) میں رقمطراز ہے:

"دُنیا میں کسی انسان نے محمدؐ کے نصب العین سے بلند نصب العین اپنے سامنے نہیں رکھا، یہ عظیم الشان نصب العین کیا تھا، خدا اور بندے کے درمیان توہمات کے پردے اُٹھا دینا، خدا کو انسان کے قلب میں رچا دینا، انسان کو خدائی صفات کے رنگ میں رنگ دینا اور صدہا باطل خداؤں کی بجائے خدا کا منزّہ اور مقدس تصوّر پیش کرنا، آج تک کبھی کسی انسان نے اتنے بڑے کام کا بیڑا نہیں اُٹھایا جس کے وسائل اور ذرائع اس قدر محدود ہوں اور مقصد اتنا دُشوار اور اُس کی قدرت سے باہر ہو۔ نصب العین کی بلندی، وسائل کی کمی اور پھر نتائج ایسے درخشاں حاصل کرنا اگر یہ انسان کی غیر معمولی قابلیت کا معیار ہیں تو کون ہے جو اس میدان میں محمد (صلعم) کے مقابلہ میں کسی دوسرے انسان کو پیش کرنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ دُنیا کے اور بڑے بڑے انسانوں نے صرف اسلحہ، قانون یا سلطنتیں پیدا کیں۔ وہ زیادہ سے زیادہ مادی قوتوں کی تخلیق کر سکے جو اکثر اوقات خود ان کی آنکھوں کے سامنے راکھ کا ڈھیر ہو کر رہ گئیں۔ لیکن اس انسان کے صرف جیوش و عساکر، مجالسِ قانون ساز، وسیع سلطنتوں، قوموں اور خاندانوں کو ہی حرکت نہیں دی بلکہ ان کروڑوں انسانوں کے قلوب کو بھی جو اس زمانہ کی آباد دُنیا کے ایک تہائی حصّہ میں بستے تھے اور اس سے بھی زیادہ اس شخصیت نے قربان گاہوں، دیوتاؤں، مذاہب و مناسک، تصورات اور معتقدات بلکہ رُوحوں تک کو ہلا دیا۔۔۔۔ اُس نے ایسی قومیت کی بنیاد رکھی جس نے دُنیا کی مختلف نسلوں اور زبانوں کے امتزاج سے ایک اُمتِ واحدہ پیدا کر دی۔ یہ لافانی اُمت اور باطل خداؤں سے سرکشی اور نفرت اور ایک خدائے واحد کے لیے والہانہ عشق۔۔۔۔ اُس نے تمام باطل خداؤں کی عبادت گاہوں کو ڈھا دیا اور ایک تہائی دُنیا میں آگ لگا دی۔

اُس کی پاک زندگی، اس کی توہم پرستی کے خلاف جنگ، مکی دَور میں طرح طرح کے مصائب کا حیرت انگیز استقلال اور صبر سے مقابلہ کرنا، پھر اُس کی ہجرت اور دعوتِ رُشد و ہدایت، خدا کی راہ

وَاَقِیْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّکٰوةَ ؕ وَ مَا تُقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِکُمْ مِّنْ خَیْرٍ تَجِدُوْهُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِیْرٌ ﴿۱۱۰﴾

اور مسلمانو! تم نماز قائم کرو۔ اور زکوٰۃ دو۔ جو خیر بھی تم اپنے لیے آگے روانہ کردگے اللہ کے ہاں اُسے موجود پاؤگے۔ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ اُسے دیکھ رہا ہے ۔

میں غیر منقطع جہاد، اپنے مقصد کی کامیابی پر یقین محکم اور ناسا عد حالات میں اس کی مافوق البشر جمعیت خاطر، فتح و کامرانی میں تحمل و عفو، کسی سلطنت سازی کے لیے نہیں بلکہ خالص خدائی مقاصد کی کامیابی کے واسطے۔

اُس کی شبانہ روز نمازیں، دُعائیں، اپنے معبود سے راز و نیاز کی باتیں، اس کی حیات، اس کی رحلت اور بعد وفات اس کی مقبولیت یہ تمام حقائق کس قسم کی سیرت کی گواہی دیتے ہیں؟

عظیم مفکر، بلند پایہ خطیب، پیغامبر، مقنن، سپہ سالار، نہ صرف اجسام بلکہ اذہان و قلوب پر غلبہ پانے والا، صحیح نظریہ حیات کو علی وجہ البصیرت قائم کرنے والا، بہت سی سلطنتیں اور ان سب پر آسمانی بادشاہی کا بانی .... یہ ہیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم)

ان تمام معیاروں کو اپنے ساتھ لاؤ جس سے انسان کی عظمت اور بلندی کو ناپا اور پرکھا جاسکتا ہے، اس کے بعد بتاؤ کہ کیا دُنیا میں اس سے بزرگ تر اور کوئی انسان کبھی ہوا ہے؟ ۵

اہلِ ایمان کی قوت کا حقیقی ذریعہ

یہ بات فرمانے کے بعد کہ یہودیوں سے لڑ جھگڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ اس معاملہ میں عفو و درگزر سے کام لو اور دیکھو کہ اللہ کیا کرتا ہے اور حق کی فتح مندی کا سامان کیسے کرتا ہے۔ وہ کام کرو جس سے جماعت میں معنوی استعداد نشو و نما پاتی ہے اور طاقتور ہوتی ہے۔ یعنی قلبی اور مالی عبادتا کی سرگرمی کا نماز اور زکوٰۃ کے ذریعہ اجتماعی مظاہرہ کرو۔ جس جماعت میں یہ سرگرمی ہوتی ہے وہ نہ

تو دین سے برگشتہ ہو سکتی ہے نہ اس کی اجتماعی قوت میں کمزوری ہو سکتی ہے۔ اقامت صلوٰۃ، ایتائے زکوٰۃ سے قرآن کا مقصد وہ حالت پیدا کرنا ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، ایک مرکز، ایک سلسلے میں ایک وجود، ایک طاقت اور ایک فرد واحد میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ یکجا ہو جاتی ہیں۔ اور تمام مواد، قویٰ، اعمال اور افراد پر ایک اجتماعی اور انضمامی دور آ جاتا ہے۔ اس طرح کہ گویا ہر قوت اکٹھی ہر عمل باہم دگر جڑا ہوا۔ ہر چیز بندی ہوئی اور سمٹی ہوئی۔ ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو جاتا ہے۔ کسی چیز، کسی گوشے اور کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ جدائی، انتشار اور الگ الگ جزو بزو فرد فرد ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی۔ یہی حالت جب اعمال و افعال پر طاری ہوتی ہے تو خیر کہلاتی ہے۔ جب انسانی جسم میں آتی ہے تو اس کا نام تندرستی ہے۔ یہی حالت جب قومی اور جماعتی زندگی کی قوتوں اور عملوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام اقامت صلوٰۃ ہے اور اس کا ظہور جماعتی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط میں دنیا دیکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ کو اسلامی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد قرار دیتا ہے اور اس کو اخوت، ولایت، مساوات کی مادہ تکوین امت فرمایا ہے اور اسی بنا پر نبوت نے اپنی تعلیمات میں نماز کو حیات ملی کے لیے خط بنایا ہے، گویا اسلام میں اقامت صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہی کا نام جماعت ہے۔ نماز میں جماعت کے التزام پر زور دینا اور اگرچہ امام نااہل ہو لیکن التزام رکھنے میں بھی حقیقت کام کر رہی ہے کہ مسلمان کی اصلی زندگی اللہ سے جانی اور مالی تعلقات استوار کرنے کا نام ہے۔

ف ۳۰۲ ۔ یعنی ان کی ایذا پر صبر کرو اور عبادات میں مشغول رہو۔ اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے ہرگز غافل نہیں ہے تمہاری کوئی نیک بات ضائع نہیں ہو سکتی۔ [1]

یہاں نماز اور زکوٰۃ کو اسلامی زندگی کے مرکز کی حیثیت سے پیش کیا ہے۔ بلکہ نماز کا عمل تو قرآن کی نظر میں ایک ایسا عمل ہے کہ اسے ایمان کہا ہے۔

ما کان اللہ لیضیع ایمانکم

اللہ تمہارے ایمان کو ضائع نہیں کرے گا

ایمان سے نماز ہی مراد ہے۔ اسلام کا یہ قانون مرکزیت زندگی کے ہر حصہ میں صاف صاف دیکھا جا سکتا ہے۔ حرکت و حیات کی بلندیوں سے لے کر زندگی کے چھوٹے چھوٹے گوشوں پر ایک

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۱

نظر ڈالیں۔ ہر جگہ زندگی اور بقا اسی قانون سے وابستہ نظر آئے گی۔ اسلام فی الحقیقت سنۃ اللہ اور فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ اگر نوعِ انسانی کی سعادت وارتقا کے لیے قانونِ اسلام اسی فاطر السماوات والارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کے لیے قانونِ حیات بنایا ہے تو ضروری ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو۔ قرآن نے جابجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ جس طرح تمام اجسام واشیاء کی زندگی اپنے مرکزوں سے وابستہ ہے اسی طرح نوعِ انسانی اور اس کی جماعت وافراد کا معنوی بقا بھی قانونِ مرکزیت پر موقوف ہے جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز اللہ کا امر ہے اسی طرح نوعِ انسانی کی سعادت کا مرکز اللہ کی عبادت ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں:

> جیسے دھوپ کو اپنے بقا میں آفتاب کی ہردم ضرورت ہے ایسے ہی انسان کو اپنے وجود وبقا میں ہر دم اپنے مالک کی جانب روئے نیاز کی ضرورت ہے۔ انسان کا فرض ہے کہ اپنے قدرت کو طاقت کو اس کی قدرت سے مستعار سمجھ کر اسی کے کاموں کے لیے روکے رکھے۔

اور فرماتے ہیں کہ:

> مدارِ طاعت صرف تین باتیں ہیں۔ نفع وراحت کی اُمید، نقصان ومضرت کا اندیشہ، اور یا محبت۔ نوکر اپنے آقا کی طاعت نوکری کی اُمید پر کرتا ہے اور رعیت اپنے حاکم کی اطاعت تکلیف کے اندیشہ سے دب کر کرتی ہے۔ اور عاشق اپنے محبوب کی اطاعت بتقاضائے محبت کرتا ہے۔

چونکہ اللہ سبحانہٗ کی دو شانیں ہیں۔ ایک شان ان کی محبوب ہونے کی اور ایک شان ان کے حاکم ہونے کی۔ حاکم ہونے کی حیثیت میں وہ نفع ونقصان کا مالک ہے۔ حدوث وبقا اس کے قبضہ میں ہے اس لیے قرآن نے مسلمانوں کی تکوینِ مرکزیت کے لیے سب سے پہلے نماز اور زکوٰۃ پر زور دیا تاکہ اللہ کے بندوں کا اللہ سے حاکم ہونے کی حیثیت سے پہلے تعلق مضبوط ہو جائے۔ اسی بنا پر نماز کی اقامت پر زور دیا ہے۔ یہ دونوں عمل اللہ کے شاہی دربار سے تعلق رکھنے والے اعمال ہیں۔ نماز میں سکون و اطمینان سے باوقار طریقہ پر آنا، اچھا اور شاندار لباس پہن کر آنا اور جناب الٰہی میں ہاتھ باندھ کر کھڑے ہو جانا بتا رہا ہے کہ خدمت کے لیے ایستادہ ہیں۔ جو حکم ہو گا کریں گے۔ اور اس کی عظمت کے احساس سے دب کر بدن کا جھکا دینا اور اس کے علو مراتب کے اعتقاد کے بعد اپنی پستی کے خیال سے پیشانی خاک آلود کر لینا اللہ کی شانِ جلال کا مظہر ہے۔ یہ گویا پوری زندگی میں اپنے دل کی امنگوں، اپنے دماغ کے

نظریوں، اپنی عقل کی کاوشوں اور اپنے اعضاء وجوارح کی حرکتوں کو اللہ کے لیے وقف کرنے کا ایک چھوٹا سا مظاہرہ انقیاد ہے۔ اس کی روزانہ مشق اس انقیاد کی تجدید کرتی ہے۔ گویا نماز کے ذریعے اللہ کی طاعت و انقیاد، فرماں برداری کی رُوح پیدا کی جاتی ہے۔ یہ اپنی جان کی حد تک پیمان و عہد ہے۔ جان کے بعد وہ مال ہے جس پر انسان جان کھپاتا ہے، محنت کرتا ہے۔ نماز کے ذریعے بندگی کی مشق اور زکوٰۃ دے کر اس کی مشق کرائی گئی کہ بندہ یہ یقین کرے کہ جو کچھ میرے پاس ہے وہ اللہ کی ملک ہے، میں اس میں ایک نائب کی حیثیت سے تصرف کر رہا ہوں۔ نماز تو سراپا پیمانۂ عبادت ہے لیکن زکوٰۃ اصل میں نیابت ہے اور اس لحاظ سے عبادت ہے کہ حکم کی پابجائی ہو رہی ہے۔

گویا یوں کہا گیا ہے کہ مسلمانو! تم طاقتور ہو، جوش میں نہ آؤ، عفو و درگزر سے کام لو اور پہلے عبادت اور نیابت کے اوصاف اپنے اندر خوب پختہ کرو۔

۳۰۳ ۔ اور جو خیر بھی تم اپنے لیے آگے روانہ کرو گے۔ اس میں بتایا جا رہا ہے کہ نماز، زکوٰۃ وہ طاقتور اسباب ہیں جن کے ذریعے دُنیا میں فلاح اور آخرت میں سعادت حاصل ہو گی لیکن اس بات کو الگ کر کے ایک ضابطہ اور قانون کی صورت میں پیش کیا جا رہا ہے کہ جو کچھ بھی نیکی کا سرمایہ تمہارے دامن میں پیشگی فراہم ہو جائے گا مستقبل میں اس کے ثمرات ضرور ظاہر ہوں گے۔ خیر ہر وہ عمل جو اللہ کی رضا کا ذریعہ ہو۔ نماز اور زکوٰۃ اعمالِ خیر میں سب سے زیادہ طاقتور اعمال ہیں۔ جس طرح مادیات میں اشیا جسمِ انسانی کو بہت زیادہ طاقت بخشتی ہیں اور تم ان کے حصول کے درپے ہوتے ہو، ایسے ہی عمل معنویات میں بھی جاری ہے۔ نماز اور زکوٰۃ کے اعمال معنوی اعمال ہیں۔ نماز سے اعمال میں بلندی، نیت میں صفائی، نگاہ میں پارسائی اور اخلاق میں طہارت و نزاہت نشو و نما پائے گی۔ جب کہ زکوٰۃ سے نظامِ جماعت قائم ہو گا باہم ہمدردی، ایک دوسرے کی امداد و اعانت کے جذبات ابھریں گے۔

نماز اور زکوٰۃ کے باہمی ارتباط کی ایک اور وجہ بھی ہے۔ اسلام کی تنظیمی زندگی صرف دو بنیادوں پر قائم ہے۔ جن میں سے ایک روحانی اور دوسری مادی ہے۔ اسلام کا نظامِ روحانی نماز باجماعت سے جو کسی مسجد میں ادا ہو قائم ہوتا ہے اور نظامِ مادی زکوٰۃ سے جو کسی بیت المال میں جمع ہو کر تقسیم ہو مرتب ہوتا ہے۔ اسی لیے یہ دونوں اسلام میں ایک ساتھ نظر آتی ہیں۔

زکوٰۃ کو اسلام میں نماز کی طرح اہمیت حاصل ہے۔ اگرچہ لفظ خیر دونوں کے لیے جامع ہے لیکن قرآن میں اگر خیر کے اطلاقات پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق زیادہ مال پر ہوا ہے

مثلاً ان ترک خیراً الوصیۃ للوالدین

اور انہ لحب الخیر لشدید

اور ما تنفقوا من خیر یوف الیکم

اور ما تنفقوا من خیر فلانفسکم

اس سے پتہ لگتا ہے کہ یہاں ان نیکیوں کی طرف متوجہ کرنا مقصود ہے جو مال کے ذریعے کی جائیں۔ مال کے بارے میں قرآن نے سب سے پہلے یہ بنیادی حقیقت بتلائی ہے کہ مال و دولت دراصل اللہ کا عطیہ اور اُس کی امانت ہے اور حقیقۃً اللہ کی ملکیت ہے۔ اس لیے اللہ کی چیز اور اللہ کے دیے ہوئے مال کو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا انسان کا فریضہ اور اس کی سعادت ہے۔

انسان اس دولت میں اللہ کا نائب اور اس کا امین ہے اس لیے مالکِ حقیقی کے حکم و اشارے سے اسے خرچ کرنے میں کیا پس و پیش ہو سکتا ہے۔

انسان کا اپنے مال سے جو تعلق ہے وہ قرآن میں کسب کے لفظ سے بیان کیا گیا ہے۔ یعنی انسان اس کا حقیقی مالک نہیں بلکہ کاسب ہے۔ پھر اس کسب کے بارے میں قرآن کہتا ہے کہ اس میں بھی تمہاری دانش و حکمت اور ہنرمندی و محنت کو دخل نہیں ہے بلکہ خدا کی رہنمائی اور اس کی بخشی ہوئی دانائی اور اس کی کاوکشائی ہی نے تم سے یہ کسب کرایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود قرآن انسان کے کسبِ حلال میں اس کے شرعی توارث اور انتقالِ ملکیت کے جائز طریقوں کو تسلیم کرتا ہے۔ اور اس بنا پر وہ انسان کی ملکیت کو صحیح سمجھتا ہے۔ اور گاہے اس کا اندازِ تعبیر ایسا ہوتا ہے جس سے انسان کے مالک ہونے کی رہنمائی ملتی ہے۔ مثلاً وہ کہتا ہے

لا تؤتوا السفہاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاماً

بیوقوفوں کو اپنے وہ مال نہ دو جن کو اللہ نے تمہاری زندگی کا سہارا بنایا ہے۔

لیکن قرآن انسان کو ایسا دائمی یتیم اور سفیہ نہیں سمجھتا جس کی ملکیت و دولت مستقل طور پر کسی دوسرے کے انتظام و تولیت میں ہو اور اس کو اپنی ملکیت میں کسی قسم کے تصرف کا کوئی حق نہ ہو۔ اس کے نزدیک انسان کے مرتبہ کمال اور شرفِ انسانیت کے شایانِ شان یہی ہے کہ انسان آزاد و مختار ہو کر اپنے مال میں جائز تصرف کر سکے۔ ایک طرف نہ وہ انسان کو اتنا بے دست و پا بناتا ہے کہ اس سے ایک بے جان مشین اور بے عقل جانور کی طرح محنت لی جائے اور اس کو مال و دولت استعمال کرنے کی صحیح اجازت بھی نہ دی جائے اس لیے کہ یہ اس کے مرتبہ انسانیت

کے منافی ہے اور یہ انسان کا جامداتی تصور ہے۔ اس سے کسب معیشت کے محرکات میں افسردگی آجاتی ہے۔ اور کسب کا وہ فطری جوش و نشاط اور زندگی کا تنوع جو تمدن کے لیے ضروری ہے مردہ ہو جاتا ہے۔ دوسری طرف وہ انسان کو اپنے مال میں تصرف کرنے، ان کے استعمال کرنے میں بالکل آزاد بھی نہیں کرتا۔ اس کے لیے اس نے بڑے وسیع جو قانونی انتظامات کیے ہیں ان کی نوعیت یہ ہے۔

۱۔ سب سے پہلے اس نے یہ یقین پیدا کیا کہ انسان مال و دولت کا حقیقی مالک نہیں ہے مالک حقیقی اللہ تعالیٰ کی ذات ہے۔ وہ اس مال میں اللہ کا امین اور نائب ہے۔

۲۔ یہ اعتقاد پیدا کرتا ہے کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہے جس میں اس کو زندگی کے تمام مال و دولت کا حساب دینا ہے اور یہ دیکھا جاتے گا کہ اس نے مال میں حقِ امانت و نیابت ادا کیا ہے یا نہیں؟۔

۳۔ اس نے بہت قوت کے ساتھ یہ ذہن بنایا ہے کہ دُنیا عیاشی کی جگہ نہیں بلکہ امتحان گاہ ہے یہاں مال و دولت اور سامان آرائش و راحت سب آزمائش کے لیے ہے۔ یہ زندگی فرصتِ عمل ہے یہ مال و دولت آخرت کی جنس ثواب اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کا زرِ مبادلہ ہے۔

۴۔ اس نے یہ بھی ضروری قرار دیا ہے کہ مال جائز، پاک اور عادلانہ طریقوں سے کمایا جائے۔ اس کے لیے کسب پر بھی کچھ قانونی اور اخلاقی پابندیاں عائد کیں۔ مسلمان کو اجازت نہیں دی گئی کہ وہ دھوکہ، چوری، قمار بازی، سنگدلی اور شقاوت سے مال پیدا کرے، خیانت، غصب، فریب دہی، غش و غرور، سٹہ بازی جیسے تمام ذرائع کو حرام قرار دیا گیا۔

۵۔ تجارت کو جائز بنایا لیکن سُود کو مطلقاً حرام کر دیا۔

۶۔ اپنے مال میں خواہ وہ کتنی کثیر مقدار میں ہو اسراف اور تبذیر کو حرام قرار دیا۔

۷۔ دولت کے ذرائع میں دُنیا میں سونا اور چاندی ہے۔ اس کے استعمال پر بطور زیور مرد پر اور زیور کے علاوہ اس کے سارے استعمالات پر مرد و عورت کے لیے پابندی لگا دی۔

۸۔ روپیہ جمع کرنے اور اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرنے کو سنگین سزا کا مستحق قرار دیا۔

۹۔ انفاق فی سبیل اللہ، غم خواری، مواسات، ایثار و ہمدردی کی بکثرت و شدت ترغیب دی گئی ہے۔

۱۰۔ یہ تصور پیدا کیا کہ ہر فرد کی ملکیت سے جماعت اور امت کے کچھ حقوق و منافع وابستہ ہیں اس لیے نتیجۃً ہر انفرادی ملکیت اجتماعی ملکیت ہے۔ اس کے ضائع ہونے سے جماعت کی حق تلفی

وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ إِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا أَوْ نَصَارَىٰ ۗ تِلْكَ أَمَانِيُّهُمْ ۗ
قُلْ هَاتُوا بُرْهَانَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿١١١﴾ بَلَىٰ مَنْ أَسْلَمَ وَجْهَهُ لِلَّهِ وَ
هُوَ مُحْسِنٌ فَلَهُ أَجْرُهُ عِنْدَ رَبِّهِ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿١١٢﴾

اور اہلِ کتاب کہتے ہیں کہ جنت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے علاوہ ہرگز کوئی نہ جائے گا۔ یہودیوں کے خیال کے مطابق یہودیوں کے سوا اور عیسائیوں کی رائے میں عیسائی کے سوا۔ یہ اُن کی امنگیں اور ولولے ہیں نہ کہ امرِ واقعہ۔ تم ان سے کہو کہ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔ یہ آرزوئیں بالکل غلط ہیں۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ جنت میں صرف وہ شخص جائے گا جو زندگی میں اپنا رُخ اللہ کی طرف رکھے گا اور اس فرمانبرداری کی زندگی میں جو حُسنِ عمل کی سوغات بھی لے کر آئے گا تو اس کے لیے اس کے رب کے حضور میں اس کا اجر ہے اور اس کے لیے نہ کسی طرح کا اندیشہ ہے نہ کسی طرح کی غمگینی۔

ہوتی ہے۔

۱۱۔ آخر میں قانونِ وراثت کے ذریعہ ہر چھوٹی سے چھوٹی دولت اور ہر معمولی سے معمولی ملکیت کو بھی بہت سے لوگوں میں تقسیم کر دیا جاتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص جو اثاثہ اور املاک چھوڑ کر مرے وہ اس کے وارثوں میں حصہ رسد تقسیم ہوتا ہے۔ اس طرح یہ ناممکن ہے کہ کوئی دولت اور ملکیت ایک نسل سے زیادہ قائم رہے۔

۱۲۔ افراد کی دولت اور ان کے سرمایہ کو جماعت کے لیے نفع بخش بنانے کی سب سے آخری اور حتمی تدبیر یہ کی کہ ہر شخص جس کے پاس اس کے ضروری مصارف سے زائد ۵۲½ تولہ چاندی کی مقدار یا اس کی رائج الوقت قیمت جمع ہو جائے۔ ایک سال گزر جانے پر اس میں چالیسواں حصہ یعنی ۲½ فی صد راہِ خدا

میں نکالے اس کا نام قرآن حکیم کی اصطلاحی زبان میں زکوٰۃ ہے۔
یہ زکوٰۃ اسلامی نظام کی اہم دفعہ ہے بلکہ اسلام کا ایمان کے بعد دوسرا رکن ہے۔ قرآن مجید نے اس کے متعلق جو اصول بتائے ہیں اور اس کی حکمتوں کی طرف جو اشارات کیے ہیں اس پر انشاء اللہ اس تفسیر میں آئندہ تفصیلی کلام کریں گے۔
اس موقعہ پر خاص طور پر یہ ارشاد کہ جو کچھ بھی نیکی اپنے لیے آگے روانہ کرو گے اللہ کے پاس اُسے پاؤ گے۔ اس میں اشارا ہے کہ زکوٰۃ ہی پر اکتفا نہ کرو بلکہ اس میدان میں خیر کا ہر اقدام اللہ کی رضامندی کا ذریعہ اور مستقبل میں ثمرہ آور اور نتیجہ خیز ہو گا بلکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے خاص طور، خاص انداز میں لوگوں کو سمجھایا ہے۔

تم میں سے کون ہے؟ جسے اپنے مال کی نسبت اپنے وارث کے مال سے زیادہ محبت ہو؟ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کوئی نہیں۔ سب کو اپنے ہی مال سے محبت ہوتی ہے حضورؐ نے فرمایا تمہارا مال وہ ہے جو تم نے آگے روانہ کر دیا اور تمہارے وارث کا مال وہ ہے جو تم چھوڑ کر مر گئے۔

راہِ نجات صرف اسلام و احسان ہے

اس آیت میں پہلے اہلِ کتاب کے دین کے معاملے میں غرور کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کو غرہ یہ ہے کہ جنت ان ہی کے لیے ہے اور نجات ان کے نام الاٹ ہو چکی ہے۔ یہ بھی اہلِ کتاب کی شناعتوں میں سے ایک شناعت ہے اور آج تک وہ اسی خود فریبی کا شکار ہیں۔ یہودی کہتے تھے کہ جب تک ایک انسان یہودی گروہ بندی میں داخل نہ ہو نجات نہیں پا سکتا۔ عیسائی کہتے تھے جب تک عیسائی گروہ بندی میں داخل نہ ہو نجات نہیں مل سکتی۔ قرآن کہتا ہے کہ نجات کا مدار یہودیت اور عیسائیت نہیں بلکہ اس کا مدار ایمانِ صحیح اور عملِ صالح ہے۔ ایمانِ صحیح یہ ہے کہ اللہ کی عبادت میں بھرپور خلوص ہو اور اس میں کسی درجہ میں شرک کا شائبہ نہ ہو اور نبوت و رسالت پر ایمان تفریق بین الرسل سے آلودہ نہ ہو۔ یہ دونوں مدعیانِ جنت ان دونوں خوبیوں سے محروم ہیں۔ اس آیت کے ذریعہ قرآن نے اس نجات کو جو فرقوں، قوموں، نسلوں کی ملک ہو کر رہ گئی ہے سب کے لیے بلاتمیز رنگ و نسل اور فرقہ و طبقہ عام کر دیا۔ اور نجات کو پوری انسانیت کا اشتراکی سرمایہ بنا دیا۔ چاہے انسان امیر ہو یا غریب،

اونچی ذات کا ہو یا نیچ کا، رنگ کا کالا ہو یا گورا، سب کے لیے شاہراہِ نجات ایک ہے اور ہمیشہ سے ایک ہی رہی ہے اور وہ صرف اسلام واحسان کی راہ ہے۔ اس پر گامزن ہونے والا نہ مستقبل کے بارے غمگین ہو سکتا ہے اور نہ ماضی کا کوئی اندیشہ رکھ سکتا ہے ان کو اپنے پروردگار کے حضور ضرور جزا ملے گی۔

۳۰۴ ۔ اہلِ کتاب کہتے ہیں۔ اگرچہ یہودی اور عیسائی دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لیے اصل عبارت یوں ہونی چاہیے تھی قالت الیھود لن ید خل الجنة الا من کان ھودا و قالت النصاریٰ لن ید خل الجنة الا النصاریٰ ۔ لیکن قرآن نے بلیغ اختصار کے ذریعے دونوں کو یکجا کر دیا اور بتا دیا کہ دونوں اپنی اپنی نجات کے مدعی ہیں اور مزہ یہ ہے کہ دونوں باہم ایک دوسرے پر نجات کا دروازہ بند کر رہے ہیں قرآن کا اندازِ تعبیر بتا رہا ہے کہ قرآن کو اس یہودیت اور نصرانیت پر اعتراض نہیں ہے جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کی نبوت سے وابستہ ہونے کی وجہ سے رونما ہوئی ہے کیونکہ یہودیت کا نام حضرت موسیٰ کی اس دعا انا ھدنا الیك سے وابستہ ہے جب کہ نصاریٰ کا لقب عیسائیوں کو نحن انصار اللہ سے ملتا ہے۔ اور یہ دونوں نام قرآن میں مقامِ مدح میں بھی آئے ہیں۔ دراصل قرآن کو یہاں جس چیز پر اعتراض ہے وہ لن ید خل الجنة الا من کان ھودا او نصاریٰ۔ کے پسِ منظر میں پوشیدہ ہے اور وہ یہ کہ نبوت سے تعلق رکھتے ہوئے اللہ پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہوئے، کتابِ الٰہی کو مانتے ہوئے وہ اس نعرہ سے تفریق بین الرسل کا اقرار کر رہے ہیں اور اعلان کر رہے ہیں کہ عیسائی ہو کر محمد رسول اللہ کو نہ مان کر جنت مل سکتی ہے اور یہودی ہو کر حضرت عیسیٰ اور محمد رسول اللہ کو نہ مانتے ہوتے بھی جنت مل سکتی ہے۔ قرآن کو ان کے عیسائی یا یہودی ہونے پر اعتراض نہیں ہے بلکہ عیسائی ہوتے ہوئے محمد رسول اللہ کو نہ ماننے پر اور یہودی ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰ اور محمد رسول اللہ کے نہ ماننے پر اعتراض ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے اگر وہ اس نعرے کے پردے میں تفریق بین الرسل جیسے سنگین جرم کے مرتکب نہ ہوتے اور عیسائی ہوتے ہوئے محمد رسول اللہ کی نبوت کو اور یہودی ہوتے ہوئے حضرت عیسیٰ اور محمد رسول اللہ کی نبوت کو تسلیم کرتے تو قرآن کو ان کے نام پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ قرآن انبیاء سے رشتہ توڑنے نہیں جوڑنے آیا ہے۔

دراصل یہاں راہیں صرف دو ہیں۔ ایک ایمان کی دوسری انکار کی۔ ایمان کی راہ یہ ہے کہ بلا تفریق سب کا اقرار کیا جائے اور سب کو مانا جائے اور انکار کی راہ یہ ہے کہ سب کا یا کسی ایک کا انکار کر دیا جائے۔ انکار کی راہ خالص کفر کی راہ ہے۔ قرآن چونکہ سب انبیاء کی تصدیق کا منادی بن کر

آیا ہے اس لیے اس کے نزدیک اس نعرے کی قیمت ولولہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

۳۰۵ ۔ یہ ان کی امنگیں اور ولولے ہیں۔ نجات وسعادت کے فیصلے امنگوں اور آرزوؤں سے نہیں ہوتے ہیں۔ اصل ارشاد میں امانی آیا ہے۔ یہ امنیت کی جمع ہے۔ اس کے معنے جھوٹی آرزوئیں، خیالی اندازے اور من گھڑت اُمیدیں ہیں۔ چونکہ ان کے اس دعوے کی پشت پر ایک آرزو نہیں بلکہ آرزوؤں کا ایک جمگھٹا تھا۔ جنت میں جانا، عذاب نہ ہونا، اپنے مخالفوں کے لیے جنت سے محرومی اور ان کے لیے عذاب، حساب وکتاب سے اپنی بے نیازی وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے بجائے آرزو کے آرزوئیں ولولے جمع کے لفظ میں لائے۔ اور ان ولولوں کی پشت پر چند خوش فہمیاں کام کررہی ہیں مثلاً یہ کہ ہم اللہ کے چہیتے ہیں، ہم انبیازادے ہیں۔ ہمارے نسب نامے میں بزرگ ترین ہستیاں ہیں۔ یہ بزرگ ہستیاں ہمارے بغیر جنت میں نہ جائیں گی۔ محض بزرگ زادگی اور نسلی ونسبی شرافت کے غرے میں اُن کا دعویٰ تھا کہ جنت بس ہمارا کام الاشہر چکی ہے۔

۳۰۶ ۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے کہ آپ ان سے کہیئے کہ خالی زبانی دعوؤں سے کیا ہوتا ہے۔ اگر حقانیت کے مدعی ہو تو اپنی تائید میں دلیل عقلی یا نقلی پیش کرو۔ یہ بات کہہ کر قرآن نے اہل ایمان کو ایک ایسا قانون بنادیا جو دوسری کسی آسمانی کتاب میں موجود نہیں ہے یعنی یہ کہ کسی کی کوئی بات دین کی زندگی میں خواہ وہ کتنی اچھی ہو بغیر دلیل کے قابلِ قبول نہیں ہے اور صرف دعویٰ کی بنیاد پر کسی بات کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔

جن لوگوں سے قرآن دلیل کا مطالبہ کررہا ہے۔ وہ فکری آزادی اور معاملہ کو دلائل کی کی قوت سے جانچنے کی نعمت سے قطعاً بیگانہ ہیں۔ وہ انسانیت کی فکری نابالغی کے زمانہ کی مخلوق ہیں۔ وہ صرف اسی کے مکلف ہیں کہ جو کچھ کہا جاتا ہے کرو۔ لیکن قرآن نے اپنی دعوت اپنے مخاطبوں کے سامنے یہ کہہ کر پیش کی۔

قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللّٰہ علیٰ بصیرۃ انا و من اتبعنی ۔

اے پیغمبر تم کہہ دو میری راہ یہ ہے کہ میں لوگوں کو اللہ کی طرف بصیرت کی بنا پر بلاتا ہوں۔

اور یہی روش میرے پیروکاروں کی بھی ہے۔

بصیرت کے معنے واضح اور صاف دلیل کے ہیں۔ گویا قرآن نے ھاتوا برھانکم کہہ کر اپنے مخاطبوں کو تعلیم دی ہے کہ ہمیشہ بات کو دلیل کی ترازو میں تول کر قبول کریں۔ قرآن نے ایمانیات اور اعمال

سب کے لیے دلیل کا پیمانہ رکھا ہے۔ ایمانیات میں اللہ کی قدرت، اللہ کا علم، اللہ کی حکمت اور اللہ کی عبادت پر آیات کونیہ سے استدلال کیا ہے اور اعمال میں مصالح اور مفاسد کو اس کی بنیاد قرار دیا ہے۔ یہ قرآن کی دعوت حجت و برہان کا اثر ہے کہ اسلام میں اجتہاد و استنباط کی اجازت ملی ہے۔ جبکہ پہلی اُمتیں ہمیں اس سے محروم نظر آتی ہیں لیکن چونکہ فکرِ انسانی جذبات کا محکوم ہے اس لیے تعقل، تدبر کے ساتھ مشورے کا بھی حکم ہے۔

۳۰۷ ۔ جنت میں صرف وہ شخص جائے گا جو زندگی میں اپنا رُخ اللہ کی طرف رکھے گا۔

اصل ارشاد میں اسلم وجھہ اللّٰہ کے الفاظ ہیں۔ لغت میں اسلام کے معنے اپنے آپ کو کسی کے سامنے جھکا دینے اور ذلیل بنا دینے کے ہیں۔ یہاں دل کے اللہ کے سامنے سراپا نیاز ہونے اور رضائے الٰہی کو مقصود و مطلوب بنانے کو اسلام وجہ کہا ہے۔ وجہ کے معنے چہرہ کے ہیں لیکن محاورے میں اکثر ذات مراد ہوتی ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے اسی حالت کو حضرت ابراہیمؑ کی دُعا میں توجیہہ وجہ یکسو ہو کر رُخ اس کی طرف کر لینا کہا ہے۔ انی وجھت وجھی للذی فطر السمٰوات سے سب سے یکسو ہو کر اپنا رُخ اس اللہ کی طرف کر لیا۔ کیونکہ انسان مقصد کی طرف جب متوجہ ہوتا ہے تو اس کا چہرہ مقصد کی طرف ہوتا ہے۔ یہاں اسلام وجہ سے مراد یہ ہے کہ بندہ اپنے مالک و مولیٰ کے سامنے اس طرح جھک جائے کہ اس کے سوا اس کا رُخ کسی اور طرف نہ ہو۔ یہ جھکنا اور ذلیل ہونا دراصل ایک عمل ہی کا نام ہے۔ اور ایمان دل کی تصدیق کو کہتے ہیں۔ تصدیق اسی طرح دل کا ایک عمل ہے جیسے اقرار زبان کا۔ جب دل کی گہرائیوں میں تصدیق ہوگی تو زندگی کے مختلف گوشوں میں اس کے سامنے جھکنا اور ذلیل ہونا ایک طبعی تقاضا ہوگا۔ مگر باریک سا فرق ہے کہ ایمان ایک علم ہے اور اسلام عمل ہے۔ لیکن یہاں عمل علم کے تابع ہے۔ اس سے ایمان اور اسلام کا باہمی ربط سمجھنے میں آپ کو آسانی ہوگی۔

کیا اسلام بلا ایمان اور ایمان بلا اسلام پایا جا سکتا ہے۔ امام سبکی فرماتے ہیں کہ اسلام اگرچہ ظاہری فرمانبرداری اور طاعت کا نام ہے مگر ایمان باطن اس کے لیے شرط ہے۔ اسی طرح ایمان اگرچہ اندرونی فرمانبرداری کو کہتے ہیں مگر انقیاد ظاہری اس کے لیے ضروری ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان بلا اسلام اور اسلام بغیر ایمان شرعاً معتبر نہیں ہے۔ اتحاف السادۃ المتقین میں علامہ زبیدی نے اس تلازم پر اشاعرہ اور احناف کا اتفاق نقل کیا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن میں ایمان و اسلام یا تو ایک ہی چیز کے دو نام ہیں ورنہ کم از کم لازم و ملزوم ضرور ہیں۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے قرآنِ حکیم کی اس آیت سے ایک لطیف استنباط فرمایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں

کہ اس آیت میں اسلام اور احسان پر جو وعدہ کیا گیا ہے دوسری آیت من امن باللہ والیوم الاخر وعمل صالحا فلھم اجرھم میں بھی وعدہ ایمان اور عمل صالح پر کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایمان و اسلام لازم و ملزوم ہیں۔

ابو طالب مکی نے ایمان و اسلام کے اس باہمی تعلق کو خوب وضاحت سے سمجھایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ایمان و اسلام کی مثال شہادتین جیسی ہے۔ کہنے کو شہادت الوہیت اور شہادت رسالت دو الگ الگ چیزیں ہیں مگر ان میں باہم گہرا تعلق ہے کہ بلحاظ حکم گویا دونوں ایک ہی ہیں۔ رسالت کے بغیر شہادتِ وحدانیت کار آمد نہیں ہوتی اور شہادتِ وحدانیت بلا شہادتِ رسالت کے بیکار رہی ہے۔ ایک شخص کے لیے جس طرح قلب کی ضرورت ہے اسی طرح جسم کی ضرورت بھی ہے۔ نہ کوئی قالب بلا قلب کے زندہ رہ سکتا ہے نہ قلب بلا قالب کے بسر کر سکتا ہے خیمے کے دو حصے ہوتے ہیں ایک اوپر کا کپڑا اور دوسرا اندرونی چوب۔ نہ کپڑا بلا چوب کے تنہا رہ سکتا ہے اور نہ صرف چوب بلا کپڑے کے خیمہ کہلائی جا سکتی ہے۔ صرف اعمالِ ظاہرہ بلا اعتقادِ باطن کھلا ہوا نفاق اور محض اعتقادِ باطن بدونِ اعمال کے کفر کا مظاہرہ ہے۔ اسلام یا ایمان کو اسی وقت معتبر کہا جا سکتا ہے جب کہ اعمالِ ظاہر کے ساتھ تصدیقِ باطن ہو اور تصدیقِ باطن کے ساتھ اعمالِ ظاہر بھی ہوں۔ قرآن نے کفر کو اسلام و ایمان دونوں کا مدِ مقابل قرار دیا ہے۔

کیف یھدی اللہ قوما کفروا بعد ایمانھم

جو لوگ مومن ہونے کے بعد کفر کرتے ہیں اللہ اُن کو ہدایت کیسے دے گا۔

اور

ایامرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون

کیا تم کو وہ مسلم ہونے کے باوجود کفر کا حکم دے گا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان و اسلام ایک دوسرے سے جُدا نہیں ہو سکتے۔

آیت میں اسلم وجھہ للہ سے مراد یہ ہے کہ عابدانہ زندگی میں ہر قسم کی آمیزش سے الگ ہو کر پوری توحید کا قائل ہو۔ زندگی میں اللہ کی طرف چہرہ رکھنا یہ ہے کہ عقائد و اعمال میں پوری فرمانبرداری کرے
۳۰۸
سے۔ اور اس فرمانبرداری کی زندگی میں حسن کار بھی ہو۔ یعنی ایمان و اسلام یا اعتقاد و اعمال میں وہ حسن کار ہو۔ اصل ارشاد میں وھو محسن آیا ہے۔ یہ احسان سے بنا ہے۔ احسان کے معنے ہماری زبان اور محاورے میں کسی کے ساتھ اچھا سلوک کرنے کے ہیں۔ لیکن یہاں جس احسان کا ذکر ہے

وہ اس کے علاوہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے احسان کی یہ تعریف فرمائی ہے،

احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی بندگی اس طرح کرو گویا اس کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگرچہ تم اس کو نہیں دیکھتے ہو تو وہ تو تمہیں دیکھ ہی رہا ہے۔

آیت میں حضورؐ کی اس تشریح کی رُو سے احسان کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے لیے فرمانبرداری کی زندگی افکار و اعمال میں اس طرح کی جائے کہ گویا اللہ سبحانہٗ ہمارے سامنے ہے اور ہماری ہر حرکت و سکون کو دیکھ رہا ہے۔ یعنی اللہ سے زندگی کے سارے گوشوں میں عابدانہ تعلقات اس طرح رکھنا چاہیے کہ وہ قہار و قدوس اور ذوالجلال و جبروت ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور گویا ہم اس کو دیکھ رہے ہیں۔

اسے ایک مثال سے سمجھو۔ غلام ایک تو اپنے آقا کے احکام کی تعمیل اس وقت کرتا ہے جبکہ وہ اس کے سامنے موجود ہو اور اس کو یقین ہو کہ وہ مجھے اچھی طرح دیکھ رہا ہے اور ایک رویہ اس کا اس وقت ہوتا ہے جبکہ وہ آقا کی غیر موجودگی میں کام کرتا ہے۔ عموماً ان دونوں وقتوں کے طرزِ عمل میں فرق ہوتا ہے، اور عام طور سے یہی ہوتا ہے کہ جس قدر دل دھیان اور محنت اور خوبصورتی کے ساتھ وہ آقا کی آنکھوں کے سامنے کام کرتا اور جس خوش اسلوبی سے اس وقت وظائفِ خدمت کو انجام دیتا ہے مالک کی عدم موجودگی اس کا وہ حال نہیں ہوتا۔ یہی حال بندوں کا اپنے مولائے حقیقی کے ساتھ ہوتا ہے جس وقت بندہ یہ محسوس کرے کہ میرا مولا حاضر و ناظر ہے۔ میرے ہر کام بلکہ میری ہر حرکت اور ہر ہر سکون کو دیکھ رہا ہے تو اس کی ایک خاص کیفیت اور اس کی بندگی میں ایک خاص شانِ نیازمندی ہوگی جو اس وقت نہیں ہو سکتی جبکہ اس کا دل اس تصور اور احساس سے خالی ہے تو احسان یہی ہے کہ اللہ کی بندگی اس طرح کی جائے گویا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور ہم اس کے سامنے اور وہ ہمیں دیکھ رہا ہے۔

آیت کا خلاصہ مطلب یہ ہے کہ دین کی رُوح دو چیزیں ہیں

ایک یہ کہ بندہ دل و جان سے اپنے آپ کو اللہ کے سپرد کر دے اس کی اطاعت و فرمانبرداری کو اپنا عقیدہ سمجھے۔

دوسری بات یہ ہے کہ جنت میں جانے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے دل سے تو اللہ کی فرمانبرداری کا ارادہ کرے مگر طاعت و فرمانبرداری کے طریقے اپنی رائے سے بنالے اور اس کے لیے اللہ کے رسُول کی رہنمائی کو نہ اپنائے۔

پہلی بات من اسلم سے اور دوسری ھو محسن سے معلوم ہوتی ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ آخرت کی نجات کے لیے صرف ارادۂ طاعت کافی نہیں ہے بلکہ حسنِ عمل بھی ضروری ہے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ لَيْسَتِ النَّصٰرٰى عَلٰى شَيْءٍ ۖ وَّقَالَتِ النَّصٰرٰى لَيْسَتِ الْيَهُودُ عَلٰى شَيْءٍ ۙ وَّهُمْ يَتْلُونَ الْكِتٰبَ ۗ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِينَ لَا يَعْلَمُونَ مِثْلَ قَوْلِهِمْ ۚ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۱۱۳﴾

اور یہودی[309] کہتے ہیں کہ عیسائیوں کا دین کچھ نہیں اور عیسائی کہتے ہیں کہ یہودیوں کا دین کچھ نہیں ہے۔ حالانکہ اللہ کی کتاب دونوں پڑھتے ہیں۔ اور اسی قسم کی بات[310] ان لوگوں نے کہی ہے جن کے پاس کتاب اللہ کا علم نہیں ہے۔ بس اللہ ہی[311] ان کے اختلاف کا روزِ قیامت فیصلہ فرمائے گا۔

قرآن کی اصطلاح میں حسنِ عمل یہ ہے کہ نبوت کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق ہو۔
لقد کان لکم فی رسول اللہ اُسوۃ حسنۃ۔
اس موقعہ پر مولانا مفتی محمد شفیع صاحب نے یہ خوب فرمایا ہے کہ،
جو شخص ان بنیادی اُصولوں میں سے کسی بھی اُصول کو چھوڑ دے خواہ یہودی ہو یا نصرانی اور یا مسلمان۔ اور پھر محض قومیت کے زعم میں اپنے آپ کو جنت کا ٹھیکیدار سمجھ لے تو یہ صرف اس کی خود فریبی ہے۔ جس کا حقیقت سے دُور کا بھی واسطہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے نزدیک کوئی بھی ان ناموں کا سہارا لے کر نہ قربِ الٰہی حاصل کر سکتا ہے اور نہ مقبول جب تک اس میں ایمان و عملِ صالح کی رُوح موجود نہ ہو۔
اُصولِ ایمان تو تمام انبیاء کا اشتراکی سرمایہ ہے اور ہر نبی کی شریعت میں مشترک ہے۔ البتہ عملِ صالح کی صورتیں بدلتی رہی ہیں۔ زمانۂ تورات میں حسنِ عمل یہ ہے کہ حضرت موسیٰؑ کے اُسوہ کے مطابق زمانۂ انجیل میں حسنِ عمل یہ ہے کہ حضرت عیسیٰؑ کے اُسوہ کے موافق ہو جب کہ زمانۂ قرآن میں حسنِ عمل یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُسوۂ حسنہ کے مطابق ہو۔ ہر نبی کا اُسوہ اپنے زمانہ میں وحی کی اس روشنی پر ہوتا ہے جو اس پر نازل ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰؑ کا اُسوۂ تورات کا نقش ہے حضرت عیسیٰؑ کا اُسوہ انجیل کا عکس ہے اور محمد رسول اللہؐ کا اُسوہ قرآن کی روشنی ہے۔

صداقت کے خلاف بغاوت

یہ بتلانے کے بعد کہ ہر گروہ اپنی پاکبازی، پارسائی اور نجات کا مدعی ہے۔ اب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ ہر گروہ دوسرے کو سچائی سے محروم سمجھتا ہے۔ اور ان میں باہم ایک دوسرے کے خلاف انتہائی تعصب ہے۔ اور صداقت کے خلاف یہ بغاوت اس وقت ہے جبکہ دونوں اللہ سے تعلق کا دم بھرتے ہیں۔ کتاب الٰہی یعنی تورات دونوں کے سامنے ہے بایں ہمہ ان کی بدکرداری کا نتیجہ یہ ہے کہ باہم دگر مخالف اور مکذب جیتے قائم ہو گئے ہیں ہر طبقہ دوسرے طبقہ کو جھٹلا رہا ہے اور ہر ایک صرف اپنے کو نجات کا مستحق سمجھتا ہے۔ یعنی جب اُمتوں کا نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے اور دین کی زندگی چند اوہام اور چند رسوم تک محدود ہو کر رہ جاتی ہے، تو یہ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔ حیرت اس پر ہے کہ وہ ایک خدا اور ایک کتاب کو مانتے ہوئے بھی یہ طرزِ عمل اختیار کیے ہوئے ہیں۔ یاد رہے کہ عہدِ عتیق کو دونوں مانتے ہیں

۳۰۹۔ یہودیوں نے تورات پڑھ کر سمجھ لیا کہ جب نصرانیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو خدا کا بیٹا قرار دیا تو بے شک وہ کافر ہو گئے۔ اور عیسائیوں نے انجیل میں صاف دیکھ لیا کہ یہودی حضرت عیسیٰؑ کی نبوت کا انکار کر کے کافر ہو گئے[1]

اور بعض نے یہی بات اس طرح پیش کی ہے کہ

یہودی قوم عقیدۃً بہر حال موحد تھی، نصرانیت کا شرک اور اس کی تثلیث برداشت ہی نہ کر سکتی تھی۔ اور نہ اس کی قائل ہو سکتی تھی کہ ایسے گھڑے ہوئے دین میں کچھ بھی صداقت ہو سکتی ہے[2]

ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کی صداقت گیری اور حق پسندی کا قرآن اس آیت میں اعلان نہیں کر رہا ہے۔ ان بزرگوں کی تشریح سے یہ تاثر ملتا ہے کہ یہودی عیسائیوں پر کفر کا فتویٰ دیتے اور عیسائی یہودیوں کو بُرا کہنے میں حق بجانب تھے اور ان کا موقف بالکل شرعی اور قانونی طور پر درست تھا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اگر یہودی عیسائیوں کو تثلیث اور شرک کی بنا پر کافر کہتے تھے اور ایسے ہی عیسائی یہودیوں کو انکارِ مسیح اور انکارِ انجیل کی بنا پر کافر کہہ رہے تھے تو ان کا ایسا کہنا قابلِ مدح ہے نہ کہ قابلِ مذمت۔ لیکن قرآن یہاں ان کی مدح سرائی نہیں بلکہ مذمت

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۲ [2] تفسیر ماجدی ص ۴۴

مذمت کررہا ہے۔ ان بزرگوں کی تشریح سے قرآن کی مذمت واضح نہیں ہوتی۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس تشریح کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ

آیت کی یہ تشریح یہودیوں اور عیسائیوں کے موقف کی تصدیق کرتی ہے لیکن قرآن ان کی اس کہنے کی مذمت کررہا ہے۔

آیت کا صاف اور واضح مطلب وھم یتلون الکتاب کی قید سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ خدا کی جانب سے آئی ہوئی سچائی کے دونوں پاس ہے لیکن دونوں نے سچائی سے انحراف کیا ہے۔ اصل کے اعتبار سے دونوں سچے ہیں لیکن عمل کے اعتبار سے دونوں جھوٹے ہیں۔ دونوں کتاب اللہ کے خلاف کررہے ہیں تورات میں آنے والے نبی کی بشارت تھی آیا اور وہ ایمان نہیں لائے اور انجیل تورات ہی کی تکمیل کے لیے آئی تھی۔ لیکن انہوں نے اس کو تورات کا مخالف سمجھ لیا اور اعلان کر دیا کہ آدمی شریعت (تورات) کے اعمال سے نہیں بلکہ صرف یسوع پر ایمان سے راستباز ٹھہرتا ہے۔ دونوں کتابوں میں اصل اور فرع کی نسبت تھی ان کا دین ایک ہی تھا۔ ایک نے اصل کو پکڑ لیا اور دوسرے نے فرع کو۔ ایک نے سارا زور علم پر صرف کر دیا اور دوسرے نے سارا وزن عمل پر ڈال دیا اور حقیقت دونوں کے خلاف ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ دونوں سچائی سے دُور جا نکلے ہیں۔ اور دُور بھی تھوڑے نہیں بلکہ اتنے دُور ہو چکے ہیں کہ موجودہ حالت میں ان میں اور بے کتاب قوموں میں کوئی فرق نہیں رہا ہے۔

۲۱۰۔ اور اسی قسم کی بات ان لوگوں نے کہی ہے جن کے پاس کتاب اللہ کا علم نہیں ہے گویا جہالت اور نادانی میں سب کا وزن برابر ہو رہا ہے۔

یعنی یہود و نصاریٰ ایک دوسرے کو گمراہ جانتے ہیں اسی طرح بُت پرست بھی اپنے سوا سب فرقوں کو گمراہ اور بے دین بتلاتے ہیں۔ اصل ارشاد کذالک قال الذین لا یعلمون ہے یعنی ایسے ہی ان لوگوں نے کہا جو جاہل ہیں ان ہی جیسی بات۔ اس میں تشبیہ کے لیے ایسے ہی اور ان ہی جیسی ڈبل تعبیرات آئی ہیں۔ بعض شارحینِ قرآن نے دوسری کو پہلی کی تاکید بتایا ہے لیکن کچھ شارحین قرآن نے اس میں بھی نکتہ آفرینی فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تشبیہیں دو ہیں اور دونوں الگ الگ ہیں۔ ایک تشبیہ یہ بتانے کے لیے ہے کہ دونوں کی بات میں ہم آہنگی ہے اور دوسری تشبیہ کا منشا یہ ہے کہ جیسے اہلِ کتاب بغیر کسی دلیل کے اپنی اپنی نجات کا محض ہوائے نفس اور عداوت کی بنا پر دعویٰ کر رہے ہیں ایسے ہی مشرکین بھی بے دلیل دعویٰ

کر رہے ہیں۔[1]

یہودیوں اور عیسائیوں کی باہمی تفضیل اور ایک دوسرے کے بارے میں یہ تصور کہ وہ کچھ نہیں۔ اتباعِ ہویٰ اور فسادِ اخلاق کی بدترین مثال ہے۔ اگر یہودی انتظار کے باوجود تورات پڑھ کر حضرت عیسیٰؑ کا انکار کر سکتے ہیں اور اگر عیسائی حضرت مسیحؑ کو مان کر تورات کو پس انداز کر سکتے ہیں تو ان دونوں سے حضور انورؐ کی نبوت کے لیے تصدیق و ایمان کی کیونکر توقع ہو سکتی ہے!

یہودیوں اور عیسائیوں کے اختلاف کی یہ داستان قرآن میں سنانے کا مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنے کے لیے ہے کہ کہیں وہ بھی اسی بیماری میں مبتلا نہ ہو جائیں کہ ایک کتاب، ایک نبی، ایک قبلہ رکھنے کے باوجود اختلاف کے شکار ہو جائیں اور ایک دوسرے کو کافر کہنے لگیں۔ اس پر تفصیلی بحث پارہ ۴ میں آئے گی۔

۲۱۱ف ۔ قرآن نے اس اختلاف کے بارے میں یہ فیصلہ بتلایا ہے کہ بس اللہ ہی روزِ قیامت ان کے اختلاف کا فیصلہ فرمائے گا۔ اس کا وہاں کیا فیصلہ ہوگا اس کا علم اللہ ہی کو ہے۔ لیکن جہاں تک دُنیا میں فیصلے کا تعلق ہے وہ قرآن نے پہلی آیت میں یعنی بلی من اسلم وجھہ للہ وھو محسن میں کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ قرآن کی دعوت اسی اختلاف کو ختم کرنے کے لیے ظہور میں آئی ہے اب تک اصولِ ایمان میں تمام انبیاء یک زبان رہے ہیں لیکن قوموں کے احوال و ظروف کے مختلف ہونے کی وجہ سے شریعت و منہاج میں اختلاف ہوتا رہا ہے۔ اب جب کہ انسانیت کمالِ بلوغ کو پہنچ چکی ہے ضروری ہے کہ دین کا رشتہ بھی علم و عمل میں سب کا ایک ہو۔ سب کی بندگی و نیاز کے لیے ایک ہی معبود کی چوکھٹ ہو اور سب کی گردنوں میں ایک ہی معبود کا رشتہ عبودیت ہو۔ سب کا رب معبود رب العالمین، سب کی کتاب نذیراً للعالمین اور سب کا نبی رحمۃ للعالمین ہو۔ کوئی وطن ہو، کوئی نسل ہو، کوئی قومیت ہو کسی درجے اور کسی حلقہ سے تعلق ہو سب کی نجات کا ضابطہ ایک ہو۔ اگر تم سب نے اس دعوت کو قبول کر لیا تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے تمام دینی اختلافات مٹا دے گا۔ سب کے بچھڑے ہوئے دل ایک دوسرے سے جُڑ جائیں گے۔ سب محسوس کریں گے کہ پوری دُنیا ان کا وطن ہے، ساری نسلِ انسانی ان کا گھرانہ ہے۔

قرآن کریم میں یہودیوں اور عیسائیوں کے اس اختلاف کا ذکر مسلمانوں کو خبردار کر رہا ہے کہ

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۲

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ مَّنَعَ مَسٰجِدَ اللّٰهِ اَنْ يُّذْكَرَ فِيْهَا اسْمُهٗ وَسَعٰى فِىْ خَرَابِهَا ؕ اُولٰٓئِكَ مَا كَانَ لَهُمْ اَنْ يَّدْخُلُوْهَآ اِلَّا خَآئِفِيْنَ ؕ لَهُمْ فِى الدُّنْيَا خِزْىٌ وَّلَهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿۱۱۴﴾

اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہے؟ جو مساجد میں اللہ کے نام کی یاد کو روکے اور ان کی بربادی میں کوشاں رہے۔ ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ خدا کی عبادت گاہوں میں قدم نہ رکھیں اور اگر وہاں جائیں بھی، تو ڈرتے ہوئے جائیں۔ اُن کے لیے دُنیا میں رُسوائی ہے اور آخرت میں عذابِ عظیم ہے۔

کوئی شخص محض دعوے سے مسلمان نام درج کرانے سے یا مسلمان زادگی یا مسلمانوں کے شہر میں پیدا ہونے سے یا مسلمان قوم کا فرد ہونے سے مسلمان نہیں بنتا بلکہ مسلمان ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں اسلام و احسان دونوں موجود ہوں۔

عبادت گاہوں میں اللہ کو یاد کرنے پر قدغن

اس سے پہلی آیت میں یہود و نصاریٰ کی نظریاتی کشمکش کا تذکرہ کیا تھا اور بتایا کہ نظریاتی طور پر ایک خدا کے پرستار ہونے اور ایک کتاب سے وابستہ ہونے کے باوجود ان میں اتنے فاصلے ہیں کہ ایک دوسرے کی دینی حیثیت کو بھی باہم یہ کہہ کر چیلنج کرتے ہیں کہ یہودیوں کے پاس کیا دھرا ہے اور عیسائیوں کا دین کچھ نہیں ہے۔ ان میں سے ہر ایک نظریات کے لحاظ سے اپنی سچائی کا مدعی ہے۔ یہی نظریاتی کشمکش ترقی کر کے عملی زندگی میں اس حد تک پہنچ گئی ہے کہ ان کی عبادت گاہیں تک الگ الگ ہو گئی ہیں۔ اور باوجودیکہ دونوں ایک خدا کے نام لیوا اور ایک شریعت کے حامل ہیں لیکن ممکن نہیں ہے ایک یہودی مذہب کا پیرو عیسائی کی بتائی

ہوئی عبادت گاہ میں جاکر اللہ کا نام لے سکے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ ان میں سے ہر گروہ صرف اپنی عبادت گاہ کو اللہ کی عبادت گاہ سمجھتا ہے۔ دوسرے گروہ کی عبادت گاہ کا اس کی نظروں میں کوئی احترام نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس سے بڑھ کر اور ظلم کیا ہو سکتا ہے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کی یاد سے روکا جائے اور صرف اس لیے روکا جائے کہ اس سے نظریاتی اختلاف ہے۔ یا ایک عبادت گاہ کو ڈھا دیا جائے اور اس لیے ڈھائی جائے کہ وہ ہماری بنائی ہوئی نہیں ہے۔ اس آیت میں اُن کی اسی انتہا پسندی کا تذکرہ ہے۔ جن لوگوں کی طبیعتیں آیاتِ قرآنی کے مطالب کے لیے پس منظر کی تلاش و جستجو کی خوگر ہو چکی ہیں۔ وہ اس آیت کی تشریح میں مختلف ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ بخت نصر نے بیت المقدس حملہ کیا اور عیسائیوں نے بخت نصر کی مدد کی تھی اور یہ کہتے ہوئے جیسا کہ ابوبکر الجصاص نے لکھا ہے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ بخت نصر کلدانی شہنشاہ کا وجود ہی ۵۸۶ء قبل مسیح ہے۔ ابھی عیسائیوں کا وجود ہی نہ تھا وہ اس کا ہاتھ بٹانے کہاں سے آ گئے۔ اور کوئی کہتا ہے ٹائیٹس رومی کے زمانے میں رومی مشرکین نے یہودیوں کو بیت المقدس سے روک دیا تھا اور کسی کی رائے ہے کہ آیت کا تعلق مشرکینِ مکہ سے ہے۔ انہوں نے حضورِ انورؐ اور صحابہؓ کو حدیبیہ کے عمرہ میں مکہ سے روک دیا تھا اور کسی نے پسِ منظر سے ہٹ کر آیت کو پیشِ منظر سے وابستہ کرنے کی کوشش کی کہ اس میں آئندہ ہونے والے واقعہ کا ذکر ہے کون سا واقعہ؟ کسی نے بتایا کہ عیسائیوں کے ہاتھوں مسجدِ اقصیٰ کی اس تباہی کا ذکر ہے جو مسلمانوں کے زمانے میں ہوئی اور کسی نے قرامطہ کے حادثہ سے آیت کا ناطہ جوڑ دیا۔ حالانکہ آیت یہودیوں اور عیسائیوں کی عملی زندگی میں افتراق کے مظاہر و نقوش پیش کرنے کے لیے آئی ہے اور بتانا صرف یہ ہے کہ ان کی نظریاتی کشمکش کا ان کی عملی زندگی میں ظہور ہو رہا تھا۔

۳۱۲ ۔ اس کے شانِ نزول نصاریٰ ہیں کہ انہوں نے یہود سے مقابلہ کر کے تورات کو جلایا اور بیت المقدس کو خراب کیا۔ یا مشرکین مکہ کہ انہوں نے مسلمانوں کو محض تعصب و عناد سے حدیبیہ میں مسجد حرام میں جانے سے روکا تھا۔ باقی جو شخص کسی مسجد کو ویران کرے وہ اسی حکم میں داخل ہے۔[1]

حضرت شیخ الہندؒ کی یہ تشریح ان ہی روایات کی بنا پر ہے جو مفسرین نے شانِ نزول کے نام پر اس آیت کے تحت درج کی ہیں۔ ورنہ آیت اپنی تشریح میں کسی روایت کی

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۲

محتاج نہیں ہے۔ آیت کے مطالب اپنے سیاق و سباق سے بالکل واضح اور صاف ہیں۔
بہرحال حکم عام ہے سببِ نزول کچھ بھی ہو حکم کو کسی خاص مسجد یا خاص زمانہ سے مخصوص کرنا دُرست نہیں ہے۔ یہاں مساجد کا لفظ جمع کی صورت میں آیا ہے اس میں جمعیت کے معنے اسی وقت باقی رہ سکتے ہیں جب یہ حکم عام ہو۔ ابوبکر ابن العربی نے یہ بات بڑی اچھی لکھی ہے کہ مساجد کا لفظ جمع ہے اس میں کسی مسجد یا کسی زمانہ کی قید لگانا محال ہے۔ یہاں قرآن میں مساجد اپنے لغوی معنے میں سجدہ گاہ یا عبادت گاہ کے معنے میں ہے عمارت کی وہ خاص قسم جس کا نام مسجد ہے اس کا اطلاق قرآن میں مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ پر ہوا ہے۔ ان دو کے علاوہ باقی تمام مسجدوں کو مساجد ہی کے نام سے پکارا ہے۔ یہاں قرآن نے مساجد اللہ کی تعبیر اختیار کر کے اس طرف اشارہ کر دیا کہ جس جگہ کو مسجد بنا دیا جائے اس کے مسجد ہونے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ اس سے بندوں کے مالکانہ حقوق منقطع ہو جائیں۔ پاتال سے لے کر عنانِ سما تک اس کی ملکیت کا کوئی دعویدار نہ ہو۔ ایک دوسرے موقعہ پر ان المساجد اللہ کی تعبیر بھی آئی ہے۔ اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ اللہ کے علاوہ کسی کی ملک نہ ہو۔ دُنیا اور دُنیا کی ہر چیز اللہ سبحانہ کے قبضہ قدرت میں ہے اور سب کا وجود اسی کی شانِ تدبیری کا مظہر ہے۔ دُنیا کا کوئی ذرہ ایسا نہیں ہے کہ اللہ کا نہیں ہے لیکن جس کو اللہ خود فرماتے کہ یہ "میرا" ہے۔ اس کی قسمت کے کیا کہنے ہیں۔ اس کی عزت و قبولیت اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہے۔ انہی میں یہ جگہیں بھی ہیں جن کو ہم مسجد کے مختصر لفظوں سے تعبیر کرتے ہیں۔ ان کی اضافت اللہ نے اپنی طرف فرمائی ہے۔ یہ اضافت شرف و اختصاص کا کام بھی دیتی ہے اور مِلک کا بھی۔ اضافت چونکہ مِلک کو ظاہر کرتی ہے اس لیے اس سے تمام مخلوقات کے مالکانہ حقوق منقطع ہو کر صرف اللہ کا حق ملکیت باقی رہتا ہے اور اضافت چونکہ شرف و اختصاص کے لیے ہے اس لیے مساجد کا احترام مساجد کا ادب اس کا ناگزیر تقاضا ہے۔ احترامِ مسجد میں جہاں اور باتیں ہیں ان میں یہ بھی ہے کہ مسجد میں جو مال لگایا جائے وہ پاک اور حلال کمائی کا ہو۔ مالِ حرام اپنا ایک اثر رکھتا ہے جو کبھی نہ کبھی فتنہ و فساد کا مرکز بن جاتا ہے جیسے زہر اگر فوری طور پر کچھ نہ بھی کرے تو بھی مطمئن نہ رہنا چاہیے۔ پھر یہ مال جب مسجد جیسی مقدس جگہ پر صرف ہو رہا ہو — یہ دربارِ الٰہی ہے اور اس کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے۔ اس میں ناپاک کی ذرہ برابر گنجائش نہیں ہے۔ حدیث میں ہے ان اللہ طیب لا یقبل الا الطیب

مالِ حرام کہیں بھی جائز نہیں ہے پھر مسجد میں اگر کوئی لگاتا ہے تو وہ دین پر ظلم کرتا ہے۔
اور مساجد اللہ کی تعبیر سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ دنیا کی تمام مساجد آدابِ مسجد کے لحاظ سے مساوی ہیں جیسے مسجدِ حرام کی بے حرمتی ظلم عظیم ہے اسی طرح دوسری تمام مساجد کے متعلق بھی یہی حکم ہے۔ اگرچہ تین مساجد مسجدِ حرام، مسجدِ اقصیٰ اور مسجدِ نبوی کا خاص شرف اپنی جگہ مسلم ہے لیکن حرمت اور ادب کے معاملہ میں سب مساجد مساوی ہیں۔[1]

خاص طور پر قرآن میں ظلم جس بات کو کہا ہے وہ مساجد میں اللہ کو یاد کرنے سے روکنا ہے۔ اس سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مساجد کا مقصد وجود اللہ کا ذکر ہے۔ حدیث میں ہے انما بنی المسجد لذکر اللہ مسجد تو ہے ہی اللہ کو یاد کرنے کے لیے

مسجد کے داخلہ میں اذن عام نہ ہونا بھی روکنے کے مفہوم میں داخل ہے۔ غالباً اسی بنا پر اسلام کے قانون دان طبقہ نے اذن عام کو مسجد کے مسجد ہونے کی شرط بتایا ہے۔ آیت میں منع فعل متعدی ہے جس کے دو مفعول ہیں، مساجد اللہ اور ان یذکر اللہ، معنے یہ ہوں گے کہ ذکر اللہ سے مسجد میں روک دیا جائے۔ لہٰذا اگر مسجد کے سامان اور اسباب ضائع ہونے کا اندیشہ ہو تو مسجد کا دروازہ بند کرنا اس ممانعت میں داخل نہیں ہے۔ فقہا اور محدثین دونوں اس کے قائل ہیں لیکن اوقاتِ نماز میں دروازہ کھلا رکھا جائے گا کیونکہ اس وقت بند کرنا اللہ کو یاد کرنے سے روکنے کے مترادف ہے۔ چوری کے خوف سے دروازہ بند کرنا بُرا نہیں ہے اور اس آیت کے تحت میں داخل نہیں ہے کیونکہ وہاں ذکر سے روکنا ہے اور یہ ذکر سے روکنا نہیں بلکہ چوری سے روکنا ہے۔

یہاں ایک سوال یہ بھی ہے کہ ابوداؤد میں حدیث ہے کہ
'اپنی عورتوں کو مسجد سے نہ روکو، البتہ ان کے گھر ان کے لیے بہتر ہیں'

بلاشبہ آغازِ اسلام میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہیں روکا تھا اور عورتیں زمانۂ نبوت میں مسجد میں باجماعت نماز پڑھتی تھیں، عیدین کے موقعہ پر ان کو عیدگاہ بھی جانے کا حکم ہوا تھا۔ مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان سے اظہارِ شوکت شاید مقصود تھا تاکہ مسلمانوں کی تعداد کا مظاہرہ ہو مگر وہ علت اب نہیں ہے۔ اگر تمام

---

[1] معارف القرآن ج ش ص ۲۴۲

احادیث کو پیش نظر رکھ کر آپ غور کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ حضور انورؐ نے ترغیب اس کی ہی دی ہے کہ عورتوں کا مسجد نہ جانا بہتر ہے۔ اجازت کے ساتھ یہ اعلان بھی نبوت نے کیا تھا کہ

"عورت کی نماز اندر گھر میں دالان کی نماز سے بہتر ہے اور عورت کی نماز گھر کی بخاری میں گھر کے کمرے سے افضل ہے" (ابوداؤد)

اس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ عورت کی وہی نماز بہتر ہے جو زیادہ پردے میں ہو۔

دراصل اس موضوع پر دو قسم کا روکنا آمنے سامنے ہو گیا ایک اللہ کی یاد سے روکنا اور دوسرے اس برائی سے روکنا جو معاشرے میں عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے جنم لیتی ہے۔ پہلی بات ایک مصلحت ہے جبکہ دوسری بات ایک مفسدہ ہے اور ایسے مواقع پر جہاں مصلحت اور مفسدہ کا آمنا سامنا ہو جائے، برائیوں کو دور کرنا قرآن کی نظر میں مقدم ہے کیونکہ یہ تقویٰ ہے۔ اس بنا پر افضل یہی ہے کہ عورت گھر میں نماز پڑھے۔ اب یہ دوسری بات ہے کہ عورتیں افضل کو ترک کر دیں اور غیر افضل پر عمل کریں۔ یہ اگرچہ بہتر نہیں ہے مگر چونکہ مسجد خانہ خدا ہے اور وہ دربار الٰہی میں اللہ کی یاد کی خاطر جا رہی ہے اس لیے اسے روکا کیونکر جائے۔ اسی وجہ سے فرمایا،

لاتمنعوا النساء کم المساجد و بیوتهن خیر لهن

عورتوں کو مساجد سے نہ روکو لیکن ان کے گھر ہی ان کے لیے بہتر ہیں۔

مسئلہ صاف ہو کر سامنے آگیا کہ گو ان کو ذکرِ الٰہی کی خاطر مساجد میں آنے سے روکا نہیں جا سکتا مگر معاشرتی مفاسد کی خاطر ان کے حق میں بہتر یہی ہے کہ گھر میں نماز پڑھیں۔ عقلی طور پر بھی یہ بات سمجھی جا سکتی ہے۔ سب جانتے ہیں کہ ماہ میں چند دن عورتوں پر ایسے گزرتے ہیں جن میں ان کو نماز پڑھنے کی اجازت نہیں ہے ان دنوں یہ مسجد کی حاضری سے معذور ہے اور یہ دن عورت کے لیے راز کے دن ہوتے ہیں۔ کوئی شریف عورت اس راز کو ظاہر کرنا گوارا نہیں کرتی اور مسجد کی حاضری میں اس راز کا کھل جانا یقینی ہے۔

اور پھر اللہ کے پیغمبرؐ نے عورتوں کو مسجد میں آنے کا غیر مشروط پروانہ نہیں دیا ہے بلکہ عورت کے مسجد میں آنے پر کچھ شرطیں بھی لگا دی ہیں

اوّل یہ کہ بناؤ سنوار کر کے مسجد نہ آئیں، ابوداؤد میں ہے

عورتیں مسجد میں آئیں تو بے زینت ہو کر آئیں

دوسرے یہ کہ خوشبو لگا کر نہ آئیں۔ مسلم میں ہے

جب تم میں سے کوئی عورت مسجد میں آئے تو خوشبو نہ لگائے۔

ان شرائط کے ساتھ اجازت ہونا خود اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کی حد تک نبوت کے پیشِ نظر مسجد میں آکر خدا کو یاد کرنے کی مصلحت کے مقابلے میں اس مفسدہ کی زیادہ اہمیت ہے جو معاشرہ میں عورتوں اور مردوں کے اختلاط سے رونما ہوتا ہے۔

شاید حضرت عائشہ صدیقہؓ نے جو نبوت کے مزاجِ قانون کی بہت زیادہ رازداں ہیں آپؐ کے فوراً بعد اس مفسدہ کو محسوس کر لیا اور فرمایا کہ

جو اطوار و حالات عورتوں میں رونما ہو گئے ہیں اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مشاہدے میں آتے تو بلاشبہ بنی اسرائیل کی عورتوں کی طرح اپنی امت کی عورتوں کو بھی مسجد آنے سے روک دیتے۔ (صحیح مسلم ج ۱ ص ۱۸۳)

حضرت عائشہ کا یہ تاثر غالباً اموی دورِ حکومت کے بارے میں ہے کیونکہ حضرت عائشہ کا سالِ وفات ۵۸ھ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عائشہؓ کی نظر مصلحت پر نہیں بلکہ اس مفسدہ پر تھی جس کا مشاہدہ خود انہوں نے امویوں کے دورِ حکومت میں کیا۔ اور فقہاء صحابہؓ میں جن کی نظر میں مصلحت کا وزن زیادہ تھا وہ عورتوں کو مسجد میں جانے سے نہ روکتے تھے۔ چنانچہ عاتکہ بنت زید سے حضرت عمرؓ نے اپنی شادی کے لیے رشتہ بھیجا تو عاتکہ نے شادی کے لیے یہ شرط پیش کی کہ ہمیں مسجد جانے سے نہ روکا جائے۔ روایات میں تصریح ہے کہ حضرت عمرؓ اس شرط پر بکراہت تیار ہوئے۔ حضرت عمرؓ کے انتقال کے بعد عاتکہ بنت زید نے حضرت زبیرؓ سے نکاح کیا اور ان کے ساتھ بھی یہی شرط پیش کی وہ راضی تو ہو گئے لیکن ایک دوسری ترکیب سے انہوں نے عاتکہ کا مسجد جانا بند کر دیا۔ حضرت عاتکہ کا نکاح کے ساتھ ایسی شرط کرنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ حضور انور کے صحابہ میں جو قانون کے مزاج سے واقف تھے وہ عموماً اپنی عورتوں کو مسجد میں جانے سے روکتے تھے۔ فقہاء نے صحابہ کرام کے فیصلہ ہی کے پیشِ نظر لکھا ہے کہ عورتوں اور خصوصاً جوان عورتوں کو مسجد میں نہ جانا چاہیے۔

جن احادیث میں مسجد جانے کی اجازت کا ذکر ہے۔ ان کا درجہ اجازت اور رخصت کا ہے حکم اور عزیمت کا ہرگز نہیں ہے۔ ارشاد ہے

جب تم میں سے کسی کی بیوی مسجد جانے کی اجازت مانگے تو اس کو منع نہ کرو۔

یہاں بھی عورت کو مسجد جانے کی جو اجازت ملی ہے اسی انداز میں ملی ہے۔ یہ کہیں نہیں

ہے کہ ان کو بھی مسجد میں آنے کا حکم ہے اور تم اسے مسجد جانے پر مجبور کرو بلکہ عموماً اجازت دی ہے تو اسی طرح کہ جب وہ تقاضا کریں تو ان کو روکا نہ جائے۔ چونکہ یہ حق ایک شرعی حق بن جاتا ہے اس لیے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے زبردستی ان کو روکنا نہیں چاہا مگر مشورہ یہی دیا ہے کہ نہ جائیں تو اچھا ہے بلکہ نہ جانے کی ترغیب بھی دی ہے۔ اجازت کی حدیث کو سامنے رکھ کر جن علماء نے عورت کو مسجد جانے کا پروانہ دیا ہے انہوں نے بھی متعدد قیدیں لگا دی ہیں۔

امام نووی رحمۃ اللہ علیہ لکھتے ہیں،

عورتوں کو مسجد میں جانے سے اس وقت نہ روکا جائے جب کہ وہ ان قیود و شرائط کی پابندی کریں گی جو احادیث میں مذکور ہیں۔ مثلاً کپڑوں میں خوشبو نہ لگائیں، بن سنور کر نہ نکلیں۔ ایسا پازیب جس سے آواز پیدا ہو نہ پہنیں۔ مردوں سے اختلاط نہ ہونے پائے۔ جوان نہ ہو جس سے کسی طرح کے فتنہ کا اندیشہ ہو اور ہر طرح کے مفسدہ سے بے خوف ہوں۔[1]

الغرض آیت سے ممانعت کے مفہوم میں عورتوں کو مسجد میں جانے کی ممانعت داخل نہیں ہے۔ چونکہ آیت کا اصل مقصود یہ ہے کہ مساجد میں اللہ کی یاد سے روکنا سب سے بڑا ظلم ہے۔ اس سے اللہ کی یاد سے مساجد میں روکنے کی تمام صورتیں اس آیت کی رُو سے ناجائز و حرام ہوں گی۔ چاہے یہ رکاوٹ بالذات ہو یا بالواسطہ۔ بالذات تو روکنا یہی ہے کہ کسی کو مسجد جانے سے یا مسجد میں اللہ کو یاد کرنے سے روکا جائے۔ اور بالواسطہ یہ کہ مسجد میں شور و شغب کر کے نمازیوں کی نماز میں خلل ڈالا جائے یہ بھی مسجد میں ذکر اللہ سے روکنے کے مفہوم میں داخل ہے۔ اس کی چند مثالیں سن لیجیے۔

گم شدہ کی تلاش

اسی بنا پر گم شدہ چیز کی تلاش کا اعلان مسجد میں جائز نہیں ہے کہ یہ مسجد کی مقصدی رُوح کے منافی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

جو شخص کسی کو سنے کہ وہ مسجد میں گم شدہ چیز کی تلاش کر رہا ہے تو چاہیے

---

[1] شرح مسلم النووی ج ۱ ص ۱۸۳

کہ کہہ دے کہ خدا کرے تجھے نہ ملے۔ کیونکہ مسجد اس کام کے لیے نہیں بنائی گئی ہے[1]
اس حدیث میں صرف گم شدہ چیز کی تلاش ہی کو نہیں روکا ہے بلکہ اس میں اس پر زجر و توبیخ بھی ہے اور ساتھ ہی اس کی وجہ بھی بتادی ہے۔ اس زمانہ میں خصوصیت سے اس ارشادِ نبوت کا مفہوم عام مسلمانوں کے ذہن نشین ہو جانے۔ لیکن اس وقت کوئی حرج نہیں جب چیز مسجد ہی میں گم ہو جائے۔ باقی جو چیز مسجد سے باہر گم ہوئی ہے اس کا اعلان اور اس کی تلاش کسی طرح مسجد میں مناسب نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کسی کو مسجد میں گم شدہ چیز تلاش کرتے دیکھو تو کہو — وہ تجھے نہ ملے جس کام کے لیے مسجد بنائی گئی ہے اسی کے لیے ہے[2]

شعر خوانی

مسجد میں بالواسطہ ذکرِ الٰہی سے روکنے کی ایک صورت مسجد میں اشعار کا پڑھنا ہے۔ حدیث میں ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مساجد میں اشعار پڑھنے اور خرید و فروخت سے منع فرمایا ہے۔ (ابوداؤد باب المساجد)

معلوم ہوا کہ مسجد میں خرید و فروخت کی بھی اجازت نہیں کہ اس سے مسجد کے مقصودِ اصلی، یذکر فیہا اسمہ، میں رکاوٹ ہوتی ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ امام اعظمؒ کی قانونی نکتہ سنجی نے جو یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ مسجد میں بلند آواز سے قرأتِ قرآن اور ذکر بالجہر جائز نہیں ہے تو اس کی بنیادی طور پر قرآن کی یہی آیت ہے یعنی یہ بھی چونکہ ایک ذریعہ ہے مسجد میں لوگوں کو یادِ الٰہی سے روکنے کا اس لیے ناجائز ہے۔

بچوں اور پاگلوں کی ممانعت

بچے اور دیوانے دونوں کو مسجد میں آنے کی ممانعت ہے ارشاد ہے،
اپنے مسجدوں کی حفاظت کرو بچوں اور پاگلوں سے

---

[1] [2] مسلم ج ۱ ص ۲۱۰

اس کا پس منظر بھی اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عقل سے بیگانہ ہونے کی وجہ سے یہ شور و شغب کریں گے اور ان کی ہنگامہ آرائی لوگوں کو یادِ الٰہی سے روکنے کا ذریعہ بن جائے گی۔

اسی بنا پر حدود کا اجراء بھی مسجد میں ناجائز ہے۔ ابن ماجہ میں اس موضوع پر مستقل عنوان ہے اور اس عنوان کے تحت انہوں نے دو ارشادِ نبوت پیش کیے ہیں کہ مسجدوں میں حدود نہ قائم کیے جائیں۔ اور ــــ مسجد میں سزا کے کوڑے لگانا بھی منع ہے۔ بلکہ اسی بنا پر مسجد میں جھگڑا کرنا، کھلا ہتھیار لے کر چلنا، ہتھیار کو تیز کرنا، مسجد کو راستہ بنانا منع ہے ابن ماجہ میں ارشادِ نبوت ہے:

> چند چیزیں مسجد میں کرنے کی نہیں ہیں۔ اس کو نہ راستہ بنایا جائے نہ ان میں ہتھیار تیز کیے جائیں، نہ کمان پکڑی جائے، نہ تیر پھیلائے جائیں، نہ کچا گوشت لے کر گزرا جائے نہ حد ماری جائے، نہ قصاص لیا جائے اور نہ اسے بازار بنایا جائے۔

مفاسد سے بچنے کی خاطر ممانعت

جن لوگوں کا نامسلمان ہونا ثابت ہو جائے اور بالخصوص وہ لوگ جو دین کی کھلی حقیقتوں کا انکار کر کے مسلمانوں سے کٹ چکے ہوں۔ ان کو مساجد میں آنے سے روکنا اس آیت کی زد سے باہر ہے۔ اس لیے کہ معاشرہ کو مفاسد سے محفوظ رکھنا خود مقصودِ قرآن ہے۔ قرآن کی زبان میں مفاسد ہی کو منکر اور فتنہ کہا جاتا ہے۔ اگر ایک طبقہ اپنی نمایاں خصوصیات کی وجہ سے مساجد میں فتنہ و فساد کا باعث ہوتا ہے تو اس مفسدہ کو ختم کرنا مقدم ہوگا اور اس کی اولین حیثیت ہوگی۔ حافظ ابن کثیرؒ نے تفسیر میں اور علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں "ابن ابی حاتم اور طبرانی کی اوسط کے حوالہ سے عبداللہ بن عباسؓ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ

> ایک جمعہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے۔ اٹھتے ہی آپؐ نے نام لے کر کہا کہ کھڑے ہو جاؤ، مسجد سے نکل جاؤ تم منافق ہو۔ اس طرح آپؐ نے متعدد آدمیوں کو نام لے کر پکارا اور مسجد سے نکال دیا۔

اور بعض روایات میں ان کی تعداد بھی ۳۶ بتائی ہے۔ اس لیے ایسے لوگوں کو مساجد میں آنے سے روک دینا اس آیت کے خلاف نہیں ہے۔ سید انور شاہؒ اپنے دور کی علم میں ایک مثالی شخصیت ہیں۔ اکفار الملحدین میں اپنا واقعہ لکھتے ہیں کہ ایک بار میرے سے ایک ملحد نے کہا ہمارا تو اس قرآن

پر ایمان ہے جس میں یہ آیت ہے۔

من اظلم ممن منع مساجد اللہ ان یذکر فیھا اسمہ

شاہ صاحب نے فوراً جواب دیا کہ جی ہاں ہم بھی اس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں جس میں یہ آیت ہے ومن اظلم ممن افتری علی اللہ کذبا او قال اوحی الی ولم یوح الیہ شیء

اس سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے یا کہے کہ میرے پاس وحی آتی ہے حالانکہ اس کے پاس وحی نہیں آتی۔

تمام منافقین، تمام ملحدین اور تمام زنادقہ کا یہی حکم ہے۔

۲۱۳

۵ - اور ان کی بربادی میں کوشاں ہیں۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ جیسے مسجد کی آبادکاری دو طرح سے ہوتی ہے کہ ایک حسی دوسرے معنوی۔ حسی یہ کہ مسجد بنائی جائے اور معنوی یہ کہ مسجد میں حاضری دی جائے۔ ایسے ہی مسجد کی بربادی بھی دو قسم کی ہوتی ہے۔ حسی یہ کہ اس کو منہدم کر دیا جائے۔ یہ مسجد کی ظاہری تخریب ہے اور معنوی یہ کہ اس میں عبادت اور ذکر اللہ پر قدغن لگادی جائے۔ یہ مساجد کی معنوی تخریب اور باطنی ویرانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مساجد کو ویران کرنا سب کے نزدیک بُرا کام ہے لیکن یہود و نصاریٰ اس بُرائی میں کھلم کھلا مبتلا ہیں۔

فقہا نے لکھا ہے کہ جس طرح اللہ کے ذکر سے مسجد آباد ہوتی ہے۔ ممنوعات اور بدعات سے مساجد کی بربادی ہوتی ہے اور وہ تمام اُمور جو نمازیوں کی اور مسجد کی ویرانی کا باعث ہوں اس آیت میں داخل ہوں گے۔[1]

مسجد کی ویرانی کی جتنی صورتیں ہیں سب حرام ہیں۔ اس میں جس طرح کھلے طور پر مسجد کو منہدم کرنا داخل ہے اسی طرح ایسے اسباب پیدا کرنا بھی اس میں داخل ہے جن کی وجہ سے مسجد ویران ہو جائے اور مسجد کی ویرانی یہ ہے کہ وہاں نماز کے لیے لوگ نہ آئیں یا کم ہو جائیں۔ کیونکہ مسجد کی تعمیر و آبادی دراصل در و دیوار یا ان کے نقش و نگار سے نہیں بلکہ ان میں اللہ کا ذکر کرنے والوں سے ہے۔

اسی لیے حدیث میں ہے کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قرب قیامت میں مسلمانوں کی مسجدیں بظاہر آباد ہوں گی مگر واقع میں برباد ہوں گی کہ ان میں حاضر ہونے والے نمازی کم ہو

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۵۴

جائیں گے [۱]

۱۳۱ؔ - ایسے لوگ اس قابل ہیں کہ اللہ کی عبادت گاہ میں قدم نہ رکھیں۔ یعنی ان کے لائق یہی تھا کہ مساجد میں خوف و تواضع اور ادب و تعظیم کے ساتھ داخل ہوتے۔ بے حرمتی صریح ظلم ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اس ملک میں حکومت اور عزت کے ساتھ رہنے کے لائق نہیں ہیں چنانچہ یہی ہوا کہ ملک شام اور مکہ اللہ نے مسلمانوں کو دلوا دیا۔ اور وہ دُنیا میں مغلوب ہوئے قید میں پڑے [۲]

مطلب یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ عبادت گاہیں اس قسم کے ظالم لوگوں کے قبضہ و اقتدار میں ہوں اور یہ ان کے متولی ہوں۔ ہونا چاہیے کہ خدا ترس لوگوں کے ہاتھ میں اقتدار ہو اور وہی عبادت گاہوں کے متولی ہوں تاکہ یہ شریر لوگ اگر وہاں جائیں بھی تو انہیں خوف ہو کہ شرارت کریں گے تو سزا پائیں گے۔ یہاں ایک لطیف اشارہ کفار مکہ کے اس ظلم کی طرف بھی ہے کہ انہوں نے اپنی قوم کے ان لوگوں کو جو اسلام لا چکے تھے بیت اللہ میں عبادت کرنے سے روک دیا تھا [۳]

مسجد کے آداب

اس آیت میں ان یدخلوھا الا خائفین کی تعبیر میں بڑی گہری معنویت ہے۔ اس سے یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مسجد کی عظمت کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں جو شخص بھی داخل ہو ہیبت و عظمت اور خشوع کی کیفیت کے ساتھ داخل ہو۔ مسجد جاتے ہوئے یہ خیال رہے کہ ہم مالک الملک کے گھر جا رہے ہیں اس لیے رفتار میں پورا وقار، اعتدال اور سکینت نمایاں ہو۔ ایسی رفتار ہرگز اختیار نہ کی جائے جس سے دیکھنے والا ہلکا پن محسوس کرے اور عام نظروں میں مضحکہ خیز ہو۔ نگاہ نیچی دل میں محبت و خشیت اور اُمید و بیم کی کیفیت طاری ہو۔ چہرے پر تواضع اور خوف کے آثار ظاہر ہوں۔ ارشادِ نبوت ہے کہ

جب تم اقامت سنو تو نماز کے لیے اس طرح آؤ کہ تم پر سکینت و وقار ہو اور دوڑو مت!

---

[۱] معارف القرآن م ش ص ۲۴۲ [۲] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۲ [۳] تفہیم القرآن ص ۱۰۴

وَلِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا
فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ اِنَّ اللّٰهَ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ

اور دیکھو مشرق اور مغرب اللہ ہی کے لیے ہے[۳۱۵]، جہاں کہیں بھی تم رُخ کرو گے اللہ کی ذات وہیں ہے۔ بلاشبہ اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے[۳۱۶]

عبادت میں قبلہ پر اختلاف

ان کے نظریاتی اختلاف کے نتیجے میں عمل میں اختلاف کا ایک مظاہرہ عبادت گاہوں کی صورت میں پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اس آیت میں ایک دوسرا مظہر پیش کیا جا رہا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں ایک شریعت کو ماننے کے باوجود قبلوں کا بھی اختلاف تھا۔ آگے چل کر تحویلِ قبلہ کے مسئلہ میں آپ یہ تصریح پڑھیں گے «ما بعضهم بتابع قبلة بعض» ان میں سے ایک گروہ دوسرے کے قبلہ کو نہیں مانتا ہے۔ یہود کا قبلہ بیت المقدس تھا جبکہ عیسائی کسی سمت یا مکان کو نہیں بلکہ سمتِ مشرق کو قبلہ بنائے ہوئے تھے اور عجب نہیں کہ اس وقت اندرونی اختلافات اور بھی ہوں۔ نسفی نے مدارک میں، زمخشری نے کشاف میں، شوکانی نے فتح القدیر میں تصریح کی ہے کہ ان میں باہم قبلہ کے موضوع پر اختلاف تھا اور سب کی تصریحات سے مقدم قرآن کی تصریح ہے۔ یہ بھی یاد رہے کہ مدینہ میں بیت اللہ یعنی خانہ کعبہ مشرق و مغرب میں نہیں بلکہ مشرق و مغرب کے درمیان یعنی جنوب واقع تھا جب کہ بیت المقدس مغرب میں تھا۔ شوکانی نے لکھا ہے «وهو فى جهة الغرب» یعنی مغرب میں بیت المقدس تھا۔ اور اس کی تائید ترمذی کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو بحوالہ ابوہریرہؓ ان الفاظ میں آئی ہے کہ حضور انورؐ نے فرمایا کہ «ما بين المشرق والمغرب قبلة» مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ سمت پرستی دونوں کے مزاجِ عبادت کا حصہ بن چکی تھی۔ مسیحی مذہب چونکہ عقائد و عبادات میں دونوں میں رومی مذہب سے متاثر تھا اس لیے وہ تو کھلم کھلا مشرق پرستی میں مبتلا ہو گیا۔ یہودی اس سے محفوظ نہ رہ سکے

ان کے بعض فرقے مغرب کے تقدس کا کلمہ پڑھتے تھے۔ انہوں نے دیکھا کہ اگر مشرق خطہ حیات ہونے کی وجہ سے مقدس ہے تو مغرب خطہ موت و دیارِ ہلاکت ہے۔ چنانچہ اس ذہن کے ساتھ دونوں سمتیں خوب پجیں۔ ہیں۔ قرآن میں ان کی اسی فکری آوارگی اور عملی گمراہی کا ذکر ہوا ہے اور بتا رہا ہے کہ ان دونوں میں فکر و عمل کی یہ گمراہی اور گمراہی میں ان کا اختلاف ان کے پارسائی کے نعروں کے کھوکھلا ہونے کی دلیل ہے۔

سیاق و سباق قرآن پر غور کرنے سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بھی اہلِ کتاب ہی کی تاریخ ملی کا ایک ورق پیش کر رہی ہے، اور آیت نمبر ۱۱۸ تک ایک موضوع مسلسل ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جنت کے ان مدعیوں کا حال یہ ہے کہ ایک کتاب کو شریعت ماننے کے باوجود

جنت کو ایک دوسرے پر بند کر رہے ہیں۔

ایک دوسرے کے دین کو بے حقیقت بتا رہے ہیں۔

ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کو عبادت گاہ تصور نہیں کرتے۔

ایک دوسرے کے عبادت میں مرکز توجہ قبلہ کو تسلیم نہیں کرتے۔

اگر پسِ منظر میں کوئی روایت نہ ہو تو آیت اپنے مطالب کی حد تک بالکل صاف ہے۔

۳۱۵۔ مشرق و مغرب اللہ ہی کے لیے ہے۔ یہ بھی یہود و نصاریٰ کا جھگڑا تھا۔ ہر کوئی اپنے قبلہ کو بہتر بتاتا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ مخصوص کسی سمت میں نہیں بلکہ ہر سمت و جہت سے پاک و منزہ ہے۔ البتہ اس کے حکم سے جس طرف منہ کرو گے وہ متوجہ ہے، تمہاری عبادت قبول کرے گا۔ اس کی رحمت سب جگہ عام ہے۔ ایک مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہے۔ اور اللہ بندوں کے مصالح اور ان کی نیتوں کو اور ان کے اعمال کو خوب جانتا ہے کہ بندوں کے حق میں کون سی چیز مفید ہے اور کون سے مضر اسی کے موافق حکم دیتا ہے اور جو اس کی موافقت کرے گا اس کو جزا اور مخالف کو سزا دے گا۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ذات نہ شرقی ہے نہ غربی۔ وہ تمام سمتوں اور مقاموں کا مالک ہے مگر خود کسی سمت یا مقام میں مقید نہیں ہے۔ لہذا اس کی عبادت کے لیے کسی سمت یا کسی مقام کو مقرر کرنے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اللہ وہاں یا اس سمت میں رہتا ہے۔ نہ یہ

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۲

کوئی جھگڑا اور اختلاف کرنے کی بات ہے لہ

مشرق و مغرب اسی کی مملوک اور مخلوق ہیں اور ان پر ہی کیا موقوف ہے ہر سمت اور ہر جہت اللہ کے لیے یکساں ہے وہ سب کا یکساں خالق مالک اور حاکم ہے۔ کسی خاص سمت میں کوئی بھی خاص تقدس کوئی بھی شائبۂ الوہیت، کوئی شان حق نمائی نہیں ہے۔ مذاہب جاہلی کی تاریخ انسانی حماقتوں، جہالتوں، وہم پرستیوں کی ایک مسلسل تاریخ ہے۔ ایک مشترک گمراہی یہ رہی ہے کہ اللہ کی ذات چونکہ متمکن ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کی ہستی کسی نہ کسی مقررہ سمت یا جہت میں ہو اور اس تلبس کی بنا پر خود وہ سمت یا جہت مقدس ہے۔ مصری، ہندی، رومی تمام مشرک قوموں نے اللہ سبحانہ، کو کسی نہ کسی جہت میں فرض کرکے خود اسی جہت کو مقدس مانا ہے اور چونکہ سورج دیوتا کا مرتبہ مذاہب شرکیہ میں عموماً اہم اور مقدم رہا ہے اس لیے شاہ خاور کے طفیل سمت مشرق ہی مقدس سمجھی گئی۔ بعض قوموں نے مشرق کے جوڑ پر مغرب کے تقدس کا نعرہ لگایا۔ ٢ہ

آیت میں گویا الٰہیات کے باب میں ایک قاعدہ اور ضابطہ پیش فرمادیا ہے کہ اللہ سبحانہ، کے بارے میں کیا عقیدہ ہونا چاہیئے؟ فرمادیا کہ اس کی ذات عالی نہ کسی جہت میں محدود ہے اور نہ کسی مکان میں مقید ہے۔ وہ لامکان ہے۔ مساجد، معابد میں اس کی عبادت کا انحصار نہیں ہے۔ سمتوں اور جہتوں کو اس کے قرب سے کوئی واسطہ نہیں ہے؟ اس کی ذات گرامی نہ جسم ہے نہ عرض ہے، کمیت اور کیفیت سے بالا ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ اللہ کی ہستی موجود ہے لیکن کیسی ہے، اس کے ادراک سے عقلِ انسانی عاجز و درماندہ ہے۔ فلاسفہ اور حکما نے بزورِ عقل صرف یہ بتایا ہے کہ خدا یہ نہیں، یہ نہیں یہ نہیں لیکن کیا ہے؟ اس کا جواب وہ تسلی بخش نہ دے سکے۔ انسان موجود ہے محدود اور ذو جہت ہے، اس کا تصور کسی ایسے موجود کا متلاشی ہے جسے وہ خوف و ہراس میں پکارے، عیش و نشاط میں یاد کرے۔ یہ گرنے لگے تو وہ اسے سہارا دے۔ یہ بھوکا ہے تو وہ اسے کھلائے، یہ پیاسا ہو تو وہ اسے پانی پلائے، یہ بیمار ہو تو وہ شفا دے۔ خلاصہ یہ کہ انسان کے ماضی اور مستقبل کے تینوں زمانوں کی زندگیاں اس کی نظرِ رحمت سے پھلتی اور پھولتی رہیں۔

لہ تفہیم القرآن ص ۱۰۵ ٢ہ تفسیر ماجدی

اسی حیرت و سراسیمگی میں یہ تنزیہہ و تشبیہہ کے دوراہے پر کھڑا تھا۔ اگر وہ نہیں نہیں سے قدم آگے بڑھا کر اپنے محسوسات کا جلوہ اس میں دیکھتا ہے تو تشبیہہ کے دلدل میں گر پڑتا ہے اور اگر نہیں نہیں کی گردان کیے جاتا ہے تو اللہ کا تصور ایک سلبی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ قرآن حکیم نے اس عقدہ کو حل کیا اور بتایا کہ خدا کی ہستی اس تنزیہہ اور اس تشبیہہ کے درمیان ہے۔ اس کے لیے صفات ہیں مگر ایسی نہیں جن کا ہم ادراک کر سکیں۔ اس لیے اسے ان تمام صفات سے یاد کرو مگر کسی مثال و تشبیہہ کی پرچھائی بھی خیال میں نہ آنے دو لیس کمثلہ شیئ۔ الغرض قرآن نے انسان کی تسلی کے لیے نماز میں رُخ مقرر کر دیا ہے لیکن اس کی ساتھ یہ فرمائش کر دی کہ اللہ کا وہ مسکن نہیں ہے۔ وہ کسی سمت اور جہت میں محدود نہیں ہے اور مشرق و مغرب سے اس کے مکیں ہونے کے نہیں بلکہ خالقانہ اور مالکانہ تعلقات ہیں۔

۳۱۶۔ اللہ بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے یعنی اللہ سبحانہ، خود تمام جہات اور اشیا کو محیط ہے۔ جس طرح کا احاطہ اس کی شان کے لائق ہے لیکن باوجود محیط ہونے کے پھر بھی جہتِ عبادت کو اس لیے متعین فرماتا ہے کہ وہ کامل العلم ہے اور ہر چیز کے مصالح کو خوب جانتا ہے[۱]

گویا وہ تو خود ہی بے پایاں وسعتوں والا ہے۔ بڑی سے بڑی وسعت خود اس کے اندر شامل ہے اسے بھلا اپنے اندر لے سکتا ہے۔ اس کی سمائی کس بڑے سے بڑے ظرف میں ہو سکتی ہے، ہر سمت اور ہر جہت تو خود اس کی مخلوق ہے، مملوک ہے، وہ لا محدود کسی محدود سمت اور جہت میں کس طرح گھر کر سکتا ہے[۲]

یعنی اللہ تعالیٰ محدود، تنگ دل، تنگ نظر اور تنگ دست نہیں ہے۔ جیسا تم لوگوں نے سمجھ رکھا ہے بلکہ اس کی خدائی بھی وسیع ہے اور اس کا زاویہ نظر اور دائرۂ فیض بھی وسیع اور وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اس کا کون سا بندہ کہاں کس وقت اور کس نیت سے پکار رہا ہے اور اسے یاد کر رہا ہے[۳]

آیت کی تشریح ختم ہو چکی ہے مگر ایک نہایت کارآمد اور مفید بات باقی رہ گئی ہے۔ اس آیت سے صحابہ و تابعین نے متعدد مسائل استنباط فرمائے ہیں۔

---

[۱] معارف القرآن م ش ص ۲۴۰ [۲] تفسیر ماجدی ص ۲۵ [۳] تفہیم القرآن ص ۱۰۵

وَقَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا ۙ سُبْحٰنَهٗ ؕ بَلْ لَّهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ كُلٌّ لَّهٗ قٰنِتُوْنَ ۞ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاِذَا قَضٰۤى اَمْرًا فَاِنَّمَا يَقُوْلُ لَهٗ كُنْ فَيَكُوْنُ ۞

اور وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے[۳۱۷] حالانکہ اللہ کی ذات اس سے پاک ہے۔[۳۱۸] اس کا کسی مخلوق سے والد ہونے کا نہیں بلکہ مالک ہونے کا تعلق ہے کیونکہ زمین و آسمان کی تمام موجودات[۳۱۹] اس کی ملک ہیں۔ سب کے سب اس کے مطیع فرمان ہیں۔[۳۲۰] وہ آسمانوں اور زمین کا بغیر مادے اور نمونے کے بنانے والا ہے۔ وہ جب[۳۲۱] کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس وہ حکم ہی دیتا ہے کہ ہو جا ویسا ہی ظہور میں آجاتا ہے۔

عبداللہ بن عمرؓ سواری پر سوار ہو کر نفلی نماز میں قبلہ رو ہونے کو ضروری نہ سمجھتے تھے اور قرآن کی اسی آیت سے استدلال کرتے ہیں۔

ایسے مواقع پر جہاں لوگوں کو صحیح طور پر سمت قبلہ معلوم نہ ہو اور رات کی تاریکی کی وجہ سے سمت متعین کرنا دشوار ہو اور کوئی بتانے والا بھی نہ ہو۔ تو وہاں اگر تخمینہ اور اندازے سے لوگوں نے نماز ادا کر لی تو نماز سب کی ہو جائے گی۔ اس کے جواز پر صحابہ اسی آیت سے استدلال کرتے تھے۔

امام مجاہد اس آیت سے دُعا کا قبلہ استنباط فرماتے تھے اور کہتے تھے کہ دُعا کے لیے کوئی سمت نہیں جس طرف بھی رُخ کر و وہی قبلۂ دُعا ہے

صحابہ اور تابعین کا مسائل میں قرآن سے استدلال کرنا آیت کا سبب نزول نہیں ہوتا۔

شاہ ولی اللہؒ نے الفوز الکبیر میں تصریح کی ہے کہ محدثین قرآنی آیات کے ذیل میں بہت سی ایسی باتیں درج کرتے ہیں جو واقع میں سببِ نزول نہیں ہیں۔ اور اس کی مثال بھی شاہ صاحب نے صحابہ کے استشہادات سے دی ہے۔ باقی رہی عبداللہ ابن عباسؓ کی وہ روایت جو ابنِ کثیرؒ نے عطاء، علی ابن ابی طلحہ کے حوالہ سے نقل کی ہے اس کا اس آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس کا تعلق دوسرے پارے میں آنے والی آیت قل لِلہ المشرق والمغرب یھدی من یشاء الی صراط مستقیم۔ سے ہے اس پر انشاء اللہ اسی مقام پر تفصیل بحث آئے گی۔

اہلِ کتاب کا کتابِ الٰہی سے انحراف

اس سے پہلی آیت میں اہلِ کتاب کا قبلہ میں اختلاف، عبادت گاہوں میں ایک دوسرے کو روکنے کا تذکرہ تھا اس آیت میں ان کے کتابِ الٰہی کو مانتے ہوئے ان کی ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت کی داستان کا بیان ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ خدا کو مانتے ہوئے یہ خدا کے مقام رفیع سے اپنے باغیانہ میلانات کی بنا پر اتنے ناآشنا ہو گئے تھے کہ اللہ کے بندوں کو اللہ کے بیٹے بنا رہے تھے اور اس میں دونوں شریک تھے یہودی بھی اور عیسائی بھی۔ اگرچہ عام یہودیوں کا یہ اعتقاد نہیں لیکن مدینہ کے ان یہودیوں کا جو اس سورت میں قرآن کے مخاطب ہیں یہ اعتقاد ضرور ہے کہ عزیرؑ اللہ کے بیٹے ہیں۔ چنانچہ عبداللہ ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ سلام بن مشکم، نعمان بن اوفی، ابوانس، شاش بن قیس اور مالک بن صیف کہ زوسارِ یہود میں سے تھے۔ حضور انورؐ کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کی کس طرح پیروی کر سکتے ہیں جبکہ آپ نے ہمارے قبلہ کو ترک کر دیا اور عزیرؑ کو ابن اللہ نہیں مانتے۔ جب اُمتوں کا نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے زندگی میں رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو اللہ کے مقدس بندوں کے بارے میں ایسے خیالات کہ وہ خدا ہی ہیں یا خدا کے بیٹے ہیں پیدا ہی ہو جاتے ہیں۔ اس میں تعجب اور حیرت کی کوئی بات نہیں ہے۔ آخر ہم میں بھی تو غالیوں کی زبان پر یہ شعر آ ہی جاتا ہے

جو مستوی عرش تھا مدینہ میں آ گیا مصطفےٰ ہو کر

یا احد اور احمد میں کوئی فرق نہیں صرف میم کی گھنڈی ہے۔ اور بس
حالانکہ جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ کفرِ خالص ہے اور وہ مشرکانہ ذہن ہے جس کی قرآن

نے تردید کی ہے۔

عیسائیوں میں حضرت مسیح کی ابنیت کا عقیدہ کوئی ثانوی درجہ یا فرعی حیثیت نہیں رکھتا۔ مسیحیت کی رُوح اور جان یہی عقیدہ ہے۔ اور پھر طرہ یہ کہ اس میں راہیں الگ بنا رکھی ہیں۔ ایک عزیر کو خدا کا بیٹا مانتا ہے تو دوسرا حضرت مسیح کو۔

ف۲۱۶۔ وہ کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ یہود حضرت عزیر کو اور نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اس کی ذات سب باتوں سے پاک ہے بلکہ سب کے سب اس کے مطیع اور مخلوق ہیں[1]۔

اللہ کے بیٹا ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ بیٹا یا اللہ کی جنس سے ہوگا یا غیر جنس سے۔ اگر لڑکا غیر جنس کا ہوگا تو نا جنس اولاد ہونا تو عیب ہے اور اللہ کی ذات عیب سے پاک ہے اور اگر ہم جنس ہوگا تو یہ اس لیے محال ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کوئی ہم جنس نہیں ہے کیونکہ صفاتِ کمال جو اللہ کے لیے لوازمِ ذات کی حیثیت رکھتی ہیں وہ اللہ ہی کے ساتھ مخصوص ہیں اور غیر اللہ میں معدوم ہیں۔ اس لیے اللہ کے علاوہ کوئی واجب الوجود نہیں ہو سکتا۔ اور واجب الوجود ہونا خود عین حقیقت یا لازمِ حقیقت ہے۔ لہذا کوئی بھی اللہ کے سوا اللہ کے ساتھ حقیقت میں شریک نہیں ہو سکتا[2]۔

اتخذ اللہ ولدا کا صحیح ترجمہ لے رکھا ہے اس نے ایک بیٹا، بنا رکھا ہے۔ ایک بیٹا یہاں یہ نہیں فرمایا کہ خدا کے ایک بیٹا ہے بلکہ یہ کہ خدا نے ایک بیٹا بنا لیا ہے۔ اتخذ اللہ ولدا کا مفہوم یہ ہے کہ اللہ نے گویا کسی کو متبنّٰی کر لیا ہے۔ مسیحیوں میں ایک فرقہ کا عقیدہ متبنّٰی کا ہے۔ اس عقیدے کا خلاصہ یہ ہے کہ مسیح خلقۃً خدا پیدا نہیں ہوتے وہ خدا شروع سے بنے بنائے اور خود بخود نہیں ہے بلکہ اصلاً و خلقۃً انسان ہی تھے۔ البتہ اقنوم ثالث یعنی رُوح القدس کا فیضان ان پر شروع سے ہونے لگا تھا۔ اس لیے وہ قدوسیت کے ایسے اوجِ کمال تک پہنچ گئے اور رُوحِ الٰہی ان کے اندر ایسی حلول کر گئی کہ اقنوم اول یعنی اللہ نے انہیں اپنا شریکِ الوہیت کر لیا اب وہ ربوبیت، مالکیت وغیرہ جملہ صفاتِ الٰہی میں شریک ہیں۔ اس عقیدے کے وجود کی شہادت تاریخ میں ۱۸۵ء میں ملتی ہے۔ آٹھویں صدی عیسوی میں پاپائے روم نے اسے الحاد و زندقہ قرار دیا۔ بارہویں صدی میں اس نے پھر زور پکڑا اور پھر یہ لوگ زندیق

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۲ [2] معارف القرآن م ش ص ۲۴۶

قرار پائے [1]

ممکن ہے کہ ایسا ہی ہو جیسا مولانا دریابادی فرما رہے ہیں لیکن دل نہیں مانتا کہ قرآن نے یہ تعبیر مسیح کی ابنیت کی تاریخ بتانے کے لیے اختیار کی ہے۔ قرآن کوئی تاریخ مذاہب کی کتاب نہیں ہے جہاں تک لفظ اتخاذ کی بات ہے تو اپنا ذوقِ عربیت تو یہ کہتا ہے کہ یہ تعبیر یہ جتانے کے لیے آئی ہے کہ مسیح کی ابنیت کی کہانی ان کی اپنی بناوٹ ہے ورنہ اس کا حقیقت سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ قرآن ایسی تمام باتوں کے لیے جن کا حقائق سے کوئی رشتہ نہ ہو اور لوگوں نے بطورِ خود بنا لی ہوں ایسی تعبیر اختیار کرتا ہے۔ قرآن میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔

۳۱۸ۃ۔ حالانکہ اللہ کی ذات پاک ہے۔ اصل ارشاد ہیں سبحانہٗ ہے یعنی اللہ کی ذاتِ گرامی تمام عیبوں، تمام کمزوریوں، تمام کوتاہیوں سے پاک ہے۔ گویا جو شخص اللہ کی معرفت رکھتے ہوئے یہ کہتا ہے کہ اس کا بیٹا ہے اس کے گمان کا بنایا ہوا گھروندا ہے ورنہ فی الواقع اللہ کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کا بیٹا ہو۔ متکلمین کی زبان میں جسے تنزیہہ اور تقدیس کہتے ہیں قرآن میں اس کو تسبیح کہتے ہیں لیکن یاد رہے کہ قرآن کی تسبیح بمعنے تنزیہ ضرور ہے لیکن بمعنی تعطیل نہیں ہے۔ تنزیہہ یہ ہے کہ جہاں تک انسانی عقل کا تعلق ہے اللہ کی صفات کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک رکھا جائے اور تعطیل کے معنے یہ ہیں کہ تنزیہہ کے درجہ کو اس قدر اونچا کیا جائے کہ فکرِ انسانی کے لیے اللہ کی ذات کے بارے میں کوئی بات ہی باقی نہ رہے۔ قرآن کی تسبیح تنزیہہ کی تکمیل ہے تعطیل کی ابتدا نہیں ہے۔ جیسے صفات کا اثباتی پہلو تشبیہہ کی طرف لے جاتا ہے اسی طرح صفات کا انکاری پہلو تعطیل کے لیے راہ ہموار کرتا ہے اور دونوں غلط ہیں۔ اگر تشبیہہ حقیقت سے ناآشنا کرتی ہے تو تعطیل عقیدے کی رُوح سے محروم کر دیتی ہے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ افراط و تفریط دونوں سے بچ کر رہے اور تشبیہہ و تعطیل دونوں کے درمیان رہے۔ قرآن نے دو فقروں میں جو راہ اختیار کی ہے وہ دونوں راہوں کے درمیان ہے ارشاد ہے

لیس کمثلہ شئ و ھو السمیع البصیر

شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ

الٰہی تجلیات کا مشاہدہ کرنے والے دو نسبتوں سے خالی نہیں ہیں۔ ایک طرف خدائی تنزیہہ

---

[1] تفسیر ماجدی ص

کی نسبت دوسری طرف تشبیہہ کی انعکاسی نسبت پہلی نسبت لیس کمثلہ شئ میں اور دوسری کو وھو السمیع البصیر میں بیان کیا ہے۔

انجیل میں باپ اور بیٹے کی حقیقت

عیسائیوں کی انجیل میں خدا کے لیے باپ اور حضرت مسیح کے لیے بیٹے کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کی حقیقت اور اللہ پر اس کے اطلاق سے کیا مقصود ہے؟ گوشت و پوست اور مادیت سے لبریز لفظ کا اللہ پر اطلاق کہاں تک دُرست ہے؟ اور اس سے کہاں تک غلطیاں پھیلی ہیں۔ ان باتوں کو چھوڑ کر یہ دیکھئے کہ یہ خدا کی جمالی صفات کی نہایت ناقص اور مادی تعبیر ہے۔ عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے اختراعی عقیدے کو مسئلہ صفات کے پردے میں چھپا لیا اور یہ تاویل کی کہ باپ خدا بیٹا حضرت عیسیٰ اور روح القدس حیات خلق اور علم تین صفتوں کا نام ہے۔ باپ حیات، بیٹا، خلق اور روح القدس علم ہے اور یہ تینوں ایک ہیں اور تینوں وجود میں الگ الگ ہیں۔ اس تشریح سے صفاتِ الٰہی میں تجسم نے راہ پالی اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔

قرآن نے تشبیہہ و تعطیل سے ہٹ کر انسانوں کے سامنے تسبیح و تنزیہہ کی راہ پیش کی بلکہ انسان کو بیٹا کی بجائے عبد اور خدا کو باپ کے بجائے رب کہا ہے۔ اَب اور رب ابن اور عبد ان دونوں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں کا تصور قرآن کے مطمح نظر سے کتنا پست ہے۔ اَب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لمحہ میں قائم ہوتا ہے مگر یہ تعلق حد درجہ ناقص اور ادنی ہوتا ہے۔ ربوبیت، اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک پیدائش سے وفات تک بلکہ ابد تک قائم رہتا ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی منقطع نہیں ہوتا ہے جس کے سہارے پر دُنیا اور دنیا کی تمام مخلوقات کا وجود ہے وہ گہوارۂ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے۔ انسان ذرہ ہو یا بصورت غذا، قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون، مضغۂ گوشت ہو یا مشتِ استخوان، شکم مادر ہو یا اس سے باہر بچہ ہو، جوان، ادھیڑ ہو یا بوڑھا، کوئی آن، کوئی لمحہ رب کے مہر وکرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔ باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے وہ سرتا سر تشبیہہ ہے۔ اللہ کی ذات

اس سے یک قلم پاک ہے۔ اس آیت میں سبحانہٗ کا یہی مطلب ہے۔

۲۱۹ ۔ زمین و آسمان کی ساری موجودات اس کی ملک اور مطیع فرمان ہیں۔ یہ جواب ہے ان کا جو اللہ کے لیے صاحبزادہ بنا کے چکر میں ہیں۔

اس جواب میں اندازِ تعبیر ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ اس میں مختلف پہلو نمایاں ہیں۔

۱۔ بیٹا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ باپ کی جنس ہو۔ کوئی بھی مخلوق اللہ کی جنس کیونکر ہو سکتی ہے جب کہ وہ مخلوق ہے۔ خالق اور مخلوق، صانع اور مصنوع، عمارت اور معمار، نقش اور نقاش میں کبھی ہم جنسی نہیں ہو سکتی ہے۔ وہ قدیم ہے یہ حادث، وہ غنی ہے یہ محتاج ہے۔ وہ باقی ہے یہ فانی ہے۔ قدیم اور حادث میں ہم جنسی ہو انسان کی عقل یہ کیسے باور کر سکتی ہے اس کا وجدان پکارتا ہے کہ ایسا ہونا ممکن نہیں ہے۔

۲۔ بیٹا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی مملوک نہ ہو۔ آقا اور غلام میں تعلق مالک و مملوک کا ہوتا ہے باپ بیٹے کا نہیں ہوتا ہے۔ جو مملوک ہے وہ عبد تو ہو سکتا ہے لیکن بیٹا نہیں ہو سکتا۔ فرزندیت و عبدیت میں تنافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی قانون میں اگر کوئی شخص اپنے بیٹے کا مالک ہو جائے تو وہ فوراً آزاد ہو جاتا ہے۔ جب انسانوں میں فرزندیت اور عبدیت جمع نہیں ہو سکتے تو بارگاہ خداوندی میں کیسے جمع ہو سکتے ہیں۔

۳۔ مخلوق کا رشتہ اپنے خالق کے ساتھ صرف ملکیت و مملوکیتِ مطلقہ کا ہے نہ کہ فرزندی و عبدیت وغیرہ خرافات کا۔ اور جب ساری مخلوقات کا یہ حال ہے تو کسی ایک کو اس کا فرزند بنانا پرلے درجہ کی حماقت اور جہالت ہے۔

۴۔ ساری کائنات آسمانی یا زمینی اللہ کی مطیع و فرمانبردار ہے اور طاعت کا یہ دائرہ اتنا وسیع ہے کہ ہر چیز اپنے موجود ہونے، باقی رہنے اور مختلف احوال و اطوار سے گزرنے میں زبانِ حال سے اس کی طاعت کے ترانے گا رہی ہے۔ گویا ہر چھوٹی بڑی چیز فنی یا ترقی یافتہ کس مخلوق کی مجال ہے جو اللہ کے بنائے ہوئے دن اور اللہ کی بنائی ہوئی رات کے ۲۴ گھنٹوں کے علاوہ ایک گھنٹہ ایک منٹ ایک لمحہ اپنے لیے پیدا کر سکے۔ بڑے سے بڑے ماہرینِ سائنس میں سے کس کے امکان میں ہے کہ اللہ کی مقرر کی ہوئی فضا سے کائنات سے باہر ایک گز ایک فٹ ایک انچ جگہ اپنے لیے تلاش کر سکے؟ کون ایسا ہے کہ اللہ نے زمان و مکان کی جو حدیں مقرر کی ہیں ان سے قدم باہر نکال سکے؟ کون ایسا ہے

کہ اللہ کے قانونِ حرارت، برودت، رطوبت و یبوست سے بے نیاز رہ سکے۔ کون ایسا ہے جو اس کے باندھے ہوئے قانون کششِ اجسام سے بغاوت کر سکے۔ عدد و وزن کے جو ضابطے خدا نے مقرر کر دیے ہیں کس میں ان سے انحراف کی ہمت ہے؟ سب کے سب اس کی تابعداری کر رہے ہیں۔ اس لیے طاعت کا یہ دم بھرتے ہوئے اللہ کا شریک وسہیم یا اللہ کا بیٹا ہونا کیونکر ممکن ہے۔ سب کے سب اس کے محکوم، اس کی مخلوق، اس کے قوانینِ تکوینی کے تابع و مسخر ہیں۔ کل لہ قانتون [1]

۳۲۰۔ بغیر مادے اور بغیر نمونے کے آسمان و زمین بنانے والا۔ اصل ارشاد لفظ بدیع آیا ہے۔ شارحینِ قرآن کا خیال ہے کہ مبدع کے معنے میں ہے۔ ابداع کے معنے عدم سے بغیر کسی مثال یا نمونہ اور بغیر کسی مادے کے وجود میں لے آنا ہے۔ اس لیے بدیع وہ ہے جو اپنے بنانے میں کسی آلہ کا محتاج ہو نہ کسی مسالہ نہ مقام و مکان کا پابند، نہ زمان و وقت میں متقید نہ کسی نمونہ کا محتاج اور نہ استاد کا بغیر کسی کی اعانت و شرکت کے وجود میں لانے والا۔ بدیع کا لفظ ان لوگوں کے رد میں ہے جو خدا کا بیٹا بناتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو ذات تنہا تمام آسمان و زمین بدونِ کسی نمونہ اور توسطِ آلات وغیرہ کے ایسے انوکھے طرز پر پیدا کرتا ہے اسے بیٹے کا سہارا تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ سورۃ انعام میں اس فقرے کے بعد یہ بلیغ فقرہ لائے ہیں انی یکون لہ ولد ولم تکن لہ صاحبۃ یعنی جب وہ آسمانوں اور زمین کا موجد ہے تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی اس کا بیٹا ہو جبکہ اس کی کوئی بیوی نہیں ہے۔ یعنی حیرت ہے کہ جب تم کسی مخلوق کو اللہ کا بیٹا قرار دو گے تو اس بچے کی ماں کسے بناؤ گے اور اس ماں کا تعلق اللہ سے کیسا بتاؤ گے۔ آج تک عیسائی جو حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں یہ جسارت نہیں کر سکے کہ مریم صدیقہ کو خدا کی بیوی قرار دیں۔ جب تمہارا وجدان یہ باور نہیں کرتا تو پھر مریم کے پیٹ سے پیدا ہونے والا بچہ خدا کا بیٹا کیونکر بن گیا۔ دنیا کے دوسرے بچوں کو بھی خدا ان کی ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کر رہا ہے وہ معاذ اللہ خدا کی اولاد نہیں کہلاتے۔ اس سے ابوت اور بنوت کا مسئلہ حل نہیں ہوتا۔ اسباب ہوں یا خوارق سب کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے۔ وہ پیدائش میں اسباب کا محتاج نہیں کیونکہ اس کی

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۶۴

وَقَالَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ لَوْلَا يُكَلِّمُنَا اللّٰهُ اَوْ تَاْتِيْنَآ اٰيَةٌ ؕ كَذٰلِكَ قَالَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ مِّثْلَ قَوْلِهِمْ ؕ تَشَابَهَتْ قُلُوْبُهُمْ ؕ قَدْ بَيَّنَّا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ۝

اور بے علم[۳۲۲] لوگ کہتے ہیں کہ خدا ہم سے خود بات[۳۲۳] کیوں نہیں کرتا ہے یا ہمارے[۳۲۴] پاس کوئی نشانی نہیں آئی ہے؟ بالکل ایسی ہی باتیں وہ لوگ بھی کہہ چکے ہیں جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اس موضوع پر پہلوں اور پچھلوں کے دل ایک جیسے[۳۲۵] اور ملے جلے ہیں۔ یقین[۳۲۶] والوں کے لیے ہم ایک نہیں متعدد نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں۔

شان یہ ہے کہ

۳۲۱ ۔ جب کسی کام کا فیصلہ کر لیتا ہے تو بس حکم دیتا ہے کہ ہو جا تو وہ ہو جاتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جو چاہے اور جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اس کی قدرت کی حد بندی نہیں ہے ایک کام کا ارادہ کیا اور ہو گیا نہ مادے کا محتاج نہ اسباب کا پابند[۱]

"کہتا ہے" کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ ہماری آپ کی طرح دو حرفی لفظ کن بولتا ہے مقصود صرف اس قدر ہے کہ ادھر حق تعالیٰ کا ارادہ ہوا اور ادھر معاً بلا توسط و توقف اس کا ظہور ہو گیا[۲]

شیخین نے ابو موسیٰ اشعری کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے "تکلیف دہ بات سن کر اللہ سے زیادہ تحمل کرنے والا کوئی نہیں۔ لوگ اس کے لیے بیٹا تجویز کرتے ہیں وہ اس پر بھی ان کو روزی اور صحت دیتا ہے۔

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص [۲] تفسیر ماجدی ص ۴۶

اللہ کی ذات پاک کسی کی ایذا دہی سے بالا تر ہے مگر جب مخلوق اپنی جانب سے ایذا دہی کے سامان کرتی ہے تو وہ اس کی اطلاع دیتا ہے کہ میں اس سے بے پروا نہیں ہوں کہ تم مجھے بُرا بھلا کہہ رہے ہو لیکن اس کے باوجود وہ عافیت و رزق کا دروازہ بند نہیں کرتا۔ اگر وہ اس کے سوا دوسرے جواب کا ارادہ کرے تو ساری دُنیا ویرانہ بن کر رہ جائے۔ ہماری پستی اور اس کی بلندی، ہماری تنگ ظرفی اور اس کی فراخ حوصلگی، ہماری بغاوت اور اس کے تحمل کا یہ نقشہ قیامت تک یونہی جاری رہے گا۔ قرآن چاہتا ہے کہ اپنے حلقہ بگوشوں کو فردائے قیامت میں رُسوائی سے بچالے۔

انکار میں عالم و جاہل کا نظریاتی اتحاد

اہلِ کتاب کی تاریخِ ملی سے انکار و سرکشی بیان فرمانے کے بعد اس موقعہ پر خاص طور پر ان لوگوں کے انکارِ نبوت کا حوالہ دیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح انسانی سچائی کا مزاج ہمیشہ ایک طرح کا ہوتا ہے اسی طرح انسانی گمراہی کا مزاج بھی ایک ہی جیسا ہوتا ہے۔ نبوت کے انکار میں جو صورت مکہ میں پیش آئی تھی بالکل وہی صورت مدینہ میں پیش آرہی ہے۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ مکہ میں نبوت کی مخاطب ان پڑھ اور علومِ نبوت سے ناآشنا قوم تھی۔ اور مدینہ میں نبوت کا روئے سخن علومِ نبوت کے جانکاروں کی طرف تھا۔ لیکن علم اور جہالت کے فرق کے باوجود دونوں جگہ منکرین نے سچائی کو ایک ہی طریقہ پر جھٹلایا ہے اور ایک ہی طرح کی صدائیں بلند کی ہیں۔ انکار میں دونوں کے نظریات میں ہم آہنگی ہے۔ وہ انکار کرتے تھے بے خبر ہو کر اور یہ انکار کر رہے ہیں باخبر ہو کر۔ نبوت سے انکار میں دونوں میں نظریاتی اتحاد ہے۔ ایک جاہل معاند ہے اور معاندانہ اعتراضات کر رہا ہے۔ دوسرا عالم معاند ہے اور عناد کی وجہ سے سرکشی اور انکار کی راہ اختیار کیے ہوتے ہے اور یہاں کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر زمانے میں گمراہی کا مزاج ایک ہی رہا ہے۔

۵ ۲۲۲۔ بے علم لوگ کہتے ہیں یعنی اہلِ کتاب اور بُت پرستوں میں جو جاہل ہیں وہ سب کہتے ہیں[1]۔ یہ بے علم کون لوگ ہیں؟ شارحینِ قرآن میں سے قتادہ کہتے ہیں کفارِ عرب یہی

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۲

مجاہد کہتے ہیں کہ عیسائی ہیں اور عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہودی ہیں۔ لیکن قرآن کے الفاظ بالکل عام ہیں اور ان لوگوں کے لیے استعمال ہوئے ہیں جو مقدس نوشتوں اور علوم نبوت سے بالکل بے بہرہ تھے۔ یہ تعبیر قرآن میں ان لوگوں کے علاوہ کے لیے آئی ہے جو اہلِ کتاب یعنی یہودی اور عیسائی نہ ہوں۔ ابھی چند آیات پیشتر قرآن میں یہودیوں اور عیسائیوں کے مقابلے میں یہ تعبیر ایسے ہی لوگوں کے لیے آئی کذالک قال الذین لایعلمون مثل قولھم اس میں سب کہتے ہیں کہ علم سے آیت میں آسمانی کتاب کا علم مراد ہے۔ یہ کہنے والے سب کے نزدیک مشرکینِ عرب اور پھر ایسے مذہب کے پیرو جس کی بنیاد کسی آسمانی کتاب پر نہ ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ دونوں آیتوں میں عنوان کی ہم آہنگی کے باوجود معنوں میں اختلاف پیدا کیا جائے اور یہ کہا جائے کہ پہلی آیت بے علموں سے مراد دُنیا بھر کے عام کفار ہیں اور اس آیت میں یہودی یا عیسائی ہیں۔ نبوت کی زندگی کے واقعات بھی اس کی تائید نہیں کرتے کیونکہ اس آیت میں جس بات کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ ہم سے براہِ راست بات کیوں نہیں کرتا یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی؟ سیرتِ نبوت کی تاریخ بتاتی ہے کہ سینکڑوں یہودی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ اقدس میں آئے۔ امتحانات لیے لیکن ان کا امتحان یہ تھا کہ وہ آپ کے اخلاق کی آزمائش کرتے۔ صحفِ انبیائے بنی اسرائیل کے سوالات دریافت کرتے، آپ کی تعلیم کا گہرا مطالعہ کرتے ان میں سے کسی نے آپ سے خارقِ عادت معجزہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ کیونکہ ان کو معلوم تھا کہ آیات وخوارق نبوت کی باطنی اور اندرونی علامات نہیں ہیں۔ آنے والے نبی کی بشارتیں تورات اور انجیل دونوں میں ہیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی صاحبِ خوارق ہونا آپ کی صفات نہیں بتائی گئی تھی۔ سینکڑوں یہود و نصاریٰ آپ کی خدمت میں آئے اور انہوں نے آپ کی نبوت کا امتحان لیا مگر امتحان کے پیچھے میں مادی معجزات کا سوال نہ تھا بلکہ عام علمی اور مذہبی معلومات کی نسبت استفسار تھا۔ قرآن میں ان کا ایک سوال بے شبہ ایسا مذکور ہے جس سے خیال ہوتا ہے کہ اہلِ کتاب بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی مادی معجزے کی خواہش رکھتے تھے وہ آیت یہ ہے۔

یسئلک اھل الکتاب ان تنزل علیھم کتاب من السماء۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ یہودیوں کی معجزہ طلبی نہ تھی بلکہ چونکہ تورات کے متعلق ان

کا یہ خیال تھا کہ اس کی چند لوحیں خود اللہ تعالیٰ نے لکھی تھیں۔ اس لیے وہ اسی تخیل کے مطابق قرآن کے من جانب اللہ ہونے کے لیے اس کے نزول کو بھی اسی طرح چاہتے تھے۔

اب اس زمانے کے عیسائیوں میں قیصر روم کے دربار، نجاشی کے دربار اور وفدِ نجران کی مدینہ میں آمد کے واقعات کو پڑھ لیجئے۔ مختلف سوالات کیے۔ اسلام کی تعلیمات کا ہر طرح امتحان کیا لیکن دعویٰ کے ثبوت میں انہوں نے کوئی آیت نہیں مانگی۔

اس لیے اس آیت میں بھی پہلی آیت کی طرح الذین لایعلمون سے قریشِ مکہ ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ یہ ان کا ہی مطالبہ ہے۔

ف ۴۴۲ ۔ خدا ہم سے خود کیوں بات نہیں کرتا۔ یعنی خواہ فرشتوں کے بغیر جیسے خود فرشتوں سے کلام کرتا ہے یا فرشتوں کے واسطے سے جیسے انبیاء سے بطورِ وحی بات کرتا ہے اور اس طرح یا تو خود ہم کو احکام بتادیں کہ رسُول کی ہمیں ضرورت ہی نہ رہے یا کم ازکم اتنا ہی کہہ دیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسُول ہیں تو ہم ان کی رسالت کے قائل ہو کر ان کی بات مان لیں گے[1]

ان کا مطلب یہ تھا کہ خدا یا تو خود ہمارے سامنے آکر کہے کہ یہ میری کتاب ہے اور یہ میرے رسُول ہیں۔ تم لوگ ان کی پیروی کرو[2]

گویا اعتراض یہ تھا کہ خدا اگر اپنے فلاں فلاں بندے سے بقول ان کے کلام کر سکتا ہے اور کرتا ہے تو آخر ہم سے کیوں نہیں کرتا ہم بھی تو انسان ہیں۔ احمقوں کے نزدیک اللہ سے ہمکلامی کے لیے گویا صرف انسان ہونا کافی تھا[3]

قرطبی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ آپ کی نبوّت کے بارے میں اللہ ہم سے بالمشافہ بات کیوں نہیں کرتا کہ ہمیں آپ کے نبی و رسُول ہونے کا پتہ لگ جاتے۔ ابنِ کثیرؒ کہتے ہیں کہ قرطبی کی بات سیاقِ قرآن کے مطابق ہے۔ شوکانی نے بھی اسی کو اپنایا ہے۔ علامہ آلوسی نے کہنے کا یہ پس منظر بتا کر اسے زیادہ وزنی بنا دیا ہے کہ ان میں یہ احساسِ برتری تھا کہ ہم بھی انبیاء اور ملائکہ کے ہم پلہ ہیں۔

ف ۴۴۳ ۔ یا ہمارے پاس کوئی نشانی کیوں نہیں آتی۔ اصل ارشاد میں لفظ آیت آیا ہے

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۴۸ [2] تفہیم القرآن ص ۱۰۶ [3] تفسیر ماجدی ص ۴۶۔

آیۃ کے لفظی معنے نشان کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن مجید میں بکثرت معجزے کے معنے میں آیا ہے۔ اور یہاں یہی مراد ہے اور معجزہ سے مراد وہ واقعہ ہے جو معمولِ عام سے ہٹا ہوا ہو اور بلا اسباب ظاہری اس کا ظہور تائیدِ رسول کے لیے ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پر معنوی دلائل و شواہد تو کثرت سے موجود تھے۔ لیکن مشرکین کی طرف سے پیہم فرمائشیں ہوتی رہی ہیں کہ کوئی حیرت انگیز حسی معجزہ دکھایا جائے جس کے بعد چون و چرا کی کوئی گنجائش نہ رہے[1]

دراصل یہ منکرینِ حق کی خاص گمراہی رہی ہے کہ سچائی کو خود سچائی میں نہیں ڈھونڈتے۔ اپنوں کرشموں کی تلاش میں سرگرداں رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ جو آدمی سب سے زیادہ عجیب قسم کی باتیں کر دکھاتے۔ وہی سب سے زیادہ سچائی کی بات بتانے والا ہے۔ گویا ان کے نزدیک سچائی اس لیے سچائی نہیں ہوتی کہ وہ سچائی ہے بلکہ اس لیے کہ عجیب عجیب طرح کے کرشمے اس کے پیچھے کھڑے ہیں۔ ان کی یہ فرمائشیں حجت و برہان کے طلب میں نہ تھیں بلکہ محض سرکشی اور ہٹ دھرمی کی باتیں تھیں جو اس لیے کہی جاتی تھیں کہ کوئی نہ کوئی بات کہہ کر اپنے انکار کے لیے سہارا پیدا کیا جاتے۔

۳۲۵ ۔ اس موضوع پر پہلوں اور پچھلوں کے دل ایک جیسے ہیں۔ یعنی انکار و سرکشی کرنے والوں کا ہمیشہ انبیاء کے مقابلے میں طرزِ عمل ایک رہا ہے۔ گویا جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ مشورے سے کہہ رہے ہیں۔ سورۃ طور میں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے اتواصوا بہ کیا انہوں نے مشورہ کر کے یہ کام شروع کیا ہے اور شاید الکفر ملۃ واحدۃ اسی کی تعبیر ہے۔ ان سے جب سچائی کی بات کہی جاتی ہے تو اسے ماننے کے لیے ہمیشہ معجزوں کی فرمائش ان کی طبیعت بن گئی ہے۔ ان کے یہ مطالبات اپنی سرکشی اور انکار کی خاطر ہوتے ہیں۔ وہ پہلے سے طے کر لیتے ہیں کہ کبھی نہیں مانیں گے۔ پھر کوشش کرتے ہیں کہ نہ ماننے کے لیے کوئی بہانہ بنائیں۔ وہ طرح طرح کی باتیں اِدھر اُدھر کی نکالتے ہیں اور نکالتے رہتے ہیں۔ کبھی ایک بات کبھی دوسری بات اور اسی طرح سلسلہ قائم رکھیں گے۔ ہر حال میں یہ کوشش کریں گے کہ نہ ماننے کے لیے کوئی بات نکال لیں۔ پہلے کسی ایک بات پر زور دیں گے کہ اس کا کیا جواب ہے۔ جب اس کا جواب مل جائے گا تو دوسری بات لے آئیں گے اور کہیں گے کہ تمہارے پاس اس کا کیا جواب ہے

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۴۶

تمہارے پاس کوئی نہیں ہے یہاں تک کہ اگر تم ان کی ساری کٹ حجتیوں کا جواب دے دو اور ساری شرطیں اور فرمائشیں پوری کر دو جب بھی وہ کوئی نہ کوئی بات پیش کر دیں گے اور راست بازی کی راہ پر کبھی نہ چلیں گے۔ قرآن نے جا بجا منکروں کی اس حالت کا ذکر کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ وہ ماننے والے نہیں ہیں اگر ماننے والے ہوتے تو اس طرح کی روش کبھی اختیار نہ کرتے۔
قرآن یہاں بتانا یہ چاہتا ہے کہ
آج کے گمراہوں نے کوئی اعتراض اور کوئی مطالبہ ایسا پیش نہیں کیا ہے جو ان سے پہلے کے گمراہ پیش نہ کر چکے ہیں۔ قدیم زمانہ سے انکار و سرکشی کا مزاج ایک ہی رہا ہے اور وہ بار بار ایک ہی قسم کے شبہات، اعتراضات اور سوالات دُہراتے رہے ہیں[1]۔
مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ فرمائشیں اور ان کے یہ مطالبات کوئی انوکھے اور نرالے نہیں ہیں۔ نادانوں نے ہر دور اور ہر ملک میں اس قسم کی فرمائشیں پیش کی ہیں۔ ان سب کا کردار ایک ہے اور کردار کی ہم آہنگی کی وجہ یہ اور صرف یہ ہے کہ تشابہت قلوبھم ان کے دل ایک جیسے اور ملے جلے ہیں۔ ان کی ذہنیتیں ایک جیسی ہیں۔
۳۲۶۔ یقین والوں کے لیے ایک نہیں بلکہ متعدد نشانیاں صاف صاف نمایاں کر چکے ہیں۔ یہ بات کہ خدا خود آکر ہم سے کیوں بات نہیں کرتا اس قدر مہمل تھی کہ اس کا جواب دینے کی حاجت ہی نہ تھی۔ جواب صرف اس بات کا دیا گیا ہے کہ ہمیں نشانی کیوں نہیں دکھائی جاتی۔ اور جواب یہ ہے کہ نشانیاں تو بے شمار موجود ہیں مگر جو ماننا چاہتا ہی نہ ہو اُسے آخر کون سی نشانی دکھائی جا سکتی ہے[2]
جواب یہ ہے کہ اہلِ یقین کے لیے صداقت کی تمام نشانیاں ظاہر کر دی گئی ہیں۔ خود یہ دعوت اور پیغام ہی آیت و نشانی ہے اور اہلِ بصیرت کے لیے معجزہ ہی ہے اور آپ کا اُمّی ہو کر ایک ایسی کتاب اور ایسی تعلیم پیش کرنا جس کی صداقت کو علماء بنی اسرائیل بھی جانتے اور سمجھتے ہیں۔ کیا یہ معجزہ جہلاء قریش کی تسلّی کے لیے کافی نہیں ہے۔
اولم یکن لھم آیۃ ان یعلمہ علماء بنی اسرائیل
کیا ان کے لیے یہ نشانی کافی نہیں ہے کہ علماء بنی اسرائیل اسے جانتے ہیں۔

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۱۶ [2] تفہیم القرآن ص ۱۰۶

مقصود یہ ہے کہ نبوت کی حقیقت معجزہ نہیں ہے بلکہ اصل اس کی دعوت اور اس کی تعلیمات ہیں۔ لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ نبوت کا دامن ظاہری آیات اور مادی نشانات سے خالی ہوتا ہے۔ تمام انبیاء کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی آیتوں کے ساتھ ان کو ظاہری آیتوں کا حصہ بھی ملتا ہے۔ قرآن حکیم نے اکثر انبیاء کے سوانح و واقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار و دلائل کو بھی بہ تفصیل بیان کیا ہے بلکہ کہنا یہ ہے کہ یہ مادی اور ظاہری نشانات نبوت کی اصل حقیقت سے خارج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد مقامات پر کفار کی مادی نشانیوں کی طلب پر قرآن نے آپ کی طرف سے یہ الفاظ کہے ہیں کہ

ھل کنت الا بشرا رسولاً

میں تو صرف ایک انسان رسول ہوں۔

معجزات بہرحال کسی نہ کسی زمانہ اور مخصوص وقت میں ظاہر ہوتے ہیں اور پھر دنیا کے دوسرے حوادث کی طرح فنا ہو جاتے ہیں۔ اس بنا پر اگر ہر معاند کے سوال پر نبوت معجزہ ہی دکھاتی رہے تو یہ تسلسل شاید کبھی ختم نہ ہو۔ اور پیغمبر کی زندگی اجنبیوں کی زندگی ہو کر رہ جاتی اس لیے ظاہری معجزہ طلب کرنے والوں کو دائمی اور مسلسل معجزہ کی طرف ملتفت ہونے کی تاکید ہوتی ہے۔ اس بنا پر اس آیت میں آیات سے آیاتِ قرآنی مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ قرآن کی ایک ایک آیت کو ہم کھول کر پیش کر چکے ہیں۔

سرکش معجزے سے بھی مطمئن نہیں ہوتے۔

نفسیاتِ انسانی کا خاصہ ہے کہ جب کسی کی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حسنِ ظن پر محمول نہیں کرتا اور اس کو اس کی ہر شے کے اندر شر، خبث اور بدی نظر آتی ہے۔ جلی سے جلی اور واضح سے واضح بُرہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دُور نہیں کر سکتے۔ معاندین جو انبیاء کے مکارم اخلاق، حسنِ تعلیم اور دیگر علمی و عملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعووں کو بھی تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے۔ اور ہر قسم کی دلیلوں کو سننے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو آخر کھیل کے طور پر وہ انبیاء سے خارق عادت معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان کو بدگمانی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہماری طرح کا ایک مدعی ... وغیرہ پر قدرت نہیں رکھتا۔ اس لیے وہ کبھی کوئی عادت کے

خلاف پیش نہ کرے گا اور اس طرح اس کی رسوائی عالم آشکارا ہو جائے گی۔ لیکن قدرتِ الٰہی آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات بھی پیش کر دیتی ہے۔ ان کو دیکھ کر بھی معاندانہ رُوح ان کے دلوں میں نبوت کی سچائی کا اعتبار نہیں پیدا ہونے دیتی اور بدگمانی انہیں یہ بتاتی ہے کہ گو اس خرق عادت کے ظہور میں تو شک نہیں مگر یہ خدائی قوت کا کرشمہ نہیں بلکہ شیطانی عمل اور سحر و جادو کی قوت سے پیدا ہوا ہے۔ اور چونکہ بظاہر معجزہ اور سحر میں کوئی فرق محسوس نہیں ہوتا اس لیے ان کے بدگمان قلب کو اس سے بھی تسلی نہیں ہوتی۔ کفارِ قریش حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے معجزوں کے مطالبہ کرتے تھے مگر جب معجزے دیکھتے تو جادوگر اور کاہن کہنے لگتے۔

چونکہ معاند حق و باطل کی قوتِ تمیز سے محروم ہوتا ہے اور یقین کی قسمت سے اس کا دامن خالی ہوتا ہے اس لیے بڑی سے بڑی نشانی بھی اس کو شک و شبہ کے گرداب سے باہر نہیں نکال سکتی۔ وہ کبھی اسے بخت و اتفاق کہتا ہے۔ کبھی جادو سمجھ کر تکذیب کرتا ہے اس لیے معجزات سے بھی اس کو ہدایت نصیب نہیں ہوتی۔ ان تمام منازل کے بعد جب معاندین پر حجت تمام ہو جاتی ہے اور پھر طلبِ معجزہ کے لیے ان کے پیہم اصرار الحاح اور طلب کی کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اس کے جواب میں ان کو نبوت کی اصل حقیقت کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے اس آیت کی روشنی سے یہ حقیقت واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے کہ قرآن کی نظر میں ان ظاہری معجزات کی چنداں وقعت نہیں ہے۔ وہ لوگوں کو ہمیشہ اصل روحِ نبوت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ یہ آیتِ قرآنی بتاتی ہے کہ نبوت اور ظاہری معجزات میں کوئی تلازم نہیں۔ اور یہ آثار و دلائل اصل نبوت سے خارج امور ہیں۔ نبوت کے اصل لوازم وحی، مخاطبہ الٰہی تزکیہ، تعلیم اور ہدایت ہیں۔ اس بنا پر جب معاندین نے معجزہ کا مطالبہ کیا تو قرآن نے اس کے جواب میں اصل حقیقت ان کے سامنے پیش کر دی کہ قد بینا الایات لقوم یوقنون۔ حاصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ پہلے لوگوں نے بھی ایسی ہی جہالت کی باتیں کہی تھیں۔ یہ نئی بات نہیں ہے۔ اور جو یقین لانے والے ہیں ان کے لیے ہم نے نبی کے برحق ہونے کی نشانیاں بیان کر دی ہیں اور جو ضد اور عداوت پر اڑ رہے ہیں وہ انکار کریں تو یہ محض عناد ہے ان کا۔[1]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۳

یقین کی دولت ایمان کی رُوح ہے

یہاں یوقنون کی تعبیر میں بڑی گہری معنویت ہے۔ مسند احمد اور ترمذی میں حضرت صدیق اکبرؓ کے حوالہ سے جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد آیا ہے کہ یقین کے بعد عافیت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔ امام بیہقی نے شعب الایمان میں ایک ارشاد نقل کیا ہے کہ اس اُمت کی سب سے پہلی اصلاح دولتِ یقین سے ہوئی ہے۔ یقین ایمان کی رُوح ہے خدا تعالیٰ کی جتنی نعمتیں ہیں وہ اس دولتِ یقین سے کمتر ہیں۔ صحیح بخاری میں عبداللہ بن مسعودؓ کا ارشاد ہے کہ الیقین الایمان کلہ، یقین ہی ایمان کی رُوح ہے۔ بیہقی نے کتاب الزہد میں ان الفاظ کو مرفوعاً بھی نقل کیا ہے۔ مگر حافظ ابن حجرؒ نے اس کو ضعیف کہا ہے۔ مسند امام احمد میں عبداللہ بن مسعودؓ کی یہ دُعا منقول ہے۔ اللھم زدنا ایمانا و یقینا و فقھا۔ اے اللہ ہمارے دل میں ایمان یقین اور ہم میں دین کی سمجھ بڑھا دے۔ سنن ترمذی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلسی دُعا میں مذکور ہے واقسم لنا من الیقین ما تھون بہ علینا مصائب الدنیا اے اللہ ہمارے حصہ میں اتنا یقین لگا دے کہ اس کی وجہ سے ہمیں دُنیا کی مصیبتیں جھیلنا آسان ہو جائے۔ سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ اگر یقین پوری حقیقت کے ساتھ دل میں سما جائے تو جنت کے اشتیاق اور دوزخ کے خوف کے مارے دل اڑنے لگے۔ جب یقین کی نعمت حاصل ہو جاتی ہے تو رُخ عالمِ مادیت کے بجائے عالمِ قدس کی طرف ہو جاتا ہے۔ اسباب بے حقیقت بن جاتے ہیں، منفعت و مضرت کا سوال نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہؓ سے دریافت کیا کہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے۔ تم بتاؤ تمہارے ایمان کی حقیقت کیا ہے۔ انہوں نے عرض کیا کہ مجھے عرشِ رحمان کا ایسا یقین حاصل ہے جیسے اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

(حجۃ اللہ البالغہ)

دلائل کی بنیاد پر یقین کی تعمیر کرنا صفتِ ایمان نہیں ہے۔ ایمان کی صفت یہ ہے کہ یقین کی بنیاد پر دلائل کی عمارت اٹھائی جائے۔ جب کسی حقیقت تک رسائی حاصل ہو جاتی ہے تو پھر دلائل کا راستہ خود بخود مختصر ہو جاتا ہے۔

إِنَّا أَرْسَلْنَاكَ بِالْحَقِّ بَشِيرًا وَنَذِيرًا ۙ وَلَا تُسْأَلُ
عَنْ أَصْحَابِ الْجَحِيمِ ﴿١١٩﴾

اے پیغمبر بلاشبہ ہم نے ہی تمہیں دینِ[327] حق دے کر روانہ کیا ہے (اور اس لیے بھیجا ہے) کہ تم لوگوں کو ایمان[328] و عمل صالح کی برکتوں کی بشارت دو اور انکارِ حق کے نتائج سے آگاہ کرو۔ جو لوگ آپ کی دعوت سے سرکشی کر کے[329] دوزخ میں جائیں گے ان کے بارے میں اللہ کے حضور آپ جوابدہ نہیں ہوں گے۔

رسالتِ عامہ اور اس کے فرائض

بنی اسرائیل یعنی یہودیوں کے تفصیلی حالات بیان فرمانے کے بعد آخر میں اولاً عیسائیوں اور پھر پوری دُنیا کے بے علم منکروں کا خاص طور پر تذکرہ بطور تمہید پیش کیا گیا۔ اصل مقصد وہ ہے جو اس آیت میں پیش کیا جا رہا ہے، پہلی آیات میں تفصیلی طور پر بتایا کہ آپ کی تشریف آوری کے وقت دُنیا کی کیا حالت تھی پہلے ان لوگوں کے حالات پر ناقدانہ تبصرہ کیا جن سے دُنیا کی آبادی اور اصلاح کی سب سے زیادہ اُمید ہو سکتی تھی، جو سام کی اولاد میں سب سے پہلے وحی الٰہی کے امانت دار تھے اس لیے قرآن نے ان سے کہا کہ لا تکونوا اوّل کافر۔ مگر یہ قوم سخت جان ہونے کے ساتھ سنگدل بھی ثابت ہوئی۔ قرآن نے ان کو طعنہ دیا کہ قست قلوبکم۔ انہوں نے مختلف زمانوں میں انبیاء کو جھٹلایا۔ ان کو تکلیفیں دیں بلکہ اُن کو قتل تک کر ڈالا۔ حضرت موسٰی اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہ آیا جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہو۔ ان کو اپنے محبوبِ خدا ہونے اور نجات یافتہ ہونے پر اتنا غرور تھا کہ وہ کہتے تھے کہ ہم کچھ کریں ہم سے کوئی باز پُرس نہ ہو گی۔ وہ سمجھتے تھے کہ جنت کی نعمتیں صرف ان ہی کے لیے ہیں۔ وہ خیال کرتے تھے کہ نبوّت و رسالت صرف ان کے گھر کی چیز ہے

کسی دوسرے کا اس میں کوئی حق نہیں۔ جو ان میں پڑھے لکھے تھے وہ خدا کے احکام کو اپنے منشا اور دولت مندوں کی خوشنودی کے لیے اپنی باطل تاویلوں سے بدلتے رہتے تھے۔ جو ان میں ان پڑھ تھے، جاہل تھے، وہ اپنے سنے سنائے قصوں پر ایمان رکھتے تھے۔ احکامِ الٰہی میں سے جو آسان اور ضرورت کے مطابق ہوتا اس کو قبول کرتے، دوسرے احکام کو پسِ پشت ڈال دیتے۔ آپس میں قتل و خونریزی کا بازار ان میں گرم تھا۔ ایک طاقتور قبیلہ دوسرے کمزور قبیلہ کو گھر سے بے گھر کر دیتا اور پھر کوئی گرفتار ہو جاتا تو فدیہ دے کر اس کو چھڑا بھی لیتے، مال و دولت کی حرص کی وجہ سے ان میں ہر قسم کا لالچ اور اخلاقی کمزوریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ اوہام خرافات پر ان کا ایمان تھا۔ تعویز، گنڈا جادو اور عملیات پر فریفتہ تھے اور سمجھتے تھے کہ یہ حضرت سلیمان کی تعلیم ہے۔

چھٹی صدی عیسوی کے خاتمہ پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے دو چار سال بعد عیسائی اپنے زوال کے پست ترین نقطہ تک پہنچ گئے تھے۔ عام سیاسی و اخلاقی حالت سے قطع نظر کر کے جب ہم مذہبی پہلو پر نظر کرتے ہیں تو وہ باپ بیٹا روح القدس اور مریم کی خدائی کے معتقد تھے۔ حضرت عیسٰی اور مریم روح القدس کی شخصیت اور مرتبہ کی تعین نے، بیسیوں فرقے پیدا کر دیئے تھے جن میں زبانی مناظروں سے گزر کر جنگ و جدل کی نوبت آ گئی تھی۔ یہاں تک کہ سنہ ۵۱۴ء میں خود عیسائیوں کے دو گروہوں کے درمیان ایک عظیم الشان مذہبی جنگ چھڑی جس میں ۶۵۰۰۰ عیسائیوں کو خارج البلد ہونا پڑا۔ جنگ عظیم کے علاوہ ہمہ وقت ہر فریق دوسرے فریق کے خون کا پیاسا رہا کرتا تھا۔ اور بارہا چھوٹی چھوٹی باتوں پر کشت و خون کی نوبت آ جاتی۔ مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی مسیحی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے وہ اس کے لیے باعثِ ننگ ہے۔ مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی۔ اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا۔ اسی زمانے میں ایک گروہ مریمی پیدا ہو گیا تھا جو حضرت مریم کو شریکِ الوہیت کر کے اقانیم ثلاثہ کی جگہ اقانیم اربعہ کا عقیدہ رکھتا تھا۔

یہ تو ان اہلِ کتاب کا حال تھا جو نبوت کے علوم کے حامل تھے۔ ان کے علاوہ باقی دنیا جن کو قرآن نے الذین لا یعلمون کہا ہے ان کا کیا حال تھا۔ اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے لیکن اسی سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جب جانکاروں کا یہ حال تھا تو نادانوں کا کیا حال ہو گا۔

پوری دُنیا ملائکہ کی الوہیت، جنات کی الوہیت، بُت پرستی، اشخاص پرستی، آثار پرستی اور مظاہر پرستی کا گہوارہ بنی ہوئی تھی۔ خرافات و اوہام، رسوم اور انسانی غلامی کی گود بنی ہوئی تھی۔ حالات یہ تھے۔ ان حالات کا ناگزیر تقاضا تھا کہ پوری دُنیا کی اصلاح کی خاطر ایسی کامل ترین، محبوب ترین نبوت کا ظہور ہو جو تمام عالم کے لیے ابد تک کافی رہے۔

الم البقرہ کے قاری کے ذہن میں یہاں پہنچ کر یہ سوال خود بخود چٹکیاں لینے لگتا ہے کہ اگر حالات یہ ہیں تو ان کا حل کیا ہے۔ اسی اٹھتے ہوئے سوال کا پیش نظر آیت میں دیا گیا ہے گویا علمائے بلاغت کی زبان میں یہ استیناف بیانی ہے۔ چونکہ عام شارحین قرآن کی نظر اس پہلو پر نہ تھی اس لیے ان کو یہ آیت بے جوڑ اور بے ربط نظر آئی۔ کسی نے کہہ دیا کہ یہ جملہ معترضہ ہے۔ اور کسی نے بتایا کہ اس کے ذریعے حضور انور کو تسلی دی جا رہی ہے۔ اور کسی کی زبان پہ آیا کہ اور نشانیوں کا کیا ذکر سب سے بڑی نشانی آپ کی ذات گرامی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ آیت نہ تسلی ہے، نہ جملہ معترضہ ہے نہ آیات میں سے کسی آیت کی تعیین کے لیے آئی بلکہ یہ ایک اٹھتے ہوتے سوال کا جواب ہے۔

۳۲۷ ۔ بلاشبہ ہم نے تمہیں دینِ حق دے کر روانہ کیا ہے۔ یعنی ہم نے تمہیں ان حالات کی اصلاح کی خاطر عقائد اور شرائع کا وہ سرمایہ دے کر روانہ کیا ہے جو سرتاسر حق ہے۔ عربی میں اس کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے یعنی جو بات ثابت، اٹل، اَن مٹ ہو اسے حق کہیں گے باطل ٹھیک ٹھیک اس کی نقیض ہے۔ ایسی چیز جس میں ثبات اور قیام نہ ہو، ٹل جانے والی مٹ جانے والی قرآن میں ہے۔ یحق الحق یعنی آپ کو جو کچھ دے کر روانہ کیا گیا ہے وہ ایک قائم اور ثابت حقیقت ہے۔ اسے اختیار کر کے ہر شخص دُنیا و آخرت کی سعادتیں حاصل کر سکتا ہے جو قوتیں اسے مٹانا چاہیں گی ضرور مٹ جائیں گی۔ یہ باقی اور قائم رہنے والی حقیقت ہے۔ اس کا بقا و قیام خود ہی اپنی حقیقت کا اعلان ہے۔ اور یہ الحق کسی خاص طبقہ، کسی خاص قوم، خاص ملک، خاص نسل اور خاص رنگ کے لیے نہیں بلکہ پوری انسانیت کے لیے، چنانچہ ارشاد ہے،

قل یا ایہا الناس قد جاءکم الحق من ربکم

قرآن کے نزول کو بھی الحق کہا گیا ہے

وبالحق انزلناہ ۔ بالحق نزل

یعنی قرآن کا انزال اور نزولِ حق کے ساتھ ہے۔ اور ان تینوں باتوں میں کہ حق آگیا، اور آپ کی رسالت حق کے ساتھ ہے، قرآن کا نزول حق کے ساتھ ہوا ہے اس طرف اشارا ہے کہ اس کے مقابلے پر جو کچھ ہے وہ حق نہیں سرتاسر باطل ہے اور باطل مٹنے کے لیے ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم دینِ حق کو لے کر آئے اور اسے دُنیا میں قائم کرنے کے لیے بھیجے گئے۔ یہ آیت گرامی مدینہ کی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے اور اس کا سیاق وسباق بتا رہا ہے کہ یہ اس دور کی داستان ہے جبکہ تینوں طاقتیں نبوت کے مقابلے میں پوری جوانی کا مظاہرہ کر رہی تھیں۔ نیک دل اور حقیقت شناس تو سننے اور دیکھنے کے ساتھ قبول کرنے پر آمادہ ہو گئے لیکن وہ بھی جن کے دل کے آئینے زنگ آلود تھے۔ پیغام کی سچائی وحی کی تاثیر، نبوت کی پُراثر دعوت، اعجاز معصومیت اور اخلاق کے پرتو سے صاف وشفاف ہوتے گئے، اور حق کا نور روز بروز زیادہ صفائی اور چمک کے ساتھ عرب کے افق پر درخشاں اور تاباں ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ ۲۳ برس کی مدت میں ایک ایمان پر مبنی اُمت، ایک قرآن پر مبنی نظامِ حکومت، ایک جامع اخلاقی نظام، ایک کامل قانون، ایک مکمل شریعت، ایک ابدی مذہب اور عملی جماعت، خدا پرستی، اخلاق، ایثار، تقویٰ، ایمانداری اور راستی کا ایک مجسم عہد یعنی حق کا ایک نیا سماں پیدا ہو گیا۔

ف ۳۲۸ - تم لوگوں کو ایمان وعمل صالح کی بشارت دو اور انکارِ حق کے نتائج سے آگاہ کردو۔ جو حق آپ کو دے کر اللہ نے روانہ کیا ہے اس کو لوگوں تک پہنچانے کا بھی طریقہ اللہ نے آپ کو بتایا ہے کہ اسے پہنچانے کے لیے طریق کار یہ ہے کہ لوگوں میں ترغیب اور ترہیب سے دعوت کا کام کیا جائے۔ اچھے کاموں پر اللہ سبحانہٗ کے وعدوں کی بشارت سنائی جائے اور بُرے کاموں پر اللہ کی سزا سے ڈرایا جائے۔

ان دو لفظوں بشیر اور نذیر میں معانی کا ایک سمندر پنہاں ہے۔

کسی شخص کا بطورِ خود ایمان اور عمل صالح پر اچھے انجام کی بشارت دینا اور کفر وبدعملی پر بُرے انجام سے ڈرانا اور بات ہے اور نبی کا اللہ کی طرف سے بشیر ونذیر بنا کر روانہ کیا جانا دوسری بات ہے۔ جو شخص اللہ کی جانب سے یہ مقام لے کر آتا ہے وہ اپنی بشارت اور انذار کے پیچھے لازماً ایک اقتدار رکھتا ہے جس کی بنا پر اس کی بشارتوں اور اس کی تنبیہوں [illegible] رکھتا ہے کہ جس

احکم الحاکمین کی طرف سے وہ روانہ کیا گیا ہے ۔ وہ اس کام کے پسندیدہ ہونے اور مستحق اجر ہونے کا اعلان کر رہا ہے لہٰذا وہ یقیناً فرض واجب یا مستحب ہے اور اس کا کسی کام کے بُرے انجام کی خبر دینا یہ معنی رکھتا ہے کہ قادر مطلق اس کام سے منع کر رہا ہے لہٰذا وہ ضرور گناہ اور حرام ہے اور یقیناً اس کا مرتکب سزا پائے گا ۔ یہ حیثیت رسُول کے سوا کسی اور شخص کو کبھی حاصل نہیں ہو سکتی[1]

اس میں اشارہ ہے کہ بشیر ہونے کی حیثیت میں میں دینِ حق کے اوامر لے کر آیا ہوں اور نذیر ہونے کی حیثیت میں میں دینِ حق کے نواہی لے کر آیا ہوں ۔ دینِ حق یعنی عقائد، اعمال اور اخلاق پر مشتمل نظامِ زندگی چونکہ اللہ کی جانب سے ہوتا ہے اور انسانوں کے سامنے اسے اللہ کا رسُول پیش کرتا ہے اور اس میں رسُول اللہ پاک کی حاکم ہونے کی حیثیت میں نمائندگی کرتا ہے اس لیے حاکم ہونے کی حیثیت میں اوامر اور نواہی حکومت کا ناگزیر تقاضا ہیں ۔ حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ انسانی علم تو انسانی زندگی کے صرف ایک ایک شعبہ کی ہدایت کرتے ہیں اور وہ بھی نامکمل اور نبوت انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے متعلق ہدایت لے کر آتی ہے اور مکمل ہدایت ۔ گویا عالم کو اپنے نظام کے لیے جن مختلف قابلیتوں کے مختلف انسانوں کی ضرورت ہوتی ہے وہ سب قابلیتیں بیک وقت اعلیٰ سے اعلیٰ طریق پر نبوت کے دامن میں موجود ہوتی ہیں ۔ معاشی، معاشرتی، تہذیبی، تمدنی، سیاسی، اجتماعی، دیوانی، فوجداری، اخلاقی اور ایک فرد کی خانگی زندگی میں تنہائیوں تک کے لیے نبوت اپنی آغوش میں ہدایات رکھتی ہیں ۔ وہ عفت و پارسائی کو بتاتی ہے تو بشیر ہے زنا سے روکتی ہے تو نذیر ہے منافع اور مصالح کو ابھارتی ہے تو بشیر ہے مضار اور مفاسد کو مٹاتی ہے تو نذیر ہے اللہ کی جانب سے دُنیا اور آخرت کا پورا کارخانہ بشیر و نذیر کے عنوان کے تحت نبوت کے زیرِ نگیں کر دیا گیا ہے ۔ اسی بنا پر نبی کے اقوال، افعال، اخلاق انسانوں کے لیے صحیح معیار میزان کا کام دیتے ہیں ۔

آیت میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ نے تم کو رسُول بنا کر روانہ کیا ہے اور اس لیے روانہ کیا ہے کہ تم دینِ حق کو انسانوں میں بشارت اور انذار کے ذریعے قائم کرو ۔ اس آیت

---

[1] تفہیم القرآن ج ۴ ص ۱۰۸

وَلَنْ تَرْضٰى عَنْكَ الْيَهُوْدُ وَلَا النَّصٰرٰى حَتّٰى تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ ۗ قُلْ اِنَّ هُدَى اللّٰهِ هُوَ الْهُدٰى ۗ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ اَهْوَآءَهُمْ بَعْدَ الَّذِیْ جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ مَا لَكَ مِنَ اللّٰهِ مِنْ وَّلِیٍّ وَّلَا نَصِیْرٍ ﴿۱۲۰﴾

اور حقیقت یہ ہے کہ آپ ان تینوں میں سے یہود و نصاریٰ کی خاطر اس اُمید پر کہ وہ اہلِ کتاب ہیں کیسی ہی محنت کریں لیکن یہ دونوں یعنی یہود و نصاریٰ آپ[۳۳۰] سے اس وقت تک ہرگز خوش نہ ہوں گے جب تک آپ اُن کے طریقے پر نہ چلیں گے ان سے صاف صاف کہہ دو کہ رہنمائی تو صرف[۳۳۱] اللہ ہی کی رہنمائی ہے نہ کہ تمہاری خودساختہ رہنمائی۔ اور بلاشبہ اگر تم نے ان کی خواہشوں[۳۳۲] پر مبنی رہنمائی کی پیروی کی باوجودیکہ تمہارے پاس علم آچکا ہے تو آپ کے لیے اللہ کی دوستی[۳۳۳] اور مددگاری کا دروازہ بند ہو جائے گا۔

میں ارسال کو اگرچہ بے قید رکھا گیا ہے لیکن جس مقام پر یہ آیت آئی ہے اور جن سے مخاطبہ میں یہ آیت آئی ہے یعنی یہودیوں، عیسائیوں اور کفار سے اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ یہ آپ کی عموم رسالت کے ساتھ رسالت کی ابدیت کا اعلان ہے

۳۲۹ ہے۔ جو لوگ آپ کی دعوت سے سرکشی کر کے جہنم میں جائیں گے آپ ان کے بارے میں اللہ کے حضور جواب دہ نہیں ہیں۔ یعنی کسی کی تکذیب آپ کا کچھ نہ بگاڑے گی۔ تکذیب کرنے والا اگر تکذیب کرتا ہے تو اس کی سزا اسی کو بھگتنا ہے۔ آپ کی حیثیت مسیطر و جبار کی نہیں بلکہ معلم و ہادی کی ہے اس لیے آپ کا کام لوگوں تک پیغام پہنچانا ہے۔ منوانا آپ کی ذمہ داری میں داخل نہیں ہے۔ اگر کوئی نہ مانے گا تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ مکی سورتوں میں چونکہ آپ کو اس کام میں جان کھپانے اور بہت بڑی محنت کرنے کا حکم دیا گیا تھا وجاھدھم بہ جھادا کبیرا

قرآن سے ان پر بڑے زور سے محنت اور کوشش کیجئے اس لیے اس موقعہ پر یہ فرما کر لا تسأل من اصحاب الجحیم آپ کو تسلی دی گئی ہے کہ محنت کے باوجود اگر کوئی حق کو نہ مانے گا تو اس کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں یعنی تجھ پر الزام نہیں کہ ان کو مسلمان کیوں نہیں کیا [1] مطلب یہ ہے کہ منکرین کے انکار کی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ آپ کیوں اس قدر فکر و تشویش میں مبتلا ہوتے ہیں۔ آپ کا فرض تو پیغام پہنچانے پر ختم ہو جاتا ہے آگے کی ذمہ داری آپ پر ذرہ برابر نہیں ہے [2]

اہل کتاب سے کوئی توقع نہیں

بُری بات اور بُرے کام سے رنجیدہ ہونا طبیعت ہے۔ اور اگر بُرائی اُن کی جانب سے ہو جن سے اس کی توقع نہ ہو تو اس رنج میں اور بھی اضافہ ہو جاتا ہے۔ یہودی اور عیسائی علوم نبوت کے جانکار، آخرت کو ماننے والے اور نسلِ انبیا سے تعلق رکھنے والے تھے۔ ان سے نبوت کو توقع تھی کہ نبوت کے کام میں مددگار ہوں گے اور ہاتھ بٹائیں گے لیکن خلاف توقع ان کی جانب سے شدید مخالفت ہوئی، اور صرف مخالفت ہی نہیں بلکہ ان کی مخالفت نے مکابرہ، انکار اور عداوت کی شکل اختیار کرلی۔ اس آیت میں قرآن نے حضورؐ کو بتایا ہے کہ ان سے اس کام میں مدد ملنے، ہاتھ بٹانے کی کوئی توقع نہ فرمایئے اور ان سے اپنی توجہ گرامی کو بالکل ہٹا لیجئے۔ آپ کی خواہش یہ ہے کہ حق کو قبول کرلیں اور ان کی خوشی اس میں ہے کہ آپ اُن کے راستہ پر چلیں۔ ان کے نزدیک دین کی سچائی، آخرت کی نجات اور حق و باطل کا معیار یہودی اور عیسائی ہونا ہے۔ ایمان اور عمل کوئی چیز نہیں ہے۔ ان کا خیال ہے کہ دین کی سچائی صرف ان کے ہی حصے میں آئی ہے۔ باقی تمام انسانی برادری اس سے محروم ہے۔ قرآن نے حضور انورؐ کو بتایا ہے اور حضور انورؐ کے واسطے سے اُمت کو آگاہ کیا ہے کہ یہ لوگ اتباع ہوئی کر رہے ہیں اور تم اتباع ہُدیٰ کر رہے ہو۔ اور یہ دونوں ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ یعنی جو متبع ہوئی ہے وہ متبع ہدیٰ نہیں ہوسکتا۔ اور جو آسمانی ہدایت کا متبع ہے وہ متبع ہوئی نہیں ہوسکتا۔ یعنی

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۲ [2] تفسیر ماجدی ص ۴۰

اتباع ہدیٰ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اتباع ہویٰ کو چھوڑے۔ لیکن یہودی اور عیسائی اس کے لیے آمادہ نہیں ہیں کہ وہ اتباع ہویٰ کو ترک کر دیں۔ بلکہ ان کی خواہش یہ ہے کہ آپ بھی ان کی خواہشات کے بنائے ہوئے راستہ پر چلیں اور اللہ کے بنائے ہوتے راستہ کو چھوڑ دیں۔ اس لیے اس راہ میں ان سے توقع نہ رکھیے۔

ــہ ۲۳۰ ۔ یہودی اور عیسائی آپ سے اس وقت تک راضی نہ ہوں گے تاآنکہ آپ ان کے طریقہ کی پیروی کر لیں۔ یہ دونوں دوسرے کافروں کے مقابلے میں علوم نبوت سے آشنا ہیں ان میں گمراہی بے علمی سے نہیں بلکہ علم کی بے راہ روی سے آئی ہے اور جو گمراہی علم کی راہ سے آتی ہے اس کا نتیجہ انتہائی خطرناک ہوتا ہے۔ یہ گمراہی تاریکی کی گمراہی نہیں بلکہ روشنی کی گمراہی ہے جہل کی نہیں علم کی گمراہی ہے۔ اس لیے یہاں اسباب ہدایت سب بے کار ہیں۔ نہ کان سنتے ہیں، نہ آنکھیں دیکھتی ہیں اور نہ عقل سوچتی ہے، حق فہمی، حق بینی کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ ان سے ہدایت اور توبہ کی کوئی توقع نہیں ہے۔ دین کے نام پر یہ گھروندے ہویٰ کی اساس پر بنے ہوئے ہیں۔ ان سے منسلک ہو جانے کے بعد انسان میں حق پسندی اور حق بینی کی جگہ گروہ پرستی کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔

یعنی یہود و نصاریٰ کو حق سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں۔ وہ کبھی آپ کا دین قبول نہیں کریں گے۔ بالفرض اگر تم بھی ان کے تابع ہو جاؤ تو خوش ہو جائیں گے اور یہ ممکن نہیں تو آپ کو ان سے موافقت کی اُمید نہ رکھنی چاہیے[1]

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی ناراضی کا سبب یہ تو نہیں ہے کہ وہ سچے طالب حق ہیں۔ اور تم نے ان کے سامنے حق کو واضح کرنے میں کچھ کمی کی ہے وہ تو اس لیے تم سے ناراض ہیں کہ تم نے اللہ کی آیات اور اس کے دین کے ساتھ وہ منافقانہ اور بازی گرانہ طرزِ عمل کیوں اختیار نہ کیا۔ خدا پرستی کے پردے میں وہ خود پرستی کیوں نہ کی۔ دین کے اُصول و احکام کو اپنے تخیلات اور خواہشات کے مطابق ڈھانے میں اس دیدہ دلیری سے کیوں کام نہ لیا۔ وہ ریاکاری، گندم نمائی جو فروشی کیوں نہ کی جو خود ان کا اپنا شیوہ ہے۔ لہٰذا انہیں راضی کرنے کی فکر چھوڑ دو۔ کیونکہ جب تک تم ان کے سے رنگ ڈھنگ اختیار نہ کر لو۔ دین کے ساتھ وہی معاملہ نہ کرو جو

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۳

خود یہ کرتے ہیں اور عقائد و اعمال کی انہیں گمراہیوں میں مبتلا نہ ہو جاؤ جن میں یہ مبتلا ہیں۔ اس وقت تک ان کا تم سے راضی ہونا امر محال ہے لے

۳۲۱ ۔ کہہ دو کہ رہنمائی تو صرف اللہ ہی کی رہنمائی ہے۔ یعنی ان کے سامنے صاف صاف اعلان کر دو کہ ہدایت تو صرف وہ ہی ہے جو اللہ کی جانب سے میں لے کر آیا ہوں، تمہاری آراء اور نفسانی خواہشوں کا بنایا ہوا پیمانہ اللہ کی ہدایت نہیں ہے۔ ۳۱ آیت میں الھدیٰ کو اللہ کی ہدایت بنایا گیا ہے یہ الہدیٰ کیا ہے؟ قرآن بتاتا ہے کہ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی وہ ہدایت ہے جو آپ پر اللہ نے بذریعہ وحی نازل فرمائی ہے۔ اور بلا تفریق و امتیاز نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ اس میں نہ تو نسل و قوم کا امتیاز ہے نہ زمان و مکان کی قید ہے وہ سب کے لیے اور ہمیشہ کے لیے ہے اور اس جملہ کا قصر بتا رہا ہے کہ اس ایک ہدایت کے سوا اور جتنی ہدایتیں بھی انسانوں نے سمجھ رکھی ہیں سب انسانی بناوٹ کی راہیں ہیں۔ خدا کی بنائی ہوئی راہ صرف یہی ایک راہ ہے۔

اسی لیے وہ ہدایت کی ان تمام صورتوں سے یک قلم انکار کرتا ہے جو اس اصل سے منحرف ہو کر طرح طرح کے ناموں اور مختلف منظریوں میں بٹ گئی ہے۔ ہدایت کی راہ تو یہی عالمگیر اور ابدی ہدایت کی راہ ہے۔ اسی کو وہ الدین القیم، الاسلام، الصراط المستقیم، سبیل اللہ سے پکارتا ہے۔ یہی وہ اصل عظیم ہے، نبوت کی دعوت کی سب سے پہلی بنیاد ہے۔ وہ جو کچھ بھی بتلانا چاہتا ہے تمام تر اسی اصل پر مبنی ہے۔ اگر اس سے نظر ہٹا لی جائے تو نبوت کا تمام کارخانہ درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اسی کو قرآن نے دوسری جگہ مقصدِ رسالت قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے۔

هوالذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله ولو کره المشرکون ۔

وہی ہے جس نے اپنے رسول کو الہدیٰ اور سچے دین کے ساتھ روانہ کیا ہے تاکہ اس دینِ حقیقی کو تمام بناوٹی دینوں پر برتر کر دے۔

یہاں بناوٹی دینوں سے مقصود زندگی کے وہ نظام ہیں جو دین کی نوعیت رکھتے ہیں۔ قرآن میں یہ اعلان اسی عنوان سے تین بار کیا گیا ہے کہ اللہ نے اپنے رسول کو الہدیٰ اور

لے تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۰۷

دین حق دے کر اس لیے روانہ کیا ہے کہ اسے دین کی نوعیت کے تمام نظاموں پر غالب کر دے۔ یہودیوں کے تذکرے میں سورۃ براۃ میں، مشرکین کے تذکرہ میں سورۃ فتح میں اور عیسائیوں کے تذکرے میں سورہ الصف میں۔ آیت بالا سنہ ۹ھ میں نازل ہوئی جبکہ سورۃ فتح والی آیت سنہ ۸ھ میں اور سورۃ الصف والی آیت سنہ ۳ھ میں نازل ہوئی جبکہ اسلام اور نبوت کی دعوت صرف مدینہ تک محدود تھی۔ مسلمانوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی۔ اس آیت قل ان ھدی اللہ ھو الھدی کا زمانۂ نزول مدنی زندگی کا بالکل ابتدائی زمانہ ہے۔ اس لیے اگر یہ کہہ دیا جائے کہ اس کا نزول سنہ ۱ھ یا سنہ ۲ھ میں ہوا تو بجا نہیں ہے۔ اپنے مقام اور اپنے مضمون کے لحاظ سے اس آیت کو جس قدر اہمیت حاصل ہے اتنا ہی زیادہ شارحین قرآن کی نگاہوں نے اس کی تشریح سے اعراض کیا ہے۔ حتیٰ کہ کہا جا سکتا ہے کہ آج قرآن کی کوئی آیت بھی دنیا کی نظروں سے اتنی پوشیدہ نہیں جس قدر یہ آیت۔

۳۴۲ - اگر تم نے ان کی خواہشوں کی پیروی کی باوجودیکہ تمہارے پاس العلم آچکا ہے۔ انداز خطاب بظاہر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن دراصل بات اُمت کو سنائی جا رہی ہے۔ کیونکہ یہ پیروی حضور انور کے لیے محال ہے اللہ سبحانہ نے آپ کو عصمت کی نعمت سے مالامال کیا ہے۔ اہواء سے مراد یہودیوں اور عیسائیوں کے رایوں اور خیالات کے ذریعے بنایا ہوا نظامِ زندگی ہے۔ جو علم و حقیقت کی جگہ نفسانی خواہشوں پر مبنی ہے۔ قرآن نے بنی اسرائیل کی بنیادی گمراہی یہی بتائی ہے کہ وہ متبع ہوٰی ہیں۔ اور اتباع ہوٰی ان میں اس قدر سرایت کر چکی ہے کہ اس کے خلاف ان کے لیے اتنا ہی مشکل ہے کہ وہ انبیاء کی جانوں سے کھیل جاتے ہیں۔ ان کی تکذیب کرتے ہیں مگر اتباع ہواء کو چھوڑنا گوارا نہیں کرتے۔ قرآن نے جیسے اس آیت میں یہودیوں کی اہواء پر مبنی نظام کی پیروی سے منع کیا ہے ایسے ہی ان لوگوں کی پیروی سے بھی روکا ہے جو اہل کتاب کی طرح علم نہیں رکھتے

ثم جعلناک علی شریعۃ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین لا یعلمون

ہم نے آپ کو اس نظامِ حق کی کھلی شاہراہ پر قائم کر دیا ہے۔ اسی پر چلیے اور اور بے علموں کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجیے۔

گویا نبوت کی لائی ہوئی ہدایت کے سامنے جو کچھ بھی ہے چاہے وہ یہودیت کے نام پر

یا عیسائیت کے نام پر یہ سب انسانوں کی خواہشوں، ان کے میلانات اور ان کے رجحانات کا بنایا ہوا سرمایہ ہے اور اس کے مقابلے پر نبوت الہدیٰ کے نام پر جو کچھ لے کر آئی ہے وہ العلم ہے، جس کی اساس وحیٔ الٰہی ہے نہ کہ انسانی رائے اور خیال۔

حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ یہ بات بطریق فرض ہے یعنی اگر بالفرض آپ ایسا کریں تو قہر الٰہی سے کوئی نہیں بچا سکتا۔ بایں طور تنبیہہ سے اُمت کو کہ اگر کوئی مسلمان ہو کر قرآن کو سمجھ کر دین سے پھرے گا تو اس کو عذاب سے کوئی نہ بچا سکے گا۔ [1]

گویا ایک سرے پر العلم ہے حقیقت سے تمام تر لبریز اور دوسرے سرے پر اہواء، حقیقت سے تمام تر خالی۔ استدلالِ قرآن کی منطقی شکل گویا یوں ہوئی۔

۱۔ یہود و نصاریٰ کی رضاطلبی کے لیے ضروری ہے کہ آپ ان کا دین اختیار کریں لیکن ان کا دین سرتاسر محرف و باطل ہے۔ اس لیے ان کی رضاطلبی کے لیے ان کے دین کا اختیار کرنا ضروری ہے۔

۲۔ جو رحمتِ خداوندی سے مالا مال اور توفیقِ الٰہی سے سرفراز ہیں اس کے لیے باطل کی پیروی امرِ محال ہے۔ آپ رحمتِ خداوندی سے مالا مال اور توفیقِ الٰہی سے سرفراز ہیں اس لیے پیرویٔ باطل محال ہے

۳۔ جب آپ کے لیے پیرویٔ باطل محال ہے تو ملتِ یہود و نصاریٰ کی پیروی بھی محال ہے۔[2]

۳۳۳ ہ۔ تو اللہ کی دوستی اور مدد کا دروازہ بند ہو جائے گا۔ یعنی اگر اس الہدیٰ اور العلم کے مقابلے میں کسی ور نظام کی پیروی مسلمانوں نے کی تو وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے اور اللہ کی محبت اور نصرت سے محروم ہو جائیں گے۔ خوب یاد رہے کہ یہ بات رسُول اللہ کو مخاطب کر کے مسلمانوں کو کہی گئی ہے۔ ابن کثیرؒ نے تصریح کی ہے الخطاب للرسول والامر لامتہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ جیسے مسلمانوں کا نبوّت کے لائے ہوئے الہدیٰ اور العلم سے وابستہ ہونا اور اس کی پیروی کرنا اللہ کی نصرت اور دوستی کا ذریعہ ہے ایسے ہی نبوّت کے علم و ہدیٰ سے ہٹ کر مسلمانوں کا زندگی میں دوسرے نظاموں سے وابستہ ہونا اور ان کی پیروی کرنا اللہ کی محبت اور دوستی اور اس کی مدد سے محروم ہونے کا سبب ہے۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۳ [2] تفسیر ماجدی ص ۴۸

اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَتْلُوْنَهٗ حَقَّ تِلَاوَتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ ؕ وَ

مَنْ يَّكْفُرْ بِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۱۲۱﴾

وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب[۳۳۴] دی ہے وہ اسے پڑھتے ہیں جیسا کہ اسے[۳۳۵] پڑھنے کا حق ہے۔ وہ ہی اس پر ایمان[۳۳۶] رکھتے ہیں۔ اور جو اس کا[۳۳۷] انکار کریں گے وہ ہی اصل میں نقصان اٹھانے والے ہیں۔

اُمت کی بعثت

یہ بھی اس موقعہ پر ذہنوں میں اٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ یہ بات معلوم ہو جانے کے بعد کہ اس وقت کی دنیائے علم یعنی اہل کتاب سے اس کام میں ہاتھ بٹانے کی کوئی توقع نہ کیجئے اور ان سے کوئی اُمید نہ رکھئے۔ کیونکہ وہ اتباع ہوی کے سنگین جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں ان کی گمراہی تاریکی کی گمراہی نہیں روشنی کی گمراہی ہے۔ جہل کی نہیں علم کی گمراہی ہے۔ اس بات کے سننے اور پہلی آیت میں جو بات کہی گئی ہے اس کے سمجھنے کے بعد کہ آپ کو اللہ نے دین حق دے کر روانہ کیا ہے پوری انسانیت کے لیے ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ ذہن میں یہ سوال خود بخود چٹکیاں لینے پر مجبور ہوتا ہے کہ اگر ان سے توقع نہیں تو یہ عظیم اور پوری انسانیت کی اصلاح کا اجتماعی کام صرف انفرادی محنت سے کیونکہ بروئے کار آئے گا۔ اگر کام صرف ایک علاقہ کی اصلاح کا یا صرف ایک وقت محدود کا ہوتا تو یہ ممکن ہوتا کہ انفرادی کوشش نتیجہ خیز ہو جاتی لیکن اس قدر اونچے اور بڑے کام کے لیے عمل کی انفرادی فیاضی اور دریا دلی خواہ کتنی زیادہ ہو ناکافی ہے۔ اس آیت میں اسی سوال کا جواب ہے کہ اس کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے ہم نے ایسی جماعت آپ کی ہمرکابی میں دی ہے جس میں مقصد کی لگن اور نصب العین کا عشق ہے۔ جو قرآن کی داعی ہے اور قرآن سے ان میں ایسی شدید محبت ہے کہ اس کے لیے کوئی قربانی نہیں جو ان کو ناگوار ہو اس کی محبت ان کے دلوں میں اس قدر راسخ ہو چکی ہے کہ اس کے اوامر و نواہی پر عمل کرنا اور فرائض کو بجا لانا ان کے ایمان و

یقین کا تقاضا بن چکا ہے۔
عام مفسرینِ قرآن نے اس آیت کو بھی سیاق و سباق سے الگ کر کے جملہ معترضہ قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس میں اہلِ کتاب کے صالح عنصر کی طرف اشارہ ہے ان کے خیال میں آیت میں کتاب سے مراد تورات اور جن کو دی گئی ہے سے مراد یہود و نصاریٰ ہیں، لیکن اس تشریح کی وجہ سے اس کے بعد آنے والے فقرے کی نشست بالکل بے محل ہو کر رہ گئی۔ نہ بہ کی ضمیر کا مرجع درست ہوا اور نہ اس فقرے میں مسند الیہ کی تقدیم سے جو حصر بتانا مقصود تھا وہ باقی رہا ہے۔ اگر یہودیوں کے چند افراد کو جو ایمان لائے تھے مثلاً عبداللہ بن سلام، اس آیت کا مصداق قرار دیا جائے اور مطلب یہ بتایا جائے کہ تورات کو بس یہی مانتے ہیں اور کوئی نہیں مانتا اور تورات کو پڑھنے کا حق بھی ادا کر رہے ہیں اور کوئی نہیں کرتا۔ تو اس میں کوئی خاص معنویت نہیں ہے۔ اس باب میں ہمیں حضرت قتادہ کی تشریح موقعہ و مقام کے زیادہ مناسب اور برمحل معلوم ہوتی ہے کہ جن کو کتاب دی گئی ہے سے صحابہ کرام اور کتاب سے قرآنِ عزیز مراد ہے۔ اب مطلب بالکل واضح اور صاف ہے کہ صحابہ کرام قرآن کی تلاوت اس طرح کرتے ہیں جو اس کا حق ہے اور ان کا ہی اس پر ایمان ہے۔ ان کے علاوہ جن سے کام میں ہاتھ بٹانے کی توقع کی جا رہی ہے ان کا ایمان نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ نبوّت کے کام میں ہاتھ بٹانے کے لیے ایسے لوگوں کی ضرورت ہے جو اپنی زندگی کی بنیادیں قرآن پر استوار کریں اور اس پر ایسا ایمان رکھیں جس کا ضمیر مشن کی ولولہ انگیزیوں اور جنون نوازیوں سے تیار ہو۔ جس میں ایثار و قربانی اور سرفروشیوں کی ایک دُنیا آباد ہو۔ اور جس میں افراد کی شخصی نجات کا نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کی نجات کا تصور اور جذبہ کار فرما ہو۔ یہ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوّت کے ساتھ آپ کی اُمّت کی بعثت کا اعلان ہو رہا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس طرف اشارہ فرمایا ہے کہ

اعظم الانبیاء شانا من لہ نوع آخر من البعثۃ

نبیوں میں سے اونچی شان والا نبی وہ ہے جس کی نبوّت کے پیشِ منظر میں ایک جدید قسم کی بعثت بھی ہو۔ (ج ا ص ۸۳)

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ آپ کی نبوت سے اللہ پاک کے دو بنیادی مقصد ہیں
ایک یہ کہ آپ کی ذات لوگوں کے لیے ذریعۂ ہدایت اور روشنی کا سبب ہو۔

دوسرے یہ کہ آپ کی اُمت بہترین اُمت ہو اور اسے لوگوں کی اصلاح کے لیے روانہ کیا گیا ہو۔
اس معنے کے اعتبار سے آپؐ کی بعثت کے آغوش میں ایک اور بعثت ہے یعنی اُمت کی اجتماعی بعثت۔ یہ مقام قرآن کے مہمات معارف میں سے ہے۔ اس کے تفصیلی مباحث انشاء اللہ دوسرے پارے میں آرہے ہیں۔ دُعاءِ ابراہیم میں بھی اُمۃ مسلمہ سے اس کی طرف اشارہ آرہا ہے۔

ف ۳۳۴ ۔ یہود میں تھوڑے آدمی منصف بھی تھے کہ اپنی کتاب کو پڑھتے تھے۔ سمجھ کر وہ قرآن پر ایمان لے آئے جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی۔ یہ آیت انہی لوگوں کے بارے ہے یعنی انہوں نے تورات کو غور سے پڑھا، انہی کو ایمان نصیب ہوا اور جس نے انکار کیا کتاب کا یعنی اس میں تحریف کی وہ خائب و خاسر ہوا[1]۔ حضرت شیخ نے آیت کا یہ مطلب عام شارحینِ قرآن کے مطابق پیش فرمایا ہے۔ اس مطلب کی موجودگی میں اور تو اور آخری فقرے من یکفر بہ میں کوئی خاص معنویت نہیں رہی۔ قرآن مستقبل کے بارے میں اعلان کر رہا ہے کہ جو اس نبوت کا، نبوت کے ذریعے آئے ہوئے العلم کا اور الکتاب کا کفر کرے گا وہ خائب و خاسر ہے اور اس تشریح کو لے کر جو عام مفسرین بیان کرتے ہیں مطلب یہ ہوگا کہ جو تورات میں تحریف کرے گا حالانکہ صرف تورات ہی تو ان کے ہاتھوں میں ہے۔ یہ گویا قرآن کا اعتراف ہوگا کہ تورات میں ابھی تک کوئی تحریف نہیں ہوئی ہے۔ اب جو تحریف کریں گے وہ کافر ہوں گے۔ حالانکہ قرآن نے کتاب کی حد تک ان پر تین قسموں پر مشتمل فردِ جرم لگائی ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں اللہ سبحانہ نے یہودیوں کو تین باتوں پر ملعون کیا ہے تحریف، تلبیس اور کتمان، تحریف کا قرآن میں متعدد مواقع پر تذکرہ ہے۔

ف ۳۳۵ ۔ وہ اسے پڑھتے ہیں جیسا کہ اسے پڑھنے کا حق ہے۔ یہ صیغہ مضارع ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ قرآن کی تلاوت کرتے ہیں جیسا کہ اس کا حق ہے۔ عکرمہ فرماتے ہیں کہ یہاں تلاوت بمعنے اتباع ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اس قرآن کا اتباع کرتے ہیں جو اتباع کا حق ہے یعنی اس کے اوامر کی پابجائی کرتے ہیں اور اس کے نواہی سے بچتے ہیں اس کے حلال کو حلال اور اس کے حرام کو حرام گردانتے ہیں، فاروق اعظم فرماتے ہیں کہ مطلب

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۳

یہ ہے کہ جب قرآن میں نعمارِ جنّت کا ذکر پڑھتے ہیں تو اللہ سے اُسے مانگتے ہیں اور دوزخ کی ہولناکیوں کے تذکرے پڑھتے ہیں تو دوزخ سے پناہ کی اللہ سے درخواست کرتے ہیں۔
مطلب یہ ہے کہ وہ قرآن کے اسرار سمجھتے ہیں، اس کی قانونی اور دستوری حکمت کے رازداں ہیں، اور انسان کی ذمہ داری کے وزن سے واقف ہیں۔ گویا تلاوتِ حق تلاوت کی تعبیر فہم و تدبر کے لیے اختیار کی گئی ہے اور یہ بتانا مقصود ہے کہ تلاوتِ کتاب اللہ کا بنیادی مقصد کتاب اللہ کو سمجھنا، اس پر غور و فکر کرنا، اس کے مدلولات کو معلوم کرنا اور زندگی کے مختلف گوشوں میں اسے برتنا ہے۔ یعنی وہ صرف تعبد کی خاطر تلاوت نہیں کرتے بلکہ تعبد کے ساتھ تدبر کے لیے تلاوت کرتے ہیں۔

ف ۲۲۶۔ وہی اس پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس سے پہلے الحق، الکتاب اور العلم کا ذکر، الحق وہ نظامِ زندگی جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے، الکتاب اس نظامِ زندگی کا ہدایت نامہ جو بذریعہ وحی قرآن کی صورت میں آپ نے پیش کیا اور العلم وہ سرمایۂ علم جو قرآن نے آپ کو دیا۔ ان تینوں میں چاہے کسی کو مرجع بنا لو مطلب ایک ہی ہے بشرطیکہ کتاب سے قرآن مراد ہو۔ مولانا تھانوی اور شاہ عبدالعزیز نے دینِ حق اور العلم کو ضمیر مرجع بتایا ہے۔

ف ۲۲۷۔ جو بھی اس کا انکار کرے گا۔ یعنی اس دینِ حق اور اس العلم کا جو قرآن کے ذریعے اللہ کی جانب سے آپ کو ارزانی ہوا ہے۔ اس کا انکار و سرکشی دُنیا اور آخرت میں سرتاسر گھاٹا اور خسارہ ہے۔ آلوسی نے اس کی وجہ ایمان دے کر کفر کو اپنانا بتایا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے یہاں صحیح مسلم اور مسند احمد کی اس حدیث کا ذکر کیا ہے جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے کہ کوئی یہودی اور کوئی عیسائی اگر مجھ پر ایمان لائے بغیر مر جائے گا وہ بلاشبہ دوزخی ہے۔
مطلب یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت پر ایمان لانا سب پر یکساں فرض ہے۔ یہود و نصاریٰ کا خاص طور پر اس لیے ذکر کیا ہے کہ وہ اہلِ کتاب تھے، جب ان کی نجات نہ ہو گی تو دوسروں کی نجات کیسے ہو سکتی ہے۔

يٰبَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ اذْكُرُوْا نِعْمَتِيَ الَّتِيْٓ اَنْعَمْتُ عَلَيْكُمْ وَاَنِّىْ فَضَّلْتُكُمْ عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝ وَاتَّقُوْا يَوْمًا لَّا تَجْزِىْ نَفْسٌ عَنْ نَّفْسٍ شَـيْـــًٔـا وَّلَا يُقْبَلُ مِنْهَا عَدْلٌ وَّلَا تَنْفَعُهَا شَفَاعَةٌ وَّلَا ھُمْ يُنْصَرُوْنَ ۝

اے بنی اسرائیل! میری وہ نعمتیں[۳۲۸] یاد کرو جن سے تمہیں سرفراز کیا۔ میں نے تمہیں دُنیا کی قوموں[۳۲۹] پر برگزیدگی عطا فرمائی تھی۔ اور دیکھو اُس دن سے ڈرو جب کوئی کسی کے ذرا کام نہ آئے گا۔ نہ کسی سے فدیہ قبول کیا جائے گا اور نہ کوئی سفارش سُودمند ہو گی اور نہ اُن کو مدد پہنچے گی۔

اُمتِ مسلمہ کی تاسیس

تمام شارحینِ قرآن کا یہ خیال ہے کہ یہ دونوں آیتیں مکرر تاکید و تنبیہہ کی خاطر لائی گئی ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ تکرار بات کو خوب ذہن نشین کرنے کے لیے ہے۔ اس موضوع پر پہلے خیالات یہی ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ اس پارے کے آغاز میں جہاں پوری انسانیت کو نبوتِ محمدیہ کے ماننے کی یہ کہہ کر دعوت دی گئی تھی ان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وہاں نبوت کی ضرورت پر آدم علیہ السلام کی تخلیق اور خلافت سے استدلال کرکے بتایا تھا کہ جو ہدایت آپ لے کر آئے ہیں وہ کوئی انوکھی نہیں ہے۔ اس ہدایتِ ربانی کی آمد کا سلسلہ تخلیقِ آدم سے شروع ہو گیا تھا اور قرآن اسی سلسلۂ ہدایت کی کڑی ہے۔ اس موقعہ پر بنی اسرائیل کو اس لیے مخاطب کیا گیا کہ وہ اس ہدایتِ ربانی کی تاریخ میں اللہ کی ہدایت کے حامل ایک عرصہ دراز تک رہ چکے تھے۔ وہاں حضورِ انورؐ کی نبوت کا تذکرہ تھا۔

اب یہاں نبوت کے ساتھ پوری اُمت کی بعثت اور اُمتِ مسلمہ کی تاسیس کا تذکرہ شروع ہونے والا ہے اور اس کا بنیادی تعلق حضرت ابراہیم کی ذاتِ گرامی سے ہے۔ اور بنی اسرائیل بھی

حضرت ابراہیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کو چونکہ منصب سے معزول کیا جا رہا ہے اور ان کی جگہ امتِ مدیر کو باقاعدہ نبوت کے کام کے لیے منتخب کیا جا رہا ہے۔ اس لیے یہ آیت ان کو یہ یاد دہانی کے لیے لائی گئی کہ تم پر ہمارے انعامات کی بارشیں بے پایاں تھیں لیکن چونکہ تم اس بزرگی اور فضیلت کو اپنے نسلی غرور، بزرگی کے نشے اور بدعملیوں کے نتیجے میں کھو چکے ہو۔ اس لیے اب یہ نعمت تم سے چھینی جا رہی ہے اور اس کام کے لیے دوسروں کو منتخب کیا جا رہا ہے۔

یاد رہے کہ نبوت اور امامت قرآن کی تشریح کے مطابق حضرت ابراہیم کی اولاد کے لیے مخصوص ہو چکی تھی۔ قرآن میں ہے

وجعلنا فی ذریتہ النبوۃ والکتاب واتیناہ اجرہ فی الدنیا

اور ہم نے ابراہیم کی اولاد میں نبوت اور کتاب رکھ دی تھی

مولانا عثمانی فرماتے ہیں حضرت ابراہیم کے بعد بجز اُن کی اولاد کے کسی کو کتاب آسمانی اور نبوت نہ دی جائے گی اسی لیے ان کو ابوالانبیاء کہا جاتا ہے۔

ایک دوسرے موقعہ پر ہے

لقد ارسلنا نوحًا وابراھیم وجعلنا فی ذریتھما النبوۃ

ہم نے نوحؑ اور ابراہیمؑ کو روانہ کیا اور ٹھہرا دی دونوں کی اولاد میں نبوت

اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ پیغمبری اور نبوت کے لیے ان کو منتخب کیا یعنی ان کی نسل کو ان کے بعد یہ دولت ان کی ذریت سے باہر نہ جائے گی۔

ان دوسروں کا انتخاب بھی چونکہ حضرت ابراہیم کی اولاد ہی سے ہو رہا ہے اس لیے اس گفتگو کا آغاز آئندہ آیت میں حضرت ابراہیم سے کیا ہے۔

حضرت ابراہیم کے تین بیٹے تھے۔ حضرت اسحاق، ان کی والدہ کا نام سارہ ہے انہوں نے شام اور فلسطین میں حکومت کی۔ مدیان، ان کی والدہ کا نام قطورا ہے۔ یہ حجاز کے پاس بحر احمر کے ساحل پر آباد ہوئے۔ حضرت اسماعیل، ان کی والدہ کا نام ہاجرہ ہے جو اپنے بھائی مدیان سے کسی قدر آگے بادیہ فاران میں آکر آباد ہوئے۔

حضرت اسحاق کے دو بیٹے تھے، یعقوب جن کا لقب اسرائیل ہے اور جو بنی اسرائیل کے مورث ہیں۔ یہ پہلے کنعان میں تھے بعد ازاں حضرت یوسف کے پاس مصر پہنچ گئے۔ جہاں ان کی اولاد کئی سو برس تک مصر کی غلامی میں رہ کر حضرت موسیٰ کے زمانہ میں پھر فلسطین واپس آئی

وَاِذِ ابْتَلٰۤى اِبْرٰهٖمَ رَبُّهٗ بِكَلِمٰتٍ فَاَتَمَّهُنَّ ؕ قَالَ اِنِّیْ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ اِمَامًا ؕ قَالَ وَمِنْ ذُرِّیَّتِیْ ؕ قَالَ لَا یَنَالُ عَهْدِی الظّٰلِمِیْنَ ۝

اور یاد کرو جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں [۳۴۰] میں آزمایا اور وہ ان سب میں [۳۴۱] پورا اُتر گیا تو اللہ نے فرمایا کہ میں تجھے پوری انسانیت کی [۳۴۲] پیشوائی دینے والا ہوں۔ ابراہیم نے عرض کیا کہ کیا میری [۳۴۳] اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے فرمایا کہ میرا وعدہ [۳۴۴] ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔

دوسرے بیٹے کا نام عیشاؤ ہے اور لقب ادوم تھا۔ یہ شمالی عرب کے کوہ سرات میں ادومی قبائل کا جدِ اعلیٰ تھا۔

حضرت اسماعیلؑ کے بارہ بیٹے تھے جو تورات کی پیشین گوئی کے مطابق خاندان کے بارہ رئیس تھے۔ ان ہم نسب اقوام و قبائل کا باہمی رشتہ حسبِ ذیل شجرہ سے واضح ہوگا۔

ابراہیم

مدین	اسماعیل	اسحاق	
	قیدار۔ ثابط	عیشاؤ ادوم	یعقوب اسرائیل
	پدرِ قریش، پدر اصحاب الحجر و انصار	ایوبؑ	پدر بنی اسرائیل
			و ابنائے اسرائیل

۳۳۸۔ میری نعمت یاد کرو۔ یعنی بنی اسرائیل کو اللہ نے نبوت کی نعمت عطا فرمائی تھی۔ یہی وہ نعمت ہے جس سے اللہ نے ان کو نوازا تھا۔ لیکن اس نعمت کی انہوں نے قدر نہیں کی چنانچہ پچھلے دس رکوعوں میں ان کی ناقدری کی پوری تاریخ بیان فرمائی ہے اور ان کو بتا دیا ہے کہ تم اس نعمت کی بے حد ناقدری کر چکے ہو، اب یہ آیت یہ بتانے کے لیے آئی ہے کہ چونکہ تم میں اس کام کی اہلیت نہیں ہے اور اللہ کا وعدہ ہے کہ نبوت نسلِ ابراہیم میں رہے گی سو بے شک تم نسلِ ابراہیم

سے ہو لیکن تم نے اس کا حق ادا نہیں کیا بلکہ تم حق اور راستی سے پھر گئے ہو اور اس نعمت کی اہلیت پوری طرح کھو چکے ہو لہٰذا تمہیں اس منصب سے ہٹا کر نسلِ ابراہیم کی دوسری شاخ بنی اسماعیل میں یہ نعمت منتقل کی جا رہی ہے۔

۳۳۹ ف۔ تمہیں دوسری قوموں پر سرفراز کیا تھا۔ اس کی تشریح گزر چکی ہے۔ یہاں مناسب مقام یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یہ سرفرازی اسی نعمتِ نبوت کی بنا پر تھی۔ پوری دُنیا نبوت کے علم و عمل سے بیگانہ تھی صرف یہی قوم سلسلۂ نبوت کی قائل و حامل تھی۔

حضرت ابراہیمؑ کی امامت

بنی اسرائیل کو اپنا انعام اور ان کی سرفرازی یاد کرا لینے کے بعد اس بنیاد کی نشاندہی فرمائی ہے جس پر ان کی بزرگی اور سرفرازی کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ یہ حضرت ابراہیم کی ذاتِ گرامی ہے۔ آپ بنی اسرائیل اور بنی اسماعیل دونوں سلسلوں کے بانی ہیں۔ اب نبوت کی نعمت نسلِ اسرائیل سے اس کی مسلسل نافرمانیوں کی پاداش میں چھین کر ایک اسماعیلی پیغمبر کے واسطہ سے پوری دُنیا کے لیے عام ہونے کا اعلان ہو رہا ہے۔ ضرورت ہے کہ ابراہیمی شخصیت اور ان کے ضمن میں اسماعیلی شخصیت کی مرکزیت اور اہمیت سے دُنیا کو روشناس کیا جائے اور بتایا جائے کہ وہ ذاتِ گرامی جس کو پوری انسانیت کے لیے بشیر و نذیر بنایا گیا ہے وہ کیا ہے؟ اس کی نبوت کی تاریخ کیا ہے؟ کیا یہ تاریخ کا کوئی اچانک حادثہ ہے یا قدرت کا روزِ اوّل ہی سے سوچا ہوا منصوبہ ہے۔

۳۴۰ ف۔ جب ابراہیم کو اس کے رب نے چند باتوں میں آزمایا۔ یعنی اللہ سبحانہ نے حضرت ابراہیم کو چند باتوں میں آزمایا۔ ابتلا سے ابتلی بنا ہے اور ابتلا بلا ہے۔ اصل میں کپڑے کے پرانا ہونے کو کہتے ہیں اور اس کے معنے آزمانا اس لیے آتے ہیں کہ گویا آزمائش اسے مانجھ کر پرانا کر دیتی ہے۔ غم اور تکلیف کو بھی اسی لیے بلا کہتے ہیں اور چونکہ اللہ سبحانہٗ کی آزمائش کبھی تکلیف سے اور کبھی راحت و خوشی سے اس لیے انعام کو بھی بلاء اور تکلیف کو بھی بلاء کہتے ہیں۔ قرآن میں ہے بلوناھم بالحسنات والسیئات۔ حضرت عمرؓ فرماتے ہیں بلینا بالضراء فصبرنا و بلینا بالسراء فلم نصبر۔ ابتلا و آزمائش کے دو مقصد ہوتے ہیں ایک یہ کہ امتحان لینے والا اس کی لیاقت و صلاحیت سے باخبر ہونا چاہتا ہے دوسرے یہ کہ لیاقت کا تو امتحان لینے والے کو علم ہوتا ہے

مگر اوروں کی نظر میں اس کے کمال کی نمائش منظور ہوتی ہے۔ یہاں ابتلاء سے مقصود حضرت ابراہیم کے کمال کا ظاہر کرنا ہے۔ قرآن نے لفظ رب لاکر اس طرف اشارہ کر دیا کہ یہ امتحان اللہ تعالیٰ کی ربوبیت سے تعلق رکھتا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ ابراہیم کو یکے بعد دیگرے اللہ نے اس طرح کے حالات کے مطابق نشوونما دی کہ ابراہیم اپنے درجہ کمال کو پہنچ کر لوگوں کے سامنے نمودار ہوئے اور اللہ کی جانب سے حضرت ابراہیم کے ساتھ یہ سارا معاملہ محبت و شفقت کے ساتھ ہوا کیونکہ جو عمل محبت و شفقت کے عاطفہ سے خالی ہو ربوبیت نہیں ہو سکتا۔ گویا ابراہیمی کمالات کے مقررہ نظام کے تحت ظہور و شہود کو یہاں ابتلاء سے تعبیر کیا ہے۔

ربوبیت کا یہ مقررہ نظام کیا ہے جس کے ذریعے ابراہیم کے کمالات منظرِ عام پر آئے۔ قرآن نے اس کے لیے کلمات کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ عام شارحینِ قرآن نے ان کی تشریح و تفسیر میں متعدد خیالات پیش کیے ہیں۔ اور علامہ آلوسی نے ان خیالات کی تعداد ۱۳ بتائی ہے۔

دراصل اللہ سبحانہٗ نے ابتداء ہی سے حضرت ابراہیم کا نظامِ تربیت کچھ اس طرح مقرر فرمایا کہ بچپن ہی میں رُشد و صلاحیت کی نمائش شروع ہو گئی تھی۔ رُشد کے مرتبہ سے گزر کر نبوت کے درجہ تک پہنچے اور مرتبۂ نبوت سے گزر کر مقامِ خلت پر جا پہنچے۔ رُشد و نبوت اور خلت کے مقامات سے گزر جانے پر اللہ کے مقررہ نظامِ ربوبیت کا تقاضا ہوا کہ ابراہیم کے فضل و کمال کی ملائکہ علوی اور سفلی میں نمائش ہو اور ابراہیم کا جلوہ حسن منظرِ عام پر آئے۔ اس کے لیے اللہ نے ایسے ہی چند کلمات کو منتخب فرمایا جیسے آدم کے فضل و کمال کو ظاہر کرنے کے لیے اسماء کو انتخاب فرمایا تھا کیونکہ اللہ کی یہ سنت ہے کہ محض اپنے علم کی بنا پر اس وقت تک کسی کو کوئی منصب اور مقام نہیں عطا فرماتے جب تک اس کے فضل و کمال کی علی رؤس الاشہاد نمائش نہ ہو جائے۔ حضرت آدم کو مقامِ خلافت دینے کے لیے ان کے فضل و کمال کا مظاہرہ فرشتوں کے سامنے ہوا اور اسماء کے ذریعے ہوا اور حضرت ابراہیم کے مقامِ امامت دینے کے لیے ان کے فضل و کمال کا مظاہرہ فرشتوں اور انسانوں کے سامنے ہوا اور کلمات کے ذریعے ہوا۔ اور جو فرق اسماء و کلمات میں ہے وہی فرق آدم اور ابراہیم کی انسانی قدروں اور صلاحیتوں میں ہے۔ آدم کا دور دورِ مفردات ہے اور ابراہیم کی انسانی قدروں کا دور دورِ مرکبات ہے۔

یہ کلمات کیا ہیں؟ ہمارے پاس اس کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس موضوع

پر اب تک جو کچھ کہا گیا ہے ان میں سے کسی ایک بات کو جزم و یقین کے ساتھ قرآن کی مراد نہیں کہا جا سکتا۔ حافظ ابن کثیر نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ اس موضوع پر ہمارے سرمایۂ علمی میں کوئی بات بھی تاریخی ثبوت کی طاقت نہیں رکھتی ہے۔

ف ۳۴۱ - اور وہ ان سب باتوں میں پورا اُترگیا۔ نہ تو قرآن نے کلمات کو متعین فرمایا ہے اور نہ یہ بتایا ہے کہ پورا اُترنے کی کیفیت کیا تھی بلکہ صرف یہ کہا ہے کہ حضرت ابراہیم نے دل و جان سے کمال مسرت و بشاشت کے ساتھ بغیر کسی کمی بیشی کے ان تمام کلمات کو بتمام و کمال پورا کر دکھایا جس سے ان کی علمی و عملی قوت کا کمال، روح کی صفائی و نورانیت، ظاہر و باطن کی طہارت و نظافت خوب واضح ہوگئی۔ قرآن میں ان کی سیرت کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ روحانی زندگی کی سب سے بڑی قوت ان کی فضیلت ہے۔ اس فضیلت کی موجودگی نے ان کے لیے فتح و کامرانی کے دروازے کھول دیے تھے۔ دُنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اس کی راہ میں حائل ہو جائیں پھر بھی اس کی رفتار میں فرق نہ آئے گا۔ حوادث و واقعات اس پر قابو نہیں پا سکتے۔ احوال و ظروف اس پر غالب نہیں آسکتے۔ افراد اور جماعتوں کی کوششیں اسے مسخر نہیں کر سکتیں۔ اس کے لیے ہر حال میں کامیابی ہے۔ اس کے لیے ہر گوشہ میں فتح مندی ہے، اس کے لیے ہر طاقت پر فرماں روائی ہے۔ وہ نبوت اور غلت سے گزر کر کلمات کی امتحان گاہ میں صرف اس لیے لائے گئے ہیں کہ سر بلند ہوں۔

حضرت ابراہیم کا ظہور سرزمینِ دجلہ و فرات میں ہوا تھا۔ انہوں نے وہاں سے ہجرت کی اور کنعان یعنی شام میں آباد ہوگئے۔ تورات میں ہے کہ انہوں نے یہ علاقہ وحی سے منتخب کیا تھا۔ جب حضرت ابراہیم یہاں مقیم ہوگئے تو وقتاً فوقتاً ان کو اور بشارتیں ملتی رہی ہیں۔ ان تمام بشارتوں کا ماحصل یہ ہے کہ اللہ نے انہیں اُمتوں کا پیشوا، نسلوں کا مورث بنایا ہے۔

سب سے پہلی بات جو حضرت ابراہیم کی زندگی میں سامنے آتی ہے وہ روحانی صداقت اور مادی ترقیات کا مقابلہ ہے لیکن حضرت ابراہیم کے علم و عمل اور وحیِ الٰہی کے فیضان نے وقت کی تمام مادی فضیلتوں کو مسخر کر لیا۔ ان کی زندگی سراسر قربانی ہی قربانی تھی۔ انہوں نے ہر محبوب چیز کو اللہ پر قربان کر دیا۔ حتیٰ کہ اپنی جان، اپنی اولاد، اپنے وطن اور اپنے املاک اور اپنے باپ کو بھی اللہ پر قربان کر دیا۔ درد و غم کی انتہا ہے مگر ابراہیم پر استقامت کی روح چھائی ہوئی ہے اور اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ درد و غم کے طوفان اُٹھ رہے ہیں لیکن حضرت ابراہیم کی استقامت و عزیمت سے ٹکرا کر رہ جاتے ہیں۔

قرآن کی معجزانہ بلاغت یہ ہے کہ وہ داستان سرائی نہیں کرتا۔ ایک جملے میں ابراہیم کی ساری زندگی کی طویل داستان کو سمیٹ کر دریا کو کوزے میں بند کر دیا اور فرمایا فاتمھن، ابراہیم نے ان کو پورا کر دیا۔

۳۴۲ ۔ اللہ نے فرمایا کہ میں تجھے پوری انسانیت کی پیشوائی دینے والا ہوں یعنی اللہ نے ابراہیم کو پوری انسانی زندگی میں سارے عالم کے روحانی اقدار میں قیادت کا منصب مرحمت فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام انبیاء تیری متابعت پر چلیں گے[1] اس میں حضرت ابراہیم کو پوری انسانیت کی امامت کی بشارت دی گئی ہے۔ امام اسے کہتے ہیں جس کی پیروی کی جائے توریت میں یہ وعدۂ امامت ان الفاظ میں ملتا ہے۔

"اور میں تجھ کو ایک بڑی قوم بناؤں گا۔ تجھ کو مبارک اور تیرا نام بڑا کروں گا اور تو ایک برکت ہوگا اور ان کو جو تجھے برکت دیتے ہیں برکت دوں گا اور ان کو جو تجھ پر لعنت کرتے ہیں لعنت کروں گا اور دُنیا کے سارے گھرانے تجھ سے برکت پائیں گے (پیدائش ۱۲ : ۲، ۱)

پورے عالم کی دینی قیادت و امامت آج تک آپ کے حصے میں چلی آرہی ہے اور اسلام کے سوا دوسرے مذاہب یعنی یہودیت و نصرانیت وہ آپ کی امامت پر متفق و متحد ہیں۔ ایک نامور انگریز فاضل بیسویں صدی کے ثلث اوّل میں آپ کا تعارف ان الفاظ میں کراتا ہے۔ ابراہیم کی ہستی کسی بدوی سردار کی نہ تھی۔ ان کی اصلی اہمیت مذاہب کے دائرے میں ہے وہ فی الواقع مورث اعلیٰ کسی نسل کے نہیں، وہ امامِ ربانی مذہبی تحریک کے تھے۔ محمدؐ کی طرح جو ان کے دو ہزار سال بعد پیدا ہوئے وہ سامی اور قبیلوں کے رہنما کی حیثیت رکھتے تھے اور توریت کی روایت کے مطابق وہ اسرائیلی مذہب کے بانی تھے۔ (انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۱ ص ۶) یورپ کی زبان سے اللہ کے حبیب اور اللہ کے خلیل کے درمیان مماثلت کا یہ اعتراف بڑی بات ہے[2]

لیکن اس حسن کے ساتھ جو لطیف طریق پر یورپ کے اس اسلام دشمن نے خاص انجکشن لگایا ہے وہ اس حسن سے زیادہ خطرناک ہے یعنی یہ کہ وہ مورثِ اعلیٰ کسی خاص نسل کے نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم سے محمد رسول اللہ اور ان کے خاندان کا کوئی نسلی تعلق نہیں ہے۔ یہ ان لوگوں کا خاص کمال یا ان کے ہاتھ کی صفائی ہے کہ اپنی تحریروں میں زہر کی ایک

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۲ [2] تفسیر ماجدی ص ۸۴

خاص مقدار رکھتے ہیں اور اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ تناسب سے بڑھنے نہ پائے اور پڑھنے والے کو متنفر اور بدگمان نہ کر دے۔ ان کی تحریریں زیادہ خطرناک ہوتی ہیں اور ایک متوسط آدمی کا ان کی زد سے بچ کر نکل جانا مشکل ہے۔ ابوبکر الجصاص رازی نے اس سے یہ فقیہانہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ دین کی زندگی میں احکام کی تعمیل کا اس آیت سے سبق ملتا ہے کیونکہ امام کہتے ہیں اسے جس کی دین کی زندگی میں اقتداء کی جائے، امام کے امام ہونے کے لیے اہتمام یعنی اقتدا ضروری ہے۔ دینی زندگی کا ہر داعی مقام امامت میں ہے درجات کے لحاظ سے اگرچہ اونچا درجہ انبیاء کا ہے لیکن انبیاء کے صدقہ میں خلفاء، علما اور عدلیہ میں بیٹھ کر فیصلہ کرنے والے قاضی اور وہ تمام لوگ جن کی اقتدا ناگزیر ہے اپنے اپنے ظرف اور اپنی اپنی حیثیت کے مطابق آیت کے مفہوم میں داخل ہیں۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے دین کی زندگی میں امامت کے اسی تقاضے کے تحت غالباً ائمہ اربعہ کے بارے میں حافظ ابن حزم کو جواب دیتے ہوئے یہ مفید نصیحت لکھ دی ہے کہ ہمارا کسی فقیہ و مجتہد پر یہ ایمان نہیں ہے کہ اللہ نے اس پر فقہ کی وحی فرمائی اور اللہ نے ہم پر اس کی طاعت فرض کی ہے اور یہ کہ وہ معصوم ہے۔ ہم اگر امام اجتہاد و فقہ کی اقتداء کرتے ہیں تو صرف اس فکر اور علم کے تحت کرتے ہیں کہ وہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسولؐ کی سنت سے واقف ہیں اور بس [1]

۳۴۳ ۔ ابراہیم نے عرض کیا کہ کیا میری اولاد سے بھی یہی وعدہ ہے۔ عالم کی پیشوائی اور بشارت پاکر حضرت ابراہیم کا دل قدرتی طور پر باغ باغ ہو گیا اور اس جوشِ مسرت میں یہ سوال کر دیا کہ اس بخشش و انعام میں میری نسل اور اولاد کا بھی حصہ ہے۔ ذریت کے معنے اولاد اور اولاد در اولاد کے ہیں۔ اس میں سارا سلسلۂ نسل آگیا اور یہ سلسلہ اسرائیلی اور اسماعیلی دونوں شاخوں کو شامل ہے [2]

گویا ابراہیم علیہ السلام نے یہ درخواست کی کہ میری ذریت میں سے بھی ائمہ بنائے جائیں، اس سے معلوم ہوا کہ مسرت و نعمت میں اپنی اولاد کو شریک کرنا نہ صرف طبعی ہے بلکہ سنتِ انبیاء بھی ہے اور حضرت ابراہیم کا بارگاہِ مولیٰ میں ادب ملاحظہ فرمایئے کہ من ذریتی لاکر امامت

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ج اص ۱۵۶ [2] تفسیر ماجدی

سوال ساری نسل کے لیے نہیں فرمایا بلکہ کچھ کے لیے فرمایا۔ کیونکہ سب کی امامت امکان سے خارج تھی۔ دُعا کے آداب و شرائط میں سے یہ بھی ہے کہ نہ نظامِ فطرت کے خلاف اللہ سے کچھ مانگے اور نہ نظامِ شریعت کے خلاف۔ اگر خلافِ سننِ الٰہی اور خلافِ شریعت کوئی اللہ سے کچھ مانگتا ہے تو یہ جنابِ الٰہی میں بے ادبی ہے۔

۳۴۴ ۔ فرمایا کہ میرا وعدہ ظالموں سے متعلق نہیں ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ اس اندازِ تعبیر کے ذریعے حضرت ابراہیم کو اولاد میں امامت ہونے کی بشارت دی ہے اور بشارت کے ساتھ یہ شرط لگادی ہے کہ امامت تو تیری ہی نسل میں رہے گی لیکن یہ امامت صرف تمہاری نسل کی بنا پر نہیں بلکہ اس وقت ملے گی جبکہ تمہاری نسل سے ہونے کے ساتھ ظالم نہ ہو بلکہ عادل ہو یعنی ایمان اور عملِ صالح کی نعمت سے مالا مال ہو۔ اور اس میں اشارہ فرمادیا کہ نسلِ ابراہیم میں دونوں قسم کے لوگ ہوں گے کچھ صالح و مطیع اور کچھ ظالم و نافرمان۔ صالحین کو امامت کی بشارت مل گئی، اور ظالم اس سے محروم ہو گئے۔

بنی اسرائیل اس پر بہت مغرور تھے کہ ہم اولادِ ابراہیم میں ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے وعدہ کیا ہے کہ نبوت و بزرگی تیری اولاد میں رہے گی اور ہم حضرت ابراہیم کے دین پر ہیں اور ان کے دین کو سب مانتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا جو وعدہ تھا وہ ان سے تھا جو نیک راہ پر چلیں۔ اس آیت میں ان کے اس شبہ کو دُور کیا کہ بنی اسرائیل اپنے کو سارے عالم کا امام اور متبوع اور سب سے افضل سمجھ کر کسی کی اتباع نہ کرتے تھے[1]

مطلب آیت کا یہ ہے کہ یہ وعدہ تمہاری اولاد کے اس حصے سے تعلق رکھتا ہے جو صالح ہو ان میں سے جو ظالم ہوں گے ان کے لیے یہ وعدہ نہیں ہے اس سے یہ بات خود بخود ظاہر ہو جاتی ہے کہ گمراہ یہودی اور مشرک بنی اسماعیل اس وعدے کے مصداق نہیں ہیں[2]

پچھلے دس رکوعوں میں بنی اسرائیل کو خطاب کر کے قدم قدم پر یہ جتایا ہے کہ تم ظالم ہو وانتم ظالمون ۵۱، ظلمتم انفسکم ۵۴، ولکن کانوا انفسھم یظلمون ۵۷، الذین ظلموا ۵۹، وانتم ظالمون ۹۲، واللہ علیم بالظالمین ۹۵، من اظلم من منع ۱۱۴۔ گویا ان کی تاریخی فردِ جرم سرتاسر ظلم ہی ہے۔ اب ان کو بتایا ہے کہ تم ابراہیم کی نسل سے ضرور ہو لیکن اپنے ظلم کی وجہ

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۴ [2] تفہیم القرآن ج ۱ ص

سے اب منصبِ امامت کے اہل نہیں رہے لہٰذا انہیں امامت کے منصب سے معزول کیا جاتا ہے اور اب ذریتِ ابراہیم کی اس شاخ کو یہ امامت سپرد کی جاتی ہے جس سے محمد رسُول اللہ کا تعلق ہے۔

فقہانے اس آیت سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ امام کے لیے ضروری ہے کہ عدل و احسان اور فضل کے زیور سے آراستہ ہو۔ ظالم و فاسق امامت کا اہل نہیں ہے۔ قرطبی نے خویز منداد کے حوالہ سے بتایا ہے کہ ظالم نہ خلیفہ ہو سکتا ہے نہ حاکم نہ مفتی نہ نماز کا امام، نہ اس کی روایت قابلِ قبول نہ اس کی شہادت قابلِ پذیرائی۔

لفظ ظالم ایک لفظِ مشترک ہے۔ شرک پر بھی ظلم بولا گیا ہے ان الشرك لظلم عظیم اور کفر کو بھی ظلم کہا گیا ہے والکافرون ھم الظلمون اور فسق پر بھی اس کا اطلاق ہوا ہے۔ فانزلنا علی الذین ظلموا رجزا من السماء بما کانوا یفسقون جن لوگوں نے امامت سے مراد قیادت و زعامت لی ہے۔ انہوں نے قیادت کی ہر نوع کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ اس کا دامن شرک کفر اور فسق کی آلودگیوں سے داغدار نہ ہو۔ لیکن علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ آیت میں ظلم کی فرد کامل ہے یعنی کفر و شرک۔ اس لیے اس آیت سے فاسق کی امامت کے عدمِ جواز پر استدلال نہیں ہو سکتا۔ الجصاص نے اس کو طویل بحث کی ہے۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ آیت بتا رہی ہے کہ اسلامی زندگی میں ہر وہ شخص جو مقامِ قیادت میں ہو اس کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اس میں عدالت اور صلاحیت ہو۔ ان کے خیال میں آیت میں عہد سے مراد اللہ کی جانب سے آئی ہوئی اوامر و نواہی کی صورت میں قانونی ذمہ داریاں ہیں۔ اگر ایک شخص اپنی زندگی میں ان قانونی ذمہ داریوں کی پابجائی نہیں کرتا تو وہ ظالم ہے۔ اور ظالم کو منصبِ قیادت نہیں مل سکتا۔ نہ وہ حاکم ہو سکتا ہے نہ وہ شہادت کا اہل ہے اور نہ اس کی روایت قابلِ قبول ہے۔ نہ مفتی ہونے کی حیثیت میں اس کے فتویٰ کو پذیرائی ہے اور نہ اسے نماز میں امامت کی اجازت ہے[1]

یہ اسلامی سیاسیات کا اہم مسئلہ ہے۔ اس کے تفصیلی مباحث کا یہ محل نہیں ہے۔ اجمالاً عرض کرتا ہوں کہ اسلام نے اس موضوع پر نظامِ عمل یہ مقرر کیا ہے کہ امامت خواہ زندگی کے کسی شعبہ سے متعلق ہو اس کے لیے امام کے انتخاب کا حق اُمت کو ہے اور اس انتخاب میں

---

[1] احکام القرآن ج ۱ ص ۸۰

اُمت کا فرض ہے کہ جسے منتخب کیا جائے وہ ظالم نہ ہو بلکہ صالح اور عادل ہو۔ لیکن اگر اُمت کو انتخاب کا موقعہ نہ ملے اور کوئی شخص خود ہی طاقت کے زور سے امامت پر قبضہ کر لے اور اس کی حکومت جم جائے تو دونوں صورتوں میں مسلمانوں پر واجب ہے کہ اسی کو خلیفہ تسلیم کریں اور اس کے سامنے گردن جھکائیں صرف اس بنا پر اس سے روگردانی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ نظام شرعی کے تحت اس کا انتخاب نہیں ہوا ہے۔ اگر اس بنا پر امامت تسلیم نہ کی جائے اور اس کے خلاف خروج کی اجازت دی جائے تو پھر دائمی کشت وخون، جنگ وقتال، دعووں میں تصادم، قوتوں میں تزاحم، ہمیشگی کی بدامنی، کبھی نہ ختم ہونے والی طوائف الملوکی اور انارکی، اُمت کی تباہی، ملکوں کی خرابی، جماعتی اختلال، احکام شریعت کا تعطل، مسلمانوں کے جان ومال کی بدامنی، اندرونی خانہ جنگی کی وجہ سے دشمنوں کا حملہ وتسلط اور اسی طرح کی بے شمار ہلاکتوں اور بربادیوں کا سیلاب اُمنڈ آئے گا۔ اس موضوع پر اُمت میں دورائیں نہیں ہیں۔ اسلام مصالح کے امکان پر مفاسد کے وقوع کی اجازت نہیں دیتا۔ لیکن یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ امامت قانونی ہو یا غیر قانونی۔ اس کے دامن میں اگر منکرات ہوں اور ظلم کا وجود پروان چڑھ رہا ہو تو حکم کیا ہے۔ ظالم کو ظلم سے منع کرنا، عدل واحسان کی تلقین کرنا یا حالات کے غلط بہاؤ میں خود بہہ جانا، یا پھر خاموش تماشائی بن جانا۔ اس موضوع پر حافظ ابنِ حزم نے الملل والنحل میں لکھا ہے کہ امام احمد بن حنبل کا مذہب یہ ہے کہ دل سے بُرا جانے لیکن امامت کے مقابلے میں خواہ ظالم ہی کیوں نہ ہو ظلم کو مٹانے کے لیے ہاتھ اُٹھانا جائز نہیں ہے۔ ابنِ حزم نے لکھا ہے کہ یہی بالاتفاق شیعہ کا بھی مذہب ہے۔ ہاں دوسرا طبقہ جس میں اہل سنت کا بھی ایک گروہ شامل ہے اور تمام معتزلہ اور خارجی اور زیدیہ سب کا مذہب یہی ہے کہ امامت کے دامن میں جب ظلم کا وجود رونما ہو تو اس کا ازالہ اسلامی فریضہ ہے اور ازالہ کی صورت اگر تلوار نکالنے کے سوا کوئی نہ ہو تو اس وقت طاقت کے زور سے ظلم کا ازالہ فرض ہو جاتا ہے بشرطیکہ باطل کے مقابلے میں کامیابی کا گمان غالب ہو لیکن ضعف کی وجہ سے اگر کامیابی کی توقع نہ ہو تو اس وقت طاقت سے ظلم کے ازالہ کی فرضیت ساقط ہو جاتی ہے۔ ابن حزم کا بیان ہے کہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی کا یہی مذہب ہے اور اسی کو ترجیح دی ہے۔ اہل سنۃ میں فقہی طور پر اس مسئلہ کو امام ابوحنیفہ نے منقح کیا ہے۔ اسی لیے ان پر محدثین نے تعجب کا اظہار بھی کیا۔ لیکن بقول الجصاص کہ ان ہی کمزوریوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ فساق وفجار کے ہاتھوں میں امامت چلی گئی اور پھر کفار نے حکومت چھین لی۔ مسلمانوں کی حکومت کمزور ہو گئی۔ مسلمانوں کی آبادیاں کھنڈر بن گئیں، دین بھی رخصت

وَاِذْ جَعَلْنَا الْبَيْتَ مَثَابَةً لِّلنَّاسِ وَاَمْنًا ؕ وَاتَّخِذُوْا مِنْ مَّقَامِ اِبْرٰهٖمَ مُصَلًّى ؕ وَعَهِدْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ اَنْ طَهِّرَا بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْعٰكِفِيْنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ ۝

اور دیکھو ہم نے[۲۲۵] اس گھر کو لوگوں کے لیے مرکز[۲۲۶] اور امن[۲۲۷] کی جگہ قرار دیا تھا اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو ہمیشہ کے لیے نماز کی جگہ بنالو اور ابراہیم و اسماعیل[۲۲۸] کو حکم دیا تھا کہ میرے اس گھر کو طواف، اعتکاف، رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے ہمیشہ[۲۲۹] پاک رکھنا۔

ہو گیا اور دُنیا بھی ختم ہو گئی۔ زندقہ، الحاد و بےدینی، خیالات میں انتہا پسندی، مجوسی عقائد، بابک خرمی کے نظریات اور مزدک مشہور اشتراکی کے ہم نوا دُنیا پر چھا گئے۔[۱]

مرکزِ دعوت

تبدیلِ امامت کا اعلان ہونے کے ساتھ ہی قدرتی طور پر تحویلِ قبلہ کا اعلان ہونا بھی ضروری تھا۔ جب تک بنی اسرائیل کی امامت کا دور تھا۔ بیت المقدس مرکزِ دعوت رہا اور وہی قبلۂ اہلِ حق بھی رہا۔ خود نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیرو بھی اس وقت تک بیت المقدس ہی کو قبلہ بنائے رہے مگر جب بنی اسرائیل اس منصب سے باقاعدہ ہٹا دیے گئے تو بیت المقدس کی مرکزیت آپ سے آپ ختم ہو گئی۔ اور چونکہ توفیقِ الٰہی نے پیروانِ دعوتِ قرآن کو خدمتِ حق کے لیے چن لیا ہے اور اقوامِ عالم کی ہدایت کا سررشتہ ان کے سپرد کیا جا رہا ہے اس کے لیے ضروری تھا کہ پہلے دعوتِ قرآن کے ظہور کی معنوی تاریخ بیان کر دی جائے۔ چنانچہ یہاں معبدِ کعبہ کی تعمیر اور حضرت ابراہیم کی دُعا

[۱] احکام القرآن ج ۲ ص ۲۴۷

کا ذکر اسی تقریب میں آیا ہے کہ آنے والے بیان کے لیے ایک قدرتی تمہید بن جائے۔
۳۴۵ ۔ ہم نے اس گھر کو اصل ارشاد میں لفظ بیت آیا ہے۔ بیت کے لفظی معنی اس گھر کے جہاں رات بسر کی جائے البیت سے متفقہ طور پر بیت الحرام یا خانہ کعبہ مراد ہے۔ شہر مکہ کے اندر کی یہ عمارت روئے زمین پر خدائے واحد کی عبادت کا قدیم ترین مکان ہے اور قرآن نے اس حقیقت کا اعلان کھلے لفظوں میں کر دیا ہے۔ مسیحیت کو کعبہ کی تقدیس کے ساتھ کعبہ کی یہ قدامت بھی بہت شاق ہے لیکن انکار قدامت پر کوئی دلیل ہر ممکن کوشش کے باوجود آج تک قائم نہ ہو سکی بلکہ انیسویں صدی عیسوی کے ربع آخر میں انگریز مصنف باسورتھ سمتھ کو لکھنا پڑا۔ یہ وہ معبد ہے جس کی قدامت عہد تاریخ سے پرے ہے (محمد اینڈ محمدنزم ص ۱۶۶) پھر آگے مشہور قدیم رومی مورخ جس کا زمانہ خود حضرت مسیح سے ایک صدی قبل کا ہے اس کے حوالے سے لکھا ہے کہ اس وقت بھی یہ معبد قدیم ترین تھا اور ساری نسل عرب کا نہایت مقدس مرجع تھا[1]

پولوس پال ایک خط میں جو گلیتوں کے نام ہے لکھتا ہے کہ،

یہ لکھا ہے ابرہام کے دو بیٹے تھے۔ ایک لونڈی ہاجرہ سے دوسرا آزاد سارہ سے پھر وہ جو لونڈی سے تھا جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو آزاد سے تھا سو وعدہ کے طور۔ یہ باتیں تمثیلی بھی مانی جاتی ہیں اس لیے کہ یہ عورتیں دو عہد ہیں' ایک تو سینا پہاڑ پر سے جو ہوا وہ تو بے جنتی ہیں۔ یہ ہاجرہ ہے کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے اور اب کے یروشلم کا جواب ہے اور بھی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے۔ پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے (گلیتوں کے نام ۲۲، ۲۶ باب ۴)

اس اقتباس سے معلوم ہوتا ہے کہ مسیحیت کا بانی پولوس بھی اس معبد سے واقف تھا کہ یروشلم اور بیت اللہ (یا عرب کا کوہ سینا) ایک دوسرے کا جواب ہیں۔ اب کے یروشلم سے ظاہر ہوتا ہے کہ یروشلم نیا ہے اور بیت اللہ پرانا۔ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ دونوں عورتیں دو عہد کا نام ہیں یعنی ان کی اولاد کے متعلق اللہ نے دو وعدے کیے تھے۔ ہاجرہ کا وعدہ کوہ سینا پر ہوا تھا جب وہ حضرت ابراہیم کے ساتھ مصر سے آرہی تھیں اور راستہ میں کوہ سینا پڑتا تھا۔ اس وعدہ کے مطابق ہاجرہ کی غلام اولاد نے عرب میں عبادت کا ایک گھر بنایا تھا۔ اور یہ غلام اس پرانے مرکزی گھر کے

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۴۸

متولی ہو گئے۔ یہ گھر بعد کو بنی اسرائیل کے نزدیک ان کے نئے مرکزی عبادت گاہ بیت المقدس کا پورا جواب تھا لہ

۳۴۶ ہ ۔ لوگوں کے لیے مرکز اصل عربی میں مثابۃ آیا ہے اور ظرف کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ مصدری معنے کسی چیز کا اپنی اصلی حالت کی یا حالتِ مقصودہ کی طرف لوٹ کر آنا۔ اور جب لوگ کسی مقام کی طرف لوٹتے ہیں تو اس مقام کو مثابۃ کہا جاتا ہے۔ اصل لفظ مثاب ہے ۃ اس میں مبالغہ کے لیے لگا دی گئی ہے جیسے علامۃ اور نسابۃ۔ گویا مثابۃ کے معنے ہیں وہ مقام جس کی طرف انسان بار بار پلٹ کر آئے اور پھر بھی جی نہ بھرے۔ یہ معنے ابنِ عباس، مجاہد سے منقول ہیں۔

اور بیت اللہ کا یہ وصف تو نگاہوں کے لیے ایک دلکش نظارہ ہے، لوگ حج پر حج اور عمرہ پر عمرہ کرتے جاتے ہیں اور اس سے اکتاتے نہیں ہیں۔ صرف حجاز یا ملکِ عرب ہی کے ہر حصے سے نہیں بلکہ روئے زمین کے ہر خطہ اور ہر علاقے سے زمانۂ ابراہیم یعنی تقریباً چار ہزار سال سے قائم ہے۔

۳۴۷ ہ ۔ اور امن کی جگہ قرار دیا۔ یہ مامونیت صرف عمارتِ کعبہ یا مسجدِ حرام سے خاص نہیں بلکہ تمام حرم کا حکم یہی ہے۔ حرم وہ علاقہ ہے جہاں انسان کی جان تو درکنار جانور تک شکار جائز نہیں ہے۔ قرآن کی دوسری آیات سے اس کی تشریح ہوتی ہے۔ مثلاً قربانی کے بارے میں حکم ہے کہ اگر حالتِ احرام میں شکار کیا تو دو معتبر آدمیوں سے اس کی قیمت لگوائیے پھر اسی قیمت کا جانور خرید کر مثلاً گائے، بکری وغیرہ کعبہ کے پاس یعنی حرم میں پہنچا کر ذبح کرے۔ قرآن میں ہے

ھدیا بالغ الکعبۃ قربانی کا جانور بطورِ نیاز کعبہ میں پہنچایا جائے۔

آیت میں کعبہ آیا ہے لیکن مراد حرم ہے کیونکہ کعبہ اور مسجد میں قربانی نہیں کی جاتی ہے۔

ایسے ہی قرآن میں ہے:

انما المشرکون نجس فلا یقربوا المسجد الحرام

مشرکین ناپاک ہیں مسجدِ حرام کے قریب نہ جائیں۔

اس آیت میں مسجدِ حرام سے علاقہ حرم ہی مراد ہے۔ قرآن ہی میں پورے شہر کو امن گاہ کہا ہے۔ اجعل ھذا بلدا اٰمنا

لہ سیرۃ النبی ص ۱۵۲

اس آیت میں جو بات فرمائی گئی ہے اس کا درجہ صرف خبر کا نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی جانب سے حکم ہے اور مطلب یہ ہے کہ حرم کا علاقہ امن گاہ ہے۔ اس میں ہر شخص کو بلکہ ہر جاندار کو مامون ہونا چاہیے۔ کسی کی جان سے اس علاقہ میں کھیلنا درست نہیں ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ حرم کا یہ تقدس زمانۂ ابراہیم سے آج تک قائم ہے۔ اس کے تفصیلی مباحث انشاء اللہ سورۂ مائدہ میں آئیں گے۔ یہاں بطورِ خلاصہ صرف یہ معلوم کر لیجئے کہ

زمانۂ جاہلیت میں بھی عربوں کے ہاتھ میں ملتِ ابراہیمی کے جو کچھ آثار باقی رہ گئے تھے، ان میں یہ بھی تھا، حرم میں اپنے باپ اور بھائی کا قاتل بھی کسی کو ملتا تو انتقام نہیں لیتے تھے۔ اور عام جنگ و قتال کو بھی حرم میں حرام سمجھتے تھے۔ شریعتِ اسلام میں بھی یہ حکم اسی طرح باقی رکھا گیا۔

دو مسئلے یہاں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اگر کوئی شخص حرم کے اندر ہی کوئی ایسا جرم کرے جس پر حد و قصاص اسلامی قانون کی رُو سے عائد ہوتا ہو تو حرم ایسے شخص کو امن نہیں دے سکتا۔ بلکہ اس پر باجماعِ اُمت حد و قصاص نافذ ہوگی۔ دوسرا یہ کہ اگر کوئی شخص باہر سے جرم کر کے پناہ لے لے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے گا۔ اس میں بعض آئمہ اس پر بھی حدودِ حرم میں حد و قصاص نافذ کرنے کا حکم دیتے ہیں۔ اور امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک اس کو حدودِ حرم میں تو سزا نہ دی جائے گی لیکن اسے سزا کے بغیر بھی نہ چھوڑا جائے گا۔ اسے مجبور کیا جائے گا کہ وہ حرم سے باہر نکلے۔ وہاں سے نکلنے کے بعد اسے سزا دی جائے گی[1]

اور لوگوں کو حکم دیا تھا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ ہمیشہ کے لیے نماز کی جگہ بنالو۔ یہ فقرہ بھی پہلے کے ساتھ ہی ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے بیت اللہ کو لوگوں کے لیے مرکز اور امن گاہ مقرر کیا تھا اور ہم نے اسی وقت یہ بھی کہہ دیا تھا کہ ابراہیم کے کھڑے ہونے کی جگہ کو نماز کی جگہ بناؤ۔ یہاں عبارت سے یہ فقرہ کہ ہم نے کہہ دیا تھا۔ اصل ارشاد میں ہٹا دیا گیا ہے اور اس لیے ہٹایا گیا ہے کہ زمانۂ نزولِ قرآن میں مخاطبوں میں سے ہر ایک قرآن کے قاری اور سامع کے ذہن میں ماضی کا استحضار ہو جائے گویا فنی طور پر ماضی کو حاضر بنا کر پیش فرما دیا۔ یہ اندازِ تعبیر زیادہ موثر ہے۔ اس سے مخاطب یہ تاثر لیتا ہے کہ اس حکم کی آغوش میں ہمارا بھی

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۶۵

وہی مقام ہے جو حضرت ابراہیم کے اوّلین مخاطبوں کا ہے اگر اس فقرے کا مسلمانوں کو مخاطب بنایا جائے تو بات صرف مسلمانوں تک رہ جائے گی اور جو مطلب میں نے عرض کیا ہے اس صورت میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ اُس وقت بھی یہ حکم تھا اور آج بھی یہی حکم ہے۔ مقام ابراہیم کیا ہے؟ یہ قیام سے ظرف مکاں ہے۔ اس کی تعیین میں اختلاف ہے۔ عبداللہ بن عباس، مجاہد اور عطاء کہتے ہیں کہ اس سے حرم کا پورا علاقہ مراد ہے۔ اور اس سے مراد وہ پتھر بھی لیا گیا جس پر حضرت ابراہیم کے قدم مبارک کا بطورِ اعجاز نشان پڑ گیا تھا اور جس کو بیت اللہ کی تعمیر کے موقعہ پر آپ نے استعمال کیا۔ مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنانے کا مطلب خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے حجۃ الوداع میں یہ بتایا ہے کہ آپ نے طواف سے فراغت کے بعد اس جگہ دو رکعت نماز پڑھی جہاں وہ پتھر تھا اور قرآن کی یہی آیت تلاوت فرمائی۔ اس سے معلوم ہوا کہ طواف کے بعد دو رکعتیں ادا کرنا مقام ابراہیم کو مصلیٰ بنانا ہے۔ اگر مصلیٰ بنانے کا یہی مطلب ہے تو بلاشبہ طواف کی دو رکعتیں واجب ہیں۔ لیکن ان دو رکعتوں کا مقام ابراہیم پر ادا کرنا سنت ہے اگر وہاں ادا نہ کر سکے تو پھر حرم کے علاقہ میں جہاں چاہے ادا کرے۔

۳۴۸ ۔ اور ہم نے ابراہیم و اسماعیل کو حکم دیا تھا۔ حضرت اسماعیل حضرت ابراہیم کے فرزند اکبر ہیں۔ مستشرقین کو حضرت اسماعیل کا ذکر حضرت ابراہیم کے ساتھ پسند نہیں ہے۔ کبھی وہ اپنے مخاطبوں کو یہ کہہ کر بہلاتے ہیں کہ ابراہیم کسی نسل کے مورثِ اعلیٰ نہیں ہیں اور کبھی اسماعیل کی والدہ ہاجرہ کو کنیز بنا کر ان کی کمزوری دکھلاتے ہیں۔ اور کبھی یہ کہہ کر لوگوں کو دھوکا دیتے ہیں کہ قرآن کی مکی سورتوں میں اسماعیل کا ابراہیم کے ساتھ کوئی رشتہ نظر نہیں آتا۔

حضرت اسماعیل کی والدہ کنیز نہیں

یاد رکھیے حضرت ابراہیم ۲۰۴۲ قبل مسیح میں پیدا ہوئے۔ آپ کی عمر توریت میں ۱۷۵ سال بتائی ہے۔ آپ کے بارہ فرزند ہوئے اور ان سے بارہ نسلیں چلی ہیں۔ توریت میں ان بارہ فرزندوں کے نام درج ہیں اور یہ تصریح ہے کہ یہ اپنی اُمتوں کے بارہ رئیس تھے۔ عرب کا مشہور عالی نسب قبیلہ قریش آپ کی ہی نسل سے ہے اس لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حضرت اسماعیل مورثِ اعلیٰ ہیں۔

حضرت اسماعیل کی والدہ کا نام ہاجرہ ہے۔ یہ لفظ اصل میں عبرانی لفظ " ہاغار " ہے جس کے معنے بیگانہ اور اجنبی کے ہیں۔ اصل میں ان کا وطن مصر ہے۔

بنی اسرائیل کہتے ہیں کہ ہاجرہ، سارہ کی لونڈی تھیں اس لیے بنی اسرائیل اونچی ذات کے اور بنی اسماعیل نیچی ذات کے ہیں۔ بنی اسماعیل، بنی اسرائیل کے برابر نہیں۔ اونچ نیچ کا مسئلہ بنانے اور بنی اسماعیل پر بنی اسرائیل کی مصنوعی برتری ثابت کرنے کے لیے ہاجرہ کے کنیز ہونے کا افسانہ بنایا گیا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ مصر میں حکمران قوت عرب کی ایک سامی قوم تھی جس سے حضرت ابراہیم کے نہایت قریبی نسبی تعلقات تھے۔ لفظ ہاجرہ کا عبرانی ہونا بھی اس کی ایک مستحکم دلیل ہے۔ اس بنا پر فرعون کا ہاجرہ کو حضرت ابراہیم کی خدمت میں دینا خود اس بات کی قوی دلیل ہے کہ درحقیقت اس ازدواج سے نسبی تعلق کا استحکام مقصود تھا۔ اس تاریخی حقیقت کی یہودی روایات سے تصدیق ہوتی ہے۔ سفرالیشار، جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے۔ اس میں تصریح ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ حضرت کا ہم وطن تھا۔ تورات کا ایک مفسر تکوین ۱۶-۱ کی تفسیر میں لکھتا ہے:

> ہاجرہ فرعون کی بیٹی تھی۔ فرعون نے جب سارہ کی کرامات دیکھیں تو کہا کہ اس کے گھر میں لونڈی بن کر رہنا دوسرے کے گھر میں بی بی بن کر رہنے سے بہتر ہے۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ بڑی بیوی ہونے کی حیثیت سے وہ سارہ کی خادمہ تھیں اور یہ خود ہماری حدیث کی کتابوں میں بھی مذکور ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے واخدمہا ہاجرہ

سارہ حضرت ابراہیم کی پہلی بیوی تھیں مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ الیعزر نام ایک دمشقی خانہ زاد گھر کا مالک تھا۔ حضرت ابراہیم نے فرزند کے لیے اللہ سے دعا مانگی، مقبول ہوئی اور حضرت ہاجرہ حاملہ ہوئیں سارہ کو یہ دیکھ کر رشک ہوا اور وہ ہاجرہ کو ستانے لگیں۔ ہاجرہ نے گھر چھوڑ کر کہیں اور جانے کا ارادہ کیا۔ وہ ایک چشمہ تک جو شور کی راہ میں واقع ہے آکر ٹھہر گئیں۔ اس وقت ایک فرشتہ نے ہاجرہ کے سامنے آکر کہا۔

> ہاجرہ اپنی بی بی کے گھر واپس جا۔ میں تیری نسل کو اتنا بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی۔ تو حاملہ ہے، تو ایک بیٹا جنے گی تو اس کا نام اسماعیل رکھنا کہ خدا نے تیرا دکھ سنا۔ وہ ایک بدو آدمی ہوگا اس کے سب خلاف اور سب کا ہاتھ اس کے خلاف ہوگا۔ وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے سکونت کریگا۔ (تکوین ۱۶-۱)

یہ مقام جہاں کنواں واقع تھا قادش اور برد کے درمیان ہے۔ ہاجرہ نے اس کوئیں کا نام زندہ نظر آنے والا کنواں رکھا۔ گھر واپس آکر ہاجرہ کے بیٹا ہوا اور حسب تعلیم الٰہی اس کا نام اسماعیل

رکھا گیا۔ اس وقت حضرت ابراہیم کی عمر ۸۶ برس تھی۔ اسماعیل عبرانی میں شماع ایل ہے۔ شماع (سماع) سننا اور ایل اللہ۔ لفظی معنے خدا کا سننا۔ اللہ نے چونکہ ابراہیم کی دُعا اور ہاجرہ کی فریاد سُنی اس لیے بچہ کا نام شماعیل رکھا گیا۔ حضرت ابراہیم نے اللہ کے حضور دعا کی کہ اے کاش اسماعیل تیرے حضور زندہ رہے۔

اللہ سبحانہ نے جواب دیا کہ

اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سنی۔ دیکھ میں اسے برکت دوں گا۔ اسے برومند کروں گا اور اس کو بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔ ۱۸۔ ۲۰) لہ

اس موضوع پر مولانا عنایت رسول چڑیاکوٹی کا رسالہ النصوص الباہرہ فی حریۃ ہاجرہ، بہترین ہے

علمی بددیانتی

اس وقت میرے پیش نظر دائرۃ المعارف الاسلامیہ ہے۔ اس میں جس دیدہ دلیری سے حضرت اسماعیل کو حضرت ابراہیم سے توڑنے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے وہ علمی بددیانتی کی بدترین مثال ہے۔

اس جگہ حضرت اسماعیل کا بناءِ کعبہ میں حضرت ابراہیم کے ذکر برداشت نہ کر سکے۔ دائرۃ المعارف کے مصنفین نے ونسنک کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ سب سے پہلے اسپر نگر نے یہ دعویٰ کیا کہ قرآن میں ایک عرصہ تک حضرت ابراہیم کی شخصیت کعبہ کے بانی اور دین حنیف کے ہادی کی حیثیت سے روشنی میں نہیں آتی، البتہ عرصہ دراز کے بعد ان کی شخصیت کو ان صفات کے ساتھ ظاہر کیا گیا ہے۔ اور ان کی ذات کی خاص اہمیت نظر آتی ہے چونکہ یہ دعویٰ اپنی اجمالی تعبیر کے لحاظ سے ابھی تشنہ تکمیل تھا اس لیے ایک طویل زمانے کے بعد اسپرنگر کے اس دعوے کو سنوگ ہیکر دنفعہ نے بڑے شرح وبسط سے پیش کیا۔ اس نے کہا کہ قرآن پاک میں جس قدر مکی آیات ہیں ان میں کسی ایک مقام پر اسماعیل کا ابراہیم کے ساتھ رشتہ نظر نہیں آتا۔ ان کے تذکرے میں ایک آیت بھی ایسی نہیں ملتی جو ان کو موسس کعبہ

لہ ارض القرآن ج ۲ ص ۴۰۔۱۰۴

اسماعیل کا باپ عرب کا پیغمبر ظاہر کرتی ہو۔ البتہ جب محمد کی مدنی زندگی شروع ہوتی ہے تو مدنی سورتوں میں حضرت ابراہیم کے ذکر کے وقت یہ تمام خصوصیات نمایاں ہوتی ہیں۔ [1]

یہ ہے وہ دعویٰ اور اس کی دلیل جو ان مستشرقین کی جانب سے صرف اس لیے بنائی گئی ہے کہ اس قسم کی لچر بنیادوں پر مسیحیت کی برتری کی عمارت قائم کی جائے اور حضرت ابراہیم کے بارے میں یہ ثابت کیا جا سکے کہ ان کا عرب کے ساتھ نہ نسلی تعلق ہے اور نہ دینی۔ لیکن جب ایک مورخ اور نقاد ان کے اس دعویٰ پر پیش کردہ دلائل کو صرف تاریخی اور تنقیدی حیثیت سے دیکھتا ہے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جو گھروندا بنایا گیا ہے اس کی بنیاد حقائق و واقعات پر نہیں، بلکہ عداوت اور بغض و عناد کے سرمایہ پر ہے۔

سب سے بڑی بات جو کہی گئی ہے یہ ہے کہ مکی سورتوں میں کسی ایک مقام پر اسماعیل کا ابراہیم سے رشتہ نظر نہیں آتا۔ یہ سرتاسر غلط بلکہ بالارادہ علمی بددیانتی ہے۔ قرآن میں جو سورت خود حضرت ابراہیم کے نام نامی پر ہے اور جو مکہ میں نازل ہوئی ہے اس کا ایک سرسری مطالعہ ہر قاری کو بتا سکتا ہے۔

۱۔ حضرت ابراہیم عرب حجاز میں قیام پذیر ہیں اور رسولِ خدا ہونے کی حیثیت میں خود کو اور اپنی اولاد کو بت پرستی سے بچنے اور اس مقام کو امنِ عالم کا مرکز بنانے کی دُعا کر رہے ہیں۔

ربّ اجعل ھذا البلد آمنا واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام

اے پروردگار اس شہر کو امن کا گہوارہ بنا دے اور مجھ کو اور میری اولاد کو بت پرستی سے بچا لے۔

۲۔ حضرت ابراہیم اقرار کرتے ہیں کہ سرزمینِ حجاز جو عرب کا قلب ہے ان ہی کی اولاد سے آباد --- اور انہوں نے ان کو بسایا ہے اور وہی اس چٹیل میدان میں کعبہ کے بانی ہیں۔

ربنا انی اسکنت من ذریتی بواد غیر ذی زرع عند بیتک المحرم

پروردگارا بے شک میں نے اپنی کچھ اولاد کو اس بِن کھیتی کی سرزمین میں تیرے مقدس گھر کے پاس بسایا ہے۔

۳۔ حضرت ابراہیمؑ حضرت اسماعیلؑ اور حضرت اسحاقؑ کے والد ہیں اور اسماعیل بڑے صاحبزادے

---

[1] دائرۃ المعارف الاسلامیہ

ہیں اور یہی اہلِ عرب کے باپ ہیں۔

الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسماعیل و اسحاق ان ربی لسمیع الدعاء

سب تعریفیں اس اللہ کے لیے ہیں جس نے مجھے بڑھاپے میں اسماعیل و اسحاق عطا فرمائے۔
بلاشبہ میرا پروردگار دعا قبول کرنے والا ہے۔

یہ خالص مکی سُورت کی آیات ہیں قرآن نے حضرت ابراہیم کا دلکش چہرہ پیش کیا ہے۔ ان آیات کا مطالعہ کرنے کے بعد کیا کوئی شخص یہ کہنے کی جرأت کر سکتا ہے کہ اسماعیل کا ابراہیم کے ساتھ رشتہ مکی آیات میں نظر نہیں آتا۔ جسے مستشرقین اپنی جہالت کی وجہ سے علمی تنقید کا عنوان بتاتے ہیں، کیا یہ آیات مکّی نہیں ہیں اور کیا ان سے وہ سب کچھ ثابت نہیں ہوتا جو مدنی آیات میں ہے

ان مدعیانِ علم کو تعصب نے اتنا اندھا بنا دیا ہے کہ قرآن اور محمد رسُول اللہ پر اعتراض کرتے وقت ان کو یہ بھی خیال نہیں رہتا ہے کہ اس قسم کے دعووں سے ہم صرف قرآن ہی کی نہیں بلکہ بائبل کی بھی تکذیب کر رہے ہیں۔

۳۴۹ میرے اس گھر کو طواف، اعتکاف، رکوع و سجود کرنے والوں کے لیے پاک رکھنا۔ یعنی وہاں بُرا کام نہ کرے اور ناپاک اس کا طواف نہ کرے اور تمام آلودگیوں سے صاف رکھا جاتے[1]

اس آیت میں بیت اللہ کو پاک رکھنے کا حکم ہے، جس میں ظاہری نجاست اور گندگی سے طہارت بھی داخل ہے اور باطنی نجاسات کفر و شرک اور اخلاقِ رذیلہ، بغض و حسد، حرص و ہوا، تکبّر و غرور، ریاء و نمائش سے پاکی بھی شامل ہے[2] پاک رکھنے سے صرف یہی مراد نہیں ہے کہ کوڑے کرکٹ سے اسے پاک رکھا جائے۔ خدا کے گھر کی اصل پاکی یہ ہے کہ اس میں خدا کے سوا کسی کا نام بلند نہ ہو۔ جس نے خانۂ خدا میں خدا کے سوا کسی دوسرے کو مالک و معبود، حاجت روا اور فریاد رس کی حیثیت سے پکارا اس نے حقیقت میں مسجد کو گندا کر دیا[3]

خانۂ خدا کی صفائی

آیتِ قرآنی اگرچہ خاص ہے مگر لفظ "بیتی" سے اشارۃً یہ بات سمجھ میں آ رہی ہے کہ

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۴ [2] معارف القرآن م ش ص ۲۶۶ [3] تفہیم القرآن

باب احکام میں عام ہے اور مفسرین نے اسی وجہ سے اس آیت کے ضمن میں لکھا ہے کہ مسجدوں کو ہر طرح سے پاک و صاف رکھنا ضروری ہے۔ ظاہری، باطنی، اعتقادی، معنوی ہر اعتبار سے پاکی کامل ہو۔ نہ نجاس ہو نہ اصنام ہوں اور نہ عصیان و طغیان۔ ویسے تو ہر انسان طبعاً نفاست پسند ہے۔ ہر شخص چاہتا ہے کہ وہ خود بھی پاکیزہ رہے اور اس کا گھر بھی صاف ستھرا ہے اور اس کی ہر چیز سے نفاست ٹپکے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مسجد جو دربارِ الٰہی ہے اس کی صفائی کس قدر ضروری ہے۔ قرآن کی اس آیت میں مسجد کی صفائی کا بیان باوجود اختصار کے بہت کافی ہے۔

اس موضوع پر ایک سے زیادہ احادیث آئی ہیں۔ ایک بار حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

میرے سامنے میری اُمت کے اعمال کی اجرتیں اور جزائیں پیش کی گئیں۔ ان میں وہ کوڑا کرکٹ بھی تھا جو کوئی شخص کسی مسجد سے نکالتا ہے[1]

اصل عربی لفظ حدیث میں قذاۃ آیا ہے۔ قذاۃ اس تنکے کو کہتے ہیں جو آنکھ میں گر جائے۔ آنکھ میں تنکے کے پڑنے سے جو تکلیف ہوتی ہے وہ سب جانتے ہیں اور اسے نکالنے کے لیے جس قدر تنگ و دو کی جاتی ہے وہ بھی کسی سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اس لفظ کے استعمال میں بڑی گہری معنویت ہے اور اس طرف اشارہ ہے کہ عالمِ ارواح میں کوڑا مسجد میں ایسی اذیت اور تکلیف کا باعث ہے جیسے عالمِ اجسام میں آنکھوں کے لیے تنکا۔ اس لیے اسے جلد سے جلد صاف کیا جائے۔ دوسرے یہ بھی معلوم ہوا کہ معمولی سے معمولی گندگی بھی مسجد میں نہ ہونی چاہیے۔

اسی لیے مسجد میں تھوکنا گناہ ہے۔ حضورِ انورؐ کا ارشاد ہے کہ تھوکنا گناہ ہے۔ کسی سے نادانستہ ایسی غلطی ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ اسے دفن کرے۔ نووی نے لکھا ہے کہ مسجد میں کہیں بھی تھوکا نہیں جا سکتا ہے بلکہ تھوکنا گناہ ہے اور قبلہ کی دیوار کا احترام نسبتاً زیادہ ہے اس کے اوپر تھوکنا اور بھی بُرا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسجد میں تھوکنے کی جرأت نہ کرے، نگلنا پڑے تو نگل لے مگر تھوکنا مناسب نہیں ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ابوذرؓ کے حوالے سے رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان نقل کیا ہے کہ میں نے اپنی اُمت کے بُرے اعمال میں اس تھوک کو بھی پایا جو مسجد میں ڈالا گیا مگر صاف نہ کیا گیا ہو۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ مسجد کے گندہ کرنے کا گناہ نامۂ اعمال میں ثبت ہوتا ہے اور قیامت کے دن حساب کتاب میں وہ بھی سامنے لایا

---

[1] مشکوٰۃ ج ۱ ص ۶۹

وَ اِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اجْعَلْ هٰذَا بَلَدًا اٰمِنًا وَّ ارْزُقْ اَهْلَهٗ مِنَ الثَّمَرٰتِ مَنْ اٰمَنَ مِنْهُمْ بِاللّٰهِ وَ الْیَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ قَالَ وَ مَنْ كَفَرَ فَاُمَتِّعُهٗ قَلِیْلًا ثُمَّ اَضْطَرُّهٗۤ اِلٰى عَذَابِ النَّارِ ؕ وَ بِئْسَ الْمَصِیْرُ ۝

اور پھر جب ایسا ہوا کہ ابراہیم نے دُعا مانگی اے میرے پروردگار اس[۲۵۰] جگہ کو امن و امان[۲۵۱] دالا شہر بنا دے اور یہاں کے بسنے والوں میں جو تجھ پر اور آخرت کے دن پر ایمان رکھیں اُن کو ہر قسم کے پھلوں سے نواز دے۔ اس پر ارشادِ الٰہی ہوا کہ تمہاری دُعا قبول ہو گئی۔ اہلِ ایمان پر ضرور ہماری نوازش ہو گی اور ان کو بھی[۲۵۲] جو ایمان کی جگہ کُفر کی راہ اختیار کریں گے چند روزہ سامانِ زندگی دوں گا۔ پھر بالآخر ان کو عذابِ جہنم کی طرف لے جاؤں گا اور جہنم بدترین ٹھکانا ہے۔

جائے گا۔ گناہ کی سنگینی کا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مشکوٰۃ میں ہے حضرت سائب کہتے ہیں کہ ایک شخص نے امامت کی۔ اتفاق کی بات ہے کہ اس نے جانبِ قبلہ تھوک دیا، جسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بچشم خود دیکھ لیا۔ آپؐ نے لوگوں کو سختی سے منع کر دیا کہ اب اسے امام نہ بنانا۔ اس امام کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو دربارِ نبوی میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس کی بات سنی اور فرمایا ہاں یہ دُرست ہے میں نے ہی روکا ہے اس لیے کہ تم نے مسجد میں تھوک کر اللہ اور اس کے رسُول کو تکلیف دی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسجد کی بے ادبی کتنا سنگین جُرم ہے۔ یہ وہ جُرم ہے کہ اس جُرم کی پاداش میں کسی عہدہ دار کو عہدہ سے معزول کیا جا سکتا ہے۔

یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ اللہ نے اپنے گھر کی تطہیر کا حکم دیا ہے اور ہر مسجد خانۂ خدا ہے۔ اس کے ساتھ مسجد کی تطہیر و تنظیف کرنے والے کو اللہ کے یہاں جو کچھ ملتا ہے وہ بھی سُن لیجئے۔ ابنِ ماجہ باب تطہیر المساجد میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

جو شخص مسجد سے گندگی ہٹائے گا اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا۔

آیت کے آخر میں فرمایا ہے کہ طواف، اعتکاف، رکوع، سجدہ کرنے والوں کے لیے اس گھر کو پاک رکھو۔ اس میں طواف اور اعتکاف کا تذکرہ درمیان واو لا کر کیا ہے لیکن رکوع اور سجدے کو بغیر واو کے لائے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ طواف اور اعتکاف دو جداگانہ عبادتیں ہیں اس لیے طواف اور اعتکاف کو بذریعہ واو عاطفہ لائے ہیں۔ اور رکوع و سجود دونوں مل کر چونکہ عبادت ہیں اس لیے رکوع اور سجود بغیر واو کے ذکر کیا ہے۔

اہلِ مکہ کیلیے ابراہیمؑ کی دُعا

یہ بھی پچھلی بات کا تتمہ ہے۔ آنے والی بات کی تمہید کے لیے ایک طرف حضرت ابراہیم کی امامت میں خانۂ کعبہ کے بنانے کا تذکرہ فرمایا اور اس دُعائے خلیل کے ذریعے یہ بھی اشارہ فرمادیا کہ ابراہیم نے جس بے آب و گیاہ سنگلاخ زمین میں اللہ کے حکم کے مطابق اللہ کا گھر بنایا تھا وہاں ضروریاتِ زندگی تک میسر نہ تھیں۔ ابھی تک یہ زمین آباد نہ تھی۔ اسی بنا پر دُعا میں لفظ بلد نکرہ استعمال فرمایا ہے۔
حضرت ابراہیم نے اہلِ مکہ کے لیے اس آیت میں تین دُعائیں فرمائی ہیں۔
ایک یہ کہ اس بے آباد جگہ کو شہر بنادے۔
دوسرے یہ کہ شہر بنانے کے بعد اسے امن کا گہوارہ بنادے۔
تیسرے یہ کہ یہاں کے بسنے والوں کے لیے روزی کے دروازے کھول دے
قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ نے ابراہیم کی تینوں دعائیں قبول فرمالی ہیں۔

۳۵۰ ۔ حضرت ابراہیم نے یہ دُعا کی کہ یہ میدان ایک شہر آباد اور با امن ہو۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔[1] دُعا کا آغاز رب سے کرکے دُعا مانگنے کا سلیقہ سکھایا ہے۔ اور سب سے پہلی یہ دُعا فرمائی کہ اس چٹیل وادی کو ایک شہر بنادیں تاکہ یہاں کی بود و باش میں وحشت نہ ہو اور ضروریاتِ زندگی مدنیت سے بآسانی فراہم ہوسکیں۔ یہی دُعا سورۂ ابراہیم میں بھی آئی ہے لیکن تھوڑے سے فرق کے ساتھ یعنی ھذا البلد آمنا لفظ بلد الف لام کے ساتھ ہے۔ دونوں تعبیروں میں باریک سا فرق ہے۔ پہلی تعبیر غالباً اس وقت کی ہے جب یہ جگہ بالکل بے آباد تھی۔ اس وقت لفظ بلد

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۴

بغیر الف لام استعمال فرمایا اور دوسری تعبیر اس وقت کی ہے جب یہاں شہریت کے آثار نمایاں ہو چکے تھے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ سورۂ ابراہیم والی دُعا کے بعد یہ الفاظ بھی حضرت ابراہیم نے فرمائے ہیں۔

الحمد للہ الذی وھب لی علی الکبر اسماعیل و اسحاق ۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ دُعا حضرت اسحاق کی پیدائش کے بعد کی ہے اور حضرت اسحاق، حضرت اسماعیل سے تیرہ سال بعد پیدا ہوئے ہیں[1]

۳۵۱ ۔ یہ حضرت ابراہیم کی دوسری دُعا ہے۔ اس میں حضرت ابراہیم نے اللہ سے شہر کو امن والا شہر بنانے کی درخواست کی ہے۔ یعنی قتل و غارت گری اور دُشمنوں کے تسلط سے محفوظ رہے۔ حضرت ابراہیم کی یہ دُعا قبول ہوئی کہ جانور تک اس میں محفوظ و مامون ہیں۔ اس کا شکار نہیں کیا جا سکتا اور خونی بھی اگر خانۂ کعبہ کے اندر پناہ گزیں ہو جائے تو اسے وہاں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ شہر اور خانۂ کعبہ کا یہ احترام جاہلیت نے اپنے زمانے میں محفوظ رکھا۔

تیسری دُعا یہ فرمائی کہ مکہ والوں کو پھل پھلاری کھانے کو ملتے رہیں۔ مکہ ایسی جگہ واقع ہے کہ ساری زمین یا سخت ریتلی ہے یا سخت پتھریلی۔ بارش بہت قلیل مقدار میں ہوتی ہے۔ غرض یہ کہ تازہ پھلوں اور درختوں کا کہیں نام و نشان ہی نہیں ہے۔ معمولی سے پھل پھول کے درخت بلکہ تازہ سبزہ و گھاس تک پیدا نہیں ہوتی۔ اور کاشت کاری و باغبانی کو تو کوئی جانتا ہی نہیں ہے۔ ایک بے آب و گیاہ سرزمین کہیں ریگستان کہیں گرم و خشک پہاڑیوں کے چٹان[2]

اس دُعا میں یہ بات بہت زیادہ جاذب نظر اور دلکش ہے کہ یہ نہیں فرمایا کہ مکہ اور اس کے ماحول کو قابلِ کاشت علاقہ بنا دو بلکہ یہ فرمایا کہ یہاں کے باشندوں کو ہر طرح کے پھل عطا فرما دو کہ پیدا کہیں ہوں اور پہنچیں یہاں۔ شاید حضرت ابراہیم نہیں چاہتے تھے کہ ان کی اولاد کاشت کاری اور باغبانی کے کاموں میں لگ جائے۔ سورۂ قصص میں جہاں اس دُعا کی قبولیت کا ذکر اہلِ مکہ پر بطور امتنان کیا ہے وہاں تصریح ہے کہ یجبی الیہ ثمرات کل شئی رزقا من لدنا حرم کی طرف ہر چیز کے ثمرات ہماری طرف سے بطور رزق کھینچے چلے آتے ہیں۔ اس میں ایک تو یہ تصریح ہے کہ خود مکہ میں پھل پیدا کرنے کا وعدہ نہیں ہے بلکہ دوسرے مقامات سے یہاں درآمد کیے جائیں گے دوسرے یہ کہ یہ نہیں فرمایا کہ ہر درخت کے پھل یہاں

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۶۸ [2] تفسیر ماجدی ص ۵

آئیں گے بلکہ فرمایا کہ ہر چیز کے ثمرات یہاں درآمد ہوں گے۔ ثمرات کو اگر نتائج اور حاصل کے معنے میں لیں تو مطلب یہ ہے کہ زندگی کی ضرورت کا کل سامان یہاں پہنچتا رہے گا چاہے وہ درختوں کے پھلوں کی صورت میں ہو اور چاہے مشینی آلات کے نتیجہ اور حاصل کی شکل میں ہو سب کچھ یہاں آتا رہے گا۔[1]

۳۵۲ ۔ اور ان کو بھی جو ایمان کی جگہ کفر اختیار کریں گے۔ اللہ اکبر کس قدر ادب ہے، جب منصب امامت کے متعلق حضرت ابراہیم نے درخواست کی تھی کہ اس میں میری اولاد کا بھی حصہ ہو تو ارشاد ہوا تھا کہ اس منصب کا وعدہ تمہاری اولاد کے صرف مومن وصالح لوگوں کے لیے ہے ظلم پیشہ اس میں داخل نہیں ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیم نے جب رزق کے لیے دُعا فرمانے لگے تو سابق فیصلے کے پیش نظر صرف اپنی اہل ایمان ہی کے لیے دُعا کی مگر اللہ تعالیٰ نے جواب میں حضرت ابراہیم کو بتایا کہ امامت اور چیز ہے اور رزقِ دُنیا اور چیز۔ امامت تو صرف اہل ایمان کو ملے گی۔ لیکن رزق اس دنیا میں سب کو دیا جائے گا۔ اس سے یہ بات خود بخود نکل آئی کہ اگر کسی کو رزق دُنیا میں فراوانی کے ساتھ مل رہا ہو تو وہ اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو کہ اللہ اس سے راضی ہے اور وہ ہی خدا کی طرف سے پیشوائی کا بھی مستحق ہے۔[2]

قلیلاً کچھ دن، چند روز سے مراد دنیوی زندگی ہے کہ آخرت کے مقابلے میں کچھ دن یا چند روز کی زندگی سے مطلب یہ ہے کہ جو فضل خداوندی اہل ایمان کے ساتھ خاص ہے اور جس سے اہل کفر محروم رہیں گے اس کا تعلق آخرت کی کامیابی اور دین کی امامت ہے۔ باقی رہے اس دنیوی زندگی کی آسائشیں اور منافع تو ان سے کافروں کو محروم نہ کیا جائے گا کہ یہ قانون ربوبیت ہے۔ لیکن کفر کا انجام بہر حال خطرناک ہے اور اسی کے نتیجے میں کافر کشاں کشاں دوزخ میں لے جایا جائے گا۔ مستدرک حاکم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور امام ذہبی نے اسے صحیح الاسناد لکھا ہے کہ

> اللہ دُنیا تو سب ہی کو دیتا ہے اس کو بھی جس سے محبت کرتا ہے اور اس کو بھی جس سے محبت نہیں کرتا ہے لیکن دین وایمان تو صرف اس کو عطا فرماتا ہے جس سے محبت کرتا ہے۔

---

[1] معارف القرآن ص ۲۰۰ [2] تفہیم القرآن ص ۱۱۲

وَاِذۡ يَرۡفَعُ اِبۡرٰهٖمُ الۡقَوَاعِدَ مِنَ الۡبَيۡتِ وَاِسۡمٰعِيۡلُ ؕ رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ

اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ

اور دیکھو وہ کیسی عظیم گھڑی تھی جب ابراہیم اور اسماعیل[۲۵۳] اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے اور اُن کی زبانوں پر یہ دُعا تھی۔ اے ہمارے رب ہم سے یہ خدمت قبول فرمالے[۲۵۴]۔ بلاشبہ تو سب کی سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

انسان کی تمام شرافت و کمال اس کی نظری اور عملی قوتوں کے کمال پر موقوف ہے۔ ان کے سنور جانے کا نام ایمان ہے۔ آزادی انسان کی سب سے بڑی شرافت اور غلامی اس کے لیے بدترین داغ ہے۔ لیکن اگر آزادی کے ساتھ ایمان نہ ہو اور عبدیت کے ساتھ ایمان میسر آجائے تو حریت کی شرافت شرافت نہیں ہے اور عبدیت کا عیب عیب نہیں ہے۔ لہٰذا اسلام میں خدا کے دوست اور دشمن کی تقسیم کا مدار سرمایہ اور دولت نہیں ہے بلکہ ایمان و کفر ہے۔ دُنیا کی دولت دوست اور دُشمن سب کا اشتراکی سرمایہ ہے لیکن ایمان کی دولت صرف دوستوں کا حصہ ہے۔

سرمد غم عشق بوالہوس را ندہند
سوزِ دلِ پروانہ مگس را ندہند

معبدِ کعبہ کی تعمیر

اس آیت میں کعبہ کی تعمیر کا منظر پیش کیا گیا ہے۔ اور اندازِ تعبیر اتنا دلکش ہے کہ پڑھنے والے کے سامنے تعمیرِ کعبہ کا نقشہ آجاتا ہے۔ اور صرف کام ہی سامنے نہیں آتا بلکہ کام کرنے والوں کا اللہ کی جناب میں اخلاص ان کے دلوں میں خشیت کی کیفیت کے سارے نقوش قاری کے ذہن میں اُبھر آتے ہیں۔ دُعا بھی ہے، دُعا کا دلکش منظر بھی ہے اور دُعا کا ماحول بھی ہے۔ جیسے کوئی متحرک واقعہ آنکھوں کے سامنے پیش آرہا ہو۔ یہ قرآن حکیم کی ایک عجیب اور دل کش

خصوصیت ہے کہ وہ آنکھوں سے اوجھل مناظر کو اس انداز میں پیش کرتا ہے جیسے وہ زندہ جاوید مجسم شکل میں سامنے موجود ہوں۔ یہ صحیح یعنی فنی منظر نگاری صرف قرآن ہی کا حصہ ہے۔ انداز بیان کی یہ کیسی عظیم بلاغت ہے کہ اولاً بیت اللہ کا لوگوں کے لیے مرکزِ اجتماع ہونے اور امن گاہ ہونے کا اعلان فرمایا، ثانیاً اس مادی انعام کے بعد معنوی انعام کا یہ کہہ کر اعلان کیا کہ ہم نے ابراہیم و اسماعیل کو حکم دیا تھا کہ اس گھر کو ہر قسم کی مادی اور معنوی گندگی سے پاک رکھنا، ثالثاً حضرت ابراہیم کے اسماعیل کی معیت میں بیت اللہ بنانے اور بناتے وقت ان کی مخلصانہ دعا کا ذکر کیا۔

۱۲۵۳۔ جب ابراہیم و اسماعیل اس گھر کی بنیادیں اٹھا رہے تھے۔ اس اندازِ بیان میں اٹھا رہے تھے کا لفظ بہت زیادہ غور طلب ہے۔ اصل ارشاد میں یرفع ہے۔ بنیادیں اٹھانے سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی بنی ہوئی چیز کو از سر نو اٹھایا جا رہا تھا، بلند کیا جا رہا تھا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ایک روایت نقل کی ہے جس سے پتہ چلتا ہے کہ بیت اللہ کی سب سے پہلی اساس حضرت آدم کے ہاتھوں رکھی گئی اور فرشتوں نے ان کو وہ مقام بتا دیا تھا جہاں کعبہ کی تعمیر ہوئی تھی لیکن ہزاروں سال کے حوادث نے اس کو بے نشان کر دیا تھا۔ البتہ اب بھی وہ ایک ٹیلہ یا ابھری ہوئی زمین کی شکل میں موجود تھا۔ یہی وہ مقام تھا جسے وحیِ الٰہی نے ابراہیم علیہ السلام کو بتایا اور انہوں نے اسماعیل کی مدد سے شروع کیا تو سابق تعمیر کی بنیادیں القواعد نظر آنے لگیں۔ انہی بنیادوں پر بیت اللہ کی تعمیر کی گئی۔ لیکن قرآن نے بیت اللہ کی تعمیر کا معاملہ حضرت ابراہیم سے شروع کیا ہے اور اس سے پہلے کی حالت کا کوئی ذکر نہیں کیا۔

بیت اللہ کی قدامت

اس پر تفصیلی بحث تو ان شاء اللہ پارہ چہارم کے آغاز میں آ رہی ہے۔ یہاں اتنا جان لینا ضروری ہے کہ خانہ کعبہ کی قدامت مسلمانوں اور یہودیوں میں یکساں مسلم رہی ہے۔ لیکن مسیحیوں کو خانۂ کعبہ سے جو ضد اور اس کی قدامت سے جو کد ہے وہ بالکل ظاہر ہے لیکن اس کے باوجود حقیقت پھر حقیقت ہے۔ آفتاب کے وجود سے روز روشن میں انکار کیسے کیا جا سکتا ہے۔ مشہور مترجم جارج سیل اپنے انگریزی ترجمۂ قرآن کے مقدمہ میں لکھتا ہے کہ:

مکہ جسے بکہ بھی کہا گیا ہے اور یہ دونوں الفاظ مترادف ہیں اور ان کے معنے مقام اجتماع عظیم کے ہیں۔ یقیناً دنیا کے قدیم ترین شہروں میں سے ہے اور بعض کی رائے میں توریت کے

شہر میسا سے بھی مراد ہے۔ اور پھر وہی آگے لکھتا ہے۔ مکہ کا معبد اہلِ عرب کے درمیان مقدس اور ایک عبادت گاہ کی حیثیت سے بہت ہی قدیم زمانہ سے اور محمدؐ سے بہت سی صدیوں قبل سے چلا آتا ہے۔ باسورتھ سمتھ جو لیکچرز آن محمد اینڈ محمد نزم کے مصنف ہیں۔ وہ لکھتے ہیں: بناؤ کعبہ کا سلسلہ حسب روایت ابراہیم و اسماعیل تک پہنچتا ہے بلکہ شیث اور آدم تک اور اس کا نام بیت ایل خود اس پر دلالت کرتا ہے کہ اسے ابتدائی شکل میں کسی ایسے بزرگ قبیلہ نے تعمیر کیا ہے۔ص ۱۶۶) سب سے بڑھ کر قابلِ لحاظ شہادت سر ولیم میور کی ہے، مکہ کے مذہب کی تاریخ بہت ہی قدیم ماننی پڑتی ہے۔ روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ کعبہ ایک نامعلوم زمانہ سے ملک عرب کا مرکز چلا آتا ہے۔ جس مقام کا تقدس اتنے وسیع رقبے میں مسلم ہو۔ اس کے معنے ہی یہ ہیں کہ اس کی بنیاد قدیم ترین زمانے سے چلی آتی ہے (لائف آف محمد مقدمہ ص ۱۰۳،۱۰۲)[1]

تورات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے یہ مکان موجود تھا۔ باقی مباحث کی تفصیلات کے لیے پارہ چہارم کا انتظار فرمایئے۔

۳۵۴۔ اے ہمارے رب ہماری یہ خدمت قبول فرمالے۔ اصل ارشاد میں تقبل آیا ہے۔ قبول اور تقبل میں فرق ہے۔ جو چیز اچھی ہو، لائق پذیرائی ہو وہاں لفظ قبول استعمال ہوتا ہے اور جو چیز ناقص ہو اور قابلِ پذیرائی نہ ہو وہاں لفظ تقبل استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ تقبل کے وزن پر آنے والے الفاظ کے معنی میں کچھ تکلف ہوتا ہے۔ اس مقام پر لفظ تقبل کا استعمال حضرت ابراہیم کے غایتِ عجز اور کمالِ تواضع کو بتا رہا ہے یعنی خداوندا عمل کی یہ حقیر سوغات لے کر تیری بارگاہِ اقدس میں حاضر ہوتے۔ تیری جناب رفیع اور تیری علو شان کے مقابلے میں تو یہ سوغات حقیر سے حقیر تر ہے لیکن اگر تیرے لطف و کرم اور فضل و رحمت سے قبول کا شرف حاصل کر لے تو کیا ہی کہنے ہیں یعنی اس کی قبولیت محض آپ کے فضل و کرم سے ہے۔

ذرا اندازہ فرمایئے کہ یہ کہنے والے خلیل اللہ ہیں جنہوں نے ملک شام کے ہرے بھرے خطہ کو چھوڑ کر مکہ کے تپتے ہوئے خشک پہاڑوں میں اپنے بیوی اور بچہ کو بسایا۔ اللہ کے گھر کی تعمیر میں اپنی پوری توانائی صرف کر دی۔ ایسے موقع پر اپنے عمل پر ناز اور اپنے کردار پر نظر ایک طبعی چیز ہے لیکن عمل کی سوغات پیش کرنے والے حضرت ابراہیم ہیں جو بارگاہِ رب العزت

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۵۰

رَبَّنَا وَاجْعَلْنَا مُسْلِمَيْنِ لَكَ وَمِن ذُرِّيَّتِنَا أُمَّةً مُّسْلِمَةً لَّكَ

وَأَرِنَا مَنَاسِكَنَا وَتُبْ عَلَيْنَا ۖ إِنَّكَ أَنتَ التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝

اے ہمارے پروردگار ہمیں ایسی توفیق دے کہ ہم سچے مسلم یعنی تیرے حکموں کے فرمانبردار ہو جائیں اور ہماری نسل میں اپنے لیے ایک اُمتِ مسلمہ بنا دے، اور اے اللہ ہمیں اپنی عبادت کے طریقے بتا دے اور ہمارے قصوروں سے درگزر فرما بلاشبہ تیری ہی ذات معاف فرمانے والی ہے اور رحم کرنے والی ہے۔

کے عزت و جلال سے آشنا ہیں اور جانتے ہیں کہ کسی شخص سے اللہ سبحانہ کے شایانِ شان عبادت و اطاعت ممکن نہیں ہے۔ ہر شخص اپنی قوت و ہمت سے کام کرتا ہے۔

اس لیے کوئی شخص بھی بڑے سے بڑا عمل کر کے اس پر ناز نہیں کر سکتا بلکہ اس کا فرض ہے کہ الحاح و زاری کے ساتھ جنابِ الٰہی میں درخواست کرے کہ میرا یہ عمل قبول فرمالیجیے۔[1]

اُمتِ مسلمہ کی تاسیس

نبوتِ محمدیہ کے تذکرے میں اُمتِ مسلمہ کی طرف پہلے اشارہ گزر چکا ہے۔ اب اس دعا میں اس کی تصریح ہے اور سورۂ انبیاء میں اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے بتایا ہے کہ تم ہی وہ اُمت ہو جس کے لیے ابراہیم نے دعا فرمائی اور جس کا نام مسلم رکھا ہے۔ یہاں نبوت سے پہلے اُمت کا تذکرہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ وہ عظیم الشان نبوت ہے جس کے صدقے انفرادی نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو کر اجتماعی نبوت کا دروازہ کھل رہا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ

[1] معارف القرآن م ش س ۱، ۲

ہم اس طرف اشارہ کیا ہے۔ حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی کی آخری وصیت حضور انورؐ کے ظہور کی بشارت دی تھی اس میں آپ کے ظہور کے ساتھ اُمت کے ظہور کی بھی بشارت ہے۔ "خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا۔ یہ ایک عجیب بات ہے کہ حضرت موسیٰ اس پیغمبر کے مقدس ساتھیوں کی تعداد دس ہزار بتاتے ہیں۔ فتح مکہ کے دن بعینہٖ یہی دس ہزار مقدسین تھے جو اس فاران سے آنے والے نورانی پیکر کے ساتھ شہرِ خلیل مکہ کے دروازے میں داخل ہوئے اور اس طرح حضرت موسیٰ نے جو کچھ کہا تھا وہ پورا ہو گیا۔

اور قرآن نے یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ اس اُمتِ مسلمہ کی مثال انجیل و تورات میں مذکور ہے

مثلهم فی التوراة ومثلهم فی الانجیل کزرع اخرج شطاه فآزره فاستغلظ فاستوی علی سوقه یعجب الزراع

ان کی مثال تورات وانجیل میں اس کھیتی سے دی گئی ہے جس نے ٹہنی نکالی ہو، پھر مضبوط ہوئی، پھر موٹی ہوئی، پھر اپنی ٹہنیوں پر سیدھی کھڑی ہو گئی۔ اس کی دلکشی کسانوں کو خوش کر رہی ہے۔

اسی سورۂ فتح میں حضور انورؐ کی رسالت کا ذکر کرنے کے بعد جن کا چہرہ وضاحت سے پیش کیا گیا ہے وہ بھی 'اُمتِ مسلمہ' ہے

محمد رسول الله والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم تراهم رکعا سجدا یبتغون فضلا من الله ورضوانا، سیماهم فی وجوههم من اثر السجود

محمدؐ اللہ کے فرستادے اور جو لوگ آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر بھاری ہیں باہم مہربان ہیں۔ تم ان کو دیکھتے ہو اللہ کے سامنے جھکے ہوئے اور سجدہ کرتے ہوئے۔ وہ خدا کی خوشی اور اس کی مہربانی کے جویا رہتے ہیں۔ ان کی پیشانیوں میں سجدہ کے اثر سے نور ہے۔

اس کی تفصیلات دوسرے پارے کے آغاز میں ملیں گی

۳۵۵ ۔ ہمیں توفیق دے کہ ہم سچے مسلم ہو جائیں۔ اسلام کیا ہے؟ اللہ کی رضامندی کی ایک بہترین دستاویز، اعتقادات و عملیات کا کامل نقشہ۔ انسانی زندگی کے تمام گوشوں کے لیے غیر فانی دستور العمل۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ یہاں اسلام سے ایمان و عمل کا مجموعہ مراد ہے۔ شوکانی

فرماتے ہیں کہ اسلام پر دوام اور اخلاص مراد ہے۔ ابن جریر فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہمیں ایسا مخلص فرمانبردار بنالے کہ ہم کسی درجہ میں تیری طاعت میں کسی کو شریک نہ کریں۔

یہ دُعا بھی اسی معرفت وخشیۃ کا نتیجہ ہے جو حضرت ابراہیم کو حاصل تھی کہ اطاعت و فرمانبرداری کے بیلے مثال کارنامے بجالانے کے باوجود اللہ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم دونوں کو اپنا فرمانبردار بنالے۔ اصل بات یہ ہے کہ جتنی زیادہ اللہ کی معرفت میں انسان کا قدم بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اس کا یہ احساس تیز سے تیز تر ہوتا جاتا ہے کہ ہم حق وفاداری پورا نہیں ادا کر رہے ہیں[1]

قربِ الٰہی کا کوئی مقام بھی ایسا نہیں ہے جہاں بندہ نیاز سے بیگانہ ہو کر ناز پر اتر آئے۔

۳۵۶ ۔ اور ہماری نسل میں سے ایک اُمتِ مسلمہ بنائے۔ قرطبی رقمطراز ہیں کہ ہر نبی نے اپنے لیے اور اپنی اُمت کے لیے دُعا فرمائی ہے لیکن ابراہیم علیہ السلام کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ نے اس اُمتِ محمدیہ کے لیے دُعا فرمائی ہے من ذریتنا میں ضمیر جمع لاکر اشارہ کیا ہے کہ نسل سے ابراہیم واسماعیل کی نسل مراد ہے اور ان دونوں کی نسل صرف عرب میں ہے جبکہ ابراہیم واسحاق کی ذریت سے بنی اسرائیل مراد ہیں۔

ذریتِ ابراہیم واسحاق

حضرت اسماعیل کے ۱۲ بیٹے اور ایک بیٹی تھی۔ اللہ نے حضرت ابراہیم کو بشارت دی تھی اور اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سُنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اُسے برومند کروں گا۔ اور اس کو بہت بڑھاؤں گا۔ اس سے ۱۲ سردار پیدا ہوں گے اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔ (تکوین ۱۷-۲۲)

آخر یہ بشارت استجابت کو پہنچی اور اسماعیل کا گھرانہ آباد ہوا۔ حضرت اسماعیل کے ۱۲ بیٹوں کے نام یہ ہیں۔ بنایوط، قیدار، ادبائیل، ہشام، مشماع، دوما، مشا، حدر، تیما، نفیش، قیدماہ، یہ بارہ بیٹے اپنے خاندان کے بارہ سردار تھے۔ ان میں سب سے بڑا بنایوط اور ان سے چھوٹا قیدار ہے۔ اور یہی دونوں تاریخ میں نمایاں نظر آتے ہیں۔ یہ تمام باپ کے زمانے

---

[1] الجامع لاحکام القرآن فتح القدیر

میں اور ایک عرصہ تک حجاز ہی میں رہے اور اپنے چچازاد بھائیوں یعنی فرزندانِ مدین کے ساتھ مل کر یمن اور حجاز سے شام و مصر تک تجارتی قافلوں کے ساتھ سفر کیا کرتے تھے اور دیگر عرب تاجروں کی طرح خوشبودار چیزوں کا کاروبار کرتے تھے۔ (تکوین ۳۷-۲۶)

تاریخ میں بارہ بیٹوں میں سے دو بڑے بیٹوں بنایوط اور قیدار کا تذکرہ ملتا ہے۔ بنایوط کو اہلِ عرب عموماً نابت کہتے ہیں۔ ان کی روایات کے مطابق خانہ کعبہ کی تولیت حضرت اسماعیل کے بعد ان کے سب سے بڑے بیٹے نابط کے حصہ میں آئی[1]

انباطین کی تاریخ کا مفصل تذکرہ یونانی اور رومی مؤرخین کرتے ہیں اور بنایوط پسر اسماعیل جس کا ذکر تورات میں ہے اور نابت بن اسماعیل جس کا عرب مؤرخین چہرہ پیش کرتے ہیں حقیقت میں تینوں ایک ہیں۔

انباط ایک مدت تک دیگر عرب قبائل کی طرح بحرِ احمر سے بحرِ فرات تک مستقل وادیوں میں بدویانہ زندگی بسر کرتے رہے۔ اس بدویت کا زمانہ دو ہزار قبل مسیح ہے۔ تورات نے بنایوط کا فرزندانِ اسماعیل کے ضمن میں ۷۰۰ء قبل مسیح میں پہلی بار نام لیا ہے اور آخر آخر قیال نبی نے بنایوط کا ذکر کیا ہے۔

انباط کی حکومت کے حدود اولاً وہ قطعۂ زمین تھا جسے یونانی عرب سنگستان کہتے ہیں اور عراقی ادوم اور سعیر یعنی خلیجِ عقبہ سے بحرِ احمر تک بوسیفوس جو پہلی صدی مسیحی میں تھا بیان کرتا ہے کہ اس عہد میں بنایوط عرب ریگستان تک پھیل گئے تھے اس کے خاص الفاظ یہ ہیں،

> ملک بحرِ احمر سے نہر فرات تک اسماعیل کے ۱۲ بیٹوں کے قبضہ میں ہے جس کی وجہ سے اس کا نام ملک بناطینہ پڑ گیا ہے۔ اس کی سرحد مغرب میں مصر اور عرب سنگستان سے مل گئی ہے اور بہت سے بیابانوں اور بلند و فراز زمینوں کو شامل ہے جو مشرق کی طرف خلیج فارس تک منتہی ہے۔ عموماً اس ملک کے باشندوں کا نام بنایوط عرب ہے۔

ان شہادتوں سے ظاہر ہے کہ انباط کا ملک مغرب میں بحرِ احمر اور مشرق میں خلیج فارس تک پھیلا ہوا تھا۔

---

[1] الاخبار الطوال ص ۱۱ ابو حنیفہ دینوری

اسی بنایوط یا نابت بن اسماعیل کی دو شاخیں آلِ غسان اور مدینہ کے اوس و خزرج ہیں۔ حضرت اسمٰعیل کا دوسرا بیٹا قیدار ہے۔ یہ شہرت اور اعزاز میں اپنے تمام بھائیوں سے زیادہ ممتاز ہے۔

قیدار بربنائے روایاتِ تورات و عرب حجاز میں آباد ہوا تھا۔ فارسٹر صاحب جن کی موافقانہ شہادت بہت کم ملتی ہے وہ لکھتا ہے:

> اشعیا نبی نے قیدار کے جس ملک کا ذکر کیا ہے اس کو ہر شخص جو جغرافیۂ عرب سے واقف ہے فوراً کہہ دے گا وہ عرب کے صوبہ حجاز کا صحیح نقشہ ہے جس میں مکہ اور مدینہ کے مشہور شہر واقع ہیں۔ عربوں کی قومی روایت بھی تاریخی مقام رکھتی ہے، جب ایک طرف اس کی تصدیق کتبِ مقدسہ سے ملتی ہے۔ جس سے قیدار کا اسی حصۂ ملک میں ہونا ثابت ہوتا ہے اور دوسری طرف اریانوس، بطلیموس اور پلینی کے بیان سے ملتی ہے جو قیداری قوم کی اسی صوبہ میں موجودگی کی غیر مشتبہ شہادت دیتے ہیں۔

قیدار ابنِ اسماعیل علیہ السلام کی عظمت کیلیے یہ بات کافی ہے کہ اس کا نام تورات کے ورقوں میں اسیریا کے کتبات میں اور یونان کے جغرافیہ میں ہر جگہ موجود ہے لیکن اسے بھی عظیم الشان عزت اس کو یہ حاصل ہے کہ وہ نورِ الٰہی جو آدم و ابراہیم کو ودیعت ہوا تھا وہ اسماعیل کے بیٹے قیدار کی پشت سے دُنیا میں جلوہ افروز ہوا۔ یعنی پیغمبرِ عالم خاتم النبیین جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نسلِ قیدار کی شاخ عدنان سے پیدا ہوئے۔

ایک قوم ہونے کی حیثیت سے قیدار کا نام سب سے پہلے ۱۰۰۰ قبل مسیح میں حضرت داؤد کی زبور میں آتا ہے۔ بنو قیدار اس زمانہ میں خیموں میں رہتے تھے۔ حضرت داؤد بادشاہی سے پہلے کافی عرصہ تک بنو قیدار کے خیموں میں رہتے تھے ۹۵۰ قبل مسیح میں حضرت سلیمان بھی اپنی غزل میں قیدار کے خیموں کا ذکر کرتے ہیں کہ وہ کالے رنگ کے ہوتے ہیں اور ہیں قیدار کے خیموں کی مانند سیاہ ہوں۔ یہ سیاہ خیمے کالے کملوں کے ہوتے تھے جو اب تک بدوی عربوں کے پیے کا نشانہ ہیں۔ خود مکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے چند پشت پہلے خیموں کا شہر تھا۔ پتھر یا مٹی کی کوئی عمارت موجود نہ تھی۔

اشعیا نبی جو تقریباً اسی زمانہ میں تھے وہ بیان کرتے ہیں کہ قیدار ایک بہادر شاندار قوم ہے۔ (۲۱۔۱۶) گاؤں میں ان کی بہت سے آبادیاں ہیں۔ (۴۲۔۱۱) بھیڑ، بکری ان کی دولت ہے اسی کی وہ تجارت کرتے ہیں۔ (۶۰۔۷)

قیدار کے متفرق رؤسا میں سے عربوں کے نزدیک سب سے زیادہ مشہور عدنان ہے۔ قیدار کی نسل کی تمام شاخیں شجرہ انساب میں اسی عدنان تک منتہی ہوئی ہیں چھٹی صدی قبل مسیح میں بنوخدنذر جسے عرب بخت نصر کہتے ہیں۔ اسیریا کے تخت پر جلوہ نما ہوتا ہے اور عراق سے لے کر شام، مصر اور عرب تک کی خاک اڑا دیتا ہے۔ اہلِ عرب کا بیان ہے کہ اس وقت عربوں کا رئیس کل معد بن عدنان تھا۔

اشعیا ۵۰۰ ق م خرقیال ۵۹۰ ق م اور یرمیا ۵۸۶ ق م نبیوں نے خانوادۂ قیدار کو اس خونخوار اور سفاک بادشاہ کے خروج سے ہوشیار کیا ہے۔

اہلِ عرب کی روایت ہے کہ بخت نصر حملہ کرتا ہوا حجاز تک پہنچ گیا تھا معد بن عدنان مقابلہ پر آئے۔ غیر منفصل جنگ کے بعد دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو گئے۔ بعض روایتوں میں ہے کہ یرمیا نبی نے معد کو بچا لیا اور شائد اس شکست سے بنو قیدار کو کچھ زیادہ صدمہ نہیں پہنچا۔ خرقیال نبی جو بخت نصر کی ان جہاں سوزیوں کے زمانے میں موجود تھے اور فلسطین سے قید ہو کر بابل گئے تھے، قیدار کے شہزادوں کا ذکر کرتے ہیں۔ عرب اور قیدار کے تمام شہزادوں نے بھیڑ، بکری کا تجھ سے بیوپار کیا۔ (۲۸، ۲۱) ان انبیاء کی معاصرانہ شہادتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ

"قیداری قوم خیموں اور دیہات میں آباد تھی۔ بہادر اور شجاع تھی، قبائل کے سردار تھے۔ بدویانہ جاہ و جلال اور شان و شکوہ رکھتے تھے۔ تجارت ان کا پیشہ تھا۔

اور بعینہٖ یہی نقشہ ان کا زمانۂ اسلام تک تھا[1]"

حضرت اسماعیل کی یہی اولاد قرآن کی اس آیت میں من ذریتنا کا مصداق ہے۔

اس آیت میں اُمتِ مسلمہ ہونے کی دُعا کی گئی ہے۔ شارحینِ قرآن نے یہ سمجھا ہے کہ اس دُعا کی حیثیت وہ ہے جو ایک باپ اپنی اولاد کے لیے کرتا ہے اور آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ یا اللہ صرف ہمیں ہی اپنا تابعدار نہ بنا بلکہ ہماری اولاد کو بھی اپنا تابعدار بنا لے اور یہ مطلب بتا دینے کے بعد من ذریتنا کے من کو تبعیضہ قرار دیا ہے۔ لیکن جب یہ سوال اٹھا کہ یہ کوئی امامت تھوڑی ہے جس کے بارے میں اللہ نے حضرت ابراہیم کو لا ینال عھد الظالمین کہہ کر بتا دیا تھا کہ ظالموں کو یہ مقام نہ ملے گا تو فوراً جواب دیا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کو بتا دیا تھا کہ ان میں ظالم ہوں گے۔

---

[1] ارض القرآن ج ۲ ص

اس لیے من تبعیضہ دُعا میں لائے ہیں۔ حالانکہ اس دُعا میں ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے
یہ تو حضرت ابراہیم و اسماعیل اُمتِ مسلمہ کے ظہور و وجود کی دُعا فرما رہے ہیں اور اس اُمتِ مسلمہ
کے لیے اللہ سے یہ درخواست فرما رہے ہیں کہ اس کا نقطۂ آغاز اور مبدا ہماری ذریت ہو۔ چنانچہ
اللہ نے ابراہیم و اسماعیل کی یہ دُعا قبول فرمائی اور اُمتِ مسلمہ کا ظہور ہوا اور اس کا نقطۂ آغاز حضرت
ابراہیم و اسماعیل ہی کی ذریت ہوئی۔ مکہ میں قریش اگر عدنان کی وساطت سے حضرت اسماعیل کے
بیٹے قیدار کی اولاد ہیں تو مدینہ میں انصار نابت ابنِ اسماعیل کی اولاد ہیں۔ یا پھر دوسرے عرب
قبائل جیسے آلِ غسان آلِ جفنہ کہتے ہیں یہ بھی نابت ابنِ اسماعیل کی اولاد ہیں اور ان میں بیشتر عیسائی
تھے۔ الغرض اُمتِ مسلمہ کا نقطۂ آغاز اور مبدا، اس دُعا کے صدقے میں ذریتِ ابراہیم و اسماعیل
بنی ہے۔ اسی اُمت کا نام مسلمان ہے۔ دُعا کی مقبولیت اسی سے ظاہر ہے کہ وہ اُمت آج تک
اسی نام سے مشہور چلی آرہی ہے۔ دوست دُشمن سب مانتے ہیں۔ حتیٰ کہ ایک اسلام دُشمن
یہودی نے بھی اقرار کیا ہے کہ

اسلام کی بنیاد تو فی الواقع اسماعیل کے ہاتھوں پڑی جو اہلِ عرب کے مورثِ اعلیٰ
ہیں [۱]

۳۵۷ ۔ اور ہمیں ہماری عبادت کے طریقے بتادے۔ اصل ارشاد میں مناسک آیا ہے۔ یہ
منسک کی جمع ہے۔ اعمالِ حج کو بھی مناسک کہتے ہیں اور مقاماتِ حج، عرفہ، منیٰ، مزدلفہ کو بھی،
یہاں دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔ دُعا کا حاصل یہ ہے کہ ہمیں اعمالِ حج اور مقاماتِ حج پوری طرح
بتادیجئے۔ اس کے لیے اَرِنَا کا لفظ آیا ہے جس کے معنے ہمیں دکھا دیجئے۔ دیکھنا آنکھ کا بھی ہوتا
ہے اور دل کا بھی۔ شیخ ابن الہمام نے فتح القدیر کی کتاب الصوم میں تصریح کی ہے کہ مصدر
اگر رؤیۃ ہو تو آنکھ کا دیکھنا اور اگر مصدر رائے ہو تو دل کا دیکھنا یعنی سمجھنا ہوتا ہے۔ یہاں
دونوں کو اس طرح جمع کیا جا سکتا ہے کہ اولاً احکام سمجھا دیے گئے اور پھر حضرت جبریل کے ذریعہ
عملاً دکھا بھی دیا گیا۔ [۲]

اور ہمارے قصوروں سے درگزر فرما۔ اصل ارشاد میں تب علینا ہے۔ اس کے معنے یہ بھی ہو
سکتے ہیں کہ ہمیں توبہ کرنے کی توفیق ارزانی فرما کہ ہم ہر حال میں بس تیری طرف لوٹیں۔ قرآن میں

---

[۱] تفسیر ماجدی ص ۵۱ [۲] معارف القرآن ص ۲۴۲

رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُوا عَلَيْهِمْ آيَاتِكَ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ

وَالْحِكْمَةَ وَيُزَكِّيهِمْ ۚ إِنَّكَ أَنتَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿١٢٩﴾

اے ہمارے پروردگار! اور تو ان میں ان ہی میں سے ایک رسول[358] برپا فرما۔ وہ ان کے سامنے تیری آیات[359] تلاوت کرے اور ان کو کتاب اور حکمت کی تعلیم دے اور اپنی پیغمبرانہ تربیت سے ان کو پاک کردے۔ بلاشبہ تو بڑے دبدبے والا اور بڑی دانائی والا ہے۔

ثم تاب علیہم لیتوبوا میں یہی معنے ہیں۔ اور یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ ہماری توبہ قبول فرما۔ اسی معنے میں زبان نبوت کا یہ ارشاد ہے ویتوب اللہ علی من تاب۔ اصل معنے لوٹنے کے ہیں۔ دونوں طرح بولا جاتا ہے تاب العبد الی ربہ بندہ اپنے رب کی طرف آیا۔ یعنی گناہ سے ہٹ گیا۔ اور توبہ کرلی۔ اور تاب اللہ علی العبد اللہ بندے پر لوٹ آیا۔ یعنی اللہ نے رحمت فرمائی اور بندے کی توبہ قبول فرمالی۔

توبہ کے بھی درجات ہیں جیسے نوکر کی توبہ، دوست کی توبہ، اولاد کی توبہ۔ توبہ کے مراتب میں بڑا اختلاف ہے ایسے ہی جناب الٰہی میں توبہ کرنے والوں کی توبہ بھی اپنے اپنے درجۂ معرفت کے لحاظ سے الگ الگ ہوتی ہے۔ یقیناً نبوت کی توبہ اپنے مقام معرفت کے لحاظ سے وہ نہیں ہوتی جو اولیاء اللہ کی ہوتی ہے اور اولیاء کی وہ نہیں ہوتی جو عامۃ مومنین کی ہوتی ہے۔

بعثتِ رسول کی دعاء

حضرت ابراہیم و اسماعیل کی دعا ابھی ختم نہیں ہوئی۔ بیت اللہ بناتے وقت دونوں نے تین دعائیں فرمائی ہیں۔

۱۔ ہماری یہ خدمت قبول فرما۔

۲۔ یہ کہ اپنے لیے ایک اُمتِ مسلمہ مبعوث فرما جس کا مبداء ہماری ذریت ہو۔
۳۔ یہ کہ اس اُمتِ مسلمہ کی تعلیم و تربیت کے لیے ہماری ذریت میں سے ایک رسُول روانہ فرما۔
اس آیت میں آخری دُعا کا ذکر ہے۔ اس دُعا میں زیادہ غور طلب یہ حقیقت ہے کہ اس مختصر سے جملے میں رسُول کی بعثت کا ذکر اس انداز سے کیا گیا ہے کہ دُعا کا سارا وزن بجائے رسُول پر پڑنے کے اُمتِ مسلمہ اور ذریت پر صرف ہو رہا ہے۔ ان کا ذکر دُعا میں پانچ بار کیا ہے۔ یعنی جس رسُول کے آنے کی انہوں نے دُعا کی ہے۔ اس کی خصوصیات یہ بتائی ہیں ۔

۱۔ ان میں سے ہو، ۲۔ ان میں آئے، ۳۔ ان کے سامنے تیرے احکام پیش کرے، ۴۔ ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ ۵۔ اپنی تربیت کے ذریعے ان کا اخلاقی تزکیہ کرے۔ ضمیر ھم کا مرجع ذریت اور اُمتِ مسلمہ دونوں کو بتایا گیا ہے اور حاصل دونوں کا ایک ہے ۔

یعنی یہ کہ نسلِ اسماعیل علیہ السلام سے ہو۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قیدار کے متفرق روساء میں سب سے زیادہ مشہور عدنان ہے۔ اسی کا بیٹا معد بن عدنان بخت نصر کے حملے کے وقت عربوں کا رئیسِ کل تھا۔ معد کے دو بیٹے تھے ایک کا نام نزار تھا۔ نزار کے پانچ بیٹے تھے۔ انما، آباد، ربیعہ، قضاعہ، مضر۔ عرب کے تمام قیداری قبائل انہی کی شاخیں ہیں۔ یہ طول میں یمن سے شام تک اور عرض میں حجاز و نجد سے بحرین و عراق تک پھیلے ہوئے تھے۔ زمانۂ اسلام تک ان کا یہی نقشہ باقی تھا ۔

مضر کی شاخ متعدد وسیع خاندانوں میں منقسم ہے۔ جن میں سے ایک قریش کا خاندان ہے۔ باقی خاندان کا نام فہر ہے ۔ عدنان تک اس کا سلسلۂ نسب یہ ہے ؛

فہر بن مالک ابن نضر ابن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن معد ابنِ عدنان۔

نسبِ رسُولؐ

عدنان تک سلسلۂ نسب حرف بحرف صحیح اور ناقابل شک ہے، صحیح روایات سے ثابت ہے احادیث میں مروی ہے۔ اشعارِ عرب میں مذکور ہے۔ عدنان تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا سلسلۂ نسب یہ ہے :

ابوالقاسم محمد رسُول اللہ بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن

الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان ۔

۳۵۸ ۔ ایک رسول ان میں سے ، آیت بتصریح بتارہی ہے کہ حضرت ابراہیم و اسماعیل نے مل کر اللہ کے حضور میں دعا کی کہ اس شہر میں ہماری نسل سے ایک پیغمبر مبعوث فرما چونکہ مقام بعثت مقرر کیا گیا اور دعا میں حضرت اسماعیل کی بھی شرکت تھی اس لیے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس دعا کا مقصود یہ تھا کہ یہ پیغمبر نسلِ اسماعیل سے ہوگا ۔ اور مکہ میں اس کی بعثت ہوگی ۔ موجودہ تورات کی کتاب پیدائش باب ۱۶ کے آخر اور باب ۱۷ کے اول میں بھی کچھ اس کے اشارات ملتے ہیں ۔

اور ہاجرہ ابراہیم کے لیے بیٹا جنی اور ابراہیم نے اپنے بیٹے کا نام جو ہاجرہ جنی اسماعیل رکھا ۔ (پیدائش ۱۶ - ۱۵)

جب ابراہیم ننانوے برس کا ہوا تب خداوند ابراہیم کو نظر آیا اور اس نے کہا کہ میں خدائے قادر ہوں تو میرے حضور میں چل اور کامل ہو اور میں اپنے اور تیرے درمیان عہد کرتا ہوں کہ میں تجھے نہایت بڑھاؤں گا تب ابراہیم منہ کے بل گرا اور خداوند اس سے ہمکلام ہو کر بولا کہ دیکھ میں جو ہوں تیرا عہد ہے ، میرے ساتھ ہے ۔ اور تو بہت قوموں کا باپ ہوگا ۔ اور تیرا نام پھر ابرام نہ کہلایا جائے گا بلکہ تیرا نام ابرہام ہوگا کیونکہ میں نے تجھے بہت قوموں کا باپ ٹھہرایا ہے ۔ اور میں تجھے بہت پھل دوں گا اور قومیں تجھ سے پیدا ہوں گے اور بادشاہ تجھ سے نکلیں گے ۔ میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کے پشت در پشت اپنا عہد جو ہمیشہ کا عہد ہے کرتا ہوں کہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا ہوں گا ۔ اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں کہ ہمیشہ کے لیے ملک ہو اور میں ان کا خدا ہوں گا ۔ (پیدائش ۱۷ - ۱ تا ۸)

اللہ تعالیٰ کا یہ عہد حضرت ابراہیم سے اسماعیل کی پیدائش کے بعد ہی اور حضرت اسحاق کی ولادت سے پہلے ہوتا ہے جس سے یہ صاف ظاہر ہے کہ یہ بشارت اسماعیل کے لیے ہے ، اسحاق کے لیے نہیں ہے ۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت اسحاق کی بشارت دی حضرت ابراہیم کو وہم ہوا کہ اس نئی بشارت سے یہ مراد تو نہیں ہے کہ اسماعیل زندہ نہ رہیں گے اور وہ

عہد اسحاق کے ساتھ پورا ہوگا۔ فوراً بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا کہ ـــ کاش اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے ” پیدائش ۱۷-۱۸) خدا نے جواب دیا۔ اور اسماعیل کے حق میں میں نے تیری سنی دیکھ میں اسے برکت دوں گا۔ اور اسے بارآور کروں گا اور اسے بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اسے بڑی قوم بناؤں گا (پیدائش ۱۷-۲۰)

حضرت ہاجرہ جب حاملہ ہونے کے بعد حضرت سارہ سے خفا ہو کر بیرسبع چلی گئیں تو فرشتہ نے آواز دی۔ میں تیری اولاد کو بہت بڑھاؤں گا۔ وہ کثرت سے گنی نہ جائے گی۔ اور خداوند کے فرشتہ نے اس سے کہا کہ تو بیٹا جنے گی، اس کا نام اسماعیل رکھنا کہ خدا نے تیرا دکھ سن لیا (پیدائش ۱۶-۱۰)

موجودہ تورات میں حضرت اسماعیل کی پیدائش اور ان کی نسل کی برومندی کی بشارتیں مذکور ہیں اور ان سے قرآن مجید کے بیان کردہ دعائے ابراہیمی اور عہدِ الٰہی کی تائید ہوتی ہے۔ اسی بنا پر روایات میں آیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے فرمایا کہ میں تمہیں بتاؤں کہ میں کیا ہوں؟ انا دعوۃ ابراھیم میں اپنے باپ ابراہیم کی دعا ہوں۔

ف ۳۵۹ ۔ وہ ان کے سامنے تیری آیات تلاوت کرے۔ آیات سے آیات وحی مراد ہیں۔ آیت کے اس حصے میں رسالت کے جن مقاصد کی نشاندہی کی گئی ہے وہ چار ہیں۔ تلاوت، تعلیم کتاب، تعلیم حکمت اور تزکیۂ نفوس۔

یہ دعا حضرت ابراہیم اور ان کے بیٹے اسماعیل دونوں نے مانگی کہ ایک رسول ان میں بھیج۔ جو ان کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ایسا نبی جو ان دونوں کی اولاد میں ہو بجز سرورِ کائنات صلی اللہ علیہ وسلم کوئی نہیں آیا۔ اس سے یہود کے خیال کا پورا پورا رد ہو گیا۔ علم کتاب سے مراد وہ معانی کتاب ومطالب ہیں جو عبارت سے واضح ہوتے ہیں اور حکمت سے مراد اسرار و لطائف ہیں [1]

تلاوتِ آیات سے مقصود قرآنی آیات کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے اور ہدایاتِ ربانی سے ان کو روشناس کرانا ہے۔

تعلیم کتاب سے مراد آیاتِ قرآنی کے معانی اور مطالب کی تشریح ہے اور احکام کی توضیح ہے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ

گویا مقاصدِ رسالت میں جس طرح الفاظ و کلمات قرآن کی تبلیغ ہے اسی طرح اس کے معانی و مطالب کا بیان بھی مقاصدِ رسالت میں داخل ہے یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قرآنی پیغام اور ہدایاتِ وحی کے پیغام رساں ہونے کے ساتھ اس پیغام کے معلّم بھی ہیں۔

تعلیم حکمت سے مراد احکام دین اسرار اور شریعت کے مقاصد ہیں۔ حضور انورؐ نے اپنی سیرۃِ طیبہ کے ذریعے اُمت کو اس سے روشناس کیا ہے۔ کچھ لوگوں نے حکمت سے سنت مراد لی ہے لیکن سنت کے دو معنے ہیں۔ ایک یہ کہ احکام و قوانین کی مصالح اور ان کے مقاصد کو سمجھنا، جسے یہ نعمت حاصل ہو جائے اس کے بارے میں ارشاد ہے من یوت الحکمۃ فقد اُوتی خیراً کثیراً۔ اسلام کے صدر اوّل میں لفظ سنّت اسی معنے میں استعمال ہوتا تھا۔ امام مالک اور امام محمد اس لفظ کو اسی معنے میں استعمال کرتے ہیں۔

دوسرے محدّثین و اصولیین کے اصطلاحی معنے،

اگر حکمت سے سنّۃ مراد بتانے والوں کا مقصد پہلے معنے میں ہو تو درست ہے اور اگر سنت سے مقصود محدّثین کی اصطلاحی سنّت ہے تو یہ قرآن میں حکمت کا مفہوم نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہند نے یہاں حکمت کو پہلے معنے لیا ہے۔

ابراہیم و اسماعیل کو یہاں پہنچ کر احساس ہوا کہ اُمتوں کی فلاح و سعادت میں صرف علمی سرمایہ اور صرف دانش و بصیرت کی روشنی اس وقت تک کام نہیں دیتی اور ناکافی ہے جب تک علم و دانش کے ساتھ عملی تربیت کا مکمل نظام وجود میں نہ آئے اور کوئی محسوس اور مرئی اُسوۂ حسنہ سامنے نہ ہو۔ اس لیے فرمایا و یزکیھم یعنی رسالت کے مقاصد میں ایک مقصد یہ بھی ہو کہ وہ اُمت میں اخلاقِ رذیلہ ہٹا کر اخلاقِ فاضلہ پیدا کرے، اعمالِ سیئہ سے بچا کر اعمالِ حسنہ کا مالک بنائے۔

دونوں باپ بیٹے نے دُعا تو کر لی لیکن ذہن میں ایک خلش ہوئی کہ جن باتوں کو اُمتِ مسلمہ کے لیے اللہ سے مانگا ہے۔ ان میں سے کسی بات کا بھی ان کی طبیعت، ان کی معیشت اور ان کے احوال و ظروف ساتھ نہیں دیتے۔ وہ شہریت و مدنیت سے دور بدویانہ زندگی بسر کریں گے۔ بدویت ان کی طبیعت ہوگی۔ علم و حکمت سے ان کو رابطہ نہ ہوگا، تہذیب و تمدن سے وہ ناآشنا ہوں گے۔ ان میں شیرازہ بندی اور اجتماعیت کا نام و نشان نہ ہوگا۔ پس اسی احساس سے دب کر دونوں نے دُعا کو اس پر ختم کر دیا۔ انک انت العزیز الحکیم۔

وَمَنْ يَّرْغَبُ عَنْ مِّلَّةِ اِبْرٰهٖمَ اِلَّا مَنْ سَفِهَ نَفْسَهٗ ؕ وَلَقَدِ اصْطَفَيْنٰهُ فِى الدُّنْيَا ۚ وَاِنَّهٗ فِى الْاٰخِرَةِ لَمِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ لَهٗ رَبُّهٗٓ اَسْلِمْ ۙ قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ۝

اور ان لوگوں کے سوا جنہوں نے اپنے آپ کو نادانی و سفاہت ہی کے حوالے کر دیا ہے کون ہے جو ابراہیم کے طریقہ سے روگردانی کرے؟ اور امر واقعہ یہ ہے کہ ہم نے اس وقت ہی اسے دُنیا میں بھی برگزیدگی دی اور آخرت کی زندگی میں بھی اس کا شمار صالحین میں سے ہے جبکہ اس کے پروردگار نے کہا کہ مسلم ہو جا تو وہ بول پڑا میں مالکِ کائنات کے لیے مسلم ہو گیا۔

بے شک یہ سب کچھ ہے لیکن آپ کی ذات عزیز ہے اسباب پر آپ کی حکومت ہے۔ آپ جو چاہیں اور جیسے چاہیں کر سکتے ہیں۔ آپ چاہیں تو حیوانات کو علیم و حکیم بنا سکتے ہیں۔ آپ سے بالا کوئی نہیں۔ اور آپ حکیم ہیں۔ آپ کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے۔

ملتِ ابراہیم ہی اسلام ہے

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کی دعوت لے کر آئے ہیں وہ ان کا خود ساختہ اور تراشیدہ نہیں ہے بلکہ یہ حضرت ابراہیم کی میراث ہے اور اس کا علمی اور عملی شجرہ نسب حضرت ابراہیم سے ملتا ہے۔ اس کا انکار اس سے اعراض خود ابراہیم کا انکار اور ابراہیم کے پیش کردہ طریقِ زندگی سے اعراض ہے۔ اسلام کے لفظی معنے اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور طاعت و بندگی کے لیے گردن جھکا دینا ہے۔ حضرت ابراہیم کے اسی جذبے کو قرآن اسلام کہتا ہے۔ ملتِ ابراہیمی کی حقیقت بھی اسلام ہے کہ انہوں نے اپنے کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا اور اس آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا ہے۔ یہی اسلام کی حقیقت ہے۔

۲۶۰ ف ۔ اور ان لوگوں کے علاوہ جنہوں نے اپنے آپ کو نادانی کے حوالہ کر دیا ہے کون ہے جو ابراہیم کے طریقے سے روگردانی کرے ۔ یعنی ملتِ ابراہیمی تو عین دینِ فطرت ہے ۔ اس کی تعلیمات طبعِ سلیم کی ترجمان ہیں ۔ اس سے کنارہ کشی تو صرف وہ شخص اختیار کر سکتا ہے جس کی فطرت ہی سلیم نہ ہو ۔ اس بات کی تصدیق ہر شخص جب چاہے اعتقاد سے نہیں آزمائش سے کرے ۔ اسلام نے جماعت کا جو نظام قائم کیا ہے وہی بہترین نظامِ اجتماعی ہے ۔ ہر فرد کے لیے جو ضابطۂ عمل بنا دیا ہے بہترین ضابطۂ شخصی ہے ، عقل و جذبات افرد و جماعت ، دل و دماغ ، جسم و رُوح حریت و طاعت انسانی زندگی کے متضاد عناصر کی جس قدر باہمی رعایت اسلام نے ملحوظ رکھی ہے دُنیا کے کسی قانون میں اس کی کہیں نظیر نہیں ملے گی ۔

قرآن کی یہ بلاغت بڑی معنے خیز ہے کہ دینِ اسلام کا شجرہ نسب حضرت ابراہیم سے جا ملایا ہے ۔ مخاطب چونکہ یہودی ، عیسائی اور مشرکینِ مکہ ہیں اور تینوں حضرت ابراہیم کے تقدس کا لوہا مانتے ہیں اس لیے اس اندازِ بیان کے ذریعے گویا ان کو جتایا جا رہا ہے کہ قرآن تمہیں کسی نئے دین کی دعوت نہیں دیتا بلکہ تمہارے ہی بزرگ و پیشوا ابراہیم کے دین کی طرف بلا رہا ہے اسے مان لینا ہی ملتِ ابراہیم کو ماننا ہے

۲۶۱ ف ۔ ہم نے اس کو دُنیا میں برگزیدگی دی ۔ یہ گویا اس کی وجہ بیان کی جا رہی ہے کہ ملتِ ابراہیم سے روگردانی بیوقوف ہی کر سکتا ہے ۔ کیونکہ اس ملت کی بزرگی اور شرف ہی کا نتیجہ ہے کہ حضرت ابراہیم کو اللہ کی جانب دُنیا میں برگزیدگی ملی ۔ یعنی ابراہیم کو انسانیت کی پیشوائی اور امامت کا منصب ملا ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ کتاب و نبوت آپ کی میراث ہو گئی ۔ یہ دنیا میں حضرت ابراہیم کو اللہ کی دی ہوئی برگزیدگی ہے اب پوری دُنیا میں روحانیت ، ہدایت ، اخلاق ، ایمان اور عملِ صالح کا سرمایہ ابراہیم کے دامن کے سوا کہیں نہیں ہے اور نبوت ، وحی کی نعمت کا ذریتِ ابراہیم سے الگ ہو کر کوئی تصور نہیں ہے ۔ اور اسی ملت پر عمل پیرا ہو کر اسی کی لوگوں کو دعوت دے کر اور اسی کے لیے محنت کر کے حضرت ابراہیم کو آخرت میں مقامِ صالحین ملا ہے ۔ لہٰذا وہ ملت جس نے ابراہیم کو اللہ کے یہاں یہ مقام دیا ہے اس سے روگردانی حماقت ، جہالت کے سوا اور کیا ہے ۔

۲۶۲ ف ۔ جب اس کے پروردگار نے کہا کہ مسلم ہو جا ۔ مسلم وہ ہے جو خدا کے سامنے سر طاعت خم کر دے ۔ خدا ہی کو اپنا مالک ، آقا ، حاکم اور معبود مان لے ، جو اپنے آپ کو

وَوَصّٰى بِهَآ اِبْرٰهٖمُ بَنِيْهِ وَيَعْقُوْبُ ؕ يٰبَنِىَّ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰى لَكُمُ الدِّيْنَ فَلَا تَمُوْتُنَّ اِلَّا وَاَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۝ اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ حَضَرَ يَعْقُوْبَ الْمَوْتُ ۙ اِذْ قَالَ لِبَنِيْهِ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْۢ بَعْدِىْ ؕ قَالُوْا نَعْبُدُ اِلٰهَكَ وَاِلٰهَ اٰبَآئِكَ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ اِلٰهًا وَّاحِدًا ۚۖ وَّنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ۝

اور اسی ملت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں اور یعقوب نے اولاد کو یہ کہہ کر وصیت کی تھی کہ اے میرے بیٹو! اس دینِ اسلام[٣٦٥] کو اللہ نے تمہارے لیے پسند فرمایا ہے لہٰذا دُنیا سے تمہاری روانگی بس اسلام ہی پر ہو۔ کیا تم موجود تھے اس وقت جب[٣٦٦] یعقوب موت کے آغوش میں جا رہا تھا اور اس نے اپنے بیٹوں کو وصیت کرتے ہوئے ان سے دریافت کیا تھا کہ میرے بعد تم کس کی عبادت کرو گے؟ انہوں نے جواب دیا کہ ہم اسی کی عبادت کریں گے جس کی تُو نے عبادت کی اور تیرے بزرگوں ابراہیم اور اسحاق[٣٦٧] نے عبادت کی اور ہم اسی کے فرماں بردار بن کر رہیں گے۔

بالکلیہ خدا کے سپرد کر دے اور اس ہدایت کے مطابق دُنیا میں زندگی بسر کرے جو خدا کی طرف سے آتی ہو۔ اس عقیدے اور طرزِ عمل کا نام اسلام ہے اور یہی تمام انبیا کا دین تھا[۱]

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ملتِ ابراہیمی کا بنیادی اُصول اور پوری حقیقت ایک لفظِ اسلام میں مضمر ہے جس کے معنے ہیں طاعتِ حق اور یہی خلاصہ ہے ابراہیم کے مذہب و مسلک کا۔ اور یہی حاصل ہے ان امتحانات کا جن سے گزر کر حضرت ابراہیم اس مقام بلند تک پہنچے ہیں اور

[۱] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۱۳

طاعتِ حق یعنی اسلام ہی وہ چیز ہے جس کے لیے یہ سارا جہاں بنایا گیا ہے اور جس کے لیے انبیا تشریف لائے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلام ہی تمام انبیاء کا دین ہے۔ اور حضرت آدم سے لے کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تک ہر آنے والے رسول اور نبی نے اسی کی طرف دعوت دی۔ اسی پر اپنی اپنی اُمّت کو چلایا۔[1]

۳۶۳ ۔ میں مالکِ کائنات کے لیے مسلم ہو گیا۔ یہ جواب ہے اللہ کے اس ارشاد کا کہ مسلم ہو جا۔ حضرت ابراہیم نے جواب میں یہ نہیں فرمایا کہ میں آپ کے لیے مسلم ہو گیا بلکہ فرمایا کہ میں رب العالمین کے لیے مسلم ہو گیا۔ اس میں اولاً ادب کو ملحوظ رکھا ہے ثانیاً اس کے ذریعے اس بات کا اعلان کر دیا کہ میری طاعت اور میرا اسلام اختیار کرنا اللہ کی ربوبیت کا تقاضا ہے۔ وہ رب العالمین یعنی سارے جہانوں کا پروردگار ہے اور سارے جہاں والوں کو اس کی طاعت کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے۔ جس نے اطاعت اختیار کر لی اس نے اپنا فرض ادا کر کے اپنا نفع حاصل کیا۔

حضرت ابراہیم و یعقوب کی وصیّت

اس سلسلے میں حضرت ابراہیم اور یعقوب کی وصیّت پیش کی ہے، حضرت ابراہیم نے اپنی اولاد کو اور ان کے بعد حضرت یعقوب نے اپنی اولاد کو اسلام پر چلنے کی وصیت کی۔ حضرت یعقوب پوری زندگی اولاد کو اسلام پر جمے رہنے کی وصیت اور نصیحت فرماتے رہے۔ حتیٰ کہ آخری وقت میں بھی انہوں نے یہی نصیحت کی۔ اس منظر میں بتایا جا رہا ہے کہ حضرت یعقوب کا وقتِ وفات قریب ہے۔ ان کے بیٹے ان کے پاس ہیں۔ اس وقت حضرت یعقوب کے دل میں کیا کھٹکا لگا ہوا ہے؟ کون سا ایسا عظیم معاملہ ہے جس سے وہ مطمئن ہونا چاہتے ہیں اور کون سی ایسی میراث ہے جس کو وہ اپنی اولاد تک بحفاظت پہنچانا چاہتے ہیں؟ یہ صرف اسلام ہے، یہی ان کی عظیم ترین میراث ہے، یہی ان کا بیش بہا خزانہ ہے۔

۳۶۴ ۔ اسی ملّت کی ابراہیم نے اپنے بیٹوں اور یعقوب نے اپنی اولاد کو وصیت کی یعنی جس ملّت کا شرف بیان ہو چکا ہے اسی ملّت کی وصیت حضرت ابراہیم و یعقوب نے اپنی اولاد

---

[1] معارف القرآن م ش ج ا ص ۲۰۶

کو فرمائی تو جو اس کو نہ مانے گا وہ ان کا بھی مخالف ہے۔ یہودی کہتے تھے کہ حضرت یعقوب نے اپنی اولاد کو یہودیت کی وصیت فرمائی وہ جھوٹے ہیں جیسے آگے آ رہا ہے[1]

حضرت ابراہیم کے صاحبزادے آٹھ تھے۔ حضرت ہاجرہ مصری کے بطن سے حضرت اسماعیل[1] حضرت سارہ کے بطن سے حضرت اسحاق[2] اور حضرت قتورا کے بطن سے زمران[3]، یقسان[4]، مدان[5]، مدیان[6]، سباق، سوخ (پیدائش ۲۵-۱-۲) یعقوب حضرت اسحاق کے صاحبزادے اور حضرت ابراہیم کے پوتے ہیں۔ اسرائیل آپ ہی کا لقب ہے۔ عمر حسب روایت توراۃ ۱۴۷ سال پائی۔ زمانہ غالباً ۲۰۰۰ قبل مسیح سے ۱۸۵۳ قبل مسیح ہے۔ ولادت کنعان (فلسطین) میں ہوئی۔ ۱۸۷۶ قبل مسیح میں اپنے نامور بیٹے یوسف کے پاس مصر میں منتقل ہو گئے۔ وفات یہیں ہوئی۔

حضرت یعقوب کے چار بیویوں سے بارہ فرزند تھے۔ ان کے نام توریت کی تصریح کے مطابق یہ ہیں، روبن، شمعون، لاوی، یہودا، اشکار، زبلون، یوسف، بنیامین، دان، نفتالی، جد، آشرا، (پیدائش ۳۵-۲۴، ۲۶)

۳۶۵ ۔ اس دینِ اسلام کو اللہ نے تمہارے لیے منتخب فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم نے جو قومِ عرب اور نسلِ یہود دونوں کے مورثِ اعلیٰ ہیں۔ اور عیسائیوں کے بھی مقتدا ہیں۔ اور حضرت یعقوب جو نسلِ اسرائیل کے جدِ امجد ہیں یہ دونوں اپنی اولاد کو اپنے اختیار کیے ہوئے اور خدا کے پسندیدہ دین منتقل کر کے دنیا سے تشریف لے گئے اور فرما گئے کہ تمہیں دین کی تلاش میں حیران و سرگرداں ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارے لیے یہ اللہ کا بنایا ہوا اور اس کا بنایا ہوا دین ہے۔

دین یعنی طریقِ زندگی، نظامِ حیات، وہ آئین جس پر انسان دنیا میں اپنے پورے طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی بنا رکھے۔ وصیت نامہ یہ تھا کہ تمہاری رہنمائی اور ہدایت کے لیے اس دینِ اسلام کو منتخب کیا۔ اسی سے وابستہ رہنے، اسی کی حفاظت کرنا اور مخلصانہ اطاعت میں زندگی کے کسی مرحلہ پر ایک لمحہ بھی کمی نہ کرنا۔ اور اس درجہ اس پر کاربند رہنا کہ تمہارا دمِ واپسیں اسلام پر ہو یعنی تمہاری پوری زندگی بالکل سرتاسر اسلامی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہمہ وقت مسلم بنے رہو۔ ہر لحظہ ایمان تمہارے دلوں کا مکیں رہے۔ دین کے مطالبات میں ایمان کا مطالبہ دائمی اور ہمہ وقتی

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۵

ہے۔ اعمال حالات کے تابع ہوتے ہیں اور حالات بدلتے رہتے ہیں۔ اس لیے عمل کے تقاضے بھی تبدیل ہوتے رہتے ہیں۔ دین کی زندگی کے لیے یہ کس قدر معنے خیز اور بلیغ فقرہ ہے۔ ان اللہ اصطفیٰ لکم الدین، فلا تموتن الا و انتم مسلمون۔ مطلب یہ ہے کہ اپنی زندگی میں اسلام اور اسلام کی تعلیمات پر پختگی سے عمل کرتے رہنا تاکہ اللہ تعالیٰ تمہارا خاتمہ بھی اسلام پر فرما دے۔ جیسا کہ بعض روایات میں آتا ہے کہ تم اپنی زندگی میں جس قسم کی حالت کو اپناؤ گے اسی حالت پر تمہاری موت ہوگی اور اسی حالت میں میدانِ قیامت میں حشر ہوگا اللہ سبحانہٗ کی سنت یہی ہے کہ جو بندہ نیکی کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے لیے اپنی بساط کے مطابق محنت کرتا ہے تو اللہ سبحانہٗ اس کو نیکی کی توفیق ارزانی فرما دیتے ہیں اور کام کو اس کے لیے آسان فرما دیتے ہیں

۳۶۶ھ۔ کیا تم موجود تھے اس وقت جب یعقوب موت کی آغوش میں جا رہا تھا۔ اس کے دو طرح معنے کیے گئے ہیں۔ ایک معنے تو وہی ہیں جو آپ پڑھ چکے ہیں اور ایک معنے یہ بھی کیا تم غیر حاضر تھے یا اس وقت موجود تھے جب یعقوب دمِ واپسیں میں اپنی اولاد سے کہہ رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت یعقوب کی وصیت کے وقت موجود نہ تھے۔ انہوں نے تو دینِ انبیائے موصوفین اختیار کرنے کا حکم دیا تھا۔ بعد میں تم نے یہ کیا ہے کہ یہود اپنے سوا سب کو اور عیسائی اپنے سوا سب کو بے دین بتلانے لگے اور مذہبِ حق یعنی اسلام سے دونوں منحرف ہو گئے۔[1]

بائیبل میں حضرت یعقوب کی وفات کا حال بڑی تفصیل سے لکھا گیا ہے مگر حیرت ہے کہ اس وصیت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ البتہ تلمود میں جو مفصل وصیت درج ہے اس کا مضمون قرآن کے بیان سے بہت مشابہ ہے۔ اس میں ہمیں حضرت یعقوب کے یہ الفاظ ملتے ہیں:

خداوند اپنے خدا کی بندگی کرتے رہنا۔ وہ تمہیں اسی طرح تمام آفات سے بچائے گا جس طرح تمہارے آباؤ اجداد کو بچاتا رہا ہے۔ اپنے بچوں کو خدا سے محبت کرنے اور اس کے احکام بجالانے کی تعلیم دینا تاکہ ان کی مہلتِ زندگی دراز ہو۔ کیونکہ خدا ان لوگوں کی حفاظت کرتا ہے جو حق کے ساتھ کام کرتے ہیں اور اس کی راہوں پر ٹھیک ٹھیک چلتے ہیں۔ جواب میں ان کے لڑکوں نے کہا جو کچھ آپ نے ہدایت فرمائی ہے ہم اس کے مطابق عمل کریں گے۔ خدا ہمارے ساتھ ہو تب یعقوب نے کہا اگر تم

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۵

خدا کی سیدھی راہ سے دائیں یا بائیں نہ مڑو گے تو خدا ضرور تمہارے ساتھ رہے گا لے

اس قرآنی وصیت کا خلاصہ یہ ہے کہ توحید عبادت کا عقیدہ اور دلی طاعت و اخلاص کی دولت ہمیشہ اللہ سبحانہ کے لیے رہنی چاہیے۔ آیات میں لفظ اسلام کا تکرار اسی حقیقت کو جتانے کے لیے ہے۔ قرآن کے مخاطبوں میں اہل عرب میں ایک دین کے دعویدار تھے اور اسی کو حق سمجھتے تھے اور بت پرستی کے باوجود ابراہیمی نسبت پر فخر کرتے تھے۔ یہودی اور عیسائی بھی دین کے علمبردار تھے اور اسی کو حق سمجھتے تھے۔ قرآن نے ان آیات میں ابراہیم و اسماعیل اور اسحاق و یعقوب سب کے رہنماؤں کا نام لے کر بتایا ہے کہ تمہارے یہ دعوے تمہارے گروہی تعصب کا سرمایہ ہیں ورنہ حقیقت میں اللہ کا دین تو ایک ہے اور اس کی روح انبیاء کی ہدایت کی روشنی میں ایک پروردگارِ عالم کی عبادت اور اس کی مخلصانہ اطاعت ہے۔ یہ انبیائے حق کے سہارے تم نجات کے خوش آئند خواب دیکھ رہے ہو۔ ان سب کی وصیت اپنی اولاد کو صرف یہ تھی کہ انسان کی نجات کا دارومدار ایمان و عمل پر ہے۔ قرآن کا ان سب سے مطالبہ یہ اور صرف یہ ہے کہ ایمان و اسلام کو اپنا ؤ۔ ایمان یہ کہ یگانہ پروردگار کی عبادت ہو اور شرک کی ہر نوع سے دامن پاک ہو اور اسلام یہ کہ زندگی کے تمام اعمال میں اللہ کی مخلصانہ اطاعت ہو۔

قرآن کی زبان میں اسلام کوئی لفظ جامد نہیں ہے جس میں کوئی معنویت نہ ہو بلکہ جمیع انبیاء کی اصطلاحی زبان کا بول ہے۔ اس کے معنے سراپا اطاعت و فرمانبرداری کے ہیں۔ اگر ایک شخص کی زندگی میں اللہ کی مخلصانہ اطاعت نہیں ہے تو انبیاء کی اصطلاحی زبان میں مسلم نہیں ہے۔ نہ اسلام کوئی جغرافیائی اور قومی اصطلاح ہے کہ اللہ کی ساری بغاوتوں کے ساتھ بھی یہ کسی سے چمٹا ہی رہے اور مردم شماری کے رجسٹر میں درج ہونے والا ہر شخص مسلم کہلائے۔

ان انبیاء کے اس اندازِ وصیت سے یہ بات بھی معلوم کی جا سکتی ہے کہ اولاد کی نظری عملی اور اخلاقی تربیت، برائیوں سے ان کو بچانے کی کوشش کرنا اولاد کی سچی محبت اور خیرخواہی ہے۔ یہ کوئی عقل کی بات نہیں کہ ایک انسان اپنے بچہ کو دھوپ کی گرمی سے بچانے کے لیے تو ساری توانائی خرچ کر دے اور دائمی عذاب سے بچانے کی کوئی فکر نہ کرے۔ اس کے جسم سے آلائش دُور کرنے کے لیے تو بے قراری اور بے تابی کا مظاہرہ کرے اور اللہ کی

لے تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۱۴

تِلْكَ أُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۖ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُم مَّا كَسَبْتُمْ ۖ وَلَا تُسْأَلُونَ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٤١﴾

بہر حال یہ اُمت[۲۴۶] تھی جو گزر چکی ہے اس کے لیے وہ ہی تھا جو اپنے اعمال سے کمایا اور تمہارے لیے وہ کچھ ہے جو تم اپنے اعمال[۲۴۷] کماؤ گے۔ تم سے یہ نہ پوچھا جائے گا کہ ان کے اعمال کیا تھے ؟

ناراضی سے بچانے کے لیے کبھی جنبش میں نہ آئے [۱]

۲۴۶ - یہ نام پہلی بار آیا ہے۔ یہ حضرت ابراہیم کے دوسرے صاحبزادے ہیں۔ حرم اوّل حضرت سارہ والدہ ہیں۔ سالِ ولادت غالباً ۲۰۰۶ قبل مسیح ہے۔ سالِ وفات غالباً ۱۸۰۰ ق م ہے۔ توریت میں عمر ۱۸۰ سال بتائی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ آپ کی ولادت کے وقت حضرت ابراہیم کی عمر ۱۰۰ سال ہے۔ آپ کی وفات کا منظر قصص الیہود میں یوں پیش کیا گیا ہے کہ

جب اسحاق نے دیکھا کہ ان کا وقتِ موعود آن پہنچا تو انہوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو اپنے پاس بلا بھیجا اور کہا کہ میں تمہیں خدا تعالیٰ کا واسطہ دیتا ہوں جس کی صفات اعلیٰ عظیم قیوم و عزیز ہیں اور جو آسمان و زمین اور ان کے درمیان ہر چیز کا خالق ہے کہ تم اسی کا خوف رکھنا اور اسی کی عبادت کرنا۔ (جلد اوّل ص ۱۱۶) [۲]

ایمانی تصور اور جاہلی نقطۂ نظر

قرآن نے اپنے تینوں مخاطبوں یہودی، عیسائی اور مشرکین کے مسلم بزرگوں کا ذکر کرنے کے بعد سعادت و شقاوت، ہدایت و ضلالت اور نجات و ہلاکت کے بارے میں ایک بنیادی اور اصولی قانون کو پیش کیا ہے۔ یہودیوں کو یہ غلط فہمی تھی کہ ہم نسلِ انبیا سے ہیں اور ان کی اولاد ہیں

---

[۱] معارف القرآن م ش ص ۲۹۲ [۲] تفسیر ماجدی ص ۵۲

نسلی اور نسبی تعلق ہماری نجات کا ذریعہ ہو گا خواہ ہم کیسے ہی گناہ کریں ہمارا کچھ نہیں بگڑتا عیسائی اس خوش فہمی میں تھے کہ حضرت عیسیٰ اپنے ماننے والوں کا مصلوب ہو کر کفارہ ہو چکے ہیں۔ اب ہماری بخشش میں کوئی کلام نہیں ہے اور مشرکین نے یہ ذہن بنا رکھا تھا کہ یہ اللہ کے بڑے چہیتے بڑے پیارے اور لاڈلے ہیں۔ ہم ان کو اپنے عابدانہ تعلقات سے اگر خوش رکھیں گے تو ہماری سفارش کر کے ہمیں پار کر دیں گے۔ قرآن نے یہاں تینوں کو مخاطب کر کے قانونِ نجات بتایا ہے اور ساتھ ہی سمجھا دیا ہے کہ جن بزرگوں کے نام لیے گئے ہیں وہ ایک اُمت ہیں اور تم دوسری اُمت ہو۔ وہ مومنین و صالحین کی جماعت ہیں اور تمہاری جماعت بدکاروں اور فاسقوں کی ہے۔ دونوں جماعتیں ضرور ہیں مگر الگ الگ ہیں۔ قرآنی تصور میں اُمت جن عناصر سے ترکیب پاتی ہے وہ ایمان و عمل صالح ہے جبکہ جاہلی نقطۂ نظر میں قوم، نسل، زبان اور وطن سے بنتی ہے۔ ایمان کا تصور یہ ہے کہ اہلِ ایمان ایک اُمت ہیں اور اہلِ کفر دوسری ملت ہیں۔ انبیاء کی پوری جماعت ایک اُمت ہیں کیونکہ ان کے ایمان و عمل میں وحدت ہے اور ایمان میں اتنی گہری معنویت ہے کہ اگر کسی دَور میں شخصِ واحد ہی معاشرہ میں ایمان کا علمبردار ہو وہ ہی اُمت ہے ان ابراہیم کان اُمۃ۔

قرآن کہتا ہے کہ نبوت کی رہنمائی میں ایمان و عمل والے ایک اُمت ہیں اور نبوت سے رُوگرداں اور کفر کی آغوش میں رہنے والے ایک دوسری اُمت ہیں۔

۳۶۸ یہودیوں اور نصرانیوں کو یقین تھا کہ ماں باپ کے گناہوں میں اولاد گرفتار ہو گی اور ان کے ثواب میں بھی اولاد شریک ہو گی۔ یہ غلط ہے اپنا کیا اپنے آگے آئے گا بھلا یا بُرا [1]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ باپ دادا کے نیک اعمال اولاد کے لیے کافی نہیں ہوں گے۔ جب تک وہ خود اپنے اعمال کو دُرست نہ کریں۔ اسی طرح باپ دادا کے بُرے اعمال کا وبال بھی اولاد پر نہ پڑے گا جبکہ اولاد اعمالِ صالحہ کی پابند ہو۔ اس سے یہ بھی ثابت ہوا کہ مشرکین کی اولاد جو بالغ ہونے سے پہلے مر جاتے ان کو اپنے ماں باپ کے کفر و شرک کی وجہ سے عذاب نہیں ہو گا اور اس سے یہود کے اس عقیدے کی نفی نردید ہو گئی کہ ہم جو چاہیں

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۵

عمل کریں ہماری مغفرت تو ہمارے آباؤ اجداد کے اعمال سے ہو گی۔ اسی طرح آج کل کے بعض سید خاندان کے افراد اس خیال میں مگن ہیں کہ ہم اولادِ رسول ہیں ہم جو چاہیں گناہ کرتے رہیں ہماری مغفرت ہو ہی جائے گی۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

اے بنی ہاشم ایسا نہ ہو کہ قیامت کے روز لوگ تو اپنے اپنے اعمالِ صالحہ لے کر آئیں اور تم اعمالِ صالحہ سے غفلت برتو صرف میرے نسب کا بھروسہ لے کر آؤ اور میں تم سے اس روز یہ کہوں کہ میں تمہیں اللہ کے عذاب سے نہیں بچا سکتا۔

اور دوسری حدیث میں ارشاد ہے :

جس شخص کو اس کے عمل نے پیچھے کر دیا اس کو اس کا نسب آگے نہیں بڑھا سکتا۔[1]

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تم ان کی اولاد سہی مگر حقیقت میں تمہیں ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ ان کا نام لینے کا تمہیں کیا حق ہے جبکہ تم ان کے طریقے سے پھر گئے ہو۔ اللہ کے یہاں تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ تمہارے باپ دادا کیا کرتے تھے بلکہ یہ دریافت کیا جائے گا کہ تم خود کیا کرتے رہے۔ اور جو یہ فرمایا کہ جو کچھ انہوں نے کمایا وہ ان کے لیے ہے اور جو کچھ تم کماؤ گے وہ تمہارے لیے ہے۔ یہ قرآن کا خاص اندازِ بیان ہے۔ ہم جس چیز کو فعل یا عمل کہتے ہیں قرآن اسے اپنی زبان میں کسب یا کمائی کہتا ہے۔ ہمارا ہر عمل اپنا ایک اچھا یا برا نتیجہ رکھتا ہے جو خدا کی خوشنودی یا ناراضی کی صورت میں ظاہر ہو گا وہی نتیجہ ہماری کمائی ہے۔ چونکہ قرآن کی نگاہ میں اصل اہمیت اسی نتیجہ کی ہے اس لیے اکثر وہ ہمارے کاموں کو عمل و فعل کے الفاظ سے تعبیر کرنے کے بجائے کسب کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے۔[2]

نجاتِ متوارث اور معصیتِ متوارث کا عقیدہ

اسلام کے طفیل اب یہ بات معمولی سی معلوم ہوتی ہے لیکن قرآن نے جب اس حقیقت کا اعلان کیا ہے اس وقت بہت ہی اہم اور گویا ایک نادر سی بات تھی۔ شخصی و ذاتی ذمہ داری اور انفرادی مسئولیت کی تعلیم اسلام کے خصوصیاتِ امتیازی میں سے ہے ورنہ مشرک تو

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۲۹۴ [2] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۱۴

مشرک یہود تک اس حماقت میں مبتلا ہو گئے تھے کہ ذاتی عمل کی کوئی ضرورت ہی نہیں ہے۔ مقبولانِ الٰہی کی جانب انتسابِ نسلی اور بزرگوں کی جانب نسبتِ نسبی بالکل کافی ہے۔ مسیحیوں کا گڑا ہوا مسئلہ معصیتِ متوارث سب کو معلوم ہے یعنی جو گناہ حضرت آدم سے سرزد ہو گیا تھا وہ ہر نسلِ آدم میں منتقل ہوتا چلا آرہا ہے۔ یہود نے اس کے مقابل ایک عقیدہ نجاتِ متوارث کا وضع کر لیا تھا اور یہ سمجھ لیا تھا کہ خدا تعالیٰ اپنے اسم پاک کے طفیل میں اور بطور اپنے افضال کے باپ کی نیکیاں اولاد کی طرف منتقل کر دیتا ہے۔ توریت مروجہ میں ایک آیت اس مضمون کی ملتی ہے —— میں خداوند تیرا خدا غیور ہوں جو باپ دادوں کی بدکاری کا بدلہ ان کی اولاد سے تیسری اور چوتھی پشت تک جو میرا کینہ رکھنے والے ہیں لیتا ہوں۔ (استثنا ۵-۹) بس اس کو رائی کا پہاڑ بنا لیا۔ کہ ہر نسل کو انتقالِ ثواب اوپر سے اور نیچے سے بھی یعنی اسلاف و اخلاف دونوں کی طرف سے ہوتا رہے گا۔ اور پھر اولادِ ابراہیم کو تو کوئی ڈر ہی نہیں ہے[1]

گویا قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ قانونِ الٰہی یہ ہے کہ ہر فرد اور جماعت کو وہی کچھ پیش آتا ہے جو اس نے اپنے عمل سے کمایا ہے۔ نہ تو ایک کی نیکی دوسرے کو بچا سکتی ہے نہ ایک کی بدعملی کے لیے دوسرا جوابدہ ہو سکتا ہے۔ انسان کے لیے قدامت پرستی کا پھندا بڑا ہی سخت پھندا ہے۔ اس کے پیچ سے وہ نکل نہیں سکتا وہ ہمیشہ ماضی کے افسانوں میں گم رہے گا اور ہر پرانے طور طریقہ کو تقدیس کی نظر سے دیکھے گا۔ لیکن قرآن کہتا ہے تلک امۃ قد خلت لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم یہ ایک گروہ تھا جو گزر چکا اب اس کے پیچھے پڑے رہنے سے تمہیں کوئی فائدہ نہ ہوگا تم اپنی خبر لو ان کے اعمال ان کے لیے تھے۔ تمہارے اعمال تمہارے لیے ہیں[2]

دراصل یہ آیت حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب کی اپنے اولاد کو وصیت کے تذکرے کے بعد بطور استدراک آئی ہے۔ ممکن ہے کسی کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ جب ان ہمارے بزرگوں کا اللہ کے یہاں یہ مقام ہے تو پھر یہ ضرور روزِ قیامت ہمارے کام آئیں گے اور ان سے تعلقِ نسبی ہمارے لیے ذریعۂ نجات ہوگا۔ اسی خلش کو دور کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ لھا ما کسبت ولکم ما کسبتم۔ جزا نسبت اور نسب پر نہیں بلکہ کسب و عمل پر ہوگی۔

---

[1] تفسیر ماجدی ج ا ص ۵۲ [2] ترجمان القرآن ص ۲۵۵

وَقَالُوا كُونُوا هُودًا أَوْ نَصٰرٰى تَهْتَدُوا ۗ قُلْ بَلْ مِلَّةَ إِبْرٰهٖمَ حَنِيفًا ۗ

وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝

اور یہودی کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ ہدایت پاؤ گے[۳۶۹] اور عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائی ہو جاؤ ہدایت پاؤ گے۔ ان سے کہہ دو کہ نہیں بلکہ آؤ اور ملت ابراہیم کے پیرو کار بن جاؤ[۳۷۰]۔ ابراہیم سب سے کٹا ہوا اور صرف اللہ کا ہو رہا تھا۔ اور وہ مشرکوں میں سے نہ تھا۔

امام غزالیؒ نے کیا اچھی بات فرمائی ہے کہ اگر اگر اس عالم میں باپ کا روٹی کھانا بھوکے بیٹے کا پیٹ نہیں بھرتا، باپ کا پانی پینا پیاسے بیٹے کو سیراب نہیں کرتا ہے تو پھر باپ کی نیکی روزِ قیامت بیٹے کو عذاب سے بچا بھی نہیں سکتی۔

غرض یہ آیت دین کی زندگی میں بہترین رہنما اصول ہے

ہدایت ملت ابراہیم کی پیروی میں ہے

پہلی آیات میں اہلِ کتاب اور مشرکین کو ملتِ ابراہیم کی حقیقت سمجھائی ہے اور بتایا ہے کہ یہی سب نبیوں کی اجتماعی دعوت رہی ہے۔ اس موضوع پر قرآن کے واضح اور صاف دلائل سُن کر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اہلِ کتاب ان سے متاثر ہوتے اور قبولِ حق پر آمادہ ہو جاتے لیکن بجائے اس کے ضد اور ہٹ دھرمی سے کام لے کر اُلٹی مسلمانوں کو یہودیت اور نصرانیت کی دعوت دینے لگے اور کہنے لگے کہ اگر ہمارے گروہ میں داخل ہو جاؤ تو تمہیں دُنیا کی فلاح اور آخرت کی نجات مل جائے گی۔ اس کے جواب میں قرآن نے ان کو اولاً ملت ابراہیمی کی پیروی کی دعوت دی ہے۔

۳۶۹ے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودی مسلمانوں کو کہتے ہیں کہ یہودی ہو جاؤ اور عیسائی کہتے ہیں کہ عیسائی ہو جاؤ تو تم کو ہدایت نصیب ہو۔ اس کے جواب میں قرآن نے حضور اکرم صلی اللہ

علیہ وسلم سے کہا کہ اس طرح کہو کہ تمہارا کہنا ہرگز منظور نہیں ہے بلکہ ہم موافق ہیں ملت ابراہیم کے جو سب بُرے مذہبوں سے علیحدہ تھے اور اس فقرہ میں کہ وہ شرک کرنے والوں میں سے نہ تھے، بھی چوٹ ہے اہلِ کتاب کے دونوں فرقوں پر کہ تم دونوں شرک میں مبتلا ہو۔ مشرکین عرب بھی مذہب ابراہیمی کے مدعی تھے۔ اس میں ان کا بھی رد ہے۔ لہٰذا اب ان فرقوں میں برحق انصاف کوئی بھی ملتِ ابراہیم پر نہیں رہا۔ صرف اہلِ اسلام ملتِ ابراہیم پر رہے ہیں[1]

۳۷ف۔ یہ قرآن نے حضور انورؐ کو بتایا ہے کہ ان کہنے والوں سے کہہ دو کہ ہمارا دین کوئی نیا دین نہیں ہے پرانا دین ہے اور وہ دین ہے جو حضرت ابراہیم کا تھا۔ ہم تمہاری نہیں بلکہ ملتِ ابراہیم کی پیروی کریں گے۔

اس جواب کی لطافت سمجھنے کے لیے دو باتیں ذہن میں رکھئے۔

ایک یہ کہ یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں، یہودیت اپنے اس نام اور اپنی مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی۔ اور عیسائیت جن عقائد اور مخصوص مذہبی تصورات کے مجموعہ کا نام ہے۔ وہ تو حضرت مسیح کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آئے ہیں۔ اگر یہودیت اور عیسائیت ہی معیارِ ہدایت ہیں تو پھر حضرت ابراہیم اور دوسرے انبیاء کے بارے میں کیا فیصلہ کیا جائے جو یہودیت اور عیسائیت کی تاریخ سے قبل ہو چکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ یہود و نصاریٰ کی مقدس کتابیں اس پر گواہ ہیں کہ حضرت ابراہیم یگانہ پروردگار کی عبادت کے علاوہ کسی کی پرستش اور اطاعت کے قائل نہ تھے۔ ان کا مشن ہی یہ تھا کہ اللہ کی صفات و خصوصیات میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہودیت و عیسائیت دونوں اس راہِ ہدایت سے منحرف ہو چکے ہیں جس پر حضرت ابراہیم گامزن تھے کیونکہ ان دونوں میں شرک کی آمیزش ہے[2]

(حنیف کی علمی تحقیق)

اس آیت میں حضرت ابراہیم کے دو وصف بیان فرمائے ہیں۔ حنیف ہونا اور دوسرے ان کا مشرکین میں سے نہ ہونا۔ دوسری بات تو ظاہر ہے اور اس میں تعریض بھی ہے کہ تم کس منہ سے اپنے کو دینِ ابراہیم کی جانب منسوب کرتے ہو وہ تو شرک کے قریب ہو کر بھی

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۵ [2] تفہیم القرآن ص ۱۱۵

نہیں گزرے تھے اور تم تو کھلے شرک کا ارتکاب کرتے ہو۔ ابراہیم کی توحیدِ خالص پر یہود و نصاریٰ دونوں متفق ہیں۔

پہلی بات کہ حضرت ابراہیم حنیف تھے۔ حنیف کے معنے میں ہمارے شارحینِ قرآن کوئی ٹھوس رائے نہیں رکھتے۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ ابراہیم کو حنیف اس لیے کہتے ہیں کہ حنیف کے معنے جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں۔ اور ابراہیم چونکہ اللہ کے دین کی طرف جھکے ہوئے تھے اس لیے ان کو حنیف کہا گیا ہے۔ ابن جریر کہتے ہیں کہ حنیف بمعنی مستقیم ہے اور جس طرح لنگوں نیک کی خاطر اندھے کو بصیر اور بچھو کاٹے کو سلیم کہتے ہیں اسی طرح لنگڑے کو احنف کہتے ہیں لہٰذا جو خدا کی فرمانبرداری میں مستقیم ہو وہ حنیف ہے۔

چونکہ ان بزرگوں نے لفظ حنیف کی تحقیق میں قرآن سے مدد نہیں لی اس لیے یہ صورت پیش آئی۔ یورپین مصنف ہمیں بتاتے ہیں کہ سریانی میں حنیف کے معنے کافر کے ہیں اور عبرانی میں منافق کے ہیں اور طعنہ دیتے ہیں کہ مقدس پیروان محمدؐ نے اس کی لفظی تحقیق کی پرواہ نہیں کی۔ اور مشورہ دیتے ہیں کہ قبیلہ بنو حنیفہ کے جھوٹے پیغمبر مسیلمہ کے نام کو اس لفظ کا ماخذ بنائیں۔ یعنی یہ کہ مسیلمہ سے مسلم اور حنیفہ سے حنیف کا لفظ لیا گیا ہے۔

یورپ کے مشرقی تبحر کا ظرف بایں ہمہ دعویٰ وسعت بہرحال تنگ ہے۔

اصل یہ ہے کہ حنیف حنف سے مشتق ہے۔ عربی میں اس کے معنے مڑنے اور جھکنے کے ہیں اس لیے حنیف وہ شخص ہے جو ایک طرف جھک کر اور مڑ کر دوسری طرف جائے۔ یہ لفظ اچھے اور بُرے دونوں معنے میں مستعمل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس نے اچھی بات کو چھوڑ کر بُری بات اختیار کی ہے تو حنیف کے وہ معنے ہو سکتے ہیں جس میں سریانی اور عبرانی زبان میں وہ مستعمل ہے یعنی کافر و منافق اور اگر یہ سمجھا جائے کہ بُرے کام کو چھوڑ کر اس نے کوئی اچھا کام کیا ہے تو اس کا مفہوم وہ ہوگا جس میں اہلِ عرب اس کو بولتے ہیں یعنی دیندار اور خدا پرست۔ اس بنا پر اچھے یا بُرے مفہوم کی تعیین موقع، استعمال اور حرف صلہ سے ہوگی۔ اصل میں اس کا ابتدائی استعمال لِلّٰہ باللدین کی تخصیص سے ہوتا تھا الحنیف للّٰہ اللہ کی طرف جھکنے والا۔ الحنیف للدین سچے مذہب کی طرف جھکنے والا، کثرتِ استعمال سے اس قید کی ضرورت نہیں رہی اور لفظ حنیف کے معنے اللہ کی طرف جھکنے والے کے ہوگئے۔ چنانچہ قرآن میں یہ لفظ دونوں طرح استعمال ہوا ہے۔ سورۂ حج میں حنیفاً للہ آیا ہے جبکہ سورۃ بینہ میں مخلصین لہ الدین حنفاء آیا ہے۔

ہر زبان میں کثرت سے اس قسم کی مثالیں ملیں گی بلکہ اصطلاحات عموماً اسی طرح کی ہوتی ہیں مثال کے لیے حنیف کے ہم معنے لفظ مسلم کو لیجئے۔ مسلم کے اصلی معنے سونپنے والے کے ہیں کوئی شخص اپنے دوست کو کسی دشمن کے حوالہ کردے تو عربی میں اس کو مسلم کہیں گے اور یہ معنے مذموم ہیں۔ اس کا ابتدائی استعمال مسلم للہ اپنے کو خدا کے سپرد کر دینے والا تھا لیکن کثرت استعمال سے صرف مسلم رہ گیا اور معنے وہی مسلم للہ کے رہے۔ اب کسی کے دل میں وسوسہ بھی نہیں آتا کہ اس کا کوئی برا مفہوم بھی ہے۔

اصل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی بعثت صائبی قوم میں ہوئی۔ حضرت ابراہیم نے علم وعمل دونوں طریق سے ان کے مذہب کی تردید کی۔ ان کی باطل پرستیوں سے سخت بیزاری کی اور اللہ برحق پر ایمان لائے اس لیے انہوں نے خود کو حنیف ظاہر کیا۔ یعنی ستارہ پرستی سے مڑ کر خدا پرستی کی طرف آنے والا۔ بعد کو بڑھتے بڑھتے اس لفظ کے معنے زاہد اور عابد دیندار کے ہو گئے۔ جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے

وادرکن اعجازا من اللیل بعد ما   اقام الصلوٰۃ العابد المتحنف

حواریوں نے رات کے آخری حصہ کو پا لیا   جبکہ عابد دیندار اپنی نماز ادا کر چکا

جاہلیت کا مشہور شاعر ابو ذویب کہتا ہے

اقامت بہ کمقام الحنیف   شہوی جمادی و شہوی صفر

اس نے وہاں قیام کیا جس طرح دیندار حنیف جمادی کے دو مہینے اور صفر کے دو مہینے قیام کرتا ہے

یہ دونوں شعر لسان العرب ہیں۔

ایک باریک نکتہ

یہاں یہ نکتہ بھی قابل توجہ ہے کہ جیسے لفظ صابی کے معنے عبرانی میں پاک اور طاہر کے ہیں لیکن عربی میں کافر کو کہتے ہیں ٹھیک اسی طرح حنیف کے معنے عبرانی اور آرامی میں کافر و منافق کے ہیں اور عربی میں موحد اور خدا پرست کے معنے میں ہے۔ معلوم ہوا کہ صابی اور حنیف یہ دونوں لفظ مقابل کے فرقوں کے نام ہیں اور ان کے اچھے اور برے مفہوم صرف مذہبی اتحاد و مخالفت پر مبنی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمان خود کو حنفاء کہتے ہیں اور کفار ان کو صباۃ (صابی کی جمع) کا لقب دیتے تھے۔ الغرض صابی کے مقابلہ میں حنیفیت ابراہیم کا مذہب ہے اور ان کی یادگار کے طور پر ان کی نیک اولاد میں اس کا کسی قدر حصہ باقی رہ گیا۔[1]

مسند احمد اور طبرانی میں حدیث ہے عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا ای الادیان احب الی اللہ قال الحنیفۃ السمحۃ۔ سب دینوں میں اللہ کو کون سا دین پیارا ہے فرمایا دینِ ابراہیمی جو نہایت آسان اور سہل تھا۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں الحنیفۃ وہ دین ہے جو ملتِ ابراہیمی کی طرح شعائر اللہ کے استحکام اور شعائر شرک کے استیصال اور رسومِ فاسدہ اور عقائدِ باطلہ کے ابطال پر قائم ہو اور السمحۃ وہ ہے جس کی تعلیم میں رہبانیت اور ناقابلِ برداشت مجاہدات نہ ہوں اور اس میں ایسی رخصتیں بھی موجود ہوں جو بوقتِ ضرورت بشری ضعف کو بچا لیں۔ اور البیضاء کا مطلب یہ ہے کہ اس دین کی علتیں اور حکمتیں ایسی واضح اور صاف ہوں کہ ہر سمجھدار کی سمجھ میں بآسانی آسکیں [1]

شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی تفسیر میں چالیس احکام شمار کر کے ایسے تحریر فرمائے ہیں جو ان ہر دو ملتوں میں تقریباً مشترک ہیں گویا دینِ محمدی کی زمین ملتِ ابراہیمی ہے اس لیے اس لقب پانے کی سب سے زیادہ مستحق یہی ملت ہے۔ ناظرین کے سامنے ان احکام کی مختصر فہرست پیش کرنا خالی از بصیرت نہ ہوگا

۱۔ دشمنانِ خدا سے جہاد کرنا۔
۲۔ بت شکنی
۳۔ غیر اللہ کی منت نہ ماننا
۴۔ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کے نام پر ذبح نہ کرنا
۵۔ رزق، شفا اور موت کو صرف مسبب الاسباب کے قبضۂ قدرت میں تصور کرنا
۶۔ اپنی جان کو خدا کی راہ میں قربان کرنا
۷۔ کہانت باطل سمجھنا۔
۸۔ بد فالی کا قائل نہ ہونا۔
۹۔ کسی ساعت کو منحوس نہ سمجھنا۔
۱۰۔ کواکب پرستی کا انکار کرنا
۱۱۔ نجومیوں سے مستقبل کے واقعات دریافت نہ کرنا۔
۱۲۔ آدابِ قربانی
۱۳۔ خصالِ فطرت
۱۴۔ جملہ افعالِ حج
۱۵۔ کعبہ کا قبلہ ہونا۔
۱۶۔ مصیبت پر صبر کرنا۔
۱۷۔ نوحہ وغیرہ نہ کرنا۔
۱۸۔ تصویر کی حفاظت اور مصوری سے اجتناب کرنا۔
۱۹۔ ترکِ نکاح، ترکِ لذائذ، ترکِ لباس و نفائس اور گوشہ نشینی جیسے افعال اختیار نہ کرنا۔

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ ص ۱۲۸

قُوْلُوْٓا اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ اِلٰٓى اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى وَعِيْسٰى وَمَآ اُوْتِيَ النَّبِيُّوْنَ مِنْ رَّبِّهِمْ ۚ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ ۖ وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾

مسلمانو! تم کہو کہ ہمارا طریقہ تو یہ ہے[۲۷۱] کہ ہم اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور قرآن پر ایمان لاتے ہیں اور جو ہم پر نازل کیا گیا ہے اور ان تمام تعلیمات پر ایمان لاتے ہیں جو ابراہیم کو، اسماعیل کو، اسحاق کو، یعقوب کو اور اولادِ یعقوب پر نازل کی گئی ہیں۔ نیز ان کتابوں پر ایمان لاتے ہیں جو موسیٰ، عیسیٰ کو دی گئیں۔ اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ ان تمام تعلیمات پر ایمان رکھتے ہیں جو دنیا میں سارے انبیاء کو ان کے مالک و مولیٰ کی جانب سے ملی ہیں۔ ہم ان میں[۲۷۲] سے کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے اور ہم اللہ ہی کے مسلم ہیں۔

۲۰۔ عبادت میں اتنی افراط سے اجتناب کرنا جس سے حقوق العباد تلف ہوں۔	۲۱۔ کسبِ معاش
۲۳۔ لباس صاف ستھرا رکھنا	۲۲۔ بلا ضرورت سوال نہ کرنا۔
۲۵۔ والد کو اولاد اور اولاد کو والد کے جرم میں گرفتار نہ کرنا	۲۴۔ لہو و لعب سے احتراز کرنا۔
	۲۶۔ حرمتِ زنا وغیرہ۔
	۲۷۔ سترِ عورت۔
۲۸۔ ختنہ کرنا۔	۲۹۔ عقیقہ کرنا۔
۳۰۔ آدابِ ضیافت۔	۳۱۔ پوشش و لباس کے احکام۔
۳۲۔ عبادت کے وقت اچھی ہیئت کا خیال رکھنا۔	۳۳۔ اشہرِ حرام کا خیال رکھنا۔
	۳۴۔ محرماتِ نکاح
۳۵۔ نکاح میں شاہدوں کا ہونا۔	۳۶۔ زکوٰۃ

۳۷۔ چاشت کی چار رکعتیں۔ ۳۸۔ تحریمہ میں رفع یدین کرنا۔
۳۹۔ رکوع کا سجدہ پر مقدم ہونا۔ ۴۰۔ نماز کی ہر نقل و حرکت میں تکبیر کہنا۔[1]

ادیانِ دُنیا میں اسلام کا چہرہ

قرآن نے اس آیت میں یہودیت اور عیسائیت کے مقابلے میں اسلام کا جو چہرہ پیش کیا ہے اس میں یہ ضروری قرار دیا ہے کہ اہلِ قرآن قرآن کے ساتھ دوسری آسمانی کتابوں کی صداقت کو بھی مانیں۔ یعنی کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک قرآن کے ساتھ دوسرے انبیاء کی کتابوں اور ان کے صحیفوں کو بھی من جانب اللہ تسلیم نہ کرے۔ حقیقت میں اسلام کا یہ چہرہ دُنیا کے مذاہب میں بالکل انوکھا اور نرالا ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔ یہ رواداری بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے۔ یہودی اپنی کتاب کے علاوہ تمام دوسری آسمانی کتابوں کا انکار کرکے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے۔ عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کرکے بھی آسمانی بادشاہت کا متوقع ہو سکتا ہے مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام دُنیا کی آسمانی کتابوں کو من جانب اللہ تسلیم نہ کرے جنّت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ بین الاقوامیت کی یہ شان اسلام کے علاوہ کسی دین میں نہیں ہے۔

تمام رسُولوں اور ان کی کتابوں کی تصدیق کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ آدم سے لے کر محمدؐ رسُول اللہ تک جتنے انبیاء خدا کی طرف سے آئے تھے وہ ایک اکائی اور وحدت ہیں۔ اسلام اسی ایک دین کا نام ہے جو آدم سے محمدؐ رسُول اللہ تک باری باری انبیاء کے ذریعے آتا رہا اور انسانوں کو اس کی تعلیم دی جاتی رہی۔ وحدتِ ادیان کا یہ راز سب سے پہلے محمدؐ رسُول اللہ کے ذریعے معلوم ہوا کہ دینِ الٰہی ہمیشہ سے ایک تھا، ایک رہا ایک رہے گا۔ نُورِ معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکلوں کی قندیلوں میں روشن ہو۔ اصل دین میں تمام انبیاء کی تعلیم یکساں تھی۔ ایک ہی دین تھا جس کو لے کر اوّل سے آخر تک انبیاء آتے رہے۔ اس میں زمان و مکاں کے تغیر کو کوئی دخل نہ تھا۔ وہ ہر زمانہ اور ہر قوم میں یکساں آیا ہے اور سب انبیاء نے یکساں

---

[1] فتح العزیز

تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟

دین میں تین باتیں ہوتی ہیں۔

اوّل اُصولِ عقائد، دوم قواعد کلیہ شریعت، سوم احکام جزئیہ۔

اُصولِ عقائد یعنی خدا کی ہستی، اس کی توحید اس کی صفاتِ کاملہ، نبوت، جزا و سزا کا یقین، اللہ کی خالص عبادت، حقوقِ انسانی اور اخلاقِ فاضلہ، یہ وہ بنیادی اُمور ہیں جن پر تمام انبیاء کا اتفاق ہے۔ یہ احکام نہ منسوخ ہوتے ہیں اور نہ زمانہ کی رفتار سے بدلتے ہیں۔ اسی کا نام دین ہے۔

قواعدِ کلیہ شریعت، اسی کا نام ملت ہے۔ یادِ الٰہی، جانی اور مالی عبادت، ان میں تفاوت کم ہوتا ہے لیکن بعض امور کسی قوم اور کسی زمانے کے لائق نہیں ہوتے ہیں تو ان میں تغیر و تبدل ہو جاتا ہے مثلاً حج کہ حضرت موسیٰ کی شریعت میں فرض نہ تھا کیونکہ یہودیوں میں اس کی صلاحیت نہ تھی وہ صرف اہلِ ظاہر تھے اسرارِ محبت سے ناآشنا تھے۔

قسم سوم احکامِ جزئیہ، اس میں تغیر و تبدل ہوتا رہا ہے۔ اس کو شریعت کہتے ہیں۔

اس لیے تمام نبیوں کا دین ایک ہے لیکن ملت اور شریعت الگ الگ ہیں۔ محمد رسول اللہ اور حضرت ابراہیم کی ملت بھی ایک ہے مگر شریعت جُدا ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ پر اور تمام نبیوں پر ایمان لانا اللہ کا دین ہے اور اسی کا نام اسلام ہے۔

۳۷/۵ ۔ یعنی یہ کہو کہ ہم سب رسُولوں اور سب کتابوں پر ایمان لاتے ہیں اور سب کو حق سمجھتے ہیں اور اپنے اپنے زمانہ میں سب واجب الاتباع ہیں اور ہم خدا کے فرماں بردار ہیں۔ ہمارا مشن احکامِ خداوندی کی پیروی ہے برخلاف اہلِ کتاب کے کہ اپنے دین کے سوا سب کی تکذیب کرتے ہیں۔ اور انبیاء کے احکام کو جھٹلاتے ہیں جو خدا کے احکام ہیں۔ ہر نبی کی دعوت میں تین باتیں ہوتی ہیں، اوّل عقائد، جیسے توحید و نبوّت وغیرہ۔ اس میں سب دین والے شریک ہیں اختلاف ممکن ہی نہیں ہے۔ دوسرے قواعدِ کلیہ شریعت جن سے جزئیات و فروع حاصل ہوتے ہیں اور ملت انہی اُصول و کلیات کا نام ہے۔ ملتِ ابراہیمی اور ملت محمدی کا توافق و اتحاد انہی کلیات میں ہے۔ تیسرے مجموعہ کلیات و فروع اور اُصول و جزئیات جس کو شریعت کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابراہیم کا دین و ملت ایک ہیں اور شریعت جُدا جُدا ہے [1]

آیت میں عام مسلمانوں سے خطاب ہے کہ کہدو ہمیں نسلی یا قومی تعصب کسی سے نہیں ہے۔ ہمارا رشتہ اسماعیلی اور اسرائیلی دین سے بس اعتقاد وانقیاد کا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم مسلمان کسی پیغمبر کے بھی منکر نہیں ہیں۔ آیت میں خصوصیت سے اسماعیل واسحاق کا تذکرہ خاص توجہ کا مستحق ہے۔ اسماعیل کا ذکر تو اس لیے ضروری تھا کہ اہلِ کتاب ان سے بغض رکھتے تھے اور اسحاق کا نام خود اس بات کی نشانی ہے کہ اسلام ایک بین الاقوامی دین ہے [1]

۳۷۲ ـ ہم ان میں سے کسی کے درمیان کوئی تفریق نہیں کرتے۔ قرآن کی جانب سے یہ اسلام کے عالمگیر اور بین الاقوامی دین ہونے کی سب سے بڑی دلیل پیش کی گئی ہے۔ آج ہر شخص فیصلہ کر سکتا ہے کہ عالمگیر مذہب وہ ہو سکتا ہے جو ہر ملک، ہر قوم، ہر نسل اور ہر زمانہ کے پیغمبروں کی علانیہ تصدیق کر رہا ہے یا وہ مذاہب ہو سکتے ہیں جو آسمانی ہدایت کو فلاں ملک، فلاں نسل، فلاں قوم کے ساتھ مخصوص کرتے ہیں۔

پیغمبروں کے درمیان تفریق نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم ان کے درمیان اس لحاظ سے فرق نہیں کرتے کہ فلاں حق پر تھا اور فلاں حق پر نہ تھا یا یہ کہ ہم فلاں کو مانتے ہیں اور فلاں کو نہیں مانتے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف سے جتنے پیغمبر آئے ہیں سب کے سب ایک ہی صداقت اور ایک ہی راہِ راست کی طرف بلانے والے ہیں۔ لہٰذا جو شخص صحیح معنے میں حق پرست ہے اس کے لیے تمام پیغمبروں کو برحق تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں۔ جو لوگ کسی پیغمبر کو مانتے اور کسی کا انکار کرتے ہیں وہ حقیقت میں اس پیغمبر کے بھی پیرو نہیں ہیں جسے وہ مانتے ہیں کیونکہ انہوں نے دراصل اس عالمگیر صراطِ مستقیم کو نہیں پایا ہے جسے حضرت موسیٰ یا عیسیٰ یا کسی دوسرے پیغمبر نے پیش کیا تھا بلکہ وہ محض باپ دادا کی تقلید میں ایک پیغمبر کو مان رہے ہیں۔ ان کا اصل مذہب نسل پرستی کا تعصب اور آباؤ اجداد کی اندھی تقلید ہے نہ کہ کسی پیغمبر کی پیروی [2]

قرآن کی دعوت

اس آیت نے یہ حقیقت کھول دی ہے کہ قرآن کی دعوت کی اوّلین بنیاد یہ ہے کہ تمام

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۵۲ ـ [2] تفہیم القرآن ص ۱۱۶

انبیاء کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے یعنی یقین کیا جائے کہ سب حق پر تھے۔ سب اللہ کے برگزیدہ نبی تھے۔ اسلام وہ دینِ قیم ہے جو ہمیشہ انبیاء کا دین رہا ہے اور قرآن یہود و نصاریٰ کی تحریفات و تصرفات اور فرقہ پروریوں کو مٹا کر اسی اسلام کی پکار ہے جس کی طرف انبیاءؑ اپنے اپنے زمانوں میں ہمیشہ لوگوں کو بلاتے رہے ہیں۔ اس لیے اسلام یہ ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آخر تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا۔ ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا۔ اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی رہی گم ہوتی رہی اور آخری بار دنیا کے کمالِ بلوغ کے زمانہ میں وہ پوری حفاظت کے وعدے کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوئی اور قیامت تک باقی و محفوظ رہے گی۔

قرآن نے اس آیت میں اور متعدد موقعوں پر تفریق بین الرسل کو ایک بہت بڑی گمراہی قرار دیا ہے اور سچائی کی راہ یہ بتائی ہے کہ سب کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ ہر راست باز انسان کا جو سچے دین پر چلنا چاہتا ہے فرض ہے کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں، تمام کتابوں اور تمام دعوتوں پر ایمان لائے اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرے۔ اس کا شیوہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ سمجھے سچائی جہاں کہیں بھی ظاہر ہوتی ہے اور جس کی زبان پر بھی ماضی میں ظاہر ہوئی ہے سچائی ہے اور میرا اس پر ایمان ہے۔

غور کرو کہ قرآن نے لا نفرق بین احد منھم میں جو بات کہہ دی ہے وہ انسان کی فکری گمراہیوں کی کتنی راہیں بند کر دیتی ہے بشرطیکہ لوگ اسے سمجھیں مگر مصیبت یہ ہے کہ لوگ ہمیشہ اسی کاوش کی پیروی کرتے رہے جو کونوا ھودا و نصاریٰ سے ٹپک رہی ہے۔ وہ حقیقت نہ پا سکے جو لا نفرق بین احد منھم میں پوشیدہ ہے۔ قرآن کے اس فقرے نے ہمیں یہ اصل عظیم بتادی ہے کہ سچائی اور راستی نہ تو کسی خاص زمانہ سے وابستہ کی جا سکتی ہے نہ کسی خاص نسل و قوم سے اور نہ کسی خاص زبان سے۔ اگر مسلمان اس اصل عظیم پر عامل ہو جائیں تو ان کے کتنے ہی گمراہ کن جھگڑے ختم ہو کر رہ جائیں۔ ایمانِ صحابہ کی حد تک یہ آیت ہمیں بتاتی ہے۔ کہ تفریق بین اصحاب محمدؐ سے انکار کیا جائے اور تمام صحابہ کے ایمان کو یکساں تسلیم کیا جائے۔ یعنی یقین کیا جائے کہ یہ سب مومن تھے، اللہ کے پیارے تھے۔ ائمہ میں اجتہاد کی حد تک سب کو مانا جائے اور کسی کے مقام اجتہاد کا انکار نہ کیا جائے۔ اور ولایت کے دائرے میں

فَإِنْ آمَنُوا بِمِثْلِ مَا آمَنتُم بِهِ فَقَدِ اهْتَدَوا ۖ وَّإِن تَوَلَّوْا فَإِنَّمَا هُمْ فِي شِقَاقٍ ۖ فَسَيَكْفِيكَهُمُ اللَّهُ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿١٣٧﴾

اس ایمانی پیمانہ پیش کرنے کے بعد اگر وہ بھی ایمان کی راہ ویسے ہی اختیار کرلیں جیسے[۳۴۲] تم نے اے مسلمانو اختیار کی ہے تو بس ہدایت پاجائیں اور اگر اس سے روگردانی کریں تو پھر سمجھ لو کہ وہ[۳۴۳] ضد اور ہٹ دھرمی میں ہیں۔ ان سے قطع نظر کرکے اپنے کام میں لگے رہو اور اطمینان رکھو کہ عنقریب اللہ ان کے مقابلے میں تمہاری حمایت کے لیے کافی ہے وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔

سب کی ولایت کا اقرار کرے۔ کسی ایک کا انکار نہ کیا جائے۔ گویا لا نفرق بین احد منھم نے ہمیں یہ اصول بتا دیا ہے کہ لا نفرق بین اصحاب محمد، اور لا نفرق بین الآئمۃ المجتہدین اور لا نفرق بین اولیاء اللہ۔ اور جیسے لا نفرق بین احد من رسلہ کا اعلان کرکے ایک پیغمبر کی فضیلت اس اعلان کے منافی نہیں ہے ایسے ہی کسی ایک صحابی کی فضیلت کا اعلان بھی ایمانِ صحابہ کے منافی نہیں ہے۔ اور جیسے انبیاء میں ایک پیغمبر کا طاعت کے لیے انتخاب عدم تفریق بین الرسل سے نہیں ٹکراتا ہے ایسے ہی آئمہ مجتہدین میں سے کسی ایک کی اقتداء سب کے اقرار و اجتہاد کے خلاف نہیں ہے اور سب کی ولایت مان کر اصلاح کے لیے کسی ایک کا انتخاب دوسروں کی ولایت کا انکار نہیں ہے۔

شیعہ سُنّی اختلاف نے مسلمانوں کو دو مختلف اُمتوں میں متفرق کر دیا لیکن اس تمام اختلاف کا ماحصل اس کے سوا کیا ہے کہ ہم لا نفرق بین احد من اصحاب رسول اللہ کے عظیم اُصول پر عمل نہ کرسکے اور ہم صحابہ کے ایمان سے کھیلنے لگے۔

دعوتِ ایمان

پچھلی آیت میں یہودیت اور عیسائیت کے مقابلے دعوت محمدی کا بین الاقوامی اور عالمگیر

ایمانی پیمانہ پیش کیا گیا تھا۔اس آیت میں ان کو دعوتِ ایمان دی جارہی ہے۔ اور ایمان کے لیے ان کے سامنے نمونہ پیش کیا جارہا ہے۔ نمونہ کے لیے صحابہ کے ایمان کو پیش کیا گیا ہے۔ یاد رہے کہ کوئی چیز نمونہ اس وقت تک نہیں بنتی جب تک وہ ہر پہلو میں مکمل نہ ہو۔ یہاں صحابہ کا ایمان اگر کسی کمی کا حامل ہوتا تو اسے خدا کی جانب سے نمونہ کے طور پر نہ پیش کیا جاتا۔ انقیادِ باطن، التزامِ طاعت، عہدِ وفاداری ایمان کے وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم کا ایک درجہ ہے۔ ایمان کے لیے ضروری ہے کہ اس میں انقیادِ باطن اور التزامِ طاعت ہو۔ اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہدِ وفاداری نہیں کرتا تو وہ مومن نہیں کہلا سکتا چہ جائے کہ اسے نمونہ بنا کر پیش کیا جائے۔ اسی طرح اگر فرمانبرداری کے لیے آمادہ ہے لیکن قلب و زبان سے تصدیق کے لیے آمادہ نہیں تو وہ بھی مومن نہیں ہے۔ ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کا عزم مصمم ہو۔ عبداللہ ابنِ عمرؓ سے دریافت کیا گیا کہ کیا رسول اللہ کے صحابہ ہنسا کرتے تھے۔ انہوں نے فرمایا جی ہاں لیکن ان کے دلوں میں ایمان پہاڑوں سے زیادہ بھاری موجود ہوتا تھا۔ (شرح السنہ) حافظ ابن کثیرؒ نے آیت ولوانا کتبنا علیھم ان اقتلوا انفسکم کی تفسیر کے ذیل میں امام اعمش سے نقل کیا ہے کہ آیت مذکورہ سن کر صحابہ کرام بول پڑے کہ اگر ہمارا رب ہمیں یہ حکم دیتا تو ہم بسروچشم اس کام کو کرتے۔ حضور انورؐ کو جب صحابہ کی زبان سے نکلے ہوئے ان جاں نثاری کے کلمات کی اطلاع ہوئی تو فرمایا۔ ان اہلِ ایمان کے دلوں میں ایمان بڑے بڑے پہاڑوں سے بھی زیادہ پائیدار اور مستحکم ہے۔

۳۷۵۔ اس آیت میں صحابہ کے ایمان کو ایک مثالی ایمان قرار دے کر حکم دیا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک مقبول اور قابلِ اعتبار صرف اسی طرح کا ایمان ہے جو صحابہ نے اختیار کیا ہے اور جو ایمان اس سے سرِ مو مختلف ہوگا وہ اللہ کے یہاں قابلِ قبول نہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جتنی چیزوں پر یہ حضرات ایمان لائے ان میں کوئی کمی نہ ہو اور جس اخلاص کے ساتھ ایمان لائے اس میں کوئی فرق نہ آئے کیونکہ وہ نفاق میں داخل ہے[1]

اس آیت میں ایمان پوری شریعتِ مطہرہ کو قبول کر لینے کا مختصر ترین اندازِ تعبیر ہے۔

---

[1] معارف القرآن ص ۲۹۷

اور اس لیے ایمانیات کی بہت سی دوسری باتیں جن کی تفصیل ہر موقع پر ضروری نہیں ہے۔ اس ایک لفظ کے تحت آتی ہے۔ کبھی اسے ایمان بالانزل الیک سے تعبیر کردیا جاتا ہے اور مطلب یہ ہوتا ہے کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام مذکور ہیں ان سب کو بے کم و کاست تسلیم کیا جائے۔

اس آیت میں یہود و نصاریٰ کو ایمان قبول کرنے پر ہدایت کی بشارت دی گئی ہے اس کا مفہوم صاف یہ ہے کہ یہ دونوں گروہ اپنی موجودہ حالت میں ہدایت پر نہیں ہیں اور یہ معلوم ہوا کہ اسلام ہدایت تامہ ہے۔ یہی وہ دین ہے جسے یہود و نصاریٰ نے کھو دیا تھا۔ اور اب جس کو محمد رسول اللہ کے ذریعے صحابہ کو نمونہ بنا کر دنیا میں پیش کیا گیا ہے اس لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو لے کر آئے وہ کامل ہے۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ

جو ایمان لایا اور جو یہودی ہوا اور نصرانی اور صابئی جو بھی خدا پر ایمان لایا اور یوم آخر پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیے اس کو کوئی خوف و غم نہ ہوگا۔

ان میں خدا پر ایمان لانے سے توحید کامل مراد ہے اور اس کا ہرگز ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں۔ یہود و نصاریٰ تو درکنار مسلمان بھی اس توحید کامل کے بغیر نجات کے مستحق نہیں ہیں جب تک مسلمان کا ایمان اور عمل صالح ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو ان کے رسول کے ذریعے سے دنیا میں آئی ہے۔ یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی، عیسائی یا صابئی بغرض کسی نبی کی پیروی کا مدعی ہو۔

یہود و نصاریٰ اور پوری دنیا کو ایمان کی دعوت اسی ہدایت کے پانے کے لیے ہے جس کو محمد رسول اللہ لے کر تشریف لائے اب فلاح و نجات اس کے ماننے پر منحصر ہے۔ اس آیت کی رو سے اسلام کو قبول کرنا تمام انسانوں پر اس لیے ضروری ہے کہ وہ تمام نبیوں کا دین ہے۔ اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین ہے۔ اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام کتب الٰہیہ کی تعلیمات کا محافظ ہے اور قیامت تک خدا کی جانب سے اس کی حفاظت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ چاروں دعوے یعنی تکمیل دین، قرآن کا آخر ہونا، قیامت تک اس کا محفوظ رہنا اور ختم نبوت قرآن میں اپنے اپنے مقام پر آئیں گے۔

۴۷۵۔ اگر اس سے روگردانی کریں تو سمجھ لو کہ وہ ضد اور ہٹ دھرمی میں ہیں۔ یعنی ان کی

صِبْغَةَ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً ۫ وَّنَحْنُ لَهٗ عٰبِدُوْنَ ۝

ہم نے تو اللہ کا رنگ قبول کر لیا ہے اور بتلاؤ کہ اللہ کے رنگ سے اچھا اور کس کا رنگ ہو سکتا ہے اور ہم تو صرف اسی کی بندگی کرنے والے ہیں ۔

دشمنی اور عند سے مٹ ڈرو، اللہ ان کے شر اور مضرت سے تمہارا محافظ ہے وہ تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ خدا سب کی باتوں کو سنتا اور سب کے حال اور نیتوں کو جانتا ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ اتنی واضح ہدایت پہنچ جانے کے بعد اگر اب بھی ایمان نہ لائیں تو اب جو ان کی مخالفت ہے وہ مخالفت ہی کی غرض سے ضد اور عداوت ہی کی بنا پر ہے اس لیے نہیں کہ حق کے حق ہونے میں کوئی کمی رہ گئی ہے یا کوئی ابہام اور پوشیدگی ہے۔ اصل بنائے فساد یہ ہے کہ وہ دین کو زندگی کی ضرورت ہی نہیں سمجھتے اس لیے اسے سمجھنا ہی نہیں چاہتے ہیں ۔

ان حالات میں قرآن نے روئے سخن اللہ کے پیغمبر کی طرف کر لیا اور مستقبل میں پیش آنے والے اندیشوں کے پیش نظر آپ کو تسکین اور تسلی دی کہ آپ دشمنوں کی قوت اور مخالفین کی کثرت سے ذرا بھی تشویش نہ کریں۔ یہ حق کے مخالفین آپ کو اور آپ کے دین کو گزند پہنچانے میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے۔ اللہ آپ کا نگہبان ہے۔ نگہبانی اور نصرت کے وعدے میں اگرچہ مخاطب حضورؐ ہیں لیکن اللہ کی نصرت سارے اہلِ ایمان کے لیے عام ہے

رسمِ اصطباغ

یہودیوں اور عیسائیوں میں ایک بڑی اہمیت کی خاص قسم کی رسم تطہیری غسل کی تھی جسے بپتسمہ یا اصطباغ کہتے ہیں۔ دعوتِ ایمان کے بعد ان کی اس ظاہر پرستی پر ارشاد ہے کہ اس رسمی اصطباغ میں کیا رکھا ہے۔ یہ دراصل ایک یہودی رسم تھی جو اس وقت ادا کی جاتی تھی جب لوگ گناہوں سے

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۶

نو بہ کیا کرتے تھے اور اس لیے فی نفسہ ایک رسم سے زیادہ اس کی کوئی حیثیت نہیں تھی۔ لیکن عیسائیوں نے اسے نجات وسعادت کی بنیاد سمجھ لیا ہے۔ جب تک ایک شخص حضرت مسیح کے نام پر اصطباغ نہ لے وہ نجات یافتہ انسان نہیں سمجھا جاتا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ کیسی گمراہی ہے کہ انسانی نجات وسعادت جس کا دارومدار نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل پر ہے محض ایک مقررہ رسم کے ساتھ وابستہ کر دی جائے۔ انسانوں کا یہ بنایا ہوا اصطباغ اللہ کا اصطباغ نہیں ہے۔ اللہ کا اصطباغ یہ ہے کہ تمہاری زندگی نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل کے رنگ میں رنگ جائیں۔

۳۷۵ ۔ دعوت ایمان سن کر یہودی پھر گئے اور اسلام قبول نہ کیا اور عیسائیوں نے بھی انکار کر دیا اور شیخی میں آکر کہنے لگے کہ ہمارے یہاں ایک رنگ ہے جو مسلمانوں کے پاس نہیں ہے۔ عیسائیوں نے ایک زرد رنگ بنا رکھا تھا اور یہ دستور تھا کہ جب ان کے بچہ پیدا ہوتا یا کوئی ان کے دین میں آتا تو اس کو اس رنگ میں غوطہ دے دیتے اور کہتے کہ پاکیزہ نصرانی ہو گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مسلمانو! تم کہو کہ ہم نے اس بناوٹی رنگ کی جگہ حقیقی رنگ یعنی اللہ کا دین قبول کر لیا ہے کہ اس میں آکر انسان ہر قسم کی ناپاکی سے پاک ہو جاتا ہے[1]

یہ بات کہ اسلام قبول کرنے کے بعد گناہ دھل جاتے ہیں قرآن نے ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف

اے پیغمبر جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ہے ان سے کہہ دو کہ اگر وہ باز آجائیں اور ایمان کی راہ اختیار کریں تو جو کچھ ہو چکا ہے سب معاف کر دیا جائے گا۔

بلاشبہ جو دین تمام ادیان کو ایک دین اور تمام قوموں کو ایک امت بنانے کا عزم لے کر آیا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام اقوام کی سب سے زیادہ مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے۔ یہ ظاہر ہے کہ دین کی تلاش صرف اس لیے ہے کہ بندہ کو اپنے خالق ومالک کے قہر سے نجات مل جائے اور فطرۃً بھی ایک گناہ گار کی خواہش ہونی چاہیے۔ اس لیے قرآن اس کا اعلان کرتا ہے کہ اگر اصطباغ کی رسم کو اس لیے نباہ رہے ہو کہ اس سے گناہ معاف ہوتے ہیں تو اس ظاہرپرستی کو چھوڑ کر ایمان وعمل کا حقیقی اصطباغ اختیار کرو۔ اگر ایسا کرو گے تو ہر ملک وملت، ہر نسل ورنگ کا جو گناہ گار بھی ایمان وعمل کا بپتسمہ لے گا تو اسلام اس کے گناہوں کی مغفرت اور نجات ابدی کا ضامن ہوگا۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۶

قُلْ اَتُحَآجُّوْنَنَا فِی اللّٰهِ وَهُوَ رَبُّنَا وَرَبُّكُمْ ۚ وَلَنَآ اَعْمَالُنَا وَلَكُمْ اَعْمَالُكُمْ ۚ وَنَحْنُ لَهٗ مُخْلِصُوْنَ ﴿۱۳۹﴾ اَمْ تَقُوْلُوْنَ اِنَّ اِبْرٰهٖمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطَ كَانُوْا هُوْدًا اَوْ نَصٰرٰی ؕ قُلْ ءَاَنْتُمْ اَعْلَمُ اَمِ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَتَمَ شَهَادَةً عِنْدَهٗ مِنَ اللّٰهِ ؕ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۰﴾ تِلْكَ اُمَّةٌ قَدْ خَلَتْ ۚ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَلَكُمْ مَّا كَسَبْتُمْ ۚ وَلَا تُسْــَٔلُوْنَ عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴۱﴾

اے پیغمبر ان سے کہو لوگو! کیا تم اللہ کے بارے[۳۷۶] میں ہم سے جھگڑتے ہو حالانکہ ہمارا اور تمہارا پروردگار وہی ہے اور ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال ہیں اور ہم اسی کی صرف بندگی کرنے[۳۷۷] والے ہیں۔ یا تمہارا یہ کہنا ہے کہ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب اور اولادِ یعقوب یہودی اور عیسائی[۳۷۸] تھے، اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ[۳۷۹]؟ اگر اللہ ہی زیادہ جانتا ہے تو اس کی گواہی دیتے ہو تو تمہاری کتابوں میں موجود ہے اور تم اسے دانستہ چھپا رہے ہو تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے جس کے پاس اللہ کی گواہی[۳۸۰] ہو اور وہ چھپائے؟ یاد رکھو اللہ تمہاری حرکات سے غافل نہیں ہے۔ وہ کچھ لوگ تھے جو گزر چکے، ان کی کمائی ان کے لیے ہے اور تمہاری کمائی تمہارے لیے ہے اور تم سے ان کے اعمال کے بارے میں پوچھ گچھ نہ ہو گی[۳۸۱]

اس آیت کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ ہم نے اللہ کا رنگ اختیار کر لیا۔ اس صورت میں فعل محذوف ہو گا صبغنا صبغۃ اللہ ہم اللہ کے رنگ میں رنگین ہو گئے یعنی ہمیں اللہ نے اپنے رنگ میں رنگ دیا۔ دوسرے یہ کہ اللہ کا رنگ اختیار کرو اس صورت میں الزموا فعل محذوف ہو گا۔ پہلی صورت میں جملہ خبریہ ہے اور اپنے خیال کا اظہار ہے اور دوسری صورت میں انشائیہ ہے خبر نہیں خدا کی جانب

سے حکم ہے۔

منشاءِ اختلاف کیا ہے؟

رسمِ اصطباغ کے بے حقیقت ہونے اور ایمان و عمل کے رنگ میں رنگین ہونے کو بطورِ مقصود ظاہر فرمانے کے بعد اس آیت میں پوری قوت سے ان کے اس بنیادی شبہ کا ازالہ فرمایا ہے کہ یہ جو تم نے اپنی یہودیت اور نصرانیت کی محبوبیت خاصہ کا عذابِ آخرت سے محفوظیت کا اور عدمِ مسئولیت کا عقیدہ اپنے دل میں جما رکھا ہے یہ یوں ہی گھڑ لیا ہے یا اس کی کوئی دلیل بھی تمہارے پاس ہے؟ آخر اللہ سبحانہ سے تمہارے اس خصوصی تعلق کی بنا کیا ہے؟ مخلوق اور مربوب ہونے میں ہمارا اور تمہارا رشتہ اللہ سے ایک ہے۔ ہمارا بھی خالق ہے تمہارا بھی خالق ہے۔ معیارِ فضیلت اور قرب اگر ہو سکتے ہیں تو وہ اخلاق و اعمال ہیں۔ اس میں بھی ہم دونوں شریک ہیں۔ اگر ہمارے اعمال اچھے ہیں تو نتائج اچھے ہوں گے اور برے ہیں تو نتائج برے ہوں گے۔ اور یہی حال تمہارا ہے لیکن اس پہلو میں ہمارا مقام تم سے برتر ہے کیونکہ عملی زندگی میں ہمارے اعمال کا سارے کا سارا رُخ اللہ کی طرف ہے جبکہ تم پوری زندگی میں اخلاص کی نعمت سے محروم ہو کر انساب و احباب کے سہارے تلاش کر رہے ہو۔ اب تم ہی بتاؤ کہ تم خدا کی محبوبیت اور اللہ سے خاص تعلق کا کس بنیاد پر دعویٰ کرتے ہو؟ آخر ہم سے الگ تمہاری یہ امتیازی نشان کیوں ہے۔ اس امتیاز کی یہ وجہ ہے یا یہ ہے کہ ابراہیم و اسماعیل اور یعقوب یہودی اور عیسائی تھے۔ اگر تمہارا یہ دعویٰ ہے تو اس کی اللہ تکذیب کرتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ نہ یہ ہے اور نہ وہ بلکہ نجات کی بنیاد تو صرف ایمان و عمل ہے اور اس سے تم محروم ہو۔ اب تم بتاؤ کہ جب صورتِ حال یہ ہے تو تمہارا مقام کیا ہے؟

۲۷۶۔ یعنی اللہ کی نسبت تمہارا نزاع کرنا اور یہ سمجھنا کہ اس کی عنایت و رحمت کا ہمارے سوا کوئی مستحق نہیں لغویات ہے۔ وہ جب تمہارا رب ہے ہمارا بھی رب ہے۔ ہم جو کچھ اعمال کرتے ہیں خالص اس کے لیے کرتے ہیں، تمہاری طرح آباؤ اجداد کے سہارے تلاش نہیں کرتے اور نہ تعصب و نفسانیت سے کرتے ہیں۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہمارے اعمال قابلِ پذیرائی نہ ہوں اور تمہارے مقبول ہوں[1] یعنی ہم بھی تو کہتے ہیں کہ اللہ ہی سب کا رب ہے اور اسی کی فرمانبرداری

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۶

ہونی چاہیے۔ کیا یہ بھی کوئی ایسی بات ہے کہ اس پر تم ہم سے جھگڑا کرو، جھگڑے کا اگر موقعہ ہے تو وہ ہمارے لیے ہے نہ کہ تمہارے لیے۔ کیونکہ اللہ کے سوا دوسروں کی بندگی کا مستحق تم ٹھہرا رہے ہو نہ کہ ہم[1]

گویا یوں کہا گیا ہے کہ اہل کتاب جب ہمارے تمہارے درمیان کوئی اختلاف پروردگار کے تعین میں نہیں۔ اوّل تو اس کی توحید پر قائم رہنا چاہیے اور تثلیث فی التوحید اور توحید فی التثلیث اور خدا کے فرزند بروز و مظہر قسم کے خرافات سے بالکل بچنا چاہیے۔ دوسرے جب اس کی صفاتِ کمالیہ پر ایمان ہے تو وہ اپنی حکمت و ربوبیت سے جس نسل، جس فرد کو بھی چاہے نبوت و رسالت سے سرفراز کر دے وہ ہر طرح مالک و مختار ہے۔ اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کسی خاص نسل کا اجارہ نہیں ہے[2]

۳۷۷ ہمارے لیے ہمارے اعمال اور تمہارے لیے تمہارے اعمال اور ہم صرف اسی کی بندگی کرنے والے ہیں۔ یعنی تم اپنے اعمال کے ذمہ دار ہو اور ہم اپنے اعمال کے۔ تم نے اگر بندگی کو تقسیم کر رکھا ہے اور اللہ کے ساتھ دوسروں کی بھی پرستش اور اطاعت بجا لاتے ہو تو تمہیں ایسا کرنے کا اختیار ہے اس کا انجام خود دیکھ لوگے۔ ہم تمہیں زبردستی اس سے روکنا نہیں چاہتے لیکن ہم نے اپنی بندگی و طاعت اور پرستش کو بالکل اللہ ہی کے لیے خالص کر دیا ہے[3]

مطلب یہ ہے کہ ہم اپنی عبادات میں ہر شرک ہر ضلالت سے پاک ہیں، رہے اعمال تو ہمارے اور تمہارے اعمال کا اثر آخرت میں تو تمہیں بھی نظر آجائے گا، آج جتنا چاہو اس پر پردہ ڈالنے کی کوشش کر دو کل کو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر سامنے آجائے گا۔

۳۷۸ تمہارا یہ کہنا ہے کہ ابراہیم و اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب یہودی یا عیسائی تھے یعنی کیا تمہارا یہ دعویٰ ہے کہ ان پیغمبروں، بزرگوں اور تمہارے مورثوں کے عقائد ذات و صفات کے بارے میں بجائے دینِ توحید کے یہودیت یا نصرانیت کے تھے۔ خطاب اہل کتاب خصوصاً یہود سے ہے اور لہجہ خطاب میں زجر اور دھمکی کا پہلو شامل ہے[4]

یہ خطاب یہود و نصاریٰ کے ان جاہل عوام سے ہے جو واقعی اپنے نزدیک یہ سمجھتے تھے کہ

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۱۷ [2] تفسیر ماجدی ج ۱ ص ۴۲ [3] تفہیم القرآن ص ۱۱۷
[4] تفسیر ماجدی ص ۵۴

یہ جلیل القدر انبیاء سب کے سب یہودی یا عیسائی تھے۔

۳۷۹ ۔ کیا تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔ یعنی ان بزرگوں کے دین و عقائد کے بارے میں تم زیادہ جانتے ہو یا اللہ۔ اگر تم مانتے ہو اور تمہارے مقدس نوشتے بھی یہ کہتے ہیں کہ لوگوں کے لیے ملتِ ابراہیمی اللہ کی پسندیدہ ملت ہے تو پھر اس ملت کی وابستگی سے خود کیوں گریزاں ہو۔ اللہ کی شہادت یہ ہے کہ یہ سب توحیدِ خالص کے پیروکار تھے۔ نزولِ قرآن کے وقت بڑے بڑے عالم فاضل موجود تھے۔ ان سب کو چیلنج دے کر کہا جا رہا ہے کہ تم واقعات کو توڑ مروڑ کر، صداقتوں کا گلا گھونٹ کر جو کچھ بھی کیے جاؤ لیکن واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ سب حضرات خالص موحد اور توحید کے مبلغ ہوتے ہیں۔[1]

۳۸۰ ۔ یہ شہادت اسلام کے برحق ہونے، ابراہیم، اسماعیل، اسحاق اور یعقوب کے مومن کامل، مبلغِ توحید ہونے اور آخر زمانہ میں ایک رسولِ برحق کے ظہور کی اس شہادت کو چھپانے والے یہودی علماء تھے اور یہ شہادت ان کی مسلّم آسمانی کتابوں اور الہامی نوشتوں میں محفوظ ہے۔

یہ خطاب یہودیوں کے علماء سے ہے جو خود بھی اس حقیقت سے ناواقف نہ تھے کہ یہودیت اور عیسائیت اپنی موجودہ خصوصیات کے ساتھ بہت بعد میں وجود میں آئی ہے۔ مگر اس کے باوجود وہ حق کو اپنے فرقوں ہی میں محدود کرتے تھے اور عوام کو اس غلط فہمی میں مبتلا رکھتے تھے کہ انبیاء کے مدتوں بعد جو عقیدے، جو طریقے اور جو اجتہادی ضابطے اور قاعدے ان کے فقہا، متکلمین اور صوفیا نے وضع کیے، انہی کی پیروی پر انسان کی صلاح و فلاح اور نجات کا دارومدار ہے۔ ان علماء سے جب پوچھا جاتا کہ اگر یہی بات ہے تو حضرت ابراہیم، اسحاق، یعقوب وغیرہ آخر تمہارے ان فرقوں میں کس سے تعلق رکھتے تھے تو وہ اس کا جواب دینے سے گریز کرتے تھے کیونکہ ان کا علم اس کی اجازت نہ دیتا کہ ان بزرگوں کا تعلق ہمارے ہی فرقہ سے تھا۔ لیکن اگر وہ صاف الفاظ میں یہ مان لیتے کہ یہ انبیاء نہ یہودی نہ عیسائی تو پھر ان کی حجت ہی ختم ہو جاتی تھی۔[2]

۳۸۱ ۔ ان کے اعمال کے بارے میں تم سے سوال نہ ہوگا۔ یہی آیت عنقریب گزر چکی ہے مگر چونکہ اہلِ کتاب کے دل میں اپنی بزرگ زادگی کی وجہ سے یہ بات خوب جم رہی تھی کہ ہمارے

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۵۴
[2] تفہیم القرآن ص ۱۱۷

اعمال کیسے ہی ہوں بالآخر ہمارے باپ دادا ہمیں ضرور بخشوالیں گے - اس لیے اس بیہودہ خیال کی تردید کے لیے تاکیداً یہ بات مکرر فرماتی ہے ۔۔۔ یا یوں سمجھو کہ یہی آیت اس سے پہلے اہل کتاب کو سمجھانے کے لیے آئی تھی اور اب دوبارہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو بتانے کے لیے آئی ہے کہ اس بحرِ تخیل میں ان کا اتباع نہ کریں کیونکہ ایسی توقعات اپنے بزرگوں سے ہر شخص کے دل میں آہی جاتی ہیں جو سراسر بیوقوفی ہے لے

رَبِّ تَقَبَّلْ مِنِّیْ اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ٥

معالم القرآن

جلد دوم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

ملکیت ـــ ادارۂ تعلیمات قرآن، سیالکوٹ

عناوین ـــ ۳۴۶

آیات ـــ ۱۱۱ ـــ ۱۴۲ تا ۲۵۲

طابع ـــ حافظ عبدالرشید خاقان

تزئین و آرائش ـــ سید انور حسین نفیس رقم، لاہور

کتابت ـــ محمود صوفی، گوجرانوالہ

ناشر ـــ عبدالرحمٰن قادری ایم اے، ناظم ادارۂ تعلیمات قرآن

صفحات ـــ ۴۸۰

تاریخ اشاعت ـــ اپریل ۱۹۸۷ء

مطبع ـــ زاہد بشیر پرنٹرز

طبع دوم جولائی ۱۹۹۰ء

ـــ ملنے کا پتہ ـــ

۱۔ دارالعلوم الشہابیہ، شہر سیالکوٹ

۲۔ المکتبۃ العلمیہ، ۱۵ لیک روڈ، لاہور

لاہور میں ملنے کا پتہ

اسلامی اکادمی لاہور

دریا بحباب اندر

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

باسمہٖ سبحانہٗ ۔ یہ قرآن حکیم کا دوسرا پارہ ہے ، اللہ سبحانہٗ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ میری ساری کمزوریوں کے باوجود تفسیرِ قرآن کی دوسری جلد کی تکمیل کا سامان بہم پہنچایا ۔ اور مجھ سیاہ کار کو توفیقِ ارزانی فرمائی کہ دوسرے پارے کی تشریح و تفسیر کر کے آخرت کے لیے زادِ راہ بناؤں ۔ چار ماہ کے بعد ۸۰۰ صفحوں کا یہ مجموعہ مشتاق نگاہوں کے سامنے ہے ۔ اس کی تالیف ، مطالب کی تلاش و جستجو اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق میں جو محنت و کاوش کی گئی ہے اس کا اندازہ کچھ پڑھنے ہی سے ہو گا ۔

اس جلد میں بعض تشریحی فوائد ذرا طویل ہو گئے ۔ کیونکہ اس پارے میں متعدد احکام آتے ہیں اور احکام میں فقہی مذاہب کا دائرہ وسیع ہے ۔

اگرچہ مولف کے مخاطبوں کی تعداد اس مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتی ہے جس کی قیادت امام اعظم ابوحنیفہ فرماتے ہیں اور مولف خود بھی احکام کی تشریح و تعبیر میں اسی مدرسۂ فکر سے تعلق رکھتا ہے لیکن اس کے باوجود مولف نے کوشش کی ہے کہ مسائل کے پیش کرنے میں انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے اور قلم کی کوئی کروٹ کسی کی دلآزاری کا ذریعہ نہ بنے ۔

ناظرین کی آسانی کے لیے ہر آیت پر عنوان قائم کر دیا ہے اور آیت کی تشریح سے پہلے آیت کا مدعا و مقصد اور سیاق و سباق بتانے کے لیے ایک مختصر سی تمہید پیش کی ہے ۔ غور کرنے سے معلوم ہو گا کہ عنوان اور تمہید دونوں آیات کا مطلب سمجھنے میں ناظرین کی بہت کچھ مدد کریں گے ۔

اسلامی زندگی میں مسائل کی تحقیق کے لیے جن بزرگوں کے علوم سے خوشہ چینی کی گئی ہے ان کے اسمائے گرامی آپ جلد اوّل کے حرفِ آغاز میں پڑھ چکے ہیں۔ ان میں حضرت مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صاحب کا اسم گرامی اور اضافہ کر لیجئے۔ اس جلد میں ان کی کتاب "عمدۃ الاثاث" سے خاص طور پر استفادہ کیا گیا ہے۔ یہ کتاب اپنے موضوع پر بہترین ہے اگرچہ اس سے پہلے دوسرے بزرگوں نے بھی اس پر طبع آزمائی کی ہے لیکن موصوف نے جس حسن ترتیب اور خوش اسلوبی سے اس مسئلہ پر قلم اٹھایا ہے وہ موصوف ہی کا حصہ ہے۔

نیز قرآن کے الفاظ کی تحقیق میں جن بزرگوں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کا ذکر پہلی جلد کے حرف آغاز میں رہ گیا تھا ان کے نام یہ ہیں،

علامہ ابوالقاسم حسین ابن الفضل، راغب اصفہانی کی مفردات القرآن فی غریب القرآن۔ علامہ ابن منظور افریقی کی لسان العرب، علامہ سید مرتضیٰ زبیدی کی تاج العروس شرح قاموس اور مولانا عبدالرشید نعمانی کی لغات القرآن۔

دردمندانہ استدعا

قرآن کا مطالعہ صرف علمی سیر کے ارادہ سے نہ کیا جائے بلکہ قرآن اور صاحب قرآن کے ساتھ اپنے ایمانی تعلق کو تازہ کرنے، عمل کرنے اور زندگی کی مختلف شاخوں میں رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کیا جائے۔ کیونکہ قرآن میں اللہ سبحانہٗ نے قرآن کے چار وصف بیان کیے ہیں موعظت، شفا، ہدایت اور رحمت۔

موعظت یعنی دل میں اثر کر جانے والے اور رُوح کو متاثر کرنے والے طریقوں سے ان تمام باتوں کی ترغیب دیتا ہے جو خیر و حق کی باتیں ہیں۔

شفا، یعنی دل کی ساری بیماریوں کے لیے نسخہ شفا ہے۔ جو فرد اور جو گروہ بھی اس نسخہ پر عمل کرے گا اُن کے دل ہر طرح کے مفاسد و رذائل سے پاک ہو جائیں گے۔

ہدایت، یعنی اہل ایمان کے لیے زندگی کے تمام گوشوں میں رہنما ہے اور سب سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ سب کی بندگی کی ذلت سے ہٹا کر اللہ کی بندگی کی عزت عطا کرتا ہے۔

رحمت، یعنی اہلِ ایمان کے لیے پیامِ رحمت ہے۔ ظلم و ستم سے دُنیا کو نجات دلاتا ہے اور رحم و محبت اور امن و سلامتی کی رُوح سے معمور کرتا ہے۔

قرآن کا مطالعہ کرتے وقت قرآن کی، قرآن روانہ کرنے والی ذات کی اور قرآن لانے والی شخصیت گرامی کی عظمت و محبت کو دل میں بیدار کیجئے اور اس طرح پڑھیے کہ گویا آپ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے اللہ سبحانہ، کا کلام سُن رہے ہیں۔ اگر ایسا کیا گیا تو آپ کو قرآن کی نورانیت اور ذاتِ نبوت کی روحانیت سے انشاءاللہ ضرور حصہ ملے گا۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

الحمد للہ رب العالمین والسلام علیٰ سیّد المرسلین وخاتم النبیین محمد و آلہ واصحابہ اجمعین۔ اللّٰھم صل علیٰ محمد وعلیٰ آل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ آل ابراھیم انک حمید مجید۔

یہ بات معالم العرفان جلد اوّل کے مقدمہ میں بتائی جا چکی ہے کہ یہ مبارک صحیفہ اللہ سبحانہٗ سے بندوں کے دو گونہ تعلّقات کو استوار کرتا ہے، حاکمانہ اور محبوبانہ، حاکمانہ تعلقات یہ ہیں کہ انسان اس کے بندے اور محکوم ہیں اور اللہ کی ذات حاکم اعلیٰ ہے۔ بندوں کا کام یہ ہے کہ حاکم کے احکام کی طاعت کریں، اسی کا نام بندگی ہے۔ محبوبانہ تعلقات یہ ہیں کہ اللہ کی ذات محبوب مطلق ہے۔ بندوں کا کام رضاء محبوب کی خاطر نیازمندانہ اعمال کرنا ہے خواہ زبانی خواہ جانی اور خواہ مالی۔ ہر قسم کی عبادت اس کا حق ہے اسی کا نام پرستش ہے۔ قرآن دو شانیں لے کر آیا ہے نامہ محبوب ہونے کی وجہ سے اس میں شانِ تعبد ہے اور ضابطہ حاکم ہونے کی وجہ سے اس میں شانِ تدبّر ہے۔

اس پارے میں اللہ کی شانِ محبوبیت سے متعلق اگرچہ اسلامی شعائر آتے ہیں مثلاً حج اور روزہ تو اللہ کی شانِ حاکمیت سے متعلق زیادہ اخلاقی، اجتماعی، سیاسی، دیوانی، فوجداری، دفاعی اور معاشرتی قوانین آئے ہیں۔

ضرورت ہے کہ اسلام میں قانون سے متعلق تفکیر کی مختصر تاریخ سے معالم کے پڑھنے والے واقف ہوں تاکہ ان کو پتہ لگ جائے کہ اسلامی قانون نہایت وسیع اور ترقی پذیر قانون ہے

اور وہ ایسے ابدی اصولوں پر قائم ہے جو کبھی فرسودہ اور از کار رفتہ نہیں ہو سکتے۔ جس میں زندگی کے تغیرات اور ترقیوں کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

خود قرآن نے اُمّت کو دعوت دی تھی۔ ارشاد ہے:

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون

اور اے پیغمبر ہم نے تم پر قرآن اتارا تاکہ اللہ کی نازل کردہ چیز کو لوگوں کے سامنے بیان کر دو اور تاکہ لوگ اس پر تفکر و غور کریں۔

اس میں اللہ سبحانہ نے قرآن کے بارے میں دو فرائض بتائے ہیں۔ ایک تبیین دوسرے تفکر۔ تبیین کو نبوّت کا اور تفکر کو اُمّت کا فریضہ قرار دیا ہے۔

یہ بات بالکل ظاہر ہے اور قضیہ عقلی ہے کہ قرآن کے حقائق کو کھولنا اس کی مراد کی تعیین کرنا صرف اُس ذاتِ گرامی کا کام ہو سکتا ہے جو خود اس قرآن کو صاحبِ قرآن سے سنے اور اس کا حقیقی مخاطب ہو اور وہ ذات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی دوسری نہیں ہو سکتی۔ جن پر قرآن اترا، جن کی زبان میں اُترا اور جن کے اخلاق و کمالات اور جن کی فطری استعداد کو اس کا ظرف بننے کے لیے ازل سے چنا گیا۔ قرآن کو قرآنی ذوق سے جس حد تک آپ سمجھ سکتے تھے طبعاً دُنیا میں کوئی دوسرا نہیں سمجھ سکتا۔ اس لیے قرآن حکیم کا بیان فی الواقع آپ کے ارشادات آپ کے اعمال اور آپ کے احوال ہیں۔

درحقیقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت دو چیزوں پر مشتمل تھی۔ ایک قرآن اور دوسرے قرآن کا بیان۔ یعنی آپ نے دُنیا کو ایک آسمانی صحیفہ عطا کیا اور دوسرا اسی آسمانی صحیفہ کا بیان اپنے ارشادات، اعمال، اخلاق اور احوال کی صورت میں دیا۔ قرآن ایک کو کتاب اور دوسرے کو حکمت کہتا ہے اور ان کو آپ کی دُنیا میں تشریف آوری کا مقصد قرار دیتا ہے چنانچہ اسی پارے میں آپ پڑھیں گے:

کما ارسلنا فیکم رسولا منکم یتلو علیکم آیاتنا و یزکیکم و یعلمکم الکتاب والحکمۃ

جیسا کہ ہم نے روانہ کیا تم میں سے ایک رسُول جو تم پر ہماری آیات تلاوت کرتا ہے اور تمہیں پاک کرتا ہے اور تمہیں کتاب اور حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔

یوں تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری تمام سعادتوں کا سرچشمہ ہے لیکن اگر ان سعادتوں کے طریق عمل کی تفصیل اور اس کے ذرائع کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس محیر العقول انقلاب کا ذریعہ صرف دو چیزیں ہیں ایک علم دوسرے عمل ان دونوں کو قرآن نے اس آیت میں کتاب اور حکمت کے نام سے پیش کیا ہے لیکن دونوں کے تذکرے سے پیشتر دونوں کے فعلی ظہور کو بیان کر دیا۔ کتاب کے فعلی ظہور کو تلاوت اور حکمت کے فعلی ظہور کو تزکیہ کے عنوان سے ظاہر کیا ہے۔

تلاوت قرآن میں اگر اللہ کی شان محبوبیت ہے تو تزکیہ میں شان حاکمیت کا اظہار ہے۔ گویا نبوت کا لایا ہوا علم اگر کتاب ہے تو اسی علم پر نبوت کا پیش کیا ہوا عمل حکمت ہے۔ امام شافعی نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں لکھا ہے کہ

> میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو میں پسند کرتا ہوں یہ سنا ہے کہ حکمت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کا نام ہے۔

حافظ ابن القیم نے اس پر صدر اول اور سلف کا اتفاق نقل کیا ہے کہ

> کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد باتفاق سلف سنت ہے۔
>
> (کتاب الروح ص ۲۹۲)

دونوں میں فرق یہ ہے کہ کتاب ما انزل اللہ ہے اور حکمت ما اراک اللہ ہے۔ یعنی کتاب اللہ کی جانب سے نازل شدہ ہے اور حکمت اللہ کی سمجھائی ہوئی ہے۔ کتاب اللہ چونکہ سرتاسر نظریات و افکار پر مشتمل ہے اس لیے وہ قرآن ہے یعنی پڑھنے کی چیز اور حکمت چونکہ سرتاسر اعمال و اخلاق اور اقوال ہے اس لیے وہ سنت ہے یعنی برتنے کی چیز۔ امام ابو محمد جوینی نے دونوں میں یہ فرق بتایا ہے کہ کتاب کی حیثیت انسانوں کے نام نامہ کی ہے اور حکمت کی حیثیت انسانوں کے نام اللہ کے پیام کی ہے۔ بہرحال یہ کتاب اور حکمت ہو یا ذکر اور بیان، ما انزل اللہ، ما اراک اللہ ہو، علم و عمل ہو، نامہ و پیام ہو یا پھر قرآن و سنت ہو۔ نام خواہ کچھ ہو۔ امت مسلمہ کی تشکیل و تعمیر میں ان دونوں کا دخل ہے اور حقیقت بھی یہی ہے کہ ان دو کے بغیر ایک مکمل معاشرہ، ایک مکمل زندگی اور ایک نظام اجتماعی جس میں عقائد و اعمال، اخلاق، جذبات، اذواق، رجحانات، تعلقات سب ہی کچھ ہوں وجود میں نہیں آسکتی۔ نبوت نے دنیا کو صرف ذکر نہیں بلکہ اس کے ساتھ اس کا بیان، صرف کتاب نہیں

دی بلکہ اس کے ساتھ اس کی حکمت صرف علم نہیں دیا بلکہ اس کے ساتھ اس پر عمل صرف قرآن نہیں دیا بلکہ اس کے ساتھ سنت دی ہے اور ان دونوں کے ذریعے اُمت کو نبوت سے علم و حکمت، اخلاق و جذبات، یقین و ایمان، ذوق و شوق، جذبۂ ایثار اور شوقِ آخرت، ذوقِ عبادت، خوف و خشیت، توبہ و انابت، دُعا و تضرع کی وہ دولت ملی ہے، جس پر اسلامی معاشرہ اور خلافتِ راشدہ کی پوری عمارت قائم ہے اور نبوت کے ذریعے ان دو نعمتوں کے مل جانے کے بعد دُنیا والوں سے اللہ سبحانہ کا مطالبہ یہ ہے کہ زندگی کا نظام قائم کرنے اللہ سے بندگی اور پرستش کے تعلقات قائم کرنے کے لیے اس پر غور و فکر سے کام لیں۔ تفکر اور تدبر کو اپنائیں۔ خلافتِ راشدہ نے قرآن کے اس مطالبہ کی جس انداز میں پاسداری کی ہے وہ تاریخ کے اوراق میں اہلِ اسلام کا بہترین سرمایہ علمی ہے۔

ابن القیم رقمطراز ہیں کہ،

> زمانہ نبوت ہی سے اہلِ ایمان احکام و قوانین پر تفکر سے کام لیتے تھے۔

ایک دوسرے موقعہ پر فرماتے ہیں،

> صحابہ کرام احکام میں تفکر سے کام لیتے اور زندگی میں مختلف قوانین کو امثال و اشباہ اور نظائر کی مدد سے معلوم کرتے۔ (اعلام)

ابن عبدالبر نے جامع بیان العلم میں اور ابن القیم نے اعلام میں اس تفکیر علمی کی پوری تاریخ لکھی ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خود صحابہ کو تفکیر کا ضابطہ بتایا ہے۔ ابن عبدالبر فرماتے ہیں:

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے معاذ بن جبل کو یمن روانہ کیا تو فرمایا کہ پیش افتادہ مسائل کو کیسے حل کرو گے۔ معاذ نے کہا کہ اللہ کی کتاب سے تلاش کروں گا۔ فرمایا کہ اگر کتاب اللہ میں نہ ملے تو کیا کرو گے۔ بولے کہ آپ کی سنت کے ذریعے کروں گا فرمایا کہ اگر سنت میں بھی نہ ملے تو کیا کرو گے بولے تفکر کروں گا۔

اس جواب کو سُن کر حضور نے فرمایا:

> اس اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے جس نے اپنے نبی کے فرستادے کو مرضیٔ رسول تک پہنچنے کی توفیق ارزانی فرمائی۔

یہ صحیح ہے کہ سارے صحابہ تفکیر علمی کا کام نہ کرتے تھے بلکہ زمانہ نبوت ہی سے ایک خاص

طبقہ تفکر میں پیش پیش تھا اور ان میں بھی از روئے تفکر قلت و کثرت تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ میں ارباب تفکر کم و بیش ایک سو تیس مرد و زن تھے اور یہ بھی ان کو قرآن نے ہی بتایا تھا کہ یہ تفکر کا کام سب کے کرنے کا نہیں بلکہ کچھ کے کرنے کا ہے۔ ارشاد ہے ؛

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین

پس کیوں ایسا نہیں ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت دین میں فہم و دانش پیدا کرنے کے لیے نکل آتی ۔

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں ؛ دوسری قسم ان علماء صحابہ کی ہے جن کا کام محفوظ سرمائے سے مسائل نکالنا اور احکام استنباط کرنا ہے۔ ایک دوسرے موقعہ پر لکھتے ہیں۔ دوسری قسم ان مفکرین کی ہے جن کو مسائل نکالنے کی نعمت ارزانی ہوئی اور جو حلال و حرام کے ضابطے بنانے کی طرف متوجہ ہوتے۔ اُن کا مقام زمین میں ایسا ہے جیسے ستارے آسمان میں۔ ان کے ذریعے ہی تاریکیوں میں سرگرداں راستہ معلوم کرتے ہیں۔ لوگوں کو ان کی ضرورت کھانے اور پینے سے زیادہ ہے اور ان کی اطاعت والدین سے بھی زیادہ از روئے قرآن فرض ہے ۔

صحابہ میں تفکیر علمی میں زیادہ مشہور حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت علی ابن ابی طالب، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت معاذ بن جبل، حضرت زید بن ثابت، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت عبداللہ ابن عمر ہیں ۔

صحابہ کرام چونکہ مدینہ سے نکل کر مختلف ممالک میں پھیل گئے، اس کے نتیجے میں یہ عمل تفکیر ان کے شاگردوں کی وساطت سے مختلف شہروں میں پہنچا۔ اور ایک سے زیادہ مدارس قائم ہو گئے۔ عراق میں عبداللہ ابن مسعود کے تلامذہ، مدینہ طیبہ میں زید بن ثابت اور مکہ میں عبداللہ بن عباس کے تلامذہ ان مدارس کے صدر نشین تھے ۔

مدینہ میں صحابہ کرام کے بعد ارباب تفکر یہ حضرات تھے۔ حضرت سعید بن المسیب، حضرت عروۃ ابن الزبیر، حضرت قاسم بن محمد، حضرت خارجہ ابن زید، حضرت ابوبکر بن عبدالرحمٰن، حضرت سلیمان بن یسار اور حضرت عبیداللہ بن عبداللہ یہی فقہاء سبعہ ہیں ۔

کوفہ کا دائرہ علمیہ جن لوگوں سے قائم تھا ان کے نام یہ ہیں۔ حضرت علقمہ، حضرت مسروق ابن الاجدع، حضرت شریح ابن الحارث، حضرت ابوعمرو عامر الشعبی، حضرت حبیب بن ثابت، حضرت سعید بن جبیر اور حضرت ابراہیم نخعی۔ یہ کوفہ کے فقہاء سبعہ ہیں ۔

ایسے ہی دوسرے شہروں کا حال تھا۔ مختلف شہروں میں ارباب تفکر کے جو مدارس قائم ہوئے ان کے قائدین کے نام تاریخ میں آج بھی محفوظ ہیں۔ مدینہ میں سعید ابن المسیب، مکہ میں عطاء ابن ابی رباح، کوفہ میں ابراہیم نخعی، بصرہ میں حسن بصری، شام میں مکحول اور یمن میں طاوس یمانی۔ تفکر کی گاڑی ان ہی بزرگوں کے ذریعے حرکت میں آتی ہے۔ ان ہی بزرگوں کے علمی فیوض کے نتیجہ میں تفکیر علمی کے مشہور چار مدرسے منصۂ شہود پر آتے ہیں۔

کوفہ میں مدرسہ حنفی کی قیادت امام اعظم فرماتے تھے۔ ان کی ولادت سنہ۸۰ھ میں اور وفات سنہ۱۵۰ھ میں ہوئی ہے۔ ابن حجر مکی نے حافظ ابن حجر عسقلانی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بہرحال اتنی بات معتمد ہے کہ آپ نے زمانہ صحابہ پایا ہے اور ابن سعد کی تصریح کے مطابق یہ بھی امر واقعہ ہے کہ کچھ صحابہ کرام کی زیارت کا ابوحنیفہ کو شرف حاصل ہے۔ یہ شرف امام صاحب کے سوا امام صاحب کے ہم عصروں میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا نہ امام اوزاعی کو شام میں نہ حماد بن زید کو بصرہ میں نہ سفیان ثوری کو کوفہ میں نہ امام مالک کو مدینہ میں نہ امام مسلم بن خالد کو مکہ میں اور نہ لیث بن سعد کو مصر میں۔

مدینہ میں مذہب مالکی کی قیادت امام مالک نے کی ————— ان کی ولادت سنہ۹۳ھ اور وفات سنہ۱۷۹ھ میں ہوئی ہے۔ ان دونوں مدرسوں کے بارے میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

جو شخص ان مذاہب کے اصول پر مطلع ہے وہ اس بارے میں کوئی شک نہ کرے گا کہ ان کی اصل فاروق اعظم کے زمانہ کی اجتماعی تفکیر ہے اور یہ ان دونوں مدرسوں کا ایک اشتراکی سرمایہ ہے۔ اس کے بعد جیسے امام مالک کے افکار کی بنیاد بیشتر مدینہ میں فقہاء صحابہ جیسے عبداللہ ابن عمر، حضرت عائشہ اور کبار تابعین فقہاء سبعہ اور صغار تابعین کی تفکیر پر ہے۔ ایسے ہی امام ابوحنیفہ کے فکر کی بنیاد عبداللہ بن مسعود کے فتاوی اور علی ابن ابی طالب کے ان عدالتی فیصلوں پر ہے۔ جو عبداللہ بن مسعود کے تلامذہ کی وساطت سے آئے ہیں۔ اور اس کے بعد ابراہیم نخعی اور امام شعبی کی تحقیقات پر ہے اور بس۔

مصر میں مدرسۂ شافعی کی قیادت امام محمد بن ادریس شافعی قرشی ولادت سنہ۱۵۰ھ اور وفات سنہ۲۰۴ھ کرتے ہیں۔

بغداد میں مدرسۂ حنبلی کے پیشرو امام احمد بن حنبل الشیبانی ولادت ۱۶۴ھ اور وفات ۲۴۱ھ
کرتے ہیں۔

ان چار تفکیری مدارس کے علاوہ اور بھی مدرسہ ہیں اور بڑے بڑے ارباب فکر گزرے ہیں لیکن یہ حسن اتفاق ہے کہ ان کے سوا دوسروں کو بقاء دوام حاصل نہیں ہوا ہے۔ مولانا اسماعیل الشہید منصب امامت میں فرماتے ہیں۔

پس مشابہ بانبیاء۔ دریں فن ائمہ مجتہدین مقبولین اند پس ایشاں را از ائمہ فن باید شمرد مثل ائمہ اربعہ، ہر چند مجتہدین بسیار از بسیار اند فاما مقبول درمیان جمہور ائمہ ہمیں چند اشخاص اند پس گویا کہ مشابہت تامہ دریں فن نصیب ایشاں گردیدہ بناء علیہ درمیان جماہیر اہل اسلام از خواص و عوام بلقب امام معروف گردیدند۔

بہر حال اس تفکیر علمی کا دائرہ اُمت میں وسیع سے وسیع تر ہوتا گیا اور اس کے نتیجے میں اُمت کو اسلامی قانون کا وہ عظیم سرمایہ اور انسانی ذہانت و محنت کا وہ عجیب و غریب اثاثہ ملا ہے جس کی نظیر دُنیا کے قانونی ذخیروں میں ملنی مشکل ہے۔ یہ زندگی کے بہت بڑے حصے اور عصر قدیم کے اکثر حالات پر حاوی ہے۔ اس تفکیر علمی کی وسعت اور اس کی قانونی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے مشہور شامی فاضل و ماہر قانون مصطفےٰ احمد الزرقاء کی کتاب المدخل الفقہی العام الی الحقوق المدنیہ کے مقدمہ سے ایک اقتباس ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں۔ وہ فرماتے ہیں:

قوانین کا تقابلی مطالعہ کرنے والی عالمی اکیڈمی کی مشرقی قانون کی کمیٹی نے پیرس یونیورسٹی کے لا کالج میں، ۲؍جولائی ۱۹۵۱ء میں فقہ اسلامی کا ہفتہ منایا اور کانفرنس منعقد کی۔ یہ کانفرنس مسٹر ملٹ پروفیسر فقہ اسلامی پیرس یونیورسٹی کی صدارت میں ہوئی۔ اس میں عرب غیر عرب ملکوں کے لا کالج کے اساتذہ، ازہر کے نمائندے عرب اور فرانسیسی وکلاء، نیز مستشرقین بڑی تعداد میں بلائے گئے۔ مصر سے چار نمائندے منتخب ہو کر گئے، دو جامعہ فواد سے ایک جامعہ ابراہیم کے لا کالج کے پرنسپل اور ازہر کی 'ہیئۃ کبار العلماء' کا ایک نمائندہ' دمشق یونیورسٹی کے لا کالج کی طرف سے میں نے اور ڈاکٹر معروف الدوالیبی نے نمائندگی کی۔ نمائندوں نے انتظامی، فوجداری اور دیوانی قوانین کے پانچ موضوعات پر بحث کی۔
۱۔ ملکیت کا اثبات، ۲۔ مفادِ عامہ کی خاطر املاک پر قبضہ، ۳۔ جرم کی ذمہ داری، ۴۔ اجتہادی

مدارس فکر کا ایک دوسرے پر اثر، ۵۔ سُود کے بارے میں اسلام کا نقطہ نظر۔

یہ سب تقریریں اور مباحث فرانسیسی زبان میں ہوئے تھے اور ہر موضوع کے لیے ایک دن مقرر تھا۔ ہر لیکچر کے بعد کانفرنس کے نمائندوں کے درمیان مباحثہ ہوتا تھا۔ اسی قسم کے مباحثہ کے درمیان ایک ممبر جو پیرس کے بار ایسوسی ایشن کے صدر تھے کھڑے ہو گئے اور یوں بولے کہ،

میری سمجھ میں نہیں آتا کہ میں اس عامی خیال میں کہ اسلامی فقہ جامد ہے۔ اس میں جدید معاشرے کی ضروریات کی تکمیل کی صلاحیت نہیں ہے اور اس کانفرنس کی تقریروں اور بحثوں سے اصول و شواہد کی بنیاد پر اس کے برعکس برخلاف جو کچھ ثابت ہو رہا ہے ان دونوں میں کیسے مطابقت پیدا کروں۔

یعنی عام رائے تو یہ ہے کہ اسلامی قانون ترقی پذیر نہیں بلکہ جامد ہے اور کانفرنس میں موجود مقررین کی تقریریں زبانِ حال سے اصول و شواہد کی روشنی میں یہ ثابت کر رہی ہیں کہ اس میں زندگی کی ترقیوں کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے۔

کانفرنس کے خاتمہ پر تمام نمائندوں نے ایک قرارداد پاس کی جس کا ترجمہ یہ ہے۔ اس کانفرنس کے شرکاء ان مباحث کے پیش نظر جو فقہ اسلامی کے سلسلے میں پیش ہوئے اور ان بحثوں کی بنا پر جس سے یہ بات اچھی طرح کھل کر سامنے آ گئی۔

الف، اسلامی فقہ کی ایک خاص دستوری و قانونی قیمت ہے جس میں شبہ نہیں کیا جا سکتا۔

ب، اس عظیم قانونی سرمائے میں فقہی مذاہب کا یہ اختلاف، معلومات، مدلولات اور قانونی اصولوں کا بڑا خزانہ ہے جو تحسین و اعتراف کا پورا مستحق ہے اور اس کے ذریعے فقہ اسلامی اس قابل ہے کہ جدید زندگی کی ضروریات اور حاجات کی تکمیل کر سکے۔

اپنی اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ یہ ہفتہ ہر سال منایا جایا کرے اور کانفرنس کے سیکرٹری ایٹ کو اس کا ذمہ دار قرار دیتے ہیں کہ وہ ان موضوعات کی ایک فہرست تیار رکھے جن کو آئندہ بحث کی بنیاد بنانے کی ضرورت ہے اور کانفرنس کے نمائندے اس کی بھی اُمید رکھتے ہیں کہ فقہ اسلامی کی ایک ڈائریکٹری تیار کرنے کے لیے ایک کمیٹی بنا دی جائے گی جس کے ذریعے قانون کی کتابوں سے استفادہ کیا جا سکے اور وہ ایک ایسا فقہی دائرۃ المعارف ہو جس میں اسلام کی تمام معلومات جدید طرز پر مرتب کی گئی ہوں۔

(المدخل الفقہی العام ساتواں ایڈیشن دمشق ۱۹۶۱ء)

پارہ دوم ایک نظر میں

اللہ کی صفات

توحید

رسالت

صحابہ کا چہرہ

اُمتِ مسلمہ

دستوری قواعد

قرآن کا تعارف

اسلامی شعائر

اخلاقی قوانین

اجتماعی قوانین

دیوانی قوانین

فوجداری قوانین

دفاعی قوانین

سیاسی قوانین

سیاست میں جسے سربراہ مقرر کر لیا جائے سچے دل سے اس کی اطاعت کرنی چاہیے ۲۴۹

معاشرتی قوانین

اللہ نے زمین میں جتنی چیزیں پیدا کی ہیں اُن کو اپنے استعمال میں لاؤ۔ صرف یہ دیکھ لو
کہ حلال ہو اور طیب ہو اور بس ۱۶۸
جن چارپایوں کا گوشت عام طور پر کھایا جاتا ہے وہ سب حلال ہیں مگر چار چیزیں
حرام ہیں، مردار جانور، حیوانات کا خون، سور کا گوشت، اور وہ چیز جو اللہ کے سوا
کسی دوسری ہستی کے نام پر پکاری جائے ۱۷۳
میاں بیوی کا تعلق ایک فطری تعلق ہے اور دونوں ایک دوسرے سے اپنے حوائج
میں وابستہ ہیں اور اس تعلق کی غرض بقائے نسل ہے ۱۸۷
مشرکوں سے شادی نہ کرو ۲۲۱
عورتوں سے ان کے ایام ماہواری میں علیحدگی اختیار کرو ۲۲۲
اللہ نے بقائے نسل کی خاطر وظیفہ زوجیت ادا کرنے کے لیے جو بات بتادی اسی
طرح ہونا چاہیے ۲۲۳
کسی جائز اور نیک بات کے خلاف قسم کھا لینا ۲۲۴
لغو قسموں کا کوئی قانونی مقام نہیں ہے ۲۲۵
بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھالی جائے جسے ایلاء کہتے ہیں تو کیا کرنا چاہیے ۲۲۶
طلاق کی عدت کا مناسب وقت مقرر کر کے نسب کا تحفظ ۲۲۸
طلاق کے بعد رجعت کا پہلا شوہر زیادہ حقدار ہے بشرطیکہ وہ خواہشمند ہو
طلاق دینے کا طریقہ ۲۲۹
شوہر بیوی کو جو کچھ دے چکا ہے اس کو طلاق کے بعد واپس لینے کا حقدار نہیں ۲۲۹
بیوی اپنا مہر یا اس کا حصہ دے کر شوہر سے طلاق لے سکتی ہے بشرطیکہ شوہر
منظور کرے۔ ۲۲۹
عورت کو یا تو بیوی بنا کر رکھنا چاہیے یا طلاق دے کر چھوڑ دینا چاہیے ۲۳۱
عدت پوری ہو جانے کے بعد عورت کو اختیار ہے جس طرح چاہے ٹھیک طریقہ پہ

نکاح کرے۔ ۲۳۲
دُودھ پلانے تک ماں کا خرچ بچے کے باپ کے ذمہ ہے ۲۲۳
دُودھ پلانے کی مدت دو برس ہے ۲۲۳
وفات کی عدت چار ماہ دس روز ہے ۲۳۴
اگر عورت عدت کے بعد دوسرا نکاح کرنا چاہے تو اسے روکنا نہ چاہیے ۲۳۴
جب تک عدت کی میعاد نہ گزر جائے نکاح کا قول وقرار نہ کرو ۲۳۵
اگر نکاح کے بعد میاں بیوی میں تعلق نہ ہوا ہو اور شوہر طلاق دے دے اور مہر کی مقدار مقرر نہ ہوئی ہو تو مرد کو اپنی حیثیت کے مطابق متعہ دینا چاہیے۔ ۲۳۶
اگر مہر کی مقدار مقرر ہو اور مرد میاں بیوی والے تعلق سے پہلے طلاق دے دے تو آدھا مہر دینا پڑے گا۔ اگر مرد اس سے زیادہ دے تو یہ تقویٰ اور فضیلت کی بات ہے ۲۳۷
باہم ایک دوسرے کے ساتھ احسان اور بھلائی کرنے کی کوشش کرو ۲۳۷
اگر شوہر نے وصیت کردی ہو کہ ایک سال تک عورت اس کے گھر میں رہے گی یعنی اس کا سوگ منائے گی تو اب ایسی وصیت واجب التعمیل نہیں۔ اگر عورت چار ماہ دس روز کے بعد دوسرا نکاح کرنا چاہے تو ایسی وصیت کی بنا پر اسے روکا نہیں جا سکتا۔ ۲۴۱

اصطلاحاتِ قرآنی

اعتکاف: عکف سے بنا ہے۔ لغت میں اس کے معنے رُکنے کے ہیں اور اصطلاح میں مسلمان مرد کا شبانہ روز روزے کے ساتھ مسجد میں بہ نیتِ عبادت رک جانا اعتکاف کہلاتا ہے۔ روزہ رکھنا، امام ابو حنیفہ کے نزدیک شرطِ اعتکاف ہے۔ امام شافعی کے نزدیک نہ روزہ ضروری ہے اور نہ پورے شبانہ روز کی شرط ہے۔ الجصاص نے قانونی اعتکاف کے لیے ان باتوں کو شرط قرار دیا ہے۔ اوّل مسجد میں ٹھہرنا، دوم روزہ رکھنا، سوم جنسی تعلقات سے شب و روز پرہیز کرنا، چہارم قربِ الٰہی کی نیت کرنا، رمضان کے آخری عشرہ کا اعتکاف سنتِ موکدۃ علی الکفایہ ہے۔

اعتداء: یہ لفظ عدوان سے بنا ہے اس کے معنے لغت میں حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ حد سے تجاوز کی متعدد صورتیں ممکن ہیں۔ حد سے مراد شریعت اور قانون بھی ہو سکتا ہے مثلاً یہ کہ انتقام کے جوش میں یا فتح مندی کے زور میں بے تحاشا دشمن کے مصافی اور غیر مصافی سب کو قتل کرنا شروع کر دے۔ اُن کے کھیتوں، باغوں اور چراگاہوں میں آگ لگا دی جاتے۔ اُن کے بے زبان جانور تلوار کے گھاٹ اتار دیے جائیں۔ حد سے مراد حدِ معاہدہ بھی ہو سکتی ہے۔ مثلاً یہ کہ بدعہد اور پیمان شکن قوموں کی دیکھا دیکھی خود بھی معاہدوں کی پرواہ نہ کی جائے اور عہد شکنی کی ابتدا اپنی طرف سے کر کے حملہ بول دیا جائے۔ اسی طرح اور بھی پہلو حد سے تجاوز کرنے کے نکل سکتے ہیں۔ لفظ اعتداء زیادتی کے ہر پہلو کو جامع ہے اور اس میں ہر قسم کی زیادتی کی ممانعت ہے۔ اعتداء کی ایک صورت یہ بھی

ہے کہ قتال علاوہ فی سبیل اللہ کے کسی اور غرض کے لیے شروع کر دیا جائے چنانچہ علامہ قرطبی نے تصریح کی ہے کہ قتال بغیر وجہ اللہ بھی اس میں داخل ہے۔ قرآن میں جوابی اور دفاعی کارروائی پر لفظ اعتداء بولا گیا ہے۔ یہ محض مجازاً اور محاورۂ زبان کے لحاظ سے اعتداء کہا گیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ زیادتی کے جواب میں جو کارروائی ہو اس پر حقیقتہً زیادتی کا اطلاق کیونکر ہو سکتا ہے۔ عربی اسلوب بیان میں ایک دستور یہ بھی ہے کہ جزائے عمل کے موقعہ پر بعینہٖ وہی لفظ بول دیا جاتا ہے جو خود اس عمل کے لیے ہوتا ہے مثلاً مکر کے مقابلہ میں مکر، کید کے مقابلہ میں کید اور استہزاء کے مقابلے میں استہزاء، اس صنعت کا نام مشاکلت ہے۔ اور قرآن نے عربی بلاغت کی دوسری صنعتوں کی طرح اس کا بھی بار بار استعمال کیا ہے چنانچہ یہاں سزائے اعتداء کے موقعہ پر اعتداء لانا اسی طرز پر ہے۔ دیکھو ابن العربی کی احکام القرآن ۔ ابوبکر الجصاص نے قرآن کے اس قانون کو کہ اگر کوئی زیادتی کرے تو تم بھی برابر کی زیادتی کرو۔ بہت زیادہ وسیع کر دیا ہے ان کی نظر میں یہ قانون نہیں بلکہ قرآن کی بتائی ہوئی ایک دستوری دفعہ ہے جس کے آغوش میں زندگی کے مختلف احوال و ظروف ہیں۔ مالیاتی اور دیوانی مسائل کے لیے اس آیت سے یہ رہنمائی مل رہی ہے کہ اگر کوئی شخص کسی کا مالی نقصان کر دے تو نقصان کرنے والے کو اسی کے مثل تلافی کرنی پڑے گی اور نقصان کا مثل جنس میں نہ ہو تو اس کی قیمت کا تاوان ادا کرنا پڑے گا اور اس اساس پر دیوانی کے ساتھ ایک سے زیادہ فوجداری قوانین کی بھی عمارت کھڑی ہے ۔

افاضۃ: اصل مادہ فیض ہے اسی سے ہم فیضان بولتے ہیں۔ اصل میں فیض کے معنے پانی کے اوپر سے گر کر بہنے کے ہیں ۔ پھر بہنے کے مفہوم کا لحاظ کرتے ہوئے بطور استعارہ اس کا استعمال پھیلنے کے معنے میں ہونے لگا اسی اعتبار سے افاضہ کے معنے منتشر ہونے اور پھیلنے کے ہو گئے ۔ قرآن میں اس لفظ کے معنے اسی مناسبت سے انبوہ انبوہ چلنے یا واپس ہونے کے ہیں۔ اصطلاح فقہ میں افاضہ عرفات سے مزدلفہ آنے کو کہتے ہیں ۔ قرآن میں عرفات سے واپسی کا تذکرہ اس کی دلیل ہے کہ عرفات میں حاضری فرض ہے ۔ حج میں تین فرض ہیں احرام پوشی، وقوف اور طواف فرض۔

ایام معدودات: اس پارے میں دو بار آیا ہے۔ روزوں کے ذکر میں زبر کے ساتھ ایاماً آیا ہے

اور حج میں ایام زیر کے ساتھ آیا ہے اور دونوں جگہ معدودات صفت آئی ہے۔ حج کے ذکر میں ایام معدودات سے ایام تشریق مراد ہیں اس پر صحابہ و تابعین سب کا اتفاق ہے۔ یعنی ۱۰، ۱۱، ۱۲ ذی الحجہ۔ حاجیوں کے قافلے عرفات اور مزدلفہ سے واپسی میں صبح کو منیٰ پہنچ جاتے ہیں۔ منیٰ مکہ معظمہ سے شمال مغرب میں ۳ میل کے فاصلہ پر ہے۔ حاجی یہاں ان تاریخوں میں قیام کرتے ہیں، حج کی متعدد رسوم کی ادائیگی یہاں ہوتی ہے۔ قربانی کرنا، حجامت کرانا، شیطانوں کے کنکریاں مارنا، احرام اتارنا، تکبیر کی کثرت ان دنوں میں خاص جز و ہے اس لیے یہاں ایام معدودات سے مراد بھی تین دن ہیں۔ روزوں کے ذکر میں ایام معدودات سے تین نہیں بلکہ پورے رمضان کا مہینہ مراد ہے۔ تاہم کوئی عربی زبان سے ناواقف یہ کہے کہ ایام جمع قلت ہے جس کا اطلاق دس دنوں سے زیادہ پر نہیں ہوتا تو اس کو چاہیے کہ ایام العرب کو جو تعداد میں سیکڑوں ہیں نو لڑائیوں میں محدود کر دے اسی طرح قرآن میں اللہ تعالیٰ نے جہاں دُنیا کے ہزار ہا انقلابات کو ایام اللہ کہا ہے ان کو نو تک میں محصور کر دے۔ یمن سے شام تک سرسبز راستہ جو مہینوں میں طے ہوتا تھا قرآن میں چند دن چند رات کہا ہے۔ پوری انسانی زندگی کو الایام الخالیہ، زمانہ کے برسوں کو الایام کہا ہے۔ دراصل جمع قلت و کثرت کا یہ قاعدہ کلیہ نہیں ہے بلکہ عمومی ہے اور صرف ان الفاظ کے لیے ہے جن کی جمع قلت و کثرت دونوں مستعمل ہیں۔ ایام کا لفظ ان میں نہیں ہے، اس کی صرف ایک ہی جمع آتی ہے۔ سند کے لیے دیکھو رضی شرح کافیہ جلد دوم اور لسان العرب۔

ارتداد: لغت میں اس کے معنے جہاں سے آیا وہیں واپس پلٹنے کے ہیں۔ اسلام کی قانونی زبان میں اسلام کو اختیار کر لینے کے بعد واپس ہو جانے کے ہیں۔ یعنی ایک مسلمان کا اسلام کو چھوڑ دینا ارتداد کہلاتا ہے۔ جبکہ کسی شخص کا اسلام کو نہ ماننا کفر ہے۔ مرتد اور کافر میں فرق ہے۔ کافر وہ ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے دین کو نہیں مانتا۔ آپ کی تصدیق نہیں بلکہ دین کے معاملہ میں تکذیب کرتا ہے اور مرتد وہ شخص ہے جو اسلام کو اپنانے اور حضور انور کی تصدیق کرنے کے بعد پھر تکذیب کرتا ہے۔ اسلامی قانون کافر کو برداشت کر لیتا ہے لیکن مرتد کو برداشت نہیں کرتا۔ دُنیا میں کوئی نظام ایسا نہیں ہے جو اپنے اندر شامل نہ ہونے والوں اور

شامل ہوکر الگ ہوجانے والوں کے ساتھ یکساں برتاؤ کرنا ہو۔ کافر کو اسلام تمام شہری حقوق دیتا ہے لیکن جو شخص مرتد ہوجاتا ہے وہ اسلامی ریاست میں جملہ شہری حقوق سے محروم ہوجاتا ہے۔ ریاست پر اس کے جان و مال کی حفاظت کی ذمہ داری باقی نہیں رہتی۔ نہ مسلمان بیوی سے اس کا نکاح باقی رہتا ہے نہ مسلمان کی میراث میں اسے حصہ ملتا ہے اور مرتد کے معاملہ میں اسلام کے قانون ساز اداروں میں سے حنفی ادارے میں سب سے زیادہ سنگینی ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ محض ارتداد سے مرتد کے تمام اعمال اکارت ہوجاتے ہیں خواہ پھر توبہ کرلے۔ اس کا کیا ہوا حج بیکار ہوجائے گا دوبارہ اگر مسلمان ہوا تو حج کرنا پڑے گا، امام مالک کا بھی یہی مذہب ہے۔

یہ مسئلہ بھی ارتداد کے موضوع پر بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ مرتد سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے یا نہیں۔ ابن قدامہ المغنی میں رقمطراز ہیں کہ امام احمد کی رائے یہ ہے کہ جو عاقل بالغ مرد وعورت اسلام کے بعد کفر اختیار کرے، اسے تین روز تک توبہ کی مہلت دی جائے۔ حافظ ابوجعفر طحاوی شرح معانی الآثار میں لکھتے ہیں، اگر سربراہ مملکت اس سے توبہ کا مطالبہ کرے تو زیادہ بہتر ہے اگر توبہ کرلے تو اسے چھوڑ دیا جائے ورنہ قتل کردیا جائے، امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور امام محمد کی بھی یہی رائے ہے۔

علامہ مرغینانی نے ہدایہ میں لکھا ہے کہ ایسے شخص کے سامنے اسلام پیش کیا جائے۔ اگر کوئی شبہ ہو تو اسے صاف کرنے کی کوشش کی جائے کیونکہ ممکن ہے کہ وہ کسی شبہ میں مبتلا ہو اور ہم اس کا شبہ دُور کردیں۔

ایلاء: لغت میں قسم کھانے کو کہتے ہیں اور قانون کی زبان میں اس قسم کو کہتے ہیں کہ جو شخص یہ قسم کھائے کہ چار مہینے یا چار ماہ سے زائد یا بلا تعیین مدت اپنی عورت کے پاس نہیں جاؤں گا اور اگر چار مہینے سے کم کے لیے قسم کھائی تو وہ ایلاء شرعی نہ ہوگا۔ اوّل کی تین صورتوں کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر رجوع کرلیا تو نکاح باقی رہے گا اور کفارۂ قسم دینا پڑے گا اور اگر چار ماہ بلا رجوع کے گزر گئے تو طلاق بائن ہوجائے گی، اب رجوع دُرست نہیں البتہ جدید نکاح جائز ہے اور ایلاء کی آخری صورت یعنی چار مہینے سے کم کے لیے اگر قسم کھائی ہے مثلاً تین ماہ کے لیے قسم کھائی ہے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر تین ماہ کے اندر عورت کے پاس گیا تو کفارۂ قسم دینا ہوگا اور نکاح باقی

رہے گا۔ اور اگر اپنی قسم کو پورا کیا یعنی تین ماہ کے اندر عورت کے پاس نہیں گیا تو تب بھی نکاح باقی رہے گا اور نہ طلاق واقع ہوگی اور نہ کفارہ لازم ہوگا۔ ایلاء کے درست ہونے کی شرط یہ ہے کہ شوہر میں طلاق کی اہلیت ہو اور عورت اس کی منکوحہ ہو۔

ایمان : یمین کی جمع ہے۔ یمین کے اصل معنے داہنے ہاتھ کے ہیں۔ معاہدہ کرنے والا اور حلیف چونکہ دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مارتا ہے اس لیے یمین قسم کے لیے اسی سے مستعار لیا گیا ہے۔ یمین کی تین قسمیں ہیں۔ ایک یمین لغو ہے۔ اس کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ امام شافعی کے نزدیک یمین لغو کے معنے یہ ہیں کہ جو قسم انسان کی زبان سے بلا قصد اور ارادہ نکل جائے جیسے عرب میں لا واللہ، بلی واللہ تکیہ کلام تھا۔ ایسی قسم میں نہ گناہ ہے نہ کفارہ۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یمین لغو وہ ہے کہ کسی گزشتہ چیز کو سچ سمجھ کر قسم کھائے اور واقع میں اس کے خلاف ہو۔ ایسی قسم میں نہ کفارہ ہے اور نہ کوئی گناہ۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ جس میں ارادہ ہو اگر وہ واقع کے خلاف ہو تو اس میں کفارہ واجب ہوگا اگرچہ قسم کھانے والے کے گمان میں وہ واقع اور نفس الامر کے مطابق ہو۔

یمین غموس یہ کہ گزری ہوئی بات پر قصداً جھوٹی قسم کھائے۔ امام اعظم کے نزدیک اس طرح کی قسم گناہ ہے جس کا علاج توبہ و استغفار ہے۔ دنیا میں اس پر کوئی کفارہ نہیں ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ یمین غموس میں کفارہ ہے۔

یمین منعقدہ یعنی آئندہ کسی کام کے بارے میں بالارادہ قسم کھائے کہ کروں گا یا نہیں کروں گا۔ ایسی قسم کے توڑنے پر بالاتفاق کفارہ قسم واجب ہوتا ہے۔

ارضاع : اس کے معنے بچہ کو چھاتی سے دودھ پلانے اور پستان چوسانے کے ہیں اور اصطلاح میں عورت کا بچہ کو دودھ پلانے کی مدت میں دودھ پلانا کہلاتا ہے۔ دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے، یہی جمہور کا مذہب ہے۔ اور امام اعظم کے نزدیک اڑھائی سال ہے۔ اور جامع الرموز میں رضاعۃ کی تعریف اس طرح کی گئی ہے کہ بچہ کا حقیقۃً یا حکماً وقت مخصوص میں عورت کے خالص یا ملے ہوئے دودھ کو پلانا جبکہ دودھ کو پینے کا نام رضاعۃ ہے،

برّ : با کے زبر اور زیر کے ساتھ، زبر کے ساتھ مصدر ہے، نیکی کرنا، بھلائی کرنا، نیکوکاری، اعتقادی اور عملی دونوں قسم کی نیکیاں بر میں داخل ہیں، نیکی کے جملہ اقسام کو شامل ہے۔ اردو میں اس کا صحیح مفہوم لفظ طاعت ہی سے ادا ہو سکتا ہے۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی

رقمطراز ہیں۔ البر الطاعۃ، اور یہ بھی لکھا ہے کہ اس سے زیادہ جامع اس کی تفسیر میں کوئی تعبیر نہیں ہے۔ امام رازی نے اس کی معنوی پہنائیوں کو مانا ہے۔ فرماتے ہیں کہ لفظ بر تمام طاعات اور تمام اعمالِ خیر کو جامع ہے۔ لفظ بر زبر کے ساتھ بھی صفت مشبہ کا صیغہ ہے اس کے معنے میں چونکہ وسعت کا تصور موجود ہے اس لیے اس کو بھی بمعنی نیکی بولا جانے لگا۔ لفظ بَر کبھی اللہ کی صفت بن کر آتا ہے جیسے انہ ھو البر الرحیم۔ اور کبھی بندہ کی جیسے برا بوالدیہ، جب اللہ کے لیے اس لفظ کا استعمال ہو گا تو اس کے معنے ثواب عطا کرنے کے ہیں اور جب بندہ کے لیے آئے گا تو اطاعت کرنے کے معنے ہوں گے۔

باغ : حد سے نکل جانے والا۔ عدولِ حکمی کرنے والا۔ بغی سے اسم فاعل ہے غیر باغ ولا عاد میں امام مجاہد نے باغی اور عادی نہ ہونے کے یہ معنے بیان کیے ہیں کہ رہزن نہ ہو، سرکار کے خلاف نہ ہو، اللہ کی معصیت کے لیے گھر سے نہ نکلا ہو تو ایسے شخص کو مردار، خون، سور کا گوشت کھانا جائز ہے ورنہ چاہے مضطر ہو اس کو رخصت نہیں ہے۔ امام شافعی بھی اس کے قائل ہیں لیکن امام اعظم اور سلف کی ایک بڑی جماعت کہتی ہے کہ بغاوت اور عدوان کا تعلق کھانے سے ہے۔ باغی کا یہ مطلب ہے کہ بے حکمی نہ کرے یعنی اضطرار کی حالت نہ ہو اور کھانے لگے اور عادی کے یہ معنے ہیں کہ زیادتی نہ کرے یعنی بقدرِ ضرورت کھائے۔

البیت : اصل میں بیت اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان رات میں آکر بسیرا کرے۔ پھر کبھی کبھی رات کا لحاظ کیے بغیر مطلق جائے سکونت کو بیت کہہ دیا جاتا ہے۔ مٹی کا گھر ہو یا چونے کا پتھر کا ——— شامیانہ یا خیمہ سب کے لیے بیت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں لفظِ بیت الف لام کے ساتھ استعمال ہو تو اس سے خانہ کعبہ مراد ہوتا ہے۔ اسی کو البیت الحرام حرمت والا گھر کہتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں حرام کے معنے جس جگہ بند رہنا چاہیے اس مکان میں کتنی باتیں منع ہیں۔ آدمی کو مارنا اور جانور کو ستانا اور درخت گھاس اکھاڑنا اور پڑا مال اٹھانا۔ اسی کو البیت العتیق بھی کہتے ہیں۔ جو چیز زمانہ یا مقام یا رتبہ میں مقدم ہو اس کو عتیق کہتے ہیں۔ اسی عتیق کے معنے کبھی قدیم کے آتے ہیں اور کبھی بزرگ اور کریم کے، خانہ کعبہ کو بیت عتیق کیوں کہا گیا ہے؟ حضرت

ابنِ عباس، ابنِ الزبیر، مجاہد اور قتادہ کا بیان ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے زبردستوں اور سرکشوں کے ہاتھ سے اس کو تباہی اور بربادی سے ہمیشہ محفوظ و آزاد رکھا اس لیے عتیق کہا گیا۔ سفیان ابنِ عیینہ کہتے ہیں کہ یہ نام اس لیے پڑا کہ وہ دوسروں کی ملکیت سے ہمیشہ آزاد رہا۔ حسن اور ابن زید کا قول ہے کہ چونکہ وہ قدیم گھر ہے اس لیے اس کا نام عتیق ہوا۔ اہلِ عرب دینار عتیق پرانی اشرفی کو کہتے ہیں۔

تبیین فجر، تبین کے معنے ظاہر ہو جانا، کھل جانا، قرآن میں صبح ہونے کے لیے خیط ابیض کا خیط اسود سے نمایاں ہونا استعمال کیا ہے۔ فجر کی سفید دھاری کا سیاہ دھاری سے ممتاز ہو جانا کنایہ ہے۔ تاریکی شب کے دور ہونے اور سپیدۂ صبح کے نمودار ہونے یعنی طلوعِ فجر سے۔ اس موقعہ پر اس لفظ کو خاص طور پر لانے کی وجہ یہ ہے کہ نہ تو تشکیکوں اور وہمی مزاج لوگوں کی طرح صبح ہونے سے پہلے کھانا پینا حرام سمجھو اور نہ ایسے بے فکر ہو جاؤ کہ صبح ہو جانے کے باوجود کھاتے رہو بلکہ روزے اور کھانے پینے کے درمیان حدِ فاصل صبح صادق کا تیقن ہے۔ اس تیقن سے پہلے کھانا پینا حرام سمجھنا درست نہیں ہے اور تیقن کے بعد کھانے پینے میں مشغولیت حرام اور روزے کے لیے مفسد ہے خواہ ایک منٹ ہو۔ قرآن نے روزے کے لیے یہ حد بندی کی ہے کہ صبح صادق ہونے کا یقین ہو جانے اس کے بعد ایک منٹ کے لیے بھی کھانے کی اجازت نہیں ہے۔ کیونکہ قرآن نے سپیدۂ صبح کے ظاہر ہونے کے لیے دھاگا کی تعبیر اختیار کی ہے۔ حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ اس سے مراد یہ ہے کہ دھاگہ جتنی سپید نمودار ہونے کے بعد رات نہیں دن ہے۔ دھاگے کی تعبیر اس کی اجازت نہیں دیتی کہ اس سے روشنی کا پھیلنا مراد لیا جائے۔

تمتع، متع سے بنا ہے اس کے معنے برتنے، فائدہ اٹھانے اور مدتِ منفعت میں امتداد ہونے کے ہیں۔ آیت قرآنی میں تمتع سے تمتع عرفی مراد ہے نہ کہ شرعی اس لیے وہ تمتع اور قران دونوں کو شامل ہے۔ اصطلاحِ قانون میں تمتع یہ ہے کہ زمانہ حج میں ایک احرام باندھ کر عمرہ کیا اور پھر دوسرے احرام سے حج بھی کیا جائے۔ دونوں احراموں کی درمیانی مدت میں حالتِ احرام کی ممنوعات سے پوری طرح فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے دینِ ابراہیمی کو چھوڑ کر اہلِ عرب جہاں اور جہالتوں میں مبتلا تھے وہاں ایک عقیدہ یہ بھی گڑھ لیا تھا کہ موسمِ حج میں عمرہ کرنا سخت گناہ ہے۔ وہ کہتے تھے کہ جب

سواریاں حج سے واپس آجائیں اور ان کی پیٹھ کے زخم اچھے ہو جائیں اُس وقت عمرہ جائز ہوسکتا ہے لیکن قرآن نے اس رسمِ قبیح کو ختم کر دیا اور زمانہ حج میں احرام باندھ کر اولاً عمرہ کرنے اور پھر احرام باندھ کر حج کرنے کی اجازت دے دی۔

تربّص: انتظار کرنا، خواہ کسی معاملہ کے ختم ہونے یا پورا ہونے کا انتظار ہو۔ قانون کی اصطلاحی زبان میں اس انتظار کا نام ہے جو عورت پر قیدِ نکاح سے آزاد ہونے کے بعد لازم ہے طلاق والی عورت کے لیے تین حیض انتظار کی مدت ہے، شوہر کی وفات ہو جائے تو چار ماہ دس روز عدت ہے۔ طلاق ہو یا وفات اگر حاملہ ہو تو وضع حمل اس کی عدت ہے اور طلاق بائنہ یا مغلظہ اور موت کی عدت میں انتظار صرف یہی نہیں ہے کہ اس مدت میں نکاح نہ کریں بلکہ اس سے مراد یہ ہے کہ زینت کے لیے بھی عدت گزرنے کا انتظار ہے یعنی اس زمانہ میں اپنے آپ کو زینت سے روک رکھے چنانچہ احادیث میں واضح طور پر یہ احکام ملتے ہیں کہ عورت کو رنگین کپڑے اور زیور پہننے سے، مہندی اور سُرمہ اور خوشبو لگانے سے اور بالوں کی آرائش سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اسے اصطلاح میں احداد کہتے ہیں۔

تراضی: باہمی رضامندی، آپس کی خوشی، ایک کا دوسرے سے راضی ہونا۔ تراضی بروزن تفاعل مصدر ہے۔ اسلام میں معاملات کی اصل بنیاد تراضی ہے۔ معاملہ خواہ کوئی ہو، اجارہ ہو، تجارت، رہن یا قرض ہو تراضی بنیادی شرط ہے اس کی تفصیلات ان شاء اللہ پارہ پنجم میں آئیں گی۔

توفّی: یہ لفظ وفا سے بنا ہے۔ اس کے اصل معنے لغت میں کسی چیز کو پورا لینے اور اس پر پورے طور پر قبضہ کرنے کے ہیں۔ نیند کی حالت میں ہوش کو پورے طور پر اٹھا لیا جاتا ہے۔ موت کے وقت رُوح پورے طور پر قبض کر لی جاتی ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی زندگی ہی میں آسمان پر مع جسم کے پورے طور پر اٹھا لیا گیا تھا۔ اس لیے تینوں صورتوں کے لیے قرآن میں لفظ توفی استعمال ہوا ہے۔ کیونکہ پورے طور پر لے لینا، قبض کر لینا موجود ہے یعنی توفی جنس ہے اور رُوح کھینچ لینا، ہوش کھینچ لینا اور جسم سمیت اٹھا لینا یہ تینوں اس کی انواع ہیں۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں توفی کے معنے کسی چیز کو پورے طور پر لینا اور موت اس کی ایک قسم ہے۔ علامہ گازرونی

لکھتے ہیں کہ توفی نیند کے لیے مجازاً استعمال ہوا ہے کیونکہ وہ بھی ایک طرح کا قبض کرنا ہے علامہ مرتضیٰ زبیدی لکھتے ہیں کہ توفی کے معنے موت مجازی ہے۔ علامہ زمخشری اساس البلاغۃ میں رقمطراز ہیں کہ توفی کے معنے حقیقی اور اصلی استیفا اور استکمال کے ہیں اور موت کے معنے مجازی ہیں۔ جن لوگوں کا مذاقِ عربیت پختہ نہیں وہ جب دیکھتے ہیں کہ توفی کا استعمال رُوح قبض کرنے اور مار ڈالنے کے لیے کرتے ہیں تو وہ قبضِ رُوح ہی کو توفی کے حقیقی معنے سمجھ لیتے ہیں یہ سرتاسر غلط ہے۔ بلاغت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ محاورات بلغاً میں اس کا استعمال ہمیشہ اس کے حقیقی معنے میں ہوتا ہے اور چونکہ موت اور نیند میں بھی یہ بات موجود ہے اس لیے ان دونوں کے لیے بھی توفی اسی اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ علامہ ابو البقاء کلیات میں رقمطراز ہیں۔ توفی بمعنے موت و قبض رُوح عوامی محاورہ ہے۔ اور توفی بمعنے پورا لینا اور حق وصول کر لینا بلغاء کا محاورہ ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں موت اور نیند کو بھی توفی سے تعبیر کر دیتے ہیں۔ اس پر تفصیلی بحث انشاءاللہ پارہ سوم میں آ رہی ہے۔

تعریض، اشارۃً کنایۃً کہنا، مبہم کہنا، پردے میں کہنا۔ امام ابو جعفر بیہقی نے "تاج المصادر" میں تعریض کا ترجمہ فارسی میں یہ لکھا ہے سخن سربستہ گفتن۔ اور امام ابو بکر محمد بن عزیز سجستانی نزہۃ القلوب میں لکھتے ہیں۔ تعریض کے معنے بغیر کھولے اور صاف بتائے کسی بات کو اشارے میں کہہ ڈالنا۔ امام راغب لکھتے ہیں' تعریض وہ گفتگو ہے جس میں دو پہلو ہوں۔ ایک صحیح اور دوسرا غلط، یا ایک ظاہر اور دوسرا پوشیدہ،' قاضی ثناء اللہ پانی پتی رقمطراز ہیں۔ جس سے سننے والا کہنے والے کی مراد تاڑ جاتے حالانکہ الفاظ اس کا ساتھ نہ دیتے ہوں نہ حقیقۃً اور نہ مجازاً،۔ اور امام فخر الدین رازی ارقام فرماتے ہیں۔ تعریض لغت میں تصریح کی ضد ہے اس کے معنے ہیں اپنے کلام میں ایسی چیز کو لے آنا جو اپنی مراد بھی بتاتی ہو اور غیر مراد بھی مگر مرادِ متکلم کی طرف اس کی رہنمائی زیادہ مکمل اور زیادہ راجح ہو۔ یہ اصل میں عرض الشی سے بنا ہے جس کے معنے جانب اور کنارے کے ہیں۔ گویا تعریض کرنے والا شخص اپنے مقصد کے گرد گھومتا تو ضرور ہے مگر اسے ظاہر نہیں کرتا۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ایک حاجت مند ایک شخص سے جو اس کی حاجت برآری کر سکتا ہے یہ کہے کہ میں تو حضور کے سلام کو حاضر ہوا ہوں۔ اور تعریض کو تلویح بھی کہہ دیتے ہیں کیونکہ تعریض متکلم کی مراد کی طرف اشارا

ہوتا ہے۔ کنایہ اور تعریض میں یہ فرق ہے کہ کنایہ میں کسی چیز کو اس کے لوازم کے ذریعہ ذکر کیا جاتا ہے مثلاً فلاں کثیر الرماد بڑی راکھ والا ہے یہ کسی کے بہت مہمان نواز ہونے سے کنایہ ہے اور تعریض یہ ہے کہ ایسی بات کا ذکر کرو جس میں تمہارے مقصود کا بھی احتمال ہو اور غیر مقصود کا بھی مگر قرائن احوال اسی بات کے مؤید ہوں کہ اسے تمہارے ہی مقصود پر محمول کیا جائے۔ بعض محققین نے ثابت کیا ہے کہ تعریض اور کنایہ میں عام اور خاص کی نسبت ہے۔ یعنی ہر تعریض تو کنایہ ہو سکتی ہے لیکن ہر کنایہ تعریض نہیں ہوتا۔ میں آپ کے سلام کو آیا ہوں کنایہ بھی ہے اور تعریض بھی اور فلاں بہت راکھ والا کنایہ ہے تعریض نہیں ہے۔ قرآن کی آیت میں تعریض سے مراد عورت کو اس کی عدت میں نکاح کا در پردہ پیغام سنا دینا ہے۔

جہاد: یہ لفظ جہد سے نکلا ہے، جہاد اور مجاہدہ فعال اور مفاعلت کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہے۔ اور لغت میں اس کے معنے محنت اور کوشش کے ہیں، اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنے بھی ہیں یعنی حق کی بلندی، اس کی اشاعت اور حفاظت کیلیے ہر قسم کی جدوجہد قربانی اور ایثار گوارا کرنا۔ اور ان تمام جسمانی، مالی، دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں۔ اس راہ میں صرف کرنا یہاں تک کہ اس کے لیے اپنی اپنے عزیز و اقارب کی، اہل و عیال کی، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی قوت کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا ان کے حملوں کو روکنا۔ اور اس کے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے پوری طرح تیار رہنا بھی جہاد ہے اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

جب جہاد کے معنے محنت اور جدوجہد کے ہیں تو ہر نیک کام اس کے تحت آسکتا ہے اسی عموم کے پیش نظر علماء نے جہاد کی متعدد قسمیں بتائی ہیں۔

۱۔ علماء دل کی اصطلاح میں جہاد کی سب سے اعلیٰ قسم خود اپنے نفس کے ساتھ جہاد کرنا ہے اور اسی کا نام ان کی زبان میں جہاد اکبر ہے۔ سورۂ عنکبوت میں اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو حق کے لیے ہر مصیبت و تکلیف میں ثابت قدم اور بے خوف رہنے کی تعلیم دی ہے اور گذشتہ انبیاء کے کارناموں کا ذکر کیا ہے کہ وہ ان مشکلات میں کیسے ثابت قدم رہے اور بالآخر اللہ نے ان کو کامیاب اور ان کے دشمنوں کو ناکام کیا۔ سورت کے آغاز میں ہے؛

من جاهد فانما یجاهد لنفسہ

جو کوئی جہاد کرتا ہے اپنے ہی لیے جہاد کرتا ہے۔

اور سورت کے آخر میں ہے کہ ہمارے کام میں یا خود ہماری ذات کے حصول میں یا ہماری رضا کی طلب میں جو جہاد کرے گا اور محنت اٹھائے گا اور نبوت کی لائی ہوئی ہدایت اور دعوت کا حلقہ وسیع کرنے غافل خدا فراموش انسانوں کو اللہ کی بندگی کے صحیح راستہ پر لگانے کے واسطے محنت و مشقت کرے گا اور اس راہ میں اپنے وقت اپنے چین و آرام کو تج کرے گا ہم اس کے لیے اپنے تک پہنچنے کا راستہ آپ صاف کر دیں گے اور اس کو اپنی راہ دکھائیں گے۔ یہی مجاہدہ کامیابی کا زینہ اور روحانی ترقیوں کا وسیلہ ہے ارشاد ہے:

والذین جاهدوا فینا لنهدینهم سبلنا وان الله لمع المحسنین

اور جنہوں نے ہمارے بارے میں جہاد کیا یعنی محنت اٹھائی ہم ان کو ضرور اپنا راستہ آپ دکھائیں گے اور بلاشبہ اللہ نیکوکاروں کے ساتھ ہے۔

۲۔ جہاد کی ایک اور قسم جہاد بالعلم ہے۔ دنیا کا تمام تر شر و فساد جہالت کا نتیجہ ہے اسے دور کرنا ہر حق طلب کے لیے ضروری ہے۔ ایک انسان کے پاس اگر عقل و معرفت اور علم و دانش کی روشنی ہے تو اس کا فرض ہے کہ وہ اس سے دوسرے تاریک دلوں کو روشنی پہنچائے۔ اسی لیے ارشاد ہے:

ادع الی سبیل ربک بالحکمة والموعظة الحسنة

تو لوگوں کو اپنے پروردگار کے راستہ کی طرف حکمت و دانائی کے ذریعے بلا

دین کی یہ دعوت و تبلیغ جو سراسر علمی طریق پر ہوتی ہے سرتاسر جہاد ہے اور اسی کا نام جہاد بالقرآن ہے۔ ارشاد ہے:

فلا تطع الکافرین وجاهدهم به جهادا کبیرا

لہٰذا تم کافروں کا کہا نہ مانو ان سے قرآن کے ذریعے بہت بڑا جہاد کرو

ابوبکر جصاص رازی نے احکام القرآن میں اس پر لطیف بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس جہاد کا درجہ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال دونوں سے برتر ہے۔ ہر ایک مسلمان کا فرض ہے کہ حق کی حمایت اور دین کی نصرت کے لیے عقل و فہم علم اور بصیرت حاصل

کرے اور ان کو اس راہ میں صرف کرے اور وہ تمام علوم جو اس راہ میں کام آسکتے ہوں ان کو حاصل کرے۔ یہ جہاد علم کا جہاد ہے جو اہل علم پر فرض ہے۔

۳۔ جہاد بالمال۔ انسان کو اللہ تعالیٰ نے جو مال و دولت دی ہے۔ اس کا منشا بھی یہی ہے کہ اس کو اللہ کی مرضی کے صحیح راستوں میں خرچ کیا جائے۔ حق کی حمایت و اشاعت کا کام چونکہ اکثر روپے پر موقوف ہوتا ہے اس لیے جہاد بالمال کی اہمیت بھی کم نہیں ہے۔ دوسری اجتماعی تحریکوں کی طرح اسلام کو بھی اپنے ہر قسم کی تحریکات اور جدوجہد کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہے۔ قرآن عزیز میں مالی جہاد کے بارے میں تنبیہہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیتیں ہیں بلکہ بمشکل کہیں جہاد کا حکم ہوگا جہاں اس جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو۔

۴۔ جہاد بالنفس۔ اگرچہ جہاد بالنفس یعنی اپنے جسم و جان سے جہاد کرنا جہاد کے ان تمام اقسام کو شامل ہے جن میں انسان کی کوئی جسمانی محنت صرف ہو اس کی آخری حد خطرات سے بے پروا ہو کر اپنی زندگی کو اللہ کی راہ میں نثار کر دینا ہے۔ دین کے دشمنوں سے اگر مقابلہ آپڑے اور وہ حق کی مخالفت پر تل جائیں تو ان کو راستہ سے ہٹانا اور اس صورت میں ان کی جان لینا یا اپنی جان دینا جہاد بالنفس کا انتہائی درجہ کمال ہے۔ ان جاں نثاروں کا نام قانونِ اسلامی کی زبان میں شہید ہے۔ یہ عشق و محبت کے شہید زندہ جاوید ہیں۔

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق		ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

حج :۔ حج کے معنے ارادہ کرنا ہیں اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد و ارادے سے مقدس مقام کا سفر ہے۔ عباداتِ اسلامی میں دین کا چوتھا رکن یا نماز، روزہ، زکوٰۃ کے بعد چوتھا فریضہ، اُمت کے ہر فرد پر خواہ وہ دنیا کے کسی علاقہ کا باشندہ ہو بہ شرطِ استطاعت و صحت و امنِ راہ عمر میں ایک بار فرض ہے۔ گویا دنیائے اسلام کی بین الاقوامی سالانہ کانفرنس، ارکانِ حج یعنی جو چیزیں فرض ہیں وہ تین ہیں۔ الف۔ احرام یعنی حدودِ حرم میں داخلہ سے پہلے عام لباس اتار کر احرام یعنی دو چادریں بے سلی پہن لینا۔ ۲۔ عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو حاضری، اصطلاح میں اسے وقوف کہتے ہیں۔ ۳۔ طوافِ زیارۃ یعنی وقوف کے بعد خانہ کعبہ کا طواف۔ واجباتِ حج چار ہیں۔ ۱۔ ۹، ۱۰ ذی الحجہ کی درمیانی شب میں

مزدلفہ میں قیام ۔ ۲۔ صفا و مروہ کے درمیان کی آمدورفت اصطلاحی نام سعی ہے ۔ ۳۔ مزدلفہ میں قیام کے بعد منیٰ میں کنکریاں پھینکنا، اصطلاحی نام رمی جمرات ہے ۔ ۴۔ طواف کعبہ، یہ طواف فرض کے علاوہ ہے ۔ اور طوافِ صدر کہلاتا ہے ۔ قربانی کرنا، سر کے بال اتروانا وغیرہا بہت سے سنن و مستحبات ان کے علاوہ ہیں ۔

حلق : منیٰ میں قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں ۔ یہ اس رسم کی تعمیل ہے کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے بال منڈواتے، ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے ۔ تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈوا دیے جاتے تھے ۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی ۔ چونکہ حج خدا کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے اس لیے انسانیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی ۔

حرمات : حرمۃ کی جمع ہے حُرمت اس چیز کو کہتے ہیں جس کا ادب ضروری ہو ۔ اہلِ عرب ادب کی وجہ سے خانہ کعبہ کو البیت الحرام کہتے ہیں، پھر اس علاقہ کا ادب جس میں خانہ کعبہ واقع ہے اس کو حرم کہتے ہیں ۔ یعنی ادب کا مقام مکہ مکرمہ کا ایک مخصوص حصہ جس کی حدود میں اللہ تعالیٰ نے اس کے ادب کی وجہ سے کچھ چیزوں کو حرام کر دیا ہے حرم کہلاتا ہے ۔ علامہ ابن علفق نے حدودِ حرم یہ بتائی ہیں ۔ مدینہ طیبہ سے تین میل کے بعد علاقہ حرم شروع ہوتا ہے ۔ طائف کی جانب سے سات میل، جدہ کی سمت میں دس میل، جعرانہ کی جانب نو میل اور یمن کی جانب سات میل ۔ یہ حدودِ حرم ہیں ۔ اور زمان کے لحاظ سے رجب، ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم چار مہینے حرام ہیں ۔ کیونکہ ان کا ادب کیا جاتا ہے ۔ اور اشخاص کے لحاظ سے وہ شخص حرام ہے جو احرام باندھ لیتا ہے اس کا بھی ادب کیا جاتا ہے ۔ گویا علاقہ حرم کا ادب، حرمت والے مہینوں کا ادب اور احرام باندھنے والے لوگوں کا ادب یہ سب مل کر حرمات ہو گئے جب تک ان میں سے کسی کا ادب ملحوظ نہیں رہتا ہے ۔ قرآن نے ان کے آداب کو ملحوظ رکھنے کا ایک ضابطہ بتایا ہے اور وہ یہ ہے کہ الحرمات قصاص ۔

حلال : یہ حل یحل کا مصدر ہے ۔ حلال ہونا ۔ تحلیل و تحریم اصل میں حقِ خداوندی ہے ۔ کسی شخص یا کسی جماعت کو خود کسی چیز کو حرام یا حلال قرار دینے کا حق نہیں ہے ۔ تمام اہلِ سنت والجماعۃ

کا اشیاء کی حلت و حرمت کے بارے میں تحقیقی مسلک یہ ہے کہ یہ تنہا اللہ سبحانہ کے اختیار کی چیز ہے۔ کسی چیز کو حلال یا حرام کرنا صرف اسی کا کام ہے۔ وہ اس میں منفرد ہے۔ اور یہ خالص اسی کا حق ہے۔ کسی دوسرے کو اس میں کسی نوع سے دخل نہیں ہے نہ بالذات کسی کو یہ اختیار ہے اور نہ ہی اللہ نے یہ اختیار کسی کو تفویض کیا ہے۔ چنانچہ شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں الحاکم لا خلاف فی انہ اللہ اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حکم دینا صرف اللہ کا کام ہے۔ یہی عبارت کم و بیش اصولِ فقہ کی مشہور کتاب التوضیح والتلویح میں بھی ہے اور اسی مضمون کو علامہ ابن امیر الحاج نے شرح تحریر الاصول میں اور علامہ اسنوی شافعی نے شرح منہاج الأصول میں نہایت شرح و بسط سے ذکر کیا ہے کہ حکم تشریعی اللہ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ اسی لیے قرآن میں یہ مسئلہ عموماً مسئلہ توحید کے ساتھ بیان ہوتا ہے کیونکہ اللہ کے حکم کے بغیر تحلیل و تحریم شرک ہے۔ شاید آپ کے ذہن میں یہ غلش پیدا ہو کہ حکمِ رسول، حکمِ اہلِ اجماع اور حکم مجتہد سے بھی کچھ چیزیں حرام ہوتی ہیں تو یہ غلش بے معنی ہے کیونکہ اللہ کے رسول کا ارشاد، حکم اہل اجماع اور اجتہاد مجتہد صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کا مظہر و کاشف ہے۔ حاکم صرف اللہ ہی ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں تحلیل و تحریم اس تکوین کا نام ہے جو عالم ملکوت میں نافذ ہوتی ہے کہ فلاں شے پر گرفت ہے یا نہیں۔ یہی تکوین اللہ کی صفات سے ہے۔ اسی تحلیل و تحریم کی نسبت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو تو وہ اس معنے میں ہے کہ آپ کا فرمان قطعی نشانی ہے اللہ تعالیٰ کے حلال یا حرام کرنے کی۔ اور مجتہدین کی طرف نسبت اس معنے میں ہے کہ وہ اس کو نص شارع سے روایت کرتے ہیں یا کلام شارع سے استنباط کرتے ہیں (حجۃ اللہ البالغہ)

خمر : شراب انگوری، اصل میں تو انگور کے کچے پانی کا نام جبکہ وہ نشہ آور ہو خمر ہے لیکن مجازاً ہر نشیلی شراب کو خمر کہہ دیتے ہیں۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں رقمطراز ہیں۔

"باتفاقِ ائمہ لغت انگور کے کچے پانی کا جبکہ وہ نشہ آور ہو خمر نام ہونا حقیقت ہے۔ حتیٰ کہ خمر کا استعمال اس میں مشہور ہے، دوسری شرابوں میں کہ جو مختلف ناموں سے موسوم ہیں اس کا استعمال مجازاً ہے۔"

خمر یا تو خمار سے ماخوذ ہے جس کے معنے خمیر اٹھنے کے ہیں۔ چونکہ اس میں بھی خمیر اٹھ کر جوش پیدا ہوتا ہے اور جھاگ آنے لگتے ہیں اس لیے اس کا نام خمر ہوا۔ یا مخامرۃ سے مشتق ہے

جس کے معنے چھپا لینے کے ہیں۔ چونکہ یہ وسواس کو گم کر دیتی اور عقل و ہوش پر پردہ ڈال دیتی ہے اس لیے اسے خمر کہا گیا ہے۔

خُلع : خلع یہ ہے کہ عورت کہے کہ تو اتنے مال پر مجھ سے خلع کر لے اور مرد کہے کہ مجھے منظور ہے اس کے کہتے ہی عورت پہ طلاق بائن واقع ہو جائے گی خواہ شوہر زبان سے طلاق نہ کہے اور مال کی اتنی مقدار عورت کے ذمہ واجب ہوگی۔ یہ خلع ہے۔ اگر دونوں میں آویزش ہے اور قصور عورت کا ہے اور خود ہی خلع کی درخواست کرتی ہے تو گنہ گار ہوگی اور مرد مال لینے میں گنہ گار نہ ہوگا۔ البتہ مہر سے زیادہ لینا مکروہ ہے۔ اور اگر قصور وار مرد ہے تو خلع کا مال لینے میں مرد گنہ گار ہوگا اور عورت گنہ گار نہ ہوگی۔

خطبہ : پیغام نکاح، منگنی نکاح کی ابتدائی بات چیت کو خطبہ کہتے ہیں۔ یہ لفظ اگر خا کے پیش کے ساتھ ہو تو وعظ و نصیحت اور تقریر کے معنے ہیں اور خا کے زیر کے ساتھ ہو تو نکاح سے قبل نکاح کی بات چیت کے معنے میں ہے۔

رجعت : اگر شوہر طلاق رجعی کے بعد بیوی کو واپس لینا چاہے تو عدت کے اندر اندر اسے واپس لینے کا حق ہے۔ رجعت یہ ہے کہ بیوی سے کہہ دے کہ میں نے تجھ سے رجعت کی یا عملاً کوئی ایسا کردار پیش کر لے جو میاں اور بیوی کے لیے عرف میں بطور عنوان ہوں۔ اس رجعت سے پہلا نکاح قائم رہتا ہے۔ رجعت کا اعلان اور اس پر گواہ مقرر کرنا ایک امر مستحب ہے لیکن یاد رہے کہ رجعت طلاق رجعی کے اثر کو ختم کرتی ہے، طلاق کو منسوخ نہیں کرتی۔ اگر اس کے بعد پھر طلاق دے گا تو یہ دوسری طلاق تصور ہوگی۔ اور اب بھی اسے رجعت کا حق حاصل ہے۔ رجعت صرف طلاقِ رجعی میں ہوتی ہے طلاقِ بائنہ میں نہیں ہوتی۔

رفث : عورتوں سے اختلاط کرنا، عورتوں سے بے پردہ ہونا، عورتوں کی طرف رغبت کرنا۔ رفث یرفث کا مصدر ہے۔ اس کے معنے فحش بات کہنے اور جماع کرنے کے ہیں۔ قاضی بیضاوی رفث کے معنے بیان کرتے ہیں ھو الافصاح بما یجب ان یکنی عنہ جس چیز کو کنایہ سے بیان کرنا چاہیے اس کو کھول کر کہنا۔ ان کا بیان ہے کہ جماع سے کنایہ ہے کیونکہ جماع تقریباً رفث سے خالی نہیں ہوتا۔ زجاج نے جو ائمہ لغت میں سے ہیں اس کی تعریف یہ کی ہے کہ رفث ایسا کلمہ ہے جو ہر اس چیز کو شامل ہے جس کی مرد عورتوں سے خواہش رکھتے ہیں۔ علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔ رفث وہ کلام ہے جو جماع اور دواعی جماع پر برانگیختہ کرنے

والی اشیاء کے ذکر پر مشتمل ہو کر جن کا بیان کرنا قبیح سمجھا جاتا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ بڑے کریم ہیں کنایہ سے کام لیتے ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی حدیث

من حج للہ فلم یرفث ولم یفسق رجع کیوم ولدتہ اُمّہ

جس نے اللہ کے لیے حج کیا پھر نہ رفث کیا اور نہ فسق کیا تو اس طرح واپس ہوتا ہے جیسے آج ہی اپنی ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا۔

کی شرح میں لکھتے ہیں کہ — آیت میں جمہور کے نزدیک رفث سے جماع مراد ہے، اور بظاہر حدیث میں رفث سے اس سے زیادہ عام چیز مراد ہے۔ قرطبی کی بھی یہی رائے ہے اور اس حدیث کا بھی یہی منشا ہے۔ جو روزے کے موضوع پر آئی کہ جب تم میں سے کسی کا روزہ ہو تو رفث نہ کرے یعنی بیہودہ کلام نہ کرے۔ (فتح الباری)

سفر: دُور کی مسافت قطع کرنے کا نام سفر ہے۔ اصل میں سفر کے معنے پردہ ہٹانے کے ہیں۔ سفر کو سفر اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ اس میں یہ معنے محفوظ ہیں۔ علامہ ابن سیدالناس المحکم میں لکھتے ہیں۔ اس نام سے سفر اس لیے موسوم ہوا کہ جس طرح ہوا سوکھے پتوں کو لاتی اور لے جاتی ہے، متفرق کرتی ہے اسی طرح سفر میں بھی آمد و رفت ہوتی ہے۔ اور امام ابومنصور ازہری فرماتے ہیں کہ — سفر کا نام اس لیے سفر پڑا کہ وہ مسافروں کے رُخ اور ان کے اخلاق کو ظاہر کرتا ہے۔ اور جو بات چھپی ہوتی ہے وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔ اور قانون کی زبان میں سفر سے خاص قسم کی قطع مسافت مراد ہے جس سے احکام شرعیہ متغیر ہو جاتے ہیں۔ آئمہ احناف کے نزدیک جس سفر سے احکام تبدیل ہو جاتے ہیں وہ یہ ہے کہ انسان تین دن رات کی مسافت کا ارادہ کرے۔ مسافت اونٹ کی رفتار سے ہو یا پیادہ روی سے۔ پھر چال درمیانی ہو۔ یہی امام سفیان ثوری اور امام حسن بن صالح کا مسلک ہے۔ ابوبکر الجصاص رقمطراز ہیں کہ — لغت اور زبان کی مدد سے سفر کی مدت متعین نہیں ہو سکتی اس کا تعلق لوگوں کے عرف اور عادت سے ہے، عرف و عادت سے متعلق چیز کی تحدید ناممکن ہے۔ ہاں اگر یوں کہا جائے کہ سفر کے معنے کھولنے کے ہیں۔ کسی دُور مقام کی طرف جانے کو سفر اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں مسافر کے احوال و اخلاق کھل کر سامنے آجاتے ہیں اور ظاہر ہے اخلاق و احوال کی نمائش کے لیے ذرا وقت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اخلاق و احوال کا پتہ گھنٹوں میں نہیں بلکہ دنوں میں لگتا ہے۔ عرف میں بھی قریب کی مسافت کو

سفر نہیں بلکہ دُور کی مسافت کو سفر کہتے ہیں۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ تین دن کی مسافت سفر صحیح ہے اور اس سے کم پر اختلاف ہے۔ اس کی تائید حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اُس ارشاد سے ہوتی ہے جو بحوالہ ابن عمر مروی ہے کہ عورت بغیر محرم کے تین دن کا سفر نہ کرے۔ معلوم ہوا کہ اصل سفر تین دن ہے۔ علامہ اکمل الدین بابرتی نے عنایہ میں ان احکام و قوانین کی نشاندہی کی ہے جو سفر کی وجہ سے بدل جاتے ہیں۔ مثلاً نماز کا قصر کرنا، روزے میں افطار کا مباح ہونا، موزوں پر مسح کی مدت کا تین دن ہونا، جمعہ عیدین اور قربانی کا واجب نہ ہونا، بغیر محرم کے آزاد عورت کا نکلنا حرام ہونا (دیکھو عنایہ علی الہدایہ)

سبیل اللہ: سبیل راستہ، اصل میں اس راستہ کو کہتے ہیں جو واضح ہو اور اس میں سہولت ہو۔ حافظ ابوالسعادات ابن الاثیر لکھتے ہیں کہ ــــ سبیل اللہ کا لفظ عام ہے جو ہر اس خالص عمل پر آتا ہے جس کے ذریعے اللہ سبحانہ کے تقرب کے راستہ پر فرائض، نوافل اور انواع عبادات کی ادائیگی کے ذریعے ایک مسلمان گامزن ہو اور جب یہ مطلق استعمال ہو تو بیشتر جہاد کے معنے میں آتا ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں وہ تمام کام جو براہِ راست دین و ملت کی حفاظت و تقویت کے لیے ہوں سبیل اللہ ہیں اور چونکہ حفظ و صیانت اُمت کا سب سے ضروری کام دفاع ہے اس لیے زیادہ تر اطلاق اسی پر ہوتا ہے ورنہ دین و ملت کے عام مصالح مثلاً قرآن و علومِ دینیہ کی اشاعت کا کام، مدارس کے اجرا و قیام دعاۃ و مبلغین اور ہدایت و ارشاد اُمت کے تمام مفید کام سبیل اللہ ہیں۔ مصاریف زکوٰۃ میں قرآن نے جہاں ایک مصرف فی سبیل اللہ بتایا ہے فقہاءِ حنفیہ میں سے صاحب فتاویٰ ظہیریہ لکھتے ہیں کہ المراد طلبۃ العلم اس سے مراد طالبانِ علم کی امداد ہے اور صاحب بدائع کے نزدیک وہ تمام کام جو نیکی و خیرات کے لیے ہوں اس میں داخل ہیں۔

شرک: قرآن نے مشرکین اور مشرکات سے نکاح کی ممانعت کی ہے۔ یہ قرآن کا خاص اصطلاحی لفظ ہے۔ لغت میں اس کے معنے ساجھا، ساجھی بنانا، شریک شرکۃ اور اشتراک سے اسم ہے۔ شاہ عبدالقادر نے موضح القرآن میں زیرِ آیہ ولا تنکحوا المشرکات لکھا ہے کہ شرک یہ ہے کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے یا وہ جو چاہے کر سکتا ہے یا ہمارا بھلا یا بُرا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے اور اس سے حاجت مانگے، اس کو مختار جان کر۔ اور

سورۃ نساء میں زیرِ آیۃ ان اللّٰہ لا یغفران یشرک بہ تحریر فرماتے ہیں۔ فرمایا کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو د شرک، فرمایا حکم میں شرک کرنے کو یعنی سوائے اسلام کے اور دین پسند کرے اور اس پر چلے۔ پس جو دین ہے سوائے اسلام کے شرک ہے۔ اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔ اور سورہ انعام میں زیرِ آیت وان اطعتموھم انکم لمشرکون فرماتے ہیں کہ شرک فقط یہی نہیں ہے کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ یہ بھی شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔ شاہ صاحب نے یہ بات کھول کر بتا دی کہ شرک جس سے قرآن روکتا ہے وہ صرف پوجا تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی شرک ہے کہ حکم میں اللہ کے سوا کسی اور کی اطاعت کرے۔ اللہ کی پوجا کو پرستش اور اللہ کی طاعت کو بندگی کہتے ہیں۔ پرستش اور بندگی دونوں میں شرک سے قرآن نے روکا ہے۔ شاہ صاحب نے اپنی خداداد فراست سے ترجمہ قرآن میں اس کی رعایت کی ہے جہاں پرستش کا ذکر ہوتا ہے وہاں شاہ صاحب عبادت کا ترجمہ پوجنا فرماتے ہیں اور جہاں بندگی کا ذکر ہوتا ہے وہاں عبادت کا ترجمہ بندگی فرماتے ہیں اور پھر اسی لحاظ سے وہ لفظ الٰہ کے معنے بتاتے ہیں۔ جہاں عبادت کو پرستش کے معنے میں بولتے ہیں وہاں الٰہ کے معنے معبود کرتے ہیں اور جہاں بندگی کے معنے کرتے ہیں وہاں الٰہ کے معنے صاحب اور حاکم کے بتاتے ہیں۔ اور اسی بنا پر قرآن میں جیسے نیازمندانہ اعمال کو اللہ کے علاوہ کسی کے لیے کرنے سے منع کیا ہے ایسے ہی تحلیل و تحریم کا حق اللہ کے علاوہ کسی اور کے لیے ماننے سے روکا ہے۔ بہرحال شاہ صاحب نے شرک کے موضوع پر موضح القرآن میں متفرق مقامات پر مختصر الفاظ میں جو کچھ فرمایا ہے اس کی تفصیل ان کے بھتیجے مولانا محمد اسماعیل صاحب شہید نے تقویت الایمان میں پیش کی ہے۔ اس سے بہتر اور مفید کتاب اُردو میں اس موضوع پر شاید کوئی ہو۔

صلوٰۃ: نماز، دعا، رحمت، صلوٰۃ یعنے عبادت مخصوصہ کی اصل یہی دعا ہے، جس طرح کسی شئے کو اس کے بعض اجزا کے لحاظ سے موسوم کرتے ہیں اسی طرح یہ عبادت یعنی نماز بھی صلوٰۃ سے موسوم ہوئی۔ کہ دُعا پر مشتمل ہے۔ نماز ان عبادات میں سے ہے کہ جس سے کوئی شریعت خالی نہیں ہے۔ اگرچہ اس کی صورتیں مختلف رہی ہیں۔ پہلے پارے میں نماز کی اقامت پر زور دیا گیا تھا اس پارے میں نمازوں کی محافظت پر زور دیا گیا ہے

نماز کس طرح پڑھنی چاہیے اور کن کن اوقات ہیں اور کتنے رکعتیں کرکے پڑھنی چاہیے اور اس کے کیا کیا آداب وشرائط ہیں۔ قرآن میں آداب وشرائط کے ساتھ نماز کی بجاآوری کی طرف اقامت سے اشارہ کیا ہے اور کتنی نمازیں ہیں اور کتنے اوقات اس کی طرف اسی پارے میں آیت محافظت سے اشارہ کیا ہے۔ دیکھو آیت ۲۳۸۔ اس آیت سے یہ بات بتصریح ظاہر ہوتی ہے ——— کہ ہم کو نماز کس طرح اور کن اوقات میں اور کتنی رکعتوں کے ساتھ پڑھنی چاہیے۔ خود اللہ تعالیٰ نے اسی طرح تعلیم فرمائی ہے جس طرح خود قرآن کی اس اجمال کی تشریح سنت نبوی کے ذریعے احادیث میں تحریراً اور اہل ایمان کے نسلاً بعد نسل منتقلہ تواتر عمل میں عملاً موجود ہے اور قرآن پاک میں اس کے عملی حوالے اور متعلقہ احکام مذکور ہیں۔

صوم : روزہ بہ صام یصوم کا مصدر ہے جس کے معنے روزہ رکھنے کے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں۔ صوم کے معنے اصل میں کام سے رک جانے کے ہیں۔ خواہ کھانا یا گفتگو کرنا یا چلنا پھرنا۔ اسی لیے اس گھوڑے کو جو چلنے پھرنے اور گھاس چارے سے رک جائے صائمہ کہا جاتا ہے۔ شاعر کہتا ہے ؎ خیل صیام واخری غیر صائمۃ۔ اور تھمی ہوئی ہوا کو صائم بولتے ہیں نیز ٹھیک دوپہر کو صوم کہتے ہیں۔ اسلامی قانون میں صوم سے مراد مکلف کا نیت کے ساتھ صبح صادق سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے استمنا اور استقاء سے رک جانے کا نام صوم ہے۔

صدقۃ : خیرات، زکوٰۃ، امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔ صدقہ وہ ہے جس کو انسان اپنے مال میں سے بطور عبادت نکالتا ہے جیسے کہ زکوٰۃ۔ لیکن صدقہ اصل میں نفلی خیرات کے لیے بولا جاتا ہے اور زکوٰۃ واجب کے لیے۔ اور کبھی واجب کو صدقہ کہا جاتا ہے جبکہ اس کا ادا کرنے والا اپنے فعل میں صدق کا ارادہ کرے۔ ارشاد ہے خذ من اموالھم صدقۃ۔ صدقہ اسلام کی قانونی زبان میں ہبہ کی طرح ہے۔ الدر المختار میں ہے الصدقۃ کالھبۃ یعنی صدقہ ہبہ کی طرح ہے۔ اور ہبہ کے لیے شرط یہ ہے کہ مالک کی ملک سے نکل کر دوسرے کے قبضہ میں چلا جائے۔ اسی بنیاد پر فقہاء نے یہ قانون بنایا ہے کہ لا یتم التبرع الا بالقبض کوئی مالیاتی نیکی بغیر قبضہ دیے پوری نہیں ہوتی ہے۔ قانون کی زبان میں جسے صدقہ کہتے ہیں اس کے لیے قبضہ اور ملکیت بنیادی شرط ہے چاہے یہ روزے کا صدقہ ہو

اور چاہے کفارہ قسم ہو، سب کے لیے مالک بنانا اور قبضہ دینا شرط ہے۔ آپ روزے کا کفارہ یا نذر کا صدقہ دینا چاہتے ہیں اور جتنا صدقہ کرنا چاہتے ہیں اس قیمت کا آپ نے کھانا پکایا اور محتاجوں، مسکینوں کی دعوت کر دی۔ انہوں نے آکر آپ کے گھر دعوت کھا لی تو قانون کی زبان میں یہ طعام اباحت ہے صدقہ نہیں ہے نہ روزے کا کفارہ ادا ہوگا اور نہ نذر پوری ہوگی۔ صدقہ کے لیے شرط یہ ہے کہ اسے ملکیت میں دیا جاتا اور ملکیت بغیر قبضہ کے درست نہیں ہے۔ اسی بنا پر قربانی کو صدقہ نہیں کہتے وہاں مالک بنانا عبادت نہیں صرف خون بہانا عبادت ہے۔ حج میں فدیہ کے موضوع پر یہ تفصیل کہ حالتِ احرام میں اگر کوئی بیمار ہو اور احرام کی حالت میں حجامت بنا لے تو اسے چاہیے کہ فدیہ دے یعنی روزے رکھے یا صدقہ دے یا قربانی دے اس کا مؤید ہے۔

ضرار: ستانا، ایذا دینا، تکلیف پہنچانا، ضرر پہنچانا ضارّ یضارّ باب مفاعلہ کا مصدر ہے جس کے معنے ایک دوسرے کو گزند پہنچانے کے ہیں۔ اسی سے زبانِ نبوت نے وہ دستوری دفعہ مستنبط فرمائی ہے جو امام مالکؒ نے اور ابن ماجہ اور دارقطنی نے اپنی سنن میں روایت کی ہے میری مراد وہ ارشاد ہے جس کے الفاظ یہ ہیں لاضرر ولاضرار، ضرر کسی کو نقصان پہنچانا اور ضرار نقصان کا جواب نقصان سے دینا ہے۔ یعنی اسلام نہ کسی کو نقصان پہنچانے کی اجازت دیتا ہے اور نہ نقصان کے جواب میں نقصان پہنچانے کی اجازت دیتا ہے۔ اسلام کے قانون ساز اداروں نے اس دستوری دفعہ کی روشنی میں متعدد قوانین بنائے ہیں۔ مالیاتی اور تعزیری قوانین ہی نہیں بلکہ اصلاحی قوانین بھی بنائے ہیں۔ اگر کسی نے آپ کا گلاس توڑ دیا ہے تو قانون آپ کو اس کے جواب میں دوسرے کا گلاس توڑنے کی اجازت نہیں دیتا بلکہ قانون آپ کے نقصان کی تلافی قیمت سے کرتا ہے۔ فوجداری قانون کا معاملہ اس سے بالکل جدا ہے وہاں مجرم کو یہ احساس دلانا ہے کہ دوسرے پر حملہ اپنے پر حملہ کرنے کے مترادف ہے۔ مالیاتی قانون کی بہت سی دفعات اسی آئینی دفعہ پر مبنی ہیں۔

۱۔ زمین کھیتی کے لیے کرایہ پر لی گئی۔ کٹائی سے پہلے کرایہ کی مدت ختم ہوگئی۔ تو زمین کو اسی اجرت پر کرایہ دار کے قبضہ میں رکھا جائے گا۔ کرایہ دار کو کھیتی کاٹنے پر مجبور نہ کیا جائے گا۔

۲۔ مارکیٹ میں فروٹ کا سودا ہو چکا ہے لیکن خریدار رقم کی ادائیگی سے پہلے کہیں چلا گیا۔ دکاندار کو پھلوں کے خراب ہونے کا اندیشہ ہو تو دکاندار بیع کو فسخ کر کے کسی دوسرے کے ہاتھ فروخت کر سکتا ہے۔

۳۔ غنڈہ گردی اور فساد کاری میں شہرت رکھنے والوں کو گرفتار کر لینا اور عدالت میں جُرم ثابت ہونے سے پہلے ان کو قید میں ڈال دینا جائز ہے۔

طلاق، طلاق، جُدائی، رُخصت کرکے چھوڑ دینا، نکاح کی قید سے باہر آنے کو طلاق کہتے ہیں۔ یہ مصدر ہے اس کا فعل باب نصر اور کرم دونوں سے آتا ہے۔ نیز طلاق بمعنے تطلیق چھوڑ دینے کے لیے اسم ہو کر بھی مستعمل ہے۔ علامہ السید شریف جرجانی کتاب التعریفات میں رقمطراز ہیں۔ طلاق کے معنے لغت میں قید سے رہا کرنے اور چھوڑ دینے کے ہیں۔ اور شریعت میں ملک نکاح کے زائل کرنے کو کہتے ہیں۔ طلاق بدعت یہ ہے کہ عورت کو تین طلاقیں ایک ہی کلمہ کے ساتھ دی جائیں، یا تینوں ایک ہی طہر میں دی جائیں۔ طلاقِ سنت یہ ہے کہ مرد عورت کو تین مرتبہ تین مجلسوں میں تین طہروں میں دے۔ طلاق احسن یہ ہے کہ مرد عورت کو ایسے طہر میں ایک طلاق دے جس میں عورت سے جماع نہ کیا ہو اور دوسری طلاق نہ دے یہاں تک کہ وہ اپنی عدت پوری کر لے۔ اور در مختار میں مرقوم ہے۔ قانون میں طلاق خاص لفظ کے ذریعے عورت کو قیدِ نکاح سے آزاد کرنے کو کہتے ہیں۔ خواہ یہ آزادی فی الحال ہو جیسے طلاق بائن میں ہوتی ہے یا اس کا انجام آزادی ہو جیسے طلاق رجعی میں عدت گزرنے کے بعد ہوتا ہے۔

عمرہ: زیارتِ بیت اللہ کے سلسلے میں ایک مخصوص عبادت کا نام ہے جو حج کی طرح خاص وقت کے ساتھ مقید نہیں ہے۔ ہاں عمر بھر میں ایک بار اس کی ادائیگی بشرطِ استطاعت سنتِ مؤکدہ ہے۔ شاہ عبدالقادر موضح القرآن میں فرماتے ہیں — عمرہ کا طریق یہ ہے کہ احرام باندھے جن دنوں چاہے طوافِ کعبہ کرے اور صفا اور مروہ میں دوڑے پھر حجامت کرا کے احرام کھول دے۔ فقہاء میں سے صاحبِ جوہرہ اور صاحب بدائع عمرہ کے وجوب کے قائل ہیں۔

عرفات: مشہور جگہ کا نام ہے جہاں ۹ ذی الحجہ کو زوالِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک وقوف کرنا حج کا اہم ترین رکن ہے۔ صاحبِ قاموس لکھتے ہیں کہ عرفات مکہ مکرمہ سے بارہ میل کے

فاصلہ پر ہے اور علامہ مرتضیٰ زبیدی نے اس کی شرح میں لکھا ہے کہ جغرافیہ نویسوں کی بھی یہی تحقیق ہے۔ مکہ معظمہ سے جو سڑک مشرق کی جانب طائف کو جاتی ہے اس پر مکہ سے کوئی بارہ میل پر کئی میل کا لمبا چوڑا میدان ہے۔ اسی کا نام عرفات ہے۔
عرفات کی وجہ تسمیہ کے بارے میں تاج العروس نے پانچ وجوہ لکھی ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ عرفات کو المشعر الحرام، المشعر الاقصیٰ اور الاَل بروزن ہلال بھی کہتے ہیں۔ اور عرفات کے درمیان جو پہاڑ ہے اسے جبل الرحمۃ کہتے ہیں۔

عرضۃ: نشان، آڑ، علامہ آلوسی روح المعانی میں رقمطراز ہیں ——— عرضہ بروزن فعلہ بمعنے مفعول ہے جیسے قبضہ اور غرفہ۔ اس کے معنے باب نصر یا ضرب سے اس کے معنے آڑ بنانے کے ہیں۔ اور علامہ ابوبکر ابن العربی نے احکام القرآن میں عرضہ کی شرح میں فرمایا ہے — ع ر ض کا مجموعہ عربی زبان میں مختلف معانی میں گردش کرتا رہتا ہے۔ مگر ان معانی کا مرجع روکنا اور منع کرنا ہے۔ کیونکہ جو چیز بھی عارض ہوتی ہے وہ مانع بن جاتی ہے چنانچہ بادل آسمان پر چھا جاتا ہے اس کو اسی لیے عارض کہتے ہیں کہ وہ آسمان، چاند اور سورج کے درمیان رکاوٹ ہو جاتا ہے۔ محاورہ ہے ھذا عرضۃ لک یہ تو تمہارا بہانہ ہے ——— قرآن میں اللہ کو قسموں کے لیے آڑ بنانے کی جو ممانعت آئی ہے اس کے دو مطلب بتائے گئے ہیں ایک یہ کہ کسی اچھے کام کے نہ کرنے پر قسم نہ کھاؤ اور پھر جب اس کے کرنے کو کہا جائے تو قسم کی آڑ نہ لو۔ اس تفسیر پر عرضہ کے معنے آڑ اور مانع کے ہیں اور دوسرا مطلب یہ کہ اپنا کام نکالنے کے لیے بات بات پر اللہ کی قسم نہ کھایا کرو کہ اس صورت میں اللہ کا باعزت نام تمہاری قسموں کا نشانہ بن جائے گا اور تم ہر وقت قسم کے ذریعے کام نکالنے کی فکر میں لگے رہو گے۔ اس تفسیر پر عرضہ کے معنے بہانہ کے ہیں۔ بہرحال قرآن نے دونوں باتوں سے روکا ہے۔

فدیہ: وہ چیز جو جان بچانے کے لیے لی یا دی جائے۔ ایک مثل ہے خذ علی ھدیتک و فدیتک، اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی پہلی چال پر چلو، یہ لفظ دوسرے پارے میں روزے اور حج کے ذکر میں آیا ہے۔ حج کے موضوع پر احرام کی حالت میں عذر کی وجہ سے حجامت بنانے پر فدیہ ہے۔ فدیہ کی تین صورتیں ہیں۔ روزے رکھ لیے جائیں، مسکینوں کو صدقہ دیا جائے یا پھر قربانی کر دی جائے۔ اور روزے کے بیان میں فدیہ کا

ذکر علی الذین یطیقونہ فدیۃ میں آیا ہے، اس کی تفسیر و تاویل میں صحابہ کی زمانہ سے اختلاف ہے۔ ۱۔ بعض صحابہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رمضان میں پہلے چند روزے فرض ہوتے تھے، ان روزوں کے متعلق یہ اجازت تھی کہ چاہے روزے رکھیں اور چاہے روزے کی جگہ ایک مسکین کا کھانا دے دیں۔ رمضان کی فرضیت کے بعد یہ اجازت منسوخ ہو گئی۔ ۲۔ دوسری روایت یہ ہے کہ یطیقونہ کی ضمیر صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو لوگ فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں وہ روزے کے ساتھ فدیہ بھی ادا کریں۔ بعد کو یہ منسوخ ہو گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ نے اس فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے جو رمضان کے بعد ہر مستطیع روزے دار پر واجب ہوتا ہے۔ ۳۔ تیسری روایت یہ ہے کہ یہ آیت محکم ہے اور یہ اجازت ان لوگوں کے لیے ہے جو روزے سے معذور ہوں جیسے بوڑھے اور حاملہ۔

قروء: جمع قرء کی، لفظ قرء لغات اضداد میں سے ہے، اہلِ حجاز کی زبان میں طہر (پاکی) اور اہلِ عراق کی زبان میں حیض کو کہتے ہیں۔ احناف کے نزدیک حیض اور شوافع کے طہر مراد ہے۔ اصل میں قرء کے معنے ایک حال باقی سے دوسرے حال باقی کی طرف منتقل ہونا حیض سے طہر کی طرف اور طہر سے حیض کی طرف منتقل ہونے کو قرء کہتے ہیں۔ اسی لیے جس عورت کو حیض نہ آتا ہو، زیادہ عمر رسیدہ ہو یا صغیر السن ہو، اس کے طہر کو قرء نہیں کہتے۔ (راغب) قرء کے معنے وقت بھی ہے۔ ابن قتیبہ نے القرطین میں اس کے لیے مختلف شواہد پیش کیے ہیں۔

قبلہ: کعبہ کا رُخ جو نماز میں سامنے ہوتا۔ سامنے کا رُخ محاورہ ہے این قبلتک تمہارا رُخ کدھر ہے؟ جو چیز منہ کے سامنے ہو اُس کو بھی قبلہ کہتے ہیں۔ نماز پڑھنے والے کے سامنے کعبہ ہوتا ہے۔ اس لیے کعبہ کو بھی قبلہ کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی نے المفردات اور پروفیسر عبدالرؤف نے معجم القرآن میں لکھا ہے کہ ـــ اصل لغت میں سامنے والے مقابل آدمی کی حالت کو قبلہ کہا جاتا ہے، مجازاً سامنے والے آدمی اور سامنے کی جہت میں اس کا استعمال ہونے لگا ہے لیکن ۱۱/۸۷ سورۂ یونس میں قبلہ سے مراد نماز کا مقام ہے۔ فرعون نے چونکہ نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی تھی اس لیے بنی اسرائیل کو حکم دیا گیا کہ اپنے گھروں ہی کو مقام نماز بنا لو۔ سیوطی، خازن و معجم القرآن۔

قصاص : قصص سے قصاص بروزن فعال بنا ہے۔ اس بدلہ کو کہتے ہیں جو اصل جُرم کے برابر ہو۔ اصل میں قصص کے معنے نقشِ قدم پر چلنے کے ہیں۔ قصہ کو بھی قصہ اس لیے کہتے ہیں کہ قصہ بیان کرنے والا ویسا ہی بیان کرتا ہے جیسا واقعہ ہوتا ہے۔ گویا اصل واقعہ کی پیروی اپنے بیان میں کرتا ہے۔ قصاص بدلہ کو بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کی سزا میں اصل جُرم کی پیروی کی جاتی ہے جیسا جُرم ویسا ہی اس کا بدلہ۔ کسی نے مار ڈالا اس کو قتل کر دیا جائے، ہاتھ توڑ دیا اس کا ہاتھ توڑ دیا جائے، جیسا اس نے کیا اور جتنا اس نے کیا ایسا ہی اور اتنا ہی اس کے ساتھ کیا جائے۔ گویا اصل جُرم کے نقشِ قدم پر چلا جائے۔ اسلام کی قانونی زبان میں قصاص نام ہے قتل، قطع اور جرح عمداً کیے ہوئے جُرم کے لیے اسی جیسی سزا کا۔ اسلام میں فوجداری ضابطہ کی بنیاد مساوات پر ہے۔ اسی پر انسان کی حیاتِ اجتماعی کا بقا موقوف ہے اور اس کے ذریعے انسانی زندگی کو دست درازی سے امن مل سکتی ہے اس برابری کی بنیاد کا فائدہ یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے خلاف عدوان کی یہ خیال کر کے جُرأت نہیں کر سکتا کہ خود اس کی زندگی کو بھی خطرہ لاحق ہوگا۔ زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص کا قتل قبائل کے قتل کا سامان بن جاتا تھا۔ اسلام کے اس عادلانہ قانون نے اس کا راستہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ شاید جدید مغربی قانون کے دلدادے اپنے اندر یہ خلش محسوس کریں کہ قتل کے بدلہ میں قتل انسانی زندگی کو ختم کرنے کے مترادف ہے اس لیے زمانہ کی ترقیوں کے مطابق اس میں ترمیم ہونی چاہیے۔ صورتیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ آپ قاتل کو قتل کی سزا دے کر پوری شہری زندگی کو محفوظ کر لیں، دوسرے یہ کہ آپ قاتل کی جان بچا کر پوری شہری زندگی کو غنڈوں، اچکوں اور آوارہ لوگوں کے حوالہ کر دیں۔ غور فرمایئے ایک قتل جو عدالت کے ذریعہ ہو جاتے اور شہری زندگی محفوظ ہو جائے یا یہ کہ پوری شہری زندگی قاتلوں کے حوالے ہو کر رہ جائے۔ پہلی بات کے نتیجہ میں قتل بند ہوگا، دوسری کے نتیجہ میں قاتلوں کی مارکیٹ کھل جائے گی اور کھلے بازار انسانوں کی جانوں کے سودے ہوں گے۔ قرآن نے اس کی طرف ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

مشعر الحرام : اسم ظرف اور مصدر میمی علامت نشان مُراد مزدلفہ یعنی مزدلفہ کی دونوں پہاڑیوں کے درمیان کا رقبہ اور خود سارے مزدلفہ کو بھی کہتے ہیں۔ مزدلفہ مکہ سے چھ میل کے فاصلہ

پر ہے۔ منیٰ سے عرفات جانے کا ایک تو سیدھا راستہ ہے۔ حاجی ۹ کو عرفات اسی راستہ سے جاتے ہیں، واپسی میں حکم ہے کہ دوسرے راستہ سے لوٹیں، یہ ذرا چکر کا ہے اور مزدلفہ اسی راستہ میں پڑتا ہے۔ حاجیوں کے قافلے رات کو دس بجے یہاں پہنچ جاتے ہیں اور رات یہاں تسبیح و تہلیل، نماز و استغفار میں گزارتے ہیں۔ مسجد پہاڑی کے اوپر ہے۔ جیسے ظہر اور عصر کی نماز بقاعدہ تقدیم عرفات کی مسجد نمرہ میں ملائی گئی تھی اسی طرح مغرب کی نماز بقاعدہ تاخیر عشا سے ملا کر مزدلفہ میں پڑھی جاتی ہے۔ یہی مشعر الحرام میں اللہ کو یاد کرنا ہے۔

متعہ : اصل ارشاد یہ ہے کہ جن عورتوں سے نکاح ہو گیا لیکن نکاح میں مہر مقرر نہ ہوا ہو اور خلوت سے پہلے طلاق ہو گئی ہو تو حکم یہ ہے کہ مرد اپنی حیثیت کے مطابق جس قدر دے سکتا ہے دے۔ اصل لفظ متوعن ہے۔ فقہا نے لفظ متعہ بنا لیا ہے۔ اور یہ عورت کو دینا شوہر پر واجب ہے لیکن اس کی مقدار کیا ہے۔ امام شافعی کے نزدیک مقدار کی تعیین کا اختیار عدالت کو ہے۔ شوہر کی تنگدستی یا فراخ دستی کے پیش نظر جتنی مقدار چاہے دلوا سکتی ہے۔ احناف کے نزدیک چادر، دوپٹہ، کرتہ دینا ضروری ہے لیکن کیسا کس قیمت کا اس کی تعیین شوہر کے حال کے مطابق کی جائے گی۔ قدوری اور کرخی نے عورت کے حال کا بھی اعتبار کیا ہے۔ تفصیل آیت نمبر ۲۳۶ میں ملاحظہ فرمائیے۔

مساس : کنائی زبان میں اس سے عورت کے ساتھ خلوت صحیحہ مراد ہوتی ہے۔ لیکن منکوحہ عورت کے لیے جائز خلوت کو بطور کنایہ مس کہتے ہیں ناجائز تعلق کے لیے یہ لفظ مستعمل نہیں ہے۔ اور زن و شو کے تعلقات جنسی کے لیے یہ قرآن میں کنائی تعبیرات اس بات کی دلیل ہیں کہ قرآن اپنے مخاطبوں کو ان معاملات میں کس قسم کی زبان استعمال کرنے کی تلقین کرنا چاہتا ہے۔ اس پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ تیسرے پارے میں آرہا ہے۔

نکاح : اصل لغت میں اس کے معنے عورت سے ہم بستری کے ہیں اور قانون کی زبان میں اس معاملہ کو کہتے ہیں جس کے ذریعہ عورت سے جنسی انتفاع مرد کے لیے روا ہو سکتا ہے اس معاملہ کے وجود میں آنے کے لیے ضروری ہے ایجاب و قبول کے الفاظ۔ دو گواہوں کی موجودگی میں اصالتاً یا وکالتاً کیے جائیں۔ قرآن میں لفظ نکاح لغوی اور قانونی دونوں معنے میں استعمال ہوا ہے۔ آیت ۲۳۰ میں اس بارے میں حتیٰ تنکح زوجاً غیرہ میں

نکاح اصطلاحی معنے میں نہیں بلکہ لغوی معنے میں ہے۔ محض عقد یعنی نکاح کے اصطلاحی معنے تو خود لفظ زوج بتا رہا ہے۔ تنکح سے مقصود ہم بستری کو ظاہر کرنا ہے۔ آلوسی کہتے ہیں نکاح کے اصطلاحی معنے تو لفظ زوج سے معلوم ہو رہے ہیں اور تنکح سے ہم بستری اور خلوت معلوم ہو رہا ہے۔ اگرچہ امام ابن جریر نے اس سوال کے جواب میں کہ ہم بستری کا لفظ قرآن میں موجود نہیں ہے۔ لکھا ہے کہ معنے کی یہ دلالت اجماع سے معلوم ہوتی ہے۔ لیکن امام رازی نے لکھا ہے کہ قول مختار یہی ہے کہ ہم بستری کی شرط قرآن ہی سے ثابت ہے۔ اور تو اور ابو مسلم اصفہانی نے بھی یہی لکھا ہے الاموان معلوماں بالکتاب کہ ازدواجی تعلق اور ہم بستری دونوں قرآن سے ثابت ہیں۔ امام رازی نے آگے اسے تفصیل سے لکھا ہے اور بتایا ہے کہ نکاح کا لفظ جب مطلق صورت میں ہو اس سے مراد اصطلاحی نکاح ہوتا ہے لیکن جب اس کی اضافت بیوی یا عورت کی طرف ہو تو یہ لغوی معنے میں استعمال ہوتا ہے اور ساری بحث کا خلاصہ یہ نکالا ہے کہ قولہ تنکح یدل علی الوطی وزوجاً یدل علی العقد (کبیر)

الھدی: قربانی کا وہ جانور جو ماہ حرم میں حرم کے اندر ذبح کے لیے روانہ کیا جاتا ہے۔ لفظ ہدایت کے اصلی معنے مہربانی کے ساتھ ایسی چیز کی رہنمائی کے ہیں جو رہنما کی نظر میں اچھی ہو۔ ہدایت کے یہ حقیقی معنے ہیں مجازاً ہر چیز کا راستہ بتانے کو کہتے ہیں چاہے وہ چیز تکلیف دہ ہو۔ ھدیۃ بروزن فعیلۃ تحفہ بھیجی ہوئی سوغات ہدیہ طریقہ کو بھی کہتے ہیں۔ ہوادی الوحش جنگلی جانوروں کا پیشرو دستہ جو گلہ کا رہنما ہو۔ اسی سے ہدی ماہ حرام میں حرم کے اندر ذبح کرنے کے لیے روانہ کیے ہوئے جانور کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع ہدایا آتی ہے۔

الوارث: وہ شخص جو کسی مرنے کے بعد اس کے ترکہ کا حصہ دار ہو۔ وارث، ارث اور تراث مصدر ہیں۔ وراثت کے اصل معنے بغیر خرید و فروخت اور بغیر ہبہ کے کسی کی طرف سے کسی مالی ملکیت کا دوسرے کی جانب منتقل ہو جانا۔ اسی نسبت سے میت کے متروکہ مال کو جو میت کے بعد اس کے اقربا کو منتقل ہوتا ہے میراث کہا جاتا ہے اور جس کی طرف منتقل ہوتا ہے اس کو وارث کہتے ہیں۔ لیکن اس معنے کے علاوہ دو اور معنے بھی وراثت کے آتے ہیں جن کے لیے وراثت کے مختلف صیغے استعمال ہوتے ہیں۔

ا۔ بلا عوض اور بلا مشقت کسی چیز کا وارث ہونا جیسے مومنین صالحین جنت کے وارث ہوں گے اس صورت میں وراثت بلا انتقال ملکیت ملتی ہے۔

۲۔ علم یا کتاب کا وارث ہونا اس صورت میں مال کی ملکیت نہیں ہوتی ہے بلکہ ایک کا علم دوسرے کو ملتا ہے جیسے اورثنا الکتاب

وصیت: یہ مصدر ہے یعنی مرنے کا وہ حکم جو مرنے سے پہلے بعض لوگوں کے متعلق وہ دے کر مرتا ہے۔ زیادہ سے زیادہ کل مال کے تہائی حصہ میں میت کی وصیت نافذ ہو سکتی ہے۔

زمانۂ جاہلیت میں مردہ شوہر کی عدت کی میعاد ایک سال تھی لیکن اسلام آیا چار ماہ دس روز عدت مقرر کر دی گئی اور یہ رسم ختم ہو گئی۔ وصیت کے موضوع پر تفصیلات انشاءاللہ چوتھے پارے میں آئیں گی۔

سَيَقُولُ السُّفَهَآءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلّٰهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ الَّتِيْ كَانُوْا عَلَيْهَا ۚ قُلْ لِّلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ ۚ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۱۴۲﴾

عقل وبصیرت سے محروم[۳۸۲] لوگ ضرور کہیں گے کہ مسلمانوں کو اس قبلہ[۳۸۳] سے کس چیز نے ہٹا دیا جس کی طرف رُخ کر کے اب تک نمازیں[۳۸۴] ادا کر رہے تھے؟ اے پیغمبر! تم کہہ دو کہ مشرق و مغرب[۳۸۵] سب اللہ کے لیے ہیں۔ اللہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم پر لگا دیتا ہے۔

تحویلِ قبلہ

بناتے کعبہ اور دُعائے ابراہیمؑ کے بیان کا سلسلہ ختم ہوا۔ اب یہاں سے اس کا دوسرا حصہ شروع ہوتا ہے جو پچھلے حصے کا قدرتی نتیجہ ہے۔ حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ نے مکہ میں عبادت گاہ کعبہ کی تعمیر کی اور تین دعائیں کیں۔ ۱۔ یہ کہ اس عبادت گاہ کو شرفِ قبول عطا فرما۔ ۲۔ دوسرے یہ کہ ہماری اولاد میں سے اُمتِ مسلمہ کا ظہور فرما۔ ۳۔ ہماری اولاد میں سے رسُول روانہ فرما۔ یہ دُعائیں بارگاہِ الٰہی میں منقبول ہوئیں مگر مشیتِ الٰہی میں ان کے ظہور کے لیے ایک خاص وقت مقرر تھا۔ جب وہ وقت آگیا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا اور آپ کی تعلیم و تزکیہ سے اُمتِ مسلمہ پیدا ہو گئی۔ اس اُمت کو بہترین اُمت کا لقب دیا گیا اور اقوامِ عالم کی تعلیم اس کے سپرد کر دی گئی اور ان دونوں کے ظہور میں آجانے کے بعد روحانی ہدایت کے مرکز کی ضرورت ہوئی۔ یہ مرکز قدرتی طور پر عبادت گاہِ کعبہ ہی ہو سکتا تھا۔ چنانچہ تحویلِ قبلہ نے اس کی مرکزیت کا اعلان کر دیا۔ یہی حقیقت قبلہ کے تقرر میں پوشیدہ تھی۔ غرض یہی رمزِ الٰہی تھا جو ہزاروں برس پہلے سے خدا کے علم میں تھا اور جس کی بنا پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد عالم کا روحانی مرکز بیت المقدس کے بجائے

ز کعبہ قرار پایا جو تاریخی حیثیت سے وہ گھر بنا جہاں کھڑے ہو کر حضرت ابراہیم نے توحید کی آواز بلند کی تھی ۔ ر جو دُنیا میں اس لحاظ سے سب سے پہلا گھر تھا اور روحانی حیثیت سے وہ گھر قبلہ قرار پایا جو اس دُنیا ں عرشِ الٰہی کا سایہ اور زمین پر حظیرۃ القدس کا عکس بنا ۔

۳۸۲ ۔ عقل و بصیرت سے محروم لوگ کہیں گے ۔ سنہ ۲ھ میں خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم ہوا ۔ حضور نور صلی اللہ علیہ وسلم جب تک مکہ معظمہ میں رہے خانہ کعبہ کی طرف اس طرح مُنہ کر کے کھڑے ہوتے کہ کعبہ اور بیت المقدس دونوں سامنے ہوتے ۔ لیکن جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو یہ صورت ممکن نہ رہی کیونکہ بیت المقدس مدینہ سے شمال میں اور خانہ کعبہ جنوب کی طرف واقع تھا تاہم چونکہ کعبہ کے قبلہ ہونے کی اب تک اجازت حاصل نہ ہوئی تھی اس لیے آپ بیت المقدس کی طرف رُخ کرتے تھے کہ وہ انبیائے بنی اسرائیل کا قبلہ تھا اور آپ ۱۶ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے رہے ۔ یہ آیت تحویلِ قبلہ سے پہلے نازل ہوئی اور یہ کہنے والے یہودی ہیں ۔ اس لحاظ سے یہ آیت ایک سچی پیش گوئی اور اخبار بالغیب کی مثال میں پیش کی جا سکتی ہے ۔ پہلے ہی بتا دیا کہ تحویلِ قبلہ پر نکتہ چینی کرنے والے ضرور نکتہ چینی کریں گے ۔ ان نکتہ چینی کرنے والوں کو اس آیت میں السفہاء کہا گیا ہے ۔ یہ سفیہ کی جمع ہے اور سفیہ کے معنے کم عقل یا بد عقل کے ہیں ۔ یہاں سفاہت صاف طور پر احکام الٰہی میں قیل و قال کرنے کو کہا گیا ہے ۔ سفہاء سے یہود کا مراد ہونا خود صحیح بخاری میں آیا ہے ۔ صحابہ اور تابعین کی اکثریت یہی رائے رکھتی ہے لیکن راجح یہی ہے جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے بتایا ہے کہ آیت کو عام رکھا جائے ۔ قاضی بیضاوی نے سفاہت کی تفسیر میں یہ نکتہ آفرینی کی ہے ۔ وہ لوگ جن کی عقل میں ہلکا پن ہو اور جنہوں نے اپنی عقلی قوتوں کو رسُوم کی پرستش اور رواجوں سے وابستگی کے ذریعے پامال کر دیا ہو ۔ یہ بے عقل لوگ کیا کہیں گے ۔ آگے ان کا مقولہ نقل کیا گیا ہے کہ یہ کہیں گے کہ مسلمانوں کو کس چیز نے ہٹا دیا ہے ۔ یہ سوالیہ انداز بیان اور تحقیق و جستجو کے لیے نہیں بلکہ بطور طنز و تعریض ہے ۔ یعنی طنز اور تعریض کے طور پر کہیں گے ؟ چونکہ ان کی یہ تعریض و طنز دین کے احکام میں تفقہ سے بیگانہ ہونے کی نشانی ہے کہ احکام کے اسرار اور علل تک ان کو رسائی نہیں صرف ظواہر پر جمود اختیار کیے ہوئے ہیں اس لیے ان کو یہاں عقل و بصیرت سے محروم سفہاء کہا گیا ہے ۔

قبلہ کی ضرورت

۳۸۳ ۔ اس قبلہ سے کس چیز نے ہٹا دیا ۔ انسان کا کوئی کام جس طرح زمانے سے خالی نہیں

ہو سکتا جس کی بنا پر اوقاتِ نماز کی تعیین کی گئی ہے اسی طرح مکان سے بھی خالی نہیں ہو سکتا جب انسان کوئی کام کرے گا تو ظاہر ہے کہ اس کا منہ کسی نہ کسی سمت ضرور ہو گا۔ اگر نماز میں کسی خاص سمت کا تعیین نہ ہوتا اور یہ عام اجازت دے دی جاتی کہ جس کا جدھر جی چاہے منہ کر کے نماز ادا کرے تو جماعت کی یکسانی کا شیرازہ درہم برہم ہو جاتا اور نمازیوں کی وحدتِ صوری قائم نہ رہتی۔ بلکہ اگر ایک ہی مسجد میں ایک ہی وقت میں کوئی پورب کوئی پچھم، کوئی اتر اور کوئی دکن رُخ کر کے کھڑا ہوتا تو یہ نظامِ وحدت کے خلاف ہونے کے علاوہ اچھا خاصا مضحکہ خیز تماشا بن جاتا۔ اس لیے ہر مذہب میں عبادت کے لیے کوئی نہ کوئی سمت مقرر کی گئی ہے۔ اکثر شامی قومیں مشرق کی طرف رُخ کرتی تھیں یہاں تک کہ یہودیوں کے ایک فرقہ السینین نے آفتاب کے مطلع کو قبلہ بنا لیا تھا۔ شامی عیسائی بھی اسی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ بنی اسرائیل میں قبلہ ضروری تھا۔ اہلِ عرب میں کعبہ کو وہی حیثیت حاصل ہے جو بنی اسرائیل میں بیت المقدس کو تھی۔

اسلام میں قبلہ کی حیثیت

اسلام میں قبلہ کی کیا حیثیت ہے؟

قبلہ یعنی وہ سمت یا جگہ جس کا رُخ کیا جائے۔ فی نفسہٖ عبادت کے لیے کوئی ضروری چیز نہ تھی لیکن چونکہ نماز میں اُمت کے نظام وحدت کو قائم رکھنے کے لیے کسی ایک رُخ کی تخصیص کی حاجت تھی اس لیے خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم ہوا۔

اسلام نے قبلہ کے لیے کسی خاص سمت کا نہیں بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا تاکہ چاروں طرف چاروں سمتوں میں نماز پڑھی جا سکے۔ اس طرح مشرق و مغرب، شمال و جنوب سب مسلمانوں کا قبلہ ہیں جس سے ایک خاص اشارہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے خدا کی طرح ان کا قبلہ بھی بے جہت ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ایک موقعہ پر پنڈت دیانند کے اس سوال کے جواب میں قبلہ کی حیثیت پر خالص حکیمانہ انداز میں جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ بہت ہی شانِ علمیت کی حامل ہے اور اس قابل ہے کہ ناظرینِ معالم العرفان کے مطالعہ میں آئے۔ مولانا فرماتے ہیں،

استقبالِ کعبہ اور لفظ بت پرستی اس پر گواہ ہیں کہ بت پرستی کو توجہ کعبہ سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے استقبالِ کعبہ کا مفہوم صرف یہ ہے کہ کعبہ کی طرف رُخ ہو۔ اس میں عبادت اور پرستش کا شائبہ بھی نہیں بلکہ نماز میں اللہ کی عبادت کے لیے نیت اور ارادہ کا ہونا تو ضروری ہے لیکن کعبہ کے استقبال کی نیت بھی نہیں

رتی ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ مسلمان کعبہ کی عبادت نہیں بلکہ اللہ کی عبادت کرتے ہیں نیز شروع نماز سے لے کر آخر تک پوری نماز میں کوئی لفظ بھی نمازی کے منہ سے ایسا نہیں نکلتا جس سے کعبہ کی تعظیم کی بھی بو آتی ہو۔ مزید براں یہ کہ وقت نماز دیوار ہائے کعبہ کا سامنے ہونا بھی شرط نہیں ہے۔ اگر بالفرض وہ دیواریں منہدم بھی ہو جائیں پھر بھی نماز اسی طرف ادا کی جائے گی۔ تاریخ گواہ ہے کہ عبداللہ بن الزبیر کے زمانے میں کعبہ کی دیواریں گرائی گئیں اور تعمیر نو کی گئی۔ اس عرصہ میں نماز بدستور جاری رہی ہے۔ اگر دیوار کعبہ مسجود یا معبود ہوتی تو اس زمانے میں نماز ضرور موقوف ہو جاتی۔ اور پھر یہ کہ اسلام نے اس خانہ کعبہ کا تعارف اللہ کے نام سے نہیں بلکہ بیت اللہ سے کرایا ہے اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ کسی مکان کی طرف کوئی جاتا ہے تو مقصود مکین ہوتا ہے اس طرف میں آداب کی بجا آوری مکان کی نہیں بلکہ صاحبِ مکان کی خاطر ہوتی ہے جیسے کسی تخت نشین کو اگر اس کے تخت کی طرف جھک کر سلام کیا جائے تو وہ سلام صاحبِ تخت کو ہوتا ہے خود تخت کو نہیں ہوتا۔ ایسے ہی سمت بیت اللہ میں عبادت بھی اللہ کی ہوتی ہے بیت اللہ کی نہیں۔

نظر میں ذرا وسعت پیدا کیجئے اور اس حقیقت پر غور فرمایئے کہ نبوت محمدیہ کے نزدیک مستحقِ عبادت وہ ذاتِ گرامی ہے جو خود بخود موجود ہو اور اس کے سوا جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے اپنے وجود و بقا میں اس کے محتاج ہوں۔ سب کے نفع و نقصان کا مالک ہو۔ اس کا کمال و جمال ذاتی ہو۔ باقی سب کا کمال و جمال اس کی عطا ہو۔ ان صفات کا موصوف عقل و نقل کی روشنی میں ذاتِ باری کے سوا کوئی نہیں مسلمانوں کے یہاں اللہ کے بعد مخلوقات و موجودات میں اگر کوئی ذات گرامی سب سے زیادہ افضل ہے تو وہ خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے نہ کوئی ولی ان کے برابر۔ نہ کوئی فرشتہ، نہ عرش و کرسی میں ان کی ہمسری کا یارا اور نہ کعبہ ان کا ہم پلہ۔ مگر اس بے مثال شانِ بزرگی کے باوجود مسلمان اپنے عقیدے کی رُو سے ان کو بھی اللہ کا بندہ اور نیاز مند سمجھتے ہیں۔ ایک ذرہ بنانے کا ان کو اختیار نہیں ہے۔ ایک رتی برابر نقصان کی ان کو قدرت نہیں ہے۔ کائنات کی تخلیق اور افعال کی فاعلیت کا مرکز صرف اللہ کی ذات ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نہیں ہیں اسی لیے ان کی عبدیت و رسالت کا اقرار شرطِ ایمان ہے۔ اسلام اللہ کے سوا کسی کی عبادت کا تصور بھی نہیں کرتا۔ اگر کرتا تو رسولِ خدا کی عبادت کا تصور کرتا لیکن جب ان کو بھی اللہ کا عبد ہی مانا معبود نہیں مانا بلکہ ان کی کمالِ عبودیت ہی کو ان کی فضیلت کی وجہ قرار دیا تو پھر اسلام خانہ کعبہ کو مسجود و معبود کیوں کر بنا سکتا ہے۔ ایسا سمجھنا بہت بڑی کم فہمی اور جہالت ہے۔

۲۸۴۔ جس کی طرف رُخ کر کے اب تک وہ نمازیں ادا کر رہے تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب مکہ سے مدینے تشریف لے گئے تو ۱۶، ۱۷ ماہ بیت المقدس ہی کی طرف نماز پڑھتے رہے۔ اس کے بعد کعبہ کی طرف منہ کرنے کا حکم کیا گیا تو یہود، مشرکین اور منافقین اور بعضے کچے مسلمان ان کے بہکانے سے شبہات ڈالنے لگے کہ یہ تو بیت المقدس کی طرف نماز پڑھا کرتے تھے جو پہلے انبیاء کا قبلہ تھا۔ اب ان کو کیا ہو گیا ہے کہ بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو قبلہ بنا لیا۔ کوئی کہتا کہ یہود کی عداوت سے ایسا کیا۔ کسی نے کہا کہ یہ اپنے دین میں متحیر و متردد ہیں۔ اس سے ان کا نبی ہونا ظاہر نہیں ہوتا۔ مخالفین کے ان شکوک اور اس جواب سے جو آگے آ رہا ہے اللہ نے اطلاع فرما دی تاکہ بروقت کوئی تردد نہ ہو اور جواب میں تامل نہ ہو۔[1]

قبلہ کی تحویل کا حکم سب سے زیادہ یہود کو گراں گزرا تھا۔ اب تک وہ یہ سمجھ کر خوش ہو رہے تھے کہ مسلمان کم از کم ان کے ہم قبلہ تو ہیں اب یہ مسرت بھی ان سے چھین گئی۔

اسلام نے قبلہ کسی خاص سمت کو نہیں بلکہ ایک مرکزی مسجد کو بنایا۔ یہ مرکزی مسجد بیت المقدس کے بجائے مسجد حرام قرار دی گئی۔ حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی مسجدوں میں ان کی نسل نے دو مرکزی مسجدوں کو محفوظ رکھا تھا۔ ایک مسجد بیت المقدس جس کو حضرت داؤد اور حضرت سلیمان نے اپنے اپنے زمانوں میں بڑے اہتمام سے بنایا تھا اور یہ بنی اسرائیل کا قبلہ ہی تھی۔ دوسری مسجد کعبہ جو بنی اسماعیل کا مذہبی مرکز تھی۔ چونکہ بنی اسرائیل نے اپنی بغاوت، سرکشی اور فسادات کے باعث اس عہد کو توڑ دیا تھا جو اللہ نے ان سے کیا تھا۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد اللہ نے ان کو متنبہ کیا جس کا ذکر سورۂ اسراء میں ہے اور جب بنی اسرائیل پر اس تنبیہ کا کوئی اثر نہ ہوا تو اللہ سبحانہ نے ان سے عہد توڑ دیا اور بنی اسماعیل کا عہد شروع کیا جو سینا میں حضرت ہاجرہ کے متعلق باندھا گیا تھا۔ معراج میں حضور انور کا بیت المقدس میں نماز ادا کرنا اور اس کے چند سال بعد خانہ کعبہ کا قبلہ بن جانا گویا بنی اسرائیل کے عہد کی شکست اور بنو اسماعیل کے عہد کی ابتدا تھی۔

قبلہ کی تاریخ

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کے گھرانے کو اللہ تعالیٰ نے دنیا کی سعادتوں اور برکتوں

---

[1] حاشیہ شیخ الہند

کا علمبردار بنایا اور ان کو ارضِ مقدس کی تولیت کا منصب عطا کیا تھا جس کے حدود اللہ سبحانہ نے خواب میں حضرت ابراہیم کو دکھائے تھے لیکن اس کے ساتھ تورات میں بار بار اعلان کے ذریعے ان کو یہ بھی بتا دیا گیا کہ اگر انہوں نے اللہ کے احکام کی اطاعت اور انبیاء کی تصدیق نہ کی تو یہ منصب ان سے چھین لیا جائے گا حضرت ابراہیم کو اسماعیل اور اسحاق دو بیٹے عطا ہوتے تھے اور ارضِ مقدس کو ان دونوں بیٹوں کے درمیان تقسیم کر دیا گیا تھا۔ یعنی شام کا ملک حضرت اسحاق کو اور عرب کا ملک حضرت اسماعیل کو ملا تھا۔ شام میں بیت المقدس اور عرب میں کعبہ واقع تھا۔ حضرت اسحاق کے فرزندوں کو جن کا مشہور نام بنی اسرائیل ہے بیت المقدس کی تولیت عطا ہوتی اور بنی اسماعیل کو کعبہ کا متولی بنایا گیا۔ حضرت ابراہیم کی اولاد میں جس قدر پیغمبر ہوتے ان میں سے بنی اسرائیل کا قبلہ بیت المقدس اور بنی اسماعیل کا کعبہ تھا۔ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جس قدر انبیاء عرب یا شام میں ہوئے۔ ان دونوں قبلوں میں سے صرف ایک کے متولی تھے۔ حضور انورؐ کو اللہ تعالیٰ نے جس طرح تمام دوسرے پیغمبروں کے متفرق اوصاف و خصوصیات کا جامع اور برزخ بنایا تھا اسی طرح حضرت اسحاق اور حضرت اسماعیل دونوں کی برکتوں اور سعادتوں کا گنجینہ بھی ذاتِ محمدی کو ہی قرار دیا یعنی حضرت ابراہیم کی جو وراثت صدیوں سے دو بیٹوں میں بٹتی چلی آ رہی تھی وہ حضور انورؐ کی آمد سے پھر ایک جگہ جمع ہو گئی اور گویا وہ خصوصیت ابراہیمیہ جو خاندانوں اور نسلوں میں منقسم ہو گئی تھی ذاتِ محمدی میں پھر یکجا ہو گئی اور آپ کو دونوں قبلوں کی تولیت نصیب ہو گئی اور نبی القبلتین کا لقب عطا ہوا۔ یہی نکتہ ہے جس کی وجہ سے حضور انورؐ کو کعبہ اور بیت المقدس دونوں کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہوا اور اسی لیے معراج میں آپ کو مسجدِ حرام سے مسجدِ اقصیٰ بیت المقدس تک لے جایا گیا اور مسجدِ اقصیٰ میں تمام انبیاء کی صف میں آپ کو امامت پر مامور کیا گیا تاکہ اس مقدس دربار میں اس کا اعلان ہو جائے کہ دونوں قبلوں کی تولیت سرکارِ محمدیؐ کو عطا ہوئی ہے اور آپ نبی قبلتین نامزد ہوئے ہیں۔

بنی اسرائیل کی مدتِ تولیت کا اختتام

بنی اسرائیل کو ارضِ مقدس کی تولیت کا شرف بہت سے شرائط اور معاہدوں کے ساتھ عطا ہوا تھا۔ اور یہ کہہ دیا گیا تھا کہ جب ان کا ثبوت سے لائے ہوئے علم و عمل سے تعلق ٹوٹ جائے گا تو یہ منصب ان سے چھین لیا جائے گا اور محکومی و غلامی کی زنجیر ان کی گردنوں میں ڈال دی جائے گی۔ حضرت داؤد اور سلیمان کے عہد میں ان کو جو نیابت و خلافت عطا کی گئی تھی عدمِ ایفائے عہد کی پاداش میں بابل کے بادشاہ بخت نصر (نبوخذ نذر) کے ہاتھوں ان سے چھین لی گئی۔ ارضِ مقدس سے وہ جلاوطن کر دیے گئے۔

یروشلم کھنڈر کر دیا گیا۔ بیت المقدس کی ایک ایک اینٹ چُور چُور کر دی گئی اور تورات کے پرزے پرزے اُڑا دیے گئے۔ اس غم ساںحہ پر بنی اسرائیل کے انبیا نے ماتم کیا۔ خدا کے سامنے دستِ تضرع دراز کیا۔ بنی اسرائیل کو توبہ و انابت کی دعوت دی تو پھر اُن کو معاف کیا گیا اور ایرانیوں کے عہد میں ارضِ مقدس کی دوبارہ تولیت سے وہ سرفراز کیے گئے لیکن اس کے بعد وہ اپنے عہد پر قائم نہ رہے۔ غیر اللہ کو سجدے کیے۔ تورات کے احکام سے روگردانی کی تو ان پر یونانیوں اور رومیوں کو مسلط کیا گیا جنہوں نے بیت المقدس کو جلا کر خاکستر کر دیا۔ یہودیوں کا قتلِ عام کیا۔ قربان گاہ کے مقدس ظروف توڑ ڈالے۔
اب اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری ہوتی ہے اور بنی اسرائیل کو توبہ و انابت کا آخری موقعہ دیا جاتا ہے۔ اگر انہوں نے حق پسندی کو اختیار کیا تو اللہ ان پر رحم فرمائے گا ورنہ ہمیشہ کے لیے اس منصب سے محروم کر دیے جائیں گے چنانچہ بنی اسرائیل میں ان سے کہا گیا کہ

عَسٰی رَبُّکُمْ اَنْ یَّرْحَمَکُمْ وَاِنْ عُدْتُّمْ عُدْنَا

اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بعد ممکن ہے کہ تمہارا پروردگار تم پر رحم کرے اور اگر تم نے پھر ویسا ہی کیا تو ہم بھی ویسا ہی کریں گے۔ (بنی اسرائیل ۱۵)

یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی۔ وہاں بنی اسرائیل سے تعلقات نہیں ہیں اسی لیے مکی سورتوں میں عموماً یہودی مخاطب نہیں ہیں۔ یہ پہلا موقع ہے کہ بنی اسرائیل کو مخاطب کیا جا رہا ہے کیونکہ اب اسلام کے نئے دَور کا آغاز ہونے والا ہے اور آپ کو مدینے کی طرف ہجرت کی اجازت ملنے والی ہے جہاں ان سے تعلقات کا آغاز ہوگا اور ان کو از سرِ نو خدا کے سامنے اپنی شرمساری کے اظہار کا موقعہ ملے گا۔ اور اللہ سبحانہٗ ان پر اپنی رحمت کا دروازہ کھولے گا لیکن اگر انہوں نے قبولِ حق سے انکار کیا تو ان کے لیے پھر وہی سزا ہے جو ان کو اس سے پہلے دو دفعہ مل چکی ہے لیکن افسوس انہوں نے اس سے عملاً فائدہ نہیں اٹھایا اور حق قبول نہیں کیا۔ اس کا قدرتی نتیجہ ہے کہ قرآن نے بنی اسرائیل کی قیادت اور امامت سے محرومی، بیت المقدس کی قبلہ کی حیثیت سے مرکزیت کے ختم کرنے کا اعلان کیا اور اس کے ساتھ نئے مرکزِ وحدت کعبہ، نئے پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور نئی اُمت اُمتِ مسلمہ کا صاف اور واضح چہرہ پیش کیا۔[۵]

یہاں حافظ ابن القیم کے اس بیان کو نظر انداز کر دینا علم سے بے انصافی ہے جو انہوں نے

---

[۵] سیرۃ النبیؐ

بدائع الفوائد میں ارقام فرمایا ہے:

آپ یہ بات پہلے سُن آئے ہیں کہ البقرہ کا بیشتر حصہ کا نزول مدنی زندگی کے بالکل ابتدائی دور میں ہوا ہے اور کمتر حصہ ایسا ہے جو بعد میں نازل ہوا اور مناسبتِ مضمون کے لحاظ سے اس میں شامل کر دیا گیا۔ اس سورت میں پھر اللہ سبحانہ' نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اب بھی موقع ہے۔

اوفوا بعهدی اوف بعهدكم

تم میرا عہد پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔

اور یہ بھی سمجھایا کہ

امنوا بما انزلت مصدقا لما معكم ولا تكونوا اول كافر به

اس کتاب پر ایمان لے آؤ جو میں نے نازل کی ہے جو تمہارے پاس کتاب کی تصدیق کرتی ہے اور دیکھو اس کے انکار میں پہل تم نہ کرو۔

اس درمندانہ اپیل اور مشفقانہ دعوت کے باوجود جب ان کی جانب سے تمرد، سرکشی اور بغاوت کا ظہور ہوا تو قرآن نے ان کو ان کی تاریخِ ملت سے ان کے جرائم یاد کرائے اور ان کے جرائم کی ایک طویل داستان بیان فرما کر ان کے قومی کردار اور اجتماعی سیرت پر کفر، فسق، عصیان، عدوان، قساوتِ قلب کی فردِ جرم لگا دی ــــ اور فیصلہ فرما دیا کہ

فما جزاء من يفعل ذالك منكم الا خزى فى الحيوة الدنيا ويوم القيامة يردون الى اشد العذاب

جن کے جرائم یہ ہوں ان کو پاداشِ عمل میں اس کے سوا کیا مل سکتا ہے کہ دُنیا میں ذلّت و رُسوائی ہو اور قیامت میں سخت سے سخت عذاب۔

لیکن دریائے کرم میں جوش آیا اور وفورِ شفقت میں بڑے درد کے ساتھ ان کو سمجھایا کہ

لو انهم امنوا واتقوا لمثوبة من عند الله خير لو كانوا يعلمون

اگر یہ لوگ ایمان لے آتے اور متقیانہ سیرت اختیار کر لیتے تو ان کے لیے اللہ کے پاس عظیم اجر تھا کاش وہ جانتے۔

اس پر بھی ان کے کانوں پر جوں نہ رینگی اور ان کے تمرد و سرکشی میں کوئی کمی نہ آئی بلکہ اس میں اور اضافہ ہو گیا کہ بارگاہِ نبوت میں بے ادب و گستاخ ہو گئے۔ اس موقعہ پر قرآن نے ان کو برملا کہہ دیا کہ وللكافرين عذاب اليم

گویا اب ہمیشہ کے لیے ان کے منصب خلافت سے ہٹائے جانے کا اعلان ہوگیا۔ ان کے اس منصب سے ہٹائے جانے کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال ذہنوں میں آیا کہ اب یہ منصب کس کو ملے گا؟ دنیا میں کس کا علم و عمل قوموں کا سہارا ہوگا اور رسوم عبادت کے لیے روحانی ہدایت کا مرکز کون سا ہوگا؟

سوال کی اہمیت کے پیشِ نظر پہلے نسخ کا مسئلہ بیان فرمایا۔ پھر حضرت ابراہیم کی امامت کا تذکرہ کیا۔ ابراہیم کے ساتھ حضرت اسماعیل کا رشتہ ظاہر کیا۔ پھر دونوں کے مکہ میں بیت اللہ بنانے کی تاریخ بنائی اور انکشاف کیا کہ بیت اللہ بنانے کے بعد ابراہیم و اسماعیل نے اپنی اولاد میں سے رسُول کی بعثت اور اس کے ساتھ اُمتِ مسلمہ کے لیے دُعا فرمائی تھی۔ ان دو رکوعوں میں ان تینوں دُعاؤں کی عملی قبولیت کا تذکرہ ہے اور دُعا کی ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔ دُعا میں سب سے پہلے خانہ کعبہ کے لیے فرمایا تھا ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم یہاں بھی سب سے پہلی آیت میں اسی کا تذکرہ ہے۔ دُعا میں دوسرے نمبر پر من ذریتنا امة مسلمة ہے یہاں بھی دُعا کے عملی ظہور کے تذکرے میں یہ دوسرے نمبر پر ہے۔ وكذالك جعلناكم امة وسطا اور دُعا میں تیسرے نمبر پر وابعث فيهم رسولا منهم ہے یہاں بھی تیسرے نمبر پر کما ارسلنا فیکم آیا ہے۔

اس تفصیل سے یہ بات صاف ہوگئی کہ بیت المقدس جو عہدِ اسرائیل کا نشان تھا اسلام کے بعد اس میں قبلہ ہونے کی شان باقی نہیں رہی تھی۔ نبی اگر ذریتِ اسماعیل میں سے ہے اور اُمتِ مسلمہ اگر ذریتِ اسماعیل سے تعلق رکھتی ہے تو ضروری ہے کہ مرکزِ عبادت اور قبلہ بھی حضرت ابراہیم کی وہ مسجد ہو جس کا تعلق حضرت اسماعیل کے عہد سے ہو یعنی خانہ کعبہ، وہ عہد کیا تھا اس کی تفصیل پیچھے وعهدنا الى ابراهيم میں پڑھ چکے ہو۔ غرض یہ حکمتِ الٰہی تھی جس کی بنا پر رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کے بعد روحانی مرکز بجائے بیت المقدس کے خانہ کعبہ قرار دیا گیا۔ یہودیوں کو اسی پر اعتراض تھا کہ مشرقی مسجد یعنی بیت المقدس کو چھوڑ کر مغربی مسجد یعنی خانہ کعبہ کو کیوں قبلہ قرار دیا گیا ہے۔ قرآن نے یہاں اس کا اجمالی اور پچھلے رکوع میں تفصیلی جواب دیا ہے۔

یہودیوں کے اعتراض کا اجمالی جواب

۲۸۵:۔ اے پیغمبر تم کہہ دو کہ مشرق و مغرب سب اللہ کے لیے ہیں یعنی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ کہہ دیں کہ نہ ہم نے یہود کے حسد کی وجہ سے اور نہ کسی تعصب کی بنا پر اور نہ اپنی رائے سے قبلہ کی تبدیلی کی ہے بلکہ یہ تبدیلی تو محض اتباعِ فرمانِ خداوندی کی وجہ سے عمل میں آئی ہے اور فرمانِ الٰہی

کی طاعت ہی ہمارا سرمایۂ دین ہے۔ ہمیں پہلے بیت المقدس کی طرف رُخ کرنے کا حکم تھا ہم نے اسے قبول کیا۔ اب ان کی جانب سے کعبہ کی طرف مُنہ کرنے کا حکم آگیا ہے اس کو دل سے مان لیا ہم سے اس کی وجہ دریافت کرنا یا ہم پر اعتراض کرنا سخت حماقت ہے۔ غلام پر یہ اعتراض کرنا کہ تم پہلے یہ کام کرتے تھے اب یہ کام کیوں کرتے ہو تقاضائے دانشمندی نہیں ہے۔ اور اگر تم ہم سے اللہ کے تمام احکام و قوانین کے اسرار و مصالح پوچھنا چاہتے ہو تو اس کے احکام کے اسرار و مصالح کا احاطہ کون کر سکتا ہے۔ ہاں اتنی بات ہماری سمجھ میں ضرور آتی ہے کہ قبلہ کا مقرر فرمانا صرف طریقہ عبادت کو بتلانے کے لیے ہے۔ اصل عبادت نہیں ہے۔ اس موضوع پر اللہ سبحانہٗ کا معاملہ سب سے الگ ہے۔ کسی کو اپنی حکمت و رحمت کے مطابق خاص رشتہ بنایا ہے اور کسی کو دوسرا۔ تمام مواقع اور جہات کا مالک وہی ہے جس کو جس وقت چاہتا ہے ایسا راستہ دکھا دیتا ہے جو سیدھا بھی ہو اور سب راستوں سے مختصر اور قریب بھی ہو۔[1]

گویا یہ ان نادانوں کے اعتراض کا پہلا جواب ہے۔ ان کے دماغ "تنگ تھے" منظر محدود تھی۔ سمت اور مقام کے بندے بنے ہوئے تھے۔ ان کا گمان یہ تھا کہ خدا کسی خاص سمت میں مقید ہے۔ اس لیے سب سے پہلے ان کے جاہلانہ اعتراض کے جواب میں یہی فرمایا گیا کہ مشرق و مغرب سب اللہ کے لیے ہیں۔ کسی سمت کو قبلہ بنانے کے معنے یہ نہیں ہیں کہ اللہ اسی سمت میں ہے جن لوگوں کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے وہ اس قسم کی تنگ نظری سے بالاتر ہوتے ہیں اور ان کے لیے عالمگیر حقیقتوں کے ادراک کی راہ کھل جاتی ہے۔[2]

اس جواب میں قبلہ کے استقبال کی حقیقت کو واضح کر دیا کہ کعبہ اور بیت المقدس کی بجز اس کے کوئی خصوصیت نہیں ہے کہ حکم ربانی نے ان کو قبلہ ہونے کا امتیاز مرحمت فرما دیا۔ وہ اگر چاہیں تو ان دونوں کے علاوہ کسی تیسری چوتھی چیز کو بھی قبلہ بنا سکتے ہیں اور پھر جس کو بنا دیا گیا اس کی طرف رُخ کرنے میں جو کچھ فضیلت ہے اس کی وجہ دراصل اللہ سبحانہٗ کے حکم کی اطاعت کے سوا کچھ نہیں ہے جو بانیٔ کعبہ حضرت ابراہیم کی ملت کا اصل الاصول ہے یعنی ان جگہوں میں اس کے سوا کوئی خصوصیت نہیں ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے ان کو قبلہ بنایا ہے اور شاید تحویل قبلہ میں یہ بھی حکمت ہو کہ عملی طور پر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ قبلہ کوئی معبود نہیں جس کی عبادت کی جاتی ہے بلکہ اصل

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۷　[2] تفہیم القرآن

چیز حکم الٰہی ہے اسی کے حکم کی اطاعت عبادت ہے لے

مطلب یہ ہے کہ نہ تو بیت المقدس کے پتھر اپنے مادے اور جوہر کے لحاظ سے اپنے اندر کوئی بزرگی رکھتے ہیں اور نہ ان میں منافع وخواص ہی کچھ ایسے ہیں کہ کہیں اور نہیں پائے جاتے اور نہ پتھر ہونے کی حیثیت سے ہیکل سلیمان کو دوسری کائناتی بناوٹوں کے مقابلے میں کوئی برتری ہے۔ کعبہ کا بھی یہی حال ہے۔ لوگوں کے لیے ان کے قبلہ ہونے کا مطلب صرف یہ ہے کہ عبادت میں اس کے ذریعے نظامِ وحدت قائم ہو جائے اللہ کے لیے مخلوق ومملوک ہونے کی حیثیت میں مشرق ومغرب یکساں ہیں۔

۳۴۹ - اللہ جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم پر لگا دیتا ہے۔ اللہ کا چاہنا ہمیشہ اس کے قانونِ حکمت کے مطابق ہوتا ہے اور اسی قانونِ حکمت کے مطابق افکار میں، اعمال میں اور اخلاق میں راہِ اعتدال یعنی نبوّت کے لائے ہوئے علم وعمل پر چلنے کی توفیق عطا فرما دیتا ہے۔ یہی صراطِ مستقیم ہے۔ یہی سیدھا راستہ ہے۔ یہی سب راستوں میں مختصر اور قریب تر ہے۔ اس وقت مسلمانوں کے لیے جس قبلہ کو مقرر کیا گیا ہے وہ سب قبلوں میں افضل ہے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ خانۂ کعبہ میں کن وجوہ کی بنا پر بیت المقدس سے زیادہ فضیلت ہے جس کی وجہ سے یہ قبلہ بہ نسبت اس قبلہ کے افضل ہے؟

اس سوال کا تفصیلی جواب مولانا محمد قاسم نانوتوی نے قبلہ نما میں دیا ہے۔ اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ سبحانہٗ کی صفات کا پرتو اور مظہر ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی صفات میں دو صفتیں صفتِ جمال اور صفتِ مالکیت اہم صفتیں ہیں۔ صفتِ جمال کی وجہ سے اللہ میں شانِ محبوبیت ہے۔ اور صفتِ مالکیت کی بنا پر اس میں شانِ حاکمیت ہے۔ خانۂ کعبہ پر اللہ کی شانِ محبوبیت کی تجلی ہے۔ اور بیت المقدس پر اللہ کی شانِ حاکمیت کی تجلی ہے۔ اس لیے بیت المقدس رتبۂ حکومت میں تجلی گاہ ہے اور خانۂ کعبہ مرتبۂ محبوبیت میں تجلی گاہ ہے۔ بیت المقدس کو اس لحاظ سے اگر دیوانِ عام کہا جائے اور خانۂ کعبہ کو شاہی محل یا دیوانِ خاص بلکہ جلوہ گاہِ محبوب کہا جائے تو کوئی مبالغہ نہیں۔ دیوانِ عام، انتظامیہ، فوج، اور عدلیہ کا کام صرف شہریوں کا انتظام، ملک کا دفاع، مظلوموں کی دادرسی اور ظالموں کی سرکوبی ہوتی ہے۔ اس کی افادیت کا دار و مدار عمائد کی وفاداری پر موقوف ہے اگر عمائد اور حکومت کے ذمہ دار ہی باغی اور سرکش ہو جائیں تو پھر یہ دیوانِ عام بیکار

لے معارف القرآن مفتی ج ۱ ص ۳۰۷

ہے اور بغاوت کے دور میں اگر دیوانِ عام مسمار ہو جاتے تو قابلِ تعجب نہیں ہے۔ اور شاہی محلسرا اور دیوانِ خاص چونکہ شب و روز رہنے کے لیے ہوتا ہے اس کی نگرانی اور حفاظت ہمیشہ ضروری سمجھی جاتی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ کو کوئی شخص مسمار نہ کر سکا اور بیت المقدس بوجہ سرکشی بنی اسرائیل جو اس زمانے میں بمنزلہ عمائدِ رعیت تھے بیکار ہو گیا اور اس وجہ سے اس کی نگہبانی بے سود نظر آئی۔ یہاں تک کہ کافروں کے ہاتھوں سے ویران اور مسمار ہونے کی نوبت آگئی اور یہ بھی قابلِ غور حقیقت ہے کہ حکومت کے کارپردازوں کا کام ملازمین کے تقرر و معزولی کے پروانے جاری کرنے اور مملکت میں نظم و نسق کے چلانے کے سوا اور کیا ہے۔ نظم و نسق اور انتظامی مشینری میں عزل و نصب کی روح ہی انقلاب و تغیر ہے۔ اس لیے اگر بیت المقدس مظہرِ تغیر و تبدل ہو جائے اور وہاں آبادی کی جگہ ویرانی اور ویرانی کی جگہ آبادی ہوتی رہے تو اس میں حیرت کی کیا بات ہے۔ اس کے برعکس تاثیرِ محبوبیت یہ ہے کہ ہجومِ خلائق اور ہنگامۂ اجتماع ہو۔ محبوب اگر ویرانے میں بھی ہو تو ہجومِ عاشقاں وہاں بھی اس پر پروانہ وار ہو۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ اپنے محلِ وقوع اور جغرافیائی لحاظ سے ایسے مقام پر بنایا گیا جہاں عیش و عشرت اور شہری زندگی کے تکلفات کا نام و نشان نہ تھا بلکہ وادِ غیر ذی زرع ہیں۔ اس کے باوجود سالانہ حج کے موقعہ پر ہجومِ خلائق سے ہر شخص یہ تاثر لیتا ہے کہ یہاں واقعی کسی دلبر کی جلوہ گری ہے جس کے جمالِ عالم فریب کا ایک عالم دیوانہ ہے۔

حکومت اور محبوبیت میں فرق

حکومتِ خداوندی بالذات کچھ نہیں۔ یہ بھی آثارِ محبوبیت سے ہے کیونکہ مرتبہ وجود جو صادر اول اور اللہ کی صفت مالکیت کا مصداق ہے۔ اس تجلی اول سے صادر ہوا ہے جو بوجہ اجتماع جملہ محاسن اللہ کی صفتِ جمال کا مصداق ہے اس لیے مرتبۂ حکومت میں جو کچھ ہو گا وہ مرتبۂ محبوبیت کا پرتو ہو گا ان دونوں میں باہم جوہری فرق ہے۔ فرق بھی ایسا جیسا آفتاب اور زمین میں نظر آتا ہے یعنی آفتاب کے تو رگ و ریشہ میں نور ہی نور رچا ہوا ہے اور زمین کے اوپر اور ارد گرد زمین میں کبھی روشنی آتی ہے اور کبھی تاریکی چھا جاتی ہے مگر آفتاب کا نور یکساں برابر رہتا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے۔ جب مشاہدہ موجود ہے تو پھر یہ ناممکن ہے کہ خانہ کعبہ سے کسی وقت برکات جدا ہو جائیں یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ خانہ کعبہ موجود ہو اور برکات نہ ہوں لیکن

یہ ممکن ہے کہ کسی وقت برکات بیت المقدس سے الگ ہو جائیں۔ یعنی بیت المقدس موجود ہو لیکن برکات نہ ہوں۔

شائد اسی بنا پر قرآن نے دونوں جگہوں میں برکات کو بتانے کے لیے تعبیر میں دلکش انداز اختیار کیا ہے خانہ کعبہ کے بارے میں لفظ "مبارک" بولا ہے اور بیت المقدس کے متعلق بارکنا کہا ہے اور زبان و ادب سے ذوق رکھنے والے جانتے ہیں کہ مبارک کی تعبیر اگر دوام کی نشاندہی کرتی ہے تو بارکنا فعل ہونے کی وجہ سے حدوث نا پائداری کو بتا رہا ہے۔ مبارک اسم صفت ہے۔ یہاں برکت اپنے موصوف سے اس درجہ گڈمڈ ہے کہ اس کے اپنے موصوف سے جدا ہونے کا تصور بھی نہیں ہو سکتا اور بارکنا حولہ میں اول بارکنا فعل کو لانا جس میں قید زمانہ ہوتی ہے اور جو فعل کے حدوث کو بتاتا ہے اور پھر اس میں حولہ کی قید لگا دینا اس بات کی دلیل ہے کہ یہاں برکت میں دوام نہیں ہے۔ اگر خانہ کعبہ سے برکات کی جدائی ناممکن ہے اور بیت المقدس سے برکات کی جدائی ممکن ہے تو اس کا یہ قدرتی نتیجہ خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ جیسے خانہ کعبہ کا بے دینوں کے ہاتھوں مسمار ہونا بعید از عقل ہے ایسے ہی بیت المقدس کا بے دینوں کے ہاتھوں برباد ہو جانا عین ممکن ہے۔ قرآن نے دونوں کی تاریخی شہادتیں پیش کی ہیں۔ بیت المقدس کی بربادی کے لیے سورہ بنی اسرائیل کا مطالعہ کیجئے اور خانہ کعبہ کی حفاظت کیلئے قرآن میں سورۃ الفیل پڑھئے۔

خانہ کعبہ تجلیات کی نمائش گاہ ہے

چونکہ خانہ کعبہ نمائش گاہ تجلی ہے اس لیے اس کی طرف سجدۂ عبادت ہی ہوتا ہے اور دوسرے ارکانِ عبادت بھی اس سے تعلق رکھتے ہیں اور تجلی اول مصداقِ محبوبیت ہے اس لیے تمام عاشقانہ ادائیں خانہ کعبہ میں قائم کی گئی ہیں اور چونکہ تجلی اول بوجہ محبوبیت مرتبہ میں وجود سے پہلے ہے تو آئینہ عکس محبوبیت یعنی خانہ کعبہ بھی بہ نسبت آئینہ عکس حکومت یعنی بیت المقدس سے مرتبہ میں شرف اولیت رکھتا ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ دیوان عام منظم و نسق، عدلیہ تک تو ہر شخص کی رسائی ممکن ہے اور اس کے برعکس محل سرائے شاہی تک ہر شخص نہیں پہنچ سکتا اور جسے یہ مقام ملتا ہے تو وہ بہت ہی صاحب نصیب ہوتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ عشرت کدہ خاص اور محل سرائے شاہی تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کسی کی بالذات رسائی نہیں ہوتی۔ حضرت ابراہیم کی اول باریابی ہوتی ہے تو ان کی حیثیت معمار اور

وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ
عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا ؕ

اور ایسے ہی اے مسلمانو! ہم نے تم کو بہترین اُمّت[۳۸۷] بنایا ہے تاکہ تم تمام انسانوں کے سامنے گواہی[۳۸۸] دینے والے بنو اور اللہ کا رسول تمہارے سامنے گواہی دینے والا ہو۔

مہتمم تعمیرات کی ہے۔

الغرض تجلّی گاہِ محبوبیت میں خانہ کعبہ اپنی مثال نہیں رکھتا۔ تعمیر میں اوّلیت کا اسے شرف حاصل ہے۔ آبادی و بربادی عالم اس کے دامن سے وابستہ ہے۔ ارکانِ حج اور عاشقانہ اداؤں کا مرکز وہ ہے اور بالآخر خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے لیے مخصوص ہے۔ یہ چاروں باتیں خانہ کعبہ میں موجود ہیں اور ان سب کی بنیادی وجہ اللہ کی صفتِ جمال کی تجلّی ہے۔ یہ تجلّی ہی مسجود معبود ہے اور دیوارِ کعبہ صرف مسجودِ الیہ ہے اور مثل تختِ شاہی اور درِ دولتِ شاہی جہت اور سمت اور قبلہ آداب و نیاز ہے۔ کعبہ کے اسی بنیادی شرف کی وجہ سے اس کو بیت المقدس پر فضیلت حاصل ہے اور اسی بنا پر بیت المقدس کو چھوڑ کر اُمّتِ مسلمہ کا اسے قبلہ بنایا گیا ہے۔

اعلان امامت اُمّتِ مسلمہ

پہلی آیت میں روحانی ہدایت کے مرکز کا اعلان ہوا تھا۔ بیت المقدس جو عہدِ اسرائیلی کی یادگار ہے، نبوّتِ محمدیہ کے بعد اس میں قبلہ ہونے کی نشان باقی نہیں رہی بلکہ حضرت ابراہیم کی مسجد قبلہ بنائی گئی جس کا تعلق عہدِ اسماعیل سے تھا یعنی خانہ کعبہ، یہ قبلہ گویا مسلمانوں کا ارضی مرکز، ملّت ابراہیم کے پیرو ہونے کا نشان، دُنیا میں موحدوں کی پہلی یادگار، محمد رسول اللہ کے پیرو ہونے

کا شعار اور مسلمانانِ عالم کی وحدت کا نشان ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے خانہ کعبہ بناتے وقت اُمتِ مسلمہ کے ظہور کی دُعا مانگی تھی۔ اللہ کے علم میں اس کے ظہور کا وقت مقرر تھا۔ پہلی دُعا کے مقبول ہونے کا عملی مظاہرہ خانہ کعبہ کو قبلہ بنا کر اور حج فرض کر کے کیا دوسری دُعا کے عملی ظہور کے لیے اس آیت میں اعلان ہو رہا ہے یعنی من ذریتنا امة مسلمة لك۔ اے اللہ ہماری نسل میں سے ایسی اُمت پیدا کر دے جو تیری فرمانبردار ہو والی دُعا کا شرفِ قبول عطا ہو رہا ہے۔ اور صرف اُمتِ مسلمہ کا عملی ظہور ہی نہیں بلکہ رہتی دُنیا تک کے لیے اس آیت میں اُمتِ مسلمہ کی امامت کا اعلان کیا جا رہا ہے اور آپ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اس آیت میں اُمتِ مسلمہ کی بعثت کا ذکر ہو رہا ہے کیونکہ انبیاء میں اونچی شان والا نبی وہ ہے جس کو پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ مرادِ الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعے سے اس کی قوم کے ذریعے سے دوسری قومیں تاریکی سے نکل کر نور میں آئیں۔ اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثتِ اولی اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لیے نامزدگی کا نام بعثتِ ثانیہ ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی بعثت کا تذکرہ اسی پارے کے دوسرے رکوع کے آخر میں اس آیت میں آ رہا ہے۔

کما ارسلنا فیکم رسولا منکم

جیسا کہ روانہ کیا ہم نے تم میں ایک عظیم الشان پیغمبر تم میں سے

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسری بعثت کا اشارہ یہ آیت ——— کذالک جعلناکم اُمة وسطاً اعلان کر رہی ہے کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اُمتِ مسلمہ کے لیے ہوتی ویسی ہی اُمتِ مسلمہ کی بعثت دوسری قوموں اور تمام انسانوں کی طرف ہوتی ہے اور اسی معنے میں قرآن میں دوسری آیات بھی ہیں۔

یہ آیتِ گرامی قرآن کے مہماتِ معارف میں سے ہے۔ اس میں اُمت کے فضائل نہیں بلکہ فرائض بتائے گئے ہیں اور آیت کا ایک ایک لفظ فرائض کی نشاندہی کر رہا ہے۔ میں فضائل کا انکار نہیں کر رہا بلکہ فضائل کا وجود جن فرائض کی ادائیگی اور پابجائی پر قرآن نے موقوف کیا ہے، ان کی طرف متوجہ کرنا چاہتا ہوں۔

اُمت کی بعثت کا مطلب

اُمت کے مبعوث ہونے کا مطلب یہ ہے کہ جس کام کو کرنے کے لیے اللہ سبحانہٗ انفرادی

رپر انبیاء کو روانہ فرماتے تھے۔ انسانی زندگی ایسے نقطۂ ارتقاء پر پہنچ گئی کہ اب ہدایت و سعادت کو
وتے کار لانے کے لیے انفرادی محنت نہیں بلکہ اجتماعی للکار ہے اس لیے انفرادی نبوت کو محمد
سُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہمیشہ کے لیے ختم فرما کر اجتماعی نبوت قائم کر دی گئی اور اُمت کو
ر نبوت سپرد کر دیا گیا ہے اور اُمت کی ذمہ داری وہی بتائی گئی جو انبیاء کی ہوتی ہے۔ درحقیقت
تم نبوت اور انقطاع رسالت کا منشا صرف یہ ہے کہ محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت
ے ساتھ چونکہ دینِ حق کی تعلیم آخری حد تک مکمل کر دی گئی اور ہمیشہ کے لیے اس کی حفاظت
ا سامان بھی کر دیا گیا اس لیے اب کسی ایسی ہستی کی ضرورت نہیں ہے جو اللہ کے احکام اور اس
ی ہدایات کو وحی کے ذریعے براہ راست اللہ سبحانہ سے حاصل کرے۔ اس کی دوسری تعبیر یہ ہے
ہ اب کسی کو منصبِ نبوت نہ ملے گا لیکن مقامِ نبوت یعنی اللہ کی طرف سے آئی ہوئی اس ہدایت
و بندوں میں پھیلانا اور اللہ کا پیغام ان تک پہنچانے کا کام یعنی دُنیا تک باقی رہے گا اور سلسلہ
بوت ختم کرنے کے بعد اللہ پاک کی طرف سے اس کی تمام تر ذمہ داری اُمت کے سپرد کر دی گئی ہے۔
قرآن نے نبوت کے جو فرائض بتائے ہیں۔ دعوت، تبلیغ، انذار، شہادت، تعلیم، تلاوت،
یام، امر بالمعروف، نہی عن المنکر بالکل یہی فرائض اُمت کے بتاتے ہیں۔
اس موضوع پر اُمت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں کہ اُمت کے فرائض نبوت ہی کے
رائض ہیں بلکہ ان میں زیادہ وزن ہے۔
نبوت سے اگر کہا گیا ہے کہ نبوت کے کام کے لیے کھڑے ہو جاؤ اور اس کے لیے یہ سادی تعبیر
اختیار کی کہ قُم، لیکن اسی کام کو جب اُمت کو کرنے کو کہا گیا تو اندازِ تعبیر سادگی کی جگہ ایک نئے روپ
میں بدل گیا۔ چنانچہ ارشاد ہے:

یا ایھا الذین امنوا کونوا قوامین للہ

اے ایمان والو! اللہ کے لیے بہت زیادہ کھڑے ہونے والے ہو جاؤ۔
جو لوگ عربی زبان کا ادبی ذوق اور معانی و بلاغت کی گہرائیوں سے آشنا ہیں وہ اس اندازِ بیان
اور اس پیرایۂ تعبیر کی لطافت کا اندازہ کر سکتے ہیں۔
ذرا غور فرمایئے کہ اوّل قُم کی جگہ قوامے کر آئے ہیں جو مبالغہ کا وزن ہے اور پھر اس کو جملہ اسمیہ
میں پیش کیا جو دوام اور ثبوت چاہتا ہے۔ اس کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ نبوت کے جن
فرائض کی ادائیگی کے لیے قرآن دامانِ نبوت میں صرف فعلی ظہور کا خواہاں ہے اسی فرض کی ادائیگی کا

قرآن اُمت سے صرف فعلی ظہور کے درجہ میں نہیں بلکہ اس فعل میں زیادتی اور رجحانات کے ساتھ دوام اور ہمیشگی کا مطالبہ کر رہا ہے اور چاہتا ہے کہ فرض کی ادائیگی کا اُمت میں بطور صفت ظہور ہو۔

دعوت بھی نبوت کے فرائض میں ایک فرض ہے اور قرآن نے ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ کہہ کر نبوت کو اس کا حکم دیا ہے۔

اُمت کو اس کام کے لیے ان الفاظ میں کہا گیا ہے۔

ولتکن منکم اُمۃ یدعون الی الخیر

اور چاہیے کہ تم ایسی اُمت بن کر رہو جو خیر کی طرف لوگوں کو بلاتی ہو۔

انذار نبوت کا فریضہ بتایا گیا ہے اور ان انت الا نذیر کہہ کر نبوت کے اس فریضہ کی اہمیت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے لیکن اسی فریضہ کی ادائیگی کے لیے قرآن میں اُمت کو جس انداز میں مخاطب کیا گیا ہے وہ یہ ہے۔

فلولا نفر من کل فرقۃ طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم

کیوں نہ ایسا کیا گیا کہ ان کے گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئی ہوتی کہ دین میں فہم و دانش پیدا کرے اور جب اپنی قوم کے پاس واپس ہوتے اور ان کو جہل و غفلت کے نتائج سے ہوشیار کرتے۔

قرآن میں اگر یعلمھم الکتاب کہہ کر تعلیم کتاب کو نبوت کے فرائض میں شمار کیا ہے تو ساتھ ہی ——— فرمایا کہ

کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب وبما کنتم تدرسون

تم کتاب کی تعلیم اور اس کے پڑھنے پڑھانے میں مشغولیت کے ذریعے ربانی ہو جاؤ۔

چونکہ تلاوتِ قرآن کو نبوت کے مقاصد میں سے ایک اہم اور بنیادی مقصد قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے یتلوا علیکم ایاتنا۔

اس لیے اُمت کے بارے میں تلاوت کا تذکرہ نہایت پُرشوکت اور شاندار انداز میں کیا ہے

الذین اتینا ھم الکتاب یتلونہ حق تلاوتہ

جیسے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو نبوت کے فرائض میں شمار کیا ہے ٹھیک اسی طرح ان دونوں کو نہ صرف اُمت کا فریضہ اور ذمہ داری قرار دیا ہے بلکہ اس کی پابجائی پر اس اُمت کا

امت ہونا موقوف قرار دیا ہے اور اسی کو اُمت کا مقصد ظہور بنایا ہے۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر

تم بہترین اُمت ہو، لوگوں کی خاطر تمہارا ظہور ہوا ہے۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو اور برائی سے روکتے ہو۔

نبوت کا سب سے اہم فرض تبلیغ ہے یعنی جو سچائی اس کو اللہ کی جانب سے ملی ہے اسے دوسروں تک پہنچا دینا۔ خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے پیغام ربانی کی بے محابا تبلیغ کریں۔ ارشاد ہے:

یاایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک

اس اُمت کی تعریف میں اللہ سبحانہٗ فرماتا ہے

الذین یبلغون رسالات اللہ ویخشونہ ولا یخشون احداً الا اللہ وکفی باللہ حسیباً

کیا کہنے ہیں ان لوگوں کے جو اللہ کے پیغامات کو پہنچاتے ہیں اور اللہ سے ڈرتے ہیں۔ اللہ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے اور اللہ ہی کافی ہے۔

اس آیت میں اور پارہ ۱۷ سورہ حج کی آخری آیت میں شہادت کو نبوت کی اور اُمت کی یکساں ذمہ داری قرار دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ تمہارا ظہور اس لیے ہوا ہے کہ اللہ کا رسول تمہارے سامنے فرضِ شہادت ادا کرے اور تم تمام انسانوں کے سامنے شہادت کا فرض انجام دو۔ گویا تم اپنا چراغ اس سے روشن کروگے اور تمہارے ذریعے تمام دنیا کے چراغ روشن ہو جائیں گے۔

لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیداً

الغرض نبوت کی ذمہ داری اور فرائض میں اُمت برابر کی حصہ دار ہے اور یہ اس اُمت کی خصوصیت ہے اور یہی اُمت کے مبعوث ہونے کا مطلب ہے اور یہی درحقیقت ختمِ نبوت کی علت ہے کہ اجتماعی نبوت قائم ہونے کے بعد انفرادی نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا ہے۔ یعنی کوئی شخص اس منصب پر انفرادی طور پر اب قیامت تک فائز نہ ہوگا۔ علامہ شاطبی فرماتے ہیں کہ نبوت کی ان ذمہ داریوں اور فرائض میں شرکت کا قدرتی نتیجہ ہے کہ قرآن نے اُمت کو نبوت کے فضائل، مناقب اور مزایا میں بھی حصہ دار بنا دیا ہے۔ لیکن مزایا اور مناقب میں شرکت بالذات نہیں بلکہ بالعرض ہے یعنی صرف اُمت ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان فرائض کی بجاآوری کی وجہ سے ہے۔

اس موضوع پر علامہ شاطبی، غرناطی نے تفصیلی بحث کی ہے۔ ہم ناظرین معالم القرآن کی ضیافت طبع

کے لیے اس کا انتخاب پیش کرتے ہیں۔

اولاً نبوت کو مقام عصمت حاصل ہے۔ اُمت کو بھی من حیث المجموع مقام عصمت حاصل ہے۔ یعنی تاقیام قیامت پوری اُمت گمراہی سے محفوظ رہے گی۔ اُمت کے افراد گمراہ ہوں تو ہوں لیکن پوری اُمۃ گمراہ نہ ہوگی۔

ثانیاً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو رؤف رحیم کہا گیا ہے تو اُمت کو بھی رحماء سے متعارف کیا گیا ہے۔

ثالثاً تشہد میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر سلام کی سوغات پیش کی گئی ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اُمت پر بھی سلام پیش کیا گیا ہے۔ السلام علیک ایھا النبی اور السلام علینا۔

رابعاً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نہ ختم ہونے والے عطایا کا وعدہ ہوا ہے۔ اُمت سے بھی یہی وعدہ ہے ان لک لاجرا غیر ممنون اور فلھم اجر غیر ممنون۔

خامسا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اللہ کی جانب سے تثبیت یعنی حق پر جمائے رکھنے کا سامان ہوا ہے تو اُمت کے لیے بھی حق پر جمائے رکھنے کا اللہ نے یہ وعدہ فرمایا ہے۔

یثبت اللہ الذین امنوا بالقول الثابت فی الحیٰوۃ الدنیا

سادساً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیاء کے بارے میں قرآن نے مجتبیٰ ہونے کا اعلان کیا ہے۔ اس اُمت کے متعلق بھی قرآن نے بتایا ہے ھو اجتبٰکم۔

سابعاً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور دیگر انبیاء اصطفائی شان لے کر آئے ہیں اور مصطفیٰ ہوتے ہیں۔ قرآن نے اس اُمت کی اصطفائی شان کا بھی تذکرہ کیا ہے۔

ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا

پھر ہم نے اس کتاب الٰہی کا وارث بنا دیا اپنے بندوں میں سے ان کو جن کو ہم نے چن لیا تھا۔

ثامناً آپ کی گزشتہ کتب میں تعریف و توصیف ہوتی ہے اور آپ کو احمد کہہ کر پکارا گیا ہے اور آپ کی اُمت کو حمادون کہا گیا ہے۔

تاسعاً آپ کو معجزات سے نوازا گیا اور اُمت کو کرامات عطا کی گئی ہیں۔

عاشراً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو شرح صدر کا مقام ملا ہے اور اُمت کے بارے میں ہے۔

افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ

حادی عشر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اکرم الاولین والآخرین ہیں اور یہ اُمت آپ کے صدقے خیر اُمت ہے۔

ثانی عشر: حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم محبوب رب العالمین ہیں اور یہ اُمت قرآن کے مطابق محبوب الٰہی ہے قرآن میں ہے۔

فسوف یاتی اللہ بقوم یحبہم و یحبونہ

ثالث عشر: حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں مقام شفاعت عطا فرمایا گیا ہے اور احادیث میں آپ کی اُمت کے لیے بھی شفاعت کا ذکر آیا۔

رابع عشر: حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام رضا ملا ہے۔

و لسوف یعطیک ربک فترضی

اور اس اُمت کو بھی قرآن نے مقام رضا ملنے کا اعلان کیا ہے

رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ

خامس عشر: حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ اور اس کے فرشتے صلات بھیجتے ہیں اور اس اُمت کے بارے میں قرآن کا بھی اعلان ہے

ھوالذی یصلی علیکم و ملائکتہ

سادس عشر: حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی الٰہی کے ذریعے علم عطا فرمانے کے بعد وحی کے مطابق فیصلہ فرمانے کے لیے مقام ارائت دیا گیا ہے۔

لتحکم بین الناس بما اراک اللہ

اور اُمت کو وحی کے مطابق فیصلہ کرنے اور استنباط و اجتہاد کا مقام دیا گیا ہے

لعلمہ الذین یستنبطونہ منہم

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اُمت کو نبوت کے فرائض اور فضائل دونوں سے نوازنے کا تذکرہ ہے اصلی اور بنیادی چیز فرائض ہیں۔ فضائل ان کے تابع ہیں۔ یہ اُمت نبوت کے ان فرائض کو ادا کرنے کے لیے مبعوث ہوئی ہے اور ان فرائض کی ادائیگی پر اسے دُنیا کی امامت اور قیادت ملی ہے۔ اس تشریح کی روشنی میں اب آیت قرآنی کی مفسرین قرآن کی بیان کردہ تفسیر پڑھیے۔

کذالک کا مطلب

۳۸۶۔ یعنی جیسا تمہارا قبلہ کعبہ ہے جو حضرت ابراہیم کا قبلہ اور تمام قبلوں سے افضل ہے ایسا ہی ہم نے تم کو سب اُمتوں سے افضل اور تمہارے پیغمبر کو سارے پیغمبروں سے افضل اور برگزیدہ

کیا: تاکہ اس فضیلت اور کمال کی وجہ سے تم تمام اُمتوں کے مقابلے میں مقبول الشہادہ گواہ قرار دیے جاؤ اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمہاری صداقت وعدالت کی گواہی دیں[1]

اصل ارشاد میں عربی تعبیر وکذالک جعلنا کم ہے۔ اور ایسے ہم نے بنا دیا تم کو۔ ایسے ہی کی تعیین میں شارحینِ قرآن مختلف الخیال ہیں ایک خیال یہی ہے جو حضرت شیخ الہند نے اختیار فرمایا ہے یعنی جیسے ہم نے افضل ترین جگہ خانہ کعبہ کو تمہارا قبلہ بنایا ایسے ہی ہم نے تم کو اُمتِ وسط بنا دیا۔ قرطبی نے بھی یہی بات دوسرے عنوان سے کہی ہے کہ جیسے کعبہ وسطِ زمین میں واقع ہے ایسے ہی ہم نے تم کو اُمتِ وسط بنایا ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں جس طرح یہ بات ہوئی کہ بیت المقدس کی جگہ خانہ کعبہ قبلہ قرار دیا گیا اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے تمہیں اُمتِ وسط بنایا اور ابن القیم بدائع الفوائد میں رقمطراز ہیں کہ جیسے اللہ نے تمام جہات میں درمیانی سمت کو تمہاری عبادتوں کے لیے قبلہ بنا دیا ایسے ہی اللہ نے تم کو اُمتِ وسط بنایا ہے۔ اس خیال کا پس منظر یہ ہے کہ مدینہ منورہ میں خانہ کعبہ مشرق ومغرب میں نہیں بلکہ جانب جنوب میں واقع ہوا تھا۔ اس کے برعکس دوسرے شارحین کہتے ہیں کہ تشبیہہ صراطِ مستقیم سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ جیسے ہم نے صراطِ مستقیم کی ہدایت بخشی ہے ایسے ہی ہم نے تم کو اُمتِ وسط بنایا ہے۔ ابنِ جریر کہتے ہیں کہ اے مسلمانو جیسے ہم نے تم کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی تعلیمات کے ذریعے ہدایت بخشی ہے اور قبلہ ابراہیم اختیار کرنے کی توفیق ارزانی کی ہے ایسے ہی ہم نے تم کو دوسری اُمتوں کے مقابلے میں اُمتِ وسط بنا دیا۔

اسی طرح کا اشارہ دونوں طرف ہے۔ اللہ کی اس رہنمائی کی طرف بھی جس سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کرنے اور قبول کرنے والوں کو سیدھی راہ معلوم ہوئی اور ترقی کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ گئے کہ اُمتِ وسط قرار دیے گئے اور تحویلِ قبلہ کی طرف بھی کہ نادان اسے محض ایک سمت سے دوسری سمت کی طرف پھرنا سمجھ رہے ہیں۔ حالانکہ دراصل بیت المقدس سے کعبے کی طرف سمت قبلہ کا پھرنا یہ معنے رکھتا ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو دنیا کی پیشوائی کے منصب سے باضابطہ معزول کر دیا ہے اور اُمتِ محمدیہ کو اس پر فائز کر دیا[2]

کچھ شارحینِ قرآن کے خیال میں کذالک تشبیہہ کے لیے نہیں ہے بلکہ حرف تشبیہہ میں مبالغہ کے لیے آیا ہے اور ذالک اسم اشارہ بعید عظمت وفخامت شان ظاہر کرنے کے لیے

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۷ [2] تفہیم القرآن ص ۱۱۹

لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ہماری ہی عجیب و غریب کارستانی اور کارگزاری ہے کہ ہم نے تم کو اُمت وسط بنا دیا ہے۔ آلوسی نے روح المعانی میں اسی کو پسند کیا ہے۔ مولانا حسین علیؒ کے حوالہ سے صاحب جواہر القرآن نے اسی کی ہمنوائی نقل کی ہے۔

تشبیہ یہاں بیانِ کمال کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسی طرح ہم نے تم کو اُمت وسط بنا دیا ہے یعنی یہ ہمارا کمال ہے[1]

ابو حیان اندلسی نے البحر المحیط میں اسی کو مشہور معنے قرار دیے ہیں۔

۲۸۷۔ ہم نے تم کو بہتر اُمت بنا دیا ہے۔ اصل ارشاد میں عربی تعبیر اُمتِ وسطًا ہے۔ عربی میں لفظ وسط دو معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک بہترین دوسرے درمیانی۔ شارحینِ قرآن نے دونوں معنے کے مطابق اپنے اپنے مذاق کے مطابق تشریح کی ہے۔ درمیانی چونکہ اطراف و جوانب کی وسعت سے ہوتا ہے اس لیے عدل مراد ہوتا ہے۔

گویا اُمتِ وسط ایک ایسا اعلیٰ اور اشرف گروہ ہے جو عدل و انصاف اور افراط و تفریط کے درمیان توسط کی روش پر قائم ہو جو دُنیا کی قوموں کے درمیان صدر کی حیثیت رکھتی ہو جس کا تعلق سب کے ساتھ یکساں حق اور راستی کا تعلق ہو اور ناحق اور ناروا کسی سے تعلق نہ ہو[2]

وسط کی زبانِ نبوت سے تشریح

مسند احمد ابن حنبل میں ابو سعید خدری کے حوالے سے بتایا گیا ہے کہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم نے وسطًا کی تفسیر عدل سے فرمائی ہے۔ عدل کے معنے ہیں برابر ہونا، کم زیادہ نہ ہونا۔ اسی لیے معاملات اور قضایا میں فیصلہ کر دینے کو عدالت کہتے ہیں کہ حاکم دو فریقوں کی باہمدگر زیادتیاں دُور کر دیتا ہے۔ ترازو کے تول کو بھی معادلت کہتے ہیں کیونکہ وہ دو پلڑوں کا وزن برابر کر دیتا ہے۔ یہی عدالت جب اشیا میں نمودار ہوتی ہے تو ان کی کمیت اور کیفیت میں تناسب پیدا کر دیتی ہے۔ ایک جزء کا دوسرے جزء کی کمیت و کیفیت میں مناسب و موزوں ہونا عدالت ہے۔

وجود کیا ہے؟ حکیم بتلاتا ہے کہ عناصر کی ترکیب کا اعتدال ہے۔ اگر اس اعتدالی حالت میں

---

[1] جواہر القرآن ص ۷۰　[2] تفہیم القرآن ص ۱۱۹

ذرا فتور آجائے وجود کی نمود معدوم ہو جائے۔ جسم کیا ہے؟ جسمانی مواد کی ایک خاص اعتدالی حالت ہے اگر اس کا ایک جز بھی اعتدال پر نہ رہے تو جسم کی ہیئتِ ترکیبی بگڑ جائے۔ صحت کیا ہے؟ اخلاط کا اعتدال ہے جہاں اس کا قوام بگڑا صحت ختم ہے۔ حسن و جمال کیا ہے؟ تناسب و اعتدال کی ایک کیفیت ہے۔ پورا کائناتی نظام اسی عدل پر قائم ہے۔ اگر لمحہ کے لیے یہ حقیقت نہ رہے تو تمام نظامِ عالم درہم برہم ہو جائے۔ اعداد کے تناسب کی عظیم الشان صداقت جس پر ریاضی اور حساب کے تمام حقائق کا دارومدار ہے کیا ہے یہی عدل ہے۔ جس روز یہ حقیقت ذہنِ انسانی پر کھلی ہے علوم و معارف کے تمام دروازے باز ہو گئے تھے۔

جب عدالت کا یہ قانون کائنات کے ہر گوشہ میں نافذ ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے افکار و اعمال اور اخلاق کے لیے بے اثر ہو جائے اور اس کی بنیاد پر قوموں اور اُمتوں کا انتخاب نہ ہو۔

قرآن آیا تو قومیں اور اُمتیں دوراہے پر کھڑی ہو کر دو حصوں میں بٹی ہوئی تھیں۔ کچھ نری مادیت کے ہو کر رہ گئے تھے۔ جسمانی لذتوں سے آگے کوئی روحانی تصور نہ رکھتے تھے ——— جیسے یہود و مشرکین اور کچھ نری روحانیت کے علمبردار تھے اور دُنیا اور اس کی تمام آسائشوں کو چھوڑ بیٹھے تھے جیسے عیسائی، صابئین اور ہندوستان کے اربابِ ریاضت۔ افراط و تفریط کے یہ دونوں دھارے اور میل و انحراف کے یہ دونوں نمونے موجود تھے۔ لیکن عدل و قسط پر مبنی درمیانہ درجہ ناپید ہو چکا ہے۔ اللہ نے اُمتِ اسلامیہ کو وہ نظامِ حیات دے کر روانہ فرمایا جو دونوں یعنی افراط و تفریط سے ہٹ کر مادہ اعتدال پر قائم ہے۔ جس میں روحانیت اور جسمانیت دونوں کے تقاضے پورے کیے گئے ہیں اور ساری انسانی حقوق کا ایک جامع چارٹر لے کر آئی ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ انسان اگر جسم و رُوح کا نام ہے تو یہ اُمت جسم و رُوح کے حقوق کی علمبردار بن کر آئی ہے اور اگر انسان حیوانیت اور فرشتگی ہے تو یہ اُمت حیوانیت اور فرشتگی کے تمام تقاضوں کا کامل ترین نمونہ بن کر آئی ہے تم درمیانی اُمت ہو یعنی دونوں راہوں سے آشنا ہو اور دونوں قسم کے کمالات کے علمبردار ہو۔

اُمتِ وسط کا انتخاب

دُعائے ابراہیم کے صدقے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ سبحانہ نے تمام عالم کی اصلاح

کے لیے روانہ کیا اور اس بنا پر آپ کو ایسی شریعت دی تھی جو تمام عالم کے لیے ابد تک کافی ہو، لیکن کوئی شریعت، کوئی قانون، کوئی دستور العمل اس وقت تک مفید اور کار آمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کی پشت پر ایسی طاقت موجود نہ ہو جو اس قانون کی عملی تصویر ہو اور جس کی ہر بات، ہر ادا، ہر جنبش عمل خطیب بن کر گرد و پیش کو اپنا ہم زبان اور ہم عمل بنالے۔

اسی بنا پر حضرت ابراہیمؑ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی دعا سے پہلے اُمتِ مسلمہ کے لیے ومن ذریتنا امۃ مسلمۃ لک کی دعا فرمائی۔ حضرت ابراہیم کی دونوں دعاؤں کو شرفِ پذیرائی حاصل ہوا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی اور آپ کی تربیت سے اصلاحِ عالم کے لیے اُمتِ مسلمہ ظہور میں آ گئی۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ جو پیغمبر تمام عالم کی اصلاح کے لیے آتا ہے وہ علاوہ ان اصول کے جو اور مذاہب میں چند نئے اصول اختیار کرتا ہے جن میں سے ایک یہ ہے کہ وہ ایک قوم کو سنتِ راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کے اعمال کی اصلاح، ان کے اخلاق کا تزکیہ کرتا ہے اور پھر ان کو اپنا دست و بازو بنالیتا ہے اور ان کو دنیا میں پھیلا دیتا ہے۔ ان کے ذریعے سے مجاہدہ کرتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

دُنیا کی اور قومیں اس منصب پر پہلے ممتاز ہو چکی ہیں۔ اب تمام قوموں میں صلاحیت کا مادہ مفقود ہو چکا تھا۔ ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کر ترقی کی رُوح فنا کر چکا تھا۔ رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے۔ ہندوؤں کا دل و دماغ صرف وہم پرستی کا کام دینے کے قابل رہ گیا تھا۔ صرف ایک عرب تھا جو بن جتی زمین کی طرح رہا ہے۔ نشو و نما سے مالا مال تھا اور ایک لوح سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا۔ مشیت ایزدی نے اسی کو تاکا اور چند روز میں وہی عرب جو سرتا پا جہل تھا سرتاپا وحشت اور سرتا پا درندہ تھا اُمتِ وسط بن گیا۔

عرب دُنیا کے وسط میں واقع ہے

شاید لفظ وسط کی معنوی وسعت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ عرب کا ملک دُنیا کے وسط میں واقع ہے۔ ایک طرف ایشیا، دوسری طرف افریقہ اور تیسری طرف یورپ کا راستہ اس سے قریب ہے۔ پھر بحری جہاز کے دور نے عرب کو جزائر اور دور دراز ملکوں سے قریب کر دیا تھا۔ اس لیے

عرب سے نکل کر وہ ایک طرف عراق ہو کر ایران، ترکستان، خراسان، سیستان، کابل اور ہندوستان تک پہنچ گئے۔ دوسری طرف شام ہو کر مصر، افریقہ، الجزائر، تیونس، مراکش اور سپین تک جا پہنچے۔ اور بحری راستوں سے ایک طرف تمام جزائر افریقہ، حبشہ، زنجبار اور پھر ادھر جزائر ہند، جاوا، سماٹرا اور چین تک ان کا گزر ہوا اور دوسری طرف سائپرس کریٹ اور سسلی تک ان کا پرچم لہرایا۔ یہ تمام مواقع اس لیے میسر آئے کہ عرب کا جائے وقوع اس دعوت کے لیے مناسب مرکز تھا۔ فرض کرو کہ اگر اس دعوت کی جگہ ہندوستان یا چین ہوتی تو اسپین اور سسلی تک پہنچنے کے لیے کتنا عرصہ درکار ہوتا۔

مشرقی اور مغربی طاقتوں کے درمیان

پھر یہ کہ اس وقت دُنیا جن دو مشرقی اور مغربی نظاموں کے زیرِ نگیں تھی ان دونوں نظاموں کے زور کو برابر کی چوٹ بن کر ایک ساتھ توڑنے کے لیے عرب کے سوا دُنیا میں کوئی جگہ جہاں سے ان دونوں پر ایک ساتھ حملہ کرنا اور دُنیا کو ان کے خُون آشام پنجوں سے نجات دینا بآسانی ممکن ہو۔

اُمتِ وسطٰی کا مبدا ذریتِ ابراہیم ہے

ابراہیمی دُعا کے مطابق اُمتِ وسط کا مبدا خود ذریتِ ابراہیم ہے۔ شمالی عرب کے تمام قبیلے حضرت ابراہیم کی اولاد اور ان کی نسل سے تھے۔ یہ بات اتنی مشہور اور متواتر روایتوں سے ثابت ہے کہ کسی نے اس کی تردید کرنے کی ہمت نہیں ہے۔ تورات نے حضرت ابراہیم کی جن اولادوں کے نام بتاتے ہیں۔ ان میں سے ایک ایک نام کا سُراغ عرب کی پرانی آبادیوں میں ملتا ہے۔ چنانچہ ریورنڈ فاسٹر نے ۱۸۴۴ء میں عرب کا جو جغرافیہ لکھا ہے اس میں پوری دلیل اور تفصیل اور شہادتوں کے ساتھ ان آبادیوں کا پتہ لگایا ہے اور ان کی جگہیں متعین کی ہیں۔ قدیم یہودی مورخ یوسیفوس نے بھی لکھا ہے اور آج کل ایک فاضل یہودی ڈاکٹر اسرائیل نے تاریخ الیہود فی بلاد العرب ایک کتاب لکھی ہے اس میں اس نے اس واقعہ کو تسلیم کیا ہے اور اس کی صحت پر دلائل پیش کیے ہیں۔ قرآن نے عرب کو مخاطب کر کے صاف صاف کہا ہے۔

ملۃ ابیکم ابراھیم

وہی تمدن و معاشرت جو تورات میں حضرت ابراہیم اور ان کے اہل و عیال کا نظر آتا ہے۔ اسلام کے عہد تک باقی ہے۔ وہی خیمے ہیں، وہی صحرا ہیں، وہی مویشی ہیں، وہی بدویانہ زندگی ہے وہی رسوم و رواج ہیں جن کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے آکر اور نکھار دیا ہے۔ وہی بیت اللہ حج اور قربانی کی عادتیں ہیں۔ اور یہ ایسا کھلا قرینہ ہے جو آج بھی یورپ کے محققوں کی نگاہوں کے سامنے ہے مشہور محقق جرمن نولڈیک کہتا ہے:

اور نیز عرب میں قدیم سامی کیریکٹر اپنے خالص رنگ میں باقی سمجھا جاتا ہے اور ان کی زبان اصل زبان کے بہت قریب ہے۔

نسب پر فخر کرنا بجائے خود کوئی اچھی چیز نہیں۔ لیکن حضرت ابراہیم نے انہی اولاد میں اُمتِ مسلمہ کے لیے جو دعا کی تھی اور ان کو جس بیت اللہ کی پاسبانی سپرد کی تھی اور ان کی تعلیم و تربیت اور تزکیہ و تطہیر کے لیے نبی کی بعثت کی جو دعا مانگی تھی اور اللہ سبحانہ نے ان کی ذریت کی نسل کو دینی و دنیاوی برکات کے عطا کرنے کا ان سے جو عہد کیا تھا ان سب کے پورا ہونے کے اور ان کا حقیقی مصداق بننے کے لیے نسل ابراہیم کی صحیح النسبی کی ضرورت تھی۔ اسی لیے اللہ نے عرب کو نسب کی حفاظت کا شرف عطا فرمایا۔[1]

الغرض وسط کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُمت ٹھیک سیدھی راہ پر ہے جس میں کچھ بھی کجی کا شائبہ نہیں ہے اور افراط و تفریط سے بالکل پاک ہے۔[2]

یعنی ایسی اُمت جو ہر اعتبار اور ہر معیار سے غایتِ اعتدال پر ہو اور ہر کجی اور افراط و تفریط سے پاک ہو۔[3]

۳۸۸ ۔ تاکہ تم تمام انسانوں کے سامنے گواہی دینے والے ہو جاؤ۔ آیت کا یہ ترجمہ عام مترجمینِ قرآن کے مطابق کیا گیا ہے۔ شاہ عبدالقادر سے لے کر نیچے تک سب نے شہادت کا ترجمہ گواہی سے کیا ہے لیکن شیخ الہندؒ اور دوسرے مترجمین نے سورۂ حج کی آخری آیت کا ترجمہ اس طرح کیا ہے "تاکہ ہو جاؤ تم بتانے والے لوگوں پر اور پیغمبر ہو بتانے والا تم پر"، دونوں ترجمے اپنی جگہ درست ہیں۔

اُمت کے گواہ بننے کا مطلب یہ ہے کہ یہ اُمت اپنے اعمال و اخلاق کی رو سے مادیت پسند

---

[1] سیرۃ النبی ص ۲۰۲ ج ۲ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۷ [3] ماجدی ص ۵۵

اور روحانیت کا غلط تصور رکھنے والوں کے سامنے ان اعمال و افکار کے غلط ہونے کی گواہی دینے والی ہے۔ ان مادیت پسندوں کے خلاف اس کی دینی زندگی کا ایک ایک گوشہ سب سے بڑی شہادت ہے جو جسمانیت کے ہو کر رہ گئے اور پوری زندگی بہیمیت کی خدمت میں گزار رہے ہیں جن کو بھول کر بھی اللہ، آخرت، اللہ کی کتاب، اللہ کے رسول کے بارے میں سوچنے کی فرصت نہیں ملتی۔ ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت ان کا سرمایہ زندگی ہوتا ہے۔ ان کے سامنے اُمت کی ساری زندگی خدا کی بندگی میں بسر ہو رہی ہے۔ زندگی کا ایک لمحہ بھی خدا کی عبادت سے خالی نہیں ہے۔ اس دُنیا میں جو کچھ بھی کر رہے ہیں۔ خدا کی شریعت کے مطابق کر رہے۔ ان کا سونا ان کا جاگنا، ان کا کھانا اور پینا، چلنا اور پھرنا غرض سب کچھ اللہ کے قانون کی پابندی میں ہے۔ اللہ نے جو خدمات ان کے سپرد کی ہیں اور دُنیا میں جو فرائض ان پر ڈالے ان سب کا بارہ نفس کی پوری آمادگی کے ساتھ اٹھاتے ہیں۔ اور ان کو اس طریقے سے ادا کرتے ہیں جس کی اللہ نے اپنے رسولوں کے ذریعے رہنمائی کی ہے۔ یہ اُمت کی مادہ پرستوں اور دُنیا کے گرویدہ لوگوں کے سامنے گواہی ہے۔

اسی طرح ان جوگیوں اور روحانی زندگی کے دلدادوں کے خلاف بھی اُمت کی زندگی گواہ ہے، جو دُنیا کی زندگی سے الگ ہو کر خدا سے لو لگاتے ہوئے ہیں۔ نفس کشی اور جسمانی تعذیب کو سب سے بڑی روحانیت سمجھتے ہیں۔ زندگی کی بنیاد راہبانہ تصور پر رکھتے ہیں جو اس دُنیا کو دارِ ابتلا نہیں دارِ تعذیب بنا کر دینداری اور دُنیاداری کی تقسیم کر چکے ہیں۔ اُمتِ اسلامیہ اپنے کردار و اعمال کے لحاظ سے ان کے خلاف یہی گواہی دے رہی ہے اور دُنیا میں حکومت کی کرسی پر بیٹھ کر اللہ کو یاد کرتی ہے اور جانتی ہے کہ ہم خدا نہیں خدا کے بندے ہیں۔ عدالت کی میز پر اللہ کو یاد کرتی ہے بازار میں دکان پر معاشرتی زندگی میں مجلسوں میں غرض پوری دُنیوی زندگی کو عبادت میں تبدیل کرنا چاہتی ہے۔ گویا یہ اُمت اپنے اخلاق و اعمال کے لحاظ سے پوری انسانی زندگی کے لیے معلم بن کر آتی ہے۔ یہی اس کی دُنیا میں انسانوں کے خلاف شہادت ہے۔

اُمت کا اس دُنیا میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا اُمت کی ذمہ داری کا وزن بتانے کے لیے ہے۔ یہ مقام قوموں کی زندگی میں انسانی عظمت کا مقام ہے کہ پوری انسانی زندگی کے لیے اس کی قیادت و امامت کا اعلان ہو۔ اس سے بڑھ کر بلندی کا تصور ہی نہیں ہو سکتا۔ انسان کی محنت و مشقت ہر طرح کی بلندیوں کو پا سکتی ہے۔

لیکن یہ بات نہیں پاسکتی کہ تمام قوموں، تمام ملکوں اور تمام طبقوں اور تمام نسلوں کے لیے اعمال و اخلاق ایمان و عمل کی درستگی کا مرکز بن جاتے۔ یہ کمالِ عمل کی وہ امامت ہے جو بادشاہوں اور زاہدوں کے حصے میں نہیں آتی۔ یہی مقامِ شہادت ہے جس کی خبر ہمیں ایک دوسری آیت میں دی گئی ہے۔

یاایھا الذین امنوا کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ ولو علی انفسکم
اوالوالدین والاقربین

اللہ سبحانہٗ کی طرف سے گواہی کے منصب پر مامور ہونا درحقیقت امت کو امامت کے مقام پر سرفراز کیا جانا ہے۔ اس میں جہاں فضیلت اور سرفرازی ہے۔ وہی ذمہ داری کا بہت بار بھی ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس اُمت کے لیے خداترسی، راست روی، عدالت اور حق پرستی کی زندہ شہادت ہیں۔ اسی طرح اس اُمت کو بھی تمام دُنیا کے لیے زندہ شہادت بننا چاہیے۔ حتیٰ کہ اس کے قول و عمل اور برتاؤ ہر چیز کو دیکھ کر دُنیا کو معلوم ہو جائے کہ خداترسی اس کا نام ہے۔ راست روی یہ ہے، عدالت اس کو کہتے ہیں اور حق پرستی ایسی ہوتی ہے۔ پھر اس کے معنے یہ بھی ہیں کہ جس طرح اللہ کی ہدایت پہنچانے کے لیے رسول اللہ کی ذمہ داری بڑی سخت تھی حتیٰ کہ اگر وہ اس میں ذرا کوتاہی کرتے تو اللہ کے ہاں ماخوذ ہوتے۔ اسی طرح دُنیا کے عام انسانوں تک پہنچانے کی نہایت سخت ذمہ داری اُمت پر عائد ہوتی ہے۔ اگر ہم خدا کی عدالت میں واقعی اس کی شہادت نہ دے سکے کہ ہم نے تیری ہدایت جو تیرے رسول کے ذریعے سے ہمیں پہنچی تھی، تیرے بندوں تک پہنچانے میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے تو ہم بہت بُری طرح پکڑے جائیں گے اور امامت کا یہی فخر ہمیں لے ڈوبے گا۔

ہماری امامت کے دَور میں ہماری کوتاہیوں کی پاداش میں خیال اور عمل کی جس قدر گمراہیاں دُنیا میں پھیلی ہیں اور جتنے فساد اور فتنے خدا کی زمین میں برپا ہوئے ہیں ان سب کے لیے اُمّہ شیاطین وانس وجن کے ساتھ ہم بھی پکڑے جائیں گے۔ ہم سے پوچھا جائے گا کہ جب دُنیا میں معصیت، ظلم اور گمراہی کا یہ طوفان برپا تھا تو تم کہاں گئے تھے [1]

صحیح بخاری، ترمذی، نسائی اور مسندِ احمد کی متعدد حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ شہادت علی الناس کے منصب کا ایک مشہدہ معاملہ ہوگا جو قیامت کے دن پیش آئے گا کہ؛

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۲

جب پہلی اُمتوں کے کافر اپنے پیغمبروں کے دعوے کی تکذیب کریں گے اور کہیں گے کہ ہم کو تو کسی نے بھی دُنیا میں ہدایت نہیں کی اس وقت آپ کی اُمت انبیاء کے دعوے کی صداقت پر گواہی دے گی اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی صداقت اور عدالت پر گواہی دیں گے۔ اس وقت وہ اُمتیں کہیں گی کہ انہوں نے ہمارا زمانہ نہیں پایا نہ ہم کو دیکھا۔ پھر ان کی گواہی کیسے مقبول ہو سکتی ہے۔ اس وقت آپ کی اُمت جواب دے گی کہ ہم کو اللہ کی کتاب اور اُس کے رسُول کے بتلانے سے اس امر کا علم یقینی ہوا۔ اس کی وجہ سے ہم گواہی دیتے ہیں۔

بلاشبہ شہادت کا مقام دُنیا و آخرت دونوں کے لیے ہے جو اُمت یہاں موجود انسانوں کے سامنے شہادت کا فرض انجام دے گی۔ وہ وہاں بھی ان انسانوں کے بارے میں گواہی دے گی جو پہلے گزر چکے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلی شہادت عمل کی ہو گی اور دوسری شہادت علم کی ہو گی۔

یہ آیتِ قرآنی مدنی زندگی کے ابتدائی دور میں نازل ہوئی ہے۔ جب مسلمانوں کی مظلومیت اور بے سروسامانی اپنے انتہائی درجوں تک پہنچ چکی تھی۔ حتیٰ کہ مشرکین کے ساتھ یہودی بھی اپنی پوری اجتماعی قوت سے مسلمانوں کو نیست و نابود کرنے میں سرگرم تھے۔ ایسی حالت میں کون اُمید کر سکتا ہے کہ انہی مظلومیتوں کے ساتھ اس اُمت کی کامیابی کا بھی کوئی امکان ہے۔ لیکن قرآن نے صرف اُمت کی کامیابی کی بشارت نہیں دی بلکہ ایک ایسے مقام تک پہنچنے کی خبر دی جو نوعِ انسانی کے لیے عظمت و ارتقاء کی سب سے آخری بلندی ہے۔

۲۸۹۔ اور اللہ کا رسُول تمہارے سامنے گواہی دینے والا ہو۔ یعنی اللہ کا رسُول اس مرتبہ بالا کے لیے کامل ترین نمونہ ہے۔ اس اُمت کو یہ مقامِ عظیم اسی رسُولِ اعظم کی سیرت، شریعت کی پیروی کے صدقے نصیب ہوا ہے۔ آپؐ کی ذاتِ گرامی سنّت اور بدعت کے موضوع پر معیارِ حقیقی ہے جیسے یہ اُمت پوری انسانیت کے مقابلے میں اپنی سیرت اور اپنے مادی اور روحانی ارتقاء کے ذریعے انسانیت کی گمراہی اور جادۂ حق سے ہٹ جانے کی گواہ ہے۔ ایسے ہی اللہ کا رسُول اس اُمت کے لیے اپنی سنّت اور اپنے اُسوۂ حسنہ کے ذریعے اُمت کے صراطِ مستقیم پر ہونے کا گواہ ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ تم اس لیے اُمتِ وسط بنے ہو کہ اللہ کا رسُول تمہارے لیے شاہد ہو اور تم تمام انسانوں کے لیے، تم اپنا چراغ اس سے روشن کرو گے، تمہارے چراغ سے تمام دُنیا کے

چراغ روشن ہوں گے۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا اُمتِ وسط ہونا اور منصبِ امامت پر مامور ہونا بالذات نہیں بلکہ بالعرض ہے۔ اگر تم نے اپنے اعمال میں نبوت کی لائی ہوئی ہدایت کو جگہ نہ دی اور اس کی سنت اور اُسوۂ حسنہ سے تمہارے اندر جھلک نہ رہا تو تم مقامِ امامت سے ہٹ جاؤ گے اور اس منصبِ عظیم کے ہرگز مصداق نہ ہو گے۔

اپنی نجات چاہتے ہو تو دُنیا کی نجات کی فکر کرو!

اس آیت نے مسلمانوں کو بتایا ہے کہ اپنی نجات چاہتے ہو تو دُنیا بھر کی نجات کی فکر کرو۔ اس حکم کی مصلحت یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسروں کی بھلائی اور بُرائی کا ذمہ دار سمجھے گا۔ وہ لازماً اپنے اعمال کی اصلاح کے لیے کوشاں ہو گا۔ اسی احساس نے کہ اللہ نے مسلمانوں کو بقول ربعی بن عامر اس لیے مبعوث کیا ہے کہ وہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔ انسانوں کی بندگی چھڑا کر خدا کی بندگی پر آمادہ کریں۔ انہیں دُنیا کی تنگی سے نکال کر آخرت کی کشادگی کی طرف لائیں اور مذاہب کی کج روی اور بے اعتدالی سے نکال کر اسلام کی صراطِ مستقیم پر لگائیں۔ ان میں ایسی رُوح پھونک دی تھی کہ آناً فاناً دو عظیم الشان سلطنتوں کو زیر و زبر کر دیا۔ وہ جزیرۂ عرب سے اس طرح نکلے تھے کہ اُن کے کپڑے خستہ تھے اُن کے جوتے پھٹے اور پُرانے تھے۔ ان کے پاس بے نیام تلواریں تھیں۔ ان کے بعض گھوڑوں کو زین بھی نصیب نہ تھی۔ دیکھتے ہی دیکھتے وہ دُنیا کے حاکم بن گئے اور ان قوموں کو اپنے زیرِ اقتدار کر لیا جو تہذیب و تمدن اور علم و فن میں دُنیا کی امام تھیں۔ اونٹوں اور بکریوں کے چرواہے جہانبانی کرنے لگے اور دُنیا کے سب سے زیادہ ترقی یافتہ گروہ کے امام ہو گئے۔ علم و فن، تہذیب و تمدن اور اخلاق و آداب میں ان کے اُستاد ہو گئے اور اللہ کا یہ وعدہ پورا ہو گیا کذالك جعلناكم أمة وسطا لتكونوا شهداء على الناس

دورِ اوّل کے مسلمانوں کے حالات کا یہ انقلاب تاریخ کا ایک نادر اور انوکھا واقعہ ہے مورخین کا اتفاق ہے کہ تاریخِ انسانی میں اس سے زیادہ عجیب و غریب واقعہ پیش نہیں آیا۔ اس کا راز اور اس حیرت انگیز انقلاب کی وجہ یہ اور صرف یہ تھی کہ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اللہ کی جانب سے منصبِ امامت پر مامور ہیں اور اللہ نے اُن کو شہادت علی الناس کا فریضہ ادا کرنے کے لیے روانہ فرمایا ہے وہ اللہ کے دین کی جدوجہد اور عام انسانوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں اور قوموں کی

اصلاح کا کام ان کے سپرد ہوا ہے۔ اس مقصد کی خاطر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی برکت سے ان میں ایک نئی رُوح اور نیا ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح بے نظم اور لا انتظام نہیں تھے بلکہ وہ زندہ نظامِ حیات کے حامل اور زبردست قوت کے مالک تھے۔ ان کو از سرِ نو زندگی مل تھی۔ ان کی دماغی تربیت نئے طریقہ پر ہوئی تھی۔ ان کی ذہنیتوں میں انقلاب آچکا تھا۔ دُنیا ان کے لیے اور وہ دُنیا کے لیے بالکل بدل گئے تھے۔ انہوں نے دُنیا پر نگاہ ڈالی، وہ دُنیا جو اُن کے لیے کبھی حیرت واستعجاب کا سبب تھی اب ان کی نظر میں حقیر تھی۔ انہوں نے دیکھا کہ دُنیا میں ہر طرف ظلم و فساد کا دور ہے۔ فسق و فجور کی گرم بازاری ہے۔ تاریکی کا غلبہ ہے اور دُنیا کی اصلاح کا کام ان کے سپرد ہوا ہے۔ اس عقیدے کی وجہ سے ان میں عجیب و غریب بے خوفی پیدا ہو گئی تھی۔ وہ اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال دیتے تھے اور ایسے ایسے کام کر گزرتے تھے جو انسانی طاقت سے باہر ہیں۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ اُن میں دو طاقتیں کارفرما تھیں۔ ایک بیرونی دوسری اندرونی۔ بیرونی طاقت اُن کے اخلاقِ عالیہ اُن کی ایمانی صفات اور اُن کی ملکی سیرت تھی۔ وہ اس وصف میں ممتاز اور معروف تھے۔ جہاں کہیں جاتے اور قیام کرتے اُن کے اخلاق اور ایمانی اوصاف اُن کا مقدمۃ الجیش ہوتے۔ یہ اخلاق و اوصاف ان کے لیے دلوں کو مسخر کر لیتے۔ نفوس میں ان کی عظمت و محبت پیدا کر دیتے۔ تلواروں، نیزوں اور بھالوں سے پہلے ان کے اوصاف و اخلاق اپنا کام کر لیتے تھے۔ جو لوگ ان کے اخلاقِ حسنہ اور حسنِ عمل کا مشاہدہ کرتے انہیں یقین ہو جاتا کہ یہ لوگ مغلوب نہیں ہو سکتے اور عنقریب یہ دُنیا پر چھا جائیں گے ـــــ اور اندرونی طاقت اُن کی مخلصانہ اللہ سے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت، اللہ کی عبادت اور زندگی کے تمام گوشوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت کا والہانہ شوق ـــــ اُن کا یہ یقین کہ اللہ اُن کی مدد کا ضامن ہے۔ اس نے اُن سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے اور اللہ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اس باطنی قوت نے اُن میں بے پناہ قوت پیدا کر دی تھی کیسے ہی ناخوشگوار حالات پیش آئے اُن کے ارادہ میں کوئی کمزوری نہ آئی۔

وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ
الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبُ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ ۚ وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً
إِلَّا عَلَى الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ۗ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِيعَ إِيمَانَكُمْ ۚ
إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوفٌ رَحِيمٌ ﴿١٤٣﴾

پہلے تم جس[۲۹۰] قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے اُسے تو ہم نے یہ جاننے[۲۹۱] کے لیے قبلہ مقرر کیا تھا کہ کون لوگ اللہ کے رسُول کی پیروی میں سچے ہیں اور کون لوگ اُلٹے پاؤں پلٹ جانے والے ہیں اور اس میں تنک نہیں کہ ہدایت یافتہ لوگوں کے علاوہ یہ معاملہ سب کے لیے بے حد سنگین تھا[۲۹۲]۔ بہرحال جو لوگ آزمائش میں پورے اُتر چکے ہیں وہ یقین کریں کہ) ایسا نہیں کہ اللہ تمہارا ایمان[۲۹۳] رائیگاں جانے دے۔ اللہ تو انسانوں کے لیے سرتاسر شفقت ورحمت والا ہے۔

اسلام کا امتیازی نشان

سیاسی حیثیت سے مدینہ پہنچ کر اسلام کو سب سے زیادہ مخلصین اور منافقین کے امتیاز کی ضرورت تھی۔ قانون ان دونوں گروہوں میں امتیاز نہ کر سکتا تھا۔ احکام میں حج ایک عبادت ہے جس کے اہل عرب مدت سے خوگر تھے۔ اس کے ساتھ وہ ان کے مذاق کی چیز بھی۔ لوگوں کا ہجوم ایک میلے کی صورت اختیار کر لیتا تھا جو عربی مدنیت کا ایک لازمی حصہ تھا۔ زکوٰۃ بھی حد فاصل نہیں ہو سکتی تھی۔ کیونکہ اکثر منافقین متمول تھے اور یہ جاہ و فخر کا ذریعہ ہو سکتی تھی۔ روزہ بھی اس کا معیار نہیں ہو سکتا تھا کیونکہ روزے کی حالت میں چوری چھپے کھا پی لینے کا موقع بآسانی مل سکتا ہے۔ صرف نماز اور نماز میں قبلہ کی تبدیلی ایسی چیز ہے جس سے مخلصین اور منافقین میں تمیز ہو سکتی تھی۔ مکہ معظمہ

کہ لوگ جو کعبہ کی عظمت کے قائل تھے۔ بیت المقدس کی طرف مُنہ کرنا جائز نہیں سمجھتے تھے۔ مدینہ میں یہود آباد تھے جن میں کچھ مسلمان ہو گئے تھے وہ بیت المقدس کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے تھے اور کعبہ کی عظمت تسلیم نہ کرتے تھے اس لیے عرب کی پہچان بیت المقدس کو قبلہ بنا کر اور یہود کی پہچان کعبہ کو قبلہ بنا کر ہو سکتی تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا اور یہ پہچان اب قیامت تک قائم رہے گی۔ اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

جو ہماری طرح نماز پڑھے، ہمارے قبلہ کی طرف مُنہ کرے اور ہمارا ذبیحہ کھاتے تو یہ وہ مسلمان ہے کہ اس کے ساتھ رب اور اس کے رسُول کا عہد ہو چکا ہے اس لیے تم بھی اس عہد کی رعایت کرو اور اسے مت توڑو۔ (صحیح بخاری عن انس بن مالک)

تکفیر اہلِ قبلہ

اسی حدیث کی وجہ سے علمِ کلام میں یہ عنوان مشہور ہو گیا ہے کہ اہلِ قبلہ کی تکفیر نہ کرنی چاہیے۔ اس کا مطلب یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ عام مسلمانوں کے ساتھ قبلہ و نماز میں شرکت کے بعد پھر کسی شخص پر کسی قسم کے اختلاف سے بھی کُفر عائد نہیں ہو سکتا۔ حالانکہ یہ مسئلہ بہت ہی غور طلب تھا کہ نمازوں میں صرف قبلہ کی طرف مُنہ کر لینا ایسا کون سا مرکزی عمل ہے جس کے بعد عقائد کا کوئی بگاڑ بھی مضرت رساں نہیں ہوتا۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے زمانہ میں اہلِ کتاب اور اہلِ اسلام کے مابین جو اعمال ما بہ الامتیاز اور حدِ فاصل تھے۔ وہ یہی اعمال تھے کیونکہ تصدیق اگرچہ اصل ایمان ہے لیکن وہ ایک قلبی صفت ہے اور اقرار اگرچہ زبان سے متعلق ہے مگر وہ بھی وقتی چیز ہے۔ دو دینوں میں کُھلا ہوا امتیاز ان کے علیحدہ علیحدہ شعائر کے ذریعے سے ہو سکتا ہے۔ اسلامی شعائر میں نماز سب سے زیادہ امتیازی عمل ہے۔ قبلہ کا معاملہ یہود و نصاریٰ کے نزدیک حقانیت کا معیار تھا۔ لیکن فرض کرو کہ اگر کسی دور میں کُفر کسی اور مذہب کی صورت میں نمودار ہو اور اس کے مذہبی شعار ان شعاروں سے مختلف ہوں تو اسی حدیث کی رُو سے کیا ان کے لیے ضروری نہ ہوگا کہ وہ اپنی صفائی کے لیے ان مخصوص شعاروں کو ترک کرکے ان کے بالمقابل اسلامی شعائر اختیار کریں۔ آخر حضرت عیسیٰ کی عبدیت کا اقرار اسلام میں داخل ہونے کے لیے جتنا ایک عیسائی کے لیے ضروری ہے اتنا ایک یہودی یا دوسرے غیر مسلم کے لیے کیوں ضروری نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ابنیتِ مسیح کا مسئلہ عیسائیوں کے مذہب کا رُکن ہے اس لیے ان کے ایمان پر

اس وقت تک اطمینان نہیں ہو سکتا ہے جب تک وہ ان کے بندہ اور رسُول ہونے کا کھُلا اعتراف نہ کریں۔ خلاصہ یہ کہ اس حدیث کا تعلق ان اندرونی فرقوں سے نہیں جو مدعی اسلام ہوں بلکہ ان کے ساتھ ہے جو اپنا دین چھوڑ کر اسلام میں داخل ہونا چاہیں۔ حدیث یہ کہتی ہے کہ اگر ان کی عملی زندگی پہلی زندگی سے بالکل الگ ہو چکی اور وہ اسلامی شعائر کو اپنا چکے ہیں تو ان کے اسلام میں شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس ارشاد کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ جو مدعیٔ اسلام یہ تین کام کرے وہ پکا مسلمان ہے خواہ اس کی پوری زندگی کافرانہ ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے نماز، استقبال اور ذبیحہ کی تخصیص کی وجہ یہ بتائی ہے کہ

صرف ان تین کے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اہل کتاب توحید کے اقرار کے ساتھ نمازیں بھی پڑھتے ہیں، استقبالِ قبلہ بھی کرتے ہیں اور جانور ذبح کر کے بھی کھاتے ہیں مگر ہماری طرح نماز پڑھتے ہیں نہ ہمارے قبلہ کی طرف مُنہ کر کے نماز پڑھتے ہیں اور نہ ہمارا ذبیحہ کھاتے ہیں۔ نماز اور ذبیحۂ مسلم کھانا ایسے کھُلے افعال ہیں کہ ان کی اطلاع آسانی سے ہو سکتی ہے برخلاف دین کے اور افعال کے۔ اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ ظاہری حالات کے موافق کیا جاتا ہے۔ جو شخص جس دین کے شعائر کو علی الاعلان کرے گا اس کے ساتھ اسی دین کا معاملہ کیا جائے گا

(فتح الباری ص ۳۹۵ جلد ۱)

تحویلِ قبلہ پر اعتراض کا دوسرا جواب

۲۹۰ ۔ پہلے تم جس قبلہ کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھتے تھے۔ یہ ان نادانوں کے اعتراض کا دوسرا جواب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصلی قبلہ تو تمہارا کعبہ ہی تھا جو حضرت ابراہیمؑ کے وقت سے چلا آیا ہے اور چند روز کے لیے جو بیت المقدس کر دیا تھا وہ صرف امتحان کے لیے تھا کہ کون تابعداری پر قائم رہتا ہے اور کون دین سے پھر جاتا ہے [1]

مفہوم آیت کا یہ ہے کہ ہم نے تحویلِ قبلہ کو آپ کی پیروی کرنے والے مسلمانوں کے لیے ایک امتحان قرار دیا ہے تاکہ ظاہر طور پر یہ معلوم ہو جائے کہ کون آپ کا صحیح فرمانبردار ہے اور کون

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ

اپنی رائے کے پیچھے چلتا ہے [1]

یعنی اس سے مقصود یہ دیکھنا تھا کہ کون لوگ ہیں جو جاہلیت کے تعصبات اور خاک و خون کی غلامی میں مبتلا ہیں اور کون ہیں جو ان بندشوں سے آزاد ہو کر حقائق کا صحیح ادراک کرتے ہیں۔ ایک طرف اہل عرب اپنے وطنی اور نسلی فخر میں مبتلا تھے اور عرب کے کعبے کو چھوڑ کر باہر کے بیت المقدس کو قبلہ بنانا ان کی اس قوم پرستی کے بت پر ناقابل برداشت ضرب تھی۔ دوسری طرف اپنی نسل پرستی کے غرور میں پھنسے ہوئے تھے اور اپنے آبائی قبلہ کے سوا کسی دوسرے قبلہ کو برداشت کرنا ان کے لیے محال تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ بت جن لوگوں کے دلوں میں بسے ہوئے تھے وہ اس راستے پر کیسے چل سکتے تھے، جس کی طرف اللہ کا رسول انہیں بلا رہا تھا اس لیے اللہ نے ان بت پرستوں کو سچے حق پرستوں سے الگ چھانٹ دینے کے لیے پہلے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کیا تاکہ جو لوگ عربیت کے بت کی پرستش کرتے ہیں وہ الگ ہو جائیں۔ پھر اس قبلہ کو چھوڑ کر کعبے کو قبلہ مقرر کیا تاکہ جو اسرائیلیت کے پرستار ہیں وہ بھی الگ ہو جائیں۔ اس طرح صرف وہ لوگ رسول کے ساتھ رہ گئے جو محض اللہ کے پرستار تھے [2]

گویا بجائے کعبہ کے بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں قریش مکہ کا امتحان مقصود تھا کہ ان میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا سچا تابعدار کون ہے کہ جس قبلہ کی طرف بھی منہ کر کے نماز پڑھنے کا حکم دے دیتے ہیں اسی طرف نماز ادا کرتے ہیں۔ اور کون قومی حمیت کی رعایت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قومی حمیت کے امتحان کے لیے بجائے خانہ کعبہ کے بیت المقدس کے استقبال کا حکم دیا۔ بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے میں قریش کی قومی حمیت کا امتحان تھا اور پھر جب تحویل قبلہ کا حکم آیا تو اس میں یہود کا امتحان تھا [3]

۱۴۳ ۔ ہم نے یہ جاننے کے لیے قبلہ مقرر کیا تھا کہ فرماں برداروں کا نافرمانوں سے امتیاز ہو جائے ۔ یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اللہ کا علم جب ازلی اور قدیم ہے تو اس جاننے کا کیا مطلب ہے۔ علماء نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں ۔ حضرت شیخ الہند نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے وہ فرماتے ہیں ۔

---

[1] معارف م ش　[2] تفہیم القرآن ص ۱۲۰　[3] معارف م ا ص ۲۳۹

علم ازلی کے باوجود جان لینے کا مطلب

اس آیت میں لنعلم (تاکہ ہم جان لیں)، جو مستقبل کا صیغہ ہے اور دوسری آیات میں بھی حتیٰ نعلم، اور فلیعلمن، اور لما یعلم، وغیرہ کلمات موجود ہیں۔ ان سب سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کو معاذاللہ پہلے علم نہ تھا، بعد کو ہوا۔ حالانکہ اللہ کا علم قدیم اور ازلی ہے۔ کان اللہ بکل شئ علیماً۔ علماء نے اس کے مختلف جوابات دیے ہیں۔

کچھ نے کہا کہ یہاں علم سے مراد ممتاز اور نمایاں کرنا ہے
کچھ نے یہاں علم سے امتحان مراد لیا ہے
کچھ نے علم کو دیکھنے کے معنے میں بتایا ہے
کچھ نے مستقبل کو ماضی کے معنے میں لیا ہے
کچھ کے خیال میں مراد یہ ہے کہ پیغمبر اور اہلِ ایمان کو پتہ لگ جائے
کچھ محققین کی رائے ہے کہ علم حال مراد ہے جس پر جزا و سزا مرتب ہوتی ہے۔
لیکن راسخین فی العلم نے اس موضوع پر دو باتیں پیش فرمائی ہیں

علم الٰہی کے لیے پہلا موقف

اوّل یہ کہ حسبِ ارشادِ الٰہی ان اللہ قد احاط بکل شئ علیماً۔ تمام چیزیں اوّل سے آخر تک چھوٹی بڑی، تھوڑی بہت خدا کے سامنے ہیں اور سب کا علم اس کو ایک ساتھ ہے۔ اس کے علم میں اگاڑی پچھاڑی ہرگز نہیں ہے مگر باہم ایک دوسرے کے مقابلے میں بے شک مقدم و مؤخر ہو سکتے ہیں لہٰذا علمِ خداوندی کے حساب سے سب ہی بمنزلہ شے واحد موجود ہیں۔ اس لیے وہاں ماضی، استقبال اور حال نکالنا بالکل غلط ہے البتہ باہم اگاڑی پچھاڑی کی وجہ سے یہ تینوں زمانے بالبداہت جدا جدا ہوں گے اس لیے اللہ سبحانہٗ کبھی تو حسبِ موقع اپنے معلوم کے اعتبار سے فرماتا ہے اور کبھی وقائع کے تقدم و تاخر کے لحاظ سے فرماتا ہے۔ پہلی صورت میں ہمیشہ ماضی یا حال کا صیغہ استعمال ہوتا ہے لیکن صیغہ استقبال نہیں ہوتا۔ دوسری صورت میں ماضی کی جگہ پر ماضی، حال کے موقع پر حال اور استقبال کے مقام پر استقبال آتا ہے۔ لہٰذا جہاں کہیں آئندہ وقائع کے لیے ماضی کا صیغہ آیا ہے تو وہ اس اعتبار سے ہے کہ اللہ سبحانہٗ کو سب کچھ مستحضر ہے اور جہاں وقائع

گزشتہ کو صیغہ استقبال سے بیان فرمایا ہے جیسے اس آیت میں ہے وہاں یہ مدِنظر ہے کہ یہ نسبت اپنے ماقبل کے مستقبل ہے علم الٰہی کے لحاظ سے مستقبل نہیں ہے۔

علم الٰہی کے لیے دوسرا موقف

ہمیں چیزوں کا علم دو طرح ہوتا ہے ایک براہِ راست دوسرے بواسطہ، مثلاً آگ کو کبھی ہم براہِ راست دیکھتے ہیں اور کبھی آگ تو سامنے نہیں ہوتی مگر دھوئیں کو دیکھ کر آگ کے ہونے کا یقین آجاتا ہے۔ بسا اوقات یہ دونوں یکجا ہو جاتے ہیں تو اس صورت میں علم دونوں طرح حاصل ہوتا ہے۔ ایک براہِ راست دوسرے بواسطہ۔ یہ دونوں علم اگرچہ یکجا ہیں آگے پیچھے نہیں ہیں مگر علم بواسطہ علم بلاواسطہ میں ایسا مدغم ہو جاتا ہے کہ اس کا خیال بھی نہیں آتا۔ ایسے ہی کبھی ایک چیز کا علم بلاواسطہ اور دوسری چیز کا علم پہلی شے کے واسطے یکدم حاصل ہوتا ہے مگر جیسے قلم کو ہاتھ میں لے کر لکھیں تو ہر چند ہاتھ اور قلم ساتھ ہی چلتے ہیں۔

لیکن کہتے یوں بھی ہیں کہ ہاتھ چلے ہلا تو قلم میں جنبش آئی۔ اسی طرح عقلِ سلیم باوجود ایک ساتھ ہونے کے ایک شے کے علم بلاواسطہ کو دوسری شے کے علم بالواسطہ سے بواسطہ پہلی شے کے حاصل ہوا ہے ایک طرح پر ضرور مقدم سمجھتی ہے۔

جب یہ بات معلوم ہو چکی ہے تو اب سنیے کہ اللہ سبحانہٗ کو بھی تمام اشیا کا علم دو طرح پر ہے بلاواسطہ اور بواسطہ بلکہ گر یعنی لوازم کا ملزومات سے اور ملزومات کا لوازم سے۔ اور دونوں علم ازل سے برابر ساتھ ہیں۔ گو علم بواسطہ کسی چیز کا اس کے علم بلاواسطہ میں محو اور مضمحل ہو اور ایسا ہی ایک چیز کا علم بلاواسطہ اور دوسری چیز کا علم بواسطہ برابر ساتھ ہے اور دونوں قدیم ہیں گو علم بواسطہ کو بطریقِ مذکور مقدم اور علم بالواسطہ کو مؤخر کہیں۔ لہٰذا جہاں علمِ خداوندی کے ذکر میں صیغہ استقبال کا یا معنے استقبال کے پائے جاتے ہیں وہ علم بالواسطہ کے لحاظ سے ہے زمانہ کے اعتبار سے کچھ تفاوت نہیں ہے اور جہاں کہیں ماضی اور حال مستعمل ہے وہاں علم بلاواسطہ مراد ہے۔ اور علم بالواسطہ کے اعتبار سے کلام فرمانے ـــ یہ حکمت ہے کہ کلامِ الٰہی کے مخاطب آدمی ہیں اور ان کو اکثر اشیا کا علم بالواسطہ ہوتا ہے اور اللہ سبحانہٗ نے اپنے علم میں صیغہ استقبال استعمال فرمایا ہے۔ وہ وہی امور ہیں جو بنی آدم کو بلاواسطہ معلوم نہیں ہو سکتے۔ اگر ایسے مواقع پر بنی آدم سے باعتبار علم بلاواسطہ کلام کہا جاتا تو ان پہ پورا الزام نہ ہوتا۔ اور جہاں یہ مصلحت نہیں وہاں

باعتبار علم بلا واسطہ صیغہ ماضی یا حال کا استعمال کیا جاتا ہے مگر بنی آدم کو ان اشیاء کا علم چونکہ بلا واسطہ ہو ہی نہیں سکتا اور ان واسطوں کا علم قبل از وجود ممکن نہیں ہے اور اس وجہ سے ان کے تمام علوم برابر نہیں ہوتے تو وہ اللہ سبحانہٗ کو اپنے اوپر قیاس کر کے صیغہ استقبال سے حدوث سمجھ جاتے ہیں اور حیران ہوتے ہیں کہ علمِ الٰہی میں حدوث ثابت ہو گیا مگر سمجھدار اہلِ علم جو نکتہ مذکورہ سے واقف ہیں سب کو مطابق یکدگر سمجھتے ہیں والحمد للہ

۲۹۲ ۔ ہدایت یافتہ لوگوں کے علاوہ یہ معاملہ سب کے لیے بے حد سنگین تھا۔ یعنی جن کو اللہ سبحانہٗ نے ہدایت کی نعمت سے نوازا ہے وہ تحویلِ قبلہ کے معاملہ کو حکیمانہ معاملہ سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ امتحان اسی چیز میں ہوتا ہے جو نفس پر دُشوار ہو۔ اس لیے اللہ سبحانہٗ نے فرمایا ہے کہ بے شک بجائے کعبہ کے بیت المقدس کو قبلہ بنانا لوگوں پر بھاری معلوم ہوا عوام مسلمین پر تو اس لیے کہ وہ قریش تھے اور کعبہ کی افضلیت کے معتقد تھے۔ ان کو اپنے خیال اور رسم و عادت کے خلاف کرنا پڑا اور خواص کے گھبرانے کی وجہ یہ تھی کہ ملتِ ابراہیمی کے خلاف تھا جس کی موافقت پر مامور تھے اور اخص الخواص جن کو ذوقِ سلیم اور تمیزِ مراتب کی لیاقت عطا ہوئی تھی وہ کعبہ کے بعد بیت المقدس کی طرف متوجہ ہونے کو ترقیٔ معکوس خیال کرتے تھے مگر جن حضرات کو حکمت و اسرار تک رسائی تھی اور حقیقتِ کعبہ اور حقیقتِ بیت المقدس کو بنورِ فراست جدا جدا مع فرقِ مراتب سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاء کے کمالات کے جامع اور آپ کی رسالت جملہ عالم اور تمام اُمتوں کے لیے شامل ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ استقبالِ بیت المقدس کی بھی نوبت آتے۔ یہی وجہ ہے کہ شبِ معراج میں تمام انبیائے سابقین سے ملاقات بھی ہوئی اور اس کے بعد استقبالِ بیت المقدس کا بھی حکم ہوا۔[۱]

ایک سوال کا جواب

۲۹۳ ۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ تمہارا ایمان رائیگاں جانے دے۔ یہ بھی ان ہی حالات میں اُٹھتے ہوتے ایک سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ پیدا ہو گیا کہ اگر کعبہ ہی اصل قبلہ ہے تو اتنی مدت کی نماز جو بیت المقدس کی طرف مُنہ کر کے پڑھی گئی ہے اس کا کیا بنے گا؟ اور یہ بھی وسوسہ پاکر

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۸

اگر بیت المقدس اصلی قبلہ نہیں ہے تو جو مسلمان اسی حالت میں اللہ کو پیارے ہو گئے ان کا کیا ہوگا؟ اس آیت میں جواب دیا گیا کہ جب تم نے بیت المقدس کی طرف نماز محض ایمان کے تقاضے اور حکمِ خداوندی کے اطاعت کے جذبے سے پڑھی تو تمہاری نیکی ہرگز ضائع نہ جائے گی[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ وہم کیا قبلہ کوئی بھی ہو اجر تو تعمیلِ حکم کا ملے گا۔ جنہوں نے بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی انہوں نے بہرحال حکم ہی کی تعمیل کی ہے اور اجر حکم کی تعمیل سے ہی متعلق ہے۔

اگر آیت کا یہ پس منظر نہ بھی ہو پھر بھی آیت کا مطلب بالکل واضح ہے کہ اللہ کی حکمت اور رحمت سے بعید ہے کہ اس ایمان کو رائیگاں کر دے جس کے نتیجہ میں اتباعِ رسولؐ اور نماز جیسے اعمال کی سرشاریاں ظہور میں آتی ہیں۔ اگر قبلہ کی تنسیخ سے ایمان رائیگاں ہوتا تو قبلہ کی تنسیخ ہی نہ ہوتی۔

قانونی دفعہ

آیت کی ضروری تشریحات ختم ہو چکی ہیں لیکن ضروری ہے کہ آیت پر بحیثیت قانونی دفعہ کے ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ اس کی عظمت پوری طرح سامنے آجائے۔ اس سلسلے میں حسبِ ذیل امور قابلِ غور ہیں۔

بخاری و مسلم اور حدیث کی دوسری معتبر کتابوں میں ہے کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تحویلِ قبلہ کا حکم آیا اور آپؐ نے عصر کی نماز جانب بیت اللہ پڑھی (اور بعض روایات میں ظہر ہے) تو بعض صحابہ کرام یہاں سے نماز پڑھ کر باہر گئے اور دیکھا کہ قبیلہ بنی سلمہ کے لوگ اپنی مسجد میں حسبِ سابق بیت المقدس کی طرف نماز پڑھ رہے ہیں تو انہوں نے آواز دے کر کہا کہ اب قبلہ بیت اللہ کی طرف ہو گیا ہے۔ ہم رسول اللہؐ کے پیچھے بجانب بیت اللہ نماز پڑھ کر آئے ہیں۔ ان لوگوں نے دورانِ صلوٰۃ ہی میں اپنا رُخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف کر لیا۔ بنو سلمہ کے لوگوں نے تو ظہر، عصر ہی سے تحویلِ قبلہ کے حکم پر عمل کر لیا لیکن مسجدِ قبا میں یہ خبر دوسرے روز صبح کی نماز میں پہنچی۔ جیسا کہ بخاریؒ اور مسلمؒ نے بروایت ابن عمرؓ بتایا ہے قبا والوں نے بھی اپنا رُخ بیت المقدس سے بیت اللہ کی طرف پھیر لیا۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۸

اس آیت سے اس واقعہ کی روشنی میں یہ دستوری قواعد معلوم ہوتے ہیں کہ اسلام میں خبر واحد دین میں حجت ہے۔ اگر خبر واحد حجت نہ ہوتی اور زمانۂ نبوت میں تحویلِ قبلہ کی خبر سن کر نمازی بیں قبلہ رد ہو جانا غلط ہوتا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یقیناً ان کو تنبیہ فرماتے کہ جب تم ایک قطعی قبلہ پر قائم تھے تو تم نے صرف ایک شخص کی خبر پر ایک فرض قطعی کو کیسے چھوڑ دیا اور براہِ راست میری ہدایت یا خبر متواتر کا انتظار کیوں نہیں کیا۔ مگر یہاں اعتراض کرنا اور کنار اپنی جانب سے فردِ واحد کا بھیجنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ خود صاحبِ نبوت کے نزدیک بھی دین کے بارے میں ایک ثقہ اور سچے شخص کا قول کافی ہے۔ امام شافعیؒ نے رسالہ میں اس پر مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔

یاد رہے کہ اصولِ حدیث کی اصطلاح میں خبر واحد اس خبر کو کہتے ہیں جو متواتر نہ ہو۔ اس لیے لفظِ واحد سے یہ دھوکہ نہ ہو کہ ایک ہی کے بیان کو خبر واحد کہتے ہیں بلکہ تواتر کا عدد کسی ایک طبقہ میں بھی اگر نہ رہے تو وہ بھی خبر واحد ہے چاہے اس کے روایت کرنے والوں کی تعداد کتنی ہو۔

دوسرا قاعدہ یہ بھی معلوم ہوا کہ قرآنی آیت کے ذریعے نبوت کے جاری کردہ عمل کو ختم کیا جا سکتا ہے یعنی منسوخ۔ بیت المقدس کو قبلہ بنانے کے موضوع پر پورے قرآن میں کوئی آیت نہیں ہے ظاہر ہے کہ بیت المقدس کو حضورؐ نے قبلہ بنایا ہے۔ اس قبلہ کو قرآن کی اس آیت نے منسوخ کر کے خانہ کعبہ کو قبلہ بنا دیا۔ اس سے یہ بات بھی اشارۃً معلوم ہوتی ہے کہ اسلام کی تشکیل میں اقوال و اعمال نبوت کی حیثیت بھی قانونی ہے۔ کیونکہ اس آیت نے یہ بات بتائی ہے کہ جو نمازیں باہر نبوت بیت المقدس کی طرف ادا کی گئی ہیں وہ عند اللہ مقبول ہیں۔

صاحبِ معارف مولانا مفتی محمد شفیع نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ
لاؤڈ سپیکر پر نماز درست ہے

صحیح بخاری باب ماجاء فی القبلہ میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی حدیث پر علامہ عینی نے تحریر فرمایا ہے
اس حدیث سے معلوم ہوا کہ جو شخص نماز میں شریک نہیں ہے وہ کسی نماز پڑھنے والے کو تعلیم و تلقین کر سکتا ہے۔

اور علامہ عینی ہی نے دوسری جگہ اسی حدیث پر یہ نوٹ بھی لکھا ہے کہ
نمازی اگر اس شخص کی بات سن لیتا ہے جو نماز میں داخل نہیں ہے تو
اس سے نمازی کی نماز پر کوئی حرف نہیں آتا ہے یہ حافظ ابو جعفر طحاوی کا استنباط ہے
شاید آپ یہاں یہ خلش محسوس کریں کہ فقہائے احناف نے خارج صلاۃ شخص کی اتباع کو مفسد

نماز قرار دیا ہے۔ یہ بھی صحیح ہے لیکن اس کا منشا یہ ہے کہ نماز میں غیر اللہ کے امر کا اتباع باعثِ فساد نماز ہے۔ اگر کوئی شخص امرِ الٰہی پہنچا رہا ہے تو امرِ الٰہی میں اس کی اتباع باعثِ فساد نماز نہیں ہے۔

دیکھ لیجیے اگر کوئی شخص نماز میں شریک ہونے کے لیے بعد میں آئے اور صف اوّل میں جگہ نہ ہو تو اسے چاہیے کہ دوسری صف میں تنہا نہ کھڑا ہو بلکہ صفِ اوّل میں سے کسی آدمی کو پیچھے کھینچ لے اور اپنے ساتھ ملا لے۔ جس نمازی کو اس شخص نے پیچھے کھینچا ہے وہ نماز میں ابھی داخل نہیں ہے اس کی نماز فاسد نہ ہوگی۔ اس کی وجہ علامہ طحطاوی نے یہ لکھی ہے کہ اس شخص نے آنے والے کے حکم کی تعمیل نہیں بلکہ اللہ کے حکم کی تعمیل کی ہے۔ شرنبلالی نے بھی یہی وجہ لکھی ہے۔

ان روایات سے ثابت ہوا کہ اگر کوئی نمازی کسی کی آواز پر عمل کرے تو اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ خود اس کی دلداری مقصود ہو تو یہ مفسد نماز ہے۔ دوسرے یہ کہ اس کی دلداری نہیں بلکہ اس کی وساطت سے حکم شرعی کی پیروی مقصود ہو یہ مفسد نماز نہیں ہے۔ علامہ طحطاوی نے یہی فیصلہ کیا ہے۔ آلہ مکبر الصوت کی آواز پر امام کا اتباع درحقیقت لاؤڈ سپیکر کا اتباع نہیں ہے بلکہ امرِ نبوّت کا اتباع ہے۔ اس آلہ سے صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ اب امام رکوع میں چلا گیا ہے۔ اس علم کے ذریعے اتباعِ امام کیا جاتا ہے نہ کہ لاؤڈ سپیکر کا اور اتباعِ امام ایک حکم الٰہی ہے۔

اس آیت کے اس فقرے ماکان اللہ لیضیع ایمانکم میں شارحینِ قرآن نے ایمان سے مراد نماز لی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمل کی حیثیت کیا ہے۔

دراصل ایمان وعمل بالکل دو جداگانہ عالم نہیں ہیں کہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں بلکہ دونوں کا باہم ایسا گہرا تعلق ہے کہ ہمیشہ ایک کا دوسرے پر عکس پڑتا رہتا ہے۔ اگر اندرونی عقیدت اعمالِ ظاہر کو چاہتی ہے تو اعمالِ ظاہر اندرونی عقیدت کے لیے ممد و معاون ہوتے ہیں۔ ایمان ایک عقیدہ ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ جوارح توحیدِ خالص اور تصدیقِ رسالت کی اپنے عمل سے گواہی دیں اور جب اعضا اس تقاضے کو پورا کرتے ہیں تو یہ عقیدہ اور راسخ اور تر و تازہ و سرسبز ہونے لگتا ہے۔

حافظ ابن تیمیہؒ حسن بصریؒ سے نقل کرتے ہیں۔

ایمان صرف ٹیپ ٹاپ اور ولولوں کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان وہ ہے جو دل میں گھر کر جائے اور جس کی اعمال تصدیق کریں۔

مقصد یہ ہے کہ اعمال انسان کی کیفیاتِ قلبیہ کا آئینہ ہیں۔ اگر وہ نیک عمل کرتا ہے تو اس کی

قَدْ نَرٰى تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَآءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ قِبْلَةً تَرْضٰىهَا ۪ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ

ہم دیکھ رہے ہیں تمہارے چہرے[۳۹۴] کا بار بار آسمان کی طرف اٹھ اٹھ جانا ہم عنقریب تمہارا رُخ ایسے قبلہ کی طرف پھیر[۳۹۵] دیں گے جسے تم پسند کرتے ہو۔ لہٰذا تم اپنا رُخ مسجدِ حرام یعنی خانہ کعبہ کی طرف پھیر[۳۹۶] لو۔ اور تم اور تمہارے ساتھی جہاں بھی کہیں ہوں اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف کرلیا کرو[۳۹۷]۔

قلبی تصدیق کی دلیل ہے ورنہ اس کی بدعملی اس کی بے ایمانی کی شاہد ہوجائے گی۔

قبلہ سمتِ مسجدِ حرام ہے

اسلام نے قبلہ کے لیے کسی خاص سمت کا نہیں بلکہ ایک مرکزی مسجد کا انتخاب کیا ہے جس کے چاروں طرف چاروں سمتوں میں نماز پڑھی جا سکے۔ اس طرح مشرق، مغرب، شمال وجنوب بیک وقت مسلمانانِ عالم کا قبلہ ہیں۔ یہ مرکزی مسجد بجائے مسجدِ اقصیٰ کے مسجدِ حرام قرار دی گئی ہے اس سے مراد مکہ شہر کی وہ مسجدِ اعظم ہے جس کے اندر خانہ کعبہ واقع ہے۔ خانہ کعبہ بہت ہی مختصر عمارت ہے۔ مدینہ والوں یا دوسرے شہروں کے رہنے والوں کے لیے اس کی جہت کی تعیین بہت دشوار تھی۔ اس لیے امت کی سہولت کے لیے ایک بہت بڑی عمارت کا نام لیا گیا ہے۔ مسجدِ حرام کی موجودہ عمارت کا نقشِ اوّل خلیفہ مہدی عباسی کے زمانے کا ہے۔ بعد کے خلفاء وسلاطین برابر اس میں اضافہ کرتے رہے۔ خصوصاً ترک سلاطین نے۔ موجودہ ہیئت گنبدوں والے برآمدے کی صورت میں سلیم ثانی متوفی ۱۵۷۷ء کے عہد سے تقریباً قائم ہے۔ صحن کی وسعت ۶۰۰ فٹ ہے۔ متعدد بڑے بڑے عالی شان اور فراخ دالان چاروں طرف اس کے علاوہ ہیں۔ اور اب سعودی حکومت

نے اس کو اور زیادہ وسعت دے دی ہے۔ سلیم کی تعمیرات کو قائم رکھ کر اس کے پیچھے وسیع دالان دو منزلے بنا دیے ہیں۔ ایک نیچے تہ خانہ ہے۔

۲۹۴۔ ہم دیکھ رہے ہیں تمہارے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اُٹھنا۔ چونکہ آپ کا اصلی قبلہ اور آپ کے کمالات کے مناسب خانہ کعبہ تھا اور سب قبلوں سے افضل اور حضرت ابراہیم کا بھی وہی قبلہ تھا۔ ادھر یہودیوں کا یہ طعنہ تھا کہ یہ نبی شریعت میں ہمارے خلاف اور ملتِ ابراہیمی کے موافق ہو کر ہمارا قبلہ کیوں اپناتے ہیں۔ اس لیے جس زمانہ میں آپ بیت المقدس کی طرف نماز پڑھتے تھے تو دل یہی چاہتا تھا کہ کعبہ کی طرف مُنہ کرنے کا حکم آجائے اور اس شوق میں آسمان کی طرف نگاہ اٹھا کر ہر طرف کو دیکھتے تھے کہ شاید فرشتہ حکم لاتا ہو۔[۱]

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو صحیح جذبۂ دینی کے تحت اس کا یقین تھا کہ اب جبکہ امامت بنی اسرائیل سے چھن چکی ہے تو ان کا قبلہ بھی قبلۂ اُمتِ مسلمہ نہیں رہ سکتا۔ تحویلِ قبلہ کا حکم اب آکر رہے گا اور فرشتۂ وحی کی انتظار میں آپ کی نظر بار بار آسمان کی طرف اٹھتی تھی۔ یہاں اسی کیفیت کی خاص انداز میں منظر کشی کی گئی ہے۔

حق تعالیٰ اگرچہ ہرگز کسی جہت میں محدود نہیں تاہم تجلیاتِ خاصہ کو قرآن میں آسمان کی جانب منسوب کیا گیا ہے۔ اسی لیے محققین نے لکھا ہے کہ بوقت اضطرار و دُعا آسمان کی طرف مُنہ کرنا موجباتِ قبول میں سے ہے۔ بلکہ اس نسبتِ علوی سے کمالِ یقین اور تصفیہ قلب میں مدد ملتی ہے۔[۲]

یہ ہے اصل وہ حکم جو تحویلِ قبلہ کے بارے میں دیا گیا تھا۔ یہ حکم رجب یا شعبان سنہ ۲ ہجری میں آیا۔ ابنِ سعد کی روایت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بشیر بن براء بن معرور کے گھر دعوت پر گئے تھے۔ وہاں ظہر کا وقت آگیا۔ اور آپ لوگوں کو نماز پڑھانے کھڑے ہوئے دو رکعتیں پڑھا چکے تھے کہ تیسری رکعت میں یکایک وحی کے ذریعے سے یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی وقت آپ اور آپ کی اقتداء میں جماعت کے تمام لوگ بیت المقدس سے کعبے کے رُخ پر پھر گئے۔ اس کے بعد مدینہ اور اطرافِ مدینہ میں اس کی منادی کر دی گئی۔ براء بن عازب کہتے ہیں کہ ایک جگہ منادی کی آواز اس حالت میں پہنچی کہ لوگ رکوع میں تھے۔ حکم سنتے ہی سب کے سب اسی

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۸　[۲] تفسیر ماجدی ص ۵۶۔

حالت میں کعبے کی طرف مڑ گئے۔[1]

روایت میں تحریف

خیال رہے کہ ابن سعد کی اس روایت کے بارے میں حافظ سیوطیؒ نے فرمایا ہے کہ اس میں تحریف ہوئی ہے۔ بشیر بن براء بن معرورؓ بنی سلمہ میں رہتے تھے اور بنی سلمہ کے بارے میں ابوداؤد نے حضرت انسؓ کے حوالہ سے جو واقعہ نقل کیا ہے وہ اس سے مختلف ہے۔ اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہاں موجودگی، نماز کی امامت کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے:

> نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے صحابہؓ بیت المقدس کی طرف منہ کرکے نماز پڑھتے تھے۔ جب تحویل قبلہ کی یہ آیت اُتری تو ایک شخص کا صبح کی نماز میں بنی سلمہ کے محلہ میں جانے کا اتفاق ہوا۔ اس نے اعلان کیا کہ خبردار ہو کہ قبلہ تبدیل ہو کر کعبہ کی طرف ہو گیا۔ یہ سنتے ہی پوری جماعت نے حالت رکوع ہی میں اپنا رُخ بدل لیا۔

اس روایت کی موجودگی میں یہ کہنا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بنی سلمہ کے محلہ میں بشیر بن معرورؓ کے ہاں ظہر کی نماز پڑھا رہے تھے صحیح نہیں ہے۔ اسی بنا پر علامہ آلوسیؒ نے اس روایت کو روایات صحیح کے مخالف بتا کر ناقابلِ اعتماد قرار دیا ہے۔ آلوسی کے الفاظ یہ ہیں:

> ماذکر مخالف للروایات الصحیحۃ سندا علی ھذا الشان فلا یعول علیہ

آیت میں یہ فقرہ تمہارے چہرے کا آسمان کی طرف بار بار اُٹھنا بتا رہا ہے کہ قبلہ کی تبدیلی کے لیے آپ سراپا متوجہ الی اللہ تھے اور آپؐ منتظر تھے، کیوں منتظر تھے اس لیے کہ یہ قبلہ ابراہیم ہے اور آپؐ ملتِ ابراہیم کے احیاء اور دعوتِ ابراہیمی کی تجدید کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ کی خواہش و رغبت کچھ اور تھی اور امرِ الٰہی کچھ اور تھا۔ اصل یہ ہے کہ وحی نازل ہونے سے پہلے ہی پورا دین نبوّت کا اس طرح مزاج بن جاتا ہے کہ رُوحِ نبوّت میں ہر وقت اشتیاق ہی مرضیاتِ الٰہی کا ہوتا ہے۔ آپؐ یہ محسوس کر رہے تھے کہ بنی اسرائیل کی امامت ختم ہو چکی ہے اس لیے اب بیت المقدس کی مرکزیت بھی ختم ہو جانی چاہیے۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ زبانِ وحی سے یہ سُن کر کہ حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ نے بیت اللہ بناتے وقت اُمتِ مسلمہ

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۲۱

کے ظہور کی دُعا مانگی تھی۔ اُمتِ مسلمہ کی امامت کا اعلان ناموس وحی کے ذریعے ہو جانے کے بعد نبوت نے منشاءِ الٰہی سمجھ لیا کہ ابراہیم کی دُعا کے نتیجے میں اُمتِ مسلمہ کی امامت کے اعلان کے بعد ابراہیم کے بنائے ہوئے گھر کی مرکزیت کا اعلان ناگزیر ہے۔ یہی منشاءِ الٰہی سمجھ کر اعلانِ مرکز کا انتظار ہونے کے لیے مشتاق نگاہیں بار بار آسمان کی طرف اُٹھنے لگیں۔ محبت و اشتیاق اور انتظار کے ان ہی حالات کی قرآن نے ان الفاظ میں منظر کشی کی ہے قد نری تقلب وجھك فی السماء

۲۹۵ - ہم تمہارا رُخ ایسے قبلہ کی طرف پھیر دیں گے جسے تم پسند کرتے ہو۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ آپؐ کی پسند یہ ہی تھی کہ مسلمانوں کا قبلہ بیت اللہ ہو۔ اسی سے آپؐ کو محبت تھی۔ اور آپ خود محسوس فرما رہے تھے کہ منشاءِ الٰہی یہی ہے اور اس کا ظہور ہونے والا ہے۔ آپ کی پسند مشیتِ الٰہی اور حکمتِ الٰہی کے تابع تھی۔ اسی بنا پر قرآن نے یہاں دُعائی پیمانہ کا نہیں بلکہ آپ کی پسند کا تذکرہ کیا ہے اور ظاہر ہے کہ نبوت کی رُوح اپنی نورانیت اور اشراق کی وجہ سے ایسے مقام پر پہنچ جاتی ہے کہ مشیتِ الٰہی سے الگ ہو کر اس کی رضا و پسند کا کوئی وجود ہی نہیں ہوتا۔ فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم آپ کو ایسے ہی قبلہ کی طرف ضرور پھیر دیں گے جو آپؐ کو پسند ہے۔ یہ گویا اللہ سبحانہٗ کی جانب سے وعدہ ہوا۔ اس کے بعد آنے والے فقرے میں اسی وعدے کو پورا کیا جا رہا ہے۔

۲۹۶ - لہٰذا تم اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف پھیر لو۔ مسجدِ حرام اس لیے کہتے ہیں کہ وہاں مقاتلہ کرنا اور جانوروں کا شکار کرنا اور درخت اور گھاس کا کاٹنا وغیرہ امور حرام ہیں اور کسی مسجد کی اتنی حرمت و عزت نہیں ہے جس قدر مسجدِ حرام کی ہے [1]

شطر کے دو معنے آتے ہیں۔ ایک نصف (آدھے) دوسرے جانب اور سمت کے۔ شارحین قرآن کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں لفظِ شطر سمت اور جہت کے معنے میں ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے بھی یہی معنے منقول ہیں۔ اور امام ترمذیؒ کا پیش کردہ یہ بیانِ نبوت کہ ما بین المشرق والمغرب قبلۃ مشرق اور مغرب کے درمیان قبلہ ہے اسی کا مؤید ہے کہ آیت میں شطر بمعنے جہت ہے۔

اگرچہ اصل قبلہ بیت اللہ ہے لیکن قرآن نے اس مسجد کا نام لیا ہے جس میں بیت اللہ

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۸

واقع ہے۔ اور اس کے لیے لفظ شطر استعمال کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دور افتادہ ممالک کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ خاص مسجد حرام ہی کی طرف ہر ایک کا رُخ ہو بلکہ سمتِ مسجدِ حرام کافی ہے۔ گویا اس فقرے کے ذریعے اس کیے ہوتے وعدے کو پورا کیا گیا ہے۔

۲۹۷۔ تم اور تمہارے ساتھی جہاں بھی ہوں اپنا رُخ مسجدِ حرام کی طرف کر لیا کرو۔ جہاں بھی ہو یعنی حضر میں یا سفر میں، مدینے میں یا دوسرے شہر میں، جنگل میں یا دریا میں جہاں بھی ہوں مسجد حرام کی طرف رُخ کر کے نماز پڑھو۔[1]

پہلے فقرے میں حضور انورؐ مخاطب تھے اور اس میں اُمت مخاطب ہے۔ اگرچہ قرآن کے عام اوامر کے نبوت اور اُمت دونوں مخاطب ہوتے ہیں۔ تخصیص کے موقعہ پر تخصیصی الفاظ کا اضافہ ہوتا ہے جیسے تہجد میں نافلۃ لک اور مہر نکاح میں خالصۃ لک۔ یہاں معاملہ کی اہمیت اور نزاکت کے پیشِ نظر نبوت اور اُمت دونوں کو الگ الگ مخاطب کیا ہے۔

اس فقرے میں شطر استعمال ہوا ہے اور مسجد حرام کے لیے ہٗ ضمیر آتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم جہاں بھی ہو نماز میں بلا تمیز اور بلا استثنا سب کا رُخ مسجدِ حرام کی سمت میں ہونا چاہیے۔

قرآن نے یہاں چاروں سمتوں میں سے کسی سمت کو قبلہ نہیں بنایا بلکہ مسجد حرام کو قبلہ قرار دیا تاکہ پوری دُنیا کے مسلمان اس طرح چاروں سمتوں میں نماز پڑھ سکیں۔ اور ان میں سمت پرستی راہ نہ پاتے۔ مثلاً مشرقی ممالک وغیرہ کے لیے مغربی جانب مسجدِ حرام کی سمت ہے تو مغرب کی جانب رُخ کر لینے سے استقبالِ قبلہ کا فرض پورا ہو جاتے گا۔ اسی لیے اُمت نے علم سمت قبلہ اور تقویم بلدان یعنی جغرافیہ فلکی اور ارضی وضع کیا ہے۔ چنانچہ جغرافیہ کے موجد تاریخ میں مسلمان ہی ہیں۔ قرآن کی رُو سے ہم اس کے ضرور مکلف ہیں کہ حتی الامکان صحیح سمت قبلہ کی تحقیق کریں مگر اس کے ہرگز مکلف نہیں ہیں کہ مسجد حرام کی بالکل سیدھ معلوم کریں۔

آیت کا قانونی پہلو

آیت کی تشریحات آپ پڑھ چکے۔ آیئے اب اس کے قانونی پہلو پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے اس سلسلے میں یہ باتیں یاد رکھنی چاہئیں،

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۸

۱۔ حیث ما کنتم سے اسلام کے قانون دان طبقہ نے یہ سمجھا ہے کہ انسان کہیں بھی ہو نماز درست ہے مسجد شرطِ نماز نہیں ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں خصائصِ نبوت میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ تمام روئے زمین میرے لیے مسجد بنا دی گئی ہے۔ اسلام کے علاوہ جتنے مذاہب ہیں وہ اپنے مراسم عبادت کی ادائیگی کے لیے چہار دیواری کے پابند ہیں۔ یہود اپنے صومعوں اور قربان گاہوں سے باہر نہ خدا کو پکار سکتے ہیں اور نہ قربانی کے نذرانے پیش کر سکتے ہیں۔ عیسائی اپنے کنیسوں کے بغیر خدا کے آگے نہیں جھک سکتے۔ یہاں تک کہ بت پرست قومیں بھی اپنے بتخانوں کی چار دیواریوں کے اندر اپنے دیوتاؤں کو خوش کر سکتی ہیں۔ لیکن قرآن کے عالمگیر نظام کا خدا اس آب و گل اور سنگ و خشت کی چار دیواریوں میں محدود نہیں ہے۔ وہ ہر جگہ ہے اور ہر جگہ سے پکارا جا سکتا ہے، کوہ و صحرا، خشکی و تری ہر جگہ اس کے سامنے سجدہ کیا جا سکتا ہے۔ وہ جس طرح مساجد میں ہے مساجد سے باہر بھی ہے۔ قانونی دفعہ اگرچہ ایک معمولی بات معلوم ہوتی ہے مگر اس کے اندر وہ صداقت پنہاں ہے جو اسلام کی عالمگیری اور اس کے آخری مذہب ہونے کا اعلانِ عام کرتی ہے۔

۲۔ قبلہ مسجدِ حرام کو بنایا ہے جو بہ نسبت بیت اللہ کے بہت زیادہ وسیع ہے اس کی طرف رُخ کر لینا دُور دُور تک لوگوں کے لیے آسان ہے۔ بلکہ قرطبیؒ نے عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے اس سے بھی زیادہ وسعت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔ ارشاد ہے:

> بیت اللہ مسجدِ حرام والوں کے لیے قبلہ ہے۔ مسجدِ حرام اہلِ حرم کے لیے قبلہ ہے اور حرم تمام دُنیا کے مشارق و مغارب میں میری اُمت کے لیے قبلہ ہے۔

مسجدِ حرام ہو یا حرم مقصود بیت اللہ ہے یعنی خانہ کعبہ۔ اس کی طرف رُخ کرنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آدمی خواہ دُنیا کے کسی کونے میں ہو ناک کی سیدھ میں کعبے کی طرف رُخ کرے۔ ظاہر ہے کہ ایسا کرنا ہر وقت ہر شخص کے لیے ہر جگہ مشکل ہے صرف سمت کی طرف رُخ کرنے سے استقبالِ قبلہ کا فرض ادا ہو جائے گا۔ مثلاً مشرقی ممالک میں جانبِ مغرب مسجدِ حرام واقع ہوتی ہے تو بس مغرب کی جانب رُخ کرنے سے استقبال ہو جائے گا۔

سمتِ مغرب میں قبلہ کی تعیین

چونکہ گرمی اور سردی کے موسموں میں سمتِ مغرب میں ہی اختلاف ہوتا ہے اس لیے فقہاء

نے اس سمت کو سمت مغرب قرار دیا ہے جو موسم سرما اور گرما کی دونوں مغربوں کے درمیان ہے اور ریاضی کے قواعد کے سرمائی اور گرمائی مغرب کے درمیان ۴۸ درجے تک سمت قبلہ قرار دی جاتی ہے یعنی ۲۴ درجے تک بھی اگر دائیں یا بائیں ہو جائے تو قبلہ کی سمت رہے گی اور نماز درست ہو گی ۔ ۴۸ درجے تک کی وسیع سمت مغرب اہل مشرق کا قبلہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو ترمذی کے حوالے سے ابھی ابھی گزرا ہے کہ مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے آپ کا یہ ارشاد اہل مدینہ کے لیے تھا۔ کیونکہ ان کا قبلہ مشرق و مغرب کے درمیان جانب جنوب تھا اس حدیث نے گویا شطر المسجد الحرام کی تشریح کر دی کہ مسجد حرام کی صرف سمت کافی ہے ۔

قرآن کی رُو سے ہم اس کے ضرور مکلف ہیں کہ حتی الامکان صحیح سمت کعبہ کی تحقیق کریں مگر اس بات کے ہرگز مکلف نہیں کہ ضرور بالکل ہی صحیح سمت معلوم کریں۔ جس سمت کے بارے میں ہمیں امکانی تحقیق سے ظن غالب حاصل ہو جائے کہ یہ سمت کعبہ ہے ادھر نماز پڑھنا درست ہے۔ مولانا بحر العلوم نے رسائل الارکان میں اسی مضمون کو بالفاظ ذیل بیان کیا ہے ۔

> استقبال قبلہ میں صرف یہ ضروری ہے کہ نمازی کی رائے اور اندازے کے مطابق کعبہ کی سمت واقع ہو جائے اور ہم اس کے ہرگز ذمہ دار نہیں ہیں کہ وہ درجہ سمت معلوم کریں جو آلات رصدیہ کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے اس لیے عام علماء کا فتویٰ یہ ہے کہ وہ انحراف مفسد نماز ہے جس میں مشرق و مغرب کا تفاوت ہو جائے (رسائل الارکان ص ۵۳)

اگر کہیں آدمی کے لیے سمت قبلہ کی تحقیق دشوار یا وہ کسی ایسی حالت میں ہو کہ قبلہ کی طرف اپنی سمت قائم نہ رکھ سکتا ہو تو جس طرف اُسے قوی گمان غالب ہو اسی طرف وہ نماز پڑھ سکتا ہے البتہ اگر دوران نماز میں صحیح سمت قبلہ معلوم ہو جائے یا صحیح سمت کی طرف نماز پڑھنا ممکن ہو جائے تو نماز کی حالت ہی میں اس طرف پھر جانا چاہیے ۔ یہ حکم ان سواریوں کا ہے جن پر سوار ہو کر چلتے ہوئے قبلہ کی طرف رُخ کرنا دشوار ہے اور جن سواریوں میں قبلہ کی طرف رُخ کرنا دشوار نہیں ہے جیسے ریل یا پانی کا جہاز اور ہوائی جہاز ان کا حکم وہی ہے جو حالت حضر میں ہے البتہ اگر نماز کی حالت میں ریل کا یا جہاز کا رُخ مڑ جائے اور نمازی کے لیے گنجائش نہ ہو کہ وہ بھی قبلہ رُخ پھر سکے تو اسی حالت میں نماز پوری کرے۔

نماز میں جو استقبال قبلہ فرض ہے وہ سینہ کا ہے، چہرے کا استقبال صرف مسنون ہے نماز اس وقت باطل ہو گی جب چہرے کے ساتھ سینہ بھی قبلہ سے پھر جائے۔ صرف گردن پھر جانے سے نماز باطل نہیں ہوتی ۔

وَإِنَّ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّهِمْ ۗ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٤﴾ وَلَئِنْ أَتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَّا تَبِعُوا قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُم بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنِ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُم مِّن بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۙ إِنَّكَ إِذًا لَّمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٥﴾

اور یہ حقیقت ہے کہ جن[۲۹۸] لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ معاملہ ان کے پروردگار کی جانب سے حق ہے اور اللہ ان کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ اور بلاشبہ اگر تم ان اہل کتاب کے سامنے سارے دلائل بھی پیش کر دو گے پھر بھی یہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے اور نہ یہ ممکن ہے کہ آپ ان کے قبلہ کی پیروی کریں اور نہ وہ خود ہی باہم ایک دوسرے کے قبلہ کے پیروکار ہیں[۲۹۹]۔ اور یاد رکھو کہ اگر تم نے اس علم و بصیرت کے باوجود[۳۰۰] جو تمہارے پاس آ چکا ہے ان کی خواہشوں کی پیروی کی تو آپ کی جانب سے یقیناً یہ بات بے جا اور بے محل ہو گی[۳۰۱]۔

خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک حقیقت ہے

اہل کتاب پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت پوری طرح کھل چکی تھی۔ پیشن گوئیاں ان کی کتابوں میں موجود تھیں جن کے پورا ہونے کا ان کو ابھی تک انتظار تھا۔ حضرت ابراہیم کی اولاد

میں سے اسماعیلؑ کے ساتھ وعدہ تھا۔ حضرت اسماعیلؑ کو عرب میں چھوڑا گیا۔ بیت اللہ سوائے عرب کے اور کہیں نہ تھا یعنی خانہ کعبہ کے سوا کوئی گھر بیت اللہ کے نام سے موسوم نہیں ہوا۔ حضرت ابراہیمؑ کا تعلق اسی گھر سے تھا۔ اور حضرت ابراہیمؑ کی یادگاریں یہاں موجود تھیں۔ بس جب ابراہیمؑ کی دعاؤں کا موعود نبی آیا تو ضروری تھا کہ اس کا قبلہ یہی کعبہ ہوتا۔ اس لیے بھی کہ وہ جانتے تھے کہ نبی موعود عرب میں ظاہر ہونے والا ہے بلکہ یہی وجہ تھی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے یہودی ملک عرب میں کثرت سے آکر آباد ہوتے اور ان پیشین گوئیوں میں صراحت سے عرب کا نام پایا جاتا ہے چنانچہ یسعیاہ ۲۱: ۱۳ میں ان الفاظ کے بعد، عرب کی بابت الہامی کلام، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت کی پیش گوئی ہے۔ اس قدر آپ کی صداقت کے نشان موجود تھے کہ دل صداقت کا انکار نہ کر سکتے تھے۔

انجیل لوقا میں ہے کہ حضرت مسیح نے آسمان پر چلے جانے سے تھوڑی دیر پہلے فرمایا کہ — دیکھو میں اپنے باپ خدا کے اس موعود کو تم پر بھیجتا ہوں۔ لیکن جب تک عالم بالا سے تم کو قوت عطا نہ کی جاتے یروشلم میں ٹھہرو (لوقا۔ ۲۴۔ ۴۹) اس کی چند سطروں کے بعد لوقا کی انجیل ختم ہو گئی اور اس موعود کے ظہور کا کوئی ذکر نہیں۔ یہ رسول موعود کون تھا۔ ظاہر ہے کہ حضرت عیسیٰ کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کوئی پیغمبر نہیں آیا۔ انجیل کے اس فقرے میں یہ الفاظ قابل غور ہیں کہ حضرت مسیح کہتے ہیں کہ اس آسمانی قوت کے ظاہر ہونے تک شہر یروشلم میں ٹھہرو۔ اس سے مقصود اس قوت آسمانی کے ظہور ہونے تک یروشلم میں محض اقامت نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس رسول موعود کے ظہور تک تمہارا قبلہ بیت المقدس رہے گا لیکن جب وہ آئے گا تو قبلہ شہر مکہ میں کعبہ ہو جائے گا۔

۲۹۸۔ جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے وہ خوب جانتے ہیں کہ یہ معاملہ ان کے پروردگار کی جانب سے حق ہے یعنی اہل کتاب کو اپنی کتاب سے معلوم ہے کہ نبی آخرالزماں بیت المقدس کی طرف کچھ دنوں تک نماز پڑھیں گے اور آخر میں کعبہ کی طرف پڑھیں گے اور یہ بھی ان کو معلوم ہے کہ اصلی اور دائمی قبلہ ان کا ملت ابراہیمی کے موافق ہو گا۔ اس لیے اس تحویل قبلہ کو وہ بھی حق سمجھتے ہیں [1]

---

[1] فوائد شیخ الہند ص ۲۶

مطلب یہ ہے کہ خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا انکار اہل کتاب کو بھی نہیں ہے پولوس پال ایک خط میں جو گلیتوں کے نام ہے لکھتا ہے :

یہ لکھا ہے کہ ابراہیم کے دو بیٹے تھے ایک ہاجرہ سے اور دوسرا سارہ سے۔ پردہ جو ہاجرہ سے تھا جسم کے طور پر پیدا ہوا اور جو سارہ سے تھا سو وعدہ کے طور پر ہوا۔ یہ باتیں تمثیل بھی مانی جاتی ہیں اس لیے کہ یہ دو عورتیں دو عہد ہیں۔ ایک تو سینا پہاڑ پر سے جو ہوا وہ ترسے غلام جنتی ہیں۔ یہ ہاجرہ ہے کیونکہ ہاجرہ عرب کا کوہ سینا ہے۔ اب کے یروشلم کا جواب ہے۔ اور یہی اپنے لڑکوں کے ساتھ غلامی میں ہے پر اوپر کا یروشلم آزاد ہے (گلیتوں کے نام ۲۲-۲۶ باب ۴)

اس اقتباس سے واضح ہے کہ عیسائیت کا بانی بھی اس بھید سے واقف تھا کہ بیت المقدس اور خانہ کعبہ ایک دوسرے کا جواب ہیں۔ اب کے یروشلم سے ظاہر ہوتا ہے کہ بیت المقدس نیا ہے اور خانہ کعبہ پرانا ہے۔

علماء اکابر یہود کو اپنے ہاں کی روایتوں اور نوشتوں کی بنا پر خوب علم تھا کہ پیغمبر آخرالزماں کا قبلہ وہی ہوگا جو ابراہیم خلیل کا ہے کہ وہ ہی قبلہ اصلی اور حقیقی ہے۔ یہودی علماء عرب میں علمی شہرت رکھتے تھے۔ عوامی زندگی ان پر اعتماد کرتی تھی اور ان کی علمی زندگی ایک پیشہ ورانہ زندگی تھی۔ یہی پیشہ ور طبقہ لوگوں میں اپنی کتابوں کے حوالے سے بے بنیاد باتیں نشر کرتا رہتا۔ ان کا مقصد محض لوگوں کو اپنے دام تزویر میں پھانسا ہوتا تھا۔ قرآن نے ان کی تکذیب کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کی کتابوں میں بشارات انبیاء سے حضور انورؐ کی نبوت ان کے نزدیک ایک ثابت شدہ حقیقت ہے اور اس کے نتیجہ میں قدرتی طور پر یہ بات بھی ان کی جانی بوجھی حقیقت ہے کہ تحویل قبلہ وحی کے ذریعے ہوا ہے اور یہی حق ہے۔ اب تحویل قبلہ پر ان کی جانب سے اعتراض کرنا محض گروہ پرستی کے تعصب کا نتیجہ ہے۔

۲۹۹۔ اور بلاشبہ اگر تم ان اہل کتاب کے سامنے سارے دلائل بھی پیش کروگے پھر بھی یہ تمہارے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے۔ یعنی اگر آپ اپنی نبوت کی اور اپنی صداقت کی ساری دلیلیں، سارے براہین بھی پیش کر دیں گے تو آپ کے قبلہ کی پیروی نہ کریں گے چہ جائے کہ آپ کی نبوت کو مان لیں۔ آپ ان کی باتوں اور ان کے اعتراضات کی طرف سے توجہ ہٹا لیجئے اور اس پر افسوس بھی نہ کیجئے کہ یہ کیوں نہیں مانتے اور یہ خیال بھی نہ کیجئے کہ دلیل و حجت اور علم و بصیرت

کے ذریعے آپ ان کو رام کر لیں گے یہ طبقہ تاریکی کی مخلوق ہے لہٰذا استدلال اس کی غذا نہیں ہے۔

اور یہ جو فرمایا ہے کہ نہ یہ ممکن ہے کہ آپ ان کے قبلہ کی پیروی کریں دما انت بتابع قبلتھم تو اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ ابراہیمی قبلہ پر ہیں۔ ابراہیم کی بزرگی اور ان کے قبلہ کی عظمت کے وہ بھی قائل ہیں اور ملت ابراہیم کی حقانیت کے موضوع پر ان میں بھی کبھی دورائیں نہیں ہوتیں۔ ابراہیم کی ذات اتحاد و اتفاق کا مرکزی نقطہ ہے۔ تو آپ صحیح موقف پر ہوتے ہوئے ان کے قبلہ کی کیوں کر پیروی کر سکتے ہیں۔ وہ تو فرع سے ہٹنا نہیں چاہتے اور آپ تو پہلے اصل پر گامزن ہیں۔ ابراہیم کی ذات بین الاقوامی ہے اس لیے آپ کو ایک مستقل امتیازی عالمگیر قبلہ عطا ہو چکا ہے۔ اب یہود و نصاریٰ کو آپ کی طرف سے ہمیشہ کے لیے مایوس ہو جانا چاہیے۔ اگر ان میں حق پرستی ہوتی تو وہ آپس میں کیوں قبلہ کے موضوع پر ایک دوسرے سے مختلف ہوتے اور کیوں ایسا ہوتا کہ یہودی عیسائیوں کا قبلہ نہیں مانتے اور عیسائیوں کو یہودیوں کے قبلہ سے انکار ہوتا۔ یاد رہے کہ یہودیوں کا قبلہ ہیکل بیت المقدس اور عیسائی کسی عمارت یا مکان کو نہیں بلکہ سمت مشرق کو قبلہ بنائے ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جب اہل کتاب استقبالِ قبلہ کو حق جاننے کے باوجود بوجہ حسد و عناد حق پوشی کرتے ہیں تو آپ ان سے اپنے قبلہ کی موافقت کی ہرگز توقع نہ رکھیے۔ ان کے تعصب کا حال یہ ہے کہ ان کے سامنے ممکن الوقوع ساری نشانیاں بھی رکھ دو گے پھر بھی آپ کے قبلہ کے لیے ان میں پذیرائی نہ ہوگی بلکہ ان کی خواہش تو یہ ہے کہ کسی طرح آپ کو اپنا تابع بنا لیں۔ اسی بنا پر وہ کہا کرتے ہیں کہ اگر ہمارے قبلہ پر رہتے تو ہم آپ کو نبی موعود سمجھتے اور یہ اس لیے کہتے ہیں کہ شاید آپ ان کے قبلہ کی طرف پلٹ جائیں۔ لیکن ان کا یہ خیال باطل اور خام ہے۔ آپ کسی وقت بھی ان کے قبلہ کا اتباع نہیں کر سکتے۔ آپ نے موجودہ قبلہ کو اللہ کی جانب سے آئی ہوئی وحی کی بنا پر اختیار کیا ہے۔ اس لیے اب موجودہ قبلہ کا حکم قیامت تک کے لیے ہے اور آپ کو قبلہ کے بارے میں اپنا ہمنوا یہ بیچارے کیا بنائیں گے۔ ان کا تو اپنا حال یہ ہے کہ قبلہ کے موضوع پر باہم مختلف ہیں۔ یہودی اگر بیت المقدس کو قبلہ بنائے ہوئے ہیں تو عیسائی بیت المقدس کی مشرقی جانب کو۔ جب وہ خود ہی اس موضوع پر متفق نہیں ہیں تو آپ کو کس منہ سے ضدین کی متابعت کی دعوت دیتے ہیں [1]

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ

۴۰۰ - اگر تم نے اس علم و بصیرت کے آنے کے باوجود ان کی خواہشوں کی پیروی کی - یعنی اگر آپ نے ان کو اسلام کی طرف مائل کرنے کی خاطر اس معاملہ میں قرآنی نص کی موجودگی میں اجتہاد بھی کیا - آپ ایسا کر نہیں سکتے لیکن اگر بالفرض آپ نے ایسا کیا - اس میں اشارہ ہے کہ جن مسائل میں نص نہ ہو اور ہدایت وحی کی علمی رہنمائی نہ ہو اس میں اجتہاد کی اجازت ہے مگر جن مسائل میں وحی الٰہی کی رہنمائی موجود ہو ان میں نبوت کو بھی اجتہاد کی اجازت نہیں ہے. مطلب یہ ہے کہ اب جبکہ ہم نے قبلہ کے موضوع پر آپ کے سامنے علم کی روشنی پیش کر دی ہے اس علم کے بعد کسی کے لیے اس کے بارے میں سوچنے کی بھی اجازت نہیں ہے - اب ایسے لوگوں کے اتحاد و یک جہتی سے قطع نظر کر لیجئے کیونکہ آپ متبع حق ہیں - جن لوگوں نے اتباع حق سے یک قلم کنارہ کشی کر لی ہے ان کے ساتھ متبع حق کا کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا - اس آیت سے یہ دستوری دفعہ معلوم ہو رہی ہے کہ قانون سازی میں مصدر اول اور اصل و اساس اللہ کی وحی ہے - وحی کی موجودگی میں ایسا کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا جو وحیٔ الٰہی سے متصادم ہو - گویا اس آیت نے بتا دیا کہ اسلامی مملکت میں قانون سازی کے اختیارات کس کو کس حد تک حاصل ہو سکتے ہیں - اور اس دستوری دفعہ کے بیان کرنے میں خود جناب نبوت کو مخاطب کیا ہے حالانکہ عصمتِ نبوت خود اس مفروضہ کے خلاف ہے - مخاطب آیت میں آپ ہیں اور سنایا اُمت کو جا رہا ہے -

اور اس میں اس اصولی دفعہ کی طرف اشارہ بھی ہے جو فقہاء نے پیش کی ہے کہ نبوت کی جانب منسوب شدہ ہر بیان اور ہر کردار کو نبوت کا بیان و کردار قرار دیا جائے گا - اگر وہ صریح قرآن کے خلاف ہو کیونکہ نبوت ایک سیرت ہے جو صرف قرآن کی روشنی ہی سے بنی ہے اور صرف قرآنی روشنی ہی کے سانچے میں ڈھل سکتی ہے - نبوت کسی بات سے عاجز نہیں ہوتی مگر اس بات سے کہ وحیٔ الٰہی کے خلاف ہو - وحی کے خلاف جو کچھ ہے خواہ کسی شکل اور کسی درجہ میں ہو نبوت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا - اگر وحی ہے تو نبوت ہو گی اگر وحی نہیں ہے تو نبوت بھی نہیں ہے. وحی کی راہ سے آیا ہوا علم یقینیات میں سے ہے اور علم حقیقی ہے -

بہرحال اس آیت نے یہ بات کھول دی کہ وحی کی صدائے الٰہی کے سامنے کسی کو برتری نہیں ہے چاہے اس کا تعلق مصالح سے ہو یا منافع سے -

یہ بھی اسی آیت نے رہنما اصول بتا دیا کہ دین کی خدمت دین کو قربان کرکے نہیں بلکہ دین کی پیروی کر کے کی جاتی ہے -

۱۰۴۔ تو آپ کی جانب سے یقیناً یہ بات بے جا اور بے محل ہوگی یعنی بالفرض اگر تھوڑی دیر کے لیے مان بھی لیا جائے کہ آپ نعوذ باللہ اہلِ کتاب کے فیصلہ کی متابعت نزولِ وحی اور علم یقینی کے خلاف کر ہی لیں تو اس تقدیر محال پر بے شک آپ کا شمار بھی بے انصافوں میں ہوگا۔ اور نبی سے یہ امرِ شنیع کسی طرح ممکن نہیں ہے تو معلوم ہوگیا کہ قبلہ اہلِ کتاب کی متابعت آپ سے ہرگز ممکن نہیں ہے کہ سراسر علم کے خلاف ہے۔[۱]

اللہ کے قانون میں رورعایت کسی کی نہیں ہے یہاں تک کہ انبیاء کے لیے بھی نہیں ہے اور نفس فطرتِ بشری کے لحاظ سے گناہوں کی صلاحیت ان میں ہوتی ہے جیسی دوسروں میں۔ یہ ... بات ہے کہ توفیقِ الٰہی ان کا تعلق ہر وقت اور ہر حال میں اپنے سے قائم رکھتی ہے اور انہیں خطا سے محفوظ اور گناہ سے معصوم بنائے رکھتی ہے۔[۲]

آیت میں ان لوگوں کو سنگین دھمکی ہے جو قرآنی علم کے باوجود عوامی مصالح کا احترام کرتے ہیں اور علمِ قرآنی کو پسِ انداز کر دیتے ہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں آیت کا مقصد اُمت کو یہ بتانا ہے کہ قرآنی حکم کے ہوتے ہوئے کبھی خواہشات اور میلانات کے سیلاب میں نہ بہنا چاہیے۔ اللہ کا حکم تمام مصلحتوں سے بالاتر ہونا چاہیے یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ اس حکم کی سنگینی بتانے کے لیے اس میں بارہ قسم کی تاکیدات کو جمع کر دیا ہے۔

۱۔ جوابِ قسم کو محذوف کر دیا ہے یعنی بخدا آپ نے اگر ایسا کیا۔

۲۔ لامِ تاکید لے کر آتے ہیں

۳۔ اور زیادہ زور پیدا کرنے کے لیے اِنْ شرطیہ لاتے ہیں یعنی اتباع کا کوئی حصہ بھی ظلم ہوگا۔

۴۔ بات کو بہت سنگین بنانے کی خاطر خاطب حضورِ انور کو فرمایا ہے حالانکہ آپ کی عصمت ثابت شدہ ہے۔

۵۔ ماجاء میں پہلے اجمال اور من العلم میں اس کی تفصیل کی ہے۔

۶۔ العلم الف لام کے ذریعے اس کی عظمت کی خاطر معرفہ بنا کر پیش کیا۔

۷۔ شرط کی جزا میں لفظ ان تاکیدی لائے ہیں۔

---

[۱] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۹ [۲] تفسیر ماجدی ص ۵۶

اَلَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَآءَهُمْ ؕ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُوْنَ ؁ اَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ (وقف منزل) فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِيْنَ ؁ (رکوع)

جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے یعنی اہلِ کتاب کے علماء، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ویسے ہی پہچانتے ہیں جس طرح اپنی اولاد کو جانتے پہچانتے ہیں لیکن اس پر ان کا ایک گروہ ایسا ہے جو جان بوجھ کر حق کو چھپا رہا ہے۔ یقین کرو کہ یہ ایک امرِ واقعی ہے لہٰذا اس کے بارے میں تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔

۸- انّ کے بعد لام تاکید لاتے ہیں۔

۹- شرط کی جزا کو جملہ اسمیہ بنا کر لائے ہیں۔

۱۰- اور زیادہ زور پیدا کرنے کے لیے اذن استعمال کیا ہے۔

۱۱- اور بجائے ظالم کہنے کے یہ کہا ہے کہ شمار ظالموں میں سے ہو گا- اس میں زیادہ زور ہے یہ کہنا کہ رشید علماء میں سے ہے زیادہ بلیغ ہے اس فقرہ سے کہ رشید عالم ہے۔

۱۲- پھر کمالِ ظلم بتانے کے لیے ظالمین کو معرفہ بنا کر لاتے۔

اور آخر میں ظلم کا متعلق حذف کر کے اس میں تعمیم پیدا کی ہے شاید اسی بنا پر امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ اس میں عالم کے حق میں غیر عالم کے مقابلہ میں شدید ترین وعید ہے۔

اگر آیت میں حضور پر کہہ کر اُمت کو سمجھایا گیا ہے جیسا کہ ابن کثیر، قرطبی اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی رائے ہے تو پھر اُمت کے منصبِ امامت کا اعلان کرنے کے بعد اس تہدید کا منشاء یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر تم نے نبوت کے لائے ہوئے علم کو لوگوں کی خواہشوں اور عوام کی مصلحتوں، قوم کی منفعتوں پر قربان کر دیا تو پھر تمہارا شمار بھی ظالموں میں سے ہو گا- اور تمہیں بھی مقامِ امامت سے ویسے ہی ہٹا دیا جائے گا جیسا تمہارے پیشرو اسی جرم کی پاداش

میں ہٹادیے گئے کیونکہ جس ذات گرامی کی دُعا کے صدقے میں تمہیں امامت دی گئی ہے ان سے کہہ دیا گیا تھا لا ینال عہدی الظالمین ۔

ایک سوال کا جواب

قرآن حکیم کا انداز بجائے تصنیف کے خطابت کا انداز ہے اس لیے اس کا مفہوم سمجھنے کے لیے ایک خطیب کے انداز بیان کا تصور رکھنا چاہیے ۔ جب وہ کسی خاص ماحول میں گفتگو کرتا ہے تو بہت سے اُمور اس کے ماحول میں اور بہت سے متکلم و مخاطب کے ذہنوں میں موجود ہوتے ہیں اور بہت سے اس کے طرزِ تکلم سے سمجھے جاتے ہیں۔ اور جب ان سب کو پیشِ نظر رکھا جاتا ہے تو اس کا کلام سمجھنے میں کوئی دُشواری نہیں ہوتی۔ پیچھے بتایا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کے علماء قبلہ کی حقیقت کو جانتے اور مانتے ہیں۔ اس کے باوجود محض گروہ پرستی کے تعصب میں انکار کر رہے ہیں۔ سننے والوں کے ذہن میں قدرتی طور پر یہاں یہ سوال اُبھرتا ہے کہ وہ قبلہ کی حقیقت کو کیونکر مانتے ہیں۔ اسی سوال کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے کہ قبلہ کو حق اس طرح مانتے ہیں کہ وہ جانتے ہیں کہ جناب رسول اللہ اللہ کے پیغمبر ہیں۔ اور آپ کی معرفت ان کو اپنی کتابوں میں آئی ہوئی بشارتوں کے ذریعے حاصل ہوتی ہے اور آپ کی ان صفات کے ذریعے ہوتی ہے جن کا تذکرہ بشارتوں میں آیا ہے اور آپ کے نبی ہونے کا معاملہ ان کے لیے اس قدر بدیہی ہے کہ اس کے لیے کسی دلیل و حجت کی ضرورت نہیں ہے ۔

یہ بات کہ انداز بیان میں آپ کا تذکرہ صراحت کو چھوڑ کر کنائی انداز یعنی ضمیر کے ذریعے کیوں کیا ہے۔ محققین نے اسے التفات سے تعبیر کیا ہے یعنی پہلی آیتوں میں آپ کو مخاطب بنایا گیا تھا اور ضمیر خطاب کے ذریعے آپ سے بات کی جارہی تھی۔ اس آیت میں یکایک ضمیر غائب لاکر آپ کا تذکرہ کیا ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ وہ لوگ جن کو ہم نے وحی و کتاب کی نعمت سے نوازا تھا وہ اس شخص کو جس کو ہم خطاب کر رہے ہیں خوب پہچانتے ہیں ۔

تورات میں آپؐ کی بشارت کنائی زبان میں

یہاں حضور انورؐ کا تذکرہ کنائی انداز میں کرنے کی اصل وجہ یہ ہے کہ تورات کی پیشین گوئی کے مطابق یہود کو تین پیغمبروں کا انتظار تھا جن میں سے دو کے نام الیاس اور مسیح تھے لیکن تیسرے

کا نام صرف وہ نبی لیا گیا ہے۔ یہ تیسرا نبی حضور انورؐ کے علاوہ کون ہے۔ یہود و نصاریٰ دونوں یقین رکھتے ہیں کہ اب مسیح کے سوا کوئی آنے والا نہیں ہے صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ہے جو نبی اور پیغمبر کے مطلق نام سے دنیا میں مشہور ہے۔ مسلمان آپ کو اسی کنائی زبان میں آنحضرت کہتے ہیں۔ چونکہ تورات و انجیل میں آپ کی بشارت کنائی زبان میں تھی۔ اور یہودی اور عیسائی اسی کنائی زبان والے وہ نبی کے منتظر تھے اور اس کے جو بشارتوں میں اوصاف بتائے گئے تھے وہ آپ کے ہی اوصاف تھے اس لیے قرآن نے یہاں کنائی زبان ہی میں آپ کا تذکرہ کیا ہے۔

مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی بیضاوی کے حاشیہ میں رقمطراز ہیں۔

جو چیز مزید شرح کی محتاج ہے وہ یہ ہے کہ یہ بات جاننا ضروری ہے کہ پیشین گوئی میں ہر نبی نے تعریض و کنایہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں جن کو صرف علماء سمجھ سکتے ہیں۔ ضرور ہی اس میں کوئی خدائی حکمت ہے۔ علماء کہتے ہیں کہ کوئی بھی نازل شدہ کتاب ایسی نہیں ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر پر مشتمل نہ ہو مگر یہ سب کچھ اشارات کے ذریعے ہے۔

اس بنا پر یہاں بھی حضور انورؐ کا تذکرہ ضمیر غائب کے ذریعے کنائی زبان میں ہے۔ شارحینِ قرآن میں سے جن بزرگوں کی نظر اس لطیف نکتہ پر نہیں ہے۔ ان کو حیرت ہے کہ ضمیر غائب کیوں لائے ابو حیان اندلسی نے اگر اسے التفات قرار دیا تو زمخشری نے یہ لطیف نکتہ آفرینی کی کہ ایسے مواقع پر جہاں سننے والوں کو اشتباہ نہ ہو اور بات کے سمجھنے میں کوئی غلطی نہ ہو ضمیر عظمت و شان کے لیے لاتے ہیں۔

۴۰۲۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ حضور انورؐ کو پہچانتے ہیں۔ متقدمین عموماً اس طرف گئے ہیں کہ یعرفونہ کی ضمیر سے مراد بیت الحرام کو بحیثیتِ قبلۃ الانبیاء پہچاننا ہے۔ ابن جریرؒ نے ابنِ عباسؓ صحابی سے لے کر قتادہ ابنِ زیدؒ، سدی ابن جریج تابعینؒ کے اقوال اسی معنے میں نقل کیے ہیں۔ لیکن متاخرین میں تقریباً سب کا اس پر اتفاق ہے کہ مراد ذاتِ رسالت ہے۔ ابوحیان اندلسی نے اسے بھی مجاہد اور قتادہ کا مسلک بتایا ہے۔ جن لوگوں کو کتاب دی گئی ہے کے فقرہ سے مراد اگرچہ علماء یہود ہیں لیکن اس کے عموم میں مسیحی بھی داخل ہیں کیونکہ توریت و صحف قدیم کو مسیحی بھی مانتے ہیں۔

یہ فقرہ یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم ایک عربی محاورہ ہے۔ وہاں بولا جاتا ہے جب آدمی کسی چیز کو یقینی طور پر جانتا ہو اور اس کے بارے میں کسی شک و اشتباہ کا شکار نہ ہو۔ ابن کثیرؒ

کہتے ہیں العرب کانت تضرب المثل فی صحۃ الشئ - مطلب یہ ہے کہ جب یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی اولاد کے پہچاننے میں کوئی اشتباہ نہیں ہے اسی طرح وہ بلا کسی شک و اشتباہ یقینی طور پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانتے ہیں۔ اس سے پہلے بھی حضور انورؐ کے بارے میں گزر چکا ہے۔

فلما جاء ھم ما عرفوا کفروا بہ

جب ان کے پاس ان کی جانی پہچانی چیز آئی تو انہوں نے اس کا انکار کر دیا۔

یہاں بھی جانی پہچانی چیز سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے۔ ابن سعد، ابن اسحاق، مسند احمد، تاریخ بخاری، مستدرک حاکم، دلائل بیہقی، معجم طبرانی اور دلائل ابونعیم میں متعدد واقعات ایسے نقل کیے گئے ہیں جن سے مجموعی طور پر ثابت ہوتا ہے کہ حضور انورؐ کی ذاتِ گرامی مدینہ کے یہودیوں کے لیے ایک جانی پہچانی شخصیت تھی۔ ام المومنین حضرت صفیہؓ ایک یہودی عالم کی صاحبزادی ہیں اور ایک دوسرے عالم کی بھتیجی ہیں۔ وہ فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینے تشریف لائے تو میرے باپ اور چچا دونوں آپ سے ملنے گئے بڑی دیر تک آپ سے گفتگو کی پھر جب گھر واپس آگئے تو میں نے خود ان کی یہ گفتگو سنی۔

چچا — کیا یہ وہ 'نبی' ہے جس کی خبر ہماری کتابوں میں دی گئی ہے؟

والد — خدا کی قسم ہاں

چچا — کیا تم کو اس کا یقین ہے؟

والد — ہاں

چچا — پھر کیا ارادہ ہے؟

والد — جب تک جان میں جان ہے اس کی مخالفت کروں گا اور اس کی بات چلنے نہ دوں گا۔

(سیرۃ ابن ہشام ج ۲ ص ۱۶۵)

عبداللہ بن سلامؓ علمائے یہود میں سے تھے۔ ایک بار حضرت عمرؓ نے آپ سے فرمایا کہ میں حضور انورؐ کو اپنی اولاد سے بھی زیادہ پہچانتا ہوں۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا وہ کیسے؟ عبداللہ بن سلامؓ نے جواب دیا۔ بیٹے میں تو شک ہو سکتا ہے کہ شاید بیوی نے خیانت کی ہو مگر حضور انورؐ کے بارے میں کوئی شک نہیں ہو سکتا۔ آپ کی صفات و علامات ہماری کتابوں میں موجود ہیں۔ آپ کو دیکھتے ہی میں نے پہچان لیا کہ آپؐ اللہ کے پیغمبر ہیں۔

۲۰۴ - ایک گروہ ایسا ہے جو جان بوجھ کر حق کو چھپا رہا ہے۔ یعنی آپؐ کی نبوت ان کے لیے جانی

پہچانتی ہے۔ پہلے فقرے میں بتایا تھا کہ حضور انورؐ کی معرفت ان کو حاصل ہے اور اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ معرفت کے ساتھ علم بھی ان کو حاصل ہے۔ علم و معرفت کے باوجود وہ کتمانِ حق کے جُرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔ یہ ان کے علم و معرفت ہی کا اثر تھا کہ علمائے یہود آنے والے نبی کے متعلق تورات کی بیان کردہ مختلف علامات اور نشانیوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے اور سوالات کرتے تھے اور آپ کا امتحان لیتے تھے اور جب ان کو تشفی ہو جاتی تو حلقہ بگوشِ اسلام ہو جاتے۔ قرآن نے یہاں کتمان کی نسبت سب کی طرف نہیں بلکہ ان میں سے ایک فریق کی طرف کی ہے۔ یہ فریق علمائے یہود سے تعلق رکھتا تھا۔

۳.۴ ۔ یقین کرو کہ یہ ایک امرِ واقعی ہے۔ اصل ارشاد ہیں الحق من ربک ہے۔ الحق سے مراد یہاں بیت اللہ کا قبلہ ہونا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ کا قبلہ ہونا آپ کے پروردگار کی جانب سے اٹل، اَن مٹ اور قیامت تک باقی رہنے والی حقیقت ہے۔ حق باطل کی نقیض ہے باطل ایسی چیز جس میں ثبات و قیام نہ ہو ٹل جانے والی اور مٹ جانے والی۔ اور حق کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے یعنی جو چیز ثابت ہو۔ قرآن جب کسی بات کو علامتِ تعریف کے ساتھ الحق کہتا ہے تو اس سے مقصود مخاطبوں کو یہ سمجھانا ہوتا ہے کہ یہ دُنیا کی ایک قائم و ثابت حقیقت ہے جن قوتوں نے اسے مٹانا چاہا ہے وہ خود مٹ گئیں۔ حتیٰ کہ آج ان کا نام و نشان بھی نہیں ہے لیکن بیت اللہ کا قبلہ ہونا ہمیشہ قائم رہنے والی بات ہے۔ اسی حقیقت کی طرف اشارہ کرنے کے لیے یہاں وہ صرف الحق کہہ کر خاموش ہو گیا۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھتا ہے کیونکہ اگر اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ حق و باطل کی جنگ میں حق ہی کو باقی رکھتا ہے تو کسی بات کے امرِ حق ہونے کے لیے صرف یہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ حق ہے۔ یعنی باقی اور قائم رہنے والی حقیقت ہے۔ اس کا بقا و قیام خود ہی اپنی حقیقت کا اعلان کر دے گا۔ حدیث و السیر کی روایتوں میں جو آتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلمؐ فتح مکہ کے بعد جب خانہ کعبہ میں داخل ہوتے تو کعبہ کے اندر کے بتوں کو توڑتے جاتے تھے اور زبانِ مبارک سے کہتے جاتے جاء الحق وزھق الباطل — تو اس میں اسی طرف اشارہ تھا۔

۴.۵ ۔ لہٰذا اس کے بارے میں تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حالات کی ساری ناسازگاریوں اور بے سر و سامانی کے سارے درجوں کے باوجود بیت اللہ کے قبلہ ہونے کا معاملہ ہو کر رہنا ہے۔ ایسی حالت میں جب کہ دُنیا کی دو بڑی طاقتور امتیں مسجد اقصیٰ اور جانبِ مشرق

وَلِكُلٍّ وِّجْهَةٌ هُوَ مُوَلِّيْهَا فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرٰتِ ؕ اَيْنَ مَا تَكُوْنُوْا يَاْتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيْعًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۴۸﴾ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

اور دیکھو ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے جس کی طرف وہ رُخ پھیر لیتا ہے لہٰذا نیکیوں کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ تم جہاں کہیں بھی ہو گے اللہ تم کو لے آئے گا۔ اللہ یقیناً ہر چیز پر پوری پوری قدرت والا ہے۔

کو قبلہ بنانے ہوتے نہیں کون امید کر سکتا تھا کہ انہیں ظلم ہیروں سے فتح و کامرانی پیدا ہو سکتی ہے۔ فرمایا ایسا ہی ہو کر رہنا ہے۔ مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھئے۔ آپ کے پاس حق ہے اور کامیابی حق ہی کی ہو کر رہے گی۔

آیئے پوری آیت پر حضرت شیخ الہندؒ کی زبانی ایک نظر ڈال لیجئے۔ فرماتے ہیں کہ اگر تم کو یہ خیال ہو کر کاش کعبہ کا مسلمانوں کے لیے قبلہ ہونا اہل کتاب کسی طرح تسلیم کر لیں اور دوسرے لوگوں کو شبہات میں نہ ڈالیں تو میرے نبی موعود ہونے میں کوئی خلجان باقی نہ رہے تو جان لو کہ اہل کتاب کو تمہارا بہت پورا علم ہے آپ کے نسب و قبیلہ، مولد و مسکن، صورت و شکل، اوصاف و احوال، سب کو جانتے ہیں جس کی وجہ سے ان کو آپ کا علم اور آپ کے نبی موعود ہونے کا ایسا یقین ہے جیسا بہت لڑکوں میں اپنے بیٹوں کو بلا تامل پہچانتے ہیں لیکن اس بات کو کچھ تو ظاہر کرتے ہیں اور کچھ دیدہ دانستہ اسے چھپاتے ہیں۔ لیکن ان کے چھپانے سے کیا ہوتا ہے۔ حق بات تو وہی ہے جو اللہ کی طرف سے ہو۔ اہل کتاب مانیں یا نہ مانیں۔ ان کی مخالفت سے کسی قسم کا تردد نہ کریں[1]

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۹

مقصد کا شعور اصلی محرک ہے

اجتماعی زندگی کی کامیابیوں کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب و آرزو وہ اصلی قوت ہے جو اُمتوں کو کامیابی اور عظمت سے ہم دوش کرتی ہے۔ یہ صحیح ہے کہ کام جیسے زمانے سے خالی نہیں ہوتا ایسے ہی مکان سے بھی خالی نہیں ہوتا۔ اصل مقصد کام ہے زمان و مکان مقصد نہیں ہیں۔ زمان و مکان اُمتوں میں بدلتے رہے ہیں۔ لیکن مقصد سب جگہوں اور سب وقتوں میں ایک رہا ہے۔ اُمت کا مقصدِ تخلیق اللہ کی عبادت ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، اوامر و نواہی سب کے سب بالآخر اس مقصدِ اصلی کے تابع ہیں۔ قبلہ کا معاملہ وحدت قائم رکھنے کے لیے اُمتوں میں مختلف رہا ہے۔ تورات سے حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب کا یہ دستور معلوم ہوتا ہے کہ وہ جہاں عبادت کرنا چاہتے تھے اس جگہ کو چند پتھروں سے گھیر کر بیت ایل بنا لیتے تھے۔ قرآن میں ہے کہ بنی اسرائیل جب مصر میں تھے تو حضرت موسیٰؑ کے ذریعے سے اُن کو حکم ہوا تھا کہ اپنے گھروں کو قبلہ رُخ کر لیں اور نماز ادا کریں۔ بیت المقدس کے قبلہ ہونے کا ذکر عہدِ قدیم کے مجموعہ صحف میں متعدد موقعوں پر آیا ہے۔ حضرت داؤد کی زبور میں ہے:

> لیکن میں جو ہوں سو تیری رحمت کی کثرت سے تیرے گھر میں آؤں گا اور تجھ سے ڈر کر تیرے مقدس ہیکل کی طرف تجھے سجدہ کروں گا۔ (۵-۷)

سلاطین اول میں ہے:

> جب تیرا گروہ لڑائی کے لیے اپنے دُشمن کے برخلاف نکلے جہاں کہیں تو ان کو بھیج دے اور خداوند کے آگے دُعا مانگے اس شہر کی طرف جس کو تُو نے پسند کیا اور اس گھر کی طرف جسے ہم نے تیرے نام کے لیے بنایا۔ (۷-۴۴)

اسی صحیفہ میں آگے چل کر ہے:

> اور اس کی طرف جو تو نے ان کے باپ دادوں کو دی اور اس شہر کی طرف جسے تُو نے چُن لیا اور اس گھر کی طرف جو میں نے تیرے نام کے لیے بنایا، تجھ سے دُعائیں مانگیں

عرب میں کعبہ کو وہی حیثیت حاصل تھی جو بنی اسرائیل کے لیے بیت المقدس کی تھی۔ قرآن نے

اس آیت میں بتایا ہے کہ تمہاری نظر زمان و مکان سے الگ ہو کر اصل مقصد پر ہونی چاہیے۔ قبلہ کا معاملہ ایک مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ ہے اور ذرائع ہمیشہ اُمتوں میں بدلتے رہے ہیں۔ مقصدِ اصلی تو اللہ سبحانہٗ کی عبادت اور طاعت ہے۔ اُمتوں میں مقصد کی لگن اس کی جد وجہد کا اصلی محرک ہے۔ جب تمہیں قبلہ ہونے کی حیثیت میں کعبہ کی حقیقت اور مرکزیت معلوم ہو چکی ہے اور پتہ لگ گیا ہے کہ یہ اُمتِ مسلمہ کا ارضی مرکز، یگانہ اللہ کی عبادت کرنے والوں کی یادگار، محمد رسول اللہ کے پیرو ہونے کا شعار، اور مسلمانانِ عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے۔

۴۰۶۔ ہر ایک کے لیے ایک سمت ہے۔ اصل ارشاد میں و لکل وجهة ہے۔ وجہہ کے معنے سمت کے ہیں۔ جہت اور وجہت دونوں ایک معنے میں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قبلہ کا معاملہ صرف اسلام ہی کی خصوصیت نہیں ہے۔ دُنیا میں اللہ کی جانب سے جو اُمتیں آتی رہی ہیں اور جو ملتیں بنتی رہی ہیں سب ہی کا ایک قبلہ رہا ہے تو پھر قبلہ کے موضوع کو بحث و نظر کا مرکز بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اسلام ہی ایک مستقل دائمی ہدایت کا نظام ہے۔ اس کے لیے بھی عبادت میں نظامِ وحدت قائم رکھنے کے لیے ایک مرکز کی ضرورت ہے۔ سب اپنے اپنے قبلہ کی طرف رُخ کرتے رہے ہیں۔ اگر قبلہ کا معاملہ ان ذرائع میں سے ہے جو انبیاء بدلتے رہے ہیں تو پھر اسے اس قدر کیوں اہمیت دیتے ہو اصل نظر تو مقاصد پر ہونی چاہیے۔ اور مقصد ہی کے پیشِ نظر محنت اور کوشش کرنی چاہیے۔ بعض عُلماء نے آیت کا یہ مطلب بتایا ہے کہ صرف اتنی بات نہیں کہ کعبہ کا قبلہ ہونا اللہ کی جانب سے ایک حقیقت ہے اور ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہے بلکہ خانہ کعبہ کے قبلہ مقرر ہونے میں یہ مژدہ جانفزا بھی ہے کہ دُنیا کے سارے مسلمان چاہے وہ جانبِ شمال میں ہوں یا جنوب میں مشرق میں ہوں یا مغرب میں سب اسی کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھیں گے اور کعبہ کی ہر جہت اور ہر طرف اُمت کے لیے قبلہ ہوگی اور یہ ایسی عظیم نعمت ہے کہ اس کی قدر و قیمت کا صرف وہ ہی شخص اندازہ کر سکتا ہے جو فضائے آسمانی کی نیلگوں چھت کے نیچے گھوم کر عالم کے مسلمانوں کو نماز کی حالت میں دیکھے تو معلوم کرے کہ کعبہ ایک مرکزی نقطہ ہے جس کے چاروں طرف تمام مسلمانانِ عالم دائرے کی صورت میں اللہ کے آگے صف بستہ اور سر بسجود ہیں۔

ہر ایک کا ایک نصب العین ہے

ایک مطلب یہ بھی ہے کہ منصبِ امامت کی وجہ سے تم میں سے ہر ایک کا ایک بنیادی مقصد ہے۔

اور یہ مقصد ہی توجہ کا مرکز ہے۔ یعنی اسی کی طرف تم میں سے ہر ایک کو متوجہ ہونا چاہیے۔ تمہارے سارے کاموں کا رُخ ادھر ہونا چاہیے۔ ایک لمحہ اور ایک سیکنڈ اس مقصد سے منظر نہ ہٹنی چاہیے۔ زندگی کی حرارت اور سعی و طلب کا ولولہ اسی سے حاصل ہوگا۔ اور یہ مقصد ہی تمہارے تمام اقدار و معیارات کا سرچشمہ اور ماخذ ہے۔

اگر صورت معاملہ یہ ہے تو پھر اُمت کو کیا کرنا چاہیے فرمایا

۴۰۷۔ لہٰذا نیکیوں کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو۔ اصل ارشاد میں عربی فاستبقوا الخیرات ہے۔ خیرات کا لفظ سب قسم کی خوبیوں کا جامع ہے۔ اس میں اخلاقی قدریں، اجتماعی قدریں، معاشرتی قدریں، عابدانہ قدریں سب سمٹی ہوئی ہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ نیکی کرو بلکہ فرمایا کہ نیکیوں اور بھلائیوں کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر کرو۔ یہ گویا اشارہ ہے کہ جو منصب تمہیں دیا گیا ہے اس کی ذمہ داریوں سے تم صرف ذاتی نیکی سے نہیں بلکہ اجتماعی نیکی کے ذریعے عہدہ برا ہو سکتے ہو۔ قرآن نے دوسری جگہ یہ بتاتے ہوئے کہ نبوت کو قرآن اگر وحی کے ذریعے ملا ہے تو اس اُمت کو جسے اللہ نے نبوت کے کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ قرآن نبوت سے وراثت کے ذریعے ملا ہے۔

ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا

پھر ہم نے وارث بنا دیا اس کتاب کا ان لوگوں کو جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمان پوری نوع انسانی میں چھانٹ کر منتخب کیے گئے ہیں تاکہ وہ کتاب اللہ کے وارث ہوں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اسے لے کر اٹھیں۔ یہی امامت کا وہ منصب جلیل ہے جس کا ذکر شہداء علی الناس میں کیا گیا ہے۔ یہ بتانے کے بعد یہ بھی انکشاف فرمایا ہے کہ اس وراثت کو پانے والے مسلمان تین قسم کے ہوں گے۔

فمنهم ظالم لنفسه ومنهم مقتصد ومنهم سابق بالخیرات باذن الله

ظالم یعنی وہ لوگ جو قرآن کو سچے دل سے اللہ کی کتاب اور محمدؐ رسول اللہ کو ایمانداری کے ساتھ اللہ کا رسول مانتے ہیں مگر عملاً نبوت کے علم و عمل کی پیروی کا حق ادا نہیں کرتے مومن ہیں مگر گنہگار ہیں۔ مقتصد میانہ رو یعنی وہ لوگ جو فرماں بردار بھی ہیں اور خطا کار بھی ہیں۔

سابق بالخیرات۔ یہ صف اوّل کے لوگ ہیں۔ یہی دراصل امامت کا حق ادا کرنے والے ہیں۔ یہ نبوت

کے واسطے ہوتے علم و عمل سے رشتہ استوار کرنے میں پیش پیش ہیں۔ اللہ سبحانہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں پیش پیش، دینِ حق کی خاطر قربانیاں کرنے میں پیش پیش اور بھلائی کے ہر کام میں پیش پیش ہیں۔

فاستبقوا الخیرات کے ذریعے قرآن اُمت سے کہہ رہا ہے کہ مقصد کی لگن کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنی پوری طاقت سابق بالخیرات بننے پر لگا دو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ امامت کا حق ادا ہو۔ زمانہ نبوت کے مسلمانوں کو آج کل کے مسلمانوں سے یہی چیز ممیز کرتی ہے۔ ان میں مقصد کی لگن اور نصب العین کا عشق تھا۔ وہ ایک عالمگیر تخیل کے داعی تھے اور اس تخیل سے ان میں ایسی شدید محبت تھی کہ اس کے لیے قربانیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر میں رہتے تھے۔

۲۰۸۔ تم جہاں بھی ہو گے اللہ تم کو لے آئے گا۔ شارحینِ قرآن نے تو بات صرف نماز تک محدود کی ہے۔ یعنی تمہاری نمازوں میں وحدت پیدا کر دے گا۔ تم شمال و جنوب، مشرق و مغرب دُنیا کے کسی خطہ، کسی علاقہ میں بھی متفرق و منتشر ہو عالم الغیب والشہادہ کو تو بہر حال علم ہے۔ وہ کعبہ کی طرف کی ہوئی ساری نمازوں کو ایک ہی حکم میں رکھے گا۔ یہ علامہ آلوسیؒ کی رائے ہے۔ ابو حیان اندلسی نے بھی اسی کے لگ بھگ خیال ظاہر کیا ہے۔

اور کچھ بزرگوں نے اسے یوم جزا اور قیامت سے متعلق قرار دیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم کہیں ہو حساب و جزا کے وقت اللہ تم کو اعمالِ نیک کی جزا اور بداعمال کی سزا دینے کے لیے اپنے اجلاس میں حاضر کرے گا۔ اکثر کا خیال یہی ہے۔ قرطبی، ابن کثیر، ابن جریر نے اسی کو اپنایا ہے لیکن قابلِ غور یہ بات ہے کہ یہ جملہ پچھلے جملہ کی علت بن کر آیا ہے۔ پچھلے فقرے میں کہا گیا تھا کہ تمہیں منصب امامت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہونے کے لیے اجتماعی طور پر نیکیوں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر کرنی چاہیے۔ نبوت کو اگر وحی کی نعمت سے نوازا گیا ہے تو تمہیں نبوت ہی کے ذریعے آئے ہوئے علم کی وراثت ملی ہے۔ نبوت پر وحی کا آنا اگر اللہ کی رحمت اور بہت بڑی مہربانی ہے۔

الا رحمۃ من ربک ان فضلہ کان علیک کبیرا

مگر یہ محض تیرے پروردگار کی رحمت ہے اور بلاشبہ اس کا تجھ پر بہت بڑا فضل ہے تو نبوت پر آئی ہوئی وحی کی وراثت کا اُمت کو مل جانا اور اس کے لیے اُمتِ مسلمہ کا چن لیا جانا بھی اللہ کا بہت ہی بڑا فضل ہے۔

ذالك هو الفضل الكبير

ظاہر ہے کہ اس اجتماعی استباق اور نیکیوں میں ایک دوسرے سے بڑھ جانے کا قدرتی نتیجہ ہے کہ اس کے ذریعے اللہ سبحانہ، صرف نماز میں نہیں بلکہ زندگی کے تمام گوشوں میں وحدت پیدا کر دے گا۔ اور ہر قسم کی جامعیت سے تم کو مالامال کر دے گا۔ توحیدِ امت، توحیدِ نظامِ عبادت کے ساتھ متحدہ اخلاقی نظام ایک کامل قانون اور ایک مکمل شریعت تم کو عطا کرے گا۔ لہٰذا اب تمہارا کام صرف سابق بالخیرات بننا ہے۔ یہ سوال کہ ان مظلومیتوں اور بے سروسامانیوں میں یہ کیوں کر ممکن ہے؟ اگلے فقرے میں اسی کا جواب ہے کہ ان اللہ علی کل شیئ قدیر۔ اللہ کے احاطۂ قدرت سے کچھ بھی باہر نہیں ہے۔ یہ بہت سے شبہات کا اصولی جواب ہے۔ اللہ سبحانہ کے بتائے ہوئے مسائل میں انسان کو جہاں کہیں بھی عقلی استبعاد معلوم ہوتا ہے اس کی بنیاد ہمیشہ اسی مغالطہ پر رہی ہے کہ اپنے اوپر قیاس کر کے اللہ کی قوتوں کو محدود اور اس کی قدرت کو زمان و مکان میں مقید سمجھ لیتا ہے۔ قرآن نے تنبیہہ کی ہے کہ خدائی فعلیت پر حکم لگاتے وقت خدا کی بے پایاں قدرت کو یاد رکھو۔

۴۰۹۔ اللہ یقیناً ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی اللہ نے ہر امت کے لیے ایک ایک قبلہ کا حکم فرمایا ہے جس کی طرف بوقت عبادت اپنا منہ کیا کریں۔ یا ہر ایک قوم مسلمان کعبہ سے جدا جدا سمت میں واقع ہے کوئی مشرق میں کوئی مغرب میں سو اس میں بحث کرنا جھگڑنا فضول ہے اور اپنے قبلہ یا اپنی سمت پر ضد کرنا عبث ہے۔ جو نیکیاں مقصود و مطلوب ہیں ان کی طرف البتہ پیش قدمی کرو۔ اور اس بحث کو چھوڑ دو جس جگہ، جس سمت کعبہ کی طرف تم ہو گے لائے گا تم سب کو اللہ میدانِ حشر میں اور تمہاری نمازیں ایسی سمجھی جائیں گی گویا ایک ہی جہت کی طرف ہوئی ہیں۔ پھر ایسی بات میں کیوں جھگڑتے ہو[1]

اس کا مطلب یہ نہیں کہ اسلام میں قبلہ کا معاملہ مرکزی حیثیت نہیں رکھتا ہے اور دین کی اصل حقیقت میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ تو ایک "ثابت شدہ حقیقت" ہے اب اس کو موضوعِ بحث بنا کر اپنی فکری اور عملی قوتوں کو اس پر ہی صرف نہ کرنا چاہیے، قبلہ کی مرکزیت، رسول کی رسالت اور اللہ کی الوہیت سب باتیں دین کی بنیادی حقیقتیں ہیں۔ صرف

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۹

ایک ہی بات کا ہو کر رہنا نہ چاہیے قبلہ ہی اگرچہ سارا دین نہیں ہے مگر دین میں قبلہ کی حیثیت مرکز اُمت کی ضرور ہے۔ اُمت کے نظامِ وحدت کی تکوین کے لیے یہ کام ہو چکا ہے اب تمہیں ان دوسرے کاموں پر توجہ صرف کرنی چاہییں جو مقصود و مطلوب ہیں اور جن پر تمہارے مقصدِ تخلیق کی کامیابی موقوف ہے اور وہ کام یہ ہے کہ نیکیوں اور بھلائیوں کے کام میں آگے بڑھنے کی سر توڑ کوشش کرو کہ اصل کام یہی ہے۔ لوگ اس بحث کو طول دے کر تمہیں اصل کام سے ہٹانا چاہتے ہیں تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ خانہ کعبہ کا قبلہ ہونا اٹل حقیقت ہے۔ اور جو لوگ اعتراض کر رہے ہیں ان کو بھی پتہ ہے کہ حق یہی ہے اور یہ بھی تمہیں معلوم ہو گیا کہ ان اعتراض کرنے والوں کا اعتراض محض گروہ پرستی کا نتیجہ ہے۔ اگر ان میں حق پرستی ہوتی تو وہ آپس میں کیوں مختلف ہوتے اور کیوں ایسا ہوتا کہ یہودی عیسائیوں کا قبلہ نہیں مانتے اور عیسائی یہودیوں کے قبلہ سے انکار ہوتا۔ جب صورتِ حال ایسی ہے تو متبع حق کو چاہیے کہ ایسے لوگوں سے قطع نظر کرے۔ کیونکہ جن لوگوں نے اتباعِ حق سے کنارہ کشی کر لی ہے ان کے ساتھ متبع حق کا کبھی اتفاق نہیں ہو سکتا ہے۔

خیرات میں مسابقت کا قانون

یہ آیت بھی قرآن کے مہمات معارف میں سے ہے اس میں اجتماعی زندگی میں کامیابی اور فتح مندی کا یہ اصول بتایا ہے کہ اُمتوں کو مسابقت کا جذبہ کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتا ہے۔ جماعت ہو یا اُمت مقاصد کی خاطر مسابقت کی کوشش ان کی جدوجہد کا اصل محرک ہے۔ مسابقت ہی حیات ہے۔ انفرادی زندگی میں ہم روزانہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ کامیابی اور عزت ان ہی افراد کے حصہ میں آتی ہے جو مسابقت کا جذبہ رکھتے ہیں اور مقصد کے حصول میں زندگی کی دوسری دلچسپیاں قربان کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ وہ جسے اپنے مقصد کا پورا پورا شعور نہیں یا مقصد کی خاطر جذبۂ مسابقت نہیں رکھتا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مسابقت ہی سے زندگی میں ترتیب و تنظیم پیدا ہوتی ہے اور انسانی قوتیں ایک مرکز پر جمع ہونے لگتی ہیں۔ قرآن نے اس آیت میں اُمتِ مسلمہ کو اسی قانونِ مسابقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ ابوحیان اندلسی کا یہ کہنا بالکل بجا اور برمحل ہے کہ یہاں استباق تسابق کے معنے میں ہے یعنی انفرادی اور ذاتی عمل کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ اشتراکی عمل کا قرآن مطالبہ کر رہا ہے اور بے قید استباق کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ خیرات میں مسابقت کا مطالبہ کیا ہے۔ یعنی تم سے صرف فعلِ خیرات مطلوب نہیں بلکہ افعالِ خیر یہ

وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِنَّهُ
لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۞ وَمِنْ حَيْثُ
خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَحَيْثُ مَا
كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ شَطْرَهٗ

اور اے پیغمبر تم جہاں[۲۱۰] سے بھی نکلو نماز میں رُخ مسجدِ حرام ہی کی طرف پھیر لو۔ اور یقین کرو کہ یہ معاملہ[۲۱۱] تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک امرِ حق ہے اور یاد رکھو اللہ تمہارے اعمال[۲۱۲] سے بے خبر نہیں ہے اور دیکھو تم کہیں سے نکلو اور کسی مقام پر ہو بس اپنا رُخ مسجد حرام کی طرف پھیر لو۔ اور اے مسلمانو! تم بھی اپنا رُخ اسی کی طرف رکھو خواہ کسی جگہ اور کسی سمت میں ہو[۲۱۳]۔

میں پوری اُمت کے افراد کا اشتراک اور اس میں مسابقت مطلوب ہے۔ قرآن نے انبیاء کی امامت کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ

جعلنا ھم ائمۃ یھدون بامرنا واوحینا الیھم فعل الخیرات

ہم نے ان کو امام بنایا وہ لوگوں کی ہمارے حکم سے رہنمائی کرتے تھے اور ہم نے ان کو نیکیوں کے کرنے کی وحی کی تھی۔

خیرات کے معنے ہیں "نیکیاں، بھلائیاں اور خوبیاں جن سے اخلاق میں حسن آتا ہے۔ قرآن میں لفظ خیر کا استعمال ان اعمال کے لیے ہوا ہے۔ جن سے اخلاقِ حسنہ کی تکوین ہوتی ہے۔ گویا اُمت کا اُمت ہونے کی حیثیت سے نصب العین یہ بتایا گیا ہے کہ نیکیوں، اچھائیوں اور بھلائیوں میں مسابقت کی جائے۔ اور اسی الخیرات میں بھرپور اور سر توڑ کوشش کی وجہ سے اُمت کو خیر اُمت کہا گیا ہے۔ اشارۃً بتا دیا کہ یہ اُمت انسانیت کے امن و سلام اور مساوات و اخوت کی علمبردار

اُمت ہے۔ اخلاقی اور معنوی خوبیاں اس کا جماعتی اور قومی نشان ہیں۔

خبر نہیں مفسرینِ قرآن نے اس آیت کی اس معنویت پر کیوں غور نہیں فرمایا۔ علامہ قرطبی اور امام رازی نے نماز کو اوّل وقت میں ادائیگی کے لیے اس آیت کو دلیل بنانے پر پورا زورِ قلم صرف کر دیا ہے۔ حالانکہ آیت کا نہ یہ منطوق ہے نہ مدلول ہے اور نہ مفہوم۔

امام رازی نے اس موضوع پر اس انداز سے دلائل کو ترتیب دیا ہے گویا آیت کا نزول ہی اس کی خاطر ہوا ہے۔ مولانا دریا بادی کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ

خطاب اُمتِ اسلامیہ کو ہے کہ حسنِ عمل کی طرف بڑھو۔ خیرات، خیر کی جمع ہے اور وسیع و عام مفہوم رکھتی ہے۔ رضائے الٰہی کی خاطر شریعت کے مطابق جملہ امور شامل۔ وصول الی اللہ کے بے شمار راستوں پر حاوی۔ عارفین نے کہا ہے کہ ہر وقت جو چیز اس وقت کے لحاظ سے خیر و مصلحت ہو اس کی طرف بڑھنا ہی استباقِ خیر ہے۔

تقررِ قبلہ کا حکمِ عام

تحویلِ قبلہ کا حکم جہاں مخالفین کے لیے خورد شغب کا ذریعہ تھا خود مسلمانوں کے لیے ایک بڑی آزمائش کا سامان تھا کیونکہ اس کے ذریعے مسلمانوں کے نظامِ عبادات میں ایک عظیم انقلاب آ گیا تھا۔ قبلے کے متعلق مخالفین کی حد تک تو یہ بات سمجھا دی گئی ہے کہ اس کا فیصلہ نہ تو اس طرح ہو سکتا ہے کہ دلیل سے انہیں مطمئن کر دیا جائے اور نہ اس کا فیصلہ اس طرح ہو سکتا ہے کہ تم ان کے قبلہ کو اختیار کر لو۔ کیونکہ ان کا کوئی ایک قبلہ نہیں ہے جس پر یہ سارے گروہ متفق ہوں۔ مختلف گروہوں کے مختلف قبلے ہیں۔ ایک کا قبلہ اختیار کرو گے تو بس ایک ہی گروہ راضی ہو گا۔ دوسرے سے جھگڑا بدستور قائم رہے گا۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ منصبِ امامت پر کھڑے ہونے کے بعد تمہارا یہ کام نہیں ہے کہ دوسروں کے پیچھے لگو اور لین دین کے اُصول پر مصالحت کرو۔ تمہارا کام تو صرف یہ ہے کہ نبوت کے علم کی جو وراثت ہم نے تم کو دی ہے سب سے بے پروا ہو کر اسی پر سختی سے کاربند ہو جاؤ۔ اس سے ہٹ کر کسی کو راضی کرنے کی فکر کرو گے اپنے امامت کے منصب پر ظلم کرو گے اور اس نعمت کی ناشکری کرو گے جو دُنیا کا امام بنا کر ہم نے تمہیں بخشی ہے۔ اسی بنا پر حکم کو بار بار دُہرایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ تحویل آخری

اور قطعی ہے اب اس کی تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ حضر میں ہو یا سفر میں دُنیا کے کسی خطہ میں کسی وقت میں ہو زمان و مکان کی قید سے بالا تحویلِ قبلہ کا حکم عام ہے۔

۴۱۰۔ مطلب یہ کہ یہ حکم استقبالِ قبلہ سفر و حضر سب کہیں کے لیے ہے محض قیام مدینہ کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ پہلے حضر اور اقامت کا حکم بتایا گیا تھا کہ مدینہ میں رہتے ہوئے کعبہ کا استقبال کرو اب اس آیت میں سفر کا حکم بتایا ہے کہ جہاں سے بھی روانہ ہو اور جہاں بھی تمہارا پڑاؤ ہو تمہیں اپنی نمازوں میں کعبہ کا استقبال کرنا چاہیے اور کعبہ ہی کو قبلہ بنانا چاہیے۔ اس میں زمان و مکان کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اور سفر و حضر کی کوئی قید نہیں۔

۴۱۱۔ یہ معاملہ تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک امرِ حق ہے یعنی ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اب اس میں نسخ اور تبدیلی کا کوئی امکان نہیں ہے۔ ایک اٹل اور ابدی فیصلہ ہے۔ اسلام کی علامت ہے۔ ملتِ ابراہیمی کے پیرو ہونے کی نشانی ہے۔ مسلمانانِ عالم کی وحدت کا شیرازہ ہے۔ اسی سے تمہاری ایمانی تربیت اور تکمیلِ عبادات وابستہ ہے۔

۴۱۲۔ اللہ تمہارے اعمال سے بے خبر نہیں ہے یعنی اے مسلمانو! تم ہی محمد رسول اللہ کی پیروی کے مخاطب ہو۔ اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں حضورِ انور کے لائے ہوئے علم و عمل کی پیروی کرنا تمہارا کام ہے۔ تمہاری زندگی کا ایک ایک گوشہ اللہ سبحانہٗ کی نظر میں ہے۔ وہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں ہے۔ اگر تم نے اپنی زندگی میں طاعت کی سرشاریوں کا مظاہرہ کیا تو اللہ تم کو بہترین جزا دے گا۔ لیکن اگر تم نے آپ کے حکم کی مخالفت کی تو پھر تمہیں ڈرنا چاہیے کہ تم کسی فتنہ کا شکار ہو جاؤ گے یا عذاب میں پکڑے جاؤ گے۔

فلیحذر الذین یخالفون عن امرہٖ ان تصیبھم فتنۃ او یصیبھم عذاب الیم۔

جو لوگ آپ کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں ان کو چوکنا رہنا چاہیے کہ ان کو کوئی فتنہ آدبوچے یا ان پر کوئی دردناک افتاد آن پڑے۔

غور فرمائیے کہ یہ مخاطبت کن لوگوں کی جا رہی ہے کہ اللہ تمہارے اعمال سے غافل نہیں نبوت کو یہ کہہ کر کہ یہ معاملہ یعنی کعبہ کے قبلہ ہونے کا معاملہ تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک امرِ حق ہے۔ صحابہ کو ایک کھلی تنبیہہ کی جا رہی ہے اور تنبیہہ بھی ان کو کی جا رہی ہے جن کے اعمالِ صالحہ اور فضائلِ اخلاق دُنیا کی ساری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ جن کے درجات اور علوِ مرتبت پر خود قرآن گواہ ہے۔ اس کے باوجود تنبیہہ ہو رہی ہے۔ تمہارے اعمال کی

قدر و قیمت اسی نسبت سے متعین کی جائے گی جس نسبت سے وہ اس نصب العین کی تقویت کا باعث ہوتے تھے جو نبوت لے کر دنیا میں آئی تھی۔ نبوت کی طاعت ان کے اخلاص و اتقاء کا پیمانہ تھی اور اللہ کے ہاں ان کا اجر بھی اسی پیمانہ سے تقسیم ہوتا تھا۔

نبوت کی طاعت کی سرشاریاں ان کی زندگی کا اتنا بڑا سرمایہ تھا کہ اگر کبھی ان سے اس میں کوتاہی ہو جاتی تو ساری عبادتیں اور ریاضتیں ان کی نگاہ میں اکارت ہو جاتی تھیں۔

۳ ا ہم ۔ اے مسلمانو! تم اپنا رخ اسی کی طرف رکھو خواہ کسی جگہ اور کسی سمت میں ہو یعنی یہ حکم حضور کے ساتھ مخصوص نہیں ہے ساری اُمت پر اس کی تعمیل فرض ہے۔

استقبالِ قبلہ کے حکم کا تکرار

تحویلِ قبلہ کا حکم مکرر سہ کرر یا تو اس واسطے بیان فرمایا ہے کہ اس کی علتیں کئی تھیں تو ہر علت کو بتلانے کے لیے اس حکم کا اعادہ فرمایا۔ قد نری تقلب وجھک سے معلوم ہوا کہ رسول اللہ کی رضا جوئی اور اظہارِ تکریم کے لیے ایسا کیا اور لکل وجھۃ ھو مولیھا سے معلوم ہوا کہ عادت اللہ یوں ہے کہ ہر ملت اور ہر ایک رسول صاحب شریعت مستقل کے لیے اس کے مناسب ایک قبلہ مقرر ہونا چاہیے اور لئلا یکون سے معلوم ہوا کہ حکم مذکور کی علت یہ ہے کہ مخالف کا الزام عائد نہ ہو سکے یا اس تکرار کی وجہ یہ ہے کہ اوّل تو قبلہ قابلِ اہتمام۔ دوسرے احکامِ الٰہیہ میں نسخ ہونا بیوقوفوں کی سمجھ سے باہر ہے۔ پھر تحویلِ قبلہ اول نسخ ہے جو شریعت محمدیہ میں ظاہر ہوا۔ اس لیے اس کی تاکید در تاکید عین حکمت و بلاغت ہے یا یہ وجہ ہے کہ اوّل آیت میں تعمیم احوال اور دوسری آیت میں تعمیم امکنہ اور تیسری میں تعمیم ازمنہ مراد ہے[1]

یہاں تک کہ استقبالِ قبلہ کا حکم چھ بار آیا ہے۔ اہلِ لطائف نے لکھا ہے کہ ہر بار کے حکم سے ایک خاص اشارہ مقصود ہے مثلاً بار اوّل سے حکم وجوب دوسری بار تعمیم احوال یعنی سفر ہو یا حضر تیسری بار سے تعمیم مکان یعنی نزدیک ہو یا دور حاضر ہو یا غائب چوتھی بار سے تعلیم ادب یعنی قبلہ رو رہنے کا استحباب، پانچویں بار سے توجہ قلبی یعنی دل اسی طرف لگا رہے جدھر چہرہ کا خاص توجہ ہے۔ چھٹی بار سے تاکید یعنی رفع احتمالِ نسخ[2]

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۹ [2] تفسیر ماجدی ص ۵۰

لِئَلَّا يَكُونَ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِي وَلِأُتِمَّ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿١٥٠﴾

"تاکہ تمہارے خلاف لوگوں کے پاس کوئی دلیل نہ رہے [۱۴]۔ اور یہ واضح ہو جائے کہ معبدِ ابراہیمی ہی تمہارا قبلہ ہے)، ہاں جو لوگ ظلم [۱۵] پیشہ ہیں ان کی زبانیں کبھی بند نہ ہوں گی تو ان سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو [۱۶]۔ اور یہ اس لیے ہے تاکہ میں نعمت [۱۷] تم پر پوری کر دوں۔ نیز کہ تم پر مستقبل میں سعی [۱۸] و عمل کی راہیں کھل جائیں۔

مولانا نے ذکرِ قبلہ کو بھی حکم قبلہ میں شامل کر کے تعداد تین کی جگہ چھ کر دی ہے۔ اصل یہی ہے کہ حکم تین ہی بار آیا ہے۔

قرطبی نے تکرار کی جو وجہ بتائی ہے اس میں کافی معقولیت ہے۔ فرماتے ہیں کہ پہلی بار حکم حالتِ حضر کا ہے کہ جب آپ اپنی جگہ مقیم ہوں تو آپ مسجدِ حرام کی طرف رُخ کر لیا کریں۔ پھر پوری اُمت کو یہی حکم دیا گیا۔ دوسری مرتبہ حکم نے یہ واضح کیا کہ یہ حکم وطن سے نکلنے اور سفر کا بھی ہے۔ اور چونکہ سفر کے حالات میں اختلاف ہوتا ہے کبھی چند روز کے لیے کسی بستی میں قیام کیا جاتا ہے کبھی سفر جاری رہتا ہے۔ ان دونوں حالتوں کو عام کرنے کے لیے تیسری بار بتا دیا کہ سفر کی کوئی حالت ہو ہر حال میں استقبالِ مسجدِ حرام ضروری ہے [۱]۔

آلوسی نے بعض علماء سے یہ وجہ بھی نقل کی ہے کہ حالات تین ہیں۔ نمازی مسجد میں ہے مسجد سے باہر شہر میں ہے، شہر سے باہر سفر میں ہے پہلا حکم مسجد میں نمازیوں کے لیے دوسرا حکم مسجد سے باہر شہر میں نمازیوں کے لیے تیسرا حکم شہر سے باہر مسافروں کے لیے۔ اور بعض

[۱] معارف القرآن م شی ص ۳۲۲

۱ اہل علم نے یہ وجہ بھی لکھی ہے کہ پہلا حکم خاص ساکنانِ حرم کے لیے دوسرا حکم ساکنانِ جزیرۃ العرب کے لیے اور تیسرا حکم تمام روئے زمین کے باشندوں کے لیے۔

یہ وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ چونکہ شریعت میں سب سے پہلے یہی حکم منسوخ ہوا ہے اس لیے اس کے بیان میں زیادہ اہتمام کیا گیا ہے۔

تقررِ قبلہ کے حکم اور مصالح

خانہ کعبہ کے قبلہ مقرر ہونے کا مسئلہ صرف نمازوں میں سمت اور جہت کا مسئلہ نہیں بلکہ اُمتِ مسلمہ کی امامت کے اعلان کے بعد امامت کے لیے مرکز کی ضرورت کا قدرتی نتیجہ ہے۔ اور زیادہ اہمیت اس کو اس لیے حاصل ہوتی ہے کہ بنی اسرائیل کو منصبِ امامت سے معزول کرنے کے بعد اسرائیلی مرکز کے خاتمہ کا اعلان ہوا ہے۔

جیسے حضرت موسیٰؑ کو اللہ کی جانب سے کتاب ملی اور بنی اسرائیل کو ان سے یہ کتاب وراثت میں ملی اور اس وراثت کی وجہ سے بنی اسرائیل کو امامت ملی اور امامت کے نتیجے میں بیت المقدس کو مرکز بنایا گیا۔

ولقد اٰتینا موسی الھدیٰ واورثنا بنی اسرائیل الکتاب

ہم نے موسیٰؑ کو ہدایت دی اور بنی اسرائیل کو کتاب کا وارث بنایا

ایسے ہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی قرآن ملا۔ اور اس اُمت کو قرآن کی وراثت ملی۔

ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا

اس سلسلے کی بنیادی باتیں یہ ہیں

۱۔ دعاءِ ابراہیمؑ میں محمد رسول اللہ کے ظہور کی بشارت
۲۔ دعاءِ ابراہیمؑ میں اُمتِ مسلمہ کے ظہور کی بشارت
۳۔ اُمتِ مسلمہ میں نبوت کے علم یعنی قرآن کی وراثت
۴۔ وراثت کی وجہ سے اُمتِ مسلمہ کی امامت کا اعلان
۵۔ امامت کی خاطر خانہ کعبہ کی مرکزیت کا قیام

قرآن نے اولاً اُمتِ مسلمہ کی امامت کا اعلان کیا اور امامت کے اعلان کا قدرتی نتیجہ ہے کہ مرکز کا اعلان ہو۔ چونکہ بیت المقدس میں اُمتِ مسلمہ کی امامت کے بعد مرکز ہونے کی شان باقی نہیں رہی ہے۔ یہ

گویا اسرائیلی امامت اور اسرائیلی مرکزو دونوں کی شکست تھی اس لیے بیت اللہ کے قبلہ مقرر ہونے پر اسرائیلی یہودی اور عیسائی سناٹے میں آ گئے کیونکہ اس تحویل قبلہ سے اسرائیلیوں کے منصب امامت سے معزول ہونے اور ان کے مرکزِ امامت کی مرکزیت ختم ہونے کا گہرا تعلق ہے۔ گویا قبلہ کا مسئلہ قوموں کی عزت و وقار کا بہت بڑا سیاسی مسئلہ بن گیا۔ چونکہ اسرائیلیوں کے اضطراب کے ساتھ اس مسئلہ کی خود مسلمانوں میں بھی خاص اہمیت حاصل ہو گئی تھی اس لیے قرآن نے ان آیات میں اس کے حکم اور مصالح بیان کیے ہیں۔

۱۴۴ ۔ تحویلِ قبلہ اتمام حجت کے لیے ہے۔

خانہ کعبہ کو قبلہ اس لیے مقرر کیا گیا ہے تاکہ لوگوں کے ہاتھ میں تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ رہے۔ کیونکہ اگر تحویلِ قبلہ نہ ہوتا تو یہود والنصاریٰ کہہ سکتے تھے کہ تورات میں لکھا ہوا ہے۔ حافظ ابن القیم نے ہدایہ الحیاری میں حضرت اشعیا کی یہ پیشین گوئی نقل کی ہے۔ یہ بات انہوں نے مکہ کو مخاطب کرکے فرمائی ہے۔

قیدار کی ساری بھیڑیں تیرے حضور میں جمع ہوں گی۔ نبایوط کے سردار تیری خدمت کریں گے تیرے دروازے دن رات کھلے رہیں گے۔ بالکل بند نہ ہوں گے اور تجھے قبلہ بنائیں گے اور تجھے اس کے بعد رب کا شہر کہہ کر پکارا جائے گا۔ (ہدایہ الحیاری ص ۱۰)

کتاب یسعیاہ باب ۵۴ آیت ا میں ہے۔

اے بانجھ! تو جو بے اولاد تھی نغمہ سرائی کر، تو جس نے ولادت کا درد برداشت نہیں کیا۔ خوشی سے گا اور زور سے چلا۔ کیونکہ خداوند فرماتا ہے کہ بیکس چھوڑی ہوئی کی اولاد شوہر والی کی اولاد سے زیادہ ہے۔ اپنی خیمہ گاہ کو وسیع کر دے۔ ہاں اپنے مسکنوں کے پردے پھیلا۔ دریغ نہ کر۔ اپنی ڈوریاں لمبی اور اپنی میخیں مضبوط کر اس لیے کہ تو داہنی اور بائیں طرف بڑھے گی اور تیری نسل قوموں کی وارث ہو گی۔

یہاں بانجھ سے مراد مکہ مکرمہ ہے کیونکہ اس مقام پر حضرت اسماعیل کے بعد کوئی پیغمبر نہیں آیا۔ اور نہ وحی نازل ہوئی برخلاف بیت المقدس کے کہ وہاں بکثرت پیغمبر آتے رہے اور وحی نازل ہوتی رہی۔ بیکس چھوڑی ہوئی کی اولاد سے مراد حضرت ہاجرہ کی اولاد ہے۔ گویا اللہ نے سرزمین مکہ کو خطاب کرتے ہوئے تسبیح و تہلیل اور شکریہ ادا کرنے کا حکم دیا ہے اس لیے کہ اولادِ ہاجرہ میں بہت سے افراد کو سارہ کی اولاد سے فضیلت عطا کی۔ پھر خدا نے جو کچھ وعدہ کیا تھا اس کو اس طرح پورا فرمایا کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اور افضل البشر خاتم النبیین بنا کر ہاجرہ کی نسل سے پیدا کیا۔ آپ ہی اس آیت کے مصداق ہیں جس نے لوہار کو پیدا کیا جو کوئلوں کی آگ کو دھونکتا ہے۔

پھر اس پیغمبر کی بدولت مکہ کو کشادگی اور فراخی ایسی نصیب ہوئی جو دُنیا کے کسی عبادت خانے کو میسر نہیں ہوئی۔ اس لیے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ مبارکہ سے اس زمانے تک دُنیا میں کوئی عبادت خانہ کعبہ کی شان کا منظر نہیں آیا۔

اس قسم کی پیشین گوئیاں بتا رہی تھیں کہ نبی آخرالزماں کا قبلہ قبلہ ابراہیمی ہوگا۔ کعبہ کو قبلہ اس لیے بنایا ہے کہ کہنے والوں کو اس اعتراض کی گنجائش باقی نہ رہے کہ ہمارے نوشتوں کے مطابق تو آخری نبی کا قبلہ قبلۂ ابراہیمی ہونا تھا اور یہ بیت المقدس کی طرف منہ کر رہے ہیں۔ لہٰذا یہ نبی موعود نہیں ہیں۔ اور مشرکین کے ہاتھ میں یہ حجت نہ رہے کہ دعویٰ تو کرتے ہیں ملتِ ابراہیمی کی پیروی کا اور قبلہ بنا رہے ہیں بیت المقدس کو۔ اس قسم کے اعتراضات کو ختم کرنے کی خاطر تحویلِ قبلہ ہوئی ہے اور قبلہ بجائے بیت المقدس کے خانہ کعبہ مقرر ہوا ہے۔

یعنی کعبہ کو قبلہ بنانے کا حکم اس لیے ہوا ہے کہ توریت میں مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم کا قبلہ خانہ کعبہ ہے اور نبی آخرالزماں کو بھی اسی کی طرف مُنہ پھیرنے کا حکم ہوگا۔ اگر آپ کو تحویلِ قبلہ کا حکم نہ ہوتا تو یہود ضرور الزام لگاتے۔ ادھر مشرکینِ مکہ یہ کہتے کہ حضرت ابراہیم کا قبلہ تو کعبہ تھا۔ یہ نبی ملتِ ابراہیمی کا دعویٰ کر کے ابراہیمی قبلہ سے اختلاف کیوں کرتے ہیں۔ اب دونوں کی حجت بازی ختم ہوگئی۔ ؎

درحقیقت یہ ان پر ایک قسم کی اتمامِ حجت ہے۔ اگر خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر نہ کیا جاتا تو یہ اعتراض ضرور ہوتا کہ جب بنائے کعبہ کے موقعہ پر کی ہوئی دُعائے ابراہیمی کا مصداق اُمتِ مسلمہ کا ظہور ہوا ہے تو اس کا قبلہ بھی وہی گھر ہونا چاہیے جہاں اس کے ظہور کی دُعا مانگی گئی تھی۔ قرآن کا اندازِ بیان اس کا زیادہ مقتضی ہے کیونکہ یہ فرمایا ہے لئلا یکون للناس علیکم حجۃ تاکہ لوگوں کے پاس تمہارے خلاف کوئی دلیل نہ رہے۔ اگر اندازِ بیان یہ ہوتا لئلا یکون للناس علیک حجۃ تو بات وہ ہوتی جو عام شارحینِ قرآن کہہ رہے ہیں۔ ہاں یہ کہا جا سکتا ہے کہ دونوں ہی مقصود ہیں مگر ایک کی حیثیت اصل منطوق کی ہے جب کہ دوسری بات دلالۃً سمجھی جا رہی ہے۔ یہ صرف فرقِ تعبیری ہے ورنہ اصل بات ایک ہی ہے۔

۱۴۵۔ ہاں جو لوگ ظلم پیشہ ہیں ان کی زبانیں کبھی بند نہ ہوں گی۔ یعنی بے انصاف لوگ اب بھی کچھ نہ کچھ الزام لگاتے ہی جائیں گے۔ مثلاً قریش کہیں گے کہ ان کو ہمارے قبلہ کا حق ہونا معلوم ہوا

؎ حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۹

تو اس کو اختیار کیا۔ اسی طرح پر ہمارے اور احکام بھی رفتہ رفتہ منظور کر لیں گے اور یہود کہیں گے کہ ہمارے قبلہ کی حقانیت ظاہر ہونے اور تسلیم کر لینے کے بعد محض حسد اور نفسانیت کے باعث اپنی رائے سے اسے چھوڑ دیا۔ تو ایسے بے انصافوں کی کوئی پرواہ کیجئے اور ہمارے حکم کی پیروی کیجئے۔[1]

الا یہاں استثنائے منقطع ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کے لیے حجت تو اب کوئی باقی نہیں رہی ہے اور اتمام حجت ہو چکی۔ مگر ظالم تو اب بھی باز نہ آئیں گے۔ یہودی اس وقت کہتے تھے اور عیسائی آج تک کہہ رہے ہیں کہ مدینہ میں جا کر بیت المقدس کو قبلہ بنانا یہودیوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے تھا اور بعد کو کعبہ کو قبلہ بنانا عربوں کو اپنے ساتھ ملانے کے لیے تھا جیسا کہ دائرۃ المعارف الاسلامیہ کے مولفین نے بھی یہ شوشہ چھوڑا ہے اور یہ اس ذات گرامی کے بارے میں کیا جا رہا ہے جس نے خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کرکے نماز پڑھی تو کسی نے کوئی اعتراض نہ کیا اور ڈیڑھ سال تک برابر نمازوں میں خانہ کعبہ کی طرف پیٹھ کرتے رہے اور سارے مسلمان بھی کرتے رہے اور اس زمانہ میں اسلام کی ترقی کی رفتار میں کوئی فرق نہیں آیا۔

۲۱۶ ۔ تم ان سے نہ ڈرو میرے سے ڈرو۔ یعنی اب بھی قبلہ کے بارے میں جو وسوسہ انداز یاں کر رہے ہیں اور اپنی حرکتوں سے باز نہیں آتے چونکہ یہ لوگ ظالم ہیں اور ان کا پیشہ ہی فتنہ انگیزی اور شبہات کو ہوائیں دینا ہے اس لیے مسلمانو تم ان سے کسی قسم کا کوئی اندیشہ نہ کرو خواہ یہ کیسے ہی مادی اعتبار سے طاقتور ہوں۔ یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں جو کچھ تم کہہ رہے ہو اور جس راہ پر تم گامزن ہو یہ حق ہے اور اس کے مقابلے پر جو کچھ ہے وہ باطل ہے۔ اندیشہ ان سے نہ کرو بلکہ مجھ سے ڈرو اور میری نافرمانی سے بچ کر رہو۔ ہمارا رسول میری جانب سے جو پیغام لے کر آیا اس کی کسی حالت میں مخالفت نہ کرو کیونکہ تمہاری طاعت کی سرشاریوں پر جزا اور تمہاری نافرمانیوں کا سزا پر مجھے پوری پوری قدرت ہے۔ میں نے تم سے ایمان و عمل صالح کی شرط پر نبوت کے لائے ہوئے نظام کو قائم کرنے کا وعدہ کیا ہے اور میں وعدہ کی خلاف ورزی نہ کروں گا۔

آیت میں اشارہ ہے کہ اندیشہ صاحب حق سے ہونا چاہیے باطل اندیشہ اور خوف کی چیز نہیں۔ حق کی موت یہی ہے کہ خود اہل حق حق سے الگ ہو جائیں اور اہل باطل سے ڈرنے لگیں ورنہ حق تو دنیا میں سربلندی اور برتری کے لیے آیا ہے۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۹

تحویلِ قبلہ اتمامِ نعمت کے لیے ہے

۱۴۷ - اور یہ اس لیے ہے کہ میں اپنی نعمت تم پر پوری کردوں۔ یعنی خانہ کعبہ کو قبلہ بنا کر میں تم پر اے مسلمانو اتمامِ نعمت کردوں گا۔

یعنی یہ قبلہ ہم نے تمہارے لیے اس لیے مقرر کیا کہ دشمنوں کے طعن سے بچو اور اس کے سبب سے ہمارے انعام و اکرام و برکات و انوار اور ہدایت کے پورے مستحق ہو جاؤ۔[1]

نماز میں جو کہ سب سے افضل عبادت ہے تمہاری توجہ سب سے افضل اور اکمل قبلہ کی طرف تاکہ اس جہت کے انوار و برکات میں تمہاری نماز کو خوب روشن اور منور بنا دیں۔[2]

اتمامِ نعمت کے مفہوم اور بھی ہو سکتے ہیں لیکن یہاں مراد تعیینِ قبلہ ہے۔ خانہ کعبہ کا محلِ نزولِ رحمت، مرکزِ تجلیات ہونا مسلم ہے ساتھ ہی نماز کا افضل عبادت ہونا مسلم ہے۔ ان دونوں حقیقتوں کے اعتبار سے ظاہر ہوتا ہے کہ خانہ کعبہ کی تعیینِ قبلہ سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔[3]

اتمامِ نعمت سے مراد وہی امامت اور پیشوائی کی نعمت ہے جو بنی اسرائیل سے سلب کر کے اس امت کو دی گئی تھی۔ دنیا میں ایک امت کی راست روی کا یہ انتہائی ثمرہ ہے کہ وہ اللہ کے امرِ تشریعی سے اقوامِ عالم کی رہنما و پیشوا بنائی جائے اور نوعِ انسانی کو خدا پرستی اور نیکی کے راستہ پر چلانے کی خدمت اس کے سپرد ہو۔ یہ منصب جس امت کو دیا گیا حقیقت میں اس پر اللہ کے فضل و انعام کی تکمیل ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ بیان یہ فرما رہا ہے کہ تحویلِ قبلہ کا یہ حکم دراصل اس منصب پر تمہاری سرفرازی کا نشان ہے۔ لہٰذا تمہیں اس لیے بھی ہمارے اس حکم کی پیروی کرنی چاہیے کہ ناشکری اور نافرمانی کرنے سے کہیں یہ منصب تم سے چھن نہ جائے۔ اس کی پیروی کرو گے تو یہ نعمت تم پر مکمل کر دی جائے گی۔[4]

آئیے اس موضوع پر دوسرے شارحینِ قرآن سے بھی استفادہ کر لیجیے۔

ابن جریر کہتے ہیں:

تاکہ میں اس کے ذریعے یعنی ابراہیم خلیل کے قبلہ کے ذریعے اپنی نعمت پوری کردوں یعنی ملتِ حنیفہ مسلمہ کی وہ شرائع و قوانین جن کی میں نے نوح، ابراہیم، موسیٰ اور عیسیٰ اور تمام انبیاء کو وصیت کی تھی تم پر مکمل اور پوری کردوں اللہ کی یہی وہ نعمت

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۹ [2] معارف القرآن ج ۱ ص ۳۲۲ [3] تفسیر ماجدی ص ۵۸ [4] تفہیم القرآن ص ۱۲۵

ہے جس کے بارے اس نے بتایا ہے کہ اسے وہ اپنے رسُول اور مومنین پر پوری کرے گا۔
ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ اتمامِ نعمت یہ ہے کہ
خانہ کعبہ کو قبلہ بنا کر شریعت کو ہر پہلو سے مکمل کر دیا جاتے گا۔

نعمت کیا ہے ؟

سورۃ فاتحہ میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ قرآن نے انعام یافتگان میں چار فرقوں کا نام لیا ہے انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ ان پر اللہ سبحانہ نے کیا انعام فرمایا ہے ؟
ظاہر ہے کہ انعام سے وہ عارضی اور نمائشی انعامات مراد نہیں، جو پہلے بھی فرعونوں، نمرودوں اور قارونوں کو ملتے رہے ہیں اور اب بھی ہماری آنکھوں کے سامنے بڑے بڑے ظالموں اور بدکاروں اور گمراہوں کو مل رہے ہیں۔ ان کو اللہ سبحانہ نے دو قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ایک علم اور دوسرا عمل۔ قرآن نے علم و عمل کے اس مجموعہ کو نعمت قرار دیا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام انبیاء کی ہدایات کا مجموعہ قرآن کی صورت میں دیا گیا ہے اس لیے آپ کمالِ علم اور کمالِ عمل لے کر تشریف لائے ہیں۔ گویا نبوت نے دُنیا کو جو کچھ دیا ہے وہ سچے علمی حقائق اور اچھے عملی نظام کے سوا کچھ نہیں ہے اور کیوں نہ ہو جب یہ حقیقت ہے کہ نبوت نام ہے اللہ تعالیٰ کی نمائندگی کا۔ اللہ کی ذات اگر جامع الکمالات ہے تو ضروری ہے کہ جو جامع الکمالات کا نمائندہ ہو، وہ بھی مجمع الکمالات ہو۔

کمالِ علمی کی حد تک قرآن حکیم اگر ایک جامع کتاب ہے تو قرآن کے نقش کو بھی مجمع ہونا چاہیے تاکہ نمونہ کو مکمل نمونہ اور عمل کو نقشِ قرآن کہا جا سکے۔ بہر حال اسی کمالِ علم اور کمالِ عمل کے مجموعہ کو قرآن میں نعمت کہا گیا ہے۔ کمالِ علم اگر ما انزل اللہ علیک ہے تو نبوت کا کمالِ عمل اسی علم کا پر تو اور نقش ما اراک اللہ ہے اس لیے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا ہے ان میں اگر باہم فرق ہے تو صرف نامہ اور پیام کا ہے۔ علمِ نبوت اگر نامۂ خداوندی ہے تو عمل نبوت پیامِ الٰہی ہے۔ علم و عمل کی یہی نعمت نبوت کو اللہ کی جانب سے بذریعہ وحی ملی ہے اور اُمت کو یہی نعمت نبوت کی جانب سے بذریعہ وراثت ملی ہے۔ اسی وراثت کی بنا پر اُمت کو امامت کا منصب ملا ہے۔ قرآن لاتم نعمتی علیکم کے ذریعے یہ ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ تحویلِ قبلہ اس لیے ہوا ہے کہ اس مرکز سے وابستگی کے ذریعہ اُس منصب کی تتمیم ہو جاتے جو بنی اسرائیل کے معزول ہو جانے کے بعد تمہیں تفویض ہوا ہے۔ قدماء میں اندازِ تعبیر سے

اگر قطع نظر کر لی جائے تو ابنِ جریرؒ کے بیان کی روح بھی یہی ہے اور ابنِ کثیرؒ بھی یہی کہنا چاہتے ہیں۔

اتمامِ نعمت کیا ہے

یہ گویا خانہ کعبہ پر اُمتِ مسلمہ کے استیلا اور غلبہ کا وعدہ پورا ہو رہا ہے اور تحویلِ قبلہ اسی کا مقدمہ ہے۔ اتمامِ نعمت سے مراد یہی ہے کہ اُمت ہر جگہ ہر خوف اور ہر بیرونی مداخلت سے محفوظ ہو کر پوری طرح اسلامی تمدن، اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائے گی۔ اور ان کو یہ طاقت بھی نصیب ہو جائے گی کہ وہ دُنیاوی منصبِ امامت کے تقاضے پورے کر سکے۔ کفر کا غلبہ اہلِ ایمان کے لیے سب سے بڑی مصیبت ہے جسے قرآن فتنہ کہتا ہے اس فتنہ سے خلاصی پا کر جب ان کو دارالاسلام میسر آ جائے گا جس میں نبوت کا لایا ہوا علم و عمل بلا کم و کاست نافذ ہو۔ اور اس کے ساتھ ان کو ذرائع بھی مل جائیں گے جن سے وہ اللہ کی زمین پر کفر و فسق کی جگہ ایمان و تقویٰ کا جاری کر سکیں گے تو یہ ان پر اللہ کی نعمت کا اتمام ہو گا۔ اس آیت میں یہ وعدہ اُمت سے وراثت کی وجہ سے ہو رہا ہے۔ سورۂ فتح میں بھی وعدہ حضورؐ سے یہی اصالتاً ہوا ہے ویتم نعمتہ علیک۔ گویا اس آیت میں اس معنے کے اعتبار سے مسلمانوں کو صرف فتح مکہ کی بشارت ہی نہیں دی جا رہی ہے بلکہ شرک کے مقابلے میں توحید کے سربلند ہونے، اسلام کے دُنیا میں پھیلنے کی بھی بشارت دی جا رہی ہے۔

۱۴۸۔ تاکہ تم پر مستقبل میں سعی و عمل کی راہیں کھل جائیں۔ اللہ کی ذات، جامع الکمالات، ہے۔ اس کا رسول، مجمع الکمالات، جامع الکمالات کی جانب سے۔ مجمع الکمالات جو علم و عمل لے کر تشریف لائے وہ دُنیا کا جامع ترین اور کامل ترین نظام ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تحویلِ قبلہ اس لیے ہوا ہے کہ تم زندگی کے مختلف گوشوں اور نئے نئے حالات کے مختلف موڑوں میں اس نظام کے ذریعے ہدایت پاؤ اور ہدایت پاتے پاتے اس مقام پر پہنچ جاؤ کہ تمہارا تعارف یہ ہو جائے کہ

اولئك على هدى من ربهم

اور اس طرح تم پر زندگی میں فلاح و سعادت کی وہ تمام راہیں کھل جائیں گی جو رضائے الٰہی کا سامان ہیں۔ چونکہ روحانی ترقیوں کی انتہا کوئی نہیں ہے اس لیے نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کی روشنی میں زندگی کے مختلف مراحل میں جب اُمت اجتماعی طور پر حرکت کرے گی تو ہدایت کے نئے سے نئے دروازے کھلتے جائیں گے اور اس میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

كَمَآ اَرْسَلْنَا فِيْكُمْ رَسُوْلًا مِّنْكُمْ يَتْلُوْا عَلَيْكُمْ اٰيٰتِنَا وَيُزَكِّيْكُمْ
وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمْ مَّا لَمْ تَكُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۞
رکوع ۱۸ فَاذْكُرُوْنِيْٓ اَذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوْا لِيْ وَلَا تَكْفُرُوْنِ ۞

چونکہ ہم نے تم میں ایک عظیم الشان پیغمبر تم ہی میں سے روانہ کیا۔ وہ ہماری آیتیں تمہارے سامنے تلاوت کرتا ہے اور تمہیں پاک و صاف کرتا ہے اور تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ باتیں سکھاتا ہے جن سے تم بیکسر نا آشنا تھے اس لیے تم میری یاد میں لگے رہو میں بھی تمہیں یاد رکھوں گا اور میرا شکر ادا کرو، کفرانِ نعمت نہ کرو۔

رسالت اور اجابت دعاء ابراہیمؑ

خانہ کعبہ کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیم نے تین دعائیں کی تھیں ایک یہ کہ بیت اللہ بنانے کی خدمت کو شرف قبول مرحمت فرما دوسرے یہ کہ ہماری نسل میں سے ایسی ایک امت پیدا کر دے جو تیرے حکموں کی فرمانبردار ہو۔ تیسری یہ کہ اس بستی کے بسنے والوں میں ایک رسول روانہ فرما جو انہی میں سے ہو۔ خانہ کعبہ کو قبلہ بنا کر پہلی دعا قبول کی گئی۔ امت مسلمہ کو منصب امامت دے کر دوسری دعا کو شرف قبول عطا فرمایا گیا۔ اس آیت میں اب تیسری دعا کی قبولیت کا تذکرہ ہو رہا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہم نے تمہیں منصبِ امامت دے کر ابراہیم کی دعا من ذریتنا امة مسلمة لك کو دیسے ہی شرف قبول عطا کیا جیسا کہ ابراہیم کی دوسری دعا کو تم میں عظیم الشان پیغمبر بھیج کر قبولیت دی تھی۔ حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں:

میں تمہارے لیے ابراہیم کی دعا و من ذریتنا امة مسلمة لك کو ایسے ہی پوری کر رہا ہوں جیسے ابراہیم کی دعا ربنا وابعث فیھم رسولا کو تمہاری خاطر پوری کی ہے۔

امت کے منصب امامت کے ذکر کے موقع پر کذالك فرمایا تھا۔ مطلب یہ تھا کہ جیسے ابراہیم

کی دعا کو قبول کر کے خانہ کعبہ کو قبلہ بنایا ہے ایسے ہی تمہیں ابراہیم کی دعا کے صدقے میں منصب امامت عطا فرمایا ہے۔ خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کی حکم اور مصالح بتاتے ہوئے فرمایا تھا لاتم نعمتی علیکم یعنی میں تم پر علم وعمل کی نعمت قبلہ کو مرکز بنا کر ویسے ہی پوری کروں گا جیسے میں نے تم میں سے عظیم الشان پیغمبر روانہ کر کے علم وعمل کی نعمت پوری کی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ صراطِ مستقیم مل جائے گی جس کی ہر نماز میں اور نماز کی ہر رکعت میں درخواست کرتے ہو۔

۱۹۳۔ جیسا کہ ہم نے تم میں ایک عظیم الشان پیغمبر تم ہی میں سے روانہ کیا یعنی علم وعمل کی نعمت کا اتمام خانہ کعبہ کے ذریعے ایسے ہی کروں گا جیسے بعثتِ رسول کے ذریعے کر چکا ہوں۔ بعثتِ رسول کے ذریعے علم وعمل کو تمہارے افکار و اعمال میں جگہ دی اور خانہ کعبہ کو مرکز بنا کر اسی علم وعمل کو پورے ملک میں قانون بنا کر نافذ کروں گا۔ شارحینِ قرآن نے کما کو تشبیہ کے لیے بتایا ہے۔ ابوحیان اندلسی نے اس پر ایک طویل بحث کی ہے۔ دوسرے بزرگوں کی رائے بھی سن لیجئے۔

یعنی یہ اتمامِ نعمت اور تکمیلِ ہدایت تم پر ایسی ہی ہوئی ہے جیسی ابتدا میں تم پر یہ اتمامِ نعمت اور ہدایت ہو چکی ہے کہ تم ہی میں سے ایک رسول ایسا بھیجا جو تم کو میری باتوں سے پاک وصاف بنا دے یعنی علماً اور عملاً تم کو کامل بنا دے [1]

یعنی ہم نے کعبہ کو قبلہ مقرر کر کے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک دعا جو در بابِ مقبولیتِ کعبہ تھی اس طرح قبول کی جیسے ان کی دوسری دعا جو در بابِ بعثتِ محمدیہ تھی قبول کی۔ قرطبی کہتے ہیں کہ حرف کاف کا تعلق بعد کی آیت فاذکرونی سے ہے کہ جیسے ہم نے تم پر ایک نعمت قبلہ کی اور دوسری نعمت بعثتِ رسول کی ارزانی کی ہے ایسی ہی نعمت ذکر اللہ بھی ہے۔ ان سب نعمتوں کا شکر ادا کرو [2]

جس طرح ہم نے قبلہ کے بارے میں تم پر اتمامِ نعمت کیا کہ سب سے افضل قبلہ تمہارے لیے مقرر کیا اسی طرح ہم نے نبوت و رسالت اور ہدایت کے بارے میں تم پر اسی طرح اتمامِ نعمت کیا کہ سب سے افضل اور اکمل اور عظیم الشان رسول تمہاری ہدایت کے لیے بھیجا۔ [3]

خانہ کعبہ کو صرف قبلہ ہی نہیں بنایا بلکہ تمہیں بالادستی دے کر اور اسے شرک کی آلودگیوں سے پاک کر کے ایسے ہی اتمام کرے گا جیسے تم میں سے رسول بھیج کر نعمت کا اتمام کیا ہے۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۹ [2] معارف القرآن م ش ص ۳۳۵ [3] معارف م ا ص ۲۲۲

قبلہ تمہارے شہروں میں اور رسُول تمہاری قوم سے ہے [1]

قبلہ کے معاملہ میں اتمام نعمت ایسے ہی کروں گا جیسے رسُول روانہ کرکے نعمتِ رسالت کا اتمام کیا ہے [2]

۴۲۰۔ وہ ہماری آیتیں تمہارے سامنے تلاوت کرے گا۔ آیات سے آیاتِ قرآنی مراد ہیں۔ ان میں علمی اور عقلی دلائل کی روشنی میں اصُول وقواعد بیان ہوتے ہیں اور اس حیثیت سے یہ دلیلِ نبوت ہیں۔ توحید، آخرت اور اصولِ اسلام سے متعلق قرآنی آیات آپ لوگوں کے سامنے تلاوت کرتے ہیں۔ آلوسیؒ نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ تلاوتِ آیات کا عنوان اختیار کرکے اثباتِ نبوت کے راستہ کی طرف اشارا کیا ہے۔

تلاوتِ آیات دلیلِ نبوت ہے

غور کیجیے کہ ایک آدمی جو اُمیوں کی گود میں پیدا اور پل کر جوان ہوا۔ اس نے ہوش سنبھالا تو گرد وپیش میں تاریکیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ علوم وفنون سے ایک عاری ملک، عاری شہر، عاری خاندان کے اندر نشو ونما پائی۔ دفعتہً غارِ حرا کے دہانے سے اجالا ہوتا ہے۔ علوم وفنون اور تہذیب وتمدن پر مشتمل آیات تلاوت ہونے لگتی ہیں۔ صحفِ انبیاء اور افکارِ عالیہ کے اوراق اس کی زبان پر جاری ہو جاتے ہیں۔ کلام کی یہ شیرینی یہ نمکینی یہ تسخیر جو دوست دُشمن سب کو یکساں فریفتہ کرتی ہے۔ کلامِ ربانی کے ذریعے مغیبات کے پردے چاک ہوتے ہیں۔ معاش اور معاد سے متعلق مصالح کی گرہ کشائی ہوتی ہے۔ یہ دلیلِ نبوت نہیں تو اور کیا ہے۔

مقاصدِ رسالت میں تلاوت اوّلین مقصد ہے

تلاوت رسالت کے مقاصد وفرائض میں سے اوّلین مقصد ہے۔ اس کے مقابلے پر دوسرا مقصد اسی آیت میں تزکیہ اور تیسرا مقصد تعلیم بیان ہو رہا ہے۔ تلاوت کا اگر تعلق الفاظ سے ہے تو تعلیم کا تعلق معانی سے ہے۔ ان دونوں کو جداگانہ مقاصد قرار دینے سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن میں جیسے معانی مقصد کی حیثیت رکھتے ہیں ایسے ہی الفاظ بھی مستقل مقصود

[1] المنار ص ۲۰ [2] روح المعانی ص ۱۸

کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان کی تلاوت و حفاظت فرض اور ضروری عبادت ہے ۔

یہاں چند حقائق قابلِ غور ہیں ۔

اولاً قرآن حکیم دوسری کتابوں کی طرح صرف کتاب نہیں جس میں معانی مقصود ہوتے ہیں الفاظ کی حیثیت ثانوی ہوتی ہے۔ ان میں معمولی تغیر و تبدل ہو بھی جائے تو کوئی حرج نہیں ہوتا بلکہ قرآن کے جس طرح معانی مقصود ہیں اسی طرح الفاظ بھی مقصود ہیں۔ اور الفاظ کے بارے میں خاص قانونی دفعات بھی ہیں۔ اسی بنا پر اسلام کے قانون داں طبقہ نے قرآن کی یہ تعریف کی ہے کہ قرآن ترتیبِ الفاظ اور معانی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ الفاظ کی ترتیب زبان کے بغیر ممکن نہیں۔ جب قرآن کے الفاظ ایک نظم اور ترتیب رکھتے ہیں تو ظاہر ہے کہ قرآن کی اپنی زبان بھی ہے۔ قرآن کی یہ زبان عربی مبین ہے۔ شامی لکھتے ہیں :

> قرآن اس کتاب کا نام ہے جو عربی الفاظ میں اس خاص نظم و ترتیب سے اتری ہے اور ان صحیفوں میں لکھی گئی ہے جو ہم تک بطورِ تواتر پہنچے ہیں۔ اس کے ترجمے کو مجازاً قرآن کہا جاتا ہے بلکہ قرآن نہ کہنا بھی ترجمۂ قرآن کو اسی بنا پر درست ہے ۔

اسی بنا پر علامہ برہان الدین مرغینانی نے لکھا ہے کہ

> قرآن کو غیر عربی میں لکھنا ممنوع ہے کیونکہ یہ اقدام قرآن کی حفاظت کے منافی ہے ہم قرآن کے الفاظ اور معانی دونوں کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں کیونکہ یہ دلیلِ نبوت ہے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ معانی قرآن کو اگر قرآن کے علاوہ دوسرے الفاظ میں لکھا جائے تو وہ قرآن کہلانے کا مستحق نہیں ہے۔ اس کو اگر کوئی شخص نماز میں پڑھے گا تو نماز نہ ہوگی ۔

ثانیاً تلاوت کو مقصدِ نبوت قرار دے کر قرآن کی حفاظت کا سامان کیا گیا ہے۔ قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں رہا اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے۔ تورات جل جل کر خاک ہوئی۔ پھر سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی۔ انجیل میں تحریف و جعل اسی زمانے میں شروع ہو گیا تھا پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی۔ زردشت کا صحیفہ سکندر کے نذر ہوا اور اب صرف گاتھا کا ایک حصہ بچا کچھا رہ گیا ہے۔ ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ ان کی حفاظت کا ان کی پشت پر کوئی سامان نہ تھا۔ لیکن قرآن نے اپنی تلاوت

کو مقاصدِ نبوت میں داخل کر کے قیامت تک کے لیے اس کی حفاظت کا سامان کر دیا۔

ثالثاً قرآن کا عربی میں نازل ہونا اور جا بجا اس پر زور دینا کہ انا انزلناہ قرآنا عربیا صرف اتنے ہی معنے نہیں رکھتا جس قدر اس وقت تک سمجھے گئے بلکہ ایک بہت زیادہ وسیع اور گہری حقیقت اس میں پوشیدہ ہے۔ تفصیل کا یہ محل نہیں مگر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ قرآن نے اپنے تعقل و تدبر کی اساس عربیت کو قرار دیا ہے تو اس سے یہی بتانا ہے کہ قرآن ان الفاظِ عربی کی اُمت میں حفاظت چاہتا ہے اور الفاظ کی حفاظت کا ذریعہ صرف تلاوت و قرأت ہے۔ اسی بنا پر عربی الفاظ کی تلاوت میں تعبد کی شان بتائی گئی ہے یہ کہنا کسی طرح درست نہیں کہ جب تک قرآن کے الفاظ کے معانی نہ سمجھے طوطے کی طرح ان کے الفاظ دہرانا بیکار ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو نہ تو قرآناً عربیاً پر زور ہوتا اور نہ تلاوت مقاصدِ نبوت میں داخل ہوتی۔

۱۲۴ ۔ اور تمہیں پاک و صاف بناتا ہے یعنی ہر طرح کے فسق و عصیان اور اخلاقی آلودگیوں سے رسول کی حیثیت صرف پیام رساں کی نہیں ہوتی مزکی پاک کرنے والے کی بھی ہوتی ہے۔ نبوت کے مقاصدِ بعثت میں سے دوسرا مقصد قرآن نے تزکیہ نفوس بتایا ہے۔ تزکیہ کے معنے پاک و صاف کرنے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ پاک و صاف کرنا دوسرے مقاصد سے جداگانہ ہے۔ یہ پاک و صاف کرنا آیاتِ الٰہی کی تلاوت کے بعد حضور انورؐ کی عملی کیفیت کو ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی تربیت، فیضانِ صحبت، حسنِ اخلاق کی تاثیر سے بُرے اچھے، بد نیک اور اشرار اخیار بن جاتے ہیں۔

کامل و مکمل

آپؐ کامل تھے اور ناقصوں کو کامل بنانے آئے تھے۔ آپؐ پاک تھے اور ناپاکوں کو دھو کر پاک و صاف بنانے آئے تھے۔ اخلاق کے سارے معلموں کی فہرست پر ایک نظر ڈالو اور دیکھو کہ یہ تکمیل کی شان سب سے زیادہ کس میں تھی؟ کیا اس میں جس کو قدم قدم پر بنی اسرائیل کی سنگدلی اور کج روی کا گلہ کرنا پڑا ہے۔ جس کے پورے گیارہ شاگرد بھی امتحان کے وقت پورے نہ اتر سکے۔ یا اس میں تھی جس کی نسبت قرآن نے بار بار اعلان کیا و یزکیہم وہ تم کو پاک و صاف بناتا ہے۔

اس تحدی اور اعلان میں یہ بات خاص لحاظ کے قابل ہے کہ اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت صرف یہی دعویٰ نہیں ہے کہ وہ خود پاک و صاف ہیں بلکہ یہ بھی ہے کہ وہ دوسروں کو اپنے فیض و اثر سے پاک و صاف بھی بنا دیتے ہیں۔ وہ ناقصوں کو کامل، گنہگاروں کو نیک اندھوں کو بینا اور تاریک دلوں کو روشن ضمیر بنا دیتے ہیں۔ چنانچہ جس وقت آپؐ نے اپنی زندگی

کا کارنامہ ختم کیا تو ایک لاکھ ۲۴ ہزار انسان آپؐ کی تربیت سے بہرہ مند ہو چکے تھے۔ اور وہ عرب جو اخلاق کے پست ترین نقطہ پر تھے ۲۳ برس کے بعد وہ اخلاق کے اس اوج کمال پر تھے جس کی بلندی تک کوئی ستارہ آج تک نہیں پہنچ سکا۔

ذاتِ نبوت میں تزکیہ کی جامعیت

اخلاق کے دوسرے معلموں کو دیکھو وہاں صرف ایک فن کے طالب علم تعلیم پاتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تربیت کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں۔ حضرت عیسیٰؑ کے مکتب میں عفو و درگزر کے سوا اور کوئی سبق نہیں ہے۔ بودھ کی خانقاہ میں دربدر بھیک مانگتے فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں ہے۔ لیکن محمد رسول اللہؐ کی تربیت گاہ میں آکر دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشوونما پا رہی ہے۔ خود معلمؐ کی ذات ایک پوری یونیورسٹی ہے جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسبِ کمال کر رہے ہیں۔

آپؐ کی حیثیت ایک انسان، ایک باپ ایک شوہر ایک دوست ایک خانہ دار ایک کاروباری ایک افسر ایک حاکم ایک قاضی ایک سپہ سالار ایک سربراہِ مملکت ایک استاد ایک واعظ ایک مرشد ایک زاہد و عابد اور بالآخر ایک پیغمبر کی نظر آتی ہے۔ یہ تمام انسانی طبقے آپ کے سامنے آکر زانوئے ادب تہ کرتے ہیں اور اپنے اپنے پیشہ و فن کے مطابق آپؐ کی تربیت اور صحبت سے بہرہ اندوز ہوتے ہیں۔

تزکیہ کی جان اور رُوح صحبت ہے۔ یہ اسی صحبت کی برکت ہے کہ کہیں ابو بکر و عمر و عثمان و علی جیسے فرمانروا زیرِ تربیت ہیں کہیں حضرت طلحہ، زبیر، معاویہ، سعد بن معاذ جیسے اربابِ رائے و تدبیر بیٹھے ہیں، کہیں حضرت خالد، ابو عبیدہ اور سعد بن ابی وقاص جیسے سپہ سالار ہیں کہیں وہ ہیں جو بعد کو صوبوں کے حکمران، عدالتوں کے قاضی اور قانون کے مقنن بننے والے ہیں۔ کہیں ان عباد زہاد کا مجمع ہے جن کے دن روزوں میں اور راتیں نمازوں میں کٹتی ہیں۔ ابوذر سلمان فارسی اور ابو الدرداءؓ جیسے وہ خرقہ پوش بزرگ ہیں جو مسیحِ اسلام کہلاتے تھے۔ کہیں وہ اصحابِ صفہ ہیں جو جنگل سے لکڑیاں لاکر بیچتے اور گزارہ کرتے ہیں۔ کہیں حضرت علی، عائشہ، ابن عباس

ابن مسعود، زید بن ثابت جیسے فقیہہ و مجتہد ہیں جن کا کام حوادث کے مطابق احکام کی تلاش ہے کہیں ابوہریرہ، انس بن مالک اور عبداللہ بن عمرؓ جیسے وہ ارباب حدیث ہیں جو علم کی خدمت کا کام کرتے ہیں۔ سب مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک ہی شمع پر پروانہ وار جمع ہیں۔ سب پر توحید کا یکساں نشہ چھایا اور سینوں میں حق پرستی کا ایک ہی ولولہ موجیں لے رہا ہے اور سب اعمال و اخلاق کے ایک ہی آئینہ اقدس کا عکس بننے کی کوشش کر رہے ہیں۔

تزکیہ کا عملی ظہور

امر واقعہ یہ ہے کہ جس طرح محمد رسول اللہ نے دنیا کو قرآن سنایا اسی طرح تزکیہ کے ذریعے نئے اخلاق، نئے جذبات و کیفیات، نیا یقین و ایمان، نیا ذوق و شوق، نئی بلند نظری، نیا جذبہ ایثار، نیا شوقِ آخرت، نیا جذبہ زہد و قناعت، نئی محبت و الفت، حسنِ سلوک و ہمدردی، برد مواسات مکارم اخلاق۔ اسی طرح سے نیا ذوقِ عبادت خوف و خشیت، توبہ و انابت، دعاو تضرع کی دولت عطا فرمائی اور اسی تزکیہ کے جامع منصوبہ کی بنیاد پر وہ سوسائٹی وجود میں آئی جسے قرآن کی زبان میں اُمتِ وسط، خیرِ اُمت کے لفظ سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ خیرِ اُمت (صحابہ کرام) اس تزکیہ کے کامل ترین نمائندہ اور بہترین نمونے تھے۔

تزکیہ زندگی کے تمام شعبوں پر حاوی ہے

نبوت کے قرآن کی بنیاد پر بپا کئے ہوئے تزکیہ کو زندگی کے خاص شعبہ کے ساتھ خاص کرنا اس جامعیت کا انکار ہے جو تزکیہ کے ذریعے نبوت کی تیار کردہ اُمت یعنی صحابہ کرام میں نظر آتا ہے۔ یہ درست ہے کہ اُمت میں وہ باطنی و روحانی کیفیات بھی اسی تزکیہ کا نتیجہ ہیں جو صوفیا کو وراثت میں ملی ہیں اور جس کی خدمت وحفاظت صوفیا نے کی ہے۔ لیکن تزکیہ کو صرف باطنی کیفیات میں محدود سمجھنا درست نہیں ہے۔ یہ صورتِ حال فی الحقیقت مسلمانوں کے عام عملی تنزل کا قدرتی نتیجہ ہے انہوں نے جب دیکھا کہ وہ عملی زندگی میں نبوت کی بلندیوں کا ساتھ نہیں دے سکتے تو کوشش کی کہ نبوت کو اس کی بلندیوں سے اس قدر نیچے اتار لیں کہ ان کی محدود عملی زندگی کا ساتھ دے سکے۔

۴۲۲ - اور نہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ یہ نبوت کے مقاصد میں سے دوسرا اور تیسرا مقصد ہے یعنی کتابِ الٰہی کی تعلیم اور حکمت کی تعلیم۔ کتاب کے دو معنے ہیں ایک صحیفہ ربانی اور یہ اکثر آیا ہے اور دوسرے نوشتۂ الٰہی اور علمِ الٰہی۔ یہاں کتاب سے بلا شبہ صحیفہ ربانی

وحی کتابی اور قرآن مراد ہے لیکن حکمت کا مفہوم اس آیت میں کیا ہے؟

حکمت کا مفہوم

حکمت کے لغوی معنے دانائی کی بات اور کام کے ہیں مگر یہاں اس سے مقصود کیا ہے۔ اس کی تحقیق کے لیے ضرورت ہے کہ مستند اہلِ لغت اور ماہرینِ قرآن کے اقوال نقل کر کے تبصرہ کیا جائے۔ سب سے قدیم لغت نویس ابنِ درید المتوفی ۳۲۱ھ اپنی کتاب 'جمہرۃ اللغۃ' میں حکمت کے یہ معنے لکھتے ہیں:

ہر وہ بات جو تجھ کو سمجھائے یا تجھ کو تنبیہ کرے یا کسی اچھی خصلت کی طرف بلائے یا کسی بُری چیز سے روکے وہ حکمت ہے۔

لغت کے امام جوہری اپنی کتاب صحاح میں لکھتے ہیں:

حکمت یعنی علم اور حکیم یعنی عالم، کاموں کو بخوبی کرنے والا۔

عربی لغت کی مبسوط و مستند کتاب لسان العرب میں ہے:

حکمت بہترین چیز کو بہترین علم کے ذریعے سے جاننے کو کہتے ہیں۔

امام راغب اصفہانی 'مفردات القرآن' میں لکھتے ہیں:

حکمت عقل اور علم کے ذریعے صحیح اور سچی بات کو پہنچنا ہے تو اللہ کی حکمت چیزوں کو اور ان کو بکمالِ خوبی پیدا کرنا ہے اور انسان کی حکمت موجودات اور اچھی باتوں کا کرنا ہے۔

یہ تو عربی لغت کے اماموں کی تصریحات تھیں۔ اب ان بزرگوں کے اقوال پر غور کرنا ہے جو زباندانی کے ساتھ قرآن اور شریعت کے استدلالات اور محاورات سے بھی کامل طور سے آگاہ تھے۔ ابنِ حیان اندلسی نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں ان کے اکثر اقوال کو یکجا کر دیا ہے۔

امام مالکؒ کا قول ہے کہ حکمت دین میں سمجھ اور اس فہم کو کہتے ہیں جو ایک فطری ملکہ اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک نور ہے۔ مجاہدؒ کی رائے ہے کہ حکمت قرآن فہمی کا نام ہے۔ مقاتلؒ کہتے ہیں کہ حکمت علم اور اس کے مطابق عمل کو کہتے ہیں۔

امام محمد بن جریرؒ طبری نے اپنی تفسیر میں حسبِ ذیل اقوال نقل کئے ہیں:

ابنِ زید کہتے ہیں کہ حکمت دین کا وہ حصہ ہے جو صرف رسول کے ذریعے معلوم ہوتا ہے وہی اسے سکھاتا ہے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ حکمت سے مراد سنتِ نبوی ہے۔

آخر میں ابن جریر نے اپنا یہ فیصلہ دیا ہے،

ہمارے نزدیک صحیح بات یہ ہے کہ حکمت ان احکامِ الٰہی کے علم کا نام ہے جو صرف رسول کے بیان و تشریح سے معلوم ہوں۔

امام شافعی نے اپنی تصنیف کتاب الرسالہ میں قتادہ کے مسلک کو پسند کیا ہے۔ لکھتے ہیں:

میں نے قرآن کے ان اہلِ علم سے جن کو میں پسند کرتا ہوں سنا ہے کہ حکمت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنّت کا نام ہے۔

ائمہ لغت اور شارحینِ قرآن کے ان تمام اقوال پر ذرا غور سے مطالعہ کرو تو معلوم ہوگا کہ سب کا مفہوم ایک ہے تعبیرات مختلف ہیں۔ حکمت عقل و فہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح غلط، صواب و خطا، حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان تمیز و فیصلہ بذریعہ غور و فکر، دلیل و برہان اور تجربہ استقرار کے نہیں بلکہ منکشفانہ طور سے ہوجاتا ہے اور اسی کے مطابق اس صاحبِ حکمت کا قول بھی ہوتا ہے۔

اس آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کاموں کا ذکر کیا ہے:

تلاوت، تزکیہ، تعلیم کتاب و حکمت۔ سوال یہ ہے کہ پہلا اور تیسرا یعنی تلاوت اور تعلیم کتاب ایک ہی کام ہے یا دو۔ اگر ایک ہی کام ہے تو بے سود تکرار کیوں؟ کیوں نہ دوسری جگہ بھی یتلو کہہ دیا گیا۔ اگر دو الگ الگ کام ہیں جیسا کہ ہر صاحبِ نظر سمجھتا ہے تو ان دونوں میں کیا فرق ہے؟ اگر رسُول کا کام محض وحی کی زبان سے سُنی ہوئی آیات کو پڑھ کر دوسروں کو سنا دینا ہے اور اسی پر بس مقاصدِ رسالت ختم ہوجاتے ہیں تو اس کا تیسرا کام الفاظ کی تلاوت سے بڑھ کر کتاب کی تعلیم اور حکمت کی تعلیم کیوں کر قرار دیا جا سکتا ہے بالکل ظاہر ہے کہ تعلیم کا مفہوم تلاوت سے بہت کچھ زیادہ ہے خصوصاً جبکہ تعلیم کا لفظ تلاوت کے بعد آیا ہو۔ وحی کے الفاظ سنا دینے سے تلاوت کا فرض ادا ہوجاتا ہے مگر تعلیم کا فرض ابھی باقی رہتا ہے۔ کتاب کی تعلیم کے معنے تلاوت کی طرح الفاظ سنا دینے کے نہیں ہیں بلکہ الفاظِ قرآنی کی تلاوت کے بعد جو آپ کا پہلا کام تھا اس کے مشکل مطالب کو حل کرنے، مجمل معانی کو سمجھانے اور اپنی زبان اور عمل سے ان کی شرح و تفصیل کر دینے کا نام تعلیم کتاب و حکمت ہے۔ یہ آپ کی

بعثت کا تیسرا مقصد یا آپ کا تیسرا کام ہے۔ اسی تعلیم کا قرآن اس آیت میں ذکر کر رہا ہے۔

جب آیات قرآنی کے مطالب و معانی کی تشریح بھی آپ کے فرائض نبوت میں داخل ہے تو لازماً اس کی حیثیت بھی پیغمبرانہ شرح و تفصیل کی ہے اور اس کی تعمیل بھی اُمت کے لیے ضروری ہے۔ آپ کی اسی زبانی و عملی شرح و تفصیل کو صحابہ نے اپنے عمل میں محفوظ رکھا اور اسی کو پوچھنے والوں کو زبانی بتایا۔ نبوت کے اسی شرح و تفصیل کا نام سنت ہے۔

اس تفصیل کے بعد حکمت کے ان معانی پر دوبارہ نظر ڈالیے جو ائمہ لغت اور شارحین قرآن نے بیان کیے ہیں تو آپ کو یقین آجائے گا کہ سب ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیرات اور ایک ہی کی متعدد تفسیریں ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی جس کا اصطلاحی نام سنت ہے۔ کتاب الٰہی کی عملی تشریحات ہیں۔ کتاب الٰہی، وحی ربانی کا نتیجہ ہے اور سنت نبوت کی بلیغانہ حکمت کا۔ اس مقام پر امام شافعیؒ کی یہ تحقیق پیشِ نظر رہنی چاہیے۔

آپ کی سنت وہ حکمت ہے جو آپ کے دل میں خدا کی طرف سے ڈالی گئی۔

(الرسالہ ص ۷۸)

اور اسی مفہوم کو امام مجاہد اس طرح ادا فرماتے ہیں کہ الحکمۃ فھم القرآن، حکمت فہمِ قرآن کا نام ہے۔ اسی کو دوسرے انداز میں یوں کہو کہ قرآن کے معانی و مطالب کی تشریح حکمت ہے اور ایسی تشریح جو نبوت کی طرف منسوب ہو سنت ہے۔ اور اسی معنے کو امام مالک اور دوسری صدی کے علمائے قرآن ان تعبیرات میں پیش کرتے ہیں کہ حکمت معرفت دین، فقہ دین اور اس علمِ دین کو کہتے ہیں جس کو رسول نے بیان کیا اور حکمت اس نور کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کسی قلب میں پیدا کرکے اسے منور کر دیتا ہے۔

حاصل یہ ہے کہ اصل حکمت وہ نورِ نبوت اور الہامی معرفت ہے جسے اللہ سبحانہٗ نے محمد رسول اللہ کے سینے میں ودیعت کیا تھا اور چونکہ آپ کے سنن اور اقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمت نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں، اس لیے ان پر بھی حکمت کا اطلاق جائز ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ کچھ بزرگوں نے حکمت کی تشریح میں اصل معنے کی طرف توجہ کی ہے اور کچھ نے ثانوی معنے کو بیان کیا ہے اور دونوں حق بجانب ہیں۔

اس موقعہ پر مفتی محمد عبدہ مصری نے یہ بات بڑی پتے کی لکھی ہے کہ

قرآن نے توحید کی دعوت دی اور اصولِ احکام بتائے لیکن قرآن نے سربراہوں کے شہریوں

سے معاملات اور احکام کے ٹکڑوں سے تعلقات کا نقشہ پیش نہیں کیا اور نہ خانگی زندگی میں شوہر کے اہلِ خانہ سے متعلق عائلی قوانین کی تفصیلات سے بحث کی ہے۔ نہ عدالتی، فوجی اور انتظامی قوانین کی تفصیلات بتائی ہیں۔ اس سلسلے میں صرف دستوری قواعد وضوابط پیش کیے۔ ان کی تفصیلات کو نبوت کے اُسوۂ حسنہ پر چھوڑ دیا ہے۔ ان تمام کی تفصیلات کو سنّت نے کھول کر بتایا ہے۔ دین میں صرف کسی خشک اخلاقی ضابطہ یا قانونی مجموعہ کا نام نہیں ہے۔ وہ جذبات و واقعات اور عملی مثالوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا ہے۔ آپ کی گھریلو زندگی، صحابہ کی مجلسی سیرت، سفر و حضر، امن و جنگ، ضعف و قوّت، قلت و کثرت میں واقعات اور عملی مثالوں کا سب سے بہتر اور مستند مجموعہ سنّتِ عملی ہے۔ یہ سنّتِ عملی متواتر ہے۔ اس کے ذریعے قرآن کے مجملات کی تفصیل مبہمات کی تبیین اور احکام میں اسرار و حکم معلوم ہوتے ہیں۔ اسی لیے قرآن کی زبان میں سنّت کو حکمت کہا گیا ہے۔

یہ واقعہ ہے اگر یہ محسوسِ عملی تربیت نہ ہوتی تو صرف اخلاقی ضوابط اور مجموعہ قوانین کے ذریعے ہی اُمّتِ دورِ اوّل میں افتراق و انتشار، عداوت و جہالت سے ہٹ کر اخوّت و ائتلاف، اتحاد و یگانگت اور علم و سیاست کی نعمت سے ہرگز ہمدوش نہ ہوتی۔ یہ سنّت ہی ہے جس نے ان کو قرآن کا برتنا اور قرآن پر چلنا سکھایا۔

۴۲۳۔ وہ باتیں سکھاتا ہے جن سے تم یکسر ناآشنا تھے۔ وحیٔ الٰہی کو عقلِ بشری سے وہی نسبت ہے جو خدا کو بندہ سے ہے اور رسُول چونکہ وحی سے مؤید رہتا ہے اس لیے قدرتاً اس کی باریک بین دُور رس دقیقہ سنج نگاہ ان دقیق حقائق تک پہنچ جاتی ہے جو بڑے بڑے عقلاء و مفکرین سے بھی مخفی رہتے ہیں۔ اور رسُول کی رسائی عالمِ حقیقت کی ان گہرائیوں تک ہو جاتی ہے جو علم و عقل کشف و اشراق سب سے ماوراء ہیں[1]

مطلب یہ ہے کہ کتاب و حکمت کے ساتھ ان باتوں کی بھی تمہیں تعلیم دیتا ہے جن کا انہیں اس سے پہلے علم نہ تھا۔ عالمی حالات، خانگی نظام، فوجی نظام، بین الاقوامی سیاست وغیرہ وغیرہ اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ تمہیں ان علوم کی تعلیم دیتا ہے جن تک نظر و فکر کے ذریعے تمہاری رسائی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ وحی کے سوا ان کے جاننے کا ذریعہ بھی کوئی نہیں۔

یہ فقرہ اپنے مقام کے لحاظ سے بہت گہری معنویت رکھتا ہے۔ اس میں تعلیمِ خصوصی کے بعد تعلیمِ عمومی

[1] تفسیر ماجدی ص ۵۸

کا ذکر ہے۔ خصوصی تعلیم کے سلسلے میں تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کا پہلے تذکرہ ہو چکا ہے۔ اب ایسی عام تعلیم کا ذکر ہے جو ان دونوں سے الگ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نبوت کا تعلیمی دائرہ صرف کتاب اور حکمت ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ اس میں اتنا عموم ہے کہ بلا قید اور بلا تخصیص جو کچھ بھی اُمتِ مسلمہ کو معلوم نہیں ہے خواہ اس کا زندگی کے کسی گوشہ سے تعلق ہو، نبوت اس کی تعلیم دیتی ہے۔ شارحینِ قرآن نے اس عموم کی توجیہہ گزشتہ واقعات سے کی ہے یعنی یہ کہ آپ گزشتہ واقعات سے باخبر کرتے ہیں۔
ابوحیان اندلسی کہتے ہیں کہ گزشتہ اُمتوں کے واقعات کا لوگوں کو پتہ نہ تھا۔ حضور انورؐ نے یہ بھی بتلایا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اسے علم لدنی بتایا ہے۔ لیکن قرآن نے کوئی قید اور کوئی تخصیص نہیں کی ہے۔ قرآن کا علم کے مفعول کو محذوف کرنا اور تعلیم کے مفعول کو مَا سے تعبیر کرنا۔ اور یعلم کو آیت میں مکرر لے کر آنا اس کی طرف اشارا کر رہا ہے کہ آپ کی تعلیم میں ہمہ گیری ہے۔ اتنی ہمہ گیری کہ دُنیا اس سے زیادہ ہمہ گیری کا تصور بھی نہیں کر سکتی ہے۔ اصلاحاتِ انسانی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے، جس کی آپؐ نے تعلیم نہ دی ہو۔ آپ کی تعلیم میں بھی ہمہ گیری ہے۔ جس پر کوتاہ بینوں کو آج نہیں بلکہ خود صحابہ کے عہد میں بھی تعجب ہوتا تھا۔ بعض مشرکوں نے حضرت سلمان فارسی سے مذاقاً کہا کہ تمہارے نبی تم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں۔ حضرت سلمان نے کہا کہ ہاں یہ سچ ہے کہ آپ ہم کو ہر چیز کی تعلیم دیتے ہیں۔ آپ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم قضائے حاجت کے لیے جائیں تو قبلہ رُخ نہ بیٹھیں اور نہ اپنے داہنے ہاتھ سے طہارت کریں نہ تین ڈھیلوں سے کم استعمال کریں جن میں کوئی گوبر اور ہڈی نہ ہو۔ حضور انورؐ کی تعلیمات کا یہ عموم اور ہمہ گیری ہی اس کی تکمیل کی دلیل ہے۔ اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ پست سے پست اور غیر متمدن سے غیر متمدن اقوام سے لے کر بلند سے بلند اور متمدن سے متمدن قوموں تک کے لیے یکساں تعلیم ہے۔ نہ عقائد پادریوں کی کونسل بناتی ہے نہ دُعائیں کلیساؤں کے حکمران بناتے ہیں اور نہ تہذیب و تمدن کی تعلیمات بے دینوں اور ملحدوں سے حاصل کی جاتی ہے۔ یہاں یعلمکم مالم تکونوا تعلمون کے عموم کی وجہ سے محمد رسول اللہ کے علاوہ کچھ نہیں ہے۔ عقائد ہوں کہ عبادات اور اخلاق ہوں کہ آدابِ تمدن، خانگی معاملات ہوں یا لین دین کے کاروبار، انسانوں کے ساتھ معاملہ ہو یا خدا کے ساتھ سب کا ماخذ محمد رسول اللہ کی ذات گرامی ہے۔ تعلیم کے موقعہ پر مالم تکونوا تعلمون کا عام مفعول لانا اور عمل کے موقعہ پر یزکیکم سے متعلق محذوف کر دینا یعنی یہ ذکر نہ کرنا کہ پاکی اور صفائی کاہے میں کرتے ہیں عقائد میں، اعمال میں، اخلاق میں، معاملات میں، احوال و آداب میں؟ اس بات کی

واضح دلیل ہے کہ آپ کو اللہ سبحانہٗ کی جانب سے کمالِ علم اور کمالِ عمل عطا ہوا ہے۔ اللہ کی ذات اگر جامع الکمالات ہے تو اللہ کے رسولؐ کی ذات یقیناً مجمع الکمالات ہونی چاہیے۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں:

> کمالِ علم پر تو آپ کا اعجازِ علمی یعنی اعجازِ قرآنی کافی ہے۔ رہے کمالاتِ عملی، ان پر اوّل تو اہلِ عقل کے لیے سوانح عمری محمدی دلالت کرنے کو کافی ہے۔ دیدۂ اہلِ نظر لیے اس کے کہ پہلے سے کوئی پیمانہ دیا جاتے جمالِ محمدی کو اوروں کے جمال سے بڑھ کر بتائے گا۔

آپؐ کا یہ علمی اور عملی کمال اور تعلیم میں اس کمال کا ہمہ گیر ظہور دین کے کامل ہونے کی دلیل ہے اور دین کے کامل ہونے کا نتیجہ یہ خود بخود ہے کہ محمد رسول اللہ آخری پیغمبر ہیں، آخری معلم ہیں، مکمّلِ دین ہیں۔ اگر انسان کی عملی واخلاقی اور سیاسی ضرورتوں کا کوئی گوشہ آپ کے فیض سے محروم رہ کر تکمیل کا محتاج ہوتا تو آپ کے بعد بھی کسی آنے والے کی حاجت باقی رہتی۔ قرآن کہتا ہے کہ دین کامل ہو چکا ہے۔ اور آپ خاتم النبیین ہیں۔

کمالِ دین اور ختمِ نبوت لازم وملزوم ہیں۔ اس کی اہمیت کو جس علمی انداز میں علامہ اقبال نے اپنی معرکۃ الآراء کتاب تشکیلِ جدید الٰہیات میں پیش کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔ آیئے آپ بھی کچھ استفادہ کر لیجئے:

> اس نقطۂ خیال سے دیکھا جائے تو پیغمبرِ اسلام صلی اللہ علیہ وسلم دُنیائے قدیم اور دُنیائے جدید کے درمیان بطورِ حدِ فاصل کھڑے دکھائی دیں گے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ آپ کی وحی (علم) کا سرچشمہ کیا ہے تو آپ دُنیائے قدیم سے متعلق نظر آئیں گے لیکن اگر اس حقیقت پر نظر کی جائے کہ آپؐ کی وحی (علم) کی رُوح کیا ہے؟ تو جنابؐ کی ذاتِ گرامی دُنیائے جدید سے متعلق نظر آئے گی۔ آپ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سُراغ پا لیا جن کی اسے اپنی شاہراہوں کے لیے ضرورت تھی۔ اسلام کا ظہور استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی۔ اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ عہدِ طفولیت کی حالت میں نہیں دیکھا جا سکتا۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن حکیم غور و فکر اور

تجارب و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ و فطرت دونوں کو علم انسانیت کے ذرائع ٹھہراتا ہے۔ یہ سب اسی مقصد کے مختلف گوشے ہیں جو ختم نبوت کی تہ میں پوشیدہ ہے۔ پھر عقیدہ ختم نبوت کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے لوگوں کے باطنی واردات کے متعلق ایک آزادانہ اور ناقدانہ طرز عمل قائم ہوتا ہے۔ اس لیے ختم نبوت کے یہ معنے ہیں کہ اب نوع انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار کی بنا پر دوسروں کو اپنی طاعت پر مجبور کرے۔

ختم نبوت کا یہی عقیدہ ایک ایسی نفسیاتی قوت ہے جو اس قسم کے دعوے اقتدار کا خاتمہ کر دیتا ہے۔ اب کسی کے باطنی مشاہدات کیسے ہی غیر معمولی کیوں نہ ہوں ان پر اس طرح تنقیدی نگاہ ڈالی جا سکتی ہے جس طرح انسانی مشاہدات کے دوسرے پہلوؤں پر۔ (تشکیل جدید الٰہیات اسلامیہ ص ۱۴۶)

۴۲۴۔ تم میری یاد میں لگے رہو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ جب ہماری طرف سے تم پر اتمام نعمت ہو چکا ہے تو اب تم کو لازم ہے کہ ہمیں زبان سے، دل سے، ذکر سے، فکر سے ہر طرح سے یاد کرو اور اطاعت کرو ہم تم کو یاد کریں گے یعنی نئی نئی رحمتیں اور عنایتیں تم پر ہوتی رہیں گی اور ہماری نعمتوں کا خوب شکر ادا کرتے رہو اور ناشکری سے بچو۔[1]

بندہ کا اپنے مالک کو یاد کرنا یہی ہے کہ اس کی بتلائی ہوئی راہ پر ہمت اور شوق سے چلتا رہے اور یہ یادِ الٰہی کسی خاص وقت کے ساتھ محدود و مقید نہیں۔ لکھتے پڑھتے، بولتے چالتے سوتے جاگتے سب میں رضائے الٰہی کو مقدم رکھنا۔ یہی بندہ کی طرف سے یادِ الٰہی ہے۔ اور اللہ کا بندوں کو یاد کرنا یہی ہے کہ ان پر دنیا و آخرت دونوں میں اپنے خصوصی فضل و کرم کی بارش کرتا رہے۔ مولانا تھانوی نے فرمایا کہ بندہ ادھر سے یاد میں لگا رہے تو ادھر سے بھی سرفرازی ہوتی رہے گی۔[2]

امام رازی نے اس فقرے کا دلکش منظر پیش کیا ہے آپ بھی لطف اٹھائیے۔

۱۔ تم مجھے میری فرمانبرداری سے یاد کرو میں تمہیں اپنی رحمت سے یاد کروں گا۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۹ [2] تفسیر ماجدی

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِيْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ
اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿۱۵۳﴾

اے اہلِ ایمان! صبر اور نماز کی معنوی قوتوں سے مدد لو۔
یقین کرو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے

۲۔ تم مجھے دعا میں یاد کرو میں تمہیں قبولیت میں یاد کروں گا
۳۔ تم مجھے حمد و ثنا اور طاعت کے ذریعے یاد کرو میں تمہیں انعامات میں یاد کروں گا۔
۴۔ تم مجھے دنیا میں یاد کرو میں تمہیں آخرت میں یاد کروں گا۔
۵۔ تم مجھے تنہائیوں میں یاد کرو میں تمہیں بیاباں میں یاد رکھوں گا
۶۔ تم مجھے فراخ دستی اور آرام میں یاد کرو میں تمہیں مصائب میں یاد کروں گا
۷۔ تم مجھے طاعت میں یاد کرو میں تمہیں امداد و نصرت میں یاد کروں گا
۸۔ تم مجھے دین کی خاطر محنتوں میں یاد کرو میں تمہیں ہدایت و رہنمائی میں یاد کروں گا
۹۔ تم مجھے صدق و اخلاص سے یاد کرو میں تمہیں خلاصی اور اختصاص سے یاد کروں گا
۱۰۔ تم مجھے فاتحہ میں ربوبیت سے یاد کرو میں تمہیں فاتحہ میں رحمت سے یاد کروں گا

صبر و نماز کی قوتوں سے مدد لو

دعائے ابراہیم کے مطابق بعثتِ رسول، ذاتِ نبوت کی پیغمبرانہ تربیت، تلاوتِ آیات، کتاب و حکمت کی تعلیم، مرکزِ ہدایت کا تقرر یہی وہ بنیادی عناصر تھے جن کی موعودہ امت کی نشو و نما اور اس کے منصبِ امامت تک پہنچنے کے لیے ضرورت تھی۔ جب یہ تمام مراتب ظہور میں آگئے تو اب ضروری ہوا کہ پیروانِ دعوتِ قرآنی کو مخاطب کیا جائے اور سرگرمِ عمل ہو جانے کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ یہاں تمام دوسری باتوں سے پہلے انہیں جس بات پر متنبہ کیا جا رہا ہے

وہ یہ ہے کہ منصبِ امامت جس سے تمہیں سرفراز کیا گیا ہے یہ کوئی پھولوں کا بستر نہیں ہے۔ یہ تو ایک عظیم الشان اور پرخطر خدمت ہے جس کا بار اُٹھانے کے ساتھ ہی تم پر ہر قسم کے مصائب کی بارش ہوگی۔ سخت آزمائشوں میں ڈالے جاؤ گے۔ طرح طرح کے نقصانات اُٹھانے پڑیں گے اور جب صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ ان تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے خدا کی راہ میں بڑھے چلے جاؤ گے تب تم پر عنایات کی بارش ہوگی۔ سب سے پہلے صبر اور نماز کی قوتوں سے مدد لینے کی تلقین کی ہے۔ صبر کی حقیقت یہ ہے کہ مشکلات و مصائب کے جھیلنے اور نفسانی خواہشوں سے مغلوب نہ ہونے کی قوت پیدا ہوجائے۔ نماز کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے ذکر و فکر سے رُوح کو تقویت ملتی رہے جس جماعت میں یہ دو قوتیں پیدا ہوجائیں وہ کبھی ناکام نہیں ہوسکتی ہے۔

۴۲۵۔ چونکہ ذکر اور شکر اور ترکِ کفران جو پہلے مذکور ہوئے یہ تمام طاعات اور منہیاتِ شرعیہ کو محیط ہیں جن کا انجام دینا دشوار امر ہے اس کی سہولت کے لیے یہ طریقہ بتلایا گیا کہ صبر اور صلاۃ سے مدد لو کیونکہ ان کی مداومت سے تمام اُمور تم پر آسان ہوجائیں گے اور اس آیت میں یہ اشارہ بھی ہے کہ جہاد میں محنت اُٹھاؤ[1]

آیت میں سرگرمِ عمل ہوجانے کی دعوت دی ہے اور چونکہ سرگرمِ عمل ہونے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ راہِ عمل کی مشکلیں اور آزمائشیں درپیش آئیں اس لیے دعوتِ عمل کے ساتھ ہی صبر و استقامت اور جاں فروشی و قربانی کی بھی دعوت دے دی گئی اور واضح کر دیا گیا کہ اس راہ میں آزمائشوں سے گزرنا ناگزیر ہے اور ساتھ ہی ان اصول و مہمات کی طرف بھی اشارہ کر دیا جن میں ثابت قدم ہوجانے کے بعد گمراہی و ناکامی سے قدم محفوظ رہ سکتے ہیں[2]

استعانت کا مطلب یہ ہے کہ جو نظامِ حیات، نبوتِ علم و عمل کی صورت میں لے کر آئی ہے اور جس کی وراثت تمہیں ملی ہے اسے دنیا میں رائج کرنے میں ان تھک محنت کرو۔ اور اس کے لیے تیاری کرو۔ اور امامت کا بوجھ اُٹھانے کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ تمہیں دو چیزوں سے حاصل ہوگی۔ ایک یہ کہ صبر کی صفت اپنے اندر پیدا کرو دوسرے یہ کہ نماز کے عمل سے اپنے آپ کو مضبوط کرو۔

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۹ [2] ترجمان القرآن ص ۲۶۱

۴۲۶۔ صبر بہت سے اہم ترین اخلاقی اوصاف کے لیے ایک جامع عنوان ہے اور حقیقت میں یہ وہ کلید کامیابی ہے جس کے بغیر کوئی شخص کسی مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا [1]

صبر کے معنے

صبر کے اصلی معنے روکنے اور قابو پانے کے ہیں۔ قرآن وسنت کی اصطلاح میں صبر کے تین شعبے ہیں۔ ایک یہ کہ اپنے آپ کو حرام اور ناجائز سے روکنا۔ دوسرے یہ کہ اپنے آپ کو طاعات وعبادات پر مجبور کرنا۔ تیسرے یہ کہ مصائب و آفات کو برداشت کرنا یعنی جو اُفتاد بھی آن پڑے اس کو اللہ کی طرف سے سمجھے اور اس میں ثواب کا اُمیدوار ہو۔ اس کے ساتھ اگر تکلیف وپریشانی کا کوئی کلمہ زبان پر آجائے تو یہ منافی صبر نہیں ہے [2]

صبر کے یہ تینوں شعبے فرائض میں داخل ہیں۔ ہر مسلمان پر یہ پابندی عائد ہے کہ تینوں طرح کے صبر کا پابند ہو۔ عوام کے نزدیک صرف تیسرے کو تو صبر کہا جاتا ہے دو شعبے جو صبر کی اصل اور بنیاد ہیں۔ عام طور پر ان کو صبر میں داخل ہی نہیں سمجھا جاتا۔ قرآن وسنت کی اصطلاح میں صابرین انہی لوگوں کا لقب ہے جو تینوں طرح کے صبر میں ثابت قدم ہوں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے امام زین العابدین کے حوالہ سے لکھا ہے کہ میدانِ حشر میں آواز آئے گی کہ صابرین کہاں ہیں تو کچھ لوگ کھڑے ہوں گے۔ فرشتے ان سے ملیں گے تو دریافت کریں گے کہ کہاں جا رہے ہو؟ کیا حساب سے پہلے ہی جنت میں جا رہے ہو؟ وہ ہاں میں جواب دیں گے تو فرشتے پوچھیں گے کہ تم کون ہو؟ جواب دیں گے کہ ہم صابرین ہیں۔ فرشتے سوال کریں گے تمہارا صبر کیا تھا؟ جواب دیں گے دو قسم کا، اوّل اللہ کی طاعت پر صبر دوسرے اللہ کی معصیت سے صبر۔ یعنی پوری زندگی ہم اللہ کی اطاعت میں لگے رہے اور اللہ کی نافرمانی سے بچے رہے۔ فرشتے کہیں گے ٹھیک ہے تم وہی ہو جاؤ جنت میں داخل ہو جاؤ۔ ابن کثیرؒ نے امام زین العابدین کا یہ تاثر نقل کر کے لکھا ہے کہ قرآن کی اس آیت میں بھی اس طرف اشارا ہے

انما یوفی الصابرون اجرھم بغیر حساب

صبر کرنے والوں کو بے حساب اجر دیا جائے گا [3]

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۲۶ [2] معارف القرآن از مفتی ص ۳۲۸ [3] ایضاً

صبر کی خاصیت یہ ہے کہ رنج وغم کو ہلکا کرتا ہے۔ حیوانات میں صرف شہوت ہے عقل نہیں۔ ملائکہ میں صرف عقل ہے شہوت نہیں۔ انسان میں عقل کے ساتھ شہوت اور غضب بھی ہے۔ اس لیے انسان کو شہوت اور غضب کا وار روکنے کے لیے صبر کی نعمت سے نوازا گیا۔ اور فرشتہ اور حیوان کو نہیں دیا گیا۔ عقل اور شہوت میں جب کشمکش ہو تو عقل کے اشارے پر چلنا اور نفسانی خواہشوں پر نہ چلنا اس کا نام صبر ہے۔ اخلاقِ جمیلہ میں صبر کا مقام نہایت بلند ہے۔ اللہ سبحانہ نے قرآن میں ستر یا بہتر بار صبر کا تذکرہ کیا ہے۔ اگر انسان پر احکام شرعیہ شاق اور گراں ہوں تو ان کو آسان کرنے کا ایک علاج صبر ہے ۔[1]

صبر کا مطلب

پہلی آیت میں امامت کی نعمت کا ذکر کر کے اس نعمت کا شکر کرنے کا حکم دیا تھا۔ اس آیت میں شکرِ نعمت کی حقیقت یہ بتائی ہے کہ صبر کیا جائے۔ صبر کا یہاں یہ مطلب نہیں کہ نعمتِ امامت اگر تم سے چھن جائے تو اس کا استقبال کریں بلکہ صبر کا یہاں مطلب یہ ہے کہ اس نعمت کی قدردانی اور منعم کی شکرگزاری یہ ہے کہ نبوت کے علم و عمل کے لیے اپنے آپ کو اطاعت پر لگا دیا جائے اور معاصی سے قطعی طور پر اپنے کو روک لیا جائے اور اسے دنیا میں قائم کرنے کے لیے ایثار و قربانی اور سرفروشیوں کے لیے اپنے کو تیار کیا جائے۔ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ صبر تین ہی ہیں۔

ایک یہ کہ اپنے کو اللہ کی نافرمانیوں، محرمات اور مناہی سے بچایا جائے۔

دوسرے یہ کہ یہ طاعات اور عبادات کا اپنے کو خوگر بنایا جائے۔

تیسرے یہ کہ حق کی خاطر جو تکلیفیں اور جو مصیبتیں آئیں ان کو برداشت کیا جائے۔

صبر کے مفہوم میں یہ تینوں ہی داخل ہیں لیکن جہاں تک مقام کا تقاضا ہے حق کی خاطر تکلیفوں، مصیبتوں کو برداشت کرنے کی تلقین ہو رہی ہے۔ مسلمان سامان اور تعداد دونوں لحاظ سے دُنیا کے مقابلے میں کم سے کم تر تھے۔ اس کے برعکس ان کے دُشمن کو سامان اور تعداد میں ان پر برتری تھی۔ مشرکین مکہ نے ان کو گھر سے بے گھر کر دیا تھا۔ یہودی سازشوں کا وہ شکار ہو رہے تھے۔ ادھر منافقین کا مکر و خداع ان کے راستہ میں رکاوٹ تھا۔ ان

---

[1] معارف القرآن ج ۱ ص ۲۴۷

حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے قرآن نے صبر و صلاۃ کا نسخہ بتایا۔ صبر سے مقصود مشکلات و مصائب کے برداشت کا اپنے آپ کو خوگر بنانا ہے۔ اسی تعلیم کا اثر ہے کہ صحابہ نے تمام خطرات سے نڈر ہو کر بڑی بڑی سلطنتوں اور فوجوں کا مقابلہ کیا اور کامیاب رہے۔

۴۲۷۔ نماز کی معنوی قوتوں سے مدد لو کیونکہ اللہ کے ذکر سے رُوح کو قوت ملتی ہے اللہ سبحانہٗ نے نماز میں وہ تاثیر رکھی ہے کہ اس سے دل کی گھبراہٹ اور بے چینی دُور ہوتی ہے قرآن میں ہے

ان الانسان خلق هلوعا اذا مسه الشر جزوعا واذا مسه الخير منوعا الا المصلين الذين هم على صلاتهم دائمون

جب اس پر مصیبت آتی ہے تو گھبرا اُٹھتا ہے اور جب اسے خوش حالی ملتی ہے تو بخل کرنے لگتا ہے مگر وہ لوگ اس عیب سے بچے ہوئے ہیں جو نمازی ہیں اور نماز پر ہمیشگی کرتے ہیں۔

نماز کی غرض و غایت

نماز کی غرض و غایت ہی یہ ہے کہ اس خالق کل، رازقِ عالم، مالک الملک، منعم اعظم کی بے پایاں بخششوں اور بے حساب نعمتوں کا شکر اپنے دل اور زبان سے ادا کریں تاکہ نفس و روح اور دل و دماغ پر اس کی عظمت و کبریائی اور اپنی عاجزی و بیچارگی کا نقش بیٹھ جائے۔ اس محبت کا نشہ رگ رگ میں سرایت کر جائے۔ اس کے حاضر ناظر ہونے کا تصور نا قابلِ زوال یقین کی صورت میں اس طرح قائم ہو جائے کہ ہم اپنے ہر دلی ارادہ و نیت اور ہر جسمانی فعل و عمل کے وقت اس کی ہوشیار اور بیدار آنکھوں کو اپنی طرف اٹھی ہوئی دیکھیں جس سے ہم اپنے بُرے ارادوں پر شرمائیں اور ناپاک کاموں کو کرتے ہوئے جھجکیں۔ اور بالآخر ان سے بالکل باز آجائیں۔ نماز کی یہ غرض و غایت بتاتی ہے کہ نماز کی عادت سے ایک مخلص نمازی کے دل و دماغ پر کیسے نفسیاتی اثرات طاری ہو سکتے ہیں اور اس کے اخلاق و عادات پر کتنا گہرا اثر پڑ سکتا ہے۔ قرآن میں اس نکتہ کی شرح اس طرح کی گئی ہے۔

ان الصلوٰة تنهىٰ عن الفحشاء والمنكر ولذكر الله اكبر

نماز بے حیائی اور بُرائی سے روکتی ہے اور البتہ خدا کی یاد سب سے بڑی چیز ہے

اس آیت سے نماز کی دو حکمتیں معلوم ہوئی ہیں ایک یہ کہ نماز برائیوں سے روکتی ہے دوسری اس سے بڑھکر یہ کہ نماز خدا کی یاد ہے اور خدا کی یاد سے بڑھ کر کوئی بات نہیں ہے۔ برائی اور بے حیائی سے بچنے کا نام تزکیہ اور صفائی ہے۔ یعنی اس سلبی حالت کی یہ ایجابی صورت ہے جس کا حصول انسان کی منزل مقصود اور حقیقی کامیابی ہے۔

۴۲۸ - یقین کرو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ اللہ تمہارے ساتھ ہے بلکہ فرمایا کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اس میں اشارا ہے اس طرف کہ نتائج کا دارو مدار اشخاص پر نہیں بلکہ اعمال پر ہے۔ صابرین کی صفت کا صیغہ اس لیے آیا ہے کہ یہ بتا دیا جائے کہ اللہ کی معیت ان کو حاصل ہو گی جن میں صبر کا بطور صفت ظہور رہوگا۔ اور ظہور بھی اجتماعی ہوگا۔ یہاں اللہ کی معیت سے اس کی مدد و نصرت مراد ہے گویا آیت میں وعدہ ہے کہ اللہ سبحانہ، صابرین کی مدد فرمائیں گے۔ اور جن کو اللہ کی مدد حاصل ہو ان پر کوئی غالب نہیں آسکتا۔

اللہ کا قانون

اللہ کی سنت یہ ہے کہ اعمالِ عظیمہ پایہ کمال کو اس وقت تک نہیں پہنچ سکتے ہیں جب تک کام کرنے والوں میں ثبات و استقامت اور دوام و استمرار نہ ہو۔ ثبات و استقامت کا ذریعہ صرف صبر ہے۔ جو صبر کریں گے ان کو اللہ کی معیت کا شرف حاصل ہوگا اور صبر ان کی کامیابی کا ذریعہ ہوگا

اللہ سبحانہ کو علم تھا کہ دعوت کی راہ میں اہلِ ایمان کو کن مشکلات سے دوچار ہونا ہے۔ رائے عامہ کیا کہے گی، کمزور طبیعت کے لوگ جی میں کیا کہیں گے۔ دنیا کی پوری قوتوں کے خلاف جانیں لگانا اور اپنی زندگیوں کو تج کرنا بہت بڑی کٹھن اور دشوار گزار منزل ہے۔ اس قسم کے ہواجس، خواطر سے دوچار ہونے اور شبہات و وساوس کا مقابلہ کرنے کی محسوس تدبیر صبر بتائی گئی ہے۔

صابرین کو اللہ کی معیت کیوں

اس لیے کہ صبور اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے صفت ہے اور جو اخلاقِ خداوندی کے خوگر

ہوں گے ان کو اللہ کی معیت حاصل ہوگی۔ اور ظاہر ہے کہ جس شخص کے ساتھ رب العزت کی طاقت ہو اس کا کون سا کام رک سکتا ہے اور کون سی مصیبت اس کو عاجز کر سکتی ہے ؟ روز مرہ کا مشاہدہ ہے کہ بڑی اور پُرقوت ہستی سے تعلق قائم ہو جانے سے دل کو کتنی تقویت حاصل ہوتی ہے۔ خطرہ کے وقت پولیس کے پہنچ جانے سے کسی بڑے حاکم کے آجانے سے دل کی کیسی ڈھارس بندھ جاتی ہے شدید بیماری کے وقت کسی نامور حکیم کے آنے سے ٹوٹی ہوئی آس کیسی جڑ جاتی ہے۔ جب معیت ہمدمی، ہمرداں، ناظرِ حقیقی، محافظِ واقعی کی نصیب ہو جائے تو انسان کی تسکین و تقویتِ قلب کا کیا پوچھنا۔ دُنیا میں رہ کر زندگی کی کشمکش میں پڑ کر مشکلات و مصائب کا پیش آتے رہنا ناگزیر ہے۔ افراد کو بھی اور اُمت و جماعت کو بھی۔ اور وہ دستور العمل ناقص ہے جو مشکلات کے دفاع اور مصائب سے مقابلہ کا طریقہ نہ بتائے۔

قرآن نے بجائے غیر ضروری تفصیلات میں جانے کے یہاں اشارہ اصل اُصول کی طرف کر دیا کہ ہجوم مشکلات کے وقت گھبرا نہ جاؤ بلکہ ثابت قدم رہو۔ خود دل کو قابو میں رکھو اور اس یقین کے ساتھ رکھو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اللہ کی معیتِ عام تو کافر و مومن فاسق و صالح اپنے ہر بندہ کے ساتھ ہے ھو معکم اینما کنتم یہاں یہ معیت مراد نہیں ہے بلکہ معیتِ خصوصی مراد ہے جس کے آثار حفاظت اعانت و نصرت ہیں۔ یہ اسی معیتِ الٰہی کا احساس و استحضار تھا جس نے صحابہ کو بے پناہ قوت و جرأت کا مالک بنا دیا تھا۔ یہی ایک تصور ہے اہلِ ایمان کے لیے جو ہر ناگوار کو خوشگوار ہر تلخ کو شیریں ہر زہر کو قند بنا دینے کے لیے کافی ہے [1]

آئیے ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیے

پہلی آیت میں نعمت سے مراد امامت و پیشوائی کی نعمت ہے اور یہ منصب اُمت کو جس راہ سے ملا ہے اس کا سیاق و سباق میں ذکر کیا ہے سیاق میں کعبہ کے قبلہ ہوتے اور مرکز ہونے کا تذکرہ کیا اور سباق میں حضور انورؐ کے رسول ہونے کا تذکرہ کیا۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ کی تینوں دُعاؤں کی قبولیت کا انکشاف کر کے اُمت کو مخاطب کیا کہ

فاذکرونی اذکرکم تم مجھے یاد رکھو میں تمہیں یاد رکھوں گا۔

یہ انداز بالکل وہی ہے جو بنی اسرائیل سے تذکرۂ نعمت کے بعد اختیار فرمایا تھا یعنی

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۵۸

اوفو بعھدی اوف بعھدکم

تم میرا وعدہ پورا کرو میں تمہارا عہد پورا کروں گا۔

بنی اسرائیل سے یہ بات انعام کے جتانے کے بعد فرمائی تھی اور اُمت مسلمہ سے یہ بات اتمام نعمت کی خوش خبری دینے کے بعد فرمائی ہے یعنی وہ ہی نعمت جو بنی اسرائیل کو ناقص ملی تھی اُمتِ مسلمہ کو وہی پوری اور تمام ملی ہے۔ بنی اسرائیل سے یہ بات ایفاء اور عہد کے لفظوں میں کہی گئی اور اُمتِ مسلمہ سے فاذکرونی اذکرکم لفظوں میں کہی گئی ہے۔

اس کے بعد وہاں بنی اسرائیل کو صبر اور صلاۃ سے استعانت کا حکم دیا گیا تھا یعنی یہ کہ مادیت کو چھوڑ کر کہ صبر اور صلاۃ کی روحانی قوتوں سے مدد لو تو محمد رسول اللہ کی صداقت تم پر کھل جائے گی اور نماز کے ذکر کو خاص اہتمام سے پیش فرمایا کہ

وانھا لکبیرہ الا علی الخاشعین الذین یظنون انھم ملاقوا ربھم وانھم الیہ راجعون

اور یہاں نماز کو نہیں بلکہ صبر کے ذکر کو طویل کیا ان اللہ مع الصابرین یہ فرق اس لیے ہے کہ حضور انورؐ کی صداقت کی شناخت میں زیادہ ضرورت عاجزی اور دُعا کی ہے۔ اور کامیابیوں کے حصول میں زیادہ ضرورت صبر کی ہے اس لیے ہر موقعہ کی مناسبت سے اسی کا ذکر کیا ہے جس کی ضرورت تھی۔ چنانچہ یہاں دُور تک صبر ہی کا تذکرہ ہے۔ یا اس کی وجہ یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے پاس مادی طاقت، سرمایہ اور تعداد کافی تھی۔ رُوحانی طاقت صفر کے درجے میں تھی۔ اس لیے ان کو نماز، نماز کی خشوعی کیفیت، اللہ کی ملاقات اور آخرت کی زندگی پر یقین کی طرف متوجہ کیا۔ اور یہاں اُمتِ مسلمہ کے پاس روحانی طاقت کا بھرپور خزانہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت کے نتیجے میں موجود تھا کمی صرف مادی طاقت کی تھی۔ اس لیے جس میں کمی تھی اسی کمی کی تلافی کا طریقہ بتایا۔ اس سے قرآن کی بلاغت کا اندازہ ہوتا ہے کہ وہ کیسے موقعہ محل کی تعبیرات کو منتخب کرتا ہے۔

وَلَا تَقُولُوا لِمَن يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَ
لَٰكِن لَّا تَشْعُرُونَ ۝ وَلَنَبْلُوَنَّكُم بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَ
نَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنفُسِ وَالثَّمَرَاتِ ۗ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ الَّذِينَ
إِذَا أَصَابَتْهُم مُّصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ ۝ أُولَٰئِكَ
عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّن رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُهْتَدُونَ ۝

اور جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل[429] کر دیے جائیں ان کو مُردہ[430] نہ کہو، بلکہ وہ تو زندہ ہیں لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے ہو[431]۔ اور ہم تمہیں کچھ خطرات کے خوف، بھوک کی تکلیف، مالوں، جانوں اور پیداوار میں نقصان کے ذریعے ضرور آزمائیں گے[432]۔ اور خوشخبری دیجئے ان صبر کرنے والوں کو جو مصیبت اور اُفتاد پڑنے پر کہتے ہیں[433] کہ انا للہ وانا الیہ راجعون ہم اللہ کے ہیں اور ہمیں بالآخر اسی کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔ یہی[434] لوگ ہیں جن پر اُن کے پروردگار کی جانب سے الطاف و عنایات اور رحمتیں ہوتی ہیں اور یہی اپنے مقصد میں زندگی کے ہر موڑ پر کامیاب ہیں۔

امامت اور ابتلا

نبوت علم و عمل کا جو پیمانہ کرآتی ہے اسے قائم کرنے اور فروغ دینے کے لیے جدوجہد کرنا اور اس کی خاطر محنت و مشقت برداشت کرنا اور اس راہ میں اپنے وقت، اپنے چین و آرام اور اپنے

جان و مال کی قربانی کرنا قرآن کا اُمت سے مطالبہ ہے۔ اس سے نہ کوئی امیر مستثنیٰ ہے نہ غریب، نہ تاجر نہ دکاندار، نہ مزدور نہ کاشتکار۔ اس موضوع پر قرآن کا مطالبہ اتنا سخت و ہمہ گیر اور اس قدر انتہا پسندانہ ہے کہ جب انصار کی جماعت نے کئی برس تک متواتر جدّ و جہد میں لگے رہنے کے اور اس راہ میں ہر طرح کی جانی و مالی قربانی کرنے کے بعد کچھ مدت کے لیے اپنے کاروبار اور اپنی کھیتی باڑی اور باغات کی اصلاح و خبر گیری کے لیے اس جدّ و جہد سے رخصت چاہی تو قرآن نے ان سے کہا کہ یہ اپنے کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ گویا انفرادی اعمال پوری طرح ادا کرتے ہوئے دین کی خدمت اور نصرت سے سبکدوش ہو کر صرف کاروباری زندگی گزارنے کو خودکشی قرار دیا۔ یہاں اُمت کی خاطر محنت و قربانی اور جدّ و جہد کے لیے اولاً استعانت بالصبر والصلوٰۃ کا عنوان اختیار فرمایا اور اس کے بعد اس آیت میں مواقع صبر کی نشاندہی کی ہے۔ گویا امامت اور ابتلا لازم و ملزوم ہیں۔ حضرت ابراہیم کو بنی نوع انسان کا امام بنایا تو امامت کے ساتھ قرآن نے ابتلا کا ذکر کیا اور ان آزمائشوں کی تفصیل قرآن میں بتائی گئی ہے جن سے گزر کر ابراہیم امامت کے مقام پر پہنچے۔ جس وقت سے حق ان پر منکشف ہوا اس وقت سے لے کر مرتے دم تک ان کی پوری زندگی سرتاسر قربانی تھی۔ یہاں اُمتِ محمدیہ کی امامت کا اعلان کرنے کے بعد ہی قرآن نے ابتلا کا ذکر کیا ہے اور پوری سورۂ بقرہ کے آخر تک اُمت کی آزمائشوں کی تفصیل بیان کی گئی ہے فرق صرف اتنا ہے کہ ابراہیم کی آزمائشوں کا تعلق گزشتہ وقائع سے ہے اور اُمت کی آزمائشیں حال اور مستقبل سے متعلق ہیں۔ اسی سلسلہ میں سب سے جان کی قربانی کا ذکر ایسے انداز میں کیا گیا ہے کہ سننے والوں میں جوش پیدا ہو۔

یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ وہ اندازِ تعبیر ایسا اختیار کرتا ہے کہ جس سے جذبات میں انگیخت پیدا ہو۔ یہ قرآن ہی کا حصہ ہے کہ وہ موقع اور مقام کی ایسی نزاکتوں کی رعایت کرتا ہے۔

۴۲۹ ۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل کر دیے جائیں۔ اللہ کی راہ سے قرآن کی زبان میں جہاد مراد ہوتا ہے۔ یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت و حفاظت کے لیے ہر قسم کی جدّ و جہد، قربانی اور ایثار گوارا کرنا۔ اور ان تمام جسمانی و مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ سبحانہٗ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں تک کہ اس کے لیے اپنی جان تک قربان کر دینا جہاد ہے اور یہ اسلام کا رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

فی سبیل اللہ کا مفہوم

افسوس ہے کہ مخالفوں نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دُنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی اور نہ ہو سکتی ہے صرف دُشمنوں کے ساتھ جنگ کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے۔ یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ محمد رسول اللہ علم وعمل کے جس نظام کو لے کر دُنیا میں آئے ہیں اور جس کی وراثت نبوت ختم ہونے کے نتیجے میں اُمت کو ملی ہے اور جس کے لیے اُمت کو منصبِ امامت دیا گیا ہے۔ وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں ہے بلکہ سرتاسر علم وعمل کا مجموعہ ہے۔ آپ کے لاتے ہوئے نظام میں نجات کا استحقاق گوشہ گیری، رہبانیت، نظری مراقبہ دھیان اور الٰہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں بلکہ یگانہ خدا کی توحید، رسول، کتابوں، فرشتوں اور جزا و سزا کے اعتقاد کے بعد ان کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے۔

گویا اسلامی زندگی سرتاسر حرکت، ایثار و قربانی، عشق کی ولولہ انگیزی، جنون نوازی اور سرفروشی کا نام ہے۔ یہی جہاد ہے اور اسی کو قرآن کی زبان میں فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ فی طاعتہ و اعلاء کلمتہ یعنی فی سبیل اللہ اللہ کی اطاعت اور اس کی بات کو سربلند کرنے کا نام ہے۔ اسی لیے قرآن میں جہاد کا مقابل لفظ قعود ہے، قعود کے بیٹھنا یعنی محنت نہ کرنا سستی اور تغافل برتنا اس بیٹھنے اور محنت کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے سستی کرنے اور آرام ڈھونڈنے کے سراسر خلاف ہے۔

۴۳۰ ۔ ان کو مُردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں۔ موت کا لفظ اور اس کا تصور انسان کے ذہن پر ایک ہمت شکن اثر ڈالتا ہے اس لیے اس بات سے منع کیا گیا کہ شہداء فی سبیل اللہ کو مردہ کہا جائے کیونکہ اس سے جماعت کے افراد میں جذبہ جہاد اور رُوح جانفروشی کے سرد پڑ جانے کا اندیشہ ہے اس کے بجائے ہدایت کی گئی کہ اہلِ ایمان اپنے ذہن میں یہ تصور جمائے رکھیں کہ جو شخص خدا کی راہ میں جان دیتا ہے وہ حقیقت میں حیاتِ جاوداں پاتا ہے۔ یہ تصور مطابقِ واقعہ بھی ہے اور اس سے رُوح شجاعت بھی تازہ ہوتی اور تازہ رہتی ہے[1]

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۲۶

اللہ کی راہ میں محنت کی آخری حد خطرات سے بے پرواہ ہو کر اپنی زندگی کو اللہ کی راہ میں داؤ پر لگا دینا ہے۔ اللہ کی راہ میں محنت کا یہ انتہائی جذبۂ کمال ہے۔ ایسے جاں نثار اور جانباز بندہ کا انعام یہ ہے کہ اس نے اپنی جس عزیز ترین متاع کو اللہ کی راہ میں قربان کیا ہے وہ ہمیشہ کے لیے اس کو بخش دی جائے یعنی فانی حیات کے بدلے اس کو ابدی حیات عطا کر دی جائے۔

ان جان نثاروں کا نام شریعت کی اصطلاح میں شہید ہے کیونکہ یہ اپنے خون کے قطروں سے شہادتِ حق کا فرض انجام دیتے ہیں۔ یہ عشق و محبت کی راہ کے شہید زندہ جاوید ہیں۔ یہ اپنے اسی خونی گلگوں پیراہن میں قیامت کے دن اٹھیں گے اور حق کی جو عملی شہادت اس زندگی میں انہوں نے ادا کی تھی اس کا صلہ اس زندگی میں پائیں گے۔

اس آیت کی تشریح میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو کچھ فرمایا ہے وہ احادیث میں مذکور ہے جن میں شہداء کی فضیلت اور ان کی اخروی نعمتوں کی تفصیل نہایت موثر الفاظ میں ہے۔ شہادت کے اسی عقیدہ نے اہلِ ایمان میں مشکلات کے مقابلے میں اور دشمنوں سے بے خوفی کی وہ روح پیدا کر دی تھی کہ کیسے ہی ناخوشگوار اور ناموافق حالات پیش آتے ان کے عزم و ارادے میں کوئی ضعف نہ آتا۔ ان کے سکون و اطمینان میں کوئی فرق نہ پڑتا، تعداد اور ساز و سامان کو وہ ہیچ سمجھنے لگے تھے۔ مادہ اور اسباب کی پرستش سے بے نیاز ہو چکے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ شہادت بہت بڑا انعام ہے۔ یونس نے بسند ابن اسحاق روایت کیا ہے کہ مسلمانوں کو جب معلوم ہوا کہ ہرقل ایک لاکھ رومیوں اور ایک لاکھ مستعربین کے ساتھ 'ماب' میں آپہنچا ہے۔ مسلمانوں کی تعداد تین ہزار سے زیادہ نہ تھی تو ان کو بڑی فکر دامن گیر ہوئی۔ اور دو راتیں 'معان' میں قیام کر کے جنگ کے مسئلہ پر غور کرتے رہے۔ بعض لوگوں کی رائے ہوئی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تمام حالات لکھ دیے جائیں اور دشمن کی تعداد سے مطلع کیا جائے۔ یا تو مدد کو پہنچیں اور یا ہمیں کوئی اور حکم دیں جس پر ہم عمل کریں۔ عبداللہ بن رواحہ نے یہ رائے سن کر لوگوں کو ہمت دلائی اور کہا کہ اے لوگو! خدا کی قسم تم اسی 'شہادت' سے گھبرا رہے ہو جس کے لیے تم نکلے تھے۔ ہم دشمنوں سے تعداد اور قوت کے بھروسہ پر نہیں لڑتے۔ ہم تو اس دین کے بھروسہ پر لڑتے ہیں جس کے ذریعے اللہ نے ہم کو عزت بخشی۔ چلو۔ ہمیں دو بھلائیوں میں سے ایک ضرور ملے گی۔ شہادت یا فتح۔ لوگوں نے کہا خدا کی قسم ابن رواحہ سچ کہتے ہیں اور لوگ چل پڑے[1]

[1] البدایہ والنہایہ ج ۴ ص ۲۴۳

جنگ یرموک کے دن ابوعبیدہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا میں شہادت کے لیے بالکل تیار ہو گیا ہوں اور انشاٰٰء اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچوں گا۔ آپ کا کوئی پیغام تو نہیں ہے؟ انہوں نے کہا آپ سے میرا سلام کہہ دینا اور کہنا یارسول اللہ ہم نے اپنے خدا کا وعدہ سچا پایا[1]

۱۳۱۔ لیکن تم ان کی زندگی کا شعور نہیں رکھتے ہو۔ یعنی جس نے اللہ کے لیے جان دی وہ اُس جہان میں جیتے ہیں مگر تم کو ان کی زندگی کی خبر اور اس کی کیفیت معلوم نہیں اور یہ سب صبر کا نتیجہ ہے[2]

آیت میں شہداء کی حیات کو ثابت کیا ہے لیکن یہ سوال کہ یہ حیات کس نوعیت کی ہے اس کا جواب قرآن ہی نے اس فقرے میں دیا ہے۔

ولکن لا تشعرون　　لیکن تمہیں اس کا پتہ نہیں ہے

شہداء کی زندگی

ظاہر ہے کہ چونکہ شہداء کی اس زندگی کا تعلق عالمِ غیب سے ہے اور عالمِ غیب کے حقائق کا ادراک ہم یہاں اپنے محسوسات کے ذریعے کر نہیں سکتے اس لیے ہم سے اس زندگی کے ماننے کا مطالبہ ہے جاننے کا نہیں۔ اس موضوع پر ہم اپنی رائے سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم جو کچھ کہہ سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ وہ پاکباز روحیں جنہوں نے اپنے خاکی جسموں، فانی زندگیوں، مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا تو اُن کو خدا کی طرف سے ایک مثالی جسم، غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و عشرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جاتی ہے یہ پُرمسرت زندگی کیسی ہوگی اس کی تفصیل آلِ عمران میں آ رہی ہے یعنی چوتھے پارے میں۔

احادیثِ صحیح میں ہے کہ ان زندہ شہیدوں کی روحیں قفسِ عنصری سے پرواز کر کے جب اڑتی ہیں تو وہ سبز پرندوں کی صورت میں جنت کی سیر کرتی ہیں اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا نشیمن بنتی ہیں۔ شہید کی نسبت گو یہ کہنا صحیح ہے کہ وہ مر گیا۔ لیکن اس کی موت کو دوسروں کی سی موت کہنا منع ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ مرنے کے بعد حیاتِ برزخی اگرچہ ہر شخص کی رُوح کو حاصل ہے

---

[1] البدایہ والنہایہ ج ۷ ص ۱۷　[2] حاشیہ شیخ الهندؒ ص ۲۹

لیکن شہید کی اپنی حیات میں دوسروں سے ایک خاص امتیاز حاصل ہے اور وہ یہ ہے کہ اس میں آثارِ حیات اوروں سے زیادہ قوی ہیں۔ شہید کی اسی قوتِ حیات کا ایک اثر عالم میں اس کے جسم خاکی تک پہنچتا ہے کہ اس کے جسم کو باوجود مجموعہ گوشت پوست ہونے کے غسل نہیں دیا جاتا کیونکہ غسل مُردہ جسم کو دیا جاتا ہے۔ اور اسے اس کے کپڑوں ہی میں کفنایا جاتا ہے یعنی جو ان کا لباسِ دنیا ہے وہی لباسِ قبر ہے کیونکہ ان کی زندگی ختم نہیں ہوتی ہے

ایمان کا حقیقی امتحان

۲۴۴۔ اور ہم تمہیں کچھ خطرات کے خوف، بھوک کی تکلیف، مالوں، جانوں اور پیداوار میں نقصان کے ذریعے ضرور آزمائیں گے۔ پہلے تو ان کا ذکر تھا جنہوں نے صبر کا اعلیٰ مقام حاصل کیا یعنی شہداء اب فرماتے ہیں کہ تمہارا علی العموم تھوڑی تھوڑی تکلیف اور مصیبت میں وقتاً فوقتاً امتحان لیا جائے گا اور تمہارے صبر کو دیکھا جائے گا۔ صابرین میں داخل ہونا کچھ سہل نہیں اس واسطے پہلے سے متنبہ فرمایا[1]

اہلِ ایمان کو بتایا ہے کہ مصیبتیں اور بلائیں ان پر یقیناً آئیں گی لیکن یہ بطور سزا اور عذاب نہیں بلکہ ابتلاء و امتحان کے رنگ میں۔ اس ارشاد کے ذریعے ان کی تسلی و تسکین کا بہترین سامان بہم پہنچا دیا۔ آزمائشِ خداوندی سے مقصود نتائج کو دُنیا پر ظاہر کر دینا ہوتا ہے ورنہ حق تعالیٰ کو یہ علم ہمیشہ سے حاصل ہے[2]

آزمائشیں کیوں ؟

ہر دعوت کو لے کر چلنے والوں کے لیے آزمائشوں سے گزرنا ضروری ہے تاکہ ان میں ایک طرف حق کی خاطر سختیاں اور مصائب برداشت کرنے کی عادت ہو جاتے اور دوسری طرف وہ جس علم و عمل کو اپنا چکے ہیں اس کی جان توڑ حفاظت کر سکیں۔ کیونکہ نفسیات کا یہ اصول ہے کہ مقصد اور نصب العین کی خاطر جس قدر تکلیفیں برداشت کی جاتی ہیں وہ نصب العین اسی قدر دلوں میں راسخ ہوتا ہے اور اس سے والہانہ محبت ہو جاتی ہے۔ مصائب اور تکالیف ہی میں

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۲۹ [2] ماجدی ص ۵۹

ایمان باللہ کا حقیقی امتحان ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے

پرچۂ امتحان

یہاں جن چیزوں کو پرچۂ امتحان بنا کر پیش کیا ہے ان پر غور فرمائیے۔ خوف، بھوک، مالوں میں خسارہ جانوں کی ہلاکت اور پیداوار کی تباہی۔ خوف کا لفظ بڑا ہی جامع ہے۔ اس میں والدین کی ناراضگی کا خوف اولاد کے چھوٹ جانے کا خوف، برادری اور قوم کے بگڑ جانے کا خوف، اربابِ اقتدار کے عتاب کا خوف، عزت کے چلے جانے کا خوف، مکانوں کے چھن جانے کا خوف اور وطن کے چھوٹ جانے کا خوف سب ہی داخل ہیں۔ الجوع بھوک نصب العین کی خاطر بھوک پیاس سے دوچار ہونا پڑے۔ اور معیشت میں حق کی خاطر بحران پیدا ہو جائے تو اس سے دل برداشتہ نہ ہو، مالوں کے خسارے میں کاروبار، تجارت، جائداد کا خسارہ داخل ہے۔ جانوں کی ہلاکت میں گرفتار ہونا، سزاؤں اور عقوبتوں سے دوچار ہونا اور قتل ہونا سب داخل ہیں۔ اور پیداوار کی تباہی میں تمام ذرائع معاش داخل ہیں۔ ان چند لفظوں میں وہ سب کچھ کہہ دیا گیا جو بڑے بڑے دفاتر میں بھی نہیں کہا جا سکتا۔

غور فرمائیے قرآن فطرتِ انسانی کی کمزوریوں کا کس طرح کھوج لگاتا ہے فرمایا کچھ خوف، بھوک، مالی، جانی اور پیداواری نقصان سے تمہیں آزمائیں گے، یعنی عزائم و مقاصد کی راہ میں جب کبھی قدم اٹھایا جائے گا تو ناگزیر ہے کہ صورتِ حال میں انقلاب ہو۔ اور جب انقلاب ہوگا تو عارضی طور پر ہر قسم کے خوف سے دوچار ہونا پڑے گا۔ بھوک کی تکلیف برداشت کرنی پڑے گی۔ مال جان اور پیداوار ذرائع کے لیے خطرات نمودار ہوں گے۔

صحابہؓ کی امتحان میں کامیابی

ان آزمائشوں میں صحابہ کرام جس طرح پورے اترے اس کی شہادت تاریخ نے محفوظ کر لی ہے اور محتاج بیان نہیں۔ بلا شائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کے کسی گروہ نے کسی انسان کے ساتھ اپنے سارے دل اور اپنی ساری روح سے ایسا عشق نہیں کیا ہوگا جیسا صحابہؓ نے اللہ کے رسولؐ سے راہِ حق میں کیا۔ انہوں نے دعوتِ حق کی راہ میں سب کچھ قربان کر کے قرآن کے پیش کردہ پرچہ امتحان میں پوری پوری کامیابی حاصل کی۔ اور پھر اسی راہ سے وہ سب کچھ پا یا جو انسانوں کی کوئی جماعت پا سکتی ہے۔

۲۲۳۔ خوش خبری دیجیے ان صبر کرنے والوں کو جو مصیبت آنے پر کہتے ہیں۔ کہنے سے مراد صرف زبان سے ان الفاظ کا کہنا نہیں بلکہ دل سے اس بات کا قائل ہونا ہے کہ ہم اللہ ہی کے ہیں۔ اس لیے اللہ کی راہ میں ہماری جو چیز قربان ہوئی وہ گویا ٹھیک اپنے مصرف میں صرف ہوئی جس کی چیز تھی اُسی کے کام آگئی اور یہ کہ اللہ ہی کی طرف ہمیں پلٹنا ہے یعنی بہرحال ہمیشہ اس دنیا میں رہنا نہیں ہے۔ آخر کار دیر یا سویر جانا خدا ہی کے پاس ہے لہٰذا کیوں نہ اس کی راہ میں جان لڑا کر اس کے حضور حاضر ہوں۔ یہ اس سے لاکھ درجہ بہتر ہے کہ ہم اپنے نفس کی پرورش میں لگے رہیں اور اسی حالت میں اپنی موت ہی کے وقت کسی بیماری یا حادثے کے شکار ہو جائیں[1]۔

فتح مشکلات کی کنجی

پہلی آیت میں استعینوا بالصبر والصلوٰۃ کہہ کر بتایا گیا۔ صبر اور دُعا فتح مشکلات کے طلسم کی کنجی ہے۔ دُعا سے ان کے دل میں اثر اور گداز پیدا ہوگا اور صبر کی عادت سے قبولِ حق کی راہ کی مشکلات دُور ہوں گی۔ کیونکہ سختیوں میں انسان کی پوشیدہ قوتیں اور طاقتیں اُبھر آتی ہیں اور دلوں میں ایسی کشادگی پیدا ہو جاتی ہے جس کا احساس تکالیف میں ہوتا ہے۔

جب سب سہارے ٹوٹ جاتے ہیں اور مومن انا للہ کہہ کر صرف اللہ سبحانہٗ کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں خشیتِ خداوندی کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ اس وقت کائنات کے سارے پردے ہٹ جاتے ہیں اور اللہ سبحانہٗ کی ذات ساری کائنات پر غالب نظر آتی ہے اس وقت مومن میں یہ احساس اجاگر ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا کچھ نہیں۔ طاقت و قوت کا سرچشمہ صرف اللہ کی ذات ہے۔ ارادہ صرف اللہ ہی کا ارادہ ہے۔ اللہ کے سوا کوئی ٹھکانہ نہیں ہے اس کی ذاتِ گرامی اس ساری کائنات کی یکتا حقیقت ہے۔

اس آیت نے بتا دیا کہ مسلمانوں کو کیونکر زندہ رہنا چاہیے۔ جان و مال کی جو مصیبت پیش آئے اس کو صبر، ضبطِ نفس اور ثابت قدمی سے برداشت کریں اور یہ سمجھیں کہ ہم اللہ کے محکوم ہیں۔ آخر بازگشت اسی کی طرف ہوگی۔ اس لیے راہِ حق میں مرنے اور مال و دولت کو لٹانے میں کوئی دریغ نہ کرنا چاہیے۔ اس راہ میں موت حیاتِ جاوید کی بشارت ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۲۷

آیت صبر کی معنویت

ذرا ٹھہر جائیے اور اس فقرے کی معنویت پر ایک نظر ڈال لیجئے۔ اصل ارشاد عربی میں ان الفاظ میں ہے انا للہ وانا الیہ راجعون - اس آیت میں سب سے پہلے مصائب کا ذکر ہے۔ فضاؤں پر خوف وہراس ہے، بھوک وپیاس کی شدت کے بادل اُمنڈ اُمنڈ کر آرہے ہیں۔ مال لٹ رہے ہیں، مکان چھن رہے ہیں، جانیں تلف ہو رہی ہیں۔ ذرائع معاش پر دُشمن کا پہرا ہے۔ گویا درد وغم کی انتہا ہے مگر ساتھ ہی صبر ویقین کی رُوح بھی چھائی ہوئی ہے اور اس طرح چھائی ہوئی ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ درد وغم کے طوفان اُٹھ رہے ہیں لیکن صبر ویقین سے ٹکرا کر رہ جاتے ہیں اس پر غالب نہیں آسکتے - یہی صورت حال اس آیت میں بیان شدہ لوگوں کی سیرت کی ہے۔

قرآن کی معجزانہ بلاغت یہ ہے کہ مدینہ کی زندگی کے پُرآشوب ماحول کی چند لفظوں میں دلکش منظر کشی کردی ہے۔ اور صورتِ حال کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ سننے والا اس آیت کو سُن کر یہ تاثر لیتا ہے کہ ہجوم مصائب میں درد وغم کی شدت نمایاں طور پر محسوس ہو رہی ہے۔ گھر سے بے گھر ہونے کی آتشِ فراق کا دھواں آنکھوں سے بے اختیار بہ رہا ہے۔ اور مصائب میں جسموں کا ایک ایک ریشہ اس طرح گھل رہا ہے گویا پوری زندگی سرتاپا جاں گدازی وہلاکت کی تصویر ہے اور یہ حالت ایک دن کی حالت نہیں بلکہ الصابرین کا صفت کا صیغہ بتا رہا ہے کہ پوری زندگی کی ہر صبح اور شام اسی میں بسر ہو رہی ہے۔ مقصود مومنین صابرین کی عادت کا بیان ہے اذا یہاں کسی ایک اتفاقی واقعہ کے لیے نہیں عام عادت کے اظہار کے لیے ہے۔ اسی حالت میں جب اللہ پر یقین کی روشنی چمکتی ہے تو اس کا حال یہ ہے کہ دُنیا کے سب سہارے جواب دے چکے ہیں۔ اُمید کے سارے رشتے یک قلم ٹوٹ چکے ہیں۔ ہر طرف سے آواز آرہی ہے کہ کامیابی کی کوئی اُمید نہیں ہے لیکن صحابہ کرام کے دلوں کے ایک ایک ریشے سے صدا یہ ہے اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ

تین چیزوں کی تعلیم

اس فقرے میں تین چیزوں کی تعلیم دی گئی ہے

ایک یہ کہ ہم سب بندے ہیں اور تمام تر اسی کی ملک ہیں۔ ہم خود بھی اور ہماری ہر چیز بھی

اپنی کوئی چیز نہیں، نہ بیوی نہ بچے نہ مال نہ جائداد، نہ وطن نہ خاندان نہ جسم نہ جان - انسان کے سارے رنج، درد و غم کی بنیاد صرف یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی محبوب چیزوں کو اپنی سمجھتا ہے لیکن جب ذہن اس عام مغالطہ سے خالی ہو جاتا ہے اور ہر چیز کے بارے میں یہ یقین پختہ ہو جاتا ہے کہ اپنی نہیں ہے تو گلہ شکوہ، رنج و غم کا سوال ہی نہیں رہتا -

دوسرے یہ کہ بڑے بڑے رنج اور صدمے اور دل کے داغ بھی وقتی اور عارضی ہیں - رہ جانے والے کوئی بھی نہیں ہیں - عنقریب انہیں چھوڑ چھاڑ کر مالک کی خدمت میں حاضری دینا ہے -

تیسرے یہ کہ وہاں پہنچتے ہی سارے قرضے بیباق ہو جائیں گے - ہر کھوئی ہوئی چیز وصول ہو کر رہے گی، یہ تینوں عقیدے جس کے جتنے زیادہ مضبوط ہوں گے - اسی قدر اس کے دل کو دنیا میں امن و سکون حاصل رہے گا - غم کو ہلکا کرنے کا جو تیر بہدف نسخہ یہاں بتایا گیا ہے یہ صحائف کائنات میں بے نظیر ہے بلکہ حق یہ ہے کہ اگر قرآن حکیم میں صرف یہی ایک آیت ہوتی تو قرآن کے اللہ کا کلام ہونے کے لیے واللہ کافی تھی [1]

۲۳۴ - یہی لوگ ہیں جن پر ان کے پروردگار کی جانب سے عنایات اور رحمتیں ہوتی ہیں - یعنی جن لوگوں نے صبر کیا اور کفرانِ نعمت نہ کیا بلکہ ان مصائب کو وسیلہ ذکر و فکر بنایا تو ان کو اے پیغمبر ہماری طرف سے بشارت دے دو [2]

علیھم صلوات کا فقرہ اس موقعہ پر بہت بڑی معنویت رکھتا ہے - اہلِ لغت کی اکثریت کہتی ہے صلاۃ بمعنے دعا آتا ہے اور اللہ کی جانب نسبت ہو تو بمعنے رحمت ہے - صاحب روح نے یہاں اسے بمعنے ثنا اور مغفرت لیا ہے - دوسرے علماء نے اس کے عنایات خاصہ کے معنے لکھے ہیں -

حافظ ابن القیمؒ نے یہاں ایک مفید بات ارشاد فرمائی ہے -

یہ کہنا کہ صلوٰۃ کی نسبت اگر اللہ کی طرف ہو تو رحمت کے معنے میں ہوتا ہے - تین وجوہ سے غلط ہے -

اولاً اس لیے کہ اس آیت میں دونوں یکجا استعمال ہوئے ہیں - عطف کی مغایرت چاہتی ہے

---

[1] ماجدی ص ۵۹ [2] شیخ الہندؒ ص ۲۹

کہ جو معنے صلاۃ کے ہوں وہ رحمت کے نہ ہوں۔

ثانیاً اس لیے رحمت کی طلب گاری ہر مسلمان کے لیے مشروع ہے لیکن صلاۃ صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مخصوص ہے اور آپ کا بالذات حق ہے۔ اسی لیے علماء نے حضور انور کے علاوہ کسی خاص شخص کے لیے صلاۃ سے منع کیا ہے۔

ثالثاً رحمتِ الٰہی عام ہے جبکہ صلاۃ خاص ہے

حافظ ابوالقاسم السہیلی فرماتے ہیں کہ لفظ صلاۃ دراصل شفقت وعنایت کے معنے میں ہے جیسے شفقت اور عنایت محسوس اور معقول دونوں طرح کی ہوتی ہے ایسے ہی صلاۃ بھی دونوں قسم کی ہوتی ہے۔ اللہ کی طرف جب اس کی نسبت ہوتی ہے تو وہ صلاۃ معقول مراد ہوتی ہے۔ جیسے لفظ علو دونوں معنوں میں استعمال ہوتا ہے محسوس اور معقول، محسوس اجسام کی صفت بن کر آتا ہے مگر معقول اللہ سبحانہٗ کی صفت ہوتا ہے۔

اسی بنا پر شاہ عبدالقادرؒ نے اس موقعہ پر صلاۃ کے معنے کے لیے ایسی خوبصورت اور انوکھی تعبیر اختیار کی ہے جس میں صلاۃ کے اصل معنے کی پوری پوری رعایت ہے اور مقام کے بہت زیادہ مناسب ہے فرماتے ہیں کہ

یہی لوگ ہیں جن پر شاباشیں ہیں ان کے رب کی اور مہربانی۔

واقعی منصبِ امامت سپرد کر دینے کے بعد اس منصب کے لائق جس کردار کا دلکش منظر پیش کیا گیا ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ شاباش کہی جاتے۔ اگرچہ اس کی جگہ لفظ عنایت بھی آسکتا ہے لیکن جو بات شاباش میں ہے وہ عنایات میں کہاں۔

علیھم صلوات

یاد رہے کہ یہ فقرہ جملہ خبریہ ہے جملہ انشائیہ نہیں ہے۔ یعنی اس میں اُمت پر صلاۃ ہونے کی خبر دی جا رہی ہے دُعا نہیں کی جا رہی ہے۔ عربی زبان میں یہ پیمانہ خبر ہی کے لیے آتا ہے دُعا کے لیے نہیں ہوتا۔ علماء نے تصریح کی ہے اور صاحب روح نے اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ اگر یہ پیمانہ یعنی الصلوٰۃ علی رسول اللہ کسی شخص نے درود کی جگہ پڑھا تو درود کا نبوت پر قرآنی مطالبہ ہرگز پورا نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ اس پیمانہ میں صلوٰۃ کی نسبت اللہ کی طرف نہیں ہے۔ علامہ آلوسی رقم طراز ہیں:

بخلاف الصلوۃ علی رسول اللہ لا یجزئ اتفاقاً قالا نہ لیس فیہا اسناد الصلوۃ

الی اللہ تعالیٰ

برخلاف الصلوٰۃ علی رسول اللہ کے کہ بالاتفاق درود کا پیمانہ ناکافی ہے کیونکہ اس میں صلاۃ کی نسبت اللہ کی طرف نہیں ہے۔

یہ بھی ایک وجہ ہے لیکن اصل بات وہی ہے کہ یہ دُعائی پیمانہ نہیں ہے اور اس کے دُعائی پیمانہ نہ ہونے کی وجہ اصولی یہ ہے کہ

اہلِ عرب سے یہ دُعائی پیمانہ منقول نہیں ہے۔ اس قسم کے دُعائی پیمانے سماعی ہیں قیاسی نہیں ہیں۔ اور سماعیات کا ضابطہ یہی ہے کہ وہ ہی الفاظ استعمال ہوتے ہیں جو اہلِ عرب سے سنے گئے۔ السلام علیک اہلِ عرب بولتے ہیں لیکن الصلوٰۃ علیک کبھی نہیں بولتے۔

یہی وجہ ہے کہ درود کے بارے میں جب قرآن نے مسلمانوں سے کہا کہ

صلوا علیہ و سلموا تسلیماً

تو صحابہ کرام نے حضور انورؐ سے دریافت کیا کہ یا رسولؐ اللہ سلام کا تو ہمیں پتہ ہے یہ بتائیے کہ صلاۃ کیسے ہو۔ یہ حدیث بحوالہ کعب بن عجرہؓ محدثین میں سے امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد، امام نسائی، امام ترمذی، امام ابن ماجہ نے پیش کی ہے۔ صحابہ نے جو کچھ دریافت کیا سوال کے الفاظ یہ تھے،

اما السلام علیک فقد علمنا فکیف الصلوٰۃ علیک

اگر سلام کے پیمانہ کی طرح صلوٰۃ کا پیمانہ بھی الصلوٰۃ علیک ہے تو صحابہ کا یہ سوال بے معنے ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ اگر الصلوٰۃ علیک بھی صلوٰۃ کا ویسا ہی پیمانہ ہے جیسے السلام علیک سلام کا تو پھر دریافت کیوں کر رہے ہیں معلوم ہوا کہ السلام علیک صحابہ کے علم کے مطابق سلام کا پیمانہ ہے اور الصلوٰۃ علیک صحابہ کے علم کے مطابق صلوٰۃ کا پیمانہ نہیں ہے اس لیے صحابہ نے حضور انورؐ سے دریافت کیا آگے حضور انورؐ نے صحابہ کو جو پیمانہ بتایا ہے وہ یہ ہے۔

اللھم صل علی محمد و علی آل محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انک حمید مجید۔

علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ اس ارشادِ گرامی کا منشا یہ ہے کہ قرآن کے مطالبہ درود کی بجا آوری صرف اس صورت میں ہو سکتی ہے کہ اسے اللہ سے طلب کیا جائے اور بس۔ اس موضوع کے تفصیلی مباحث انشاء اللہ پارہ ۲۲ سورۂ احزاب میں آئیں گی۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ ۖ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ أَوِ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا ۚ وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿١٥٨﴾

بلاشبہ صفا اور مروہ[435] نامی دو پہاڑیاں اللہ کی نشانیوں[436] میں سے ہیں
پس جو شخص بھی حج یا عمرہ[437] کی نیت سے بیت اللہ کا ارادہ کرے
تو اس کے لیے کوئی گناہ نہیں[438] ہے کہ وہ ان دونوں کا طواف کرے
اور جو شخص بھی خوش دلی[439] کے ساتھ نیکی کا کوئی کام کرتا ہے تو اللہ
ہر عمل کی قدردانی کرنے والا[440] سب کچھ جاننے والا ہے :

مرکزِ قبلہ سے مناسک کی وابستگی

خانہ کعبہ کو قبلہ بنانے کا لازمی نتیجہ یہ تھا کہ مکہ شہر پر مسلمانوں کو بالادستی حاصل ہو تاکہ حضرت ابراہیمؑ کا بنایا ہوا گھر شرک و گناہ کی آلودگی سے پاک ہو لاتم نعتی میں اشارۃً اس بالادستی کی بشارت سنا کر مسلمانوں کو اس مقصد کے حصول کے لیے راستہ بتایا۔ اب اس آیت کے ذریعے یہ بتایا جا رہا ہے کہ خانہ کعبہ صرف نمازوں میں توجہات کا قبلہ ہی نہیں بلکہ حج اور عمرے کے مناسک کی ادائیگی کا مقام بھی ہے۔ اور اسی سلسلہ میں ذہنوں میں آنے ہوتے اس سوال کا جواب بھی دے دیا کہ صفا اور مروہ کا طواف مناسکِ حج اور عمرہ سے ہے یا محض زمانۂ جاہلیت کی ایجاد ہے۔ کیونکہ زمانۂ جاہلیت میں صفا پر اساف اور مروہ پر نائلہ کے استھان بنا لیے گئے تھے اور ان کے گرد طواف ہونے لگا تھا۔ مسلمانوں کے دلوں میں یہ خلش پیدا ہوئی کہ آیا صفا اور مروہ کی سعی کا حج اور عمرہ سے کوئی تعلق ہے یا نہیں اور یہ کہ یہ کردار کہیں مشرکانہ عمل کی کاپی تو نہیں ہے۔ نیز حضرت عائشہؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ مدینہ کے دلوں میں پہلے ہی سے سعی بین الصفا والمروہ کے بارے میں کراہت موجود تھی کیونکہ وہ منات کے معتقد تھے اور اساف و نائلہ کو نہیں مانتے

تھے۔ قرآن نے اس آیت کے ذریعے بتادیا کہ ان دونوں مقامات کے درمیان حج اور عمرہ میں سعی کرنا مناسک میں سے ہے۔ جیسے خانہ کعبہ میں بتوں کا ہونا خانہ کعبہ کے قبلہ ہونے سے مانع نہیں ہے۔ ایسے ہی صفا و مروہ پر نائلہ اور اساف کا ہونا طواف میں رکاوٹ نہیں۔ ان مقامات کا تقدس خدا کی جانب سے ہے۔ جاہلیت کی وقتی برائی سے ان کے دامانِ تقدس پہ کوئی داغ نہیں آسکتا۔

۴۲۵۔ بلاشبہ صفا اور مروہ دو پہاڑیاں۔ صفا اور مروہ کعبہ کے قریب دو پہاڑیاں ہیں۔ اگرچہ اب برائے نام رہ گئی ہیں۔ تاہم کچھ کچھ نشانات باقی ہیں۔ صفا وہ پہاڑی معلوم ہوتی ہے۔ جہاں حضرت ابراہیم اپنی سواری کے گدھوں اور نوکروں کو چھوڑ کر اکیلے حضرت اسماعیل کو لے کر آگے بڑھے تھے۔ اور مروہ وہ پہاڑی ہے جس پر حضرت ابراہیم نے حضرت اسماعیل کی قربانی کرنی چاہی اور غیب کی آواز سے رک گئے اور اسماعیل کی جگہ پر مینڈھا قربان کیا۔ بعض روایتوں میں ہے کہ حضرت ہاجرہ اسماعیل کو لے کر جب یہاں آئی تھیں اور وہ پیاس سے بے تاب ہو گئے تھے تو حضرت ہاجرہ صفا اور مروہ کے درمیان پانی کی تلاش میں دوڑی تھیں اور آخر زمزم کا چشمہ ان کو نظر آیا۔ یہ صفا و مروہ کی سعی ان کی اسی مضطربانہ دوڑ کی یادگار ہے۔ بہرحال حج اور عمرہ میں پہلے صفا پر پھر مروہ پر چڑھ کر کعبہ کی طرف منہ کر کے خدا کی حمد کرتے اور دعاء مانگتے ہیں۔ پھر اس سے اتر کر دعائیں مانگتے ہوتے مروہ پر آتے ہیں۔ وہاں بھی دعائیں مانگتے ہیں کہ یہ دونوں وہ مقامات ہیں جہاں روحانی کرشمے کے عظیم الشان جلوے حضرت ابراہیم اور ہاجرہ کو نظر آتے۔

۴۲۶۔ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اصل ارشاد میں شعائر اللہ اللہ کی نشانیاں یعنی وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے نشانِ بندگی قرار دیا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں۔ شعائر شعیرہ کی جمع ہے اور ابن فارس نے اس کا واحد شعار بتایا ہے۔ ہر وہ شئ جو کسی کے لیے نشان مقرر ہو یا جو کسی علامت کو بتاتے اسے شعیرہ کہتے ہیں۔ اور امام ابوبکر جصاص رازی رقم طراز ہیں۔ اہلِ لغت کا بیان ہے کہ شعائر شعیرہ کی جمع ہے۔ شعیرہ وہ نشانی ہے جو اس چیز کو بتاتی ہے جس کے لیے وہ مقرر کی گئی ہے۔ اشعار بدن کے معنے یہ ہیں کہ جانور پر ایسی نشانی لگادی جائے جس سے معلوم ہو جائے کہ یہ قربانی کا جانور ہے۔ اسی بنا پر کہتے ہیں کہ شعائر مناسکِ حج کی تمام علامات کا نام ہے اور سورۂ مائدہ میں آیت لا تحلوا شعائر اللہ اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ شعائر اللہ، اللہ کے دین کے تمام نشانات پر حاوی ہے یعنی دین کے وہ فرائض اور نشانات کہ جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتلادیا ہے کہ ان کے حدود سے

تجاوز نہ کریں اور ان کے حقوق میں کوتاہی نہ کریں۔ اور ان کو ضائع نہ ہونے دیں۔ یہ معنے ان تمام معانی کو جامع ہیں جو سلف سے اس کی تشریح میں منقول ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں باب تعظیم شعائر ایک مستقل عنوان قائم کر کے شعائر اللہ کی تشریح کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ شعائر اللہ وہ محسوس اور مرئی اُمور ہیں جن کے ذریعے اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اور اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں ان کی تعظیم اللہ کی تعظیم اور ان کی بے حُرمتی و بے ادبی جناب الٰہی میں بے ادبی ہے۔ اسلام میں بزرگ تر شعائر چار ہیں۔ قرآن، خانہ کعبہ، ذاتِ پیغمبر اور نماز ان کے بعد ہر ایک کے بارے میں شعیرہ ہونے کی حیثیت پیش کی ہے۔

شاہ عبدالعزیز نے شعائر کے معنے میں ذرا وسعت کر دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ دین کے عرف میں شعائر مکانات، اوقات اور علامات عبادت کو کہتے ہیں۔ کعبہ، عرفات، مزدلفہ، رمی جمار، صفا و مروہ، منیٰ اور مساجد، رمضان، حرمت کے مہینے، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، جمعہ ایام تشریق، اذان، تکبیر، ختنہ، نماز با جماعت، نماز جمعہ، عیدین سب اللہ کے شعائر ہیں۔

شائد آپ یہاں یہ خلش محسوس کریں کہ جن اعمال کی شرعیت ہمارے ادراک سے بالا ہے ان پر عمل کرنا بغیر سمجھے عبث ہے۔ لیکن جناب الٰہی کے احکام میں ایسا سوچنا غلط ہے۔ کیونکہ ہمارا اعتقاد ہے کہ اللہ سبحانہٗ اپنی رحمت و حکمت سے عمل کے وہی پیمانے تجویز کرتا ہے جن میں ہمارے لیے سرتا سر خیر ہی خیر ہے۔ امام غزالیؒ فرماتے ہیں کہ ہماری مثال اس شخص کی ہے جو کسی ڈاکٹر پر بھرپور اعتماد کر کے اس کا نسخہ استعمال کرے اور اس سے اس کو فائدہ پہنچے۔ وہ اگرچہ نسخہ کے اجزاء کا واقف نہیں اور ہر چیز کے خواص سے نابلد ہے۔ اس کے لیے یہ جاننا ہی کافی ہے کہ یہ دوا نافع ہے۔ یہی حیثیت اسلامی شعائر کی ہے۔

بعض بزرگوں نے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ احکام شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ کچھ وہ احکام ہیں جو اُمت کے لیے بطورِ تعبد مقرر کیے گئے ہیں، مثلاً نماز بطریق مخصوص اور نماز میں خانہ کعبہ کی طرف رُخ کرنا۔ مناسک حج وغیرہ یہ ایسے احکام ہیں جن کی شرعیت کی مصلحت ہمارے ادراک سے بالا ہے۔ ان میں کمی و بیشی کے ہم مجاز نہیں۔ ان میں کسی کی رائے حجت نہیں ہے۔ ان میں کمی بیشی کے ذریعے دین میں بدعت کو گھس آنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کو شعائر کہتے ہیں۔ یہ گویا ایک مسلمان کی اسلامی زندگی کی نشانیاں ہیں۔

۲۔ کچھ احکام وہ ہیں جن کی شرعیت انسانی مصالح کی خاطر ہوتی ہے۔ ان کے اسباب و علل

تک ہماری رسائی ممکن ہے جیسے احکام معاملات، سیاست، معاشرت، عدالت۔ ان کو شعائر نہیں کہتے ہیں۔ گویا اسلامی قانون دو قسم کے احکام کا مجموعہ ہے[1]

اس سے پہلے تحویل قبلہ کا اور سب قبلوں میں افضل ہونے کا ذکر تھا۔ اب اس کے محل ادائے حج و عمرہ ہونے کو بیان فرماتے ہیں تاکہ ولاتمّ نعمتی علیکم کی تصدیق و تکمیل ہو جائے۔ یا یوں کہئے کہ اس سے پہلے صبر کی فضیلت مذکور تھی۔ اب یہ فرمایا گیا کہ دیکھو صفا و مروہ جو شعائر اللہ میں داخل ہیں اور ان میں سعی کرنا حج و عمرہ میں ضروری ہوا اس کی وجہ یہی ہے کہ یہ فعل صابرین یعنی حضرت ہاجرہ اور ان کے صاحبزادے حضرت اسماعیل کے آثار میں سے ہے۔ حدیث و تفسیر و تاریخ میں یہ واقعہ مصرح ہے جس کے دیکھنے سے ان اللہ مع الصابرین کی تصدیق ہوتی ہے[2]

۴۳۷۔ پس جو شخص بھی حج یا عمرہ کی نیت سے بیت اللہ کا ارادہ کرے۔ حج عبادات اسلامی کا چوتھا رکن یا نماز روزہ زکوٰۃ کے بعد چوتھا فریضہ ہے۔ اُمت کے ہر فرد پر خواہ وہ دُنیا کے کسی علاقہ کا باشندہ ہو۔ بہ شرط استطاعت و صحت و امن راہ عمر میں ایک بار فرض ہے۔ گویا دنیائے اسلام کی بین الاقوامی سالانہ کانفرنس ارکان حج یعنی جو چیزیں فرض ہیں وہ تین ہیں۔ ۱۔ پوشش احرام یعنی حدود حرم میں داخلے سے پہلے عام لباس اتار کر احرام یا بے سلا لباس پہن لینا۔ ۲۔ میدانِ عرفات میں ۹ ذی الحجہ کو حاضری بہ اصطلاح میں اسے وقوف کہتے ہیں۔ ۳۔ طواف زیارت یعنی وقوف کے بعد خانہ کعبہ کا طواف۔ اور واجبات حج چار ہیں۔ ۱۔ ۹ اور ۱۰ ذی الحجہ کی درمیانی شب میں مزدلفہ میں قیام۔ ۲۔ صفا و مروہ کے درمیان سعی ——— ۳۔ مزدلفہ میں قیام کے بعد منیٰ میں کنکریاں پھینکنا اصطلاحی نام رمی جمرات ہے۔ ۴۔ طواف کعبہ یہ طواف فرض کے علاوہ ہے۔ اور طوافِ صدر کہلاتا ہے۔ قربانی کرنا، سر کے بال اتروانا وغیرہ۔ بہت سے سنن اور مستحبات ان کے علاوہ ہیں۔ عمرہ۔ اس کا دوسرا نام حجِ اصغر ہے۔ اس میں حج کی طرح ماہ و تاریخ کی کوئی قید نہیں ہے نہ اس میں عرفات اور مزدلفہ کا وقوف ہے اور نہ ہی منیٰ کا قیام۔ سال کے ہر موسم میں اور ہر وقت ہو سکتا ہے۔ عمرہ کی نیت سے احرام میقات سے باندھے۔ طوافِ کعبہ اور صفا مروہ کے درمیان سعی کرے، بال اترولئے بس عمرہ ہو گیا، احرام کھول ڈالے۔

---

[1] تفسیر المراغی ص ۲۷

[2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۹

رسُومِ حج کی غرض و غایت

دراصل حج کے تمام مراسم اس پرانے عہد کے طریقِ عبادت کی یادگار ہیں جن کا باقی رہنا اس لیے ضروری ہے تاکہ انسانیت کے روحانی دورِ ترقی کا عہدِ آغاز ہماری نگاہوں کے سامنے ہمیشہ قائم رہی اور ہمارے جذبات و احساسات کو یہ تاریخ کی یاد سے پہلے کے واقعات ہمیشہ متحرک کرتے رہیں۔ اور خدا کی یاد اپنے گناہوں کی مغفرت اور آئندہ اپنی نیک زندگی گزارنے کا عہد ہماری حج سے پہلے اور حج کے بعد کی زندگیوں میں جوڑ پیدا کر کے تغیر و اصلاح کا ایک نیا باب کھولنے کا موقع دے۔ اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت وضاحت سے فرمایا۔ کنکری مارنے، صفا مروہ کے درمیان دوڑنے اور خانہ کعبہ کے طواف کرنے کا مقصد خدا کی یاد قائم کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہے [1]

حج کے مقامات عموماً پیغمبرانہ نشان اور ربانی شان کے جلوہ گاہ ہیں۔ جہاں پہنچ کر اور جن کو دیکھ کر وہ خدائی رحمت و برکت کے واقعات یاد آتے ہیں۔ اور اسی لیے قرآن کی اصطلاح میں ان کا نام شعائر ہے۔ یعنی خدا کے نشانات۔ اور ان ہی شعائر کی تعظیم و زیارت کا نام حج و عمرہ ہے۔ اس آیت میں لفظ شعائر سے اسی طرف اشارہ کیا ہے ان الصفا والمروۃ من شعائر اللہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ حج ہو یا عمرہ ان کا ایک بڑا مقصد ان مقامات کا ادب و احترام ہے تاکہ ان مقامات سے جو مقدس روایات وابستہ ہیں ان کی یاد قائم رہے اور دلوں میں تاثیر کی کیفیت پیدا ہوتی رہے۔

۴۲۸۔ تو اس کے لیے کوئی گناہ نہیں ہے۔ صفا اور مروہ کے درمیان سعی کرنا امام مالک اور امام شافعی فرض بتاتے ہیں لیکن امام ابوحنیفہ صفا و مروہ کے درمیان سعی کو واجب کہتے ہیں۔ اگر چھوڑ دے گا تو ایک بکرا ذبح کرنا پڑے گا۔ اور امام احمد کے نزدیک مستحب ہے۔ فلا جناح کی تعبیر سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ سعی بین الصفا والمروہ ضروری اور واجب نہیں ہے۔ چنانچہ صحیحین میں ہے کہ فقہاءِ سبعہ میں سے عروۃ بن الزبیر نے اس تعبیر سے یہی سمجھا اور اپنا یہ خیال حضرت عائشہ کے روبرو پیش کیا کہ اس تعبیر سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ صفا اور مروہ کے درمیان سعی واجب نہیں ہے۔ حضرت عائشہ نے فرمایا کہ اے میرے بھانجے آیت کا مطلب یہ نہیں

[1] ترمذی، نسائی

جو توسنے سمجھا اگر آیت کا مطلب یہ ہوتا تو انداز بیان یہ ہوتا فلاجناح علیہ ان لا یطوف بھما۔ صفا و مروہ کی سعی نہ کرنے میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ دراصل واقعہ یہ ہے کہ انصار قبل از اسلام منات کے پجاری تھے۔ اور جب وہ مسلمان ہوتے اور حج میں سعی بین الصفا والمروہ کا حکم آیا تو کفار کی مشابہت کی وجہ سے ان کو اشکال پیش آیا۔ اس پر قرآن نے ان کو بتایا۔ یعنی انصار کے اشکال کو دُور کرنے کے لیے یہ تعبیر اختیار فرمائی کہ فلاجناح علیہ ان یطوف بھما۔ یعنی خواہ اس میں کفار کی مشابہت ہے اس کے باوجود طواف کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اگر یہ بتانا مقصود ہوتا کہ صفا و مروہ کی سعی نہ کرنے میں کوئی مضائقہ اور گناہ نہیں ہے۔ بتانا یہ ہے کہ اساف و نائلہ بتوں کی موجودگی صفا و مروہ کی سعی کوئی گناہ والی بات نہیں ہے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص یہ مسئلہ دریافت کرے کہ جس کپڑے میں مقدار درہم سے کم نجاست لگی ہو تو اس میں نماز پڑھنا کیسا ہے؟ تو اس کا جواب یہی دیا جائے گا کہ ایسے کپڑے میں نماز پڑھنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ نماز فرض نہیں بلکہ مستحب ہے۔ یہی حکم سعی کا ہے[1]

صفا و مروہ کی تاریخ

مکہ میں اہل عرب حضرت ابراہیم کے وقت سے ہمیشہ حج کرتے تھے اور حج کرنے وقت صفا اور مروہ کا بھی طواف کرتے تھے۔ زمانۂ کفر میں ان دو پہاڑیوں پر دو بُت بھی رکھ دیے گئے۔ اور ان کی تعظیم بھی ہونے لگی اور سمجھتے تھے کہ یہ طواف ان دو بتوں کی تعظیم کے لیے ہے۔ جب لوگ مسلمان ہوتے اور ذہنوں میں بُت پرستی سے بیزاری آئی تو خیال آیا کہ صفا و مروہ میں سعی تو ان بتوں کی تعظیم کے لیے ہے۔ جب بتوں کی تعظیم حرام ہے تو صفا اور مروہ کی سعی بھی ممنوع ہونی چاہیے۔ ان کو تاریخی طور پر یہ معلوم نہ تھا کہ صفا و مروہ کی سعی تو اصل میں مناسک حج سے متعلق ہے۔ زمانۂ کفر میں وہاں بُت رکھ دیے گئے تھے۔ ادھر انصار مدینہ زمانۂ کفر ہی میں صفا و مروہ کی سعی کو بُرا سمجھتے ہیں تو مسلمان ہونے کے بعد ان کو بھی صفا و مروہ کی سعی میں خلجان ہوا اور حضور انور کی جناب میں اپنے اس خلجان کو پیش کیا۔ اس پر قرآن نے یہ جواب دیا اور فریق اوّل و دوم دونوں کو بتا دیا کہ صفا و مروہ کے طواف میں کوئی گناہ نہیں یہ تو اصل سے اللہ کی

[1] معارف م ۱ ص

کی نشانیاں ہیں۔ ان میں سعی کرنی چاہیے [1] اس کی توضیح یہ ہے کہ۔

صفا و مروہ کو نسبت تو دراصل توحید کے خاص گھرانے بیت اللہ سے حاصل تھی، یعنی ہاجرہؑ اسماعیلؑ اور ابراہیم علیہ السلام سے لیکن زمانۂ جاہلیت میں ان پر بھی مشرکین کا قبضہ ہوگیا تھا۔ اور ایک ایک پہاڑی پر ایک ایک دیوی کی مورتی نصب ہوگئی تھی۔ مشرک تبرک کرتے جاتے تو انہیں بھی دوڑ دوڑ کر چھوتے اور چومتے۔ دورِ نبوت کے مسلمان صحابہ کی توحید نوازی اور شرک بیزاری کا کیا پوچھنا۔ قدرتاً خیال گزرا کہ کہیں ان پہاڑیوں کے درمیان آمد و رفت شرک کے شعائر میں نہ ہو۔ آیت میں ان کے شبہ کو دُور کیا گیا اور ارشاد ہوا ہے کہ یہ صفا و مروہ جاہلیت کی نہیں توحید کی یادگاریں ہیں اس لیے اگر ان کے درمیان سعی کو اسلامی و توحیدی حج کا جزو رکھا جائے تو اس میں مطلق مضائقہ نہیں ہے۔

صفا و مروہ کے درمیان یہ آمد و رفت سات بار ہوتی ہے۔ درمیان کا کچھ فاصلہ تقریباً دو فرلانگ دوڑ کر چلنا ہوتا ہے۔ اسی لیے اس کا نام سعی ہے۔ اس فاصلہ کے لیے علامت کے طور پر سڑک کے کنارے دیوار کے ستون سبز رنگ کے بنا دیے گئے ہیں۔ کسی زمانے میں یہاں ویرانہ تھا لیکن اب تو سعودی حکومت نے اسے باقاعدہ مسقف کر دیا ہے اور دو منزلہ بنایا ہے۔ زیریں اور بالائی منزل دونوں میں سعی ہوسکتی ہے۔

مروہ حضرت اسماعیلؑ کی قربان گاہ ہے

حضرت ابراہیمؑ نے اپنے اکلوتے بیٹے کی قربانی جہاں کی توراۃ میں اس مقام کا نام مورہ یا موریا بنایا گیا ہے۔ بعض بے احتیاط مترجموں نے اس نام کا بھی ترجمہ کر دیا ہے اور بلوطوں کے جھنڈ یا بلند زمین اس کا ترجمہ کیا ہے لیکن محتاط مترجموں نے اصل عبری نام کو قائم رکھا ہے۔ چنانچہ اس وقت ہمارے پیش نظر توراۃ کا وہ عربی ترجمہ ہے جو عبری، کلدانی اور یونانی زبانوں کے مقابلہ سے بائبل سوسائٹی لندن کی طرف سے ۱۸۸۵ء لندن میں چھپا ہے۔ اس کا تلفظ موریا کیا ہے۔ لیکن درحقیقت یہ لفظ مروہ ہے جو مکہ میں بیت اللہ کے پاس ایک پہاڑی کا نام ہے۔ اس فارسی ترجمہ کی عبارت یہ ہے۔

خدا ابراہیم را امتحان کردہ بدو گفت اے ابراہیم عرض کرد لبیک گفت کہ اکنون پسر خود را کہ

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۳۰

یگانہ تست دا دراد دوست میداری یعنی اسحاق را برداری و بزمین موریا بروداوراآں جا
بریکے از کوہ ہا کہ بتو نشان دہم برائے قربانی سوختنی بگذراں ۔ (پیدائش - ۲۲)

اس عبارت میں اسحاق کا نام یہود کی تحریف اور اضافہ ہے ۔ حضرت ابراہیم کو حضرت اسمٰعیل کی قربانی کے لیے جو مقام بتایا گیا تھا وہ سرزمین مروہ تھی ۔ وہ اس مقام سے جہاں وہ مقیم تھے چند روز کی مسافت پر تھی ۔ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ کی شریعتوں کے مطابق ضروری تھا کہ جس مقام پر قربانی گزرانی جائے وہ کوئی قربان گاہ اور بیت اللہ ہو ۔ خاص کر اس لیے بھی کہ وہاں حضرت ابراہیم نے خدا کی عبادت کی اور سجدہ کیا اور وہ قربان گاہ یا بیت اللہ ایسا معروف اور مشہور ہو کہ ساتھ کے نوکروں کو یہ کہا جا سکے کہ ہم وہاں جا کر عبادت کر کے واپس آتا ہوں ۔

ابراہیم بجادماں گفت شما ایں جا بمانید تامن باپسر را انجا روم و عبادت کردہ نزدشما
بازآئیم ۔ (پیدائش - ۲۲)

یہ خصوصیتیں کعبہ کے سوا کہیں اور نہیں پائی جاتی ہیں ۔ اور نہ یہود و نصاریٰ اس کے لیے کسی مقام کو ثابت کر سکے اور نہ اس عظیم الشان واقعہ کی کسی قسم کی بھی یادگار حضرت اسحاق کی نسل میں موجود تھی اور نہ ہے اور نہ بیت المقدس اور مسیح کی ولادت گاہ سے اس واقعہ کے یادگاری امر کا تعلق پہلے تھا نہ اب ہے ۔

۴۳۹ - اور جو شخص بھی خوش دلی کے ساتھ نیکی کا کوئی کام کرتا ہے ۔ اصل عربی ارشاد میں لفظ تطوع آیا ہے ۔ اس کے معنے ہیں اس نے خوشی سے نیکی کی، اس نے شوق سے نیکی کی ۔ اس نے زیادہ نیکی کی ۔ تطوع سے جس کے معنے اصل میں تو نیکی میں تکلف کرنے کے ہیں مگر عرف میں جو چیزیں قانونی طور پر لازم و فرض نہ ہوں جیسے نوافل وغیرہ ۔ ان کے بجالانے اور انجام دینے کو کہتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی سا کام ہو، کسی نوعیت اور کسی درجہ کا ہو جو بھی انسان خوشی سے انجام دے گا اس کا اجر اسے مل کر رہے گا ۔

۴۴۰ - اللہ ہر عمل کی قدردانی کرنے والا ہے ۔ شکر کا لفظ جب اللہ کے لیے آتا ہے تو اس کے معنے یہ ہوتے ہیں کہ وہ بندے کی تھوڑی سی طاعت پر معاوضہ بہت دیتا ہے ۔ اللہ نے اپنے لیے یہ انداز تعبیر اختیار کر کے ہمیں یہ تعلیم دی ہے کہ اللہ کے انعامات کا شکر کرنا چاہیے اور اس کے انعام کا سب سے بڑا شکر یہ ہے کہ اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اس کی مرضی کے مطابق استعمال کرے ۔ اس کی نعمتوں سے اسی کی نافرمانیاں کرنا اس کی نعمتوں کی ناقدرشناسی اور بہت بڑی ناشکری ہے ۔

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ
مِن بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ وَ
يَلْعَنُهُمُ اللَّاعِنُونَ ۝ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنُوا
فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝ إِنَّ الَّذِينَ
كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ
وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝ خَالِدِينَ فِيهَا ۖ لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ
الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنظَرُونَ ۝

بلاشبہ جو لوگ[۲۲۱] ہماری نازل کردہ واضح تعلیمات اور ہدایات کو باوجودیکہ
ہم انہیں انسانوں کی ہدایت کے لیے کتاب میں بیان کر چکے ہیں
چھپاتے ہیں تو یہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت[۲۲۲] ہے اور تمام لعنت
کرنے والے بھی ان ہی پر لعنت کرتے ہیں۔ ہاں جو لوگ[۲۲۳] اس طرز عمل سے
باز آجائیں اور اپنی اصلاح کر لیں اور احکام کو بیان کریں تو ان کو میں
معاف کر دوں گا اور میں ہی تو درگزر کرنے والا بے حد مہربان ہوں۔
بلاشبہ جن لوگوں نے کفر و[۲۲۴] انکار کی راہ اپنائی اور کفر کی اسی حالت پر
مرتے دم تک ڈٹے رہے ان پر ہی اللہ کی، فرشتوں کی اور سب
انسانوں کی لعنت ہے۔ ہمیشہ اسی لعنت میں رہیں گے۔ نہ ان کی
سزا میں کمی ہوگی اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔

تعلیم و تذکیر ایک مقدس جماعتی فرض ہے

یہ بات بتانے کے بعد کہ اُمتِ مسلمہ کو منصبِ امامت ملا ہے اور اس کی خاطر نبوت سے تم کو نبوت کے لاتے ہوئے علم و عمل کی وراثت ملی ہے، امامت کا تقاضا یہ ہے کہ تم اس علم و عمل کو زندگیوں میں اپناؤ اور پورے عالم میں اسے رائج اور قائم کرو۔ یہ کام صرف ولولوں، آرزوؤں اور تمناؤں سے نہ ہوگا۔ اس کے لیے تمہیں ہر قسم کی آزمائشوں کے لیے تیار ہو جانا چاہیے۔ جیسے نبوت نے تمہارے سامنے تلاوتِ آیات، تزکیہ، تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کا کام کیا ہے۔ تمہیں پوری انسانیت میں یہی کام کرنا چاہیے تعلیم و تذکیر تمہارا مقدس جماعتی فرض ہے۔ اس میں کوتاہی جماعتی فرض سے کوتاہی ہے۔ اسی بات کو سمجھانے کے لیے ان لوگوں کی داستان سنائی ہے جنہوں نے کتاب اللہ کی اشاعت کی بجائے اس کو مذہبی پیشہ ور لوگوں کے ایک محدود طبقہ میں محدود کر دیا تھا اور عوامی زندگی کو اس کی ہوا تک نہ لگتی تھی۔ پھر جب عام جہالت کی وجہ سے ان کے اندر گمراہیاں پھیل گئیں تو ان پیشہ ور لوگوں نے جن کو عُلما کہا جاتا تھا نہ صرف یہ کہ اصلاح کی کوئی کوشش نہ کی بلکہ وہ عوام میں اپنی مقبولیت برقرار رکھنے کے لیے ہر اس ضلالت اور بدعت کو جس کا رواج عام ہو جاتا اپنے قول و عمل سے یا اپنے سکوت سے الٰہی سندِ جواز عطا کرتے۔ اس سے بچنے کی تاکید مسلمانوں کو کی جا رہی ہے۔ دُنیا کی ہدایت کا کام جس اُمت کے سپرد کیا جائے اس کا فرض یہ ہے کہ اس ہدایت کو زیادہ پھیلائے۔ تیسرے پارہ میں آلِ عمران کی آیت ۹۰، اور چوتھے پارہ میں آل عمران آیت ۱۰۴ میں اس کی تفصیل آ رہی ہے۔ یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ دوسروں کے واقعات کے پردے میں اُمتِ مسلمہ کو سمجھاتا ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرِّ دلبراں گفتہ آید در حدیثِ دیگراں

آیت کا مصداق یہود و نصاریٰ ہیں اور اس پر حضرت ابن عباس صحابی اور مشاہیرِ تابعین کا اتفاق ہے تاریخی اور روایتی واقعہ کے اعتبار سے آیت یہود کے کردار کی تصویر پیش کر رہی ہے لیکن حکم کے اعتبار سے آیت عام ہے۔ قرآن تو بڑی بات ہے صحابہ نے تو کسی ارشادِ نبوت کے چھپانے کو بھی اس آیت کی وجہ سے گوارا نہیں کیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں اگر قرآن میں یہ آیت نہ ہوتی تو میں تم سے کوئی حدیث بیان نہ کرتا۔

۱۴۱ — بلاشبہ جو لوگ ہماری نازل کردہ واضح تعلیمات اور ہدایات کو چھپاتے ہیں۔ اس سے مراد یہودی ہیں جو تورات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارات تھیں ان کو اور تحویلِ قبلہ وغیرہ

اُمور کو چھپاتے ہیں۔ اور جو بھی دنیوی اغراض کی خاطر اللہ کے کسی حکم کو چھپاتا ہے وہ اس میں داخل ہے[1]۔

علمائے یہود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں سابقہ کتابوں میں آتی ہوئی بشارتوں کو چھپاتے تھے نہ ضرورت کے وقت بیان کرتے اور نہ ہی سوال کے وقت جواب دیتے۔ کچھ میں تحریف لفظی کرکے چھپاتے اور کچھ میں مطلب غلط بنا کر بتاتے۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے بتایا ہے کہ وہ صرف حضور انور کے متعلق بشارات ہی کو نہیں بلکہ کتاب کی واضح تعلیمات اور ہدایات کو طرح طرح کی تاویلات کرکے چھپاتے تھے۔ یہاں تک کہ انہوں نے پورے دین کا حلیہ بگاڑ دیا تھا اور لوگوں کو صراطِ مستقیم سے ہٹا دیا تھا[2]۔

مطلب یہ ہے کہ کتبِ سابقہ کے مضامین اور پیشین گوئیوں کو دانستہ چھپاتے ہیں اور چھپانا بھی صرف خاموشی کا نہیں بلکہ الٰہی حق کے مخالف شہادت سے بھی نہیں چوکتے۔ کتمان اس چھپانے کو کہتے ہیں جو بالارادہ ہو اور اس موقعہ پر جہاں اظہار ضروری ہے البینات وہ نشانیاں ہیں جو بجائے خود واضح، صاف اور صریح ہوں۔ الھدیٰ وہ ہے جو دوسروں کے لیے ذریعہ ہدایت ہو۔ یہاں بیّنات سے مراد رسالتِ محمدیؐ کے دلائل و شواہد ہیں اور ھدیٰ سے مراد محسوس احکام ہیں۔ علمائے یہود اپنے پاس موجود آسمانی کتب کے ذریعے جانتے تھے کہ محمد رسول اللہ کی رسالت برحق ہے اور آپؐ جو احکام بیان فرماتے ہیں وہ بھی برحق ہیں مگر اس کے باوجود اللہ کے بیان کردہ احکام کو چھپاتے تھے۔

کتمانِ علم کا جُرم

کتمانِ علم یہ ہے کہ انسان اس پر خود عمل نہ کرے اور دوسروں کو اس کی دعوت نہ دے۔ نبوت کے لاتے ہوتے علم و عمل کا لوگوں سے چھپانا اتنا بڑا سنگین جُرم ہے کہ اس کے مرتکب کو آگے آیت میں لعنت کا مستحق قرار دیا جا رہا ہے۔

آیت صرف یہودیوں کی داستانِ تاریخ سنانے کے لیے نہیں بلکہ اُمتِ مسلمہ کو اس سنگین جُرم سے بچانے کے لیے آئی ہے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں حکمِ آیت عام ہے۔ اعتبار عموم لفظ کا ہے کسی سبب خاص کا نہیں۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان سب لوگوں کے متعلق فیصلہ دے رہی

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۳۰ [2] تفسیر المنار

ہے جو کتمانِ علم کے جُرم کے مرتکب ہوں۔ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں اس آیت میں کتمانِ علم کرنے والوں کے بارے میں بہت بڑی دھمکی ہے۔ چونکہ عموم کی وجہ سے آیت کی گرفت سخت ہے اس لیے کچھ لوگوں نے آیت کی گرفت سے بچنے کے لیے مختلف راہیں تلاش کی ہیں مثلاً یہ وعید اس عالم کے حق میں ہے جس سے اللہ کا حکم دریافت کیا جائے اور وہ اسے چھپائے۔ اور یا یہ وعید اس صورت میں ہے جبکہ اس کے سوا کوئی دوسرا شخص وہاں مسئلہ بتلانے والا موجود ہی نہ ہو۔ اور اس سے انہوں نے یہ قاعدہ بھی بنا لیا ہے کہ اللہ کے احکام کی نشر و اشاعت، لوگوں کو اس کی دعوت دینا علماء کی ذمہ داری نہیں ہے۔ لیکن اہلِ علم نے اس سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ قرآن میں صرف کتمانِ علم پر وعید نہیں ہے بلکہ یہاں علم کر بھی قرآن نے اسی آیت میں اُمت کا ایک متعین اجتماعی فرض بتایا ہے اور اس فرض کی پا بجائی نہ کرنے پر وعید آئی ہے۔ ہاں قرآنی نقطہ نظر سے یہ کہا جا سکتا ہے کہ اس فرض کی ادائیگی کی حد تک کل سب سے مطلوب نہیں ہے۔ کچھ کے کرنے سے سب ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں۔ لیکن کچھ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پورے ضلع میں صرف انفرادی ذمہ داری اس فرض کی پا بجائی کے لیے کافی ہے۔ نہیں بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر جگہ مسلمانوں میں ایک جماعت یہ کام کرنے والی ہو۔ اس کے تفصیلی مباحث کے لیے پارہ چہارم کا انتظار کیجئے۔

۲۴۲۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ کی لعنت ہے اور تمام لعنت کرنے والے بھی ان پر لعنت کرتے ہیں۔ اللہ کی لعنت یہ ہے کہ وہ ان لوگوں کو اپنی رحمت اور اپنے فضل و کرم سے محروم کر دیتا ہے۔ اور لعنت کرنے والوں کی لعنت یہ ہے کہ ان بدکاروں کے لیے بددعا کی جائے۔ ان کے لیے حق تعالیٰ کی رحمت سے دوری اور اس کے فضل و کرم سے محرومی طلب کی جاتی ہے[1]

لعنت کرنے والے ان میں جن و انس اور ملائکہ سب حیوانات داخل ہیں۔ کیونکہ ان کی حق پوشی کی وجہ سے جب پوری دُنیا میں قحط، وبا اور قسم قسم کی بلائیں آتی ہیں تو حیوانات بلکہ جمادات تک کو تکلیف ہوتی ہے اور سب ان پر لعنت کرتے ہیں[2]

قرآن نے لٰعِنُوْنَ میں لعنت کرنے والوں کو متعین نہیں کیا۔ امامِ تفسیر مجاہد اور عکرمہ کہتے ہیں کہ اس عدمِ تعیین سے اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ دُنیا کی ہر چیز اور ہر مخلوق ان پر لعنت

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۶۰ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۳۰

کرتی ہے یہاں تک کہ تمام جانور اور حشرات الارض بھی ان پر لعنت کرتے ہیں کیونکہ ان کی بداعمالی سے ان سب مخلوقات کو نقصان پہنچتا ہے۔ حضرت براء بن عازب کی حدیث سے اس کی تائید ہوتی ہے جس میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لَعِنُوْنَ سے مراد تمام زمین پر چلنے والے جانور ہیں [1]

اللہ تعالیٰ اس لیے لعنت کرتا ہے کہ یہ لوگ اللہ کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہدایت اور علم چاہتا ہے اور یہ لوگ گمراہی اور جہالت کو پسند کرتے ہیں۔ ملائکہ اور ارواحِ انبیاء وصلحاء اس لیے لعنت کرتے ہیں کہ ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اللہ کے احکام کو بیان کیا جاتے اور ان کی خوب نشر واشاعت کی جاتے اور یہ کتمانِ حق کرنے والے ان حضرات کی کوششوں کو رائیگاں کرتے ہیں اور عوامی زندگی اس لیے لعنت کرتی ہے کہ ان کے کتمانِ حق کی وجہ سے وہ نبوت کے لاتے ہوتے علم وعمل سے ناآشنا رہتے ہیں [2]

۴۴۳۔ ہاں جو لوگ اس طرزِ عمل سے باز آجائیں، اور اپنی اصلاح کرلیں اور کتمان کی جگہ بیان کا شیوہ اختیار کرلیں تو اُن کو میں معاف کردوں گا۔ توبہ کی حقیقت یہ ہے کہ جو گناہ اور نافرمانی یا ناپسندیدہ عمل بندے سے سرزد ہوجاتے، اس کے بُرے انجام کے خوف سے اس پر اُسے دلی ندامت ہو اور آئندہ کے لیے اس سے بچے رہنے اور دُور رہنے کا اور اللہ کی فرمانبرداری اور اس کی رضاجوئی کا عزم وفیصلہ کرے۔ ظاہر ہے کہ جب یہ توبہ والی کیفیت نصیب ہوگی تو جو گناہ ہوچکے ہیں بندہ اللہ تعالیٰ سے ان کی ضرور معافی مانگے گا تاکہ سزا اور بُرے انجام سے بچ سکے۔ اور اسی طرح جب سزا اور عذاب کے خوف سے معافی مانگے گا تو اس کو گناہ پر رنج اور افسوس اور آئندہ کے لیے اسے نہ کرنے کا عزم بھی ضرور ہوگا۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ توبہ واستغفار لازم وملزوم ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مجرم ماضی پر پشیمان ہوکر اب بھی باز آجائیں اور اس کے ساتھ وہ آئندہ کے لیے فیصلہ کرلیں کہ اپنی بگڑی حالت کو سنوار لیں گے۔ اصل ارشاد عربی میں واصلحوا آیا ہے اور اپنی اصلاح کرلیں یعنی زندگی کو بنالیں اور سنوارلیں۔ انسانی زندگی میں بناؤ سنوار چار چیزوں سے آتا ہے: ا۔ خدا کا ڈر جو آدمی کو بُرائیوں سے روکنے اور سیدھا چلانے کے لیے ایک ہی قابلِ اعتماد ضمانت ہے۔ راست بازی، انصاف، امانت، حق شناسی، ضبطِ نفس اور

[1] معارف القرآن م ش ص ۳۴۹ [2] معارف م ا ص ۲۵۵

ام دوسری خوبیاں جن پر ایک پُرامن اور اسلامی تہذیب و تمدن کی پیدائش کا انحصار ہے۔
ایک تخم سے پیدا ہوتی ہیں۔

۲۔ خدائی ہدایت کی پیروی جو انسان کے شخصی اجتماعی اور بین الاقوامی رویہ کو اخلاقی اصولوں
پابند کرنے کی ہی ایک صورت ہے۔

۳۔ عملِ صالح یعنی اللہ سبحانہٗ کی دی ہوئی قوتوں کو اس کی مرضی میں استعمال کرنا۔

اور صرف اسی پر اکتفا نہ کریں کہ توبہ کرلیں اور اپنی بگڑی حالت کو سنوار لیں بلکہ اس کے لیے ام بھی کریں کہ جس حق کو چھپایا تھا اسے لوگوں کے سامنے کریں یعنی احکامِ حق کو چھپانے کی بہ بیان کرنے کا شیوہ اختیار کریں۔ توبہ اور قبولِ توبہ کا بیان قرآن میں بار بار آیا ہے۔ یہاں توبہ ے ساتھ اصلاح اور تبیین کی قید لگی ہوتی ہے۔ محققین نے لکھا ہے کہ جن گناہوں سے صرف وقِ اللہ پامال ہوتے ہیں مثلاً نماز روزہ کو چھوڑ دیا ان کے لیے تو محض توبہ و استغفار کافی ہے اس کا تعلق اللہ کی صفات رحمانیت اور رحیمیت سے ہے لیکن جن گناہوں سے بندوں کی حق تلفی لازم تی ہے مثلاً قتل، چوری، رشوت، غصب، فساد، بدامنی، سود خوری، عقائدِ باطلہ کا اعلان ان ے لیے ضروری ہے کہ ہر تشیں معصیت کے ضرر کا عملی تدارک بھی بقدرِ امکان کرے۔ اگر ایسا کرے ا تو توبہ قبول ہوگی کیونکہ یہاں معاملہ حق تعالیٰ کی صفتِ عدل سے ہے[1]

توبہ، اصلاح اور بیانِ حق کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ میں ان کو معاف کر دوں گا یعنی اگرچہ ان کی حق پوشی کے باعث بعض آدمی گمراہی میں پڑ گئے لیکن جب انہوں نے حق پوشی سے توبہ کر کے اظہارِ حق پورے طور پر کر دیا تو اب بجائے لعنت کے ہم ان پر رحمت نازل فرماتے ہیں کیونکہ ہم تواب و رحیم ہیں[2]

۱۶۱ - بلاشبہ جن لوگوں نے کفر و انکار کی راہ اپنائی اور کفر کی اسی حالت پر مرتے دم تک ڈٹے رہے یعنی جو خود پوشی یا کسی دوسرے کی حق پوشی کے باعث گمراہ ہوا اور اخیر تک کافر ہی رہا اور توبہ نصیب نہ ہوئی تو وہ ہمیشہ ملعون رہے گا اور مرنے کے بعد بھی توبہ قبول نہ ہوگی بخلاف اوّل فریق مذکور کے کہ توبہ نے ان کی لعنت کو منقطع کر دیا کہ زندگی میں تائب ہو گئے۔
پہلی آیت میں ان لوگوں کا حکم بتایا تھا جنہوں نے توبہ کر لی، اصلاحِ احوال کر کے بیانِ حق

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۶۰ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۳۰

کا شیوہ اختیار کر لیا۔ اس آیت میں ان لوگوں کا حکم بتایا جا رہا ہے جنہوں نے راہِ کفر اختیار کی اور آخری دم تک اسی پر ڈٹے رہے۔

کُفر کی صورتیں

قرآن نے کُفر کی مختلف صورتیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ انسان سرے سے اللہ ہی کو نہ ملنے یا اس کی بالادستی کو تسلیم نہ کرے اور اس کو اپنا اور پوری کائنات کا مالک و معبود ماننے سے انکار کرے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کو تو مانے مگر اس کے احکام کو نہ مانے۔ تیسرے یہ کہ اللہ کے پیغمبروں کو نہ مانے۔ چوتھے یہ کہ پیغمبروں کو تو مانے مگر ان میں کسی کو مانے اور کسی کو نہ مانے۔ پانچویں یہ کہ انبیاءؑ نے اللہ کی طرف سے عقائد، اخلاق اور قوانینِ حیات کے متعلق جو تعلیمات بیان کی ہیں ان کو یا ان میں سے کسی چیز کو قبول نہ کرے۔ چھٹے یہ کہ نظریہ کے طور پر تو ان سب چیزوں کو مانے لیکن عملاً احکامِ الٰہی کی دانستہ نافرمانی کرے اور اس نافرمانی پر اصرار کرتا رہے اور دنیوی زندگی میں اپنے رویے کی بنا اطاعت پر نہیں بلکہ نافرمانی پر رکھے۔ یہ سب مختلف طرزِ فکر و عمل اللہ کے مقابلے میں باغیانہ ہیں اور ان میں ہر ایک رویہ کو قرآن کُفر تعبیر کرتا ہے۔

کافروں پر لعنت

لعنت لغت میں اللہ کی رحمت سے دُور کرنے کو کہتے ہیں۔ اس آیت میں دھم کفار کی قید سے الجصاص نے یہ مسئلہ نکالا ہے اور تفسیر کبیر میں امام رازی نے اسے جصاص کی طرف منسوب کر کے نقل کیا ہے کہ جس کافر کے کفر کی حالت میں مرنے کا یقین نہ ہو اس پر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔ اور چونکہ کسی شخص کے خاتمہ کے بارے میں یقینی علم کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اس لیے کسی کافر کا نام لے کر لعنت کرنا جائز نہیں ہے۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن کافروں پر نام لے کر لعنت کی۔ آپ کو ان کی موت کا کفر پر ہونا بذریعہ وحی معلوم ہو گیا۔ البتہ عام کافروں اور ظالموں پر بغیر نام لیے لعنت کرنا جائز ہے۔ جب کافروں کے بارے میں اسلام یہ گوارا نہیں کرتا تو مسلمانوں کے متعلق وہ کب گوارا کرے گا کہ ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر لعنت بھیجے۔ ابوبکر ابن العربی نے لکھا ہے کہ بعض مسلمان گنہ گار پر لعنت بالاتفاق حرام ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوالدرداؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسولؐ اللہ سے سُنا ہے آپؐ فرماتے تھے کہ لعنت

سانے والوں کو نہ شہادت کا حق دیا جائے گا اور نہ شفاعت کا۔ ظاہر ہے کہ جو شخص دُنیا میں دوسروں
. اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دُور کرنے کا عادی ہوگا قیامت میں اسے شفاعت اور شہادت کے
ن سے محروم کر دیا جائے گا۔ شفاعت نام ہے اللہ کی رحمت مانگنے کا اور یہ لعنت کا اُلٹ
ہے۔ دُنیا میں قانونِ شہادت یہ ہے کہ مقدمہ میں گواہ وہ ہو سکتا ہے جو اُس کا دُشمن نہ ہو۔ دُنیا
ہی میں جو شخص اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دُور کر کے اپنی دُشمنی کا ثبوت دے چکا ہے وہ آخرت
ں کب کسی کا گواہ بن سکتا ہے۔

امام بیہقی نے شعب الایمان میں حضرت عائشہؓ کے حوالہ سے یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضورِ انور
صلی اللہ علیہ وسلم ابو بکرؓ کے پاس سے گزرے۔ وہ اتفاقاً اپنے کسی غلام کے بارے میں لعنت
کا لفظ استعمال فرما رہے تھے۔ آپؐ ان کی طرف متوجہ ہوتے اور فرمایا ربِ کعبہ کی قسم یہ ہرگز نہ
ہوگا کہ جو لوگ لعنتیں برسائیں وہ صدیق بھی ہوں۔ حضرت ابو بکر نے فوراً اس غلام کو آزاد کیا
اور حضورِ انورؐ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا کہ آئندہ ایسا نہ ہوگا۔ نبی کے بعد صدیق کی
شفاعت کا درجہ ہے اور اس کے بعد شہداء اور صالحین کی شفاعت کا۔ حضورِ انورؐ نے سمجھایا کہ
آخرت میں جس اُمت کو شفاعت اور شہادت دونوں کا منصب ملا ہے جب اس کے لیے بالعموم
لعنت کا استعمال کرنا ناموزوں ہے تو پھر ان میں جو صدیق کہلائیں ان کے کہنے کیا! صدیق اکبر
نے اس نکتہ کو خوب سمجھ لیا اور اسی لیے اس غلطی کی ہر ممکن طریقہ سے تلافی کرنے کی کوشش
فرمائی۔ اس ضمن میں حضورؐ نے ہمیں باہم افتراقی اسباب کو مٹانے کا بھی ایک بڑا سبق دیا ہے۔
لیکن یہ بات ضمنی ہے۔ اصل بات آخرت کا نقصان ہے۔ قانونِ مادی اور قانونِ رُوحانی
میں بھی فرق ہے۔ مادی قانون ان ظاہری مضرتوں کو اہمیت دیتا ہے اور رُوحانی ضابطہ یعنی
شریعت آخرت کی مضرتوں کو پیشِ نظر رکھتا ہے۔ اس لیے شریعت اپنی نظرِ حقیقت کے
مطابق ان اسباب و اثرات کا ذکر کرتی ہے اور ظاہر میں ان آثارِ ظاہری کے درپے رہتا ہے۔
اور اسی کو فلسفہ سے تعبیر کرتا ہے۔ لہٰذا ایک ظاہر پرست کے نزدیک تو نزاہتِ زبان کا
فلسفہ صرف دعوت، اتحاد اور باہمی اسبابِ منافرت کا چھوڑ دینا ہے اور نبوت کے قانون کی
نظر میں یہ سب ضمنی اور سطحی نفع و نقصان ہیں۔ ان کو سمجھنے سمجھانے کے لیے انسان کی عقل خود بھی کافی
ہے جو اصل اور دائمی نقصان ہے اور ہمارے عقل و ادراک سے بالاتر ہے وہ اُمت کی امتیازی
خصوصیت یعنی شفاعت سے محرومی ہے۔

وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ ﴿١٦٣﴾ إِنَّ فِي خَلْقِ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي
الْبَحْرِ بِمَا يَنفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِن مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ
الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ فِيهَا مِن كُلِّ دَابَّةٍ وَتَصْرِيفِ الرِّيَاحِ
وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِّقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿١٦٤﴾

اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے کوئی معبود نہیں ہے اس کے سوا۔ اس کی ذات بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والی ہے۔ بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے، رات دن کے ایک کے بعد ایک کے آتے رہنے، اور سمندروں میں جہازوں کے انسانوں کی کاربراری کی خاطر چلنے میں، اور برسات میں جسے اللہ تعالیٰ آسمانوں سے برساتا ہے اور اس کی آب پاشی سے زمین مرنے کے بعد جی اٹھتی ہے۔ اور اس بات میں کہ ہر قسم کے جانور زمین میں پھیلے ہوتے ہیں اور ہواؤں کے پھرنے اور بادلوں میں جو آسمان و زمین کے درمیان مسخر ہیں ان لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں اللہ کی توحید عبادت کی بڑی نشانیاں ہیں۔

خالقیت و ربوبیت سے توحیدِ عبادت پر استدلال

اس سے پہلی آیت میں کفر کا تذکرہ کیا ہے۔ دینِ اسلام کے بدیہی مسلمات کو دل سے ماننا اگر

یمان ہے تو ان بدیہی مسلمات میں سے کسی ایک بات کے انکار کا نام کفر ہے۔ ایمان کی صرف یہی ایک صورت ہے کہ دین کے تمام بدیہی مسلمات قلب و زبان سے مان لیے جائیں۔ اور کفر کی صورتیں بہت ہیں کفر و ایمان کی مثال ترازو کے دو پلڑوں کی ہے کہ ان کے اعتدال کی صرف ایک ہی صورت ہے اور اختلاف کی بہت۔ شاید دنیا میں اہلِ ایمان کی قلت اور اہلِ کفر کی کثرت کا یہی راز ہے ورنہ بظاہر کافروں کے مقابلے میں مومنوں کی کثرت ہونی چاہیے۔ پھر علماء نے تصریح کی ہے کہ کفر صرف گفتار ہی سے خاص نہیں بعض افعال بھی موجب کفر ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے اسلام کے قانون داں طبقہ نے ایسے افعال کے صدور پر بھی کفر کا حکم لگا دیا۔ بعض افعال ایسے ہوتے ہیں جو اگرچہ فقیہ کی نظر میں قانونی طور پر کفر نہیں ہوتے مگر احادیث میں ان پر کفر کا اطلاق آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ احادیث کا اندازِ بیان ایک آئینی دستاویز جیسا نہیں ہوتا بلکہ اس میں زیادہ تر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام گفتگو ہوتی ہے۔ اس لیے اس کا اندازِ بیان بھی عام گفتگو کا ہوتا ہے۔ اس ترغیب و ترہیب کے موقعہ پر تمام شروط و قیود کا لحاظ نہیں ہوتا بلکہ ایسی تعبیرات اختیار کی جاتی ہیں جو مقصد پر عمل پیرا ہونے کے لیے زیادہ سے زیادہ محرک ہوں۔ حضرت مولانا اسماعیل شہید نے منصبِ امامت میں انبیاء علیہم السلام کے اظہارِ دعوت کے موضوع پر جو کچھ سپردِ قلم فرمایا ہے وہ بہت زیادہ قابلِ قدر تحقیق ہے۔ اس میں نبی کے طرزِ دعوت کی بڑی تفصیل کی ہے اور خوب سمجھایا ہے کہ انبیاء کا اندازِ بیان کیا ہوتا ہے اور اسی طرح اس کے سمجھنے کا انداز کیا ہونا چاہیے۔

یوں تو کفر کی ہر قسم انسانیت کے لیے بدنما داغ ہے لیکن کفر کی جو قسم سب سے بدتر ہے وہ شرک ہے یعنی اللہ تعالیٰ کی ذات، اس کی صفات، اس کی عبادت میں کسی اور کو شریک بنا لینا۔ قرآن و سنت کا اعلان ہے کہ اللہ سبحانہ نے ہر انسان کی فطرت شرک کی ہر آلودگی سے پاک و صاف بنائی ہے۔ اس کو اس قسم کی نجاستوں سے ملوث کرنے کا مجرم یا تو وہ خود ہے یا اس کے والدین ہیں۔ پروردگارِ عالم نے تخلیقِ عالم سے پہلے یہ طے کر دیا ہے کہ اس کی بارگاہ میں ہر کوتاہی و لغزش قابلِ معافی ہو سکتی ہے مگر کفر و شرک کا مجرم ہرگز قابلِ معافی نہیں ہوگا۔ اس کی سزا اس کو ضرور بھگتنی ہوگی۔

دُنیا میں انبیاء کے مخاطب وہ نہیں رہے جو خدا کی ذات میں شرکت کے قائل ہوں۔ انبیاء کے مخاطب زیادہ تر عبادت ہی میں شرک کرتے تھے اور اس گمراہی میں اس قدر گر گئے تھے کہ ان کے نزدیک معبودِ حقیقی کا منبر باطل اور اپنے بنائے ہوئے معبودوں سے نیچے گر گیا تھا۔ اس تمام گمراہی

کی بنیاد صرف یہی تھی کہ ان کے عقیدے میں ان کے نفع ونقصان کا رشتہ غیراللہ سے قائم ہو گیا تھا۔ اس لیے نبوت کی دعوت کا مرکزی نقطہ توحیدِ عبادت بن گیا۔ چنانچہ اس آیت میں کتمانِ علم کے جرم کی سنگینی بیان کرنے کے بعد توحیدِ الوہیت کی حقیقت سمجھائی گئی ہے اور نظامِ ربوبیت سے توحیدِ الوہیت پر استدلال کیا ہے یعنی جو رب العالمین تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے اور جس کی ربوبیت کا اعتراف تمہارے دل کے ایک ایک ریشے میں موجود ہے۔ اس کے سوا کون اس کا مستحق ہو سکتا ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے۔

۴۴۵۔ اور تمہارا معبود ایک ہی معبود ہے۔ اصل ارشاد میں الٰہکم الٰہ واحد ہے یہ لفظ عربی زبان میں فعال کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے۔ چونکہ عام تراجم میں اس کا ترجمہ خدا سے کر دیا گیا ہے اس لیے اس میں کوئی معنویت باقی نہیں رہی ہے اور اس سے علمیت کی بو آنے لگی ہے حالانکہ الٰہ علم نہیں ہے صفت کا صیغہ ہے جبکہ لفظ اللہ ذاتِ واجب الوجود کا علم ہے۔

الٰہ اَلِہَ سے بنا ہے عربی میں یہ لفظ ایک سے زیادہ معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ مثلاً حیران اور سرگشتہ ہونے پر الٰہ بولا جاتا ہے۔ کسی سے تعلق پیدا کر کے یا کسی کی پناہ میں جا کر سکون و اطمینان حاصل ہونے پر الہت الی فلان بولا جاتا ہے۔ آدمی کسی مصیبت سے خوف زدہ ہو اور کوئی اسے پناہ دے اس وقت بولتے ہیں الہ الرجل فالٰہہ وغیرہ۔ آدمی کسی کی طرف شدتِ شوق سے متوجہ ہو تو اسے بولتے ہیں الہ الرجل الی فلان۔ اونٹنی کا بچہ جب ماں سے بچھڑ جانے کے بعد ماں سے ملے اور ماں سے چمٹ جاتے تو بولتے ہیں الہ الفصیل۔

ان سب استعمالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ الٰہ وہ ذات ہے جو انسان کی حاجتیں پوری کر سکتی ہو۔ بےقراریوں میں اسے سکون بخش سکتی ہو۔ پھر جس کے بارے میں انسان یہ گمان کرتا ہو کہ وہ حاجت کے وقت حاجت پوری کر سکتا ہے۔ خطرات میں پناہ دے سکتا ہے، اضطراب میں سکون بخش سکتا ہے۔ اس کی طرف انسان کا اشتیاق کے ساتھ توجہ کرنا ایک ناگزیر امر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ لفظ الٰہ جن اساسی تصورات پر بولا جاتا ہے وہ یہ ہیں۔ حاجت روائی، پناہ دہندگی، سکون بخشی، بالاتری و بالادستی، اشتیاق۔ ان تمام معانی کو ملحوظ رکھ کر اس کا ترجمہ محققین نے معبود، قابلِ پرستش، لائقِ بندگی سے کیا ہے۔

توحیدِ الوہیت کا اصل منشا توحیدِ عبادت ہے اور انبیاء اسی کی دعوت لے کر آتے ہیں یعنی نبوت کی دعوت میں جس معاملہ پر زیادہ زور صرف ہوتا ہے وہ توحید فی العبادت ہے۔ اسلام

کے جملہ ابواب میں اور ہر باب کی تمام فصلوں میں جس نکتہ کی ہر جگہ رعایت ملحوظ رہی ہے وہ ہی توحید عبادت ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ مخلوق کی پیدائش سے اصل مقصود ہی توحید عبادت ہے۔ شیطانی طاقتیں ہمیشہ چونکہ اسی مقصد میں خلل انداز ہوتی ہیں اسی لیے نبوت بھی اسی کے مقابلہ کی تیاری میں پیش پیش رہی ہے اور نبوت کا لایا ہوا علم و عمل اتنا صاف ہوتا ہے کہ اس میں شرک فی العبادۃ کی کوئی ادنیٰ سی شکن بھی پیدا ہونے کا کوئی امکان نہ رہے۔ اسی بنا پر آسمانی ہدایات میں کامل ترین ہدایت وہ ہے جس کے حدود توحید عبادت میں سب سے زیادہ مستحکم ہوں۔

اسلامی توحید کی پاکیزگی

اگر آپ توحید الوہیت کی پاکیزگی زیادہ وضاحت کے ساتھ دیکھنا چاہتے ہیں تو حافظ ابن تیمیہؒ کا کتاب الرد علی البکری میں وہ بیان پڑھئے جو اہل اسلام اور فرقہ صابئہ کی عبادت کے موضوع پر سپرد قلم کیا ہے۔ وہ تحریر فرماتے ہیں کہ:

صابئین کواکب اور ملائکہ کی عبادت میں مبتلا تھے اور ان کا نام عقول اور نفوس رکھا کرتے تھے اور خالق و مخلوق کے مابین ان کو ایک واسطہ تصور کرتے تھے۔ ان کے مقابلے میں نبوت تھی۔ جب نبوت نے ان کو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور رسولوں کی طاعت کا حکم دیا تو انہوں نے الزام کے طور پر کہا کہ اللہ اور مخلوق کے درمیان واسطہ تو تم بھی مانتے ہو۔ فرق یہ ہے کہ تم بشر کا واسطہ مانتے ہو یعنی رسول کا اور ہم روحانیات کا۔ اس لیے ہم تم سے افضل رہے۔ شہرستانی نے ملل و نحل میں ان کے جواب میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ روحانیات کی نسبت سے بشر کو واسطہ بنانا افضل ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ شہرستانی کے اس جواب سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ خود شہرستانی پر بھی اسلامی توحید کی پوری حقیقت منکشف نہیں ہوئی۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلام اللہ سبحانہ کی عبادت میں واسطہ کا قائل ہی نہیں ہے نہ انسان کو واسطہ مانتا ہے نہ فرشتہ کو اور نہ روحانیات کو۔ انبیاء اسلام میں بندے اور خدا کے درمیان عبادت میں واسطہ نہیں بلکہ ہدایت میں واسطہ ہوتے ہیں۔ وہ اللہ کے پیغامات بندوں کو پہنچاتے ہیں۔ ان کا واسطہ اوامر و نواہی میں اطاعت کا ہوتا ہے اور بس۔ رسول کی مثال ایسی ہے جیسے نماز میں امام کی، اور حج میں معلم کی۔ جیسے معلم

حاجی کو صرف احکام حج بتاتا ہے ایسے ہی رسُول بھی صرف اللہ کی عبادت کا طریقہ بتاتا ہے حاجی کا معلم ہو یا نماز کا امام دونوں اللہ سبحانہ کی عبادت میں قطعاً واسطہ نہیں ہوتے بلکہ وہ خود بھی اور لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بلا واسطہ عبادت کرنے میں شریک ہوتے ہیں۔ اس کے برعکس صابئین عبادت ہی میں روحانیات کا واسطہ تسلیم کرتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہؒ کی یہ تحقیق نہایت قابلِ قدر ہے اور اس سے اسلام کی توحید کی پاکیزگی اور زیادہ واضح ہو جاتی ہے۔ آج مسلمانوں میں بعض جاہل فرقے انبیاء۔ اولیاء کو اللہ تعالیٰ کی عبادت میں شریک کرتے ہیں اور اسی کو اپنی عبادت کی قبولیت کا معیار سمجھتے ہیں۔ ان کا شرک صابئین سے بھی زیادہ عبرتناک ہے۔

اس آیت میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ اس کائنات ہستی میں پرستاری اور پوجا کے لائق صرف ایک ہی اللہ کی ذات ہے۔ اگر تم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سر جھکا لیا تو توحید الوہیت کا اعتقاد باقی نہیں رہا۔ یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی ہے اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ اگر ہم نے اپنی دعاؤں اور طلب گاریوں میں کسی دوسری ہستی کو شریک کر لیا تو اللہ کی الوہیت میں شریک کر لیا۔ دعا، استعانت، رکوع و سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل، اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ معاملات اور نیاز مندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور بندوں کے درمیان باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں اگر ان اعمال میں کسی دوسرے کو شریک کر لیا جائے تو اللہ کے رشتۂ الوہیت کی یگانگت قائم نہیں رہ سکتی ہے۔ قرآن نے اس آیت میں مخاطبوں کو یہی بات سمجھائی ہے کہ قابلِ پرستش صرف ایک ہی ذات ہے اور وہ ہی ہے جو اس کائنات ہستی کی خالق ہے۔ کسی دوسرے الٰہ کا یہاں سرے سے وجود ہی نہیں ہے نہ بڑے کا نہ چھوٹے کا نہ ملکی کا نہ غیر ملکی کا۔ اللہ کے ساتھ کسی الٰہ کا تصور محض وہمِ انسانی کی ایک اختراع ہے ورنہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ لا الٰہ الا ھو

۶۴۴۔ یعنی معبودِ حقیقی تم سب کا ایک ہی ہے اس میں تعدد کا احتمال ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اب جس نے اس کی نافرمانی کی بالکل مردود اور غارت ہوا۔ اس کے سوا اور کوئی معبود ہوتا تو ممکن تھا کہ اس سے نفع و نقصان کی توقع باندھی جاتی۔ یہ آقائی اور بادشاہی نہیں اور استادی و پیری نہیں ہے کہ ایک جگہ موافقت نہ آئی دوسری جگہ چلے گئے۔ یہ تو معبودی ہے نہ اللہ کے سوا کسی کو معبود بنا سکتے ہو اور نہ کسی سے اس کے علاوہ خیر کی اُمید باندھ سکتے ہو[1] اور ایسا معبود

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۳۳

جو تم سب کے معبود بننے کا مستحق ہو وہ تو ایک ہی معبودِ حقیقی ہے۔ اس کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں ہے۔ وہی رحمٰن ورحیم ہے اور کوئی ان صفات میں کامل نہیں ہے اور بدون کمال صفات معبودیت کا استحقاق باطل ہے۔ پس بجز اللہ کے کوئی اور مستحق عبادت نہیں ہے[1]

اس آیت میں کتمان والی وعید کے بعد توحید کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے کہ سب سے پہلے جس چیز کا اظہار واجب ہے اور جس کا چھپانا کسی حال میں بھی جائز نہیں وہ توحید ہے۔ القرطبی نے لکھا ہے کہ پہلی آیت میں اللہ سبحانہ نے کتمانِ حق سے ڈرایا اور اب بتایا کہ سب سے پہلی چیز جس کا ظاہر کرنا واجبات میں سے ہے اور جسے چھپانا حرام ہے وہ توحید ہے۔ آیت میں واحد سے مراد یہ ہے کہ وہ بے مثل اور یگانہ ہے۔ ذات وصفات میں بے نظیر ہے اور استحقاقِ عبادت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ علامہ آلوسی نے آخری معنے کو راجح بتایا ہے۔ اور علامہ نسفی فرماتے ہیں کہ واحد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی الوہیت میں یگانہ ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس کے علاوہ کسی کو الہ کہنا درست نہیں ہے[2]

۷۴۴۔ اس کی ذات بے حد مہربان نہایت رحم کرنے والی ہے۔ رحمان ورحیم اگرچہ دونوں اسم رحمت سے ہیں لیکن رحمت کے دو مختلف پہلوؤں کو ظاہر کرتے ہیں۔ رحمٰن کے معنے یہ ہیں کہ وہ ذات جس میں رحمت ہے اور رحیم کے معنے یہ ہیں کہ وہ ذات جس میں نہ صرف رحمت ہے بلکہ جس سے ہمیشہ رحمت کا ظہور ہوتا رہتا ہے۔ اور ہر آن ہر لمحہ تمام کائنات اس سے فیضیاب ہو رہی ہے۔ یہاں رحمت کو دو الگ الگ اسموں سے کیوں تعبیر کیا گیا اس لیے کہ قرآن خدا کی الوہیت کا جو نقشہ ذہن نشین کرانا چاہتا ہے اس میں سب سے زیادہ نمایاں رحمت ہی کی صفت ہے بلکہ کہنا چاہیے کہ تمام تر رحمت ہی ہے اس لیے ضروری تھا کہ استحقاقِ عبادت کے موقعہ پر خصوصیت کے ساتھ اس کی صفتی اور فعلی دونوں حیثیتیں واضح کر دی جائیں یعنی اس میں رحمت ہے کیونکہ وہ الرحمان ہے اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے رحمت کا ظہور بھی ہو رہا ہے کیونکہ الرحمٰن کے ساتھ وہ الرحیم بھی ہے۔ یہ دونوں صفتیں اللہ سبحانہ کی الوہیت کے لیے بطور دلیل لائی گئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ صفتِ رحمت میں دونوں پہلوؤں سے وہ کمال رکھتا ہے اس لیے وہی مستحق عبادت ہے وہی معبود ہونے کے لائق ہے۔ اس کے سوا کسی کی رحمت کا یہاں ظہور

---

[1] معارف القرآن ج ۱ ص ۳۰۵ [2] جواہر القرآن ص ۷۹

نہیں ہے اس لیے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

۴۴۸۔ کچھ بزرگوں کی رائے ہیں یہ آیت توحید کی دلیل ہے یعنی اس بات کی کہ کائنات ہستی میں اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اللہ ہی تمہارے نیاز مندانہ اعمال کا مستحق ہے کیونکہ ۱۔ وہ آسمان و زمین کا خالق ہے۔ ۲۔ دن اور رات میں اختلاف کر رہا ہے۔ ۳۔ سمندروں میں جہاز رانی اس کی قدرت سے ہو رہی ہے۔ ۴۔ باران رحمت نازل کر رہا ہے۔ ۵۔ باران رحمت کے ذریعے مردہ زمین میں زندگی بخش رہا ہے۔ ۶۔ گہوارہ زمین میں مختلف جانداروں کو پھیلا رہا ہے۔ ۷۔ ہواؤں میں گردش کا نظام اس کی قدرت سے قائم ہے۔ ۸۔ آسمان و زمین کے مابین بادلوں کی تسخیر ہے ——— اور کچھ بزرگوں کے خیال میں اس آیت میں توحید کی نہیں بلکہ الہ کے رحمان و رحیم ہونے کی دلیل بیان کی جا رہی ہے یعنی خدا کے یگانہ معبود ہونے کی دلیل تو خدا کا رحمان و رحیم ہونا ہے اور الہ کے رحمان و رحیم ہونے کی دلیل کائنات خلقت میں ایک مقررہ نظام کے ساتھ رحمت کے مظاہر کا موجود ہونا ہے۔ گویا خدا کی توحید پر اگر رحمت سے استدلال کیا ہے تو کائنات کے افادہ و فیضان زینت و جمال تسویہ موزونیت و اعتدال قوام اور تکمیل و اتقان سے الہ کے رحمان و رحیم ہونے پر استدلال کیا ہے۔ بہرحال کچھ ہو مآل دونوں کا ایک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ وہ صفت رحمت میں کامل ہے اس لیے وہی مستحق عبادت ہے اور وہی معبود ہونے کے قابل ہے۔ اس کے سوا نہ کسی کی رحمت عام ہے اور نہ تام۔ رحمت کے عام اور تام ہونے یا کائنات میں اللہ کے الہ ہونے پر چند دلائل پیش فرماتے ہیں۔

کائنات ہستی کی تخلیق

اللہ کے الہ ہونے کی پہلی دلیل یہ پیش فرمائی ہے کہ اس کائنات علوی اور سفلی کی تخلیق میں چونکہ اللہ کے سوا کسی کو دخل نہیں ہے۔ نہ سوائے خدا کے یہ کسی نے بنایا ہے۔ اس لیے اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے۔ یاد رہے کہ دلیل ہمیشہ کسی دعویٰ کے لیے صرف وہ منظر، وہ حالت وہ عمل اور وہ کیفیت بن سکتی ہے جو مخالف تسلیم کرتا ہوا اور مانتا ہو۔ نبوت کے مخالفین چونکہ اللہ کے خالق السماوات والارض ہونے کو مانتے تھے اور اس خدائی عمل میں کسی کو شریک نہیں مانتے تھے اس لیے قرآن نے یہاں ان کے مسلمات کو بطور دلیل پیش کیا ہے۔ چنانچہ قرآن نے

ان کے اس نظریہ کو دوسرے موقعہ پر ان الفاظ میں پیش کیا ہے ۔

ولئن سألتھم من خلق السمٰوٰت والارض لیقولن اللہ

آپ اگر ان سے دریافت کریں کہ آسمان و زمین کا بنانے والا کون ہے تو ضرور کہیں گے کہ اللہ ہے۔

شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ توحیدِ وجود اور توحیدِ خالقیت میں مشرکینِ عرب یہودی اور عیسائیوں کا نبوت سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان کے الفاظ یہ ہیں ؛

لم یخالف فیھما مشرکو العرب ولا الیھود ولا النصاری

یعنی توحیدِ وجود اور توحیدِ خالقیت میں مشرکینِ عرب، یہودی اور عیسائی نبوت کے مخالف نہیں ہیں۔

اس سے بھی آگے ایک قدم بڑھاکر یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ صرف اتنی بات نہیں کہ مخالف نہیں ہیں بلکہ

بل القرآن العظیم ناص علی انھما من المقدمات المسلمۃ عندھم

بلکہ قرآن عظیم نے بتایا ہے کہ توحید کے یہ دونوں درجے ان مقدمات میں سے ہیں جو ان سب کے مانے ہوتے ہیں۔

ان الفاظ کے ذریعے قرآن نے توحیدِ خالقیت سے توحیدِ الوہیت پر استدلال کیا ہے یعنی جو اللہ تمام کائنات کی تخلیق کر رہا ہے آسمان ہوں یا زمین سب اس کی مخلوق ہیں اور جس کی خالقیت کو تم مانتے ہو اور جس کا اعتقاد تمہارے دماغوں میں موجود ہے۔ اس کے سوا کون اس کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے ۔

دن اور رات کا اختلاف

اللہ کے مستحقِ عبادت اور الٰہ ہونے کی دوسری دلیل یہ پیش کی ہے کہ یہ اللہ کی ذات ہے جس نے رات اور دن کا نظام قائم کیا ہے۔ کبھی رات بڑی ہے دن چھوٹا ہے اور کبھی دن بڑا ہے۔ گویا تاریکی اور روشنی ہی کا اختلاف نہیں بلکہ تاریکی اور روشنی کی کمیت کا اختلاف اور اس اختلاف کے نتیجے میں موسمیاتی اختلاف بھی اسی کا قائم کردہ ہے۔ اس اختلاف میں حکمتِ الٰہی کی کتنی ہی نشانیاں موجود ہیں۔ یہ بات کہ شب و روز کی آمد و شد کی دو مختلف حالتیں ٹھہرادی گئی ہیں اور وقت کی نوعیت ہر معین مقدار کے بعد بدلتی رہتی ہے۔ زندگی کے لیے بڑی ہی تسکین و دل بستگی کا ذریعہ ہے۔ اگر ایسا نہ

ہوتا اور وقت ہمیشہ ایک ہی حالت پر برقرار رہتا تو دنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا۔ قطبین کے اطراف میں جہاں شب و روز کے اختلاف کا کوئی نام و نشان نہیں اس اختلاف کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے اور پتہ چلتا ہے کہ یہ اختلاف گزرانِ حیات کے لیے کیسی عظیم الشان نعمت ہے۔ الغرض رات دن کا یہ اختلاف ایک مضبوط گواہ ہے۔ اس بات کے لیے کہ اس کائناتِ ہستی میں اللہ کے سوا الٰہ اور عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے۔

تسخیرِ بحر

والفلک یعنی جہازوں میں جو انسانوں کی کاربرآری کے لیے سمندروں میں چلتے رہتے ہیں اس بات کی شہادت موجود ہے کہ اللہ کے سوا الٰہ اور عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے۔ کیونکہ پانی کو حق تعالیٰ نے ایسا جوہرِ سیال بنایا ہے کہ اس کی پیٹھ پر لاکھوں ٹن وزن کے جہاز بڑے بڑے وزن کو لے کر مشرق سے مغرب تک منتقل کر دیتے ہیں اور ان کو حرکت میں لانے کے لیے ہواؤں کا چلانا اور پھر اپنی حکمت کے ساتھ ان کے رُخ بدلتے رہنا یہ سب اس کا پتہ دیتے ہیں کہ ان چیزوں کا بنانے والا اور چلانے والا کوئی بڑا ہی علیم و خبیر اور حکیم ہے۔ اور اس کارسازی میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ بما ینفع الناس میں اشارہ ہے کہ بحری جہازوں کے ذریعے ایک ملک کا سامان دوسرے ملک میں درآمد برآمد کے ذریعے عام انسانوں کے لیے بے شمار فائدے ہیں جن کو شمار بھی نہیں کیا جا سکتا۔ انسانی منفعت کی ہر ممکن چیز اس میں سمیٹ دی گئی ہے۔ سمندروں کی یہ تسخیر کمالِ علم، کمالِ قدرت اور کمالِ حکمت کی عکاسی کر رہی ہے۔ یہاں اگرچہ تسخیر کا لفظ نہیں ہے لیکن قرآن نے دوسرے موقعہ پر سمندروں میں جہازرانی کے لیے تسخیر استعمال کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

سخر لکم الفلک لتجری فی البحر بامرہٖ

مسخر کر دیا ہے اللہ نے جہازوں کو تمہارے لیے تاکہ وہ حکمِ الٰہی سے سمندروں میں چلتے رہیں۔

اس تسخیر کا قدیم منظر یہ تھا کہ انسان کا چھوٹا سا بچہ لکڑی کے دو گز کے تختے جوڑ کر سمندر کے سینے پر سوار ہوتا تھا اور دنیا کا منظر یہ ہے کہ آگ، پانی، ہوا، بجلی تمام عناصر پر انسان حکمرانی کر رہا ہے۔

بارانِ رحمت کا نزول

اللہ کے مستحقِ عبادت ہونے کی چوتھی دلیل یہ ہے کہ وہ انسانوں کی فائدہ رسانی کے لیے بارانِ رحمت لاتا ہے۔ اگر سمندروں میں تلاطم نہ ہوتا تو میدانوں کو زندگی اور شادابی کے لیے ایک قطرہ بارش میسر نہ آتا۔ اگر بادل کی گرج، بجلی کی کڑک نہ ہوتی تو بارانِ رحمت کا فیضان بھی نہ ہوتا۔ زیادہ واضح لفظوں میں یوں سمجھو کہ دُنیا میں ہر شخص پرورش کا محتاج ہے اور اسے پرورش مل رہی ہے۔ ضروری ہے کہ کوئی پرورش کرنے والا موجود ہے۔ یہ پرورش کرنے والا کون ہے۔ یقیناً وہ نہیں ہو سکتا جو خود پرورده اور محتاجِ پروردگار ہے۔ یہ صرف اللہ کی ذات ہے جو بارانِ رحمت کے ذریعے تمہاری کاربرآری کر رہی ہے اور جو تمہاری حاجت روائی کر رہا ہے۔ وہ ہی تمہارے نیازمندانہ اور عابدانہ اعمال کا مستحق ہے۔

زمین میں سرسبزی شادابی

گرمی کے موسم میں جو زمین خشک ہو جاتی ہے اس کو زمین کی موت سے تعبیر کیا ہے اور بارش کے بعد زمین پر جو سبزہ اور تروتازگی نظر آتی ہے اس کو زندگی فرمایا ہے۔ بارش کا برسنا اور زمین کا ہر سال مر کر زندہ ہونا اللہ سبحانہٗ کا بلاشرکت غیر کارنامہ ہے اور یہ اللہ کے بلاشرکت الٰہ ہونے کی دلیل ہے۔ قرآن میں دوسرے موقعہ پر زمین کے احیا کو نباتات سے تعبیر کیا ہے اور یہ بتایا ہے کہ اس میں جتنی چیزیں اُگتی ہیں موزوں ہیں، وزن کی ہوئی، مطلب یہ ہے کہ زمین میں جو کچھ اُگتا ہے اس کے لیے حکمتِ الٰہی نے ایک خاص اندازہ ٹھہرایا ہے۔ ہر چیز اپنی نوعیت، اپنی کیفیت اور اپنی کمیت میں ایک جچی تلی حالت رکھتی ہے جس سے کبھی باہر نہیں ہو سکتی۔ ممکن نہیں کہ گھاس کی ایک شاخ بھی ایسی نکل آئے جو گھاس کے مقررہ اندازے اور تناسب کے خلاف ہو۔

جانداروں کا زمین میں پھیلاؤ

دابہ ہر اس جانور کو کہتے ہیں جو زمین پر چلتا ہو چاہے وہ ذوی العقول ہوں یا غیر ذوی العقول۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان سے پانی برسایا، اس سے مختلف نباتات پیدا کیے جو ہر جاندار کی زندگی اور زندہ رہنے کا سامان ہے۔ پھر اس نباتات سے فائدہ اُٹھانے کے لیے جاندار اور ذی رُوح مخلوق

کو پیدا کیا تاکہ وہ زمین کی پیداوار کھا کر زندہ رہ سکے ۔

ہواؤں کی تبدیلی

ہواؤں کا چلنا اور اُن کا رُخ بدلنا جس کو تصریف الریاح فرمایا ہے ۔ یہ مفہوم بھی بہت عام ہے جس میں ہر قسم کی ہوائیں داخل ہیں ۔ پروا ہو یا پچھوا ، شمالی ہو یا جنوبی ، ہلکی یا تیز ، گرم ہو یا ٹھنڈی ۔ رحمت کی ہوا ہو یا عذاب کی ، غرض تمام ہواؤں کے اُلٹ پلٹ اور تبدیلی کو لفظ تصریف شامل ہے اور چونکہ ہواؤں کی یہ تبدیلیاں اور تصریفات اسی وحدہٗ لاشریک کا کارنامہ ہیں ۔ اس لیے اس کے علاوہ الٰہ کوئی نہیں ہے ۔

بادلوں کی تسخیر

بادلوں کا آسمان و زمین کے درمیان مسخر ہونا اور اللہ کے فرمان کا تابع ہونا بھی من جملہ دلائل توحید کی ایک بہت بڑی دلیل ہے ۔ بارانِ رحمت ہواؤں کی تبدیلی کے ذکر کے بعد بادلوں کی تسخیر کا ذکر یہ سمجھانے کے لیے کیا ہے کہ بارش زمین کی شادابی اور روئیدگی کا ذریعہ ہے لیکن دیکھو یہ سارا معاملہ کیسے انجام پا رہا ہے اور کس طرح ایک پورا انتظام کام کر رہا ہے ۔ پہلے سمندر سے بھاپ اُٹھتی ہے وہ پانی کے ذروں سے باردار ہو کر بلندی کی طرف چڑھتی ہے ۔ پھر بلندی میں ابر کی چادریں بنتی ہیں اور یہ چادریں محض حکمِ الٰہی سے فضا میں پھیل جاتی ہیں ۔ پھر وہی چادریں بارش کے قطرے بن کر گرنے لگتی ہیں ۔ اور زمین کے ایک ایک ذرے کو شاداب کر دیتی ہیں ۔ یہ آسمان میں پانی کا جمع ہونا رہنا اور پھر ٹھیک ٹھیک ہماری حاجتوں کے مطابق حکمِ الٰہی سے پانی برسنا اللہ کے الٰہ ہونے اور صرف اسی کے مستحق عبادت ہونے کی دلیل ہے ۔

۹۴۴ ۔ اس آیت میں خالقیت کے بعد اللہ کے الٰہ ہونے پر اللہ کی ربوبیت سے استدلال کیا ہے فرمایا اپنی زندگی کی ضرورتوں کو دیکھو اور پھر ربوبیتِ الٰہی کی بخششوں اور کار فرمائیوں پر نظر ڈالو ۔ زندگی کی کوئی قدرتی احتیاج ایسی نہیں ہے جس کا قدرتی انتظام نہ ہو ۔ اور کارخانۂ عالم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو تمہارے لیے افادہ و فیضان نہ رکھتا ہو حتیٰ کہ معلوم ہوتا ہے کہ پوری دُنیا کی ہر چیز صرف اس لیے بنی ہے کہ تمہاری کوئی نہ کوئی ضرورت پوری کر دے اور کسی نہ کسی شکل میں خدمت و نفع رسانی کا ذریعہ ہو ۔ پھر کیا ممکن ہے کہ یہ سب کچھ بغیر کسی ارادے کے

ظہور میں آگیا ہو۔ اور کوئی ربوبیت رکھنے والی ہستی موجود نہ ہو۔ اور اگر ایک ایسی موجود ہے تو ہر طرح کی عبادتوں کی مستحق اس کی ذات ہے۔ وہ ہرگز مستحق نہیں ہیں جو اپنی احتیاجوں میں خود کسی پروردگار کی پروردگاریوں کے محتاج ہیں [1]

مطلب یہ ہے کہ آسمان کے اس قدر وسیع اور بے ستون پیدا کرنے میں اور زمین کے اتنی وسیع اور مضبوط پیدا کرنے میں اور اس کے پانی پر پھیلانے میں اور رات دن کے بدلتے رہنے اور ان کے گھٹانے اور بڑھانے میں اور کشتیوں کے دریا میں چلنے میں اور آسمان سے پانی برسانے اور اس سے زمین کو سرسبز و تر و تازہ کرتے ہیں اور جملہ حیوانات میں اس سے توالد و تناسل نشو و نما ہونے میں اور جہاتِ مختلفہ سے ہواؤں کے چلانے میں اور بادلوں کو آسمان و زمین میں معلق کرنے میں دلائل عظیمہ اور کثیرہ ہیں۔ حق تعالیٰ کی وحدانیت اور اس کی قدرت اور حکمت و رحمت پر ان کے لیے جو صاحب عقل و تنظر ہیں [2]

اگر انسان کائنات کے اس کارخانے کو جو شب و روز اس کی آنکھوں کے سامنے چل رہا ہے محض جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ عقل سے کام لے کر اس نظام پر غور کرے اور ضد یا تعصب سے آزاد ہو کر سوچے تو یہ آثار جو اس کے مشاہدے میں آرہے ہیں اس نتیجے پر پہنچانے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ یہ عظیم الشان نظام ایک ہی قادرِ مطلق حکیم کے زیرِ فرمان ہے۔ تمام اختیار و اقتدار بالکل اسی کے ہاتھ میں ہے کسی دوسرے کی خود مختارانہ مداخلت یا مشارکت کے لیے اس نظام میں ذرہ برابر کوئی گنجائش نہیں ہے۔ لہٰذا فی الحقیقت وہ ہی ایک خدا تمام موجوداتِ عالم کا الٰہ اور معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی دوسری ہستی کسی قسم کے اختیارات رکھتی ہی نہیں ہے کہ الوہیت اس کا کوئی حصہ ہو [3]

لآیٰتٍ لقوم یعقلون یعنی ان میں غور و فکر کرنے والوں کے لیے اللہ کے مستحقِ عبادت ہونے کے دلائل ہیں۔ بلاشبہ اگر ان دلائل میں غور و فکر سے کام لیا جائے تو ان سے خداوند قادر و دانا کی وحدانیت کا پورا پورا یقین ہو جاتا ہے اور دل اس حقیقت پر مطمئن ہو جاتا ہے کہ اللہ کے سوا عبادت کے کوئی لائق نہیں ہے ہر قسم کی عبادت اسی کے ساتھ مخصوص ہے۔ ان

---

[1] ترجمان القرآن ج ۲ ص ۲۹۲

[2] حاشیہ شیخ الہند ص ۳۱　[3] تفہیم القرآن ص ۱۳۰

دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ زبردست قدرت، گہری حکمت اور وسیع علم کا مالک ہے۔ اس کی رحمت و شفقت کائنات کے ذرّے ذرّے کو شامل ہے۔ پھر ان تمام صفات و افعال میں وہ واحد و یکتا ہے۔ ان افعال میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ حصر قرآن کے مخاطبوں کے عقائد کے مطابق ہے کیونکہ مشرکین ان تمام امور کو اللہ ہی کے ساتھ مخصوص مانتے ہیں۔ اور ان کاموں میں وہ کسی کو خدا کا شریک نہیں سمجھتے تھے جیسا کہ خود قرآن میں اس کی صراحت ہے [1]

حقائق ہستی کی معرفت

ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ زمین اگر ۲۵ ہزار میل محیط کا کوئی گولا ہو تو یا اگر غیر محاسب شدہ وسعت کی کوئی چپٹی چیز ہے تو بھی، اگر تیزی اور پھرتی کے ساتھ گردش کر رہی ہے یا اگر اپنی جگہ پر ساکن ہے تو بھی ہر حال میں اور ہر صورت فرض کرنے کے بعد بھی کیسی عظیم الشان کاریگری کیسی بے مثال صناعی کا نمونہ ہے۔ فضا کی خلا میں کس کی قوت اسے اٹھائے پھرتی ہے! اس کے چاند، سورج اور ستاروں، سیاروں کے فاصلہ کا خاص تناسب کس نے قائم کر رکھا ہے۔ اس کی رفتار کی ایک خاص شرح کس نے متعین کر دی ہے۔ آفتاب سے اسے ایک خاص مقدار میں روشنی اور گرمی کون پہنچا رہا ہے۔ چاند سے روشنی اور خنکی ایک مقررہ حساب کے ساتھ کس کا دستِ قدرت لا رہا ہے؟ آسمان اگر ٹھوس مادی اجسام ہیں تو یا اگر خلا میں محض حدِ نظر ہیں تو بھی ہر صورت میں ان کی وضع ساخت ترکیب ہیئت، انسان کی دسترس سے کتنی بالا تر ہے گنتی و شمار سے باہر ثوابت و سیاروں کے سکون و حرکت کا انتظام کون کر رہا ہے؟ ستاروں کی یہ روشنی اور ان کے طلوع و غروب میں یہ باقاعدگی کس کے حکم سے قائم ہے۔ نظامِ فلکی کے بے شمار اجزاء و عناصر میں یہ ترتیب اور باہمی تناسب کس کی حکمت و صنعت کے دم سے زندہ ہے۔ رات اور دن کس طرح ایک برتر قانون کے اندر جکڑے نظر آ رہے ہیں۔ گرمی و سردی اور برسات ہر موسم میں ان کے مناسب وقت پر تبدیلیاں کون کرتا رہتا ہے؟ مختلف ملکوں میں ان کے طلوع و ظہور کے وقت کیسے بندھے ہوتے ہیں؟ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ جس وقت

---

[1] جواہر القرآن ص ۲۰

ہر بکہ میں دن چڑھتا ہے دمشق میں بھی دن نکل آتے۔ نہ یہ ہوتا ہے کہ امریکہ کی شام کبھی ایران کی شام بن جاتے۔ جنوری میں جو اوقات اندھیرا چھا جانے کے ہوتے ہیں یہ نہیں ہوتا کہ جون میں بھی باقی رہیں۔ آخر یہ رات دن کے بندھے ہوئے اور قانون میں جکڑے ہوتے تغیرات کس کی حکومت قاہرہ اور حکمت کاملہ کی شہادت دے رہے ہیں۔ بحر زخار سارے بڑا عظموں کو اپنی گرفت میں لیے رہنے والا، رقبہ میں خشکی سے چہار چند، اپنی اس ساری عظمت و رہبت کے باوجود کس طرح مشت خاک انسانوں کے قبضے میں آگیا ہے۔ کس طرح لکڑی کے تختوں کو جوڑ جاڑ کر، ان میں لوہے کی کیلیں ٹھونک کر، ان پر لوہے کی چادریں چڑھا کر انسان سمندر کے بڑے سے بڑے مہیب فاصلوں اور مسافتوں کو طے کر کے رکھ دیتا ہے۔ اس میں مدوجزر جب ہوگا قمری مہینے کی فلاں فلاں تاریخوں ہی میں ہوگا۔ اپنی ساری غضبناک تندی کے باوجود ایک خاص رقبہ کے حدود سے آگے نہ بڑھ سکے گا۔ ایک مخصوص مقرر وزن کی چیزوں کو وہ اپنے اوپر تیراتے گا اس کے پانی کا ایک مخصوص مزاج، خاص رنگ، خاص مزہ ہوگا۔ کنوؤں کے پانی سے مختلف دریاؤں کے پانی سے مختلف، اس طرح سینکڑوں دوسرے قانونوں کا پابند اسے کس کی مشیت، کس کی قدرت، کس کی حکومت نے کر رکھا ہے؟ بارش کا خاص خاص فصلوں میں خاص خاص موسموں میں یا خاص خاص فضائی تغیرات کے ماتحت ہونا، بخارات کا ایک خاص گرمی پاکر سمندری ذخیرہ آب سے اُٹھنا ایک فاصلہ تک اوپر جانا، ایک خاص درجہ کی سردی پاکر ان دخانی و ہوائی اجزا کا منجمد ہو جانا ان کا بادل کی شکل اختیار کر لینا۔ ایک خاص درجہ ثقل تک بڑے بڑے بھاری اور بوجھل بادلوں کا فضا میں مسخر رہنا، پھر مختلف تغیرات کے تحت مختلف علاقوں میں جانا پھر ایک بندھی ہوئی مقدار میں ایک متعین مدت کے اندر برسنا۔ اس سے ازسر نو خشک زمین میں جان پڑ جانا۔ یہ سارے ردوبدل کسی حکیم کی حکمت، کسی آمر کی حکومت، کسی قادر کی قدرت کی کیسی کھلی شہادت دے رہے ہیں۔ پھر حیات نباتی کے علاوہ خود حیات حیوانی حسن عجائب کا نمونہ ہے ہر زندہ جسم میں بے شمار ذرّوں اور خلیوں کا مجموعہ ہوتا ہے۔ ان کی ایک مخصوص ترتیب اور متعین ترکیب ہوتی ہے۔ ایک خاص حرارت حیات کو قائم رکھتی ہے۔ ایک مقدار سے زیادہ سردی اس اجتماع میں انتشار پیدا کرتی ہے۔ نظام تغذیہ، نظام تنفس، نظام تناسل، نظام عصبی وغیرہ جسم کے اندر کے متعدد نظامات پھر ہر نظام کے ماتحت بے شمار قاعدے اور ضابطے اس سارے نظام کی تکوین و قیام پر اللہ کے سوا کس کی قدرت، کس کی مشیت، کس کی حکومت

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَّتَّخِذُ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ اَنْدَادًا يُّحِبُّوْنَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَشَدُّ حُبًّا لِّلّٰهِ ۭ وَلَوْ يَرَى الَّذِيْنَ ظَلَمُوْٓا اِذْ يَرَوْنَ الْعَذَابَ ۙ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۙ وَّاَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعَذَابِ ۝

اور (اللہ کی الوہیت پر ان واضح اور صاف دلائل کے باوجود) کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسری ہستیوں کو اُس کا ہم پلہ، ہمسر اور مدِمقابل بنا لیتے ہیں۔ وہ اُن سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے محبت ہونی چاہیے۔ حالانکہ ایمان والوں کو سب سے زیادہ اللہ سے محبت ہونی چاہیے۔ اور کاش جو کچھ ان ظالموں کو عذاب دیکھ کر سوجھنے والا ہے وہ آج ہی ان کو سوجھ جائے کہ ساری قوتوں اور سارے اختیارات کا مرکز اللہ ہی کی ذات ہے اور یہ کہ اللہ کی سزا بے حد سنگین ہے۔

کار فرما ہے۔

اگر مانتے ہو کہ اللہ کی اور جانتے ہو کہ ان تمام صفات و افعال میں وہ یکتا و بے ہمتا ہے تو پھر عبادت اور بندگی کے لائق بھی وہ اکیلا ہے۔ دونوں باتوں میں طبعی ربط ہے اور دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں:

همامتشابكتان متلازمتان

دونوں باہم ملے جلے اور لازم و ملزوم ہیں

اللہ کی محبت اور ایمان لازم وملزوم ہیں

پہلی آیت میں توحید خالقیت اور توحید ربوبیت سے توحید عبادت پر استدلال کیا تھا اور بتایا تھا کہ زندگی کی ضرورتوں کو دیکھو اور پھر ربوبیت الٰہی کی بخششوں اور کار فرمائیوں پر نظر ڈالو اور سوچو کہ زندگی کی کوئی ضرورت ایسی نہیں ہے جس کا قدرتی نظام نہ ہو اور کارخانہ عالم کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو ربوبیت الٰہی کا فیضان نہ رکھتا ہو۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ پورا نظامِ عالم اس کی گواہی دے رہا ہے تو پھر سوچنا چاہیے کہ ہر طرح کی عبادت کے مستحق اللہ کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اس کے باوجود لوگوں نے عابدانہ تعلقات ان سے قائم کر رکھے ہیں جو اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں خود اللہ سبحانہ کی پروردگاریوں کے محتاج ہیں۔ قرآن نے اس آیت میں انداد کہا ہے۔ انداد جمع ند کی ہے۔ انداد سے مراد مفسرین قرآن نے اوثان واصنام، رؤساء وسرداران مقتدایان قوم وغیرہ بتایا ہے اور سب درست ہے۔

اصل یہ ہے کہ انسان کی فطرت میں اللہ سبحانہ کی غیب درغیب ذات کی طرف اگر کوئی میلان ہوتا ہے تو وہ صرف اس لیے کہ اس کے نزدیک نفع ونقصان کا رشتہ اسی قادر و توانا کی ذات سے وابستہ ہے اور اگر اس اعتقاد میں کمزوری نمایاں ہوتی ہے تو اللہ سبحانہ کی طرف یہ میلان ختم ہو جاتا ہے اور وہ بندہ خدا ہونے کی بجائے بندۂ اسباب بن جاتا ہے۔ اس کی زبان سے ذکر ہوتا ہے تو اسباب کا، اس کے دل میں اگر محبت ہوتی ہے تو صرف اسباب کی، خوف ہوتا ہے تو ان سے۔ حتی کہ اس کے جملہ عواطف ومیلانات کا مرکز اسباب بن جاتے ہیں اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ نفع ونقصان کے اصلی مالک سے اسے ایسا ذہول ہو جاتا ہے کہ اس کے تذکرہ سے بھی اسے کوئی لگاؤ نہیں رہتا بلکہ اور انقباض ہونے لگتا ہے۔ جو کیف اور جو ذوق وشوق اس کو یا رسول اللہ، یا علی، یا غوث کے نعروں میں میسر آتا ہے وہ یا اللہ کے نعرے میں نصیب نہیں ہوتا۔ جس محبت سے وہ بزرگوں کی نذر ونیاز کرتا ہے اس کے عشر عشیر سے اللہ کے نام کی قربانی نہیں کرتا۔ یہ توحید کا عمق نہیں ہے بلکہ شرک کے قوالب ہیں۔ ربوبیت، عبد و معبود، خالق ومخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک، پیدائش سے وفات تک بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے جو ایک لمحہ کے لیے منقطع نہیں ہو سکتا۔ جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے۔ وہ گہوارہ عدم سے لے کر فنائے محض کی

منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے ۔ انسان ذرہ ہو یا بصورتِ غذا، قطرۂ آب ہو یا نطفۂ خون، مضغۂ گوشت ہو یا مشتِ استخوان، شکمِ مادر میں ہو یا اس سے باہر ہو، بچہ ہو یا جوان، ادھیڑ ہو یا بوڑھا، کوئی آن کوئی لمحہ رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ اسلام کا سینہ اس ازلی و ابدی عشق و محبت کے نور سے کس درجہ معمور ہے اور وہ خم خانۂ الست کی سرشاری کی یاد بھٹکے ہوئے انسانوں کو کس کس طرح دلا رہا ہے ۔ اسلام کا سب سے پہلا حکم ایمان ہے ۔ ایمان کا سب سے بڑا لازمہ حب الٰہی ہے اور یہ وہ دولت ہے جو اہلِ ایمان کو عملاً نصیب ہوتی تھی ۔

شرک فی العبادۃ

۴۵۰ ۔ یعنی آدمیوں میں جو کہ شعور و عقل میں جمیع مخلوقات سے افضل ہیں کچھ ایسے بھی ہیں کہ باوجود دلائلِ سابقہ کے پھر غیر اللہ کو حق تعالیٰ کا شریک اور اس کے برابر بناتے ہیں[1]

مطلب یہ ہے کہ جو صفات اللہ کے لیے خاص ہیں ان میں سے کچھ کو دوسروں کی طرف منسوب کرتے ہیں اور خدا ہونے کی حیثیت سے بندوں پر جو اللہ کے حقوق ہیں وہ سب یا ان میں سے بعض حقوق یہ لوگ ان دوسرے بناوٹی معبودوں کو ادا کرتے ہیں ۔ مثلاً سلسلہ اسباب پر حکمرانی، حاجت روائی، مشکل کشائی، فریاد رسی، دعائیں سننا اور غیب و شہادت ہر چیز سے واقف ہونا یہ سب اللہ کی مخصوص صفات ہیں اور یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ بندے اسی کو مقتدرِ اعلیٰ مانیں ۔ اسی کے آگے اعترافِ بندگی کریں اسی کی طرف اپنی حاجتوں میں رجوع کریں، اسی کو مدد کے لیے پکاریں، اسی پر بھروسہ کریں، اسی سے اُمیدیں وابستہ کریں اور اسی سے ظاہر و باطن میں ڈریں[2]

۴۵۱ ۔ وہ ان سے ایسی محبت کرتے ہیں جیسے اللہ سے محبت ہونی چاہیے ۔ یعنی صرف اقوال و اعمال جزئیہ ہی میں ان کو اللہ کے برابر نہیں مانتے بلکہ محبتِ قلبی جو کہ صدورِ اعمال کی اصل ہے اس تک شرکت اور مساوات کی نوبت پہنچا رکھی ہے جو شرک کا اعلیٰ درجہ ہے اور شرک فی الاعمال اس کا خادم اور تابع ہے[3]

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ آج بھی مسیحیوں کو محبت اور تعلقِ خاطر خدا سے کہیں زیادہ "خدا کے بیٹے" اور

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۳۱ [2] تفہیم القرآن ص ۱۳ [3] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۳۱

پھر رُوح القدس، اور مقدس کنواری، سے ہے اور ہندوؤں کی محبت اور تعلق خاطر اپنے اشور اور پرماتما سے کہیں زیادہ درگا مائی، لکشمی مائی، اگنی دیوتا وغیرہ دیویوں، دیوتاؤں کے ساتھ اور ریشیوں، نیبوں سادھوؤں کے ساتھ ہے۔ کحب اللہ اس فقرے نے اسے بالکل صاف کر دیا کہ غیر اللہ سے نفس محبت ممنوع نہیں ہے۔ بلکہ ماں باپ، بھائی بہن، بیٹے بیٹی، عزیزوں، دوستوں، رفیقوں سے تو محبت درجہ طبعی میں ہے۔ ائمہ شریعت و طریقت سے بھی محبت رکھنا مستحب ہے۔ البتہ جو محبت حرام ہے وہ محبوب کو درجۂ ربوبیت پر جا پہنچانے والی محبت ہے۔ یا علی، یا حسین، یا خواجہ، یا غوث یا وارث کے نعرے لگانے والے ذرا اپنے دلوں کو ٹٹول کر دیکھیں کہ محبت کا کتنا حصہ اللہ کے لیے باقی رہ گیا اور کتنا دوسروں کی نذر ہو چکا ہے[1]

شرک فی الطاعۃ

خدا کی طرح ان کی تعظیم اور اطاعت کرتے ہیں اور خدا کے حکم کی طرح ان کے حکموں کو بلا چون و چرا واجب الاطاعت سمجھتے ہیں اور ایمان کا مقتضا یہ ہے کہ خالق و مخلوق کی محبت اور اطاعت میں فرق ہونا چاہیے[2]

یہاں شرک کی ایک قسم اور بھی ہے جس کی طرف صاحب معارف نے اشارا کیا ہے اور جس پر محقق اُمت شاہ عبدالعزیز نے خاص طور پر تنبیہہ فرمائی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ شرک کی ایک قسم شرک فی الطاعۃ ہے۔ اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کی اطاعت کرنی ایسی اطاعت کہ اس میں خدا تعالیٰ کے رسُول اور اس کے مبلغ ہونے کی حیثیت بھی ملحوظ نہ رہے حتیٰ کہ اگر اس کا حکم حکمِ خداوندی کے خلاف بھی ہو جب بھی اسی کی اطاعت کی جاتے اس کا نام مستقل طاعت ہے۔ یہ صرف ایک خدائے وحدہ لاشریک کا حق ہے۔ اس لیے اس میں بھی کسی کو شریک بنانا ایک قسم کا شرک ہی ہے۔ اسی لیے قرآن نے اہلِ کتاب کی اس نوع کی طاعت کو شرک سے تعبیر کیا ہے۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ

ان لوگوں نے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو خدا بنا رکھا ہے۔

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۶۲　[2] معارف م ۱ ص ۲۶۰

مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے عالموں کو اور عیسائیوں نے اپنے پوپ اور اس کے مقرر کیے ہوتے پادریوں کو دین کے بارے میں جو منصب دیا ہے اور وہ اپنے مولویوں اور درویشوں کے بارے میں جو اعتقاد رکھتے ہیں وہ فی الحقیقت ان کو پروردگار کے مثل بنا لینے کے مترادف ہے۔

خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے آیت کا یہی مطلب بتایا ہے جیسا کہ آپ سورۃ توبہ میں پڑھیں گے۔ اطاعت کا یہ منصب صرف رب العزت کے لیے ہے۔ اس مضمون سے حضرت شاہ صاحب نے یہ استنباط فرمایا ہے کہ قرآنی منظر میں دینی پیشواؤں کو اس بات کا حق دے دینا کہ وہ جو کچھ اپنی خواہش سے ٹھہرا دیں اس کی بلا چون و چرا اطاعت کی جائے، شرک کی ایک قسم ہے جسے مستقل اطاعت کہا جاتا ہے۔ اسی قسم کی اطاعت کو قرآن نے شرک کہا ہے۔ وان اطعتموھم انکم لمشرکون۔

یاد رہے کہ یہ ساری گفتگو مستقل طاعت میں ہے۔ باقی رہی غیر مستقل طاعت جس میں مطاع کو کوئی مستقل حیثیت نہیں ہوتی بلکہ یہ طاعت رب العزت کے حکم کی وجہ سے ہوتی ہے۔ جیسے رسول کی اطاعت، خلافت راشدہ کی اطاعت، ائمہ مجتہدین کی اطاعت، یہ شرک نہیں ہے بلکہ بعض مرتبہ فرض اور واجب ہو جاتی ہے۔

عبادت اور طاعت میں فرق

عبادت کی حقیقت غایت تذلل اور انتہائی خشوع و خضوع کا اظہار ہے۔ یہ اسی کے لیے مناسب ہے جس میں غایت درجہ عظمت ہو، ایسی عظمت کہ اس سے برتر وہم و گمان میں نہ آسکے۔ اس درجہ کی عظمت صرف ایک ذات میں منحصر ہے۔ اس لیے اس میں غیر مستقل طور پر بھی کسی کی شرکت کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اس میں ہر قسم کی شرکت شرک ہے۔

اس کے برعکس اطاعت کے لیے صرف حکمرانی کی لیاقت درکار ہے۔ یہ بذریعہ خلافت مخلوق میں بھی ہے اس لیے نیابتہً غیر اللہ کی اطاعت شرک نہیں ہے۔ اس جوہری فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے ہمارے زمانے میں دو طبقے افراط و تفریط کا شکار ہو گئے۔ ایک تو تاویل کر کے غیر اللہ کی عبادت کو جائز بتانے لگا۔ اور دوسرا مجتہدین کی اطاعت کو ناجائز بتلانے لگا۔ اور کوئی اطاعت رسول کو بھی شرک کا ایک شعبہ قرار دے بیٹھا۔ یہ تمام راہیں حقیقت سے ناآشنا ہونے کی دلیل ہیں۔

قرآن حکیم نے اس مسئلہ کو علمی و عملی دونوں طرح پر پورے طور سے واضح اور صاف کر دیا ہے علمی لحاظ سے صاف صاف بتایا ہے کہ رسُول کی اطاعت اللہ کی اطاعت سے علیحدہ نہیں ہوتی اس کو مستقل سمجھنا ہی غلط ہے اس لیے اس کے شرک ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ رسُول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ عبادت کے متعلق پورے قرآن میں اس قسم کی کوئی تعبیر نہیں آئی ہے جس سے یہ خطرہ ہو سکے کہ غیر اللہ کی عبادت کسی حالت میں بھی اللہ کی عبادت ہو سکتی ہے۔ عملی دائرے میں رسُول کی اطاعت اور اولی الامر کی طاعت کو خود قرآن نے ضروری قرار دیا ہے۔ پھر یہ شرک کیونکر ہو سکتا ہے۔ قرآن سے بغیر کسی تاویل کے صاف اور صریح طور پر جو کچھ سمجھ میں آرہا ہے وہ یہ ہے کہ اللہ کے حکم کے تحت کچھ افراد اور جماعتوں کی طاعت تو جائز ہے لیکن عبادت میں اس کا حکم یہی ہے کہ اس میں کسی کو بھی شریک نہ کیا جائے۔ لہٰذا مسئلہ اتنا صاف اور واضح ہے جتنا ہو سکتا ہے لیکن تاویل کا دروازہ کب بند ہو سکتا ہے۔ عبادت بغیر اللہ کے مشتاق اور طاعت رسُول سے بیزار دونوں جماعتیں اسے کھٹکھٹا رہی ہیں۔ اللہ تعالیٰ دونوں کو صحیح فہم مرحمت فرمائے۔[1]

۴۵۲ - ایمان والوں کو سب سے زیادہ اللہ سے محبت ہونی چاہیے۔ یعنی مشرکین کو جو اپنے معبودوں سے محبت ہے اہلِ ایمان کو اپنے اللہ سے اس سے بھی زیادہ اور مستحکم محبت ہوتی ہے۔ کیونکہ مصائب دُنیا میں مشرکین کی محبت بسا اوقات زائل ہو جاتی ہے اور عذابِ آخرت دیکھ کر تو بالکل تبری اور بیزاری ظاہر کریں گے جیسا کہ اگلی آیت میں آتا ہے برخلاف مومنین کے کہ ان کی محبت اللہ کے ساتھ ہر ایک رنج و راحت، مرض و صحت، دُنیا و آخرت میں برابر باقی اور پائیدار رہنے والی ہے۔ اور نیز اہلِ ایمان کو جو محبت اللہ سے ہے وہ اس محبت سے بھی زیادہ ہے جو محبت کہ اہلِ ایمان کو ماسوائے اللہ یعنی انبیاء، اولیاء، ملائکہ، عباد، علماء، یا اپنے آباؤ اجداد اور اولاد و مال سے ہوتی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سے تو اس کی عظمت شان کے موافق بالاصالہ بالاستقلال و اور اوروں سے بالواسطہ اور حق تعالیٰ کے حکم کے موافق ہر ایک اندازے کے مطابق محبت رکھتے ہیں۔

ع اگر فرقِ مراتب نہ کنی زندیقی۔ خدا اور غیر خدا کو محبت میں برابر کر دینا خواہ کوئی ہو مشرکین کا کام ہے[2]

مطلب یہ ہے کہ ایمان کا اقتضا یہ ہے کہ آدمی کے لیے اللہ کی رضا ہر دوسرے کی رضا پر

---

[1] ترجمان السنۃ ج ۲ ص ۲۹۶ [2] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۳۱

مقدم ہو اور کسی چیز کی محبت بھی انسان کے دل میں یہ مرتبہ اور مقام حاصل نہ کرے کہ وہ اللہ کی محبت پر اسے قربان نہ کر سکتا ہو۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا میں جو بھی فضل و کمال یا جود و نوال ہے اس کا منبع اور سرچشمہ اللہ سبحانہٗ کی ذاتِ گرامی ہے اس لیے اہلِ ایمان اللہ سبحانہٗ کو بالذات محبوب اور مخلوق کو بالعرض محبوب رکھتے ہیں کیونکہ محبت محبوب کی عزت و کمال کے مطابق ہوتی ہے اور عزت و کمال اور جود و نوال میں اللہ سے بڑھ کر کوئی نہیں۔ وہی منعم حقیقی ہے اس لیے راحت اور تکلیف، بیماری اور تندرستی، شادی اور غمی کسی حال میں بھی اہلِ ایمان کی محبت اللہ سے کم نہیں ہوتی۔ برخلاف مشرکین کے کہ جب اپنے معبودوں سے ناامید ہو جاتے ہیں تو ان سے منہ پھیر لیتے ہیں اور خدا کی طرف متوجہ ہو جاتے ہیں[1]

اور یہ وجہ بھی ہے کہ اگر کسی مشرک کو یہ ثابت ہو جائے کہ میرے معبود سے مجھے کوئی نقصان پہنچے گا تو اس کی محبت فوراً ختم ہو جاتی ہے اور مومن باوجود اس کے کہ نافع و ضار میں حق تعالیٰ ہی کو جانتا ہے لیکن اس کی محبت میں کوئی فرق نہیں آتا اور اللہ سبحانہٗ کی محبت ہر حال میں باقی رہتی ہے۔ نیز اکثر مشرکین مصیبتِ شدیدہ میں اپنے شرکاء کو فراموش کر دیتے ہیں۔ اور مومنین من حیث الایمان مصائب میں بھی خدا کو نہیں چھوڑتے ہیں[2]۔

اس موقعہ پر محبت کے لفظ کا استعمال ایک سچی، دلنشیں اور دلکش تعبیر ہے کیونکہ مومنین کا اللہ سبحانہٗ سے قلبی تعلق، روحانی کشش اور رشتہ مودت و قرابت رکھتے ہیں۔ یہ ایسا وجدانی تعلق ہے جو روحانی محبت سے مربوط ہے۔

اللہ پر ایمان اور اللہ کی محبت دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ پس اگر اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کو بھی ویسی ہی چاہت سے ماننے لگے جیسی چاہت سے صرف اللہ کے لیے ہے تو پھر یہ اللہ کے ساتھ دوسرے کو ہم پلہ بنا دینا ہوا۔ اور توحیدِ الٰہی کا عقیدہ درہم برہم ہو گیا۔ مومن وہ ہے جو سب سے زیادہ اللہ کی محبت رکھنے والا ہو۔

۴۵۳۔ اور کاش جو کچھ ان ظالموں کو عذاب دیکھ کر سوجھنے والا ہے وہ آج ہی ان کو معلوم ہو جاتے یعنی جن ظالموں نے اللہ کے لیے شریک بنائے اگر وہ اس آنے والے وقت کو دیکھ لیں

---

[1] معارف القرآن ج۱ ص ۲۶۰ [2] معارف القرآن م شفیع ص ۳۵۳ [3] ترجمان القرآن ص ۳۶۳

کہ جس وقت ان کو عذابِ الٰہی کا مشاہدہ ہوگا کہ زور سارا اللہ ہی کے لیے ہے عذابِ خداوندی سے کوئی بچا نہیں سکتا اور اللہ کا عذاب سخت ہے تو ہرگز اللہ کی عبادت کو چھوڑ کر دوسروں کی طرف متوجہ نہ ہوں اور نہ اُن سے اُمیدِ منفعت رکھیں لے

اس آیت میں یریٰ کو مفسرینِ قرآن نے بعلم کے معنے میں بتایا ہے۔ لیکن کچھ شارحینِ قرآن کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ لفظ یریٰ یہاں آنکھ سے دیکھنے کے معنے میں ہی ہے معقول المعنے بات کے لیے اس موقعہ پر اس کا استعمال منظر کشی کی خاطر ہے گویا معقول کو محسوس کے درجہ میں لاکر کہا گیا ہے کہ اگر معاملہ ان کے سامنے متشکل ہو کر آجائے تو کیا بنے گا۔ اور یہاں عبارت میں لو یعنے اگر کاش کا جواب قرآن میں مذکور نہیں ہے اس کا جواب کیا ہے حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں کہ جواب یہ ہے کہ وہ سمجھ لیتے کہ قوت اللہ کے لیے ہے۔ مفتی محمد شفیع کا بھی میلان یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ ظالم مشرکین جب دُنیا میں کسی مصیبت کو دیکھتے تو اس کے وقوع میں غور کر کے یہ سمجھ لیا کرتے کہ اللہ تعالیٰ کا عذاب آخرت میں کہ دارالجزا ہے اور بھی سخت ہوگا تو اس طرح غور کرنے سے بنائے ہوئے معبودوں کا عجز اور اللہ سبحانہ کی عظمت وقدرت منکشف ہو کر توحید و ایمان اختیار کر لیتے۔

دراصل آیت میں دو ترکیبیں ہیں۔ ایک یہ کہ لَو شرطیہ ہے اور اس کا جواب محذوف ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دُنیا میں شرک کر کے اپنی جانوں پر ظلم کر رہے ہیں اگر ان کو معلوم ہو جائے کہ قیامت میں جب وہ اللہ کا عذاب دیکھیں گے اس وقت ان کا کیا حال ہوگا تو وہ ہرگز شرک نہ کریں اور وہ عذاب اس لیے پائیں گے کہ روزِ قیامت سارا زور اور اختیار صرف اللہ کا ہوگا اور اس کا عذاب نہایت سخت ہوگا اور جس کو مشرکوں نے اپنا سفارشی اور حیلہ ساز سمجھا ہوا تھا وہ سب بے بس اور عاجز ثابت ہوں گے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ لَو تمنی کے لیے ہے جس کا جواب نہیں آتا اور یریٰ یعنے یعلم ہے اور عذاب سے دنیوی عذاب مراد ہے مطلب یہ ہے کہ کاش یہ مشرک جب دُنیا میں مصائب و آلام کی صورت میں اللہ کا عذاب دیکھتے۔ اس وقت وہ اس بات کا یقین کر لیتے کہ ہر قسم کی قوت و طاقت اور تصرف و اختیار صرف خدا ہی کو حاصل ہے اور اس کی گرفت نہایت زبردست ہے اور یہ بات ان کی سمجھ میں آجاتی کہ اللہ کے سوا کوئی پیغمبر یا ولی، فرشتہ یا جن ناصر و مددگار اور مختار و متصرف نہیں اور نہ اللہ کے عذاب سے کوئی بچا سکتا ہے لے

لے حاشیہ شیخ الہند ص ۱۳ ۲ے جواہر القرآن ص ۸۲

إِذْ تَبَرَّأَ الَّذِينَ اتُّبِعُوا مِنَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا وَرَأَوُا الْعَذَابَ وَ
تَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ﴿۱۶۶﴾ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّ
لَنَا كَرَّةً فَنَتَبَرَّأَ مِنْهُمْ كَمَا تَبَرَّءُوا مِنَّا ۗ كَذَٰلِكَ يُرِيهِمُ
اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ عَلَيْهِمْ ۖ وَمَا هُمْ
بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ﴿۱۶۷﴾ رکوع

جب ایسا ہوگا کہ وہ جھوٹے پیشوا جن کی پیروی کی گئی ہے، بجائے اس کے کہ اپنے پیروؤں کے کام آئیں اپنے پیروؤں سے بیزاری[۴۵۴] ظاہر کریں گے کیونکہ عذاب اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں گے اور ان کے باہمی رشتوں کا تمام سلسلہ[۴۵۵] ٹوٹ جائے گا اور وہ لوگ جنہوں نے ان کی پیروی کی تھی بول پڑیں گے کاش ہمیں ایک[۴۵۶] بار دنیا میں واپسی کی مہلت مل جاتی تو ہم ان سے اسی طرح بیزاری ظاہر کردیں گے جس طرح یہ ہم سے بیزاری ظاہر کررہے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کو ان کے اعمال کو سرتاسر حسرت اور پشیمانی بنا کر دکھائے گا۔[۴۵۷] اور وہ آگ کے عذاب سے چھٹکارا پانے والے نہیں ہیں۔[۴۵۸]

پیروان باطل کی پیروی کا نتیجہ

اس سے پہلی آیت میں کام کرنے کا اصول محبت کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ جب عقل سے کام لے کر انسان ایمان لے آئے تو پھر کام کرنے کے لیے اپنے اندر محبت الٰہی کا وہ ولولہ پیدا کرے

جو تمام ولولوں سے زیادہ ہو۔ دُنیا میں جس قدر لوگ کام کرتے ہیں وہ کسی نہ کسی جذبہ کے ماتحت ہی کام کرتے ہیں مگر فرمایا کہ مومنوں کا جذبۂ محبت خدا کی راہ میں کام کرنے کے لیے سب جذبات محبت سے بڑھ کر ہونا چاہیے۔ اگر حبِ وطن، حبِ قوم، حبِ لسان یا خاندان کی محبت کوئی جذبہ پیدا کر سکتی ہے اور انسان اس کے ذریعے بڑے سے بڑے کام کر سکتا ہے تو ان تمام ولولوں سے بڑھ کر اللہ کی محبت کا جذبہ ہونا چاہیے۔ اور صرف اللہ کی محبت کے لیے کام کرنا جس کے سامنے دوسری تمام محبتیں ہیچ ہوں۔ اللہ کا تصور اور اس کی محبت زندگی اور وجود کے ہر گوشہ اور اعمال کی ہر شاخ میں اس طرح دائر و سائر ہو جس طرح خون رگوں میں گردش کرتا ہے۔ جب خدائے برتر کی محبت اس طرح افراد کے ذہن و قلب پر پیوست ہو جاتی ہے تب ان کے اندر سے کفر و باطل کی مرعوبیت دُھل کر نکل جاتی ہے۔

قرآن نے پہلی آیت میں شرک فی العبادۃ کرنے والوں کا دلکش انداز میں انجام پیش کیا تھا اس آیت میں شرک فی الطاعۃ کرنے والوں کے انجام سے آگاہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ عبادت اور طاعت دونوں کی بنیاد محبت ہے۔ خدا کی زمین پر بندگی اور پرستش خدا کی ہونی چاہیے اور معبودانِ باطل کو ہر جگہ سے اُکھاڑ پھینکا جائے۔ خواہ یہ معبود ہوائے نفس کی شکل اختیار کریں یا دیوتاؤں اور بُتوں کی، طبقاتی اور قومی مفاد کی صورت میں ظاہر ہوں یا آمروں اور لیڈروں اور بادشاہوں کا بھیس بدل کر آئیں جیسے یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے کہ بندے اسی کو مقتدائے اعلیٰ تصور کریں اور اسی کی پرستش کریں ایسے ہی مالک الملک ہونے کی حیثیت سے یہ منصب بھی اللہ سبحانہٗ کا ہے کہ بندوں کو امر و نہی کے احکام دے اور یہ صرف اللہ کا حق ہے کہ بندے اس کی حاکمیت کو تسلیم کریں۔ اس کے حکم کو منبع قانون مانیں، اسی کو امر و نہی کا مختار سمجھیں۔ اپنی زندگی کے معاملات میں اس کے فرمان کو فیصلہ کن قرار دیں۔

پہلی آیت میں انداد سے جیسے عبادت کی حد تک اوثان اور اصنام مراد ہیں ایسے طاعت کی حد تک رؤسا، سردارانِ قوم اور زعماء مراد ہیں۔ قرآن میں اطاعت کے سلسلے میں تصریح ہے

ربنا انا اطعنا سادتنا و کبراءنا

ان سرداروں، رؤساء اور مقتدایانِ قوم اور خود مقتدیوں اور پیروکاروں کا کیا انجام ہوگا اس آیت میں یہاں اس منظر کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جب قیامت میں مشرکین کے خواص امراء رؤسا اور زعماء اپنے عوام اور اپنی رعایا سے علیحدگی کا اعلان کریں گے۔

۴۵۴ - اپنے پیروؤں سے بیزاری ظاہر کریں گے یعنی وہ وقت ایسا ہوگا کہ بیزار ہو جائیں گے متبوع اپنے تابعداروں سے اور بت پرست اور بتوں میں کوئی علاقہ نہ رہے گا۔ ایک دوسرے کا دشمن ہو جاتے گا عذاب الٰہی دیکھ کر۔[1]

مطلب یہ ہے کہ مشاہدہ عذاب کا وقت وہ ہوگا جب کہ تمام ذی اثر اور صاحبِ اقتدار لوگ جن کی پیروی کی جاتی تھی اور ان کا کہا چلتا تھا ان سب لوگوں سے بیزار اور علیحدہ ہو جائیں گے جو ان کی پیروی کرتے تھے اور ان کے کہنے پر چلتے تھے۔ یہ سب تابع اور متبوع عذابِ خداوندی کا مشاہدہ کریں گے۔[2]

یہاں خاص طور پر گمراہ کرنے والے پیشواؤں اور لیڈروں اور ان کے نادان پیروؤں کے انجام کا اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ جس غلطی میں مبتلا ہو کر پچھلی اُمتیں بھٹک گئیں اس سے مسلمان ہوشیار رہیں اور رہبروں میں امتیاز کر سکیں اور غلط رہبری کرنے والوں کے پیچھے چلنے سے بچیں گے۔

یہاں اس منظر کا نقشہ پیش کیا گیا ہے جب مشرکین کے خواص، علماء، امراء اپنے عوام اور رعایا سے علیحدگی کا اعلان کر دیں گے اور انہیں بے یار و مددگار چھوڑ دیں گے۔[3]

۴۵۵ - اور ان کے باہمی رشتوں کا تمام سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ اصل ارشاد میں لفظ اسباب آیا ہے۔ لغت میں اس رسی کو کہتے ہیں جس کے ذریعے آدمی درخت پر چڑھتا ہے۔ پھر مقاصد تک پہنچنے کے وسائل اور ذرائع کے معنے میں استعمال ہونے لگا۔ مطلب یہ ہے کہ تابع اور متبوع، راعی اور رعیت، امام اور مقتدی کے درمیان جو دنیوی روابط تھے وہ سب ختم ہو جائیں گے اور ان کے تراشیدہ رشتوں میں سے کوئی رشتہ وہاں قائم نہ رہے گا۔ یعنی اہلِ باطل کے جتنے بھی باہمی تعلقات ہیں استادی شاگردی کے، ہم نسبی اور قرابت کے، ہم وطنی اور دوستی کے یہ سب اسی دُنیا تک محدود ہیں۔ آخرت میں جو حقائق کے مشاہدے و معائنہ کا وقت ہوگا سب ایک دوسرے سے بے تعلق ہو جائیں گے۔ قرآن میں ہے الاخلاء یومئذ بعضھم لبعض عدو الا المتقین۔ بھم میں ب عن کے معنے میں بھی لی گئی ہے اور با کو سببیہ کہا گیا ہے یعنی یہ قطع تعلق ان کے کفر کی وجہ سے ہوگا۔ مقصد یہ بتانا ہے کہ ان میں ہر قسم کے تعلقات منقطع ہو جائیں گے۔ نہ کوئی

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۳۱ [2] کشف الرحمٰن ص ۳۸ [3] تفہیم القرآن ص ۱۳۲
[4] تفسیر ماجدی ص ۶۲

تابع رہے گا اور نہ کوئی متبوع۔ ہر ایک جرم میں شریک ہوگا سب پر فردِ جرم لگ جائے گی۔ ہر ایک کو اپنی فکر دامن گیر ہوگی۔ اس وقت یہ تبری اور بیزاری ذرہ برابر مفید نہ ہوگی۔

۴۵۶۔ کاش ہمیں ایک بار دُنیا میں واپسی کی مہلت مل جائے۔ مشرکین کہیں گے کسی طرح ہمیں پھر دُنیا میں لوٹ جانا نصیب ہو تو پھر ہم بھی ان سے اپنا انتقام لیں اور جیسے یہ آج ہم سے جُدا ہو گئے ہم بھی ان کو جواب دے کر جُدا ہو جائیں لیکن آرزو محال ہے بجز افسوس کے ان کو کوئی نفع نہ ہوگا۔[1]

مطلب یہ ہے کہ انبیا علیہم السلام کی مخالفت کرنے والے عام طور پر دو قسم کے لوگ ہوتے تھے۔ ایک تو وہ جو آبادی میں ذی اثر اور اربابِ اقتدار ہوتے تھے جیسے سردار، نمبردار، چودھری، سرمایہ دار قوم کے بڑے لوگ قوم کے رؤسا، اور دوسرے وہ چھوٹے لوگ جو ان بڑوں کے زیرِ اثر ہوتے تھے۔ اور ان کی اتباع کرتے تھے اور ان کے کہنے پر چلتے تھے جیسے عام شہری۔ روزِ قیامت جب عذاب کی ہولناکیوں کا مشاہدہ کریں گے تو یہ چھوٹے اور عام شہری ان بڑوں سے یہ خواہش کریں گے کہ ہمیں اس عذاب سے بچاؤ۔ کیونکہ تم ہمارے بڑے ہو اور ہم تمہارے کہنے کی وجہ سے کفر و شرک کا ارتکاب کرتے تھے لیکن قیامت کے ہولناک دن میں بھلا کون کس کے کام آسکتا ہے۔ وہ بڑے لوگ ان کو دھتکار دیں گے کہ ہم کو اپنی پڑی ہوئی ہے ہم تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتے۔ اس موقع پر ہر قسم کے تعلقات، میل جول، برادری، رشتہ داری، ایک فریق کا متبوع ہونا دوسرے کا تابع ہونا غرض ہر قسم کا ارتباط ختم ہو جائے گا۔ اس مایوسانہ طرزِ عمل کو دیکھ کر یہ چھوٹے لوگ جو بڑوں کے تابع فرمان تھے غصّے ہو کر یہ کہیں گے کہ کسی طرح دُنیا میں ہم ایک دفعہ پھر چلے جائیں اور تم کو ویسا ہی کورا جواب دیں جیسا تم نے کورا جواب دے کر ہم سے اپنا پیچھا چھڑا لیا ہے۔ یہ اس گفت و شنید کا خلاصہ ہے جو اس دن تابع و متبوع چھوٹوں اور بڑوں کے درمیان پیش آئے گی۔ قرآن حکیم میں اور بھی متعدد مقامات پر مختلف عنوان سے یہ واقعہ ذکر کیا گیا ہے۔

۴۵۷۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ان کے ان اعمال کو سرتاسر حسرت و پشیمانی بنا کر دکھائے گا یعنی جیسے مشرکین کو عذابِ الٰہی اور اپنے معبودوں کی بیزاری دیکھ کر سخت حسرت ہوگی اسی طرح ان کے جملہ اعمال کو حق تعالیٰ ان کے لیے موجبِ حسرت بنا دے گا۔ کیونکہ حج و عمرہ اور صدقات و خیرات

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۳۱

جو اچھے کام کیے ہوں گے وہ سب تو بسبب شرک رائیگاں ہو جائیں گے اور شرک و گناہ جس قدر کیے ہوں گے ان کا بدلہ عذاب ملے گا تو اب پہلے بُرے اعمال سب کے سب موجب حسرت ہوں گے کسی عمل سے کچھ نفع نہ ہوگا۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اس طرح ان کے مزعومہ اسباب نجات کو باطل کر کے اور ان کی آرزوں پر پانی پھیر کر ہم ان کے اعمال کو سراپا حسرت و ندامت بنا کر ان کو دکھا دیں گے یعنی ان کی وہ تمام عبادتیں جو دنیا میں انہوں نے کیں تھیں شرک کی وجہ سے سب رائیگاں جائیں گی اور آخرت میں حسرت و ندامت کے سوا کچھ حاصل نہ ہو گا۔[2]

حسرت و ندامت

بتانا یہ ہے کہ جس طرح معبودوں کی بیزاری دیکھ کر مشرکین کو حسرت ہو گی ایسے ہی ان کے اعمال کو اللہ تعالیٰ حسرت و ندامت کر کے دکھاتے گا۔ رویت سے مراد اگر یہاں دل کی رویت ہے تب تو حسرات تیسرا مفعول ہے ورنہ فقرے میں حال واقع ہے۔ حسرت کے معنے سخت ندامت اور پشیمانی کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جب ان کے اعمال ان کو دکھائے جائیں گے تو ان کو ان پر سخت ندامت و پشیمانی ہو گی۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ بُرے اعمال کو حسرت و ندامت کی شکل میں پیش کیا جائے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اعمالِ صالحہ کو دکھایا جائے اور کہا جائے کہ ان نیک اعمال کے ترک کرنے پر تم عذاب میں مبتلا ہوئے ہو تو اس پر ان کو سخت حسرت و پشیمانی ہو گی۔ بہرحال بُرے اعمال کے ارتکاب اور نیک اعمال کے ترک پر دونوں ہی پر اس دن حسرت و پشیمانی ہو گی۔ بلکہ کافروں نے جو کام نیکیاں سمجھ کر کیے ہوں گے اور وہ وہاں بے کار ثابت ہوں گے تو اس پر بھی ندامت ہو گی۔ اور چونکہ ہر طرف ہر لحاظ سے ندامت اور حسرت ہی حسرت نظر آتے گی اسی لیے اس دن کا نام یوم الحسرت ہے۔[3]

حضرت شاہ عبدالقادرؒ کی رائے

شاہ صاحب فرماتے ہیں جن کو لوگ پوجتے ہیں سوائے اللہ کے، اس روز پوجنے والوں کو جواب

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۲۱ [2] جواہر القرآن [3] کشف الرحمٰن ص ۳۸

دیں گے اور ان کی اُمید سب کی طرف سے ٹوٹے گی اور افسوس کھائیں گے۔ اس وقت کچھ فائدہ نہیں افسوس کا، یہاں سے بُت پرستوں کا احوال ہے۔ (موضح)

شاہ صاحب نے متبوع سے کافروں کے معبود مراد لیے ہیں۔ کافروں کے یہ معبود اوثان اور اصنام کی صورت میں تھے۔ یہ اوثان اور اصنام کے اشخاص اگرچہ پتھر کی مورتیاں تھیں مگر جن کی یہ مورتیاں تھیں وہ شخصیتیں تھیں یعنی بزرگوں کے مجسمے اور ان کی یادگاریں، ان کی عبادت سے مشرکین کا مقصد یہ ہوتا تھا کہ ان بزرگوں کی ہمیں خوشنودی حاصل ہو جائے اور وہ ہماری حاجت روائی اور مشکل کشائی کر سکیں۔ یہ معبود بھی اس دن اپنی براءت کا اظہار کریں گے اور اپنی پوجا کرنے والوں کی پوجا کا انکار کر دیں گے۔ حضرت شاہ صاحب نے جو تفسیر کی ہے اس میں حسرت و ندامت کی زیادہ شدت ہے کیونکہ جن کو حاجت روا اور مشکل کشا جان کر پوجا تھا جب وہی ان کی امداد سے انکار کر دیں گے تو اس وقت پشیمانی بہت زیادہ ہوگی اور نجات کی آس بالکل ہی ٹوٹ جائے گی۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ جب ان کے معبود ان کی سرپرستی سے ہاتھ اٹھالیں گے اور یہ دیکھیں گے کہ جن کو ہم معبود سمجھتے تھے وہ خود ہیچ پریشان ہیں اور کس مپرسی میں مبتلا ہیں تو بگڑ کر کہیں گے کہ کاش ہم دُنیا میں ایک بار پھر چلے جائیں اور تمہاری عبادت سے بالکل باز رہیں اور تمہاری پرستش سے دست بردار ہو جائیں۔

حضرت شاہ صاحب نے جو لطیف معنے بیان کیے ہیں اس کی بھی گنجائش ہے اور یہ شاہ صاحب کی وقت نظر کا کمال ہے اور اس معنے کے لحاظ سے اوپر والی آیت سے بہت گہرا ربط ہے، کیونکہ اوپر کی آیت میں انداد کی محبت کا ذکر تھا اور اس آیت میں محبت کے انجام کا ذکر ہے۔

بالفاظ دیگر عام مفسرین کی تشریح کے مطابق آیت میں غیر اللہ کی بندگی کرنے والوں کی تردید کی گئی ہے اور شاہ صاحب کی تشریح کے مطابق آیت میں غیر اللہ کی پرستش کرنے والوں کی تردید ہے اور دونوں صحیح ہیں۔

۴۵۸۔ اور آگ کے عذاب سے چھٹکارا پانے والے نہیں ہیں یعنی دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، بخلاف موحدین اور اہل ایمان کے کہ اگر بسبب معاصی دوزخ میں جائیں گے تو انجام کار نجات پا جائیں گے۔[1]

کیونکہ شرک کی سزا دائمی عذاب ہے البتہ گنہگار مسلمان انبیاء کی شفاعت سے بعد چندے جہنم

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۳۱

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ۝ إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ۝

اے لوگو! آ زمین کی چیزوں میں سے جس قدر حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں انہیں کھاؤ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ بلاشبہ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ وہ تمہیں برائی اور بدکاری کے کاموں کا ہی حکم دیتا ہے۔ اور یہ حکم دیتا ہے کہ اللہ کے متعلق وہ باتیں کہو جن کے بارے میں تمہیں علم نہیں ہے۔

سے نکال لیے جائیں گے۔ چونکہ مسند الیہ کی تقدیم مفید حصر ہوتی ہے اس لیے آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ جہنم سے نہ نکلنا کفار کے ساتھ مخصوص ہے۔ معلوم ہوا کہ کفار کے علاوہ کوئی فریق ایسا بھی ہے کہ جو بعد چندے دوزخ سے نکالا جائے گا وہ مسلمان گنہگاروں کا فریق ہے۔

بندگی صرف اللہ کا حق ہے

پہلی آیت میں اللہ کو چھوڑ کر اندادسے تعلقات وابستہ کرنے والوں کا ذکر تھا۔ انداد دو قسم کے ہیں ایک وہ جن سے پرستش کے تعلقات قائم کیے جاتے ہیں اور ایک وہ ہیں جن سے بندگی کے تعلقات وابستہ کیے جاتے ہیں۔ عامہ مفسرین نے قرآن کی آیت اذا تبرأ الذین اتبعوا کا مصداق بندگی کے تعلقات کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ داستان راعی ، رعیت ، رئیس اور مرؤس اور زعیم اور عوام کی ہے۔ اس آیت میں اسی بندگی سے متعلق ان احکام کا بیان شروع ہے جن کے متعلق

طرح طرح کی گمراہیاں لوگوں میں پھیل ہوئی تھیں اور دین حق کی بنیادی صداقتوں پر ان کا اثر پڑ تا تھا۔ یہ اگرچہ بیان فروعی احکام کا ہے لیکن اپنی تشریحات و موعظت میں سرتاسر اصول معارف ہیں من جملہ عالمگیر گمراہیوں کے ایک بنیادی گمراہی یہ تھی کہ کھانے پینے کے بارے میں طرح طرح کی خودساختہ پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ اور دینداری کی سب سے بڑی بات یہ سمجھی جاتی تھی کہ انسان کھانے پینے میں سب سے زیادہ توہم پرست ہو۔ ظاہر ہے کہ جس جماعت کی ذہنیت ایسی توہم پرستانہ پابندیوں میں جکڑی ہوئی ہو وہ کبھی آزادی کے لیے ترقی و وسعت کا قدم نہیں اٹھا سکتی۔ سب سے پہلے اس معاملہ کی حقیقت واضح کی گئی اور بتایا گیا کہ یہ صرف اللہ کا حق ہے کہ بندے اس کی حاکمیت تسلیم کریں۔ اس کے حکم کو منبع قانون مانیں۔ اسی کو امر و نہی کا مختار سمجھیں۔ اپنی زندگی کے معاملات میں اس کے فرمان کو فیصلہ کن قرار دیں اور حلت و حرمت کے لیے اسی کی طرف رجوع کریں۔ جو شخص خدا کی ان صفات میں سے کسی صفت کو بھی کسی دوسرے کی طرف منسوب کرتا ہے وہ دراصل اسے خدا کا مدِمقابل اور ہمسر قرار دیتا ہے۔

۴۵۹۔ اہل عرب بُت پرستی کرتے تھے اور بتوں کے نام پر سانڈ بھی چھوڑتے تھے اور ان جانوروں سے نفع اٹھانا حرام سمجھتے تھے۔ اور یہ بھی ایک طرح کا شرک ہے۔ کیونکہ تحریم و تحلیل کا منصب اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ اس بارے میں کسی کی بات ماننی گویا اس کو اللہ کا شریک بنانا ہے اس لیے پہلی آیت میں شرک کی خرابی بیان فرما کر اب تحریم حلال سے ممانعت کی جاتی ہے[1] اس مضمون کا گزشتہ مضمون سے عظیم الشان ربط ہے۔ گزشتہ آیت میں بتایا گیا تھا کہ اللہ سبحانہٗ یکتا و تنہا ہے وہی خالق و مالک ہے۔ جو اس کے شرکاء و انداد بناتے ہیں ظالم ہیں۔ اس میں بتایا ہے کہ وہی یکتا و تنہا پروردگار تمام انسانوں کا رازق ہے اور اس کی الوہیت کا تقاضا یہ ہے کہ وہی پوری انسانیت کے لیے قانون بنائے اور ضابطہ حیات مقرر کرے۔ یہ بات بیان کر کے قانون سازی کو عقیدے کے ساتھ عجیب طریقہ سے مربوط کر دیا گیا ہے۔

۴۶۰۔ زمین کی چیزوں میں سے جس قدر حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں انہیں کھاؤ۔ یعنی جو کچھ زمین میں پیدا ہوتا ہے اس میں سے کھاؤ بشرطیکہ وہ شرعاً حلال و طیب ہوں۔ نہ تو فی نفسہٖ حرام ہو۔ جیسے مردار، خنزیر اور ما اھل بہ لغیر اللہ اور نہ کسی امر عارضی سے اس میں حرمت

---

[1] حاشیہ شیخ الہندؒ ص ۳۱

اُگتی ہو۔ جیسے غصب، چوری، رشوت، سُود کا مال کہ ان سب سے اجتناب ضروری ہے [1]

حلال کا مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں بجائے خود جائز ہیں حرام نہیں کی گئی ہیں اور طیب یہ ہے کہ جو چیزیں جائز ذرائع سے حاصل ہوئی ہوں اور جن میں غیر کا حق نہ ہو۔ مثلاً غصب، چوری، بیع فاسد اور اُجرتِ فاسدہ نہ ہو۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ کھانے پینے کے معاملے میں ان تمام پابندیوں کو توڑ ڈالو جو توہمات اور جاہلانہ رسموں کی بنا پر لگی ہوئی ہیں۔ اور جب تمہیں معلوم ہو چکا کہ گمراہوں اور گمراہ کرنے والوں کا انجام حسرت و ندامت کے سوا کچھ نہیں ہے تو اپنے پیشواؤں کی رائے پر مت چلو۔ اور ان کے کہنے سے کسی چیز کو اپنے اوپر حلال اور حرام نہ کرو کیونکہ یہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ایک قسم کی ہمسری ہے۔ حلال و حرام ہونا محض اللہ کے حکم کے تابع ہے کیونکہ مالکِ حقیقی اللہ کی ذاتِ گرامی ہے۔ کسی کو اللہ کی ملک میں تصرف کا حق حاصل نہیں ہے کہ کسی چیز پر حلال و حرام ہونے کا فتویٰ لگائے لہٰذا تم اس سے توبہ کرو اور اللہ کی پیدا کی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ بشرطیکہ وہ حلال ہوں اور پاکیزہ ہوں [3]

سہل بن عبداللہ کہتے ہیں کہ نجات تین باتوں کے اپنانے میں ہے۔ حلال روزی، فرائض کی بجا آوری اور حضور انورؐ کی پیروی۔ ابو عبداللہ الساجی کہتے ہیں علم کی تکمیل کا دارومدار پانچ باتوں پر ہے۔ اللہ کی معرفت، حق آشنائی، عمل میں اخلاص، سنت کی پیروی اور حلال روزی۔ حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ سعد بن وقاص لیثی نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ آپ دُعا فرمائیں اللہ مجھے مستجاب الدعوات بنا دے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں ارشاد فرمایا کہ لقمہ حلال کا التزام کر لو خود بخود مستجاب الدعوات ہو جاؤ گے۔ یہ ہے اسلام میں اکل حلال کی اہمیت [4]

۱۶۸۔ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو۔ یعنی شیطان کی پیروی ہرگز نہ کرو کہ جس چیز کو چاہا حرام کر لیا جیسے بتوں کے نام سانڈ اور جس کو چاہا حلال کر لیا جیسے **ما اُحل بہ لغیر اللہ** وغیرہ [5] مطلب یہ ہے کہ اللہ کی جائز کی ہوئی چیزوں کو حرام اور اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں کو جائز قرار دینا

---

[1] افاداتِ شیخ الہندؒ ص ۳۱ [2] تفہیم القرآن ص ۱۳۳ [3] معارف القرآن م ۱ ص ۲۶۳
[4] تفسیر ماجدی ص ۶۲ [5] افاداتِ شیخ الہندؒ ص ۳۱

شیطان کی پیروی کرنا ہے۔ یہ حکم تو ہر شیطانی روش کے لیے عام ہے لیکن خصوصیت کے ساتھ تعلق حرام اور حلال غذاؤں سے ہے۔

اصل عربی میں لفظ خطوات آیا ہے یہ خطوۃ کی جمع ہے، چلنے والے کے دونوں قدموں کے درمیانی فاصلہ کو کہتے ہیں۔ شیطان چونکہ نافرمانی کی راہوں پر چلتا ہے اس لیے اس کے قدم بقدم چلنے سے مراد اللہ کی نافرمانی کرنا ہے، اسی مشہور ائمہ تفسیر میں سے قتادہ ابن وعامر اور سدی نے اللہ کی ہر معصیت کو خطوات شیطان بتایا ہے۔ امام مسروق سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ میں نے اپنے بیٹے کو راہ خدا میں ذبح کرنے کی نذر مانی ہے۔ فرمایئے کہ میری نذر کا کیا حکم ہے؟ حضرت مسروق نے فرمایا کہ بکرا ذبح کرو اور بیٹے کو ذبح کرنے کی نذر خطوات شیطان سے ہے۔

سید رشید رضا اس جگہ بڑی عجیب بات لکھ گئے ہیں۔ فرماتے ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ اغواء اور وسوسہ اندازی میں شیطان کے پیروکار نہ بنو۔ کیونکہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے شیطان کی دشمنی سے واقف ہونے کے لیے شیطان کی معرفت ضروری نہیں ہے۔ شیطان کی معرفت کہ شیطانی ہواجس اور خواطر کا اندازہ لگایا جائے۔ یہ ہواجس، خواطر اور وساوس ہی شیطان کی وہ وحی ہے جس کا قرآن نے تذکرہ کیا ہے۔

شیاطین الانس والجن یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول غرورًا

انسان اور جنوں کے شیاطین باہم ایک دوسرے کو خوش آئند باتیں دھوکہ کے طور پر کرتے ہیں۔

خوش آئند باتوں سے وہ تمام چالیں، وسوسے اور شکوک وشبہات مراد ہیں جن سے شیاطین لوگوں کو حق کے خلاف ابھارتے اور اکساتے ہیں۔ انسان کے فرائض میں یہ بات ہے کہ وہ ان خواطر کا محاسبہ کرے اور اس کے لیے ایک ضابطہ مقرر ہے اور دیکھے کہ نفس میں جب کسی کار خیر مثلاً مال خرچ کرنے کا داعیہ رونما ہو اور اس کے ساتھ مال جمع کرنے اور اقتصادی بدحالی کا وسوسہ آئے تو سمجھ لے کہ یہ شیطانی وحی ہے اور کسی طرح بھی دھوکہ میں نہ آئے۔ ایسے ہی جب حق کی مدافعت کے لیے وقت کا مطالبہ ہو اور شیطان ایسے وساوس ڈالے کہ خطرات مول نہ لینے چاہییں تو سمجھ لے کہ وسوسہ شیطانی ہے۔ شیطانی وسوسہ کا سب سے زیادہ نمایاں اثر تحلیل وتحریم پر ہوتا ہے۔ مصالح قومی اور ملکی سیاست کے پیش نظر وہ لوگوں کو اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حرام کرنے پر ابھارتا ہے۔ اس معاملہ میں شیطان کی پیروی نہ کرنی چاہیے۔ اور اس کے دھوکہ سے بچنا چاہیے۔ حلال وہ ہے جسے اللہ نے حلال کیا اور حرام وہ ہے جسے اللہ نے حرام کیا۔ جو شخص یا جو ادارہ یہ کام کرتا ہے وہ شیطان

کی پیروی کرتا ہے کیونکہ تحلیل و تحریم اللہ کا منصب ہے۔

۴۶۲۔ وہ تمہیں برائی اور بدکاری کے کاموں ہی کا حکم دیتا ہے یعنی شیطان کا کام اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ تم کو بری اور بے حیائی کی باتیں سکھاتا ہے۔

اصل ارشاد میں سُوء اور فحشاء کے الفاظ آئے ہیں۔ سُوء ایسی ہر برائی جس کا ہونا یا جس کا انجام انسان کو غمگین بنا دے۔ کچھ برائیاں ایسی ہیں جن پر انسان شیطان کے بہکانے میں آکر دفاع کی خاطر قدم اٹھاتا ہے لیکن برائی کے ارتکاب کے نتیجے میں اسے اچانک نقصان سے دوچار ہونا پڑتا ہے اور بعض کاموں میں برائی آغاز میں ظاہر نہیں ہوتی لیکن انجام میں اس کا ظہور ہوتا ہے فحشاء یہ لفظ فحش سے بنا ہے جس کے اصلی معنے حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے معنی قبیح یعنی برائی کے ہیں کیونکہ جس چیز کی جو حد خالق کائنات نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا برائی ہے یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جاتے وہ فحشاء کہلاتی ہے۔ قرآن نے گناہ کے معنے میں حدودِ الٰہی سے تعدی اور تجاوز کے الفاظ بھی استعمال کیے ہیں۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حدیں مقرر کر دی ہیں۔ اب جو ان حدوں سے آگے بڑھتا ہے وہ فحشاء کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی بنا پر زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے اور اس کے معنے ہی امر قبیح کے ہو گئے۔ اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر بدگوئی اور بدکاری پر ہوتا ہے۔ جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ سُوء وہ چیز ہے جو عقلاً ناپسندیدہ ہو اور فحشاء وہ جسے شریعت نے برا قرار دیا ہو۔ یہ فرق بھی بتایا گیا ہے کہ سُوء میں کوئی حد شرعی مقرر نہیں ہوتی اور فحشاء میں حد شرعی مقرر ہوتی ہے۔ یہ معنے حضرت عبداللہ بن عباس سے قرطبی نے نقل کیے ہیں۔ کچھ کا خیال ہے کہ سُوء سے مراد ہر قسم کے معاصی ہیں اور فحشاء سے گناہوں کی بدترین قسم مراد ہے اس لیے فحشاء کی تفسیر زنا اور بخل سے کی گئی ہے۔ بعض بزرگوں نے حلال و طیب کے مقابلے کی وجہ سے بری اور گندی چیزوں سے تفسیر کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیطان کی چالوں سے ہوشیار ہو کر رہو۔ تمہارا یہ کام نہ ہونا چاہیے کہ شیاطین کے قدم بقدم چلو۔ ان ملعونوں کا تو مشن ہی یہ ہے کہ لوگوں کو بے حیائی اور برائی کی طرف لے جائیں۔

۴۶۳۔ اور شیطان تم کو حکم دیتا ہے کہ اللہ کے بارے میں وہ باتیں کہو جن کا تمہیں علم نہیں ہے یعنی مسئلے اور احکامِ شرعیہ اپنی طرف سے جیسا کہ بہت سے مواقع پر دیکھا جاتا

ہے کہ مسائلِ جزئیہ سے گزر کر امورِ اعتقادیہ تک نصوصِ شرعیہ کو چھوڑ کر اپنی طرف سے احکام تراشے جاتے ہیں اور نصوصِ قطعیہ اور اقوالِ سلف کی تحریف اور تغلیط کرتے ہیں [1]

مطلب یہ ہے کہ ان وہمی رسموں اور پابندیوں کے بارے میں یہ خیال کہ یہ سب امور مذہبی ہیں جو اللہ سبحانہٗ کی طرف سے تعلیم کیے گئے ہیں دراصل شیطانی اغواء کا کرشمہ ہے اس لیے کہ فی الواقع ان کے من جانب اللہ ہونے کی کوئی سند موجود نہیں ہے [2]

گویا تحریم و تحلیل کا ضابطہ خود بناؤ اور کہو کہ اللہ کا حکم یہی ہے اور اس نے ہی یہ فرمایا ہے کہ کہ فلاں کی نیاز دلوایا کرو یا ان کی سفارش سے تم کو میری بارگاہ میں تقرب حاصل ہو جائے گا۔ اس طرح عقائد، اعمالِ تعبدیہ اور شعائرِ دینیہ کے خود ساختہ پیمانوں کو اللہ کے دین کی طرف منسوب کرو اور اللہ کے ذمہ ایسی باتیں لگاؤ جن کا تمہیں قطعاً علم نہیں ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں یعنی مسئلے اپنی طرف سے بنا لو جیسے اب بھی بہت غلط العام ٹھہرا رہے ہیں (موضح القرآن) شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے زمانے میں بہت سی بدعات اور رسوماتِ شرکیہ میں لوگ مبتلا ہیں اور ان سب رسومِ قبیحہ اور بدعات کو اللہ اور اس کے رسول کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ نیز عرض کرتا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے زمانہ پر کیا موقوف ہے ہمارے زمانے میں بھی عوام کا یہی حال ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت سے بے اعتنائی ہے اور بدعات کا نہایت اہتمام ہے۔ بہر حال شیطان کا یہی طریقۂ کار ہے کہ وہ لوگوں کو غیر شرعی اُمور پر آمادہ کرتا رہتا ہے۔

آیت میں شیطان کے وسوسہ کو امر سے تعبیر فرمایا ہے۔ امر کے معنے حکم دینے کے ہیں۔ تو اس میں نکتہ یہ ہے کہ شیطان کے وسوسہ پر اس طرح کاربند ہوتے ہیں جیسے کوئی حاکم کا حکم مانتا ہے [3]

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ اپنی طرف سے حلال و حرام کا پیمانہ ہرگز نہ بنانا چاہیے ایسا کرنا اللہ کے حقِ ربوبیت پر چھاپہ مارنے کے مترادف ہے۔ اور یہ شرک ہے کیونکہ یہ خدا ہی کی شان ہے کہ وہ اپنے بندوں پر حلال و حرام مقرر کرے۔ اس طرح کہنے سے اللہ پر جھوٹ باندھنا ہے۔ یہ خیال کرنا کہ اگر فلاں اس طرح کیا جائے گا تو ٹھیک ہو جائے گا ورنہ اس میں گڑبڑ ہو جائے گی غلط ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ عقیدہ کہ محرم میں پان نہ کھایا جائے لال کپڑے

---

[1] افادات شیخ الہندؒ ص ۳۱ [2] تفہیم القرآن ص ۱۳۳ [3] تیسیر القرآن ص ۳۹

وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا ۗ أَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ ﴿١٧٠﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الَّذِي يَنْعِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ۚ صُمٌّ بُكْمٌ عُمْيٌ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ ﴿١٧١﴾

اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو ہدایات[۴۶۴] نازل کی ہیں ان کی پیروی کرو تو کہتے ہیں نہیں۔ بلکہ ہم تو اسی[۴۶۵] طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو چلتے پایا ہے۔ کوئی ان سے پوچھے کہ چاہے ان کے باپ دادے عقل[۴۶۶] سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں پھر بھی ان ہی کی پیروی کرو گے اور واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی مثال[۴۶۷] جنہوں نے راہ کفر اختیار کی ایسی ہے جیسے ایک چرواہا جو چوپاؤں کے آگے چیختا جاتا ہے کہ چوپائے کچھ بھی نہیں سنتے مگر صرف بلانے اور پکارنے کی آواز۔ وہ بہرے[۴۶۸]، گونگے، اندھے ہیں پس کبھی سوچنے اور سمجھنے والے نہیں ہیں

نہ پہنے جائیں۔ بی بی کی صحنک مرد نہ کھائیں۔ ان کی نیاز میں فلاں فلاں ترکاریوں کا ہونا ضروری ہے مستی بھی ہو، حنا بھی ہو۔ شاہ عبدالحق کا تحفہ حلوہ ہے اس کو احتیاط سے بناؤ اور حقہ پینے والے کو نہ کھلاؤ۔ شاہ مدار کی نیاز مالیدہ ہے۔ بوعلی شاہ قلندر کی نیاز سویاں اور اصحاب کہف کی گوشت روٹی ہے۔ شادی کے موقعہ پر فلاں فلاں رسم اور موت پر فلاں فلاں رسم ضروری ہے۔ قول علی اللہ

بغیرِ علم بلکہ افتراء علی اللہ کذباً ہے۔ اگر غور کرو گے تو بدعت کی بھی یہی حقیقت ہے کہ جس کام کو اللہ نے دین نہیں بتایا اس کو بلا دلیلِ شرعی دین بنا دیا جائے۔

اسی راہ سے عقائد میں فساد، شریعت میں تحریف اور اللہ کے دین میں بگاڑ آتا ہے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ سورۃ اعراف میں آئے گی۔

آبائی دین و رسوم کی پابندی

ہر نئی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے اڑبن کر سامنے آتی ہے وہ قومی رسم و رواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے۔ انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی زنجیر نہیں ہے۔ دوست و آشنا کا چھوٹنا، ماں باپ سے علیحدگی، آل و اولاد سے کنارہ کشی، مال و جائداد سے دست برداری، جماعت کی مخالفت، قوم سے انقطاع، وطن سے دُوری ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے۔ ملکی رسم و رواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش و آئین کی موروثی اُلفت، حق و باطل کی تمیز اور نیک و بد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے۔ عام دُنیا کی فطری حالت کے علاوہ عرب کی قوم قدامت پسندی اور قدیم حالت پر بقا و استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب دینِ حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی وہ یہی طریقۂ آباء کے چھوڑنے کا مسئلہ تھا اور اسی کو وہ دینِ حق کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل سمجھتے تھے۔ قرآن نے بار بار ان کے اس نظریہ کو دُہرایا اور اس کی لغویت کو ظاہر کیا ہے اور بتایا کہ ایمان کی راہ عقل و بصیرت کی راہ ہے اور کفر کا خاصہ کورانہ تقلید اور بے بصیرتی ہے۔ اندھی تقلید یعنی جو کچھ دیکھتے اور سنتے آئے ہیں بے سمجھے بوجھے اسی پر جمے رہنا اور دلیل و برہان اور علم و بصیرت کی جگہ اپنے آباؤ اجداد کا قول و عمل حجت سمجھنا ہدایت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

۲۶۴۔ اللہ نے جو ہدایات نازل کی ہیں ان کی پیروی کرو۔ اصل ارشاد میں ما انزل اللہ ہے۔ مراد یہ ہے کہ جب ان سے عالم برگیر شریعتِ الٰہی کی ماتحتی میں آنے کے لیے کہا جاتا۔ جیسے ایمان باللہ کی ایمان بالرسول کے بغیر کوئی حیثیت نہیں ہے ایسے ہی اتباع ما انزل اللہ رسول سے الگ ہو کر کوئی حیثیت نہیں رکھتی۔ کیونکہ خدا کی محبت کا معیار قرآن کے نزدیک صرف

یہ ہے کہ رسُول کا اتباع کیا جائے۔ جو قرآن اس زور کے ساتھ اتباعِ رسُول کا حکم دے رہا ہے وہ رسُول کی اتباع سے الگ ہوکر ما انزل اللہ کے اتباع کا حکم کیسے دے سکتا ہے۔ آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ما انزل اللہ کو چھوڑکر آباؤ اجداد کی پیروی نہ کرنا چاہیے یہ مطلب نہیں ہے کہ رسُول کی پیروی بھی نہ کرنی چاہیے قرآن کی آیت کا یہ مطلب بتانا قرآن سے انتہائی بدمذاقی کی دلیل ہے۔ رسُول کی اطاعت خدا ہی کی اطاعت ہوتی ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ

اس لیے اتباعِ رسُول کو اتباعِ ما انزل اللہ کے منافی سمجھنا خود قرآن کے صریح خلاف ہے۔ چہ جائے کہ اس پر اُلٹا قرآن سے استدلال کیا جائے۔

قرآن نے خود اپنے نزول کی غرض ہی یہ بتائی ہے کہ رسُول اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعے جو اللہ نے اسے مرحمت فرمائی ہے۔ لوگوں کے درمیان فیصلے کرے۔ اللہ سبحانہٗ کی اپنے رسُول کی عطا کی ہوئی یہی فہم آپ کے عمل، ارشادات اور فیصلوں کی صورت میں محفوظ ہے۔ اسی کا نام ما اراک اللہ ہے اور اسلامی قانون میں ما انزل اللہ کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔ دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ وحی قرآنی کے ذریعے نہیں کرتا تھا بلکہ رسُول کے فہم، نورِ نبوت، فیضِ حکمت، شرحِ صدر، تبیینِ حقیقت اور ارائت کے ذریعے فرماتا تھا۔ لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً وحی قرآنی کے مطابق ہوتا تھا۔

رسُول کا وجود مستقل ہدایت ہے

اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو امام و پیشوا اور ہادی و رہنما فرمایا ہے یعنی نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد ان کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہوجاتی ہے۔ ان کی بعثت ہی اس لیے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں اور ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں۔ جس اُمت میں مبعوث ہوتے ہیں اس کے سامنے ہدایت کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں کان دونوں کی روشنی لے کر ایک ہوتی ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرمایا ہے۔

کیف تکفرون وانتم تتلی علیکم آیات اللہ وفیکم رسولہ

تم کیسے کفر کروگے دراں حالیکہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسُول موجود ہے۔

اس آیت نے بتادیا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں کے پاس تھیں ایک تو

آیاتِ الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں دوسری خود رسول کا مستقل وجود جو اپنی تعلیم و تلقین، فیضِ صحبت، اور اثر سے ان کو بھٹکنے نہ دیتا اور ضلالت سے روکتا تھا۔ اگر صرف کتابِ الٰہی اس کام کو انجام دے سکتی تو رسول کے ذکر کی حاجت بلکہ خود بعثت کی ضرورت نہ تھی۔

۴۶۵۔ نہیں، بلکہ ہم تو اسی طریقہ پر چلیں گے جس پر ہم نے باپ دادا کو پایا ہے۔ گویا طریقِ آبائی ان کے خیال میں غلطی کا امکان ہی نہیں۔ یہی جمود عین جہالت و ضلالت ہے۔ آج مشرک قوموں اور مبتدع فرقوں کا بھی یہی حال ہے۔ جب انہیں اتباعِ حق کی دعوت دی جاتی ہے تو وہ جواب میں اپنے آباؤ اجداد کی رسوم کو پیش کر دیتے ہیں[1]۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان لوگوں کو سمجھایا جاتا ہے کہ حلال کو حرام اور حرام کو حلال کہنے سے باز آؤ اور اپنی طرف سے ھذا حلال و ھذا حرام نہ کہو۔ اور تمام مشرکانہ رسومات کو ترک کر دو اور ما انزل اللہ کی اتباع اور پیروی کرو۔ ما انزل اللہ سے مراد خواہ قرآن ہو یا وہ احکام ہوں جن پر قرآن مشتمل ہے تو اس مطالبہ پر وہ یہ جواب دیتے ہیں کہ ہم ما انزل اللہ کی بجائے اپنے بڑوں کی اتباع کریں گے گویا مطلقاً اتباع کا انکار نہیں کرتے بلکہ قرآن کے مقابلے میں اپنے آباؤ اجداد کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہیں[2] گویا ان پابندیوں اور رسموں کے لیے ان کے پاس کوئی سند اور کوئی حجت اس کے سوا نہیں ہے کہ باپ دادا سے یوں ہی ہوتا چلا آیا ہے۔ نادان سمجھتے ہیں کہ کسی طریقے کی پیروی کے لیے یہ حجت بالکل کافی ہے[3]۔

۴۶۶۔ کوئی ان سے پوچھے کہ چاہے ان کے باپ دادے عقل سے کورے اور ہدایت سے محروم رہے ہوں پھر بھی ان ہی کی پیروی کرو گے یعنی حق تعالیٰ کے احکام کے مقابلے میں اپنے باپ دادا کا اتباع کرتے ہیں اور یہ بھی شرک ہے چنانچہ بعض جہال مسلمان بھی ترکِ نکاح بیوگان وغیرہ رسومِ باطلہ میں ایسی بات کہہ گزرتے ہیں اور بعض زبان سے گو نہ کہیں مگر عمل درآمد سے ان سے ایسا ہی مترشح ہوتا ہے سو یہ بات اسلام کے خلاف ہے[4]۔

ائمہ کی تقلید

اس آیت سے جس طرح اندھی تقلید اور اتباع کی مذمت ثابت ہو رہی ہے ایسے ہی جائز تقلید

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۶۳ [2] تیسیر القرآن ص ۳۹ [3] تفہیم القرآن
[4] افاداتِ شیخ الہندؒ ص ۳۲

کے لیے اسی آیت سے ایک ضابطہ بھی معلوم ہو رہا ہے۔

قرآن نے جائز تقلید کی طرف ان دو لفظوں میں اشارہ کیا ہے لایعقلون اور لایھتدون۔ قرآن کا اس پر اعتراض ہے کہ وہ بے عقل اور بے ہدایتوں کی پیروی کر رہے ہیں۔ ہدایت سے مراد وہ احکام ہیں جو اللہ سبحانہ کی جانب سے منصوص اور واضح طور پر نازل ہوتے ہیں۔ اور عقل سے مراد وہ احکام ہیں جو بذریعہ اجتہاد نصوص شرعیہ سے استنباط کیے گئے ہوں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کے باپ دادے بے عقل اور بے ہدایت نہ ہوتے یعنی اگر ان کے پاس اللہ کی جانب سے آئے ہوئے احکام ہوتے اور ان میں نصوص شرعیہ سے استنباط کی صلاحیت ہوتی تو قرآن کو ان کی اتباع اور تقلید پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اس میں اشارا ہے کہ جس عالم کے بارے میں یہ اطمینان ہو جائے کہ اس کے پاس قرآن و سنت کا علم ہے اور اس کو درجۂ اجتہاد بھی حاصل ہے تو ایسے عالم اور مجتہد کی اتباع کی ممانعت آیت سے ثابت نہیں ہوتی ہے بلکہ آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس عالم کے بارے میں یہ علم ہو جائے کہ اس کے پاس قرآن و سنت کا علم ہے اور اس کو درجۂ اجتہاد بھی حاصل ہے کہ جو احکام صراحتہً قرآن و سنت میں نہ ہوں ان کو قرآن و سنت سے استنباط کر سکتا ہے تو ایسے عالم کی اتباع جائز ہے، نہ اس لیے کہ یہ اس عالم کی بات کی پذیرائی ہے بلکہ اس لیے کہ یہ اللہ کے حکم کو ماننا اور اس کا اتباع ہے۔ ہم چونکہ براہ راست اللہ کے حکم سے واقف نہیں ہیں اس لیے کسی عالم مجتہد کا اتباع کرتے ہیں تاکہ اللہ تعالیٰ کے احکام پر عمل پیرا ہو سکیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ

> کسی بھی مجتہد کے بارے میں ہمارا یہ اعتقاد نہیں ہے کہ اللہ نے اس کی طرف فقہ کی وحی کی ہے اور ہم پر اس کی طاعت فرض کی ہے اور یہ معصوم ہے۔ ہم ان میں سے کسی کی اتباع اور اقتدار کرتے ہیں تو صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کے عالم ہیں۔

یہ بات شاہ صاحب نے حافظ ابن حزم کے اس موقف کے جواب میں کہی ہے جو انہوں نے اس آیت سے استدلال کر کے اختیار کی تھی کہ تقلید حرام ہے۔ اس حد تک تو ہم بھی حافظ موصوف کے ہمنوا ہیں کہ اس آیت کی رو سے تقلید حرام ہے لیکن کس کی؟ نادان اور بے ہدایت آباؤ اجداد کی۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر ان کے آباؤ اجداد کے پاس عقل کی روشنی اور نورِ ہدایت ہوتا تو قرآن کو ان کی تقلید پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں کورانہ تقلید یہ ہے کہ گمراہی اور بے عقل کی تقلید کی جائے خواہ پھر اس کے ساتھ ہزار دلائل ہوں۔ اس کے بالمقابل روشن خیالی

یہ ہے کہ ارباب ہدایت اور اہلِ عقل کی پیروی کی جاتے۔ مولانا شہید نے منصب امامت میں احکام شرعیہ کے علم کی دو راہیں بتائی ہیں فرماتے ہیں،

علم باحکامِ شرعیہ بدو طریق حاصل شود تقلید و تحقیق

اور اس کے بعد تحقیق کے دو طریقے بتائے ہیں اجتہاد اور الہام۔ اجتہاد کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ معقول ذوی العقول ہو۔ یعنی وہ لایعقلون اور لایہتدون کا مصداق نہ ہوں۔ مجتہدین کو فنِ اجتہاد میں انبیاء کے مشابہ قرار دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔

پس مشابہ با بنیاد دریں فنِ مجتہدین مقبولین اند پس ایشاں را از ائمہ فن باید شمرد مثل ائمہ اربعہ ہر چند بسیار از بسیار گزشتہ اند فاما مقبول درمیان جمہورِ اُمت ہمیں چند اشخاص اند پس گویا مشابہت تامہ دریں فن نصیب ایشاں گردیدہ بناء علیہ درمیان جماہیر اہلِ اسلام از خواص و عوام بلقب امام معروف گردیدند۔

امام قرطبی نے اس آیت کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ اس آیت میں جس تقلید سے روکا گیا ہے اس سے مراد باطل عقائد و اعمال میں آباؤ اجداد کی تقلید ہے۔ عقائد صحیحہ اور اعمالِ صالحہ میں اگر کوئی اہلِ علم و بصیرت کی تقلید کرتا ہے تو وہ اس میں داخل نہیں ہے جیسا کہ سورۃ یوسف میں قرآن نے حضرت یوسف کی زبانی انکشاف کیا ہے۔

اتبعت ملۃ آبائی ابراھیم و اسحاق و یعقوب

اس سے معلوم ہوا کہ آباء کی تقلید باطل میں حرام حق میں جائز بلکہ مستحسن ہے۔ امام قرطبی نے اس آیت کے تحت ائمہ مجتہدین کی تقلید کے متعلق لکھا ہے کہ

کچھ لوگوں نے اس آیت کو تقلید کی مذمت میں پیش کیا ہے اور باطل کی حد تک صحیح ہے لیکن حق کی حد تک اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حق میں تقلید کرنا دین کے اُصولوں میں سے ایک مستقل بنیاد ہے اور مسلمانوں کے دین کی حفاظت کا بہت بڑا ذریعہ ہے کہ جو شخص اجتہاد کی صلاحیت نہیں رکھتا تقلید ہی پر اعتماد کرتا ہے[1]

حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ نے دین میں تحریف کے اسباب پر بحث کرتے ہوئے جہاں یہ بتایا ہے کہ دین میں تحریف کا ایک سبب تقلید بھی ہے اسی جگہ یہ بات بھی کھول دی ہے کہ اس

---

[1] معارف القرآن م ش ج ۱ ص ۳۵۸

میں وہ تقلید ہرگز ہرگز داخل نہیں ہے جو اُمت مرحومہ ائمہ مجتہدین کی کر رہی ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔

اُمت مرحومہ جو ائمہ کی تقلید کر رہی ہے یہ وہ تقلید نہیں ہے جو دین میں تحریف کا سبب ہوتی ہے کیونکہ پوری اُمت کا اس پر اجماع ہو چکا ہے کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید جائز ہے۔

بہرحال تقلید آج نہیں بلکہ بقول شاہ صاحب دو صدیاں گزرنے پر مجتہدین کے مذاہب پیدا ہو گئے اور لوگ اماموں کی تقلید کرنے لگے۔ اور یہی اس زمانہ میں وقت کا ناگزیر تقاضا تھا۔ بلکہ اسی میں اُمت کی ان گنت اجتماعی مصالح پوشیدہ ہیں۔ یعنی ۱۳ سو سال سے مسلمانوں کا ہر مدرسۂ فکر جادہ تقلید پر چلتا آیا ہے۔ اور اُمت کے عمل کی گاڑی قریب قریب اسی توارث کے ساتھ چلتی آ رہی ہے جس کے ساتھ اسلام کا نظام علمی ہم تک پہنچا ہے۔ جس طرح قرآن حکیم کے متعلق ہمارا یہ یقین کہ وہ ہر تحریف سے محفوظ ہے۔ اس بنیاد پر مبنی ہے کہ اس کو لاکھوں آدمیوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے اسی طرح دین کی عملی زندگی میں تقلید کی حقیقت پر یقین کرنے کے لیے بھی ہمارے پاس اس سے زیادہ مضبوط اور مستحکم کوئی دوسرا ثبوت نہیں ہے کہ ہزاروں اور لاکھوں آدمیوں نے نہیں بلکہ کروڑوں آدمیوں نے خیرالقرون سے ورثہ میں پایا ہے۔ محدثین ہوں یا فقہا، متکلمین ہوں یا حکماء صوفیا ہوں یا اولیا۔ سب کے سب عمل کی زندگی میں تقلید کو اپناتے آئے ہیں اور مسلمانوں میں ہر قسم کے اختلاف کے باوجود زمانہ شاہ ولی اللہ تک دو رائیں نہیں ہوتی ہیں۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تقلید کے پیچھے اُمت کے اتفاق کی دوسری صدی سے آج تک اتنی بڑی طاقت رہی ہے کہ پوری تاریخ میں کسی طبقہ سے خواہ وہ محدثین ہوں یا صوفیاء، فقہا ہوں یا متکلمین دس شخصیتوں کے نام نہیں گنائے جا سکتے جن کو غیر مقلد کہا جا سکے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

قد اجتمعت الامۃ علی جواز تقلید ھا الی یومنا ھذا

اس طریق سے جس چیز کو مسلمانوں نے اسلاف سے ورثہ میں پایا ہو وہ اگر کسی کے شک میں ڈالنے سے متزلزل ہو جاتے تو پھر اس یقین کو ہلا دینا بھی کچھ مشکل نہیں ہے جو ہمیں اسلامی عقائد اور ہمری زندگی کے متعلق حاصل ہوا ہے۔ بلکہ میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ اگر خود رائی "آزادی" آوارگی فکر سے عمل کے ایسے متوارثات بھی شک کی نذر ہو جائیں تو ایک شخص اس امر میں بھی شبہ کر سکتا ہے کہ فی الواقع ذاتِ نبوت نے علم و عمل کا کوئی پیمانہ اسلام کے نام پر پیش بھی کیا ہے یا نہیں۔ کیونکہ جس توارث کے ساتھ ہمیں ائمہ مجتہدین سے مصادیق و مدلولات قرآن و سنت

پہنچے ہیں جن کے قبول کرنے اور اپنانے کا نام تقلید ہے۔ اسی تواتر کے ساتھ ہمیں محدثین سے ارشادات نبوت پہنچے ہیں۔ نہ ہم خود امام ابوحنیفہ سے مل کر آتے ہیں اور نہ ہماری امام بخاری سے ملاقات ہوئی ہے۔ اگر شک کی بیماری ہمارے دل پر اس قدر غالب ہو جائے کہ آج ہم پورا ہزار سال گزرنے پر اسلام کے ان اکابر پر شبہ کرنے لگیں تو کچھ عجب نہیں کہ کل کو یہی بیماری ہمیں محدثین سے بدگمان کر دے۔ آخر ہماری سوسائٹی میں ایسا طبقہ موجود ہے جو محدثین پر اعتماد نہیں کرتا۔

اجتماعیات کے بہت بڑے فلاسفر علامہ اقبال نے ائمہ اربعہ کی تقلید کے موضوع پر جو بیش قیمت خیالات چھوڑے ہیں وہ بھی سن لیجئے۔

مضمحل گردد چوں تقویم حیات — ملت از تقلید مے گیرد ثبات
راہ آبا رو کہ ایں جمعیت است — معنئے تقلید ضبط ملت است
نقش بر دل معنئے توحید کن — چارہ کار خود از تقلید کن
اجتہاد در زمانہ انحطاط — قوم را برہم مے پیچد بساط
زاجتہاد عالمان کم نظر — اقتدا بر رفتگان محفوظ تر
عقل آبایت ہوس فرسودہ نیست — کار پاکان از غرض آلودہ نیست
فکر شان ریسد ہمی باریکتر — ورع شان با مصطفیٰ نزدیکتر

عقائد میں تقلید

یہاں تک گفتگو فروع اور اعمال کے ارد گرد چکر لگا رہی تھی۔ باقی رہا اصول و عقائد تو اگرچہ معتزلہ اور متکلمین کا ایک فرقہ یہ کہتا ہے کہ مقلد کا ایمان معتبر نہیں ہے۔ ان کے خیال میں ایمان ایسی تصدیق کا نام ہے جو تشکیک سے بھی زائل نہ ہو سکے۔ ایسی تصدیق دلائل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ شیخ تاج الدین السبکی نے اس مسئلہ کی تحقیق فرماتے ہوئے تقلیدی ایمان کی چند صورتیں لکھی ہیں۔

۱۔ یہ کہ اسلام کی حقانیت ہی پورے طور پر دل نشیں نہ ہو اور قلب میں شک و تردد کی خلش باقی رہے۔

۲۔ یہ کہ اسلام کی حقانیت کا اذعان اگرچہ حاصل ہو مگر نجات ابدی کے لیے تمام دین یکساں

منظر آئیں اور ان میں جس دین کو چاہے اس کا اختیار کرنا جائز سمجھے۔

۳۔ یہ کہ اسلام کی حقانیت میں کوئی شک و تردد باقی نہ ہو۔ نجاتِ ابدی صرف دینِ اسلام میں منحصر سمجھے اور اسلام کے سوا کسی اور دین کا اختیار کرنا ایک لمحہ کے لیے بھی جائز نہ سمجھے۔

پہلی دو صورتیں یقیناً معتبر نہیں اور تیسری صورت بے شبہ معتبر ہے خواہ ان مقاصد کے لیے دماغ میں ایک دلیل کا بھی تصور موجود نہ ہو۔

اس حقیقت کا ثبوت اس سے بڑھ کر اور کیا ہو سکتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کے عہدِ مبارک میں کفار کے جوجم غفیر عین جنگ کے رعد و برق میں حلقہ بگوش اسلام ہوتے ان سب کا اسلام معتبر مان لیا گیا۔ اور کسی واقعہ میں بھی ثابت نہیں ہوتا کہ ان نومسلموں کو اسلام کے فرائض و واجبات کی طرح نظر و استدلال سیکھنے کی بھی دعوت دی گئی ہو۔

صاحب روح المعانی بعض اکابر محققین سے ناقل ہیں کہ ایمان دراصل اس بدیہی تصدیق کا نام ہے جو خوش نصیبوں کے قلوب میں اس طرح سما جاتی ہے کہ اگر وہ خود بھی اسے نکالنے کی کوشش کریں، تو نکال نہ سکیں۔ تاریخ میں ایسے لوگوں کی مثالیں کم نہیں جو دلائل پر غور و فکر کے بغیر اسلام لے آتے اور اس کے برخلاف ایسی مثالیں بہت ہیں جن کے سامنے حقانیت اسلام کے دلائل روزِ روشن کی طرح عیاں تھے، مگر اس کے باوجود اس سعادتِ عظمیٰ سے محروم رہے وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم۔ اس سے صاف نتیجہ نکلتا ہے کہ یہ خیال سراسر غلط ہے کہ ایمان و یقین کا حاصل ہونا صرف دلائل کی پرورش ہی پر موقوف ہے بلکہ دلائل کی روشنی میں حاصل شدہ ایمان یکسر ناقابلِ وثوق اور حقیقتِ اذعان سے معرّیٰ ہوتا ہے اس میں یہ احتمال ہر وقت قائم رہتا ہے کہ اگر دلائل دوسری جانب واضح ہو جائیں تو اسی وقت یہ ایمان بھی دوسری جانب منتقل ہو جائے۔

شیخ اکبر فتوحاتِ مکیہ میں امام غزالی کی کتاب فیصل التفرقہ سے نقل فرماتے ہیں کہ متکلمین کی اس جماعت کا غلو اور انحراف بھی کس قدر تعجب خیز ہے جو عوام کا ایمان صرف اس لیے معتبر نہیں مانتے کہ ان کو حقانیتِ اسلام کا یقین دلائل سے حاصل نہیں ہوتا۔ یہ جماعت ان متواتر واقعات سے بھی واقف نہیں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مسعود اور صحابہ کے مبارک دور میں بہت سے ان پڑھ بُت پرستوں کا ایمان معتبر مانا گیا حالانکہ

نہ خود ان کو دلائل کا علم تھا اور کسی نے بعد میں ان کو دلائل کی تعلیم دی تھی [1]

نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ علیہ نے درست لکھا ہے کہ

کس قدر حیرت ناک بات ہے جس سے رونگٹا کھڑا ہو جاتا ہے اور جسے سُن کر دلوں پر کپکپی طاری ہو جاتی ہے۔

اس کی وجہ بھی نواب صاحب نے بیان فرمائی ہے فرماتے ہیں کہ

فانھا جنایۃ علی جمیع ھذہ الامۃ المرحومہ

ایسا کہنا پوری اُمتِ مرحومہ پر فردِ جُرم لگانے کے مترادف ہے

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ عمل ہو یا عقیدہ، کردار ہو یا افکار تقلید کی بنیاد پر اٹھی ہوئی دونوں کی عمارت دُرست ہے جبکہ مقتدا اربابِ عقل اور صاحبانِ ہدایت ہوں۔ اور اگر دونوں میں مقتدا ہدایت سے محروم اور بے بصیرت ہوں تو نہ عمل میں اس آیت کی رُو سے تقلید جائز ہے اور نہ ایمان میں۔ علامہ قرطبی نے صحیح فرمایا ہے کہ ہدایت سے محروم اور بے بصیرت لوگوں کے مقلدین اپنے اعمال و افکار کو اہلِ باطل کے سہارے کرتے ہیں جب کہ اہلِ حق و ہدایت کے مقلدین اپنے اعمال و افکار کی نسبت قرآن و سنت کی طرف کرتے ہیں۔

اس لیے اس آیت سے ائمہ کی تقلیدِ فقہی کا عدمِ جواز نہیں بلکہ قاعدہ اقتضاء النص کے مطابق آیت سے تقلید کے جواز پر استدلال کیا جا سکتا ہے۔ آیت میں جس امر کی مذمت ہو رہی ہے وہ نفسِ تقلید نہیں بلکہ گمراہ اور نادان اسلاف کی تقلید ہے اور یہ قید خود اس امر کی دلیل ہے کہ محققین اہلِ علم کی تقلید جائز ہی نہیں بلکہ عین مطلوب ہے۔ کسی مریض سے اگر یہ کہا جائے کہ تم نے یہی کیا حماقت کی کہ ایک اناڑی اور ان پڑھ کا علاج شروع کر دیا تو ظاہر ہے کہ اس فقرے سے نفسِ علاج کی مذمت نہیں بلکہ اناڑی اور ان پڑھ سے علاج کی مذمت نکلی اور نفسِ علاج کی مقبولیت ظاہر ہوئی۔

۱۷۱ - اور واقعہ یہ ہے کہ ان لوگوں کی مثال جنہوں نے راہِ کفر اختیار کی ایسی ہے یعنی ان کافروں کو راہِ ہدایت پر چلانا ایسا ہے جیسا کوئی جنگل کے جانوروں کو بلاتے کہ وہ سوائے آواز کے کچھ نہیں سنتے۔ یہی حال ان لوگوں کا ہے جو خود علم نہ رکھیں اور نہ علم والوں کی بات قبول کریں [2]

---

[1] ترجمان السنۃ ج ۱ ص ۱۴۲ [2] افاداتِ شیخ الہند ص ۳۲

مطلب یہ ہے کہ ان کافروں کو دینِ حق کی طرف دعوت دینے کی مثال اس شخص کی طرح ہے جو کسی ایسے جانور کے پیچھے چلاتا ہو جو سوائے پکار اور آواز کے کچھ نہ سنتا ہو اور نہ کچھ سمجھتا ہو۔ یہ بہرے گونگے اور اندھے ہیں لہٰذا یہ کوئی کام کی بات نہ سنتے ہیں اور نہ سمجھتے ہیں۔ اس مثال میں ایک طرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں جو داعیٔ حق ہیں اور دوسری طرف کفار ہیں جو اپنے آباؤ اجداد کے طریقوں پر اڑے ہوتے ہیں۔ وہ محض جانوروں کی طرح پکارنے والے کی آواز تو سنتے ہیں مگر سمجھتے کچھ نہیں ہیں۔ اسی اعتبار سے ان کو بہرہ گونگا اندھا کہا گیا ہے کہ وہ نہ حق بات کو سنتے ہیں نہ دینِ حق کی تائید میں کچھ بولتے ہیں اور نہ امرِ حق کی روشنی ان کو کچھ نظر آتی ہے۔ وہ بالکل غیر ذوی العقول بہائم کی طرح ہیں۔ بعض حضرات نے اس مثال کی تشریح اس طرح کی ہے کہ یہ کافر اپنی بے عقلی اور نافہمی میں اور مقدماتِ دین کے سمجھنے اور سمجھانے میں اس جانور کی طرح ہیں جو آواز نکالتا ہے تو سوائے اس کے کہ وہ آواز سنائی دیتی ہے نہ وہ جانور خود اس کو سمجھتا ہے اور نہ دوسرے جانور اس کو سمجھتے ہیں۔ یعنی یہ تمثیل صرف کافروں کی ہے۔ داعی الی الحق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ بعض حضرات کا خیال ہے کہ یہ مثال بتوں کو پکارنے کی ہے کہ مشرک ان کو پکارتے ہیں مگر وہ سننے سمجھنے خاک نہیں ہیں۔ بہرحال مثال کی تشریح میں مختلف باتیں کہی گئی ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ کافروں کی بے عقلی کا یہ حال ہے جو اس مثال سے سمجھ میں آسکتا ہے کہ ایک شخص ایسے جانور کے پیچھے چلاتا ہے جو بجز دُعاء اور نداء کے کچھ نہیں سمجھتا۔ اسی طرح یہ کافر بات چیت تو سنتے ہیں لیکن دینِ حق کی بات اور کام کی بات نہ کان لگا کر سنتے اور نہ سمجھتے ہیں۔ دین کی بات سننے سے بالکل گونگے بہرے اور اندھے بنے ہوتے ہیں اور امرِ حق پر غور کرنے سے بالکل عاری ہیں۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں یعنی ان کافروں کو سمجھانا ایسا ہے جیسا کوئی جنگل کے جانوروں کو بلاتے سو وہ سوائے آواز کے کچھ نہیں سنتے یہ حال ہے اس شخص کا جو خود علم نہیں رکھتا اور علم والے کی بات قبول نہیں کرتا۔ (موضح القرآن[1])

تمثیل کے دو پہلو

اس تمثیل کے دو پہلو ہیں۔ ایک یہ کہ ان لوگوں کی حالت ان بے عقل جانوروں کی سی ہے جن کے گلے اپنے اپنے چرواہوں کے پیچھے چلے جاتے ہیں اور بغیر سمجھے بوجھے ان کی صداؤں پر حرکت کرتے ہیں

---

[1] کشف المعانی ص

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ كُلُوا۟ مِن طَيِّبَٰتِ مَا رَزَقْنَٰكُمْ
وَٱشْكُرُوا۟ لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿١٧٢﴾

اے ایمان والو! تم وہ تمام پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں اور اللہ سبحانہٗ کا شکر بجا لاؤ اگر تم صرف اللہ ہی کی بندگی کرتے ہو۔

اور دوسرا پہلو یہ ہے کہ ان کو دعوت و تبلیغ کرتے وقت ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گویا جانوروں کو پکارا جا رہا ہے جو صرف آواز سنتے ہیں مگر کچھ نہیں سمجھتے کہ کہنے والا ان سے کیا کہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے جامع الفاظ استعمال فرمائے ہیں کہ یہ دونوں پہلو ان میں سما جاتے ہیں[1]

۴۶۸۔ وہ بہرے گونگے اور اندھے وہ کچھ نہیں سمجھتے یعنی یہ کفار گویا بہرے ہیں جو حق بات نہیں سنتے، گونگے ہیں جو حق بات نہیں کہتے، اندھے ہیں جو راہِ حق نہیں دیکھتے۔ لہٰذا وہ کچھ نہیں سمجھتے کیونکہ جب ان کے ہر سہ قویٰ مذکورہ فاسد ہوگئے تو تحصیلِ علم و فہم کی اب کیا صورت ہو سکتی ہے[2]

کان، زبان اور آنکھ موجود ہیں مگر چونکہ ان کے موجود ہونے سے کوئی فائدہ نہیں اس لیے گویا کہ وہ موجود ہی نہیں ہیں لہٰذا وہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں۔ یہ فکرِ انسانی کے معطل ہونے کی گویا آخری حد ہے۔

قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ہدایت و سعادت کی راہ عقل و فکر کی راہ ہے اور ضلالت و شقاوت کا سرچشمہ جہل و کوری اور قوتِ فکر کا بیکار کرنا ہے۔ جو لوگ اللہ کی دی ہوئی زبان، کان اور آنکھ سے کام نہیں لیتے یا ہوائے نفس سے اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ذہن و ادراک کی قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتے۔ چنانچہ یہاں انسان کی دماغی شقاوت کی اس حالت کی

[1] تفہیم القرآن ص ۱۳۴ [2] افاداتِ شیخ الہندؒ ص ۳۲

طرف اشارہ کیا ہے۔ جب بڑے بوڑھوں کی کورانہ تقلید کے اثر سے اس درجہ مغلوبیت آجائے کہ عقل و حواس کی ساری روشنیاں اس کے لیے بیکار ہو جائیں قرآن کا فیصلہ ہے کہ فہم لایعقلون۔

اللہ کی نعمتوں کا استعمال خدا پرستی کے خلاف نہیں ہے

مشرکین مکہ نے اپنے اوہام سے طرح طرح کی چیزیں حرام ٹھہرا لی تھیں۔ یہودیوں نے بھی کھانے پینے میں قسم قسم کی رکاوٹیں اختیار کر لی تھیں اور سمجھتے تھے کہ یہ خدائی حکم ہے۔ مشرکین کی کج روی اور یہودیوں کی غلط راہ روی کا تذکرہ کرنے کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کرکے فرمایا کہ تم ماکولات اور مشروبات میں ان کج رو اور غلط رو لوگوں کی پیروی نہ کرو بلکہ اللہ کی نعمتوں کو استعمال کرو اور شکر بجا لاؤ۔ یہی فرمانبردار بندوں کی بندگی کا صحیح طریقہ ہے۔ گویا بتایا گیا ہے کہ تم اللہ سبحانہٗ کو قانون ساز سمجھو اور حلال و حرام کے معاملے میں صرف اسی کے بنائے ہوئے قوانین کی پیروی کرو۔ رازق اللہ کی ذاتِ گرامی ہے اور تمام نعمتیں اسی کا عطیہ ہیں۔ اسی نے اپنی عطا کردہ پاک و طیب اشیا کو تمہارے لیے حلال قرار دیا ہے۔ حلال و حرام ٹھہرانے کا حق صرف وحیٔ الٰہی کا ہے۔ قرآن کے اس اعلان نے یہ بات کھول دی کہ زندگی کی آسائشیں خدا پرستی کے خلاف نہیں بلکہ ان کو کام میں لانا عین منشاءِ ایزدی کی تعمیل ہے۔ چنانچہ فرمایا کہ مسلمانو! اگر تم صرف اللہ ہی کی بندگی کرنے والے ہو اور سمجھتے ہو کہ حلال اور حرام میں حکم اسی کا حکم ہے تو وہ تمام چیزیں بے کھٹکے کھاؤ جو اللہ سبحانہٗ نے تمہاری غذا کے لیے مہیا کر دی ہیں اور اس کی نعمتوں کو کام میں لا کر اس کے شکر گزار ہو جاؤ۔ اسلام سے پہلے عام گمراہی یہ تھی کہ سمجھتے تھے روحانی سعادت ملنے کی شرط یہ ہے کہ دنیا ترک کر دی جائے اور خدا پرستی کا مقتضا یہ ہے کہ زندگی کی آسائشوں سے کنارہ کش ہو جائے۔ قرآن نے بتایا کہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ خدا پرستی کا تقاضا یہی ہے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمتوں کو کام میں لایا جائے۔

۴۶۹۔ وہ تمام پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تمہیں عطا کی ہیں۔ اکلِ طیبات کا حکم اوپر گزر چکا۔ لیکن مشرکین چونکہ شیطان کی پیروی سے باز نہیں آتے اور احکام بنا کر اپنی طرف سے اللہ کے ذمے لگاتے ہیں۔ اور اپنی رسومِ باطلہ آبائی کو نہیں چھوڑتے اور حق بات سمجھنے کی ان میں گنجائش ہی نہیں ہے تو اب ان سے اعراض فرما کر خاص مسلمانوں کو اکلِ طیبات کا حکم فرمایا گیا اور اپنا انعام ظاہر کرکے ادائے شکر کا امر کیا گیا۔ اس میں اہلِ ایمان کے مقبول اور مطیع ہونے کی جانب

اور مشرکین کے مردود، معتوب و نافرمان ہونے کی طرف اشارا ہو گیا۔[1]

صیغہ امر کھاؤ تم یہاں بمعنے اجازت ہے، بہ معنے حکم نہیں۔ اور یہاں لفظ کلوا لفظی معنے میں صرف کھانے تک محدود نہیں ہے بلکہ ہر قسم کا جائز انتفاع اس میں آگیا۔[2]

یہاں پیروانِ دعوتِ ایمان کو بطورِ خاص مخاطب کرکے بتایا ہے کہ تمہارے لیے چند بیان کردہ اشیاء کے علاوہ دُنیا کی تمام نعمتیں حلال و طیّب ہیں۔ تمہیں ان نعمتوں پر ہر وقت شکرِ الٰہی بجا لانا چاہیے۔[3]

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم ایمان لاکر صرف خدائی قانون کے پیرو بن چکے ہو جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے تو پھر وہ ساری چھوت چھات اور زمانہ جاہلیت کی وہ ساری بندشیں اور پابندیاں توڑ ڈالو جو پنڈتوں اور پروہتوں نے، ربیوں اور پادریوں نے، جوگیوں اور راہبوں نے اور تمہارے باپ دادا نے قائم کی تھیں۔ جو کچھ خدا نے حرام کیا ہے اس سے تو ضرور بچو مگر جن چیزوں کو خدا نے حلال کیا ہے انہیں بغیر کسی کراہت اور رکاوٹ کے کھاؤ پیو۔ مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اس وقت تک پوری طرح اللہ کی بندگی کے نظام میں جذب نہیں ہو سکتا جب تک وہ کھانے پینے کے معاملہ میں پچھلی جاہلیت کی پابندیوں کو توڑ نہ ڈالے اور ان توہمات کی بندشوں سے آزاد نہ ہو جاتے جو اہلِ جاہلیت نے قائم کر رکھی ہیں۔ کیونکہ اس کا ان پابندیوں پر قائم اس بات کی علامت ہے کہ ابھی تک اس کے رگ و پے میں جاہلیت کا زہر موجود ہے۔[4]

۱۷۲۔ اور اللہ سبحانہٗ کا شکر بجالاؤ اگر تم صرف اللہ ہی کی بندگی کرتے ہو۔ شکر زبان سے بھی کرو اور عمل سے بھی۔ شکر اس بات کا کہ اس نے رزق کی تمہارے لیے تخلیق کی اور اس تک رسائی کے اسباب کو آسان کیا اور اس طرح کہ طیّبات کی طلب و تلاش میں اللہ کے قوانین کی پیروی کرو۔ اور طیبات کے استعمال میں رضائے الٰہی کے جویا رہو اور زبان سے اس کی ثنا و حمد کرو اور یہ یقین رکھو کہ یہ طیّبات محض اللہ کا اپنے بندوں پر بلا شرکتِ غیر انعام و احسان ہے۔ اس کی تخلیق اور ہم رسائی میں انداد کی کوئی تاثیر نہیں ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم صرف اللہ ہی کی بندگی کرتے ہو، اس کے علاوہ کسی سے عابدانہ تعلقات نہیں رکھتے ہو، یگانہ کائنات میں اس کی تدبیر و تصرف

---

[1] افاداتِ شیخ الہندؒ ص ۳۲ [2] تفسیر ماجدی ص ۶۳ [3] سید قطبؒ ص ۸۴
[4] تفہیم القرآن ص ۱۶۰

پر یقین رکھتے ہو تو ان نعمتوں کی تخلیق اور ان کی اباحت پر اللہ کا شکر ادا کرو اور ایسے انداد نہ بناؤ جن سے عالمِ غیب میں رزق کی اُمیدیں وابستہ کرو اور تحلیل و تحریم میں صرف اللہ کو مرجع سمجھو کیونکہ یہ صرف اللہ ہی کا حق ہے ۔

اس موقعہ پر اس ارشادِ نبوت کی بڑی گہری معنویت معلوم ہوتی ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ نے حلال و طیب روزی کی تلاش کو انبیا اور اہلِ ایمان کا یکساں فریضہ قرار دیا ہے ۔ صحیح مسلم میں ہے :

> حضرت ابو ہریرہ فرماتے ہیں کہ جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگو ! اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ صرف پاک ہی کو پسند کرتا ہے اور اس نے اس بارے میں جو حکم اپنے پیغمبروں کو دیا ہے وہ اپنے سب مومن بندوں کو دیا ہے ۔ پیغمبروں کے لیے اس کا ارشاد ہے ۔ اے رسولو ! تم پاک اور حلال غذا کھاؤ اور عملِ صالح کرو ۔ میں تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہوں ۔ اور اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے اس نے فرمایا ہے کہ اے ایمان والو ! تم ہمارے رزق میں حلال و طیب کھاؤ اور حرام سے بچو ۔ اس کے بعد حضورؐ نے فرمایا کہ ایک ایسا آدمی جو طویل سفر کر کے کسی مقام پر ایسی حالت میں جاتا ہے کہ اس کے بال پراگندہ ہیں اور جسم و کپڑوں پر گرد و غبار ہے اور آسمان کی طرف ہاتھ اٹھا کے دُعا کرتا ہے اے میرے رب اے میرے رب اور حالت یہ ہے کہ اس کا کھانا حرام ہے اس کا پینا حرام ہے ۔ اس کا لباس حرام ہے اور حرام غذا سے اس کی نشو و نما ہوتی ہے ۔ تو اس شخص کی دُعا کیسے قبول ہو گی [1]

معلوم ہوا کہ حرام کھانے والے کی دُعا قبول نہیں ہوتی ہے ۔ آیت سے بھی قبولیت دُعا کے لیے حلال خوری کی طرف اشارا معلوم ہوتا ہے ۔

---

[1] صحیح مسلم ج ۱

إِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ بِهِ لِغَيْرِ اللّٰهِ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَلَآ إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۷۳﴾

اللہ نے تم پر صرف مردہ جانور، خون، سور کا گوشت اور وہ چیز جو خدا کے سوا کسی دوسری ہستی کے نام پکاری جائے حرام کیے ہیں۔ ہاں اگر ایسی حالت پیش آجائے کہ ایک آدمی بے بس ہو کر بہ حالت مجبوری کھالے بشرطیکہ نہ تو طالب لذت ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ہو تو ایسی صورت میں مجبور و بے بس کے لیے کوئی گناہ نہیں۔ بلاشبہ اللہ لغزشوں کو معاف کرنے والا اور ہر حال میں تمہارے لیے رحمت رکھنے والا ہے۔

چار حرام چیزیں

پہلی آیت میں بتایا تھا کہ پاک روزی تلاش کرنا اور کھانا، حلال کو حرام نہ کرنا اور اللہ کا شکر بجالانا عبادت ہے۔ اس آیت نے وہ عظیم الشان تفرقہ جو دین اور دنیا کے نام سے مذاہب نے قائم کر رکھا تھا دفعۃً مٹادیا اور بتادیا کہ اسلام میں دین اور دنیا کی حیثیت دو حریف کی نہیں بلکہ دو دوست کی ہے۔ دنیا کے وہ تمام کام جن کو دوسرے مذاہب دنیا کہتے ہیں اسلام کی نظر میں اگر وہ کام اسی طرح کیے جائیں۔ لیکن ان کی غرض و غایت کوئی مادی خود غرضی اور نمائش نہ ہو بلکہ اللہ کی رضا اور اس کے احکام کی اطاعت ہو تو وہ دنیا کے نہیں دین کے ہیں۔ اس لیے پاک روزی کھانا اور اس کا شکر ادا کرنا عبادت قرار دیا گیا۔ اب اس آیت میں بتایا

جا رہا ہے کہ جیسے حلال کو حرام نہ کرنا بندگی ہے ایسے ہی اللہ کے حرام کو حلال سمجھنا رُوحِ عبادت کے خلاف ہے جیسا کہ مشرکینِ مکہ اس میں مبتلا تھے مثلاً مردار جانور اور ایسے جانور جن کو غیر اللہ کے نام پر ذبح کیا جاتا کھاتے تھے۔ اسی کے ضمن یہ بھی بتلا دیا کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں ان کے علاوہ دوسرے جانوروں کو اپنی رائے سے حرام قرار دینا غلطی ہے۔ اس آیت نے بتایا ہے کہ حیوانات کے سلسلے میں تو اللہ کی حرام کی ہوئی بس یہ چیزیں ہیں نہ وہ چیزیں جو لوگوں نے اپنی تجویز سے گڑھ رکھی ہیں۔ آیت میں تردید مشرکین کے خود تراشیدہ محرمات کی گئی ہے۔

ا ے ۴- اللہ نے تم پر صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں۔ یہ حصر مشرکین کے خیال کی تردید کے لیے یعنی صرف ان چیزوں کو حرام کیا ہے ان چیزوں کو حرام نہیں جن کو تم اپنی طرف سے حرام کر رہے ہوئے گویا تردید تمامتر مشرکوں کے خود تراشیدہ محرمات کی ہو رہی ہے باقی جو چیزیں حدیث صحیح کی بنا پر یا کسی اور دلیلِ شرعی سے حرام ہیں۔ ان سے آیت میں کوئی بحث نہیں ہے۔ آلوسی رقمطراز ہیں کہ:

آیت میں حصر اضافی کے ذریعے مذکور کے لحاظ سے نہیں بلکہ مشرکین کے اعتقاد کے پیش نظر ہے۔

تمام حرام چیزوں کا یہاں حصر نہیں بلکہ یہاں حصر اضافی ہے حصر حقیقی نہیں ہے۔ جن چیزوں کو مشرکین حرام بتاتے تھے ان کے مقابلے میں حصر ہے۔ کیونکہ ان کے علاوہ بھی اور بہت سی چیزیں کتاب وسنت سے حرام ہیں)۔

آیت میں حرمت کو اشیا مذکورہ میں منحصر کر کے بیان فرمایا ہے جس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ اشیائے مذکورہ کے سوا کوئی جانور حرام نہیں ہے حالانکہ جملہ درندے اگدھا اور کتا سب کا کھانا حرام ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ اس حصر سے حکم حرمت کو ان ہی چار میں منحصر کرنا ہرگز مقصود نہیں ہے۔ بلکہ حکم حرمت کو صحت وصداقت کے ساتھ مخصوص فرما کر اس حکم کی جانب مخالف کی تردید مقصود ہے یعنی بتانا یہ ہے کہ یہ چیزیں اللہ پاک نے تم پر حرام فرما دی ہیں۔ اس میں دوسرا احتمال ہی نہیں ہے اور ان کو حلال سمجھنا بالکل غلط ہے۔

یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ حکم حرمت کو ان ہی چار چیزوں میں منحصر مانا جائے مگر اسے حصر اضافی کہا جاتے یعنی خاص ان چیزوں کے لحاظ سے حصر مانا جاتے جن کو مشرکین نے اپنی طرف سے حرام کر دیا تھا جیسے بحیرہ سائبہ وغیرہ جن کا ذکر آئندہ آئے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ ہم نے تم پر فقط میتہ خنزیر وغیرہ حرام کیا تھا۔ تم جو سانڈ وغیرہ کی تعظیم کرتے ہو۔ یہ محض تمہارا افترا ہے باقی رہے

ا۔ معارف م عثی ص ۳۵۹

ماخذ سے اور خبیث جانور ان کے حرام ہونے میں مشرکین کو بھی اعتراض نہ تھا۔ لہٰذا یہ حصر ان جانوروں کے لحاظ سے ہوگا جن کو مشرکین نے خلافِ حکمِ الٰہی اپنی طرف سے حرام ٹھہرا لیا تھا۔ دوسرے جانوروں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے[1]

اس آیت میں مطلق حلال و حرام کا بیان نہیں بلکہ ان مخصوص جانوروں کی ـــــ حرمت کا بیان ہے جن کے بارے میں مشرکینِ مکہ اپنے مشرکانہ عقائد کی بنا پر بے راہ روی اختیار کیے ہوئے تھے۔ پچھلی آیت میں اس کی وضاحت آچکی ہے کہ بہت سے حلال جانوروں کو مشرکین حرام سمجھتے تھے یا اپنے اوپر حرام کر لیتے تھے۔ اس کے بالمقابل یہاں یہ بتلایا گیا ہے کہ اللہ کے نزدیک فلاں فلاں جانور حرام ہیں جن سے تم نہیں بچتے اور وہ حرام نہیں ہیں جن سے تم پرہیز کرتے ہو[2]

۲۷۴ - مردہ جانور، محرمات میں سے یہ سب سے مقدم ہے جسے اُردو میں مُردار کہتے ہیں۔ مُردار وہ ہے کہ خود بخود مر جائے اور ذبح کی نوبت نہ آئے یا خلافِ طریقہ شریعت اس کو ذبح کیا جائے مثلاً گلا گھونٹا جائے یا زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹا جائے یا لکڑی پتھر اور غلیل و بندوق سے مارا جائے یا اوپر سے گر کر یا کسی جانور کے سینگ مارنے سے مر جائے یا درندہ پھاڑ ڈالے یا ذبح کے وقت بالارادہ تکبیر کو چھوڑ دیا جائے کہ یہ سب مردار اور حرام ہیں۔ البتہ دو جانور بحکم حدیث شریف اس حرمت سے مستثنیٰ ہیں اور ہم کو حلال ہیں۔ مچھلی اور ٹڈی[3]

خود قرآن کی دوسری آیت واحل لکم صید البحر سے معلوم ہوا کہ دریائی جانور کے لیے ذبح کرنا شرط نہیں ہے۔ اسی بنا پر احادیثِ صحیحہ میں مچھلی اور ٹڈی کو میت سے مستثنیٰ قرار دے کر حلال کیا گیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے ہمارے لیے دو مُردار ایک مچھلی اور دوسرے ٹڈی اور دو خون یعنی ایک کلیجی اور دوسرے تلی حلال کیا ہے۔ اور سمندر کے بارے میں یہ بھی ارشادِ نبوت ہے کہ اس کا مُردہ حلال ہے۔ امام مالک، اصحاب سنن، امام احمدؒ امام بیہقیؒ دار قطنی، حاکم، ترمذی، ابن خزیمہ، ابن حبان اور امام بخاری نے اسے روایت کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جانوروں میں سے مچھلی اور ٹڈی بغیر ذبح کے حلال ہیں خواہ وہ خود مر جائیں یا کسی کے مارنے سے مر جائیں۔ البتہ جو مچھلی سڑ جانے کی وجہ سے خود پانی کے اوپر آجائے وہ حرام ہے (جصاص)[4] دراصل سمندر کے مُردار کی دو قسمیں ہیں۔ ایک قسم وہ جو مائی المعاش ہے دوسری قسم وہ ہے

---

[1] افاداتِ شیخ الہندؒ ص ۲۳ [2] معارف م ش ص ۳۶۱ [3] افاداتِ شیخ الہندؒ ص ۳۲ [4] معارف م ش ص ۳۶۱

جو پانی میں رہتی ہے لیکن پانی سے باہر بھی زندگی گزارتی ہے جیسے مینڈک۔

قسم اول یعنی مائی المعاش جو پانی سے جدا ہو کر زندہ نہیں رہ سکتی۔ اس کا مُردہ سب علما کے نزدیک جائز ہے۔ امام اعظم ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ سمندر کا وہ مُردہ جو سمندر ہی میں اپنی طبعی موت مر جاتے اور مرنے کے بعد پانی کے اوپر آجائے وہ حرام ہے۔

ایسے تمام سمندری جانور جو خشکی میں رہتے ہیں جیسے مینڈک، کچھوا، کیکڑا۔ اس میں علما کا اختلاف ہے۔ امام مالک کے خیال میں سب کا کھانا جائز ہے چاہے اپنی طبعی موت سے مرے ہوں یا شکار کے ذریعے۔

امام شافعی کا مذہب یہ ہے کہ مائی المعاش جانوروں کا مردہ بلا اختلاف جائز ہے چاہے اپنی طبعی موت سے مرے اور چاہے شکار کے ذریعے اور ایسے تمام جانور جو مائی المعاش ہونے کے ساتھ خشکی میں بھی زندہ رہ سکتے ہیں ان کا حکم بھی امام شافعی کے نزدیک حلال ہونے کا ہے۔

امام احمد فرماتے ہیں کہ سمندر میں زندگی بسر کرنے والے جانوروں کا مُردہ بہر حال حلال ہے خواہ کسی صورت سے مرے اور جو جانور آبی ہونے کے ساتھ خشکی میں بھی رہتے ہیں ان کا مُردہ بہرحال حرام ہے۔

امام ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ تمام آبی جانور جو خشکی میں رہتے ہیں ان کا مُردہ حرام ہے کیونکہ خبیث ہیں۔ اور جو جانور آبی ہیں اور پانی ہی میں مر جاتیں ان کا شکار کیا ہوا جانور حلال ہے۔ اور جو جانور سمندر میں اپنی طبعی موت سے مرتا ہے اور پانی کے اوپر تیرنے لگتا ہے اس کا مُردہ حرام ہے۔

امام ابو حنیفہ کے پہلے مسئلہ کی دلیل یہ ہے کہ ایسے تمام جانور جو خشکی میں رہتے ہیں اگر وہ اپنی طبعی موت سے مر جائیں ان میں گندگی اور خباثت آجاتی ہے اور قرآن نے نبوت کے فرائض میں ایک فریضہ خباثت کی تحریم بتایا ہے ویحرم علیھم الخبائث۔

اس جانور اور مچھلی کے بارے میں جو اپنی طبعی موت سے ختم ہو کر پانی کے اوپر تیرنے لگتی ہے امام ابو حنیفہ کا موقف یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے کھانے سے منع فرمایا ہے چنانچہ ابوداؤد میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

جو جانور سمندر پھینک دے یا اس سے لیا جاتے اسے کھاؤ اور جو خود مر کر پانی کے اوپر آجاتے اسے نہ کھاؤ۔

امام ابوداؤد کہتے ہیں کہ محدثین میں سے اس حدیث کو سفیان ثوری، ایوب اور حماد نے ابوالزبیر

کے حوالہ سے حضرت جابر کا موقوف اثر بنا کر روایت کیا ہے اور یہ روایت مرفوعاً ضعیف طریق سے آتی ہے۔ امام نووی نے شرح المہذب میں اس کو بالاتفاق حفاظ ضعیف فرمایا ہے۔ امام بیہقی فرماتے ہیں کہ یہ روایت یحییٰ بن سلیم الطائفی کے حوالہ سے آتی ہے اور محدثین کو ان کے حافظہ کی شکایت ہے۔ امام بیہقی نے السنن الکبریٰ میں من کرہ اکل الطافی کا عنوان قائم کرکے اس حدیث کے موقوف اور مرفوع دونوں پہلو پیش کیے ہیں اور مرفوع کے مقابلہ میں موقوف کو ثابت لکھا ہے۔ یہ امام بیہقی کی اپنی رائے ہے ورنہ جہاں تک اصولِ علمِ حدیث اور فنِ حدیث کا تعلق ہے وہ ہمیں ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتے کہ اس حدیث کو ناقابلِ اعتبار قرار دیں۔ نہ مرفوع ہونے کی حیثیت میں اور نہ موقوف۔

مرفوع ہونے کی حیثیت میں اس لیے کہ یہ حدیث مرفوعاً متعدد طرق سے مروی ہے اور ان طریقوں میں بعض طریق صحیح بھی ہیں۔ اسی ابوداؤد کی روایت کو دیکھئے۔ اس پر بڑی سے بڑی جرح یہ ہے کہ اس کا راوی یحییٰ بن سلیم الطائفی ہے اور اس کا حافظہ خراب ہے۔ حالانکہ یحییٰ ابن سلیم صحیحین میں خود بخاری و مسلم کے راویوں میں سے ہے۔ ابوداؤد کے علاوہ دوسرے محدثین نے اسے مرفوعاً روایت کیا ہے۔ مثلاً بیہقی اور دار قطنی نے بحوالہ ابی احمد الزبیری مرفوعاً روایت کیا ہے۔ اور ان پر بیہقی نے وہم کا الزام عائد کیا ہے یعنی ابواحمد کو وہم ہو گیا ہے ورنہ اصل روایت مرفوع نہیں ہے۔ حالانکہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ابواحمد زبیری ایک جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ان کا نام محمد بن عبداللہ بن الزبیر بن عمرو بن درہم ہے اور ان کی ثقاہت میں محدثین رطب اللسان ہیں اس روایت کے مرفوع ہونے کی تائید بقیہ بن الولید کی اس مرفوع روایت سے بھی ہوتی ہے جو بیہقی میں موجود ہے بقیہ بن الولید کے بارے خواہ کوئی کچھ کہے لیکن یہ واقعہ ہے کہ بقیہ مسلم کے راویوں میں سے ہے۔ اس کے ساتھ عبدالعزیز بن عبداللہ یحییٰ بن ابی امینہ اور ابن ابی ذئب کی روایات اسی کی تائید میں ہیں۔ ان حالات میں حدیث جابر پر مرفوع ہونے کی حیثیت میں ضعیف ہونے کا الزام بہت بڑی دلیری ہے۔ یہ بات اُصولِ حدیث میں طے ہو چکی ہے کہ ثقہ راوی کی زیادت بالاتفاق مقبول ہوتی ہے خواہ وہ زیادت متن حدیث میں ہو خواہ سند میں۔ اور جب حدیث کے مرفوع اور مرسل ہونے کا جھگڑا ہو تو وہ حدیث جمہور علماء کے نزدیک مرفوع ہی سمجھی جائے گی۔ نیز مثبت کو نافی پر ترجیح ہو گی۔ اگر بالفرض اس زیادت کو تنہا یحییٰ بن سلیم ہی بیان فرماتے تب بھی محدثین کرام کے طے شدہ اُصول و ضوابط کے تحت یہ روایت مرفوع اور موصول ہی ہوتی حالانکہ ابواحمد الزبیری، بقیہ

ابن الولید، عبدالعزیز بن عبداللہ، یحییٰ ابن ابی انیسہ اور ابن ابی ذیب وغیرہ سب ثقہ راوی اس کو مرفوع اور موصول بیان کرتے ہیں۔ قاعدے کے مطابق مرفوع و متصل کو ترجیح ہے۔

اس موضوع پر چند قانونی دفعات بھی گوش گزار فرما لیجیے۔

دفعہ ۱:۔ قرآن کی اس آیت میں مطلقاً میتہ کو حرام قرار دیا ہے اس لیے جس طرح اس کا گوشت کھانا حرام ہے اس کی خرید و فروخت بھی حرام ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مُردار کے استفاع سے ممانعت فرمائی ہے اور یہی حکم تمام نجاستوں کا ہے۔

دفعہ ۲:۔ اس آیت میں میتہ کے حرام ہونے کا حکم عام ہے جس میں مُردار کے تمام اجزاء شامل ہیں لیکن دوسری آیت میں اس کی تشریح علیٰ طاعم یطعمہ سے کر دی گئی ہے جس سے معلوم ہوا کہ مُردار جانور کے وہ اجزاء حرام ہیں جو کھانے کے قابل ہیں۔ اس لیے مُردار جانور کی ہڈی، بال جو کھانے کی چیز نہیں وہ پاک ہیں اور ان کا استعمال جائز ہے۔ قرآن کی آیت ومن اوبارھا واشعارھا میں جانوروں کے بالوں سے مطلقاً انتفاع کو جائز قرار دیا ہے ذبیحہ کی شرط نہیں ہے۔

دفعہ ۳:۔ مُردار کی کھال پر چونکہ خون وغیرہ کی نجاست لگی ہوتی ہے اس لیے وہ دباغت سے پہلے حرام ہے مگر دباغت کے بعد جائز ہے۔ احادیث صحیحہ میں اس کی مزید تصریح موجود ہے۔

دفعہ ۴:۔ مُردار جانور کی چربی اور اس سے بنائی ہوتی چیزیں بھی حرام ہیں اور ان کا استعمال کسی صورت میں جائز نہیں ہے اور خرید و فروخت بھی حرام ہے۔

دفعہ ۵:۔ صابون وغیرہ جن میں مُردار کی چربی استعمال ہوتی ہے ان سے پرہیز کرنا احتیاط ہے مگر مُردار کی چربی ہونے کا علم اگر یقینی نہ ہو تو پھر گنجائش ہے۔ نیز اس لیے بھی کہ بعض صحابہ کرام مثلاً عبداللہ بن عمر، ابوسعید خدری، اور ابوموسیٰ اشعری مُردار کی چربی کا صرف کھانے میں استعمال ناجائز قرار دیتے ہیں۔ اس کے علاوہ استعمال کی اجازت دیتے ہیں[1]

دفعہ ۶:۔ زندہ جانور کا اگر گوشت کا کچھ حصہ کاٹ لیا جائے تو وہ بھی مُردار ہی کے حکم میں داخل ہوگا۔

۲۔۴ ۔ خون ۔ اس سے مراد وہ خون ہے جو رگوں سے بہتا ہے اور ذبح کے وقت نکلتا ہے اور جو خون گوشت پر لگا رہتا ہے وہ حلال اور پاک ہے۔ اگر گوشت کو بغیر دھوئے پکا لیا جائے

---

[1] معارف القرآن م شفیع ص ۳۶۲

تو اس کا کھانا جائز ہے البتہ نظافت کے خلاف ہے اور تلی اور کلیجی کہ خون منجمد ہیں بحکم حدیث شریف حلال ہیں[1]

یہاں بلا قید خون کا ذکر ہے لیکن سورۃ انعام میں اس کے ساتھ مسفوح یعنی بہنے والا ہونے کی شرط ہے اس لیے علماء و فقہا کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جو یہاں مطلق صورت میں ہے وہ اسی قید مسفوحیت کے ساتھ حرام ہے۔ اس پر فقہاء کا اتفاق ہے کہ خون جاری حرام بھی ہے اور ناپاک بھی۔

دفعہ ۱۔ خون میں جاری ہونے کی قید سے وہ خون مستثنیٰ ہیں جو بہتے اور جاری نہیں ہوتے اس لیے جو خون گوشت میں لگا رہ جاتا ہے وہ بالاجماع حرام نہیں ہے۔ فقہاء صحابہ اور تابعین کا اس پر اتفاق ہے۔ اسی طرح مچھر، مکھی، کھٹمل وغیرہ کا خون بھی ناپاک نہیں ہے لیکن زیادہ ہو جائے تو اسے بھی دھونا چاہیے۔

دفعہ ۲۔ جس طرح خون کا کھانا پینا حرام ہے اسی طرح اس کا خارجی استعمال بھی حرام ہے۔ اور تمام نجاستوں کی خرید و فروخت اور اس سے نفع اٹھانا حرام ہے۔ کیونکہ الفاظِ قرآنی میں مطلقاً دم کو حرام فرمایا ہے جس میں اس کے استعمال کی تمام صورتیں شامل ہیں۔

بیمار کو خون دینے کا حکم

اس مسئلہ کی تحقیق یہ ہے کہ انسانی خون انسان کا جزء ہے اور جب بدن سے نکال لیا جائے تو وہ ناپاک بھی ہے۔ اصلاً تو یہ عمل ناجائز ہونا چاہیے۔ اوّل اس لیے کہ اعضاءِ انسانی کا احترام ضروری ہے اور دوسرے اس لیے کہ خون نجاست ہے اور ناپاک چیز کا استعمال ناجائز ہے۔

لیکن عام حالات میں شریعتِ اسلامی کی دی ہوئی سہولتوں میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ خون اگرچہ انسانی بدن کا ایک حصہ ہے لیکن اسے کسی دوسرے انسان میں منتقل کرنے کے لیے انسانی اعضاء میں قطع و برید کی ضرورت پیش نہیں آتی۔ صرف انجکشن کے ذریعے ایک جسم سے خون لے کر دوسرے کے جسم میں منتقل کر دیا جاتا ہے اس لیے اس کا معاملہ دودھ کی طرح ہے کہ وہ بھی ایک انسان کے جسم سے دوسرے جسم میں منتقل کیا جاتا ہے مثلاً ماں کو شریعت میں دودھ پلانے کا حکم ہے اور دودھ کو بطور دوا بڑوں کے لیے بھی فقہا نے استعمال کرنے کی

---

[1] افاداتِ شیخ الہندؒ ص ۳۲

اجازت دی ہے چنانچہ فقہ حنفیہ میں اس کی اجازت موجود ہے۔ عالمگیری میں ہے۔

اس میں مضائقہ نہیں ہے کہ دوا کے لیے کسی شخص کی ناک میں عورت کا دودھ ڈالا جائے یا پینے میں استعمال کیا جائے۔

صاحب درمختار نے عورت کے دودھ کو بلا ضرورت استعمال کرنے کو حرام قرار دیا ہے اور علامہ شامی نے حاوی سے نقل کیا ہے کہ عورت کے دودھ کو بطور دوا استعمال کرنے کی اجازت ہے بشرطیکہ اس میں شفا ہونا معلوم ہو جائے اور اس کی متبادل کوئی دوسری دوا معلوم نہ ہو جیسا کہ پیاسے کے لیے حالتِ اضطرار میں اس کی اجازت ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔

دودھ ہی پر خون کو قیاس کر لیا جائے تو خون کے استعمال کے لیے بطور دوا استعمال کرنے کی گنجائش ہے اس لیے انسان کا خون دوسرے کے بدن میں منتقل کرنے کا شرعی پہلو یہ معلوم ہوتا ہے کہ عام حالات میں تو جائز نہیں مگر علاج و دوا کے طور پر اس کا استعمال اضطراری حالت میں بلاشبہ جائز ہے۔ اضطراری حالت سے مراد یہ ہے کہ مریض کی جان کا خطرہ ہو اور کوئی دوسری دوا اس کی جان بچانے کے لیے موثر یا موجود نہ ہو اور خون دینے سے اس کی جان بچنے کا ظن غالب ہو۔ ان شرطوں کے ساتھ خون دینا جائز ہے [۱]

۴۷۴۔ خنزیر یعنی سور زندہ ہو یا مردہ یا قاعدہ شریعت کے موافق ذبح کیا گیا ہو ہر حال میں حرام ہے۔ اور اس کے تمام اجزاء گوشت، پوست، چربی، ناخن، بال، ہڈی، پٹھا ناپاک اور ان سے نفع اٹھانا اور کسی کام میں لانا حرام ہے۔ اس موقعہ پر چونکہ کھانے کی چیزوں کا ذکر ہے اس لیے صرف گوشت کا ذکر کیا ہے مگر اس پر سب کا اجماع ہے کہ خنزیر چونکہ بے غیرتی، بے حیائی اور حرص اور رغبت الی النجاسات میں سب سے بڑھا ہوا ہے اور اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی نسبت فانہ رجس، فرمایا ہے۔ بلاشبہ نجس العین ہے نہ اس کا کوئی جزو پاک اور نہ کسی قسم کا انتفاع اس سے جائز، جو لوگ کثرت سے اس کو کھاتے اور اس کے اجزا سے نفع اٹھاتے ہیں ان میں بھی یہ اوصاف واضح طور پر مشاہدہ ہوتے ہیں [۲]

بعض مبتدع فرقوں کے اس قول کے جواب میں کہ گوشت کی حرمت سے چربی کی حرمت کہاں لازم آتی ہے۔ فقیہ ابن عربی مالکی کہتے ہیں کہ یہ اعتراض اہل عجم کی طرف سے ہوا ہے جو

---

[۱] معارف القرآن م ش ص ۳۶۲

بھی نہیں جانتے کہ لفظ لحم میں شحم شامل ہے البتہ شحم میں لحم شامل نہیں ہے۔ جس طرح ہر حمد شکر ہے لیکن ہر شکر حمد نہیں ہے۔ باقی جہاں تک سور کے جسم کا تعلق ہے تو جمہور فقہا اس کی نجاست کے قائل ہیں البتہ امام مالک کا اصول چونکہ یہ ہے کہ زندگی خود دلیلِ طہارت ہے اور ہر زندہ جانور پاک ہے اس لیے وہ سور کی نجاست کے بھی قائل نہیں ہیں جیسا کہ ابن العربی نے لکھا ہے۔

سور کا جسم تو ناپاک ہے البتہ اس کے بالوں سے نفع اٹھانے کی کچھ گنجائش ہے۔ چنانچہ امام ابوحنیفہ، محمد اور اوزاعی سور کے بالوں سے انتفاع کے جواز کے قائل ہیں۔ اور امام شافعی عدم جواز کے اور امام ابویوسف سے جواز و کراہت دونوں ہی منقول ہیں۔ الجصاص نے اس پر اچھی بحث کی ہے۔

سور کی حرمت بائیبل میں موجود ہے

فقہی احکام اور شرعی حرمت سے قطع نظر خنزیر ہے ہی ایسی نجس چیز کہ خود فطرتِ سلیم اسے گندہ سمجھتی ہے اور نظافتِ طبع کو اس کی طرف رغبت کرنے سے کراہت آتی ہے۔ یہاں تک کہ لفظ خنزیر خود عربی لسانیات کے بعض ماہروں کی رائے کے مطابق قذما لنشیٔ (گندی چیز) سے بنا ہے۔ انگریزی زبان میں جتنے نام اس جانور کے یا اس جانور کے گوشت کے لیے ہیں وہ بھی سب دلالت ثانوی گندگی اور غلاظت پر کرتے ہیں اور اس کے گوشت کے جو طبی نقصانات ہیں خصوصاً غدودی امراض میں یہ جس قدر معین و مددگار ہوتا ہے اس پر تو آج کل کے ڈاکٹر بہت کچھ لکھ چکے ہیں۔ سور کی گندگی اور ناپاکی اتنی روشن دعیاں ہے کہ بعض پرانی قومیں مثلاً اہلِ مصر بھی اسے نجس سمجھتے رہے ہیں بلکہ خود یہود کے یہاں بھی یہ حرام تھا۔ آج مسیحی قومیں جس شوق و ذوق سے یہ گندہ گوشت تازہ اور خشک دونوں صورتوں میں کھایا کرتی ہیں اور اس کی چربی سے جو طرح طرح کے کام لیتی ہیں بلکہ اس کی نسل کی پرورش کا انتظام جس بڑے پیمانے پر جا بجا کیے ہوتے ہیں۔ اسے دیکھ کر قیاس یہی ہوتا ہے کہ کراہت کیسی؟ عجب نہیں کہ کچھ فضائل اس جانور کے مسیحی مذہب میں وارد ہوتے ہیں۔ حالانکہ اس کی حرمت اور نجاست دونوں صراحت کے ساتھ بائیبل میں موجود ہیں۔ اور سور کہ کھر اس کا دو حصہ ہوتا ہے اور اس کا پاؤں چرا ہے، پر وہ جگالی نہیں کرتا اور یہی تمہارے لیے ناپاک ہے (احبار ۱۱۔۷) اور سور کہ اس کے کھر چرے ہوئے ہیں، یہ جگالی نہیں کرتا، یہی تمہارے لیے ناپاک ہے۔ تم اس کا گوشت نہ کھاؤ، نہ اس کی لاش کو ہاتھ

نگاہ رکھو۔ (استثنا ۱۲-۸)[1]

سور کی تحریم کا اعلان قرآن نے ہی نہیں بلکہ بقول شاہ ولی اللہ حضرت نوح سے لے کر تمام انبیاء نے سور کی تحریم کا اعلان کیا ہے اور آج یہ دریافت ہو چکا ہے کہ سور کے گوشت اور خون میں ایک خطرناک کیڑا اور اس کے انڈے ہوتے ہیں جو انسانی صحت کے لیے سخت نقصان دہ ہے مگر کچھ لوگ کہتے ہیں کہ آج پکانے کے جو ترقی یافتہ ذرائع فراہم ہو چکے ہیں ان کی آگ اس قدر تیز ہوتی ہے کہ یہ کیڑے پکنے کے بعد ختم ہو جاتے ہیں۔ مگر یہ کہنے والے اتنا نہیں سوچتے کہ تحریم الٰہی اس قدر طویل عرصہ کے بعد انسان یہ ایک وجہ مضرت دریافت کر سکا ہے ممکن ہے آئندہ چل کر اس سے بھی زیادہ ضرر رساں اسباب دریافت ہو جائیں اس لیے کیا یہ مناسب نہیں ہے کہ اسلامی قانون پر اعتماد کر لیا جائے جس نے صدیوں پہلے خنزیر کو حرام قرار دیا۔

۴۷۵۔ اور وہ جانور جو اللہ کے سوا کسی دوسری ہستی کے نام پر پکارا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ ان جانوروں پر اللہ کے سوا بت وغیرہ کا نام پکارا جائے یعنی اللہ کے سوا کسی بت، جن یا کسی روح خبیث یا پیر یا پیغمبر کے نامزد کر کے اور اس جانور کی جان ان کی نذر کر کے ان کے تقرب یا رضا جوئی کی نیت سے ذبح کیا جائے اور محض ان کی خوشنودی کی غرض سے اس کی جان نکالنی مقصود ہو تو ان سب جانوروں کا کھانا حرام ہے، چاہے بوقتِ ذبح تکبیر پڑھی ہو اور اللہ کا نام لیا ہو۔ کیونکہ جان کو جان آفرین کے سوا کسی دوسرے کے لیے نذر و نیاز ماننا ہرگز درست نہیں ہے اس لیے جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر مانی جائے تو اس کی خباثت مردار کی خباثت سے بڑھ کر ہے۔ کیونکہ مردار میں تو یہی خرابی ہے کہ اس کی جان اللہ کے نام پر نہیں نکلی اور اس کی جان تو غیر اللہ کے نامزد کر دی گئی جو عین شرک ہے لہٰذا جیسے خنزیر اور کتے پر بوقت ذبح تکبیر کہنے سے حلت نہیں آتی اور مردار پر اللہ کا نام لینے سے کوئی نفع نہیں ہوتا ایسے ہی جس جانور کی جان غیر اللہ کی نذر کر دی ہو اس پر ذبح کے وقت نام الٰہی لینے سے ہرگز ہرگز کوئی نفع اور اس میں حلت نہیں آسکتی۔ البتہ اگر غیر اللہ کے نامزد کرنے کے بعد اپنی نیت ہی سے توبہ کر لی اور پھر ذبح کیا تو اس کے حلال ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔ علماء نے تصریح کر دی ہے کہ اگر کسی بادشاہ کے آنے پر اس کی تعظیم کی نیت پر جانور ذبح کیا جائے یا کسی جن کی اذیت سے بچنے کے لیے اس کے نام کا جانور ذبح کیا جائے

۱؎ ماجدی ص ۶۴ ۲؎ تفسیر سید قطب ص ۴۹

یا توپ کے چلنے اور ایلنٹوں کے پزاوہ پکنے کے لیے بطور بھینٹ جانور ذبح کیا جائے تو وہ جانور بالکل مردار اور حرام ہوگا اور ایسا کرنے والا مشرک ہوگا۔ حدیث شریف میں آیا ہے لعن اللّٰہ من ذبح لغیر اللّٰہ یعنی غیر اللہ کے تقرب اور تعظیم کی خاطر جانور ذبح کرے اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ ذبح کے وقت اللہ پاک کا نام لے یا نہ لے۔ البتہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ جانور کو اللہ کے نام پر ذبح کرکے فقراء کو کھلاتے اور اس کا ثواب کسی قریب یا پیر اور بزرگ کو پہنچا دے یا کسی مردہ کی طرف سے قربانی کرکے اس کا ثواب اس کو دے کیونکہ یہ ذبح غیر اللہ کے لیے ہرگز نہیں ہے۔ بعض حضرات اپنی کج روی سے یہ حیلہ ایسے مواقع پر بیان کرتے ہیں کہ پیروں کی نیاز وغیرہ میں ہم کو تو مقصود یہی ہوتا ہے کہ کھانا پکا کر مردے کے نام سے صدقہ کر دیا جائے تو اول تو خوب سمجھ لیں کہ اللہ کے سامنے جھوٹے حیلوں سے بجز مضرت کوئی نفع حاصل نہیں ہو سکتا۔ دوسرے ان سے پوچھا جائے کہ جس جانور کی تم نے غیر خدا کے لیے نذر مانی ہے اگر اسی قدر گوشت اس جانور کے عوض خرید کر اور پکا کر فقیروں کو کھلا دو تو تمہارے نزدیک بے کھٹکا وہ نذر ہو جاتی ہے یا نہیں۔ اگر بلا تامل اس کو کر سکتے ہو اور اپنی نذر میں کسی قسم کا خلل تمہارے دل میں نہیں رہتا تو تم سچے ہو ورنہ تم جھوٹے ہو اور تمہارا یہ فعل شرک ہے اور وہ جانور مُردار اور حرام ہے۔[1]

اس کا اطلاق اس جانور کے گوشت پر بھی ہوتا ہے جسے اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر ذبح کیا گیا ہو اور اس کھانے پر بھی ہوتا ہے جو اللہ کے سوا کسی اور کے نام پر بطور نذر پکایا جائے حقیقت یہ ہے کہ جانور ہو یا غلہ یا اور کوئی کھانے کی چیز دراصل اس کا مالک اللہ سبحانہ ہے اور اللہ ہی نے وہ چیز ہم کو عطا کی ہے۔ لہٰذا اعتراف نعمت یا صدقہ یا نذر و نیاز کے طور پر اگر کسی کا نام ان چیزوں پر لیا جا سکتا ہے تو وہ صرف اللہ ہی کا نام ہے اس کے سوا کسی دوسرے کا نام لینا یہ معنے رکھتا ہے کہ ہم خدا کے بجائے یا خدا کے ساتھ اس کی بالاتری بھی تسلیم کر رہے ہیں اور اس کو بھی منعم سمجھتے ہیں۔[2]

ایک غلط تشریح

بعض معاصرین یہاں ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہیں اور ان کی کوشش ہے کہ دوسرے

---

[1] افادات شیخ الہند، ص ۳۲ [2] تفہیم القرآن ص ۱۳۵

بھی اس کا شکار ہو جائیں۔ ان کی رائے میں آیت کی مراد صرف وہ ذبیحہ ہے جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے وہ فرماتے ہیں کہ :

> بعض لوگ ان چیزوں اور جانوروں کو بھی حرام کہہ دیتے ہیں جس پر کسی ولی یا نبی کا نام لے دیا جاتے خواہ ذبح کے وقت اللہ کے نام سے ذبح کیا جائے۔ کیونکہ اس طرح مشرکین کے مشرکانہ عمل سے تشبیہ ہو جاتی ہے کیونکہ وہ بھی اپنے بتوں کے نام سے دیا کرتے تھے لیکن اگر منظر انصاف سے دیکھا جائے تو مسلمانوں کے اس عمل کو مشرکین کے عمل سے ظاہری، باطنی، صوری یا معنوی کسی قسم کی مشابہت نہیں ہے[1]

گویا معاصر کے خیال مبارک میں اس آیت کی رُو سے حرام صرف یہ ہے کہ ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ یعنی اگر ایک شخص بکرے کی نذر لات کی اور گائے کی منت منات کی مانے اور پھر بسم اللہ پڑھ کر ذبح کر دے تو یہ جانور حلال ہے کیونکہ اس کے حرام ہونے کے بارے میں قرآن کی یہ آیت خاموش ہے۔ موصوف کی غلط فہمی کا باعث یہ ہے کہ وہ غیر اللہ کا نام لے کر ذبح کرنے اور غیر اللہ کے تقرب اور رضا حاصل کرنے کے لیے ذبح کرنے میں فرق نہیں کرتے۔ حالانکہ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ لغیر اللہ اور باسم غیر اللہ کا فرق معمولی استعداد والوں پر بھی مخفی نہیں۔

اہلال کے لغوی معنے آواز بلند کرنے کے آتے ہیں۔ اصل میں چاند دیکھتے وقت آواز لگانے اور پکارنے کے ہیں۔ پھر ہر آواز کیلئے اس کا استعمال ہونے لگا۔ چنانچہ ولادت کے وقت بچے کے رونے کو اسی سے استہلال اور حاجیوں کے لبیک کہنے کو بھی اہلال کہتے ہیں۔ اہلال کے معنے ذبح کے کہیں نہیں آتے۔ اسی بنا پر بعد کے شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے ذبح کا اضافہ کیا ہے۔ مثلاً قرطبی فرماتے ہیں ذکر علیہ اسم غیر اللہ جس پر غیر اللہ کا نام لیا جاتے یا ابن کثیر لکھتے ہیں ما ذبح علی غیر اسمہ جو بغیر خدا کے نام پر ذبح کیا جائے۔ ورنہ اکابر مفسرین نے اس تعبیر کی وجہ یہ بتائی ہے کہ اہلال لانے کی وجہ یہ ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں کے نام پر پیش کی ہوئی نذروں نیازوں اور قربانیوں کو جب ذبح کرنے کا ارادہ کرتے تو ذبح کے وقت ان کا نام پکارتے تھے۔ (ابن جریر)

صحابہ اور تابعین سے جو تفسیر منقول ہو کر ہم تک پہنچی ہے اس میں بھی یہی بتایا ہے کہ

---

[1] ضیاء القرآن ص ۴۳

ایک صورت یہ ہے کہ بتوں کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ذبح کیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ بتوں کے نام پر ذبح کیا جائے۔ (البحر المحیط)

صحابہ اور تابعین کی یہ تفسیر سامنے رکھ کر معاملہ کے تمام پہلوؤں پر نظر ڈالو ہر بات اس طرح واضح ہو جاتی ہے گویا تمام قفلوں کے کھلنے کے لیے صرف اسی ایک کنجی کا انتظار تھا۔ ابوبکر الجصاص کے قول اذا اھل بہ لغیر اللہ عند الذبح کا مطلب بھی ٹھیک ٹھیک اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ کسی دور از کار تاویل کی ضرورت پیش نہیں رہی۔ کیونکہ اس طرح کی تفسیر یہی خیال پیدا کرتی ہے کہ بتوں کا تقرب حاصل کرنا جیسا ان میں رائج تھا ایسا ہی بتوں کے نام سے ذبح کرنا بھی رائج تھا۔ ماذبح لاصنام بتوں کے لیے ذبح کیا گیا کی واقعیت بھی سامنے آگئی۔ اور وہ تمام بے معنی توجیہیں غیر ضروری ہو گئیں جن پر ہمارے معاصر مفسر مجبور ہوئے۔ اس تفسیر کے بعد یہ بات بھی خود بخود معلوم ہو گئی کہ قرآن نے خصوصیت کے ساتھ یہ بات کیوں بیان کی کہ غیر اللہ کے لیے پکارا گیا اور کیوں اسے محرمات میں شمار کیا گیا۔ معلوم ہو گیا کہ دراصل قرآن دونوں باتوں سے روکنا چاہتا ہے اس سے بھی کہ غیر اللہ کے نام کو کسی جانور پر بطور نذر و نیاز نام پکارا جائے اور اس سے بھی کہ غیر اللہ کے نام پر جانور کو ذبح کیا جائے فرق صرف اتنا ہے کہ پہلی بات آیت قرآنی کا منطوق ہے اور دوسری بات اسی آیت کا مدلول ہے۔

اسی بنا پر ضحاک اور مجاہد کہتے ہیں کہ ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام پکارنا مراد ہے اور جمہور مفسرین کا اسی طرف میلان ہے اور اسی لیے وہ اپنی تشریحات میں عند الذبح کی قید لگاتے ہیں۔ اس صورت میں آیت کے معنے یہ ہوئے کہ جو جانور غیر اللہ کے نام سے ذبح کیا جائے وہ حرام ہے۔ یہ بات قرآن میں دوسری آیات میں کھول کر بیان کی گئی ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے ماذبح علی النصب جو ذبح کیا گیا ہو تھانوں پر وہ بھی حرام ہے۔ نصب وہ پتھر ہیں جن کی زمانہ جاہلیت میں پوجا کی جاتی تھی اور ان کے لیے جانور ذبح کیے جاتے تھے اور سورہ انعام میں ہے لاتاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ اور ربیع وغیرہ علما کہتے ہیں ما اھل بہ لغیر اللہ میں کوئی قید نہیں ہے۔ آیت مطلق ہے اور آیت کے معنے یہ ہیں کہ غیر اللہ کے نام سے جو جانور نامزد کیا گیا ہو وہ حرام ہے اور ایسا ہی حرام ہے جیسے سور اور مردار۔ شاہ عبدالعزیز نے اپنی تفسیر میں اسی کو ترجیح دی ہے فرماتے ہیں

> جو شخص جانور ذبح کرنے سے غیر اللہ کا تقرب چاہتا ہے وہ ملعون ہے۔ ذبح کے وقت خدا کا نام لے یا نہ لے کیونکہ جب اس نے مشہور کر دیا کہ یہ جانور فلاں غیر خدا کے لیے ہے تو ذبح کے وقت خدا کا نام لینے سے کوئی فائدہ نہ ہوگا جب وہ جانور

بطور نذر غیر خدا کی طرف منسوب ہوگیا اور اس میں مُردار سے زیادہ نجاست آگئی۔

یہ سوال کہ اگر واقعہ یہی ہے تو ضحاک مجاہد اور دوسرے جمہور مفسرین نے اس آیت کی تشریح میں عندالذبح کی قید کیوں لگائی ہے جس سے اچھے اچھے بزرگوں کو غلط فہمی ہوگئی۔

اس موضوع پر سب سے اچھی بحث حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپنے ایک مکتوب میں فرمائی ہے اور عجیب و غریب حقائق پر مشتمل ہے۔ یہاں ہم اس کا ایک خاص حصہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔

حلت و حرمت کا دارومدار نیت پر ہے اور زبانی ذکر اس نیت ہی کا ترجمان ہے کیونکہ بغیر زبانی ذکر کے دل کی نیت سے باخبر ہونا ممکن نہیں ہے۔ حدیث میں ہے انما الاعمال بالنیات، عمل کی حقیقت یہی نیتِ قلبی ہے اور حرکات خاصہ صورتِ عمل ہے۔ اگر عمل ہے اور نیت نہیں تو جسم بے جان ہے۔ معلوم ہوا کہ حلت و حرمت کی علت ذبح کے وقت صرف زبان سے اللہ یا غیر اللہ کا نام لینا نہیں بلکہ حلت کی اصل علت خاص اللہ کی نیت ہے اور حرمت کی اصل علت غیر اللہ کی نیت ہے۔ قرآن کی آیت فکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ (کھاؤ وہ جانور جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو) میں صرف زبانی ذکر مراد نہیں ہے۔ کیونکہ اصل ذکر تو ذکرِ قلبی ہے اور ذکرِ زبانی کو اس لیے ذکر کہا جاتا ہے کہ وہ ذکرِ قلبی کا ترجمان ہے۔ اگر کوئی شخص دل سے کسی کی یاد میں محو ہو اور زبان سے ساکت ہو تو وہ ذاکر سمجھا جاتا ہے لیکن اگر زبان سے کسی کا نام لے اور دل میں کوئی بسا ہو تو حقیقت شناس لوگوں کے نزدیک اس کا شمار یاد کرنے والوں میں نہیں ہو سکتا۔

نیتِ قلبی ایمان کی طرح ایک امر باطنی ہے اور ذکر لسانی کلمہ شہادت کی طرح اس کا ترجمان ہے۔ کلمہ شہادت کو ایمان کی حقیقت نہیں کہا جا سکتا۔ ورنہ لازم آئے گا کہ مومن کلمہ ایمان کے تلفظ کے وقت مومن ہو۔ اور اس تلفظ سے پہلے مومن نہ ہو۔

اسی طرح جس شخص نے کسی جانور کے متعلق نیت تو غیر اللہ کی کی اور اس جانور غیر خدا کیلئے تجویز کر دیا مگر ذبح کے وقت زبان سے اللہ کا نام لیا تو اس کا اعتبار نہ ہوگا اس لیے کہ تقربِ غیر اللہ کی نیت کے بعد ذبح کے وقت محض زبان سے اللہ کا نام لینا بے روح عمل ہے جیسے حضورؐ کی نبوت کو نہ مانتے ہوئے محض زبان سے کلمہ پڑھنا بے معنی ہے۔

مشرکین عرب نیت بھی غیر اللہ کی کرتے تھے اور ذبح کے وقت بھی غیر اللہ کا نام

بیلتے تھے۔ اور مومنین مخلصین نیت بھی اللہ ہی کی کرتے ہیں اور نام بھی اللہ ہی کا لیتے ہیں۔ مبتدعین نیت تو کرتے ہیں غیر اللہ کی اور ذبح کرتے ہیں اللہ کے نام سے۔ یہ بین بین صورت شرک بھی ہے اور نفاق بھی۔ اس تیسری قسم کا مصداق اس اُمت کے شرک نواز افراد ہیں۔

پہلی دو صورتوں میں ظاہر و باطن میں کوئی تضاد نہیں ہے اس لیے اس کا حکم ظاہر ہے۔ لیکن تیسری صورت میں ظاہر و باطن میں تخالف ہے کیونکہ باطن میں نیت تو غیر اللہ کی ہے اور ظاہر میں ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جا رہا ہے۔ لہٰذا یہاں اعتبار باطن کا ہوگا ظاہر کا نہ ہوگا۔

ایسا جانور اگرچہ ظاہر میں فکلوا مما ذکر اسم اللہ علیہ کا مصداق ہے لیکن باطن اور حقیقت میں لا تاکلوا مما لم یذکر اسم اللہ علیہ کا مصداق ہے۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ اسے حرام قرار دیا جائے۔

ذکر زبانی اگر حلت و حرمت کا مدار ہے تو صرف بلحاظ ظاہر اور صورت کے ہے اور مرتبہ ثانیہ میں ہے اور ذکرِ قلبی اور نیت باعتبارِ حقیقت کے مدار اور مرتبہ اولی میں ہے یہ ناممکن ہے کہ حلت و حرمت میں ذکر لسانی کو تو دخل ہو اور نیت اور ذکرِ قلبی کو اس میں دخل نہ ہو۔ لہٰذا جس جانور میں نیت تو غیر اللہ کی ہو اور ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جائے تو اس کی حقیقت تو دوسری قسم کی ہوگی اور صورت دوسری قسم کی ہوگی اور جب صورت اور حقیقت میں تعارض ہو تو ترجیح حقیقت کو ہوگی۔

بطور احتمال عقلی یہاں ایک چوتھی قسم بھی ہے جو اس تیسری قسم کا عکس ہے وہ یہ کہ نیت تو ہے خاص اللہ کے لیے نذر کی مگر ذبح کے وقت نام لیا جائے غیر اللہ کا۔ یہ قسم آج تک وجود میں نہیں آئی۔ یہ محض احتمال عقلی کا درجہ ہے۔

قرآن کی آیت ما اھل بہ لغیر اللہ میں اہلال باعتبارِ زمانہ عام ہے۔ وقتِ ذبح کے ساتھ مخصوص اور مقید نہیں ہے۔ اور جن حضرات مفسرین نے عند الذبح کا تشریح میں اضافہ فرمایا ہے۔ ان کی مراد تقیید اور تخصیص نہیں بلکہ یہ لفظ اس لیے

لہ مثلاً ربیع ابن انس نے تشریحی نوٹ میں فرمایا ہے ماذکر عند ذبحہ اسم غیر اللہ اور شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے
(باقی اگلے صفحہ پر)

زیادہ کیا ہے کہ نیت سابقہ کا علم اور ظہور ذبح کے وقت ہوتا ہے اگر اللہ کا تقرب کی نیت ہے تو ذبح کے وقت اللہ کا نام لے گا اور اگر غیر اللہ کی نیت کی ہے تو ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لے گا۔

نزول آیت کے زمانے میں اللہ کی نذر اور غیر اللہ کی نذر میں بھی امتیاز تھا کہ ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جاتا تو معلوم ہوتا کہ یہ اللہ کی نذر ہے اور اگر غیر اللہ کا نام لیتا تو پتہ چلتا غیر اللہ کی نذر ہے[۱]۔ یہ تیسری قسم کہ نیت تو ہو غیر اللہ کی اور ذبح کے وقت نام لیا جائے اللہ کا وہاں موجود نہ تھی۔ یہ شرک و توحید کا معجون مرکب بعد میں پیدا ہوا۔ یہ بین بین قسم اگر ظاہر اور صورت کے اعتبار سے جائز ہے تو باطن اور حقیقت کے اعتبار سے ناجائز ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ "عند الذبح" کی قید اس زمانے کے دستور کی طرف اشارہ کے لیے ہے احترازی نہیں ہے۔

عند الذبح کا اضافہ مفسرین نے محض یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ اگر کسی جانور کو غیر اللہ کے لیے نامزد کیا اور غیر خدا کے تقرب کی نیت کی تو اس جانور کی حرمت اس شرط پر موقوف ہے کہ اس کی یہ نیت ذبح کے وقت تک باقی رہے اور اگر ذبح سے پہلے اس نیت فاسدہ سے توبہ کرلے اور اللہ کے نام پر ذبح کرے تو پھر یہ جانور حرام نہ رہے گا بلکہ حلال ہو جائے گا۔ غرض یہ کہ عند الذبح کی قید نیت اور فعل ذبح میں تعلق اور لگاؤ بتانے کے لیے اور تبدل نیت و تغیر ارادہ سے احتراز کے لیے ہے کہ اگر غیر اللہ کی نیت فعل ذبح کے ساتھ اور مقرون ہے تب تو وہ جانور حرام ہے اور اگر ذبح سے پہلے نیت بدل جائے تو حرمت بھی بدل جائے گی۔

یہ بھی ملحوظ خاطر رہے کہ عند الذبح میں لفظ عند ظرف زماں ہے جو محض

صف کا بقیہ حاشیہ ۱۔ آنچہ آواز بلند کردہ شود در ذبح وے لغیر اللہ" اور ابوبکر الجصاص نے بتایا ہے اذا اھل بھا لغیر اللہ عند الذبح، یہ اور اس قسم کی تشریحات میں عند الذبح کی قید کیوں ہے؟ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اسی کی وضاحت فرما رہے ہیں۔

[۱] کیونکہ وہاں دو ہی قسمیں موجود تھیں مومنین اور مشرکین۔ مومنین نیت بھی اللہ کی کرتے اور ذبح کے وقت بھی اللہ کا نام لیتے، مشرکین نذر بھی غیر اللہ کی کرتے اور ذبح کے وقت نام بھی غیر اللہ کا لیتے۔

اقتران پر دلالت کرتا ہے۔ یہ علیت کو نہیں بتاتا اور حلت وحرمت کا مدار علت پر ہے۔ زمانہ اور وقت پر نہیں ہے۔ اس آیت میں حرمت کی علت اہلال لغیر اللہ ہے۔ اور عند الذبح کی قید اہلال اور ذبح میں اقتران بتانے کے لیے تعین یہ بتانے کے لیے کہ درمیان میں کوئی دوسری نیت فاصل اور متخلل نہ ہو۔ لہذا اگر علت یعنی نیت غیر اللہ ابتداء سے آخر تک یعنی وقتِ ذبح تک مستمر رہے تو حرمت بھی مستمر ہے اور اگر علت بدل جائے تو معلول بھی بدل جائے گا اور اگر بالفرض یہ تسلیم کر لیا جائے کہ ما اھل بہ لغیر اللہ سے صرف وہی جانور مراد ہے جس پر ذبح کے وقت غیر اللہ کا نام لیا جائے اور نیت وارادہ کو حرمت میں کوئی دخل نہیں ہے پھر بھی اثباتِ حلت کے لیے کافی نہیں ہے کیونکہ حرمت صرف ما اھل بہ لغیر اللہ میں منحصر نہیں ہے۔ ایسا گوشت بھی حرام ہے جو چوری اور غصب اور رشوت سے حاصل کیا گیا ہو۔ ایسے ہی یہ جانور اگرچہ ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل نہیں پھر بھی حرام ہے کیونکہ صرف غیر اللہ کے تقرب کی نیت حرمت کے لیے کافی ہے۔

(ماخوذ از مکتوب سوم از مکاتیبِ قاسم العلوم)[1]

قرآن کی دعوتِ توحید

اصل یہ ہے کہ قرآن کی دعوتِ توحید یہ تھی کہ سچی خدا پرستی یہ ہے کہ نہ صرف اسے مانا جائے بلکہ جو کچھ اس کے لیے مانا جائے اس میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کیا جائے۔ اس کا مطالبہ یہ ہے کہ ہر طرح کی بندگی و پرستش کی مستحق صرف اللہ کی ذات ہے، اگر ہم نے عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسری ہستی کے سامنے سرِ نیاز جھکا دیا تو خدا پرستی باقی نہ رہی۔ دعا واستعانت، رکوع وسجود، نذر و نیاز، اعتماد و توکل اور اسی طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیاز مندانہ اعمال وہ اعمال جو خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ اگر ان اعمال میں دوسروں کو بھی شریک کر لیا تو اللہ کے رشتہ عبادت کی یگانگت باقی نہ رہی۔ اور جب یگانگت باقی نہ رہی تو سچی خدا پرستی بھی نہ ہوئی۔ عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور حاجت روائیوں کا جو تصور ہمارے اندر اللہ کا

---

[1] معارف م ۱ ج ۱ ص ۲۶۸

اعتقاد پیدا کرتا ہے۔ وہ صرف اللہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ اگر ہم نے ویسا ہی اعتقاد کسی دوسری ہستی کے لیے پیدا کرلیا تو ہم نے اسے خدا کا شریک بنا دیا۔ اور جب شریک بنالیا تو پھر صرف اسی کو نہیں مانا دوسروں کو بھی مان لیا۔ حالانکہ اس کے ماننے کے معنے تو یہ تھے کہ صرف اسی کو مانا جائے۔

نبوت کے مخاطب مشرکین دوسرے مشرکانہ اعمال کے ساتھ یہ بھی کرتے تھے کہ اپنی کاربرائیوں کی خاطر غیر اللہ سے مدد مانگتے، بیماری سے تندرستی، غریبی سے گلوخلاصی کے لیے غیر اللہ سے مدد کے خواہاں ہوتے اور زندگی میں پیش افتادہ مقاصد میں کامیابی کی خاطر ان کی نذریں مانتے اور نذر و نیاز کے ان اعمال کے ذریعے مقاصد میں کامیابی کی توقع رکھتے تھے

قرآن نے ایات مستعین کے ذریعے اس کی بیخ کنی کی اور بتایا کہ ایاہ تدعون فیکشف ماتدعون الیہ

قرآن نے اصلاً اس آیت میں اسی جانور کو حرام قرار دیا ہے جو غیر اللہ کے لیے بطور نذر و نیاز نامزد کیا گیا ہو۔

اس کی تین صورتیں ہیں

۱۔ یہ کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لیے ذبح کیا جائے اور ذبح کے وقت بھی اسی غیر اللہ کا نام لیا جائے۔ یہ صورت بالاجماع اُمت حرام ہے۔

۲۔ یہ کہ کسی جانور کو تقرب الی غیر اللہ کے لیے ذبح کیا جائے یعنی اس کا خون بہانے سے تقرب الی غیر اللہ مقصود ہو۔ لیکن بوقت ذبح اس پر نام اللہ کا لیا جائے۔ جیسے بہت سے ناواقف مسلمان بزرگوں، پیروں کے نام پر ان کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے بکرے، مرغ وغیرہ ذبح کرتے ہیں لیکن ذبح کے وقت اس پر اللہ کا نام لیتے ہیں۔ یہ صورت بھی باتفاق فقہاء حرام اور مذبوحہ مُردار ہے۔ لیکن اس کے حرام ہونے کی وجہ میں اختلاف ہے۔ بعض مفسرین اور فقہا نے اسے بھی اس قرآنی آیت کا مدلول صریح بتایا ہے۔ مفسرین میں سے مولانا عبدالحکیم سیالکوٹی حاشیہ بیضاوی میں رقمطراز ہیں:-

---

لہ حجۃ اللہ البالغہ

ہر وہ جانور جس کو غیر اللہ کے لیے نامزد کر دیا گیا وہ حرام ہے اگرچہ بوقتِ ذبح اللہ ہی کا نام لے کر ذبح کیا جاتے۔ اس لیے علماء فقہاء کا اس پر اتفاق ہے کہ کسی جانور کو غیر اللہ کے تقرب کے لیے اگر کوئی مسلمان ذبح کرے تو وہ مرتد ہو جاتے گا اور اس کا ذبیحہ مرتد کا ذبیحہ کہلاتے گا۔

تفسیر کبیر اور نظام الفرقان میں رازی اور نیشاپوری نے بھی اس پر اجماعِ علماء نقل کیا ہے۔ صاحب درمختار نے کتاب الذبائح میں، شاہ عبدالعزیز نے فتاویٰ عزیزی میں اور مولانا عبدالحی فرنگی محلی نے مجموعہ فتاویٰ میں اس کو ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل کر کے حرام قرار دیا ہے۔

بعض بزرگوں نے اس صورت کو ما اھل بہ لغیر اللہ کا صریح مدلول تو قرار نہیں دیا لیکن اشتراکِ علت یعنی تقرب الیٰ غیر اللہ کی وجہ سے اس کو بھی ما اھل کے ساتھ ملحق کر کے حرام قرار دیا ہے۔ احقر کے نزدیک احتیاط یہی ہے۔ الغرض یہ صورت جس میں نیت تو تقرب الیٰ غیر اللہ کی ہو مگر ذبح کے وقت اللہ کا نام لیا جاتے۔ ما اھل بہ کے حکم میں ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔

۳۔ یہ ہے کہ حیوان کے علاوہ دوسری چیزوں مثلاً مٹھائی وغیرہ کو غیر اللہ کے نام پر نذر کے طور پر دیا جاتے جیسے ہندو بتوں پر اور ناداں مسلمان بزرگوں کے مزارات پر چڑھاتے ہیں فقہائے کرام نے اس کو بھی اشتراکِ علت کی وجہ سے اس آیت کے حکم میں داخل کر کے حرام قرار دیا ہے اور اس کے کھانے پینے، دوسروں کو کھلانے، بیچنے، خرید نے سب کو حرام کیا ہے۔ البحر الرائق میں ہے۔

ایسی تمام نذریں جو اکثر عوام مانتے رہتے ہیں جیسا کہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ کوئی شخص گھر سے لاپتہ ہو گیا، یا کوئی بیمار ہو گیا یا کسی کو زندگی کی کوئی ضرورت پیش آ گئی۔ ان حالات میں ایک شخص کسی بزرگ کے مزار پر آتا ہے پردہ سر پر رکھ کر کہتا ہے۔ اے میرے آقا اگر فلاں شخص گھر آجائے، بیمار تندرست ہو جاتے، میری حاجت روائی ہو جاتے تو آپ کی اتنا سونا، اتنا چاندی، اتنا کھانا، اتنا پانی، اتنا شمع اور اتنا تیل نذر مانتا ہوں ہوں۔ یہ نذر بالاجماع باطل ہے۔

یہ مسئلہ قیاسی ہے جس کو نصِ قرآنی متعلقہ حیوانات پر قیاس کیا گیا ہے [1]

[1] معارف م ش ص ۳۶۸

۱۷۴- بے بس ہو کر۔ اصل ارشاد میں عربی لفظ اضطرار آیا ہے۔ اس کے معنے اصل میں انسان کے کسی ضرر رساں چیز پر مجبور ہونے کے ہیں۔ عام طور پر اس کا استعمال انسان کو کسی ایسے امر پر مجبور کرنے کے لیے ہوتا ہے کہ جسے وہ ناپسند کرتا ہو۔ اضطرار کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کسی بیرونی سبب کی وجہ سے ہو مثلاً یہ کہ انسان کو کسی امر پر اس طرح مجبور کیا جائے کہ اس کے نہ کرنے کی پاداش میں اسے قتل کر دیا جائے یا زبردستی پکڑ کر اس سے کام کرایا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اضطرار کسی داخلی سبب کی بنا پر ہو یعنی ایسی قوت کے غلبہ کی وجہ سے کہ اگر اس کی مدافعت نہ کی جائے تو ہلاکت واقع ہو جیسے بھوک سے بے تاب ہو کر کسی حرام چیز کے کھانے پر مجبور ہونا۔ اس آیت میں دونوں طرح کا اضطرار داخل ہے یعنی یہ کہ انسان کسی ایسی جگہ ہو جہاں اس کو بجز حرام کے اور کچھ کھانے کو دستیاب نہ ہو اور وہ بھوک پیاس کی شدت سے قریبِ ہلاکت ہو یا یہ کہ رزقِ حلال موجود ہے مگر وہ حرام چیز کے کھانے یا پینے پر اس لیے مجبور ہے کہ اگر اس نے ایسا نہ کیا تو اُسے ہلاک کر دیا جائے گا یا اُس کا کوئی عضو ضائع کر دیا جائے گا۔ قرطبی رقمطراز ہیں کہ جمہور فقہاء اور عُلماء کی رائے میں اضطرار سے آدمی کی وہ حالت مراد ہے جس میں آدمی نہ ہوت اور بھوک سے لاچار ہو جائے۔ دراصل یہ آیت قرآنی اضطرار کے سبب کی حد تک مجمل ہے۔ قرآن کی دوسری آیت نے سببِ اضطرار کی نشاندہی کی ہے۔ میری مراد سورۂ مائدہ کی وہ آیت ہے جس میں بتایا ہے کہ فمن اضطر فی مخمصۃ جو کوئی بھوک سے بے بس ہو جائے۔

۷۷۴- بشرطیکہ نہ تو طالبِ لذت ہو اور نہ حد سے بڑھنے والا ہو، باغ، کا ترجمہ ہم نے طالبِ لذت سے کیا ہے۔ یہ معنے صاحبِ مدارک نے کیے ہیں ورنہ عام طور پر اس کے معنے نافرمانی کرنے والا کیے جاتے ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک تو سربراہِ مملکت کا باغی مراد ہے اور احناف اس کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ نافرمانی کرنے والا نہ ہو۔ صاحبِ مدارک نے جو معنے بتائے ہیں وہ لغت کے زیادہ موافق ہیں۔ صحیح حدیث میں ہے "یا باغی الخیر اقبل" اور قرآن میں اسی معنے میں یہ لفظ مختلف صورتوں میں آیا ہے۔ اگرچہ لفظ باغی یہاں مطلق آیا ہے لیکن قرآن نے اس کی جگہ دوسرا لفظ بول کر اس کے معنے کی توضیح کر دی ہے یعنی غیر متجانف لاثم گناہ کی طرف اس کا میلان نہ ہو اور اس کو گناہ کی رغبت نہ ہو۔

ایسا ہی اختلاف عادٍ میں ہے۔ سیوطی نے رہزن اور ڈاکو کے معنے بتائے ہیں لیکن لغت میں اس کے معنے آگے بڑھنے اور حد سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ امام شافعی کے نزدیک

یہ مطلب ہے کہ وہ کوئی ناجائز سفر نہ کر رہا ہو اور حنفیہ کہتے ہیں کہ حد سے تجاوز کرنے والا نہ ہو۔ یعنی خوب پیٹ بھر کر نہ کھائے[1]

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اشیائے مذکورہ حرام ہیں۔ لیکن جب کوئی بھوک سے مرنے لگے تو اُسے لاچاری کی حالت میں کھا لینے کی اجازت ہے بشرطیکہ نافرمانی اور زیادتی نہ کرے۔ نافرمانی یہ کہ مثلاً اضطرار کی حالت کے بغیر کھانے لگے اور زیادتی یہ کہ قدرِ ضرورت سے زیادہ کھاتے۔ بس اتنا ہی کھائے کہ جس سے مرے نہیں[2]

اس آیت میں حرام چیز کے استعمال کی تین شرطوں کے ساتھ اجازت دی گئی ہے۔ ایک یہ کہ واقعی مجبوری کی حالت ہو مثلاً بھوک پیاس سے جان پر بن گئی ہو۔ بیماری کی وجہ سے جان کا خطرہ ہو اس حالت میں حرام چیز کے سوا اور کوئی چیز میسر نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ خدا کے قانون توڑنے کی خواہش دل میں موجود نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ ضرورت کی حد سے تجاوز نہ کیا جائے۔ مثلاً حرام چیز کے چند لقمے یا چند قطرے اگر جان بچا سکتے ہیں تو ان سے زیادہ اس چیز کا استعمال نہ ہونے پائے[3]

اضطرار اور اس کے احکام

یہ آیت گرامی ہماری زندگی میں رہنمائی کے لیے چند قانونی دفعات کی رہنما ہے۔

دفعہ ۱:- حالتِ اضطرار میں لاچار اور بے اختیار شخص کو بقدر سدِ رمق جس سے زندگی بچ جائے مردار کھا لینا بالاجماع جائز ہے اور اس سے زیادہ پیٹ بھرنے کے لیے بالاجماع ناجائز ہے۔

پیٹ بھرنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک مُردار سے پیٹ بھرنے اور زادِ راہ بنانے کو جائز بتاتے ہیں۔ موطا میں تصریح ہے۔ سب سے بہتر بات جو مضطر کے بارے میں معلوم ہوتی ہے یہی ہے کہ وہ پیٹ بھر کر کھائے اور آئندہ کے لیے اٹھا کر بھی رکھ لے۔ ضرورت نہ ہو تو پھینک دے۔

لیکن مالکیوں سے ابنِ ماجشون اور ابنِ حبیب نے امام مالک کی موطا والی تصریح سے اتفاق نہیں کیا۔ وہ بقدر سدِ رمق تک اجازت دیتے ہیں۔ اس سے آگے ناجائز بتلاتے ہیں۔ مزنی نے امام شافعی کا بھی یہی مذہب بتایا ہے۔ اور نووی نے اسی کو صحیح کہا ہے لیکن امام غزالی نے

---

[1] کشف الرحمٰن ص ۴ [2] افاداتِ شیخ الہند ص ۳۳ [3] تفہیم القرآن ج ۱ ص ۱۳۵

امام شافعی کے مذہب کی تفصیل یہ بتاتی ہے کہ اگر آبادی سے دُور ہو تو پیٹ بھر کر کھا لینا جائز ہے ورنہ نہیں۔ ابن قدامہ نے امام احمد کی جانب دو روایتیں منسوب کی ہیں ایک یہ کہ پیٹ بھرنا جائز نہیں ہے اور دوسری یہ کہ جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک حلت کی بنیادی شرط ہی یہ ہے کہ صرف اتنی مقدار کھاتے جو جان بچانے کے لیے کافی ہو، پیٹ بھر کر کھانا یا قدرِ ضرورت سے زیادہ کھانا حرام ہے۔

دفعہ ۲:۔ مُردار کھانے کے لیے اضطرار کی وہ حد جس سے مُردار کھانا مباح ہو جاتا ہے عُلماء میں مختلف فیہ ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ ہلاکت کا اندیشہ ہو۔ یا یقینی طور اور ظنِ غالب کے طور پر عضو کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو۔ علامہ زرقانی نے امام مالک کا بھی یہی نقطہ نظر نقل کیا ہے۔ البتہ امام نووی نے شرح المہذب میں امام شافعی کی ترجمانی اس طرح کی ہے کہ مُردار کھانے کے لیے صرف بھوک کا زیادہ لگنا کافی نہیں ہے صرف اتنا اندیشہ کافی ہے کہ اگر بھوک کی حالت میں نہ کھائے گا تو ساتھیوں سے بچھڑ جائے یا سواری پر سوار نہ ہو سکے گا اور چل نہ سکے گا۔ امام الحرمین کہتے ہیں ان حالات کے رونما ہونے کے لیے صرف ظنِ غالب کافی ہے۔ علامہ ابنِ قدامہ نے مغنی میں صرف اندیشۂ ہلاکت کو اضطرار قرار دیا ہے۔

دفعہ ۳:۔ اندیشۂ ہلاکت میں کیا مُردار کا کھا لینا واجب ہے یا صرف اجازت ہے۔ اس موضوع پر عُلماءِ قانون کا اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک حفظِ نفس یعنی جان بچا لینا اولین فرائض میں سے ہے اور ایسے موقع پر غذا نہ کھانا خودکشی کے مترادف ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے جو شخص مباح سے مجتنب رہا تا وقتیکہ مر گیا وہ خود اپنا قاتل ہے۔ آیاتِ قرآنی لا تقتلوا انفسکم اور لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ اسی کی مقتضی ہیں کہ جان بچانا واجب ہے۔ یہی امام مالک اور امام شافعی کا مذہب راجح ہے۔ حنابلہ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ صرف شوافع میں سے ابواسحاق اور احناف میں سے امام ابویوسف کہتے ہیں کہ واجب نہیں ہے۔

دفعہ ۴:۔ حالتِ اضطرار میں مضطر کو دو حراموں میں سے کون سا حرام کر لینے کی اجازت ہے۔ مُردار کھا لینے کی یا کسی کا کھانا چوری کر کے یا غصب کر کے یا لوٹ مار کر کے کھا لینے کی؟ ابنِ قدامہ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ مُردار کھا لے لیکن چوری، غصب اور لوٹ مار نہ کرے اور وجہ بھی بتائی ہے کہ مُردار کی حُرمت حقِ تعالیٰ ہے اور چوری وغیرہ حق العباد ہے، حق اللہ کے لیے اجازت ملی ہے لیکن حق العباد کے لیے اجازت نہیں ہے۔ حنابلہ کا یہی مذہب ہے۔

دفعہ ۵:۔ حالتِ اضطرار میں بطورِ دوا کے حرام چیزوں کے استعمال کے لیے اس آیت سے اشارۃً جواز کا پروانہ مل گیا۔ لیکن اس کی چند شرطیں ہیں۔ اوّل یہ کہ بیماری ایسی شدید ہو کہ جان کا خطرہ ہو۔ دوسرے یہ کہ سوائے حرام کے اور کوئی علاج اور دوا موثر نہ ہو۔ تیسرے یہ کہ استعمال سے شفا یقینی ہو۔ چوتھے یہ کہ استعمال کا مقصود لذت یابی نہ ہو۔ پانچویں یہ کہ قدرِ ضرورت سے زیادہ نہ ہو۔

ان شرطوں کے ساتھ ہر حرام چیز کا بطورِ دوا استعمال کھانے پینے میں ہو یا خارجی استعمال میں باتفاقِ فقہاءِ اُمت جائز ہے۔

دفعہ ۶:۔ عام بیماریوں میں حرام اور ناپاک دواؤں کا استعمال جائز ہے یا نہیں۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ اکثر علماء کی رائے میں بغیر اضطرار حرام دواؤں کا استعمال جائز نہیں ہے کیونکہ حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اہلِ ایمان کے لیے حرام میں شفا نہیں رکھی۔ (بخاری) بعض دوسرے فقہاء نے ایک خاص واقعہ حدیث سے استدلال کر کے جائز قرار دیا۔ وہ واقعہ عرینیں کا ہے جو حدیث کی تمام کتابوں میں موجود ہے کہ کچھ گاؤں والے لوگ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ وہ مختلف بیماریوں میں مبتلا تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو اُونٹ کا دودھ اور پیشاب استعمال کرنے کی اجازت دی جس سے ان کو شفا ہوگئی مگر اس واقعہ میں متعدد احتمالات ہیں جن سے حرام چیز کا استعمال مشکوک ہو جاتا ہے۔ اس لیے اصل حکم تو یہی ہے کہ عام بیماریوں میں جب تک شرائط مذکورہ موجود نہ ہوں حرام دوا کا استعمال جائز نہیں لیکن فقہاءِ متاخرین نے موجودہ زمانے میں حرام و ناپاک دواؤں کی کثرت اور ابتلاءِ عام اور عوام کے ضعف پر نظر کر کے اس شرط کے ساتھ اجازت دی ہے کہ کوئی دوسری دوا حلال اس مرض کے لیے کارگر نہ ہو یا موجود نہ ہو۔ درمختار اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

> حرام چیزوں کو بطورِ دوا استعمال کرنے میں اختلاف ہے۔ ظاہر مذہب میں ممانعت ہے جیسا کہ البحر الرائق کی کتاب الرضاع میں مذکور ہے۔ لیکن مصنف نے یہاں اور کتاب الرضاع میں حاوی سے نقل کیا ہے کہ بعض علما کہتے ہیں کہ علاج کی خاطر حرام چیزوں کا استعمال جائز ہے بشرطیکہ اس کے استعمال سے عادۃً شفا یقینی ہو اور اس کا بدل موجود نہ ہو جیسے پیاسے کو شراب کا گھونٹ پینے کی اجازت ہے[1]

[1] معارف القرآن م شفیع ص ۳۸۱

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتَرُونَ بِهِ
ثَمَنًا قَلِيلًا ۙ أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ
اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ أُولَٰئِكَ
الَّذِينَ اشْتَرَوُا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابَ بِالْمَغْفِرَةِ ۚ
فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ۝ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ
بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ
لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ۝ رکوع ۲۱ ۵

یہ حقیقت ہے کہ جو لوگ کتاب[۲۷۹] میں نازل شدہ اللہ کے احکام کو چھپاتے ہیں اور اس کتمانِ حق کے بدلے دُنیا کے مادی فائدے[۲۸۰] خریدتے ہیں وہ اپنے پیٹوں[۲۸۱] میں آگ ہی بھر رہے ہیں۔ روزِ قیامت اللہ اُن سے بات نہ کرے گا[۲۸۲] اور نہ اُن کو گناہوں[۲۸۳] سے پاک کرے گا۔ اور اُن کے لیے دردناک سزا ہے۔ یہی لوگ ہیں[۲۸۴] جنہوں نے ہدایت کے تبادلے میں گمراہی اور بخشش کے بدلے میں سزا کا سودا کیا ہے۔ دوزخ کا عذاب برداشت[۲۸۵] کرنے میں ان کا حوصلہ عجیب اور حیرت انگیز ہے۔ یہ سب[۲۸۶] کچھ اس لیے ہوا ہے کہ اللہ نے حق کے ساتھ کتاب نازل کی تھی اور یہ واقعہ ہے کہ جن لوگوں نے کتابِ الٰہی

میں اختلاف ڈالا وہ باہمی ضد میں دُور دراز راہوں میں کھو ئے گئے۔

۴۷۸۔ مجبور و بے بس کے لیے کوئی گناہ نہیں۔ یہ تعبیر بتا رہی ہے کہ یہ چیزیں ہیں تو حرام لیکن بحالتِ اضطرار ان کے استعمال کا گناہ معاف کر دیا گیا ہے۔ حلال ہونے اور گناہ معاف ہونے میں بڑا فرق ہے۔ اگر حالتِ اضطرار میں ان کو حلال کرنا مقصود ہوتا تو حرمت سے صرف استثناء کر دینا کافی ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ چیز تو اپنی جگہ حرام ہی ہے مگر اسے کھا پی کر جان بچانے والا اللہ کے نزدیک مجرم نہیں ہے اسی لیے آیت کے آخر میں غفور رحیم فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تو بخشنے والا ہے۔ بندوں کے ہر قسم کے گناہوں کو بخش دیتا ہے۔ پھر ایسے لاچار اور مضطر کی بخشش کیسے نہ فرمائے گا اور اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے کہ مجبوری کی حالت میں صاف اجازت دے دی کہ جس طرح بن پڑے اپنی جان بچا لو۔ ممانعت کا اصلی حکم لاچاری کی حالت میں تم سے اٹھا لیا ورنہ اس مالک الملک کا حق تھا کہ فرما دیتا کہ تمہاری جان جائے یا رہے مگر ہمارے حکم کے خلاف ہرگز نہ کرنا۔ یہاں ایک خلجان یہ بھی ہوتا ہے کہ بھوک سے مرتے ہوئے مضطر بدحواس کو یہ اندازہ کرنا کہ اتنے لقموں سے سدِ رمق ہو جائے گا اور اس سے زائد ایک لقمہ نہ کھائے محال نہیں تو دشوار ضرور ہے اس لیے واللہ غفور رحیم فرما کر سہولت عطا فرما دی[1]

قانونِ تحلیل و تحریم میں یہود کی روش

بیانِ توحید کے فوراً بعد تحلیل و تحریم کا قانون اس لیے پیش کیا ہے کہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ ایک خدا کی عبادت کا لازمہ یہ ہے کہ اس کی ہی اطاعت کی جائے اور اسی کو قانون ساز اور شارع بھی مانا جائے اور زندگی کے تمام مسائل میں اسی کے احکام پر عمل پیرا ہوں اور حلال و حرام کے بارے میں طرح طرح کی بے اصل پابندیاں لگانے سے باز رہیں۔ یہ سوال کہ اگر حقیقت یہی ہے تو پھر اہلِ کتاب نے نت نئی بے جا پابندیوں کے جو قوانین بنا رکھے ہیں ان کو اس کا پروانہ کس نے دیا ہے؟ اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ جو اہلِ کتاب نے حلال و حرام کے بارے میں طرح طرح کی پابندیاں اپنے پیچھے لگا رکھی ہیں تو یہ اس لیے ہے کہ ان میں کتاب اللہ پر علم و عمل سے تعلق ختم ہو

1 افاداتِ شیخ الہند ص ۳۲

چکاہے اوران کے علماء حق فروش ہیں کہ دُنیا کی طمع سے احکام الٰہی میں تحریف کرتے ہیں یا انہیں ظاہر نہیں کرتے اور عوام اپنے علماء کی اندھی تقلید میں مبتلا ہیں۔

کتاب اللہ علم و حقیقت ہے اور اختلاف جہل و ظن کی مخلوق ہے۔ جب علم و حقیقت کا آفتاب سامنے آجاتے تو اختلاف کی تاریکیاں چھٹ جانی چاہییں۔ جو لوگ نزولِ کتاب کے بعد بھی اختلاف میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور الگ الگ ٹولیاں بنا کر اللہ کے دین کی اجتماعی قوت کو پامال کرتے ہیں تو وہ شقاق بعید میں پڑ جاتے ہیں یعنی ایسے گہرے اور دُور دراز افتراقی جھنجھٹوں میں پڑ جاتے ہیں جن سے کبھی نکل نہیں سکتے اور جس قدر ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور زیادہ حقیقت سے دُور ہوتے جاتے ہیں۔

۴۷۹ - جو لوگ کتاب میں نازل شدہ اللہ کے احکام کو چھپاتے ہیں۔ یعنی اللہ نے جو کتاب آسمانی میں حلال و حرام کے احکام روانہ کیے یہودیوں نے ان کو چھپایا اور اپنی طرف سے کمی بیشی کی جیسا کہ پہلی آیت میں بتایا جا چکا ہے ایسے ہی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات جو اس میں لکھی تھیں ان کو بھی چھپاتے اور بدلتے تھے اور یہ دونوں سخت گناہ ہیں۔ کیونکہ اس کا مطلب اور نتیجہ یہ ہے کہ ہدایت اور طریقِ حق کسی کو نصیب نہ ہو۔ سب گمراہ رہیں حالانکہ حق تعالیٰ نے کتاب و رسول کو ہدایتِ خلق کے لیے روانہ کیا تھا سو انہوں نے خدا کے بھی خلاف کیا اور خلق اللہ کو جاہل اور گمراہ بنایا[1]

بتانا یہ ہے کہ عام لوگوں میں یہ جتنے غلط توہمات پھیلے ہیں اور باطل رسموں اور بے جا پابندیوں کی جو نئی نئی شریعتیں بن گئی ہیں ان سب کی ذمہ داری اُن علماء پر ہے جن کے پاس کتاب الٰہی کا علم تھا مگر انہوں نے عام خلائق تک اس علم کو نہ پہنچایا۔ پھر جب لوگوں میں دین سے بے خبری کے نتیجے میں غلط طریقے رواج پانے لگے تو اس وقت بھی وہ ظالم مُنہ میں گھنگھنیاں ڈالے بیٹھے رہے بلکہ ان میں سے بہتوں نے اپنا فائدہ اسی میں دیکھا کہ کتاب اللہ کے احکام پر پردہ ہی پڑا رہے[2]

دراصل مدینے کے یہود جانوروں کی حلت و حرمت اور ان کے کھانے نہ کھانے میں بڑی پرہیزگاری جتلاتے تھے اور مسلمانوں کے مُنہ آتے حالانکہ خود ایسے حرام کے کھانے میں بڑے مشاق تھے جو کسی حالت میں بھی روا نہیں۔ مثلاً یہ کہ احکامِ الٰہی کو چھپاتے اور کچھ روپیہ پیسے لے کر سائل کی مرضی کے مطابق فتوی دیتے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وہ لوگ جو احکامِ الٰہی کو چھپاتے ہیں اور اس سے مادی فوائد حاصل کرتے ہیں۔

---

[1] امداداتِ شیخ الہند ص ۳۳ [2] تفہیم القرآن ص ۱۳۵

۴۰۸ - اور اس کتمانِ حق کے ذریعے مادی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ یعنی خلق اللہ کی گمراہی اور اللہ کی نافرمانی پر بس نہیں کی بلکہ اس حق پوشی کے عوض میں جن کو گمراہ کرتے تھے ان سے اکثار رشوت میں مال بھی لیتے تھے جس کا نام ہدیہ، نذرانہ اور شکرانہ رکھ چھوڑا تھا حالانکہ یہ حرام خوری، مردار اور خنزیر کے کھانے سے بھی بدتر ہے۔ اب ظاہر ہے کہ ایسی حرکاتِ شنیعہ کی سزا بھی سخت ہوگی جیسے آگے بتایا جا رہا ہے۔[1]

ناجائز طریقے سے فائدہ اُٹھانے کی ایک عام صورت رشوت ہے۔ رشوت کے معنے یہ ہیں کہ کوئی اپنی باطل غرض اور ناحق مطالبہ کو پورا کرنے کے لیے کسی ذی اختیار یا کار پرداز کو کچھ دے کر اپنے موافق کرلے۔[2]

عرب میں یہودیوں کے مقدمے اُن کے عُلماء اور رئیس فیصلے کرتے تھے اور چونکہ دولت اور تموّل نے ان میں اونچے نیچے طبقے قائم کر دیے تھے اس لیے وہ قانون کی ناہمواری کے دل سے خواہاں رہتے تھے۔ قانون کی زد سے نکلنے کے لیے علانیہ رشوت دیتے اور اُن کے عُلماء علانیہ لیتے اور ایک کا حق دوسرے کو دلاتے۔ اور اس ذریعے سے تورات کے احکام پر مصلحتوں اور ضرورتوں کے پردے ڈالتے تھے۔ چنانچہ تورات کے قوانین میں تحریف کا ایک بڑا سبب یہی رشوت خواری تھی۔ قرآن حکیم نے اس فقرے میں ان کے اسی گناہ کی پردہ دری کی ہے۔

مفسرین نے تصریح کی ہے کہ یہ آیت اگرچہ یہود کے بارے میں نازل ہوئی ہے مگر اس میں جو حکم بیان کیا گیا ہے وہ عام ہے اور اُمتِ محمدیہ کے علماء کو بھی شامل ہے۔ کیونکہ اصل مقصد تو حکم کو بیان کرنا ہے کرنے والا خواہ کوئی ہو اعتبار تو الفاظ کے عموم کا ہوتا ہے خواہ سبب کچھ ہو بلاشبہ کہ جو شخص مال کے لالچ سے حکمِ شرعی کو بدل دے یا چھپاتے وہ سنگین جرم کا مرتکب ہے۔ صرف دنیا کی حقیر دولت کی وجہ سے مسائل کو چھپانا اور لوگوں کو حق نہ بتانا قرآن کے نزدیک بہت بڑا سنگین جرم ہے۔ اللہ کی عبادت کی حد تک بزرگوں، نبیوں اور ولیوں کی نذروں نیازوں کی تاویلات کرنا اور آیاتِ قرآنی کو چھپانا جیسے اس آیت کی زد میں آتا ہے ایسے ہی اللہ کی طاعت کے سلسلے میں جب اسلام کو ایک نظامِ تمدن اور ضابطہ حیات کی حیثیت سے دنیا پر غالب کرنے کا نام لیا جائے اور اس کی طرف دعوت دی جاتے تو یہ کہنا کہ اسلام تو ایک روحانی حقیقت ہے جو مادی اور تمدنی اقتدار کے بغیر بھی اپنا کام کرتی رہتی ہے۔ اسلام میں اقتدار مطلوب نہیں ہے۔ قرآن کے بیان کردہ حقائق کو

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۳۳　[2] مجمع البحار مختفی

چھپاتا ہے اور چھپایا بھی اس لیے جاتا ہے کہ اس طرح ان کو اپنی روپیلی مصلحتوں کے بروئے کار آنے کی توقع ہوتی ہے۔

۴۸۱ ۔ وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھر رہے ہیں۔ یعنی اگرچہ بظاہر ان کو یہ مال لذیذ اور نفیس معلوم ہو رہا ہے مگر حقیقت میں وہ آگ ہے جسے خوش ہو کر اپنے پیٹوں میں بھر رہے ہیں۔ جیسے مزے دار کھانے میں زہر ملا ہو کر کھاتے وقت مزے دار لگتا ہے اور پیٹ میں جا کر آگ لگا دیے [1]

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ احکامِ الٰہی کو چھپاتے ہیں اور حق فروشی کرتے ہیں ان کے پیٹوں میں وہ کچھ جا رہا ہے جو اُن کے دوزخ میں جانے کا سبب ہے۔ اس طرح یہ استعارہ تمثیلیہ ہے جیسا کہ صاحبِ روح کی رائے ہے۔ کھانے والا جب کھاتا ہے پیٹ ہی میں جاتا ہے۔ پھر یہ کہنا کہ پیٹ میں کھاتا ہے۔ پیٹ کی قید میں گہری معنویت ہے۔ دراصل اکل فی بطنہ اہلِ عرب اس وقت بولتے ہیں جب آدمی خوب پیٹ بھر کر کھاتے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا پیٹ تو صرف دوزخ کی آگ سے ہی بھرے گا جیسا کہ حدیث میں آتا ہے انسان کا پیٹ تو مٹی ہی سے بھرتا ہے یعنی اس کی حرص اور طمع تو قبر ہی میں جا کر ختم ہو گی۔ نیز پیٹ میں آگ بھرنا اس لیے فرمایا کہ یہود دُنیا کی اس معمولی دولت کے لالچ میں آکر خدا کے احکام میں ردو بدل اور منشائے الٰہی میں تحریف پیٹ ہی کی خاطر کرتے تھے اس لیے یہی سزا ان کو ملے گی۔ ابن جریر نے اس آیت کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ یہودی سرمایہ دار اپنے علما کو اس لیے رشوت دیتے تھے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو اوصاف توریت میں ہیں وہ عام لوگوں کو نہ بتائیں، لیکن قرآن پاک کے منطوق سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ وہ احکامِ الٰہی میں عام طور سے ردّ و بدل کیا کرتے تھے اور اس کے ذریعے دُنیا کی دولت کماتے تھے چنانچہ سورۂ مائدہ میں اس حرام کا ذکر تفصیل سے آ رہا ہے۔

۴۸۲ ۔ اللہ اُن سے قیامت کے دن بات نہ کرے گا۔ حالانکہ قیامت کے دن دربارِ عام ہو گا۔ مومن و کافر، فاسق و فاجر سب جمع ہوں گے۔ اس دن کی ہمکلامی کوئی رُتبہ اور شرف نہیں رکھتی۔ وہ دن تو عدالت اور فیصلہ کا دن ہو گا۔ مجرم اور قصوروار بھی اس کا کلام سُنیں گے۔ لیکن یہ لوگ اس دن بھی کلامِ الٰہی سے محروم رہیں گے۔ غصہ اور سرزنش بھی فرشتوں کے ذریعے ہو گی۔

---

[1] افاداتِ شیخ الهند ص ۳۳

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب باری قیامت کے روز ان سے خطاب فرمائیں گے۔ جواب یہ ہے کہ کلام نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ لطف و رحمت کے ساتھ اُن سے کلام نہ ہوگا اور بطور تخویف و تذلیل و تہدید وعید اللہ سبحانہ ان سے کلام فرماتے گا، جس سے اُن کو سخت صدمہ اور غم ہوگا یا یوں کہہ دیجئے کہ بلا واسطہ ان سے کلام نہ کیا جائے گا بلکہ ملائکہ عذاب کی وساطت سے کلام ہوگا۔

ایک عجیب نکتہ

کلام نہ کرنے کی دھمکی سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہو رہی ہے کہ ہر شخص کے دل میں محبت الٰہی خوب راسخ ہے۔ اگرچہ سر دست محسوس نہیں ہوتی تو اسے ہم کو انگر زیر خاکستر سمجھنا چاہیے۔ قیامت میں جب موانع دور ہو جائیں گے تو اس محبت کا بھرپور ظہور ہوگا۔ کیونکہ اگر یہ نہ ہوتا تو پھر یہ دھمکی ایسی ہو گی کہ کوئی اپنے دشمن سے کہے کہ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا۔ ایسا کہنا یقیناً بے سود ہے مجان جانتا اعراض محبوب کو درد جانگداز سمجھتے ہیں نہ کہ دشمن۔ اس سے معلوم ہوا کہ قیامت کے روز ہر سینہ محبت الٰہی سے ایسا لبریز ہوگا کہ اللہ سبحانہ کی بے التفاتی عذاب دوزخ سے بھی بدرجہا زیادہ جانکاہ معلوم ہوگی۔[1]

۴۸۳۔ اور نہ اُن کو گناہوں سے پاک کرے گا۔ یعنی ان کو گناہوں کی آلودگی سے پاک نہ کرے گا۔ یہ آیت دراصل ان پیشواؤں کے جھوٹے دعووں کی تردید اور ان غلط فہمیوں کا رد ہے۔ جنہوں نے عام لوگوں میں اپنے متعلق پھیلا رکھی تھیں۔ وہ ہر ممکن طریقے سے لوگوں کے دلوں میں یہ خیال بٹھانے کی کوشش کرتے اور لوگ بھی ان کے متعلق ایسا ہی گمان رکھتے تھے کہ آن کی ہستیاں بڑی ہستیاں ہیں، بڑی پاکیزہ اور مقدس ہیں اور جو ان کا دامن گرفتہ ہو جائے گا اس کی سفارش کر کے وہ اللہ سے بخشوا لیں گے۔ اللہ سبحانہ نے جواب میں فرمایا ہے کہ ہم ہرگز ان کو منہ نہ لگائیں گے اور نہ ان کو پاکیزہ قرار دیں گے۔[2]

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۲ [2] تفہیم القرآن ص ۱۳۲

گویا ان کو کہا جا رہا ہے کہ اہلِ ایمان اگرچہ کتنے ہی گنہ گار ہوں مگر دوزخ میں ایک زمانہ معین تک رہ کر اور گناہوں سے پاک ہو کر جنت میں داخل کر دیے جائیں گے۔ برخلاف کفار کے کہ وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور کبھی پاک ہو کر جنت میں جانے کے لائق نہ ہوں گے۔ امورِ کفریہ نے ان کو بمنزلہ نجس العین کے بنادیا ہے کہ نجاست ان کی کسی طرح دور نہیں ہو سکتی اور مسلمان عاصی کا حال ایسا سمجھئے کہ پاک چیز پر نجاست واقع ہو گئی نجاست زائل ہو کر پھر پاک ہو گیا۔

اس کے بعد فرمایا کہ ان کو دردناک سزا ہو گی۔ اس سے زیادہ اور کیا عذاب الیم ہو گا کہ ظاہر بدن سے بڑھ کر ان کے باطن میں آگ ہو گی اور محبوبِ حقیقی ان سے ناخوش ہو گا، پھر اس مصیبت جانکاہ سے کبھی نجات نہ ملے گی نعوذ باللہ[1]

تجیب بلاغت

علامہ آلوسی رقم طراز ہیں کہ معنوی اعتبار سے اس آیت گرامی میں بلیغانہ معنویت ہے کہ اس میں فردِ جرم کی حیثیت سے بیک وقت تین چیزیں پیش کی گئی ہیں۔ اولاً علماء کا احکام الٰہی کو چھپانا ثانیاً اسے دنیوی منافع اندوزی کا ذریعہ بنانا ثالثاً عالم ہونے کی حیثیت میں دنیا میں حق کا گواہ ہونا اور فرضِ شہادت کی ادائیگی نہ کرنا۔ ان علماء نے ان تینوں جرائم کا چونکہ ارتکاب کیا ہے اس لیے ان تین جرائم کی نوعیت کے لحاظ سے تین ہی باتیں پیش فرمائی ہیں۔ چونکہ دین کے کاروبار کے ذریعے وہ مادی منافع کے بہاں در پے ہیں اس لیے فرمایا اولئک ما یاکلون فی بطونھم الا النار۔ یہ منافع آخرت میں اُن کے پیٹوں میں آگ کی صورت میں نمایاں ہوں گے۔ اور چونکہ انہوں نے دنیا میں آیاتِ الٰہی کو چھپایا اور اس کو بیان کرنے سے گریز کیا اس لیے لا یکلمھم اللہ اللہ اُن سے روزِ قیامت بات نہ فرمائے گا۔ اور چونکہ انہوں نے فرضِ شہادت کی ذمہ داری پوری نہیں کی بلکہ جھوٹی شہادت دی ہے اس لیے لا یزکیھم اور اُن کا تزکیہ نہیں فرمائے گا اور پھر چونکہ اس جھوٹی شہادت کے ذریعے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف ہوتی ہے اس لیے روزِ قیامت ان کو بھی دردناک تکلیف سے دوچار ہونا پڑے گا۔

یہاں تک ایک ایک جرم کی سزا فرداً فرداً پیش کی گئی ہے، اب مجموعہ کا مجموعہ سے مقابلہ

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۲۳

رکے ان کی بدنصیبی اور شناعتِ اعمال کو نمایاں کر رہے ہیں ۔

۴۸۴ ۔ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور مغفرت کے بدلے سزا کا سودا کیا ہے ۔ یعنی یہ وگ ہمیشہ اس کے لائق ہیں، کیونکہ انہوں نے خود سرمایہ نجات کو غارت کیا اور گمراہی کو ہدایت کے مقابلے یں پسند کیا اور اسبابِ مغفرت کو چھوڑ کر اسبابِ عذاب کو اختیار کیا [1]

الہدیٰ سے مراد کتابِ الٰہی اور اس کے احکام ہیں جب کہ الضلالہ سے کتابِ الٰہی اور اس کے احکام ے مقابلہ میں انسانی رائے، نظریات، افکار اور اقدار ہیں ۔ ایمان وعمل کی زندگی میں اور حلال وحرام کے اتے میں جو شخص احکامِ الٰہی کو چھوڑ کر انسانی افکار کی پیروی کرتا ہے وہ بلاشبہ ہدایت کو چھوڑ کر اس نیا میں گمراہی کو پسند کر رہا ہے اور اس کے نتیجے میں آخرت میں مغفرت کے بدلے میں عذاب سے ہمدوش ہونا پڑے گا ۔

اس سے معلوم ہوا کہ دُنیا میں نبوت کی راہ سے ہٹ کر دوسری راہوں پر چلنے والا گمراہ ہے اور آخرت یں عذاب کا مستحق ہے اور راہِ نبوت پر چلنے والا ہدایت پر گامزن ہے اور آخرت میں مغفرت کا مستحق ہے ۔

۴۸۵ ۔ دوزخ کا عذاب برداشت کرنے میں اُن کا حوصلہ کیسا عجیب ہے یعنی اپنی خوشی سے دوزخ یں جانے کے اسباب کو اختیار کرتے ہیں ۔ گویا دوزخ کی آگ ان کو نہایت مرغوب اور محبوب ہے کہ اپنی یمان ومال کے بدلے اس کو خرید رہے ہیں ورنہ سب جانتے ہیں کہ عذابِ نار پر صبر کرنا کیسا ہے [2]

ما اصبرھم صیغہ تعجب ہے ۔ یہ عربی میں حیرت اور تعجب کے موقع پر بولا جاتا ہے ۔ لیکن یہاں تعجب کرنے والے اہلِ ایمان ہیں ۔ یعنی مسلمانوں کو ان کے کردار پر حیرت اور تعجب ہے کہ کس ڈھٹائی سے وہ ان اعمال و زندگی میں اپناتے ہوتے ہیں جن کا اسبابِ جہنم ہونا ان کو معلوم ہے ۔ یہ گویا بدعملی اور بدکرداری پر ڈھٹائی اور جماؤ کے لیے ایک بلیغ استعارہ ہے ۔ اس استعارے کی قیمت کا صحیح اندازہ لگانا ہو تو ذرا تصور کی دُنیا میں اس قوم کو دیکھئے جو مانتی ہو کہ کتاب اللہ کی جانب سے ہے اور قیامت کے روز اللہ کی جناب میں پیش ہونے پر ایمان رکھتی ہو ۔ اس کے باوجود وہ تحریف وتاویل کے ذریعے آیاتِ الٰہی کو چھپا رہی ہو ۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ایسے ہی لوگوں کا کردار قابلِ تعجب اور دیکھنے والوں کے لیے حیرت زا ہے ۔ ورنہ جو نہیں جانتے اور پھر عمل نہیں کرتے ان کا معاملہ قابلِ تعجب نہیں ہے ۔ ان کو اپنی ان حرکتوں کے ہولناک ثمرے اور دہشت ناک نتائج معلوم ہیں اس پر بھی یہ شوخ چشمی، یہ ڈھٹائی ؟

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۳۳ [2] ایضاً

۴۸۶ - یہ سب کچھ اس لیے ہوا ہے کہ اللہ نے الخ یعنی یہ ضلالت کو ہدایت کے بدلے اور عذاب کو مغفرت کے بدلے خریدنے کی دلیل یا ان پر عذابات مذکورہ سابقہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ نے جو کتاب نازل فرمائی انہوں نے اس کے خلاف کیا اور طرح طرح کے اختلافات اس میں ڈالے اور خلاف و دشمنی میں دور جا پڑے یعنی بڑا خلاف کیا یا طریقہ حق سے دُور ہو گئے۔ ایک صورت یہ بھی ہے کہ ان کا صابر علی النار ہونا چونکہ بدیہی البطلان منظر آتا تھا اس لیے لفظ ذالك سے آخر اس کے جواب کی طرف اشارا فرمایا۔[1]

صاحب روح نے ذالک کا مشار الیہ گزشتہ تمام باتوں کو قرار دیا ہے یعنی یہ تمام سزائیں ان کو اس جُرم کی پاداش میں ملی ہیں کہ اللہ نے کتاب نازل کی کہ اس پر عمل کیا جاتے اسے اللہ کے بندوں تک پہنچایا جائے اور اسے چھپایا نہ جائے اور اس کو کاروبار نہ بنایا جائے اور ۔ کتاب اللہ کا عالم ہونے کی حیثیت سے شہادت کا جو فرض ان کے ذمہ لگایا ہے اس کو پورا کیا جاتے لیکن اس کے برعکس انہوں نے بادشاہوں اور امیروں کی مطلب برآریوں کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنایا اور اس کے فتوے دے کر انعام و اکرام لیا، معاملات و قضایا میں رشوت لے کر فیصلے کیے، تمام مذہبی اعمال و رسوم کے باقاعدہ فیسیں مقرر کر دیں اور اس غرض سے کہ آمدنی کے وسائل زیادہ ہوں نئی نئی رسمیں اور نئی نئی تقریبیں نکالیں۔ بس اس جُرم کی پاداش میں ان پر یہ سارے عذاب آتے۔ اللہ نے جس کتاب کو حق اور سچائی کے ساتھ نازل کیا اُسے چھوڑ بیٹھے اور لوگوں کو بجائے اللہ کی کتاب کے اپنے رُجحانِ نفس اور میلانِ طبع کی دعوت دینے لگے ۔ اس کے ساتھ عذاب کی دوسری وجہ یہ ہے کہ خود کتابِ الٰہی میں اختلاف کر بیٹھے۔ کچھ پر ایمان لائے اور کچھ کا انکار کر دیا۔ اور اس کے نتیجے میں وہ جادۂ حق سے بھٹک گئے۔ یعنی بھٹک کر حق و صداقت سے بہت ہی دُور جا پڑے۔ یہ مراد بھی ہو سکتی ہے کہ یہ غفلت ان میں اس لیے پیدا ہوئی ہے کہ اللہ کے سچے کلام میں انہوں نے اختلاف کیا۔

قرآن نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے یا ایہا الذین اٰمنوا ان کی اس گمراہی کی طرف اس لیے اشارہ کیا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ ان کا ایمان سے محروم ہو جانا اور دینِ حق کا عملاً چھوڑ دینا اصل ان کے علماء و مشائخ کی ان گمراہیوں اور دُنیا پرستیوں کا نتیجہ تھا۔

ہمیں اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہیے اور غور کرنا چاہیے کہ کیا ہم بھی یہود کے قدم بقدم

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۳۲

لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ
الْبِرَّ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ الْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ
وَالنَّبِيّٖنَ ۚ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى
وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ ۙ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ ۚ
وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ ۚ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا ۚ
وَالصّٰبِرِيْنَ فِى الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ ۗ
اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا ۗ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

نیکی صرف یہی نہیں ہے کہ تم اپنے چہرے مشرق اور مغرب کی طرف پھیر لو بلکہ نیکی کی راہ تو ان لوگوں کی ہے جو اللہ پر، آخرت کے دن پر، فرشتوں پر، کتاب پر اور خدا کے سارے نبیوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں، مسافروں اور سوال کرنے والوں کو اور غلاموں کے آزاد کرنے میں دیں۔ اور نماز قائم کریں زکوٰۃ ادا کریں۔ اور قول و قرار کر کے اپنی بات پوری کریں۔ تنگی و مصیبت کی گھڑی یا خوف و ہراس کا وقت ہر حال میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ یہی لوگ نیکی کی راہ میں سچے ہیں اور یہی لوگ

بُرائیوں سے بچنے والے ہیں ۔

تو نہیں چل رہے ہیں ۔ اور کیا کتاب اللہ کی حد تک ہم بھی کتمان اور اشترا بآیات اللہ کی بیماری کے بعض نو سنہیں ہیں ۔

کیا ہم فرمانرواؤں اور ارباب اقتدار کی مطلب برآریوں کے لیے فتوے دے کر ان سے انعام و اکرام نہیں لیتے ۔

کیا تمام مذہبی رسُوم کے لیے ہمارے یہاں باقاعدہ قیمتیں مقرر نہیں ہیں ۔

کیا ہم نے بہشتی دروازے نہیں بنائے کہ جو اس میں سے گزر گیا جنتی ہے ۔

کیا ہم نے تبرکات و آثار نہیں بناتے اور لوگوں کے دلوں میں اعتقاد پیدا نہیں کیا کہ جس کسی نے ان کی زیارت کر لی اسے دین و دُنیا کی برکتیں مل گئیں ۔

کیا مقابر و مشاہد کی مجاوری دُنیا کی دولت کمانے کا ذریعہ نہیں ہے ۔

کیا مُردوں کو ثواب پہنچانے کے لیے رقمیں مقرر نہیں ہیں اور اس غرض کے لیے طرح طرح کی رسمیں نہیں ہیں ۔ اگر نہیں تو پھر گیارہویں ، ستر ھویں ، تیرھویں ، عُرسوں کی ہماہمی ، تیجہ ، دسواں اور چالیسواں کیا ہیں ۔

کیا دین کی ساری باتوں کو یک قلم دکانداری اور پیشہ نہیں بنالیا گیا ہے ۔

رسمی نہیں اصلی نیکوکاری

یہودی عُلماء کے اس کردار پر روشنی ڈالنے کے بعد کہ وہ آیات کتاب کے کتمان کا سنگین جُرم کر رہے ہیں اور اس طرح وہ ایمان و کُفر کی دو متضاد حقیقتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں اور اس کے باوجود وہ نازاں ہیں کہ چونکہ دین کے نام پر چند رسُوم پر عمل پیرا ہیں اس لیے وہ دیندار ہیں ۔ قرآن نے ان آیات میں صاف لفظوں میں واضح کر دیا ہے کہ نیک ہونے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ تم اپنا مُنہ نماز میں کس سمت میں کرتے ہو اور اللہ سے صرف مسجد کی چار دیواری میں پرستش کے تعلقات قائم کرتے ہو بلکہ دین کے نام پر اصل سعادت و فلاح وہ حاصل کر سکتے ہیں اور صحیح معنے میں نیکوکار کہلانے کے وہ مستحق ہیں جن کے افکار ، جن کے اعمال ، جن کے اخلاق دین کے

تقاضے پورے کر رہے ہوں۔ ان آیات میں بتایا ہے کہ عبادت میں کسی سمت کی طرف مُنہ کر لینے کا نام ہی نیکی نہیں ہے۔ نیکی تو دراصل نام ہے تصور و شعور کا، اعمال اور روشِ زندگانی کا، نیکی نام ہے اس تصور کا جو افراد اور جماعتوں کو اصلاح آشنا کر دے، نیکی نام ہے اس روش کا جو انسان کی کایا پلٹ دے۔ ساری شریعت کو پس انداز کر کے صرف ایک بات کا ہو رہنا نیکی نہیں ہے، راست بازی اور حق پرستی کی جگہ نفسانی خواہشوں کی پرستش کا نام نیکی نہیں ہے۔ اس میں تفصیل کے ساتھ بتایا ہے کہ فلاح و سعادت کے بنیادی اُصول و قواعد کیا ہیں؟

۴۸۷۔ جب آیاتِ سابقہ میں یہودیوں نے اپنی بُرائی سنی تو کہنے لگے کہ ہم میں تو بہت سے اسباب و آثار ہدایت و مغفرت کے موجود ہیں۔ مثلاً ایک بات یہی ہے کہ ہم جس قبلہ کی طرف مُنہ کرنے کے لیے مامور ہیں اس کی طرف متوجہ ہو کر نماز جو عبادات میں سب سے افضل ہے اللہ کے حکم کے موافق ادا کرتے ہیں پھران خرابیوں اور عذاب کے ہم کیونکر مستحق ہو سکتے ہیں۔ اس خیال کی تردید میں ارشاد ہے کہ اصلی نیکی جو ہدایت و مغفرت کے لیے درکار ہے یہ نہیں کہ تم صرف اپنا مُنہ نماز میں مشرق یا مغفرت کی طرف کر لیا کرو اور عقائد و اعمال ضروریہ کی پروا نہ کرو۔[۱]

ان آیات میں ایک خاص انداز میں اس بحث کو ختم کر دیا گیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ تم نے سارا دین صرف اس بات میں منحصر کر دیا ہے کہ نماز میں انسان کا رُخ مغرب کی طرف ہو یا مشرق کی۔ یعنی تم نے صرف سمت و جہت کو دین کا مقصد بنا لیا اور ساری نیکیاں اسی میں دائر ہو گئیں۔ گویا شریعت کا کوئی اور حکم موجود ہی نہیں ہے۔[۲]

مشرق و مغرب کی طرف مُنہ کرنے کو تو صرف بطورِ تمثیل بیان کیا گیا ہے۔ دراصل مقصود یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ مذہب کی چند ظاہری رسُوم کو ادا کر دینا اور صرف ضابطے کی خانہ پُری کے طور پر چند مقرر مذہبی اعمال انجام دینا اور تقویٰ کی چند معروف شکلوں کا مظاہرہ کرنا وہ حقیقی نیکی نہیں ہے جو اللہ کے یہاں وزن اور قدر رکھتی ہے۔[۳]

سمت پرستی کی گمراہی

اسلام سے پہلے دُنیا کی بے شمار گمراہیوں میں سے ایک اہم گمراہی سمت پرستی تھی، یعنی دوسری

---

[۱] افاداتِ شیخ الھند ص ۴۴ [۲] معارف م ش ص ۳۰۷ [۳] تفہیم القرآن ص ۱۲۷

پرستشوں کے علاوہ سمتوں اور جہتوں کی پرستش بھی جاری ہوگئی تھی۔ اور مختلف جاہل قوموں نے یہ اعتقاد جما لیا تھا کہ فلاں مخصوص سمت مثلاً مشرق مقدس ہے اور فلاں سمت مثلاً مغرب قابلِ پرستش ہے۔ قرآن حکیم یہاں شرک کی اسی خاص صورت کی تردید کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ کسی سمت و جہت میں کیا تقدس ہے اور کوئی سمت بحیثیت سمت ہرگز قابلِ تقدیس نہیں ہے۔ البر (نیکی و طاعت) سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ہمارے حضرات مفسرین کو اس آیت میں جو شبہ نظر آیا وہ محض اس لیے کہ ان کی نظر دوسرے مذاہب کی اس گمراہی پر نہ تھی۔

ظاہر ہے کہ اسلام نے کوئی سمت بحیثیت سمت ہرگز متعین نہیں کی ہے۔ اس نے صرف ایک مکان مقرر یعنی خانہ کعبہ کو ایک مرکزی حیثیت دی ہے اور اسے قبلۂ توجہ ٹھہرایا ہے خواہ وہ کسی سمت میں پڑ جائے۔ چنانچہ مشاہدہ ہے کہ کعبہ مصر و طرابلس و حبشہ سے مشرق میں پڑتا ہے، ہندوستان، افغانستان اور چین سے مغرب میں، شام و فلسطین اور مدینہ طیبہ سے جنوب میں، یمن اور بحرِ قلزم کے جنوبی ساحلوں سے شمال میں۔ اور بہت سے مقامات سے ان مختلف سمتوں کے مختلف گوشوں میں۔ المشرق سورج دیوتا دنیائے شرک کا معبودِ اعظم رہا ہے۔ مشرک قوموں نے اس کی پرستش بڑی کثرت سے کی ہے اور یہ چونکہ مشرق سے نکلتا ہے اس لیے عموماً جاہل قوموں نے مشرق کو بھی مقدس سمجھ لیا ہے اور عبادت کے لیے مشرقی رُخ اختیار کر لی۔ حضرت مسیح کے چند سال ہی بعد جب مسیحیوں میں ایک شخص پولوس نامی آگیا اور اس نے مسیحیت کا رُخ بجائے تجدید موسویت کے ایک مستقل تثلیثی شرک کی طرف پھیر دیا۔ رومی اس وقت صاحبِ اقتدار تھے۔ محکوموں کے دلوں میں رومی مشرکوں کے علوم و فنون، تہذیب و معاشرت، دین و عقائد کا تسلط تھا اور رومی مذہب کا ایک جز آفتاب پرستی تھی۔ اس لیے مسیحیوں نے جہاں اور بہت سے مشرکانہ رسوم رومیوں سے لیے وہیں مشرق پرستی کو بھی ان سے لے لیا۔ قرآن نے اس مشرقی رُخی پر زبردست ضرب کاری لگائی اور بتا دیا کہ سمت وار تقدس تو کسی درجہ میں بھی نہیں ہے بلکہ طاعتیں وہ ہیں جن کا تفصیلی ذکر آگے آ رہا ہے۔[1]

ایمان باللہ

۴۸۸۔ اللہ پر ایمان رکھے۔ اسلام سے پہلے قرآن کے مخاطبوں کے ذہن میں ایک بالاتر ہستی کا

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۶۵

تخیل ضرور موجود تھا جس کا نام گرامی اُن کے یہاں اللہ تھا۔ مگر اللہ کیا ہے، کیسا ہے۔ اس کی صفات کیا ہیں، اس کی طرف کیا کیا باتیں منسوب کی جاسکتی ہیں، کن کن باتوں سے وہ پاک ہے۔ اس کا تعلق اپنے بندوں کے ساتھ کیسا ہے؟ ہم کو اس کے آگے کیسے جھکنا چاہیے۔ اس سے کیا مانگنا چاہیے اور کیونکر مانگنا چاہیے۔ اس کے حضور میں دُعا کیونکر کرنی چاہیے۔ ہم اُس سے ڈریں اور کیونکر ڈریں اور اُس سے ڈرنے کی حقیقت کیا ہے اس سے محبت کی جاسکتی ہے یا نہیں اگر کی جاسکتی ہے تو کیونکر؟ اس کی قدرت کہاں تک ہے۔ اس کے علم کی حیثیت کیا ہے؟ کیا وہ ہم سے دُور ہے یا بالکل قریب تر، اس کے تقدس، بڑائی اور عظمت کی کوئی حد ہے؟ اس پر ہم توکل اور بھروسہ کیونکر کریں۔ کیا وہ انسانوں کی کسی صنف سے کوئی کلام بھی کرتا ہے، کیا اس کے کچھ احکام بھی ہیں اور وہ احکام واجب الاطاعت بھی ہیں۔ وہ کن باتوں سے خوش ہوتا ہے اور کن سے ناخوش۔ کیا وہ ہمارے دلوں کے چھپے ہوئے رازوں سے بھی واقف ہے۔ کیا اُس کی اجازت کے بغیر زمین کا کوئی ذرہ بھی اپنی جگہ سے حرکت نہیں کرسکتا۔ اس کی مشیت، اس کا ارادہ کیونکر آسمان سے زمین تک ہر چیز کو محیط ہے؟ کیا اس کے بنائے ہوئے قواعد و قوانین بھی ہیں۔ کیا وہ انسانوں کی تعلیم و اصلاح کے لیے پیغمبر روانہ کرتا ہے۔ کیا ہم اس کی بارگاہ میں اپنے اعمال کے جواب دہ بھی ہیں۔ ہم سے کیوں اور کیونکر ہمارے اعمال کا مواخذہ کرے گا۔ یہ وہ باتیں ہیں جن سے عرب جاہلیت کا ایک ایک ذرہ پڑھ جاؤ، اُن کے مذاہب و اعتقادات کا ایک ایک حرف تلاش کرو۔ اس سے زیادہ کچھ نہ پاؤ گے کہ اللہ ایک طاقتور اعلیٰ ہستی ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے اور مصیبتوں اور بلاؤں میں اسی کو پکارنا چاہیے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبانی تعلیمات سے ان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا۔ اُس کی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا۔ اس کی مشیت و ارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا۔ ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی ان کو تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا جس کی وسعت غیر محدود ہے جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرے میں نافذ ہے، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اُجالے کی ہر چیز داخل ہے۔ دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں۔ اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جوابدہ اور ذمہ دار ہے۔ اس کے مواخذہ کا خوف اس کی رحمت کی اُمید ہے۔ وہ محبوب ازل ہے اس کی محبت کا نشہ ہمارے دلوں کی ہوشیاری ہے۔ اس کے فضل و کرم اور لُطف و محبت کی نیرنگیاں اُوپر سے نیچے تک پھیلی ہوئی ہیں۔ اُس کی قوت ہر قوت سے غالب اس کا ارادہ ہر ارادے میں نافذ اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے۔ اس کی عبادت ہر مخلوق پر

فرض اور اس کی اطاعت ہر مکلف پر واجب ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک و منزہ ہے اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے موصوف ہے۔ انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ و اصلاح کے لیے رسولوں اور پیغمبروں کو بھیجتا رہا۔ اور ان سے ہم کلام ہوتا رہا، اس کے کچھ احکام اور بندھے ہوئے قوانین ہیں جن کی طاعت نیکی اور نافرمانی گناہ ہے۔ وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسوں کی اُمید، زخمیوں کی مرہم، بیقراروں کی تسلی اور بیکسوں کا سہارا ہے۔ وہ ہماری گردن کی رگ سے بھی قریب تر ہے ہم اس کو جب پکاریں وہ سنتا ہے۔ وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے۔ وہ جب چاہے آسمان اور زمین کو فنا کر دے۔ اس کی محبت دُنیا کا حاصل، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصد اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔ یہی ایمان باللہ ہے۔

اس ایمان باللہ کا یہ اثر ہوا کہ وہ لوگ جن کو بھولے سے خدا کا نام یاد نہ آتا تھا وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کے لیے تیار ہو گئے۔ وہ چلتے پھرتے، اُٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر حال میں اس کی یاد میں سرمست سرشار تھے۔ اس سرمستی و سرشاری میں انہوں نے جنگلوں میں راہبانہ زندگی بسر نہیں کی، دولت مندوں کی بھیک کو اپنا سہارا نہیں بنایا، دُنیا کی کشمکش سے نجات حاصل کرنے کے لیے بزدلانہ گوشہ نشینی کو تقدس کا نام دے کر اختیار نہیں کیا بلکہ فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدوجہد اور سعی و کوشش کو اپنا مذہب سمجھا اور خدا کا حکم مان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجا لانے اور ان تمام ہنگاموں کے ساتھ ان کا معاملہ دلدارِ ازل کے ساتھ ہمیشہ قائم رکھا۔ ان کا توکل، ان کا صبر، ان کا استقبال، ان کی صداقت، ان کی راست بازی، ان کی اطاعت غرض ان کی ہر چیز ان کے اسی ایمان باللہ کا پرتو تھی۔

ایمان بالیوم الآخر

۴۸۹۔ آخرت کے دن پر۔ قرآن حکیم میں ایمان باللہ کے بعد اسی کی اہمیت پر سب سے زیادہ زور دیا گیا ہے۔ کیونکہ موجودہ دُنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد اسی آئندہ دُنیا کے گھر کی بنیاد پر قائم ہے۔ اگر یہ بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمالِ انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے۔ اسی لیے مذاہب نے کسی نہ کسی اصطلاح میں دوسری زندگی کو متفقاً تسلیم کیا ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم نے اس آئندہ زندگی کو دو دوروں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک موت سے لے کر قیامت تک اور دوسرا قیامت سے لے کر ابد تک۔ پہلے دَور کا نام برزخ ہے اور

دوسرے کا نام بعث یا حشر و نشر ہے۔ ان سب کے معنے اُٹھنے اکھٹے ہونے کے ہیں لیکن ان سب سے مقصود ایک ہی حقیقت کی طرف اشارا ہے اور وہ موجودہ دُنیا کے خاتمے کے بعد دوسری دُنیا کی زندگی ہے۔ اسی لیے اس دوسری زندگی یا اس کے عالم کو الیوم الآخر، الدار الآخرہ اور عقبی الدار کہا ہے جس کے معنے دوسرے یا پچھلے دن اور گھر کے ہیں۔ ایمان بالآخرۃ یہ ہے کہ اس حقیقت کا یقین کیا جائے کہ یہ دُنیا ایک دن قطعی طور پر فنا ہو جائے گی اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ اپنی خاص قدرت سے پھر سب کو زندہ کرے گا۔

چونکہ دین و مذہب کی ساری اساس اپنی حیثیت سے جزاو سزا کے عقیدے پر ہے کہ اگر آدمی اس کا قائل نہ ہو تو پھر وہ کسی دین و مذہب اور اس کی تعلیمات و ہدایات کو ماننے اور اس پر عمل کرنے ہی کی ضرورت کا قائل نہ ہوگا۔ اس لیے ہر مذہب میں خواہ وہ مسلمانوں کا خود ساختہ ہو یا اللہ کا بھیجا ہوا، جزاو سزا کو بطور بنیادی عقیدے کے تسلیم کیا گیا ہے۔ انسانی دماغوں کے بنائے ہوئے مذاہب میں اس کی شکل تناسخ وغیرہ تجویز کی گئی ہے لیکن خدا کی طرف سے آئے ہوئے ادیان و مذاہب کل کے کل اس پر متفق ہیں کہ اس کی صورت وہی حشر و نشر کی ہو گی جو اسلام بتاتا ہے۔

فرشتوں پر ایمان

۴۹۰۔ فرشتوں پر یعنی وہ فرشتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ فرشتوں کا اعتقاد دُنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح رہا ہے لیکن ان کے اس اعتقاد میں کچھ باتیں ایسی داخل تھیں جو اللہ کی شانِ توحید کے منافی تھیں۔ اسکندریہ کے نوافلاطونی فلسفہ کی رُو سے عقل اول کی اضطراری ہی پیدائش کے بعد خدا کو معطل ہو جانا پڑا اور فرشتوں کو عقول کی صورت میں اصلی کارفرما قرار دیا گیا تھا۔ عراق کے صابئی اجرام سماوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے۔ اور انہی کو عالم کا کارفرما مانتے تھے۔ یہود بھی ان کو کسی قدر صاحب اختیار تصور کرتے تھے اور کبھی کبھی ان کو خدا کا درجہ دیتے تھے جیسا کہ تورات صحیفہ تکوین کے قصوں میں کہیں کہیں نظر آتا ہے۔ ان کو خدا کے بیٹوں کے خطاب سے بھی کبھی کبھی یاد کرتے تھے۔ ہندوؤں میں وہ دیوتا اور دیبی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے۔ دوسری طرف اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے چھوٹے خداؤں کے مرتبہ پر فائز تھے۔ عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جز تسلیم کرتے تھے اور یہ تثلیث کا ایک رُکن تھا۔ عربوں میں فرشتے خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے۔ وہ ان کی پوجا کرتے تھے اور ان کو اپنے گناہوں کا شفیع سمجھتے تھے۔

تعلیم محمدی نے ان تمام عقائدِ باطلہ کو مٹادیا اور ایک ایک کر کے ان میں سے ہر عقیدے کی تردید کر دی۔ اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں۔ ان کو خدائی کا کوئی اختیار نہیں۔ وہ صرف خدا کی طاعت، عبادت اور اس کے احکام کی بجاآوری میں مصروف رہتے ہیں۔ ان میں سے جس کے جو کام سپرد ہے وہ اسی کو انجام دیتا ہے۔ وہ ہماری ہی طرح بندۂ محض ہیں۔ وہ نہ عبادت کے مستحق ہیں نہ خدا کے حکم کے بغیر وہ شفاعت کا ایک حرف زبان سے نکال سکتے ہیں۔ اور نہ خدا کے سامنے عرض کرنے کی جرأت کر سکتے ہیں۔ یہودی ان کو خدا کے بیٹے اور عرب خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ قرآن نے دونوں کی تردید کی اور بتایا کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں، وہ نہ مرد ہیں نہ عورت ہیں، نہ کھاتے ہیں نہ پیتے ہیں اور نہ خدائی کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ وہ خدا کے خوف سے ہمیشہ کانپتے اور لرزتے رہتے ہیں۔

فرشتوں پر ایمان لانے سے اسلام میں دو باتیں مقصود ہیں:

۱۔ ایک یہ کہ اسلام سے پہلے بُت پرست اقوام اور دوسرے اہلِ مذاہب میں ان فرشتوں کو خدائی کا جو مرتبہ دیا گیا تھا۔ اس غلط عقیدے کو مٹا کر یہ حقیقت ظاہر کی جائے کہ ان کی حیثیت بے اختیار محکوم بندہ کی ہے جب تک اس کی تصریح نہ ہوتی کلمۂ توحید کی تکمیل نہ ہوتی۔

۲۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ مادے کے خواص و طبائع کو دیکھ کر مادہ پرست جو ان خواص اور طبائع مادی کی بالذات کارفرمائی کا یقین کرتے ہیں اس کا ازالہ کیا جائے کیونکہ یہی چکر ان کی ٹھوکر کا باعث ہو جاتا ہے اور بالآخر خدا کے انکار تک لے جاتا ہے۔

درحقیقت ان مادی خواص و طبائع پر روحانی اسباب مسلط ہیں جو اللہ کے حکم سے اس کے مقررہ اُصول کے مطابق نظامِ عالم کو چلا رہے ہیں۔ مادہ اور اس کے خواص بالذات موثر نہیں ہیں، بلکہ کوئی دوسرا ہے جو اپنے ارواحِ مجردہ کے ذریعے سے ان کو موثر بناتا ہے۔ اس عقیدے سے مادیت کا بُت ہمیشہ کے لیے ٹوٹ جاتا ہے۔ غرض منزہ خالق اور مادی مخلوق کے درمیان احکام و شرائع کا نزول اور قدرتِ الٰہی کے افعال کا صدور ان محکوم ارواحِ مجردہ ملائکہ کے ذریعے ہوتا ہے۔

کتابوں پر ایمان

۱۹۴۔ کتاب پر۔ کتاب سے جنس مراد ہے اس کا اطلاق صحیفۂ آسمانی کے نفسِ تخیل پر ہوگا مطلب یہ ہے کہ تمام آسمانی کتابوں کی صداقت کو تسلیم کیا جائے اور تمام کتابوں پر ایمان رکھا جائے

جن کتابوں کے نام مذکور ہیں ان پر ناموں کے ساتھ اور جن کے نام مذکور نہیں ان پر بالاجمال ایمان ضروری ہے۔ کسی قوم میں اگر کوئی آسمانی کتاب ہے جس کا وجود قرآن سے پہلے ہے لیکن قرآن نے اس کے نام کی تصریح نہیں کی اور اس میں توحیدِ الٰہی کی دعوت اور طاغوت سے بچنے کی نصیحت بھی ہے تو اگرچہ ہم اسے بتصریح خدا کی کتاب تسلیم نہیں کر سکتے تاہم بالتصریح اس کا انکار بھی نہیں کر سکتے۔ اسی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہلِ کتاب کی نہ تصدیق کرو اور نہ تکذیب۔ یہی حال دوسری مشکوک کتابوں کا ہے۔ یہود تورات کے سوا کچھ نہیں مانتے۔ عیسائی تورات کے احکام نہیں مانتے لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں۔ تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے۔ پارسی اوستا کے باہر خدا کے کلام ہونے کا شبہ بھی نہیں کر سکتے لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحیفہ ابراہیم، تورات، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے اور دوسری اگلی آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں ہوں تکذیب نہ کرے کہ ان کا اللہ کی کتابیں ہونا ممکن ہے۔ بہرحال اللہ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ یقین کیا جائے کہ اللہ پاک نے اپنے رسولوں کی وساطت سے وقتاً فوقتاً ہدایت نامے بھیجے ہیں۔ ان میں سب سے آخر اور سب کا خاتم قرآن مجید ہے، جو پہلی تمام کتابوں کا مصدق اور مہیمن بھی ہے۔ یعنی ان کتابوں میں جتنی ایسی کتابیں تھیں جن کی تعلیم و تبلیغ ہمیشہ اور ہر زمانہ میں ضروری ہوتی ہے وہ اس قرآن میں لے لی گئی ہیں۔ گویا یہ تمام کتبِ سماویہ کے ضروری مضامین پر حاوی اور سب سے مستغنی کرنے والی کتاب ہے اور خدا کی آخری کتاب ہے اور چونکہ وہ کتابیں اب محفوظ نہیں ہیں اس لیے اب صرف یہی کتاب ہدایت ہے جو سب کے قائم مقام اور سب سے زیادہ مکمل ہے اور زمانہ آخر تک اس کی ذمہ داری خود اللہ سبحانہ نے لی ہے۔ شاید یہاں اسی لیے الکتاب مفرد لائے ہیں۔

ایمان بالانبیاء

۴۹۲۔ اور خدا کے سارے نبیوں پر ایمان۔ اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا یہ ہے کہ اس واقعی حقیقت کا یقین کیا جائے کہ اللہ نے اپنے بندوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے وقتاً فوقتاً اور مختلف علاقوں میں اپنے برگزیدہ بندوں کو اپنی ہدایت اور اپنی رضامندی کا دستور دے کر روانہ کیا ہے اور انہوں نے پوری دیانت و امانت کے ساتھ اللہ کا وہ پیغام بندوں تک پہنچا دیا ہے اور لوگوں کو راہِ راست پر لانے کے لیے پوری پوری کوششیں کیں۔ یہ سب پیغمبر اللہ کے برگزیدہ اور صادق بندے تھے۔ ان میں سے چند

کے نام اور کچھ کے حالات بھی قرآن میں ہمیں بتائے گئے ہیں اور بہتوں کے نہیں بتلائے گئے۔ بہر حال خدا کے ان سب رسولوں کی تصدیق کرنا اور بحیثیت پیغمبر ہی ان کا پورا پورا احترام کرنا ایمان کی شرطوں میں ہے۔ اور اسی کے ساتھ اس پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ اللہ نے اس سلسلۂ نبوت کو حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم کر دیا۔ آپ خاتم الانبیاء اور خدا کے آخری رسول ہیں۔ اور اب قیامت تک پیدا ہونے والے انسانوں کے لیے نجات و فلاح آپ ہی کے اتباع اور آپ ہی کی ہدایات کی پیروی میں ہے[1]

رسولوں پر ایمان اسلام کی ان خصوصیات میں سے ہے جن کی تکمیل صرف اسلام کے ذریعہ ہی انجام کو پہنچی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود مبارک سے پہلے دنیا کی ہر قوم کو بجائے خود یہ خیال تھا کہ وہی اللہ کے خاص محبوب اور پیارے ہیں۔ تمام دنیا کی قوموں میں ہدایتِ ربانی کے لیے وہی منتخب کیے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ دنیا کی تمام قومیں اس فیض سے قطعاً محروم ہیں۔ اسی کی سرزمین دیوتاؤں اور دیبیوں کا مسکن اور اسی کی زبان خدا کی مقدس زبان ہے۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات نے تنگ خیالی کے اس محدود دائرے کو دنیا کی عظیم الشان وسعت سے بدل دیا۔ آپ نے یہ سکھایا کہ دنیا کی تمام قومیں اللہ کی نظر میں یکساں ہیں۔ عرب کو عجم پر اور نہ عجم کو عرب پر فضیلت ہے اور نہ کالے کو گورے پر اور نہ گورے کو کالے پر کوئی تقدم حاصل ہے۔ ساری زمین خدا کی ہے اور تمام قومیں ایک خدا کی مخلوق ہیں۔ اس تعلیم کا پہلا نتیجہ یہ نکلا کہ قوموں اور ملکوں کی فطری فضیلت کی پرانی داستان طاقِ نسیان ہو گئی۔ دنیا کی تمام قومیں ایک سطح پر آگئیں اور مساواتِ انسانی کا راستہ صاف ہو گیا۔

اسلام میں پیغمبروں کی کوئی تعداد محدود نہیں ہے۔ طبرانی میں ایک ضعیف روایت ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء آئے۔ دوسری روایت میں اس سے کم تعداد بھی مروی ہے۔ قرآن میں انہی انبیا کا ذکر ہے جن سے عرب مانوس تھے یا ان کے ہمسایہ یہود و نصاریٰ کے صحیفوں میں جن کے تذکرے تھے۔ قرآن میں بعض ایسے انبیاء بھی مذکور ہیں جن سے صرف عرب واقف تھے اور یہود و نصاریٰ بے خبر تھے۔ مثلاً حضرت ہود اور شعیب، بعض ایسے بھی ہیں جن کو یہود و نصاریٰ جانتے تو تھے لیکن پیغمبر نہیں مانتے تھے مثلاً حضرت داؤد، حضرت سلیمان۔ وحی محمدی نے ان سب کو پیغمبر تسلیم کیا اور ان کی صداقت و عظمت کا اقرار کیا۔

ایمانیات

یہاں تک قرآن میں اس نیکی اور طاعت کے لیے جو اثرِ ہدایت اور سببِ مغفرت ہو سکتی ہے ایمانیات

---

[1] معارف الحدیث ج ۱ ص ۶۵

کا تذکرہ کیا ہے۔ کیونکہ انسان کے تمام اعمال، معاملات اور اخلاق و آداب کا محور اصلی اس کے عقائد ہیں۔ یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل، اخلاق، معاملات اور آداب زندگی کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرہ حیات کا ہر خط اسی پر جاکر ختم ہو جاتا ہے۔

قرآن نے ان لوگوں کے اعمال کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں اس راکھ سے دی ہے جسے ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور اُن کا وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو ایمان سے محروم ہیں بے بنیاد اور بے اصل ہے۔

سورۃ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں ہے۔

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر ہر عمل بے بنیاد ہے۔ وہ ہماری سیرابی کا سرچشمہ ہے جس کے ناپید ہو جانے سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے علم و عمل، تصور و فعل، عقلیت و عملیت میں تعلق ثابت کیا ہے مگر اصلی زور انسان کی عملیت پر صرف کیا اور عقائد کے اتنے ہی حصہ کا یقین و اقرار ضروری قرار دیا۔ جو دل کی اصلاح کرے اور عمل کی بنیاد، اخلاق و عبادات کی اساس قرار پا سکے۔ عقائد کے فلسفیانہ الجھاؤ اور تصورات و نظریات کی تشریح و تفصیل کر کے عملیت کو برباد نہیں کیا۔ چند سیدھے سادے اُصول جو تمام ذہنی سچائیوں اور واقعی حقیقتوں کا جوہر اور خلاصہ ہیں۔ ان کا نام عقیدہ اور ان پر یقین کرنے کا نام ایمان ہے۔ قرآن نے اس آیت میں عقائد کے صرف پانچ اُصول تلقین کیے ہیں۔ خدا پر ایمان، خدا کے فرشتوں پر ایمان، خدا کے رسولوں پر ایمان، خدا کی کتابوں پر ایمان اور اعمال کی جزا، سزا یعنی یوم آخر پر ایمان۔

۴۹۳۔ اور اللہ کی محبت میں اپنا مال رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں، مسافروں اور سوال کرنے والے کو اور غلام کے آزاد کرنے میں دیں۔ ایمانیات کے ضروری اُصول بیان کرنے کے بعد یہاں سے اعمال کی تصحیح شروع فرمائی ہے اور اعمال میں مقدم معاملات اور مالیات کو کیا ہے۔

معاملات و مالیات

یہ جو فرمایا ہے کہ اللہ کی محبت میں مال دے۔ اصل ارشاد عربی میں اتی المال علی حبہ ہے۔ اس میں تین احتمال ہیں۔

ایک یہ کہ حبہ کی ضمیر اللہ کی طرف پلٹ جائے، معنے یہ ہوں گے کہ مال خرچ کرنے میں کوئی نفسانی غرض شامل نہ ہو بلکہ صرف اللہ کی محبت اس خرچ کا تقاضا ہو۔ گویا یہ بتا دیا کہ مال کا خرچ کرنا خود ہرگز محمود اور مطلوب نہیں۔ مقصود صرف وہ خرچ ہے جو اللہ کی راہ میں اللہ کی رضا جوئی کے لیے اللہ کے دین کے فروغ کے لیے ہو۔

دوسرے یہ کہ ضمیر مال کی طرف پلٹ جائے۔ مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کی راہ میں وہ مال خرچ کرنا موجب ثواب ہے جو انسان کو محبوب ہو، بیکار چیزیں اللہ کی راہ میں نہ دے۔ اس میں بھی ایک پختہ کار مومن کی سیرت کی تصویر آگئی ہے۔ مال و زر کی محبت اور قدر اس کے دل میں ہے، خواہشیں اس کی زندہ ہیں۔ اپنی ذات پر اپنے محبوبات و مرغوبات پر وہ خرچ کرنا چاہتا ہے لیکن امرِ الٰہی کے آگے اپنی گردن جھکا دیتا ہے، اپنی خواہشوں کو دبا دیتا ہے، اپنے شوق کو حکمِ خداوندی پر قربان کر دیتا ہے۔ وہ عمل اسی پر کرے گا جو حکمِ ربانی ہے اور خرچ وہیں کرے گا جہاں شریعت حکم دیتی ہے۔

تیسرے یہ کہ ضمیر کا مرجع اٰتی فعل کا مصدر ایتاء ہو۔ مطلب یہ ہوگا کہ وہ اپنے دینے پر دل سے راضی ہو، یہ نہ ہو کہ خرچ کر رہا ہو مگر اندر سے کڑھ رہا ہو۔

انفاقِ مال کی ذمہ داری

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مالدار آدمی پر مزید انفاقِ مال کی ذمہ داری باقی رہتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اصول کی صراحت فرمائی ہے۔

فاطمہ بنتِ قیس کہتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تمہارے اموال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔ مسند دارمی زکوٰۃ

یہی روایت ترمذی میں اس طرح آئی ہے کہ

مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔

ترمذی ہی میں فاطمہ بنتِ قیس کی روایت میں یہ اضافہ بھی ہے کہ یہ فرمانے کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے زیرِ نظر آیت کی تلاوت فرمائی۔

رشتہ داروں پر خرچ کرنا

یہاں اس کے لیے ذوی القربیٰ کی تعبیر آئی ہے۔ یعنی تمہاری مالی اعانت کے سب سے پہلے

حقدار قریبی اور رشتہ دار ہیں۔ یہ نہ ہو کہ بھائی کی کوٹھیاں تیار ہو رہی ہوں اور بہن جھونپڑے کو ترس رہی ہو، چچا کے پاس موٹریں ہوں اور بھتیجے کو تانگے کے پیسے بھی میسّر نہ ہوں۔ ہر مالدار کو سب سے پہلے خبر گیری اپنے نادار عزیزوں، کنبہ والوں، بھائیوں، بہنوں، بھتیجوں، بھانجوں اور دوسرے قریبوں کی کرنی چاہیے۔

اس بات پر تمام مدارس قانون اسلامی کا اتفاق ہے کہ رشتہ داروں میں سے اپنے نادار ماں باپ نادار نابالغ اولاد اور کسبِ معاش سے معذور نادار بالغ اولاد کا مالی و نفقہ واجب ہے۔ اس بالغ بیٹی کا نفقہ بھی واجب ہے جو غیر شادی شدہ ہو یا بیوہ یا مطلقہ ہونے کی وجہ سے باپ کے گھر واپس آ گئی ہو۔ البتہ یہ نفقہ اسی صورت میں واجب ہو گا جب یہ فرد نادار نہ ہو بلکہ اپنی ضرورت سے فاضل مال رکھتا ہو۔ اس نفقہ کی مقدار ضروریاتِ زندگی اور عرفِ عام کے اعتبار سے متعین کی جائے گی۔ امام مالک کے نزدیک فرد پر والدین کے علاوہ کسی دوسرے رشتہ دار کا نفقہ واجب نہیں ہے۔ امام شافعی کے نزدیک ماں باپ کی طرح دادا، دادی، نانا، نانی وغیرہ کا اور اولاد کی طرح پوتے پوتی، نواسے نواسی وغیرہ رشتہ داروں کا بھی نفقہ واجب ہے۔ امام احمد کے نزدیک ان رشتہ داروں کے علاوہ فرد پر ہر اس رشتہ دار کا نفقہ واجب ہے جس کے مرنے پر وہ اس کا وارث ہو سکتا ہو۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک مذکورہ بالا صلبی رشتہ داروں کے علاوہ صرف ان عزیزوں کا نفقہ واجب ہو گا جس سے فرد کوئی رحمی قرابت رکھتا ہو اور جن کا وہ محرم ہو۔ اس رائے کے مطابق چچازاد بھائی کا نفقہ واجب نہ ہو گا۔ امام صاحب کے نزدیک اصول دادا، نانا اور فروع پوتا، نواسہ کے علاوہ باقی رشتہ داروں کے درمیان نفقہ کا مدار رحمی قرابت ہے [1]

اس موضوع پر مزید قانونی مباحث کے لیے پارہ ۱۰ کا انتظار فرمائیے۔

یتیموں کی نگرانی

اس کے بعد محلہ اور بستی کے یتیم بچوں اور بچیوں کا نمبر آتا ہے۔ جن کا کوئی والی وارث باقی نہیں رہا ہے۔ جماعت کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو آغوشِ محبت میں لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے۔ اس کے متروکہ مال کی حفاظت کرے، اس کی تعلیم و تربیت کی فکر کرے،

---

[1] نظام النفقات ص ۲۸

عقل و شعور تک پہنچنے کے بعد اس کے باپ کی متروکہ جائداد اس کو واپس کرے اور یتیم لڑکیوں کی حفاظت اور ان کی شادی بیاہ کی مناسب انتظام کرے یہ وہ احکام ہیں جو پوری تفصیل سے قرآن میں پڑھیں گے۔

آج دُنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے موجود ہیں لیکن اگر یہ سوچا جائے کہ قرآن کے آنے سے پہلے بھی یہ بدقسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا۔ اس کے تفصیلی مباحث انشاآللہ اسی پارے کی آیت ۲۱۵ میں آ رہے ہیں۔

ناداروں کی امداد

ہر انسان خواہ وہ کسی قدر صاحبِ دولت اور بے نیاز ہو کسی نہ کسی وقت اس پر ایسی اُفتاد آ پڑتی ہے کہ اُسے دوسروں کا دست ونگر بننا پڑتا ہے اور اُسے دوسروں سے مدد کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے انسانی جماعت کے ہر رُکن کا فرض ہے کہ وہ اپنے ایسے مصیبت زدہ بھائی کی ہر طرح مدد کرے، اور اپنی موجودہ بہتر حالت پر مغرور ہو کر کبھی کسی حاجت روائی سے بے پروائی نہ برتے اور نہ یہ سمجھے کہ اس کو کبھی دوسروں کی ضرورت نہ پڑے گی۔ قرآن کی یہ آیت کہتی ہے کہ مالک کے پاس اپنی ضرورت سے زیادہ مال تو اس کی ایمانی ذمہ داری ہے۔ کہ اہلِ حاجت کی حاجت روائی کرے، اس حاجت روائی کا کم سے کم معیار یہ ہے کہ معاشرہ میں کوئی ایسا فرد باقی نہ رہے جس کی بنیادی ضروریات کی تکمیل نہ ہو سکے۔

غرض یہ ہے کہ حاجت مندوں کی حاجت برآری، ضرورت مندوں کی ضرورت کو پورا کرنا اور جس قدر بھی مدد وہ چاہے کہ تمہاری طاقت میں ہو اس کو دینا ہر مسلمان پر ایک حق کی حیثیت رکھتا ہے جسے ہر مسلمان کو پورا کرنا چاہیے۔ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کی تشریح ان الفاظ میں فرمائی ہے۔

> جو شخص اپنے بھائی کی حاجت برآری میں لگا رہے گا اور جو کسی مسلمان کی مصیبت کو دُور کرے گا تو اللہ قیامت کی مصیبتوں میں سے کسی مصیبت کو اس سے دُور فرمائے گا۔

ایک دوسری روایت میں ہے:

> اللہ اپنے بندے کی مدد میں اس وقت تک رہتا ہے جب تک بندہ اپنے بھائی کی مدد میں رہتا ہے۔

مسافر کا حق

اس آیت کی رُو سے ہر صاحبِ استطاعت فرد کے لیے لازم ہے کہ مسافر کی مدد کرے۔ مسافر کے پاس جب زادِ راہ ختم ہو جاتا ہے اور وہ اپنے گھر سے اور وطن سے دُور ہوتا ہے اس وقت اس کی مدد کرنا بھی ضروری ہوتا ہے تاکہ اُسے یہ احساس رہے کہ ساری انسانیت اس کا خاندان اور روئے زمین اس کا وطن ہے۔ عبداللہ بن عباس، قتادہ اور ابنِ جبیر نے یہاں ابن السبیل سے مہمان مراد لیا ہے۔ مہمان نوازی کے موضوع پر نبوت کے جو ارشادات آئے ہیں وہ بتاتے ہیں کہ ایک شب و روز کا قیام و طعام مسلمان مقیم پر مسافر مہمان کا حق ہے۔ مسافر مہمان کے لیے تین دن تک اس سہولت سے فائدہ اُٹھانے کی گنجائش ہے اور میزبان کو چاہیے کہ خوشدلی کے ساتھ اس کی ضیافت کرے۔ تین دن کے بعد اگر میزبان کچھ کرتا ہے تو اس کی حیثیت صدقہ کی ہے اور مہمان کو حتی الامکان تین دن سے زیادہ قیام سے پرہیز کرنا چاہیے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شب کی مہمانی واجب ہے۔ پھر اگر مہمان کسی کے گھر رہ جاتے تو مہمانی اس پر قرض ہے چاہے وہ دے چاہے چھوڑ دے۔

چونکہ کہیں مہمان ہونا میزبان کے لیے بہرحال ایک گونہ تکلیف کا باعث ہے اور کسی کے یہاں بے وجہ مفت کھانا انسانی اور اسلامی غیرت کے خلاف ہے اس لیے ضرورت تھی کہ جہاں میزبان کو مہمان کی خاطر تواضع اور تعظیم و تکریم کی ہدایت کی گئی ہے وہاں مہمان کو بھی یہ بتا دیا جائے کہ وہ کسی دوسرے کے خوانِ کرم سے حدِ ضرورت سے زیادہ فائدہ نہ اُٹھائے چنانچہ احادیث میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے۔ کہ مہمان کو کسی کے یہاں تین دن سے زیادہ نہ ٹھہرنا چاہیے۔ (بخاری باب اکرام الضیف)

سائل کا حق

سائل مانگنے والے کو کہتے ہیں لیکن عام شہرت کی بنا پر سائل کے معنے صرف بھیک منگے کے لینا ٹھیک نہیں ہے، بلکہ اس سے ہر وہ ضرورت مند مراد ہو سکتا ہے جو تم سے کسی چیز کا خواستگار ہو۔ یہاں سوال کرنے والے کے معنے آتی المال کے قرینہ کی وجہ سے بھیک مانگنے والے کے سمجھے جاتے ہیں مگر لفظ کا عموم وسعت کو چاہتا ہے۔ یعنی ہر ضرورت مند جو تم سے کسی قسم کی مدد کا خواہاں ہو، خواہ وہ جسمانی ہو، مالی ہو علمی ہو، یہاں تک کہ کوئی لنگڑا تم سے صرف تمہارے کندھے کا سہارا چاہتا ہے تو وہ بھی سائل کے تحت میں ہے۔ امکان بھر اس کو پورا کرو اور نہ کر سکو تو نرمی اور خوبصورتی سے عذر کرو۔ مدد کی ایک صورت

یہ بھی ہے کہ تم کسی دوسرے سے اس کی سفارش کردو۔ صحیح بخاری میں ہے کہ جب کوئی سائل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آتا تو آپ صحابہ سے فرماتے کہ تم سفارش کرو تو تمہیں بھی ثواب ملے گا یہ تو مالدار کو ہدایت ہے۔

دریوزہ گری اسلام میں

لیکن سوال کرنے کو اسلام نے پسند نہیں کیا ہے۔ اسلام کسی ایسے شخص کو سوال کرنے کی اجازت نہیں دیتا جو اپنا گزارہ کر سکے یا جو اپنی روزی حاصل کر سکے۔ اسلام کی نظر میں ہر شخص کو کام کرنا چاہیے اور صرف وہی شخص دوسروں سے امداد کی درخواست کرے جو بالکل تنگ دست ہو جائے۔

اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ دریوزہ گری کا باعث افلاس و تنگدستی ہے۔ افلاس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک وہ جو بتقاضائے فطرت پیدا ہوتا ہے جس کا تعلق حکمۃ اللہ سے ہے ایسے فقر کے لیے اس آیت میں سائل کی مدد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ اور اسلامی حکومت ایسے فقر کو اپنے بیت المال سے دُور کرتی ہے۔

اس کی دوسری قسم وہ ہے جو سستی اور کاہلی سے پیدا ہوتی ہے، اسلام ایسے مصنوعی افلاس کا مخالف ہے۔ وہ اپنی سوسائٹی کے کسی فرد کو اس راہ پر چلنے سے سختی کے ساتھ روکتا ہے جو اس مصنوعی افلاس کی طرف جاتی ہو۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا کوئی فرد عضو معطل بن کر زندہ رہے۔ اس لیے وہ بار بار مختلف طریقوں سے تجارت اور ابتغاء فضل کی ترغیب دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اس نے دریوزہ گری کے مسئلہ پر پوری تفصیل سے بحث کی ہے۔ ارشاد ہے:

سوال کرنے والا قیامت کے دن اس حال میں اٹھے گا کہ
اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہو گا

یہ حدیث امام مسلم کے علاوہ امام بخاری نے بھی روایت کی ہے اور اس کا مطلب یہی ہے کہ دنیا میں جو ذلت و رسوائی گداگری کے سلسلے میں انسان کو اٹھانی پڑتی ہے اس کی تشہیر قیامت کے دن بدیں عنوان قبیح ہو گی۔ اس سے زیادہ ابلغ اور واضح وہ حدیث ہے جو سنن نسائی میں ہے۔

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص لوگوں سے سوال کرتا ہے ایسی حالت میں جبکہ اس کے پاس غنی بنانے والی چیز ہو۔ له ما يغنيه تو وہ قیامت کے روز اللہ کی عدالت میں اس طرح پیش ہو گا کہ اس کے چہرے میں سوال کرنے کی خراشیں نمایاں ہوں گی۔

اس حدیث میں مایغنیہ کا لفظ آیا ہے جو مبہم ہے مگر سنن ابی داؤد کی ایک روایت میں اس کی وضاحت آئی ہے کہ

اگر کسی کے پاس ایک دن کا کھانا ہو تو اس کے لیے سوال کرنا حرام ہے۔ اس سے زیادہ صاف لفظوں میں دوسری جگہ فرمایا،

مالدار اور رزق کی کمائی پر قدرت رکھنے والے کے لیے سوال حرام ہے۔ آگے فرمایا کہ

جو مالدار یا کما کر کھا سکنے والا مانگ کر کھائے گا وہ گویا جہنم کی آگ کا دہکا ہوا پتھر کھا رہا ہے۔

آگے ارشاد ہوتا ہے

جس کا جی چاہے یہ کام کرے اور جس کا جی چاہے زیادہ کرے۔

غلاموں کی امداد

غلاموں کو آزاد کرانے کے لیے بھی مال خرچ کیا جائے اور ان کو غلامی سے آزاد کرایا جائے جو اسلام کے مقابلے میں ہتھیار اٹھانے کی بنا پر غلام بن گئے ہیں تاکہ ان کی آزادی اور ان کی انسانی کرامت ان کو دوبارہ میسر آسکے۔ رقاب رقبۃ کی جمع ہے لفظی معنے گردن کے ہیں۔ محاورے میں اس سے مراد وہ ہوتے ہیں جن کی گردنیں آزاد نہیں ہیں یا جو بندھے ہوتے ہیں یعنی غلام جو دوسروں کی رعایا نہیں یا قیدی جو کسی جرم فوجداری یا دیوانی کی علت میں گرفتار ہو کر محصور ہوں۔ غلاموں کی آزادی کے دو طریقے ہیں یا تو ان کو خرید کر آزاد کرایا جائے یا انہیں وہ رقم دی جائے جس کو وہ معاہدۂ آزادی کے سلسلے میں اپنے مالک کو دے سکے۔

۴۹۴ - اور نماز قائم کرے اور زکوٰۃ دے۔ ایمانیات اور معاملات کے بعد عبادات کا تذکرہ کیا ہے۔ عبادات بے شمار ہیں۔ بنیادی اور بڑی تقسیم عبادات بدنی اور مالی کی ہے۔ یہاں الصلوٰۃ اور الزکوٰۃ کے ذریعے دونوں کی جنس کی طرف اشارہ کر دیا، نماز ساری بدنی عبادتوں کے اور زکوٰۃ ساری مالی عبادتوں کے قائمقام ہے۔

۴۹۵ - قول و قرار کرکے اپنی بات پوری کریں، ایمانیات، معاملات اور عبادات کے بعد اخلاق کا ذکر کیا ہے۔ اخلاقیات میں سب سے اونچا مقام ایفاء عہد کا ہے۔ یہاں صیغہ اسم فاعل لاکر اشارہ کر دیا ہے کہ ایفاء عہد کی عادت دائمی ہونی چاہیے۔

عام طور پر عہد کے معنے صرف قول و قرار کے سمجھے جاتے ہیں لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کی حقیقت

بہت وسیع ہے۔ وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے۔ اس لحاظ سے یہ مختصر سا لفظ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے۔ اسی لیے قرآن میں بار بار اس کا ذکر آیا ہے۔ اور مختلف حیثیتوں سے آیا ہے۔ یہاں اصلی اور واقعی نیکی کے اوصاف کے تذکرے میں یہ فقرہ آیا ہے۔

تمام عہدوں میں سب سے پہلے انسان پر اس عہد کو پورا کرنا واجب ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے جو روزِ الست میں بندوں نے اپنے خدا سے باندھا اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے۔ دوسرا وہ عہد ہے جو اللہ کا نام لے کر بیعت کی صورت میں پیغمبر سے کیا گیا ہے۔ تیسرا وہ عہد ہے جو عام طور پر قول و قرار کی صورت میں باہم ہوتا ہے۔ چوتھا عہد وہ ہے جو اہلِ حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہوتا ہے اور جن کے ادا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے۔

۴۹۶۔ تنگی و مصیبت کے وقت یا خوف و ہراس کی گھڑی ہر حال میں صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں۔ البأساء مصیبت اور تنگدستی اس کا اصلی تعلق اہلِ لغت نے مالی پریشانیوں سے بتایا ہے اور ضراء کا اصلی تعلق جسمانی آزار سے ہے۔ حین البأس کا مطلب ہے کہ جنگ کے وقت دشمنانِ دین کے مقابلے میں ثبات و صبر کے ظاہر کرنے اور جوہرِ سیرت و مردانگی کی چمک دکھانے کے بھی یہی مواقع ایک مومن کے لیے ہوتے ہیں۔[1]

یہاں تک آیت مذکورہ میں دین کے تمام شعبوں کے اہم اصول آگئے اور بلیغ اشارات سے ہر ایک کی اہمیت کا درجہ بھی معلوم ہو گیا۔[2]

پوری آیت کے مطالب کا خلاصہ یہ ہے کہ نیکی اور بھلائی جو اثرِ ہدایت اور سبب مغفرت بن بن سکتی ہے یہ ہے کہ اللہ، روزِ قیامت، ملائکہ، کتبِ آسمانی اور انبیاء پر دل سے ایمان لائے، محبت اور رغبت کے باوجود اپنے مال کو علاوہ زکوٰۃ کے رشتہ داروں، یتیموں، غریبوں، مسافروں اور سائلوں پر خرچ کرے۔ اور غلاموں کے آزاد کرانے میں یعنی مسلمان جن کو کافروں نے قید کر لیا ہو اس کی رہائی میں یا مقروض کو قرض خواہ سے چھڑانے میں یا غلام کو آزاد کرانے میں یا غلام مکاتب کو رہائی دلانے میں مال دے اور نماز کو خوب درستی کے ساتھ پڑھے، چاندی سونے اور جملہ اموالِ تجارت میں

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۶۶ [2] معارف القرآن ص ۳۷۷

زکوٰۃ دے۔ اور اپنے عہد و قرار کو پورا کرے۔ اور فقر و فاقہ، بیماری اور تکلیف اور خوف کی حالت میں صبر و استقلال سے رہے، یہود و نصاریٰ چونکہ ان عقائد، اعمال اور اخلاق میں کوتاہ اور کمزور تھے۔ اور ان کی پابجائی میں قسم قسم کی خلل اندازیاں کرتے تھے جیسا کہ قرآنی آیات میں اس کا تذکرہ ہے تو اب یہود و نصاریٰ کا صرف اپنے قبلہ کے استقبال پر ناز کرنا اور اپنے آپ کو طریق ہدایت پر سمجھنا اور مستحق مغفرت کہنا بیہودہ خیال ہے تاوقتیکہ ان اعتقادات، اعمال اور اخلاق پر قائم نہ ہوں جو اس آیت کریمہ میں بالتفصیل بتائے گئے ہیں۔ صرف استقبالِ قبلہ سے نہ ہدایت ہو سکتی ہے اور نہ عذاب الٰہی سے نجات مل سکتی ہے[1]

۷۹۴۔ یہی لوگ نیکی کی راہ میں سچے ہیں۔ یعنی جو لوگ اعتقادات، اعمال اور اخلاق مذکورہ سے موصوف ہوں وہ ہی عقائد، اعمال اور اخلاق اور دین و ایمان میں سچے ہیں۔ یا اپنے قول و قرار میں سچے ہیں۔[2]

مطلب یہ ہے کہ کمالاتِ حقیقی سے موصوف اور طاعت و پرہیزگاری میں پورے اترنے والوں کی علامتیں بھی یہی ہیں جو اوپر بیان ہو چکی ہیں۔ اس معیار سے جس کو چاہو جانچ لو، دیکھ لو۔[3] صدقوا صدق سے بنا ہے، اس کے معنے عام طور پر سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں لیکن اسلام کی نگاہ میں اس کے بڑے وسیع معنے ہیں جس کے لحاظ سے اس میں قول ہی نہیں بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں بڑی دقتِ نظر سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں اور قرآن و حدیث سے ہر ایک کے معنے بتائے ہیں۔ ۱۔ بات میں سچائی ۲۔ ارادہ میں سچائی ۳۔ عزم میں سچائی ۴۔ عزم کو پورا کرنے میں سچائی ۵۔ عمل میں سچائی ۶۔ دینداری کے مقامات اور مراتب میں سچائی۔ لیکن ذرا معنے میں وسعت دیجئے تو تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں سمٹ جاتی ہیں۔ یعنی زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی۔

قرآن نے اس شخص کو جس کی زبان کا ہر حرف دل کا ہر ارادہ اور عمل کی ہر جنبش حق و صداقت کا پورا مظہر ہو جائے صدیق کہا ہے۔ قرآن کی آیت کے اس فقرے اولٰئک الذین صدقوا میں سچائی کی بھی اعلیٰ قسم مراد ہے یعنی تینوں کا مجموعہ کیوں ان آیات میں جن کو صادق کہا گیا ہے ان کے تین قسم کے اوصاف بتائے گئے ہیں۔ اوّل ان کے اعمال کا کمال دوسرے ان کی عملی زندگی

[1] افادات شیخ الہند ص ۴۲ [2] ایضاً [3] تفسیر ماجدی ص ۶۶

کا کمال اور تیسرے ان کا اخلاقی کمال اور جو لوگ علم و عمل اور حال کے ان تمام فضائل کے درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں ان ہی کو شریعت کی زبان میں صدیق کہتے ہیں۔ جو نبوت کے بعد انسانیت کا سب سے پہلا مرتبہ کمال ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صدیقیت اُس کامل ایمان کے بعد حاصل ہوتی ہے جس سے عمل و اخلاق کبھی جُدا نہیں ہو سکتے۔

۲۹۸ - یہی بُرائیوں سے بچنے والے ہیں یعنی یہی لوگ اپنے اعمال و اخلاق میں پرہیزگار اور متقی ہیں۔ یا بچنے والے ہیں گناہ اور بُری باتوں سے یا عذاب الٰہی سے۔ اہل کتاب کہ جن کو ان خوبیوں میں سے کوئی بھی میسر نہیں ہے ان کا اپنی نسبت ایسا خیال کرنا کیسے دُرست ہو سکتا ہے[1]

جیسا کہ ہم آغاز میں بتا آئے ہیں کہ سورۂ بقرہ کا موضوع اجتماعی تقویٰ ہے۔ سورت کے شروع میں یہ اعلان ہوا ہے کہ

ھدی للمتقین　　یہ کتاب تقویٰ والوں کو راہ دکھاتی ہے۔

اس آیت میں اہلِ تقویٰ کا پورا چہرہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ قرآن اس قسم کی متقی سوسائٹی بناتا ہے اور یہی لوگ اللہ کی نگاہ میں متقی ہیں جن کے خدوخال اس آیت میں پیش کیے گئے ہیں۔

اسی بنا پر اس آیت کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

جو شخص اس آیت پر عمل کرے گا وہ اپنے ایمان کو کامل کرے گا۔

محققین کہتے ہیں کہ یہ آیت اہم ترین آیتوں میں سے ہے اور اس دین و شریعت کے ۱۶ احکام ہیں۔ قاضی بیضاوی کا یہ کہنا بالکل برمحل اور بجا ہے کہ یہ آیتِ قرآنی تمام کمالاتِ انسانی کو اپنے دامن میں لیے ہوئے ہے۔ کمالات جو کچھ جتنے کچھ اور جیسے کچھ بھی ہیں تین گوشوں سے باہر نہیں، علمی کمال، متعدی کمال، ذاتی کمال۔ علمی کمال کی طرف آمن باللہ الخ میں اشارہ ہے۔ تعدی کمال کے لیے آتی المال میں رہنمائی ہے اور ذاتی کمال کی طرف واقام الصلوٰۃ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے۔ اسی لیے ان اوصاف کی جامع شخصیتوں کی صداقت اور تقویٰ کو بنیاد بنا کر چہرہ پیش کیا ہے۔ ایمان و علم کے لحاظ سے صداقت ذاتی اور متعدی خوبیوں کی وجہ سے تقویٰ لاتے ہیں۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۴۴

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلَى ۖ
الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنثَىٰ بِالْأُنثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ
مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتِّبَاعٌ بِالْمَعْرُوفِ وَأَدَاءٌ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ
ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۗ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ
ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَاةٌ يَا أُولِي
الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝

اے مسلمانو! مقتولین کے بارے میں تم پر قصاص فرض ہوا ہے۔ قصاص
میں ہر انسان دوسرے انسان کے برابر ہے۔ آزاد آدمی نے قتل کیا
ہو تو آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے، غلام قاتل ہو تو وہ غلام ہی قتل کیا
جائے اور عورت اگر اس جرم کی مرتکب ہو تو عورت ہی سے قصاص
لیا جائے۔ ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کے بھائی کی جانب سے
کچھ نرمی کا برتاؤ ہو تو معروف طریقہ کے مطابق تابعداری کرنی چاہیے
اور قاتل کو لازم ہے کہ حسن کاری کے ساتھ اس کی ادائیگی کرے۔
اور دیکھو یہ تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے لیے تخفیف اور رحمت
ہے۔ اس پر بھی جو زیادتی کرے گا اس کے لیے دردناک سزا ہے

اور اے عقل والو تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے تاکہ تم برائیوں سے بچو۔

قانونِ فوجداری

اس سے پہلے آیت میں بتایا تھا کہ اجتماعی اور انفرادی زندگی میں ہدایت و مغفرت کی صحیح راہ کیا ہے۔ اور اس طرف بھی اشارہ کر دیا تھا کہ اس وقت اہلِ کتاب کی دُنیا اس سے بے بہرہ ہے اور بالتصریح یہ بات سنادی تھی کہ دین میں سچا اور متقی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ایمانیات، اعمال اور اخلاق سے موصوف ہونا چاہیے۔ اس کے بغیر کوئی نہ اپنے دعویٰ ایمان میں سچا ہے اور نہ گمراہی سے محفوظ ہے۔
چونکہ قرآن کے پیش کردہ ضابطہ نجات و سعادت پر نزولِ قرآن کے وقت کی دنیا پوری نہیں اترتی ہے اس لیے سب سے ہٹ کر خاص اہلِ ایمان کو مخاطب کیا ہے اور ہدایت و سعادت کی اُصولی باتیں بتانے اور تقویٰ کو مدارِ نجات و سعادت قرار دینے کے بعد زندگی میں تقویٰ کی بہم رسانی کے مختلف گوشے پیش فرماتے ہیں۔ ان گوشوں میں جانی اور مالی عبادات اور معاملات کی فوجداری اور دیوانی صورتیں شامل ہیں ان قانونی دفعات پر وہ ہی عمل پیرا ہو سکتا ہے جو ضابطہ ہدایت و مغفرت کو اپنا تا ہو۔ ان دفعات کا اصل مقصود تو اہلِ ایمان کی زندگی کے مختلف گوشوں میں رہنمائی ہے۔ مگر ضمناً کہیں صاف اور کہیں تعریضاً بیگانوں کی غلطیوں پر متنبہ کیا جائے گا مثلاً کتب علیکم القصاص میں اسی طرف اشارا ہے کہ یہود وغیرہ نے جو قصاص میں دستور بنا رکھا ہے یہ ان کی ایجاد بے بنیاد خلاف حکم الٰہی ہے جس سے صاف معلوم ہو گیا کہ اُصولِ سابقہ کے مطابق نہ ان کا کتاب اللہ پر ایمان دُرست ہے اور نہ انبیاء پر۔ نہ عہد خداوندی کے وہ وفادار ہیں اور نہ سختی اور مصیبت میں ان کو یارائے صبر ہے۔ نہ اپنے عزیز و اقارب کے مقتول ہو جانے پر اللہ کی کتاب اور سنتِ انبیاء کو چھوڑ کر بے گناہوں کے قتل کرنے میں ان کو دریغ ہے۔

۴۹۹۔ دعوتِ ایمانی کے پیروکاروں کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ جب تم اللہ سبحانہٗ پر ایمان رکھتے ہو تو زندگی کے گوناگوں معاملات میں اسی کے احکام پر کاربند رہو۔ ان احکامِ الٰہی میں ایک حکم قصاص ہے۔

قانونِ فوجداری اور قانونِ دیوانی کی اکثر دفعات کا نفاذ حکومت کے اسلامی ہونے پر موقوف ہے۔ یعنی اُمت میں ان قوانین کے نافذ کرنے کی باقاعدہ قدرت ہو۔ قرآن کا بلا قید یہ اندازِ خطاب بتا رہا ہے کہ مسلمانوں کا غیر اسلامی اقتدار کی آغوش میں رہنا اسلام کے نزدیک واقعات میں نوادر کا مفروضہ

میں بھی داخل نہیں۔ اسلام اپنے ماننے والوں سے محکومیت کی نہیں دنیوی سربلندی کی توقع رکھتا ہے اور اسے بطور ایک مسلمہ کے فرض کیے رہتا ہے کہ اُمت دنیوی اقتدار کی مالک ہے۔

۵۰۰ ۔ زمانہ جاہلیت میں یہود اور اہلِ عرب کا دستور یہ تھا کہ شریف النسب لوگوں کے غلام کے بدلے رذیل لوگوں کے آزاد کو اور عورت کے بدلے مرد کو اور ایک آزاد کے بدلے دو کو قصاص میں قتل کرتے تھے۔ اللہ سبحانہ نے اس آیت میں حکم دیا کہ اے ایمان والو ہم نے تم پر مقتولین کے بارے میں برابری اور مساوات کو فرض کر دیا ہے۔ قصاص کے معنے لغت میں برابری اور مساوات کے ہیں۔ تم نے جو یہ دستور نکالا ہے کہ شریف اور رذیل میں امتیاز کرتے ہو یہ لغو ہے۔ سب کی جانیں برابر ہیں۔ غریب ہو یا امیر، شریف ہو یا رذیل، عالم و فاضل ہو یا جاہل، جوان ہو یا بوڑھا، تندرست ہو یا بیمار، صحیح الاعضاء ہو یا لنگڑا اندھا۔[1]

قصاص صرف انتقام کے معنے میں نہیں ہے کہ ہر فرد دوسرے فرد سے لینا شروع کر دے۔ بلکہ قانونِ فوجداری کے تحت سزا کی منظم، مہذب، منضبط ترین شکل کا نام ہے۔ اُمت کا ایک قانونی و اجتماعی حق ہے۔ اس کے اجراء کی ذمہ داری حکومت یا اہلِ حل و عقد پر عائد ہوتی ہے۔ یہاں مومنین سے خطاب اجتماعی حیثیت سے ہے انفرادی حیثیت سے نہیں۔[2]

قصاص یعنی خون کا بدلہ، یہ کہ آدمی کے ساتھ وہی کچھ کیا جائے جو اس نے دوسرے آدمی کے ساتھ کیا۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قاتل نے جس طریقے سے مقتول کو قتل کیا ہو اسی طریقے سے اس کو قتل کیا جائے بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ جان لینے کا جو فعل اس نے مقتول کے ساتھ کیا ہے وہی اس کے ساتھ کیا جائے۔[3]

قتلی عربی میں قتیل کی جمع ہے قتل سے بنا ہے۔ فقہاء نے قتل کی اولاً تقسیم کی ہے اور تقسیم کے بعد ہر قسم کی علیحدہ تعریف کی ہے۔

قتل کی تین صورتیں ہیں۔ قتلِ عمد، قتلِ شبہ عمد، اور قتل خطاء

قتلِ عمد یہ ہے کہ کوئی کسی کو بالارادہ کسی آہنی سلاخ سے یا کسی اور حربے سے جس کے ذریعے گوشت پوست کٹ کر خون بہہ سکے قتل کرے۔ اس آیت میں اسی کی سزا بتائی گئی ہے۔ اس قتلِ عمد کے تین بنیادی رُکن ہیں۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۴۳ [2] ماجدی ص ۶۶ [3] تفہیم القرآن

ایک یہ کہ مقتول زندہ آدمی ہو
دوسرے یہ کہ قتل قاتل کے فعل کا نتیجہ ہو
تیسرے یہ کہ قاتل نے مارنے کا ارادہ کیا ہو۔

۵۰۱ ۔ آزاد آدمی نے قتل کیا ہو تو آزاد ہی سے بدلہ لیا جائے گا۔ یہ توضیح ہے اس برابری کی جس کا اعلان پہلے ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ ہر مرد آزاد کے قصاص میں صرف وہی ایک آزاد مرد قتل کیا جا سکتا ہے جو اس کا قاتل ہے۔ یہ نہیں کہ ایک کے بدلے کیف ما اتفق قاتل کے قبیلہ سے دو کو یا زیادہ کو قتل کر ڈالو۔ آیت میں آزاد کے مقابلے میں آزاد کا جو ذکر آیا ہے یہ اس خاص واقعہ کی بنا پر ہے جس میں یہ آیت نازل ہوئی۔

حافظ ابن کثیر نے باسناد ابن ابی حاتم یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ زمانہ اسلام سے پہلے دو عرب قبیلوں میں جنگ ہو گئی۔ دونوں طرف سے آزاد اور غلام مرد اور عورتیں قتل ہو گئے۔ ابھی ان کے معاملہ کا فیصلہ نہ ہونے پایا تھا کہ زمانہ اسلام شروع ہو گیا اور یہ دونوں قبیلے اسلام میں داخل ہو گئے۔ مسلمان ہو جانے کے بعد ان میں اپنے اپنے مقتولوں کا بدلہ لینے کی گفتگو شروع ہوئی۔ ایک قبیلہ جو قوت و شوکت میں زیادہ تھا۔ اس نے کہا کہ ہم اس وقت راضی نہ ہوں گے جب تک ہمارے غلام کے بدلے میں تمہارا آزاد آدمی اور عورت کے بدلے میں مرد کو قتل نہ کیا جائے[1]

قرآن نے ان کے اس رویہ کے جواب میں کہا کہ اگر آزاد آدمی نے آزاد آدمی کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلے میں وہی قتل کیا جائے گا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مقتول کی بڑائی یا نسل کے شرف کی وجہ سے دو آدمی قتل کیے جائیں جیسا کہ عرب جاہلیت میں دستور تھا۔

۵۰۲ ۔ غلام قاتل ہو تو غلام ہی کو قتل کیا جائے گا۔ یعنی ہر غلام کے بدلے میں وہی غلام قتل کیا جائے گا جو قاتل ہے۔ یہ نہ ہو گا کہ کسی شریف کے غلام کے قصاص میں قاتل کو جو غلام ہے اُسے چھوڑ کر ان رذیل لوگوں میں سے کہ جن کے غلام نے قتل کیا ہے کسی آزاد کو قتل کیا جائے۔

عورت کا بھی یہی حکم ہے کہ عورت اگر قاتل ہے تو قصاص میں عورت ہی قتل کی جائے گی۔ یعنی ہر ایک کے قصاص میں صرف وہی عورت قتل کی جائے گی جس نے اس کو قتل کیا۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ شریف النسب عورت کے قصاص میں رذیل عورت کو چھوڑ کر جو کہ قاتلہ ہے کسی مرد کو قتل کر دیں۔ غلام

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۴۴ [2] معارف القرآن ص ۳۸۰

یہ ہے کہ ہر آزاد دوسرے آزاد کے اور ہر غلام دوسرے کے برابر ہے، لہٰذا قصاص میں مساوات چاہیے اور تعدی جو اہلِ کتاب اور جہالِ عرب میں رائج ہے ممنوع ہے[1]۔

قصاص میں مساوات

مطلب یہ ہے کہ قصاص میں مساوات ملحوظ ہونی چاہیے۔ اور خون سب کا برابر ہے۔ یہ نہیں کہ اونچے شخص کی جان کی قیمت معمولی شخص کی جان سے زیادہ سمجھی جائے۔ عرب کے جاہلی دور میں ایک دستور یہ پڑ گیا تھا کہ آزادوں میں سے کوئی اگر کسی غلام کو مار ڈالتا تو قصاص میں اس آزاد کی جان لینے کے بجائے کسی غلام کی جان لی جاتی۔ دُنیا کی تاریخ دوسرے ملکوں میں بھی ایسی مثالوں سے خالی نہیں۔ اور امریکہ میں تو آج تک ایک گورے کا خون ایک کالے کے خون سے کہیں زیادہ قیمت رکھتا ہے۔ اور فرنگی حکومتیں اپنے ایک مقتول کے عوض قاتل قوم کے کئی کئی شخصوں کی جانیں بے تکلف لیتی رہتی ہیں۔ یہاں اُن فقہا کو داد دینی پڑتی ہے جنہوں نے آیتِ قرآنی کی رُوح سمجھ کر آیت کی تفسیر میں صاف لکھ دیا ہے المساواۃ بینھم یعنی ہر حال میں قصاص میں برابری کو پیشِ نظر رکھا جائے۔

اسلام نے ان ظالمانہ دستوروں کو یکسر مٹا دیا اور اعلان کر دیا کہ زندگی ہر انسان کی، اُمت کے ہر فرد کی یکساں قابلِ احترام ہے۔ مرد ہو یا عورت، آزاد ہو یا غلام جس کا جو قاتل ہوگا سزا پائے گا[2]۔

اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں لوگوں کا طریقہ یہ تھا کہ ایک قوم یا قبیلے کے لوگ اپنے مقتول کے خون کو جتنا قیمتی سمجھتے تھے، اتنی ہی قیمت کا خون اس خاندان یا قبیلے یا قوم سے لینا چاہتے تھے جس کے آدمی نے اُسے مارا ہو۔ محض مقتول کے بدلے میں قاتل کی جان لینے سے ان کا دل ٹھنڈا نہ ہوتا تھا وہ ایک آدمی کا بدلہ بیسیوں اور سینکڑوں سے لینا چاہتے تھے۔ ان کا کوئی معزز آدمی اگر دوسرے گروہ کے کسی چھوٹے کے ہاتھوں مارا گیا ہو تو وہ اصلی قاتل کے قتل کو کافی نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کی خواہش یہ ہوتی تھی کہ قاتل کے قبیلے کا بھی کوئی ویسا ہی معزز آدمی مارا جائے یا اس کے کئی اُن کے مقتول پر سے صدقے کیے جائیں۔ اس کے برعکس اگر مقتول ان کی نگاہ میں کوئی ادنیٰ درجہ کا شخص اور قاتل کوئی زیادہ قدر و عزت رکھنے والا ہوتا تو وہ اس بات کو گوارا نہ کرتے تھے کہ مقتول کے قاتل کی جان لی جائے۔ اور یہ حالت کچھ قدیم جاہلیت میں نہ تھی۔ موجودہ زمانے میں جن قوموں کو انتہائی مہذب سمجھا جاتا ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۴۳ [2] تفسیر ماجدی ص ۶۶

ان کے باقاعدہ سرکاری اعلان تک میں یہ بات بغیر کسی شرم کے دُنیا کو سنائی جاتی ہے کہ ہمارا ایک آدمی مارا جائے گا تو ہم قاتل کی قوم کے پچاس آدمیوں کی جان لیں گے۔ اکثر یہ خبریں ہم سنتے ہیں کہ ایک شخص کے قتل پر مغلوب قوم کے اتنے یرغمال گولی سے اڑائے گئے۔ ایک مہذب قوم نے اسی بیسویں صدی میں اپنے ایک فرد کے قتل کا بدلہ پوری مصری قوم سے لے کر چھوڑا۔ دوسری طرف ان نام نہاد مہذب قوموں کی باضابطہ عدالتوں تک کا یہ طرزِ عمل رہا ہے کہ اگر قاتل حاکم قوم کا فرد ہو اور مقتول کا تعلق محکوم قوم سے ہو تو ان کے جج فیصلہ کرنے سے گریز کرتے ہیں۔ یہی خرابیاں ہیں جن کے سدباب کا حکم اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دیا ہے وہ فرماتا ہے کہ مقتول کے بدلے میں صرف قاتل ہی کی جان لی جائے قطع نظر اس سے کہ قاتل کون ہے اور مقتول کون [1]

آیت کا مفہوم مخالف

آیت کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جس نے قتل کیا ہے وہی قصاص میں قتل کیا جائے عورت ہو یا غلام، قاتل عورت اور غلام کی جگہ بے گناہ مرد یا آزاد کو قتل کرنا جائز نہیں ہے ایسے ہی قاتل مرد اور آزاد کی جگہ عورت اور غلام کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ آیت کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ عورت کو اگر کوئی مرد قتل کردے یا غلام کو اگر کوئی آزاد قتل کردے تو اس سے قصاص نہ لیا جائے گا قرآن کی اسی آیت کے آغاز میں القصاص فی القتلی اس کی واضح دلیل ہے [2]

آزاد کسی غلام کو مرد کسی عورت کو اگر قتل کردے تو قصاص لیا جائے گا یا نہیں۔ یہ آیت کریمہ اس معاملہ میں خاموش ہے۔ اسی بنا پر اس موضوع پر ائمہ قانون کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ ان النفس بالنفس اور حدیث المسلمون تتکافوء دماءھم خون سارے مسلمانوں کے برابر ہیں کی وجہ قصاص کے قائل ہیں کہ دونوں صورتوں یعنی مرد اگر عورت کو قتل کردے اور آقا غلام کو قتل کردے میں قصاص لیا جائے گا اور جیسے قوی اور ضعیف، صحیح اور مریض، معذور اور غیر معذور حکم قصاص میں یکساں ہیں ایسے ہی آزاد اور غلام مرد اور عورت کو امام ابوحنیفہ قصاص میں برابر فرماتے ہیں بشرطیکہ غلام مقتول قاتل کا غلام نہ ہو کہ وہ حکم قصاص سے ان کے نزدیک مستثنیٰ ہے اور کوئی مسلمان کافر کو قتل کر ڈالے تو اس پر بھی قصاص ہے بشرطیکہ کافر حربی نہ ہو۔ مسلمان اور کافر حربی میں کوئی قصاص

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۲۸　[2] معارف القرآن مفتی ص ۳۸۰

نہیں ہے[1]

۱۔ اس پر پوری اُمت کا اتفاق ہے کہ اگر مرد عورت کو قتل کر دے تو مرد سے قصاص لیا جائے گا۔ زمانہ نبوت سے اس پر عمل ہے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ آزاد اگر غلام کو قتل کر دے تو اس سے قصاص لیا جائے یا نہیں۔ امام ابو حنیفہ، ابن ابی لیلیٰ اور داؤد ظاہری کہتے ہیں کہ آزاد سے قصاص لیا جائے گا بشرطیکہ آزاد غلام کا آقا نہ ہو۔ اور دوسرے ائمہ مالک، شافعی اور احمد کہتے ہیں کہ آزاد سے غلام کا قصاص نہ لیا جائے گا

امام ابو حنیفہ قرآن کی آیات کے عموم سے استدلال کرتے ہیں۔ اس آیت میں بلا قید مقتولین میں قصاص فرض کیا گیا ہے۔ دوسری آیات میں بلا قید اعتداء اور معاقبہ پیش کیا گیا ہے مثلاً

فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی

جو بھی تم پر زیادتی کرے تم بھی ایسے ہی زیادتی کرو جیسے اس نے کی۔

اور

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ

اور سختی کے جواب میں سختی کرو جیسی تم پر سختی کی گئی ہے

یہ آیات اپنے عموم کے لحاظ سے آزاد، غلام، مرد، عورت سب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہیں۔ اور جو لوگ آزاد اور غلام کے درمیان قصاص کو نہیں مانتے وہ یہ مانتے ہیں کہ اگر غلام آزاد کو قتل کر دے تو اس سے قصاص لیا جائے گا لیکن یہ نہیں مانتے کہ اگر آزاد غلام کو قتل کر دے تو قصاص لیا جائے گا۔

۲۔ ابو حنیفہ، ابو یوسف، محمد، زفر اور ابن ابی لیلیٰ قصاص میں برابری کی شرح کو صرف مسلمانوں تک ہی محدود نہیں کرتے بلکہ وہ اس کو مسلم و کافر دونوں کے لیے یکساں قرار دیتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان اگر کسی کافر کو قتل کر دے تو اس سے بھی اسی آیت کی رُو سے قصاص لیا جائے گا بشرطیکہ کافر حربی نہ ہو۔ دوسرے ائمہ امام شافعی، اوزاعی، ثوری کا کہنا ہے کہ مسلمان سے قصاص نہ لیا جائے گا۔

۳۔ شوہر اگر بیوی کو قتل کر دے اور بیوی اگر شوہر کو قتل کر دے تو آیت کے عموم کی وجہ سے قصاص لیا جائے گا۔ لیث بن سعد اور زہری کو چھوڑ کر تمام فقہاء اور اسلام کے قانون دان طبقہ کا یہی خیال ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ان دونوں میں برابری ہے لہذا دونوں سے قصاص لیا جائے گا۔

موانع قصاص

۱۔ اگر مقتول قاتل کا جزء ہو مثلاً والد نے بیٹے کو قتل کر دیا تو باپ سے قصاص نہ لیا جائے گا۔ امام مالک

[1] افادات شیخ الہند ص ۴۳

کے سوا ائمہ ثلاثہ کا یہی خیال ہے۔ والد کے ساتھ دادا، پردادا کا بھی یہی حکم ہے اور باپ کے ساتھ ماں اور دادی کا یہی حکم ہے۔ حتیٰ کہ کافر باپ بھی اگر اپنے مسلمان لڑکے کو اور غلام اپنے آزاد بیٹے کو قتل کر دے تو اس کا بھی یہی حکم ہے۔

۲۔ آقا اپنے غلام کو قتل کر دے تو ملک کی وجہ سے آقا کو قتل نہ کیا جائے گا

۳۔ مقتول کے ورثا میں سے اگر ایک شخص بھی اپنے قصاص کا حق معاف کر دے تو سب کے قصاص کا حق ساقط ہو جائے گا کیونکہ قتل کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ مثلاً مقتول کے چار لڑکے ہوں ایک ان میں سے قصاص کو معاف کر دے تو باقی تین کا حق ساقط ہو جائے گا اور وہ قاتل کے قتل کا مطالبہ نہ کر سکیں گے۔

قصاص کے موضوع پر یہ باتیں بھی یاد رکھنی چاہئیں۔

۱۔ اسلامی قانون میں کسی مقتول کے قصاص کا حق اس کے ورثا کا ہے، حکومت پر صرف اس حق کو نافذ کرنے کی ذمہ داری ہے۔ اگر مقتول کے ورثاء قاتل کو معاف کر دیں تو حکومت کو بدلہ لینے کا کوئی حق نہیں ہے۔ انصاف کا تقاضا بھی یہی ہے کہ کسی شخص کے مرنے کا اثر جس جماعت پر اور جس سوسائٹی پر پڑتا ہے اس کو ہی یہ حق ہونا چاہیے کہ چاہے وہ انتقام لے یا معاف کر دے۔ ہاں حکومت وہاں خود مدعی ہو سکتی ہے جہاں مقتول کا کوئی وارث نہ ہو اور مقتول کی جانب سے کوئی مدعی نہ ہو۔ موجودہ دور میں یہ دستور نہیں ہے اور یہ کہا جا سکتا ہے کہ یہ رائج الوقت قانون اسلامی قانون کے خلاف ہے کیونکہ مروجہ قانون میں حکومت خود مدعی ہوتی ہے۔

۲۔ جب قانونِ اسلامی میں قصاص اولیائے مقتول کا حق ہے تو وہ اس معاملہ کو از روئے قرآن تین طریقوں سے نمٹانے کا حق رکھتے ہیں۔ فوجداری، دیوانی اور اخلاقی۔ ۱

فوجداری یہ کہ قصاص لے لیں یعنی جان کے بدلے جان

دیوانی یہ کہ جان کے بدلے مال لے لیں

اخلاقی یہ کہ نہ جان لیں نہ مال لیں بلکہ مجرم کو معاف کر دیں جس طرح چاہیں اولیائے مقتول فیصلہ کر سکتے ہیں اور عدالت کو فریقین کا فیصلہ تسلیم کرنا ہوگا۔

قانونِ دیوانی

۵۰۳۔ ہاں اگر کسی قاتل کے ساتھ اس کے بھائی کی جانب سے۔ یعنی مقتول کے وارثوں سے اگر بعض بھی خون کو معاف کر دیں تو اب قاتل کو قصاص میں قتل نہیں کر سکتے بلکہ یہ دیکھا جائے گا کہ اس

نے معاف کس طرح کیا ہے۔ بلامعاوضہ مال محض ثواب کی غرض سے کیا ہے یا دیت شرعی اور بطور مصلحت کسی مقدار مال پر راضی ہو کر صرف قصاص سے دست برداری کی ہے۔ اوّل صورت میں قاتل ان وارثوں کے مطالبہ سے بالکل سبکدوش ہو جائے گا اور دوسری صورت میں قاتل کو چاہیے کہ وہ معاوضہ اچھی طرح ممنونیت اور خوشدلی کے ساتھ ادا کرے[1]

جس کو معاف کر دیا گیا اس سے مراد قاتل ہے من اخیہ اس کے بھائی کی جانب سے، یعنی مقتول کے فریق کی جانب سے مدعی یا مستغیث کی طرف سے لفظ اخیہ کی بلیغانہ معنویت اس موقعہ پر سر دھننے کے قابل ہے۔ شدید ہیجانِ جذبات انتقام واشتعال پذیری کی جگہ قتل سے بڑھ کر اور کون سی ہو سکتی ہے۔ اس انتہائی موقعہ پر یہ لفظ لا کر بتا دیا کہ قاتل باوجود اس قدر سنگین جرم کے کافر نہیں ہوا۔ اخوت اسلامی کے دائرے سے خارج نہیں ہوا۔ مقتول کا ولی وارث قاتل کا دینی بھائی اس وقت بھی ہے گویا اس میں اشارا ہے کہ گناہ خواہ کیسا ہی سنگین ہو مگر گنہ گار کافر نہیں ہوتا۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس عنوان کے تحت کہ المعاصی من الکبائر لا یکفر صاحبہا الا بالشرک، خواہ گناہ کتنے بڑے ہوں گنہ گار کو کافر نہیں بناتے ہاں شرک کے ذریعہ ایک مسلمان کافر ہو جاتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ انسان کی فطرت بہت کمزور ہے وہ گناہ کی طرف رغبت کر سکتی ہے۔ اس میلان سے اللہ پاک نے اس کو معذور ہی مانا ہے اور یہ حکم دیا ہے کہ وہ اپنی اس کمزوری کی توبہ و استغفار کے ذریعے تلافی کرے لیکن شرک کی طرف میلان انسان کی فطرت نہیں ہے۔ یہ خلافِ فطرت ہے اس میں کوئی شخص بھی اللہ کے یہاں معذور نہیں ہے۔ یہ اپنے خالق سے کھلی مخالفت اور اعلانِ بغاوت ہے۔ اس لیے اس کے بعد اس کا شمار دشمنوں میں ہوتا ہے۔ یہ کمزوری نہیں کہ اسے نباہ لیا جائے بلکہ سرکشی و بغاوت ہے۔

اور آیت میں بھائی کہہ کر نہایت لطیف طریقے سے نرمی کی سفارش بھی کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے اور دوسرے شخص کے درمیان باپ مارے کا بیر ہی سہی مگر ہے تو وہ تمہارا انسانی بھائی لہٰذا اگر اپنے خطاکار بھائی کے مقابلے میں انتقام کے غصے کو پی جاؤ تو یہ تمہاری انسانیت کے زیادہ شایانِ شان ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلامی قانونِ تعزیرات میں قتل تک کا معاملہ قابلِ راضی نامہ ہے۔ مقتول کے وارثوں کو یہ حق پہنچتا ہے کہ قاتل کو معاف کر دیں اور اس صورت میں عدالت کے لیے جائز نہیں ہے کہ قاتل کی جان ہی لینے پر اصرار کرے[2]

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۲۵　[2] تفہیم القرآن ص ۱۳۸

۵۰۴۔ کچھ نرمی کا برتاؤ ہو۔ اصل ارشاد میں شئی آیا ہے یعنی سزائے واجب کا کچھ حصہ چھوڑ دیا جائے یا تمام سزا معاف کر دیا جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ مقتول کے وارث اگر قاتل کو سزائے قتل نہ دینا چاہیں بلکہ اسے کوئی ہلکی اور معمولی سزا لے کر یا خون بہا کی پوری رقم میں سے کچھ حصہ اسے معاف کرکے چھوڑ دینے پر آمادہ ہوں ان کو ایسا کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔

رومیوں کی مشرک قوم میں قتل تمام تر ایک جرم قانونِ فوجداری تھا۔ قانونِ دیوانی سے اس کا کوئی تعلق نہ تھا۔ موجودہ فرنگی قانون چونکہ تمام تر رومیوں کے قانون رومن لاء پر مبنی ہے اس لیے اس میں بھی قتل محض ایک فوجداری جرم ہے۔ قرآن کی نظر فطرتِ بشری کی گہرائیوں اور مصالح اجتماعی کی باریکیوں پر ہے۔ اس نے اپنے اصولِ قانون میں یہ بات رکھی کہ قتل جس طرح فوجداری جرم ہے دیوانی بھی اور اخلاقی بھی۔ فوجداری اس لیے کہ اجتماعی زندگی میں ایک فرد کی جان تلف ہوگئی۔ دیوانی اس لیے کہ تلف ہونے والے کی ذات سے جو مادی منفعتیں اہلِ قرابت کی وابستہ تھیں خطرے میں پڑ گئیں۔ اور اخلاقی اس لیے کہ ایک برائی وجود میں آئی اور اس سے دامانِ اخلاق تار تار ہوا۔ اس لیے اس جرم سے محض اسٹیٹ حکومت اور سوسائٹی ہیئتِ اجتماعیہ ہی کے ایک قانون کی خلاف ورزی نہیں ہوتی بلکہ یہ فرد پر بھی اس کی شخصی حیثیت میں حملہ ہے گویا یہ جرم ایک پبلک حیثیت رکھتا ہے اور ایک پرائیویٹ اور جب اس کی یہ دوگونہ حیثیت ہے تو مقتول کے وارثوں اور خون کے مدعیوں کو یہ اختیار ہونا چاہیے کہ وہ چاہیں تو مجرم کو پوری سزا حکومت سے دلوائیں اور چاہیں تو خود مالی معاوضہ لے کر انتہائی سزا سے دستبردار ہو جائیں۔ اسی مالی معاوضہ کو اصطلاحِ شریعت میں دیت کہتے ہیں۔ دیت کا ذکر قرآن میں پانچویں پارہ میں آرہا ہے [1]

اور اگر قتلِ عمد میں قاتل کو پوری معافی دے دی جائے۔ مثلاً مقتول کے دو بیٹے ہیں اور ان دونوں نے اپنا حق معاف کر دیا تو قاتل پر کوئی مطالبہ نہ رہے گا۔ اگر دونوں بیٹوں میں سے ایک نے معاف کر دیا دوسرے نے معاف نہیں تو سزائے قتل سے تو قاتل بری ہو گیا لیکن معاف نہ کرنے والے کو آدھی دیت دلائی جائے گی۔

دیت کی مقدار اور اس کی ادائیگی

اسلامی قانون میں دیت سو اونٹ یا ہزار دینار یا دس ہزار درہم ہے اور درہم آج کے حساب کے

[1] تفسیر ماجدی ص ۶۰

اعتبار سے تقریباً ساڑھے تین ماشے کا ہوتا ہے تو پوری دیت ۲۹۱۶ تولے ۸ ماشے چاندی ہوگی یعنی ۳۶ سیر ۶ ۳ تولے ۸ ماشے جس کی قیمت مروجہ کرنسی میں ۵۰۰ ۴۸ ۵ روپے ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ کے نظریہ کے مطابق ہے[1]

جب کبھی اونٹوں پر یا دینار و درہم پر فریقین کی صلح ہو تو شریعت نے جو مقدار مقرر کی ہے وہی لینی ہوگی اس سے زیادہ لینے کا حق نہ ہوگا۔ ہاں کم ہو جائے تو مضائقہ نہیں ہے مثلاً مدعی پچاس اونٹوں پر صلح کرے۔ اور اگر صلح کسی اور سامان اور اشیا پر ہو جائے تو پھر گنجائش ہے چاہے وہ مال جس پر صلح ہوئی ہو وہ ہزار دینار سے زائد کا ہو تب بھی لینا جائز ہوگا بلکہ صلح ہو جانے کے بعد اگر اولیائے مقتول چاہیں تو اس سامان کے بدلے میں نقد روپیہ لے لیں یہ بھی جائز ہے۔ اگر کسی سامان پر صلح ہو جانے کے بعد نقد روپیہ کی مقدار اگر شرعی مقررہ مقدار سے بڑھ جائے تب بھی لے لینا جائز ہے مثلاً فریقین نے غلام پر صلح کر لی۔ صلح کے بعد یہ طے ہوا کہ بجائے غلام کے اس کی قیمت دے دو اور وہ قیمت ہزار دینار یا دس ہزار درہم سے زیادہ ہوتی ہے پھر بھی اس قیمت کا لینا جائز ہوگا[2]

۵۰۵ ۔ تو معروف طریقہ کے مطابق تابعداری کرنی چاہیے اور قاتل کو چاہیے کہ حسن کاری کے ساتھ اس کی ادائیگی کرے یعنی مقتول کے وارثوں میں اگر بعض بھی خون کو معاف کر دیں تو قاتل کو قصاص میں تو قتل نہیں کر سکتے، ہاں یہ دیکھا جائے گا کہ وارثوں نے معاف کس طرح کیا ہے محض ثواب کی خاطر کیا ہے یا دیت شرعی اور بطور مصلحت کسی مقدار مال پر راضی ہو کر کیا ہے۔ پہلی صورت میں قاتل وارثوں کے مطالبہ سے بالکل سبکدوش ہو جائے گا اور دوسری صورت میں قاتل کو چاہیے کہ وہ معاوضہ اچھی طرح ممنونیت اور خوشدلی سے ادا کرے[3]

مطلب یہ ہے کہ مقتول کے وارثوں کو مال کا مطالبہ معقول، نرم طریقے پر کرنا چاہیے اور قاتل کو اس کی ادائیگی خوبصورتی، حسن کاری اور خوش اسلوبی سے کرنی چاہیے۔ معروف کا لفظ قرآن میں بکثرت آیا ہے۔ اس سے مراد وہ صحیح طریق کار ہے جس سے بالعموم انسان واقف ہوتے ہیں جس کے متعلق ہر وہ شخص جس کا کوئی ذاتی مفاد کسی خاص پہلو سے وابستہ نہ ہو یہ بول اٹھے کہ بے شک حق و انصاف یہی ہے اور یہی مناسب طریق عمل ہے۔ رواج عام کو بھی اسلامی اصطلاح میں عرف اور معروف کہا جاتا ہے وہ ایسے تمام معاملات میں معتبر ہے جن کے بارے میں اسلامی قانون نے

---

[1] معارف القرآن مفتی ص ۳۸۱ [2] کشف الرحمان [3] افادات شیخ الہند ص ۳۵

کوئی خاص ضابطہ مقرر نہ کیا ہو[1]

گویا اس فقرے میں قاتل اور مقتول کے وارثوں کو تاکید ہو رہی ہے کہ قاتل کو چاہیے کہ جتنی رقم کی قرار داد ہو چکی ہو اسے بغیر مزید طوالت یا پیچیدگی و بدمزگی کے فریق مقتول تک خوبصورتی سے پہنچا دیں۔

۵۰۶ - اور دیکھو یہ تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے لیے آسانی اور رحمت ہے۔ یعنی اجازت ہے کہ قتلِ عمد میں چاہو تم قصاص لے لو چاہو خون بہا لے لو اور چاہے معاف کر دو۔ اللہ کی جانب سے سہولت اور مہربانی ہے۔ قاتل اور وارثانِ مقتول دونوں کے لیے جو تم سے پہلے لوگوں پر نہ ہوئی تھی کہ یہود پر خاص قصاص اور عیسائیوں پر دیت یا عفو مقرر تھا[2]

ایک طرف قصاص کی بظاہر سختی دوسری طرف دیت اور عفو کی نرمی یہ حسنِ امتزاج اور اعتدال و توازن کا یہ مکمل توام اسی قانون کا حصہ ہو سکتا ہے جو بشری دماغ سے نہیں حکمتِ مطلق سے نکلا ہے[3]

عام مفسرین کا خیال یہی ہے کہ قصاص یہودیوں میں اور عفو عیسائیوں میں تھا جیسا کہ قرطبی اور آلوسی نے بتایا ہے اور قرآن نے ان دونوں کے درمیان اعتدال کی راہ اختیار کی کہ قتل کے معاملہ کو فوجداری، دیوانی، اور اخلاقی طور پر حل کیا لیکن اگر ہم منظر میں ذرا وسعت پیدا کر لیں اور قتل کے موضوع پر قانون ساز دنیا کا مطالعہ کریں تو قرآن کا پیش کردہ قانون صرف یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان راہِ اعتدال نہیں بلکہ قانون کی پوری تاریخ میں نقطۂ اعتدال نظر آئے گا۔

۵۰۷ - اس پر بھی جو زیادتی کرے گا اس کے لیے دردناک سزا ہے۔ یعنی اس تخفیف و رحمت کے باوجود بھی اگر کوئی خلاف ورزی کرے گا اور دستورِ جاہلیت پر چلے گا یا معافی اور دیت قبول کر لینے کے بعد بھی قاتل کو قتل کرے گا تو اس کے لیے سخت عذاب ہے[4]

مثلاً یہ کہ مقتول کا وارث خون بہا لینے کے بعد پھر انتقام لینے کی کوشش کرے یا قاتل خون بہا ادا کرنے میں ٹال مٹول کرے اور مقتول کے وارث نے جو احسان اس کے ساتھ کیا ہے اس کا بدلہ احسان فراموشی سے دے۔ زیادتی کی اور بھی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں مثلاً کسی بے گناہ پر قتل کا جھوٹا دعویٰ کر دیا۔ اور یا یہ کہ پہلے قاتل کو معاف کر دیا اور پھر معافی کے بعد پورا قصاص لینے کے درپے ہو گیا۔ ایسے بے دردوں اور خدا ناترسوں کو صرف خوفِ آخرت ہی

[1] تفہیم القرآن ص ۱۳۹ [2] افاداتِ شیخ الہند ص ۲۵ [3] ماجدی ص ۶۷ [4] افاداتِ شیخ الہند ص ۲۵

بے جا جسارتوں سے روک سکتا ہے۔

۱۰۸۔ اور اے عقل والو تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ یعنی حکم قصاص بظاہر نظر اگرچہ بھاری معلوم ہوتا ہے لیکن عقل مند سمجھ سکتے ہیں کہ یہ حکم بہت بڑی زندگانی کا سبب ہے کیونکہ قصاص کے خوف سے ہر کوئی کسی کو قتل کرنے سے رکے گا تو دونوں کی جان محفوظ رہے گی اور قصاص کے سبب قاتل و مقتول دونوں کی جماعتیں بھی قتل سے محفوظ اور مطمئن رہیں گی۔ عرب میں ایسا ہوتا تھا کہ قاتل اور غیر قاتل کا لحاظ نہیں کرتے تھے جو ہاتھ آجاتا مقتول کے وارث اُسے قتل کر ڈالتے اور فریقین میں اس کے باعث ایک خون کی وجہ سے ہزاروں جانیں ضائع ہونے کی نوبت آتی تھی۔ جب خاص قاتل ہی سے قصاص لیا گیا تو یہ تمام جانیں بچ گئیں اور یہ معنے بھی ہو سکتے ہیں کہ قصاص قاتل کے حق میں باعث حیات اخروی ہے[1]

دراصل اس آیت میں ایک دوسری جاہلیت کی تردید کی جا رہی ہے جو پہلے بھی بہت سے دماغوں میں موجود تھی اور آج بھی بکثرت پائی جاتی ہے۔ جس طرح اہل جاہلیت کا ایک گروہ انتقام کے پہلو میں افراط کی طرف چلا گیا۔ اسی طرح ایک دوسرا گروہ عفو کے پہلو میں تفریط کی طرف چلا گیا اور اس نے سزائے موت کے خلاف اتنی تبلیغ کی ہے کہ بہت سے لوگ اس کو ایک نفرت انگیز چیز سمجھنے لگے ہیں اور دنیا کے متعدد ملکوں نے اسے بالکل منسوخ کر دیا ہے۔ قرآن اسی پر اہل عقل کو مخاطب کر کے کہتا ہے کہ قصاص میں سوسائٹی کی زندگی ہے جو سوسائٹی انسانی جان کا احترام نہ کرنے والوں کی جان کو محترم ٹھہراتی ہے۔ وہ دراصل اپنی آستین میں سانپ پالتی ہے۔ تم ایک قاتل کی جان بچا کر بہت سے بے گناہ انسانوں کی جانیں خطرے میں ڈالتے ہو۔

اعجازِ قرآنی کا حیرت انگیز نمونہ

فی القصاص حیاۃ قصاص میں زندگی ہے۔ اس جملہ کی جامعیت پر عقل انسانی دنگ رہ جاتی ہے۔ اس قدر اختصار اور پھر بے شمار معانی سے مالا مال ہونے کی وجہ سے بلاغت کا شاہکار ہے۔ یہ فقرہ ان تمام تعبیرات سے بہتر اور عمدہ ہے جو اہل کتاب کے یہاں اس مفہوم کی ادائیگی کے لیے مشہور ہیں۔ مثلاً کہتے ہیں:

قتل البعض احیاء للجمیع
کچھ کو مار ڈالنا سب کی زندگی کا سامان ہے۔

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۵

اور یہ کہ

اکثروا القتل لیقل القتل

زیادہ قتل کرو تاکہ قتل کم ہو جائے

اور یہ کہ

القتل انفی للقتل

قتل سے قتل دور ہوتا ہے

لیکن قرآن کا یہ بلیغ فقرہ

فی القصاص حیاۃ

قصاص میں زندگی ہے

پہلے فقروں کے مقابلے امام رازی کی رائے کے مطابق چھ وجہ سے زیادہ فصیح ہے۔

۱۔ قرآنی فقرہ ان سب فقروں سے زیادہ مختصر ہے

۲۔ انسانی کلام القتل انفی للقتل بظاہر یہ چاہتا ہے کہ ایک چیز خود ہی اپنی نفی کرے اور یہ کلام میں عیب ہے اس کے برعکس الفاظِ قرآنی پکار کر کہہ رہے ہیں کہ قتل کی نوع جسے قصاص کہتے ہیں حیات کی ایک نوع کا سبب ہے۔

۳۔ انسانی کلام میں لفظ قتل کا تکرار ہے برخلاف کلامِ الٰہی کے کہ یہ تکرار سے پاک ہے۔

۴۔ انسانی کلام قتل سے روکنے کے علاوہ اور کسی معنے کا فائدہ نہیں دیتا اس کے برعکس الفاظِ قرآن قتل اور زخمی کرنے سے روکنے کا فائدہ دے رہا ہے۔

۵۔ انسانی کلام میں قتل کو ایک دوسری حکمت کا تابع بنا کر اسے مطلوب اور مقصود بتایا گیا ہے اس کے برعکس الفاظ قرآنی میں بلاغت اس لیے زیادہ ہے کہ وہ قتل کا نتیجہ زندگی کو قرار دیتا ہے جو مقصود اصلی ہے۔

۶۔ ظلماً قتل کرنا بھی قتل کی ایک قسم ہے مگر یہ قتل کو روکنے والی نہیں اور انسانی کلام میں قتل کی کوئی تفصیل نہیں بتائی گئی کہ کون سا مفید ہے اور کون سا مضر۔ قرآن نے قتل کی جگہ قصاص کا لفظ استعمال فرما کر یہ تعیین بھی کر دی کہ قصاص ہر صورت مفید ہی مفید ہے لہٰذا انسانی کلام بظاہر غلط اور قرآنی الفاظ ظاہری و باطنی طور پر فصیح ہے[1]

---

[1] اظہار الحق ج ۲ ص ۳۶۸

علامہ آلوسی نے ان ہی وجوہ کو اختصار سے بیان کرنے کے بعد کچھ اور اضافہ بھی فرمایا ہے۔

۱۔ القتل انفی للقتل انسانی کلام میں حروف کی تعداد زیادہ ہے۔ جبکہ فی القصاص حیاۃ میں تعداد حروف کم ہے۔

۲۔ کلامِ الٰہی میں شانِ کلیت ہے کیونکہ ہر قصاص میں حیاۃ کا سامان ہے برخلاف انسانی کلام کے کہ اس کی یہ شان نہیں کیونکہ ہر قتل قتل کو دُور نہیں کرتا۔ ظالمانہ قتل وخونریزی سے قتل کو اور زیادہ فروغ ملتا ہے۔

۳۔ کلامِ الٰہی فی القصاص حیاۃ میں تنوین تنویع یا تعظیم کے لیے ہے اور مطلب یہ ہے کہ قصاص میں عظیم زندگی ہے یا ایک خاص قسم کی زندگی ہے انسانی کلام اس خوبی سے خالی ہے۔

۴۔ کلامِ الٰہی میں فی القصاص حیاۃ میں علم بدیع کی ایک صنعت ہے جسے صنعتِ طباق کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک فقرہ میں دو یا دو سے زیادہ متضاد چیزوں کو جمع کر دیا جائے۔ اس فقرے فی القصاص حیاۃ میں بھی قصاص اور زندگی کو یکجا کر کے ایک حسین مطابقت پیدا کی گئی ہے۔

۵۔ قرآنی فقرہ مقصودِ اصلی کی نشاندہی کر رہا ہے یعنی زندگی۔ جب کہ نفی قتل اس مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔

۶۔ اس میں مضمون کی ندرت پائی جاتی ہے کیونکہ قتل جو حیات کو فنا کر دیتا ہے اسی کو خود قرآنی آیت میں حیات کا ظرف بنایا گیا ہے۔

۷۔ قرآنی فقرہ تکرار کے بدنما دھبے سے پاک ہے۔

۸۔ قرآنی فقرے میں الفاظ کی شیرینی اور سلاست ہے۔

۹۔ قرآنی فقرے میں کسی حیثیت اور اعتبار کی قید کی ضرورت نہیں جبکہ انسانی کلام کا مطلب حیثیت کو ملحوظ رکھے بغیر چست نہیں ہوتا۔

۱۰۔ فی القصاص حیاۃ کے فقرے میں لام جنس لایا گیا ہے جو مارنا، زخمی کرنا اور مار ڈالنا سب کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔

۱۱۔ قرآنی فقرہ تقابل بتلانے والے لفظ سے خالی ہے جس سے یہ وہم ہو سکے کہ قصاص کو چھوڑ دینا ہی قتل کو ختم کرنا ہے۔

۱۲۔ قرآنی فقرہ تنافی کی منافیت کار کے ذریعہ پر مشتمل ہے۔

۱۳۔ قرآنی فقرہ اس سے خالی ہے کہ ایک ہی چیز خود اپنی نفی کا سبب بن جائے۔ سبحان من علت کلمتہ و بھرت آیتہ [1]

---

[1] روح المعانی ج ۲ ص

۵۰۹۔ تاکہ تم برائیوں سے بچ جاؤ یعنی تاکہ تم بچتے رہو قصاص کے اندیشہ سے کسی کو قتل کرنے سے یا بچو قصاص کے سبب عذاب آخرت سے یا اس لیے کہ تم کو قصاص کی حکمت معلوم ہو گئی ہے تو اس کی محافظت یعنی ترک قصاص سے بچتے رہو۔[1]

حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں یعنی حاکموں کو چاہیے کہ قصاص دلانے میں قصور نہ کریں تاکہ آئندہ خون بند ہو (موضح القرآن)

جیسا کہ ہم آغاز میں بتا آئے کہ اس سورت کا موضوع اجتماعی تقویٰ ہے، پہلی آیت میں تقویٰ والوں کا نہ صرف عام حلیہ بلکہ ایک ایک خط و خال نمایاں کر دیا ہے اور بتا دیا کہ خدا کی نگاہ میں یہی متقی سوسائٹی اور سچے ہیں۔ اب یہاں سے اجتماعی زندگی میں تقویٰ پیدا کرنے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے چنانچہ حکم قصاص بیان فرمانے کے بعد فرمایا ہے کہ لعلکم تتقون۔ السیوطی نے اسے قصاص کی مشروعیت کی علت بتایا ہے۔ صرف قصاص ہی پر منحصر نہیں ہے بلکہ اسلام کے سارے عابدانہ اعمال کا منشا اجتماعی تقویٰ کا حصول ہے۔ چنانچہ آغاز ہی میں اس کی تصریح کر دی گئی ہے۔

یا ایھا الناس اعبدوا ربکم الذی خلقکم والذین من قبلکم لعلکم تتقون

اے لوگو! تم اپنے اس پروردگار کی عبادت کرو جس نے تم کو اور تم سے پہلوں کو پیدا کیا تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ روزے کا بھی یہی مقصد ہے، حج کا بھی یہی منشا ہے۔ قربانی کی بھی یہی غرض ہے، تمام اخلاقی نظام بھی اس تقویٰ کی بنیاد پر ہے۔ اس آیت میں لعلکم تتقون کے ذریعے یہ بتایا گیا ہے کہ قانون قصاص عین عدل و مساوات کا قانون ہے اور ہیئت اجتماعی کے نظم و قیام درستی کا بہترین ضامن اور کفیل ہے کہ کوئی کسی پر زیادتی نہ کرنے پائے اور قوی و ضعیف سب کے حقوق کا تحفظ ہو جاتا ہے یہ نہ ہو کہ جو زبردست ہوں وہ زیر دستوں پر ظلم ڈھاکر رہیں۔ اُمت کے مختلف طبقوں میں ایک دوسرے کی طرف سے اطمینان و دل جمعی پیدا کرنے والا درحقیقت یہی قانون ہے۔ اور جب اس قانون پر ایک عرصہ تک عمل ہو گا اور اس قانون کی روح اُمت میں سرایت کر جائے گی تو ساری اُمت کا مزاج صالح ہو جائے گا اور آئین پسندی باہم صلح و سازگاری خدمت و معاونت جزو زندگی بن جائے گی اور اُمت دیکھتے ہی دیکھتے اُمت صالحین و ابرار اور اُمت عادلہ خیر اُمت کہلانے کی مصداق ہو جائے گی۔

---

[1] افادات شیخ الہند

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرًا ۖ

الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾

فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَمَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا إِثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يُبَدِّلُونَهُ ۚ

إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوصٍ جَنَفًا أَوْ إِثْمًا

فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾ رکوع ۲۲

یہ بات بھی تم پر فرض کی گئی ہے کہ جب تم میں سے کسی کے مرنے کا وقت قریب آجائے اور اپنے بعد بڑا مال و متاع چھوڑ رہا ہو تو اپنے والدین اور رشتہ داروں کے لیے دستور کے مطابق وصیت کرے۔ متقی انسانوں پر ایسا کرنا ضروری ہے۔ پھر جو شخص وصیت سننے کے باوجود اسے تبدیل کرے گا تو گناہ اسی کے سر ہوگا جس نے ردوبدل کیا ہے۔ یقین کرو کہ اللہ سب کچھ سننے والا، جاننے والا ہے۔ ہاں اگر کسی شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے بیجا رعایت یا کسی معصیت میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو اور بروقت مداخلت کر کے صلح کرادے تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہے بلاشبہ اللہ بخشنے والا اور بڑا مہربان ہے۔

قانونِ وصیت

حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں لکھا ہے کہ اسلامی قانون کا مبنیٰ حکمت ہے اور اس کی اصل

توجہ معاش اور معاد میں انسانی مصالح کی طرف ہے، قانون سرتاسر عدل مجسم رحمت اور سرتا پا حکمت و مصلحت ہے۔ دنیا و آخرت دونوں میں فلاح و سعادت اس سے وابستہ ہے۔ الشاطبی نے بھی الموافقات میں لکھا ہے کہ اسلامی قانون بندگان خدا کی مصالح کے خاطر وجود میں آیا ہے۔ مفکرین اس پر متفق ہیں کہ وہ بنیادی انسانی مصالح جن کا تحفظ انسان کی اولین ضرورت ہے پانچ ہیں۔ جان کا تحفظ، مال کا تحفظ، دین کا تحفظ، آبرو کا تحفظ، عقل کا تحفظ۔ ایمانیات کا پیمانہ پیش کر کے اگر عقل تحفظ کیا گیا ہے تو قصاص کے ذریعے جان کے تحفظ کی ضمانت دی ہے۔ پیش نظر آیت میں تحفظ مال کی ایک نوع کا ذکر ہے دوسری انواع کا ذکر آگے آرہا ہے۔ روزے، حج، نماز اور زکوٰۃ کے ذریعے دین کا تحفظ کیا گیا ہے اور نکاح کے ذریعے انسان کی آبرو کو ملحوظ کیا ہے۔ تفصیلات اپنے اپنے موقع پر آ رہی ہیں۔ اس آیت میں مرنے کی جان کے بعد اس کے مال کا تحفظ کا ذکر ہے۔ قرآن نے آتی المال میں حق ملکیت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یعنی یہ کہہ کر مال دیتا ہے حق ملکیت کو ظاہر کیا تھا۔

حق ملکیت کی تعریف

فقہ اسلامی میں ملکیت کی متعدد تعریفیں ملتی ہیں لیکن چند الفاظ میں کی جانے والی تعریف ان حدود اور ذمہ داریوں کا احاطہ نہیں کر سکتی جو اسلام میں حق ملکیت کے ساتھ لازماً وابستہ ہیں۔ ہمارے نزدیک قرآن کے مال کے بارے میں لفظ ایتاء اور دوسرے بے شمار مواقع پر انفاق کے استعمال کے پیش نظر ملکیت کی مختصر جامع تعریف وہ ہے جو مشہور حنفی مدرسہ فکر کے محقق علامہ زین العابدین ابراہیم بن نجیم کی ہے۔ یہ تعریف اس تعریف کے مطابق ہے جو ابن ہمام نے فتح القدیر میں کی ہے۔ ابن نجیم کی تعریف یہ ہے۔ ملکیت تصرف کر سکنے کے اختیار کا نام ہے جس کا سرچشمہ شریعت کا پروانہ ہو۔ الا یہ کہ کوئی مانع موجود ہو۔ اس تعریف کی رو سے ضروری ہے کہ ملکیت کا حصول شرعی طور پر ہوا ہو۔ وہی مالکانہ حق معتبر ہے۔ جو مالک کو شریعت نے دیا ہو۔ شریعت میں حصول ملکیت کے متعدد طریقوں میں سے انتقال ملکیت بذریعہ معاہدہ ہے۔ یہ انتقال بالعوض بھی ہو سکتا ہے اور بلا عوض بھی۔ اس طرح کے انتقال ملکیت کی ایک عام شکل وصیت بھی ہے جس کے ذریعے مالک کے مرنے کے بعد متعلقہ ملکیت اس شخص کی طرف منتقل ہو جاتی ہے جس کے حق میں وصیت کی گئی ہو۔ وصیت کے علاوہ تمام معاہدوں میں طرفین کی رضامندی شرط ہے۔ وصیت کے ذریعے مالک اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس کی وفات کے بعد اس کے ترکہ کا ایک حصہ متعین فرد یا افراد کی ملکیت ہو جائے گا۔

۵۱۰ ۔ اور وہ اپنے بعد بڑا مال چھوڑ رہا ہو ۔ اصل ارشاد میں لفظ خیر آیا ہے، خیر سے مراد عرف میں صرف مال نہیں بلکہ مال کثیر ہوتا ہے ۔ ابن ابی شیبہ کی وہ روایت اس کی مؤید ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ :

حضرت عائشہ سے کسی نے دریافت کیا کہ میں وصیت کرنا چاہتا ہوں ۔ آپ نے پوچھا تمہارے پاس کتنا سرمایہ ہے ؟ اس نے بتایا کہ تین ہزار ۔ آپ نے فرمایا کہ اولاد کس قدر ہے ؟ اس نے کہا چار ۔ حضرت عائشہ نے فرمایا قرآن کہتا ہے ان ترک خیرا اور یہ سرمایہ بہت تھوڑا ہے تم اسے اپنی اولاد کے لیے چھوڑ دو یہی افضل ہے ۔

حضرت علی مرتضیٰ اپنے ایک آزاد شدہ غلام کی وفات کے وقت اس کے پاس آئے تو اس کا سارا سرمایہ ۷۰۰ یا ۶۰۰ درہم تھا ۔ اس نے حضرت علی سے وصیت کے بارے میں دریافت کیا ۔ آپ نے فرمایا کہ نہیں اللہ کا ارشاد ہے ان ترک خیرا یہ سرمایہ زیادہ نہیں ہے تم اسے اپنے ورثہ کے لیے رہنے دو ۔

یہ دونوں روایتیں کہہ رہی ہیں کہ حضرت عائشہ اور حضرت علی خیر کا مفہوم قرآن کی اس آیت میں سرمایہ کثیر سمجھتے تھے ۔

مالِ کثیر کیا ہے ؟

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ مالِ کثیر جسے قرآن نے خیر کہا ہے اس کی مقدار کیا ہے ؟ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ ہزار درہم مالِ کثیر ہے ۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ ساٹھ دینار سے کم مالِ کثیر نہیں ہے ۔ حضرت علی ۷۰۰ درہم کو مالِ کثیر نہیں کہتے اور حضرت عائشہ تین ہزار درہم کو بھی مالِ کثیر نہیں فرماتی ہیں ۔

دراصل مالِ کثیر کے لیے چونکہ قرآن و سنت نے کوئی خاص پیمانہ مقرر نہیں کیا ہے اس لیے ان بزرگوں نے اپنے اجتہاد سے اپنے احوال و ظروف کے مطابق یہ تعیین فرمائی ہے ۔ ورنہ عرف کے مختلف ہونے کی وجہ سے مال کثیر کی مقدار مختلف ہوتی رہتی ہے اور معلوم ہے کہ عرف اشخاص، احوال اور زمانے کے اختلاف سے مختلف ہوتا رہتا ہے ۔ ایک بے گھر شخص کسی غریب بستی میں اگر ۵۰ دینار کا سرمایہ بھی رکھتا ہے تو وہ بھی سرمایہ دار ہے اور اس کا سرمایہ یقیناً مالِ کثیر ہے لیکن اگر کوئی امیر یا وزیر کسی بڑے شہر میں ۵۰۰ دینار چھوڑتا ہے تو وہ یقیناً غریب ہے اور اس کے ۵۰۰ دینار مالِ کثیر

نہیں ہیں۔

۱۸۰۔ دستور کے مطابق وصیت کرے۔ لوگوں میں دستور تھا کہ مُردہ کا تمام مال اس کی بیوی اور اولاد بلکہ خاص بیٹوں کو ملتا تھا، ماں باپ اور سب اقارب محروم رہتے تھے۔ اس آیت میں ارشاد ہے کہ ماں باپ اور جملہ اقارب کو انصاف کے ساتھ دینا چاہیے۔ مرنے والے پر اسی کے موافق وصیت فرض ہوتی اور یہ وصیت اس وقت فرض تھی جس وقت تک آیت میراث نازل نہیں ہوئی تھی۔ جب سورۃ نسآ میں احکام میراث نازل ہوئے سب کا حصہ اللہ تعالیٰ نے آپ متعین فرمادیا اب ترکہ میت میں وصیت نہ رہی۔ اس کی ضرورت ہی ختم ہوگئی۔ البتہ وصیت مستحب ہے مگر وارث کے لیے جائز نہیں۔ اور تہائی سے زیادہ جائز نہیں ہے ہاں اگر کسی کے ذمہ لوگوں کے قرض اور امانتیں ہوں اور لین دین کا جھگڑا ہو تو اس میں وصیت اب بھی فرض ہے [1]

اس آیت میں جو وصیت اس مرنے والے پر فرض کی ہے جو مال چھوڑ کر مرا ہے اس کے تین حصے ہیں، ایک یہ کہ مرنے والے کے ترکہ میں اولاد کے سوا کسی دوسرے وارث کے حصے مقرر نہیں ہے۔ ان کے حصے مرنے والے کی وصیت کے مطابق مقرر ہوں۔

دوسرے یہ کہ ایسے اقارب کے لیے وصیت کرنا مرنے والے پر فرض ہے۔

تیسرے یہ کہ ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت جائز نہیں۔

ان تین احکام میں سے پہلا حکم تو اکثر صحابہ و تابعین کے نزدیک آیت میراث سے منسوخ ہوگیا ہے اور باجماعِ اُمت جن رشتہ داروں کا میراث میں کوئی حصہ مقرر نہیں ہے ان کے لیے میت پر وصیت کرنا کوئی فرض و لازم نہیں اس لیے فرضیتِ وصیت ان کے حق میں بھی منسوخ ہی ہوگی۔

دوسرا حکمِ وصیت کا فرض ہونا یہ بھی باجماعِ اُمت منسوخ ہے اور اس کی ناسخ وہ حدیث ہے جس کا اعلان رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے خطبہ میں فرمایا۔

اللہ تعالیٰ نے ہر ایک حق والے کو اس کا حق خود دے دیا ہے۔ اس لیے اب کسی وارث کے لیے وصیت جائز نہیں ہے۔

تیسرا حکمِ وصیت ایک تہائی میں جائز ہے۔ یہ باتفاقِ اُمت اب بھی باقی ہے۔ بلکہ وارثوں کی اجازت سے ایک تہائی سے زیادہ کی اور پورے مال کی وصیت بھی جائز ہے [2]

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۳۵ [2] معارف القرآن م ش ص ۲۸۴

اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں جس وصیت کا ذکر ہے وہ منسوخ ہے۔ جن رشتہ داروں کے حصے قرآن نے مقرر کر دیے ہیں اُن کے لیے وصیت واجب نہیں ہے۔ صرف ایک تہائی مال میں وصیت کی اجازت ہے لیکن وہ بھی ضروری نہیں ہے۔

عامہ مفسرین قرآن کی رائے یہی ہے اور اس رائے کے مطابق قرآن کی یہ آیت منسوخ ہے۔ شاہ ولی اللہ نے جن پانچ آیتوں کو منسوخ مانا ہے ان میں سے ایک یہ بھی ہے۔ لیکن کچھ مفسرین کی رائے میں یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ بیضاوی نے بھی نسخ کو محلِ نظر بتایا ہے۔ ابن جریر نے بھی یہی بتایا ہے کہ ایک جماعت نے قائلین نسخ کی مخالفت کی ہے۔ قرطبی نے اس آیت پر لکھا ہے کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے یا محکم ہے، بعض علماء کہتے ہیں کہ منسوخ نہیں ہے۔ آیت کا عنوان عمومی ہے اور معنے خاص ہیں۔ یہ آیت ان والدین کے بارے میں ہے جو میراث کے حقدار نہیں ہوتے۔ مثلاً والدین کافر ہوں اور اُن رشتہ داروں کے متعلق ہے جن کا وراثت میں کوئی حق نہیں ہوتا۔ مدارک میں علامہ نسفی نے بھی ایک قول عدم نسخ کا لکھا ہے۔

جو لوگ اسے منسوخ نہیں کہتے ان کا موقف یہ ہے کہ قرآن میں وراثت کے حکم میں ہر جگہ ساتھ ساتھ من بعد وصیۃ کا لفظ موجود ہے۔ اگر فقہاء حنفیہ میں سے فخر الاسلام کی یہ بات بالکل درست ہو کہ تاریخی لحاظ سے آیت میراث کا نزول باتفاق آیت وصیت کے بعد ہوا ہے۔ آیت میراث میں من بعد وصیۃ کا مطلب بھی یہ ہے کہ تقسیم ترکہ وصیت کے نفاذ کے بعد ہو۔ اگر یہ آیت منسوخ ہے تو پھر وصیت کون سی ہے جس کے پورے کرنے کی قرآن ہدایت کر رہا ہے۔ دوسرے یہ کہ سورۃ مائدہ میں جو آخری سورتوں میں سے ایک ہے صاف طور پر وصیت کے لکھانے، اس پر عملدرآمد کرنے، گواہی لینے وغیرہ کا حکم موجود ہے۔ یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہ آیت وصیت منسوخ نہیں ہے۔

نیز صحیح بخاری کی کتاب الوصایا میں ایک واضح ارشاد موجود ہے۔ سعد بن ابی وقاص اللیثی سے روایت ہے کہ میں فتح مکہ والے دن بیمار ہو گیا (یعنی آیت وراثت کے نازل ہونے کے بعد) رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کو تشریف لاتے اور آپ کو یہ بات بیحد ناپسند تھی کہ کوئی اس جگہ وفات پاتے جہاں سے اُس نے ہجرت کی تھی۔ چنانچہ آپ نے فرمایا کہ اللہ ابن عفرا پر رحم فرماتے۔ میں نے عرض کیا۔ میں اپنے سارے مال کے متعلق وصیت کر جاؤں، آپ نے فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا کہ پھر نصف مال کی حد تک، آپ نے فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا کہ پھر ایک تہائی مال کی؟ آپ نے فرمایا ہاں ایک تہائی کی حد تک اور ایک تہائی بھی بہت ہے۔ تو اپنے ورثا کو مالدار چھوڑ جاتے یہ بات اس سے بہتر ہے

کہ ان کو محتاج چھوڑ کر جائے کہ وہ لوگوں سے مانگتے پھریں ۔

یہ ارشاد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کے آخری ایام کا ہے ۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ وصیت کا حکم اس وقت تک منسوخ نہ سمجھا جاتا تھا ۔ اور یہ بھی اس حدیث سے معلوم ہو رہا ہے کہ صرف ایک صحابی ہی نے آیتِ وصیت کو منسوخ نہیں سمجھا بلکہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسے منسوخ نہیں سمجھا اور وصیت کرنے کو جائز تصور کیا ہاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ضروری قرار دیا کہ ورثاء کو بالکل محروم نہ کیا جائے اس لیے ایک تہائی تک مال کی وصیت کر دی جائے ۔ دوسرے اس سے معلوم ہوا کہ اس وصیت سے مراد خیراتی اور رفاہی کاموں کے لیے وصیت ہے نہ کہ رشتہ داروں کے لیے ۔ اس لیے اگر آیت کے معنے میں یہ طریق کار اختیار کیا جائے کہ للوالدین والاقربین کو ان تولّی کے متعلق کیا جائے اور معنے یوں کیے جائیں کہ جو شخص مالِ کثیر والدین اور اقرباء کے لیے چھوڑے تو وہ وصیت کرے ۔ ماں باپ اور رشتہ داروں کے لیے وصیت کرنا مراد نہیں ہے ۔ بلکہ مراد اس سے صرف یہ ہے کہ جو شخص اپنے ورثاء کے لیے مالِ کثیر چھوڑے وہ کچھ حصہ اس مال کا فی سبیل اللہ بھی وصیت کرے ۔ مسلمانوں میں آج اس پر عمل متروک ہے مگر دوسری قومیں ایسی وصیتیں کرتی ہیں ۔

صاحب جواہر القرآن نے اپنے شیخ مولانا حسین علیؒ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ حضرت شیخ اس طرح توجیہہ فرماتے تھے کہ آیت میں وصیت والدین اور رشتہ داروں کے لیے نہیں بلکہ والدین اور رشتہ داروں کو ہے ۔ اور آیت میں المعروف سے مراد حکم شرعی ہے اور مطلب یہ ہے کہ مرنے والے پر لازم ہے کہ وہ والدین اور رشتہ داروں کو اس بات کی وصیت کرے کہ وہ اس کا ترکہ حکم شرعی کے مطابق تقسیم کریں۔[1]

دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وصیت اور میراث کی توضیح میں حسبِ ذیل دو قاعدے بیان فرمائے ہیں ۔

ایک یہ کہ اب کوئی شخص کسی وارث کے حق میں وصیت نہیں کر سکتا ہے ۔ یعنی جن رشتہ داروں کے حصے قرآن میں مقرر کر دیے گئے ہیں ان کے حصوں میں نہ تو وصیت کے ذریعے سے کوئی کمی بیشی کی جا سکتی ہے نہ کسی وارث کو میراث سے محروم کیا جا سکتا ہے اور نہ کسی وارث کو اس کے قانونی حصے کے علاوہ کوئی چیز بذریعہ وصیت دی جا سکتی ہے ۔

دوسرے یہ کہ وصیت کل جائداد کے صرف ایک تہائی حصے کی حد تک کی جا سکتی ہے ۔ ان دو

---

[1] جواہر القرآن ص ۸۶

تشریحی ہدایات کے بعد اب اس آیت کا منشا یہ قرار پاتا ہے کہ آدمی اپنا کم از کم دو تہائی مال تو اس لیے چھوڑ دے کہ اس کے مرنے کے بعد وہ حسبِ قاعدہ اس کے وارثوں میں تقسیم ہو جائے اور ایک تہائی مال کی حد تک اسے اپنے ان غیر وارث رشتہ داروں کے حق میں وصیت کرنی چاہیے جو اس کے اپنے گھر یا اس کے خاندان میں مدد کے مستحق ہوں۔ یا جنہیں وہ خاندان کے باہر محتاجِ اعانت پاتا ہو۔ یا رفاہِ عام کے کاموں میں سے جس کی بھی وہ مدد کرنا چاہے، بعد کے لوگوں نے وصیت کے اس حکم کو محض ایک سفارشی حکم قرار دے دیا یہاں تک کہ بالعموم وصیت کا طریقہ منسوخ ہی ہو کر رہ گیا۔ لیکن قرآن میں اسے حکم قرار دیا گیا ہے جو خدا کی طرف سے متقی لوگوں پر عائد ہوتا ہے۔ اگر اس حق کو ادا کرنا شروع کر دیا جائے تو بہت سے وہ سوالات خود بخود حل ہو جاتے ہیں جو میراث کے بارے میں لوگوں کو الجھن میں ڈالے ہوئے ہیں۔ مثلاً ان پوتوں اور نواسوں کی میراث کا معاملہ جن کے ماں باپ، دادا اور نانا کی زندگی میں مر جاتے ہیں لے

آیتِ وصیت اور آیتِ میراث میں مفاہمت

ہمیں چاہیے کہ معاملہ کے اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈالیں اور سوچیں کہ آیتِ وصیت اور آیتِ میراث میں کوئی تعارض نہیں ہے بلکہ دونوں میں مفاہمت کی گنجائش ہے۔ صاحبِ تفسیر ثنائی نے اس راہ میں جو کوشش فرمائی ہے وہ قابلِ تنقید ہے، فرماتے ہیں :

آیتِ میراث اس آیت کی شرح ہے، کیونکہ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے وصیت کرنے کا حکم فرمایا تھا مگر چونکہ اس وصیت میں کمی زیادتی کرنا انسانی طبیعت سے کچھ بعید نہ تھا اس لیے خدا تعالے عالم الغیب نے اس وصیت کی آپ ہی شرح فرما دی بلکہ اس فعل کو جو اس کی شرح میں مستعمل ہوا تھا اپنی طرف منسوب کیا اور فرمایا یوصیکم اللہ۔ اس جگہ یحکم، یامر، یقضی جیسے الفاظ کو چھوڑ کر یوصی لانا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ایصاء۔ اس فعلِ وصیت کی شرح ہے جس میں اجمال تھا۔ اب آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ اپنے ان وارثوں کے حق میں جن کے حصے اللہ نے مقرر کر دیے ہیں، یہ وصیت کرنا تم پر فرض ہے کہ اپنے اپنے حصے شریعت کے مطابق لے لیں۔ کوئی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے لیکن ان ورثا کے علاوہ اور لوگ بھی میت سے دور نزدیک کا تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں۔ ان کی نسبت وصیت کی کوئی شرح نہیں ہے بلکہ یہ میت کے اختیار اور صوابدید پر موقوف ہے من بعد وصیۃ

لے تفہیم القرآن

ہیں اسی اختیار کی طرف اشارا ہے لیکن اس اختیار کو بھی کھلا اور آزاد نہیں رکھا بلکہ ایک تہائی کی پابندی لگا دی ہے۔ تہائی کی تعیین سے غیر مضار کی شرح ہو گئی یعنی وصیت کسی کو نقصان نہ دیتی ہو اور وارث کے حق میں لا وصیۃ لوارث وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں فرما کر یوصیکم اللہ کو اس آیت کتب علیکم۔۔۔ الخ کی شرح بنا دیا۔ خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ جن کے حق میں اللہ نے حصے مقرر کر دیے ہیں ان کی نسبت تو مقرر حصص کے لیے وصیت کرنے کی حاجت نہیں ہے بلکہ ان کی وہی وصیت ہے جسے خدا نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔ اور جن لوگوں کے حصص مقرر نہیں ہیں ان کے حق میں میت کو تہائی مال تک وصیت کرنے کی اجازت ہے۔

سرسید صاحب کی تشریح

سرسید احمد خاں صاحب کا یہ فرمانا کہ

قرآن مجید کی دونوں آیات ملانے سے یہ نتیجہ نکلا کہ مرنے والے نے اگر کوئی وصیت کی ہے تو اس کا مال اس کی وصیت کے مطابق تقسیم کیا جائے اور اگر اس نے کچھ وصیت نہیں کی یا جس قدر کی ہے اس سے زیادہ مال چھوڑا ہے تو اس کے مال کی یا اس قدر کی جو وصیت سے زیادہ ہے آیت میراث کے مطابق تقسیم ہو جائے گی۔ بالکل درست نہیں ہے کیونکہ بحکم القرآن یفسر بعضھا بعضا۔ قرآن جو آپ اپنی تفسیر کرتا ہے وہ ہر طرح سے مقدم ہے سرسید کی تفسیر اس کے خلاف ہے[1]

اسلام نے ایک تہائی ترکہ کی حد تک وصیت کا حق دے کر اہم انسانی مفادات کا تحفظ کیا ہے مثلاً بعض اوقات مالک کا کوئی رشتہ دار دوسرے قریبی ورثا کے موجود ہونے کے سبب ترکہ میں حقدار نہیں ہوتا۔ حالانکہ وہ ناداری کے باعث اس کا مستحق ہوتا ہے۔ یا اس سے تعلق یا اور کسی مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ترکہ میں اسے بھی کچھ حصہ ملے۔ حقِ وصیت کے ذریعے مالک کو اس کا موقعہ ملتا ہے کہ ایسے رشتہ داروں کے حق میں بھی کچھ مال چھوڑ جاتے۔ اسی طرح اس حق سے کسی محسن کے احسان کا بدلہ دینے، کسی کمزور کو سہارا دینے اور رفاہِ عامہ یا دینی امور کے نگران کسی ادارے کی مدد کرنے کے بھی مواقع ملتے ہیں۔ وصیت کے محرکات عموماً یہی ہوتے ہیں اور عملاً ان اغراض کے علاوہ کسی اور غرض کے لیے اس حق کو بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔

---

[1] تفسیر ثنائی ص ۱۲۶

اگر کسی فرد کا کوئی وارث نہ ہو تو احناف کے نزدیک وہ اپنے پورے ترکہ پر وصیت کا حق استعمال کر سکتا ہے[1] کیونکہ اس حق کی تحدید کا اصل مقصد ورثا کے حق کا تحفظ ہے۔ لیکن امام مالک اور امام شافعی اس صورت میں بھی تہائی ترکہ سے زیادہ وصیت کو درست نہیں سمجھتے۔ کیونکہ جب کوئی متعین فرد اس کا وارث نہ ہو تو مسلمان اس کے وارث ہوں گے اور اس کا ترکہ سارے مسلمانوں کی ملک ہوگا۔ اور اس کو وصیت کے ذریعے مسلمانوں کا حق کالعدم کرنے کا اختیار نہیں ہے[2]

وصیت کا حق ورثا کے علاوہ دوسروں کو مال منتقل کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ جمہور فقہاء کے نزدیک اگر تمام ورثا رضامند ہو جائیں تو کسی وارث کے حق میں بھی وصیت کی جا سکتی ہے۔ ان کے نزدیک ایک وارث کے حق میں وصیت سے ممانعت کا مقصد دوسرے ورثا کے حق کا تحفظ ہے، اگر وہ بخوشی اپنے حق کے ایک حصہ سے دوسرے وارث کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار ہوں تو اس کی ممانعت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی[3]

۵۱۲۔ متقی انسانوں پر ایسا کرنا ضروری ہے۔ قرطبی لکھتے ہیں کہ اس ضروری ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ فرض و واجب ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ متقین کی قید یہاں موجود ہے۔ اگر فرض ہوتا تو یہ قید نہ ہوتی بلکہ حکم عام ہوتا۔ تقویٰ کی قید بتا رہی ہے کہ ضروری نہیں ہے۔ دوسرے علماء کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ جو وصیت مسلمانوں پر فرض کی گئی ہے، متقین کے لیے ضروری ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان موت کے بعد جو کچھ چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اگرچہ دوسروں کے قبضہ میں جاتا ہے لیکن مرنے سے پہلے اس کے ٹھیک ٹھیک خرچ ہونے اور عزیزوں، قریبیوں کو فائدہ پہنچانے کی فکر مرنے والے کی زندگی کے فرائض میں ہے اور اس ذمہ داری سے وہ بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ اور اس کام کو صرف وہ ہی لوگ کریں گے جن میں خدا کے نام پر ہر کام کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت ہے۔

وصیت کی تبدیلی

۵۱۳۔ پھر جو شخص وصیت سننے کے باوجود اسے تبدیل کرے۔ یعنی مرنے والا تو وصیت انصاف کے ساتھ کر گیا مگر دینے والوں نے اس کی تعمیل نہ کی تو مرنے والے پر کوئی گناہ نہیں ہے

---

[1] بدائع الصنائع ج ۴ ص ۱۰۷۔ [2] بدائع الصنائع ص ۱۴۰۔ [3] بدایۃ المجتہد

وہ اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکا۔ گنہگار وہ ہوں گے جنہوں نے تعمیل نہیں کی۔ اللہ تعالیٰ سب کی باتیں سننے والا اور جاننے والا ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ مرنے والے کی وصیت ایک مقدس امانت ہے۔ جو لوگ اس کے امین ہیں اُن کا فرض ہے کہ بے کم و کاست اس کی تعمیل کریں۔ اگر وہ لوگ جن پر تعمیل چھوڑی گئی ہے خیانت کریں تو اس کے لیے وہ خود جواب دہ ہوں گے۔ وصیت کرنے والا اور وصیت سے فائدہ اٹھانے والے جوابدہ نہیں ہو سکتے۔

سلف صالحین میں سے جو علماء وصیت کے وجوب کے مدعی ہیں وہ اس آیت اور عبداللہ ابن عمرؓ کی اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جو ائمہ حدیث نے پیش کی ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو مسلمان وصیت کرنا چاہتا ہے اس کو یہ حق نہیں کہ وہ دو راتیں اس میں دیر کرے، اُسے چاہیے کہ وصیت اپنے سرہانے ہی رکھے۔

حضرت عطاء ابن ابی رباح، امام زہری، ابو مجلز، طلحہ ابنِ مصرف اور ائمہ میں سے اسحاق بن راہویہ اور داؤد ظاہری کی یہی رائے ہے۔ ابو عوانہ اسفرائنی اور ابن جریر کا یہی مختار ہے۔ جمہور کی رائے میں وصیت مستحب ہے[2] اور اس سے اشارۃً یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ جن گواہوں کے سامنے وصیت کی گئی کہ فلاں فلاں عزیز کو اتنا اتنا حصہ ملے اور گواہ نے اپنی طرف سے اس میں قطع و برید کر دی جس سے حقداروں کی حق تلفی ہو گئی تو اس میں حاکموں اور قاضیوں کا کوئی قصور نہیں۔ قصور صرف جھوٹے گواہوں کا ہے۔

وصیت کی اصلاح

۱۵۱۴۔ اگر کسی شخص کو وصیت کرنے والے کی جانب سے بے جا رعایت یا معصیت میں پڑ جانے کا اندیشہ ہو یعنی اگر کسی شخص کو مرنے والے کی جانب سے اندیشہ یا علم ہو کہ اس نے کسی وجہ سے غلطی کھائی یا کسی کی بے جا رعایت یا دیدہ و دانستہ خلافِ حکمِ الٰہی دے گیا۔ پس اس شخص نے اہلِ وصیت اور وارثوں میں حکمِ شریعت کے موافق صلح کرا دی تو اس کو کچھ گناہ نہیں۔ وصیت میں یہ تغیر و تبدل جائز ہے[3]

یا مطلب یہ ہے کہ اگر وصیت کرنے والا کسی وارث کے حق کو تلف کر رہا ہو یا خلاف ورزی حکمِ الٰہی کر کے مال کی وصیت کرنے لگے تو دوسروں کا فرض ہے کہ اس کی اصلاح کر دیں جیسا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سعد بن ابی وقاص کے معاملہ میں کیا۔ اور اصلاح کی صورت یہ ہو کہ وصیت نامہ کے

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۵۳ [2] فتح الباری [3] افادات شیخ الہند ص ۳۵

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ
مِن قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ۝ أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن
كَانَ مِنكُم مَّرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۚ
وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ۖ فَمَن
تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهُ ۚ وَأَن تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ إِن
كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝

مسلمانو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے[515] جیسے تم سے پہلے لوگوں[516] پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم میں متقیانہ سیرت[517] پیدا ہو جاتے۔ یہ چند مقررہ[518] دنوں کے روزے ہیں۔ لہٰذا جو تم میں سے[519] بیمار ہو یا بحالتِ سفر ہو تو اس کے لیے اجازت ہے کہ دوسرے دنوں میں گنتی پوری کرلے۔ اور جو لوگ[520] روزہ رکھنے کی طاقت بمشکل[521] رکھتے ہوں تو اُن کے لیے روزے کے بدلے ایک مسکین کا کھانا کھلانا ہے۔ پھر اگر کوئی شخص اپنی خوشی سے کچھ زیادہ[522] بھلائی کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اور اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو روزہ[523] رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے۔

مضمون میں ترمیم کرلے اور وارثوں کی حق تلفیوں کو دور کر دے۔ مثلاً وصیت اگر بے ضابطہ ہے یا خلافِ قاعدۂ شریعت ہے اور کوئی شخص وارثوں کے درمیان وقوعِ نزاع یا احتمالِ نزاع ہی کو دیکھ کر مضمونِ وصیت میں ایسی ترمیم کرلے جس سے حق تلفیوں کی اصلاح ہو جائے اور وارثوں میں باہم

مصالحت ہو جائے۔ بعض فقہا نے اس حکم کے تحت وسعت دے کر کہا ہے کہ حکم صرف وصی اور گواہانِ وصیت اور حاکم ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ اُمت کا ہر فرد اس پر عمل کر سکتا ہے جیسا کہ الجصاص اور ابن العربی نے لکھا ہے کیونکہ اس حکم کا تعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہے اور وہ ساری اُمت پر فرض ہے۔ فقہا نے اس سے یہ بھی استنباط کیا ہے کہ غلبہ ظن کے بعد رائے پر عمل کرنا اجتہاد جائز ہے کیونکہ وصیت کرنے والے کی جانب سے ظلم و زیادتی کا اندیشہ ظن غالب ہی کے حکم میں ہے۔[1]

روزے کی فرضیت

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ سورت کا اصلی موضوع اجتماعی تقویٰ یعنی اتقیا کی ایسی جماعت بنانا ہے جو انسانی تمدن کو خیر و صلاح کی بنیاد پر تعمیر کرے مگر وہ اس غرض کے لیے صرف اجتماعی اُصول وضع کرنے اور ان اُصولوں کی بنیاد پر ایک نظام تمدن بنانے پر اکتفا نہیں کرتا۔ بلکہ ساتھ ساتھ اپنے جماعتی نظام کے لیے افراد تیار کرنے کا بھی انتظام کرتا ہے تاکہ جماعت جن افراد پر مشتمل ہو۔ ان میں کا ایک ایک شخص اپنے خیالات اپنی سیرت اور اپنے کردار کے لحاظ سے اس نظام کے ساتھ بیش از بیش موافقت رکھتا ہو۔ اور با عقیاتہ میلانات کے ساتھ مجبورانہ اطاعت کرنے کے بجائے اپنے نفس و روح کی پوری آمادگی سے اپنے دل و دماغ کے مخلصانہ عقیدے اور اپنی سیرت کی ذاتی قوت کے ساتھ اس کی پیروی کرے۔

روزہ اسلام کی عبادات میں تیسرا رُکن ہے۔ عربی میں اس کو صوم کہتے ہیں جس کے لفظی معنے رکنے کے ہیں۔ بعض مفسرین کی تشریح کے مطابق قرآن میں اس کو کہیں 'صبر' بھی کہا گیا ہے جس کے معنے ضبطِ نفس، ثابت قدمی اور استقلال کے ہیں۔ ان معنوں سے ظاہر ہوتا ہے کہ اسلام کی زبان میں روزے کا کیا مفہوم ہے؟

ان آیات میں نہ صرف روزے کے چند احکام بلکہ روزے کی تاریخ اور روزے کی حقیقت بتائی گئی ہے

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۹۶

روزے کب فرض ہوئے

۵۱۵۔ مسلمانو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے۔ روزے کی تاریخ بیان کرنے سے پہلے یہ بتا دیا گیا ہے کہ مسلمانوں پر روزے فرض ہو گئے ہیں۔ اسلام میں روزہ روزِ اوّل ہی سے فرض نہیں ہوا کیونکہ اسلام نے عبادات کو روحانی امراض کی دوا قرار دیا ہے جن کا استعمال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب امراضِ روحانیہ پیدا ہو جاتے ہیں یا ان کے پیدا ہونے کا زمانہ شروع ہوتا ہے۔ قوائے شہوانیہ اور زخارفِ دنیویہ کی شیفتگی اور لذاتِ حسیہ کے انہماک و توغل سے جو روحانی بیماریاں پیدا ہو سکتی تھیں، مکہ میں یہ تمام ساز و سامان مفقود تھے۔ بلکہ خود کفار کے جور و ستم نے ان جذبات کا استیصال کر دیا تھا۔ اس لیے وہاں اس روحانی علاج کی ضرورت نہ تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لائے تو کفار کے مظالم سے نجات ملی۔ انصار کی ایثارِ نفسی نے مسلمانوں کو وجہ کفاف سے بے نیاز کر دیا۔ فتوحات کا سلسلہ بھی شروع ہو گیا۔ اور اس میں روز افزوں وسعت پیدا ہوتی گئی۔ اب وہ وقت آ گیا یا عنقریب آنے والا تھا کہ دنیا اپنی اصلی صورت میں مسلمانوں کے سامنے آ کر ان کو اپنا فریفتہ بنائے۔ اس لیے درحقیقت یہ تداخل کا موسم تھا جس میں مرض کے پیدا ہونے سے پیشتر پرہیز کی ضرورت تھی اور وہ پرہیز روزہ تھا جو ۲ھ میں فرض ہوا۔

ایک خلش اور اس کا ازالہ

اس سے یہ خلش دور ہو جاتی ہے جو بعض ناواقفوں کو ہوئی ہے کہ چونکہ آغازِ اسلام میں مسلمانوں کو اکثر فاقوں سے دوچار ہونا پڑتا تھا اس لیے اُن کو روزے کا خوگر کیا گیا حالانکہ اصول کی رُو سے فاقہ مستوں کو روزے کی جس قدر ضرورت ہے شکم سیروں کے لیے وہ اس سے بھی زیادہ ضروری ہے۔ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ مرغوباتِ شہوانیہ کا ترک کرنا نہایت مشکل کام تھا اس لیے روزہ وسطِ اسلام میں فرض کیا گیا جب کہ لوگ توحید، نماز اور احکامِ قرآنی کے خوگر ہو چکے تھے اس لیے احکام کا یہ اضافہ اسی زمانے کے لیے موزوں تھا۔

روزے کی تاریخ

۵۱۶۔ جیسے تم سے پہلوں پر روزہ فرض کیا گیا۔ یہ حکم روزے کے متعلق ہے جو ارکانِ اسلام

میں داخل ہے اور نفس کے بندوں، ہوا پرستوں کو نہایت ہی شاق ہے اس لیے تاکید اور اہتمام کے الفاظ سے بیان کیا گیا ہے اور یہ حکم حضرت آدم کے زمانہ سے اب تک برابر جاری ہے۔ چاہے ایام کی تعیین میں کچھ اختلاف ہے اور اُصول مذکورہ سابقہ میں جو صبر کا حکم تھا روزہ اس کا ایک بڑا رکن ہے۔ حدیث میں روزے کو نصف صبر فرمایا ہے۔[1]

قرآن نے اس آیت میں تصریح کی ہے کہ روزہ اسلام کے ساتھ نہیں بلکہ اسلام سے پہلے بھی کل مذاہب کے مجموعہ احکام کا ایک جُزو رہا ہے۔ اللہ اکبر عرب کا ایک اُمی مدعی ہے کہ روزہ دُنیا کے تمام مذاہب میں فرض عبادت رہا ہے۔ اگر یہ دعویٰ تمامتر صحت پر مبنی ہے تو اُس اُمی عربی کے علم کے مافوق ذرائع میں کیا شک رہ جاتا ہے۔ اس دعویٰ کی تصدیق میں یورپ کے محقق ترین ماخذ کا ہم حوالہ دیتے ہیں۔ انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کا مضمون نگار روزے کے متعلق لکھتا ہے:

روزے کے اُصول اور طریقے گو آب و ہوا، قومیت و تہذیب اور گرد و پیش کے حالات کے اختلاف سے بہت کچھ مختلف ہیں لیکن بمشکل کسی ایسے مذہب کا نام ہم لے سکتے ہیں جس کے مذہبی نظام میں روزہ نہ ہو۔

آگے چل کر لکھتا ہے:

گویا کہ روزہ ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے ہر جگہ موجود ہے۔

یہودیوں میں بھی روزہ فریضہ الٰہی ہے۔ حضرت موسیٰ نے کوہِ طور پر چالیس دن بھوکے پیاسے گزارے (خروج ۳۴۔۲۸) چنانچہ عام طور پر یہود حضرت موسیٰ کی پیروی میں چالیس دن روزہ رکھنا اچھا سمجھتے تھے لیکن چالیسویں دن کا روزہ ان پر فرض ہے جو ان کے ساتویں مہینہ تشرین کی دسویں تاریخ کو پڑتا ہے اور اسی لیے اس کو عاشورا کہتے ہیں۔ یہی عاشورا کا دن وہ دن تھا جس میں حضرت موسیٰ کو تورات کے دس احکام ملے تھے اسی لیے تورات میں اس دن کے روزے کی نہایت تاکید آئی ہے۔ اس کے علاوہ یہودی صحیفوں میں اور دوسرے روزوں کے احکام بھی بتصریح مذکور ہیں۔

عیسائی مذہب میں اگر بھی ہم کو روزوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ نے بھی چالیس دن تک جنگل میں روزہ رکھا۔ حضرت یحییٰ جو حضرت عیسیٰ کے گویا پیشرو ہیں وہ بھی روزے رکھتے تھے اور اُن کی اُمت بھی روزے دار تھی۔ حضرت عیسیٰ نے خود اپنے پیروؤں کو بے ریا اور مخلصانہ روزہ

---

[1] افاداتِ شیخ السند ص ۳۵

رکھنے کی نصیحت فرمائی ہے چنانچہ اپنے حواریوں کو فرماتے ہیں :

پھر جب تم روزہ رکھو، ریاکاروں کی مانند اپنا چہرہ اُداس نہ بناؤ کیونکہ وہ اپنا مُنہ بگاڑتے ہیں کہ لوگوں کے نزدیک روزہ دار ٹھہریں۔ تم سے سچ کہتا ہوں کہ وہ اپنا بدلہ پا چکے۔ پھر جب تم روزہ رکھو اپنے سر میں تیل لگاؤ اور مُنہ دھوؤ تاکہ تم آدمی پر نہیں بلکہ اپنے باپ پر جو پوشیدہ ہے روزے دار ظاہر ہو اور تیرا باپ جو پوشیدگی میں دیکھتا ہے تجھ کو آشکارا بدلہ دے۔

(متی ۶-۱۷)

ایک دوسرے مقام پر حضرت عیسیٰ سے ان کے شاگرد پوچھتے ہیں کہ ہم پلید رُوحوں کو کس طرح نکال سکتے ہیں ؟ وہ اس کے جواب میں فرماتے ہیں ،

یہ جنس سوائے دُعا اور روزے کے کسی اور طرح سے نہیں نکل سکتی۔ (متی ۱۷-۳۱)

اہلِ عرب بھی اسلام سے پہلے روزے سے کچھ نہ کچھ مانوس تھے۔ مکہ کے قریش جاہلیت کے دنوں میں عاشورا کا روزہ رکھتے تھے۔ کیونکہ اس روز خانہ کعبہ پر نیا غلاف ڈالا جاتا تھا۔ مدینے میں یہود اپنا عاشورا الگ مناتے تھے۔ یعنی وہی اپنے ساتویں مہینہ کی دسویں تاریخ کو روزہ رکھتے تھے۔

ان تصریحات سے ثابت ہوتا ہے کہ قرآن کی یہ آیت کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم کس قدر تاریخی صداقت پر مبنی ہے [1]

روزہ کی حقیقت

۱۵ - تاکہ تم میں متقیانہ سیرت پیدا ہو جائے یعنی روزے کے ذریعے نفس کو اس کی مرغوبات سے روکنے کی عادت پڑے گی تو پھر ان مرغوبات سے جو شرعاً حرام ہیں رُک سکوگے۔ نیز روزے سے نفس کی قوت و شہوت میں کمزوری آئے گی تو اس طرح تم متقی ہو جاؤ گے۔ بڑی حکمت روزے میں یہی ہے کہ نفسِ سرکش کی اصلاح ہو اور شریعت کے احکام نفس پر بھاری ہیں۔ ان کا کرنا آسان ہو جاتے اور متقی بن جاؤ [2]

انسان کی ہر قسم کی بدبختیوں اور ناکامیوں کے علل و اسباب کی اگر تحلیل کی جائے تو آخری نتیجہ یہ نکلے گا کہ وہ دُنیا میں مختلف ضرورتوں کا محتاج ہے۔ وہ مختلف اغراض کا پابند ہے۔ اس کے دل کی

---

[1] سیرۃ النبی ج ۵ ص ۲۸۸ [2] افادات شیخ الہند ص ۳۵

کوئی جنبش اور اس کے عضو کی کوئی کشش ضرورت اور غرض سے خالی نہیں ہے۔ اخلاق جس کا ایک حد تک روحانیت سے تعلق ہے تحقیق کی جائے تو اس کی بنیاد بھی عموماً کسی ضرورت یا غرض نفسانی پر مبنی نظر آئے گی اس لیے ہماری ہر قسم کی بدبختیاں اور آلودگیاں صرف ایک ہی علت کا نتیجہ ہیں ا ضرورت اور غرض، اگر انسان ہر چیز سے بے نیاز ہو جائے تو وہ انسان نہیں فرشتہ ہے۔

قابل غور امر یہ ہے کہ انسان کی ضرورتوں اور اس کے مختلف اغراض و مقاصد کا جو ایک وسیع اور غیر متناہی سلسلہ نظر آتا ہے اس کی اصل حقیقت کتنی ہے ہمارے دلوں میں آرزوؤں کا ایک ڈھیر ہے تمناؤں کی ایک بھیڑ ہے اور خود ساختہ ضرورتوں کا ایک انبار ہے۔ لیکن کیا خوشنما کپڑوں، عالیشان عمارتوں، لذیذ غذاؤں اور تیز رفتار سواریوں کے بغیر ہم جی نہیں سکتے۔ فرزند و عیال، زر و مال اور خدم و حشم سے اگر ہمارے کاشانے خالی ہوں تو کیا ہماری زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا۔ بادشاہوں نے فقیروں کی زندگی بسر کی ہے اور زندہ رہے ہیں۔

خود ساختہ ضرورتوں کی نفی و تحلیل کے بعد شائد انسان کی حقیر ضرورتوں کا وسیع دائرہ ایک دو نقطوں میں محدود ہو کر رہ جاتے اور ما بہ قوت غذا یعنی کھانا اور پینا ہے جس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ روح اور جان کا جسم میں باقی رہنا صرف سدرمق پر موقوف ہے۔ اور سدرمق صرف کھانے کے چند لقموں اور پانی کے چند گھونٹوں پر موقوف ہے اور سچ یہ ہے کہ اس کے بعد کی تمام انسانی ضرورتوں کا مولد و منشا ان ہی چند لقموں اور چند گھونٹوں میں افراط، وسعت، تفنن اور تعیش کا نتیجہ ہے۔ اس بنا پر ایک انسان اور ایک فرشتہ یعنی عالم ناسوت اور عالم ملکوت کے دو باشندوں میں اگر فرق و امتیاز کی دیوار قائم کی جائے تو صرف یہی ایک چیز تمام فرق و امتیازات کو محیط ہو گی۔ انسان کے تمام جرائم اور گناہوں کی فہرست اگر تیار کی جاتے اور اس کی حرص و ہوس اور قتل و خونریزی کے آخری اسباب ڈھونڈے جائیں تو ان ہی دو چیزوں کے افراط و تعیش کی مزید طلب اس سلسلے کی آخری کڑی ہو گی۔

اس بنا پر دُنیا کے تمام مذاہب میں مادیات کی کثافتوں سے بری اور پاک ہونے کے لیے کھانے پینے سے ایک حد تک امتناع اور پرہیز سب سے پہلی شرط رکھی گئی ہے جس سے اصل مقصود یہ ہے کہ انسان رفتہ رفتہ اپنی ضرورتوں کا دائرہ کم کر دے اور آخر یہ کہ قوت و غذا کی طلب و حرص سے بے نیازی کے لیے متواتر کوشش جاری رکھے کہ انسانوں کے تمام جرائم اور گناہ اسی قوت کے نتائج ہیں۔ اگر یہ طلب اور ضرورت فنا ہو جائے تو ہم کو دفعتہً عالم ناسوت میں عالم ملکوت کی جھلک نظر آنے لگے۔ لیکن جب تک انسان انسان ہے اس کو غذا سے قطعی بے نیازی ہونا ناممکن ہے۔ اسی

وجہ سے تمام مذاہب نے اس سے اجتناب اور بے نیازی کی ایک مدت محدود کردی ہے۔ اس مدت کے اندر انسانوں کو ایسے تمام انسانی ضروریات سے جن سے استغنا کسی تھوڑے زمانے تک ممکن ہے مجتنب ہو کر تھوڑی دیر کے لیے ملاءِ اعلیٰ کی مقدس مخلوقات میں داخل ہو جانا چاہیے۔ اور چونکہ ان مخلوقات کا فرضِ زندگی محض اللہ کی اطاعت و عبادت ہے اس لیے انسان بھی حتیٰ الامکان اتنی دیر تک اپنی زندگی کا یہی فرض قرار دے۔

قرآن حکیم نے ان تمام حقائق کو صرف ایک لفظ تقویٰ سے بے نقاب کر دیا ہے۔ اور چونکہ روزے کی یہ حقیقت تمام سماوی مذاہب میں مشترک تھی اس لیے قرآن نے دیگر مذاہب کو بھی طنزاً اس میں شریک کر لیا ہے اور فرمایا کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم لعلکم تتقون۔

روزے کی غرض و غایت تقویٰ ہے یعنی اپنی خواہشوں کو قابو میں رکھنا اور جذبات کے تلاطم سے اپنے آپ کو بچا لینا۔ اس سے معلوم ہوا کہ روزہ ہمارے لیے ایک قسم کے روحانی علاج کے طور پر فرض ہوا ہے۔

۵۱۸۔ یہ چند مقررہ دنوں کے روزے ہیں۔ یعنی گنتی کے چند روز جو زیادہ نہیں ہیں اور اس سے رمضان کا مہینہ مراد ہے جیسا کہ آگے آرہا ہے[1] اس بلیغ انداز سے زمانہ صیام کی تخفیف کی طرف اشارہ کر دیا۔ جس سے سننے والے پر فوراً بوجھ نہ پڑ جاتے اور فرمایا کہ چند گنے ہوتے دن۔ ظاہر ہے کہ سال کے ۳۶۵ دنوں میں انتیس اور تیس دنوں کے روزے چند گنتی ہی کے دن ہوتے ہیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

عربی زبان سے ناواقف اگر یہ کہے کہ ایام جمع قلت ہے جو دس روز سے زیادہ کے لیے استعمال نہیں ہوتی تو اس کو چاہیے کہ ایام العرب کو جو تعداد میں سینکڑوں ہیں ان کو زیادہ سے زیادہ دس لڑائیوں میں محدود کر دے۔ اسی طرح قرآن میں جہاں دنیا کے ہزار ہا انقلابات کو ایام اللہ کہا ہے ان کو دس تک انقلابات عالم میں محدود کر دے۔ یمن سے شام تک سرسبز راستہ کو جو مہینوں میں طے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ نے احسان کے موقع پر چند دن اور چند راتیں فرمایا سیروا فیها لیالی و ایاما اور فی الایام الخالیہ میں ایام کا اطلاق قرآن نے پوری انسانی عمر پر کیا ہے۔ اور تلک الایام نداولها میں ایام کو زمانہ کے

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۲۵

برسوں اور صدیوں پر بولا ہے۔ دراصل جمع قلت اور کثرت کا یہ قاعدہ کلی نہیں بلکہ عمومی ہے۔ اور صرف ان الفاظ کے لیے جن کی جمع قلت اور کثرت دونوں استعمال ہوتی ہیں، ایام کا لفظ ان میں نہیں۔ اس کی صرف ایک ہی جمع آتی ہے اور وہ افعال کے وزن پر ایام ہے۔ سند کے لیے دیکھو رضی شرح کافیہ جلد دوم اور لسان العرب لفظ یوم [1]

معذورین کا روزہ

۵۱۹۔ لہذا جو تم میں سے بیمار ہو یا بحالت سفر ہو۔ یعنی اس مدتِ قلیل میں بھی اتنی سہولت اور آسانی ہے کہ جو بیمار ایسا ہو کہ روزہ نہ رکھ سکے یا مسافر ہو تو اس کو اختیار ہے کہ روزے نہ رکھے اور جتنے روزے کھائے اتنے ہی رمضان کے سوا اور دنوں میں روزے رکھ لے خواہ ایک ساتھ یا متفرق کرکے۔[2]

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حقیقت میں روزہ کا فریضہ ادا کرنے سے معذور ہوں جیسے بیمار اور مسافر ان کے لیے رخصت ہے کہ رمضان کے کسی روزہ یا پورے رمضان کے روزوں میں اگر کوئی سفر یا بیماری کے عذر کی بنا پر روزہ نہ رکھ سکے تو وہ اس عذر کے دفع ہونے کے بعد قضا روزے کو پورا کرے۔

بیمار کے دو معنے ہیں یا تو وہ فعلاً بیمار ہو یا یہ کہ کسی مسلمان متقی طبیب کا مشورہ ہو کہ اگر یہ شخص روزے رکھے گا تو بیمار ہو جائے گا۔ یا بار بار کے تجربوں کے بعد شخص کو خود غالب گمان ہو جائے کہ وہ اس سے بیمار ہو جاتا ہے تو اس کے لیے مناسب ہے کہ رمضان کا روزہ عذر کی موجودگی تک قضا کرے اور اس کے بجائے دوسرے مناسب موقع پر قضا رکھے۔

مسافر کا روزہ

سفر کے اندازے شریعت نے مقرر کر دیے ہیں یعنی سفر کی اتنی مقدار کہ جس میں روزے کا چھوڑنا جائز ہے۔ لیکن خود ان اندازوں میں زمانہ صحابہ ہی سے اختلاف ہے۔ عبداللہ ابن عباس، عبداللہ بن عمرو جیسے جلیل القدر صحابہ اور امام سفیان ثوری کا مذہب یہ ہے کہ شرعی سفر کا اطلاق تین دن کی مسافت والے سفر پر ہوتا ہے۔ احناف کا بھی یہی مسلک ہے۔ اگرچہ دوسرے ائمہ کے نزدیک دو روز بلکہ ایک روز کے سفر میں بھی افطار جائز ہے۔[3]

---

[1] سیرۃ النبی ص ۲۹۹ [2] افاداتِ شیخ الہند ص ۳۵ [3] ماجدی ص ۶۹

یہ تحدید کہ سفر کتنا ہو؟ قرآن کے الفاظ میں مذکور نہیں ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور صحابہ کے تعامل سے امام اعظم اور بہت سے فقہاء نے اس کی مقدار تین منزل یعنی وہ مسافت جس کو پیادہ مسافر بآسانی تین روز میں طے کر سکے قرار دی ہے اور بعد کے فقہاء نے میلوں کے حساب سے ۴۸ میل لکھے ہیں۔

دراصل تحدید مسافت کے موضوع پر یعنی سفر کی اس مسافت کے بارے میں جس میں مسافر نماز قصر کر سکے اور روزہ چھوڑ سکے علماء کا اختلاف ہے۔ اس کی تفصیلی بحث انشاء اللہ پانچویں پارے میں آئے گی۔

۵۲۰۔ جو لوگ روزہ رکھنے کی مشکل سے طاقت رکھتے ہوں تو ان کے لیے روزے کے بدلے ایک مسکین کا کھانا کھلانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ روزہ رکھنے کی طاقت تو رکھتے ہوں مگر ابتدا میں چونکہ رمضان کی بالکل عادت نہ تھی اس لیے ایک ماہ کامل پے درپے روزے رکھنا ان کو نہایت شاق تھا تو ان کے لیے یہ سہولت فرمائی گئی تھی کہ اگرچہ تم کو کوئی عذر مثل بیماری یا سفر کے پیش نہ ہو مگر صرف عادت نہ ہونے کی بنا پر روزہ تم کو دشوار ہو تو اب تم کو اختیار ہے چاہے روزہ رکھو چاہے روزے کے بدلے ایک مسکین کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلاؤ۔ کیونکہ جب اس نے ایک دن کا کھانا دوسرے کو دے دیا تو گویا اپنے آپ کو ایک دن کے کھانے سے روک لیا اور فی الجملہ روزے کی مشابہت ہو گئی پھر جب وہ لوگ روزے کے عادی ہو گئے تو یہ اجازت باقی نہ رہی جس کا بیان آئندہ آیت میں ہے۔ اور بعض اکابر نے طعام مسکین سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے۔ معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ فدیہ دینے کی طاقت رکھتے ہیں وہ ایک مسکین کے کھانے کی مقدار اس کو دے دیں جس کی مقدار شریعت میں گیہوں کا آدھا صاع اور جو کا پورا صاع ہے۔ تو اس معنے کے لحاظ سے یہ آیت منسوخ نہ ہو گی۔[1]

اس آیت کے یہ تکلف معنے بھی ہیں کہ جو لوگ مریض یا مسافر کی طرح روزہ رکھنے سے مجبور نہیں ہیں بلکہ روزہ رکھنے کی طاقت رکھتے ہیں مگر کسی وجہ سے دل نہیں چاہتا تو ان کے لیے بھی گنجائش یہ ہے کہ وہ روزے کے بجائے روزے کا فدیہ بصورت صدقہ ادا کریں۔ یہ حکم آغاز اسلام میں تھا جب لوگوں کو روزے کا خوگر کرنا مقصود تھا۔ اس کے بعد قرآنی حکم من شھد منکم الشھر فلیصمہ سے یہ حکم عام لوگوں کے حق میں منسوخ ہو گیا۔[2]

۲ھ ہجری میں رمضان کے روزوں کا حکم آیا مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۶ [2] معارف القرآن م ش ص ۲۸۹

کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہیں اور پھر بھی روزہ نہ رکھیں وہ ہر روز کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا اور یہ رعایت منسوخ ہو گئی [1]

دراصل اس آیت کی تفسیر و تاویل میں زمانہ صحابہ ہی سے اختلاف ہے۔

بعض صحابہ کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ اول رمضان سے پہلے چند روزے فرض ہوئے تھے ان روزوں کے متعلق یہ اجازت تھی کہ چاہے روزے رکھیں، چاہے روزے کے بجائے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔ رمضان کی فرضیت کے بعد یہ اجازت منسوخ ہو گئی۔

اکثر علماء محققین یہ کہتے ہیں کہ آیت میں نسخ ضرور ہوا ہے۔ عبداللہ بن عمرؓ سلمہ بن الاکوعؓ اور دیگر صحابہ سے بھی منقول ہے۔ بخاری و مسلم، ابوداؤد اور بیہقی کی روایات سے بھی یہی ظاہر ہے کہ آغاز اسلام میں لوگوں کو اختیار تھا کہ اگر روزوں کی ہمت ہو تو روزے رکھیں ورنہ روزے افطار کر لیں اور روزے کے بدلے میں فدیہ دے دیں۔ کچھ عرصہ بعد یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ حافظ بدرالدین عینی نے شرح بخاری میں اسی کو اختیار کیا ہے اور مشہور مفسر قرآن امام ابن جریر نے بروایت ابن ابی لیلیٰ اسی کا تذکرہ کیا ہے۔ صحیح بخاری اور اکثر کتب تفسیر میں بھی مذکور ہے۔ اس تفسیر کا خلاصہ یہ ہے کہ :

آیت کتب علیکم الصیام نازل ہوئی۔ اور اس سے رمضان کے روزے فرض ہوئے مگر مریض اور مسافر کو اجازت ہوئی کہ افطار کر لیں تو بعد میں اتنے ہی دن روزے رکھ لیں۔ اس پر صحابہ نے عرض کیا کہ ہم چونکہ روزوں کے عادی نہیں ہیں اگر نہ رکھ سکیں تو اس کی مکافات کیا ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ جو لوگ طاقت کے باوجود روزہ نہیں رکھتے وہ افطار کر لیں اور ایک فقیر کو کھانا دیں۔ اس کے بعد قرآن کی دوسری آیت سے یہ حکم منسوخ ہو گیا۔

علماء کی ایک جماعت کی رائے یہ ہے کہ یطیقونہ میں ضمیر صوم کی طرف نہیں بلکہ طعام کی طرف ہے، اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ فدیہ کی طاقت رکھتے ہوں وہ روزے کے ساتھ ایک مسکین کا کھانا بھی فدیۃً ادا کریں بعد کو یہ حکم منسوخ ہو گیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اس طعام مسکین کے فدیہ سے صدقۃ الفطر مراد لیا ہے جو رمضان کے بعد ہر مستطیع روزہ دار پر اپنی اور اپنی نابالغ اولاد کی طرف سے ادا کرتا ہے [2]

کچھ علماء کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم غیر منسوخ ہے اور اجازت ان لوگوں کے لیے ہے جو روزوں سے

---

[1] تفہیم القرآن ص، [2] الفوز الکبیر

معذور ہوں جیسے بڑھا اور حاملہ۔

اطاقۃ کی معنوی تحقیق

دراصل لفظ یطیقون کے لغوی معنے کی تحقیق نہیں کی گئی ہے۔ اطاقۃ کو وسعت کے معنے میں سمجھ لیا گیا اور یطیقون کا ترجمہ یوں کرتے ہیں کہ جو روزہ رکھ سکتے ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا دے دیں۔ بلاشبہ اس ترجمہ کے مطابق یا تو منسوخ کہنا پڑے گا اور یا آج کل بعض آزاد خیال لوگوں کی رائے کے مطابق یہ کہنا پڑے گا کہ

جو روزے کی طاقت رکھتے ہیں وہ بھی روزے کے بجائے فدیہ دے کر روزے سے بچ سکتے ہیں۔

حالانکہ یہ صریح غلط ہے۔ اس کا مطلب تو یہ ہوگا کہ غریب روزہ رکھیں اور امیر فدیہ دے کر مستثنیٰ ہو جائیں ایسی تفریق اسلامی فرائض میں کہیں روا نہیں رکھی گئی ہے اور اسلام کا تواتر عمل اس کے بالکل خلاف ہے۔ اور آیت فمن شهد منكم الشهر فليصمه کے سراسر منافی ہے۔

تحقیق یہ ہے کہ اطاقۃ کے معنے کسی کام کو مشکل کے ساتھ کر سکنے کے ہیں۔ اطاقۃ باب افعال سے مصدر ہے۔ اس کا ثلاثی مجرد کے مصدر سے فعل نہیں بنتا، فعل بنانے کے لیے باب افعال استعمال ہوتا ہے اور اطاقۃ کے معنے لسان العرب اور تاج العروس میں یہ لکھتے ہیں :

طوق کے معنے طاقت کے ہیں یعنی قوت کی انتہائی غایت کے اور وہ اس مقدار کا نام ہے جسے کوئی مشقت و مشکل سے کر سکے۔

طاقت کے اس معنے کی تائید خود قرآن پاک سے بھی ہوتی ہے۔

ربنا ولا تحملنا مالا طاقة لنا به خداوندا ہم پر وہ بوجھ نہ رکھ جس کی ہم کو طاقت نہیں ہے

جس کی ہم کو طاقت نہیں کے یہ معنے نہیں ہیں جس کی ہم کو وسعت نہیں یعنی جس کو ہم کر نہیں سکتے کیونکہ قرآن کی نص سے ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتا جس کو وہ کر ہی نہیں سکتا۔

لا يكلف الله نفسا الا وسعها۔

اس لیے ظاہر ہے کہ یہ دعا کرنے کہ اللہ ہم پر وہ بوجھ نہ ڈال جسے ہم اٹھا نہیں سکتے صحیح نہ ہوگی بلکہ اس دعا میں طاقت نہ ہونے کے معنے یہ ہیں کہ ہم جسے بمشکل اٹھا سکتے ہوں۔ اسی طرح طالوت کے لشکر کا یوں کہنا کہ

لا طاقة لنا اليوم بجالوت وجنوده آج ہم میں جالوت اور اس کی فوج کے مقابلے کی طاقت نہیں۔

اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ ہم مقابلہ ہی نہیں کر سکتے بلکہ یہ معنے ہیں کہ ہم بمشکل مقابلہ کر سکتے ہیں۔

حدیثوں سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ ابوداؤد میں ہے :

عن ابن جبیر عن ابن عباس وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین قال کانت رخصۃ للشیخ الکبیر والمراۃ الکبیرۃ وھما یطیقان الصیام ان یفطرا ویطعما مکان کل یوم مسکینا۔

ابن جبیر ابن عباس سے روایت کرتے ہیں کہ ان لوگوں پر جو مشکل سے روزہ رکھ سکتے ہیں ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے۔ فرمایا کہ یہ بوڑھے مرد اور عورت کے لیے اجازت ہے کہ دونوں بمشکل روزہ رکھ سکتے ہیں وہ روزہ نہ رکھیں اور ہر دن کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلائیں۔

اس حدیث میں ظاہر ہے کہ یطیقان الصیام کے معنے یہ نہیں ہو سکتے کہ جو روزہ نہیں رکھ سکتے کہ استطاعت کے ساتھ اجازت جمع نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اس کے معنے یہ ہیں کہ جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں، علامہ زمخشری جو لغتِ عربی میں مسلم امام ہیں فرماتے ہیں :

اور ہو سکتا ہے کہ یطیقونہ کے معنے یہ کیے جائیں کہ جو لوگ نہایت مشقت اور انتہائی محنت سے روزہ رکھ سکیں ہ[1]

سید انور شاہ نے مشکلات القرآن میں یطیقون کے اسی معنے کی طرف اشارا کیا ہے۔

اس بنا پر آیت کا ترجمہ یہ ہو گا کہ جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں وہ روزے کے بجائے ایک مسکین کا کھانا فدیۃً دے دیں۔

اب روزے کے سلسلے میں معذورین کی دو صورتیں ہوئیں۔

ایک یہ کہ عذر ہنگامی اور عارضی ہو جیسے مرض یا خوفِ مرض یا سفر تو ان کے لیے یہ آیت ہے۔

فمن کان منکم مریضاً او علی سفر فعدۃ من ایام اخر

یعنی بیماروں اور مسافروں کو بیماری اور سفر کی حالت میں روزہ نہ رکھنے کی رخصت ہے اور یہ چھوڑے ہوئے روزے دوسرے مناسب وقت پر قضا کریں۔ اسی میں حاملہ اور مرضعہ (دودھ پلانے والی عورت) بھی داخل ہو گئی۔ اگر حاملہ اور مرضعہ کو اپنی بیماری یا بچہ کی بیماری کا اندیشہ ہو تو وہ عذر کی موجودگی تک روزہ نہ رکھے اور اس عذر کے دُور ہو جانے پر قضا کرے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ وہ عذر دائمی ہو اور ناقابلِ ازالہ ہو جیسے کوئی دائم المرض ہو۔ بہت ہی کمزور ہو یا بہت بوڑھا شیخ فانی ہو جو بمشکل روزہ رکھ سکتا ہو تو وہ روزہ نہ رکھے اور ہر روزے کے بدلے ایک

---

[1] کشاف ج ۱ ص ۲۲۸

مسکین کو کھانا کھلاتے۔ اس کے لیے یہ آیت ہے۔

وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ طعام مسکین

۵۲۱۔ پھر اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے یعنی اگر ایک دن کے کھانے سے زیادہ ایک مسکین کو دے یا کئی مسکینوں کا پیٹ بھر دے تو سبحان اللہ بہت ہی بہتر ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ ایک سے زیادہ مسکین کو کھانا کھلاتے یا یہ کہ روزہ بھی رکھے اور مسکین کو کھانا بھی کھلاتے گویا اس قدر مقدار تو بہر حال واجب ہے۔ اب اگر اس میں کوئی زیادتی کرنا چاہے یعنی ایک شخص کے بجائے دو شخصوں کو کھلا دے، کھانے کی تعداد بڑھا دے، کھانے کی قسم بہتر کر دے، فدیہ کے ساتھ روزے کو بھی جمع کرلے تو اور ہی بہتر ہے۔ خیر، خیرات، فیاضی، سیر چشمی، حسن سلوک، حسن معاشرت کی تاکید تو اسلام میں ہمیشہ اور ہر حال میں موجود ہے لیکن رمضان کے مبارک مہینے میں اس کی اہمیت اور زیادہ ہے۔ چنانچہ ماہ مبارک کے ختم پر جو صدقۃ الفطر واجب بتایا گیا ہے وہ اسی سلسلے کی اہم کڑی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فیاضی و سخاوت میں اپنی مثال آپ تھے تاہم متعدد حدیثوں میں آتا ہے کہ اس ماہ مبارک میں آپ کا جوش کرم اور بڑھ جاتا تھا اور آپ فیاض سے فیاض تر ہو جاتے تھے[2]

۵۲۲۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو تو روزہ رکھنا تمہارے لیے بہتر ہے۔ یعنی اگر تمہیں روزے کی حکمت اور منافع معلوم ہے تو جان لو کہ روزہ رکھنا تمہارے لیے فدیہ دینے سے بہتر ہے اور روزہ رکھنے میں کوتاہی نہ کرو[3] کیونکہ روزہ میں خیر ہی خیر ہے۔ اس میں ارادے کی تربیت ہے اور اپنے آرام کو اللہ کی عبادت کے لیے قربان کرنا ہے۔ اور یہی عناصر اسلامی تربیت کے ناگزیر اجزا ہیں۔

عام مفسرین قرآن نے فمن تطوع کو فدیہ کے حکم کی تفریع قرار دیا ہے۔ لیکن جس شخص سے فرض ساقط ہو کر فدیہ کا مطالبہ کیا ہے اس کو یہ کہنا کہ فدیہ میں اور اضافہ کرو سمجھ میں نہیں آتا۔ اصل یہ ہے کہ یہ ایام معدودات پر تفریع ہے کہ صرف ان کے ہی روزوں پر اکتفا نہ کرو بلکہ اور روزے رکھو۔ کیونکہ روزہ تمہارے لیے خیر ہی خیر ہے۔ تمہاری انفرادی اور تمہارے اجتماعی تربیت کے اخلاقی و روحانی منافع اس میں موجود ہیں کیونکہ روح کے زندہ کرنے اور نفس و شہوات کو کچلنے میں روزے کا کوئی بدل نہیں ہے۔ حضرت ابو امامہ نے حضور انور سے کہا کہ مجھے ایسی بات بتا دیجئے جسے میں اپنا لوں، فرمایا بس روزہ رکھا کرو۔ اس کے مثل کوئی چیز نہیں (رواہ النسائی بسند صحیح) یہی وجہ ہے کہ ہر عمل کا اجر محدود ہے مگر روزے کا اجر غیر محدود ہے۔

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۶ [2] ماجدی ص ۶۹ [3] افادات شیخ الہند ص ۳۶

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِيْٓ اُنْزِلَ فِيْهِ الْقُرْاٰنُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَبَيِّنٰتٍ مِّنَ الْهُدٰى وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۭ وَمَنْ كَانَ مَرِيْضًا اَوْ عَلٰى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ اَيَّامٍ اُخَرَ ۭ يُرِيْدُ اللّٰهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيْدُ بِكُمُ الْعُسْرَ ۡ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰىكُمْ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ﴿۱۸۵﴾

یہ رمضان[۴۲۲] کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا۔ وہ انسانوں کے لیے رہنما ہے اور اس میں ہدایت اور حق و باطل کو جدا کر دینے کی روشن صداقتیں ہیں لہٰذا تم میں[۴۲۳] سے جو[۴۲۴] شخص اس ماہ کو پاتے اُسے چاہیے کہ اس ماہ کے روزے رکھے اور جو شخص بیمار[۴۲۵] ہو یا مسافر ہو تو اس کے لیے حکم[۴۲۶] یہ ہے کہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے سختی اور تنگی نہیں چاہتا۔ تمہیں یہ طریقہ اس لیے بتایا جا رہا ہے کہ تم روزوں[۴۲۷] کی تعداد پوری کر لو اور اس[۴۲۸] لیے بھی کہ جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے اس پر اللہ کی بڑائی کا اعلان کرو نیز اس لیے کہ اس کے انعامات کو کام میں لا کر اُس کے شکر گزار بنو۔

ایام روزہ کی تحدید

روزہ روحانی بیماری کا علاج اور دوا ہے اور دوا کو بقدر دوا ہی ہونا چاہیے۔ اگر پورا سال اس دوا میں صرف کر دیا جاتا تو یہ ایک غیر طبعی علاج ہوتا اور اہل ایمان کی جسمانی جدوجہد کا خاتمہ ہو جاتا اور ان کی شگفتگی مزاج مٹ جاتی جو عبادت کا اثر قبول کرتی ہے۔ اور اگر ایک روز کا تنگ اور محدود دائرہ رکھا جاتا تو یہ اتنی کم مدت ہوتی کہ اس میں دوا کا فائدہ بھی ظاہر نہ ہوتا اس لیے قرآن نے روزے کے لیے سال کے ۱۲ مہینوں میں سے صرف ایک مہینہ کا زمانہ مقرر کیا۔ اس ایک مہینہ کے لیے تخصیص کی ضرورت تھی تاکہ تمام افرادِ امت بیک وقت اس فرض کو ادا کر کے اسلام کے نظام وحدت کا مظاہرہ کریں اور اس کے لیے وہ ہی زمانہ موزوں تھا جس میں خود قرآن نازل ہونا شروع ہوا یعنی رمضان۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے ہمیشہ یہ مہینہ روزے میں گزارا۔ اور آج تک کل امت محمدیہ پوری دُنیا میں اسی کو ماہ صیام مانتی ہے اور پورے مہینہ بھر روزے رکھتی ہے چونکہ روزہ بہرحال مشقت کی چیز ہے اس لیے قرآن میں ماہ رمضان کے روزوں کی تحدید اور فرضیت نہایت بلاغت کے ساتھ تدریجی طور پر کی گئی ہے تاکہ نفس انسانی آہستہ آہستہ اس اہم ذمہ داری کو اٹھانے کے قابل ہو جائے۔ اولاً زمانہ کی تخصیص کے بغیر کہا گیا کتب علیکم الصیام۔ اس کے بعد تسلی دی گئی کہ یہ تم پر ہی اکیلے فرض نہیں کیے گئے بلکہ کما کتب علی الذین من قبلکم۔ اب بھی مدت نہیں بتائی گئی۔ اس کے بعد فرمایا کہ ایاماً معدودات (گنتی کے دن) مدت کی تعیین کو اب بھی ظاہر نہیں فرمایا۔ البتہ اس بلیغ انداز میں زمانہ صیام کی تخفیف کا ذکر کیا گیا جس سے سننے والوں پر فوراً بوجھ نہ پڑے اور فرمایا کہ چند گنتی کے دن۔ اس کے بعد روزوں کی استثنیٰ کا ذکر شروع کیا تاکہ طبیعتیں متوجہ ہوں یعنی مسافر اور مریض کو رخصت دی گئی۔ اس انداز بیان سے معلوم ہو گیا کہ یہ روزے کسی ایک خاص زمانہ میں فرض ہوں گے۔ اگر روزوں کا زمانہ خاص نہ ہوتا تو یہ کہنا بیکار ہوتا کہ اگر تم بیمار یا مسافر ہو تو دوسرے دنوں میں رکھو۔ نیز یہ بھی پتہ چل گیا کہ جو دن ہوں گے وہ گنے ہوئے اور مقرر ہوں گے ورنہ ایاماً معدودات پھر عدۃ من ایام اخر اور آگے چل کر لتکملوا العدۃ (ان گنتی پوری کرلو) نہ فرمایا جاتا۔ بعد ازیں دوسری رعایت کا اعلان کیا کہ جو بمشکل روزہ رکھ سکتے ہوں یعنی دائمی بیماری کے شکار ہوں وہ ایک مسکین کا کھانا فدیہ دے دیں۔ پھر کہا جا رہا ہے کہ اس اجازت کے باوجود بھی ان تصوموا خیر لکم روزہ رکھنا ہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ اس قدر طویل تمہید کے بعد روزے کے گنے ہوئے دنوں کی تعیین کی جاتی ہے کہ وہ ایک مہینہ ہے اور رمضان کا مہینہ ہے۔

اب بھی روزہ رکھنے کا حکم دینے سے پہلے رمضان کی عظمت اور اہمیت بتائی گئی۔

رمضان کی عظمت و اہمیت

۵۲۳۔ یہ رمضان کا مہینہ ہے جس میں قرآن نازل ہوا... الخ۔ حدیث میں آیا ہے کہ صحف ابراہیم اور تورات و انجیل کا نزول رمضان ہی میں ہوا ہے۔ اور قرآن حکیم بھی رمضان کی چوبیسویں رات میں لوح محفوظ سے اول آسمان پر سب ایک ساتھ بھیجا گیا۔ پھر تھوڑا تھوڑا کرکے مناسب احوال میں آپ پر نازل ہوتا رہا اور ہر رمضان میں حضرت جبریل علیہ السلام قرآن نازل شدہ آپ کو مکرر سناتے جاتے۔ ان سب حالات سے رمضان کی فضیلت اور قرآن مجید کے ساتھ اس کی مناسبت اور خصوصیت خوب ظاہر ہوگئی۔ اس لیے اس مہینے میں تراویح مقرر ہوئی لہٰذا قرآن کی خدمت اس مہینے میں خوب اہتمام سے کرنی چاہیے کہ اسی واسطے مقرر اور معین ہوا ہے[1]

قرآن اور صیام میں مناسبت

مناسبت یہ ہے کہ چونکہ اس ماہ میں اللہ سبحانہ کا وہ کلام معجز نازل ہوا جس کے انوار و تجلیات اور خیرات و برکات کی کوئی حد اور نہایت نہیں ہے۔ محبین و عاشقین دنیا میں اللہ کے دیدار سے محروم ہیں لیکن اس کے کلام سے دل کو تسلی دے لیتے ہیں کہ کلام کے پردے سے کچھ اس کا جلوہ نظر آجاتا ہے۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل　　　　ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

بہرحال ماہ رمضان عجب مبارک مہینہ ہے جس میں اللہ کا کلام نازل ہوا اور اللہ کی کتاب اتری جو ایک نعمت کبریٰ اور منت عظمیٰ ہے، لہٰذا اس عظیم الشان نعمت کے شکریہ میں کوئی خاص عبادت اس مہینے میں مقرر ہونی چاہیے جو کلام الٰہی کے مناسب ہو سو وہ روزہ ہے جو روزہ دار کو ترک طعام و شراب اور ترک لذات کی وجہ سے فرشتوں کے قریب بنا دیتا ہے اور قلب میں کلام خداوندی کے اسرار و تجلیات کے قبول کرنے کی صلاحیت پیدا کر دیتا ہے۔

امام ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ رمضان کا پورا مہینہ نہایت مبارک ہے مگر وہ انوار و برکات کہ جو اس کے دنوں سے وابستہ ہیں وہ اور ہیں اور جو خیرات و برکات اس مہینہ کی راتوں سے متعلق ہیں وہ اور ہیں۔ اور ممکن ہے کہ اسی وجہ سے یہ حکم ہوا ہو کہ افطار میں جلدی اور سحری میں تاخیر کریں۔ تاکہ دونوں وقتوں میں پورا امتیاز حاصل ہو جائے اور جس طرح قرآن حکیم خداوند ذوالجلال کے کمالات ذاتیہ

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۶

اور شئون صفاتیہ کا مظہر اتم ہے۔ اسی طرح ماہِ رمضان حق تعالیٰ کی خیرات و برکات کا مظہر اتم ہے۔ اس مہینے میں جو خیر و برکت بھی نازل ہوتی ہے وہ براہ راست عزت سے فائض ہوتی ہے۔ قرآن حکیم کی طرح یہ مہینہ بھی اپنی نوع میں حقیقت جامعہ ہے۔ اسی مناسبت سے اس مہینے میں قرآن مجید نازل ہوا[1]

رمضان کی حقیقت

ہمیں چاہیے کہ معاملہ کے اس پہلو پر بھی ایک نظر ڈال لیں۔

بلاشبہ یہ مادی عالم جس طرح مادی نظام اور قانون کا پابند ہے اسی طرح عالم روحانی میں اللہ سبحانہٗ نے اسی قسم کا ایک اور نظام قانون اور علل و اسباب کا سلسلہ بھی قائم کر رکھا ہے جس یقین کے ساتھ ہم یہ دعویٰ کر سکتے ہیں کہ زہر انسان کے لیے قاتل ہے۔ اسی یقین کے ساتھ طبیب روحانی کا واقف کار کہتا ہے کہ گناہ انسان کی رُوح کو قتل کر دیتا ہے۔ نبی میں فیضان وحی قبول کرنے کے لیے کس طرح استعداد پیدا کی جاتی ہے۔ دُنیا میں کب مبعوث ہوتا ہے۔ معجزات کا ظہور اس سے کن اوقات میں ہوتا ہے۔ اور اپنے دعوے کو وہ کس طرح پیش کرتا ہے۔ انکار و مزاحمت پر وہ مہاجرت الی اللہ کیوں کر کرتا ہے۔ اور پھر کیوں کر دعوت کے مُنکر ناکام و خاسر اور اہلِ ایمان فلاح یاب اور کامیاب ہوتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک چیز مرتب اور منتظم قواعد کے مطابق بترتیب ظہور میں آتی ہے۔ قرآن حکیم میں تیرہ مقام پر "سنۃ اللہ" کا لفظ آیا ہے لیکن ان میں زیادہ تر اسی روحانی نظام و ترتیب کی طرف اشارہ ہے۔

فلسفہ تاریخ میں جس طرح سیاسی واقعات کی تکرار اور حوادث کے بار بار اعادے سے اصُول و نتائج تک پہنچ کر ایک عام تاریخی قانون بنا لیا جاتا ہے۔ بعینہٖ اسی طرح انبیاء علیہم السلام کے سوانح اور تاریخیں بھی اپنے واقعات کے بار بار کے اعادے سے خصائصِ نبوّت کا اُصول و قانون ہمارے لیے مرتب کرتی ہیں۔

پیغمبرانہ تاریخ کے ان ہی اصُول و قوانین میں سے ایک یہ ہے کہ نبی میں جب کمال انسانیت کو پہنچ کر فیضانِ نبوّت کے قبول کی استعداد اللہ کی جانب پیدا ہونے کا وقت آتا ہے تو نبی ایک مدت کے لیے عالم انسانی سے الگ ہو کر ملکوتی خصائص میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اسی وقت سے اس کے دل کی انغ

---

[1] معارف قرآن م ا ص

میں وحی الٰہی کا سرچشمہ موجیں مارنے لگتا ہے۔ کوہ سینا کا پر جلال پیغمبر حضرت موسیٰ جب تورات لینے جاتا ہے[1] تو چالیس شبانہ روز بھوکا پیاسا رہتا ہے۔ کوہ سعیر کا مقدس آنے والا حضرت عیسیٰ[2] اس سے پہلے کہ اس کے منہ سے انجیل کی زبان گویا ہو۔ وہ چالیس روز و شب بھوکا اور پیاسا رہتا ہے۔

اسی طرح فاران سے آتشیں شریعت لانے والا پیغمبر جناب رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نزول قرآن سے پہلے پورے ایک ماہ حرا نامی مکہ کے ایک غار میں ہر قسم کی عبادتوں میں معروف رہتا تھا۔ بالآخر اسی اثنا میں ناموس اکبر اقرا باسم ربک کا مژدہ لے کر نمودار ہوتا ہے[3]

یہ واقعہ کس ماہ مبارک میں پیش آیا ہے۔ قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ یہ رمضان کا مبارک ماہ تھا۔ یہ کس شب کی داستان ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ایک برکت والی رات کی بات ہے۔ انزلناہ فی لیلۃ مبارکۃ اس مبارک رات کو ہم کس نام سے جانتے ہیں قرآن کہتا ہے کہ اس کا نام لیلۃ القدر ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ رمضان وہ مقدس مہینہ ہے جس میں قرآن سب سے پہلی بار دنیا میں نازل ہوا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پورے عالم کی رہنمائی اور انسانوں کی دستگیری کے لیے دستور نامہ الٰہی کا سب سے پہلا صفحہ عنایت کیا گیا۔ قرآن کا حامل اور اس وحی الٰہی کا مہبط ان دنوں ایک غار کے کونے میں یکہ و تنہا بھوکا اور پیاسا تھا سر بزانو تھا۔ اس بنا پر اس ماہ مقدس میں بھوکا پیاسا رہنا کسی عبادت گاہ میں یکہ و تنہا رہنا۔ راتوں کو بیدار رہنا اور نزول وحی کی رات میں سربسجود رہنا تمام پیروان رسالت محمدیہ کے لیے ضروری ہو گیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ روزہ، تراویح، لیلۃ القدر اور اعتکاف کی حقیقت اسلام میں کیا ہے اور رمضان مبارک میں روزوں کی تخصیص اسلام میں کس بنا پر ہے[5]

اب وہ موقع آیا ہے کہ بتایا جائے کہ چند گنتی کے دنوں کی تعیین و تحدید رمضان کا مہینہ ہے۔

---

[1] خروج ۳۴ - ۲۸ [2] انجیل متی ۴ - ۲

[3] صحیح بخاری بدء الوحی، ایک ماہ کا بیان صحیح مسلم باب نزول وحی اور سیرۃ ابن ہشام باب بدء البعثت میں ہے

[4] بخاری اور سیرۃ ابن ہشام سے واضح ہے کہ آپ ان دنوں میں تحنث اور اعتکاف کرتے تھے۔ اعتکاف کا ایک جز روزہ ہے آج کل کے بعض مصنفین نے بھی ان قرائن سے یہی سمجھا ہے کہ آپ ان دنوں روزہ رکھتے تھے۔ دیکھو التشریع الاسلامی۔

[5] سیرۃ النبی ج ۵ ص

رمضان سنہ قمری کے نویں مہینے کا نام ہے۔ اسلام نے قمری مہینوں کو قانونی حیثیت دی ہے اور حسابات میں اسی تقویم سے کام لیا ہے۔ قمری مہینے چونکہ مختلف موسموں میں ادل بدل کر آتے رہتے ہیں مسلمان روزے دار بھی اسی گردش سے ہلکی گرمی، ہلکی سردی، شدید گرمی اور شدید سردی، خشک و تر ہر موسم میں بھوک و پیاس کے ضبط و تحمل کا خوگر ہو جاتا ہے۔ روزوں کی تعداد تو قرآن نے مقرر کر دی ہے زمانہ بھی ایک متعین و مقرر ہے۔ یہ نہیں کہ محض تعداد جس کا جب جی چاہے پوری کرے۔ انفرادی اصلاح تو شاید حسب مرضی روزوں سے بھی ہو جاتی لیکن اجتماعی منافع و مصالح کے لیے تعداد کی تعیین بھی ضروری تھی۔ وحدت اُمت کے لیے ضروری تھا کہ عرب، چین، مصر و ہندوستان، فرانس و جاپان، حبش و اسٹریلیا، افغانستان و کینیڈا، سائبیریا و میکسیکو، برطانیہ اور اسٹریا غرض ساری زمین پر آبادی جہاں کہیں بھی ہو سب ایک ہی وقت میں روحانیت کی اس سالانہ پریڈ میں شریک ہوں۔ علم الاجتماع کے مبصرین جانتے ہیں کہ وحدت اُمت اور تنظیم ملت میں کتنا زیادہ دخل اس ہم وقتی یا وقت کی اس ہم آہنگی کو ہوتا ہے [1]

۵۲۴- لہٰذا تم میں سے جو شخص اس مہینے کو پالے اسے چاہیے کہ اس ماہ کے روزے رکھے یعنی جب اس ماہ مبارک کے فضائل مخصوصہ عظیمہ تم کو معلوم ہو چکے تو اب جس کسی کو یہ مہینہ ملے اس کو روزہ ضرور رکھنا چاہیے [2]

اس آیت میں چند باتیں اور تشریح طلب ہیں۔

۱- عربی زبان کا محاورہ یہ ہے کہ جو ظرف زمان ترکیب نحوی میں اپنے فعل کا مفعول فیہ ہوتا ہے وہ فعل اس ظرف زماں کو محیط ہوتا ہے۔ مثلاً اگر یہ کہنا ہو کہ اس نے پورے مہینے روزے رکھے تو کہیں گے صام شھراً۔ اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اس نے مہینے میں چند روزے رکھے بلکہ معنے یہ ہیں کہ پورے ماہ روزے رکھے۔ اور اگر یوں کہنا ہو کہ اس نے سال بھر روزے رکھے تو عربی میں کہیں گے صام سنۃً۔ اس سے یہ معلوم ہوا کہ اس آیت میں قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ پورے رمضان روزے رکھے جائیں اور چونکہ لفظ شہر بولا ہے اس لیے مہینہ کے شروع سے ان روزوں کا آغاز اور مہینے کے ختم پر ان کا خاتمہ ہوگا۔

۲- لفظ شہد کے معنے کسی مقام یا زمانہ میں موجود یا حاضر رہنے کے ہیں۔ اسی سے شہادت اور

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۶۹ [2] افادات شیخ الہند ص ۳۶

شاہد کے معانی نکلے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ روزے اسی پر فرض ہیں جو اس ماہِ رمضان میں موجود اور حاضر ہو۔ ماہِ رمضان میں غیر حاضر اور غیر موجود ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ ماہِ رمضان آئے اور شخص غیر حاضر ہو یعنی اس دُنیا میں موجود نہ ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ شخص موجود ہو مگر رمضان کا وہاں گزر نہ ہو۔ یہ صورت ان علاقوں میں درپیش آئے گی جہاں شب و روز کا وہ نظام موجود نہیں ہے جو باقی متمدن دُنیا میں ہے مثلاً جن مقامات پر کئی مہینوں کے دن اور کئی مہینوں کی راتیں ہوتی ہیں وہاں رمضان کی آمد کا سوال نہیں ہے۔

اس کا مقتضا یہ ہے کہ ان پر روزے فرض ہی نہ ہوں۔ فقہائے احناف میں سے حلوانی اور بقالی وغیرہ نماز کے متعلق تو اسی پر فتویٰ دیا ہے کہ ان لوگوں پر اپنے ہی دن رات کے اعتبار سے نماز کا حکم عائد ہوگا۔ اسی بنیاد پر اگر کہا جائے کہ جہاں چھ مہینے میں صرف پانچ نمازیں ہوں گے رمضان وہاں نہیں آئے گا اس لیے روزے بھی وہاں فرض نہ ہوں گے۔ حضرت حکیم الامت تھانوی نے امداد الفتاوی میں روزے کے بارے میں اسی کو اختیار فرمایا ہے۔[1]

رمضان اور تراویح کا ربط

۳- اس آیت کا اسلوب صاف کہہ رہا ہے کہ رمضان کے سلسلے میں قرآن اور صاف کا اس اہمیت کے ساتھ تذکرہ اپنے اندر ایک خاص معنویت رکھتا ہے۔

قرآن نے رمضان کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے اس پر اور خود قرآن کے متعلق جو کچھ کہا گیا اس پر بحیثیتِ مجموعی اگر نظر ڈالی جائے تو حسبِ ذیل اُمور سامنے آتے ہیں:

اولاً: رمضان عرب کے رائج مہینوں میں سے ایک مخصوص مہینہ کا نام ہے۔

ثانیاً: اس ماہ میں قرآن کا نزول شروع ہوا ہے۔

ثالثاً: اس ماہِ رمضان میں جو شخص حاضر اور موجود ہے اس پر روزہ فرض ہے۔

قرآن کے متعلق قرآن نے اسی آیت میں جو کچھ بتایا ہے یہ ہے

اولاً: قرآن اللہ کی جانب سے نازل شدہ کتاب ہے۔

ثانیاً: قرآن کا نزول رمضان کے مہینے میں شروع ہوا ہے اور دوسری جگہ بتایا ہے کہ قرآن کا نزول لیلۃ مبارکہ میں ہوا ہے۔ اور ایک اور جگہ بتایا ہے کہ جس رات میں قرآن کا نزول ہوا ہے وہ لیلۃ القدر ہے۔

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۳۹۳

ثالثاً: قرآن انسانوں کو سعادت اور نجات کی راہ بتانے آیا ہے۔
رابعاً: قرآن ہدایت کی روشن صداقتیں رکھتا ہے۔
خامساً: قرآن حق کو باطل سے ممتاز کرنے آیا ہے۔

رمضان کے تذکرے میں قرآن کے ان اوصاف پر جو بھی نظر ڈالے گا وہ بلاشبہ پکار اُٹھے گا کہ اسلوبِ بیان کا تقاضا یہ ہے کہ حکم یہ دیا جائے کہ جو شخص تم میں سے رمضان کو پائے اُسے چاہیے کہ دن میں صیام اور رات کو قیام کرے۔ اوروں کا پتہ نہیں ہے مگر میرا ذوق یہی کہتا ہے کہ قرآن کے اسی اندازِ بیان سے نبوت کو قیامِ رمضان کے فرض ہونے کا اندیشہ ہوا تھا۔ زید بن ثابت کا وہ بیان غور سے پڑھئے جو صحیحین کے علاوہ حدیث کی متعدد کتابوں میں موجود ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان میں مسجد میں چٹائی کا ایک کمرہ بنایا۔ اس میں آپ نے کچھ راتیں نماز پڑھی۔ لوگوں کا ہجوم ہو گیا۔ پھر ایک رات اچانک کمرہ کے اندر سے آواز آئی۔ لوگوں نے خیال کیا کہ آنحضرت محوِ استراحت ہیں۔ کچھ نے اس مقصد کی خاطر کہ آپ باہر تشریف لائیں کھنگارنا شروع کیا۔ صبح کو آپ نے فرمایا جو کچھ تم کر رہے تھے میں دیکھ رہا تھا لیکن اس کے باوجود میں نہیں آیا۔ وجہ یہ ہے کہ مجھے یہ اندیشہ ہو گیا کہ کہیں تم پر یہ فرض نہ ہو جائے اور فرض ہونے کی صورت میں تم اسے نباہ نہ سکو۔ لہٰذا لوگو! اپنے گھروں میں نماز پڑھا کرو فرض نماز کے علاوہ دوسری نمازیں گھر ہی میں بہتر ہیں۔[1]

اس فقرے کو بار بار پڑھئے کہ مجھے فرضیت کا اندیشہ ہو گیا یعنی یہ اندیشہ ہو گیا کہ کہیں تم پر قیامِ رمضان فرض ہو جائے۔ اور سوچئے کہ اس اندیشہ کا اس کے علاوہ پسِ منظر کیا ہے کہ قرآن کے بلیغانہ اندازِ بیان سے زبانِ وحی پر آئی ہوئی بات نبوت نے سمجھ لی۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانی کو اندیشہ فرضیت پر فتح الباری میں بڑی حیرت ہوئی ہے اور یہ سوال قائم کر کے کہ نمازوں کے پانچ ہونے کے بارے میں اعلانِ فرضیت کے بعد نبوت کو یہ اندیشہ کیوں ہوا ہے؟ تین جوابات لیے ہیں۔ ان میں سے ان کے خیال میں بہتر اور عمدہ جواب یہی ہے کہ آپ کو رمضان کی راتوں میں تہجد کی نماز کی فرضیت کا اندیشہ تھا۔ لیکن حافظ صاحب نے یہ نہیں بتایا کہ یہ اندیشہ پیدا کیوں ہوا۔ اس کا پسِ منظر کیا تھا؟ دراصل وحی کا اندازِ بیان ہی ایسا تھا جس سے نبوت کو قیامِ رمضان کے بارے میں

---

[1] مصابیح السنہ ص ۸۰

منشاء ربانی کو سمجھ لیا اور اسی کے لیے اندیشہ فرضیت کی تعبیر اختیار فرمائی۔ آیت قرآنی کے بلیغ اسلوب کو پیش نظر رکھ کر تراویح یا قیام رمضان کے سارے پہلوؤں پر نظر ڈالو ہر بات اس طرح واضح ہو جاتی ہے گویا تمام تاویل کے کھونے کے لیے صرف ایک چابی کا انتظار تھا مجھے تم پر قیام رمضان کی فرضیت کا اندیشہ ہو گیا، کا منشا بھی صاف معلوم ہو گیا۔ کسی دور از کار توجیہ کی ضرورت پیش نہیں آئی کیونکہ اس نوع کا انداز بیان ہی تاثر دیتا ہے کہ قیام رمضان فرض ہونا چاہیے اور رمضان کو قرآن کی سالگرہ ہونا چاہیے۔ اور حضرت ابوہریرہ کے اس بیان

ارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قیام رمضان کی ترغیب دیتے تھے مگر پختگی کے ساتھ حکم نہ دیتے تھے' کی علت بھی سمجھ میں آگئی اور وہ تمام بے معنی توجیہیں غیر ضروری ہو گئیں جن پر علماء یمانی مجبور ہوئے۔ اس تشریح کے بعد اس سوال کا جواب بھی خود بخود مل گیا کہ قرآن نے رمضان کے سلسلے میں خصوصیت کے ساتھ یہ بات کیوں بیان کی کہ نزول قرآن رمضان میں ہوا ہے اور کیوں قرآن کے متعدد اوصاف کا تذکرہ کیا۔ یہ دراصل قیام رمضان کے لیے اللہ سبحانہ کی جانب سے درپردہ ترغیب تھی جسے حضور انور نے اپنی خداداد نگاہ نبوت سے دیکھ لیا۔ یعنی چونکہ منشاء قرآن یہ بتانا تھا کہ رمضان کے دنوں میں روزہ رکھا جائے اور راتوں میں قرآن کی تلاوت کے ذریعے عابدانہ سرشاریوں کا مظاہرہ کیا جائے اس لیے یہ انداز بیان قرآن نے اختیار فرمایا۔

صحابہ میں فاروق اعظم نے اندیشہ فرضیت کا زمانہ ختم ہونے کے بعد منشاء نبوت کی تکمیل فرمادی۔ قیام لیل کا پورا انتظام اُمت کے سامنے پیش کر دیا۔ تراویح کی نماز با جماعت کا قیام، جماعت کا مساجد میں تمام قرآن کے قاریوں کا انتظام، نماز عشا کے بعد تراویح کی ادائیگی، تراویح کی رکعات کی تعداد، تراویح کے بعد با جماعت وتروں کا اہتمام۔ یہ سب کچھ فاروق اعظم کا ساختہ و پرداختہ ہے اور پوری جماعت صحابہ نے اسے بلانکیر قبول کیا ہے۔

آئیے اب آخر میں حضرت شاہ عبدالقادر کی زبانی ساری تفصیل کا خلاصہ سن لیجئے۔ فرماتے ہیں کہ رمضان کا ماہ اسی سے ٹھہرا کہ اس میں قرآن اترا۔ بس قرآن کی خدمت اس مہینے میں اول چاہیے۔ اسی سبب سے رسول خدا نے تقید کیا تراویح کا۔ آپ نے چند روز جماعت کرائے پھر نہ کرائی۔ قرآن میں اشارات ہیں صریح فرض نہ ہو جائے۔ (موضح القرآن)

۵۲۵ ۔ اور جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا مسافر ہو تو اس کے لیے حکم یہ ہے کہ دوسرے دنوں میں تعداد پوری کرے۔ سابقہ حکم عام سے یہ سمجھ میں آتا تھا کہ شاید مسافر اور مریض کو بھی افطار و قضا کی اجازت نہیں ہے

اور جیسے روزے کی طاقت رکھنے والوں کو اب افطار کی ممانعت کردی گئی ایسی ہی مسافر اور مریض کو بھی ممانعت ہوگئی۔ اس لیے مریض و مسافر کے بارے میں تصریح کردی کہ ان کو رمضان میں افطار کرنے اور دوسرے دنوں میں ان کی قضا کر دینے کی اجازت ہے[1]۔ اور ظاہر ہے جب ہنگامی اور عارضی عذر والوں کو افطار کی اجازت ہے تو جو دائمی عذر رکھتے ہوں اور عذر ناقابل ازالہ ہو جیسے کوئی دائم المرض ہو بہت ہی کمزور ہو یا بہت بوڑھا ہو تو ان کا وہی حکم ہے کہ ہر روزے کے بدلے فدیہ دے دے۔ اس آیت کو دوبارہ اس لیے لائے ہیں کہ من شھد منکم الشھر کے عموم سے کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ معذوروں سے بھی رعایت ختم ہوگئی اس لیے یہ تکرار حقیقی نہیں بلکہ صرف صوری اور ظاہری ہے[2]۔

سفر کی حالت میں روزہ رکھنا نہ رکھنا آدمی کے اختیارِ تمیزی پر چھوڑ دیا گیا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ جو صحابہ سفر میں جایا کرتے تھے ان میں سے کوئی روزہ رکھتا تھا اور کوئی نہ رکھتا تھا۔ اور دونوں میں سے کوئی ایک دوسرے پر اعتراض نہ کرتا تھا۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی کبھی سفر میں روزہ رکھا ہے اور کبھی نہیں رکھا ہے۔ یہ امر متفق علیہ ہے کہ جس روز آدمی سفر کی ابتدا کر رہا ہو اس دن کا روزہ افطار کر لینے کا اسے اختیار ہے۔ چاہے تو گھر سے کھانا کھا کر چلے اور چاہے گھر سے نکلتے ہی کھالے۔ دونوں عمل صحابہ سے ثابت ہیں۔

جنگی مہم میں فوجیوں کے لیے روزہ

یہ امر کہ اگر کسی شہر پر دشمن کا حملہ ہو تو کیا فوجی مقیم ہونے کے باوجود جہاد کی خاطر روزہ چھوڑ سکتے ہیں علماء کے درمیان اختلافی ہے۔ بعض علماء اس کی اجازت نہیں دیتے مگر حافظ ابن تیمیہ نے نہایت قوی دلائل سے فتویٰ دیا ہے کہ ایسا کرنا بالکل جائز ہے۔ اور اگر فوجی مہم پر ہوں اور مقیم نہیں بلکہ مسافر ہوں تو سب کے نزدیک چھوڑنا جائز ہے۔ حضرت عمرؓ کا بیان ہے کہ ہم دو مرتبہ رمضان میں حضور کے ہمراہ جنگ میں گئے۔ پہلی مرتبہ بدر میں اور آخری بار فتح مکہ کے موقع پر اور دونوں بار ہم نے روزے نہیں رکھے۔ عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ فتح مکہ کے موقع پر حضور نے فرمایا تھا کہ انہ یوم قتال فافطروا دوسری روایت میں یہ الفاظ ہیں انکم قد دنوتم من عدوکم فافطروا۔ یعنی دشمن سے مقابلہ درپیش ہے روزے چھوڑ دو[3]۔

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۹ [2] ماجدی ص ۰۷ [3] تفہیم القرآن ص ۱۴۲

۵۲۶ — اللہ تمہارے لیے آسانی چاہتا ہے سختی اور تنگی نہیں چاہتا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو اول رمضان میں حکم فرمایا اور بوجہ عذر بیماری یا سفر کے افطار کرنے کی اجازت دی اور دیگر اوقات میں ان دنوں کی شمار کی برابر روزوں کا قضا کرنا تم پر پھر واجب فرمایا۔ ایک ساتھ ہونے یا متفرق ہونے کی ضرورت نہیں تو اس میں اس کا لحاظ ہے کہ تم پر سہولت ہو دشواری نہ ہو۔ اور یہ بھی منظور ہے کہ تم اپنے روزوں کی شمار پوری کر لیا کرو ثواب میں کمی نہ آ جائے۔ اور یہ بھی مد نظر ہے کہ تم اس طرح سراسر ہدایت خیر پر اپنے اللہ کی ثنائی بیان کیا کرو اور اس کو بزرگی سے یاد کیا کرو اور یہ بھی مطلوب ہے کہ ان نعمتوں پر شکر کرکے شکر کرنے والوں کی جماعت میں داخل ہو جاؤ۔ سبحان اللہ روزے جیسی مفید عبادت ہم پر واجب فرمائی اور مشقت اور تکلیف کی حالت میں سہولت بھی فرما دی اور فراغت کے وقت اس نقصان کے جبر کا طریقہ بھی بتلا دیا۔[1]

آیت میں ارادۂ تکوین نہیں بلکہ ارادۂ تشریع مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ اپنے احکام کے ذریعے بندوں کو مشقت اور تنگی سے دوچار کرنا نہیں چاہتا بلکہ ان کے لیے آسانی، خیر اور منفعت چاہتا ہے۔

اسلام کا دستوری مزاج آسانی ہے

یہ آیت اسلام میں ایک خاص دستوری دفعہ ہے۔ اسی سے اسلام کے قانون دان طبقہ نے یہ قاعدہ بنایا ہے کہ المشقۃ تجلب التیسیر مشقت اور تنگی آسانی کا ذریعہ ہوتی ہے۔ اس موضوع پر صرف یہی آیت نہیں بلکہ اور بھی آیات ہیں مثلاً ما جعل علیکم فی الدین اللہ نے تمہارے لیے دین میں تنگی نہیں رکھی۔ علامہ شاطبی نے الموافقات میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ لوگوں کے لیے دین میں سختی اور تنگی نہیں بلکہ آسانی چاہتا ہے یعنی اس میں کوئی تنگی اور سختی نہیں۔ سب سے زیادہ سہل سب سے زیادہ سبک سب سے زیادہ واضح سب سے زیادہ فکر و عمل کی وسعت رکھنے والی ہے۔ اس آیت نے بتا دیا کہ فکر و عمل کے ارتقاء کی راہ انسانوں پر جس بات نے روک رکھی ہے وہ یہی دین کی تنگی اور رکاوٹ ہے۔ اسی تنگی نے انہیں اس طرح جکڑ رکھا ہے کہ ایک قدم بھی وسعت بلندی کی طرف نہیں اٹھا سکتے۔ اللہ نے اس جکڑبندی سے تمہیں نجات دی اور یہ اس کا بڑے سے بڑا احسان ہے۔ اس موضوع پر ایک سے زیادہ حدیثیں آئی ہیں۔ حضرت انس کی متفق علیہ حدیث ہے کہ حضور نے فرمایا یسروا ولا تعسروا آسانی کرو دشواری نہ کرو۔ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عباس

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۶

کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دین سرتاسر آسان ہے۔ یہ نرمی اور سہولت اسلام کی بنیاد ہے اور اسی بنیاد پر اسلام کے قانون کی عمارت قائم ہے۔ اگر اس پر تفصیلی بحث کی جاتے تو ہمیں سارے اسلامی قانون پر ایک اجمالی نظر ڈالنی پڑے گی اور اس اجمال ہی میں اس قدر پھیلاؤ ہے کہ ہماری تفسیر کے اوراق اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے ہم تفصیلی مباحث سے بچ کر دین اسلام کے صرف وہ اصول تیسیر پیش کرتے ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ نے تحریر فرماتے ہیں۔ ان کی روشنی میں آپ تمام قانونِ اسلامی کا جائزہ لے کر یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ اسلام میں دوسرے مذاہب کے مقابلے میں کتنی آسانی ہے۔

شاہ صاحب نے حجۃ اللہ البالغہ میں قرآن کی اس آیت یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر کو پیش نظر رکھ کر تیسیر کے موضوع پر تفصیلی بحث فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ اسلامی قانون میں تیسیر دوسرے قوانین کے مقابلے میں کیوں کر ہے۔ فرماتے ہیں،

۱۔ اسلام نے کسی عبادت کے لیے ایسی چیز کو رکن یا شرط کا درجہ نہیں دیا جس کی ادائیگی میں دشواری ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر مجھے اُمت کے مشقت میں پڑنے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے ساتھ ان کو مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

۲۔ فخر و مباہات اور قومی افتخار انسانی طبیعت کا ایک ناگزیر تقاضا ہے، اسلام نے طبیعت کے اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے جمعہ اور عیدین کا اجتماع قائم کیا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لیعلم الیہود ان فی دیننا فسحۃ یہودیوں کو پتہ لگ جاتے کہ ہمارے دین میں فکر و عمل کی وسعت ہے، جکڑ بندی اور جمود نہیں ہے۔ زندگی کے میدان میں تنگی اور رکاوٹ نہیں ہے۔ اس بنا پر اسلام نے طاعات ہی کو اس تقاضے کو پورا کرنے کے لیے استعمال کر لیا۔

۳۔ اسلام میں ایک حصہ ایسا بھی ہے جو طبیعت اور عقل دونوں کی چاہتوں کا مرکز ہے۔ مثلاً صفائی اور ستھرائی کا حکم جمعہ کے دن غسل کرنے، خوشبو لگانے، مساجد کو صاف رکھنے، قرآن کو تجوید سے پڑھنے اور اذان کو خوش آوازی سے دینے کا حکم اسی بنا پر ہے۔

۴۔ اسلام مذہبی زندگی میں احکام کی بے جا سختیاں ناقابل برداشت پابندیاں، ناقابل فہم عقیدوں کا بوجھ وہم پرستیوں کا انبار، غیر اللہ کی تعبد کی بیڑیاں ہٹا کر سہل و آسان راہ بتاتا ہے۔ اور اس کے ساتھ طبعی تنفر اور میلان کا بھی لحاظ کرتا ہے۔ اسی بنا پر غلام، مجہول النسب اور دیہاتی کی امامت مکروہ قرار دیتا ہے، کیونکہ بہت سے حالات میں ان کی امامت تنفر کا موجب ہو سکتی ہے۔

۵۔ اکثریت کے طبعی تقاضوں کو ملحوظ رکھتا ہے۔ مثلاً سربراہ مملکت کو مملکت میں، صاحب البیت

کو گھر میں عدت کا حق دیتا ہے۔

۶۔ علم کی اشاعت، وعظ و نصیحت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا اہتمام پر زور دیتا ہے تاکہ قانون پر عمل کرنے کے لیے لوگوں میں بالشت آمادگی پیدا ہو۔

۷۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عملی زندگی نے عزیمت و رخصت والے نمونے قائم کیے ہیں تاکہ انسانی زندگی کے لیے آسانی ہو۔

۸۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو مہذب اور کامل بننے کی اللہ کی بارگاہ میں دعائیں کی ہیں اور آپ کی دعائیں یسر و آسانی کا ذریعہ بن گئی ہیں۔

۹۔ صحبتِ نبوت کی وجہ سے اللہ نے لوگوں پر سکینت نازل فرمائی اور اس طرح لوگوں کے لیے قانون پر عمل پیرا ہونا آسان ہو گیا۔

۱۰۔ اسلام نے دوسروں کے حقوق تلف کرنے والوں کے حقوق تلف کر دیے جیسے قاتل کو وراثت سے محروم کر دیا۔

۱۱۔ مشقت والے احکام تدریجاً اور آہستہ آہستہ نازل فرمائے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں۔ اول اول وہ سورتیں نازل ہوئیں جن میں جنت اور دوزخ کا ذکر ہے۔ جب طبیعتیں اسلام کی طرف مائل ہو گئیں تو حلال حرام کی پابندیاں آئی ہیں۔ اگر روزِ اول ان سے کہا جاتا کہ شراب نہ پیو تو وہ چھوڑنے کو تیار نہ ہوتے۔

۱۲۔ اسلام نے احکام کے نفاذ میں تا امکان عوامی جذبات کی رعایت کی ہے۔ بیت اللہ کو ابراہیمی بنیاد پر بنانے کا ارادہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے ملتوی فرمایا کہ اس میں قریش کے جذبات کو ٹھیس پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

۱۳۔ ارکان و شرائط کی تحدید و تعیین کی گئی ہے لیکن اس طرح نہیں کی کہ بجائے آسانی کے اور مصیبت بن جاتی۔ ایک حد تک ان کی تعیین بھی کر دی اور اس کے بعد معاملہ کو خود ان کے سپرد کر دیا۔ مثلاً نماز میں سورۃ فاتحہ کو ضروری قرار دیا لیکن مخارج حروف کی ادائیگی اور طرزِ قرأت کے لیے کوئی پابندی نہیں لگائی۔ نماز کے لیے استقبالِ قبلہ کو شرط قرار دیا لیکن قبلہ کی سمت معلوم کرنے کے لیے کوئی ٹھوس ضابطہ مقرر نہیں کیا بلکہ حالات کے مطابق معاملہ کو فکر و بصیرت پر چھوڑ دیا۔ زکوٰۃ کا نصاب دو سو درہم بتایا لیکن درہم کا وزن مقرر نہیں فرمایا۔ رمضان کے روزوں کے لیے رمضان کو شرط قرار دیا لیکن ہلالِ رمضان کے لیے کوئی قانونی پابندی نہیں لگائی بلکہ یہ کہہ کر آزاد چھوڑ دیا کہ ۲۹ کو چاند نہ ہو تو شعبان کے ۳۰ پورے کرلو۔

۱۴۔ اسلام نے لوگوں کو علوم و فنون کے اصطلاحی دقائق سے ہٹ کر ان کی سادہ فطرت اور تخلیقی عقل

کے مطابق مخاطب کیا ہے، قرآن جب نازل ہوا تو اس کے مخاطبوں کا پہلا گروہ وضعی اور صناعی طریقوں سے مانوس نہ تھا۔ فطرت کی سیدھی سادی فکری حالت تھی۔ استقبالِ قبلہ، اوقاتِ نماز، اور عید و رمضان کے بارے میں اپنی معلومات کی ذمہ داری کا بوجھ لوگوں پر نہیں ڈالا۔

ان چودہ اُصولوں کو اسلام نے اپنا کر دُنیا کے ادیان و قوانین کے مقابلہ میں اسلام کو سرتاسر آسان کر دیا۔ اس لیے مجموعی لحاظ سے جس قدر آسانی اسلام میں ہے وہ کہیں نہیں ملتی۔

بہرحال اس موقعہ پر آیت کا حاصل یہ ہے کہ جو لوگ حقیقت میں اس فریضہ کی ادائیگی سے ماہِ رمضان میں ادائیگی سے معذور ہوں اللہ اُن کے لیے آسانی چاہتا ہے۔ بیماری اور سفر کی حالت میں روزے کی ادائیگی کا حکم دے کر ان کو تنگی اور دُشواری سے دوچار کرنا نہیں چاہتا۔

۵۲۷۔ کہ تم روزوں کی تعداد پوری کر لو۔ اور تمہیں دوسرے دنوں میں قضا کرنے اور رمضان کے دنوں کی گنتی کا خیال رکھنے کا حکم اس لیے دیا ہے تاکہ روزوں کی تعدادِ مطلوب پوری کر سکو۔ اور کوئی دن کم نہ ہو اور یہ تعداد ایک ماہ ہے۔ اگر کوئی شخص مرض یا سفر کے عذر کی وجہ سے یہ تعداد پوری نہ کر سکا تو روزوں کی قضا کے ذریعے ضرور اس تعداد کو پوری کرے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ روزوں کی تعداد کو قرآن کے نزدیک بہت بڑی اہمیت ہے۔ اس اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ روزے کے ذکر میں خاص طور پر تعداد کا ذکر چار مرتبہ آیا ہے پہلے فرمایا ایاماً معدودات چند گنے ہوئے دن۔ پھر فرمایا عدۃ من ایام اخر دوسرے چند دنوں کی گنتی۔ پھر ان دنوں کی گنتی کو رمضان کے مہینے سے مقرر فرمایا۔ پھر اس تقرر کے بعد مریض اور مسافر سے کہا کہ اگر رمضان میں روزہ نہ ہو سکے تو عدۃ من ایام اخر دوسرے دنوں میں گنتی کا حساب کر لو۔ پھر آخر میں فرمایا ولتکملوا العدۃ کہ مقصد گنتی کو پورا کرنا ہے۔ گنتی کی اسی اہمیت کے پیشِ نظر اصحاب ابی حنیفہ کا قرطبی نے کیا طبری کے حوالے سے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ایک شہر والوں نے تیس روزے رکھے جبکہ دوسرے شہر کی آبادی نے ۲۹ روزے رکھے تو آخر الذکر آبادی کے ذمہ ایک روزے کی قضا ہے۔ کیونکہ قرآن کہتا ہے ولتکملوا العدۃ۔ الجصاص نے بھی احکام القرآن میں اسی کو اختیار کیا ہے۔

۵۲۸۔ اور اس لیے بھی کہ جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے اس پر اللہ کی بڑائی کا اعلان کرو۔ عام مفسرین کا خیال ہے کہ ان تین فقروں میں بالترتیب تین دلائل پیش فرمائے ہیں۔ اور بتایا یہ ہے کہ اللہ نے تمہارے لیے رمضان کے روزے اس لیے مقرر فرمائے ہیں تاکہ تم گنتی پوری کر لو۔ بیمار اور مسافر ہونے کی حالت میں روزہ قضا کرنے کی اجازت اس لیے دی ہے تاکہ تم اللہ کی عطا کردہ رخصت ادا اور عزیمت قضا پر اللہ کی بڑائی بیان کرو اور بحالتِ دُشواری شیخِ فانی کے لیے فدیہ کی آسانی اس لیے دی ہے تاکہ تم

اللہ کا شکر کرو۔

اور گویوں کہا جاسکتا ہے کہ گنتی کا پورا کرنا روزوں کی مشروعیت کی علت ہے۔ اور اللہ کا آسانی چاہنا سفر، بیماری اور مشقت میں روزوں کی رخصت کی علت ہے اور تکبیر سارے ماہِ رمضان کے روزوں کی تعداد پوری کرنے کی علت ہے۔ اسی کا مظاہرہ عید الفطر میں ہوتا ہے۔ کیونکہ عید کی رات، اور عید کے دن نماز عید کے بعد تک شروع میں اور اسی کی ادائیگی سے ہم ان انعامات پر اللہ کا شکر ادا کرتے ہیں۔

یہ دراصل اللہ سبحانہ کے اس عظیم الشان احسان کا جو اس نے پیغمبرِ صادق کے ذریعے انسانوں پر کیا ہے شکریہ ہے۔ اور اس کی احسان شناسی کا احساس ہے۔ وہ کتابِ الٰہی، وہ تعلیمِ ربانی، وہ ہدایتِ رحمانی جو ماہِ رمضان میں انسانوں کو عطا ہوئی، جس نے ان کو شیطان سے فرشتہ اور ظلمانی سے نورانی بنایا۔ پستی و ذلت کے عمیق غار سے نکال کر ان کو اوجِ کمال تک پہنچایا۔ ان کی وحشت کو تہذیب و اخلاق سے ان کی جہالت کو علم و معرفت سے ان کی نادانی کو حکمت و دانائی سے اور ان کی تاریکی کو بصیرت اور روشنی سے بدل دیا۔ جس نے ان کی قسمتوں کے پانسے پلٹ دیے اور فضل و دولت اور خیر و برکت کے خزانوں سے ان کے کاشانوں کو معمور کر دیا۔ جس نے ذرۂ بے مقدار کو آفتاب اور مشتِ خاک کو ہمدوشِ ثریا بنا دیا۔ قرآن نے ان دو فقروں میں ولتکبروا اللہ علی ما ھدٰکم ولعلکم تشکرون اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس ہدایتِ ربانی اور کتابِ الٰہی کے عطیہ پر شکرگزاری کا یہ رمز و اشارہ ہے کہ اس مہینے کی راتوں میں مسلمان اس پوری کتاب کو تراویح میں پڑھتے اور سنتے ہیں۔ اور اس ماہ کے خاتمہ پر اللہ اکبر اللہ اکبر کا نعرہ بلند کرتے ہوئے عیدگاہوں میں جاتے اور خوشی و مسرت کے ولولوں کے ساتھ عید کا دوگانہ شکر ادا کرتے ہیں۔

شکرگزاری کی بہترین صورت

رمضان کے روزوں کو صرف عبادت اور تقویٰ کی تربیت ہی کا کورس نہیں بتایا گیا بلکہ انہیں مزید براں اس عظیم الشان نعمتِ ہدایت پر اللہ تعالیٰ کا شکریہ بھی قرار دیا گیا ہے جو قرآن کی شکل میں اس نے ہمیں عطا فرمائی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک دانش مند انسان کے لیے کسی نعمت کی شکرگزاری اور کسی احسان کے اعتراف کی بہترین صورت اگر ہو سکتی ہے تو وہ صرف یہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو اس مقصد کی تکمیل کے لیے تیار کرے جس کے لیے عطا کرنے والے نے وہ نعمت عطا کی ہے۔ قرآن ہم کو اس لیے عطا کیا گیا ہے کہ ہم اللہ تعالیٰ کی رضا کا راستہ جان کر خود اس پر چلیں اور دنیا کو اس پر چلائیں۔ اس مقصد کے لیے ہم کو تیار کرنے کا بہترین ذریعہ روزہ ہے۔ لہٰذا نزولِ قرآن کے مہینے میں

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِي لَعَلَّهُمْ يَرْشُدُونَ ﴿١٨٦﴾

اور (اے پیغمبر) جب آپ سے میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں تو ان کو بتا دو کہ میں ان کے قریب ہوں۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ لہذا ان کو چاہیے کہ میرا کہا مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ حصولِ مقصد میں کامیاب ہوں۔

ہماری روزہ داری صرف عبادت ہی نہیں ہے اور صرف اخلاقی تربیت بھی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ خود اس نعمتِ قرآن کی بھی صحیح اور موزوں شکرگزاری ہے [1]

روزہ اور قربِ الٰہی

عام خیال یہ تھا کہ بندہ جس قدر اپنے اوپر تکلیف اٹھاتا ہے اسی قدر اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے اور وہ اس کی بڑی عبادت شمار ہوتی ہے۔ اس لیے لوگ اپنے جسم کو بڑی بڑی تکلیفیں دیتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جس قدر جسم کو زیادہ آزار دیا جائے گا اسی قدر روح میں زیادہ صفائی اور پاکیزگی آئے گی چنانچہ یونانی

[1] تفہیم القرآن

فلسفیوں میں اشراقیت، عیسائیوں میں رہبانیت اور ہندوؤں میں جوگ اسی اعتقاد کا نتیجہ تھا۔ جوگیوں اور جینیوں میں روزے کی غیر معمولی مدت اور اس کی سختیاں اسی عقیدے کی طرف اشارہ کرتی ہیں۔ یہودیوں کی اصطلاح میں روزے کے لیے نفس کو دکھ دینے کی اصطلاح جاری ہے۔ چنانچہ تورات میں روزے کے لیے اکثر اسی قسم کا فقرہ مستعمل ہے۔ سفر الاحبار میں ہے:

اور یہ تمہارے لیے قانون دائمی ہوگا کہ ساتویں مہینے کی دسویں تاریخ تم میں سے ہر ایک خواہ وہ تمہارے دیس کا ہو خواہ پردیسی، جس کی بود و باش تم میں ہے اپنی جان کو دکھ دے۔

تورات کے سفر العدد (۲۹-۷) میں ہے:

اور اس ساتویں کی دسویں تاریخ مقدس جماعت ہوگی۔ اور تم اپنی جانوں کو دکھ دینا اور کچھ کام نہ کرنا۔

یہ اصطلاح تورات کے اور مقامات میں بھی مذکور ہے۔ لیکن نبوت محمدی نے یہ راز آشکارا کیا کہ روزے سے مقصود تہذیب نفس کی اصلاح ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ جب تک ترک لذائذ نہ ہو حق کی لذت نہیں ملتی ہے نہ ہماری تکلیف اللہ سبحانہ کی خوشنودی کا باعث ہے اور نہ بندوں کی غیر معمولی تکلیف سے اللہ کو آرام ملتا ہے۔ نہ زن و فرزند کی نفرت سے خدا کی محبت نصیب ہوتی ہے نہ ترک دنیا سے دین کی دولت ملتی ہے۔ یہ بات بھی نہیں ہے کہ جب تک فاقہ کشی کے چلے نہ کھینچے جائیں اللہ کا قرب حاصل نہیں ہوتا۔ جیسا کہ اہل مذاہب کا خیال ہے۔ اس آیت میں یہی بات سمجھائی جا رہی ہے کہ قرب الٰہی کے لیے تو صرف ایمان و اخلاص شرط ہے۔ اللہ سبحانہ تو ہر حال میں بندے کی پکار سنتا ہے اور اس کی شہ رگ سے بھی قریب ہے۔ ایمان و اخلاص کے ساتھ جب بھی اسے پکارا جائے گا اس کا دروازہ رحمت کھل جائے گا

۵۲۹۔ جب میرے بندے میرے بارے میں دریافت کریں۔ سوال و جواب کا تعبیری انداز اختیار کرکے بات میں زور پیدا کیا گیا ہے۔ اس تعبیر میں کس قدر دلآویزی ہے۔ کس قدر نرمی مہربانی شفقت اور محبت ہے کہ میرے بندے میرے بارے میں آپ سے دریافت کرتے ہیں، کیا دریافت کرتے ہیں اسے چھوڑ دیا گیا ہے۔ پہلی آیات میں قرآن نے روزوں کو پورا کرنے اور اللہ کی بڑائی بیان کرنے کا مطالبہ کیا تھا اور بتایا تھا کہ ایسا کرنا تمہیں شکر الٰہی کے لیے تیار کردے گا۔ تکبیر اور شکر دونوں کا تعلق کردار و گفتار دونوں سے ہے۔ غالباً گفتار کے ذریعے تکبیر و تحمید کے بارے میں پوچھنے والوں نے پوچھا ہوگا کہ کیسے ہونا چاہیے باآواز بلند یا آہستہ۔ اسی سوال کا جواب یہ آیت دے رہی ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ

نے سوال کی گتھی کو روایات کے ذریعے حل کرنے کی خاطر سب سے پہلے ابن جریر اور ابن حاتم کی وہ روایت پیش فرمائی ہے جس میں ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کرتا ہے کہ بتائیے ہمارا رب قریب ہے یا دُور ہے۔ اگر قریب ہے تو ہم اس سے اپنی معروضات کو مناجات کے ذریعے کہیں اور اگر دُور ہے تو ہم اسے باآواز بلند پکاریں۔ اس پر قرآن نے جواب یہ دیا اور اسی آیت کی تشریح میں غزوۂ خیبر کا یہ واقعہ بھی درج کیا ہے کہ ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ ہم ایک سفر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب تھے، مجمع باآواز بلند تکبیر کہتا جا رہا تھا کہ حضور انور نے مجمع کو مخاطب کر کے فرمایا، لوگو! تم اپنے آپ پر رحم کرو۔ کیونکہ تم کسی بہرے اور غائب کو نہیں پکار رہے ہو بلکہ جسے پکار رہے ہو وہ تمہارے قریب ہے اور سُن رہا ہے۔ یہ واقعہ اس آیت کی عملی تفسیر ہے لیکن آیت کا سببِ نزول نہیں ہے۔

قاضی بیضاوی نے یہاں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ اللہ سبحانہ نے ماہِ رمضان کے روزوں کا حکم دینے، تعداد پوری کرنے اور تکبیر و شکر کے فرائض بجالانے کے بعد اس آیت کے ذریعے بتایا ہے کہ اللہ ان کے احوال سے باخبر، ان کی باتوں کو سننے والا، ان کی پکار کا جواب دینے والا اور ان کے اعمال کی جزا دینے والا ہے۔ اس طرح گویا لوگوں کو عبادت و دُعا کی ترغیب دی ہے۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں:

پہلے حکم یہ تھا کہ رمضان میں اوّل شب میں کھانے پینے اور عورتوں کے پاس جانے کی اجازت تھی لیکن سو رہنے کے بعد ان چیزوں کی ممانعت تھی۔ کچھ لوگوں نے اس کے خلاف کیا اور سونے کے بعد عورتوں سے قربت کی۔ پھر آپ سے آکر عرض کیا اور اپنے قصور کا اقرار اور ندامت کا اظہار کیا اور توبہ کی نسبت آپ سے سوال کیا تو اس پر یہ آیت اتری کہ تمہاری توبہ قبول ہو گئی اور احکامِ خداوندی کی اطاعت کی تاکید فرما دی گئی اور حکمِ سابق منسوخ فرما کر آئندہ کو اجازت دے دی گئی کہ تمام شب ماہِ رمضان میں صبح صادق سے پہلے کھانا وغیرہ حلال ہے جس کا ذکر اس کے بعد کی آیت میں آتا ہے۔ اور پہلی آیت میں جو بندوں پر سہولت اور عنایت کا ذکر تھا۔ اس قرب و اجابت و راحت سے اُس کی بھی خوب تاکید ہو گئی۔ نیز ایک تعلق و ربط کی وجہ یہ بھی ہے کہ پہلی آیت میں تکبیر اور اللہ کی بڑائی بیان کرنے کا حکم تھا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کچھ لوگوں نے دریافت کیا کہ ہمارا رب دُور ہے تو ہم اس کو پکاریں، نزدیک ہے تو آہستہ بات کریں۔ اس پر یہ آیت اُتری یعنی وہ قریب ہے ہر ایک کی بات سنتا ہے آہستہ ہو یا پکار کر اور جن موقعوں پر پکار کر تکبیر کہنے کا حکم ہے وہ دوسری وجہ سے ہے۔ یہ وجہ نہیں ہے کہ وہ آہستہ بات سنتا نہیں ہے[1]

---

[1] حاشیہ شیخ الہند ص ۳۶

۵۳۰۔ تو ان کو بتا دو کہ میں قریب ہوں۔ یعنی تمہاری جان اور وجود سے بھی زیادہ قریب ہوں تم کو دیکھتا ہوں اور تمہاری آواز بلا تشویش کے علیحدہ علیحدہ سنتا ہوں۔ تم مجھ کو نہیں دیکھتے اس لیے تم مجھ کو دور سمجھتے ہو ورنہ حقیقت میں تم سے میں بہت قریب ہوں[1] قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ قریب ہونے سے مراد یہ ہے کہ اللہ کو بندوں کے افعال و اقوال کا پورا پورا علم ہے۔ گویا قریب سے قرب مکانی نہیں بلکہ قرب علمی مراد ہے۔ علامہ آلوسی نے بھی اس تعبیر کو اللہ کے کمالِ علم کے لیے استعارہ قرار دیا ہے۔ لیکن صوفیا کے نزدیک اس لحاظ سے کہ اللہ کی ذات کے لیے مکانوں کی نسبت ایک ہوتی ہے لسے قرب وجودی بتایا ہے۔ الیواقیت والجواہر میں عبدالوہاب الشعرانی نے یہ علمی لطیفہ لکھا ہے کہ و نحن اقرب منکم جب آدمی کی روح حلقوم تک پہنچ جاتی ہے اور اس سے ہم زیادہ قریب ہوتے ہیں۔ اس قرب کی ایک عالم نے علمی قرب سے تفسیر کی ہے۔ صوفیاء میں سے کوئی بزرگ موجود تھے۔ انہوں نے برجستہ فرمایا کہ قربِ علمی نہیں بلکہ قربِ وجودی مراد ہے کیونکہ اگر قربِ علمی مراد ہوتا تو آخر میں ولکن لا تعلمون ہوتا ولکن لا تبصرون نہ ہوتا۔ بہرحال قربِ علمی ہو یا قربِ وجودی، اس سے قربِ مادی و مکانی مراد نہیں ہے۔

۵۳۱۔ پکارنے والا جب مجھے پکارتا ہے میں اس کی پکار سنتا ہوں اور جواب دیتا ہوں۔ اس فقرے میں اللہ نے اپنے قرب کی دلیل یہ بیان فرمائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میرے قریب ہونے کی دلیل یہ ہے کہ مجھے جب کوئی پکارتا ہے میں اسے جواب دیتا ہوں۔ قرطبی کہتے ہیں کہ پکارنا بمعنے عبادت ہے اور جواب دینا بمعنے قبول ہے یعنی جب بھی کوئی میری عبادت کرتا ہے میں اسے شرفِ پذیرائی دیتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ تم مجھے دیکھ نہیں سکتے اور نہ اپنے حواس سے مجھے محسوس کر سکتے ہو لیکن یہ خیال نہ کرو کہ میں تم سے دور ہوں۔ نہیں میں اپنے ہر بندے سے اتنا قریب ہوں کہ جب وہ چاہے مجھ سے عرض معروض کر سکتا ہے حتیٰ کہ دل ہی دل میں وہ مجھ سے جو کچھ گزارش کرتا ہے میں اسے بھی سن لیتا ہوں اور صرف سنتا ہی نہیں بلکہ فیصلہ بھی صادر کرتا ہوں۔ جن بے حقیقت اور بے اختیار ہستیوں کو تم نے اپنی نادانی سے الٰہ قرار دے رکھا ہے ان کے پاس تمہیں دوڑ دوڑ کر جانا پڑتا ہے اور پھر بھی وہ تمہاری شنوائی نہ کر سکتے ہیں اور نہ ان میں یہ طاقت ہے کہ تمہاری درخواستوں پر کوئی فیصلہ صادر کر سکیں مگر میں بے پایاں کائنات کا فرمانروائے مطلق، تمام اختیارات اور طاقتوں کا مالک تم سے اتنا قریب ہوں کہ تم خود بغیر کسی واسطہ اور وسیلے اور سفارش کے براہ راست ہر وقت اور ہر جگہ مجھ تک اپنی عرضیاں

---

[1] معارف القرآن م ۱ ص ۲۸۹

چھپا سکتے ہوئے

گویا سمجھا یا گیا ہے کہ روزے کی عبادت سے مقصود خود تمہارے نفس کی اصلاح و تربیت ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ جب تک فاقہ کشی نہ ہوگی خدا کو پکارا نہیں جا سکتا جیسا کہ اب تک سمجھا گیا ہے کہ کوئی گوشت نہ کھانے کا عہد کر رہا ہے کوئی ہفتہ میں ایک دن کھانا کھاتا ہے، کوئی سرتاسر برہنہ رہتا ہے اور ہر قسم کے لباس کو تقدس کے خلاف جانتا ہے، کوئی چلہ کی سردی میں اپنے بدن کو ننگا رکھتا ہے کوئی عمر بھر یا سالہا سال تک اپنے آپ کو کھڑا رکھتا ہے یا بیٹھا رہتا ہے۔ کوئی اپنا ایک ہاتھ کھڑا رکھتا ہے۔ کوئی عمر بھر تاریک تہ خانوں اور غاروں میں چھپ کر خدا کی روشنی تلاش کرتا ہے۔ کوئی تجرد اور ترک دنیا کر کے اہل و عیال اور زن و فرزند کے تعلق سے نفرت رکھ کر خدا کی محبت کا دعویدار بنتا ہے۔

قرآن نے اس آیت کے ذریعہ یہ راز آشکارا کیا ہے کہ روزے کا مقصد ہرگز یہ نہیں ہے بلکہ روزے کا مقصد اللہ کے سامنے اپنی بندگی اور عبودیت کا نمونہ پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجا لا کر قلب میں ایسی کیفیت پیدا کرنا ہے جس سے دل میں تمام نیک کاموں کی تحریک اور برے کاموں سے نفرت پیدا ہو اور اللہ کی راہ میں ہر قسم کی جسمانی اور جانی قربانی کرنے، مقصد کے حصول کے لیے تکلیف اور مشقت برداشت کرنے کا اپنے کو خوگر بنا لینا یوں کہو کہ ایثار و قربانی کی تمام جزئیات کی سرخی روزہ ہے۔

۵۳۲ - لہٰذا ان کو چاہیے کہ میرا کہا مانیں اور مجھ پر ایمان لائیں تاکہ وہ حصول مقصد میں کامیاب ہوں۔ اور ان پر فلاح دارین کی راہیں کھل جائیں یعنی اگر وہ اپنی پکار کا جواب چاہتے ہیں تو ان کو چاہیے کہ ایمان و عمل کی جو دعوت میں ان کو دے رہا ہوں اس کو اپنائیں اور قبول کریں تاکہ اس کے نتیجے میں ان کے لیے ہر قسم کی خیر کے دروازے کھل جائیں اور مقصد کے حاصل کرنے میں وہ کامیاب و کامران ہوں۔ دراصل حقیقی عروج و ترقی اور اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب و آرزو وہ اصل قوت ہے جو اقوام و ملل کو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد مقاصد کی کشش اس کی جدوجہد کا اصل محرک ہے۔ یہی حال اسلامی نظام کا بھی ہے۔ یہ پورا نظام اعلاء کلمۃ اللہ اور دین حق کے قیام کی سعی و طلب پر استوار ہے۔ روزہ، نماز، حج اور زکوٰۃ عبادات و فرائض اور اوامر و نواہی سب کے سب بالآخر اسی غایت اصلی کے تابع ہیں کہ اللہ کی زمین پر بس اسی کی بندگی اور پرستش کی جائے۔ زمانۂ نبوت کے مسلمانوں کو

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۴۴

أُحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَىٰ نِسَائِكُمْ ۚ هُنَّ لِبَاسٌ
لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ ۗ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ
أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۖ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ
وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّىٰ يَتَبَيَّنَ
لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۖ ثُمَّ
أَتِمُّوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ
فِي الْمَسَاجِدِ ۗ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرَبُوهَا ۗ كَذَٰلِكَ
يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿١٨٧﴾

تمہارے لیے یہ بات جائز ہے کہ روزوں کے دنوں میں رات کے وقت اپنی بیویوں سے خلوت کرو[٥٣٣]۔ وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے[٥٣٤] لیے[٥٣٥]۔ اللہ کو معلوم ہے کہ تم لوگ چپکے چپکے اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے مگر اس نے تمہارا قصور معاف کر دیا اور تم سے درگزر فرمایا۔ لہذا اب بغیر کسی اندیشہ کے اپنی بیویوں سے خلوت کرو اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لیے مقرر کر دیا ہے اسے حاصل کرو[٥٣٦]۔ نیز راتوں کو کھاؤ پیو یہاں تک کہ صبح کی سپید دھاری رات کی کالی دھاری سے الگ نمایاں ہو[٥٣٧] جائے۔ پھر رات تک روزے کا وقت پورا کرو[٥٣٨]۔ ہاں اگر تم مسجد میں

اعتکاف کرتے[۳۹] ہو، تو اس حالت میں تم کو اپنی بیویوں سے خلوت نہ کرنا چاہیے۔ یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدود ہیں، ان کے نزدیک[۴۰] بھی نہ جاؤ۔ اللہ اسی طرح اپنے احکام واضح کر دیتا ہے تاکہ لوگوں میں متقیانہ[۴۱] سیرت پیدا ہو۔

آج کل کے مسلمانوں سے یہی چیز میز کرتی ہے کہ ان میں مقصد کی لگن اور نصب العین کا عشق تھا۔ وہ ایمان کے داعی تھے اور ایمان سے ان میں ایسی شدید محبت تھی کہ اس کے لیے کوئی قربانی نہ تھی جسے انہوں نے گوارا نہ کیا ہو اور کوئی مشقت نہ تھی جو انہوں نے نہ سہی ہو۔ اسی کی خاطر انہوں نے علم کی روشنی حاصل کی۔ جاہلیت کے رسوم و عادات کو انہوں نے یکدم ترک کر دیا اور چند سال کے عرصہ میں وہ صفات حاصل کر لیں جو کتنیا کی ترقی پذیر قوموں میں نمایاں ہوتی ہیں۔ عشق کا جنون وہ ہے کہ جب سر پہ سوار ہوتا ہے تو محبوب کی طلب میں کوئی مزاحمت مزاحمت نہیں ہوتی اور کوئی مصیبت مصیبت نہیں رہتی اور شوقِ منزل راہ کی تمام دشواریوں سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ قرآن اسی حالت کو رُشد کے نام سے پکارتا ہے اور ان صفات کے رکھنے والوں کو راشدین کہتا ہے۔

حبب الیکم الایمان وزینہ فی قلوبکم وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان اُولٰئک هم الراشدون ۰

اللہ نے تمہارے دلوں میں ایمان کی محبت ڈال دی اور اس کو تمہارے دلوں میں سجا دیا۔ اور کفر، فسوق اور عصیان سے نفرت اور ناگواری ڈال دی یہی لوگ راشدین ہیں۔

اسی لیے اس دور کو جس میں صحابہ کرام نے اسلام پر اپنی زندگی کی بنیادیں استوار کی تھیں خلافتِ راشدہ، اور ان اکابر کو جنہوں نے اس دور کی رہنمائی کی تھی راشدین کہا جاتا ہے۔

زیرِ نظر آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کی دعوت کو اپنانے اور اللہ پر ایمان لانے کا بدلہ ان کو یہ ملے گا کہ وہ رُشد کو حاصل کر لیں گے۔ اس رُشد کو حاصل کریں گے جو ایمان کے نتیجے میں ملتا ہے اور اس منہاجِ زندگی پر چل پڑیں گے جو منہاجِ زندگی اللہ نے انسان کے لیے متعین فرمایا ہے۔

روزے کے احکام کی تفصیل

پہلی آیات میں بتایا ہے کہ روزے سے مقصود خود تمہارے نفس کی اصلاح اور تربیت ہے۔ یہ سمجھ کر عبادت میں سختی اور تنگی اختیار کرنا خدا کی خوشنودی کا موجب ہے صحیح نہیں۔ کیونکہ اللہ تمہارے لیے سختی اور تنگی نہیں بلکہ آسانی چاہتا ہے۔ اللہ کا قرب تنگی و سختی سے نہیں بلکہ ایمان و اخلاص سے حاصل ہوتا ہے۔ یہودیوں میں روزے کی شرطیں نہایت سخت تھیں مثلاً یہ کہ شام کو روزہ کھول کر سو جائیں تو پھر درمیان میں اٹھ کر کچھ کھا پی نہیں سکتے۔ اسی طرح روزے کے مہینے میں زناشوئی کا تعلق بھی مطلقاً ممنوع تھا۔ مسلمانوں کو جب کتب علیکم الصیام کما کتب علی الذین من قبلکم کے ذریعے روزے کا حکم ہوا تو انہوں نے خیال کیا کہ تشبیہ کیفیت صوم میں بھی ہے۔ ان کے لیے بھی وہ پابندیاں ضروری ہوں گی اور چونکہ پابندیاں سخت تھیں اس لیے نباہ نہ سکے۔ کچھ عورتوں سے خلوت کے مرتکب ہو گئے اور کچھ سو گئے اور کھانا نہ کھا سکے۔ ۴۸ گھنٹوں کا روزہ رکھنا پڑا۔ اس موضوع پر روایات مختلف ہیں مثلاً صحیح بخاری میں براء بن عازب کا بیان ہے کہ

روزے فرض ہوتے تو لوگ پورے رمضان بیویوں سے خلوت نہ کرتے تھے۔ کچھ لوگ اپنے ضمیر کے خلاف کرتے تھے۔

مسند احمد، ابو داؤد، مستدرک حاکم میں عبدالرحمان بن ابی لیلیٰ کے حوالہ سے حضرت معاذ بن جبل کا بیان ہے کہ

لوگ سونے سے پہلے رمضان میں کھاتے پیتے، بیویوں سے خلوت کرتے، سو کر اُٹھنے کے بعد ان سب سے پرہیز کرتے۔

روزے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ جسمانی خواہشیں بالکل ترک کر دی جائیں بلکہ مقصود ضبط و اعتدال ہے ان آیات میں روزے کے ان ہی احکام کی تفصیل ہے۔

رات میں خلوت جائز ہے

۵۳۳۔ یعنی رمضان کی رات میں جو نیند کے بعد کھانا پینا، عورت کے پاس جانا حرام تھا۔ اس میں بھی سہولت کر دی گئی۔ اب تمام رات میں جب چاہو عورتوں کے ساتھ اختلاط کرو[1]

یعنی زناشوئی کا تعلق کوئی بُرائی اور ناپاکی کی بات نہیں جس کا عبادت کے مہینے میں کرنا جائز نہ ہو۔

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۶

وہ مرد اور عورت کا فطری تعلق ہے۔ اور دونوں ایک دوسرے سے حوائج میں وابستہ ہیں۔ لہٰذا ایک فطری علاقہ عبادتِ الٰہی کے منافی کیوں ہو؟[1]

یہاں سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ بیوی کی طرف میل و رغبت ذرا بھی کمالِ روحانیت و تزکیہ نفس کے منافی نہیں ہے۔ جیسا کہ بہت سے مشرکانہ اور جاہل مذاہب میں سمجھ لیا گیا ہے اور ماہِ صیام کی طاعت و عبادت اور بیوی سے خلوت و صحبت کے درمیان کوئی منافات نہیں ہے۔ اسلام نے جس چیز پر سخت پہرا بٹھایا ہے وہ شہوتِ حرام اور اس کے مبادی و مقدمات ہیں نہ کہ نفسِ شہوت۔ بھوک پیاس نیند کی طرح جنسی بھوک بھی اگر اپنے حدود کے اندر ہے تو ایک طبعی اور بے ضرر خواہش ہے۔ قصداً اور بلا ضرورتِ شرعی رمضان کا روزہ توڑ دینا کی سزا اسلام نے دو مہینے یعنی ساٹھ دن کے مسلسل روزے رکھی ہے اور شوہر بیوی اگر اپنے مشترک عمل سے روزہ توڑ دیں تو دونوں کی یہی سزا ہے۔ لیکن اگر بیوی رضامند نہ ہو اور شوہر اسے ہم بستری پر مجبور کر دے تو بیوی پر گناہ نہیں ہے۔ البتہ خود جبر کا تحقق ہونا چاہیے۔ اُس کے لیے صرف ایک روزے کی قضا کافی ہے۔ کفارے کی بنیاد قصد و تعمد پر ہے۔[2]

یہ بھی روزے میں اسلام کی تجویز کردہ اصلاحات میں سے ایک اصلاح ہے، اب تک روزے کے دنوں میں راتوں کو بھی میاں بیوی علیحدہ رہتے تھے لیکن چونکہ یہ مدت غیر فطری ہے۔ اکثر لوگ مجبور ہو کر نفسانی خیانت کے مرتکب ہو جاتے تھے اس لیے اسلام نے صرف روزے کی حالت تک کے لیے یہ ممانعت محدود کر دی اور رات کو اجازت دے دی۔

رفث کے لفظی معنے شہوت انگیز کلام کے ہیں لیکن جب اس کے ساتھ الیٰ آتا ہے تو اس سے مراد صحبت ہوتی ہے۔ اور مراد ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لفظ کنائی زبان میں اس معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ اور یہ قرآن کی تعبیری نزاہت و نفاست ہے کہ وہ ایسے مواقع پر بات کنائی زبان میں کہتا ہے اور اس طرح وہ مخاطبوں کو سمجھاتا ہے کہ ایسے مواقع پر زبان میں نزاہت اور نفاست حسن ہے۔

زناشوئی کی لباس سے بلیغانہ تشبیہہ

۵۳۴۔ وہ تمہارے لیے لباس ہیں اور تم ان کے لیے۔ لباس اور پوشاک سے غرض اختلاط و اتصال ہے۔ یعنی جس طرح بدن سے کپڑے لگے اور ملے ہوتے ہیں اسی طرح مرد و عورت آپس میں ملتے ہیں۔[3]

---

[1] ترجمان القرآن [2] ماجدی ص ۱۱ [3] افاداتِ شیخ الہند ص ۳۶

زمخشری نے اس فقرے کو اٹھے ہوئے سوال کا جواب بتایا ہے۔ سوال یہ ہے کہ رمضان کی راتوں میں عورتوں سے خلوت کی اجازت کیوں دی گئی ہے۔ فرمایا۔ اس لیے دی گئی ہے کہ چونکہ میاں اور بیوی کے تعلقات کی عمارت باہمی ملابست اور مخالطت کی اساس پر قائم ہوتی ہے اور ان کا باہمی نہ ملنا دشوار ہے اس بنا پر ان کو یہ سہولت دے دی گئی ہے۔ گویا جیسے لباس اور جسم کے درمیان کوئی پردہ نہیں رہ سکتا بلکہ دونوں کا باہمی تعلق و اتصال بالکل غیر منفک ہوتا ہے ایسے ہی تمہارا اور تمہاری بیویوں کا تعلق بھی ہے۔

لفظ لباس کا استعمال حسن تعبیر کے ساتھ تعلقات میں مودت و نرمی کی طرف بھی اشارہ کر رہا ہے۔ گویا اُردو محاورے میں میاں اور بیوی میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ وہ ایک دوسرے کے حق میں اوڑھنا اور بچھونا ہیں۔ لباس کی تشبیہ کس اعتبار سے ہے۔ مختلف زبانوں سے اس کے مختلف جوابات ملے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ چونکہ دونوں ایک دوسرے کے محتاج ہوتے ہیں اس لیے لباس کہا گیا ہے اور کچھ کی رائے ہیں اس کا پس منظر اجسام کی ملابست اور ملامست ہے لیکن غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے حق میں لباس کا وصف امتیازی اس کی پردہ پوشی ہے۔ لباس جسم کے عیبوں کو چھپاتا ہے۔ اس کے حسن و خوبی کو ابھارتا ہے۔ تشبیہ سے خاص اشارا اسی وصف کی جانب معلوم ہوتا ہے۔ گویا ہر اسلامی خاندان میں میاں بیوی کو ایک دوسرے کا پردہ پوش ہونا چاہیے اور ایک دوسرے کی زینت کو بڑھانے والا۔ ظاہر ہے کہ جو رشتہ میاں بیوی کے درمیان ہوتا ہے اس کی وجہ سے جتنے مواقع ایک کو دوسرے کے جسمانی و اخلاقی، روحانی کمزوریوں پر مطلع ہونے کے ملتے ہیں اتنے نہ کسی دوست کو ملتے ہیں اور نہ کسی عزیز کو۔ اس صورت حال میں عورت کے اخلاق کا کمال یہی ہے کہ شوہر کی ہر کمزوری کو چھپائے اس پر صبر کرے، اُسے بہتر سے بہتر صورت میں ظاہر کرے۔ علیٰ ہذا مرد کے کمالِ اخلاق کا بھی یہی تقاضا ہے۔ دونوں کی اخلاقی تکمیل کا یہ مؤثر ترین نسخہ اسلام نے باتوں باتوں میں پیش کر دیا ہے[1]

قرآن پاک نے میاں بیوی کی باہمی رفاقت کی جس حقیقت کو ظاہر کیا ہے وہ اس ازدواجی تعلق کے پورے دفتر کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس کا خلوت خانہ عالم کی کشاکش دُنیا کے حوادث اور مشکلات کے تلاطم میں امن و سکون اور چین کا گوشہ ہے۔ مرد و عورت کو ایک دوسرے سے ملا کر اللہ تعالیٰ نے دونوں کے جنسی میلان کو ان کی معاشی اور معاشرتی کمی کی تکمیل کا ذریعہ بنایا ہے۔ اس لیے یہ ایک دوسرے کے ساتھ لازم و ملزوم، ایک دوسرے کی پردہ پوش، ایک دوسرے کی زینت اور ایک دوسرے کی

---

[1] ماجدی ص ۷۱

تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ قرآن پاک کی بلاغت دیکھئے کہ اس نے ان سارے مطالب کو صرف ایک تشبیہہ میں ادا کر دیا ہے ھن لباس لکم و انتم لباس لھن ۔ اس پوشاک کے پردے میں جیسا کہ ابھی بتایا گیا بیسیوں معنے پوشیدہ ہیں۔ تم ان کے لیے ستر پوش ہو وہ تمہارے لیے۔ تم اُن کی زینت ہو وہ تمہاری، تم اُن کی خوبصورتی ہو وہ تمہاری، تم ان کی تکمیل کا ذریعہ ہو وہ تمہاری۔ یہی نکاح اور شادی کے اغراض ہیں۔ اور اپنی اغراض کو پورا کرنا حقوقِ زوجین کو ادا کرنا ہے۔

۵۳۵ - اللہ کو معلوم ہے کہ تم لوگ چپکے چپکے اپنے آپ سے خیانت کر رہے تھے۔ اپنے نفس کے ساتھ خیانت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ سونے کے بعد عورتوں کے پاس جا کر بوجہ مخالفتِ حکمِ الٰہی تم اپنے آپ کو گنہگار بناتے ہو جس سے تمہارے نفس مستحق عتاب ہوتے ہیں اور اُن کے ثواب میں نقصان پڑتا ہے سو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے تم کو معاف کر دیا اور آئندہ کو اجازت دی[1]

یہ تشریح عام مفسرین کے خیال کے مطابق ہے۔ ان کی رائے میں پہلا حکم یہ تھا کہ سو جانے کے بعد کھانا پینا اور زناشوئی کے تعلقات حرام تھے۔ اس آیت نے اسے منسوخ کر دیا اور غروبِ آفتاب کے بعد سے طلوعِ صبح صادق تک پوری رات میں کھانے پینے اور خلوت کی اجازت دے دی گئی۔ اگرچہ سو کر اُٹھنے کے بعد ہو۔ لیکن قرآن کا اندازِ تعبیر کہتا ہے کہ ابتدا میں اس قسم کا کوئی صاف حکم موجود نہ تھا کہ رمضان کی راتوں میں اپنی بیوی سے مباشرت نہ کرو۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن کا اندازِ بیان یہ نہ ہوتا کہ تختانون انفسکم تم اپنے آپ سے خیانت کرتے تھے بلکہ اندازِ تعبیر یوں ہوتا کنتم تختانون اللہ تم اللہ سے خیانت کرتے تھے جیسا کہ دوسرے موقعہ پر ہے لا تخونوا اللہ و رسولہ مت خیانت کرو اللہ اور اُس کے رسُول سے۔ یہ اندازِ بیان قرآن نے اختیار ہی یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ اللہ نے یہ حکم نہیں دیا تھا بلکہ جب روزے کا حکم ہوا تو صحابہ کرام نے خیال کیا کہ کما کتب علی الذین من قبلکم میں تشبیہہ کیفیتِ روزہ کے لیے ہے۔ اس لیے اہلِ کتاب کی روزے میں پابندیاں ان کے لیے بھی ضروری ہیں۔ اسی پر قیاس کر کے انہوں نے سمجھ لیا کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے اور چونکہ پابندیاں سخت تھیں اس لیے اپنے طور پر اس کو نباہ نہ سکے اور ناجائز ہونے کا دل میں خیال لیے بسا اوقات اپنی بیویوں کے پاس چلے جاتے تھے۔ یہ گویا اپنے ضمیر کے خلاف اقدام تھا اور اس سے اندیشہ تھا کہ ایک کمزور ذہنیت ان کے اندر پرورش پاتی رہے گی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس پر تنبیہہ فرمائی۔ پھر ارشاد فرمایا کہ یہ فعل تمہارے لیے جائز ہے۔

لہ افاداتِ شیخ الہند ص ۳۶

۵۳۶ ۔ لہٰذا اب بغیر کسی اندیشہ کے اپنی بیویوں سے خلوت کرو اور جو کچھ اللہ نے تمہارے لیے مقرر کیا ہے اسے حاصل کرو۔ یعنی لوح محفوظ میں جو اولاد اللہ نے تمہارے لیے مقدر فرما دی ہے۔ عورتوں کی مباشرت سے وہ مطلوب ہونی چاہیے۔ محض شہوت رانی مقصود نہ ہو۔ اس میں عزل کی کراہت اور لواطت کی ممانعت کی طرف بھی اشارا ہے [1]

ابتداء میں اگرچہ اس قسم کا کوئی صاف اور صریح حکم موجود نہ تھا کہ مباشرت نہ کرو لیکن لوگ اپنی جگہ یہی سمجھتے تھے کہ ایسا کرنا جائز نہیں ہے اس لیے اللہ نے فرمایا کہ یہ فعل تمہارے لیے جائز ہے لہٰذا اب اسے برا فعل سمجھتے ہوئے نہ کرو بلکہ اللہ کی اجازت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے قلب و نظر کی پوری طہارت کے ساتھ کرو۔

منع حمل اور قطع نسل

ابتغوا ما کتب اللہ لکم کا بلیغ فقرہ اپنے اندر معانی کا سمندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اس میں صاف صاف بتایا گیا ہے کہ مباشرت سے مقصود افزائش نسل ہے نہ کہ ارادی لاولدی اور عزل۔ منع حمل اور قطع نسل کی جس جدید تحریک کا اس وقت زور ہے اور جو ضبط تولید وغیرہ مختلف خوشنما ناموں سے پیش ہو رہی ہے۔ قرآن نے اپنے بلیغ انداز میں ان سب کی تردید کر دی ہے اور بتا دیا کہ مباشرت کا جو نتیجہ طبعاً نکلتا ہے اسی کی توقع رکھنی چاہیے اور اسی کا انتظار کرنا چاہیے۔ عام قاعدہ یہی ہے۔ باقی میاں بیوی کے اجتماع کے قدرتی نتیجوں کو بلا وجہ اور بلا ضرورت شدیدہ مصنوعی ذریعوں سے روکنا مصیبتوں کو دور کرنا نہیں جسمانی آلام اور اخلاقی امراض کو بڑھانا اور فرد و قوم دونوں کو نئے نئے فتنوں کی دعوت دینا ہے۔ انتہائی سرگرم کوششوں کے باوجود اول تو ابھی تک کوئی پوری طرح حمل روک آلہ دریافت نہیں ہو سکا ہے۔ اب تک کوئی مانع حمل ایسا نہیں دریافت ہو سکا ہے جو ہر طرح قابل اطمینان ہو سکے

بہرحال اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اولاد جو ازدواجی زندگی کا مقصد ہے اس کے طالب بنو۔ اور یہ یاد رکھو کہ اس چیز کا تمام تر انحصار تقدیر الٰہی پر ہے نہ کہ تمہارے اختیار یا اللہ کے سوا کسی اور کے تصرف پر۔ اس کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کی اصل غایت صرف لذت نہیں ہے بلکہ بغلتے نسل ہے جو عین منشائے الٰہی ہے۔ اگر آدمی صرف لذت کے درپے ہو تو اس کا اثر انسان پر

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۹۰ ماجدی ص ۷۱

بُرا پڑ سکتا ہے لیکن اگر نگاہ اصل غایت پر ہو تو یہ بھی عبادت میں داخل ہے۔ اس زمانے میں ضبطِ ولادت کی تحریک اس کے بالکل برعکس ازدواجی زندگی کے اصل مقصد کی بیخ کنی کر رہی ہے اور لذت کو اصل اہمیت دے رہی ہے[1]

سحری کا آخری وقت یا روزے کا آغاز

۵۳۷۔ نیز راتوں کو کھاؤ پیو یہاں تک کہ صبح کی سپید دھاری رات کی کالی دھاری سے نمایاں ہو جائے یعنی جیسے رات بھر میں مجامعت کی اجازت دی گئی۔ اسی طرح رمضان کی رات میں تم کو کھانے اور پینے کی بھی اجازت ہے صبح صادق تک[2]

عرب میں یہ رواج تھا کہ سونے سے پہلے جو کھا لیتے، سو جانے کے بعد کھانا پینا ناجائز تھا۔ ابتدائے اسلام میں بھی یہودیوں کی طرح یہی قاعدہ تھا۔ ایک دفعہ رمضان کا زمانہ تھا۔ ایک صحابی کے گھر میں شام کا کھانا تیار نہیں ہوا تھا۔ ان کی بیوی کھانا پکا رہی تھیں وہ انتظار کرتے کرتے سو گئے۔ کھانا پک چکا تو ان کی بیوی کھانا لے کر آئیں وہ سو چکے تھے اس لیے کھانا نہیں کھا سکتے تھے دوسرے دن پھر روزہ رکھا اُن کو غش آگیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی

آیت کا مطلب یہ ہے کہ طلوعِ صبح تک کھانے پینے کی اجازت ہے۔ فجر کی سفید دھاری کا سیاہ دھاری سے ممتاز ہو جانا کنایہ ہے۔ تاریکی شب کے دُور ہونے اور سپیدۂ صبح کے نمودار ہونے یعنی صبح ہونے سے۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی تفسیر منقول ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ روزے کا وقتِ آغاز صبح ہونے سے ہوتا ہے اور صبح کے سپیدہ کے لیے آیت میں سپید دھاگے کی تعبیر یہ بتانے کے لیے ہے کہ صبح کا ادنیٰ حصہ بھی اگر مثل دھاگے کے ظاہر ہو جائے تو کھانا پینا حرام ہو جاتا ہے اور روزہ کا وقت شروع ہو جاتا ہے اور اس کی صحیح علامت یہ ہے کہ جب رات کے آخری حصے میں افق کے مشرقی کنارے پر سفیدۂ صبح کی باریک سی دھاری نمودار ہو کر اُوپر کو بڑھنے لگے تو سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے اور روزے کا وقت شروع ہو جاتا ہے۔

قرآن میں صرف طلوعِ صبح کو سحری کی انتہا نہیں بلکہ تبیّنِ صبح کو سحری کی انتہا بتایا ہے۔ تبیّن لغت میں ظاہر ہو جانے، نمایاں ہو جانے اور خوب واضح ہو جانے کو کہتے ہیں، اس لفظ کا استعمال بتا رہا ہے کہ

---

[1] تدبر قرآن ص ۳۱۵　[2] افادات شیخ الہند ص ۳۶

سحری کا آخری وقت صبح صادق کے اچھی طرح نمایاں ہو جانے تک ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ آیت کے معنے یہ ہیں کہ دن کی سپیدی رات کی تاریکی سے ممتاز ہو جائے اور یہ امتیاز صبح صادق کے طلوع ہونے کے بعد کا وقت دن کا وقت ہے۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ سیاہ دھاگے سے رات اور سپید دھاگے سے صبح صادق مراد ہے۔

یہ بات علماء میں اختلافی ہے کہ سحری کا وقت اختتام طلوع صبح ہے یا تبین صبح ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت کی رائے ہے کہ صبح صادق کے واضح اور نمایاں ہونے تک سحری کا وقت ہے۔ یہی امام اعمش کی رائے ہے۔ اور کچھ کا خیال ہے کہ سپید دھاگے کے نمایاں ہونے سے مراد دن کی سپیدی کا نمایاں ہونا اور سڑکوں، گلیوں اور گھروں میں پھیل جانا ہے۔ لیکن جمہور علماء اور صحابہ کی رائے یہی ہے کہ طلوع صبح صادق پر سحری کا وقت ختم ہو جاتا ہے۔

قرآن نے چونکہ سحری کے اختتام کو بتانے کے لیے استعارے کی بلیغ زبان اختیار کی ہے اس لیے خود زمانہ نبوت ہی میں کچھ لوگوں نے اسے تشبیہ سے الگ ہو کر معنے لغوی پر محمول کیا۔ چنانچہ عدی بن حاتم طائی کہتے ہیں کہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی تو میں نے دھاگے کو دھاگا ہی سمجھا اور میں نے دو موٹے موٹے دھاگے لیے اور دونوں کو اپنے تکیے کے نیچے رکھ لیا۔ اور دونوں کو دیکھتا رہا۔ رات کی تاریکی میں دونوں میں کوئی فرق معلوم نہیں ہوا۔ صبح کو حضور انور کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور واقعہ عرض کیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم واقعہ سن کر ہنس پڑے۔ اور فرمایا کہ تمہارا تکیہ تو کافی لمبا چوڑا ہے کہ اس میں دن رات سما گئے ہیں۔ ان دھاگوں سے تو رات کی تاریکی اور دن کی سپیدی مراد ہے۔

اگر حضرت عدی نے ایسا سمجھا ہے تو اس پر تعجب اور حیرت کی کون سی بات ہے۔ قرآن کی زبان قریش کی زبان ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اسلام قبول کرنے والا ہر شخص زبان کی ساری چاشنیوں سے واقف ہو۔ ابو بکر الجصاص نے یہ بات بالکل برمحل لکھی ہے کہ لیس کل العرب تعرف سائر لغاتها۔ ہر عربی پوری زبان پر قابو نہیں رکھتا ہے اس لیے اگر عدی نے صبح کو پہچاننے کے لیے دو سیاہ سفید دھاگے رکھ لیے تو اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ اس سے فہم صحابہ پر کوئی حرف نہیں آتا۔

بہرحال طلوع فجر کے لیے دھاگے کی تعبیر بڑی لطیف ہے۔ اس کا اطلاق صبح صادق کے اولین ظہور پر ہی ہو سکتا ہے، روشنی پھیل جانے کے بعد اسے دھاگے سے تشبیہ دینے میں کوئی معنویت نہیں ہے جو لوگ تبین سے روشنی پھیل جانا مراد لیتے ہیں قرآنی تعبیر ان کا ساتھ نہیں دیتی ہے اور شاید من الفجر کے اضافے میں بھی اسی طرف اشارہ ہے۔ اگر قرآن میں من الفجر کی بجائے من النهار ہوتا تو شاید کچھ بات

بن جاتی۔ تبیین کے ساتھ من الفجر فرما کر تشدد اور تساہل کی تمام راہیں بند کردی ہیں اور بتا دیا کہ نہ تو صبح صادق ہونے سے پہلے کھانا پینا چھوڑ دو اور نہ ایسی بے فکری کو اپناؤ کہ صبح ہو جانے پر بھی کھاتے پیتے رہو۔ روزے کے آغاز اور سحری کے اختتام میں اصل چیز صبح صادق کا تبیین اور تیقن ہے۔ تیقن سے پہلے کھانے پینے کو حرام سمجھنا درست نہیں ہے اور تیقن کے بعد کھانے پینے میں مشغول رہنا حرام اور روزے کے لیے مفسد ہے۔

سحری میں تاخیر سنت ہے اور اس کی بڑی فضیلت آئی ہے لیکن یہ تاخیر صبح صادق ہونے تک ہے صحیحین میں قاسم بن محمد نے حضرت عائشہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! آذانِ بلال پر کھانا پینا نہ چھوڑا کرو کیونکہ وہ رات میں آذان دیتا ہے۔ ہاں ابن اُمّ کلثوم کی آذان سنو تو چھوڑ دو کیونکہ وہ طلوعِ فجر ہونے پر آذان دیتا ہے اور امام بخاری نے قاسم بن محمد کے حوالہ سے ہی یہ انکشاف فرمایا ہے کہ دونوں آذانوں میں صرف اتنا ہی فصل ہوتا تھا کہ ایک اترتا اور دوسرا چڑھتا۔ اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سحری کا وقت طلوعِ صبح صادق پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ صبح صادق ہو جانے کے بعد بھی کچھ کھایا پیا جا سکتا ہے کسی طرح بھی صحیح نہیں ہے۔

بعض مفسرین کا یہ کہنا کہ نسائی کی ایک حدیث سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور حضراتِ صحابہ بالکل صبح ہو جانے تک سحری سے شغل فرماتے تھے۔ بس اس کا لحاظ رہتا کہ کہیں آفتاب ہی نہ نکل آئے۔

یا یہ کہنا

سحر میں سیاہی شب سے سپیدۂ صبح کا نمودار ہونا اچھی خاصی گنجائش اپنے اندر رکھتا ہے اور ایک شخص کے لیے یہ بالکل صحیح ہے کہ اگر عین طلوعِ فجر کے وقت اس کی آنکھ کھلی تو وہ جلدی سے اُٹھ کر کچھ کھا پی لے۔ حدیث میں آتا ہے کہ حضورؐ نے فرمایا: اگر تم میں سے کوئی شخص سحری کھا رہا ہو اور آذان کی آواز آجائے تو فوراً چھوڑ نہ دے بلکہ اپنی حاجت بھر کھا پی لے۔

پہلی بات کسی طرح بھی روایۃً اور درایۃً درست نہیں ہے۔ روایۃً اس لیے کہ نسائی کی روایت کے بارے میں حافظ ابن کثیرؒ نے امام نسائیؒ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ

اس حدیث کے بیان کرنے میں عاصم ابن ابی النجود منفرد ہے۔

اور ابوبکر الجصاص رازی فرماتے ہیں کہ

اگر روایتی طور پر حدیث حذیفہ ثابت بھی ہو جائے تو پھر بھی اس سے صبح صادق

کے بعد کھانے پینے کا جواز معلوم نہیں ہوتا۔ کیونکہ حدیث حضور انورؐ کے عمل کو ظاہر نہیں کرتی ہے زید اپنا عمل بیان کر رہے ہیں کہ انہوں نے کھایا۔ کھانے کے وقت میں حضورؐ کے پاس ہونا تو زید کے اس عمل کے بارے میں حضورؐ کے واقف ہونے کی دلیل ہے اور نہ معلوم ہو جانے کے بعد اجازت کی دلیل ہے۔ اگر حضور انور کا واقف ہونا بھی ثابت ہو جائے تو ہم یہی کہہ سکتے ہیں کہ آخری وقت میں کھائی اور دن سے قرب ہونے کی وجہ سے اس وقت کو دن کہہ دیا ہے۔

حافظ ابنِ کثیرؒ نے بھی بات امام نسائی کے حوالے سے بتائی ہے کہ دن سے قریب ہونے کی وجہ سے سحری کے آخری وقت کو دن کہہ دیا ہے۔ خود قرآن میں بھی ایک جگہ مدتِ عدت کے قرب ہونے کو عدت کے پورا ہونے کے لیے بولا ہے۔ حافظ ابنِ کثیرؒ کہتے ہیں کہ حدیث کا یہی مطلب متعین ہے۔

درایتہً اس لیے دُرست نہیں۔ ہے کہ روایت کے یہ الفاظ کہ بس اتنی کسر رہ گئی تھی کہ سورج نہیں نکلا تھا یہ بتاتے ہیں کہ گویا سحری صبح کی نماز سے فراغت کے بعد کھائی جا رہی تھی۔ اور یہ ان لوگوں کا موقف ہے جو روزے کو طلوعِ آفتاب سے شروع کرتے ہیں اور غروبِ آفتاب پر ختم کرتے ہیں۔ حافظ ابن جریر نے کچھ لوگوں کی یہ رائے بتائی ہے لیکن ابنِ کثیرؒ نے اس پر کڑی تنقید کی ہے اور لکھا ہے کہ یہ نصِ قرآنی کے خلاف ہے۔

دوسری بات کہ سحری میں سیاہی شب سے سپیدہ صبح کا نمودار ہونا اچھی خاصی گنجائش رکھتا ہے۔ ایک ذاتی رائے رکھتا ہے جس کی قرآن نفی کر رہا ہے۔ اور ایسا کوئی ارشاد کم از کم ہم کو علموں کی نظر سے بالکل نہیں گزرا جس میں حضورؐ نے فرمایا ہو کہ اگر تم میں سے کوئی شخص سحری کھا رہا ہو اور آذان کی آواز آجائے تو فوراً نہ چھوڑے بلکہ اپنی حاجت بھر کھا پی لے۔ اگر اس سے مقصود وہ ارشادِ نبوت ہے جس میں حضورؐ نے فرمایا کہ

آذانِ بلال کی وجہ سے تم میں سے کوئی کھانا نہ چھوڑے۔

تو حدیث ہی میں اس کی علت یہ بتائی گئی ہے کہ بلال صبح صادق ہونے سے پہلے رات کو اذان دیتے ہیں۔ ایک دوسری روایت میں ہے کہ بلال لوگوں کو ہوشیار کرنے کے لیے بہت سویرے آذان دیتے ہیں۔ اس علت کی موجودگی میں یہ کہنا درست نہیں کہ اگر ایک شخص کی عین طلوعِ فجر کے وقت آنکھ کھلی ہو تو وہ جلدی سے اٹھ کر کھا پی لے۔ علماء نے تصریح کی ہے کہ اس حالت میں اصل تو یہی ہے کہ کھانے پینے پر اقدام نہ کرے لیکن مشکوک حالت میں صبح صادق کا یقین ہونے سے پہلے کچھ کھا پی لیا تو گنہگار نہیں ہوگا اور بعد میں اگر ثابت ہو گیا کہ صبح صادق ہو چکی تھی تو روزہ کی قضا اُس کے ذمہ واجب ہوگی۔

روزے کا آخری وقت

۵۲۸۔ پھر رات تک روزے کا وقت پورا کرو۔ یعنی طلوعِ فجر سے رات تک روزے کو پورا کرو۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کئی روزے لگاتار رکھنے اس طرح پر کہ رات کو بھی افطار نہ کرے مکروہ ہے[1]

رات تک روزہ پورا کرنے سے مراد یہ ہے کہ جہاں رات کی سرحد شروع ہو جاتی ہے وہیں تمہارے روزے کی سرحد ختم ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ رات کی سرحد غروبِ آفتاب سے شروع ہوتی ہے لہٰذہ غروبِ آفتاب ہی کے ساتھ افطار کر لینا چاہیے۔ افطار کی صحیح علامت یہ ہے کہ جب دن کے آخری حصہ میں مشرق کی جانب سے رات کی سیاہی بلند ہوتی نظر آئے تو افطار کا وقت ہو جاتا ہے[2]

غروبِ آفتاب ہی روزے کے افطار کا حکم شرعی ہے، صحیحین میں حضرت عمرؓ کے حوالے سے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب رات مشرق کی جانب سے آجائے اور دن مغرب کی طرف چلا جائے تو روزہ دار روزہ افطار کرے۔ سہل بن سعد الساعدی کہتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگوں میں اس وقت تک خیر کا دور دورہ رہے گا جب تک وہ افطار میں جلدی کرتے رہیں گے۔ اور مسند احمد میں بحوالہ ابوہریرہ یہ بھی حضورِ انورؐ کا ارشاد ہے کہ اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں مجھے اپنے بندوں میں سب سے زیادہ محبوب وہ ہیں جو روزے کے افطار میں جلدی کرتے ہیں۔ ان ارشادات کی روشنی میں آیت کے صاف معنے یہ ہوئے کہ افطار عین غروبِ آفتاب کے بعد ہونا چاہیے۔

حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت سے صومِ وصال کی ممانعت استنباط فرمائی ہے۔ یعنی بلا افطار کیے دن اور رات کے مسلسل روزے کی ممانعت بھی اسی آیت سے معلوم کی ہے۔ مسند امام احمد میں ہے بشیر بن الخصاصیہ کی اہلیہ لیلیٰ کہتی ہیں کہ میں نے دو دن کا متصل روزہ رکھنے کا خیال ظاہر کیا تو مجھے میرے شوہر نے بتایا کہ اس طرح کے روزے سے حضورؐ نے منع فرمایا ہے اور آپ کا فرمان ہے کہ یہ طریقہ عیسائیوں کا ہے تم ویسے ہی روزہ رکھا کرو جیسے اللہ نے حکم دیا ہے ثم اتموا الصیام الی اللیل رات ہونے پر روزہ افطار کر لو۔

روزہ کا آیات کی روشنی میں مفہوم

صیام اور صوم کے لفظی معنے اگرچہ رُکنے کے ہیں صام الفرس صوماً کے معنے ہیں گھوڑے نے

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۶ [2] تفہیم القرآن ص ۱۴۶

چارہ نہیں کھایا روزانہ استعمال میں عام طور پر نفسانی خواہشوں اور انسانی حرص و ہوا کا مظہر تین چیزیں ہیں کھانا، پینا اور عورت و مرد کے جنسی تعلقات ان ہی سے طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک رُکے رہنے کا نام قرآن کی زبان میں روزہ ہے جیسا کہ احل لکم لیلۃ الصیام الرفث الی نسائکم اور کلوا واشربوا حتی یتبین لکم الخیط الابیض من الخیط الاسود من الفجر سے معلوم ہو رہا ہے اور اس رُکنے کے لیے شرط یہ ہے کہ بالارادہ ہو۔ اس لیے اگر بغیر ارادے کے بھول کر روزے میں کھا پی لیا تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹے گا۔ سنن ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ کے حوالے سے حضور انورؐ کا ارشاد ہے:

جو شخص بھول کر کھا پی لے تو اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا کیونکہ یہ تو اللہ کی دین ہے۔

اسی طرح ان افعال سے جو کہ روزے کے منافی ہیں لیکن وہ قصداً سرزد نہیں ہوتے بلکہ بے ارادہ از خود سرزد ہوتے ہیں روزہ نہیں ٹوٹتا۔ ابو داؤد میں ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جسے قے آ جائے یا سونے کی حالت میں احتلام ہو جائے اس سے روزہ نہیں ٹوٹتا ہے۔

اعتکاف

۵۳۹۔ ہاں اگر تم مسجد میں اعتکاف کر رہے ہو تو اس حالت میں تم کو اپنی بیویوں سے خلوت نہ کرنی چاہیے۔ یعنی روزے میں تو رات کو مباشرت کی اجازت ہے مگر اعتکاف میں رات دن کسی وقت عورت کے پاس نہ جائے[1]

اعتکاف کے لغوی معنے کسی جگہ ٹھہرنے کے ہیں۔ اور قرآن و سنت کی اصطلاحی زبان میں خاص شرط کے ساتھ مسجد میں ٹھہرنے کو کہتے ہیں۔ قرطبی نے اعتکاف کی یہ تعریف کی ہے "خاص طاعت کی خاطر خاص وقت خاص جگہ اور خاص شرائط کے تحت مسجد میں رُک جانا اعتکاف ہے۔"

آیت میں جیسے لفظ مساجد کے عموم سے معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف ہر مسجد میں ہو سکتا ہے ایسے ہی مساجد کی قید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اعتکاف کے لیے مسجد شرط ہے۔ قرطبی نے اس پر علما کا اجماع نقل کیا ہے ہاں عورتوں کا اعتکاف بجائے مسجد کے گھر میں کسی گوشہ میں ہونا چاہیے۔ فقہا نے مسجد کے ساتھ یہ بھی قید لگائی کہ اس میں نماز باجماعت ہوتی ہو۔ یہ شرط درحقیقت مسجد کے مفہوم

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۶

ہی سے مستفاد ہے کیونکہ مساجد بنانے کا مقصد ہی نماز با جماعت ہے ورنہ تنہا نماز تو ہر جگہ ہو سکتی ہے[۱]

اعتکاف سے مقصود چونکہ تبتل الی اللہ ہے اور اس میں دل کی کامل یکسوئی مطلوب ہے۔ نیز مسجد اس کے لوازم سے ہے اس کے دوران بیویوں سے زن و شو کا تعلق قائم کرنے کی اجازت نہیں ہے[۲]

رمضان میں اعتکاف کے ذریعے رمضان کے فوائد و مقاصد کی تکمیل کی گئی ہے۔ دل کی جمعیت، طبیعت کے سکون اور اللہ سبحانہٗ کی جانب توجہ تام پیدا کرنے میں رمضان کے اندر جو کمی رہ جاتی ہے اُسے اعتکاف کے ذریعے پورا کیا جاتا ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں: اسلام میں اعتکاف کی قانونی رُوح یہ ہے کہ قلبِ انسانی تنہائی میں سراپا توجہ ہو کر پوری جمعیت کے ساتھ اور مخلوق سے سارے رشتے توڑ کر اللہ سبحانہٗ کی طرف اس طرح متوجہ ہو جائے کہ دل خواطر اور وساوس کی جگہ یادِ الٰہی اور محبتِ خداوندی کی سرشاریوں سے ہم دوش ہو جائے۔ یادِ الٰہی اس کا فکر، محبتِ الٰہی اس کا خیال اور رضائے الٰہی کی طلب اس کی سوچ بن جائے۔ مخلوق سے جی ہٹا کر اللہ سے جی لگائے۔ یہ ہے رمضان کے آخری عشرے میں اعتکاف کا پسِ منظر —— حکیم الاُمت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ چونکہ مسجد میں اعتکاف انسان کے لیے جمعیتِ خاطر، دل کی صفائی، طاعت کے لیے یکسوئی، ملائکہ سے تشبہ اور لیلۃ القدر پا لینے کا ذریعہ ہے۔ اس لیے جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے عشرۂ آخر میں اعتکاف کو پسند فرمایا اور اُمت کے حسن کار طبقہ کے لیے سنت بن گیا[۳]۔ اعتکاف مسنون بھی ہے اور اسی کو فقہاء نے سنت مؤکدہ علی الکفایہ کہا ہے۔ یعنی بستی بھر میں اگر کوئی بھی کرے تو پوری بستی کی جانب سے سنت ادا ہو جائے گی۔

روحانی قوت و توانائی کا ذخیرہ اپنے اندر بھرنے کے لیے، اپنے کو روحانی و ایمانی اعتبار سے تازہ دم کرنے کے لیے اس سے بہتر اور مؤثر نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے کہ عین اس زمانہ میں جب کہ بیس روز کی مسلسل طاعت و عبادات اور شب و روز کے ذکرِ الٰہی و فکرِ ایمانی سے رُوح صاف ہو چکی ہے، ملکوتیت پیدا ہو چکی ہے۔ انسان اپنے کو چند روز کے لیے کامل یکسوئی اور انقطاع کے عالم میں لے آئے اور اخلاص و للہیت کی مشقوں کو دُعاؤں سے عبادتوں سے ذکر و فکر سے منتہائے کمال پر پہنچا دے[۴]

آیت میں اعتکاف کا ذکر روزے کے ذکر میں اس انداز سے آیا ہے کہ فقہا نے اعتکاف کے لیے روزے کو شرط قرار دیا ہے۔ قرآن کے الفاظ سے معلوم ہوتا ہے کہ رمضان کے مہینے اور مسجد سے

۱؎ معارف القرآن م ش ۲؎ تدبرِ قرآن ۳؎ الارکان الاربعہ ۴؎ ماجدی

اس عبادت کو خاص مناسبت ہے چنانچہ جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے عمل اور آپ کے ارشادات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ کے حوالے سے آیا ہے کہ جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہر رمضان میں دس روز اعتکاف کرتے تھے اور جس سال آپ کا وصال ہوا آپ نے بیس روز کا اعتکاف کیا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم ہر رمضان میں آخری عشرے کا اعتکاف کرتے تھے۔ یہاں تک کہ آپ کا وصال مبارک ہوگیا۔ پھر آپ کے بعد آپ کی بیویوں نے بھی اعتکاف کیا۔

بخاری ہی نے حضرت عائشہ کے حوالے سے بیان کیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم جب اعتکاف فرماتے تو اپنا سر مجھ سے قریب کر دیتے میں کنگھی کر دیتی۔ اور آپ گھر میں بغیر انسانی ضرورت کے داخل نہ ہوتے۔

۲۴۰۔ یہ اللہ کی ٹھہرائی ہوئی حدود ہیں۔ ان کے نزدیک بھی نہ جاؤ۔ یعنی روزے اور اعتکاف کے جو احکام دربارہ حلّت و حرمت بیان ہوئے ہیں۔ یہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے قواعد ہیں۔ ان سے ہرگز باہر نہ ہونا بلکہ ان کے قریب بھی نہ جانا۔ یا یہ مطلب ہے کہ اپنی رائے یا کسی حجت سے ان میں سرمو تفاوت نہ کرنا[1]

گویا اشارہ فرمایا کہ روزے میں کھانے پینے اور مباشرت کی جو ممانعت ہے یہ اللہ کی حدود ہیں۔ ان کے قریب بھی نہ جاؤ کیونکہ قریب جانے سے حد شکنی کا احتمال ہے۔ اسی لیے روزے کی حالت میں کلی کرنے میں مبالغہ مکروہ ہے۔ مُنہ کے اندر کسی دوا کا استعمال کرنا مکروہ ہے[2]

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے نفس کی آزادی کے لیے جو حدیں مقرر کی ہیں ان کی پوری احتیاط سے نگرانی کرنی چاہیے۔ یہاں تک کہ اپنے آپ کو ان سے بچائے رکھنے کے لیے ذرا ان سے دُور ہی دُور رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ جو جانور کسی چراگاہ کے بالکل پاس پاس چرتا ہے اس کے متعلق اندیشہ ہے کہ وہ چراگاہ میں چلا جائے[3]

یہ نہیں فرمایا کہ ان حدوں سے تجاوز نہ کرنا بلکہ یہ فرمایا کہ ان کے قریب بھی نہ پھٹکنا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جس مقام سے معصیت کی حد شروع ہوتی ہے عین اسی مقام کے آخری کنارے پر گھومتے رہنا آدمی کے لیے خطرناک ہے۔ سلامتی اسی میں ہے کہ آدمی سرحد سے دُور رہے تاکہ

---

[1] ملفوظات شیخ الہند ص ۳۶ [2] معارف القرآن م ش ص ۲۰۰ [3] تدبر قرآن

وَلَا تَأْكُلُوٓا۟ أَمْوَٰلَكُم بَيْنَكُم بِٱلْبَٰطِلِ وَتُدْلُوا۟ بِهَآ إِلَى ٱلْحُكَّامِ
لِتَأْكُلُوا۟ فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَٰلِ ٱلنَّاسِ بِٱلْإِثْمِ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ۝ رکوع ۲۳

اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ[۵۴۲] اور اسے حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ[۵۴۳] تاکہ لوگوں کے مال ناحق حاصل کر لو حالانکہ تم جانتے ہو کہ یہ حق تلفی ہے۔

بھولے بھی قدم اس کے پار نہ چلا جائے۔ یہی مضمون اس حدیث میں بیان ہوا ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہر بادشاہ کے لیے ایک حمیٰ ہوتی ہے۔ اللہ کی حمیٰ اس کی وہ حدیں ہیں جن سے اس نے حلال وحرام کا فرق قائم کیا ہے۔ حمیٰ اس چراگاہ کو کہتے ہیں جسے کوئی رئیس یا بادشاہ پبلک کے لیے ممنوع کر دیتا ہے۔ جو جانور حمیٰ کے اردگرد چرتا رہے گا ہو سکتا ہے کہ ایک روز حمیٰ کے اندر داخل ہو جائے[۱]

۵۴۱۔ اللہ اسی طرح اپنے احکام واضح کرتا ہے تاکہ لوگوں میں متقیانہ بیرت پیدا ہو۔ یعنی جس طرح اس نے یہاں روزے اس کے حدود و اعتکاف اور اس کے متعلقات بیان کر دیے ہیں اسی طرح وہ اپنے سارے احکام و شرائع انسان کے سود و بہبود کے لیے تفصیل سے بیان کرتا ہے۔ ان احکام کی پابجائی تمہیں متقی اور پرہیزگار بنا دے گی[۲] تقویٰ ہی وہ مقصدِ عظیم ہے جس کی قدر و قیمت سے پیروانِ دعوتِ ایمانی کو آشنا ہونا چاہیے تاکہ وہ روئے زمین پر اللہ کا بنایا ہوا نظام برپا کر سکیں اور ساری انسانیت کی نگرانی کا فرض انجام دے سکیں۔ راستہ کی صعوبتوں، دشواریوں سے گزر سکیں اور خواہشوں کے جال میں پھنسنے سے اپنے آپ کو بچا سکیں۔

---

[۱] تفہیم القرآن [۲] ماجدی

مال حرام سے ہمیشہ کے لیے بچو

روزے کے حکم سے پہلے عزیزوں اور رشتہ داروں کے اموال کا تذکرہ تھا۔ اب روزوں کے احکام ختم ہونے پر بھی مالیاتی حقوق کے ہڑپ کرنے کی ممانعت آتی ہے۔ مالیاتی مسائل کے درمیان روزے کے مسائل بیان کیے گئے ہیں۔ اس سے اسلام میں روزے کا مقام واضح ہوجاتا ہے کہ اس عبادت کا اصل مقصود حرص و طمع، بخل اور لالچ اور اس قبیل کی دوسرے رذایل پر قابو پانا ہے۔ ان پر قابو پانے ہی سے انسان میں وہ تقویٰ پیدا ہوتا ہے جو حقوق و معاملات میں انسان کو عدل پسند اور محتاط بناتا ہے۔ روزے کے آغاز میں بھی لعلکم تتقون فرمایا اور انجام میں بھی لعلھم یتقون فرمایا گویا روزے کے ذریعے پوری زندگی میں ہر قسم کی برائی سے بچنے کی مشق کرائی جارہی ہے۔ ظاہر ہے کہ روزہ چند گھنٹوں کے لیے حلال سے بچنے کا نام ہے۔ یہاں اس آیت کے ذریعے اشارہ کردیا ہے کہ چند گھنٹے حلال روزی سے بچنا کچھ سودمند نہیں ہوسکتا۔ اگر ایک شخص بندوں کے حقوق سے بے پرواہ ہے اور مال حرام سے اپنے آپ کو نہیں روک سکتا۔ نیکی صرف یہی نہیں ہے کہ چند گھنٹوں کے لیے تم نے حلال غذا چھوڑ دی۔ نیکی کی راہ یہ ہے کہ ہمیشہ کے لیے حرام غذا چھوڑ دو۔

ہمیں چاہیے کہ معاملے کے اس پہلو پر بھی نظر ڈالیں کہ کیا وجہ ہے کہ روزے کے بیان سے پہلے تو حقداروں کے لیے وصیت کرنے اور وصیت میں عدل وانصاف کی ہدایت کی۔ اور روزے کے بیان کے بعد رشوت کے ذریعے حکام کو خریدنے اور ایسے دوسروں کے حقوق کے غصب کرنے کا ذریعہ بنانے کی ممانعت فرمائی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح ایمان باللہ کی ساری قدروقیمت اس وقت ہے جب اس میں شرک کی آمیزش نہ ہو۔ اسی طرح طاعت و عبادات کی ساری افادیت اس وقت ہے جب ضمیر میں وہ احساس ہو جس کی بناپر ہر کام میں اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت ہو۔ اسی کیفیت کا نام تقویٰ ہے۔ اسی کو دوسرے لفظوں میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ عبادت کی ساری افادیت اسی وقت تک ہے جب تک پوری زندگی میں قانونِ الٰہی کے نفاذ کے لیے دیانتدار حکام موجود ہیں اور معاشرہ حرام کاری، حرام خوری سے پاک ہے جہاں معاشرے میں رذایل رواج پاتے ہیں۔ بس عبادت کی افادیت کا جنازہ نکل جاتا ہے۔

۴۲ ۵۔ اور تم آپس میں ایک دوسرے کا مال ناجائز طور پر نہ کھاؤ۔ روزے سے طہارتِ نفس مقصود تھی۔ اب تطہیرِ اموال کے بارے میں حکم ہورہا ہے۔ اور معلوم ہوگیا کہ مال حلال تو صرف روزے

بن چند گھنٹے کھانا منع ہے اور مالِ حرام سے روزہ مدت العمر کے لیے ہے۔ اس کے لیے کوئی حد نہیں جیسے چوری خیانت یا دغابازی یا رشوت یا زبردستی یا قمار یا ناجائز کاروبار یا سُود ان ذریعوں سے مال کمانا بالکل حرام اور ناجائز ہے۔[1]

اکلِ اموال سے صرف کھانا مراد نہیں ہے بلکہ مال کا ناجائز استعمال اور اسے اپنے تصرف میں لے آنا مراد ہے اردو میں ایسے موقع پر روپیہ کھانا، ہڑپ کرنا اور ہضم کرنا بولتے ہیں۔ باطل سے ہر ناجائز طریق جو عدل و انصاف، قانون، عرف اور سچائی کے خلاف ہو مراد ہے۔ اس کے تحت جھوٹ، خیانت، غصب، رشوت، سُود، سٹہ، جوا، چوری اور معاملات کی وہ ساری قسمیں آتی ہیں جن کو اسلام نے ناجائز قرار دیا ہے۔

افزائشِ دولت کے ذرائع

اسلام ملکیتِ دولت کے بارے میں جس نظریہ کا قائل ہے اس کے تحت اس نے مال کے ذریعے مزید مال حاصل کرنے اور اسے استعمال کرنے کے طریقوں پر کچھ پابندیاں عائد کی ہیں۔ وہ مالک کو کھلی چھٹی نہیں دیتا کہ من مانی کرتا جائے۔ وہ ہر شخص کو مال کے ذریعے مال کمانے کی پوری آزادی دیتا ہے لیکن اس کے ساتھ یہ ضروری قرار دیتا ہے کہ دولت جائز، پاک اور غیر ظالمانہ طریقوں سے پیدا کی جائے۔ اس کے لیے کسب پر کچھ قانونی اور اخلاقی پابندیاں عائد کرتا ہے۔ انسان کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ دھوکہ، چوری، قماربازی سنگدلی اور شقاوت سے مال پیدا کرے۔ خیانت، غصب، فریب دہی، سٹہ بازی جیسے تمام ذرائع کو حرام قرار دیتا ہے۔ یہی وہ راہیں ہیں جن سے دولت کی بڑی مقدار دفعۃً بغیر کسی محنت اور جائز مبادلہ کے ہاتھ آجاتی ہے۔ اسلام افزائشِ دولت کے لیے صرف پاکیزہ ذرائع ہی کو روا رکھتا ہے۔ آج ہم سرمایہ میں جو بے تحاشا اضافہ دیکھتے ہیں اس کی وجہ دراصل دھوکہ، فریب، سُود، قمار، اچکاپن، چوری، غصب وغیرہ وہ جرائم ہیں جو آج کے معروف طریقہائے استعمال میں پوشیدہ ہیں۔ جن غلط ذرائع پر اسلام پابندی لگاتا ہے ان کی تفصیل مطالعہ کے لیے ایک علیحدہ تصنیف درکار ہے۔ یہاں ہم صرف اصولی حدود کے ذکر پر اکتفا کریں گے۔

۱۔ کاروبار میں جن منافیٔ اخلاق حرکتوں کے ذریعے نفع حاصل کیا جاتا ہے ان میں دھوکہ، فریب اور غلط بیانی بہت نمایاں چیزیں ہیں۔ کاروباری دُنیا میں غلط اور مبالغہ آمیز اشتہار بازی، عیب دار مال

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۳۶

کو اچھا بنا کر پیش کرنا۔ گھٹیا مال کو بظاہر بلند معیار بنا کر سامنے لانا۔ قیمتِ خرید کے بارے میں غلط بیانی سے کام لے کر خریدار کو زیادہ قیمت دینے پر آمادہ کرنے کی صورت بنانا یہ سب اکل اموال الناس بالباطل میں داخل، ممنوع اور قانوناً قابلِ گرفت جرائم ہیں۔

۲۔ ناپ تول کے پیمانے غلط اور معیاری نہ رکھنا، یا بالارادہ کم تولنا اور کم ناپنا اس سلسلے میں ہر کوتاہی قرآن کی اس آیت کی رُو سے حرام اور قابلِ تعزیر جُرم ہے۔

۳۔ اشیائے خوراک اور دوسری اس قسم کی چیزوں میں ملاوٹ کرنا اور اس کے خریداروں کو دھوکہ دینا اس آیت کی روشنی میں جُرم ہے۔

۴۔ مال کو مہنگا کرنے کے لیے ذخیرہ اندوزی کرنا اور اس طرح رسد میں مصنوعی کمی کر کے قیمت میں اضافہ چاہنا ممنوع ہے۔

ان کے ساتھ بعض ایسی مضرت رساں شکلیں اس آیت کا مصداق بن جاتی ہیں جو بظاہر معصوم معلوم ہوتی ہیں مثلاً فروخت کرنے والے کا فرض ہے کہ اگر اس کے مال میں کوئی عیب ہے تو خریدار کو اس پر مطلع کرے خواہ وہ اس سے مطالبہ کرے یا نہ کرے۔ سامانِ تجارت کے عیب پر اپنی خاموشی کے ذریعے پردہ ڈال دینا بجائے خود ایک ممنوع فعل ہے خریدار کو اس عیب سے باخبر کر دینا ضروری ہے جس کے علم میں آنے کے بعد اس کی خریداری کے ارادے میں تبدیلی کا امکان ہو[1] خریدار کی شدتِ احتیاج اور اضطراری کیفیت سے فائدہ اٹھا کر اس سے زیادہ دام وصول کرنا حرام ہے اور ایسا ہر معاہدہ بیع فاسد تصور ہوگا۔ علامہ عبدالرزاق السنہوری نے علامہ ابنِ عابدین الشامی کے حوالہ سے لکھا ہے:

> مضطر کی خرید و فروخت ناجائز ہے۔ اس کی صورت یہ ہے کہ آدمی کو کھانے پینے یا لباس وغیرہ اشیاء کی شدید ضرورت ہو اور فروخت کرنے والا بازار کے بھاؤ سے زیادہ قیمت وصول کرنے پر اصرار کرے۔ ایسا بھی ہو سکتا ہے کہ فروخت کرنے والا مجبور ہو اور خریدار بازار کے بھاؤ سے بہت کم دام پر سودا چکانا چاہے[2]

بہرحال قرآن میں یہاں یہ بات اجمالاً کہی گئی ہے۔ دوسرے مقامات پر اس کی تفصیل آ رہی ہے اور مزید تفصیل اس کی احادیث میں ہے۔ اسلامی قانون میں تمام معاملات کی بنیاد اسی اصل پر ہے۔

---

[1] مصادر الحق ج ۲ ص ۱۸۴ [2] فتاویٰ شامی ج ۴ ص ۴۴

۵۴۳۔ اور اسے احکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ تاکہ لوگوں کے مال ناحق حاصل کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔
کہ یہ حق تلفی ہے۔ یعنی کسی کے مال کی خبر نہ دو ظالم حاکموں کو یا اپنا مال بطور رشوت حاکموں کو نہ دو کہ اس کو اپنا ہمنوا بنا کر کسی کا مال کھالو، یا جھوٹی گواہی دے کر یا جھوٹی قسم کھا کر یا جھوٹا دعویٰ کر کے کسی کا مال نہ کھاؤ اور تم کو اپنے ناحق ہونے کا علم بھی ہے[1]

اس آیت کا ایک مفہوم تو یہ ہے کہ حاکموں کو رشوت دے کر ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرو اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ جب تم خود جانتے ہو کہ مال دوسرے شخص کا ہے تو محض اس لیے کہ اس کے پاس اپنی ملکیت کا کوئی ثبوت نہیں ہے یا اس بنا پر کہ کسی اینچ پینچ سے تم اس کو کھا سکتے ہو اس کا مقدمہ عدالت میں نہ لے جاؤ۔ ہو سکتا ہے کہ حاکم عدالت روداد مقدمہ کے لحاظ سے وہ مال تمہیں دلوادے۔ مگر حاکم کا ایسا فیصلہ دراصل غلط بنائی ہوئی روداد سے دھوکہ کھا جانے کا نتیجہ ہوگا۔ اس لیے عدالت سے اس کی ملکیت کا حق حاصل کرنے کے باوجود حقیقت میں تم اس کے جائز مالک نہ بن جاؤ گے۔ عنداللہ وہ تمہارے لیے حرام ہی رہے گا[2]

دراصل اس آیت میں جن باتوں سے روکا گیا ہے وہ یہ ہیں۔
ایک یہ کہ دنیا کی کوئی عدالت بہتر سے بہتر ہو اور کوئی حاکم خواہ کیسا ہی عادل ہو بہرحال دنیوی فیصلے غیب دانی کی بنا پر نہیں روداد مقدمہ ہی کی بنا پر صادر ہوں گے اور ان میں غلطی، لغزش ناانصافی کا ہر وقت احتمال ہے۔ آیت قرآنی اسی حقیقت کی طرف توجہ دلا رہی ہے کہ جو حق ہے وہ عنداللہ حق ہی رہے گا اور جو ناحق ہے وہ اللہ کے یہاں ناحق ہی شمار ہوگا اگرچہ حاکم کا فیصلہ اس کے برعکس ہو۔ عدالت کے فیصلے حق کو ناحق اور ناحق کو حق نہیں بنا سکتے۔ اصلی چیز انسان کی توجہ و لحاظ کے قابل خود انسان کا ضمیر اور تقویٰ ہے۔ حدیث میں اس بات کو صراحت کے ساتھ بیان کیا گیا ہے صحیحین میں حضرت ام سلمہ کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی آیا ہے کہ

میں ایک انسان ہی ہوں۔ اور تم لوگ اپنے مقدمات لے کر میرے پاس آتے رہتے ہو۔ ہو سکتا ہے کہ تم میں ایک آدمی اپنے دلائل بنا سنوار کر بیان کرنے میں دوسرے شخص سے زیادہ ماہر ہو اور میں اس کے بیان سے متاثر ہو کر جیسا اس کا بیان سنوں اسی کے مطابق فیصلہ کر دوں۔ تو اگر میں کسی کے بھائی کے حق کا فیصلہ اس کے حق

---

[1] افادات شیخ الہند ص۷۰، [2] تفہیم القرآن ص ۱۴۸

میں اس طرح نہ دے دوں تو اسے چاہیے کہ وہ میرے اس طرح کے فیصلہ پر اعتماد کر کے اس کا مال نہ دبا لے اور خوب سمجھ لے کہ جو مال اسے اس طرح ملا ہے وہ درحقیقت آگ کا ایک انگارہ ہے ۔

شرح معانی الآثار میں یہ ارشاد اس طرح آیا ہے کہ میں ایک انسان ہی ہوں ۔ اور جن معاملات کے فیصلے تم میرے پاس لے کر آتے ہو ان کی حقیقت کا مجھے پتہ نہیں ہوتا جیسا تم مجھ سے بیان کرتے ہو اسی کے مطابق فیصلہ کر دیتا ہوں ۔ امام بخاری نے باب اثم من خاصم فی باطلہ وھو یعلمہ میں اس حدیث کو ذکر کیا ہے اور اس میں یہ الفاظ ہیں ۔ یہ ہو سکتا ہے کہ تم میں سے کوئی دوسرے سے زیادہ لفاظ اور لسان ہو اور اس وجہ سے میں یہ خیال کر لوں کہ جو بات اس نے کہی ہے وہ سچ ہی کہی ہے ۔

علامہ قسطلانی نے انما انا بشر میں انسان ہی ہوں کی وجہ حصر پر لکھا ہے کہ آپ نے اپنی بشریت کو بصیغۂ حصر اس لیے پیش کیا ہے تاکہ ان لوگوں کی تردید ہو جائے جن کا خیال یہ ہے کہ جب آپ رسول ہیں تو آپ پر ہر معاملہ کی حقیقت بھی بالکل روشن ہو جانی چاہیے اور آپ کو یہ بھی معلوم ہو جانا چاہیے کہ فریقین میں سے مظلوم کون ہے اور ظالم کون ؟ اسی خیال کی تردید کے لیے آپ نے فرمایا کہ بشری ساخت ہی اللہ نے ایسی بنائی ہے کہ بشر صرف ظاہری حالت ہی کا ادراک کر سکتا ہے اور اس کو ایسے حالات پیش آئے بغیر چارہ نہیں ہے لہذا جب تک قدرت اس کو اپنی فطرت کے خلاف نہ چلائے اور بذریعہ وحی اس کو اطلاع نہ دے اس پر وہی حالات طاری ہوتے ہیں جو دوسرے انسانوں پر طاری ہوتے ہیں ۔ علامہ قسطلانی کے بیان سے یہ حقیقت کھل کر سامنے آگئی ہے کہ انبیاء علیہم السلام دانائے غیب کیوں نہیں ہوتے ۔ کیونکہ وہ انسان ہوتے ہیں اور انسان کی ساخت ہی میں اس کی صلاحیت نہیں ہے ۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق ہی اس طرح فرمائی ہے کہ اسے غائبات کا بلا واسطہ علم ہو ہی نہیں سکتا اور جن باتوں کا اس کو علم ہوتا ہے یہ اس کی فطرت کا تقاضا نہیں بلکہ اللہ سبحانہ کی جانب سے بذریعہ وحی وقتی موہبت ہے ۔ اس کے بعد علامہ قسطلانی نے اس کی حکمت بھی لکھی ہے کہ رسول کو اپنے مقدمات کے بارے میں غیب کا علم کیوں نہیں دیا ؛ تاکہ شہادت اور قسم کی ضرورت ہی نہ رہتی اور رسول اپنے یقین کی بنا پر جس طرح دوسرے احکام شریعت بیان کرتا ہے اسی طرح مقدمات کے فیصلے بھی کر دیا کرتا ۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے رسولوں کو تمام مقدمات میں صحیح صحیح حالات کی اطلاع دے دیا کرتا کہ وہ اپنے علم کی بنا پر مقدمات کے فیصلے کر دیں تو امت اس معاملے میں نبوت کی پیروی سے محروم ہو جاتی ۔ اس لیے

اللہ سبحانہ نے واقعات اور حالات کی اطلاع دینے کی جگہ اپنے رسولوں کو بھی مقدمات کے فیصلے کے لیے تفتیش و اجتہاد مدعی سے ثبوت کا پابند کیا اور اُمت کو بھی اس میں آپ کی پیروی کا حکم دیا۔ البتہ مدعی کو یہ فہمائش کر دی کہ وہ اس قانون سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش نہ کرے کیونکہ اگر وہ اپنی چرب زبانی سے قانونی طور پر کامیابی حاصل کرے گا تو باطنی آئین کی گرفت سے نہ بچ سکے گا۔ اگر کوئی مال ناجائز شہادت سے حاصل کر لیا تو قیامت میں اسے اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا جو چرب زبانی، سخن سازی سے اپنے اثر و رسوخ سے جھوٹے مقدمے جیت جائیں انہیں اور زیادہ ڈرنا چاہیے کہ ان پر علاوہ دوسرے جرائم کے اور فریق ثانی کی حق تلفی کے ایک اور جرم عدالت کو فریب دینے کا بھی عائد ہوگا۔

رشوت کی حُرمت قرآن سے

دوسری بات جس سے اس آیت میں روکا گیا ہے کہ مال کو حکام رسی کا ذریعہ نہ بناؤ تاکہ تم دوسروں کا مال ہڑپ کر سکو۔ کیونکہ رشوت حصولِ مال کا جائز ذریعہ نہیں ہے بلکہ یہ گناہ اور حق تلفی اور غصبِ حقوق کا راستہ ہے۔

اس آیت میں رشوت کے بارے میں تین باتوں کی طرف واضح اشارات ہیں۔

ایک یہ کہ رشوت کے ذریعے عدالت کی افادیت ختم ہو جاتی ہے۔ عدالت کی افادیت کا تمام تر انحصار عدالت کی راست روی اور دیانت پر موقوف ہے۔ عدالت ہی قانون کی محافظ ہے۔ عدالت کو اگر رشوت کے ذریعے بددیانت بنا دیا جائے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب عدالتیں انصاف کا گھر نہیں بلکہ تجارت گاہیں ہیں۔ ان میں حکام کاروباری ہیں اور ان میں عدل و انصاف بکاؤ مال ہے جس کے پاس دولت ہو وہ خرید سکتا ہے اور جس کے پاس دولت نہ ہو وہ انصاف کی نعمت سے محروم ہوگا۔ تدلوا بھا الی الحکام میں اسی طرف اشارا ہے۔ تدلوا۔ ادلاء سے بنا ہے اور ادلاء کے معنے کنوئیں میں ڈول ڈالنے کے ہیں۔ جس طرح ڈول کے ذریعے طالب تک پانی پہنچتا ہے اسی طرح رشوت کے ذریعے طالب حاکم تک پہنچتا ہے۔ اس معاملہ میں اتنی احتیاط برتی ہے کہ حکام کو تحفے اور ہدیے پیش کرنے کی ممانعت کر دی ہے۔ ایک بار ایک عامل نے آکر کہا کہ یہ صدقہ کا مال ہے اور یہ مجھے ہدیہ ملا ہے۔ یہ سن کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے منبر پر کھڑے ہو کر تقریر کی اور حمد و ثنا کے بعد فرمایا:

عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو روانہ کرتے ہیں تو یہ آکر کہتا ہے کہ یہ تمہارا ہے اور یہ میرا ہے۔ یہ اپنے باپ اور ماں کے گھر میں بیٹھ کر دیکھے کہ اس کو تحفے ملتے ہیں یا نہیں۔

يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْأَهِلَّةِ ۖ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَ
الْحَجِّ ۗ وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَ
لَٰكِنَّ الْبِرَّ مَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أَبْوَابِهَا ۚ وَاتَّقُوا
اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝

آپ سے لوگ قمری مہینوں کے چاندوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دیجئے کہ یہ انسانوں کے لیے وقت شناسی کا پیمانہ ہے اور اس سے حج کے مہینوں کا تعین ہوتا ہے۔ اور یہ کوئی نیکی کی بات نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں ان کے پچھواڑے سے اندر آؤ۔ نیکی تو اس شخص کی ہے جو اپنے اندر متقیانہ سیرت پیدا کرے۔ گھروں کے اندر دروازوں سے آؤ اور اللہ کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم فلاح وسعادت سے ہمدوش ہو جاؤ۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں میری جان ہے۔ وہ اس میں سے جو کچھ لے جائے گا وہ قیامت کے روز اپنی گردن پر لاد کر لائے گا۔ اونٹ، گائے، بکری جو ہو، پھر آپ نے اپنے دونوں ہاتھ اٹھا کر تین بار فرمایا۔ خداوندا میں نے پہنچا دیا[1]
دوسرے یہ کہ رشوت کی گرم بازاری سے سب سے زیادہ معاشرہ متاثر ہوتا ہے۔ جب رشوت کے

[1] صحیح بخاری باب ہدایا العمال

ذریعے لوگوں میں دوسروں کے حقوق ہڑپ کرنے کا رجحان پیدا ہوجاتا ہے تو وہ اپنی ذاتی اغراض کے استحصال کے لیے رشوت کی راہ اختیار کرتے ہیں۔ عرب میں یہودیوں کے مقدمے ان کے علماء اور رئیس فیصلے کرتے تھے۔ چونکہ دولت اور تمول نے ان میں اپنے نیچے چلتے قائم کر دیے تھے اس لیے وہ قانون کی ناہمواری کے دل سے خواہش مند رہتے تھے۔ قانون کی زد سے بچنے کے لیے علانیہ رشوت دیتے تھے اور ان کے قاضی علانیہ لیتے اور ایک کا حق دوسرے کو دلا دیتے تھے۔ اور اس ذریعے سے تورات کے احکام پر مصالح و ضرورت کے اقتضا سے پردہ ڈال دیتے تھے۔ چنانچہ تورات کے قوانین میں تحریف کا ایک بڑا سبب بھی رشوت خواری تھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے رشوت دینے اور لینے والے دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔[1]

رشوت کا گناہ ہونا ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس کو سب جانتے ہیں، عقل اس کی گواہ ہے، فطرتِ انسانی اس کی شاہد ہے، دُنیا کا معروف اس پر حجت ہے اور تمام مذاہب و ادیان اس کی حرمت پر متفق ہیں۔ چنانچہ فرمایا کہ وانتم تعلمون۔[2]

اسلامی حکومت قائم ہونا اور اسلام کے سارے فوجداری دیوانی قانون کا نافذ ہونا تو بڑی بات ہے۔ قرآن عزیز کی اگر صرف اسی آیت پر آج عمل ہوجائے تو جھوٹے دعووں، جعلی کاغذات، جھوٹی گواہیوں، جھوٹے حلف ناموں، اہلکاروں اور عہدہ داروں کی رشوتوں کے ساتھ ساتھ اعلیٰ حکام کی خدمت میں نذرانوں، قیمتی ڈالیوں، شاندار عمارتوں کا کہیں وجود تک باقی نہ رہے۔[3]

ماہ شناسی کا پیمانہ

پہلی آیات میں شہرِ رمضان کا ذکر تھا اور اس آیت میں چاند کا ذکر ہے۔ مہینے کا تعلق چاند ہی سے ہے۔ یہی شہود شہر اور مہینے ہونے کی نشانی ہے اسی لیے ہلال نظر آنے کا نام شہود ہے۔ الجصاص لکھتے ہیں۔ رویت الہلال ہی شہود الشہر ــــ پہلی آیت میں روزے کی فرضیت کے لیے شہودِ شہر کو بطورِ شرط پیش کیا ہے اور شہر کا شہود چاند ہونے پر موقوف ہے۔ اسی بنا پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رمضان کے آغاز و اختتام کا رشتہ چاند سے اس طرح جوڑ دیا ہے کہ گویا چاند ہی

---

[1] ابوداؤد کتاب الاقضیہ [2] تدبر قرآن [3] تفسیر ماجدی

روزے کے لیے علت ہے۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اور علامہ طیبی نے الکاشف میں اس طرف اشارات کیے ہیں۔ آئندہ آیات میں حج اور اس کے احکام ہیں ان کا تعلق بھی ہلال سے ظاہر ہے۔

۴۴۵۔ قمری مہینوں کے چاندوں کے بارے میں آپ سے پوچھتے ہیں۔ آفتاب ہمیشہ ایک صورت پر رہتا ہے اور چاند کی صورت بدلتی اور اس کی مقدار گھٹتی بڑھتی رہتی ہے۔ اس لیے لوگوں نے چاند کے گھٹنے اور بڑھنے کی وجہ آپ سے دریافت کی۔ اس سے پہلے رمضان اور روزوں کا ذکر تھا اور آگے حج کا ذکر آرہا ہے دونوں کی مناسبت سے درمیان میں چاند کا ذکر کیا ہے[1]

یہ سوال کرنے والے کون ہیں اور سوال کیا ہے؟

ابو نعیم اصفہانی اور ابن عساکر نے عبداللہ ابن عباس کے حوالہ سے انکشاف کیا ہے کہ سوال کرنے والے صحابہ میں معاذ بن جبل اور ثعلبہ ہیں لیکن عبداللہ ابن عباس کا یہ بیان روایتی اور تاریخی حیثیت سے اتنا بے وزن ہے کہ حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں اس کا تذکرہ بھی مناسب نہیں سمجھا۔

سوال کی نوعیت بعض روایات میں یہ بتائی گئی ہے کہ دریافت کیا گیا کہ چاند گھٹتا بڑھتا کیوں ہے؟ اور بعض روایات میں ہے کہ چاند بنایا کیوں ہے؟ یہ دوسرا سوال جواب کے زیادہ قریب ہے۔ لیکن قرآن میں ہلال نہیں بلکہ اس کی جمع اہلہ آتی ہے۔ سوال چاند کے بارے میں نہیں بلکہ چاندوں کے بارے میں ہے اور چاندوں کے بارے میں سوال کے معنے یہ ہیں کہ وہ قمری مہینوں کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ مقصود چاند سے متعلق مہینوں کے بارے میں دریافت کرنا ہے۔ عربی میں ہلال بول کر ماہ مراد ہوتا ہے۔ خاص طور پر جمع کی صورت میں تو اس کا استعمال مہینوں کے لیے ہی ہوتا ہے۔ اس سوال سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت معاشرے کے تمام افراد پر روح دینی پوری طرح چھا گئی تھی اور نیا عقیدہ دلوں پر اس طرح غالب آگیا تھا کہ کوئی شخص معاملات زندگی میں اس وقت تک کوئی قدم نہ اٹھاتا جب تک وہ یہ معلوم نہ کرے کہ اس صورت حال میں نبوت کا کیا فیصلہ ہے۔ بہر حال ہمارے خیال میں اس سوال کا تعلق چاند سے متعلق مہینوں سے ہے اور مہینوں میں سے خاص مہینوں کے متعلق جیسا کہ جواب سے ظاہر ہے۔ یہ خاص مہینے فی الواقع رمضان کے بعد آتے ہیں۔ یعنی شوال، ذیقعد، ذی الحج کے دس دن۔ یہ حج کے مہینے ہیں۔ جب رمضان کا پہلے تذکرہ ہو چکا اور رمضان کے فضائل بھی بیان ہوئے تو ان مہینوں

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۰

کے بارے میں خود بخود سوال پیدا ہوگیا جو رمضان کے ساتھ شروع ہو جاتے ہیں مگر چونکہ حج کے مہینوں میں دو حرمت والے مہینے بھی ہیں اس لیے ان کے احکام بھی ساتھ ہی بیان کر دیے۔

الاشہر کی جگہ الاہلہ لانے کی وجہ

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اگر صورتِ حال یہی ہے تو پھر اشہر جو شہر کی جمع ہے اسے چھوڑ کر الاہلہ کی تعبیر کیوں اختیار کی ہے۔ یہ کیوں نہ فرمایا کہ یسئلونک عن الاشہر اور یہ کیوں کہا ہے یسئلونک عن الاھلۃ۔

اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ اہلِ عرب میں یہ رسم رائج ہو چکی تھی کہ قمری سال کو شمسی سال سے مطابق کرنے کے لیے اس میں کبیسہ کا ایک ماہ بڑھا دیتے تھے تاکہ حج ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا رہے اور وہ ان زحمتوں سے بچ جائیں جو قمری حساب کے مطابق مختلف موسموں میں حج کے گردش کرتے رہنے سے پیش آتی ہیں۔ اس طرح ۳۳ سال تک حج اپنے اصلی وقت کے خلاف دوسری تاریخوں میں ہوتا رہتا تھا اور صرف چونتیسویں سال ایک مرتبہ اصل ذی الحجہ کی ۹۔۱۰ تاریخ کو ادا ہوتا تھا۔ اس لحاظ سے قمری مہینے دو ہوتے۔ ایک وہ جو حسابی اہلِ عرب نے بنا رکھے تھے دوسرے وہ جو واقعی چاند سے وابستہ تھے۔ قرآن نے یہاں الاہلہ کی تعبیر یہ سمجھانے کے لیے اختیار کی ہے کہ وہ قمری مہینے اسلام میں معتبر ہیں جن کا تعلق ماہ بماہ چاندوں سے ہے وہ قمری مہینے مراد نہیں ہیں جو تم نے حسابی بنا رکھے ہیں۔ کیونکہ انسانوں کے لیے قدرتی حساب یہی ہے۔ چاند چھپتا ہے اور پھر نکلتا ہے۔ ہر شخص خواہ کسی متمدن شہر میں رہتا ہو، خواہ صحرا میں، معلوم کر سکتا ہے کہ کب مہینہ ختم ہوتا ہے اور کب شروع ہوا۔ اس کے لیے نہ تو علم ہیئت کی حساب دانیوں کی ضرورت ہے نہ تقویمی جدولوں کی۔

۵۴۵۔ ان سے کہہ دیجیے کہ یہ انسانوں کے لیے وقت شناسی کا پیمانہ ہے اور اس سے حج کے مہینوں کا تقرر ہوتا ہے۔ یعنی ان سے کہہ دو کہ چاند کا اس طرح پر نکلنا اس سے لوگوں کے معاملات اور عبادات مثلاً قرض، اجارہ، عدت، مدتِ حمل، رضاعت، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کے اوقات ہر ایک کو بے تکلف معلوم ہو جاتے ہیں بالخصوص حج۔ کیونکہ روزے وغیرہ کی قضا تو غیر ایامِ رمضان میں ہو سکتی ہے۔ حج کی تو قضا بھی مقررہ ایامِ حج کے سوا دوسرے ایام میں نہیں ہے۔ اور حج کے خاص طور پر بیان کرنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ ذی قعدہ، ذی الحج، محرم اور رجب۔ یہ چار مہینے حرمت والے ہیں۔ ان میں لڑائی کرنا، کسی کو قتل کرنا حرام تھا۔ اہلِ عرب کو ان مہینوں میں اگر لڑائی پیش

آتی تو مقدم و موخر کر لیتے اور لڑائی کرتے۔ مثلاً ذی الحج یا محرم میں لڑائی پیش آتی تو اس کو صفر بنا لیتے اور رجب صفر آتا تو اسے محرم یا ذی الحجہ بنا لیتے ان کے اس خیال کی تغلیط کے لیے یہاں حج کی تصریح فرمائی کہ جو ایام حج کے لیے اللہ نے مقرر فرماتے ہیں ان میں تقدیم و تاخیر ہرگز جائز نہیں ہے۔[1]

جواب میں اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ یہ گھٹتا بڑھتا چاند تمہارے لیے جنتری ہے جو آسمان پر نمودار ہو کر دنیا بھر کے لوگوں کو بیک وقت ان کی تاریخوں کا حساب بتاتا ہے۔ حج کا ذکر خاص طور پر اس لیے فرمایا ہے کہ عرب کی مذہبی، تمدنی اور معاشی زندگی میں اس کی اہمیت سب سے بڑھ کر تھی۔ سال کے چار مہینے حرمت والے مہینے تھے۔ ان مہینوں میں لڑائیاں بند رہتیں، راستے محفوظ رہتے۔ امن کی وجہ سے کاروبار فروغ پاتے۔[2]

مطلب یہ ہے کہ یہ محترم مہینے لوگوں کی عوامی بہبود اور خاص کر حج و عمرہ کی سہولتوں کے لیے مقرر ہیں، یہ اشہر حرم نہ صرف عبادات کے نقطہ نظر سے اہل عرب کے لیے بڑی اہمیت رکھتے تھے بلکہ ان کی معاشی و تجارتی سرگرمیوں کا تمام تر انحصار انہی مہینوں پر تھا۔ اہل عرب زمانہ جاہلیت میں سارا سال لڑنے بھڑنے میں صرف کرتے اس وجہ سے ملک میں تجارتی نقل و حرکت تقریباً معطل ہو جاتی۔ یہ صرف اشہر حرام کا فیض تھا کہ سال میں پورے چار مہینے امن و امان سے گزارتے اور ان مہینوں میں اہل ملک حج و عمرہ کی برکتوں سے بھی سعادت اندوز ہوتے اور ملک اور بیرون ملک کی تجارتی منڈیوں تک بھی بغیر کسی خطرے کے پہنچتے اور ان سے لین دین کرتے۔ بالخصوص قریش کی تجارتی سرگرمیوں کے لیے تو یہ مہینے گویا بہار کے مہینے تھے۔ اسی حقیقت کی طرف یہاں مواقیت للناس کے الفاظ اشارا کر رہے ہیں یعنی ان محترم مہینوں میں لوگوں کے لیے گوناں گوں فوائد و مصالح مضمر ہیں۔ اس عام فائدے کے بعد اس کے خاص فائدے حج کا بھی ذکر فرمایا۔[3]

اعتبار حساب قمری

اس آیت سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ چاند کے ذریعے تاریخوں اور مہینوں کا حساب معلوم ہو جائے گا جس پر ہمارے معاملات اور عبادات کی بنیاد ہے۔ اس سے واضح اشارہ اس طرف نکلتا ہے کہ اسلام نے حساب کے لیے قمری مہینوں کو اپنایا ہے۔ قرآن عزیز نے جن مہینوں کی

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۷ [2] تفہیم القرآن ص ۱۴۹ [3] تدبر قرآن ص ۲۲۹

تعداد بارہ بتاتی ہے ان کا رشتہ سورج کی رفتار سے نہیں بلکہ چاند کی رفتار سے مربوط ہے۔ چاند زمین کے گرد گردش کرتا ہے اور اپنی اس گردش کو ۲۷ دن، ۷ گھنٹوں اور ۴۳ منٹوں میں پورا کرتا ہے۔ اس دور کو علماء ہیئت چاند کا نجومی دور کہتے ہیں۔ اس طرح ۲۷ دن، ۷ گھنٹے کی مدت نے ۲۸ منزلیں بنا دی ہیں۔ ۳۶۰ درجوں کو ۲۸ راتوں پر تقسیم کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چاند ہر روز تقریباً ۱۳ درجے کی مسافت طے کرتا ہے۔ دنیا کی تمام زبانوں میں ان ۲۸ منزلوں کے نام مقرر ہیں۔ چاند کے ان ۲۸ ادوار کو قرآن نے منازل کہا ہے والقمر قدرناہ منازل۔ چاند ان منزلوں کو ختم کرنے تک اس قدر باریک ہو جاتا ہے کہ نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ اور یہ ادوار ختم ہونے پر جب چاند ان ہی منازل کا دوبارہ دور شروع کرتا ہے تو نمایاں ہو کر بڑھنے لگتا ہے۔ چاند کی اسی نمود کا نام ہلال ہے۔ اسی کو قرآن میں اوقات شناسی کا پیمانہ قرار دیا ہے۔ اور یہی شہود شہر اور مہینہ ہونے کی نشانی ہے۔ الجصاص لکھتے ہیں کہ چاند کا دیکھنا ہی شہودِ شہر ہے۔ قرآن نے یہاں ہلال کی جمع اہلہ لاکر اشارا کر دیا کہ شہود وہ ہی اسلام میں معتبر ہے جن کا دامن حساب سے نہیں بلکہ ہلال سے وابستہ ہو۔ لیکن چاند کے ہونے کا معاملہ قرآن نے اپنی عادت کے مطابق خود نہیں بتایا بلکہ اس کی تعیین ذات نبوت پر چھوڑ دی ہے۔ یہ نبوت نے بتایا ہے کہ چاند کے ہونے کا مدار کیا ہے؛

رؤیتِ ہلال حدیث کی روشنی میں

اس موضوع پر نبوت کے جو ارشادات آئے ہیں، حافظ ابن القیم نے تہذیب السنن میں ان کی کل تعداد دس بتائی ہے۔ ان کی اجمالی فہرست یہ ہے؛

(۱) عبداللہ بن عمر، ۲۔ عبداللہ ابن عباس، ۳۔ ابوہریرہ، ۵۔ عائشہ صدیقہ، ۶۔ حذیفہ، ۷۔ رافع ابن خدیج، ۸۔ طلق بن علی، ۹۔ سعد بن ابی وقاص، ۱۰۔ حارث بن حاطب۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عمر کی حدیث یہ ہے؛

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا روزہ نہ رکھو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو اور افطار نہ کرو یہاں تک کہ چاند دیکھ لو۔ اگر بادل ہو تو اندازہ کرلو۔

اور صحیح مسلم میں ہے کہ تیس کا اندازہ کر لو۔ عبداللہ بن عمر کی دوسری حدیث جو بحوالہ عبداللہ بن دینار بخاری میں آئی ہے اس میں ہے کہ تیس کی گنتی پوری کرلو۔ نافع کی مذکورہ بالا روایت میں اصل الفاظ فاقدروا لہ آتے ہیں۔ علماء کا اس جملے کی تشریح میں اختلاف ہے۔ جمہور کی رائے یہ ہے کہ ماہ کے آغاز کو دیکھ لو اور حساب کر کے تیس پورے کرلو۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اگر ۲۹ تاریخ ہو اور چاند نظر

نہ آئے تو مہینہ کو تنگ کر لو اور احتیاطاً روزہ رکھ لو۔ حدیث کے راوی عبداللہ بن عمر کے عمل سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ اگر ۲۹ تاریخ ہو اور بادل ہو تو منازل کا حساب کر کے پتہ لے لو کہ حساب نے طلوع کب ہے۔ شوافع میں سے العباس بن سریج نے تابعین میں سے مطرف بن عبداللہ نے اور محدثین میں سے ابن قتیبہ نے اسی کو اپنایا ہے۔ حافظ ابن الصلاح فرماتے ہیں کہ منازلِ قمر جاننے کا مطلب یہ ہے کہ چاند کی رفتار معلوم کر لو۔ حدیث کا یہ مطلب جمہور کے یہاں شرفِ قبول حاصل نہ کر سکا۔

۲۔ عبداللہ ابن عمر کی دوسری حدیث یہ ہے :

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یقیناً ہم ایک اُمّی اُمّت ہیں، نہ لکھتے ہیں اور نہ حساب کرتے ہیں۔ ماہ ایسا ایسا ہوتا ہے یعنی ۲۹ اور ۳۰ کا ہوتا ہے۔

علماء نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ مسلمان ایک اُمّی اُمّت ہیں۔ ان کا حساب اور لکھائی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ان کو سادہ طریق پر یہی جان لینا کافی ہے کہ مہینہ کبھی ۲۹ کا ہوتا ہے اور کبھی ۳۰ کا۔ ۲۹ کا چاند نظر آجاتے تو ٹھیک ہے ورنہ ۳۰ کا تو یقیناً ہے۔ کتاب سے مراد لکھنا اور حساب سے فلکیات کا حسابی علم ہے۔ لیکن کچھ علماء نے اس سے اتفاق نہیں کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اس ارشاد کا مقصود اُمّتِ اسلامیہ کے بارے میں یہ بتانا نہیں ہے کہ اُمّتِ اسلامیہ ایک بے حساب اور بے قلم اُمّت ہے بلکہ دراصل یہ جتانا ہے کہ ہم اہلِ عرب کی موجودہ حالت یہ ہے کہ ہم نہ قلم کے شہسوار ہیں اور نہ حساب کے ماہر ہیں۔ لہٰذا اس ارشاد میں جو بات فرمائی گئی ہے وہ اپنے وقت اور ملکِ عرب کے اس وقت میں باشندوں کے بارے میں ہے نہ کہ دُنیا میں قیامت تک ہونے والی پوری اُمّتِ اسلامیہ کے بارے میں ——— پھر جو کچھ بھی ہے ایک خبر کے پیرائے میں ہے۔ یہ کوئی انشا اور حکم نہیں ہے لیکن یہ افسوس کی بات ہے کہ لوگوں نے اسے اس طرح استعمال کرنا شروع کر دیا ہے کہ گویا یہ اُمّتِ اسلامیہ کی پوری اجتماعی زندگی کے لیے نبوّت کا فیصلہ ہے۔ ان کے خیال میں مسلمانوں کو اُمّتِ محمدیہ ہونے کی حیثیت میں دوسری قوموں کے مقابلے میں بے حساب اور بے قلم ہی بن کر رہنا چاہیے۔ حالانکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے قرآن نے اہم مقصد یہ بتایا ہے کہ اُمّت میں اُمّیت اور بے علمی کا خاتمہ کر کے علم و حکمت کو عام کیا جائے۔ قرآن کی ایک سے زیادہ آیات اس کی شاہد ہیں۔ عرب میں جس قسم کی صلاحیت اور اس وقت کے معاشرے میں جس طرح کی استعداد تھی اس کے لحاظ سے چاند کے ثبوت کے لیے یہ سادہ سا پیمانہ پیش فرمایا کہ چاند

۲۹ اور ۳۰ کا ہوتا ہے۔ ۲۹ کا ہو تو روزہ رکھ لو اور افطار کر لو ورنہ ۳۰ کی گنتی پوری کر لو۔ اس ارشاد سے یہ نتیجہ نکالنا کہ حضور انور کی جانب سے اُمتِ اسلامیہ کے اُمی ہونے اور اُمی رہنے کی پیش گوئی بہت بڑی زیادتی ہے۔ جیسے روزے کے شروع کرنے اور ختم کرنے کے لیے طلوعِ صبح صادق اور روزہ افطار کرنے کے لیے غروبِ آفتاب وقت شناسی کا پیمانہ ہے۔ اوقات کا یہ پیمانہ شمسی ہے اور وہ قمری۔ ہم پورے رمضان تقویمات پر طلوع و غروبِ آفتاب کے معاملے میں اعتماد کرتے ہیں۔ نمازوں کے اوقات میں بھی وقت شناسی کے لیے بیشتر سرمایہ یہی محکمہ موسمیات کی تقویمات ہیں۔ اور فقہاء نے ہمیں اس کی اجازت دی ہے۔ چنانچہ علامہ شامی نے مختارات النوازل کے حوالہ سے بتایا ہے کہ علمِ نجوم کی دو قسمیں ہیں، حسابی اور استدلالی۔ حسابی کی حد تک یہ علم قطعی ہے اور نمازوں میں اوقاتِ شناسی کی خاطر اس فن سے استفادے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ صاحبِ کشاف اصطلاحات الفنون نے سراجیہ سے نقل کیا ہے کہ اس قدر علمِ نجوم کے حاصل کرنے میں کوئی حرج نہیں جس سے نمازوں کے اوقات معلوم ہو سکیں۔ آٹھویں صدی کے مشہور حافظ ابن رجب حنبلی نے بھی ایسی تصریح کی ہے اور علامہ شامی نے قبلہ کی بحث میں لکھا ہے کہ اوقاتِ نماز اور قبلہ کے بارے میں اس فن پر اعتماد درست ہے۔ علامہ ابن نجیم نے چاند کے موضوع پر الاشباہ میں مثبتین کا یہ خیال پیش کر کے کہ لا باس بالاعتماد علی قول المنجمین لکھا ہے کہ احناف میں سے علامہ شمس الدین سرخسی نے اس نظریہ کو حدیث سے رد کر دیا ہے۔ الفاظ یہ ہیں،

ردہ الامام السرخسی بالحدیث اور حدیث یہ لکھی ہے ،

من صدق کاھناً او منجماً فقد کفر بما انزل علی محمدؐ	جو شخص کاہن یا نجومی کی تصدیق کرتا ہے وہ اس وحی کا منکر ہے جو حضور انور پر نازل ہوئی ہے ۔

یہ حدیث مسندِ احمد، مستدرک حاکم اور سنن کبریٰ میں مختلف الفاظ میں آئی ہے۔ حافظ عراقی نے الامالی میں اور حافظ ذہبی نے تلخیص میں اس کی صحت اور قوت کو مانا ہے لیکن شرح الاشباہ میں علامہ حموی نے بتایا ہے کہ چاند کے بارے میں فلکیات کے علم سے استفادے کی ممانعت نہ اس حدیث کا منطوق ہے اور نہ منہوم۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ نجومی اور کاہن سے حوادثِ غیبیہ معلوم کرنے میں استفادہ ناجائز ہے۔ باقی حساب کے ذریعے یہ معلوم کرنا کہ چاند فلاں روز طلوع ہو گا اور گہن فلاں روز لگے گا تو یہ اُمور حسابی ہیں۔ ان کا ارشاد گرامی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ علامہ شامی بھی البحر الرائق کے حاشیہ منحۃ الخالق میں علامہ حموی کے ہمنوا ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ چاند کا معاملہ اس سے متعلق نہیں ہے

یہ حساب قطعی ہے۔

علامہ دقیق العید نے دونوں مدرسوں میں کچھ مفاہمت کی کوشش فرمائی ہے۔ ان کا کہنا ہے:

اس بنیاد پر تو نجومیوں کی بات پر اعتماد نہ کرنا چاہیے کہ چاند حساب کی رُو سے چونکہ سُورج سے جُدا ہو چکا ہے اس لیے چاند ہے۔ ہاں اگر حساب کی رُو سے یہ معلوم ہو کہ چاند افق پر طلوع ہو چکا ہے اور نظر آ سکتا ہے لیکن افق کے ابر آلود غبار آلود یا ہواؤں کے مکدر ہونے کی وجہ سے نظر نہیں آ سکتا تو اس پر عمل واجب ہے کیونکہ سبب شرعی موجود ہے۔ چاند کے ہونے کے بارے میں آنکھ سے دیکھنا شرط نہیں ہے۔ (شرح العمدۃ ج ۲ ص ۴)

۳۔ ابن عباس کی حدیث ابو داؤد، ترمذی، نسائی، مسلم اور ابن ماجہ میں ہے:

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان سے ایک دو روز پہلے روزہ نہ رکھو۔ ہاں اگر کوئی پہلے سے روزہ رکھ رہا ہو۔ روزہ اس وقت رکھو جب چاند دیکھ لو۔ اگر بادل وغیرہ ہو تو تیس کی گنتی پوری کر لو۔ پھر افطار کرو اور مہینہ ۲۹ کا ہو۔

یہ حدیث مختلف کتابوں میں آئی ہے اور محدثین کی اکثریت نے اس کی تصحیح فرمائی ہے۔

۴۔ ابو ہریرہ کی حدیث ابوداؤد میں ہے:

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم چاند دیکھو تو روزہ رکھو اور جب چاند دیکھو تو روزہ افطار کرو۔ اگر بادل وغیرہ ہو تو تیس روزے پورے کرو۔

اور صحیح بخاری میں یہ روایت اس طرح آئی ہے۔ اگر بادل وغیرہ ہو تو شعبان کے تیس دن پورے کرو۔ ترمذی میں یہ الفاظ آئے ہیں۔ اگر بادل ہو تو تیس کی گنتی پوری کرو۔ اور پھر افطار کرو۔ اسی روایت میں مسلم، ابن ماجہ اور نسائی کے الفاظ یہ ہیں کہ اگر بادل ہو تو تیس دن گن لو۔ صرف بخاری میں شعبان کی زیادتی ہے باقی کسی روایت میں شعبان کا نام نہیں ہے۔ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ یہ امام بخاری کے استاد آدم کا تفسیری اضافہ ہے ورنہ شعبہ کے تمام تلامذہ میں سے کسی نے بھی یہ اضافہ نہیں کیا۔ اور حافظ ابن حجر نے اس کی تائید میں بیہقی کی ایک روایت بھی پیش کی ہے۔

۵۔ حدیثِ عائشہ مسندِ احمد، ابوداؤد اور دارقطنی میں اس طرح آئی ہے۔

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس قدر شعبان کی تاریخوں کا خیال رکھتے تھے اتنا دوسرے مہینوں کا نہیں رکھتے تھے۔ رمضان کا روزہ چاند دیکھ کر رکھتے تھے۔ اگر بادل وغیرہ ہوتا تو تیس دن کی گنتی پوری کر کے روزہ رکھتے۔

دار قطنی نے اس کی سند کو صحیح کہا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی بھی دار قطنی کے ہمنوا ہیں۔

۶۔ حدیث حذیفہ ابوداؤد اور نسائی میں اس طرح آئی ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان سے پہلے روزہ نہ رکھو۔ جب چاند دیکھ لو یا گنتی پوری کر لو تو روزہ رکھو۔

اگرچہ کچھ محدثین نے اسے مرسل کہا ہے لیکن صحیح یہی ہے کہ یہ مرسل نہیں ہے بلکہ موصول ہے جیسا کہ حافظ ابن القیم نے تہذیب السنن میں تصریح کی ہے۔

۷۔ رافع ابن خدیج کا بیان دار قطنی میں اس طرح آیا ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ شعبان کی رمضان کی خاطر گنتی رکھو اور رمضان سے پہلے کوئی روزہ نہ رکھو۔ جب چاند دیکھ لو تو روزہ رکھو اور جب چاند دیکھ لو تو روزہ افطار کر لو کیونکہ مہینہ ایسا یعنی ۲۹ اور ۳۰ کا ہوتا ہے۔

اس کی سند میں ایک راوی واقدی ہے۔ اگرچہ ضعیف ہے مگر چونکہ اس کی تائید دوسری حدیثوں میں ہے اس لیے اس کا ضعیف ہونا مؤثر نہیں ہے۔

۸۔ طلق بن علی کی حدیث دار قطنی میں اس طرح آئی ہے:

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ چاندوں کو اللہ نے لوگوں کے لیے اوقات کا پیمانہ بنایا ہے اس لیے جب تم چاند دیکھو تو روزہ رکھ لو اور جب چاند دیکھو تو افطار کر لو اور اگر بادل ہو تو گنتی پوری کر لو۔

اس روایت میں اگرچہ محمد بن جابر ضعیف ہے مگر چونکہ اسے صحیح روایات کی تائید حاصل ہے اس لیے اس کا ضعیف نقصان دہ نہیں ہے۔

۹۔ سعد بن ابی وقاص اللیثی کی حدیث نسائی میں اس طرح آئی ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مہینہ ایسا ایسا ہے۔

۱۰۔ الحارث بن حاطب امیر مکہ کا بیان ابوداؤد میں اس طرح ہے:

ہم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیمانہ چھوڑا ہے کہ ہم اپنی عبادات چاند دیکھ کر منائیں، چاند نظر نہ آئے تو دو نیک مسلمانوں کی شہادت سے منائیں۔

رویت ہلال فقہ کی روشنی میں

قرآنی اشارات اور نبوت کی پیش فرمودہ تشریحات کی روشنی میں اسلام کے قانون ساز اداروں نے

اس موضوع پر جو قوانین مرتب کیے ہیں ان کا خلاصہ بھی گوش گزار فرمایئے۔ ناظرین کی سہولت کے لیے دفعات کی شکل میں مرتب کر دیا ہے۔

دفعہ ۱:- اگر ۲۹ تاریخ ہو اور عام منظرین چاند نہ دیکھ سکیں تو رمضان کا چاند ہونے کی صورت میں اگر مطلع ابرآلود، غبار آلود ہو تو ایک عادل مسلمان کی خبر پر روزہ رکھا جا سکتا ہے!

تشریح:- علامہ مرغینانی نے تصریح کی ہے کہ چونکہ روزے کا معاملہ ایک خالص دینی معاملہ ہے اور دینی معاملہ ہونے کی وجہ سے یہ روایت سے پوری مشابہت رکھتا ہے اس لیے اس میں صرف خبر ہی کافی ہے۔ علامہ ابنِ عابدین شامی لکھتے ہیں کہ اگر مطلع ابرآلود ہو تو ہلال رمضان بالاتفاق خبر کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ نہ شہادت کی ضرورت ہے اور نہ عددِ شہادت کی اور نہ عدالت کی نہ لفظِ شہادت کی، صرف ایک عادل مسلمان کی خبر سے رمضان کا چاند ہونا ثابت ہو سکتا ہے۔ (تنبیہ الغافل)

علامہ ابن قدامہ نے امام احمد کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ رمضان ایک عادل مسلمان کی خبر سے ہو سکتا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ صحابہ میں حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن عمر کی بھی یہی رائے ہے اور ائمہ میں عبداللہ ابن المبارک اور امام شافعی کا بھی یہی مسلک ہے۔ حافظ ابن القیم لکھتے ہیں کہ شریعت کے اصول وضوابط کا بھی یہی تقاضا ہے کہ رمضان کے لیے ایک مسلمان عادل کی خبر کافی ہو۔ کیونکہ یہ عبادت میں داخل ہونے کی اطلاع ہے۔ لہٰذا اس میں ایک ہی کافی ہے جیسے نماز کے وقت آنے کی اطلاع ایک مؤذن کے ذریعے ہو سکتی ہے ایسے ہی دخولِ رمضان کے لیے بھی ایک کی خبر کافی ہے۔ دونوں میں فرق کوئی نہیں ہے[1]

رمضان کے متعلق ابرآلود ہونے کی قید کا اضافہ احناف نے کیا ہے۔ دوسرے تمام قانون ساز اداروں میں یہ قید نہیں ہے۔ لیکن ان کے نزدیک صرف ایک آدمی کی خبر سے نہیں بلکہ شہادت سے رمضان ثابت ہوگا۔ شہادت ہونے کی صورت میں وہ تمام شرطیں ملحوظ ہوں گی جو قانونِ اسلام میں شہادت کے لیے مقرر ہیں۔ رعایت صرف عددِ شہادت میں ہوگی۔ حافظ ابن حزم بھی احناف کے ہمنوا ہیں۔ احناف کی رائے اور دوسرے آئمہ کی رائے کی بنیاد پر رمضان کے چاند ہونے کی صورت میں اگر مطلع ابرآلود ہو تو جوہری فرق یہ ہوگا کہ احناف کی رائے میں ایک مفتی اور عالم دین کے اس فتویٰ سے رمضان ہونا ثابت ہو جائے گا جس کی بنا ایک مسلمان عادل کی خبر ہو۔ اور حضرات شوافع کی رائے

---

[1] الطرق الحکمیہ ص ۱۲۶

ہیں چونکہ شہادت ضروری ہے خواہ وہ ایک ہی ہے اس لیے رمضان کے چاند ہونے کا فیصلہ مفتی کے فتویٰ سے نہیں بلکہ شہادت اور حکم حاکم سے ہوگا[1]

امام مالک کے نزدیک بھی شہادت اور حکم حاکم ضروری ہے مگر وہ رمضان کے لیے ایک شہادت کو کسی حال میں کافی نہیں سمجھتے۔ حافظ ابن حزم رمضان اور عید کے لیے صرف خبر کو کافی بتاتے ہیں بلکہ وہ خبر دینے والے کے لیے عادل ہونے، آزاد ہونے اور مرد ہونے کی قید کو بھی ضروری تصور نہیں فرماتے۔ احوط اور اسلم میری رائے میں احناف کا مسلک ہے۔

دفعہ ۲:۔ اگر مطلع ابر آلود ہو اور چاند رمضان کا نہیں بلکہ عید کا ہو تو اس کے ثابت ہونے کے لیے ضروری ہے کہ عدالت ہو، شہادت ہو، شہادت کا پورا نصاب ہو اور شہادت میں گواہوں کی جانب سے لفظِ شہادت استعمال ہو۔

تشریح:۔ چاند دیکھنے والا کسی مفتی یا عالم کے سامنے نہیں بلکہ حاکم کے سامنے چاند دیکھنے کی گواہی دے۔ اور گواہ کے لیے ضروری ہے کہ تہمت کی پاداش میں سزا یافتہ نہ ہو۔ دُرِ مختار میں ہے کہ عید الفطر کا چاند ثابت ہونے کے لیے مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں نصابِ شہادت، مجلسِ حاکم اور لفظِ شہادت ضروری ہے۔ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ اگر مطلع کسی نوع سے آلودہ ہو تو عید کا چاند ثابت ہونے کے لیے شہادت، عددِ شہادت کے ساتھ عدالت شرط ہے[2]

علامہ مرغینانی رقمطراز ہیں کہ ہلالِ عید میں ان شرطوں کے اضافہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ روزہ نہ رکھنے کا تعلق حقوق العباد سے ہے اس لیے اس میں وہ ساری شرطیں ملحوظ ہوں گی جو حقوق العباد کو ثابت کرنے کے لیے ضروری ہیں۔ علامہ ابن النجیم نے البحر الرائق میں پوری قوت اور وضاحت سے لکھا ہے کہ عید میں وہ تمام شرطیں پیشِ نظر رکھنی چاہئیں جو حقوقِ بندگان میں ہوتی ہیں۔ مثلاً آزادی، گواہی، گواہوں کی تعداد اور لفظِ شہادت وغیرہ۔ علامہ ابنِ قدامہ نے بتایا ہے کہ عید کے چاند کے لیے دو عادل مسلمانوں کی شہادت ناگزیر ہے اور یہ سب فقہا کا اجماعی فیصلہ ہے۔ علامہ نووی نے شرح مسلم میں دعویٰ کیا ہے کہ ہلالِ عید کا ثبوت کسی کے نزدیک بھی ایک شہادت سے نہیں ہو سکتا بلکہ اس کے لیے دو شہادتیں ضروری ہیں۔ علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں اسے فقہاء کا مذہب قرار دیا ہے۔ علامہ ابن حزم نے المحلیٰ میں عید کے لیے صرف ایک شخص کی خبر کو چاند کے ثبوت کا معیار قرار دیا ہے اور ان آئمہ ہدیٰ کی

---

[1] الفقہ علی المذاہب الاربعہ [2] تنبیہ الولستان ص ۱۳۴

تغلیط کی ہے جو عید کے لیے دو شہادتیں ضروری بتاتے ہیں اور رمضان و عید میں تفریق حکم پر ان کے توقف کرتا نص پر محمول کیا ہے۔ لیکن جمہور علماء کی عمومی رائے نے حافظ ابن حزم سے اتفاق نہیں کیا۔ علامہ خطابی نے معالم السنن میں حافظ ابن حزم کے خیال کی کچھ محدثین کی طرف نسبت کر کے پر زور تردید کی ہے اور لکھا ہے کہ اگر رویت ہلال کا مسئلہ باب روایت سے ہو تو روایت کے ساتھ حکایت بھی درست ہونی چاہیے اور معلوم ہے کہ حکایت درست نہیں ہے اس لیے چاند دیکھنے کا روایت سے نہیں بلکہ شہادت سے تعلق ہے۔

روایت حکایت اور شہادت میں فرق

شہادت یہ ہے کہ چاند دیکھنے والا شخص خود اصالتاً حاکم کے سامنے کہے کہ میں گواہی دیتا ہوں۔ اگر گواہی میں گواہ شہادت کا پیرایہ استعمال نہ کرے گا حاکم کے سامنے نہیں بلکہ کسی عالم کے سامنے کہے گا تو شہادت نہ ہو گی۔ دُرِّ مختار میں ہے کہ ایسی تمام اطلاعات جن میں شہادت کا لفظ نہ ہو وہ روایات ہیں شہادات نہیں ہیں۔ حاکم کے روبرو ہونا بھی شرطِ شہادت ہے۔ اگر کسی مفتی، عالم اور علامہ کے سامنے ہو گی تو شہادت نہ ہو گی، روایت ہو گی۔ علماء نے ان دونوں میں اور بھی بہت سے امتیازات کی نشاندہی کی ہے علامہ رازی نے بنیادی فرق یہی بتایا ہے کہ واقعہ کی اطلاع اگر حاکم کے روبرو ہو تو شہادت ہے ورنہ روایت ہے۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے تدریب الراوی میں ایک خاص عنوان کے تحت ۱۱ فرق بتائے ہیں۔ حافظ ابن القیم نے بدائع الفوائد میں اس پر ایک مبسوط مقالہ سپردِ قلم کیا ہے۔

حکایت ان دونوں سے جدا ہے مثلاً یوں کہا جائے کہ لاہور والوں نے چاند دیکھا ہے یا ملتان میں چاند ہو گیا ہے۔ چاہے یہ بات ریڈیو، ٹیلی ویژن، ٹیلیفون ہی سے معلوم ہو، یہ نہ روایت ہے نہ شہادت بلکہ حکایت ہے۔ علامہ ابن نجیم کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں نے بتایا کہ فلاں شہر والوں نے چاند دیکھ لیا۔ تو اس سے چاند کا ہونا ثابت نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ صرف حکایتِ رویت ہے۔ صاحب دُرِّ مختار رقمطراز ہیں کہ چاند کا ہونا اوروں کے دیکھنے کی شہادت سے ثابت نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ شہادت نہیں بلکہ حکایت ہے علامہ شامی فرماتے ہیں کہ اگر دوسرے شہر کے حاکم کے فیصلے کو اس طرح بیان کرے گا تب بھی چاند ہونا ثابت نہ ہو گا کیونکہ یہ فعل حاکم کی حکایت ہو گی شہادت نہ ہو گی اور چاند کے ہونے میں شہادت حجت ہے روایت اور حکایت حجت نہیں ہے۔

دفعہ ۳۔ اگر مطلع صاف ہو، چاند خواہ رمضان کا ہو یا عیدین کا تو چاند کے ثابت ہونے

کے لیے ضروری ہے کہ بڑی جماعت چاند دیکھنے کی شہادت دے۔

تشریح :۔ تعداد مقصود نہیں ہے اصل چیز علم شرعی کا حاصل ہونا ہے اور علم شرعی سے مقصود صرف چاند ہونے کے بارے میں گمان غالب ہونا ہے اور شہادت کے بارے میں اگرچہ آرار مختلف ہیں مگر فیصلہ کن بات یہی ہے کہ تعداد کوئی بھی مقرر نہیں ہے جس سے فیصلہ کرنے والے حاکم کو اطمینان ہو جائے وہ ہی مطلوب ہے چاہے فیصلہ کرنے والا حاکم خود سربراہ مملکت ہو، گورنر ہو، ڈپٹی کمشنر ہو یا جسے اس مقصد کے لیے حکومت نے مقرر کیا ہو۔ رائے عامہ کا مقرر کردہ یا منتخب نہ ہو، شہادتوں کی جس تعداد پر متعلقہ افیسر کو اطمینان ہو جائے وہ ہی مطلوب ہے۔ صاحب دُرِ مختار لکھتے ہیں کہ تعداد کوئی مقرر نہیں۔ یہ سربراہ مملکت یا متعلقہ افیسر کے صوابدید اور اختیار تمیزی پر موقوف ہے کہ وہ دیکھے کہ کس قدر شہادتوں سے اسے اطمینان ہوتا ہے، علامہ شامی نے اسی کو ظاہر الروایت قرار دیا ہے۔ صاحب مجمع الانہر نے تجنیس کے حوالہ سے بتایا ہے کہ امام محمد کہتے ہیں کہ گواہوں کی تعداد کا معاملہ سربراہ مملکت کے سپرد ہے اور یہی صحیح ہے۔ ابن نجیم نے البحر میں، کاشانی نے بدائع میں بھی یہی تصریح کی ہے۔ الحاصل ظاہر روایت میں بڑی جماعت کی تعداد تو مقرر نہیں کی گئی لیکن مطلع صاف ہونے کی حالت میں چاند کے ثابت ہونے کے لیے بڑی جماعت کی شہادت فقہاء احناف کے نزدیک ضروری ہے اور اسی کو قانون کی عام کتابوں میں ظاہر الروایت قرار دیا گیا ہے اور علامہ شامی نے رد محتار اور تنبیہ الغافل والوسنان میں اسی کی ہمنوائی کی ہے۔ لیکن کچھ فقہاء احناف نے حسن بن زیاد کے حوالہ سے آتی ہوئی امام ابوحنیفہ کے اس بیان کو اپنایا ہے کہ مطلع صاف ہو یا نہ ہو دونوں صورتوں میں دو مردوں یا ایک مرد اور دو عورتوں کی شہادت پر چاند ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس روایت کا صاحب دُرِ مختار نے تذکرہ کیا ہے اور علامہ ابن نجیم نے یہ کہہ کر سراہا ہے کہ ہمارے زمانے میں اس روایت پر ہی عمل مناسب ہے اور کچھ بزرگوں نے دونوں میں اس طرح مفاہمت کرانے کی سعی بلیغ فرمائی ہے کہ ظاہر روایت میں بڑی جماعت کی شرط تو ضروری ہے مگر تعداد مقرر نہیں ہے اور امام حسن کی اس روایت میں اس تعداد کا کمترین درجہ دو بتایا گیا ہے۔ یعنی اگر فیصلہ کرنے والے دو گواہوں پر ہی اطمینان ہو جائے تو دو گواہوں کی گواہی پر بھی فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس مفاہمت کے فارمولے سے احناف، مالکیہ اور حنابلہ میں ہم آہنگی ہو گئی۔ سب کا مسلک یہی ہے کہ ہر حال میں دو گواہوں کا ہونا ضروری ہے۔

حافظ ابن حزم اس سے بھی پیچھے گئے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ دین کی بات ہے اور دین کی باتوں میں خبر واحد کا قبول کرنا درست ہے۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں۔ زیادہ قرین صواب یہی ہے کہ جب سارے

عیدین اعمال میں خبرِ واحد قبول کی جا سکتی ہے تو یہاں بھی ایک شخص کی خبر کو شرفِ قبول ہونا چاہیے ۔

دفعہ ۴ :- مطلع کے ابرآلود، غبار آلود اور دھواں آلود ہونے کی وجہ سے جیسے دیکھنے میں اختلاف ہو جاتا ہے ایسے ہی اگر مطلع صاف ہو تو ہواؤں کے مکدر ہونے کی وجہ سے یا جگہ کے پست ہونے کی وجہ سے بھی چاند دیکھنے میں اختلاف ہو سکتا ہے ایسی حالت میں ان دو گواہوں کی گواہی کو رد نہیں کرنا چاہیے جو شہر میں مطلع صاف ہونے کے باوجود بلند جگہ یا صاف فضا میں شہر سے باہر چاند دیکھ لیں ۔

تشریح :- علامہ شامی نے مبسوط سے نقل کیا ہے کہ اگر مطلع صاف ہو تو حاکم کسی بھی شہری کی شہادت کو رد کر سکتا ہے ۔ لیکن اگر کوئی شخص بیرونِ شہر سے یا کسی اونچی جگہ سے چاند دیکھ کر آیا ہو تو ایسے شخص کی شہادت کو قبول کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ صاحب محیط کی زبانی خود علامہ شامی نے اس کی توجیہ فرمائی ہے کہ

> چاند کے دیکھنے میں ہواؤں کے صاف اور میلا ہونے کی وجہ سے اختلاف ہو سکتا ہے نیز جگہ کی پستی اور بلندی بھی اس پر اثر انداز ہوتی ہے ۔ ظاہر ہے کہ بیرونِ شہر کی فضا شہر کی فضا کے مقابلے میں بہرحال صاف ہے ۔ اور پہلی تاریخ کا چاند اونچے مقام سے بمقابلہ پست کے نظر آ سکتا ہے ۔　　　　(رد محتار)

اور صاحب بحر نے تصریح کی ہے کہ اس معاملے میں رمضان اور عید دونوں کا حکم ایک ہے ۔ حافظ ابو جعفر طحاوی فرماتے ہیں کہ اگر مطلع صاف ہو اور ایک شخص بیرونِ شہر سے آ کر شہادت دے کہ میں نے چاند دیکھا ہے تو اس شہادت کو قبول کیا جائے گا ۔ صاحب محیط نے بھی اسی روایت پر اعتماد کیا ہے ۔ علامہ کرخی نے بھی اسی کو پسند کیا ہے ۔ امام ظہیر الدین نے فتاویٰ ظہیریہ میں اسی کو اختیار کیا ہے اور صاحب محیط نے تو اس کو اس قدر جزم و یقین کے ساتھ پیش کیا ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ یہی ظاہر روایت ہے ۔ علامہ شامی فرماتے ہیں کہ اگر یہ مبسوط کی روایت ہے اور مبسوط کا کتبِ ظاہر الروایۃ سے ہونا سب کو معلوم ہے تو پھر اس کے ظاہر روایت ہونے میں کوئی بھی شبہ نہیں ہے ۔ اور علامہ موصوف نے تنبیہ الغافل میں بتایا ہے کہ اگر یہ روایت ظاہر روایت کے خلاف بھی ہو پھر بھی ہمارے زمانے میں اس پر عمل میں کوئی مضائقہ نہیں ہے ۔ امام طحاوی کی روایت کی بنا پر احناف، شوافع اور ظاہریہ میں ہم آہنگی ہو گئی ۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ درست یہی ہے کہ مطلقاً ایک شہادت بھی کافی ہے جیسا کہ ابن عمر اور ابن عباس کی حدیثیں رہنمائی کر رہی ہیں ۔ یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ رویت کے اختلاف کے اسباب متعدد ہوتے ہیں اور دیکھنے والوں میں بھی قسم قسم کے دیکھنے

والے ہوتے ہیں۔ کسی کی نگاہ تیز ہے اور کوئی کم نظر، ایسا کئی بار دیکھنے میں آیا ہے کہ لوگوں کا جمِ غفیر چاند کا جویا ہوتا ہے مگر منظر چند ہی کو آتا ہے اور اکثریت چاند کی دید سے محروم رہتی ہے۔ صحابہ کرام حج کو جا رہے تھے۔ ذی الحجہ کا چاند عبداللہ بن عباس کو نظر آیا اور حضرت عمر کو نظر نہیں آیا۔

دفعہ ۵۔ شریعت میں آفتاب کے مطالع کا اختلاف تو اوقات شناسی میں قابلِ اعتبار اور مؤثر ہے لیکن چاند کے مطالع کا اختلاف نہ معتبر ہے اور نہ مؤثر۔

تشریح:۔ اتنی بات تو سب مانتے ہیں کہ چاند کا طلوع مختلف ممالک میں بعد مسافت کی بنا پر مختلف ہوتا ہے لیکن سوال مطالع کے مختلف ہونے کا نہیں بلکہ اختلاف مطالع کو مان کر شرعاً اس کے معتبر ہونے اور نہ ہونے کا ہے اور ایک شہر والوں کا چاند دیکھنا دوسرے شہر والوں کے لیے حجت ہے خواہ دونوں شہروں میں کتنی مسافت ہو تا آنکہ ابتدائے مغرب میں اگر چاند دیکھ لیا جائے اور اس کی اطلاع معتبر طریق سے انتہائے مشرق میں پہنچ جائے تو ان کے لیے رمضان یا شوال کا ہونا ثابت ہو جائے گا۔ ظاہر روایت میں امام ابوحنیفہ سے یہی منقول ہے اور جمہور احناف کا اسی پر اعتماد ہے۔ البتہ بعض حنفیہ جیسے صاحب تبیین الحقائق وغیرہ نے یہ رائے قائم کی ہے کہ اختلاف مطالع معتبر ہے لیکن ان کا یہ کہنا خلاف مذہب ہونے کے علاوہ چونکہ بے دلیل بھی ہے اس لیے چنداں قابلِ اعتماد نہیں ہے۔ حدیث صوموا لرؤیتہ وافطروا لرؤیتہ میں تمام دنیا کے مسلمان مخاطب ہیں۔ یہ علاقائی خطاب نہیں ہے اس لیے جہاں بھی مسلمان چاند دیکھ لیں گے چاند ہو جائے گا۔ اور سب مسلمانوں پر حجت ہوگا۔ صرف شرط یہ ہے کہ چاند دیکھنے کی اطلاع دوسرے مقامات پر شرعی طریق پر پہنچے۔ ایک حدیث جسے امام ترمذی نے روایت کیا ہے اور جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے یعنی کریب کا حضرت ابن عباس کو یہ بتانا کہ شام میں رمضان کا چاند جمعرات کو ہوا ہے مدینے میں جمعہ کو ہوا تھا اور ابن عباس کا اسے قبول نہ کرنا۔ امام ترمذی نے شہادت قبول نہ کرنے کا باعث اختلاف مطالع قرار دیا ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ابن عباس کے کریب کی شہادت قبول نہ کرنے کا باعث یہ ہے کہ شہادت کا نصاب پورا نہ تھا۔ کریب کا خود دیکھنا تو شہادت ہے اوروں کے دیکھنے کو کریب کا بیان کرنا شہادت نہیں بلکہ حکایت ہے اور ابن عباس کا یہ دریافت کرنا کہ کیا تم نے دیکھا ہے اسی کا موید ہے۔ اگر اختلاف مطالع قبول نہ کرنے کا باعث ہوتا تو اول بار ہی فرما دیتے کہ ہم وہاں کی رویت کا اعتبار نہ کریں گے۔ بہرحال یہ صرف امام شافعی کا مذہب ہے ورنہ احناف، موالک، حنابلہ اور ظاہریہ کا مذہب یہی ہے کہ اختلاف مطالع معتبر نہیں ہے علامہ عبدالرحمان الجزیری نے مذاہب کی تفصیل اس طرح پیش فرمائی ہے:

جب چاند کا دیکھا جانا دُنیا کے کسی حصہ میں ثابت ہو جانے تمام عالم کے مسلمانوں پر روزہ فرض ہو جاتا ہے ثابت ہو جانے کے بعد نہ قریب اور بعید کا کوئی فرق اور نہ چاند کے مطالع کا اختلاف مؤثر ہے۔ یہی ائمہ ثلاثہ کا مسلک ہے۔

علامہ ابن قدامہ نے اس موضوع پر حنابلہ کے موقف کی توضیح اس طرح کی ہے:

قرآن میں اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے فمن شهد منكم الشهر فليصمه۔ اور حضور انور نے ایک دیہاتی کے اس سوال پر کہ کیا اللہ نے آپ کو رمضان کے مہینہ کے روزہ رکھنے کا حکم دیا ہے؟ جواب دیا کہ ہاں ایک اور شخص نے پوچھا کہ تجھے اللہ نے کتنے روزے رکھنے کا حکم دیا۔ فرمایا رمضان کے مہینہ کے۔ اور پورے عالم کے مسلمانوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ماہ رمضان کے روزے فرض ہیں۔ جب یہ بات ثابت ہو جائے کہ رمضان کا مہینہ شروع ہو چکا ہے خواہ کہیں بھی چاند ہو تو رمضان کے روزے رکھنا فرض ہو گیا کیونکہ رمضان نام ہے دو چاندوں کے درمیانی عرصہ کا اور دُنیا کے سارے معاملات میں اس دن کا رمضان ہونا متحقق ہے اس لیے اجماع، قرآنی حکم کی وجہ سے اس دن کا روزہ رکھنا فرض ہے۔ (المغنی ج ۳ ص ۸۸)

ابن رشد نے ہدایہ میں امام مالک سے یہ بیان منسوب کیا ہے کہ:

دوسرے شہروں میں صرف خبر سے چاند کا ہونا ثابت نہ ہو گا بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ سرکاری طور پر اعلان ہو۔ اگر سرکاری اعلان ہو گا تو اس پر عمل واجب ہو گا۔

اور یہ بھی ابن رشد نے لکھا ہے کہ،

اگر کسی شہر والوں کے نزدیک دوسرے شہر میں چاند ہونا ثابت ہو جائے تو ان پر رمضان کی صورت میں قضا واجب ہو گی۔

مقصود صرف یہ بتانا ہے کہ جمہور کی رائے میں آفتاب کے مطالع کا اختلاف معتبر اور مؤثر ہے۔ لیکن چاند کے مطالع کا اختلاف ثابت تو ہے مگر معتبر اور مؤثر ہرگز نہیں ہے۔ شرط یہ ہے کہ بطریق موجب ثبوت ہو جائے اور یہ ثبوت خواہ بطور شہادت ہو یا بطور استفاضہ اور اس شرط کے اضافہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ محض افواہوں سے چاند ہونے کا ثبوت شرعاً معتبر نہیں ہے ابن عابدین الشامی نے رد محتار میں، ابن نجیم نے البحر الرائق میں اس کی پُرزور تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ ثبوت میں افواہوں کی کوئی بھی قیمت نہیں ہے۔

دفعہ ۶ - کسی ملک اور شہر میں چاند نظر آنا اس وقت دوسرے ملکوں اور شہروں میں حجت ہوگا جب چاند دیکھنے کا ثبوت شرعاً بطریق موجب ہوگا۔

تشریح :- چونکہ شرعاً مہینہ ہونے کے لیے چاند کا وجود نہیں بلکہ شہود ضروری ہے اور شہود کے لیے شرعی ثبوت درکار ہے اس لیے فقہاء نے ثبوت کا جو پیمانہ قرآن و سنت کی روشنی میں مقرر کیا ہے اسے وہ طریق موجب کہتے ہیں۔ اور طریق موجب کی تشریح یہ کی ہے کہ

الف، حاکم کے روبرو دو گواہ گواہی دیں کہ ہم نے چاند دیکھا ہے، صرف خبر سے چاند کا ثبوت نہ ہوگا۔

ب، دو گواہ حاکم کے سامنے چاند دیکھنے کی نہیں بلکہ دوسرے شہر کے حاکم کے فیصلہ کی اس تفصیل کے ساتھ گواہی دیں کہ فلاں حاکم نے دو گواہوں کی گواہی لے کر ہمارے سامنے فیصلہ کیا ہے تو اس شہر کے حاکم کے لیے اس فیصلہ کی شہادت پر فیصلہ کرنا درست ہوگا اور شرعاً یہ فیصلہ حجت ہوگا۔

اس کا مفاد یہ ہے کہ اگر شہر کے عالم، مفتی کے پاس خبر آجاتے کہ کراچی میں چاند ہوا ہے اور دیکھنے والے اگر خود خبر دیں تو اس سے مطلع صاف ہونے کی صورت میں چاند ہونا ثابت نہ ہوگا نہ رمضان اور نہ عیدین کا اور یہ خبر اگر تار، ٹیلیفون، ریڈیو اور خط کے ذریعے اگر حاکم کے پاس بھی پہنچے تب بھی شہادت نہ ہوگی کیونکہ شہادت کے لیے شاہد کا حاکم کے روبرو ہونا شرط ہے اور یہ شرط یہاں موجود نہیں ہے۔ جن صورتوں میں ثبوتِ ہلال کے لیے شہادت کی ضرورت ہے وہاں ان اشیاء مذکورہ کے ذریعے آنے والی خبریں ثبوتِ ہلال کے لیے مفید نہیں ہیں۔ البتہ جن صورتوں میں ثبوتِ ہلال کے لیے صرف خبر کافی ہے جیسے ابر و غبار کی حالت میں رمضان کا ثبوت وہاں ٹیلیفون اور خط کے ذریعے آئی ہوئی خبر پر رمضان ہو سکتا ہے بشرطیکہ خبر دینے والا عادل مسلمان ہو اور دیکھنے والے کا خط اور ٹیلیفون پر بولنے والے کی آواز پہچان سکے۔ الغرض ہلالِ رمضان میں مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں ان شرائط کے ساتھ خط اور ٹیلیفون کے ذریعے آئی ہوئی خبر پر اعتماد کیا جا سکتا ہے اور اس پر ایک مفتی رمضان ہونے کا فتویٰ اور حاکم رمضان ہونے کا فیصلہ کر سکتا ہے اور اس صورت کے علاوہ دوسری تمام صورتوں میں ان شرطوں کے ساتھ خط اور ٹیلیفون، ریڈیو، وائرلیس اور ٹیلی ویژن کے ذریعے آئی ہوئی خبروں پر اعتماد درست نہیں ہے۔

دفعہ ۷ - اگر کسی شہر میں چاند نظر آگیا ہو اور دوسرے شہروں میں اس شہر کے روزہ رکھنے یا عید کرنے کی خبر بطورِ استفاضہ پہنچے تو یہ خبر بھی حجت ہے اور اس پر عمل کر کے

رمضان اور عید منالینا درست ہے۔

تشریح :۔ صاحب دُرِ مختار فرماتے ہیں کہ اگر خبر ایک شہر کی دوسرے شہر میں بطورِ استفاضہ پہنچے تو صحیح یہی ہے کہ ایسی خبر حجت لازمہ ہے۔ الامام الحلوانی کے حوالے سے صاحب منحۃ الخالق لکھتے ہیں کہ خبر اگر دوسرے شہر میں بطورِ استفاضہ آئے اور ثابت ہو جائے کہ چاند ہو گیا تو اس پر عمل واجب ہے۔ یہی ہمارے اصحاب کا صحیح مذہب ہے۔ علامہ شامی رقمطراز ہیں کہ استفاضہ کا مطلب یہ ہے کہ جس شہر میں چاند نظر آیا ہے وہاں سے متعدد جماعتیں اور افراد آکر بتائیں کہ وہاں لوگوں نے روزہ رکھا ہے یا عید منائی ہے اور یہ بتانے والے جانے بوجھے ہوں یہ نہ ہو کہ اصل خبر ایک شخص کی ہو اور وہ شہر میں پھیل کر سب کے مُنہ پر چڑھ گئی ہو۔ یہ استفاضہ شرعاً مفید نہیں ہے۔ کیونکہ یہ صرف افواہ کے درجے کا استفاضہ ہے، استفاضہ وہ مفید ہے جس میں خبر کا تحقق ہو۔ افواہ کے درجے میں استفاضہ ہوگا تو شرعاً اس کا اعتبار نہ ہوگا۔ افواہ والے استفاضہ اور استفاضہ شرعی میں جوہری فرق یہ ہے کہ افواہ میں بات ایک سے زیادہ لوگوں کے مُنہ پر ہوتی ہے مگر سرچشمہ اور منبع ایک مخبر کی خبر ہوتا ہے اور استفاضہ شرعی میں خبر کا منبع اور سرچشمہ ایک نہیں بلکہ متعدد حضرات ہوتے ہیں، جس شہر میں چاند دیکھا گیا ہے وہاں سے آنے والے متعدد حضرات بتاتے ہیں کہ شہر والوں نے فلاں دن روزہ رکھا ہے اور ان بتانے والوں میں ایکسطرح کا تواتر ہوتا ہے۔ یہ استفاضہ شرعی ہے۔ استفاضہ شرعی میں ریڈیو، ٹیلی فون، تار، وائرلیس اور ٹیلی ویژن کا بھی اعتبار کیا جائے گا کیونکہ علامہ شامی نے لکھا ہے کہ استفاضہ شہادت، فیصلہ حاکم پر گواہی اور شہادت بر شہادت کا نام نہیں بلکہ ایسی خبر کو کہتے ہیں جو تواتر کے ذریعے آئے اور خبر میں شرعاً ان ذرائع کا اعتبار ہے۔ اگر ملک کے مختلف حصوں اور سمتوں سے دس بیس ریڈیو اور ٹیلیفون کے ذریعے کسی شہر کے روزہ رکھنے یا عید کرنے کی اطلاع آجائے تو یہ قابلِ اطمینان ہے۔

دراصل علمائے احناف نے متواتر اور خبرِ واحد کے درمیان خبر رسانی کا ایک ذریعہ قائم کیا ہے جو نہ قوت میں متواتر ہوتا ہے اور نہ ضعف میں خبرِ واحد۔ اسی کو وہ خبرِ مستفیض اور مشہور کہتے ہیں۔ اگرچہ ابوبکر جصاص کی رائے میں یہ متواتر کی قسم ہے لیکن عامہ حنفیہ کے خیال میں یہ متواتر کی قسم نہیں بلکہ اس کا قسیم ہے۔ یہ حقیقت میں اصل کے لحاظ سے انفرادی روایت ہے کیونکہ اس کے بیان کرنے والے محدود ہوتے ہیں مگر شہرت کی وجہ سے ایک اجتماعی شہادت ہے۔ اور احناف ایسے مقام پر اس کی ضرورت پر زور دیتے ہیں۔ جہاں مسئلہ کا تعلق رائے عامہ سے ہو۔ الجصاص لکھتے ہیں کہ اصل یہ ہے کہ جس بات کا تعلق رائے عامہ سے ہو اس میں صرف خبرِ استفاضہ ہی

قابلِ قبول ہو سکتی ہے۔ (احکام القرآن)

دوسرے علماء کی رائے میں استفاضہ خبرِ واحد ہی کی ایک قسم ہے۔ اس لیے ان کے نزدیک اس کی تعریف بھی احناف کی تعریف سے بالکل جدا ہے۔ حافظ ابن الہمام نے التحریر میں اور ابن کمال باشا نے التیسیر میں اس کی تفصیل بتائی ہے۔ علامہ شامی نے استفاضہ کی راہ سے آئی ہوئی خبر کو اس شہادت سے بھی زیادہ قوی بتایا ہے جس میں کہنے والا کہے کہ کراچی والوں نے چاند دیکھا ہے۔ استفاضہ میں چاند دیکھنے کی نہیں بلکہ روزہ رکھنے یا عید کرنے کی اطلاع ہوتی ہے۔ حافظ ابن القیم نے استفاضہ کی حقیقت پر ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے، وہ آخر میں فرماتے ہیں:

استفاضہ بھی ایک غیر مشکوک علمی ذریعہ ہے اور یہ دو مقبول شہادتوں سے زیادہ قوی ہے۔ (الطرق الحکمیہ۔ ص ۲۰۳)

دفعہ ۸۔ اگر کسی حاکم مسلمان نے مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں دو شہادتیں لے کر اور مطلع صاف ہونے کی صورت میں دو سے زیادہ گواہیوں کے ذریعے چاند ہونے کا فیصلہ کر دیا اور حکومت کا یہ فیصلہ دوسرے شہر میں پہنچا تو دوسرے شہر کے حاکم کے لیے یہ فیصلہ حجت ہوگا اور اس فیصلہ کی بنا پر وہ عید منانے کا مجاز ہوگا۔

تشریح: عام شہریوں کے پاس اگر اس قسم کی اطلاع آئے چاہے پیر کے پاس یا عالم اور مفتی کے پاس تو ان کے لیے عید کرنا اس وقت تک درست نہیں ہے جب تک اس شہر کا حاکم فیصلہ نہ کرے۔ ہاں ایسی بستی جہاں مسلمان حاکم ہی کوئی نہ ہو وہاں عالم اور مفتی بہ بنا کے ضرورت حاکم کے قائمقام ہیں۔ مفتی شہادت پر نہیں خبر پر فتویٰ دے گا۔ چنانچہ صاحب دُرِ مختار نے اس کی تصریح کی ہے۔

حاکم کے پاس اگر دوسرے شہر کے حاکم کے فیصلے کی شہادت آئے تو ضروری ہے۔ شہادت دینے والے دو مسلمان عادل ہوں۔ عالمگیری میں ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے گواہی دی کہ فلاں شہر کے حاکم نے دو شخصوں کی گواہی لے کر رویتِ ہلال کا فلاں روز فیصلہ کیا ہے تو اس شہر کے حاکم کے لیے فیصلہ کی اس گواہی پر چاند ہونے کا فیصلہ کرنا درست ہے لیکن مفتی کے فتویٰ کا یہ حکم نہیں ہے اگر کسی شہر کے مفتی نے افطار کا حکم دے دیا ہے تو اس پر خواہ کتنے شاہد کیوں نہ ہوں دوسرے شہر میں حکمِ حاکم کے بغیر اس پر عمل کرنا درست نہیں ہے کیونکہ شرعاً حاکم کا فیصلہ تو رویتِ ہلال میں حجت ہے مگر مفتی کا فتویٰ حجت نہیں ہے۔ جہاں اور جب بھی کسی معاملہ کے لیے شہادت

شرط ہے وہاں حکم حاکم ضروری ہے کیونکہ شہادت کا وجود حکم حاکم اور عدالت کے بغیر نہیں ہو سکتا علامہ شامی نے عید کے تذکرے میں لکھا ہے کہ

عید کے لیے شہادت شرط ہے اور اس کے لیے ہر حال میں حکم حاکم ناگزیر ہے کیونکہ اس کا تعلق حقوق بندگان سے ہے۔

شہادت لینے اور شہادت بنانے میں بہت بڑا فرق ہے۔ ایک مفتی شہادت بنا تو سکتا ہے مگر شہادت لے نہیں سکتا۔ شہادت لینے کے لیے حاکم ہونا ضروری ہے۔ اسی بنا پر ایک عالم دین شرعاً نکاح کرنے کا تو مجاز ہے مگر نکاح توڑنے کا مجاز ہرگز نہیں ہے۔ نکاح کرنے میں شہادت بنائی جاتی ہے اور نکاح توڑنے میں شہادت لی جاتی ہے۔ نکاح توڑنے کے لیے حکم حاکم اور قضائے قاضی شرط ہے اس لیے چاند کے فیصلہ کرنے میں مفتی اور عالم کی کوئی بھی قیمت نہیں ہے۔

دفعہ ۹۔ اگر ضلعی حکومت کے سربراہ نے مطلع صاف نہ ہونے کی حالت میں دو شہادتیں لے کر اور مطلع صاف ہونے کی حالت میں دو سے زیادہ شہادتیں لے کر رویت ہلال کا فیصلہ کر دیا اور یہ فیصلہ ملک کے دوسرے مقامات پر ضلعی سربراہوں کے پاس پہنچا تو یہ شرعاً حجت ہے اور اس پر عید اور رمضان درست ہے۔

تشریح:۔ ضلعی سربراہ کے پاس ضلعی سربراہ کا فیصلہ پہنچنے میں ان ہی ذرائع کو شرعاً معتبر قرار دیا جائے گا جو دوسرے تمام معاملات اور حقوق العباد میں معتبر ہیں شہادت کے لیے تو چونکہ مجلس حاکم کی حاضری گواہ کے لیے شرط ہے اس لیے اس میں خط، ٹیلیفون، ریڈیو، وائرلیس اور ٹیلیویژن معتبر نہیں ہے لیکن یہ شہادت نہیں بلکہ سربراہ ضلع کا فیصلہ ہے اور فیصلے کی اطلاعات میں فقہاء نے خط کو جائز قرار دیا ہے۔ کتاب القاضی الی القاضی کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ اس کے جواز کی فقہا نے صرف یہ شرط بتائی ہے کہ جس حاکم کے پاس سے یہ اطلاع آئے وہ حکومت کا مقرر کردہ حاکم ہو۔ لوگوں کا بنایا ہوا نہ ہو۔ ضلع کا سربراہ ہو قصبہ کا تھانیدار یا گاؤں کا نمبردار نہ ہو۔ چنانچہ علامہ شامی نے اس کی تصریح کی ہے۔ لہٰذا اگر ذمہ دار حاکم نے دوسرے ذمہ دار حاکم کو اپنے فیصلہ سے مطلع کر دیا اور یہ اطلاع اس کو سرکاری ذرائع سے آئی تو سربراہ کے لیے اس کا فیصلہ شرعاً حجت ہے۔

دفعہ ۱۰۔ اگر حکومت کی جانب سے مقرر شدہ حاکم نے کسی مقام پر شہادتیں شرعی طریق پر لی ہیں تو ان لی ہوئی شہادتوں کی رپورٹ کے لیے مقررہ حاکم کی جانب سے حکومت تک پہنچانے میں خواہ حکومت صوبائی ہو یا مرکزی خط اور ٹیلیفون کے ذرائع کا استعمال

کرنا درست ہے اور اس راہ سے آئی ہوئی رپورٹوں پر حکومت کا فیصلہ درست ہے۔

تشریح :۔ شرعی طریق پر شہادت یہ ہے کہ ان لوگوں سے گواہی لی جاتی جو اپنے اخلاق و دیانت کے لحاظ سے بالعموم لوگوں کے درمیان قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہوں یعنی ان میں ثقاہت اور عدالت ہو اور عدالت یہ ہے کہ فرائض کی پابجائی کے ساتھ اخلاق و دیانت کے لحاظ سے لوگوں میں معروف ہوں، گواہوں میں عدالت کی شرط قرآن کی بتائی ہوئی ہے۔ سنت میں اس کی تصریح ہے اور فقہاءِ اسلام کا اس پر اجماع ہے۔ ہاں متاخرین فقہاء نے معاشرہ میں عدالت کاملہ کے فقدان کے باعث موجودین میں امثل یعنی اچھے کی شہادت قبول کرنے کا فتویٰ دیا ہے۔ یہ گویا حقیقی عدالت کی جگہ اضافی عدالت کو قبول کرنے کا فقہا کی جانب سے فتویٰ ہے۔[۱] یہ بھی ان مسائل میں سے ایک ہے جو عصر و زمان کے اختلاف کی بنا پر مختلف ہوا ہے۔ بہرحال شہادت کے لیے عدالت شرط ہے۔ اگر حاکم نے شرعی طریق پر شہادت سے لی تو پھر حاکموں کے مابین رپورٹوں کا تبادلہ کتاب القاضی الی القاضی کی حیثیت رکھتا ہے۔ پاکستان میں ڈپٹی کمشنر میں دونوں حیثیتیں ہوتی ہیں۔ انتظامیہ کے سربراہ ہونے اور عدلیہ کے نگران ہونے کی یہ اپنی دونوں حیثیتوں میں گورنر کی وساطت سے صدرِ مملکت کی نمائندگی کرتا ہے۔ علامہ شامی نے صراحۃً لکھا ہے کہ قاضی مصر ہونا چاہیے اگرچہ بعض علماء کی رائے میں یہ شرط ضروری نہیں ہے۔ عالمگیری میں لکھا ہے کہ حدود و قصاص، دیوانی معاملاتِ منقولات کی حد تک کتاب القاضی معتبر نہیں ہے لیکن اس کے سوا جملہ معاملات میں کتاب القاضی معتبر ہے۔ اور قاضی ابو یوسف سے اس میں کافی توسیع منقول ہے۔ قاضی خاں نے بتایا ہے کہ کتاب القاضی کی حیثیت دو گواہوں کی ہے۔ البتہ چاند کی حد تک رپورٹ کنندہ حاکموں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ مسلمان ہوں اور ان کی زندگی میں محرمات کے کھلے دھبے نہ ہوں اور بس۔ اگرچہ درجات اور خوبیوں کی بلندیاں نہ ہوں کیونکہ تقویٰ شرطِ قضا نہیں ہے۔

دفعہ ۱۱۔ حکومت کی جانب سے چاند ہونے کا فیصلہ کرنے کے لیے ایک شخص یا متعدد اشخاص پر مشتمل کمیٹی کا تقرر تمام ملک کے لیے شرعاً درست ہے اور اس مقررہ شخص یا کمیٹی کا کیا ہوا فیصلہ شرعاً حکومت ہی کا فیصلہ متصور ہوگا۔

تشریح :۔ چونکہ قانون کے نقطۂ نظر سے مطلع ابر آلود ہونے کی صورت میں رمضان کے سوا سب مہینوں کا اور مطلع صاف ہونے کی حالت میں رمضان اور غیر رمضان کے چاند ہونے کا فیصلہ

---

[۱] معین الحکام ص ۵۴

کرنا حکومت کا کام ہے اور امام شافعی اس میں بھی حکم حاکم کو ضروری قرار دیتے ہیں احناف کے نزدیک حکم حاکم مطلع ابرآلود کی صورت میں رمضان کے لیے شرط نہیں ہے۔ وہ یہ ضرور کہتے ہیں کہ اگر حاکم ثبوت ہلال کا فیصلہ کر دے خواہ کسی طریق سے کرے اصلی یا ضمنی تمام مسلمانوں پر روزہ رکھنا واجب ہو جاتا ہے اس بنا پر حکومت خود خواہ اس کی جانب سے کہ وہ اس کام کی بجا آوری کے لیے ایک شخص یا متعدد اشخاص کو مقرر کر دے یہ شخص یا اشخاص بارہ مہینوں کے بارے میں جو فیصلہ کریں گے وہ حکومت ہی کا فیصلہ ہوگا اور عام شہریوں کے لیے واجب العمل ہوگا۔ لیکن ان فیصلہ کرنے والوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ ان کو چاند کے بارے میں فیصلہ کرنے کے شرعی ضوابط کا علم ہو۔

۵۴۶۔ اور یہ کوئی نیکی کی بات نہیں ہے کہ تم اپنے گھروں میں ان کے پچھواڑے سے اندر آؤ۔ زمانۂ جاہلیت کا ایک دستور یہ بھی تھا کہ جب گھر سے نکل کر احرام کی حالت میں پھر کوئی ضرورت گھر میں جانے کی درپیش آ جاتی تو دروازے سے نہ جاتے چھت پر چڑھ کر گھر کے اندر اترتے۔ یا گھر کی پشت کی جانب سے نقب دے کر گھستے اور اس کو نیکی کی بات تصور کرتے ـــــ اللہ تعالیٰ نے اس کو غلط فرمایا[1]

انصار حج کر کے واپس آتے تھے تو دروازے کی راہ سے گھر میں نہیں داخل ہوتے تھے بلکہ پچھواڑے سے کود کر آتے تھے اور اس کو کارِ ثواب سمجھتے تھے۔ چنانچہ ایک شخص حج کر کے آیا اور دستور کے خلاف دروازے سے گھس آیا تو لوگوں نے اس کو بڑی لعنت ملامت کی۔ یہ رسم چونکہ حج ہی کے سلسلے میں تھی اس لیے اس کا ذکر بھی حج ہی کے ساتھ فرما دیا۔ اس آیت میں نہ صرف اس رسم کی تردید ہو گئی بلکہ تمام اوہام پر یہ کہہ کر ضرب لگا دی ہے کہ نیکی دراصل اللہ سے ڈرنے اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے بچنے کا نام ہے ان بے معنی رسموں کا نیکی سے کوئی رابطہ نہیں ہے جو محض باپ دادا کی تقلید میں برتی جا رہی ہیں اور جن کا انسان کی سعادت و شقاوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اپنی طرف سے کسی جائز اور مباح امر کو نیکی بنا لینا اور دین میں داخل کر لینا مذموم اور ممنوع ہے۔ اسی سے بہت سی باتوں کا بدعت ہونا بھی معلوم ہو گیا۔ امتوں میں یہ عام بیماری رہی ہے کہ لوگ آہستہ آہستہ دین کے اصلی احکام و فرائض کو پس پشت ڈال دیتے ہیں

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۷

اوران کی خانہ پری بدعات ورسُوم سے کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اہلِ عرب پر یہ دور گزرا ہے۔ یہ لوگ حج تو زمانۂ جاہلیت میں بھی کرتے رہے لیکن اس کی اصلی رُوح سے اس کو بالکل خالی کرکے اور رسوم کا ایک گورکھ دھندھا بنا کر کرتے تھے۔

یہ سوال کہ وہ ایسا کیوں کرتے تھے کہ گھروں میں داخل ہونے کے بجائے گھروں کے پچھواڑے سے آتے۔ بظاہر اس کی وجہ ان کا یہ خیال ہوگا کہ جن دروازوں سے گناہوں کا بوجھ لادے ہوئے نکلے ہیں پاک ہوجانے کے بعد انہی دروازوں سے گھروں میں داخل ہونا خلافِ تقویٰ ہے۔ یا جیسا کہ امام زہری فرماتے ہیں۔ کہ ان کے اس کردار کا پس منظر یہ تھا کہ وہ احرام باندھنے کے بعد یہ گوارا نہ کرتے تھے کہ ان کے سروں پر چھت کا سایہ ہو اس لیے وہ دروازوں سے نہیں بلکہ کوٹھوں سے جاتے تھے اور اسے بہت بڑی نیکی خیال کرتے تھے۔ اور یہ توہم صرف حالتِ احرام ہی تک نہ تھا بلکہ ان کی زندگی کے مختلف گوشوں میں اسی توہم کے ایک سے زیادہ مظاہر موجود ہیں۔ سفر سے واپسی پر گھر کے دروازے سے گھر میں داخل ہونے کو متقیانہ سیرت کے خلاف تصور کرتے۔ بلکہ امام حسن بصری نے تو یہاں تک بتایا ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ سفر کے لیے جاتے روانہ ہونے کے بعد اگر کسی وجہ سے سفر کو ملتوی کرنا پڑتا تو دروازے سے گھر میں داخل ہونے کو شگونِ بد تصوّر کرتے، دیوار پھاند کر گھر میں جاتے۔ مدینہ میں رواج تھا کہ عید اور کسی میلہ سے واپسی پر گھروں میں پچھواڑوں سے داخل ہونے کو بہت بڑی نیکی سمجھتے تھے۔ قرآن کی اس آیت نے ان سب توہمات پر مبنی رسُوم کے خلاف احتجاج کیا ہے اور بتایا ہے کہ رسُوم کی پابجائی دینداری نہیں ہے۔ دینداری یہ ہے کہ حدود الٰہی کا احترام ملحوظ ہو۔ اسی سے آخرت کی فلاح اور اللہ کی خوشنودی حاصل ہوسکتی ہے۔

بدعت وسنّت کا قاعدہ

ابن العربی نے بتایا ہے کہ فقہا کی جانب سے اسلامی قانون میں پیش کیے ہوئے اس ضابطہ کی کہ جو چیز شریعت میں صرف مباح ہو یعنی قرآن وسنّت میں اس کی کوئی نظیر یا مثال طاعت وعبادت کے احکام میں نہ ملے اسے اپنی جانب سے عبادت اور طاعت بنالینا یا اسی طرح کسی مباح چیز کو بلا دلیلِ شرعی معصیت ومحل ملامت یقین کرلینا یہ دونوں اعتقاد گناہ ہیں اور ہر بدعت اسی حکم میں داخل ہے۔ یہی آیت اصل ہے یعنی فقہا نے یہ قانون اسی آیت گرامی سے مستنبط کیا ہے۔ قرطبی نے ابنِ عباس کی سند سے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ ایک روز حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تقریر فرما رہے تھے

کہ اتنے میں ایک شخص کو دھوپ میں کھڑا دیکھا - دریافت فرمایا کہ دھوپ میں کیوں کھڑا ہے۔ معلوم ہوا کہ وہ ابواسرائیل انصاری ہیں اور اس کی نذر ماننے ہوئے ہیں کہ روزہ رکھ کر بیٹھیں گے نہیں، کھڑے ہی رہیں گے۔ اور سایہ میں کھڑے نہ ہوں گے اور کسی سے بات نہ کریں گے، خاموش رہیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ ان کو وہاں سے اٹھالاؤ۔ ان سے کہو سایہ میں ہو جائیں، بات کریں، بیٹھ جائیں اور اپنا روزہ پورا کریں۔ اسلام نام صرف امتثال امر کا ہے اور ایمان کی حقیقت فقط تعمیلِ حکم ہے۔ اس راہ میں خود رائی سرتاسر کج رائی ہے[1]

ایک اور مطلب

بعض مفسرین آیت کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ ہر کام کو اپنے طریقہ پر کرنا اور اس صورت میں آیت میں پہلی آیت کے ساتھ ایک لطیف ربط ہو جاتا ہے۔ یعنی یہ کہ بے محل اور لایعنی سوال جیسا تم نے ہلال کے بارے میں کیا ہے نہ کرنا چاہیے۔ گویا اس میں اشارا ہے کہ بارگاہِ نبوت میں ایسے سوالات کرنا بے محل اور بے جوڑ ہیں اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے مکان میں پچھواڑے سے داخل ہونا کیونکہ نبوت ریاضی اور طبعیات کے مسائل بیان کرنے کے لیے نہیں آئی ہے۔ ان باتوں کا جاننا وحی پر موقوف نہیں ہے۔

۷۴۵ - اللہ کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم فلاح وسعادت سے ہمدوش ہو جاؤ۔ آیت نے بتا دیا کہ فلاح اور تقویٰ میں قریب ترین تعلق ہے اور یہ حقیقت ذہن میں تازہ ہو گئی کہ فلاح دارین کا اصل اصول تقویٰ ہے۔ اللہ سے ڈرتے اور اللہ سے محبت کرنے میں تضاد نہیں بلکہ ان میں باہم لگاؤ ہے۔ مخلوقات میں جس کسی چیز سے خوف کیا جاتا ہے اس میں خاصہ یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے سے بھگاتی ہے، دور کرتی ہے۔ لیکن اللہ کے ڈر میں اس کے برعکس ایک کشش ہوتی ہے۔ وہ اللہ کی طرف لاتا ہے، کھینچتا ہے بلاتا ہے، اللہ سے قریب تر کرتا ہے اور اس طرح عملاً محبتِ الٰہی کے مترادف ہے۔ اہل تقویٰ اور صالحین سے جس خوف کی نفی کی گئی ہے وہ دہشت کے مترادف ہے اور وہ وحشت سے پیدا ہوتا ہے۔ تقویٰ اس کے برعکس احساسِ عظمت سے پیدا ہوتا ہے اور وہ رب عظیم سے قریب تر کرنے والا ہے۔

---

[1] ماجدی

وَقَاتِلُوْا فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ الَّذِیْنَ یُقَاتِلُوْنَکُمْ وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ
اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ الْمُعْتَدِیْنَ ۞ وَاقْتُلُوْھُمْ حَیْثُ ثَقِفْتُمُوْھُمْ
وَاَخْرِجُوْھُمْ مِّنْ حَیْثُ اَخْرَجُوْکُمْ وَالْفِتْنَةُ اَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ ۚ
وَلَا تُقٰتِلُوْھُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ حَتّٰی یُقٰتِلُوْکُمْ فِیْهِ ۚ
فَاِنْ قٰتَلُوْکُمْ فَاقْتُلُوْھُمْ ؕ کَذٰلِکَ جَزَآءُ الْکٰفِرِیْنَ ۞
فَاِنِ انْتَھَوْا فَاِنَّ اللّٰہَ غَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ۞

اور دیکھو جو تم سے لڑائی لڑ رہے ہیں تم بھی ان سے اللہ کی راہ میں لڑو[547]۔ ہاں کسی قسم کی زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو[548] پسند نہیں کرتا۔ اور ان کو جہاں پاؤ قتل کر دو[550] اور جس جگہ سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے تم بھی ان کو نکال دو۔ اور فتنہ کا قائم رہنا قتل و خونریزی سے کہیں بڑھ کر ہے[551]۔ اور جب تک وہ خود مسجد حرام کے حدود میں تم سے لڑائی نہ کریں تم بھی اس جگہ ان سے لڑائی نہ کرو۔ پھر اگر وہ تم سے لڑائی کرتے ہیں تو تم بھی ان سے لڑو[552]۔ منکرین کی سزا ایسی ہی ہے۔ اس کے بعد اگر وہ لڑائی سے باز آ جائیں تو اللہ کی ذات بھی بخشنہار اور رحمت[553] والی ہے۔

دفاعی جنگ کی اجازت

پہلی آیت میں حرمت والے مہینوں کا ذکر تھا۔ اور فی الواقع سوال کا رُخ اشہرِ حرم اور ان کے آداب اور احکام کی طرف تھا۔ اشہرِ حرام یعنی حرمت والے مہینوں کا تقدس حضرت ابراہیم کے زمانے سے چلا آرہا تھا۔ ان میں لڑائی زمانۂ جاہلیت میں حرام سمجھی جاتی تھی۔ خانہ کعبہ کے قبلہ بننے اور کفار کے قبضے سے اس کی واگذاری کا اعلان ہونے کے بعد زبانوں پر یہ سوال آگیا کہ خود حرم اور اشہرِ حرم کے احترام کو ملحوظ رکھنے کے حدود و قیود کیا ہیں؟ اس وقت تک حرم پر مشرکین کا قبضہ تھا۔ اس وجہ سے اس بات کا قوی اندیشہ تھا کہ اگر مسلمان حج کے لیے جائیں اور کفار روکیں اور جنگ کی نوبت آجائے تو کیا کیا جائے گا۔ اس لیے احکامِ حج سے پہلے مسلمانوں کو حرم اور اشہرِ حرم کے آداب و احکام سے روشناس کرایا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ چونکہ حرم اور اشہرِ حرم کے احترام میں پوری عرب قوم کے احساسات نہایت نازک تھے ان میں لڑنا بھڑنا سب ہی کے نزدیک سب سے بڑی معصیت تھی اس لیے مسلمان بھی اس وقت تک ان میں کسی جنگ کے لیے اگرچہ وہ مدافعانہ کیوں نہ ہو تیار نہ ہو سکتے تھے جب تک قرآن اس کی اجازت نہ دے۔ ذی قعدہ ۶ھ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جماعتِ صحابہ کے ہمراہ عمرہ کے ارادے سے مکہ کی زیارت کو تشریف لائے۔ جب آپ مکہ کے نزدیک پہنچے تو مشرکین جمع ہو کر لڑنے کو تیار ہو گئے اور مسلمانوں کو روک دیا۔ بالآخر اس پر صلح ہوئی کہ امسال بغیر زیارت کے واپس ہو جائیں اور آئندہ سال آکر عمرہ کریں۔ جب دوسرے سال ذی قعدہ ۷ھ میں آپ نے مکہ کا ارادہ فرمایا تو صحابہ کرام کو یہ اندیشہ ہوا کہ اگر اہلِ مکہ اس بار بھی وعدہ خلافی کرکے لڑنے کو تیار ہو گئے تو ہم کیا کریں گے۔ لڑیں تو حرمِ مکہ اور اشہرِ حرم میں کیوں کر لڑیں اور نہ لڑیں تو عمرہ کیسے کریں۔ ان حالات میں اللہ سبحانہ نے یہ خاص ہدایات دی ہیں۔

۵۴۸ ۔ یعنی گروہ اس مہینہ حرام میں خلافِ عہد تم سے لڑیں تو تم بھی بے تامل ان سے لڑو۔ ہاں تمہاری جانب سے ابتدا اور زیادتی نہ ہونی چاہیے[1]

گویا یہ مسلمانوں کو اس بات کی اجازت ہے کہ اگر حج کے سلسلے میں جنگ کی نوبت آجائے تو حرم میں اور اشہرِ حرم میں دفاعی جنگ جائز ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۳۰

اس پر ساری اُمت کا اتفاق ہے کہ ہجرتِ مدینہ سے پہلے قتال کی اجازت نہ تھی، ہجرت کے بعد سب سے پہلے اس آیت میں قتال کا حکم ملا۔ اگرچہ صدیق اکبر کا ایک بیان یہ بھی بتاتا ہے کہ قتال کفار سے متعلق پہلی آیت سورۂ حج کی ہے یعنی اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا۔ لیکن اکثر صحابہ اور تابعین کے نزدیک یہی آیت حکم قتال میں اولین ہے اور صدیق اکبر نے جسے پہلی کہا ہے وہ بھی ابتدائی آیتوں میں ہونے کی وجہ سے پہلی ہو سکتی ہے [1]

اسلام کا قانونِ جنگ

غور فرمایئے قتال کا یہ حکم ان لوگوں کو مل رہا ہے جو دو چار مہینے نہیں پورے تیرہ برس مکہ میں ہر طرح کے شدائد پر صبر کے امتحان میں پورے اتر چکے تھے۔ اب وطن سے بے وطن ہو کر، گھر بار چھوڑ نے پر بھی مدینہ میں چین سے بیٹھنے نہ پائے تھے۔ اللہ تربت ٹھنڈی کرے لارڈ ہیڈلے کی، نو مسلم ہو کر بات پتے کی فرما گئے کہ اسلامی غزوات کے تین ابتدائی جغرافیائی محل وقوع کو دیکھ کر خود فیصلہ کر لو کہ لڑائی کی ابتداء کس نے کی اور چڑھائی کون کس پر کر کے گیا تھا۔ حملہ اور جارحانہ اقدام کون کر رہا تھا اور حفاظت خود اختیاری اور مدافعت میں کون لڑ رہا تھا۔ مکہ کے جنگ جو، اہل فساد یا مدینہ کے مومنین و صابرین۔ جنگِ بدر مدینہ سے کل تیس میل پر ہوئی۔ جنگِ اُحد مدینہ سے صرف بارہ میل کے فاصلہ پر ہوئی اور جنگِ احزاب میں تو محاصرہ ہی مدینہ کا ہوا۔ ہر بار قریشِ مکہ یا ان کے حلیف ہی چڑھ کر آئے۔ آیت کا یہ فقرہ الذین یقاتلونکم بتا رہا ہے کہ جنگ کی ابتدا کرنے والے مسلمان نہ تھے۔ دوسرے یہ کہ قتال کا حکم صرف ان کے مقابلے میں ہے جو واقعی لڑ رہے ہوں یا آج کل کی اصطلاح میں صرف محاربوں کے مقابلے میں۔ غیر محاربی آبادی کے سروں پر بم برسا دینے پر امن شہریوں پر ہوائی تاخت کرنے اور ان پر زہریلی گیس چھوڑنے کے مہذب ترین آئین حرب سے اسلام کا قانونِ جنگ ناآشنا ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جب دشمن واقعۃً سر پر آجاتے اور لڑائی شروع کر دے تب تم قتال کرو۔ اتنے انتظار و توقف کے معنے یہ ہوں گے کہ آدھی جیت ان کی ہو گئی جیسا کہ اس زمانے کی لڑائیوں میں مشاہدہ ہو رہا ہے بلکہ غنیم کا ارادہ اور آمادگی ہی اسے اس حکم کے تحت لانے کے لیے کافی ہے [2]

الغرض آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے کام میں تمہارا راستہ روکتے ہیں۔ اور اس بنا پر تمہارے

---

[1] معارفِ قرآن م شفیع ص ۴۱۳　[2] تفسیر ماجدی ص ۷۰

دشمن ہو گئے ہیں کہ تم خدا کی ہدایت کے مطابق نظام زندگی کی اصلاح کرنا چاہتے ہو اور اس اصلاحی کام میں جبر و ظلم کی طاقتیں استعمال کر رہے ہیں۔ ان سے جنگ کرو۔ اس سے پہلے جب تک مسلمان کمزور اور منتشر تھے۔ ان کو صرف تبلیغ کا حکم تھا اور مخالفین کے ظلم و ستم پر صبر کرنے کی ہدایت کی جاتی تھی۔ اب مدینے میں ان کی چھوٹی سی ریاست بن جانے کے بعد پہلی مرتبہ حکم دیا جا رہا ہے کہ جو لوگ اس دعوت فلاح کی راہ میں مسلح مزاحمت کرتے ہیں۔ ان کو تلوار کا جواب تلوار سے دو۔ اس کے بعد ہی جنگ بدر پیش آئی اور لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہو گیا [1]

جنگ کا پس منظر

آیت میں اسلامی جنگ کا پس منظر بتانے کے لیے فی سبیل اللہ کی قید کتنی اہم اور دنیا کی تاریخ جنگ میں کیسی انقلاب انگیز ہے۔ دنیا میں ہمیشہ لڑائیاں لڑی گئی ہیں، لڑی جا رہی ہیں اور لڑی جائیں گی لیکن ان کا پس منظر کیا ہے۔ زر، زمین اور زن یا زیادہ سے زیادہ یہ کہ قوم اور وطن کے لیے یہ خصوصیت صرف اسلامی جنگ کی ہے کہ جب کبھی اور جن حالات میں ہو اس کا مقصد شرک کو مٹانے، توحید کو بلند کرنے، دین حق کی حمایت و نصرت، انسانی حکومت کو مٹا کر خدائی حکومت قائم کرنا ہو۔ خودی کے لیے نہ ہو خدا کے لیے ہو۔ نفس کے لیے، قبیلہ کے لیے، اقتدار کی توسیع کے لیے، آزادیٔ تجارت کے لیے، آزادیٔ سمندر کے لیے، نو آبادیوں کے تحفظ کے لیے، برآمد کی منڈیوں کے قائم کرنے کے لیے نہ ہو بلکہ فی سبیل اللہ ہو اور فی سبیل اللہ کا مطلب فقہا کی قانونی زبان میں اعلاء کلمۃ اللہ اور اعزاز دین اللہ ہے۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ قرآن میں جہاد اور قتال ہم معنی ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں اس لیے جہاد فی سبیل اللہ اور قتال فی سبیل اللہ ان دونوں لفظوں کے ایک معنے نہیں ہیں بلکہ ان دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے۔ یعنی ہر جہاد قتال نہیں ہے بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قسم قتال ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن

جہاد کا لفظ جہد سے نکلا ہے۔ جہاد اور مجاہدہ فعال اور مفاعلت کے وزن پر مصدر ہیں۔ لغت میں اس کے معنے محنت اور کوشش کے ہیں۔ اسی کے قریب اس کے اصطلاحی معنے بھی ہیں یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت و حفاظت کے لیے ہر قسم کی جدوجہد، قربانی اور ایثار گوارا کرنا اور ان تمام جسمانی، مالی و دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں تک کہ اس کے لیے اپنی اور اپنے عزیز و اقارب کی، اہل و عیال، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی طاقت کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا اور اس کے لیے جنگ کے میدان میں کود پڑنا بھی جہاد ہے اور یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

آداب جہاد

۵۴۹۔ ہاں کسی قسم کی زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ لڑائی میں بچے، عورتیں اور بوڑھے قصداً نہ مارے جائیں اور حرم میں اپنی طرف سے لڑائی شروع نہ کی جائے[1] اس سے مراد یہ ہے کہ عورتیں، بچے، بہت بوڑھے اور اپنے مذہبی اشغال میں دنیا سے یکسو ہو کر لگے ہوتے عبادت گزار راہب، پادری وغیرہ اور ایسے ہی اپاہج و معذور لوگ یا وہ لوگ جو کافروں کے یہاں محنت و مزدوری کا کام کرتے ہیں ایسے لوگوں کو قتل کرنا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جنگِ اسلامی کے قانون کی اس حد بندی سے تجاوز ہے جو قرآن میں الذین یقاتلونکم میں بتایا گیا ہے یعنی ان لوگوں سے قتال کرو جو تم سے قتال کرتے ہیں اور مذکورہ قسم کے افراد قتال کرنے والے نہیں ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مجاہدین کو بوقتِ جہاد جو ہدایات دیتے تھے ان میں اس کی واضح تشریحات موجود ہیں۔ صحیح بخاری و مسلم میں بروایتِ عبداللہ بن عمر ایک ارشاد ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا ہے۔

ابوداؤد میں یہ ہدایات آئی ہیں:

تم اللہ کے نام پر اور رسول اللہ کی ملت پر جہاد کے لیے جاؤ کسی بوڑھے، ضعیف کو اور چھوٹے بچے کو یا کسی عورت کو قتل نہ کرو۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہندؒ ص ۳۷

حضرت صدیق اکبر نے جب یزید بن ابی سفیان کو ملک شام روانہ کیا تو ان کو بھی یہی ہدایات دیں کہ عبادت گزار راہبوں کو اور کافروں کی مزدوری کرنے والوں کو بھی قتل نہ کریں جب کہ وہ قتال میں حصہ نہ لیں[1]

حد سے تجاوز

اعتدا کے لغوی معنے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں اور اس کی متعدد صورتیں ہو سکتی ہیں۔ حد سے مراد قانونِ اسلام کی حد بھی ہو سکتی ہے جیسے پہلے بتایا گیا مثلاً یہ کہ انتقام کے جوش یا فتح مندی کے نشہ میں بے تحاشا غنیم کے نبرد آزما اور غیر نبرد آزما سب کو قتل کرنا شروع کر دو۔ ان کے کھیتوں، ان کے باغوں، ان کی چراگاہوں میں آگ لگا دو۔ ان کے بے زبان جانور مار دیے جائیں۔ قرآن نے دُنیا کو یہ سبق دیا ہے کہ قوت کا استعمال صرف اس حد تک جائز ہے جس حد تک ضروری ہے۔ اور حد سے مراد حدِ معاہدہ بھی ہو سکتی ہے مثلاً یہ کہ بد عہد اور عہد شکن قوموں کی دیکھا دیکھی خود بھی معاہدوں کی پروا نہ کی جائے۔ اور عہد شکنی کی ابتدا اپنی طرف سے کر کے ہلہ بول دیا جائے۔ اسی طرح اور پہلو بھی تجاوز حدود کے نکل سکتے ہیں۔ لفظ اعتدا زیادتی کے تمام پہلوؤں کا جامع ہے اور ہر قسم کی زیادتی کی ممانعت اس سے نکل سکتی ہے۔ اعتدا کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ قتال علاوہ فی سبیل اللہ کے کسی اور غرض کے لیے شروع کر دیا جائے۔ چنانچہ بعض دقیق النظر مفسرین نے یہ پہلو بھی لیا ہے۔ ابن العربی نے لاتعتدوا کی اس طرح تشریح کی ہے کہ دین کے علاوہ کسی چیز کے لیے جنگ نہ کرو۔ قرطبی لکھتے ہیں اللہ کی رضا کے علاوہ کسی چیز مثلاً قومی حمیت اور شہرت کے لیے جنگ نہ کرو[2]

بہرحال اس فقرے کا حاصل یہ ہے کہ چونکہ تمہاری جنگ مادی اغراض کے لیے نہیں ہے اس لیے حد سے تجاوز نہ ہو۔ نہ ان لوگوں پر ہاتھ اُٹھاؤ جو دینِ حق کی راہ میں مزاحمت نہیں کرتے اور نہ لڑائی میں جاہلیت کے طریقے اپناؤ۔ عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور زخمیوں پر دست درازی کرنا دشمن کے مقتولوں کا مثلہ کرنا کھیتوں اور مویشیوں کو خواہ مخواہ برباد کرنا۔ اور دوسرے تمام وحشیانہ اور ظالمانہ افعال حد سے گزرنے کی تعریف میں آتے ہیں۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ قوت کا استعمال وہیں کیا جائے جہاں وہ ناگزیر اور اسی حد تک کیا جائے جتنی اس کی ضرورت ہو[3]

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۴۹۱ [2] تفسیر ماجدی ص ۵، [3] تفہیم القرآن ص ۱۵۰

۵۵۰۔ اور ان کو جہاں پاؤ قتل کرو۔ یعنی جس جگہ پاؤ یعنی حرم میں ہوں خواہ غیر حرم میں جس جگہ بھی پاؤ اور جہاں سے انہوں نے تم کو نکالا ہے یعنی مکہ سے۔

مطلب یہ ہے کہ بیت اللہ کا حج تم پر فرض ہے۔ اور ملت ابراہیم کے اصلی وارث ہونے کی وجہ سے یہ تمہارا حق بھی ہے بلکہ اس کے اصلی حقدار تم ہی ہو۔ اس وجہ سے اگر تمہارے اس حق اور فرض کی راہ میں قریش مزاحم ہوں تو ان کا مقابلہ کرو اور جہاں ان سے تصادم ہو وہیں ان کو قتل کرو۔ اگرچہ اس قتال کی نوبت حرم اور حدود حرم میں پیش آئے اور جس مکہ سے انہوں نے تم کو نکالا ہے تم بھی ان کو وہاں سے نکالو کیونکہ ابراہیم و اسماعیل کی وراثت صرف نسل و نسب کی بنا پر کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ خود حضرت ابراہیم کے ارشاد کے مطابق اس کے اصلی حقدار وہ ہیں جو ان کی ملت پر قائم ہیں۔ یہ درجہ تم کو حاصل ہے نہ کہ ان کو اس لیے اس گھر سے نکالے جانے کے وہ مستحق ہیں نہ کہ تم۔[1]

قتال انفرادی نہیں اجتماعی مراد ہے

قتال کے بارے میں قرآن کی جمع کے لفظوں میں تعبیرات بہت معنے خیز ہیں۔ فقہائے حنفیہ نے ان ہی تعبیرات سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قتال کا فریضہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ مزدری ہے کہ مملکت کا انتظام ہو، امام کی سربراہی ہو۔ فوج اور عسکریت کا وجود اور وجوب اسی آیت سے بطور عبارت النص کے معلوم ہو رہا ہے اور امام کی سربراہی کی بھی آیت بطور اقتضاء النص نشاندہی کر رہی ہے۔ کیونکہ فوجی تنظیم اور اس کی اجتماعی ترتیب بغیر سرکار یعنی امام کے ممکن نہیں ہے۔

اسی سے قتال کی دو قسمیں معلوم ہوتی ہیں دفاعی اور ہجومی۔ دفاع کی صورت میں قتال فرض عین ہوتا ہے اور ہجوم کی صورت میں فرض کفایہ ہوتا ہے۔ کفایہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں سے کچھ پر فرض ہے بلکہ فرضیت سب پر ہوتی ہے ہاں کچھ کے مقصد کو حاصل کرنے کے بعد ذمہ داری سے سب سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اقناع میں ہے۔

اذا قام بہ من یکفی سقط وجوبہ عن غیرھم

---

[1] تدبر قرآن ص ۴۳۱

جب اتنے لوگ کام کو انجام دیں جو حصولِ مقصد کے لیے ضروری ہوں تو پھر باقی سے مطالبہ ختم ہو جائے گا۔

صاحب ہدایہ لکھتے ہیں

اذا قام فریق من الناس سقط من الباقین

جب مسلمانوں کی ایک جماعت اس کے لیے کھڑی ہو گئی تو باقی کے لیے واجب نہ رہا۔

قتال اگر دفاعی ہو تو یہ فرض کفایہ نہیں ہے بلکہ بالاتفاق نماز روزے کی طرح ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔ ایک گروہ کے دفاع کرنے سے باقی مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ جیسے ایک گروہ کے نماز پڑھ لینے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ سے نماز ساقط نہیں ہوتی۔ اس کی تفصیلات انشاء اللہ پارہ ۱۱ میں آ رہی ہیں۔

۵۵۱ - اور دیکھو فتنہ کا رہنا قتل و خونریزی سے کہیں بڑھ کر ہے یعنی دین سے پھر جانا یا دوسرے کو پھرانا مہینہ حرام کے اندر مار ڈالنے سے بہت بڑا گناہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حرم میں کفار کا شرک کرنا اور کرانا زیادہ قبیح ہے حرم میں مقاتلہ کرنے سے تو اب اے مسلمانو! کچھ اندیشہ نہ کرو اور جواب ترکی بہ ترکی دو[1]

مطلب یہ ہے کہ جنگ بُرائی ہے لیکن فتنہ کا قائم رہنا اس سے بھی زیادہ سخت برائی ہے پس ناگزیر ہوا کہ فتنے کے ازالہ کے لیے جنگ کی حالت گوارا کی جائے۔ قریشِ مکہ کا فتنہ کیا تھا؟ یہ تھا کہ وہ جبر و قہر سے لوگوں کو مجبور کرتے تھے کہ جس بات کو حق سمجھتے ہیں اسے حق نہ سمجھیں یعنی دین و اعتقاد کی آزادی مفقود ہو گئی ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بُرائی جنگ کی بُرائی سے بھی زیادہ ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے انسداد کے لیے جنگ کی بُرائی گوارا کر لی جائے[2]

یعنی یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ کسی کو قتل کرنا سخت بُرا کام ہے مگر کفار مکہ کا اپنے کفر و شرک پر جما رہنا اور مسلمانوں کو ادائے عبادت سے روکنا اس سے زیادہ سنگین ہے۔ اس سے بچنے کے لیے ان کو قتل کرنے کی اجازت دے دی گئی ہے۔ آیت میں لفظ فتنہ سے کفر و شرک اور مسلمانوں کو ادائے عبادت سے روکنا مراد ہے[3]

اس سے پہلی آیت اور اسی آیت کے پہلے فقرے میں جو مشرکین سے قتال کی اجازت دی

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۵۴ [2] ترجمان القرآن ص ۲۸۷ [3] معارف م ش ص ۴۱۲

گئی ہے یہاں تک کہ حدودِ حرم اور اشہرِ حرام میں بھی وہ جنگ کریں تو ان کو قتل کرنا اور مکہ سے ان کو بے دخل کرنا جائز ٹھہرایا گیا ہے۔ اس فقرے میں اسی کی دلیل بیان کی جا رہی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر چند حدودِ حرم اور اشہرِ حرم میں قتل و قتال ایک بہت ہی سنگین بات ہے۔ لیکن جس گھر میں اللہ کے بندوں اور بندیوں کو صرف اس جرم کی پاداش میں ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا رہا ہے کہ وہ اللہ پر ایمان لائے۔ یہ ظلم و ستم اس قتل سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ اس سنگین تر فتنہ کو مٹانے کے لیے تمہیں یہ اجازت دی گئی ہے کہ اگر نوبت جنگ پیش آجائے تو تم کفار کو ترکی بترکی جواب دو اور جہاں کہیں تمہارے مقابلے پڑ جائیں ان کو قتل کرو۔ یہ چیز نہ احترامِ حرم کے منافی ہے اور نہ حرمتِ اشہرِ حرام کے[1]

آیت میں لفظ فتنہ اسی معنے میں استعمال ہوا ہے جس میں انگریزی کا لفظ (PERSECUTION) استعمال ہوتا ہے۔ یعنی کسی گروہ یا شخص کو محض اس بنا پر ظلم و ستم کا نشانہ بنانا کہ اس نے رائج الوقت خیالات اور نظریات کی جگہ کچھ دوسرے خیالات و نظریات کو حق پاکر قبول کر لیا ہے۔ اور وہ تنقید و تبلیغ کے ذریعے سے سوسائٹی کے موجود الوقت نظام میں اصلاح کی کوشش کرتا ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ بلاشبہ انسانی خون بہانا بہت برا کام ہے۔ لیکن جب کوئی انسانی گروہ زبردستی اپنا فکری استبداد دوسروں پر مسلط کرے اور لوگوں کو قبولِ حق سے بجبر روکے اور اصلاح و تغیر کی جائز کوشش کا مقابلہ دلائل سے کرنے کے بجائے حیوانی طاقت سے کرنے لگے تو وہ قتل کی بہ نسبت زیادہ سخت برائی کا ارتکاب کرتا ہے۔ اور ایسے گروہ کو بزور شمشیر ہٹا دینا بالکل جائز ہے[2]

ایک معنے تو فتنہ کے یہی ہیں جو آپ کے گوش گزار ہوئے۔ دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ مکہ والوں کی مسلسل اور لگاتار تعدیاں اور مظالم قتل سے بھی کہیں زیادہ سخت و ناقابلِ برداشت ہیں اور بعض اکابر مفسرین کی نظر بھی اسی پہلو کی طرف گئی ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں :

> وہ آزمائشیں اور چیرہ دستیاں جن سے آدمی دوچار ہوتا ہے۔ مثلاً گھر سے بے گھر ہونا قتل سے بھی زیادہ سنگین ہیں۔ قتل تو ایک وقتی اور ہنگامی فعل ہے لیکن ان چیرہ دستیوں کی تاریخ تو طویل ہوتی ہے۔

علامہ زمخشری کہتے ہیں :

> وہ اُفتاد جو انسان کی خرمنِ حیات پر گرتی ہے اور جس کی اذیت سے انسان کو چھٹکارا

---

[1] تدبر قرآن ص ۴۲۱ [2] تفہیم القرآن ص ۱۵۰

نہیں ملتا قتل سے کہیں زیادہ سخت ہے ۔

علامہ ابوحیان اندلسی فرماتے ہیں:

گھر سے بے گھر ہونا شہر بدر ہونا اور ملک چھوڑنا قتل سے بھی زیادہ تکلیف دہ ہے وطن سے مفقدی دوستوں کی جدائی اور دائمی زندگی کی پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے ۔

ایک معنے یہ بھی کیے گئے ہیں کہ یہاں فتنہ سے مراد آخرت کا ابدی عذاب ہے جو انہیں کفر کی سزا میں ملے گا۔ گویا ارشاد یہ ہے کہ وہ دائمی عذاب دُنیا کی سزائے قتل سے کہیں بڑھ چڑھ کر اور فتنہ بول کر عذاب مراد لینا جائز ہے ۔

۵۵۲۔ اور جب وہ خود مسجد حرام کی حدود میں تم سے لڑائی نہ کریں تم بھی اس جگہ ان سے نہ لڑو پھر اگر وہ لڑائی کرتے تو تم بھی ان سے لڑو۔ یعنی مکہ ضرور امن کی جگہ ہے لیکن جب انہوں نے ابتدا کی اور تم پر ظلم کیا اور ایمان لانے پر دُشمنی کرنے لگے کہ یہ بات مار ڈالنے سے بھی سخت ہے تو اب ان کو امان نہ رہی، جہاں پاؤ مارو۔ آخر جب مکہ فتح ہوا تو آپ نے یہی فرما دیا کہ جو ہتیار سامنے کرے اسی کو مارو باقی سب کو امن ہے[1]

یعنی مسجدِ حرام کے آس پاس جس سے مراد پورا حرمِ مکہ ہے تم ان لوگوں سے اس وقت تک قتال نہ کرو جب تک وہ خود قتال کی ابتدا نہ کریں[2]

گویا یہ تاکید ہے اس بات کی کہ مسلمان مسجدِ حرام کے پاس جنگ میں پہل نہ کریں۔ ہاں اگر ان کو مسجدِ حرام سے روکنے کے لیے ان پر کفار کی طرف سے حملہ کیا جائے تو اس کا منہ توڑ جواب دیں۔ مسجدِ حرام کا احترام ایک مشترک ذمہ داری ہے۔ اگر کفار مسلمانوں کی دُشمنی میں اس کے احترام کو بالائے طاق رکھ دیتے ہیں تو پھر وہ خود بھی اس کے مستحق نہیں ہیں کہ ان سے کسی قسم کی رعایت کی جائے یہ درحقیقت ان کے اپنے کیے کی سزا ہے[3]

اس تاکید کی وجہ یہ ہے کہ یہاں قتال کی ابتدا بلاوجہ اور بلاضرورت کر دینے سے حدودِ حرم کی ہتک لازم آتی ہے۔ مسجدِ حرام یعنی مسجدِ کعبہ کے اردگرد نواح میں کئی میل کا پورا علاقہ جو اصطلاح میں حرم کہلاتا ہے اور اس کے احترام کے خاص آداب و قواعد ہیں۔ اس آیت کے نزول کے وقت مسلمانوں اور مشرکینِ مکہ کے درمیان عارضی صلح کا معاہدہ تھا۔ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ مسلمانوں کے لیے معاہدہ کے

---

[1] فوائد حضرت شیخ الہند ص ۲۷ [2] معارف قرآن م ش ص ۱۵۴ [3] تدبر قرآن ص ۴۲۱

سو قتال سے دوسرا مانع احترام حدودِ حرم بھی ہے بعض تابعین اور فقہاءِ حنفیہ نے آیت سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسجدِ حرام میں قتل و قتال ناجائز ہے تاوقتیکہ وہ جواب اور مدافعت میں نہ ہو۔ اور یہ بھی اسی آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ قتال کی ابتدا کی ممانعت صرف مسجدِ حرام کے آس پاس حرم کے ساتھ مخصوص ہے دوسرے مقامات پر جیسے دفاعی جنگ جائز ہے ایسے ہی ہجومی بھی دُرست ہے۔

جنگ میں اخلاقی اقدار کا تحفظ

غلبہ و اقتدار کے وقت انتقام کے حدود کے اندر رہنا اخلاق کے مرتبہ اعلیٰ کا مقام ہے۔ مہذب سے مہذب تر اور متمدن سے متمدن تر لوگوں کی عقل و متانت اور قوتِ عدل و توازن جنگ کے میدان میں جواب دے دیتی ہے اور کل کے مظلوم، بے ساختہ اور شاید بے شعوری کے عالم میں آج کے ظالم بن جاتے ہیں۔ قرآن عزیز کا اس موقعہ پر اپنے پیروؤں کو ضبط و احتیاط کی تلقین کرنا افرادِ اُمّت کو حکمت و اخلاقِ فاضلہ کے بلند سے بلند مقام پر پہنچا دیتا ہے۔ اور جب یہ بات بھی پیشِ نظر ہو کہ آیت کا وقتِ نزول ذیقعدہ ۶ھ ہے۔ جب معاہدۂ حدیبیہ کے دوسرے سال مسلمان عمرہ کی نیت سے مکہ روانہ ہو رہے تھے اور اندیشہ تھا کہ مشرکین معاہدہ کو توڑ کر جنگ شروع کر دیں گے۔ اور اس کے جواب میں قدرۃً مسلمان بھی اشتعال میں آجائیں گے تو آیت کے اس تاکیدی اور امتناعی حکم کی قدر و منزلت اور بھی بڑھ جاتی ہے۔ فتح مندیوں کی گھڑیوں میں ایسی ہدایت پر عمل دُنیا کی کس قوم نے کیا ہے؟ ۲۰ ر رمضان المبارک ۸ھ مطابق ۱۱ فروری ۶۳۰ء جمعہ کا دن ہے۔ اسلامی لشکر مکہ کی طرف جا رہا ہے کہ حضرت سعد بن عبادہ کی زبان سے ابوسفیان کو دیکھ کر یہ بات نکل آئی کہ آج گھمسان کا دن ہے آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا۔ یہ محض ایک گونہ تعریض تھی جس کو ایک پُرجوش مجاہدِ حق قدیم دُشمن کو دیکھ کر کہہ گیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو سعد کے اس کہنے کا علم ہوا تو فرمایا سعد نے غلط کہا۔ یہ ایسا دن ہے کہ اللہ اس کی عظمت دوبالا کرے گا اور کعبہ کو غلاف پہنایا جائے گا۔

۵۵۲۔ اس کے بعد اگر وہ لڑائی سے باز آجائیں تو اللہ کی ذات بخشنہار اور مہربان ہے یعنی ان سب باتوں کے باوجود اگر اب بھی مسلمان ہو جائیں اور شرک سے باز آجائیں تو توبہ قبول ہے۔ لے باز آجانے سے مقصود کفر سے باز آنا ہے کیونکہ کفر سے توبہ کر کے انسان بخشش اور رحم کا مستحق ہو سکتا

لے افاداتِ شیخ الہند ص ۳۷

وَقٰتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ لِلّٰهِ ؕ فَاِنِ انْتَهَوْا فَلَا عُدْوَانَ اِلَّا عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ۞ اَلشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمٰتُ قِصَاصٌ ؕ فَمَنِ اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰى عَلَيْكُمْ ۪ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُتَّقِيْنَ ۞

اور دیکھو ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ یعنی ظلم و فساد باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے۔ پھر اگر لوگ باز آجائیں تو پھر اقدام ان کے خلاف جائز ہے جو ظالم ہیں۔ شہر حرام شہر حرام کا بدلہ ہے۔ مہینوں کی حرمتیں ادلہ بدلہ اور برابر ہیں لہٰذا جو شخص تم پر زیادتی کرے تم بھی اس کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر اس کو جواب دو اور اللہ سے ہر حال میں ڈرتے رہو اور یہ یقین رکھو کہ اللہ حدود الٰہی کا احترام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

ہے۔ یہاں مغفرت اور رحمت کا ذکر کر کے قرآن نے کافروں کو اللہ کی طرف متوجہ کیا ہے کہ اگر وہ چاہیں تو اللہ پر ایمان لا کر اس کی مغفرت اور رحمت سے استفادہ کر سکتے ہیں۔ یہ ہے عظمت اسلام کہ اسلام صرف ایمان قبول کرنے پر کافروں کو معاف کر دیتا ہے اور ان سے قصاص اور تاوان

ختم کر دیتا ہے۔ جہادِ اسلامی کا اصل مقصود یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کا دین اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ نہ رہے اور کوئی معاشرتی ڈھانچہ ایسا باقی نہ رہے جو ان کو اللہ کا دین چھوڑنے پر اکسا سکے اور گمراہ کرے اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے کہ جب اللہ کا دین غالب ہو جائے اور اس قدر طاقتور ہو جائے کہ اللہ کے دشمن اس سے ڈرنے لگیں اور کوئی شخص اس کے راستہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کی جرأت نہ کرے۔ اس مقصد کے حصول کے لیے ضروری ہے کہ یہ شہر جس میں بیت اللہ ہے کفار و مشرکین کے تسلط سے آزاد اور کفر و شرک کی نجاستوں سے پاک ہو اور اسلام کا مرکز اور تمام اہلِ ایمان کا قبلہ ہو۔ یہ امر واقعہ ہے کہ بیت اللہ کو کفار کے قبضہ و تسلط سے چھڑانا اور اس کو کفر و شرک کی تمام الائشوں سے پاک کر کے از سرِ نو اس کو اسلام اور ملتِ اسلامیہ کا مرکز بنانا دعوتِ قرآنی کا اصل نصب العین ہے اور اس نصب العین کا حصول ہی گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس مشن کا آخری کام ہے۔ اس روشنی میں غور کیجئے تو یہ حقیقت بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ باز آنے کے صرف یہ معنے نہیں ہیں کہ کفار قریش جنگ سے رک جائیں بلکہ اس کے معنے یہ ہیں کہ اپنی ان تمام مخالفانہ و معاندانہ حرکتوں سے جن کے وہ آج تک اس دعوتِ حق کی مزاحمت کے لیے مرتکب ہو رہے ہیں۔ باز آکر اس کے حامی و ناصر بن جائیں۔ اگر وہ یہ راہ اختیار کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے وہ تمام جرائم معاف کر دے گا جن کے وہ اب تک مرتکب ہوتے ہیں[1]

اسلام میں جنگ کے مقاصد

اسلام کے قانون دان طبقہ نے قتال کے دو مقاصد بتائے ہیں۔ ایک یہ اللہ کے نام کا بول بالا ہو، الٰہی حکومت قائم ہو، دوسرے یہ کہ دنیا ظلم و فساد سے خالی ہو کر امن و سلام کا گہوارہ بنے۔ قانون کی زبان میں پہلے مقصد کا نام اعلاءِ کلمۃ اللہ دوسرے مقصد کو دفع الشر عن العباد کہتے ہیں۔ یہ آیت گرامی اسلام میں جنگ کے ان دوگونہ مقاصد کی توضیح کر رہی ہے۔ اسی کے لیے قرآن میں فی سبیل اللہ اور فی سبیل المستضعفین من الرجال والنساء والولدان کی تعبیر ہے مقصد یہ بتانا ہے کہ قتال کے یہ دو بنیادی مقاصد ہیں کہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایات اور ان

---

[1] تدبر قرآن ملخصاً ص ۴۲۲

ہدایت پر مشتمل نظام عادلانہ دنیا میں قائم کرنا اور پوری زندگی ظلم وفساد کو دُور کر کے امن و سلام قائم کرنا، منکرات کو مٹانا اور معروفات کو رائج کرنا۔ ان ہی مقاصد کی خاطر نبوت آئی ہے اور ان ہی کے مطابق قیادت کی ذمہ داریاں اُمتِ مسلمہ پر ڈالی گئی ہے۔ یہ وہ مقاصد جب تک حاصل نہ ہوں جنگ جاری رکھی جائے۔ ان ہی مقاصد کو ملحوظ رکھ کر قانونی حیثیت سے اسلام نے دُنیا کی قوموں کو تین حصّوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق مقرر کیے ہیں۔

اوّل مشرکینِ عرب ان کے لیے صرف دو صورتیں ہیں اسلام قبول کریں یا تلوار۔

دوم اہلِ کتاب یعنی ان کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن میں آئے ہیں مثلاً عیسائی اور یہودی۔ ان کے لیے تین صورتیں ہیں، اسلام قبول کریں، اسلام قبول نہیں کرتے تو اسلامی نظام کے تحت رہنا قبول کریں۔ اگر وہ ایسا کریں گے تو ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہیں گی، ان کو اپنے مذہب کے بدلنے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ ان کی جان ومال اور عزت وآبرو کی حفاظت اسلام کا نظام کرے گا اور اگر نظام بھی قبول نہیں کرتے تو پھر جنگ فیصلہ کرے گی۔

سوم شبہ اہلِ کتاب یعنی وہ لوگ جو توریت، انجیل، زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابی وغیرہ، مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے۔ ان دو باتوں کے علاوہ اہلِ کتاب کے بقیہ حقوق اسلام نے ان کو عطا کیے ہیں۔ ان آیاتِ قرآنی میں قتال کی بحث صرف مشرکینِ عرب اور قریش سے ہے۔ اسی روشنی میں ان آیاتِ قرآنی کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

۵۵۴۔ ان سے جنگ کرو یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے اور دین صرف اللہ کے لیے ہو جائے یعنی کافروں سے لڑائی اسی لیے ہے کہ ظلم موقوف ہو اور کسی کو دین سے گمراہ نہ کر سکیں اور خاص اللہ ہی کا حکم جاری ہو لہٰذا جب وہ شرک سے باز آجائیں تو زیادتی سوائے ظالموں کے اور کسی پر نہیں ہے یعنی جو بدی سے باز آگئے اب وہ ظالم نہ رہے تو اب ان پر زیادتی نہ کرو۔ ہاں جو فتنہ سے باز نہ رہیں ان کو شوق سے قتل کرو[1]

فانتھوا میں ضمیر ھم کا مرجع کیا ہے؟ جنگ جاری رکھنے کا حکم کس کے مقابلے میں دیا جا رہا ہے۔ روئے زمین کے سارے کافر نہیں صرف مشرکینِ عرب ہیں۔ فقہاءِ حنفیہ اور اکثر تابعین کا یہی

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۳۰

ال ہے۔ قرطبی نے، ابوحیان اندلسی نے، علامہ آلوسی نے اسی کو اپنایا ہے۔ الجصاص رقمطراز ہیں :

یہ آیت صرف مشرکین کے بارے میں ہے کیونکہ آغازِ خطاب میں ان کا ہی تذکرہ ہے

یہ آیت اس موضوع پر فیصلہ کن ہے کہ مشرکینِ عرب کو قرآن جنگ اور قبولِ اسلام کے علاوہ کسی چیز کی رعایت نہیں دیتا ۔

حتیٰ یہاں اظہارِ غایت کے لیے ہے یعنی اس وقت تک ان سے جنگ جاری رکھی جائے کہ حدودِ رم اور حدودِ عرب میں شرک و کفر باقی نہ رہنے پائے۔ اور اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین سرزمینِ رم میں نہ رہے۔ یہ گھر اللہ کی عبادت کے لیے بنا ہے اس لیے اللہ کے دین کے سوا کسی دوسرے دین ن یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اگر وہ لوگ اسلام نہ لائیں تو اگرچہ عام کفار سے جزیہ دینے کے اقرار پر قتال سے دست کش ہونے کا حکم ہے لیکن یہ خاص کفار چونکہ اہلِ عرب ہیں ان کے لیے جزیہ کی رعایت نہیں ہے بلکہ ان کے لیے اسلام ہے یا قتل [1]

کفارِ عرب اگر اسلام نہ لادیں تو ان کے لیے صرف قتل کا قانون ہے۔ اگر وہ جزیہ دینا چاہیں نہ لیا جائے گا۔

علامہ ابن قدامہ رقمطراز ہیں :

یہودیوں، عیسائیوں اور مجوسیوں کے سوا مشرکینِ عرب سے جزیہ قبول نہ کیا جائے ان کے لیے اسلام اور قتل کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہی امام احمد کا مذہب ہے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ دُنیا کے تمام کافروں کو جزیہ کی رعایت دی جائے لیکن مشرکینِ عرب کے لیے یہ رعایت نہیں ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ مشرکین قریش کے سوا سب کو جزیہ کی رعایت ملے گی ۔

علامہ سید رشید رضا لکھتے ہیں :

حق مختار یہی ہے کہ اہلِ کتاب اور مجوسیوں کے لیے جزیہ کی رعایت ہے لیکن مشرکینِ عرب کیلیے یہ رعایت قطعاً نہیں ہے ۔

علامہ آلوسی رقمطراز ہیں :

مشرکینِ عرب کے لیے قتل اور اسلام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد

ہ ماجدی ص ۵، [1] بیان القرآن ص ۱۱۰

ہے تعاقبو نہ دادیلون۔

اس آیت سے اوپر والی آیت کے مضمون کی مزید وضاحت ہو گئی کہ کفارِ قریش سے یہ جنگ اس وقت تک جاری رہنی چاہیے جب تک سرزمین عرب پر فتنہ کا کوئی اثر باقی ہے اور اللہ کے دین کے علاوہ کوئی اور دین یہاں قائم ہے۔ یہ گھر صرف اللہ کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا ہے اس لیے اللہ کے دین کے سوا کسی دوسرے دین کے لیے یہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ قرآن نے اس آیت میں کفارِ عرب کے سامنے جن کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت براہِ راست تھی۔ اور جو بیت اللہ پر ناجائز طور پر قابض تھے صرف دو ہی راہیں باقی رکھی ہیں۔ یا تو اسلام قبول کر لیں یا تلوار دوسرے کفار کی طرح ان کے لیے جزیہ کی گنجائش نہیں ہے[1] چنانچہ سورۃ براءت نازل ہونے کے بعد تمام مشرکین عرب مسلمان ہو گئے اور حکمتِ الٰہی کا یہی فیصلہ ہوا کہ جاہلیت عرب کا شرک یہاں پر سر نہ اٹھائے۔

اس آیت میں فتنہ سے مقصود شرک و کفر ہے کیونکہ یہی تباہی اور ہلاکت کے ذرائع ہیں اور فتنہ سے کفر و شرک مراد ہونے پر محققینِ اُمت کا اجماع ہے۔ حافظ ابن کثیر نے عبداللہ ابن عباسؓ، ابوالعالیہ، مجاہد، حسن، قتادہ، ربیع، مقاتل اور سدی کے حوالے سے بھی تشریح کی ہے۔ حافظ ابن جریر نے بھی یہی معنے کیے ہیں۔ نہ معلوم صاحبِ تفہیم القرآن یہ فرما کر کہ یہاں فتنہ سے مراد وہ حالت ہے جس میں دین اللہ کے بجائے کسی اور کے لیے ہو۔ اپنے مخاطبوں کے ذہن میں کیا اتارنا چاہتے ہیں۔ اس معنے کی رُو سے الدین للہ اور فتنہ دونوں ایک ہی بات کے لیے مثبت اور منفی پہلو ہوں گے اور یہ بلاغتِ قرآنی کے خلاف ہے کہ وہ بے مقصد تاکیدی تعبیر اختیار کرے۔ بلاغت کا حسن تاکید میں نہیں بلکہ تاسیس میں ہے، تاسیس یہی ہے کہ یہاں فتنہ سے مقصود شرک و کفر کی وہ حالت ہو جو انہوں نے اللہ کے گھر میں قائم کر رکھی ہے۔ یہی اس کا منطوق ہے۔ اس کے مدلول میں وہ تعدیاں بھی داخل ہیں جو قبولِ حق کرنے والوں پر وہ روا رکھتے تھے اور اس کے مفہوم میں وہ ظلم و ستم بھی ہے جس کا مقہور و مجبور انسان نشانہ بنتے تھے لیکن اس کا منطوق یہاں مشرکین کی مشرکانہ اور کافرانہ زندگی ہے۔ یہ درست ہے کہ سوسائٹی کی وہ حالت جس میں بندوں پر بندوں کی خدائی اور فرماں روائی قائم ہو اور جن میں اللہ کے قانون کے مطابق زندگی بسر کرنا ممکن نہ رہے فتنے کی

---

[1] تدبرِ قرآن

حالت ہے کیونکہ اس کا حاصل وہی کفر و شرک ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ اسلامی جنگ کا مطمح نظر یہ ہے کہ اس فتنے کی جگہ ایسی حالت قائم ہو جس میں بندے صرف قانونِ الہٰی کے مطیع بن کر رہیں۔

۵۵۵۔ اگر لوگ باز آجائیں تو پھر اقدام اُن کے خلاف جائز ہے جو ظالم ہیں۔ صرف باغیانہ روش سے باز نہ آئیں بلکہ اپنی کافرانہ و مشرکانہ روش چھوڑ دیں جو جنگ و قتال کا باعث بنی ہوتی ہے اور جب کافرانہ روش سے تائب ہو کر مسلمان ہو جائیں گے تو ظاہر ہے کہ اب اپنے حق میں ظالم نہیں رہے اور اب ان کو سزا نہیں دی جا سکتی اور ان کے خلاف کوئی اقدام نہیں ہو سکتا۔ جیسا کہ دسویں پارہ سورۃ توبہ میں ہے،

فان تابوا واقاموا الصلوٰة واٰتوا الزكوٰة فخلوا سبيلهم

اگر وہ توبہ کر لیں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں تو ان کی راہ چھوڑ دو۔

عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں فلا سبیل لکم یا نعتل اب تمہیں ان کو قتل کرنے کا کوئی جواز نہیں ہے۔

لفظ عدوان کے لفظی معنے زیادتی کے ہیں۔ یہاں سزا اور سزائے قتل کے معنے میں ہے حافظ ابن کثیر اور علامہ آلوسی نے بھی یہی معنے بتاتے ہیں۔

عربی اسلوبِ بیان میں ایک دستور یہ بھی ہے کہ جزائے عمل کے موقعہ پر بعینہٖ وہ ہی لفظ بول دیا جاتا ہے جو خود اس عمل کے لیے ہوتا ہے مثلاً مکر کے لیے مکر کید کے لیے کید اور استہزا کے لیے استہزا۔ اس صنعت کا نام مشاکلت ہے اور قرآن حکیم نے علمِ بلاغت کی دوسری صنعتوں کی طرح اس کا بھی بار بار استعمال کیا ہے چنانچہ یہاں سزائے عدوان کے موقع پر خود لفظ عدوان کا لانا اسی انداز پر ہے۔ ابن قتیبہ، زمخشری، راغب، اصفہانی اور ابنِ جریر نے اس کی تصریح کی ہے[1] عربی زبان کے اسی معروف قاعدے کے مطابق زیرِ نظر آیت میں بھی لفظ عدوان آیا ہے۔ لیکن اس سے مراد صرف وہ اقدام ہے جو جوابی کارروائی کے طور پر کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اپنی حرکتوں سے باز آ کر اسلام کی راہ اختیار کر لیں تو ان کے پچھلے جرائم کی بنا پر ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ ہو گی۔ پھر صرف ان کے خلاف ہی اقدام ہو گا جو اپنے کفر و شرک اور اپنے ظلم و عدوان پر جمے رہ جائیں[2]

---

[1] ماجدی ص ۷۶　[2] تدبرِ قرآن ص ۴۳۵

ہمارے معاصر مفسر صاحب تفہیم القرآن نے اس آیت پر تشریحی نوٹ میں باز آجانے کی جو تفسیر فرمائی ہے اسے پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ موصوف اس آیت کو عام کفار سے متعلق سمجھتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق خاص کفارِ قریش سے ہے۔ اور یہ بات اسی جگہ نہیں بلکہ سورۃ انفال اور توبہ میں بھی دہرائی گئی ہے۔ اور یہاں بھی یہ بات دوسری بار آتی ہے۔ سورۃ انفال میں کفارِ قریش کو خطاب کر کے کہا گیا ہے:

> ان کافروں کو بتا دو کہ اگر وہ باز آ گئے تو جو پہلے کر چکے ہیں وہ معاف کر دیا جائے گا۔ اور اگر انہوں نے پھر اس طرح کی حرکت کی تو ہمارے اس طریقے کو یاد رکھیں جو ہم نے پچھلی قوموں کے معاملے میں اختیار کیا ہے۔ مسلمانو! ان سے جنگ کرو تاآنکہ فتنہ نہ رہے اور اس سرزمین میں سارا دین اللہ کا ہو جائے۔ پس اگر وہ باز رہے تو وہ جو کچھ کریں گے اللہ ان کے اعمال کو دیکھ رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ عام کافروں کے برخلاف خاص قریش کے بارے میں یہ حکم ہوا کہ جب تک یہ توبہ کر کے نماز قائم نہ کریں اور زکوٰۃ نہ دیں اس وقت تک ان کے لیے ڈھیل نہیں ہے۔ ان تصریحات کی موجودگی میں مولف محترم کا یہ فرمانا کہ

بازآجانے سے مراد کافروں کا اپنے کفر و شرک سے باز آجانا نہیں بلکہ فتنہ سے باز آجانا ہے، کافر، مشرک دہریے ہر ایک کو اختیار ہے کہ اپنا جو عقیدہ رکھتا ہے اور جس کی چاہے عبادت کرے یا نہ کرے اپنے اندر کوئی معنویت نہیں رکھتا ہے بلکہ سرتاسر مفسرینِ قرآن کی اختیار کردہ راہ کے خلاف ہے۔ اس کے تفصیلی مباحث انشاءاللہ سورۃ برأت میں آئیں گے۔

مہینوں کا احترام

۵۵۶۔ شہرِ حرام شہرِ حرام کا بدلہ ہے۔ مہینوں کی حرمتیں ادلہ بدلہ اور برابر ہیں۔ حرمت کا مہینہ یعنی ذیقعدہ کہ جس میں عمرہ کی قضا کرنے جا رہے ہو بدلہ ہے اس حرمت کے مہینہ یعنی ذیقعدہ سالِ گزشتہ کا جس میں تمہیں کفارِ مکہ نے عمرہ سے روک دیا اور مکہ میں جانے نہ دیا تھا۔ اب تم شوق سے ان سے بدلہ لو کیونکہ ادب اور حرمت رکھنے میں تو برابری ہے یعنی اگر کوئی کافر ماہِ حرام کی حرمت کرے اور تم سے نہ لڑے تو تم بھی ایسا ہی کرو۔ مکہ والے ——— جو سالِ گزشتہ میں تم پر ظلم کر چکے انہوں نے نہ ماہِ حرام کی حرمت کا پاس کیا اور نہ حرم کا خیال کیا اور نہ تمہارے احرام کا لحاظ

کیا۔ اگر اس دفعہ بھی سب حرمتوں کو نظر انداز کر کے آمادۂ پیکار رہوں تو تم بھی کسی حرمت کا خیال نہ کرو بلکہ اگلی اور پچھلی کسر نکال لو مگر جو کرو خدا سے ڈر کر کرو اس اجازت کے خلاف ہرگز نہ ہو[1]

مطلب یہ ہے کہ اگر حرمت کے مہینوں کی رعایت کی جائے تو تمہاری طرف سے بھی رعایت ہونی چاہیے۔ اگر نہ کی جائے تو تمہاری طرف سے بھی نہیں ہے۔ مہینوں کی حرمت کا معاملہ جب لڑائی ہو اور بدلہ ہے یعنی جیسی روش ایک فریق جنگ کی ہو گی ویسی ہی دوسرے فریق کو بھی اختیار کرنی چاہیے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک فریق تو حرمت سے بے پروا ہو کر حملہ کر دے اور دوسرا فریق حرمت کے خیال سے ہاتھ پر ہاتھ دھرا بیٹھا رہے[2]

اشہر حرام اور حدودِ حرم کا احترام مسلّم ہے بشرطیکہ کفار بھی اس کا احترام ملحوظ رکھیں اور ان میں دوسروں کو ظلم وستم کا ہدف نہ بنائیں لیکن جب ان کی تلواریں ان مہینوں اور اس بلد امین میں بے نیام ہوتی ہیں تو وہ سزاوار ہیں کہ ان کے قصاص میں وہ بھی ان کے امن و احترام کے حقوق سے محروم کیے جائیں۔ مزید فرمایا کہ جس طرح اشہرِ حرام کا یہ قصاص ضروری ہے اسی طرح دوسری حرمتوں کا قصاص بھی ہے۔ یعنی جس محترم چیز کے حقوق حرمت سے وہ تمہیں محروم کریں تم بھی اس کے قصاص میں اس کے حقِ حرمت سے انہیں محروم کر سکتے ہو۔ لہٰذا جس طرح کے اقدامات حرم اور اشہرِ حرم کی حرمتوں کو برباد کر کے وہ تمہارے خلاف کریں تم ان کو ترکی بہ ترکی جواب دو[3]

اہلِ عرب میں حضرت ابراہیم کے زمانہ سے یہ قاعدہ چلا آرہا تھا کہ ذی قعدہ، ذی الحجہ اور محرم کے تین مہینے حج کے لیے مختص تھے اور رجب کا مہینہ عمرے کے لیے خاص کیا گیا تھا اور ان چار مہینوں میں جنگ اور قتل و غارت گری ممنوع تھی تاکہ زائرین کعبہ امن و امان کے ساتھ خدا کے گھر تک پہنچ جائیں اور اپنے گھروں کو واپس آجائیں۔ اس بنا پر ان مہینوں کو حرام مہینے کہا جاتا تھا یعنی حرمت والے مہینے۔ آیت کا منشا یہ کہ ماہِ حرام کی حرمت کا لحاظ کفار کریں تو مسلمان بھی کریں اور اگر وہ اس حرمت کو نظر انداز کر کے کسی حرام مہینے میں مسلمانوں پر دست درازی کریں تو پھر مسلمان بھی ماہِ حرام میں بدلہ لینے کے مجاز ہیں[4]

اجازت کا پسِ منظر

اس اجازت کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ۶ھ میں حدیبیہ والے سال جب رسول اللہ صلی اللہ

---

[1] افادات شیخ الہند [2] ترجمان القرآن [3] تدبر قرآن ص ۴۳۶ [4] تفہیم القرآن

علیہ وسلم صحابہ کو ہمراہ لے کر مکہ کے ارادے سے تشریف لے گئے تو مشرکین آمادۂ جنگ ہو گئے تھے اور تیراندازی اور سنگ افگنی شروع کر دی تھی۔ صحابہ کے سامنے یہ سابقہ تجربہ موجود تھا۔ اب ۷ھ میں جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم صلح حدیبیہ میں طے شدہ قانون کے مطابق فوت شدہ عمرہ ادا کرنے کے لیے صحابہ کے ساتھ مکہ کے لیے روانہ ہوئے تو صحابہ کے ذہنوں میں دو سوال ابھر آئے کہ اگر مشرکین تمام معاہدوں کو پس انداز کر کے آمادۂ جنگ ہو گئے تو ہمارا موقف کیا ہوگا۔ حدودِ حرم میں لڑائی ناجائز ہے اور زمانہ بھی ذی قعدہ کا ہے جس کا شمار حرمت والے مہینوں میں ہے ان میں لڑائی ناجائز ہے۔ قرآن نے اس آیت میں سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ جیسے حرم مکہ کی حرمت سے حالتِ دفاع مستثنیٰ ہے ایسے ہی شہر حرام میں بھی دفاعی جنگ کی اجازت ہے۔[1]

۵۵۷۔ جو شخص تم پر زیادتی کرے تم بھی اس کی زیادتی کے جواب میں اسی کے برابر اس کو جواب دو۔ یعنی فریقِ مقابل اگر قتال شروع کرے تو تم بھی برابر کا جواب دو۔ مثلاً ایک زیادتی یہ ہے کہ دشمن ان مہینوں کا احترام نہ کرے تو تم بھی خاموش واقعی جوابی کارروائی کرو۔ یہاں مسلمانوں کی جانب سے جوابی کارروائی کو محض مجازاً اور محاورۂ زبان کے اعتبار سے اعتداء فرمادیا گیا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ زیادتی کے جواب میں جو کارروائی بطور سزا کی جائے اس پر حقیقتہً زیادتی کا اطلاق کیونکر ہو سکتا ہے۔ عربی زبان کے قاعدہ مشاکلت کا تذکرہ پہلے بھی ہو چکا ہے۔ وہی صورت یہاں بھی ہے اور محض لفظی تطابق کی بنا پر یہاں سزائے اعتداء کو خود اعتداء سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اہلِ لغت اور اہلِ تفسیر دونوں کے یہاں یہ تصریح منقول ہے۔

ایک دستوری دفعہ

اس آیت سے اسلام کے قانون دان طبقہ نے یہ نکتہ بھی معلوم کیا ہے کہ متلفات اور عدوانات میں تاوان مثلی ہوتا ہے۔ خواہ یہ مثلیت جنسیت میں ہو یا قیمت میں۔ جنسیت میں مثل مکیل موزون اور معدود میں ہوتا ہے۔ قرآن کے اسی ضابطے سے معارض ہونے کی وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہ نے حدیث مصراۃ کو شاذ قرار دیا ہے۔ کیونکہ یہ آیت صراحۃً کہہ رہی ہے کہ عدوانات کی حدود میں تاوان مثلیات میں مثلی ہوتا ہے۔ اس کی روشنی میں دودھ کا تاوان دودھ ہونا چاہیے کیونکہ

---

[1] معارف قرآن

دودھ ذوات الامثال سے ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا جوار شاد تاوان کے موضوع پر ایک ضابطہ کی صورت میں اُمت کو شہرت کی راہ سے ملا ہے اس کا تقاضا یہی ہے۔ یہ آپ کا عدالتی فیصلہ ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ کیا ہے کہ خراج ضمان کے ساتھ ہے علامہ ابن دقیق العید نے امام ابوحنیفہ کے اس موقف کی کہ حدیث مصراۃ شاذ ہے وجہ یہ بتائی ہے کہ:

یہ کہ مثلیات میں تاوان مثلی اور قیمتی اشیا میں قیمت سے ہوتا ہے۔ اس حدیث میں دودھ اگر مثلیات سے ہے تو اس کا تاوان دودھ سے ہونا چاہیے۔ اور اگر قیمتی ہے تو اس کی قیمت دی جانی چاہیے لیکن حدیث مصراۃ میں جو تاوان تجویز کیا گیا ہے نہ وہ مثلی ہے اور نہ قیمتی بلکہ تاوان میں کھجوریں دی گئی ہیں اس لیے یہ حدیث اس اصول کے مخالف ہے۔

۵۵۸۔ اور اللہ سے ہر حال میں ڈرتے رہو اور یقین رکھو کہ اللہ حدود الٰہی کا احترام کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ یہ اسلام کا معجزانہ کمال ہے کہ ایک طرف تو قتال اور انتقام کی پوری اجازت دی جا رہی ہے اور دوسری طرف یہ یاددہانی بھی کرائی جا رہی ہے کہ دیکھنا حدود سے تجاوز کسی حال میں نہ ہو، جوش پر پورا قابو ہو۔ یہ نہ ہو کہ تم حالتِ انتقام میں اپنی طرف سے زیادتی کر بیٹھو۔ خوفِ خدا باز پرس کا خیال ہر وقت رہنا چاہیے۔ جو کچھ بھی ہو شدید سے شدید اشتعال کے موقع پر بھی ہیجانِ نفس کے تحت نہیں بلکہ خشیتِ الٰہی کے تحت ہو۔ حافظ ابن جریر نے واتقوا ایھا المومنون فی حرماتہ وحدودہ ان تعتدوا فیھا میں یہی بات فرمائی ہے۔ اللہ اکبر اس حکیمانہ امتزاج کی نظیر دُنیا کے کسی قانون، آئین کسی نظام میں کہاں مل سکتی ہے؟ اللہ اللہ کتنی بلند پُر حکمت تعلیم ہے۔ ایک طرف انتقام میں اہلِ ایمان پر تقویٰ کی زبردست قید عائد کی جا رہی ہے دوسری طرف ارشاد ہو رہا ہے کہ ان احکام سے کہیں پست ہمت نہ ہو جانا اور یہ خیال نہ کرنا کہ حدود و قیود لگا کر پُر زور مقابلہ سے روکا جا رہا ہے۔ فرمایا یہ بات نہیں ہے بلکہ قانونِ الٰہی یہ ہے کہ اللہ کی فتح و نصرت، رحمت و عنایت ان ہی لوگوں کے شاملِ حال ہوتی ہے جن کے دلوں میں اللہ کی خشیت و عظمت ہوتی ہے اور متقی ہوتے ہیں۔ تقویٰ کی تاکید ہمت افزائی کے لیے ہے ضعف پیدا کرنے کے لیے نہیں۔ مع المتقین، متقین کے ساتھ اللہ کی معیت کی نوعیت کیا ہوتی ہے محققین کا فیصلہ ہے کہ اللہ کی معیت نصرت و اعانت، حفظ و علم کی راہ سے ہوتی ہے نہ کہ کسی جسمانی و مادی اعتبار سے۔ اور یہیں سے امام رازی نے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ اللہ سبحانہٗ نہ مجسم ہے اور نہ وہ کسی جگہ کو گھیرے ہوئے ہے[1]

---

[1] تفسیر ماجدی ص ۷۶

وَاَنۡفِقُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَلَا تُلۡقُوۡا بِاَیۡدِیۡکُمۡ اِلَی التَّہۡلُکَۃِ ۚۖۛ وَاَحۡسِنُوۡا ۚۛ اِنَّ اللّٰہَ یُحِبُّ الۡمُحۡسِنِیۡنَ ﴿۱۹۵﴾

اور اللہ کی راہ میں [۵۵۵] خرچ کرو اور اپنے آپ کو ہلاکت اور تباہی میں نہ ڈالو۔ (زندگی میں) حسن کار [۵۶۱] بن کر رہو اللہ حسن کاروں سے محبت کرتا ہے۔

انفاق و احسان

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جس مقصد عظیم پر تم ایمان لائے ہو اور جس کی وجہ سے تمہیں دنیا کی قیادت سونپی گئی ہے اور جس کی خاطر تم سے جان کی قربانی کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اس کے لیے تمہیں مال کی قربانی بھی برداشت کرنی ہو گی۔ مگر کوئی گروہ اس بات پر آمادہ نہیں کیا جاسکتا کہ اپنی ذاتی یا قومی اغراض سے بالاتر محض ایک اعلیٰ درجہ کے اخلاقی و روحانی مقصد کی خاطر اپنا مال بے دریغ صرف کرے جب تک کہ اس کا معاشی نقطۂ نظر تبدیل نہ ہو جائے۔ مادہ پرست لوگ جو پیسہ کمانے کے لیے جیتے ہیں اور پیسے پیسے پر جان دیتے ہیں، اور جن کی نگاہ ہر وقت نفع و نقصان کی میزان پر لگی رہتی ہے کبھی اس قابل نہیں ہو سکتے کہ مقاصد عالیہ کے لیے کچھ خرچ کر سکیں۔ وہ بظاہر کچھ خرچ کرتے ہیں تو پہلے اپنی ذات یا اپنی برادری یا اپنی قوم کے مادی منافع کا حساب لگاتے ہیں۔ اس ذہنیت کے ساتھ اس دین کی راہ پر انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جس کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیوی فائدوں اور نقصان سے بے پروا ہو کر محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور انسانی زندگی کو امن و سلام کا گہوارہ بنانے کے لیے اپنے مال خرچ کرو۔ اس کے لیے نظر کی وسعت، حوصلے کی فراخی، دل کی کشادگی، احساسِ ذمہ داری اور سب سے بڑھ کر خالص اللہ کی رضا جوئی کی ضرورت ہے۔ اسی ذہنیت کو ٹھیک کرنے کے لیے قرآن نے اس آیت میں انفاق و احسان کی پیوندکاری کی ہے۔ یعنی اللہ کے دین کو

سربلند کرنے کے لیے صرف انفاق کا مطالبہ نہیں ہے بلکہ انفاق میں حسن کار بننے کا مطالبہ ہے یعنی اللہ کی راہ میں دل وجان سے دل کی پوری خوشنودی، دماغ کے پورے شعور کے ساتھ خرچ کرو۔ اس میں ریاکاری نہ ہو۔ اللہ اکبر یہ قرآنی اعجاز کا کمال ہے کہ خالص مادی کام میں احسان کی پیوندکاری کرکے کام کو اخلاقی اور روحانی قدروں کا حامل بنا دیتا ہے۔

۵۵۹- اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی طاعت یعنی جہاد وغیرہ میں اپنے مال کو صرف کرو[1]۔ جہاد میں صرف مردان کار ہی کی ضرورت نہیں ہوتی بلکہ اس کے ساتھ دولت اور سرمایہ بھی جہاد کی ناگزیر ضرورت ہے۔ صدر اوّل میں نہ تو سرکاری فوج وجود میں آئی تھی نہ رضاکاروں کی کوئی الگ قسم تھی، نہ سپاہیوں کے مصارف کے لیے حکومت کا کوئی خزانہ تھا۔ سبھی رضاکار تھے اور سب کے لیے ضروری تھا کہ اپنا خرچ خود اٹھائیں بلکہ بن پڑے تو دوسروں کے لیے بھی خرچ کریں۔ ان میں قرآن کے بیان کے مطابق ایسے لوگ بھی تھے جن کے ایمان واخلاص کا یہ حال تھا کہ جب ان کے لیے سرمایہ فراہم نہ ہونے کی وجہ سے سواری کا انتظام نہ ہو سکا اور ادب واحترام نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ اس کا اظہار کر سکیں تو ان کی آنکھیں جو دردِ دل کی غماز ہیں خاموش نہ رہ سکیں۔ حسرت وغم کے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ تبوک میں صحابہ کی ایک جماعت نے جو زادِ راہ کی مقدرت نہیں رکھتی تھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ ہمارے لیے سواری کا بندوبست کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہاں سے کروں۔ کوئی سامان نہیں ہے۔ اس پر وہ روتے ہوئے چلے گئے اور ان کے درد وغم کا یہ حال تھا کہ تاریخ میں البکائین کے نام سے مشہور ہو گئے یعنی بہت رونے والے (ابن جریر)

اسی بنا پر قرآن نے قتال کے ذیل میں جان دینے کا حکم دینے کے بعد خاص طور پر مال خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔

لوگ سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ دینے کے بعد انفاق وخیرات کے سارے مطالبات ختم ہو جاتے ہیں بلاشبہ ایسا سمجھنا ایک ظلم قرآن کو بھلا دینا ہے۔ قرآن نے مسلمانوں کو جس طرح زندگی بسر کرنے کی تلقین کی ہے وہ صرف اپنی اور اپنے بیوی بچوں کے پیٹ ہی کی زندگی نہیں ہے، بلکہ منزلی، خاندانی، معاشرتی، جماعتی اور انسانی فرائض کی ادائیگی کی ایک پوری آزمائش ہے۔ اور جب تک

---

[1] افاداتِ شیخ الہند، ص ۳۰

اس میں پورا نہیں اترتا اسلامی زندگی کی لذت اس پر حرام ہے۔ اسلامی زندگی کا تقاضا ہے کہ انفاق و خیرات کے لیے انسان کا ہاتھ کشادہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اعمال میں کسی عمل پر اتنا زور نہیں دیا جتنا نماز اور انفاق پر۔ اہل ایمان کے بارے میں فرمایا ہے ینفقون اموالھم باللیل والنھار سرا و علانیہ مومن وہ ہیں جن کا ہاتھ ہمیشہ کھلا رہتا ہے۔ رات دن، پوشیدہ اور ظاہر ہر حال میں سرگرم انفاق رہتے ہیں۔ لہذا یہ سمجھنا کہ سال پورا ہونے پر زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد انفاق فی سبیل اللہ کے مطالبات پورے ہوگئے صاف قرآن کی تعلیم سے روگردانی ہے۔ زکوٰۃ تو ایک خاص ٹیکس ہے جو ایک خاص مقصد کے لیے لگایا گیا ہے اور سال میں ایک مرتبہ دینا پڑتا ہے لیکن ہماری زندگی کا ہر چوبیس گھنٹہ ہم سے انفاق کا مطالبہ کرتا ہے۔ اگر ہم اسلامی زندگی کا توشہ لے کر اللہ کے حضور پیش ہونا چاہتے ہیں تو ہمارا فرض ہے کہ حسب استطاعت اس کے تمام مطالبات پورے کریں[1]

فی سبیل اللہ کی قید بڑی معنے خیز ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں وہ تمام کام جو براہ راست دین و ملت کی تقویت کے لیے ہوں سبیل اللہ کے کام ہیں اور چونکہ اسلام کی حفاظت و صیانت کا سب سے زیادہ ضروری کام دفاع ہے اس لیے زیادہ تر اطلاق اسی پر ہوا۔ اس قید نے یہ بات کھول دی ہے کہ اسلام میں جس طرح محض جان دینا مقصود نہیں بلکہ وہ جان دینا مقصود ہے جو اللہ کی راہ میں اللہ کے دین کی برتری کے لیے ہو اسی طرح مطلق صرف مال کی کوئی قیمت و قدر نہیں۔ قدر قیمت صرف اس صرف مال کی ہے جو باطل کی راہ میں نہیں حق کی راہ میں ہو، ہوائے نفس کی تکمیل کے لیے نہیں بلکہ رضائے الٰہی کے حصول کے لیے ہو۔ اسی وجہ سے اسیوطی، اور قرطبی نے اس کی تشریح طاعت اللہ سے کی ہے[2]

یہاں انفاق کا یہ حکم اس جہاد کے لیے ہے جس کا یہاں پہلی آیات میں حکم آیا ہے جہاد میں جان اور مال دونوں کی قربانی کا مطالبہ ہے۔ اسی لیے قرآن میں جہاں جہاد کا حکم آیا ہے وہاں انفاق کا حکم ضرور آیا ہے[3]

انفرادی ملکیت

انفقوا میں قرآن کا منطوق اور عبارۃ النص تو یہی ہے کہ خرچ کرنے کا مطالبہ ہو رہا ہے مگر اس کے مدلول اور دلالۃ النص سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن اموال و املاک میں افراد کی انفرادی ملکیت

---

[1] ترجمان القرآن [2] ماجدی [3] تدبر قرآن

کا اعلان کر رہا ہے۔ اگر اموال، ارباب اموال کی ملک نہیں تو انفاق کے مطالبہ میں کوئی معنویت نہیں ہے قرآن اموال کی انفرادی ملکیت کے حق کو تسلیم کرتا ہے اور انفرادی ملکیت کو اس نے اپنے نظام کی بنیاد قرار دیا ہے اور ساتھ ہی اس حق کو تسلیم کرنے پر مرتب ہونے والے لازمی نتائج کو بھی تسلیم کرتا ہے مثلاً حقدار کے حق کی حفاظت۔ اور ساتھ ہی وہ اس بات کو غلط قرار دیتا ہے کہ بغیر معاوضہ دیے کسی کی ملکیت چھین لی جائے۔ اسلام میں اس صریح اور واضح حق کے تسلیم کیے جانے میں کوئی شبہ نہیں ہے یہ بات بھی شبہ سے بالاتر ہے کہ یہ حق اسلامی طرز زندگی کا ایک بنیادی اصول اور اسلام کے اقتصادی نظام کی اساس ہے۔

۵۶۰ ۔ اور اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اصل ارشاد ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ ہے۔ اس کے معنے دو طرح سے کیے گئے۔ ایک تو وہ ہی ہیں جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیے یعنی اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ مبرد مشہور عربی زبان کا امام ہے۔ اس لیے یہی معنے بتاتے ہیں۔ لفظ ایدی بول کر خود قرآن میں ساری ذات انسانی مراد لی گئی ہے مثلاً کسبت ایدیکم یہ تمہارے ہاتھوں نے کمائی کی ہے یعنی تم نے کمائی کی ہے قدمت یداک تیرے دونوں ہاتھوں نے پیش کیا یعنی جو کچھ تو نے پیش کیا۔ عربی زبان میں سراپا سپردگی کے لیے یہ محاورہ بھی ہے القی بیدہ فی امر بیچارگی کے موقعہ پر یہ تعبیر آتی ہے ایک موقعہ پر عبد المطلب نے کہا تھا واللہ ان القانا بایدینا للموت لعجز بخدا ہمارا اپنے کو موت کے حوالہ کر دینا بیچارگی ہے اس لیے ترجمہ عربی بلاغت کے لحاظ سے بہتر یہی ہے کہ اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ اس کے مقابلے میں یہ دوسرا ترجمہ کہ اپنے ہاتھوں اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو بے جان اور پھس پھسا ہے۔ بتایا یہ گیا ہے کہ مال صرف کرو اور اپنی جان کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یعنی جہاد کو چھوڑ بیٹھو۔ اپنے مال کو جہاد میں صرف نہ کرو کہ اس سے تم ضعیف اور دشمن قوی ہو جائے گا[1]

مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے دین کو سربلند کرنے کے لیے اپنا مال خرچ نہ کرو گے اور اس کے مقابلے میں اپنے ذاتی مفاد کو عزیز رکھو گے تو یہ تمہارے لیے دنیا میں بھی موجب ہلاکت ہوگا اور آخرت میں بھی۔ دنیا میں تم کفار سے مغلوب اور ذلیل ہو کر رہو گے اور آخرت میں تم سے سخت باز پرس ہو گی[2]

قرآن میں جب جمع حاضر کا صیغہ آتا ہے تو کبھی افراد مخاطب ہوتے ہیں اور کبھی جماعت، یہاں

---

[1] افادات شیخ التفسیر ص ۳۸ [2] تفہیم القرآن ص ۱۵۳

اصل خطاب اُمّت سے بحیثیتِ مجموعی ہے اور یہ حقیقت بیان کی جارہی ہے کہ افرادِ اُمّت نے اگر جہاد سے جان چرائی اور مجاہدین کو مالی امداد میں بخل سے کام لیا۔ تو نتیجہ لازمی طور پر ساری اُمّت کی تباہی ہوگا۔ یہی معنے عبداللہ ابن عباس، ابوایوب انصاری اور حضرت حذیفہ جیسے صحابہ سے اور حسن، قتادہ، عکرمہ اور عطاء جیسے تابعین سے منقول ہیں۔ اور محدثِ جلیل امام بخاری نے بھی یہی معنے بتائے ہیں۔[1] ابوداؤد، ترمذی، نسائی، عبدابن حمید، ابن ابی حاتم، ابن جریر، حافظ ابویعلیٰ، ابن حبان، الحاکم، کے حوالہ سے حافظ ابن کثیر نے یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ ابوعمران کہتے ہیں کہ قسطنطنیہ کی جنگ میں ایک مہاجر مسلمان کافروں کی صفوں کو چیرتا ہوا اندر گھس گیا۔ میں نے ابوایوب انصاری سے کہا کہ دیکھو اس شخص نے اپنی جان کو ہلاکت میں ڈال دیا۔ یہ سن کر حضرت ابوایوب انصاری نے فرمایا کہ اس آیت کو میں خوب جانتا ہوں۔ یہ آیت ہمارے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ کیونکہ جب اسلام پھیل گیا اور مسلمانوں کو اقتدار مل گیا تو ہم انصاری جمع ہوئے اور یہ سوچنے لگے کہ اب جہاد بند کرو اور اپنی کھیتی باڑی میں لگ جاؤ۔ اس پر یہ آیت اتری۔ ہلاکت یہ نہیں ہے جس کو تم ہلاکت کہہ رہے ہو بلکہ ہلاکت یہ ہے کہ جہاد چھوڑ کر گھر میں بیٹھ رہیں اور اپنے کاروبار میں مشغول ہوجائیں۔ الغرض مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی سے جی چراتے ہیں بظاہر تو وہ گمان کرتے ہیں کہ وہ اپنے کو خطرات سے بچارہے ہیں لیکن درحقیقت وہ اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالتے ہیں۔ انسان کے لیے زندگی اور بقا کا خزانہ اللہ کی راہ میں جان و مال کی قربانی میں ہے نہ کہ ان کو بچانے میں۔

۱۹۵۔ زندگی میں حسن کار بنو۔ اللہ حسن کاروں سے محبت کرتا ہے۔ اس جملہ میں ہر کام کو اچھی طرح کرنے کی ترغیب ہے اور کام کو اچھی طرح کرنا دو طرح ہے۔ ایک عبادات میں دوسرے معاملات و اخلاق میں۔[2] مطلب یہ ہے کہ پوری زندگی میں حسن پسند نہیں بلکہ حسن کار بن کر رہو۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں احسنوا اعمالکم و افعالکم یعنی اپنی زندگی کے اعمال و افعال میں حسن پیدا کرو۔

احسان کا لفظ حسن سے نکلا ہے جس کے معنے کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں عمل کا ایک درجہ یہ ہے کہ آدمی کے سپرد جو خدمت ہو اسے بس کردے اور دوسرا درجہ یہ ہے کہ اسے خوبی کے ساتھ کرے اپنی پوری قابلیت اور اپنے تمام وسائل اس میں صرف کردے اور دل و جان سے اس کی تکمیل کی کوشش کرے۔ پہلا درجہ محض طاعت کا درجہ ہے جس کے لیے صرف تقویٰ اور خوف

---

[1] ماجدی ص ۷۷ [2] معارف القرآن ص ۱۸ / ۴

کافی ہو جاتا ہے اور دوسرا درجہ احسان کا درجہ ہے جس کے لیے محبت اور گہرا قلبی لگاؤ درکار ہوتا ہے۔[1]

یہاں احسان کے معنے کسی کام کو خوبی کے ساتھ کرنے کے ہیں یعنی اللہ کی راہ میں فیاضی اور خوش دلی کے ساتھ خرچ کرو۔ انفاق میں جب تک اللہ کے لیے یہ جوش وجذبہ نہ ہو اس وقت تک اسے احسان کا درجہ حاصل نہیں ہوتا۔

حدیث جبریل میں احسان کی تعریف

دراصل مسلمان کی ساری زندگی عابدانہ زندگی ہے۔ چاہے جہاد ہو یا انفاق ہو، نماز ہو یا دوسرے اعمال ہوں ان سب میں قرآن کا مطالبہ احسان کا ہے۔ احسان کا لفظ قرآن حکیم میں مختلف مقامات پر استعمال ہوا ہے کہیں تقویٰ کے ساتھ کہیں ایمان کہیں عمل صالح کے ساتھ۔ حدیث جبریل میں احسان کی یہ تعریف کی گئی ہے کہ اللہ کی اس طرح عبادت کرو کہ تم گویا اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ تم اگرچہ اس کو فی الواقع دیکھتے نہیں ہو مگر وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے۔ ایک دوسری روایت میں عبادت کی جگہ عمل آیا ہے کہ تم اللہ کے لیے اس طرح عمل کرو۔ ایک تیسری روایت میں خشیہ آیا ہے یعنی اللہ سے اس طرح ڈرتے رہو۔ حافظ ابن رجب فرماتے ہیں کہ احسان کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس تصور کے ساتھ ہو کہ وہ تم سے اتنا قریب ہے گویا تمہارے سامنے ہے اور تم اسے دیکھ رہے ہو۔ اگر یہ تصور دشوار ہو تو پھر اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنے اس ایمان کا تصور جماؤ کہ وہ تمہاری تمام حرکات وسکنات دیکھ رہا ہے۔ یہ ایمان تو ہر شخص کو حاصل ہے جب اس پر بار بار غور کرو گے تو اللہ سبحانہ کے قرب کا تصور تم پر اتنا غالب آجائے گا کہ پھر ہر وقت گویا تمہارے سامنے ہوگا۔ اس بنا پر حدیث میں آئی ہوئی احسان کی تعریف میں ایک ہی حال مذکور ہے اور دوسرا جملہ پہلے حال کی تحصیل کا ایک ذریعہ ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ ان کو دو جداگانہ حال قرار دیے جائیں اور مطلب یہ ہو کہ اگر تمہیں پہلا حال میسر نہ آسکے تو دوسرے حال پر اکتفا کر لو اور کم از کم اس تصور سے تو خالی نہ رہو کہ وہ تمہیں دیکھتا ہے۔

مقام اخلاص ومشاہدہ

اور بعض عارفین نے ان دو مقاموں کو مقام اخلاص اور مقام مشاہدہ سے تعبیر کیا ہے۔ پہلا

---

[1] تفہیم القرآن ص ۱۵۲

مقام مقام مشاہدہ ہے اور دوسرا مقام اخلاص۔ اگر یہ تصور میسر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہر وقت دیکھتا ہے۔ ہماری ہر ہر حرکت پر اس کی نظر پڑ رہی ہے تو اس حالت میں غیر اللہ کی طرف التفات یا عبادت میں غیر اللہ کی شرکت کا شائبہ بھی ممکن نہیں ہے اس کا نام مقام اخلاص ہے۔ لیکن اگر بلند فطرت کا قلب نور عرفان ویقین سے اتنا منور ہو جائے کہ حجاب غیر اٹھا کر غیب الغیب کا مشاہدہ کرنے لگے تو یہ مقام مشاہدہ ہے اور یہ اصل احسان اسی یقین کا نام ہے۔ یہ مشاہدہ اسی یقین کا ایک اثر ہوتا ہے جو کمالِ استحضار اور انتہائی رسوخ کے بعد حاصل ہوتا ہے۔

قرآن کریم کی ان آیات میں اس صفت احسان کی طرف اشارات ہیں جن میں اللہ سبحانہٗ کی قرب ومعیت کا تذکرہ ہے۔ قرب ومعیت کی تمام داستان بندہ کے اسی یقین وحضور کے کرشمے ہیں جن کے پیدا کرنے کا وہ بہرحال مامور ہے۔ صوفیائے کرام نے اس قرب ومعیت کو اپنے فن اور اپنے ذوق کے مطابق دوسری طرح پیش کیا ہے مگر درحقیقت وہ سب کیفیات ہیں جو الفاظ کی محدود تعبیرات میں مقید ہو کر فضول وحدۃ الوجود کا باعث بن گئی ہیں۔

حافظ ابن رجب کی تعبیر بہت صاف اور واضح ہے اور علماء وصوفیاء دونوں کے مذاق کے قریب ہے۔ اصل مقصد توحید ورسالت کا صرف علم حاصل کرنا نہیں بلکہ ان علوم کو حصول در احوال سے مقام کی حد تک پہنچانا ہے۔ علوم جب تک احوال نہیں بنتے اس وقت تک طبیعت میں نہ تو جذبہ عمل پیدا ہو سکتا ہے اور نہ عمل میں کوئی ذوق نصیب ہو سکتا ہے۔

ہم ان کو صرف ایک علمی تحقیق کی نظر سے دیکھتے ہیں اور یہ باور نہیں کرتے کہ یہ تمام علوم درحقیقت عالم غیب کے وہ حقائق ہیں جو خارج میں عالم شہادت سے زیادہ مستحکم طور پر موجود ہیں۔ ہمیں حق تعالیٰ کی ذات وصفات، جنت اور دوزخ کے تمام غیبی حقائق صرف خیالی نظر آتے ہیں لیکن یقین کی منزلیں طے کرتے کرتے جب ہم منزلِ احسان تک پہنچتے ہیں تو پھر جن کو ہم پہلے اوہام سمجھتے تھے اب وہی حقائق نظر آنے لگتے ہیں اور جن کو ہم حقائق سمجھتے تھے ان کی حیثیت اوہام سے زیادہ کچھ نہیں رہتی۔ ہمارے باطن میں جب یہ انقلاب رونما ہو جاتا ہے تو قرآن اس کو احسان سے تعبیر کرتا ہے۔ احسان کی پہلی کڑی عمل ہے، عمل سے عقائد راسخ ہوتے ہیں اور جب عقائد راسخ ہو جاتے ہیں تو اسی پر صفتِ احسان کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اور اسی راہ سے انسان کے عنصر مادیۃ کو عروج میسر آتا ہے۔ حقیقی ارتقا یہی ہے کہ انسان جب تک مادیت میں ڈوبا ہوا ہے وہ صفتِ احسان سے آشنا نہیں ہوتا اور جونہی اس کے

وَاَتِمُّوا الْحَجَّ وَالْعُمْرَةَ لِلّٰهِ ۭ فَاِنْ اُحْصِرْتُمْ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ
الْهَدْيِ ۚ وَلَا تَحْلِقُوْا رُءُوْسَكُمْ حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ ۭ
فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيْضًا اَوْ بِهٖٓ اَذًى مِّنْ رَّاْسِهٖ فَفِدْيَةٌ
مِّنْ صِيَامٍ اَوْ صَدَقَةٍ اَوْ نُسُكٍ ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ ۣ فَمَنْ تَمَتَّعَ
بِالْعُمْرَةِ اِلَى الْحَجِّ فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَدْيِ ۚ فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ
فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ فِي الْحَجِّ وَسَبْعَةٍ اِذَا رَجَعْتُمْ ۭ تِلْكَ
عَشَرَةٌ كَامِلَةٌ ۭ ذٰلِكَ لِمَنْ لَّمْ يَكُنْ اَهْلُهٗ حَاضِرِي الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ رکوع ۲۴

حج اور عمرہ کی جب نیت کرلی جائے تو اسے اللہ کے لیے پورا کرو۔[۵۶۲] پھر اگر ایسی صورت پیش آجائے کہ تم اس نیت سے نکلے لیکن راہ میں تمہیں روک دیا گیا۔ تو پھر جو قربانی میسر آئے اللہ کی جناب میں پیش کرو۔[۵۶۳] اور اس وقت تک سر کے بال نہ منڈاو جب تک قربانی اپنے ٹھکانے نہ پہنچ جائے ۔ ہاں اگر کوئی شخص بیمار ہو یا اسے سر کی تکلیف کی وجہ سے مجبوری ہو تو چاہیے کہ سر منڈانے کا فدیہ دے دے یعنی روزے رکھے

یا صدقہ کرے یا قربانی کرے۔[۱۳۳] پھر جب تمہیں امن نصیب ہو جائے اور تم حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ تو جو شخص تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عمرہ کا فائدہ اٹھائے وہ حسبِ مقدور قربانی دے[۱۳۴]۔ اور اگر قربانی میسّر نہ ہو تو[۱۳۵] تین روزے حج کے زمانے میں اور سات گھر پہنچ کر اس طرح پورے دس روزے رکھ لے۔ یاد رہے کہ یہ حکم ان کے لیے ہے[۱۳۶] جس کا گھر بار مکہ میں نہ ہو۔ اور دیکھو ہر حال میں[۱۳۷] اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان لو کہ وہ نافرمانوں کو سزا دینے میں سخت ہے۔

مادی عنصر کو ارتقاء ملتا ہے اسی وقت اس کی ماہیت کا دوسرا پاک عنصر یعنی روحانیت چمکنے لگتا ہے اور صفتِ احسان کی ابتدا ہونے لگتی ہے اور جس قدر اس کا یہ عنصر شریعت کی تطہیر و تزکیہ سے مادی عنصر کو رام کرتا جاتا ہے اتنا ہی یہ عنصر بھی عنصر روحانیت کے ہم رنگ ہوتا جاتا ہے یہاں تک کہ اس کے ظاہر و باطن مادیت اور روحانیت میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔ اس انقلاب کے بعد اب اس کے لیے آخرت اور عالمِ غیب پر یقین کرنا اسی طرح بدیہی ہو جاتا ہے جیسے اپنی آنکھوں کے مشاہدات پر۔

انبیاء علیہم السلام کے اکثر غیبی علوم کا تعلق اسی صفتِ احسان سے ہوتا ہے۔ جو شخص صفتِ احسان سے جتنا بے بہرہ ہوتا ہے اتنا ہی وہ ان علوم سے بھی بے بہرہ ہوتا ہے۔ یہ اس کی خوش فہمی ہے کہ وہ اس کا انکار اپنی روشن خیالی کا ثمرہ تصور کرتا ہے۔ حقیقت یہ نہیں ہے بلکہ دراصل اس کا یہ تردد صفتِ احسان سے دُوری اور محرومی کا ثمرہ ہے[۱]

زندگی میں اس حسن کاری کا آخری نقرے میں یہ نتیجہ بتایا ہے کہ ان اللہ یحب المحسنین اللہ سبحانہٗ ان حسن کاروں سے جو زندگی میں اعمال حسن نیت اور اخلاص سے اس طرح کرتے ہیں کہ گویا اللہ کو دیکھ رہے ہیں محبت کرتا ہے۔

---

[۱] ترجمان السنۃ ج ۱ ص ۹۷۵

مسند احمد میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ تین قسم کے آدمیوں سے محبت کرتا ہے۔ اوّل وہ لوگ جو اس کی راہ میں خلوصِ نیت کے ساتھ اپنی جان فدا کرتے ہیں۔ دوم وہ جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر کرتے ہیں۔ سوم وہ جو وضو کر کے اللہ کی یاد کے لیے اس وقت اٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے بستر لگاتا ہے۔

شعائر حج

رمضان اور حج دونوں عبادتوں کا تعلق چونکہ قمری مہینوں سے تھا اس لیے روزے کے سیاق میں اور حج کے سباق میں چاند کے مہینوں کا ذکر فرمایا۔ اور پھر چاند ہی کے بارہ مہینوں میں چار ماہ اشہرِ حرام کہلاتے ہیں جن میں لڑائی ملتِ ابراہیمی میں حرام ہے اور ان ہی مہینوں میں حج اور عمرہ کی عبادات کی جاتی ہیں اس لیے پہلے اشہرِ حرام اور حدودِ حرم میں قتال کے احکام بتائے اب اشہرِ حرام اور حرم میں ہونے والی عبادات حج اور عمرے کے احکام بیان کیے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں سب سے پہلے یہ بتایا کہ اگر لڑائی کی وجہ سے یا کسی دوسری وجہ سے حج کو یا عمرہ کو جاتے ہوئے راستہ میں رک جانا پڑے تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ نیز حج اور عمرہ کے تمتع کی صورت کیا ہے؟ حج اور عمرے میں کیا نسبت ہے؟ جس طرح فرض نمازوں کے ساتھ سنتیں اور نوافل ہیں۔ جن سے اصل نماز کے لیے طبیعت میں بیداری اور آمادگی پیدا ہو جاتی ہے اور اگر اس میں کوئی کمی رہ جاتی ہے تو ان سے اس کسر کا جبر بھی ہو جاتا ہے اسی طرح عمرے کی نوعیت حج کے لیے ایک مشق کی ہے اس سے حج کے لیے طبیعت میں آمادگی بھی پیدا ہوتی ہے اور بعض حالات میں اس کے کسر کا جبر بھی ہوتا ہے۔ اپنے لغوی مفہوم کے اعتبار سے لفظ عمرہ تعمیر، آبادکاری اور رونق کی طرف اشارا کرتا ہے جس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اس سے مقصود اللہ کے رونق بھی ہے اور دلوں کی زندگی اور بیداری بھی اور یہ دونوں چیزیں لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔

حج اسلام کی عبادات میں چوتھا رکن اور انسان کی خداپرستی اور عبادت کا پہلا اور قدیم طریقہ ہے۔ اس کے لفظی معنے قصد و ارادے کے ہیں اور اس سے مقصود خاص عبادت کے قصد و ارادے کسی مقدس مقام کا سفر ہے لیکن اسلام میں یہ ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر وہاں حضرت ابراہیم کے بنائے ہوئے گھر خانہ کعبہ کے گرد چکر لگانے اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر

کچھ آداب و اعمال بجا لانے کا نام ہے۔

۵۶۲۔ حج اور عمرہ کی جب نیت کر لی جائے تو اسے اللہ کے لیے پورا کرو۔ جمہور کے قول کے مطابق حج کی فرضیت ۳ھ یعنی غزوہ اُحد والے سال میں سورہ آلِ عمران کی اس آیت سے ہوئی۔ و للّٰہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلاً۔ اسی آیت میں حج کی فرضیت کی شرائط کا بیان اور باوجود قدرت نہ ہونے کے حج نہ کرنے پر سخت وعید آئی ہے۔ زیرِ نظر آیت باتفاقِ مفسرین قصہ حدیبیہ ۶ھ میں نازل ہوئی۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ ارشاد کا مقصود حج کی فرضیت بتلانا نہیں ہے بلکہ حج اور عمرہ کے بارے میں یہ تعلیم پیشِ نظر ہے کہ اگر کوئی شخص حج یا عمرہ کو بذریعہ احرام شروع کر دے تو اس کا اتمام واجب ہے۔ اس لیے اس آیت سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ عمرہ واجب ہے بلکہ صرف یہ معلوم ہوتا ہے کہ عمرہ کو شروع کرنے کے بعد اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بحوالہ ترمذی و امام احمد حضرت جابر سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ عمرہ واجب ہے۔ آپ نے فرمایا واجب تو نہیں، لیکن کر لو تو بہتر ہے۔ اس وجہ سے امام اعظم ابوحنیفہ اور امام مالک کے نزدیک عمرہ واجب نہیں سنت ہے[1]۔

اور اتمام یعنی پورا کرنے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نہ تو شروع کر کے درمیان میں چھوڑ دو، اور نہ حج کا احرام باندھ کر اسے فسخ کر کے عمرہ بناؤ۔ جو شروع کیا ہے اسی کو پورا کرو۔ اور حج و عمرہ کے آداب سنن کو بھی پورا کرو۔ اور حج و عمرہ کا تمام سفر خالص اللہ کے لیے ہو۔ بغیر اخلاص کے عبادت میں حسن پیدا نہیں ہوتا۔ کیونکہ اہلِ عرب کے لیے حج اور عمرہ عبادت سے زیادہ تجارت کا ذریعہ بن گئے تھے۔ ان کے لیے ان عبادات کی حیثیت تجارتی میلوں کی رہ گئی تھی اور وہ تمام مقاصد مرورِ زمانہ سے ان کی نظروں سے بالکل اوجھل ہو گئے تھے جن کے لیے حضرت ابراہیم نے اس گھر کی تعمیر فرمائی تھی۔ یہاں للّٰہ کے لفظ سے مسلمانوں کو حج و عمرے کے اس خاص مقصد کی طرف متوجہ کیا ہے کہ یہ عبادتیں اللہ کی رضا حاصل کرنے اور تقویٰ کی تربیت کے لیے مقرر کی گئی ہیں نہ کہ میلوں کے انعقاد اور کاروباری سرگرمیوں کے لیے۔ اس لیے تم کفار و مشرکین کے برخلاف اللہ کو اپنا مقصود بناؤ۔ اس سلسلے میں مسلمانوں کو تجارتی فوائد حاصل کرنے کی جو محدود اجازت دی گئی ہے اس کا آگے ذکر

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۴۲۴

فرمایا ہے:[1]

الغرض ارشاد کا مقصود یہ ہے کہ حج اور عمرہ کی جب عبادتیں بجا لاؤ تو اللہ کی خوشنودی ہی کے لیے بجا لاؤ۔ اخلاص نیت کے ساتھ اور اللہ کے مقرر کیے ہوئے قاعدوں اور ضابطوں کے ساتھ تمام مراسم سے ٹھیک ٹھیک پورا کرو۔ یہ نہ ہو کہ کسی طرح اُلٹے سیدھے ادا کر کے ان عبادتوں کو ناقص اور فاسد بنا دو۔

اس فقرے کی حضرات صحابہ و تابعین سے متعدد تفسیریں نقل ہوئی ہیں لیکن سب سے جامع تفسیر امام مقاتل کی ہے کہ درمیان میں کوئی ایسا کام نہ کرو جو ان عبادتوں کے شایان شان نہ ہو۔ (قرطبی) للہ کی تفسیر میں علامہ ابن العربی مالکی نے یہ خوب نکتہ آفرینی کی ہے کہ اعمال تو سارے کے سارے اللہ کے لیے ہوتے ہیں۔ خلق، ارادہ اور علم ہر لحاظ سے۔ یہاں خاص طور پر اللہ کے لیے کہہ کر تنبیہ مقصود ہے کہ حج اور عمرہ کا قصد تفاخر کی نیت سے نہ ہو اخلاص محض کے ساتھ قرب و رضائے الٰہی کی نیت سے ہو۔ گویا احسان کے جس مرتبہ کو حاصل کرنے کی پہلی آیت میں تلقین کی گئی تھی۔ اس آیت میں اس کی عملی مشق بتائی گئی ہے کیونکہ احسان کا حاصل یہی ہے کہ یہ تصور میسر آ جائے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ہمہ وقت دیکھ رہا ہے۔ ہماری ہر ہر حرکت پر اس کی نظر پڑ رہی ہے تو اس حالت میں غیر اللہ کی طرف التفات نہ ہو۔

دمِ احصار اور اس کا حکم

۵۶۳۔ پھر اگر ایسی صورت پیش آ جائے کہ تم اس نیت سے نکلے لیکن راہ میں تم کو روک دیا گیا تو پھر جو قربانی میسر آئے اللہ کی جناب میں پیش کر دو اور سر کے بال اس وقت تک نہ منڈاؤ جب تک قربانی اپنے ٹھکانے پر نہ پہنچ جائے۔ یعنی جب کسی نے حج یا عمرہ شروع کیا اور اس کا احرام باندھا تو اس کو پورا کرنا ضروری ہو گیا، بیچ میں چھوڑ بیٹھے یا احرام سے نکل جائے یہ منع ہے۔ لیکن اگر دشمن یا بیماری کی وجہ سے درمیان ہی میں رک گیا اور حج و عمرہ نہیں کر سکا تو پھر اس کے ذمہ وہ قربانی واجب ہے جو اسے میسر آ جائے جس کا ادنیٰ درجہ ایک بکری ہے۔ اس قربانی کو کسی کے ہاتھ مکہ روانہ کرے اور یہ مقرر کر لے کہ فلاں روز اس کو حرم مکہ میں پہنچ کر ذبح کر دینا اور جب

[1] تدبر قرآن۔ [2] ماجدی

اطمینان ہو جائے کہ اب اپنے ٹھکانے یعنی حرم میں پہنچ کر اس کی قربانی ہو چکی ہوگی اس وقت سر کی حجامت کرالے اس سے پہلے ہرگز نہ کرالے اس کو دمِ احصار کہتے ہیں جو حج یا عمرہ سے رک جانے کی وجہ سے لازم ہوتا ہے[1]

احصار اور حصر کے معنے لغتِ عربی میں گھیر لیے جانے کے ہیں۔ کچھ علماء کا خیال ہے کہ احصار کے معنے مرض کی وجہ سے گھر جانے اور رک جانے کے ہیں اور حصر کے معنے دُشمن کی طرف سے گھیر لیے جانے کے ہیں۔ قرآن میں لفظ اس معنے میں استعمال ہوا ہے فخذواھم واحصروھم میں یہی معنے ہیں اور کچھ علماء کی رائے اس کے برعکس ہے وہ فرماتے ہیں کہ احصار کے معنے دُشمن کے گھیرنے کے ہیں اور حصر کے معنے بیماری میں گھر جانے کے ہیں۔ اور علماء کی ایک جماعت کا دعویٰ ہے کہ حصر اور احصار دونوں ایک معنے میں ہیں۔ دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ علامہ آلوسی اسی کے ہم نوا ہیں۔

اس آیت میں کون سا احصار مراد ہے؟ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کے خیال میں یہاں گھیر لیے جانے سے مراد دُشمن کی طرف سے گھیر لیا جانا ہے۔ صحابہ میں عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن عمر، انس بن مالک، عبداللہ الزبیر کی اور تابعین میں سعید بن المسیب اور سعید بن جبیر کی یہی رائے ہے۔

ابراہیم نخعی، سفیان ثوری، حسن بصری، داؤد ظاہری اور امام اعظم ابوحنیفہ یہاں احصار سے ہر قسم کی رکاوٹ مراد لیتے ہیں چاہے دشمن کی جانب سے ہو اور چاہے بیماری کی وجہ سے ہو۔ صحابہ میں عبداللہ ابن مسعود کی اور تابعین امام مجاہد، عطاء بن ابی رباح، قتادہ، عروہ ابن الزبیر کی یہی رائے ہے۔

اگر مسائل کا فیصلہ ووٹوں کی اکثریت سے نہیں بلکہ دلائل کی قوت سے ہوتا ہے تو پھر ہمیں یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ دلائل کی قوت مؤخر الذکر حضرات کے پاس ہے۔ یہ درست ہے کہ ان آیات کے نزول کے وقت مکہ پر مشرکین کا قبضہ تھا اور انہوں نے وہاں سے مسلمانوں کو نہ صرف یہ کہ نکال چھوڑا تھا بلکہ کسی قیمت پر بھی ان کو مکہ آنے کی اجازت دینے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس امر کا سخت اندیشہ تھا کہ مسلمان اگر حج یا عمرے کے لیے مکہ جائیں تو وہ پوری قوت سے مزاحمت کریں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ یہ صورتِ حال اس کی متقاضی تھی کہ پہلے سے اس امکانی خطرے کے لیے مسلمانوں کو تیار کر دیا جائے چنانچہ ان آیات میں یہ ہدایات دی گئیں کہ اگر تم دُشمن کے گھیرے میں آجاؤ اور بیت اللہ تک پہنچنا ممکن نہ ہو تو

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۳۸

جو قربانی میسر ہو پیش کردو۔ اس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ یہاں آیات کے نزول کا پس منظر ہے۔ لیکن احکام و قوانین میں پس منظر اور واقعات نہیں بلکہ قانون کا عمومی انداز معتبر ہوتا ہے۔ اُصول میں احکام و قوانین کی حد تک پہلے شدہ پالیسی ہے کہ العبرۃ بعموم اللفظ لا بخصوص السبب۔ اور یہ کہنا یہاں کچھ علمی طور پر بے وزن ہے کہ سببِ نزول منطوق میں ضرور داخل ہوتا ہے۔ کیونکہ دشمن کے روکے جانے کو اس آیت کے منطوق سے خارج نہیں بلکہ بیماری کی وجہ سے روکے جانے کو آیت کے منطوق میں داخل کیا جارہا ہے۔ یہ بات اس وقت تو شاید کچھ باوزن ہوتی اگر ان بزرگوں کا موقف یہ ہوتا کہ آیت کے منطوق میں صرف مرض کی بنا پر رک جانے والے داخل ہیں اور جن کو دشمن نے روک دیا ہو وہ داخل نہیں ہیں۔ یہاں معاملہ برعکس ہے۔ امام شافعی اور امام مالک کہتے ہیں کہ آیت کے منطوق میں صرف وہ داخل ہیں جن کو دشمن نے روک دیا ہے۔ اور امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ سب داخل ہیں خواہ وہ ہوں جن کو دشمن نے روک دیا اور چاہے وہ ہوں جن کو بیماری آڑے آگئی۔ بہرحال کچھ ہوں فان احصرتم اگر تمہیں روک دیا گیا چاہے دشمن نے روکا ہو یا بیماری نے حکم یہ ہے فما استیسر من الھدی جو قربانی بھی تمہیں میسر ہو پیش کردو۔ اس فقرے کے ذریعے متعدد مسائل کی نشاندہی کی گئی ہے۔

اوّلاً ھدی اصطلاح میں اس جانور کو کہتے ہیں جو بیت اللہ کی طرف قربانی کے لیے روانہ کیا جائے مصدر بمعنے مفعول ہے اور مطلب یہ ہے کہ احرام والا جب احرام کی حالت سے حلال ہونے کا ایسے موقعہ پر ارادہ کرے تو اسے چاہیے کہ بیت اللہ پر قربانی کرکے حلال ہو۔ علماء کی عمومی رائے ہدی کے بارے میں یہی ہے کہ اس سے مراد بھیڑ ہے۔ اگرچہ اونٹ گائے بکری سب کی قربانی ہوسکتی ہے لیکن میسر ہونے اور آسان ہونے کی رعایت سے اُمرا ربعہ نے یہ فائدہ اٹھایا ہے کہ بھیڑ بکری مراد ہے۔ یعنی یہ کم ازکم درجہ ہے۔ صحابہ میں علی ابن ابی طالب اور عبداللہ بن عباس کی یہی رائے ہے۔

ثانیاً اس امر میں اختلاف ہے کہ یہ قربانی جو احصار کی وجہ سے دی جاتی ہے کہاں دی جاتے۔ امام شافعی، امام مالک کی رائے جہاں گھر جاتے وہیں قربانی دینا مراد ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم اور صحابہ نے حدیبیہ میں قربانی اسی جگہ دی تھی جہاں آپ کو دشمن نے روک دیا تھا اور یہ مقام حرم سے باہر تھا۔ لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس سے مراد حرم ہے۔ یعنی اگر آدمی راستہ میں رک جانے پر مجبور ہوجائے تو اپنی قربانی کا جانور یا اس کی قیمت کو حرم میں روانہ کردے تاکہ اس کی طرف سے حدودِ حرم میں قربانی کی جاسکے۔ اس موقعہ پر مولانا دریابادی کا یہ ارشاد کہ قربانی کا جو جانور ساتھ ہو اسے وہیں ذبح کردو۔ حنفیہ کی ترجمانی نہیں ہے اور ایسے ہی مولانا اصلاحی کا یہ فرمانا کہ جو قربانی میسر ہو

وہیں پیش کردو جہاں گھر جاؤ۔ شوافع کے مسلک کی ترجمانی ہے۔ ابوحنیفہ نے قرآن کی اس آیت لا تحلقوا کے زور سے یہ بات سمجھی ہے۔ اس آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ سر اس وقت تک نہ مونڈو جب تک قربانی ٹھکانے نہ لگ جائے۔ اصل ارشاد میں لفظ محل آیا ہے اور اس کے معنے ٹھکانے کے ہیں۔ قربانیوں کا ٹھکانہ اور محل کیا ہے یہ بھی قرآن ہی نے بتایا ہے ثم محلھا الی البیت العتیق۔

یہ کہنا کہ حضور انور اور صحابہ نے قربانی حرم سے باہر دی تھی احناف کے یہاں کچھ زیادہ وقیع نہیں ہے ان کا کہنا ہے کہ حضور انور اور صحابہ کو قریشِ مکہ نے مکہ کی ترائی میں واقع حدیبیہ کے راستہ میں روکا تھا اور حدیبیہ جسے آج شمیسی کہتے ہیں جدہ کی طرف سے مکہ مکرمہ جائیں تو یہ عین حدِ حرم پر واقع ہے۔ مقام وہی ہے صرف نام بدل گیا۔ مکہ مکرمہ سے اس کا فاصلہ ۲۲ کیلومیٹر ہے۔ اس جگہ دو بلند مینار حدِ حرم کا نشان بنائے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اسی مقام پر قیام فرما ہوئے۔ یہیں قریش کے قاصد اور نمائندے آتے رہے۔ اسی جگہ بیعتِ رضوان ہوئی تھی۔ اس بنا پر یہ بالکل قرینِ قیاس ہے کہ حضور انور نے یہاں قربانی حدودِ حرم ہی میں کی تھی۔ بلکہ امام زہری نے تو یہ بات کھول بھی دی ہے کہ حضور نے حرم میں قربانی کی۔ بہر حال اس موضوع پر امام ابوحنیفہ کا مذہب یہی ہے۔

یہاں یہ سوال بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ جو دشمن کی جانب سے یا مرض کی وجہ سے رکاوٹ کی بنا پر احرام باندھنے کے بعد عمرہ نہ کر سکیں اور دمِ احصار دے دیں تو اس سے عمرے کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے یا اس عمرے کی قضا کرنی پڑتی ہے؟

امام ابوحنیفہ ایسے عمرے کی قضا کو واجب قرار دیتے ہیں۔ کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ نے حدیبیہ والے عمرے کی قضا فرمائی۔ اور ذیقعدہ ۷ھ میں دوبارہ تشریف لائے۔ اس مرتبہ آپ کے ساتھ دو ہزار صحابہ کرام تھے۔ اونٹوں کے علاوہ گھوڑے بھی ساتھ تھے اور قربانی کے لیے ۶۰ اونٹ بھی ہمراہ لے لیے تھے۔ اسی کو عمرۃ القضاء کہتے ہیں۔ حضرت امام شافعی کا یہ ارشاد کہ اسے عمرۃ القضاء حضور اور قریشِ مکہ کے مابین فیصلہ کی وجہ سے کہا گیا۔ تاریخی طور پر کوئی قیمتی معلومات نہیں ہیں۔

دمِ جنایت

ہاں اگر کوئی شخص بیمار ہو یا سر میں تکلیف کی وجہ سے مجبور ہو تو اسے چاہیے کہ سر منڈانے کا فدیہ دے دے یعنی روزے رکھے یا صدقہ کرے یا قربانی۔ یعنی اگر حالتِ احرام میں کوئی بیمار ہو یا اس کے

سر میں درد یا سر میں زخم ہو تو اس کو بضرورت حالتِ احرام میں حجامت بنانا جائز ہے مگر بدلہ دینا پڑے گا تین روزے یا چھ محتاجوں کو کھانا کھلانا یا ایک دنبہ یا بکرے کی قربانی کرنا۔ یہ دم جنایت ہے کہ حالتِ احرام میں بضرورتِ مرض لاچار ہو کر امورِ مخالف احرام کرنے پڑے [1]

پہلی آیت میں سر منڈانے کو احرام کھولنے کی علامت قرار دیا گیا ہے جس سے معلوم ہوا کہ حالتِ احرام میں سر منڈانا یا بال کٹوانا منع ہے۔ اسی کی مناسبت سے یہ حکم بتایا گیا کہ جو شخص حج یا عمرہ کے اعمال بجالانے سے مجبور تو نہیں مگر حالتِ احرام میں سر کے بال منڈانے یا کٹوانے کی ضرورت پیش آگئی تو وہ کیا کرے۔ ارشاد فرمایا کہ اگر کسی بیماری کی وجہ سے سر یا بدن کے کسی حصے کے بال منڈانے کی مجبوری ہو یا سر میں جوئیں پڑ جائیں اور وہ اسے تکلیف دے رہی ہوں تو ایسی صورت میں حالتِ احرام میں حجامت کرانا بقدرِ ضرورت جائز ہے لیکن اس کا فدیہ دینا پڑے گا۔ فدیہ یہ ہے کہ روزے رکھے، صدقہ کرے یا قربانی کرے۔ فدیہ کی یہ تینوں صورتیں قرآن میں اجمالاً بیان کی گئی ہیں۔ یعنی روزے، صدقہ، یا قربانی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرمائی ہے کہ روزے تین ہوں اور صدقہ چھ مسکینوں کو کھانا کھلانے کی صورت میں اور قربانی کم از کم ایک بکری کی ہو۔

فدیہ کی ادائیگی کا مقام

اگر احرام والا کسی بیماری کے سبب یا سر میں تکلیف کی بنا پر سر منڈانے پر مجبور ہو جائے تو اسے فدیہ دینا چاہیے اس پر تو علماء کا اتفاق ہے کہ یہ فدیہ تین روزوں یا چھ مسکینوں کو کھانا کھانے یا قربانی کی صورت میں ہو لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ اس کی ادائیگی کہاں ہو؟ قربانی کے بارے میں امام ابو حنیفہ، امام ابو یوسف امام محمد فرماتے ہیں کہ قربانی صرف مکہ میں ہونی چاہیے۔ صدقہ، اور روزے کے لیے کوئی قید نہیں خواہ کہیں کرے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ صدقہ اور قربانی مکہ میں ہو، روزے میں آزاد ہے اور امام مالک کی رائے میں تینوں کی ادائیگی کے لیے مکان کی کوئی پابندی نہیں ہے۔ اسے آزادی ہے جہاں چاہے ادائیگی کرے۔ امام مالک ھدی اور نسک میں فرق کرتے ہیں۔ قرآن میں اس موقعہ پر نسک استعمال ہوا ہے۔ نسک مطلق بلا قید قربانی کو کہتے ہیں اور ہدی وہ قربانی کہلاتی ہے جو مکہ میں کی جاتے۔ قرآن کی آیت بلا قیدِ مکان آئی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۸

کعب ابن عجرہ کی جو حدیث اس آیت کی تشریح میں آئی ہے اس میں بھی مکان کا کوئی ذکر نہیں ہے۔
اس لیے علامہ آلوسی کا یہ کہنا کہ الظاہر العموم بالکل بجا ہے۔ عام احناف اسے ہدی پر قیاس کرتے
ہیں اور اس کے حرم میں ہونے کو ضروری قرار دیتے ہیں لیکن دلیل کی قوت مالکیہ کے پاس ہے۔

۵۹۵ ۔ پھر جب تمہیں سکون و چین نصیب ہو جائے اور تم حج سے پہلے مکہ پہنچ جاؤ تو جو شخص
تم میں سے حج کا زمانہ آنے تک عمرہ کا فائدہ اٹھائے تو وہ حسب مقدور قربانی کرے۔ یعنی جو محرم
کہ دشمن کی طرف سے اور بیماری سے مطمئن ہو جائے خواہ اس کو کسی قسم کا اندیشہ پیش ہی نہ آیا ہو یا
دشمن کا خوف یا بیماری کا کھٹکا پیش تو آیا مگر جلدی زائل ہو گیا۔ احرام حج و عمرہ میں خلل نہ آنے پایا تو اس کو
دیکھنا چاہیے کہ اس نے حج و عمرہ دونوں ادا کیے یعنی قرآن اور تمتع کیا افراد نہیں کیا تو اس پر قربانی ایک بکرا
یا ساتواں حصہ گائے کا لازم ہے۔ اسے دمِ قرآن یا دمِ تمتع کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ اسے دمِ شکر کہتے ہیں اور
اس میں سے کھانے کی اجازت دیتے ہیں اور امام شافعی اسے دمِ جبر کہتے ہیں اور قربانی کرنے والے کو اس
میں سے کھانے کی اجازت نہیں دیتے[1]

افراد، تمتع اور قرآن

افراد یہ کہ صرف حج کا احرام باندھا جائے اور عملاً صرف حج پر اکتفا کیا جاتے۔ جو شخص ایسا کرے اس کو
مفرد کہتے ہیں۔

قران حج و عمرہ دونوں کا احرام ایک ساتھ باندھا جائے، پہلے عمرہ کرکے پھر حج کیا جائے جو شخص ایسا
کرے اسے قارن کہتے ہیں۔

تمتع ایامِ حج میں پہلے عمرہ کا احرام باندھ کر عمرہ کر لیا جائے اور اس کے بعد اسی سال اسی سفر میں حج
کا احرام باندھ کر حج کرے جو شخص ایسا کرے اُسے متمتع کہتے ہیں۔

آیت میں اذا امنتم ایک جامع لفظ آیا ہے جو مرض کے دُور ہو جانے پر بھی اسی طرح حاوی ہے
جس طرح خطرۂ دشمن کے دفع ہو جانے پر قرطبی اور ابن العربی کا یہی خیال ہے یہاں صحت کے لیے امن
کی تعبیر اختیار کی ہے[2] مطلب یہ ہے کہ جب وہ سبب دُور ہو جائے جس کی وجہ سے تمہیں مجبوراً راستہ
میں رک جانا پڑا تھا۔ چونکہ اس زمانے میں حج کا راستہ بند ہونے اور حاجیوں کے رک جانے کی وجہ زیادہ تر

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۴۰۳ [2] ماجدی ص ۸۰

دشمن اسلام قبیلوں کی مزاحمت ہی تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اوپر کی آیت میں گھر جانے اور اس کے بالمقابل یہاں امن نصیب ہوجانے کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ لیکن جس طرح گھر جانے کے مفہوم میں دشمن کی مزاحمت کے علاوہ دوسرے تمام موانع شامل ہیں۔ اسی طرح امن نصیب ہونے کا مفہوم بھی ہر مانع د مزاحم چیز کے دُور ہوجانے پر حاوی ہے [1]

تمتع کے لفظی معنے فائدہ اٹھانے کے ہیں اور فقہ کی اصطلاح میں حج اور عمرے کے ملا لینے کے ہیں یعنی زمانۂ حج میں ایک احرام باندھ کر عمرہ ادا کیا جائے اور پھر دوسرے احرام سے حج بھی کر لیا جائے۔ دونوں احراموں کی درمیانی مدت میں حالتِ احرام کی ممنوعات سے پورا فائدہ اٹھایا جائے۔ دینِ ابراہیمی کو چھوڑ کر عرب جاہلی جہاں اور بہت سے اوہام میں گرفتار تھے وہاں ایک عقیدہ یہ بھی گڑھ لیا تھا کہ موسم حج میں عمرہ کرنا سخت گناہ ہے [2]

آفاقی حجاج کے لیے ایک رُخصت

دراصل یہ آفاقی حاجیوں یعنی میقات سے باہر رہنے والوں کے لیے ایک رُخصت بیان ہورہی ہے میقات وہ جگہ جس سے آگے مکہ مکرمہ جانے والا بغیر احرام کے نہیں جاسکتا۔ آفاقی کے لیے پانچ میقات ہیں۔ اہلِ مدینہ کے لیے ذوالحلیفہ، کوفہ اور بصرہ والوں کے لیے ذات عرق، شام والوں کے لیے جحفہ، یمن کے رہنے والوں اور ہندو پاکستان کے لیے یلملم اور نجد والوں کے لیے قرن میقات ہے۔

حج یا عمرہ کرنے والا آفاقی میقات سے احرام باندھ کر مکہ کی طرف جاتا ہے۔ زمانہ احرام میں نہ سر کے بال منڈاتے ہیں نہ ترشواتے ہیں۔ دنیا کے عیش و نشاط اور تکلف کی زندگی سے پرہیز کرتے ہیں یعنی نہ خوشبو لگاتے ہیں، نہ سلے کپڑے پہنتے نہ سر چھپاتے ہیں نہ خوشبودار کھانا کھاتے ہیں، نہ شکار کرتے ہیں، نہ کسی کی جان لے سکتے ہیں نہ بیوی سے ہم بستری کر سکتے ہیں۔ اور اسی والہانہ انداز سے یہ ترانہ پڑھتے ہیں۔

لبیک اللھم لبیک، لبیک لا شریک لک لبیک ان الحمد والنعمۃ لک والملک لک

زمانہ جاہلیت میں ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ کو کرنا چاہیے۔ ایک احرام کے ساتھ ہو یا دو

---

[1] تفہیم القرآن [2] ماجدی ص ۸۰

احراموں کے ساتھ ہو گناہ سمجھا جاتا تھا۔ یہ بات حدودِ میقات میں رہنے والے کے لیے درست تھی اس لیے کہ ان کے لیے الگ الگ سفر کرنا کچھ دشوار نہ تھا لیکن دُور سے آنے والے حاجیوں کے لیے اس میں دُشواری تھی اس وجہ سے قرآن نے ان کو یہ رُخصت عطا فرمائی کہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ دونوں کر سکتے ہیں۔ اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ پہلے عمرہ کر کے احرام کی پابندیوں سے آزاد ہو جاتے اور دوبارہ پھر حج کی تاریخوں میں حرم ہی میں حج کے لیے نیا احرام باندھیں اسے اصطلاح میں تمتع کہتے ہیں۔ دوسری یہ کہ میقات سے حج اور عمرہ دونوں کا احرام ساتھ باندھ لے۔ اس کو قِران کہتے ہیں۔ لفظی معنے کے لحاظ سے لفظ تمتع دونوں کو جامع ہے کیونکہ اس کے معنے حج اور عمرہ کو جمع کر کے نفع اٹھانے کے ہیں۔ وہ دونوں صورتوں میں برابر ہے۔ قرآن کی یہ آیت دونوں کو شامل ہے۔ اگرچہ آیت سے تینوں کا جواز معلوم ہو رہا ہے یعنی قِران، تمتع اور افراد کا لیکن یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ ان تینوں میں افضل کون سا ہے۔ عملی طور پر قرآن سے تینوں کا جواز تو آپ کے سامنے آچکا ہے لیکن قرآن کا یہی علم جب دامانِ نبوت میں عمل کی صورت اختیار کرتا ہے تو اسی افضلیت کے باب میں فیصلہ کن طاقت بن جاتی ہے۔

امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ قِران افضل ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ افراد افضل ہے اور امام مالک کا خیال ہے کہ افراد قِران سے افضل ہے اور قِران تمتع سے۔

اس اختلاف کا مدار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل پر ہے۔ ان میں سے جن بزرگوں کے نزدیک روایتی اور تاریخی طور پر یہ ثابت ہو گیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں حج قِران کو ملا دیا یا انہوں نے قِران کی افضلیت کا فیصلہ فرما دیا اور جن کے خیال مبارک میں یہ ثابت ہو گیا کہ حضور انور نے حج افراد کیا ہے انہوں نے افراد کو افضل قرار دے دیا۔ اور جن کی رائے میں یہ بات تاریخی طور پر معلوم ہوئی کہ حضور انور نے تمتع فرمایا انہوں نے تمتع کو افضل کہہ دیا۔ مثلاً امام احمد بن حنبل۔

خالص محدثانہ نقطہ نظر سے یہ ایک طویل الذیل بحث ہے۔ تاریخی طور پر احادیث کی روشنی میں ہمیں علامہ قرطبی کی رائے پسند ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں حج قِران کیا تھا۔ حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے حافظ ابن القیم نے زاد المعاد اور تہذیب السنن میں اس پر مبسوط بحث فرمائی ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے احادیث کی روشنی میں یہی فیصلہ دیا ہے۔ کہ حجۃ الوداع میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قِران کیا ہے اور یہی افضل ہے۔ اس آخری دَور میں علامہ سید رشید رضا نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ

صفوة القول ان محمد صلى الله عليه وسلم كان قارنا

بہرحال قران ہو یا تمتع دونوں میں قرآن نے قربانی کو ضروری قرار دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر کسی نے صرف حج کا احرام باندھا ہو تو اس پر قربانی ضروری نہیں ہے۔ قربانی اس کے ذمہ ہے جس نے حج اور عمرہ کا احرام باندھا ہے۔ یا عمرہ کا زمانہ حج میں احرام باندھا ہے اور پھر حلال ہونے کے بعد حج کی تاریخوں میں حرم سے حج کا احرام باندھا، صورتیں متعدد ہیں :

۱۔ یہ کہ حج کا احرام باندھا پھر عمرہ کی خاطر اسے فسخ کر دیا ۔

۲۔ حج اور عمرہ دونوں کا احرام باندھا اسے قِران کہتے ہیں ۔

۳۔ پہلے عمرہ کا احرام باندھا، عمرہ کرنے کے بعد حلال ہو کر حج کا احرام باندھا اسے تمتع کہتے ہیں۔

۴۔ صرف حج کا احرام باندھا اسے افراد کہتے ہیں ۔

۵۔ صرف عمرہ کا احرام باندھا۔

صورت اوّل میں ابو حنیفہ، مالک، شافعی فسخ کی اجازت نہیں دیتے نہ تو حج کا احرام باندھ کر اسے عمرہ بنانے کی اور نہ عمرہ کا احرام باندھ کر اسے حج بنانے کی۔ ان کے نزدیک دونوں صورتیں ناجائز ہیں۔ امام احمد، ظاہریہ اور محدثین کی اکثریت اسے جائز بتاتی ہے۔ یہی وہ متعۃ الحج ہے جس سے حضرت عمر منع فرماتے تھے اور اسی کے بارے میں حضرت عثمان فرماتے ہیں کہ یہ حالات کے تحت ہمارے لیے جائز تھا تمہارے لیے جائز نہیں ہے۔ غالباً خاص طور پر ایسا کرنے یعنی حج کا احرام باندھ کر اسے عمرہ بنانے کی ضرورت یہ پیش آئی تھی کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ حج اور عمرہ کو ایک ہی سفر میں ادا کرنا گناہ عظیم خیال کرتے تھے۔ ان کی خود ساختہ شریعت میں عمرے کے لیے الگ اور حج کے لیے الگ سفر کرنا ضروری تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اس قید کو اڑا دیا اور میقات سے باہر سے آنے والوں کو یہ رعایت دی کہ وہ ایک ہی سفر میں حج اور عمرہ کر سکتے ہیں۔ البتہ جو لوگ میقات کے اندر رہتے ہیں ان کو اس کی اجازت نہیں دی کیونکہ ان کے لیے عمرہ اور حج الگ الگ کرنا مشکل نہیں ہے۔ بس اسی وجہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو جو حج کا احرام باندھ کر آئے تھے یہ حکم دیا کہ پہلے اس احرام سے عمرہ کر دو پھر حج کے لیے دوسرے احرام سے حج کرنا۔ چنانچہ ابوداؤد اور نسائی میں یہ بات صراحتاً بتائی گئی ہے ۔

ابوذر فرماتے ہیں کہ ہمارے بعد کوئی اس کا مجاز نہیں ہے کہ حج کا احرام باندھ کر اسے فسخ کرے اور عمرہ کرے یہ تو صرف حضور انور کے صحابہ کے لیے رخصت تھی۔ جب ذہنوں سے جاہلیت کی گرفت ڈھیلی ہو گئی اور لوگوں کے لیے اسلام کا قانون مانوس ہو گیا کہ حج کے مہینوں میں میقات سے باہر

رہنے والوں کے لیے عمرہ جائز ہے تو حج کو فسخ کرنے کی رخصت بھی ختم ہو گئی۔ حافظ ابن القیم نے اس کی حمایت میں تفصیلی بحث کی ہے اور مولانا عثمانی نے فتح الملہم میں اس کے تفصیلی جوابات دیے ہیں۔

دوسری اور تیسری صورت یعنی قران اور تمتع قربانی ان ہی دو میں واجب ہے۔ چوتھی اور پانچویں صورت میں قربانی واجب نہیں ہے۔

جن دو صورتوں میں قربانی واجب ہے اس کو دمِ قران اور دمِ تمتع کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک یہ دمِ شکر ہے اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ یہ دمِ جبر ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ کی رائے میں اسے دس ذی الحجہ کو ذبح ہونا چاہیے اور اس کا گوشت قربانی کرنے والے کے لیے کھا لینا جائز ہے اور امام شافعی اس کے لیے یوم نحر یعنی دس ذی الحجہ کو ضروری نہیں سمجھتے اور قربانی کرنے والے کو اس کے کھانے کی اجازت نہیں دیتے۔

۵۶۶ - اگر قربانی میسر نہ ہو تو تین روزے حج کے زمانہ میں اور سات گھر پہنچ کر اس طرح دس پورے رکھے۔ یعنی جس نے قران یا تمتع کیا اور اس کو قربانی میسر نہ ہوئی تو اس کو چاہیے کہ تین روزے رکھے حج کے دنوں میں جو کہ یوم عرفہ یعنی نویں ذی الحجہ پر ختم ہوتے ہیں اور سات روزے جب رکھے کہ حج سے بالکل فارغ ہو جائے۔ دونوں کا مجموعہ دس روزے ہو گیا۔[1]

مطلب یہ ہے کہ جس کی مالی حیثیت قربانی ادا کرنے کے قابل نہیں ہے تو اس پر دس روزے اس طرح واجب ہیں کہ تین روزے تو ایامِ حج میں رکھے یعنی نویں ذی الحج تک پورے کرے۔ باقی سات روزے حج سے فارغ ہو کر جہاں چاہے اور جب چاہے رکھے۔ مکہ مکرمہ میں رہ کر ہی پورے کرے یا گھر واپس آ کر۔ اگر کوئی شخص تین روزے حج کے دنوں میں نہ رکھ سکا تو پھر امام ابوحنیفہ اور اکابر صحابہ کے نزدیک اس کو قربانی ہی کرنا چاہیے۔ جب بھی قدرت ہو حرم میں کر لے (احکام)[2]

یہ بات باقی کہ سات روزے حج سے فارغ ہو کر جہاں چاہے رکھے حضرت امام احمد اور امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں کہ مکہ میں نہ رکھے۔ مکہ سے باہر آ کر رکھے۔ گویا امام ابوحنیفہ رجوع کے معنے اعمالِ حج سے فراغت کے لیتے ہیں جبکہ امام مالک مکہ سے واپسی کے اور امام شافعی گھر پہنچنے کے بتاتے ہیں۔ آخر میں بطورِ تاکید فرمایا کہ تلک عشرۃ کاملہ اور تاکید کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ حرفِ واو تخییر کے لیے ہے اور یہ بھی

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۴۰۳ [2] معارف القرآن م شفیع ص ۴۲۶

بتاتا ہے کہ ، کا عدد آیت میں تکثیر کے لیے نہیں بلکہ تعدید کے لیے ہے کیونکہ ، کا عدد عربی زبان میں دونوں معنے دیتا ہے۔

۵۶۷۔ یاد رہے کہ یہ حکم ان کے لیے ہے جن کا گھر مکہ میں نہ ہو۔ امام ابو حنیفہ کے نزدیک یہ کا اشارہ تمتع کی طرف ہے کیونکہ تمتع اور قران میقات کے اندر رہنے والوں کے لیے نہیں ہے بلکہ آفاقیوں کے لیے ہے جو میقات سے باہر رہتے ہیں۔ چونکہ آفاقیوں پر سفر کی صعوبت و مشقت ہٹا کر یہ خاص مہربانی کی گئی ہے اس لیے اشارہ تمتع کی طرف ہے اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ یہ کا اشارہ قربانی اور اس کے بدل کی طرف ہے۔ آفاقی پر واجب یہی تھا کہ وہ حج اور عمرہ کا احرام میقات سے باندھے مگر اس نے ایسا نہیں کیا اس لیے اس کی تلافی قربانی سے کی گئی۔ یہ بات خواہ کیسی اچھی ہو لیکن اگر صورتِ حال یہی ہوتی تو لام کی جگہ آیت میں علیٰ آتا۔ علیٰ ذمہ داری کو بتانے کے لیے آتا ہے برخلاف لام کے کہ وہ اس کے لیے نہیں آتا۔

من لم یکن اھلہ وہ شخص کہ نہ ہو اس کا گھر مکہ میں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ میقات سے باہر کا باشندہ ہو۔ یہ امام ابو حنیفہ کی رائے ہے اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ شخص ہے جو حرم سے باہر مسافت قصر پر رہتا ہو۔

مسجد حرام سے مراد آیت میں خاص مسجد حرام نہیں بلکہ حرم کا علاقہ ہے جیسا کہ دوسری آیات میں ہے مثلاً المسجد الحرام الذی جعلنا ہ للناس سواء ن العاکف فیہ والباد۔ یا جیسے سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً من المسجد الحرام۔

۵۶۸۔ اور دیکھو ہر حال میں اللہ کی نافرمانی سے بچو اور خوب جان لو کہ وہ نافرمانوں کو سزا دینے میں سخت ہے۔ آیت کے آخر میں تقویٰ اختیار کرنے جس کے معنے ہیں اللہ سبحانہٗ کی نافرمانی سے بچنے کے اور اس کے بعد فرمایا واعلموا یعنی جو شخص جان بوجھ کر اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے اس کے لیے اللہ کا عذاب سخت ہے[1]

اصل چیز اور مدار کار تمام احکام و مسائل میں بس یہی تقویٰ ہے باقی تعبیر و تفسیر میں جزئی اختلاف تو اپنی اپنی فہم و بصیرت، فکر و نظر کے مطابق علماء، فقہاء، شارحین، مفسرین میں ہوتے ہی رہیں گے۔ شدید العقاب یہاں جس انداز سے آیا ہے اس سے بعض علماء نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ

[1] معارف القرآن م ش

اَلْحَجُّ اَشْهُرٌ مَّعْلُوْمٰتٌ فَمَنْ فَرَضَ فِيْهِنَّ الْحَجَّ فَلَا
رَفَثَ وَلَا فُسُوْقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۗ وَمَا تَفْعَلُوْا
مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمْهُ اللّٰهُ ۗ وَتَزَوَّدُوْا فَاِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوٰى ۡ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم
وَاتَّقُوْنِ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ ۝

حج کے مہینے جانے پہچانے ہیں[۵۰۹]۔ لہٰذا جو شخص بھی ان مقررہ مہینوں[۵۱۰] میں حج کو لازم کرلے تو پھر اُس کے لیے حج کی حالت میں نہ تو شہوت کا کام نہ گناہ کی بات کرنی ہے اور نہ لڑائی جھگڑے کی بات[۵۱۱]۔ اور یاد رکھو تم جو بھی نیکی کروگے اللہ کے علم میں ہے[۵۱۲]۔ اور حج کرو تو اس کے سفر کے سروسامان کی تیاری کرو۔ اور سب سے بہتر سروسامان تقویٰ ہے[۵۱۳]۔ اور اے ارباب دانش ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو اور اُس کی نافرمانی سے بچو۔

مقدس متبرک مقامات میں جس طرح قبولیت و سعادت کے مواقع بہت زیادہ اسی طرح گناہ و عقوبت کا بھی زیادہ خطرہ ہے[۱]۔

گویا اس آخری فقرے کے ذریعے اصل رُوح کی طرف متوجہ کیا ہے کہ ان تمام احکام کا اصل مقصد تقویٰ ہے۔ یہی ان کا حاصل ہے اور اسی سے ان میں نورانیت آتی ہے۔ اگر انسان اس چیز کو نگاہ میں

[۱] ماجدی

نہ رکھے تو نہ تو ان کا حق ہی ادا کر سکتا ہے اور نہ ان احکام سے اسے روحانیت حاصل ہو سکتی ہے۔ بلکہ اس کی ساری زندگی خدا سے جھوٹی آرزوئیں باندھنے اور اپنے نفس کو ناروا الاونس دینے میں گزر جاتی ہے۔ حالانکہ اللہ کے طبعی قوانین جس طرح اپنے نتائج میں بے لاگ ہیں اسی طرح اس کے شرعی و اخلاقی قوانین بھی اپنے نتائج میں بے لاگ ہیں۔

حج کے آداب

حج کے لیے یہ ضروری ہے کہ احرام باندھنے کے بعد سے لے کر احرام اتارنے تک ہر حاجی نیکی و پاکبازی اور امن و سلامتی کی پوری تصویر ہو۔ وہ لڑائی جھگڑا اور دنگا فساد نہ کرے۔ کسی کو تکلیف نہ دے، یہاں تک کہ کسی چیونٹی تک کو نہ مارے۔ شکار تک اس کے لیے جائز نہیں۔ کیونکہ وہ اس وقت صلح و آشتی اور امن و امان کا نمونہ ہے۔ اخلاق، دیانت اور معاملات کی حد تک حاجی کو ایسا ہونا چاہیے کہ کوئی اس پر انگشت نمائی نہ کر سکے۔ شہوانی باتوں، اللہ کی نافرمانیوں اور آپس کے لڑائی جھگڑے سے اس کا دامن قطعاً آلودہ نہ ہو۔ کیونکہ قرآن کے نزدیک یہ حج کی عبادت انسان کو ترکِ دنیا اور زہد کی اس آخری حد سے روشناس کرتی ہے جس سے آشنائی اللہ کے نزدیک صرف مرغوب نہیں بلکہ مطلوب بھی ہے اور جو اخلاقی تربیت اور تزکیہ کے لیے ناگزیر ہے اور جس کے ذریعے دل میں وہ احساس پیدا ہوتا ہے جس کی بنا پر ہر کام میں اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔ یہی حج کا منشا ہے ومن یعظم شعائر اللہ فانھا من تقوی القلوب اور جو اللہ کے شعائر کی عزت کرتا ہے تو یہ دلوں کے تقویٰ سے ہے۔ قربانی کی بھی یہی غرض ہے اور حج کے سفر اور زندگی کے ہر معاملہ میں راستہ کا توشہ مال و دولت اور ساز و سامان سے زیادہ تقویٰ ہے۔

۵۶۹۔ حج کے مہینے جانے پہچانے ہیں۔ شوال کے آغاز سے لے کر ذی الحجہ کی دسویں رات تک یعنی صبح تک کا نام اشہرِ حج ہے۔ کیونکہ حج کا احرام ان مہینوں کے اندر ہوتا ہے اگر اس سے پہلے کوئی حج کا احرام باندھے گا تو وہ مکروہ ہو گا یعنی حج کے لیے چند مہینے مقرر ہیں اور سب کو معلوم ہیں۔ مشرکین جو اپنی ضرورت سے ان میں تغیر و تبدیلی کرتے تھے جس کو قرآن میں نسیئ کہا گیا ہے یہ بالکل بے اصل اور باطل ہے[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۲۸

اس فقرے میں یہ باتیں تشریح طلب ہیں۔ حج کیا ہے اور اشہر معلومات سے کون سے مہینے مراد ہیں!

حج دراصل اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کے مورد خاص میں حاضری، حضرت ابراہیم کی طرح اللہ کی دعوت پر لبیک کہنا اور اس عظیم الشان قربانی کی روح کو زندہ کرنا ہے۔ یہی روح اور یہی باطنی جذبہ ہے جس کو حاجی ان بزرگوں کے مقدس اعمال اور قدیم دستوروں کے مطابق حج میں اپنے عمل اور کیفیت سے مجسم ہو کر ظاہر کرتے ہیں۔ تمدن کے اسی ابتدائی دور کی طرح وہ بن سلے اور سادہ کپڑے پہنتے ہیں یعنی احرام باندھتے ہیں۔ اگر حج سے مراد احرام حج ہے تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ حج کے احرام باندھنے کے لیے وقت چند مہینے ہیں۔ اور اگر حج سے مراد اعمال و افعال حج ہیں تو مطلب یہ ہوگا کہ اعمال کے لیے وقت چند مہینے ہیں۔ پہلی بات صحیح ہے لیکن دوسری بات درست نہیں کیونکہ اعمال حج تو نام ہے وقوف عرفہ، قیام مزدلفہ، قیام منیٰ، قربانی، حلق راس، رمی جمار، طواف اور سعی کا اور یہ تمام اعمال تین ماہ میں نہیں بلکہ صرف ۸ ذی الحجہ سے شروع ہو کر ۱۳ ذی الحجہ پر ختم ہو جاتے ہیں۔ اس لیے اولیٰ اور قرین مقام یہی ہے کہ حج کے احرام کا وقت چند مقررہ مہینے ہیں یعنی ان مہینوں میں ہی حج کا احرام باندھا جا سکتا ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیت امام شافعی کے اس موقف کی تائید کرتی ہے کہ حج کا احرام حج کے مہینوں سے پہلے ناجائز ہوگا۔ اگر ان مہینوں سے پہلے احرام باندھا تو وہ حج کا نہیں بلکہ عمرہ کا احرام ہوگا۔ امام ابو حنیفہ، امام مالک اور امام احمد کہتے ہیں کہ اشہر حج سے پہلے حج کا احرام اگر کسی نے باندھ لیا تو منعقد تو ہو جائے گا لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے۔ یہ آئمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ احرام حج کے لیے شرط ضرور ہے لیکن ارکان حج میں اس کا شمار نہیں ہے اور اس کی حیثیت حج کے لیے وہی ہے جو نماز کے لیے وضو کی جیسے وضو نماز کے وقت سے پہلے کر لینی جائز ہے ایسے ہی حج کے مہینوں سے پہلے احرام بھی جائز ہے لیکن چونکہ احرام میں ایک گونہ ارکان سے مشابہت ہے اس لیے ایسا کرنا مکروہ ہے۔

بعض معاصر مفسرین کا یہ کہنا کہ آیت میں لفظ حج اور عمرہ دونوں ہی کے لیے استعمال ہوا ہے کچھ درست نہیں ہے کیونکہ عمرہ کا اسلام میں وقت مقرر نہیں ہے اس کا احرام ہر شخص پورے سال میں باندھ سکتا ہے بلکہ مکی کے لیے تو حج کے مہینوں میں عمرے کی اجازت بھی نہیں ہے۔ اشہر حج میں عمرے کی اجازت صرف آفاقی کے لیے ہے جیسے پہلے خود قرآن میں یہ حکم صراحتاً آچکا ہے۔

اشہر معلومات کے لفظی معنے جانے بوجھے مہینوں کے ہیں۔ یعنی لوگوں میں جانے پہچانے ہیں یہ شوال، ذی قعدہ اور ذی الحجہ کے دس روز ہیں۔ عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن عباس، عبداللہ بن الزبیر

اور عبداللہ ابن عمر سے بھی منقول ہے۔ امام بخاری نے بصیغہ جزم تعلیقاً اور ابن جریر نے موصولاً حضرت عبداللہ کا یہ اثر نقل کیا ہے کہ اشہر حج شوال ذی قعدہ اور ذی الحجہ کے دس روز ہیں۔ مسند امام احمد میں عبداللہ ابن عباس سے اس فقرے کی یہی تفسیر آئی ہے۔ امام حاکم نے مستدرک میں اسے اپنی سند سے نقل کرکے علی شرط الشیخین کہا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ صحابہ میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ ابن الزبیر، اور حضرت عبداللہ بن عباس، تابعین میں حضرت عطا، حضرت طاؤس، حضرت مجاہد، حضرت ابراہیم نخعی، حضرت عامر الشعبی، حضرت حسن بصری، حضرت محمد بن سیرین، حضرت مکحول، حضرت قتادہ، حضرت ضحاک، حضرت ربیع ابن انس اور حضرت مقاتل بن حیان اور ائمہ میں امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل، امام ابویوسف کا مذہب یہی ہے۔

امام مالک فرماتے ہیں کہ اشہر حج شوال، ذی قعدہ اور پورا ذی الحجہ ہے۔ اور اس کے لیے ابوامامہ کی وہ حدیث مرفوع پیش فرماتے ہیں جس میں ہے کہ حضور انور نے فرمایا ہے کہ حج کے مہینے شوال، ذی قعدہ، اور ذی الحجہ ہیں۔ روایتی طور پر اس کی پوزیشن یہ ہے کہ حافظ ابن کثیر نے اسے موضوع کہا ہے۔ اور اگر اس کی صحت کو شک و شبہ سے بالاتر تسلیم کیا جائے تو پھر بھی ذی الحجہ کا نام تغلیباً آیا ہے جیسے بولا جاتا ہے۔ میں نے اس کو اس سال دیکھا۔ اور میں نے اس سے آج ملاقات کی۔ دیکھنے اور ملنے کے چند لمحات پر سال اور دن بولا گیا ہے۔

۵۷۰۔ لہذا جو شخص ان مقررہ مہینوں میں حج کو لازم کرلے۔ لازم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ حج کا احرام باندھا کر اس طرح پر دل سے نیت کی اور زبان سے تلبیہ کہا[1] احرام کی حقیقت کے بارے میں یہ امام ابوحنیفہ کی ترجمانی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ احرام نام ہے دل سے نیت کرنے اور زبان سے تلبیہ کہنے کا۔ جبکہ امام مالک اور امام احمد صرف دل سے نیت کرنے کو احرام کہتے ہیں۔ وہ اسے روزے پر قیاس کرتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ اسے نماز پر قیاس کرتے ہیں۔ احادیث میں احرام کے بارے میں اہلال پر زور دیا گیا ہے بلکہ احرام کے لیے تعبیر ہی اہلال کی آئی ہے اور اہلال کے معنے بلند آواز سے تلبیہ کہنے کے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ احرام کی اصلی روح تلبیہ ہے۔

۵۷۱۔ تو پھر اس کے لیے حج کی حالت میں نہ تو شہوت کا کام ہے نہ گناہ کی بات کرنی ہے اور نہ لڑائی جھگڑے کی بات۔ اس میں حج کا احرام باندھنے والے کے لیے کچھ منفی آداب و احکام

---

[1] افادات شیخ السند ص ۳۸

بیان کیے ہیں جن سے حالت احرام میں پرہیز کرنا لازم و واجب ہے ۔ احرام باندھنے کے بعد کن چیزوں سے پرہیز ضروری ہے وہ تین ہیں ، رفث ، فسوق اور جدال ۔
رفث ایک جامع لفظ ہے جس میں میاں بیوی کے جنسی تعلقات اور ان کے مقدمات حتیٰ کہ زبانی عورت سے اس موضوع پر کھلی گفتگو بھی داخل ہے ۔ محرم کے لیے حالتِ احرام میں یہ سب چیزیں حرام ہیں ۔
فسوق کے لغلی معنے نکلنے کے ہیں ۔ قرآن کی زبان میں عدول حکمی اور نافرمانی کو فسوق کہا جاتا ہے ۔ یہ اپنے عام معنے کے لحاظ سے سب گناہوں کو شامل ہے اور اسی لیے بعض اکابر نے عام معنے ہی مراد لیے ہیں ۔ چنانچہ ابن کثیر نے عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے فسوق کی تفسیر معاصی نقل کی ہے یعنی سارے گناہ اور نافرمانیاں ۔ یہی تفسیر عطاء ابن ابی رباح ، مجاہد ، طاؤس یمانی ، عکرمہ ، سعید بن جبیر ، محمد بن کعب ، حسن بصری ، قتادہ ابن دعامہ ، ابراہیم نخعی ، زہری ، ربیع ابن انس ، عطاء ابن یسار اور مقاتل سے منقول ہے ۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے نافع نے ایک بیان یہ نقل کیا ہے کہ فسوق سے مراد محظورات اور ممنوعات احرام کے خلاف اقدام ہے ۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ حالت احرام میں صرف ممنوعاتِ احرام سے بچنے کا اس میں مطالبہ ہے ۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں حرام ہیں وہ ہمیشہ ہی حرام ہیں ۔ باقی جو اگر جائز و مباح ہیں ان میں بھی بہت سی چیزوں سے حالتِ احرام میں دستبردار ہونا چاہیے ۔

محرماتِ احرام

جو چیزیں اصل میں گناہ نہیں مگر احرام کی حالت میں منع ہیں چھ ہیں ۔
۱ ۔ میاں بیوی کے جنسی تعلقات اور اس کے مقدمات و مبادی ۔
۲ ۔ بری جانوروں کا شکار خود کرنا یا کسی کو بتانا ۔
۳ ۔ بال یا ناخن کاٹنا ۔
۴ ۔ خوشبو کا استعمال ، یہ چاروں مرد و عورت دونوں کے لیے حرام ہیں ۔
۵ ۔ سلے ہوئے کپڑے پہننا ، یہ صرف مردوں کے لیے حرام ہے ۔
۶ ۔ سر اور چہرے کو ڈھانپنا ۔ امام اعظم اور امام مالک کے نزدیک چہرے کو ڈھانپنا عورت کے لیے بھی ناجائز ہے ۔

جدال کے معنے ایک دوسرے کو پچھاڑنے کے ہیں اس لیے سخت قسم کے جھگڑے کو جدال کہتے ہیں۔ یہ لفظ بہت عام ہے اور مفسرین قرآن نے مار پیٹ، ہاتھا پائی، زبانی حجت و تکرار حتیٰ کہ خادم کے ڈانٹنے کو ممنوعات میں شمار کیا ہے۔

عام معنے تو جدال کے یہی ہیں، کیونکہ حج کے موقعہ پر دُنیا کے گوشہ گوشہ کی آبادیاں کھنچ کر آتی ہیں، ہر قسم ہر عمر، ہر قماش، ہر مزاج کے لوگ ہوتے ہیں۔ بوڑھے بھی جوان بھی بچے بھی، بڑے تیز مزاج اور غصہ ور بھی، حریص و طامع بھی، پھر راہ اور سواری کے سلسلے میں طرح طرح کی تکلیفیں اور صعوبتیں درپیش آتی ہیں۔ بڑے حلیم بھی دامنِ صبر چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ رشک و منافقت، بدنظری و بدکاری، نزاع و جدال، کے مواقع قدم قدم پر ہوتے ہیں۔ اللہ سبحانہ نے رفث، فسوق اور جدال سب کی تصریحاً اور تاکیداً ممانعت کرکے کمزور بندوں کے حق میں انتظام فرمادیا۔

ان تینوں کی ممانعت سے نفسانی محرکات کے وہ تمام دروازے بند ہو جاتے ہیں جن سے انسان گناہ میں داخل ہوتا ہے۔ حج میں ان کی ممانعت کے بعض خاص وجوہ بھی ہیں۔

ایک وجہ یہ ہے کہ احرام کی پابندیوں کی وجہ سے ان چیزوں کے لیے نفس میں اکساہٹ بہت زیادہ ہو جاتی ہے۔ انسان کی یہ طبعی کمزوری ہے کہ جس چیز سے روک دیا جائے اس کی خواہش اس کے اندر بڑھ جاتی ہے اور شیطان اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ سفر کی حالت میں ہونے کی وجہ سے ان چیزوں کے مواقع بہت پیش آتے ہیں۔ آدمی اگر چوکنا نہ ہو تو ہر قدم پر فتنہ میں پڑ سکتا ہے۔

۴۷۵۔ اور یاد رکھو کہ تم جو بھی نیکی کروگے اللہ کے علم میں ہے۔ یعنی تم جو نیک کام کرتے ہو اللہ تعالیٰ اس سے باخبر ہے۔ چونکہ ہر خادم و غلام کی یہی خواہش ہوتی ہے۔ اس کی کارگزاری اور خدمت گزاری کا علم اس کے آقا کو حاصل ہو جائے تاکہ وہ خلوص انعام و اکرام کا مستحق ہو سکے[1]

حاجیوں کے اعمالِ خیر کی تشویق و رغبت کے لیے یہ بہترین و موثر یاد دہانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے عالمِ کل اور عالمِ جزئیات ہونے کا پورا پورا خیال رکھو۔ اہلِ جاہلیت کی طرح کہیں اس تذبذب میں نہ پڑ جانا کہ ہمارے فلاں فلاں عمل خیر کا صلہ ملے گا یا نہیں۔ علمِ الٰہی میں وہ آتے بھی پانے سے رہ گئے۔ مومن کے لیے تو بڑی سے بڑی ہمت بھی اسی عقیدہ کا استحضار پیدا کرسکتا ہے کہ خفی سے

---

[1] کشف الرحمٰن

خفی، باریک سے باریک نیکی بھی عالم الغیب کی نظر سے پوشیدہ نہیں[1]

۱۹۷۔ اور حج کرو تو اس کے سروسامان کی تیاری کر دو اور سب سے بہتر سروسامان تقویٰ ہے۔ایک غلط دستور کفر میں یہ بھی تھا کہ بغیر زادِ راہ خالی ہاتھ حج کو جانا ثواب سمجھتے اور اس کو توکل کہتے۔ اور وہاں جا کر ہر ایک سے مانگتے پھرتے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جن کو مقدور ہو وہ خرچ ہمراہ لے کر جائیں تاکہ خود تو سوال سے بچیں اور لوگوں کو پریشان نہ کریں[2]

توکل کی جھوٹی نمائش

مطلب یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں حج کے لیے زادِ راہ لے کر چلنے کو ایک دنیا دارانہ فعل سمجھا جاتا تھا۔ اور ایک مذہبی آدمی سے یہ توقع کی جاتی تھی کہ وہ خدا کے گھر کی طرف دنیا کا سامان لیے بغیر جائے گا۔ اس آیت میں ان کے اس غلط خیال کی تردید کی گئی ہے اور ان کو بتایا گیا ہے کہ زادِ راہ نہ لینا کوئی خوبی نہیں ہے۔ اصل خوبی خدا کا خوف اور اس کے احکام کی خلاف ورزی سے اجتناب اور زندگی کا پاکیزہ ہونا ہے۔ جو مسافر اپنے اخلاق درست نہیں رکھتا اور خدا سے بے خوف ہو کر بُرے اعمال کرتا ہے وہ اگر زادِ راہ ساتھ نہ لے کر محض ظاہر میں فقیری کی نمائش کرتا ہے تو اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اللہ اور خلق خدا دونوں کی نگاہ میں وہ ذلیل ہو گا اور اپنے اس مذہبی کام کی بھی توہین کرے گا جس کے لیے وہ سفر کر رہا ہے۔ لیکن اگر اس کے دل میں اللہ کا ڈر ہو اور اس کے اخلاق دُرست ہوں تو خدا کے ہاں بھی اس کی عزت ہو گی اور مخلوق بھی احترام کرے گی چاہے اس کا توشہ دان کھانے سے بھرا ہوا ہو۔

دراصل اس حکم کے ذریعے ان لوگوں کی اصلاح کی گئی ہے جو حج و عمرہ کے لیے بے سروسامانی کی حالت میں نکلتے ہیں اور دعویٰ یہ کرتے ہیں کہ ہم اللہ پر توکل کرتے ہیں۔ پھر راستہ میں بھیک مانگ کر رفقاء کو پریشان کرتے ہیں اور خود کو تکلیف میں ڈالتے ہیں۔ ان کو ہدایت کی گئی کہ سفرِ حج کے لیے ضروری سامان لے کر چلنا چاہیے۔ یہ توکل کے منافی نہیں ہے بلکہ توکل کی حقیقت یہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے دیے ہوئے اسباب و وسائل کو اپنی مقدور کے مطابق حاصل کرے پھر اللہ پر توکل کرے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے توکل کی یہی تفسیر منقول ہے۔ ترکِ اسباب کا نام توکل رکھنا

---

[1] ماجدی [2] افاداتِ شیخ الہند ص ۳۸

جہالت ہے۔[1]

اس قرآنی آیت کی قدر وہ لوگ کر سکتے ہیں جن کی جاہلی قوموں کی ذہنیت پر نظر ہو، خاص کر عرب جاہلیت کی تاریخ پر۔ آج بھی ہندوستان میں کتنی قومیں ہیں جو تیرتھ یاترا کے وقت گھر سے مفلس و تہیدست نکلنا ہی اپنی روحانیت کا کمال سمجھتے ہیں۔ راستہ میں مانگتے ہوئے جائیں گے۔ کوئی دوسرا انہیں کھلا پلا دیا کرے، یہ اپنے فقیر ہونے پر فخر کریں گے۔ اس قسم کے سارے تخیلات کو اسلام نے مٹا دیا اور حکم دیا کہ جب حج کے لیے گھر سے نکلو تو ضرورت کے مطابق روپیہ پیسہ لے کر نکلو۔ راستہ میں دوسروں پر بار بننے کی کوشش نہ کرو۔ اسلام ایسی رسوم کو جو جھوٹی اور نمائشی روحانیت پر مبنی ہوں، شخصی غیرت اور خودداری کے منافی ہوں اور پھر اجتماعی معاشیات پر خواہ مخواہ بوجھ ہوں گوارا نہیں کرتا۔ فقہاء نے اس آیت سے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اس آیت سے سفر حج میں زادِ راہ لینے کا وجوب معلوم ہو رہا ہے اور یہ بھی فقہاء نے اسی آیت کی روشنی میں بنایا ہے کہ یہ آیت ان توکل پیشہ صوفیوں کی تردید کر رہی ہے جو کسبِ معاش کو چھوڑ دیتے ہیں اور اسے کوئی بڑا روحانی کمال سمجھتے ہیں۔[2]

روحانی زادِ راہ

عام مفسرین کی رائے یہی ہے کہ آیت میں تزودوا سے حج کے لیے مادی زادِ راہ مراد ہے۔ ان کی رائے میں اس تاکید کی وجہ یہ پیش آئی کہ اکثر اہل عرب زادِ راہ کے بغیر حج کے لیے جاتے تھے اور اس طرح خود بھی زحمت اٹھاتے اور دوسروں کے لیے زحمت کا ذریعہ بنتے۔ اگرچہ یہ بات اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہے کہ حج کے لیے زادِ راہ مقدم ہے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے حج فرض ہی ان لوگوں پر کیا ہے جو ہر پہلو سے اس کے لیے استطاعت رکھتے ہوں لیکن یہ معنے لینا قرآن کی آیت کا مدلول اور مفہوم تو ہو سکتا ہے مگر منطوق نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عربی زبان میں فان کا لفظ جب اس طرح آتا ہے جس طرح اس آیت میں آیا ہے تو وہ اپنے ہی مضمون کی تعلیل کا کام دیتا ہے اگر تزودوا سے مراد مادی زادِ راہ ہوتا تو اس کے بعد اس کی تعلیل میں اسی کی وجہ بیان ہوتی لیکن یہاں جو وجہ بیان ہوئی ہے وہ ہے تقویٰ کی زادِ راہ۔

---

[1] معارف القرآن م ش [2] ماجدی

لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَإِذَآ أَفَضْتُم مِّنْ عَرَفَٰتٍ فَٱذْكُرُوا ٱللَّهَ عِندَ ٱلْمَشْعَرِ ٱلْحَرَامِ ۖ وَٱذْكُرُوهُ كَمَا هَدَىٰكُمْ وَإِن كُنتُم مِّن قَبْلِهِۦ لَمِنَ ٱلضَّآلِّينَ ۝ ثُمَّ أَفِيضُوا مِنْ حَيْثُ أَفَاضَ ٱلنَّاسُ وَٱسْتَغْفِرُوا ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝

(دیکھو) اس میں تمہارے لیے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ تم اعمالِ حج کے ساتھ اپنے پروردگار کے فضل کو بھی تلاش کرو[۵۵۴]۔ لہٰذا جب عرفات سے تمہاری روانگی ہو تو مزدلفہ میں اللہ کو یاد کرو[۵۵۵] اور اسی طرح یاد کرو جس طرح تمہیں اس نے یاد کرنے کا طریقہ بتایا ہے[۵۵۶]۔ اگرچہ تم اس سے پہلے راہِ حق سے بھٹک جانے والوں میں سے تھے[۵۵۷]۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ تم بھی اے اہلِ مکہ وہیں سے لوٹو جہاں سے لوگ لوٹتے ہیں[۵۵۸] اور اللہ سے اپنے گناہوں کی بخشش مانگو[۵۵۹]۔ بلاشبہ اللہ خطائیں بخشنے والا اور ہر حال میں رحمت کرنے والا ہے۔

اس فقرہ سے مناسبت بھی اسی کو ہے کہ تقویٰ ہی کی زاد کی تلقین کی جائے کیونکہ پہلی آیت میں کہا

گیا ہے کہ حاجی کو رذائل سے دامن بچا کر رکھنا چاہیے۔ یہ رذائل خواہ شہوانی ترغیبات ہوں یا فاسقانہ حرکات ہوں اور یا لڑائی جھگڑا ہو۔ اب اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ رذائل کے بجائے اس سفر میں فضائل کا زادِ راہ ہونا چاہیے۔ اعمالِ صالحہ، اخلاقِ حسنہ کا توشہ ہونا چاہیے۔ یہی ایک چیز ہے جس کے ذریعہ بندہ اپنے مولیٰ کی ناراضگی سے بچ سکتا ہے۔ اسی لیے آیت کو عقل کے نام پر تقویٰ کا مطالبہ کر کے ختم کر دیا گیا ہے۔ گویا بتایا گیا ہے کہ تقویٰ کے ذریعے روحانیت آتی ہے اور اسی کی راہ سے وہ نورانیت آتی ہے جس سے آدمی میں اللہ کے قوانین سے فائدہ اٹھانے کی اہلیت اور صلاحیت رونما ہوتی ہے۔

حج کے مقاصد

اس آیت میں اس اصل عظیم کا اعلان کیا گیا ہے کہ اسلامی زندگی کی راہ دنیوی معیشت اور دنیوی فلاح و ترقی کے منافی نہیں ہے بلکہ وہ ایک ایسی کامل زندگی پیدا کرنی چاہتا ہے جس میں دنیا و آخرت دونوں کی سعادتیں موجود ہوں۔ حج ایک عبادت ہے لیکن اس کا عبادت ہونا اس سے مانع نہیں کہ کاروبار دنیوی کا بھی فائدہ اٹھاؤ۔ مال و دولت اللہ کا فضل ہے۔ بس چاہیے کہ اللہ کے فضل کی تلاش میں رہو۔ قرآن نے ایک دوسرے موقعہ پر فرمایا ہے کہ حج سے روحانی فوائد کے ساتھ اجتماعی اور اقتصادی فوائد بھی وابستہ ہیں لیشھدوا منافع لھم حج اس لیے ہے کہ لوگ اپنے فوائد دیکھ لیں۔ سورۃ مائدہ میں حج کا ایک صریح مقصد تجارت اور حصولِ رزق بھی قرار دیا ہے۔ چنانچہ سورہ مائدہ میں ہے ولا آمین البیت الحرام یبتغون فضلاً من ربھم و رضوانا اور ان کو ستاؤ جو اس ادب والے گھر کے ارادہ سے جا رہے ہوں اپنے پروردگار کا فضل اور خوشنودی تلاش کرنے۔ قرآن پاک کے محاورے میں خدا کا فضل تلاش کرنے سے مقصود تجارت ہے۔ تجارت اور روزی کمانا بظاہر دنیا کا ایک کام معلوم ہوتا ہے اس لیے اسلام کے بعد بعض صحابہ نے اپنے اس خالص روحانی سفر میں تجارت کو شامل کرنا اچھا نہیں سمجھا۔ اسی شبہ کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے گویا یہ اٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے۔

یہ اندیشہ کہ یہ دنیا کا کام ہے جو روحانی سفر میں جائز نہیں ہے۔ درست نہ تھا کیونکہ اولاً طلبِ رزق ہر حال میں بجائے خود اسلام میں عبادت اور نیکی کا کام ہے ثانیاً یہ کہ حضرت ابراہیم کی دعا کی

بنا پر یہ خود حج کے مقاصد میں ہے کہ اس کے بغیر اس شہر کی آبادی، ترقی اور بقا ممکن نہیں یعنی حج کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ خانہ کعبہ کی حفاظت اور خدمت کے لیے اس شہر کی آبادی اور رونق قائم رہے جس کا بڑا ذریعہ تجارت ہے۔

حج کا بنیادی مقصد یادِ الٰہی، دُعا اور اللہ کی حمد میں مشغول ہونا ہے۔ اس آیت میں یادِ الٰہی کی مقدار کو بتانے کے لیے عرفات اور مشعرِ حرام کا ذکر کیا ہے۔

وقوفِ عرفات

عرفات میں نویں ذی الحجہ کو تمام حاجیوں کو ٹھہرنا اور زوالِ آفتاب سے لے کر غروبِ آفتاب تک یہاں دُعا اور اللہ کی حمد و ثنا میں مصروف رہنا پڑتا ہے اور اصل حج اسی کا نام ہے۔ یہاں کوسوں تک جہاں تک نظر کام کرتی ہے ملک ملک کے لوگ ایک طرز اور ایک لباس میں کھڑے ہو کر رو رو کر اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں اور خدا سے اپنا نیا عہد باندھتے ہیں۔ یہیں جبلِ رحمت کے پاس کھڑے ہو کر اسلام کا امیر تمام دُنیا کے آئے ہوئے حاجیوں کے سامنے خطبہ عام دیتا ہے اور ان کے فرائض سے آگاہ کرتا ہے۔ عرفات کے اس وقوف میں ایک طرف تو اسلام کی شان و شوکت کی عظیم الشان نمائش ہوتی ہے اور دوسری طرف یہ اجتماعِ عظیم روزِ حشر کی یاد دلاتا ہے۔ یہ اجتماع اور اس کا موثر بے نظیر منظر دلوں میں مغفرت اور رحمتِ الٰہی کی طلب کا طوفان انگیز جوش پیدا کرتا ہے اور اس میں اس طرح خود کھو یا جاتا ہے کہ زندگی بھر اس کی لذت باقی رہتی ہے۔

مشعرِ حرام کا وقوف

مزدلفہ میں مشعرِ حرام ہے۔ حج کا زمانہ بھیڑ بھاڑ اور دوڑ دھوپ کا ہوتا ہے۔ عرب مغرب کے بعد عرفات سے روانہ ہوتے تھے اسی حالت میں اگر منیٰ کو براہِ راست چلے جاتے تو راستہ کی خستگی سے چور چور ہو جاتے اسلام نے اس کو اس لیے باقی رکھا کہ یہاں ایک مسجد واقع ہے جس کو مشعرِ حرام کہتے ہیں اور یہ عبادت کا خاص مقام ہے۔ اس لیے عرفات سے شام کو لوٹ کر رات بھر یہاں قیام کرنا اور طلوعِ فجر کے بعد تھوڑی دیر عبادت کرنا ضروری قرار دیا۔

۴۷۵۔ اس میں تمہارے لیے کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ تم اعمالِ حج کے ساتھ اپنے پروردگار کے فضل کو بھی تلاش کرو۔ یعنی حج کے سفر میں اگر سوداگری بھی کرو تو گناہ نہیں بلکہ مباح ہے۔ لوگ

کو اس میں شبہ ہوا تھا کہ شاید تجارت کرنے سے حج میں نقصان آئے اب جس کا مقصود اصلی حج ہو اور اس کے ذیل میں تجارت بھی کرے تو اس کے ثواب میں نقصان نہ آئے گا[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ بھی قدیم عربوں کا ایک جاہلانہ تصور تھا کہ سفرِ حج کے دوران کسبِ معاش کے لیے کام کرنے کو بُرا سمجھتے تھے۔ کیونکہ ان کے نزدیک کسبِ معاش ایک دنیادارانہ فعل تھا اور حج جیسے ایک مذہبی کام کے دوران میں اس کا ارتکاب مذموم تھا۔ قرآن اس خیال کی تردید کرتا ہے اور انہیں بتاتا ہے کہ ایک خداپرست آدمی جب خدا کے قانون کا احترام ملحوظ رکھتے ہوئے اپنی معاش کے لیے جدوجہد کرتا ہے تو دراصل اپنے رب کا فضل تلاش کرتا ہے اور کوئی گناہ نہیں اگر وہ اپنے رب کی رضا کے لیے سفر کرتے ہوئے اس کا فضل بھی تلاش کرتا جائے[2]

بین الاقوامی سالانہ کانگریس

اسلام جس طرح فلاحِ اخروی کا ضامن ہے فلاحِ دنیوی کا بھی داعی ہے اور اس کی یہ جامعیت اس کی ہر عبادت سے بالکل عیاں ہے۔ وضو، نماز، نماز با جماعت، روزہ، زکوٰۃ ان سب کے ذریعے روحانی تربیت اور باطنی نورانیت کے ساتھ دنیوی، مادی، جسمانی، معاشی فائدوں اور مصلحتوں کی بھی خدمت لی گئی ہے۔ یہی اصول حج کے بارے میں بھی کام کر رہا ہے۔ حج کا منزل بمنزل سفر، بری اور بحری طویل سفر اور اُمت کے مختلف طبقوں کا مختلف گوشوں سے یہ عظیم الشان اجتماع ایک خشک عبادت اور محض ذکرِ الٰہی کے لیے نہیں ہے۔ انفرادی اور اجتماعی ہر قسم کے فوائد اس سے وابستہ ہیں۔ حج کے روحانی اسرار و حقائق تو اپنی جگہ ہیں لیکن اس بین الاقوامی کانگریس سے جو سیاسی، ملی، اجتماعی فائدے وابستہ ہیں اور اس بین الاقوامی سالانہ مارکیٹ سے جو مالی، تجارتی، معاشی فائدے حاصل ہو سکتے ہیں ان کا اندازہ اور اعتراف بیگانے تو بیگانے یگانے بھی بار ہا کر چکے ہیں۔ اس آیت میں خاص طور پر توجہ اس سفر کے معاشی و تجارتی پہلو پر دلائی ہے اور جو رکاوٹ ایک خالص دیندار شخص کو ان فوائد کے حاصل کرنے سے ہو سکتی ہے اسے دور کر دیا ہے[3]

آیت میں فضل سے مراد باتفاقِ مفسرین مال اور تجارتی نفع ہے۔ اس قسم کے معاشی فوائد کے لیے قرآن کے دوسرے مقامات پر بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ خدا کی حدود میں رہتے ہوئے

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۲۰۸ [2] تفہیم القرآن [3] ماجدی

اور اس کے حقوق ادا کرتے ہوئے بندہ جو معاشی فتوحات حاصل کرتا ہے وہ سب فضلِ رب میں داخل ہے[1]

اس آیت میں یادِ الٰہی سے پہلے اور قرآن کی دوسری آیات میں بھی اسی انداز سے حج کے موضوع پر معاشی اور تجارتی فوائد کا ذکر آیا۔

حج اور بین الملی تجارت

قرآن حکیم کا عام اندازِ خطاب یہ ہے کہ وہ جزئیات سے کسی قسم کا تعرض نہیں کرتا اس کی توجہ ہمیشہ اہم باتوں کی طرف ہوتی ہے۔ اس بنا پر اللہ سبحانہ نے جس قسم کی تجارت کی حج میں اجازت دی ہے اور اس کی ترغیب و حوصلہ افزائی کی ہے وہ عرب کی اقتصادی اور تمدنی زندگی میں ایک نئے باب کا اضافہ ہے۔ عرب اگرچہ ایک بادیہ نشین اور غیر متمدن قوم تھی تاہم معاش کی ضرورتوں نے اسے تمدن کی ایک عظیم الشان شاخ یعنی تجارت کی طرف ابتدا ہی سے متوجہ کر دیا تھا۔ قریش کا قافلہ عموماً شام وغیرہ کے اطراف میں مال لے کر جایا کرتا تھا۔ اور ان لوگوں نے وہاں کے رہنے والوں سے مستقل طور پر تجارتی تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ خود مکہ کے متصل عکاظ، ذوالمجاز وغیرہ متعدد بازار قائم تھے اور حج کے زمانے میں اچھی خاصی تجارتی منڈی بن جاتے تھے۔ اس لیے اہلِ عرب کو صرف تجارت کی طرف متوجہ کرنے کی چنداں ضرورت نہ تھی۔ لیکن اسلام جو عظیم الشان و عالمگیر مدنیت پیدا کرنا چاہتا تھا اس کی گرم بازاری کے لیے عکاظ، ذوالمجنہ، اور ذوالمجاز کی وسعت کافی نہ تھی۔ وہ دُنیا کی تمام متمدن قوموں کی طرح تجارت بین الاقوامی کا مستقل سلسلہ قائم کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ وہ دیکھ رہا تھا کہ عنقریب آفتابِ اسلام حجاز کی پہاڑیوں سے بلند ہو کر تمام بحر و بر پر چمکنے والا ہے۔ اس لیے اس آیت کریمہ میں جس "اقتصادی و تجارتی" فضل کی طرف اشارہ کیا ہے وہ ایک وسیع بین الملی تجارت کا قیام ہے ورنہ اہلِ عرب جس قسم کی تجارت کرتے تھے وہ تو ہر حال میں قائم رکھی جا سکتی تھی۔ البتہ بین الاقوامی تجارت کا سلسلہ بالکل قیامِ امن و بسطِ عدل و اجتماعِ عام پر موقوف تھا اس لیے جب کامل امن و امان قائم ہو گیا اور حج نے راستہ کے تمام نشیب و فراز ہموار کر دیے تو اس وقت اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کو تمدن کی اس منفعتِ عظیمہ کی ترغیب عام دی۔

---

[1] تدبر قرآن

وقوف عرفات

۵۷۵ - لہٰذا جب تمہاری عرفات سے روانگی ہو تو مزدلفہ میں اللہ کو یاد کرو۔ جس طرح اس نے تمہیں یاد کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔

حج کے اعمال تو بہت ہیں لیکن فرض تین ہی ہیں احرام پوشی، ۹ ذی الحجہ کو عرفات کی حاضری اور بیت اللہ کا طواف۔ ان تینوں میں بھی اہم ترین رکن بھی وقوفِ عرفات ہے۔ افضتم، افاضہ سے بنا ہے اور اس کے لفظی معنے انبوہ در انبوہ چلنے یا واپس ہونے کے ہیں۔ اصطلاح قانون میں افاضہ عرفات سے مزدلفہ جانے کو کہتے ہیں۔

عرفات مکہ مکرمہ سے جو سڑک مشرق کی جانب طائف کو جاتی ہے اس پر مکہ سے کوئی بارہ میل کے فاصلہ پر کئی میل رقبہ کا ایک لمبا چوڑا میدان ہے اور اس کا نام عرفات ہے۔ اس میدان میں ایک پہاڑی ہے جسے جبل رحمت کہتے ہیں۔ سال بھر یہ میدان سنسان پڑا رہتا ہے صرف ایک دن یعنی ۹ ذی الحجہ کو ساری کسر نکل جاتی ہے۔ اس روز یہ میدان انسانوں اور ان کی سواریوں سے کھچا کھچ بھر جاتا ہے۔ یہاں حاجی زوالِ آفتاب سے غروبِ آفتاب تک رہتے ہیں۔ اسی کا اصطلاحی نام وقوف ہے۔ یہی حاضری تمام اعمالِ حج کی جان ہے۔ اور یہ سارا وقت توبہ استغفار عبادت، انابت میں صرف ہونا چاہیے۔ یہاں ظہر اور عصر کی نماز کو بہ قاعدہ تقدیم مسجد نمرہ میں ملا کر پڑھا جاتا ہے۔[1]

عرفات کی مسجد نمرہ میں امام جمعہ کی طرح دو خطبے پڑھے اور ان کے درمیان خفیف جلسہ کرے، خطبوں سے فراغت کے بعد امام ظہر اور عصر کی نماز ظہر کے وقت میں پڑھاتے۔ اذان صرف ایک بار ہو لیکن اقامت دونوں نمازوں کے لیے الگ الگ کہی جاتے اور ظہر و عصر کے دونوں فرضوں کے درمیان کوئی سنت اور نفل نہ پڑھی جاتے۔ ان دو نمازوں کے ایک وقت میں پڑھنے کی صرف اس شخص کو اجازت ہے جو محرم ہو اور امام کے ساتھ نماز پڑھے۔ اگر امام حج کے ساتھ نماز نہیں پڑھی گئی بلکہ اپنے طور پر پڑھی تو پھر دونوں نمازوں کو جمع کرنا درست نہیں ہے۔ ظہر کو ظہر کے وقت میں اور عصر کو عصر کے وقت میں پڑھنا ہوگا۔ نماز سے فارغ ہو کر پھر موقف چلا جائے

---

[1] ماجدی

عرفات میں سوائے بطن عرفہ کے جہاں چاہے وقوف کرے اور اچھا یہ ہے کہ جبل رحمت کے پاس قبلہ رو کھڑے ہو کر تکبیر و تہلیل تلبیہ کرتا ہوا ہاتھ پھیلا کر خوب دل سے دعا مانگے اور بہت گڑگڑائے امام اس کے بعد خطبہ پڑھے۔ غروب آفتاب تک دعا و استغفار کا یہ سلسلہ جاری رہے۔ چوتھا کلمہ زیادہ پڑھا جائے۔ جب آفتاب غروب ہو جائے تو امام تمام لوگوں کے ساتھ عرفات سے انبوہ در انبوہ آہستگی سے مزدلفہ کی طرف روانہ ہو جائے۔ عرفات سے مزدلفہ کی طرف اسی روانگی کو قرآن نے افاضہ کہا ہے اذا افضتم من عرفات

مزدلفہ کا وقوف

عرفات سے غروب آفتاب کے بعد چل کر مشعر حرام میں قیام ہوتا ہے۔ اب اس میدان کا نام مزدلفہ ہے۔ اس میں دو پہاڑیاں ہیں۔ ان دو پہاڑیوں کے درمیانی جگہ کا نام مشعر حرام ہے، یہیں ایک مسجد بھی ہے۔ اس لیے مشعر حرام اس مسجد کو، اور پہاڑیوں کے درمیانی حصہ کو اور سارے مزدلفہ کو بھی کہتے ہیں۔ اس میدان میں رات گزارنا اور مغرب و عشا کو بقاعدہ تاخیر عشا کے وقت میں پڑھنا واجب ہے۔ یہ دو نمازیں بھی ایک اذان اور دو اقامتوں کے ساتھ پڑھی جاتی ہیں۔ اگرچہ یہاں پوری رات تسبیح و تہلیل میں گزاری جاتی ہے مگر خصوصیت کے ساتھ دو نمازوں کا جمع کرنا اس جگہ کی مخصوص عبادت ہے۔ دسویں ذی الحجہ کی رات مزدلفہ میں گزارنے کے بعد جب صبح ہو جائے تو یہاں خاص طور پر صبح کی نماز منہ اندھیرے اوّل وقت میں پڑھے۔ پھر سب لوگ وہاں وقوف کریں۔ اس میں نہایت الحاح و زاری کے ساتھ دعائیں کریں۔

مشعر حرام میں ذکر اللہ پر خاص طور پر زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں لوگ مزدلفہ میں جگہ جگہ آگ جلاتے، قصیدہ خوانی، داستان گوئی اور مفاخرت کی مجلسیں منعقد کرتے قرآن نے ان چیزوں کی جگہ ان کو ذکر اللہ، تسبیح و تہلیل کی ہدایت فرمائی کیونکہ اصلاً ان مقامات کی حاضری اسی مقصد کے لیے ہے۔ دراصل حج کے یہ ارکان ہمارے اندرونی احساسات، کیفیات اور تاثرات کے مظاہر اور تمثیلیں ہیں۔ اصل چیز تو اللہ کی یاد ہے اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اصلی اور صحیح حج کا نام صرف حج نہیں بلکہ حج مبرور رکھا ہے یعنی وہ حج جو سراپا نیکی ہو اور یہی حج ان تمام برکات اور رحمتوں کا خزانہ ہے جو عرفات کے سائلوں کے لیے خاص ہے حج کی روحانیت درحقیقت توبہ، انابت اور گزشتہ ضائع اور کھوئی ہوئی عمر کی تلافی کے عہد اور

آئندہ کے لیے اطاعت اور فرمانبرداری کے اعتراف اور اقرار کا نام ہے اور اس کا اشارہ خود دعائے ابراہیمی میں مذکور ہے۔

وارنا مناسکنا وتب علینا انک انت التواب الرحیم ط

اور ہم کو اپنے حج کے احکام سکھادے اور ہم پر رجوع فرما۔

حضرت ابراہیم کی یہ دعا بھی ان کی دوسری دعاؤں کی طرح قبول کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حج درحقیقت اس سرزمین میں آکر اپنی طاعت اور فرمانبرداری کا عہد و اقرار ہے۔ اور ان مقامات میں کھڑے ہو کر اور چل کر اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں اپنی سیاہ کاریوں سے توبہ کرنا اور اپنے روٹھے ہوئے مولا کو منانا ہے۔ اگرچہ توبہ سے ہر جگہ گناہ معاف ہو سکتا ہے اور اللہ کو ہر جگہ یاد کیا جا سکتا ہے اس کے لیے عرفات اور مشعر حرام کی کچھ تخصیص نہیں لیکن حج کے مشاعر مقامات اپنے گوناگوں تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ صدق، توبہ اور ذکرِ الٰہی کی نورانیت کے لیے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہیں اور مشاعر کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے دل میں ہے اس کا نفسیاتی اثر دل پر بڑا گہرا پڑتا ہے۔ وہ مقامات جہاں انبیاء علیہم السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول اور انوارِ الٰہی کی بارش ہوئی۔ وہ ماحول وہ فضا وہ تمام گنہ گاروں کی اجتماعی گریہ و زاری، فریاد و پکار اور آہ و نالہ، وہ قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد جہاں ابراہیم کو مناسکِ حج کی معرفت حاصل ہوئی جہاں حضرت ابراہیم نے اپنی اور اپنی اولاد کے لیے دعا مانگی۔ جہاں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اور اپنی امت کے لیے دعائیں مانگیں۔ وہی مشاعر، وہی مشاہد ہم گنہ گاروں کی دعاؤں کے لیے کس قدر موزوں اور مناسب ہیں کہ پتھر سے پتھر دل بھی ان مشاہد و مشاعر کے درمیان موم بننے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں۔ پس اسی جگہ یعنی مشعر حرام کے بارے میں فرمایا کہ مشعر حرام یعنی مزدلفہ میں اللہ کو یاد کرو۔

یادِ الٰہی کا قرآنی ضابطہ

۵۷۶۔ اور اسی طرح یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں یاد کرنے کا طریقہ بتایا ہے۔ یعنی کفار بھی پہلے اللہ کو یاد کرتے تھے مگر شرک کے ساتھ، وہ ذکر نہ چاہیے بلکہ توحید کے ساتھ جس کی تم کو ہدایت فرمائی ہے[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الہندؒ ص ۲۹

مطلب یہ ہے کہ جاہلیت کے زمانے میں اللہ کی عبادت کے ساتھ جن دوسرے مشرکانہ اور جاہلانہ افعال کی آمیزش کرتے تھے ان سب کو چھوڑ دو اور اب جو ہدایت اللہ نے تم کو بخشی ہے اس کے مطابق خالصۃً اللہ تعالیٰ کی عبادت کرو۔[1]

اس آیت میں یاد کرنے کی ہدایت کے ساتھ یہ ہدایت بھی فرمائی کہ یہ یادِ الٰہی اس طریقہ پر ہو جو اللہ نے نہیں بتائی اور سکھائی ہے یعنی تسبیح و تہلیل اور ذکر و عبادات کی صورت میں۔ اس طریقہ پر نہ ہو جو زمانۂ جاہلیت کی یادگار ہے۔ جس طرح اس زمانے میں لوگ عید وغیرہ کے موقعوں پر چراغاں کرتے تھے۔ پکنک کا پروگرام بناتے ہیں۔ مشاعروں کی مجلسیں منعقد کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ رقص و سرود کی محفلیں بھی کہیں کہیں آراستہ ہو جاتی ہیں۔[2] گویا یادِ الٰہی اپنے رسُول کے بتاتے ہوئے طریقے پر اپنے خود ساختہ اختراعی طریقوں سے بچ کر کرو۔ کیونکہ یہ حقیقت ہے کہ شرک و کفر سے بچ کر دین کے دائرے میں آجانے کے بعد سب سے بڑا خطرہ اہلِ ایمان کو شیطان کی جانب سے جو ہو سکتا ہے وہ اذکار میں بدعات و محدثات کا ہے۔ انسان اپنے دل سے طرح طرح کے طریقے عبادت و یادِ الٰہی کے لیے ایجاد کرتا رہتا ہے اور ان کو دین کا حصہ بنا لیتا ہے۔ حالانکہ دین وہ ہے جو نبوت اللہ کی جانب سے ما انزل اللہ یا ما ارادہ اللہ کی صورت میں پہنچائے۔ یہاں اگر اس کی تاکید ہے کہ برابر یادِ الٰہی میں لگے رہو تو دوسری طرف اس کی بھی صراحت ہے کہ اس یاد کے طریقے اپنے ایجاد کردہ نہ ہوں نبوت کے بتائے ہوتے ہوں۔[3]

اس آیت نے ہمیں ایک اصولی ضابطے سے روشناس کیا ہے یعنی یہ کہ ذکر اللہ اور عبادت میں بندہ خود مختار نہیں کہ اللہ کو جس طرح چاہے یاد کرے اور جس طرح چاہے اس کی عبادت کرے بلکہ ذکر اللہ کے کچھ آداب ہیں۔ ان کے مطابق کرنا ہی عبادت ہے۔ اس کے خلاف کرنا ناجائز ہے اور ان میں کمی بیشی یا مقدم و مؤخر کرنا، چاہے اس میں ذکر اللہ کی کچھ کثرت بھی ہو اللہ سبحانہ کو پسند نہیں ہے۔ نفلی عبادات اور صدقات میں جو لوگ بلا دلیلِ شرعی اپنی طرف سے کچھ خصوصیات اور اضافے کر لیتے ہیں اور ان کی پابندی کو ضروری سمجھ لیتے ہیں اچھا نہیں ہے۔ آیتِ قرآنی ان کے لیے تازیانۂ عبرت ہے۔

۵۷۷۔ اگرچہ تم اس سے پہلے راہِ حق سے بھٹک جانے والوں میں سے تھے ضال ہمیشہ گمراہ کے معنے میں نہیں آتا ناواقف کے معنے میں بھی آتا ہے۔ یہاں ضلالت دو معنے دے رہی ہے۔ ایک یہ کہ تم حضور انور کے آنے سے احکامِ الٰہی سے بے خبر اور ناواقف تھے۔ دوسرے یہ کہ حج کے احکام تو

---

[1] تفہیم القرآن [2] تدبر قرآن [3] ماجدی

تمہیں حضرت ابراہیم کی شریعت سے ورثہ میں ملے تھے مگر نبوت کا جادۂ عمل اور محسوس و مرئی نمونہ نہ ہونے کی وجہ سے تم راہِ حق سے بھٹک چکے تھے۔ اور یہی معنے یہاں زیادہ مناسب ہیں۔ یہ فقرہ گویا بطور امتنان ارشاد ہوا ہے جس طرح آلِ عمران اور سورۂ جمعہ میں حضورِ انور کی بعثت اور مقاصدِ بعثت بیان فرمانے کے بعد وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان مقامات کے اذکار و احکام اور اعمال[1] کے بارے میں نبوت کی جانب سے جو تمہاری رہنمائی ہو رہی ہے اس کی قدر کرو۔ اس لیے کہ اب تک تم ان مقامات میں خود رائی سے عمل کے پیمانے بنا رہے تھے اور اب نبوت عمل کا محسوس اور مرئی پیمانہ لے کر آئی ہے ان کو اپناؤ۔ تمہاری راہ ضلالت اور جہالت کی راہ تھی اور نبوت کی راہ ہدایت اور علم و بصیرت کی راہ ہے۔

عبادت میں اسلامی مساوات

۵۷۸۔ پھر یہ بھی ضروری ہے کہ تم بھی اے اہلِ مکہ وہیں سے لوٹو جہاں سے لوگ لوٹتے ہیں۔ زمانۂ کفر کی ایک غلطی یہ بھی تھی کہ قریشِ مکہ عرفات تک نہ جاتے، کہتے کہ عرفات حرم سے باہر ہے۔ بلکہ حرم کی حد یعنی مزدلفہ میں ٹھہر جاتے اور قریش کے سوا اور سب لوگ عرفات تک پہنچتے۔ پھر وہاں سے طواف کے لیے مکہ کو واپس آتے اس لیے فرمادیا کہ جہاں سے سب لوگ طواف کو آئیں تم بھی وہیں جا کر لوٹو یعنی عرفات سے[1]

قرینہ دلیل ہے کہ یہاں قریش سے خطاب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مناسکِ حج کے بارے میں جو پابندیاں سب پر ہیں بالکل وہی پابندیاں قریش پر ہیں اس لیے جس طرح دوسرے لوگ عرفات جاتے ہیں اور وہاں سے لوٹتے ہیں اسی طرح تم بھی عرفات جا کر لوٹا کرو۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ قریش زمانۂ جاہلیت میں حج کے موقع پر خاص اپنے لیے عرفات کی حاضری کو ضروری نہیں سمجھتے تھے صرف مزدلفہ تک جاتے اور وہیں سے لوٹ آتے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ بیت اللہ کے مجاور ہیں اس لیے ان کے لیے حدودِ حرم سے نکلنا مناسب نہیں[2]

دراصل حضرت ابراہیم و اسماعیل کے زمانے سے عرب کا معروف طریقۂ حج یہ تھا کہ ۹ ذی الحجہ کو منیٰ سے عرفات جاتے اور رات کو وہاں سے پلٹ کر مزدلفہ میں ٹھہرتے مگر بعد میں جب قریش کی مذہبی

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۲۹　[2] تدبرِ قرآن

اجارہ داری قائم ہوگئی تو انہوں نے کہا کہ ہم اہلِ حرم ہیں۔ ہمارے مرتبہ سے یہ بات فروتر ہے کہ عام لوگوں کے ساتھ عرفات تک جائیں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے لیے یہ شانِ امتیاز قائم کی کہ مزدلفہ جا کر پلٹ آتے۔ اور عام لوگوں کو عرفات تک جانے دیتے۔ پھر یہی امتیاز بنی خزاعہ اور بنی کنانہ اور ان دوسرے قبیلوں کو بھی حاصل ہوگیا۔ جن کے ساتھ قریش کے شادی بیاہ کے تعلقات تھے۔ آخر کار نوبت باینجا رسید کہ جو قبیلے قریش کے حلیف تھے ان کی شان بھی عربوں سے اونچی ہوگئی اور انہوں نے عرفات جانا چھوڑ دیا۔ اسی فخر و غرور کا بت اس آیت میں توڑا گیا ہے۔

آیت کا خطاب خاص اگرچہ قریش اور اُن کے رشتہ دار اور حلیف قبائل کی طرف ہے لیکن خطاباً ان سب کی طرف ہے جو آئندہ کبھی اس قسم کے امتیازات اپنے لیے مخصوص کرنا چاہیں۔ ان کو حکم دیا جا رہا ہے کہ اور سب لوگ جہاں تک جاتے ہیں ان کے ہمراہ جاؤ، انہی کے ساتھ ٹھہرو۔ انہی کے ساتھ پلٹو۔ اور اب تک جاہلیت کی بنا پر سنتِ ابراہیمی کی جو خلاف ورزی کرتے رہے اس پر اللہ سے معافی مانگو۔[1]

اس ارشادِ ربانی سے انسانی معاشرت کے لیے ایک کارآمد اور مفید اُصول معلوم ہوا کہ رہن سہن، قیام و مقام میں بڑوں کو چھوٹوں سے ممتاز ہو کر نہ رہنا چاہیے بلکہ مل جل کر رہنا چاہیے۔ اس سے باہمی اخوت، بھائی چارہ، ہمدردی اور محبت پروان چڑھتی ہے۔ امیر و غریب کی تفریق مٹتی ہے۔ مزدور اور سرمایہ دار کی جنگ ختم ہوتی ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آخری حجۃ الوداع کے خطبہ میں اس کو خوب واضح فرمادیا کہ کسی عربی کو عجمی پر، گورے کو کالے پر کوئی فضیلت نہیں۔ مدارِ فضیلت تقویٰ اور اطاعتِ الٰہی ہے۔[2]

۹۵۷۔ اور اللہ سے اپنی بخشش کی دُعا مانگو۔ بلاشبہ اللہ خطائیں بخشنے والا اور ہر حال میں رحمت کرنے والا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے یہاں یہ بات بڑی لطیف لکھی ہے کہ اللہ سبحانہٗ عبادت کی بجا آوری کے بعد اکثر و بیشتر استغفار کا حکم دیتا ہے۔ چنانچہ نماز سے فراغت کے بعد استغفار کا ذکر صحیح مسلم میں ہے حافظ ابن جریر نے اس موقعہ پر عباس بن مرداس کی وہ حدیث پیش کی ہے جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عرفات میں غروبِ آفتاب سے پہلے اُمت کے لیے استغفار کا ذکر ہے۔

حدیث صحیح میں حضرت عائشہ صدیقہؓ سے روایت ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں یوم عرفہ

---

[1] تفہیم القرآن [2] معارف قرآن م ش

فَإِذَا قَضَيْتُمْ مَّنَاسِكَكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ
أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۗ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا وَمَا
لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۝ وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي
الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ النصف
أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا ۚ وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۝
وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ
فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ وَمَن تَأَخَّرَ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ ۗ وَاتَّقُوا اللَّهَ
وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝

پھر جب تم مناسک حج پورے کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جیسے تم پہلے
اپنے باپ دادا کو یاد کرتے رہے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ۔ لوگوں میں
کچھ ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی ہے اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا
عطا کر اور ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اور کچھ
ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا
میں بھی خیر و خوبی عطا کر اور آخرت میں بھی خیر و خوبی عطا کر اور ہمیں

دوزخ کے عذاب سے بچا۔ یہی لوگ ہیں[۵۸۳] جن کو ان کے کیے کا حصہ ملے گا اور اللہ بڑی جلدی حساب چکانے والا ہے۔ اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔[۵۸۴] لہٰذا جو دو دن ہی میں جلدی چل دیا اس پر کوئی گناہ نہیں۔ اور جو دو دن بعد ٹھہرا رہا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں۔[۵۸۵] یہ اس شخص کے لیے ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین مانو کہ تم کو اس کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔[۵۸۶]

سے زیادہ بندے آگ سے آزاد کیے جاتے ہیں۔ حج کا بیان جہاں سے شروع ہوا ہے دیکھتے آئیے تزکیۂ قلب کا کس درجہ قدم قدم پر اہتمام ہے۔ حرم شریف نہیں حدودِ حرم بھی ابھی منزلوں فاصلہ پر ہیں کہ ساری عمر کا مانوس مالوف لباس بدن سے اتر گیا اور اب نہ سر پر ٹوپی ہے نہ کسی قسم کی پگڑی وعمامہ، جسم پر نہ شیروانی ہے نہ کوٹ، تہ بند نہ قمیص، شاہ وگدا، رئیس ورعیت، حکام وعوام سب کے سب دو دو چادروں میں ملبوس، پھر احرام پہنتے ہی بہ چیزیں حرام تھیں ان کا ذکر ہی نہیں۔ جو ہمیشہ حلال تھیں اور فی نفسہٖ جائز ہیں ایک خاصی طویل مدت کے لیے ممنوع۔ کتنی ہی مرغوبات مالوفات سے اس عرصہ میں دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ یہ بھی کافی نہیں گھڑی گھڑی تلبیہ کہتے رہو۔ اللہ کے دربار میں حاضری کی صدائیں لگاتے رہو، مسلسل ذکرِ الٰہی کرتے ہو۔ اب حکم مل رہا ہے کہ خطاؤں، گناہوں، سیہ کاریوں کو یاد کر کے ان کی معافی مانگو۔ اتنے پاکیزہ، اتنے ستھرے، اس قدر اصلاحی اجتماع سے دنیا جہان کے میلوں ٹھیلوں، بت پرستانہ، اوہام پرستانہ، ہوس پرستانہ تہواروں کی کوئی بھی مناسبت ہے؟

کوئی نسبت بھی ان آنکھوں سے ہے پیمانہ کو[۱]

---

[۱] ماجدی

تکمیلِ حج

قریش نے اجارہ داری کے باعث جو امتیازات قائم کر رکھے تھے ان کو مٹا دیا گیا اور تمام انسانوں کے ساتھ ان کو میدانِ عرفات کے ایک گوشہ میں کھڑا کر دیا گیا۔ چونکہ حج کی فرضیت دوسری عبادات سے قطعی مختلف تھی۔ عام اہلِ عرب نماز کے اوقات ارکان اور خصوصیات سے ناواقف تھے۔ زکوٰۃ ان میں سرے سے موجود نہ تھی، روزہ بھی ان کے یہاں کوئی اہمیت کی چیز نہ تھی اس لیے ان سب عبادات کی تعلیم تدریجاً دی گئی اور عملی فرضیت تک ان کو مختلف منزلیں طے کرنی پڑیں۔ لیکن حج کا معاملہ اس سے بالکل مختلف تھا۔ یہ عرب کا ایک ایسا قومی شعار تھا جس کے تمام اصول وارکان پہلے سے موجود تھے صرف ان کا محل اور طریقہ استعمال تبدیل ہو گیا تھا۔ یا ان میں بعض مشرکانہ رسوم داخل ہو گئے تھے۔ اس لیے اسلام نے حج کے بارے میں تدریج سے کام نہیں لیا۔ اسلام نے ان مفاسد کی اصلاح کر کے حج کا اعلان کر دیا۔

ہر عبادت کی اصلی غرض و غایت ذکرِ الٰہی، طلبِ مغفرت اور اعلائے کلمۃ اللہ ہے لیکن اہلِ عرب نے حج کو ذاتی و خاندانی نام و نمود کا ذریعہ بنا لیا تھا۔ چنانچہ جب تمام مناسکِ حج سے فارغ ہو چکتے۔ تو تمام قبائل منیٰ میں آ کر قیام کرتے تھے۔ مفاخرت عرب کا ایک قومی نشان تھا۔ اور اس مجمع عام سے بڑھ کر اس کے لیے کوئی موقع نہ ملتا تھا۔ اس بنا پر ہر قبیلہ ذکرِ الٰہی کی جگہ اپنے اپنے آباؤ اجداد کے کارنامے اور محاسن بیان کرتا تھا۔ دراصل عرب کے پاس ایسا کوئی پیغام تو موجود نہ تھا جو ساری انسانیت کو اپیل کر سکے اس لیے وہ اپنی زبان دانی اور فصاحتِ لسانی کا سارا زور ایک دوسرے پر فخر کرنے میں صرف کیا کرتے تھے جب اسلام آیا تو ان کو ایک عالمگیر انسانی فلاح کا پروگرام میسر آیا اور قرآن نے ان کو ہدایت کی کہ ایامِ حج کے بعد بجائے اپنے باپ دادوں کے کارناموں پر فخر کرنے کے اللہ کو یاد کریں اور اس مقام کو قوموں اور خاندانوں کے مفاخرت کے بجائے اہلِ ایمان کے باہمی تعارف، محبت، مساوات و یکجہتی کا مقام بنائیں۔ دین اور دُنیا کے معاملہ میں دُنیا کی عالمگیر گمراہی یہ ہے کہ یا تو افراط میں پڑ گئے ہیں، یا تفریط میں اور راہِ اعتدال گم ہو گئی ہے یعنی یا تو دُنیا کا انہماک اس درجہ بڑھ جاتا ہے کہ آخرت سے یک قلم بے پروا ہو جاتے ہیں، یا آخرت کے استغراق میں اتنے دور نکل جاتے ہیں کہ ترکِ دُنیا اور رہبانیت کا دم بھرنے لگتے ہیں۔ لیکن دینِ حق کی راہ میں ہر گوشہ عمل کی طرح یہاں بھی اعتدال کی راہ ہے۔ اور صحیح زندگی اس کی زندگی ہے جو کہتا ہے خدایا میں دُنیا اور آخرت دونوں کی سعادتیں چاہتا ہوں۔

۵۸۰۔ پھر جب تم مناسک حج پورے کر چکو تو اللہ کو یاد کرو جیسے تم پہلے اپنے باپ دادا کو یاد کرتے تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔ یعنی دسویں ذی الحجہ کو جب حج کے افعال رمی جمرات، ذبح قربانی، سر منڈانے، طواف کعبہ اور سعی بین الصفا والمروہ سے فراغت پا چکو تو زمانہ قیام منیٰ میں اللہ کا ذکر کرو جیسے کفر کے زمانہ میں اپنے باپ دادا کا ذکر کرتے تھے۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ ذکر کرنا چاہیے۔ ان کا قدیم دستور تھا کہ حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں تین روز قیام کرتے اور بازار لگاتے اور اپنے باپ دادا کی بڑائی اور فضائل بیان کیا کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے روک دیا اور فرمایا کہ ان دنوں میں اللہ کی بڑائی بیان کرو[1]

مطلب یہ ہے کہ مناسک حج سے فراغت کے بعد لوگوں پر تفریحات اور دلچسپیوں کا موڈ طاری ہوتا تھا اور شعر و شاعری اور مفاخرت کی مجلسیں منعقد ہوتی تھیں۔ خصوصاً قیام منیٰ کے دن تو ان چیزوں ہی کے لیے خاص ہو گئے تھے۔ شعراء اور خطباء اپنے اپنے قبیلوں اور اپنے آباؤ اجداد کے مفاخر نظم و نثر میں بیان کرتے، طلاقت لسانی سے ایک دوسرے پر فوقیت لے جانے کی کوشش کرتے۔ قرآن نے اس لغویت کی بھی اصلاح کی اور اس کی جگہ اس سے زیادہ اہتمام اور اس سے زیادہ جوش و خروش کے ساتھ یادِ الٰہی میں مشغول رہنے کی ہدایت کی[2]

قومی عظمت، قومی خودداری، نسلی مفاخرت جس طرح جدید جاہلی تہذیب کا عنصر ہیں، عرب کے دینِ جاہلی کا بھی رکن اعظم تھے۔ عرب جب منیٰ میں جمع ہوتے تو ہر ہر قبیلہ اپنے قبائل کی جے پکارتا اور اپنے بزرگوں کے مفاخر و مناقب کے پرزور بیان سے دلوں کو گرماتا۔ کذکرکم آباءکم میں مسلمانوں کو حکم دیا جا رہا ہے کہ یہی جوش و خروش تم اللہ کے ذکر میں دکھاؤ۔ تمہاری نہ کوئی قوم ہے نہ کوئی نسل، نہ تمہارا کوئی وطن، تم سب ان کے بدلے اللہ سبحانہٗ کی عظمت کو دلوں میں بٹھاؤ اور اللہ کا نام زبان پر لاؤ۔ آیت میں لفظ اَوْ یہاں تخییر کے لیے نہیں بلکہ ترقی کا مفہوم دے رہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے ساتھ ربط و تعلق کم از کم اس درجہ کا تو ہو جتنا اپنے خاندان، اپنے قبیلہ اپنی قوم کے ساتھ رکھتے ہو بلکہ بہتر یہ ہے کہ اس سے بھی کہیں زیادہ ہو۔ علمائے نحو کو اَوْ اشدّ ذکرا کی ترکیب میں بڑی دشواریاں پیش آ رہی ہیں اور انہوں نے یہاں بڑی بڑی موشگافیاں کی ہیں۔ وہ حیران ہیں کہ اس کا عطف کیسے کیا جاتے۔ حالانکہ مطلب بالکل واضح ہے کہ صرف اتنا

---

[1] افادات شیخ الهند　[2] تدبر قرآن

ہی اللہ کو یاد نہ کرو جتنا باپ دادا کو کرتے ہو بلکہ اس سے بھی زیادہ یاد کرو۔ قرآن کے اس بلاغت آمیز ایجاز کی داد صرف اربابِ ذوق دے سکتے ہیں۔ اس موقع پر ابوبکر ابن العربی نے یہ بات بہت پتے کی لکھی ہے کہ یہ بڑی عجیب بات ہے کہ نحویوں کو کسی دیہاتی عربی کا کوئی شعر مل جاتا ہے تو وہ خوشی سے پھولے نہیں سماتے اور اس کو قاعدہ بنا لیتے ہیں۔ اور اگر قرآنی آیت کا کوئی پیوند ان کے معروف قواعد کے خلاف ان کو نظر آجاتا ہے تو ان کی ہوائیاں اڑ جاتی ہیں اور چاہتے ہیں کہ دیہاتیوں کی زبان کی وجہ سے قرآن میں تاویلات کریں۔

۵۸۱۔ لوگوں میں کچھ ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی ہے اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں عطا کر اور ان کے لیے آخرت میں حصہ نہیں ہے۔

اللہ کو یاد کرنے والوں کی قسمیں

پہلے یہ فرمایا تھا کہ اللہ کو یاد کرو اور دوں کو مت کرو۔ اب یہ بتلایا جاتا ہے کہ اللہ کو یاد کرنے والے اور اس سے دعا مانگنے والے بھی دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن کا مطلوب صرف دنیا ہے۔ ان کی دعا یہی ہے کہ ہم کو جو کچھ دولت عزت وغیرہ دی جائے دنیا ہی میں دے دی جائے۔ سو یہ لوگ تو آخرت کی نعمتوں سے بے بہرہ ہیں۔ دوسرے وہ جو طالب آخرت ہیں جو دنیا کی خوبی یعنی توفیق بندگی وغیرہ اور آخرت کی خوبی یعنی ثواب و رحمت و جنت دونوں کی طلب کرتے ہیں سو ایسوں کو آخرت میں ان کے حج اور دعا جملہ حسنات سے پورا حصہ ملے گا۔[1]

اللہ کو صرف الہ المعاش بنانے والے

دنیا میں ایسی قومیں بھی ہیں جو خدا کی قائل ہیں اور اسے معبود بھی سمجھتی ہیں لیکن حشر و نشر، جزا اور سزا کی قائل نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کی دعائیں، تمنائیں، قدریں اسی مادی دنیا کی ترقیات تک محدود رہتی ہیں۔ مشرکین عرب بھی اسی قسم کے عقیدے رکھتے تھے۔ اور یہ لوگ جب بھی دعا مانگتے تو تمامتر سامانِ دنیوی اور دشمن پر فتح و نصرت کی دعا کرتے اور یہی کہتے آتنا فی الدنیا اور اس میں بھی حسنۃ نہ کہتے کیونکہ دنیوی اغراض کی سرشاریاں اس درجہ ان پر غالب

[1] افاداتِ شیخ الہند

ہوتی نہیں کہ ان کو اس کی پروا ہی نہ تھی کہ دنیا حسنہ ہو یا سیئہ۔ بس اس دُھن میں رہتے کہ دُنیا ملے خواہ کیسی ملے اور کسی راہ سے ملے۔ یہ گویا اشارا ہے ان لوگوں کی طرف جن کے دل و دماغ کے ہر گوشے پر محبتِ دُنیا کا غلبہ ہوتا ہے اور اس غلبہ کی وجہ سے وہ ہر جگہ اسی چیز پر نگاہ رکھتے ہیں جو ان کے دل میں سرفہرست ہوتی ہے۔ یہاں تک کہ اگر انہیں حج جیسی عظیم عبادت کا موقعہ بھی نصیب ہوتا ہے تو اس میں قبولیت دُعا کے ہر موقع پر خدا سے اپنی دنیوی آرزوؤں ہی کی تکمیل کے لیے دُعا کرتے ہیں کتنے لوگ ہیں جو اپنے کسی نہ کسی دنیوی مقصد کے لیے حج کرتے ہیں وہ دُعا کی قبولیت کے ہر مقام پر اپنی وہی درخواست پیش کرتے ہیں جو ان کے دل میں دنیا سے متعلق غالب ہوتی ہے [1]

اس آیت میں اُن مسلمانوں کے لیے بڑی عبرت ہے جو موسم حج اور مقامات مقدسہ میں بھی دُعاؤں میں اپنی اغراضِ دنیویہ کو ترجیح دیتے ہیں اور بیشتر اوقات انہی میں صرف کرتے ہیں۔ اور اگر ہمارے حالات کا جائزہ لیا جائے تو ثابت ہوگا کہ بہت سے دولت مند لوگ یہاں بھی جو وظائف اور دُعائیں کرتے ہیں یا بزرگوں سے کراتے ہیں ان میں بکثرت ایسے ہیں جن کی غرض ان تمام وظائف اور ادعیہ سے صرف دولت کی ترقی، تجارت میں برکت، اغراضِ دنیویہ میں کامیابی کے سوا کچھ نہیں ہوتی۔ وہ وظائف اور نوافل اگر پڑھتے ہیں تو صرف اس لیے کہ معاشی مشکلات حل ہو جائیں اور اپنے تئیں اس خوش فہمی میں ہیں کہ ہم بہت عبادت گزار ہیں۔ اور بہت سے زندہ بزرگوں کے پاس جاتے ہیں اور بہت سے وفات یافتہ اولیاء اللہ کی قبور پر جاتے ہیں اور اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی دُعا اور توجہ سے معاشی مشکلات دُور ہوں، آفاتِ دُنیا سے گلو خلاصی ہو۔ کاروبار میں برکت ہو، ایسے لوگوں کے لیے اس آیت میں خاص عبرت ہے [2]

گویا ان کے خیال میں عبادت کا سارا نظام صرف معاشی صلاح و فلاح، بقاؤ ارتقاء کا ذریعہ ہے۔ یقیناً یہ غلطی اسی قسم کی غلطی ہوگی جس میں مسلمان آج اللہ سبحانہٗ سے معاشی تعلقات توڑ لینے کی وجہ سے مبتلا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایسا نظامِ حیات جامع نظامِ حیات نہیں ہو سکتا جس میں انسان کے لامحدود منازلِ زندگی کو صرف بطنِ مادر اور شکمِ قبر کے درمیانی عرصہ تک محدود کر دیا جائے یا یوں کہیے کہ انسانیت کا سارا زور چند اُلجھے ہوئے سانسوں کے سلجھانے پر صرف کر دیا جائے۔ اس تنگ خیالی، تنگ دلی، تنگ نظری کی اسلامی نظامِ حیات میں تو کیا گنجائش نکل سکتی ہے۔

---

[1] ماجدی، تدبر قرآن ملخصاً [2] معارف القرآن م ش

فکر و نظر کے غیر روحانی نظاموں میں بھی آدمی کی بلند فطرت سیال ذہنیت اس کو برداشت کرنے کو تیار نہیں ہے ۔ قرآنی آیت

قل ھل ننبئکم بالاخسرین اعمالا ۱ الذین ضل سعیھم فی الحیاۃ الدنیا وھم یحسبون انھم یحسنون صنعا

فرما دیجئے ، کیا ہم تمہیں بتادیں کہ کاموں کے حساب سے خسارے میں کون ہیں ؟ یہ وہی لوگ ہیں جن کی کوشش دُنیا کی زندگی میں گُم ہو گئی ۔ حالانکہ وہ خیال کر رہے ہیں کہ اچھا کام کر رہے ہیں ۔

میں ارشاد ہوا ہے کہ سعی و عمل جدو جہد میں سب سے زیادہ محروم ، کوتاہ بخت ، نادان زدہ ، دیوالیہ اور کون ہو سکتا ہے جس نے خلافتی توانائیوں اور نیابتی صلاحیتوں کو صرف دُنیا کی زندگی کے تنگ دائرہ تک محدود کر دیا اور اسی کمترین زندگی پر خوش ہو کر اطمینان کا سانس لے رہا ہو ۔ اس طرح پست زندگی کے شکنجوں میں دب کر اپنی روحانی موت کو طمانیت اور سکینت سمجھ بیٹھا ۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی ۔

بلا شبہ جب ہم اس معاشی دُنیا میں ہیں تو یقیناً ہمیں اس کی بھی ضرورت ہے کہ ہم اللہ کو الہ المعاش بنائیں ۔ لیکن اس کے معنے یہ کب ہیں کہ معاد کی حد تک ہم ناخدا شناس اور خدا فراموش ہو جائیں ۔ یہ کتنی بڑی کور بختی ہوگی کہ جس کے پاس الاولی اور ثواب الدنیا کے ساتھ الاخرہ اور ثواب الاخرہ بھی ہے ۔ اپنی اخروی زندگی میں باوجود ضرورت کے اللہ سے بیگانے ہو جائیں ۔ ایسا دیوانہ کون ہوگا جو معاشی ضرورتوں میں تو اللہ کو الہ بنانے سے نہ شرماتے لیکن آخرت کی ضرورتوں کے لیے اسی اللہ کو الہ بنانے اور اُس کے آگے گڑ گڑانے ، التجا و زاری کرنے میں اپنی ہتک محسوس کرے ۔ اگر قرآن نے اس کے متعلق یہ فرما کر فمنھم من یقول ربنا اتنا یہ اعلان کیا ہے نہیں بلکہ یہ دھمکی ہے مالہ فی الاخرۃ من خلاق آخرت میں اس کا کوئی حصہ نہیں تو آپ ہی بتائیے کہ ایسا شخص اس کے علاوہ اور کس چیز کا مستحق ہے ۔ صرف یہی نہیں کہ ان تنگ نظروں اور کوتاہ بینوں کے لیے آخرت میں کچھ نہیں ہے بلکہ یہ بھی فرما دیا کہ

جو فائدہ اسی دنیا میں چاہتا ہے تو ہم دیتے ہیں جلدی جتنا دینا چاہیں اسی دنیا میں پھر آخر کار اس کے لیے جہنم ہے ۔

وہ لوگ جو آخرت سے بے پروا ہو کر اللہ سے محض الہ المعاش بنانے کا رشتہ رکھتے ہیں گویا دو تعلقوں میں سے صرف ایک تعلق کو تھام کر دوسرے سے کنارہ کشی کر لیتے ہیں ۔ اور یوں ایک

کنارے پر بیٹھ کر صرف دنیوی زندگی کی کامیابیوں کے لیے اس کی عبادت کرتے ہیں۔ نمازیں بھی اس لیے پڑھتے ہیں، تلاوت بھی اس لیے کرتے ہیں۔ خیر و خیرات کی مدوں میں بھی اسی لیے چندے اور صدقے دیتے ہیں کہ ان کی نوکری برقرار رہے۔ ان پر ترقیوں کی راہیں کھل جائیں، ان کی تجارت میں فروغ ہو، فصل پوری ہاتھ لگے، بال بچوں سے گود بھری رہے، گھر کا اقبال اونچا ہو، اعزاز بڑھے اور بس۔

جادۂ اعتدال

۵۸۲۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں جن کی دعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں خیر و خوبی عطا کر، اور آخرت میں خیر و خوبی عطا کر اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا۔ یہ اشارہ انسانیت کے پسندیدہ طبقہ یعنی اہلِ ایمان کی طرف ہے مومنین کی دعائیں، مناجاتیں، آرزوئیں، دنیا و آخرت دونوں کی فلاح و بہبود کی جامع ہوتی ہیں۔ حسنۃ کے بارے میں مفسرین قرآن میں اختلاف ہے۔ تندرستی، فراغت، نیک بیوی، نیک اولاد، حلال مال، علم نافع، عبادت اور طاعت سب کو ہی اس کا مصداق بتایا گیا ہے۔ لیکن لفظ حسنہ خود صفت ہے اس کا موصوف محذوف ہے اور اچھا یہ ہے کہ اس کا موصوف حیاۃ ہو حیاۃً حسنۃً بہترین اور اچھی زندگی۔ اچھی زندگی میں وہ سب چیزیں داخل ہیں جن کو حسنہ کا مصداق بتایا گیا ہے اور اس میں ہر قسم کی خیر و خوبی آگئی گویا خلاصہ کے طور پر دنیا میں حسنہ اگر توفیقِ خیر ہے تو آخرت میں ثمرہ خیر ہے۔ دنیا اور آخرت دونوں میں اچھی زندگی ایمان کی منزلِ مقصود ہے۔ اس معنے کے اعتبار سے اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی ایک مسلمان کے لیے الہ المعاش بھی ہے اور الہ المعاد بھی۔ اس لیے ایک مسلمان کا صحیح دینی مقام یہی ہے کہ الہ المعاش ہونے کے ساتھ جو ذات الہ المعاد بھی ہے اسی کی بارگاہ میں سر جھکاتے اور کہے کہ اے ہمارے مالک ہمیں دنیا میں خیر و خوبی دے اور آخرت میں خیر و خوبی دے اور آخرت میں ہمیں دوزخ سے بچا۔ ایسی جامع ہمہ گیر دعا کی نظیر سے ادیان و ملل کے صحیفے خالی ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خود اس دعا کی کثرت کرتے تھے۔ مال، اولاد، صحت، اطمینان وغیرہ جو چیزیں بھی تحصیلِ خیر میں معین و مددگار ہو سکتی ہیں۔ خواہ بظاہر کیسی ہی دنیوی اور مادی ہوں سب مومن کا مقصود اور مطلوب بن سکتی ہیں۔ البتہ خود دنیا ہرگز کسی مومن کا مدعا اور مقصود نہیں ہو سکتی۔ آیت میں اصل زور حسنہ پر ہے خواہ یہ کہیں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ ہمیں تو اللہ کی بارگاہ

سے صرف بھلائی اور بہتری درکار ہے۔ دُنیا میں ہو یا آخرت میں[1]

پہلے گروہ کے بعد اس گروہ کا ذکر یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ اس گروہ کی طلب اللہ کی بارگاہ میں پسندیدہ ہے۔ اور اہلِ ایمان کو بھی یہی طریقہ اپنانا چاہیے۔ اس دُعا سے یہ تعلیم ملتی ہے کہ بندے کو اپنے رب سے دنیا اور آخرت دونوں کی بھلائی طلب کرنی چاہیے۔ اور اس بھلائی کا فیصلہ اور انتخاب اسی پر چھوڑ دینا چاہیے، وہی سب سے زیادہ بہتر طریقے پر جانتا ہے کہ ہمارے لیے حقیقی خیر کس چیز میں ہے۔ خاص طور پر دنیا کی چیزوں میں سے کس چیز کا خیر ہونا تو منحصر ہے۔ اس امر پر کہ وہ چیز ہمارے لیے آخرت کی کامیابی کا وسیلہ و ذریعہ بن سکے اور کسی چیز کے اس پہلو کو جاننا صرف اللہ تعالیٰ ہی کا کام ہے۔ اس لیے بندے کے لیے بہتر یہی ہے کہ وہ اس معاملہ کو اللہ تعالیٰ ہی پر چھوڑ دے۔ اپنی طرف سے کوئی تجویز پیش نہ کرے[2]

خدا کو یاد کرنے والوں کی دوسری قسم

اصل میں تقسیم ثلاثی ہے یعنی تین قسم کے لوگ ہیں۔

۱۔ کچھ وہ ہیں جو دُعاؤں میں اللہ سے صرف دُنیا کے خواہاں ہیں۔

۲۔ کچھ وہ ہیں جو اللہ سے دُعاؤں میں دُنیا اور آخرت دونوں کی خیر و خوبی مانگتے ہیں۔

۳۔ کچھ وہ ہیں جو اللہ سے صرف آخرت مانگتے ہیں۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان آیات میں پہلی اور دوسری قسم کو بیان کیا گیا ہے لیکن تیسری قسم کا تذکرہ نہیں کیا! ایسا کیوں کیا گیا ہے!

اس لیے کہ تیسری قسم کا دُنیا میں کہیں وجود ہی نہیں ہے۔ اور رہبانیت کے نام پر جو معاش گریز زندگی کے مدعی ہیں قرآن کے نزدیک زندگی میں اس کی کوئی گنجائش نہیں ہے بلکہ خود قرآن نے اس غیر فطری مسلک کے متعلق جس تاریخی حقیقت کا انکشاف کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دُنیا کی جس قوم کو جس زمانے میں جو دین بھی دیا گیا اس میں رہبانیت کے معاش گریز مسلک کا مطالبہ اللہ کی طرف سے کبھی نہیں کیا گیا۔ یہ ایک جانی بوجھی حقیقت تھی اس لیے اس قسم کا تذکرہ نہیں کیا گیا۔

اور یہ وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ

---

[1] ماجدی [2] تدبرِ قرآن

اوّل تو ایسی قسم بہت ہی قلیل و نادر ہے بلکہ تقریباً معدوم ہے۔ نیز یہ صورت بھی شرعاً پسندیدہ نہیں ہے انسان ضعیف و ناتواں ہے۔ دنیوی ضرورتوں سے مستغنی نہیں ہے، عبدیت کا تقاضا یہ ہے کہ جوتی کا تسمہ بھی اللہ سے مانگے [1]

پہلی اور دوسری قسم کو بیان فرما کر یہ اشارہ فرما دیا کہ وہ جاہل ہیں جو صرف آخرت ہی مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں دُنیا کی کوئی پروا نہیں ہے۔ کیونکہ درحقیقت ان کا یہ دعویٰ غلط اور خیالِ خام ہے۔ انسان اپنے وجود و بقا اور عبادت و طاعت سب میں دنیوی ضروریات کا محتاج ہے۔ وہ نہ ہوں تو دین کا بھی کوئی کام کرنا مشکل ہے۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ جس طرح وہ آخرت کی بھلائی اور بہتری اللہ سے مانگتے تھے اسی طرح دُنیا کی بھلائی اور آسائش بھی طلب کرتے۔ جو شخص دنیوی حاجات کے لیے دُعا مانگنے کو زُہد و بزرگی کے خلاف سمجھے وہ مقامِ انبیاء سے ناواقف اور بے خبر ہے ہاں صرف دنیوی حاجات ہی کو اپنا مقصدِ زندگی نہ بنائیے آخرت کی بھی فکر کرے اور اس کے لیے بھی دُعا مانگے [2]

۵۸۳۔ یہی لوگ ہیں جن کو ان کے کیے کا حصہ ملے گا اور اللہ بڑی جلدی حساب چکا دینے والا ہے۔
پہلے گروہ کے متعلق جو صرف دُنیا کا طالب ہے یہ فرما دیا کہ ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور دوسرے گروہ کے متعلق ارشاد ہوا کہ یہ اپنی کمائی کا حصہ پائیں گے اور یہ حصہ اس اصول کے مطابق ہوگا جو اللہ نے اپنے نیک بندوں کی نیکیوں کے بدلے کے لیے مقرر کیا ہے۔ واللہ سریع الحساب۔ پہلے فقرے میں دُنیا کی جزا کی طرف اشارا کیا ہے اور اس فقرے میں آخرت میں ہونے والی جزا کا تذکرہ ہے۔ جو لوگ آخرت کے عذاب و ثواب کو دُور کی بات سمجھتے ہیں ان کو ان الفاظ سے یہ بات یاد دلائی ہے کہ تم جس حساب و کتاب کو دُور کی بات سمجھ رہے ہو جب وہ سر پر آئے گا تو تمھیں پتہ لگ جائے گا کہ اس پر تو ایک صبح و شام بھی نہیں گزری۔
اسی طرح جو لوگ اللہ کے اچھے وعدوں کو وعدہ فردا سمجھتے ہیں اور یہ گمان کرتے ہیں کہ ان کے ظہور میں ایک لامتناہی مدت باقی ہے ان کو ان الفاظ سے یہ تسلی دی جاتی ہے کہ اطمینان رکھو خدا کے وعدوں کے پورا ہونے میں دیر نہیں ہوگی۔ جب تمھیں اجر ملے گا تو محسوس کرو گے کہ تمھاری مزدوری تمھارا پسینہ خشک ہونے سے پہلے ہی تم کو مل گئی [3] گویا یوں کہا گیا ہے کہ قیامت میں سب سے

---

[1] معارف ج ۱ ص ۴۰۶ [2] معارف قرآن ج ش [3] تدبر قرآن

ایک دم میں حساب لے گا یاں کہو کہ قیامت دُور نہیں ہے جلدی ہُونے والی ہے اس سے کسی طرح بچاؤ ممکن نہیں اس کی فکر سے غافل مت ہو۔

۵۸۴۔ اور گنتی کے چند دنوں میں اللہ کو یاد کرو۔ اصل ارشاد میں ایاماً معدودات ہے۔ اس سے مراد ذی الحجہ کی ۱۱، ۱۲، ۱۳ تاریخیں ہیں جن میں حج سے فارغ ہو کر منیٰ میں قیام کا حکم ہے۔ ان دنوں میں رمی جمرات یعنی کنکریوں کے مارنے کے وقت اور ہر نماز کے بعد تکبیر کہنے کا حکم ہے اور دیگر اوقات میں بھی ان دنوں میں کثرت سے ذکر الٰہی اور تکبیر کہنی چاہیے [1]

منیٰ کے قیام میں جو عبادتیں کی جاتی ہیں یہ ہیں۔

تکبیرات، قربانی، حلق راس اور رمی جمار۔ قرآن نے منیٰ میں ہونے والی ان عبادتوں کا تذکرہ نہیں کیا۔ کیونکہ یہ اولاً وہ اعمال تھے جن سے قرآن کے مخاطب آشنا تھے، ثانیاً قرآن کا اپنا انداز یہ ہے کہ وہ مظاہر اعمال کو کم پیش کرتا ہے۔ اصلاً اعمال کی رُوح کی طرف لوگوں کو متوجہ کرتا ہے نماز میں رکعات، قیام، رکوع اور سجود کی کیفیت بیان نہیں کرتا بلکہ اقامتِ صلاۃ، خشوع اور ذکر اللہ کی تلقین کرتا ہے کیونکہ رُوحِ انسانی کی تربیت اور اس کی ترقی کا راز ان سے وابستہ ہے۔ اعمال کے مظاہر کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اُسوۂ حسنہ اور طریق کار سے متعین فرماتے ہیں۔ یہاں بھی سنت نے ہی یہ بات بتائی ہے کہ ان دنوں میں ذکر اللہ سے مراد نمازوں کے بعد قربانی کے موقعہ پر اور رمی جمار کرتے وقت تکبیرات ہیں

قربانی

منیٰ میں پہنچ کر سب سے پہلا عمل دسویں کی صبح کو قربانی کا ہے۔ قربانی کے ساتھ ہی تلبیہ ختم ہو جاتا ہے اور تکبیرات شروع ہو جاتی ہیں۔ یہ قربانی حضرت اسماعیل کی یادگار اور اپنی روحانی قربانی کی تمثیل ہے۔ اگرچہ قربانی کا اصلی مقام مروہ کی پہاڑی ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اپنی قربانی پیش کی تھی۔ اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قربانگاہ مروہ اور پھر مکہ کی تمام گلیاں ہیں۔ رفتہ رفتہ جب مسلمانوں کی کثرت سے حج کے دائرے نے مکانی وسعت حاصل کر لی اور قربانیوں کے لیے کوئی حد نہ رہی۔ ادھر مروہ اور مکہ کا تمام میدان

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۳۹

شہر اور آبادی کی صورت بدل چکا اس لیے شہر سے چند میل کے فاصلہ پر ایک میدان کو اس کے لیے منتخب کر لیا جس کا نام منیٰ ہے۔ قربانی کا فائدہ یہ ہے کہ منیٰ کے سہ روزہ قیام میں یہ قومی عید کی عمومی دعوت بن جاتے جس میں لوگ ایک دوسرے کو دوست احباب کو، فقراء و مساکین کو کھانا کھلائیں۔ یہ قربانی ان لوگوں پر واجب ہے جو حج اور عمرہ بصورت قران یا تمتع ادا کریں۔ اگر بعض حالات میں قربانی نہ ہو سکے تو دس روزے رکھ لیں کہ یہ بھی ذاتی قربانی کی ایک تمثیل ہے جسے تفصیل سے آپ سن چکے ہیں۔

حلق راس

قربانی کے بعد حاجی سر کے بال منڈاتے یا ترشواتے ہیں۔ یہ اس رسم کی تعمیل ہے کہ نذر دینے والے جب نذر کے دن پورے کر لیتے تو اپنے سر کے بال منڈاتے۔ ساتھ ہی اس رسم میں ایک اور پرانی یادگار کا اشارہ چھپا ہے۔ تمدن کے ابتدائی عہد میں دستور تھا کہ جو غلام بنا کر آزاد کیا جاتا تھا اس کے سر کے بال منڈوا دیے جاتے تھے۔ یہ غلامی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ چونکہ حج اللہ کی دائمی غلامی اور بندگی کا اقرار و اعتراف ہے اس لیے انسابیت کی یہ پرانی رسم باقی رکھی گئی ہے۔

رمی جمار

منیٰ ہی کے میدان میں پتھر کے تین ستون کھڑے ہیں، کہتے ہیں کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اپنے بیٹے اسماعیلؑ کو قربانی کے لیے لے چلے تو شیطان نے ان موقعوں پر وسوسہ ڈالا۔ انہوں نے اس کو یہاں رجم کیا جس کے معنے کنکریاں مارنے کے ہیں اور جو پہلے زمانہ میں لعنت کے اظہار کا طریقہ تھا اور اسی لیے شیطان کو رجم کیا گیا۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ دنیا میں بت پرستی کا سب سے بڑا مظاہرہ پتھر کے بتوں کی صورت میں ہوا ہے۔ اس لیے پتھر کے ان ستونوں کو کنکری مار کر بت پرستی کے اس سب سے بڑے مظاہرے کو سنگسار کیا جاتا ہے۔ بہرحال اللہ کی تسبیح اور حمد پڑھ کر ان کنکریوں کو ان ستونوں پر پھینکتے ہیں اور شیطان سے محفوظ رہنے کی دعا مانگتے ہیں۔

تکبیرات

منیٰ کے قیام کے زمانے میں یعنی ۱۰، ۱۱، ۱۲ اور ۱۳ ذی الحجہ کو نمازوں کے بعد تکبیرِ تشریق کہنا بھی

اسی ذکر اللہ کا ایک عملی مظاہرہ ہے۔ یہ تکبیرات نمازوں کے بعد ان ایام میں واجب ہیں بلکہ حضرت عمر اور ان کے صاحبزادے عبداللہ کے بارے میں آتا ہے کہ وہ ان دنوں میں نمازوں کے بعد، اور مجالس میں بستروں پر، خیموں میں، راستہ میں تکبیرات کہتے تھے اور لوگ ان کے ساتھ تکبیرات کہتے تھے اور پورا میدانِ منیٰ تکبیرات کے غلغلہ سے گونجتا تھا۔

ایک ضروری نکتہ

ان دنوں میں منیٰ میں قیام اور رات گزارنا، رمی کرنا، قربانی کرنا، تکبیرات کہنا اور حلق راس باتفاقِ اُمت حج کے ارکان نہیں ہیں۔ کیونکہ خود قرآن نے مزدلفہ کے وقوف کے بعد یہ بتایا ہے کہ فاذا قضیتم مناسککم جب تم حج کے ارکان پورے کر چکو۔ پتہ نہیں کہ اس کے باوجود مولانا دریابادی نے یہ نکتہ آفرینی کیوں فرمائی ہے کہ

> اذا کے لفظ سے یہ دھوکہ نہ ہو کہ یہاں حکم ادائے مناسک کے بعد مل رہا ہے۔ اذا ہمیشہ بعد کے لیے نہیں آتا، ہم معانی کے موقعہ پر بھی قرآن میں آیا ہے۔ یہاں معنے یہ ہیں جب تم ادائے مناسک کر رہے ہو[1]

حالانکہ اذا قضیتم کے یہ معنے باتفاقِ مفسرین درست نہیں ہوں۔ صحیح معنے یہ ہیں جب تم پورے کر چکو اپنے حج کے کام (شیخ الہند)، پھر جب تم کر چکو تم مناسک اپنے حج کے (شاہ عبدالقادر) جب تم ارکانِ حج سے فارغ ہو چکو (حقانی)، جب تم اعمالِ حج اپنے کر چکا کرو (مرشد تھانوی) یہ تو اردو تراجم ہیں ان کے علاوہ مفسرینِ قرآن نے بھی یہی مطلب بتایا ہے۔ مثلاً ابن کثیر فرماتے ہیں یامر تعالیٰ بذکرہ بعد قضاء المناسک اللہ نے مناسک پورے ہو چکنے کے بعد اپنے ذکر کا حکم دیا ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں اذا فعلتم منسکا من مناسک الحج جب تم حج کے مناسک میں سے ایک ایک منسک کر چکو۔ آلوسی رقمطراز ہیں ادیتم عبادا تکم الحجیۃ و فرغتم منھا جب تم حج کی عبادات ادا کر چکو اور ان سے فارغ ہو جاؤ۔ استیعاب مقصود نہیں صرف یہ دکھانا ہے کہ مولانا دریابادی کے بتاتے ہوئے معنے خلافِ مقصود اور مفسرین کی تشریحات کے خلاف ہیں۔

ایامِ تشریق میں منیٰ کا قیام

اس پر علماء کا اتفاق ہے کہ منیٰ میں ہونے والے اعمال یعنی قربانی، تکبیرات، رمی جمار

[1] ماجدی ص ۸۸

اور حلق راس میں کوئی چیز ارکانِ حج میں داخل نہیں ہے۔ لیکن ان اعمال کے واجب ہونے میں ائمہ کے درمیان اختلاف ہے۔ امام احمد منیٰ میں شب باشی اور رمی کو واجب کہتے ہیں۔ امام مالک منیٰ کے قیام اور وہاں رات گزارنے کو واجب بتاتے ہیں اور رمی کو سنت کہتے ہیں۔ امام ابو حنیفہ رمی کو واجب کہتے ہیں اور منیٰ کے قیام کو سنت بتاتے ہیں۔ امام شافعی کی دو رائیں ہیں۔ ایک رائے میں وہ امام احمد کے ہمنوا ہیں اور دوسری رائے میں وہ امام ابو حنیفہ کے ہم خیال ہیں۔

۵۸۵۔ لہٰذا جو دو دن ہی میں جلدی چل دیا اس پر کوئی گناہ نہیں اور جو دو دن بعد ٹھہرا اس پر بھی کوئی گناہ نہیں ہے۔ یعنی گناہ تو یہ ہے کہ ممنوعاتِ شرعیہ سے پرہیز نہ کرے اور جو کوئی اللہ سے ڈرے اور زمانہ حج میں پرہیزگاری کرے تو پھر اس میں کوئی گناہ نہیں کہ منیٰ میں دو دن قیام کیا یا تین دن کہ اللہ نے دونوں باتیں جائز رکھی ہیں۔ اگرچہ افضل یہی ہے کہ تین دن قیام کرے [1]

دراصل مناسکِ حج ختم ہونے پر جو لوگ واپس آنا چاہتے تھے ان میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ ایک کہتا کہ جو لوگ ایامِ تشریق میں واپس آ جاتے ہیں وہ گنہ گار ہیں۔ دوسرا ان لوگوں کو الزام دیتا جو دیر میں واپس ہوتے۔ چونکہ ان میں درحقیقت کوئی گنہ گار نہ تھا اس لیے قرآن حکیم نے دونوں کو جائز رکھا۔ یعنی مکہ کی طرف منیٰ سے روانگی کے لیے دونوں صورتیں بالکل جائز ہیں۔ اب اگر کوئی شخص ۱۰ ذی الحجہ کے بعد صرف دو دن قیام کر کے ۱۲ کی شام کو مکہ چلا آئے تو بھی درست ہے اور جس کا جی چاہے ۱۳ تک وہیں ٹھہرا رہے جب بھی درست ہے۔ امام شافعی کے ہاں اگر ۱۲ کو واپس ہونا ہے تو غروبِ آفتاب سے پہلے رمی کرے اور امام ابو حنیفہ کے ہاں اگر ۱۳ تک ٹھہرنا ہے تو طلوعِ آفتاب سے پہلے رمی کرے۔ فلا اثم علیہ میں نفی دونوں صورتوں میں گناہ کی کی گئی ہے گویا بلحاظِ جواز دونوں شقیں برابر ہیں اور بلحاظِ درجہ بھی دونوں مساوی ہیں۔ فقہاءِ حنفیہ کے نزدیک ۱۳ کا قیام افضل ہے [2]

مقصد یہ ہے کہ اس قلیل مدت کو بھاری اور گراں سمجھ کر وہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ ویسے اس امر کی اجازت ہے کہ جسے کوئی جلدی ہو تو ۱۲ ذی الحجہ ہی کو واپس ہو جائے۔ ورنہ ۱۳ تک کے قیام کا ثواب حاصل کرلے۔ دونوں ہی صورتیں اختیار کی جا سکتی ہیں۔ البتہ یہ ملحوظ رہے کہ اس عجلت کا باعث ان ایام کی گرانی اور طوالت کا احساس نہ ہو۔ بلکہ کوئی واقعی ضرورت اس کی داعی ہو [3]

۵۸۶۔ یہ اس شخص کے لیے ہے جو تقویٰ اختیار کرے۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور یقین مانو

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] ماجدی [3] تدبرِ قرآن

کہ تم کو اس کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔ یعنی حج کی خصوصیت نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے ہر کام میں اور ہر وقت ڈرتے رہو کہ سب کو قبروں سے اٹھ کر اس کے پاس جمع ہونا ہے حساب دینے کو۔[1]

یہ جملہ درحقیقت اُن سب کی رُوح ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ خاص ایامِ حج میں جب کہ اعمالِ حج میں مشغول ہو اس وقت بھی اللہ سے ڈرو، احکامِ حج میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور حج کے بعد بھی اپنے حج پر مغرور نہ ہو بلکہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ اور گناہوں سے بچتے رہو۔ کیونکہ وزنِ اعمال کے وقت انسان کے گناہ اس کے نیک اعمال کو کھا جائیں گے۔ نیک اعمال کا اثر اور وزن ظاہر نہ ہونے دیں گے۔

حج درحقیقت انسان کی گزشتہ زندگی اور آئندہ زندگی کے لیے حدِ فاصل کا کام دیتا ہے اور اصلاح اور تغیر کی طرف اپنی زندگی کو موڑ دینے کا موقعہ بہم پہنچاتا ہے۔ یہاں سے اپنی پچھلی زندگی جیسی بھی ہو اس کو ختم کر کے نئی زندگی شروع کرتا ہے۔ ان بابرکت مقامات پر حاضری اور وہاں کھڑے ہو کر جہاں جلیل القدر انبیائے کرام اور خاصانِ الٰہی کھڑے ہوئے خدا کے گھر کے سامنے قبلہ کے روبرو جو اس کی نمازوں اور عقیدتوں اور مناجاتوں کی غائبانہ سمت ہے اپنی پچھلی زندگی کی کوتاہیوں پر ندامت اور اپنے گناہوں کا اعتراف اور آئندہ اطاعت اور فرمانبرداری کا وعدہ و اقرار وہ اثر پیدا کرتا ہے کہ شر سے خیر کی طرف خیر سے اور زیادہ خیر کی طرف زندگی کا رُخ بدل جاتا ہے اور زندگی کا گزشتہ باب بند ہو کر اس کا دوسرا باب کھل جاتا ہے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ وہ اس کے بعد اپنے نئے اعمال کے لیے نئے سرے سے پیدا ہو جاتا ہے۔ اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، "جس نے اللہ کے لیے حج کیا اور اس میں ہوس رانی نہ کی اور نہ گناہ کیا تو وہ ایسا ہو کر لوٹتا ہے جیسے اس دن تھا جس روز اس کی ماں نے جنا" یعنی ایک نئی زندگی ایک نئی حیات اور ایک نیا دَور شروع کرتا ہے جس میں دین اور دُنیا کی بھلائیاں جمع اور دونوں کی کامیابیاں شامل ہوں گی۔

اس لیے خاص طور پر حاجیوں کو آئندہ کے لیے تقویٰ کی ہدایت کی گئی ہے کہ پچھلے گناہ معاف ہو چکے ہیں آئندہ کے لیے احتیاط رکھو تو دُنیا و آخرت کی بھلائی تمہارے لیے ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّعْجِبُكَ قَوْلُهٗ فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَيُشْهِدُ
اللّٰهَ عَلٰى مَا فِيْ قَلْبِهٖ ۙ وَهُوَ اَلَدُّ الْخِصَامِ ۝ وَاِذَا تَوَلّٰى سَعٰى
فِي الْاَرْضِ لِيُفْسِدَ فِيْهَا وَيُهْلِكَ الْحَرْثَ وَالنَّسْلَ ۭ وَاللّٰهُ لَا
يُحِبُّ الْفَسَادَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُ اتَّقِ اللّٰهَ اَخَذَتْهُ الْعِزَّةُ
بِالْاِثْمِ فَحَسْبُهٗ جَهَنَّمُ ۭ وَلَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ
يَّشْرِيْ نَفْسَهُ ابْتِغَاۗءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ رَءُوْفٌۢ بِالْعِبَادِ ۝

اور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اُن کی بات تم کو دُنیا کی زندگی کے بارے میں بھلی معلوم ہوتی ہے اور جو کچھ اُن کے دل میں ہے اس پر وہ خدا کو گواہ بناتے ہیں حالانکہ وہ پرلے درجے کے جھگڑالو ہیں۔ اور جب ان کو اقتدار مل جاتا ہے تو زمین میں ان کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائیں، کھیتوں کو غارت کریں اور نسلِ انسانی کو تباہ کریں، حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو وقار و عزت کا خیال اس کو گناہ پر جما دیتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے تو بس جہنم ہی کافی ہے اور وہ بہت بُرا

ٹھکانا ہے [۵۹۱]۔ دوسری طرف انسانوں ہی میں ایسے بھی ہیں جو رضائے الٰہی کی طلب میں جان فروشی کرتے ہیں اور ایسے بندوں پر اللہ بہت مہربان ہے [۵۹۲]۔

خدا پرستی اور دُنیا پرستی

اسلام دُنیا کا نہیں لیکن دُنیا پرستی کے غرور و سرشاری کا مخالف ہے۔ یہی دُنیا پرستی کا غرور انسان کو خدا پرستی اور راست بازی سے بے پروا کر دیتا ہے۔ جب اسے طاقت مل جاتی ہے تو غرض و نفس کی پرستش میں وہ سب کچھ کر گزرتا ہے جو دُنیا میں ایک ظالم و مفسد انسان کر سکتا ہے۔ لیکن جو لوگ سچے خدا پرست ہیں وہ دُنیا میں کتنے ہی مشغول ہوں مگر اُن کے پیشِ نظر دُنیا پرستی نہیں ہوتی بلکہ رضائے الٰہی کا حصول ہوتا ہے۔ ایک دُنیا پرست اپنے نفس کے لیے دوسروں کو قربان کر دے گا، لیکن یہ لوگ رضائے الٰہی کی راہ میں خود اپنے نفس کو قربان کر دیں گے۔ ایک شخص کی دنیوی زندگی بظاہر کتنی ہی خوشنما ہو اور وہ اپنی نیک دلی کا کتنا ہی دعویٰ کرے لیکن ان باتوں سے کچھ نہیں بنتا۔ اصل کسوٹی یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ طاقت و اختیار پا کر اپنے ابناءِ جنس کے ساتھ کیا سلوک کرتا ہے۔ حرث و نسل کی تباہی انسانی غرورِ طاقت کا بہت بڑا فساد ہے۔ دنیوی طاقت کے متوالوں سے جب کہا جاتا ہے اللہ سے ڈرو تو اُن کا گھمنڈ انہیں اور زیادہ ظلم و معصیت پر آمادہ کر دیتا ہے۔ ان آیات میں انسانی زندگی کے دو نمونے پیش کیے گئے ہیں۔ پہلا نمونہ اس انسان کا ہے جو دورُخا چالاک اور چرب زبان ہے، جس کے اپنے مفادات اس کی زندگی کا محور ہیں جس کی گفتگو تو بڑی خوشنما ہے مگر دل کی دُنیا تاریک ہے۔ دوسرا نمونہ اُس انسان کا ہے جو سچا مومن ہے۔ جو ہر کام رضائے الٰہی کے مطابق کرتا ہے وہ نیکی اور نیکوکاری میں اپنی طرف سے کوئی کمی نہیں کرتا۔ کیونکہ وہ اپنی زندگی خدا کی نذر کر چکا ہوتا ہے۔ حج کے ذیل میں مومن و کافر کا ذکر کیا تھا۔ اور ان آیات میں مخلص و منافق کا تذکرہ اسی مناسبت سے کیا جا رہا ہے۔

۵۸۴۔ اور کچھ لوگ ایسے ہیں کہ ان کی بات دنیوی زندگی کے بارے میں تم کو بھلی معلوم ہوتی ہے اصل ارشاد میں یعجب آیا ہے۔ یہ اعجاب سے بنا ہے۔ اس کے معنے اچھا لگنا، بھلا معلوم ہونا اور پسند

آتا ہیں فی الحیاۃ الدنیا کے دو مطلب بتائے گئے ہیں۔ ایک تو یہی کہ دنیا کی زندگی کے بارے میں اور اس کے موضوع پر جب وہ بات کرتے ہیں تو آپ کو ان کی بات اچھی لگتی ہے۔ یہی مطلب شاہ ولی اللہؒ نے اختیار کیا ہے۔ قاضی بیضاویؒ نے بھی اسے پسند کیا ہے۔ دوسرے معنے یہ بتائے گئے کہ تمہیں اس دنیا میں ہوتے ہوئے ان کی بات اچھی لگتی ہے کیونکہ ظواہر ہی ظواہر ہیں۔ باطن کا حال صرف اللہ جانتا ہے۔ وہ آپ کو اپنی چرب زبانی سے دھوکا دے دیتا ہے۔ اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ فی یہاں اظہارِ مقصد کے لیے بولا گیا ہے۔ یعنی گفتگو سے اسے منصود محض حصولِ دنیا ہوتی ہے طلبِ آخرت نہیں ہوتی۔ صاحبِ کشاف نے یہی معنے بتائے ہیں۔

بے اخلاص ایمان کا نمونہ

اس آیت میں ان لوگوں کا چہرہ پیش کیا گیا ہے جو ایمان کا دعویٰ اور نعرہ لگا کر اپنے ایمان میں اخلاص نہیں رکھتے۔ یعنی منکر تو نہیں ہیں مانتے تو سب کچھ ہیں لیکن ایمان کے تقاضوں کو پورا نہیں کرتے۔ اگر آپ کسی دستور کو مانتے ہیں لیکن آپ اس پر عمل نہیں کرتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس پر دل سے یقین نہیں کیا۔ یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال ہمارے دل کے تابع ہیں۔ اس لیے جب تک دل نہیں بدلے گا ہمارے اعمال میں کوئی تغیر نہیں ہو سکتا یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیرِ اثر ہے۔ اور ایمان کا مقصد دل کی اصلاح ہے۔ اگر یہ درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا۔

ایک خاص نکتہ

یہاں ایک خاص نکتہ ہے۔ یہودیوں نے سب سے زیادہ زور عمل رسوم اور رواج پر دیا تھا۔ اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات و فلاح کا دارومدار رکھا۔ اسلام فکر و نظر اور کردار و عمل کی اصلاح کر کے دونوں کو جمع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نجات نہ صرف ایمان اور نہ صرف عمل پر ہے بلکہ ایمان صحیح اور عملِ صالح کی جامعیت پر موقوف ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عملِ صالح کی علت ہے یعنی عملِ صالح کے لیے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصفِ لازم بتاتا ہے ہر اہم

موقع پر اس نے مسلمانوں کو یا ایھا الذین آمنوا کی ندا سے خطاب کیا ہے، جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کرتے ہیں جو ایمان سے متصف ہوں۔ بہت سے موقعوں پر ہے ان کنتم مومنین اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات ایمان والوں کے لیے خاص ہے اور وہی اس کے سزاوار ہیں۔ محبتِ الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے والذین امنوا اشد حبا للہ۔ ایمان کا نتیجہ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت اور اس کے فیصلہ کے آگے سر جھکانا ہے۔ الغرض تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے اور اسی لیے وہ اصل الاصول ہے۔ وہ نہ ہو تو ساری انسانی نیکیوں کی عمارت بے بنیاد ہے۔ لیکن ایمان صرف زبانی دعویٰ کا نام نہیں بلکہ دل کی تصدیق و یقین کا وہ درخت ہے جس کے ساتھ عمل کی شاخیں اور اخلاق کے ثمرات ہوں۔ ایمان اصل ہے اور عمل اس کی فرع۔ ایمان ملزوم ہے اور اعمال اس کی خصوصیات اور لوازم ہیں۔ ان دونوں میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ اس لیے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں ہو سکتا اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ و بار درخت ہے جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم و وجود برابر ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ لوگ اعمال کے لحاظ سے دو طرح کے ہیں۔ ایک وہ جن کے اعمال میں ایمان کی کوئی شہادت نہیں ہوتی۔ یہ لوگ کردار کے کمزور ہوتے ہیں لیکن گفتار کے غازی ہوتے ہیں۔ یہ اپنی عملی کمزوریوں پر اپنی چرب زبانی اور خوش گفتاری سے پردے ڈالنے اور مخاطب کی نیک نیتی اور کریم النفسی سے فائدہ اٹھا کر اس کو اپنے طرزِ عمل کے بارے میں مطمئن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ مدینہ کے منافقین میں بھی ایک گروہ ایسے لوگوں کا تھا۔ یہ لوگ کھاتے پیتے، سہل پسند تن آسان، چرب زبان تھے۔ شکلیں اچھی، لباس صاف ستھرے، مجلسی آداب میں مشاق لیکن دل کے بودے اور عمل کے چور تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو اسلام کی حمایت میں آسمان و زمین کے قلابے ملاتے[1]

۵۸۸۔ اور جو کچھ اس کے دل میں ہے اس پر وہ خدا کو گواہ بناتا ہے۔ یعنی آپ کو اللہ کی قسمیں کھا کر یقین دلاتا ہے۔ قسم کا مفہوم بھی شہادت ہی پیش کرنا ہوتا ہے۔ نبوت سے علمِ غیب کی نفی پر دلائل سے قرآن و حدیث بھرے ہیں۔ مگر ایک مزید دلیل اس آیت سے بھی

---

[1] تدبر قرآن

نکلتی ہے۔ منافق کے نفاق کا علم اللہ سبحانہ وحی کے ذریعے آپ کو کر رہا ہے۔ ورنہ آپ کو تو ان کی باتیں قرآن کی تصریح کے مطابق پسند آ رہی تھیں۔ اگر آپ کو یہ علم ہوتا کہ یہ منافق ہے تو قرآن یہ نہ کہتا کہ آپ کو اس کی باتیں پسند آتی ہیں[1]

منافق کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ اپنے کو معتبر ثابت کرنے کے لیے بات بات پر قسمیں کھاتا ہے۔ اس کے پاس چونکہ کردار کی حجت نہیں ہوتی اس لیے ہر قدم پر قسم کو بطور دلیل پیش کرتا ہے۔ جھوٹا آدمی اپنی نفسیاتی کمزوری کی وجہ سے سمجھتا ہے کہ مخاطب اس کی بات اس وقت تک باور نہیں کرے گا جب تک وہ اس کو قسم کھا کر یقین نہ دلائے۔ ایک راست باز اور صاحبِ کردار اپنے عمل پر اعتماد کرتا ہے اور جب اس پر کوئی گرفت کرتا ہے تو وہ اپنے عمل ہی کی دلیل سے اس کی مدافعت کرتا ہے لیکن ایک منافق کے پاس چونکہ عمل کا سہارا نہیں ہوتا اس لیے جب اس پر کوئی گرفت ہوتی ہے تو وہ قسم کو اپنی ڈھال بناتا ہے اور اسی کے سہارے لوگوں کی گرفت سے بچنے کی کوشش کرتا ہے[2]

۵۸۹ ۔ حالانکہ وہ پرلے درجہ کا جھگڑالو ہے۔ اصل ارشاد عربی میں الد الخصام ہے۔ اس کے معنے ہیں وہ دشمن جو تمام دشمنوں سے زیادہ ٹیڑھا ہو یعنی جو حق کی مخالفت میں ہر ممکن حربے سے کام لے کسی جھوٹ، کسی بے ایمانی، کسی غدر و بدعہدی اور کسی ٹیڑھی سے ٹیڑھی چال کو بھی استعمال کرنے میں تامل نہ کرے[3] الد دراصل لدد سے صفت کا صیغہ بنا ہے۔ اس کے معنے شدید الخصومۃ کے ہیں۔ خصام خصم کی جمع ہے جیسے بحر کی جمع بحار ہے اور یا باب مفاعلۃ کا مصدر ہے۔ خاصم مخاصمۃ خصاماً۔ مطلب یہ ہے کہ بظاہر تو ان کی باتیں تمہارے سامنے بڑی چکنی چپڑی ہوتی ہیں لیکن ان کے دلوں میں تمہارے اور اسلام کے خلاف شدید قسم کا بغض و حسد بھرا ہوا ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا خیال ہے ان ابغض الرجال الی اللہ الالد الخصام اللہ سبحانہ کی نظر میں سب سے زیادہ مبغوض وہ ہے جو بہت زیادہ جھگڑالو ہو۔

یہ گروہ ہر جماعت میں موجود ہوتا ہے اور اس کی چرب زبانی امتوں میں زمانوں کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ کبھی اس کی چرب زبانی ایک شخص کو اپنے دامِ تزویر میں لے آتی ہے اور کبھی اس کی طلاقتِ لسانی کا پوری امت شکار ہو جاتی ہے۔ ہمارے زمانے میں اخبارات و رسائل کے

---

[1] ماجدی [2] تدبر قرآن [3] تفہیم القرآن

ذریعے یہ کام بڑی آسانی سے ہوتا ہے۔ سیاسی وساوس اور قومی اوہام کو آڑ بنا کر اہلِ حق کے خلاف پوری امت کو بھڑکا دیا جاتا ہے۔

بے ایمان اقتدار کی نشانیاں

۵۹۰۔ اور جب ان کو اقتدار مل جاتا ہے تو ملک میں ان کی ساری دوڑ دھوپ اس لیے ہوتی ہے کہ فساد پھیلائیں، نسلِ انسانی کو تباہ کریں۔ حالانکہ اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اصل ارشاد میں اذا تولی آیا ہے۔ اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک وہ ہیں جو ہم نے اختیار کیے ہیں یعنی جب اسے اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ اور جب وہ ملک میں حاکم ہو جاتا ہے امام مجاہد اور امام ضحاک نے بھی یہی معنے بتائے ہیں۔ شاہ ولی اللہ اور شاہ رفیع الدین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ اس قسم کے لوگوں کو اگر اقتدار مل جاتا ہے تو ظلم و فساد کا بازار گرم کر دیتے ہیں اور شہریوں کی جان و مال کو ان سے خطرہ لاحق ہوتا ہے۔ قوم کے نام پر لوگوں کی جانوں سے کھیلنا اور ملک کے نام پر لوگوں کے اموال کو ہڑپ کرنا ان کی ظالمانہ اور مفسدانہ زندگی کا کارنامہ ہے۔ موجودہ حوادث اس آیت کی بہترین شرح ہیں۔ اور اس طبقہ کی وجہ سے عام زندگی ایک طرف ظلم و ستم کا نشانہ بن رہی ہے اور اس کے نتیجے میں پیداوار کم ہو رہی ہے۔ بازار میں گرانی ہو رہی ہے۔ اجناس میں نایابی روبہ اضافہ ہے اور دوسری طرف جماعتی اور قومی زندگی دین سے بے بہرہ ہو کر فسادِ اخلاق اور سوءِ اعمال کا شکار ہو رہی ہے۔ پہلا فساد اگر صوری اور مادی ہے تو یہ دوسرا فساد باطنی اور معنوی ہے۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ شخص مزے مزے کی دل لبھانے والی باتیں کر کے جب آپ کے پاس سے پلٹتا ہے تو اس کی ساری تگ و دو فساد کی راہ میں ہوتی ہے۔ فساد سے مراد اللہ کی بندگی اور طاعت کی اس دعوت کی مزاحمت ہے جو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دے رہے ہیں۔ زمین میں تمام عدل و امن کا انحصار اس پر ہے کہ اللہ کے بندے اللہ کی بندگی کریں۔ یہی راستہ ہے جس سے شیطان کے لیے دراندازیوں اور فساد کی تمام راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ اگر یہ نہ ہو تو تمام نسلِ انسانی شیطان کی فساد انگیزیوں کی آماجگاہ بنی رہتی ہے۔ آخر میں ارشاد فرمایا کہ واللہ لا یحب الفساد یعنی وہ بظاہر کتنی ہی چکنی چپڑی باتیں کیوں نہ کریں، اسلام، حضور انور اور قرآن کی محبت و دوستی کا دم کیسا ہی بھریں لیکن وہ اللہ کی نظروں میں کوئی مقام نہیں رکھتے۔

کیونکہ وہ اپنے طرزِ عمل سے اس فساد کو بڑھاتے رہتے ہیں جس کے نتیجے میں تمام انسانیت کی تباہی ہے اللہ تعالیٰ نے جب دُنیا بنائی ہے تو وہ اس کی فلاح و بہبود چاہتا ہے نہ کہ اس میں فساد۔

۵۹۱۔ اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ سے ڈر تو وقار اور عزت کا خیال اسے گناہ پر جما دیتا ہے۔ یہ حال ہے منافق کا کہ ظاہر میں خوشامد کرے اور قسمیں کھائے کہ میں سچا ہوں اور میرے دل میں اسلام کی محبت ہے اور جھگڑے کے وقت کمی نہ کرے اور قابو پا دے تو لوٹ مار مچا دے اور روکنے میں اس سے زیادہ چڑے اور گناہ میں ترقی کرے [1] یعنی جب اسے اس کا کوئی مخلص اور بہی خواہ سمجھاتا ہے اور اسے نیکی کی تلقین کرتا ہے یا اسے برائی پر ٹوکتا ہے تو بجائے سنبھلنے کے اور زیادہ بگڑ جاتا ہے اور اپنی کج روی میں اور زیادہ دلیر ہو جاتا ہے۔ گویا اسلام دوستی اور دینداری کے ایسے جھوٹے دعوے داروں کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ جب ان کی کسی خلافِ اسلام بات پر گرفت کی جاتی ہے اور ان کو اصلاح کی طرف متوجہ کیا جاتا ہے تو ان کے پندار و غرور پر ایک ضرب کاری لگتی ہے۔ وہ اپنی کمزوری، بے اعتمادی اور احساسِ کمتری کی وجہ سے سمجھتے ہیں کہ اگر ایک مرتبہ انہوں نے اپنی کمزوری تسلیم کر لی تو ان کا سارا بھرم ختم ہو جائے گا۔ اس وجہ سے وہ اپنی اکڑ میں کوئی خم پیدا نہیں ہونے دیتے۔

ایک عام غلط فہمی

ایک عام غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ لوگ سمجھتے ہیں منافقوں کا گروہ کافروں کا کوئی خاص سازشی گروہ تھا جو جاسوسوں کے بھیس میں مسلمانوں میں رہتا۔ باہر نکلتا تو مسلمان بن جاتا۔ اکیلے میں ہوتا تو اپنے اصلی صورت میں لوٹ آتا۔ حالانکہ ایسا سمجھنا قرآن و احادیث کی صاف صاف تصریحات کو جھٹلانا ہے۔ ان لوگوں نے اسلام بطورِ اپنے دین و اعتقاد کے اسی طرح اختیار کر لیا تھا جس طرح دوسرے مسلمانوں نے۔ وہ اپنے کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ان کی بیویاں ان کو مسلمان سمجھتی تھیں، اُن کے بچے ان کو مسلمان سمجھتے تھے۔ اُن کے گھر کا ہر فرد یقین کرتا تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔ وہ نماز پڑھتے تھے، روزہ رکھتے تھے، اسلام کے طور طریقے پر اولاد کی پرورش کرتے تھے۔ جہاں تک ایک دین کو بطور دین کے اختیار کر لینے کا تعلق ہے کوئی بات ایسی نہ تھی جو بظاہر

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

ان کے مسلمان ہونے کے خلاف ہو۔ تاہم قرآن نے فیصلہ کیا ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں کیونکہ اسلام کا گھونٹ تو انہوں نے پی لیا ہے لیکن ان کے حلق کے نیچے نہیں اترا ہے۔ کسی تعلیم کو اختیار کر لینے کے بعد یقین و عمل کی جو روح پیدا ہونی چاہیے۔ وہ اس سے یک قلم محروم تھے۔ اخلاص و صداقت کے لیے ان کے دلوں میں کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ قرآن سنتے مگر اس لیے نہیں کہ عمل کریں۔ وہ نماز پڑھتے مگر بے دلی اور تاوان اتارنے کی خاطر، خیرات کرتے مگر مجبور ہو کر۔ ان کے دلوں میں دین سے زیادہ دنیا کا عشق تھا۔ اسلام کے جو احکام ان کے شخصی اغراض کے خلاف نہ ہوتے ان پر خوش خوش عمل کرتے، جو خلاف ہوتے ان سے بھاگنا چاہتے۔ جب کبھی خوشحالیوں کا موقعہ ہوتا تو وہ سب سے پہلے مومن ہوتے اور جب کبھی اسلام کی خاطر قربانیوں کا موقعہ آجاتا تو سب سے آخری صفوں میں بھی دکھائی نہ دیتے۔ جہاد کے تصور سے ان کی روحیں لرز جاتیں۔ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا حکم ان کے لیے پیام موت ہوتا۔ اسلام کے دشمنوں سے سازگاریاں رکھنے میں ان کو کوئی تامل نہ ہوتا۔ وہ سمجھتے تھے کہ دونوں طرف ملے رہنے میں مصلحت ہے۔ اگر بازی الٹ پڑی اور دشمن فتح مند ہو گئے تو ان کے پاس بھی اپنی جگہ بنی رہے گی۔[1] اس پر تفصیلی تبصرہ کے لیے سورۂ براءت کا انتظار فرمائیے۔

۵۹۲ ۔ دوسری طرف انسانوں میں ایسے بھی ہیں جو رضائے الٰہی کی طلب میں جان فروشی کرتے ہیں اور اللہ ایسے بندوں پر بہت مہربان ہے۔

پہلی آیت میں اس منافق کا ذکر تھا جو دین کے بدلے دنیا لیتا تھا۔ اس کے مقابلے میں اس آیت میں اس مخلص کامل الایمان کا ذکر ہے جو اپنی جان و مال اور دنیا کو دین کے لیے صرف کرتا ہے۔ یہ اللہ کی بہت بڑی رحمت ہے کہ اپنے بندوں کو توفیق دی جو اللہ کی رضا کی خاطر اپنی جان و مال کو خرچ کرتے ہیں۔ اور نیز ہر ایک کی جان و مال تو اللہ کی ملک ہے۔ پھر جنت کے بدلے اس کو خریدنا یہ محض اس کا احسان ہے۔[2]

روایات میں اس آیت کا جو پس منظر بتایا گیا ہے کہ یہ آیت صہیب رومی کے کردار پر نازل ہوئی۔ حضرت صہیب رومی جب ایمان لائے اور مکہ سے ہجرت کا ارادہ کیا تو کافروں نے ان کو اپنے مال و اسباب کے ساتھ جانے کی اجازت نہیں دی بلکہ یہ کہا کہ اگر جانا ہے تو سب کچھ

---

[1] ترجمان القرآن [2] افادات شیخ الہند

چھوڑ جائیں، چنانچہ آپ سب کچھ چھوڑ کر روانہ ہو گئے۔ مدینہ پہنچ کر جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ واقعہ سنایا تو آپ نے فرمایا کہ صہیب کی تجارت نفع بخش رہی صہیب کی تجارت نفع بخش رہی۔ قرآن کی اس آیت نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کی تصدیق کر دی۔

دراصل اس آیت میں ان مخلص اہلِ ایمان کا ذکر ہے جنہوں نے اللہ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لیے اپنا سب کچھ تج کر دیا ہے۔ ان کا ذکر یہاں دو پہلوؤں سے ہے۔ ایک یہ کہ ان منافقین کو غیرت آئے جن کا ذکر اوپر کی آیات میں ہوا ہے کہ سب تمہارے ہی جیسے مفاد پرست اور ابن الوقت نہیں ہیں، بلکہ تمہارے ہی آنکھوں کے سامنے اللہ کے وہ بندے ہیں جو اپنا تن، من، دھن سب کچھ خدا کی راہ میں قربان کرنے کا عہد کر چکے ہیں۔ اور اپنی زندگی کا مقصد اس کی رضا کے سوا کچھ نہیں سمجھتے۔ دوسرا یہ کہ اس ذکر سے ان اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی ہو جو ان منافقین کے برعکس اللہ ہی کے لیے جیتے اور اللہ ہی کے لیے مرنے والے تھے۔ گویا ان دو نمونوں کو پیش کر کے بتایا گیا ہے کہ اللہ کو زندگی کا کون سا نمونہ پسند ہے۔

آیت کے آخر میں واللہ رؤف بالعباد لا کر اشارہ کیا ہے کہ اس طبقہ کا انسانوں میں ہونا صرف اس طبقہ ہی پر رحمت نہیں بلکہ پوری انسانیت پر اللہ کی رحمت ہے۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ ہر چند اللہ تعالیٰ کے ساتھ جاں فروشی کا معاملہ بڑا کٹھن ہے اور اللہ کی رضا جوئی کے لیے اپنی ساری زندگی کو تج کرنا ایک عظیم جہاد ہے۔ جس کے تقاضے بڑے صبر آزما ہیں لیکن اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر بڑا ہی مہربان ہے۔ وہ ان پر ان کی استطاعت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا اور اگر اس عہد کے تقاضوں میں ان میں کوئی بھول چوک ہو جاتی ہے تو اس کو معاف کرتا ہے، لغزشوں اور کوتاہیوں کے لیے اس نے توبہ اور اصلاح کی راہیں کھلی رکھی ہیں[1]

---

[1] تدبر قرآن

يَآَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۠ وَلَا تَتَّبِعُوْا
خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝ فَاِنْ زَلَلْتُمْ مِّنْۢ
بَعْدِ مَا جَآءَتْكُمُ الْبَيِّنٰتُ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝
هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ يَّاْتِيَهُمُ اللّٰهُ فِيْ ظُلَلٍ مِّنَ الْغَمَامِ
وَ الْمَلٰٓئِكَةُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ رکوع ۲۵

اے ایمان والو! تم پورے کے پورے[۵۹۳] اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔[۵۹۴] وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ پھر دیکھو اگر تم ڈگمگا گئے باوجودیکہ ہدایت کی روشن دلیلیں تمہارے پاس آ چکی ہیں تو جان لو کہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔[۵۹۵] یہ لوگ کیا اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ اور اس کے فرشتے بادلوں کے سائبانوں میں اُن کے پاس آئیں اور جو کچھ ہونا ہے اس کا فیصلہ کر دیا جائے، یہ سب اُمور اللہ ہی کے حوالے ہیں۔[۵۹۶]

اسلام سے وفاداری تقسیم نہیں ہو سکتی

نفاق کے مقابلے میں اخلاص کا تذکرہ پہلی آیت میں ہو چکا ہے۔ اس آیت میں حکم

ہو رہا ہے کہ ایمان و اخلاص کا تقاضا یہ ہے کہ ساری وفاداری اسلام سے ہو۔ اسلام میں داخل ہونے کے بعد کسی اور سے وفاداری کا دم نہ بھرا جائے۔ یعنی دینِ اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ اس ہدایت کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت کچھ مدعیانِ ایمان کی وفاداری تقسیم تھی۔ ایک طرف اسلام کا دم بھرتے تھے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان کے مدعی تھے اور دوسری طرف غیر اسلامی نظام سے تعلقات رکھتے تھے۔ قرآن نے جگہ جگہ ان کی اس روش کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً وہ کھلے لفظوں میں کہتے تھے سنطیعکم فی بعض الامر ہم کچھ معاملات میں آپ کی اطاعت کریں گے۔ ظاہر ہے کہ کہنے والے یہ بات یہودیوں سے کہہ رہے ہیں۔ سورۂ نساء میں ہی ان کی اس روش کا تذکرہ ان لفظوں میں کیا ہے یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وہ چاہتے ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت کے پاس لے جائیں۔ یہاں طاغوت سے مراد یہود کی عدالتیں ہیں۔ قرآن اس آیت میں ان کو ہدایت دے رہا ہے کہ اسلام کو قبول کرنے کے بعد کسی اور نظام سے وفاداری اسلام سے غداری ہے۔ بلکہ یہ آیت جس پس منظر میں نازل ہوئی ہے اس کو دیکھ کر یہ بات بآسانی سمجھی جا سکتی ہے کہ اسلام سے وابستہ ہونے کے بعد کسی غیر اسلامی نظام سے وفاداری قابلِ قبول نہیں ہے بلکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے دوسرے انبیاء کے لائے ہوئے نظام سے کسی درجہ میں وابستگی بھی اسلامی نظام سے وفاداری کو مشکوک بنا دیتی ہے۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ درخواست کی کہ ہم کو نظامِ حیات میں رہتے ہوئے اس کی بھی اجازت دی جائے کہ موسوی نظامِ حیات کے مطابق ہفتہ کے روز کی تعظیم اور اونٹ کے گوشت اور دودھ سے پرہیز کرتے رہیں اور تورات کی تلاوت کرتے رہیں لیکن اس قرآنی آیت کی روشنی میں ان کو اجازت نہیں دی۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اسلام میں وفاداری ناقابلِ تقسیم ہے۔ وفاداری کی یہ تقسیم ایمان و اسلام کے منافی ہے اور یہیں سے شیطانوں کو انسانوں کو گمراہ کرنے کی راہ مل جاتی ہے۔ قرآن نے اس فتنہ کو ختم کرنے کی ہدایت اور حکم دیا کہ پوری زندگی بغیر کسی استثنا اور بغیر کسی تحفظ کے اسلام کی نگرانی میں آجانی چاہئے۔ یہ نہ ہو کہ زندگی کے ایک حصہ میں اسلام سے وفاداری ہو اور زندگی کے دوسرے حصوں میں کسی اور سے روابط استوار کیے جائیں۔ پورے کے پورے اسلام کو اپناؤ اور اسلام سے وفاداری میں کسی تقسیم کو گوارا نہ کرو۔

۵۹۳ ۔ اے ایمان والو! تم پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ پہلی آیت میں

مومن مخلص کی مدح فرمائی تھی جس سے نفاق کا ابطال منظور تھا۔ اب فرماتے ہیں کہ اسلام کو پورا پورا قبول کرلو۔ یعنی ظاہر و باطن، عقیدہ عمل میں صرف احکام اسلام کا اتباع کرو نہ کہ اپنی عقل یا کسی دوسرے کے کہنے سے کوئی حکم تسلیم کرلو یا کوئی عمل کرنے لگو۔ اس سے بدعت کا قلع قمع مقصود ہے کیونکہ بدعت کی حقیقت یہی ہے کہ کسی عقیدہ یا عمل کو کسی وجہ سے مستحسن سمجھ کر اپنی طرف سے دین میں شمار کرلیا جائے۔ مثلاً نماز روزہ جو کہ افضل عبادت ہے اگر بدون حکم اسلام کوئی اپنی طرف سے مقرر کرنے لگے جیسے عید کے دن عیدگاہ میں نوافل پڑھنا یا ہزاری روزہ رکھنا تو یہ بدعت ہوگا خلاصہ یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ اور بدعات سے بچتے رہو[1]

سلم زیر اور زبر دونوں کے ساتھ ہے اور دونوں کے الگ الگ معنے ہیں۔ زیر کے ساتھ اسلام کے معنے ہیں اور زبر کے ساتھ امن اور صلح کے معنے میں ہے۔ اس جگہ جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک اسلام مراد ہے لفظ کافۃ جمیعًا اور عامۃ کے معنے میں ہے۔ یہ لفظ یہاں ترکیب میں حال ہے۔ اس میں دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ ادخلوا کی ضمیر سے حال ہو دوسرے یہ کہ سلم کا حال ہو۔ پہلی صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ تم پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ یعنی تمہارے ہاتھ پاؤں، آنکھ کان، دل اور دماغ سب کا سب دائرۂ اسلام اور طاعت الٰہیہ میں داخل ہونا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ ہاتھ پاؤں سے تو احکام الٰہیہ بجالا رہے ہو مگر دل و دماغ اس پر مطمئن نہ ہوں۔ یا دل و دماغ تو اس پر مطمئن ہوں مگر ہاتھ پاؤں اور اعضا و جوارح عمل میں دل و دماغ کا ساتھ نہ دیتے ہوں۔ اور اس سے زیادہ واضح یہ کہ تمہاری زندگی کے سارے گوشوں میں اسلام ہو یہ نہ ہو کہ مسجد کی حدود کے اندر تو اسلام کو اپنایا جاتے اور زندگی کے سارے احوال و اطوار غیر اسلام کے سپرد کر دیے جائیں۔ تزکیۂ نفس کی حد تک تو اسلام کی تعلیمات پر عمل کیا جائے مگر سیاسی، اجتماعی، تمدنی، تہذیبی زندگی کو غیر اسلام کے لیے آزاد چھوڑ دیا جائے۔

دوسری صورت میں ترجمہ یہ ہوگا کہ پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ اسلام کے بعض احکام تو قبول کرو اور بعض میں پس و پیش رہے۔ اور چونکہ اسلام نام ہے اس مکمل نظام حیات کا جس کی آغوش میں عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، اخلاق اور حکومت و سیاست سب موجود ہیں۔ تم سب اس پورے نظام میں داخل ہو جاؤ۔

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۴۰

خلاصہ دونوں صورتوں کا ایک ہے کہ اسلام خواہ کسی شعبۂ زندگی سے متعلق ہو جب تک اس کے تمام احکام کو سچے دل سے قبول نہ کرو گے مسلمان کہلانے کے مستحق نہیں ہو۔

اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی تنبیہ ہے جنہوں نے اسلام کو صرف مسجد اور عبادات کے ساتھ مخصوص سمجھ لیا ہے۔ معاملات اور معاشرت کے احکام کو گویا دین کا جزء ہی نہیں سمجھتے۔ اصطلاحی دینداروں میں یہ غفلت عام ہے۔ حقوق و معاملات اور خصوصاً حقوقِ معاشرت سے بالکل بیگانہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام کو وہ اسلام کے احکام ہی یقین نہیں کرتے۔ نہ ان کے معلوم کرنے کا اہتمام کرتے ہیں نہ ان پر عمل کرنے کا[1]

الغرض آیت کا مقصد یہ ہدایت دینا ہے کہ کسی استثنا اور تحفظ کے بغیر اپنی پوری زندگی اسلام کے تحت لے آؤ۔ تمہارے خیالات، تمہارے نظریات، تمہارے علوم تمہارے اطوار و احوال تمہارے معاملات اور تمہاری تگ و دو کے راستے سب بالکل تابع اسلام ہوں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی زندگی کو مختلف حصوں میں تقسیم کر کے بعض حصوں میں اسلام کی پیروی کرو اور بعض حصوں کو اس کی پیروی سے مستثنیٰ کر لو[2]

اس آیت پر سرسری نگاہ ڈال کر نہ گزر جائیے، خاص طور پر پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ اسلام صرف چند عقائد یا صرف چند عبادات، یا صرف چند قوانین کا نام نہیں ہے۔ یہ ایک جامع اور مانع نظامِ حیات ہے، ایک مکمل و منظم دستورِ زندگی ہے، انسانیت کے ایک ایک شعبہ، ہر ہر گوشہ پر حاوی اور اس کا ہر جُز اس کے کل سے اس کے دوسرے اجزاء سے نہایت درجہ ملحق و مرتبط یہ نہیں ہو سکتا کہ کوئی شخص توحید تو اسلام سے لے لے لیکن عبادات کے مسجد، کلیسا، مندر سب کو یکساں سمجھے یا رسالت پر تو ایمان لے آئے لیکن معاشیات کے قاعدے کارل مارکس سے اور اخلاق کے ضابطے گوتم بدھ سے لینے چاہے۔ معادیات، معاشیات، اخلاقیات، اجتماعیات اسلام کے سب اپنے ہیں۔ کسی اور فلسفہ کسی اور دین کسی اور نظریہ کی پیوندکاری اسلام کے ساتھ نہیں ہو سکتی[3]

۵۹۴۔ اور شیطان کے نقشِ قدم پر نہ چلو وہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ کہ اپنے وسوسے سے بے اصل چیزوں کو تمہارے دل نشین کرتا ہے اور دین میں بدعات کو شامل کرا کے تمہارے دین کو

---

[1] معارف القرآن م ش ص ۴۴۳ [2] تفہیم القرآن [3] ماجدی

خراب کرتا ہے اور تم اس کو پسند کرتے ہو۔[1]

شیطان کے نقشِ قدم پر چلنے کی متعدد صورتیں ہیں مثلاً یہ کہ اپنے آپ کو مسلمان کہلاتے رہو رسُوم لو مجوسِ عجم سے، معاشرت اختیار کرو مشرکینِ ہند کی، قانونِ فوجداری لے لو فرنگی ملحدین سے، معاشیات لے لو سوشلزم کے نام پر رُوس اور چائنا کے بے دینوں سے، معاملات طے کرنے لگو دستورِ یہود کے مطابق۔ شیطان کے نقشِ قدم پر چلنا یہی ہے کہ اسلام میں غیر اسلام کی آمیزش کی جاتے اور اسے کوئی اصلاحی اور تجدیدی کارنامہ قرار دیا جاتے۔ اسلام کامل ہے اور اس کا کمال یہی ہے کہ جو بات اسلام میں قابلِ رعایت نہ ہو دین ہونے کی حیثیت سے اس کی رعایت نہ کی جائے اور ایسے امر کو دین سمجھنا ایک شیطانی لغزش ہے اور یہ نسبت ظاہری معاصی کے اس میں زیادہ سنگینی ہے۔ اس آیت میں بیک وقت دو کو شدید تنبیہہ ہے ایک طرف جاہل متبدع اہلِ تصوف کو دوسری طرف روشن خیال اہلِ تجدد کو۔[2]

۵۹۵۔ پھر دیکھو اگر تم ڈگمگا گئے باوجودیکہ ہدایت کی روشن دلیلیں تمہارے پاس آچکی ہیں تو جان لو کہ اللہ غالب حکمت والا ہے۔ یعنی شریعتِ محمدی کے صاف صاف احکام معلوم ہونے کے بعد بھی اگر کوئی اس پر قائم نہ ہو بلکہ دوسری طرف بھی نظر رکھے تو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ سب پر غالب ہے جس کو چاہے سزا دے کوئی اس کے عذاب کو روک نہیں سکتا۔ بڑا حکمت والا ہے جو کرتا ہے حق اور مصلحت کے موافق کرتا ہے خواہ عذاب دے یا ڈھیل دے۔ یعنی نہ جلد باز ہے نہ بھولنے والا نہ خلافِ انصاف اور غیر مناسب کرنے والا۔[3]

بیّنات سے مراد وہ تنبیہات ہیں جو شیطان کی چالوں اور اس کے فتنوں سے آگاہ کرنے کے لیے نہایت تفصیل کے ساتھ قرآن میں بیان ہوئی ہیں اور وہ واضح اور قطعی ہدایات بھی ہیں جو ایمان کے تقاضوں کو بیان کرنے کے لیے آئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر سُورج کی طرح روشن ہدایات کے باوجود بھی تم خدا کے اپنے ازلی اور کھلے ہوئے دشمن ہی کے نقشِ قدم پر چلتے ہو تو اس بات کو خوب اچھی طرح سمجھ لو کہ خدا کی پکڑ سے تم کسی طرح بچ نہیں سکتے وہ عزیز و حکیم ہے۔[4]

آیت میں عزیز لاکر اس جانب اشارہ کیا ہے کہ ہر قسم کی قدرت اور قوت کا خزانہ اللہ کی ذات

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] ماجدی [3] افاداتِ شیخ الہند [4] تدبرِ قرآن

ہے اور اس کی ہدایات کی خلاف ورزی کرنا اس کی قدرت و طاقت کے بالمقابل آنے کے مترادف ہے۔ اسی طرح لفظ حکیم لاکر یہ بتایا ہے کہ جو کچھ اس نے اپنے بندوں کے لیے طریقہ اختیار کیا ہے وہ سراسر خیر ہے اور جن امور سے روکا ہے ان میں شر ہی شر ہے۔ اگر لوگ اس کے احکامِ طاعت اور اس کی ممانعتوں سے نہیں بچیں گے تو وہ خسارے میں رہیں گے۔

زللتم زلۃ سے بنا ہے اس کے لفظی معنے پھسل جانے کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی بالارادہ نہیں پھسلتا ہے۔ یہ ایک بے اختیار عمل ہے۔ یہ لفظ لاکر ڈرایا ہے کہ بالارادہ اور دانستہ مخالفت بڑی چیز ہے۔ جب غلطی اور بے خیالی سے بہک جانے میں بھی گرفت کا احتمال ہے۔ غور فرمائیے کہ یہ مخاطبت کن لوگوں سے کی جا رہی ہے۔ ان سے جن کی نمازیں اور عبادتیں یکسر خلوص و للہیت سے معمور تھیں، اعمالِ صالحہ اور فضائلِ اخلاق کی ساری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے تھے جن کے درجات اور علوِ مرتبت پر خود قرآن گواہ ہے۔ اس کے باوجود اُن کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ اگر زندگی کی محبتوں اور الفتوں نے اسلام کے کچھ اجزاء سے بھی بیزاری اور بے توجہی کا مظاہرہ کیا تو پھر یقین کر لو کہ خدا کوئی کمزور و ناتواں ہستی نہیں ہے بلکہ وہ غالب و توانا ہے۔ تو جو اس کی تنبیہات کے باوجود شیطان کی پیروی کریں گے ان کو ضرور پکڑے گا۔

آج جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری نمازیں اور دعائیں، ہمارے اوراد اور وظائف اور ہماری پرستشیں اور ریاضتیں آخرت کی نجات و فلاح کے لیے کافی ہیں انہیں غور کرنا چاہیے کہ جب صحابہ کرام کو ان کی نمازوں اور عبادتوں کے باوجود انجام سے اس لیے ڈرایا جا رہا ہے کہ مبادا اسلام کی سربلندی اور نبوت کے لائے ہوئے نظام حیات کے غلبہ کی کوشش میں ان کے قدم سست پڑ جائیں تو ہم لوگوں کی عبادتیں کس شمار و قطار میں ہیں جبکہ خدا کے دین کو سربلند کرنے اور پورے اسلام کو غالب کرنے کے لیے ادنیٰ ترین قربانی دینے پر بھی تیار نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے دل بھی اب اس آرزو اور تمنا سے خالی ہو چکے ہیں کہ زمین پر اللہ کا کلمہ بلند ہو اور اس کے عطا کیے ہوئے قانونِ سعادت اور ضابطہ حیات کا بول بالا ہو۔

۵۹۶ ۔ یہ لوگ کیا اس کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ اور اس کے فرشتے بادلوں کے سائبانوں میں ان کے پاس آئیں اور جو کچھ ہونا ہے اس کا فیصلہ کر دیا جائے۔ یعنی جو لوگ حق تعالیٰ کے صاف صاف احکام کے باوجود بھی اپنی کج روی سے باز نہیں آتے تو ان کو رسول اور قرآن پر تو یقین و اعتماد نہ ہوا۔ اب صرف اس کی کسر ہے کہ اللہ پاک خود اور اس کے فرشتے ان پر آئیں اور جزا و سزا کا

فصلہ جو قیامت کو ہونے والا ہے آج ہی فیصلہ ہو جاتے۔ آخر کار سب امور حساب و عذاب کا مرجع اللہ ہی کی طرف ہے۔ تمام حکم اسی کے حضور سے صادر ہوتے ہیں۔ اس میں تردد کی کوئی بات نہیں گھبراتے کیوں ہو[1]

مطلب یہ ہے کہ ان بینات اور تنبیہات کے بعد بھی جو لوگ جادہ مستقیم پر گامزن نہ ہو سکے۔ اب سنۃ اللہ کے تحت تو ان پر حجت کے پورا ہونے کے لیے کوئی چیز باقی نہیں رہی۔ اب بھی اگر وہ کسی چیز کے منتظر ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اب اس بات کے خواہش مند ہیں کہ اللہ سبحانہ ان کو اپنا جلال دکھائے اور حق و باطل کی اس کش مکش کا آخری فیصلہ کر دے لیکن اس فیصلہ کا تعلق براہِ راست اللہ سے ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کس قوم کا فیصلہ کب ہونا اور کس طرح ہونا چاہیے[2]

ایک اہم حقیقت

یہ الفاظ قابلِ غور ہیں۔ ان سے پتہ چلتا ہے کہ اس دنیا میں انسان کی ساری آزمائش صرف اس بات میں ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھے بغیر مانتا ہے یا نہیں اور ماننے کے بعد اتنی اخلاقی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کہ نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود فرمانبرداری اختیار کرے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی بعثت میں، کتابوں کی تنزیل میں حتیٰ کہ معجزات تک میں عقل کے امتحان اور اخلاقی قوت کی آزمائش کا ضرور لحاظ رکھا ہے اور کبھی حقیقت کو اس طرح سے پردہ نہیں کیا ہے کہ آدمی کے لیے مانے بغیر چارہ نہ رہے کیونکہ اس کے بعد تو آزمائش بالکل بے معنے ہو کر رہ جاتی ہے اور امتحان میں کامیابی و ناکامی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ اسی بنا پر یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ اس وقت کا انتظار نہ کرو جب اللہ اور اس کی سلطنت کے کارکن فرشتے خود سامنے آجائیں گے۔ کیونکہ پھر تو فیصلہ ہی کر ڈالا جائے گا۔ ایمان لانے اور طاعت میں سر جھکا دینے کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت تمہارے حواس سے پوشیدہ ہے اور تم محض دلیل سے اس کو تسلیم کر کے اپنی دانش مندی کا اور محض فہمائش سے اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر کے اپنی اخلاقی طاقت کا ثبوت دیتے ہو۔ ورنہ جب حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی اور تم بچشم خود دیکھ لو گے کہ خدا اپنے تختِ جلال پر متمکن ہے اور یہ ساری کائنات کی سلطنت اس کے فرمان پر چل رہی ہے اور یہ فرشتے زمین و آسمان کے

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] تدبرِ قرآن

انتظام میں لگے ہوئے ہیں اور یہ تمہاری ہستی اس کے قبضۂ قدرت میں پوری بے بسی کے ساتھ جکڑی ہوئی ہے۔ اس وقت تم ایمان لائے اور اطاعت پر آمادہ ہوئے تو اس ایمان و طاعت کی قیمت ہی کیا ہے؟ اس وقت تو کوئی کٹے سے کٹا کافر اور بد سے بدتر مجرم و فاجر بھی انکار و نافرمانی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایمان لانے اور اطاعت قبول کرنے کی مہلت بس اسی وقت تک ہے جب تک کہ پردہ کشائی کی وہ ساعت نہیں آتی۔ جب وہ ساعت آگئی تو پھر نہ مہلت ہے نہ آزمائش، بلکہ وہ فیصلہ کا وقت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمان و ہدایت وہ معتبر ہے جو نتیجہ ہو آیاتِ الٰہی کے سننے اور سمجھنے کا نہ کہ وہ جو منتظر ہو جلالِ الٰہی اور قہر خداوندی کے ظہور اور مشاہدہ کا۔ جو گروہ اس چیز کا منتظر ہوتا ہے وہ صرف اپنی شامت کے ظہور کا منتظر ہوتا ہے اس لیے کہ وہ حقائق کو دیکھ کر ماننا چاہتا ہے اور اللہ کو مطلوب یہ ہے کہ انسان اپنی عقل سے کام لے اور اس کے روانہ کیے ہوئے نبیوں اور رسولوں کی رہنمائی کو قبول کرے۔

عقائد کا ایک اہم اُصولی مسئلہ

عقائد کا یہ اُصولی اور مسلّم مسئلہ ہے کہ ذات باری کے لیے نہ محل ہے نہ ظرف۔ اس لیے اسلامی عقیدے کے لحاظ سے اللہ تعالیٰ کے آنے یا جانے کے کوئی معنی ہی نہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ عقلاء و حکماء کا اس پر اجماع ہے کہ اللہ کی ذات آنے جانے سے پاک و منزّہ ہے اور آگے اس پر متعدد دلائل قائم کرنے کے بعد لکھتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اللہ کی ذات جسم و مکان سے پاک ہے، آنے اور جانے کا وہاں کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ اکثر مفسرین نے آیت کو متشابہات میں شمار کیا ہے اور صاف لکھ دیا ہے کہ اس پر اجمالی ایمان کافی ہے۔ تفصیل عقلِ بشری سے ماوراء ہے۔ چنانچہ مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے لیے آنا وغیرہ جہاں مذکور ہے اس کی حقیقت کے درپے ہونا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جس طرح اس کی ذات کی حقیقت کسی کو مدرک نہیں ہوئی ہے اسی طرح اس کے صفات و افعال کی کنہ معلوم نہیں ہو سکی، البتہ وجود اور وقوع پر اجمالاً بلا تعیینِ کیفیت ایمان لے آنا چاہیے۔ اس سے زیادہ فکر میں پڑنا مالایطاق کا قصد کرنا ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا اس طرح آنا متشابہات میں سے ہے جس کے متعلق جمہور صحابہ و تابعین اور اسلافِ اُمت کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے مضمون کو حق و صحیح ہونے کا اعتقاد و یقین رکھے اور کیفیت کہ کس طرح یہ کام ہو گا کہ اس کی دریافت کی فکر میں نہ پڑے۔ کیونکہ جیسے اللہ

کی ذات اور تمام صفات کی حقیقت اور کیفیت کا معلوم کرنا انسان کی عقل سے بالاتر ہے، یہ بھی اس میں داخل ہے۔ مولانا محمد ادریس فرماتے ہیں کہ

جن آیات و احادیث میں حق تعالیٰ کا آنا اور اُترنا اس قسم کے اُمور کا ذکر آیا ہے اس کے بارے میں علمائے سلف کا مسلک یہ ہے کہ ان کی تحقیق و تفتیش میں نہ پڑے اور بلا تشبیہہ و تمثیل ان پر ایمان لائے جس طرح اللہ کی ذات بے چون و چگون ہے اسی طرح اس کے افعال بھی بے چون چگون ہیں۔ اور علماء خلف کا مسلک یہ ہے کہ وہ عوام کے عقائد کی حفاظت کے لیے کوئی مناسب تاویل کر دیتے ہیں تاکہ ظاہر الفاظ سے عوام کسی غلط فہمی میں نہ پڑ جائیں۔ مثلاً اس آیت کے وہ معنے بتاتے ہیں کہ آنے سے اللہ کا حکم یا عذاب کا آنا مراد ہے۔ اور حضرات صوفیائے کرام یہ فرماتے ہیں کہ بادلوں کے اندر اللہ کے آنے سے اللہ سبحانہٗ کی تجلیات مراد ہیں۔ یعنی قیامت کے روز اللہ تعالیٰ ظلل من الغمام میں متجلی ہوگا اور جس طرح آنکھ کی پتلی میں آسمانوں کا جلوہ اور الفاظ کے پردے میں معانی کا جلوہ دیکھا جا سکتا ہے اسی طرح ابر کے سائبانوں میں حق سبحانہٗ کا بے چون و چگون جلوہ دیکھا جا سکتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ رشید آگیا، یہ بات میرے خیال میں آگئی اور صبح آگئی۔ آنا سب جگہ ہے مگر حقیقۃً ہر جگہ مختلف ہے۔ آنا آنے والے کے تابع ہے۔ زید کا آنا اور قسم کا ہے، کسی بات کا دل میں آنا اور قسم کا ہے۔ ایسا ہی اللہ تعالیٰ کے آنے کو سمجھو کہ اس کا آنا اس شان اور عظمت کے مطابق ہوگا چنانچہ صاحب رُوح المعانی علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ آئے گا جیسا آنا اس کی شان کے مطابق ہوگا۔ اس کی ذات محدثات کی مشابہت اور ممکنات کی صفات کی قید سے پاک ہے۔ یہی سلف صالحین کا مذہب ہے۔

ایک تفسیری نکتہ

مولانا دریا بادی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی فرما کر داد تحقیق دی ہے کہ اگر آیت قرآنی کا رُخِ سخن یہودیوں کی طرف کر دیا جاتے تو بات بالکل صاف ہو جاتی ہے اور بجائے سابقہ تفسیرات کے صرف اتنا بڑھا دینا پڑے گا "حسب اعتقادِ یہود"، کیونکہ یہود کا مذہب تشبیہہ و تجسیم کا تھا۔ یہ لوگ خدا کی جسمانیت کے پوری طرح قائل تھے اور جلوہ حق کو بادلوں سے خاص طور پر متعلق سمجھتے تھے بلکہ بادلوں کو گویا اللہ تعالیٰ کی سواری سمجھے ہوئے تھے۔ اُن کے مقدس نوشتوں اور صحیفوں میں اب تک اس قسم کی تعلیمات محفوظ چلی آتی ہیں۔ " وہ نور کی پوشاک کی مانند پہنتا ہے اور آسمانوں کو پردے

سَلْ بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ كَمْ آتَيْنَاهُم مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ ۗ وَمَن يُبَدِّلْ
نِعْمَةَ اللَّهِ مِن بَعْدِ مَا جَآءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢١١﴾
زُيِّنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَوٰةُ الدُّنْيَا وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ
آمَنُوا ۘ وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيَٰمَةِ ۗ وَاللَّهُ يَرْزُقُ
مَن يَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٢١٢﴾

بنی اسرائیل[۵۹۷] سے دریافت کرلو کہ ہم نے ان کو کتنی روشن دلیلیں دی تھیں۔ اور یاد رکھو جو کوئی بھی اللہ کی نعمت[۵۹۸] سے ہمدوش ہونے کے بعد اُسے بدل ڈالتا ہے تو اللہ کا قانون بھی اُسے سزا دینے میں بہت سخت ہے۔ جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے دُنیا کی زندگی اُن کے لیے بڑی محبوب[۵۹۹] اور پسندیدہ بنادی گئی ہے اور وہ اس زندگی کی سرشاریوں میں ان لوگوں کا مذاق اڑاتے[۶۰۰] ہیں جو نعمتِ ایمان سے مالا مال ہیں۔ حالانکہ روزِ قیامت اہلِ تقویٰ ہی اُن کے مقابلے میں سربلند ہوں[۶۰۱] گے اور باقی رہی دُنیا کی دولت تو یہ اللہ کے اختیار میں ہے جسے چاہتا ہے وہ بے حساب دے دیتا ہے۔

کے مانند پھیلاتا ہے وہ اپنے بالاخانوں کو پانیوں میں بناتا ہے اور بدلی کو اپنی رتھ ٹھہراتا ہے اور ہوا کے بازوؤں پر وہ سیر کرتا ہے (زبور ۱۰۴-۳) خداوند ایک تیز رو ابر پر سوار ہو کر مصر آئے گا اور مصر کے بت اس کے حضور میں لرزاں ہوں گے (یسعیاہ ۱۹-۱) کروبی گھر کی داہنی طرف کھڑے ہوتے اور اندرونی صحن بادل سے بھر گیا۔ تب خداوند کا جلال کروبی سے اٹھ گیا اور گھر کے آستانہ پر آیا اور گھر بادل سے بھر گیا اور صحن خداوند کے جلال کی چمک سے معمور ہو گیا (حزقی ایل) غرض اللہ تعالیٰ کا بادلوں سے بطور مرکب یا سواری کے قریب ترین تعلق یہود کے تخیل میں رچ گیا تھا۔ لہٰذا اس آیت میں قرآن مجید نے اپنی طرف سے کوئی بات نہیں کہی ہے بلکہ ضمیر غائب لا کر صرف یہود کے نظریہ کی ترجمانی کی ہے کہ یہ بنی اسرائیل اس خیال میں مگن ہیں کہ اللہ تعالیٰ مع فرشتوں کے بدلیوں پر سوار ہو کر ان کے سامنے آئیں گے اور ہر امر قطعی کا فیصلہ فرما دیں گے۔ امام رازی کی نظر اس نکتہ پر پہنچ گئی اور وہ اپنی تفسیر میں لکھ گئے کہ میرے خیال میں یہی تفسیر تمام تفسیرات سے زیادہ واضح ہے۔ اس لیے اب اس تشریح کے بعد نہ مجاز وغیرہ کسی تاویل کی حاجت رہتی ہے اور نہ کوئی اشکال رہتا ہے۔

سعادت وشقاوت کا پیمانہ

جیسے کائنات کا عام قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے۔ ممکن نہیں کہ یہاں کوئی چیز اپنا وجود رکھتی ہو اور آثار و نتائج کی گرفت سے بالا ہو۔ جیسے اللہ سبحانہ نے اجسام میں خواص و نتائج رکھے ہیں اسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں اور جیسے جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں اسی طرح روح انسانی کے لیے بھی قدرتی انفعالات ہیں۔ جسمانی موثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں اور معنوی موثرات سے روح انسانی متاثر ہوتی ہے۔ اعمال کے بھی قدرتی خواص و نتائج ہیں جنہیں سعادت وشقاوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اچھے اعمال کا نتیجہ سعادت ہے اور برے اعمال کا نتیجہ شقاوت ہے۔ سعادت وشقاوت کے اس نقشہ میں نسب اور نسبتیں بیکار ہیں۔ پچھلی آیت میں صحابہ کرام کو مخاطب کر کے کہا تھا کہ واضح اور روشن دلائل آنے کے بعد حق کے جادہ سے قدموں کی لغزش اللہ کے قانون کی پکڑ سے بچا نہیں سکتی ہے۔ اللہ کی ہدایت ظاہر ہو چکی اور تمہیں وہ سب کچھ بتایا جا چکا ہے جس کی سعادت اور استقامت حق کے لیے

ضرورت تھی۔ اس پر بھی اگر تم نے ٹھوکر کھائی اور راہِ ہدایت پر قائم نہ رہے تو یہ نعمتِ الٰہی کو محرومی سے بدلنا ہوگا۔ ایمان کی برکتیں اور سعادتیں حاصل کرنے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ اسلام کے دائرے میں آجاؤ بلکہ چاہیے کہ پوری طرح آجاؤ یعنی اعتقاد و عمل کے ہر گوشہ میں ایمان کی رُوح تمہارے اندر پیدا ہو جائے اور از سرتا پا پیکرِ ایمان ہو جاؤ۔　　اس سلسلے میں بنی اسرائیل سے عبرت پکڑو کہ اللہ نے ان کو ہدایت و سعادت کی راہ دکھائی۔ لیکن انہوں نے محرومی و شقاوت کی راہ اختیار کی۔ سعادت و شقاوت کا پیمانہ سب کے لیے ایک ہے۔

۵۹۷۔ بنی اسرائیل سے دریافت کرلو۔ سعادت و شقاوت کے اجتماعی قانون کو سمجھنے کی خاطر بنی اسرائیل کو اس سوال کے لیے دو وجہ سے پیشِ منظر رکھا گیا ہے۔ ایک یہ کہ آثارِ قدیمہ کے بے زبان کھنڈروں کی بہ نسبت ایک جیتی جاگتی قوم زیادہ بہتر سامانِ عبرت و بصیرت ہے۔ دوسرے یہ کہ بنی اسرائیل وہ قوم ہے جس کو کتاب اور نبوّت کی مشعل دے کر دُنیا کی رہنمائی کے منصب پر مامور کیا گیا تھا اور پھر اس نے دُنیا پرستی، نفاق اور علم و عمل کی ضلالتوں میں مبتلا ہو کر اس نعمت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا۔ لہٰذا جو گروہ ان کے بعد منصبِ امامت پر مامور ہوا ہے اس کو سب سے بہتر سبق اگر کسی کے انجام سے مل سکتا ہے تو وہ یہی قوم ہے[1]

گویا اس موقعہ پر اللہ سبحانہٗ نے حضور انور پیشِ منظر رکھ کر اہلِ ایمان کو سمجھایا ہے کہ بنی اسرائیل سے دریافت کرو کہ ان کے پاس کتنی صاف اور واضح آیات آچکی ہیں۔

آیت بینۃ سے مراد وہ کھلی کھلی نشانیاں ہیں جو بطورِ معجزہ کے بنی اسرائیل کو ملی ہیں۔ ان کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ ایمان و ہدایت کا راستہ ان پر کھلتا ہے جو عقل اور سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ اور جو عقل سے کام نہیں لیتے وہ دنیا کے جہان کے معجزے دیکھ کر بھی بدستور اپنے تذبذب اور اپنی بے اعتقادی ہی میں پڑے رہتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی تاریخ معجزات کی داستان ہے۔ سمندر کا خشک ہونا، ایک خشک پہاڑی سے بارہ چشموں کا پھوٹ پڑنا، ایک بے آب و گیاہ زمین میں ان کے لیے من و سلویٰ کا خوانِ نعمت بچھا دینا۔ غرض قدم قدم پر ان کے لیے معجزے ظاہر ہوتے لیکن جو بے اعتقادی ان پر روزِ اوّل سے مسلط تھی وہ بدستور مسلط رہی۔ پھر انہی کے نقشِ قدم پر چلنے والوں سے یہ توقع کس طرح کرتے ہو کہ اگر اُن کے سامنے ان کی

[1] تفہیم القرآن

طلب کے مطابق کوئی معجزہ ظاہر ہو جائے گا تو اُن کی آنکھیں کھل جائیں گی۔ یہ غلط ہے اُن کی آنکھیں بڑے بڑے معجزے دیکھ کر بھی نہیں کھلی ہیں [1]

تقریباً سارے ہی مفسرین نے تھوڑے بہت اختلاف کے ساتھ آیت بینات پر یہی تشریحی نوٹ لکھا ہے۔ لیکن قرآن کے سیاق و سباق پر غور کرنے سے جو بات صاف معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ اس موقعہ پر آیۃ بینۃ سے احکام تشریعی یعنی کتاب الٰہی کی آیات مراد ہیں۔ سیاق میں کہا گیا ہے فان زللتم من بعد ما جاءتکم البینات یعنی اگر تم پھسل گئے۔ واضح آیات کے آنے کے باوجود تو پھر تم اللہ کے قانونِ جزا سے نہیں بچ سکتے ہو۔ اس میں البینات سے مراد کھلے ہوئے احکام ہیں اور سباق میں اس ارشاد کے یہ ضابطہ عام اور قانونِ کلی آرہا ہے کہ ومن یبدل نعمۃ اللہ جو بھی اللہ کی نعمت کو بدل ڈالے گا۔ یہاں باتفاقِ مفسرین نعمت سے مراد اللہ کی شریعت اور احکام ہیں۔ اگر سیاق و سباق میں احکام کا ذکر ہے تو کوئی وجہ نہیں کہ درمیان میں آیۃ بینۃ سے معجزات و خوارق مراد لیے جائیں اور اس طرح آیت کو اپنے مطالب کے لحاظ سے ما قبل اور ما بعد سے بے جوڑ بنا دیا جائے۔ مطلب یہی ہے کہ بنی اسرائیل موجود ہیں ان سے پوچھ لو کہ ان کو اللہ نے زندگی کو عابدانہ بنانے کے لیے کتنے واضح احکام دیے تھے اور یہ اللہ سبحانہٗ کی نعمتِ کبریٰ تھی۔ ان کو اس نعمت کا شکر ادا کرنا چاہیے تھا اور دل و جان سے اس کو قبول کرتے، اس پر عمل پیرا ہوتے، اور زندگی کو اس کے مطابق بناتے لیکن انہوں نے دیدہ دانستہ حق سے انحراف کیا اور دُنیا پرستی اور علم و عمل کی گمراہیوں میں مبتلا ہو کر اس نعمت سے اپنے آپ کو محروم کر لیا اور اس کے نتیجہ میں وہ امامت کے منصب سے معزول ہو گئے۔ تمہیں ان کے انجام سے سبق سیکھنا چاہیے۔ اس لیے اس آیت میں آیۃ بینۃ سے مراد بنی اسرائیل کی سرفرازیاں مثلاً کتاب تورات اور دوسرے آسمانی صحیفوں کا نزول اور ان میں انبیائے کرام کا مسلسل ظہور ہے۔ کتابوں کی صورت میں علم کی نعمت، اور انبیاء کی صورت میں عمل کی نعمت ہے۔ اللہ نے ان کو نوازا تھا اور جیسا کہ ہم سورۃ فاتحہ کی تشریح میں بتا چکے ہیں کہ نبوت کا لایا ہوا علم و عمل ہی اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہے۔

نبوت کا لایا ہوا علم و عمل نعمتِ خداوندی ہے

۵۹۸۔ اور یاد رکھو جو کوئی بھی اللہ کی نعمت سے بہرہ وش ہونے کے بعد اسے بدل ڈالتا ہے،

---

[1] تدبر قرآن

یعنی یہ قاعدہ محقق ہے کہ جو کوئی اللہ کے احکام سراپا ہدایت کو بدلے اور اس کے انعامات اور احسانات کا کفران کرے تو پھر اس کا عذاب سخت ہے۔ آیات کے بدلنے والے پر کہ دُنیا میں مارا جائے اور لُوٹا جاتے یا جزیہ دے اور ذلیل ہو اور قیامت کو دوزخ میں جا پڑے ہمیشہ کے لیے۔ نعمت کے آجانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا علم حاصل ہو جاتے یا بے تکلف حاصل ہو سکے لے

اگرچہ قانون عام ہے لیکن اشارۃً آیت بنی اسرائیل کی طرف ہے کہ ہدایت کی امامت و پیشوائی کی باگ ان کے ہاتھ میں تھی۔ اور عامۃ الناس انہی کے پیچھے چلتے تھے۔ فرمایا کہ ان کی محرومی دیکھو کہ کس طرح اللہ کی نعمت کی ناشکری کر رہے ہیں اور ہدایت کی جگہ ضلالۃ کو اپنا شعار بنا لیا ہے اللہ نے انہیں لوگوں کی پیشوائی دی تھی۔ ان کا فرض تھا کہ دعوتِ حق کی قبولیت میں سب سے آگے ہوتے اور لوگوں کی سچی رہنمائی کرتے مگر انہوں نے استبدالِ نعمت کی راہ پسند کی، خود بھی گمراہ ہوئے اور لوگوں کو بھی گمراہ کیا۔

نعمت سے مراد نبوت کا لایا ہوا اللہ کی جانب سے علم و عمل ہے جو پہلے بنی اسرائیل کو ملا تھا اور اب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے مسلمانوں کو ملا ہے اور اس کے بدلنے سے مراد یہ ہے کہ اس کی قدر کرکے اس کو ایمان و ہدایت کا ذریعہ بنانے کے بجائے اس کو کفر کا ذریعہ بناتے ہیں۔ یعنی جو چیز ہدایت اور استفادے کے لیے آئی تھی الٹا اسی کو فسق و کفر کا ذریعہ بنا رہے ہیں۔

نعمۃ اللہ اپنے وسعت و اطلاق کے لحاظ سے اگرچہ ہر قسم کی نعمتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے لیکن یہاں نبوّت کے علم و عمل کی نعمت مراد ہے من بعد ما جاءتہ کا فقرہ زور دینے اور تاکید کے لیے ہے۔ یعنی باوجودیکہ یہ نعمت پوری طرح ان کے پاس موجود ہے۔ ان کو اس کی پوری طرح فہم و معرفت حاصل ہے پھر بھی اس کی ناقدری کر رہے ہیں اور اس کے ذریعے زندگی میں بناؤ سنوار نہیں پیدا کرتے۔

قرآن کی یہ آیت آج اُمّت کے کس قدر حسبِ حال اور ان کے لیے کس قدر قابلِ غور ہے اللہ کی عطا کی ہوئی اس علم و عمل کی نعمت کے ساتھ ہمارا کیا حال ہے۔ کون سی نعمت ایسی ہے جس کی رُوح ہم نے نہیں بدل ڈالی۔ ہماری نمازیں، ہمارے روزے، ہمارے حج اور ہماری

لے افاداتِ شیخ الہند

ساری عبادتیں تقویٰ کی رُوح سے خالی ہیں۔ اب صرف ان عبادات کے ڈھانچے موجود ہیں۔ اتفاق اور اخلاق کی دولت ناپید ہے۔ نتیجہ آنکھوں کے سامنے ہے۔

انسانیت نے جب بھی نعمتِ الٰہی سے گریز کیا اور اس کے بدلے دُنیا کو ترجیح دی وہ ہمیشہ اس دنیا میں عذاب سے دوچار رہی ہے۔ آج بھی انسانیت ساری دُنیا میں اسی جُرم کی پاداش میں مبتلائے عذاب ہے، حیرت و اضطراب کا شکار ہے، انسان ایک دوسرے کو کھا رہا ہے۔ نفسیاتی اور اعصابی امراض سے دوچار ہے۔

قرآن کی اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ آیات بیّنات صرف ان میں خیر کی آبیاری کرتی ہیں جن میں قبولِ حق کی صلاحیت ہوتی ہے اور جو اس کی طلب و جستجو کے لیے تگ و دو کرتے ہیں، نفوسِ خبیثہ اور وہ لوگ جو مادی لذّتوں اور حُبِّ جاہ کے بیمار ہیں ان کو آیات و بیّنات کچھ فائدہ نہیں دیتی ہیں۔ یہ اللہ کی سنّت ہے اور صرف بنی اسرائیل کے لیے نہیں بلکہ سب کے لیے ہے۔ ایسا ہی ہوتا رہا ہے ایسا ہی ہو رہا ہے اور ایسا ہی ہوتا رہے گا۔

مادّی قدریں اور ایمانی قدریں

۵۹۹۔ جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے دُنیا کی زندگی ان کے لیے بڑی محبوب ہے یعنی کافر جو اللہ کے صاف احکام اور اس کے پیغمبروں کی مخالفت کرتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کی نظروں میں دُنیا کی خوبی اور اس کی محبت ایسی سما گئی ہے کہ اس کے مقابلے میں آخرت کے رنج اور راحت کو خیال ہی میں نہیں لاتے بلکہ مسلمان جو فکرِ آخرت میں مصروف اور اللہ کے احکام کی تعمیل میں مشغول ہیں اُلٹا ان کو ہنستے اور ذلیل سمجھتے ہیں۔ لہٰذا ایسے احمق نفس کے بندوں سے تعمیلِ احکامِ الٰہی ہو تو کیونکر ہو۔ رؤسائے مشرکین حضرت بلال اور عمار اور صہیب اور فقرائے مہاجرین کو دیکھ کر تمسخر کرتے کہ ان نادانوں نے آخرت کے خیال پر دُنیا کی تکالیف اور مصائب کو اپنے سر لیا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تو دیکھو کہ ان فقیروں محتاجوں کی امداد سے عرب کے سرداروں پر غالب آنا اور دُنیا بھر کی اصلاح کرنا چاہتے ہیں[1]

دُنیا کی زندگی محبوب ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو دُنیا کا ساز و سامان، جاہ و حشم، باغ و

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۴۰

مکان، موٹر اور ریڈیو، کوٹھی اور فرنیچر، سب باوجود فانی اور بے حقیقت ہونے کے انہیں نہایت اہم اور قابل وقعت نظر آتا ہے اور ان کے دلوں کے لیے اس میں خاص کشش ہے[1]

دراصل اس آیت میں پہلی بات کی علت بیان کی جا رہی ہے۔ پہلے یہ بتایا گیا ہے کہ اس دُنیا میں اللہ کی نعمتِ علم و عمل کو کفر سے تبدیل کر دیں گے تو اللہ کا قانون ان کی سخت گرفت کریگا۔

اس آیت میں تبدیل نعمت کی وجہ بتائی گئی ہے کہ بدلنے کا باعث دُنیا کی زندگی کا وہ فریبِ نظر فتنہ ہے جس میں مبتلا ہونے کے بعد غلط کار لوگ اپنی غلط کاری میں مگن زندگی گزارتے ہیں۔ اس بنا پر آیت کفر سے مراد انکارِ خدا، انکارِ رسالت، انکارِ آخرت اور انکارِ وحی نہیں بلکہ کفر یہاں کفران سے ہے اور ناقدری و ناشکری کے معنے میں ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کی جانب سے آئی ہوئی علم و عمل کی نعمت کو تبدیل کرنے کا اصلی باعث دُنیا کی محبت اور اس کی شان و شوکت ہے۔

دُنیا کے فریبِ نظر کو ہی زینت کا مصداق بتایا گیا ہے اور فریبِ نظر یہ ہے کہ اس دُنیا کی زندگی میں حق و باطل اور کفر و ایمان دونوں کو مہلت مل ہوتی ہے۔ کوئی شخص اگر نیکی اور اطاعت کی راہ اختیار کرتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ وہ ابتلا کے قانون سے بالا ہو جاتے بلکہ بعض حالات میں اس کا ابتلا اس کے ایمان کے اعتبار سے سخت سے سخت ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص کفر و نافرمانی کی زندگی گزارنا چاہتا ہے تو اس کے لیے بھی سنۃ الہٰی یہ نہیں ہے کہ فوراً خدا کے فرشتے اتر کر اس کو ناپ لیں بلکہ اکثر حالات میں اس کو ایسی ڈھیل پر ڈھیل دی جاتی ہے کہ اس کی جرأت و جسارت میں روز بروز اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ اسی فریبِ نظر کو یہاں زُیِّنَ سے تعبیر فرمایا ہے[2]

لیکن زینت کی یہ تشریح یہاں جچتی نہیں ہے۔ یہاں تو صرف یہ بتایا جا رہا ہے کہ دُنیا پرستوں کے لیے یہ دُنیوی زندگی خوشنما بنا دی گئی ہے وہ اسی کے حصول میں لگے ہوئے ہیں ان کی نظر اس سے آگے نہیں بڑھتی۔ وہ اس زمین کی مادی قدروں کے علاوہ اور کسی قسم کی قدروں کو نہیں پہچانتے اور ان کے لیے ممکن نہیں ہے کہ یہ اندازہ کر سکیں کہ مومن کی نظر کس قدر بلند اور اس کے تصورات میں کس قدر فوقیت ہے۔ مومن ساری دُنیا کو ٹھکرا دیتا ہے، اس لیے نہیں کہ اس کی ہمتیں پست ہیں یا وہ منفی طرزِ فکر کا حامل ہے اور زمین کی شادابی

---

[1] ماجدی [2] تدبر قرآن

اور دُنیا کی نشوونما سے گریز کرتا ہے بلکہ اس لیے کہ وہ دُنیا پر بلندیوں اور رفعتوں سے نظر ڈالتا ہے۔ وہ دنیا میں منہاجِ الٰہی نافذ کرنا چاہتا ہے تاکہ ساری انسانیت ضابطہ الٰہی کے تحت زندگی بسر کرے۔ انسانیت کے لیے ترقیوں کی راہیں کھل جائیں اور دُنیا کی معمولی اور چھوٹی چھوٹی چیزوں کو نظرانداز کر کے ایمان جیسی ارفع و اعلیٰ رشتہ کو اپنالے اور تمام بحر و بر میں اللہ کا کلمہ بلند ہو۔

۲۰۰۔ اور وہ اس زندگی کی سرشاریوں میں ان لوگوں کا مذاق اڑاتے ہیں جو نعمتِ ایمان سے مالامال ہیں۔ دُنیا پرست اسی دنیوی زندگی کی مادی لذت، دولت، عیش و عشرت پر مٹا رہتا ہے۔ اسی کو مہتم بالشان سمجھتا ہے۔ اسی پیمانے سے سب کو ناپتا رہتا ہے۔ وہ بے حد تنگ نظر ہوتا ہے۔ وہ اس برائے نام عیش پر عیش دوام و عشرتِ لازوال کو قربان کر دیتا ہے۔ اسی غلط معیار کی بنا پر اسی کج نگاہی سے کام لے کر اپنے آپ کو بڑا سمجھتا ہے اور اہلِ ایمان و طاعت کی بے وقعتی اور تحقیر کرتا ہے۔ نگاہ کی یہ کجی اور غلط بینی ہی دُنیا کا شدید ترین ابتلا ہے۔ دُنیا کی آلائشوں میں اُلجھا ہوا جب اہلِ ایمان کو دیکھتا ہے کہ اپنی زندگیاں ان بلند تر مقاصد کے لیے وقف کر چکے ہیں جن میں انسانیت کی فلاح ہے۔ ان مقاصد کے لیے وہ مشقتیں اُٹھاتے ہیں، تکلیفیں برداشت کرتے ہیں اور اپنے تمام دنیوی مفادات کو اس عظیم مقصد کی خاطر قربان کرتے جاتے ہیں تو ان دُنیا پرستوں کو اہلِ ایمان کی ان قربانیوں کا راز سمجھ میں نہیں آتا تو پھر یہ اہلِ ایمان کے طریقِ فکر اور ان کے طرزِ عمل کا مذاق اُڑاتے ہیں۔

۲۰۱۔ حالانکہ روزِ قیامت اہلِ تقویٰ ان کے مقابلے میں سربلند ہوں گے۔ ان مذاق اڑانے والوں کو جواب دیا جا رہا ہے کہ یہ ان کی جہالت اور خام خیالی ہے کہ دُنیا پر ایسے فریفتہ ہیں۔ ان کو پتہ نہیں کہ روزِ قیامت ہی غربا، اور فقرا، ان سے اعلیٰ اور برتر ہوں گے[1] یعنی اس دُنیا میں تو بے شک صورتِ حال یہی ہے کہ دُنیا پرست اہلِ ایمان اور تقویٰ کا مذاق اڑا سکتے ہیں کیونکہ اس دُنیا کا کارخانہ جزا و سزا کے قانون پر نہیں چل رہا ہے بلکہ یہ پورا کارخانہ قانونِ ابتلا کے تحت چل رہا ہے لیکن اس زندگی کے بعد ایک دوسری زندگی آرہی ہے جو جزا و سزا کے قانون کا مظہر ہو گی۔ اس زندگی میں وہ اہلِ ایمان جو دنیا کی زینتوں میں خدا فراموش نہیں ہوئے بلکہ انہوں نے تقویٰ والی زندگی گزاری ہے وہ بالا ہوں گے۔ گویا یہ میزانِ حق ہے جو اللہ سبحانہٗ

---

[1] افاداتِ شیخ الہند ص ۴۱

كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً ۟ فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَ مُنْذِرِيْنَ ۪ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ ؕ وَمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ اِلَّا الَّذِيْنَ اُوْتُوْهُ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ بَغْيًۢا بَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللّٰهُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لِمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِهٖ ؕ وَاللّٰهُ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ﴿۲۱۳﴾

ابتدا میں سب لوگ ایک ہی اُمت تھے پھر اُن میں اختلاف رُونما ہوا پس اللہ نے انبیا روانہ فرمائے۔ نیک عملی کے نتائج کی خوشخبری دینے اور بدعملی کے نتائج سے متنبہ کرنے والے بنا کر۔ اور ان کے ساتھ کتاب برحق نازل کی تاکہ جن باتوں میں اختلاف کرنے لگے تھے ان میں وہ فیصلہ کرے۔ اور لوگ اس لیے باہم مختلف نہیں ہوتے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے ناآشنا تھے نہیں بلکہ وحی الٰہی کے واضح احکام آنے کے باوجود محض آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کا شکار ہوتے۔ بالآخر اللہ نے ایمان

لانے والوں کو دین کی وہ حقیقت اپنے حکم سے سمجھا دی جس میں لوگ مختلف ہو گئے تھے اور اللہ جسے چاہتا ہے راہِ راست دکھا دیتا ہے

کے ہاتھ میں ہے۔ اہلِ ایمان کو چاہیے کہ وہ معیارِ قرآن سے واقف ہو جائیں۔ اور بیوقوف لوگوں کے مذاق اور کافرانہ تصورات کا خیال کیے بغیر ایمانی تقاضے پورے کریں کیونکہ روزِ قیامت برتری اور بالاتری ان کا ہی حصہ ہے۔

یہاں صرف یہ بتایا کہ اہلِ تقویٰ بالا ہوں گے۔ یہ نہیں بتایا کہ مذاق اڑانے والوں کا انجام کیا ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ چیز بالکل متعین ہے۔ اس کی خبر ان کو پیغمبر کے ذریعے سے دی گئی تھی اس وجہ سے اس کے اظہار کی ضرورت نہیں تھی۔[1]

کشمکشِ اختلاف میں صراطِ مستقیم

اس سے پہلے آیات میں اہلِ ایمان کے ساتھ دنیا پرستوں کے مذاق کا تذکرہ تھا۔ اس آیت میں اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی کی جا رہی ہے کہ اطمینان رکھو صراطِ مستقیم پر تم ہی ہو۔ اختلافات کی کشمکش میں صراطِ مستقیم تمہارے ہی پاس ہے۔ اور گمراہی و ضلالت کی اس گھٹا ٹوپ تاریکی میں صرف تم ہی شاہراہِ مستقیم پر گامزن ہو۔ یہ لوگ تمہاری قربانیوں اور دنیا سے بے رخی پر مذاق اڑا رہے ہیں یہ اس باہمی ضد اور عناد کا کرشمہ ہے جس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ابتداء میں انسانی جمعیت کا یہ حال تھا کہ لوگ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے۔ ان میں نہ تو کسی طرح کا اختلاف تھا نہ کسی طرح کی مخاصمت، سب کی زندگی ایک ہی طرح کی تھی اور سب اپنی قدرتی یکرنگی پر قانع تھے۔ پھر ایسا ہوا کہ نسلِ انسانی کی کثرت اور ضروریاتِ معیشت سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ہو گئے۔ اور اختلافات نے تفرقہ و انتشار کی صورت اختیار کر لی۔ ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنے لگا اور ہر زبردست زیردست کے حقوق پامال کرنے لگا۔ جب یہ صورت حال

---

[1] تدبرِ قرآن

پیدا ہوئی تو ضروری ہوا کہ نوعِ انسانی کی ہدایت اور عدل و صداقت کے قیام کے لیے وحی الٰہی کی روشنی نمودار ہو۔ چنانچہ یہ روشنی پیدا ہوئی اور خدا کے رسُولوں کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ قائم ہو گیا۔ اور از آدم تا محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہی سلسلہ قائم ہے۔ دوسرے لفظوں میں ایک ہی پیغام ہے جسے تمام انبیاء کرام لائے، ایک ہی ملت ہے جو ہمیشہ سے چلی آرہی ہے۔ اور جو ایک خدا ایک معبود اور ایک قانون ساز کے تصور پر قائم ہے۔ حضرت شیخ الہند نے یہاں یہ بات بہت اونچی فرمائی ہے کہ قرآن کی یہ آیت ہمیں دو رہنما اصُول سے آشنا کر رہی ہے۔ ایک یہ کہ اللہ نے جو کتابیں اور ایک سے زیادہ انبیاء روانہ کیے ہیں تو اس لیے روانہ نہیں فرمائے کہ ہر فرقہ کو جُدا طریقہ بتایا ہو بلکہ سب کے لیے اللہ نے اصل میں ایک ہی راستہ مقرر کیا۔ جب لوگ اس راستہ سے ہٹ گئے تو اللہ نے انبیاء روانہ فرمائے اور کتابیں نازل کیں تاکہ اس کے مطابق راہِ عمل اختیار کریں۔ اس کے بعد پھر بھٹکے تو اللہ نے مزید پیغمبر اور کتاب اسی راہ کے قائم کرنے کے لیے روانہ کی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے تندرستی ایک ہے اور بیماریاں بے شمار۔ جب ایک بیماری پیدا ہوئی تو دوسری دوا اور پرہیز اس کے مطابق تجویز فرمائی۔ جب دوسرا مرض پیدا ہوا تو دوسری دوا اور پرہیز اس کے موافق فرمایا۔ اب آخر میں ایسا طریقہ اور قاعدہ فرما دیا جو سب بیماریوں سے بچاتے اور سب کے بدلے کفایت کرے اور وہ طریقہ اسلام ہے جس کے لیے پیغمبرِ آخرالزماں اور قرآن شریف روانہ کیے گئے۔

دوسرا اصُول یہ معلوم ہوا کہ اللہ کی سنت یہی ہے کہ بُرے لوگ ہر نبی مبعوث کے خلاف اور ہر کتابِ الٰہی میں اختلاف کو پسند کرتے رہے اور اس میں کوشاں رہے تو اب اہلِ ایمان کو کفار کی بدسلوکی اور فساد سے تنگ دل اور دل برداشتہ نہ ہونا چاہیے۔

۲۰۶۔ ابتداء میں لوگ ایک ہی اُمت تھے یعنی حضرت آدم کے وقت سے ایک ہی سچا دین رہا ایک مدت تک۔ اس کے بعد لوگوں نے اختلاف کر ڈالا تو خدا تعالیٰ نے انبیاء کو بھیجا جو اہلِ ایمان و طاعت کو ثواب کی بشارت دیتے اور اہلِ کفر و معصیت کو عذاب سے ڈراتے تھے اور ان کے ساتھ سچی کتاب بھیجی تاکہ لوگوں کا اختلاف اور نزاع دُور ہو اور دینِ حق ان کے اختلافات سے محفوظ اور قائم رہے۔[1]

---

[1] افادات شیخ الہند ص ۴۱

اس فقرے کان الناس امۃ واحدۃ میں دنیا میں ادیان کی تاریخ بیان کی گئی ہے۔ لفظ اُمۃ عربی زبان میں ہر ایسی جماعت کو کہتے ہیں جس میں کسی وجہ سے رابطہ اتحاد اور وحدت ہو چاہیے یہ وحدت نظریات و عقائد کی ہو یا ایک زمانہ میں یا جگہ میں جمع ہونے کی یا کسی دوسرے علاقہ کی بنا پر ہو مثلاً نسب، زبان، رنگ وغیرہ۔

اس جملہ کا مفہوم یہ ہے کہ کسی زمانہ میں تمام انسان باہم متفق متحد ایک جماعت تھے۔ اس میں دو باتیں قابلِ غور ہیں۔

اوّل یہ کہ اس جگہ وحدت سے کس قسم کی وحدت مراد ہے دوسرے یہ کہ وحدت کس زمانہ میں تھی۔ پہلی بات کا فیصلہ تو اسی آیت کے آخری جملہ نے کر دیا جس میں اس وحدت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا اور مختلف راہوں میں حق متعین کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام اور آسمانی کتابیں روانہ کی گئی ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ نسب یا زبان یا رنگ یا وطن اور زمانہ کا اختلاف نہ تھا بلکہ نظریات اور عقائد و خیالات کا اختلاف تھا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس آیت میں وحدت فکر و خیال اور وحدت عقیدہ مسلک ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ایک زمانہ ایسا تھا جبکہ تمام افرادِ انسانی صرف ایک عقیدہ رکھتے تھے وہ عقیدہ کیا تھا۔ اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ سب عقیدۂ توحید و ایمان پر متفق تھے۔ دوسرے یہ کہ سب کفر و ضلال کو اپناتے ہوئے تھے۔ مفسرین صحابہ و تابعین نے دونوں طرح تفسیر فرمائی ہے مگر جمہور مفسرین کے نزدیک راجح یہ ہے کہ مراد یہ ہے کہ سب ایمان و توحید پر متفق تھے۔

اب یہ سوال کہ ایمان و توحید پر انسانیت کا یہ اتفاق و اتحاد کس دور میں تھا، مفسرین اس میں مختلف الخیال ہیں۔ ابی بن کعب اور ابن زید کہتے ہیں کہ یہ واقعہ عالم ازل سے تعلق رکھتا ہے۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت آدم کے دنیا میں تشریف لانے بسنے اور اولاد ہونے کے بعد کا ہے اور بعض حضرات کہتے ہیں کہ یہ واقعہ طوفانِ نوح کے بعد کا ہے۔ اور حقیقت یہ ہے کہ تینوں صحیح ہیں۔ ان میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ تینوں زمانے ایسے تھے جن میں پوری انسانیت، ملتِ واحدہ اور اُمتِ واحدہ بنے ہوتے ایمان و توحید کی شاہراہ پر تھی[1]

---

[1] معارف القرآن م شفیع ص ۴۹۶

آغازِ فطرت میں نسلِ انسانی توحید پر قائم تھی

اس آیت نے یہ ایک بڑی گرہ کھول دی کہ نسلِ انسانی آغازِ فطرت میں اپنی حیثیت سے ایک اور واحد تھی اور توحید کی علمبردار تھی۔ اس میں مذہب اور ادیان کے تفرقے نہ تھے۔ فرنگی محققین اکثر معمول مدتوں اس باب میں بھٹکتے رہے اور ان میں اکثر یہی کہتے رہے کہ انسان کا ابتدائی مذہب شرک یا تعددِ الٰہہ تھا۔ شروع شروع میں وہ ایک چیز کو خدا سمجھتا تھا اور عقیدہ توحید تو نسلِ انسانی بہت ٹھوکریں کھانے کے بعد پہنچی ہے[1]

قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے جس انسان کو پیدا کیا تھا اس کو یہ بھی بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے؟ اور تیرے لیے صحیح راستہ کون سا ہے۔ اس کے بعد ایک مدت تک نسلِ آدم راہِ راست پر قائم رہی اور ایک امت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کیے۔ اس وجہ سے نہیں کہ ان کو حقیقت نہیں بتلائی گئی تھی بلکہ اس لیے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے اور آپس میں ایک دوسرے پر ظلم و سرکشی اور زیادتی کرنے کے خواہشمند تھے اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انبیاء روانہ فرمائے۔ یہ انبیاء اس لیے نہیں آئے کہ ہر ایک اپنے نام سے ایک نئے مذہب کی بنا ڈالے اور اپنی ایک نئی امت بنالے بلکہ ان کے بھیجے جانے کی غرض یہ تھی کہ لوگوں کے سامنے اس کھوئی ہوئی راہِ حق کو واضح کر کے انہیں پھر سے ایک امت بنا دیں[2]

قرآن کے اس فقرے پر سرسری نظر ڈال کر نہ گزر جاؤ۔ ذرا ٹھہر کر اس پر غور کرو۔ یہ وحدت کس طرح ہر گوشہ میں علم و یقین کی روشنی پیدا کر رہی ہے۔ قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اولاً معاملہ کے لحاظ سے تمام انسانوں کی حالت یکساں رہی ہے۔ کوئی ملک ہو اور کوئی دور ہو وہاں کچھ لوگ ایسے ضرور پیدا ہوئے ہیں جنہوں نے اللہ کے بندوں کو اللہ کی توحید کی تعلیم دی۔ ثانیاً یہ تعلیم اگرچہ مختلف وقتوں مختلف ملکوں، مختلف پیرایوں مختلف زبانوں

---

[1] ماجدی [2] تفہیم القرآن

ہیں دی گئی لیکن ان اختلافات سے تعلیم مختلف نہیں ہوتی وہ ہمیشہ ایک ہی رہی گویا ایک ہی پیغام تھا جو کسی نے بہت سے پیامبروں کو دے کر روانہ کیا ہو اور زبانیں بہت سی ہو گئی ہوں مگر بات ایک ہی رہی ہو۔ ثالثاً۔ تمام دعوتوں کی صرف تعلیم ہی یکساں نہیں رہی بلکہ تذکیر و موعظت کے اصول انذار و تبشیر بھی ایک ہی رہے۔ رابعاً، اگرچہ زمانے مختلف رہے، ملک مختلف ہوتے، قومیں مختلف ہوئیں، احوال و ظروف مختلف رہے مگر جو معاملات پیش آئے وہ اپنی نوعیت میں ہمیشہ ایک ہی طرح رہے۔ خامساً دعوت کے ماننے نہ ماننے کے لحاظ سے بھی حالت ہمیشہ یکساں رہی۔ سادساً، ہمیشہ ماننے والوں کی فکری حالت بھی ایک طرح کی رہی اور نہ ماننے والوں کی فکری حالت ایک ہی طرح کی رہی۔ سابعاً، نتیجہ بھی ہمیشہ ایک ہی رونما ہوا ہے۔ کان الناس اُمة واحدة میں قرآن نے ان سب وحدتوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ جب صورت حال یہ ہے تو تم ان کی مخالفانہ سرگرمیوں کے باوجود اپنے موقف پر جمے رہو۔ آزمائش کا یہ دور جو اللہ تعالیٰ کی سنت کے تحت ہے گزر جانے کے بعد کامیابی اور فتح مندی تمہارے لیے ہے۔

۶۰۳۔ پھر ان میں اختلاف رونما ہوا۔ جس لفظ کا یہ ترجمہ ہے وہ محذوف ہے۔ اس محذوف کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ ہے کہ قرآن میں دوسرے موقع پر ارشاد ہے کان الناس اُمة واحدة فاختلفوا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ اس محذوف کو آگے چل کر کھول دیا ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے لیحکم بین الناس فیما اختلفوا فیہ۔ یہاں یہ حذف عربی اسلوب کے مطابق تکرار سے بچنے کے لیے فرمایا ہے۔

دراصل اس آیت میں وحدتِ ملت کے بعد اختلاف واقع ہونے کا تذکرہ اس لیے ضروری نہیں سمجھا گیا کہ اختلاف کا ہونا تو سب ہی جانتے ہیں ضرورت اس امر کے اظہار کی تھی کہ ان اختلافات کثیرہ سے پہلے ایک ایسا زمانہ بھی گزر چکا ہے جس میں پوری انسانیت ایک ہی مذہب و ملت اور ایک ہی دینِ حق کی پیرو تھی۔ اسی کو بیان فرمایا۔ پھر جو اختلافات دُنیا میں رونما ہوتے اور سب کے مشاہدے میں آرہے ہیں ان کے ہونے کو بیان کرنے کی ضرورت نہ تھی۔

مطلب یہ ہے کہ پہلے دُنیا میں سب انسان ایک دینِ حق پر قائم تھے پھر اختلاف طبائع سے اغراض میں اختلاف ہوا۔ ایک عرصہ کے بعد اعمال و اعتقاد میں اختلاف کی نوبت آگئی جہاں تک کہ حق و باطل میں امتیاز ہی مٹ گیا اور اس کے نتیجے میں گروہ بندی میں مبتلا ہو گئے۔

۶۰۴۔ پھر اللہ نے انبیاء روانہ فرمائے۔ نیک عملی کے نتائج کی خوشخبری دیتے اور بدعملی کے

نتائج سے آگاہ کرنے کے لیے۔ یعنی انبیا۔ اس لیے روانہ کیے گئے ہیں کہ تبلیغ و دعوت کا فرض انجام دیں۔ جو سچائی ان کو اللہ کی جانب سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچائیں اور جو علم اُن کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کریں۔ خدا کا جو پیغام ان کو ملا ہے اور اللہ نے جس صداقت سے ان کو آگاہ کیا ہے اس سے اللہ کے بندوں کو آگاہ کرنا۔ جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں ان کو دی گئی ہیں ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا۔ اس دعوت و تبلیغ میں جو تکلیف بھی پیش آئے اس کو راحت جاننا، جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا۔ اس حق کی آواز کو دبانے کے لیے جو قوت بھی سر اُٹھائے اسے کچل دینا۔ اور مال، اہل و عیال غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگ راہ ہو کر سامنے آئے اسے ہٹا دینا، نبوت کے فرائض میں داخل ہے۔ دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے انہوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار سے انجام دیا اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی۔ اس فرض کی ادائیگی میں تبشیر اور انذار دونوں ہوتے ہیں۔ تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوشخبری سنانا، اور انذار یعنی خدا کے جلال سے ڈرانا، عذابِ الٰہی کا خوف دلانا اور لوگوں کو ان کے انجامِ بد سے ڈرانا۔

۶۰۵۔ اور اُن کے ساتھ برحق کتاب نازل کی تاکہ جن باتوں میں لوگ اختلاف کرنے لگے تھے اُن میں وہ فیصلہ کر دے۔ یعنی اُن کے ساتھ سچی کتاب بھیجی تاکہ لوگوں کا اختلاف اور نزاع دور ہو۔ اور دینِ حق اُن کے اختلاف سے محفوظ رہے[۱]۔ مطلب یہ ہے کہ کتابِ الٰہی اس لیے نازل نہیں ہوئی کہ لوگوں کی فطری استعداد، صلاحیتوں اور قوتوں کے فرق کو مٹا دے بلکہ اس لیے نازل ہوئی ہے کہ لوگ اس کتاب کو اپنے معاملاتِ زندگی میں حکم بنائیں اور جب ان میں اختلاف ہو تو اس کتاب کی جانب رجوع کریں۔ قرآن کے اس اندازِ بیان سے ایک اور حقیقت سمجھ میں آتی ہے جو اسلام کے تصورِ تاریخ کی بنیاد ہے۔

اسلام کا تصورِ تاریخ

قرآن نے کتابِ الٰہی کو لوگوں کے درمیان فیصل اور ان کی زندگی کی اساس مقرر کیا ہے۔ زندگی جب تک اس اساس کے مطابق ہے حق ہے اور جب اس اساس سے ہٹ کر دوسرا

[۱] افاداتِ شیخ الہند ص ۱۴

بنیادوں پر قائم ہو باطل ہے۔ خواہ تاریخ کے کسی مرحلہ پر تمام انسان اس باطل پر متحد کیوں نہ ہو جائیں کیونکہ حق و باطل کا فیصلہ انسانوں کے ہاتھ میں نہیں ہے اور نہ انسان کے کسی چیز کو حق قرار دینے سے وہ حق بن سکتی ہے بلکہ قرآنی منظریہ یہ ہے کہ لوگوں کی زندگیاں اگر کسی رُخ پر قائم ہو جائیں اور زندگی کا وہ رُخ کتابِ الٰہی کے خلاف ہو تو وہ کبھی بھی حق نہیں بن سکتا نہ وہ دین میں شامل ہو سکتا ہے نہ اسے دین کی صحیح تعبیر قرار دیا جا سکتا ہے اور نہ نسلاً بعد نسل اس پر عمل اس کے جواز کی دلیل بن سکتا ہے۔ مثلاً اسلامی تاریخ میں کبھی اسلام میں کوئی انحراف اگر رُونما ہوا اور پھیل کر سارے معاشرے پر چھا گیا تو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ چونکہ اس روش پر سارے لوگ قائم ہو گئے اس لیے یہی قرآن کی اصل تعبیر ہے نہیں ہرگز نہیں قرآن اس تاریخی حادثہ سے قطعاً بری ہے۔ یہ انحراف حقانیت کی ہرگز دلیل نہیں ہے۔ بلکہ جب بھی کوئی فرد یا جماعت زندگی کے احیاء کی کوشش کرے گی اس کے لیے لازم ہوگا کہ وہ پہلے اس قسم کے انحرافات کو ختم کر کے قرآن کے چہرے سے زمانہ کا گرد و غبار صاف کرے اور تمام معاملات اور جملہ اُمورِ زندگی کو قرآن حکیم کی روشنی میں طے کرے۔

۴۰۶- لوگ اس لیے باہم مختلف نہیں ہوئے کہ ہدایت سے محروم اور حقیقت سے ناآشنا تھے بلکہ وحی الٰہی کے واضح احکام آنے کے باوجود صرف آپس کی ضد اور مخالفت سے اختلاف کا شکار ہوتے۔ یہاں یہ بات صاف ہو گئی کہ اختلاف و نزاع کا باعث آپس کی ضد اور نفسانیت ہوتی۔ نہ یہ امر کہ اصل احکامِ الٰہی یا پیامِ حق میں کسی طرح کا اپنچ پیچ تھا اور نہ یہ کہ مسائل اجتہادی میں کوئی رائے یا اجتہاد کا اختلاف تھا[1]

مطلب یہ ہے کہ احکامِ الٰہی میں ان ہی نے اختلاف کیا ہے جن کو کتابِ الٰہی ملی تھی جیسے یہود و نصاریٰ توراۃ و انجیل میں اختلاف و تحریف کرتے تھے۔ اور یہ نزاع بے سمجھی سے نہیں کرتے تھے بلکہ خوب سمجھ کر محض حُبِّ دُنیا اور ضد و حسد سے ایسا کرتے تھے۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اہلِ کتاب کو طریقۂ حق کی ہدایت فرمائی اور گمراہوں کے اختلافات سے بچا لیا جیسے آپ کی اُمت کو ہر عقیدے و عمل میں امرِ حق کی تعلیم فرمائی اور یہود و نصاریٰ کے اختلاف اور افراط و تفریط سے ان کو محفوظ رکھا[2]

---

[1] تفسیر ماجدی [2] افاداتِ شیخ الہند

گویا اللہ کی جانب سے کتابیں حق سے کرآئیں تاکہ ان کے تمام نزاعات کا جو دینِ حق میں رونما کردیے گئے تھے فیصلہ کرکے از سر نو حق کو اجاگر کردیا جائے۔ لیکن جن اُمتوں کو یہ حق عطا ہوا، انہوں نے نہایت واضح دلائل کی روشنی میں اس حق کو سمجھ لینے کے باوجود محض آپس کی ضد اور کد سے خود ہی اس حق میں اختلاف کیا اور اس طرح اللہ سبحانہٗ کی جانب سے بار بار حق کی وضاحت کے باوجود اختلاف قائم رہا۔ اور ان ہی لوگوں کے ہاتھوں ظلم ہوا جو اس حق کے امین بنا کر روانہ کیے گئے تھے۔

اب اللہ تعالیٰ نے اپنی توفیق سے اس نزاع و اختلاف میں حق کی راہ اس قرآن کے ذریعے اہلِ ایمان یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ماننے والوں پر کھولی ہے اور اللہ ہی اپنی مشیت اور حکمت کے تقاضوں کے مطابق جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی ہدایت کرتا ہے۔

اُمت کی عظیم ذمّہ داری

اس آخری فقرے واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم میں اس عظیم ذمہ داری کی طرف اشارہ ہے جو اس اُمت پر دینِ حق کے بارے میں ڈالی گئی ہے کہ اس حق کو پاکر تم بھی اس میں اس طرح کے اختلافات برپا کرنے والے نہ بن جانا جس طرح دوسرے تم سے پہلے بن گئے۔ اور اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ میدان جیتنا کوئی آسان نہیں ہے بلکہ یہ بڑی جان جوکھوں کا کام ہے، دینداری اور حق پرستی کے پشتینی ٹھیکیدار جن کے کاروبار کی ساری کامیابی کا دارومدار حق کے گم رہنے میں ہے تمہیں آسانی سے نہیں چھوڑیں گے بلکہ تمہارے پیچھے جھاڑ کے کانٹوں کی طرح پڑ جائیں گے[1]

یہاں مسلمانوں پر واضح کردیا کہ بنی اسرائیل ہی پر موقوف نہیں، تمام پچھلی اُمتوں کا یہی حال رہا ہے۔ پس قیامِ حق کے لیے تعلیمِ حق کی نہیں کیونکہ وہ تو روزِ اوّل سے ہے اور ہمیشہ موجود رہی ہے بلکہ حق پر ثابت قدم رہنے کی ضرورت ہے۔

اللہ کے چاہنے کا مطلب

اس آیت اور اس قسم کی دوسری آیات میں اللہ کے چاہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس پر کوئی قدغن اور پابندی نہیں ہے کہ وہ اپنا کام کسی سے ضرور لے، یہ اس کی اپنی چاہت ہے کس سے

---

[1] تدبرِ قرآن

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ ۖ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَّاءُ وَزُلْزِلُوا حَتَّىٰ يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَىٰ نَصْرُ اللَّهِ ۗ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿٢١٤﴾

پھر کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ محض ایمان کا زبانی دعویٰ کر کے تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ حالانکہ ابھی تو تمہیں وہ آزمائشیں پیش ہی نہیں آئی ہیں جو تم سے پہلے لوگوں پر پیش آ چکی ہیں۔ ہر طرح کی سختیاں اور محنتیں انہیں پیش آئیں، شدتوں اور ہولناکیوں سے ان کے دل دہل گئے یہاں تک کہ اللہ کا رسول اور جو لوگ ایمان لائے تھے پکار اٹھے اے نصرتِ الٰہی! تیرا وقت کب آئے گا۔ تب اچانک پردۂ غیب چاک ہوا اور اللہ کی مدد یہ کہتے ہوئے نمودار ہو گئی ہاں گھبراؤ نہیں اللہ کی مدد تم سے قریب ہے۔

کام لیتا ہے اور کس طرح لیتا ہے۔ مولانا محمد ادریسؒ کا یہ کہنا بجا ہے کہ کسی کو بغیر آیات بینات اور بغیر کسی دلیل و برہان اور بغیر کسی استاد و معلم کے سیدھا راستہ بتلا دیتا ہے اور کسی کو صاف نشانیوں کے بعد سیدھا راستہ نصیب نہیں ہوتا۔ ہدایت اس کی ملک ہے،

جس کو چاہے دے اور جس کو چاہے نہ دے۔ لیکن اللہ سبحانہ کی عادت اور سنت یہ ہے کہ حق کی ہدایت سے اسی کو سرفراز فرماتے ہیں کہ جو دُنیا پر فریفتہ نہ ہو اور دُنیا کی زینت نے اُسے اپنا گرویدہ نہ بنایا ہو۔ کیونکہ جن کے دل دُنیا کی محبت میں گرفتار ہو چکے وہ کبھی حق کو قبول نہیں کرتے اور انبیاء کرام کی ہدایت اور نصیحت کی طرف کان نہیں لگاتے بلکہ ایسے لوگ ہمیشہ اہلِ حق کو ستاتے ہیں اور طرح طرح کی ان کو ایذا پہنچاتے ہیں۔

علمبرداران حق کے لیے امتحان سنۃ الٰہی ہے

اس آیت میں اہلِ ایمان کے دلوں میں ایک روشن اور مکمل تصور ابھارا جاتا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ سنتِ الٰہی یہی ہے کہ اللہ پاک مومنین کو کھنگالتے ہیں اور ان کو جنت کے لیے تیار کرتے ہیں اور اُن کو بتاتے ہیں کہ وہ اپنے عقیدے کا دفاع کریں۔ اس کے لیے تکلیفیں، مصیبتیں اور اذیتیں برداشت کریں اور فتح و کامرانی اور شکست و ناکامی کے درمیان جھولتے رہیں یہاں تک کہ وہ اپنے مشن میں اس قدر پختہ ہو جائیں کہ کوئی طاقت ان کو متزلزل نہ کر سکے، کوئی قوت ان کو خوفزدہ نہ کر سکے اور محنتوں، اذیتوں کی سختیاں سہہ سہہ کر وہ کندن بن جائیں، پھر وہ اللہ کی مدد اور نصرت کے مستحق ہوں گے، مومن ہونے کے لیے صرف یہی نہیں ہے کہ ایمان کا اقرار کر لیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ ان تمام آزمائشوں میں ثابت قدم رہیں جو پہلے حق پرستوں کو پیش آ چکی ہیں۔ اس وقت ان میں اتنی ہمت ہوگی کہ وہ ایمان کے تحفظ کے ساتھ خوف و ذلت سے آزاد ہو کر اور دُنیا کی آسائشوں سے بالا ہو کر اللہ کا قرب حاصل کریں گے اور جنت کے حقدار ہوں گے۔

۲۱۰۔ کیا تم نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ محض ایمان کا زبانی دعویٰ کر کے تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ پہلے یہ بات بتائی گئی تھی کہ دشمنوں کے ہاتھوں انبیاء اور ان کے پیروکاروں کو تکلیفیں اٹھانی پڑی ہیں۔ اب اس آیت میں اہلِ اسلام کو خطاب ہے کہ تم اس فکر میں ہو کہ جنت میں داخل ہو جاؤ حالانکہ اگلی امتوں کو جو تکالیف پیش آئیں وہ تم کو پیش نہیں آئی ہیں۔ ان کو فقر و فاقہ اور مرض اور خوف اس درجہ پیش آئے کہ مجبور اور عاجز ہو کر نبی اور ان کی اُمت بول اٹھے کہ دیکھئے اللہ نے جس مدد اور اعانت کا وعدہ فرمایا وہ کب آئے گی[1] مطلب یہ ہے کہ انبیاء جب کبھی

---

[1] افادات شیخ الہند

دُنیا میں آئے انہیں اور اُن پر ایمان لانے والے لوگوں کو خدا کے باغی و سرکش بندوں سے سخت مقابلہ پیش آیا اور انہوں نے اپنی جانیں جوکھوں میں ڈال کر باطل طریقوں کے مقابلے میں دینِ حق کو قائم کرنے کی جدوجہد کی۔ اس دین کا راستہ کبھی پھولوں کی سیج نہیں رہا کہ آمنا کہا اور چین سے لیٹ گئے۔ اس آمنا کا قدرتی تقاضا ہر زمانے میں یہ رہا ہے کہ آدمی جس دین پر ایمان لایا ہے اُسے قائم کرنے کی کوشش کرے اور جو طاغوت اس راستہ میں مزاحم ہو اس کا زور توڑنے میں اپنے جسم و جان کی ساری قوتیں صرف کر دے[1]

یہ دراصل اس سنۃ اللہ کا ذکر ہے جس کی کسوٹی پر ہر وہ جماعت پرکھی جاتی ہے جو اصل حق کی حامل ہو۔ مطلب یہ ہے کہ منافقین اور کفار کی اس مخالفت اور اس تمسخر و استہزاء سے گھبرا نہ جاؤ۔ ابھی تو اس راہِ عشق کی ابتدا ہے، آگے اس سے کہیں کٹھن منزلیں آ رہی ہیں، تمہیں بھی ان ساری منزلوں سے گزرنا ہے جن سے تم سے پہلے حاملینِ حق کو گزرنا پڑا ہے[2]

۶۰۸ - حالانکہ ابھی تو تمہیں وہ آزمائشیں پیش ہی نہیں آئیں جو تم سے پہلے لوگوں کو پیش آچکی ہیں۔ ہر طرح کی سختیاں اور مصیبتیں ان کو پیش آئیں، شدتوں اور ہولناکیوں سے ان کے دل دہل گئے۔ مطلب یہ ہے کہ تم سے پہلے جو مسلمان گزر چکے ہیں ان پر بڑے مصائب و آلام آئے ہیں۔ کچھ تو عام طور پر نیک اور مخلص بندوں پر بلائیں نازل ہی ہوتی رہتی ہیں۔ نیز اہلِ حق پر اہلِ باطل کسی جانب سے بھی طرح طرح کے تشدد ہوتے ہیں وہ سب سے پہلے پیغمبروں پر اور پیغمبروں کے ساتھیوں پر ہوتے رہے ہیں، فقر و فاقہ اور طرح طرح کی تکالیف میں مبتلا ہوئے۔ پھر مخالفوں کی جانب سے حملے اور لڑائیاں اس قدر شدید ہوئیں کہ اہلِ حق ہلا ہلا دیے گئے نہ تزلزل یا زلزلہ جنگ کے موقعہ پر بھی بولا گیا ہے جیسا کہ سورۂ احزاب میں ہے وزلزلوا زلزالاً شدیداً لہٰذا جب تم سے پہلے لوگوں کو راہِ حق میں اس قدر مصائب کا سامنا کرنا پڑا ہے تو کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ تم کو ان حالات و واقعات سے دوچار ہونا نہ پڑے گا۔ حضرت خباب ابن الارت فرماتے ہیں کہ ہم نے کفار کے مظالم سے تنگ آکر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی کہ یا رسول اللہ آپ ہمارے لیے اللہ تعالیٰ سے دُعا نہیں کرتے اور آپ ہمارے لیے اللہ سے مدد نہیں مانگتے۔ آپ نے ارشاد فرمایا جو لوگ تم سے پہلے تھے اُن کو قسم قسم کی سزائیں دی گئیں۔ کسی کے سر پر آرہ

---

[1] تفہیم القرآن　[2] تدبر قرآن

رکھ کر اس کو چیرا جاتا ہے۔ وہ اس پر بھی اپنے دین سے نہ پھرتا تھا۔ اور کچھ کے جسم کی کھال لوہے کی کنگھیوں سے اتاری جاتی تھی مگر وہ اس پر بھی دین پر جمے رہتے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس کام کو اس روز پورا کر کے رہے گا جبکہ ایک سوار صنعا سے حضرموت تک بے خوف و خطر چلا جائے گا اور اس کے دل میں اللہ کے سوا کسی کا کوئی ڈر نہ ہوگا اور بھیڑ کو بھیڑیے سے کوئی اندیشہ نہ ہوگا لیکن جلدی چاہتے ہو۔ گویا بتایا جا رہا ہے کہ تم ابھی سے گھبرا رہے ہو ابھی تو منزل بہت دور ہے۔

۲۰۹۔ یہاں تک کہ اللہ کا رسول اور جو لوگ ایمان لاتے تھے پکار اٹھے کہ نصرتِ الٰہی تیرا وقت کب آئے گا؟ انبیاء اور مومنین کا یہ کہنا کچھ وعدۂ الٰہی میں تردد کی وجہ سے نہ تھا۔ مولانا اسی کے بارے میں مثنوی میں فرماتے ہیں:

در گمان افتاد جانِ انبیاء　　زاتفاق منکرے اشقیاء

بلکہ بحالتِ اضطرار بمقتضائے بشریت اس کی نوبت آئی جس میں ان پر کوئی الزام نہیں ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ ایک طرف تو حالت یہ تھی کہ ان پر اس قدر مظالم ہوئے کہ پیمانۂ صبر لبریز ہو گیا اور دوسری طرف پیغمبروں کی معرفت جو نصرت اور مدد کے وعدے ان سے کیے گئے ان میں تاخیر ہوئی تو پیغمبر اور ان کے ساتھی مسلمان بے قرار ہو کر دعائیں کرنے لگے کہ جس مدد کا وعدہ کیا گیا تھا وہ مدد کب آئے گی۔ گویا انبیاء اور مومنین کا یہ قول حالتِ اضطراب میں دعا و مناجات کے طور پر تھا۔ بطور اعتراض یا شکوہ نہیں۔ نصرتِ الٰہی کا وعدہ ضرور تھا مگر وقت کا تعین نہ تھا جب ہجوم شدائد ہوتا تو نصرتِ غیبی کی ضرورت محسوس ہوتی اور اپنے اجتہاد سے بالحاح وزاری پکارتے کہ حضرت یہی تو دستگیری کا وقت ہے۔

آیت میں اشارا ہے کہ مسلمانوں کو بھی ہر قسم کی بلائیں پیش آئیں گی جیسی کہ پہلی امتوں کو پیش آچکی ہیں[2] ہمیں اس آیت پر غور کرنا چاہیے کہ جب صحابہ کرام کو اس انداز سے مخاطب کیا جا رہا ہے کہ مبادا اسلام کی سربلندی اور دینِ حق کے غلبہ کی کوشش میں ان کے قدم سست پڑ جائیں تو ہم لوگوں کی عبادتیں کس شمار و قطار میں ہیں جبکہ خدا کے دین کو سربلند کرنے اور اسلام کو دنیا پر غالب کرنے کے لیے ادنیٰ ترین قربانی دینے پر بھی تیار نہیں ہیں۔ یہاں تک کہ ہمارے قلوب بھی اب اس آرزو اور تمنا سے خالی ہو چکے ہیں کہ خدا کی زمین پر اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کے عطا

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] ماجدی

يَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۖ قُلْ مَآ اَنْفَقْتُمْ مِّنْ خَيْرٍ
فَلِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۗ
وَمَا تَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيْمٌ ﴿٢١٥﴾

اے پیغمبر آپ سے لوگ[۶۱۱] دریافت کرتے ہیں کہ خیرات کے طور پر خرچ کریں تو کیا خرچ کریں۔ ان سے کہہ دو کہ جو[۶۱۲] کچھ بھی تم اپنے مال میں سے خرچ کر سکتے ہو کرو تو اس کے مستحق[۶۱۳] تمہارے والدین، رشتہ دار، یتیم، مسکین اور مسافر ہیں۔ اور یاد رکھو کہ بھلائی[۶۱۴] کے جو کام بھی تم کرو گے اللہ اس کو خوب جاننے والا ہے۔

کیے ہوئے قانونِ سعادت اور ضابطۂ حیات کا بول بالا ہو۔ کیا آج اسلامی نظام عملاً اسی طرح کفر کے غلبہ سے گھرا ہوا نہیں ہے جس طرح وہ مدنی زندگی میں کفر کی طاقتوں سے محصور تھا؟ اور کیا آج دینِ حق کے قیام اور اسلامی طرزِ زندگی کو ایک عملی حقیقت بنانے میں جان فروشی اور ایثار کی کچھ کم ضرورت ہے؟

۶۱۰۔ تب اچانک پردۂ غیب چاک ہوا اور اللہ کی مدد یہ کہتے ہوئے نمودار ہو گئی کہ ہاں گھبراؤ نہیں اللہ کی مدد تم سے قریب ہے۔ یعنی جب نوبت یہاں تک پہنچی تو رحمتِ الٰہی متوجہ ہوئی اور ارشاد ہوا کہ ہوشیار ہو جاؤ اللہ کی مدد آگئی، گھبراؤ نہیں۔ لہٰذا اے مسلمانو! تکالیفِ دنیوی اور دشمنوں کے غلبہ سے گھبراؤ نہیں، تحمل سے کام لو اور ثابت قدم رہو۔[۱]

---

[۱] افاداتِ شیخ الہند

آیت کا حاصل یہ ہے کہ مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ اگر تمہارا یہ گمان ہے کہ حق کی راہ خطرات اور آزمائشوں سے خالی ہے اور تم اسلام کا دعویٰ کر کے ایک ٹھنڈی سڑک سے سیدھے جنت میں چلے جاؤ گے۔ تو تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ جنت میں کوئی شخص اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک امتحان سے یہ متعین نہ ہو جائے کہ یہ اللہ کی راہ میں جہاد کا ولولہ رکھتا ہے یا نہیں اور حق کے لیے آزمائشوں کی تاب لا سکتا ہے یا نہیں۔ اس موضوع پر قرآن میں صرف یہی آیت نہیں ہے۔ سورۂ آلِ عمران کی آیت ۱۴۲ اور سورۂ توبہ کی آیت ۱۶ اور سورۂ العنکبوت کی آیت ۱ سے آیت ۱۰ تک کا موضوع یہی ہے۔

خیرات کے موضوع پر دین و دنیا کی تقسیم نہیں

دولت کے مصارف کے باب میں اسلام کی دو خصوصیتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اس نے صرف ضرورت کی حد تک مصارف کو محدود کرنے کا حکم نہیں دیا جیسا کہ دنیا کے تمام مذاہب کے عام رجحانات ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو ضرورت میں بھی کمی کی جائے حتیٰ کہ کھانا جتنے روز آدمی چھوڑ سکتا ہے چھوڑ دے پانی ترک کر دے، سانس تک نہ لے، کپڑے بھی جہاں تک اتار سکتا ہے اتار دے۔ اسلام ضرورت تو ضرورت ہے زینت و آرائش کے حدود تک جانے والوں کو دین کے دائرے میں بلند سے بلند مقام عطا کرتا ہے۔ تختِ سلیمانی پر بھی دینی مدارج کا سب سے بلند ترین درجہ یعنی نبوت تک مل سکتی ہے۔ حضرت عثمان کو دربارِ نبوت سے الغنی کا لقب مل جاتا ہے اور وہ اسے اپنے لیے باعث فخر قرار دے سکتے ہیں۔ یہ اسلام کی وہ خصوصیت ہے جس پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ اس کی تفصیلات کے لیے پارہ ۸ کا انتظار کیجئے۔

اسلام کی دوسری خصوصیت اس سے عجیب تر یہ ہے کہ عموماً مذاہب نے دولت کے جائز مصارف کے دو حصے کر رکھے ہیں' ایک دینی مصارف اور دوسرے دنیوی مصارف۔ لیکن اسلام نے اس تقسیم ہی کو حذف کر دیا۔ اسلامی نقطۂ نظر سے دولت کے سارے ایسے مصارف جن کو عام طور پر دنیوی مصارف کہا جاتا ہے وہ دینی مصارف بن سکتے ہیں۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ صرف دولت یا خرچ کے متعلق قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں نے دو بار ماذا ینفقون کے الفاظ سے دربارِ نبوت میں سوال پیش کیا۔ اس سوال کے جواب میں جو پہلا جواب قرآن

نے دیا ہے وہ یہ ہے قل ما انفقتم من خیر اس میں اس غلطی کا ازالہ کیا گیا ہے کہ لوگ سمجھتے تھے کہ خیرات صرف غیروں ہی کو دی جا سکتی ہے۔ اپنوں اور عزیزوں کی مدد کرنا خیرات نہیں ہے۔ خیرات کے مصارف بتلاتے ہوئے واضح کر دیا کہ اس کا اولین مصرف تمہارے عزیز و اقارب ہیں اگر وہ محتاج ہوں۔

۲۱۱ — اے پیغمبر آپ سے لوگ دریافت کرتے ہیں کہ خیرات کے طور پر خرچ کریں تو کیا خرچ کریں۔ اس سے پہلی آیات میں یہ بات بطورِ قاعدہ کلیہ کے بہت تاکید سے بیان ہوئی ہے کہ کفر و نفاق کو چھوڑ دو اور پورے پورے اسلام میں داخل ہو جاؤ۔ حکمِ الٰہی کے مقابلے میں کسی کی نہ سنو۔ اللہ کی رضا کی خاطر جان و مال خرچ کرو اور ہر طرح کی تکلیف کو برداشت کرو۔ اب یہاں سے اسی کلیہ کے تحت جزئیات کی تفصیل بیان ہو رہی ہے جو کہ مال جان اور دیگر معاملات جیسے نکاح، طلاق وغیرہ کے متعلق ہیں تاکہ اس کلیہ کی تاکید اور تحقیق خوب ذہن نشین ہو جائے[1]

سوال کے پس منظر میں صاحب تدبر قرآن کو یہ بہت دُور کی سوجھی کہ قاعدہ ہے کہ آدمی کے دل میں اگر کسی چیز سے متعلق کمزوری ہو وہ اس کے دُور کرنے کی ہمت نہ کر رہا ہو تو وہ اپنی کمزوری کو چھپانے کے لیے بار بار سوال کرتا ہے اور اس طرح گویا وہ یہ تاثر دینا چاہتا ہے کہ جہاں تک اصل کام کا تعلق ہے اس کو کرنے کے لیے تو وہ تیار ہے لیکن کرے کیا کہ ابھی تو اصل بات ہی اس کی سمجھ میں نہیں آئی ہے۔ یہی راز ہے کہ سوالات سچے اور پکے مسلمانوں کی طرف سے بہت کم کیے گئے زیادہ ان لوگوں کی طرف سے کیے گئے جو کم ہمت اور بخیل تھے اور اپنی کمزوری کو سوالات کے پردے میں چھپانا چاہتے تھے۔

کیا اچھا ہوتا کہ مولانا اصلاحی ان کم ہمت، بخیل اور کچے لوگوں کی معاشرہ صحابہ میں نشاندہی فرما دیتے۔ روایات میں بتایا گیا ہے کہ عمرو بن جموح نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ سوال کیا تھا کہ ما ننفق من اموالنا واین نضعھا۔ ہم اپنے اموال میں سے کیا خرچ کریں اور کہاں کریں اور ابن جریر کی روایت کے مطابق یہ سوال تنہا عمرو بن جموح کا نہیں بلکہ عام مسلمانوں کا تھا۔ دراصل صورتِ حال یہ نہیں بلکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

ان سوالات سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت روح ایمان کس قدر بیدار تھی اور صحابہ کے دلوں پر ایمان کی گرفت کس قدر مضبوط تھی اور صحابہ اپنی زندگی کے متنوع معاملات میں اسلام کا حکم معلوم کرنے کے لیے کس قدر بے تاب رہتے تھے۔ بلکہ صحابہ کے سوالات سے پتہ لگتا ہے کہ زندگی کے تمام گوشوں میں ایک رفتار ارتقا کا عمل جاری ہے۔ اور نئے معاشرے میں کچھ ایسی اقدار فروغ پا رہی ہیں جن سے اس معاشرے کا تشخص نکھر رہا ہے اور افراد کے باہمی تعاون میں اضافہ ہو رہا ہے۔ اب یہ منتشر و پراگندا قبائل نہیں ہیں بلکہ ایک اُمت ہیں۔ اور ایسی اُمت ہیں جس کا اپنا منفرد تشخص ہے، اپنا ایک نظام زندگی ہے، اپنا ایک مضبوط اور مربوط وجود ہے۔ جس میں سب افراد مل کر ایک ہو گئے ہیں۔ اب ہر فرد یہ چاہتا ہے کہ اس نئے نظام کے قوانین و قواعد سے واقفیت حاصل کرے۔

ان سوالات سے یہ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اس وقت معاشرے کے تمام افراد پر روحِ ایمانی پوری طرح چھائی ہوئی ہے اور ایمان دلوں میں اس قدر پیوست ہو چکا ہے کہ کوئی شخص معاملاتِ زندگی میں اس وقت تک کوئی قدم اٹھانا گوارا نہیں کرتا جب تک وہ یہ معلوم نہ کر لے کہ اس صورتِ حال میں اسلام کا کیا فیصلہ ہے۔ اب تک ذہنوں میں یہ بات تھی کہ خیرات صرف غیروں کو دی جا سکتی ہے اپنوں اور عزیزوں کی مدد کرنا خیرات نہیں ہے۔ اس آیت میں یہی بات بتائی گئی کہ خیر اور نیکی کے متعلق اگر تمہارا سوال ہے تو اب تک جو یہ سمجھا جاتا تھا کہ صرف غریبوں اور مسکینوں کو دینا خیر اور خیرات ہے۔ قرآن کہتا ہے یہ صحیح نہیں ہے بلکہ یتیموں اور مسکینوں کو دینا بھی خیر ہے اور اپنے خاندان والوں مثلاً والدین یا اقربا پر خرچ کرنا بھی خیر ہے۔ خیر کے معنے عربی میں مال کے بھی آتے ہیں اور عموماً لوگوں کا ذہن اس آیت میں اسی معنے کی طرف منتقل ہو جاتا ہے حالانکہ آیت کو ختم کرتے ہوئے (ماتفعلوا من خیر فان اللہ بہ علیم) (اور نیکی کی راہ سے جو کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اُسے جانتا ہے) میں خیر کے معنے بتا دیے گئے کہ خیریت اور نیکی کا مدار تمہاری نیتوں پر ہے۔ یعنی اگر تم نے اپنے اقربا اور خاندان والوں پر اس لیے خرچ کیا ہے کہ یہ اللہ سبحانہٗ کا حکم ہے تو تمہارا یہ خرچ خیر ہے اور نیکی ہے اور اگر یتامیٰ اور مساکین پر اس لیے خرچ کرتے ہو کہ اللہ کی رضا جوئی مقصود نہیں ہے تو بظاہر یہ کتنا ہی بڑا دینی خرچ ہو پھر بھی وہ دنیوی خرچ ہے۔

۶۱۳۔ تو اس کے مستحق تمہارے والدین، رشتہ دار، یتیم، مسکین اور مسافر ہیں۔

معارف خیر کی یہ فہرست کیسی جامع اور اس کی ترتیب کس قدر حکیمانہ ہے۔ سب سے بڑھا ہوا اور اہم ترین حق انسان کے ماں باپ کا ہے۔ جتنی بھی مالی خدمت ہو سکے ان کی کی جائے۔ پھر دوسرے عزیزوں کا نمبر ہے۔ اس میں بھائی بہن، چچا، پھوپھی وغیرہ سب آگئے۔ شریعت نے اپنے نظام میں خاندان کو جو مرکزی اہمیت دی ہے اس پر یہ ایک اور دلیل ہے۔ پھر اُمت کے وہ فرزند ہیں جو معاش کے سب سے بڑے ظاہری سہارے یعنی شفیق باپ کے سائے سے محروم ہو چکے ہیں۔ پھر وہ اللہ کے بندے ہیں جن پر کسی طبعی معذوری کی وجہ سے یا اور کسی خارجی سبب سے معاش کے عام ذریعے بند ہو چکے ہوں اور اپنی ضرورتوں کے پورے ہونے کے لیے بیرونی امداد کے محتاج ہوں اور آخر میں وہ عام انسان آتے ہیں جو اپنے وطن سے دُور ہونے کے باعث عارضی طور پر احتیاج یا تنگدستی میں مبتلا ہوں۔ قریبی اور دُور کے حقدار اور ملی رشتہ رکھنے والے سب کے سب اپنی جگہ پر کس خوبصورتی سے ایک نظم کے اندر فٹ آگئے ہیں[1]

دراصل پوچھنے والوں نے دو باتیں پوچھی تھیں۔ ایک یہ کہ خرچ کہاں کریں۔ دوسرے یہ کہ خرچ کیا کریں۔ اس آیت میں پہلے حصہ کا جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ خرچ کرنے والوں کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنی چاہیے کہ وہ جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں اس کا مصرف اُن کے والدین، اُن کے خویش و اقارب، اُن کے یتیم، اُن کے مسکین اور اُن کے مسافر ہیں۔ اس میں معاشرے کے متعدد طبقوں کو بیان کیا گیا ہے۔ کچھ کے ساتھ خونی رشتے ہیں، کسی کے ساتھ شفقت اور جذبۂ ترحم کا واسطہ ہے اور کچھ عظیم تر رشتہ انسانیت میں منسلک ہیں۔ ان سب کو اسلام کے مضبوط نظام میں اجتماعی کفالت کی ضمانت دی گئی ہے۔

انفاق میں سب سے پہلا اپنا حق ہے

آیتِ قرآنی میں جو ترتیب بتائی گئی ہے اس میں خود اپنی ذات کا ذکر نہیں۔ کیونکہ یہ بات جانی پہچانی ہے۔ لیکن جناب رسول اللہ نے اپنے ارشاد میں اس کا خاص طور پر تذکرہ فرمایا ہے۔ چنانچہ صحیح مسلم میں ہے۔ حضرت جابر کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے

---

[1] تفسیر ماجدی

ایک شخص سے فرمایا کہ پہلے اپنی ذات پر خرچ کرو۔ اگر بچ رہے تو اپنے بال بچوں پر خرچ کرو۔ اگر بچ رہے تو اپنے رشتہ داروں پر خرچ کرو۔ اگر ان سے بچ رہے تو اس طرح اس طرح خرچ کرو۔ گویا سب سے پہلا حق اپنا ہے۔ اس لیے اسلام نے یہ ناجائز قرار دیا ہے کہ کوئی اپنے آپ کو قتل کر دے یا کسی عضو کو بگاڑ دے۔ حتیٰ کہ اسلامی قانون کی رو سے کسی کو اس کا بھی حق نہیں ہے کہ کھانا پینا اس حد تک چھوڑ بیٹھے کہ اس کی جان باقی نہ رہے یا اس کا کوئی عضو خراب ہو جائے زیلعی رقمطراز ہیں:

جائز اور حلال چیز کو چھوڑ کر اپنی جان کو ضائع کرنا یا کسی عضو کو نقصان پہنچانا حرام ہے۔ (شامی ج ۵ ص ۹۲)

بہرحال دولت کا سب سے پہلا مصرف خود کمانے والے کی ذات ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ

تم میں سے جو کوئی نادار و مفلس ہو تو چاہیے کہ خرچ کی ابتدا خود اپنی ذات سے کرے۔

دوسری حدیث میں ہے

پہلے اپنی ذات سے شروع کرو پھر اُن پر جو تمہارے زیر پرورش ہیں۔

ابوداؤد میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے آکر دریافت کیا میرے پاس ایک اشرفی ہے کیا کروں۔ پہلا جواب اس کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی دیا کہ اپنی ذات پر خیرات کرو۔

اس حدیث سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اپنے اوپر خرچ کرنا بھی صدقہ ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ پہلا مصرف اسلام نے خود کمانے والے کی ذات کو قرار دیا ہے۔ اس کے بعد اُن لوگوں کے مصارف کا درجہ ہے جن کی پرورش کا وہ قانوناً ذمہ دار ہے۔ فقہاء نے اس سلسلے میں بیوی بچے اور اُن کے مختلف قانونی حالات کو تفصیل کے ساتھ طویل دفعات کے تحت بیان کیا ہے جن کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

والدین کے مصارف قانونی و اخلاقی

قرآن کی رو سے ایسے ماں باپ کے مصارف واجب ہیں جو نفیر ہوں۔ ابن قدامہ

لکھتے ہیں:

اہلِ علم کا اس پر اتفاق ہے کہ ایسے نادار والدین جن کی کمائی نہ ہو اور نہ اُن کے پاس مال ہو اُن کا خرچہ اولاد پر واجب ہے۔

والدین کے مصارف قانونی طور پر تو اس وقت واجب ہوتے ہیں جب وہ واقعی محتاج ہوں۔ یعنی حکومت مجبور کرے کہ لڑکے کے مال سے والدین کے مصارف کی پابجائی کرے گی۔ لیکن غیر قانونی طور پر یعنی اخلاقاً والدین کی خدمت اپنے مال کا سب سے بڑا مصرف ہے خصوصاً اس سلسلے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ماں کے حق کو جتنی اہمیت دی ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب آپ سے دریافت کیا گیا کہ کس کے ساتھ حسنِ سلوک کروں؟ تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ماں کے ساتھ، ماں کے ساتھ، ماں کے ساتھ، پھر جو قریب تر رشتہ دار ہو اور جو اُس کے بعد (ابوداؤد) پھر آپ نے خود ہی تشریح فرمادی۔

ماں کو دو باپ کو دو، بہن کو دو، بھائی کو دو، قریبی رشتہ دار کو پھر جو اُن کے بعد قریب ہوں۔

رشتہ داروں کو اسلام نے کیوں ترجیح دی۔ اس کی وجہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بتائی ہے کہ ایسی صورت میں دینے والے کو دو ثواب حاصل ہوتے ہیں۔ رشتہ داری کا ثواب اور صدقہ کا ثواب۔

رشتہ داروں کے حقوق

قرآن نے قرابت میں صلہ رحمی کو نیکی کا ایک باب قرار دے کر اس فعل کو جسے فطرتاً آدمی کا جی چاہتا ہے نقطہ نظر کی تھوڑی سی تبدیلی سے خیرات میں شامل کر دیا۔ اور یہ ایک ایسا نظم ہے کہ ہر شخص بآسانی اس کو انجام دے سکتا ہے۔ لوگ اپنے رشتہ داروں کی ان اسلامی ذمہ داریوں کا احساس اگر کرنے لگیں تو بے روزگاری، محتاجی کے نالوں کی آواز کچھ دھیمی پڑ سکتی ہے۔ رشتہ داروں کے تعلقات کی قانونی دفعات اسی پارے میں آئندہ تفصیل سے آرہی ہے۔

یتیموں کی نگرانی اور تربیت

ان کے مصارف کی ذمہ داری کی قانونی دفعات چوتھے پارے میں آرہی ہیں۔ اس سلسلے میں

یتیموں کے بارے میں خاص طور پر آیت ۲۱۹ میں اصلاح کا ضابطہ بتایا گیا ہے۔ لغت میں یتیم کے معنے صاحب قاموس نے یگانہ اور نادر کے لکھے ہیں الیتیم الفرد و کل شئ یعز نظیرہ یگانہ اور ہر ایسی چیز جو نادر المثال ہو۔ زمخشری رقمطراز ہیں کہ سعلۃ یتیمۃ ، بیت یتیم کے محاورات بے مثال اور نادر الوجود کے لیے بولے جاتے ہیں۔ بچہ بے باپ کے ہو کر فرد رہ جاتا ہے اس لیے وہ یتیم کہلاتا ہے۔

مسکینوں کے مصارف

مساکین یعنی ایسے لوگ جن میں معاشی جدوجہد کی قوت ہی گویا ساکن اور بجھی ہوئی ہوتی ہے مثلاً جو یتیموں کا حال ہے کہ معاش حاصل کرنے کے لیے جن جسمانی اور عقلی قوتوں کی ضرورت ہے ابھی ان کی نشوونما بھی ان میں صحیح طور پر نہیں ہونے پاتی اسی طرح ایسے لوگ جن میں یہ قوتیں ابھری ہوں لیکن بڑھاپے یا کسی اور وجہ سے جدوجہد کی صلاحیت ساکن ہو گئی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حصول معاش کی قوتیں جن کی متحرک نہ رہی ہوں اب خواہ یہ سکون اس لیے ہو کہ ابھی ان کی حرکت کا وقت نہیں آیا یا متحرک ہو کر ساکن ہو گئی ہوں بہرحال ان سب پر المسکین کا لفظ بولا جاتا ہے جو سکون سے بنا ہے اور مبالغہ کا صیغہ ہے اور مفعیل کے وزن پر ہے۔ یعنی انتہائی سکون کی حالت میں جن کی معاشی قوتیں ہوں۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:

> مسکین کا لفظ سکون سے بنا ہے گویا یوں سمجھو کہ عجز و بیچارگی نے اُسے ٹھنڈا اور ساکن کر دیا ہو۔

مسافروں کا حق

ابن السبیل مسافر کو کہتے ہیں۔ مگر عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس سے مراد مہمان ہے ہر صاحب استطاعت فرد کے لیے لازم ہے کہ مہمان ہونے والے مسافر کو کم از کم ایک دن رات کا قیام و طعام پیش کرے۔ ابوداؤد میں ہے کہ

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مہمان کی ایک رات ضیافت کرنا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ جس کے صحن میں مہمان صبح کرے اس پر یہ حق فرض ہے کہ مہمان چاہے تو اس کا تقاضا کرے اور چاہے چھوڑ دے۔

صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ ،

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو شخص بھی خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اس کا حق ایک دن ایک رات ہے۔ مہمانی کی مدت تین دن ہے۔ اس کے بعد جو کچھ کیا جاتے صدقہ ہے۔

یہ ارشادات بتاتے ہیں کہ ایک شب و روز کا قیام و طعام ہر صاحب استطاعت مسلمان مقیم پر مسافر مہمان کا حق ہے۔

یاد رہے کہ آیت میں جو حکم بیان ہوا ہے زکوٰۃ کے بارے میں نہیں بلکہ عام صدقات اور خیرات کے بارے میں ہے۔ کیونکہ والدین زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی مالدار آدمی پر مزید انفاق مال کی ذمہ داری باقی رہتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس اصول کی صراحت فرمادی ہے۔ ارشاد ہے

مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے

محدثین نے اپنی کتابوں میں عنوان قائم کیا ہے ترمذی میں ہے باب ماجاء ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ زکوٰۃ کے سوا بھی مالدار کے مال میں حق ہے۔

۲۱۴۔ اور یاد رکھو کہ بھلائی کے جو کام بھی تم کرو گے اللہ اس کو خوب جانتا ہے۔ یعنی انسان جو نیکی بھی کرتا ہے اس کا ایک ایک ذرہ اللہ کے علم میں ہے۔ نہ کوئی چیز اس کے علم سے باہر ہے اور نہ کرنے والے کی نیت اور ارادہ اس سے پوشیدہ ہے۔ گویا اس میں کسی بھی عمل کے نیکی ہونے کا قانون اور قاعدہ کلیہ بیان فرمادیا کہ نیکی کا مدار اس پر ہے کہ حق تعالیٰ تمہارے اس خرچ کے بارے میں کیا جانتے ہیں یعنی اگر تم نے اپنے رشتہ داروں پر خرچ کیا اور اس لیے خرچ کیا ہے کہ اللہ سبحانہ کا یہ حکم ہے تو تمہارا یہ خرچ قطعاً خیر ہے اور ایسے ہی اگر تم نے یتیموں اور مسکینوں پر خرچ کیا اور اس لیے کیا کہ یہ اللہ کا حکم ہے تو یہ بھی قطعاً خیر ہے۔ اور اگر خرچ میں اللہ کی مرضی کا اتباع مقصود نہیں ہے تو یہ بظاہر کتنا ہی بڑا دینی کام سمجھا جاتے لیکن پھر بھی وہ دنیوی کام ہے۔ گویا اصول یہ بتادیا گیا کہ جسے عام طور پر دنیوی خرچ کہا جاتا ہے جیسے والدین پر اپنے عزیزوں پر خرچ کرنا صرف نیت اور نقطہ نظر کی تبدیلی سے وہ بھی خیرات بن جاتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

اپنی بیوی پر آدمی جو خدا کو سامنے رکھ کر خرچ کرتا ہے وہ صدقہ ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسَىٰ أَن تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۖ وَعَسَىٰ أَن تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾ رکو

لڑائی کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے۔ ممکن ہے کہ ایک بات کو تم ناگوار سمجھتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور بہت ممکن ہے کہ ایک بات تمہیں اچھی لگتی ہو اور اسی میں تمہارے لیے برائی ہو۔ اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔

صرف یہی نہیں کہ وہ صدقہ بن جاتا ہے بلکہ تمام صدقات میں اس صدقہ کو برتری حاصل ہو جاتی ہے۔ فرمایا ہے :

وہ اشرفی جسے اللہ کی راہ میں تم نے خرچ کیا اور وہ اشرفی جو غلام آزاد کرانے میں صرف کی، اور وہ اشرفی جو کسی مسکین پر تم نے صدقہ کی اور وہ اشرفی جو تم نے اپنی بیوی پر خرچ کی۔ ان تمام اشرفیوں میں ثواب اور اجر کے اعتبار سے سب سے بڑی وہ ہے جسے تم نے اپنی بیوی پر خرچ کیا۔

بیوی اور بچے تو ایک حد تک غیر بھی ہو سکتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی زیادہ ارشاد فرمایا کہ آدمی جو خود اپنی ذات پر صرف کرتا ہے یہ بھی صدقہ ہے۔ مسند احمد کی حدیث ہے :

تم نے خود اپنے کو جو کچھ کھلایا یہ بھی صدقہ ہے۔ جو اپنی اولاد کو کھلایا یہ بھی صدقہ ہے اپنی بیوی کو جو کچھ کھلایا یہ بھی صدقہ ہے، اپنے نوکر کو جو کچھ دیا یہ بھی صدقہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ فان اللہ بہ علیم یعنی اللہ سبحانہ کی مرضی کو دھیان میں سامنے رکھ کر تبذیر کے سوا دولت کے تمام مصارف صدقہ بن جاتے ہیں۔ گویا اللہ سبحانہٗ اس خیر کے عمل سے اس کے اصل محرک جذبے سے اور اس کے پیچھے کارفرمانیت سے واقف ہے اس لیے یہ عمل ضائع نہیں ہے بلکہ اللہ کے یہاں اس کا پورا پورا اجر ملے گا۔ سید قطب نے یہاں یہ بات خوب فرمائی ہے کہ یہ خداوند کا بنایا ہوا اسلامی نظام تربیت ہے جس کے ذریعے اسلام انسان کو انسان کی حیثیت میں لے کر چلتا ہے اور اسے ان بلند آفاق اور اعلیٰ مراتب تک لے جاتا ہے جہاں تک انسانیت کبھی نہیں پہنچ سکتی اور آئندہ بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتی جب تک اسلامی منہاجِ تربیت کو نہ اپنائے اور اسلام کے ضابطۂ حیات کو اپنی زندگی میں برپا نہ کرے اور اسلامی قانونِ زندگی کو اپنی سماجی اور شہری زندگی میں نافذ نہ کرے۔

دین کی سربلندی کے لیے لڑائی کا حکم

مال کا خرچ کرنا ہو یا راہ خدا میں جان کھپانا ہو دونوں ایک ہی سلسلے کی باتیں ہیں۔ گزشتہ آیات میں راہ خدا میں ابتلاء و مصائب کا ذکر کیا تھا اور بتایا تھا کہ جنت میں داخل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ زندگی ابتلا سے دوچار ہو۔ ابتلاء کے سلسلے میں پہلے مال کی قربانی کا ذکر کیا اب اس آیت میں جان کی قربانی کا ذکر ہو رہا ہے۔

جان کی قربانی کے بارے میں بعض ذہنوں میں ایک خلش پیدا ہوتی ہے کہ جنگ ایک ناگوار اور ناپسندیدہ چیز ہے۔ اس کا حکم کیوں دیا ہے۔ اس خلش کو دور کرنے کے لیے ایک اصولی حقیقت جو واضح فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ انسان اپنے لیے فوز و فلاح کا راستہ خود طے نہیں کر سکتا ہے بلکہ وہ خدا ہی طے کرا سکتا ہے جس نے اس کو پیدا کیا ہے اس لیے کہ اسی کو علم ہے کہ انسانی فطرت کے مضمرات اور اس کی صلاحیتیں کیا ہیں؟ اور وہ طریقے کیا ہیں جن کو اختیار کر کے انسان اپنی صلاحیتیں اجاگر کر سکتا ہے۔ اگر اپنے لیے خیر و شر کا فیصلہ کرنے کا سارا معاملہ انسان کی اپنی خواہش اور اس کی اپنی عقل پر چھوڑ دیا جاتا تو عجب نہیں کہ وہ اپنی خواہشاتِ نفس کی پیروی میں اپنی زندگی سے وہ ساری باتیں ایک ایک کر کے خارج کر دیتا جو اس کے عروج و کمال اور اس کے روحانی و اخلاقی ارتقاء کا ذریعہ

ہیں۔ انسانی فطرت کا یہ عجیب رمز ہے کہ جو چیزیں اس کے نفس کو پسند ہیں وہ لے پستی کی طرف لے جانے والی ہیں اور جو چیزیں اس کو بلند کرنے والی ہیں وہ لے ناپسند اور اُس کے نفس کے لیے ناگوار ہیں اس وجہ سے اس کی فلاح کی راہ بتانے کی ذمہ داری اللہ سبحانہٗ نے اپنے اوپرے لی ہے اور اپنے رسُولوں کے ذریعے اس کی رہنمائی کی ہے۔

۲۱۵ - لڑائی کا تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ یعنی دین کے دُشمنوں سے تم پر لڑنا فرض ہوا ہے جب تک آپ مکہ میں رہے آپ کو مقاتلہ کی اجازت نہ ہوئی۔ جب مدینے ہجرت فرمائی تو مقاتلہ کی اجازت ہوئی لیکن صرف اُن کافروں سے جو خود اہلِ اسلام سے مقاتلہ کریں۔ اس کے بعد علی العموم کافروں سے قتال کی اجازت ہوگئی اور قتال فرض ہوگیا۔ اگر دُشمن مسلمانوں پر چڑھائی کریں تو جہاد فرض عین ہے ورنہ فرض کفایہ بشرطیکہ جملہ شرائط جو قانونِ اسلامی کی کتابوں میں مذکور ہیں پائی جائیں۔ البتہ جن لوگوں سے مسلمان مصالحت کرلیں یا ان کی امن و حفاظت میں آجائیں تو ان سے لڑائی کرنا ان کے مقابلہ میں ان کے کسی مخالف کو مدد دینا ہرگز مسلمانوں کو جائز نہیں ہے[1]

، ہجرت کے بعد قتال کی اجازت سورہ حج کی مشہور آیت اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا یعنی مسلمانوں کو اجازت ہے کہ وہ اپنے دفاع میں ہتھیار اٹھالیں۔ بالاتفاق یہ پہلی آیت ہے جو اذن قتال کے بارے میں نازل ہوئی۔ اس کے بعد ۲ھ میں اس آیت کے ذریعے قتال کی فرضیت کا حکم آگیا۔

حالات کا اجمالی نقشہ

قتال کی اجازت کن حالات میں ملی - ان کا اجمالی نقشہ یہ ہے

۱۔ دعوتِ حق کے ساتھ مسلمانوں پر جبر وظلم کا لامتناہی سلسلہ شروع ہوگیا۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر قسم کے آزار پہنچائے گئے۔

۲۔ اہلِ ایمان کی حالت زیادہ رنج افزا ہوئی تو وہ حضور انور کے ارشاد کے مطابق حبشہ ہجرت کرگئے مگر قریش نے ان کو حبشہ سے نکلوانے کے لیے ایک وفد نجاشی کے

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

ساتھ دربار حبش میں روانہ کیا۔

۳۔ طائف میں اوباشوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر پتھر برسائے جس سے پیشانی مبارک کانخون پائے مبارک تک پہنچ گیا۔

۴۔ تیرہ سال تک ہر قسم کی سختیاں صبر سے برداشت کی گئیں۔ جب ان کا خاتمہ ہوتا نظر نہ آیا تو گھر بار چھوڑ کر مکہ سے اڑھائی سو میل شمال کی جانب ایک بستی میں چلے گئے۔

۵۔ اتنی دور جانے کے باوجود قریش نے مدینہ منورہ کے یہود سے سازباز کی۔

۶۔ مدینہ منورہ میں مسلمانوں کا ابتدائی دور اس حالت میں گزرا کہ وہ ہر وقت ہتھیار پہنے رہتے تھے۔ راتوں کو پہرہ دیتے اور معمولی سا کھٹکا بھی ہوتا تو دیکھ بھال کے لیے نکل پڑتے۔

مقابلے میں عزم کی منزل

اب مظلومی میں صبر کا دور گزر چکا۔ اب مقابلے میں عزم کی منزل پیش آگئی۔ اس لیے قتال کو فرض کیا گیا۔ مکی زندگی میں قتال سے ہاتھ روکنے میں ایک حکمت یہ تھی کہ مومنین کے قلب صبر کے لیے تیار اور حکم ماننے، قیادت کے سامنے سر جھکانے اور اجازت کے منتظر رہنے کے عادی ہو جائیں۔ کیونکہ زمانہ جاہلیت میں بڑی شدید حمیت پائی جاتی تھی اور لوگ ذرا سی بات پر انتقام اور بدلے کے لیے برسرپیکار ہو جاتے تھے مگر مسلمانوں کو انسانی قیادت کی جو عظیم ذمہ داریاں سونپی جانے والی تھیں ان کی تکمیل کے لیے نفسیاتی صفات کو کنٹرول کرنا اور اپنے آپ کو میر کارواں کے تابع فرمان بنادینا انتہائی ضروری تھا۔ اور اس تربیت کے نتیجے میں ان شخصیات کے نفوس میں حمیت و طاعت بہادری و تدبر اور جوش میں ایک عجیب توازن اور ہم آہنگی پیدا ہوگئی۔

۶۱۶۔ اور وہ تمہیں ناگوار ہے۔ ناگوار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نفس کو دشوار اور گراں معلوم ہوتا ہے۔ یہ نہیں کہ قابلِ رد و انکار نظر آئے اور مخالفت حکمت و مصلحت سمجھا جاتے اور موجبِ ناخوشی اور تنفر ہو۔ لہٰذا اتنی بات میں کوئی الزام نہیں[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ بات بالکل قدرتی اور طبعی ہے کہ اپنی جان عزیز ہوتی ہے اور اسے خطرہ میں ڈالتے ہوئے ہر جاندار قدرتاً جھجکتا ہے۔ پھر مکہ کے غریب مہاجر جو ابھی ترکِ وطن

---

[1] افادات شیخ الہند

کر کے مدینے آئے تھے۔ روپیہ پیسہ ہیں، سازو سامان ہیں، تعداد میں غرض مادی اعتبار سے کسی معنے میں بھی اپنے حریفوں کے مدِمقابل نہ تھے۔ ان شکستہ دلوں، شکستہ بازوؤں کو جنگ وقتال کا حکم پا کر اگر طبعی گرانی محسوس ہوئی ہو تو یہ ان کے مرتبہ اخلاص اور قوتِ ایمانی کے ہرگز منافی نہیں ہے یہ آیت صاف طور پر ان مستشرقین کی تردید کر رہی ہے جنہوں نے یہ لکھ ڈالا کہ مسلمان مالِ غنیمت کے حرص میں خود ہی جنگ کے مشتاق تھے[1]

۱۷۶۔ ممکن ہے کہ ایک بات کو تم ناگوار سمجھتے ہو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو اور بہت ممکن ہے کہ ایک بات تمہیں اچھی لگتی ہو اور اسی میں تمہارے لیے برائی ہو۔ تعداد میں قلیل اور قوت و شوکت میں کم مسلمانوں کو قتال پر آمادہ کرنے کے لیے قرآن عزیز کو اس تفصیل و اہتمام سے کام لینے کی ضرورت پیش آ رہی ہے۔ ان کی بعثت اسلام کے مشہور کرم فرما اور مسیحی دنیا کے نامور مورخ پروفیسر مارگولیس کا یہ قول کس قدر فریب اور دروغ پر مبنی ہے کہ محمدؐ نے اپنے شورش پسند پیرووں کو مشغول کار رکھنے کے لیے انہیں جہاد میں لگا دیا، گویا کمزوروں کا زورآوروں کے سامنے اپنی جانیں دینے کے لیے آنا شکار کی قسم کا کوئی مشغلہ سیر و تفریح ہے دین کے دشمنوں پر بھی یہ اللہ کی کیسی پھٹکار ہے کہ صحیح بات کو سمجھنے کے لیے عقلیں بھی مسخ ہو جاتی ہیں۔

اسلام اور انسانی فطرت

دراصل اسلام انسانی فطرت کے ساتھ اس طرح پیش آتا ہے کہ نہ تو طبعی احساسات سے گریز کرتا ہے اور نہ دشوار کاموں کا زبردستی حکم دیتا ہے بلکہ انتہائی حکیمانہ طریق پر نفس کو اطاعت کے لیے تیار کرتا اور اس کے سامنے امیدوں کے نئے نئے چراغ روشن کرتا ہے "تاکہ اس میں خیر کے لیے آمادگی پیدا ہو کر اطاعت کی سرشاری رُونما ہو۔ اور یہ بھی محسوس کرے کہ اللہ سبحانہٗ اس کی کمزوریوں سے واقف، فرائض کی گرانباریوں کا معترف اور اس کی قوتوں کا صحیح اندازہ رکھنے والا ہے۔ اسلام کے اس طریقہ تربیت سے طبیعت میں اکتاہٹ پیدا نہیں ہوتی۔ مشقت کے سامنے آتے ہی ہمتیں پست نہیں ہوتی ہیں۔ بلکہ اس مرحلے سے گزر کر زیادہ

---

[1] تفسیر ماجدی

مضبوط اور ثابت قدم ہوتا ہے کیونکہ اسے معلوم ہے کہ اللہ سبحانہ، اس کی مدد کرنے والا ہے۔ وہ محنتیں کرتا ہے اس لیے کہ محنت کے سینہ سے چشمہ خیر اُبلے گا اور تنگی کے بعد راحت آتے گی۔ وہ اپنی محبوب اشیا کی ہوس میں اپنی جان نہیں کھپاتا۔ کیونکہ اسے خیال ہوتا ہے کہ اس لذت کا انجام حسرت و افسوس ہے۔ کیونکہ بسا اوقات محبوب اشیا سے ناگواری کا پہلو نکل آتا ہے اور روشن و چمکدار برق خرمنِ اُمید کو جلا کر خاکستر کر دیتی ہے۔

۶۱۸ — اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے ہو۔ یعنی یہ بات ضروری نہیں کہ جس چیز کو تم اپنے حق میں نافع یا مضر سمجھو وہ واقع میں بھی تمہارے لیے ویسی ہی ہوا کرے بلکہ ہو سکتا ہے کہ تم ایک چیز کو مضر سمجھو اور وہ مفید ہو اور کسی چیز کو مفید خیال کرو اور وہ مضر ہو۔ تم نے تو سمجھ لیا کہ جہاد میں جان و مال سب کا نقصان ہے۔ اور ترک جہاد میں دونوں کی حفاظت ہے اور یہ نہ جانا کہ جہاد میں دُنیا اور آخرت کے کیا کیا منافع ہیں اور اس کے ترک میں کیا کیا نقصان ہیں۔ تمہارے نفع اور نقصان کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے تم اسے نہیں جانتے۔ اس لیے وہ جو حکم دے اس کو حق سمجھو اور اپنے اس خیال کو چھوڑ دو[1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ ہی کا علم کامل اور ظاہر و باطن کو محیط ہے اس لیے اس کے احکام ہمیشہ بے شمار حکمتوں اور مصلحتوں پر مبنی ہوتے ہیں۔ انسانی علم اس کے برخلاف کسی چیز کا بھی کامل اور جامع نہیں ہے۔ اس لیے خود انسان کی حکمت و مصلحت اسی میں ہے کہ احکام خداوندی کی تعمیل بے چون و چرا کرے[2]

گویا اس کے معنے یہ ہیں کہ یہ صرف اللہ کی شان ہے کہ اس کا علم ظاہر و باطن اور ماضی و مستقبل سب کو محیط ہے اس لیے اس نے انسان کی رہنمائی کے لیے سارا پروگرام خود بنا کر نازل فرمایا ہے اور اس قدر جامع ہے کہ اس میں دُنیا و آخرت کی کامیابی کی پوری پوری ضمانت ہے۔

---

[1] افادات شیخ الہند [2] تفسیر ماجدی

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ ۖ قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ ۖ
وَصَدٌّ عَن سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ بِهِ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ
أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِندَ اللَّهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ۗ وَ
لَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّىٰ يَرُدُّوكُمْ عَن دِينِكُمْ إِنِ
اسْتَطَاعُوا ۚ وَمَن يَرْتَدِدْ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ
كَافِرٌ فَأُولَٰئِكَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ۖ وَ
أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢١٧﴾

وہ تم سے شہرِ حرام[۶۱۹] میں جنگ کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ کہہ دو کہ
اس میں جنگ بڑی سنگین بات[۶۲۰] ہے۔ لیکن اللہ کے راستہ سے
روکنا، اس کا کفر کرنا اور مسجدِ حرام سے روکنا اور اس کے لوگوں کو
اس سے نکالنا اللہ کے نزدیک اس جنگ سے بھی زیادہ سنگین[۶۲۱] ہے
اور جبر و ظلم کے ذریعے سے لوگوں کو دین سے پھیرنا قتل سے بھی بڑا
گناہ[۶۲۲] ہے۔ اور یہ لوگ تم سے برابر جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک
کہ تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں، اگر دین سے پھیرنا ان کے بس

میں ہو۔[۶۲۳] اور یاد رکھو جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا اور
اس کی موت حالتِ کفر ہی میں ہو گی تو بس یہی لوگ ہیں جن کے
اعمال دُنیا اور آخرت میں اکارت گئے اور یہی لوگ دوزخی ہیں
اس میں ہمیشہ رہیں گے۔[۶۲۴]

جنگ کے موضوع پر ایک شبہ کا جواب

پیچھے الشھرالحرام کے ذیل میں پڑھ چکے ہو کہ قمری سال کے چار مہینے محرم، رجب، ذیقعدہ اور ذی الحجہ عرب جاہلیت میں متبرک و محترم تھے۔ قتل و غارت عرب جاہلیت کا پیشہ تھا لیکن اس زمانے میں ہر قسم کی جنگ بند رہتی۔ اسلام نے بھی ان مہینوں کی حرمت کو برقرار رکھا۔ اس آیت میں الشھرالحرام سے ماہ رجب مراد ہے اور پسِ منظر میں ایک خاص واقعہ ہے۔

عبداللہ بن جحش کی مہم

ہوا یہ کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ بن جحش کی زیرِ سرکردگی آٹھ آدمیوں پر مشتمل ایک دستہ ایک مہم پر روانہ فرمایا۔ سفر کی سمت بھی بتا دی اور ایک تحریر حوالہ کر دی کہ دو روز کے بعد اس کو دیکھنا اور اس کے مطابق عمل کرنا۔ عبداللہ نے دو روز سفر کے بعد تحریر دیکھی، اس میں لکھا تھا کہ نخلہ پہنچو اور وہاں قریش کی کارروائیوں یا ان کے قافلے کی دیکھ بھال کرو۔ اور ضروری خبریں ہمیں پہنچاؤ۔ لیکن ساتھیوں میں سے کسی کو اس کی مرضی کے خلاف عمل پر مجبور نہ کرو۔ عبداللہ نے تمام ساتھیوں پر واضح کر دیا کہ جسے شہادت کی آرزو ہو وہ ساتھ رہے۔ لیکن کسی نے بھی اختلاف نہ کیا۔ البتہ سعد بن ابی وقاص اور عتبہ بن غزوان کا اونٹ گم ہو گیا۔ یہ دونوں اس کے تعاقب میں پیچھے رہ گئے۔ باقی ساتھی عبداللہ کی کمان میں نخلہ نامی مقام میں جا اُترے۔ ان کے پاس سے قریش کا ایک قافلہ گزرا جس کے اونٹوں پر منقیٰ، چمڑا اور دوسرا تجارتی سامان لدا ہوا تھا۔ عمرو بن الحضرمی بھی اس قافلہ کے ساتھ تھا۔ قریش کے قافلہ نے ان

مہاجرین کو دیکھا تو ان پر ہیبت چھا گئی۔ عکاشہ ابن محصن کا سر منڈا ہوا تھا تو سمجھے کہ یہ لوگ عمرہ کر کے آرہے ہیں لہٰذا ان سے ڈرنے کی ضرورت نہیں ہے۔

عبداللہ بن جحش کا فیصلہ اور واپسی

عبداللہ بن جحش نے ساتھیوں سے کہا کہ اگر آج رات ان پر حملہ نہ کیا تو کل یہ حرم میں داخل ہو جائیں گے اور ان پر ہاتھ نہ اٹھایا جا سکے گا۔ آج جمادی الثانی کا آخری دن ہے یعنی ۳۰ جمادی الثانی مطابق ۲۷، دسمبر ۶۲۳ء ہے اور کل یکم رجب ہے۔ ایک خطرہ یہ بھی تھا کہ یہ لوگ مکہ پہنچتے ہی قریش کو مہاجرین کے حالات سے باخبر کر دیں گے اور وہ موقعہ پر پہنچ کر فتنہ برپا کر دیں گے غرض غور و فکر کے بعد حملہ کا فیصلہ ہوا۔ رافد تیمی کے تیر سے عمرو بن الحضرمی مارا گیا۔ عثمان بن عبداللہ اور الحکم بن کیسان کو قید کر لیا گیا۔ نوفل بن عبداللہ بچ کر نکل گیا۔ عبداللہ بن جحش ان کے ساتھی قافلے کے اونٹوں کو اور قیدیوں کو لے کر مدینہ منورہ روانہ ہو گئے۔ ابن جحش نے مال غنیمت کا پانچواں حصہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے الگ کر لیا۔ باقی ساتھیوں میں تقسیم کر دیا۔ مدینہ منورہ پہنچ کر پوری سرگزشت بارگاہِ نبوت میں پیش کر دی۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے تمہیں حرمت کے مہینے میں قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔ یہ کارروائی ایسے وقت ہوئی جبکہ تاریخ یکم رجب تھی اور صحابہ اس کو جمادی الثانیہ کی ۳۰ تاریخ سمجھ رہے تھے مگر چاند انتیس کا ہو چکا تھا جس کا صحابہ کو علم نہ تھا۔ ابن جریر اور امام بیہقی نے یزید بن رومان کے حوالے حضرت عروہ کی زبانی جو واقعہ لکھا ہے اس میں یہی ہے کہ یہ جمادی الثانیہ کی آخری تاریخ تھی اور یہ امر مشتبہ رہا کہ رجب کا چاند دیکھنے کے بعد حملہ ہوا ہے یا پہلے۔ خود عبداللہ بن جحش کا بیان ہے کہ ہم نے ابن حضرمی کے قتل کے بعد رجب کا چاند دیکھا انا قتلنا الحضرمی ثم سینا فنظرنا الی ھلال رجب فلا ندری افی رجب اصبناہ ام فی جمادی یعنی ہم نے حضرمی کو قتل کیا شام کو ہم نے رجب کا چاند دیکھا لیکن پتہ نہ چلا کہ واقعہ رجب میں ہوا ہے یا جمادی ثانیہ میں۔ جب یہ دستہ مالِ غنیمت لے کر بارگاہِ رسالت میں پہنچا تو حضور نے فرمایا کہ میں نے تم کو حرمت والے مہینے میں جنگ کرنے کی اجازت نہیں دی تھی۔ نیز آپ نے ان کے لائے ہوتے مالِ غنیمت میں سے بیت المال میں حصہ لینے سے انکار کر دیا۔ عام مسلمانوں نے بھی اس کردار کو کوئی کارنامہ نہیں تصور کیا بلکہ ان کو سخت ملامت کی اور مدینے میں کوئی

شخص ایسا نہ تھا جس نے انہیں اس پر داد دی ہو۔ یہ بیچارے بہت شرمندہ ہوئے اور سمجھے کہ ہم تو تباہ ہو گئے۔

اُدھر قریش نے پروپیگنڈا کرنے کے لیے اس واقعہ کو بہت شہرت دی کہ یہ دین ابراہیمی کے داعیوں کا حال ہے کہ ماہِ حرام تک میں خون ریزی سے نہیں چوکتے۔ ان ہی اعتراضات کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے اور ساتھ ہی قیامت تک باقی رہنے والا یہ اُصول بھی بتا دیا کہ اسلام ان لوگوں کی حرمتوں کا پاس رکھتا ہے جو خود بھی اپنی حرمتوں کو ملحوظ رکھنے والے ہوں۔

باری تعالیٰ کا فیصلہ

اس آیت کے ذریعے اللہ نے فیصلہ فرمایا۔ ان اعتراضات کا جواب دیا اور مسلمانوں کو بتایا کہ بے شک یہ کارروائی حرمت والے مہینے میں ہوئی ہے لیکن یہ جوابی کارروائی ہے۔ بلاشبہ حرمت والے مہینے میں لڑائی ایک گناہ ہے لیکن اس سے بڑھ کر گناہ یہ ہے کہ لوگوں کے عقیدہ و عمل پر قدغن قائم کیا جائے، اللہ کی نافرمانی کی جائے، مسجدِ حرام سے لوگوں کو روکا جائے، پُرامن شہریوں کو گھر سے بے گھر کر دیا جائے، حرمت والے مہینہ میں جنگ اگر گناہ ہے تو یہ اس کے مقابلہ میں فتنہ ہے اور الفتنۃ اکبر من القتل۔

اس کے بعد حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خمس لے لیا، مالِ غنیمت تقسیم کر دیا اور سعد اور عتبہ کی بسلامت واپسی کے بعد مکی قیدیوں کا فدیہ لے کر رہا کر دیا۔ قیدیوں میں سے الحکم بن کیسان نے اسلام قبول کر لیا اور مدینہ ہی میں قیام پذیر ہو گئے۔ بیر معونہ کے واقعہ میں جامِ شہادت نوش فرمایا۔ دوسرا قیدی مکہ میں بحالتِ کفر ہی مر گیا۔

ایک تاریخی حقیقت

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان مکہ چھوڑ کر اڑھائی سو میل شمال چلے آئے تھے تاکہ اطمینان سے دینِ حق کی تبلیغ کر سکیں لیکن قریش کی عداوتوں نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔

قریش نے سب سے پہلے عبداللہ ابن ابی اور اس کے ہمنواؤں کو سازباز کے لیے چنا۔ بعد ازیں مدینہ منورہ کے یہودیوں سے سازش کی۔ جب یہودیوں کو اپنے ساتھ ملا چکے تو مدینہ میں مسلمانوں کو کہلا بھیجا کہ مکہ سے صاف بچ نکلنے پر مغرور نہ ہو جانا، ہم اب بھی تمہیں نہ چھوڑیں گے۔ ساتھ

ہی چھیڑ چھاڑ شروع کر دی۔ ربیع الاول ۲ھ یعنی ستمبر ۶۲۳ء میں ایک قریش سردار کرز بن جابر مدینہ آیا۔ جو مویشی میدان میں چر رہے تھے انہیں پکڑ کر لے گیا۔ یہ اس امر کا اعلان تھا کہ قریش مسلمانوں کو مدینہ میں بھی اطمینان کا سانس نہ لینے دیں گے ـــــ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے کی حفاظت کے لیے دو موثر جوابی تجویزیں سوچیں۔ ایک یہ کہ قریش کی شامی تجارت کا راستہ مخدوش کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ مدینہ کے آس پاس جو قبائل رہتے تھے ان سے امن وامان کے معاہدے کیے جائیں۔

قریش اور مسلمانوں کے درمیان حالت جنگ قائم تھی۔ عبداللہ بن جحش کی مہم بھی اسی سلسلے کی کڑی تھی۔ حالتِ جنگ میں دشمن کو تجارتی نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا قطعاً مستوجب طعن نہیں۔ جن بزرگوں نے اس باب میں تکلفات فرمائے ہیں۔ میں سمجھتا ہوں کہ انہوں نے حقیقی صورتِ حال پیش نظر نہیں رکھی اور صرف اس خیال سے متاثر ہو گئے کہ کہیں مسلمانوں پر غارت گری کا الزام عائد نہ ہو جائے لیکن حالتِ جنگ میں پیش بندی کے طور پر دشمن کو نقصان پہنچانا۔ اور اسے جنگ کے معاملے میں بے دست و پا بنا دینا ہر اعتبار سے درست اور جائز ہے۔ اور یہ سب کے نزدیک تدابیرِ جنگ میں سے ایک مؤثر تدبیر ہے۔

قرآن نے اس آیت کے ذریعے جیسے قریش کو منہ توڑ جواب دیا ایسے ہی ان صحابہ کرام کے کردار کی داد دی جنہوں نے عبداللہ بن جحش کی کمان میں تجارتی قافلہ کو گرفتار کیا اور عمرو بن حضرمی کو قتل کیا۔ یہ پہلا مقتول ہے جو اسلام کے ہاتھوں مارا گیا اور اسلام میں یہ پہلی غنیمت ہے جو مسلمانوں کے ہاتھ آئی۔ عمرو بن حضرمی کے قتل ہی کو ابوجہل نے مختلف تدبیروں سے غزوۂ بدر کا بنیادی سبب بنا لیا تھا جیسا کہ انشاء اللہ سورۃ انفال کے تشریحی نوٹوں میں تفصیل آئے گی۔

آیت قرآنی نے جب اسے کارنامہ قرار دیا تو عبداللہ بن جحش نے خوش ہو کر آیتِ قرآنی کے مطالب کو حالات کے مطابق اشعار میں پیش کیا۔

تعدون قتلا فی الحرام عظیمۃ　　　　واعظم منہ لو یری الرشد راشد

صدودکم عما یقول محمد　　　　وکفر بہ واللہ راء و شاھد

تم لوگ شہر حرام میں لڑائی کو برائی سمجھتے ہو حالانکہ محمد رسول اللہ کی باتوں سے لوگوں کو روکنا، اور آپ کی نبوت کا انکار اس سے کہیں بڑھ کر برائی ہے کاش کوئی سمجھ دار غور کرے اور اللہ تو خوب دیکھنے والا ہے۔

واخراجکم من مسجد اللہ واھلہ　　　لئلا یری فی البیت للہ ساجد[1]

اور تمہارا اللہ کے گھر سے اللہ والوں کو نکالنا تاکہ اللہ کے گھر میں اللہ کو سجدہ کرنے والا کوئی نظر نہ آئے شہر حرام میں قتل سے زیادہ سنگین جُرم ہے۔

فانا وان غیبتمونا بقتلہ　　　وارجف بالاسلام باغ وحاسد

سقینا من ابن الحضرمی رماحنا　　　بنخلۃ لما اوقدت الحرب واقد

دما وابن عبداللہ عثمان بیننا　　　ینازعہ غل من القید عاند

تم اگرچہ اس قتل پر ہم کو عار دلاؤ اور حاسد لوگ اسلام کے بارے میں کتنی ہی جھوٹی خبریں اڑائیں لیکن ہم کو پرواہ نہیں ہے۔ یقیناً ہم نے عمرو بن الحضرمی کے خون سے مقام نخلہ میں اپنے نیزوں کو سیراب کیا۔ جبکہ واقد نے لڑائی کی آگ بھڑکائی اور عثمان ہمارے درمیان قیدی تھا جسے بیڑیاں اور ہتھکڑیاں اپنی طرف کھینچ رہی تھیں[1]

۶۱۹ - وہ شہر حرام میں جنگ کے بارے میں تم سے پوچھتے ہیں، الشہر حرام سے یہاں ماہ رجب مراد ہے۔ واقعہ کی تاریخ صحابہ کے خیال میں ۳۰، جمادی الثانیہ تھی۔ بعد کو علم ہوا جیسا کہ آج کل بھی قمری مہینوں میں بارہا ہوتا رہتا ہے کہ چاند ۲۹ کا ہو گیا تھا اور وہ تاریخ یکم رجب تھی۔ مشرکین نے سہو وغلطی کی اس رائی کو لے کر پہاڑ بنا دیا اور اعتراض شروع کر دیا کہ مسلمانوں کو اب محترم مہینوں کی حرمت کا بھی پاس نہیں ہے۔ اصل یہی ہے جیسا کہ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور امام بیہقی نے یزید بن رومان کے حوالے سے عروہ کی زبانی بتایا ہے کہ یہ واقعہ جمادی الثانیہ کی آخری تاریخ میں پیش آیا ہے لیکن ابن اسحاق نے سیرت میں جو روایت درج کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ رجب کی آخری تاریخ میں پیش آیا۔ اور بعض معاصر مفسرین نے بھی اس کو اپنایا ہے۔ ہمارے خیال میں پہلی بات صحیح ہے دونوں میں فرق ہے۔ جمادی الثانیہ والی روایت کی رُو سے صحابہ کا یہ اقدام یعنی حرمت والے مہینے میں جنگ سہو اور غلطی کی بنا پر تھا یعنی ان کو ۲۹ کو چاند ہونے کا علم نہ تھا اور دوسری روایت کی رُو سے صحابہ کا یہ اقدام عمداً اور جان بوجھ کر تھا۔ حضرت شیخ الہند نے بھی پہلی روایت کو اختیار فرمایا۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔ حضرت فخر عالم نے اپنی ایک جماعت کافروں کے مقابلے

---

[1] سیرۃ ابن ہشام ج ۱ ص ۱۹ و اصابہ ج ۱ ص ۳۰۸

کے لیے روانہ کی۔ انہوں نے کافروں کو مارا اور مال لوٹ لائے۔ مسلمان تو جانتے تھے کہ یہ جمادی الثانیہ کا آخری دن ہے اور وہ رجب کا غرہ تھا جو کہ اشہر حرام میں داخل ہے۔ کافروں نے اس پر بہت طعن کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے حرام مہینہ کو حلال کر دیا اور اپنے لوگوں کو حرام مہینہ میں لوٹ مار کی اجازت دے دی۔ مسلمانوں نے حاضر ہو کر آپ سے پوچھا کہ ہم سے شبہ میں یہ کام ہوا اس کا کیا حکم ہے؟ [1]

اگرچہ پوچھنے والے مسلمان تھے لیکن آیتِ قرآنی کا انداز بتا رہا ہے کہ صرف مسلمانوں نے ہی نہیں سوال کیا بلکہ پوچھنے والے قریش بھی تھے جیسا کہ ابنِ کثیر نے حضرت عروہ ابن الزبیر کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اس واقعہ کے بعد قریشِ مکہ کا ایک وفد بارگاہِ رسالت میں حاضر ہوا اور دریافت کیا کہ کیا شہرِ حرام میں قتال جائز ہے؟ بہرحال دونوں نے کیا اور قرآن نے دونوں کو جواب دیا۔

یہ بات اگرچہ واضح تھی کیونکہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اگر مشرکین تمہارے ارادۂ حج میں مزاحم ہوں تو تمہیں ان سے جنگ کی اجازت ہے۔ لیکن یہاں صورتِ حال کچھ دوسری رونما ہو گئی تھی۔ ان کو روانہ کیا گیا تھا خبر رسانی کے لیے اور انہوں نے بطورِ خود یہ اقدام کیا۔ اس لیے حضور انور نے یہ فرمایا کہ میں نے تم کو حرمت کے مہینے میں قتل کا حکم نہیں دیا تھا۔ صورتِ حال بدل جانے کی وجہ سے تشویش پیدا ہوئی اور خود اپنوں کی جانب سے سوال ہوا۔ اس لیے قرآن نے اس سوال کا تفصیلی جواب دیا۔

۲۰۶۔ کہہ دو کہ اس میں جنگ کرنا بڑی سنگین بات ہے۔ یعنی شہرِ حرام میں جنگ کرنا بے شک گناہ کی بات ہے لیکن صحابہ کرام نے تو اپنے علم کے موافق جمادی الثانیہ میں قتال کیا تھا۔ شہرِ حرام یعنی رجب میں نہیں کیا تھا اس لیے مستحقِ عفو ہیں۔ اُن پر الزام لگانا بے انصافی ہے [2]

مطلب یہ ہے کہ شہرِ حرام میں جنگ بہت بڑا گناہ ہے بشرطیکہ دانستہ یعنی ماہِ حرام کا علم رکھتے ہوئے ہو۔ اور یہ جُرم صحابہ سے سرے سے سرزد ہی نہیں ہوا۔ علامہ آلوسی رقمطراز ہیں کہ صحابہ نے جو کچھ کیا وہ ایک اجتہادی غلطی کی بنا پر کیا اور اجتہاد میں غلطی معاف ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] ایضاً

اشہرِ حرام میں قتال

یہ سوال کہ حرمت والے مہینوں میں اب بھی قتال جائز ہے یا نہیں۔ محققین کا متفقہ فیصلہ ہے کہ جب کافر اس زمانہ میں لڑنا شروع کر دیں تو مسلمانوں کے لیے دفاعی وجوابی قتال تو بہرحال جائز ہے۔ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں اس پر اتفاق نقل کیا ہے۔ ہاں اس میں گفتگو ہوتی ہے کہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے ابتدا کرنی جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور جمہور فقہاء اس کے قائل ہیں کہ قرآن کی دوسری آیتوں سے یہ حکم کالعدم ہو گیا ہے۔ ابن العربی لکھتے ہیں کہ تمام علماء کی رائے میں اب یہ حکم نہیں ہے۔ الجصاص فرماتے ہیں کہ فقہاء تابعین میں سے سلیمان بن یسار اور سعید بن المسیب نے اس کا جواز بیان کیا ہے اور عام فقہاء کی یہی رائے ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ جمہور اُمت اس کے جواز کے قائل ہیں۔ تابعین میں حضرت عطاء، ابن ابی رباح اور بعض اکابر اس کے قائل ہیں کہ حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ممانعت کا حکم دائمی ہے بلکہ حضرت عطاء تو اپنے موقف کی صحت پر قسم اٹھا لینے کو تیار تھے۔

یہ سوال کہ شہرِ حرام میں قتال کے جواز کا پروانہ کس آیت کے ذریعے حاصل ہوا ہے بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اس موضوع پر علماء کی آراء مختلف ہیں۔

کچھ کہتے ہیں قاتلوا المشرکین کافۃ سے اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے

کچھ کہتے ہیں کہ قرآن کی آیت فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم سے اس کی اجازت معلوم ہوتی ہے اور لفظ حیث کو اس جگہ زمانہ کے معنے میں لیا ہے۔

کچھ کے خیال میں شہرِ حرام میں جنگ کی اجازت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہوتی ہے کہ خود آپ نے طائف کا محاصرہ شہرِ حرام میں فرمایا۔ اور حضرت عامر اشعری کو شہرِ حرام ہی میں اوطاس کے جہاد کے لیے بھیجا۔ اسی بنا پر عامہ فقہاء اس حکم کو منسوخ قرار دیتے ہیں۔ جصاص نے فرمایا وھو قول فقہاء الامصار صاحب روح المعانی نے اسی آیت کے تحت اور قاضی بیضاوی نے سورۃ براۃ کے پہلے رکوع کی تفسیر میں شہرِ حرم میں حرمت قتال کے منسوخ ہونے پر اجماعِ اُمت نقل کیا ہے (بیان القرآن)

لیکن قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری میں ان تمام دلائل کا تفصیلی جائزہ لیا ہے اور بتایا ہے کہ شہرِ حرم کی حُرمت کی تصریح خود اس آیت میں موجود ہے جس کو آیت السیف کہا جاتا ہے

ان عدۃ الشھور عند اللہ اثنا عشر شھرا فی کتاب اللہ یوم خلق السموات والارض منھا اربعۃ حرم، ذالک الدین القیم۔
اللہ کے نزدیک مہینوں کی گنتی بارہ ہے۔ اللہ کی کتاب میں ایسا ہی لکھا گیا جس روز آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا۔ ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔ دین کی سیدھی راہ یہی ہے۔

یہ آیت آیاتِ قتال میں سب سے آخر میں نازل ہوئی ہے۔ اور خطبۂ حجۃ الوداع میں بھی ان مہینوں کی حرمت کا ذکر ہے۔ یہ خطبہ حجۃ الوداع میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وفات سے صرف اسی روز پہلے دیا تھا۔ اس لیے مذکورہ بالا آیات کے ذریعے اشہرِ حرم میں قتال کی اجازت معلوم نہیں ہوتی ہے۔ باقی رہا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل تو وہ اس کا ناسخ نہیں ہے۔ کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا محاصرہ طائف ذی قعدہ میں نہیں شوال میں ہوا ہے اس لیے اس کو بھی اجازت کی دلیل نہیں بنایا جا سکتا۔ البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ اشہرِ حرم میں قتال کی حرمتِ مطلقہ جو آیاتِ قرآنی سے معلوم ہو رہی ہے اس سے یہ صورت خارج ہے جبکہ کفار خود ان مہینوں میں مسلمانوں سے جنگ کریں۔ اگر ایسا ہو تو مسلمانوں کے لیے جوابی حملہ اور دفاع جائز ہے۔
خلاصہ یہ ہے کہ جنگ کا آغاز تو ان مہینوں میں ہمیشہ کے لیے حرام ہے لیکن دفاع جائز ہے جیسا کہ ابوبکر الجصاص نے بحوالہ حضرت جابر بتایا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کسی شہرِ حرام میں اس وقت تک قتال نہ کرتے تھے جب تک قتال کی ابتداء کفار کی جانب سے نہ ہو جائے[1]

۶۲۱۔ لیکن لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنا، اللہ کی نافرمانی کرنا اور مسجدِ حرام سے روکنا، اور اس سے لوگوں کو نکالنا اللہ کے نزدیک جنگ سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ یعنی لوگوں کو اسلام لانے سے روکنا اور خود دینِ اسلام کو نہ ماننا اور لوگوں کو بیت اللہ کی زیارت سے روکنا اور مکہ کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا۔ یہ باتیں شہرِ حرام میں مقاتلہ کرنے سے زیادہ گناہ ہیں اور کفار برابر یہ حرکات کرتے رہے۔ خلاصہ یہ کہ شہرِ حرام میں بلا وجہ اور ناحق لڑنا بیشک اشد گناہ ہے مگر جو لوگ حرم میں بھی کفر پھیلائیں اور بڑے بڑے فساد کریں اور اشہرِ حرام

---

[1] معارف القرآن ج ش ملخصاً

میں بھی مسلمانوں کو ستانے میں کمی نہ کریں۔ ان سے لڑنا منع نہیں ہے علاوہ ازیں جب مشرکین ایسے اُمورِ شنیعہ میں سرگرم ہیں تو ایک تھوڑے تصور پر مسلمانوں کی نسبت طعن کرنا جو اُن سے بوجہ لاعلمی صادر ہوا بڑی شرم کی بات ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کی راہ سے روکنا، اللہ کا کفر کرنا مسجدِ حرام سے اللہ کے بندوں کو محروم کرنا اور جو اپنے اعمال و عقائد کے اعتبار سے اس مسجدِ حرام کے سب سے زیادہ حقدار ہیں ان کو یہاں سے ہجرت پر مجبور کرنا اشہرِ حرم میں جنگ کرنے سے بھی بڑے جرائم ہیں۔ اس وجہ سے اگر ان سنگین تر جرائم کے سدِ باب کے لیے اشہرِ حرم میں جنگ کرنی پڑے تو یہ اشہرِ حرم کی حرمت کا قصاص ہے اور گناہ نہیں بلکہ بہت بڑی نیکی ہے۔ جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ بلا شبہ ماہِ حرام میں لڑنا بہت بُری حرکت ہے لیکن اس پر اعتراض کرنا ان لوگوں کو زیب نہیں دیتا جنہوں نے ۱۳ برس مسلسل اپنے بھائیوں پر صرف اس لیے ظلم توڑے ہوں کہ وہ اللہ پر ایمان رکھتے تھے۔ پھر ان کو یہاں تک تنگ کیا کہ وہ جلا وطنی پر مجبور ہو گئے۔ پھر اس پر بھی اکتفا نہ کیا بلکہ اپنے ان بھائیوں کے لیے مسجدِ حرام تک جانے کا راستہ تنگ کر دیا۔ اب جن ظالموں کا نامۂ اعمال ان کرتوتوں سے سیاہ ہے ان کا کیا حق ہے کہ ایک معمولی سی جھڑپ پر اس قدر شور مچائیں حالانکہ اس جھڑپ میں جو کچھ ہوا ہے وہ لاعلمی میں ہوا ہے۔ اور اس کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ ایک اجتہادی غلطی ہوئی اور بس غلطی سے درگزر کیا جا سکتا ہے مگر کفر و شرک کا جرم کسی طرح بھی قابلِ معافی نہیں ہے۔

قرآن کا بتایا ہوا ضابطہ

قرآن نے اس آیت کے ذریعے زندگی میں یہ رہنما اُصول اور دستوری دفعہ بتا دی کہ ان لوگوں کی حرمتوں کو ملحوظ رکھا جائے گا جو خود اپنی حرمتوں کا پاس کرتے ہوں۔ لیکن قرآن اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ شریر لوگ نیک لوگوں کو اذیتیں دیں، پرہیزگار لوگوں کو قتل کریں اور اہلِ ایمان کو آزمائش میں ڈالنے کے لیے حرمتوں کو ڈھال بنالیں اور اس کے سہارے سارے گناہ کرتے رہیں اور سزا سے بچتے رہیں۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

قرآن کا بتایا ہوا یہ اصول دوسرے مواقع پر بھی کارفرما نظر آتا ہے۔ قرآن بُری بات کی تشہیر سے روکتا ہے مگر اس سے ظالم کا ظلم مستثنیٰ ہے۔ کیونکہ اگر ظالم کے ظلم پر خاموشی اختیار کی جائے اور اس کی حرمت کی وجہ سے اس کے ظلم کی تشہیر نہ کی جائے تو ظالم کی دست درازیاں بڑھ جائیں۔ غیبت حرام ہے مگر فاسق کی غیبت میں اس کے فسق سے لوگوں کو آگاہ کرنا روا ہے، کیونکہ فاسق کی بُرائی اور فسق سے معاشرے کو تکلیف پہنچتی ہے اس لیے اس کا وہ احترام باقی نہیں رہتا کہ اس کی بُرائی سے لوگوں کو آشنا نہ کیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن حرمتوں کی آڑ میں بُرائی کرنے کی اجازت نہیں دیتا۔ اور جیسے قرآن حرمتوں کی آڑ میں بُرائی کرنے کی اجازت نہیں دیتا ایسے ہی مسلمانوں کو اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ اپنے مقام سے گر کر کفار کی سطح پر آجائیں۔

۶۲۲۔ اور جبر و ظلم کے ذریعے لوگوں کو دین سے پھیرنا قتل سے زیادہ سنگین گناہ ہے۔ یعنی دین میں فساد اور فتنہ ڈالنا تاکہ لوگ دینِ حق کو قبول نہ کریں۔ اس قتل سے بدرجہا مذموم ہے جو مسلمانوں سے شہر حرام میں واقع ہو۔ مشرکین کی عادت تھی کہ دینِ اسلام کی باتوں میں طرح طرح سے خدشات اور شبہات پیدا کرتے تھے تاکہ لوگ شبہ میں پڑ جائیں اور اسلام کو قبول نہ کریں۔ چنانچہ اسی قصہ میں کہ مسلمانوں سے شہرِ حرام میں بوجہ لاعلمی قتل واقع ہوا اور اس پر مشرکین نے زبان درازی کی تو اس سے مقصود یہی تھا کہ لوگ قبولِ اسلام سے متنفر ہو جائیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مسلمانوں سے جو قتل صادر ہوا اس پر مشرکین کا طعن کرنا اس وجہ سے کہ لوگ دینِ حق سے بچل جائیں، قتل مذکور سے بدرجہا مذموم اور شنیع ہے[1]

فتنہ کا استیصال

فتنہ سے مراد وہ شدید مزاحمتیں اور رکاوٹیں ہیں جو معاندین نے دینِ حق کی راہ میں پیدا کر رکھی ہیں۔ اس دین کی راہ میں جس کا مقصد ہی دُنیا کو راہِ امن دکھانا اور تمام زحمتوں اور کلفتوں سے نجات دلانا ہے۔ کچھ لوگوں نے یہاں فتنہ کے معنے مطلق کفر ہی بتائے ہیں۔ لیکن یہاں یہ معنے زیادہ چسپاں نہیں ہیں۔ امام رازی نے بھی اسے ضعیف کہا ہے۔ راجح بات

---

[1] افادات شیخ الہند

وہی ہے جو پہلے بتائی گئی۔ اکبر کی تفسیر عبداللہ ابن عباس صحابی اور تابعین نے اشد سے کی ہے۔ مقصد ارشادیہ ہے کہ دین حق کی راہ میں جو لوگ رکاوٹ پیدا کرتے ہیں اور لوگوں کو اس طرف آنے سے طرح طرح کی سازشوں، تدبیروں، ترکیبوں سے روکتے ہیں وہ حقیقۃً دنیا کو امن و عدل و عافیت سے محروم کر دینا چاہتے ہیں۔ اور اس لیے وہ نوع و نسل انسانی کے مجرم ہیں۔ اسلامی جہاد کی تو غایت ہی دنیا سے ہر قسم کی خود غرضیوں اور فریب کاریوں، ظلم و جور، شورش و بدامنی کو دور کرنا ہے۔ جو احمق اس کو اور عالم دنیوی حکومتوں کے قتل و قتال کو یکساں سمجھ رہے ہیں وہ جراح کے نشتر اور ڈاکو کے خنجر کو ایک سطح پر رکھتے ہیں[1]

خاص طور پر فتنہ کا حوالہ دیا ہے کہ یہ فتنہ جو مکہ میں پایا جا رہا ہے قتل سے بھی کہیں زیادہ سنگین جرم ہے۔ فتنہ سے مراد وہ سنگدلانہ اذیتیں اور تکلیفیں ہیں جو کفار و مشرکین مسلمانوں کو اسلام سے پھیرنے کے لیے پہنچا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ فتنہ تو قتل سے بھی بڑا کام ہے۔ پھر یہ فتنہ جب بلد امین اور بلد حرام میں موجود ہے نہ سرزمین حرم کا احترام اس سے ظالموں کو روک رہا ہے اور نہ اشہر حرم کا احترام مانع ہے تو آخر مظلوموں کی مدافعت کے لیے اشہر حرم میں جنگ کو کیوں گناہ قرار دیا جائے[2]

۶۲۳ ۔ اور یہ لوگ تم سے برابر جنگ کرتے رہیں گے یہاں تک کہ تم کو تمہارے دین سے پھیر دیں۔ اگر دین سے پھیرنا ان کے بس میں ہو۔ یعنی جب تک تم دین پر قائم رہو گے یہ مشرکین کسی حالت اور کسی موقعہ پر بھی تمہارے مقاتلہ اور مخالفت میں کمی نہیں کریں گے۔ حرم مکہ اور اشہر حرام ہی کیوں نہ ہو جیسا کہ عمرۂ حدیبیہ میں پیش آیا نہ حرم مکہ کا لحاظ کیا اور نہ شہر حرام کی پروا کی۔ بلا وجہ محض عناد سے مارنے مرنے کو مستعد ہو گئے اور مسلمانوں کے مکہ میں جانے اور عمرہ کرنے کے روادار نہ ہوئے پھر ایسے معاندین کی طعن و تشنیع کی کیا پروا کی جائے اور ان سے مقاتلہ کرنے میں شہر حرام کی وجہ سے کیوں روکا جائے[3]

گویا یہ بیان ہے اس کا کہ مشرکین عرب اسلام سے کس درجہ بیزار اور حق کے کس درجہ دشمن تھے لایزالون یقاتلونکم انہی دشمنان حق کی طرف اشارہ ہے۔ ایک انگریز مترجم قرآن کیمرج یونیورسٹی کے استاد عربی پروفیسر پامر ہوتے ہیں اس موقع پر طنز و تعریض کے انداز میں

---

[1] ماجدی [2] تدبر قرآن [3] افادات شیخ الھند

یوں رقمطراز ہیں:

اب اسلام نے کافروں پر ہر چہار طرف سے دھاوا بول دیا۔

اللہ اکبر کتنا بڑا جھوٹ ہے۔ آیت قرآنی یہ بتا رہی ہے کہ کافروں نے اسلام پر دھاوا بول دیا تھا۔ اس جھوٹ میں سچ صرف اتنا ہے کہ دھاوا بول دیا لیکن کس نے بول دیا۔ قرآن کہتا ہے کافروں نے بول دیا اور پروفیسر صاحب فرماتے ہیں کہ اسلام نے بول دیا۔[1]

اس آیت میں دو اشارے پائے جاتے ہیں۔ ایک تو یہ کہ کفار دینِ اسلام کے مٹانے پر کوئی دقیقہ نہ اٹھا رکھیں گے لہٰذا مسلمانوں کو خبردار رہنا چاہیے۔ دوسرا اشارہ یہ ہے کہ مسلمانوں پر ان کا قابو نہیں چلے گا اور وہ انشاء اللہ مسلمانوں کو مرتد نہ بنا سکیں گے۔[2]

یہ فقرہ دراصل فتنہ کی سنگینی کو واضح کرنے کے لیے آیا ہے کہ کفار و مشرکین مسلمانوں کو دینِ حق سے پھیرنے کے لیے جو مظالم کر رہے ہیں ان کی نوعیت صرف انفرادی واقعات ہی کی نہیں ہے جو کسی وقتی جوش کے تحت صادر ہو گئے ہوں بلکہ مسلمانوں کو دین سے پھیرنے کے لیے یہ لوگ خونریز جنگوں کا ایک سلسلہ چھیڑنے کے منصوبے بنا رہے ہیں اور یہ اگر ان کے امکان میں ہو تو اس وقت تک دم لینے والے نہیں ہیں جب تک تمہیں اسلام سے پھیرنے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ کیا ایسے سخت و شدید فتنہ کے مقابلہ میں اشہرِ حرم میں لڑائی گناہ ہی رہے گی۔[3]

اسلام میں ارتداد کا حکم

۶۲۴ - اور یاد رکھو جو شخص تم میں سے اپنے دین سے پلٹ جائے گا اور اس کی موت حالتِ کفر ہی میں ہو گی تو بس یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا و آخرت میں اکارت گئے اور یہی لوگ دوزخی ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ یعنی مسلمان ہونے کے بعد اسلام سے پھر جانا اور اسی حالت پر مرجانا ایسی سخت بات ہے کہ عمر بھر کے اس کے نیک کام ضائع کر کسی بھلائی کے مستحق نہیں رہتے۔ دنیا میں نہ ان کی جان و مال محفوظ رہے نہ نکاح قائم رہے، نہ ان کو میراث ملے نہ آخرت میں ثواب ملے اور نہ کبھی جہنم سے نجات نصیب ہو۔ ہاں اگر

---

[1] ماجدی [2] معارف م ا [3] تدبر قرآن

پھر اسلام قبول کر لیں تو اسلام کے قبول کرنے کے بعد والے اعمال کی جزا پوری ملے گی [1]

یہاں تک تو اصل سوال کا جواب تھا۔ اب ارتداد کی مناسبت سے مسلمانوں کو تنبیہ کی جا رہی ہے کہ اگر اُن کے ظلم و ستم سے مرعوب ہو کر تم میں سے کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا اور اسی حالت میں مر جائے گا تو اس کے تمام اعمال دُنیا و آخرت دونوں میں اکارت ہو جائیں گے اور وہ دوزخ میں پڑے گا۔ اکارت ہونے کے لیے حَبِطَت کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اعمال سے مراد وہ اعمال ہیں جو بظاہر نیکی کے ہیں اور حبط سے مراد اُن کا بے نتیجہ اور بے اثر ہونا ہے یعنی اس کفر کے بعد وہ کام اکارت ہو جائیں گے جو مسلمان ہونے کی حالت میں کیے تھے

حَبِطَت دراصل عربی محاورے حبطت الناقۃ سے ماخوذ ہے اور یہ اس وقت بولا جاتا ہے جب اونٹنی زہریلا گھاس کھالے جس سے اس کا پیٹ پھول جائے اور مر جائے۔ قرآن اعمال کے ضائع ہو جانے کے لیے یہ لفظ استعمال کرتا ہے جس سے مدلول معنوی اور مدلول حسی دونوں واضح ہو جاتے ہیں کہ باطل اعمال کی نمائش تو بڑے اور پُر شکوہ ہوتے ہیں مگر اُن کا آخری انجام ہلاکت اور تباہی ہے جیسے بدگھاس کھا کر اونٹنی کا پیٹ پھول جاتا ہے اور وہ مر جاتی ہے

حبطِ اعمال کا قانونی مقام

امام شافعی نے اس فقرے سے یہ استنباط کیا ہے کہ اگر کوئی شخص دینِ اسلام سے مرتد ہو جائے اور پھر کفر ہی کی حالت میں مر جائے تو اُس کے اعمال اکارت جائیں گے۔ اور اگر مرتد ہو لے کے بعد مرنے سے پہلے دوبارہ اسلام لے آئے تو اس کے اعمال ضائع نہ ہوں گے کیونکہ آیت میں حبطِ اعمال کے لیے دو چیزوں کا ذکر ہے ایک ارتداد یعنی من یرتدد منکم عن دینہ اور دوسرے کفر پر موت یعنی فیمت وھو کافر۔ حبطِ اعمال کے لیے ان دونوں باتوں کا پایا جانا شرط ہے۔ امام ابوحنیفہ یہ فرماتے ہیں کہ محض ارتداد سے اعمال حبط ہو جاتے ہیں۔ کفر پر مرنا شرط نہیں ہے۔ قرآن میں دوسرے موقع پر یہ حکم بے قید آیا ہے۔

من یکفر بالایمان فقد حبط عملہ اس آیت میں جیسے جانبِ شرط میں دو چیزیں مذکور ہیں ایک ارتداد دوسرے موت علی الکفر ایسے ہی جوابِ شرط میں بھی دو چیزوں کا ذکر ہے

---

[1] افادات شیخ الہند

ایک حبطِ اعمال اور دوسرے دخولِ جہنم۔ حبطِ اعمال تو محض ارتداد سے ہو جائے گا مگر جہنم میں جانے کے لیے موت علی الکفر شرط ہے جس طرح شرط کے دو حصے ہیں اسی طرح جوابِ شرط کے بھی دو حصے ہیں۔ جوابِ شرط کا پہلا حصہ شرط کے حصہ اول سے اور جوابِ شرط کا دوسرا حصہ شرط کے دوسرے حصہ سے متعلق ہے۔ یہی امام مالک کا مذہب ہے۔

اس کا نتیجہ عملی زندگی میں یہ ہوگا کہ اگر ایک مسلمان معاذ اللہ مرتد ہوگیا اور پھر توبہ کرکے مسلمان ہوگیا تو اگر اس نے پہلے مسلمانی کے زمانہ میں حج کیا ہوگا تو امام ابوحنیفہ کے نزدیک حج دوبارہ کرنا ہوگا۔ مگر امام شافعی کے نزدیک پہلا ہی حج کافی ہے۔

حبطِ اعمال کا قانونی مفہوم

حبطِ اعمال کا اثر آخرت میں تو یوں ظاہر ہوگا کہ ہر قسم کی عبادات اور اعمال کے اجر سے محرومی ہوگی۔ اور دُنیا میں اس کا قانونی طور پر ظہور اس طرح ہوگا کہ وہ اسلامی ریاست میں جملہ شہری حقوق سے محروم ہو جائے گا۔ ریاست پر اس کے مال و جان کی حفاظت باقی نہیں رہتی، امام محمد نے السیر الکبیر میں تصریح کی ہے کہ مرتد کی حیثیت اسلامی ریاست میں حربی جیسی ہو جاتی ہے۔ گویا ارتداد سے مرتد کی زندگی بھی اکارت ہو جاتی ہے اور اکارت ہو جانا یہ ہے کہ ایسے شخص کو اسلامی ریاست زندہ رہنے کا حق نہیں دیتی ہے۔ اس کے تفصیلی مباحث یعنی قتلِ مرتد پر قرآن و سنت کی روشنی میں بحث، اس کی شرعی حیثیت، خلافتِ راشدہ میں اس کے نظائر، ارتداد کے خلاف خلیفہ اوّل کا جہاد، قتلِ مرتد پر عقلی بحث تو انشاء اللہ پارہ ۵ میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنا گوش گزار فرمالیجئے کہ حافظ ابن تیمیہ نے الصارم المسلول میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ مسئلہ کی جزئیات میں اسلام کے قانون دان طبقہ میں خواہ کتنا اختلاف ہو لیکن یہ مسئلہ کہ مرتد کی اسلامی قانون میں سزا قتل ہے فقہ کے چاروں مذاہب میں اتفاقی ہے۔

امام مالک کا مذہب مؤطا میں یہ بتایا گیا ہے۔

زید بن اسلم سے امام مالک نے روایت کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو اپنا دین بدلے، اس کی گردن مار دو۔ اس حدیث کے متعلق امام مالک نے فرمایا جہاں تک ہم سمجھتے ہیں اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص اسلام سے نکل کر کسی دوسرے

طریقے کا پیرو ہو جائے مگر اپنے کفر کو چھپا کر اسلام کا اظہار کرتا ہے جیسا کہ زندیقوں اور اسی طرح کے دوسرے لوگوں کا ڈھنگ ہے تو اس کا جرم ثابت ہو جانے کے بعد اسے قتل کر دیا جائے اور توبہ کا مطالبہ نہ کیا جائے کیونکہ ایسے لوگوں کی توبہ کا بھروسہ نہیں ہے۔ اور جو شخص اسلام سے نکل کر علانیہ کسی دوسرے طریقے کی پیروی اختیار کرے اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے توبہ کرے تو خیر ورنہ قتل کیا جائے۔

شوافع کا مذہب ان کی مستند ترین کتاب متن ابی شجاع میں اس طرح پیش کیا گیا ہے۔

جو شخص اسلام سے پھر جائے اسے فوراً توبہ کو کہا جائے اور اس کے لیے تین دن کی مہلت بھی دی جا سکتی ہے۔ اگر توبہ کرے تو بہتر ورنہ اسے قتل کر دیا جائے اُس کو غسل نہ دیا جائے، نماز نہ پڑھی جائے اور مسلمان کے قبرستان میں دفن نہ کیا جائے۔

علامہ ابن قاسم غزی نے متن ابی شجاع کی شرح میں، شیخ ابراہیم باجوری نے اپنے حاشیہ میں، علامہ نووی نے شرح المہذب اور الروضہ میں امام شافعی کا یہی مذہب نقل کیا ہے۔

حنابلہ کا مذہب ان کی مشہور ترین کتاب المغنی میں ابن قدامہ نے اس طرح بیان کیا ہے۔

امام احمد بن حنبل کی رائے یہ ہے کہ جو عاقل و بالغ مرد یا عورت اسلام کے بعد کفر اختیار کرے اسے تین دن تک توبہ کی مہلت ملنی چاہیے۔ اگر توبہ نہ کرے تو قتل کر دیا جائے۔ یہی رائے حسن بصری، زہری، ابراہیم نخعی، مکحول، حماد، مالک، لیث، اوزاعی، شافعی اور اسحاق بن راہویہ کی ہے۔

فقیہ حنابلہ علامہ منصور بن یونس نے اپنی مشہور کتاب الروض المربع میں بھی حنابلہ کا مذہب یہی بیان کیا ہے۔

امام ابو حنیفہ کا مذہب اس موضوع پر امام سرخسی نے شرح السیر الکبیر میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔

مرتد اگر مسلمان نہ ہو تو اسے قتل کر دیا جائے۔ مرتد چاہے آزاد ہو یا غلام کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص اپنا دین بدل ڈالے اسے قتل کر دو۔ اس میں آزاد اور غلام سب شامل ہیں۔ غلام کا آقا اگر چاہے تو اپنے غلام کو ارتداد کی سزا خود بھی دے سکتا ہے۔ عبداللہ بن عمر نے اپنے غلام کو نصرانی ہو جانے پر خود ہی سزا دی تھی اور اس کی وجہ یہ ہے کہ مرتد ارتداد کی وجہ سے قتل کے باب میں حربی کی طرح ہوتا ہے اور حربی کو

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَتَ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٢١٨﴾

جو لوگ ایمان لائے[۶۲۵] اور جن لوگوں نے وطن سے[۶۲۶] بے وطن ہونے کی سختیاں برداشت کیں اور اللہ کی راہ میں جہاد[۶۲۷] کیا تو بلاشبہ ایسے ہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کے اُمید وار[۶۲۸] ہیں اور اللہ بہت بخشنے والا مہربان ہے۔

قتل کرنے کا ہر مسلمان مجاز ہے۔ ہاں افضل یہی ہے کہ معاملہ کو عدالت کے ذریعہ نمٹایا جائے کیونکہ اس میں حد کی معنوی حیثیت ہے اور حدود کی بجا آوری عدالت کا کام ہے۔

حافظ ابو جعفر طحاوی نے اپنی کتاب شرح معانی الآثار میں حنفی مذہب کی ترجمانی اس طرح کی ہے:

اسلام سے مرتد ہونے والے شخص کے بارے میں فقہاء کے درمیان اختلاف اس امر میں ہے کہ آیا اس سے توبہ کا مطالبہ کیا جائے یا نہیں۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر سرکار اس سے توبہ کا مطالبہ کرے تو یہ زیادہ بہتر ہے۔ پھر اگر وہ شخص توبہ کرے تو چھوڑ دیا جائے ورنہ قتل کر دیا جائے۔ امام ابو حنیفہ، ابو یوسف، اور محمد ان لوگوں میں سے ہیں جنہوں نے یہ رائے اختیار کی ہے۔

الغرض فقہ کے تمام مشہور مدارس اس پر متفق ہیں کہ ارتداد کی سزا قتل ہے اور قتل کی یہ سزا قرآن کے بتائے ہوئے اسی اصول پر مبنی ہے کہ قرآن کے نزدیک اسلام سے پھر جانے والے کے اعمال حبط ہو جاتے ہیں یعنی اسلامی مملکت میں جملہ شہری حقوق سے محروم ہو جاتا ہے۔

دین کی خاطر ہجرت اور جہاد

زمانہ رسالت کے مسلمانوں یعنی صحابہ کرام کی یہ خصوصیت تھی کہ ان میں مقصد کی لگن اور نصب العین

کا عشق تھا۔ وہ ایک عالمگیر تخیل کے داعی تھے اور اس تخیل سے ان میں ایسی شدید محبت تھی کہ اس کے لیے کوئی قربانی نہ تھی جسے انہوں نے گوارا نہ کیا ہو اور کوئی مشقت نہ تھی جو انہوں نے نہ سہی ہو۔ نبوت کی جس پکار پر انہوں نے اپنی زندگیاں استوار کی تھیں وہ ایک جاندار انقلاب انگیز اور متحرک نظام فکر و عمل تھا جس کا خمیر عشق کی ولولہ انگیزیوں اور جنوں نوازیوں سے تیار ہوا تھا، جس میں ایثار اور سرفروشیوں کی دنیا آباد تھی۔ ان کے اعمال عبادت کی قیمت اسی نسبت سے متعین کی جاتی تھی جس نسبت سے وہ اس نصب العین کی تقویت کا باعث ہوتے تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ ان کے اخلاص و ایثار کا پیمانہ تھا اور اللہ کے یہاں ان کا اجر بھی اسی پیمانے سے تقسیم ہوتا تھا۔ عبداللہ بن جحش کی کمان میں جن مہاجرین نے سرفروشی اور جانبازی کا کارنامہ انجام دیا تھا اور جو بے خبری میں شہر حرام میں ہو گیا تھا ان کو پہلی آیت سے یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہماری اس معاملہ میں کوئی گرفت نہ ہو گی مگر یہ خلش دلوں میں پیدا ہو رہی تھی کہ اس محنت کا اللہ کے یہاں اجر بھی ملے گا؟ اس آیت میں قرآن نے اُن کو تسلی دی ہے کہ مطمئن رہیں کہ ان کا یہ کارنامہ اللہ کی راہ میں جہاد کا کارنامہ ہے اور ان کو اللہ کی رحمت سے اُمیدوار رہنا چاہیے۔

۶۲۵۔ جو لوگ ایمان لائے۔ پہلی آیت سے صحابہ کرام کو یہ تو معلوم ہو گیا کہ ہمارے اوپر اس بارے میں کوئی مواخذہ نہیں مگر اُن کو یہ تردد تھا کہ دیکھئے اس جہاد کا کوئی ثواب بھی ملتا ہے یا نہیں۔ اس آیت میں بتایا گیا کہ جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی خاطر اللہ کے دشمنوں سے لڑے۔ اپنی کوئی غرض اس لڑائی میں نہ تھی وہ بے شک اللہ کی رحمت کے اُمیدوار اور اس کے مستحق ہیں اور اللہ اپنے بندوں کی خطائیں بخشنے والا اور ان پر انعام فرمانے والا ہے وہ ایسے تابعداروں کو محروم نہ کرے گا۔[1]

اہلِ استقامت کا مقام

گویا کفار کے ظلم و ستم سے گھبرا کر مرتد ہو جانے والوں کا انجام بتلانے کے بعد ان لوگوں کا مقام بھی بتا دیا جو کفار کی ان ستم رانیوں کے باوجود اپنے ایمان پر جمے رہے اور ہجرت و جہاد کی بازیاں کھیلیں۔ ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ لوگ بے شک اس کے سزاوار ہیں کہ اپنے رب کی رحمت

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

کے اُمیدوار ہیں۔

اس وقت ہجرت اور جہاد مسلمانوں پر بیک وقت فرض تھے۔ بیت اللہ کی آزادی اور فتنہ کے قلع قمع کے لیے جہاد کا حکم ہو چکا تھا۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نصرت اور ایمان کے تحفظ کے لیے ہجرت کا بھی اور یہ دونوں ہی معرکے بڑے سخت تھے۔ اس وجہ سے ان دونوں باتوں کا ذکر فرمادیا۔ اس میں مسلمانوں کے لیے یہ رہنمائی بھی ہے کہ کفار کی ستم رانیوں کا جواب ارتداد نہیں بلکہ ہجرت اور جہاد ہے[1]

اس آیت میں تین باتیں بتائی ہیں۔ ایک ایمان، دوسرے ہجرت، تیسرے جہاد۔ ایمان کا ذکر تو ان دو کے لیے بطور شرط ہے۔ یعنی یہ دونوں، ہجرت اور جہاد اس وقت معتبر ہوں گے جب ایمان کی زمین پر ہوں۔

ایمان کا درجہ کمال

ایمان سے مراد یہاں یقین کی وہ دولت ہے جس میں عالم غیب یقین میں عالم شہادت کے برابر ہو جائے۔ یہ دولت یقین جس کے ہاتھ آجاتی ہے اس کی عقل میں کمال آجاتا ہے اور جس کی عقل میں کمال آجاتا ہے اس کے لیے نفس و قلب کی تکمیل کی منزل بھی دور نہیں رہتی۔ یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دلائل کی بنیاد پر یقین کی تعمیر کرنا ایمان کی صفت نہیں۔ ایمان کی صفت یہ ہے کہ یقین کی بنیاد پر دلائل کی تعمیر کی جائے۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی لکھتے ہیں کہ نور ایمان کی دو قسمیں ہیں۔

پہلی قسم اس شخص کا ایمان ہے جو دلیل و بنیاد کی سیر حاصل ہو۔ یہ ایمان بھروسہ کے قابل نہیں کیونکہ یہ دلیل کے ساتھ گھومتا رہتا ہے۔ اس قسم کے ایمان کے نور کی تروتازگی دلوں میں نہیں اترتی۔

دوسری قسم کا ایمان وہ ہے جو صرف ہدایت پر مبنی ہو یہی وہ ایمان ہے جس کی تروتازگی دلوں میں سما جاتی ہے اس میں شک و شبہ کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر کہا گیا ہے کہ مومن کامل وہ ہے جس کے نزدیک عالم غیب یقین میں عالم شہادت

[1] تدبر قرآن

کے برابر ہو جائے۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے مراتب احسان پر بحث کرتے ہوئے عقل و نفس اور قلب کی فنا کی یہ تحقیق لکھی ہے۔

جب انسان کے یہ جواہر لطیفہ اپنے اصل خواص سے مجرد ہو کر عالم غیب کی سیر میں مستغرق ہو جاتے ہیں تو یہی ان کی فنا سمجھی جاتی ہے۔ جب انسانی قلب و جوارح آداب الٰہیہ کی زیر تربیت مہذب ہو جاتے ہیں تو ان میں آثار عبودیت اس طرح نمایاں ہوتے ہیں جس طرح لو کے مارے درخت میں پتیاں اب اس کا رُخ مادیت کی بجائے عالم روحانیت کی طرف ہوتا ہے اسباب بے حقیقت بن جاتے ہیں۔ منفعت اور مضرت کا سوال منظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اور حقائق شرعیہ کا یقین اپنی آنکھوں کے مشاہدات سے بڑھ کر نصیب ہو جاتا ہے۔ ایک بار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ سے دریافت کیا کہ ہر چیز کی ایک حقیقت ہوتی ہے تم بتاؤ کہ تمہارے ایمان کی کیا حقیقت ہے؟ انہوں نے عرض کیا مجھے عرش کا ایسا یقین حاصل ہے جیسا میں اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں۔

یقین کی اسی دولت کا اس آیت میں آمنوا کے عنوان سے تذکرہ کیا ہے۔

۶۲۶ - اور جن لوگوں نے وطن سے بے وطن ہونے کی سختیاں برداشت کیں، اصل ارشاد میں ھاجروا آیا ہے۔ یہ ہجرت سے بنا ہے جس کے معنے ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں جب کوئی فرد یا جماعت سعادت و صداقت کے کسی مقصد اعلیٰ کے لیے اپنے دنیوی محبوبات و مالوفات کو ترک کر دے۔ مثلاً دولت کو آرام و راحت کو، عزیز و اقربا کے قرب کو وطن و مکان کو تو اس کا نام ہجرت الی اللہ اور ذہاب الی اللہ ہے۔ اللہ کے ہر رسول اور اُن کے پیروؤں کو قیام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑی ہے۔ چونکہ وطن و مکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے ترک کرنے میں اہل و عیال، مال و متاع، دوست و احباب ہر طرح کے علاقوں کو چھوڑنا پڑتا ہے اور اس کی محبت و الفت کی زنجیر دوسری ساری زنجیروں سے بھاری ہے اس لیے ترک وطن کی ہجرت اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہے اور اصطلاحاً ہجرت کا اطلاق ترک وطن ہی پر ہوا ہے۔

ترقیوں کا راز ہجرت میں پوشیدہ ہے

ہجرت کا لفظ ہمارے لیے آج ایک دینی اصطلاح ہے۔ اور ہم سمجھتے ہیں کہ یہ اس دَور

کی یادگار ہے جب مذہبی جذبات کی برانگیختگی نے تمدنی احساسات کو مغلوب کر دیا تھا اور انسان دینداری کے جنون میں اپنی عقلی تمدنی زندگی تک کو قربان کر دیتا تھا۔ لیکن ذرا غور کرو کہ اب دُنیا کی اعلیٰ سے اعلیٰ علمی و تمدنی ترقیاں بھی ہمیں جس راہ کی طرف بلا رہی ہیں وہ ہجرت کی حقیقت سے کب خالی ہیں۔ اور آج خود علم و تمدن کا تمام ذخیرہ بھی کس عملی حقیقت کا نتیجہ ہے؟ ہجرت سے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں ان سب کو ترک کر دینا خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشیں ہوں، حتیٰ کہ قوم ہو ملک ہو، وطن ہو، اہل و عیال ہوں سب کو چھوڑ دینا۔ سوچیے علم و عمل کا کون سا گوشہ ہے جس میں اس کے بغیر کامیابی حاصل ہو جائے۔ ہمارے مطلوبات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ایسی نہیں جو بغیر ہجرت کے مقام سے گزرے مل جائے۔ یہ دُنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں حیرت انگیز انکشافات و انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام کس عمل کے نتائج ہیں۔ اگر کج نظری کو چھوڑ دو تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ صرف عملِ ہجرت کی کار فرمائیاں ہیں۔ یہ کیسی عجیب بات ہے کہ اگر صرف قطب شمالی کی تحقیق کے لیے ڈیڑھ سو قافلے یکے بعد دیگرے نکلیں اور یکسر قربان ہو جائیں تو یہ تحقیق علم کا کمال ہو۔ لیکن اسی عمل کو اگر قرآن اللہ کا کلمہ بلند اور دینِ حق کے تحفظ کی خاطر کے لیے ہجرت کے نام سے تعبیر کرے تو اس کا انکار کر دیا جائے۔ ہمارے نزدیک یہ تو تمدن ہے کہ دریائے نیل کا مخرج دریافت کرنے کے لیے سینکڑوں انسان اپنا گھر بار چھوڑ دیں اور ہلاک ہو جائیں لیکن یہ وحشت ہے کہ قیامِ حق اور اشاعتِ اسلام کی راہ میں اللہ کے بندے ترکِ وطن کریں۔ اگر نیوٹن اپنی راتوں کی نیند اور بستر کی راحت چھوڑ دے تاکہ کششِ ثقل کا قانون دریافت کرے تو ہم اس کی داد دیں کہ یہ علم پرستی ہے لیکن اگر نبوت قانونِ کششِ ثقل کے لیے نہیں بلکہ عالم کے لیے قانونِ نجات کی دریافت میں گھر بار چھوڑ دے تو یہ تمہارے ذہنوں کے لیے بوجھ ہے۔ اللہ اکبر دین کے تحفظ و بقا کی خاطر وطن جیسی عزیز و محبوب چیز کو وطن کے تمام مرغوبات اور مالوفات کے ساتھ چھوڑنا اور کفر کی بستی کو ترک کر کے ایمان کی بستی میں آجانے کا نام ہجرت ہے گویا ایمان کے تحفظ کے لیے قوم کو چھوڑ دینا، ہم وطنوں کو چھوڑ دینا، اہلِ قرابت کو چھوڑ دینا، ہم زبان ساتھیوں کو چھوڑ دینا، کارخانوں اور دکانوں کو چھوڑ دینا، عزتوں اور عہدوں کو چھوڑ دینا ہجرت ہے۔

ہجرت الی اللہ والرسول کا مفہوم

یہاں ہاجروا کا لفظ بغیر کسی قید کے آیا ہے لیکن قرآن میں دوسرے موقعہ پر اس میں قید آئی ہے اور احادیث میں بھی اس قید کی تصریح اور توضیح ہے۔ پانچویں پارے میں آپ پڑھیں گے۔

من یخرج من بیتہ مہاجرا الی اللہ ورسولہ ثم یدرکہ الموت فقد وقع اجرہ علی اللہ

جو بھی اپنے گھر سے اللہ اور اُس کے رسُول کی طرف ہجرت کرکے نکلے اور پھر راستہ میں اسے موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے حضور میں ثابت ہو چکا ہے۔

ایسے ہی حدیث میں وضاحت آئی ہے۔

لکل امرء مانوی فمن کانت ہجرتہ الی اللہ ورسولہ فھجرتہ الی اللہ ورسولہ (بخاری)

ہر شخص کے لیے وہ ہے جو اس کی نیت ہے لہٰذا جس نے اللہ اور اس کے رسُول کی طرف ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسُول کی طرف ہوئی۔

قرآن و حدیث نے ہاجرت کی قید اللہ و رسُول کو بنا کر پیش کیا ہے۔ اس لیے ہجرتیں فی الواقع دو ہیں ایک ہجرت الی اللہ دوسرے ہجرت الی الرسول۔

ہجرت الی اللہ یہ ہے کہ آدمی سب کی بندگی و پرستش چھوڑ کر صرف اللہ کی بندگی اختیار کرے سب کی طرف سے اپنی قلبی توجہ، اپنے توکل واعتماد، اپنی محبت و مودت اور اُمید وبیم کا رشتہ توڑ کر یکسوئی کے ساتھ صرف اللہ ہی کا ہو جائے۔

ہجرت الی الرسُول یہ ہے کہ پیروی و اقتداء اور اتباع و انقیاد کی تمام غلط اور باطل صورتوں سے منہ موڑ کر اور دوسرے تمام راستوں سے ہٹ کر صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی و اقتدا اور آپ کی طاعت و پیروی کو اپنا دستورِ زندگی بنالے اور آپ ہی کے بتائے ہوئے راستہ پر یکسو ہو کر چلنے کا فیصلہ کرلے، آپ کی ہر بات کی تصدیق کرے اور تمام دُنیا کے مقابلے میں آپ کے حکم کو مقدم اور واجب الاطاعت سمجھے۔

یہ دونوں ہجرتیں ایمان کی طرح ہر مسلمان پہ فرضِ عین ہیں۔ ان دو ہجرتوں کے بغیر کسی عمل کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

جہاد کی حقیقت

۶۲۷- اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ جہاد کے معنے ہیں کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے اپنی انتہائی کوشش صرف کر دینا۔ جہاد کے معنے عموماً قتال اور جنگ کے سمجھے جاتے ہیں مگر مفہوم کی یہ تنگی قطعاً غلط ہے۔ یہ لفظ جُہد سے نکلا ہے۔ جہاد اور مجاہدہ اسی جہد کے فعال اور مفاعلہ کے وزن پر مصدر ہیں۔ لغت میں اس کے معنے محنت اور کوشش کے ہیں۔ اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنے بھی ہیں۔ یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت اور حفاظت کے لیے ہر قسم کی جدوجہد قربانی اور ایثار گوارا کرنا۔ اور ان تمام جسمانی، مالی، دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں تک کہ اس کے لیے اپنی، اپنے عزیزوں کی، اہل وعیال کی، خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کی مخالف قوتوں کو توڑنا اور ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا۔ اُن کے حملوں کو روکنا اس کے لیے جنگ کے میدان میں اگر اُن سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی پوری طرح تیار رہنا۔ یہی جہاد ہے۔ اور یہ اسلام کا ایک رُکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

نبوت کی دعوت صرف نظریہ نہیں ہے

افسوس ہے کہ دُنیا نے اتنے اہم اور اتنے ضروری اور اتنے وسیع مفہوم کو جس کے بغیر دُنیا میں کوئی تحریک نہ کبھی سرسبز ہوئی ہے اور نہ ہو سکتی ہے۔ صرف دین کے دُشمنوں کے ساتھ جنگ کے تنگ میدان میں محصور کر دیا ہے۔ یہ بات قرآن میں بار بار کہی اور دہرائی گئی ہے کہ محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس تعلیم اور شریعت کو لے کر دُنیا میں تشریف لائے وہ محض نظریہ اور فلسفہ نہیں بلکہ عمل اور سرتاسر عمل ہے اور اس میں نجات کا استحقاق گوشہ گیری، رہبانیت، مراقبات اور الٰہیات کی فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہٗ کی توحید، رسُولوں کی کتابوں اور فرشتوں کی سچائی، قیامت کی جزا و سزا کے یقین کے بعد ان کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے۔ اسی قرآن میں جہاد کا متابل قعود (یا) بیٹھنا یعنی کچھ نہ کرنا اور نکما بن کر رہنا۔ فضل اللہ المجاہدین باموالھم وانفسھم علی القاعدین درجۃ اس بیٹھنے اور جہاد کرنے کے باہمی تقابل سے یہ بات کھل جاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت

بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈنے کے سراسر خلاف ہے۔

جہاد اور قتال میں باہم نسبت

اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد اور قتال ہم معنے ہیں، حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں یہ دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں اس لیے جہاد اور قتال کے ایک معنے نہیں ہیں بلکہ ان دونوں میں عام خاص کی نسبت ہے یعنی ہر جہاد قتال نہیں ہے بلکہ جہاد کی مختلف قسموں میں سے ایک قسم قتال ہے۔ اسی لیے قرآن پاک میں ان دونوں لفظوں کے استعمال میں ہمیشہ فرق ملحوظ رکھا گیا ہے۔

جہاد کی دو صریح قسمیں بتائی گئی ہیں۔ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال۔ جان اور مال کی باطل محبت انفرادی اور اجتماعی ترقیوں کی راہ میں رکاوٹ ہے۔ یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم مومن کامل ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت نہیں روک سکتی۔ جسمانی اور روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے۔

ترقی وسعادت کا یہ گُر صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا اسی جہاد کا جذبہ اور اسی کے حصولِ ثواب کی آرزو تھی جس کے سبب سے مکہ میں مسلمانوں نے تیرہ برس تک ہر قسم کی تکلیفوں کا بہادرانہ مقابلہ کیا، ریگستان کی جلتی دھوپ، پتھر کی بھاری سل، طوق وزنجیر کی گراں باری، بھوک کی تکلیف، پیاس کی شدت، تلوار کی دھار، بال بچوں سے جدائی، مال و دولت سے دستبرداری، اور گھر بار سے دگذری کوئی چیز بھی اُن کے قدمِ استقلال میں لغزش نہ پیدا کر سکی۔ پھر دس برس تک مدینہ منورہ میں انہوں نے تلوار کی چھاؤں میں جس طرح گزارے وہ دُنیا کو معلوم ہے۔

خلاصہ یہ کہ جہاد وسیع تر مفہوم رکھتا ہے۔ اس میں اسلام کی خاطر ہر قسم کی جدوجہد شامل ہے۔ مجاہد وہ شخص ہے جو اپنے مقصد کی دُھن میں لگا ہو۔ دماغ سے اسی کے لیے تدبیریں سوچے، زبان و قلم سے اسی کی تبلیغ کرے اور زبان و دہن اسی کی خدمت کرے، ہاتھ پاؤں سے اسی کے لیے دوڑ دھوپ کرے سب اپنے تمام امکانی وسائل کو اس کے فروغ دینے میں صرف کردے اور ہر اس مزاحمت کا پوری قوت سے مقابلہ کرے جو اس راہ میں پیش آئے۔ فی سبیل اللہ کی قید لگا کر اس حقیقت کو واضح کر دیا کہ ہجرت و جہاد بجائے خود کیسے ہی بلند کام ہی

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَآ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۚ وَاِثْمُهُمَآ اَكْبَرُ مِنْ نَّفْعِهِمَا ؕ

لوگ آپ سے شراب اور جوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ لیکن ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔

لیکن اللہ کی بارگاہ میں ان کی قبولیت کی شرط یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں ہوں، دینِ حق کے واسطے ہوں، ورنہ محض محنت ہی محنت ہو گی، وطن، قوم، نسل، زبان، رنگ کے نام پر جان دینے والے آج ہندوؤں، پارسیوں، جرمنوں، انگریزوں، روسیوں، امریکیوں اور جاپانیوں میں کروڑوں کی تعداد میں مل جائیں گے لیکن سب کے سب فی سبیل اللہ اور ایمان کے بنیادی وصف سے خالی ہیں۔

۶۲۸۔ بلاشبہ ایسے ہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ یعنی ایمان، ہجرت اور جہاد کے اوصاف جن میں موجود ہوں وہی رحمتِ الٰہیہ کے امیدوار ہو سکتے ہیں۔ اس میں ان مسلمانوں کو بشارت ہے جنہوں نے عبداللہ بن جحش کی زیر سرکردگی ایک مشرک کو یکم رجب میں بغیر صحیح تاریخ سے واقفیت کے قتل کر دیا تھا۔ زندگی کی بازی لگا دینے والوں کے بارے میں یہ فرمایا کہ یہ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہو سکتے ہیں یعنی یقین تو ان تمام مراحل سے گزرنے کے بعد بھی کسی کو نہ کرنا چاہیے اس لیے کہ وہاں نجات اپنے عمل سے نہیں بلکہ اللہ کے فضل سے ہو گی۔ اسی لیے آیت کے خاتمہ پر فرمایا واللہ غفور رحیم یعنی غلطیاں بھی معاف کر دے گا اور اپنی رحمت کے تقاضے سے اجر بھی عطا فرمائے گا۔ حافظ ابن القیم نے اس موضوع پر زاد المعاد فی ہدی خیر العباد میں بہترین مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔

شراب اور جوا ــ دو برائیاں

شاید عام نگاہوں میں یہاں شراب اور جوئے کا تذکرہ بے جوڑ معلوم ہو لیکن جو لوگ عرب کے اس زمانے کے تمدنی و معاشرتی حالات سے واقف ہیں جس زمانے میں یہ آیتیں اتری ہیں وہ جانتے ہیں کہ عرب معاشرے میں جہاں شراب اور جوئے کے بہت سے مضر پہلو تھے وہاں ان کے بعض مفید اور رفاہی پہلو بھی تھے۔ عرب کے سخی اور دولت مند لوگوں میں یہ طریقہ رائج تھا کہ زمانہ قحط میں وہ جگہ جگہ اکٹھے ہوتے خوب شراب پیتے۔ پھر شراب کی مستی میں جس کسی کے اونٹ یا اونٹنی کو چاہتے ذبح کر دیتے۔ پھر اس کے مالک کو منہ مانگے پیسے دیتے۔ اور اس کے گوشت پر جوا کھیلتے اور ہر شخص جس قدر گوشت جیتتا جاتا وہ ان غریبوں اور فقیروں میں تقسیم کر دیتا جو اس طرح کی تقریبات میں پہلے ہی موجود ہوتے۔ یہ روایت عرب میں بڑی محبوب روایت تھی۔

عرب شاعروں نے اس جوئے اور شراب کا ذکر اپنے قصائد میں بڑے اہتمام سے کیا ہے جاہلیت کا مشہور شاعر طرفہ کہتا ہے:

وما زال تشرابی الخمور ولذتی

وبیعی وانفاقی طریفی ومتلدی

میری شراب نوشی، لذت اندوزی اور اپنی حاصل کردہ اور موروثی دولت کا خرچ کرنا میرا شعار رہا۔

دیکھ لیجئے ساری دولت کے انفاق کو کس فخر سے بتا رہا ہے اور انفاق بھی کہاں ہے میں، اسی شراب نوشی اور لذت اندوزی میں۔

لبید بن ربیعہ جو عرب کا مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے کہتا ہے،

قد بت سامرها وغایة تاجر

وافیت اذ رفعت وعز مدامها

میں ان کا قصہ گو تھا اور شراب فروش کی منزل میں آتا جاتا رہا جب اس کا جھنڈا بلند ہوا اور اس کی شراب گراں ہو گئی۔

تغلب ان قبیلوں میں تھا جنہوں نے عیسائی مذہب قبول کر لیا تھا لیکن اس مذہب

نے بھی عربوں کو اس بُری عادت سے باز نہیں رکھا تھا بلکہ شراب کی درآمد زیادہ تر ان ہی عیسائیوں کے ملک شام سے ہوتی تھی تغلب کا سب سے بڑا شاعر کہتا ہے ۔

صبنت الکاس عنا ام عمرو

وکان الکاس مجراھا الیمینا

اے عمرو کی ماں تونے ہم سے پیالہ ہٹا لیا حالانکہ پیالہ کا دَور دائیں طرف ہی تھا۔

ان اشعار سے اندازہ ہوگا کہ جاہلیت میں شراب نوشی کا کیا عالم تھا۔ شراب فروشوں کی دکانیں کسی ممتاز مقام پر ہمیشہ کھلی رہتی تھیں اور نشان کے لیے وہاں جھنڈا اُڑا کرتا تھا جس کو غایت کہتے تھے۔ انتہا یہ ہے کہ تجارت کا لفظ شراب فروشی کا مترادف بن گیا تھا۔

بدر میں قریش کے دولت مند روسار مارے گئے ان کے مرثیہ میں قریش کا ایک شاعر خاص طور سے اُن کے بزم شراب اور مجلسِ رقص وسرود کا ذکر کرتا ہے ۔

وماذا بالقلیب قلیب بدر

من القینات والشرب الکرام

بدر کے گڑھے میں ناچنے والیوں اور فیاض شرابیوں کا ماتم ہے ۔

شراب کے رواج عام کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ عربی زبان میں شراب کے ڈھائی سو نام ہیں۔ اور علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے ان ناموں پر ایک مستقل کتاب لکھی ہے۔

شراب خوری کے ساتھ ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج تھا۔ عرب کے مال ودولت کا تمام سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا اس لیے جُوا بھی ان کے ذریعے کھیلا جاتا تھا چنانچہ ایک جاہلی شاعر اپنے حریف سے کہتا ہے :

اعیرتنا البانھا ولحومھا وذالک عاریا بن ربیطۃ ظاھر

نحابی بھا اکفاءنا ونھینھا ونشرب فی اثمانھا ونقامر

کیا تم ہم پر عیب لگاتے ہو کہ ہم اونٹ کا دودھ اور گوشت کھاتے ہیں۔ اے ابن ربطیہ ہم پر یہ عیب نہیں لگ سکتا۔ کیونکہ ہم ان کو اپنے ہمسروں کو بطور عطیہ کے دیتے ہیں اور ان کو مہمانی میں خرچ کرتے ہیں اور ان کی قیمت سے شراب پیتے ہیں اور جُوا کھیلتے ہیں۔

اس غرض سے اونٹوں کو ذبح کرکے ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں منقسم کرتے۔ اور ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈال کر لاٹری نکالتے۔ ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس

تیر مقرر کر لیے تھے جن کے نام یہ ہیں ،

فذ ، توام ، رقیب ، حلس ، مسبل ، معلی ، منافس ، منیح ، سفیح ، وغد۔

ان میں سے ہر تیر کے مختلف حصے معین کر لیے تھے اور جب جوا کھیلتے تو ان کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے وہ ایک ایک تیر کو ایک ایک نام پر نکالتا جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے جن جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تیروں کا کوئی حصہ نہ ہوتا تھا وہ جن کے نام پر نکلتے وہ ناکام ہوتے۔ اس طرح جو گوشت جمع ہوتا وہ فقیروں ، غریبوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیتے۔ چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لیے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا اور اس قسم کے لوگوں کو نہایت بخیل خیال کرتے تھے اور ان کو برم کا خطاب دے رکھا تھا۔ جو لوگ یہ خطاب حاصل کر لیتے ان سے شادی بیاہ کو ننگ و عار خیال کیا جاتا چنانچہ ایک جاہل اپنی بیوی کو وصیت کرتا ہے۔

واذا هلکت فلا تریدی عاجزا

عقسا ولا برما ولا معنا لا"

یعنی میرے مرنے پر تو کسی عاجز ، کمزور جوئے میں شریک نہ ہونے والے اور سفر میں ساتھیوں سے الگ ہونے والے سے شادی نہ کرنا۔

رفتہ رفتہ اس قمار بازی کا مذاق ان میں اس قدر عام ہو گیا تھا کہ لوگ مال و دولت کھو چکنے کے بعد بیوی اور اولاد پر بازی لگا لیتے تھے۔ یہ قمار بازی اور وہ بھی شراب کی بدمستی میں اکثر مار پیٹ اور لڑائی پر ختم ہوتی۔ آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ عبس و ذبیان کی چہل سالہ گھوڑ دوڑ بھی قمار بازی کا نتیجہ تھی۔ حصولِ دولت اور کسبِ شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان کے خاندان تباہ ہو جاتے تھے[1]

غرض جوئے اور شراب کا یہی پہلو ہے جس کی وجہ سے عرب سوسائٹی میں ان کا شمار فیاضی اور سخاوت کے محاسن اور خدمتِ خلق اور ہمدردیٔ غرباء کے محرکات میں سے ہوتا تھا۔ جب قرآن نے انفاق پر سابقہ آیات میں زور دیا تو بعض لوگوں کے ذہنوں

---

[1] سیرۃ النبی ج ۴

میں یہ سوال پیدا ہوا کہ جب قرآن غریبوں اور یتیموں کی ہمدردی اور اُن کی امداد کے لیے مال خرچ کرنے پر اتنا زور دیتا ہے تو آخر اس جُوئے اور شراب میں کیا خرابی ہے جو قحط کے زمانے میں غرباء کی امداد کا بہت بڑا ذریعہ ہے؟ قرآن نے یہاں اس آیت میں اسی سوال کا جواب دیا ہے۔

۶۲۹ - لوگ آپ سے شراب اور جُوئے کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ یہ دریافت کرنے والے کون ہیں اور کیوں دریافت کر رہے ہیں۔ دریافت کرنے والے خود اہلِ ایمان ہیں اور دریافت کرنے کی وجہ عرب معاشرے میں جُوئے اور شراب کی وہ مخصوص نوعیت ہے جو ان میں اس وقت رائج تھی، اُن میں جُوئے اور شراب کی حیثیت ہمارے زمانہ کی قمار بازی اور شراب نوشی سے بالکل مختلف تھی۔ ہمارے ہاں جُوا نری قسمت آزمائی اور بربادی اور شراب نوشی نری عیاشی ہے۔ اُن کے یہاں ان میں مخلوقِ خدا کی ہمدردی اور رفاہِ عام کا ذہن کارفرما تھا اس لیے اہلِ عرب ان کو اخلاقی فضائل میں شمار کرتے تھے۔ اسی پہلو سے یہاں انفاق اور جہاد کے سلسلے میں یہ سوال پیدا ہو گیا کہ انفاق کی ایک راہ یہ بھی ہے کہ قحط کے زمانے میں مالدار لوگ شراب پیتے اور جُوا کھیلتے ہیں اور جو کچھ جیتتے ہیں وہ غریبوں پر خرچ کرتے ہیں۔ اس کے بارے میں کیا فتویٰ ہے؟ یعنی ان کے جواز اور عدمِ جواز کے بارے میں اور سوال بھی انہوں نے کیا جن کے ذہن اس کی بُرائی کو محسوس کر چکے تھے۔

خمر اور میسر یہاں دونوں اپنے عام اور وسیع معنے میں ہیں۔ خمر شرابِ انگوری۔ اصل میں تو انگور کے کچے پانی کا نام ہے جب کہ وہ نشہ آور ہو لیکن مجازاً ہر نشیلے مشروب کو خمر کہتے ہیں۔ علامہ سیّد مرتضیٰ زبیدی تاج العروس شرح قاموس میں رقمطراز ہیں ۔

> یہ جان لینا چاہیے کہ باتفاقِ آئمہ لغت انگور کے کچے پانی کا جبکہ وہ نشہ آور ہو خمر نام ہونا حقیقت ہے۔ دوسری شرابوں کو جو مختلف ناموں سے موسوم ہیں خمر مجازاً کہا جاتا ہے۔

خمر یا تو اختمار سے بنا ہے جس کے معنے خمیر اٹھنے کے ہیں۔ چونکہ اس میں بھی خمیر اٹھ کر جوش پیدا ہو جاتا ہے اور جھاگ آنے لگتے ہیں اس لیے اس کا نام خمر ہوا۔ یا مخامرة سے مشتق ہے جس کے معنے چھپا لینے کے ہیں۔ چونکہ یہ وسواس کو گم اور عقل و ہوش پر پردہ ڈال دیتی ہے اس لیے اس کو خمر کہتے ہیں۔ صحابہ اور تابعین سے بھی یہی معنے منقول

ہیں الخمر ما خامر العقل (بخاری عن ابن عمر)۔ المیسر بھی ایسے ہی وسیع معنے میں ہے اور جوئے کے تمام انواع کو شامل ہے۔ علامہ زبیدی لکھتے ہیں کل شئ فیہ قمار فھو من المیسر ہر چیز جس میں جوا ہو میسر ہے۔ میسر یسر سے بنا ہے اس کے معنے آسان ہونے کے ہیں چونکہ جوئے میں دولت آسانی سے مل جاتی ہے اسے میسر کہتے ہیں۔ ان دونوں پر خالص قانونی نقطۂ نظر سے مباحث کی تفصیل انشاء اللہ ساتویں پارہ میں آئے گی۔

یہاں اتنی بات ضرور سمجھ لیجئے کہ یہ آیت سلسلہ حرمت کی سب سے پہلی آیت ہے اس میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ ان میں بڑا گناہ ہے، لیکن ان میں لوگوں کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ سمجھدار لوگوں نے تو بڑا گناہ سمجھ کر شراب چھوڑ دی اور کچھ منافع للناس کی وجہ سے پیتے رہے۔ پھر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔

لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ

نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔

اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کچھ نے چھوڑ دی لیکن کچھ نمازوں کے اوقات کے علاوہ پیتے رہے۔ حضرت عمر نے دعا مانگی اے اللہ شراب کے بارے میں ہمارے لیے شافی بیان کردے۔ اتفاق سے اسی زمانہ میں بعض انصار نے بھی سعد بن ابی وقاص کی دعوت کی شراب کا دور بھی چلا۔ یہ پی کر بدمستی میں کہنے لگے کہ مہاجر انصار سے اچھے ہیں۔ اس پر بات بڑھی اور مار پیٹ تک نوبت پہنچی۔ اس پر یہ حکم آیا۔[1]

انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ لعلکم تفلحون۔

بلاشبہ شراب جوا، بت اور پانسے ناپاک ہیں اور شیطان کے کام ہیں۔ ان سے بچ کر رہو۔

اس کے بعد شراب قطعاً حرام ہوگئی۔

تشریع اسلامی کا بنیادی اصول

اس موقعہ پر اسلامی تشریع کے ایک بنیادی قاعدے کی طرف اشارہ مناسب معلوم ہوتا ہے

[1] صحیح مسلم فضائل سعد بن ابی وقاص

وہ قاعدہ یہ ہے کہ قرآن حکیم جہاں کسی ایمانی تصور اعتقادی مسئلہ پر گفتگو کرتا ہے وہاں گفتگو کا انداز فیصلہ کن قطعی اور حتمی ہوتا ہے مگر جب کوئی ایسا مسئلہ سامنے آجاتا ہے جس کی نوعیت اجتماعی صورت حال سے متعلق ہوتی ہے یا وہ معاشرے کا رواج ہوتا ہے تو قرآن حکیم اولاً اس کے لیے مناسب حالات پیدا کرتا ہے اور آہستہ آہستہ تدریجی عمل سے ایسی فضا پیدا کرتا ہے جس سے اسلامی قانون کے نفاذ میں آسانی ہو اور لوگوں کو قانون کی پیروی میں سہولت ہو۔ شراب اور جوئے کا معاملہ چونکہ عادت اور سماجی ڈھانچہ کا معاملہ تھا جس کے لیے تدریجی علاج کی ضرورت تھی۔ اس لیے اولاً دینی وجدان کو ابھارا اور قانونی دلیل کی وضاحت کی گئی کہ ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہے پھر دوسرا حکم آیا کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ اس کے بعد تیسرے مرحلے پر حرمتِ خمر کا حکم بیان کر دیا گیا [1]

شراب کی اس تدریجی حرمت کی طرف حضرت شیخ الہند نے اپنے انداز میں اشارہ فرمایا ہے:

شراب اور جوئے کے حق میں کئی آیتیں اتری ہیں۔ ہر ایک میں ان کی برائی ظاہر کی گئی آخر سورۂ مائدہ کی آیت میں صاف صاف ممانعت کر دی گئی۔ اب جو چیزیں نشہ لاویں وہ سب حرام ہیں اور جو شرط بندھی جائے کسی چیز پر جس میں ہار جیت ہو وہ محض حرام ہے اور ایک طرف کی شرط حرام نہیں۔

۲۰۴۔ آپ فرما دیجئے کہ ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔ شراب پینے میں عقل جاتی رہتی ہے جو تمام امورِ شنیعہ سے بچاتی ہے۔ اور لڑائی قتل وغیرہ طرح طرح کی خرابیوں کی نوبت آتی ہے اور مختلف قسم کے امراض روحانی اور جسمانی پیدا ہو جاتے ہیں جو بسا اوقات باعثِ ہلاکت ہوتے ہیں اور جوا کھیلنے میں حرام مال کھانا اور سرقہ اور تضییعِ مال اور عیال باہم دشمنی وغیرہ طرح طرح کے مفاسد ظاہری و باطنی پیش آتے ہیں [2]

اصل ارشاد میں: اثم کبیر آیا ہے اثم کا لفظ ہر ایسے کام کے لیے بولا جاتا ہے جو نیکی کی راہ سے روکنے والا ہو۔ اگرچہ کسی چیز کی ممانعت کے لیے اسے اثم قرار دینا کافی ہے چہ جائیکہ جب اس پر کبیر کی تاکید کا لیبل بھی لگا دیا جائے۔ اثم کبیر ہی سے نشائد سمجھنے والوں نے سمجھا ہے کہ شراب کی مقدار قلیل بھی حرام ہے۔

---

[1] فی ظلال القرآن - [2] افاداتِ شیخ الہند

شراب و جوا معاشرتی خرابیوں کی جڑ ہیں

اس لحاظ سے اس فقرے فیہما اثم کبیر میں بڑی گہری معنویت ہے۔ معاشرے میں آج تک جتنے فسادات شراب نوشی سے پیدا ہو چکے ہیں، اظہر من الشمس ہیں۔ گالیاں یہ بکواتے، بے حیائی یہ پھیلاتے، حرام کاری کی طرف یہ بلاتے، بلوے دنگے یہ کراتے، چوری ٹھگی پر یہ آمادہ کرتے، قتل کی نوبت یہ لے آتے، ہر عبادت سے، طہارت سے، پاکیزہ نفسی سے یہ روک دیتے۔ اور قمار بازی کی لائی ہوئی مصیبتیں بھی اس سے کچھ کم نہیں ہیں [1]

اسلام کا مزاج تشریع

اس فقرے کے ذریعے قرآن نے اصل سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ ٹھیک ہے کہ اس میں بعض رفاہی فائدے بھی ہیں لیکن ان دونوں سے معاشرہ کو جو نقصان پہنچتا ہے وہ ان کے فوائد سے کہیں زیادہ ہے۔ اس وجہ سے اخلاقی بہبود کے نقطہ نظر سے یہ ناجائز ہیں۔ گویا قرآن نے اسلامی قانون کا یہاں یہ مزاج بتا دیا کہ جن چیزوں کا نقصان ان کے نفع سے زیادہ ہو وہ اسلامی قانون میں ممنوع ہیں [2] مطلب یہ ہے کہ جو چیزیں اخلاقی اعتبار سے مضر ہیں اگر ان سے بظاہر کوئی فائدہ لوگوں کو پہنچتا بھی ہو یا پہنچایا بھی جا سکتا ہو جب بھی ان کے ضرر کے پہلو کے غلبہ کی وجہ سے اسلام میں ان سے احتراز ضروری ہے۔ مثلاً ہو سکتا ہے کہ کسی جگہ لوگ لاٹری ڈالیں تاکہ اس کی آمدنی سے ایک شاندار مسجد بنائی جائے یا ایک امدادی شو منعقد کریں تاکہ اس کے ٹکٹ فروخت کر کے کسی مصیبت زدہ علاقے کے مسلمانوں کی مدد کریں۔ بظاہر یہ کام نیکی اور خدمت خلق کے ہیں لیکن اسلام اس قسم کی نیکی کے جواز کو تسلیم نہیں کرتا کیونکہ اس نیکی کے پردے میں جو بدی پرورش پاتی ہے یا اس مصلحت کی آغوش میں جو مفاسد پروان چڑھ رہے ہیں ان کا وزن مصلحت اور نیکی سے کہیں زیادہ ہے۔ ہمارے فقہاء اور قانون دان طبقہ نے اسی کو درء المفاسد اولیٰ من جلب المصالح کے عنوان سے پیش کیا ہے۔ مفاسد کی حیثیت فقہا کی نظر میں وبا کی ہے۔ وبا کو دور کرنے کا بہر حال بندوبست کیا جائے گا

[1] ماجدی [2] تدبر قرآن

خواہ اس کے نتیجہ میں کچھ مصالح اور منافع خطرے میں پڑ جائیں۔ اسی بنا پر قرآن نے منہیات سے روکنے کا زیادہ اہتمام کیا ہے۔ اور اسی بنا پر فقہا نے منشیات کی تجارت پر قانونی قدغن قائم کی ہے خواہ اس میں تجارتی منافع موجود ہیں۔ اور اسی لیے کسی مالک مکان کو ایسی جگہ کھڑکی وغیرہ رکھنے کی اجازت نہیں دی جہاں سے پڑوسی کی عورتوں پر نظر پڑتی ہو۔

۶۳۱ - اور ان میں لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی پیدا کی ہوئی کائنات میں سرے سے مضر ہی مضر اور ہر طرح کے نفع و مصلحت سے خالی کوئی چیز نہیں ہے۔ یہاں تک کہ شراب نوشی اور قمار بازی جیسے گندے مشغلے بھی اس کلیہ سے مستثنیٰ نہیں ہیں۔ مثلاً شراب سے بعض بیماریوں کا علاج ہو سکتا ہے، بعض شرابیں خوشبو رکھتی ہیں، شراب سے فوری لذت و سرور حاصل ہوتا ہے، بعض قوتوں میں عارضی طور پر تحریک پیدا ہوتی ہے اسی طرح جوئے میں جو جیتتا ہے اسے بلا مشقت و تعب تھوڑی ہی سی دیر میں آمدنی ہو جاتی ہے۔[1]

یہ مولانا دریابادی کا نہیں بلکہ بعض دوسرے مفسرین کا بھی خیال ہے کہ قرآن نے یہاں جوئے اور شراب کے جن منافع کا ذکر کیا ہے وہ ان کے مادی اور طبی فوائد ہیں لیکن ہماری رائے میں یہ خیال صحیح نہیں ہے بلکہ یہ دراصل ان فوائد کی طرف اشارہ ہے جو اس وقت کی عرب سوسائٹی میں مخصوص روایات کی بنا پر پائے جاتے تھے، یعنی شراب پی کر جوا کھیلنا اور جوئے کے نتیجہ میں جو کچھ بازیافت ہو اسے غریبوں میں تقسیم کر دینا۔ یہ ان کے یہاں بڑی اونچی بات تھی اور اسے کمالات میں شمار کیا جاتا تھا۔ قرآن یہاں انہی رفاہی فوائد کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ ورنہ قرآن کو اشیاء و اعمال کے طبی و مادی فوائد سے کوئی سروکار نہیں ہے۔

قرآنی بلاغت کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اگر طبی اور مادی فوائد قرآن کے پیش نظر ہوتے تو آیت میں نفع کا مقابلہ اثم سے نہیں ضرر سے ہوتا۔ اثم کا لفظ طبی نقصانات کے لیے استعمال نہیں ہوتا بلکہ اخلاقی مفاسد اور گناہوں کے لیے آتا ہے۔ اگر شراب کے طبی نفع کی بات بیان کرنی پیش نظر ہوتی تو نفع کے مقابلہ پر ضرر آتا اثم نہ آتا۔

۶۳۲ - لیکن ان دونوں کا گناہ ان کے فائدے سے کہیں زیادہ بڑھا ہوا ہے۔ گویا اہل ایمان کو اس فقرے کے ذریعے قانونی دلیل کا طریقہ بتایا جا رہا ہے کہ جب شراب اور جوئے

---

[1] ماجدی

میں منافع اور مفاسد دونوں ہیں اور مفاسد کا وزن منافع کے مقابلے میں زیادہ ہے تو عقلِ سلیم کے لحاظ سے یہ دونوں چیزیں واجب الاحتراز ہیں کیونکہ اصولاً مصالح اور مفاسد کی صورت میں مفاسد دُور کرنے کی طرف توجہ ہونی چاہیے۔ لیکن آپ پیچھے پڑھ آئے کہ اس آیت کے نازل ہونے اور اس قاعدے کے معلوم ہو جانے کے باوجود کچھ نے شراب چھوڑ دی اور کچھ پیتے اور پلاتے رہے۔ یہاں تک کہ نماز میں سکر کی حالت میں آنے کی ممانعت آگئی۔ جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا کہ کوئی مخمور نماز میں نہ آئے لیکن چونکہ اب بھی ممانعت کا کوئی حکم عام نہ تھا اس لیے کچھ اب بھی پیتے اور پلاتے رہے حتیٰ کہ سورۂ مائدہ کی آیت کے بعد شراب قطعاً حرام ہو گئی۔

اس تمام صورتِ حال سے اسلامی تشریع کا یہ قاعدہ معلوم ہوتا ہے کہ کسی چیز کی حُرمت پر جب تک کسی نص کی دلالت صرف ظنی ہو قطعی نہ ہو اسے قانونِ عام کی حیثیت حاصل نہیں ہوتی۔ اس میں اجتہاد کی گنجائش ہوتی ہے، جو اپنے اجتہاد کی قوت سے حرام ہونا معلوم کرے وہ اس سے باز آجائے اور جو نہ سمجھے وہ اباحت پر عمل پیرا رہے۔ اس آیت میں شراب اور جوئے کی حرمت قطعی بیان نہیں کی گئی ہے بلکہ اس سے جو حرمت ثابت ہو رہی ہے وہ صرف ظنی ہے۔ اسی بنا پر حضرت عمرؓ نے یہ دُعا فرمائی کہ اے اللہ شراب کے بارے میں پورا بیان فرما۔ سورۂ مائدہ کی آیت نے شراب کی قطعی حرمت کا اعلان کر دیا۔ ابوبکر الجصاص کا یہ کہنا کہ شراب کی حرمت پر اگر کوئی آیت نہ بھی اترتی جب بھی خود یہ آیت حرمت کے لیے کافی ہوتی۔ اپنی جگہ درست ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حرمت تو اس آیت سے بھی ثابت ہے قطعی نہ سہی۔ اس سے فہمِ صحابہ پر حرف گیری مقصود نہیں بلکہ ذوقِ اجتہاد بتانا مقصود ہے۔ جیسے اور بھی بہت سی چیزیں اجتہاد کی راہ سے حرام ہو جاتی ہیں اس آیت میں شراب کے حرام ہونے کے لیے پورا اجتہادی سرمایہ موجود ہے۔ دونوں باتوں میں فرق ظاہر ہے۔ ایک صورت یہ ہے کہ شراب سے بچو۔ یہ صاف اور صریح ہے اور دوسری یہ ہے کہ شراب میں فائدے اور نقصان دونوں ہیں۔ لیکن نقصان ان میں زیادہ ہے۔ پہلی صورت حرمت میں قطعی ہے۔ دوسری صورت قطعی نہیں ظنی ہے۔ پہلی صورت میں ہم صرف شراب کو حرام کہیں گے دوسری صورت صرف شراب کو نہیں بلکہ ان تمام اعمال، تمام احوال، تمام اشیاء کو حرام قرار دیں گے جن مصالح کے مقابلے میں مفاسد کا وزن زیادہ ہوگا۔

یہاں مولانا دریابادی شراب اور جوئے کے موضوع پر بڑی مفید بات فرما گئے۔ آپ بھی مستفید ہو جائیے۔

اسلام کا تاریخی کارنامہ

یہ فخر تاریخ میں اسلام ہی کو حاصل ہے کہ اس نے اپنے ایک اشارے سے اپنی حدودِ مملکت سے شراب اور جوئے کا خاتمہ کر دیا۔ اشخاص و افراد کی کارستانیوں سے قطع نظر اُمت کی نظر میں بحیثیتِ مجموعی لفظ شرابی اور لفظ جواری دونوں انتہائی تحقیر و ذلت کے القاب بن کر رہ گئے۔ یہ اسلام ہی کا اعجاز ہے کہ اس نے اپنے پیروؤں کو ان اخلاقی سچائیوں کی حد تک پاکیزگی اور ستھرائی کے اس بلند مقام پر پہنچا دیا جہاں باوجود علم و فضل، فہم و دانش کے بلند بانگ دعوؤں کے آج تک نہ کوئی ٹمپرنس ایسوسی ایشن پہنچا سکی ہے اور نہ کوئی قانونِ امتناع جاری کرنے والی حکومت سر ولیم میور، اپنے نہیں بیگانے ہیں، معتقد نہیں منتقد ہیں۔ لکھتے ہیں۔ اسلام فخر کے ساتھ کہہ سکتا ہے کہ ترک میکشی کرانے میں جیسا وہ کامیاب ہوا ہے کوئی اور مذہب نہیں ہوا ہے۔ انیسویں صدی کے ربع آخر میں لندن کے چرچ کانگرس کے ایک اجلاس میں ایک ممتاز پادری اسحاق ٹیلر نے کہا تھا۔ دُنیا میں انسدادِ مے نوشی کی سب سے بڑی انجمن خود اسلام ہے۔ برخلاف اس کے ہماری یورپین تجارت کے قدم جہاں جہاں پہنچتے ہیں، مے نوشی سے بدکاری اور لوگوں میں اخلاقی پستی بڑھتی جاتی ہے۔ ٹمپرنس کے نام سے مے نوشی میں اعتدال پیدا کرنے کے لیے یورپ، امریکہ اور ہندوستان میں آج بھی خدا معلوم کتنی انجمنیں بہترین نظم و نظام کے ساتھ قائم ہیں۔ اور امریکہ کے مشہور کارکن، گریہ پا جانسن نے تو اپنی سرگرمیوں کی دھوم ساری دُنیائے متمدن میں مچا دی۔ اور بڑے بڑے ڈاکٹر اور ماہرینِ سائنس شراب کے نقصانات پر بیانات اور اعداد شائع کرتے رہتے ہیں لیکن ان ساری سرگرم کوششوں کے باوجود خود ان ہی لوگوں کو اقرار ہے کہ شراب کو قطعی طور پر حرام کیے بغیر کوئی چارہ نہیں ہے۔ ہندوستان میں غالباً ۱۹۳۹ء میں متعدد صوبائی حکومتوں نے اپنے علاقوں میں قانونِ امتناعِ شراب نافذ کیا تھا لیکن آخر میں واپس لیا۔ اس کے مقابلے میں یہ بھی سنیے کہ حرمتِ شراب کی جس وقت آخری آیت اتری، حضرت ابو عبیدہ امینِ اُمت اور ابی بن کعب جو سید القراء تھے، ابو طلحہ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دَور چل رہا تھا۔ ساقی گری کی خدمت حضرت انس انجام دے رہے تھے

چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انس کی زبانی روایت ہے۔

میں ابوعبیدہ اور ابی بن کعب اور ابوطلحہ کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آکر کہا کہ شراب حرام ہو گئی۔

حافظ ابن حجر نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے جن میں حضرت معاذ بن جبل بھی تھے۔ اس موقع پر لحاظ کے قابل بات یہ ہے کہ اگرچہ یہ مدتوں کی عادت تھی اور اس وقت بھی سب خمار میں جھوم رہے تھے تاہم جونہی یہ آواز آئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب کی ممانعت کر دی، کسی نے پوچھا تک نہیں اور یکبارگی جام و سبو توڑ ڈالے۔ یہ صرف ابوطلحہ کے گھر کا حال نہ تھا بلکہ تمام مدینے کی گلی کوچوں میں شراب بہہ رہی تھی۔ بخاری باب المظالم میں ہے:

فجرت فی سکک المدینۃ مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی پھرتی تھی۔

جوا اور اس کی مختلف صورتیں

قمار بازی جس میں لاکھوں کی دولت لوگوں کو اس طرح مل جاتی ہے کہ ملک کے کسی باشندے کو اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں ملتا۔ جوئے میں جتنے غصہ اور غیظ و غضب سے بھرے ہوئے دل سے مال دیا جاتا ہے۔ شاید اتنا غصہ اتنا غیظ تو چور اور ڈاکو پر بھی اس کو نہیں ہوتا جس کا مال چوری ہو جاتا ہے۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے جوئے کے موضوع پر حجۃ اللہ البالغہ میں جو کچھ ارقام فرمایا ہے وہ توجہ سے پڑھنے کے لائق ہے۔

جوئے میں لوگوں کے مال کو اس طرح اچک لیا جاتا ہے کہ اس میں بالکلیہ جہالت، حرص اور جھوٹی آرزوؤں کے ہاتھوں آدمی گرفتار ہو جاتا ہے اور دھوکہ کی گاڑی پر سوار ہو کر اس میدان میں کودتا ہے۔ اور حرص، غلط آرزو وغیرہ اس کو ان شرائط کے مان لینے پر آمادہ کر دیتی ہے جنہیں نہ شہری زندگی کی تعمیر میں اور نہ باہمی امداد میں دخل ہے۔ ہارنے والا اگر ہارنے کے بعد خاموش ہوتا ہے تو اس کی یہ خاموشی غصہ اور ایسی ناکامی و نامرادی کی چنگاریوں پر ہوتی ہے جن میں وہ بالارادہ گیا تھا یوں ہی جیتنے والا اپنی جیت سے لذت اندوز ہوتا ہے اور اس کاروبار

کی چھوٹی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی ہے اور اس کی حرص اس فعل سے باز آنے
کی اجازت نہیں دیتی بالآخر کچھ ہی دن کے بعد اس کا تاوان خود ہی اس کے سر پر
مسلط ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر کسی ملک کے باشندوں میں لین دین کی اس عادت بد کا رواج پیدا ہو جاتا ہے تو بالآخر اس کا نتیجہ ملک کی دولتِ عامہ کے نظام میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور باہم ایک طویل جھگڑوں کی بنیاد پڑ جاتی ہے اور حصولِ معاش کے جو صحیح اور مطلوب ذرائع ہیں ان کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں لوگ باہمی امداد و اعانت سے لاپروا ہو جاتے ہیں جس پر تمدن کی بنیاد قائم ہے۔

بالآخر فرماتے ہیں کہ

> دوسروں کی خبر سے خود معائنہ اور مشاہدہ نہیں بے نیاز کر سکتا ہے۔ آخر جواریوں میں تم نے ان امور کے سوا جن کا میں نے ذکر کیا ہے کبھی کسی اور چیز کا بھی مشاہدہ کیا ہے[1]

بہر حال ملک کی معاشی قوتوں کا ایک بڑا حصہ قمار کے ذریعے سے ضائع ہو جاتا ہے اس لیے اسلام نے صرف قمار کی حقیقی شکلوں کو نہیں بلکہ جن معاملات میں تھوڑا بہت بھی قماری رنگ پایا جاتا ہو ان کو ممنوع قرار دے دیا۔ تفصیل ان شاء اللہ ساتویں پارہ میں آئے گی۔

اسلام کے قانونِ قمار سے یورپ کی سرکشی

امر واقعہ یہ ہے کہ اس باب میں یورپ نے اسلام کے قانون سے باغی ہو کر اپنے ہاتھوں اپنا جو حال کیا ہے اور کر رہا ہے وہ عالم آشکار ہے۔ خودکشی اور اقدام خودکشی کے کتنے واقعات قماربازی کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ پھر مالی ابتری کا اندازہ اس سے کیجئے کہ یورپ کی پہلی جنگ عظیم سے اکیلے ملک انگلستان سے متعلق تخمینہ ہے کہ کم از کم دس کروڑ پونڈ سالانہ کی رقم اپنے مالکوں کے قبضہ سے نکل کر جواریوں کے ہاتھ میں پہنچتی ہے۔ یہ تخمینہ یورپ کے صرف ایک ملک اور ایک چھوٹے سے رقبہ سے متعلق تھا اور

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ

وَيَسْئَلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۬ قُلِ الْعَفْوَ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ

اور پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ کہہ دو کہ جو کچھ ضرورت سے بچ رہے، اسی طرح اللہ تمہارے لیے احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم دنیا و آخرت دونوں کی فکر کرو۔

وہ بھی جنگ عظیم سے قبل کا۔ یورپ کے کل ملکوں اور امریکہ کی ساری ولایتوں کی مجموعی تباہ کاریوں کی جدید ترین تنفیذ کے لیے اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ حساب کے کن ہندسوں تک میزان پہنچے رہیں قانون دولت کی ناکام کوششیں تو انسائیکلوپیڈیا آف ریلیجن کے اسی مقالہ میں ہے کہ قانون تما ہیں کمی پیدا کرنے کی اپنی والی سب ہی کوششیں کر رہا ہے بجز اسے قطعی ممنوع کرنے کی ناممکن کوشش کے۔ یہ حوصلہ اسلام ہی کا تھا کہ اس نے عقلائے فرنگ کی اس ناممکن کوشش کو اپنی حدود میں ممکن ہی نہیں بلکہ واقعہ بنا کر دکھا دیا۔[1]

مزید انفاق مال کی ذمہ داری

اللہ تعالیٰ نے مختلف انسانوں کو مختلف صلاحیتوں کا مالک بنایا ہے۔ استعداد کے اس اختلاف کے پہلو بہ پہلو سماجی زندگی میں مختلف افراد کو سعی و عمل کے جو مواقع ملتے ہیں وہ بھی یکساں نہیں ہیں۔ اس صورت حال کے لازمی نتیجہ کے طور پر معاشرہ کے افراد میں کچھ لوگ متمول ہوتے ہیں اور کچھ نادار و غریب، کچھ لوگ پیدائشی طور پر معذور ہوتے ہیں، کچھ دوسرے افراد اتنی کم

[1] تفسیر ماجدی

صلاحیتیں رکھتے ہیں کہ وہ اپنی ضرورت کے مطابق مال نہیں کما سکتے۔ اسی طرح مواقع کا اختلاف اور حالات کا گوناگوں تغیر لوگوں کو عارضی یا مستقل احتیاج و تنگ دستی میں مبتلا کر دیتا ہے۔ پس معاشرے میں اہلِ حاجت کا وجود ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے۔ ان کی حاجت روائی کے بارے میں پہلی آیت یسئلونك ماذا ینفقون میں بتایا گیا ہے کہ اصحابِ استطاعت اپنے ذاتی مال میں ان کی حاجت روائی کے لیے قدم اٹھائیں۔ اہلِ حاجت کی حاجت روائی کے علاوہ اجتماعی فلاح و بہبود اور ہنگامی تقاضوں کو پورا کرنے کے بہت سے دوسرے کام ہیں جو سارے افراد سے کم و بیش یکساں تعلق رکھتے ہیں، لیکن کسی ایک فرد سے براہ راست ایسا تعلق نہیں رکھتے کہ وہ ان کا اہتمام کرے۔ اکثر اجتماعی کاموں کے مالی تقاضے اتنے وسیع ہوتے ہیں کہ اُن سے عہدہ برآ ہونا کسی ایک فرد کے بس سے باہر ہے۔ یہ اجتماعی اُمور اسی وقت انجام پا سکتے ہیں جب افراد اپنے مال کا ایک حصہ ان کاموں کے لیے وقف کر دیں۔ اسی کے لیے قرآن نے نفقاتِ واجبہ اور زکوٰۃ کا نظام قائم کیا ہے۔ نفقاتِ واجبہ اور زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی مالدار آدمی پر مزید انفاقِ مال کی ذمہ داری باقی رہتی ہے۔ یہ سوال کہ اس مزید ذمہ داری کے حقوق کیا ہیں اسی کا جواب قرآن نے اس آیت میں دیا ہے۔ یاد رہے کہ یہاں وہ انفاق زیرِ بحث نہیں جو عام مستحقین کے لیے صدقاتِ واجبہ اور زکوٰۃ وغیرہ کی صورت میں ہر مسلمان پر ضروری ہے بلکہ یہ وہ انفاق ہے جس کا تعلق جہاد، اعلاءِ کلمۃ اللہ اور تحفظ و دفاعِ ملت سے ہے۔ ان مقاصد کے لیے انفاق کی جو ذمہ داری ایک مسلمان پر عائد ہوتی ہے اس آیت میں اس کی آخری حد بتائی ہے۔

۲۳۶۔ لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں؟ یعنی لوگوں نے پوچھا تھا کہ مال اللہ کے واسطے کس قدر خرچ کریں۔ حکم ہوا کہ جو اپنی ضروری اخراجات سے زائد ہو کیونکہ جیسا آخرت کا فکر ضرور ہے دنیا کا فکر بھی ضرور ہے۔ اگر سارا مال اٹھا ڈالو تو اپنی ضروریات کیونکر پوری کرو اور جو حقوق تم پر لازم ہیں ان کو کیوں کر ادا کرو۔ معلوم نہیں کس کس خرابی دنیوی اور دینی میں پھنسو[1]

زکوٰۃ کی شرح تو سب کو معلوم تھی اور صدقاتِ واجبہ کا حکم پہلے آ چکا ہے۔ یہاں یہ سوال مزید انفاق کی ذمہ داریوں کے متعلق تھا یعنی تحفظِ ملت اور جہاد بالمال کی جو ذمہ داری ایک مسلمان پر عائد ہوتی ہے اس کی حدود کیا ہیں۔ اس سوال کا پسِ منظر صحابہ میں انفاق کی وہ سرشاریاں تھیں

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

جواں میں صحبتِ نبوت کی برکت سے پیدا ہو گئی تھیں۔ قرآن نے جواب نہایت مختصر دیا ہے مگر ساتھ ہی نہایت جامع اور واضح بھی ہے۔ فرمایا کہ العفو خرچ کرو۔

قرآن میں العفو کا مفہوم

یہ عفو کیا چیز ہے؟ اس کا جواب تو بعد کو دیا جائے گا پہلے قرآن کی دوسری آیتوں پر ایک نگاہ ڈال لیجئے تاکہ عفو کا مطلب سمجھنے میں آسانی ہو۔ سورۂ بنی اسرائیل میں ہے:

اور اپنا ہاتھ اتنا نہ سکیڑ لو کہ گردن میں بندھ جائے اور نہ بالکل ہی پھیلا دو۔ دونوں صورتوں کا نتیجہ یہ نکلے گا کہ ہر طرف سے ملامت پڑے گی اور درماندہ ہو کر رہ جاؤ گے۔

پھر سورۃ الفرقان میں ہے:

وہ لوگ جب خرچ کرتے ہیں اور اپنے خرچ میں نہ تو اسراف کرتے ہیں اور نہ تنگی کرتے ہیں بلکہ اُن کا خرچ ان دونوں کے درمیان اور ٹھیک ہوتا ہے۔

ان دونوں آیتوں میں خرچ کے معاملہ میں اعتدال کی فہمائش کی گئی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہترین صدقہ کی یہ تعریف فرمائی ہے:

خیر الصدقۃ ما کان عن ظھر غنیً (بخاری)

بہترین صدقہ وہ ہے جو تونگری کی پشت پناہی میں ہو۔

مشہور شارح حدیث امام خطابی نے معالم السنن میں ظهر غنی کا یہ مطلب بتایا ہے:

ایسی تونگری جس پر بھروسہ کر سکتا ہو اور جس کی پشت پناہی حاصل کر سکتا ہو، مصائب اور حوادث کے وقت میں۔

امام خطابی نے یہ مطلب بتاتے ہوئے اپنی تائید میں ایک اور ارشادِ نبوت پیش کیا ہے:

بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی کی مالداری کو باقی رکھے۔

قرآن کی آیات اور ارشاداتِ نبوت کا صاف مطلب یہ ہے کہ صدقہ، انفاق کرتے ہوئے اس کا خیال رکھا جائے کہ اتنا سرمایہ آدمی کے پاس رہ جائے جس سے وہ آئندہ آمدنی حاصل کرنے یا مصارف میں مدد لے۔ خطابی کے الفاظ یستظھر بہا کا اس کے سوا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔

سعد بن وقاص کو کل مال کے صدقہ کرنے سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر منع فرمایا

تھا کہ کیا تم اس کو پسند کرتے ہو کہ تمہاری اولاد تمہارے بعد ہاتھ پھیلاتی پھرے۔

لغت میں العفو کے معنے زیادتی اور بڑھوتری کے ہیں۔ مشہور امام لغت الفراء سے صاحب لسان نے نقل کیا ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد قل العفو ہے اس سے مراد المال (سرمایہ) کا فضل اور بڑھوتری ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ العفو مال کی زیادتی اور آمدنی یعنی سرمایہ کی آمدنی یا اصل کے منافع کو کہتے ہیں۔ وہ طبقہ جس کی گزر بسر کسی سرمایہ یا جائداد، زمین، مکان وغیرہ کی آمدنی پر ہے یا معاشی اصطلاح میں یوں کہیے جو شغل اصل کے منافع سے اپنی معاشی ضرورتیں پوری کرتا ہے اس کے متعلق اس آیت میں حکم دیا گیا ہے کہ وہ العفو کی حد سے آگے نہ بڑھیں یعنی اصل کو محفوظ رکھتے ہوئے جو زائد آمدنی ہو اس کو خرچ کریں، صدقہ دیں، خیرات کریں، مقصد یہ ہے کہ ادائے فرائض کے بعد انفاق میں اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ عفو خرچ کیا جائے اصل کو محفوظ رکھا جائے۔

مسند احمد اور ابن ماجہ وغیرہ میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ اس زمین اور اس گھر کی قیمت میں برکت نہ دے جو پھر زمین ہی یا گھر میں نہ لگادی جائے۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ ایسی چیزیں جو اصل کی حیثیت سے کام کرتی ہیں اولاً ان کو الگ ہی نہ کرنا چاہیے۔ اور اگر کسی ضرورت سے آدمی ان کو الگ کرے بھی تو اسے چاہیے کہ ان کے روپے کو پھر کسی چیز میں لگا دے جو اصل کا کام دے سکیں۔ یہ تو ان لوگوں کا حکم ہے جن کے مال میں اصل اور عفو کی صورت ہو۔ باقی جن کی گزر اوقات کسی اصل کی آمدنی پر نہیں جیسے ملازم پیشہ لوگ یا جو مزدوری کرتے ہیں ان کو درمیانی حالت اختیار کرنی چاہیے۔

بہر حال آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اصل کو باقی رکھ کر عفو کو ملی ضروریات اور اسلام کے تحفظ کے لیے خرچ کر دینا چاہیے اور خرچ کا پیمانہ عفو تک ہی رکھنا چاہیے اصل تک نہ جانا چاہیے۔ گویا اس سوال کا جواب کہ تحفظ ملت کی خاطر جہاد بالمال یا انفاق کی مزید ذمہ داریاں جو مسلمان پر عائد ہوتی ہیں اس کی حدود کیا ہیں؟ قرآن نے یہ بتا دیا ہے کہ اس کی حد یہ ہے کہ اصل کو محفوظ رکھ کر عفو کو اللہ کی راہ میں دے دو۔ خبر نہیں عام لوگوں نے اس آیت سے یہ بات کیسے سمجھ لی ہے کہ ـــ مالدار لوگوں پر اس حد تک مزید انفاق مال کی ذمہ داری ہے جس حد تک اہل حاجت کی حاجت روائی اور اجتماعی امور کی انجام دہی کے لیے درکار ہو،

حالانکہ معاملہ اس کے برعکس ہے۔ مالدار لوگوں پر اس حد تک انفاق مال کی ذمہ داری ہے جب تک اصل کے ساتھ عفو موجود ہے۔ قرآن کی رُو سے جیسے کوئی شخص اس کا مجاز نہیں کہ عفو کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرے ایسے ہی کوئی اس کا مکلف نہیں کہ اصل کو ختم کر کے دربدر بھیک مانگتا پھرے۔

فاضل آمدنی پر سرکار کا قبضہ

عفو کے لفظ سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ناگزیر ضروریات سے فاضل آمدنی ایک اسلامی حکومت اجتماعی مقاصد کے لیے اپنے قبضہ میں لے سکتی ہے بالکل غلط ہے اور قرآن کے منشا کے خلاف ہے۔

اوّلاً اس لیے کہ جو بات آیت میں بتائی گئی ہے اس کا تعلق حکومت سے نہیں بلکہ عام شہریوں سے ہے کہ وہ اپنی صوابدید اور اختیارِ تمیزی سے عفو کی حد تک ایثار کے لیے تیار رہیں۔

ثانیاً اس ایثار کا تعلق عام حالات سے نہیں بلکہ ہنگامی حالات سے ہے جبکہ ملت کے تحفظ کا سوال سامنے آجائے۔ ایسے حالات میں اسلام کا حقیقی رُجحان یہی ہے کہ افراد کی تربیت اس طرح کی جائے کہ ان کے اندر ارادہ اور اختیار کی آزادی قائم رہے۔ اسلام کی نظر میں آزادی اور اختیارِ تمیزی کی بنیاد پر کی ہوئی نیکی کی جو قدر ہے وہ مجبوری اور پابندی کی نیکی نہیں ہے۔

۲۴۳۔ اسی طرح اللہ تمہارے لیے احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم دُنیا و آخرت دونوں کی فکر کرو۔ یعنی دُنیا فانی اور مُحل حوائج ہے اور آخرت باقی اور دارِ ثواب ہے اس لیے سوچ سمجھ کر ہر ایک امر میں اس کے مناسب حال خرچ کرنا چاہیے۔ اور مصلحت دُنیا و آخرت دونوں کو پیشِ نظر رکھنا چاہیے اور احکام کو واضح طور پر بیان فرمانے سے یہی مطلب ہے کہ تم کو فکر کرنے کا موقعہ ملے[1]

مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے انفاق کا یہ مسئلہ بیان کیا ہے اسی طرح ہم اپنے اور احکام بھی صاف اور واضح کر کے بیان کرتے ہیں تاکہ تم آگے پیچھے کے تمام معاملات پر غور

---

[1] افادات شیخ الہند

کر لیا کرو یا مطلب یہ ہے کہ انفاق کا تعلق دنیا و آخرت دونوں سے ہے لہٰذا دونوں پہلوؤں پر غور کر لیا کرو اور اگر فی الدنیا والآخرۃ کا پیوند تبیّن سے قائم کیا جائے تو مطلب یہ ہے کہ ہم تمام احکام خواہ وہ دُنیا کے ہوں یا آخرت کے صاف صاف بیان کرتے ہیں تاکہ تم خوب غور کر سکو کہ دُنیا فانی ہے اور آخرت باقی ہے۔ فانی کس قدر ضروری ہے اور باقی کہاں تک ضروری ہے تاکہ دُنیا اور آخرت کے کام دُنیا اور آخرت کی حیثیت کا لحاظ کر کے کیا کرو خصوصیہ کہ مال جیسے دنیوی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ذریعہ ہے ایسے ہی آخرت حاصل کرنے کا بھی یہی سبب ہے۔ یعنی اگر دولت کمانے میں کوئی خدا سے غافل نہ ہوا اور دولت کمانے کے جن ذرائع پر قرآن نے پہرہ لگا دیا ہے ان سے بچ کر خدا کے قائم کیے ہوئے حدود میں دولت کمائے تو صرف حدیثوں میں نہیں بلکہ قرآن میں بھی ہے

اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاماً تمہارے مال جن کو اللہ نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ کے عجیب و غریب مانع الفاظ میں مالی قوت کی دنیا میں حقیقت بیان کر دی ہے یعنی مسلمانوں کے ٹھہراؤ اور قیام کا ذریعہ مال ہے۔ یہ قرآن کا نظریہ ہے۔ قدرت کی اتنی بڑی نعمت جس کے ساتھ ہمارا قیام وابستہ ہے ضرورت ہے کہ ہم اسے دُنیا میں خرچ کرنے میں پوری احتیاط اور فکر سے کام لیں اور دیکھ لیں۔ اگر صدقاتِ واجبہ ہیں جیسے زکوٰۃ، صدقہ، عشر، بیوی اولاد کا نان و نفقہ وہ تو بہرحال ادا کرنے ہیں اور اگر صدقات نافلہ ہیں تو سوچ لیں ایسا نہ ہو کہ عفو سے گزر کر اصل اور منافع سے گزر کر سرمایہ بھی نہ رہے اور پھر در بدر بھیک مانگتے پھریں۔

دُنیا و آخرت میں ہم آہنگی

فی الدنیا والآخرۃ کا اضافہ کر کے قرآن نے اہلِ ایمان کی اسلامی زندگی کے لیے ایک رہنما اُصول دیا ہے۔ عام نگاہوں میں چونکہ وہ معیار نہیں ہوتا جو دین و دُنیا دونوں کے فوائد اور مصالح کو صحیح صحیح تول سکے اس لیے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر دینداری کی طرف میلان ہوا تو لوگ دین کو نری رہبانیت بنا لیتے ہیں یہاں تک کہ جنگ و جہاد خواہ کسی حالت میں بھی ہو ان کے ہاں خلافِ تقویٰ ہوتا ہے اور اگر دُنیاداری کی طرف میلان ہو گا تو جوئے و شراب جیسی چیزوں کو بھی محض اس خیال کی بنا پر نیکی قرار دینے کی کوشش کریں گے۔ قرآن نے فکرِ انسانی کی تربیت کی جو راہ اختیار کی ہے وہ عدمِ توازن کو دُور کر کے اس کو اس قابل بناتی ہے

وَيَسْـَٔلُونَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ۭ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّھُمْ خَيْرٌ ۭ وَاِنْ تُخَالِطُوْھُمْ فَاِخْوَانُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ۭ وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ

اور لوگ آپ سے یتیم بچوں کے بارے[635] میں پوچھتے ہیں ان سے کہہ دو جس بات میں ان کے اصلاح[636] و درستگی ہو وہ ہی بہتر ہے۔ اور اگر ان کے ساتھ مل کر رہو گے تو بہرحال وہ تمہارے بھائی ہیں[637]۔ اور اللہ جانتا ہے کہ کون اصلاح کرنے والا ہے[638] اور کون خرابی کرنے والا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو تمہیں مشقت میں ڈال دیتا بلاشبہ وہ دبدبہ والا اور حکمت والا ہے۔

کہ وہ دُنیا و آخرت دونوں کو صحیح تول سکے۔ مطلب یہ ہے کہ تم دُنیا و آخرت دونوں کے معاملہ میں اکٹھا غور و فکر کرو تاکہ اس کے نتیجہ میں جسمانی اور روحانی سعادتوں سے ہمدوش ہو کر صحیح معنے میں اُمتِ وسط درمیانی اُمت بن سکو۔ اُن کی طرح نہ ہونا جن کا گمان یہ ہے کہ آخرت دُنیا کو چھوڑے بغیر نہیں ملتی اور نہ اُن کی طرح ہونا جن کا خیال ہے کہ اصل دُنیا ہی ہے جو مزے اُڑانے ہیں اڑا لو۔ تم نہ فرشتے ہو نہ حیوان ہو۔ تم درمیانی مخلوق ہو۔ تمہارا نوعی کمال یہی ہے کہ دُنیا و آخرت میں ہم آہنگی پیدا کرو اور کہو کہ ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاٰخرۃ حسنۃ اسی بنا پر علماء نے تصریح کی ہے کہ دُنیا کے تمام فنون و علوم کا سیکھنا مسلمان کے ایمان کا تقاضا ہے اور فرضِ کفایہ ہے۔ اگر پوری اُمت ان سے بے رُخ ہو جائے تو تارکِ فرض ہو گی۔

اعمال کی میزانِ صحیح

دُنیا و آخرت دونوں میں غور و فکر کی ہدایت کی گئی ہے۔ کیونکہ صرف دُنیا میں فکر و غور انسانی عقل اور قلب کو وجود انسان کی حقیقت زندگی کے حقائق اور اس کے روابط اور سماجی قدروں کا صحیح اور مکمل تصور نہیں عطا کر سکتا۔ اور نہ ہی صرف دُنیا میں سوچ بچار سے سماجی قدریں اور معاشرتی ڈھانچے صحیح استوار ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ دُنیا کی زندگی تو انسان کی ابدی زندگی کا ایک معمولی اور مختصر سا خاکہ ہے اور کسی معمولی اور مختصر حصے پر شعور و عمل کی بنیادیں رکھنا دُرست نہیں ہے۔ اتفاق سے اگرچہ اس دُنیا میں بھی یہ فوائد حاصل ہوتے ہیں کہ دل کی طہارت اور شعور کی پاکیزگی میسر آتی ہے، معاشرے میں سلامتی اور اخوت کی فضا ابھرتی ہے لیکن چونکہ ہر شخص ان فوائد کو محسوس نہیں کر سکتا اس لیے آخرت کے ثواب اور جزا کی یقین دہانی کر دی گئی تاکہ قلب مطمئن ہو جائے اور اعمال کی یہ صحیح میزان اس کے ہاتھ آجائے۔

یتیموں کی تربیت

اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے قرآن میں یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے متعلق بار بار سخت احکام آچکے تھے۔ کہیں ارشاد ہوا کہ یتیم کے مال کے نزدیک نہ جاؤ اور کہیں فرمایا کہ جو لوگ ناجائز طور پر یتیموں کا مال کھاتے ہیں وہ اپنے پیٹوں میں آگ بھرتے ہیں۔ ان احکام کی بنا پر وہ لوگ جن کی تربیت میں یتیم بچے تھے اس قدر خوفزدہ ہوئے کہ انہوں نے ان کا کھانا پینا تک اپنے سے الگ کر دیا اور اس احتیاط پر بھی ان کو اندیشہ ستا رہا تھا کہ کہیں یتیموں کے مال کا کوئی حصہ ان کے مال میں نہ مل جائے۔ چنانچہ ابوداؤد اور نسائی میں عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے بتایا ہے کہ ان آیات کے بعد صحابہ اس قدر محتاط ہو گئے تھے کہ جن کی تربیت میں یتیم بچے تھے ان کے یہاں اگر یتیم کے کھانے میں سے کچھ بچ بھی جاتا تو وہ اسے چھوڑ دیتے اور نہ کھاتے حتیٰ کہ کھانا خراب ہو جاتا۔ صحابہ پر کھانے کی یہ اضاعت بھی بڑی شاق ہوتی۔ اس لیے انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ان

بچوں کے ساتھ ہمارے معاملے کی صحیح صورت کیا ہے؟

اجتماعی کفالت قرآنی معاشرے کا ایک اہم اصول ہے اور اہلِ ایمان کو کمزوروں اور بیکسوں کی خبرگیری کی ذمہ داری سونپی گئی ہے اس لیے یہاں خاص طور پر یتیموں کے بارے میں ہدایت کی گئی کہ ان کے جان و مال کا تحفظ کیا جائے۔

۲۲۵- اور لوگ آپ سے یتیم بچوں کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ یتامیٰ یتیم کی جمع ہے یتیم کے معنے پہلے بیان ہو چکے ہیں۔ عربوں میں روزانہ کے قتل و غارت اور بدامنی سے یتیموں کی کثرت تھی مگر جیسا چاہیے ان کے غور و پرداخت کا سامان نہ تھا وہ اپنے باپ کی وراثت سے محروم رہتے تھے کیونکہ چھوٹے بچوں کو وہ وراثت نہیں دیا کرتے تھے اور نہ سنگ دل عربوں میں عام طور سے ان کے ساتھ رحم و شفقت کا جذبہ تھا۔ قرآن میں ان کی اس بدسلوکی کا بار بار ذکر آیا ہے۔ ایک آیت میں ان متولیوں کا نقشہ کھینچا گیا ہے جو یتیموں کے جوان ہونے کے اندیشہ سے ان کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد جلد کھا کر ہضم کرنا چاہتے تھے۔ تفصیلی احکام تو چوتھے پارے میں آرہے ہیں یہاں تو ان کو سمجھایا جا رہا ہے۔ جنہوں نے سورۂ نساء کے احکام سن کر یتیموں کے کھانے اور خرچ کو بالکل علیحدہ کر دیا تھا اور اس پر وہ انتظامی پریشانیوں سے دوچار ہو گئے تھے۔ شیخ الہند فرماتے ہیں۔ بعض لوگ یتیم کے مال میں احتیاط نہ کرتے تھے تو اس پر حکم ہوا تھا کہ لاتقربوا مال الیتیم الا بالتی ھی احسن۔ اور ان الذین یاکلون اموال الیتامیٰ ظلماً انما یاکلون فی بطونھم ناراً۔ اس پر جو لوگ یتیموں کے نگران تھے ڈر گئے اور یتیموں کے کھانے اور خرچ کو بالکل جدا کر دیا کیونکہ شرکت کی حالت میں یتیم کا مال کھانا پڑتا اس میں الجھن پیش آئی کہ ایک چیز یتیم کے لیے تیار کی جاتی، بچ جاتی تو خراب ہو کر ضائع ہو جاتی۔ اس کے نتیجہ میں یتیموں کا مالی نقصان ہوتا تو پریشانی ہوتی۔ صحابہ نے حضور انور سے عرض کیا کہ ان کے خرچ کا انتظام کیسے رکھا جائے۔ آیا اپنے حساب میں شامل کر لیا جائے یا ان کا حساب بالکل الگ کر دیا جائے۔ یہ سوال کرنے والے یتیموں کے اولیا تھے جن کی ولایت و سرپرستی میں یتیم بچے پل رہے تھے۔ اللہ اکبر! اصحاب کی احتیاط اور مرتبۂ تقویٰ کے کیا کہنے، صراحت کے ساتھ سوال کیا کہ یتامیٰ کی جائداد سے انتفاع کی کوئی صورت اولیا کے لیے جائز ہے؟[1]

---

[1] ماجدی

۶۳۶۔ جس بات میں ان کی اصلاح و درستگی ہو وہی بہتر ہے۔ یعنی مقصود تو صرف یہ بات ہے کہ یتیم کے مال کی درستی اور اصلاح ہو سو جس موقع میں علیحدگی میں یتیم کا نفع ہو تو اس کو اختیار کرنا چاہیے۔ اور جہاں شرکت میں بہتری نظر آئے تو ان کا خرچ شامل کر لو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے کہ ایک وقت ان کی چیز کھالی تو دوسرے وقت اپنی چیز ان کو کھلادی کیونکہ یہ یتیم بچے تمہارے دینی بھائی ہیں اور بھائیوں میں شرکت اور کھانا کھلانا بیجا نہیں۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ یتیموں کی اصلاح کی رعایت ضروری ہو۔ اور اللہ خوب جانتا ہے کہ اس شرکت سے کس کو خباثت اور فساد مالِ یتیم مقصود ہے اور کس کو یتیموں کی اصلاح اور ان کی نفع رسانی منظور ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ اس سوال کے جواب میں قرآن نے جو اصولی بات فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ ہر پہلو سے یتیموں کی بہبود اور اصلاح پیشِ نظر رہے۔ جس چیز میں ان کی بہتری ہو وہی بہتر ہے۔ اگر تمہارے حالات کے لحاظ سے یہ بہتر ہے کہ ان کے معاملات الگ رہیں اور تم ان کی دیکھ بھال کرو تو ایسا کرو اور اگر محسوس کرو کہ اپنے ساتھ شامل کر کے زیادہ بہتر طریقے سے یہ فرض انجام دے سکتے ہو تو تمہیں اس کی بھی اجازت ہے۔ آخر وہ تمہارے بھائی بند ہیں۔ پھر علیحدگی کیوں لازم ہو[2]

گویا یہاں ایک اصول بیان کر دیا کہ اولین شرط یتیم کے جائداد کے مصالح کی رعایت ہے۔ اگر اس کا یہ تقاضا ہو کہ اپنا اور یتیم کا حساب ایک رکھا جائے تو یہی کیا جائے ورنہ اس کے برعکس۔ اصلاح کا لفظ عام ہے اگرچہ اس کا قریبی تعلق مالی مصالح سے ہے مگر لفظ کے عموم میں جسمانی یا مالی، اخلاقی ہر قسم کی اصلاح داخل ہے۔ فقہاء نے بقاعدہ اقتضاء النص اس عموم سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یتیم پر جو تہدید، تنبیہ، تعلیم و تربیت کے سلسلے میں ہو وہ بالکل درست ہے۔

۶۳۷۔ اگر ان کے ساتھ مل کر رہو گے تو بہرحال وہ تمہارے بھائی ہیں اور اس لیے مشترک خرچ میں کوئی مضائقہ نہیں۔ اصل ارشاد میں فاخوانکم آیا ہے۔ اخوان اخ کی جمع ہے اخ یعنی بھائی کا لفظ انتہائی اخلاص، یگانگت اور مروت کا مظہر ہے۔ اس ایک لفظ میں

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] تدبرِ قرآن

سب کچھ آگیا۔ یعنی جب تم اور یتیم بھائی بھائی ہو تو بھائی بھائی میں تکلف کیسا۔ اور عرب میں تو یہ رشتہ اور زیادہ قوی تھا۔ چونکہ اس وقت اکثر مسلمانوں کے پاس مسلمان ہی بچے تھے اس لیے اخوانکم فرمایا مطلب یہ ہے کہ اخوت سے اخوتِ ایمانی مراد ہے۔ وطنی، لسانی، نسلی مراد نہیں ہے اور اگر کوئی بچہ یتیم ایسا ہو جس سے اخوتِ ایمانی کا رشتہ نہ ہو یہودی ہو، ہندو ہو، عیسائی ہو اس کا بھی بجنسہ یہی حکم ہے اور اس کی دلیل دوسری آیات و احادیث ہیں جو الفاظ عام میں وارد ہیں بلکہ غیر مسلم یتیم بچہ کے ساتھ اتنی رعایت اور زیادہ ہے کہ اس بچہ پر بالغ ہونے کے بعد اسلام قبول کرنے کے لیے کوئی جبر نہیں کیا جائے گا اسے مذہبی آزادی دی جاتی ہے[1]

اسلام کی یتیم نوازی کا اعتراف

اسلام کی یتیم نوازی و یتیم پروری کا اعتراف اپنوں ہی کی طرح بیگانوں اور منکروں کو بھی ہے۔ برطانوی مصنف باسورتھ سمتھ نے لکھا ہے کہ " پیغمبر اسلام کی توجہ خصوصی کے مرکز غلاموں کی طرح یتیم بھی رہے ہیں۔ وہ خود بھی یتیم رہ چکے تھے اس لیے دل سے چاہتے تھے کہ جو حسن سلوک خدا نے اُن کے ساتھ کیا وہ ہی دوسروں کے ساتھ رکھیں" (محمد اینڈ محمڈنزم ص ۲۵۱) امریکی ماہر اجتماعیات ڈاکٹر رابرٹس لکھتے ہیں " قرآن کے مطالعہ سے ایک خوشگوار چیز یہ معلوم ہوتی ہے کہ محمد کو بچوں کا کس قدر خیال تھا، خصوصاً ان بچوں کا جو والدین کی سرپرستی سے محروم ہو گئے ہوں۔ بار بار تاکید بچوں کے ساتھ حسن سلوک کی ملتی ہے (سوشل لاز آف دی قرآن ص ۴۰) اور پھر کہا ہے ' محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے یتیموں کے باب میں اپنی خاص توجہ مبذول رکھی۔ یتیموں کے حقوق کا بکثرت ذکر اور ان سے بدسلوکی کرنے والوں اور ان کے حقوق غصب کرنے والوں کے خلاف سخت سے سخت وعیدیں سیرۃ محمدی کے اس پہلو کو ظاہر کرتی ہیں جس پر مسلمان مصنفین کو بجا طور پر ناز ہے (ص ۴۱)[2]

دراصل اسلام سے پہلے مذاہب میں اس واجب الرحم فرقہ کے رحم و شفقت اور ان کی امداد و پرورش کا ذکر بہت کم ملتا ہے۔ تورات میں عشر اور زکوٰۃ کے مستحقین میں دوسرے

---

[1] بیان القرآن [2] ماجدی

لوگوں کے ساتھ یتیم کا نام بھی دوایک جگہ ملتا ہے کہ شہر کے پھاٹک کے اندر جو یتیم ہوں وہ آئیں کھائیں سیر ہوں۔ (استثنا ۱۴:۲۹، ۲۶:۱۲) انجیل نے ان بیچاروں کی کوئی دادرسی نہیں کی اور نہ کسی تعلیم میں ان کا ذکر کیا ہے۔ اس مظلوم کی اصلی دادرسی کا وقت اس وقت آیا جب مکہ کا یتیم دینِ کامل کی شریعت لے کر دُنیا میں آیا۔ وحی الٰہی نے سب سے پہلے خود اُن کو ہی یاد دلایا۔

الم یجدک یتیماً فاٰوی	کیا تجھ کو اللہ نے یتیم نہیں پایا۔ پس اسی نے پناہ دی۔
فاما الیتیم فلا تقھر	تو یتیم کو نہ دبا۔

آج دُنیا کے شہر شہر میں یتیم خانے قائم ہیں۔ لیکن اگر یہ سوال کیا جائے کہ کیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد سے پہلے بھی یہ بد قسمت گروہ اس نعمت سے آشنا تھا تو تاریخ کی زبان سے جواب نفی میں ملے گا۔ اسلام پہلا دین ہے جس نے اس مظلوم فرقہ کی دادرسی کی۔ عرب پہلی سرزمین ہے جہاں کسی یتیم خانے کی بنیاد پڑی اور اسلام کی حکومت پہلی حکومت ہے جس نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا اور عرب، مصر، شام، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتیں قائم کیں ساتھ ساتھ ان مظلوموں کے لیے بھی امن و راحت خانے بنائے، ان کے وظیفے مقرر کیے، مکتب قائم کیے، جائدادیں وقف کیں اور دُنیا میں ایک نئے انسٹیٹیوشن کی طرح ڈالی۔ اور قانوناً اپنی عدالتوں کا یہ فرض قرار دیا کہ وہ بے دلی اور سرپرست یتیموں کے سرپرست ہوں۔ ان کی جائدادوں کی نگرانی ان کے معاملات کی دیکھ بھال اور اُن کی شادی بیاہ کا انتظام کریں۔ تفصیلات انشاء اللہ آپ کو پارہ چہارم میں ملیں گی۔

۸۳۷۔ اللہ جانتا ہے کہ کون اصلاح کرنے والا ہے اور کون خرابی کرنے والا۔ ہم بدنیت کو بھی جانتے ہیں اور نیک نیت کو بھی۔ لہٰذا اگر تمہاری نیت بخیر ہے تو تمہیں تو یتیموں کی ذمہ داری قبول کرنے سے گھبرانا نہ چاہیے۔ یعنی ہر شخص یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ بات پوشیدہ نہیں ہے کہ کس کے پیشِ نظر یتیم کی بہبود ہے اور کس کے پیشِ نظر اس پردے میں یتیم کے مال کو کھانا ہے۔ لہٰذا اس معاملے میں تمہیں اپنے اعمال کا محاسبہ کرتے رہنا چاہیے اور تمہیں جان لینا چاہیے کہ تمہیں ایک روز ایک ایک ذرہ کا حساب

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ۭ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ

مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى

يُؤْمِنُوْا ۭ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ۭ اُولٰۗىِٕكَ

يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ ښ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ

بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٢١﴾ رکوع

اور مشرک عورتوں سے جب تک ایمان[۶۳۹] نہ لے آئیں نکاح نہ کرو ایک مشرک عورت تمہیں خواہ کتنی پسند[۶۴۰] آئے لیکن کنیز مومن عورت اس سے کہیں بہتر ہے اور اسی[۶۴۱] طرح مشرک مرد جب تک ایمان نہ لے آئیں مومن عورتیں اُن کے نکاح میں نہ دی جائیں۔ یقیناً بندہ مومن مشرک سے بہتر ہے اگرچہ بظاہر مشرک مرد تمہیں کتنا پسند آئے۔ یہ لوگ یعنی مشرکین تمہیں[۶۴۲] دوزخ کی طرف بُلاتے ہیں اور اللہ اپنے حکم سے تمہیں جنت اور مغفرت کی طرف بُلا رہا ہے۔ اللہ ہدایت کے لیے اپنے احکام بیان کر رہا ہے تاکہ لوگ نصیحت[۶۴۳] پذیر ہوں۔

دیتا ہے۔ قرآن صرف قانون سازی نہیں کرتا بلکہ قانون پر عمل کے لیے انسان کے وجدان کو بھی بیدار کرتا ہے۔ اس آیت میں انسان کے وجدان کو جھنجوڑا ہے۔ آخر میں فرمایا ولو شاء اللہ لاعنتکم یعنی اگر اللہ کی حکمت و مشیت تکوینی کا تقاضا ہوتا تو تمہیں پریشانی میں ڈال دیتا اور اس اشتراک سے روک دیتا۔ یہ محض اللہ کی عنایت ہے کہ اس نے تمہاری آسانی کے پیش نظر تمہیں یتیموں کے کھانے میں شریک ہونے کی اجازت دے دی ورنہ یہ عین ممکن تھا کہ وہ تمہیں اس اختلاط سے روک دیتا اور ساتھ ہی یہ حکم دیتا کہ یتیم کے مال اور جائداد کی حفاظت کرو۔ اگر ایسا ہوتا تو تم بڑی مشقت میں پڑ جاتے لیکن اللہ تعالیٰ نے تم پر بڑا فضل فرمایا کہ اس نے بغیر کسی مشقت میں ڈالے تمہارے لیے خدمت اور نیکی کی راہ کھول دی لہٰذا تم میں سے ہر شخص کو خدا کے اس احسان کا شکر گزار ہونا چاہیے اور اس اجازت سے کوئی غلط فائدہ نہ اٹھانا چاہیے۔ آیت کو اللہ کی دو صفتوں پر ختم کیا ہے۔ پہلی صفت عزیز ہے۔ اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ وہ جو چاہتا حکم دیتا، کوئی قوت اس سے بالاتر، کوئی حاکم اس کے اوپر نہیں ہے۔ سب پر بالا دست خود ہے لیکن چونکہ اس کے ساتھ حکیم ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ احکام وہی دیتا ہے جو بندوں کے لیے نرم و آسان اور قرین مصلحت ہوں۔

ازدواجی زندگی میں رشتہ ایمان کی تقدیم

پہلی آیت میں یتیموں کی تربیت، ان کی فلاح و بہبود اور اصلاح کی ہدایت کی گئی ہے اور اس سلسلے میں ان کے ساتھ اشتراک کی اجازت دی ہے۔ یتیموں کی اصلاح کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ یتیم کا ولی یتیم کے تحفظ کی خاطر یتیم کی ماں سے نکاح کرے تاکہ ایک وقت میں دو نیکیاں فراہم ہو جائیں۔ ایک یتیم کی پرورش اور تربیت، دوسرے بیوہ کی حفاظت۔ اس ارادے سے اگر نکاح کیا جائے تو اس کا کیا حکم ہے۔ قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہ مصلحت بجائے خود اہمیت رکھنے والی ہے اور اس کو پیش نظر رکھ کر یتامیٰ کی ماؤں سے نکاح کیا جا سکتا ہے لیکن شرط یہ ہے کہ وہ مومنہ ہوں۔ یہ شرط اس لیے لگائی ہے کہ اس وقت صورت حال یہ تھی کہ بہت سے ایسے یتیم بھی تھے جن کی مائیں اسلام میں داخل نہیں ہوئی تھیں، اس وجہ سے یہ ہدایت ہوئی کہ اس مصلحت کی خاطر بھی مشرکات سے نکاح کی اجازت بہرحال نہیں

ہے کیونکہ اس سے دوسرے مفاسد کے رونما ہونے کا اندیشہ ہے جن کی طرف آگے اشارہ آرہا ہے۔

۲۲۹۔ اور مشرک عورتوں سے جب تک ایمان نہ لے آئیں نکاح نہ کرو۔ پہلے مسلمان مرد کا فر عورت کا فرمرد مسلمان عورت دونوں صورتوں میں نکاح کی اجازت تھی۔ اس آیت سے اسے منسوخ کر دیا گیا۔ اگر مرد یا عورت مشرک ہو تو اس کا نکاح مسلمان سے درست نہیں یا نکاح کے بعد ایک مشرک ہو گیا تو نکاح سابق ٹوٹ جائے گا۔ اور مشرک یہ کہ علم یا قدرت یا کسی اور صفتِ خداوندی میں کسی کو خدا کا مماثل سمجھے یا خدا کے مثل کسی کے تعظیم کرنے لگے۔ مثلاً کسی کو سجدہ کرے یا کسی کو مختار سمجھ کر اس سے اپنی حاجت مانگے۔ باقی اتنی بات دیگر آیات سے معلوم ہوتی ہے کہ یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح درست ہے وہ ان مشرکین میں داخل نہیں بشرطیکہ وہ اپنے دین پر قائم ہو ملحد اور بے دین نہ ہو۔ خلاصہ تمام آیات کا یہ ہے کہ مسلمان مرد کا مشرک عورت سے نکاح کرنا درست نہیں ہے تاوقتیکہ مسلمان نہ ہو جائے[1]

اس آیت میں مشرک عورتوں سے مسلمان مردوں کے نکاح کو حرام بتایا گیا ہے۔ مشرک عورتوں سے مراد وہ عورتیں ہیں جو کتابی نہ ہوں۔ کیونکہ سورۃ مائدہ میں جو اس سورت کے بعد نازل ہوئی کتابی عورتوں کا حکم الگ بیان کیا گیا ہے۔ صحابہ میں عبداللہ بن عمر کتابی عورتوں کو بھی اس آیت میں داخل سمجھتے ہیں۔ لیکن عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ کتابی عورتیں اس حکم میں سورۃ مائدہ کی آیت کی وجہ سے داخل نہیں ہیں۔ علماء نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ قرآنی اطلاقات میں مشرکین اور اہلِ کتاب علیحدہ علیحدہ ہیں۔ پہلے پارے میں پڑھ آئے ہو۔

ما یود الذین کفروا من اھل الکتاب ولا المشرکین

اس میں مشرکین کو اہلِ کتاب سے الگ کر کے پیش کیا ہے۔ قرآن ہی میں ایک اور مقام پر ہے:

لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین

یہاں بھی مشرکین سے اہلِ کتاب کو ممتاز کر کے پیش کیا ہے۔

یہ صرف عبداللہ بن عباس ہی سے مروی نہیں بلکہ قرطبی کی تصریح کے مطابق صحابہ

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

میں حضرت عثمان، حضرت جابر، حضرت طلحہ اور حضرت حذیفہ کا بھی یہی خیال ہے۔ اور تابعین میں سے سعید بن المسیب، سعید بن جبیر، حسن بصری، مجاہد طاؤس، عکرمہ، شعبی اور ضحاک کا بھی یہی مذہب ہے۔

دراصل اسلام نے قانونی حیثیت سے دُنیا کی عورتوں کو ۶ حصوں میں تقسیم فرمایا ہے اور ان کے علیحدہ علیحدہ احکام بیان کیے ہیں۔

۱۔ مسلمان عورتیں۔ جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو کتاب الہٰی یقین کرتی ہیں۔ ان کے تفصیلی احکام ازدواجی زندگی کے بارے میں سورۂ نساء میں آئیں گے۔

۲۔ اہلِ کتاب کی عورتیں یعنی ان کتابوں کے پیروکار جن کے نام قرآن میں مذکور ہیں۔ یا یوں کہو جو قرآن کو گو آسمانی کتاب نہیں مانتی ہیں مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتی ہیں۔ ان سے ازدواجی تعلق کے بارے میں احکام سورۂ مائدہ میں آرہے ہیں۔

۳۔ مشرک عورتیں یعنی وہ جن کے پاس نہ کوئی آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دینِ الٰہی کی طرف منسوب ہیں جیسے قریشِ مکہ کی عورتیں۔ ان کے ازدواجی احکام یہاں بیان کیے جا رہے ہیں۔

۴۔ کتابی حربی عورتیں۔ یعنی ان اہلِ کتاب کی عورتیں جن سے مسلمان برسرِ پیکار ہیں۔ ان کے احکامِ ازدواجی پارہ دس سورۂ توبہ میں اجمالاً آئیں گے۔

۵۔ مرتد عورتیں یعنی وہ جو اسلام قبول کرنے کے بعد اسلام سے پھر گئی ہوں۔ چاہے عیسائی ہو گئی ہوں یا یہودی۔ یا کچھ اور۔ ان کے ازدواجی احکام کے بارے میں اسی سورہ میں اشارات ہیں۔

۶۔ شبہ اہلِ کتاب کی عورتیں یعنی وہ جو قرآن، توراۃ، انجیل اور زبور کو نہیں مانتے۔ ان کے ازدواجی احکام اسی آیت میں اشارۃً بیان کیے گئے ہیں۔

بہرحال اس آیت میں مشرک عورتوں سے مسلمان مردوں کے ازدواجی رشتہ کا یہ حکم بتایا گیا ہے کہ خواہ مصلحت اس میں کتنی اہم ہو مسلمان کے لیے مشرک عورتوں سے نکاح کرنا روا نہیں ہے۔ چاہے یہ مصلحت ہو کہ اس طرح ایک یتیم کی پوری نگرانی اور ایک بیوہ کی خدمت ہو جائے گی اور چاہے یہ مصلحت ہو کہ اس طرح مشرک عورتوں کو اسلام کا قریب سے مطالعہ کرنے کا موقعہ ملے گا اور وہ مسلمان ہو جائے گی۔ اسلام موہوم مصالح کے پیشِ نظر متعین مفاسد کو نظر انداز نہیں کرتا۔ مشرک عورت ہی کے حکم میں مرتد عورتیں داخل ہیں کہ ان سے بھی کسی مسلمان کا ازدواجی رشتہ جائز نہیں ہے۔ اور اسی میں شبہ اہلِ کتاب مجوسیوں، ہندوؤں کی عورتیں بھی داخل ہیں۔

مشرکہ سے نکاح کی ممانعت میں قرآن کی سنگینی

قرآن کی نظر میں مشرک عورت سے ازدواجی رشتہ پر یہ سنگین پابندی کیوں ہے ؟
اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ میاں بیوی کا رشتہ انتہائی اُلفت ومودت اور باہمی مناسبت وموانست کا رشتہ ہے ۔ بیوی کو اگر شوہر سے اس درجہ نامناسبت ہے کہ وہ اس کی ساری شعوری اور اختیاری زندگی کے اصل واُصول ایمان ہی کی مُنکر ہے تو معلوم ہوا کہ دونوں میں باہمی مناسبت کی بنیاد درجہ ضعیف میں بھی موجود نہیں ہے ۔ مرد کو ایسی عورت کے ساتھ نباہ کرنے کا خیال ہی چھوڑ دینا چاہیے ۔ موافقت کے دوسرے عناصر موجود نہ ہوں نہ سہی ۔ لیکن کم از کم ایمان تو مشترک ہو جس کے تابع زندگی کے سارے معاملات ہیں ۔ انسانی فطرت خود ایسے بے جوڑ رشتہ کو گوارا نہیں کرتی ہے ۔ دینِ فطرت اسے کیونکر جائز رکھ سکتا ہے ۔ پھر نکاح اسلام میں ایک خالص دینی اور ایمانی عمل ہے ۔ محض دیوانی معاہدہ نہیں ہے جب ایک فریق دین وایمان کی بنیاد ہی سے منحرف ہے تو اس کے ساتھ ایمانی معاہدہ کیونکر کیا جا سکتا ہے ۔ حتیٰ یومن کی قید لگا کر بتا دیا ہے کہ ممانعت کی بنیاد تمام تر ایمانی ہے لسانی، نسلی، قومی، وطنی، اقتصادی وغیرہ ہرگز نہیں ہے [1]

۷۰۶ ۔ ایک مُشرک عورت خواہ تمہیں کتنی پسند آئے لیکن کنیز مومن عورت اس سے کہیں بہتر ہے ۔ یعنی اگرچہ مُشرک بی بی بسبب مال، جمال اور شرافت کے تم کو پسند آئے ۔[2]
گویا اس فقرے کے ذریعے یہ بات قرآن نے اپنے مخاطبوں کے کوزۂ ذہن میں اُتار دی کہ ایک مسلمان کنیز ایک آزاد مشرکہ عورت پر ترجیح رکھتی ہے اگرچہ وہ اپنے نسب، مال، جاہ اور جمال کی بنا پر تمہارے لیے دلکشیوں کا سامان ہو ۔ کیونکہ قرآن کی نظر میں پسند وناپسند کا معیار نسب، نسل، قومیت، وطنیت، زبان، آزادی اور غلامی نہیں ہے بلکہ ایمان اور عملِ صالح ہے ۔ کافر کی ایک مہ جبین شہزادی تمہارے لیے بے قیمت ہے اگر وہ ایمان کے زیور سے آراستہ نہیں ہے اور افریقہ کی وہ کالی کلوٹی حبش کنیز مسلمان کے لیے جنت کی حور ہے اگر اُس کا دل اسلام کے نور سے منور ہے ۔ قرآن کے اس فقرے سے اندازہ ہوتا ہے کہ کفر

---

[1] ماجدی [2] شیخ الہند

قرآن کی نظر میں کس قدر مبغوض اور ایمان کس قدر محبوب ہے۔ کافر عورت میں دُنیا جہان کی خوبیاں ایک طرف اور اس کے کفر کی گندگی ایک طرف۔ لفظ امۃ آیا ہے۔ آزاد کے مقابلے میں باندی اور کنیز کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہر مسلم عورت یہاں تک نعمتِ آزادی سے محروم اور دنیا میں حقیر ذلیل سمجھی جانے والی باندی تک آزاد خوش جمال، خوش حال کافر عورت سے بہتر ہے۔

ایک لطیف استدلال

آیتِ قرآنی میں ایمان کا کفر سے مقابلہ کرکے یہ بتایا گیا کہ ایک مسلمان عورت ایک آزاد مشرکہ عورت پر ترجیح رکھتی ہے۔ صاحبِ تفسیر مظہری نے اس سے یہ لطیف استنباط فرمایا ہے کہ جیسے ایک مسلمان عورت کو ایک کافر عورت پر ترجیح ہے ایسے ہی مسلمان معاشرے میں ایک نیکوکار، پرہیزگار، پاکدامن مسلمان عورت کو چاہے وہ فقیر اور صورت وشکل بھی اچھی نہ رکھتی ہو ایک بدکار، بدعنوان مسلمان عورت پر ترجیح ہے چاہے وہ دولت مند اور حسین وجمیل ہو۔ غالباً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش فرمودہ وہ معیار جو صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بحوالہ ابوہریرہ آتا ہے اسی آیت سے اسی تقابل کو پیشِ نظر رکھ کر مستنبط ہے۔ ارشاد ہے کہ عورت سے چار باتوں کی وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے۔ مالداری، خاندانی شرافت، حسن وجمال اور دینداری۔ تم دیندار کو ترجیح دو۔ ایک اور ارشاد صحیح مسلم کا بحوالہ عبداللہ ابن عمر اس طرح آیا ہے۔ دُنیا کے تمام سامان میں بہترین چیز نیک بیوی ہے۔

۲۲۱۔ اور اسی طرح مشرک مردوں سے جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں مومن عورتوں کا مشرک مردوں سے نکاح نہ کرو۔ یعنی مسلمان عورتوں کا مشرک مردوں سے نکاح حرام ہے۔ اس آیت میں مشرکین اگرچہ خاص عرب کے مشرکین کے لیے بطورِ لقب استعمال ہوا ہے لیکن دوسری قومیں جن میں شرک پایا جاتا ہے خواہ وہ اہلِ کتاب سے ہوں یا شبہ اہلِ کتاب وہ اس کے مدلول میں داخل ہیں۔ کیونکہ قرآن میں کسی کا کوئی استثنا نہیں ہے۔ آیت میں مطمحِ نظر حتی یؤمنوا ہے۔ یعنی اصلی مانع ان مردوں کا کفر ہے۔ جب یہ مانع دور ہو جائے تو پھر کوئی امر مانع نہیں ہے۔ اسلام کا منکر جو کوئی اور جس قسم کا ہو مومن خاتون اس کے نکاح میں نہیں آسکتی ہے نہ دی جاسکتی ہے اور نہ رہ سکتی ہے۔ فقہا نے لکھا ہے کہ شوہر اگر پہلے سے مسلمان ہے ۔۔ بعد کو خدانخواستہ مرتد ہو گیا تو مسلمان عورت اسی وقت اس کے نکاح سے باہر ہو جائے گی۔

اور جو نکاح ابھی تک صحیح تھا ٹوٹ جائے گا۔ اور یہ عورت عدت پوری کر کے کسی مسلمان سے نکاح کرنے کی مجاز ہے۔ یہ بھی لکھا ہے کہ اگر میاں بیوی پہلے سے کافر ہیں اور عورت مسلمان ہو گئی تو اب بظاہر نکاح کی کوئی صورت نہیں ہے بجز اس کے کہ شوہر بھی اسلام قبول کرے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام و کفر کے درمیان کوئی نقطہ مشترک نہیں ہے۔ جس جگہ کفر ہے وہاں اسلام نہیں ہے اور جہاں اسلام ہے وہاں کفر کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اسلام کے ساتھ ساتھ کفر کی کسی ادا کو بھی نبھایا نہیں جا سکتا۔ اس کے تفصیلی مباحث انشاء اللہ پارہ ۲۸ سورہ ممتحنہ میں آئیں گے۔ اس موقعہ پر پھر پہلی بات کو دہرایا کہ لعبد مومن خیر من مشرک ولو اعجبکم۔ لام تاکید کے لیے ہے یعنی اپنی علمی قابلیت کی بنا پر، اونچی ڈگریوں کی بنا پر، اعلیٰ عہدوں کی بنا پر غرض کسی بھی دنیوی بنیاد پر مسلمان عورت کا نکاح کافر مشرک مرد سے نہ کرو۔ حتیٰ کہ نعمت آزادی سے محروم اور عرفاً حقیر و ذلیل سمجھے جانے والے غلام مومن کو اختیار کر سکتے ہو لیکن کسی کافر کو اختیار نہ کرو خواہ دنیوی اعتبار سے کیسا ہی ہو[1] گویا تمہارے لیے یہ بات تو جائز ہے کہ تم اپنی لڑکی کا ہاتھ ایک غلام زادے کے ہاتھ میں پکڑا دو۔ اگر وہ دولت ایمان رکھتا ہے اور ایک نواب زادہ شہزادہ اور صاحبزادہ کو بھی اپنی لڑکی دینے سے انکار کر دو اگر وہ ایمان سے محروم ہے۔

۲۴۲۔ یہ لوگ یعنی مشرکین تمہیں دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ تمہیں اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف بلا رہا ہے۔ یعنی مشرکین اور مشرکات جن کا ذکر ہوا اُن کے اقوال، اُن کے افعال، ان کی حمیت، ان کے ساتھ میل ملاپ، شرک کی نفرت اور اس کی برائی کو دل سے کم کرتا ہے اور شرک کی طرف رغبت کا باعث ہوتا ہے جس کا انجام دوزخ ہے اس لیے ایسوں کے ساتھ نکاح کرنے سے اجتناب بہتر ہے[2]

زندگی پر رشتہ کے اثرات

اس آیت میں اس حکم کی علت بتائی گئی ہے جو مشرکین سے شادی بیاہ کا تعلق نہ رکھنے کے متعلق اوپر بیان ہوا ہے۔ عورت اور مرد کے درمیان نکاح کا تعلق محض ایک شہوانی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک گہرا تمدنی، اخلاقی اور قلبی تعلق ہے۔ مومن اور مشرک کے درمیان اگر یہ قلبی

---

[1] ماجدی [2] افادات شیخ الہند

تعلق ہو تو جہاں اس امر کا امکان ہے کہ مومن شوہر یا بیوی کے اثر سے مشرک شوہر یا بیوی پر اور اس کے خاندان اور آئندہ نسل پر اسلام کے عقائد اور طرزِ زندگی کا نقش ثبت ہوگا وہیں اس امر کا بھی امکان ہے کہ مشرک شوہر یا بیوی بلکہ اس کا خاندان اور دونوں کی نسل تک متاثر ہو جائے گی اور غالب امکان اس امر کا ہے کہ ایسے ازدواج سے اسلام اور کفر وشرک کی ایک ایسی معجون مرکب اس گھر یا خاندان میں پرورش پائے گی جس کو غیر مسلم خواہ کتنا ہی پسند کریں مگر اسلام کسی طرح پسند کرنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ جو شخص صحیح معنوں میں مومن ہو وہ محض اپنے جذبات شہوانی کی تسکین کے لیے کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ اس کے گھر اور اس کے خاندان میں کافرانہ ومشرکانہ خیالات اور طور طریقے پرورش پائیں اور وہ خود بھی نادانستہ اپنی زندگی کے کسی پہلو میں کفر وشرک سے متاثر ہو جائے۔ اگر بالفرض ایک فردِ مومن کسی فردِ مشرک کے عشق میں مبتلا ہو جائے تب بھی اس کے ایمان کا اقتضا یہی ہے کہ وہ اپنے خاندان، اپنی نسل اور خود اپنے دین واخلاق پر اپنے شخصی جذبات قربان کر دے[1]

ہمیں چاہیے کہ ازدواجی زندگی کے سلسلے میں معاملے کے اس پہلو پر ایک نظر ڈال لیں۔ بلاشبہ رشتہ ناتے کے اثرات زندگی پر صرف سطحی اور سرسری نہیں ہوتے بلکہ گہرے ہوتے ہیں۔ اگر آدمی ان میں عقائد واعمال کو کوئی اہمیت نہ دے صرف حسن یا مال یا خاندان یا مصلحت ہی کو سامنے رکھے تو ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے ہی خرچ پر اپنے گھر میں ایک ایسی بلا پال لے جو صرف اسی کے نہیں بلکہ اس کی آئندہ نسلوں کے ایمان واسلام کا بیج بھی مار دے شادی بیاہ کے تعلقات نے مذہب، روایات اور تہذیب وتمدن میں جو عظیم تبدیلیاں کی ہیں اس کی عملی مثالوں سے تاریخ اٹی پڑی ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے اندر بے شمار عقائد کی گمراہیاں ان عورتوں کے ذریعے پھیلی ہیں جو وہ دوسری بت پرست قوموں میں سے بیاہ لائے۔ اسی طرح ہمارے ہاں مغل سلاطین نے ہندو راجاؤں کے ہاں سیاسی مصالح کی خاطر جو شادیاں کیں تو ان کی لڑکیوں کے ساتھ ساتھ ان کے عقائد اوہام، رسوم اور عبادات کے طریقے بھی اپنے گھروں میں گھسا لائے۔ آج بھی جو لوگ قوموں کے امتیازی نشانات اور نظریات مٹانے کے درپے ہیں وہ اس کا سب سے زیادہ کارگر نسخہ آپس کی شادیوں کو سمجھتے ہیں

---

[1] تفہیم القرآن

وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ۖ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى
الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ
حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿۲۲۲﴾
نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۡ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ۭ
وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ۭ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲۲۳﴾

اور اے پیغمبر آپ سے لوگ عورتوں کے ایام ماہواری کے بارے میں دریافت کرتے ہیں ان سے کہہ دو کہ وہ ایک گندگی کی حالت ہے لہٰذا تم ان دنوں میں عورتوں سے علیحدہ رہو اور جب تک وہ ایام سے فارغ ہو کر پاک وصاف نہ ہو لیں ان کے قریب نہ جاؤ۔ اور پھر جب وہ پاک وصاف ہو جائیں تو ان کے پاس جاؤ اس طرح جیسا اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں بس جس طرح بھی چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ اور اپنے لیے مستقبل کا سامان کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ ایک روز

تمہیں اس کے حضور میں پیش ہونا ہے اور اے پیغمبر اہل ایمان کو خوش خبری دے دو۔[۲۲۳]

اس وجہ سے ایک مسلمان کو اس معاملہ میں بے پروا اور سہل انگار نہیں ہونا چاہیے بلکہ اس عظیم حقیقت کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے کہ جس ذاتِ گرامی پر وہ ایمان لایا ہے اس کی دعوت جنت کی طرف ہے اور جو لوگ ایمان سے محروم ہیں وہ دوزخ کے داعی ہیں[۱]

۲۴۶ - اللہ اپنے احکام بیان کر رہا ہے تاکہ لوگ نصیحت یاب ہوں۔ اس آیت میں فرمایا کہ اللہ اپنے احکام بیان کرتا ہے تاکہ لوگ نصیحت یاب ہوں۔ اصل ارشاد میں لعلھم یتذکرون آیا ہے۔ تذکر ذکر سے بنا ہے اس کے معنے نصیحت یاب ہونا، یاددہانی حاصل کرنا اور پہلی آیت کے آخر میں فرمایا تھا کہ اللہ تمہارے لیے احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم غور و فکر اور سوچ بچار سے کام لو۔ اصل ارشاد میں لعلکم تتفکرون آیا ہے۔ تفکر فکر سے بنا ہے۔ فکر یہ ہے کہ اللہ کی دی ہوئی عقل سے کام لیں اور سوچیں اور غور کریں۔ اس آیت سے پہلے چونکہ مصالح و منافع کا ذکر تھا اس لیے تفکر کی دعوت دی اور زیرِ نظر آیت میں چونکہ جنت کی طرف دعوت کا تذکرہ ہے اس لیے سوچنے کی نہیں بلکہ نصیحت پذیر ہونے کی تلقین کی ہے۔ گویا تفکر والی بات ایک فلسفی اور حکیم کا حکمت پر مبنی حکم ہے اور دوسری بات ایک زاہد اخلاقی کا وعظ ہے۔ واعظ ہمیشہ نصیحت اور عبرت کی تلقین کرتا ہے اور حکیم ہمیشہ تعقل اور تفکر کی دعوت دیتا ہے۔

ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ

تذکر نام ہے عمل کے فائدہ سے آشنا ہونے کا اور تفکر کہتے ہیں عمل کی علت اور مصلحت سے شناسائی کو۔ عامل کو اگر فائدہ معلوم نہ ہو تو عمل میں دوام نہیں ہوتا اور اگر حکم کی مصلحت کا پتہ نہ ہو تو اس میں دوسروں کو دعوت دینے کی ہمت نہیں ہوتی۔ اگر آپ حکم کی مصلحت اور علت جانتے ہوں گے تو آپ کو حالات سے مطابقت میں کبھی دشواری

---

[۱] تدبر قرآن

نہ ہوگی۔ شاید یہیں سے ہمارے فقہا نے یہ قاعدہ معلوم کیا ہے کہ مدارِ حکم وجود و عدم دونوں میں علت ہوتا ہے۔

ازدواجی تعلق اور پاکبازی کا حکم

قرآن زندگی کا مکمل دستور العمل ہے، وہی زندگی جس میں کھانا پینا، سونا، جنسی تعلقات، بچہ کا باپ یا ماں بننا سب کچھ داخل ہے۔ زندگی کا ہر شعبہ جو کچھ بھی تعلق تعمیر سیرت سے ہے اس کی بابت ہدایات و احکام وہ لازمی طور پر دے گا۔ وہ صرف ملفوظات کا مجموعہ نہیں بلکہ معاشیات سیاسیات، معاشرت، اخلاقیات، قانون غرض انفرادی و اجتماعی زندگی کے ہر شعبہ کا ایک ضابطہ ہے۔ ایامِ ماہواری سے متعلق یہ سوال مدینہ کی زندگی میں یہودیوں سے اختلاط کی وجہ سے رونما ہوا۔ سوال یہ نہیں ہے کہ ایامِ ماہواری میں عورتوں سے قربت جائز ہے کہ نہیں۔ کیونکہ اس زمانے عورت کے پاس جانا زمانہ جاہلیت کے عربوں میں بھی ناجائز تھا۔ اور تمام آسمانی مذاہب میں یہ ممنوع رہا ہے۔ سوال تو ان تشدیدات سے متعلق ہے جو یہودیوں نے اپنے توہمات سے زندگی پر عائد کر رکھی تھیں۔ ان تشدیدات کا اب بھی تورات کے ورقوں میں پتہ ملتا ہے۔ چنانچہ تورات کا تشدد ہی اس باب میں اپنی مثال آپ ہے۔ "عورت اپنے ایامِ ماہواری کے زمانے میں خود ہی ناپاک نہیں ہوتی بلکہ جو شخص یا جو چیز بھی اس سے چھو جاتی ہے وہ بھی ناپاک ہو جاتی ہے اور سلسلہ در سلسلہ یہ ناپاکی متعدی ہوتی جاتی ہے۔ جو کوئی اسے چھوئے گا شام تک نجس رہے گا اور جو کوئی اس کے بستر کو چھوئے اپنے کپڑے دھوئے اور پانی سے غسل کرے اور شام تک ناپاک رہے، اور جو کوئی اس چیز کو جس پر وہ بیٹھی ہے چھوئے اپنے کپڑے دھوتے اور پانی سے نہاتے شام تک ناپاک رہے۔ اگر مرد اس کے ساتھ سوتا ہے اور اس کی نجاست اس پر ہو تو وہ سات دن تک ناپاک رہے گا اور ہر ایک بستر جس پر وہ مرد سوئے گا ناپاک ہوگا" احبار ۱۵۔ ۱۹۔ ۲۴)

اُن کے یہاں یہی مسائل تقویٰ کا پیمانہ تھے۔ ان حالات میں یہ سوال خود بخود اُبھرا کہ عورت سے بچنے کے حدود کیا ہیں، اس کے لیے طہارت کے کیا آداب ہیں۔ اور طلاق و عدت کے مسائل میں حیض کی کیا اہمیت ہے

قرآن نے ان ہی مسائل کو موضوع بحث بنانے کے لیے سب سے پہلے ماہواری کے مسئلہ کو لیا اور اس کا جواب دیا۔ چونکہ اس سے پہلے عورتوں سے نکاح کا ذکر آچکا تھا اس لیے یہاں سوالنامہ کو پہلی بات کے ساتھ مربوط کرنے کے لیے حرف و لاتے ہیں۔ گویا مشرکین سے مناکحت کے بیان سے نکاح، طلاق اور ازدواجی زندگی کی مہمات کی طرف سلسلہ پھیر دیا ہے۔ مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی اور صحیح مسلم میں حضرت انس نے اس سوال کا جو پس منظر بتایا ہے اس میں بھی اس کی نشاندہی کی گئی ہے۔

حضرت انس کہتے ہیں کہ یہودی زمانہ حیض میں عورت کو کمرہ سے باہر رکھتے اس کے ساتھ کھانا پینا گوارا نہ کرتے اور نہ گھروں میں ان کو ساتھ رکھنا گوارا کرتے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو قرآن نے یہ جواب دیا۔

۴۴۶۔ اے پیغمبر لوگ آپ سے ایام ماہواری کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔

اصل ارشاد میں لفظ محیض آیا ہے۔ حیض کی طرح یہ بھی مصدر ہے اور مصدر میمی ہے۔ بطور ظرف بھی استعمال ہوتا ہے۔ یعنی مکان حیض اور زمانہ حیض۔ حیض وہ فاسد خون ہے جو مخصوص زمانہ اور مخصوص حالت میں تندرست جوان غیر حاملہ عورت کے رحم سے نکلتا ہے۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں حیض کہتے ہیں اس خون کو جو عورتوں کی عادت ہے۔ اس حالت میں مجامعت کرنا اور نماز روزہ سب حرام ہے۔ اور خلاف عادت جو خون آئے وہ بیماری ہے اس میں مجامعت نماز روزہ سب جائز ہے۔ اس کا حال ایسا ہے جیسا زخم یا فصد سے خون نکلنے کا۔ یہود اور مجوس حالت حیض میں ایک گھر میں رہنے کو جائز نہ سمجھتے تھے اور نصاریٰ مجامعت سے بھی پرہیز نہ کرتے تھے۔ آپ سے پوچھا گیا اس پر یہ آیت اتری۔ آپ نے صاف فرمادیا کہ مجامعت اس حالت میں حرام ہے اور ان کے ساتھ کھانا پینا رہنا سب درست ہے۔ یہود کا افراط اور نصاریٰ کی تفریط دونوں کی تردید ہو گئی۔

حیض کی مدت

حیض کی مدت میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام سفیان ثوری، امام ابویوسف اور امام محمد فرماتے ہیں کہ ایام ماہواری کم از کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس روز ہوتے ہیں۔ امام شافعی کی رائے میں کم از کم مدت ایک دن رات اور زیادہ سے زیادہ پندرہ

دن ہے۔

تین دن سے کم اور دس روز سے زیادہ جو خون آئے وہ حیض نہیں استحاضہ کہلاتا ہے۔ اگر جوان عورت کو خون آنا شروع ہوا اور وہ تین رات دن سے پہلے بند ہو گیا تو یہ استحاضہ سمجھا جائے گا کیونکہ حیض تین دن سے کم نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح اگر کوئی عادت والی عورت اپنی عادت سے زیادہ خون دیکھے اور عادت اس کی ہر ماہ دس سے کم کی ہو تو یہ زیادہ عرصہ بھی استحاضہ ہو گا۔

ایک بار جوان عورت کو حیض آنے سے عادت مقرر ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک عورت جس کو سات روز حیض آئے اور دوسری بار سات دن سے زیادہ ہو کر دس دن سے بڑھ جائے تو اس کا حیض سات دن ہو گا۔

۵۴۶۔ ان سے کہہ دو کہ وہ ایک گندگی ہے۔ طب قدیم اور جدید دونوں متفق ہیں۔ کہ یہ ایک خاص قسم کا ناقص خون ہے۔ رنگ و بو ترکیب عام خون سے الگ ہے۔ اصل میں اذیٰ کا لفظ استعمال ہوا ہے جس کے معنے گندگی کے بھی ہیں اور بیماری کے بھی۔ حیض صرف ایک گندگی نہیں ہے بلکہ طبی حیثیت سے وہ ایک ایسی حالت ہے جس میں عورت تندرستی کی بہ نسبت بیماری سے زیادہ قریب تر ہوتی ہے[1]

مقام اور موقع کی مناسبت سے یہاں معنے نجاست اور گندگی کے زیادہ مناسب ہیں۔ انداز خطاب اور مقتضائے سوال دونوں کی رُوح یہی ہے کہ یہاں اذیٰ سے مراد نجاست اور گندگی ہو۔ چونکہ مخاطب نجاستوں سے بچنے کو پہلے ہی مانتے ہیں اس لیے یہاں آئندہ حکم کے لیے بطور علت اسے پیش کر دیا۔ ایک ارشاد نبوت میں صراحۃً لفظ اذیٰ نجاست کے معنے میں استعمال ہوا ہے فرماتے ہیں:

جب تم میں سے کسی کے جوتے کو گندگی لگی ہو تو اُسے چاہیے کہ جوتے کو زمین سے رگڑ دے اور اس میں نماز پڑھ لے۔

اس ارشاد میں نجاست کے لیے لفظ اذیٰ آیا ہے اور حکم سے پہلے علت بیان اس لیے کی گئی ہے تاکہ قرآن کے مخاطبوں کا ذہن صاف ہو جائے کہ یہ حکم بربنائے تعبد نہیں بلکہ

---

[1] تفہیم القرآن

بر بنائے نجاست ہے۔

علیحدگی کی حد

۶۴۶ - لہٰذا تم عورتوں سے علیحدہ رہو اور جب تک وہ ایام سے فارغ ہوکر پاک وصاف نہ ہولیں ان کے قریب نہ جاؤ۔ پاک ہونے کی تفصیل یہ ہے کہ اگر حیض اپنی پوری مدت یعنی دس روز پر موقوف ہوا تو اسی وقت سے مجامعت جائز ہے۔ اور اگر دس روز سے پہلے ختم ہوگیا مثلاً چھ روز کے بعد اور عورت کی عادت بھی چھ روز کی تھی تو خون کے بند ہوتے ہی مجامعت دُرست نہیں ہے بلکہ جب غسل کرے یا نماز کا وقت ختم ہو جائے۔ اور اگر عورت کی عادت سات یا آٹھ دن کی تھی تو ان دنوں کے پورا کرنے کے بعد مجامعت دُرست ہوگی [1]

آیت میں عورت سے قربت کے لیے طہارت کو شرط قرار دیا ہے۔ اس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ قرآن میں اذیٰ کے معنے نجاست کے ہیں۔ اگر بیماری کے ہوتے تو یہ ارشاد نہ ہوتا کہ یہاں تک کہ پاک ہو جائیں۔ اسی پر عورت کے پاس نہ جانے کا حکم مرتب ہے۔

قرآن حکیم میاں بیوی کے جنسی تعلقات کو ہمیشہ استعاروں اور کنایوں میں بیان کرتا ہے اس لیے یہاں بھی الگ رہو اور قریب نہ جاؤ کی تعبیر اختیار کی ہے۔ مگر قریب نہ جانے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ حائضہ عورت کے ساتھ ایک بستر پر بیٹھنے یا ایک جگہ کھانا کھانے سے بھی احتراز کیا جائے۔ اور اسے زمانۂ حیض میں بالکل اچھوت بنا کر رکھ دیا جائے، جیسا کہ یہود ہنود اور بعض دوسری قوموں کا دستور ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جو تشریح فرمائی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس حالت میں صرف فعلِ مباشرت سے پرہیز کرنا چاہیے باقی تمام تعلقات بدستور رہیں [2]

صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی اور مسندِ احمد میں حضرت انس کے حوالے سے جو ارشاد آیا ہے اس میں اس بات کو کھول کر بتا دیا گیا ہے کہ سوائے فعلِ مباشرت کے کچھ بھی ناجائز نہیں ہے۔

---

[1] افادات شیخ الہند [2] تفہیم القرآن

حیض کے احکام

چونکہ آیتِ قرآنی میں عورت کے قریب نہ جانے کی علت نجاست بتائی گئی ہے اس لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کو ان تمام اعمال سے اس زمانہ میں روک دیا ہے جن کے لیے اسلام میں طہارت شرط ہے ۔

۱۔ عورت کے لیے اس زمانے میں نماز پڑھنا منع ہے ۔ اس موضوع پر ایک سے زیادہ ارشاداتِ نبوت آئے ہیں اور یہ مسئلہ اجماعی ہے یعنی اس پر اُمت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں ۔

۲۔ حالتِ حیض میں روزہ بھی ممنوع ہے ۔ اس پر بھی سب کا اتفاق ہے ۔ نماز اور روزے میں ایک باریک سا فرق ہے ۔ نماز کی قضا نہیں ہے اور روزے کی قضا ہے ۔ حافظ ابن المنذر اور امام نووی نے اس پر بھی پوری اُمتِ مسلمہ کا اجماع نقل کیا ہے کہ حیض والی عورت پر روزے کی قضا ہے نماز کی قضا نہیں ہے ۔

۳۔ بیت اللہ کا طواف اور مسجد میں داخل ہونا بھی ممنوع ہے ۔ ابوداؤد میں حدیث آتی ہے جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

میں مسجد کو جنبی اور حائض کے لیے جائز نہیں کرتا ۔

مطلب یہ ہے کہ حیض والی عورت کو مسجد میں داخل ہونے کی اجازت نہیں ہے ۔ حافظ ابن القیم نے تہذیب السنن میں ابن ماجہ کی حدیث بھی پیش کی ہے جس میں تصریح ہے کہ حضور انور نے یہ اعلان فرمایا :

لوگو! خبردار ہو جاؤ مسجد جنبی اور حیض والی عورت کے لیے حلال نہیں ہے ۔

حافظ منذری نے اس موضوع پر علماء کا اختلاف نقل کیا ہے ۔ امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کا مذہب تو یہی ہے کہ حیض والی عورت کے لیے مسجد میں داخل ہونا منع ہے اور یہی امام ثوری کی رائے ہے ۔

طواف کے موضوع پر صریح ارشادِ نبوت آیا ہے ۔ صحیح مسلم میں قاسم بن محمد کے حوالہ سے حضرت عائشہ کا بیان آیا ہے کہ میں حضور انور کے ساتھ حج میں ہمرکاب تھی ۔ ہم مقام سرف میں پہنچے ۔ مجھے ایام ماہواری شروع ہو گئے ۔ میں گریہ وزاری میں تھی کہ حضور تشریف لائے ۔ دریافت فرمایا کیا بات ہے کیوں رو رہی ہو ۔ میں نے عرض کیا کاش میں اس سال حج کو نہ آتی ۔

فرمایا وہ کیوں شاید تمہیں ماہواری کی شکایت ہو گئی ہے۔ بتایا کہ جی ہاں۔ فرمایا کوئی بات نہیں، یہ تو آدم کی بیٹیوں سے متعلق ناگزیر ہے۔ تم ایسا کرو کہ سب کچھ حاجیوں کے اعمال کرو لیکن بیت اللہ کا اس وقت تک طواف نہ کرنا جب تک پاک نہ ہو جاؤ۔

۴۔ حیض والی عورت کو قرآن کو ہاتھ لگانا اور قرآن پڑھنا بھی منع ہے۔ امام ترمذی نے اس موضوع پر عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پیش فرمایا ہے کہ جنبی اور حیض والی عورت قرآن نہ پڑھے۔

قرآن کو ہاتھ لگانے کے موضوع پر بھی متعدد احادیث آئی ہیں۔ سنن نسائی میں عمرو بن حزم کے حوالہ سے یہ بات بتائی گئی ہے کہ جو دستاویزات حضور انور نے اہل یمن کو روانہ کی تھیں اس میں ایک حکم یہ بھی تھا لا یمس القرآن الا طاهر قرآن کو صرف پاک شخص ہاتھ لگائے اور یہ قرآن کی آیت سے پہلے معلوم ہو چکا ہے کہ بحالت حیض عورت ناپاک ہوتی ہے۔ لہٰذا عورت کو بحالت نجاست قرآن کو چھونا جائز نہیں ہے [1]

یہ تمام احکام قرآن کی بیان کردہ قید حتیٰ یطھرن سے مستنبط ہیں۔

۲۲۲۔ پھر جب وہ خوب پاک صاف ہو جائیں تو اُن کے پاس جاؤ اس طرح جیسے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے یعنی جس موقعہ سے مجامعت کی اجازت دی ہے یعنی آگے کی راہ سے کہ جہاں سے بچہ پیدا ہوتا ہے دوسرا موقعہ یعنی لواطت حرام ہے [2]

ارشاد میں یطھرن اور تطھرن دو لفظ استعمال ہوئے ہیں۔ پہلا لفظ طہارت سے بنا ہے اس کے معنے پاک ہونا اور اس سے مراد ہے کہ عورت کی ناپاکی والی حالت ختم ہونا اور تطہیر اسی سے بنا ہے مگر اس کے معنے میں ذرا مبالغہ ہے یعنی عورت کا نہا دھو کر پاکیزگی کی حالت میں آجانا۔ عورت سے قربت کے لیے اصلی شرط تو طہارت ہے مگر اس کے ساتھ یہ بھی ارشاد ہے کہ جب وہ نہا دھو کر پاکیزگی حاصل کر لیں تب ان کے پاس جاؤ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ چونکہ قربت کی ممانعت کی اصلی علت نجاست ہے اس لیے نجاست کے ختم ہو جانے پر یہ پابندی ختم ہو جاتی ہے لیکن افضل اور اولیٰ یہ ہے کہ جب عورت نہا دھو کر پاک ہو جائے تب اس سے ملاقات کرو۔ اور شاید اس موضوع پر وہ قانونی تفصیل جو امام ابوحنیفہ نے کی ہے

---

[1] تفصیل کے لیے دیکھو نصب الرایہ ج ۱ ص ۱۹۸ نیل الاوطار ج ۱ ص ۲۰۰ [2] افادات شیخ الہند

اس کی اساس قرآن کا یہی نظریہ طہارت و تطہیر ہے کہ جس عورت کا خون دس روز آکر بند ہو گیا، اس سے بغیر غسل کے خون بند ہوتے ہی قربت جائز ہے اور جس عورت کا خون دس روز سے کم آکر بند ہوا ہو اگر اس کی عادت معروفہ کے خلاف بند ہوا ہے تو اس سے قربت جائز نہیں ہے جب تک عادت کا وقت نہ گزر جائے اور عادت کے موافق بند ہوا ہے تو جب تک غسل نہ کرے یا ایک نماز کا وقت نہ گزر جائے قربت جائز نہیں ہے۔ نماز کا وقت گزر جانے کے بعد بغیر غسل کے بھی قربت جائز ہے۔ شیخ ابن الہمام نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے [1]

کیا امر سے امر تکوینی مراد ہے؟

خلاصہ یہ ہے کہ خون بند ہونے اور عورت کے نہا دھو کر پاک ہونے کے بعد ان سے قربت کی اجازت ہے۔ ان کے پاس آؤ جہاں سے اللہ نے تم کو حکم دیا ہے۔ اصل ارشاد من حیث امرکم اللہ ہے۔ امر سے اللہ کا وہ حکم تکوینی اور فطری مراد ہے جو انسان اور حیوان سب کی جبلت میں ودیعت کیا گیا ہے اور جس سے انسان تو انسان حیوان بھی بالطبع واقف ہیں [2] آیت میں قرآن نے اللہ کی بنائی ہوئی انسان میں طبیعت اور فطرت کو امر اللہ کہا ہے۔ یہ انسان کی طبیعت ہے کہ کھانے کے لیے لقمہ منہ میں ڈالتا ہے آنکھ اور ناک میں نہیں ڈالتا۔ اللہ نے فطرت یہی بنائی ہے۔ جیسے یہ فطرت ہے اور اللہ کا امر طبعی ہے ایسے ہی عورت سے مقام نسل میں مجامعت کا عمل کرنا ایک فطری امر ہے اور اس کے خلاف کرنا درجہ حیوانیت سے گر جانے کے مترادف ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ تمام بدیہیات فطرت، اللہ کے اوامر میں شامل ہیں اور اس حیثیت سے وہ اسلامی شریعت کے اجزا ہیں۔ اگرچہ لفظوں میں خدا کی جانب سے حکم دیا گیا ہو یا نہ دیا گیا ہو [3]

یہ سید رشید رضا، صاحب تفہیم القرآن اور صاحب تدبر قرآن کی رائے ہے۔ لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ بلاشبہ اس امر الٰہی کی اس جگہ کوئی وضاحت نہیں کی گئی ہے۔ لیکن قرآن میں دوسرے مقامات پر اس کی پوری وضاحت کی گئی ہے۔ اسی سورۃ میں پہلے گزر چکا ہے۔

فالآن باشروھن وابتغوا ما کتب اللہ لکم۔ لہٰذا آپ اپنی بیویوں سے خلوت کرو اور جو کچھ

---

[1] فتح القدیر ج ۱ ص ۱۲۲ [2] تفہیم القرآن [3] تدبر قرآن

تمہاری ازدواجی زندگی میں اللہ نے تمہارے لیے ٹھہرا دیا اسے حاصل کرو۔

مباشرت کا یہی حکم ہے جو قرآن میں پہلے آچکا ہے۔ آیت قرآنی میں اسی کو امر کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے اور اس مباشرت کے ساتھ دوسرا حکم یہ تھا کہ جو کچھ تمہاری ازدواجی زندگی میں اللہ نے تمہارے لیے ٹھہرا دیا ہے اسے حاصل کرو یعنی اس عمل سے اصلی غرض قرآن کے نزدیک افزائش نسل اور حصول اولاد ہے۔ ابن کثیر نے اس معنے کی تائید میں عبداللہ بن عباس، ابوہریرہ، انس بن مالک جیسے صحابہ کرام سے لے کر قاضی شریح، مجاہد، حسن بصری، ضحاک، قتادہ، عکرمہ، عطاء، سعید بن جبیر وغیرہ تابعین تک سب کا اجماع نقل کیا ہے۔ گویا زیر نظر آیت کے اس فقرے میں قرآن نے امر سے باشروا اور من حیث سے ابتغوا ماکتب اللہ کی طرف بلیغ انداز میں اشارہ کر دیا اور بتا دیا کہ مباشرت کا طبعی نتیجہ جو نکلتا ہے اس کو پیش نظر رکھنا چاہیے اس لیے آیت میں امر تکوینی نہیں تشریعی ہے لیکن جیسے اتیان کا امر اباحت کے لیے ہے ایسے ہی پہلی آیت میں بھی مباشرت کا امر اباحت کے لیے ہے اور اسی کو یہاں امر کم اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

ظاہر و باطن کی صفائی

۸۴۶۔ اللہ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو بدی سے باز رہیں اور پاکیزگی اختیار کریں۔ یعنی جو توبہ کرتے ہیں گناہ سے جو ان سے اتفاقیہ سرزد ہوا مثلاً حالت حیض میں وطی کا مرتکب ہوا اور ناپاکی یعنی گناہوں اور وطی حالت حیض اور وطی موقع نجس سے احتراز کرتے ہیں [1]

توابین اس سیاق میں وہ لوگ ہیں جن سے قوانین کے باب میں کوئی اتفاقی خلاف ورزی ہو جائے اور وہ بعد کو توبہ کریں اور اپنی غلطی پر نادم ہوں۔ المتطہرین متطہرین اس سیاق میں وہ لوگ مراد ہیں جو عورت کی مواصلت سے اس کی طبعی ناپاکی کے زمانے میں محترز رہتے ہیں اسی لفظ سے فقہا نے اشارۃ النص سے یہ استنباط کیا ہے کہ جو اعمال صریحاً نجس ہیں مثلاً اغلام وہ سب حرام ہیں۔ صفائی و طہارت کی یہ روح قرآنی عام ہے اور اس کے تحت میں جسمانی اور ظاہری صفائی پوری طرح آجاتی ہے۔ اسلام کی اس لطافت پسندی، نظافت پسندی

[1] افادات شیخ الہند

طہارت پسندی کے مقابلے میں دوسرے سرے پر وہ مذاہب ہیں جن میں قرب الٰہی کا ذریعہ صفائی نہیں بلکہ جسمانی گندگی و غلاظت ہے، مسیحیت کی تاریخ میں صدیوں تک راہبوں کے لیے غسل یا جسم کی صفائی ایک مستقل معصیت رہی ہے۔ [1]

دراصل توبہ اپنے باطن کو گناہوں سے پاک کرنے کا نام ہے اور تطہیر اپنے ظاہر کو نجاستوں اور گندگیوں سے پاک کرنا ہے۔ گویا اللہ سبحانہ، مومن میں دونوں خصلتیں یعنی جسمانی صفائی اور روحانی پاکیزگی پسند فرماتے ہیں۔ جسم کی طہارت کی حد تک اسلام میں احداث سے طہارت، انجاس سے طہارت اور اوساخ سے طہارت پر زور دیا گیا ہے۔ اور بنیادی طور پر اس ظاہری طہارت کو باطنی طہارت کا ذریعہ بتایا ہے اور روحانی صفائی کے لیے نماز روزہ، حج اور زکوٰۃ جیسے اعمال مقرر ہیں۔ ان سب کا حاصل اللہ کی طرف رجوع ہے اور اللہ کی طرف رجوع کا نام ہی درحقیقت توبہ ہے۔ یاد آیا مرحوم مولانا محمد ادریس شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ قدس اللہ سرہ العزیز وفات سے دو روز قبل ضعف و نقاہت کی وجہ سے خود وضو نہ کر سکتے تھے۔ مولانا مشرف علی نے اس حالت میں وضو کرایا۔ وضو کے بعد نماز پڑھائی۔ نماز پڑھ کر ایک عجیب شادمانی کی حالت میں فرمایا بھائی مشرف تم نے دو کام کرائے ہیں ایک وضو دوسرے نماز، وضو کا حاصل طہارت ہے اور نماز کا حاصل توبہ ہے۔ میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ سبحانہ، تمہیں توابین اور متطہرین میں سے بنائے۔

شاید وضو کے آخر میں جو دعا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ترمذی میں اللھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطہرین کے اضافہ سے آئی ہے اسی آیت سے مستنبط ہے، اگرچہ امام ترمذی اس اضافہ کو روایتی نقطہ نظر سے مضطرب بتاتے ہیں لیکن دوسرے محدثین نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ اور ابن القیم نے زاد المعاد میں اسے صحیح مانا ہے فرماتے ہیں،

> وضو کے آغاز میں بسم اللہ کے علاوہ دوسرے اذکار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہیں۔ ہاں آخر میں یہ دعا ثابت ہے اشھد ان لا الہ الا اللہ واشھد ان محمداً عبدہ ورسولہ اللھم اجعلنی من التوابین واجعلنی من المتطہرین۔

---

[1] تفسیر ماجدی

۲۲۳۔ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں بس جس طرح چاہو اپنی کھیتی میں جاؤ۔ یہود عورت کی پشت کی طرف سے ہو کر صحبت کرنے کو ممنوع کہتے تھے اور کہا کرتے تھے کہ اس سے بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ آپ سے دریافت کیا گیا تو قرآن نے یہ جواب دیا کہ تمہاری عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتی ہیں جس میں نطفہ بجائے تخم اور اولاد بمنزلہ پیداوار کے ہیں۔ یعنی اس سے مقصود اصلی صرف نسل کا باقی رکھنا اور اولاد کا پیدا ہونا ہے۔ لہٰذا تمہارے اختیار تمیزی پر ہے کہ آگے سے یا کروٹ سے یا پس پشت سے پڑ کر یا بیٹھ کر جس طرح چاہو مجامعت کرو مگر یہ ضرور ہے کہ تخم ریزی اس خاص موقع میں ہو جہاں پیداواری کی امید ہو۔ یعنی مجامعت خاص فرج میں ہو۔ لواطت ہرگز ہرگز نہ ہو۔ یہود کا خیال غلط ہے کہ اس سے بچہ احول (بھینگا) پیدا ہوتا ہے[1]

اصل ارشاد میں حرث آیا ہے۔ حرث کہتے ہیں اس موضع زمین کو جس میں تخم ریزی ہوتی ہے اور اس میں سبزی غلہ نباتات کا نشو و نما ہوتا ہے۔ کھیت والے اسے اپنی بہت بڑی دولت سمجھ کر حد درجہ عزیز رکھتے ہیں۔ اسلام نے ہم بستری کا اصل مقصد طلب اولاد قرار دیا ہے اگرچہ اس کے دوسرے پہلو طلب لذت کو بھی نظر انداز نہیں کیا۔ یہاں کھیتی میں آنا کنایہ ہے عورت کے ساتھ صحبت کرنے سے۔ اور قرآن ایسے مواقع پر کنایات ہی سے کام لیتا ہے۔ کھیتی میں آنا کہہ کر اشارہ کر دیا ہے کہ یہ آنا اور داخلہ کھیتی میں ہونا چاہیے اور قبول تخم کے زمانے میں اور جگہ میں ہونا چاہیے نہ کہ اس کے علاوہ یعنی نہ زمانہ حیض میں ہونا چاہیے اور نہ بے محل ہونا چاہیے[2]

اس فقرے میں بیک وقت دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک تو اس آزادی، بے تکلفی، خود مختاری کی طرف جو ایک کھیتی کے مالک کو اپنی کھیتی کے معاملے میں حاصل ہوتی ہے دوسرے اس پابندی، ذمہ داری اور احتیاط کی طرف جو ایک کھیتی والا اپنی کھیتی کے معاملے میں ملحوظ رکھتا ہے۔ اس کی طرف حرث کا لفظ اشارہ کر رہا ہے اور پہلی چیز کی طرف انی شئتم کے الفاظ وہ آزادی اور یہ پابندی۔ یہ دونوں مل کر اس رویہ کو متعین کرتی ہیں جو ایک شوہر کو اپنی بیوی کے معاملے میں اختیار کرنا چاہیے[3]

---

[1] افادات شیخ الہند [2] ماجدی [3] تدبر قرآن

گویا بتا دیا گیا کہ اللہ سبحانہ نے عورتوں کو مردوں کے لیے سیر گاہ نہیں بنایا ہے بلکہ ان دونوں کے درمیان کھیت اور کسان کا سا تعلق ہے۔ کھیت میں کسان محض تفریح کے لیے نہیں جاتا بلکہ اس لیے جاتا ہے کہ اس سے پیداوار حاصل کرے۔ نسلِ انسانی کے کسان کو بھی انسانیت کی اس کھیتی میں اس لیے جانا چاہیے کہ وہ اس سے نسل کی پیداوار حاصل کرے۔ خدا کی شریعت کو اس سے بحث نہیں ہے کہ تم اس کھیت میں کاشت کس طرح کرتے ہو البتہ اُس کا مطالبہ تم سے یہ ہے کہ جاؤ کھیت ہی میں اور اس غرض کے لیے جاؤ کہ اس سے پیداوار حاصل کرنی ہے[1]

بیوی سے غیر فطری عمل قرآن کی نظر میں

انی شئتم میں انی کے معنے کیف اور این کے ہیں یعنی جس طرح کے جس کیفیت کے اور جدھر سے اور جس جہت سے۔ قرآن میں انیٰ کیف کے معنے میں آیا ہے جیسے انی یحیی ھذہ اللہ بعد موتھا یا پھر انی یکون لی غلم۔ اس آیت میں بھی قرآنیات کے بہترین ماہرین عبداللہ ابن عباس صحابی اور مجاہد، قتادہ، عکرمہ وغیرہ تابعین نے بھی یہی معنے بتلاتے ہیں۔ گویا اس آیت میں صاف صاف ان یہودیوں کی تردید کی جا رہی ہے۔ جو اس معاملہ کی نسبت وہم پرستیوں کا شکار ہو کر طرح طرح کی قیدیں اپنے پیچھے لگائے ہوتے تھے مثلاً کسی خاص طریقہ کو جائز سمجھتے تھے کسی کو ناجائز، کسی خاص طریقے میں برکت سمجھتے، کسی میں نحوست قرآن کی کوئی اصلیت نہیں جس طرح بھی چاہو فطری طریقہ سے یہ معاملہ کر سکتے ہو۔

بعض گندہ مذاق لوگوں نے انی کو این یعنی جدھر اور جس رُخ کے معنے میں لے کر اس کی تشریح میں اپنی گندہ سیرتی کے عجیب عجیب مظاہرے کیے ہیں۔ حالانکہ ظاہر ہے کہ مقام و محل میں کسی تبدیلی کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

قرطبی نے لکھا ہے کہ ان معنے کی اس آیت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ شیخین نے حضرت جابر کا جو بیان نقل کیا ہے وہ اس کی ہرگز اجازت نہیں دیتے۔ حضرت جابر فرماتے ہیں کہ یہودیوں کا خیال تھا اور وہ اس کا پرچار کرتے تھے کہ عورت سے صحبت پیچھے سے کی جائے تو بچہ بھینگا پیدا ہوتا ہے۔ قرآن نے ان کی وہم پرستی کی انی شئتم کہہ کر تردید کی ہے۔ لہذا یہ کہنا کہ اس

---

[1] تفہیم القرآن

فقرے کا معاذ اللہ مطلب یہ ہے کہ اپنی بیوی سے عمل لواطت بھی جائز ہے بہت بڑی بدذوقی ہے بلکہ ابن کثیر نے جمہور علماء کا مذہب یہ بتایا ہے کہ ایسا سوچنے والا بھی مسلمان نہیں ہے۔ احادیث میں ان لوگوں کے خلاف جو فطری حدود سے تجاوز کرتے ہیں بہت بڑی نفرت کا اظہار کیا گیا ہے۔ یہ احادیث مسند امام احمد، ابوداؤد، نسائی اور ترمذی میں موجود ہیں۔ مختلف الفاظ میں کم و بیش بارہ صحابہ کرام کے حوالہ سے آئی ہیں۔ ابوالفرج ابن الجوزی نے ایک رسالہ میں ان کو جمع کر دیا ہے۔ رسالہ کا نام تحریم المحل المکروہ ہے۔

قرآن نے کھیتی کے استعارے میں اس ناپاک مذاق کی تردید کر دی ہے۔ لوگوں نے خود امام مالک کے زمانے میں امام مالک کے بارے میں مصر میں جب یہ بے پرکی اڑائی کہ امام موصوف عورتوں سے اس معاملہ کو جائز بتاتے ہیں تو امام صاحب نے جب یہ بات سنی تو سنانے والے کو مخاطب کرکے فرمایا کہ یہ مجھ پر بہتان ہے! اور پھر جو بات فرمائی وہی سنانا چاہتا ہوں فرمایا کہ کیا تم عربی نہیں ہو اور کیا زبان آشنا نہیں ہو۔ اللہ پاک کا ارشاد ہے نساء کم حرث لکم کیا کھیتی اس جگہ بھی ہو سکتی ہے جہاں اُگنے کی صلاحیت نہیں ہو۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کا لفظ حرث ہی اس گندے ذہن کی تردید کے لیے کافی ہے انی شئتم کے معنے یہی ہیں کہ عورت سے مباشرت کے لیے کسی خاص ہیئت کسی خاص وضع کی پابندی نہیں۔ آزادی، بے تکلفی، خود مختاری کے ساتھ جیسے چاہے یہ معاملہ کرے۔ صرف یہ پیشِ نظر ہے کہ کھیتی ہو، ایسے مقام پر ہو جہاں قبول تخم کی صلاحیت ہو۔ حافظ ابن کثیر نے اس معنے پر امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل جیسے آئمہ فقہ اور اُن کے شاگردوں اور بہت سے تابعین کا اجماع نقل کرکے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ اس معنے سے تجاوز کرکے جواز تلاش کرنے والوں کا ان تمام علماء فقہاء نے شدت سے انکار کیا ہے بلکہ بعض نے اس کو کفر قرار دیا ہے۔

ذرا معاملے کے اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ قرآن نے خُونِ حیض کو نجاست قرار دے کر عورت سے زمانۂ حیض میں صحبت کو ناجائز قرار دیا ہے۔ گویا صحبت نہ کرنے کی علت قرآن کی نظر میں خُون کی نجاست ہے۔ ذرا انصاف فرمائیے جو قرآن مجامعت کے محل میں نجاست کی وجہ سے صحبت جائز نہیں سمجھتا کیا وہ یہ گوارا کر سکتا ہے کہ بے موقع اور بے محل میں پاخانے کی نجاست میں ملوث ہونے کی کسی کو اجازت دے معاذ اللہ معاذ اللہ

امام دارمی نے مسند میں واقعہ لکھا ہے کہ سعید بن یسار نے عبداللہ ابن عمر سے

دریافت کیا کہ اپنی باندیوں سے تحیض کا عمل کیا جا سکتا ہے؟ حضرت عبداللہ نے دریافت کیا کہ وہ کیا ہوتا ہے بتایا گیا کہ عورت کے ساتھ غیر فطری عمل۔ فرمایا کہ کیا کوئی مسلمان یہ کر سکتا ہے۔

۶۵۰- اور اپنے لیے مستقبل کا سامان کرو۔ یعنی اعمالِ صالحہ اپنے لیے کرتے رہو یا یہ کہ دلی سے اولادِ صالحہ مطلوب ہونی چاہیے محض حظِ نفس مقصود نہ ہو[1] بالفاظِ دیگر صحبت کے وقت اللہ کا نام لو تاکہ اولاد شیطان کے اثر سے محفوظ رہے اور نیک اولاد کی نیت کرو تاکہ آخرت کی کھیتی بنے اور تمہارے لیے دعا و استغفار کرے اور قیامت کے دن تمہارے کام آئے۔[2] صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد منقول ہے کہ جو شخص بیوی کے پاس جانے سے پہلے بسم اللہ، اللھم جنبنا وجنب الشیطان مارزقتنا پڑھ لیتا ہے اس کی اولاد شیطان سے محفوظ رہتی ہے۔

اصل ارشاد میں قدموا لانفسکم آیا ہے قدموا تقدیم سے ہے۔ اس کے معنے آگے روانہ کرنا یعنی اپنے لیے آگے روانہ کرو۔ آگے کیا روانہ کرو۔ اس معاملے میں قرآن خاموش ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں طاعات کی پابجائی اور منہیات سے اجتناب کی سوغات آگے روانہ کرو۔ قرطبی کہتے ہیں کہ قرآن نے اس بات کو کھول دیا ہے جس سے یہاں خاموشی اختیار رہے۔

ما تقدموا لانفسکم من خیر تجدوہ عند اللہ

اب مطلب یہ ہوا کہ اپنے لیے طاعات اور عملِ صالح آگے روانہ کرو۔ لیکن قرآن کی آیت عام ہے۔ اور آلوسی نے لکھا ہے کہ ہمیں اس عموم کو باقی رکھنا چاہیے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو مذکورہ بالا اوامر کے نتائج میں انسان کو زندگی کامیاب بنانے کے لیے پسندیدہ اور ناپسندیدہ جذبات سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ پسندیدہ یہ کہ ہر شخص کو چاہیے کہ اپنے اس عمل کو مستقبل کے لیے نافع بنائے اور شادی کے بعد انسان کے مستقبل کے سارے منافع کا راز اولادِ صالح میں ہے دُنیا میں بھی آخرت میں بھی۔ آخرت میں نفع اس لیے کہ باپ اولاد کے وجود میں آنے اور اس کے نیکوکار ہونے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اولادِ صالح باپ کا عمل ہوتا ہے۔ موت کے بعد اولاد کی دعا اس کو نفع بخش ہے۔ اور اولاد کے

---

[1] افاداتِ شیخ الہند　[2] معارفِ قرآن ص ۱-۳

صالح ہونے کا سارا مدار والد کی تربیت پر ہے۔ لہٰذا تقدیم کے عنوان سے یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ صرف ایک کسان کی حیثیت سے بیج بکھیرنا ہی تمہارا کام نہیں ہے اس کی نگرانی، اس کی رکھوالی، اس کی اچھی تربیت اور تربیت کی خاطر اچھی بیوی کا تلاش کرنا بھی تمہارے فرائض میں داخل ہے۔ اور دُنیا میں نفع اس لیے کہ اس سے تم نسل انسانی کے مستقبل میں اپنی جگہ محفوظ اور اس کے قیام و بقا میں اپنا حصّہ ادا کر سکو۔

بعض اہلِ تفسیر نے اس کی تشریح اس طرح بھی کی ہے کہ اس فقرے سے دو مطلب نکلتے ہیں اور دونوں کی یکساں اہمیت ہے۔ ایک یہ کہ اپنی نسل برقرار رکھنے کی کوشش کرو تاکہ تمہارے دُنیا چھوڑنے سے پہلے تمہاری جگہ دوسرے کام کرنے والے پیدا ہوں۔ دوسرے یہ کہ جس آنے والی نسل کو تم اپنی جگہ چھوڑنے والے ہو۔ اس کو دین، اخلاق اور آدمیت کے جوہروں سے آراستہ کرنے کی فکر کرو[1]

لیکن ہمارے نزدیک وہی تشریح موقعہ اور محل کے مناسب ہے۔

۱۵۶ ـ اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ ایک روز تمہیں اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ اس آیت کے ذریعے اس کی تاکید ہے کہ عین لذت کے وقت بھی اپنی عبدیت کو اپنی ذمہ داری کو بھول نہ جاؤ بلکہ ہو سکے تو اپنی لذتوں کو بھی عبادت بنا لو۔ اور اس کا طریق یہ ہے کہ تمہارے ہاتھ سے تقویٰ الٰہی کا سررشتہ کسی حال میں نہ چھوٹنے پائے واتقوا اللہ یعنی ہر حال میں ایامِ حیات کے ہر لمحہ میں تقویٰ الٰہی پر قائم رہو واعلموا انکم ملاقوہ میں تقویٰ پیدا کرنے کی آسان ترکیب یہ بتائی ہے کہ لقاءِ الٰہی کا استحضار رکھو اور یہ یقین کرو کہ تمہیں اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔ اور اس میں یہ تنبیہہ بھی ہے کہ اگر فرائض کے ادا کرنے میں تم نے بالارادہ کوتاہی کی تو اللہ باز پرس کرے گا۔ اور نہایت لطیف انداز میں یہ بھی سمجھا دیا کہ حالتِ حیض میں عورت سے صحبت کرکے اور عورت کے ساتھ غیر فطری تعلق پیدا کرکے اور بالآخر غلط کار عورت کو اپنی رفاقت میں لے کر زندگی گزارنے سے محتاط رہو۔ کیونکہ تمہیں اللہ کے حضور پیش ہونا ہے جہاں طاعت کے منافع سے تمہیں ہمدوش ہونا ہے اور نافرمانی کی تلخیاں بھی گوارا کرنی ہیں خلاصہ یہ ہے کہ اگرچہ تم اللہ کی ان حدود کو آج خلوت اور جلوت میں توڑ سکتے ہو اور تمہیں اس کی مہلت ملی ہوئی ہے لیکن یاد رکھو

---

[1] تفہیم القرآن

وَلَا تَجْعَلُوا اللّٰهَ عُرْضَةً لِّاَيْمَانِكُمْ اَنْ تَبَرُّوْا وَتَتَّقُوْا وَتُصْلِحُوْا
بَيْنَ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ
اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوْبُكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ۝
لِلَّذِيْنَ يُؤْلُوْنَ مِنْ نِّسَاۗىِٕهِمْ تَرَبُّصُ اَرْبَعَةِ اَشْهُرٍ ۚ فَاِنْ فَاۗءُوْ فَاِنَّ
اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَاِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَاِنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝

اور دیکھو ایسا نہ کرو کہ کسی کے ساتھ بھلائی کرنے، پرہیزگاری کی راہ اختیار کرنے اور لوگوں میں باہم صلح کرانے میں اللہ کے نام کو اپنی قسموں کیلئے نشانہ نہ بناؤ، یاد رکھو اللہ سننے والا دیکھنے والا ہے۔ اللہ تمہاری لغو اور بے ہودہ قسموں پر گرفت نہیں کرتا ہے لیکن اللہ پکڑ کرتا ہے اُن قسموں پر جو واقعی تم نے سمجھ بوجھ کر کھائی ہیں اور تمہارے دلوں نے کمائی ہیں اور اللہ بہت درگزر کرنے والا اور بُردبار ہے۔ جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس جانے کی قسمیں کھا لیتے ہیں اُن کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ اگر انہوں نے رجوع کر لیا تو اللہ معاف کرنے والا ہے مہربان ہے۔ اور اگر انہوں نے طلاق ہی

کی ٹھان لی تو یقین کر لیں کہ اللہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے ۔

کہ ایک روز تمہیں اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے جس کی آنکھیں تمہیں ہر جگہ دیکھ رہی ہیں اور جس کی پکڑ سے تمہیں کوئی بچا نہ سکے گا ۔

۶۵۲ - اے پیغمبر اہل ایمان کو بشارت دے دو۔ آیت میں اہل ایمان سے ارباب کمال مراد ہیں کیونکہ صحابہ کا ایمان صرف علم و تصدیق کے درجہ کا ایمان نہ تھا۔ ایمان کی اصل حقیقت جزم و یقین ہے۔ یہی یقین جب تک الفاظ کے قالب میں رہتا ہے ایمان کا وجود لفظی ہے۔ جب ترقی کر کے دل میں داخل ہو جاتا ہے تو ایمان کا وجود ذہنی ہے اور جب رسوخ کے بعد کیفیت شہود پیدا کر لیتا ہے تو اس کا وجود خارجی کہلاتا ہے۔ مرتبۂ احسان اسی کا نام ہے۔ بے خبری اور کم ہمتی کی وجہ سے اس مرتبہ کو صرف صوفیائے کرام کا حصّہ سمجھ لیا گیا ہے۔ گویا علماء اور عام مومنین کو اسے تلاش کرنا اپنی حدود سے تجاوز کرنا ہے جسے ہم صوفیا کا حصہ سمجھتے ہیں۔ قرآن کی زبان میں وہ ہی ایمان ہے اور ہر مسلمان پر فرض ہے کہ اس رنگ کے حاصل کرنے کے لیے پوری پوری جدوجہد کرے۔ اگر وہ اس راہ میں قدم نہیں اٹھاتا تو گویا وہ اپنے ناقص ایمان پر راضی رہتا ہے

ازدواجی زندگی کے احوال

ازدواجی زندگی سے تعلق رکھنے والے اور مختلف احوال و ظروف میں پیش آنے والے مسائل کا یہاں سے کافی دُور تک سلسلہ ہے۔ نکاح کے مسائل نے ایک طرف طلاق و نکاح سے متعلق بعض مناسب وقت مسائل کے بیان کے لیے تقریب پیدا کر دی۔ دوسری طرف عورتوں کے حقوق کے تحفظ کے تقاضے سے بعض احکام و ہدایات کے لیے نہایت سازگار فضا رونما ہو گئی اور قرآن کا قاعدہ ہے کہ جب ایک بات کے لیے موزوں حالات پیدا ہو جاتے تو بارش کی طرح کلام ایک وسیع دائرے میں لوگوں کے سامنے ظاہر ہو جاتا ہے۔ سب سے پہلے اس گمراہی کا ازالہ کیا کہ ازدواجی زندگی سے لوگ بے پرواہ ہو کر طرح طرح کی بے معنی قسمیں کھا لیتے ہیں اور پھر سمجھتے ہیں کہ رشتہ نکاح ٹوٹ گیا۔ ان ہی میں سے ایک صورت ایلاء کی ہے۔ ایلاء کو بیان کرنے کے لیے بطور تمہید پہلے عام قسموں کا ذکر کیا ہے ۔

۶۵۳۔ اور دیکھو ایسا نہ کرو کہ کسی کے ساتھ بھلائی کرنے، پرہیزگاری کی راہ اختیار کرنے اور لوگوں میں باہم صلح کرلنے میں اللہ کو اپنی قسموں کے لیے نشانہ نہ بناؤ۔ یعنی کسی اچھے کام نہ کرنے پر خدا کی قسم کھا بیٹھے مثلاً ماں باپ سے نہ بولوں گا، فقیر کو کچھ نہ دوں گا یا باہم کسی کی صلح نہ کراؤں گا۔ ایسی قسموں پر خدا کے نام کو بُرے کاموں کے لیے ذریعہ بنانا ہوا تو ایسا ہرگز مت کرو اور اگر کسی نے ایسی قسم کھائی تو اس کا توڑنا اور کفارہ دینا واجب ہے [1]

کسی جائز اور نیکی کی بات کے خلاف قسم

عرب جاہلیت کے جاہلانہ دستور میں ایک دستور یہ تھا کہ اللہ کی قسم کھا کر یہ کہہ بیٹھتے تھے کہ ہم فلاں فلاں کام نیکی اور تقویٰ کا نہ کریں گے۔ اور جب کوئی کہتا تو یہی عذر پیش کر دیتے کہ ہم تو اس کی قسم کھا چکے ہیں۔ ان اعمالِ خیر کا یوں بھی ٹوٹنا ہر صورت میں مذموم تھا چہ جائے کہ اللہ تعالیٰ کے نام گرامی اور اس کی قسم کو بجائے قربِ حق کے اس سے دوری کا ذریعہ بنا لیا جائے قرآن کی یہ آیت شعارِ جاہلی کی تردید ہے [2]

اللہ کو نیکی میں حجاب بنانے کا مطلب

آیت میں لفظ عرضۃ آیا ہے۔ عرضہ غرفہ کے وزن پر عربی میں متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے لیکن ان معانی میں سے دو زیادہ مناسب ہیں۔

اوّل یہ کہ عرضہ کو مانع اور رکاوٹ کے معنے میں لیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ذات گرامی کو کسی نیک کام اور اپنے درمیان رکاوٹ اور حجاب نہ بناؤ کہ کسی اچھے کام کے نہ کرنے پر اس کے نام کی قسم کھالو اور پھر نامِ خدا کی تعظیم کی خاطر اسے ترک کردو۔

ان معنے کی تائید آیت کے اس سببِ نزول سے بھی ہوتی ہے جسے ابن جریر نے بحوالہ ابن جریج پیش کیا ہے کہ مسطح نامی شخص جس کا تعلق فقراء مہاجرین سے تھا اور جو حضرت عائشہ کے واقعہ افک میں ملوث تھا۔ یعنی واقعہ کو ہوا دینے میں ان کا بھی حصہ تھا۔ حضرت ابوبکر ان کے اخراجات کی کفالت کرتے تھے لیکن اس واقعہ کے بعد حضرت ابوبکر نے مسطح کی امداد نہ کرتے

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] ماجدی

کی قسم کھالی، اسی کا ذکر سورۂ نور میں ان الفاظ میں آیا ہے۔

ولا یاتل اولوا الفضل منکم والسعۃ ان یؤتوا اولی القربیٰ

تم میں سے اربابِ فضل اور صاحبِ مقدرت اس بات کی قسم نہ کھا بیٹھیں کہ اپنے رشتہ داروں مساکین اور مہاجرین کی مدد نہ کریں گے۔

نیز ان معنے کی تائید صحیحین کی اس حدیث سے بھی معلوم ہوتی ہے جس میں حضورِ انور کا ارشاد ہے

جو کسی کام پر قسم کھالے پھر اسے معلوم ہو کہ دوسری بات اس سے بہتر ہے اُسے چاہیے کہ وہ ہی بات کرے جو بہتر ہو اور اپنی قسم کا کفارہ دے دے۔

ایک اور ارشاد ہے۔

بخدا انشاء اللہ میں کسی کام پر اگر قسم کھالوں اور مجھے دوسری بات اس سے بہتر معلوم ہو وہی بات کروں گا جو بہتر ہو اور اپنی قسم کا کفارہ دے دوں گا۔

ابن ماجہ میں حدیثِ عائشہ ہے۔

جو شخص بھی قطع رحمی اور معصیت پر قسم کھا بیٹھے اسے قسم توڑ دینی چاہیے۔ یہی نیکی ہے۔

اس موضوع پر اور بھی ارشادات آئے ہیں۔ انسان جلد بازی سے کارِ خیر نہ کرنے پر قسم کھا بیٹھتا ہے۔ اللہ کو یہ پسند نہیں ہے کہ اس کا اسم گرامی نیکیوں کے لیے حجاب ہو۔ اس لیے اس آیت میں اہلِ ایمان کو اس سے روک دیا۔

اللہ کی قسموں کا نشانہ بنانے کا مطلب

عرضہ کے دوسرے معنے ہدف اور نشانہ کے ہیں۔ اللہ کو قسموں کا ہدف اور نشانہ بنانے کا مطلب یہ ہے کہ جا و بیجا موقعہ، بے موقعہ، بے ضرورت اور لایعنی طور پر اللہ کی قسموں میں بہتات کی جائے، ایسا شخص یقیناً اُن اشرار اور بدکردار لوگوں میں سرِ فہرست ہے جن کا تذکرہ قرآن نے سورۂ القلم میں کیا ہے۔

ولا تطع کل حلاف مھین، ھماز، مشاء بنمیم، مناع للخیر، معتد، اثیم عتل، بعد ذالک زنیم۔

کہا نہ مانو ایسے شخص کا جو بہت قسمیں کھانے والا، بے وقعت طعنہ باز، چغلخور،

بھلائی کے لیے سب سے بڑی آڑ، ظلم و زیادتی میں بے باک، بداعمال، جفا پیشہ اور بداصل ہو۔

اللہ کے نام کو لایعنی قسموں کے لیے استعمال کرنا ایسا ہے جیسے کوئی شخص مچھر مارنے کے لیے بندوق استعمال کرے۔ اہل عرب میں دو باتیں خوبیوں میں شمار ہوتی تھیں۔ ایک قسمیں کھانا دوسرے قسموں کا پاس کرنا۔ ایک عربی شاعر نے ان دونوں کو ایک شعر میں اس طرح پیش کیا ہے۔

قلیل الالایا حافظ لیمینہ　　　　　　　وان سبقت منہ الالیۃ برت

قسمیں کم کھانے والا اور اپنی قسم کی نگرانی کرنے والا اور اگر قسم کھائے تو سچی ہو کر رہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں میں نے جھوٹی اور سچی کبھی کوئی قسم نہیں کھائی ہے۔

بہرحال دونوں معنے میں پہلے معنے کی رعایت سے حضرت عبداللہ ابن عباس سے آیت کی یہ تفسیر منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اپنی قسم کو خیر کے کام نہ کرنے کے لیے آڑ نہ بناؤ بلکہ کفارہ دے کر نیک کام کرو۔ یہی معنے مسروق، شعبی، ابراہیم نخعی، مجاہد، طاؤس، سعید بن جبیر، عطاء، عکرمہ، مکحول شامی، زہری، حسن، قتادہ، مقاتل، ربیع، ضحاک اور عطاء خراسانی نے بتائے ہیں۔ یہاں بھی معنے زیادہ چسپاں ہیں۔ یہ بات کہ اللہ کے نام کو کاسے میں حجاب، رکاوٹ اور آڑ نہ بناؤ۔ آگے اس فقرے میں بتایا گیا ہے ان تبروا وتتقوا وتصلحوا بین الناس۔ بر یعنی تقویٰ اور اصلاح باہمی۔ ان تین لفظوں میں اعمال خیر کی ساری قسموں کو سمیٹ دیا گیا ہے۔ بر کا لفظ زیادہ رفاہی اور فلاحی نیکیوں پر بولا جاتا ہے، والدین کی خدمت، غریبوں کی امداد، فقیروں کی دادرسی، مسافروں کی اعانت، رشتہ داروں کی ہمدردی، مسکینوں کی خبرگیری، مسجدوں، شفاخانوں، سڑکوں، مسافرخانوں، یتیم خانوں کی تعمیر جیسے امور کو بر کہتے ہیں اور تقویٰ ان نیکیوں پر بولا جاتا ہے جس پر خدا کی نافرمانی سے دامن داغدار نہ ہو۔ رہزنی، چوری کو ختم کرنا، آوارگی سے پردگی اور اخلاق باختگی کو دور کرنا اور وہ تمام راہیں جو اللہ کی نافرمانی کی طرف لے جانے والی ہوں ان پر قدغن کرنا تقویٰ ہے۔ اور اصلاح سے مراد معاشرہ میں افراد کا باہم میل جول ہے۔

اب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ رفاہی، فلاحی نیکیوں کو معاشرہ میں بروئے کار لانے برائیوں کو معاشرہ سے ختم کرنے اور معاشرے کے افراد میں باہم صلح و صفائی، اخوت بھائی چارہ، میل ملاپ قائم کرنے کے لیے جو اعمال کیے جاتے ہیں ان کو رد کرنے کے

اللہ کی قسموں کو آڑ بنانا کسی صورت میں درست نہیں ہے۔ آیت کو واللہ سمیع علیم پر ختم کیا ہے یعنی اس آیت پر عمل کرتے وقت تمہیں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ اللہ تمہاری زبانوں پر آئی ہوئی قسموں کو سنتا ہے اور قسموں کے نتائج کو خوب جانتا ہے اس لیے سوچ سمجھ کر منہ سے بولو اور دل میں ہر وقت اس کے لیے اخلاص رکھو۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں اگر کوئی قسم کھاتا ہے تو اللہ اس کو سنتا ہے اور اگر کوئی عظمت وجلالِ خداوندی کی وجہ سے قسم کھانے سے رکتا ہے تو اللہ اس کی نیت کو خوب جانتا ہے، تمہاری کوئی بات ظاہری اور باطنی اس سے مخفی نہیں ہے اس لیے نیتِ قلبی اور قولِ لسانی دونوں میں احتیاط لازم ہے۔

یہ آیت آگے بیان ہونے والے مسئلہ ایلاء کے لیے بطورِ تمہید آتی ہے۔ ایلاء خاص طرح کی قسم کو کہتے ہیں جیسے آگے آرہا ہے، لیکن قسم چونکہ تمام معاشرتی، سماجی اور سیاسی معاملات اور معاہدات میں اعتماد واستحکام کا ذریعہ ہے اور اس سے ہماری شہری زندگی کے نہایت اعلیٰ مقاصد پورے ہوتے ہیں اس لیے ایلاء، طلاق کے مسائل سے پہلے خود قسم کی اہمیت کو واضح فرما دیا[1]

قسم کے تفصیلی مباحث انشاء اللہ پارہ ہفتم کے آغاز میں آرہے ہیں۔

ارادی اور غیر ارادی قسمیں

۴ ۶ ۵ ۔ اللہ تمہاری لغو اور بیہودہ قسموں پر گرفت نہیں کرتا ہے لیکن اللہ ان قسموں پر گرفت کرتا ہے جو تم نے سمجھ بوجھ کر کھائی ہیں اور تمہارے دلوں نے کمائی ہیں۔ لغو اور بیہودہ قسم وہ ہے کہ منہ سے عادت اور عرف کے مطابق بے ساختہ اور ناخواستہ نکل جائے اور دل کو خبر تک نہ ہو۔ ایسی قسم کا نہ کفارہ ہے نہ اس میں گناہ ہے۔ البتہ اگر کوئی بالقصد الفاظِ قسم مثل واللہ اور باللہ کہے اور اس سے محض تاکید مقصود ہو قسم کا قصد نہ ہو تو اس پر ضرور کفارہ لازم آئے گا[2]

قسم کی تین قسمیں ہیں ان میں سے ایک قسم یمین لغو ہے۔ لغو کے دو معنی ہیں۔ ایک تو یہ کہ کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم بلا ارادہ نکل جائے۔ یا نکلی تو ارادے سے مگر اس کو

---

[1] تدبر قرآن [2] افاداتِ شیخ الہند

اپنے گمان میں سچ سمجھ رہا ہے۔ مثلاً رشید گھر میں آچکا ہے۔ لیکن اس کو خبر نہ تھی اور قسم کھا لی کہ وہ نہیں آیا تھا۔ یا آئندہ بات پر اس طرح قسم نکل گئی کہ کچھ کہنا چاہتا تھا کچھ اور بے ارادہ مُنہ سے قسم نکل گئی۔ اس میں گناہ نہیں ہوتا اور اس کو اسی بنا پر لغو کہا جاتا ہے کہ گناہ کے بارے میں یہ ساقط الاعتبار ہے اور اس کے مقابلے میں جس پر مواخذہ ہونے کا ذکر فرمایا ہے یہ وہ قسم ہے جو بالارادہ جھوٹی سمجھ کر کھائی ہو اس کو غموس کہتے ہیں۔ اس میں گناہ ہوتا ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ کے نزدیک کفارہ نہیں ہوتا اور ایسے ہی معنے مذکور کے لحاظ سے لغو میں بھی بدرجہ اولیٰ کفارہ نہیں اس آیت میں ان ہی دونوں قسموں کا بیان ہے۔

دوسرے معنے لغو کے یہ ہیں کہ جس پر کفارہ نہ ہو اور اس کو لغو کہنے کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا میں اس پر قانونی مواخذہ نہیں ہے اور لغو با ہیں معنے غموس کو بھی شامل ہے کیونکہ کفارہ یعنی قانونی مواخذہ نہیں ہوتا اگرچہ گناہ ہوتا ہے [1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لایؤاخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم ولکن یؤاخذکم بما کسبت قلوبکم کے مقابلہ پر ذکر فرمایا ہے اور دل کی کمائی سے بالاتفاق کذب اور گناہ کا ارادہ مراد ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ یمین لغو جو ما کسبت قلوبکم کے مقابلے میں مذکور ہے اس سے مراد یہی ہے کہ جس قسم میں جھوٹ کا ارادہ نہ ہو بلکہ اپنے گمان میں سچ سمجھا ہو لیکن واقع میں جھوٹ ہو، وہ یمین لغو ہے جس میں کوئی مواخذہ نہیں نہ گناہ اور کفارہ، عبداللہ ابن عباس، مجاہد اور ابراہیم نخعی سے یہی تفسیر منقول ہے [2]

لغو قسموں کو اگرچہ مواخذہ سے مستثنیٰ رکھا ہے کیونکہ اللہ کی ذات غفور اور حلیم ہے لیکن اس کو لغو سے تعبیر کرکے واضح کر دیا کہ بلند اخلاق اور پاکباز لوگوں کو اس سے بچ کر رہنا چاہیے۔ قرآن میں شائستہ لوگوں کے اوصاف میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ ھم عن اللغو معرضون وہ لغو چیزوں سے احتراز کرتے ہیں [3]

ابوبکر الجصاص نے اس موقعہ پر ایک مفید بحث سپردِ قلم فرمائی ہے کہ جیسے اللہ سبحانہٗ نے قرآن پاک میں مختلف مواقع پر لفظ لغو استعمال کیا ہے اور ہر موقعہ پر معنے لغو مقام اور موقع کے لحاظ سے الگ ہیں۔ مثلاً بُری بات کے معنے میں لا تسمع فیھا لاغیۃ،

---

[1] بیان القرآن [2] معارف قرآن م ا [3] تدبر قرآن

بیکار کے معنے میں اذا مروا باللغو مروا کراما۔ ایسے ہی سلف صالحین سے لغو یمین کے بھی ایک سے زیادہ معانی منقول ہیں۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ یمین لغو یہ ہے کہ آدمی کسی بات پر قسم کھائے کر وہ ہے اور وہ جانتا ہو کہ ہے اور واقع میں نہ ہو۔ یہی معنے امام مجاہد اور ابراہیم نخعی سے منقول ہیں اور حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ یمین لغو یہ ہے کہ دوران گفتگو بطور تکیہ کلام لاواللہ، بلی واللہ بولا جاتے۔ ہمارے نزدیک اس کا منشا ماضی پر قسم کھانے سے روکنا ہے۔ چنانچہ حضرت عطاءؒ نے حضرت عائشہ سے منسوب کر کے بتایا ہے کہ آدمی کا یہ کہنا بخدا ہم نے ایسا کیا تھا اور بخدا ہم نے ایسا نہ کیا تھا یمین لغو ہے۔ امام حسن بصری اور امام شعبی نے بھی یہی معنے بتاتے ہیں۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ یمین لغو یہ ہے کہ آدمی حرام پر قسم اٹھاتے۔ چونکہ یمین لغو میں ان سب معانی کی گنجائش ہے اور سب جانتے ہیں کہ قرآن میں ولکن یواخذکم بما کسبت قلوبکم کا عطف ایمان لغو پر ہے۔ دل کی کمائی یہی ہے کہ جھوٹ اور گناہ پر مشتمل قسم ہو، اس لیے ضروری ہے کہ اس میں مواخذہ سے آخرت کا مواخذہ مراد ہے[1]

ایلاء اور اس کا حکم

۶۵۵- جو لوگ اپنی عورتوں کے پاس جانے کی قسمیں کھا لیتے ہیں ان کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ یعنی اگر کوئی قسم کھائے کہ میں اپنی عورت کے پاس نہ جاؤں گا تو اگر چار مہینے کے اندر عورت کے پاس گیا تو قسم کا کفارہ دے گا اور عورت اس کے نکاح میں رہے گی۔ اور اگر چار مہینے گزر گئے اور اس کے پاس نہ گیا تو عورت پر طلاق ہو جائے گی۔ شریعت میں ایلاء یہ ہے کہ عورت کے پاس جانے سے چار ماہ یا زائد کے لیے بلا قید مدت قسم کھائے، اور چار ماہ سے کم ایلاء نہ ہوگا۔ ایلا کی تینوں صورتوں میں چار مہینے کے اندر عورت کے پاس جائے گا تو کفارہ قسم کا دینا پڑے گا ورنہ چار ماہ کے ختم پر بلا طلاق ہی عورت مطلقہ بائنہ ہو جائے گی[2]

قسموں کے بارے میں تمہید کے بعد اب ایک ایلاء کا حکم بیان ہو رہا ہے جس میں قسم کو بنیادی اور اصلی حیثیت حاصل ہے۔ عرب میں دستور تھا کہ جب بیوی سے ناراض ہوتے تو یہ قسم کھا لیتے کہ اب میں تیرے پاس نہ آؤں گا۔ زمانۂ جاہلیت میں عورتوں کو ستانے کا ایک

---

[1] احکام القرآن [2] افادات شیخ الہند

طریقہ تھا۔ اس سے عورت نہ بیوہ ہوتی اور نہ خاوند والی۔ عربی میں اس طرح کی قسم کے لیے لفظ ایلا آیا ہے۔ یہ الو سے افعال کے وزن پر مصدر ہے۔ الو کے لغوی معنے کسی کام میں کوتاہی کرنے اور کمی کرنے کے ہیں۔ یہ عرب میں زمانۂ جاہلیت کی اصطلاح ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ شوہر اپنی بیوی سے جنسی تعلقات نہ رکھنے کی قسم کھا لیتا ہے۔ چونکہ اس کے مفہوم میں چھوڑ دینا موجود ہے اس لیے قطع تعلق کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اسلام نے بھی اسے چند اصلاحات کے ساتھ باقی رکھا ہے۔

اگر کوئی قسم کھائے کہ اپنی بیوی سے صحبت نہ کروں گا۔ اس کی چار صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی مدت مقرر نہ کرے، دوسرے یہ کہ چار ماہ کی قید لگا دے، سوم یہ کہ چار ماہ سے زیادہ کی قید لگا دے، چہارم یہ کہ چار ماہ سے کم کی مدت کا نام لے۔ پہلی دوسری اور تیسری صورت کو اسلام کی قانونی زبان میں ایلا کہتے ہیں۔ اور اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار ماہ کے اندر اپنی قسم توڑ لے اور بیوی کے پاس چلا آوے تو قسم کا کفارہ دے گا اور نکاح نہ ٹوٹے گا۔ اور اگر چار ماہ گزر جائیں اور قسم نہ توڑی ہو تو اس کی عورت پر طلاق بائن پڑ جائے گی یعنی بغیر نکاح صلح نہیں ہو سکتی ہے۔ اور چوتھی صورت کا حکم یہ ہے کہ اگر قسم توڑ دے تو کفارہ لازم ہو گا اور اگر قسم پوری کر لی تو نکاح پر کوئی اثر نہ ہو گا[1]

اس قسم کی قسم چونکہ ازدواجی مقاصد کے خلاف اور بر و تقویٰ کے منافی ہے۔ اس سے بیوی بالکل معلق ہو کے رہ جاتی ہے اس وجہ سے اسلام نے اس طرح کی قسم کھانے والوں کے لیے چار ماہ کی مدت مقرر کی ہے کہ اس کے اندر وہ بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لیں۔[2]

آیت میں چونکہ ایلا کا لفظ استعمال ہوا ہے اور لفظ ایلا قانون کی زبان میں عورت کے پاس نہ جانے پر اس قسم کو کہتے ہیں جس کے نتیجے میں مدت گزر جانے پر میاں اور بیوی کے درمیان طلاق ہو جائے اس لیے فقہائے صحابہ میں سے حضرت علی اور عبداللہ ابن عباس نے یہ سمجھا ہے کہ اگر بچے کے دودھ پلانے کی خاطر بیوی کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی تو ایلاء نہ ہو گا لیکن عبداللہ بن عباس سے یہ بھی منقول ہے کہ بیوی سے صحبت نہ کرنے کی ہر قسم

---

[1] بیان القرآن [2] تدبر قرآن

ایلاء ہے چاہے رضا کی حالت میں یا غصہ کی حالت میں۔ ائمہ تابعین میں سے ابراہیم نخعی، امام ابن سیرین اور امام شعبی کا بھی یہی خیال ہے۔ اور چونکہ ایلاء کے مفہوم میں قسم کھا لینا داخل ہے اس لیے فقہائے احناف اور شوافع نے اس آیت کا منشا یہ سمجھا ہے کہ عورت کے پاس نہ جانے پر قسم کھانے پر اس حکم کا اطلاق ہوگا۔ باقی قسم کھائے بغیر تعلقات منقطع کر لینا تو یہ خواہ کتنی ہی طویل مدت کے لیے ہو ایلاء نہیں ہے۔ لیکن فقہائے مالکیہ کی رائے میں صرف ترکِ تعلق ہی پر بشرطیکہ مدت چار ماہ ہو ایلاء کا اطلاق ہوگا خواہ قسم کھاتے نہ کھائے۔

۶۵۶۔ قرآن کے لیے چار ماہ کی مدت ہے۔ اگر چار مہینے سے کم پر قسم کھائی تو یہ ایلاء شرعی نہیں ہے۔ آیت میں چونکہ چار مہینے کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں اس لیے فقہا میں، امام ابوحنیفہ امام ابو یوسف اور امام محمد اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے زن شو کا تعلق نہ رکھنے کی اپنی بیوی سے چار ماہ کی قسم کھائی تو یہ ایلا ہوگا۔ اگر اس مدت میں قسم نہ توڑی اور مدت گزر گئی تو طلاق بائنہ پڑ جائے گی۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ زمانۂ جاہلیت میں چونکہ سال دو سال کا ایلا کرتے تھے اس لیے اللہ پاک نے چار ماہ کی مدت مقرر فرمادی، اس سے کم مدت پر ایلاء نہیں ہوگا۔ مگر امام مالک اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر چار ماہ کے لیے قسم کھائی تو ایلا نہ ہوگا اس سے زیادہ کی مدت پر قسم سے ایلا ہوگا۔

۶۵۷۔ اگر انہوں نے رجوع کر لیا تو اللہ معاف کرنے والا ہے، مہربان ہے۔ یعنی اگر قسم توڑ کر چار ماہ کے اندر اندر اپنی بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لیں تو اللہ مغفرت کرنے والا مہربان ہے۔ یعنی ان کی یہ قسم ایک حق تلفی پر مبنی تھی اور قسم کو کسی حق تلفی کے لیے سپر بنانا جائز نہیں لیکن اصلاحِ حال کے بعد اللہ تعالیٰ اس کوتاہی کو معاف فرما دے گا

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ چار ماہ کی مدت میں اگر رجوع کر لیا تو قسم کا کفارہ بھی دینا پڑے گا یا نہیں۔ کچھ فقہاء حسن بصری اور ابراہیم نخعی کی رائے یہ ہے کہ اس پر کفارہ نہیں ہے کیونکہ یہاں کفارے کا کوئی ذکر نہیں ہے لیکن اکثر فقہاء امام مالک، امام شافعی، امام ابوحنیفہ بھی فرماتے ہیں کہ اس پر کفارہ ہے۔ یہاں اگرچہ کفارے کا ذکر نہیں ہے مگر قرآن نے قسموں کے توڑنے کے بارے میں جو ساتویں پارے میں عام ضابطہ بیان کیا ہے اس میں کوئی استثنا نہیں ہے۔ اس لیے کوئی وجہ نظر نہیں آتی کہ اس

وَالْمُطَلَّقٰتُ يَتَرَبَّصْنَ بِاَنْفُسِهِنَّ ثَلٰثَةَ قُرُوْٓءٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَهُنَّ اَنْ
يَّكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللّٰهُ فِيْٓ اَرْحَامِهِنَّ اِنْ كُنَّ يُؤْمِنَّ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ وَبُعُوْلَتُهُنَّ اَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِيْ ذٰلِكَ اِنْ اَرَادُوْٓا
اِصْلَاحًا ؕ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِيْ عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۪ وَلِلرِّجَالِ
عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ رکوع ۱۲

اور جن عورتوں کو طلاق مل جائے تو ان کو ایام ماہواری کے تین مہینوں تک انتظار کرنا چاہیے۔ اُن کے لیے روا نہیں ہے کہ جو کچھ اللہ نے اُن کے پیٹوں میں پیدا کیا ہو اُسے چھپائیں اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتی ہیں، اور اُن کے شوہر اُن کی واپسی کے زیادہ حقدار ہیں اگر وہ عدت کے اندر اصلاحِ حال پر تیار ہو جائیں، اور یاد رکھو عورتوں کے لیے بھی اسی طرح کے حقوق مردوں پر ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر ہیں۔ ہاں مردوں کو عورتوں پر ایک خاص درجہ دیا گیا ہے اور اللہ زبردست حکمت والا ہے۔

صورت کو اس ضابطہ سے مستثنیٰ کیا جائے۔

امام مالک، امام شافعی کے خیال میں اگر ایلاء کرنے والا چار ماہ گزرنے کے بعد رجوع کرے گا تو صحیح ہے لیکن امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ اگر چار ماہ کے اندر اندر رجوع کرے گا تو درست ہے چار ماہ گزرنے پر رجوع معتبر نہ ہوگا۔

امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک محض چار ماہ گزرنے سے طلاق نہ پڑے گی، چار ماہ گزر جانے کے بعد قسم کھانے والا یا تو طلاق دے یا رجوع کرے، طلاق ہونا اس کے طلاق دینے پر موقوف ہے اور اگر نہ طلاق دے نہ رجوع کرے بلکہ سکوت کرے تو عدالت اس سے طلاق دلائے گی۔ لیکن امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر چار ماہ بغیر رجوع کے گزر گئے تو اس پر طلاق پڑ جائے گی خواہ شوہر طلاق دے یا نہ دے۔ [1] صحابہ میں حضرت عثمان، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت کے نزدیک رجوع کا موقعہ چار ماہ کے اندر ہے۔ اس مدت کا گزر جانا اس بات کی دلیل ہے کہ شوہر نے طلاق کا عزم کر لیا ہے اس لیے مدت گزرتے ہی طلاق پڑ جائے گی۔ اور یہ طلاق بائن ہوگی یعنی دورانِ عدت میں شوہر کو رجوع کا حق نہ ہوگا۔ ہاں اگر دونوں چاہیں تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ حضرت عمر، حضرت علی اور حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی ایک قول اسی معنے میں منقول ہے۔ [2]

طلاق اور اس کے احکام

اسلام سے پہلے دنیا میں طلاق سے متعلق عجیب افراط و تفریط قائم تھی۔ افراط یہودیوں میں اور تفریط کا شکار مسیحی تھے۔ یہودیوں میں نہ طلاق پر کوئی قید تھی اور نہ شوہر پر اس باب میں کوئی ذمہ داری تھی۔ اس کا جب جی چاہتا وجہ بلاوجہ طلاق نامہ لکھ کر بیوی سے چھٹکارا حاصل کر لیتا۔ بیوی اسی وقت دوسرا مرد کر سکتی تھی۔ توریت کے قانون کے الفاظ یہ ہیں:

"اگر کوئی مرد کوئی عورت لے کر اس سے شادی کرے اور بعد اس کے ایسا ہو کہ وہ اس کی نگاہ میں عزیز نہ ہو اس سبب سے کہ اس نے اس میں کوئی پلید بات پائی تو وہ اس کا طلاق نامہ لکھ کر اس کے ہاتھ دے اور اسے اپنے گھر سے باہر کر دے اور جب وہ اس کے گھر سے نکل گئی تو جا کے

---

[1] معارف قرآن م ا　[2] تفہیم القرآن

دوسرے مرد کی ہو وے (استثنا ۲۴-۲۰۱)

اس آزادی اور بے قیدی کے مقابلے میں مسیحیوں نے یہ سختی اور تنگی اختیار کی کہ زن شو میں کوئی گنجائش ہی نہ رکھی۔ انجیل کے الفاظ میں جسے خدا نے جوڑا دیا ہے اُسے آدمی جُدا نہ کرے۔ جو کوئی اپنی بیوی کو چھوڑ دے اور دوسرے سے بیاہ کرے وہ اس پہلی کے خلاف زنا کرتا ہے اور اگر عورت اپنے شوہر کو چھوڑ دے اور دوسرے سے بیاہ کرے تو وہ زنا کرتی ہے۔ (مرقس ۱۰-۷، ۱۲- میں نہیں بلکہ خداوند حکم دیتا ہے کہ بیوی شوہر سے علیحدہ نہ ہو (ا-کرنتھیوں ۷-۱۰)۔ چنانچہ مسیحی آبادی کے سوادِ اعظم یعنی فرقہ کیتھولک کے نزدیک تو طلاق مطلقاً ناجائز ہے اور بجز موت کے کوئی صورت میاں بیوی میں جُدائی کی ممکن نہیں ہے۔ اور یہی فرقہ اسلام سے پہلے موجود تھا۔ پروٹسٹنٹ فرقہ اسلام سے صدیوں بعد پیدا ہوا۔ اس کے ہاں البتہ اجازت ہوتی ہے لیکن صرف اس صورت میں کہ پہلے عدالت میں کسی ایک فریق کا ارتکاب زنا یا ظلم وجور ثابت ہو۔ یہ حال اُن قوموں کا تھا جو اپنے کو کتابی کہتے تھے۔ باقی رہیں قدیم جاہلی اور مشرک مہذب ترقی یافتہ قومیں سو ایک طرف یونانیوں میں ہندوؤں میں اور ایک عہد خاص تک رومیوں میں طلاق سے کوئی واقف ہی نہ تھا بلکہ ہندو مذہب میں تو آج تک طلاق ناجائز ہے۔ دوسری طرف رومیوں میں عہد جمہوریت کے خاتمہ پر طلاق کے جائز ہونے کے ساتھ ہی اس کا جوز ور بندھا۔ تو گویا شرافت اور طلاق لازم وملزوم ہو گئے۔ دُنیا کے دوسرے بڑے بڑے مذہبوں اور بڑی بڑی مہذب قوموں کی یہ بے اعتدالیاں اور افراتفریاں اگر پیش نظر رہیں تو پھر قرآن کے قانون کی حکمتوں اور اس کے پیدا کیے ہوئے توازن و اعتدال کی قدر ہو گی۔ اسلام نے فطرتِ بشری کا بالکل صحیح اندازہ کر کے یہ حکم دیا کہ جب زوجین میں ناموافقت لا علاج حد تک پہنچ جائے اور اس ناموافقت کے اسباب کا احاطہ واستقصا ممکن ہی نہیں۔ ہر شخص کے لیے الگ الگ ایک سبب ہوتا ہے اور دوسری صورتیں موافقت پیدا کرنے کی ناکام ہو جائیں تو آخری علاج یہ ہے کہ فریقین ہنسی خوشی اور باضابطہ معاہدۂ نکاح کو فسخ کر کے ایک دوسرے سے مستقل علیحدگی اختیار کر لیں اسی کا اصطلاحی نام طلاق ہے اور اس انقطاعی عمل کو آزاد نہیں چھوڑا ہے بلکہ اس پر متعدد پابندیاں عائد کر دی ہیں۔ ان آیات میں ان ہی قیود و شرائط کا ذکر آ رہا ہے[1]

---

[1] ماجدی

۶۵۸ - اور جن عورتوں کو طلاق مل جائے ۔ تو اصل ارشاد میں المطلقات آیا ہے ۔ لفظ اگرچہ عام ہے مگر یہاں مراد وہ خاص عورتیں ہیں کہ جو آزاد ہوں، لونڈی اور باندی نہ ہوں اور ان کو حیض بھی آتا ہوں، نابالغ اور حاملہ نہ ہوں اور ان سے صحبت یا خلوت صحیحہ بھی ہو چکی ہو [1] گویا یہاں احکام صرف آزاد شوہر دیدہ بیویوں کے بیان ہوں گے، دوسری قسم کی عورتوں کے احکام دوسرے مقامات پر قرآن میں ملیں گے [2]

آیت میں قرءٔ سے مراد اور اس کی لغوی تحقیق

۶۵۹ - تو ان کو ایام ماہواری کے تین مہینوں تک انتظار کرنا چاہیے، ایام ماہواری کے لیے قرآن میں لفظ قروء استعمال ہوا ہے ۔ یہ قرءٔ کی جمع ہے اس کے معنے کی تعیین میں اہلِ لغت میں اختلاف ہے بعض نے اس کے معنے حیض کے کیے ہیں اور بعض نے طہر اس کے اصل معنے ابن قتیبہ نے وقت کے بتاتے ہیں بلکہ علامہ ابن العربی نے اس پر اہلِ لغت کا اتفاق نقل کیا ہے لیکن اس سے میعاد کا آغاز بھی مراد ہو سکتا ہے اور انجام بھی' دونوں مفہوم ایک دوسرے کے متضاد ہیں، لغت عرب میں دونوں مختلف ہیں ۔ امام رازی نے ابو عبیدہ سے نقل کیا ہے کہ یہ لفظ کلام عرب میں اضداد سے ہے اس لیے یہاں بھی اہل شرح و تفسیر کے دو گروہ ہوتے ہیں ۔ ایک جماعت نے طہر کے معنے کیے ہیں، حضرت عائشہ سے بھی یہی معنے مروی ہیں اور امام شافعی کا یہی مذہب ہے ۔ لیکن دوسری طرف حضرت عمر، حضرت علی، حضرت ابن عباسؓ حضرت ابن مسعود، حضرت ابو موسیٰ جیسے تیرہ صحابہ سے منقول ہے کہ یہاں قرءٔ سے حیض مراد ہے ۔ امام سفیان ثوری، امام اوزاعی، امام ابوحنیفہ کا یہی مذہب ہے ۔ آئمہ لغت کا بھی زیادہ رجحان اسی طرف ہے کہ اس کے معنے حیض کے ہیں، لیکن چونکہ ہر حیض کے ساتھ لازماً طہر بھی ہوتا ہے اس وجہ سے عام بول چال میں اس سے طہر کو بھی تعبیر کر دیتے ہیں ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس لفظ کو حیض ہی کے معنے میں استعمال فرمایا ہے ۔ مثلاً ارشاد ہے المستحاضۃ تدع الصلوٰۃ ایام اقرائھا حیض والی عورت زمانۂ حیض میں نماز چھوڑ دے ۔ فاطمہ بنت ابی حبیش سے ایک بار آپ نے فرمایا اغتسلی و صلی ما بین القرءٔ الی القرءٔ غسل کر اور

---

[1] معارف القرآن م ا　[2] ماجدی

حیض سے حیض تک نماز پڑھو۔ پھر یہاں جو مسئلہ بیان ہوا ہے اس کا ظاہری قرینہ بھی یہی ہے کہ قروء سے مراد حیض ہو۔ کیونکہ آیت میں مطلقہ عورتوں کی عدت بیان ہو رہی ہے اور عدت کی اصل حکمت یہ ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے اور حاملہ ہونے نہ ہونے کے باب میں فیصلہ کن حیض ہی ہے نہ کہ طہر۔

طلاق کے بعد عورت کے لیے عدت کا حکم

اور انتظار کرنا چاہیے، یہ ترجمہ ہے یتربصن کا۔ اس فقرے میں تعبیر کی پُرشوکت پاکیزگی ہے۔ طلاق کے بعد عورت کن حالات سے دوچار ہوتی ہے۔ اندر سے شادی کی طرف میلان ہوتا ہے، نفسانی بیقراریاں بے راہ روی کی ترغیب دیتی ہیں۔ عورتوں کی فطری خجالت کچھ کہنے نہیں دیتی ہے۔ عورت کے ان تمام احوال اور اس کی قلبی اور نفسانی کیفیات کو اس فقرے میں صراحۃً نہیں کنایۃً اور اشارۃً بیان کر دیا ہے۔ طلاق کے بعد عورتوں کی نفسیاتی حالت کی یہ عجیب اور لطیف تصویر کشی ہے جس کا مفہوم تو یہی ہے کہ وہ بغیر شادی کے تین حیض سے پاک ہونے کا انتظار کریں مگر قرآن اس لطیف تعبیر سے ازدواجی زندگی کے از سرِ نو شروع کرنے کی ترغیب بھی دلا رہا ہے اور یہ کہہ رہا ہے کہ وہ اس دلی رغبت سے گریز کرتی رہیں۔ اور انتظار کی حالت میں اس رغبت پر قابو رکھیں کیونکہ یہ رغبت ان میں فطری ہے کہ وہ عورتیں اپنے آپ پر اور دوسرے لوگوں پر یہ ثابت کرنا چاہتی ہیں کہ ان کی ازدواجی زندگی کی ناکامی ان کے اپنے کسی نقص کی بنا پر نہیں بلکہ وہ اب بھی کسی مرد کو اپنا کر نئی زندگی شروع کرنے کے قابل ہیں۔ یہ جذبہ مرد میں نہیں اُبھرتا کیونکہ وہ خود طلاق دیتا ہے۔ البتہ طلاقن میں یہ جذبہ بڑا شدید ہوتا ہے قرآن یتربصن بانفسھن کی بلیغانہ تعبیر میں اس نفسیاتی حالت کی تصویر کشی کرتا ہے اور اس حالت کو مدنظر رکھ کر حکم دیتا ہے کہ طلاق والی عورتیں اس مقررہ عرصے تک انتظار کریں تاکہ نئی زندگی سے پہلے معلوم ہو جائے کہ اُن کا جسم پہلی ازدواجی زندگی کے اثر سے پاک ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ طلاق والی عورتوں پر فرض ہے بلکہ آغاز ہی والمطلقات سے کیا ہے اور آگے فقرہ ایسا لے کر آئے ہیں جس میں ظاہر کیا گیا ہے گویا وہ تعمیل ارشاد کے لیے بالکل تیار ہیں اور اس کی بجا آوری میں ان کو کوئی پس و پیش نہیں ہے گویا یوں کہا گیا ہے کہ ہم نے ان کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اور انہوں نے ہمارے حکم کی فوری تعمیل کی ہے۔ تعبیر کی یہ لطافت اعجازی شان رکھتی ہے اور یہ صرف

قرآن کا حصہ ہے۔

انتظار کا مطلب یہ ہے کہ جب تک تین حیض نہ گزر جائیں اس وقت تک کسی جگہ نکاح نہ کریں۔ یہ نہ ہو کہ ادھر شوہر نے طلاق دی ادھر بیوی نے معاً دوسرا شوہر کر لیا۔ یہ پہلی پابندی نکاح پر عائد ہوتی۔ پہلے نکاح سے آزادی کے بعد کا جو تعطل کا زمانہ ہے اسے اصطلاحِ شریعت میں عدت کہتے ہیں۔

عدت مقرر کرنے کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ جدائی کے بعد میاں بیوی کو اپنے جذبات کو پرکھنے کا پورا موقعہ مل جاتے۔ کیونکہ ہو سکتا ہے کہ ان کے دلوں میں محبت کی کوئی کسک باقی ہو۔ اور وہ ابھر آئے کچھ جذبات ہوں جو برانگیختہ ہو جائیں اور کچھ ایسی مفاہمت جو وقتی غصے اور ناراضگی دُور ہونے کے بعد دوبارہ اہمیت اختیار کرے اور اسے جدائی کے اسباب کمتر محسوس ہونے لگیں۔ اور اس طرح محبت و میلان کی مطابقت دونوں کو دوبارہ قریب کر دے اور گھر تباہی سے بچ جاتے۔ طلاق گھریلو زندگی کی تباہی کا وہ عمل ہے جو اس وقت کیا جاتا ہے، جب کوئی علاج باقی نہ رہے۔

اسلام میں عدت کی مصلحتیں

۶۶۰۔ ان کے لیے روا نہیں ہے کہ اللہ نے اُن کے پیٹوں میں جو کچھ چھپایا ہوا ہے اسے چھپائیں۔ یعنی عورتوں کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنے حیض یا حمل کو چھپائیں کہ کسی طرح عدت جلدی پوری ہو جاتے یا شوہر کو بصورتِ طلاق رجعی رجعت کا حق باقی نہ رہے۔[1] کیونکہ چھپانے کی یہ کوشش عدت کے شمار و حساب میں خلل انداز ہوگی اور اس طرح قرآن نے جو مصلحتیں اس کے اندر رکھی ہیں وہ ضائع ہو کر رہ جائیں گی ما خلق اللہ کے الفاظ عام ہیں۔ رحم کے اندر جو کچھ بھی ہو جاندار بچہ ہو یا ایام ماہواری کا خون ہو، دونوں کو شامل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خواہ حمل قائم ہو چکا ہو خواہ ایام ماہواری کا دور چل رہا ہو کوئی بھی صورتِ حال ہو اُسے چھپانا جائز نہیں ہے۔[1]

اصل مقصود اس عدت کا چونکہ یہ معلوم کرنا ہے کہ عورت حاملہ ہے یا نہیں اس لیے کہ

---

[1] معارف القرآن م اسے ماجدی

اس چیز پر بہت سے اُمور کا انحصار ہے اس وجہ سے ان مطلقات کے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ اگر حمل کی قسم کی کوئی چیز وہ محسوس کرتی ہیں تو اس کو چھپانے کی ہرگز کوشش نہ کریں۔ اس سے ان تمام مصالح کو سخت نقصان ہوگا جو قرآن نے اس حکم میں عورت، مرد اور پیٹ میں موجود بچے کے لیے ملحوظ رکھی ہیں [1]

زمانۂ جاہلیت میں یہ دستور تھا کہ عورت پہلے شوہر سے جُدائی کے بعد دوسرے شوہر سے شادی کرنا چاہتی تو وہ پہلے سے حاملہ ہوتی تو دوسرے سے شادی کرنے کے بعد بچہ کو دوسرے کا بتاتی۔ قرآن نے اس ناپاک رسم پر قدغن لگا دی۔ کیونکہ یہ دھوکے، جھوٹ اور بہتان جیسی ساری برائیوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے، اولاد کسی کی ہو اور منسوب کسی اور سے ہو۔ عورت کو حکم دیا ہے کہ معلوم ہو جانے پر حمل کو چھپانے کی ہرگز کوشش نہ کرے۔

عدت میں شوہر کو رجعت کا حق ہے

۱۶۶ — اُن کی واپسی کے اُن کے شوہر زیادہ حقدار ہیں اگر وہ عدت کے اندر اصلاحِ حال کے لیے تیار ہو جائیں۔ یعنی اس مدت کے دوران شوہر کو حق حاصل ہے کہ وہ اگر سازگاری اور بحالیٔ تعلقات کا طالب ہے تو وہ مراجعت کر سکتا ہے۔ قرآن میں میاں بیوی کے تعلقات کو بڑی اہمیت دی گئی ہے۔ اس کا ٹوٹنا صرف اسی صورت میں گوارا کیا ہے جب سازگاری کا کوئی امکان بھی باقی نہ رہے اس وجہ سے یہ عدت رکھ دی گئی ہے جس میں دوسرے مصالح کے ساتھ ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ اگر طلاق کا باعث کوئی وقتی ناراضگی ہو تو دونوں ٹھنڈے دل سے اس پر غور کر لیں۔

قرآن نے شوہر کو رجعت کا حق غیر مشروط نہیں بلکہ اس شرط کے ساتھ دیا ہے کہ بشرطیکہ خوشگواری اور محبت کے ساتھ ازدواجی زندگی گزارنے کا اُن کا ارادہ ہو۔ زمانۂ جاہلیت کی طرح عورتوں کو ستانا اور پریشان کرنا مقصود نہ ہو۔ یا اس طریق سے مہر کا معاف کرانا پیشِ نظر نہ ہو۔ یاد رہے کہ یہ شرط اجازتِ خداوندی ہے صحتِ رجعت کی شرط نہیں ہے۔ رجعت ہر حال میں دُرست ہے۔ قانونی احکام اور اخلاقی ہدایات دونوں الگ الگ ہیں۔ قانون کا

---

[1] تدبر قرآن

تعلق اس دُنیا سے ہے مومن کو اپنا معاملہ اللہ سے دُرست رکھنا چاہیے کہ اجر کا مدار اسی پر ہے اس لیے قانون کے درمیان اخلاص کی بھی تاکید کی گئی ہے اور رجعت کا حق عورتوں کو نہیں مردوں کو اس لیے دیا گیا ہے طلاق دینے والا مرد ہے اس لیے اُسے ہی رجعت کا حق ملنا چاہیے۔ عورت کو یہ حق حاصل نہیں ہے۔ یہ رجعت یعنی واپسی بلا تجدید نکاح ہو گی اور فی ذالک سے اشارہ کر دیا ہے کہ یہ رجعت عدت کے اندر اندر ہو۔ اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں تک ہو سکے اسے پختہ نہ ہونے دے اور میاں بیوی از سرِ نو آباد ہو جائیں۔ طلاق کو قرآن نے صرف ضرورت کے موقعہ پر بطورِ علاج اور آخری تدبیر کے جائز رکھا ہے۔ خواہ مخواہ اس کی ترغیب نہیں دی ہے اور نہ بلا ضرورت اسے پسند فرمایا ہے۔ اور حدیثِ نبوی میں جو اسے ابغض المباحات سے تعبیر فرمایا ہے یعنی اللہ کی قانوناً جائز ٹھہرائی ہوئی چیزوں میں سے اللہ کے نزدیک سب سے زیادہ ناپسند۔ وہ اسی حقیقت کی ترجمانی ہے۔ تین ماہ کی مدت غور و فکر کے لیے اور ناگواری و بیزاری کے ہنگامی جذبات کے سرد پڑ جانے کے لیے بہت ہوتی ہے۔ اس عرصہ میں اگر شوہر بیوی کو واپس لینا چاہے تو طلاق کو قول و عمل سے منسوخ کر سکتا ہے اسی کو اصطلاح میں رجعت کہتے ہیں۔

اس آیت کے حکم میں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ ایک جماعت کے نزدیک جب تک عورت تیسرے حیض سے فارغ ہو کر نہا نہ لے اس وقت تک طلاق بائن نہ ہو گی اور شوہر کو رجعت کا حق باقی رہے گا، صحابہ میں حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ ابنِ عباس، حضرت ابوموسیٰ اشعری اور حضرت عبداللہ بن مسعود اور بڑے بڑے صحابہ کی یہی رائے ہے اور فقہائے احناف نے اسی کو اپنایا ہے برخلاف اس کے دوسری جماعت کہتی ہے کہ عورت کو تیسری بار حیض آتے ہی مرد کا حقِ رجعت ختم ہو جاتا ہے۔ یہ رائے حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت زید بن ثابت کی ہے۔ فقہائے شافعیہ اور مالکیہ نے اسی کو اختیار کیا ہے[1]

رجعت کا یہ حکم ہر طلاق والی عورت کے لیے نہیں ہے بلکہ صرف اُس عورت کے لیے ہے جسے ایک یا دو طلاقیں ملی ہوں۔ تین طلاقوں کی صورت میں مرد کو رجعت کا حق نہیں ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔ اگرچہ پہلا حکم ہر طلاق والی کے لیے عام ہے یعنی عدت کا والمطلقات

---

[1] تفہیم القرآن

بتاہمیں میں سب کو حکم دیا گیا ہے لیکن اس فقرے وبعولتھن احق میں ان عورتوں کا ہی صرف خصوصیت سے حکم بتایا گیا ہے جن کو ایک یا دو طلاقیں ملی ہوں۔ قانونِ عام بتانے کے بعد خاص قانون بتا دینا قرآن کا عام طرز ہے۔ اور قرآن میں اس کی بہت مثالیں ہیں۔ بہرحال طلاق رجعی یعنی ایک یا دو ہونے کی صورت میں شوہر کو رجعت کا حق ہے اور اس پر اجماع ہے لیکن اس موضوع پر فقہاء میں چند باتوں میں اور بھی اختلاف ہے۔

اوّل یہ کہ رجعت کر لینے کے بعد زمانۂ عدت میں میاں بیوی کے جنسی تعلقات دُرست ہیں یا نہیں۔ امام شافعی اسے ناجائز بتاتے ہیں اور امام ابوحنیفہ اسے دُرست قرار دیتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک رشتۂ نکاح عدت گزرنے سے منقطع ہوتا ہے، عدت کے اندر بالکل منقطع نہیں ہوتا۔ امام ابوحنیفہ نے یہ بات قرآن کے فقرے وبعولتھن سے سمجھی ہے۔ اگر رشتۂ نکاح منقطع ہو جاتا تو قرآن ان کے شوہر نہ کہتا۔ طلاق کے باوجود اُن کو شوہر کہنا اس کی دلیل ہے کہ رشتۂ نکاح منقطع نہیں ہوا ہے۔ رشتۂ نکاح قائم ہونے کی وجہ سے مطلقہ رجعی کا نان ونفقہ شوہر کے ذمہ واجب ہے۔ اگر زمانۂ عدت میں شوہر کا انتقال ہو جائے تو عورت وراثت میں حصہ دار ہے اور اگر عورت کا انتقال ہو جائے تو شوہر وراثت کا حقدار ہے۔ زمانۂ عدت میں شوہر کے لیے اپنی مطلقہ رجعی کی بہن سے شادی کرنا جائز نہیں ہے۔

دوم اگر شوہر رجعت کرنا چاہے تو اس کا طریق کار کیا ہونا چاہیے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ گفتار اور الفاظ کے پیمانہ کے بغیر رجعت نہیں ہوتی لیکن امام ابوحنیفہ اور امام احمد فرماتے ہیں کہ گفتار ضروری نہیں خوشنودی اور رضامندی کا جو پیمانہ بھی اختیار کر لے رجعت ہو جائے گی چاہے گفتار ہو یا کردار۔

سوم شوہر اگر رجعت کرنا چاہے تو کیا دوسرے مالیاتی معاملات کی طرح اس پر شہادتوں کا ہونا ضروری ہے۔ امام شافعی اور امام احمد اسے ضروری بتاتے ہیں۔ لیکن امام ابوحنیفہ اور امام مالک شہادت کو ضروری نہیں بلکہ ایک پسندیدہ عمل قرار دیتے ہیں۔ اُن کا موقف یہ ہے کہ اگر طلاق کے لیے شہادت ضروری نہیں ہے تو رجعت کے لیے بھی ضروری نہیں ہے۔

آیت کی تشریحی رُوداد آپ سُن چکے آئیے اب حضرت شیخ الہند کی زبانی اس تمام رُوداد کا خلاصہ بھی گوش گزار فرما لیجیے۔ فرماتے ہیں:

جب مرد نے عورت کو طلاق دی تو ابھی اس عورت کو دوسرے سے نکاح روا نہیں جب تک

تین حیض پورے نہ ہو جائیں تاکہ حمل ہونا معلوم ہو جائے اور کسی کی اولاد کسی نہ مل جائے۔ اس لیے عورت پر فرض ہے کہ جو اس کے پیٹ میں ہو اس کو ظاہر کر دے خواہ حمل ہو یا حیض آتا ہو اور اس مدت کو عدت کہتے ہیں۔ یہ بات معلوم کر لینی چاہیے کہ یہاں مطلقات سے خاص وہ عورتیں مراد ہیں کہ اُن سے نکاح کے بعد صحبت یا خلوتِ شرعیہ کی نوبت خاوند کو آچکی ہو اور اُن عورتوں کو حیض بھی آتا ہو اور آزاد بھی ہوں کسی کی لونڈی نہ ہوں کیونکہ جس عورت سے صحبت یا خلوت کی نوبت نہ آئے اس کے اوپر طلاق کے بعد عدت بالکل نہیں ہے اور جس عورت کو حیض نہ آتے مثلاً صغیر سن ہو یا بوڑھی ہو گئی یا اس کو حمل ہو تو پہلی دونوں صورتوں میں اس کی عدت تین مہینے ہے اور حاملہ کی عدت وضع حمل ہے اور جو عورت آزاد نہ ہو بلکہ کسی کی شرعی قاعدے کے مطابق لونڈی ہو۔ اگر اُس کو حیض آتا ہو تو اُس کی عدت دو حیض ہے اور اگر حیض نہ آئے تو اگر وہ صغیرہ یا بڑھیا ہے تو اُس کی عدت ڈیڑھ ماہ ہے اور اگر حاملہ ہے تو وضع حمل ہے۔ دوسری آیتوں اور حدیثوں سے یہ تفصیل ثابت ہے اور یہ جو فرمایا ہے کہ شوہروں کو واپسی کا حق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ مرد اگر چاہے تو عورت کو پھر رکھ لے اگرچہ عورت کی خوشی نہ ہو۔ مگر اس واپسی سے مقصود سلوک اور اصلاح ہو۔ عورت کو ستانا یا اس دباؤ میں اس سے مہر معاف کرانا منظور نہ ہو، یہ ظلم ہے۔ اگر ایسا کرے گا تو گنہگار ہوگا۔ اگرچہ رجعت صحیح ہو جائے گی۔

اسلام میں حقوقِ زوجین

۶۶۲۔ عورتوں کے لیے مردوں پر اسی طرح کے حقوق ہیں جیسے مردوں کے عورتوں پر ہیں۔ یعنی یہ امر تو حق ہے کہ جیسے مردوں کے حقوق عورتوں پر ہیں ایسے عورتوں کے حقوق مردوں پر ہیں جن کا قاعدہ کے موافق ادا کرنا ہر ایک پر ضروری ہے تو اب مرد کو عورت کے ساتھ بدسلوکی اور اس کی ہر قسم کی حق تلفی کرنا ممنوع ہو گی مگر یہ بھی ہے کہ مردوں کو عورتوں پر فضیلت اور فوقیت ہے اس لیے رجعت میں حق مرد کو دیا گیا ہے[1]

یہ قرآنی بلاغت کا اعجاز ہے کہ اتنا بڑا مضمون اتنے مختصر سے فقرے میں ادا کر دیا۔ اور

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

اس کے ذریعے دُنیا کو بتایا ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ بس مردوں کے حقوق عورتوں اور شوہروں کے حقوق بیویوں پر ہیں انہیں بلکہ اسی طرح عورتوں کے حقوق مردوں پر اور بیویوں کے حقوق شوہروں کے ذمہ عائد ہوتے ہیں۔ حقوقِ نسواں کا یہ نام عرب کے ایک اُمّی کی زبان پر اُس وقت آیا جب دُنیا کی دُنیا اس تصور سے نا واقف تھی ۔ اور یہودیت و عیسائیت کی دُنیا میں عورت ہر بُرائی کا سرچشمہ تھی۔ اور ذلت و خسارت کا مرقع ۔ جیوز انسائیکلوپیڈیا میں ہے ــــ "معصیت اوّل چونکہ بیوی ہی کی تحریک سے سرزد ہوئی تھی اس لیے اس کو شوہر کا محکوم کر کے رکھا گیا۔ اور شوہر اس کا حاکم ہے' شوہر اُس کا مالک و آقا ہے اور وہ اس کی مملوکہ ہے ۔ اور مسیحی دُنیا سے متعلق مسٹر لیکی فرنگی لیکی اپنی تاریخ اخلاق یورپ میں لکھتے ہیں ؛

عقیدہ یہ تھا کہ عورت جہنم کا دروازہ ہے اور تمام آفاتِ بشری کا باعث ہے۔ اسے اپنے آپ کو ذلیل سمجھنے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ عورت ہے ۔

یہ حال وقت کے اونچے اونچے مذہبوں کا تھا۔ شرک و جاہلیت کے پست مذہبوں کا ذکر ہی کیا ہے۔ خود ملک عرب کا یہ حال تھا کہ عورتیں گویا انسان نہیں جانور یا جائداد ہیں [1]

وراثت میں عورتوں کا کوئی حق نہ تھا۔ عرب کا قول ہے کہ وراثت اس کا حق ہے۔ جو تلوار پکڑ سکتا ہے۔ لڑائیوں میں مفتوحہ قبیلہ کی عورتیں عین میدانِ جنگ میں فاتحین کے تصرف میں آتیں۔ اگر صلح ہو جاتی اور عورتیں واپس دے دی جاتیں تو باوجود اس کے کہ سب کے ناموس برباد ہو جاتے بدستور گھروں میں لے لی جاتیں اور اسے کوئی عیب نہ سمجھا جاتا۔ فاتحین اس تصرف پر فخر کرتے اور اسے اپنے اشعار میں ظاہر کرتے۔ قبیلہ قیس اور بنو دارم میں جو معرکہ ہوا جو احرجان کے نام سے مشہور ہے اس کی نسبت جریر کہتا ہے ؛

نکحت نساءھم بغیر مھور، ان کی عورتوں سے بغیر مہر کے نکاح کیا ۔

طلاق کے لیے کوئی مدت اور عدت نہ تھی۔ نکاح کی کوئی حد نہ تھی۔ دو حقیقی بہنوں سے ایک ساتھ نکاح کرتے ۔ باپ مر جاتا تو اس کی کل بیویاں بجز حقیقی ماں کے بیٹے کے تصرف میں آتیں اور اس کی جائز بیویاں سمجھی جاتیں ۔

ایامِ ماہواری کے زمانہ میں عورتوں کو الگ کر دیتے اور ان کے ساتھ کھانا پینا چھوڑ دیتے۔ عورت

---

[1] ماجدی

جب بیوہ ہو جاتی تو گھر سے باہر ایک نہایت تنگ کوٹھری میں رہنے کو اور خراب سے کپڑے پہننے کو دیتے۔ خوشبو وغیرہ کی کوئی چیز استعمال نہ کر سکتی۔ اس حالت کے ساتھ جب پورا سال ہو جاتا تو ایک بکری یا گدھا لاتے اس سے وہ اپنے اندام نہانی کو مس کرتی۔ پھر کوٹھری سے باہر نکلتی اور اس کے ہاتھ میں مینگنی دی جاتی وہ مینگنی کو پھینک دیتی اس وقت سوگ سے نکل آتی۔ عورت کا جو مہر مقرر ہوتا وہ باپ کو ملتا۔

غرض مجموعی حیثیت سے عورت بدترین مخلوق اور ہر قسم کے جبر و تعدی کا تختہ مشق بنی ہوئی تھی۔ رفتہ رفتہ یہاں تک نوبت پہنچ گئی تھی کہ جس کے گھر میں لڑکی پیدا ہو جاتی اس کو سخت رنج ہوتا اور شرم کے مارے لوگوں سے چھپتا پھرتا۔ اسی کے نتیجے میں دختر کشی کی رسم جاری ہو گئی۔ لڑکی پیدا ہوتی تو اُسے میدان میں لے جا کر زمین کھودتے اور زندہ گاڑ دیتے۔ عورت کو وراثت کا کوئی حصہ نہیں ملتا۔ عورت بیوہ ہو جاتی تو اپنے شوہر کے وارثوں کی ملک تصور کی جاتی۔ جو وارث اگر بیوہ پر چادر ڈال دیتا وہ اس کی جائز مدخولہ ہوتی۔

اسلام نے عورتوں کی قدر و منزلت سے دُنیا کو روشناس کیا اور یہاں تک ان کی قدر و منزلت کو اونچا کیا کہ قانوناً ان کو مردوں کے دوش بدوش کھڑا کر دیا اور اس کے قانونی حقوق میں ان کو برابر کا درجہ عطا کیا۔ البتہ اخلاقاً رتبہ میں مردوں کو تھوڑی سی اعزازی برتری دی گئی ہے۔ اسی برتری کو قرآن نے اس آیت میں و للرجال علیھن درجۃ سے تعبیر کیا ہے۔ لیکن یہ برتری بھی ان کو بے وجہ نہیں دی گئی ہے اس لیے تاکہ وہ عورتوں کی نگرانی اور نگہبانی کا فرض انجام دے سکیں یعنی گویا وہ اپنی گھریلو عدالت کے اعزازی صدر بنائے گئے ہیں۔ یہ نکتہ اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ یہ اوپر کی آیت میں میاں بیوی کے خانگی جھگڑوں کے دُور کرنے کے سلسلے میں ہے۔ گھر کے روزمرہ کے مناقشوں کا فیصلہ اسی طرح ہو سکتا ہے کہ دونوں کے قانونی حقوق و فرائض یکساں ماننے کے بعد شوہر کو اعزازی فوقیت کا مرتبہ دیا جائے تاکہ وہ اپنے گھر کے نظام کو اچھی طرح چلا سکے[1]

اس اعزازی منصب کے لیے شوہر کا انتخاب بھی بے وجہ نہیں۔ قرآن نے اس کی مصلحتیں بتادی ہیں۔ اس کی تفصیل پارہ پنجم میں آرہی ہے۔

---

[1] سیرۃ النبی

گویا قرآن نے یہ چار لفظ کہہ کر لھن مثل الذی علیھن انسان کی معاشرتی زندگی کے سب سے بڑے انقلاب کا اعلان کر دیا۔ ان چار لفظوں نے عورت کو وہ سب کچھ دے دیا جو اس کا حق تھا مگر جو اسے کبھی نہیں ملا تھا ان چار لفظوں نے اسے محرومی و شقاوت کی خاک سے اٹھایا اور عزت و سعادت کے تخت پر بٹھایا۔ اس اسلوب بیان کی جامعیت اور مانعیت پر غور کرو زندگی و معاشرت کی کونسی بات ہے جو ان چار لفظوں میں نہیں آگئی اور کون سا رخنہ ہے جو بند نہیں ہو گیا۔ البتہ اس اعلان کے بعد آخر میں یہ بھی کہہ دیا گیا کہ حقوق کی برابری کے باوجود مرد کے لیے ایک درجہ ہے۔ یعنی خاندانی زندگی کے نظام میں سربراہی کا۔ قرآن نے اس درجہ کو قوام کہا ہے خاندانی زندگی کے نظام میں اگر کوئی قوام نہ ہو تو خاندانی زندگی کا نظام قائم نہیں رہ سکتا۔ ورنہ جہاں تک معیشتی اور مالیاتی استقلال کا تعلق ہے قرآن نے اس سے صاف انکار کر دیا کہ یہ استقلال صرف مردوں ہی کے حصے میں آیا ہے۔ اس نے قطعی لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ مرد کی کمائی مرد کے لیے ہو گی اور عورت کی کمائی عورت کے لیے ہو گی۔ الغرض جہاں تک جنسی درجہ اور حقوق کا تعلق ہے قرآن کے نزدیک دونوں جنسیں برابر ہیں۔ البتہ معیشت کی فراہمی کا کام نظام معاشرت نے مردوں کے ذمہ ڈال دیا ہے اسی کو وہ ایک خاص درجہ کہتا ہے۔ اصلاً یہ ایک طرح کی باہمی تقسیم عمل ہے۔ مرد کماتا ہے اور عورت خرچ کرتی ہے۔

قرآن کے تمام مخاطبات عام ہیں

قرآن جب کبھی یاایھا الناس اور یاایھا الذین آمنوا کہتا ہے تو یکساں طور پر مردوں اور عورتوں کو مخاطب کرتا ہے۔ اس نے مذہبی اعمال میں امتیاز کی کوئی لکیر ایسی نہیں کھینچی ہے جسے عورت عبور نہ کر سکتی ہو۔ تمام اعمال و طاعات یکساں طور پر دونوں کے لیے ہیں اور دینی فضیلتوں کے تمام مدارج بھی یکساں طور پر دونوں کے حصے میں آئے ہیں، انسان ان دونوں نصف ٹکڑوں سے مل کر انسان ہے ایک نصف دوسرے نصف سے یہ نہیں کہہ سکتا کہ تو کمتر ہے میں بہتر ہوں۔ خطابات اور بیانات میں آج کل یہ طریقہ اختیار کیا جاتا ہے کہ جب کبھی معاشرت و جمعیت کے اعتبار سے لوگوں کا ذکر کیا جائے تو مرد و عورت دونوں کو یاد کیا جاتا ہے، مثلاً کہیں گے ہر مرد اور عورت کا یہ فرض ہے یا قوم ہر مرد اور عورت سے یہ امید رکھتی ہے۔ ہر ایسا بیان جو اس تصریح سے خالی ہو ناقص بیان سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآن نے آج سے تیرہ سو برس پہلے

یہی اسلوب بیان اختیار کیا تھا ان المسلمین والمسلمات والمومنین والمومنات والقانتین والقانتات والصادقین والصادقات والصابرین والصابرات والخاشعین والخاشعات والمتصدقین والمتصدقات والصائمین والصائمات والحافظین فروجھم والحافظات والذاکرین اللّٰہ کثیراً والذاکرات۔

یورپ میں آج تک اپنے ذاتی نام سے عورت اپنی شخصیت نمایاں نہیں کر سکتی جب تک شادی نہیں ہوتی مس فلاں رہتی ہے اور جب شادی ہو جاتی ہے تو مسز جونس ہے یعنی خود اس کی شخصیت کوئی مستقل انفرادیت نہیں رکھتی۔ باپ کے سائے میں دکھائی دے گی یا شوہر کے۔ لیکن مسلمانوں کی معاشرتی تہذیب میں کبھی ایسا نامنصفانہ تخیل پیدا نہیں ہوا۔ عورت لڑکی ہو یا بیوی وہ ہمیشہ فاطمہ اور عائشہ کی حیثیت سے نمایاں رہی ہے۔ باپ اور شوہر کے سائے میں نہیں چھوڑی جاتی۔ افسوس ہے کہ اب یورپ کی اندھی تقلید میں لوگ اس درجہ کھوئے گئے کہ اپنا قدیم طریقہ چھوڑ کر یورپ کا طریق تسمیہ اختیار کرتے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہندوستان اور مصر میں یہ طریقہ عام ہو گیا ہے کہ مس اور مسز اور مادموزیل اور مادام کی ترکیب سے جدید تعلیم یافتہ خواتین کو یاد کیا جاتا ہے۔ حالانکہ یورپ کا یہ طریقہ قرونِ وسطیٰ کی غیر شائستہ ذہنیت کی یادگار ہے اور خود یورپ بھی اب اس کا خواہش مند نہیں کہ اس کی عمر دراز کی جائے [1]

افراط و تفریط

قرآن نے اس آیت کے ذریعے عورت کے معاملے میں افراط و تفریط سے ہٹ کر راہِ اعتدال اختیار کی ہے۔ یہ کہہ کر کہ جس طرح عورتوں کے حقوق و فرائض ہیں ایسے ہی مردوں کے بھی حقوق و فرائض ہیں۔ اس کوتاہی اور تفریط پر ضرب لگائی جو عورت کے معاملے میں دنیا نے اختیار کر رکھی تھی۔ عورت کی ہستی کو مستقل قرار دیا۔ اسے آزاد و خود مختار قرار دیا۔ اپنے اموال کا مالک بنایا۔ کوئی شخص بھی خواہ باپ دادا ہی ہو بالغ عورت کو مجبور نہیں کر سکتا کہ فلاں سے نکاح کر۔ اُس کے اموال میں اُس کی اجازت کے بغیر تصرف کا کسی کو حق نہیں ہے۔ اپنے رشتہ داروں کی جائداد میں یہ بھی مردوں کی طرح حصہ دار ہے۔ عورت پر اخراجات کو ایک عبادت قرار دیا۔ اور اس کے ساتھ یہ بتا کر کہ مردوں کو عورتوں پر فوقیت ہے اس زیادتی پر بھی ضرب کاری

---

[1] ترجمان القرآن

اَلطَّلَاقُ مَرَّتٰنِ ۪ فَاِمْسَاكٌۢ بِمَعْرُوْفٍ اَوْ تَسْرِيْحٌۢ بِاِحْسَانٍ ؕ وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْا مِمَّاۤ اٰتَيْتُمُوْهُنَّ شَيْـًٔا اِلَّاۤ اَنْ يَّخَافَاۤ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۙ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيْمَا افْتَدَتْ بِهٖ ؕ تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝

طلاق دو مرتبہ ہے[۶۶۳] (اس کے بعد دو راہیں ہیں) ایک یہ کہ رجعت کر کے عورت کو قاعدہ کے مطابق رکھ لے دوسرے یہ کہ رجعت نہ کرے عدت پوری ہونے دے اس طرح اچھے طریقہ پر اسے چھوڑ دے[۶۶۴]۔ اور تمہارے لیے یہ بات حلال نہیں ہے کہ اپنی بیویوں کو چھوڑتے وقت اُن سے کچھ بھی لو اگرچہ وہ اسی مال میں سے کیوں نہ ہو جو تم نے اُن کو دیا ہے[۶۶۵] لیکن اگر میاں بیوی ایسے ہوں کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ سکیں گے لہٰذا مسلمانو! اگر تمہیں یہ خطرہ فی الواقع محسوس ہو کہ میاں بیوی اللہ کی حدود کو قائم نہ کریں گے تو پھر دونوں پر اس مال کے لینے دینے پر کوئی گناہ نہیں ہے

جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑائے[۶۶] یہ سب احکام خداوندی ہیں
تم ان سے[۶۶] قدم باہر نہ نکالو۔ اور جو کوئی اللہ کی حد بندیوں سے نکل
جائے گا تو ایسے ہی لوگ ہیں جو ظلم کرنے والے ہیں۔

لگادی کہ ان کو کھلے بہار چھوڑ دیا جائے اور مردوں کی سیادت سے یہ آزاد ہو کر بے قیدی اور بے راہ روی کی آغوش میں چلے جائیں[۱]

تعدادِ طلاق اور اس کا صحیح طریقہ

چونکہ تمام معاشرتی زندگی کی بنیاد نکاح کے پاکیزہ رشتہ پر ہے اور نکاح کی حیثیت صرف ایک دیوانی معاملہ کی نہیں بلکہ اس معاملاتی پہلو سے کہیں زیادہ عبادت کا پہلو غالب ہے اس لیے نکاح کے منعقد ہونے کے لیے باجماعِ اُمت کچھ ایسی شرطیں ضروری ہیں جو عام معاملات میں نہیں ہوتی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ہر عورت اور ہر مرد کے درمیان یہ رشتہ نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے قرآن نے ایک مستقل ضابطہ پیش کیا ہے جس کی تفصیل سورۂ نساء میں آرہی ہے۔ اور کچھ اشارات یہاں آچکے ہیں۔ اور یہ کہ دوسرے معاملات کے صحیح ہونے اور منعقد ہونے کے لیے گواہی شرط نہیں ہے لیکن نکاح کے منعقد ہونے کے لیے گواہوں کی موجودگی شرط ہے۔ امام اعظم اور دوسرے ائمہ کے نزدیک نکاح میں معاملہ کی حیثیت سے زیادہ عبادت کی حیثیت غالب ہے۔

اگر کسی مجبوری کے پیشِ نظر اس کے ٹوٹنے کی نوبت آئے تو یہ نہیں ہونا چاہیے کہ آدمی ایک ہی جھٹکے میں اس مقدس رشتہ کو توڑ دے، جس طرح قرآن نے نکاح کے معاملے کو عبادت کی حیثیت دے کر عام معاملات سے علیٰحدہ کر دیا ہے اور اس پر کئی پابندیاں لگادی ہیں۔ اسی طرح اس مقدس رشتہ کے توڑنے کو بھی عام معاملات کی سطح سے بالا رکھا ہے اور اس میں دیوانی معاملہ جیسی آزادی نہیں دی کہ جب چاہے اور جیسے چاہے توڑ دے بلکہ اس کے لیے

[۱] معارف القرآن م شفیع

ایک خاص حکیمانہ قانون بنایا ہے۔ اسی قانون کا ان آیات میں ذکر ہے۔

۶۶۳۔ طلاق دو مرتبہ ہے۔ یعنی جب تک واپسی کی گنجائش باقی ہے طلاق دو بار ہے۔ دو بار تک الفاظ طلاق ادا کر لینے پر رجوع کر سکتا ہے اور ان دو طلاقوں کے لیے بھی نبوت کا بتایا ہوا صحیح طریق یہ ہے۔

اوّلاً۔ ان میں تفریق کی جائے یکبارگی نہ ہوں بلکہ علیحدہ علیحدہ ہوں۔ دو طلاقوں کو جمع کرنا بدعت ہے انما السنۃ التفریق۔

ثانیاً۔ ایام ماہواری کے زمانے میں نہ ہو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔

ثالثاً۔ اس پاک میں طلاق نہ دی جائے جس میں شوہر بیوی سے ہم جنسی کے تعلقات کر چکا ہو۔ وجہ ظاہر ہے کہ اگر حیض میں طلاق دی گئی تو عدت کا عرصہ طویل ہو جائے گا۔ کیونکہ یہ حیض عدت میں شمار نہ ہوگا بلکہ اس کے بعد طہر اور طہر کے بعد جو حیض آئے گا اس سے عدت کا آغاز ہوگا۔ ان شرطوں کے ساتھ جو طلاق ایک بار دی گئی پھر دوسری بار دی جاتے۔ یہ دونوں بار طلاق رجعی ہے۔ یعنی ابھی نکاح بالکل ختم نہیں ہوا ہے بلکہ عدت پوری ہونے تک شوہر کو اختیار ہے کہ رجوع کر کے بیوی کو اپنے گھر میں رکھ لے۔

۶۶۴۔ ایک یہ کہ رجعت کر کے عورت کو قاعدہ کے مطابق رکھ لے دوسرے یہ کہ رجعت نہ کرے عدت پوری ہونے دے۔ اس طرح اچھے طریقہ سے چھوڑ دے۔ اسلام سے پہلے دستور تھا کہ دس بیس جتنی بار چاہتے طلاق دے دیتے مگر عدت کے ختم ہونے سے پہلے رجعت کر لیتے۔ پھر جب چاہتے طلاق دیتے اور رجعت کر لیتے اور اس صورت سے بعض شخص عورتوں کو اسی طرح بہت ستاتے۔ اس لیے قرآن نے بتایا کہ طلاق جس میں رجعت ہو سکے کل دو بار ہے۔ ایک یا دو طلاق تک تو اختیار ہے کہ عدت کے اندر مرد چاہے تو عورت کو پھر دستور کے مطابق رکھ لے یا اچھی طرح سے چھوڑ دے۔ پھر عدت کے بعد رجعت کا حق باقی نہیں رہتا۔ ہاں اگر دونوں راضی ہوں تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ امساک بالمعروف اور تسریح باحسان سے مقصد یہ بتانا ہے کہ رجعت کرے تو موافقت اور حسن معاشرت کے ساتھ ہے، عورت کو قید میں رکھنا اور ستانا پیش نظر نہ ہو جیسا کہ ان میں دستور تھا ورنہ سہولت اور عمدگی کے ساتھ اس کو روانہ کر دے [1]

---

[1] افادات شیخ الہند

مطلب یہ ہے کہ اس فقرے میں ایک بہت بڑی معاشرتی خرابی کی جو عرب میں رائج تھی اصلاح کردی۔ عرب میں قاعدہ یہ تھا کہ ایک شخص اپنی بیوی کو بے حد وحساب طلاق دینے کا مجاز تھا جس عورت سے اس کا شوہر بگڑ جاتا اُس کو وہ بار بار طلاق دے کر رجوع کرتا رہتا تھا تاکہ وہ غریب نہ تو اُس کے ساتھ بس ہی سکے اور نہ اُس سے آزاد ہو کر کسی اور سے نکاح ہی کرسکے۔ قرآن حکیم کی یہ آیت اسی ظلم کا دروازہ بند کرتی ہے۔ اس آیت کی رُو سے ایک مرد رشتہ نکاح میں اپنی بیوی پر حد سے حد دو ہی بار طلاقِ رجعی کا حق استعمال کرسکتا ہے۔ جو شخص اپنی منکوحہ کو دو مرتبہ طلاق دے کر اس سے رجوع کر چکا ہو وہ اپنی عمر میں جب کبھی اس کو تیسری طلاق دے گا عورت اس سے مستقل طور پر جُدا ہو جائے گی۔[1]

گویا اس آیت میں طلاق دینے والے کو یہ ہدایت دی گئی ہے کہ وہ دو مرتبہ طلاق دے اور وہ الگ الگ پاکیوں میں دے اور پھر تیسری پاکی میں یا تو رجعت کرے اگر رجعت کرنا چاہے یا اُس کو رُخصت کر دے اگر اُس کا آخری فیصلہ اُس کو رُخصت ہی کر دینے کا ہے۔ رجعت کی صورت میں اسے معروف کی پابندی کی ہدایت کی گئی ہے یعنی اس رجعت سے مقصود بیوی کو اس طرح بیوی بنا کر رکھنا ہو جس طرح ایک شریف، مہذب اور خدا ترس آدمی بیوی کو رکھتا ہے اور جس کا پہلے لوگوں میں چلن ہے۔ مقصود اس سے بیوی کو معلق رکھنا نہ ہو۔ رُخصت کرنے کی صورت میں اس کو احسان کی ہدایت ہوئی ہے کہ ہر چند اس کا بیوی پر کوئی حق باقی نہیں رہا لیکن مرد کی مردانگی اور شرافت یہی ہے کہ جس سے ایک عرصہ تعلق رہ چکا ہے اس کو حسبِ توفیق دے دلا کر روانہ کرے۔[2]

چونکہ دینے دلانے کا ذکر آ گیا اس لیے اسی ضمن میں دی ہوئی چیزوں کو واپس لینے پر تنبیہ فرمائی ہے۔ مثلاً مہر کی صورت میں یا نان ونفقہ کی شکل میں جو مال، جائداد، سامان اس کو دے چکے اس کو واپس لینے کی ممانعت فرمادی۔

بیوی کو دیے ہوئے مال کو واپس لینا ناجائز ہے

۶۶۵۔ اور تمہارے لیے یہ بات حلال نہیں ہے کہ اپنی بیویوں کو چھوڑتے وقت ان سے کچھ بھی لو اگرچہ وہ اسی مال میں سے ہو جو تم نے اُن کو دیا ہے۔ یعنی مردوں کو یہ روا نہیں ہے

[1] تفہیم القرآن [2] تدبر قرآن

کہ عورتوں کو جو مہر دیا ہے اس کے طلاق کے بدلہ میں واپس لیں لے

دراصل یہ تسریح باحسان کی تشریح ہے اور بتایا جارہا ہے کہ رخصت کے وقت حسن کاری یہ ہے کہ بیوی کو زمانۂ رفاقت میں جو کچھ دے چکا ہے اس سے واپس نہ لے۔ اکثر انسان جب غصہ میں آتا ہے تو یہ بھی کر گزرتا ہے کہ اب تک جو کچھ دیا گیا ہے اس سے چھین لیتا ہے۔ عرب جاہلیت میں یہی دستور تھا۔ آیت میں اسی ظالمانہ دستور کی ممانعت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ مہر وغیرہ جو کچھ ان کو پہلے دے چکے ہو اب اس کے واپس لینے کا کوئی محل نہیں ہے۔ ما اتیتموھن کی تعبیر عام ہے لیکن مفسرین اور فقہاء نے اس سے مراد مہر کی رقم لی ہے۔ مگر فقیہ ابن العربی مالکی نے اسے ہر اس مال تک وسعت دی ہے جو شوہر بیوی کو دے چکا ہو۔ دل کو لگتی بات یہی ہے کہ مہر تو عورت کا حق ہے اس کے واپس لینے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس سے لازماً وہ چیزیں مراد ہیں جو زمانۂ رفاقت میں بیوی کو بطور تحفہ دی گئی ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا ہے کہ طلاق ہو جانے کے بعد مرد کے لیے روا نہیں ہے کہ ان کو واپس لے۔ کیونکہ ایسا کرنا ایک طرف اگر مرد کے شیوۂ شرافت کے خلاف ہے تو دوسری طرف عورت کو تنگ کرنے کے مترادف ہے۔ الغرض مہر اور وہ زیور اور کپڑے وغیرہ جو شوہر اپنی بیوی کو دے چکا ہو ان میں سے کوئی چیز بھی واپس مانگنے کا حق نہیں ہے۔ یہ بات ویسے بھی اسلام کے اخلاقی اصولوں کے منافی ہے کہ کوئی شخص کسی ایسی چیز کو جسے وہ دوسرے کو بطور تحفہ و ہدیہ اور ہبہ دے چکا ہو واپس لے، اور اپنی ہی قے کو خود چاٹ لے مگر خصوصیت کے ساتھ ایک شوہر کے لیے تو یہ بہت ہی شرمناک بات ہے کہ وہ طلاق دے کر رخصت کرتے وقت اپنی بیوی سے وہ سب کچھ رکھوا لینا چاہے جو اس نے اسے از خود کبھی دیا تھا۔ اس کے برعکس اسلام نے یہ اخلاق سکھائے ہیں کہ آدمی جس عورت کو طلاق دے اسے رخصت کرتے وقت کچھ نہ کچھ دے کر رخصت کرے جیسا کہ آگے آیت ۲۴۱ میں آرہا ہے لے

خلع کی اجازت

۲۲۹ - لیکن اگر میاں بیوی ایسے ہوں کہ دونوں کو اندیشہ ہو کہ اللہ کی حدود کو قائم نہ رکھ

لے افادات شیخ الہند لے تفہیم القرآن

رکھیں اور اس کا مسلمانو! تم بھی خطرہ محسوس کرو کہ میاں بیوی اللہ کی حدود کو قائم نہ کریں گے تو پھر ان دونوں پر اس مال کے لینے اور دینے میں کوئی حرج نہیں ہے جس کو دے کر عورت اپنی جان چھڑائے۔ یعنی ویسے تو مال لینا شوہر کو حرام ہے ہاں اگر ناچاری ہو اور کسی طرح دونوں میں موافقت نہ ہوتی ہو اور دونوں کو اندیشہ ہو کہ وہ بوجہ شدت مخالفت احکام خداوندی کے مطابق زندگی نہ گزار سکیں گے تو ایسی حالت میں مال لینا روا ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ عورت مال دے کر اپنے آپ کو نکاح سے چھڑائے اور مرد وہ مال لے لے اس کو خلع کہتے ہیں۔ اور جب اس ضرورت کی وجہ سے میاں بیوی کو خلع کرنا درست ہوا تو سب مسلمانوں کو اس میں سعی کرنا درست ہو گی [1]

عورت سے مال مقرر کر کے اسے طلاق دینے کی دو صورتیں ایک خلع دوسرے طلاق علی المال۔ خلع یہ ہے کہ عورت کہے کہ تو اتنے مال پر مجھ سے خلع کرے اور مرد کہے کہ مجھے منظور ہے۔ اس کہنے کی ساتھ عورت پر طلاق بائن پڑ جائے گی اور مال دینا عورت کے ذمہ واجب ہو جائے گا۔ اور طلاق علی المال یہ ہے کہ مرد کہے کہ اگر تو مجھے اتنی رقم دے دے تو تجھ پر طلاق۔ اس کا حکم یہ ہے کہ اگر عورت منظور نہ کرے تو طلاق واقع نہ ہو گی۔ اور اگر منظور کرے تو فوراً طلاق بائن ہو جائے گی [2]

مطلب یہ ہے کہ جب بیوی کو میاں سے ایسا اختلاف ہو کہ صاف نظر آ رہا ہو کہ ازدواجی زندگی کے نباہ کے لیے جن قیود و حدود کی نگہداشت کی ضرورت ہے ان کو فریقین ملحوظ نہیں رکھ سکتے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے کہ بیوی کوئی مال یا رقم دے کر ایسے میاں سے گلو خلاصی کرلے۔

قانون کی زبان میں اس کو 'خلع' کہتے ہیں۔ یعنی ایک عورت کا اپنے شوہر کو کچھ دے دلا کر اس سے طلاق حاصل کرنا اس معاملے میں اگر عورت اور مرد کے درمیان گھر میں ہی کوئی معاملہ طے ہو جائے تو جو کچھ طے ہوا ہو وہی نافذ ہو گا۔ لیکن اگر عدالت میں معاملہ جائے تو عدالت اس امر کی تحقیق کرے گی کہ آیا فی الواقع عورت اس حد تک متنفر ہو چکی ہے کہ اس کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا۔ اس کی تحقیق ہو جانے پر عدالت کو اختیار ہے کہ حالات کے لحاظ سے

---

[1] افادات شیخ الہند [2] بیان القرآن

جو فدیہ چاہے تجویز کرے اور اس کو شوہر قبول کرکے طلاق دیتا ہو گا [1]

خلع کے موضوع پر علماء قانون کے یہاں تین باتیں اختلافی ہیں۔ خلع کی حیثیت، بدل خلع کی مقدار اور خلع والی عورت کی عدت۔

خلع کی حیثیت

صحابہ میں حضرت عمر بن الخطاب، حضرت علی ابن ابی طالب حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ تابعین میں سعید بن المسیب، الحسن البصری، عطاء ابن ابی رباح، شریح قاضی، الشعبی، ابراہیم نخعی۔ اور آئمہ میں امام مالک، امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد، امام سفیان ثوری، امام اوزاعی کہتے ہیں کہ اس کی حیثیت طلاق بائنہ کی ہے یعنی شوہر کو یہ حق باقی نہیں رہتا کہ اس میں رجوع کر سکے۔ البتہ اگر یہی مرد و عورت پھر ایک دوسرے سے راضی ہو جائیں تو دوبارہ نکاح کر سکتے ہیں۔ اس کے مقابلے پر دوسرا مدرسۂ فکر ہے جس میں صحابہ میں عبداللہ ابن عباس، حضرت عثمان بن عفانؓ تابعین میں طاوس یمانی عکرمہ اور آئمہ میں امام شافعی اور امام احمد بن حنبل ہیں اُن کے خیال میں یہ طلاق نہیں بلکہ فسخ ہے۔ آیت کا پس منظر جو احادیث میں آیا ہے اس سے خلع کے طلاق ہونے کی حیثیت کی تائید ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ثابت بن قیس کی بیوی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی اور عرض کیا یا رسول اللہ! میں ثابت بن قیس کے دین اور اخلاق و عادات پر کوئی عیب نہیں لگاتی ہوں۔ مگر میں اور وہ ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے۔ میں برقع اٹھا کر بہت سے لوگوں میں اُن کو آتے دیکھا تو وہ سب سے زیادہ سیاہ فام، پست قد اور بدصورت ثابت ہی نظر آتے۔ حضور انور نے فرمایا کیا تم اس کو وہ باغیچہ دے سکتی ہو جو اس نے تم کو دیا ہے۔ کہا ہاں وہ بھی اور کچھ زیادہ بھی دے سکتی ہوں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت بن قیس کو بلایا اور فرمایا کہ تم اس سے وہ باغیچہ واپس لے لو اور اس کو طلاق دے دو۔

یہ اسلام میں اولین خلع ہے

---

[1] تفہیم القرآن

بدلِ خُلع کی مقدار

اس پر عُلماءِ قانون کا تقریباً اتفاق ہے کہ شوہر کو بدلِ خلع میں عورت کو دیے ہوتے سامان سے زیادہ لینا روا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ جتنا کچھ اور جو کچھ مرد نے عورت کو دیا ہے اتنا ہی بدل خلع ہو۔ عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن عمر، عکرمہ، مجاہد، ابراہیم نخعی، قبیصہ، الحسن بن صالح، اور ائمہ میں امام مالک، امام شافعی، امام لیث کا یہی مذہب ہے۔ البتہ امام ابوحنیفہ اور امام احمد کی رائے میں مکروہ ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ کے مسلک میں تھوڑی سی تفصیل ہے۔ جواز تو قرآن کے عموم کی وجہ سے ہے اور کراہت صحابہ کرام کے ان آثار کی وجہ سے ہے جو اس موضوع پر آئے ہیں۔ تفصیل حافظ ابن کثیر اور ابو بکر الجصاص نے احکام القرآن میں پیش کی ہے۔

خُلع والی عورت کی عدت

اکثر اہلِ علم کا مذہب یہی ہے کہ خلع والی عورت کی عدت بھی مطلقہ عورت کی طرح ہے۔ اگر اسے ایام ماہواری آتے ہیں تو تین حیض ہیں۔ صحابہ میں حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ ابن عمر، تابعین میں سعید بن المسیب، سلیمان بن یسار، عروہ بن عبداللہ، سالم بن عبداللہ، ابوسلمہ عمر بن عبدالعزیز اور ائمہ میں سفیان ثوری، اوزاعی، ابوحنیفہ، مالک، شافعی، اور احمد بن حنبل کا یہی خیال ہے۔ اس کے مقابلے میں کچھ عُلماء کی رائے یہ ہے کہ خلع والی کی عدت صرف ایک حیض ہے۔

کیا خُلع کے لیے عدالت ضروری ہے

جمہور صحابہ تابعین اور ائمہ کی رائے یہی ہے کہ خُلع کی صحت کے لیے عدالت شرط نہیں ہے۔ قرآن نے لاجناح علیہما کے ذریعے اس کی زوجین کو بلاشرط اجازت دی ہے۔ صرف حسن بصری اور محمد بن سیرین سے یہ منقول ہے کہ خُلع کے لیے عدالت ضروری شرط ہے لیکن اُمت میں اس خیال کو علمی پذیرائی حاصل نہیں ہے۔

تعبیر میں اعجازِ قرآنی

۶۶۷۔ یہ سب احکامِ خداوندی ہیں تم ان سے باہر قدم نہ نکالو۔ اسی پلٹے میں روزے کے

فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهٗ مِنْۢ بَعْدُ حَتّٰى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهٗ ؕ فَاِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ اَنْ يَّتَرَاجَعَآ اِنْ ظَنَّآ اَنْ يُّقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ؕ وَتِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝

پھر اگر دو طلاقوں کے بعد کوئی تیسری طلاق بھی دے تو پھر وہ عورت اس تیسری طلاق کے بعد اُس شخص کے لیے حلال نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ اُس شوہر کے علاوہ کسی اور سے شادی کر لے پھر اگر یہ دوسرا شوہر بھی طلاق دے دے تو اب اُن دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ دوبارہ آپس میں نکاح کر کے مل جائیں بشرطیکہ دونوں کو گمان ہو کہ وہ آئندہ ازدواجی زندگی میں اللہ کی حدود کو اپنائیں گے اور یہ اللہ کی حدود ہیں جنہیں وہ اُن لوگوں کے لیے بیان کرتا ہے جو علم رکھتے ہیں ۔

ذکر میں فرمایا تلک حدود اللہ فلا تقربوھا یہ اللہ کی حدیں ہیں ان کے نزدیک نہ جاؤ اور یہاں فرمایا تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا یہ اللہ کی حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو۔ روزے کے ذکر میں ایسی چیزوں پر پابندیاں عائد کی گئی تھیں جن میں کشش اور دلکشی تھی۔ مثلاً روزے کی حالت میں کام ودہن کی لذتیں منع ہیں۔ روزے کی حالت میں جنسی تعلقات ناجائز ہیں۔ دلکش ممنوعات میں کشش زیادہ ہوتی ہے اس لیے مناسب یہی ہے کہ ان کے قریب جانے سے روکا جائے کہ مبادا اس کے قریب جا کر قوتِ ارادی کمزور پڑ جائے اور اس کی کشش

پر قابو نہ پا سکے۔ لیکن چونکہ یہاں دلکشی کی کوئی بات نہیں ہے۔ یہاں تذکرہ باہمی رنجشوں، ناگواریوں، ناسازگاریوں اور اختلافات کا ہے اس لیے یہاں خطرہ براہ راست حدود کو توڑنے کا ہے اس لیے یہاں تعدی سے منع کیا گیا۔ موقعہ کی مناسبت سے دونوں تعبیروں میں عجیب و غریب وقت بینی سے کام لیا گیا ہے یہ بھی اعجازِ قرآن ہے۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں کہ: سب احکام مذکورہ یعنی طلاق اور رجعت اور خلع حدود اور قواعد مقرر فرمودہ حق تعالیٰ ہیں۔ ان کی پوری پابندی کرو کسی قسم کا خلاف، تغیر اور کوتاہی ان میں نہ کرنی چاہیے۔

تیسری طلاق قطعی اور مغلظ

طلاق کا صحیح طریقہ جو قرآن و سنت میں بیان کیا گیا ہے یہ ہے کہ عورت کو حالتِ طہر میں ایک مرتبہ طلاق دی جاتے۔ اگر جھگڑا ایسے زمانہ میں ہوا ہو جبکہ عورت ایامِ ماہواری میں ہو تو اسی زمانے میں طلاق دینا درست نہیں ہے بلکہ ایامِ ماہواری سے فراغت کے بعد طلاق دے اور ایک طلاق دے۔ ایک طلاق دینے کے بعد اگر چاہے تو دوسرے طہر میں دوسری طلاق دے۔ ورنہ بہتر یہی ہے کہ پہلی ہی طلاق پر اکتفا کرے۔ اس صورت میں شوہر کو یہ حق رہتا ہے کہ عدت کے گزرنے سے پہلے جب چاہے رجوع کرے۔ اور اگر عدت گزر بھی جائے تو دونوں کے لیے موقعہ باقی رہتا ہے کہ پھر باہمی رضامندی سے دوبارہ نکاح کر لیں۔ لیکن تیسرے طہر میں تیسری طلاق دینے کے بعد نہ تو شوہر کو رجوع کا حق باقی رہتا ہے اور نہ اس کا ہی کوئی موقع رہتا ہے کہ دونوں کا پھر نکاح ہو سکے۔ نکاح کا مقصد یہ نہیں ہے کہ ایک مرد اور ایک عورت کسی نہ کسی طرح ایک دوسرے کے گلے پڑ جائیں۔ اور نہ یہ ہے کہ عورت کو مرد کی خود غرضانہ کام جوئیوں کا آلہ بنا دیا جائے بلکہ مقصودِ حقیقی یہ ہے کہ دونوں کے ملاپ سے ایک کامل اور خوشحال ازدواجی زندگی پیدا ہو جائے۔ ایسی زندگی جبھی پیدا ہو سکتی ہے کہ آپس میں محبت و سازگاری ہو اور حدود اللہ یعنی خدا کے ٹھہرائے ہوئے واجبات و حقوق ادا کیے جائیں۔ لہٰذا اگر کسی وجہ سے ایسا نہیں ہے تو نکاح کا مقصودِ حقیقی ہو گیا اور ضروری ہے کہ دونوں فریق کے لیے تبدیلی کا دروازہ کھول دیا جائے۔ اگر مقصودِ نکاح فوت ہونے پر بھی علیحدگی کا دروازہ نہ کھولا جاتا تو یہ انسان کے آزادانہ حقِ انتخاب کے خلاف

ایک بے جا رکاوٹ ہوتی اور ازدواجی زندگی کی سعادت سے سوسائٹی محروم ہو جاتی۔

۶۶۸- پھر اگر دو طلاق کے بعد تیسری طلاق دی تو پھر وہ عورت اس تیسری طلاق کے بعد اس شخص کے لیے حلال نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ اُس شوہر کے علاوہ کسی اور سے شادی کرلے، پھر اگر یہ دوسرا شوہر اُسے طلاق دے دے تو پھر ان دونوں پر اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ دوبارہ باہم نکاح کے ذریعے مل جائیں۔ یعنی اگر شوہر اپنی عورت کو تیسری بار طلاق دے گا تو پھر وہ عورت اُس کے لیے حلال نہ ہوگی تاوقتیکہ وہ عورت دوسرے شخص سے نکاح نہ کرے اور دوسرا خاوند اس سے صحبت کرکے اپنی خوشی سے طلاق نہ دیدے۔ اس کی عدت پوری کرکے پھر زوجِ اوّل سے نکاحِ جدید ہو سکتا ہے اس کو حلالہ کہتے ہیں اور حلالہ کے بعد زوجِ اوّل سے نکاح اسی وقت ہو سکتا ہے کہ ان کو حکم خداوندی قائم رکھنے یعنی ایک دوسرے کے حقوق ادا کرنے کا خیال اور اس پر اعتماد ہو ورنہ ضرور باہمی اور اتلافِ حقوق کی نوبت آئے گی اور گناہ میں مبتلا ہوں گے[1]

یہ تیسری طلاق کا ذکر ہے۔ اگر کسی شخص نے تیسری بار بھی طلاق دے ڈالی تو اب نکاح کا معاملہ بالکل ختم ہو گیا۔ اُس کو رجعت کرنے کا کوئی اختیار نہیں رہا۔ اور چونکہ اُس نے شرعی حدود سے تجاوز کیا ہے کہ بلا وجہ تیسری طلاق دی ہے تو اس کی سزا یہ ہے کہ اب اگر یہ دونوں راضی ہو کر پھر آپس میں نکاح کرنا چاہیں تو وہ بھی نہیں کر سکتے۔ اب دوبارہ نکاح کی شرط یہ ہے کہ یہ عورت عدتِ طلاق پوری کرنے کے بعد کسی دوسرے مرد سے نکاح کرے اور حقوقِ زوجیت ادا کرکے دوسرے شوہر کے ساتھ رہے۔ پھر اگر اتفاق سے وہ دوسرا شوہر طلاق دے دے یا مر جائے تو طلاق یا موت کی عدت پوری کرکے پہلے شوہر سے نکاح ہو سکتا ہے۔

قرآن کا اندازِ بیان بتا رہا ہے کہ طلاق دینے کا اصلی اور شرعی طریقہ یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو طلاقیں دی جائیں۔ تیسری طلاق دینا مناسب نہیں ہے۔ قرآن نے الفاظ الطلاق مرتان کے بعد تیسری طلاق کو حرف اِن کے ساتھ بیان کرکے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ امام مالک اور بہت سے فقہاء تیسری طلاق کے جواز کے قائل نہیں ہیں۔ وہ اس کو طلاقِ بدعی کہتے ہیں۔ اور دوسرے فقہاء نے تین طلاقوں کا جواز اس شرط کے ساتھ مانا ہے کہ الگ الگ تین طہروں میں تین دی جائیں۔ ان کی اصطلاح میں اسے طلاق سنۃ کہا گیا ہے

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

قرآن وسنت کی تصریحات اور تعامل صحابہ وتابعین سے عددِ طلاق کے متعلق جو کچھ ثابت ہوتا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جب طلاق دینے کے سوا کوئی چارہ ہی نہ رہے تو طلاق احسن دے، احسن یہ ہے کہ صرف ایک طلاق حالتِ طہر میں دے دے، جس میں مجامعت نہ کی ہو۔ اور یہ ایک طلاق دینے کے بعد دوسری طلاق نہ دے۔ عدت ختم ہونے پر رشتہ نکاح ٹوٹ جائے گا[1]

تین طلاقیں بیک بار

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اگر ایک شخص قرآن وسنت کے بتائے ہوئے طریقہ طلاق کے مطابق طلاق نہ دے بلکہ طہر میں دینے کے بجائے ایام ماہواری میں دے دے یا ایک طہر میں ایک طلاق دینے کے بجائے ایک ہی طہر میں تینوں طلاقیں ایک ہی مجلس اور ایک ہی کلمہ میں دے دے اس کا کیا حکم ہے؟

بے شک ایسا کرنا قرآن وسنت کی رو سے ناجائز ہے اور ایسا کرنے والا سخت گنہ گار ہے لیکن جمہور امت اور ائمہ اربعہ کے نزدیک اس کا گناہ ہونا اس کے موثر ہونے میں مانع نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کسی شخص نے ایک مجلس میں اور ایک ہی کلمہ میں تین طلاقیں دیں تینوں پڑجائیں گی۔ آئمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد بن حنبل، جمہور تابعین اور اکثر صحابہ کا یہی مذہب ہے۔ اس کے مقابلے میں کچھ کی رائے یہ ہے کہ یہ تینوں طلاقیں سرے سے واقع ہی نہ ہوں گی۔ یہ اہل تشیع کی رائے ہے اور ایک خیال یہ ہے کہ ان تین طلاقوں سے ایک طلاق رجعی پڑے گی یہ امام اسحاق بن راہویہ کی رائے ہے۔

چونکہ جمہور کا مسلک پچھلی دو آراء کے مقابلے میں بہت ہی مستحکم دلائل سے ثابت ہے اور یہ عقل ونقل کی روشنی میں قطعاً بے غبار ہے اس لیے ہم یہاں ناظرین معالم کی ضیافتِ طبع کے لیے اولاً جمہور کے مسلک کے دلائل بیان کرتے ہیں۔ بعد ازیں مخالف مدارس کے نقطہ ہائے نظر کی وضاحت کریں گے۔ اس موضوع پر سب سے زیادہ مفید علمی بحث حضرت مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز نے ایک رسالہ نامی عمدۃ الاثاث میں فرمائی ہے۔ اس جگہ اس کی تلخیص کہیں کہیں اضافہ کے ساتھ پیش کرتا ہوں۔

---

[1] معارف القرآن

طلاق ثلاثہ کے واقع ہونے کے دلائل یہ ہیں:۔

۱۔ اللہ سبحانہ نے طلاق دینے کا قاعدہ اور ضابطہ یہ بیان فرمایا ہے کہ دو طلاقوں کے بعد رجوع کا حق حاصل ہے اور اسی طرح بیوی کو حبالہ عقد اور نکاح میں نہ رکھنے کا حق بھی اسے پہنچتا ہے چنانچہ ارشاد ہے :۔

اگر اس نے بیوی کو اور طلاق دی تو اب وہ عورت اس کے لیے حلال نہیں ہے تاوقتیکہ وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے ۔ (قرآن)

امام شافعی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ خوب جانتا ہے کہ ظاہر قرآن بتا رہا ہے کہ جس شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں عام اس سے کہ اس سے اس نے ہم بستری کی ہو یا نہ کی ہو تو وہ عورت اس شخص کے لیے حلال نہیں ہے تاوقتیکہ وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے۔ (کتاب الام ج ۶ ص ۱۶۰، السنن الکبریٰ ج ۷ ص ۳۲۳)

قرآن میں اس سے پہلے الطلاق مرتان کا ذکر ہے ۔یعنی طلاق رجعی دو بار ہے ۔اس کے بعد فان طلقھا میں حرف فا کے ساتھ یہ بیان فرمایا ہے کہ اگر دو مرتبہ طلاق دے چکنے کے بعد فوری طور پر طلاق دے دے تو اب وہ عورت اس مرد کے لیے حلال نہیں تاوقتیکہ وہ شرعی قاعدہ کے مطابق کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے اور پھر وہ اپنی مرضی سے طلاق دے اور عدت گزر جائے ۔ اس جگہ اگر حرف فا کی جگہ ثمہ ہوتا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ ایک طہر میں ایک طلاق اور دوسرے طہر میں دوسری طلاق اور پھر تیسرے طہر میں تیسری طلاق بھی متعین ہے مگر انداز بیان یوں نہیں ہے ۔ یہاں حرف فا ہے جس کا مطلب بھی یہ ہے کہ دو طلاق کے بعد اگر فی الفور تیسری طلاق بھی کسی نادان نے دی تو اب اس کی بیوی اس کے لیے حلال نہیں ہے جب تک وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ ایک ہی مجلس اور ایک ہی جگہ میں تین طلاقیں دی جائیں ۔الغرض امام شافعی اور امام بیہقی کا یہ فرمانا بالکل سچا ہے کہ اگر تین طلاقیں دے دی ہوں تو اب وہ اس کے لیے حلال نہیں ہے ۔ اس آیت کا ظاہری مطلب تو اسی کی تائید کرتا ہے کہ تین طلاقیں جو ایک ہی مجلس میں دی گئی ہوں وہ تین ہی متصور ہوں گی۔ ہاں عموم الفاظ اور دیگر دلائل سے ہر ہر طہر پر دی گئی طلاق بھی اس کے عموم میں داخل ہے ۔حافظ ابن حزم فرماتے ہیں؛

پھر ہم نے ان لوگوں کی جو بیک وقت تین طلاقوں کو بدعت نہیں کہتے بلکہ سنت

کہتے ہیں۔ یہ دلیل پائی کہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے فان طلقها فلا تحل له ... لہٰذا یہ آیت ان تین طلاقوں پر بھی صادق آتی ہے جو اکٹھی ہوں اور ان پر بھی جو متفرق ہوں۔ اور بغیر نص کے اس آیت کو تین اکٹھی طلاقوں کو چھوڑ کر صرف متفرق کے ساتھ مخصوص کر دینا صحیح نہیں ہے۔ (محلی ج ۱۰ ص ۲۰۷)

گویا حافظ ابن حزم کے نزدیک جس طرح متفرق طور پر تین طلاقیں اس آیت کے مفہوم میں داخل ہیں اسی طرح تین اکٹھی بھی اسلام کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اور حضرت عبداللہ ابن عباس اس آیت کریمہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ:

اگر کسی نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہوں تو وہ اس کے لیے حلال نہیں ہے تاآنکہ وہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے۔ (سنن کبریٰ ج ۷ ص ۳۷۶)

بہرحال تین طلاقوں کا بیک کلمہ اور ایک مجلس میں واقع ہونا قرآن حکیم کی اسی آیت کریمہ سے ثابت ہے اور جمہور کا اس سے استدلال بالکل صحیح اور درست ہے۔ اس آیت کے علاوہ قرآن کریم کی کچھ دوسری آیات میں اس کے اشارات موجود ہیں جیسا کہ اپنے موقع پر انشاءاللہ آئے گا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ شرعاً پسندیدہ طریقہ جس میں آدمی کے لیے گنجائش بھی باقی رہتی ہے یہ ہے کہ متفرق طور پر اور ہر ایک طہر میں ایک طلاق دی جائے لیکن وہ کون سی صحیح صریح اور معمول بہ دلیل ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ ایک سے زائد طلاق بایں طور ممنوع ہے کہ اس کا اعتبار ہی نہ ہو گا۔

۲۔ حضرت عائشہ سے روایت ہے،

ایک شخص نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دیں، سو اس نے کسی اور مرد سے نکاح کیا اور اس نے ہم بستری سے پہلے اُسے طلاق دے دی، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا کہ کیا وہ عورت اپنے پہلے خاوند کے لیے حلال ہے تو آپ نے فرمایا کہ نہیں جبتک دوسرا خاوند اس سے ہم بستری نہ کرے۔

(بخاری ج ۲ ص ۷۹۱، مسلم ج ۱ ص ۴۶۳، السنن الکبریٰ ج ۷، ص ۳۳۴)

اس حدیث میں طلق امراته ثلاثا کا جملہ بظاہر اسی کا مقتضی ہے کہ یہ تین طلاقیں کٹھی اور دفعۃً دی گئی تھیں۔ چنانچہ حافظ ابنِ حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ یہ جملہ ظاہراً اسی کو چاہتا ہے کہ تین طلاقیں اکٹھی اور دفعۃً دی گئی تھیں۔ (فتح الباری ج ۹ ص ۲۹۵) اور یہی مطلب اس کا

حافظ بدرالدین عینی بیان کرتے ہیں۔ (عمدۃ القاری ج ۹ ص ۳۷) اور علامہ عسقلانی اس باب کا عنوان نقل کرنے کے بعد او تسریح باحسان کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

یہ عام ہے دفعۃً تین طلاقوں کے واقع کرنے پر بھی یہ صادق ہے اور آیت اس پر دلالت کرتی ہے اور اس میں کسی کا انکار منقول نہیں، بجز ان کے جو اس کو جائز نہیں سمجھتے۔

اور امام بخاری نے اس پر یہ عنوان قائم کیا ہے

باب من جوز الطلاق الثلاث

جس کا مطلب یہ ہے کہ ان تین طلاقوں سے دفعۃً اور اکٹھی تین طلاقیں بھی مراد ہیں۔ کیونکہ اگر متفرق طور پر تین طہروں میں تین طلاقیں ہی مراد ہوں تو اس میں کسی کا اختلاف ہی نہیں ہے۔ پھر نہ معلوم حضرت امام بخاری نے اس غیر اختلافی مسئلہ کے لیے باب کیوں قائم کیا۔ علاوہ ازیں حضرت امام بخاری نے دفعۃً تین طلاقیں دینے کا کون سا باب قائم کیا ہے جس میں اختلاف بھی ہے اور حضرت امام بخاری اس کے جواز کے بھی قائل ہیں۔ اور اسی کے قریب محدث دارمی نے باب قائم کیا ہے۔ اور امام بیہقی نے یہ باب قائم کیا ہے۔

باب ماجاء فی امضاء الطلاق الثلاث وان کن مجموعات

اور پھر اس کے تحت یہ حدیث بھی درج کی ہے۔ بہرحال یہ حدیث بتاتی ہے کہ تین طلاقیں اگر دی جائیں تو واقع ہو جاتی ہیں۔

۳۔ حضرت عائشہ سے دریافت کیا گیا کہ

ایک شخص ایک عورت سے شادی کرتا ہے اور بعد ازیں اسے تین طلاقیں دے دیتا ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ عورت اس شخص کے لیے حلال نہیں ہے جب تک دوسرا خاوند اس سے ہم بستری نہ کرے جیسے پہلا شوہر کر چکا ہے۔ (مسلم ج ۱ ص ۴۶۳، السنن الکبریٰ ج ۷ ص ۳۷۱)

اس حدیث میں لفظ ثلاثا اسی کا متقضی ہے کہ تین طلاقیں دفعۃً اور اکٹھی دی گئی ہوں اور دارقطنی نے سنن میں یہ روایت اس طرح پیش کی ہے۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب مرد اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دے تو وہ اس کے لیے حلال نہیں۔

۴۔ حضرت محمود بن لبید کی روایت ہے کہ
آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ اطلاع ملی کہ ایک شخص نے اپنی بیوی کو اکٹھی تین طلاقیں دے دی ہیں تو آپ غصہ سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ پھر آپ نے یہ ارشاد فرمایا کہ کیا میری موجودگی ہی میں اللہ تعالیٰ کی کتاب سے کھیلا جا رہا ہے۔ حتیٰ کہ ایک شخص کھڑا ہوا اور اس نے کہا یا رسول اللہ میں اُسے قتل نہ کر دوں۔ (نسائی ج ۲ ص ۸۲)
حافظ ابن القیم فرماتے ہیں اسناد علی شرط مسلم (زاد المعاد ص ۵۴) کہ اس کی سند مسلم کی شرط کے مطابق ہے۔ اور علامہ ماردینی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بسند صحیح ہے۔ (الجوہر النقی ج ۲ ص ۳۳)
حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں اسنادہ جید (نیل الاوطار ج ۱ ص ۱۴۱) اور حافظ ابن حجر فرماتے ہیں رواتہ موثقون (سبل السلام ج ۲ ص ۲۱۲)

ایک شبہ کا ازالہ

اس حدیث پر یہ شبہ کیا گیا ہے کہ اولاً یہ مرسل ہے کیونکہ محمود بن لبید کا آنحضرت سے احادیث سننا تاریخی طور پر ثابت نہیں۔ ولادت بلاشبہ زمانہ نبوت میں ہوئی ہے ثانیاً امام نسائی نے اس کو روایت کرنے کے بعد لکھا ہے، مجھے یہ حدیث صرف مخرمہ ابن بکیر کے حوالہ سے ملی ہے اور مخرمہ کی اپنے والد سے روایت بطور وجادہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ مرسل صحابی ہے اور صحابہ کے مراسیل کے بارے میں تقریباً تمام علمائے کرام متفق ہیں کہ وہ حجت ہیں۔ چنانچہ امام بیہقی کتاب القراءۃ میں لکھتے ہیں کہ صحابہ کے مراسیل حجت ہیں (ص ۴۴۱) امام نووی لکھتے ہیں کہ مرسلات صحابہ جمہور اہل اسلام کے نزدیک حجت ہیں (مقدمہ ص ۱۷) قاضی شوکانی رقمطراز ہیں کہ صحابہ کے مراسیل حدیث مسند کے حکم میں ہیں (نیل الاوطار ج ۱ ص ۱۴۳) وجادہ کے طور پر روایت مخرمہ کی صرف نہیں ہے دفتر حدیث میں اور بھی روایات ہیں جن کو حضرت مخرمہ نے اپنے والد کے حوالہ سے پیش کیا ہے۔ اور محدثین نے بلا نکیر قبول کیا ہے۔ صحیح مسلم میں امام مسلم نے مخرمہ کی متعدد حدیثیں پیش کیں جن کو انہوں نے اپنے والد کے حوالہ سے پیش کیا ہے اور امام مسلم نے ان کو اپنی صحیح میں ممتاز جگہ دی ہے۔

۵۔حضرت عویمر العجلانی نے جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے اپنی بیوی خولہ بنت قیس سے لعان کیا تو اس کے بعد

حضرت عویمر نے کہا یا رسول اللہ اگر میں اس کو اپنے پاس روکوں اور بیوی بنا کر رکھوں تو میں نے اس پر جھوٹ کہا، لہٰذا اس نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم صادر فرمانے سے پہلے ہی اس کو تین طلاقیں دے دیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ تین طلاقیں دفعۃً واقع ہو سکتی ہیں۔ کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر کوئی انکار نہیں فرمایا۔ اگر تین طلاقیں دفعۃً واقع نہ ہوتیں تو آپ اس پر ہرگز خاموشی اختیار نہ فرماتے۔ چنانچہ امام نووی فرماتے ہیں:

اس حدیث سے ہمارے اصحاب نے استدلال کیا ہے کہ ایک ہی لفظ میں جمع کرکے تین طلاقیں دے دینا حرام نہیں ہے اور وجہ استدلال یہ ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاقوں کے بولنے پر کوئی انکار نہیں فرمایا۔ ہاں اس استدلال پر یہ اعتراض کیا گیا ہے کہ آپ نے اس لیے انکار نہیں فرمایا کہ لعان کی وجہ سے اس کی بیوی طلاق کا محل ہی نہ رہی تھی اور نہ طلاق نافذ ہونے کی نوبت آئی لیکن اس اعتراض کا یہ جواب دیا گیا ہے کہ اگر تین طلاقیں ایک دم دینا حرام ہوتا تو آپ ضرور اس پر نکیر فرماتے اور یہ فرما دیتے کہ اکٹھی تین طلاقیں دینا حرام ہے تو کیوں تین طلاقیں دے رہا ہے؟

مطلب یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا دفعۃً تین طلاقوں کے صادر کرنے پر انکار نہ فرمانا ان کے وقوع کی دلیل ہے اور امام بخاری کا اسے من جوز الطلاق الثلاث کے تحت لانا امام بخاری کے میلان کو بھی بتا رہا ہے۔

۶۔ حضرت عبداللہ بن عمر نے بحالت حیض اپنی بیوی کو ایک طلاق دی۔ پھر ارادہ کیا کہ باقی دو طلاقیں بھی باقی دو حیض کے وقت دے دوں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر ہوئی تو آپ نے حضرت ابن عمر سے فرمایا کہ تجھے اللہ تعالیٰ نے اس طرح تو حکم نہیں دیا ہے تو نے سنت کی خلاف ورزی کی ہے۔ سنت تو یہ ہے کہ جب طہر کا زمانہ آوے تو ہر طہر کے وقت اس کو طلاق دے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے رجوع کا حکم دیا چنانچہ میں نے رجوع کر لیا۔ پھر آپ نے مجھ سے فرمایا کہ جب وہ طہر کے زمانے میں داخل ہو تو اس کو

طلاق دینا اور مرضی ہوئی تو بیوی بنا کر رکھ لیتا۔ اس پر میں نے عرض کیا۔

یا رسول اللہ، تو فرمائیے کہ اگر میں اسے تین طلاقیں دے دیتا تو کیا میرے لیے رجوع کی اجازت ہوتی۔ آپ نے فرمایا نہیں وہ تجھ سے جدا ہو جاتی اور یہ کارروائی معصیت ہوتی۔ (السنن الکبریٰ ج ۷ ص ۳۳۴، سنن دار قطنی ج ۲ ص ۴۳۶)

(دیکھو عمدۃ الاثاث ص ۵۶ تا ۵۷)

حضرت نافع ابن عمر فرماتے ہیں کہ حضرت رکانہ بن عبد یزید نے اپنی بیوی کو بتہ (قطع تعلق کرنے والی) طلاق دی تو اس کے بعد انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر دی اور کہا کہ

بخدا میں نے صرف ایک کا ارادہ کیا ہے اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ خدا کی قسم تو نے صرف ایک ہی طلاق کا ارادہ کیا تھا۔ رکانہ نے کہا بخدا میں نے ایک ہی طلاق کا ارادہ کیا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ بیوی اسے واپس کر دی۔ دوسری طلاق رکانہ نے اس کو زمانہ عمرؓ میں اور تیسری زمانہ عثمانؓ میں دی۔

یہ روایت اس معاملہ میں کہ ایک ہی مجلس میں اور ایک کلمہ سے تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں نص ہے کیونکہ اگر ایسا نہ ہوتا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو قسم نہ دیتے یعنی اگر رکانہ کہہ دیتے کہ بتہ سے میری نیت تین کی تھی تو تینوں پڑ جاتیں۔ بتہ طلاق قطعی کے لیے کنایہ ہے اور ثلاث صریح ہے۔ اگر ان کی نیت سے تین واقع نہ ہوتیں تو قسم دلا کر ارادہ پوچھنا بے معنے ہو جاتا اور اس کی معنویت یہی ہے کہ اگر وہ کہہ دیتے کہ میری نیت تین کی تھی تو تینوں طلاقیں ہو جاتیں۔

۸۔ حضرت عبداللہ ابن عمر سے جب اس قسم کے مسئلہ کے بارے میں دریافت کیا جاتا تو وہ جواب دیتے کہ

اگر تم نے اپنی بیوی کو ایک یا دو طلاقیں دی ہیں تو بے شک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے اس صورت میں رجوع کا حکم دیا تھا اور اگر تم نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دی ہیں تو یقیناً وہ تم پر حرام ہو گئی ہے یہاں تک کہ وہ تیرے علاوہ اور کسی مرد سے شادی کرے۔ اور اس طرح تو نے اپنی بیوی کو طلاق دینے میں اللہ تعالیٰ کے حکم کی نافرمانی بھی کی ہے۔ (مسلم ج ۱ ص ۴۷۶)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ تین طلاقوں کے بعد کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایک یا دو طلاق کے بعد رجوع کرنے کا حکم آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔ تین طلاقوں کے بعد رجوع ثابت نہیں ہے۔ ورنہ حضرت عبداللہ بن عمر اس کا حوالہ دیتے اور اس کے خلاف فتویٰ دینے کی جرأت نہ کرتے۔ اور اس سے یہ پتہ لگا کہ اس شخص نے دفعتہً اور یکبارگی تین دی تھیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو وہ یہ نہ فرماتے کہ تو نے طلاق کے سلسلے میں اپنے رب کی نافرمانی کی ہے۔

۹۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عمر کے پاس آیا۔ اس نے کہا کہ میں نے بحالت حیض اپنی بیوی کو طلاق بتہ دے دی یعنی تین طلاقیں۔ انہوں نے فرمایا کہ تو نے اپنے پروردگار کی نافرمانی کی اور تیری بیوی تجھ سے جدا ہو گئی۔ اس شخص نے آگے سے عرض کیا کہ عبداللہ بن عمر کے ساتھ بھی ایسا ہی معاملہ پیش آیا تھا۔ مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کو رجوع کا حق دیا اس پر حضرت عمر نے فرمایا،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کو یہ حکم دیا تھا کہ وہ اپنی بیوی کی طرف رجوع کرے مگر اس لیے کہ اس کی طلاق باقی تھی اور تیرے لیے اپنی بیوی کی طرف رجوع کا حق نہیں کیونکہ طلاق باقی نہیں ہے۔ (السنن الکبریٰ ج ۷، ص ۳۳۴)[1]

۱۰۔ امام مجاہد کہتے ہیں کہ میں عبداللہ بن عباس کے پاس تھا کہ ایک شخص نے آکر بتایا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔ عبداللہ بن عباس خاموش ہو گئے۔ سائل سمجھا کہ شاید واپسی کا کچھ سامان ہو جائے گا۔ سکوت کے بعد حضرت عبداللہ نے فرمایا تم لوگ حماقت کرتے ہو وہ بولا حضرت اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا جو اللہ سے ڈرتا ہے اللہ اس کے لیے کوئی راہ نکال دیتا ہے۔ ابن عباس نے فرمایا تو اللہ سے نہیں ڈرا اس لیے تیرے لیے کوئی راہ نہیں ہے اور فرمایا:

تو نے اپنے رب کی نافرمانی کی، تیری عورت تجھ سے جدا ہو گئی۔

(سنن ابوداؤد)

ابوداؤد نے اس کے متابعات بھی ذکر کیے ہیں۔ یہ قرآنی آیت کی عبداللہ ابن عباس نے

---

[1] عمدۃ الاثاث تلخیصاً ص ۵۴ تا ۶۱

تفسیر پیش کی ہے اور اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص تین طلاقیں بیک بار نہیں دیتا اس کے لیے اللہ رجعت کی راہ بتاتے ہیں اور ایسا شخص اللہ سے ڈرتا ہے۔ اور جو اللہ سے نہیں ڈرتا اور تینوں طلاقیں بیک بار ہی دے دیتا ہے اللہ اس کے لیے رجعت کی راہ نہیں بتاتا۔ کیونکہ تینوں طلاقیں واقع ہو کر قطعی ہو جاتی ہیں۔ یہ مفسرِ قرآن، ترجمانِ قرآن، حبرالامۃ کی تشریح ہے۔ اسی پر صحابہ اور تابعین، ائمہ مجتہدین کا اجماع ہے۔

اجماعِ صحابہ

اس پر صحابہ کرام کا اجماع ہے کہ تین طلاقیں دینے سے تینوں ہو جاتی ہیں جیسا کہ علامہ زرقانی نے شرح موطا میں حافظ ابن عبد البر سے نقل کیا ہے۔ قاضی ابوالولید باجی نے منتقی میں ابوبکر الجصاص رازی نے احکام القرآن میں اور حافظ ابو جعفر طحاوی نے معانی الآثار میں اس پر سلف کا اجماع نقل کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں رقمطراز ہیں۔

متعہ کا حرام ہونا اور تین طلاقوں کا پڑ جانا۔ دونوں راجح ہیں اور دونوں کی پشت پر اس اجماع کی بھرپور طاقت ہے جو زمانۂ عمرؓ میں ہو چکا ہے۔ تاریخ و روایت میں ایسی کوئی نقل نہیں ہے جس سے یہ ثابت ہو کہ زمانۂ فاروق اعظم میں کسی نے اس کی مخالفت کی ہو۔ لہٰذا اس اجماع کے بعد اس میں اختلاف کرنا صحابہ کے اجماع کو ٹھکرا دینے کے مترادف ہے اور جمہور علماء کی یہاں اس اجماع کے بعد کسی اختلاف کی کوئی قیمت نہیں۔

حافظ ابن رجب حنبلی نے اس موضوع پر ایک علمی اور تحقیقی کتاب لکھی اور کتاب کا نام "بیان مشکل الاحادیث الواردۃ فی ان الطلاق الثلاث واحدۃ" ہے۔ اس کتاب میں حافظ صاحب موصوف رقمطراز ہیں:

صحابہ تابعین اور قابل اعتماد ائمہ ملت سے اس موضوع پر کہ تین طلاقیں جب یکبارگی دی جائیں تو ان کو ایک ہی شمار کیا جائے۔ صراحۃً کچھ بھی منقول نہیں ہے۔ (الاشفاق علی احکام الطلاق الکوثری ص ۳۵)

اور اسی میں فرماتے ہیں:

ہمیں پوری امت میں ایسے کسی شخص کا علم نہیں ہے جس نے کھل کر اس مسئلہ

میں مخالفت کی ہو، نہ فتوی میں نہ علم میں نہ فیصلہ میں۔ صرف چند لوگوں کے منہ پر یہ بات آئی ہے ان کو ان کے معاصرین نے منہ توڑ جواب دیا ہے۔

بہرحال یہ مسئلہ دلائل و براہین کی بنیادوں پر قائم ہے اس میں آج تک چند افراد کے تفرد کو چھوڑ کر امت میں دو رائیں نہیں ہوتی ہیں۔

دراصل تین طلاقوں کا دفعۃً دینا اور طلاق کا زمانہ حیض میں دینا دونوں میں ہم آہنگی ہے جیسے بحالتِ حیض اپنی بیوی کو طلاق دینا ممنوع اور خلافِ سنت ہے۔ مگر جمہور اہلِ اسلام کے نزدیک طلاق واقع ہو جاتی ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر نے اپنی بیوی کو بحالتِ حیض طلاق دی تھی اور اس طلاق کو دربارِ نبوت میں طلاق ہی قرار دیا گیا تھا اور قرار دے کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو رجوع کا حکم دیا تھا اور یہ ارشاد فرمایا تھا کہ طہر کے زمانہ میں جو مجامعت سے خالی ہو طلاق دینا۔ خارجیوں اور اہلِ تشیع کا تو یہ خیال ضرور ہے کہ حیض کی حالت میں دی گئی طلاق نہیں ہوتی جیسا کہ الخطابی نے معالم السنن میں بتایا ہے مگر حیرت ہے کہ امام ابن حزم، حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم پر کہ وہ بھی حالتِ حیض میں دی گئی طلاق کو کالعدم قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح تین طلاقوں کے موضوع پر حافظ ابن تیمیہ اور حافظ ابن القیم شیعوں کی طرح تین طلاقوں کے ایک طلاق ہونے کے قائل ہیں۔ سب سے پہلے شیخ تقی الدین سبکی، عزالدین ابن جماعہ نے پھر حافظ ابن رجب حنبلی نے ان کا رد لکھا ہے۔ اور ان کی سب سے بڑی دلیل یہ ہے کہ بحالتِ حیض طلاق دینا ممنوع ہے اور جب یہ ممنوع ہے تو اس پر طلاق کا شرعی حکم تین ہونا یا حالتِ حیض میں طلاق ہونا کس طرح مرتب ہوگا۔ مگر یہ دلیل ایک شبہ سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی ہے۔ کیونکہ کسی چیز کا ناجائز اور ممنوع ہونا اپنے مقام پر ہے اور اس پر شرعی حکم مرتب ہونا اپنی جگہ پر ہے۔ کون نہیں جانتا کہ ارتداد، زنا، چوری، قتل اور ڈاکہ وغیرہ اسلامی قانون کی نظر میں سنگین جرائم ہیں مگر ان پر شرعاً احکام بھی مرتب ہوتے ہیں۔ ارتداد، اور قتلِ ناحق اور ڈاکہ کی بعض صورتوں میں اپنی شرائط کے ساتھ قتل کا حکم ہوگا اور شرعی ثبوت کے بعد چوری میں ہاتھ کاٹا جائے گا۔ اور زنا میں رجم اور کوڑوں کی سزا ملے گی۔ تو کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ چونکہ

ارتداد شرعاً حرام ہے اس لیے اس پر شرعاً کوئی حکم مرتب نہ ہوگا۔ زنا چونکہ قرآن میں حرام ہے اس لیے اس کی کوئی سزا نہیں ہے۔ چوری چونکہ شرعاً ناجائز ہے اس لیے چور کے ہاتھ نہ کاٹے جائیں گے۔ قتل کو قرآن نے چونکہ حرام قرار دیا ہے اس لیے قصاص کا حکم نہیں ہے۔

ذرا غور فرمائیے اپنی منکوحہ بیوی کو محرمات ابدیہ میں سے کسی کے ساتھ تشبیہہ دینا شریعت کی زبان میں ظہار کہلاتا ہے اور اس کو قرآن میں اللہ تعالیٰ نے ناپسندیدہ بات اور جھوٹ سے تعبیر فرمایا ہے۔ منکرا من القول وزورا" -

مگر باوجود جھوٹ اور ناپسندیدہ ہونے کے اس پر حکم شرعی کفارہ ظہار کی صورت میں مرتب ہوتا ہے۔ اور قذف (تہمت) ممنوع ہے۔ مگر حد اور شہادت کے مردود ہونے کا حکم اس پر بھی مرتب ہے۔

یہ صرف سطحی قسم کی منطق ہے۔ اسی طرح سمجھئے کہ حیض کی حالت میں طلاق دینا ممنوع ہے مگر اس پر حکم ضرور مرتب ہوگا اور اسی طرح تین طلاقیں بیک وقت مکردہ، بدعت اور غیر مستحسن ہیں۔ پھر وقوع ان کا بھی ہوگا۔ اگرچہ کراہت اس فعل میں بھی شامل ہوگی اور دفعۃً تین طلاقیں بلاشبہ جہالت اور حماقت کا کام ہے مگر واقع تین ہی ہوں گی۔ چنانچہ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں:

> جس شخص نے ایک ہی کلمہ میں تین طلاقیں دے دیں تو بے شک اس نے جہالت کا ارتکاب کیا مگر اس کی بیوی اس پر حرام ہو جائے گی اور اس کے لیے وہ کبھی حلال نہیں ہو سکتی تاوقتیکہ کسی اور مرد سے نکاح نہ کرے۔ (کتاب الصلوٰۃ ص ۱۴۴)

آئیے ذرا سرراہے کچھ آن کے دلائل بھی سن لیجئے جو کہتے ہیں کہ ایک بار دی ہوئی تین طلاقیں تین نہیں ایک ہیں۔

پہلی دلیل

> حضرت طاؤس کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے، حضرت ابو بکر کے زمانہ اور حضرت عمر کی خلافت کے ابتدائی دو سال میں تین طلاقیں ایک ہی ہوتی تھی۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ لوگوں نے اپنے معاملہ میں جلد بازی سے کام لیا ہے۔ حالانکہ ان کو سوچنا اور سمجھنے کا وقت حاصل تھا ہم کیوں نہ ان کو ان پر نافذ کر دیں تو حضرت عمر نے تین ہی نافذ کر دیں۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں جمہور کی طرف سے اس حدیث کے آٹھ جواب دیے ہیں۔ لیکن ہم تفصیل میں جانے سے دور رہتے ہوئے صرف مولانا سرفراز کے بیان ہی پر اکتفا کرتے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ

اوّلاً امام بیہقی فرماتے ہیں کہ امام بخاری نے اس روایت کی تخریج محض اس لیے نہیں

کی ہے کہ حضرت عبد اللہ ابن عباس کی تمام روایات اس کے خلاف ہیں اور تمام ثقہ راوی مثلاً حضرت سعید بن جبیر، حضرت عطاء ابن ابی رباح، حضرت مجاہد، حضرت عکرمہ، حضرت عمرو بن دینار، حضرت مالک ابن الحویرث، حضرت محمد بن ایاس اور حضرت معاویہ ابن ابی عیاش، عبد اللہ بن عباس سے یہ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے تین طلاقوں کو تین ہی قرار دیا ہے (سنن کبریٰ ج ۷ ص ۳۳۸)
اور قاضی شوکانی امام احمد سے نقل کرتے ہیں کہ

حضرت ابن عباس کے تمام شاگرد حضرت ابن عباس کے خلاف روایت کرتے ہیں جو طاؤس نقل کرتے ہیں۔ (نیل الاوطار ج ۶ ص ۲۴۴)

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث مضطرب ہے (فتح الباری ص ۲۹۲) امام ابن العربی مالکی شارح ترمذی فرماتے ہیں کہ اس روایت میں کلام ہے لہٰذا یہ روایت اجماع پر ترجیح نہیں پاسکتی ہے۔ علامہ ابو جعفر النحاس اپنی کتاب الناسخ والمنسوخ میں لکھتے ہیں کہ طاؤس اگرچہ مرد صالح ہیں لیکن حضرت ابن عباس سے بہت سی روایات میں منفرد ہیں۔ اہل علم جن روایات کو قبول نہیں کرتے۔ منجملہ ان کے ایک روایت وہ بھی ہے جس میں انہوں نے حضرت ابن عباس سے تین طلاقوں کے ایک ہونے کی روایت کی ہے لیکن صحیح روایت حضرت ابن عباس اور حضرت علی سے یہی ہے کہ تین طلاقیں تین ہوتی ہیں (اعلام مرفوعہ ص ۲۲)

ثانیاً کسی چیز کا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک اور عہد صدیقی میں ہونا اس کا مقتضی ہے کہ وہ کام حضور انور کے حکم اور اجازت سے ہوا ہو۔ بعض کام ایسے بھی تھے جو آپ کے عہد مبارک میں ہوتے تھے لیکن آپ کو ان کی خبر تک نہ تھی تو ایسے امور کا جواز کیونکر ثابت ہو سکتا ہے۔ کتب احادیث میں بہت سے واقعات اس قسم کے ہیں۔ یہ حدیث نہ تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قول ہے اور نہ فعل ہے پھر اس کو کیونکر حجت گردانا جاسکتا ہے۔ چنانچہ مشہور ظاہری محدث علامہ حافظ ابن حزم لکھتے ہیں؛

اس حدیث میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جو یہ بتائے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین طلاقوں کو ایک کہا تھا یا ان کو ایک کی طرف لوٹایا تھا اور نہ اس میں یہ چیز موجود ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کے ہونے کا علم ہوا اور آپ نے برقرار رکھا اور حجت تو صرف اس چیز میں ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہو یا کوئی کام کیا ہو یا آپ کو اس کا علم ہوا ہو اور آپ نے

اس پر نکیر نہ فرمائی ہو۔　　　(محلی ج ۱۰ ص ۲۰۶)

علامہ موصوف کے اس بیان سے معلوم ہوا کہ یہ حدیث سرے سے مرفوع ہی نہیں ہے۔ کیونکہ مرفوع حدیث کے تینوں اقسام قولی، فعلی اور تقریری سے یہ خارج ہے اور حجت تو صرف آپ کی حدیث ہے۔ اگر فی الواقع یہ حدیث ہوتی اور حضرت ابن عباس کو یہ معلوم ہوتا کہ حضور انور کے مبارک زمانہ اور عہدِ صدیقی میں بلا کسی متعین صورت کے مطلقاً تین طلاقوں کو ایک کہا جاتا تھا تو جب حضرت عمر تین کو تین بتانے لگے تھے تو حضرت ابن عباس ضرور اس کے خلاف آواز بلند کرتے۔ اور حیرت یہ ہے کہ صرف یہی نہیں کہ اس کے خلاف ابن عباس نے احتجاج نہیں کیا بلکہ حضرت ابن عباس فتوی بھی تین ہی کا دیتے رہے۔ اور یہ طے شدہ بات ہے کہ کسی راوی کا اپنی روایت کے خلاف عمل اور فتویٰ بشرطیکہ وہ منسوخ نہ ہو۔ اس کی عدالت پر اثر انداز ہوتا ہے۔ اور یہ بھی اُصول کا مسئلہ ہے کہ جس حدیث سے حضرات صحابہ کی عدالت پر حرف آتا ہو اس کے راوی اگرچہ کتنے ثقہ ہوں وہ قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ ان تمام قرائن سے یہ حقیقت بے غبار ہو جاتی ہے کہ حضرت ابنِ عباس کی حدیث کا وہ مطلب نہیں ہے جو سمجھا گیا ہے۔

ثالثاً:۔ اگر ابنِ عباس کی اس حدیث کا یہی مطلب ہے کہ تین طلاقیں زمانۂ نبوت اور عہدِ صدیقی میں تین نہیں بلکہ ایک قرار دی جاتی تھیں۔ تو سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ کوئی کسی ایک شخص کا انفرادی معاملہ نہیں بلکہ اس کا تعلق سارے معاشرے اور پوری اُمت سے ہے اور جن کاموں کا تعلق رائے عامہ سے ہوتا ہے ان کی روایت بھی عمومی ہوتی ہے ایسا معاملہ جس کا تعلق پوری عوامی زندگی سے ہو اس کو مشہور ہونا چاہیے اور جب اس کی نقل کے دواعی اور اسباب بھی زیادہ ہوں تو اسے متعدد راہوں سے منقول ہونا چاہیے لیکن اس کے باوجود سارے دفترِ حدیث میں ابنِ عباس کی اس ایک حدیث کے علاوہ کوئی حدیث نہیں اور وہ بھی ان کے بے شمار تلامذہ میں سے صرف حضرت طاؤس کی زبانی۔ یہ بات اس حدیث کی صحت کو مخدوش بنا دیتی ہے۔ اصولیین کی یہ طے شدہ پالیسی ہے۔ صاحب جمع الجوامع کے حوالہ سے علامہ شنقیطی رقمطراز ہیں۔

نقل کے دواعی ہونے کے باوجود خبر واحد کے ذریعے کسی بات کا منقول ہونا صحیح نہ ہونے کی علامت ہے۔　(اضواء البیان ص ۱۹۴)

اور ابن الحاجب کے مختصر الاصول میں ہے :

اگر کسی بات کے بیان کرنے میں ایک شخص منفرد ہو اور منقول ہونے کے اسباب زیادہ ہوں۔ حالانکہ وہ کام انفرادی نہیں بلکہ عمومی ہو تو یہ روایت کے صحیح نہ ہونے کی علامت ہے ۔

یہ حقیقت ہے کہ تین طلاقوں کا زمانۂ نبوت اور عہد صدیقی میں ایک ہونا اور فاروق اعظم کا اس کے خلاف اس کو تین بنا دینا اتنا بڑا تاریخ میں اقدام ہے کہ اس کا ذکر ہر کہ ومہ کی زبان پر ہو۔ اور اس لیے ہو کہ یہ حضرت عمر کے احداث کا سب سے بڑا جواب ہے لیکن صحابہ کا سکوت اور ان سے اس موضوع کچھ منقول نہ ہونا اس بات کی دلیل ہے۔ کہ ابن عباس سے یہ روایت تنہا طاؤس کی تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے۔ علامہ قرطبی نے المفہم میں جیسا کہ حافظ عسقلانی نے ان سے نقل کیا ہے اس طرف اشارا کیا ہے فرماتے ہیں :

اس حدیث کا ظاہر سیاق چاہتا ہے کہ یہ بات سب جانتے ہوں گے اور ایسے احکام میں عادات کا تقاضا یہی ہے کہ یہ منظر عام پر ہوتے ہیں۔ صرف ایک شخص کا اسے پیش کرنا حدیث کی صحت مشکوک کر بنائے یا نہ بنائے لیکن عمل میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے ۔

اور یا پھر ابن عباس کی روایت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے اور عہد صدیقی میں دی گئیں تین طلاقوں کو ایک قرار دیا جاتا تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس عہد میں بجائے تین طلاقیں دینے کے صرف ایک طلاق دینے کا رواج تھا۔ اگرچہ تین کا ثبوت بھی اس زمانے میں ملتا ہے جیسا کہ محمود بن لبید کی روایت میں گزر چکا ہے مگر نسبتاً کم تھا۔ بعد کو حضرت عمر نے اس سیلاب پر بند لگانے کے لیے یہ قانون نافذ کر دیا۔ حضرت عمر کا یہ ارشاد اس کی تائید کرتا ہے کہ شریعت نے ان کو تدبر کا موقع دیا تھا لیکن لوگوں نے جلدبازی سے کام لینا شروع کر دیا۔ اور ایک روایت میں تتابع الناس آیا ہے یعنی عہد فاروقی میں لوگوں نے لگاتار طلاق دینی شروع کر دی اس کی تائید کرتا ہے۔ ابن عباس کی روایت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ عدد اور گنتی کے لحاظ سے تو تین ہوتی تھیں مگر ان کا شمار ایک کیا جاتا تھا - اور اس مطلب کی تائید حضرت ابراہیم نخعی کی اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو مصنف ابن ابی شیبہ وغیرہ میں آئی ہے کہ

صحابہ کرام اس کو پسند کرتے تھے کہ بیوی کو صرف ایک ہی طلاق دی جائے پھر اس کو چھوڑ دیا جائے یہاں تک کہ اس پر تین حیض گزر جائیں۔
حافظ ابن حجر نے درایہ میں اس کی سند پر صحت کی مہر لگائی ہے۔ دوسرے محدثین مثلاً حافظ ابو زرعہ رازی نے بھی حدیث ابن عباس کا یہی مطلب بتایا ہے۔ فرماتے ہیں:

اس حدیث کا میرے نزدیک مطلب یہ ہے کہ جیسے تم اب اکٹھی تین طلاقیں دیتے ہو زمانۂ نبوت اور عہدِ صدیقی اور حضرت عمر کے ابتدائی زمانے میں صحابہ کرام تین نہیں بلکہ ایک ہی دیتے تھے۔ (السنن الکبریٰ ج ، ص ۳۳۸)

اس حدیث کا یہی مطلب امام نووی، امام خطابی، امیر یمانی اور علامہ زرقانی نے بھی بتایا ہے۔ گویا اس لحاظ سے حضرت ابن عباس نے اس حدیث میں طلاق کے موضوع پر لوگوں کی عادت بدلنے کا ذکر کیا ہے اور بس اس لیے اس حدیث کا پیش پا افتادہ مسئلہ سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حضرت ابن عباس کی اس روایت کو اگر ظاہر ہی پر محمول کیا جائے اور ہر طرح سے اس کو بے غبار تسلیم کر لیا جائے تو پھر ذرا اس پر غور فرمائیے کہ اس کا ان صحیح روایات سے تعارض لازم آئے گا جو جمہور کی طرف سے پیش کی جاتی ہیں۔ تعارض کی صورت میں بھی جمہور کی طرف سے پیش کردہ احادیث کو کئی وجوہ سے ترجیح ہوگی۔

اوّلاً یہ کہ علامہ حازمی نے یہ قاعدہ بیان کیا ہے کہ اگر ایک حدیث ظاہر قرآن کے موافق ہو اور دوسری نہ ہو تو جو حدیث ظاہر قرآن کے موافق ہوگی اسی کا اعتبار ہوگا۔ (کتاب الاعتبار) اور یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ جمہور کی پیش کردہ حدیثیں ظاہر قرآن کے موافق ہیں اس لیے ان ہی کو ترجیح ہوگی۔

ثانیاً ایک حدیث پر جمہور اُمت کا عمل ہو اور دوسری پر نہ ہو تو اس حدیث کو ترجیح ہوگی جس پر جمہور اُمت کا عمل ہے کیونکہ یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ حدیث صحیح ہے بخلاف دوسری کے (کتاب الاعتبار)

مصر کے مشہور محدث و فقیہ لیث بن سعد نے امام مالک کے نام جو خط لکھا ہے اس میں اس معیار کو واضح طور پر پیش کیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

جب کوئی ایسا مسئلہ سامنے آ جائے جس پر مصر، شام، عراق میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

کے صحابہ نے زمانہ ابوبکر و عمر و عثمان میں عمل کیا ہو اور اسی پر تا آخر حیات قائم رہے ہوں تو ہماری ایسے مسئلہ کے بارے میں رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہرگز ہرگز اس کی اجازت نہ دی جائے کہ وہ اب کوئی ایسا کام کریں جو صحابہ و تابعین کے سر تا سر خلاف ہو۔ (اعلام الموقعین ص ۹۶)

اور یہ بات پہلے واضح ہو چکی ہے کہ صحابہ کرام اور تابعین اور جمہور اُمت کا اسی پر اجماع ہے کہ یک وقت دی گئی تین طلاقیں تین ہی ہیں۔

ساوساً جب اباحت اور حرام میں تعارض ہو تو محرم کو ترجیح ہوتی ہے۔ جمہور ان احادیث سے استدلال کرتے ہیں جن سے حرمت ثابت ہوتی ہے اور اس کے مقابلے میں تین کو ایک بتانے والے اباحت کے علمبردار ہیں۔ اس لیے یہاں بھی جمہور ہی کا پلڑا بھاری ہوگا۔

سابعاً ابن عباس کی یہ حدیث مطلق نہیں بلکہ غیر مدخول بہا کے بارے میں ہے۔ یعنی یہ حدیث ایسی عورت کے بارے میں ہے جس کے ساتھ نکاح کے بعد ابھی تک خاوند نے ہم بستری نہ کی ہو۔ اور اسے یوں طلاق دی ہو۔ انت طالق، انت طالق، انت طالق، اس میں وہ پہلی طلاق ہی سے جُدا ہو جائے گی، دوسری اور تیسری طلاق کا وہ محل نہیں ہے اور اس کی تائید اس سے ہوتی ہے خود حضرت طاؤس کی اسی روایت میں بھی غیر مدخول بہا کی قید موجود ہے۔ چنانچہ علامہ علاؤالدین المارِدینی نے ابوبکر بن ابی شیبہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ

> محدث ابن ابی شیبہ نے سند کے ساتھ جس کے تمام راوی ثقہ ہیں، حضرت طاؤس، عطاء اور جابر بن زید سے یہ روایت کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ جب کوئی شخص اپنی غیر مدخول بہا بیوی کو تین طلاقیں دے تو وہ ایک ہوگی۔ (الجوہر النقی)

اس سے معلوم ہوا کہ حضرت طاؤس کی روایت بھی عام عورتوں کے متعلق تین طلاقوں کے بارے میں نہیں ہے بلکہ خاص اس عورت کے بارے میں ہے جس سے نکاح تو ہوا ہے مگر ہم بستری کی نوبت نہیں آئی کہ طلاق کا حادثہ پیش آگیا۔ اس لیے حضرت طاؤس کی یہ روایت علی الاطلاق وہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حافظ ابو عمر بن عبدالبر مالکی فرماتے ہیں کہ مسلم کی یہ روایت وہم ہے اور غلط ہے۔ (الجوہر النقی ص ۳۳۷)

اور اسی بنا پر صحابہ، تابعین اور آئمہ کا بھی یہی مسلک ہے کہ ایسی عورت ایک ہی طلاق

سے جُدا ہو جائے گی۔ بہرحال مسلم کی ابن عباس والی روایت مطلق نہیں بلکہ غیر مدخول بہا کے بارے میں ہے۔ اب یہ آپ کے صوابدید پر موقوف ہے کہ آپ یہ تسلیم کرلیں کہ

الف: مسلم کی روایت میں قبل ان یدخل بھا کا فقرہ کسی راوی سے رہ گیا ہے

ب: مسلم کی روایت مجمل ہے اور دوسری روایات اس کی مفسر ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس مسئلہ پر ہم کو تین پہلوؤں سے غور و فکر کرنا چاہیے۔

۱۔ ابنِ عباس کی روایت کا اگر یہ مطلب ہو کہ تین طلاقوں کو ایک بنا دیتے تھے تو کیا اس کی تائید میں نبوت کا کوئی ارشاد و عمل موجود ہے۔

۲۔ علم الحدیث اور اُصولِ فن کی رُو سے ابنِ عباس کی مسلم والی روایت کی حیثیت کیا ہے۔

۳۔ اہلِ علم کی علمی طاقت کا اس موضوع پر کیا فیصلہ ہے۔ علمی طاقت کی حد تک تو آپ سُن چکے ہیں کہ فقہاءِ صحابہ، فقہاءِ تابعین اور آئمہ اربعہ اور اُن کے اتباع، محدثین اور علماء کی اکثریت کا فیصلہ یہی ہے کہ یکبارگی دی ہوئی تین طلاقیں تین شمار ہوں گی۔ اور تینوں واقع ہو جائیں گی۔ نص کی حد تک اس ایک روایت کے علاوہ حضور انور کا کوئی ارشاد اور کوئی عمل سارے دفترِ حدیث میں ایسا نہیں جس سے اس کی تائید ہوتی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس رکانہ کے واقعہ میں حضور انور کا رکانہ سے قسم لینا اور ابنِ عمر کے زمانۂ حیض میں طلاق کے واقعہ میں ابنِ عمر کے اس سوال کے جواب میں کہ اگر میں اسے تین طلاقیں دے دیتا تو پھر کیا ہوتا، حضور کا یہ فرمانا، تیری عورت تیرے سے جُدا ہو جاتی اس کی دلیل ہے کہ تین طلاقیں اگر یکبارگی دی جائیں تو تینوں پڑ جاتی ہیں۔

اُصولِ حدیث کی روشنی میں ہم بتا چکے ہیں کہ ـــــ جن معاملات کا تعلق رائے عامہ سے ہے اور جن کو سب کو جاننا چاہیے وہاں انفرادی بیان میں صحت کی ضمانت نہیں ہے۔ اور ـــــ یہ کہ اگر کسی روایت کا دوسری صحیح روایت سے تعارض ہو تو اسے ترجیح ہوگی جسے ظاہر قرآن کی تائید حاصل ہو۔ اور اگر ایک حدیث پوری اُمت کے عمل کو چیلنج کرتی ہو اور دوسری اُمت کے عمل کی تائید کرتی ہو تو ترجیح تائیدِ عمل کو ہوگی۔ اور ـــ دو حدیثوں میں سے اگر ایک حدیث حرام کہہ رہی ہو اور دوسری حدیث اباحت کا پروانہ دیتی ہو تو ترجیح حرام کو ہوگی۔ ابنِ عباس کی اس حدیث کے جوابات علماء نے اور بھی دیے ہیں لیکن ہمارا مقصد تمام جوابوں کا احاطہ نہیں ہے۔ آئیے آخر میں اس حدیث کے بارے

میں ایک ضروری بات سن لیجئے ،

کیا حضرت عمر کا قانون سیاسی تھا

بعض حضرات نے حضرت عمر کے اس فیصلہ کو تین طلاقوں کو تین ہی کر دیا جائے عقوبت اور سزا پر اور بعض نے سیاست پر محمول کیا ہے۔ چنانچہ انہی حضرات میں مولانا ثناءاللہ مرحوم بھی ہیں جو یہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کا یہ عمل شرعی نہ تھا بلکہ سیاسی تھا۔ اُن کی تردید کرتے ہوئے ہمارے شہر کے مشہور اہلحدیث عالم مولانا محمد ابراہیم صاحب میر سیالکوٹی فرماتے ہیں :

حضرت عمر کی طرف یہ تصور دلانا کہ انہوں نے معاذ اللہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کو بدل ڈالا بہت بڑی جرأت ہے، واللہ اس عبارت کو نقل کرتے وقت ہمارا دل دہل گیا اور حیرانی طاری ہو گئی کہ ایک شخص جو خود مسئلہ کی حقیقت کو نہیں سمجھتا وہ رسول اللہ کے خلیفہ کی نسبت یہ خیال رکھتا ہے کہ وہ سنت کے بدلنے میں اس قدر جری تھا استغفر اللہ استغفر اللہ اس حکم کو سیاسی سمجھنے میں سخت ٹھوکر کھائی ہے اور پیچ در پیچ غلطیوں کے سلسلہ میں پڑ گئے۔ یہ کہنا کہ خلیفہ کے بعد اس کے بحال رہنے نہ رہنے میں اختلاف ہوا سراسر غلط اور ایجادِ بندہ ہے۔ محدثین کی طرف یہ بات منسوب کرنی کہ وہ اسے حکم کہتے تھے، بالکل غلط ہے اور یہ ایجادِ بندہ ہے۔ پھر آگے چل کر کہتے ہیں :

جو گروہ اس حکم میں حضرت عمر کی موافقت کرتا ہے وہ یہ نہیں کہتا کہ حضرت عمر کا حکم محض سیاسی تھا اور نہ یہ کہتا ہے کہ وہ سیاسی حکم اب بھی بحال رہنا چاہیے بلکہ وہ تو اسے اس لیے مانتا ہے کہ اس کے نزدیک حضرت عمر کا یہ حکم قرآن و حدیث سے ماخوذ ہے۔ پھر آگے لکھتے ہیں۔ جناب نے جو یہ فرمایا ہے کہ محدثین اس کو سیاسی حکم کہتے ہیں اس جگہ محدثین سے ہم اگر جمیع محدثین مراد لیں جو بجا ہے تو ہم دریافت کرتے ہیں کہ حضرت امام ابوحنیفہ، حضرت امام مالک، حضرت امام شافعی اور حضرت امام احمد اور دیگر آئمہ جن کے اسمائے گرامی لکھنے میں خوفِ طوالت ہے محدثین کی فہرست میں شامل ہیں یا نہیں۔ اگر شامل ہیں تو یہ بات کلیۃً تو درست نہ ہوئی کہ محدثین اس کو سیاسی حکم سمجھتے

ہیں کیونکہ سب آئمہ مذکورین زیرِ سوال میں تین طلاقیں پڑنے کے قائل ہیں۔ کیا جناب مہربانی فرما کر ان بزرگانِ دین کے ناموں کی تصریح بتانے کی تکلیف گوارا کریں گے جہاں انہوں نے اس حکم فاروقی کو سیاسی حکم قرار دیا ہو — اور اگر محدثین سے جناب کی مراد بعض محدثین ہوں تو اس صورت میں ہم گزارش کریں گے کہ جناب اس کے حوالے کی بھی تکلیف گوارا کریں۔ اور اگر محدثین سے آپ کی اپنی ذات گرامی اور اس زمانے کے آپ جیسے اہلِ حدیث علماء مراد ہیں تو بے ادبی معاف مجھے آپ کو یا ان کو محدثین کہنے میں تامل ہے۔ دورۂ صحاح ستہ کی سطروں پر نظر گزار دینے سے محدث نہیں بن سکتے۔ (ازہار مرغوبہ بحوالہ اہلحدیث اخبار ۱۵ نومبر ۱۹۲۹ء)

حضرت مولانا ابراہیم نے جس سلجھے ہوئے انداز میں حضرت عمر کے اس حکم کے سیاسی ہونے کی تردید فرمائی ہے اس پر اس سے زیادہ اور کیا کہا جا سکتا ہے۔ الغرض حضرت عمر کا یہ حکم نہ تو سزا کے طور پر تھا اور نہ سیاسی تھا بلکہ خالص مذہبی اور شرعی حکم تھا۔ اگر بالفرض اور بھی کوئی دلیل نہ ہوتی تو خود ان کا ارشاد خلیفہ راشد ہونے کی وجہ سے سنت ہوتا۔ اور پھر ان کے زمانہ میں حضرات صحابہ کا اجماع اس پر مستزاد ہے۔ اور حضرات آئمہ اربعہ اور جمہور امت کا اتفاق اس کے علاوہ ہے۔ ظاہر قرآن اور احادیث صحیحہ اس کے علاوہ ہیں جو سب سے مقدم ہیں اس لیے یہی مسلک ہے اسی میں خیر اور دین و دنیا کی فلاح مستور ہے [1]

۶۶۹ ۔ ہاں اگر وہ عورت اس شوہر کے علاوہ کسی اور سے شادی کرے۔ دوسرے شوہر سے یہ نکاح پہلے شوہر سے طلاق قطعی پانے کے تین ماہ بعد یعنی ایام عدت گزر جانے کے بعد ہوگا۔ شادی کے لیے اصل ارشاد میں تنکح آیا ہے۔ نکاح یہاں اپنے اصطلاحی شرعی معنے میں یعنی عقد کے مترادف نہیں ہے بلکہ اپنے اصلی اور لغوی معنے میں یعنی ہم بستری کے مترادف ہے۔ محض عقد کا مفہوم تو خود لفظ زوجا سے نکل رہا ہے۔ تنکح سے مقصود ہم بستری کو ظاہر کرنا ہے۔ اور امام ابن جریر اس سوال کے جواب میں کہ ہم بستری کا ذکر قرآن میں صراحت کے ساتھ نہیں ہے تو آخر یہ دلالت کہاں سے آئی۔ لکھتے ہیں کہ معنے کی یہ دلالت ساری امت کے اجماع نے پیدا کی ہے۔ اور امام رازی نے لکھا ہے کہ قول مختار یہی ہے کہ ہم بستری

---

[1] عمدۃ الاثاث

کی شرط حدیث سے نہیں قرآن ہی سے ثابت ہے۔ اور تو اور ابو مسلم اصفہانی بھی اس کا حامی ہے کہ عقد اور ہم بستری دونوں باتیں قرآن سے معلوم ہو رہی ہیں۔ خبر نہیں ہمارے زمانے کے جدید مفسروں کی سمجھ میں یہ کیوں آتا۔ ان کا دعویٰ ہے۔ رہی یہ بات کہ ایسی عورت اپنے پہلے شوہر کے لیے صرف اس صورت میں جائز ہو گی جب اس کا دوسرا شوہر اسے وطی کے بعد طلاق دے تو کم از کم اس وطی کے لیے قرآن سے کوئی ثبوت نہیں نکلتا۔ تنکح کے لفظ سے جو دلیل دی جاتی ہے اس کا بے بنیاد ہونا بالکل واضح ہے [1]

بہر حال جمیع فقہا و ائمہ مجتہدین کا مذہب یہی ہے کہ مطلقہ کے ساتھ پہلے شوہر کا نکاح جب ہی درست ہو گا جب دوسرا شوہر اس کے ساتھ ہم بستری کرکے اسے طلاق دے اور اس طلاق پر بھی تین ماہ کی مدت گزر جائے۔ علامہ شوکانی نے ابن المنذر کے حوالہ سے بتایا ہے کہ پہلے شوہر کے لیے حلال ہونے کی اس شرط پر کہ دوسرا شوہر ہم بستری کرے اہل علم کا اجماع ہے۔ سوائے تابعین میں سے سعید بن جبیر اور سعید بن المسیب کے کہ ان کی رائے میں صرف دوسرے شوہر سے نکاح ہی اگر ہو جائے تو عورت طلاق کے بعد پہلے شوہر کے لیے حلال ہو جاتی ہے۔ لیکن مذہب جمہور یہی ہے کہ ہم بستری شرط ہے اور یہی بات اسلامی قانون کے عین مزاج کے مطابق ہے۔ شریعت نے یقیناً طلاق کو پسند نہیں کیا ہے۔ اس کے نفاذ میں طرح طرح کی قیدیں لگا دی ہیں۔ ترغیب یہ دی ہے کہ خوب سوچ کر ہی طلاق دی جائے۔ لیکن ان سب مرحلوں سے گزرنے کے بعد جب طلاق نافذ ہو جاتی ہے تو پھر اب رعایت کا کوئی موقع نہیں ہے۔ شوہر کو اب دوبارہ آسانی سے وہ بیوی واپس نہیں مل سکتی۔ اب اسے اس معاملہ میں خون جگر ہی پینا پڑے گا۔ سزائے زنا میں بھی یہی روح کارفرما ہے۔ ثبوتِ زنا نہایت قوی بلکہ قطعی ہونا چاہیے۔ ذرا سے شبہ سے بھی ملزم کو فائدہ ملے گا لیکن جب سارے مراحل طے ہو جائیں تو پھر سزا کے معاملے میں کسی رعایت کی گنجائش نہیں۔ یہی اسلامی قانون کا مزاج ہے۔

نکاح بشرطِ التحلیل

اس شرط کے ساتھ نئے شوہر کا کسی طلاق والی عورت سے نکاح کرنا کہ بعد صحبت طلاق

---

[1] تدبر قرآن

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ أَوْ
سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ ۚ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ وَ
مَن يَفْعَلْ ذَٰلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ ۚ وَلَا تَتَّخِذُوا آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ
وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ
يَعِظُكُم بِهِ ۚ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ۝

اور جب ایسا ہو کہ تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور اُن کی عدت[ف ٤٦٠]
پوری ہونے کو آئے تو پھر تمہارے لیے دو ہی راستے ہیں یا تو طلاق سے[ف ٤٦١]
رجوع کر کے انہیں ٹھیک طریقے پر روک لو یا ٹھیک طریقے پر
چھوڑ دو۔ ایسا نہ کرو کہ انہیں نقصان[ف ٤٦٢] پہنچانے کے لیے روکے رکھو
تاکہ اُن پر جور و ستم کرو۔ اور یاد رکھو جو کوئی ایسا کرے گا تو اپنے
ہاتھوں خود ہی نقصان اُٹھائے گا[ف ٤٦٣]۔ اور دیکھو ——— اللہ کے حکموں
کو ہنسی کھیل[ف ٤٦٤] نہ بناؤ۔ اللہ کا اپنے اوپر انعام یاد کرو[ف ٤٦٥] اور جو کچھ اس نے
کتاب و حکمت سے نازل کیا ہے اُسے یاد رکھو جس کے ذریعے وہ تمہیں
نصیحت کرتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو اور خوب جان لو کہ اس کے
علم سے کوئی بات باہر نہیں ہے۔

دے دی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے شوہر اول کے لیے جائز ہو جائے حرام ہے۔ اور ایسا کرنے والا اس قدر بڑے گناہ کا مرتکب ہوتا ہے کہ پہلے شوہر اور دوسرے شوہر دونوں کے لیے زبانِ نبوت پر لعنت آئی ہے۔ مسند احمد، نسائی اور ترمذی میں عبداللہ بن مسعود اور علی ابن ابی طالب فرماتے ہیں کہ

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے محلل یعنی دوسرا شوہر اور محلل لہٗ یعنی پہلا شوہر ان دونوں پر لعنت فرمائی ہے۔

اور اکثر فقہاء کے نزدیک یہ نکاح فاسد ہوتا ہے۔ حنفی قانون کی کتابوں میں یہ قانونی نکتہ دیکھ کر اس گناہ پر دلیر ہو جاتے ہیں کہ نکاح درست ہو جاتا ہے اور لگائی ہوئی شرط لغو ہو جاتی ہے۔ لیکن یہ نکاح کا قانونی نفاذ ہے اس سے اس کے گناہ کی سنگینی پر کوئی حرف نہیں آتا ہے۔ اس کی حیثیت بالکل یکبارگی دی ہوئی تین طلاقوں کی یا زمانہ حیض میں دی ہوئی طلاق کی ہے جیسے وہ ناجائز ہونے کے باوجود قانونی طور پر نافذ ہو جاتی ہیں ایسے ہی ایسا نکاح ناجائز ہونے کے باوجود قانونی طور پر نکاح ہو جاتا ہے۔ اس سے یہ سمجھ لینا کہ یہ گناہ نہیں ہے بہت بڑی جرأت ہے۔ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ میرے پاس جب اس قسم کا واقعہ آئے گا تو میں دونوں کو سنگسار کر دوں گا۔ اللہ اکبر جس لعنت کو نبوت نے دور کیا تھا ہم آج اس میں مبتلا ہیں۔ فانا للہ

طلاق کے بعد بلند اخلاق کا مظاہرہ

اس سے پہلی آیات میں طلاق دینے کا طریقہ، طلاق کی تعداد اور یہ بات بتائی گئی کہ معمولی طور پر طلاق بلا معاوضہ ہونی چاہیے۔ ہاں اگر دونوں میاں بیوی کے درمیان کچھ لینے دینے پر ہی راضی نامہ ہو جائے تو پھر اس میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ اس کے بعد تیسری طلاق کا ذکر کیا اور بتایا کہ تیسری طلاق ازدواجی زندگی میں ایسے بگاڑ کی دلیل ہے جس میں اصلاح کی کوئی توقع نہ رہی ہو اس صورت میں فریقین کو نیا ساتھی منتخب کرنا چاہیے۔ اگر یہ طلاقیں عبث اور جلد بازی میں ہوں تو ایسے شخص کو سزا ملنی چاہیے۔ اب ان آیات میں طلاق والی عورتوں کے ساتھ برتاؤ اور حسنِ سلوک کی تلقین کی جا رہی ہے اور بتایا جا

رہا ہے کہ معاشرے میں حسن سلوک اور خوش اخلاقی کا مظاہرہ ہونا چاہیے خواہ ازدواجی زندگی برقرار رہے یا ختم ہو جائے اور کسی صورت میں سزا دینے اور زیادتی کرنے کی نیت نہ کی جائے۔ ایسے وقت میں تمہیں بلند اخلاقی اور فراخ حوصلگی کا مظاہرہ کرنا چاہیے۔ گویا یہاں قرآن نے مردوں کو اکسایا ہے کہ اس کی شرافت اور مردانہ بلند حوصلگی اور عورتوں کے مقابلے میں اس کی بالادستی کا تقاضا یہ ہے کہ بیوی کے ساتھ حسنِ سلوک کیا جائے اور ان کو روکنے کا ہرگز ہرگز یہ منشا نہ ہو کہ بیوی پنجۂ استبداد میں رہے اور شوہر کو اپنی خواہش کے مطابق اسے اذیت پہنچانے کا موقعہ مل جائے۔

٦٧٠- اور جب ایسا ہو کہ تم اپنی عورتوں کو طلاق دے دو اور اُن کی عدت پوری ہونے کو آئے یعنی عدت ختم ہونے کو آئی۔[1] مطلب یہ کہ زمانہ عدت ابھی ختم ہونے کو ہو لیکن پوری طرح ختم نہ ہوا ہو، بالکل ختم ہو جانے کا مطلب یہ ہے کہ اب رجعت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ اصل ارشاد میں بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ بلوغ یا بلاغ اصل میں تو کسی مقصد کے انتہا کو پہنچ جانے کا نام ہے مگر کبھی اس کے قریب پہنچ جانے پر بھی بولا جاتا ہے۔ یہاں اختتامِ میعاد کے قریب پہنچنا ہی مراد ہے۔ اجل کسی چیز کے لیے جو وقت مقرر کر دیا جائے وہ اس کی اجل کہلاتا ہے، یہاں مراد عورت کی عدت ہے۔ اس سے بھی اشارہ نکلتا ہے کہ قرآن کے نزدیک اصل طلاقِ رجعی ہے ورنہ عدت گزرنے کو ہو تو روک رکھنا بے معنی ہے۔

٦٧١- یا تو طلاق سے رجوع کر کے ان کو ٹھیک طریقے پر روک لو یا ٹھیک طریقے پر چھوڑ دو۔ مطلب یہ ہے کہ جب رجعی طلاق والی عورت کی عدت گزرنے کے قریب آئے تو شوہر کو دو اختیار حاصل ہیں۔ ایک یہ کہ رجعت کر کے اپنے نکاح میں رہنے دے۔ یہ معنے ابن عباسؓ حسن بصری، مجاہد اور قتادہ نے بتائے ہیں اور ٹھیک طریقے پر روکنے سے یہی مراد ہے۔ اصل ارشاد میں امسکوھن بمعروف آیا ہے۔ معروف کے معنے یہ ہیں کہ ایسے طریق پر روکا جائے جس سے عورت کو نقصان نہ پہنچے اور مرد کی خود غرضیوں اور نفس پرستیوں سے اس کی حق تلفی نہ ہو، یعنی قاعدے، دستور، شرافت اور عزت کے مطابق یہ کام ہونا چاہیے۔ اور دوسرا یہ کہ رجعت نہ کرے اور نکاح کا تعلق ختم کر کے اس کو بالکل آزاد کر دیا جائے۔ اور یہ

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

آزادی بھی عزت و شرافت اور دستور کے مطابق ہو۔ گویا بتایا گیا ہے کہ عدت ختم ہونے سے پہلے پہلے خوب سوچ سمجھ کر دو باتوں میں سے ایک بات کا فیصلہ کر لو رکھنے کا یا چھوڑنے کا۔ اگر رکھنا چاہتے ہو تو دستور کے مطابق بیوی سے ازدواجی تعلقات بحال کر لو اور اگر یہ منظور نہ ہو تو پھر حسن و خوبی کے ساتھ اس کو رخصت کر دو۔ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ نہ تو بیوی کی طرح رکھو، نہ طلاق دے کر اس کی راہ کھولو، بیچ میں لٹکائے نہ رکھو جیسا کہ عرب جاہلیت میں لوگ کیا کرتے تھے۔

علامہ قرطبی نے دونوں جگہ معروف کی قید سے یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ اگر شوہر عورت کے حقوق کی پابجائی نہ کر سکے تو اسے طلاق دینا چاہیے کیونکہ معروف کے مطابق روکنا یہی ہے کہ شوہر حقوقِ زوجیت کی ادائیگی کرے۔ اگر وہ ایسا نہیں کرتا تو وہ معروف کی مقررہ حد سے خروج کرتا ہے۔ اور اگر شوہر معروف کی خلاف ورزی کرتا ہے یعنی عورت کے حقوقِ زوجیت ادا نہیں کرتا، نان و نفقہ نہیں دیتا تو عورت اس کے خلاف عدالت میں استغاثہ کر سکتی ہے اور عدالت اس بنیاد پر تفریق کر سکتی ہے۔ یہ امام مالک، امام شافعی، امام احمد، امام اسحاق کا مسلک ہے۔ صحابہ میں سے حضرت علی، عمر اور ابو ہریرہ کا فیصلہ بھی یہی ہے لیکن دوسرے آئمہ فرماتے ہیں کہ اس بنیاد پر عدالت تفریق کی مجاز نہیں ہے بلکہ شوہر کو نان و نفقہ دینے پر مجبور کرے گی۔ صاحبِ دُرِ مختار نے یہاں تک لکھ دیا ہے کہ عدالت میں جج حنفی ہو اور وہ اس بنیاد پر تفریق کا فیصلہ کرے تو فیصلہ نافذ نہ ہو گا۔ ہاں اگر اس کے حکم سے کوئی شافعی جج فیصلہ کر دے تو نافذ ہو جائے گا۔ اگرچہ اب حنفی علماء نے احوال و ظروف کے تحت اس مسئلہ میں مالکیہ کے مذہب کو اپنا لیا ہے اور الحیلۃ الناجزہ میں اس کی اجازت دے دی ہے۔ چنانچہ لکھا ہے کہ نان و نفقہ سے تنگ اور لاچار عورت کے لیے ضروری ہے کہ کسی طرح خلع وغیرہ کر لے لیکن اگر باوجود سعی بلیغ کے کوئی صورت نہ بن سکے تو سخت مجبوری کی حالت میں مذہبِ مالکیہ پر عمل کرنے کی گنجائش ہے کیونکہ ان کے نزدیک زوجہ متعنت کو تفریق کا حق مل سکتا ہے۔ اور سخت مجبوری کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ عورت کے خرچ کا کوئی انتظام نہ ہو سکے۔ یعنی نہ کوئی عورت کے خرچ کا بندوبست کرتا ہو اور نہ عورت حفظِ آبرو کے ساتھ کسبِ معاش پر قدرت رکھتی ہو۔ اور دوسری صورت مجبوری کی یہ ہے کہ اگرچہ بسہولت یا بدقت خرچ کا انتظام ہو سکتا ہے لیکن

شوہر سے علیحدہ رہنے میں ابتلاءِ معصیت کا قوی اندیشہ ہے۔ اور تفریق کی صورت یہ ہے کہ عورت اپنا استغاثہ مسلمان جج کے سامنے پیش کرے اور وہ معاملہ کی شرعی شہادت وغیرہ کے ذریعے پوری تحقیق کرے۔ اگر عورت کا دعویٰ صحیح ہو تو اس کے خاوند سے کہا جائے کہ اپنی عورت کے حقوق ادا کرو یا طلاق دو ورنہ عدالت تفریق کر دے گی۔ اگر شوہر کسی صورت پر عمل نہ کرے تو جج طلاق واقع کر دے۔

امساک و تسریح کے قواعد

آیت میں بالمعروف امساک اور تسریح دونوں کے ساتھ لاکر اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ رجعت کے بھی کچھ قواعد ہیں اور آزاد کرنے کی بھی کچھ شرطیں ہیں۔ دونوں میں سے جس کو بھی شوہر اختیار کرے، رکھے یا چھوڑے شرعی قاعدے کے مطابق کرے۔ گویا معروف سے مراد شرعی قواعد ہیں۔ دونوں صورتوں کے شرعی قواعد کا کچھ حصہ تو خود قرآن نے بیان کر دیا ہے اور تفصیلات سنت نے بیان کی ہیں۔ مثلاً طلاق کے بعد عدت میں رجعت کا ہی خیال ہو تو اس کے لیے قاعدہ یہ ہے کہ اولاً غصہ و رنجش کو دور کر کے بیوی کے ساتھ خوشگوار زندگی بسر کرنے کی اور حقوقِ زوجیت پورے کرنے کا ارادہ کرے۔ عورت کو اپنی قید میں رکھ کر ستانا مقصود نہ ہو۔ اور دوسرا قاعدہ یہ ہے کہ رجعت کے وقت دو مسلمان گواہ بنا لے۔ سورۃ طلاق میں ہے۔

واشھدوا ذوی عدل منکم اور اپنے میں سے دو معتبر کو گواہ بنالو۔

یہ تو رجعت کے قواعد ہیں۔ تسریح یعنی بیوی کو رخصت کرنے کے بھی قواعد ہیں۔ مثلاً ایک قاعدہ پہلے بیان ہو چکا ہے کہ عورت کو طلاق ہی دینا ہو اور قطع تعلق کا ہی ارادہ ہو تو عورت سے طلاق کے معاوضہ میں اپنا دیا ہوا سامان یا مہر یا کوئی اور معاوضہ نہ لیا کرے[1]۔ دیکھئے آیت نمبر ۲۲۹۔

۲۷۶۔ ایسا نہ کرو اُن کو نقصان پہنچانے کے لیے روکے رکھو تاکہ اُن پر جور و ستم کرو۔ یعنی عدت کے ختم ہونے تک خاوند کو اختیار ہے کہ اس عورت کو موافقت اور اتحاد

---

[1] معارف القرآن م ش تلخیصاً

کے ساتھ پھر ملا لے یا خوبی اور رضامندی کے ساتھ بالکل چھوڑ دے۔ یہ ہرگز جائز نہیں کہ قید میں رکھ کر اس کو ستانے کے قصد سے رجعت کرے جیسا کہ بعض اشخاص کرتے تھے۔ پہلی آیت یعنی الطلاق مرتان میں یہ بتلایا تھا کہ دو طلاق تک زوج کو اختیار ہے کہ عورت کو عمدگی سے پھر ملا لے یا بالکل چھوڑ دے۔ اب اس آیت میں یہ ارشاد ہے کہ یہ اختیار صرف عدت تک ہے۔ عدت کے بعد شوہر کو اختیار حاصل نہ ہوگا اس لیے کوئی تکرار کا شبہ نہ کرے[1] گویا اس آیت میں وضاحت کر دی ہے کہ معروف کے مطابق روک لینے سے قرآن کا منشا کیا ہے؟ اس منشا کی وضاحت یوں فرمائی کہ یہ روکنا ہرگز ہرگز اس ارادے کے ساتھ نہ ہو کہ اس طرح بیوی تمہارے پنجہ استبداد میں رہے اور تم اس کو اپنی خواہش کے مطابق اذیت پہنچا سکو۔ پہلے مثبت پہلو میں بات کہنے کے بعد اب منفی پہلو میں اس کی وضاحت اس لیے کر دی گئی کہ ظالم لوگ طلاق اور طلاق کے بعد مراجعت کے شوہری حق کو اس ظلم کے لیے استعمال کر سکتے ہیں[2]

۶۷۳ - یاد رکھو جو کوئی ایسا کرے گا اپنے ہاتھوں خود ہی نقصان اٹھائے گا یعنی جو شخص مطلقہ کو ظلم و زیادتی کے لیے روکے گا وہ خود اپنے اوپر ظلم کرے گا۔ کیونکہ وہ بھی انسانی برادری کا ایک فرد ہے۔ اس پر ظلم گویا اپنے اوپر ظلم ہے۔ اور اللہ کی معصیت کا ارتکاب اور اس کی طاعت سے روگردانی بھی اپنی ذات پر ظلم ہے۔ گویا بتایا ہے کہ جو لوگ ایسی جسارت کرتے ہیں تو وہ بظاہر تو ایک عورت کو نشانہ ظلم بناتے ہیں لیکن فی الواقع وہ سب سے بڑا ظلم اپنے آپ پر کر رہے ہیں۔ کیونکہ ہر ظلم و جور کا بدلہ بارگاہ خداوندی میں لیا جائے گا اور جب تک مظلوم کا بدلہ وہاں ظالم سے نہ لیا جائے گا آگے نہ بڑھے گا۔ اور دُنیا میں بھی اگر غور کیا جائے تو ہر صاحب بصیرت دیکھ سکتا ہے کہ ظلم کے نتائج یہاں بھی مختلف روپ بدل کر رونما ہوتے رہتے ہیں۔

قرآن انسانی زندگی میں رہنمائی کے لیے اپنے قوانین کو دُنیا کے عام تعزیراتی قوانین سے ممتاز کر کے پیش کرتا ہے۔ اس کا انداز خالص مربیانہ ہوتا ہے۔ قانون کی حکمت و مصلحت بتاتا ہے اور اس کی خلاف ورزی میں خلاف ورزی کرنے والے کو خود اس کے نقصان سے آگاہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس اقدام سے خود انسانی قدریں کس قدر تباہ ہوتی ہیں۔ اس انداز بیان سے

---

[1] افادات شیخ الہند　[2] تدبر قرآن

وہ اپنے ماننے والوں میں دماغ کے پورے شعور اور قلب کے بھرپور سکون کے ساتھ طاعت کی سرشاریاں پیدا کرتا ہے اور یہ قرآن ہی کا حصہ ہے۔

۶۷۴ - اور دیکھو اللہ کے احکام کو ہنسی کھیل نہ بناؤ کہ جس پر جی چاہا عمل کیا اور جسے چاہا یوں کا یوں چھوڑ دیا۔ نکاح و طلاق، ایلا، خلع، رجعت، حلالہ وغیرہ میں بڑی حکمتیں اور مصلحتیں ہیں۔ ان میں حیلے کرنے اور بیہودہ اغراض کو دخل دینے مثلاً کوئی رجعت کرے اور اس سے مقصود عورت کو تنگ کرنا ہو تو گویا اللہ کے احکام کے ساتھ ٹھٹھے بازی ٹھہری نعوذ باللہ من ذالک اللہ کو سب کچھ معلوم ہے ایسے حیلوں سے بجز مضرت اور کیا ہو سکتا ہے [1] اسلامی قانون میں حیاتِ اجتماعی اور معاشرتی کا سنگِ بنیاد خاندان اور خاندانی زندگی ہے۔ اور خاندان کا کلیدی نقطہ میاں بیوی کے صحیح تعلقات ہیں اس لیے ایک معنے میں کہنا چاہیے کہ سارے نظامِ معاشرت کی بنیاد ہی یہی حقوقِ زناشوئی کی ادائیگی ہے۔ اور جس طرح بعض بظاہر معمولی بے احتیاطیاں بڑی بڑی سخت بیماریوں کا سبب بن جاتی ہیں بعض جزئی احکام میں شریعت سے بے پروائی بڑے بڑے سخت فتنوں کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ ان دقائق کو سنبھالے رکھنا شریعت ہی جیسے حکیمانہ نظام کا کام ہے۔ شریعت کو مذاق بنانے کی ایک تفسیر تو یہ ہے کہ نکاح و طلاق کے لیے اللہ نے جو حدود مقرر کیے ہیں ان کی خلاف ورزی کرنا، مثلاً ایک طلاق کی جگہ فوراً تین طلاقیں دے دینا جیسا کہ امام نسائیؒ نے بروایت محمود بن لبید نقل کیا ہے کہ،

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ایک آدمی کے متعلق خبر دی گئی جس نے اپنی بیوی کو یکبارگی تین طلاقیں دی تھیں۔ آپ غصہ میں آکر کھڑے ہو گئے اور فرمایا کیا اللہ کی کتاب کے ساتھ کھیل کیا جاتا ہے۔ حالانکہ میں تمہارے درمیان موجود ہوں۔ اتنے میں ایک آدمی کھڑا ہو گیا اور بولا کہ یا رسول اللہ کیا میں اُسے قتل کر دوں۔

اللہ کے احکام کے ساتھ مذاق ہی کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ یکبارگی تین طلاقیں دینے کے بعد نکاح بشرط التحلیل کیا جائے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

آیت کی تفسیر میں یہ بھی کہا گیا ہے یہ احکام محض ہزل نہیں پوری سنجیدگی سے ہر حال میں نافذ ہو جائیں گے۔ یہ نہیں کہ پہلے تو زبان سے صاف الفاظ میں طلاق دے دی اور پھر بعد کو یہ کہہ دیا کہ میں نے تو مذاق کیا تھا۔

ابوداؤد میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے ارشادِ نبوت آیا ہے کہ

تین معاملات ایسے ہیں جن میں جد اور ہزل دونوں برابر ہیں۔ نکاح، طلاق اور رجعت۔

جد کا مطلب ہے کہ بات کو باوقار اور متانت سے کہنا اور ہزل کہتے ہیں بات کو دل لگی اور مذاق میں کہنا۔ طلاق، نکاح اور رجعت میں مذاق اور متانت دونوں برابر ہیں۔ مذاق میں دی گئی طلاق بھی ویسے ہی پڑ جائے گی جیسے متانت میں دی ہوئی۔

اُمّت کو نعمت کی یاد دہانی

۶۷۵۔ اللہ کا اپنے اوپر انعام یاد کرو اور اس کتاب و حکمت کو بھی جسے اس نے نازل کیا ہے اور جس کے ذریعے وہ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ ازدواجی زندگی کا معاملہ نہایت اہم اور نازک ہے اور مرد کی خود غرضیوں اور نفس پرستیوں سے ہمیشہ عورتوں کی حق تلفی ہوتی ہے اس لیے خصوصیت سے یہاں مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے اور ان کو یاد دلایا گیا ہے کہ اللہ نے ان کو نیک ترین اُمت ہونے کا منصب عطا کیا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم نے ہدایت و موعظت کے تمام پہلو واضح کر دیے ہیں۔ لہٰذا تم اپنے جماعتی شرف و مقام سے غافل نہ ہو اور ازدواجی زندگی میں اخلاق و پرہیزگاری کا بہترین نمونہ بن کر رہو اور ضمناً اس حقیقت کی طرف اشارا فرما دیا کہ جس جماعت کے افراد کی ازدواجی زندگی درست نہیں ہے۔ وہ کبھی منصب قیادت کے اہل نہیں ہو سکتی"[1] گویا بتا دیا کہ اللہ سبحانہٗ کی ایسی عظیم نعمتیں پانے کے بعد اگر تم نے ان کا حق یہی ادا کیا کہ خدا کے حدود کو توڑا اور اس کی شریعت کا مذاق بنایا تو سوچ لو ایسے لوگوں کا انجام کیا ہو سکتا ہے[2]

دراصل اس آیت میں اللہ سبحانہٗ مسلمانوں کو نعمتیں یاد دلا رہا ہے کہ اُس نے ان پر

---

[1] ترجمان القرآن [2] تدبر قرآن

وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ أَنْ
يَنْكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۗ ذَٰلِكَ يُوعَظُ
بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۗ ذَٰلِكُمْ أَزْكَىٰ لَكُمْ
وَأَطْهَرُ ۗ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٢﴾

اور جب تم اپنی عورتوں[۲۶۹] کو طلاق دے چکو اور بعد ازیں وہ اپنی عدت پوری کر لیں تو تم اس میں رکاوٹ[۲۷۰] نہ بنو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں جبکہ قاعدے اور دستور کے مطابق باہم ازدواجی رشتہ پر رضامند ہو جائیں۔ یہ تم میں سے اس شخص کو نصیحت کی جا رہی ہے جو اللہ اور آخرت والے دن پر ایمان رکھتا ہے۔ تمہارے لیے شائستہ[۲۷۱] اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے۔ اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔[۲۷۲]

کتاب وحکمت نازل کی ہے۔ اس تعبیر میں ایک نعمت نہیں متعدد نعمتیں ہیں۔ سب سے پہلی نعمت خود مسلمانوں کا اُمتِ مسلمہ کی حیثیت سے ظہور ہے۔ دوسرے یہ کہ اللہ کی جانب سے عالم کی اصلاح کے لیے ان کو منصبِ امامت عطا کیا گیا ہے۔ تیسرے یہ کہ اصلاحِ عالم کے لیے ان کو ابدی ضابطۂ حیات دیا گیا۔ اور چوتھے یہ کہ ضابطہ کے مطابق ان کو ایک محسوس مرئی نظامِ زندگی عطا کیا گیا۔ پانچویں یہ کہ ان کو ایسا جماعتی تشخص نبوت کے ذریعے عطا فرمایا جس کی

جانب ساری انسانیت متوجہ ہوئی ان کو وہ سب کچھ ملا جو انسانیت کے لیے ممکن تھا۔ انہیں ایسا جامع اور مکمل عقیدہ دیا گیا کہ ایسا جامع اور مکمل عقیدہ کبھی انسانیت کو نہیں ملا تھا۔ ان کو اقوام عالم میں ممتاز کیا اور سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کو نفس کو سلامتی، گھر کی سلامتی اور معاشرے کی سلامتی میسر آئی، انہیں اطمینانِ قلب اور راحت ضمیر کی دولت ملی۔ انہیں احساس و شعور کی رفعتیں عطا ہوئیں۔ اس پس منظر میں اللہ سبحانہ ان کو اپنی نعمتیں یاد دلاتے ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ سے ڈرتے رہو اور ذمہ داری کا احساس کرو۔ احتیاط سے قدم اٹھاؤ اور خوب جان لو کہ وہ تمہاری ہر بات سے واقف ہے۔ تقویٰ اور علمِ الٰہی کی کاملیت کا استحضار ہی صالحانہ زندگی کی بنیادیں ہیں۔

نکاح میں عورتوں پر پابندی نہ لگاؤ

پہلی آیت میں یہ بتایا گیا تھا کہ یا تو عورت کو بیوی کی طرح رکھنا چاہیے اور اس کے حقوق ادا کرنے چاہئیں۔ یا طلاق دے کر اس کی راہ کھولو۔ بیچ میں لٹکاتے نہ رکھو جیسا کہ عرب جاہلیت میں رواج تھا۔ اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ جب عورت کو طلاق دی گئی اور اس نے عدت کا زمانہ پورا کر لیا تو پھر اسے اختیار ہے جس سے چاہے ٹھیک طریقہ پر نکاح کرے نہ تو اسے دوسرے نکاح سے روکنا چاہیے نہ اس کی پسند کے خلاف اس پر زور ڈالنا چاہیے۔ اور نہ اس بات پر ناراض ہونا چاہیے۔ اب وہ آزاد ہے کہ جہاں چاہے شادی کرے۔ اس کے ارادے میں طلاق دینے والے شوہر یا اس کے خاندان والوں کو کوئی رکاوٹ نہ پیدا کرنی چاہیے خواہ یہ رکاوٹ صریح ہو یا اندرونی سازش اور جوڑ توڑ کی نوعیت کی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت معقل بن یسار نے اپنی بہن کی شادی ایک شخص سے کر دی، اس نے طلاق دے دی اور عدت بھی گزر گئی۔ اس کے بعد یہ شخص اپنے فعل پر پشیمان ہوا اور چاہا کہ دوبارہ نکاح کر لیں۔ اس کی بیوی یعنی معقل بن یسار کی بہن بھی اس پر آمادہ ہو گئی۔ لیکن جب معقل کے روبرو اس کا ذکر آیا تو انہوں نے کہا میں نے اپنی بہن تمہارے نکاح میں دے دی تھی تم نے اس کی یہ قدر کی کہ اس کو طلاق دے دی۔ اب پھر تم میرے پاس آتے ہو کہ دوبارہ نکاح کر دوں۔ خدا کی قسم اب وہ تمہارے نکاح میں نہ لوٹے گی۔

قرآن کے اس فیصلہ کے سامنے معقل بن یسار نے سر تسلیم خم کر دیا اور خود جا کر بہن کا دوبارہ اسی شخص سے نکاح کر دیا اور قسم کا کفارہ دیا۔

۶۷۶۔ اور جب تم اپنی عورتوں کو طلاق دے چکو اور بعد ازیں وہ اپنی عدت پوری کر لیں اور عدت پوری کرنے کے بعد دوسرے نکاح کی آرزومند ہوں بلغن اجلهن سے یہاں قرب ختم مراد نہیں جیسا کہ پہلی آیت میں تھا بلکہ عدت کا پورا ہونا مراد ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ خود سیاق بتا رہا ہے کہ دونوں آیتوں میں بلوغ الگ الگ معنے میں ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ یہاں عدت کا پورا ہونا مراد ہے۔

اس آیت میں مخاطب کون ہیں۔ امام رازی کی رائے میں شوہر مخاطب ہیں اور قاضی بیضاوی کہتے ہیں کہ لڑکی کے اولیا مخاطب ہیں اور علامہ زمخشری نے پوری اُمت کو مخاطب قرار دیا ہے۔ قرین قیاس یہی ہے کہ خطاب عام ہے۔ شوہروں کو بھی کہا جا رہا ہے کہ جس نے ایک عورت کو طلاق دے دی اب اسے اس کی راہ میں رکاوٹ بننے کی اجازت نہیں اور اولیا سے بھی کہا جا رہا ہے کہ ان کو بھی کوئی رکاوٹ نہ بننا چاہیے خواہ اس رکاوٹ کی نوعیت کچھ ہو جیسا کہ معقل بن یسار کے بارے میں پڑھ آئے ہو۔

۶۷۷۔ تم اس میں رکاوٹ نہ بنو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں جبکہ قاعدے اور دستور کے مطابق باہم ازدواجی رشتہ پر رضامند ہو جائیں۔ یہ بات ان سب سے کہی جا رہی ہے جو نکاح سے روکنے والے ہوں خواہ زوج اوّل جس نے طلاق دی ہے وہ دوسری جگہ عورت کو نکاح کرنے سے روکے یا عورت کے ولی وارث عورت کو پہلے خاوند سے یا کسی جگہ نکاح کرنے سے مانع ہوں۔ سب کو روکنے سے ممانعت آ گئی۔ ہاں اگر خلاف قاعدہ کوئی بات ہو مثلاً غیر کفو میں عورت نکاح کرنے لگے یا پہلے خاوند کی عدت ہی میں نکاح کرنا چاہے تو بے شک ایسے نکاح سے روکنے کا حق ہے۔ بالمعروف کا یہی مطلب ہے[1]

بالغہ عورت مختار ہے

اس آیت میں فعل نکاح کی نسبت عورتوں کی طرف کی گئی ہے یعنی کہا گیا ہے کہ عورتیں

---

[1] افادات شیخ الہند

نکاح کریں اپنے پسندیدہ شوہروں سے ۔اس سے اشارہ نکلتا ہے کہ عورت اپنے معاملات میں صاحب اختیار ہے اور شادی کے لیے منتخب کرنا اور شوہر کو پسند کرنا اس کے اختیار تمیزی اور صوابدید پر موقوف ہے لیکن اس سے پہلے آیت ۲۲۲ میں پڑھ چکے ہو کہ لاتنکحوا المشرکین مت نکاح میں دو مسلمان عورتوں کو مشرکین کے نکاح میں، اس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ نکاح کا معاملہ مردوں کے ہاتھ میں ہے اور عورت بے اختیار ہے ۔ علماء نے دونوں باتوں کا محمل یہ قرار دیا ہے کہ لڑکی اگر نابالغہ ہو تو وہ اپنے معاملات میں مختار نہیں ہے ۔ بلکہ اس کے اولیاء مختار ہیں ۔ لیکن اگر لڑکی بالغہ ہو تو وہ اپنے معاملات میں مختار ہے ۔ اور اس کی رضامندی کے بغیر نکاح کر دینا درست نہیں ہے ۔ آزاد بالغہ عورت اپنا نکاح خود اپنے صوابدید سے اپنے کفو میں کر سکتی ہے ۔ یہی امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف کا مسلک ہے ۔ ان بزرگوں نے اس پر کئی طرح سے قرآن اور سنت دونوں سے استدلال کیا ہے ۔

اولاً اس آیت میں ان ینکحن میں فعل نکاح کا فاعل عورتوں کو کہا گیا ہے اور اسناد میں اصل یہی ہے کہ عورت خود یہ کام کرے ، ایسے ہی قرآن کی دوسری آیت حتی تنکح زوجا غیرہ ، میں بھی نکاح کی نسبت عورت کی طرف ہے ۔ ان دونوں آیتوں سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ ازدواجی معاملات میں اگر عورت بالغہ ہو تو مختار ہے اور اس کے اس اختیار پر کسی کو قدغن قائم کرنے کا حق نہیں ۔

ثانیاً ۔ قرآن میں عضل سے منع کیا گیا ہے ۔ عضل کے معنے رکاوٹ ڈالنے کے ہیں ۔ اسی سے الداء العضال ناقابلِ علاج بیماری کو کہتے ہیں ۔ مطلب کہ ایسی عورتوں کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالو ۔ خطاب خواہ شوہروں کو ہو یا اولیاء کو اس سے سمجھ میں یہی آرہا ہے کہ قرآن نے چونکہ ان کو نکاح کرنے کی آزادی دی ہے ۔ اولیاء کو اس آزادی کے سلب کرنے سے منع کیا جا رہا ہے ۔ اگر بالغہ عورت کا یہ حق ہی تسلیم نہ کیا جاتے کہ وہ اپنے ازدواجی معاملہ میں آزاد ہے تو یہ کہنا ہی بے معنے ہے کہ تم ان کی ازدواجی زندگی میں رکاوٹ نہ بنو ۔

ثالثاً ۔ اذا تراضوا بینھم بالمعروف یعنی جب وہ باہم قاعدہ اور دستور کے مطابق اس پر رضامند ہو جائیں ۔ قاعدہ کے مطابق سے مراد یہ ہے کہ عورت اور مرد دونوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ شادی کا مسئلہ طے کرنے میں کوئی ایسی بات نہ کریں جو شریف خاندانوں

کی روایات کے خلاف ہو جس سے سابق شوہر یا ہونے والے شوہر یا خود عورت کے خاندان کی عزت و شہرت کو بٹہ لگنے کا اندیشہ ہو۔ اس لیے اگر کسی عورت نے کسی ایسے شخص سے نکاح تجویز کیا ہے جو عورت کا کفو ہم پلہ نہیں ہے۔ یا نکاح میں مہر اپنی برادری کی عام عورتوں کے مہر مثلی سے کم مقرر کیا تو یہ باہمی رضامندی معروف کے مطابق نہ ہو گی۔ اس بنا پر عورت کے اولیاً کو روکنے کا حق حاصل ہوگا اور اگر عورت نے تجویز کے مطابق معروف کے خلاف نکاح کر لیا تو اولیا کو یہ حق حاصل ہوگا کہ وہ اس کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کریں اور عدالت اس بنیاد پر نکاح توڑنے کی مجاز ہو گی۔ حنفی قانون میں یہی ظاہر روایت ہے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورت اپنے معاملات میں آزاد ہے۔ اگر آزاد و خود مختار نہ ہوتی تو تراضی کی نسبت میں اس کا کوئی ذکر نہ ہوتا۔ اور معروف کی قید سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ اگر نابالغہ بغیر ولی کے نکاح کرے تو نکاح نہ ہوگا۔ یا اگر بغیر گواہوں کے نکاح کرے یا مطلقہ زمانۂ عدت میں نکاح کرے یا کسی ایسے شخص سے نکاح کرے جس سے ازدواجی تعلق حرام ہے۔ یہ سب نکاح باطل ہیں۔ ہر مسلمان کو اس کو روکنے کا حق حاصل ہے۔

لفظ تراضی سے یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی ہے کہ نکاح میں ایجاب وقبول رُکن ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ کبھی بجائے زوجین کے ان کے وکیل یا ولی یہ کام کریں۔ بہر حال اس آیت سے دو اہم قانون معلوم ہوتے۔

ایک یہ کہ قرآن کی رُو سے بالغہ جوان عورت اپنے معاملات میں مختار ہے۔ اس پر کسی کا کوئی دباؤ نہیں ہے۔ اس کی تائید قرآن سے ہی نہیں بلکہ اس ارشادِ نبوت سے بھی ہوتی ہے جو صحیح مسلم، ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور موطا میں حضرت عبداللہ ابنِ عباس کے حوالہ سے آتا ہے۔

بیوہ عورت اپنی ذات کی حد تک خود زیادہ حقدار ہے اپنے ولی سے اور نوجوان بالغہ لڑکی سے اس کی ذات کے بارے میں اجازت طلب کی جاتے۔ اور اگر خاموش ہو جائیں تو خاموشی ہی اجازت ہے۔

اس موضوع پر ایک سے زیادہ احادیث آئی ہیں۔ حضرت خنساء کی حدیث کو مسلم کے سوا سب نے روایت کیا ہے کہ ان کے والد نے اُن کی مرضی کے بغیر نکاح کر دیا تھا۔ انہوں نے بارگاہِ رسالت میں استغاثہ دائر کیا۔ حضور انور نے نکاح کو غلط قرار دیا۔ دوسرا

حدیث ابوہریرہ کی ہے جس کی جماعت نے تخریج کی ہے جس میں عبداللہ ابن عباس کی حدیث کا مضمون ہے۔ تیسری حدیث حضرت عائشہ کی ہے جسے بخاری و مسلم دونوں نے روایت کیا ہے جس میں تصریح ہے الیکو تستاذن نوجوان لڑکی سے اجازت لی جائے۔ چوتھی حدیث اسی مضمون کی بحوالہ ابوموسیٰ اشعری مسند احمد میں ہے اور ان کے علاوہ بھی اس موضوع پر متعدد حدیثیں آئی ہیں جن کا مجموعی مفاد یہ ہے کہ نوجوان اپنے معاملات میں مختار ہے۔ ان کی اجازت اور اُن کی مرضی کے بغیر ان کی رفاقت کا فیصلہ کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

دوسرا قانون اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ بالغہ آزاد لڑکی کا بغیر ولی کی اجازت کے نکاح ہو سکتا ہے۔ اگر وہ راضی ہو تو اس پر ولی کی پابندی نہیں ہے۔ بشرطیکہ وہ معروف کے مطابق کریں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور امام ابویوسف کا موقف ہے لیکن اس کے مقابلے میں امام شافعی، امام احمد اور امام ابواسحاق فرماتے ہیں کہ عورت بالغہ کا نکاح ولی کے بغیر باطل ہے اور اس موقف پر ان کا استدلال ابوموسیٰ کی اس حدیث سے ہے جس میں ارشاد ہے کہ لا نکاح الا بولی۔ نکاح ولی کے بغیر نہیں ہے اور اس کے علاوہ سلیمان بن ہلال اور ابوہریرہ کی حدیث مسند ابی داؤد طیالسی اور مسند شافعی اور سنن دارقطنی کے حوالہ سے آئی ہے۔ لیکن ان روایات کی تاریخی حیثیت ایسی مستحکم نہیں ہے۔ قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں ان کی روایتی حیثیت پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بھی اپنی تفسیر میں ان روایات پر تبصرہ کیا ہے۔ احناف کا فیصلہ یہ ہے کہ احادیث میں تعارض کے وقت دو ہی طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ دونوں میں سے ایک کو راجح قرار دیا جائے۔ اور یا پھر دونوں کو جمع کر دیا جائے۔

ترجیح دو وجہ سے ہو سکتی ہے ایک یہ کہ معانی قرآن سے مطابقت ہو۔ دوسرے یہ کہ روایتی اور تاریخی لحاظ سے زیادہ وزنی ہو۔ بلاشبہ وہ روایات جن میں نوجوان لڑکی کو بغیر ولی کے نکاح کی اجازت دی گئی ہے زیادہ صحیح ہیں۔ ظاہر ہے کہ ابن ماجہ، دارقطنی اور طیالسی کا اہل نظر کے یہاں وہ مقام نہیں ہے جو بخاری اور مسلم کا ہے۔ اجازت کی روایات بخاری و مسلم میں ہیں جب کہ ولی کی پابندی والی روایات میں ضعف و اضطراب ہے۔ اور اجازت والی روایات قرآن سے مطابقت رکھتی ہیں جبکہ پابندی عائد کرنے والی روایات قرآن کی دی ہوئی آزادی پر پابندی لگاتی ہیں۔

اس کے علاوہ دونوں کو جمع بھی کیا جا سکتا ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ ولی کے بغیر نکاح غلط ہونے کی احادیث اس صورت میں ہیں جبکہ عورت اپنی شادی غیر کفو میں کرلے اور اجازت کی احادیث کا تعلق اس صورت سے ہے جبکہ عورت اپنی پسند سے اپنا نکاح کفو میں کرے۔ حنفی مدرسۂ فکر میں کچھ علماء ایسے بھی ہیں جو غیر کفو میں نکاح کو درست ہی نہیں مانتے۔ یعنی ان کے خیال میں اگر عورت غیر کفو میں نکاح کرلے تو ہوتا ہی نہیں ہے جیسا کہ علامہ شامی نے شمس الائمہ وغیرہ سے نقل کیا ہے اس صورت میں لفظ باطل حدیث میں حقیقی معنے میں ہوگا۔ ہاں جو علماء یہ کہتے ہیں کہ عورت اگر غیر کفو میں شادی کرے تو نکاح تو ہوجاتا ہے لیکن عورت کے اولیا کو اس پر اعتراض کا حق حاصل ہے اور عورت شادی کرلے تو اولیا عدالت میں اس بنیاد پر فسخ نکاح کا دعویٰ کر سکتے ہیں۔ یہی ظاہر روایت ہے۔ اس صورت میں حدیث میں لفظ باطل سے بطلان حکمی مراد ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اگر کسی عورت کو اس کے شوہر نے طلاق دے دی ہو۔ اور زمانۂ عدت کے اندر اس سے رجوع نہ کیا ہو۔ پھر عدت گزر جانے کے بعد وہ دونوں آپس میں دوبارہ نکاح کرنے پر رضامند ہوجائیں تو عورت کے رشتہ داروں کو اس میں مانع نہ ہونا چاہیے۔ نیز اس کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ جو شخص اپنی بیوی کو طلاق دے چکا ہو اور عورت عدت کے بعد اس سے آزاد ہوکر کہیں دوسری جگہ اپنا نکاح کرنا چاہتی ہو تو اس سابق شوہر کو ایسی کمینہ حرکت نہ کرنی چاہیے کہ اس کے نکاح میں مانع ہو۔ اور یہ کوشش کرتا پھرے کہ جس عورت کو اس نے چھوڑا ہے اسے کوئی نکاح میں لانا قبول نہ کرے[1]

اس تفصیلی تشریح کی روشنی میں آیت کا صاف صاف اور واضح لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ

۱۔ اگر آپ نے اپنی بیوی کو طلاق دے دی اور وہ اپنی عدت بھی پوری کرچکی ہو تو اب اس کو اختیار ہے کہ وہ جس سے چاہے نکاح کرے۔ اگر شوہر اول نے تین طلاقیں نہیں دی ہیں تو چاہے دوبارہ اسی سے نکاح کرلے یا کسی اور سے کرلے۔ اور اگر پہلے شوہر نے تین طلاقیں دی ہیں تو پہلے سے نہیں بلکہ کسی دوسرے سے نکاح کرنا چاہے تو کرلے اور

---

[1] تفہیم القرآن

جس سے وہ نکاح کرنا چاہتی ہے وہ عورت اور یہ ہونے والا شوہر باہم قاعدہ شرعیہ کے مطابق رضامند بھی ہوں یعنی عقد صحیح کرنا چاہتے ہوں۔ مہر بھی مناسب مقرر ہو۔ گواہوں کے سامنے نکاح ہو۔ اور حقوقِ زوجیت کے پورا کرنے کا التزام ہو۔ اور باہم حسن سلوک کے ارادے سے نکاح کرتے ہوں تو ایسی حالت میں نہ تو پہلے شوہر کو مزاحمت کا حق ہے کہ وہ یہ کہہ کر عورت کو روکے کہ میں کسی مرد سے نکاح نہ کرنے دوں گا اور نہ عورت کے اولیا کو یہ حق ہے کہ وہ مزاحمت کریں۔ اور یہ کہہ کر روکیں کہ ہم پہلے خاوند سے نکاح نہ کرنے دیں گے۔

۲۔ عضل کے معنے ہیں روکنا، منع کرنا، تنگ کرنا۔ یہاں عورتوں کو نکاح سے روکنا مراد ہے۔ یہ رکاوٹ کھلی ہو یا درپردہ اندرونی سازش اور جوڑ توڑ کی ہو۔ بعض برادریوں میں یہ جہالت پائی جاتی ہے کہ طلاق کے بعد شوہر کی وفات کے بعد یہ لوگ اپنے خاندانی رواج کی بنا پر گوارا نہیں کرتے کہ ایسی عورت کہیں شادی کرے۔ اسے اپنی توہین تصور کرتے ہیں اور عورت کی شادی میں قسم قسم کی رکاوٹیں پیدا کر دیتے ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اب کسی کو اس کے راستہ میں رکاوٹ نہ بننا چاہیے۔

۳۔ بعض لوگوں نے طلقتم کا مخاطب شوہروں کو بتایا ہے اور تعضلوا کا مخاطب اولیا کو قرار دیا ہے۔ حالانکہ واقعات و حالات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ رکاوٹ شوہروں اور اولیا دونوں کی طرف سے ہوتی ہے۔ آیت کے عموم کا تقاضا یہی ہے کہ مخاطب سب ہوں اور تمام صورتیں اس میں شامل ہوں۔ اس لیے مناسب یہی ہے کہ خطاب کو دونوں جگہ عام رکھا جائے جیسا کہ بعض مفسرین نے اس کی تصریح کی ہے۔

۴۔ ہاں اگر عورت غیر کفو میں نکاح کرے۔ یا مہرِ مثل سے کم مہر پر نکاح کرے تو ولی کو روکنے کا حق ہے۔ اگر عورت اپنی ناسمجھی سے ایسا کرے تو ولی کو یہ بھی حق ہے کہ وہ اس کے خلاف عدالتی کارروائی کرے۔ تراضوا بینھم کے ساتھ معروف کی قید لگا کر بتا دیا کہ معروف کے خلاف جو صورتیں بھی ہوں ان میں روکنے کا حق اولیا کو بلکہ ہر مسلمان کو ہے مثلاً،

ا: تین طلاقوں کے بعد اگر عورت پہلے شوہر سے شادی کرنا چاہے،

ب: عدت کے اندر دوسرے شوہر سے شادی کرنا چاہے،

ج: بغیر ایجاب و قبول کے شادی کرنا چاہے،

د: جن مردوں سے شادی کرنا عورت کے لیے حرام ہے ان میں سے کسی سے شادی

کر رہی ہو۔

۵ : بغیر شہادتوں کے شادی کرنا چاہے۔

۶ : ایسے شخص سے شادی نہ کرے جس کے نکاح میں پہلے سے اس کی بہن ہو۔ ایسے نکاح شرعاً باطل ہیں، ان کو روکنے کا ہر مسلمان کو حق حاصل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نکاح میں اگر کوئی شرعی نقص ہو اور جانبین کی باہمی رغبت ہو اور لڑکی لڑکا رضامند ہوں تو اس میں مزاحمت کرنا روکنا موجبِ فتنہ اور خطرات ہے۔ یعنی عورت کو نکاح سے روکنے اور اس کا نکاح ہو جانے میں وہ پاکیزگی ہے جو نکاح سے رکنے میں ہرگز نہیں ہے اور عورت جب پہلے خاوند کی طرف راغب ہو تو اسی کے ساتھ نکاح ہونے میں وہ پاکیزگی ہے کہ دوسرے کے ساتھ نکاح میں ہرگز نہیں[1]

۲۳۲ ۔ تمہارے لیے شائستہ اور پاکیزہ طریقہ یہی ہے۔ یعنی یہ تمہارے لیے بہت صفائی اور پاکیزگی کی بات ہے اور گناہ میں مبتلا ہونے سے حفاظت ہے۔ یہاں تفصیل کی ضرورت نہیں ہے۔ عام طور پر مسلمان ان نزاکتوں سے آشنا ہیں جن کی طرف قرآن نے اپنے بلیغ انداز میں اشارۃً فرمایا ہے کہ ان احکام کی خلاف ورزی کا نتیجہ گناہوں کی غلاظت میں آلودگی اور فتنہ فساد ہے، کیونکہ عاقلہ بالغہ جوان لڑکیوں کو نکاح سے روکنا ایک طرف تو ان پر ظلم اور ان کی حق تلفی ہے اور دوسری طرف ان کی عفت و عصمت کو خطرے میں ڈالنا ہے اور اگر وہ کسی گناہ میں خدانخواستہ مبتلا ہوں تو اس میں بالواسطہ وہ بھی شریک ہوں گے جو نکاح کو روک کر اس کا سبب بنے ہیں۔ وبالِ آخرت سے پہلے بہت ممکن ہے کہ ان مجبور عورتوں کا یہ ابتلا خود مردوں میں جنگ و جدال کا پیش خیمہ بن جائے۔ اور اگر مطلق نکاح سے نہ روکا مگر ان کی پسند کے خلاف دوسرے شخص سے نکاح پر مجبور کیا تو اس کا نتیجہ بھی دائمی مخالفت ہے۔ اس لیے فرمایا ہے کہ ان کے تجویز کیے ہوئے شوہروں سے نکاح کرنے سے نہ روکنا ہی تمہارے لیے پاکی اور صفائی کا ذریعہ ہے[2]

ہم نے ازکیٰ کا ترجمہ شائستہ کیا ہے بعض حضرات نے اس کا ترجمہ نافع کیا ہے۔ جب کھیتی بڑھتی ہے اور اس میں نمو ہوتا ہے تو عرب کہتے ہیں زکا الزرع، اسی محاورے سے

---

۱ افاداتِ شیخ الہند ۲ معارف القرآن

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ
اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ؕ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ ؕ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَآرَّ وَالِدَةٌۢ
بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۚ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ
اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ؕ وَاِنْ
اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ
اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

اور جو شخص ماں سے اپنے بچے کو دودھ پلوانا چاہے تو اس صورت میں چاہیے کہ ماں اپنے بچہ کو دو سال دودھ پلائے اور جس کا بچہ ہے اس پر لازم ہے کہ ماں کے کھانے کپڑے کا دستور کے مطابق انتظام کرے۔ کسی شخص پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ نہ تو ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے، اور وارث پر بھی عورت کا کھانا کپڑا اسی طرح ہے۔ پھر اگر والدین باہمی رضامندی

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ

مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ

الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿٢٤٨﴾ رکوع ۳۲ ۱۶

اور اُن سے اُن کے پیغمبر نے کہا کہ طالوت کے اللہ کی جانب سے مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے مقدس تابوت تمہارے پاس واپس آئے گا۔ اس تابوت میں تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے لیے دلجمی کا سامان ہے اور جو کچھ موسٰی اور ہارون کے گھرانے اپنی مقدس یادگاریں چھوڑ گئے ہیں اُن کا بقیہ ہے اور جس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اگر تم مومن ہو تو اس واقعے میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے۔

قیادت وحکومت صرف اسی شخص کا حق ہے جو دولت و ثروت کا مالک اور سرمایہ داری میں نمایاں حیثیت رکھتا ہو اور حسب ونسب میں بھی بلند مرتبہ ہو۔ اقوامِ دُنیا کا حکومت کے بارے میں یہ تصور اس درجہ عام رہا ہے کہ جو قومیں تہذیب وتمدن اور علم ودانش کی علمبردار رہی ہیں وہ بھی اس معاملہ میں جاہلیت کے دوش بدوش نظر آتی ہیں۔ اسلام نے اس جاہلی نظریہ پر پہلی ضرب کاری لگائی اور واضح کیا ہے کہ اللہ کے نزدیک حکومت وامامت، قیادت وخلافت کا تعلق ـــــ

۱۔ نہ دولت وثروت سے وابستہ ہے۔

۲۔ نہ حسب و نسب اس کے لیے کارآمد ہے۔
۳۔ نہ یہ چیز وراثت میں منتقل ہوتی ہے۔
امام ابوبکر الجصاص احکام القرآن نے اس آیت سے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے اور خوب کیا ہے فرماتے ہیں،

یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن کے نزدیک خلافت و حکومت میں وراثت نہیں ہے اور یہ بھی اس سے ثابت ہے کہ امامت کے استحقاق میں نسب کو بھی دخل نہیں ہے۔

بلکہ منصب کا مدار علم اور صحت پر ہے کیونکہ حق و انصاف حسن تدبیر اصابت رائے جو حکومت وزارت کے لیے بنیادی شرط ہے وہ مال و دولت، حسب و نسب سے پیدا نہیں ہوتی۔

طالوت کے تقرر کی غیبی نشانی

بنی اسرائیل نے جب یہ سنا تو اپنے پیغمبر سے کہا کہ طالوت کے تقرر کی اور بھی کوئی دلیل ہونی چاہیے تاکہ ہمیں کوئی شبہ نہ رہے۔ ذات نبوت نے دعا فرمائی اور طالوت کے تقرر کی نشانی بتا دی۔[1]
گویا بنی اسرائیل کی رد و کد نے بات کو اتنا طول دے دیا کہ انہوں نے حضرت سموئیل سے یہ مطالبہ ہی کر دیا کہ اگر طالوت کا تقرر من جانب اللہ ہے تو اس کے لیے اللہ کا کوئی نشان دکھائیے۔ حضرت سموئیل نے فرمایا کہ اگر تمہیں اللہ کے اس فیصلہ کی تصدیق منظور ہے تو اتمام حجت کے لیے وہ بھی تم کو عطا کر دی جاتی ہے اور وہ یہ کہ جو متبرک صندوق تابوت سکینہ تمہارے ہاتھوں سے چھن گیا ہے وہ طالوت کی بدولت تمہارے پاس واپس آئے گا اور حکمت الٰہی سے ایسا ہوگا کہ تمہاری دیکھتی آنکھوں آئے گا۔ فلسطینیوں سے بنی اسرائیل کی مرعوبیت ان کے ہاتھوں ان کے قتل عام اور خدا کے صندوق چھن جانے کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

فلسطی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی اور ہر ایک اپنے ڈیرے کو بھاگا اور وہاں نہایت بڑی خوں ریزی ہوئی کیونکہ تیس ہزار پیادے وہاں کھیت آئے

---

[1] افادات شیخ الہند

اور خدا کا صندوق چھن گیا۔ (سموئیل باب ۴، ۱۰، ۱۱)

خدا کے صندوق کے چھن جانے کا جو اثر بنی اسرائیل پر ہوا اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے۔

اس خبر لانے والے نے جواب دیا اسرائیلی فلستیوں کے آگے سے بھاگے اور لوگوں میں بڑی خونریزی ہوئی اور تیرے دونوں بیٹے حفنی اور فینحاس بھی مر گئے۔ اور خدا کا صندوق چھن گیا۔ جب اس نے خدا کے صندوق کا ذکر کیا تو وہ کرسی پر سے پچھاڑ کھا کے گر پڑا اور اس کی گردن ٹوٹ گئی ـــــــ اور کہنے لگی کہ اسرائیل کی حشمت جاتی رہی اس لیے کہ خدا کا صندوق چھن گیا تھا اور اس کا خسر اور خاوند جاتے رہے تھے سو اس نے کہا کہ حشمت اسرائیل سے جاتی رہی کیونکہ خدا کا صندوق چھن گیا ہے۔ (سموئیل باب ۴، ۱۷۔ ۲۲)

اس آیت میں اسی چھنے ہوئے صندوق کی واپسی کو طالوت کے تقرر کے لیے ایک نشان قرار دیا گیا ہے۔ تابوت کی واپسی کیسے ہوئی؟ اس کا جواب آپ کو اس آیت کے تشریحی نوٹ میں ملے گا۔

تابوت سکینہ

۱۷۔ اور ان سے ان کے پیغمبر نے کہا طالوت کے بادشاہ ہونے کی نشانی یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے مقدس تابوت تمہارے پاس آئے گا۔ بنی اسرائیل میں ایک صندوق چلا آتا تھا۔ اس میں تبرکات تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام وغیرہ انبیائے بنی اسرائیل اس صندوق کو لڑائی میں آگے رکھتے تھے۔ اللہ اس کی برکت سے فتح دیتا۔ جب جالوت ان پر غالب آیا تو یہ صندوق بھی وہ لے گیا۔ جب اللہ تعالیٰ کو صندوق کا پہنچانا منظور ہوا تو یہ کیا کہ جہاں صندوق کو رکھتے وہیں وبا اور بلا آتی، پانچ شہر ویران ہو گئے۔ ناچار ہو کر دو بیلوں پر لاد کر ہانک دیا۔ فرشتے بیلوں کو ہانک کر طالوت کے دروازے پر پہنچا گئے۔ بنی اسرائیل اس نشانی کو دیکھ کر یقین لائے اور طالوت نے جالوت پر فوج کشی کی اور موسم نہایت گرم تھا[1]

تابوت کا خاص اصطلاحی نام تابوت سکینہ ہے۔ یہ بنی اسرائیل کا اہم ترین ملی و قومی

---

[1] افادات شیخ الہند

ورثہ تھا۔ اس کے اندر اصل نسخہ تورات مع تبرکات انبیاء محفوظ تھا۔ اسرائیلی اس کو بڑی برکت اور تقدیس کی چیز سمجھتے تھے۔ اور اس کے ساتھ برتاؤ انتہائی احترام کا رکھتے تھے۔ سفر و حضر، جنگ و امن ہر حال میں اسے بڑی حفاظت سے اپنے ساتھ رکھتے۔ یہ کچھ ایسا بڑا نہ تھا۔ موجودہ علمائے یہود کی تحقیق کے مطابق اس کی پیمائش حسب ذیل تھی۔

طول ۲½ عرض ۱½ بلندی ۱½ فٹ۔ بنی اسرائیل اپنی ساری خوش بختی اسی سے وابستہ سمجھتے تھے۔ مدت ہوئی فلسطینی اسے ان سے چھین لے گئے تھے۔ اسرائیل اسے اپنے حق میں انتہائی نحوست و بدطالعی سمجھ کر اس کی واپسی کے لیے حد درجہ بیتاب تھے۔ طالوت کے وقت میں یہ تابوت آنے کے بعد تاریخ کا بیان ہے کہ بنی اسرائیل کے قبضہ میں حضرت سلیمان ۹۲۲ ق م مسیح تک رہا اور آپ نے بیت المقدس میں ہیکل سلیمانی کی تعمیر کے بعد اسی میں رکھ دیا تھا۔ اس کے بعد سے اس کا پتہ نہیں چلتا۔ یہود کا عام خیال ہے کہ یہ تابوت اب بھی ہیکل سلیمان کی بنیادوں کے اندر دفن ہے۔

چونکہ اس دور میں بنی اسرائیل کے سامنے سب سے بڑا مسئلہ اس تابوت کو اپنے دشمنوں سے واپس لینے کا تھا اسی بنا پر حضرت سموئیل نے طالوت کے خدائی تقرر کے لیے یہ نشانی ٹھرائی کہ اس کے بعد تابوت تمہارے پاس فرشتوں کی مدد سے آجائے گا۔ چنانچہ ان کی یہ پیش گوئی پوری ہوئی اور فلسطیوں نے اس صندوق کو ایک گاڑی پر رکھ کر اس کو بنی اسرائیل کے علاقہ میں ہانک دیا۔ تابوت کی اس گاڑی کا بغیر کسی گاڑی بان اور بغیر کسی محافظ اور وہ بھی دو ایسی گایوں کے ذریعے جن کے دودھ پیتے بچے گھروں میں روک لیے گئے تھے اس طرح بغیر دائیں بائیں مڑے ٹھیک منزل پر پہنچ جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو فرشتوں کی رہنمائی اور مدد ہی سے ہو سکتا ہے۔ قرآن نے تحملہ الملائکۃ سے اسی طرف اشارہ کیا ہے [1]

قرآن اور توریت کے بیان میں فرق

اس باب میں بائبل کا بیان قرآن سے کسی حد تک مختلف ہے۔ قرآن کی زیر بحث آیت سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ اس کی واپسی کا واقعہ اس وقت پیش آیا جب طالوت کا خدا کے مقرر کردہ

---

[1] تدبر قرآن

بادشاہ کی حیثیت سے ہوا ہے۔ اور یہ واقعہ گویا ایک نشان تھا۔ اس بات کا کہ طالوت کا تقرر اللہ کی جانب سے ہے۔

اس کے بالکل برعکس تورات کا بیان یہ ہے کہ اس سے بہت پہلے ہی تابوت کو ایک گاڑی میں رکھ کر اسرائیل کے علاقہ کی طرف ہانک دی تھی۔ اس طرح تورات میں اس کی واپسی کا پس منظر یہ ہوتا ہے کہ فلسطینیوں کے لیے تابوت مصیبت بن گیا تھا۔ اس سے تنگ آ کر انہوں نے صندوق روانہ کر دیا۔

میرے خیال میں دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ یہ واقعہ کوئی راز نہیں۔ اس کی پشت پر ایک تاریخ ہے۔ اسرائیلیوں کو اس رد و کد اور بحث و مناظرہ میں وقت لگانا پڑا۔ اللہ سبحانہٗ کے سارے معاملات تکوینی ہوتے ہیں۔ اور اللہ نے اس مقررہ وقت پر اس کام کے ہونے کے لیے عالم غیب میں خبر نہیں کتنے زمانہ پہلے سے حالات میں سازگاری شروع فرمائی ہوگی۔ احوال و ظروف جب اس ڈھب پر آ گئے کہ ان کے ظہور کی عملی گھڑی آ گئی تو انہوں نے اس صندوق کو اس سکیم کے مطابق واپس کر دیا۔ اس سارے کام کے لیے سات ماہ کا عرصہ کوئی عرصہ نہیں ہے۔

۷۱۔ اس تابوت میں تمہارے لیے دلجمعی کا سامان ہے۔ اصل ارشاد میں سکینہ آیا ہے سکینۃ سکون سے فعیلۃ کے وزن پر ہے۔ اس کے معنے سکون، طمانیت اور وقار کے ہیں۔ فیہ سکینۃ کا مطلب یہ ہے کہ تابوت تمہارے لیے طالوت کے معاملہ میں سکونِ قلب کا سامان ہے۔ اور سکون کے نتیجے میں اب تمہارا اختلاف ختم ہو جائے گا۔ چونکہ صندوق بغیر گاڑی بان کے فرشتوں کی رہنمائی سے آیا تھا اس لیے اس سے دلوں کی بے چینی ختم ہو گئی۔ قرآن میں اس کو کبھی تثبیت کہا جاتا ہے اور کبھی سکینت۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد میں نزولِ ملائکہ کو نزولِ سکینت فرمایا ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت براؓ بن عازب کے حوالے سے آیا ہے کہ:

> ایک شخص زمانۂ نبوت میں سورۂ کہف تلاوت کر رہا تھا رات کا وقت تھا۔ پاس ہی اس کا گھوڑا بندھا ہوا تھا۔ بدلی اٹھی اور چکر کاٹنے لگی۔ کبھی کبھار قریب آجاتی گھوڑا بدکنے لگا۔ صبح ہونے پر وہ شخص جناب رسالتمآب میں حاضر ہوا۔ اور رات کا پورا واقعہ سنا دیا۔ حضور نے فرمایا قرآن کے لیے سکینت نازل ہوئی۔ الفاظ یہ

ہیں۔ تلك السكينة تنزلت للقرآن
ایک دوسری حدیث میں ہے کہ
اسید بن الحضیر قرآن تلاوت کر رہے تھے، رات کا وقت تھا اور یہی واقعہ پیش آیا حضور نے فرمایا کہ فرشتے تیرا قرآن سُن رہے تھے۔

ایک موقعہ پر فرشتوں کو سکینت کہنا اور دوسرے موقعہ پر ان کو فرشتہ اس بات کی دلیل ہے کہ فرشتوں کا نزول اللہ کی جانب سے دلجمعی کا سامان ہوتا ہے۔ یہاں فرشتوں کی رہنمائی میں صندوق کا آنا بنی اسرائیل کی دلجمعی کا سامان بن گیا۔ اور شائد تابوت کے سامانِ سکینت بننے کی وجہ یہ بھی ہو کہ بنی اسرائیل اس کو بڑا متبرک اور اپنے لیے فتح ونصرت کا نشان سمجھتے تھے۔

۱۸۷۔ اور جو کچھ موسیٰ اور ہارون کے گھرانے اپنی مقدس یادگاریں چھوڑ گئے ہیں۔ اُن کا بقیہ ہے۔ یعنی اس صندوق میں آلِ موسیٰ اور آلِ ہارون کے چھوڑے ہوئے تبرکات تھے۔ ان تبرکات کا تمہیں مل جانا صد ہزار خیرات و برکات کا موجب ہوگا۔ تبرکات سے مقصود پتھر کی وہ تختیاں ہیں جو طورِ سینا پر اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو دی تھیں۔ اس کے علاوہ تورات کا اصل نسخہ بھی اس میں موجود تھا جسے حضرت موسیٰ نے خود لکھوا کر بنی لاوی کے سپرد کیا تھا۔ نیز ایک بوتل میں من بھی رکھ دیا تھا تاکہ آئندہ نسلیں اللہ تعالیٰ کے اس احسان کو یاد کریں جو صحرا میں اس نے ان کے باپ پر کیا تھا اور غالباً حضرت موسیٰ کا وہ عصا بھی تھا جو اللہ کے عظیم الشان معجزات کا مظہر تھا[1]

ایک شبہ کا ازالہ

اس کے بعد قرآن میں یہ فقرہ ہے کہ تحملہ الملائکۃ فرشتے اس تابوت کو اٹھائے ہوئے تھے۔ عام مفسرینِ قرآن نے اس کا مطلب وہی بتایا ہے جو حضرت شیخ الہند نے اپنے افادات میں اختیار فرمایا ہے کہ فرشتوں کی رہنمائی میں گائیوں کی گاڑی اسرائیلی علاقہ میں آگئی۔ ان گائیوں کا رُخ خاص اسرائیلی علاقہ کی جانب کر دینا بھی فرشتوں کا کام تھا اور طالوت کی تائید میں غیبی نشان تھا۔ چنانچہ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ ساقتها الملائكة الى طالوت گاڑی کی گائیوں کو

---

[1] تفہیم القرآن

طالوت کی طرف ملائکہ نے ہانکا۔ ابن کثیر نے امام سفیان ثوری کے اساتذہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اس کو ایک گاڑی کے ذریعے فرشتے لے کر آئے۔ محمود آلوسی رقمطراز ہیں۔ اللہ نے اس گاڑی پر چار فرشتے مقرر فرما دیے جو گاڑی کو ہانک کر طالوت کے گھر لے آئے۔ یہی بات قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اپنی تفسیر میں فرمائی ہے۔ عبدالوہاب نجار نے بھی قصص القرآن میں یہی لکھا ہے کہ فرشتوں کی رہنمائی میں اس طرح یہ گائیں صندوق کی گاڑی کو بغیر کسی قائد و سائق کے منزل مقصود پر لے آئیں۔

حیرت ہے کہ مولانا حفظ الرحمان کو یہ مطلب باطل اور نظم قرآنی کے خلاف نظر آیا۔ اس کی وجہ خود انہوں نے یہ بتائی ہے کہ

اس لیے کہ قرآن عزیز کے بیان کا حاصل تو یہ ہے کہ تابوت سکینہ کی واپسی طالوت کی حکمرانی کے لیے خدا کا ایک نشان ہے۔ مگر تورات سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ گاڑی میں جوتی گئی گائیں بیت شمس کی سڑک پر لے جا کر چھوڑ دی گئیں۔ البتہ انہوں نے دائیں بائیں رُخ نہ کیا اور سیدھی چلتی رہیں یہاں تک کہ بیت شمس کے سامنے کھیتوں میں جا کھڑی ہوئیں ــــــ تابوت کے حاصل ہونے کا یہ طریقہ بے شبہ معجزہ یا نشان کی حیثیت نہیں رکھتا۔

مولانا نے شاید غور نہیں کیا کہ تابوت کے آنے کو طالوت کے حکمران ہونے کے لیے آیۃ قرار دیا گیا ہے۔ تابوت کی آمد کی کیفیت کو قرآن نے طالوت کی حکمرانی کے لیے آیت قرار نہیں دیا۔ تابوت کی گاڑی کا بغیر کسی گاڑی بان اور بغیر کسی محافظ کے اور وہ بھی دو ایسی گایوں کے ذریعے جن کے دودھ پیتے بچے گھروں پر روک لیے گئے۔ اس طرح بغیر دائیں بائیں مڑے ٹھیک منزل پر پہنچ جانا ایک ایسا واقعہ ہے جو کروبیوں کی رہنمائی اور فرشتوں کی مدد ہی سے ہو سکتا ہے اسی چیز کو قرآن نے تحملہ الملائکہ سے تعبیر کیا ہے۔

ہاں بائبل میں تابوت سکینہ کی واپسی عہد طالوت سے بہت پہلے بتائی گئی ہے۔ قرآن نے یہاں یہ تصریح کر کے حسب معمول بائبل کے بیان کی تصحیح کر دی۔ کیونکہ اولاً بائبل میں جہاں فلستیوں کے اس تابوت کو لے جانے اور پھر واپس آنے کا ذکر ہے وہاں سے ہرگز یہ پتہ نہیں چلتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے۔ چنانچہ پادری ڈملو کی تفسیر بائبل میں اس کا صاف اعتراف موجود ہے۔

ثانیاً سموئیل کی دونوں کتابوں کے متعلق یہ علم ہے کہ یہ خود کوئی تاریخی حیثیت نہیں

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ ۙ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ
بِنَهَرٍ ۚ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي ۚ وَمَنْ لَمْ يَطْعَمْهُ
فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ ۚ فَشَرِبُوا مِنْهُ
إِلَّا قَلِيلًا مِنْهُمْ ۚ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ
قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ ۚ قَالَ
الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلَاقُو اللَّهِ كَمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ
غَلَبَتْ فِئَةً كَثِيرَةً بِإِذْنِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ۝

پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو بولے کہ اللہ تمہارا امتحان ایک دریا[1] کے ذریعے لینا چاہتا ہے لہٰذا یاد رکھو جو شخص اس کا پانی پیئے گا اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے اور میرا ساتھی وہ ہے جو اس کا مزہ بھی نہ چکھے، ہاں اگر کوئی مجبوری کی حالت میں اپنے ہاتھ سے ایک چلو لے لے اور پی لے تو اس کا کوئی مضائقہ نہیں ہے[2] لیکن جب لشکر دریا پر پہنچا تو ایک تھوڑی تعداد کے سوا سب نے پی لیا۔ پھر جب طالوت اور اُس کے ساتھ وہ لوگ جو ایمان رکھتے

دریا پار ہوئے تو ان لوگوں نے جنہوں نے طالوت کے حکم کی نافرمانی کی تھی کہا ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کی سکت نہیں ہے[۲۲۱] لیکن وہ لوگ جن کو اللہ سے ملنے کی یقین کی دولت حاصل تھی پکار اٹھے کہ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں۔ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے[۲۲۲]

رکھتی ہیں بلکہ ان کا ماخذ کوئی اور ابتدائی تحریر ہے۔ اور پھر تابوت کا ذکر سموئیل کے پانچویں چھٹے باب میں ایسے بے ربط طریق پہ ہے کہ پادری ڈملو اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ تابوت کا ذکر جو پانچویں چھٹے باب میں ہے اس سے اس بات کا پتہ نہیں ملتا کہ یہ کس زمانہ کا واقعہ ہے سوائے اس کے کہ یہ جنگ افیک کے بعد کا ہے۔ چھٹے باب کی پہلی آیت میں لکھا ہے کہ صندوق سات مہینوں تک فلستیوں کے ملک میں رہا اور ساتویں باب کی دوسری آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ تابوت بیس برس تک قریہ یعاریم میں رہا۔ اور سارے بنی اسرائیل نے خداوند کے لیے نالے کیے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ابھی وہ مغلوب تھے، حالانکہ تابوت کا ان کے درمیان آنا بطور نشان تھا۔ کہ وہ مظفر و منصور ہوں گے لہٰذا یہ واقعات ہرگز قابلِ اعتبار نہیں۔ قرآن کا بیان یہاں صحیح ہے کیونکہ اس کی واپسی بنی اسرائیل کی فتح و ظفر کی نشانی تھی اور فلستیوں پر ان کا فتح یاب ہونا طالوت کے زمانہ سے شروع ہوتا ہے۔

طالوت کی جنگی تیاری

چونکہ طالوت کے تقرر سے مقصود میدانِ جنگ کی قیادت تھی اس لیے سب سے پہلے اسی مقصد کے حصول کی خاطر طالوت نے بنی اسرائیل کو نفیرِ عام دیا کہ وہ دشمنوں کے مقابلے میں جانے کے لیے تیار ہو جائیں۔ لیکن جب وہ جنگ کی تیاری کر رہے تھے تو ان کی کمان میں ایسی قوم آ گئی تھی

جو ایک طرف دشمن سے شکست خوردہ قوم تھی اور مقابلہ ایک غالب قوت سے تھا۔ دوسری طرف طالوت کے تقرر کو پہلے مشکوک نگاہوں سے دیکھا تھا۔ ان دو باتوں کی وجہ سے آغاز ہی میں ان کو آزما لینا ضروری تھا تاکہ پتہ لگ جائے کہ کون شخص تعمیلِ حکم، منبطِ نفس اور صداقت و اخلاص کا حامل ہے اور کس میں یہ اوصاف نہیں پائے جاتے تاکہ ادائے فرض سے پہلے ہی ایسے عناصر کو الگ کر دیا جائے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ مہم فلسطیوں کے مقابلہ کے لیے تھی جن کا سردار جاتی جولیت تھا جس کا ذکر قرآن نے جالوت کے نام سے کیا ہے۔ اس جنگ میں طالوت اور جالوت کی فوجوں کے ایک دوسرے کے بالمقابل فوج آرائی کی جو شکل بیان ہوئی ہے وہ بالکل اس شکل سے ملتی ہے جو ہمارے ہاں بدر کے موقعہ پر کفار اور مسلمانوں کے مابین پیش آئی۔ سموئیل میں اس کا ذکر اس طرح آیا ہے:

> پھر فلستیوں نے جنگ کے لیے اپنی فوجیں جمع کیں اور یہوداہ کے شہر شوکہ میں فراہم ہوئے۔ شوکہ اور عزیقہ کے درمیان افسدمیم میں خیمہ زن ہوئے۔ ساول اور اسرائیل کے لوگوں نے جمع ہو کر ایلہ کی وادی میں ڈیرے ڈالے اور لڑائی کے لیے فلستیوں کے مقابل صف آرائی کی، اور ایک طرف کے پہاڑ پر فلستی اور دوسری طرف کے پہاڑ پر بنی اسرائیل کھڑے ہوئے اور ان دونوں کے درمیان وادی تھی۔
>
> (سموئیل باب ۱۷ ۱-۳)

اس نقشہ پر غور کیجئے اور پھر ایک نظر اس نقشہ پر ڈالیے جو بدر کے موقع پر کفار اور مسلمانوں کے آمنے سامنے ہونے کا بیان ہوا ہے تو صاف نظر آئے گا کہ یہ بالکل جنگِ بدر کی تصویر ہے۔ صحیح بخاری کی کتاب المغازی میں حضرت براء ابن عازب کا یہ بیان اس کی تائید کرتا ہے کہ ہم اصحابِ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپس میں بات چیت کیا کرتے تھے کہ اصحابِ بدر کی تعداد اصحابِ طالوت کے برابر ہے۔ گویا جنگِ بدر کے پیش آنے سے پہلے قرآن نے اس کا نقشہ طالوت کی جنگ میں دکھا دیا تھا۔

فوج کی آزمائش

۷۱۹۔ پھر جب طالوت فوجوں کو لے کر چلے تو بولے کہ اللہ تمہارا امتحان ایک دریا کے ذریعے لینا چاہتا ہے۔ ہوس سے طالوت کے ساتھ چلنے کو سب تیار ہو گئے۔ طالوت

نے کہہ دیا کہ جو کوئی جوان زور آور ہو اور بے فکر ہو وہ چلے ایسے بھی اسی ہزار نکلے۔ پھر طالوت نے ان کو آزمانا چاہا۔ ایک منزل میں پانی نہ ملا۔ دوسری منزل میں ایک نہر ملی۔ طالوت نے حکم دیا کہ جو ایک چلو سے زیادہ پانی پیئے گا وہ میری ساتھ نہ رہے۔ صرف تین سو تیرہ آدمی ان کے ساتھ رہ گئے اور سب جدا ہو گئے۔ جنہوں نے ایک چلو سے زیادہ نہ پیا ان کی پیاس بجھی اور جنہوں نے زیادہ پیا ان کو اور زیادہ پیاس لگی اور آگے نہ چل سکے[1]

مطلب یہ کہ آمنا سامنا ہونے سے پہلے طالوت نے اپنی فوج کے ڈسپلن اور ان کی اطاعت و وفاداری کا امتحان لینے کے لیے یہ اعلان کیا کہ سامنے جو فلاں نہر ہماری راہ میں آرہی ہے اس کے ذریعے سے اللہ تمہارا امتحان کرے گا تم میں سے جو اس کا پانی پی لے گا وہ میرا ساتھی نہ بن سکے گا۔ جو اس کو بالکل نہ پیئے گا وہ میرا ساتھی ہوگا۔ اگر کسی نے ہاتھ سے ایک آدھ چلو پی لیا تو وہ قابل درگزر ہے۔ اس امتحان میں اکثریت ناکام ہو گئی۔ لوگوں نے خوب سیر ہو کر پیا۔ صرف تھوڑے سے لوگ اس امتحان میں کامیاب ہو گئے[2]

یہ نہر کون سی ہے

نہر کے معنے ندی نالے کے نہیں بلکہ دریا کے ہیں۔ دریا سے یہاں مراد دریائے یردن ہے۔ یہ دریا بڑا نہیں۔ براہِ راست لمبائی ۶۵ میل ہے۔ البتہ پیچ وخم ملا کر کوئی ۲۰۰ میل کی ہے۔ علاقہ فلسطین میں اہم ترین دریا یہی ہے اور گویا ملک کی قدرتی سرحد کا کام دیتا ہے چنانچہ یردن کے اس پار اور اس پار علاقوں کی تقسیم توریت میں درج ہے (یوشع ۱-۱۴-۱۵) اس کا بہاؤ شمال سے جنوب کی طرف ہے۔ یہ بحر جلیل اور بحر طبریہ ہوتا ہوا بحر مردہ میں گرتا ہے اس کا پانی شروع میں تو صاف اور شفاف ہے لیکن آگے چل کر گدلا بدبو دار ہے[3]

آزمائش کیوں لی گئی

سنت الٰہی یہی ہے کہ تقرر کے موقعہ پر جو اختلاف رائے کا اظہار کرتے ہیں تقرر کے بعد ان کا امتحان لیا جاتا ہے تاکہ وفاداری کا عملی مظاہرہ ہو جائے۔ آدم کی خلافت پر فرشتوں

---

[1] افادات شیخ الہند [2] تدبر قرآن [3] ماجدی

نے سوال کیا تھا تو حضرت آدم کو خلیفہ بنانے کے بعد ملائکہ کی وفاداری کا مظاہرہ کرنے کے لیے آدم کو مسجودِ ملائکہ بنایا۔ حضرت یوسف کے بھائیوں نے حضرت یوسف پر رشک کیا تو حکومت کے بعد یوسف کے لیے بھائیوں کا امتحان یوسف کو مسجودِ برادران بنا کر لیا۔ یہاں اسرائیلیوں کو اول وہلہ میں طالوت کی قیادت سے اختلاف تھا اس لیے حکومت و قیادت ملنے کے بعد سب سے ان کی وفاداری اور طاعت گزاری کا امتحان لیا گیا تاکہ کھرے کھوٹے کا پتہ لگ جائے۔

اور اس کی وجہ یہ بھی بتائی گئی ہے کہ

ایسے مواقع پر لوگوں کا ہجوم عام ہو جاتا ہے اور ان میں کار آمد اور موقعہ پر کام آنے والے کم ہوتے ہیں۔ جوش میں سب ہی قدم اٹھا دیتے ہیں مگر وقت پر ہوش والے تھوڑے ہوتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ کو جوش اور ہوش والوں میں امتیاز کرنا مقصود تھا۔ اس کا یہ امتحان مقرر کیا گیا کیونکہ جنگ میں ضرورت استقلال، جفاکشی اور ہوشمندی کی ہوتی ہے۔ شدتِ پیاس کے وقت بے منت پانی ملنے پر ضبط کرنا استقلال اور جذبات پر قابو پانے کی علامت ہے اور والہانہ پانی پر گر جانا عدمِ استقلال اور سرتاسر جذباتی ہونے کی نشانی ہے[1]

۲۴۹۔ یاد رکھو جو شخص اس کا پانی پئے گا اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں ہے اور میرا ساتھی وہی ہے جو اس کا مزہ بھی نہ چکھے ہاں اگر کوئی مجبوری کی حالت میں اپنے ہاتھ سے ایک چلو لے کر پی لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

لَيْسَ مِنِّي کا مطلب

اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں یہ ترجمہ ہے لَیْسَ مِنِّی کا یعنی میرے ہمراہیوں اور رفیقوں میں سے نہیں ہے۔ یہ معنے نہیں کہ وہ سرے سے ایمان ہی سے خارج ہو گیا۔ کیونکہ یہ گناہ ہے اور گناہ خواہ کتنا سنگین ہو۔ اس کا مرتکب کافر نہیں ہوتا ہے اور شاید یہی ظاہر کرنے کے لیے اندازِ تعبیر یہ اختیار فرمایا کہ لَیْسَ مِنِّی میرے سے نہیں یعنی میرا ساتھی اور رفیق نہیں ہے۔ احادیث میں بعض اعمال کی نسبت لیس منی اور بعض کی نسبت لَیْسَ مِنَّا آیا ہے مثلاً النکاح من سنتی فمن رغب عن سنتی فلیس منی۔ نکاح میری سنت ہے پس جو شخص میری

---

[1] معارف قرآن م ش

سنت سے روگرداں ہوگا وہ مجھ سے نہیں ہے اور ایک حدیث میں ہے من حمل علینا السلاح فلیس منا جو شخص ہمارے خلاف تلوار اٹھائے وہ ہم سے نہیں ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔ لیس منا میں جمع کا صیغہ ہے جس سے مقصود اُمت ہے اور لیس منی میں اپنی ذات خاص کا ذکر ہے جس سے مقصود ترک سنت ہے۔ پس جن احادیث میں لیس منا کی وعید آئی ہے ان سے مقصود یہی ہوگا کہ ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ یہ ایک پیرایہ وعید ہے جو حضور انور ان مواقع پر بولتے جہاں صریح و قطعی کفر کی جگہ کفر سے بہت ہی قریب اور اسلامی زندگی سے بہت ہی بعید حالت کا بتانا مقصود ہوتا تھا اور جن حدیثوں میں لیس منی آیا ہے ان سے مقصود صرف ترک اتباع سنت و اسوۂ نبوت ہے۔ بہرحال اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ وہ شخص دائرۂ ایمان سے نکل گیا ہے۔

چلو بھر پانی میں کوئی مضائقہ نہیں

موسم گرمی کا تھا اور طالوت کے فوجیوں کو ضرور پیاس لگی ہوگی۔ اس لیے اصل حکم تو بہرحال امتحان میں یہی تھا کہ کوئی شخص راستہ میں یہ پانی زبان پر نہ رکھے اور یہ دوسرا حکم بطور رخصت تھا کہ ایک آدھ چلو سے منہ تر کر لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ گویا سو فی صدی امتحان میں کامیابی کی شرط تو یہی تھی کہ اس دریا کا پانی کوئی نہ چکھے لیکن چلو پی لینے کو نظر انداز کر دیا گیا۔ اور ہاتھ کی قید اس لیے لگادی کہ مبادا بے اجازت مٹک، لپ، گلاس، کٹورے تک نوبت پہنچادے۔ لکھا ہے کہ جن لوگوں نے چلو بھر پانی پی لیا اُن کی پیاس بجھ گئی اور اُن کے دل قوی ہو گئے اور جن لوگوں نے زیادہ پیا وہ نہ صرف بزدل ہو گئے بلکہ اُن کی پیاس بھڑک اُٹھی۔

فوجیوں کی باہمی گفتگو

۱۴۷۔ پھر جب طالوت اور اس کے ساتھ وہ لوگ جو ایمان رکھتے تھے دریا پار ہو گئے تو ان لوگوں نے طالوت کے حکم کی نافرمانی کی تھی کہا کہ ہم میں جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہے۔ یہ فوجیوں کی آپس میں گفتگو تھی۔ دشمن کی کثرت تعداد اور اس کا عظیم سامان دیکھ کر اس کی ہیبت دل میں بیٹھ جانا اور اپنی طرف سے مایوس ہو جانا ایک امر طبعی تھا۔ اچھوں اچھوں کی ہمت بھی ایسے موقع پر طبعی طور پر چھوٹ جاتی ہے۔ یہ بات اُن کے ہی مُنہ سے

نکل ہو گی جو پانی پی کر سیراب ہو چکے تھے اور قرینہ کہتا ہے کہ انہوں نے دریا پار کرنے کی زحمت بھی گوارا نہ کی ہو گی بلکہ دریا کے اسی کنارے کھڑے کھڑے پار جانے والوں سے کہا کہ ہم میں جالوت سے ٹکر لینے کی ہرگز ہمت نہیں ہے۔

جالوت فلسطینوں کے لشکر کا مشہور سردار، بڑا قدآور پہلوان تھا۔ گویا انسان نما دیوزاد تھا۔ توریت میں اس کی جسامت، قدوقامت، شہ زوری، اس کا سامانِ جنگ اور اس کی میدانِ جنگ میں مقابلہ کی داستان کا ذکر تفصیل کے ساتھ موجود ہے۔ اسرائیلیوں نے اس کا یہ سامان دیکھا تو سہم اُٹھے۔ خود توریت کی روایت ہے کہ جس وقت طالوت اور سارے بنی اسرائیل نے اس فلسطی کی بات سنی تو ان کی دلاوری نکل گئی اور وہ ڈر گئے۔ (سموئیل ۱۷-۱۱)

فتح و شکست کا مدار

۲۴۷۔ لیکن وہ لوگ جن کو اللہ سے ملنے کا یقین ہے پکار اُٹھے کہ کتنی ہی چھوٹی جماعتیں ہیں جو اللہ کے حکم سے بڑی جماعتوں پر غالب آگئیں اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔

نتیجہ یہ نکلا کہ جب لشکر دریا پار کر گیا تو جن لوگوں نے ضبطِ نفس اور اطاعتِ امیر کا ثبوت دیا تھا انہوں نے بے خوف ہو کر کہا کہ ہم ضرور دشمن کا مقابلہ کریں گے کیونکہ اللہ کی قدرت کا یہ مظاہرہ اکثر ہوتا رہتا ہے کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آتی رہتی ہیں اور بڑی جماعتیں چھوٹی جماعتوں سے شکست کھاتی رہتی ہیں۔ فتح و شکست کا مدار افراد کی کثرت و قلت پر نہیں بلکہ ایمان باللہ اور اخلاص پر ہے اور اللہ کی مدد انہی کا ساتھ دیتی ہے جو مومن مخلص ہوں اور ثابت قدم ہوں۔

اربابِ عزیمت کا چہرہ

ایمان تو سب کے پاس تھا مگر اربابِ عزیمت کا چہرہ اللہ نے اس عنوان سے پیش فرمایا کہ الذین یظنون انھم ملاقوا اللہ جن کو اللہ کی ملاقات کا یقین ہے۔ اس خاص صفت سے ان کے تعارف کرانے کی وجہ یہ ہے کہ وہ حقیقی شجاعت جو موت کو اللہ کی راہ میں زندگی سے بھی زیادہ عزیز بنا دیتی ہے وہ مومن کے اس یقین سے پیدا ہوتی ہے کہ اللہ کی راہ میں مرنے والے مرتے نہیں ہیں بلکہ حقیقی زندگی اور اپنے رب کی ملاقات سے مشرف ہوتے ہیں — گویا یہ

وَلَمَّا بَرَزُوْا لِجَالُوْتَ وَجُنُوْدِهٖ قَالُوْا رَبَّنَآ اَفْرِغْ عَلَيْنَا
صَبْرًا وَّثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢٥٠﴾
فَهَزَمُوْهُمْ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۣۙ وَقَتَلَ دَاوٗدُ جَالُوْتَ وَ
اٰتٰىهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَهٗ مِمَّا يَشَآءُ ۭ وَ
لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّفَسَدَتِ
الْاَرْضُ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ ذُوْ فَضْلٍ عَلَى الْعٰلَمِيْنَ ﴿٢٥١﴾

اور پھر وہ جب میدان جنگ میں جالوت اور اُس کے لشکر کے سامنے آئے تو انہوں نے کہا خدایا (تو دیکھ رہا ہے کہ ہم کمزور ہیں اور تھوڑے ہیں اور مقابلہ اُن سے ہے جو طاقتور ہیں اور بہت ہیں) تو ہم پر صبر کے جام انڈیل دے اور ہمارے قدم میدانِ جنگ میں جما دے اور ہمیں کافروں پر غلبہ عطا فرما[۲۲۳] چنانچہ ایسا ہی ہوا، انہوں نے حکم الٰہی سے دشمنوں کو شکست دی[۲۲۴] اور داؤد کے ہاتھ سے جالوت مارا گیا، پھر اللہ نے داؤد کو بادشاہی اور حکومت سے سرفراز کیا۔ اور اس کو وہ سب کچھ سکھلا دیا جن کی حکمرانی و دانشوری کی خاطر سکھانے کی اس کی مشیت ہوئی[۲۲۵]۔ اور دیکھو اگر اللہ انسانوں کے ایک

گروہ کے ذریعے دوسرے گروہ کو نہ ہٹاتا تو دُنیا خراب ہو جاتی، لیکن اللہ سب جہانوں کے لیے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔ ۲۵۱

کہہ کر بتا دیا کہ جو لوگ اللہ کی ملاقات پر یقین رکھتے ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ اہلِ ایمان کی مختصر سی جماعت جو مشقتوں اور تکلیفوں سے گزر کر بلندیوں اور رفعتوں تک پہنچتی ہو وہ ہی غالب رہنے والی ہے کیونکہ اس کا تعلق اُس طاقتور ہستی سے ہے جو ساری کائنات پر قدرت رکھنے والی ہے۔ یہ لوگ یہ بھی یقین رکھتے ہیں کہ مدد صرف اللہ ہی کی جانب سے آتی ہے اور اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے اور ان کے ساتھ ہے جن کو اس نے حق و باطل کے معرکہ میں حق کو سر بلند کرنے کے لیے منتخب کیا ہے۔

اس طرح مسلمانوں کو اشارتاً سمجھا دیا کہ طالوت کا تقرر بھی اللہ نے کیا تھا اور عالم کی اصلاح کے لیے تمہارا تقرر بھی اللہ نے کیا ہے خواہ پوری دُنیا کی اکثریت تمہارے خلاف ہو مگر تمہیں اس یقین کے ساتھ قدم اٹھانا چاہیے کہ تم اللہ کی جانب سے اصلاح کا فرض ادا کرنے آئے ہو۔ فتح و شکست کا مدار افراد کی کثرت و قلت نہیں بلکہ ایمان و یقین ہے۔

میدانِ جنگ میں دُعاء

یہی دُعا وہ ہے جو سچی استعداد کے ساتھ ہو، طالوت کے ساتھیوں نے اپنی دُعا میں صرف یہ نہیں کہا کہ ہمیں فتح مند کر بلکہ فتح مندی کی طلب سے پہلے صبر و ثبات کی طلب گاری کی اور کہا کہ ہمیں صبر دے اور ہمارے قدم جما دے کیونکہ خدا کی نصرت انہی کے حصہ میں آتی ہے جن میں صبر و ثبات کی رُوح پیدا ہو جاتی ہے۔ اس موقعہ پر یہ دُعائی پیمانہ بتا رہا ہے کہ قرآن کی نگاہ میں دُعا کی کتنی اہمیت ہے۔ یہ کوئی مسجد نہیں، خانقاہ نہیں، میدانِ جنگ ہے۔ عین میدانِ جنگ میں اہلِ ایمان کا اللہ سے یہ تعلق اس بات کی علامت ہے کہ قرآن کسی موقعہ پر اللہ سے بے نیازی گوارا نہیں کرتا۔ دُعا کی اس کیفیت میں بھی بدر کی تصویر آنکھوں میں پھر جاتی ہے۔ حضرت علی فرماتے ہیں:

حضرت طاؤس، حضرت حسن بصری، حضرت عمر بن عبدالعزیز اور تمام اہلِ ظاہر اس بات کے قائل ہیں کہ عورت اپنی عدت کا زمانہ جہاں چاہے گزار سکتی ہے۔ اور اس زمانے میں سفر بھی کر سکتی ہے۔[1]

چار مہینے دس روز کا مطلب یہ ہے کہ ایک سو تیس دن کی عدت ہے۔ مگر ہاں اگر کسی عورت کا شوہر چاند رات کے دن مرا تو پھر چاند کے حساب سے عدت پوری کی جائے خواہ کوئی چاند انتیس کا ہو یا تیس کا۔ لیکن اگر چاند رات کو نہیں مرا تو پھر ایک سو تیس دن پورے کرنے ہوں گے۔ عدت ختم ہونے کا وقت وہی ہو گا جو شوہر کے انتقال کا وقت ہے۔

۶۸۴ - پھر جب وہ یہ عدت پوری کر لیں تو وہ جو کچھ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں اس کا تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔ یعنی جب بیوہ عورتیں اپنی عدت پوری کر لیں یعنی غیر حاملہ چار ماہ دس روز اور حاملہ مدتِ حمل تو ان کو دستورِ شریعت کے مطابق نکاح کر لینے میں کوئی گناہ نہیں اور زینت و خوشبو سب حلال ہیں۔[2]

مطلب یہ ہے کہ عدت گزار چکنے کے بعد وہ آزاد ہیں کہ اپنے معاملہ میں دستور کے مطابق جو قدم مناسب خیال کریں اٹھائیں۔ اس کے بعد نہ اولیا پر کوئی الزام ہے اور نہ اُن پر کوئی گناہ ہے۔ اگر انہوں نے معروف کے کوئی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ غیر شرعی رسموں کو شریعت کا درجہ دے کر خواہ مخواہ ایک دوسرے کو مطعون نہ بنانا چاہیے نہ شوہر کے وارثوں اور اولیا کو یہ طعنہ دینا چاہیے کہ عورت اپنے شوہر کا پورا سوگ بھی نہ منا سکی کہ وہ اس سے تنگ آ گئے اور نہ عورت کو یہ طعنہ دینا چاہیے کہ ابھی شوہر کا کفن بھی میلا نہ ہونے پایا تھا کہ یہ شادی رچانے بیٹھ گئی۔ اللہ نے جو حدود مقرر کر دیے ہیں بس ان کی پابندی کر لی چاہیے۔[3]

آیت زیرِ بحث میں بالمعروف کا مطلب یہ ہے کہ وہ نکاح شرعی طریق سے کریں نکاح صحیح کریں، مہر مناسب ہو، رشتہ کفو میں ہو، تو کسی کو ان کے اختیار تمیزی اور صوابدید پر قدغن لگانے کی اجازت نہیں ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قانون نے ایک بالغہ عورت کو جو حق دیا ہے اگر وہ اسے شرعی طریقہ کے مطابق استعمال کریں تو

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الہند [3] تدبر قرآن

کسی کو روکنے اور دخل دینے کی اجازت نہیں ہے۔ ہاں اگر وہ اس حق کو ضابطۂ شریعت کے خلاف استعمال کرے۔ مثلاً جس سے نکاح حرام ہے وہ اس سے نکاح کرنے لگے یا بغیر گواہوں کے نکاح کرے تو بے شک عدالت کو عورت کے سرپرستوں کو بلکہ ہر مسلمان کو حسب استطاعت روکنے کا حق ہے۔ گویا اس طرح اسلام نے بیوہ عورت کو دوسری شادی کی اجازت دے کر اس کے سر سے دیوروں اور شوہر کے دوسرے عزیزوں کو ہر قسم کی جابرانہ حکومت کا قلع قمع کر دیا اور اس کو نہ صرف اخلاق بلکہ اسلام کے قانون کا حصہ بنا دیا۔ اور جس سوسائٹی سے اُسے اوروں سنے نکال دیا ہے اس میں دوبارہ اس کو عزت کے ساتھ داخلہ کا پروانہ دیا اور جس مہر و عنایت سے وہ محروم ہو چکی ہے وہ اس کو پھر عطا کیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے بیواؤں کی امداد فرمائی اور گیارہ شادیوں میں سے ۹ شادیاں بیوہ عورتوں سے کی ہیں۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ، حضرت حفصہ، حضرت زینب، حضرت اُم سلمہ، حضرت اُم حبیبہ، حضرت جویریہ، حضرت میمونہ، حضرت صفیہ بیوہ تھیں جن کی کفالت کا بار آپ نے اپنے دوش مبارک پر اٹھایا۔ اور ساتھ ہی ارشاد فرمایا:

بیوہ اور مسکین کے لیے دوڑ دھوپ کرنے والا ایسا ہے جیسا کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والا اور ایسا ہے جیسا دن بھر روزہ رکھنے والا اور شب بھر اللہ کی جناب میں قیام کرنے والا۔ (صحیح بخاری کتاب الآداب)

۶۸۸ - اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ کو اس کی پوری خبر ہے۔ یعنی اللہ تمہارے عمل کی باریکیوں سے آشنا ہے۔ اس پر کچھ بھی پوشیدہ نہیں۔ اس لیے سوچ سمجھ کر قدم اٹھاؤ۔ تمہاری قدموں کی لغزش تمہاری معاشرت کو خراب کرے گی۔ تم خواہ عصرِ جدید میں ارتقاء کی کتنی منزلیں طے کر جاؤ اور علوم و فنون میں خواہ کیسے ہی درجہ کمال کمال کو پہنچ جاؤ تمہیں اپنی عملی زندگی میں سے معاشرتی اصلاح کے ان اجتماعی قوانین سے بے پروا نہ ہونا چاہیے جو سینۂ قرآن سے اُبل کر تمہارے سامنے آئے ہیں۔ رُسوم و عادات کی اصلاح صرف قرآن سے بستگی میں ہے۔ اسی سے تمہارے اعمال میں اصلاح آئے گی اور اس کے نتیجے میں تم دُنیا میں خوشحال اور آخرت میں شادماں ہو گے۔

وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا عَرَّضْتُمْ بِهٖ مِنْ خِطْبَةِ النِّسَآءِ اَوْ اَكْنَنْتُمْ
فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ ؕ عَلِمَ اللّٰهُ اَنَّكُمْ سَتَذْكُرُوْنَهُنَّ وَلٰكِنْ لَّا تُوَاعِدُوْ
هُنَّ سِرًّا اِلَّآ اَنْ تَقُوْلُوْا قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ؕ۬ وَلَا تَعْزِمُوْا عُقْدَةَ
النِّكَاحِ حَتّٰى يَبْلُغَ الْكِتٰبُ اَجَلَهٗ ؕ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِيْٓ
اَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوْهُ ۚ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ ﴿٢٣٥﴾ رک

جن بیوہ عورتوں سے تم نکاح کرنا چاہو اشارے اور کنائے میں اپنا خیال ان تک پہنچا دو یا اپنے جی میں نکاح کا ارادہ پوشیدہ رکھو۔ دونوں صورتوں میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تمہارے دل میں ضرور آئے گا۔ لیکن خفیہ طور پر ان سے نکاح کا وعدہ نہ لو۔ ہاں اگر کوئی بات کہنی ہے تو دستور کے طریقے سے کہو اور عقدِ نکاح باندھنے کا اس وقت تک ارادہ نہ کرو جب تک عدت پوری نہ ہو جائے اور یقین کرو کہ جو کچھ تمہارے اندر ہے اللہ اُسے خوب جانتا ہے۔ اس سے ڈرو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا اور بُردبار ہے۔

زمانہ عدت میں نکاح حرام ہے

اسلامی معاشرے میں ایک دوسرے کے جذبات کے احترام کی بڑی اہمیت ہے۔ مسلمانوں کا معاشرہ سماجی معاشرہ ہے جانوروں کا گلہ نہیں ہے۔ یہ جذبات ہی کا احترام ہے کہ اگر کوئی انتقال کر جائے تو کسی کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اس کی بیوہ سے اس کے زمانہ عدت ہی میں نکاح کی پینگیں بڑھانا شروع کردے۔ اپنے ایک مرحوم بھائی کے لیے ایک حساس اور دردمند بھائی کے اندر جو جذبات ہونے چاہییں یہ بات اس کے منافی ہے۔ ایک غم زدہ بیوہ کے جذبات کا ایک شریف آدمی کو جو لحاظ ہونا چاہیے۔ یہ اس کے خلاف ہے اس لیے یہ موقعہ سنِ ازدواجی زندگی کے بارے میں گفتگو کے لیے مناسب نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس گفتگو سے بیوہ کے دل کو ٹھیس پہنچے اور اس کے زخموں کو ہرا کردے۔ اللہ اکبر نازک مواقع پر جذبات کا یہ احترام قرآنی تعلیمات ہی کا حصہ ہے۔ بیوہ عورت شوہر کے سائے سے محروم ہو کر بے یار و مددگار اور بے مونس و غم خوار ہے۔ نہ اس کے کھانے پینے کا سہارا ہے اللہ نے جسے عملی مشکلات سے پرے رکھا تھا اور اس کی ذمہ داری اس کے شوہر کے حوالے کر دی تھی۔ اب لاچار و بے بس ہے۔ اب غم و الم اور فکر و تردد کے علاوہ بڑی مشکل یہ درپیش ہے کہ ایک بے حامی و بے محافظ عورت کو دیکھ کر بجائے اس کے غم کو غلط کرنے کے حملہ آور گدھ کی طرح اس کے پس و پیش منڈلانے لگیں اور اس رفیقِ حیات کی جدائی کے فوراً بعد جس کے ساتھ اس کی زندگی کا سکون وابستہ تھا شادی کی بات کرنے بیٹھ جائیں یہ بہت بڑی بے حسی ہے۔

٦٨٩۔ جن بیوہ عورتوں سے تم نکاح کرنا چاہو اشارے اور کنائے میں اپنا خیال ان تک پہنچاؤ یا اپنے جی میں نکاح کا ارادہ پوشیدہ رکھو۔ اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یعنی عورت شوہر کے نکاح سے جدا ہوئی تو جب تک عدت میں ہے کسی دوسرے کو جائز نہیں ہے کہ اس سے نکاح کرے یا صاف وعدہ لے لے یا صاف پیغام بھیجے۔ لیکن اگر دل میں ارادہ رکھے کہ عدت کے بعد نکاح کروں گا یا اشارۃً اپنا مطلب اسے سنا دے تاکہ کوئی دوسرا اس سے پہلے پیغام نہ دے۔ مثلاً عورت کو سنا دے کہ تجھ کو ہر کوئی عزیز رکھے گا یا کہے میرا ارادہ کہیں شادی کرنے کا ہے تو کچھ گناہ نہیں لیکن صاف پیغام ہرگز نہ دے [1]

[1] افادات شیخ الہند

اصل ارشاد ہیں فیما عرضتم بہ من خطبۃ النساء۔ عرضتم تعریض سے بنا ہے اور کسی شخص کو ایسے الفاظ میں اپنا مطلب سمجھانا جن الفاظ کے معنے مختلف ہوں۔

ایسے ذو معنے اور ذو مطالب الفاظ کے ساتھ اپنے مطلب کو سمجھانے اور بیان کرنے کو تعریض کہتے ہیں۔ تعریض تصریح کے مقابلے میں آتا ہے۔ تصریح کے معنے ہیں صاف الفاظ میں اپنا مطلب بیان کرنا۔ علمائے بلاغت نے تعریض اور کنایہ میں فرق کیا ہے زمخشری اور تفتازانی نے اس پر بحث کی ہے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ کبھی دونوں جمع ہو جاتے ہیں اور کبھی نہیں ہوتے۔ مثلاً آپ کو کسی سے کچھ روپے لینے ہیں اور آپ اس کے پاس جائیں اور جا کر کہیں کہ سلام کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ یہ تعریض بھی ہے اور کنایہ بھی ہے اور اگر آپ کسی سخاوت جتانے کے لیے چولہوں میں راکھ کی بہتات بتائیں تو یہ کنایہ ہے تعریض نہیں ہے اور اگر آپ ایسے شخص کو مخاطب کرکے جس نے آپ کو تکلیف پہنچائی ہو یہ کہیں کہ آپ نے مجھے تکلیف دی ہے آپ کو پتہ لگ جائے گا یہ تعریض ہے کنایہ نہیں ہے۔

تعریض کی مثالیں

سکینہ دختر حنظلہ کہتی ہیں کہ میں عدت میں تھی کہ میرے پاس محمد بن علی تشریف لائے اور یوں گویا ہوئے کہ آپ کو میرا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے رشتہ اور میری حضرت علی سے جو قرابت ہے وہ بھی آپ جانتی ہیں۔ اور عرب میں میرا مقام بھی آپ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ سکینہ نے سُن کر کہا اللہ آپ کو معاف کرے آپ زمانہ عدت میں رشتہ کی بات کر رہے ہیں۔ وہ بولے جی میں تو حضور انور اور علی سے اپنی قرابت آپ کو بتا رہا ہوں۔

حضرت اُم سلمہ بیوہ ہو چکی تھیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ان سے رشتہ کرنا چاہتے تھے فرمایا:

تم جانتی ہو کہ فرستادہ خدا ہوں، اللہ کی مخلوق میں سب سے برتر ہوں اور میرے خاندان میں میرا مقام بھی تم سے پوشیدہ نہیں ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اس سلسلہ میں بطور اشارا یوں کہہ سکتا ہے کہ میرا بھی شادی کا ارادہ ہے یا میری آرزو ہے کہ مجھے کوئی نیک بیوی مل جائے۔

خطبہ یعنی رشتہ

خطبہ خاء کے زیر کے ساتھ کسی عمل سے یا کسی قول سے نکاح کی درخواست اور نکاح کے پیغام کو کہتے ہیں اور خطبہ خاء کے پیش کے ساتھ اس کلام کو کہتے ہیں جو پند و نصائح پر مشتمل ہو اور جس میں عام لوگوں کو خطاب کیا جاتے۔ اُردو میں خِطبہ خاء کے زیر کے ساتھ منگنی اور رشتہ کے معنے میں ہے۔ مسند احمد، سنن نسائی اور صحیح بخاری میں ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا نہ منگنی کرے کوئی شخص دوسرے کی منگیتر سے یہاں تک کہ رشتہ کرنے والا رشتہ چھوڑ دے۔ یا اسے اجازت دے دے۔

مطلب آیت کا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بیوہ سے نکاح کا خواہاں ہو تو وہ یہ ذکر سکتا ہے کہ کوئی کلمہ بطور اشارہ زبان سے کہہ دے یا اپنے دل میں نکاح کا ارادہ کرے لیکن یہ جائز نہیں ہے کہ پوشیدہ طور پر نکاح کا قول و قرار کرے۔ بس اس موقعہ پر تعزیت و ہمدردی تک بات محدود رہنی چاہیے۔ جو اس طرح کے حالات کے لیے معروف ہے۔

۶۹۰۔ اللہ جانتا ہے کہ ان کا خیال تمہارے دل میں ضرور آئے گی لیکن خفیہ طور پر ان سے نکاح کا وعدہ نہ ہو۔ ہاں اگر کوئی بات کہنی ہے۔ تو دستور کے مطابق کہو۔ دل میں ان کے خیال آنے کو ذکر کہا ہے۔ لیکن جو کچھ منع ہے وہ عدت میں عورت کو رشتہ دینا ہے۔ اگر تم وہاں جاکر رشتہ کا پیغام نہ دو بلکہ اپنی جگہ اس کا ذکر کرو۔ مثلاً اپنے گھر میں اپنے والدہ، والد، بھائی اور بہن سے ذکر کرو کہ عورت نیک ہے اگر وہاں رشتہ ہو جائے تو کیا خیال ہے اس طرح ذکر کرنے کی اجازت ہے اس لیے کہ یہ ایک فطری میلان ہے جو دراصل مباح اور جائز ہے صرف حالات کی بنا پر اس کے عملی اقدام میں تاخیر کی ہدایت کی گئی ہے کیونکہ اسلام فطری میلانات کو کچلتا نہیں ہے بلکہ انہیں مہذب اور شائستہ بناتا ہے۔ اسی طرح بشری انگیخت کو دبانے کے بجائے ایسے اظہار کے مناسب مواقع فراہم کرتا ہے۔ اور اسی لیے اسلام ان باتوں سے روکتا ہے جو شعور کی پاکیزگی اور ضمیر کی طہارت کے خلاف ہوں۔ بہرحال اس قسم کے تذکرے اور ذکر و اذکار میں کوئی مضائقہ نہیں۔ لیکن پوشیدہ طور پر ان سے قول و قرار نہ لو۔ یعنی ارادہ کرنے،

اشارہ کرنے اور گھر میں ذکر واذکار میں تو کوئی حرج نہیں لیکن یہ بات مناسب نہیں ہے کہ عدت پوری ہونے سے پہلے پوشیدہ طور پران سے کوئی وعدہ لے لیا جائے کیونکہ یہ بات ادب کے خلاف ہے۔ اس میں اس کے مرحوم شوہر کی یادوں میں خیانت ہے۔ اور اس میں اللہ سبحانہٗ سے حیا کی کمی ہے اس لیے کہ اللہ نے عدت کو ازدواجی زندگی کے دو معاہدوں کے درمیان بطور فصل مقرر کیا ہے۔ الا ان تقولوا قولا معروفا یعنی اس میں کوئی برائی نہیں کہ دستور کے مطابق کوئی بات کہہ دو۔ قول معروف سے وہی تعریض مراد ہے یعنی اشارے اور کنائے میں کچھ کہنے کی اجازت ہے۔ رہا عزم نکاح اور وہ بھی عدت میں حرام ہے۔ لا تعزموا عقدۃ النکاح، عزم کے معنی ہیں ارادے کا آخری درجہ جس کے بعد کام صادر ہو جاتا ہے۔ انسانی ارادے کے مختلف درجات میں سانح، خاطر، تفکر، ارادہ، ہمت اور عزم۔ عزم آخری درجہ کا نام ہے جو کام سے خاص جوڑ رکھتا ہے یعنی عزم کام کے بالکل متصل اور قریب ہوتا ہے۔ زیادتی احتیاط کی بنا پر یہ تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ نکاح نہ کرو بلکہ فرمایا ہے کہ نکاح کا عزم بھی نہ کرو اور یہ تعبیر لطافت اور دقیق ہونے کے لحاظ سے تلک حدود اللہ فلا تقربوھا کے قریب ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عدت موت کی ہو یا طلاق بائن کی اس کے دوران کسی مرد کو یہ جائز نہیں ہے کہ صاف الفاظ میں عورت سے نکاح کی بات کرے یا اس سے کوئی وعدہ حاصل کرے یعنی تصریحاً پیغام دینا حرام ہے اور اشارۃً کہنا جائز ہے اور دل سے یہ ارادہ کرنا کہ عدت ہی میں اس سے نکاح کر لوں گا یہ حرام ہے اور دل میں یہ ارادہ کرنا کہ عدت گزرنے کے بعد اس سے نکاح کر دوں گا جائز ہے۔ اور جو عورت رجعی طلاق کی عدت گزار رہی ہو تصریحاً اور تعریضاً دونوں طرح حرام ہے۔

۶۹۱۔ اور یقین کرو کہ جو کچھ تمہارے اندر ہے اللہ خوب جانتا ہے۔ اس سے ڈرتے رہو اور جان لو کہ اللہ بخشنے والا اور بردبار ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جی کی باتیں جانتا ہے لہٰذا ناجائز ارادے سے بچتے رہو، اور اگر ناجائز ارادہ ہو گیا تو اس سے توبہ کرو، اللہ بخشنے والا ہے۔ اور گنہ گار کی اگر پکڑ نہ ہو تو اس سے مطمئن نہ ہو جائے کیونکہ وہ حلیم ہے سزا میں جلدی نہیں کرتا[1]۔ یہاں قانون بیان کرنے کے بعد خشیت الٰہی کی طرف متوجہ کیا ہے۔

[1] افادات شیخ الہند

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمَسُّوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا
لَهُنَّ فَرِيضَةً ۚ وَمَتِّعُوهُنَّ عَلَى الْمُوسِعِ قَدَرُهُ وَ
عَلَى الْمُقْتِرِ قَدَرُهُ ۚ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ ۖ حَقًّا عَلَى
الْمُحْسِنِينَ ۝ وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمَسُّوهُنَّ
وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ
يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوَ الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ النِّكَاحِ ۚ وَأَنْ
تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۚ وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ
اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۝

اور اگر تم عورتوں کو اس[۶۹۲] صورت میں طلاق دو کہ نہ اُن کو ہاتھ لگایا ہو اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا ہو تو تم پر کوئی گناہ نہیں۔ البتہ ایسی صورت میں ان کو فائدہ پہنچاؤ مقدور والا اپنی حیثیت کے مطابق دے، تنگ دست اپنی حالت کے موافق، یہ فائدہ دستور کے مطابق ہونا چاہیے۔ نیک کردار لوگوں کے لیے ایسا کرنا ضروری ہے۔ اور اگر ایسا[۶۹۳] ہو کہ تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے ان کو طلاق دے دی اور تم مہر مقرر کر چکے تھے تو اس صورت میں مقررہ مہر کا آدھا دینا چاہیے۔ ہاں اگر عورتیں اپنی خوشی سے معاف کر دیں یا وہ

مرد درگزر کر جائے جس کے ہاتھ میں رشتہ نکاح ہے اور مہر کی پوری رقم دے دے۔ اور یاد رکھو کہ درگزر کرجانا ہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے اور دیکھو باہم ایک دوسرے کے ساتھ احسان کرنا اور بھلائی کرنا نہ بھولو۔ اور خوب سمجھ لو کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو وہ اللہ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے۔

کیونکہ دلوں کے خیالات اور ذہنی کیفیات کی مرد و زن کے تعلقات میں بڑی اہمیت ہے اور اللہ کا ڈر اور اس بات کا اندیشہ کہ اللہ دلوں کی باتوں سے واقف ہے۔ یہ قانون کے نفاذ کی حتمی اور یقینی ضمانت ہے۔ آگے انسانی ضمیر کے اطمینان کے لیے فرمایا کہ خوب جان لو کہ اللہ بخشنے والا اور بُردبار ہے۔

طلاق قبل الدخول

اسلام سے پہلے جو اخلاقی مذاہب قائم تھے ان سب میں عورت کو اور عورت و مرد کے ازدواجی تعلق کو بہت حد تک ارتقاء روحانی کے لیے بہت بڑی رکاوٹ سمجھا گیا تھا۔ اسلام نے آکر اس نظریہ کو باطل کیا اور بتایا کہ اخلاق اور رُوح کی تکمیل جس قدر تجرد میں ہو سکتی ہے اس سے بدرجہا زیادہ تعلق ازدواج میں ممکن ہے کہ اخلاق نام حسن معاملہ اور حُسنِ سلوک کا ہے۔ جو کسی کا شوہر نہ ہو، جو کسی کی بیوی نہ ہو اُسے کیا معلوم کہ اس پر دُنیا کے کیا فرائض ہو سکتے ہیں اور اخلاق کی تکمیل کے لیے اس کو کون سے فطری مواقع مل سکتے ہیں۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ میاں بیوی میں ازدواجی تعلقات اگر نکاح کے باوجود قائم نہ ہوں اور مہر بھی مقرر نہ ہو۔ یا مہر تو مقرر ہو لیکن ازدواجی تعلقات کی نوبت نہ آئی ہو تو اس قسم کے مواقع پر کس قسم کا اخلاقی نمونہ پیش کرنا چاہیے۔ یہاں قرآن نے لفظ فضل استعمال کرکے تمام اخلاقی بزرگیوں کو کوزے میں بند کر دیا۔ فرمایا کہ اگر کوئی منکوحہ سے

خلوت کیے بغیر اس کو طلاق دے دے تو شوہر پہ آدھا مہر واجب ہو جاتا ہے یہ تو قانون ہوا مگر اخلاقی حکم یہ ہے کہ یا تو عورت اس نصف کو بھی معاف کر دے اور کچھ نہ لے تو یہ عورت کا حسنِ اخلاق ہے اور یا شوہر ادا کر دے اور آدھا نہ کاٹے تو یہ مرد کا حسن اخلاق ہے۔ اس کے بعد فرمایا۔ اور آپس میں فضل کو نہ بھولو۔ اس طرح انسانی برادری میں قرآن نے ایک طرف عورت کو مرد کے ہمدوش بنا دیا اور دوسری طرف اخلاق کی بزرگیوں کا نام لے کر جتا دیا کہ روحانی ارتقاء میں اصل و اساس اخلاق کا حُسن ہے۔ غور فرمایئے جس سے یہاں معاف کرنے کو کہا جا رہا ہے۔ کیا یہ وہ ہی جنس نہیں جس کی ہستی اسلام سے پہلے شرم و عار کا باعث تھی۔ جس کی پیدائش کی خبر سُن کر باپ کے چہرے کا رنگ سیاہ پڑ جاتا تھا یا یہ حال ہے کہ اس سے کہا جا رہا ہے کہ عورت نرمی برتتے، معاف کر دے۔ یہ کس قدر بلیغ اور موثر انداز ہے۔ اس کا اثر یہ تھا کہ بیویوں کے لیے آنکھوں کی ٹھنڈک ہونے کی دُعائیں کرتے تھے۔ ربنا ھب لنا من ازواجنا وذریاتنا قرۃ اعین۔

۶۹۲۔ اگر تم عورتوں کو اس صورت میں طلاق دو کہ نہ ان کو ہاتھ لگایا اور نہ ان کے لیے مہر مقرر کیا تو تم پر کوئی گناہ نہیں البتہ ایسی صورت میں ان کو فائدہ پہنچاؤ۔ مقدور والا اپنی حیثیت اور تنگ دست اپنی حیثیت کے مطابق دے۔ یعنی اگر نکاح کے وقت مہر کا ذکر نہ آیا۔ اور بلا مہر ہی نکاح کر لیا پھر بھی نکاح دُرست ہے مہر بعد میں مقرر ہو جائے گا۔ لیکن اس صورت میں اگر ہاتھ لگانے سے پہلے یعنی مجامعت اور خلوت صحیح سے پہلے ہی طلاق دے دی تو مہر کچھ لازم نہ ہو گا لیکن زوج کو لازم ہے کہ اپنے پاس سے عورت کو کچھ دے دے کم سے کم یہی کہ تین کپڑے کُرتہ، سربند، چادر اپنی حالت کے موافق خوشی سے دے دے[1]

مطلب یہ ہے کہ اگر یہ صورت پیش آجاتے کہ نکاح میں نہ مہر طے ہوا ہو اور نہ خلوت ہوئی ہو تو ایسی صورت میں شوہر کے ذمہ مہر واجب نہیں ہے بلکہ مہر کی جگہ اسے چاہیے کہ وہ دستور کے مطابق اسے کچھ دے دلا کر رُخصت کرے دستور کے موافق سے مراد یہ ہے کہ اس کے لیے کوئی مقدار معین نہیں بلکہ اس کا انحصار آدمی کے معیار زندگی پر ہے۔ ایک

---

[1] افادات شیخ الہند

غریب اپنی وسعت کے مطابق دے امیر اپنی وسعت کے مطابق۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس عورت کا کوئی مہر مقرر نہ تھا اور طلاق بھی خلوت صحیحہ سے پہلے ہوگئی تو ایسی عورت کا مہر نہ دینے کا تم پر کوئی مضائقہ نہیں۔ ہاں اس کو دستور کے مطابق کچھ سامان دینا چاہیے۔

مطلقہ کے لیے متعہ کی مقدار

یہ سامان کیا اور کتنا ہونا چاہیے؟

اس کا جواب اگرچہ لوگوں نے مختلف دیا ہے لیکن قرآن نے جو کچھ بتایا ہے کہ یہ امارت اور غربت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہے بلکہ فراخ دست پر اس کی حیثیت کے مطابق اور تنگدست پر اس کی حیثیت کے مطابق ہونا چاہیے۔ اگر مقدار کی تعیین مرد کی مالی حیثیت دیکھ کر مقرر کی جائے تو ابو بکر الجصاص کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ جیسے یہ مالی حالت کے پیش نظر مختلف ہوگا ایسے ہی مختلف ذالک فی الازمان زمانے کے لحاظ سے بھی مختلف ہوگا۔ کیونکہ اللہ سبحانہ نے مقدار کے بارے میں دو بنیادی شرطیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ شوہر کی حالت کو دیکھا جائے کہ مالی حالت کیسی ہے دوسرے یہ دیکھا جائے کہ وقت کا دستور اور قاعدہ کیا ہے۔ پہلی شرط اگر علی الموسع قدرہ وعلی المقتر قدرہ سے معلوم ہوئی ہے تو دوسری شرط متاعاً بالمعروف سے معلوم ہوتی ہے۔ معروف کا دار و مدار ہر زمانہ کی رسوم و عادات سے تعلق رکھتا ہے۔ اور عادات و رسوم ہمیشہ بدلتی رہتی ہیں۔ لہٰذا متعہ کی مقدار کی تعیین میں ان دونوں کو پیش نظر رکھنا ہوگا اور اس کی شرعاً کوئی تحدید نہیں جن بزرگوں سے ایک جوڑے، کچھ خرچے یا ایک خادم یا کرتہ، کساوا، سربند یا پانچ سو درہم یا خادم، خرچہ اور کپڑے یا دس ہزار۔ حافظ ابن کثیر نے سارے اقوال نقل کیے ہیں۔ یہ ان بزرگوں نے اپنے اپنے احوال و ظروف اپنے قومی اور ملکی رسوم و عادات کے مطابق پیش فرمایا ہے۔ بلکہ الجصاص نے امام ابوالحسن کرخی سے، ان دو شرطوں کے ساتھ عورت کی حالت کا بھی اعتبار کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ متعہ کی مقدار متعین کرنے کے لیے یہ دیکھنا ہوگا کہ

۱۔ مرد کا معیار زندگی کیا ہے

۲۔ عورت کا معیار زندگی کیا ہے

۳۔ ملکی اور قومی دستور کیا ہے

ان تین باتوں کو پیشِ نظر رکھ کر متعہ کی مقدار کی جائے گی ۔

متعہ کس عورت کو دینا واجب ہے

متعہ کسے دیا جاتا ہے ۔ اس موضوع پر فقہائے صحابہ ، فقہاء سبعہ اور آئمہ اجتہاد کے درمیان اختلاف ہے صحابہ میں حضرت علی ہر مطلقہ کے لیے متعہ کو ضروری بتلاتے ہیں اور یہی امام زہری کی رائے ہے اور عبداللہ بن عمر جس عورت کو طلاق ایسی حالت میں ملی ہو کہ اس کا مہر مقرر نہ ہوا اور مرد نے خلوت نہ کی ہو متعہ واجب کہتے ہیں ۔ فقہاء سبعہ میں قاسم بن محمد کی بھی یہی رائے ہے اور یہی امام ابوحنیفہ ، امام ابویوسف ، امام محمد اور امام زفر کی رائے ہے کہ متعہ صرف اس عورت کو دینا واجب ہے جس کا مہر مقرر نہ ہو اور خلوت سے پہلے شوہر نے اسے طلاق دے دی ہو ۔ یہی قرآن کی اس آیت کا منطوق ہے ۔ قرآن میں ایک دوسرے موقع پر ہے ۔

یاایھا الذین اذا نکحتم ثم طلقتموھن من قبل ان تمسوھن فمالکم من عدۃ تعتدونھا فمتعوھن و سرحوھن سراحا جمیلا

اے اہلِ ایمان جب تم مسلمان عورتوں سے نکاح کر لو اور پھر ان کو خلوت سے پہلے طلاق دے دو ان پر کوئی عدت نہیں ہے ۔ ان کو کچھ سامان دے کر اچھے طریقے پر رخصت کر دو ۔ (سورۂ احزاب)

یہ دونوں آیتیں بتا رہی ہیں کہ متعہ دینا واجب ہے کیونکہ

اولاً ، متعوھن میں امر آیا ہے اور امر اصل میں وجوب ہی ثابت ہوتا ہے

ثانیاً ، متاعاً بالمعروف حقاً علی المحسنین میں لفظ حقاً تاکیدی الفاظ میں سب سے زیادہ زوردار تعبیری پیمانہ ہے ۔

ثالثاً ، اس کے وجوب کو پر زور کرنے کے لیے اسے شرطِ احسان قرار دیا ہے ۔ اور یہ ہر شخص کا پیش نہاد ہونا چاہیے کہ محسن بن کر رہے ۔

امام مالک اور ان کے اصحاب اس مطلقہ کے لیے متعہ کو واجب نہیں بلکہ مستحب کہتے ہیں ۔ اس کے باوجود اس پر علماء یک زبان ہیں کہ اس قسم کی مطلقہ عورت متعہ کے سوا کسی چیز کی حقدار نہیں ہے ۔

مہرِ مثلی کی تعریف

اس آیت سے یہ مسئلہ بھی ضمناً معلوم ہو گیا کہ اگر بوقت نکاح مہر کا ذکر نہ آیا ہو پھر بھی نکاح ہو جاتا ہے۔ جس عورت کا مہر نکاح کے وقت مقرر نہ کیا جائے اس کو مہر مثلی دینا پڑتا ہے۔ مہر مثلی کا مطلب یہ ہے کہ جو عورت کی قوم کا وقت کا دستور ہو یعنی جو اس عورت کی بہنوں، پھوپھیوں ددھیال کی لڑکیوں میں سے اس جیسی لڑکیوں کا جو مہر مقرر ہو وہ مہر مثل کہلاتا ہے۔ اگر کسی عورت کا نکاح اور مہر مقرر نہ ہوا اور شوہر کا انتقال ہو گیا تو عورت کو مہر مثلی دلایا جائے گا۔

آئمہ خمسہ نے حضرت علقمہ کے حوالہ سے عبداللہ بن مسعود کا یہ عدالتی فیصلہ نقل کیا ہے کہ

عبداللہ بن مسعود کی عدالت میں مقدمہ آیا کہ ایک عورت کی ایک شخص سے شادی ہوئی مہر کوئی مقرر نہ تھا۔ شوہر کا انتقال ہو گیا تو حضرت عبداللہ نے فیصلہ کیا کہ اس کو شوہر کی جائداد سے میراث بھی ملے۔ یہ وفات کی عدت بھی گزارے گی اور اس کو مہر مثلی دیا جائے گا۔ معقل بن سنان صحابی نے جب عبداللہ کا فیصلہ سنا تو فرمایا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بروع دختر واشق کے معاملہ میں بھی ایسا ہی فیصلہ فرمایا تھا

(نیل الاوطار ص ۱۹۴)

متعہ کیوں دیا جاتا ہے

اگرچہ نکاح کے بعد شوہر کا ازدواجی رشتہ اس سے قائم نہیں ہوا اور مہر اس کا مقرر نہیں ہے مہر کی جگہ اب مرد کی مروت اور بلند اخلاقی کا تقاضا یہ ہے کہ اسے مہر نہ سہی کچھ ضرور دے دلا کر روانہ کرے۔ یہ عطیہ مہر کا ایک بدل ہونے کے علاوہ اس کا ایک نفسیاتی فائدہ بھی ہے اور وہ یہ کہ اس کا تعلق بالکل آغاز ہی میں ٹوٹ جانا عورت کے لیے ایک انتہائی تکلیف دہ امر ہے مگر اس عطیہ سے یہ فضا دور ہو کر نرمی اور معذرت کا ماحول پیدا ہو جائے گا اور عورت کے دل میں طلاق کا افسوس اور صدمہ کسی قدر کم ہو جائے گا۔ اسی لیے یہ فرمایا گیا ہے کہ یہ متعہ دستور کے مطابق ہو تاکہ معاشرہ میں انسانی مروت کا تقاضا پورا ہو جائے اور خوشگوار یادیں باقی رہیں مگر ساتھ ہی شوہر کو بھی اس کی استطاعت سے زیادہ کا حکم نہیں دیا۔

طلاق دراصل عورت کی زندگی پر ایک داغ ہے۔ معاشرے میں طلاق وہ مقام بلند

نہیں رکھتی ہے جو دوسری عورتوں کا ہوتا ہے۔ معاشرے کی نگاہوں میں عورت کی پوزیشن بلند کرنے کے لیے قرآن نے شوہر پر متعہ کو واجب کر دیا۔ شوہر کی جانب یہ عطیہ؟ اور یہ سامان گویا اپنی منکوحہ کی نزاہت کی شہادت اور اس بات کا اعتراف ہے کہ طلاق مرد اپنے کسی عذر کی وجہ سے دے رہا ہے عورت میں کسی کمزوری کی بنا پر نہیں دے رہا۔ یہ سامان دے کر وہ معاشرے میں عورت کی آبرو اور اس کی عزت کو قائم کرتا ہے اور گویا اس طرح اپنے اس کردار پر اس اقدام سے افسوس کا اظہار کرتا ہے۔ تاریخ میں ہے کہ امام حسن نے اپنی ایک مطلقہ بیوی کو دس ہزار درہم متعہ دے کر فرمایا تھا کہ جدا ہونے والی دوست کی یہ کوئی قیمت نہیں ہے۔ اللہ اکبر اسلام نے عورت کو کیسی پستی سے اٹھا کر کس بلندی پر کھڑا کیا ہے۔

طلاق کی ایک اور صورت

۶۹۳۔ اگر ایسا ہو کہ تم نے ہاتھ لگانے سے پہلے ان کو طلاق دے دی اور تم مہر مقرر کر چکے تھے تو اس صورت میں مقررہ مہر کا آدھا دینا چاہیے۔ یعنی اگر نکاح کے وقت مہر مقرر ہو چکا تھا اور ہاتھ لگانے سے پہلے طلاق دے دی تو آدھا مہر دینا لازم ہوگا[1]۔ طلاق کی ایک صورت وہ تھی جو بیان ہو چکی یعنی نہ مہر طے ہوا تھا اور نہ خلوت ہوئی تھی کہ طلاق ہو گئی۔ دوسری صورت اب بیان ہو رہی ہے کہ مہر تو بوقتِ نکاح مقرر ہو چکا تھا لیکن خلوت نہیں ہوئی تھی کہ طلاق ہو گئی۔ عام قاعدہ ایسے موقع کے لیے یہ ہے کہ مہر کا نصف حصہ شوہر کے ذمہ واجب الادا ہوگا[1]۔

دو مستثنیٰ صورتیں

مگر عورت یا مرد جس کے اختیار میں ہے نکاح قائم رکھنا اور توڑنا اپنے حق سے درگزر کریں تو بہتر ہے۔ عورت کی درگزر یہ کہ آدھا ہی معاف کر دے اور مرد کی درگزر یہ کہ جو مہر مقرر ہوا تھا پورا حوالے کر دے یا تمام مہر ادا کر چکا تھا تو آدھا واپس نہ لے بلکہ سارا مہر اس کے پاس رہے۔ پھر فرمایا کہ مرد درگزر کرے تو تقویٰ کے زیادہ مناسب ہے کیونکہ اللہ نے اسے بڑائی دی اور

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] ماجدی

مختار کیا ہے نکاح باقی رکھنے اور طلاق دینے کا۔ اور نفس نکاح سے تمام مہر لازم ہو جاتا ہے اب بدون لگائے طلاق دے کر شوہر نصف مہر کو اپنے سے ہٹاتا ہے یہ تقویٰ کے مناسب نہیں ہے اور بیوی کی جانب سے کسی قسم کی کوتاہی نہیں ہوتی۔ جو کچھ کیا شوہر نے کیا ان وجوہ سے شوہر ہی کو درگزر کرنا زیادہ مناسب ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ دو صورتیں اس حکم عام سے مستثنیٰ ہیں۔ ایک یہ کہ بیوی اپنے حق سے تمام تر دستبردار ہو جائے اور نصف مہر بھی نہ لے اور دوسری صورت یہ کہ شوہر اپنے حق سے دستبردار ہو جائے یعنی جو نصف مہر اسے رکھ لینے کا اختیار ہے اسے بھی وہ نہ رکھے اور بجائے نصف کے پورا مہر ادا کر دے۔

طلاق والی عورتوں کی چار قسمیں

دراصل جیسے طلاق کی مختلف صورتیں ہیں ایسے ہی طلاق والی عورتوں کی بھی باعتبار خلوت اور ہم بستری مختلف صورتیں ہیں۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں:

طلاق کی مہر و خلوت کے اعتبار سے چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔

اولاً یہ کہ نکاح ہو مگر مہر نہ ہو اور خلوت نہ ہو اور طلاق ہو گئی ہو۔

ثانیاً یہ کہ نکاح ہو مہر بھی ہو مگر خلوت نہ ہو اور طلاق ہو گئی ہو۔

ان دونوں صورتوں کا حکم قرآن کی دونوں آیتوں میں معلوم ہو چکا۔

ثالثاً یہ کہ مہر مقرر ہو اور خلوت بھی ہوئی ہو پھر طلاق ہو گئی۔ اس صورت میں مہر پورا دینا پڑے گا۔

رابعاً یہ کہ مہر بوقت نکاح مقرر نہیں ہوا تھا اور خلوت کے بعد طلاق دے دی اس میں مہر مثلی دینا پڑے گا۔

یہی چاروں صورتیں شوہر کی وفات ہونے کی صورت میں یہی ہیں لیکن موت اور طلاق میں تھوڑا سا فرق ہے۔ مثلاً اگر مہر مقرر نہ تھا اور خلوت سے پہلے یا بعد میں شوہر کی وفات ہو گئی دونوں صورتیں مہر مثلی ادا کرنا پڑے گا اور بوقتِ نکاح مہر مقرر ہوا اور خلوت

---

[1] افادات شیخ الہند

سے پہلے یا بعد کو شوہر مرگیا تو ان دونوں صورتوں میں مقررہ مہر کی ادائیگی لازم ہو گی۔[1]

ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ مہر مقرر نہ تھا اور طلاق خلوت سے پہلے ہو گئی۔ اس صورت میں مہر نہیں صرف متعہ دینا واجب ہے۔ دوسرے مہر مقرر ہو لیکن طلاق خلوت سے پہلے ہو گئی اس صورت میں آدھا مہر ادا کرنا واجب ہے۔ یہ دونوں صورتیں قرآن نے ان دو آیتوں میں پیش کی ہیں، تیسرے یہ کہ مہر مقرر تھا اور طلاق خلوت کے بعد دی گئی تو اس میں پورا مہر ادا کرنا واجب ہے۔ چوتھے، مہر مقرر نہ تھا اور طلاق خلوت کے بعد ہوئی تو مہر مثلی ادا کرنا واجب ہے۔

شوہر کو میدانِ ایثار میں آگے بڑھنے کی تلقین

یہاں قرآن نے یہ فرمانے کے بعد کہ عورت معاف کر دے یا شوہر معاف کر دے بیدہ عقدۃ النکاح کہہ کر مرد کو اکسایا ہے کہ اس کی فتوتِ مردانگی، بلند حوصلگی اور اس کے درجے اور مرتبے کا تقاضا یہ ہے کہ وہ عورت سے اپنے حق کی دستبرداری کا خواہش مند نہ ہو بلکہ ایثار کے میدان میں خود آگے بڑھے۔ اس ایثار کے لیے قرآن نے یہاں مرد کو تین پہلوؤں

اولاً یہ کہ مرد کو اللہ نے یہ فضیلت عطا فرمائی ہے کہ وہ نکاح کی گرہ کو جس طرح باندھ سکتا ہے اسی طرح کھول بھی سکتا ہے۔

ثانیاً یہ کہ ایثار و قربانی جو تقویٰ کے اعلیٰ ترین اوصاف میں سے ہے وہ جنس ضعیف کے مقابلے میں جنس قوی کے زیادہ شایاں شان ہے۔

ثالثاً یہ کہ مرد کو اللہ سبحانہ نے اس کی صلاحیتوں کے اعتبار سے عورت پر جو ایک درجہ ترجیح بخشا ہے اور جس کے سبب سے اس کو عورت کا قوام اور سربراہ بنایا ہے۔ یہ ایک بہت بڑی فضیلت ہے جس کو عورت کے ساتھ کوئی معاملہ کرتے وقت مرد کو نہ بھولنا چاہیے اس فضیلت کا فطری تقاضا یہ ہے کہ مرد عورت سے لینے والا نہیں بلکہ اس کو دینے والا ہے۔[2]

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] تدبر قرآن

ایک آئینی نکتہ

اس آیت میں مبصرین اور قانون سازی کرنے والوں کے لیے ایک اہم آئینی نکتہ کی طرف اشارہ کر دیا۔ وہ یہ کہ نکاح کی گرہ جس طرح مرد کے قبول سے بندھتی ہے۔ اسی طرح نکاح کی گرہ مرد کی طلاق سے کھلتی ہے یا پھر عدالت کے ذریعے گویا یہ سررشتہ اصلاً قرآن نے مرد ہی کے ہاتھ میں رکھا ہے۔ اس لیے طلاق کے معاملے میں عورت کو مرد کے مساوی اختیار دینے کا رجحان جو مغرب کی نقالی میں ہمارے مسلمان ملکوں کے "قانونی اداروں میں بڑھتا جا رہا ہے۔ قرآن کی روح کے خلاف ہے اور اس سے خاندانی نظام کا شیرازہ پراگندہ ہو جانا یقینی بات ہے۔

یاد رہے کہ طلاق کے بارے میں عدالت کو جو اختیار ہے وہ بھی خاص حالات میں شوہر کی نیابت ہے۔ اگر قرآن عورت کو اس معاملہ میں کسی درجہ میں اختیار دینا چاہتا تو مرد کے متعنت ہونے، مفقود ہونے یا اس قسم کی دوسری صورتوں میں عدالت کو اختیار نہ دیتا بلکہ عورت سے کہہ دیتا کہ وہ بھی مرد کو طلاق دے دے۔

کچھ لوگوں نے یہاں بیدہ عقدۃ النکاح سے عورت کا ولی مراد لیا ہے۔ لیکن یہ درست نہیں ہے۔ سنن دارقطنی میں اس موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ عقدۃ نکاح کا ولی شوہر ہے۔

صحابہ میں حضرت علی، عبداللہ ابن عباس، تابعین میں سعید بن المسیب، شریح قاضی، نافع بن جبیر، محمد بن کعب، طاوس، مجاہد، شعبی، سعید بن جبیر، آئمہ میں امام ابوحنیفہ، امام سفیان ثوری کی یہی رائے ہے۔

۲۴۹۔ اور یاد رکھو کہ درگزر کر جانا ہی تقویٰ کے زیادہ قریب ہے، اور دیکھو باہم ایک دوسرے کے ساتھ احسان کرنا اور بھلائی کرنا نہ بھولو۔ اور خوب سمجھ لو کہ جو کچھ تم کر رہے ہو وہ اللہ کی نظر سے پوشیدہ نہیں۔ اس آیت کے ذریعہ دونوں کو فضائل اخلاق فراہم کرنے کی تلقین کی ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ ایک ہی موقعہ پر حکم و حکمت دونوں میں ہم آہنگی پیدا کر دیتا ہے۔ ابھی ابھی وہ عزیز ہونے کی حیثیت میں آرڈر اور حکم دے رہا تھا اور

یکبارگی وہ حکیم ہونے کی حیثیت میں قانون پر عمل پیرا ہونے والوں کو فضائلِ اخلاق کا درس دینے لگتا ہے۔ کبھی وہ حاکم ہونے کی حیثیت میں قرآن میں قانونِ حکومت بناتا ہے اور ساتھ ہی حکیم ہونے کی حیثیت میں وہ قانون کے منافع اور مصالح سے بحث شروع کر دیتا ہے۔ یہاں قرآن نے اب فضائلِ اخلاق کا موضوع چھیڑ دیا ہے اور فضائلِ اخلاق کی سب سے زیادہ ضرورت ازدواجی زندگی میں ہے۔ غور فرمائیے کہ اخلاقی فضائل میں سے ازدواجی سے مناسب دو اخلاقی بزرگیوں کا کیسے حسین انداز میں پیوند لگایا ہے۔ ایک عفو و درگزر دوسرے فضل و احسان۔ عفو و درگزر خود اللہ سبحانہٗ کی بہت بڑی صفت ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو دُنیا ایک لمحہ کے لیے بھی آباد نہ رہے اور دم کے دم میں یہ گناہوں سے بھری ہوئی کائنات سونی پڑ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی ساری صفتوں میں اپنی اسی صفت کی تجلی کا پرتو اپنے بندوں میں پیدا کرنے کی بے پردہ دعوت دی ہے۔

او تعفوا عن سوء فان اللہ کان عفواً قدیراً

یا کسی بُرائی کو معاف کر دو بے شک اللہ معاف کرنے والا قدیر ہے۔

یہاں مرد و زن دونوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ معاف کرو معاف کرنا ہی تمہیں متقیانہ سیرت کا علمبردار بنا دے گا۔ کیونکہ گھر کی زندگی میں جو متقی نہیں ہے وہ پوری دُنیا میں اتقیا کی امامت کیسے کرے گا؟ اور عفو و درگزر سے بڑھ کر یہ بھی فرمایا کہ تمہیں باہم فضل و احسان کو ہرگز فراموش نہ کرنا چاہیے۔ فضل کے لفظ میں اس قدر جامعیت، عموم اور ہمہ گیری ہے کہ یہ ہر نیکی کے کام کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اور اس لیے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا۔ البتہ ان تمام صورتوں میں ایک عام شکل یہ ہے کہ فضل نام ہے دوسروں کے ساتھ ایسا سلوک کرنا کہ جس سے اس کا دل خوش ہو اور اس کو آرام پہنچے۔ غور فرمائیے یہ بات کس موقعہ پر فرمائی ہے۔ نکاح کے موقعہ پر نہیں بلکہ طلاق کے موقعہ پر جو تعلقات کی بقا کا نہیں بلکہ تعلقات کے انقطاع کا نام ہے۔ باہمی حسنِ سلوک، مروت، رعایت اور احسان سے نہ چوکو۔ اس سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ کسی ناخوشگوار واقعہ کے پیش آجانے سے صحبتِ قدیم و محبتِ سابق کے حقوق زائل نہیں ہوتے بلکہ حالتِ طیش و ناگواری میں بھی تقویٰ، حسنِ اخلاق، عفو و درگزر اور فضل و احسان کرنا چاہیے۔ اور آخر میں فرمایا کہ یہ تمہیں اس لیے کرنا چاہیے کہ اللہ کی نگاہ سے تمہاری عملی زندگی کا ہر گوشہ پوشیدہ نہیں ہے۔

اللھم اجعلنا من الکاظمین الغیظ والعافین عن الناس والمحسنین۔

حٰفِظُوْا عَلَی الصَّلَوٰتِ وَ الصَّلٰوۃِ الْوُسْطٰی ق وَ قُوْمُوْا لِلّٰہِ
قٰنِتِیْنَ ۝ فَاِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا اَوْ رُکْبَانًا ۚ فَاِذَآ اَمِنْتُمْ
فَاذْکُرُوا اللّٰہَ کَمَا عَلَّمَکُمْ مَّا لَمْ تَکُوْنُوْا تَعْلَمُوْنَ ۝

نمازوں کی نگہداشت رکھو، خاص طور پر بیچ والی نماز کی،[695] اور نمازوں میں خدا کے حضور فرمانبردارانہ کھڑے ہو۔[696] اگر خطرے کی حالت ہو تو پیدل یا سوار جس حالت میں ادا کر سکو نماز ادا کرو۔[697] پھر جب خطرہ دُور ہو جائے تو اللہ کو اس طریقہ پر یاد کرو جو اُس نے تم کو سکھایا ہے جسے تم نہیں جانتے تھے۔[698]

نمازوں کی محافظت

یہ آیت بغیر کسی پیوند کے یہاں آئی ہے۔ یعنی ایسا حرف کوئی نہیں آیا جو اسے پہلے سے مربوط کرے۔ علمائے لسنہ کی زبان میں اسے استئناف کہتے ہیں۔ ایسا کیوں کیا جاتا ہے۔ علمائے بلاغت کہتے ہیں کہ ایسا ان مواقع پر کیا جاتا ہے جب کسی اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب دینا ہوتا ہے۔ اس موقعہ پر نکاح و طلاق کے قوانین کے بیان میں قانون کی پابجائی کے لیے یکدم اخلاقی فضائل، مواعظ و نصائح کا بیان اس طرح آیا ہے کہ ذہنوں میں یہ سوال خود بخود اُبھرتا ہے کہ انسان جو خواہشوں کا بندہ اور غرض پرستیوں کی مخلوق ہے کیونکر ایسی اخلاقی طاقت پیدا کر سکتا ہے کہ ازدواجی زندگی کی اخلاقی آزمائشوں میں پورا اُترے؟ اس سوال کا جواب اس آیت میں یہ دیا ہے کہ اس کی راہ صرف یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی بندگی اور نیازمندی اور

فرماں برداری کی سچی رُوح اپنے اندر پیدا کی جائے اور خدا کی طاعت و نیازمندی پیدا کرنے کا ذریعہ اللہ کی عبادت ہے اور اللہ کی عبادات میں سب سے طاقتور عبادات نماز ہے۔ لہٰذا چاہیے کہ نماز کی محافظت کرو اور نماز پڑھو تو اس طرح پڑھو کہ خشوع و خضوع میں ڈوبے ہوئے ہو۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں کہ طلاق کے احکام میں نماز کو بیان کرنے کی چند وجوہ ہیں۔ اوّل یہ کہ دُنیا کے معاملات میں پڑ کر کہیں خدا کی عبادت نہ بھلا دینا۔ دوم یہ کہ ہوا و ہوس کے بندوں کو بوجہ غلبہ حرص و بخل عدل کو پورا کرنا اور انصاف سے کام لینا اور وہ بھی رنج و غم اور غصہ کی حالت میں بہت دُشوار ہے۔ اس حالت میں عفو و درگزر اور فضل و احسان پر ان کا عمل پیرا ہونا کچھ مستبعد معلوم ہوتا تھا۔ اس لیے فرمایا کہ کوئی بات نہیں اس کا علاج یہ ہے کہ نماز کی محافظت اور اس پر پابندی کرو اور نماز کے حقوق کی پوری پوری رعایت کرو۔ نماز کو ازالہ رذائل اور تحصیل فواضل میں بڑا اثر ہے۔

نیز اس میں اس طرف اشارہ ہے کہ اسلام میں معاشرت، معاملات، قانون و اخلاق کے مسائل عبادات سے الگ نہیں اور نظام شریعت میں خالق کے حقوق اور مخلوق کے حقوق دوش بدوش ہیں۔ ان میں کوئی دوئی نہیں ہے۔

۵۹۶۔ نمازوں کی نگہداشت کرو خاص طور پر بیچ والی نماز کی۔ بیچ والی نماز سے عصر کی نماز مراد ہے کہ دن اور رات کے بیچ میں ہے۔ اس کی تاکید زیادہ فرمائی کہ اس وقت دُنیا کا شغل زیادہ ہوتا ہے[1]

اس آیت میں دو باتیں تشریح طلب ہیں ایک نمازوں کی محافظت دوسرے الصلوٰۃ الوسطیٰ کی تحقیق۔

محافظت کے معنے کسی چیز کی حفاظت میں خوب کوشش کرنے اور اس پر مداومت کرنے کے ہیں۔ جب یہ لفظ علیٰ کے ساتھ استعمال ہو تو اس کے معنے مداومت اور ہمیشگی کرنے کے آتے ہیں۔ الصلوات جمع ہے اس کا واحد صلوٰۃ ہے۔ اس سے مراد یہ پانچ نمازیں ہیں۔ نمازِ فجر، نمازِ ظہر، نمازِ عصر، نمازِ مغرب، اور نمازِ عشا۔ پوری اُمت اس پر متفق ہے کہ ان پانچوں نمازوں میں سے ایک کا منکر بھی مسلمان نہیں رہ سکتا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

پانچ نمازیں قرآن سے

پانچ نمازیں ویسے تو تواتر عملی سے ثابت ہیں جن کی قطعیت ہر قسم کے شک وشبہ سے پاک ہے۔ لیکن علماء نے اس آیت سے بھی استنباط کیا ہے کہ نمازیں پانچ ہیں۔ الصلوات جمع ہے۔ جمع اگرچہ تین پر بھی بولا جاتا ہے لیکن صلوٰۃ وسطیٰ نکل کر تین ہونے کی صورت میں الصلوات میں جمع کے معنے نہیں رہتے اس لیے یہاں حتماً پانچ مراد ہیں کہ صلوٰۃ وسطیٰ نکل کر بھی جمع کے معنے باقی رہیں۔ چونکہ بعض مستشرقین نے دانستہ یا نادانستہ طور پر نماز کی تعداد اور اس کے اوقات کے بارے میں غلط فہمی پھیلائی ہے۔ دیکھو دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں لفظ صلوٰۃ اس لیے ضرورت ہے کہ اس موضوع پر سینہ قرآن سے اُبلی ہوئی ہدایات عام ناظرین کو معلوم ہوں۔

مکی زندگی میں سورۃ طور دعوت کے پُر آشوب زمانے میں نازل ہوئی۔ اس میں حکم ہوا۔

> اپنے رب کے فیصلہ کا انتظار کیجئے، بے شک تو ہماری آنکھوں کے سامنے ہے۔ اور اپنے رب کی تسبیح کر جب تو نماز کو کھڑا ہو اور کچھ رات کے حصہ میں اس کی تسبیح کر اور ستاروں کی پیٹھ پھیرتے وقت۔ (طور ۲۰)

سورۃ دہر میں جو رائے عامہ کے نزدیک مکی ہے اور غالباً سورۃ طور کے بعد نازل ہوئی ہے ان ہی معنوں میں ایک اور آیت آئی ہے جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب کی ایک نماز جسے نمازِ عصر کہتے ہیں کا ذکر ہے۔ یہ گویا ایک اور نماز بڑھی۔ پہلے نمازِ تہجد کے ساتھ نمازِ عشا، نمازِ فجر تھی اب نمازِ عصر فرض ہوئی۔ سورۃ دہر میں ہے:

> صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے پروردگار کا نام لیا کر اور کچھ رات گئے اس کو سجدہ کر اور رات کو دیر تک اس کی تسبیح کر۔

اس میں رات کی دیر تک نماز کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائے شب۔ اصل ارشاد میں لفظ اصیل اور من اللیل آیا ہے۔ اصیل دن کے آخری حصہ کو کہتے ہیں۔ عام کتب لغت میں لکھا ہے کہ وہ وقت جو عصر کے بعد سے مغرب تک ہے اصیل کہلاتا ہے۔ ابھی نمازیں تین تھیں ایک فجر کے وقت ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو اسی لیے ابھی باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھنے کا حکم تھا۔ ان تین وقتوں میں عبادت نے اب باقاعدہ نماز کا قالب اختیار کر لیا تھا اس لیے حکم ہوا۔

اقم الصلوٰۃ طرفی النھار وزلفا من اللیل

دن کے دونوں کناروں فجر و عصر اور رات کے ایک حصہ میں نماز ادا کر۔

یہ آیت سورۃ ہود جو مکہ میں نازل ہوئی اور غالباً نماز کے اوقات کے سلسلے میں یہ پہلی آیت ہے جس میں تسبیح کی بجائے باقاعدہ نماز کی اقامت کا حکم آیا ہے۔ گویا اب تک تین نمازیں نمازِ فجر، نمازِ عصر، اور نمازِ عشا باقاعدہ فرض ہو چکی ہیں۔

اب آہستہ آہستہ نماز کی تکمیل کی طرف قدم بڑھا۔ سورۃ روم جو مکہ میں نازل ہوئی اور رومیوں کی شکست کے بعد نازل ہوئی ہے فرمایا:

اللہ کی تسبیح کرو جب شام کرو اور جب صبح کرو اور اس کی حمد آسمانوں اور زمین میں ہے اور دن کے آخری حصہ میں اس کی تسبیح کرو اور جب ظہر کرو۔

اس آیت پاک میں زوال کے بعد ظہر اور غروب سے پہلے عصر کی مبہم نمازوں کی توضیح کر دی گئی۔ تمام آیات کو سامنے رکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ فجر کا بالتصریح ذکر طٰہٰ، نور، دہر، ہود، ق، روم اور نور میں ظہر کا بالاجمال دہر، ق، طٰہٰ اور روم میں اور بالتصریح اسرا اور ——— روم میں عشار کا بصورت صلوٰۃ اللیل مزمل، طور اور دہر میں اور بصورتِ عشار بالاجمال طٰہٰ، ہود میں، اور بالتصریح ق اور نور میں ہے۔

زیرِ نظر آیت مدنی ہے پانچوں نمازیں فرض ہو چکی ہیں۔ اب اس آیت میں ان نمازوں کی پابندی، نگہداشت اور ان پر مداومت کا حکم دیا جا رہا ہے اس کے لیے اس آیت میں محافظت کا لفظ آیا ہے اس کے لفظی معنے نگرانی کے ہیں اور اس کی وسعت میں پابندی سے ادا کرنا، وقت پر ادا کرنا اور بشرائط ادا کرنا سب داخل ہیں۔ یہاں محافظت کا لفظ اس پہلو کی طرف بھی اشارا کر رہا ہے کہ مشکل اور پُرخطر حالات میں بھی ہر طرح کے خطرات کا مقابلہ کر کے اس کی حفاظت کی جاتے۔

نماز مومن کی دینی زندگی کا حصار ہے

یہ بات کہ نماز پورے دین کے لیے بمنزلہ حصار اور شہر پناہ ہے۔ اگرچہ قرآن کے قاری کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہے اس کے شواہد قرآن میں ایک سے زیادہ ہیں لیکن اس آیت میں یہ بات محافظت کے عنوان سے پیش کی ہے جو اس نماز کی تمام ظاہری اہتمام کی ایک

جامع تعبیر ہے اور جس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ درحقیقت نمازوں کی حفاظت ہی دین کی دوسری تمام باتوں کی حفاظت کی ضامن ہے۔

اس پارے میں تمام احکام سے پہلے استعانت بالصلوٰۃ کا حکم دیا ہے اور اب معاشرتی احکام کے ختم ہونے پر یکایک محافظت صلوٰۃ کا حکم دیا ہے۔ نماز ہی سے آغاز اور نماز ہی پر معاشرتی احکام کا اختتام کیا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ جس طرح ایک شہر پناہ پورے شہر کو اپنی حفاظت میں لیے ہوتی ہے اسی طرح نماز دوسری تمام نیکیوں کو اپنی حفاظت میں لیے ہوتے ہے۔ مقصد یہ ہے کہ نماز سارے دین کی محافظ ہے۔ تم اس کی محافظت کرو یہ پوری زندگی میں تمہاری پاسبان رہے گی۔

الصلوٰۃ الوسطیٰ کا مطلب

صلوٰۃ کے معنی نماز اور وسطیٰ وسط سے بنا ہے۔ اوسط کا مونث ہے۔ اس کے دو معنے آتے ہیں ایک درمیان اور دوسرے بہترین۔ اور علماء نے دونوں معنے کی رعایت سے اپنے اپنے مذاق کے مطابق تشریح کی ہے۔ اصل میں لغوی معنے تو درمیانی اور بیچ والی کے آتے ہیں۔ چونکہ درمیان افراط و تفریط سے ہٹ کر ہوتا ہے اس لیے مرادی معنے بہترین کے ہیں۔ قرآن میں مسلمانوں کو اُمتہ وسطاً اسی رعایت سے کہا گیا ہے۔ بہرحال بہترین ہو یا درمیانی زمانہ صحابہ سے قرآن کے شارحین نے اپنے ذوق کے لحاظ سے اس کی تعیین کی ہے لیکن سب نے یہ تعیین نمازوں کے مقابلے میں کی ہے۔ آج تک کسی نے نمازیوں کو پیش نظر رکھ کر نہیں کی ہے۔ صحابہ کی نظر میں یہ بات ضرور تھی کہ دن بھر کی پانچ نمازوں میں بیچ کی یا بہترین نماز کون سی ہے لیکن افضل ہونے کا یہ مطلب کہ ایسی نماز جو ظاہر و باطن میں بہترین نماز ہو یا ایسی نماز جو محاسن صلوٰۃ کی جامع ہو کسی نے نہیں بتایا کیونکہ اس سے آیت میں قطعاً کوئی معنویت نہیں رہتی۔ اس مطلب کے ساتھ مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ نماز پڑھنے کی یہ کیفیت ہونی چاہیے قرآن محافظت کے ذریعہ کیفیت کا نہیں بلکہ ایک محسوس اور مرئی پیمانہ عمل کی نگرانی کا مطالبہ کر رہا ہے مولانا آزاد ترجمان القرآن میں آیت کا یہ ترجمہ ایسی نماز جو اپنے ظاہر و باطن میں بہترین نماز ہو اور مولانا مودودی تفہیم القرآن میں یہ ترجمہ ایسی نماز جو محاسن صلوٰۃ کی جامع ہو کرتے

خبر نہیں اپنے مخاطبوں کے ذہن میں کیا اتارنا چاہتے ہیں۔ کیا یہ بتانا چاہتے ہیں کہ نماز کے بہترین ہونے کا مدار نماز میں نمازی کی کیفیات خشوع و خضوع پر ہے۔ اور قرآن ان کیفیات والی نماز کی نگرانی کی تاکید کر رہا ہے۔ اگر یہ بات ہے تو یہ آیت قرآنی کا نہ منطوق ہے نہ مدلول اور نہ مفہوم۔ یہاں نماز کو نمازوں کے مقابلے پر بہترین کہا گیا ہے نمازیوں کے مقابلے میں نہیں کہا گیا یعنی یہ بتانا نہیں ہے کہ کس کی نماز بہترین ہے۔ علماء نے اسی حیثیت سے اس پر بحث کی ہے اور اسی بنیاد پر بہترین نماز کے بارے میں اختلاف ہوا ہے۔
علامہ قرطبی نے تفسیر میں بارہ قول نقل کیے ہیں۔ ہمیں ان میں سب سے زیادہ پسند وہ ہے جس میں نمازِ عصر کو صلاۃِ وسطیٰ کا مصداق قرار دیا گیا ہے۔ یہی جمہور کا مذہب ہے۔
حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

> امام ترمذی اور امام بغوی نے اسی کو اکثر علماء صحابہ کا مسلک قرار دیا ہے۔ قاضی ماوردی کہتے ہیں یہی جمہور تابعین کی رائے ہے۔ حافظ ابو عمرو بن عبدالبر فرماتے ہیں کہ محدثین کا یہی خیال ہے۔ ابن عطیہ نے اپنی تفسیر میں لکھا ہے کہ رائے عامہ اسی کی ہمنوا ہے۔ حافظ دمیاطی نے اپنی کتاب "کشف الغطا" میں اسی کو راجح بتا کر حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابوایوب انصاری، حضرت عبداللہ بن عمرو، حضرت سمرہ ابن جندب، حضرت ابوہریرہ، حضرت ابو سعید خدری، حضرت حفصہ، حضرت ام سلمہ، حضرت ام حبیبہ، حضرت ابن عمر، حضرت ابن عباس اور حضرت عائشہ کے حوالے پیش کیا ہے۔ یہی عبیدہ، ابراہیم نخعی، زر بن جیش، سعید بن جبیر، ابن سیرین، الحسن، قتادہ، الضحاک، الکلبی، مقاتل اور عبید کی رائے ہے۔ اسی کو ائمہ میں احمد بن حنبل، شافعی، اور بقول ابن المنذر ابوحنیفہ، ابویوسف اور محمد نے اختیار کیا ہے۔　(ابن کثیر ج ۱ ص ۲۹۱)

ان اکابر نے ایسا کیوں کہا ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ علی ابن ابی طالب فرماتے ہیں کہ غزوہ احزاب میں مشرکین کے حملے کی وجہ سے حضور انور اور صحابہ کرام کی نماز عصر رہ گئی۔ آپ نے اس وقت فرمایا: اللہ ان کے گھروں اور دلوں کو آگ سے بھر دے جنہوں نے ہماری صلوٰۃ وسطیٰ نمازِ عصر فوت کرا دی۔

پھر آپ نے یہ نمازِ عصر مغرب اور عشا کے درمیان پڑھی۔ یہ حدیث صحیح مسلم میں آئی ہے اور حافظ ابن کثیرؒ نے اس کے مخارج اور اس کی روایتی حیثیت پر خوب سیر حاصل بحث کی ہے۔ اور اس کے ساتھ ایک مرفوع حدیث بھی پیش فرمائی ہے جس میں سمرہ ابن جندب کے حوالہ سے حضور انورؐ کا یہ ارشاد ہے کہ صلوٰۃِ وسطیٰ نمازِ عصر ہے۔ یہ حدیث مسندِ احمد، ترمذی میں ہے اور ترمذی نے اس کے حسن اور صحت پر مہرِ تصدیق ثبت کی ہے اور اس کے علاوہ بھی دوسری احادیث اس موضوع پر آتی ہیں۔ تاریخ و روایت کی اتنی بڑی طاقتور شہادت کے باوجود کہنے والوں نے یہ کہنے کی کیسے جرأت فرمائی ہے کہ

اس سے سمجھا گیا ہے کہ آپ نے نمازِ عصر کو صلوٰۃِ وسطیٰ فرمایا ہے

یعنی حضورؐ نے خود تو یہ بات نہیں فرمائی ہے مگر لوگوں نے حضور انور کی بات کی مراد یہ سمجھ لی حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ غزوۂ احزاب میں حضورؐ نے دعا میں الفاظ ہی یہ فرماتے تھے شغلونا عن الصلوٰۃ الوسطیٰ صلاۃ العصر۔

یہ صحابہ کی سمجھی ہوئی بات اس وقت ہوتی جب ارشادِ نبوت میں صلاۃ العصر کی تصریح نہ ہوتی لیکن جب ارشاد میں خود یہ تصریح ہے تو اسے لوگوں کی سمجھی ہوئی بنا کر بے وزن کرنا کچھ اچھا نہیں ہے۔ علامہ شوکانی نے اس موقف کی درستگی اور صحت پر یہ فرما کر مہرِ تصدیق ثبت کی ہے کہ یہی مذہب حق ہے اسی کو اپنانا چاہیے اور کوئی انصاف پسند آدمی اس کی صحت میں شک نہیں کر سکتا۔ (نیل الاوطار)

بہر حال اس میں تو علماء نے اختلاف کیا ہے کہ معروف پانچ نمازوں میں کون سی نماز صلوٰۃِ وسطیٰ ہے اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں یہ سارے اقوال جمع کر دیے اور ان کی تعداد ۱۷ تک بتاتی ہے۔ عصر، ظہر، مغرب، عشاء، فجر، جمعہ، ساری نمازیں عشا اور صبح دونوں، پانچوں میں سے ایک صبح اور عصر، نماز با جماعت، صلوٰۃ الخوف، وتر نماز، عید قربان، نمازِ عید الفطر، نمازِ چاشت، جمعہ بروز جمعہ اور اس کے علاوہ ظہر ان تمام اقوال کا محور الصلاۃ ہیں۔ یعنی نمازیں ہیں۔ بہر حال صلوٰۃِ وسطیٰ سے مراد نمازِ عصر ہے۔

عصر کی نماز صلوٰۃِ وسطیٰ کیوں ہے

یہ نماز ہماری تمام نمازوں میں ایسی نماز ہے جو رات اور دن دونوں کی سرحد پر واقع ہے

اگرچہ یہ حیثیت صبح کی نماز کو بھی حاصل ہے لیکن جس سرحد پر عصر کی نماز واقع ہے وہ عام حالات میں بھی پُر خطر ہے۔ صبح کا وقت بے شک راحت اور آرام کا وقت ہے اور اس لیے اس وقت کی نماز قیمتی ہے مگر عصر کے وقت دن کی تمام سرگرمیاں اپنے آخری مرحلے میں داخل ہوتی ہیں۔ اس لیے طالبانِ دُنیا کے لیے یہ بہت بڑی آزمائش کی گھڑی ہوتی۔ مسافر رات سے پہلے گھر پہنچنا چاہتا ہے، دکاندار دکان بڑھانے سے پہلے کچھ کمائی کی فکر میں ہے۔ نوکر اپنی مقررہ ڈیوٹی کے سرانجام دینے کے چکر میں ہے۔ یہاں تک کہ میدانوں میں کھلاڑی بھی اپنے آخری داؤں اور اپنی آخری بازی کے منصوبوں میں ایسے غرق ہوتے ہیں کہ کسی کو کسی دوسری چیز کا کوئی ہوش نہیں ہوتا۔ اس وجہ سے قرآن نے عام نمازوں کی نگہداشت کے حکم میں عصر کی نماز کے لیے نگہداشت کا خاص حکم دیا۔ رہا یہ سوال کہ اگر مقصود عصر کی نماز تھی تو اسے صاف صاف عصر کے لفظ ہی سے کیوں تعبیر نہیں کر دیا اس کا جواب یہ ہے کہ اس لفظ کے استعمال سے اس نماز کا وہ نازک محل وقوع ہمارے سامنے آجاتا ہے جس کی وجہ سے یہ خاص نگہداشت کی محتاج ہے[1]

۶۹۶۔ اور نمازوں میں اللہ کے حضور فرمانبردارانہ کھڑے ہو جاؤ یعنی نماز میں ایسی حرکت نہ کرو کہ جس سے معلوم ہو جائے نماز نہیں پڑھ رہے ہو۔ ایسی باتوں سے نماز ٹوٹ جاتی ہے جیسے کھانا پینا یا کسی سے بات کرنا، ہنسنا[2] گویا آیت کے آغاز میں نماز کی کیت کی طرف متوجہ کیا تھا کن اوقات میں اور کتنی کتنی رکعات اور کن آداب و شرائط کے ساتھ نمازیں پڑھنی چاہئیں اور انجام میں نماز کی کیفیت کی طرف متوجہ کیا ہے یعنی کیسے پڑھنی چاہیے۔ قرآن نے اس فقرے میں جس قنوت کا حکم دیا گیا ہے وہ عجیب جامع لفظ ہے لغت میں اس کے حسبِ ذیل معنے ہیں۔ چُپ رہنا، بندگی کرنا، دعا مانگنا، عبادت کرنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا۔ بعض علماء نے ان معنے کو دس تک پہنچا دیا ہے اور علامہ ابن العربی نے اپنی ایک نظم میں ان کو بیان کیا ہے۔ قنوت کے ان متعدد معانی میں سے ہر معنے نماز میں مقصود ہیں۔ کیونکہ نماز میں ذکر و قراۃ تسبیح و استغنا، سلام و تشہد کے سوا تمام انسانی ضرورتوں اور باتوں سے خاموشی ہوتی ہے وہ

---

[1] تدبرِ قرآن [2] افاداتِ شیخ الهند

خدا کی بندگی بھی ہے دُعا بھی ہے اعبادت بھی ہے۔ اس میں دیر تک قیام بھی ہے اور عاجزی کا اظہار بھی ہے۔ اگر ان میں سے کوئی چیز بھی کسی نماز میں کم ہو تو اسی قدر نماز کی کیفیت میں کمی ہو جائے گی۔ شیخین اور اصحاب سنن نے علاوہ ابن ماجہ کے زید بن ارقم کے حوالہ سے بتایا ہے کہ صحابہ کرام نماز میں باتیں کرتے تھے۔ قرآن کی یہ آیت جب نازل ہو گئی تو ہمیں نماز میں خاموش رہنے کا حکم مل گیا۔

نماز خوف میں بھی معاف نہیں ہے

۲۹۷۔ اگر خطرے کی حالت ہو تو پیدل ہو یا سوار جس حالت میں ادا کر سکو نماز ادا کرو۔ یعنی اگر لڑائی اور دشمن سے خوف کا وقت ہو تو ناچاری کو سواری پر اور پیادہ بھی اشارہ سے نماز درست ہے گو قبلہ کی طرف منہ بھی نہ ہو[1]

پیدل سوار کے لیے اصل ارشاد میں رجالاً اور رکباناً کے الفاظ آئے ہیں۔ رجال راجل کی جمع ہے اور رکبان راکب کی جمع ہے۔ راجل پیدل کو کہتے ہیں اور راکب سوار کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر دشمن نے خطرے کی حالت پیدا کر دی ہو اور ایسی حالت میں نماز شرائط و آداب کے ساتھ ادا کرنی ممکن نہ ہو اور وہ کیفیت و جمعیت نہ حاصل ہو سکتی ہو جس کا قوموا للہ قانتین میں مطالبہ ہے تو پھر بھی نماز کی کمیت کو کسی حال میں ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے کہ یہی نماز کی محافظت ہے۔ پیدل یا سوار جس حالت میں نماز ادا کر سکتے ہو نماز ادا کرو۔ اس سے اسلام میں نماز کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے کہ نماز حالت خوف میں بھی معاف نہیں ہوتی۔ نماز کی پابندی اور نگرانی بہر حال کرنی ہے۔ ترک نماز کی اجازت خطرے کی موجودگی میں بھی نہیں ہے ہاں قرآن میں دوسری جگہ ماحول کی رعایت سے وہ شکل و صورت بھی بتادی جو خطرے کی حالت میں نماز با جماعت کے لیے اختیار کی جاتی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نماز کی نگرانی اور اس کی پابندی قرآن کے نزدیک ایمان کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ قرآن نے دوسرے موقع پر ایک جماعت کے اسلام کی صحت کی شرط نماز اور زکوٰۃ کو بتایا ہے۔ اسلام کی نظر میں فرد اگر نماز نہیں پڑھتا تو گنہ گار اور جماعت

---

[1] افادات شیخ الہند

اگر نماز نہیں پڑھتی تو وہ اسلام کی باغی ہے اور قانونِ بغاوت کے تحت اس سے معاملہ ہونا چاہیے۔ اسلام کا قانونِ بغاوت ہے اس کی تفصیل انشاء اللہ سورۃ مائدہ میں آئے گی۔ کسی جماعت کی دینی اخوت کی بنیادی شرط یہی نماز ہے۔ اسلامی مملکت کے شہریوں کے لیے وفاداری کا نشان اور اسلامی مملکت کے سربراہوں کے لیے اسلامیت کی علامت بھی قرآن نماز کو قرار دیتا ہے اس کی تفصیل انشاءاللہ سورۃ حج میں آتے گی۔ اسلام کے عہدِ اقتدار میں مسلمانی کی پہچان نماز تھی۔ افسوس زمانۂ حاضر میں مسلمانوں کی نماز سے بے رغبتی اس حد تک ہو چکی ہے کہ ہمارے شاعر کو یہ شکوہ کرنا پڑا۔

مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے

اس کا نتیجہ ہے کہ آج مسلمان دینی عقیدے کا نہیں ایک سیاسی قومیت کا نام ہو گیا ہے۔ مسلمان ہونے کی نشانی دینداری نہیں ہے بلکہ مسلمان قوم کا فرد ہونا ہے۔

انا للہ و الی اللہ المشتکی

حضورِ انور کا تمام نبیوں میں امتیازی مقام

۶۹۸ - پھر جب خطرہ دُور ہو جاتے تو اللہ کو اس طریقہ پر یاد کرو جو اس نے تم کو سکھایا ہے جسے تم نہیں جانتے تھے۔ یعنی جب امن کے حالات میسر ہوں تو اس طرح اللہ کو یاد کرو جس طرح اس نے تمہیں سکھایا ہے۔ یہاں یاد کرنے سے مراد نماز ہے اور نماز کے موضوع پر یہاں اس فقرے کا علمکم ما لم تکونوا تعلمون سے بڑی معنے خیز بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اللہ پاک کی تعلیم ہے کیونکہ قرآن میں نماز کا حکم آیا ہے لیکن اس کے ادا کرنے کا طریقہ کہیں نہیں بتایا گیا۔ یہ چیز حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم سے اُمت کو معلوم ہوئی۔ اور حضور کی تعلیم ہی کو اس آیت میں اللہ نے اپنی تعلیم بتایا ہے کیونکہ تمام نبیوں میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خاص فوقیت اور امتیاز حاصل ہے وہ یہ ہے کہ آپ جو شریعت لے کر آتے اس کی صورت صرف نظری اور خیالی نہ تھی اور نہ وہ کسی حیثیت سے مجمل اور مبہم ہے بلکہ آپ نے اپنے عمل اور طریق سے اس کی پوری تشریح فرما دی اور خود عمل پیرا ہو کر اپنے تمام پیروؤں سے اس پر عمل کروا کر اس کے بارے میں پیدا ہونے والے ہر شک و شبہ کی جڑ کاٹ دی۔ قرآن نے جس روزانہ

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا ۖۚ وَّصِيَّةً لِّاَزْوَاجِهِمْ
مَّتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ غَيْرَ اِخْرَاجٍ ۚ فَاِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْ مَا
فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوْفٍ ۗ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ۝ وَلِلْمُطَلَّقٰتِ
مَتَاعٌۢ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ
اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ۝ رکوع ۳۱ / ۱۵

اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیوہ عورتیں چھوڑ جائیں اور مرنے سے پہلے اس طرح کی وصیت کر جائیں کہ برس دن تک انہیں نان و نفقہ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔ اور پھر ایسا ہو کہ وہ مقررہ مدت سے پہلے گھر چھوڑ دیں اور دوسرا نکاح کر لیں یا نکاح کی بات چیت کر لیں تو جو کچھ وہ جائز طریقہ پر اپنے لیے کریں گی اس کے لیے تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم ضرور ان کو وصیت کی خاطر روکو۔ یاد رکھو اللہ سب پر غالب اور اپنے ہر کام میں حکمت رکھنے والا ہے ۲۴۰ اور دیکھو جن عورتوں کو طلاق دے دی ہو تو چاہیے کہ ان کو مناسب طریقہ پر فائدہ پہنچایا جائے۔ متقی

انسانوں کے لیے ایسا کرنا لازم ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ تم پر اپنی آیات واضح کرتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو اور سوچو سمجھو۔

طریق عبادت نماز کو پیش کیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس کے تمام ارکان آداب و شرائط و اوقات و تعداد کی پوری تشریح فرمادی اور ان میں سے ہر چیز ناقابلِ شک قومی و عملی تواتر کے ذریعے سے اُمت کو پہنچی۔ نماز کس طرح پڑھنی چاہیے، اس میں کیا پڑھنا چاہیے کن کن وقتوں میں پڑھنی چاہیے، کس وقت کی نماز کی کتنی رکعتیں ہیں، ان میں سے ہر چیز کی زبانی تشریح فرمائی، صحابہ کو تلقین کی اور عملاً نبوت کی پوری زندگی میں جو حکم نماز کے بعد گزری، ایک دن دو دن نہیں کم از کم مدینہ میں متصل دس برس تک ہر روز پانچ دفعہ، تمام جماعت مسلمین کے سامنے پورے اعلان کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔ یہاں تک کہ وصالِ مبارک والی بیماری میں بھی اس سے تخلف نہ ہوا۔ اور آخری سانس تک اسی طرح بدستور اس پر عمل ہوتا رہا۔ اس پورے نظام کو اور اس پورے ماحول کو قرآن نے یہاں اپنی طرف منسوب کیا اور فرمایا اس نے تم کو سکھائیں وہ باتیں جو تم نہیں جانتے تھے۔ حضور انور چونکہ اللہ کی جانب سے سکھانے پر مامور تھے ویعلمکم الکتاب والحکمۃ اس لیے ایک معلم ہونے کی حیثیت میں آپ نے اُمت کو جو کچھ بھی سکھایا وہ اللہ ہی نے سکھایا۔

بیوہ کے لیے مرحوم شوہر کی وصیت

اس سے پہلے آیات میں مطلقات کے متعہ کا ذکر کیا تھا۔ اس آیت میں بیوہ کے متعہ کا ذکر کیا جا رہا ہے۔ بیوہ غریب ظہورِ اسلام کے وقت یوں بھی ہر مذہب میں کس مپرسی کی حالت میں پڑی ہوتی تھی اور عرب جاہلیت میں تو کوئی اس کی بات پوچھنے کا بھی روادار نہ تھا۔ اسلام نے آکر دُنیا کی تاریخ میں پہلی بار بیوہ کی عزت اور اس کے حقوق کا اعلان کیا۔ مشرکانہ مذاہب میں تو بیوگی اور نحوست مترادف تھے اور بیوہ کو عمر بھر کی تحقیر و لعن کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔

۶۹۹ - اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیوہ عورتیں چھوڑ جائیں اور مرنے سے پہلے ان کے بارے میں وصیت کر جائیں کہ سال بھر تک ان کو نان و نفقہ دیا جائے اور گھر سے نہ نکالی جائیں۔ اگر وہ خود نکل جائیں تو جو کچھ وہ جائز طریقہ پر کریں تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔

اس آیت کی تشریح میں علماء کی مختلف رائیں ہیں۔ مثلاً یہ کہ

یہ حکم اوّل تھا اس کے بعد جب آیتِ میراث نازل ہوئی اور عورتوں کا حصہ مقرر ہو چکا اور ہر عورت کی عدت چار ماہ دس دن ٹھہرا دی گئی۔ تب سے اس آیت کا حکم منسوخ ہو گیا۔ [1]

زمانہ جاہلیت میں وفات زوج کی عدت ایک سال تھی اور اسلام میں بجائے ایک سال کے چار ماہ دس روز مقرر ہوئے مگر اس میں عورت کی اتنی رعایت رکھی گئی تھی کہ اگر عورت اپنی مصلحت سے شوہر کے ترکہ کے گھر میں رہنا چاہے تو سال بھر تک اسے رہنے کا حق حاصل ہے اور اسی کے ترکہ سے اس مدت میں اس کو نان و نفقہ بھی دیا جائے گا اس آیت میں اسی کا بیان ہے اور شوہروں کو حکم ہے کہ اس طرح کی وصیت کر جایا کریں اور چونکہ یہ عورت کا حق تھا اس کو وصول کرنے نہ کرنے کا اختیار حاصل تھا، اس لیے وارثوں کو گھر سے نکالنا جائز نہ تھا لیکن خود اس کو جائز تھا کہ خود اس کے گھر نہ رہے اور اپنا حق ورثہ کو چھوڑ دے بشرطیکہ عدت پوری ہو چکی ہو۔ اور نکاح وغیرہ سب درست تھا اور یہی مراد ہے قاعدہ کی بات سے البتہ عدت کے اندر نکلنا اور نکاح کرنا وغیرہ سب گناہ تھا۔ عورت کے لیے اور مرد کے لیے بھی اور جو منع کر سکے اور نہ روکے اس کے لیے بھی۔ پھر جب آیتِ میراث نازل ہوئی گھر بار سب ترکہ میں سے عورت کو حق مل گیا۔ سو اپنے حصہ میں رہے اپنے حصہ سے خرچ کرے یہ آیت منسوخ ہو گئی۔ [2]

شروع اسلام میں عورت کی عدت ایک سال تھی اور عورت کے لیے کوئی میراث نہ تھی صرف یہی ایک سال کا نان و نفقہ تھا۔ آیتِ میراث کے نازل ہونے کے بعد نان و نفقہ کی وصیت کا حکم منسوخ ہو گیا اور سابقہ آیتِ عدت سے جو پہلے گزر چکی ہے ایک سالہ عدت کا حکم منسوخ ہو گیا اور آیتِ عدت اگرچہ تلاوت میں مقدم ہے مگر نزول میں

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] معارف القرآن م ش

موخر ہے۔

امام مجاہد فرماتے ہیں کہ یہ آیت محکم ہے منسوخ نہیں ہے۔ اصل عدت تو صرف چار مہینے دس روز ہے اس کا پورا کرنا واجب ہے اور ایک سال کی عدت حکم استحبابی ہے۔ چار ماہ دس روز کے بعد عورت کو اختیار رہے کہ چاہے سال بھر پورا کرے یا نہ کرے اس لیے اس آیت سے عورت پر ایک سال کی عدت کا وجوب نہیں بلکہ شوہروں پر ایک سال کی وصیت کا وجوب معلوم ہوتا ہے [1]

اسلام سے پہلے رسم جاہلیت

دراصل اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں رسم یہ تھی کہ شوہر کے مرجانے کے بعد عورت ایک سال تک عدت میں رہتی تھی۔ اور عورت کو وحشیانہ تکالیف پہنچائی جاتی تھیں۔ اسلام نے بیوہ کے لیے عدت چار ماہ دس روز مقرر کی۔ اور اگر حمل ہے تو پھر اس کی عدت بچہ کی پیدائش ہے خواہ کسی وقت ہوجائے۔ اور چونکہ ابتداء میراث کا قانون نازل نہیں ہوا تھا اس لیے اللہ سبحانہ نے بیوہ عورتوں کے لیے یہ حکم دیا کہ ان کے حق میں سال بھر نان ونفقہ کی وصیت کی جائے اور یہ بھی وصیت کی جائے کہ بیوہ کو سال بھر تک گھر سے نہ نکالیں اور ساتھ ہی یہ بات عورت کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دی کہ اگر وہ چاہے تو رہ سکتی ہے اور جانا چاہے تو جاسکتی ہے لیکن وارثوں کو نکالنے کا حق نہیں۔ خلاصہ یہ کہ جب تک میراث کا حکم نہیں آیا تھا۔ اس وقت یہ حکم تھا کہ شوہر موت کے وقت ایک سال کے لیے نان ونفقہ اور مکان میں سکونت کی وصیت کر جائے اسی کو قرآن میں متاعاً فرمایا ہے۔ جب عورتوں کی میراث کا حکم نازل ہوگیا تو اب یہ حکم باقی نہیں رہا بلکہ عورت اپنے شوہر کے ترکہ میں سے اپنے نان ونفقہ وغیرہ کا انتظام کرے۔ وصیت کی ضرورت نہیں ہے اور یہ جو فرمایا کہ اگر خود بخود نکل جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ عدت پوری کرنے کے بعد چلی جائیں تو تم پر یعنی ورثہ اور حکام پر کوئی الزام نہیں ہے۔ یہ اس کا حق ہے۔ اگر وہ فائدہ حاصل کرنا نہیں چاہتی تو نہ کرے۔ اس تقریر کی رو سے دوسرے تمام اعتراضات کا دروازہ

---

[1] معارف قرآن م ۱

بند ہو جاتا ہے اور اس کہنے کی ضرورت نہیں رہتی کہ ناسخ نزول میں مقدم ہے اور تلاوت میں مؤخر ہے۔ بہر حال کچھ ہو اس پر اتفاق ہے کہ اب عدت بیوہ کی چار ماہ دس روز ہے۔ اور عورت کی میراث مقرر ہو جانے کے بعد نان و نفقہ کا حق ساقط ہو چکا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر شوہر نے وصیت کر دی ہو کہ ایک برس تک عورت اس کے گھر میں رہے اور نان و نفقہ دیا جائے یعنی ایک سال سوگ منائے اور گھر سے نہ نکلے جیسا کہ عرب جاہلیت میں دستور تھا تو ایسی وصیت اب واجب التعمیل نہیں۔ کیونکہ وفات کی مدت چار ماہ دس دن مقرر کر دی گئی ہے۔

بہر حال بیوہ کے لیے وصیت کا حکم وقتی تھا اور وجہ یہ تھی کہ ان آیات کے نزول کے زمانے تک میراث کا قانون نازل نہیں ہوا تھا ——— چنانچہ والدین اور اہلِ قرابت کے لیے بھی اسی پارے میں وصیت کی ہدایت گزر چکی ہے۔ ظاہر ہے کہ بعد میں جب وراثت کا قانون جاری ہو گیا اور میت کے دوسرے وارثوں کی طرح اس کی بیوہ کا بھی حصہ مقرر ہو گیا تو جس طرح والدین اور دوسرے وارثوں سے متعلق وصیت منسوخ ہو گئی بیوگان کے لیے بھی منسوخ ہو گئی اور اس کی جگہ وراثت کے مستقل قانون نے لے لی[1]

اس آیت میں فلاجناح علیکم کے خطاب میں بہت گہری معنویت ہے کہا تو یہ گیا ہے کہ اگر عورتیں خود گھر سے چلی جائیں فان خرجن۔ اور گناہ کی نفی بجائے عورتوں کے مردوں سے کی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام معاشرہ اس صورتِ حال کا ذمہ دار ہے اور شریعت و قانون کی ذمہ داری معاشرے کے تمام افراد پر اجتماعی طور پر ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داریاں کیا ہیں اور اس جماعت کا ظہور اللہ کے قانون کے نفاذ کے لیے کس قدر ضروری ہے۔ اس خطاب سے یہاں یہی مقصد ہے کہ ذمہ داری کا یہ احساس افراد اور جماعت کے دلوں میں بخوبی جاگزین ہو جائے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ کی ذات عزیز حکیم ہے تاکہ قلوب ہر کام میں اللہ کی قوت اور اس کی حکمت کی جانب متوجہ ہوں یعنی یاد دلایا ہے کہ وہ بڑا قوت والا ہے لہٰذا اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنا کتنی زبردست نادانی ہے۔ وہ حکیم ہے اس کے احکام سارے کے سارے

[1] تدبرِ قرآن

قریب بعید، جلی وخفی مصالح بشری کے جامع ہیں۔

عام طلاق والی عورتوں کا متعہ

۷۰۰۔ اور دیکھو جن عورتوں کو طلاق دے دی گئی ہو تو چاہیے کہ ان کو مناسب طریقے پر فائدہ پہنچایا جائے۔ متقی انسانوں کے لیے ایسا کرنا لازم ہے۔

اس سے پہلے متعہ دینے کا حکم اس طلاق پر آ چکا ہے کہ نہ مہر ٹھہرا ہو نہ شوہر سے خلوت ہوئی ہو اب اس آیت میں وہ حکم سب کے لیے آگیا مگر اتنا فرق ہے کہ سب کو متعہ دینا مستحب ہے ضروری نہیں اور پہلی صورت میں ضروری ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ مطلقہ عورتوں کے لیے متعہ دینے کا حکم متوسمن میں پہلے آ چکا ہے مگر وہ متعہ دو قسم کی عورتوں کے لیے تھا۔

اوّل وہ جن کا مہر مقرر نہ تھا اور خلوت سے پہلے طلاق ہو گئی اس کا متعہ یہ تھا کہ سامان دیا جائے دوسری وہ کہ مہر مقرر ہو اور خلوت سے پہلے طلاق ہو گئی ہو اسے آدھا مہر دیا جائے اب یہاں باقی طلاق والیوں کے بارے میں بتایا جا رہا ہے۔ سوم وہ جن کا مہر مقرر ہے اور خلوت کے بعد طلاق ہو گئی ان کو پورا مہر دیا جائے۔ چہارم وہ جن کا مہر مقرر نہ ہو اور خلوت کے بعد طلاق ہو گئی ہو اسے مہر مثلی دیا جائے۔ اس صورت میں متاع کے معنے مہر کے ہوں گے اور یہ واجب ہے یا اور اگر مہر کے معنے سامان کے ہوں جیسے پہلی صورت میں ہے تو یہ صرف پہلی مطلقہ کو دینا واجب ہے اور باقی کو مستحب۔ اور اگر متاع سے زمانۂ عدت کا نان و نفقہ مراد ہو تو جس طلاق والی عورت کی عدت ہے زمانۂ عدت میں اس کا نان و نفقہ واجب ہے چاہے طلاق رجعی ہو یا طلاق بائن۔ غرض آیت اپنے عموم کی وجہ سے سب کو شامل ہے[2]

بعض علماء کی رائے میں اس آیت میں وہ ہی مطلقات مراد ہیں جن کو متعہ دیا جاتا ہے اور جن کا پہلے ذکر ہو چکا ہے اور المطلقات میں الف لام عہد کا ہے یعنی جن کا مہر مقرر نہ ہو اور طلاق خلوت سے پہلے ہو گئی۔ اس صورت میں یہ آیت عام نہیں ہے بلکہ پہلی آیت کے حکم کی تاکید

---

[1] افادات شیخ الہند [2] معارف القرآن

ہے۔ کیونکہ وہاں یہ کہا گیا متاعاً بالمعروف حقاً علی المحسنین جس سے یہ شبہ ہوا کہ یہ متعہ دینا محض احسان اور تبرع کے درجہ کی بات ہے واجب اور لازم نہیں ہے۔ اسی شبہ کے دُور کرنے کے لیے بطور تاکید یہ ارشاد ہوا ہے۔ گویا نکاح و طلاق کے احکام کا بیان ختم کرتے ہوئے ان مطلقہ عورتوں کے لیے احسان و سلوک کا مکرر حکم ہے۔ کیونکہ اس معاملہ میں رشتہ کار مردوں کے ہاتھ میں ہے اور عورتوں کا پہلو کمزور ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ بار بار حسنِ سلوک اور عفو و درگزر پر زور دیا جائے۔ پہلے حقاً علی المحسنین کہہ کر حسن کاروں سے کہا گیا تھا کہ یہ تمہاری حسن کاری کا تقاضا ہے اور اب حقاً علی المتقین کہہ کر اس کو اہلِ تقویٰ پر تقویٰ کا لازمی تقاضا اور ایک حق قرار دیا ہے۔ گویا پہلے جو بات دیانت اور ایک اخلاقی تقاضا تھی اب وہی بات فیصلہ اور قانونی تقاضا ہے۔

قرآن میں جو حقوق تقویٰ کے حوالہ سے آتے ہیں وہ اس دُنیا کی زندگی میں قانون کی گرفت میں آتے ہیں اور یہ فجور کے مقابلے پر آتا ہے۔ مثلاً ایک موقعہ پر فرمایا کہ ان کا عہد پورا کرو اور ساتھ ہی فرمادیا کہ ان اللہ یحب المتقین گویا فضائلِ اخلاق کی بہم رسانی کا نام اگر احسان ہے تو اخلاقی رذائل سے دامن بچا کر رکھنے کا نام تقویٰ ہے۔ اسی لیے اسلام میں تمام عبادات کی غرض و غایت تقویٰ بتائی گئی ہے۔ کیونکہ ان کے ذریعے بندہ میں خدا کی نافرمانی سے بچنے کی قوت پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ایک چیز محسنین پر حق قرار دی گئی ہے تو یہ ہو سکتا ہے کہ اسلام کا قانون اس دُنیا میں اس کی خلاف ورزی کرنے والوں پر کوئی قانونی گرفت نہ کرے لیکن اگر ایک چیز متقین پر حق قرار دی گئی ہے تو اسلام کا قانون اس دُنیا میں اس کی خلاف ورزی کرنے والوں پر قدغن قائم کرے گا۔ احسان اگر آخرت کی زندگی میں درجات کی بلندی کا ذریعہ ہے تو تقویٰ دنیا کی زندگی میں اسلام کے شہریوں کے لیے اسلام سے وفاداری کا نشان ہے۔

۱۰۷۔ اسی طرح اللہ تم پر اپنی آیات واضح کرتا ہے تاکہ تم عقل سے کام لو اور سوچو سمجھو۔

یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ نے یہاں نکاح، طلاق، عدت کے احکام بیان فرمائے ایسے ہی اپنے احکام و آیات کو واضح فرماتا ہے کہ تم سمجھ لو اور عمل کرسکو۔ یہاں نکاح و طلاق کے احکام ختم ہو چکے ہیں۔[1]

---

[1] افادات شیخ الہند

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ حَذَرَ الْمَوْتِ
فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا ثُمَّ أَحْيَاهُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ
وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۝ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ
وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝ مَّن ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ
قَرْضًا حَسَنًا فَيُضَاعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۚ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَ
يَبْسُطُ وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ۝

اے پیغمبر کیا تم نے ان لوگوں کی سرگزشت پر غور نہیں کیا جو اپنے گھروں
سے موت کے ڈر سے نکل کھڑے ہوئے اور باوجودیکہ ہزاروں کی تعداد
میں تھے[۲۰۲]۔ پس اللہ نے حکم دیا کہ تم مر جاؤ۔ پھر اللہ نے اُن کو زندہ کر دیا[۲۰۳]۔
یقیناً اللہ انسانوں پر بڑا ہی فضل و رحمت والا ہے۔ لیکن اکثر لوگ
ناشکری کرتے ہیں۔ اور دیکھو اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو
کہ اللہ تمہاری باتوں کو سننے والا اور تمہارے اعمال سے باخبر ہے[۲۰۴]۔ کون ہے
جو اللہ کو خوش دلی سے قرض دیتا ہے تاکہ اللہ اس کا قرض دو گنا سہ گنا
سے زیادہ کر کے ادا کرے اور تنگی و کشائش اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے

اور اسی کے حضور تم کو پیش ہونا ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یہ سنت ہے کہ وہ اس انداز سے احکام بیان فرماتا ہے کہ حکم بھی بتایا جائے حکم کی علت کی طرف بھی اشارہ کیا جائے۔ اور ان میں ذکر اللہ اور پند و نصیحت کا اس طرح پیوند لگا دیا جاتے کہ اس پر عمل کے لیے آمادگی پیدا ہو جاتے۔ گویا اس طریق سے قرآن اپنے مخاطبوں کی عملی اصلاح کے ساتھ عقلی تربیت بھی کرتا ہے تاکہ مخاطب اپنے دین کی حد تک صاحب بصیرت ہو اور ہر دور میں اس کے تقاضوں کو سامنے رکھ کر قرآن کے احکام کا دُنیا کے سامنے علمبردار ہو۔ یہاں حکیم الامت نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ ان احکام طلاق وغیرہ میں اتقوا اللہ اور حدود اللہ، سمیع علیم، عزیز حکیم، اور بصیر، خبیر اور ھم الظالمون وغیرہ تعبیرات کا اس بہتات کے ساتھ آنا۔ اس بات کی دلیل قطعی ہے کہ یہ سب احکام شریعت میں مقصود اور واجب ہیں۔ محض مشورے کے طور پر نہیں کہ ان میں ترمیم و تبدیلی کا ہمیں حق حاصل ہو۔[1]

جہاد زندگی کی کامرانیوں کی چابی ہے۔

اب طلاق و نکاح کے احکام بیان فرمانے کے بعد سلسلہ بیان پھر اسی طرف پھرتا ہے جہاں سے نکاح و طلاق کا بیان شروع ہوا تھا۔ یعنی جہاد کے احکام و مصالح کی طرف، بات یہ بتائی جا رہی تھی کہ ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے کہ ایمان کی خاطر زندگی میں جہاد کی سرگرمیاں ہوں۔ جو لوگ ایمان میں ثابت قدمی کا مظاہرہ وطن سے بے وطن ہونے کی سختیاں برداشت کرکے اور اللہ کی راہ میں محنت اور جہاد سے کرتے ہیں یہی اللہ کی رحمت کے اُمیدوار ہیں۔ اور اب ان آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ جو جماعت ایمان کی مدعی ہو کر موت سے ڈرتی ہے وہ کبھی زندگی کی کامرانیاں حاصل نہیں کر سکتی۔ اسی سلسلہ میں بنی اسرائیل کے ایک گروہ کی عبرت انگیز سرگزشت بیان ہوئی ہے جس نے باوجود کثرتِ تعداد کے جہاد سے بے رُخی اختیار کی تھی۔ اس مقام پر اس بحث میں اُلجھنے کی ضرورت نہیں کہ یہ کون لوگ تھے، کہاں تھے اور کس

[1] بیان القرآن

زمانے میں تھے اور کس جگہ تھے۔ قرآن کوئی تاریخی دستاویز نہیں اور اس کے جاننے پر اصل مقصد موقوف نہیں ہے کیونکہ اصل مقصد تو عبرت و نصیحت ہے اور اس میں زمان و مکان سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ اصل منشا یہ ہے کہ زندگی اس کے ظاہری اسباب اور اس کی اصل حقیقت کے بارے میں تصورات اور نقطہ نظر درست رکھا جاتے۔ اللہ کی تقدیر پر یقین ہو، فرائض اور ذمہ داریاں بغیر گھبرائے اور پریشان ہوتے اطمینان سے پوری کی جائیں۔ کیونکہ جو کچھ ہوتا ہے وہ ہو کر رہے گا۔ موت و زندگی اللہ کے قبضے میں ہے۔ خوف اور پریشانی سے نہ زندگی میں اضافہ ہو سکتا ہے اور نہ موت ٹل سکتی ہے۔ اللہ ہی جان دینے والا ہے اور اللہ ہی جان لینے والا ہے۔ بہرحال ان آیات میں اہل ایمان کو جہاد کی ترغیب دی گئی ہے اور ان کمزوریوں سے بچنے کی ہدایت فرمائی ہے جن کی وجہ سے اُمتیں رذائل و انحطاط کا شکار ہو جاتی ہیں۔

۲۰۷۔ اے پیغمبر کیا تم نے ان لوگوں کی سرگزشت پر غور نہیں کیا جو اپنے گھروں سے موت کے خوف سے نکل کھڑے ہوئے تھے اور باوجودیکہ وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ یہ پہلی اُمت کا قصہ ہے کہ کئی ہزار شخص بار ساتھ لے کر وطن سے بھاگے۔ اُن کو ڈر ہوا تھا غنیم کا اور لڑنے سے جی چھپایا۔ یا ڈر ہوا تھا وبا کا اور تقدیر پر توکل و اعتماد نہ کیا۔ پھر ایک منزل پر پہنچ کر بحکم الٰہی سب مر گئے پھر سات روز کے بعد پیغمبر کی دُعا سے زندہ ہوتے کر آگے کو توبہ کریں۔ یہ واقعہ یہاں اس لیے ذکر فرمایا کہ کافروں سے لڑنے یا فی سبیل اللہ مال خرچ کرنے میں جان و مال کی محبت کے باعث دریغ نہ کریں اور جان لیں کہ اللہ موت روانہ کرے تو موت سے چھٹکارا نہیں ہے۔ اور زندگی چاہے تو مُردہ کو دم کے دم میں زندہ کر دے۔ زندہ کو موت سے بچا لینا تو کوئی چیز ہی نہیں۔ پھر اس کی تعمیلِ حکم میں موت سے ڈر کر جہاد سے بچنا یا افلاس سے ڈر کر صدقہ اور دوسروں پر احسان یا عفو و فضل سے رُکنا بددینی کے ساتھ حماقت بھی ہے۔[1]

اس مقام کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ مسلمان اس وقت مکہ سے نکالے گئے تھے۔ سال سے مدینہ میں پناہ گزین تھے اور کفار کے مظالم سے تنگ آکر خود بار بار مطالبہ کر چکے تھے کہ ہمیں لڑنے کی اجازت دی جاتے مگر جب انہیں لڑائی کا

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

حکم دے دیا گیا تو ان میں سے بعض لوگ کسمساہے تھے اس لیے یہاں اس واقعہ کو پیش کر کے انہیں عبرت دلائی گئی ہے۔ قرآن نے جن لوگوں کا واقعہ بیان کیا ہے نہ ان کے مقام کا ذکر کیا ہے اور نہ قوم و اُمت اور نہ ان کی پوری تعداد بتائی ہے۔ اگر یہ باتیں انسانی زندگی کے لیے مفید ہوتیں تو قرآن بیان کر دیتا اور اس موضوع پر تاریخ و روایت کے دفتر میں نبوت کی پیش کی ہوئی تشریح بھی نہیں ہے۔ مفسرین قرآن نے بہت سی باتیں لکھی ہیں لیکن ان کا سرچشمہ اسرائیلی روایات ہیں اور شاید بعض بزرگوں نے روایات کی مبالغہ آمیزی سے گھبرا کر اس کے واقعہ ہونے کا انکار کر دیا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر نے حضرت ابن عباس کے حوالہ سے بتایا ہے کہ یہ تمثیل ہے واقعہ اور قصہ نہیں ہے محض عبرت کے لیے پیش کی گئی ہے۔

اتنی بات واضح ہے کہ یہ لوگ موت کے اندیشہ سے گھر چھوڑ کر بھاگ گئے تھے۔ دشمن کے حملہ کا اندیشہ تھا یا کسی وبائی بیماری کا خطرہ تھا۔ موقعہ اور مقام کا تقاضا یہی ہے کہ دشمن کا اندیشہ تھا۔ اور ان کا یہ بھاگنا اس لیے نہ تھا کہ ان کی تعداد تھوڑی تھی۔ یہ ہزاروں یعنی بہت تھے۔ موت کے ڈر جُبن، بزدلی، محبت دنیا کی وجہ سے وہ باوجود اکثریت کے بھاگ گئے۔ اکثریت کے باوجود چونکہ ان کا یہ طرزِ عمل بڑا ہی عجیب و غریب ہے۔ اس لیے بات کو الم تر سے شروع کیا گیا ہے، عربی میں یہ طرزِ خطاب ایسے موقع پر آتا ہے جب مخاطب کو کسی بڑے اہم، حیرت انگیز، عجیب و غریب واقعہ کی طرف توجہ دلانا مقصود ہو۔ رویتا ہمیشہ آنکھ سے دیکھنے کے معنے میں نہیں آتا بلکہ وہم و تخیل غور و فکر اور عقل کی راہ سے مطالعہ کو بھی رویت کہتے ہیں اور جب اس کا صلہ الی ہو تو کوئی مقصود، کوئی نتیجہ نکالنا یا عبرت حاصل کرنا ہوتا ہے۔ ان کی یہ حالت کہ باوجود کثرتِ تعداد کے جُبن، بزدلی اور موت کے ڈر سے گھروں کو چھوڑ بیٹھے۔ چونکہ انتہائی حیرت انگیز بات تھی اس لیے فرمایا کہ کیا آپ نے غور نہیں فرمایا۔

اُمت موت سے کب ڈرتی ہے

اُمتوں میں یہ حالت کب رونما ہوتی ہے۔ جب بدعات اور شرک کے غلبے سے ان کی دینی و اخلاقی حالت خراب ہو جاتی ہے اور اجتماعی تنظیم نہ ہونے کی وجہ سے سیاسی شیرازہ پامال ہو جاتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بحوالہ حضرت ثوبان سنن ابو داؤد

میں آتا ہے :

قریب ہے کہ دنیائے کفر تمہارے خلاف ایک دوسرے کو دعوت دے جیسے کھانے والے کھانے پر دعوت دیا کرتے ہیں۔ کسی نے دریافت کیا کیا اس روز ہماری تعداد کم ہوگی۔ ارشاد ہوا کہ نہیں بلکہ بہت زیادہ تعداد میں ہوں گے لیکن تمہاری حیثیت سیلاب کے کوڑے کرکٹ جیسی ہوگی، اور اللہ سبحانہ، تمہارے دشمنوں کے سینوں سے تمہارا دبدبہ ہٹا دے گا اور تمہارے دلوں میں وہن پیدا ہو جائے گا۔ پوچھنے والے نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ وہن کیا ہوتا ہے؟ فرمایا دنیا کی محبت اور موت کا ڈر اور اس کی ناگواری۔

۳۰۷۔ بس اللہ نے ان کو حکم دیا کہ تم مر جاؤ پھر اللہ نے اُن کو زندہ کیا یعنی وطن سے جان بچانے کے لیے اور حکمِ جہاد کی تعمیل سے جی چرانے کے لیے لیکن یہ تدبیر کچھ بھی کام نہ آئی اور اُلٹے موت کا شکار ہو گئے۔

یہاں موت وحیات سے کیا مراد ہے۔ عام رائے یہی ہے کہ یہاں موت زندگی کے فنا ہونے اور حیات اسی مادی زندگی کے معنے میں آیا ہے لیکن قرآن میں موت صرف اسی معنے میں نہیں بلکہ دوسرے معانی میں بھی آیا ہے۔ مثلاً نیند، بے ہوشی، اخلاقی و ایمانی موت اور ویسے ہی حیات، بیداری، ہوش میں آنا اور ایمانی و اخلاقی زندگی کے معنے میں آیا ہے۔ یہاں فرد کی موت وحیات کا تذکرہ نہیں بلکہ اُمت اور قوم کی موت وحیات کا تذکرہ ہے۔ قرینِ قیاس یہی ہے کہ چونکہ وہ بہت بڑی اکثریت کے باوجود حکمِ جہاد سے جان بچا رہے تھے اس کے نتیجے میں ان کی بزدلی کی وجہ سے دشمن اُن پر غالب آگیا۔ اور ایک عرصہ گزر جانے کے بعد جیسا کہ قرآن میں ثم (پھر) کی معنویت کا تقاضا ہے۔ ان کو زندگی ملی یعنی عزم و ثبات کی ایسی رُوح اُن میں پیدا ہو گئی کہ دُشمنوں کے مقابلہ پر آمادہ ہو گئے اور دُشمن کے مقابلے میں فتح مند ہو گئے۔ گویا بتا دیا گیا کہ جو جماعت موت کو ناگوار سمجھتی ہے وہ کبھی زندگی کی کامرانیاں حاصل نہیں کر سکتی ہے۔

آیت کا یہ مطلب سیّد رضا رشید، مفتی محمد عبدہ اور مولانا آزاد نے بتایا ہے اور موقعہ و محل کے زیادہ مناسب ہے۔ آخر میں فرمایا ہے کہ اللہ انسانوں پر بے پایاں فضل و بخشش والا ہے لیکن افسوس لوگوں کو اس انعام کی قدر نہیں ہے۔

۴۰۷۔ اور دیکھو اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور جان لو کہ اللہ تمہاری باتوں کو سننے والا

اور تمہارے اعمال کو جاننے والا ہے۔ حکم کی مخاطب پوری اُمت مسلمہ ہے لیکن خطاب بحیثیت جماعت ہے بحیثیت افراد نہیں ہے۔ کہ فرداً ہر شخص جب جی چاہے تلوار اٹھا کر چلانا شروع کر دے۔ اس تمہیدی حکایت کے بعد کہ موت و زیست سب کا سر رشتہ اللہ کے قبضہ میں ہے اب حکم ملتا ہے کہ اسی کے حکم سے اسی کے دین کی خدمت کے لیے جہاد و قتال میں مشغول ہو جاؤ گویا اوپر کی تاریخی تمہید کے بعد مسلمانوں کو مخاطب کیا ہے اور کہا ہے کہ اللہ کی راہ میں جنگ کرو اور یقین کرو کہ اللہ سن رہا ہے جانتا ہے۔ یعنی تمہیں دو وجہ سے جنگ کرنی چاہیے۔ ایک تو اس لیے کہ یہ جنگ اللہ کی راہ میں، قوم، وطن، زبان، نسل اور کاروبار کی راہ میں نہیں ہے اس وجہ سے اس میں ہر قدم پر بندے کو اللہ کی معیت حاصل ہے دوسرے اس لیے کہ اللہ تمہاری جانبازیوں، قربانیوں، دعاؤں اور فریادوں، اور تمہارے دشمنوں کی چالوں اور تدبیروں سے خوب واقف ہے یہاں ان صفات کا حوالہ دینے سے مقصود یہ ہے کہ جب اللہ سنتا ہے اور جانتا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ تمہاری پکار پر تمہاری مدد کو آئے گا اور تمہاری جانبازیوں کا بھرپور صلہ دے گا۔

جہاد ایمان کی کسوٹی ہے

اہل ایمان کو اس آیت کے ذریعہ تنبیہہ کی گئی ہے کہ اللہ کی راہ میں قربانی ہی ایمان کی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے اس لیے ایمان کا دعویٰ کر کے اپنی ذاتی نیکیوں پر قانع نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ ممکن ہے کہ ہماری نیکیاں خالص اور بے آمیز نہ ہوں بلکہ ان میں ذاتی اور قومی مفاد کی خواہش بھی شامل ہو۔ اپنے ایمان کا امتحان کرنا چاہتے ہو تو دیکھو اللہ کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی تم میں کتنی خواہش ہے؟ کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

جس شخص کو اس طرح موت آئے کہ نہ تو اس نے اللہ کی راہ میں جہاد کیا اور نہ

لے ماجدی

اپنے دل میں جہاد کی خواہش کی تو وہ ایک طرح سے نفاق کی حالت پر مرا۔
غور کیجیے آج کتنے مسلمان ہیں جن کے قلوب جہاد فی سبیل اللہ کی خواہش سے معمور ہیں۔ جو لوگ ہم میں سے دیندار ہیں انہی کے دلوں کا جائزہ لیجیے۔ کیا ان میں سرفروشی اور جاں نثاری کی آرزو کہیں جھلکتی ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی خواہش تو اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے کہ ہم موجودہ کافرانہ زندگی سے غیر مطمئن ہوں اور اسے بدلنے کی آرزو رکھتے ہوں وہ لوگ جہاد کی تمنا کیوں کریں جو موجودہ ماحول کی آسائشوں اور نعمتوں اور غیر اسلامی نظامات کے منافع سے استفادہ کر رہے ہوں اور نہ تو اس استفادے کو برا سمجھتے ہوں اور نہ ان نظامات سے باہر نکلنا چاہتے ہوں۔ جو لوگ غیر اسلامی نظامات اور باطل افکار و اقدار کی خدمت کرنے اور ان سے نفع حاصل کرنے کے بعد محض روزہ نماز اور تسبیح و تہلیل کی بنا پر اپنے آپ کو خدارسیدہ سمجھتے ہیں ان کو کیا پڑی ہے کہ حق کے قیام کی خاطر جان و مال کی قربانی دیں اور صداقت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کریں۔ خدا کا کلمہ بلند کرنے کی خواہش اور اس کے لیے ایثار و جاں فروشی کا جذبہ تو اس جماعت میں پیدا ہو سکتا ہے جو کافرانہ تہذیب سے بیزار اور اس کی جگہ اسلامی تہذیب کے قیام کی آرزومند ہو۔ اس کے برعکس غیر اسلامی نظامات سے ہماری دل بستگی اس قدر پختہ ہو گئی ہے کہ نہ صرف یہ کہ ہم میں ان نظامات سے باہر نکلنے کی حس باقی نہیں رہی ہے بلکہ جب کبھی ان کو خطرہ ہوتا ہے ہماری تمام کوششیں ان نظامات کی حفاظت اور بقا میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ بہرحال مجاہدانہ زندگی مسلمان کی سب سے بڑی عزت ہے۔

۲۴۵۔ کون ہے جو اللہ کو خوش دلی سے قرض دیتا ہے تاکہ اللہ اس کا قرض دوگنا سہ گنا زیادہ کر کے ادا کرے اور تنگی و کشائش اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے اور اسی کے حضور تم کو پیش ہونا ہے یعنی چاہیے کہ خرچ کرو اللہ کے راستہ میں مال اور تنگی سے نہ ڈرو کشائش اور تنگی سب اس کے اختیار میں ہے اور اسی کی طرف لوٹ کر سب کو جانا ہے۔

قرضِ حسنہ

قرضِ حسنہ اسے کہتے ہیں جو قرض دے کر تقاضا نہ کرے اور اپنا احسان نہ رکھے اور بدلہ نہ چاہے اور اسے حقیر نہ سمجھے اور خدا کو دینے سے جہاد میں خرچ کرنا مراد ہے یا محتاج

لو دینا[1] مطلب حضرت شیخ کا یہ ہے کہ
قرض حسن کا لفظی ترجمہ اچھا قرض ہے اور اس سے مراد ایسا قرض ہے جو خالص نیکی کے جذبے سے بے غرضانہ کسی کو دیا جائے اس طرح جو مال راہ خدا میں خرچ کیا جائے اسے اللہ تعالیٰ اپنے ذمہ قرض قرار دیتا ہے۔ اور وعدہ کرتا ہے کہ میں نہ صرف اصل واپس کروں گا بلکہ اس سے کئی گنا زیادہ دوں گا۔ البتہ شرط یہ ہے کہ قرض حسنہ ہو یعنی اپنی نفسانی غرض کے لیے نہ دیا جائے بلکہ صرف اللہ کی خاطر ان کاموں میں صرف کیا جائے جن کو وہ پسند کرتا ہے[2]
دراصل قرض حسن خالص قرآنی اصطلاح ہے اس سے مراد ہر وہ رقم ہے جو دین کی کسی مد میں خرچ کی جائے۔ یہاں مراد مصارف جہاد ہیں۔ اس ملی چندے کو قرض اور پھر قرض حسنہ سے تعبیر کرنا محاورۂ عرب کے مطابق ہے۔ عرب والے اچھے معاوضہ والے عمل کو اچھے قرض اور ہر بُرے معاوضہ والے عمل کو بُرے قرض سے تعبیر کرتے ہیں۔ عرب ایک مشہور تجارت پیشہ قوم تھی۔ قرض، بیع وشرا وغیرہ کے الفاظ اگر ان کی لوبی زبان کا جزو بن گئے ہوں تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔[3]

راہِ خدا میں خرچ کے لیے قرض کی تعبیر

یہاں اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو قرض سے تعبیر فرمایا ہے۔ قرض قرضدار کے ذمہ واجب ہوتا ہے اور یہ رب کریم کا کتنا بڑا انعام ہے کہ جو مال اس نے خود بندوں کو دیا ہے وہی مال جب ان سے اپنی راہ میں خرچ کراتا ہے۔ تو اس کو اپنے ذمہ قرض قرار دیتا ہے پھر اس سے بھی زیادہ روح ودل کے لیے سامانِ راحت یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ یہ قرض اس لیے مانگتا ہے کہ وہ بندوں کے دیے ہوئے ان خزف ریزوں کو خوب بڑھاتے اور ان کو بڑھا کر ایک لازوال خزانہ کی صورت میں ان کو واپس کردے یعنی اس قرض کی ضرورت ہی گویا اس لیے پیش آئی ہے کہ اس راہ سے وہ اپنے بندوں کے لیے نفع کمانے کی راہ کھول دے کہ اگر وہ چاہیں تو ایک خرچ کرکے دس گنا سے سات سو گنا تک اس کا اجر حاصل کریں[4]
اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو مجازاً قرض کہا گیا ہے کیونکہ قرض دینے کے معنے یہ ہیں کہ کسی

---

[1] افادات شیخ الہند [2] تفہیم القرآن [3] ماجدی [4] تدبر قرآن

کو اپنا سرمایہ اس شرط پر دیا جائے کہ وہ پھر برابر سرابر اسے واپس کردے۔ بندہ حقیقتہً کسی چیز کا مالک نہیں ہے۔ یہاں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے اللہ سبحانہٗ کی ملکیت ہے۔ خود بندے اس کی مخلوق اور مملوک ہیں۔ آقا کو غلام سے قرض مانگنے کی کیا ضرورت محض تلطف اور اظہارِ عنایت کی خاطر اس کا نام قرض رکھ دیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جو کچھ بھی دو گے اس کا معاوضہ ملے گا۔ جیسا کہ

ان اللہ اشتریٰ من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ۔

اللہ نے اہلِ ایمان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے میں خرید لیا ہے۔

جان و مال کے عوض میں جنت دینے کا نام بیع و شرا خرید و فروخت رکھ دیا ہے۔ حالانکہ جان اور مال اور جنت کے مالک وہی ہیں۔ خرید و فروخت کے لیے یہ ضروری ہے کہ خریدار اور مالک کی ملک علیحدہ علیحدہ ہو۔ لہٰذا جیسے اس آیت میں درحقیقت وہی خریدار وہی مالک ہیں صرف ظاہر کے لحاظ سے بندے کو مالک اور اپنے کو خریدار مجازاً کہدیا ہے۔ اسی طرح اس گرامی قدر آیت میں سمجھ لو کہ لینے والے اور دینے والے سب وہی ہیں۔ مجازاً اس کو قرض سے تعبیر کردیا تاکہ بندے کا دل خوش ہو جائے اور بندے کو اگر کچھ عقل ہے تو غیرت سے زمین میں گڑ جائے کہ اللہ اکبر خود اپنے فضل و کرم سے مال و دولت ہم کو دیتے ہیں اور پھر ہمارے ہاتھ میں دے کر فرماتے ہیں کہ لاؤ اس میں سے ہمیں کچھ قرض دے دو اور حکم بھی حکم کے انداز میں نہیں دیتے بلکہ بندے سے دریافت کرتے ہیں کہ بتاؤ کون ہے! جو اللہ کو قرض دیتا ہے!۔

اللہ کے بندوں کی مدد اللہ کو قرض دینا ہے

بعض علماء فرماتے ہیں کہ اللہ کو قرض دینے سے مراد اللہ کے بندوں کو قرض دینا ہے چنانچہ ایک حدیثِ قدسی میں یہی حقیقت ایک مؤثر پیرائے میں واضح کی گئی ہے۔

قیامت کے روز ایسا ہوگا کہ اللہ سبحانہٗ ایک انسان سے کہے گا کہ ابن آدم! میں بیمار ہو گیا تھا مگر تُو نے میری بیمار پرسی نہیں کی۔ بندہ حیران ہو کر کہے گا کہ بھلا ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے اور تو تو رب العالمین ہے۔ فرمائے گا کیا تجھے معلوم نہیں کہ میرا فلاں بندہ تیرے قریب بیمار ہو گیا تھا اور تُو نے اس کی خبر نہیں لی تھی۔

اگر تو اس کی بیمار پُرسی کے لیے جاتا تو مجھے اس کے پاس پاتا۔ اے ابنِ آدم! میں نے تیرے سے کھانا مانگا تھا مگر تو نے نہیں کھلایا۔ بندہ عرض کرے گا بھلا ایسے کیسے ہوسکتا ہے کہ تجھے کسی بات کی احتیاج ہو۔ اللہ سبحانہٗ فرمائے گا کیا تجھے یاد نہیں کہ میرے فلاں بھوکے بندے نے تجھ سے کھانا مانگا تھا اور تو نے انکار کر دیا تھا اگر تو اسے کھلاتا تو تو اسے میرے پاس پاتا۔ ایسے ہی اللہ سبحانہٗ فرمائے گا اے ابنِ آدم میں نے تیرے سے پانی مانگا تھا مگر تو نے مجھے پانی نہیں پلایا بندہ عرض کرے گا بھلا ایسا کیونکر ہوسکتا ہے کہ تجھے پیاس لگے تُو تو خود پروردگار ہے۔ اللہ سبحانہٗ فرمائے گا کہ میرے فلاں پیاسے بندے نے تیرے سے پانی مانگا لیکن تو نے اسے پانی نہیں پلایا اگر تُو اُسے پانی پلا دیتا تو اسے میرے پاس پاتا۔ (مسلم عن ابوہریرہ)

اس سے معلوم ہوا کہ بندے کے لیے اللہ کو قرض دینے کی عملی راہ یہ ہے کہ اس کے بندوں کی اعانت و نصرت کی جائے۔

آیت پر عمل کا ایک منظر

حضرت ابوالدحداح انصاری کا واقعہ ابنِ کثیر نے ابنِ ابی حاتم اور دوسرے مفسرین نے طبرانی اور بیہقی کے حوالہ سے اور علامہ قرطبی نے اپنی سندِ مسلسل سے نقل کیا ہے کہ انہوں نے اس آیت کو سن کر دریافت کیا۔ یا رسُول اللہ! کیا خدا بھی قرض طلب کرتا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں۔ انہوں نے عرض کیا آپ اپنا ہاتھ بڑھائیے۔ سرکار کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر کہا میں نے اپنا وہ باغ جو ایک چاردیواری میں ہے اور جس میں کھجوروں کے چھ سو درخت ہیں اللہ سبحانہٗ کو قرض دے دیا ہے۔ ان کے بیوی بچے بھی اس باغ میں رہتے تھے۔ حضور انور کی مجلس سے باغ دے کر اُٹھے اور باغ کے دروازے پر کھڑے ہو کر اپنی بیوی کو آواز دی۔ اور اس سے کہا کہ بال بچوں کو لے کر باغ سے باہر آجا۔ میں نے یہ باغ اللہ کو قرض دے دیا ہے۔ بلکہ علامہ قرطبی نے وہ نظم بھی نقل کی ہے جو اس مخیر صحابی نے اپنی بیوی کو مخاطب کر کے اس موقعہ پر کہی۔

هداك ربي سبل الرشاد الى سبل الخير والسداد
اے بیوی اللہ تجھے رشد و ہدایت، خیر اور صواب کی راہوں پر چلا دے۔
بيني من الحائط بالود فقد مضى قرضا الى التناد
اس باغ سے محبت کے ساتھ جدا ہوجا یہ باغ قیامت تک اللہ کا قرض ہو چکا
اقرضته الله على اعتمادي بالطوع لا من ولا ارتداد
یہ باغ میں نے اللہ کو بھر پور اعتماد کے ساتھ خوشی سے قرض دے دیا ہے نہ احسان ہے نہ واپسی
الا رجاء الضعف في المعاد فارتحلي بالنفس والاولاد
صرف آخرت میں دوگنے ثواب کی امید ہے لہٰذا تو خود بچوں کو لے کر باہر آجا،
والبر لا شك فخير زاد قدمه المرء الى المعاد
آخرت کا بہترین توشہ وہ نیکی ہے جو آدمی خدا کی راہ میں آگے روانہ کرتا ہے

لکھا ہے کہ اہلیہ بھی زبان و ادب کی چاشنی سے مالا مال تھی۔ شوہر کی زبان سے باغ کو راہ خدا میں دینے کی خبر سن کر شوہر کو پہلے یہ کہہ کر مبارک باد دی۔

ربح بيعك ، بارك الله لك فيما اشتريت
تمہاری تجارت نفع والی ہو اللہ تعالیٰ تمہارے سودے میں برکت دے

اور بعد ازیں منظوم کا جواب منظم سے دیا۔

بشرك الله بخير وفرح مثلك ادى ما لديه ونصح
تجھ کو بھلائی اور خوشی کی بشارت ہو تیرے جیسا ہی ایسے حوصلہ کا کام کرتا ہے
قد متع الله عيالي ومنح بالعجوة السوداء والزهو البلح
اللہ نے میرے بچوں کو قسم قسم کی کھجوریں دے دیں اگر باغ دے دیا تو کیا ہوا۔
والعبد يسعى وله ما قد كدح طول الليالي وعليه ما اجترح
بندہ جو کچھ کرتا ہے وہ اپنی منفعت اور آخرت کے لیے کرتا ہے۔

اس کے بعد ان کی اہلیہ بچوں کی طرف متوجہ ہوئی۔ بچے جو پھل دامنوں میں لیے ہوئے تھے وہ دامن جھٹک دیے اور جو کھجوریں بچے کھا رہے تھے انگلی ڈال کر ان کے منہ سے نکال دیں اور بچوں سے کہا کہ اس باغ سے چلو اور اسی وقت دوسرے باغ میں منتقل ہو جاؤ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو فرمایا:

اللہ ہی جانتا ہے کہ ابوالدحداح کے لیے آخرت میں کتنے بے شمار کھجور کے باغ اور کتنے شاندار محلات ہیں ۔

قرآن کا ذو اضعاف اکثر

اضعاف ضعف کی جمع ہے ضعف کے معنے کسی چیز میں اس کے مثل اور اس کے برابر اور ملا دینا جس کو ہم اپنی زبان میں دگنا کرنا کہتے ہیں فیضاعفہ لہ اضعافا کثیرۃ کیسا بلیغ فقرہ ہے پہلے مضاعفہ سے فعل لاتے جس کے معنے ڈبل کرنے کے ہیں پھر اضعافاً کا اضافہ فرمایا جس کے معنے بہت سے دگنے اور بعدازیں کثیرۃ فرمایا جس کے معنے بہت اور زیادہ کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایک مرتبہ دگنا نہیں بلکہ بے شمار مرتبہ اس میں دگنے ملاتا رہتا ہے ارشادِ نبوت ہے کہ اللہ تعالیٰ ایک کھجور کے برابر صدقہ کو اس طرح پالتا ہے جس طرح تم لوگ گھوڑے کے بچہ کو پالتے ہو۔ قیامت کے روز وہ کھجور کا ٹکڑا اُحد کے پہاڑ کے برابر ہو گا حساب میں جیسے ذو اضعاف اقل کہتے ہیں یہ اس کا مقابل ہے۔ وہاں تقسیم کرتے کرتے چھوٹا عدد نکالتے ہیں اور یہاں دوگنا دوگنا کرتے کرتے اس کو شمار سے باہر کر دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرض حسنہ والے ثواب کو سوائے خدا کے اور کوئی نہیں جانتا ۔

نکتہ کی بات

آخر میں ایک نکتہ کی بات فرما دی کہ تنگی اور کشائش کا انحصار آدمی کی اپنی تدبیروں پر نہیں بلکہ اللہ کے اختیار میں ہے۔ قبض اور بسط کا مفہوم بہت عام ہے۔ ہر وہ چیز جو روک لی جائے اور ہر وہ چیز جس میں کشادگی کی جاتے اللہ ہی کے قبضے میں ہے۔ خواہ وہ مال ہو یا عمر، برکت فی الاعمال ہو یا عمل کی توفیق، دل کی سخاوت ہو یا بخل و امساک، قلب کا وہ قبض و بسط جو اصطلاح صوفیہ ہے یا شرحِ صدر اور ضیقِ صدر ہو۔ غرض ہر چیز کا قبض و بسط اللہ تعالیٰ ہی کے حیطۂ اختیار میں ہے۔ یہاں مال کی مناسبت سے تنگدستی اور فراخ دستی کا مفہوم اختیار کر لیا ہے۔ ورنہ قرآنی مفہوم بہت وسیع ہے ۔

بالکل آخر میں بازگشت کا ذکر فرمایا ہے والیہ ترجعون تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔ اگر خوش دلی سے خرچ کیا تو ثواب کی فراوانی ہو گی

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَاِ مِنْۢ بَنِىْٓ اِسْرَآءِيْلَ مِنْۢ بَعْدِ مُوْسٰى ۘ اِذْ قَالُوْا

لِنَبِىٍّ لَّهُمُ ابْعَثْ لَنَا مَلِكًا نُّقَاتِلْ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ قَالَ هَلْ

عَسَيْتُمْ اِنْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ اَلَّا تُقَاتِلُوْا ۭ قَالُوْا وَمَا لَنَآ

اَلَّا نُقَاتِلَ فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَقَدْ اُخْرِجْنَا مِنْ دِيَارِنَا وَاَبْنَآئِنَا ۭ

فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ

بِالظّٰلِمِيْنَ ۝

اے پیغمبر کیا تم نے اس واقعہ پر غور نہیں کیا جو موسٰی کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو پیش آیا۔ بنی اسرائیل کے سرداروں نے اپنے زمانہ کے پیغمبر سے درخواست کی تھی کہ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے ہمارے لیے ایک حکمران مقرر کر دو۔ نبی نے کہا کہ مجھے توقع نہیں ہے کہ تم ایسا کر سکو، اگر تمہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو یہ بات ممکن ہے کہ تم نہ لڑو۔ سرداروں نے کہا ایسا کیوں کر ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں۔ حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے جا چکے ہیں اور اپنی اولاد سے علیحدہ ہو چکے ہیں

لیکن جب ایسا ہوا کہ اُن پر جنگ فرض کی گئی تو ایک تھوڑی تعداد
کے سوا سب نے پیٹھ دکھا دی اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے ۱۱؎

اور اگر بخل کیا تو مواخذہ ہوگا۔ یہ آخری جملہ وعد اور وعید دونوں کو شامل ہے۔ وعید تو اس اعتبار سے کہ جس زندگی کی خاطر حال میں بخل سے کام لے رہے ہیں۔ یہ زندگی تو چند روزہ ہے اصل زندگی تو آخرت کی زندگی ہے جس کی واقعی اور اصلی فکر ہونی چاہیے اور وعد اس لحاظ سے کہ بہتر یہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں دادِ شجاعت اور دادِ سخاوت دے کر خدا کے حضور پیش ہو تاکہ وہ تمہیں اپنے بے پایاں انعامات سے نوازے۔

جہاد کی خاطر مطالبہ قیادت

یہ واقعہ بھی اسرائیلی تاریخ کا ہے جیسا کہ پہلا واقعہ ان کی تاریخ سے تعلق رکھتا ہے۔ بنی اسرائیل کی تاریخ سے چن کر اس موقعہ پر ان دو واقعات کو اس لیے پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمانوں کے لیے ایک سرمایہ بن جائے اور دعوتِ اسلامی کے کامیاب بنانے میں ان سے فائدہ اٹھایا جا سکے۔

دوسرا واقعہ بنی اسرائیل کے اس دور سے متعلق ہے جب وہ حضرت موسیٰ کی وفات کے بعد اقتدار و عزت سے محروم ہو چکے تھے، دشمنوں کے سامنے ذلیل ہو چکے اور ہدایتِ ربانی سے انحراف کے نتیجے میں مصائب کا شکار تھے۔ اس وقت بنی اسرائیل بنی اسماعیل کی چیرہ دستیوں کا شکار تھے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ کے عہد میں تقریباً سنہ ۱۵۰۰ ق م بنو اسماعیل تمام حجاز میں یمن سے شام تک پھیل گئے تھے۔ حضرت موسیٰ کے بعد قضاۃ بنی اسرائیل کے زمانے تقریباً سنہ ۱۲۰۰ قبل مسیح میں وہ عمالقہ و اہلِ مدین کے پہلو بہ پہلو سپاہیانہ جوہر کے ساتھ بنی اسرائیل پر چھاپہ مارتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سات برس تک لگاتار بنی اسرائیل اسماعیلیوں کے پنجہ میں گرفتار رہے۔ سال میں جب فصل تیار ہوتی اسماعیلی برق و باد کی طرح آتے اور سب کاٹ کر لے جاتے۔ آٹھویں برس بنی اسرائیل میں جدعون نامی ایک پہلوان پیدا ہوا۔ اس نے

اسماعیلیوں کو شکست فاش دی۔ طالوت کے عہد میں غالباً ۱۰۵۰ قبل مسیح میں بنو اسماعیل حجاز سے نکل کر بادیہ شام اور بادیہ عراق تک پھیل گئے تھے کیونکہ مورخین عرب کا بیان ہے کہ مکہ اور حجاز میں جب اسماعیل کی اولاد زیادہ ہو گئی تھی تو نجد و حدود عراق وغیرہ میں پھیل گئی۔ اس کی تائید روایات یہود سے بھی ہوتی ہے۔ اسی زمانہ کا یعنی حضرت موسیٰ سے کوئی تین صدی بعد اور حضرت داؤد سے کچھ ہی قبل کا یہ واقعہ ہے۔ بنی اسماعیل نے اسرائیلیوں سے فلسطین کے اکثر علاقے چھین لیے تھے۔

۷۰۶۔ اے پیغمبر کیا تم نے اس واقعہ پر غور نہیں کیا جو موسیٰ کے بعد بنی اسرائیل کے سرداروں کو پیش آیا۔ بنی اسرائیل کے سرداروں نے اپنے پیغمبر سے درخواست کی۔ سرداروں کے لیے اصل ارشاد الملاء آیا ہے۔ ملاء مطلق جماعت نہیں اہل حل و عقد یا اہل الرائے کی جماعت ہے توریت میں اس موقع پر اسرائیلی بزرگ ہے اس وقت بنی اسرائیل کے نبی حضرت شموئیل ہیں ۱۱۰۰ تا ۱۰۲۰ ق م ملک شام قدیم ایک کوہستانی علاقہ افرائیم کے نام سے تھا۔ اس کے شہر رامہ میں رہتے تھے۔ قرآن کی آیت بتا رہی ہے کہ گرے پڑے لوگوں اور پست قوموں میں جب زندگی کی دوبارہ امنگ پیدا ہوتی ہے تو اس کا آغاز عوام سے نہیں بلکہ خواص سے ہوتا ہے۔ یہاں قرآن نے الملاء سے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ ملاء سے مراد قوم کے اشراف و اعیان اور اکابر و سادات ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ قوم کے اشراف و اعیان ہوتے ہیں جو قوم کی چوپالوں، پنچایتوں، مجلسوں، کونسلوں اور اس کے درباروں کو پُر کرتے ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ بنی اسرائیل کے اہل فکر و نظر نے اپنے وقت کے پیغمبر سے درخواست کی تھی یعنی احوال کی تبدیلی کا احساس اولاً ان میں پیدا ہوا تھا جیسے ملک و قوم میں تباہی اور بربادی کا نقطہ آغاز قوم کے اشراف و اعیان ہوتے ہیں ایسے ہی قوم کی اصلاح کا مبداء بھی خواص ہوتے ہیں جب تک خواص میں تبدیلی کا احساس نہ ہو کامیابی نہیں ہوتی۔

سیاسی نظام کی تجویز

۷۰۷۔ ہم اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے ہمارے لیے ایک حکمران مقرر کر دیجئے۔ حضرت سموئیل سے بنی اسرائیل کے اعیان و اشراف نے درخواست کی۔ ہمارے لیے ایک حکمران مقرر کر دیجئے۔ اصل ارشاد میں لفظ ملک آیا ہے۔ عربی زبان میں اس کے معنے

میں بڑی وسعت ہے۔ ہر صاحب قوت و اقتدار جو اپنے احکام و قوانین نافذ کر سکے ملک ہے۔ اور یہاں ملک سے مراد امیر جیش یا سالار لشکر ہے اور یہی سیاق کے مطابق ہے۔ توریت میں اس موقعہ پر بادشاہ آیا ہے اور اسرائیلی تخیل میں بادشاہ کے لیے فوج کی سرداری لازمی تھی اور ہر سردار اعلیٰ کو بادشاہ کہتے تھے جیوز انسائیکلو پیڈیا میں ہے بادشاہ کا پہلا فرض یہ تھا کہ فوج کی امارت اور سپہ سالاری کرے (ج ۷، ص ۵۰۱) اور یہ تصریح بھی ہے کہ فلسطین میں تقریباً ہر بڑا سردار بادشاہ کہلاتا تھا (ج ۷، ص ۵۰۰) توریت میں اسی موقع کا بیان ان الفاظ میں ہے "تب سارے اسرائیلی بزرگ جمع ہو کر رامہ میں سموئیل کے پاس آتے اور اسے کہا کہ دیکھ تو بوڑھا ہوا اور تیرے بیٹے تیری راہ پر نہیں چلتے۔ اب تو کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو ہم پر حکومت کیا کرے جیسا کہ سب قوموں میں ہے، ہم تو بادشاہ چاہتے ہیں جو ہمارے اوپر مقرر ہو، تاکہ ہم اور سب گروہوں کی طرح ہوں اور ہمارا بادشاہ عدالت کرے اور ہمارے آگے آگے چلے اور ہمارے لیے لڑائی کرے" (سموئیل ۸، ۱۹، ۲۰)[1]

خلافت اور ملوکیت

بعض معاصر مفسرین کو بنی اسرائیل کی بارگاہ نبوت میں اس درخواست پر کہ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دو۔ بہت بڑی حیرت ہوئی اور ان کو یہ انکشاف کرنا پڑا کہ اس وقت بنی اسرائیل میں اس قدر جاہلیت آچکی تھی اور وہ غیر مسلم قوموں کے طور طریقوں سے اتنے متاثر ہو چکے تھے کہ خلافت اور بادشاہی کا فرق ان کے ذہنوں سے نکل گیا تھا اس لیے انہوں نے درخواست جو کی وہ خلیفہ کے تقرر کی نہیں بلکہ ایک بادشاہ کے تقرر کی تھی۔

یہ بات چند وجوہ سے محتاج تنقیح ہے

۱۔ قرآن نے ایک موقعہ پر بنی اسرائیل کو حضرت موسیٰ کی ایک تقریر کے حوالہ سے دو نعمتوں کی یاد دہانی کرائی ہے ایک نبوت، دوسرے بادشاہت، چنانچہ ارشاد ہے۔

یا قوم اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء و جعلکم ملوکا۔ واتاکم

---

[1] تفسیر ماجدی

مالم یؤت احدا من العالمین۔

یاد کرو اے میری قوم اللہ کی اس نعمت کو کہ اس نے تمہارے اندر نبی پیدا کیے اور تم کو بادشاہ بنایا اور وہ کچھ دیا جو دُنیا میں کسی کو نہیں دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ نبوّت اور حکومت دونوں اللہ کی نعمتیں ہیں اور اللہ نے بنی اسرائیل کو عطا فرمائی تھیں۔ چنانچہ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت یوسف کے زمانہ میں اور ان کے بعد بنی اسرائیل کو مصر میں حکومت ملی۔ مدّتِ دراز تک یہی اس زمانہ کی مہذب دُنیا کے سب سے بڑے فرماں روا تھے۔ اور ان کا سکہ ان اطراف میں رواں تھا۔ اس بنا پر یہ کہنا کہ بنی اسرائیل کی یہ درخواست کہ ہمارے لیے بادشاہ مقرر کر دو۔ ان کی جاہلیت سے متاثر ہونے کی وجہ سے تھی کچھ دُرست نہیں ہے کیونکہ جس چیز کو خود قرآن اللہ سبحانہ کی نعمت قرار دیتا ہے۔ اس کو جاہلی تاثر نہیں قرار دیا جا سکتا۔

۲۔ ملک صاحبِ اختیار و اقتدار کو کہتے ہیں۔ یہ اختیار و اقتدار دونوں طرح کا ہو سکتا ہے پابندِ شریعت بھی اور شریعت سے بے پروا اور آزاد بھی۔ نبوّت کے دامن سے وابستہ پابندِ شریعت اللہ کی نعمت ہے۔ بنی اسرائیل نے وقت کے پیغمبر سے اسی کی درخواست کی ہے۔ اگر نبوّت سے باغی اور شریعت سے آزاد اقتدار کی یہ درخواست ہوتی تو بارگاہِ نبوّت میں پیش نہ ہوتی۔ امرِ واقعہ یہ ہے کہ حضرت سموئیل کے تقرر سے اس بادشاہ کا تقرر ہوا اور توریت کی تفصیلات سے معلوم ہوتا ہے کہ نبوّت ہی کی ہدایات اور نبوّت ہی کی رہنمائی کے زیرِ اثر یہ بادشاہ تقرر کے بعد اپنے سارے فرائض انجام دیتا تھا۔ اس لیے یہ کہنا کہ بادشاہ کی درخواست بنی اسرائیل کے جاہلیت سے متاثر ہونے کی نشانی ہے کچھ وزن نہیں رکھتا ہے۔

بنی اسرائیل کا تو مجھے پتہ نہیں مگر یہ کہہ کر ہم اپنے مخاطبوں کو یہ تاثر دے رہے ہیں کہ معاذاللہ ہم میں تو بات کرنے کی جرأت ہے لیکن یہ جرأت بنی اسرائیل کے اس جلیل القدر پیغمبر میں نہ تھی۔

۳۔ وہی مصر جس کی حکومت دماغوں میں فرعونیت پیدا کرنے کی سبب بنتی رہی اور آج تک اس کا یہی حال ہے لیکن جب یوسف علیہ السلام کو اسی فرعونی حکومت کی سرزمین پر اقتدار و اختیار عطا کیا گیا تو اللہ کا یہ پیغمبر انعام ملتے ہی یہ آرزو کرتا ہے۔

فاطر السموات والارض انت ولیی فی الدنیا والآخرۃ توفنی مسلما

والحقنی بالصالحین۔

"قرآن نے حضرت سلیمان و حضرت داؤد کا چہرہ ایک بادشاہ کی حیثیت سے پیش کیا ہے اس لیے لفظ بادشاہ کوئی قابلِ نفرت چیز نہیں ہے۔ قابلِ نفرت تو وہ کردار و عمل ہے جو نبوت سے بغاوت کر رہا ہو۔ خلافت بھی اگر نبوت سے بغاوت کر جائے تو اس کا مقام بھی یہی ہے۔ بادشاہ اچھے اور بُرے دونوں ہوتے ہیں۔ ایک بادشاہ وہ بھی تھا جس نے حضرت موسیٰ سے مقابلہ کیا اور ایک بادشاہ حضرت موسیٰ بھی ہیں۔ قرآن کی سورۃ کہف میں ذوالقرنین کے نام سے جس تمثیلی واقعہ کا ذکر ہے میرے نزدیک اس واقعہ کے بارے میں یہ سوال کہ ذوالقرنین کون تھا؟ کہاں تھا اور کب تھا؟ غیر ضروری ہے۔ سوچنے اور سمجھنے کی اس میں بات یہ ہے کہ ایک ایسا بادشاہ جسے اتنا بڑا اقتدار عطا کیا گیا کہ گویا مطلع الشمس اور مغرب الشمس تک وہ پہنچ گیا اور اتنی مختلف زبانیں بولنے والی قوموں پر اس کو حکومت دی گئی اور سائنسی وسائل کی اتنی فراوانی کہ لوہے کی اینٹیں بنا کر بجائے گارے کے رانگ پگھلا کر دیوار بنائی۔ لیکن باوجود ان تمام باتوں کے اپنی اس سائینٹفک دیوار کی تعمیر سے جب فارغ ہوئے تو بجائے کسی کبر و ناز کے اپنی بندگی کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا

ھذا رحمۃ من ربی

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک سیاسی نظام میں اصل اہمیت اس کی صورت کی نہیں بلکہ اس کی رُوح کی ہے۔ اگر اس کی رُوح خدا اور رسُول کے قانون کے تابع ہے تو وہ قابلِ ستائش ہے۔ اس کی شکل کچھ بھی ہو۔ اگر رُوح خدا اور رسُول کی باغی ہے تو وہ قابلِ مذمت ہے عام اس سے کہ وہ ملوکیت ہو یا جمہوریت[1]

حضرت سموائیل کا شبہ

۱۰۸۔ نبی نے کہا کہ مجھے توقع نہیں ہے کہ تم ایسا کر سکو اگر تمہیں لڑائی کا حکم دیا گیا تو یہ بات ممکن ہے کہ تم نہ لڑو۔ یہ بات حضرت سموائیل نے کچھ تو اپنی فراستِ ایمانی اور کچھ اپنی قوم کی اُفتادِ طبع کے تجربوں کی بنا پر فرمائی یعنی ان کو معلوم تھا کہ بنی اسرائیل کے تنزل کا

---

[1] تدبرِ قرآن

باعث یہ نہیں ہے کہ وہ قیادت سے محروم ہیں یا میدانِ جنگ میں اُن کی کمان کرنے والا کوئی نہیں ہے بلکہ ان کی تمام نکبتوں، پستیوں اور شکستوں کا باعث یہ ہے کہ خطرناک حالات کا سامنا کرنے کے لیے ان میں قوتِ ایمانی نہیں ہے۔ اس وجہ سے حضرت سموایل نے ان کے اس مطالبہ کی صداقت کو شک کی نگاہوں سے دیکھا اور اس کی مخالفت کی۔ چنانچہ تورات میں ہے ___ لیکن وہ کلام جو انہوں نے کہا کہ کسی کو ہمارا بادشاہ مقرر کر جو حاکم ہو۔ سموایل کی نظروں میں بُرا معلوم ہوا۔ اور سموایل نے اللہ سے دُعا کی۔ خداوند نے سموایل سے کہا کہ لوگوں کی آواز پر اور اُن کی ساری باتوں پر جو تجھے کہیں کان دھر کہ انہوں نے تجھ کو حقیر نہیں کیا بلکہ مجھے حقیر کیا ہے۔ (سموایل ۸: ۶-۷)

لیکن قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کے اس مطالبے پر حضرت سموایل کا جو جواب نقل کیا ہے، وہ اس سے جدا اور بنی اسرائیل کی عادات و رسوم کے عین مطابق ہے۔

قرآن حکیم میں ہے کہ جب بنی اسرائیل نے حضرت سموایل سے بادشاہ کے تقرر کی درخواست کی تو انہوں نے ارشاد فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ایسا نہ ہو جب تم پر کوئی بادشاہ مقرر کر دیا جائے اور وہ تم کو دشمنوں سے مقابلہ کے لیے جہاد کا حکم دے تو تم بزدل ثابت ہو اور جہاد سے انکار کر جاؤ۔

بنی اسرائیل کا جواب

۹ مے ۔ سرداروں نے کہا کہ ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ ہم اللہ کی راہ میں نہ لڑیں حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے گئے اور اپنی اولاد سے علیحدہ ہو چکے ہیں۔ یعنی وہ بولے کہ واہ کہیں یہ بھی ممکن ہے کہ ہم نہ لڑیں۔ حکم شرعی سے قطع نظر ہم لوگ انتہائی مظلوم ہیں۔

اس زمانے میں فلسطینیوں کی جو شدید اور بے پناہ یورش اسرائیلیوں پر جاری تھی اور اسرائیل کا ملک جس بے اندازہ حد تک ان کے ہاتھوں تاراج ہو رہا تھا اس کی تفصیلات قدیم اسرائیلی مورخ جوزیفس کے صفحات اور یہود کی دوسری تاریخوں میں ملتی ہیں، توریت بھی ان معرکہ آرائیوں سے بالکل خالی نہیں ہے۔ ایک جگہ ہے۔ اور جب وہ باہم مقابل ہوتے تو اسرائیلی نے فلسطینیوں سے شکست پائی اور انہوں نے ان کے لشکر میں سے قریباً چار ہزار آدمی مارے　　اور دوسری جگہ سو فلسطینی لڑے اور بنی اسرائیل نے شکست کھائی۔ اور ہر ایک اپنے اپنے خیمہ کو بھاگا اور وہاں نہایت خونریزی ہوئی کہ تیس ہزار اسرائیلی مارے گئے اور خدا کا صندوق لوٹا گیا (سموایل ۴-۱۰)[1] وجہ اس کی یہ تھی کہ حضرت موسیٰ کے بعد تین سو

[1] ماجدی

سال تک بنی اسرائیل کا کوئی باقاعدہ مضبوط سیاسی نظام قائم نہ ہو سکا بلکہ قبیلوں اور خاندانوں میں سردار حکومت کرتے تھے اور ان کے مناقشات اور معاملات کے فیصلے قاضی انجام دیتے۔ اور نبی ان تمام امور کی نگرانی کے ساتھ ساتھ دین کی دعوت و تبلیغ اور اس کی نشر و اشاعت کی خدمت انجام دیتے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ ان قاضیوں میں سے کسی قاضی کو منصب نبوت عطا ہو جاتا اور اس تمام عرصہ میں بنی اسرائیل کا نہ کوئی بادشاہ تھا اور نہ تمام قوم کا ایک حکمران اور اسی لیے ہمسایہ قومیں اکثر ان پر حملہ آور ہوتی رہتی تھیں۔ اور بنی اسرائیل اُن کا نشانہ بنتے رہتے تھے کبھی فلسطینی چڑھ آتے، کبھی مدیانی حملہ آور ہوتے اور ان میں سے اگر کسی حملہ آور کو ہزیمت ہو جاتی پھر بھی وہ آئے دن چھاپے مارتے رہتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے۔ اس صورت حال سے تنگ آکر بنی اسرائیل کے اشراف و اعیان کو اپنا سیاسی نظام بنانے کی فکر لاحق ہوئی اور حضرت شموایل سے بادشاہ بنانے کی درخواست کی حضرت سموایل نے فرمایا کہ مجھے اندیشہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جب تم پر کوئی بادشاہ مقرر کیا جائے اور وہ تم کو دشمنوں کے مقابلہ میں جہاد کا حکم دے تو تم بزدل ثابت ہو، بنی اسرائیل نے بڑی قوت اور گرمجوشی سے جو جواب دیا ہے قرآن نے اس کو یہاں نقل کیا ہے۔ بولے یہ کیسے ممکن ہے کہ ہم جہاد سے انکار کر دیں جب کہ ہم خوب جانتے ہیں کہ ہم کو دشمنوں نے بہت زیادہ ذلیل کیا ہے۔ انہوں نے ہم کو ہمارے گھروں سے نکالا اور ہماری اولاد کو قید کر لیا۔

بنی اسرائیل کا جہاد سے فرار

۰ ۱۷۔ لیکن جب ایسا ہوا کہ ان پر جنگ فرض کی گئی تو ایک تھوڑی تعداد کے علاوہ سب نے پیٹھ دکھا دی اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ یعنی حضرت سموایل کا کہا بنی اسرائیل کے آگے آیا۔ اور بنی اسرائیل اتنے دعووں کے باوجود پست ہمت اور بزدلی کا شکار ہو گئے جوزیفس کی مشہور تاریخ یہود میں ہے، ان پر دہشت طاری ہو گئی، یعنی پہاڑوں میں چھپ گئے۔ بعض نے زیر زمین غاروں میں پناہ لی اور بہت سے لوگ تو اپنا ملک چھوڑ کر دریائے یردن عبور کر گئے" (باب ۶ فصل ۶) گویا حضرت سموایل کا اندازہ بالکل صحیح ثابت ہوا۔ انہوں نے تو اللہ کی ہدایت کے مطابق ان کے لیے امیر بھی مقرر کر دیا جیسا کہ آگے آرہا ہے اور جہاد کا حکم بھی دے دیا لیکن بنی اسرائیل نے اپنی عادت کے مطابق

گریز پائی اختیار کی۔ آگے تفصیلات آرہی ہیں۔

کچھ اجتماعی قوانین

اس سے معلوم ہوا کہ جس گروہ میں صبر و استقامت کی سچی رُوح نہیں ہوتی۔ اس میں بسا اوقات سعی و عمل کے ولولے پیدا ہو جاتے ہیں لیکن جب آزمائش کا وقت آتا ہے تو بہت کم نکلتے ہیں جو راہِ عمل میں ثابت قدم رہنے والے ہوں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ نے قوموں اور اُمتوں کے مزاج میں یہ بات رکھی ہے کہ جب ان کی اجتماعی زندگی اور آزادی خطرہ میں پڑ جاتی ہے اور کوئی طاقتور ان کو غلام بنانے کے خیال سے ظالمانہ رویہ اختیار کرتا ہے تو اپنے اس حق کی حفاظت اور ظالم کے دفاع کے لیے تشتت و افتراق چھوڑ کر اتحاد و اتفاق کی جانب متوجہ ہو جاتی ہیں اور اپنے لیے ایک سیاسی تنظیم کی تلاش شروع کر دیتی ہیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کا حضرت سموئیل سے یہ مطالبہ کہ ہمارے لیے بادشاہ مقرر کرو۔ اسی فطری تقاضے کے تحت ہے۔

قرآن نے جہاد کا ایک بنیادی مقصد فی سبیل المستضعفین بھی بنایا ہے۔ اسی کو فقہاء کی زبان میں دفع الشر عن العباد کہتے ہیں۔ بنی اسرائیل اعلاء کلمۃ اللہ کی حد تک نبوت کی رہنمائی میں زندگی بسر کر رہے تھے لیکن دفع الشر عن العباد کی حد تک وہ بے چینیوں کا شکار رہتے اور صرف اسی مقصد کے تحت وہ سیاسی تنظیم بنا کر مدافعت کرنا چاہتے تھے جیسا کہ وقد اخرجنا من دیارنا وابنائنا کی تعبیر بتا رہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر مسلمان کسی وقت نبوت کی رہنمائی میں بھی زندگی بسر کر رہے ہوں اور اُن کی دینی زندگی کو کوئی خطرہ نہ ہو لیکن ظلم و جور، استبداد اور چیرہ دستی ان کو اگر آنکھیں دکھا رہی ہو تو خالص چیرہ دستی کے مٹانے کی خاطر لڑنا بھی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں :

حضرت موسیٰ کے بعد کچھ عرصہ بنی اسرائیل کا کام درست رہا پھر جب ان کی نیت بگڑی تب ان پر ایک غنیم کافر بادشاہ جالوت نامی مسلط ہوا۔ ان کو شہر سے نکال دیا اور لوٹ لیا اور ان کو پکڑ کر بندہ بنا لیا۔ بنی اسرائیل بھاگ کر بیت المقدس میں جمع ہوئے۔ اس وقت شموائیل پیغمبر تھے ان سے درخواست کی کہ کوئی بادشاہ ہم پر مقرر کر دیجئے کہ اس کے ساتھ ہو کر ہم جہاد کریں، فی سبیل اللہ۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا ۚ قَالُوٓا أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ ۚ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ ۖ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٤٧﴾

اور اُن سے اُن کے پیغمبرؑ نے فرمایا کہ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو حکمران مقرر کیا ہے۔ وہ بولے ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ اُسے ہم پر حکمرانی مل جائے حالانکہ ہم اس سے کہیں زیادہ حکمران ہونے کے حقدار ہیں۔ اور پھر اُس کو مال و دولت کی وسعت بھی حاصل نہیں۔ پیغمبرؑ نے یہ سن کر فرمایا کہ اللہ نے طالوت ہی کو حکمرانی کے لیے تم پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے۔ اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں میں اُسے وسعت دی ہے۔ اور حکمرانی تمہارے دینے سے کسی کو نہیں مل سکتی اللہ جسے چاہتا ہے حکمرانی عطا فرماتا ہے۔ اللہ اپنی قدرت میں بڑی وسعت والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔

طالوت کی قیادت و فرماں روائی

حضرت سموئیل نے جب بنی اسرائیل پر حجت پوری کر دی تو اب اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں

درخواست پیش فرمائی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو بتایا کہ بنی اسرائیل کی درخواست منظور ہوئی اور ہم نے طالوت کو جو علمی اور جسمانی طور پر تم سے ممتاز ہے۔ تم پر بادشاہ مقرر کیا۔ بنی اسرائیل نے جب یہ سُنا تو ان کو یہ فیصلہ ناگوار ہوا اور ناگواری کا اظہار اعتراض کی صورت میں کیا۔ مورخین کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل میں ایک عرصہ سے نبوت کا سلسلہ سبط لاوی میں اور حکومت و سرداری کا سلسلہ سبط یہودا میں چلا آتا تھا تو اب جبکہ سموئیل علیہ السلام کے ارشاد کے مطابق یہ شرف بنیامین کی طرف منتقل ہونے لگا تو بنی اسرائیل کے ان سرداروں کو حسد پیدا ہوا اور وہ اس کو برداشت نہ کر سکے۔ شروع میں کسی بات کو مان لینا اور وقت پر انکار کر دینے کی یہ ادا بنی اسرائیل کی زندگی کا طغرائے امتیاز بن چکی تھی اس لیے یہاں بھی کار فرما رہی کیونکہ وہ یہ سمجھے ہوئے تھے کہ حضرت سموایل کی نظر انتخاب بہرحال ہم ہی میں سے کسی پر پڑے گی۔ اس لیے جب انہوں نے خلاف توقع بنیامین کے گھرانے سے ایک غریب مگر قوی اور عالم انسان کو اس منصب پر مامور دیکھا تو حسد کی آگ بھڑک اُٹھی اور بحث شروع کر دی۔ ان آیات میں اسی کو حسین طریقہ پر پیش کیا گیا ہے۔

حضرت سموایل کا چہرہ

۱۱ے۔ اور اُن سے اُن کے پیغمبر نے فرمایا۔ یہاں بھی پیغمبر سے حضرت سموئیل علیہ السلام مراد ہیں۔ اشموئیل عبرانی لفظ ہے اور عربی میں اس کا ترجمہ اسماعیل ہوتا ہے اور کثرت استعمال سے اشمویل، شمویل رہ گیا۔ مورخین کہتے ہیں کہ شمویل حضرت ہارون کی نسل سے ہیں۔ ان کا نسب نامہ یہ ہے۔ سموایل بن حنہ، بن عاقر ادبہ کی کڑیاں مذکور نہیں اور امام مقاتل کے بیان کے مطابق یہ نسب ہے سموایل ابن بالی بن علقمہ بن یرنام بن بہومین تھو بن صوف بن علقمہ بن باحث ابن عموص ابن عزاما۔ تورات میں بھی نسب نامہ اس کے لگ بھگ ہے۔ جو یہاں علقمہ ہے وہ تورات میں القانہ ہے۔ ان کی ولادت کا واقعہ بھی کچھ عجیب و غریب بیان کیا ہے حضرت سموایل کے نام سے دو صحیفے تورات میں موجود ہیں۔ پہلے صحیفہ میں آپ کی نبوت طالوت کی بادشاہی، حضرت داؤد کا جالوت کو قتل کرنا اور طالوت کی وفات تک کے واقعات مذکور ہیں اور اس میں کل ۳۱ باب ہیں۔ دوسرے صحیفہ میں طالوت کی وفات کے بعد حضرت داؤد کی حکومت اور طالوت کے بیٹوں سے ان کی لڑائی تک کے احوال مذکور ہیں اور اس میں ۲۴ باب ہیں[1]۔ اور سید رشید رضا

---

[1] حاشیہ اظہار الحق

رقم طراز ہیں کہ ان دونوں کی تاریخی اور روایتی حیثیت مشکوک ہے کیونکہ خود یہودیوں کو بھی ان دونوں صحیفوں کے کاتبوں کا پتہ نہیں ہے اور نہ ان کو یہ معلوم ہے کہ ان کا زمانہ کتابت کون سا ہے صرف نام کی نسبت کسی کتاب کی صحت کی ضمانت نہیں ہے[۱]

طالوت کا چہرہ

۲۴۷ ۔ اللہ نے تمہارے لیے طالوت کو حکمران مقرر کیا ہے ۔ طالوت ابن کش تاریخ میں بنی اسرائیل کے پہلے بادشاہ تسلیم کیے گئے ہیں۔ زمانہ حکومت سنہ ۱۰۲۸ تا سنہ ۱۰۱۲ ق م ہے۔ ان کا نام توریت میں ساول آیا ہے۔ تورات میں ان کے نصب حکومت کا تذکرہ بڑا طویل ہے اور خداوند نے شاول کے زمانے سے پہلے سموئیل کے کان میں کہہ دیا تھا کہ کل اسی وقت میں ایک شخص بنیامین کی سرزمین سے تیرے پاس روانہ کروں گا تو اس پر تیل ملیو کہ میری قوم اسرائیل کا حاکم ہو تا کہ میرے لوگوں کو فلسطینیوں کے ہاتھ سے چھڑائے ۔ سو جب سموایل ساول سے دوچار ہوا تو وہیں خداوند نے کہا کہ دیکھ یہی شخص ہے جس کی بابت میں نے تجھے کہا تھا یہی میرے لوگوں پر ریاست کرے گا ۔ (سموئیل ۹ - ۱۵، ۱۶، ۱۷)[۲]

طالوت کا نام بائبل میں ساول ہے ۔ یہ قبیلہ بن یمین کا ایک ۳۰ سالہ نوجوان تھا بنی اسرائیل میں اس سے زیادہ خوبصورت کوئی شخص نہ تھا اور ایسا قد آور تھا کہ لوگ اس کے کاندھے تک آتے تھے ۔ اپنے باپ کے گم شدہ گدھے کو تلاش کرنے نکلا تھا۔ راستہ میں جب سموایل نبی کی قیام گاہ کے قریب پہنچا تو اللہ تعالیٰ نے نبی کو اشارہ کیا کہ یہی شخص ہے جس کو ہم نے بنی اسرائیل کی بادشاہی کے لیے مقرر کیا ہے[۳]

اسے طالوت کیوں کہتے ہیں ؟ کچھ عجب نہیں کہ اپنے غیر معمولی قد و قامت کی وجہ سے وہ لوگوں میں اس لقب سے مشہور ہو گئے ہوں ۔ عربی اور عبرانی دونوں زبانیں قریب قریب ہیں۔ اس وجہ سے دونوں میں بہت سے مادے مشترک ہیں ۔ گمان ہوتا ہے کہ تورات نے ان کا ذکر نام سے کیا ہے اور قرآن نے لقب سے ۔ ورنہ پھر ماننا پڑے گا کہ ان کے نام کے بارے میں تورات کا نام غلط ہے اصل نام طالوت ہی ہے[۴]

---

[۱] تفسیر المنار [۲] ماجدی [۳] تفہیم القرآن [۴] تدبر قرآن

تورات میں طالوت کے حلیہ کی تفصیلات بھی بتاتی ہیں۔
"بہت خوب جوان تھا اور بنی اسرائیل کے درمیان اس سے زیادہ خوبصورت کوئی نہ تھا۔ (سموئیل ۹۔ ۱۰) اور وہ جب جماعت کے درمیان کھڑا ہوتا تو شانوں سے لے کر اوپر تک سب لوگوں سے زیادہ لمبا تھا۔ (سموئیل ۱۰، ۱۳) اور دراز قامتی اسرائیلیوں کے ہاں کوئی معمولی صفت نہیں، بڑی اہم اور ضروری صفت سرداری کے لیے تھی۔ توریت کے بعد ان کے ہاں کا مقدس ترین نوشتہ تالمود ہے۔ اس میں تصریح ہے خداوند تبارک و تعالیٰ اپنی سکینت کا نزول اس شخص پر کرتا ہے جو دراز قد ہو، دانشمند ہو، مضبوط ہو، متموّل ہو۔"
قرآن حکیم کی اس بلاغت کے قربان جائیے کہ اس نے نام ہی ایسا رکھا جس سے بلند قامتی کی طرف اشارا ہو جائے۔[1]

اس آیت نے یہ بات کھول دی کہ طالوت کا تقرر بواسطہ نبوّت اللہ کی جانب سے ہوا ہے یعنی حضرت سموئیل نے اللہ کی جانب سے بنی اسرائیل کو طالوت کے تقرر کی خبر دی ہے۔

بنی اسرائیل میں نسلی تعصب

۱۷۲۔ وہ بولے ایسا کیونکر ہو سکتا ہے کہ اسے ہم پر حکمرانی مل جائے حالانکہ اس سے کہیں زیادہ ہم حکمران ہونے کے حقدار ہیں۔ اور پھر اس کو مال و دولت بھی حاصل نہیں۔ بنی اسرائیل کے اپنے مطالبہ پر جب سموئیل نے سالار کے تقرر کی اللہ کی جانب سے اطلاع دی تو بجائے اس کے کہ خوشی سے اس کو قبول کرتے۔ انہوں نے اپنی عادت کے مطابق اس تقرر پر اعتراض کر دیا کہ یہ ہمارا سردار کیسے ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ تو اس منصب کے ہم خود حقدار ہیں[2] مقصود نبی کی تکذیب نہ تھی بلکہ ان کے اس تقرر کی اطلاع پر اعتراض حیرت و تعجب کو ظاہر کرنے کے لیے تھا۔ ایک خاص قبیلہ کی جانب سے اعتراض و انکار کا ذکر توریت میں بھی ہے، "بنی بعال بولے کہ یہ شخص ہم کو کس طرح بچائے گا اور اس کی تحقیر کی اور اس کے لیے نذرانے نہ لائے۔" (سموئیل ۱۰، ۲۷)
بنی اسرائیل حضرت یعقوب کی بارہ اولادوں کی نسل میں نسلی بنا پر ۱۲ فرقوں یا قبیلوں

---

[1] ماجدی [2] تدبر قرآن

میں بٹے ہوتے تھے۔ ان میں سب سے چھوٹا قبیلہ بن یامین کا تھا اور تورات میں تصریح ہے کہ طالوت اسی قبیلے سے نسبی تعلق رکھتے تھے۔ یہی وجہ تھی اُن کے حقیر سمجھے جانے کی، چنانچہ حضرت سموئیل نے ان کے تقرر کا اُن سے ذکر کیا تو انہوں نے بڑی خاکساری سے یہ الفاظ بیان کیے کہ

> کیا میں بن یمینی یعنی بنی اسرائیل کے سب سے چھوٹے قبیلہ سے نہیں ہوں اور کیا میرا گھرانہ بن یمینی کے قبیلہ کے سب گھرانوں میں سب سے چھوٹا نہیں۔ (اسموئیل ۹: ۲۱)

نسل و خاندان کی اہمیت جب جائز حدود سے بڑھ جاتی ہے تو ہندوؤں کی طرح ذات پات کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اسرائیلیوں کا بھی یہ عقیدہ ہو گیا تھا کہ نبوت حق مخصوص ہے نبی لاوی کا اور حکومت حق ہے قبیلہ بنی یہوداکا۔ جیسے آج عام ہندوؤں کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی کہ کوئی شخص جو برہمن نہ ہو چھتری نہ ہو وہ حاکم اعلیٰ کیسے تسلیم کیا جاسکتا ہے۔

کیا خلافت قریش کا حق ہے

مشہور ہے کہ خلافت میں دوسری شرائط کے ساتھ قریشی ہونا بھی ایک شرط لازم ہے لیکن کیا واقعی اسلام کا مطالبہ یہ ہے۔ جہاں تک قرآن و سنت، آثارِ صحابہ اور تمام دلائل شرعیہ کا تعلق ہے کوئی نص قطعی موجود نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ اسلام نے معاملۂ خلافت و امامت کو صرف قریش کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔ احادیث اس بارے میں جس قدر موجود ہیں سب صحیح ہیں، یہ بھی مروی ہے کہ حضرت ابوبکرؓ نے مجمع صحابہ میں اس کو پیش کیا اور کسی نے انکار نہیں کیا۔ یہ بھی درست ہے کہ صحابہ میں ہمیشہ اس بات کی شہرت رہی، اور یہ بھی غلط نہیں ہے کہ جب تک خاندانِ عباسیہ باقی رہا لوگ اس کو بطور ایک شرط سمجھتے رہے لیکن ان ساری باتوں کی وہ حقیقت نہیں ہے جو اب سمجھی جاتی ہے۔ ان ساری باتوں کے صحیح ہونے کے ساتھ یہ بھی صحیح ہے کہ اسلام نے اسرائیلیوں کی طرح خلافت کو نہ کسی قوم میں مخصوص کیا ہے اور نہ کسی خاندان میں۔ اسلام جو اس طرح کے تمام نسلی امتیازات مٹانے اور ہمیشہ کے لیے صرف ایمان کی بے قید و عام عظمت قائم کرنے اور عمل کے قانونِ الٰہی کے آخری اعلان کے لیے آیا تھا۔ اس کے نام سے ساری باتیں مانی جاسکتی ہیں لیکن اس کا وہم بھی نہیں ہوسکتا کہ اس نے خاندان و نسل کا کوئی امتیاز تسلیم کیا ہو۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ امتیازِ

نسب کے جس بت کو خود اس نے توڑا ہوا سی کے ٹکڑوں کو پھر جوڑ کر از سرِ نو ایک نیا بت خانہ قائم کر دے۔ اس پر تفصیلی بحث کے لیے آپ کو کافی انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہو گی انشاءاللہ اس کے تفصیلی مباحث آپ کو ۲۶ پارے میں ملیں گے۔

بہرحال اسرائیلیوں کا پہلا اعتراض نسلی تعصب کی بنیاد پر تھا۔ دوسرا اعتراض ان کا یہ تھا کہ مالی اعتبار سے بھی طالوت اس منصب کے لائق نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کے اس مباحثہ سے ان کا کردار سامنے آتا ہے ان کا مطالبہ تو یہ تھا کہ ایک بادشاہ مقرر کیا جائے جس کی ماتحتی میں وہ راہِ خدا میں جہاد کریں مگر جب بادشاہ مقرر کر دیا گیا تو سر اکڑ گئے گردنیں تن گئیں۔ اللہ سبحانہٗ کے تقرر کو چیلنج کرنے لگے اور کہنے لگے کہ طالوت بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے نہ وہ کوئی شاہی نسل سے ہے اور نہ اس کے پاس مال و دولت کی فراوانی ہے۔ یہ فکر کی وہ بے راہروی ہے جو بنی اسرائیل کا مزاج تھا۔

حضرت سموئیل کا بنی اسرائیل کو جواب

۴۷ اے پیغمبر نے یہ سن کر فرمایا کہ اللہ نے طالوت ہی کو تم پر برگزیدگی عطا فرمائی ہے اور علم کی فراوانی اور جسم کی طاقت دونوں میں اسے وسعت دی ہے۔ حضرت سموئیل نے بنی اسرائیل کو بتایا کہ طالوت کیوں بادشاہ بننے کا مستحق ہے اور اللہ سبحانہٗ نے اس کو کیوں مقرر کیا ہے حضرت سموئیل نے پہلا جواب تو یہی دیا ہے کہ طالوت کا یہ تقرر انسانی نہیں بلکہ خدائی ہے ان اللہ اصطفاہ علیکم یعنی اللہ نے حاکمیت کے معاملے میں طالوت کو تم پر بزرگی عطا فرمائی ہے۔ اس میں حاکم ہونے کی پوری پوری صلاحیت موجود ہے اس لیے ہر طرح یہی مناسب و پُر مصالح ہے ایسا کہ تمہارا ذہن ان باریک مصالح تک نہیں پہنچ سکتا۔ توریت میں اس مقام پر ہے کہ، اور سموئیل نے کہا کہ تم اسے دیکھتے ہو جسے اللہ نے مقرر کیا کہ اس کی مانند سارے لوگوں میں ایک بھی نہیں ہے،۔ (سموئیل ۱۰، ۲۴)

دوسرا عقلی جواب یہ دیا کہ تم اپنے معیار سے بھی دیکھ لو۔ تمہارے معیار سے فوج کے سربراہ میں دو چیزیں ہونی ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ اسے سپہ سالاری کا فن آتا ہو وہ طالوت کو حاصل ہے دوسرے یہ کہ اس میں جسمانی توانائی ہو اس میں بھی طالوت تم سے ممتاز ہے۔ گویا حضرت سموئیل نے۔ بنی اسرائیل کے معترضین اور نکتہ چین سرداروں کی نکتہ چینی کا جواب دیتے

ہوئے فرمایا:
میں پہلے ہی جانتا تھا کہ تمہاری پستی اور بزدلی تمہارے وقتی جوش اور ولولہ کو کبھی پائیدار نہیں رہنے دے گی اور وقت آنے پر تمہاری یہ گرم جوشی برف کی طرح سرد ہو کر رہ جائے گی چنانچہ تم نے اب اسی لیے حیلہ جوئی شروع کر دی۔ تم کو یہ معلوم ہونا چاہیے کہ حکمرانی کا جو معیار تم نے سمجھ لیا ہے یعنی وسعتِ مال اور کثرتِ دولت اور اونچی ذات کا ہونا تو یہ قطعاً غلط اور سرتاسر باطل ہے۔

اللہ سبحانہ کے نزدیک حکمران کے اوصاف میں قوتِ علم اور طاقتِ جسم ضروری ہیں کیونکہ یہی دو وصف حسنِ تدبیر، صحتِ فکر اور جرأت و شجاعت کے ضامن ہیں اور ان اوصاف میں طالوت تم سب میں ممتاز ہے۔

۱۷۵۔ اور حکمرانی تمہارے دینے سے کسی کو نہیں مل سکتی، اللہ جسے چاہتا ہے حکمرانی عطا فرماتا ہے اللہ اپنی قدرت میں بڑی وسعت والا ہے۔ چونکہ طالوت کی قوم میں پہلے سے سلطنت نہ تھی۔ ان کی نظر میں طالوت سلطنت کے قابل نظر نہ آتے اور بوجہ مال و دولت اپنے آپ کو لائق خیال کیا نبی نے فرمایا کہ سلطنت کسی کا حق نہیں اللہ کی دین ہے سلطنت کی بڑی لیاقت عقل اور بدن میں طاقت ہے جس میں طالوت تم سب سے افضل ہے۔

دراصل حضرت سموایل نے بنی اسرائیل کو اپنے جواب میں بتایا کہ طالوت کا تقرر اللہ نے چار باتوں کی وجہ سے کیا ہے۔ اوّل استعدادِ فکری، دوم وسعتِ علم، سوم صحت اور جسم کی توانائی، چہارم اللہ کی توفیق۔ تین باتوں کو پہلے بیان فرمایا ہے۔ اب اس آیت میں چوتھی بات کو بیان کیا جا رہا ہے اور اسے علیحدہ اس کی اہمیت کے پیش نظر پیش کیا گیا ہے اور چونکہ پہلی تین باتوں کا تعلق آدمی کے ان اوصاف سے ہے جن کی بنا پر اس منصب کے لیے مقرر کیا جاتا ہے۔ توفیقِ بندہ کے اوصاف میں سے نہیں اور نہ بندہ کو اپنی محنت و کوشش کو اس میں دخل ہے اس لیے اسے علیحدہ اور مستقل عنوان سے بیان فرمایا۔

اللہ کی مشیت اور اسباب

اس سے یہ لطیف نکتہ معلوم ہوا کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے

تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس عالم طبیعت میں اللہ بلاسبب اور بغیر قانون کرتا ہے۔ یہاں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہو رہا ہے اللہ کی مشیت سے ہو رہا ہے۔ اللہ جب کسی کو اپنے قانون اور اپنی سنت کے مطابق بادشاہ بنانا چاہتا ہے تو پہلے اس میں استعداد فراہم کرتا ہے اور بعد ازیں اس کی کوشش کے لیے اسباب فراہم کرتا ہے گویا بیک وقت دو باتیں جمع ہوتی ہیں ایک اس کی ذات میں دوسری اس کی ذات سے باہر لوگوں میں۔

عام زبانوں پر مشہور حدیث کما تکونون یولی علیکم میں اس طرف اشارہ ہے مطلب یہ ہے کہ جیسے تم ہو گے ویسے ہی تم پر حکمران ہوں گے الدر المنتشرۃ فی الاحادیث المشتہرۃ میں لکھا ہے کہ یہ حدیث ابن جمیع نے معجم میں بحوالہ ابو بکر اور بیہقی نے شعب الایمان میں بحوالہ یونس بن اسحاق آئی ہے لیکن حدیث منقطع ہے۔ ایسے مواقع پر لوگوں کو ان آیتوں سے شبہ ہو جاتا ہے جن میں یہ ذکر ہے کہ اگر خدا چاہتا تو ان کو ہدایت دیتا۔ اس لیے وہ غلطی سے یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ خود اللہ تعالیٰ ہی ان کافروں کو ہدایت سے جبراً روکے ہوتے ہے حالانکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ از خود اسلام قبول نہیں کر سکتے کیونکہ اس کے لیے ان میں کوئی ارادہ، کوئی طلب کوئی خواہش نہیں ہے۔ اب صرف یہی صورت ہے کہ اللہ ان کو زبردستی مسلمان بنانا چاہے مگر ایسے زبردستی سے مسلمان یا کافر بنانا اللہ کے جاری قانون کے خلاف ہے۔

بہرحال اس فقرے میں بتایا گیا ہے کہ اقتدار و اختیار اللہ کی دین ہے جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور جس کو دیتا ہے اپنی حکمت کے تقاضوں کے تحت دیتا ہے۔ اس کا اقتدار سب کے اقتداروں کو محیط اور اس کا علم ہر چیز پر حاوی ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں ـــــ اللہ سبحانہ نے طالوت کے تقرر پر ان کے اعتراض کا تین طرح سے جواب دیا ہے اول یہ کہ بادشاہ ہونے کے سبب حقیقی اللہ کا تقرر ہے اور یہ نسبی قابلیت سے بالکل بے نیاز ہے یعنی اس کے یہاں تقرر نسب ناموں سے نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ کہ بادشاہ ہونے کے اسباب طالوت میں موجود ہیں، علم کی وسعت، جسم کی صحت و توانائی اس کے لیے ضروری ہے۔ مال و دولت کی کثرت کوئی معیار نہیں ہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ و رسول کے فیصلہ کے بعد اس پر کوئی اعتراض نہ ہونا چاہیے نہیں اس فیصلے کے سامنے بلا چون و چرا سر نگوں ہو جانا چاہیے۔

قرآن اور معیار استحقاق منصب

قرآن کی اس آیت نے اس ذہن کی قطعی طور پر تردید کر دی جس میں اقوام دنیا مبتلا ہیں کہ

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَنْ يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ تَحْمِلُهُ
الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ﴿۲۴۸﴾

رکوع ۳۲ ۱۶

اور اُن سے اُن کے پیغمبر نے کہا کہ طالوت کے اللہ کی جانب سے مقرر ہونے کی علامت یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے مقدس تابوت تمہارے پاس واپس[۱] آئے گا۔ اس تابوت میں تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے لیے دلجمی کا سامان[۲] ہے اور جو کچھ موسیٰ اور ہارون کے گھرانے اپنی مقدس یادگاریں چھوڑ گئے ہیں اُن کا بقیہ[۳] ہے اور جس کو فرشتے اٹھائے ہوئے ہوں گے۔ اگر تم مومن ہو تو اس واقعے میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے۔

قیادت و حکومت صرف اسی شخص کا حق ہے جو دولت و ثروت کا مالک اور سرمایہ داری میں نمایاں حیثیت رکھتا ہو اور حسب و نسب میں بھی بلند مرتبہ ہو۔ اقوامِ دُنیا کا حکومت کے بارے میں یہ تصور اس درجہ عام رہا ہے کہ جو قومیں تہذیب و تمدن اور علم و دانش کی علمبردار رہی ہیں وہ بھی اس معاملہ میں جاہلیت کے دوش بدوش نظر آتی ہیں۔ اسلام نے اس جاہلی نظریہ پر پہلی ضرب کاری لگائی اور واضح کیا ہے کہ اللہ کے نزدیک حکومت و امامت، قیادت و خلافت کا تعلق ــــ

۱۔ نہ دولت و ثروت سے وابستہ ہے۔

وَالْوَالِدٰتُ يُرْضِعْنَ اَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ اَرَادَ
اَنْ يُّتِمَّ الرَّضَاعَةَ ۭ وَعَلَى الْمَوْلُوْدِ لَهٗ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ
بِالْمَعْرُوْفِ ۭ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ اِلَّا وُسْعَهَا ۚ لَا تُضَاۗرَّ وَالِدَةٌۢ
بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُوْدٌ لَّهٗ بِوَلَدِهٖ ۤ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذٰلِكَ ۚ فَاِنْ
اَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِّنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا ۭ وَاِنْ
اَرَدْتُّمْ اَنْ تَسْتَرْضِعُوْٓا اَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ اِذَا سَلَّمْتُمْ مَّآ
اٰتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوْفِ ۭ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ۝

اور جو شخص ماں سے اپنے بچے کو دُودھ پلوانا چاہے تو اس صورت میں چاہیے کہ ماں اپنے بچہ کو دو سال دُودھ پلاتے اور جس کا بچہ ہے اس پر لازم ہے کہ ماں کے کھانے کپڑے کا دستور کے مطابق انتظام کرے۔ کسی شخص پر اُس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔ نہ تو ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے اور نہ باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے، اور وارث پر بھی عورت کا کھانا کپڑا اسی طرح ہے۔ پھر اگر والدین باہمی رضامندی

اور صلاح و مشورہ سے دُودھ چھڑانا چاہیں تو اُن پر کوئی گناہ نہیں[۶۸۴]
ہے اور اگر تم چاہو کہ اپنے بچوں کو دُودھ پلواؤ تو اس میں بھی کوئی
گناہ نہیں ہے بشرطیکہ جو کچھ اُن کو دینا کیا تھا دستور کے مطابق
اُن کے حوالے کر دو[۶۸۵]- اور دیکھو ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو
اور یقین کر لو کہ جو کچھ بھی تم کرتے ہو وہ اللہ دیکھ رہا ہے۔

یہ معنے لیے گئے ہیں اور یہ جو فرمایا ہے کہ جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتا ہے اس کو نصیحت کی جاتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسے ہی لوگ نصیحت کے لائق ہیں اور ان ہی سے توقع ہے کہ یہ اللہ سبحانہٗ کی نصیحتوں کو قبول کریں گے۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ اللہ اور یوم آخر پر ایمان کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ بندہ ان احکامِ الٰہیہ کا پورا پورا پابند ہو۔ اور جو لوگ ان احکام کی پیروی میں کوتاہی کرتے ہیں وہ سمجھ لیں کہ ان کے ایمان میں خلل ہے۔

حضرت شیخ الہند کے لفظوں میں ذالک یوعظ سے آیت کا حاصل یہ ہوا ہے کہ "حکم جو مذکور ہوتے ان سے اہل ایمان کو نصیحت دی جاتی ہے وہ ہی منتفع ہوتے ہیں اور یوں تو نصیحت سبھی کے لیے ہے کسی کی خصوصیت نہیں اور مومنین کے خاص کرنے سے دوسروں پر تہدید اور ان کی تحقیر بھی مفہوم ہوتی ہے۔ یعنی جو لوگ ان حکموں پر عمل نہیں کرتے گویا ان کو اللہ اور یوم آخر پر ایمان ہی نہیں ہے"[۱]

۶۷۹- اور اللہ جانتا ہے تم نہیں جانتے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اُن کے دلوں کی باتوں کو اور آئندہ کے نفع و نقصان کو خوب جانتا ہے اور تم نہیں جانتے۔

مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ ہی کو علم ہے کہ ان احکام میں تمہارے اخلاق و اعمال کے لیے کس قدر پاکیزگی اور طہارت کا سامان ہے اور ان میں تمہاری اجتماعی مصلحتیں کس قدر ہیں اور کتنے مفاسد سے اس کے ذریعہ تمہاری حفاظت کی گئی ہے۔ تمہیں اس کا صحیح علم نہیں

---

[۱] افادات شیخ الہند

ہے کیونکہ تمہارا علم خواہشوں سے آلودہ اور اوہام سے ملوث رہتا ہے۔ انسان انسان ہے خواہ کہیں کا باشندہ ہو۔ خواہ انسانی زندگی کا کتنا طویل تجربہ رکھتا ہو لیکن اس کے علم محدود کی رسائی ان احکام تک نہیں ہوتی ہے۔

بچوں کو دودھ پلانے کے احکام

طلاق کی صورت میں ایک نہایت اہم مسئلہ چھوٹے بچوں کی پرورش کا تھا۔ ماں باپ کی علیحدگی کے بعد دودھ پیتے بچوں کی پرورش کا کیا انتظام ہو۔ اس بارے میں طرح طرح کی خرابیوں کا اندیشہ تھا ان کا سدباب کیا گیا۔ زیادہ خطرہ ایسی حالت میں ماں کو نقصان کا تھا کہ طلاق کی وجہ سے جدائی ہو گئی ہے اور مادرانہ محبت کی وجہ سے مجبور ہے کہ بچہ کو دودھ پلاتے۔ حکم دیا گیا کہ دودھ پلانے تک اس کا خرچ باپ کے ذمہ ہوگا اور دودھ کی مدت کو جس ماں سے پورا کرانا چاہیں یا جس صورت میں باپ سے دودھ پلانے کی اجرت ماں کو دلوانا چاہیں تو اس کی مدت دو سال کامل ہیں۔ ساتھ ہی اس بارے میں دو بنیادی قاعدے بھی واضح کر دیئے۔ نہ تو ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے نقصان پہنچایا جاتے اور نہ باپ کو۔ نیز کسی پر اس کی وسعت سے زیادہ خرچ کا بار نہیں پڑنا چاہیے۔ سب سے پہلے یہ یاد دہانی کرائی کہ مطلقہ ماں پر اپنے بچہ کے بھی کچھ فرائض ہیں۔ اس کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ ہو سکتا ہے کہ میاں بیوی کے اختلافات کے نتیجے میں مادری جذبات بھی سرد پڑ جائیں اور بچہ کو اس کی سزا بھگتنی پڑے۔ اللہ سبحانہٗ اپنے بندوں پر والدین سے بھی زیادہ مہربان ہے۔ اس لیے فرمایا کہ

۶۸۰۔ اور جو شخص ماں سے اپنے بچہ کو دودھ پلوانا چاہے تو اس صورت میں چاہیے کہ مائیں اپنے بچوں کو دو سال دودھ پلائیں۔ یعنی ماں کو حکم ہے کہ اپنے بچہ کو دو برس تک دودھ پلاتے اور یہ مدت اس کے لیے ہے جو ماں باپ بچہ کے دودھ پلانے کی مدت پورا کرنا چاہیں ورنہ اس میں کمی بھی جائز ہے جیسا کہ آگے آ رہا ہے اور اس حکم میں وہ مائیں بھی داخل ہیں جن کا نکاح باقی ہے اور وہ بھی جن کو طلاق مل چکی ہے یا ان کی عدت بھی گزر چکی ہو۔ ہاں اس قدر فرق ضرور ہے کہ نان نفقہ منکوحہ اور عدت والی عورت کا تو ہر حال میں شوہر کے ذمہ

لازم ہوگا دُودھ پلائے یا نہ پلائے اور عدت ہو جانے کے بعد صرف دُودھ پلانے کی وجہ سے نان و نفقہ دینا پڑے گا[1]

بچہ کی ماں چونکہ بچہ کی تربیت اور اس کی اصلاح وغیرہ کی کمالِ شفقت کی وجہ سے زیادہ نگرانی کر سکتی ہے اس لیے شیر خوار بچوں کی پرورش کے انتظام کی خاطر اس کو مقدم فرمایا اور ترجیح دی اور فرمایا کہ مائیں اپنے بچوں کو دُودھ پلایا کریں۔ یہ حکم استحبابی ہے۔ اور کچھ بزرگوں نے اس حکم کو وجوبی قرار دیا ہے۔ لیکن یہ وجوب قانونی نہیں بلکہ دیانتہً ہے۔ یعنی اگر کوئی ماں بلا کسی عُذر اور مجبوری کے دودھ پلانے سے انکار کرے تو آخرت میں اس سے باز پُرس ہوگی لیکن دُنیا میں قانونی طور پر اسے مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اور عدالت میں اس بنیاد پر اس کے خلاف استغاثہ دائر نہ ہو سکے گا۔

دو سال پورے کرنے کے لیے باپ کے ارادے کی شرط لگا دی ہے تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ اگر کوئی اس مدت کی تکمیل نہ کرنا چاہے تو پہلے بھی دُودھ چھڑا سکتا ہے۔ جیسے اسی آیت میں آگے آرہا ہے۔ باقی دو سال سے زیادتی تو اس کا یہاں ذکر نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں صرف اس مدت کا تذکرہ کیا گیا ہے جس مدت تک ماں کو دودھ پلانا اور باپ کو دُودھ پلوانے کی اُجرت دینے کا تعلق ہے۔

دُودھ پلانے کی مدت

آیت سے معاشرتی زندگی کے دو قانون معلوم ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ عورت پر اپنے بچہ کو پورے دو سال دُودھ پلانے کی ذمہ داری ہے۔ اگر طلاق دینے والا شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت رضاعت کی مدت پوری کرے۔ دوسرا یہ کہ پوری مدتِ رضاعت دو سال ہے۔ جب تک کوئی عذر مانع نہ ہو بچہ کا حق ہے کہ یہ مدت پوری کی جائے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دودھ پلانے کی پوری مدت دو سال ہے۔ اس کے بعد دُودھ نہ پلایا جائے علم صحت ابدان اور نفسیات نے آج یہ حقیقت ثابت کر دی ہے کہ دو سال بچے کی صحت اور نفسیاتی نشوونما کے لیے انتہائی اہم ہیں۔ لیکن اللہ سبحانہٗ نے اس انسانی تجربہ سے پہلے ہی یہ حکم

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

دے کر مسلمانوں پر بہت احسان فرمایا ہے اور نسلِ انسانی کو اس کی لااہلیت کی نذر نہیں کیا۔
اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ مطلقہ عورت کو دُودھ پلانے کی اُجرت صرف دو سال ملے گی۔ یہ بات کہ دُودھ پلانے کی خود مدت کتنی ہے۔ اس میں جمہور عُلماء کا یہی خیال ہے کہ ہر بچّہ کو دُودھ پلانے کی مدت دو سال ہے لیکن دُودھ پلانے کی اس مدت میں جس پر حکم تحریم مرتب ہوتا ہے عُلماء کا اختلاف ہے۔ جمہور کا خیال یہی ہے کہ حرمتِ رضاعت جس عرصہ میں ثابت ہوتی ہے وہ دو سال ہے۔ یعنی بچّہ دو سال کی عمر تک اگر کسی عورت کا دُودھ پیئے گا تو اس پر رضاعت کے احکام لاگو ہوں گے۔ صحابہ میں حضرت عمر، عبداللہ بن عباس عبداللہ بن مسعود، ابوہریرہ، عبداللہ ابن عمر، اور ائمہ میں امام شافعی، امام احمد، امام سفیان ثوری، امام مالک، امام محمد، امام ابو یوسف اور ایک روایت میں امام ابوحنیفہ کی یہی رائے ہے۔ البتہ قرآن حکیم کی دوسری آیت کی بنا پر امام ابوحنیفہ کے نزدیک اگر تیس مہینے یعنی ڈھائی سال کے عرصہ میں بھی دُودھ پلا دیا تو احکامِ رضاعت ثابت ہو جائیں گے۔ اور اگر بچّہ کی کمزوری کی بنا پر ایسا کیا گیا تو گناہ بھی نہ ہوگا۔ اس کی تفصیلی بحث انشآ اللہ سورۂ نسآ میں آئے گی۔

۱۸۶۔ اور جس کا بچّہ ہے اس پر لازم ہے کہ ماں کے کھانے کپڑے کا دستور اور قاعدے کے مطابق انتظام کرے۔ یعنی باپ کو بچّہ کی ماں کو کھانا کپڑا یعنی نان و نفقہ ہر حال میں دینا پڑے گا۔ منکوحہ ہونے کی صورت میں اس لیے کہ وہ اس کے نکاح میں ہے اور معتدہ ہونے کی صورت میں اس لیے کہ وہ عدّت میں ہے اور ان عورتوں کو جن کی عدّت ختم ہو چکی ہے اور بچّہ کو دُودھ پلا رہی ہیں اس لیے کہ دُودھ پلانے کی یہ اُجرت ہے اور بچّہ کے ماں باپ ایک دوسرے کو بچّہ کی وجہ سے تکلیف نہ دیں۔ مثلاً ماں بلاوجہ دُودھ پلانے سے انکار کرے یا باپ بلا سبب ماں سے بچّہ کو جُدا کر کے کسی اور سے دودھ پلوائے یا کھانے کپڑے میں تنگی کرے۔[1]

دُودھ پلانے کی حالت میں باپ کے ذمّے کھانے اور کپڑے کا ذکر کر کے سمجھا دیا کہ جس طرح عورت کو دُودھ پلانا ضروری ہے اسی طرح اس شخص پر جس کے لیے بچّہ جنا جاتا ہے

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

یعنی باپ پر عورت کا کھانا کپڑا دو صورتوں میں مرد پر واجب ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ عورت کا کھانا کپڑا دو صورتوں میں مرد پر واجب ہوتا ہے ایک جبکہ عورت نکاح میں ہو دوسرے جبکہ وہ عدت میں ہو۔ اور ان ہی دو صورتوں میں ماں کو حکم دیا گیا ہے کہ اگر کوئی عذر نہ ہو تو وہی دُودھ پلاتے کیونکہ اگر بچہ کے باپ کی منکوحہ اور معتدہ نہ ہو تو وہ اجنبی ہے۔ اجنبی عورت اگر دُودھ پلاتے گی تو اس کو دُودھ پلانے کی اُجرت دی جائے گی اور بچہ کا باپ اس کو دُودھ پلانے کی مزدوری دے گا نہ یہ کہ اس کے کھانے کپڑے کا ذمہ دار ہو گا۔ اور سوچنے کی بات ہے کہ جب ان دونوں حالتوں یعنی منکوحہ اور معتدہ ہونے کی صورت میں پہلے ہی عورت کا نان و نفقہ واجب ہے تو پھر رضاعت میں نان و نفقہ کی قید لگا کر یہ بتایا ہے کہ عورت کا نان ونفقہ تو اس کی خدمت اور پابندی کی وجہ سے مرد پر ضروری ہے اور جب وہ بچہ کو دودھ پلائے گی تو منکوحہ ہونے کی صورت میں یقیناً خدمت میں کوتاہی ہو گی اور معتدہ ہونے کی صورت میں عدت کی پابندی کے ساتھ اس پر ایک ذمہ داری کا اضافہ ہو گا۔ لہٰذا یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ اب نان و نفقہ میں بھی کمی ہونی چاہیے۔ اس مصلحت سے فرمایا کہ نان و نفقہ کا وجوب بدستور رہے گا۔ منکوحہ کے کھانے کپڑے میں کمی نہ ہو گی اور معتدہ جب تک عدت میں ہے اس کو نان و نفقہ کے علاوہ کچھ لینے کا حق نہ ہو گا کیونکہ ان دونوں حالتوں میں دیانۃً اور اخلاقاً دُودھ پلانا واجب ہے۔ خلاصہ یہ کہ اس آیت سے دو قانون معلوم ہوئے۔

۱۔ مطلقہ پر اپنے بچہ کو پورے دو سال دُودھ پلانے کی ذمہ داری ہے۔ اگر طلاق دینے والا شوہر یہ چاہتا ہے کہ عورت یہ رضاعت کی مدت پوری کرے۔

۲۔ اس مدت میں بچے کے باپ پر مطلقہ کے کھانے کپڑے کی ذمہ داری ہے اور اس معاملہ میں دستور کا لحاظ ہو گا یعنی شوہر کی حیثیت، عورت کی ضروریات اور مقامی حالات کو پیش نظر رکھ کر فریقین فیصلہ کریں گے کہ عورت کو نان و نفقہ کے طور پر کیا دیا جائے گا۔

آیت میں بالمعروف کا مطلب یہ ہے کہ دُودھ پلانے کے زمانے میں جس قسم کے کھانے کپڑے کا دستور ہو یا جو عدالت اپنی رائے سے دونوں کی حالت دیکھ کر مقرر کر دے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ

۶۸۲۔ کسی شخص پر اس کی وسعت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جاتے نہ تو ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے نقصان پہنچایا جاتے اور نہ باپ کو اس کے بچہ کی وجہ سے، اس کے جس قدر

احکام ہیں خواہ وہ عورت کے لیے ہوں یا مرد کے لیے ہوں جوان کے لیے ہوں یا بوڑھے کے لیے، بیمار کے لیے ہوں یا تندرست کے لیے، غریب کے لیے ہوں یا مالدار کے لیے۔ ہر شخص کے حسب حال اور اس کی حالت کے مناسب ہیں۔ وہ کسی شخص کو ایسا حکم نہیں دیتا جو اس کی بساط اور طاقت سے زیادہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ

۱۔ اگر عورت کی عدت پوری ہو چکی ہو اور نکاح کا کوئی تعلق باقی نہ رہا ہو۔ تب عورت کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ مرد سے دودھ پلانے کی اُجرت طلب کرے۔ خواہ انکار کر دے۔ اس پر قانوناً کوئی جبر نہیں ہے۔ ہاں دیانتہً اسے یہ کام کرنا چاہیے۔ البتہ اگر بچہ کسی اور عورت کا دودھ نہیں پیتا۔ یا کوئی انا ہی نہ ملے اور بازاری دودھ بچے کو نقصان دیتا ہو تو بچہ کی ماں کو دودھ پلانے پر مجبور کیا جائے گا۔

۲۔ اسی طرح اگر عورت دودھ پلانے پر رضامند ہو اور اُجرت بھی مناسب مانگتی ہو اور عورت کے دودھ میں کوئی خرابی نہ ہو تو ماں کا حق برتر ہو گا اور مرد کو یہ حق نہ ہو گا کہ وہ کسی اور عورت کو ترجیح دے اور ماں کو چھوڑ کر کسی انا سے دودھ پلوائے۔

۳۔ ہاں اگر ماں کے دودھ میں کوئی خرابی ہو اور اس سے بچہ کو نقصان پہنچتا ہو تو بے شک باپ کو حق ہو گا کہ وہ بجائے ماں کے کسی انا سے دودھ پلوائے۔ اسی طرح اگر ماں انا سے زیادہ اُجرت مانگتی ہو تو باپ کو اس زیادتی کے قبول کرنے پر مجبور نہ کیا جائے گا اور اس کو یہ حق ہو گا کہ وہ انا سے دودھ پلوائے اور ایسی حالت میں جب باپ زیادہ اُجرت مانگنے کی وجہ سے بچہ کو ماں کی بجائے انا سے دودھ پلوائے اور ماں یہ مطالبہ کرے کہ بچہ کو میرے پاس رکھا جائے تو انا کو اس کے پاس رکھ کر دودھ پلوانا غرض لاتضار والدۃ بولدھا نہ تو ماں کو اس کے بچہ کی وجہ سے نقصان پہنچایا جائے گا اور نہ باپ کو اس کا مفہوم اس قدر عام ہے کہ اس میں ہر ایک کو نقصان سے بچانے کی رعایت رکھی گئی ہے۔ اور ہر جہت سے رکھی گئی ہے۔ مدعا یہ ہے کہ بچے کی صحیح پرورش ہو۔ ان دونوں فقروں سے عملی زندگی کے لیے یہ دو قانون معلوم ہوئے۔

۱۔ فریقین میں سے کسی پر طاقت سے زیادہ بوجھ نہ ڈالا جائے۔

۲۔ نہ بچے کے بہانے سے ماں کو کوئی نقصان پہنچایا جائے اور نہ بچہ کی آڑ لے کر باپ پر کوئی ناروا بوجھ ڈالا جائے۔

بچہ کی ماں اور اُجرت کا مطالبہ

اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ اگر بچہ کی ماں دُودھ پلانے کی اُجرت کا مطالبہ کرتی ہے تو جب تک اس کے نکاح میں ہے یا طلاق کی عدت میں ہے اسے اُجرت کے مطالبہ کا حق نہیں ہے۔ نان ونفقہ جو شوہر کے ذمہ ہے وہی کافی ہے مزید اُجرت کا مطالبہ باپ کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے۔ ہاں عدت گزر جانے پر وہ بچہ کے باپ سے اُجرت مانگ سکتی ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔

یتیم بچہ کو دُودھ پلانا

۶۸۳۔ اور وارث پر بھی عورت کا کھانا کپڑا اسی طرح ہے یعنی اگر باپ مرجاوے تو بچہ کے وارثوں پر بھی یہی لازم ہے کہ دُودھ پلانے کی مدت میں اس کی ماں کے کھانے کپڑے کا خرچ اٹھائیں اور تکلیف نہ پہنچائیں اور وارث سے مراد وہ وارث ہے جو عورت کا محرم بھی ہو[1]

اصل ارشاد وعلی الوارث مثل ذالک ہے اور وارث پر اسی جیسا ہے۔ اس میں دو باتیں تنقیح طلب ہیں۔ وارث سے کون مراد ہے اور "اسی کا" اشارا آیت میں کس طرف ہے۔ وارث کی حد تک آئمہ قانون کا اختلاف ہے۔ امام شافعی اور امام مالک وارث سے باپ کا وارث مراد لیتے ہیں اور وہ خود دُودھ پینے والا بچہ ہے اور مطلب یہ بتاتے ہیں کہ باپ کے مرنے کے بعد بچہ کے اخراجات کی پابجائی بچہ کے مال میں سے کی جائے گی اور امام احمد، امام ابوحنیفہ وارث سے خود بچہ کا وارث مراد لیتے ہیں۔ یعنی اگر بچہ مرجائے تو جو اُس بچہ کے وارث شرعاً ہوں گے ان پر بچہ کے ان اخراجات کی ذمہ داری ہو گی جو بچہ کے باپ پر تھی لیکن امام ابوحنیفہ یہ شرط لگاتے ہیں کہ وہ وارث ہونے کے ساتھ محرم بھی ہو۔ اور محرم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس بچہ اور اس کے وارث میں ایسا رشتہ ہو کہ اگر دونوں میں سے ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت فرض کر لیا جائے تو دونوں میں ازدواجی

---

[1] افادات شیخ الہند

تعلق حرام ہو مثلاً بھائی، چچا، دادا، بہن، ماں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر باپ زندہ نہ ہو تو بچے کو دودھ پلانے یا پلوانے کا انتظام اس شخص کی ذمہ داری ہے جو بچہ کا جائز وارث اور محرم ہو۔ اگر ایسے وارث ایک سے زیادہ ہوں تو ہر ایک پر بقدر میراث ذمہ داری تقسیم ہو گی۔

نابالغ بچہ کی کفالت

اسی سے امام اعظم نے عملی زندگی کا یہ قانون بھی معلوم کیا ہے کہ نابالغ یتیم بچوں کے اخراجات کی ذمہ داری دودھ چھڑانے کے بعد وارثوں پر ہو گی۔ کیونکہ دودھ کو درجہ مقصودیت حاصل نہیں مقصد تو بچے کی پرورش اور تربیت ہے۔ اس لیے تربیت کی ساری ضروریات کی ذمہ داری وارثوں پر ہو گی۔ اگر بچے کے ماں اور دادا دونوں زندہ ہیں تو یہ دونوں اس بچہ کے محرم بھی ہیں اور وارث بھی۔ اس لیے اس کا نفقہ ان دونوں پر بقدر میراث ہو گا۔ یعنی ایک تہائی ماں کے ذمہ اور دو تہائی دادا کے ذمہ ہو گا۔[1]

نادار رشتہ داروں کی کفالت

امام ابوحنیفہ نے اسی آیت سے یہ قانونی نکتہ بھی معلوم کیا ہے کہ شیرخوار بچہ کی کفالت جو دوسروں پر واجب کی گئی ہے اس کی علت یہی ہے کہ بچہ بذات خود چھوٹے ہونے کی وجہ سے اپنی پرورش کے لیے دوسروں کا محتاج ہے۔ احتیاج اور ضرورت مندی کے اشتراک علت سے محتاج عورتوں، اپاہج مردوں اور نابالغ بچوں کے مصارف ان رشتہ داروں کے ذمہ ہیں۔ حافظ ابن کثیر رقمطراز ہیں کہ یہی حضرت فاروق اعظم اور جمہور سلف کی رائے ہے۔ ابن قدامہ نے امام احمد کی بھی یہی رائے لکھی ہے کہ فرد پر ہر اس رشتہ دار کی کفالت واجب ہے جس کے مرنے پر وہ اس کا وارث ہو سکتا ہو۔ امام احمد نے اس رائے کے حق میں قرآن حکیم کی اسی آیت سے استدلال کیا ہے جس میں وارث کو نفقہ کے وجوب کا سبب بتایا ہے۔ اس طور سے امام احمد کے نزدیک ماں باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، پوتے، نواسے وغیرہ صلبی رشتہ داروں کے علاوہ بھائی، بہن، چچا زاد بہنیں، پھوپھی، بھتیجی وغیرہ کی کفالت بھی واجب ہو گی۔ لیکن امام

---

[1] معارف القرآن

ابوحنیفہ کے نزدیک مذکورہ بالا صلبی رشتہ داروں کے علاوہ صرف ان اعزہ کی کفالت واجب ہو گی جن سے فرد کوئی رحمی قرابت رکھتا ہو اور جن کا وہ محرم ہو۔ اس بنیاد پر چچازاد بھائی کا نفقہ واجب نہ ہوگا۔ امام صاحب کے نزدیک اصول اور فروع کے علاوہ باقی رشتہ داروں میں کفالت کا مدار رحمی قرابت ہے نہ کہ وراثت۔

اگر ایک نادار فرد کے نفقہ کے متعدد ذمہ دار موجود ہوں تو یہ ذمہ داری ان میں کس طرح تقسیم کی جائے۔ اس کے بارے میں فقہا کے درمیان خاصا اختلاف ہے۔ ہمارے نزدیک قابل ترجیح وہ رائے ہے جو علامہ کاشانی نے بدائع الصنائع میں اختیار کی ہے۔ یعنی ہر محتاج فرد کی کفالت کی ذمہ داری اس کے وارثوں پر ان کے حصہ وراثت کی نسبت سے تقسیم کر دی جائے گی۔ یہی امام احمد کی رائے ہے۔

دوسری تنقیح طلب بات اس آیت میں مثل ذالک کا اشارہ ہے۔ اصل میں اس ارشاد وعلی الوارث مثل ذالک کا پیوند ترکیبی وعلی المولود لہ رزقھن وکسوتھن بالمعروف سے ہے۔ درمیان کے دو فقرے دو ضمنی باتوں کو سمجھانے کے لیے آئے ہیں۔ لفظ ذالک عربی زبان میں اشارۂ بعید کے لیے آتا ہے تو اس کا مشار الیہ اس کے قریب نہیں اس سے دور ہونا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے بچہ کی خوراک و پوشاک کی ذمہ داری والد پر ہے۔ اسی طرح والد کے مرجانے کے بعد بچہ کے وارث پر ہے۔ بعض علماء نے ذالک کا اشارہ قریب یعنی لاتضار والدۃ کے مضمون جملہ کو قرار دیا ہے یعنی جیسے والد کی طرح وارث کو بھی نقصان نہ پہنچایا جائے لیکن اس میں کوئی معنویت نہیں ہے کیونکہ نقصان نہ پہنچانے میں وارث کی کوئی خصوصیت نہیں ہے۔ بہرحال اس آیت میں ہماری عملی زندگی کے لیے یہ قانون بتایا گیا ہے کہ اگر بچہ کا باپ وفات پا چکا ہو تو بعینہ یہی پوزیشن مذکورہ ذمہ داریوں اور حقوق کی بجا آوری میں بچہ کے وارث کی ہو گی۔

بچہ کا دودھ چھڑانا

۶۸۴ - پھر اگر والدین باہمی رضامندی اور صلاح و مشورے سے دودھ چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ یعنی اگر ماں باپ کسی مصلحت کی وجہ سے دو سال کے اندر ہی بچہ کی مصلحت کا لحاظ کر کے باہمی مشورہ و رضامندی سے دودھ چھڑانا چاہیں تو اس میں

کوئی گناہ نہیں ہے مثلاً ماں کا دودھ اچھا نہ ہو[1]

مطلب یہ ہے کہ اگر بچے کے والدین رضامندی اور باہمی مشورے سے یہ ارادہ کر لیں کہ بچے کی شیر خوارگی کی مدت یعنی دو سال سے کم میں ہی دودھ چھڑا دیں خواہ ماں کی معذوری کی وجہ سے ایسا کیا جائے یا بچے کی کسی بیماری کے پیش نظر ایسا کیا جائے تو اس میں کوئی گناہ کی بات نہیں[2] گویا بتا دیا کہ مدت میں کمی کی گنجائش ہے۔ یہ ایسی تحدید نہیں کہ اس سے نیچے آنا ناجائز ہو۔ کیونکہ قرآن نے پہلی آیت میں حولین کاملین فرما دیا تھا۔ کاملین سے یہ بات مفہوم ہو رہی ہے کہ شاید ایک روز بھی کمی روا نہیں ہے۔ اس لیے فرمایا کہ حولین سے پہلے اگر کوئی دودھ چھڑانا چاہے تو کوئی حرج نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ کمال کا مرجع زیادت ہے یعنی اس سے زیادہ اگر پلا یا گیا تو یہ جائز نہیں ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے علامہ نسفی کے اس موقف پر بھرپور تنقید کی ہے کہ اس آیت میں توسیع کی طرف اشارا ہے اور مطلب یہ ہے کہ دو سال سے زیادہ یا کم میں کوئی دودھ چھڑانا چاہے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ایسا ہو تو پھر دو سال کی تحدید میں کوئی معنویت نہیں ہے۔ دراصل ابوحنیفہؒ کا دودھ پلانے کی مدت میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ان کے نزدیک بھی دو سال ہیں بلکہ اختلاف اس میں ہے کہ بچے نے دو سال ۶ ماہ کی عمر میں اگر کسی عورت کا دودھ پی لیا تو رضاعت ثابت ہوگی یا نہیں۔ ابوحنیفہ حملہ وفصالہ ثلاثون شہراً کی وجہ سے حرمت کے قائل ہیں۔ صاحب دُرِ مختار رقمطراز ہیں الخلاف فی التحریم اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ اپنی جگہ آئے گی۔

۶۸۵۔ اور اگر تم چاہو کہ اپنے بچوں کو دودھ پلواؤ تو اس میں بھی کوئی گناہ نہیں ہے بشرطیکہ جو کچھ ان کو دینا کیا تھا دستور کے مطابق ان کے حوالہ کر دو۔ یعنی اے مردو اگر تم کسی ضرورت اور مصلحت سے ماں کے سوا کسی دوسری عورت سے دودھ پلوانا چاہو تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے مگر اس کی وجہ سے ماں کا کوئی حق نہ روکا جائے اور نہ کاٹا جائے بلکہ دستور کے مطابق جو کچھ ماں کو دینا ٹھہرایا تھا وہ دے دو[3] اور یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ دودھ پلانے والی کا حق نہ کاٹے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہاری مصلحت کا تقاضا یہ ہو کہ تم

---

[1] افادات شیخ الہند [2] معارف القرآن [3] افادات شیخ الہند ۰

اپنی اولاد کو ماں کی بجائے کسی انا سے دودھ پلوانا چاہو تو ایسا کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے بشرطیکہ جو کچھ تم نے انا کو دینا کیا ہو وہ اس کو دستور کے مطابق دے دو۔ اور یا یہ کہ بشرطیکہ اُن کے حقوق کی پاسبجائی میں کوئی کوتاہی نہ کرو اور اس کا نان ونفقہ وغیرہ جو کچھ دینا ہے قاعدے کے مطابق بچہ کی ماں کو دے دو۔ خلاصہ یہ ہے کہ ماں کا حق قاعدے کے مطابق ادا کرو۔

بعض حضرات نے بالمعروف کو انیتم کے متعلق کیا ہے۔ اب مطلب یہ ہوگا کہ جو ماں کو دستور کے مطابق دینا کیا تھا یعنی معروف سے مراد یہ ہے کہ معاملہ صاف کرو۔ وہ کھانے کپڑے پر تمہارے بچے کو دودھ پلائے گی یا تنخواہ لے گی یا دونوں۔ اور اگر تنخواہ لے گی تو کیا لے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ماں دودھ پلانے پر راضی ہے لیکن باپ یہ دیکھتا ہے کہ ماں کا دودھ بچہ کے لیے نقصان دہ ہے تو ایسی حالت میں اس کو حق ہے کہ ماں کو دودھ پلانے سے روکے اور کسی انا سے پلوائے۔ اور یہ بھی معلوم ہوا کہ جس عورت کو دودھ پلانے پر رکھا جائے، اس سے معاملہ تنخواہ کا پوری صفائی کے ساتھ طے کر لیا جائے تاکہ بعد میں جھگڑا نہ ہو اور وقت مقررہ پر یہ اُجرت اس کے سپرد کر دے [1]

آیت کے آخر میں رضاعت کے سارے قانون کو تقویٰ الٰہی سے مربوط کر دیا ہے۔ یہ ایک عمیق اور لطیف شعور ہے کہ اس کے بغیر ان احکام کی رُوح تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ اور نہ بغیر تقویٰ کے ان کی پاسبجائی ہو سکتی ہے کیونکہ تقویٰ ہی ہر معاملے میں بس کی گانٹھ ہے۔ یعنی ان احکام پر پوری طرح کاربند ہو جاؤ کسی قسم کی کوتاہی نہ کرو۔ اور اس یقین کے ساتھ عمل کے میدان میں قدم رکھو کہ اللہ سبحانہ تمہارے اعمال کے ایک ایک گوشہ کو دیکھ رہا ہے اور اس کے نتیجے میں تمہارا ایک ایک عمل درج رجسٹر ہو رہا ہے۔ وقت آ رہا ہے کہ تمہیں تمہارے اعمال کی جزا ملے گی۔ اگر تم یہاں حقوق کی پاسبجائی کرو گے اور اولاد کے معاملے میں خانگی زندگی باہمی مشاورت اور رضامندی سے چلاؤ گے اور مضرتوں سے دامن بچا کر رکھو گے تو اللہ تعالیٰ دنیا میں تمہاری اولاد کو تمہاری آنکھوں کی ٹھنڈک، دلوں کی مسرت وشادمانی کا سامان بنائے گا اور آخرت میں تمہارے لیے یہ ثواب اور اجر وجزا کا ذریعہ ہوں گے۔

---

[1] معارف القرآن

وَالَّذِيْنَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُوْنَ اَزْوَاجًا يَّتَرَبَّصْنَ
بِاَنْفُسِهِنَّ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّعَشْرًا ۚ فَاِذَا بَلَغْنَ اَجَلَهُنَّ فَلَا
جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا فَعَلْنَ فِيْٓ اَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوْفِ ۗ وَاللّٰهُ بِمَا
تَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۲۳۴﴾

اور جو لوگ تم میں سے وفات پا جائیں اور اپنے پیچھے بیویاں چھوڑ جائیں تو ان کو چاہیے کہ چار ماہ دس روز تک عدت وفات میں اپنے آپ کو روکے رکھیں۔ پھر جب وہ یہ مدت پوری کر لیں تو (انہیں اپنے معاملے کا اختیار ہے) وہ جو کچھ اپنے بارے میں دستور کے مطابق کریں۔ اس کا تم پر کوئی الزام نہیں ہے۔ اور تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ کو اس کو پوری خبر ہے۔

بیوہ کی عدت

دُنیا کے عمرانی اور معاشرتی مسائل میں وفات کے بعد بیوہ کا مسئلہ بھی کچھ کم اہمیت نہیں رکھتا۔ بیوہ کے ساتھ دُنیا کے کسی دوسرے مذہب نے کوئی خاص توجہ نہیں کی بلکہ بعض مذہبوں نے تو بیوہ کو زندہ رہنے کے حق ہی سے محروم کر دیا۔ اسلام نے بیوہ کو زندہ رہنے پوری طرح زندہ رہنے کا سہاگنوں ہی کی طرح زندہ رہنے کا حق عطا کیا ہے۔ اور یہ باب بھی

جہاں تک دُنیوی برکتوں کا تعلق ہے اسلام کا ایک روشن ترین باب ہے ۔ اسلام سے پہلے وہ عورت جس کا شوہر مرجاتا رسوم ورواج کی انتہائی سختیاں گوارا کرتی تھی ۔ خود عربوں میں یہ رواج تھا کہ وہ بیوہ عورت کو ایک پرانے گھر میں بری حالت میں بٹھا دیتے ۔ اور ایک سال تک اسے خوشبو لگانے یا اچھے کپڑے پہننے کی اجازت نہ دیتے ۔ جب سال پورا ہوجاتا تو اسے بہت سی جاہلی رسمیں پوری کرنی پڑتیں ۔ کبھی وہ اونٹنی کی مینگنیاں پھینکتی اور کہیں اسے گدھے اور بکری پر سوار کیا جاتا ۔ جب اسلام آیا تو اس نے عورت کے جسم ناتواں سے یہ سارا بوجھ اتار دیا ۔ اور اس کو شوہر کی محرومی کے ساتھ ساتھ معاشرے کی طرف سے کی جانے والی زیادتیوں سے بچالیا اور اسے شائستہ اور مطمئن زندگی گزارنے کے حقوق عنایت کیے ۔

۶۸۶ ۔ اور جو لوگ تم میں سے وفات پاجائیں اور اپنے پیچھے بیوی چھوڑ جائیں تو اُن کو چاہیے کہ چار ماہ دس روز تک عدتِ وفات میں اپنے آپ کو روکے رکھیں ۔ پہلے گزر چکا ہے کہ طلاق کی عدت میں تین حیض انتظار کرے ۔ اب فرمایا کہ موت کی عدت میں چار مہینے دس دن انتظار کرے ۔ اس مدت میں اگر معلوم ہوگیا کہ عورت کو حمل نہیں تو عورت کو نکاح کی اجازت ہوگی ورنہ وضع حمل کے بعد اجازت ہوگی ۔ اس کی تشریح سورۂ طلاق میں آئے گی ۔ حقیقت میں تین حیض یا چار مہینے دس دن حمل کے انتظار اور اس کے دریافت کرنے کے لیے مقرر فرمائے ۔ [1]

یہ عدتِ وفات ان عورتوں کے لیے بھی ہے جن سے شوہروں کی خلوتِ صحیح نہ ہوئی ہو ۔ البتہ حاملہ عورت اس سے مستثنیٰ ہے ۔ اس کی عدتِ وفات وضع حمل تک ہے ، خواہ وضع حمل شوہر کی وفات کے بعد ہی ہوجائے یا اس میں کئی مہینے صرف ہوں ۔ [2]

مطلقہ عورت کی عدت میں ہم بتا چکے ہیں کہ اس کی عدت کی بڑی وجہ استبراء رحم ہے ۔ تاکہ حمل کا معاملہ صاف ہوجائے اور نسب میں کسی قسم کی غلطی واقع نہ ہو ۔ یہاں بھی یہی مقصود ہے ۔ نیز یہ عدت اس غم اور افسوس کو بھی شامل ہے جو خاوند کے مرجانے سے عورت کو پیش آتا ہے اور نکاح جیسی نعمت کے چھن جانے سے جو صدمہ ہوتا ہے ۔

---

[1] افادات شیخ الہند [2] تفہیم القرآن

اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ کوئی عورت جو اللہ پر ایمان رکھتی ہے اور قیامت کے دن کا یقین رکھتی ہے اس کو یہ حلال نہیں ہے کہ وہ کسی مُردے پر تین دن سے زیادہ سوگ کرے سوائے اپنے شوہر کے کہ اس پر چار ماہ دس روز سوگوار رہے۔ اگرچہ نکاح کی نعمت سے محرومی تو طلاق میں بھی ہوتی ہے لیکن طلاق میں میاں بیوی کو کچھ نہ کچھ دخل ہوتا ہے اور موت کی وجہ سے جو نعمت سلب ہوتی ہے اس میں کسی کو بھی دخل نہیں ہوتا۔ اس لیے یہاں عدت کی میعاد طلاق کی مدت سے زیادہ کر دی۔ اور چونکہ طلاق میں خاوند زندہ ہوتا ہے اس لیے استبراء رحم کے لیے تین حیض رکھے اور یہاں چونکہ خاوند موجود نہیں ہے جو استبراء رحم کے معاملہ میں ایک واقف کار اور رازدان فریق ہوتا ہے۔ اس لیے عدت کی میعاد میں اضافہ کر دیا۔ اور چونکہ اس عدت میں استبراء کے ساتھ عورت کے سوگ کی بھی رعایت ہے اس لیے سوائے حاملہ کے ہر بیوہ کے لیے عدت مقرر کی ہے چاہے وہ صغیرہ ہو یا اس سے خلوت نہ ہوئی ہو۔ حاملہ کی بحث انشاء اللہ سورۂ طلاق میں آئے گی۔

عدت میں احداد کا حکم

یہودی مذہب میں بیوہ عورت ایک بھائی کے مرنے کے بعد اس کے دوسرے بھائی کی ملک ہوتی تھی۔ وہ جس طرح چاہتا اس سے معاملہ کرتا۔ عیسوی مذہب میں یہ جبری قانون تو جاتا رہا مگر وہ کوئی دوسرا ایسا ہی پہلو نہ پیش کر سکا۔ ہندوؤں میں اب اس کی زندگی کی ضرورت ہی نہ سمجھی جاتی تھی۔ اب اس کو اپنے شوہر کی چتا سے لپٹ کر جل کر مر جانا چاہیے۔ اور اگر زندہ رہے تو اس کی صورت یہ ہے کہ وہ دنیا کی تمام آرائشوں اور لذتوں سے علیحدہ ہو کر ساری عمر سوگ میں گزارے، عربوں کا رواج پہلے پڑھ چکے ہو۔ اسلام آیا تو اس مظلوم کی فریاد رسی ہوئی۔ اس نے سب سے پہلے تو یہ کیا کہ ان کے غیر محدود سوگ کے زمانے کو محدود کر دیا۔ یعنی چار ماہ دس روز اور صرف اسی مدت میں یہ حکم دیا کہ اس مدت میں بناؤ سنگار نہ کریں جیسے خوشبو لگانا، مہندی لگانا، سرمہ لگانا، زیور پہننا، رنگے ہوئے کپڑے پہننا، اس کو احداد کہتے ہیں۔ احداد کے معنے لغت میں روک دینے کے ہیں۔ اسی سے دربان کو حداد کہتے ہیں کیونکہ وہ اندر آنے سے روکتا ہے

اور اسی لیے سزا کو حد کہتے ہیں کیونکہ وہ گناہ سے روکتی ہے اسی بنا پر امام اعظم کے نزدیک حدود کی حیثیت گناہوں کے لیے زواجر کی ہے کفارے کی نہیں ہے۔ علامہ ابن درستویہ فرماتے ہیں۔ احداد کے معنے یہاں عدت والی عورت کا اپنے کو زینت، بناؤ سنوار اور ازدواجی تعلق کے پیغام سے روکنے کے ہیں۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں حضرت اُم سلمہ کے حوالہ سے حضرت اُم حبیبہ کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ

میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے برسرِ منبر یہ بات سنی ہے کہ کسی عورت کے لیے جو اللہ پر ایمان اور قیامت کے دن پر یقین رکھتی ہو تین دن سے زیادہ سوگ جائز نہیں ہے ہاں شوہر پر وہ چار ماہ دس روز سوگ کر سکتی ہے۔

اور بخاری و مسلم میں حضرت اُم عطیہ کے حوالہ سے آتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

کوئی عورت کسی میت پر تین دن سے زیادہ سوگ نہ کرے ہاں بیوی اپنے شوہر کے مرنے پر چار ماہ دس روز سوگ کرنے کی مجاز ہے۔ وہ نہ رنگین کپڑے پہنے لیکن یمنی چادریں اس میں داخل نہیں ہیں اور نہ سرمہ لگائے اور نہ خوشبو لگائے۔

الغرض بناؤ سنگار کرنا، خوشبو لگانا، مہندی لگانا، سرمہ لگانا، زیور پہننا، رنگے ہوئے کپڑے پہننا، بلا ضرورت گھر سے نکلنا یہ سب باتیں اجمالاً حرام ہیں۔ اور عدت میں جو باتیں بیوہ کو ممنوع ہیں وہی باتیں اس عورت کو بھی منع ہیں جسے طلاق بائنہ ملی ہو۔ یہ امام ابو حنیفہ، ابو عبید، ابو ثور اور کچھ مالکیہ اور کچھ شوافع کا مذہب ہے۔ نیز یہ حکم چھوٹی بچی اور غیر مسلم عورت کا نہیں ہے یعنی ان پر احداد نہیں ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۃ طلاق میں ملے گی۔

اپنے آپ کو روکے رکھیں سے یہاں مراد صرف یہی نہیں کہ وہ اس مدت میں نکاح نہ کریں بلکہ اس سے مراد اپنے آپ کو ان باتوں سے بھی روکنا ہے جن کا ذکر پڑھ چکے ہو۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ آیا اس زمانے میں عورت گھر سے نکل سکتی ہے یا نہیں۔ حضرت عمر، حضرت عثمان، حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت اُم سلمہ، حضرت سعید بن المسیب، حضرت ابراہیم نخعی اور آئمہ اربعہ اس کے قائل ہیں کہ زمانہ عدت میں عورت کو اسی گھر میں رہنا چاہیے جہاں اس کے شوہر نے وفات پائی ہے دن کے وقت کسی ضرورت سے وہ باہر جا سکتی ہے مگر رات کو قیام اسی گھر میں ہونا چاہیے۔ اس کے برعکس حضرت عائشہ، ابن عباس، حضرت علی، حضرت جابر، حضرت عطاء

بدر کے دن میں نے لڑائی میں حصہ لیا۔ ذرا واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں پڑے ہوئے فرما رہے ہیں یا حی یا قیوم پھر میں میدان میں گیا اور لڑا، پھر واپس آیا تو حضور کو اسی حال میں پایا۔ (فتح الباری)

سجدے سے سر اٹھایا جاتا ہے، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھے ہوتے ہیں، تن اور بدن کا ہوش باقی نہیں ہے، مونڈھوں سے چادر مبارک گر گئی ہے لیکن کامل انہماک اور استغراق، دل کی ساری قوت و توجہ اصرار اور الحاح کے ساتھ زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں؛

یا اللہ! آپ کو یاد دلاتا ہوں اپنا عہد اور اپنا وعدہ اے اللہ اگر آپ چاہیں تو آپ کی بندگی نہ ہو۔ اے اللہ اگر یہ مٹھی بھر اسلام کے نام لیواؤں کی جماعت تباہ ہوگی تو تیری زمین میں بندگی نہ ہوگی۔ (بخاری و مسلم)

وعدے کے باوجود اللہ اور اللہ کی نصرت کو جس بے قراری سے آج ڈھونڈھا جا رہا ہے کہ بقول حضرت عبداللہ بن مسعود ہم نے کسی گم شدہ چیز کے طالب کو تلاش و جستجو میں ایسا نہیں سنا جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے اللہ کی مدد کو تلاش کرتے تھے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کو کامیابی سے ہمکنار کرنے کے لیے دعا بھی ایک تدبیر ہے۔

آدابِ جنگ کی تعلیم

۲۴۷۔ اور پھر جب وہ میدانِ جنگ میں جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے آئے تو انہوں نے کہا خدایا تو ہم پر صبر کے جام انڈیل دے اور ہمارے قدم میدانِ جنگ میں جما دے اور ہمیں کافروں پر غلبہ عطا فرما۔ سامنے آئے ترجمہ ہے برزوا کا۔ براز کھلے میدان کو کہتے ہیں اور بروز کے معنے کھلے میدان میں آجانا۔ بعض دفعہ کسی شخص کی چھپی ہوئی حالت کے ظاہر ہونے پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب طالوت اور اس کی فوجوں کا جالوت اور اس کے لشکر سے آمنا سامنا ہو گیا جیسے قرآن نے بدر کا نقشہ جنگ بتاتے ہوئے یہ تعبیر اختیار کی ہے فلما تراءت الفئتان جب دونوں گروہوں کا آمنا سامنا ہوا۔ یعنی فوجیں ایک دوسرے کے سامنے میدان میں صف بستہ ہو گئیں۔ اور مڈبھیڑ ہونے کو تھی کہ طالوت اور اس کی فوجوں نے سب سے پہلا کام جو کیا وہ اور صرف یہ تھا کہ اسباب سے ہٹ کر خالقِ اسباب کی طرف متوجہ ہو گئے اور عقلی تدبیر یعنی امتحان کے بعد کامیابی کی اس کلیدی تدبیر کو اپنایا جسے دعا کہتے ہیں۔ میدانِ جنگ میں

بہترین موقعہ کا انتخاب، فوج کی صف بندی، صفوں میں ترتیب، سامانِ جنگ کی استطاعت کے مطابق بہم رسانی۔ تیر کب چلائے جائیں، تلوار کب استعمال ہو، پتھروں اور ڈھیلوں سے دُشمن پر کب حملہ ہو، ان میں سے ہر بات کی تکمیل کے بعد طالوت اور اس کے فوجیوں نے عالم غیب کی طرف اپنے کو متوجہ کیا اور سراپا اخلاص مجسم ہو کر پُرنم آنکھوں کے ساتھ اللہ کی جناب میں دُعا کی۔

اس طرح قرآن نے اپنے مخاطبوں کو آدابِ جنگ کی تعلیم دی ہے کہ ایمان و اسلام کے علمبرداروں کا تکیہ قوت و شوکت پر نہیں بلکہ نصرتِ الٰہی پر ہوتا ہے۔ قرآن اور توریت کے بیان کا تقابلی مطالعہ کیا جائے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ توریت میں نفسِ جنگ کے خشک واقعات کی تفصیل قرآن سے کہیں زیادہ ہے اور وہ اسی پر قانع ہے کہ گویا توریت کوئی تاریخ و تذکرے کی کتاب ہے بر خلاف اس کے قرآن ہر موقعہ پر اصولِ دین، اخلاقِ عالیہ کی تعلیم دیتا ہے اور یہی اس نے یہاں کیا ہے کہ میدانِ جنگ کے تمام واقعات میں سے خاص طور پر اور عنوان بنا کر دُعا کا ذکر کیا ہے۔ افرغ علینا صبراً ہم پر صبر کے جام انڈیل دے یا ہم پر صبر کو پانی کی طرح بہا دے کہ سر سے پیروں تک صبر کے پانی میں نہا جائیں اور صبر کی برودت اور سکینت ہمارے ظاہر و باطن میں سرایت کر جائے۔ ثبت اقدامنا ہمیں ثبات قدمی عطا فرما کہ کسی حال میں بھی پیچھے نہ ہٹیں۔ ثباتِ قلب اور ثباتِ قدم کے بعد کافروں پر غلبہ کی درخواست پیش کی۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ثابت قلبی اور ثابت قدمی کا ثمرہ قدرتی طور پر نتیجہ غلبہ ہی ہو جاتا لیکن اُن عارفین کی نظر اپنے سارے انتظامات اور ساری سعی سے بڑھ کر تائیدِ الٰہی پر مرکوز تھی اس لیے صراحت کے ساتھ غلبہ کی دُعا بھی ان کی زبانی نقل کی گئی۔

اس دُعا کی پیمانے کی لطافت قابلِ شنید ہے۔

اولاً: دُعا میں ربوبیت کو بطورِ وسیلہ پیش کیا ہے جس کا حاصل ادنیٰ سے ادنیٰ تر مقام سے اٹھا کر آہستہ آہستہ درجہ کمال تک پہنچا دینا ہے۔

ثانیاً: لفظِ افراغ لا کر صبر کی بہتات اور فراوانی کی درخواست کی ہے اور اس لفظ میں لطیف اشارہ ہے کہ اے اللہ ہمیں کام ودہن کی تشنگی دُور کرنے کے لیے دریا کے پانی کی ضرورت نہیں ہمیں تو اپنے دلوں اور سینوں کی ٹھنڈک کے لیے صبر کا پانی درکار ہے۔ کیونکہ افراغ کے معنے بہانے کے آتے ہیں۔

ثالثاً: دُعا میں لفظ علیٰ لائے ہیں جس کے معنے اوپر کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ صبر ایسا عطا کر

بجوم پر چھا جائے۔
رابعاً: لفظ صبر کو تعظیم اور شان کی برتری کے لیے نکرہ لائے ہیں یعنی عظیم الشان صبر سے ہمیں مالا مال کر۔
خامساً: صبر کے لیے افراغ کا لفظ بولا ہے جس کے معنے بہانے کے ہیں اور اس موقعہ پر گویا دُعا مانگنے والوں پر کیفیت طاری ہوگئی کہ صبر کا پانی آ رہا ہے۔ اس احساس سے یہ اندیشہ ہوا کہ اس میں قدم نہ پھسل جائیں اس لیے افراغ کی مناسبت سے فرمایا کہ ہمارے قدم جمائے رکھنا۔
سادساً: اس دُعا میں حسنِ طلب کے ساتھ حسنِ ترتیب کا بھی لحاظ رکھا گیا ہے۔ پہلے صبر، پھر ثباتِ قدم اور پھر دُشمن پر غلبہ۔
۲۴۷۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ انہوں نے حکمِ الٰہی سے دُشمنوں کو شکست دی۔ یعنی طالوت کے لشکر نے جالوت کے لشکر کو شکست فاش دی۔ اذن آیت میں حکمِ الٰہی اور توفیق کے معنے میں ہے۔ فهزموهم۔ حرف فاء فصیحہ ہے یعنی چونکہ طالوت اور اس کی فوج نے جنابِ الٰہی میں فریاد کی تھی اس لیے اللہ نے ان کی دُعا قبول فرمائی اور دُعا کی قبولیت کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے اُن کو جمعیتِ قلب ثباتِ قدم کی نعمت عطا فرمائی اور اپنی خاص نصرت کے ذریعے اُن کو غلبہ مرحمت فرمایا۔
توریت نے فلسطیوں کی اس شکست کو اس طرح پیش کیا ہے:

اور فلسطیوں نے جو دیکھا کہ اُن کا پہلوان مارا پڑا تو وہ بھاگ نکلے اور اسرائیل اور یہودا کے لوگ اُٹھے اور للکارے اور فلسطیوں کو وادی تک عقرون کے پھاٹک تک رگیدا اور فلسطیوں میں سے جو زخمی ہوئے سو شعریم کی راہ میں جات اور عقرون تک کنارے گرے تھے تب بنی اسرائیل فلسطیوں کو رگیدے پھرے اور اُن کے خیموں کو لوٹا۔
(سموئیل ۱۷-۵۲)

۲۴۵۔ اور داؤد کے ہاتھ سے جالوت مارا گیا۔ پھر اللہ نے داؤد کو بادشاہی اور حکومت سے سرفراز کیا اور اس کو وہ سب کچھ سکھایا جس کی حکمرانی و دانشوری کی خاطر سکھانے کی اس کی مشیت ہوئی۔ اس جنگ میں حضرت داؤد کے والد اور اُن کے چھ بھائی اور خود حضرت داؤد بھی شریک تھے حضرت داؤد کو راہ میں تین پتھر ملے اور بولے اٹھالے ہم کو ہم جالوت کو قتل کریں گے۔ جب مقابلہ ہوا، جالوت خود باہر نکلا اور کہا کہ میں اکیلا تم سب کو کافی ہوں میرے سامنے آتے جاؤ۔ حضرت سموئیل نے حضرت داؤد کے والد کو بلایا کہ اپنے بیٹے مجھ کو دکھاؤ۔ اس نے چھ بیٹے جو قد آور تھے دکھائے

لیکن حضرت داؤد کو نہیں دکھایا ان کا قد چھوٹا تھا اور بکریاں چراتے تھے۔ پیغمبر نے اُن کو بلوایا اور دریافت کیا کہ تم جالوت کو مارو گے انہوں نے فرمایا کہ ضرور ماروں گا۔ پھر جالوت کے سامنے گئے اور اور ان ہی تین پتھروں کو فلاخن میں رکھ کر مارا۔ جالوت کا صرف ماتھا کھلا تھا اور تمام بدن لوہے میں غرق تھا۔ تینوں پتھر اس کے ماتھے پر مارے اور پیچھے کو نکل گئے۔ جالوت کا لشکر بھاگا اور اسرائیلیوں کو فتح ہوئی۔ پھر طالوت نے داؤد سے اپنی بیٹی کی شادی کر دی اور طالوت کے بعد یہ بادشاہ ہوتے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حکم جہاد ہمیشہ سے چلا آرہا ہے اور اس میں اللہ کی بڑی رحمت ہے۔[1]

حضرت داؤد کا چہرہ

داؤد بن یسی ابن عوبید ایک پیغمبر برحق ہوتے۔ ان کا زمانہ ۱۰۲۴ تا ۹۹۳ ق م ہے۔ قرآن میں آپ کا ذکر ۱۶ مقام پر آیا ہے۔ طالوت کی فوج میں صرف ایک نوجوان سپاہی کی حیثیت سے شامل تھے۔ اس وقت تک نہ نبوت سے سرفراز ہوئے تھے اور نہ ملک وسلطنت سے۔ ان کی ابتدا غریبانہ لیکن انتہا نہایت شاندار تھی۔

طالوت کی فوج میں ان کی شمولیت کے بارے میں مختلف روایات ہیں۔ ایک سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ یہ اس جنگ کے پیش آنے سے پہلے ہی طالوت کے سلاح بردار تھے۔ دوسری روایت سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ بالکل وقت کے وقت اپنی بکریاں چراگاہ میں چھوڑ کر اپنے بڑے بھائیوں کو جو جنگ میں شریک تھے اپنے باپ کے حکم سے کچھ چیزیں دینے آئے تھے۔ یہاں میدانِ جنگ تیار تھا اور جالوت مقابلہ کے لیے للکار رہا تھا لیکن کسی میں ہمت نہ ہو رہی تھی۔ یہ دیکھ کر ان کو جوش آیا اور اس کے مقابلہ کے لیے خود کو پیش کر دیا۔ یہ اس وقت بالکل نوخیز سرخ رو اور خوش قامت نوجوان تھے۔ طالوت کو ان کی کم عمری اور ناتجربہ کاری کی بنا پر اجازت دینے میں تردد تھا لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ میں اپنی بکریوں پر حملہ کرنے والے شیروں کے جبڑے توڑ دیا کرتا ہوں بھلا اس نامختون فلسطینی کی کیا حیثیت ہے؟ تو طالوت نے ان کے عزم و ہمت کو دیکھ کر اجازت دے دی۔ پھر واہیوں کی طرح اپنی فلاخن اٹھائی، چادر کے ایک کونے میں کچھ پتھر رکھے

---

[1] افادات شیخ الہند

اور وقت کے سب سے بڑے دیو کے مقابلہ میں ڈٹ گئے۔ حضرت داؤد نے فلاخن میں رکھ کر پتھر مارا۔ وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔ اتنے بڑے سپہ سالار کا ایک اَن ٹرینڈ شہری کے فلاخن سے ڈھیر ہو جانا ظاہر ہے کہ ایک عظیم واقعہ تھا۔

قرآن نے اس داستان سرائی سے بچ کر کام کی بات فرمائی ہے کہ وقتل داؤد جالوت جالوت کو داؤد نے مار ڈالا۔ اس کے بعد قرآن نے حضرت داؤد کا تعارف ان الفاظ میں کرایا کہ و اتاہ اللہ الملک اللہ نے داؤد کو بادشاہی دی۔ قرآن نے یہاں صاف کہہ دیا کہ یہ بادشاہی خدائی عطیہ تھی یہ فرمانروائی بنی اسرائیل کو ملی۔ حضرت داؤد نسلِ اسرائیل کے دوسرے بادشاہ ہیں۔ تاجدارِ اوّل طالوت تھے۔ آپ انہی کے داماد تھے۔ طالوت جب مع اپنے بڑے فرزند کے میدانِ جنگ میں کام آگئے تو قبیلہ یہودا نے ان کو اپنا بادشاہ مقرر کیا اور دو سال کی کشمکش کے بعد باقی قبیلوں نے بھی آپ پر اتفاق کر لیا۔ سات سال تک آپ نے اپنا پایہ تخت جبرون یعنی الخلیل کو رکھا۔ اس کے بعد یروشلم کو دشمنوں کے قبضے سے نکال کر اسے دارالسلطنت بنایا۔ آپ نے اپنے گرد و پیش کے حکمرانوں کو مغلوب و مسخر کیا اور اپنے حدودِ سلطنت بنایا۔ آپ کا عہدِ حکومت تاریخ اسرائیل میں فتوحاتِ ملکی اور حسنِ انتظام دونوں کے لیے یادگار ہے۔ ابھی قرآن کا پیش کردہ داؤدی چہرہ ختم نہیں ہوا ہے آگے ارشاد ہے کہ اللہ نے داؤد کو حکمت دی۔ اور ان تمام چیزوں کو تعلیم دی جو اللہ نے چاہا۔ یعنی حکمرانی اور دانشوری کی باتوں میں سے اللہ نے جو کچھ سکھلانا چاہا سکھا دیا۔ شارحینِ قرآن نے یہاں حکمت سے مراد نبوت لی ہے اور کچھ اس کا مصداق زبور کو بتاتے ہیں، دونوں درست ہیں یعنی علومِ نبوت کا ان کو وہ خزانہ ملا جس کا مظہر زبور ہے۔ دراصل بادشاہی میں جب حکمتِ نبوت کی پیوندکاری ہو تو اسی کا نام خلافت ہے اور اگر حکمتِ نبوت بادشاہ کی رہنما نہ ہو تو یہ بادشاہت چنگیزی ہے۔ نبی ہو کر بادشاہ ہونا اللہ کو پسند ہے۔ گویا بادشاہی اور فقیری کا یہی امتزاج اسلام کا طرۂ امتیاز ہے۔ آخری بات اس سلسلے کی یہ ہے کہ وعلمہ مما یشاء اللہ نے جو کچھ چاہا اُن کو سکھا دیا چونکہ علومِ انبیاء کو ناپنا ہمارے بس کی بات نہیں ہے اس لیے فرمایا کہ اللہ نے جو کچھ چاہا سکھا دیا۔ اس کے عموم میں وہ تمام علوم و فنون و صنائع جو حضرت داؤد کو اللہ نے سکھائے تھے آگئے۔

حضرت داؤد پر تفصیل اور سیر حاصل مباحث انشاء اللہ پارہ ۲۲ اور ۲۳ میں آئیں گے۔

حق و باطل کی معرکہ آرائی دائمی ہے

۲۲۶۔ اور دیکھو اگر اللہ انسانوں کے ایک گروہ کے ذریعے دوسرے گروہ کو نہ ہٹاتا تو دنیا خراب

ہو جاتی۔ لیکن اللہ سب جہانوں کے لیے فضل و رحمت رکھنے والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین کا نظام برقرار رکھنے کے لیے یہ ضابطہ بنا رکھا ہے کہ وہ انسانوں کے مختلف گروہوں کو ایک خاص حد تک تو زمین میں غلبہ و طاقت حاصل کرنے دیتا ہے۔ مگر جب کوئی گروہ حد سے بڑھنے لگتا ہے تو کسی دوسرے گروہ کے ذریعے سے وہ اس کا زور توڑ دیتا ہے۔ اگر کہیں ایسا ہوتا کہ ایک قوم اور ایک پارٹی ہی کا اقتدار زمین میں ہمیشہ کے لیے رکھا جاتا اور اس کی قہرمانی لازوال ہوتی تو یقیناً ملکِ خدا میں فسادِ عظیم برپا ہو جاتا [1]

مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں حکومتوں اور سلطنتوں کے جو انقلابات ہوتے ہیں یہ یونہی خواہ مخواہ بلا ضرورت نہیں ہونے بلکہ ہمیشہ بامقصد و پُر حکمت ہی ہوتے ہیں اور اس طریق کار سے ظلم و عصیان اور طغیان کی اصلاح مدِ نظر ہوتی ہے [2]

اس قرآنی آیت نے یہ بات کھول کر بتا دی اور علم الاجتماع کا یہ مسئلہ واضح کر دیا کہ اگر قوموں اور جماعتوں کی باہمی کشمکش نہ ہوتی اور ہر جماعت اپنی اپنی حالت میں بغیر منازعت کے چھوڑ دی جاتی تو نتیجہ یہ نکلتا کہ دُنیا ظلم و فساد سے بھر جاتی اور حق و عدالت کا نام و نشان باقی نہ رہتا۔ پس یہ اللہ کا بڑا ہی فضل ہے کہ جب کبھی ایک گروہ ظلم و فساد میں چھوٹ ہو جاتا ہے تو مزاحمت کے محرکات دوسرے گروہ کو مدافعت کے لیے کھڑا کر دیتے ہیں اور ایک قوم کا ظلم دوسری قوم کی مقاومت سے دفع ہوتا رہتا ہے [3]

مسئلہ دفاع کی طرف توجہ کی وجہ

یہاں خاص طور پر اس مسئلہ دفاع کی طرف توجہ دلانے کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اور خاص طور پر اس کی حکمت و مصلحت کیوں بیان کی گئی ہے؟

اس کی وجہ یہ ہے کہ دُنیا میں مذہب کے راہبانہ تصور نے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات اتار دی تھی کہ آخرت کی نجات و فلاح کے لیے صرف اوراد و وظائف اور انسانوں کے نیاز مندانہ اعمال کافی ہیں۔ جنگ اور اللہ کے دین کو برتر کرنے اور مظلوموں کو ظلم و ستم سے بچانے کے لیے کوئی محسوس قدم اٹھانا دینداری کے خلاف ہے۔ اس آیت میں اہلِ ایمان کو سمجھایا گیا ہے کہ ایمانی زندگی

---

[1] تفہیم القرآن [2] ماجدی [3] ترجمان القرآن

اسی عمل کے بقاء پر موقوف ہے، جب تک اہلِ ایمان میں یہ جذبہ باقی رہے گا اور اس کام کی راہ میں ہر فرد اپنی زندگی اور اپنا مال قربان کرنے کے لیے تیار رہے گا اس وقت دُنیا کی کوئی قوت ان پر غالب نہ آسکے گی۔ جس روز یہ جذبہ مُردہ ہو جائے گا اسی دن سے اہلِ ایمان کی ایمانی موت بھی شروع ہو جائے گی۔ قرآن نے یہاں پہلے مثال میں اسرائیل کی تاریخ سے دو واقعے پیش کیے ہیں اور بتایا ہے کہ جب تک اسرائیل میں اعتقاداً و عملاً یہ جذبہ باقی رہا، اقتدار و حکومت ان کے گھر کی کنیز تھی اور جب چند گھڑیوں کے عیش و راحت کا عشق ایمانی زندگی کے دائمی عیش کی طلب پر غالب آگیا اور اس چیز کو چھوڑ بیٹھے تو ذلت و محکومی کا داغ ہر اسرائیلی کی پیشانی پر لگ گیا۔ یہاں قرآن نے کھول کر بتا دیا ہے کہ اسلام کے دُنیا میں قیام کی اور اہلِ ایمان کے پوری دُنیا میں اُمتِ وسط بننے کی اصل بنیاد یہی ہے اس لیے سارے عملوں اور نیکیوں سے جو ایک مسلمان دُنیا میں کر سکتا ہے اس عمل کا مرتبہ و اجر افضل و اعلیٰ ہے۔ جس عمل میں جس قدر زیادہ ایثار و قربانی ہو گی، اتنا ہی زیادہ اجر و ثواب ہو گا۔ یہاں حضرت داؤد کا کارنامہ بیان کرتے ہوئے صرف اس کردار کی نمائش کی ہے کہ قتل داؤد جالوت اور اس کے علاوہ کوئی بات نہیں فرمائی جبکہ دوسرے موقع پر قرآن نے حضرت داؤد کے بارے میں یہ انکشاف کیا کہ وہ تسبیح و تہلیل کی شخصیت تھی۔

وسخرنا مع داؤد الجبال یسبحن والطیر

ہم نے پہاڑوں کو داؤد کے لیے مسخر کر دیا وہ اللہ کی پاکی کی صدائیں بلند کرتے تھے اور اسی طرح پرندوں کو بھی۔

یعنی جب حضرت داؤد حمدِ الٰہی کے نغمے گاتے تھے تو سماں بندھ جاتا تھا۔ چٹانیں اور پرندے تک وجد میں آجاتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایمانی زندگی میں صرف تسبیحات و تہلیلات ہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ ایمان کی خاطر سرفروشی کی بھی ضرورت ہے اور اس کے لیے کوئی خاص وقت اور خاص عہد نہیں، ہر حال اور ہر زمانے میں ایک مومن و مسلم کی زندگی میں ایمان و صداقت کی بنیاد یہی چیز اور اسی کا سچا عشق و ولولہ ہے۔ یہی سنامِ دین ہے یہی عمادِ ملت ہے یہی اساسِ شریعت ہے، یہی ملاکِ اسلام ہے یہی ایمان و نفاق کی اصلی کسوٹی ہے۔ نماز اسی کی خاطر ہے، روزہ اسی کی خاطر ہے، حج اسی کے لیے ہے، زکوٰۃ اسی کے لیے ہے۔ سب ان کے لیے ملتوی ہو سکتے ہیں اس کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ نماز دین کا ستون ہے اور

روزہ برائیوں سے بچنے کی ڈھال ہے لیکن جہاد دین کی بنیاد ہے اور برائیوں کو معدوم کرنے والی قوت ہے۔ اس کی فضیلت کو کوئی عمل نہیں پہنچ سکتا اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا عمل ہے جو اللہ کی نظروں میں محبوب ہو اور کرنے والے کو اس کی دائمی محبوبیت سے سرفراز کرے۔ ہزاروں نمازیں اور ہزاروں روزے بھی اس ایک قطرۂ خون کے گرد پا کو نہیں پا سکتے جو اس راہ میں کام آیا اور عمر بھر کے صدقات و خیرات بھی اس ایک درہم کے اجر کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو اس راہ میں خرچ کیا گیا۔ یہی عمل ایمان و اسلام کی سب سے بڑی پہچان ہے۔

مقام عبرت

آج جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہماری نمازیں اور دعائیں، ہمارے اوراد و وظائف اور ہماری ریاضتیں اُخروی نجات و فلاح کے لیے کافی ہیں ان کو غور کرنا چاہیے کہ جب صحابہ کرام کو ان کی نمازوں، عبادتوں اور اعمالِ صالحہ کے باوجود یہاں قرآن یہ سمجھا رہا ہے کہ ایمان کی برتری اور دفع مظالم کے لیے جہاد ضروری ہے کہ مبادا اسلام کی سربلندی اور دینِ حق کے غلبہ کی کوشش میں ان کے قدم سست پڑ جائیں تو ہم لوگوں کی عبادتیں کس شمار میں ہیں جبکہ ہم اللہ کے دین کو سربلند کرنے اور اسلام کو دنیا پر غالب کرنے کے لیے ادنیٰ سے ادنیٰ قربانی دینے کو بھی تیار نہیں ہیں یہاں تک کہ ہمارے دل بھی اس آرزو سے خالی ہیں کہ اللہ کی زمین پر اس کا کلمہ بلند ہو اور اُس کے عطا کیے ہوئے قانونِ سعادت اور ضابطۂ حیات کا بول بالا ہو فاناللہ وانا الی اللہ المشتکی

غور فرمائیے کہ مخاطبت کن لوگوں سے کی جارہی ہے اور کیا کہا جا رہا ہے؟ ان سے جن کو کہا گیا ہے:-

کذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس

ہم نے تمہیں نیک ترین اُمت بنایا تاکہ تم ساری انسانیت کے سامنے فرضِ شہادت ادا کرو اور پھر اُن سے کہا گیا ہے:

یاایھا الذین آمنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین

اے اہلِ ایمان صبر و نماز کی قوت سے سہارا لو یقین کرو کہ اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ ان ہی کے سامنے صابرین کی مثال پیش کر کے کہا جا رہا ہے کہ،

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ۭ وَاِنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِيْنَ ﴿۲۵۲﴾

اے اللہ کے رسول جو کچھ بیان کیا گیا ہے اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں اور ہمارا پیش کرنا برحق ہے یقیناً آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے اپنی پیغامبری کے لیے چن لیا ہے ﴿۲۵۲﴾

۱۔ فتح و شکست کا مدار افراد کی قلت، کثرت پر نہیں بلکہ ایمان کی قوت اور صبر و ثبات پر ہے۔
۲۔ ایمان باللہ میدانِ مقابلہ میں جمنے اور ڈٹنے کے لیے سب سے بڑا سبب ہے۔
۳۔ میدانِ جنگ میں اللہ کی جناب میں دعا کرنا، رونا اور آہ و زاری کرنا فتح و کامرانی میں مؤثر ہے۔
۴۔ جنگ انسانی زندگی میں ایک ناگزیر ضرورت ہے اور یہ مظلوموں کا قدرتی حق ہے۔ اگر وہ اس حق سے محروم کر دیے جائیں تو دنیا میں انسانی ظلم و استبداد کی مدافعت کا کوئی سامان باقی نہ رہے گا۔
۵۔ تم حق کے علمبردار ہو، حق ہی کو باقی رہنا ہے بشرطیکہ تم اس کے لیے محنت کرو گے۔ باطل کے مقابلہ میں حق، ظلم کے مقابلہ میں عدل، منکر کے مقابلہ میں معروف اور فساد کے مقابلے صلاح کو سربلندی ملتی ہے اگر حق کی خاطر داعی قوتیں ظہور میں آجائیں۔

نبوتِ محمدیہ کی دلیل

تاریخ کے یہ واقعات جو ہم نے آپ کو سنائے ہیں آپ کی زبان سے ان کا منظرِ عام پر آنا۔

اس بات کی واضح اور کھلی دلیل ہے کہ آپ بھی انبیاء ورسل کے مبارک سلسلے کی کڑی ہیں۔ ورنہ جس چیز کے جاننے کا آپ کے پاس ذریعہ نہ تھا۔ آپ اسے کیسے بیان کر سکتے تھے اور وہ بھی ایسی صحت کے ساتھ کہ اصل واقعہ تمام غیر فطری ملاوٹوں سے بالکل پاک ہو۔

قرآن کی مختلف سورتوں میں اس کا اظہار ہے کہ اے اللہ کے پیغمبر تمہاری زبان سے آج گزشتہ پیغمبروں، اگلی امتوں کے واقعات ادا ہوتے ہیں۔ ان واقعات سے آگاہی حاصل کرنے کے تین ہی ذریعے انسان کے ہاتھ میں ہیں ایک یہ کہ اس واقعہ کے وقت موجود ہو۔ دوسرا یہ کہ ان حالات کو کتابوں میں پڑھے تیسرا یہ کہ اوروں سے سُنے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اطلاع کے ان تینوں ذرائع سے ناآشنا تھے اوّل ذریعہ تو ظاہر ہے کہ مفقود تھا۔ قرآن حکیم میں آدم سے مولدِ محمدی تک کے تمام واقعات بیان کیے گئے ہیں۔ یہ واقعات آپ کی ولادت باسعادت سے پہلے وقوع پذیر ہوئے تھے اور آپ کے پاس ان کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہ تھا۔ علم کا دوسرا ذریعہ یہ تھا کہ کتابوں کو پڑھ کر اطلاع حاصل ہو۔ قرآن حکیم نے اس کی بھی نفی کی ہے، تیسرا ذریعہ یہ تھا کہ دوسروں سے سُن کر یہ علم حاصل کیا جائے۔ سب کو معلوم ہے کہ نبوت سے پہلے حضور انور کی تمام تر زندگی مکہ معظمہ میں گزری۔ مکہ میں نہ ان واقعات کا کوئی واقف کار تھا اور نہ قریش کو ان سے آگاہی تھی اس لیے یہ ذریعہ علم بھی ثابت نہیں ہے۔ اس کے باوجود آپ اُمّی ہو کر اُمیوں میں جوان ہو کر کتب سابقہ کی ظاہری تعلیم سے ناآشنا ہو کر بھی اگر آپ یہ واقعات پیش کر رہے ہیں تو یہ آپ کا اعجازی کارنامہ ہے جو آپ کے نبی ہونے کی کھلی دلیل ہے۔ کفار کو خطاب کر کے ایک موقعہ پر قرآن نے کہا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کے لیے کیا یہ دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ ناآشنائے تعلیم ہو کر وہ کچھ جانتے ہیں جس کی بنی اسرائیل کے سوا کسی کو خبر نہیں ہے اولم یکن آیتہ ان یعلمہ علماء بنی اسرائیل

۲۷۔ اے اللہ کے رسول جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو ہم تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں اور ہمارا پیش کرنا برحق ہے یقیناً آپ ان لوگوں میں سے ہیں جن کو اللہ نے اپنی پیغامبری کے لیے چن لیا ہے۔ یہ قصہ جو بنی اسرائیل کا گزرا یعنی ہزاروں کا نکلنا اور ان کا دفعتاً مرنا اور جینا اور طالوت کا بادشاہ ہونا یہ سب اللہ کی آیتیں ہیں جو تمہیں سنائی جا رہی ہیں اور تم بے شک اللہ کے رسولوں میں سے ہو، یعنی جیسے پہلے پیغمبر ہو چکے

ں ویسے ہی تم بھی یقیناً رسول ہو کیونکہ ان گزشتہ واقعات کو ٹھیک ٹھیک بیان کرتے ہو۔ نہ کسی کتاب میں آپ نے پڑھا اور نہ کسی آدمی سے سُنا۔[1] گویا بتا دیا گیا ہے کہ اس سرگزشت میں جو کچھ بیان کیا گیا ہے یہ سرتاسر آیات اللہ ہیں کیونکہ اللہ نے وحی کے ذریعے بتائی ہیں۔ اگر وحیٔ الٰہی کا فیضان نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ان واقعات کا تمہیں علم ہوتا اور دُنیا کے آگے تم اس طرح پیش کرتے۔ ظاہر ہے کہ واقعات تم سے ہزاروں سال پہلے کے ہیں اور دُنیا میں گزشتہ واقعات کے علم و سماعت کے جتنے وسائل ہو سکتے ہیں ان میں سے کوئی وسیلہ بھی تمہارے پاس موجود نہیں ہے۔ اس لیے بلا شبہ آپ اللہ کے پیغمبر ہیں۔

صداقتِ نبوت کی واضح دلیل

گویا قرآن حکیم نے بتایا ہے کہ اگر اللہ کی جانب سے آپ پر وحی کا فیضان نہ ہوتا تو آپ یہ واقعات نہ بتلا سکتے کیونکہ آپ کے پاس ان کے جاننے کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ آپ ظاہری تعلیم سے بالکل بیگانہ تھے۔ اگر آپ نے کوئی تعلیم پائی ہوتی تو آپ کے معاصر ساحر کے طرز پر اس کا بھی آپ کو الزام دیتے کہ آپ پڑھے لکھے ہیں۔ چونکہ یہ بات آپ کے مخالف بھی مانتے تھے کہ آپ نے کبھی کسی کے سامنے زانوئے ادب طے نہیں کیا۔ اس لیے انہوں نے یہ الزام بھی آپ کو کبھی نہیں دیا۔ ان کو اس بات کا یقین تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا سینہ ظاہری تعلیم کے عیب سے پاک ہے۔ چنانچہ قرآن نے باآوازِ بلند کہا،

قل لو شاء اللہ ما تلوتہ علیکم ولا ادراکم بہ فقد لبثت فیکم عمرًا من قبلہ افلا تعقلون

کہہ دو کہ اگر اللہ چاہتا تو میں تمہیں قرآن نہ سناتا اور نہ تمہیں اس سے خبردار کرتا۔ دیکھو یہ واقعہ ہے کہ اس سے پہلے تمہارے اندر ایک پوری عمر بسر کر چکا ہوں۔ کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے۔

صداقتِ نبوت کی یہ سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل ہے۔ فرمایا کہ میں تم میں نیا آدمی نہیں ہوں جس کے احوال و اخلاق کا تمہیں پتہ نہ ہو۔ تم ہی میں سے ہوں اور دعویٔ نبوت

---

[1] افادات شیخ الہند

سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ عمرِ انسانی کی پختگی کی کامل مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہارے سامنے ہے۔ اس تمام مدت میں مجھے کسی سے سیکھتے یا پڑھتے دیکھا۔ اگر تمام عمر میں میں نے کسی کے سامنے زانوئے ادب طے نہیں کیا تو پھر یکایک یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ پڑھ جاؤں۔ بلاشبہ میرے پاس اللہ کی وحی آتی ہے اور اگر یہ نہیں تو کیا میں غلط کہہ رہا ہوں۔ خود عقل سے سوچو کہ اگر تمام عمر میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب خدا پر بہتان باندھنے کے لیے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر وحی آتی ہے اور میں اللہ کا رسُول ہوں۔

قرآن نے ان تمام شکوک و شبہات کو دہرایا ہے جو ان کی جانب سے پیش ہوتے، مگر آپ کے مخالفوں نے یہ شُبہ کبھی نہیں کیا کہ حضورِ انور نے چپکے سے پڑھنا سیکھ لیا ہے اور دوسری آسمانی کتابیں پڑھ کر یہ قرآن بنا لیتے ہیں۔ اس سے معلوم تھا کہ آپ کی ظاہری تعلیم نہ ہونے پر ان کو یقین تھا۔

بہر حال یہاں قرآن نے آپ کے نبی ہونے کی مستحکم دلیل یہ پیش کی ہے کہ چونکہ یہ واقعات نہ تم نے ان کی کتابوں میں پڑھے ہیں نہ کسی تاریخ میں دیکھے اور نہ تم کو ان کی خبر ہے۔ پھر جو تم ان کو صحیح بیان کر رہے ہو بجز وحی کے تمہارے پاس کوئی ذریعہ نہیں اور وحیٔ الٰہی کے ذریعہ سے کسی بات کو بیان کرنا یہی پیغمبری ہے۔ اس لیے آپ بھی اللہ کے پیغمبروں میں سے ایک پیغمبر ہیں۔ جنگ کی جو منزل آپ کو پیش آگئی ہے سنتِ الٰہی کا مقتضا یہی تھا کہ ظلم و فساد کی بیخ کنی کرنے اور اللہ کے نام کا بول بالا کرنے کے لیے اس منزل سے گزرنا ناگزیر ہے۔ اس راہ سے جیسے سب رسُولوں کو گزرنا پڑا ہے آپ کو بھی گزرنا ہے۔

ربّ تقبل منی انك انت السمیع العلیم۔

معالم القرآن

جلد سوم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

علم و کتاب واٹس ایپ گروپ

ملکیت — — — — — — — ادارۂ تعلیماتِ قرآن سیالکوٹ
ناشر — — — — — — — عبدالرحمٰن قاری ایم اے ناظم ادارۂ تعلیماتِ قرآن
تالیف — — — — — — — محمد علی الصدیقی الکاندھلوی
طابع — — — — — — — حاجی عبدالغنی
تزئین و آرائش — — — — — خالد یوسفی
کتابت — — — — — — محمد نواز عابد کیلانی
صفحات — — — — — —
تاریخ اشاعت — — — — —
مطبع — — — — — — —

قیمت روپے

— — ملنے کا پتہ — —

دارالعلوم الشہابیہ زنگ پورہ روڈ سیالکوٹ

— فون نمبر ۳۲۹ —

دریا بحباب اندر

آلِ عمران

حرفِ آغاز

بِاسْمِہٖ سُبْحَانَہٗ، یہ قرآن کا تیسرا پارہ ہے۔ خداوند ذوالجلال کی یہ بے پایاں عنایت ہے کہ اس نے ساری جسمانی اور روحانی کمزوریوں کے باوجود تیسرے پارے کی تشریح کی توفیق بخشی۔

وعدے کے مطابق اس پارے کو بہت پہلے مشتاق نگاہوں کے سامنے آجانا چاہیے تھا لیکن کافی تاخیر کے بعد آرہا ہے۔

اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ لاہور جاتے ہوئے کار کے حادثہ میں میری صحت پر غیر معمولی اثر پڑا۔ حادثہ میں اُوپر کا جبڑا اتر گیا۔ ناک کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ یہ اللہ کا فضل خاص ہے کہ اس نے دوبارہ زندگی عطا فرمائی! اور دل کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ زندگی اور پھر صحت کا یہ عطیہ اللہ نے معالم القرآن کے لیے عطا فرمایا ہے۔ الحمدللہ اب صحت اچھی ہے اور اپنے اندر کام کرنے کی ہمت پاتا ہوں۔ یہ واقعہ مورخہ ۲۳ اگست ۷۵ء کو پیش آیا اور عرصہ تک صاحب فراش رہا۔ اور کئی ماہ تک لکھنے پڑھنے سے معذور رہا۔

دوسری وجہ یہ ہوئی کہ مجھے مورخہ ۶ نومبر کو کچھ دوستوں کی دعوت پر کویت جانا پڑا۔ کویت سے زیارتِ حرمین کے لیے اللہ سبحانہٗ نے اسباب مہیا کردیئے۔ وہاں پہنچنے کے بعد روحانی سکون ملا۔ اور جسم کی ساری شکایتیں دُور ہوگئیں۔ اور الحمدللہ ایسی صحت نصیب ہوئی کہ حج کے تمام فرائض، واجبات اور ارکان بغیر سواری کے پیدل چل کر ادا کیے۔ گویا جو کچھ حادثہ میں کھویا تھا سب کچھ پالیا۔ حج سے فراغت کے بعد جسم و روح سے گناہوں کے میل کچیل اور نافرمانیوں کا گرد وغبار اترا۔ پریشانی اور پشیمانی کی تلخ کامیوں کے بوجھ سے دبی ہوئی اور بجھی ہوئی طبیعت سنبھلی تو مدینہ طیبہ کا ارادہ کیا۔ مدینہ زادہا اللہ شرفاً صرف شہر نہیں حسن واحسان، جمال وکمال کا لطیف مرکز ہے۔ مشہور نعت گو شاعر قدسی کے اشعار بلا ارادہ زبان پر آگئے۔

مرحبا سیدِ مکی مدنی العربی — دل وجان باد فدایت چہ عجب خوش لقبی
من بیدل بجمال تو عجب حیرانم — اللہ اللہ چہ جمالست بدین بوالعجبی
چشمِ رحمت بکشا سوئے من انداز نظر — اے قریشی لقبی ہاشمی و مطلبی

باہمہ تشنہ لبانیم تو ئی آب حیات　　　　رحم فرما کہ زحد مے گزرد تشنہ لبی
عاصیانیم زمانیکہ اعمال بپرس　　　　سوئے مارو ئے شفاعت بکن از بے لبسی
سیدی انت حبیبی و طبیب قلبی　　　　آمدہ سوئے تو قدسی پے درمان طلبی

مدینے سے قلب و روح کی نورانیت کی سوغاتیں لے کر الخبر روانہ ہوا۔ الخبر میں ملک عباس کی شبانہ روز محنت، جانفشانی اور دریادلی کی جیتی جاگتی تصویر پاکستانی اسکول کی صورت میں زبانِ حال سے اپنے بانی کے ترانے گاتے دیکھی۔ میں نے اسکول کو از فرق تا قدم دیکھا اور انتظام و تعلیم کے ہر پہلو سے ناپا اور یوں محسوس ہوا کہ :- ؏

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے ساقی

الخبر میں دو روز قیام کے بعد کویت پہنچا۔

یہاں معالم القرآن کی خاطر دو ماہ قیام کیا۔ درس اور خطابات کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ تدریس قرآن اور خطابات کے ساتھ میں نے احباب میں معالم القرآن کے لیے تعاون کی مہم شروع کر دی۔ الحمد للہ احباب نے اس سلسلہ میں بہت بڑی گرمجوشی، دریادلی کا مظاہرہ کیا۔

پورے سفر میں علاوہ عام امداد کے کچھ احباب نے پوری کتاب اور کچھ نے نصف کتاب کے اخراجات کے لیے سرپرستی قبول فرمائی۔ مثلاً

جناب الحاج ملک عباس حسین رئیس اعظم سیالکوٹ	پوری کتاب
جناب الحاج خیر الدین صاحب گوجرانوالہ	〃 〃
جناب الحاج عبد الغنی صاحب 〃	〃 〃
جناب الحاج محمد عبد اللہ صاحب کراچی	〃 〃
جناب الحاج امین اللہ قریشی	نصف کتاب
جناب الحاج نذیر احمد صاحب جہلم	
جناب الحاج محمد اسماعیل محمد ابراہیم صاحبان سیالکوٹ	〃 〃

میری غیبت میں دار العلوم الشہابیہ میں تدریس قرآن اور خطابت کے کام کی ذمہ داری کو میرے عزیز مولانا عبد الجبار ایم اے صدر شعبۂ اسلامیات اسلامیہ کالج سیالکوٹ نے جس کاوش اور خلوص سے انجام دیا۔ اس کے لیے میں بےحد ممنون ہوں اور میرے قلب کی نہائیوں سے ان کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ غلط بینی اور عالمانہ بے دینی کے اس دَور اور کالج کے ماحول میں اللہ نے ان کو قلب کی سلامتی اور اسلام کی محبت کی نعمت سے مالا مال کیا ہے گویا

اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا۔

واپسی پر معالم القرآن کی تیسری جلد کی کاپیاں پڑھی ہیں۔ اب جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہے آپ کے ہاتھوں میں ہے اللہ کرے کہ میری یہ محنت آخرت میں میرے لیے زادِ نجات اور اس دُنیا میں لوگوں کے لیے زادِ ہدایت ہو۔ آمین۔

اس جلد میں کل ۲۹۸ نوٹ ہیں۔ ان میں سورۂ بقرہ میں مالیاتی مسائل پر اتنے مفصل نوٹ دیئے ہیں کہ بعض چالیس پچاس صفحوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ آل عمران میں بعض تشریحی نوٹ اچھے خاصے طویل ہو گئے ہیں اس طرح یہ تشریحی مواد پورے آٹھ سو صفحات پر پھیل گیا۔ اس سلسلے میں جس قدر کاوش کی گئی اور جہاں جہاں سے استفادہ کیا گیا اس کی پوری تفصیل پیش کرنا سر بار تطویل ہی کا باعث نہیں بلکہ سر گردانی ہے۔

قرآن میں مالیاتی مسائل پڑھتے وقت اتنی بات ضرور ذہن میں رکھی جائے کہ ایک کامیاب نظام حیات وہ ہی ہو سکتا ہے جو فطرتِ انسانی کے تمام پہلوؤں کو پیشِ نظر رکھے۔ آدمی کی فطرت جن مختلف عناصر سے مرکب ہے۔ ان سب کی اہمیت محسوس کرے۔ ان کے مطالبات سے گریز کرنے یا ان کے وجود سے انکار کرنے کے بجائے ان کا سامنا کرے اور ہر ایک کو اس کی اہمیت کے مطابق نشوونما پانے کا موقع دے۔

اس حیثیت سے صرف قرآن ہی ایک ایسے نظام کا داعی ہے جس نے تلخ سے تلخ حقیقت کا سامنا کرنے سے دریغ نہیں کیا۔ انسان کی جسمانیت ایک حقیقت ہے اس سے چشم پوشی اور اغماض ممکن نہیں۔ قرآن نے بدھ مت کی طرح نہ اس کا انکار کیا اور نہ اسے کچلنا چاہا بلکہ مناسب حدود کے اندر اس کی نشوونما کی آزادی دی۔ اسی طرح انسان کے اندر عقل کی بے پناہ تنقیدی قوت موجود ہے۔ قرآن نے قرونِ وسطیٰ کے پادریوں کی طرح اس کی زبان بندی نہیں کی۔ آدمی کے سامنے ہندو دھرم کی طرح مابعد الطبیعات اور مافوق الادراکیات کا ایک گورکھ دھندا پیش نہیں کیا۔ قرآن نے سب سے پہلے ایک علمی و عقلی نظامِ حیات پیش کیا ہے۔

اس جلد میں مالیاتی مسائل کے جو مباحث پیش کرنے کی کوشش کی گئی وہ سب کتابوں میں موجود ہیں لیکن میں نے خاص طور پر اس سلسلے میں جن سے استفادہ کیا ہے ان کے اسماء گرامی یہ ہیں۔ امام فخر الدین رازی۔ امام غزالی شاہ ولی اللہ محدث۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی۔ علامہ عبد الرزاق سنہوری، علامہ عبد اللہ دارز ومیاطی۔ الشیخ مصطفیٰ الزرقا مولانا مناظر حسن گیلانی۔ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی، ڈاکٹر نجات اللہ صدیقی۔ ڈاکٹر انور اقبال قریشی وغیرہ وغیرہ۔ اور تقابل ادیان کے موضوع پر حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی مہاجر مکی، مولانا محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ کراچی سے زیادہ استفادہ کیا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اسلام میں قانون کا اوّلین مصدر

جلد دوم کے مقدمہ میں ہم اسلام میں قانون سے متعلق تفکیر کی مختصر تاریخ پر تبصرہ کرتے ہوئے بتا چکے ہیں کہ اسلامی قانون نہایت وسیع اور ترقی پذیر قانون ہے اور وہ ایسے ابدی اصولوں پر قائم ہے جو کبھی فرسودہ اور از کار رفتہ نہیں ہو سکتے جس میں زندگی کے تغیرات اور ترقیوں کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت ہے اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ وضعی نظام قانون خواہ وہ جمہوری ہو یا اشتراکی افراد کے باہمی اختلاف اور تمدن کے نزاعی مسائل کا کوئی قطعی اور یقینی حل نہیں رکھتا اور نہ معاشرتی و سیاسی زندگی کی بنیاد پر افراد کے درمیان اتفاق رائے پیدا کر سکتا ہے جس نظام کی بنیاد انسانی ارادہ و عقل پر ہو گی وہ انسانی عقل و ارادے سے بہت بھی سکتا ہے کیونکہ اس کی پشت پر انسان سے ماوراء کوئی ارادہ و طاقت نہیں ہے جس کا یقین و اعتقاد افراد کو سارے اختلافات کے باوجود کسی ایک نقطہ یا مرکز پر جمع رکھ سکے۔ اسلامی نظام اپنی بنیاد اور مرکزی عقائد و افکار کے لحاظ سے ایک اٹل نظام ہے جس میں کوئی تبدیلی نہیں کی جا سکتی لیکن تفصیلی امور، ضمنی مسائل اور اصولوں کے عملی انطباق کے لحاظ سے وہ ایک لچک بھی رکھتا ہے جس کے باعث زمانہ کے مقتضیات اور وقت کی ضروریات کے ساتھ اسے مطابقت دی جا سکتی ہے چونکہ اسلامی نظام ایک الہامی نظام ہے اس لیے اس کے قانون کا اوّلین اور مرکزی مصدر قرآن حکیم ہے، قرآن کے بعد دوسرا مصدر سنت ہے۔

قرآن کی حیثیت قانون سازی میں وہی ہے جو وضعی قوانین میں دستور و آئین کی ہوتی ہے۔ اس میں قانون سازی کے بنیادی اصول اور عقائد کی تفصیل موجود ہے۔ دستور و آئین ہونے کی وجہ سے قرآن اپنے اندر شان جامعیت رکھتا ہے۔ قرآن میں جامعیت اصول کے لحاظ سے ہے امام شاطبی فرماتے ہیں۔ قرآن نے قوانین اکثر کلی طور پر بتائے ہیں جزئیات کو اصلاً بیان نہیں کیا ہے۔

الموافقات ص ۳۶۶- حافظ ابن حزم نے قرآن کی اسی جامعیت کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ قانون کے تمام موضوعات میں کوئی موضوع بھی ایسا نہیں جس کی اصل قرآن میں موجود نہ ہو، اللہ کا شکر ہے کہ ہم جانتے ہیں سوائے موضوع قراض کے کہ اس کی اصل ہمیں قرآن میں معلوم نہیں ہوتی ہے۔ الموافقات ج ۳ ص ۱۱۳۔ یہ حافظ ابن حزم کی رائے ہے ورنہ حافظ ابن القیم اور علامہ شاطبی نے قراض کی نشاندہی ہی قرآن میں کی ہے۔ بہر حال قرآن اپنی شان جامعیت کی وجہ سے دستور و آئین کی حیثیت رکھتا ہے اسی لیے قانون سازی میں اس کو دوسرے مصادر کے مقابلہ میں اولین مصدر کی حیثیت حاصل ہے۔ دین دراصل ان ہی قوانین کلیہ کا نام ہے ان کلیات و اصول کی بنیاد پر جو قانون بنایا جاتا ہے اس کا نام شریعت ہے قرآن کی جامعیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ وہ توضیح و تشریح کا محتاج نہیں اس کی کسی آیت میں کوئی اجمال کسی عموم میں کوئی قید اور کسی مراد میں کوئی ابہام نہیں ہے یا ارکان و شرائط، اسباب و موانع کی تمام تفصیلات اس میں موجود ہیں بلکہ قرآن کے جامع ہونے کا مطلب یہ اور صرف یہ ہے کہ اس کے صفحات میں بنیادی عقائد اور ایمانی صفات سے لے کر اجتماعی زندگی کے دور دراز گوشوں سے تعلق رکھنے والی ہدایات موجود ہیں۔ بات توحید رسالت اور آخرت سے شروع ہو کر اللہ کی بندگی کا مطالبہ اور اچھے اخلاق کی تلقین کرتے ہوئے انسان کی معاشرتی، تمدنی اور سیاسی زندگی کے پھیلے ہوئے میدانوں میں داخل ہو جاتی ہے اور یہاں پہنچ کر ایک طرف اس امر کی اصولی ہدایات دی جاتی ہیں کہ انسانی معاشرت کی تعمیر ان خطوط پر کی جائے ازدواجی رشتے ان ضوابط کے تحت قائم کیے جائیں۔ زندگی اس طرح منظم کی جائے۔ مرد کی ذمہ داریاں یہ ہوں گی اور عورت کے فرائض یہ ہوں گے رہنے سہنے میں یہ طریقے اختیار کیے جائیں اور کھانے پینے میں یہ آداب ملحوظ رکھے جائیں۔ لباس میں ان حدود کا خیال رکھا جائے اور غذا میں ان شرائط کی پابندی کی جائے۔ دوسری طرف معاشرے کے تمام مسائل پر نظر ڈالی جاتی ہے اور بتایا جاتا ہے کہ ایک فرد پر دوسرے فرد کے حقوق یہ ہیں۔ باہمی تعلقات ان بنیادوں پر قائم کیے جائیں۔ کاروبار کو ان حدود و ضوابط کا پابند کیا جائے۔ تیسری طرف اجتماعی زندگی کے اونچے اور بڑے معاملات کے متعلق ہدایات کی جاتی ہیں کہ معاشرے کی تنظیم کے اصول اور طریقے یہ ہوں۔ سیاسی نظام اس طرح قائم کیا اور چلایا جائے۔ غلط کار افراد کو یہ سزائیں دی جائیں۔ فوجداری کے قوانین یہ ہوں۔ حکومت کے باغیوں کے ساتھ یہ طرز عمل اختیار کیا جائے۔ حکومت اپنی بین الاقوامی پالیسی ان اصولوں پر مرتب کرے۔ سربراہ مملکت اور عمال حکومت کے یہ فرائض ہوں۔ غرض انسان کے مسائل جہاں اور جس گہرائی سے شروع ہوتے ہیں ٹھیک وہیں سے قرآن کے احکام ہی شروع ہوتے ہیں اور اس وقت تک ختم نہیں ہوتے جب تک کہ یہ مسائل ہی ختم نہ ہو جائیں پھر ان ہمہ گیر احکام کی حیثیت صرف جزئیات کی نہیں بلکہ کلیات و اصول کی ہے۔ کسی کتاب کے جامع ہونے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ اس میں منتشر اور مختلف جزئیات کے احکام بہ صورت کلیات بیان کر دیئے جاتیں۔ امام شاطبی فرماتے ہیں۔

اس میں اصول و کلیات بتائے گئے ہیں۔ قرآن حکیم مختصر ہونے کے باوجود جامع کتاب ہے اور اس کی جامعیت یہی ہے کہ اس میں اصول و کلیات بتائے گئے ہیں۔

قرآن عظیم زمین کی طرح پھلوں اور پھولوں کا گہوارہ رہا جس طرح زمین سے پھل اور پھول کے عجائبات نت نئے رنگ میں نکلتے رہتے ہیں مگر زمین ایک ہی رہتی ہے اور جس طرح سمندر میں سے انواع و اقسام کے موتی اور جواہر نکلتے رہتے ہیں مگر سمندر ایک ہی رہتا ہے اسی طرح قرآنی اصول و کلیات سے جزئیات اور مسائل قیامت تک نکلتے رہیں گے مگر اصول و کلیات ایک ہی رہیں گے مسائل و نقشہ تبدیل ہوتا رہے گا مگر اصول و کلیات پرانے ہی رہیں گے۔ اس لیے ہر دور کے شارحین قرآن نے قرآن کے اصول و کلیات کو جوں کا توں رکھ کر ان کے حقائق و معارف اور ان کے طرز استدلال و تفہیم میں نئے نئے علوم پیدا کیے۔ اگر کسی زمانے میں حکمت و فلسفہ کا زور ہوا اور عام شہری زندگی اُدھر لگ کر فلسفی مزاج بن گئی جن کے جذبات صرف فلسفیانہ رنگ میں بات سمجھنے کے عادی ہو گئے تو حکمائے اسلام نے حکیمانہ نقطہ نظر میں قرآن کو سمجھا اور سمجھایا اور اس کے ایک ایک نقطہ اور اسلوب سے فلسفیانہ اور حکیمانہ عجائبات پیدا کیے اور اسی رنگ حکمت سے اس کی تشریح کی گئی۔ اس کے صدقے میں حکمت و فلسفہ کے فنون مرتب ہوئے۔ اور فن اسرار کا ذخیرہ جمع ہو گیا۔ اگر کسی زمانے میں انسانی زندگی سیاسی جھمیلوں کا شکار ہوئی اور شہری زندگی کا مذاق سیاسی بن گیا تو اسرار راشدین اور علماء صالحین نے اسی رنگ میں قرآن پڑھا اور پڑھایا اور اس کے ذریعے سیاست کی ساری الجھنوں کا مداوا کیا۔ اور اگر کسی اسلامی حکومتوں کو نظم مملکت کی خاطر عام شہری زندگی کے لیے قانون سازی کی ضرورت پیش آئی تو فقہاء مجتہدین نے قرآن ہی کی رُو سے مملکت کے لیے پوری انسانی زندگی کے لیے قانون سازی کا کام کیا۔ یگانے ہی نہیں بیگانے بھی آج انگشت بدنداں ہیں کہ یہ قانون سازی اس دور میں کیسے ظہور میں آئی۔

الغرض قرآن حکیم خداشناسی اور آداب عبدیت کے تمام اصولوں پر حاوی ہے جیسا کہ جہاں بانی کے ایک ایک نکتہ، ایک ایک گوشہ کے لیے ہو مکمل آئین ہے ایک چوب خشک اس پر عمل کر کے عارف ہو سکتا ہے اور ایک فقیر بے نوا اس کی پیروی کر کے تاج شاہانہ پہن سکتا ہے۔ پھر شاہی او رگدائی کے یہ اصول اس نے اس شان سے اپنے سادے اور جامع الفاظ میں پیش کیے ہیں کہ دُنیا کے مختلف زبانوں کی تو قلموں ضروریات میں سے کبھی کوئی ضرورت ایسی پیش نہیں آئی جس کے بارے میں قرآن کی بھرپور روشنی نہ ہو۔ اللہ سبحانہ کا کلام گرامی اگر جامع ہے تو ظاہر ہے جس پر یہ کلام اترا ہے وہ ذات گرامی بھی جامع کا مجمع ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اگر قرآن یہ شان جامعیت لے کر آیا ہے تو حضور انور کی ذات اسی جامع کے لیے مجمع بن کر آئی ہے۔ آپ پر قرآن اترا، آپ کی زبان میں اترا، آپ کے اخلاق و کمالات اور آپ کی فطری استعداد کو اس کا ظرف کے لیے ازل سے چنا گیا۔ حضور انور کی شان مجمعیت کا مطالعہ کرنا چاہتے ہو تو شاہ عبدالعزیز کا وہ بیان پڑھو جو انھوں نے تفسیر عزیزی میں پیش کیا ہے۔

سوچنا چاہیے کہ جب مجمع یہ ہے تو جامع کا کیا حال ہوگا۔ اللہ اکبر! جس کلام کی متکلم ایسی ذاتِ گرامی ہو جس کے علم کی کوئی نہایت نہیں۔ تمام کائنات کے علوم و فنون اس کے دریا کے علم کا ایک قطرہ بھی نہ ہوں۔ اس کے کلام کی شانِ جامعیت کیا ہوگی۔

اصطلاحاتِ قرآنی

تخبطِ شیطان: تخبط، خبط اللیل سے ہے جس کے معنے رات کی تاریکی میں بھٹکنے کے ہیں۔ خابط اللیل اس شخص کو کہیں گے جسے اپنے دائیں بائیں کا کچھ ہوش نہ ہو۔ یوں ہی ہرزہ گردی کر رہا ہو۔ اسی سے تخبط خبط عشواء کا محاورہ ہے۔ اس شخص کے لیے بولا جاتا ہے جو اندھی اونٹنی کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکتا پھرے۔ اسی سے تخبط الشیطان نکلا ہے جس کے معنے ہیں شیطان نے اسے دیوانہ یا پاگل بنا دیا۔ سُود خوار ایک انسان کو حاجتمند دیکھتا ہے تو اس کی مدد کا جذبہ اس کے اندر پیدا نہیں ہوتا بلکہ چاہتا ہے کہ اس کی احتیاج اور بے بسی سے اپنا کام نکال لے اور اس کی محتاجی کو اپنی دولت مندی کا ذریعہ بنائے۔ خود غرضی کا یہ جذبہ اگر بے روک بڑھتا ہے تو پھر اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ انسان میں انسانی ہمدردی کی بُو تک نہیں رہتی۔ ایک بے رحم اور بے پناہ درندہ بن کر رہ جاتا ہے۔ قرآن نے اسی حالت کو مرگی سے تشبیہہ دی ہے جسے عربی میں شیطان کے مس سے تعبیر کرتے ہیں۔ زمخشری رقمطراز ہیں کنی بالمس عن الجنون یعنی زر پرستی کے جوش سے تمام انسانی احساسات فنا ہو جاتے ہیں اور پیسے کے پیچھے پاگل ہو کر رہ جاتا ہے۔ سُود خوار کی یہ حالت کب ہو گی؟ مشہور مُفسّرِ قرآن ابنِ عطیہ کہتے ہیں کہ دنیا کی زندگی ہی میں سُود خوار کی یہ حالت ہوتی ہے۔ مہاجن ساہوکار جو روپیہ کے پیچھے دیوانہ رہتا ہے واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو جنون ہو گیا ہے۔ عام مفسرینِ قرآن کی رائے میں سُود خوار کی یہ حالت آخرت کی زندگی میں قبروں سے اُٹھتے وقت ہو گی۔

تکلیف: کلف، مصدر مجرد سے بنا ہے۔ کلف کے معنے شیفتہ ہونا اور بصورت اسم سیاہی زردی آمیز یا سُرخی سیاہی آمیز رنگ۔ قاموس، کلف، صیغہ صفت شیفتہ عاشق، شاید اس وجہ سے کہ

عاشق کے چہرہ پہ برداشتِ مصائب کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ کلفۃ سرخی سیاہی آمیز یا سرخی مائل بسیاہی رنج، سختی، کلِف کلفاً اسمع شیفتہ ہوگیا۔ کلفہ بہ اس کو فلاں چیز کا شیفتہ بنا دیا۔ (افعال) تکلیف تفعیل کسی کو ناقابلِ برداشت حکم دیا۔ حملت الشئی تکلفۃً اس چیز کو میں نے دشواری کے ساتھ برداشت کیا۔ اسی سے لا یکلف اللہ نفساً الا وسعہا میں تکلیف استعمال ہوا ہے تکلف کسی کے حکم دینے سے کسی کام کو اپنے اوپر برداشت کرنا اور دشواری اٹھانا (تاج العروس) اصل میں تکلف نام ہے چہرے پر کچھ بدنمائی ظاہر کرتے ہوئے اور دشواری کی علامات ظاہر کرتے ہوئے کسی کام کو کرنا۔ اس کی دو قسمیں ہیں۔ اول یہ کہ کسی کام کو کرتے وقت چہرے پر بناوٹی دشواری کے آثار نمودار کر لینا۔ دوم یہ کہ بلندیٔ حوصلہ دکھلاتے ہوئے کسی مقصد کو حاصل کرنے کے لیے دشواری اٹھانا۔ دونوں صورتوں میں چہرے پر کچھ انقباضی کیفیت ضرور پیدا ہو جاتی ہے۔ پیشانی پر بل اور رخساروں کی کھال میں سلوٹیں نمایاں ہونا ضروری ہیں۔ پہلی قسم مذموم اور قبیح ہے اور دوسری قسم اچھی اور محمود ہے۔

اللہ کی طرف سے بندوں پر جو تکلیفات عائد کی جاتی ہیں ان کی تعمیل میں بندوں کی طرف سے تکلفِ محمود کا ظہور ہوتا ہے۔ (راغب)

تکلیفِ شرعی کیا ہے؟

علماءِ اصول میں سے امام الحرمین فرماتے ہیں کہ دشواری والا کام کسی کے ذمہ لگا دینا تکلیف ہے۔ الفاظ یہ ہیں ھو الزام ما فیہ المشقۃ۔ علامہ الشیخ محمد اعلیٰ تھانوی نے کشاف اصطلاحات الفنون میں اسی کو جمہور اصولیین کا مسلک بتایا ہے لیکن علامہ باقلانی نے تکلیف کی جو تعریف کی وہ قدرے اس سے مختلف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ سختی آمیز امر کی طلب کو تکلیف کہتے ہیں۔ چونکہ طلب کا تعلق امرِ مستحب سے بھی ہے امتحاناً امرِ مستحب کا بھی آدمی مامور ہے اس لیے امام باقلانی کے نزدیک امرِ مندوب بھی تکلیفاتِ شرعیہ میں داخل ہے لیکن امرِ مندوب میں ایجاب نہیں ہوتا۔ اور امام الحرمین کے نزدیک تکلیف کے لیے الزام اور ایجاب ضروری ہے ان کے قول پر مندوب و مستحب کو تکلیفِ شرعی نہیں کہا جا سکتا۔

مدارِ تکلیف

تکلیفاتِ شرعیہ کا مدار ایمان باللہ پر ہے۔ کافر غیر مومن ہونے کی وجہ سے غیر مکلف بالعبادت ہوتا ہے۔

آدمی کب مکلّف ہوتا ہے؟

امام شافعی اور امام ابوالحسن اشعری کے نزدیک دعوتِ پیغمبرؐ کے بعد اور امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک دعوتِ پیغمبر اور اتنا وقت گزرنے کے بعد کہ کائنات پر غور کر کے آدمی خالق کائنات کی ہستی اور اس کی وحدانیت کو دریافت کر سکے۔ اسی وجہ سے بچہ پختہ اور مغفل مکلف نہیں ہوتا ہے۔

تفضیل: اللہ تعالیٰ نے اپنے رسُولوں میں سے ہر رسُول کو کسی نہ کسی پہلو سے فضیلت بخشی ہے اور اس فضیلت کے اعتبار سے وہ دوسروں پر ممتاز ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰؑ سے کلام فرمایا ہے اور یہ ان کی فضیلت کا خاص پہلو ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء میں جامع الفضائل ہیں کیونکہ آپ کی ذاتِ گرامی مجمع الکمالات ہے۔ آپ کی اُمت کو ساری اُمتوں سے بہتر بنایا اور آپ کی شریعت کو تکمیلِ ادیان اور اتمامِ نعمت قرار دیا۔ ظاہر ہے کہ مطیع کی افضلیت مطاع کی افضلیت کی رہینِ منت ہے اور نعمت کا اتمام حاملِ نعمت کے افضل ہونے کو مستلزم ہے۔ اگر آپ کی شریعت تمام پچھلی شریعتوں کی جامع اور اس لیے ان سب سے افضل ہے اور اگر آخری اُمت ساری پچھلی اُمتوں کے برکات و نعم سے مالامال اور اس لیے ان سب سے اشمل و اصلح ہے تو یہ اس کے بغیر ممکن نہیں ہے کہ آخری پیغمبر سارے پچھلے رسُولوں کے مقامات و مراتب کا جامع اور ان سب سے افضل و اکمل ہو۔ اور آنچہ ہمہ خوباں دارند تو تنہا داری۔ کا مصداق ہو۔ قرآن و سنت کی تصریحات اس موضوع پر بے شمار ہیں۔

تفکّر: فکر سے بنا ہے اس کے معنے غور کرنے اور سوچنے کے ہیں معنی کے لحاظ سے نظر کا مرادف ہے۔ اگرچہ بعض عُلماء نے دونوں میں باریک فرق بھی بتایا ہے کہ فکر نام ہے معقولات کو ترتیب دینے کا اور نظر نام ہے معقولات کا مطالعہ کرنے کا اور اسے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ فکر یہ کہ خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لیں اور اپنے اندر سوچیں اور سمجھیں۔ نظر یہ کہ کارخانۂ ہستی کے عجائب و دقائق کا مشاہدہ کریں اور اس سے بصیرت حاصل کریں۔ فکر اور تفکّر میں یہی فرق ہے۔ فکر اس قوت کا نام ہے جو علم کو معلوم کی طرف لاتی ہے اور تفکر نام ہے اس قوت سے اقتضاء عقل کے مطابق کام لینے کا۔ یہ انسان کی صفت ہے حیوان کی نہیں ہے اسی لیے تفکّر کا استعمال اس شے کے متعلق ہوتا ہے جس کی صورت کا انسان کے دل و دماغ میں حاصل ہونا ممکن ہو۔ قرآن نے اپنے ماننے والوں کو مختلف عنوانوں سے تفکّر کی دعوت دی ہے۔ قرآن کی یہ دعوت بتا رہی ہے کہ اسلام میں قانونی مصادر کی دو قسمیں ہیں نقلی اور عقلی۔ نقلی مصادر میں تو اربابِ فکر و بصیرت نقل کے پابند ہوتے ہیں۔ اس کے دائرے سے باہر ہونا جائز نہیں مثلاً قرآن، سُنت، اجماع

لیکن عقلی مصادر میں مجتہد کی فکری جولانگاہ وسیع سے وسیع تر ہوتی ہے۔ اس کی مدد سے صرف قانون ہی نہیں بلکہ اصولِ قانون کی بھی تکوین ہوتی ہے اسی بنا پر اسلامی قانون دوسرے قوانین سے اس معاملہ میں خاص طور پر ممتاز ہے جیسا کہ ڈاکٹر منہوری نے اصول قانون میں اعتراف کیا ہے۔ ان کا ارشاد ہے۔

> فقہاء قانونِ اسلامی کو دوسری اُمتوں کے فقہاء کے مقابلے میں یہ خاص شانِ امتیازی حاصل ہے کہ دوسرے قوانین کے علی الرغم انھوں نے علم اصول الفقہ کے نام سے اصولِ قانون کی تدوین کی ہے جس میں اسلامی قانون کے مصادر کی نشاندہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان مصادر سے قانون سازی کا طریقہ کیا ہے؟ یہ علم ٹھیٹھ عقلی ہے۔ اور اس کے ذریعے اسلامی قانون دوسرے تمام قوانین سے ممتاز ہے۔

تاویل: عربی میں تاویل کے معنے کسی بات کے یا کام کے نتیجہ اور مآل کے ہیں اور چونکہ الفاظ کے معانی بھی ان کی دلالت کا مآل اور نتیجہ ہوتے ہیں اس لیے مطالب اور معانی کو تاویل کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ ہر جگہ لغوی معنے میں آیا ہے لیکن اصطلاح میں یہ لفظ خاص معنے میں یعنی کسی لفظ کا ایسا مطلب مقرر کرنا جو اس کے ظاہری مدلول سے ہٹا ہوا ہو۔ قرآن میں یہ لفظ سات جگہ آیا ہے اور ہر جگہ اپنے لغوی معنے میں ہے۔ شارحینِ قرآن نے پارہ سوم کی آیت متشابہات میں اس لفظ کو اصطلاحی معنے میں لیا ہے۔ یہ صحیح نہیں ہے۔ قرآن میں یہ لفظ نہ تو علمِ کلام کی اصطلاحی تاویل ہے اور نہ علمِ اصول کی۔ حافظ ابنِ تیمیہ نے الاکلیل فی المتشابہ و التاویل میں اس پر اچھی بحث کی ہے ان کی ساری بحث کا خلاصہ یہ ہے:

> قرآن کی اس آیت میں لفظ تاویل کو اہلِ تفسیر کی اصطلاحی تاویل کا لبادہ پہنانا درست نہیں ہے اور نہ متاخرین متکلمین اور اصولیین کے اصطلاحی معنے اس کے منہ میں ڈالنے صحیح ہیں۔ یہاں تاویل صرف اپنے لغوی معنے میں ہے۔

حواریون: حواری کی جمع ہے۔ یہ حور سے مشتق ہے حور کے معنے ایک چیز سے لوٹ آنا یا ایک چیز کی طرف لوٹ جانا۔ اسی سے قرآن میں یحور آیا ہے۔ انہ ظن ان لن یحور، اور اسی سے تحاور ایک دوسرے پر بات لوٹانے کے معنے میں ہے واللہ سمیع تحاورکما ۔۔۔۔ اور حور اصل میں بیاض یعنی سپیدی کو کہتے ہیں۔ حور اس عورت کو کہتے ہیں جس کی آنکھ کی سپیدی اعلیٰ درجہ کی سفید اور پتلی خوب سیاہ ہو۔ حضرت مسیح کے ساتھیوں کو حواری اس لیے کہتے ہیں کہ حواری دھوبی کو کہتے ہیں اور چونکہ حضرت عیسیٰ کے حواری دھوبی کا کام کرتے تھے اس لیے ان کو حواری کہا گیا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ ابن عباسؓ سے منقول

ہے کہ چونکہ ان کے کپڑے سپید تھے اس لیے وہ حواری کہلائے۔ ابن ابی حاتم نے ضحاک سے روایت کی ہے کہ حواری قبطی زبان میں دھوبی کو کہتے ہیں اور قتادہ کہتے ہیں کہ حواری اس کو کہتے ہیں جس میں خلافت اور حکومت کی صلاحیت ہو۔ ترمذی نے ابن عیینہ سے ناصر اور مددگار کے معنے نقل کیے ہیں ان سب میں تینوں معانی کا مفہوم قریب قریب ایک ہے۔ یونس بن حبیب نے خالص کے معنے بتائے اور ابن الکلبی نے خلیل کے معنے لکھے ہیں۔ زجاج کا قول لسان العرب میں منقول ہے۔ الحواریون خلصان الانبیاء۔ یعنی نبیوں کے خالص دوست حواری کہلاتے ہیں۔

بارہ حواریوں کے نام

حضرت عیسٰی علیہ السلام کے بارہ حواری تھے ان کے نام اناجیل میں حسب ذیل بتائے گئے ہیں: ۱۔ شمعون جو پطرس کہلاتا ہے۔ ۲۔ اس کا بھائی اندریاس۔ ۳۔ زبدی کا بیٹا یعقوب۔ ۴۔ اس کا بھائی یوحنا۔ ۵۔ فلپس۔ ۶۔ برتلمائی۔ ۷۔ توما۔ ۸۔ متی محصول لینے والا۔ ۹۔ حلفی کا بیٹا یعقوب۔ ۱۰۔ تدی ۱۱۔ شمعون قنانی۔ ۱۲۔ یہوداسکریوطی۔ قرآن نے حضرت کے حواریوں کا چہرہ یہ پیش کیا ہے۔ نحن انصار اللہ امنا باللہ واشھد بانا مسلمون۔ یعنی اپنے افکار و اعمال میں ایمان و اسلام کی تصویر ہیں۔ اور اخلاص کا یہ عالم ہے کہ اللہ کے دین اللہ کے پیغمبر کے قدم قدم پر مددگار رہیں۔ آیئے اب ذرا حواریوں کا چہرہ خود اناجیل کی زبانی بھی سن لیجئے۔ ان بارہ کی ایمانی حالت کے متعلق جو کچھ لکھا ہے وہ ایسے سخت اور نازیبا الفاظ ہیں کہ یہ تسلیم کرنا ہی مشکل معلوم ہوتا ہے کہ یہ حواریوں کی حالت ہو کہیں ان کو کم اعتقاد کہا گیا ہے متی ۶، ۷، ۸) کہیں بے اعتقاد (متی ۱۷۔ ۱۱) کہیں ان کو رائی کے دانہ کے برابر بھی ایمان سے محروم بتایا ہے متی ۱۷، ۲۰) کہیں پطرس کو شیطان کے نام سے پکارا گیا ہے۔ ان میں سے ایک یہوداسکریوطی صرف تیس ۳۰ روپیہ لے کر حضرت مسیح کو گرفتار کرا دیتا ہے اور بارہ کے گیارہ رہ جاتے ہیں مگر گنتی کو پورا کرنے کی خاطر پولوس کو داخل کر کے بارہ کی تعداد پھر بنائی جاتی ہے۔

ربا۔ سود۔ امام راغب لکھتے ہیں۔ اصل سرمایہ پر جو زیادتی ہو وہ ربا ہے لیکن قانون اس زیادتی کو کہتے ہیں جو خاص طریقہ پر ہو۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ یہ ربا یربو سے ہے اور اس کی اصل زیادت ہے۔ چاہے وہ خود چیز میں ہو جیسے اھتزت وربت یا مقابلے میں ہو جیسے دو درہم کے مقابلے میں ایک درہم۔ کچھ کے خیال میں یہ دونوں ربا کے حقیقی معنے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ پہلے حقیقی اور دوسرے مجازی ہیں۔ ابن سریج کہتے ہیں کہ ربا دوسرے معنے میں حقیقت شرعیہ ہے۔ (فتح الباری)

حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں رقمطراز ہیں کہ :

ربا وہ قرض ہے جو اس شرط پر ہو کہ قرضدار سے قرض خواہ نے جتنا لیا ہے اس سے زیادہ یا اس سے اچھا واپس کرے گا اور چند سطور کے بعد ارقام فرماتے ہیں کہ واضح رہے کہ ربا کی دو صورتیں ہیں حقیقی اور حکمی۔ ربا حقیقی روپوں اور قرضوں میں ہوتا ہے اور ہم بتا چکے ہیں کہ اس کے ذریعے معاملاتی مقاصد کی روح پامال ہو کر رہ جاتی ہے۔ زمانۂ جاہلیت کی سوسائٹی اسی کی خوگر تھی اور اسی کی وجہ سے نہ ختم ہونے والا لڑائیوں کا سلسلہ اس زمانہ میں پیش آیا ہے۔ اس کی قلت بھی کثرت کی داعی ہے لہٰذا معاشرے میں اسے قطعی طور پر ختم ہونا چاہیے۔ چنانچہ قرآن اس بارے میں نازل ہو چکا ہے۔ دوسرا ربا حکمی جسے ربا فضل بھی کہتے ہیں۔ اس موضوع پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے سونے کو سونے کے بدلے، چاندی کو چاندی کے بدلے، گیہوں کو گیہوں کے بدلے جَو کو جَو کے بدلے، کھجور کو کھجور کے بدلے اور نمک کو نمک کے بدلے۔ ایک جیسا برابر سرابر اور ہاتھوں ہاتھ بیچو۔ اور جب جنس مختلف ہو تو جیسے چاہو بیچو بشرطیکہ نقد ہو۔ اس ربا فضل کو ربا حقیقی سے مشابہت کی وجہ سے تغلیظاً ربا کہہ دیا گیا ہے۔ جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے منجم کو کاہن فرمادیا ہے اور اسی سے لا ربا الا فی النسیئۃ ربا نہیں مگر نسیہ یعنی دین میں) کے معنے سمجھ میں آسکتے ہیں پھر شریعت میں ربا کا استعمال ان معنے میں اس کثرت سے کہ وہ اس معنے میں بھی حقیقت شرعیہ بن گیا۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

ایام جاہلیت میں ربا کا جس انداز سے معمول تھا اس کے متعلق امام مالک زید بن اسلم سے جو مشہور تابعی ہیں ناقل ہیں کہ انھوں نے بیان کیا۔

جاہلیت میں ربا یہ تھا کہ ایک شخص کا دوسرے شخص کے ذمہ ایک مدت معینہ کے لیے حق واجب الادا ہوتا پس جب مدت پوری ہو چکتی تو کہتا تو ادا کرتا ہے یا زیادہ کرتا ہے۔ اب اگر وہ ادا کر دیتا تو اس کو لے لیتا ورنہ اپنا حق زیادہ کر دیتا اور مدت میں تاخیر کر دیتا امام محمد بن جریر طبری نے عطا اور مجاہد سے اسی کے قریب روایت کیا ہے۔ نیز قتادہ سے نقل کیا ہے کہ جاہلیت میں ربا کا یہ دستور تھا کہ ایک شخص مدت مقررہ پر سودا فروخت کرتا جب مدت پوری ہو جاتی اور خریدار کے پاس ادا کرنے کے لیے کچھ نہ ہوتا تو یہ رقم زیادہ کر دیتا اور مدت کو مؤخر کر دیتا۔ (فتح الباری)

خلاصہ یہ ہے کہ لفظ ربا کے معنے عربی میں زیادتی اور بڑھوتری کے ہیں۔ اور معاملاتی اصطلاح میں اہلِ عرب اس لفظ کو اس زائد رقم کے لیے استعمال کرتے تھے جو ایک قرض خواہ اپنے قرضدار سے ایک طے شدہ شرح کے مطابق اصل کے علاوہ وصول کرتا ہے۔ اسی کو ہماری زبان میں سود کہتے ہیں۔ یا یوں کہہ دو کہ زیادہ مناسب ہے جو ایک قرض دینے والا صرف مہلت کے بدلے میں اپنے قرضدار سے اپنی اصل رقم پر وصول کرتا ہے۔ جاہلیت اور اسلام میں یہ اصطلاح مذکورہ مفہوم کے لیے مشہور رہی ہے اس کی شکلیں مختلف رہی ہیں لیکن اس کی اصل حقیقت یہی ہے کہ قرض خواہ قرضدار سے ایک مقررہ شرح پر اپنے دیئے ہوئے روپیہ کا منافع صرف اس بنا پر وصول کرے کہ اس نے ایک خاص مدت کے لیے اس کو روپیہ استعمال کرنے کی اجازت دی۔

ربانی: زاہد، خدا پرست، درویش، اللہ والا، مربی، مرشد خلق۔ امام راغب لکھتے ہیں ربانی کے متعلق بعض کہتے ہیں کہ ربان کی طرف منسوب ہے اور لفظ فعلان، فعل بکسر عین سے بنایا جاتا ہے جیسے عطشان اور سکران اور بعض کی رائے ہے کہ رب مصدر کی طرف منسوب ہے اور ربانی وہ ہے جو علم کی پرورش کرے اور کچھ کہتے ہیں کہ منسوب تو رب ہی کی طرف ہے مگر اسے کہتے ہیں جو اپنی علم کے ذریعہ تربیت کرے۔ لیکن یہ دونوں لازم ملزوم ہیں کیونکہ جو شخص علم کے ذریعے اپنے نفس کی پرورش کرتا ہے وہ علم کی پروردگاری بھی کرتا ہے اور علم کی پرورش کرتا ہے وہ علم کے لیے اپنے نفس کا بھی پروردگار ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ یہ رب اسم باری کی طرف منسوب ہے جیسے الٰہ سے الٰہی۔ اور نون کا اضافہ اس میں ایسا ہے جیسے اہلِ عرب روحانی، جسمانی میں کرتے ہیں اور کچھ کی رائے ہے کہ لفظ ربانی اصل میں عبرانی ہے اور یہی زیادہ مناسب معلوم ہوتا ہے کیونکہ یہ اہلِ عرب کے کلام میں بہت کم استعمال ہوتا ہے۔ ربی کا لفظ تورات اور انجیل میں بہت استعمال ہوا ہے۔

زیغ: زیغ کے اصل معنے میل یعنی جھکنے اور مائل ہونے کے ہیں۔ یہ لفظ بیک وقت دو مفہوموں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے ایک کجی دوسرے گرنا، کوئی چیز جب جھک جاتی ہے تو گرنے کے قریب ہو جاتی ہے۔ زیغ کی حالت رسوخ کی ضد ہے جس کا ذکر الراسخون فی العلم میں ہے۔ زیغ دلوں کی ایک عام بیماری ہے لیکن اہلِ کتاب اس بیماری کا زیادہ شکار تھے۔ نبیوں کی اُمتوں کا جب انبیاء کی تعلیمات سے مخلصانہ تعلق نہیں رہتا تو یہ بیماری پیدا ہو جاتی ہے۔ یہود کی تاریخ گواہ ہے کہ وہ شروع ہی سے اس بیماری میں مبتلا رہے اور ان کے زیغ کا یہ نمایاں پہلو ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کی موجودگی ہی میں اس میں مبتلا رہے۔ قرآن میں اس کا ذکر ہے۔ فلما زاغوا ازاغ اللّٰہ قلوبھم

شہادت: اس پارے میں اسلامی مالیات کے سلسلے میں شہادت کا ذکر آیا ہے۔ قرآن میں شہادت

مالیاتی قوانین کے سلسلہ میں
تین معنے میں استعمال ہوا ہے جانی قربانی۔ ادائے قرض اور گواہی۔ اس بارے میں
قرآن نے ضابطہ شہادت کی طرف اشارات کیے۔ شہادت، یعنی گواہی اسلام کی قانونی اصطلاح میں یہ
ہے کہ کسی حق کو ثابت کرنے کے لیے لفظ شہادت کے ساتھ مجسٹریٹ کے روبرو سچی خبر دی جائے۔ اگر خبر
سچی نہ ہوگی تو گواہی نہ ہوگی۔ اگر لفظ شہادت سے پیش کرے گا تو شہادت نہ ہوگی اور مجسٹریٹ کے روبرو نہ ہوگی تو
روایت ہوگی مگر شہادت نہ ہوگی۔ علامہ رازی نے بنیادی فرق یہی بتایا ہے کہ واقعہ کی اطلاع اگر حاکم کے
روبرو ہو تو شہادت ہے ورنہ روایت ہے۔ شہادت دینے والے کے لیے ضروری ہے کہ مسلمان ہو عاقل
و بالغ اور آزاد ہونے کے ساتھ عادل ہو۔ یہ سب صفات اس آیت سے ہی معلوم ہو رہی ہیں کیونکہ آیت میں
حکم ہے۔ واستشهدوا شهيدين من رجالكم اس میں لفظ رجالکم اسلام عقلی بلوغ اور آزادی
کی نشاندہی کر رہا ہے مالیاتی معاملات میں شہادت کا نصاب دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہیں۔

شیطان، حق سے روکنے والا۔ بت، معبودِ باطل، سرکش، سخت طاغی، مفسد، شاہ

طاغوت: عبد القادر نے اس کا ترجمہ ہڑونگا کیا ہے اور اس کی تشریح یوں کی ہے وہ جو ناحق سرداری
کا دعویٰ کرے کچھ سند نہ رکھے ایسے کو طاغوت کہتے ہیں۔ بت شیطان اور زبردست ظالم سب یہی ہیں۔
(حاشیہ قرآن مترجم مطبوعہ مطبع مصطفائی سنہ ۱۲۸۲ھ) امام محمد ابن جریر طبری فرماتے ہیں میرے نزدیک طاغوت
کے بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں حد سے متجاوز ہو اور پھر حق تعالیٰ کو چھوڑ کر اسے
پوجا بھی جائے وہ طاغوت ہے خواہ جو اس کو پوجتا ہے اس پر اس کا دباؤ ہو۔ خواہ پوجنے والے کی اپنی مرضی ہو
اور خواہ وہ معبود انسان ہو یا شیطان، پتھر ہو یا بت یا کچھ ہی کیوں نہ ہو۔

علامہ محب الدین ابو البقاء عبد اللہ العکبری لکھتے ہیں۔ طاغوت مذکر بھی آتا ہے اور مؤنث بھی۔ نیز واحد
جمع، تذکیر و تانیث سب میں ایک ہی طرح پر استعمال کیا جاتا ہے۔ اس کی اصل طغیوت ہے کیونکہ یہ طغیت
تطغی سے ہے اسی کا مصدر طغیان ہے پھر لام کلمہ کو مقدم کر کے عین سے پہلے کر دیا گیا تو طیغوت بن گیا
پھر حرفِ علت متحرک اور اس کا ماقبل مفتوح ہوا تو اس کو الف سے بدل دیا چنانچہ اب اس کا وزن فلعوت ہے
اور دراصل یہ ملکوت کی طرح مصدر ہے۔ واضح رہے کہ مصدر ہونے کی صورت میں اس کی تا زائدہ ہوگی۔ اور
علامہ سمین نے بعض سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ اس کی تا زائدہ نہیں لام کلمہ کا بدل ہے اور اس کا وزن فاعول ہے
مبرد نے تصریح کی ہے کہ میرے نزدیک زیادہ درست یہ ہے کہ یہ جمع ہے۔ ابو علی فارسی کہتے ہیں کہ ہمارے
نزدیک ایسا نہیں ہے بلکہ یہ رغبوت ملکوت اور رہبوت کی طرح مصدر ہے۔ جس طرح یہ اسماء آحاد ہیں۔
اسی طرح یہ اسم بھی مفرد ہے جمع نہیں ہے اور جو چیز اس کے مصدر مفرد ہونے پر دلالت کر رہی ہے وہ آیت

کہ یہ اولیاء ھم الطاغوت اس میں جمع کی جگہ مفرد آیا ہے جیسے بطور مبالغہ ھم رضا ھم عدل کہا جاتا ہے ایسے ہی یہاں بھی اولیاء ھم الطاغوت آیا ہے اور سیبویہ کے نزدیک یہ اسم جنس ہے مفرد مذکر اور اس کی جمع و تانیث الامراد ہونے کی بنا پر ہے اور علامہ زمخشری تفسیر سورہ زمر میں رقمطراز ہیں۔ یہ لفظ شیطان یا شیاطین کے لیے استعمال کیا گیا ہے کیونکہ یہ مصدر ہے اور اس میں کئی مبالغے ہیں۔ جمع کے موقعہ پر طاغوت لانے کی یہ وجہ بھی بتائی گئی ہے کہ اللہ سے منہ موڑ کر انسان ایک ہی طاغوت کے جنگل میں نہیں پھنستا ہے بلکہ بہت سے طواغیت اس پر مسلط ہو جاتے ہیں جن میں سے ہر ایک اپنی اغراض کی بندگی کراتا ہے اور بے شمار آقاؤں کا یہ غلام ساری عمر اسی چکر میں رہتا ہے کہ کس آقا کو خوش کرے۔

عبرت: نصیحت حاصل کرنا، دوسرے کے حال پر اپنے حال کو قیاس کرنا۔ دھیان کرنا۔ راغب لکھتے ہیں۔ اصل میں عبر کے معنے ہیں ایک حال سے دوسرے حال میں گزرنے کے۔ اعتبار اور عبرت اس حالت کے ساتھ خاص ہے جس کے ذریعے ایک ایسی چیز کی معرفت کے ذریعے جو مشاہدہ میں آرہی ہے اس چیز کی معرفت تک پہنچا جائے جو ابھی مشاہدے میں نہیں آئی۔ اور علامہ احمد فیومی المصباح المنیر میں فرماتے ہیں۔ اعتبار کے معنے نصیحت پکڑنے کے بھی آتے ہیں جیسے فاعتبروا یااولی الابصار۔ عبرہ اسی اعتبار سے اسم ہے۔ خلیل کہتا ہے کہ عبرت اور اعتبار بما مضی کے معنے گزرے ہوئے واقعات سے نصیحت پکڑنے اور عبرت حاصل کرنے کے ہیں۔ عبرت کی جمع عبر جیسے سدرۃ کی جمع سدر ـــــ امام فخر الدین رازی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں۔ عبرت کے معنے نصیحت حاصل کرنا یہ وہ نشانی ہے کہ جس کے ذریعے جہالت کے مقام کو عبور کر کے علم تک رسائی ہوتی ہے اس کی اصل عبور ہے جس کے معنے ایک جانب سے دوسری جانب پار ہونے کے ہیں اور اسی عبور سے عبارۃ ہے جس کے معنے اس کلام کے ہیں جو معنے کو لے کر مخاطب تک پہنچتا ہے اسی سے عبارۃ الرویا خواب کی تعبیر ہے علامہ بغدادی نے اس کی تعریف ان الفاظ میں کی ہے۔ عبرت وہ رہنمائی ہے جو یقین تک پہنچاتی اور علم تک رسائی کراتی ہے اور قاضی شوکانی نے تفسیر فتح القدیر میں اس کی تشریح مختلف مقامات پر متعدد پیرایہ بیان میں کی ہے چنانچہ سورہ آل عمران میں لکھتے ہیں عبرۃ، عبور سے بروزن فعلۃ ہے اور اس سے مراد نصیحت حاصل کرنا ہے اور تنکیر تعظیم کے لیے یعنی عظیم عبرت اور بڑی موعظت اور سورۂ یوسف میں رقمطراز ہیں، عبرت وہ فکر و بصیرت جو جہالت و حیرت سے نجات دلاتی ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ اعتبار ہی کی ایک نوع ہے یعنی معلوم کی طرف سے مجہول کی طرف کو عبور کرنا۔ اور سورہ نحل میں فرماتے ہیں کہ اصل میں

عبرت کے معنے ایک چیز کو دوسری چیز کے ساتھ اس طرح تمثیل دینا کہ مشاکلت اور مشابہت کی بنا پر اس دوسری چیز کی حقیقت الم نشرح ہو جائے۔

عدالت: فرائض کی بجا آوری اور صدق و امانت میں شہرت کا نام عدالت ہے۔ یعنی ایسے لوگوں کو گواہ بنایا جائے جو اپنے اخلاق و دیانت کے لحاظ سے لوگوں میں قابلِ اعتماد سمجھے جاتے ہوں۔ گواہوں میں عدالت کا ہونا قرآن سے معلوم ہوا ہے اور اس پر اسلام کے قانون داں طبقہ کا اتفاق ہے۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ عدالت ظاہری کافی ہے یا خاص طور پر تفتیش بھی کی جائے۔ صاحب در مختار نے عادل اسے قرار دیا ہے من لم یطعن فی بطن ولا مرج۔ جو پیٹ اور شرمگاہ کے سلسلے میں فہیم نہ ہو یعنی نہ حرام خور اور نہ حرام کار ہو۔ اور علامہ شامی نے ذخیرہ سے عدالت کی تعریف یہ نقل کی ہے کہ کبائر سے گریز پائی ہو۔ صغائر پر اصرار نہ ہو۔ برائیوں کے مقابلے میں خوبیاں زائد ہوں اور خطا کے مقابلے صواب زیادہ ہو۔

کرسی: حافظ ابن تیمیہ، حافظ ابن القیم اور حافظ ابن حزم اور دوسرے اصحاب الظواہر کے نزدیک کرسی سے حقیقی کرسی مراد ہے یعنی یہی بیٹھنے کی کرسی۔ لیکن کیفیت مجہول ہے۔ معلوم نہیں کیسی کس چیز کی بنی ہوئی ہے غرض جیسی اللہ کے لیے سزاوار ہے۔ کچھ علماء کے نزدیک وہ جسم محیط مراد ہے جس کے اندر سارا جہان سمایا ہوا ہے۔ بعض نے انصاف و حکومت کی کرسی مراد لی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کے نزدیک کرسی سے علم مراد ہے۔ دراصل یہ اللہ سبحانہ کے اقتدار اور حاکمانہ اختیارات کی استعارے کی زبان میں تفہیم ہے تاکہ اس کی کمزور مخلوق میں اس کی طرف ایک فکری انجذاب پیدا ہو جائے۔ کرسی دراصل عالمِ غیب کی کرسی ہے اگر ہم اپنے ادراک کے مطابق اس کی شکل و صورت اختراع کریں گے تو یہ سر تا سر غلط ہے اور اگر اس کا انکار کر دیں تو یہ بھی بیہودگی ہے۔ شیخ اکبر سے شیخ عبدالوہاب الشعرانی نے بڑے پتے کی بات نقل کی ہے کہ یہ بھی عجیب بات ہے کہ انسان ما وراء عقل و فکر کی چیزوں کو اپنی عقل کی ترازو میں تولنا چاہتا ہے حالانکہ اس کو اپنی عقل کی کوتاہی معلوم ہے۔ پھر اپنی قوتِ خیال و حفظ کا قصور بھی اس پر عیاں اور قوتِ واہمہ کا اختتام اس پر مستزاد۔ اس کے باوجود اس کے سامنے معاملاتِ ربانیہ کا ذکر آتا ہے تو وہ اپنی ہی عقل و فکر کی تقلید کرنے لگتا ہے کیا اس کا یہ فرض نہ تھا کہ جو کچھ اللہ سبحانہ نے اپنے متعلق بتایا ہے اسے بے چون و چرا مان لینا اور اپنے اس فکر کی تقلید نہ کرنا جو اسی کے خیال کا مقلد ہے اور جس کا خیال اس کے حواس کی تقلید کرتا ہے شاہراہِ مستقیم اس موضوع پر وہی ہے جسے سلف صالحین نے اختیار کیا ہے یعنی جو کچھ بتایا گیا ہے اسے مان لیا جائے اور اس کی کیفیت کے معاملہ میں بحث و تمحیص اور تحقیق و تفتیش نہ کی جائے۔ بلاشبہ اللہ کی کرسی ہے

لیکن یہ عالم غیب کی کرسی ہے ہماری اس کی حقیقت تک رسائی نہیں ہے۔

مُحکمات: اسم مفعول جمع مؤنث محکمۃ مفرد احکام مصدر افعال پختہ درست جن کے معانی اور الفاظ میں اجمال واشتباہ نہ ہو۔ دلالت لفظ علی المعنے واضح ہو، غیر مراد کا احتمال نہ ہو۔ ابوالبقاء کلیات میں رقمطراز ہیں کہ محکم وہ ہے جس میں ایک ہی معنے ہوں کیونکہ محکم متقن کا مرادف ہے۔ بناء محکم اس عمارت کو کہتے ہیں جس میں کوئی کمزوری اور خرابی نہ ہو اس لیے محکم کی مراد بھی محکم ہوتی ہے۔ اصل میں یہ لفظ احکام سے بنا ہے اور اس مادہ کے عمومی معنے روکنے کے آتے ہیں ہر محکم اپنی مضبوطی کی وجہ سے اپنے تک خلل سے رکاوٹ ہوتا ہے اس لیے وہ محکم ہے جو احکام خود قرآن کے اوصاف میں سے ایک اہم وصف ہے۔ کتاب احکمت آیاتہ یعنی قرآن کی آیات محکم ہیں۔

شارحین قرآن محکمات کی تعریف میں مختلف الخیال ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ محکم وہ جو سب شریعتوں میں یکساں ہو۔ کچھ کی رائے میں محکم ناسخ کا دوسرا نام ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ محکم وہ ہے جس کے دلائل کھلے اوصاف ہوں اور کچھ کے مبارک خیال میں محکم وہ ہے جس تک جلی یا خفی دلیل کے ذریعے رسائی ممکن ہو، کچھ حلال وحرام کے بیان کو حکم بتاتے ہیں اور کچھ کا کہنا ہے محکم وہ ہے جس کے صرف ایک معنے ہوں دوسرے معانی کا احتمال نہ ہو۔ لیکن قرآن نے محکمات کا جو چہرہ ھن ام الکتاب کے ذریعے پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محکم سے مقصود وہ مطالب ہیں جو اصل اور بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں اور اس لیے سب کے لیے صاف صاف اور کھلے احکام ہیں مثلاً توحید ورسالت اور اوامر ونواہی، حلال وحرام یعنی ان کی زبان بالکل صاف ہے جن کا مفہوم مقرر کرنے میں کسی اشتباہ کی گنجائش نہیں ہے جن کے الفاظ معنے ومدعا پر صاف اور صریح دلالت کرتے ہیں۔ یہ خیر وشر کے مسلمات اور معروف ومنکر کے قطعیات پر مشتمل ہیں۔ ان کو دل قبول کرتے ہیں اور ان کے قبول کرنے کی اس کے سوا کوئی شرط نہیں ہے کہ دل میں سلامتی ہو۔

متشابہات: اسم فاعل متشابہہ مؤنث کی جمع ہے یعنی کچھ آیتیں قرآن میں متشابہات ہیں۔ قرآن میں متشابہ ہونے کا کیا مطلب ہے۔ اس کی تشریح علماء نے مختلف طور پر کی ہے راغب فرماتے ہیں کہ جن آیات کی تفسیر تماثل لفظی یا معنوی کی وجہ سے مشکل ہو وہ متشابہات ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ جن آیات کی معرفت تدبر وتفکر کے بغیر نہ ہو اور کچھ کی رائے میں جن آیات تک رسائی کا کوئی ذریعہ نہ ہو اور کچھ کے خیال میں جن آیات کے معانی میں متعدد تاویلات محتمل ہوں وغیرہ وغیرہ متشابہات ہیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن میں آیات تین طرح کی ہیں۔ محکم مطلق، متشابہہ مطلق، محکم اور متشابہ فی الجملہ۔

فی الجملہ متشابہ کی تین قسمیں ہیں۔
اولاً: لفظ کے اعتبار سے تشابہ ہو۔
ثانیاً: بلحاظِ معنے تشابہ ہو۔
ثالثاً: لفظ اور معنے دونوں کے اعتبار سے تشابہ ہو۔

الف: متشابہ کا تشابہ اگر لفظ کی وجہ سے ہے تو کبھی مفرد لفظ کے اعتبار سے ہوتا ہے اور کبھی مرکب کی وجہ سے لفظ مفرد میں تشابہ کبھی لفظ غرابت کی وجہ سے ہوتا ہے جیسے ابّا یہ لفظ غریب المعنے ہے اس لیے مرادی معنے کی تعیین میں اشتباہ ہے کبھی لفظ کے مشترک المعانی ہونے کی وجہ سے اشتباہ پیدا ہو جاتا ہے جیسے ید اور عین دونوں مختلف المعانی ہیں۔ معنے کی تعیین میں اشتباہ ہے۔

کلام مرکب میں تشابہ کبھی اختصار کی وجہ سے ہوتا ہے۔ کبھی کسی لفظ کو بڑھا دینے کی وجہ سے ہوتا ہے جیسے لیس کمثلہ شیئ۔ کبھی ترتیب عبارت کی وجہ سے اشتباہ ہوتا ہے۔

ب: متشابہ من حیث المعنے کی مثال میں اللہ سبحانہ کی صفات کو پیش کیا جا سکتا ہے جو نہ محسوس ہیں نہ متشابہ بالمحسوس، اور جو چیز محسوس یا متشابہ محسوس ہو اس کا تصور ہمارے لیے ناممکن ہے اس لیے صفاتِ الٰہیہ ہمارے لیے متشابہات ہیں۔

اگر لفظ اور معنی دونوں کے اعتبار سے تشابہ ہو تو اس کی پانچ صورتیں ہیں۔
اول: کمیت اور مقدار میں تشابہ ہو جیسے اقتلوا المشرکین۔
دوم: کیفیتِ حکم میں تشابہ ہو معلوم نہیں کہ واجب ہے یا مستحب جیسے فانکحوا ما طاب لکم۔
سوم: اختلافِ زمان کی وجہ سے تشابہ ہو جیسے ناسخ و منسوخ میں ہوتا ہے۔
چہارم: رسوم و رواج اور ماحول کو نہ جاننے کی وجہ سے تشابہ ہو جیسے انما النسیٔ زیادۃ فی الکفر
پنجم: صحت فعل یا فساد فعل کی شرائط نہ جاننے کی وجہ سے تشابہ ہو جیسے نماز کی شرائط نہ جاننا۔
شارحینِ قرآن نے متشابہ کی جو تعریفیں کی ہیں کوئی بھی ان سے باہر نہیں۔

متشابہ کا حکم

۱۔ تنقیح بالا سے یہ واضح ہے کہ بعض متشابہات کا علم ہمارے لیے ناممکن ہے جیسے صفاتِ الٰہیہ وقتِ قیامت کی تعیین وغیرہ وغیرہ۔
۲۔ کچھ متشابہات کا علم ہم کو ہو سکتا ہے اور ہوتا ہے جیسے الفاظِ عربیہ اور احکام معظمہ کو ہم جانتے ہیں۔

۳۔ کچھ متشابہات ایسے ہیں جن کا علم صرف علماء راسخین کو ہوتا ہے۔
اس تفصیل کے پیش رکھ کر یہ سمجھنا دشوار نہیں ہے کہ مایعلم تاویلہ الا اللہ میں
اللہ پر وقف ہی صحیح ہے اور ما بعد سے وصل بھی صحیح ہے۔ اگر نمبر ا متشابہات مراد ہوں تو وقف
ضروری ہے اور نمبر ۲ متشابہات مراد تو وصل صحیح ہے۔

پارہ سوم ایک نظر میں

اللہ کی صفات

توحید الوہیت و ربوبیت

رسالت ونبوّت

معجزات وکرامات

ایمان واسلام

اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے ۱۹
اسلام دین کی وقتی تائید یا صرف تلاوت سے حاصل نہیں ہوتا اس کے لیے سوسائٹی کا احکام اسلامی پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے۔
اسلام سے آنے پر ہدایت ہونا موقوف ہے ۲۰
عبادت و طاعت میں صرف اللہ کا ہو کر رہنا اور کسی مرحلہ پر شرک سے دامن آلودہ نہ ہونا اسلام کی جان ہے۔ ۶۴
ابراہیم یہودی اور عیسائی نہ تھے بلکہ حنیف مسلم تھے۔ ۶۷
پوری کائنات مسلم ہے تکوینًا ہو یا تشریعًا ۸۴
اسلام کے سوا کوئی دین قابل قبول نہیں ہے ۸۵

صحابہ کرام رضؓ

اللہ کی راہ میں انفاق مال کی قربانی کو صحابہ نے دل وجان سے قبول کیا۔
صحابہ کرام کے انفاق مال کے لیے خالص معاشی تمثیل ۲۶۱
اللہ کی راہ میں مالی قربانی وہ اس طرح کرتے تھے کہ اس کا نہ احسان جتائے اور نہ کوئی خدمت لیتے۔ ۲۶۲
ان کی مالی قربانیاں محض رضائے الٰہی کی خاطر ہوتی تھیں ۲۶۵
صحابہ کرام میں مقصد کی اس قدر لگن تھی کہ اس کے لیے کوئی قربانی نہ تھی جو انھوں نے گوارا نہ کی معاشی فکر سے بے پروا ہو کر انھوں نے زندگی کو خدمتِ دین کے لیے وقف کر دیا تھا۔ ۲۷۳
دن رات اور خلوت وجلوت میں وہ اپنے اموال دین کی برتری کے لیے خرچ کرتے تھے۔ ۲۷۴
ایمان، عمل صالح، اقامتِ صلاۃ اور زکوٰۃ کی ادائیگی ان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کی خاص نشانیاں تھیں ۲۷۷
ایمان قبول کرنے کے بعد زندگی کے تمام گوشوں میں ایمانی تقاضوں کے لیے طاعت کی سرشاری اور سمعنا واطعنا کی پکار ان کے دلوں میں راسخ ہو گئی تھی۔ طاعت کی ان سرشاریوں کے ۲۸۵

باوجود ان کی نظریں اپنی کوتاہیوں پر ہوتی تھیں اور ان کی زبانوں پر غفرانک ربنا کی صدا ہوتی تھی۔ ۲۸۵

استعدادِ عمل کے ساتھ وہ کفر کے مقابلہ میں فتح مندی کی دُعائیں مانگتے تھے صحابہ نے اپنی دُعائیں صرف یہ نہیں کہا ہمیں کافروں کے مقابلے میں فتحمند کر بلکہ فتح مندی کی طلب سے پہلے بھول چوک پر گرفت نہ کرنے کی طلبگاری کی اور کہا اے ہمارے پروردگار ہم سے وہ بوجھ نہ اٹھوا جس کی ہم میں طاقت نہ ہو، ہمیں معاف کردے اور ہمیں بخش دے۔ کیونکہ خدا کی نصرت انہی کے حصے میں آتی ہے جن میں استعدادِ عمل کے ساتھ غرور نہ ہو بلکہ عجز و نیاز ہو ۲۸۶

صحابہ پر علم کے رسوخ اور معرفت کے کمال سے یہ حقیقت کھل گئی تھی کہ متشابہات کی حقیقت کا ادراک عقلِ انسانی کی دسترس سے باہر ہے ان کا کہنا تھا کہ جو کچھ بھی ہے ہمارا اس پر ایمان ہے۔ ۷

قرآن نے صحابہ کے عقلی کمال کو سراہا ہے۔ ۷

سارے حسنِ عمل اور طاعت کی سرشاریوں کے باوجود وہ اللہ سے دُعا کرتے تھے کہ اے ہمارے رب ہدایت کے بعد ہمارے دلوں کو کج نہ کر ۸

صحابہ کرام کے اوصاف اور ان کے ایمان و عمل کا چہرہ ۱۷

صحابہ کرام ملت ابراہیم کے پیروکار رہیں ۶۸

کتاب الٰہی کے تعلیم و تعلم کے ذریعے صحابہ کا مقام ربانیت ۷۹

دستوری قواعد

دین کے معاملہ میں کسی قسم کا جبر و اکراہ جائز نہیں ہے۔

جو بھی طاغوت سے بیزار ہوا اور اللہ پر ایمان لائے وہ فلاح و سعادت سے ہمدوش ہے اسی کا دوسرا نام اسلام ہے ۲۵۶

نبوت کا کام ہدایت کی تخلیق و توفیق نہیں بلکہ ہدایت کی تبلیغ ہے ۲۷۱

ہر نیکی کا بدلہ پورا پورا ملے گا حق تلفی نہ ہوگی ۲۷۲

معاملات میں ظالم اور مظلوم دونوں کو سوسائٹی میں گوارا نہیں کیا جا سکتا یعنی اسلام نہ یہ پسند کرتا ہے کہ تم کسی کا مال چھین لو اور نہ یہ پسند کرتا ہے کہ کوئی تمہارا چھین لے کسی پر طاقت ۲۷۹

سے بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا۔ ۲۸۶

ہر شخص کو اپنے اعمال کی جزا و سزا ملتی ہے ۲۸۶

مدارِ نجات اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت ہے ۳۲

اللہ کی عبادت اور نبی کی طاعت صراطِ مستقیم ہے ۵۱

قرآن کا تعارف

قرآن کا نزول تفکر کے لیے ہوا ہے۔ ۲۶۶

قرآن اللہ نے حق کے ساتھ پیغمبر پر نازل کیا ہے قرآن ان سب کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو قرآن سے پہلے نازل ہو چکی ہیں۔ ۳

قرآنی آیات دو اصولی قسموں پر مشتمل ہیں محکمات اور متشابہات

قرآن کی آیات متشابہات کا تعلق عالمِ غیب کے حقائق سے ہے ۷

قرآن علم ہے اس کی آیات کا کفر سنگین جرم ہے ۱۹

قرآن فضلِ الٰہی ہے ۷۳

قرآن کا تعلیم و تعلم ہی ایک مومن کو دنیا میں ربانی بنا سکتا ہے ۸۰

اخلاقی قوانین

اچھا بول زبان کی شیرینی اور عفو درگزر اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے ساتھ خدا کے بندوں کے لیے اذیت ہو ۲۶۳

دکھاوے کی خیرات اکارت ہے کیونکہ جو شخص نیکی کے لیے نہیں بلکہ نام و نمود کے لیے کرتا ہے اور خدا کی جگہ انسانوں کی نگاہوں میں بڑائی چاہتا ہے وہ یقیناً خدا پر سچا ایمان نہیں رکھتا ۲۶۴

اخلاق کے لیے ایمان شرط ہے یہی ایمان جس سے حسنِ نیت پیدا ہوتی ہے آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے جو نہ ہو تو اعمال کی حیثیت اس کھیتی کی ہو جاتی ہے جو پہاڑ کی چٹان پر لگائی جائے۔ ۲۶۴

خیرات میں من و اذیٰ روحِ ایمان کے منافی ہے۔

اگر دل میں اخلاص ہو تو تھوڑی خیرات بھی برکت و فلاح کا سامان ہے ۲۶۵
نکمی اور بیکار چیز راہِ خدا میں دینا اور سمجھنا کہ ثواب کما لیا اخلاق کے خلاف ہے اگر تمہیں
کوئی ایسی چیز دے دے تو کیا پسند کرو گے؟ ۲۶۷
ہر انسان میں ایسی سمجھ بوجھ کا پیدا ہو جانا کہ اخروی نفع و نقصان کو سمجھ سکے اور اچھائی اور
برائی کا شناسا ہو سکے حکمت ہے یہ اخلاق کی بنیاد ہے قرآن کہتا ہے جسے حکمت مل
گئی تو اس نے بہت بڑی خیر پالی۔ ۲۶۸
خیرات کرنا اخلاقِ حسنہ کا قدرتی نتیجہ ہے اس میں نہ تو کسی پر احسان ہے اور نہ کسی سے تحسین
و تشکر کی توقع ہے ۲۷۲
قرآن میں ہر قسم نیک کاموں کی غرض و غایت صرف رضائے الٰہی ہے یہی قرآن کی نظر
میں اخلاق کی غرض و غایت ہے یہاں دو نعمتیں ہیں جان اور مال اور ان دونوں کو
اللہ کی راہ میں خرچ کرنا حسنِ عمل ہے۔ ۲۷۲
حاجت مندوں کو سوال کر کے اپنی عفت اور خودداری کو تاراج نہ کرنا چاہیے ان کی
شانِ اخلاق یہ ہو کہ بے نیاز رہیں اور لوگوں کا اخلاق یہ ہو کہ بے مانگے مدد کریں۔ ۲۷۳
قرآن انسانوں میں باہم محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے اس لیے اس نے خیرات کا
حکم دیا لیکن سود خواری کی ذہنیت اس کی ضد ہے اس سے انسان میں انسان ہمدردی
کا نام و نشان تک نہیں رہتا سود خوار اخلاقی اعتبار سے اتنا بے رحم اور درندہ ہو جاتا ہے
کہ قرآن اسے شیطان کی چھوت سے باؤلا اور دیوانہ کہتا ہے۔ ۲۷۴
اخلاق کا تقاضا یہ ہے کہ قرضدار اگر تنگدست ہو تو اسے فراخ دستی تک مہلت دی جائے۔ ۲۸۰
بلند اخلاقی یہ ہے کہ معاف کر دیا جائے ۲۸۰
برداشت و صبر، گفتار و کردار کی راستی، نیاز مندی اور عاجزی اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اور
جنابِ الٰہی میں سحری کے وقت میں گناہوں کی معافی مانگنا بلند اخلاقی اوصاف ہیں ۱۷
سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ حق و عدالت سے دشمنی کی جائے اور ظلم و فساد سے محبت کی جائے ۲۰
اخلاق کی گراوٹ کا سب سے بڑا شاہکار گروہی تعصب ہے اس کے نتیجہ میں انسان حق و صداقت کو صرف
اپنے گروہ کی وراثت سمجھتا ہے جانتے بوجھتے حق کا انکار کرتا ہے حق میں باطل کی آمیزش کر کے
حق کو مشتبہ بنانے کی کوشش کرتا ہے حق کو ناکام بنانے کے لیے اسکیمیں بناتا ہے۔ ۷۲

دیانت ہر حال میں دیانت ہے اور خیانت ہر حال میں خیانت ہے دین و مذہب کے اختلاف سے حقائق معطل نہیں ہو سکتے۔ ۷۴

عہد شکنی اور غداری کرنے والوں کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے ۷۷

جان بوجھ کر اللہ کے نام پر جھوٹ بولنا سنگین جُرم ہے ۷۸

سیاسی قوانین

انسانی زندگی میں ایمان وکفر کی آویزش اختلاف استعداد کا نتیجہ ہے۔ جنگ کی جو منزل پیش آئی ہے وہ ناگزیر ہے ظلم و فساد کی مدافعت کے لیے ایسا ہونا ضروری ہے ۲۵۳

جب دفع فساد کے لیے جنگ ناگزیر ہے تو اس کی تیاری یہ ہے کہ اپنا مال خرچ کرو۔ ۲۵۴

جنگ کی اجازت ظلم و تشدد کے انسداد کے لیے دی گئی ہے نہ کہ دین کی اشاعت کے لیے ۲۵۶

حکومت و اقتدار اللہ کی بخشش ہے اب وقت آگیا ہے کہ حق و باطل کا فیصلہ ہو اور حق کو سیاسی برتری حاصل ہو۔ ۲۷

مسلمانوں سے خطاب کہ راہِ عمل میں سرگرم ہو جاؤ اور اپنے شخصی علاقوں کو جماعتی علاقوں پر ترجیح نہ دو اور دشمنوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ ۲۸

اسلام کی سیاسی برتری کے لیے نبوت کی غیر مشروط اتباع ضروری ہے ۳۰

اسلام کی سیاسی برتری کے لیے اہل کتاب سے دو ٹوک فیصلہ کرو۔ ان سے کہو کہ آؤ مل کر لگائیں نہ پروردگار کی عبادت اور طاعت کا نظام چلائیں۔ ۶۴

جو لوگ مومن ہونے اور رسُول کی حقانیت کی شہادت دینے کے باوجود کفر کی راہ اختیار کریں وہ ظلم کار ہیں۔ ۸۶

اسلام کے سوا کوئی نظامِ حیات قابلِ پذیرائی نہیں ہے۔ ۸۵

اجتماعی قوانین

جب افراد کا تعلق ایمان و عمل سے ہٹ کر شفاعت، خلت اور فدیہ پر ہو جاتا ہے تو اجتماعی زندگی کا شیرازہ درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ ایمان باللہ کا حقیقی امتحان صرف انفاق میں ہے۔ ۲۵۴

اجتماعی زندگی میں تخیل کی عظمت اور مقصد کا عشق ہے جب تعلق ٹوٹ جاتا ہے تو فرائض دین کی پابندی، لذت و حلاوت سے خالی ہو جاتی ہے۔ ۲۵۵

مقصد کی خاطر سرگرم عمل ہونے کا لازمی نتیجہ طاغوت کا انکار ہے اور کوئی شخص صحیح معنے میں اللہ کا مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ طاغوت کا منکر نہ ہو۔ ۲۵۶

جب تک تخیل سے محبت نہ ہو اور حصول مقصد کی طلب ان کے جذبۂ عمل کو بیدار نہ کرے زندگی میں ہر قسم کی کوشش بے نتیجہ رہتی ہے اور زندگی کی ہر شاخ نورانیت سے بے بہرہ رہتی ہے۔ قوموں میں پہلے مقصد کا شعور پیدا ہوتا ہے مقصد اگر اللہ کے کلمہ کا بول بالا ہو تو پوری زندگی میں تاریکیاں دُور ہو کر نورانیت آجاتی ہے اور اگر زندگی کا مقصد طاغوت ہو تو زندگی کی ہر شاخ میں تاریکی ہی تاریکی ہوتی ہے ۲۵۷

مقصد کی لگن اور نصب العین کا عشق اگر افراد میں موجود ہو تو خواہ کام کرنے والا فرد واحد ہو اور سامنے بہت بڑی ظالم اور جابر قوت ہو فتح مندی یقینی ہوتی ہے ۲۵۸

مقصد کا عشق مایوسیوں میں اُمید کی کرن لے کر آتا ہے۔ عام زندگی میں خواہ بربادی ہی بربادی ہو داعی کی نگاہ اللہ کی قدرت پر ہونی چاہیے ۲۵۹

اجتماعی زندگی میں دعوتِ حق سے مردہ قوموں کا زندہ ہو جانا اور گمراہ افراد کا ایک تربیت یافتہ جماعت کی حالت میں بدل جانا ۲۶۰

اُمت مسلمہ جس نصب العین کی علمبردار بن کر آئی ہے اس کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیوی فائدے اور نقصان سے بے پرواہ ہو کر محض اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے اپنا وقت اپنی قوتیں اور اپنی کمائیاں خرچ کرے اس کے لیے نظر کی وسعت، حوصلے کی فراخی، دل کی کشادگی اور سب سے بڑھ کر اللہ کی رضا جوئی کی ضرورت ہے کہ اجتماعی زندگی کے نظام الٰہی تبدیلی کی ضرورت ہے کہ افراد کے اندر مادہ پرستانہ اخلاقیات کے بجائے یہ اخلاقی اوصاف نشوونما پائیں ۲۶۴

اجتماعی زندگی میں ذہنیت کی تبدیلی کے لیے ایک عجیب مثال ۲۶۶

اجتماعی زندگی میں دین کی پابندی کی خاطر رضاکارانہ تنظیم ضروری ہے ۲۷۳

سود اجتماعی زندگی کا وہ ناسور ہے جو زندگی کی ہر شاخ میں تباہی لاتا ہے ۲۷۶

اجتماعی زندگی کی کامیابی کے لیے ان اہلِ تقویٰ کی ضرورت ہے جو راہِ حق میں پوری استقامت دکھانے والے ہوں، کسی نقصان اور مصیبت سے نہ گھبرانے والے، کسی لالچ سے پھسلنے والے ہوں۔ ۱۷

مالیاتی ضوابط

فوجداری قوانین

وقف لازم

تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلٰى بَعْضٍ مِّنْهُمْ مَّنْ
كَلَّمَ اللّٰهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجٰتٍ ؕ وَاٰتَيْنَا عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ
الْبَيِّنٰتِ وَاَيَّدْنٰهُ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا اقْتَتَلَ
الَّذِيْنَ مِنْۢ بَعْدِهِمْ مِّنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ وَلٰكِنِ
اخْتَلَفُوْا فَمِنْهُمْ مَّنْ اٰمَنَ وَمِنْهُمْ مَّنْ كَفَرَ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ
مَا اقْتَتَلُوْا ۫ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيْدُ ﴿۲۵۳﴾

رکوع ۳۲ / ۱

یہ ہمارے پیغمبر ہیں جن میں سے کچھ کو ہم نے کچھ پر فضیلت دی ہے[۲۲۸] ان میں سے کچھ تو ایسے ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور کچھ ایسے ہیں جن کے اللہ نے درجے بلند کیے۔[۲۲۹] اور ہم نے ہی مریم کے بیٹے عیسٰی کو روشن دلائل عطا کیے اور اس کو روح القدس کی تائید سے[۲۳۰] سرفراز کیا۔ اگر اللہ چاہتا تو لوگ ان پیغمبروں کے بعد ہدایت کی روشن اور واضح دلائل آنے کے باوجود باہم نہ لڑتے لیکن انبیاء کے بعد لوگ باہم اختلاف کر بیٹھے، کچھ لوگوں نے ایمان کی راہ اختیار کی اور کچھ نے کفر کی۔[۲۳۱] اور اگر اللہ چاہتا تو لوگ باہم دست بگریباں نہ ہوتے لیکن اللہ جو ارادہ کر لیتا ہے

وہی کرتا ہے۔[۲۵۳]

رسولوں میں سب سے افضل رسولؐ

پہلی آیت اور یہ آیت روح القدس تک سلسلہ کلام میں بطور التفات آئی ہے۔ اس سے پہلے ذکر تھا کہ اللہ سبحانہ، جہاد کا حکم نہ دیتا اور اس کے نیک بندے زمین کو فتنہ و فساد سے پاک کرنے کے لیے تلوار نہ اٹھاتے تو بدکار اور غنڈے زمین کو امن و سلام کی جگہ شر و فساد کا گہوارہ بنا دیتے اور اللہ کی زمین نیکی اور تقویٰ سے خالی ہو جاتی ـــ اور بعد میں بتایا ہے کہ انسانوں نے انبیاء کی صاف اور کھلی ہدایت کے باوجود انبیاء کے بعد جنگ و نزاع اور باہمی خوں ریزی کا ایسا بیج بو دیا جو ہمیشہ پھل لاتا رہتا ہے۔ اللہ کی سنت یہ ہے کہ اس نے ہدایت و ضلالت کے بارے میں جبر کا طریقہ اختیار نہیں کیا اگر وہ ایسا کرتا تو کوئی بھی ایمان چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار نہ کرتا ـــ ان دونوں باتوں کے درمیان جن کا تعلق جہاد کی ضرورت اور حکمت سے ہے یہ دو آیتیں آئی ہیں ایک تلك آيات الله الخ اور دوسری تلك الرسل فضلنا... سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس موقعہ پر اولاً حضور انور کی رسالت کی اور پھر رسولوں میں آپ کی فضیلت کا تذکرہ کیوں کیا گیا ہے؟

اس بات کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آپ سمجھیں کہ رسول کسے کہتے ہیں؟ اور رسالت کیا ہوتی ہے؟ کیونکہ دونوں آیتوں میں اصل مقصود یہی ہے اسی کو زوردار بنانے کے لیے ان اور لام تاکید لائے ہیں۔ اور قاعدہ ہے کہ کلام میں جس چیز پر زور ہوتا ہے وہی مقصودِ کلام ہوتا ہے۔ اس موقعہ پر اس پر زور دینے کی وجہ یہ ہے کہ نبی ہونے کے لیے صرف صاحب وحی ہونا ضروری ہے لیکن نبی ہونے کے بعد جب اللہ سبحانہ کی جانب سے کافر قوم تک پہنچانے پر مامور کر دیا جائے تو وہ رسول ہوتا ہے۔ نبی صرف اہل ایمان تک پیغام پہنچاتا ہے اور رسول اہل ایمان کے ساتھ اہل کفر تک پیغام پہنچانے کے لیے مامور ہوتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ کسی کو غیب کی خبریں وحی کے ذریعے دے کر نبی بنا دے تو وہ نبی ہو جاتا ہے اور جب تک کسی کافر قوم کو خدائی پیغامات پہنچانے کا اس کو حکم نہ دے۔ اس وقت تک وہ صرف نبی رہتا ہے خواہ وہ کسی پہلی شریعت پر ہی عمل کرتا ہے۔ ہاں جب اس کو کسی کافر قوم تک اللہ کے احکام پہنچانے کا حکم ہو جائے تو اب وہ نبی ہونے کے ساتھ رسول اللہ بھی بن جاتا ہے حضرت آدم اور حضرت نوح کے درمیان جس قدر اللہ کے برگزیدہ بندے آئے وہ سب انبیاء تھے۔ رسول اللہ ان میں کوئی نہ تھا۔ ان کا

وظیفہ صرف یہ تھا کہ وحی ربانی پر خود عمل کریں اور مومنوں کی جو جماعتیں ان کے سامنے تھیں اُن کو بھی عمل کرنے کا حکم دیں۔ جب حضرت نوح علیہ السلام کا دور آیا اور کفر ظاہر ہوا تو اب اُن کی اصلاح کے لیے حضرت نوح علیہ السلام مبعوث فرمائے گئے اور وہ رسُول اللہ کہلائے اسی لیے اُن کو حدیثوں میں سب سے پہلا رسُول کہا گیا ہے۔

اور یہ بھی حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں کہ رسُول کے لیے جدید شریعت لانا قطعاً ضروری نہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام رسُول تھے باوجودیکہ وہ ملّتِ ابراہیمی کے پیرو تھے۔ اسی طرح حضرت داؤد علیہ السلام بھی رسُول تھے اور شریعت تورات پر عامل تھے۔

اب سمجھئے کہ پہلے قرآن نے حضرت داؤد کا کافروں کے مقابلہ میں جہاد کا تذکرہ کیا اور پھر جہاد کی حکمت یہ بیان کی کہ اگر قوموں اور جماعتوں کی کش مکش میں مدافعت نہ ہوتی تو دُنیا سے حق و عدالت کا نام و نشان مٹ جاتا۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے باطل کی سرکوبی کا یہ انتظام فرما دیا ہے۔ آپ بھی اللہ کے رسُول ہیں اور رسُول ہونے کی حیثیت میں آپ کا بھی سابقہ کافروں سے پڑا ہے۔ جو منزل دوسرے رسُولوں کو کافروں سے مقابلہ کی پیش آتی رہی ہے وہ رسُول ہونے کی حیثیت میں سُنّتِ الٰہی کے مطابق آپ کو بھی پیش آئے گی۔ رسُولوں کا رسالت کے لحاظ سے اگرچہ درجہ یکساں ہے لیکن اس میدان میں جو جتنی زیادہ آزمائشوں سے گزرتا ہے اور جس قدر زیادہ محنت کرتا ہے وہ اپنی محنت کے لحاظ سے اسی قدر بلند درجہ رکھتا ہے اور اسی قدر افضل ہوتا ہے۔ آپ کی رسالت قومی، ملکی رسالت نہیں بلکہ عالمی اور بین الاقوامی رسالت ہے۔ اس لیے آپ کا مقام بھی رسالت میں اپنے کام اپنی محنت کے لحاظ سے زیادہ ہے اور چونکہ آپ کا کام اور محنت سب سے زیادہ ہے اس لیے آپ کی فضیلت بھی سب سے زیادہ ہے۔

اسی بنا پر قرآن نے آپ کی وحی اور آپ کی رسالت کے ذکر میں مشبہ بہ کی حیثیت سے ان انبیاء کا نام لیا ہے جن کا پالا وقت کی طاغوتی طاقتوں سے پڑا اور جنہوں نے اس راہ میں بے حساب محنت کی ہے مثلاً حضرت نوح، حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہما السلام۔ اگرچہ حضرت موسیٰ کا سابقہ فرعون سے پڑا ہے۔ مگر حضرت موسیٰ کے ساتھ اہل ایمان کا ایک گروہ پہلے سے موجود ہے لیکن حضرت ابراہیمؑ نے جو کام رسالت کا کیا ہے وہ مثالی ہے۔ وہ ایسے ملک میں ہوئے جہاں ان کا کوئی ساتھی نہ تھا اور ایسے بادشاہ کے سامنے جو اپنے زمانہ کا سب سے بڑا سرکش بادشاہ تھا تن تنہا حضور انور کی طرح دعوتِ حق کا حربہ لے کر کھڑے ہوتے اور کامیاب ہوئے۔ اس لیے درود میں تشبیہ کے لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام

کا نام آیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن یہاں یہ بتانا چاہتا ہے کہ رسول ہونے کی وجہ سے جنگ کی منزل آپ کو پیش آکر رہے گی اور چونکہ آپ کا کام عالمی ہے اس لیے آپ کا مقام تمام رسولوں میں برتر، اعلیٰ اور افضل ہوگا۔ اوروں کو اگر ایک درجہ میں بزرگی ملی ہے تو آپ کو ایک میں نہیں بلکہ عظیم درجات میں فضیلت ملے گی۔

رسولوں میں فرقِ مراتب

۲۸۷ ۔ یہ ہمارے پیغمبر ہیں جن کو ہم نے فضیلت دی ہے کچھ کو کچھ پر۔ یعنی پیغمبر جن کا ذکر ہو چکا ہے ان میں فضیلت دی ہم نے بعض کو بعض پر۔ بعضے ان میں ایسے ہیں کہ ان سے بات کی خدا تعالیٰ نے جیسے آدم اور موسیٰ علیہ السلام اور بلند کیا بعضوں کا درجہ جیسے کوئی ایک قوم کا نبی کوئی ایک گاؤں کا کوئی ایک شہر کا اور کوئی تمام جہان کا جیسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ السلام۔ علامہ آلوسی نے یہ بات یہاں برموقعہ لکھی ہے کہ اس جملہ کے ذریعہ پہلی آیت میں جو بات کہی گئی ہے اس سے ترقی کر کے یہ بات فرمائی گئی ہے کہ آپ صرف رسول ہی نہیں بلکہ آپ تمام رسولوں میں افضل ہیں۔ تلك اسم اشارہ ہے اس کا مشار الیہ مرسلین بتاویل جماعت ہے۔

تفضیل فضل سے مشتق ہے بزرگی دینا، فضیلت دینا، برتری دینا۔ فضل کی دو قسمیں ہیں ایک محمود جیسے علم اور حلم کی زیادتی۔ دوسرے مذموم جیسے غصہ کی زیادتی۔ فضل کا لفظ محمود کے لیے اور فضول مذموم کے لیے آتا ہے۔ جب ایک چیز کی دوسری چیز پر فضیلت کا لفظ آتا ہے تو فضل کی تین قسمیں ہوتی ہیں ایک فضل جنسی جیسے انسان پر حیوان کی فضیلت، دوسرے فضل نوعی جیسے انسان کی فضیلت حیوان پر تیسرے فضل ذاتی جیسے ایک انسان کی فضیلت دوسرے انسان پر۔ اس کے علاوہ فضل ذاتی دو طرح کا ہوتا ہے ایک یہ کہ کمیت کے اعتبار سے ہو، دوسرے یہ کہ کیفیت کے اعتبار سے ہو۔

قرآن نے اس آیت میں دوسرے انبیاء کے مقابلے میں ذاتی برتری کا اعلان کیا ہے اور دوسرے مواقع پر بتایا ہے کہ یہ فضیلت کمیت کے اعتبار سے بھی ہے اور کیفیت کے اعتبار سے بھی۔ کیفیت کے بارے میں ارشاد ہے۔

وکان فضل اللہ علیک عظیما۔

یعنی کمالِ علمی جو تمام کمالات میں افضل ہے اور اوّل بھی ہے۔ اس میں آپ کی ذات بلحاظِ کیفیت

لہ افاداتِ شیخ الہند۔

سب سے برتر اور سب سے فائق ہے۔
اور ایک دوسرے موقع پر کیت کے بارے میں ارشاد ہے۔
ان فضلہٗ کان علیک کبیرًا۔
یعنی آپ کو کیت کے لحاظ سے کمالِ علمی میں فضیلت اور بزرگی حاصل ہے۔

حضور انورؐ کے فضائل

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس کی جو عقلی توجیہہ فرمائی ہے وہ قابلِ شنید ہے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ ــــ اللہ سبحانہٗ کی اوّلین تجلّی اس کائناتِ ہست و بود میں ہر قسم کی ساری صفتوں کا سرچشمہ اور ہر طرح کے جلال و جمال کے احوال و ظروف کا حرفِ اول ہے۔ اور تمام کائنات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس اوّلین تجلّی کے اصلی اور واقعی قالب ہیں۔ اس لیے یہ ماننا پڑے گا کہ جیسے تجلّی اول عالمِ وجوب میں حقیقۃ الحقائق ہے ایسے ہی تجلّی اوّل کا قالب عالمِ امکان میں حقیقۃ الحقائق ہے۔ اس بنا پر ملائکہ ہوں یا جنات، اولادِ آدم ہوں یا کوئی اور مخلوق علمی اور عملی کمالات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرح دستِ نگر ہوں گے جیسے چاند اور ستارے آفتاب کے دست نگر ہوتے ہیں۔

جس کلی فضیلت کی طرف انبیاء کے مقابلے میں یہاں قرآن نے اشارا کیا ہے زبانِ نبوت نے خود اس کی جزئیات بھی پیش فرمائی ہیں۔ یعنی دوسرے انبیاء کے مقابلے میں جو فضائل اور خصائص آپؐ کو عطا ہوئے وہ متعدد اور معتبر حدیثوں میں مختلف تعدادوں میں نام بنام زبانِ اقدس سے ادا ہوئے ہیں۔ صحیحین میں حضرت جابرؓ سے مروی ہے کہ آپؐ نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں۔

۱۔ مجھے رعب و داب کے ذریعے فتح و نصرت دی گئی۔
۲۔ میرے لیے تمام روئے زمین سجدہ گاہ بنائی گئی۔
۳۔ مالِ غنیمت کو میرے لیے حلال کیا گیا۔
۴۔ شفاعت کا مرتبہ مجھے عطا ہوا۔
۵۔ مجھ سے پہلے انبیاء خاص اپنی قوموں کی طرف آتے تھے اور میں تمام دُنیا کے لیے مبعوث ہوا ہوں۔

اور صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی زبانی ان میں چھٹی خصوصیت بھی بیان ہوئی ہے وہ یہ کہ:

۶۔ کہ مجھے جوامع الکلم عنایت ہوئے ہیں۔ انبیاء کا سلسلہ میری ذات پر ختم ہوا۔

احادیث کی دیگر روایات میں کچھ اور خصائص بھی زبانِ اقدس سے بیان ہوئے ہیں۔ مثلاً یہ کہ میرا معجزہ وحی قیامت تک کے لیے ہے۔ میرے پیرو تمام انبیاء سے زیادہ ہیں۔ میری نبوت اولین ہے۔ مجھ کو فلاں فلاں سورتیں دی گئی ہیں جو کسی اور کو نہیں ملی ہیں۔ فلاں وقت کی نمازیں خاص میری اُمت کے لیے فرض ہوئی ہیں۔ لیکن فی الواقع ان میں بعض جزئیات ایسی ہیں جو ان ہی سات عنوانوں کے تحت کسی نہ کسی حیثیت سے مندرج ہیں۔ سورتوں کی خصوصیت جوامع الکلم میں داخل ہے۔ بعض نمازوں کے اوقات کا اضافہ بعثتِ عامہ اور ختمِ نبوت میں داخل ہے۔

قرآن میں آپ کی دو فضیلتیں مذکور ہوئی ہیں وہ ان سب کو جامع ہیں۔ ایک تکمیلِ دین اور دوسرے ختمِ نبوت۔ بہرحال اجمال کو چھوڑ کر ذیل میں ہم کو نمایاں فضائل پر قرآنِ پاک اور احادیث کی روشنی میں ایک اجمالی نظر ڈالنا چاہیے۔

بعثتِ عامہ

اس سلسلے میں آپ کی سب سے بڑی خصوصیت بعثتِ عامہ ہے یعنی یہ کہ آپ تمام کائناتِ ارضی کی تمام آبادیوں کے لیے رسُول بنا کر روانہ کیے گئے۔ حضرت شیخ الہند نے اسی کو اپنے افادات میں تمام فضائلِ نبوی کی اساس قرار دیا ہے جیسا کہ ابھی ابھی آپ ان کی زبانی سُن آئے ہیں۔ اسی بعثتِ عامہ کا یہ قدرتی نتیجہ ہے کہ اب روئے زمین پر شریعتِ محمدی کے علاوہ کسی شریعت کی پیروی کرنا نجات کے لیے کافی نہیں ہے۔ آپ کی بعثت کی ہمہ گیری کا یہ عالم ہے کہ اس میں نہ تو قوموں کی تخصیص ہے نہ زمان و مکان کی بلکہ حیات و وفات کی بھی قید نہیں ہے۔ یہاں تک کہ جن و انس کی بھی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اگر غیر مکلف اور جمادات بھی غیر شعوری طور پر مستفیض ہو سکتے ہیں تو وہ بھی بلاشبہ اس میں داخل ہیں۔ الغرض یہ عموم و اطلاق یا خالق کی خالقیت و ربوبیت کے لیے ہے اور یا پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کے لیے وہ ربُّ العالمین ہے تو یہ رحمۃٌ للعالمین ہے اللھم صل وسلم وبارك علیہ کما تحب وترضیٰ۔

اس کی عملی دلیل یہ ہے کہ تمام پیغمبروں کے حالات پڑھ جاؤ سب کے پیروں کو اس کی زندگی میں خود اسی کے قوم و ملک کے اندر محدود پاؤ گے۔ لیکن آپ کے حلقہ بگوشوں میں خود آپ کی زندگی میں عرب کے علاوہ سلمان عجمی، صہیب رومی، بلال حبشی سب کو پاؤ گے، سلاطینِ عالم کے نام آپ کے دعوت نامے بھی اسی عموم

بعثت کے عملی دلائل ہیں۔ اور یہ بعثت عامہ اس بات کی دلیل ہے کہ آپ کے وجود اقدس پر تمام پیغمبرانہ نعمتوں کا خاتمہ ہو گیا اور نبوت و رسالت کا سلسلہ منتہی ہو گیا اور اب دنیا کسی نئے آنے والے کے وجود سے مستغنی ہو گئی اسی لیے قرآن نے زمانہ نبوت کے سب سے بڑے مجمع میں یہ اعلان کر دیا۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا

آج میں نے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے دین کی حیثیت سے اسلام کو پسند کیا۔

فضائل نبویؐ اور مولانا محمد قاسمؒ

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز نے صف انبیا میں آپ کی افضلیت کو جس انداز سے اپنے مخاطبوں کو سمجھایا ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ یہاں اسے نظر انداز کرنا خود علم سے بے انصافی ہے انبیاء علیہم اسلام کو رسُول کہنے کی وجہ یہ ہے کہ قافلۂ انبیاء ایک قافلۂ سفارت ہے۔ یعنی وہ پیغامِ خداوندی پہنچاتے ہیں اور احکامِ الٰہی لاتے ہیں۔ اگر انبیاء قافلۂ سفارت ہے تو قافلہ کے لیے سالار قافلہ ہونا ضروری ہے۔ اور پھر رسالت اور سفارت ایک صفت ہے اور صفات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک وہ جو موصوف کی اپنی ذاتی ہوں مانگی ہوئی نہ ہوں، دوسری وہ جو اپنی ذاتی نہیں بلکہ موصوف میں یہ صفت کسی دوسرے کا فیضان ہو۔ اور یہ بات بدیہی ہے کہ جہاں سے صفت کا فیضان ہوگا وہاں اس کا موصوف ضرور ہوگا ورنہ صفات کا بغیر موصوف کے ہونا لازم آئے گا اور موصوف ماننے کے ساتھ یہ ماننا بھی پڑے گا کہ وہ موصوف مصدر صفت ہے۔ زمین کو دیکھئے کہ یہ منور ہے مگر نور کی یہ صفت اس کی اپنی نہیں بلکہ آفتاب کا فیضان ہے اور آفتاب کا نور ذاتی اور خانہ زاد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اصولی بات یہ ہے کہ ایک موصوف صفات کے لیے مصدر ہونا چاہیے اور باقی جہاں وہ صفت پائی جائے اسی کا فیضان ہو یعنی ان کی صفت ذاتی نہیں بلکہ موصوف ذاتی کی عطا ہو۔ اس اصولی قاعدہ کی رُو سے وہ موصوف جس میں صفت ذاتی اور خانہ زاد ہو ان تمام کے مقابلے میں جن کی صفات موصوف اصلی کا فیضان ہوں افضل ہوگا اور سب کی امامت و قیادت کا منصب وار بھی ہوگا اور ساتھ ہی سب کا خاتم بھی ہوگا۔ کیونکہ اس موصوف ذاتی میں صفت کو مصدر ماننے کے ساتھ یہ ماننا پڑے گا کہ یہ صفت اس میں اوّل اور بدرجہ اتم موجود ہے اور جو صفت میں اوّلیت اور اتمیت کا حامل ہوگا وہی افضل ہوگا اور چونکہ نبوت و رسالت بھی اوصاف

میں سے ایک صفت ہے اور صفت بھی ایسی کہ اس میں احکام الٰہی کی رسالت ہے اس لیے حضور انور کی ذات گرامی خاتم الانبیاء، سرور انبیاء اور افضل الانبیاء ہوگی۔

فضیلت پر قرآن و حدیث میں مفاہمت

شاید آپ کے ذہن میں یہاں یہ خلش پیدا ہو کہ اگر دوسرے انبیاء و مرسلین کے مقابلے میں قرآن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کے بارے میں اس قطعیت کا مدعی ہے اور پوری اُمت کا اجماعی عقیدہ بھی یہی ہے تو پھر ان احادیث صحیحہ کے بارے میں ہماری فکری مطالعہ کیا ہونا چاہیے جن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے اپنے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ نہ کہو کہ میں حضرت یونس سے افضل ہوں۔ چنانچہ امام بخاری نے بحوالہ ابوہریرہ بیان کیا ہے کہ:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے کوئی شخص ہرگز یہ نہ کہے کہ میں یونس سے بہتر ہوں۔

اور صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے یہ واقعہ آیا ہے کہ:

ایک مسلمان اور ایک یہودی میں باہم تیز کلامی ہوگئی۔ مسلمان نے کہا کہ اس ذات کی قسم جس نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ساری مخلوق پر فضیلت بخشی اور یہودی بولا اس ذات کی قسم جس نے موسیٰ علیہ السلام کو ساری مخلوق پر فضیلت بخشی۔ یہ سنتا تھا کہ مسلمان نے فوراً ایک زناٹا کس دیا۔ یہودی حضور انور کی خدمت میں آیا اور سارا واقعہ بیان کر دیا۔ حضور انور نے مسلمان کو بلایا اور اس معاملہ کی تحقیق کی۔ اس نے جو بات تھی صاف کہہ دی۔ آپ نے سن کر فرمایا، موسیٰ پر تم مجھے اس طرح فضیلت نہ دو۔ کیونکہ قیامت کے روز ایک وقت آئے گا کہ تمام لوگ بیہوش ہو جائیں گے میں بھی اُن میں ہوں گا۔ پھر سب سے پہلے مجھے ہوش آئے گا کیا دیکھوں گا کہ موسیٰ علیہ السلام عرش عظیم کا پایہ تھامے ہوں گے۔ اب مجھے پتہ نہیں کہ وہ بیہوش ہوئے تھے یا اُن کو مجھ سے پہلے ہوش آیا۔ یا پھر آپ اُن میں شمار ہے جن کو اللہ تعالیٰ نے اس بیہوشی سے مستثنیٰ قرار دے دیا تھا۔

اس موضوع پر محدثین اور شارحین حدیث کے جوابات مختلف ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وہ ارشاد گرامی جس میں انبیاء میں باہم فضیلت یا ذات اقدس کو کسی نبی پر فضیلت کی ممالعت آئی ہے اس دور کے ارشادات ہیں جبکہ زیر نظر آیت تفضیل نازل نہیں ہوئی تھی۔ لیکن یہ جواب کچھ وزنی نہیں

ہے کیونکہ یہودی کا یہ واقعہ یا یونس علیہ السلام کی فضیلت سے متعلق روایات کا سلسلہ اس زمانہ سے تعلق رکھتا ہے جو مدنی زندگی کے آخری سال ہیں۔ اور اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام کے مابین واقعات فضیلت خود ذات اقدس سے منقول ہیں۔

کچھ کا خیال یہ ہے کہ اگرچہ ان روایات میں سے بعض طریقوں میں فضیلت انبیاء سے متعلق عام الفاظ منقول ہیں یعنی **لاتفضلوا بین الانبیاء** مگر درحقیقت اس ارشادِ گرامی کا مقصد صرف ذاتِ اقدس ہے جیسا کہ یہودی کے واقعہ اور یونس علیہ السلام سے متعلق روایت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اور اگرچہ آپ جانتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام اولادِ آدم پر فضیلت دی ہے تاہم آپ نے یہ بات تواضع اور انکسار کے طور پر فرمائی ہے۔ مگر یہ جواب بھی کچھ برمحل نہیں ہے کیونکہ جب آپ نے ایک بات عام الفاظ میں ارشاد فرمائی تو اس کو بے دلیل صرف ذاتِ اقدس کے ساتھ مخصوص کرنے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

کچھ کی رائے یہ ہے کہ جن روایات میں انبیاء علیہم السلام کو باہم ایک دوسرے پر فضیلت سے انکار کیا گیا ہے ان میں نفسِ نبوت میں فضیلت مراد ہے۔ خصائص اور فضائل کے لحاظ سے افضل و مفضول ہونے کا انکار نہیں ہے۔ یہ جواب اس وقت درست اور دلچسپ ہوتا جبکہ ارشادِ گرامی ایسے واقعہ سے متعلق ہوتا جس میں کسی نبی کے ماننے نہ ماننے کا واقعہ ہوتا۔ یہودی کے واقعہ میں نفسِ نبوت زیرِ بحث نہیں بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ کے افضل و مفضول ہونے کی بحث ہے۔

مسئلہ فضیلت کا بہترین حل

اس مسئلہ کا بہترین حل یہ ہے کہ یوں کہا جائے کہ بلاشبہ انبیاء و رسل کے درمیان فضائل موجود ہیں اور ان میں افضل و مفضول کی نسبت قائم ہے اور یقیناً نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں اور رسولوں سے افضل ہیں۔ ان احادیث میں فضیلت دینے کی جو ممانعت آئی ہے اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ کسی نبی کو دوسرے نبی پر اس طرح فضیلت نہ دو کہ جس سے ان میں باہم ایک دوسرے کی تنقیص لازم آتی ہو۔ یعنی یہ نہیں ہونا چاہیے کہ کسی پیغمبر کی محبت کے جوش میں اتنے بڑھ جاؤ کہ جس سے دوسرے پیغمبر کی شانِ رفیع کی تنقیص کا پہلو نکلتا ہو۔ جیسے خود پیغمبر کی شان میں ایسی مبالغہ آمیز مدحت طرازی ممنوع ہے کہ جس سے اللہ سبحانہٗ کی شانِ گرامی میں تنقیص کا پہلو نکلتا ہو۔ چنانچہ ارشاد ہے کہ:

میری ایسی مبالغہ آمیز تعریف کرو جتنی نصاریٰ نے ابنِ مریم کی شان میں کی، میں تو صرف اللہ کا بندہ اور اس کا رسول ہوں لہٰذا مجھے عبداللہ اور رسول اللہ کہا کرو۔ (بخاری و مسلم)

نیز ایسے موقعہ پر بھی فضیلت کو موضوع بنانا درست نہیں ہے جبکہ یہ مسئلہ مجادلہ اور مناظرہ کی شکل اختیار کرے۔ کیونکہ ایسے مواقع پر پوری احتیاط کے باوجود انسان جذبات کی رو میں بہہ کر دوسرے پیغمبر کے متعلق ایسی باتیں کہہ ڈالتا ہے جو ان کی توہین اور تنقیص کا باعث ہو جاتی ہیں۔ اور نتیجہ میں آدمی ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے۔ چنانچہ جس واقعہ میں آپ نے یہ ارشاد فرمایا وہ اسی قسم کا مجادلہ تھا۔ باقی نبیوں کے درمیان بعض خصائص اور فضائل کی بنا پر جو فرقِ مراتب قائم ہے اور جس کے بارے میں خود یہ فرماتا ہے تلك الرسل فضلنا بعضهم على بعض تو یہ امر مجبوب ہے۔

اس موضوع سے متعلق حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے جو بحث نقل کی ہے وہ بھی قابلِ مطالعہ ہے فرماتے ہیں:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو انبیاء کے درمیان فضیلت دینے کی ممانعت فرمائی ہے تو علماء اس کے متعلق فرماتے ہیں کہ ایسی فضیلت ممنوع ہے جو اپنی رائے سے اختراع کی جائے وہ فضیلت ممنوع نہیں ہے جو دلیلِ شرعی پر قائم ہو یا وہ منع ہے جو اس انداز میں کی جائے کہ جس سے دوسرے کی تنقیص ہوتی ہو یا خصومت اور جھگڑے کا باعث بنتی ہو یا ایسی فضیلت سے روکا گیا ہے جو ایک نبی کے اندر اس طرح تمام فضائل کو بند کرتی ہے کہ جس سے دوسرے نبی میں ہر طرح کی فضیلت کی نفی لازم آتی ہو۔ لیکن اس طرح فضیلت بیان کرنا کہ مثلاً کوئی کہے کہ امام کو مؤذن پر فضیلت ہے جائز ہے کیونکہ اس سے مؤذن کی تنقیص نہیں ہے۔

(فتح الباری ج ۶ ص ۳۴۶)

خلاصہ اس ساری گفتگو کا یہ ہے کہ حضرت یونسؑ پر اگرچہ عتابِ الٰہی کا ذکر خود قرآن ہی میں موجود ہے لیکن یہ بارگاہِ نبوت کے مطابق اللہ سبحانہ کے مواخذے کی بات ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت کو یہ سبق سکھایا ہے کہ ان مواخذوں کو دیکھ کر کسی اُمتی کے لیے یہ مناسب نہیں ہے کہ وہ اپنے ذہن میں ان کے متعلق کمتری کا کوئی ادنیٰ تصور بھی لائے۔ یا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عقیدت میں اس کے والہانہ جذبات اس کو کسی تعصب کی طرف لے جائیں۔ کیونکہ انبیاء کی جماعت میں افضل و مفضول تو ضرور ہیں مگر کمتر کوئی نہیں اور ان میں باہم تعصب پیدا کرنے والے کے لیے کوئی گنجائش نہیں۔ یہ سب ایک ہی صداقت کے پروئے ہوئے موتی ہیں جن میں چھوٹا بڑا تو ضرور ہے مگر گھٹیا کوئی نہیں ہے۔ لہٰذا ان روایات کا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت کے اس اجماعی عقیدے سے کوئی تعارض نہیں جو قرآن کی صریح آیات سے ثابت ہے اس قسم کی جس قدر حدیثیں ہیں ان سب کا تعلق ایسی فضیلت سے ہے جس سے دوسری جانب میں کسی تنقیص کا

شائبہ ہونے کی گنجائش ہو سکتی ہو۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ سے آپ کو اس کی تائید ملے گی۔ بہرحال نبوت کا ذہن ہمیشہ افراط و تفریط سے خالی ہوتا ہے۔ وہ نہ کسی نبی کے متعلق مبالغہ آمیز ستائش کا کوئی کلمہ سن سکتا ہے اور نہ اپنے متعلق کوئی ادنیٰ اطراء برداشت کر سکتا ہے۔

۲۹۷۔ ان میں سے کچھ ایسے ہیں جن سے اللہ نے کلام کیا اور کچھ ایسے ہیں جن کے درجے بلند کیے۔

یہاں جن سے کلام کیا سے مراد باتفاق مفسرین حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں۔ یہاں سے اس تفضیل کی تفصیل بیان کی جا رہی ہے جسے پہلے فقرے میں پیش کیا گیا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اللہ کی ہم کلامی کا ذکر سورۂ نساء میں اجمالاً اور سورۂ اعراف میں تفصیلاً آ رہا ہے۔ سورۂ نساء میں ارشاد ہے۔

وکلم اللہ موسیٰ تکلیماً اور سورہ اعراف میں ہے وکلمہ ربہ اور اسی کے ساتھ فرمایا ہے یا موسیٰ انی اصطفیتک علی الناس برسالاتی وبکلامی۔ یہ آیات بتا رہی ہیں کہ اگرچہ اللہ کی وحی سب پیغمبروں کو آتی ہے اور یہ وحی ہی اللہ کا کلام ہے مگر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کلام کے بارے میں کوئی خاص معاملہ ہوا ہے۔ قرآن ہی میں جو کلام الٰہی کی صورتیں بتائی گئی ہیں وہ تین ہیں۔ ارشاد ہے:

ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ مایشاء

کسی آدمی کی طاقت نہیں ہے کہ اللہ اس سے باتیں کرے مگر وحی سے یا پردے کے پیچھے سے یا روانہ کرتا ہے کوئی پیغام رساں پس وہ وحی کرتا ہے اس کے حکم سے جو وہ چاہے۔

یعنی اللہ سے ہمکلام ہونے کی تین صورتیں ہیں۔

الف: بلاواسطہ پردہ کے پیچھے سے کلام فرمائے۔

ب: وحی کے ذریعے کلام فرمائے۔

ج: فرشتہ متجسد ہو کر نبی کے سامنے آئے اور اللہ کا کلام پہنچا دے۔

بظاہر وحی کی پہلی صورت حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کوہ طور پر پیش آئی جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہی صورت لیلۃ المعراج میں پیش آئی۔ اس صورت میں نبی کو قوت سامعہ استماع کلام سے لذت اندوز ہوتی ہے مگر اس حالت میں آنکھیں دولت دیدار سے متمتع نہیں ہوتی ہیں۔ اگرچہ یہاں جمہور کے نزدیک حضرت موسیٰ مراد ہیں مگر من کلم اللہ میں من کی معنوی وسعت کے پیش نظر اگر اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی داخل ہوں تو کچھ بعید نہیں۔

یہاں اس کلامی بحث کا محل نہیں ہے کہ کلام اللہ کی صفت ہے یا فعل اس کے تفصیلی مباحث انشاء اللہ آپ کو پارہ ششم کے آغاز میں ملیں گے۔

خصائص نبوت اور اس کی قسمیں

دوسرا فقرہ اور کچھ ایسے ہیں جن کے درجے بلند کیے۔ اس سے مراد جمہور مفسرین قرآن کے نزدیک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور تقاضائے مقام بھی یہی ہے کہ حضور انور کی ذات گرامی مراد ہو۔ مخاطبوں میں یہودی عیسائی اور مسلمان ہیں۔ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کا ذکر صراحۃً آگیا اور حضور انور کا ذکر آپ کے مقام کے لحاظ سے اس فقرے میں اشارۃً فرمایا۔ زمخشری نے کنائی زبان میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر کی وجہ یہ بتائی ہے کہ جہاں شناخت اور تعیین میں کوئی دقت نہ ہو اور ذات مخالبوں کے لیے معروف اور جانی پہچانی ہو وہاں کنایہ وابہام صراحت وتفصیل سے بڑھ کر بلیغ اور موثر ہوتا ہے۔ اور پھر اس انداز بیان میں مزید لطف یہ ہے کہ حضور انور کا ذکر درمیان میں ہے جبکہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کا ذکر سیاق وسباق میں ہے یہ بھی گویا اشارہ ہے کہ آپ کی شریعت ان دونوں کی شریعتوں کے درمیان اور بہترین ہے جیسے خود آپ کی اُمت دونوں اُمتوں کے بین بین اور بہترین ہے۔

آپ کے درجات وہ خصائص ہیں جو آپ کو اللہ کی جانب سے ارزانی ہوئے ہیں۔ یہ خصائص تین قسم کے ہیں ایک وہ جو صرف آپ کی ذات شریعت میں ہیں۔ دوسرے وہ جو آپ کی لائی ہوئی شریعت اور کتاب میں ہیں اور تیسرے وہ جو آپ کی اُمت میں ہیں۔ تینوں کا قرآن میں ذکر ہے۔

آپ کی ذات گرامی سے متعلق جو خاص مزیت وخصوصیت قرآن نے بیان کی ہے یہ ہے۔

انك لعلى خلق عظيم

آپ تو بہت بڑے اخلاق کے مالک ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ تعالیٰ نے جن اعلیٰ اخلاق وملکات پر پیدا فرمایا وہ مثالی ہیں۔ آپ کے اعمال واخلاق قرآن کی عملی تفسیر تھے۔ قرآن جس نیکی، جس خوبی اور بھلائی کی طرف دعوت دیتا ہے وہ آپ میں فطرۃً موجود اور جس بدی وزشتی سے روکتا ہے آپ طبعاً اس سے نفور وبیزار ہیں۔ پیدائشی طور پر آپ کی ساخت اور تربیت ایسی واقع ہوئی ہے کہ آپ کی کوئی حرکت اور کوئی چیز حد تناسب اعتدال سے ایک انچ ادھر اُدھر ہٹنے نہیں پاتی۔ آپ کا حسن اخلاق اجازت نہیں دیتا کہ آپ کسی بُرائی پر کان دھریں۔

دوسری خصوصیت جو قرآن ہی نے آپ کی بتائی ہے یہ ہے۔

وما ارسلنک الا رحمۃ للعالمین

اور ہم نے آپ کو ہی سب جہانوں کے لیے رحمت بنا کر روانہ کیا ہے۔

یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دوسرے انبیاء کے مقابلے میں ایک اہم برتری اور بزرگی یہ ہے کہ آپ کا ظہور کسی ایک ملک کسی ایک قوم کسی ایک نسل کے لیے نہیں بلکہ تمام دنیا کے لیے رحمت کا ظہور ہے یہ درجہ بیان کرکے قرآن نے ہمارے ہاتھ میں ایک کسوٹی دے دی ہے کہ اس پر ہم اس ظہور کی ساری صداقتیں پرکھ سکتے ہیں۔ اگر فی الحقیقت یہ تمام نوع انسانی کے لیے رحمت کا ظہور ہے اور ہے تو اس کی سچائی میں کوئی شک نہیں۔ یہ جانچ تاریخ کی بے لاگ جانچ ہے۔ ہر طرح کی مذہبی خوش اعتقادیوں سے منزہ ہر طرح کی خود پرستانہ طرفداریوں سے پاک کیونکہ یہاں حقیقت کی عدالت ہے اور وہ صرف حقیقت کی شہادت قبول کرتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ یہ بات جو آپ کے بارے میں فرمائی گئی ہے کسی پیغمبر کے بارے میں نہیں کہی ہے۔

قرآن ہی میں دوسرے انبیاء کے مقابلے میں آپ کا یہ خصوصی درجہ بھی بتایا ہے۔

وما ارسلنک الا کافۃ للناس بشیراً ونذیراً

ہم نے آپ کو پوری انسانیت کے لیے بشیر و نذیر بنا کر روانہ کیا ہے۔

یہ بھی وہی درجہ خصوصیت ہے جسے ہم پہلے بعثت عامہ کے عنوان سے پیش کر چکے ہیں۔

قرآن نے خود آپ کی لائی ہوئی کتاب کی یہ فضیلت بیان کی ہے کہ

ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم

بلاشبہ یہ قرآن راہ دکھاتا ہے ایسی جو سب سے زیادہ سیدھی ہے۔

یعنی قرآن ہدایت کی ایسی راہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے۔ قرآن نے اپنے جس قدر اوصاف بیان کیے ہیں ان سب میں جامع ترین وصف یہی ہے کہ زندگی اور سعادت کے ہر گوشے میں اس کی رہنمائی سیدھی بات کے لیے ہے۔ کسی طرح کی کجی، کسی طرح کا پیچ، کسی طرح کا الجھاؤ۔ کسی طرح کی افراط و تفریط اس کی رہنمائی میں نہیں ہے۔

آپ کی پیروی سے بنی ہوئی اُمت کی یہ فضیلت بیان کی گئی ہے کہ آپ کی اُمت کو اُمت وسطا اور خیر اُمت قرار دیا ہے۔

اگر قرآن کا بغور مطالعہ کیا جائے تو دوسرے انبیاء کے مقابلے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفیع درجات کی بے شمار مثالیں قرآن ہی سے مل جائیں گی۔

ارباب سیر نے ان درجات و فضائل کو آپ کے خصائص کے تحت بیان کیا ہے اور خصائص کی

کثرت کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت کا معیار قرار دیا ہے۔ انھوں نے معمولی سے معمولی بات کو بھی خصوصیات میں شمار کر لیا ہے۔ مثلاً حافظ ابو سعید نیشاپوری نے شرف المصطفیٰ میں آپ کے خصائص کی تعداد ساٹھ لکھی ہے۔ حافظ سیوطی نے الخصائص الکبریٰ میں اس پر سینکڑوں کا اور اضافہ کر دیا۔ زیر نظر آیت خصائص کا نہیں بلکہ رفع درجات کا اعلان نبیوں کے مقابلے میں کر رہی ہے اس لیے ہمیں اس کے لیے قرآن کا مطالعہ کرنا چاہیے ضروری ہے کہ یہ بات خود قرآن کی زبانی سُنی جائے اور ایک معتقد کی طرح نہیں بلکہ ایک محقق کی طرح اور پھر عالم انسانیت کے ایک ایک گوشہ سے شہادت طلب کی جائے۔ افسوس ہے کہ اس وقت تک کوئی کوشش ایسی نہیں کی گئی جو اس موضوع پر علمی حیثیت سے وقیع سمجھی جا سکے۔ ہم پارہ ۱۵ میں اس کی کوشش کریں گے اور ایک خاص عنوان کے تحت یہ مسئلہ بیان کریں گے۔ یہاں اتنی تفصیل کی گنجائش نہیں اور اختصار مفید مدعا نہیں ہے۔

فضائل صحابہؓ

قرآن نے ہمیں ایک کسوٹی دے دی ہے اس کے ذریعے ہم اپنے دوسرے افکار کو بھی جانچ سکتے ہیں ذہن کو تعصب کی تمام آلائشوں سے پاک کر کے سوچیے کہ انبیاء سب کے سب نبوت میں شریک ہیں اور نفس نبوت ان سب کا اشتراکی سرمایہ ہے۔ کسی ایک نبی کی نبوت کا انکار بھی قرآن کے نقطۂ نظر سے اتنا بڑا کفر ہے کہ شاید اس سے زیادہ جرم کفر کی دُنیا میں کوئی نہ ہو۔ سب نبیوں کی نبوت کو مان کر قرآن نے ہمیں تفضیل کا سبق دیا ہے یعنی انبیاء میں نبی ہونے کے باوجود اپنے خصائص، اپنے مزایا اور اپنے درجات کے اعتبار سے فرق مراتب ہے اور ان میں افضل و مفضول کی نسبت قائم ہے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ ایسے ہی صحبت اور عدالت تمام صحابہ کا اشتراکی سرمایہ ہے۔ ہم کسی ایک صحابی کی صحبت اور عدالت کا انکار نہیں کر سکتے۔ صحبت و عدالت کا شرف سب کو حاصل ہے لیکن اس کے ساتھ ان میں بھی انبیاء کی طرح فرق مراتب اور افضل و مفضول کی نسبت ہے۔ خود قرآن نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ:

لا یستوی منکم من انفق من قبل الفتح وقاتل۔

تم میں سے جنھوں نے فتح مکہ سے پہلے خرچ کیا ہے اور جنگ کی ہے ان کے برابر کوئی نہیں ہے۔

مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ ان سے افضل ہیں۔ اور ان میں صحبت اور عدالت میں برابری کے باوجود افضل و مفضول کی نسبت ہے اور فضیلت کا معیار اللہ سے لگاؤ، اللہ کے دین کے لیے قربانی، اللہ کے دین

سے واقفیت ہے۔

حضرت عیسٰیؑ کے تذکرے میں صراحت کی وجہ

۷۳۰۔ اور ہم نے عیسٰیؑ ابن مریم کو روشن دلائل عطا کیے۔ اور اس کو روح القدس کی تائید سے سرفراز کیا۔ اس فقرے میں حضرت عیسٰیؑ کے بارے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔

ایک یہ کہ ہم نے حضرت عیسٰی کو روشن دلائل عطا کیے۔

دوسرے یہ کہ ہم نے حضرت عیسٰیؑ کو رُوح القدس کی تائید سے نوازا۔

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عیسٰی کے ذکر میں قرآن نے اتنی صراحت اور صفائی اور اس قدر زور کے ساتھ بات کیوں کہی اور حضرت موسٰیؑ کی طرح تعبیر کا پیرایہ یہ کیوں اختیار نہیں کیا و منھم من ایدہ بروح القدس۔ اوّل دو فقروں میں ان کا تذکرہ پھر نام لے کر ان کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور پھر ایک بات نہیں ان کے چہرے کے پیش فرمانے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ یہود حضرت عیسٰیؑ کے معجزات کو شیطانی تصرف کا نتیجہ سمجھتے تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ حضرت عیسٰیؑ یہ معجزات شیطانوں اور بھوتوں کی مدد سے دکھاتے ہیں۔ انجیل میں یہود کے اس الزام کا بار بار ذکر آیا ہے اس پس منظر کو سامنے رکھ کر آیت کے الفاظ پر غور کیجئے تو آیت میں صراحت، صفائی اور زور کی وجہ سمجھ میں آجائے گی کہ اس میں کس بات کی تاکید اور کس بات کی تردید ہو رہی ہے۔ روح القدس کی تائید ہو یا معجزات کا ظہور ہر پیغمبر ان دونوں سے نوازا جاتا ہے لیکن حضرت عیسٰی کے باب میں اس کا اظہار اس لیے فرمایا کہ یہود ان پر الزام لگاتے تھے۔

آیت کے اس فقرے کی تفسیر کے لیے جلد اوّل میں نوٹ ۲۲۹ پڑھئے۔

قانونِ دفاع کا دوسرا حصّہ

۷۳۱۔ اگر اللہ چاہتا تو لوگ ان پیغمبروں کے بعد ہدایت کی روشن اور واضح دلیلوں کے باوجود باہم نہ لڑتے۔ لیکن انبیاء کے بعد لوگ باہم اختلاف کر بیٹھے، کچھ ایمان لائے اور کچھ نے کفر کی راہ اختیار کی۔ یعنی جو لوگ ان انبیاء پر ایمان لائے اور صاف حکم، روشن دلائل ہمارے پیغمبر کے نبی ہونے کی سن چکے ہیں اگر خدا چاہتا تو یہ باہم نہ لڑتے اور مخالفت نہ کرتے اور کوئی ان میں کافر نہ ہوتا۔[1]

---

[1] اشارات شیخ الہند

آیت کا یہ حصہ قانون دفاع کا دوسرا حصہ ہے۔ درمیان میں مسئلۂ رسالت محمدیہ اور مسئلۂ فضیلت ذات انور آگیا تھا۔ اور جس وجہ سے آیا اس کی تفصیل آپ کے گوش گزار ہو چکی ہے۔ قانون دفاع کا پہلا حصہ ان قوموں کے متعلق تھا جو انبیاء کو نہیں مانتی ہیں۔ نبوت و رسالت کی منکر ہیں، آخرت کی زندگی کو ایک وہم کی تخلیق قرار دیتی ہیں۔ ان کے بارے میں فرمایا تھا کہ

اگر قوموں اور جماعتوں کی باہمی کش مکش اور مدافعت نہ ہوتی اور ہر جماعت بغیر مزاحمت کے اپنی اپنی حالت پر چھوڑ دی جاتی تو نتیجہ یہ نکلتا کہ دنیا ظلم و فساد سے بھر جاتی اور حق و عدالت کا نام و نشان مٹ جاتا۔ یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ جب کبھی ایک گروہ ظلم و فساد میں چھوٹ ہو جاتا ہے تو مزاحمت کے محرکات دوسرے گروہ کو مدافعت کے لیے کھڑا کر دیتے ہیں اور ایک قوم کا ظلم دوسری قوم کی مقاومت سے دفع ہوتا رہتا ہے۔

اب یہاں قانون دفاع کا دوسرا حصہ بیان ہو رہا ہے اور اس کا تعلق ان اُمتوں سے ہے جو انبیاء کو مانتی ہیں۔ آخرت کی زندگی پر یقین رکھتی ہیں۔ لیکن اس کے باوجود پیغمبروں کی یہ اُمتیں باہم اختلاف رکھتی ہیں اور ایک دوسرے کے خلاف میدان جنگ کی گرم بازاری کر رہی ہیں۔

جنگ کی جو منزل آپ کو پیش آگئی ہے سنت الٰہی کا مقتضا یہی ہے کہ پیش آئے ان انبیاء سے باغی اُمتوں کے ظلم و فساد کی مدافعت کے لیے اس منزل سے گزرنا ضروری ہے ان اُمتوں کے بارے میں فرمایا:

اللہ نے مختلف زمانوں میں یکے بعد دیگرے اپنے پیغمبر روانہ کیے اور پیغمبر اللہ کی جانب سے ان کے پاس واضح ہدایات لے کر آئے لیکن ان کے دُنیا سے روانہ ہونے کے بعد اُن کی اُمتوں میں بگاڑ پیدا ہو گیا اور باہم جنگ و خون ریزی کا انھوں نے ایسا بیج بویا کہ ہمیشہ پھل لاتا رہتا ہے۔

اور اس کے ساتھ اس کائنات میں اللہ کی قدرت اور انسان کے اختیار کے بارے میں یہ ضابطہ بتا دیا کہ:

اگر خدا چاہتا تو طبیعت بشری ایسی بناتا کہ اس میں اختلاف و نزاع کی گنجائش ہی نہ ہوتی اور کسی ایک حالت فکری پر مجبور کر دیتا لیکن اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ انسان کو مجبور و مضطر نہ بنائے اور ہر راہ میں چلنے کی قدرت دے دے۔

لہٰذا اس آیت گرامی میں دو اہم اور بنیادی مسئلے بیان ہوئے ہیں۔

اولاً۔ امتوں میں قانونِ دفاع کیا ہے؟
ثانیاً۔ امتوں میں ہدایت کے باوجود اختلاف و نزاع کیوں پیدا ہوتا ہے۔
ان دونوں باتوں کا تعلق عام ناخدا شناس اور خدا کی باغی قوموں سے نہیں بلکہ امتوں سے ہے اسی بنا پر یہ مسئلہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کے ذکر کے بعد پیش فرمایا ہے کیونکہ مدینہ کی زندگی میں قرآن کی مخاطب ان دونوں پیغمبروں کو ماننے والی امتیں ہیں یعنی یہودی اور عیسائی۔
پہلی بات کے بارے میں یہاں اشارۃً بتا دیا کہ حق کو بلند کرنے، عدالت کو دنیا میں قائم کرنے اور ظلم و فساد کو مٹانے کے لیے رسول ہونے کی حیثیت میں آپ کو ان کے منہ آنا ہوگا اور سورت برأت میں یہ بات صراحۃً اور کیونکہ بتا دی کہ:

قاتلوا الذین لا یومنون باللّٰہ و بالیوم الاخر و لا یحرمون ما حرم اللّٰہ و رسولہ ولا یدینون دین الحق من الذین اوتوا الکتاب حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون۔

اہلِ کتاب میں سے جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ نہ تو اللہ پر سچا ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت کے دن پر اور نہ ہی ان چیزوں کو حرام سمجھتے ہیں جنہیں اللہ اور اس کے رسول نے حرام قرار دیا اور نہ نظامِ حق پر عمل پیرا ہیں ان سے بھی جنگ کرو یہاں تک کہ وہ جزیہ دینا قبول کریں اس حال میں کہ ان کی سرکشی ٹوٹ جائے۔

اس آیت میں صراحۃً عرب کے یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف اعلانِ جنگ کا حکم دیا ہے۔
دوسری بات کے بارے میں اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ہدایت و ضلالت کے بارے میں اللہ کی سنت یہ ہے کہ اس نے ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں جبر کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا۔ اگر وہ ایسا کرتا تو اس میں شبہ نہیں ہے کہ کسی کے لیے بھی ایمان چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کرنے کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ بندوں کو آزادی دی ہے کہ وہ اپنی سوجھ سمجھ اور اپنے اختیار و ارادہ کی آزادی کے ساتھ چاہیں کفر کی راہ اختیار کریں اور چاہیں ایمان کی راہ اختیار کریں[1]
گویا یہ بات سمجھائی ہے کہ رسولوں کے ذریعے سے علم حاصل ہو جانے کے بعد جو اختلافات لوگوں کے درمیان رونما ہوئے اور اختلافات کے نتیجے میں لڑائیاں ہوئیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ معاذ اللہ، خدا بے بس تھا اور اس کے پاس ان اختلافات کو روکنے کا کوئی زور نہ تھا۔ نہیں اگر وہ چاہتا

[1] تدبر قرآن

تو کسی کی مجال نہ تھی کہ انبیاء کی دعوت سے سرتابی کر سکتا اور کفر و بغاوت کی راہ چل سکتا اور اس کی زمین میں فساد برپا کر سکتا مگر اس کی مشیت یہ تھی ہی نہیں کہ انسانوں سے ارادہ و اختیار کی آزادی چھین لے اور ان کو ایک خاص روش پر چلنے کے لیے مجبور کر دے۔ [1]

اس مقام پر قانونِ اجتماعی بیان کرنے کی وجہ

احقر کے ذوق میں اس مضمون میں ایک گونہ تسلی دینا ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یعنی جب آپ کی رسالت ثابت ہے اور پھر بھی منکرین نہ مانتے تھے تو یہ موقع ہے آپ کی جانب سے افسوس اور ملال کا اس لیے اللہ تعالیٰ نے بتا دیا کہ آپ ہی کی تخصیص نہیں یہاں دستور ہی یہ ہے کہ ایمان عام کسی اُمت میں نہیں ہوا۔ کسی نے موافقت کی کسی نے مخالفت کی۔ اس میں بھی حق تعالیٰ کی حکمتیں ہیں اگرچہ ہر شخص کو معلوم نہ ہوں [2]

اس کو اس طرح بھی پیش کیا گیا ہے کہ ــــ اس سے مقصود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ انبیاء سابقین کی طرح آپ کی نبوت و رسالت بھی دلائل سے ثابت ہے اور جس طرح بہت سے لوگ انبیاء سابقین پر باوجود آیاتِ بیّنات ایمان نہیں لائے اسی طرح اگر بہت سے معاندین آپ کی نبوت و رسالت کی تصدیق نہ کریں تو تعجب نہ فرمائیے ایمان عام کسی اُمت میں نہیں ہوا ہے کسی نے تصدیق کی اور کسی نے تکذیب اور اس میں اللہ سبحانہ کی حکمتیں ہیں جس کا اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں ہے [3]

یہاں اس قانون کے بیان کرنے سے مقصود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دینا ہے کہ لوگوں کی ہدایت و ضلالت کے بارے میں آپ کی ذمہ داری صرف اس قدر ہے کہ آپ لوگوں تک حق پہنچا دیں اس کو قبول کرنا یا رد کرنا یہ ان کے اُوپر چھوڑیے یہ نہ تو آپ کی ذمہ داری ہے اور نہ آپ اس کے لیے پریشان ہوں۔ [4] [5]

۷۳۲ ۔ اور اگر اللہ چاہتا تو لوگ باہم دست و گریباں نہ ہوتے لیکن اللہ جو کچھ چاہتا ہے کرتا ہے۔

یعنی حق تعالیٰ مختار ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ [5]

علامہ شارحین قرآن نے اس فقرے کو تکرار قرار دے کر اسے تاکید بتایا ہے۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں دو اجتماعی ضابطے بتائے گئے۔ پہلے حصہ میں اگر یہ ضابطہ بتایا ہے کہ ہدایت و

---

[1] تفہیم القرآن [2] بیان القرآن [3] معارف القرآن [4] تدبر قرآن [5] افادات شیخ الہند

ضلالت کے معاملہ میں اللہ نے جبر کا طریقہ اختیار نہیں فرمایا اگر وہ ایسا کرتا تو اس میں شبہ نہیں کہ کسی کے لیے بھی ایمان چھوڑ کر کفر کی راہ اختیار کرنے کی گنجائش باقی نہ رہتی ——— تو دوسرے حصہ میں یہ قانون بتایا ہے کہ انسان کی تخلیق ہی اللہ نے ایسی فرمائی ہے کہ اس میں استعداد کے مختلف ہونے کی وجہ سے فکر میں اختلاف ہو رہا ہے کا یہی اختلاف جنگ و خونریزی کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے۔ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو جنگ و خونریزی نہ ہوتی یعنی انسان ایک ہی استعداد لے کر آتا۔ ایک ہی فکری حالت ہوتی۔ استعدادوں کا اختلاف اور افکار کا تنوع نہ ہوتا اور جنگ کی نوبت نہ آتی۔ استعدادوں کے اسی اختلاف اور افکار کے اسی تنوع کی وجہ سے انسانوں میں فکری وحدت اور عملی ہم آہنگی پیدا کرنے کے لیے نبوت آئی ہے۔ نبوت کے ساتھ لگ جانا اس کی پیروی کرنا لوگوں کو اختلاف سے بچا سکتا ہے اور اس کے نتیجے میں انسانوں میں جنگ کی جگہ ایمان و اسلام کی زندگی آسکتی ہے۔

قضا و قدر اور قرآن

آیت کے دونوں حصوں میں شاء اور اقتتل لا کر قرآن نے دو صداقتوں کی طرف رہنمائی کی ہے۔

اولاً یہ کہ اللہ سبحانہ تمام دنیا اور اس کے ذرے ذرے پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے۔ آسمان و زمین اور بحر و بر میں کوئی چیز نہیں جو اس کے ارادے اور مشیت کے بغیر حرکت کر سکے اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اسی کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو اسلام کی جان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے اور ایک ایسا اللہ ماننا پڑے جس کے اختیارات محدود جس کی قدرتیں ناقص اور جس کی شہنشاہی ناتمام ہو۔

ثانیاً یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی مگر انسان کو اپنے اعمال کو کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا گیا ہے۔ آیت میں **اقتتل، اختلفوا، امن اور کفر** کے افعال سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ بندہ کے اپنی اختیاری چیزیں ہیں۔ اگر یہ اختیار تسلیم نہ کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جاتے جیسے دوسری مخلوقات ہے تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیاء کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں، ظلم و انصاف دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے۔ انسان کا اپنے کسی فعل پر قابلِ مدح یا قابلِ ملامت ہونا بے معنی ہو جائے۔

الغرض یہ دونوں صداقتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کو قدرتِ تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جزو کل پر حاوی ہے۔ اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل

ہے جس کی وجہ سے وہ عمل کا ذمہ دار بنتا ہے۔

قرآن نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے ایک طرف وہ کہتا ہے کہ خدا کی اجازت کے بغیر ایک پتا بھی نہیں گرتا اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ ہر انسان اپنے اعمال کے ہاتھوں گرد ہے۔ یعنی اللہ کی ہمہ گیر قدرت، وسیع اختیارات اور ناقابل رد مشیت کے باوجود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضاء کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی ہے۔ یہی ارادہ اور اعضاء کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری اور تکلیف و بازپرس کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال اور اخلاق کی پوری عمارت کھڑی ہے۔

زیر نظر آیت میں لوگوں کی نگاہ صرف شاء میں اٹک کر رہ گئی۔ اس سے وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ خود اللہ سبحانہٗ ان کافروں کو ہدایت سے، اتفاق اور اتباع سے جبراً روکے ہوئے ہے۔ حالانکہ اس کا مطلب ہے کہ یہ لوگ اختلاف سے باز نہیں آتے الا یہ کہ خدا خود ان کو زبردستی ایمان و اسلام کی نعمت سے نواز دے۔ اگر اللہ ایسا کرنا چاہے تو کر سکتا ہے مگر ایسا کرنا اللہ کی سنت اور قانون جاری نہیں ہے۔ یعنی اس کی عادت نہیں ہے کہ وہ بندوں کے ارادے اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے۔

قرآن کا بغور مطالعہ کر دیہ بات صاف اور صریح معلوم ہو جائے گی کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا موخر ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی قدس سرہ العزیز نے کیا خوب فرمایا ہے۔

> اس کافر کا ناقابل ایمان ہونا اللہ کے اس خبر دینے کی وجہ سے نہیں ہوا بلکہ خود اللہ کا یہ خبر دینا اس کافر کے ناقابل ایمان ہونے کی وجہ سے واقع ہوا ہے اور ناقابل ایمان ہونے کی صفت خود اس کی شرارت و عناد و مخالفت حق کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص میں قبول حق کی استعداد رکھی ہے مگر یہ شخص خود اپنے ہوائے نفسانی اور خود غرضی کی وجہ سے مخالفت کرتا ہے یہاں تک کہ ایک روز وہ استعداد فنا ہو جاتی ہے[1]

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی مشیت علت اور انسانوں کی لڑائی معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ یعنی ان کا قتال اور آپس میں لڑنا خدا کے چاہنے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ جنگ

---

[1] بیان القرآن۔

اور خون ریزی ان کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ خود اس اختلاف سے نہیں بچتے جو لڑائی کا پیچ بوتا ہے اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ ان کو زبردستی بچا دیتا مگر ایسی زبردستی اللہ کی سنت کے خلاف ہے۔ اس کی عادت نہیں ہے کہ وہ بندے کے ارادے اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو کسی برائی سے بچائے۔ اور یہی طبعی اصول ہے کہ انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے تو آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ اگر کوئی اس کو الٹ کر بیان کرے تو قرآن سے بےخبری ہے۔

اس مسئلہ میں رسالت محمدیہ کی مصلحت بینی یہ ہے کہ آپ نے اپنی امت کو اس پر جس شدت سے ایمان لانے کی تلقین فرمائی ہے اسی شدت سے اس میں بحث و مناقشہ سے منع فرمایا اور در حقیقت اس نظریہ سے اسی طرح فائدہ اٹھانے میں راز ہے۔ یہ کلی جہاں چٹکی خوشبو اڑ گئی۔

اس عقیدے کے تمام وسیع اطراف اور جوانب کو چھوڑ کر قرآن حکیم کی صرف اس آیت کو سمجھ لینا کافی ہے۔

ولم یکن له شریك فی الملك وخلق كل شیٔ فقدره تقدیراً

اللہ کی سلطنت میں اس کا کوئی شریک نہیں اور اس نے ہر چیز کو پیدا کیا اور پھر اس کا ایک اندازہ ٹھہرایا۔ [۱]

بہرحال اس آیت گرامی کی تشریح میں دو پہلو ہیں ایک نظری اور دوسرا عملی، نظری یہ کہ کائنات میں جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ سبحانہ کے ارادے اور مشیت سے ہوتا ہے اور انسانوں کے اعمال اسی کی قدرت اور مشیت کے تحت ہیں یہ عقیدہ ایمان کی جان ہے۔

عملی یہ کہ انسان کو اللہ سبحانہ نے عمل کرنے کا ارادہ و اختیار دے کر مکلف بنایا ہے اور عملی زندگی انسان کی ارادی اور اختیاری چیز ہے۔

یہ افسوس کی بات ہے کہ اس آیت کی تشریح و تفسیر میں ہمارے شارحین قرآن کی نظر دونوں پہلوؤں پر یکساں نہیں ہے بلکہ عملی پہلو کو نظر انداز کیا گیا ہے۔ یہ کوئی نہیں بتاتا کہ نبیوں کی ان امتوں میں اقتتال، اختلاف جیسے سنگین جرائم جو پیدا ہوئے ان کا حکم کیا ہے؟ اور انبیاء جو ان جرائم کی روک تھام کے لیے آتے ہیں امتوں کے ان سے باغیانہ تعلقات کی نوعیت کیا ہے۔ قرآن دراصل اسی پہلو پر زور دینا چاہتا ہے جو نظروں سے اوجھل ہو گیا۔ قرآن کا مقصد تو یہ بتانا ہے کہ:

---

[۱] سیرۃ النبیؐ

۱۔ انبیاء دنیا میں تشریف لائے انھوں نے کام کیا۔
۲۔ انبیاء اپنے ساتھ اللہ کی جانب سے واضح ہدایات لے کر آئے۔
۳۔ انبیاء کی تاکید میں آیات اور معجزات کی رونمائی ہوئی۔
۴۔ انبیاء کی واضح اور کھلی ہدایات اوران کی صاف زندگی کے باوجود ان کی اُمت کے تعلقات انبیاء کے لائے ہوئے علم وعمل سے ٹوٹ گئے۔
۵۔ اُمتوں کے تعلقات افکار، اقدار، اعمال، اخلاق میں انبیاء سے ٹوٹے تو وہ اختلاف کا شکار ہوگئیں۔
۶۔ اختلاف پیدا ہوا تو اختلاف کے نتیجے میں اللہ کے مقررہ قانون کے مطابق باہمی جنگ، قتل اور خون ریزی اور فساد باہمی کا نشانہ بن کر رہ گئے۔

عام شارحین قرآن کی نظر اس پہلو سے ہٹ کر اس کے صرف نظری پہلو سے چمٹ گئی، حالانکہ بتانے کی یہ چیز تھی کہ انبیاء کے لائے ہوئے علم وعمل سے تعلقات توڑنا قرآن کی نظر میں ایسا سنگین جرم ہے جس کے نتیجے میں اُمتیں اختلاف کا شکار ہو جاتی ہیں۔ اور اختلاف سے اُمتوں میں آمیزش کی جگہ آویزش جنم لیتی ہے۔

اختلاف کی حقیقت

اختلاف سے مقصود کیا ہے؟ اسے سمجھ لینا چاہیے۔ اللہ کے دین کی حقیقت تو نام ہے نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل۔ اور ان دونوں کے مطابق ایمان اور عمل صالح کا۔ لیکن نبیوں کے بعد آنے والوں نے یہ حقیقت فراموش کر دی اور نبوت کے علم وعمل سے رشتہ توڑ کر دین کو طرح طرح کی رسموں اور رواجوں کا مجموعہ بنا لیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ انسان کی نجات وسعادت کی راہ یہ نہیں ہے کہ ایمان اور عمل کیا ہے بلکہ سارا دارومدار اس پر ٹھہرا کہ کون کن کن رسموں کا پابند ہے۔ اگر ایک آدمی خاص رسوم ادا کر لیتا ہے خواہ اس کی پوری زندگی نبوت کے علم وعمل سے کیسے ہی باغیانہ تعلقات رکھتی ہو تو یقین کیا جاتا ہے کہ وہ نجات یافتہ ہے۔ اور اگر رواجوں اور رسموں کا پابند نہیں ہے خواہ اس کی زندگی اللہ اور عبادت وطاعت میں گزر رہی ہو تو یقین کیا جاتا ہے کہ نجات کا دروازہ اس پر بند ہے۔ گویا دین کی سچائی، آخرت کی نجات اور حق وباطل کا معیار تمام تر رسوم کی پابندی اور رواج پرستی ہوگی ایمان وعمل کوئی چیز نہیں ہے۔

اس سلسلے میں قرآن نے اس آیت میں جن باتوں پر زور دیا ہے ان میں تین باتیں سب سے زیادہ نمایاں ہیں۔

۱۔ نبوت انسان کی نجات و سعادت کے لیے البینات لے کر آتی ہے اور ایمان و اعمال کا مدار یہی البینات ہیں نہ کہ وقت کی رسوم

۲۔ فلاح کا راستہ یہ ہے کہ نبوت کے علم و عمل (البینات) سے وابستہ ہو کر اتفاق و اتحاد ہو اور تمام اعمال اور افراد ایک ایسی اجتماعیت کا نمونہ ہوں کہ ہر قوت سمٹی ہوئی اور ہر چیز بندھی ہوئی ہو۔ اور یہ اجتماع و ائتلاف ہی ان کی ایمانی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد ہو۔

۳۔ اصل دین یگانہ خدا کی عبادت اور اس کے رسُول کی طاعت ہے۔ ان کے علاوہ قوم، برادری خاندان، ملک، زبان کے نام پر اس کے خلاف جو کچھ کہا جاتا ہے وہ اصلیت سے انحراف کا نتیجہ ہے۔ البینات سے ہٹ کر فکر و عمل کی راہیں تلاش کرنا ہی وہ اختلاف ہے جس سے نبوت بچانے آئی ہے۔ یاد رہے نبوت کی لائی ہوئی البینات پر تفکر و تدبر اس کی روایت و تاریخ، اس کی اشاعت و تبلیغ سے متعلق محنتوں عرق ریزیوں اور جانفشانیوں کا اختلاف وہ اختلاف نہیں ہے جس سے قرآن روکنے آیا ہے۔ یہ تو مقصودِ قرآنی ہے اور علم و قانون کی زندگی میں اگر یہ نہ ہو تو یہ جمود ہے۔ قرآن فکر و عمل میں جمود کا داعی نہیں بلکہ تفقہ، تدبر، تفکر، استنباط کے ذریعے ارتقاء کا داعی ہے۔ خوب سمجھ لو۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ ۗ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿۲۵۴﴾

اے اہل ایمان! ہم نے جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں سے کچھ خرچ کرو[۴۲۳] پہلے اس کے کہ یہ زندگی ختم ہو کر وہ دن آجائے کہ اس میں نہ تو کاروبار ہوگا، نہ یاری اور دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش ہوگی اور[۴۲۴] جو لوگ انکار کرنے والے ہیں فی الواقع وہی نقصان والے ہیں[۴۲۵]

دفاع کے لیے سرمایہ کی ضرورت

پہلے یہ بات بتائی جا چکی ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت میں کافروں کے ظلم و فساد کو مٹانا اور انسانی زندگی کو حق و عدالت پر قائم کرنا ضروری ہے اور اسی سلسلہ میں دفاع کے حکم و مصالح بھی زیر بحث آئے۔ یہ ثابت ہو جانے کے بعد کہ مدافعت کے بغیر دُنیا سے ظلم و جور، کفر و نفاق، باطل اور منکر ختم نہیں ہو سکتا اور جب تک مفاسد اور مظالم ختم نہ ہوں گے عدل و تقویٰ حق و ایمان پر مبنی زندگی وجود میں نہیں آسکتی۔ اب ان وسائل اور ذرائع کی نشاندہی مقصود ہے جن کے پستانوں سے دودھ پی کر دفاع کامیاب ہوتا ہے۔ دفاع کی کامیابی کا اس مادی دُنیا میں مادی ذریعہ سرمایہ ہے۔ قرآن نے اموال یا سرمایہ کو انسان کے معاشی نظام کے قیام و بقا کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے اور اس میں محتاط رہنے کی تاکید کی۔ ارشاد ہے۔

ولا تؤتوا السفہاء اموالکم التی جعل اللہ لکم قیاما

اور اپنے اس سرمایہ کو کم عقل لوگوں کے حوالے نہ کرو جسے اللہ نے تمہارے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔

قرآن نے زیر نظر آیت کے ذریعے مسلمانوں کو اسی ضرورت کی یاد دہانی کا احساس دلایا ہے اور اسے پورا کرنے کے لیے انفاق کی دعوت دی ہے اور انداز تعبیر ایسا عجیب و غریب اختیار کیا ہے جسے سن کر روحانی حرارت مل جاتی ہے۔ پہلا انداز تعبیر اسی انفاق کے سلسلے میں نہایت بلیغ تھا اس میں عجیب لطافت تھی۔

فرمایا تھا۔ من ذا الذی یقرض اللہ قرضًا حسنًا۔ کون ہے جو اللہ کو خوش دلی سے قرض دیتا ہے؟ اس میں مخاطبوں کو اس طرح مخاطب کیا ہے کہ مخاطب ایمان میں عین الیقین کے مقام پر ہے اور کمالات کی منزلیں طے کرکے صدیقین کے مقام پر گامزن ہے اس کا ایمانی شعور و وجدان اس قدر لطیف ہو چکا ہے کہ گویا وہ اپنے محبوب کو منانے کی فکر میں ہے۔ لیکن اس آیت میں انفاق کی دعوت میں انداز تعبیر بدل گیا ہے۔ شفقت و رافت سے ہٹ کر ہیبت و صولت، عزت و جلال اس کے ایک ایک لفظ سے ٹپک رہا ہے۔ اس میں دبدبہ و رُعب، جلال و ہیبت ہے گویا پہلے محبوب نے عاشقوں سے کہہ رہا تھا کہ بولو قرض کون دیتا ہے؟ اور اب حاکم اپنے محکوموں سے ایک آقا اپنے غلاموں سے کہہ رہا ہے کہ اس فرصت کو غنیمت سمجھو۔ خرچ کرو یہ وقت پھر کبھی نہ آئے گا اور جو وقت آئے گا وہ خرچ کرنے کا نہیں خرچ کے نتائج کے ظہور کا دن ہوگا۔ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہٗ فرماتے ہیں:

"اس سورت میں عبادات و معاملات کے بارے میں ایک سے زیادہ متعدد احکام آئے ہیں ان میں سب کی تعمیل اور پابجائی طبع انسانی کے لیے ناگوار اور شاق ہے اور تمام کاموں میں سب سے زیادہ کٹھن کام انسان کے لیے جان اور مال کی قربانی ہے۔ اللہ کے زیادہ احکام و فرامین ان ہی دو مال اور جان کے بارے میں ہیں۔ اللہ کی ساری نافرمانیوں کا سرچشمہ ان ہی دونوں جان اور مال کی محبت ہے۔ ان کے جال میں پھنس کر ہی انسان گناہ میں مبتلا ہوتا ہے۔ گویا جیسے جان و مال کی محبت گناہوں کی جڑ ہے ایسے ہی اس سے نجات تمام عابدانہ سرشاریوں اور طاعت گزارانہ اعمال کے لیے آسانی اور سہولت کا ذریعہ ہے اس لیے انفاق اور قتال کے احکام کو بیان فرمایا۔ قتال کا حکم قاتلوا فی سبیل اللہ کے ذریعے اور انفاق کا حکم من ذا الذی یقرض اللہ قرضًا حسنًا کے ذریعے دیا۔ اس کے بعد جان کی قربانی کی تاکید کے لیے قصہ طالوت کی عملی مثال پیش فرمائی۔ اب اس آیت میں انفاق کی تاکید کی جارہی ہے اور چونکہ انفاق مال پر عبادات و معاملات کے اکثر احکام موقوف ہیں اس لیے اس کے بیان میں زیادہ تفصیل اور تاکید سے کام لیا ہے۔ چنانچہ آئندہ سورت کے اختتام تک اکثر احکام کا تعلق انفاق ہی سے ہے۔"

۲۵۴۔ اے اہل ایمان ہم نے تم کو جو کچھ دیا ہے اس میں سے کچھ خرچ کرو۔ یعنی اللہ کی راہ میں دین کو برتر کرنے کی خاطر اس دولت اور سرمایہ میں سے خرچ کرو جو ہم نے تم کو دیا ہے۔ اس آخری فقرے کے ذریعے ذہن صاف کر دیا کہ مال و دولت جو کچھ بھی بندوں کے پاس ہے خود بخود نہیں بلکہ اللہ کا بخشا ہوا عطیہ

ہے اسی کی دین ہے اور اسی کو حق حاصل ہے کہ جن کاموں میں چاہے صرف کرنے کا حکم دے۔

سب کچھ نہیں بلکہ کچھ خرچ کرو

اور پھر اس کی پیشانی پر حرف مِن لگا کر اشارہ کر دیا کہ اگرچہ سب کچھ ہمارا عطیہ اور ہماری دین ہے مگر تم کو سب کچھ خرچ کرنے کا حکم نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ اس سب کچھ میں سے کچھ خرچ کرنے کا حکم ہو رہا ہے۔ اللہ اکبر کیسی بلیغ لطافت ہے۔ مقامِ محبت میں عاشقوں سے سب کچھ قرض دینے کا مطالبہ کیا اور مقامِ حاکمیت میں غلاموں کو سب کچھ نہیں بلکہ کچھ خرچ کرنے کا حکم دیا۔ اس میں لطیف اشارہ ہے کہ تعلقات کی نوعیت بدل جانے سے حکم کی نوعیت بدل جاتی ہے۔ صحابہ میں دونوں نمونے موجود ہیں وہ بھی ہیں جن کی سرشاریاں عاشقانہ ہیں اور وہ بھی جن میں احکام کی بجا آوری محکومانہ ہے۔ اس آیت میں چونکہ شانِ حاکمیت غالب ہے اس لیے فرمایا کہ سب کچھ نہیں بلکہ کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ کی تفسیر بھی اُمت کو سمجھاتی ہے۔ ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سونے کا ٹکڑا لایا یہ کہہ کر پیش کیا کہ میری طرف سے صدقہ ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی جانب سے مُنہ پھیر لیا۔ اس نے پھر توجہ دلائی۔ بار بار وہ توجہ دلاتا تھا اور آپ بے رُخی برتتے رہے تھے تا آنکہ جب اصرار حد سے گزر گیا تب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سونے کے ٹکڑے کو ہاتھ میں لے کر اس زور سے اس شخص کی طرف پھینکا کہ واقعہ کا راوی آنکھوں دیکھا حال اس طرح بیان کرتا ہے کہ اگر اس کے لگ جاتا تو زخمی ہو جاتا۔ اس کے بعد آپ نے صدقہ کا یہ ضابطہ بتایا کہ خیر صدقۃ ما کان عن ظہر غنی

سب سے اچھا صدقہ وہ ہے جو تونگری کی پشت پناہی میں ہو۔

مشہور شارح حدیث امام خطابی نے معالم السنن میں ظہر غنی کا مطلب یہ بتایا ہے ایسی تونگری جس پر بھروسہ کر سکتا ہو اور جس کی پشت پناہی حاصل کر سکتا ہو اس وقت جب مصائب اور حوادث کا تسلط ہو۔

اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ صدقہ میں دیتے ہوئے اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اتنا سرمایہ آدمی کے پاس رہ جائے جس سے وہ آئندہ آمدنی یا مصارف کے پیش آنے میں مدد لے سکے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا انفاق کے بارے میں یہ ضابطہ اسی سب کچھ میں کچھ کے مطالبہ سے مستنبط ہے۔

اموالِ فاضلہ کا مطالبہ

اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن مسلمانوں سے اجتماعی ضروریات کے لیے اموالِ فاضلہ کا اس آیت کے

ذریعے مطالبہ کر رہا ہے۔ عام حالات میں اجتماع کی مالی ضروریات تو زکوٰۃ وغیرہ سے پوری کی جاسکتی ہیں لیکن ایسے غیر معمولی اور ہنگامی حالات بھی پیش آسکتے ہیں جن میں ان طریقوں سے اجتماعی مفاد کا تحفظ ممکن نہ ہو، شدید قحط، عام سیلاب، جنگ میں اسلامی زندگی کو اچانک طور پر کثیر اموال کی ضرورت پیش آسکتی ہے۔ ایسے ہنگامی حالات میں اسلامی ریاست اس بات کی مجاز ہوگی کہ اپنے صاحب ثروت شہریوں سے ان کی ضرورت سے زائد اموال کا مطالبہ کرے۔ تاکہ اجتماع کو ہلاکت سے بچایا جا سکے۔ اجتماع کی وہ ہلاکت جو ملک پر دشمنوں کے قبضہ یا قحط کے نتیجہ میں خلق خدا کی ہلاکت و بربادی سے واقع ہوگی۔ خود سرمایہ داروں کو بھی اپنی لپیٹ میں لے لے گی۔ لہٰذا خود ان کے مفاد کا تقاضا ہے کہ ان کے فاضل مال کے ذریعے اس خطرہ کو دور کیا جائے۔ کیونکہ مال زندگی کے لیے ہے اور ایسے حالات میں جبکہ زندگی خطرے میں ہو مال کو اس کے تحفظ کے لیے استعمال نہ کرنا خود کو ہلاکت کے سپرد کر دینے کے مترادف ہے۔ اس نکتہ کو امام شاطبی غرناطی اور امام غزالی نے بہت خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے۔

> اگر وسیع و عریض ملک کے دفاع اور سرحدوں کی ناکہ بندی کے لیے فوج میں اضافہ کی ضرورت ہو اور سرکاری خزانہ خالی ہو تو سربراہ مملکت اسلامی کو اس بات کا اختیار حاصل ہے بشرطیکہ وہ عادل ہو کہ مالدار لوگوں پر اتنے محاصل عائد کرے۔ سربراہ کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیئے کہ محاصل ملکی پیداوار پر عائد کیے جائیں تاکہ کسی مخصوص طبقہ پر محاصل عائد کرنے کا یہ نتیجہ نہ ہو کہ لوگ متنفر ہو جائیں۔ یہ محاصل بہت سے لوگوں سے تھوڑے تھوڑے وصول کیے جائیں تاکہ کسی پر ناقابل برداشت بوجھ نہ پڑے۔ اور مقصد حاصل ہو جائے۔ (الاعتصام ج ۲)
>
> فقہاء احناف میں سے شمس الائمہ سرخسی نے اس مسئلہ پر یوں روشنی ڈالی ہے حسن تدبیر کا تقاضا یہ ہے کہ دفاع کی تیاری کے لیے جتنے مال کی ضرورت ہو اسے مالداروں پر محصول عائد کر کے وصول کر لیا جائے تاکہ شہری اپنے باقی اموال و املاک کے بارے میں محفوظ ہو جائیں۔ (المبسوط ج ۱۰)

حافظ ابن حزم ظاہری نے لکھا ہے کہ کفالت عامہ کے لیے اگر زکوٰۃ کی آمدنی کافی نہ ہو تو مالدار افراد پر مزید محاصل عائد کیے جا سکتے ہیں۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

> ہر ملک کے مالدار لوگوں پر فرض ہے کہ اپنے غریب لوگوں کی کفالت کریں۔ اگر زکوٰۃ کی آمدنی اس کے لیے کافی نہ ہو تو سربراہ ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرے گا۔ ان غریبوں کے لیے اتنے مال کا انتظام کیا جائے گا جس سے وہ بقدر ضرورت غذا حاصل کریں اور اسی طرح

جاڑے اور گرمی کا لباس اور ایک ایسا مکان جو ان کو بارش دھوپ اور راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ رکھ سکے۔ (المحلی ج۶)

وہ ضروریات جن کی تکمیل کے لیے قرآن انفاق کا مطالبہ کررہا ہے صرف دفاعی اغراض اور کفالت عامہ تک محدود نہیں ہیں —— ماوردی نے لکھا ہے کہ شہر کی چہار دیواری، مساجد، نہروں کی مرمت اور تعمیر کے سلسلے میں شہر کے باشندوں سے حسب استطاعت مالی خدمت حاصل کرنا جائز ہے۔ یہی رائے فقیہ ابو یعلی حنبلی نے بھی ظاہر کی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ چوتھے اور پانچویں پارے میں ملے گی۔

یہاں انفاق کے مطالبہ کی نوعیت پر ہمارے شارحین قرآن کو حیرت ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ یہ فرض ہے اور کوئی کہتا ہے کہ نفل ہے۔ دراصل ہم مالیاتی مسائل میں زکوٰۃ سے الگ ہو کر فرضیت کے بارے میں سوچنے کے عادی نہیں ہیں۔ ہم سمجھتے ہیں کہ زکوٰۃ دے دینے کے بعد انفاق و خیرات کے تمام مطالبات ختم ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ ایسا سوچنا ایک قلم قرآن کو بھلا دینا ہے۔ زکوٰۃ تو ایک خاص قسم کا ٹیکس ہے اور ایک خاص مقصد کے لیے لگایا جاتا ہے جو سال میں ایک بار دیا جاتا ہے لیکن ہماری زندگی کا ہر گوشہ ہم سے انفاق کا مطالبہ کرتا ہے۔

امت میں جہاں بھی بگاڑ رونما ہوا اور بگاڑ کو دُور کرنے کے لیے سرمایہ کی ضرورت ہو مسلمان سرمایہ داروں کے فرائض میں اس آیت کی رُو سے یہ بات داخل ہے کہ وہ مفاسد کو دُور کرنے کے لیے اپنے سرمایہ کو حرکت دیں اگر وہ اسلامی زندگی کا توشہ لے کر دُنیا سے جانا چاہتے ہیں تو ان کا فرض ہے کہ حسب استطاعت قرآن کے تمام مطالبات پورے کریں۔ اس آیت میں جو حکم دیا گیا ہے وہ سادہ حکم نہیں بلکہ ایک سنگین وعید پر مشتمل ہے۔

مال خرچ نہ کرنے پر سنگین وعید

۲۵۴۔ پہلے اس کے کہ یہ زندگی ختم ہو کر وہ دن آئے کہ اس میں نہ تو کاروبار ہوگا نہ یاری و دوستی کام آئے گی اور نہ کسی کی سفارش ہوگی۔ یعنی عمل کا وقت ابھی ہے آخرت کی زندگی میں نہ تو اعمال بکتے ہیں نہ کوئی آشنائی سے دیتا ہے نہ کوئی سفارش سے چھڑا سکتا ہے جب تک پکڑنے والا نہ چھوڑے لے

لے افادات شیخ الہند۔

اصل ارشاد میں لا بیع فیہ ولا خلۃ ولا شفاعۃ کے الفاظ آئے ہیں۔ ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ آخرت کی نجات کا تمام تر دارومدار ایمان و عمل پر ہے۔ وہاں نہ تو نجات کی خرید و فروخت ہو سکتی ہے نہ کسی کی دوستی آشنائی کام دے سکتی ہے نہ کسی کی سفارش سے کام نکالا جا سکتا ہے۔[1]

بیع خرید و فروخت، لین دین، بیچنا خریدنا مصدر ہے۔ سودا دے کر قیمت لینے کا نام بیع اور قیمت دے کر سودا لینے کا نام شرا ہے۔ کبھی شرا کے معنے میں بیع اور بیع کے معنے میں شرا کا استعمال ہوتا ہے۔ آخرت میں بیع نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہاں کسی قسم کا معاوضہ، مبادلہ نہ ہوگا یعنی آخرت میں اعمال کی بکری نہ ہوگی کہ کسی سے خرید کر ادائیگی کر دے اور اس طرح چھٹکارا کرالے۔ قرطبی لکھتے ہیں کہ وہاں خرید و فروخت ناممکن ہوگی۔ خرید یہ کہ کسی سے عمل کچھ دے کر لے لے اور فروخت یہ کہ کچھ لے کر کسی کو عمل دے دے۔ صدقہ یہاں ہو سکتا ہے وہاں صدقہ کی صورت ممکن نہیں ہے۔ دوسرے موقعہ پر ارشاد ہے۔

انفقوا مما رزقنکم من قبل ان یاتی احدکم الموت فیقول رب لولا اخرتنی الی اجل قریب فاصدق واکن من الصالحین۔

جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے کچھ خرچ کر لو اس سے پہلے کہ موت تمہارے سامنے آ کھڑی ہو اور تم یہ کہہ رہے ہو اے میرے پروردگار تو نے مجھے تھوڑی سی مہلت کیوں نہ دے دی میں صدقہ کر لیتا اور نیکو کاروں میں سے ہو جاتا۔

یعنی جو کچھ صدقہ کرنا ہے جلدی کرو ورنہ موت سر پر آ پہنچے گی تو پچھتاؤ گے کہ ہم نے اللہ کے راستے میں خرچ نہ کیا، موت کے التوا کی تمنائیں کرو گے۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ محشر میں یہ آرزو کرے گا کہ کاش مجھے دنیا میں پھر لوٹا دیا جائے تو خوب صدقہ کر کے آؤں۔

خلۃ کے معنے

خلۃ کے معنے دوستی و آشنائی کے ہیں۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں۔ خلۃ خلال سے بنا ہے جو اندرون اور درمیان کے معنے میں ہوتا ہے۔ کیونکہ وہ اس محبت کا نام ہے جو نفس کے اندر پیوست ہو گئی ہو اور بعض کی رائے ہے کہ خلل سے ماخوذ ہے کیونکہ جب دو شخص دوست ہوتے ہیں تو ہر ایک دوسرے کے خلل کو روکتا ہے یا پھر خل سے بنا ہے جس کے معنے ریگستانی راستہ کے ہیں کیونکہ دونوں راست راستہ کے رفیق ہوتے ہیں۔ یا خلت سے بنا ہے جس کے معنے خصلت کے ہیں کیونکہ دو دوستوں کی خصلتیں ملتی جلتی ہوتی ہیں

[1] ترجمان القرآن۔

مطلب یہ ہے کہ آخرت میں اپنا ایمان و عمل کام آئے گا کسی دوست، آشنا، رفیق کی دوستی، آشنائی اور رفاقت کام نہ آئے گی۔ قرآن میں دوسرے موقعہ پر ارشاد ہے۔

وینفقوا مما رزقنٰکم سراً وعلانیۃ من قبل ان یاتی یوم لا بیع فیہ ولا خلال۔

اس سے پہلے کہ وہ ہولناک دن آئے جبکہ نجات کے لیے نہ تو کسی طرح کا لین دین کام آئے گا نہ کسی طرح کی دوستی ہماری دی ہوئی روزی میں سے ظاہر و پوشیدہ خرچ کرتے رہیں۔

مطلب یہ ہے کہ وہاں انفاق کی نیکی کام آئے گی۔ بیع و شرا یا محض دوستانہ تعلقات سے کام نہیں نکلے گا۔ یعنی وہاں نہ نیک عمل خرید کر لاسکو گے نہ کوئی ایسا دوست ہوگا جس کے دوستانہ تعلقات تمہاری نجات کرا سکیں۔

سب سے آخر میں شفاعت کی نفی کی گئی ہے یعنی وہاں شفاعت بھی نہ ہوگی۔ شفاعت کے لیے جلد اول میں نوٹ ۱۶۳ پڑھئے۔

پورے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ روز قیامت میں نجات کا دارومدار ایمان و عمل پر ہوگا دنیا میں اگر کوئی کسی حق کی پاداش میں مجرم کی حیثیت سے قانون کے سامنے آتا ہے تو علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ چھٹکارے کی تین ہی صورتیں ہوتی ہیں۔ کچھ لے دے کر جان بچالی جاتی ہے یا کوئی دوست و احباب مدد کو پہنچ جاتے ہیں یا پھر کسی صاحب جاہ و منصب کی سفارش سے بچ جاتا ہے۔ وہاں ان باتوں میں سے کوئی بات نہ ہوگی۔

تین گمراہیوں کی تردید

تین لفظ بول کر تین گمراہیوں کی تردید فرمائی ہے۔ لا بیع سے اس فکری گمراہی کی تردید ہے کہ آخرت میں دنیا کی طرح اعمال کا کاروبار ہوگا وہاں بھی لین دین ہو سکے گا کوئی کسی سے نیکیاں خریدے گا کوئی کسی کے ہاتھ اپنی برائیاں فروخت کرے گا۔ قرآن نے ایک لفظ بول کر اس خرافات اور لغو خیالی کا خاتمہ کر دیا۔

اور لا خلۃ سے اہل کتاب کی اس فکری ضلالت کو رد کر دیا کہ دنیا کے نسبی رشتہ داریوں اور ذاتی خانگی دوستیوں سے آخرت میں کام چل جائے گا۔ قرآن نے بات صاف کر دی کہ وہاں کسی قسم کے دوستانہ تعلقات کام نہ آئیں گے۔

لا شفاعۃ سے عیسائیوں کی اس گمراہی کی تردید کر دی کہ حضرت عیسٰی کی حیثیت ابن اللہ ہونے کی وجہ سے

شائع مطلق کی ہے۔ انسان کے قالب میں انھوں نے اسی لیے جنم لیا ہے کہ اپنی جان کا فدیہ دے کر قیامت میں شائع مطلق کی حیثیت سے ظاہر ہوں اور ان کی شفاعت سب کے حق میں نجات کا حکم قطعی رکھتی ہے۔

اسلام میں شفاعت کا جو تصور ہے وہ مسیحی اور یہودی تصور سے بالکل جداگانہ ہے اس کے دو پہلو ہیں ایک مثبت دوسرے منفی۔ ان دونوں میں صحیح توازن قائم رکھنا ضروری ہے اور قرآن شفاعت کے موضوع پر اسی توازن کو قائم رکھنا چاہتا ہے افسوس کہ مسلمانوں نے اس توازن کو قائم نہ رکھا اور اس کے مثبت پہلو میں وہ اس قدر آگے نکل گئے کہ بقول علامہ اقبال

یہ مسلماں ہیں جنہیں دیکھ کے شرمائیں یہود

مولانا اسماعیل شہید نے شفاعت پر بڑی سیر حاصل بحث کی ہے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ معالم القرآن کے ناظرین کی ضیافتِ طبع کے لیے ہم یہاں اس کا خلاصہ پیش کر دیں۔

شفاعتِ وجاہت

دنیا میں شفاعت کئی طرح کی ہوتی ہے۔ کوئی شخص مجرم کی حیثیت سے بادشاہ کے سامنے پیش ہو۔ اسے بچانے کی ایک صورت یہ ہے کہ کوئی امیر وزیر بادشاہ سے اس کی سفارش کرے۔ بادشاہ کا جی تو یہی چاہتا ہے کہ اس کے قانون کے مطابق چور کو سزا ملے لیکن اس امیر سے دب کر اس کی سفارش مان لیتا ہے اور اس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے کیونکہ وہ امیر اس کی سلطنت کا بڑا رکن ہے اور اس کی بادشاہت کو بڑی رونق دے رہا ہے۔ بادشاہ یہ خیال کر کے کہ ایک چور سے درگزر کر جانا اتنے بڑے شخص کی ناراضگی کے مقابلے میں بہتر ہے چور کو معاف کر دیتا ہے۔ اس کو شفاعتِ وجاہت کہتے ہیں۔ یعنی اس امیر کی وجاہت کی وجہ سے اس کی سفارش قبول ہوئی۔ اس قسم کی شفاعت اللہ کی جناب میں ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتی ہے۔

شفاعتِ محبّت

دوسری صورت یہ ہے کہ شہزادوں میں سے کوئی یا بادشاہ کا کوئی چہیتا اس چور کی سفارش کرے۔ بادشاہ اس کی محبت سے لاچار ہو کر اور یہ سوچ کر کہ چور کو معاف کر دینا بہ نسبت محبوب کے ناراض ہو جانے اور روٹھ جانے کے بہتر ہے۔ اس کی سفارش قبول کرے اور چور کو معاف کر دے۔ اس کو شفاعتِ محبت کہتے ہیں۔ اس قسم کی شفاعت بھی اللہ سبحانہ کے دربار میں ممکن نہیں ہے۔

شفاعت بالاذن

تیسری صورت یہ ہے کہ چور پر چوری ثابت ہو گئی مگر وہ ہمیشہ کا چور نہیں ہے اور چوری کو اس نے پیشہ نہیں بنایا ہے مگر نفس کی شامت سے قصور ہو گیا ہے۔ اپنے قصور پر شرمندہ ہے اور ڈر رہا ہے۔ رات دن بادشاہ کا منہ دیکھ رہا ہے کہ دیکھئے میرے حق میں کیا حکم ہوتا ہے۔ اس کا یہ حال دیکھ کر بادشاہ کے دل میں اس پر ترس آجاتا ہے، مگر آئین بادشاہت کا خیال کر کے بے سبب درگزر نہیں کرتا کہ کہیں لوگوں کے دلوں میں اس آئین کی قدر نہ گھٹ جاوے۔ کوئی امیر وزیر اس کی مرضی پاکر اس خطاکار کی سفارش کرتا ہے اور بادشاہ اس امیر کی عزت بڑھانے کو ظاہر میں اس کی سفارش کا نام کر کے اس چور کی تقصیر معاف کر دیتا ہے۔

یہ امیر اس چور کی سفارش اس لیے نہیں کرتا کہ وہ چور کا قرابتی ہے یا آشنا بلکہ صرف اس لیے کر رہا ہے کہ امیر نے بادشاہ کی مرضی یہی سمجھی ہے کیونکہ امیر بادشاہ کا امیر ہے چور کا حمایتی نہیں ہے۔ اس کو شفاعت بالاذن کہتے ہیں یعنی یہ سفارش خود مالک کی اجازت، اس کے حکم اور اس کی مرضی سے ہوتی ہے۔ اللہ کی جناب میں روزِ قیامت یہی شفاعت ہو گی اور انبیاء، اولیاء کی جس شفاعت کا قرآن و حدیث میں ذکر ہے۔ اس کے معنے یہی ہیں۔

آیئے ایک بار آیت پر ایک جامع نظر ڈال لیجئے۔ ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ:

جو عملِ خیر دنیا میں فوت ہو جائے گا آخرت میں اس کی تلافی نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ تلافی کے طریقوں میں سے بعض طریقے تو وہاں موجود نہ ہوں گے اور جو موجود ہوں گے وہ عام اور اختیاری نہ ہوں گے۔ نہ موجود ہونے والے طریقوں میں بیع ہے اور جو طریقے موجود تو ہوں گے مگر عام اور اختیاری نہ ہوں گے۔ ان میں دوستی اور شفاعت ہے۔ دوستی اور خلت وہاں موجود تو ہو گی لیکن مجرم کی اختیاری نہ ہو گی۔ ارشاد ہے۔

الاخلاء یومئذ بعضہم لبعض عدو الا المتقین۔

سب دوست اس دن باہم دشمن ہوں گے لیکن جن کی دوستی اللہ کی خاطر تھی وہ کام آجائے گی۔
ایسے ہی شفاعت وہاں موجود تو ہو گی لیکن مجرم کی اختیاری نہ ہو گی بلکہ اذنِ الٰہی پر موقوف ہو گی جیسا کہ اگلی آیت میں آرہا ہے۔

من ذا الذی یشفع عندہ الا باذنہ۔

کون ہے جو اللہ کے حکم کے بغیر اللہ کی جناب میں سفارش کر سکے؟

اس لیے یہ آیت قرآنی مطلق خلت اور مطلق شفاعت کی نفی نہیں کر رہی ہے جس کی نفی ہو رہی ہے۔

وہ اور ہے اور دوسرے مواقع پر جسے ثابت کیا گیا ہے وہ اور ہے[1]

۲۵۷۔ جو لوگ انکار کرنے والے ہیں فی الواقع وہی نقصان والے ہیں۔ اس فقرے کا صحیح مطلب بتانے میں شارحین قرآن مختلف ہیں حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں کفار نے اپنے آپ پر ظلم کیا جس کی شامت سے ایسے ہو گئے کہ آخرت میں نہ کسی کی دوستی سے ان کو نفع ہو سکے اور نہ سفارش سے ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں اعمال اور مال کو بے موقع استعمال کرتے ہیں اس طرح کہ طاعات بدنیہ و مالیہ کو ترک اور معصیت بدنیہ و مالیہ کو اختیار کرتے ہیں تو تم کافروں جیسے مت بنو۔

مولانا اصلاحی فرماتے ہیں۔

الکافرون سے مراد ہمارے نزدیک وہ ہیں جو اس طرح کے کسی دن کے ظہور کے منکر ہیں جس سے یہاں ڈرایا گیا ہے۔ جو لوگ آخرت کے منکر ہوں ان کے لیے یہ ممکن نہیں ہے کہ وہ کل کے ادھار کے لیے آج کے نقد کو قربان کر سکیں ایسے لوگوں کے بارے میں فرمایا کہ اگرچہ یہ لوگ اپنی دانست میں اپنے آپ کو بہت حقیقت پسند سمجھتے ہیں اور ان کا گمان یہ ہے کہ وہ اپنے کو نفع پہنچا رہے ہیں لیکن درحقیقت یہ اپنی جانوں پر بہت سے ظلم ڈھا رہے ہیں۔

---

[1] بیان القرآن

اَللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ اَلْحَیُّ الْقَیُّوْمُ ۚ لَا تَاْخُذُهٗ سِنَةٌ وَّ
لَا نَوْمٌ ؕ لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ مَنْ ذَا الَّذِیْ
یَشْفَعُ عِنْدَهٗۤ اِلَّا بِاِذْنِهٖ ؕ یَعْلَمُ مَا بَیْنَ اَیْدِیْهِمْ وَمَا
خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا یُحِیْطُوْنَ بِشَیْءٍ مِّنْ عِلْمِهٖۤ اِلَّا بِمَا شَآءَ ۚ
وَسِعَ كُرْسِیُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ ۚ وَلَا یَـُٔوْدُهٗ حِفْظُهُمَا ۚ
وَهُوَ الْعَلِیُّ الْعَظِیْمُ ﴿۲۵۵﴾

اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں ہے[436]، وہ زندہ جاوید ہستی جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے[437]، اس کی ذات اونگھ اور نیند سے بالا ہے[438]، آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیّت ہے[439]، کون ہے جو اُس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کر سکے[440]؟ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے وہ اُسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ اُن سے اوجھل ہے وہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں ہے[441]۔ اور انسان اللہ کے علم میں سے کسی بات کا بھی احاطہ نہیں کر سکتا ہاں مگر جتنی بات کا علم وہ خود انسان کو دینا چاہے[442]، اس کا تختِ حکومت آسمانوں و زمین کے تمام پھیلاؤ پر چھایا

ہوا ہے[۲۳]، اور آسمان و زمین کی نگہبانی و حفاظت اس کو تھکاتی نہیں ہے[۲۴]، اور اس کی ذات گرامی ہم سری اور ہم پلہ ہونے سے برتر[۲۵] اور پوری کائنات سے بزرگ تر ہے[۲۶]۔

مشہور امام تفسیر ابن جریر نے یہ مطلب بتایا ہے کہ ہم نے کافروں کو دوستوں، رفقاء اور اقرباء کی نصرت اور امداد سے محروم کیا ہے اور ہم ایسا کرنے میں ظالم نہیں ہیں۔ کیونکہ ہماری جانب سے یہ ان کے کفر کی جزا ہے۔ ظالم تو وہی ہیں جنہوں نے کفر کیا۔

آلوسی لکھتے ہیں۔ کہ متقی اہل ایمان کو تو اپنے ایمان و عمل کی پوری پوری جزا ملے گی۔ لیکن کافر اپنے کفر کی پاداش میں اس سے محروم رہیں گے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں اس ظالم سے زیادہ ظلم والا کوئی نہیں ہے جو روز قیامت اللہ کی جناب میں کفر کی زاد راہ لے کر حاضر ہو۔

اوروں کا پتہ نہیں لیکن میرا ذوق یہ کہتا ہے کہ آیت میں کفر اور ظلم اپنے اصطلاحی معنے میں نہیں بلکہ لغوی معنے میں ہے۔ کفر کے لغوی معنے ناشکری کرنے کے اور ظلم کے معنے بے موقع استعمال کرنے کے ہیں مطلب پوری آیت کا یہ ہے کہ اے ایمان والو ہم نے رزق کی نعمت عطا فرمائی اور ایسے لوگوں سے یہ نعمت لے کر نہیں دی ہے جو مال میں تصرف غلط کرتے تھے۔ اجتماعی مصالح اور منافع کے موقعہ پر خرچ نہ کرتے تھے تم ان جیسے نہ ہو جانا۔ انہوں نے بخل و امساک کر کے اپنے پر اور اپنی قوم پر ظلم کیا ہے اور اس کے نتیجے میں وہ اللہ کے انعامات کے ناقدر شناس رہے اور ناقدر شناس ہی اپنا نقصان کیا کرتے ہیں۔ قرآن میں لفظ کفر اور ظلم بہت مقامات پر لغوی معنے میں آیا ہے۔

سراپردۂ عظمت و جلال

انبیاء کے بعد اختلاف و اقتتال اور آیات بینات آنے کے بعد پہلے کفر و ایمان کا ذکر کیا تھا اور بعد ازیں اہل ایمان کو انفاق کی دعوت دی اور والکافرون ہم الظالمون کے ذریعے اشارۃً بتا دیا کہ ایمان کا تقاضا پورا کرنا تمہارا کام ہے۔

اب اسی سلسلے میں ایک آیت ایسی آئی ہے جو نہ صرف تصور ایمانی کے قواعد کی ترجمان ہے۔

بلکہ اللہ سبحانہ کی حقیقی اور واقعی عظمت کا شاہکار ہے۔ صحیح مسلم میں ابی بن کعب کا بیان ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے دریافت کیا ابوالمنذر قرآن میں سب سے زیادہ باعظمت آیت کون سی ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ لا الہ الا ہو الحی القیوم ..... حضور نے میرے سینہ پر ہاتھ مارا اور فرمایا کہ اے ابوالمنذر علم تمہیں مبارک ہو۔ اسی طرح حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہم اور دیگر صحابہ کرام سے منقول ہے کہ تمام آیتوں میں سب سے زیادہ باعظمت اور آیتوں کی سردار آیۃ الکرسی ہے۔

حضرت شیخ الہند یہاں بڑی لطیف اور بہت گہری بات فرما گئے

اصل بات یہ ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے اپنے کلام پاک میں ملے جلے تین قسم کے مضمون بیان فرمائے ہیں۔ علمِ توحید وصفات، علمِ احکام، علمِ قصص وواقعات۔ قصص وواقعات سے توحید کی تائید یا احکام کی تاکید مقصود ہوتی ہے۔ علمِ توحید در علمِ احکام بھی باہم اس طرح مربوط ہیں کہ گویا باہم ایک دوسرے کے لیے علت اور علامت کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اللہ کی صفات احکامِ شرعیہ کے لیے بمنزلہ منشا واصل ہیں اور احکامِ شرعیہ صفات کے لیے بمنزلہ ثمرات و فروع ہیں۔ اس لیے جیسے علمِ قصص اور علمِ احکام سے علمِ توحید کی تائید ہوتی ہے ایسے ہی علمِ قصص اور علمِ توحید سے علمِ احکام کی تاکید ہوتی ہے۔ بلکہ یوں کہو کہ علمِ احکام کی ضرورت اور حقیقت واصلیت ثابت ہوتی ہے اور بیان میں یہ تفنن بہت ہی احسن اسہل اور قابلِ قبول ہے کیونکہ ــــ اولاً ایک طریقہ کی پابندی موجب ملال ہوتی ہے اور ایک علم سے دوسرے علم کی طرف منتقل ہو جانا ایسا ہوتا ہے جیسے ایک باغ کی سیر کر کے دوسرے باغ کی سیر کرنے لگے۔ ثانیاً تفنن کے ذریعے حقیقت، منشا اور ثمرہ اور نتیجہ نمایاں ہو کر سامنے آجاتا ہے اور تعمیلِ احکام نہایت شوق و مستعدی اور رغبت و بصیرت سے ہوتی ہے۔ بیان کا یہ طریق بہت شاندار، مفید اور قرآن میں کثیر الاستعمال ہے۔ ذرا نظر کو وسیع کیجئے اور غور فرمائیے کہ یہاں اول احکام بیان کیے گئے احکام کے بعد بقدرِ مصلحت قصص کو بیان کر کے تمام احکام کے فوائد ونتائج گویا ہمیں آنکھوں سے دکھلا دیئے ان سب کے بعد آیۃ الکرسی لائے جو توحید وصفاتِ الٰہیہ میں ایک ممتاز آیت ہے اس کو بیان فرما کر تمام احکام کی جڑیں دل کی وادی میں پیوست کر دی ہیں اور ایسی مستحکم کر دی ہیں کہ ہلائیں نہ ہلیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس عظیم آیت کے ذریعے قرآن نے اپنے مخاطبوں کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا، اس کی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا، اس کی مشیت و ارادہ اور قدرت و وسعت سے آگاہ کیا ایک ایسی ہستی سے ان کو معرفت کی راہ بتائی۔ جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود ہے جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرے میں نافذ ہے، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اُجالے کی ہر چیز داخل ہے دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں۔ اس کی قوت ہر قوت پر غالب اس کا ارادہ ہر ارادے میں نافذ اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک و منزہ اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے وہ اندھیرے کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسیوں کی اُمید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کی تسلی اور بیکسوں کا سہارا ہے۔

قرآن اللہ سبحانہٗ کے تمام اوصاف حمیدہ اور اسمائے حسنیٰ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ اللہ کے اسماء و صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے، قرآن پاک کا کوئی رکوع ایسا نہیں جس کا خاتمہ اللہ کی توصیف اور حمد پر نہ ہو۔ یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق پر محبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوب ازل اور نور عالم کے ساتھ قرآن کے مخاطبوں کے دلوں میں تھے۔

توحید کی تکمیل

۷۳۶۔ اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں ہے۔ اہل عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق مانتے تھے۔ قدرت کے کارخانے کا اس کو تنہا مالک سمجھتے تھے۔ یہودیوں کا خدا ایک خاندانی خدا تھا جس نے ساری دنیا صرف بنی اسرائیل کے لیے پیدا کی تھی اور اس کو بنا کر ساتویں دن تھک کر بیٹھ گیا تھا وہ انسان سے کشتی لڑتا تھا اس کی اولاد تھی۔ عیسائیوں کا خدا سب کچھ مسیح ابن مریم کو دے کر معطل ہو چکا تھا۔ ایرانیوں کے خدا کی خدائی نیکی اور بدی کی دو مملکتوں میں تقسیم تھی۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو ہماری ہر قسم کی بندگی و پرستش کا مستحق ہے۔ جو انسانوں کی پکار سنتا اور ان کی دعائیں قبول کرتا ہے۔ دُعا و استعانت، رکوع و سجود، عجز و نیاز، نذر و طواف، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام نیاز مندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان پرستش کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ محکومیت، طاعت اور احکام کی فرمانبرداری اور تحلیل و تحریم کے اختیارات وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان بندگی کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ اگر ان اعمال میں تم نے کسی دوسری ہستی کو اس کا شریک کر لیا تو اللہ کے رشتہ الوہیت کی یگانگت قائم نہ رہی۔ اسی طرح عظمتوں، کبریائیوں، کارسازیوں اور فرمانروائیوں

کا جو اعتقاد ہمارے اندر خدا کی ہستی کا تصور پیدا کرتا ہے وہ صرف اللہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ وہ آسمان سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے۔ اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا اس کا شریک نہیں ہے۔ اس کی شہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصّہ نہیں ہے۔ اس کے کارخانۂ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں ہے کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دُنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل نہیں۔ سب کمزور ہیں وہی ایک قوت والا ہے۔ سب جاہل ہیں اسی ایک کو علم ہے۔ سب فانی ہیں اسی ایک کو بقا ہے۔ سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے۔ سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک ہر بُرائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے۔ وہ ہر قسم کے صفاتِ عالیہ اوصاف کمالیہ اور محامدِ جمیلہ سے موصوف ہے۔ اس کے مانند کوئی نہیں۔ اس کی تشبیہ و مثال کوئی نہیں۔ لوگوں نے اس نقرے سے لا الہ الا ہو کو توحید ذات اور توحید وجود کا دعویٰ قرار دیا ہے اور اس آیت کے ذریعے وہ اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ اس ایک خدا کے سوا دوسرے کسی خدا کا سرے سے وجود ہی نہیں ہے۔ لیکن قرآن جن سے مخاطب ہے ان میں سے کوئی بھی اللہ کے سوا کسی دوسرے خدا کے وجود کا قائل نہیں ہے وہ اگر قائل ہیں تو اللہ کے ساتھ دوسروں کے الٰہ یعنی معبود ہونے کے قائل ہیں۔ الٰہ فعال کے وزن پر ہے ہر قوم کے نزدیک جس کی بندگی و پرستش کی جائے وہ الٰہ ہے، خواہ وہ معبود برحق ہو یا معبود باطل، سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن کے مخاطبوں نے اللہ سے عبادت کا رشتہ توڑ کر اوروں کے ساتھ جوڑ رکھا تھا۔ یا ذات کا رشتہ کسی اور سے ان کا وابستہ تھا۔ قرآن کا مطالعہ اور قرآن کی مخاطب قوموں کے حالات بتاتے ہیں کہ انھوں نے خدا کی ذات کو مان کر اوروں سے عبادت کا رشتہ جوڑ رکھا تھا اسی لیے قرآن نے ان کے عبادت کے ان رشتوں پر لا الہ الا ہو کہہ کر ضرب کاری لگائی ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ توحید ذات اور توحید خالقیت میں قرآن کے مخاطبوں کا قرآن سے کوئی اختلاف نہ تھا۔ آیۃ الکرسی اسی توحید الوہیت کا شاہکار ہے اور اس میں اسی کے دلائل ہیں۔

الوہیت کی پہلی دلیل

۴۳۷۔ وہ زندہ جاوید جو تمام کائنات کو سنبھالے ہوئے ہے۔ یعنی اللہ سبحانہٗ کے یگانہ معبود ہونے کی اوّلین دلیل یہ ہے کہ اس کی ذات حی و قیوم ہے۔ حی کے معنے زندہ کے ہیں۔ یہ اللہ سبحانہٗ کی نمایاں صفت ہے مگر وہ ایسا حی نہیں جس پر موت آسکے بلکہ ایسا حی ہے جس کے وجود کے ساتھ پوری کائنات ہستی کا رشتہ حیات قائم ہے۔ ایسا حی، کہ اگر وہ نہ ہو تو کائنات کی حیاۃ اور حیاۃ سے پہلے اس کا وجود ہی مٹ کر رہ جائے۔ کائنات

میں جو زندہ ہیں اس کی زندگی اُن کی طرح نہیں کہ اپنے وجود کے بقاء کے لیے ہر لحظہ دوسرے کا محتاج ہو بلکہ ایسا حی جس کی حیاۃ دوسروں کے لیے منشاء حیاۃ ہو۔ اس کی حیات ذاتی اور ابدی ہے۔ اس کی نہ ابتداء ہے اور نہ انتہاء اس کے سوا ہر چیز اپنی ذات سے مردہ اور معدوم ہے۔ ہماری حیات پائیدار نہیں ہے نہ ازل سے ہے اور نہ ابد تک رہے گی۔ ایک زمانہ وہ تھا کہ زندگی نہ تھی۔ اور ایک زمانہ آنے والا ہے کہ زندگی نہ ہوگی۔ یہ ہماری زندگی کا وجود و انفصال باآواز بلند کہہ رہا ہے کہ ہماری زندگی خانہ زاد نہیں۔ زمین کی روشنی اور پانی کی گرمی کی طرح مستعار ہے جیسے زمین کی روشنی اور پانی کی گرمی آفتاب کا فیضان ہے۔ ہماری حیاۃ بھی کسی ایسی ذات کا فیضان ہوگا جس کی حیات خانہ زاد ہو جیسے آفتاب پر پانی کی گرمی اور زمین کی روشنی کا قصہ ختم ہو جاتا ہے ایسے ہی ہماری حیات کا قصہ بھی ایک ایسی ذات پر ختم ہوتا ہے جس کی حیات اپنی اصلی اور خانہ زاد ہے یہی ذات گرامی الحیّ ہے۔ اس کی حیات جب اسی کی خانہ زاد ہے تو یہ حقیقت باور کرنے میں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے کہ اس کی ذات اور اس کی حیات لازم و ملزوم ہیں جیسے آفتاب سے نور اور آگ سے گرمی جدا نہیں ہو سکتے یہ نہیں ہو سکتا کہ آگ ہو اور گرمی نہ ہو آفتاب ہو اور روشنی نہ ہو، ایسے ہی یہ بھی نہیں ہو سکتا کہ اللہ کا وجود ہو اور حیات نہ ہو۔ اور کوئی شخص یہ باور نہیں کر سکتا کہ زندگی والی ہستی موجود ہو لیکن کوئی ارادہ کوئی قوت کوئی فعل، کوئی کارفرمائی، کوئی گفتار، کوئی بصارت، کوئی سماعت، کوئی رحمت، کوئی حکمت موجود نہ ہو۔ انسان کی فطرت کبھی یہ باور نہیں کر سکتی۔ اس کا وجدان پکارتا ہے جو ذات حی ہے وہ سمیع و بصیر ہے وہ متکلم و رحیم ہے۔ جب ہم پکاریں وہ سنتا ہے، وہ نیکیوں کو پسند اور گناہوں سے نفرت کرتا ہے۔

القیوم: قیام سے مبالغہ کا صیغہ فیعول کے وزن پر ہے یعنی وہ ذات گرامی جو خود رہنے والی اور دوسروں کو رکھنے والی خود موجود باقی ہے اور دوسروں کے وجود و بقا کا سامان کر رہی ہے۔ (مفردات القرآن)

یہ لفظ اگرچہ مختصر ہے لیکن درحقیقت قرآن کی بلاغت نے اس ایک لفظ میں کائنات کے وجود قیام بقا قرار ثبات، حفاظت، نگرانی، رزق رسانی، پروردگاری، کارسازی، تنظم، نقاشی اور تعمیر و تحسین کا بے پایاں دفتر چھپا رکھا ہے۔ قیوم کے معنے لغت میں خود بخود رہنے والے اور دوسروں کے لیے تھم اور آسرا ہونے کے ہیں۔ پھر قیوم کے اس لغوی معنے سے اس سردار کے معنے پیدا ہوئے جو دوسروں کے لیے سہارا ہو اور اس کو بھی کہتے ہیں جس کا آغاز کوئی نہ ہو اور خود بخود اور ہمیشہ سے ہو۔ اور اس جائے پناہ کے معنے میں بھی مستعمل ہوتا ہے جو سب کو مصیبت کے وقت اپنے دامن میں پناہ دے۔ اور اس مرجع اور مرکز کے معنے میں بھی آتا ہے جس کی طرف ہر شخص دوڑ دوڑ کر جاتا ہے۔ ان معانی کے علاوہ علماء نے اس کی تفسیر میں

حسب ذیل معانی بھی لکھے ہیں ۔

امام مجاہد	ہر چیز کو قائم رکھنے والا
امام ربیع	ہر چیز کا نگران، رازق
قتادہ	ہر چیز کی عمر، رزق اور عمل کا نگران
ابن الاعرابی	مدبر
زجاج	محافظ، خود بخود ہونے والا

تمام معانی صرف ایک لفظ کے اندر پوشیدہ ہیں ۔ اور یہ سب ایک حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں کیونکہ اوپر معلوم ہو چکا ہے کہ اس لفظ کے معنے خود بخود قائم ہونے والے اور دوسروں کو قائم رکھنے والے کے ہیں اللہ کا یہ اسم گرامی توحید اسلامی کے ہر شعبہ کو حاوی ہے ۔ اسی لیے اللہ پاک کے ناموں میں اسم اعظم کا درجہ قرار دیا گیا ہے ۔ ایک صحابی نماز پڑھ رہے تھے ۔ نماز سے فارغ ہوئے تو یوں دعا مانگی ۔

اللّٰھم انی اسئلك بان لك الحمد لا الٰہ الا انت المنان، بدیع السمٰوات والارض یا ذا الجلال والاکرام یا حی یا قیوم

حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ میں حضور انورؐ کے ساتھ مسجد میں بیٹھا تھا ۔ حضور نے جب یہ دعا سُنی تو فرمایا کہ اس نے اللہ کا وہ نام لے کر دعا کی ہے کہ جب وہ اس نام کے ساتھ پکارا جاتا ہے تو جواب دیتا ہے اور جب اس سے مانگا جاتا ہے تو ضرور دیتا ہے حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اللہ سبحانہٗ کی شانِ قیومیت پر جس انداز سے تبصرہ کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے ۔ فرماتے ہیں :

میرا دعویٰ ہے کہ تمام امکانی حقائق کا قیوم اللہ سبحانہٗ کا واحد شخصی امر ہے بالفاظِ دگر وہ صرف پیدا کرنے والا ہی نہیں بلکہ جو چیز جتنی مدت تک رہتی ہے اس کو موجود اور برقرار رکھنے والی قوت اسی ایک کی ہے، ایک ہی طاقت ہے جو ذرے سے لے کر آفتاب تک محسوس و نامحسوس ہر شے کو تھامے اور ٹھہرائے ہوئے ہے ۔

آگے فرماتے ہیں :

الحاصل کہنا یہ ہے کہ تمام موجوداتِ امکانی جن کا ظہور اس عالم میں ہو رہا ہے یہ ایک واحد وجود کے ساتھ وابستہ ہیں اور سارے ظلال کا قیام و بقاء، قرار و ثبات ایک ہی قیوم کے ساتھ وابستہ ہے اور اس بنیاد پر یعنی قیوم سب کا ایک ہی ہے، یہ بھی ماننا پڑے گا کہ کائنات کی تمام ذاتیں اور شخصیتیں اپنی ذات کے حساب سے تو ایک ہیں لیکن ماہیتوں کے

لحاظ سے مختلف ہیں۔

یہ بتا دینے کے بعد کہ سارے عالم کا قیوم ایک ہی شخصی واحد وجود ہے۔ اب میں اسی قیوم کے بارے میں مختلف بزرگوں کی اصطلاحیں بتانا چاہتا ہوں۔

بزرگوں نے اس قیوم کو مختلف ناموں سے موسوم کیا ہے۔ ظاہر الوجود یہ شیخ محی الدین ابن عربی کی اصطلاح ہے یا موجودات کے ہیکلوں پر پھیلا ہوا وجود بھی اسی کی تعبیر ہے۔ اور یہ مجدد الف ثانی رح کی اصطلاح ہے اسی کو نفس رحمانی کہتے ہیں۔ یہ شاہ ولی اللہ نے قیوم کے لیے اختیار کی ہے کبھی اس قیوم کو اسماء الہیہ کا خاتم بھی کہا گیا ہے۔ اسی کی تعبیر الرحمٰن سے بھی کرتے ہیں۔ شاہ صاحب نے بدر بازغہ میں اسی کو اپنایا ہے اور المرید کے لفظ سے بھی مقصود یہی قیوم ہے۔

بہرحال اس فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ کی ذات حیّ و قیّوم ہے۔ اس کا حیّ و قیّوم ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کے علاوہ عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے۔ صرف اسی کی ذات ہماری عبادتوں کی مستحق ہے۔

توحیدِ الوہیت کی دوسری دلیل

۲۸۷۔ اس کی ذات اونگھ اور نیند سے بالا ہے۔ یہ صفت قیومیت کی تکمیل ہے۔ یا اس کی تاکید ہے کیونکہ اونگھ اور نیند ایک قسم کا فتور ہے جو شان قیومیت کے منافی ہے اور حیات کو کمزور بناتی ہے، جسے اونگھ اور نیند آئے گی اس کی حیات بھی ناقص ہوگی اور دوسروں کی تدبیر بھی نہ کر سکے گا اس سے اس کی شانِ قیومیت میں نقصان لازم آئے گا۔[1]

پچھلے جملہ میں لفظ قیوم لا کر بتایا کہ اللہ سبحانہٗ سارے آسمانوں، زمینوں میں سمانے والی تمام کائنات کو تھامے ہوئے ہے اور ساری کائنات اسی کے سہارے قائم ہے تو ایک انسان کا خیال اپنی جبلت و فطرت کے مطابق اس طرف جاتا ہے کہ جو ذات اتنا بڑا کام کر رہی ہے اس کو کسی وقت آرام کی بھی ضرورت ہوگی۔ اس فقرے میں اس پر تنبیہ کر دیا کہ اللہ سبحانہٗ کی قدرت کاملہ کے سامنے یہ سارے کام نہ کچھ مشکل ہیں نہ اس کو آرام کی ضرورت ہے، اس کی ذات تاثر و انفعال سے پاک ہے[2] مسیحیوں اور یہودیوں کا عقیدہ ہے کہ حق تعالیٰ نے جب چھ روز میں آسمان و زمین کو بنا ڈالا تو ساتویں دن

---

[1] معارف م ا　　[2] معارف م ش

اسے سستانے اور آرام لینے کی ضرورت پیش آگئی۔ قرآن بتاتا ہے کہ اللہ کی ذات دائم، بیدار، ہمہ خبردار، غفلت، سستی، تھکن سب سے ماوراء ہے لے

یہ ان لوگوں کے خیال کی تردید ہے جو خداوند عالم کی ہستی کو اپنی ناقص ہستیوں پر قیاس کرسکتے ہیں اور اس کی طرف وہ کمزوریاں منسوب کرتے ہیں جو انسانوں کے ساتھ مخصوص ہیں مثلاً بائیبل کا یہ بیان کہ خدا نے چھ روز میں زمین و آسمان کو پیدا کیا اور ساتویں دن آرام کیا ہے

گویا بتا دیا گیا کہ نیند اور اونگھ اس کے قیوم ہونے کے منافی ہے جو خود نیند سے مغلوب ہو کر اپنے کو قائم نہ رکھ سکے گا وہ دُنیا کو کیسے قائم رکھے گا اور جب وہ ہر لحہ خود بیدار ہے اور اپنی دنیا کی نگرانی کر رہا ہے تو پھر یہ کیوں فرض کیا جائے کہ وہ اس دُنیا کے انتظام و انصرام میں کسی اور کا بھی محتاج ہے اس سے معلوم ہوا جو ذات اپنی حیات اور قیومیت میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی قیومیت میں ہر کمزوری سے پاک ہو کیونکہ اس کی یگانگت کی عظمت قائم رہ نہیں سکتی اگر کوئی کمزوری اس کی ذات کی طرف منسوب ہو۔

اگر پوری آیۃ الکرسی اللہ کی توحید کے ایجابی پہلو کا تعارف ہے تو یہ فقرہ سلبی پہلو نمایاں کر رہا ہے۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ اللہ یہ ہے۔ سلبی پہلو یہ ہے کہ اللہ یہ نہیں ہے یہ نہیں ہے۔ یہ توضیح ہے کہ اللہ سبحانہ کی ہستی ہے اور ضرور ہے۔ متاخرین فلاسفہ نے بزور عقل مقام معرفت تک رسائی حاصل کرنی چاہی تو تنزیہہ کی راہ پر اتنی دور نکل گئے کہ آخر میں سوائے عدم محض کے کچھ ہاتھ نہ آیا، ان تنزیہات کا سلسلہ جہاں جا کر ختم ہوا وہ یہ تصور تھا کہ اللہ یہ نہیں یہ بھی نہیں انسان موجود ہے صرف مجرد نہیں مادی بھی ہے اس کا تصور کسی موجود کا متلاشی ہے جو اسے زندگی عطا کرتا ہو، جو اس کی زندگی کے بقا کا سامان کر رہا ہو جس کی یہ مملوک ہو جو اس کے بارے میں معلومات رکھتا ہو۔ جس کی شہنشاہیت کا ڈنکا بج رہا ہو۔ آیۃ الکرسی میں اللہ کی معرفت کے اسی مثبت پہلو کو نمایاں کیا ہے قرآن نے آیۃ الکرسی میں اللہ کی معرفت کے لیے سلبی پہلو میں دو فقرے اور ایجابی پہلو میں آٹھ فقرے بول کر بتا دیا کہ اس کے لیے صفات، نعوت اور شئون ہیں مگر ایسی نہیں جن کا وہم و خیال ادراک کرسکے۔ بس تنزیہہ کے درجہ میں اتنی بات یاد کر لو کہ اس کی قومیت پر کسی کمزوری کا داغ نہیں اور اس کی شہنشاہیت ہر قسم کے عیب سے پاک ہے۔

لے ماجدی ۔ ہے تفہیم القرآن

یہ تنبیہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اللہ کی ذات ہی معبود برحق ہے۔ وہی الٰہ بننے کا مستحق ہے۔ اسی کو خوف وبہر اس میں پکارنا چاہیے، اسی کو عیش وراحت میں یاد کرنا چاہیے۔

توحیدِ الوہیت کی تیسری دلیل

۷۲۹۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اسی کی ملکیت ہے۔ یعنی کائنات میں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہے بلا شرکت اس کی ملکیت ہے اور سب اس کے بندے ہیں سب پر اس کی حکمرانی ہے، سب اس کے قانون وآئین کے تحت ہیں، سب کے احوال میں وہی تصرف کر رہا ہے اور سب کے وجود وبقاء کا وہی محافظ ہے مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات سے مالکانہ اور شاہانہ تعلقات اسی کے ہیں۔ اس صفت میں کوئی اس کا شریک نہیں ہے۔ اس آیت نے صرف انسان کی نہیں بلکہ پوری کائنات کی حیثیت بتادی ہے اور یہ انکشاف کیا ہے کہ انسان کی حیثیت اللہ کی جناب میں ملک اور مملوک کی ہے۔ اللہ کی ملک ہو کر اللہ کے علاوہ کسی اور سے عبادت کے تعلقات استوار کرنا تقاضائے دانشمندی نہیں ہے، ملک اللہ کی اور عبادت غیر اللہ کی۔ اور صرف ملک ہی نہیں بلکہ انسان اللہ کا مملوک بھی ہے۔ اللہ کا مملوک ہو کر غیر اللہ کی طاعت بے غیرتی ہے گویا جیسے خدا کی مالکیت کا یہ تقاضا ہے کہ پرستش اس کے سوا کسی کی نہ ہو ایسے ہی اس کی ملکیت اور بادشاہت کا تقاضا یہ ہے کہ بندگی اس کے علاوہ کسی کی نہ ہو۔

یہ فقرہ اس مشرکانہ ذہن کی تردید کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے کچھ مقبول بندوں کو دُنیا کے خاص علاقوں میں مالکانہ تصرف کا اختیار دے دیا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں مشرکین کی اس فکری گمراہی کی نشاندہی اس طرح فرمائی ہے کہ وہ جب طواف کرتے تو یہ تلبیہ کہا کرتے تھے۔

لبیك لاشریك لك الا شریك هولك تملكه وما ملك (صحیح مسلم)

حضرت شاہ ولی اللہ محدث فرماتے ہیں کہ مشرکین عرب کا یہ عقیدہ تھا کہ آقا تو خدا ہی ہے اور وہی مدبر بھی ہے لیکن وہ کبھی اپنے بعض بندوں کو بزرگی اور الوہیت کا لباس پہنا دیتا ہے اور ان کو بعض خاص کاموں میں تصرف کا اختیار دے دیتا ہے اور ان کی اپنے بندوں کے حق میں شفاعت قبول کرتا ہے جیسے شہنشاہ جو بڑے کاموں کے علاوہ خاص خاص علاقوں میں اپنے نائب مقرر کرتا ہے اور ان صوبوں کے اختیارات ان کے سپرد کر دیتا اور دوسری کتاب میں لکھتے ہیں کہ مشرکین کا عقیدہ تھا کہ جہان کا مدبر تو اللہ تعالیٰ ہے لیکن وہ اپنے

بندوں کو دُنیا کے مخصوص خطّوں میں تصرف کا مالک بنا دیتا ہے۔
عیسائی بھی حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے بارے میں یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ انجیل متی میں ہے،
میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سپرد کر دیا گیا ہے۔
(متی باب ۱۱، آیت ۲۷)
یسوع نے پاس آکر ان سے باتیں کیں اور کہا کہ آسمان اور زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے۔
(باب ۲۸۔ آیت ۱۹)
قرآن نے اس آیت میں لفظ لہٗ پہلے لاکر اسی فکری گمراہی کی تردید کی ہے۔
بالکل آخر میں حافظ ابن جریر کا وہ نوٹ بھی سُن لیجئے جو انھوں نے اسی آیت کی تشریح میں لکھا ہے۔

ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ اللہ کی ذات ہی مالک ہے اور اس میں کوئی شریک، سہیم، ساتھی اور ساجھی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ ہونی چاہیے۔ کیونکہ مملوک کا کام مالک کی پسند اور چاہت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ وہ صرف مالک ہی کے حکم کا بندہ ہوتا ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ تمام آسمان و زمین اور اس کے موجودات میری مِلک اور میری بنائی ہوئی ہے اس لیے میرے سوا میری مخلوقات میں سے کسی کے سامنے سرِ نیاز نہ جھکانا چاہیے۔ چونکہ میں مالک ہوں اس لیے بندوں کو میرے سوا کسی کی عبادت نہ کرنی چاہیے اور اپنے آقا کے سوا کسی کی طاعت نہ کرنی چاہیے۔

توحیدِ الوہیت کی چوتھی دلیل

۲۴۷۔ کون ہے جو اس کی جناب میں اس کی اجازت کے بغیر شفاعت کر سکے۔ اللہ کی عبادت میں توحید سے روگردانی کا ایک بڑا سبب شفاعت کے وہ غلط معنے تھے جو عربوں اور عیسائیوں میں رائج تھے۔ عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنے سمجھ رکھے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلّق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا۔ وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہوتا ہے، جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی شہری کی رسائی سفارشیوں کے بغیر نہیں ہوتی۔ اسی طرح وہ اللہ کے دربار میں سفارشیوں کے بغیر رسائی ناممکن سمجھتے تھے۔ اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کے خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد

تھے۔ چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے کہ:

هاؤلاء شفعاءنا عند الله — یہ اللہ کے یہاں ہمارے سفارشی ہیں

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ان کی مشرکانہ عبادتوں پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ:

ما نعبدهم الا ليقربونا الى الله زلفى۔ — ہم ان کی اسی لیے عبادت کرتے ہیں کہ ہمیں اللہ سے تقرب میں نزدیک کردیں۔

یہ بھی ان کا عقیدہ تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت اللہ کی طرف سے دونوں جہان میں مختارِ کل ہیں وہ یہاں دینے اور نہ دینے کا اور وہاں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس عقیدہ کا نام اُن کے یہاں شفاعت تھا اور یہ دیوتا اُن کے شفیع تھے۔

قرآن نے شفاعت کے موضوع پر مشرکانہ ذہن کی اس آیت میں تردید کی ہے اور بتایا کہ یہ اختیار اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ سب اس کی عظمت اور جلال کے سامنے سرنگوں ہیں۔

اس جملہ سے اللہ کی حاکمیت، جلال اور کبریائی کو بیان کرنا مقصود ہے کہ اس کی بارگاہِ عالی میں کسی کی مجال نہیں ہے کہ اس کی اجازت کے بغیر لب کشائی کر سکے[1]

مطلب یہ ہے کہ جب سب کے سب اللہ کے محکوم و مملوک ہیں تو کسی کی کیا مجال ہے کہ اللہ کی اجازت کے بغیر اس کے حضور میں کسی کی سفارش کے لیے زبان کھول سکے۔ اس آیت نے شفاعت کے اس تصور کا بالکل خاتمہ کر دیا جس کی بنیاد اس خیال پر تھی کہ بعض ترکاء کو اللہ کے ہاں اعتماد کا یہ درجہ حاصل ہے کہ وہ کسی لیے خود بڑھ کر اللہ سے سفارش کر سکتے ہیں اور خدا ان کی نازبرداری میں ضرور ان کی سفارش قبول کرے گا فرمایا کہ نہ اللہ کے یہاں کسی کا یہ درجہ ہے اور نہ کوئی اُس کے دربار میں اس کی اجازت کے بغیر زبان کھولنے کا مجاز ہے[2]

حافظ ابن جریر نے آیت کے اس فقرے کی تشریح جو فرمائی ہے وہ بھی گوش گذار فرما لیجئے تاکہ اس فقرہ کا دلیلِ الوہیت ہونا معلوم ہو جائے، فرماتے ہیں:

اللہ سبحانہٗ جب اپنے غلاموں اور اپنے بندوں کو سزا دینا چاہے گا تو اللہ کی اجازت اور مرضی پائے بغیر کسی مجرم کے حق میں کس کو یارائے سخن ہو سکتا ہے۔ یہ ان لوگوں کو جواب دیا جا رہا ہے جو مشرکانہ

[1] معارف م ا
[2] تدبر قرآن

عبادتوں کی توجیہہ و تاویل میں یہ کہتے تھے کہ اس راہ سے ہمیں اللہ کا قُرب حاصل ہوگا۔ فرمایا کہ آسمان و زمین میں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے اللہ کی ملکیت ہے۔ میرے علاوہ کسی سے تمہارے عابدانہ تعلقات نہ ہونے چاہئیں، کیونکہ شفاعت وہ نہیں کرے گا جسے تم اپنا شفیع بنا لوگے بلکہ شفاعت وہ کرے گا جسے اللہ سبحانہٗ شفاعت کی اجازت دے گا اور اس کو کرے گا جس سے اللہ راضی ہوں گے۔

آلوسی فرماتے ہیں کہ اس فقرے کے ذریعے یہ بتایا جا رہا ہے کہ کائنات میں کوئی بھی اللہ کا ہمسر اور ہم پلہ نہیں ہے جو اللہ کی بارگاہ میں اللہ کے ارادے اور فیصلہ پر کسی طرح سے اثر انداز ہو سکے۔

توحیدِ الوہیّت کی پانچویں دلیل

۱۴۷۔ جو کچھ بندوں کے سامنے ہے وہ اسے بھی جانتا ہے اور جو کچھ ان سے اوجھل ہے وہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے آگے پیچھے کے تمام حالات سے باخبر ہے۔ آگے اور پیچھے کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ اُن کے پیدا ہونے سے پہلے اور پیدا ہونے کے بعد کے تمام حالات و واقعات اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ اور یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ آگے سے مراد وہ حالات ہیں جو انسان کے کھلے ہیں اور پیچھے سے مراد اس سے مخفی واقعات و حالات ہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کا علم محیط ہے۔[۱]

مقصد یہ ہے کہ حاضر و غائب، محسوس و معقول، مدرک و غیر مدرک سب کا علم اسے پورا پورا حاصل ہے یہاں آگے اور پیچھے صرف دو سمتوں کا نام ہے لیکن مراد جمیع جہات ہیں اور یہ کنایہ عربی زبان میں عام ہے۔

اللہ کی صفات میں حیات، قیومیت، مالکیت کے اثبات کے بعد یہاں اس حقیقت کا اعلان ہوا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی صفتِ علم بھی کامل ہے۔ اور سفارش و شفاعت کے بعد صفتِ علم کا تذکرہ بالکل برمحل ہے کیونکہ سفارش کا ایک موقعہ یہ بھی ہوتا ہے کہ جس حاکم یا مالک کے سامنے مقدمہ درپیش ہو اُس کا علم محیط کامل نہ ہو اس لیے خارجی ذرائع سے اس کی معلومات میں اضافہ کیا جائے۔ یہاں یہ کہہ کر کہ اللہ کا علم ہر خفی و جلی پر حاوی ہے یہ بتا دیا کہ اس کے علم پر کسی اضافہ کی ضرورت نہیں ہے۔[۲] گویا بتا دیا کہ خدا کے سامنے کسی کے بارے میں زبان کھولنے کی تو جسارت وہ کرے جو اللہ کی معلومات میں اضافہ کر سکتا ہو اور یہ کہنے کی پوزیشن میں ہو کہ فلاں کے بارے میں نعوذ باللہ اللہ کو پوری آگاہی نہیں ہے لیکن یہ حیثیت کس کی ہے؟ اللہ سبحانہٗ سب کے آگے پیچھے اور اس کے ماضی اور مستقبل ہر چیز سے باخبر ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم کی یہ وسعت اور

[۱] معارف مشس [۲] ماجدی

دوسروں کے علم کی یہ محدودیت مشرکین کے تصور شفاعت کا بالکل خاتمہ کر دیتی ہے۔
دنیا اور آخرت کے بارے میں اللہ سبحانہ کا علمی احاطہ خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس کائنات ہست و بود میں اللہ سبحانہ کے علاوہ ہماری عابدانہ نیاز مندیوں کا کوئی مستحق نہیں ہے۔

توحید الوہیت کی چھٹی دلیل

اور انسان اللہ کے علم میں سے کسی بات کا بھی احاطہ نہیں کر سکتا ہاں مگر جتنی بات کا علم وہ خود انسان کو دینا چاہے ـــــ کون اللہ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتے؟ وہی مخلوقات جن میں پیغمبر، فرشتے سب داخل ہیں۔ یعنی اپنے علم غیب سے جتنا اور جس قدر وہ پسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے بتا دیتا ہے اور وہ بھی اتنی مقدار کہ تم اس چیز کو جان لو اصل حقیقت کا علم اور علمی احاطہ اللہ کے ساتھ مخصوص ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کا علم خود بخود ہے اور مخلوق کے تمام احوال کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے جو اس کی الہیت کی دلیل ہے اور بندوں کا علم نہایت قلیل اور ناتمام بلکہ برائے نام ہے۔ بندہ بغیر اس کے بتائے ایک ذرہ کو بھی نہیں جان سکتا اور ایک ذرے کے بھی تمام احوال اور کیفیات، جہات اور حیثیات کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ اگر ایک حال کو جان لیتا ہے تو سو حال سے بے خبر ہوتا ہے اور اس علم ناتمام کے ساتھ اس کی بارگاہ میں اس کی اجازت کے بغیر یارائے دم زدن نہیں۔ بارگاہ خداوندی میں یہ ناممکن ہے کہ اس کو کسی چیز کا علم نہ ہو۔

آلوسی لکھتے ہیں کہ ان دونوں فقروں کو بذریعہ عطف جوڑنے کی وجہ یہ ہے کہ پہلا فقرہ یہ بتانے کے لیے تھا کہ اللہ سبحانہ کا علم کامل اور محیط ہے اور یہ دوسرا فقرہ یہ بتانے کے لیے ہے کہ اللہ کے سوا علم کامل کسی کے پاس نہیں ہے۔ یہ مثبت اور منفی کا مجموعہ اس کی دلیل ہے کہ خود بخود علم میں اللہ کی ذات یگانہ ہے یہی ان صفات کمال میں اصل و اساس کی حیثیت رکھتا ہے جس پر الوہیت کی عمارت کھڑی ہوتی ہے یعنی چونکہ یہ علمی کمال اللہ کے سوا کہیں نہیں پایا جاتا اس لیے اللہ کے سوا پرستش اور بندگی کا مستحق کوئی نہیں۔

علم الٰہی کے لیے ایک لطیف اشارہ

ان دو فقروں کو بذریعہ عطف جوڑا گیا ہے۔ اس پیوندکاری میں از روئے بلاغت قرآن نے عجیب و غریب منظر کشی کا نمونہ پیش کیا ہے۔
انسان کو جو علم بھی حاصل ہوتا ہے وہ ذرائع کی راہ سے حاصل ہوتا ہے۔ ذرائع دو قسم ہیں۔

طبعی اور شرعی۔ طبعی ذرائع وجدان، حواس اور عقل واستدلال، اور شرعی ذرائع وحی، الہام اور اجتہاد، ذرائع کے بغیر خود بخود علم کو علم غیب کہتے ہیں اور ذرائع کی راہ سے آئے ہوئے علم کو علم شہادت کہتے ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ اپنے کو بار بار عالم الغیب والشہادۃ کہتا ہے یعنی ذرائع کی راہ سے آئے ہوئے علم کا اور بغیر ذرائع کے خود بخود حاصل ہونے والے علم کا جاننے والا ہے۔ بالغرض اجمالاً علم غیب اس علم کا نام ہے جو خود بخود ہو۔ پہلے فقرے میں یہ بات بتائی گئی تھی کہ اللہ سبحانہ انسانوں میں ذرائع کی راہ سے آئے ہوئے علم سے واقف ہے لیکن انسان اللہ کے اس علم سے بے خبر ہے جو خود بخود ہے۔ یہ علم اللہ سبحانہ جس کو جتنا چاہتا ہے عطاء فرماتا ہے اور یہ عطاء بھی بذریعہ وحی ہوتی ہے خود بخود کسی کو کوئی علم نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر قرآن نے زمانہ ماضی کے واقعات بتانے کے بعد خاص طور پر اس ذریعہ کا اظہار فرمایا ہے۔ مثلاً

تلك من انباء الغیب نوحیہ الیك۔

توحیدِ الوہیت کی ساتویں دلیل

۷۴۳۔ اس کا تختِ حکومت آسمان وزمین کے تمام پھیلاؤ پر چھایا ہوا ہے۔ اس کی کرسی علم و قدرت تو ساری کائنات پر محیط ہے۔ اس کو اپنے اندر لیے ہوئے ہے تو آسمان پر عرش پر کسی وسیع سے وسیع چیز کے بھی اندر کیسے سما سکتا ہے۔ وہ سب کو گھیرے ہوئے ہے اسے کون گھیر سکتا ہے۔ اس وسیع صفت کے اثبات سے ان مشرکوں کے عقیدے کی تردید ہو گئی جو اللہ تعالیٰ کے مجسم ہونے اور کسی مکان میں اس کے محدود و مقید ہونے کے قائل ہیں۔ کرسی سے مراد علمِ الٰہی ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس سے یہی معنے منقول ہیں اور بہت سے مفسرین نے اسی کو اپنایا ہے۔ رازی، نسفی اور زمخشری کا میلان اسی طرف ہے۔

کرسی کے دوسرے معنے قدرت اور حکومت کے ہیں، چنانچہ بہت سے اہلِ لغت اور اہلِ تفسیر اسی طرف گئے ہیں۔ چنانچہ فیروزآبادی، راغب، بغوی نے یہ معنے بتائے ہیں بہرحال کرسی علم ہو یا کرسی حکومت وہ جمیع کائنات کو احاطہ کیے ہے۔ بڑی چھوٹی، لطیف، کثیف، جلی خفی ہر چیز اس پر عیاں ہے[1]

کرسی ایک جسم ہے عرش سے چھوٹا اور آسمان سے بڑا۔[2] قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے محدثین کی

---

[1] ماجدی   [2] بیان القرآن

طرف نسبت کر کے یہی بات بتائی ہے۔ حافظ ابنِ تیمیہ، حافظ ابن القیم، حافظ ابن حزم ظاہری کے نزدیک کُرسی سے حقیقی معنے مراد ہیں یعنی یہی جسے ہم اپنی زبان میں کُرسی کہتے ہیں۔ لیکن کیفیت مجہول ہے معلوم نہیں کیسی کس چیز کی غرض جیسی اللہ کے لیے سزاوار ہے۔

یہ صحیح ہے کہ اگر کُرسی علم اور کُرسی حکومت مراد ہو تو اس فقرے میں کوئی خاص معنویت نہ ہو گی بلکہ بقول قاضی ثناء اللہ پانی پتی یہ پہلے جملہ کا استدراک ہو گا اس لیے تقاضائے مقام یہی ہے کہ اس لفظ کو اپنے معنے ہی میں رکھا جائے اور مجاز و استعارہ نہ قرار دیا جائے۔ اور اس کے علم کے بارے میں بجائے تاویل کے مسلک تفویض اختیار کیا جائے۔ یہی سلف صالحین کی اکثریت کی رائے ہے جیسا کہ روح المعانی میں آلوسی نے اکثر سلف کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے کہ مانتے ہیں کہ کُرسی ہے لیکن کُرسی کی کیفیت کا علم ہماری دسترس سے باہر ہے۔ جیسے اس کی ذات اُس کی سماعت، اس کی بصارت، اس کے کلام کی کیفیت کا ہم ادراک نہیں کر سکتے، اس کی کُرسی کا بھی ہم ادراک نہیں کر سکتے، اس موقعہ پر بعض معاصر مفسرین کا یہ اندازِ بیان حیرتناک ہے کہ کیا اللہ تعالیٰ بھی کوئی جسم رکھتا ہے جو وہ اس معنے میں کُرسی نشین ہو گا؟ استغفر اللہ اس استبعاد کی بنا پر تو اللہ کے سمیع، بصیر، متکلم، مستوی علی العرش ہونے کا بھی مذاق اڑایا جا سکتا ہے۔ بلاشبہ آپ کو حق ہے کہ آپ کرسی کے معاملہ میں راہِ تاویل اختیار کریں لیکن اس کا آپ کو ہرگز حق نہیں ہے کہ جو تفویض کی راہ پر چلیں ان پر جسم کی تعریض کریں۔ خدا بھلا کرے رشید رضا کا کیسی اچھی بات کہہ گئے۔

آیتِ قرآنی بتا رہی ہے کہ کُرسی کوئی ایسی چیز ہے جو آسمان و زمین پر قابو رکھتی ہے اس کا ماننا اس کے متعین ہونے پر موقوف نہیں ہے۔ یہ بات کہ اس سے مراد علم ہے حکومت ہے یا یہ ایک جسم لطیف ہے، کچھ ہو اگر علم الٰہی مراد ہو تو بات صاف ہے لیکن اگر کُرسی اللہ کی کوئی تخلیق ہے تو پھر یہ مخلوق اس عالمِ غیب سے تعلق رکھتی ہے جس پر ہمارا ایمان ہے نہ تو ہم اس کی حقیقت کی کرید کرتے ہیں اور نہ ہم اس میں اپنی عقل سے کوئی رائے زنی کرتے ہیں۔

بہرحال کُرسی کا مفہوم کچھ ہو آیت کا مطلب واضح ہے کہ جس کا اقتدار اس قدر اعلیٰ ہے کہ تمام کائنات اس کی کُرسی میں سمائی ہوئی ہے۔ یہ صورت نہیں ہے کہ اس کی مملکت کا کوئی دُور دراز کا علاقہ اس کے اقتدار و اختیار سے باہر ہو اور وہ ان علاقوں میں اپنے اقتدار کے لیے گورنروں کا محتاج ہو۔ اللہ تعالیٰ اس دُنیا کے بادشاہوں کی طرح نہیں ہے جو اپنی سلطنت کے سنبھالے رکھنے میں گورنروں اور وزراء کے

محتاج ہوتے ہیں بلکہ وہ غیر محدود علم غیر محدود قدرت غیر محدود اختیار کا مالک ہے۔ اس لیے اس کائنات میں اس کے علاوہ ہماری پرستاریوں اور بندگیوں کا کوئی مستحق نہیں ہے۔

توحید الوہیت کی آٹھویں دلیل

۴۴ ۷۔ اور آسمان وزمین کی نگہبانی اور حفاظت اس کو تھکاتی نہیں ہے۔ یہ مشرک قوموں کے اس نظریہ کی تردید ہے کہ اتنے وسیع اور لق ودق سلسلۂ کائنات کی نگرانی اکیلا اللہ کیسے کرسکتا ہے اس لیے نعوذ باللہ کبھی تھک جاتا ہوگا اور یہ کاروبار سنبھالنے کے لیے اسے ضرورت شریکوں اور مددگاروں کی ہوتی ہوگی۔ قرآن یہاں اسی گمراہی کی تردید کر رہا ہے کہ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی کے لیے اپنی مملکت کا انتظام اپنے غیر محدود علم اپنے غیر محدود اقتدار واختیار کی وجہ سے قطعاً دشوار نہیں ہے۔ اس کو ذرا بھی اس میں بوجھ محسوس ہوتا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اس مقام پر یہ بات بڑی خوب لکھی ہے ——— اللہ سبحانہ کو کائنات کی نگرانی میں کوئی تھکاوٹ محسوس نہیں ہوتی، اس کے اقتدار واختیار وعلم کامل کے لیے اس کی نگرانی بالکل معمولی بات ہے، کیونکہ اس کی ذات تو انسانوں کے ایک ایک عمل کی نگران، ہر چیز کی محافظ ہے اس کے حیطۂ اقتدار اور اس کی کتاب علم سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ پوری کائنات اس کی جناب میں معمولی اور اس کی نسبت سے چھوٹی اور ہر آن اس کی محتاج ہے۔ یہ بھی اس کے الٰہ مطلق ہونے کی دلیل ہے۔

توحید الوہیت کی نویں دلیل

۴۵ ۷۔ اس کی ذات گرامی ہم پلہ ہونے سے برتر ہے۔ علی بلند مرتبہ سب سے اوپر، عالی شان۔ یہ علو سے ہے جس کے معنے برتر ہونے کے ہیں۔ فعیل کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں:

> علی کے معنے رفیع القدر یعنی بلند مرتبت کے ہیں۔ جب یہ اللہ کی صفت پر جیسے ھو العلی الکبیر یعنی وہ ذات جو اس سے کہیں برتر ہے کہ وصف بیان کرنے والوں کا وصف بلکہ عالموں کا علم بھی اس کا احاطہ کرسکے۔

اور تاج العروس میں ہے۔

> اللہ تعالیٰ کے اسماء حسنی میں علی بھی ہے اس کے معنے اس ذات کے ہیں جس کے اوپر کوئی نہ ہو جو ساری خلق پر غالب ہے اور جس نے اپنی قدرت سے سب کو مغلوب کر رکھا ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ:

علی کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذات جو انداد و اشباہ سے بالا ہے۔ ذات و صفات میں اس کا ہم پلہ اور ہمسر کوئی نہیں ہے۔ اس میں تمام صفات نقص کی نفی سارے عوارض حدوث سے برتری کا اعلان ہے۔ اس لفظ کے ذریعے اللہ سبحانہ کی توحید کی وہ رُوح پھونکی گئی ہے کہ اس کے بعد اب کوئی ذہن نہ رہے جو اللہ کے سوا کسی کے معبود ہونے کی بات سوچے اس کے برتر ہونے کے صرف یہی معنے نہیں ہیں کہ وہ مخلوقات سے برتر ہے بلکہ وہ اس کے ساتھ ہمارے علم و فکر سے بھی برتر ہے۔

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم از ہر چہ گفتہ اند و شنیدیم و خواندہ دام

توحید الوہیت کی دسویں دلیل

۷۴۶۔ پوری کائنات سے بزرگتر ہے۔ عظیم عظمت سے بنا ہے اس کے معنے بڑا اور بزرگ ہونے کے ہیں۔ علامہ مرتضی زبیدی تاج العروس میں فرماتے ہیں۔

عظیم اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے جو بمعنی کبیر ہے اور یہ دونوں مترادف ہیں۔

اور امام رازی فرماتے ہیں کہ:

کبیر وہ ہے جو ذاتی طور پر بڑا ہو اور عظیم وہ جسے دوسرا بڑا سمجھیں اسی لیے اللہ تعالیٰ کے اوصاف میں بجائے عظیم کے کبیر کا استعمال زیادہ ہے۔

اور امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں لکھتے ہیں کہ:

حلیمی رحمۃ اللہ نے العظیم کے معنے میں یہ بیان کیا ہے کہ عظیم وہ ذات ہے جس پر کسی قسم کی پابندی نہ ہو سکے کیونکہ عظیم القوم لوگوں کے معاملات کے مالک کو کہتے ہیں اللہ سبحانہ ایسی قدرت والا ہے کہ اس کو کوئی چیز عاجز نہیں کر سکتی اور یہ ممکن ہی نہیں کہ اس کو دبا کر یا مغلوب کر کے اس کی نافرمانی کی جا سکے۔ لہذا واقعی اور حقیقی طور پر تو عظیم اللہ ہی کی ذات ہے اوروں کے لیے یہ لفظ مجازاً بولتے ہیں۔

امام خطابی فرماتے ہیں کہ:

عظیم کے معنے عظمت و جلال والا اور اس معنے کا تعلق عظمت شان اور جلالت قدر سے ہے اور وہ عظیم نہیں جو اجسام کی صفات میں آتا ہے۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں:

عظیم وہ ذات ہے جس کے مقابلے پر اس کے سوا ہر چیز حقیر سے حقیر تر ہے۔ اللہ کی پوری کائنات کے مقابلہ میں یہ عظمت اس بات کی دلیل ہے کہ عبادت کے لائق اللہ ہی ہے

ثلٰثۃ عشرۃ کاملۃ۔

دس دلائل کے ساتھ یہ دعویٰ الالٰہ، لا الٰہ الا اللہ قرآن نے ثابت کیا ہے اور انسانیت کے سامنے توحید الوہیت کا جامع مانع تصور پیش کیا ہے اور ایک ایسی ہستی سے آشنا کیا جس کی قدرت بے انتہا، جس کی وسعت غیر محدود ہے، جس کی مشیت کائنات کے ذرے ذرے میں نافذ ہے، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے۔ دلوں کے اسرار، زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں، اس کی قوت ہر قوت پر غالب، اس کا ارادہ ہر ارادے میں نافذ اور اس کا ہر حکم ہر حکم سے بالاتر ہے۔

اللہ کی ہستی کا اعتقاد انسانی فطرت کے اندرونی تقاضوں کا جواب ہے اسے حیوانی سطح سے بلند ہونے اور انسانیت اعلیٰ کے درجہ تک پہنچنے کے لیے بلندی کے ایک نصب العین کی ضرورت ہے اور اس نصب العین کی طلب بغیر کسی ایسے تصور کے پوری نہیں ہو سکتی جو کسی نہ کسی شکل میں اس کے سامنے آئے لیکن مشکل یہ ہے کہ مطلق کا تصور سامنے آ نہیں سکتا وہ جب بھی آئے گا ایجابی صفتوں کا کوئی نقاب ڈال کر آئے گا۔ کیونکہ غیر صفاتی تصور کو انسان پکڑ نہیں سکتا۔ وہ ایک ایسا جلوہ محبوب چاہتا ہے جس کے عشق میں اس کا دل ٹیک پڑے وہ ایسی اعلیٰ و عظیم ہستی چاہتا ہے جس کا دامن کبریائی پکڑنے کے لیے ہمیشہ اپنا دست عجز و نیاز بڑھاتا رہے۔ آیۃ الکرسی نے اسی نصب العین کی ضرورت کو پورا کیا ہے۔

آئیے اب آخر میں اس پوری تشریح کا خلاصہ پڑھ لیجئے۔ اس کا خلاصہ سب نے ہی لکھا ہے لیکن حضرت شیخ الہند نے جو جامع خلاصہ لکھا ہے وہ ان کا ہی حق ہے۔

اس آیت میں توحید ذات اور عظمت صفات حق تعالیٰ کو بیان فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ موجود ہے، ہمیشہ سے ہے اور کوئی اس کا شریک نہیں۔ تمام مخلوقات کا موجد وہی ہے۔ تمام نقصان اور ہر طرح کے تبدل اور فتور سے منزہ ہے، سب چیزوں کا مالک ہے۔ تمام چیزوں کا کامل علم اور سب پر پوری قدرت اور اعلیٰ درجہ کی عظمت اس کو حاصل ہے۔ کسی کو نہ اتنا استحقاق نہ اتنی مجال کہ بغیر اس کے حکم کے کسی کی سفارش بھی اس سے کر سکے۔ کوئی امر ایسا نہیں جس کے کرنے میں اس کو دشواری ہو۔ تمام چیزوں اور سب کی عقلوں سے برتر ہے اس کے مقابلے میں سب حقیر ہیں۔ اس سے دو چیزیں کھل کر سامنے آگئیں۔ ایک یہ کہ اللہ سبحانہ کی ربوبیت و

حکومت اور بندوں کی محکومیت اور عبدیت جس سے اللہ سبحانہ کے تمام احکام مذکورہ اور غیر مذکورہ کا بلاچون وچرا واجب التصدیق اور واجب التعمیل ہونا. اور اس کے احکام میں کسی قسم شک و شبہ کا معتبر نہ ہونا معلوم ہو گیا۔

دوسرے یہ بات کہ عبادات و معاملات کثیرہ اور ان کے نعمت و نقمت کو دیکھ کر شاید کسی کو خلجان ہو کہ ہر ہر فرد کے اس قدر معاملات و عبادات کی نہایات ہے ان کا ضبط اور حساب و کتاب کیسے ممکن ہے. اس آیت میں اس خلجان کو بھی اللہ سبحانہ نے اپنی چند صفات مقدسہ پیش فرما کر دور فرما دیا یعنی اس کا علم اور قدرت اس قدر کامل ہے۔ ایک چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس سے باہر ہو جس کا علم اور قدرت ایسا غیر متناہی اور یکساں رہنے والا ہو اس کو تمام جزئیات عالم کے ضبط رکھنے میں اور ان کی جزا عطا فرمانے میں کیا دقت ہو سکتی ہے۔ [1]

---

[1] افادات شیخ الہند

لَآ اِكْرَاهَ فِى الدِّيْنِ ۙ قَدْ تَّبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ
بِالطَّاغُوْتِ وَيُؤْمِنْۢ بِاللّٰهِ فَقَدِ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقٰى ۗ
لَا انْفِصَامَ لَهَا ۗ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۵۶﴾

دین کے بارے میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔[۴۷] بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور نمایاں ہوگئی ہے۔[۴۸] پھر جو کوئی طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے[۴۹] تو بلاشبہ اس نے فلاح کا ایسا مضبوط حلقہ تھام لیا جس کو ٹوٹنا نہیں ہے[۵۰] اور یاد رکھو اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔[۵۱]

دین وایمان میں جبر نہیں ہے

اصل گفتگو دفاع کے موضوع پر ہو رہی ہے۔ دفاع کے سلسلے میں دفاع کی سب سے بڑی ضرورت یعنی اجتماعی انفاق پر متوجہ کیا اور انفاق پر متوجہ کرنے کا انداز خالص حاکمانہ اختیار فرمایا۔ حاکمانہ انداز کے اظہار کے لیے اللہ سبحانہٗ کی عظمتِ شان، ان کا الٰہ مطلق ہونا اور اس کے دلائل بیان فرمائے۔ اب دفاع ہی کے سلسلے میں یہ بات بتائی جا رہی ہے کہ دین وایمان کا معاملہ ارادی اور اختیاری ہے۔ جبر واکراہ کا نہیں ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ جنگ کی اجازت ظلم وتشدد کے انسداد کے لیے دی گئی ہے نہ کہ لوگوں کے حلقوم میں جبراً ایمان انڈیلنے کے لیے۔ دین کی اشاعت کا ذریعہ ایک ہی ہے اور وہ دعوت ظاہر ہے جو نظامِ حیات اپنی اشاعت کے لیے صرف دعوت کا راستہ رکھتا ہو، جس نے اس کے اصول بتائے ہوں، جس نے عقل و

بصیرت اور فہم و تدبر کا ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو، ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو۔ وہ کیونکر جبر و اکراہ اور زبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا تھا۔

قرآن نے نہ صرف یہ کہ دین کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ اللہ کا دین زبردستی کی چیز نہیں ہے۔ اسلام میں دین کا اولین جز ایمان ہے۔ ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی شخص کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بزور پیدا نہیں کر سکتی بلکہ تیز سے تیز تلوار بھی کسی طرح دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی۔

۲۴۷۔ دین کے بارے میں کسی طرح کا جبر نہیں ہے۔ جب دلائل توحید بخوبی بیان فرما دیئے گئے جس سے اہل کفر کو کوئی عذر باقی نہ رہا تو اب زور سے کسی کو مسلمان بنانے کی کیا حاجت ہو سکتی ہے۔ عقل والوں کو خود سمجھ لینا چاہیے اور نہ شریعت کا یہ حکم ہے کہ زبردستی کسی کو مسلمان بناؤ۔ افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین خود نص موجود ہے اور جو جزیہ کو قبول کرے اس کا جان و مال محفوظ ہو جائے گا۔[1]

حضرت جابر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ نجد کی طرف غزوہ کرنے گئے تھے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم واپس ہوئے اور دوپہر کے وقت ایک ایسی وادی میں پہنچے جہاں بہت سی خاردار جھاڑیاں تھیں، آپ وہاں اتر گئے اور لوگ بھی درختوں کے سائے کی تلاش میں ادھر ادھر منتشر ہو گئے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک کیکر کے درخت کے نیچے فروکش ہوئے اور اپنی تلوار ایک درخت پر لٹکا دی، ابھی ہماری آنکھ ذرا لگی تھی کہ ہم کیا دیکھتے ہیں کہ آپ ہمیں بلا رہے ہیں اور ایک دیہاتی شخص آپکے پاس موجود ہے۔ آپنے فرمایا میں سو رہا تھا کہ اس شخص نے میری تلوار میرے قتل کے ارادے سے لی۔ اتفاقاً میں بیدار ہو گیا دیکھا تو تلوار ننگی ہوئی ہاتھ میں تھی۔ وہ بولا کہ بتاؤ اب تم کو مجھ سے کون بچا سکتا ہے کہا کہ اللہ تین بار فرمایا۔ یہ جواب سن کر ہیبت کے مارے اس کے ہاتھ سے تلوار گر گئی اور اس تلوار کو آپنے اٹھا لیا اور فرمایا بول اب تجھ کو مجھ سے کون بچائے گا۔ وہ بولا کہ تلوار پر قبضہ کرنے والوں میں آپ ہی بہترین جانیئے۔ آپنے فرمایا اچھا کیا تو گواہی دیتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے کہا کہ نہیں۔ ہاں یہ عہد کرتا ہوں کہ آئندہ نہ کبھی خود آپسے جنگ کروں گا اور نہ ایسے لوگوں کا ساتھ دوں گا جو آپسے جنگ کریں۔ آپنے اسے چھوڑ دیا۔

---

[1] افادات شیخ الہند۔

امام بخاری نے غزوہ بنی المصطلق سے قبل اس روایت کا ذکر کیا ہے اور اس شخص کا نام غورث بن الحارث بتایا ہے۔ قسطلانی نے واقدی کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ شخص اگرچہ اس وقت مسلمان نہیں ہوا لیکن اپنی قوم میں جاکر مسلمان ہوگیا اور اس کی وجہ سے کافی لوگ مسلمان ہوئے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر اسلام میں قرآن نے اکراہ کی اجازت دی ہوتی تو آپ کو اس سے زیادہ اکراہ کا اور کون سا موقعہ ملتا جب کہ دشمن کی تلوار آپ کے ہاتھ میں ہو۔ اس پر اقدام قتل کی دفعہ بھی عائد ہو چکی ہو۔ وہ تنہا ہو اور آپ کے ساتھ صحابہ کی ایک جماعت ہو لیکن اس تمام اقتدار کے باوجود اللہ کا رسول صرف اس کے سامنے دعوت اسلام تو پیش کرتا ہے مگر اس کے صاف انکار کر دینے پر بھی اس سے کوئی باز پرس نہیں کرتا۔ اور اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کے اقدام قتل پر نہ کوئی سزا دیتا ہے نہ اس کا انتقام لیتا ہے ادھر یہ امر بھی قابل غور ہے کہ عرب کی فطرت اگر کوئی جبر و تشدد برداشت کر سکتی تو اس سے زیادہ بے بسی کا وقت اور کون سا ہو سکتا ہے مگر یہاں بھی اس دیہاتی کی درشت فطرت نے اسے اس کے لیے آمادہ نہیں کیا کہ وہ حالات کی سنگینی کے پیش نظر صرف زبانی طور پر ہی اسلام کا اقرار کر لیتا۔ حضور انور کی سیرت اور قوم کے حالات دونوں اس بات کے گواہ ہیں کہ اسلام کے لیے کبھی اکراہ نہیں کیا گیا۔ اگر کیا بھی جاتا تو ہرگز کارگر نہ ہوتا۔

جہاں آزادی رائے کا یہ عالم ہو کہ ایک مجاہد قوم کا فرد سفیر بن کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوتا ہے چہرۂ اقدس پر نظر پڑتے ہی نور ایمان دل میں آجاتا ہے اور یہ خود درخواست کرتا ہے کہ میں واپس نہیں جاؤں گا۔ آپ نے فرمایا کہ میں عہد کے معاملہ میں دغا نہیں کروں گا۔ تم واپس جاؤ۔ یہاں سے جاکر بھی اگر ایمان کی روشنی تمہارے دل میں رہے تو پھر واپس آجانا۔ وہاں بھلا اکراہ کا کیا تصور کیا جا سکتا ہے۔ اس قسم کے واقعات سے یہ بداہۃً ثابت ہوتا ہے کہ اسلام شمشیر کی طاقت سے نہیں پھیلا ہے بلکہ دلائل کی طاقت اور صاحب نبوت کی اخلاقی صداقت اور ان وجدانی قرآن سے پھیلا ہے جو دلوں میں پہاڑوں سے زیادہ پائیدار ہوتے ہیں۔

قرآن حکیم نے آپ کے اس اضطراب کو جو کفار کے اسلام کے متعلق آپ کے سینہ میں موجزن تھا، ناگواری کے انداز میں اکراہ سے تعبیر فرمایا ہے افانت تکرہ الناس حتی یکونوا مومنین۔ یعنی ان کے اسلام کے بارے میں آپ کا اضطراب و شوق اس حد سے نہ بڑھنا چاہیے کہ یوں معلوم ہونے لگے کہ گویا آپ ان کو زبردستی مسلمان بنانا چاہتے ہیں۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن نے اشاعت اسلام کے لیے کبھی بھی اکراہ کا حکم نہیں دیا بلکہ صاف لفظوں میں لا اکراہ فی الدین فرمایا گیا ہے۔

قرآن نے جنگ کا حکم دوسرے بارے میں فتنہ کے انسداد کے لیے دیا ہے اور فتنہ کو اشد من القتل اور اکبر من القتل کہا ہے۔

اس وقت فتنہ قریش کیا تھا؟ یہ تھا کہ ظلم و تشدد کے ذریعے دین و اعتقاد کا فیصلہ کرنا چاہتے تھے۔ قرآن نے اس کے خلاف جنگ کا حکم دیا۔ لہذا جس بات کے خلاف اس نے جنگ کا حکم دیا ہے خود اسی کا مرتکب کیونکر ہو سکتا تھا؟

اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لیے لڑنا جائز ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس جنگ سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ لڑائی صرف اس لیے تھی کہ اسلام کو تلوار کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے۔ حالانکہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو۔ اور نہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ میں کوئی واقعہ ایسا ہے جس میں کسی کافر کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو بلکہ اگر ہے تو یہ ہے۔

> اگر مشرکوں میں سے کوئی آدمی آئے اور تم سے امان مانگے تو اسے امان دو۔ یہاں تک وہ اچھی طرح کلام اللہ سن لے پھر اسے باامن اس کے ٹھکانے پہنچا دو۔ یہ بات اس لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں کو اسلام کا علم نہیں ہے۔

یہ نہیں فرمایا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے اس کو پناہ نہ دو بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دو۔ اور اس کو کلام الٰہی سنایا جائے تاکہ اس کو غور و فکر کرنے کا موقعہ ملے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس طریق پر مسلمان ہو گا اس کا باعث تلوار نہیں بلکہ حق کا پیغام ہو گا۔

جہاد اسلام پر اکراہ نہیں ہے

حقیقت یہ ہے کہ جہاد کی مشروعیت مظلوموں کی حمایت، جلا وطنوں کے حق دلانے، حج کا راستہ کھولنے اور عقیدے کی آزادی حاصل کرنے کے لیے ہوئی تھی۔ جیسا کہ اس کی تفصیل پارہ دوم میں زیر آیت ۱۹۳ بیان ہو چکی ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف سے مقابلہ ہو جائے تو میدان جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرو۔ اول یہ کہ تم مسلمان ہو کر ہمارے بھائی بن جاؤ۔ اگر ایسا کرو تو تم دین، حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں برابر کے حصہ دار ہو۔ اور اگر یہ منظور نہ ہو تو دوسری بات یہ ہے کہ تم اپنے مذہب پر رہ کر ہماری سیاسی بالادستی قبول کر لو۔ اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہو گی۔ اگر وہ ان دونوں باتوں میں سے کوئی بات قبول کریں تو ان سے لڑنا جائز نہیں ہے۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے مناظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام کا سیاسی نظام قبول کر لیا اور خونریزی رک گئی۔ اور لڑائی کا میدان محبت

داشتی کی بزم بن گئی۔

اسلام کا یہ قانون سراسر امن پسندی، سلامت طلبی اور خونریزی سے بچنے کی آخری کوشش ہے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا دستور تھا کہ جب کسی فوج کو متعین کرتے تو سردار کو ہدایت کرتے۔

جب تمہارا کسی دشمن سے مقابلہ ہو تو اس کو تین باتوں میں سے ایک بات کو قبول کرنے کی دعوت دو۔ ان میں سے جو بات بھی وہ قبول کرے اس کو مان لیا جائے اور اس پر حملہ نہ کیا جائے۔ ان کو اسلام کی دعوت دی جائے۔ اگر وہ قبول کرے تو پھر اس سے رک جاؤ۔ اس کے بعد اس سے خواہش کرو کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آجائے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی سی ہوگی۔ قانون اس پر مسلمانوں پر جاری ہوگا۔ لیکن غنیمت اور فے میں اس کا حصہ نہ ہوگا جب تک وہ جہاد میں شرکت نہ کرے۔ اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو اس کو جزیہ دے کر ذمی بننے کو کہو۔ اگر وہ اس کو مان لے تو اس سے رک جاؤ اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگو اور لڑائی شروع کرو۔ [1]

یہ وہ اصول جنگ ہے جس سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی کو مجبور کر کے بزور شمشیر مسلمان بنانا۔ صحابہ کرام کے زمانہ میں جب ایرانیوں سے لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدان جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی۔ حضرت سلمان فارسی تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے کہ میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیر فرمان ہیں۔ اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں اور اگر تم اپنے ہی مذہب پر رہنا چاہتے ہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو مذہب کی تبدیلی پر مجبور نہیں کیا گیا۔ گویا مقصود اصلی قانون اسلام کو غالب رکھنا ہے فرداً فرداً ہر کافر کو مسلمان بنانا نہیں ہے۔

مسلمان کے لیے قانونی اکراہ

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ اسلام اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ کسی کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے لیکن ساتھ ہی وہ اس بات کی بھی اجازت نہیں دیتا کہ ایک شخص اسلام کے دائرے میں داخل ہو جانے کے بعد بھی غیر اسلامی زندگی بسر کرے اور اس پر کوئی گرفت نہ ہو بلکہ وہ اس کو مجبور کرتا ہے کہ وہ اسلام کی

---

[1] صحیح مسلم

حدود و قیود کی پابندی کرے۔ لادینی نظاموں میں مذہب نجی زندگی سے متعلق مانا جاتا ہے اس وجہ سے ان میں حکومت کی نافرمانیوں پر تو سزائیں اور تعزیرات ہیں لیکن اللہ سے بغاوت کی آزادی حاصل ہوتی ہے لیکن اسلام میں مذہب کے پرائیوٹ زندگی ہونے کا کوئی تصور نہیں ہے بلکہ اسلامی حکومت اصلاً اللہ کی حکومت ہوتی ہے اور ریاست کا سیاسی ادارہ صرف اللہ کے احکام و قوانین کے اجزاو نفاذ کا ایک ذریعہ ہوتا ہے اس وجہ سے اس میں اللہ کی نافرمانی قابلِ گرفت ہوتی ہے۔ خواہ وہ نافرمانی خلوت میں ہو یا جلوت میں۔ فرق صرف یہ ہے کہ خلوت کی نافرمانی پر اللہ کی عدالت آخرت میں گرفت کرے گی اور ظاہری نافرمانیوں پر اسلام کا دنیوی قانون ان کو سزا دے گا۔

ارتداد بھی اسی زمرے کا ایک جرم بلکہ بہت بڑا جرم ہے اور اس پر جو سزا ایک اسلامی نظام میں دی جاتی ہے وہ اس بات پر نہیں دی جاتی کہ ایک شخص کو اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے بلکہ اس پر دی جاتی ہے کہ اس نے اللہ کی حکومت میں اس کے قانون کے خلاف علم بغاوت بلند کیا ہے [۱]

حیرت کا مقام ہے کہ قانونی سزائیں تو عین مصلحت اور عین تدبر اور عین سیاست بن جائیں اور شرعی حدود قتل مرتد اور رجم زانی وغیرہ وغیرہ یہ سزائیں جبر اور اکراہ قرار دی جائیں اور وحشیانہ سزائیں کہلائیں۔ قتل مرتد کے مسئلہ میں اشکال ہے اور مارشل لا میں کوئی اشکال نہیں۔ کیا قانون مارشل لا میں ووٹ کی قائم شدہ حکومت کے مرتدین کا قتل نہیں؟ کیا افسوس کا مقام نہیں کہ مجازی اور جعلی حاکم کے مرتدین کا قتل تو عین تہذیب اور عین تمدن ہو اور خدائے احکم الحاکمین کے مرتدین کے قتل پر ناک منہ چڑھائیں اور اس کو وحشیانہ فعل قرار دیں۔ اس کا صاف مطلب ہوا کہ ہماری بغاوت تو جرم ہے اور اللہ تعالیٰ کی بغاوت جرم نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو عقل دے جو اللہ کے بندوں پر اپنا حق اللہ تعالیٰ سے زیادہ سمجھتے ہیں [۲]

یہ فقرہ اپنی ساخت کے اعتبار سے ایک خبر ہے اور خبر ہونے کی حیثیت میں اگرچہ اس کا مطلب یہی ہے کہ دین کے معاملے میں کوئی زبردستی نہیں ہے یعنی دین کا معاملہ جبری نہیں بلکہ اختیاری ہے اور اس کو اختیار کرنا ہر شخص کے صوابدید اور اختیار تمیزی پر موقوف ہے جیسے دوسرے مقام پر ارشاد ہوا ہے۔

قل الحق من ربکم فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر۔

کہہ دو کہ حق تمہارے پروردگار کی جانب سے ہے جس کا جی چاہے قبول کرے اور جس کا جی چاہے انکار کرے۔

ایمان و کفران دو میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کر لیں گے اور نافہم اس سے محروم رہیں گے۔ اسی لیے بار بار یہ واضح کیا گیا ہے کہ رسول کا کام تبلیغ ہے۔

---

[۱] تدبر قرآن [۲] معارف م ا

بعض بزرگوں کی یہ رائے ہے کہ اگرچہ جملہ خبریہ ہے مگر معنے میں انشاء کے ہے اور مطلب یہ ہے کہ قرآن مسلمانوں کو دین کے بارے میں اکراہ سے منع کر رہا ہے۔ یہی بات زیادہ قرینِ قیاس ہے اور صحابہ کا مختلف مواقع پر اس آیت سے استدلال اسی مطلب کا موید ہے۔

رشد و غوایت میں امتیاز

۷۴۸۔ بلاشبہ ہدایت کی راہ گمراہی سے الگ اور ممتاز ہوگئی۔ پہلے جملہ میں جو بات کہی گئی تھی کہ دین کے معاملہ میں کوئی جبر نہیں زبردستی نہیں۔ یہ فقرہ اس کی علت بیان کرنے کے لیے لایا گیا ہے گویا سننے والے کے ذہن میں یہ سوال ابھر آیا کہ زبردستی نہ ہونے کی وجہ کیا ہے؟ جواب دیا گیا کہ وجہ یہ ہے راہِ حق راہِ باطل سے ممتاز ہوچکی ہے اور اللہ کی حجت پوری ہوچکی ہے۔ اس فقرے کا عام مطلب شارحین قرآن نے یہی بتایا ہے کہ جدا ہوچکی ہے ہدایت گمراہی سے۔ یا یہ کہ اب تو کفر و اسلام کے درمیان کھلے امتیازات نمایاں ہوچکے۔ یا یہ کہ اللہ نے اپنے نبی کے ذریعے حق و باطل کو الگ الگ کر دیا ہے یا یہ کہ حق کا حسن و جمال اور باطل کا قبح خوب ظاہر اور نمایاں ہوچکا ہے۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں:

> کہ مطلب یہ ہے کہ پہلی آیت میں اللہ سبحانہٗ کے اوصاف، اسماء اور نعوت پر مبنی جو معرفت پیش کی جاچکی ہے اس کے ذریعے ایمان کفر سے اور راہِ حق راہِ باطل سے چونکہ ممتاز ہوچکی ہے اس لیے زبردستی اور جبر کا اب کوئی سوال ہی نہیں ہے۔

اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی بھی فرماتے ہیں:

> کہ چونکہ دلائل عقلیہ اور معجزاتِ نبویہ نے یہ بات کھول دی ہے کہ ایمان کا راستہ رُشد و ہدایت کا راستہ ہے جس کے ذریعے آدمی ابدی سعادت سے ہمکنار ہوسکتا ہے اور کفر کی راہ غوایت و گمراہی ہے جس کے نتیجے میں انسان دائمی کور بختی کا شکار ہوجاتا ہے اس لیے اللہ کی حجت لوگوں پر پوری ہوچکی ہے۔ اب چونکہ لوگوں کے پاس حق کی پذیرائی سے گریزپائی کا کوئی عذر نہیں ہے اس لیے زبردستی اور جبر کی ضرورت نہیں ہے۔

سید رضا نے یہاں بڑے پتے کی بات لکھی ہے کہ:

> چونکہ یہ بات نمایاں ہوچکی ہے کہ اس نظام میں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے ہیں رُشد و ہدایت، فلاح و کامیابی ہے اور اس کے مقابلے میں دوسرے نظاموں میں غوایت و ضلالت کے سوا کچھ نہیں ہے اس لیے جبر و زبردستی کی گنجائش نہیں ہے۔

ایک دستوری دفعہ

اس آیتِ قرآنی سے اسلامی دستور کی ایک اہم ترین آئینی دفعہ بھی معلوم ہوتی ہے جس پر اسلامی حکومت کی قانونی عمارت میں اسلام کے قانون دان طبقے نے بہت زیادہ فائدہ اٹھایا ہے۔ یعنی یہ قرآنی آیت اگر ایک طرف اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ ہم کسی کو مسلمان ہونے پر مجبور کریں تو دوسری طرف اس بات سے بھی روکتی ہے کہ کسی کو اسلام سے نکل جانے پر مجبور کر دیں۔ گویا جبری داخلہ اور جبری اخراج دونوں ممنوع ہیں۔

طاغوت کا کفر اور اللہ پر ایمان

۷۴۹۔ پھر جو کوئی طاغوت کا انکار کرے اور اللہ پر ایمان لائے۔ پہلی آیت میں جو بات کہی گئی تھی اس آیت میں اس کا نتیجہ بتایا جا رہا ہے کہ جو شخص اپنی زندگی میں افکار، اعمال اور اخلاق کی حدود میں طاغوت کا باغی اور اللہ کا حامی بن کر رہے گا اور پوری زندگی طاغوت سے کنارہ اور اللہ سے مومنانہ تعلقات کی اساس پر قائم کرے گا وہ ایسی شاندار اور پائدار اسلامی زندگی سے ہمدوش ہوگا جس میں شکست و ریخت کا کوئی احتمال نہ ہوگا دنیا کا کوئی نظام خواہ کتنا ترقی یافتہ ہو اپنے شہریوں کو اور دنیا کا کوئی مذہب اپنے ماننے والوں کو اتنی عظیم سیاسی، اجتماعی اور فکری فلاح و سعادت کی ضمانت نہیں دے سکتا جو قرآن اپنے لائے ہوئے نظامِ حیات کے بارے میں اہلِ ایمان کو دے رہا ہے لیکن قرآن کی یہ ضمانت کہ فلاح و سعادت کی ایسی مضبوط کڑی اس کے ہاتھ میں آجائے گی جو کبھی ٹوٹنے والی نہیں یعنی جس کے ہاتھ آگئی وہ کبھی گر نہیں سکتا اور تنزل کا شکار نہیں ہو سکتا۔ علی الاطلاق نہیں ہے بلکہ دو شرطوں کے ساتھ ہے۔ پہلی شرط کفر بالطاغوت اور دوسری ایمان باللہ۔

طاغوت کیا ہے؟

کفر بالطاغوت کا مطلب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے آپ یہ سمجھیں کہ قرآن کی اصطلاحی زبان میں طاغوت کیا ہے؟ امام فخر الدین رازی نے مفسرین سے پانچ اقوال نقل کیے ہیں۔

۱۔ حضرت عمر، مجاہد اور قتادہ رضی اللہ عنہم نے شیطان کے معنے بیان کیے ہیں۔

۲۔ سعید بن جبیر رضی اللہ عنہ نے کاہن کہا ہے۔

۳۔ ابوالعالیہ رضؓ نے ساحر بتایا ہے۔

۴۔ بعض مفسرین بت بتاتے ہیں۔ اور پانچواں قول یہ ہے کہ اس سے سرکش جن اور انسان نیز ہر

وہ شخص جو حد سے گزر جائے مراد ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ تحقیق اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ ان سب اشیا سے اتصال کے وقت طغیان کا حصول ہوا اس لیے یہ سب چیزیں اسباب طغیان قرار دے دی گئیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اس سلسلے میں جو اقوال بھی بیان کیے گئے ہیں وہ تعین کے لیے نہیں بلکہ تمثیل کے طور پر ہیں۔ طاغوت اپنے عموم کے اعتبار سے ہر گناہ میں حد سے گزرنے والے۔ نیز ہر اس معبود کے لیے کہ جس کی حق تعالیٰ کے سوا پرستش کی جائے استعمال ہوتا ہے اور اسی اعتبار سے ساحر، کاہن، سرکش جن اور خیر کے راستہ سے روکنے والے کو طاغوت سے موسوم کیا جاتا ہے۔ چنانچہ امام محمد بن جریر طبری فرماتے ہیں۔

میرے نزدیک طاغوت کے بارے میں صحیح بات یہی ہے کہ جو بھی اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں حد سے تجاوز کرے اور پھر حق تعالیٰ کو چھوڑ کر اس کی بندگی بھی کی جائے وہ طاغوت ہے خواہ جو اس کی بندگی کرتا ہے اس پر اس کا دباؤ ہو خواہ بندگی کرنے والے کی اپنی مرضی ہو اور خواہ وہ معبود انسان ہو یا شیطان کچھ بھی ہو۔

اور شاہ عبد القادر فرماتے ہیں۔

ہر ڈنگا وہ جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے کچھ سند نہ رکھے ایسے کو طاغوت کہتے ہیں اور شیطان اور زبردست ظالم سب یہی ہیں [1]

لغت کے اعتبار سے تو طاغوت ملکوت، جبروت کے وزن پر طغی کے مادہ سے بنا ہے جس کے معنے حد سے بڑھ جانے کے ہیں۔ جو چیز اپنی حد سے بڑھ جائے اس کے لیے عربی میں طغیان آتا ہے۔ پانی حد سے بڑھ جائے تو عربی میں کہیں گے طغی الماء پانی حد سے بڑھ گیا، آفت اور مصیبت حد سے زیادہ ہو تو اسے طاغیہ کہتے ہیں۔ آدمی نافرمانی میں حد سے بڑھ کر چھوٹ اور بے لگام ہو جائے اسے کہیں گے انہ طغی وہ حد سے بڑھ گیا۔ فرعون کے بارے میں ہے اذھب الی فرعون انہ طغی طغیان صرف بندگی کی حدود سے نکل جانے کا نام نہیں ہے کیونکہ بندگی کی حدود سے تو ہر عاصی اور عادی نکل جاتا ہے قرآن کی اصطلاحی زبان میں طاغوت سے مراد وہ شخص ہے جو نافرمانی کے تمام درجوں سے نکل جائے۔ قرآن نے نافرمانی اور حدود بندگی سے نکلنے کے لیے عصیان اور عدوان کے الفاظ بولے ہیں۔ عصیان یہ ہے کہ بندگی کی حدود سے نکلے مگر یہ نکلنا انفرادی ہو اور خلوت میں ہو اور عدوان یہ ہے کہ بندگی کی حدود سے نکلے مگر یہ نکلنا اجتماعی ہو اور جلوت میں ہو۔ قرآن نے یہودیوں کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں بندگی کے حدود سے نکل جانے کو عصیان اور عدوان کہا ہے۔ ذالک بما عصوا وکانوا یعتدون۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ مطلق حدود بندگی سے تجاوز کا نام طغیان نہیں ہے۔ طغیان یہ ہے کہ نافرمانی اور خدا کی بغاوت کا تمام حدود سے تجاوز کر جائے۔ اگر ایک شخص خلوت میں

[1] موضح القرآن

خدا کی نافرمانی کرتا ہے تو یہ عصیان ہے اور اگر جلوت اور سوسائٹی میں کھلم کھلا بندگی کی حدود کو روندتا ہے تو یہ عدوان ہے لیکن اگر اللہ کی نافرمانی کو سوسائٹی میں قانون بنا کر، رسم بنا کر، فیشن اور تہذیب بنا کر رائج کرتا ہے تو یہ نافرمانی میں طغیان ہے اور قرآن کی زبان میں اس کا نام طاغوت ہے۔ قرآن میں اس لفظ کا مختلف مقامات پر استعمال خود اس کے اصطلاحی معنے بتاتا ہے۔ قرآن نے اسے افکار، عبادات اور معاملات تینوں کے لیے بولا ہے۔ ایمان بالطاغوت، ولایت طاغوت، عبادت طاغوت، تحاکم الی الطاغوت اور قتال فی سبیل الطاغوت کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔

طاغوت پر ایمان کے بارے میں ارشاد ہے۔

یومنون بالجبت والطاغوت۔ وہ اوہام اور شریر قوتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔ یہ یہود کی قومی سیرت کو بیان کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ان میں اتنی ذہنی پستی آگئی ہے کہ وہ اوہام پر ایمان رکھتے ہیں یعنی سحر، کہانت اور نجوم و عملیات کو مانتے ہیں اور ان کا رجحان مادیت اور ذوق مادہ پرستی کی طرف اس قدر زیادہ ہو چکا ہے کہ وہ سرکش قوتوں پر ایمان رکھتے ہیں۔

طاغوت کی عبادت اور بندگی کے ذکر میں فرمایا۔

والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا
اور وہ لوگ جو طاغوت سے بچے یعنی اس کی عبادت سے

لقد بعثنا فی کل اُمۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت
بلاشبہ ہم نے ہر اُمت میں رسُول روانہ کیا تاکہ لوگوں کو یہ بات بتلائے کہ اللہ کی بندگی کرو اور سرکش قوتوں سے بچو۔

شاہ عبدالقادر رحمہ اللہ نے یہاں طاغوت کا ترجمہ ہڑدنگا کیا ہے اور پھر خود تشریح فرمائی کہ وہ جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے، کچھ سند نہ رکھے ایسے کو طاغوت کہتے ہیں۔

طاغوت کی ولایت کا ذکر اسی آیت کے بعد آرہا ہے۔

والذین کفروا اولیاء ھم الطاغوت
اور جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے تو ان کے مددگار سرکش ہیں۔

تحاکم الی الطاغوت کے بارے میں ارشاد ہے۔

یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ
اور وہ چاہتے ہیں کہ اپنے مقدمات طاغوت کے پاس لے جائیں حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے

کہ اس کا انکار کریں

اور قتال فی سبیل الطاغوت کے بارے میں ہے۔

والذین کفروا یقاتلون فی سبیل الطاغوت

اور جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ہے وہ طاغوت کے راستہ میں جنگ کرتے ہیں۔

ان آیات قرآنی سے معلوم ہوا کہ قرآن کی اصطلاحی زبان میں طاغوت وہ طاقت ہے جس پر ایمان رکھا جائے جس کی بندگی کی جائے، جس کو نصرت و امداد کے لیے آسرا سمجھا جائے، جس سے مقدمات کے فیصلے کرائے جائیں اور جس کی راہ میں جنگ کی جائے۔ مطلب ہے کہ طاغوت کی مادی طاقت کو مانا جائے اور تمام افکار و خیالات عقائد و نظریات کا مرکز فکر و نظر کا مرجع طاغوت بن کر رہ جائے۔ زندگی کے سارے گوشوں میں اس کی بندگی کی سرشاریاں ہوں، مشرکانہ اعمال رائج ہوں، رسموں اور رواجوں کا نام دین ہو، ولایت و نصرت کی اُمیدیں اللہ کی اسی باغی قوت سے وابستہ ہو کر رہ جائیں زندگی کے فوجداری، دیوانی معاملات میں فیصلہ کی قوت اسی کو تصور کر لیا جائے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اُمتوں میں اُصول و صداقت کے بجائے منافع و مصالح اور آجل کے مقابلہ میں عاجل کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہوتا ہے۔ اور ایک اصول ناقابل اعتبار ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی سطح پر آجاتی ہے۔ زندگی کے تمام گوشوں میں طاغوتی تہذیب، طاغوتی فلسفہ اخلاق اور طاغوتی معیاروں کو قبولِ عام حاصل ہو جاتا ہے۔ اس کا سارا نظام زندگی تمام تر مادہ پرستی اور مصلحت جوئی پر مبنی ہوتا ہے۔ افادیت اور مصلحت پرستی اس کے نظامِ زندگی کے ریشہ ریشہ میں سما جاتا ہے۔ طاغوت کا صرف ایک ہی عملی مذہب ہوتا ہے اور وہ مذہب مادہ پرستی ہے۔

قرآن نے اس آیت میں جو عظیم بشارت اہل ایمان کو دی ہے کہ اسلام کے نظام کو اپنا لینے کے بعد تم ایسے حلقہ میں آجاؤ گے جس میں شکست و ریخت کا کوئی احتمال نہیں اس کی اولین اور بنیادی شرط یہ ہے کہ تمہارے اندر کفر بالطاغوت کی رُوح کارفرما ہو۔ یعنی اپنے افکار و نظریات میں، اپنے اعمال و اخلاق میں، اپنے عابدانہ تعلقات میں، اپنی رفاقت اور دوستی کے روابط، اپنے معاشرتی، دیوانی، فوجداری مقدمات اور معاملات میں اپنے اجتماعی اور سیاسی احوال و ظروف میں طاغوت کا باغی بن کر رہنا ہوگا۔ یہ منفی شرط ہے اور منفی کو پہلے پیش کرنے کی وجہ یہی ہے جیسا کہ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں بتایا ہے کہ اس کا درجہ تخلیہ کا ہے یعنی صفائی کا، اس کے بعد جو تعمیری شرط آرہی ہے اس کے لیے پہلے صفائی ہونا ناگزیر ہے۔

دوسری شرط یہ ہے کہ یومن باللہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ یہاں ایمان نرے مان لینے کے معنے میں نہیں ہے بلکہ ماننے اور اپنانے کے معنے میں ہے۔

ایمان کے لیے عبادت کا لزوم

مولانا محمد قاسم فرماتے ہیں:

جو شخص اللہ کو مالک نفع وضرر سمجھے گا، اس کو اپنے حدوث و بقا اور دوام میں اللہ کی اسی طرح احتیاج ہوگی جیسے دھوپ کو اپنے حدوث و بقا میں آفتاب کی ہر دم حاجت رہتی ہے۔ بلاشبہ اس کو ہر آن خدا کی طرف روئے نیاز ہوگی اور اپنی قدرت کو اس کی قدرت سے مستعار سمجھ کر اس کے کاموں کے لیے اپنے کو وقف کر دے گا۔ (حجۃ الاسلام)

ایمان دراصل قدرت الٰہیہ کے قہر و غلبہ کے اس مشاہدے کا نام ہے جس کے بعد انسان کو اپنی قدرت و طاقت کی ساری داستان محض ایک افسانہ نظر آنے لگتی ہے۔ یہ منزل صرف کلمہ طیبہ زبان سے ادا کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اسلام کی اس عملی زندگی گزارنے سے حاصل ہوتی ہے جس میں قدم قدم پر یہ سبق ملتا رہتا ہے کہ اس کو درحقیقت کوئی اختیار نہیں۔ نہ وہ اپنی جان کا مالک ہے نہ مال کا نہ سونے جاگنے کا حتیٰ کہ وہ کسی نقل و حرکت کا بھی مالک نہیں ہے۔ اس کی ہر حرکت و سکون اور اس کا ہر ہر نطق و سکوت سب ان قوانین کے تحت ہے جو قرآن نے اس کو دیے ہیں۔ جب وہ قرآن کے اوامر و نواہی کے سامنے اس طرح گردش کرنے کا عادی ہو جاتا ہے تو اب اس پر یہ راز آشکارا ہونے لگتا ہے کہ درحقیقت یہ اس پر کوئی جبر نہیں تھا بلکہ بندگی کی حقیقت یہی تھی جس طرح ایک غلام اپنے نفع و نقصان کی کوئی طاقت نہیں رکھتا اس کے تمام معاملات سب اس کے آقا کے ہاتھ میں ہوتے ہیں اسی طرح بندۂ مومن کا حال ہو جانا چاہیے۔

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں:

کہ اسلام اس مجموعہ آئین پر عمل کرنے کا نام ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم انسانی زندگی کے لیے لے کر آئے تھے۔ صرف زبانی قول کا نام نہیں اس لیے جو شخص اس مجموعہ پر جتنا زیادہ عمل پیرا ہوگا اس کا دین بھی اتنا زیادہ مکمل شمار ہوگا اور جو عمل میں جتنا پیچھے رہ جائے گا وہ اتنا ہی اپنے دین میں ناقص رہ جائے گا۔ (کتاب الایمان ص ۹۲)

۷۵۰۔ بلاشبہ اس نے فلاح و سعادت کا ایسا مضبوط حلقہ تھام لیا جس میں شکست و ریخت کا کوئی احتمال نہیں ہے۔ بندہ کا اللہ سبحانہ سے صحیح علمی اور عملی تعلق ہی کا نام اسلام ہے یہ وہ زبردست حلقہ ہے جس کے ہاتھ لگ جانے کے بعد زندگی کا ہر مرحلہ آسان ہو جاتا ہے اور ہر مشکل کا حل مل جاتا ہے۔ اس ایک حلقہ کے سوا باقی سارے حلقے اور دنیا کے سارے نظام ناقص، کمزور اور بودے ہیں۔ یہاں اسلامی نظام کو عروہ سے تشبیہ دی ہے

اور اس کو زور سے پکڑنا یہ ہے کہ انسان پوری کوشش سے اس پر عمل کرے۔ استمساک یعنی تھام لینا بول کر اشارا فرما دیا کہ جب تک انسان طغیان کے تمام سرچشموں سے کھلم کھلا بغاوت نہ کرے گا اور حق ویقین کے ساتھ دامانِ ایمان سے وابستہ نہ ہوگا وہ ایمان و اسلام کا العروۃ الوثقیٰ تھامنے والا متصور نہ ہوگا۔ صرف مردم شماری کے رجسٹر میں مسلمان درج ہونا اس کے لیے کافی نہیں ہے۔

العروۃ الوثقیٰ

اس کے معنے ہیں مضبوط کڑا، حلقہ وغیرہ۔ شارحین نے اس کے مشبہ کی تعیین میں مختلف باتیں کہی ہیں۔ کسی نے ایمان، کسی نے اسلام، کسی نے قرآن، کسی نے لا الٰہ الا اللہ اور کسی نے الحب فی اللہ والبغض فی اللہ بتایا ہے لیکن یہ صرف تعبیر کا اختلاف ہے، بقول حافظ ابن کثیر ان میں کوئی منافات نہیں یا بقول علامہ قرطبی سب کا مال ایک ہے۔ لیکن امام مجاہد اور امام سعید بن جبیر نے یہاں ایک پتے کی بات فرمائی۔ انھوں نے اس آیت کو پیش کر کے قرآن کی یہ آیت تلاوت فرمائی۔

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسھم

اللہ کبھی تبدیل نہیں کرتا کسی کی قومی حالت جب تک وہ خود تبدیل نہ کرے اپنی ذاتی حالت۔

مابقوم قومی حالت سے مراد وہ نتائج ہیں جو عزت و ذلت کی صورت میں کسی قوم کو ملتے ہیں اور ما بانفسہم ذاتی حالت سے مراد وہ اعمال ہیں جو کسی قوم کی برتری اور کامیابی کا باعث ہوتے ہیں۔ قرآن کے نزدیک اقوام و جماعات کے عروج و زوال اور موت و حیات کا اس آیت کی رو سے قانون یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہ کسی گروہ کو اپنی نعمتوں سے سرفراز کرتا ہے تو اس میں کبھی تغیر نہیں ہوتا جب تک خود اس گروہ کے افراد اپنی حالت متغیر نہیں کر دیتے۔ چنانچہ دُنیا کی تاریخ اس کی گواہ ہے کہ ہر قوم خود ہی اپنی زندگی کا گہوارہ بناتی ہے اور پھر خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھودتے ہیں۔ حضرت امام مجاہد نے یہاں جو آیت تلاوت فرمائی ہے اس کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اس عروۃ الوثقیٰ کو تھام لینے سے اہلِ ایمان کو دُنیا میں بلندی، رفعت، عروج اور امامت ملی ہے۔ اس کے استمساک میں جب بھی اہلِ ایمان کی جانب سے کمی، کوتاہی اور نقصان نمودار ہوگا اس کے نتائج بھی اللہ کی سنت کے مطابق ظاہر ہو جائیں گے کیونکہ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے کہ اللہ کسی قوم کی حالت نہیں بدلتا جب تک وہ خود اپنی حالت نہ بدل ڈالے یعنی اصل اس بارے میں عروہ وثقیٰ کا استمساک یعنی مسلمانوں کا اسلام سے لگاؤ ہے وہ جیسی حالت چاہیں اپنے عمل اور صلاحیت سے حاصل کر سکتے ہیں۔ قرآن نے دوسرے موقعہ پر یہ بات کھول کر بتائی ہے۔

ومن یسلم وجھہ الی اللہ وھو محسن فقد استمسک بالعروۃ الوثقیٰ

جو بھی اپنے اندر اللہ کے لیے سپردگی پیدا کرے اور وہ حسن کارہو تو اس نے تھام لیا مضبوط حلقہ اور کڑا۔

۲۵۶ ۔ اور یاد رکھو کہ اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ یعنی اللہ کو ظاہر و باطن کل وجزئی ہر قسم کا علم ہے۔ اللہ کی باخبری اور ہمہ علمی ہمیں ایک معمولی اور موٹی سی بات معلوم ہوتی ہے لیکن جاہلی قوموں میں ایک دو نہیں کثرت سے ایسی ہیں جو حق تعالیٰ کی صفتِ علم میں بھی شبہ کر چکی ہیں۔ یہاں تک کہ بعض جاہلی فلاسفہ یہ بھی کہتے ہیں کہ اللہ کو صرف کلیات کا علم ہے جزئیات کا نہیں۔ قرآن میں اس قسم کی آیتوں کی پوری قدر جب ہی ہوتی ہے جب دُنیا کی جاہلی قوموں کے عقائد باطلہ پر نظر ہو[1]

ان دو ناموں کا اضافہ یہ واضح کر رہا ہے کہ جو لوگ غیر اسلامی نظاموں کو چھوڑ کر اسلامی نظام کو اپناتے ہیں وہ ایک ایسی ذات کا دامن پکڑتے ہیں جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔ اس وجہ سے وہ ہر مرحلے پر اور ہر قدم پر ان کا ملجا و ماوی ہے برعکس اس کے جو غیر اسلامی نظام سے وابستہ ہیں وہ انہوں کے سہارے زندگی گزار رہے ہیں جن کو ان کے آغاز وانجام کا تو درکنار خود اپنے آغاز وانجام کا بھی پتہ نہیں ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں جہاں اسماءِ الٰہیہ میں سے جس جس نام کا ذکر کیا ہے پھر جو ترتیب ان اسماء میں رکھی ہے اس میں خاص معنویت ہوتی ہے، محض اسماء شماری منظور نہیں ہے حافظ ابن القیم نے اس موضوع پر بڑی دلکش بحث کی ہے ان شاء اللہ کسی موقعہ پر ہدیہ ناظرین ہو گی۔

---

[1] ماجدی۔

اَللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُخْرِجُهُمْ مِّنَ الظُّلُمٰتِ اِلَى النُّوْرِ ۗ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَوْلِيٰۗـــُٔــهُمُ الطَّاغُوْتُ يُخْرِجُوْنَهُمْ مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمٰتِ ۗ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۵۷﴾

اللہ ان لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو ایمان کی راہ پر چلیں[۵۲]۔ اللہ ان کو ہر طرح کی تاریکیوں سے نکالتا اور روشنی میں لاتا ہے[۵۳]۔ اور وہ لوگ جو کفر کی راہ پر چلتے ہیں ان کے مددگار سرکش قوتیں ہیں[۵۴] وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں میں لے جاتے ہیں[۵۵]۔ لہٰذا یہی جہنم والے ہیں ہمیشہ اسی میں رہنے والے ہیں[۵۶]۔

ایمان و کُفر کا نظریاتی تقابل

نبوت اللہ کی جانب سے انسانی زندگی کی رہنمائی کے لیے جو نظامِ حق لے کر آئی ہے وہ سرتاسر روشنی ہے اور اس کے مقابلہ میں جو نظام بھی طاغوتی قوتیں لے کر آتی ہیں وہ سرتاسر تاریکی ہے۔ روشنی نمودار ہونے کے ساتھ تاریکی کا چھٹ جانا ناگزیر ہے۔ دُنیا میں اگر تاریکیاں چھائی ہوئی ہیں تو ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ روشنی موجود ہو جائے۔ اگر روشنی نمایاں ہو گئی تو پھر روشنی کو روشن دکھلانے کے لیے اور کسی بات کی ضرورت نہیں ہے روشنی جس طرف بھی رُخ کرے گی تاریکی خود بخود چھٹ جائے گی۔

اس آیت میں نظامِ حق اور نظامِ باطل میں دو وجہ سے فرق بتایا گیا ہے۔ اوّلاً یہ کہ نظامِ حق کو اپنانے والوں کو اللہ کی ولایت، دوستی، مددگاری اور کارسازی کا شرف حاصل ہوتا ہے، وہ اپنی زندگی کے تمام گوشوں

میں اللہ کی رہنمائی میں قدم اٹھاتے ہیں۔ ان کو یقین رہتا ہے کہ اللہ ان کی مدد کا ضامن ہے ان سے اس نے فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے اور اللہ کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی ولایت اور کارسازی کے نتیجہ میں اہل ایمان میں ایک نئی رُوح نیا ولولہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان کے ذہنوں میں انقلاب آجاتا ہے۔ دُنیا ان کے لیے اور وہ دُنیا کے لیے بالکل بدل جاتے ہیں۔ اس کے برعکس نظامِ باطل دُنیا میں جاہلیت کا علمبردار ہے۔ اس کی زمامِ قیادت طاغوت کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور اس کے ماننے والوں کو اسی کی نصرت و اعانت اسی کی حمایت اور سازگاری حاصل ہوتی ہے، وہ زندگی کے ہر موڑ پر قدم اس کی رہنمائی میں اٹھاتے ہیں۔

ثانیاً نظامِ حق کی خاصیت یہ ہے کہ اس کے ذریعے افکار، اعمال، اخلاق اور احوال میں روشنی اور نورانیت ہوتی ہے۔ اس کے ذریعے اُمت میں سیرت کی صلابت، اخلاق کی شہامت اور اصول کی استقامت ہوتی ہے۔ منافع و مصالح کے مقابلے میں اُصول و صداقت اور دُنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دینے کا جذبہ رونما ہوتا ہے۔ اس کے برعکس نظامِ باطل میں تاریکیاں ہی تاریکیاں ہوتی ہیں۔ جاہلیت کی تاریکی، فکری گمراہی کی تاریکی، لادینی کی تاریکی، جنسی بے راہ روی کی تاریکی، اخلاقی فساد کی تاریکی، شہوت و حرص کی تاریکی، تمرد و سرکشی اور کبر و طغیان کی تاریکی، ضعف و ذلت کی تاریکی، شک و ریب کی تاریکی اور اتنی تاریکیاں جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

یاد رہے کہ قدیم ترین زمانے سے دُنیا میں دو متقابل دعوتیں پائی جاتی ہیں۔ ایک پیروی نفس اور انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمہ داری کی دعوت، دوسرے اللہ کی عبدیت انسان کی اللہ کے سامنے ذمہ داری و جوابدہی اور نبوت کی پیروی کی دعوت۔ پہلی دعوت کا نام جاہلیت ہے۔ دوسری دعوت خود اسلام کی ہے۔ ان دونوں دعوتوں کی قیادت دُنیا کی مختلف جماعتیں کرتی رہی ہیں۔ ۱۴۰۰ سو برس سے اسلام کی دعوت کی امامت قیامت تک کے لیے محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیروؤں کے نام لکھ دی گئی ہے۔ اور پہلی دعوت کی قیادت وقتاً فوقتاً دنیا میں مختلف طاغوت کرتے رہے ہیں، یہاں تک کہ تقریباً دو سو برس سے اس کی قیادت و امامت یورپ کی طاغوتی قوتیں کر رہی ہیں۔ یہ طاغوتی قوتیں جاہلیت کی عالمگیر نمائندگی کے لیے مختلف ناموں سے دُنیا کے مختلف گوشوں میں اشتراکیت، قومیت، وطنیت صیہونیت، مسیحیت کے نام سے کام کر رہی ہیں۔

اس آیت میں ان دونوں دعوتوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ اور تقابلی مطالعہ کے بعد اس کی واقعاتی رنگ میں تصویر نمایاں کی گئی ہے۔

اہل ایمان کے لیے اللہ کی ولایت

۷۵۲۔ اللہ ان لوگوں کا ساتھی اور مددگار ہے جو ایمان کی راہ پر چلیں۔ اصل ارشاد میں لفظ ولی آیا ہے یہ فعیل کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ اس کے دو مصدر آتے ہیں، ایک وَلیٰ دوسرے ولایۃ، ولی کے معنے لگاؤ اور تعلق کے ہیں اور لگاؤ کے معنے کی رعایت سے اس میں محبت، رفاقت کے معنے کئے گئے ہیں۔ اسی بنا پر علماء نے اس کے معنے محب محبت کرنے والے کے کیے ہیں۔ نکاح اور جنازے کے موضوع پر عورت کا ولی اور میت کا ولی اسی معنے میں بولا جاتا ہے اور ولایت کے معنے مدد کرنا، انتظام کرنا، معاملات کی نگرانی کرنا آتے ہیں، اس کی رعایت سے علماء نے اس کے معنے مددگار، کارساز کیے ہیں۔ اہل ایمان کے اللہ سبحانہ سے چونکہ دونوں قسم کے تعلقات ہیں محبت کے بھی اور حکومت کے بھی یعنی اہل ایمان سے اللہ پاک محبت بھی کرتے ہیں اور ان پر حاکم بھی ہیں۔ اس لیے آیت میں علماء نے ولی کے دونوں معنے کیے ہیں۔ علامہ آلوسی نے مددگار، محبت کرنے والا اور معاملات کا متولی کیے ہیں۔ علامہ قرطبی نے علامہ خطابی سے جہاں یہ معنے نقل کیے کہ مددگار جو اہل ایمان کی مدد کرتا ہے وہاں دوسرے معنے سمجھانے کے لیے۔ قرآن کی یہ آیت بھی تلاوت کی ہے ان اللہ مولی الذین آمنوا۔ قاضی بیضاوی نے بھی محب اور متولی امور، حافظ ابن جریر نے بھی نصیر اور متولی امور، امام رازی نے المتکفل بالمصالح کے معنے کیے ہیں یعنی رفیق دوست، پشت پناہ، سرپرست، بگڑے کام بنانے والا، آڑے وقت میں کام آنے والا۔ مطلب یہ ہے لوگوں کو زندگی میں نور کے لائے ہوئے نظام کو اپنانے میں اللہ کی رفاقت، اعانت، دوستی، حمایت، سرپرستی حاصل ہوتی ہے۔

قرآن میں جس ولایت خداوندی کو یہاں اہل ایمان کے لیے بیان کیا گیا ہے یہ صرف خدا کے لیے خاص ہے یعنی اس کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ اہل ایمان کے لیے اللہ کے سوا کسی کی ولایت نہیں ہے۔ ان کا معین و مددگار، ان کا کارساز و کار فرما، ان کا پشت پناہ اور مشکل کشا صرف اللہ سبحانہ ہے۔ جو بات یہاں قرآن سے مفہوماً معلوم ہو رہی ہے اس کو قرآن نے دوسرے مواقع پر صراحۃً کلمہ حصر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایک موقعہ پر ہے فاللہ ھو الولی اللہ ہی کارساز و مددگار ہے۔ دوسرے موقعہ پر ہے وھو الولی الحمید وہی حمد و ستائش کے لائق کارساز ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے۔ قل اغیر اللہ اتخذ ولیا۔ کہہ دو کیا میں اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو کارساز بنالوں۔ ایک اور جگہ پر ہے ان ولی اللہ میرا کارساز تو بس اللہ ہے۔ حضرت یوسف کی دعا میں ہے انت ولی فی الدنیا والاخرۃ تو ہی میرا دنیا اور آخرت میں کارساز ہے۔ ایک اور موقعہ پر ہے وکفیٰ باللہ ولیا وکفیٰ باللہ نصیراً تمہارے لیے اللہ کی کارسازی اور

مددگاری کافی ہے۔

اہل ایمان کی باہمی معاملات پر تفصیل بحث انشاءاللہ پارہ دس میں آئے گی اور اسی طرح یہود و نصاریٰ سے ترکِ موالات پر بحث کے لیے پارہ ششم کا انتظار فرمائیے۔

اہل ایمان کے لیے ولایت کا عملی مظاہرہ

۷۵۲۔ اللہ ان کو ہر طرح کی تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے۔ یعنی اللہ کی ولایت کا عملی مظاہرہ اس طرح ہوتا ہے کہ وہ اس دنیا کی زندگی میں اہل ایمان کو ایک روشنی عطا فرماتا ہے۔ یہ روشنی اسلام کی روشنی ہے جس کی اُجالے میں اہل ایمان نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی کی مختلف منزلیں اور حالات کے مختلف مراحل طے کرتے ہیں۔ دوسرے موقعہ پر ارشاد ہے۔

افمن شرح اللہ صدرہٗ للاسلام فھو علیٰ نور من ربہ

جس کا سینہ اللہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے وہ اپنے اللہ کی جانب سے ایک روشنی پر ہوتا ہے۔

اسی نور کا صدقہ ہے کہ اہل ایمان میں نئی روح، نیا ولولہ، نئی زندگی رونما ہوگئی تھی۔ ان کی تربیت اسی نور کے سائے میں نورانی طریقہ پر ہوئی۔ اُن کے ذہنوں میں قرآن کی برکت اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے نورانیت آگئی اور اسی نورانیت کی وجہ سے دُنیا ان کے لیے اور وہ دُنیا کے لیے بالکل بدل گئے اور ان کو احساس ہوا کہ ان کو اللہ نے اس لیے مبعوث کیا ہے کہ وہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔ "انسانوں کی بندگی چھڑا کر خدا کی بندگی پر آمادہ کریں۔" انہیں دُنیا کی تنگی سے نکال کر کشادگی کی طرف لائیں اور مذاہب کی کجروی اور بے اعتدالی سے نکال کر اسلام کی صراطِ مستقیم پر لگائیں[1]۔" اسی نور کے سہارے وہ زندگی کے مختلف گوشوں میں مسائل زندگی حل کرتے تھے اور اسی نور نے ان میں یہ رُوح پیدا کردی تھی کہ وہ اللہ کے دین کے فروغ کی جدوجہد اور عام انسانوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں اور قوموں کی اصلاح کا کام ان کے سپرد ہوا ہے اور یہ کہ اللہ ان کا مددگار اور ان کی کامیابی کا ذمہ دار ہے۔ اس کا ثبوت ان کے ہر قول و فعل سے ملتا تھا۔ ان کے دلوں میں اطمینان اور خود اعتمادی اس نور کا نتیجہ تھی۔ جنگ یرموک میں جب امراء نے حضرت ابوبکر و عمر رض کو اپنی مشکلات لکھیں۔ رومیوں کی کثرتِ تعداد اور ان کی جنگی تیاریوں کی اطلاع دی تو انھوں نے جواب میں لکھا۔

تم سب مجتمع رہو اور ایک روح بن کر مشرکین کا مقابلہ کرو تم اللہ کے مددگار رہو۔ اللہ اپنے مددگار کی مدد کرتا ہے کافروں کی مدد نہیں کرتا۔ تم کو قلت سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ (البدایہ)

اسی نور نے ان کو اخلاقِ عالیہ، ایمانی صفات اور ملکی سیرت میں اس قدر ممتاز اور معروف بنا دیا تھا کہ وہ جہاں جاتے اور قیام کرتے ان کے اخلاقِ حسنہ اور ایمانی اوصاف ان کا مقدمۃ الجیش ہوتے۔ یہ اخلاق و اوصاف ان کے لیے لوگوں کے دلوں کو مسخر کرتے، نفوس میں ان کی عظمت و محبت پیدا کرتے۔ تلواروں، تیروں اور بھالوں سے پہلے ان کے اوصاف و اخلاق اپنا کام کر لیتے تھے۔ جو لوگ ان کے اخلاقِ حسنہ اور حسنِ عمل کا مشاہدہ کرتے انہیں یقین ہو جاتا کہ یہ لوگ مغلوب نہیں ہو سکتے اور عنقریب یہ دُنیا پر چھا جائیں گے۔

اسی نور کی برکت سے ان کی عقلوں میں اس قدر نورانیت آگئی تھی کہ تدبّر و تفکّر کے ذریعے وہ انسانی زندگی کے ہر شعبے کے لیے ایسا اسلامی قانون بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے جس میں زندگی کے تغیرات و ترقیات کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت تھی۔ اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی اور انسانی قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہ تھی۔ یہی اسلامی فقہ قانون کا وہ عظیم ذخیرہ اور انسانی ذہانت و عظمت کا وہ عجیب و غریب سرمایہ ہے جس کی نظیر دنیا کے قانونی ذخیروں میں ملنی مشکل ہے۔ یہ نبوّت کے لائے ہوئے علم و عمل سے اجتہاد کے ذریعے استنباط کیا ہوا ذخیرہ ہے۔ اسی بنا پر علماء، اور شارحینِ قرآن کی نُور کا مصداق متعین کرنے میں تعبیرات مختلف ہیں۔ کوئی ایمان کہتا ہے کوئی توفیق بتاتا ہے اور جو کچھ بھی کوئی کہتا ہے سب صحیح ہے۔ جس کی نظر اس باغیچہ کے جس درخت پر اور درخت کے جس پھول پر پڑی ہے اسی کو اس نے نمایاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ ورنہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ ایمان کے بعد اسلامی زندگی اللہ کی جانب سے عطا کی ہوئی وہ روشنی ہے جس کی تابانی میں ایک مومن پوری زندگی کا سفر طے کرتا ہے۔ اس روشنی میں یگانگت اور وحدت ہوتی ہے اس میں تعدد اور تکثر نہیں ہوتا۔ سارے تنوعات اور بوقلمونیوں کے باوجود اس میں وحدت ہی وحدت ہوتی ہے۔ نورِ طاعت، نورِ ایمان، نورِ ایقان سب کا مرکز ایک نُور ہے برخلاف ظلمات کے کہ اس میں وحدت نہیں کثرت ہی کثرت ہوتی ہے۔ دُنیا میں ساری گمراہیاں اور گمراہیوں کے سارے فنون ظلمات ہیں۔ شرک و کُفر و نفاق سے شروع ہو کر نیچے تک چلے آیئے جہاں جہاں اور جس جس رنگ میں نظریات و افکار، اعمال و اخلاق سے متعلق جو گمراہیاں دُنیا میں پھیل رہی ہیں علمی، سیاسی، اقتصادی، اخلاقی، معاشرتی جن کو یورپ کی طاغوتی طاقتیں زندگی کے ہر شعبے اور تمدن کے ہر میدان میں پھیلا رہی ہیں سب اس میں داخل ہیں۔ ان میں خواہ کتنا تکثر کتنا تعدد ہو قرآن کی نظر میں اس کا علاج ایک اور صرف ایک ہے اور وہ النور ہے۔ یعنی ایمان و اسلام کی روشنی۔ اس روشنی سے ہٹ کر ہر علاج خود ظلمت ہے۔ شاید اسی بنا پر قرآن نُور کو واحد لے کر آیا ہے اور ظلمات کو جمع لے کر آیا ہے۔

ۛ لے قادین کے درمیان کلمات ربعی بن عامر کے ہیں جو انھوں نے یزدگرد کے دربار میں مسلمانوں کے قاصد کی حیثیت سے کہے تھے۔

شارحین قرآن نے اس کی اور وجوہ بھی بتائی ہیں مثلاً
چونکہ حق کی روشنی کا منبع ایک ہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نیز حق میں انتشار نہیں ہوتا بلکہ وحدت پائی جاتی ہے اس وجہ سے نور واحد آیا ہے برعکس اس کے ظلمات جمع استعمال ہوا اس لیے کہ اس کے ظہور میں آنے کے رستے مختلف ہیں اور اس کے مزاج میں انتشار و اختلاف بھی ہے[1]
کفر کی بے شمار قسمیں ہیں اس لیے ظلمات کو جمع لے کر آئے ہیں۔ انواع کفر اور اسباب کفر بہت زیادہ ہیں۔ دو نقطوں کے درمیان منحنی یا ٹیڑھے خط بے شمار ہو سکتے ہیں سیدھا خط ایک ہی ہوتا ہے۔ اللہ راست ایک ہی ہوتا ہے اس لیے النور قرآن میں جہاں بھی آیا ہے صیغہ واحد ہی میں آیا ہے[2]
تاریکیوں سے مراد جہالت کی تاریکیاں ہیں جن میں بھٹک کر انسان اپنی فلاح و سعادت کی راہ سے دُور نکل جاتا ہے اور حقیقت کے خلاف چل کر اپنی تمام قوتوں اور کوششوں کو غلط راستوں میں صرف کرنے لگتا ہے۔[3]

طاغوت کی ولایت

۲۵۷۔ اور وہ لوگ جو کفر کی راہ پر چلتے ہیں ان کی مددگار سرکش قوتیں ہیں۔ یہاں طاغوت جمع کے معنے میں آیا ہے۔ مبرد نے تصریح کی ہے کہ یہ جمع ہے لیکن ابو علی فارسی کہتے ہیں کہ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ مصدر ہے جیسے رغبوت، رہبوت اور ملکوت، جس طرح یہ اسماء واحد ہیں اسی طرح طاغوت بھی اسم مفرد ہے جمع نہیں۔ اس آیت میں جمع کے مقام پر مفرد لایا گیا ہے اور بطور مبالغہ اس طرح لانا بلاغت ہے جیسے ھم رضا اور ھم عدل اور سیبویہ کے خیال میں یہ اسم جنس ہے۔ بہرحال اس کا اطلاق واحد اور جمع دونوں پر ہوتا ہے یہاں معنے میں جمع ہی مراد ہے۔ اور جب فضا ساری کی ساری تاریک در تاریک ہو تو ظاہر ہے کہ شیطنت اور بدی کے محرکین بھی زیادہ ہی ہوتے ہیں اور شیطان بدی کے چہرے پر طرح طرح کے نقاب ڈال کر اور قسم قسم ناموں سے سامنے آتا ہے، مساجد کے محراب و منبر سے لے کر تخت حکومت تک پر اس کا قبضہ ہو جاتا ہے۔ تہذیب، تمدن، سیاست، زبان و ادب، ثقافت سب میں اس کی امامت و قیادت مان لی جاتی ہے۔ گویا انسانی زندگی کی ہر شاخ طاغوت کی ولایت میں پروان چڑھتی ہے اور اس کے نتیجہ میں انسانی زندگی ناخدا شناس اور غدا کی کھلم کھلا بغاوت پر اتر آتی ہے۔ گویا انسان خدا سے منہ موڑ کر ایک ہی طاغوت کے چنگل میں نہیں پھنستا بلکہ بہت سے طواغیت اس پر مسلط ہو جاتے ہیں۔ اور ان سب کی کوشش اور تگ و دو یہ

[1] تدبر قرآن۔ [2] ماجدی [3] تفہیم القرآن

ہوتی ہے کہ

۷۵۵ ۔ وہ ان کو روشنی سے نکال کر تاریکیوں میں لے جاتے ہیں۔ روشنی سے مراد اسلامی زندگی ہے اور تاریکیوں سے مراد ضلالت کی وہ تاریکیاں ہیں جو طواغیت تعلیم، قومیت، ثقافت، تحقیق، سیاست، معاشیات اور ادب کے نام پر پیش کرتے رہتے ہیں۔ جس کا نام ان کی زبان میں ترقی ہے اور جس کی نسبت سے وہ ترقی پسند اور ترقی یافتہ بنتے اور بناتے ہیں۔

علّامہ اقبال اور طاغوتی تہذیب

علّامہ اقبال نے زمانہ حال کی ان طاغوتی قوتوں کے عناصر ترکیبی اور اس کے کمزور پہلوؤں کا اچھی طرح معائنہ کیا اور اس فساد کی تہ تک پہنچنے کی کوشش کی جو اس کے مادی رجحان، دین اور اخلاقی و روحانی اقدار سے اس کی بغاوت کی وجہ سے اس کے ضمیر میں شامل ہوگیا۔ اس کا نتیجہ دل کی وہ بے نوری اور زندگی کی وہ بے کیفی ہے جو اس ترقی پر بری طرح مسلط ہے اور اس نے اس کو ایک مشینی و مصنوعی رنگ دے کر روحانی قدروں سے اس کا رشتہ منقطع اور اللہ کی رحمت سے اس کو دور کر دیا ہے۔ انھوں نے اس طاغوت کی لادینی بنیاد اور اس کے لادینی ضمیر کا جا بجا ذکر کیا ہے جس کو مذہب و اخلاقیات سے بیر ہے اور جو روح نبوت سے بیزار ہو کر مادیت کے معبودان باطل کا پرستار اور ایک نئے بت خانہ کا معمار ہے۔ مثنوی پس چہ باید کرد میں فرماتے ہیں۔

لیکن از تہذیب لا دینی گریز　　　زاں کہ او با اہلِ حق دارد ستیز
فتنہ ہا این فتنہ پرداز آورد　　　لات و عزیٰ در حرم باز آورد
از فسونش دیدۂ دل نابصیر　　　روح از بے آبی او تشنہ میر
لذتِ بے تابی از دل مے برد　　　بلکہ دل زین پیکر گل می برد

کہنہ دزدے غارت او بر ملاست
لالہ می نالد کہ داغ من کجا است

اس طاغوتی تہذیب کا شیوہ غارت گری اور آدم دری ہے اور اس کا مشغلہ و مقصد تجارت اور سوداگری ہے۔ دنیا کو امن و سکون بے غرض محبت اور خلوص کی دولت اسی وقت نصیب ہو سکتی ہے جب اس طاغوت جدید کا نظام تہ و بالا ہو جائے۔

تا تہ و بالا نہ گردد ایں نظام
دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

اس طاغوتی تمدن کی بنیادوں اور اس کے طرزِ فکر پر تنقید اور جائزہ علامہ اقبال کے علمی خطبات میں جو انہوں نے مدارس میں دیئے تھے قدرتی طور پر زیادہ ٹھوس اور گہرا ہے۔ اس لیے کہ علم و فلسفہ کی زبان شعر و ادب کی زبان کے مقابلے میں علمی خیالات اور جچی تلی تنقید کی زیادہ صلاحیت رکھتی ہے۔ وہ مغرب کی مادی تہذیب کی ساخت اور مزاج اور موجودہ انسان پر نیز ان مسائل اور مشکلات پر جن سے وہ دوچار ہے تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

عصر حاضر کی ذہنی سرگرمیوں سے جو نتائج مرتب ہوئے ان کے زیرِ اثر انسان کی روح مردہ ہو چکی ہے۔ یعنی وہ اپنے ضمیر اور باطن سے ہاتھ دھو بیٹھا ہے خیالات اور تصورات کی جہت سے دیکھئے تو اس کا وجود خود اپنی ذات سے متصادم ہے۔ سیاسی اعتبار سے نظر ڈالیے تو افراد افراد سے ــــــ اس میں اتنی سکت ہی نہیں کہ اپنی بے رحم انانیت اور ناقابلِ تسکین جوع زر پر قابو حاصل کر سکے۔

وہ ایک واقف کار مبصر کی حیثیت سے سرمایہ داری اور اشتراکیت دونوں کو اسی طاغوت کے شجرِ مادیت کی دو شاخیں اور ایک ہی خاندان کے دو گھرانے قرار دیتے ہیں جس میں ایک مشرقی ہے اور ایک مغربی۔ لیکن مادی طرزِ فکر زندگی اور انسان کے متعلق محدود نقطہ نظر میں دونوں ایک جان دو قالب ہیں۔

علامہ اقبال طاغوتی ولایت کے مقابلے میں خدائی ولایت یعنی اسلام کی لازوال نعمت پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ انھوں نے اپنے خطبۂ صدارت میں جو ۱۹۳۲ء میں آل مسلم پارٹیز کنونشن میں لایا تھا مسلمانوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا:

جس دین کے تم علمبردار ہو وہ فرد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرتا ہے اور اس کی اس طرح تربیت کرتا ہے کہ وہ اپنا سب کچھ خدا اور اس کے بندوں میں صرف کر دے۔ اس دینِ قیم کے مضمرات ابھی ختم نہیں ہوئے یہ دین اب بھی ایک دنیا پیدا کر سکتا ہے جس میں غریب امیروں سے ٹیکس وصول کریں جس میں انسانی سوسائٹی معدوں کی مساوات پر نہیں بلکہ روحوں کی مساوات پر قائم ہو۔

قرآن نے اس تقابلی مطالعے کے ذریعے سمجھا دیا کہ الذین آمنوا اسلام کی دعوت کے علمبردار ہیں جبکہ الذین کفروا الطاغوتی دعوت کے علمبردار ہیں۔ دنیا میں یہ دونوں متقابل دعوتیں ہیں اور ایک دوسرے کی حریف ہیں۔

قرآن کہتا ہے کہ اہلِ ایمان کو طاغوتی دعوت کو اپنا مستقل حریف حقیقی مدِ مقابل اور اپنا عالمگیر دشمن سمجھنا چاہیے اور اس کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ دعوت کی عالمگیر قوت سے محروم ہو جائے اور اس کا اقتدار اس حد تک ختم ہو جانا چاہیے کہ اس کی تحریکِ دعوت میں کوئی کشش اور کمزور انسانوں کے لیے کوئی کشمکش باقی نہ رہے۔

ان کو دنیا کے ہر حصے پر یورپ کی طاغوتی تہذیب اور طاغوتی طاقت کو اس نظر سے دیکھنا چاہیے کہ وہ دنیا میں کفر کی داعی اور جاہلیت کی علمبردار ہے اور اس کی قوت کی وجہ سے دعوت الٰہی کو فروغ نہیں ہوتا۔ ان کی نگاہ میں دنیا کا سب سے اہم مسئلہ یہی عالمگیر مسئلہ ہونا چاہیے اور ہر مسئلہ اسی مرکزی مسئلہ کا جزء ہونا چاہیے۔ لیکن افسوس کہ یہ عظیم الشان حقیقت آج مسلمانوں کی نگاہوں سے بالکل اوجھل ہے۔ وہ ماضی کے طاغوت کو تلاش کر رہے ہیں اور آج کا طاغوت ان کی نظر سے بالکل مخفی ہے۔

کافر کے جہنم میں خلود کی وجہ

۷۵۶۔ لہٰذا یہی لوگ جہنم والے ہیں، ہمیشہ اسی میں رہنے والے ہیں۔ بقول امام غزالی انسان اگرچہ ازلی نہیں مگر اپنے ارتقاء کے لحاظ سے ابدی ضرور ہے اس لیے اس کو ایک ابدی مستقر کی ضرورت ہے۔ دنیا اس کا ابدی مستقر نہیں ہو سکتا صرف عارضی مستقر ہے ولکم فی الارض مستقر و متاع الی حین

اس کا دائمی مستقر جنت یا دوزخ ہیں اللہ سبحانہ نے اس کی تقسیم اعمالِ صالحہ اور اعمالِ سیئہ پر نہیں رکھی بلکہ ایمان و کفر پر رکھی ہے۔ کیونکہ مومن خواہ کتنا ہی گنہ گار ہو مگر اس کا ابدی مستقر جنت ہی ہوگا اور کافر خواہ کتنے ہی اچھے اچھے کام کیوں نہ کرے لیکن اس کا ابدی مستقر جہنم ہی رہے گا۔ اب رہی یہ بات کہ محدود عمر کے ایمان و کفر کی جزا خلود و دوام کیوں رکھی گئی ہے تو ہمارے نزدیک اس کا سب سے بہتر جواب وہ ہے جو ابن قتیبہ نے اپنی کتاب "تاویل مختلف الحدیث" میں دیا ہے۔ اسی کا خلاصہ علامہ شیخ بدر الدین عینی نے شرح بخاری میں اور عبدالوہاب، شعرانی نے الیواقیت والجواہر میں نقل کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> جنت میں خلود اور ابدی زندگی کی بنیاد عمل پر نہیں بلکہ بندے کی نیت پر رکھی گئی ہے۔ اگر اس کی بنیاد عمل پر ہوتی تو اخروی زندگی کی مدت بھی اتنی ہی ہونی چاہیے تھی جتنی کہ اس کے عمل کی تھی یا زیادہ سے زیادہ اس سے دگنی لیکن چونکہ اس کی بنیاد نیت پر رکھی گئی ہے اور عامل کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر وہ ہمیشہ زندہ رہے گا تو اللہ سبحانہ کی اطاعت ہمیشہ ہی کرے گا اس نیت میں اگر کوئی چیز حائل ہوتی ہے تو وہ اس کی موت ہے اس لیے اس کو اپنی نیت کے مطابق دوام و خلود کا بدلہ مل جاتا ہے اور یہی حال کافر کا دوزخ میں ہے کہ اس کا خلود و دوام بھی اس کی نیت کا ثمرہ ہے۔ (عمدۃ القاری)

میرا مقصد اعمال کی قدر و قیمت کو کم کرنا نہیں بلکہ ایمان کی اہمیت اور کفر کی گھناؤنی شکل بتانی ہے عمل کی حد سے زیادہ اہمیت اعتزال اور اس سے زیادہ بے اعتنائی ارجاء ہے، صحیح راہ پر قائم رہنے کے لیے حدود شناسی

ضروری ہے۔ غالباً صحیح بخاری کی حدیث انس میں اسی طرف اشارہ ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا اور اس کے دل میں جَو برابر بھی نور ایمان ہو گا تو بالآخر وہ دوزخ سے نکال لیا جائے گا اور جس نے لا الہ الا اللہ کہہ دیا اور اس کے دل میں گیہوں کے ایک دانہ کے برابر بھی نور ایمان ہو گا وہ بھی بالآخر دوزخ سے نکال لیا جائے گا اور جس شخص نے لا الہ الا اللہ کہہ لیا اور اس کے دل میں ذرہ برابر بھی نور ایمان ہو گا وہ بھی دوزخ سے نکال لیا جائے گا۔ (بخاری)

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مومن اگرچہ کتنا ہی ادنیٰ درجہ کا ہو مگر وہ بھی اپنے گناہوں کی سزا بھگت کر آخر کار دوزخ سے نکال لیا جائے گا۔ اگرچہ ایمان اللہ تعالیٰ سے ایک عہد کا نام ہے مگر دل میں اس کی ایک حقیقت بھی ہوتی ہے جو اس کا وجود خارجی کہلاتی ہے۔ یہ حقیقت کسی کے دل میں پہاڑ کے برابر ہو گی اور کسی کے رائی کے دانہ کے برابر۔ اس کے ہوتے ہوئے کوئی شخص جہنم میں نہیں رہ سکتا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ بارگاہ صمدیت میں ایمان کی قدر و قیمت کیا ہے؟ اس کے بالمقابل کفر و شرک ہے جس کے دل میں شرک ہو گا وہ اللہ تعالیٰ کی جنت کے قریب بھی نہیں پھٹک سکتا۔ اس سے شرک کی قباحت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے اسی لیے جنت و دوزخ کی تقسیم ایمان و کفر پر ہے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِي حَاجَّ إِبْرٰهِمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتٰهُ اللّٰهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرٰهِمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِ وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِ وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرٰهِمُ فَإِنَّ اللّٰهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِينَ ۚ

کیا تم نے اس شخص[۶۵۷] کے حال پر غور نہیں کیا جس نے حضرت ابراہیمؑ سے[۶۵۸] جھگڑا کیا تھا، جھگڑا بھی ابراہیمؑ کے رب کے بارے میں[۶۵۹] تھا اور اس بنا پر تھا کہ اس کو اللہ نے حکومت دے[۶۶۰] رکھی تھی۔ جب ابراہیمؑ نے کہا کہ میرا رب تو وہ اللہ ہے جو مخلوقات کو مارتا اور جلاتا ہے[۶۶۱] تو اس نے جواب میں کہا جلانا اور مارنا میرے اختیار میں ہے[۶۶۲]، اس پر ابراہیمؑ نے کہا اگر ایسا ہی ہے تو اللہ سورج کو مشرق سے طلوع کرتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا[۶۶۳]۔ یہ جواب سن کر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا[۶۶۴] اور اللہ ظالموں پر ہدایت کا دروازہ نہیں کھولتا ہے[۶۶۵]۔

طاغوت کے سامنے حضرت ابراہیم کا اعلانِ حق

اس سے پہلی آیات میں کفر و ایمان کا نظریاتی تقابل پیش کیا تھا۔ اب اس رکوع میں کفر و ایمان کا واقعاتی تقابل پیش کیا جا رہا ہے۔ اس کی توضیح کی خاطر تین واقعات مثال کے طور پر پیش کیے ہیں۔ یہ پہلی مثال ایسے

سرکشی کی ہے جو اپنے زمانہ کا طاغوت ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے واضح دلائل کے ساتھ اس کے سامنے دعوتِ حق پیش کی اور وہ لاجواب ہو کر رہ گیا مگر چونکہ طغیان اس کی زندگی میں رونما ہو چکا تھا اس لیے حق کے واضح ہونے کے باوجود وہ حق کے سامنے سرنگوں نہیں ہوا۔

قرآن نے حضرت ابراہیمؑ کے دو مناظروں کا ذکر کیا ہے۔ ایک مناظرہ یہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے وقت کی سب سے بڑی طاغوتی طاقت سے کیا دوسرا مناظرہ وہ ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے اپنی قوم سے کیا اس کا اجمالی ذکر ساتویں پارے میں وحاجہ قومہ کے عنوان سے اور سورۂ انبیاء میں تفصیلی تذکرہ ہے۔ عام شارحینِ قرآن دونوں میں فرق نہیں کرتے لیکن دونوں میں بڑا باریک اور جوہری فرق ہے۔ وقت کے سربراہ سے جو مناظرہ ہوا ہے اس کا موضوع فی ربہ اللہ کی ربوبیت اور حکومت ہے جبکہ قوم سے جو مناظرہ ہوا ہے اس کا موضوع فی اللہ اللہ کی الوہیت ہے۔ دوسرے لفظوں میں اگر آپ چاہیں تو اسے یوں کہہ سکتے ہیں کہ وقت کے بادشاہ سے مناظرہ اللہ کی بندگی پر ہے اور قوم سے مناظرہ اللہ کی پرستش پر ہے اور جس مقام پر جو مناظرہ پیش کیا ہے وہ مقام کے عین تقاضے کے مطابق ہے۔ اس مقام پر چونکہ اُمت مخاطب ہے اور اہلِ ایمان کو دنیا میں اسلام کی دعوت کا عالمگیر نمائندہ بنا کر پیش کیا گیا ہے اور امت سے کہا گیا کہ۔

قاتلوا ھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین للّٰہ۔

اس لیے یہاں وہ ہی مناظرہ پیش ہونا چاہیے جو حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کی ربوبیت پر وقت کی سب سے بڑی طاغوتی قوت سے کیا۔ اس واقعہ میں اُمت کے لیے سب سے بڑا سبق یہی ہے کہ وہ دُنیا کی طاغوتی قوتوں کے سامنے متقابل دعوت، متقابل نظامِ حیات اور متقابل تہذیب کے علمبردار ہیں۔ گویا ایک دعوت کا علمبردار اگر طاغوت ہے تو اس کے مقابلے دوسری دعوت کے علمبردار اہلِ ایمان ہیں۔ اور یہ دو متقابل دعوتیں، متضاد نظامِ حیات اور متضاد تہذیبوں کے علمبردار ہیں۔ اور اس طرح ایک ترازو کے دو پلڑوں کی طرح نہیں کہ جس قدر ایک نیچا ہوگا دوسرا اونچا ہوگا۔ ان دونوں دعوتوں میں ہر دعوت کے علمبرداروں کا وجود۔ ان کا فروغ اور ان کی طاقت دوسری دعوت کے علمبرداروں کے لیے ایک مستقل مزاحمت ایک مسلسل خطرہ اور ایک دائمی کشمکش ہے۔ اس امرِ واقعی کا احساس پیدا کرنے کے لیے قرآن نے یہ واقعہ یہاں بہت بڑی صراحت اور بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا مناظرہ کس سے تھا

۲۵۷۔ کیا تم نے اس شخص کے حال پر غور نہیں کیا۔ عربی زبان میں حیرت اور استعجاب کے موقعہ پر

یہ اندازِ بیان اختیار کرتے ہیں الم تر کیا تم نے نہیں دیکھا جب کسی حیرت انگیز نقص یا عیب کی طرف توجہ دلانا ہو تو اس کا آغاز اس طریقہ پر کرتے ہیں۔ ابن جریر نے اہل عرب کے حوالہ سے اس انداز کو پیش کیا ہے۔
یہ شخص کون ہے اتنا تو قرآن سے صراحتاً معلوم ہو رہا ہے کہ وہ بادشاہ ہے اور یہ بات اشارتاً معلوم ہو رہا ہے کہ وہ ظالم ہے۔ یعنی اس کا بادشاہ ہونا اور ظالم ہونا تو قرآن سے معلوم ہو رہا ہے۔ توریت بھی یہی بتاتی ہے ـــــ کہ کوش سے نمرود پیدا ہوا زمین پر جبار ہونے لگا۔ خداوند کے سامنے صیاد و جبار تھا اسی واسطے مثل ہوئی کہ خداوند کے سامنے نمرود سا صیاد و جبار۔ (پیدائش ۱۰۔ ۸۔ ۹) اور کوش سے نمرود پیدا ہوا وہ زمین پر جبار ہونے لگا (تواریخ ۱۔ ۱۰۔ ۶) اور حسب روایات یہود یہ نمرود اپنے قبیلہ والوں کی مختصر فوج سے آل یافث کو شکست دینے کے بعد زمین کا بادشاہ ہوگیا اور آزر کو اس نے اپنا وزیر بنا لیا۔ اس کے بعد اپنی عظمت کے نشہ میں خدا سے بیگانہ ہوگیا اور بہت سخت قسم کا مشرک ہوگیا[۱] (جیوز انسائیکلو پیڈیا)
ہمارے مفسرین میں سے بغوی نے بھی لکھا ہے کہ سر پر تاج پوشی کا یہی موجد تھا۔ روئے زمین پر جبار کی حیثیت سے سامنے آیا اور ربوبیت کا مدعی بنا۔ ابن کثیر نے امام مجاہد کے حوالہ سے اس کا نسب نامہ یہ لکھا ہے نمرود پسر کنعان پسر کوش پسر سام پسر نوح علیہ السلام۔ اور حافظ ابوالقاسم السہیلی سے اس طرح نقل کیا ہے نمرود پسر کوش پسر کنعان پسر حام پسر نوح۔
اہل ایران کا دعویٰ ہے کہ عراق و بابل کی قدیم ترین حکومت ان کے ہاتھ میں تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ جمشید کے بعد جو نوسام بن نوح کا معاصر تھا ضحاک تازی نے ملک پر قبضہ کر لیا۔ عرب بھی اس کو تسلیم کرتے ہیں۔
اہل یمن بھی اس کے مدعی ہیں اور ان کا خیال ہے کہ یہ بادشاہ ان کی قوم میں سے تھا اور اس کا نام ضحاک بن علوان تھا۔ اور ہمیں یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ ضحاک ہی نمرود ہے اور حضرت ابراہیمؑ اس کے زمانہ میں پیدا ہوئے ہیں اور اسی نے ان کو جلانے کا ارادہ کیا تھا۔
بنی اسرائیل کا قدیم خاندان عہد ابراہیمی سے بہت پہلے اسی کا باشندہ تھا اور نہایت قدیم زمانہ سے اس کے تعلقات یہاں سے قائم ہیں۔ تورات کی روایت ہے کہ بابل کا سب سے پہلا بادشاہ کوش کا بیٹا نمرود تھا۔ اصل عبارت یہ ہے۔
کوش حام کا بیٹا تھا۔ کوش کی اولاد سبا، حویلہ، سبتا، رعماہ اور سبتیکا۔ رعماہ کے بیٹے شبا، ودان کوش نے نمرود کو پیدا کیا اور اس کی حکومت کی ابتداء بابل اور عراق میں ہوئی۔ (تکوین ۱۰۔ ۶۔ ۸۔ ۹۔ ۱۰)

---

[۱] ماجدی

یورپ میں تاریخ قدیم کا مورخ جرمن فاضل ڈنکر ہے وہ بابل کی فصل تاریخ میں تورات کے اس فقرے کی تفسیر یوں کرتا ہے۔

سفر تکوین شل تناخرین یہود کے، کوش، کے نام کے اندران اقوام کو داخل کرتا ہے جو جنوبی سمت میں رہتے ہیں۔ نوبی، اثوبی اور جنوبی عرب کے قبائل۔ یہاں پر ہم ان فرزندان کوش کو جنھوں نے بابل کی بنیاد ڈالی۔ جنوبی قبائل کے باشندے کہہ سکتے ہیں جو تقریباً خلیج فارس کے سواحل پر مقیم تھے۔

اہل عرب اور اہل بابل کے بیانات سے اس سے زیادہ کوئی اور علم حاصل نہیں ہوتا کہ کسی قدیم زمانہ میں عرب سامیہ کے ایک خاندان نے عراق پر حکومت کی اس سے زیادہ حالات قدامت کی تاریکی میں مخفی ہیں لیکن ارکیالوجی کی اعانت سے بابل کے آثار نے قدامت کے پردے کو چاک کر دیا ہے۔ انیسویں سے سے بابل کا تمدن زندہ ہو رہا ہے اور علم الآثار کے چراغ طلسمی میں اب نظر آرہا ہے کہ بابل واسیریا کا ہر پتھر درحقیقت ان کی تاریخ کا ایک صفحہ ہے [1]

بہرحال نمرود کا وجود سب کے یہاں مسلم ہے اور اس میں قدیم وجدید میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ قرآن نے اس کے بارے میں سب سے پہلا یہ انکشاف کیا ہے کہ:

۲۵۸۔ جس نے ابراہیم سے جھگڑا کیا تھا جس واقعہ کا یہاں ذکر کیا گیا ہے اس کی طرف کوئی اشارہ بائبل میں موجود نہیں ہے مگر تلمود میں یہ پورا واقعہ موجود ہے اور بڑی حد تک قرآن کے مطابق ہے۔ اس میں بتایا گیا کہ حضرت ابراہیم کا باپ نمرود کے یہاں سلطنت کے بڑے عہدے دار کا منصب رکھتا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے جب کھلم کھلا شرک کی مخالفت کی اور بت خانے میں بڑکر بتوں کو توڑ ڈالا تو ان کے باپ نے خود ان کا مقدمہ بادشاہ کے دربار میں پیش کیا۔ پھر وہ گفتگو ہوئی جو یہاں بیان کی گئی ہے [2]

انیسویں صدی کے ثلث آخر میں فرنگی مادیت اور عقل پرستی اور اس کی تقلید میں ہندوستان کی روشن خیالی نے اس واقعہ کا سرے سے انکار کر دیا یعنی چونکہ اس خاص قصہ کا ذکر بائیبل میں موجود نہیں ہے اس لیے وہ اس واقعہ کے ماننے میں تامل کر رہے ہیں۔ لیکن جوں جوں فرنگی مورخین کے قدم آگے بڑھتے گئے یہ تشکیک اور بے اعتقادی بھی کمزور ہوتی گئی۔ انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے سب سے آخری ایڈیشن میں اقرار ہے کہ نصف صدی

[1] ارض القرآن [2] تفہیم القرآن

پیشتر اس واقعہ کو جیسا ہے اصل نا معتبر سمجھ لیا گیا تھا وہ خیال اب مزید تحقیق سے قائم نہیں رہا۔[1]
جیسا کہ پہلے اشارہ کیا جا چکا ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا یہ مناظرہ وقت کے ایک طاغوت سے ہے۔ دوسرا مناظرہ قوم سے ہے جس کا تفصیلی ذکر پارہ ۷ امیں آرہا ہے اور ایک تیسرا مناظرہ ان کا خود اپنے باپ سے ہے جس کا ذکر پارہ ۱۶ امیں آرہا ہے اور ایک چوتھا اور سب سے پہلا مناظرہ حضرت ابراہیمؑ کا خود اپنے سے ہے۔ اس کا تفصیلی ذکر ساتویں پارے میں آرہا ہے جس میں قوم کافر ہونے کی حیثیت میں ھذا ربی کہتے ہیں اور خدا کی دی ہوئی حجت نبوی آگے سے بیزاری کا اعلان کرتی ہے۔

مناظرہ کا موضوع کیا تھا

۷۵۹ ۔ یہ جھگڑا بھی ابراہیم کے رب کے بارے میں تھا یعنی مناظرے کا موضوع اللہ کی ربوبیت تھی الوہیت نہ تھی۔ وہ اللہ کے مقابلے میں اس دنیا میں اپنی ربوبیت اپنی حکومت اور کارسازی کا مدعی تھا جبکہ حضرت ابراہیم کا موقف یہ تھا کہ اللہ کے علاوہ کارساز اور رب کوئی نہیں۔ انسان حکومت میں اللہ کی نیابت کر سکتا ہے لیکن حکومت کا مالک بن کر اپنی بندگی نہیں کرا سکتا۔ گویا مابہ النزاع یہ بات تھی کہ اقتدار صرف اللہ کے لیے ہے یا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی شریک ہے۔ اللہ کے بندے صرف اللہ کی بندگی کریں یا اللہ کے ساتھ کسی اور کی بھی بندگی کریں۔ بندوں کی بندگی کو مٹانا اور صرف اللہ کی بندگی کا نظام قائم کرنا نبوت کا منتہائے نظر ہوتا ہے۔ لفظ رب سے قرآن حکیم حکومت مراد لیتا ہے اللہ کے علاوہ اور اللہ کے ساتھ وہ کسی کی ربوبیت کو نہیں مانتا۔ جو خالق کائنات ہے وہی کائنات کی ربوبیت کا حقدار ہے۔ اسی کی ذات گرامی نظریات و افکار اعمال و اخلاق، تدبیر و سیاست، دستور و قانون کا سرچشمہ ہے۔ اس کی حکومت میں کوئی بھی اس کا شریک نہیں ہے۔ قرآن میں وحدت اقتدار کے نظریہ کو مختلف دلائل سے ثابت کیا ہے۔ وہ خلاق عالم بھی ہے اور اس کا حکمران بھی الا لہ الخلق والامر اقتدار کی ساری خصوصیات نبوت اللہ کے لیے ثابت کرتی ہے۔ وحدت اقتدار، حیات ابدی، قدرت کاملہ اور سطوت و جبروت ان خصوصیات میں بے ہمتا ہمیت کی حامل ہیں۔ حضرت ابراہیم کائنات کی ربوبیت کا مالک صرف اللہ کو بتاتے تھے جبکہ نمرود خود خود فراموشی اور خدا فراموشی کا شکار ہو کر اپنی ربوبیت کا مدعی تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نمرود اللہ کی ہستی کا منکر نہ تھا وہ ربوبیت میں اللہ کی توحید کا منکر ہو کر خود کو شریک ربوبیت سمجھتا تھا۔

---

[1] ماجدی

ابراہیمؑ سے مناظرہ کرنے کی وجہ

۲۶۰۔ اور اس بنا پر تھا کہ اللہ نے اس کو حکومت دی تھی یعنی نمرود اللہ کی ربوبیت کے موضوع پر مناظرہ صرف اس لیے کر رہا تھا کہ وہ نشۂ حکومت کی سرشاریوں میں خدا فراموش ہو چکا تھا۔ اس فقرے میں معاملہ کی ساری نوعیت کھول کر پیش فرما دی ہوتا تو یہ چاہیے تھا کہ اللہ کی بخشی ہوئی نعمت پا کر وہ اللہ کا شکر گزار بندہ تھا۔ لیکن تنگ ظرفوں اور کم عقلوں کے لیے نعمت اکثر گمراہی کا باعث ہوئی ہے اور انھوں نے اس کو شکر کی جگہ کفر کا سبب بنایا۔ جن لوگوں کو اقتدار حاصل ہو جاتا ہے جب وہ اس اقتدار کو اللہ کے فضل و کرم کے بجائے اپنے استحقاق اپنے علم اور اپنی تدبیر کا نتیجہ سمجھتے ہیں تو وہ اس بات کو بالکل بھول جاتے ہیں کہ اللہ سبحانہ یہ اقتدار بخش کر ان کا امتحان کر رہا ہے بلکہ وہ استکبار میں مبتلا ہو کر خود اپنی ربوبیت کا دعویٰ کر بیٹھتے ہیں اور اس کے لیے تدبیر یہ اختیار کرتے ہیں کہ خدا کے اوتار یا مظہر یا ظلِ اللہ کے روپ میں اپنے کو پیش کرتے ہیں۔ چنانچہ دولت و نعمت اور اقتدار کا گھمنڈ ہمیشہ ضلالت کے اسباب میں سے ایک سبب رہا ہے۔ بہت کم خوش قسمت ایسے نکلے ہیں جو اپنے آپ کو اس فتنہ سے بچا سکتے ہیں [1]

قرآن کا تصورِ حکومت

حکومت اور مملکت کے سلسلے میں قرآن نے سب سے پہلی اور بنیادی حقیقت یہ بتائی ہے کہ حکومت اور مملکت دراصل اللہ کا عطیہ اور اس کی امانت ہے اور حقیقۃً اللہ کی ملکیت ہے اس لیے اللہ کی چیز اور اللہ کی دی ہوئی حکومت کو اللہ کی مرضی میں استعمال کرنا انسان کا فریضہ اور اس کی سعادت ہے۔ قرآن نے دولت اور مملکت کے موضوع پر یہی اسلوب اختیار کیا ہے اور بتایا ہے کہ انسان دولت و مملکت کا حقیقی مالک نہیں ہے مالک حقیقی اللہ تعالیٰ ہے۔ اس کے فضل و توفیق سے یہ دولت و حکومت اس کو نصیب ہوتی ہے، وہ اس کا امین ہے لہٰذا اس کے صرف و استعمال میں اس کی مقرر کی ہوئی حدود کا اس کو پابند رہنا چاہیے۔

ثُمَّ جَعَلْنَاكُمْ خَلَائِفَ فِي الْأَرْضِ مِنْ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ تَعْمَلُونَ

پھر ہم نے ان کے بعد زمین میں تم کو خلیفہ بنایا تاکہ ہم دیکھیں کہ تمہارے اعمال کیسے ہیں۔

یہ یقین پیدا کیا کہ اس زندگی کے بعد دوسری زندگی ہے جس میں اس زندگی کے تمام دولت و حکومت

---

[1] تدبرِ قرآن۔

کا حساب اس کے مالک حقیقی کو دینا ہوگا اور دیکھا جائے گا کہ اس نے خلافت ونیابت اور امانت کا کیسا حق ادا کیا۔

قرآن نے بہت قوت کے ساتھ اس ذہنیت کو پیدا کرنے کی کوشش کی ہے کہ دُنیا دارالعیش نہیں دارالامتحان ہے۔ یہاں دولت وحکومت اور سامان آرائش وراحت سب آزمائش کے لیے ہے، یہ زندگی ایک مختصر یا طویل فرصتِ عیش نہیں ہے بلکہ فرصتِ عمل ہے۔ یہ دولت وحکومت اس لیے نہیں ہے کہ اس سے عیش وعشرت کے اسباب اور لہو ولعب کا سامان پیدا کیا جائے بلکہ یہ آخرت کی جنس ثواب اور رضائے الٰہی حاصل کرنے کا سکہ ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام نے اپنے ایک بیان میں اسی کو پیش فرمایا ہے۔

لیبلوانی اشکر ام اکفر

اور اسی کا قرآن نے قصۂ داؤد میں ذکر کیا ہے۔

قلیل من عبادی الشکور

یاد رہے کہ قرآن نے ان دونوں پیغمبروں کو بادشاہ کہا ہے اور ابھی ابھی حضرت داؤد کے بارے میں بھی تعبیر دوسرے پارے کے آخر میں پڑھ کر آئے ہیں کہ

اتاہ اللہ الملک۔

یہی تعبیر یہاں نمرود کے متعلق آئی ہے۔ اتاہ اللہ الملک دونوں جگہ انداز روش ایک ہے مگر ایک مقبول ومحبوب بارگاہِ الٰہی ہے اور دوسرا طاغوت ہے۔ ایک شکر گزار اور فرمانبردار بندہ ہے اور دوسرا کم عقل اور کم ظرف نافرمان بندہ ہے۔

حضرت ابراہیم کا نمرود سے جھگڑا یہ اور صرف یہ تھا کہ حضرت ابراہیم حکومت کو عطیہ الٰہی فرماتے تھے اور نمرود اسے اپنا ہنر اور کمال سمجھتا تھا حضرت ابراہیم حکومت میں اللہ کی مرضی پوری کرنے کی تلقین کرتے تھے اور نمرود اپنی مرضی چلانے پر اصرار کرتا تھا۔ حضرت ابراہیم کا کہنا تھا کہ حکومت تیری ذاتی دانائی، ہنروری سے حاصل نہیں ہوئی بلکہ خدا کی رہنمائی اور اس کی بخشی ہوئی دانائی سے یہ حکومت تجھے ملی ہے۔ یہ اس کا عطیہ ہے۔ اس میں اللہ کی مرضی چلنی چاہیے۔ میں پیغمبر ہوں میرے پاس اس کے احکام آتے ہیں، خدا کے بندوں پر خدا کے احکام نافذ ہونے چاہییں نہ کہ تیرے۔ حکومت واقتدار فی الواقع اللہ کی ملکیت ہے تو اس کا مالک نہیں ہے۔

آیت کی بے موقع تشریح

بات ختم ہو چکی مگر ایک نہایت اہم بات باقی رہ گئی ہے ان آتاہ اللہ الملک کے متعلق بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اس فقرے میں ضمیر حضرت ابراہیم کی طرف جا رہی ہے اور مراد وہ وعدہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم سے کیا تھا کہ زمین مقدس کا آپ کو وارث بنایا جائے گا اور ہمیشہ کے لیے آپ کے نسل میں رہے گی۔ اسی پر جھگڑا ہے۔ یہ تشریح جس پس منظر اور ذہنی تحفظ کے ساتھ کی گئی ہے۔ اس کی طرف علامہ آلوسی نے کچھ اشارہ کیا ہے۔ دراصل کچھ ذہن یہاں ایک کافر کے بارے میں ملک کی داد و دہش کی خبر سن کر چونک گئے اور ان کو اس پر حیرت ہوئی کہ اللہ نے ایک ایسے شخص کو ملک و حکومت کی نعمت کیسے ارزانی کر دی جو اتنا بڑا کافر ہے۔

اس بارے میں استدلال قرآن کی ایک آیت سے کیا گیا ہے یعنی لاینال عہدی الظالمین یعنی حضرت ابراہیم سے کہا گیا تھا کہ میرا عہد امامت ظالموں کو نہ ملے گا۔ اس آیت کی تشریح نوٹ نمبر ۴۴۳ جلد اول میں گزر چکی ہے۔ لیکن ہمیں سب سے پہلے خود اس مقام پر تدبر کرنا چاہیے کہ کیا فی الحقیقت یہاں واقعات ہمیں اس کی اجازت دیتے ہیں جس سے حضرت ابراہیم کو ملک دینے کا وعدہ اس آیت سے ثابت ہوتا ہو۔ خواہ وہ وعدہ کسی قسم اور کسی نوعیت کا ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ تفسیر قرآن کی تاریخ میں اس سے بڑھ کر اور کوئی ناقابل توجیہہ بوالعجبی نہیں قرآن میں کوئی ایسی بات نہیں کوئی ایسی تعبیر نہیں جس سے یہاں حضرت ابراہیم کا وعدہ ظاہر ہوتا لیکن یہ تکلف آیت کو توڑ مروڑ کر ایسا بنایا جا رہا ہے کہ کسی نہ کسی طرح کافر کو ملک دینے کی بات بن جائے اور یہ کوشش صرف اس لیے کی جا رہی ہے کہ ایک مزعومہ عقیدہ موجود ہے جس کا قرآن سے کوئی ثبوت نہیں ہے۔ خود قرآن کا سباق اس کو نہیں چاہتا اور سلف صالحین کی راہ سے آیت کی جو تفسیر ہم تک پہنچی ہے وہ اس کی موید نہیں اور تاریخ کے واقعات اس کا ساتھ نہیں دیتے۔ علامہ آلوسی کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ اس میں کبھی دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں۔

نمرود کا سوال اور حضرت ابراہیم کا جواب

۷۶۱۔ جب حضرت ابراہیم نے فرمایا کہ میرا رب تو وہ اللہ ہے جو مخلوقات کو مارتا اور جلاتا ہے۔ نمرود اللہ تعالیٰ کے وجود کا منکر نہ تھا۔ اس کا دعویٰ یہ نہیں تھا کہ زمین و آسمان کا خالق اور کائنات کا مدبر وہ خود ہے۔ اس کا کہنا یہ نہیں تھا کہ اسباب عالم کے پورے سلسلے پر اسی کی حکومت چل رہی ہے بلکہ اس کا دعویٰ یہ

اور صرف یہ تھا کہ اس ملکِ عراق اور اس کے باشندوں کا حاکمِ مطلق میں ہوں۔ میری زبان قانون ہے، میرے اوپر کوئی اقتدارِ بالا نہیں ہے اور عراق کا ہر وہ باشندہ غدار ہے جو ملک میں میری ربوبیت نہ ملنے یا میرے سوا کسی اور کی ربوبیت کو مانے۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام فرما رہے ہیں کہ میں صرف ایک ہی ذاتِ گرامی کو رب مانتا ہوں اور اس کے سوا سب کی ربوبیت کا منکر ہوں۔ اور اللہ کی ربوبیت کو واضح کرنے کے لیے حضرت ابراہیم نے سب سے پہلے وہی بات کہی جو سب سے زیادہ واضح تھی۔ یعنی سارے نظامِ ربوبیت کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہے۔ کائنات کی زندگی اور موت کے سارے قانون کا مالک وہی ہے کسی بندے میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اس نظامِ حیات و موت کو بدل ڈالے یا اس میں کوئی ادنیٰ تصرف بھی کر سکے۔ یہ نمرود کے سوال کا جواب ہے نمرود اتنا دلیر، سرکش اور بر خود غلط بنا ہوا تھا کہ اس نے حضرت ابراہیم سے سوال کر دیا کہ اگر مجھے رب نہیں مانتا تو پھر بتا تیرا رب کون ہے تو کس کے حکم و قانون کو مانتا ہے؟

خدائی کی تقسیم

اس سوال کی نوعیت کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کر لیا جائے کہ مشرکین نے ہمیشہ خدائی کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک مافوق الفطرت خدائی جو سلسلہ اسباب پر حکمران ہے اور جس کی طرف انسان اپنی حاجات اور مشکلات میں دستگیری کے لیے رجوع کرتا ہے۔ اس خدائی میں وہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ ارواح اور فرشتوں اور جنوں اور سیاروں کو شریک کرتے ہیں۔ ان سے دعائیں مانگتے ہیں۔ ان کے سامنے مراسمِ پرستش بجا لاتے ہیں اور ان کے آستانوں پر نذر و نیاز پیش کرتے ہیں۔ دوسری تمدنی سیاسی معاملات کی خدائی یعنی ربوبیت و حاکمیت جو قوانینِ حیات مقرر کرنے کی مجاز اور اطاعتِ امر کی مستحق ہو اور جسے دنیوی معاملات میں فرمانروائی کے اختیارات حاصل ہوں۔ اس دوسری قسم کی خدائی کو دنیا کے تمام مشرکین نے ہر زمانے میں اللہ تعالیٰ سے سلب کر کے یا اس کے ساتھ شاہی خاندانوں مذہبی پروہتوں اور معاشرے کے اکابر میں تقسیم کر دیا ہے۔

اکثر شاہی خاندان اسی دوسرے معنے میں خدائی کے مدعی ہوئے ہیں اور اسی کو مستحکم کرنے کے لیے انھوں نے بالعموم پہلے معنے والے خداؤں کی اولاد ہونے کا دعویٰ کیا ہے اور مذہبی طبقہ اس معاملے میں ان کے ساتھ شریکِ سازش رہا ہے۔

اس طرح الوہیت آمیز شاہی کا تصور پوری طرح نشو و نما پا جاتا ہے اور شاہانِ وقت نیم خدا کی حیثیت اختیار کر لیتے ہیں۔ چنانچہ روایاتِ یہود میں یہاں تک نمرود کے بارے میں تصریح ملتی ہے کہ وہ اپنی تعظیم خدا ہی کی طرح کراتا تھا اور اپنے لیے اس نے عرشِ الٰہی تیار کیا تھا جس پر اجلاس کیا کرتا تھا۔ کلدانیوں کا ملکی اور قومی مذہب

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے وقت میں اصلاً شمس پرستی تھا۔ نمرود کلدانی فرعون مصری کی طرح اپنے کو اسی خدائے اعظم کا مظہر، بروزاور اوتار سمجھتا تھا اور اہل توحید کو اپنے ملک کا غدار و باغی سمجھتا تھا۔ نمرود نے بھی فرعون کی طرح حضرت ابراہیم سے دریافت کیا کہ تیرا رب کون ہے یعنی جس پروردگار کا تو ذکر کرتا ہے وہ کون ہے؟ حضرت ابراہیم نے جواب میں ارشاد فرمایا میرا رب وہ ہے جس کے قبضہ واختیار میں موت وحیات کی ساری قوتیں ہیں۔ یہ ایسی بات ہے جو سوال کا براہِ راست جواب بھی ہے، اس میں اس کے سارے تصورات کا بالواسطہ رد بھی ہے اور صرف دعویٰ نہیں بلکہ دعویٰ کے ساتھ اس کی خاموش دلیل بھی ہے۔

اس کے تمام تصورات کا ابطال کیسے ہوا؟ اس طرح کہ میں تیری گھڑی ہوئی ربوبیت کا قائل نہیں ہوں میں تو صرف اس ایک کی ربوبیت مانتا ہوں اور اس کی بندگی کرتا ہوں جو حیات بھی دیتا ہے اور حیات کو ختم کرنے کی طاقت بھی رکھتا ہے۔ وہی رہنمائے زندگی ہے۔ اس فقرے کی بلیغانہ جامعیت پر غور کرو احیاء اور اماتت سارے کارخانۂ ربوبیت کا سرچشمہ ہے۔ یہاں جو کچھ بھی ہے اس کے سوا کیا ہے کہ کائناتِ حیاتی کے بقاء وفنا کا ایک قانون ہے اور بس کسی بندے میں یہ طاقت نہیں ہے جو اس احیائی اور افنائی نظام میں تبدیلی کر سکے۔ یہاں وجود ہے اور وجود کی وہ معنوی قوتیں ہیں جو اسے قائم درباقی رکھتی ہیں اور قیام وعمل کی راہوں پر لگاتی ہیں اور یا پھر وجود نہیں ہے اور اس قیام وبقا کی ساری قوتیں ناپید ہو رہی ہیں۔ انہی دو حقیقتوں کو احیاء اور اماتت سے تعبیر کیا ہے۔

دعوے کے ساتھ دلیل کیوں کر ہے، احیاء اور اماتت کا یہ سارا نظام خود بخود نہیں چل رہا ہے حیات کے اس پھیلے ہوئے کارخانے کی پشت پر کسی ایسی ہستی کا ارادہ اس کی حکمت، کارسازی اور پروردگاری کام کر رہی ہے جو الحی ہے یعنی زندہ ہے اور اس کی زندگی کے لیے فنا نہیں ہے القیوم ہے یعنی ہر چیز اس کے حکم سے قائم ہے۔ وہ اپنے قیام کے لیے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اس کی حکومت سے کوئی گوشہ باہر نہیں۔ اس کے علم کے لیے کوئی شے مخفی نہیں۔ وہ غفلت سے منزہ اور نسیان سے پاک ہے۔ جس ذات نے اتنا بڑا کارخانۂ ربوبیت قائم کر رکھا ہے اس زندگی میں قانونی اور حاکمانہ ربوبیت بھی اسی کا حق ہے۔

نمرود کا طاغوتی جواب

۲۶۷۔ اس نے جواب میں کہا کہ جلانا اور مارنا تو میرے اختیار میں ہے، نمرود کے ذہن میں اقتدار کا خناس گھسا ہوا تھا۔ اس وجہ سے اس نے اس واضح حقیقت پر بھی یہ معارضہ کر دیا کہ موت اور زندگی پر تو اختیار میں بھی رکھتا ہوں، جس کا چاہوں سر قلم کر دوں جس کو چاہوں بخش دوں۔ ظاہر ہے کہ یہ معارضہ ایک

بالکل ہی احمقانہ ہے۔ آپ غور فرمائیں کہ ایک شخص کہتا ہے کہ اللہ کی ذات ممکنات کو ایجاد اور فنا کرنے والی ہے اور اس کے جواب میں کوئی احمق کہتا ہے کہ شہریوں کا رانسنگ سسٹم میرے قبضہ میں ہے۔ ان کی روشنی اور پانی کا انتظام میں کرتا ہوں۔ اس احیائی قوت کا میں مالک ہوں اور جب چاہوں ان راہوں پہ قدغن قائم کر کے میں شہریوں کو مار سکتا ہوں یا یوں کہے کہ قانون میرے ہاتھ میں ہے جسے چاہوں معاف کردوں اور جسے چاہوں مار ڈالوں۔ آپ ایسے سخافتِ عقل، سفاہت بلادت اور حماقت کے علاوہ کیا کہیں گے۔ حضرت ابراہیمؑ مناظر اور مجادل نہ تھا، داعی تھے۔ دعوت کی راہ تلقین و ہدایت کی راہ ہوتی ہے۔ جدل و خصومت کی راہ نہیں ہوتی۔ داعی کا یہ طریقہ نہیں ہوتا کہ مخاطب کو دلیلوں کے الجھاؤ میں پھنسا دے یا کسی خاص دلیل پر اڑ کر اُس کا ناطقہ بند کر دے بلکہ وہ چاہتا ہے کہ کسی نہ کسی طرح اس کے دل میں سچائی اتار دے۔ حضرت ابراہیم کی پہلی بات جب مخاطب کا دماغ ہضم نہ کر سکا تو انھوں نے فوراً دوسری بات پیش کردی جو اس کی دماغی استعداد کے بالکل مطابق تھی۔

نمرود اور فرعون کی دماغی استعداد

اس سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہوگیا کہ نمرود کے زمانہ میں انسان کی عقلی استعداد اس قدر بالغ نہیں ہوئی تھی جتنی فرعون کے زمانہ میں ہوگئی تھی۔ فرعون نے حضرت موسیٰؑ سے یہی سوال کیا تھا کہ فمن ربکما یا موسیٰ؟ اس سوال کا جو بلیغ جواب حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو دیا ہے وہ اس جواب سے زیادہ دقیق ہے جو حضرت ابراہیمؑ نے نمرود کو دیا۔ حضرت موسیٰؑ نے فرمایا

ربنا الذی اعطیٰ کل شیٔ خلقہ ثم ھدیٰ

ہمارا رب وہ ہے جس نے ہر چیز کو اس کی خلقت بخشی پھر اس پر زندگی و عمل کی راہ کھول دی۔

دونوں پیغمبروں کے جواب سے آپ دونوں کے مخاطبوں کی عقلی اور دماغی استعداد کا فرق معلوم کرسکتے ہیں۔ بلاشبہ علمی لحاظ سے حضرت موسیٰؑ نے جو جواب دیا ہے وہ زیادہ دقیق ہے۔ دونوں کے مخاطبوں کے تصورات ایک ہیں مگر چونکہ دونوں کی دماغی استعداد مختلف ہے اس لیے جواب مختلف ہے۔

حضرت ابراہیمؑ کا حکیمانہ جواب

۷۶۳۔ اس پر ابراہیم نے فرمایا تو پھر اللہ تو سورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو ذرا اسے مغرب سے نکال لا۔ یہاں دراصل جملہ محذوف ہے اور حذف فا اسی محذوف جملہ کی نشاندہی کر رہی ہے۔ یعنی تو اگر اپنے

دعویٰ قدرت اور تصرف میں کچھ بھی سچائی رکھتا ہے تو کائنات حیاتی نہ سہی کائنات طبعی کے خدائی نظام میں اتنا تصرف کر دے کہ سورج کو مشرق کے بجائے مغرب سے نکال دے۔

حضرت ابراہیمؑ کے اس جواب میں بلاغت یہ ہے کہ سورج کلدانیوں کے عقیدے کے مطابق معبودِ اعظم تھا اور نمرود سورج دیوتا کا اوتار تھا۔ اسی کی مثال کو اور زیادہ قریب الفہم بنانے کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے پیش کر دیا گویا اس میں نمرود پر بہترین گرفت تھی[1] اصل یہ ہے کہ نمرود مشرک تھا۔ خدا کے وجود اور اس کی ہستی کا منکر نہ تھا اور سورج کے طلوع و غروب کو اللہ کے حکم کے تابع سمجھتا تھا۔ اس لیے حضرت ابراہیمؑ نے اس کے سامنے آفتاب کا ذکر کر دیا۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضرت ابراہیمؑ کا سورج کے استدلال سے منشا یہ ہو کہ کارخانۂ حیات و ممات کا تمام نظم میرے پروردگار کے اختیار میں ہے۔ احیاء اور اماتت اسی کے قبضہ میں ہے۔ اس احمق نے استدلال کے ایک مقدمہ پر اعتراض کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ نے اس اعتراض کی روک تھام اس طرح فرمائی کہ اگر احیاء و اماتت تیرے قبضہ میں ہے تو آفتاب روزانہ ہمارے افق پر مشرق سے نکل کر زندہ ہوتا ہے اور روزانہ مغرب میں ڈوب کر مر جاتا ہے۔ آفتاب کے غروب کو مرنا اور طلوع کو زندہ ہونا محاورہ ہے۔ حدیث میں الشمس حیۃ کی تعبیر آئی ہے۔ حضرت ابراہیمؑ نے فرمایا اگر تیرا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ تو بھی احیاء و اماتت کا مالک ہے تو ذرا آفتاب کو مرتے ہی زندہ کر دے جس وقت آفتاب مر رہا ہو اور مغرب کے افق میں دفن ہو رہا ہو تو اسی وقت اس کو زندہ کر کے واپس لے آ۔ اب یہ گویا پہلی دلیل کی توضیح ہوئی دوسری دلیل نہیں ہے اور احیاء اماتت کی یہ توضیح اس کی دماغی استعداد کے بالکل مطابق بیٹھی۔

حضرت ابراہیم اگر چاہتے تو احیاء و اماتت کے بارے میں اس کی غلط فہمی کو دور کر دیتے لیکن انھوں نے محسوس کر لیا کہ واضح بات پر اس قسم کا احمقانہ معارضہ وہی کر سکتا ہے جو دماغی استعداد سے قطعی محروم ہو اس لیے انھوں نے احیاء و اماتت کی ایسی واضح مثال پیش فرما دی جو اس کے نزدیک مسلم تھی اور جس سے بحث کا دروازہ بند ہو گیا۔

اب اس شبہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ نمرود یہ کہہ سکتا تھا کہ اگر خدا موجود ہے تو وہ ہی مغرب سے نکال دے کیونکہ نمرود خدا کی ہستی کا منکر نہ تھا۔ اس کا اللہ کے وجود میں حضرت ابراہیم علیہ السلام سے کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ اس کو اگر اختلاف تھا تو اللہ کی ربوبیت میں تھا۔

۴۶۷۔ یہ جواب سن کر وہ کافر ہکا بکا رہ گیا۔ اگرچہ حضرت ابراہیم کے پہلے ہی فقرے سے یہ بات واضح ہو چکی تھی کہ رب اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے تاہم نمرود اس کا ڈھٹائی سے جواب دے گیا لیکن دوسرے فقرے

---

[1] ماجدی

کے بعد اس کے لیے مزید ڈھٹائی سے کچھ کہنا مشکل ہو گیا۔ وہ خود بھی جانتا تھا کہ آفتاب و ماہتاب اسی خدا کے زیر فرمان ہیں جس کو ابراہیم رب مان رہا ہے۔ پھر وہ کہتا تو آخر کیا کہتا مگر اس طرح جو حقیقت اس کے سامنے بے نقاب ہو رہی تھی اس کو تسلیم کر لینے کے معنے یہ تھے کہ اپنی مطلق العنان فرمانروائی سے دست بردار ہو جائے جس کے لیے یہ طاغوت تیار نہ تھا لہٰذا وہ صرف ششدر ہو کر رہ گیا۔ خود پرستی کی تاریکی سے نکل کر حق پرستی کی روشنی میں نہ آیا سلہ

ظلم کار کی ہدایت سے محرومی

۷۶۵۔ اور اللہ ظالموں پر ہدایت کا دروازہ نہیں کھولتا۔ اس فقرے میں ایک اصولی قاعدہ بتایا گیا ہے کہ جو لوگ اللہ کی نعمتوں اور اس کی بخشی ہوئی قوتوں اور صلاحیتوں کو بیجا استعمال کرتے ہیں، جو اللہ کے انعامات کو اس کا فضل قرار دینے کے بجائے ان کو اپنا حق سمجھتے ہیں۔ جو نعمتوں پر خدائے منعم کے شکر گزار ہونے کے بجائے غرور اور گھمنڈ میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ جو خدا کی بندگی اور فرماں برداری کے بجائے اپنی خدائی کا تخت بچھاتے ہیں اور اپنے کو رب ٹھہراتے ہیں۔ ان پر ہدایت کی راہ نہیں کھلتی۔ ایسے لوگوں کے سامنے حق کتنا ہی واضح ہو جائے وہ اس کو قبول کرنے کے بجائے بحث اور کٹ حجتی کیا کرتے ہیں سلہ

آیئے اب حضرت شیخ الہند کا ارشاد گرامی بھی پوری آیت پر پڑھ لیجئے۔

پہلی آیت میں اہل ایمان اور اہل کفر اور ان کے نور ہدایت اور ظلمت کفر کا ذکر تھا اب اس کی تائید میں چند نظائر بیان فرماتے ہیں۔ نظیر اول میں نمرود بادشاہ کا ذکر ہے وہ اپنے آپ کو سلطنت کے غرور میں سجدہ کراتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس کے سامنے سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ نمرود نے سجدہ نہ کرنے کی وجہ دریافت کی تو فرمایا کہ اپنے رب کے سوا سجدہ کسی کو نہیں کرتا۔ اس نے کہا کہ رب میں ہوں انھوں نے جواب دیا کہ میں تجھے رب نہیں کہتا رب وہ ہے جو جلاتا ہے اور مارتا ہے۔ نمرود نے دو قیدی منگا کر بے قصور کو مار ڈالا اور قصوروار کو چھوڑ دیا اور بولا کہ دیکھا جس کو میں چاہوں مارتا ہوں اور جسے میں چاہوں نہیں مارتا ہوں۔ اس پر حضرت ابراہیم نے آفتاب کی دلیل پیش فرمائی۔ اس مغرور احمق کو لاجواب کیا اور اس کو ہدایت نہ ہوئی۔ یعنی لاجواب ہو کر بھی ارشاد ابراہیم پر ایمان نہ لایا۔ یا یوں کہو حضرت ابراہیم کی دوسری بات کا کوئی جواب نہ دے سکا حالانکہ جیسا جواب پہلے ارشاد کا دیا تھا ویسا جواب دینے کی یہاں بھی گنجائش تھی۔

سلہ تفہیم القرآن

اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا ۚ قَالَ اَنّٰی یُحْیٖ
هٰذِهِ اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا ۚ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَةَ عَامٍ ثُمَّ بَعَثَهٗ ؕ قَالَ
كَمْ لَبِثْتَ ؕ قَالَ لَبِثْتُ یَوْمًا اَوْ بَعْضَ یَوْمٍ ؕ قَالَ بَلْ لَّبِثْتَ مِائَةَ
عَامٍ فَانْظُرْ اِلٰی طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ لَمْ یَتَسَنَّهْ ۚ وَانْظُرْ اِلٰی
حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَكَ اٰیَةً لِّلنَّاسِ وَانْظُرْ اِلَی الْعِظَامِ كَیْفَ
نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا ؕ فَلَمَّا تَبَیَّنَ لَهٗ ۙ قَالَ اَعْلَمُ اَنَّ اللّٰهَ
عَلٰی كُلِّ شَیْءٍ قَدِیْرٌ ﴿۲۵۹﴾

یا جیسے وہ شخص جو ایک بستی پر گزرا جس کی مکانوں کی چھتیں گری ہوئی تھیں اور گری ہوئی چھتوں پر در و دیوار کا ملبہ پڑا تھا وہ بول پڑا جس بستی کی ویرانی کا یہ عالم ہے کیوں کر یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ اسے موت کے بعد زندگی سے ہمدوش کرے یعنی دوبارہ آباد کرے۔ پھر اللہ نے اس شخص پر سو سال کے لیے موت طاری کر دی پھر اُسے اٹھایا اور دریافت کیا کہ کتنی دیر اس حالت میں رہے ہو؟ بولے کہ ایک روز یا ایک روز کا کچھ حصہ، ارشاد ہوا نہیں بلکہ تم نے سو سال اس حالت میں گزارے ہیں۔ اپنے کھانے اور پانی پر نظر ڈالو کہ

ان میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے یعنی برسوں پڑے رہنے کی ان میں کوئی علامت نہیں ہے۔ اور اپنے گدھے پر بھی ایک نظر ڈالو کہ وہ کس حالت میں ہے اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے نشانی بنا دیں۔ اور ہڈیوں کے اس پنجر کو دیکھو کہ ہم کس طرح ان کا ڈھانچہ بنا کر اٹھاتے ہیں اور پھر کیسے اس ڈھانچے پر گوشت کا غلاف چڑھاتے ہیں۔ اس طرح اس کے سامنے جب حقیقت کھل کر سامنے آ گئی تو بول پڑا کہ میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ اللہ کی ذات ہر چیز پر قدرت رکھتی ہے۔

واقعاتی تقابل کی دوسری مثال

پہلی مثال میں صاحب ایمان کے مقابلہ میں طاغوت کو پیش کر کے بتایا تھا کہ اللہ کیسے اہل ایمان کی مدد کرتا ہے۔ اس دوسری مثال میں مقابلے پر خود طاغوت نہیں لیکن طاغوت کے ایسے ہمہ گیر اثرات ہیں جن کی قرآن نے وهی خاویة علی عروشها میں منظرکشی کی ہے اور یہ بربادی نتیجہ ہے بخت نصر کی قاہرانہ اور جابرانہ طاقت کے مظاہرے کا۔ قرآن اس واقعہ کو پیش کر کے یہ بتانا چاہتا ہے کہ یہاں بھی حالات کی ساری ناسازگاری کے باوجود اللہ کی ولایت نے اپنا کام کیا۔ یہ بھی صاحب دعوت پیغمبر ہیں اور حضرت ابراہیم بھی اللہ کے صاحب عزیمت پیغمبر ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے واقعہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا طاغوت کی عقلیت سے مقابلہ ہے اور یہاں طاغوت کی عقلیت سے نہیں بلکہ طاغوت کی قوت و جبروت کے مظاہر سے مقابلہ ہے۔ وہاں نمرود کے مقابلے میں اہل حق میں ابراہیمؑ کے سوا کوئی نہیں ہے اور یہاں نبی کے ساتھ حق کو ماننے والوں کی عددی طاقت موجود ہے مگر بخت نصر کی طاغوتی قوت نے ان کو بے بس کر رکھ دیا ہے حتیٰ کہ وقت کے پیغمبر کو بھی اس نے قید کر لیا ہے۔

واقعہ کی شخصیت

۲۶۶ ۔ جیسے وہ شخص جو ایک بستی پر گزرا۔ یہاں دو باتیں تشریح طلب ہیں۔ ایک کہ یہ شخص کون ہے، دوسرے یہ کہ بستی سے کون سی بستی مراد ہے۔

وہ شخص حضرت عزیر تھے اور تمام توریت ان کو یاد تھی بخت نصر کافر بادشاہ تھا۔ اس نے بیت المقدس کو ویران کیا اور بنی اسرائیل کے بہت آدمیوں کو قید کر کے لے گیا۔ ان میں حضرت عزیر بھی تھے۔ جب قید سے رہا ہو کر آئے تب حضرت عزیرؑ نے راستہ میں ایک شہر دیکھا۔ ویران اس کی عمارت گری ہوئی تھی۔ دیکھ کر اپنے جی میں کہا کہ یہاں کے رہنے والے سب مر گئے کیونکر حق تعالیٰ ان کو جلائے اور یہ شہر پھر سے آباد ہو۔ اسی جگہ ان کی روح قبض ہوئی اور ان کی سواری کا گدھا بھی مر گیا۔ سو برس تک اسی حال میں رہے کسی کو خبر نہ ہوئی۔ اس عرصہ میں بخت نصر بھی مر گیا اور کسی بادشاہ نے اس عرصہ میں بیت المقدس کو آباد کیا اور اس شہر کو بھی خوب آباد کیا پھر سو برس کے بعد حضرت عزیر زندہ کیے گئے۔ ان کا کھانا پینا اسی طرح پاس رکھا ہوا تھا ان کا گدھا جو مر چکا تھا اور اس کی بوسیدہ ہڈیاں اپنی حالت پر تھیں۔ وہ ان کے روبرو زندہ کیا گیا اور اس سو برس میں بنی اسرائیل قید سے خلاص ہو کر شہر میں آباد ہو چکے تھے۔ حضرت عزیر نے زندہ ہو کر آبادہی دیکھا[1]۔

واقعہ کی تاریخی حیثیت

مشہور یہی ہے کہ یہ شخص جس کا واقعہ یہاں بیان ہو رہا ہے حضرت عزیر علیہ السلام ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ نے ان کو حکم فرمایا تھا کہ تم یروشلم جاؤ ہم اس کو دوبارہ آباد کریں گے۔ حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن سلام اور قتادہ، سلیمان اور حسن کا رجحان یہی ہے کہ یہ واقعہ حضرت عزیر سے متعلق ہے۔ (ابن کثیر)

اور وھب بن منبہ اور عبداللہ بن عبید کا کہنا یہ ہے کہ یہ شخص حضرت برمیاہ نبی تھے ابن جریر طبری نے اسی کو ترجیح دی ہے اور ہمارے نزدیک یہی راجح ہے۔ کیونکہ جب قرآن نے اس ہستی کا نام ذکر نہیں کیا اور نبی معصوم صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موضوع پر کوئی صحیح روایت موجود نہیں ہے اور صحابہ و تابعین سے جو آثار منقول ہیں ان کا ماخذ بھی وہ روایات و اقوال ہیں جو وہب بن منبہ، کعب احبار اور حضرت عبداللہ بن سلام

---

[1] افادات شیخ الہند

تک پہنچتے ہیں اور انھوں نے جن کو اسرائیلی واقعات سے نقل کر کے بیان کیا ہے تو اب واقعہ سے متعلق شخصیت کی تحقیق کے لیے صرف ایک ہی راہ باقی رہ جاتی ہے کہ تورات اور تاریخی مصادر سے اس کو حل کیا جائے تو اس حقیقت کے پیشِ نظر جب ہم تورات کے مجموعہ صحائفِ انبیاء اور تاریخی بیانات پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ

بنی اسرائیل کی سرکشی اور شرارت حد سے تجاوز کر چکی ہے اور ظلم و فساد کا بازار گرم ہے کہ خدا کی جانب سے اس زمانہ کے پیغمبر یرمیاہ علیہ السلام پر وحی آتی ہے کہ بنی اسرائیل میں منادی کر دو کہ ان حرکات سے باز آجاؤ ورنہ گزشتہ قوموں کی طرح ان کو تباہ و برباد کر دیا جائے گا۔ یرمیاہ علیہ السلام نے جب خدا کا پیغام بنی اسرائیل کو پہنچایا تو انھوں نے کوئی اثر قبول نہ کیا اور ظلم و شرارت میں اور چھوٹ ہو گئے بلکہ یرمیاہ علیہ السلام کے ساتھ مذاق شروع کر دیا اور ان کو قید میں ڈال دیا۔ اس حالت میں بھی یرمیاہ نے ان کو بتایا کہ وہ بابل کے بادشاہ کے ہاتھوں برباد ہوں گے اور ان کو قید کر کے بابل لے جایا جائے گا۔ اور یروشلم کو مٹایا جائے گا۔ (یرمیاہ نبی کا صحیفہ)

تقریباً ساتویں صدی قبل مسیح کا وسط تھا کہ بابل میں بخت نصر کا ظہور ہوا۔ اور اس نے اپنی قاہرانہ و جابرانہ طاقت سے قرب و جوار کی تمام حکومتوں کو مسخر اور زیر کر لیا اور تھوڑے عرصہ میں اس نے فلسطین پر پے در پے تین حملے کیے۔ بنی اسرائیل کو شکست فاش دی اور یروشلم اور فلسطین کے تمام علاقے کو برباد کر ڈالا اور تمام بنی اسرائیل کو قید کر کے بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکتا ہوا بابل لے گیا اور تورات کے تمام نسخوں کو خاکستر کر دیا ایک نسخہ بھی اسرائیلیوں کے ہاتھ میں محفوظ باقی نہ رہا۔ جب بخت نصر اسرائیلی گھرانوں کو قید کر کے غلام بنا رہا تھا تو کسی شخص نے اس سے یہ کہا کہ یہاں ایک یرمیاہ نامی زندان میں قید ہے۔ اس نے تیرے اس حملے سے پہلے ان سب حالات کے بارے میں پیشین گوئی کر کے بنی اسرائیل کو ڈرا دیا تھا مگر اس کی قوم نے اس کی بات پر کان نہ دھرا اور اس کو قید کر دیا۔ بخت نصر نے یہ سنا تو یرمیاہ علیہ السلام کو قید خانے سے باہر نکالا اور ان سے بات چیت کرتا رہا۔ یرمیاہ کی علم و دانش سے مسحور گفتگو کو سن کر اس نے خواہش کی کہ وہ بھی اس کے ساتھ بابل چلیں۔ وہ ان کو احترام سے رکھے گا۔ مگر حضرت یرمیاہ نے اس کی خواہش کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ جبکہ میری قوم اس ذلت کے ساتھ بابل جا رہی ہو۔ میں اس عزت کے مقابلہ میں اپنی موجودہ حالت کو ترجیح دیتا ہوں۔ (دیکھو البدایہ والنہایہ تاریخ ابن خلدون)

یرمیاہ نبی کے صحیفے میں ہے کہ انھوں نے وہیں بیٹھ کر بابل میں اسرائیلیوں کو یہ پیشین گوئی لکھ کر روانہ کر دی کہ بنی اسرائیل ستر سال بابل میں اس ذلت و خواری کے ساتھ غلام رہیں گے۔ اس کے بعد پھر وہ اپنے وطن آ کر بسیں گے۔

چنانچہ بخت نصر کی ہلاکت کے عرصہ دراز کے بعد جب تقریباً ۵۳۹ ق م میں فارس کے بادشاہ کے خسرو نے بابل کے بادشاہ بیل شاہ زار کو شکست دے کر فارس کو اس کے بے پناہ مظالم سے نجات دلائی تو اسی زمانہ میں اس نے بنی اسرائیل کو بھی آزاد کیا۔ یروشلم اور ہیکل کی تعمیر کرائی۔

خسرو فتح بابل کے بعد تقریباً دس برس زندہ رہا اسی دوران میں بنی اسرائیل آزاد ہو کر بیت المقدس کی تعمیر میں مشغول ہوئے مگر یہ تعمیر اس کی زندگی میں مکمل نہ ہو سکی۔ کے خسرو کے بعد دارا اور دارا کے بعد ارد شیر کے زمانے میں وہ اس کو مکمل کر سکے۔ اور یروشلم کو تباہ کرنے اور کے خسرو سے لے کر ارد شیر کے زمانے تک دوبارہ اس کے مکمل آباد ہو جانے کے درمیان جو ایک طویل مدت ہے وہی وقفہ ہے جس پر ارمیاہ علیہ السلام کو وہ واقعہ پیش آیا جس کا اس آیت میں ذکر ہو رہا ہے۔

قرآن سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جب حضرت یرمیاہ نے بخت نصر کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا اور وہ بیت المقدس کی اس تباہ حالی سے گھبرا کر دور کسی جنگل میں گوشہ گیر ہو گئے تو اللہ تعالیٰ نے بذریعہ وحی ان کو یہ حکم دیا ہو گا کہ وہ اسی ویرانہ میں رہ کر کام کریں جو آج اگرچہ وھی خاویۃ علی عروشھا اور بنی اسرائیل کی بدکاریوں کی وجہ سے تباہ و برباد ہے مگر ہمیشہ سے انبیاء کی مقدس سرزمین ہے اور یہ بھی فرمایا ہو گا کہ ہم اس بستی کو دوبارہ زندگی دیں گے اور اقتدار اہل حق کے ہاتھ میں آئے گا۔ حضرت یرمیاہ خدا کے حکم سے جب وہاں پہنچے اور ان کی نگاہوں میں اس کی بربادی کا نقشہ آیا تو انھوں نے دعوت میں اپنی انفرادی محنت اور حالات کی ناسازگاری کو دیکھ کر از راہ حیرت دل میں یا زبان سے یہ بات کہی ہو گی کہ اب کون سے اسباب ہوں گے جن کے ذریعے اللہ سبحانہٗ اس مردہ بستی کو زندگی مرحمت فرمائیں گے۔

واقعات و حوادث کی اس پوری مدت میں حضرت یرمیاہ علیہ السلام کی عمر کا تخمینہ تقریباً ڈیڑھ سو سال ہوتا ہے اور یہ مدت اس زمانے کی طبعی عمر کے لحاظ سے کوئی تعجب خیز نہیں ہے۔

اس تحقیق کی تائید حضرت یسعیاہ علیہ السلام کی اس پیشین گوئی سے بھی ہوتی ہے جو انھوں نے سائرس نجات دہندہ بنی اسرائیل کے متعلق ڈیڑھ سو سال پہلے کی تھی۔ کیونکہ یسعیاہ نبی کے انتقال سے متصل ہی یرمیاہ علیہ السلام کا ظہور ہوا لہٰذا نجات بنی اسرائیل کی درمیانی مدت کا معاملہ ان ہی کے ساتھ پیش آ سکتا ہے۔ اس کے برعکس حضرت عزیر علیہ السلام کی حیات طیبہ کے متعلق جو تفصیلات تورات اور اسرائیلیات میں منقول ہیں ان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ بابل کی اسارت کے زمانے میں وہ صغیر سن تھے اور اسرائیلیوں کے ساتھ بابل ہی میں رہے۔ چالیس برس کی عمر میں فقیہ تسلیم کر لیے گئے اور وہیں منصب نبوت پر سرفراز ہوئے اور یروشلم کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالنے والوں کے خلاف دارا اور ارد شیر کے درباروں میں جس وفد نے کوشش

کی ان میں بھی حضرت عزیر پیش پیش رہے ہیں اور تورات کے ناپید ہوجانے کے بعد اس کی تجدید ان ہی کے فیضان نبوت کا اثر ہے۔

غرض بنی اسرائیل کی اسیری بابل سے لے کر رہائی اور تعمیر و آبادی بیت المقدس تک کی درمیانی مدت میں حضرت عزیر علیہ السلام بنی اسرائیل کے ساتھ ساتھ نظر آتے ہیں ۔۔۔۔ یہ ہیں وہ شواہد و قرائن جن کی وجہ سے ہم نے مفسرین کے راجح قول کو مرجوح اور مرجوح کو راجح کہنے کی جسارت کی ہے۔ واللہ اعلم بحقیقۃ الحال [1]

حضرت یرمیاہ کا استعجاب

۷۶۷۔ وہ بول پڑا کہ جس بستی کی ویرانی کا یہ عالم ہے کیونکر ہو سکتا ہے کہ اللہ اسے موت کے بعد زندگی سے ہمدوش کرے یعنی دوبارہ آباد کرے۔ یہ سوال انکار کی نوعیت کا نہیں ہے بلکہ اس کی حیثیت استعجاب اور حیرت کی ہے اور یہ حیرت بھی اللہ سبحانہ کی قوت فاعلی میں نہیں بلکہ مفعول کی قوت قابلی میں ہے۔ اسی بنا پر فقرے میں فاعل سے مفعول پہلے لائے ہیں یعنی ھذہ جیسا کہ علامہ آلوسی نے تصریح کی ہے اور ھذہ اس کا مشار الیہ قریہ یعنی بستی ہے۔ اگر اشارہ بستی کی طرف ہے اور یہی ظاہر ہے تو اس کا صاف مطلب ہے کہ آیت میں لفظ احیاء اپنے حقیقی معنے میں نہیں بلکہ مجازی معنے میں ہے جیسا کہ استجیبوا لله وللرسول اذا دعاکم لما یحییکم میں احیاء سے احیاء مجازی مراد ہے۔ یعنی بستی کی زندگی سے اس کی آباد کاری اور اس کی موت سے بستی کی بربادی مقصود ہے۔ اگر یہی مطلب ہے تو پھر سوال کی نوعیت افسوس کی اور آباد کاری کے لیے اظہار شوق کی ہے۔ اس میں قیامت میں مردوں کے انکار یا اس پر حیرت کا کوئی دور کا بھی اشارا نہیں ہے۔

بابل کے حملہ نے صرف اسرائیل کی آبادیوں ہی کو پامال نہیں کیا تھا بلکہ بنی اسرائیل کی نسل و قومیت ہلاک و منتشر ہو گئی تھی۔ لیکن ایک صدی کے بعد گردش زمانہ نے پھر پلٹا کھایا اور کارساز قدرت نے وقت کی سب سے بڑی فاتح شہنشاہیت کو ان کی اعانت و دستگیری کے لیے کھڑا کر دیا یعنی شہنشاہ فارس کو۔ اب اسرائیل کی تمام بستیاں پھر آباد ہو گئیں اور یہودی قومیت کا جسم مردہ پھر زندہ ہو گیا۔

غرض بیت المقدس کی ویرانی کا یہ منظر دیکھ کر حضرت یرمیاہ کے دل میں یا زبان پر یہ سوال آگیا کہ انی یحیی ھذہ الله بعد موتھا؟ قرآن کہتا ہے کہ اللہ نے یرمیاہ علیہ السلام کو اس کا نظریاتی نہیں بلکہ عملی جواب دیا۔

---

[1] قصص القرآن

یرمیاہ کی موت اور بعثت

۷۶۸۔ پس اللہ نے اس پر سو سال کے لیے موت طاری کر دی پھر اسے اٹھایا۔ دوبارہ زندگی کے لیے احیار کی تعبیر چھوڑ کر بعثت کی تعبیر میں گہری معنویت ہے بتانا یہ چاہتے ہیں کہ زندہ ہونے والے دن ویسے ہی اُٹھ کھڑے ہوئے جیسے وفات کے وقت تھے۔ عقل و فہم ویسی ہی موجود تھی۔ نظر و استدلال کی وہی بھرپور صلاحیت تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ موت آئی تھی تو بستی کے ہولناک مناظر تھے اور اٹھے تو آباد کاری، شہری زندگی کی شادابی جوبن پر تھی، جو بستی اس طرح تباہ ہو چکی تھی کہ اس کی تعمیر کا وہم و گمان بھی نہیں کیا جا سکتا تھا۔ اس وقت مشیت الٰہی سے ایسا ہوا کہ وقت کی بہت بڑی شہنشاہی کے دل اس طرف متوجہ ہو گئے اور بغیر اس کے کہ تاج و تخت اور لشکر و اسلحہ میں سے کوئی چیز انہیں میسر ہو خود بخود ان کا مُردہ شہر مُردہ، ہیکل اور مُردہ جماعت کی دوبارہ زندگی کا سامان ہو گیا۔ اگرچہ ہمارے مفسرین نے اس کی آباد کاری کا پس منظر ایک خواب کو قرار دیا ہے جو سائرس فارس کے شہنشاہ نے دیکھا جسے روایات میں کوشک کہا گیا جو خورس کی بگڑی ہوئی شکل ہے جسے ہم سائرس کہتے ہیں لیکن صرف خواب ہی کی بات نہیں بلکہ معاملہ خواب سے زیادہ ہے۔ تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ جب سائرس نے بابل فتح کیا تو دانیال نبی جو شاہانِ بابل کے وزراء میں شامل ہو گئے تھے اسے یسعیاہ نبی کی پیشین گوئی دکھائی کہ ۱۶۰ سو سال پہلے اس کے ظہور کی خبر دے دی گئی ہے۔ یہ بات دیکھ کر سائرس بیحد متاثر ہوا۔ اور بیان کیا جاتا ہے کہ اسی کا نتیجہ وہ فرمان تھا جو اس نے تعمیر ہیکل کے لیے جاری کیا۔

تورات کی شہادت یہ ہے کہ سائرس کا ظہور اور بابل کی فتح بنی اسرائیل کے لیے زندگی اور خوشحالی کا نیا پیغام تھا اور یہ ٹھیک اسی طرح ظہور میں آئی جس طرح یسعیاہ نبی نے ایک سو ساٹھ برس پہلے اور یرمیاہ نے سو برس پہلے وحی الٰہی سے مطلع ہو کر خبر دے دی تھی۔ چنانچہ سائرس نے دانیال نبی کی نہایت توقیر کی۔ یہودیوں کو یروشلم میں بسنے کی اجازت دے دی۔ نیز اپنی تمام مملکت میں اعلان کر دیا کہ خدا نے مجھے حکم دیا ہے کہ یروشلم میں اس کے لیے ہیکل بناؤں۔ لہٰذا تمام لوگوں کو ہر طرح کا سامان اس کے لیے مہیا کرنا چاہیے۔ اس نے سونے چاندی کے وہ تمام ظروف جو بخت نصر ہیکل سے لوٹ مار کر کے لایا تھا۔ بابل کے خزانہ سے نکلوائے اور یہودیوں کے ایک امیر شیش نصر کے حوالے کر دیئے کہ ہیکل کی تعمیر کے بعد بدستور اس میں رکھ دیئے جائیں[1]۔ اس تمام صورتحال کو پوری ایک صدی گزر گئی، سو سال بعد جب حضرت یرمیاہ علیہ السّلام اٹھا لیے گئے تو پھر کیا ہوا اسی

---

[1] عزرا باب اوّل

اُٹھے ہوئے سوال کا قرآن نے جواب دیا ہے۔

ایک سو سال کی موت

۷۶۹۔ اللہ نے دریافت فرمایا بولو کتنی دیر اس حالت میں رہے ہو بولے کہ ایک روز یا ایک روز کا کچھ حصہ ارشاد ہوا نہیں بلکہ تم نے سو سال کا عرصہ گزارا ہے۔ سو سال کی تعبیر کا منطوق تو یہی ہے کہ ریمیاہ پر سو سال تک موت طاری رہی ہے لیکن اس مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ بیت المقدس کی تعمیر دوبارہ پورے ایک سو سال بعد ہوئی۔ دن کا کچھ حصہ فرمایا کیونکہ جب مرے تھے اس وقت کچھ دن چڑھا تھا اور جب زندہ ہوئے تو ابھی شام نہ ہوئی تھی تو یہ سمجھے کہ اگر میں یہاں کل آیا تھا تو ایک دن ہوا اور اگر آج بھی آیا تھا تو دن سے ہی کم رہا۔ [1]

قدرت کی پہلی نشانی

۷۷۰۔ اپنے کھانے پینے پر نظر ڈالو کہ ان میں ذرا تغیر نہیں آیا ہے یعنی ایک سو سال تک پڑے رہنے کی اس میں کوئی نشانی نہیں ہے۔ یہ گویا اس بات کی نظیر پیش کی گئی ہے کہ اتنی مدت کے باوجود جیسے تمہارے کھانے میں کوئی تغیر نہیں آیا ایسے ہی اتنا عرصہ گزر جانے کے باوجود تمہارے اندر بھی کوئی تبدیلی نہیں آئی ہے۔ فقہاء مفسرین نے اس جواب سے یہ نکتہ خوب نکالا ہے کہ اس میں اجتہاد کے لیے جواز کا پروانہ مل رہا ہے اور نظیر ہے اس کی کہ اللہ سبحانہ جس چیز کو جتنی مدت چاہے محفوظ رکھ سکتا ہے۔ انسانی عقل و فہم مادی مثالوں اور نظیروں کی ہمیشہ حریص رہتی ہے اس لیے مادی مثال پیش فرما دی کہ اگر تم کو یہ شبہ ہو کہ باوجود اتنی طویل مدت گزرنے کے تمہارے جسم میں کوئی تغیر کیوں نہیں ہوا تو اپنے کھانے اور پینے کی چیز کو دیکھ لو کہ باوجود اتنی طویل مدت گزر جانے کے ان میں ذرہ برابر تغیر نہیں ہوا حالانکہ کھانے پینے کی چیزیں بہت جلد تغیر آجاتا ہے اور موسم گرما میں تو صبح کا کھانا شام ہی تک خراب ہو جاتا ہے، لہذا جو ذات گرامی کھانے پینے کی چیز کو اتنا عرصہ تغیر سے محفوظ رکھ سکتی ہے وہ تمہارے جسم کو بھی ہر قسم کی تبدیلی سے بچا سکتی ہے۔

قدرت کی دوسری نشانی

۷۷۱۔ اور اپنے گدھے پر ایک نظر ڈالو کہ وہ کس حالت میں ہے کہ وہ گل سڑ کر ریزہ ریزہ ہو چکا ہے اور

[1] افادات شیخ الہند

ہڈیاں بھی اس قدر بوسیدہ ہو چکی ہیں کہ ہاتھ لگنے کی بھی تاب نہیں ہے۔ یہاں کچھ لفظ حذف کر دیئے گئے ہیں اصل عبارت یوں بھی کہ اپنے گدھے پر نظر ڈالو کہ ہم اسے کس طرح زندہ کرتے ہیں۔ اور یہ اس لیے حذف کیا گیا ہے کہ آگے زندہ کرنے کی عملی صورت کا ذکر آ رہا ہے۔ یہ گدھا حضرت ارمیاہ کی سواری تھی۔ جیسا کہ شام، مصر اور فلسطین میں گدھے سے سواری کا کام گھوڑے ہی کی طرح لیا جاتا تھا۔ تورات اور انجیل دونوں میں گدھے کا ذکر سواری کے جانور کی حیثیت سے بکثرت آیا ہے۔ حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح علیہم السلام کا اس پر سوار ہونا مذکور ہے۔ فقرے میں لفظ اُنظر یعنی دیکھو اور نظر ڈالو کو مکرر لے کر آنا اس کی واضح دلیل ہے کہ کھانے اور گدھے پر نظروں کی نوعیت میں اختلاف ہے۔ کھانے پر نظر کی نوعیت یہ تھی کہ دیکھو وہ خراب نہیں ہوا اور گدھے پر نظر اس حیثیت سے ہے کہ دیکھو وہ خراب ہو چکا ہے اس کی صرف ہڈیاں باقی ہیں۔ پہلی بات کو حضرت ارمیاہ کے جسمانی بقاء کے لیے نظیر بنایا گیا ہے جبکہ گدھے کو اصل مسئلہ سمجھانے کے لیے مار دیا گیا ہے۔ اصل مسئلہ تو یہی ہے کہ انی یحیی ھٰذہ اللہ بعد موتھا۔ بغیر اسباب و وسائل، بغیر اقتدار، بغیر تاج و تخت اور بغیر لشکر اور اسلحہ کے خود بخود یہ مردہ شہر کیوں کر زندگی سے ہمدوش ہو جائے گا۔ اسی مسئلہ کو عملی طور پر سمجھانے کے لیے گدھے کو مار دیا گیا ہے۔ اب اس کی ہڈیوں کا صرف پنجر باقی ہے۔ لیکن اصل مسئلہ سمجھانے سے پہلے درمیان میں ایک اور مسئلہ کی طرف خاص طور پر اچانک اشارہ کر دیا۔ اور وہ مسئلہ بعث بعد الموت کا ہے جو تمام انبیاء کی دعوتوں کا مرکزی نقطہ ہے۔ اور ادیانِ عالم کے بنیادی عقائد میں سے ایک عقیدہ ہے۔

برہان بعث بعد الموت

۲۷۷ ۔ اور یہ ہم نے اس لیے کیا ہے تاکہ ہم تمہیں لوگوں کے لیے قیامت کی نشانی بنا دیں کہ قیامت کے دن بھی اللہ کی قدرت سے مردے قبروں سے زندہ ہو کر اٹھیں گے اور لوگ جب تم کو دیکھیں تو قیامت میں مُردوں کے زندہ ہونے کی ایک مجسم دلیل سمجھ لیں اور یقین کر لیں کہ قیامت میں بھی مردے اسی طرح جسم کے ساتھ دوبارہ زندہ کیے جائیں گے [1]

یہ فقرہ واو عطف کے ذریعے لایا گیا ہے اور ساتھ ہی واو کے بعد لام تعلیل لگا یا ہے۔ واو چاہتا ہے کہ اس سے پہلے کوئی اور فقرہ ہو جس سے اس کا پیوند قائم کیا جائے اور لام چاہتا ہے کہ اس کا معلول ہو۔ فقرے سے دونوں کو حذف کر دیا گیا ہے۔ اس لیے علماء نے یہاں محذوف کو متعین کیا ہے اور ایسا محذوف بتایا ہے

---

[1] معارف قرآن ۱۴۱

جس میں معطوف علیہ اور معلل بننے کی صلاحیت ہو۔ وفعلنا ذالک یعنی اور یہ معاملہ ہم نے تمہارے ساتھ اس لیے کیا ہے کہ تمہاری موت کے بعد یہ زندگی لوگوں کے لیے بعث بعد الموت کے موضوع پر حجت، دلیل اور برہان کا کام دے سکے اور لوگ یقین کر سکیں کہ انسان کی زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی اس کے بعد بھی ایک زندگی ہے اور اس زندگی میں جیسے کچھ اعمال ہوں گے ویسے ہی نتائج دوسری زندگی میں پیش آئیں گے۔ قرآن میں ایمان باللہ کا ایک بنیادی عقیدہ یہی مسئلہ ہے۔

غور فرمائیے کہ حضرت ارمیاہ کے واقعہ میں بعث بعد الموت کے ساتھ کیسا عجیب و غریب تشابہ ہے یہاں حضرت ارمیاہ سے جی اٹھنے کے بعد سوال ہو رہا ہے۔

کم لبثت؟ کتنی دیر اس حالت میں رہے ہو؟

روزِ قیامت مردوں کے زندہ ہونے کے بعد ان سے دریافت کیا جائے گا کم لبثتم فی الارض عدد سنین زمین میں کتنے سال رہے ہو۔

یہاں حضرت ارمیاہ نے جواب دیا کہ:

لبثت یوما او بعض یوم میں ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہا ہوں۔

وہاں روزِ قیامت پوری انسانیت کا یہی جواب ہو گا۔

لبثنا یوما او بعض یوم ہم ایک دن یا دن کا کچھ حصہ رہے ہیں۔

احیاء کا عملی مظاہرہ

۷۷۳۔ اور ہڈیوں کے اس پنجر کو دیکھو کہ ہم کس طرح ان کا ڈھانچہ بنا کر اٹھاتے ہیں پھر کیسے اس ڈھانچہ پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ حضرت عزیر کے سامنے وہ سب ہڈیاں موافق ترکیب بدن کے جمع کی گئیں پھر ان پر گوشت پھیلایا گیا اور چمڑا درست ہوا۔ پھر خدا کی قدرت سے یکبارگی اس میں جان آئی اور اٹھ کھڑا ہوا اور اپنی بولی بولا[1]۔

اب یہ اصل سوال کا جواب ہے۔ سوال کو پھر ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ اللہ اس بستی کو فنا ہونے کے بعد کیسے زندہ کرے گا۔ یہاں ہر سو موت ہی موت ہے زندگی کا کہیں نام و نشان نہیں اور زندگی کے ظہور کے لیے اسباب و

[1] معارف قرآن م ا

[2] افادات شیخ الہند میں حضرت عزیر کا نام حضرت شیخ نے شہرت کی بنا پر لیا ہے ورنہ ہم بتا آئے ہیں کہ اس واقعہ کی شخصیت حضرت عزیر نہیں بلکہ حضرت ارمیاہ ہیں

و وسائل بھی نہیں۔ اجتماعی زندگی کے اسباب و وسائل تو یہی ہیں کہ تاج و تخت ہو، لشکر اور اسلحہ ہو اور اس سے بنی اسرائیل محروم ہو چکے ہیں۔ اب یہ بستی زندگی سے کیونکر بہرہ وش ہو گی۔ حضرت ارمیاہ کے دل میں حیاتِ اجتماعی کے لیے یہ سوال اللہ سبحانہٗ کی شانِ حکیمی کے پیشِ نظر پیدا ہوا۔ اور ان کے فکر و نظر میں یہی غالب تھا کہ اللہ سبحانہٗ حکیم ہیں ان کے سارے کام حکمت کے تحت ہوتے ہیں۔ لیکن اللہ سبحانہٗ ان کو یہاں سمجھانا چاہتے ہیں کہ بے شک اللہ کی ذات حکیم ہے مگر حکیم ہونے کے ساتھ وہ قدیر بھی ہے حکمت یہ ہے کہ وہ جو کچھ کرے قواعد و ضوابط کے تحت کرے۔ مصالح اور حِکَم کی خاطر کرے اسباب و وسائل کے ساتھ کرے اور قدرت یہ ہے کہ قاعدے و ضابطے سے بالا ہو کر کرشمے سبب اور وسیلہ کے بغیر کرے۔ اس پر اسباب کی حکمرانی نہیں کیونکہ وہ خالق اسباب ہے۔ فرمایا دیکھو ہڈیوں کا بے جان ڈھانچہ تمہارے سامنے موجود ہے۔ اس میں زندگی کا کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ اب بغیر کسی سبب اور بغیر کسی وسیلہ کے تمہاری آنکھوں کے سامنے ہڈیوں کا ڈھانچہ بناتے ہیں۔ پھر اس ڈھانچہ پر گوشت کا غلاف چڑھاتے ہیں۔ تمہارے سامنے ایک مکمل اور متشکل زندگی ظہور میں آجائے گی۔

بس جیسے یہاں اللہ کی شانِ قدیری کا ظہور ہوا ہے اور بغیر سبب اور وسیلہ کے گدھے میں زندگی موجود ہو گئی ٹھیک اسی طرح بغیر تاج و تخت اور بغیر لشکر و اسلحہ اور بغیر کسی طاقت کے اللہ اس بستی کو دوبارہ زندگی بخشنے پر قادر ہے۔ بے شک بیت المقدس بالکل ویران و منہدم ہو چکا ہے اور اسرائیلیوں کی قومیت اس طرح پامال ہو چکی ہے کہ اسباب کی دنیا میں اس کی تعمیر کا وہم و گمان بھی نہیں ہو سکتا لیکن اللہ کو ہر چیز پر قدرت حاصل ہے۔

قدرت کے عملی مظاہرے کا نتیجہ

۴۷۷۔ اس طرح جب اس کے سامنے حقیقت کھل کر آ گئی تو بول پڑا کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ کے پیغمبر نے اس تمام کیفیت کو ملاحظہ فرمانے کے بعد فرمایا کہ مجھے خوب یقین ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی میں جو جانتا تھا کہ مردوں کو جلانا اللہ کو آسان ہے سو اب اپنی آنکھ سے دیکھ لیا۔ یہ مطلب نہیں کہ پہلے یقین میں کوئی کمی تھی۔ ہاں مشاہدہ نہ ہوا تھا[1]۔ یعنی اس مشاہدے اور عملی مظاہرے کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت ارمیاہ بول اٹھے کہ میں جانتا ہوں کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے جیسے وہ گدھے کی سوکھی ہڈیوں میں جان ڈال سکتا ہے ایسے وہ اس پھوٹے شہر میں بھی دوبارہ زندگی لا سکتا ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

واقعہ کی غلط تفسیر

بعض شارحین نے اس واقعہ کی غلط تفسیر فرمائی ہے سب سے پہلے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے سورۂ کہف کے تفسیری فوائد سپردِ قلم فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس پیشین گوئی کا محل ٹھیک اس مکاشفہ کے بعد ہے جس میں حزقیل نبی نے بنی اسرائیل کی سوکھی ہڈیوں کو زندہ ہوتے دیکھا تھا اور جسے قرآن نے البقرہ میں اوکالذی مرّ علی قریۃ وھی خاویۃ علی عروشھا میں بیان کیا ہے۔ؔ

اور مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں:

البتہ صحیفہ حزقی ایل میں اس سے ملتی جلتی ہوئی ایک چیز ملتی ہے جس کی نوعیت ایک مکاشفہ کی ہے۔

اس کے بعد حزقی ایل کا پورا مکاشفہ نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔

اگر قرآن کے اس حوالہ کا تعلق حزقی ایل نبی کے اسی مشاہدہ ملکوت سے مان لیا جائے تو اس کے معنے یہ ہوں گے یہ آیاتِ الٰہی کے مشاہدے کے لیے اسی طرح کی ایک سیر ملکوت تھی جس طرح کی سیر ملکوت کی اس سے اعلیٰ مثال ہمارے یہاں واقعہ معراج ہے۔

حیرت ہے کہ جب قرآن عزیز اس واقعہ کو صاف اور صریح طور پر واقعہ شخصی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو ایک مدت کے لیے موت کی آغوش میں سلا دیا۔ پھر زندہ کر کے اس سے موت کی مدت کے بارے میں سوال کیا۔ جب وہ صحیح جواب نہ دے سکا تو خود اس کی تصحیح فرمائی اور اس سے متعلق شواہد کا مشاہدہ کرایا تو پھر مولانا مرحوم نے حزقیل کے مکاشفہ کو اس کی تفسیر کیسے قرار دیا ہے اور اس سے زیادہ حیرت افزا مولانا اصلاحی کا یہ جرأت مندانہ اقدام ہے کہ وہ اس واقعہ کے ساتھ واقعہ معراج کو بھی واقعہ نہیں بلکہ مکاشفہ قرار دے رہے ہیں۔ مکاشفہ کا مطلب ہے کہ یہ کوئی واقعہ نہیں ہے بلکہ اس پیغمبر کا قلبی واردہ ہے یا ان کے ذہن کی ایک کیفیت ہے جسے الفاظ کا جامہ پہنا دیا گیا۔ جیسا ہمارے صوفیا کو ہوتا رہتا ہے۔

مکاشفہ کی حقیقت

مکاشفہ قرآن و سنت کی اصطلاح نہیں بلکہ صوفیائے کرام کی اصطلاح ہے۔ فن تصوف میں توجہ، ہمت اور

ؔ ترجمانِ قرآن

مکاشفہ کی اصطلاحات پائی جاتی ہیں۔ مکاشفہ نام ہے انسان کی قوتِ خیال کی ایسی صفائی اور تہذیب کا کہ جس میں انسان کے سامنے مثالی صورتیں محسوسات کی شکل میں رونما ہوتی ہیں کبھی حسین و جمیل خاص آب و رنگ کے ساتھ یہی صورتیں ان کے سامنے جلوہ افروز ہوتی ہیں کبھی نورانی اجرام کی شکل میں سامنے آتی ہیں۔ یا ان صورتوں کے قالب میں کبھی چہرہ پرداز ہوتی ہیں جن کی عظمت اور احترام دیکھنے والے کے دل میں ہوتا ہے کبھی اس کا ظہور باضابطہ مرتب کلام کی شکل میں ہوتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اس کو وہ سُن رہا ہے اور یہ حالات اس پر بیداری میں بھی پیش آتے ہیں اور خواب میں بھی۔ ان ہی لوگوں کو اربابِ کشف کہتے ہیں [1]

حضرت مولانا آزاد اس واقعہ کو اسی خیالی اور مثالی رنگ میں دیکھ رہے ہیں یعنی ان کی مبارک رائے میں یہ اس پیغمبر کی خیالی قوت میں مثالی صورت ہے ورنہ عالمِ طبیعت کا کوئی واقعہ نہیں ہے۔ اور مولانا اصلاحی کی رائے میں معراج بھی اسی مکاشفہ میں مثالی صورت کا نام ہے اس کا ہمارے عالمِ طبیعت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

غور فرمائیے کہ ایک برگزیدہ ہستی کا ایک ایسے کھنڈرات اور ویران بستی پر گزر ہوا جو کبھی بہت ہی بارونق اور آباد بستی تھی، جہاں شہری زندگی پورے جوبن پر تھی او کالذی مر علی قریۃ وھی خاویۃ علی عروشھا انہوں نے ہیبت ناک اور افسوسناک منظر دیکھا تو دل میں خیال آیا یا زبان پر بات آگئی کہ یہ بستی زندگی سے کیونکر معمور ہو گی انی یحیی ھذہ اللہ بعد موتھا اللہ تعالیٰ نے یہ سوال دل میں یا زبان پر آتے ہی اس کی روح قبض کر لی اور سو سال تک اسی حالت میں رکھ کر دوبارہ زندگی دی فاماتہ اللہ مائۃ عام ثم بعثہ اور زندگی بخشنے کے بعد ان سے اللہ سبحانہ نے دریافت کیا بتاؤ کہ تم اس حالت میں کتنی مدت رہے ہو؟ برگزیدہ ہستی نے جواب دیا ایک دن یا دن کا کچھ حصہ قال کم لبثت قال لبثت یوما او بعض یوم چونکہ جواب خلافِ واقعہ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس کی اصلاح فرمائی اور امر واقعہ کا اظہار کرتے ہوئے فرمایا نہیں بلکہ تم سو برس تک موت کی آغوش میں رہے۔ قال بل لبثت مائۃ عام پھر اپنی قدرتِ کاملہ کے تصرفات کا مشاہدہ کرایا کہ ایک جانب اس طویل مدت کے باوجود کھانے پینے کی تمام چیزیں تر و تازہ اور موسمی اثرات سے محفوظ ہیں اور دوسری جانب ان کی سواری کا گدھا گل سڑ کر بوسیدہ ہڈیوں کا ڈھانچہ رہ گیا تھا۔ فانظر الی طعامک وشرابک لم یتسنہ اور پھر فرمایا کہ ہم نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ تم کو بعث بعد الموت کے موضوع پر دوسروں کے لیے اپنی قدرتِ کاملہ کا ایک نشان بنادیں۔ پھر ان تمام باتوں کے بعد اس بزرگ ہستی کو مشاہدہ کرایا کہ کس طرح ہڈیوں نے آپس میں ترتیب پائی پھر ان پر گوشت چڑھایا، پھر چمڑا اور ان کا گدھا زندہ کھڑا ہو گیا یہ سب کچھ دیکھ لینے اور مشاہدہ کرنے کے بعد جب

---

[1] عبقات

علم الیقین نے عین الیقین کا درجہ حاصل کر لیا تو فوراً اس بزرگ ہستی نے اعتراف کر لیا کہ بے شک اللہ کی قدرت کاملہ اسباب سے بے نیاز ہے وہ جس طرح چاہے بے روک ٹوک تصرف کرے کوئی اس کے لیے مانع نہیں اور بول پڑے اعلم ان اللہ علی کل شیئ قدیر۔

اب ان صاف اور واضح آیات پر دوبارہ غور کیجئے اور سوچئے کہ قرآن عزیز نے اس واقعہ کو ایک حقیقی واقعہ کی حیثیت سے بیان کیا ہے یا مجازکے طور پر ایک مکاشفہ کی شکل میں، نیز کیا حزقیل علیہ السلام کے مکاشفہ اور ان آیات میں ذکر کردہ واقعہ کے درمیان مشابہت کی وجہ سے دونوں کو ایک بتانا کسی طرح صحیح ہو سکتا ہے نہیں ہرگز نہیں۔ لہٰذا یہ تاویل درست نہیں ہے۔ ؎

ہاں اگر یوں کہا جاتے کہ یہ واقعہ تو حضرت پر میاہ ہی کو پیش آیا ہے مگر اس کے قریب قریب حضرت حزقیل کا ایک مکاشفہ بھی ہے، صحیفہ حزقیل میں موجود ہے تو درست ہو سکتا ہے۔

حزقیل کا مکاشفہ

حضرت حزقیل نے اس مکاشفہ میں بنی اسرائیل کی سوکھی ہوئی ہڈیوں کو دوبارہ زندہ ہوتے دیکھا ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

> خدا کا ہاتھ مجھ پر اور اس نے مجھے اپنی روح میں اٹھا لیا اور اس وادی میں جو ہڈیوں سے پر تھی مجھے اتار دیا اور مجھے ان کے چوگرد پھرایا اور دکھایا۔ وہ وادی کے میدان میں بکثرت اور نہایت سوکھی تھیں اور اس نے مجھے بتایا کہ اے آدم زاد کیا یہ ہڈیاں زندہ ہو سکتی ہیں۔ میں نے جواب دیا کہ اے خداوند تو ہی جانتا ہے۔ پھر اس نے مجھے فرمایا کہ ان ہڈیوں پر نبوت کر اور ان سے کہہ اے سوکھی ہڈیو! خداوندی کلام سنو۔ خداوند خدا ان ہڈیوں کو یوں فرماتا ہے کہ میں تمہارے اندر روح ڈالوں گا اور تم زندہ ہو جاؤ گی اور تم پر نسلیں پھیلاؤں گا اور گوشت چڑھاؤں گا اور تم کو چمڑا پہناؤں گا اور تم میں دم پھونکوں گا اور تم زندہ ہو گی۔ (حزقیل ایل باب ۳۷)

یہ حادثہ اسرائیلی تاریخ کا چونکہ عظیم حادثہ ہے کہ اس میں صرف بنی اسرائیل کی آبادیاں ہی برباد نہیں ہوتی تھیں بلکہ اسرائیل نسل و قومیت بھی ہلاک و منتشر ہو گئی تھی اسی لیے صرف حضرت حزقیل نے نہیں بلکہ انبیائے بنی اسرائیل نے اس کے ظہور کی پیشین گوئیاں کی تھیں۔

؎ قصص القرآن

اس سلسلے میں سب سے پہلی پیشین گوئی یسعیاہ نبی کی تھی۔ انھوں نے پہلے بیت المقدس کی تباہی کی خبر دی کہ بابل کے ہاتھوں ظہور میں آئے گی۔ اس کے بعد اس کی دوبارہ تعمیر کی بشارت دی ہے۔ اسی طرح یرمیاہ نبی نے پیشین گوئی کی تھی، کہ ستر برس تک یہودی بابل میں قید رہیں گے اور اس کے بعد بیت المقدس کی نئی تعمیر ہوگی، خداوند کہتا ہے جب بابل پر ستر برس گزر جائیں گے تو میں تمہاری خبر لینے آؤں گا تب مجھے پکارو گے میں جواب دوں گا۔

غرض اس حادثہ کی انبیائے بنی اسرائیل نے پیشین گوئیوں، مکاشفات اور امثال کے ذریعے خبر دی تھی اگر مجموعہ تورات کا اس ارادہ سے مطالعہ کیا جائے گا تو پیشین گوئیوں مکاشفات اور امثال کا ایک مجموعہ تیار ہو سکتا ہے۔ ان میں ہر بات اپنی جگہ درست اور صحیح ہے لیکن قرآن جو واقعہ پیش کر رہا ہے ان سے اس کی واقعیت متاثر نہیں ہو سکتی ہے۔

وَاِذْ قَالَ اِبْرٰهٖمُ رَبِّ اَرِنِیْ كَیْفَ تُحْیِ الْمَوْتٰىؕ قَالَ اَوَلَمْ تُؤْمِنْؕ قَالَ بَلٰى وَلٰـكِنْ لِّیَطْمَىٕنَّ قَلْبِیْؕ قَالَ فَخُذْ اَرْبَعَةً مِّنَ الطَّیْرِ فَصُرْهُنَّ اِلَیْكَ ثُمَّ اجْعَلْ عَلٰى كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءًا ثُمَّ ادْعُهُنَّ یَاْتِیْنَكَ سَعْیًاؕ وَاعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ عَزِیْزٌ حَكِیْمٌ۠ رکوع ۳۵

اور اس پر بھی غور کرو کہ ابراہیم نے کہا تھا میرے آقا مجھے دکھا دے کہ تو مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے[۵۵۵] فرمایا کیا تجھے معلوم نہیں اور تو مانتا نہیں ہے؟ عرض کیا ہاں جانتا بھی ہوں اور مانتا بھی ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے[۵۵۶]، فرمایا اگر تم اس کے خواہاں ہو تو چار پرندے لے لو، پھر اُن کو اپنے ساتھ ملا لو بعد ازیں ان کا ایک حصہ ہر پہاڑ پر رکھ لو تا پھر اُن کو پکارو وہ تیرے پاس دوڑتے آئیں گے[۵۵۷] اور خوب جان لو کہ اللہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے[۵۵۸]۔

واقعاتی تقابل کی تیسری مثال

نمرود کے سامنے مقابلے میں حضرت ابراہیمؑ نے دعویٰ کیا تھا کہ ربی الذی یحیی و یمیت اور نمرود نے بڑی ڈھٹائی سے کہہ دیا تھا کہ انا احی و امیت۔ حضرت ابراہیمؑ نے خالص داعیانہ انداز میں نمرود کی دماغی استعداد

کے مطابق فوراً دوسری بات پیش کر دی، نتیجہ یہ نکلا کہ تیر نشانے پر لگ گیا اور طاغوتی انکار رسوا ہو کر رہ گیا نمرود کے سامنے حضرت ابراہیمؑ نے جو دعویٰ کیا تھا وہ دو حصوں پر مشتمل تھا، ایک یہ کہ احیاء اللہ سبحانہٗ کا کام ہے اور دوسرے یہ کہ اماتت اللہ سبحانہٗ کی صفت ہے۔ موت کا مسئلہ عدمی ہونے کی وجہ سے بدیہی ہے لیکن حیات کا مسئلہ ایک وجودی حقیقت ہے۔ اس لیے مسئلہ احیاء کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ نے یہ سوال پیش فرمایا اور سوال بھی یہ نہیں کہ آپ احیاء پر قادر ہیں یا نہیں بلکہ سوال یہ ہے کہ احیاء کی کیفیت کیا ہے۔ نمرود کے مجرم کے عفو و درگزر کو احیاء بنا کر مسئلہ کو اُلجھا دیا تھا۔ اور حضرت ابراہیم جانتے تھے کہ احیاء یہ ہے کہ بے جان چیز میں جان ڈال دی جائے نہ یہ کہ جاندار کو چھوڑ دیا جائے۔ بے جان چیز میں جان کیسے پڑتی ہے اور اللہ سبحانہٗ کیسے ڈال دیتے ہیں۔ اسی کو سمجھنے کے لیے حضرت ابراہیمؑ نے یہ سوال کر دیا۔ یہ سوال احیاء کا نہیں بلکہ کیفیت احیاء کا ہے۔ ایمانیات میں احیاء پر ایمان لانے کا مطالبہ ہے کیفیت احیاء پر ایمان کا مطالبہ نہیں ہے اور اس کیفیت کا سوال بھی حضرت ابراہیمؑ نے اس لیے کیا ہے کہ ایک داعی کی حیثیت سے مخالفوں میں ان کو کام کرنا ہے اس لیے ان کو مقابلہ کے لیے موضوع احیاء پر پوری بصیرت ہونی چاہیئے۔ بصیرت صرف یہ نہیں کہ کسی چیز کا علم ہو بلکہ بصیرت یہ ہے کہ وہ اس کے مشاہدے میں آ چکی ہو یعنی علم الیقین سے بڑھ کر عین الیقین تک پہنچنے کا نام بصیرت ہے۔ حضرت ابراہیم کو جو کام سپرد کیا گیا تھا اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ جو کچھ فرمائیں علیٰ وجہ البصیرت فرمائیں۔ اس لیے جس چیز کی طرف وہ لوگوں کو دعوت دیں اس کی حقیقت ان کو آنکھوں سے مشاہدہ کرا دی جائے، تاکہ وہ دُنیا کو پوری قوت سے کہہ سکیں کہ تم قیاس اور گمان سے کام لیتے ہو مگر میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر کہہ رہا ہوں۔ اسی بنا پر قرآن نے اپنے مخاطبوں سے حضورؐ کے بارے میں فرمایا ہے افتمارونہ علیٰ ما یریٰ۔ اس بنا پر حضرت ابراہیمؑ کو بے جان چیز میں جان ڈال کر احیاء کی حقیقت کا مشاہدہ کرایا گیا کیونکہ احیاء نام ہے بے جان چیز میں جان ڈال دینے کا۔

اصل بات تو صرف یہ ہے کہ ربی الذی یحیی و یمیت طاغوت کا دماغ احیاء کی حقیقت کو نہ پاسکا۔ اور اس نے مجرم جاندار کے معاف کر دینے کو احیاء سمجھا اور اللہ کی شان احیائی کا طاقت کے نشہ میں انکار کر دیا قرآن کہتا ہے کہ اس کے لیے ہدایت کا دروازہ بند ہو گیا۔ اس کے مقابلے میں دو ماننے والوں کا ذکر فرمایا ہے یعنی دونوں اللہ کی شان احیاء کو مانتے ہیں اور دنیا کو منوانے آئے ہیں۔ دونوں لذت محبت سے آشنا ہیں مگر دونوں احیاء کے بارے میں علم الیقین سے عین الیقین تک پہنچنا چاہتے ہیں۔ ایک کہہ رہا ہے کہ انی یحیی ھذہ اللہ بعد موتہا اس میں احیاء پر استعجاب کا اظہار ہے اور دوسرا کہہ رہا ہے کہ رب ارنی کیف تحیی الموتیٰ۔ اس میں کیفیت احیاء دکھانے کی درخواست ہے پہلے کا نام نہیں لیا، کیونکہ اس نے حیرت کا اظہار کیا دوسرے کا نام صاف بتا دیا کیونکہ اس نے سوال میں ادب کو ملحوظ رکھا۔

۷۷۵۔ میرے آقا مجھے دکھا دے کہ تو مردوں کو زندہ کیسے کرتا ہے؟ ہم نے بالارادہ ترجمہ یہ کیا ہے کہ تو زندہ کیسے کرتا ہے یہ نہیں کیا کہ تو زندہ کیسے کرے گا۔ کیونکہ یہاں بات کا تعلق موضوع بحثِ احیاء سے ہے۔ بعث بعد الموت موضوع بحث نہیں اس لیے ہم اس کا رشتہ قیامت سے نہیں بلکہ دنیا میں حضرت ابراہیم کی دعوت سے سمجھتے ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ اس کے مفہوم میں بعث بعد الموت یعنی قیامت میں مُردوں کا زندہ کرنا بھی داخل ہو جائے لیکن منطوق قرآنی صرف اللہ کی شانِ احیاء ہے۔ سوال کی نوعیت خود بول رہی ہے کہ سائل کو اللہ سبحانہ کی شانِ احیائی میں کوئی شبہ نہیں وہ احیاء کو نہیں بلکہ کیفیتِ احیاء کو دریافت کر رہا ہے۔

حضرت ابراہیم کے اس سوال کو عام انسانوں کے سوالات کی سطح پر نہ سمجھنا چاہیے یہ ایک اندازِ ناز کا سوال ہے اس کو اسرارِ خلت کی روشنی میں سمجھنا چاہیے۔ یہاں شک و تردد کا کوئی موقعہ اور محل نہیں ہے بلکہ اذعان والقان کی اس گرامی قدر شخصیت پر جب محبت و خلت کی کیف آور ہوائیں چلنی شروع ہوئیں تو اس فضا میں نازونیاز کا سماں خود بخود پیدا ہو گیا۔ اور اسی فضاء ناز میں حضرت خلیل کی زبان احیاء کی کیفیت کا مشاہدہ کرنے کے لیے بے ساختہ متحرک ہو گئی۔ خدا کے اس مقدس رسولؑ کے دامن یقین کو شک و تردد سے پاک و صاف کرنے کے لیے خود حضرت خلیل کی زبانی اسی آیت میں یہ بتا دیا۔

حضرت ابراہیمؑ کا مقامِ یقین

۷۷۶۔ فرمایا کیا تجھے معلوم نہیں اور تو جانتا نہیں ہے۔ عرض کیا ہاں جانتا بھی ہوں اور مانتا بھی ہوں لیکن چاہتا ہوں کہ میرا دل مطمئن ہو جائے۔ گویا یہاں خود ہی قرآن نے تم ایمان نہیں لائے کہہ کر حضرت ابراہیمؑ کی زبانی یہ بات صاف کر دی کہ ان کے سوال کا منشا ضعفِ یقین نہیں بلکہ ربطِ خلت ہے۔

اطمینان کے معنے ہیں کسی چیز کا اپنی جگہ پر ٹھیک ٹھیک اس طرح ٹک جانا کہ اس کے اِدھر اُدھر جھکنے یا لڑھکنے کا کوئی اندیشہ باقی نہ رہے۔ برتن اگر اپنی جگہ پر ٹھیک جم کر رکھا گیا ہے تو اطمینان کا لفظ بولیں گے۔ اگر چراغ کی لو بالکل سیدھی ہو اس میں ہوا کی وجہ سے کوئی جھونکا نہ ہو تو اس کے لیے بھی اطمینان ہی استعمال کریں گے۔

اطمینان اس دل جمعی کا نام ہے جس میں قلق اضطراب اور بے چینی نہ ہو اور یقین میں ایسا سکون ہو کہ گویا آنکھوں سے دیکھ رہا ہے۔

اطمینان اور سکینت میں فرق ہے۔ اولاً سکینت قلبی خوف پر غالب قوت کا نام ہے اور اطمینان خوف میں نہیں بلکہ امن کی حالت میں دل کے اندر پیدا ہونے والی کیفیت ہے۔ ثانیاً سکینت وقتی ہوتی ہے جبکہ اطمینان دائمی ہوتا ہے۔

اطمینان کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ ڈر کی حالت میں اُمید کا دامن تھام لینا۔ دوسرا درجہ رُوح کا کشفِ حقائق میں وعدہ پر بھروسہ کرنا۔ تیسرا درجہ نام ہے اللہ سبحانہ کی ذات اسماء اور صفات کے مشاہدے کا۔ مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ اطمینان کا جو درجہ ولایت وصدیقیت کے مناسب ہے وہ حضرت ابراہیم کو پہلے بھی حاصل تھا۔ اب آپ کو طلب اس اطمینان کی تھی جو مقامِ نبوت اور پھر مقامِ خلت کے شایانِ شان ہو۔ بہر حال حضرت ابراہیمؑ کا دامنِ یقین شک و تردد سے پاک تھا۔

احیاء کی کیفیت کا مشاہدہ

۷۷۔ فرمایا اگر تم اس کے خواہاں ہو تو چار پرندے لے لو پھر ان کو اپنے ساتھ ہلا لو بعد ازیں ان کا ایک حصہ ہر پہاڑ پر رکھ لو۔ پھر ان کو پکارو وہ تیرے پاس دوڑتے آئیں گے حضرت ابراہیمؑ حسبِ ارشادِ الٰہی چار جانور لائے۔ ایک مور، ایک مرغ، ایک کوا، ایک کبوتر اور جانوروں کو اپنے ساتھ ہلایا تاکہ پہچان لیں اور ہلانے سے آنے لگیں۔ پھر چاروں کو ذبح کیا پھر ایک پہاڑ پر چاروں کے سر رکھے ایک پر پیر رکھے ایک پر سب کے دھڑ رکھے پہلے بیچ میں کھڑے ہو کر ایک کو پکارا، اس کا سر اٹھ کر ہوا میں کھڑا ہوا، پھر دھڑ ملا، پھر پیر لگے، وہ دوڑتا چلا آیا۔ پھر اسی طرح چاروں آ گئے۔ [1]

اصل ارشاد میں چار پرندوں کو لینے کا ذکر ہے لیکن شارحینِ قرآن نے ان پرندوں کے نام بھی بتا دیئے۔ بقول حافظ ابنِ کثیر ان کی تعیین میں کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر کسی قسم کی افادیت اس میں ہوتی تو قرآن بتا دیتا۔ ایسے مواقع پر قرآن کی خاموشی خود اس کے لیے بے فائدہ ہونے کو بتا رہی ہے۔ اصل ارشاد میں ہدایت یہ آئی ہے کہ چار پرندے لینے کے بعد ان کو ہلاؤ۔ ہلانے کے لیے قرآن میں فصرھن الیک کی تعبیر آئی ہے۔ لفظ صر کا مصدر مصور ہے اس کے معنے ہلانے اور مائل کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ صار یصور اور صار یصیر دونوں سے پڑھا گیا ہے یعنی حرف صاد کے پیش کے ساتھ اور زیر کے ساتھ اور لفظ مشترک ہے بمعنے مائل کرنا، ہلانا، پارہ پارہ کرنا، ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور کچھ کے خیال میں زیر کے ساتھ ہو تو کاٹنا اور پارہ پارہ کرنا اور پیش کے ساتھ ہو تو ہلانا اور کچھ کہتے ہیں کہ پیش کے ساتھ دونوں معنے میں آتا ہے اور زیر کے ساتھ صرف پارہ پارہ کرنے کے معنے میں آتا ہے ابنِ ابی حاتم نے دو طریقوں سے اس کے معنے ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے نقل کیے ہیں اور ایک سے زیادہ طرق سے تابعین کی ایک جماعت سے بھی یہی معنے منقول ہیں۔ اور حافظ ابنِ جریر نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت

[1] افاداتِ شیخ الہند۔

کیا ہے کہ قرآن کی اس آیت میں یہ لفظ نبطی زبان کا ہے اور اس کے معنے پارہ پارہ کر دینے کے ہیں تفصیل کے لیے ملاحظہ ہو فتح الباری ج ۸۔

بہرحال یہ لفظ عربی زبان میں دونوں معنے میں آتا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب ائمہ لغت اور زبان کی شہادت موجود ہے تو پھر صرھن کے معنے یوں ہوں گے کہ ان پرندوں کو ملاؤ اور جمع کر کے ان کے ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ لغت کے ان ہی معنے کو بتانے کے لیے حضرت عبداللہ بن عباس، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو مالک، ابوالاسود الدئل، وہب بن منبہ اور حسن بصری نے اس کی تفسیر پارہ پارہ کر دینے سے فرمائی ہے یہی تفسیر امام مجاہد، ابوعبیدہ اور ابن الانباری اور زجاج نے کی ہے امام رازی فرماتے ہیں کہ اس تفسیر پر تمام شارحین قرآن کا اجماع ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ ان چاروں پرندوں کے ٹکڑے ٹکڑے یعنی سر کو، دھڑ کو، بازو کو، پیروں کو سب سے الگ الگ کر دو۔ گویا اول ان کو ذبح کرنا ہے۔ پھر ان کو ملانا ہے۔ ان ملے جلے پرندوں کے مجموعہ میں چار حصے کر دو اور یہی مجموعہ کا ملا جلا ایک حصہ ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ چونکہ چاروں کے پارہ پارہ کرنے اور ان کو باہم ملانے کے بعد چار حصے کرنے میں وقت لگتا ہے اس لیے فرمایا کہ پھر ان کا ایک حصہ ایک پہاڑ پر رکھ دو۔ کام میں وقت لگنے کی وجہ سے ثم یعنے پھر آیا ہے جو عربی میں تراخی کو بتاتا ہے پہاڑوں پر رکھنے میں بھی کافی وقت صرف ہوا ہے۔ اس لیے فرمایا کہ پھر ان کو بلاؤ، تمہارے بلانے پر یہ سارے دوڑ کر آئیں گے اور اس طرح تمہیں مشاہدہ ہو جائے گا کہ بے جان چیزیں جان کیسے پڑتی ہے۔

۸۷۷۔ اور خوب جان لو کہ اللہ سب پر غالب اور حکمت والا ہے چونکہ یہاں دو قسم کی خلش پیدا ہونے کا احتمال ہے اول یہ کہ جسم بے جان اور متفرق الاجزا کیسے زندہ ہو گئے۔ دوسرے یہ کہ پرندے کے چار ہونے اور ان کے اجزا کو متفرق کر کے بلانے میں کیا فائدہ اس لیے پہلی خلش کے لیے لفظ عزیز اور دوسری خلش کے لیے لفظ حکیم لا کر دونوں شبہات کا قلع قمع کر دیا یعنی اس کو خوب سمجھ لو کہ اللہ زبردست طاقت والا ہے جو چاہے کر سکتا ہے اور اس کے ہر حکم میں اس قدر حکمتیں ہوتی ہیں جن کا ادراک اور احاطہ اگر ہم کو نہ ہو تو یہ ہمارا نقصانِ علم ہے اس کی حکمت کا انکار ممکن نہیں [1]

آیت کے آخر میں فرمایا ان اللہ عزیز حکیم یعنی اللہ تعالیٰ زبردست ہیں اور حکمت والے ہیں زبردست ہونے میں قدرتِ کاملہ کا بیان ہے اور حکمت والا کہہ کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ بمقتضائے حکمت ہر ایک کو احیائ کا مشاہدہ نہیں کرایا جاتا ورنہ اللہ سبحانہٗ کے لیے کوئی دشوار نہیں کہ ہر انسان کو مشاہدہ کرا دیں مگر پھر ایمان بالغیب

---

[1] افادات شیخ الہند۔

کی نفیلت باقی نہیں رہتی [۱]

آخر میں گویا اشارہ فرمایا کہ اللہ کی ذات اپنے حکم پر غالب ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ قانون کی اس پر حکمرانی نہیں ہے بلکہ قانون پر وہ غالب ہے۔ کائنات کو بنانا بھی اسی کا کام ہے اور چلانا بھی اسی کا کام ہے اور بنانے کے بعد مٹانا بھی اسی کا کام ہے اور مٹانے کے بعد دوبارہ زندہ کرنا بھی اس کا کام ہے۔ اسی نے اپنی حکمتِ بالغہ سے اعادہ حیات کے معاملہ کو حکمتِ تکوین کے موافق بنایا ہے۔

آیت کا منطوق، مدلول اور مفہوم

آیت کی تفسیر ختم ہو چکی ہے لیکن اس آیت کے بعض پہلوؤں کی تشریحات رہ گئی ہیں ضروری ہے کہ ان پر ایک نظر ڈال لی جائے۔

اس آیت میں جو واقعہ بیان کیا گیا ہے وہ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کا ہے جس میں حضرت ابراہیم ؑ نے اللہ سبحانہٗ سے مُردوں کے زندہ کرنے کی کیفیت دکھانے کی درخواست کی ہے اور اللہ سبحانہٗ نے ان کی اس درخواست کو یہ کہہ کر شرفِ قبول عطا فرمایا ہے کہ چار پرندے لے لو، ان کو ہلالو، پھر ان میں سے ایک حصّہ کو ایک پہاڑ پر بٹھا دو پھر انہیں بلاؤ وہ دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اس پر بحیثیتِ مجموعی نظر ڈالی جائے تو اپنی بلاغت کے لحاظ سے حسبِ ذیل اُمور سامنے آتے ہیں۔

الف: حضرت ابراہیم علیہ السلام نے نمرود کے مقابلہ میں جو دعویٰ پیش کیا تھا کہ ربی الذی یحیی و یمیت میرا رب وہ ہے جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے اور نمرود نے بڑے تمرد اور سرکشی سے کہہ دیا تھا کہ انا احی و اُمیت میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں اس نے بد دماغی اور بلادت کی وجہ سے زندہ کرنے کے معنے یہ سمجھے تھے کہ زندہ شخص جرم کر کے آئے اسے چھوڑ دینا یہ زندہ کرنا ہے حالانکہ زندہ کرنا یہ نہیں بلکہ زندہ کرنا یہ ہے کہ بے جان چیز میں جان ڈال دی جائے۔ حضرت ابراہیم چونکہ داعی تھے وہ فوراً سمجھ گئے کہ میری بات کو نمرود کا دماغ ہضم نہیں کر سکا اس لیے بجائے یہ فرمانے کے کہ مجرم کو مارا اور پھر زندہ کر کے دکھا، یا میں ایک مُردہ لاتا ہوں اس میں جان ڈال کر دکھا، فوراً نمرود کے سامنے دوسری بات پیش کر دی کہ میرا رب سُورج کو مشرق سے نکالتا ہے تو مغرب سے نکال کر دکھا، نمرود لاجواب ہو گیا، میدان جیت گئے لیکن احیاء والی بات ذہن میں موجود تھی، اللہ کی قدرت پر پورا یقین تھا اور ایمان و اذعان میں جس علم الیقین کی ضرورت ہوتی ہے اس کی دولت سے دامن

[۱] معارف القرآن م ش

بھرپور تھا لیکن داعی دعوت میں جن معاملات سے گزرتا ہے اس کا تقاضا تھا کہ یقین علم الیقین سے عین الیقین اور حق الیقین تک حاصل ہو۔ چنانچہ دعوت کے کام میں سرشاری کی وجہ سے انتہائے شوق میں درخواست کر دی رب ارنی کیف تحیی الموتی۔ ذوق و شوق عین تقاضائے یقین ہے اگر اللہ سبحانہٗ کی صفت احیاء پر یقین نہ ہوتا تو کیفیت احیاء کے مشاہدے کا شوق ہی پیدا نہ ہوتا۔ یہ سوال تو صرف کیفیت احیاء کے متعلق تھا اور حضرت موسیٰ کا سوال تو اس سے کہیں بڑھ کر خود بارگاہِ جمال کے لیے حجابانہ دیدار کی خاطر تھا رب ارنی انظر الیک کون کہہ سکتا ہے کہ محبت و عشق کے اس مضطربانہ سوال میں شک کی بو بھی آسکتی ہے بلکہ سراسر یقین ہی اس شوق کا محرک بنا۔ یہاں وفورِ شوق سے حضرت ابراہیم نے بڑے ادب سے درخواست پیش کر دی کہ رب ارنی کیف تحیی الموتی میرے آقا مجھے دکھائیے کہ آپ مُردوں کو زندہ کیسے کرتے ہیں؟ اللہ سبحانہٗ نے فرمایا ابراہیم کیا میری صفتِ احیاء پر یقین نہیں عرض کیا ضرور ہے لیکن یہ اس لیے چاہتا ہوں کہ اطمینان حاصل ہو جائے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ چار پرندے لے لو اور ان کو پارہ پارہ کر کے یکجا کرو۔ پھر ان کو الگ چار پہاڑوں پر رکھ کر ان کو پکارو اور بے جان چیز میں زندگی آنے کا آنکھوں سے نظارہ کرو۔ تمہیں کیفیت کا پتہ لگ جائے گا۔ حضرت ابراہیم کو اللہ کی شانِ احیائی کا یقین تو پہلے ہی تھا اب عین الیقین ہو گیا بلکہ یہ فرما کر ثم ادعھن تم ان کو بلاؤ حق الیقین کی نعمت سے نواز دیا۔ اگر پرندے نہ مارے جاتے اور ذبح نہ کیے جاتے تو کیفیت احیاء کا آنکھوں سے مشاہدہ نہ ہوتا۔ اس طرح حضرت ابراہیمؑ نے جو دعویٰ نمرود کے سامنے کیا اس کو آنکھوں سے دیکھ لیا۔

یہ اس آیت کا منطوق ہے جس کی خاطر فی الواقع حضرت ابراہیم کا یہ واقعہ یہاں پیش کیا گیا ہے۔ اس صورت میں لفظ احیاء اپنے حقیقی معنے یعنی بے جان چیز میں جان ڈالنے کے معنے میں آیا ہے اور صرھن الیک میں لفظ صُرھن بصور سے ہلانے اور ٹکڑے ٹکڑے کرنے کے معنے میں ہے۔ اس میں از روئے لغت یہ معنے لینے کی گنجائش موجود ہے اور یہی معنے ہیں کیونکہ اولاً یہاں لفظ جزاء کا آنا واضح قرینہ ہے اس بات کا کہ ان پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے ہی پہاڑوں پر رکھنے کی ہدایت ہوئی تھی اور ثانیاً حضرت ابراہیم احیاء کی کیفیت کا مشاہدہ کرنا چاہتے جیسا کہ ان کے سوال سے ظاہر ہو رہا ہے اور یہ مشاہدہ کسی تردد اور شک کی بناء پر نہیں بلکہ میدانِ دعوت میں بصیرت اور طمانیتِ قلب کے لیے کرنا چاہتے تھے۔ کیفیتِ احیاء کا مشاہدہ اس طرح نہیں ہو سکتا تھا کہ چند مانوس چڑیاں ان کے پاس ان کی آواز پر آ جائیں اس قسم کا مشاہدہ تو تیتر بیٹر پالنے والے روزانہ کرتے رہتے ہیں۔ اگر یہی تجربہ حضرت ابراہیم کو کرایا جاتا تو اس سے ان کو کیفیتِ احیاء کا مشاہدہ کیسے ہوتا جس کی درخواست انہوں نے جناب الٰہی میں کی تھی۔ یہ مشاہدہ اسی صورت میں ہو سکتا تھا کہ ایک شے کے اجزاء فنا اور انتشار کے بعد از سر نو مختلف گوشوں سے جمع ہو کر نئی زندگی حاصل کریں۔

ب : حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ظہور ایک ایسے زمانے میں ہوا تھا جبکہ ان کے ملک میں اور ان کے ملک سے باہر کوئی گروہ بھی ایسا نہ تھا جس میں قبولیت حق کی استعداد دکھائی دیتی ہو یہ حالت دیکھ کر انھوں نے فرمایا کہ خدایا تو کیونکر ان مُردوں میں زندگی عطا کرے گا۔ اس پر اللہ سبحانہٗ نے دعوتِ حق کی انقلاب انگیز حقیقت پرندوں کی مثال سے واضح کر دی کہ اگر تم چار پرندوں کو لے کر کچھ روز اپنے پاس رکھ کر اور ان کی تربیت پختہ کر کے ان کو ایسا بنا سکتے ہو کہ تمہاری آواز سنتا اور تمہارے بلانے پر اڑتے ہوئے آ سکتے ہیں تو کیا گمراہ اور متوحش انسان دعوتِ حق کی تعلیم و تربیت سے اس درجہ اثر پذیر نہیں ہو سکتے کہ تمہاری صدائے حق سنیں اور اس کا جواب دیں۔ حضرت ابراہیم کا مقصد کہ جس زمین میں کام کر رہا ہوں یہ زمین بڑی ہی سنگلاخ ہے اس میں دعوت کی کاشت کی جائے گی تو حاصل کیوں کر ملے گا۔ اور یہ حقیقت ہے کہ ساری محنتوں کے باوجود بدبخت مخاطبوں نے ایک نہ سُنی اور سوائے آپ کی زوجہ محترمہ حضرت سائرہ اور آپ کے پیارے بھتیجے حضرت لوط کے کوئی ایمان نہیں لایا۔ قوم نے آپ کو ہر طرح ستانے اور آپ کی ایذا رسانی پر کمر باندھی یہاں تک ظالموں نے آپ کو دہکتی ہوئی آگ میں ڈال دیا۔ مسند ابی یعلی میں حضرت ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت ہے کہ جب آپ کو آگ میں ڈالا گیا تو آپ کی زبان مبارک پر یہ الفاظ تھے۔

اللھم انك فی السماء واحد وانا فی الارض واحد اعبدك

اے اللہ بلاشبہ تو آسمان میں واحد ہے اور میں زمین میں تیرا اکیلا پرستار ہوں۔

(البدایہ والنہایہ)

ان ہی حالات میں اللہ سے درخواست کی اے اللہ مجھے دکھلائیے کہ تو ان مردوں میں ایمان کی زندگی کیسے بخشے گا۔ اللہ نے فرمایا کہ کیا تمہیں یقین نہیں آتا عرض کیا کہ علم بھی ہے اور یقین بھی ہے لیکن یہ اس لیے چاہتا ہوں تاکہ میرے دل میں اطمینان و سکون آجائے یعنی تیری قدرت پر تو یقین و ایمان ہے لیکن یہ جو مایوس کن حالات دیکھ کر دل بے چین ہوتا ہے اس کا مداوا چاہتا ہوں۔ اس پر ارشادِ الٰہی ہوا کہ چار پرندے لے لو۔

آپ نے اپنا وطن چھوڑ کر شام، مصر اور عرب کی طرف ہجرت کی۔ یہ تمام مقامات وہ تھے جن میں سام کی اولاد پھیلی ہوئی تھی۔ اور مختلف ناموں سے ان کی حکومتیں قائم تھیں آثارِ قومیات، السانیات اور دوسرے تاریخی قرائن سے معلوم ہوتا ہے کہ عرب کا ملک سامی اقوام کا پہلا مسکن اور پہلی آبادی تھی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اس داعی حق نے متوحش اور گمراہ انسانوں کی جو تربیت کی تھی اس نے تاریخ عالم کا سب سے زیادہ عظیم الشان انقلاب پیدا کر دیا۔ قوموں کی قومیں اور نسلوں کی نسلیں دعوتِ ابراہیمی پر قدم اٹھاتی رہیں اور باوجودیکہ تین ہزار سال سے زیادہ مدت گزر چکی ہے لیکن آج بھی ہر سال انسانوں کے بے شمار غول اس دعوت پر لبیک کہتے ہوئے

معبدِ ابراہیمی میں جمع ہوتے ہیں۔

اس صورت میں بھی حضرت ابراہیم کا یہ سوال کسی شک اور تردد کی بنا پر نہ تھا یعنی یہ نہ بات تھی کہ حضرت ابراہیم دعوت کے بارے میں مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے بلکہ محض اطمینان خاطر کے لیے یہ درخواست فرمائی تھی تاکہ حالات کی سنگینی کا پامردی سے مقابلہ کیا جا سکے اور غالباً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشادِ گرامی کا جو امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت ابوہریرہ رض کے حوالے سے پیش کیا ہے کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ہم حضرت ابراہیم علیہ السلام سے زیادہ شک کرنے کے مستحق ہیں اور اس کے بعد یہ آیت تلاوت فرمائی۔

پس منظر یہی ہے کہ دعوت کے معاملہ میں جس قسم کے حالات سے ابراہیم دوچار تھے ہم بھی اسی قسم کے حالات سے دوچار ہیں۔ جیسے وہاں حالات میں سنگینی تھی یہاں بھی سنگینی ہے لیکن حالات کی ان ناخوشگواریوں کے باوجود نتائج کے معاملہ کو اگر ابراہیم شک کی نگاہ سے دیکھ سکتے تھے تو ہم بھی دیکھ سکتے ہیں۔ میں کی جگہ ہم اس لیے فرمایا کہ قرآن نے کارِ نبوت میں اُمت کو آپ کا ساتھی بنا دیا تھا یعنی نبوّت کا منصب آپ پر ختم کر کے کارِ نبوت اُمت کے سپرد کر دیا تھا۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ اس ارشاد کے ذریعے حضور نے اپنے سے اور حضرت ابراہیم سے شک کی نفی فرمائی ہے اور مزہ یہ ہے کہ لفظ ہم فرما کر یہ فیصلہ خود ان صحابہ پر چھوڑ دیا ہے جو آپ کے فیضِ صحبت سے یقین وایمان کی موجیں اپنے سینوں میں مشاہدہ کر رہے تھے کہ وہ خود سوچیں کہ جب ان کے دل میں یقین وایمان کا عالم یہ ہے تو اس شمع فروزاں کے دل میں ایمان وایقان کا کیا عالم ہو گا جس کو اللہ تعالیٰ نے مقامِ خلت سے نوازا تھا۔ اگر بالفرض ابراہیم کا یہ سوال تردد اور شک کی بنا پر ہوتا تو ہم اس شک کے ان سے زیادہ حقدار ہوتے کیونکہ ہمارے حالات میں زیادہ سنگینی ہے لیکن حالات کی اس سنگینی کے باوجود جب ہمیں احیاء کے بارے میں کوئی شک نہیں تو بھلا حضرت ابراہیم کو کیا شک ہو سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ حضور نے یہ بات مدینہ میں فرمائی ہے۔ جب سنگین حالات کے دور سے گزر چکے ہیں یہ قرآن کی اس آیت کا مدلول ہے۔ اس صورت میں لفظ احیاء مجازی معنے میں ہے جیسے انی یحیی ھذہ اللہ بعد موتھا میں ہے اور فصرھن الیك میں لفظ صار یصور سے صرف ہلانے کے معنے میں ہے اور عزیز حکیم یہ بتانے کے لیے کہ اللہ کی ذات غالب ہے وہ چاہے تو سب یکبارگی ایمان قبول کر سکتے ہیں اور اللہ اس پر قدرت رکھتا ہے کہ زبردستی ان کے اندر ایمان ڈال دے مگر ایسی زبردستی اس کے قانونِ حکمت کے خلاف ہے یعنی اس کی حکمت نہیں ہے کہ بندوں کے ارادے اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے۔

ج: اس آیت سے اشارہ ملتا ہے کہ مرنے کے بعد قیامت میں مُردے بھی اسی طرح زندہ ہو جائیں گے

جس طرح اللہ تعالیٰ ان جانوروں کے متفرق اجزاء کو دوبارہ جوڑ کر اور گوشت پوست پہ چڑھا کر زندہ کر سکتا ہے اسی طرح قیامت کے روز مُردوں کے جسموں کے متفرق ریزوں کو جمع کر کے ان میں جان ڈال سکتا ہے [1]

اس واقعہ میں حق تعالیٰ نے قیامت کے بعد حیات بعد الموت کا ایسا نمونہ حضرت خلیل کو دکھا دیا جس نے مشرکین اور منکرین کے سارے شبہات کا ازالہ مشاہدہ سے کر دیا۔[2] حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اے ابراہیم اسی طرح روز قیامت سب اجزاء داجساد کو جمع کر کے ایک دم سے جان ڈال دوں گا۔ فقط اس واقعہ کو دکھلا کر حق تعالیٰ نے احیاء یوم قیامت کی حقیقت بتلا دی کہ اسی طرح اوّل اجزاء مدینہ مختلف مقامات سے جمع ہو کر اجساد تیار ہوں گے پھر ان میں رُوح پڑ جائے گی [3]

یہ قرآن کی اس آیت کا مفہوم ہے اس صورت میں لفظ احیاء اپنے حقیقی معنے میں ہے اور موتی سے مراد قیامت میں زندہ ہونے والے مُردے ہیں اور فصرھن الیك کے مفہوم میں ہلانا، ذبح کرنا، ٹکڑے ٹکڑے کرنا پھر ان کو رلا ملا دینا داخل ہے اور سوال یہ تھا کہ قیامت کے دن مُردے زندہ کیوں کر ہو جائیں گے؟ اور جواب یہ ہوا کہ پرندوں کو ٹکڑے ٹکڑے یا قیمہ کر دیا جائے پھر ان کے چار حصے کر دیئے جائیں اور چار پہاڑوں پر رکھ دیئے جائیں پھر انہیں بلایا جائے۔ قدرتِ الٰہی سے زندہ ہو کر دوڑ کر تمہارے پاس آئیں گے۔ سوال وجواب میں مطابقت یوں ہے کہ سوال مُردوں کے زندہ ہو جانے کی نسبت تھا جو آئین قدرتِ الٰہی کا معجزہ دکھا دیا گیا جس طرح یہ پرندے بلانے والے کی آواز پر پرندہ ہو گئے اسی طرح حکمِ الٰہی سے مُردے زندہ ہو جائیں گے لیکن اس تفسیر پر عام ذہنوں میں یہ خلش ہوتی ہے کہ بعث بعد الموت کے بارے میں حضرت ابراہیم کو نبی ہونے کے باوجود یہ تردد کیوں ہوا۔ اگرچہ بعض مفسرین نے تو اس تردد کو یہ کہہ کر گوارا کر لیا کہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی اپنے سلوک باطن کے ایک دور میں اس بات کی خواہش کی کہ ان کو مشاہدہ کرا دیا جائے کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو حشر کے وقت کس طرح زندہ کرے گا۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ

حضرت ابراہیم کو تردد مُردوں کے زندہ ہونے کے باب میں تھا [4]

مرحوم سید احمد خاں نے اس خلش کی سنگینی کو سب سے زیادہ محسوس کیا اور بالآخر یہ کہہ کر اپنا بچاؤ کیا۔ کہ بزرگوں کو جو اس قسم کے خلجانِ قلبی پیش آیا کرتے ہیں۔ ان کا دفعیہ کشف اور خواب ہی میں ہوتا ہے پس ضرور ہے کہ ان بزرگوں کو بھی جو ایک عقدہ در بارِ احیاءِ موتی پیش آیا ہے، اس کا دفعیہ خواب میں ہوا ہو گا۔ حضرت

---

[1] معارف القرآن م ا [2] معارف القرآن م ش [3] بیان القرآن [4] تدبر قرآن۔

ابراہیم علیہ السلام سے نہ تو پہلے کسی اور نہ خود ابراہیم نے مُردہ کا زندہ ہونا دیکھا تھا اس لیے کوئی ذی عقل اس قسم کے سوالات اللہ سے نہیں کر سکتا۔

دوسری جگہ فرماتے ہیں۔

یہ سوال ابراہیم علیہ السلام کا رویت سے ہے اور یہ ظاہر ہے کہ رویت کیفیتِ احیار موتی نہیں ہو سکتی اس لیے کہ غایت مافی الباب یہ ہے کہ اگر ہمارا مُردہ زندہ ہو جائے یا کوئی بیمار اچھا ہو تو ہم آنجہان لیں گے کہ زندہ بیمار اچھا ہو گیا مگر اس کی زندگی کی کیفیت ہمیں معلوم نہ ہوگی کہ کس طرح ہوا۔ پس حضرت ابراہیمؑ کا سوال رویت قلبی سے متعلق تھا جو خواب میں ان کو حل ہو گیا۔ ص ۲۹۱

حیرت ہے کہ سید صاحب نے اس قسم کی بے جان تاویل کی پناہ لی کہ بزرگوں کو ہمیشہ عقدہ کشائی خواب ہی میں ہوتی ہے۔ کیا حضرت زکریا کو بیٹے کی خبر سے تعجب نہیں ہوا تھا اور کیا حضرت مریم کا عقدہ بھی انی یکون لی غلام؟ خواب ہی میں حل ہوا تھا۔ سید صاحب کا یہ فرمانا کہ یہ سوال ذی عقل کا کام نہیں کیا حضرت موسیٰ علیہ السلام کا یہ سوال کہ رب ارنی انظر الیک قرآن میں نہیں ہے اور یہ فرمانا کہ مردہ زندہ ہوتا تو ہم دیکھ سکتے ہیں مگر اس کی کیفیت نہیں دیکھ سکتے۔ حضرت ابراہیم کا سوال اسی رویہ سے تھا جس کو سید صاحب مانتے ہیں۔ ان کے پیشِ نظر وہ کیفیت نہیں جو مقولہ کیف سے ہے یہ وہ جانتے تھے کہ اللہ کو اسباب و آلات کی حاجت نہیں چنانچہ ان کا بلیٰ کہنا اسی امر کی وضاحت کرتا ہے۔ اطمینان قلب وہ صرف رویت امر عجب کے متعلق چاہتے تھے۔ آیت کیف سے فلسفیانہ کیفیت نہیں بلکہ عرفی کیفیت مراد ہے۔ حسب عرف اس سوال سے تاثیر فعل دیکھنا منظور ہے نہ کہ کیفیت فعل، پس آپ کا فرمانا کہ کیفیتِ احیار تو کسی طرح مرئی نہیں ہو سکتی عرف عام اور خطابیات سے چشم پوشی ہے [1]

لیکن دوسرے علماء نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کی طرف تردد کی نسبت کو گوارا نہیں کیا اور اس تفسیر کی صورت میں اس خلش کے متعدد جوابات دیئے ہیں۔

سب سے بہتر جواب علامہ سندھی نے صحیح بخاری کے حاشیہ میں دیا ہے کہ بعث بعد الموت کے موضوع پر مومن بہ یعنی وہ چیز جس کے ماننے اور جس پر ایمان لانے کا مطالبہ ہے وہ صرف قیامت میں مُردوں کا زندہ ہونا ہے۔ مُردوں کے زندہ ہونے کی کیفیت ایمانیات میں داخل نہیں ہے یہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو قیامت میں مُردوں کے زندہ ہونے میں کوئی تردد نہیں کیونکہ وہ زندہ

---

[1] تفسیر ثنائی۔

کرنے کے بارے میں نہیں بلکہ زندہ کرنے کی کیفیت کے بارے میں دریافت کر رہے ہیں اور یہ کیفیت کا سوال اس بات کی دلیل ہے کہ سائل احیاء کو ویسا ہی مانتا ہے جیسا ماننا چاہیے۔ صاحب روح المعانی نے اس جواب کو پسند کیا ہے۔ دوسرے علماء نے بھی اس پر مبسوط بحث کی ہے۔

مَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَمَثَلِ
حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ
وَاللّٰهُ يُضٰعِفُ لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ۝ اَلَّذِيْنَ
يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ثُمَّ لَا يُتْبِعُوْنَ مَآ اَنْفَقُوْا
مَنًّا وَّلَآ اَذًى ۙ لَّهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ قَوْلٌ مَّعْرُوْفٌ وَّمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِّنْ
صَدَقَةٍ يَّتْبَعُهَآ اَذًى ؕ وَاللّٰهُ غَنِيٌّ حَلِيْمٌ ۝

جو لوگ اللہ کی راہ[79] میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں ان کے خرچ کی مثال اس بیج کے دانے کی سی ہے جو زمین میں بویا جاتا ہے جب بویا گیا تھا تو ایک دانہ تھا لیکن جب بار آور ہوا تو ایک دانہ سے سات بالیں نکل آئیں اور ہر بال میں سو[80] دانے (یعنی خرچ کیا ایک اور بدلہ میں ملے سات سو) اور اللہ جس کسی کے لیے چاہتا ہے اس سے بھی دوگنا کر دیتا ہے وہ بڑی وسعت رکھنے والا اور سب جاننے والا ہے[81]۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں اور اس انداز سے خرچ کرتے ہیں کہ اس کے

بعد نہ تو احسان جتاتے ہیں اور نہ اپنے قول و فعل سے لینے والے کو کوئی ایذا پہنچاتے ہیں تو ان کے پروردگار کے حضور ان کے عمل کا اجر ہے۔ نہ تو ان کے لیے کسی طرح کا ڈر ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی۔[۴۸۲] ایک میٹھا بول اور ذرا سی چشم پوشی اس صدقے سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو اور اللہ بے نیاز اور بُردبار ہے۔[۴۸۳]

اللہ کی راہ میں خرچ کی قدر و قیمت

اصل مسئلہ یہ بتایا جارہا تھا کہ یہ دنیا عالم اسباب ہے یہاں کوئی نظام حیات کامیابی سے اس وقت تک دنیا میں بر سر عروج نہیں ہو سکتا جب تک اس کی پشت پر کامیابی کے وسائل نہ ہوں۔ ہر نظام حیات کی کامیابی کے لیے اگر اس کے ماننے والوں میں قربانیوں کی سرشاریاں ضروری ہیں تو اسلام بھی اپنے ماننے والوں سے یہی مطالبہ کرتا ہے اسی مطالبہ کا نام قرآن کی اصطلاحی زبان میں جہاد ہے۔ اس کا خمیر عشق کی ولولہ انگیزیوں اور جنوں نوازیوں سے تیار ہوتا ہے اس میں ایثار و قربانی اور سرفروشیوں کی ایک دُنیا آباد ہوتی ہے۔ چنانچہ اسی سلسلے میں قتال کی فرضیت، قتال کی تلقین اور دفاع کی اہمیت اور اس کے حکم و مصالح بتائے گئے تھے اور بتایا گیا تھا کہ جب دفاع ناگزیر ہے تو اس کے لیے تیاری کرنی چاہیے اور سب سے بڑی تیاری یہ ہے کہ اپنا مال اس راہ میں خرچ کرو اس کے بعد بتایا کہ جس نظام حیات کی تم دعوت لے کر کھڑے ہوئے ہو اس میں اور دُنیا کے نظام ہائے حیات میں بہت بڑا فرق ہے۔ یہ نظام حیات اللہ سبحانہٗ کی جانب سے انبیاء کا لایا ہوا ہے۔ اس کے بعد اللہ سبحانہٗ کا جامع تصور اور کائنات کی حیثیت اور اس میں انسان کا اللہ کے مقابلے میں مقام بتا کر دونوں نظاموں الٰہی اور انسانی کا اوّلاً نظریاتی تقابل اور پھر واقعاتی تقابل پیش فرمایا۔ الٰہی مقصد کی خاطر دفاع کی تیاری کے سلسلے میں مال خرچ کرنے کی جو اہل ایمان کو تلقین کی گئی تھی یہاں تمثیل کے ذریعے اس راہ میں خرچ کرنے کی قدر و قیمت بتائی جارہی ہے اور اس پر آمادہ کیا جارہا ہے کہ جس مقصدِ عظیم پر تم ایمان لاتے ہو اور جس کی خاطر جان و مال کی قربانیاں کرنے کا تمہیں حکم دیا جارہا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ تمہارا ذاتی انفاق یا قومی اغراض سے بالاتر ہو کر ہو۔ ان مادہ پرست لوگوں

کی طرح نہ ہو جو صرف پیسہ کمانے کے لیے جیتے ہیں اور پیسے پیسے پر جان دیتے ہیں اور جن کی نگاہ ہر وقت نفع ونقصان کی میزان ہی پر جمی رہتی ہے کبھی اس کے لیے تیار ہی نہیں ہوتے کہ محض رضائے الٰہی کے لیے خرچ کریں اور اگر بظاہر کرتے بھی ہیں تو پہلے اپنی ذات، اپنی برادری یا اپنی قوم کے مادی منافع کا حساب لگا لیتے ہیں۔ اس ذہنیت کے ساتھ اس نظامِ حیات کی راہ پر انسان ایک قدم بھی نہیں چل سکتا جس کا مطالبہ یہ ہے کہ دنیوی فائدوں اور نقصانوں سے بالاتر ہو کر محض اللہ کے کلمہ کا بول بالا کرنے کے لیے اپنا وقت، اپنی قوتیں اور اپنی کمائیاں خرچ کرو۔ ایسے نظامِ حیات پر چلنے کے لیے نظر کی وسعت، حوصلے کی فراخی، دل کی کشادگی اور خالص اللہ کی رضا طلبی کی ضرورت ہے۔ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں آیۃ الکرسی میں علم وقدرت وغیرہ صفاتِ الٰہی کا ذکر تھا۔ اس کے بعد یہ تین قصے بیان فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے ہدایت کر سکتا ہے اور جس کو چاہے گمراہ کر سکتا ہے اور مارنا جلانا سب اس کے اختیار میں ہے اب جہاد اور اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت اور اس کے متعلق قیود وشرائط بیان فرمائے جس کا ذکر کسی قدر گزر بھی چکا ہے کیونکہ جہاد وانفاق مال میں جو موانع نظر آتے ہیں حق تعالیٰ کے علم وقدرت کے یقین کر لینے کے بعد اور اس کے عجائب قدرت کے حالات معلوم ہو جانے کے بعد ان کا ازالہ ہو جائے گا ورنہ کمی تو ضرور آ جائے گی۔

اللہ کی راہ کا مفہوم

۲۶۱۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنا مال خرچ کرتے ہیں۔ اللہ کی راہ سے کیا مراد ہے احکام شریعت کے مطابق سارے نیک کام۔ مال کا خرچ خواہ اپنی ضروریات کی تکمیل میں ہو یا اپنے بال بچوں کا پیٹ پالنے میں یا اپنے اعزہ اقربا کی خبر گیری میں یا محتاجوں کی اعانت میں یا رفاہِ عام کے کاموں میں یا اشاعتِ دین اور جہاد کے مقاصد میں، بہرحال اگر وہ قانونِ الٰہی کے مطابق ہو اور خالص اللہ کی رضا کے لیے ہو تو یہ اللہ کی راہ میں ہوگا۔[1]

فی سبیل اللہ۔ قرآن کی ایک اصطلاح ہے جس کے تحت وہ سارے کام آ جاتے ہیں جو اسلام اور مسلمانوں کی فلاح وبہبود کے لیے کیے جائیں حالات کے اعتبار سے کوئی کام زیادہ اہم ہو سکتا ہے اور کوئی کم لیکن جو کام بھی رضائے الٰہی کے لیے اور شریعت کی ہدایات کے تحت کیا جائے وہ سبیل اللہ ہے۔[2]

دراصل فی سبیل اللہ قرآنِ حکیم کی ایک اصطلاح ہے۔ اس کا ایک خاص مفہوم ہے لغت کی زبان میں تو اس کے معنے صرف اللہ کے راستہ کے ہیں لیکن اصطلاحی طور پر اس کے معنے میں اس قدر وسعت نہیں ہے

[1] تفہیم القرآن [2] تدبر قرآن

جس قدر سمجھی گئی ہے۔ یہ لفظ قرآن میں اس ترکیب کے ساتھ ۶۶ بار استعمال ہوا ہے۔ حافظ ابوالسعادات ابن الاثیر الجزری لکھتے ہیں:

> سبیل اللہ کا لفظ عام ہے جو ہر اس خالص عمل کے لیے آتا ہے جس کی وجہ سے حق تعالیٰ کے تقرب کے راستہ پر فرائض، نوافل اور انواع عبادات کی ادائیگی کے ذریعے گامزن ہو جائے اور جب مطلق استعمال ہو تو بیشتر جہاد کے معنے میں آتا ہے حتیٰ کہ کثرتِ استعمال کی بنا پر ایسا ہو گیا کہ گویا اسی معنے میں منحصر ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ قومی عروج اور اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب و آرزو وہ اصل قوت ہے جو دنیا میں قوموں کو کامیابی اور عظمت سے ہمدوش کرتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد مقصد کی کشش اس کی جدوجہد کا اصلی محرک ہے۔ غرض مقصد اور نصب العین ہی افراد و اقوام کو سرگرم عمل کرتا ہے۔ ان میں زندگی کی حرارت اور سعی و طلب کا ولولہ پیدا کرتا ہے۔ اور مقصد ہی ان تمام اقدارِ حیات کا سرچشمہ ہوتا ہے۔ تمدنی اور معاشرتی نظامات درحقیقت مقصد کے ایک نظام پر قائم ہوتے ہیں۔ اگر کسی وقت زندگی کا رشتہ مقصد سے ٹوٹ جاتا ہے تو زندگی اور زندگی کے سارے شعبے بے جان ہو جاتے ہیں۔ تمدن، تہذیب، معاشرت معاملات، تعلیم، سیاست، معیشت، حکومت حتیٰ کہ رسوم عبادت کا رشتہ جب تک مقصد کے ساتھ وابستہ رہتا ہے، سب جاندار رہتے ہیں اور جب ان کا رشتہ مقصد سے ٹوٹ جائے تو یہ سب بے جان ہو کر رہ جاتے ہیں۔

مثال کے طور پر فوجی طاقت کو لیجئے۔ ظاہر ہے فوجی طاقت فی نفسہٖ مقصود نہیں ہوتی۔ فوجی طاقت کی اس وقت ضرورت ہوتی ہے۔ جب پوری قوم کسی برتر مقصد کے لیے کام کر رہی ہو اور عسکریت اس کے لیے بطور وسیلہ ضروری ہو۔ جب فوجی طاقت کے حصول پر توجہ کی جاتی ہے تو لازماً افرادِ قوم کی جسمانی صحت کو بہتر بنانے کی بھی تدابیر اختیار کی جاتی ہیں اور جسمانی صحت کی ترقی ایک تبعی اور ضمنی مقصد قرار پاتی ہے۔ صحتِ عامہ کی ترقی کے لیے فن طب اور علم حفظانِ صحت پر بھی توجہ مبذول کی جاتی ہے اور نتیجۃً علوم طب کی ترقی و اشاعت بھی ایک ذیلی مقصد کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح مقاصد کا ایک سلسلہ بن جاتا ہے جو کسی بنیادی مقصد کے تابع ہوتا ہے۔ اب فرض کیجئے کہ ان تبعی مقاصد کو حقیقی مقصد قرار دے دیا جائے اور افرادِ قوم اس بنیادی مقصد کو بھول جائیں جس کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا تھا تو کیا ان مقاصد میں سے کوئی مقصد بھی زندہ رہ سکتا ہے؟

قرآن نے بھی ایمان والوں کا ایک بنیادی مقصد مقرر کیا ہے اور بنیادی مقصد وہی ہے جسے اسلام تعلیل کے ساتھ بعثت کی غرض و غایت قرار دیا گیا ہے یعنی لیظھرہ علی الدین کلہ یعنی رسول اس لیے دنیا میں آیا ہے کہ جس نظامِ حیات کو وہ لے کر آیا ہے اس کو تمام نظام ہائے حیات پر غالب کر دے۔ گویا قرآن کے نزدیک

اسلامی زندگی کا بنیادی مقصد اللہ کے کلمہ کا بول بالا اور اس نظام حق کا دنیا میں قیام ہے جو نبوت کی راہ سے آیا ہے قرآن کی زبان میں اسی بنیادی مقصد کا نام سبیل اللہ ہے اور اس کے مقابلے میں جو کچھ بھی ہے وہ سبیل الطاغوت ہے۔ نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ، عبادات، فرائض اور امر و نواہی سب کے سب اسی بنیادی مقصد کے تابع ہیں کہ اللہ کی زمین پر بس اسی کی بندگی ہو اور معبودانِ باطل کو ہر جگہ سے نکال پھینکا جائے۔ قرآن نے قتال، انفاق جہاد، ہجرت، احصار، اتباع، نصرت، نفر اور دعوت میں اسی بنیادی مقصد کی شرط لگائی ہے اور اس مقصد سے ہٹ کر دوسرے تمام مقاصد کو سُبُل فرمایا ہے۔ ارشاد ہے۔

ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السُبُل۔

یہی میرا سیدھا راستہ ہے اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو

جب یہ مقصد نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے تو اُمتوں میں اسلامی زندگی کی ساری شاخیں مُرجھا جاتی ہیں اور اعمالِ روحانی کی حیثیت رُسوم کی بن کر رہ جاتی ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ والدین کی خدمت اعزہ واقربا کی خبر گیری رفاہِ عام کے کاموں میں پیسے خرچ کرنا اس وقت نیکی ہوں گے جب یہ اس بنیادی مقصد کے لیے ہوں ورنہ والدین کی خدمت، اقربا کی خبر گیری اور محتاجوں کی اعانت تو سب ہی کرتے ہیں اور یہ اپنی جگہ نیکی ہیں اور قرآن کی زبان میں خیر ہیں لیکن ان کاموں کے فی سبیل اللہ ہونے کی شرط یہ ہے کہ اس بنیادی مقصد کی خاطر کیے جائیں اگر آپ مدرسہ بناتے ہیں، کنواں لگاتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں تو بے شک یہ سب کارِ خیر ہیں لیکن اگر یہ بنیادی مقصد کی خدمت کر رہے ہیں تو پھر فی سبیل اللہ ہیں۔

صحت صدقہ کی شرطیں

۷۸۰۔ ان کے خرچ کی مثال اس بیج کے دانے کی ہے جو زمین میں بویا جاتا ہے جب بویا گیا تھا تو ایک دانہ تھا لیکن جب بار آور ہوا تو ایک دانہ سے سات بالیں نکل آئیں اور ہر بال میں سو دانے۔ یعنی اللہ کی راہ میں تھوڑے مال کا ثواب بہت ہے جیسے ایک دانہ سے سات سو دانے پیدا ہوں اور اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے جس کے واسطے اور سات سو سے سات ہزار اور اس سے بھی زیادہ کر دے اور اللہ بہت بخشش والا اور ہر ایک خرچ کرنے والے کی نیت اور اس کے خرچ کی مقدار اور مال کی کیفیت کو خوب جانتا ہے یعنی ہر ایک سے اس کے مناسب معاملہ فرماتا ہے [1]

[1] افادات شیخ الہند۔

مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کا اجر و ثواب ایک سے لے کر سات سو گنا تک ہے۔ ایک پیسہ خرچ کرے تو سات سو پیسوں کا ثواب ملتا ہے۔ صحیح اور معتبر احادیث میں ہے کہ ایک نیکی کا ثواب دس گنا تک ملتا ہے اور سات سو گنا تک پہنچ سکتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا کہ جہاد و حج میں ایک درہم خرچ کرنے کا ثواب سات سو درہم کے برابر ہے۔ یہ روایت ابن کثیرؒ نے بحوالہ مسند امام احمدؒ نقل فرمائی ہے[1]

ایک عام فہم مادی مثال دے کر سمجھا دیا کہ اللہ کے راستہ میں دینے کا طریقہ کیا ہے۔ آپ ذرا غور فرمائیں کہ ایک کاشتکار ایک دانہ گندم سے سات سو دانے کیسے حاصل کرتا ہے، اس طرح کہ دانہ گندم اچھا اور عمدہ ہو، بچا ہوا نہ ہو، جس زمین میں دانہ ڈال رہا ہے وہ زمین بھی عمدہ ہو۔ اور خود کاشتکار کاشتکاری کے فن سے آشنا ہو۔ ان باتوں میں سے ایک بات بھی نہ ہوگی تو ایک دانہ میسر نہ آئے گا اور اگر میسر بھی آیا تو ایسا بار آور نہ ہوگا کہ ایک دانہ سے سات سو دانے بن جائیں۔

یہی حال اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا ہے۔ کاشتکاری کے فن سے واقفیت یہ ہے کہ خرچ کرنے میں ایمان کے ساتھ اخلاص ہو دانہ اور بیج کا عمدہ ہونا یہ ہے کہ جو کچھ اللہ کی راہ میں خرچ کر رہا ہے وہ راہِ حلال سے آیا ہوا مال ہو اور زمین کا عمدہ ہونا یہ ہے کہ جس کو دے رہا ہے وہ اس کا مستحق ہو۔ اس طرح اس مثال سے جیسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی فضیلت معلوم ہو رہی ہے ایسے ہی اللہ کی راہ میں دینے کی شرطیں کہ مال حلال ہو، خرچ کرنے میں ایمان و اخلاص ہو، جس کو دے رہا ہو وہ اس کا مستحق ہو۔ ایک خالص مادی مثال کے ذریعے ایک خالص اجتماعی مسئلہ کو سمجھانا قرآنی بلاغت ہے۔ صرف یہاں نہیں قرآن میں دوسرے مقامات پر لہلہاتی کھیتیوں، ہرے بھرے گھنے باغوں، ان کے مختلف موسمی حالات کا تذکرہ اس بار اس طرح بیان کیا ہے کہ بظاہر یوں محسوس ہوتا ہے کہ شاید اس کتابِ الٰہی کے مخاطب وہی لوگ ہیں جو کاشت کاری اور باغبانی کرتے ہیں۔ اور زراعتی تلمیحات کے ساتھ تجارتی اور کاروباری تلمیحوں سے قرآن بھرا ہوا ہے۔ علماء نے کھیتی کی اس لطیف تمثیل و تشبیہ سے عجیب نکتہ آفرینی فرمائی ہے ایک یہ کہ اپنے مصارفِ خیر کی حفاظت و نگہداشت بھی اہلِ زراعت کی طرح کرنی چاہیے ریا، نمائش، عجب تکبر، ایذا اور احسان رکھنے سے ان کو برباد نہ کرنا چاہیے دوسرے یہ کہ جس طرح تخم ریزی اور آبپاشی کے اختلاف سے پیداوار محنت اور قیمت مختلف ہوتی رہتی ہے۔ اسی طرح اجر اگرچہ مقدار میں برابر ہی برابر ہو تاہم حسنِ قبول و قرب درجات کی کیفیت وغیرہ میں نیت و اخلاص کے اعتبار سے کمی بیشی ہوتی رہتی ہے[2]

---

[1] معارف قرآن [2] بیان القرآن

نیت کے اعتبار سے نیکی کی قسمیں

نیک کام میں خرچ کرنا باعتبار نیت کے تین قسم کا ہے۔ اول نمائش کے لیے اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے اس میں کچھ ثواب نہیں۔ اس کا ذکر آگے آرہا ہے۔ دوم اللہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کیا جائے اس میں ادنیٰ درجہ کا اخلاص ہو۔ اس کا ثواب دس گنا ملتا ہے۔ من جاء بالحسنة فله عشر امثالها میں اس ادنیٰ درجہ ہی کا بیان ہے۔ تیسرے یہ کہ اللہ کی راہ میں بھرپور اخلاص کے ساتھ خرچ کیا جائے اس کے لیے ثواب کا اس آیت میں وعدہ ہے دس سے زیادہ سات سو تک ۔[1]

آیت میں بتایا یہ گیا ہے کہ جس قدر خلوص اور جتنے گہرے جذبے کے ساتھ ایک مسلمان اللہ کی راہ میں مال خرچ کرے گا اتنا ہی اللہ کی جانب سے اس کا اجر زیادہ ہوگا، جو خدا ایک دانے میں اتنی برکت دیتا ہے کہ اس سے سات سو دانے اُگ سکتے ہیں اس کے لیے کچھ مشکل نہیں کہ تمہاری خیرات کو بھی اسی طرح نشوونما دے اور ایک روپے کے خرچ کو اتنی ترقی دے کہ اس کا اجر سات سو گنا ہو کر تمہاری طرف پلٹے ۔[2]

اصل میں تو ضابطہ نیکی کا یہی ہے کہ ایک کے بدلے دس کا ثواب ملتا ہے۔

اس مثال کے ذریعے ہماری اس حیرت کو دور کر دیا کہ ایک معمولی سے صدقہ کا ثواب دس گنا کیوں کر ملتا ہے فرمایا جیسے یہ ایک دانہ سینکڑوں دانے بنتا ہے ایسے ہی نیکی کا ایک بیج ثواب کے سینکڑوں دانے پیدا کر لیتا ہے۔

۱۸۷ ۔ اور اللہ جس کے لیے چاہتا ہے اس سے بھی دوگنا کر دیتا ہے۔ وہ بڑی وسعت رکھنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جس کے لیے چاہتا ہے سات سو سے بھی ثواب میں اضافہ کر دیتا ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ سات سو کی زیادتی اس شخص کے لیے ہوتی ہے جس کے لیے اللہ چاہتا ہے۔ آیت کے آخر میں واللہ واسع علیم فرمایا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ ہم صاحب وسعت ہیں یعنی ثواب زیادہ دیتے ہیں۔ ہمارے ہاں کوئی کمی نہیں ہے۔ لوگوں نے گنجائش اور کشائش کا ترجمہ کیا ہے۔ اردو میں بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ فلاں شخص کا دسترخوان بڑا وسیع ہے، فلاں شخص دینے میں بڑا وسیع حوصلہ ہے۔ علیم کا مطلب ہے کہ ہم ہر شخص کی حالت سے خوب واقف ہیں جس میں جس قدر خلوص ہوگا اور خیرات کرنے میں جس قدر مشقت اٹھائے گا۔ اسی قدر اس کے اجر و ثواب میں زیادتی ہوگی۔

---

[1] بیان القرآن [2] تفہیم القرآن

اس فقرے میں اللہ کی دو صفتیں بیان ہوتی ہیں۔ایک یہ کہ وہ فراخ دست ہے۔اس کا ہاتھ تنگ نہیں ہے کہ تمہارا عمل فی الواقع جتنی ترقی اور جتنے اجر کا مستحق ہو وہ دے نہ سکے دوسرے یہ کہ وہ علیم ہے بے خبر نہیں ہے کہ جو کچھ تم خرچ کرتے ہو اور جس جذبے سے کرتے ہو اس سے وہ ناواقف رہ جائے اور تمہارا اجر مارا جائے۔

قانونی اور اخلاقی انفاق

یہ آیت دراصل اس انفاق کی فضیلت بیان کر رہی ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے یعنی اللہ کے کلمہ اور اس کے دین کو برتر کرنے کے لیے کیا جائے یہی اس آیت کا منطوق ہے۔جب تک منتشر افراد ایک شیرازے میں نہیں بندھ جاتے جماعت کا وجود نہیں ہوتا لیکن جماعت کے وجود کے ساتھ ہی افراد کی طرح جماعت کو بھی ضروریات پیش آتی ہیں۔جماعت کے کمزوروں، معذوروں اور مفلسوں کی مدد جماعت اور اس کے مقصد حیات کی حفاظت کے لیے سرفروشانہ مجاہدے کی صورت میں اس کے اخراجات کی کفالت، اس مقصد کے لیے کام کرنے والوں کی آمد و رفت اور سفر کے وسائل کی بہم رسانی، مقصد کی خاطر جماعت کے مالی نقصان اُٹھانے والوں اور مقروضوں کی امداد کرنا۔جماعت کے ان کارکنوں کو معاوضہ دینا جو جماعت کی علمی تعلیمی خدمت بجا لائیں۔ اس آیت میں اسی انفاق کی فضیلت بیان ہو رہی ہے یہ انفاق مال جس کی قرآن یہاں بزرگی بیان کر رہا ہے زکوٰۃ کے علاوہ ہے۔اسلام نے انفاق کے دو درجے رکھے ہیں ایک قانونی دوسرے اخلاقی۔قانونی انفاق میں تو زکوٰۃ اور نفقات واجبہ ہیں اور اخلاقی انفاق جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے اس کا بلند سے بلند تصور پیش کیا ہے اور اس کی قدر و قیمت کو نہایت اونچا بتایا ہے۔صحابہ میں اخلاقی انفاق پر عمل کے مختلف مظاہر تھے۔ان میں وہ بھی تھے جو قرآن کی ان ترغیبات کی وجہ سے کل کے لیے اٹھا کر رکھنا بھی پسند نہ کرتے تھے جیسے ابوذر غفاریؓ حضرت ابوبکرؓ اور ایسے جو بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ اللہ کی راہ میں لٹا دیتے تھے جیسے حضرت عبدالرحمان بن عوفؓ اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے اور خود تکلیف اُٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے جیسے حضرت علیؓ اور بعض انصار کرام۔اللہ سبحانہ نے ان کی مدح فرمائی۔یہ سب اس لیے تھا کہ انھوں نے قرآن سے یہ بات سُنی تھی کہ کمثل حبة انبتت سبع سنابل فی کل سنبلة مائة حبة اور پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانِ مبارک سے یہ ترغیب سُنی کہ

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص اللہ کی راہ میں خرچ کے لیے رقم روانہ کرے اور خود گھر ہی بیٹھا ہے اس کو اللہ سبحانہ... سوگنا ثواب دیں گے اور جو خود بھی راہِ خدا میں کام کے لیے

نکل جائے اور رقم بھی خرچ کرے اس کو اللہ سبحانہ سات لاکھ گنا اجر عطا فرمائیں گے۔ اس کے بعد آپ نے قرآن کی یہی تلاوت فرمائی۔

یہ ارشادِ نبوت ابن کثیر نے تو ابن ابی حاتم کے حوالہ سے صرف حضرت عمران بن حصین کی زبانی نقل کیا ہے لیکن علامہ آلوسی کا کہنا ہے کہ ابن ماجہ اور ابن ابی حاتم نے یہ ارشاد ان جلیل القدر صحابہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ حضرت علی، حضرت ابوالدرداء، حضرت ابوہریرہ، حضرت عمران بن حصین، حضرت ابوامامہ، حضرت عبداللہ بن عمر، اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

قبولیتِ صدقہ کی شرطیں

۲۶۲ ۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور اس طرح خرچ کرتے ہیں کہ

۱۔ ایمان واخلاص ہو۔ ۲۔ مال حلال ہو۔ ۳۔ مصرف صحیح ہو۔

اس آیت میں اسی کی قبولیت کی شرطیں بتائی جارہی ہیں۔ جس طرح نماز کے لیے دو قسم کی شرطیں ہیں ایک شرطِ صحت دوسرے شرطِ قبولیت، اسی طرح جو کچھ راہِ خدا میں دیا جائے اس کے لیے دو قسم کی شرطیں ہیں۔ ایک شرائطِ صحت، دوسرے شرائطِ قبولیت۔ شرائطِ صحت آپ سن چکے ہیں۔ شرائطِ قبولیت یہ ہیں کہ۔

۱۔ جس کو دیا ہے اس پر احسان نہ جتایا جائے۔

۲۔ برتاؤ سے اس کو طعنہ دے کر یا خدمت لے کر تحقیر نہ کی جائے اور اس کی دلآزاری کا کوئی طریقہ اختیار نہ کیا جائے۔

گویا اس آیت میں صدقہ کے قبول ہونے کی دو منفی شرطیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ دے کر احسان نہ جتلائے دوسرے یہ کہ جس کو دے اس کو عملاً ذلیل نہ کرے اور کوئی ایسا برتاؤ کرے جس سے وہ اپنی حقارت اور ذلت محسوس کرے یا اس کو ایذا ہو[۲]

حضرت عبدالرحمان بن یزید فرماتے ہیں کہ میرے والد کہا کرتے تھے اگر کسی کو کچھ دو اور تم دیکھو کہ جب تم آتے جاتے اسے سلام کرتے ہو تو وہ شرمندہ ہوتا ہے یا تمہارا سلام کرنا اس پر گراں گزرتا ہے تو اس کو سلام نہ کیا کرو کبھی یہ من اور اذی میں داخل نہ ہو جائے۔

---

[۱] افاداتِ شیخ الہند [۲] معارف م ش

بطلب ہے کہ یہ سات سو گنا اور اس سے زیادہ کا اجر عظیم ان خرچ کرنے والوں کے لیے ہے جو خرچ کرنے کے بعد نہ تو ان لوگوں پر کوئی احسان جتائیں جن پر انھوں نے خرچ کیا ہے اور نہ کسی پہلو سے ان کی دل آزاری کریں۔ یہ واضح رہے کہ یہ دل آزاری اور احسان جتانا ایک ہی فاسد کردار کے دو پہلو ہیں۔ لئیم اور کم ظرف لوگ اگر کسی پر کچھ خرچ کر بیٹھتے ہیں تو اس کے بدلے میں ان کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ وہ شخص زندگی بھر ان کا ممنونِ احسان بن کے رہے اگر وہ یہ محسوس کرتے ہیں کہ ان کی یہ خواہش پوری نہیں ہو رہی ہے تو پھر اس کو وہ اپنے طعنوں کا ہدف بناتے ہیں اور جہاں ان کو موقعہ ملتا ہے اس کو ذلیل کرتے ہیں فرمایا کہ ایسے لوگوں کے لیے کوئی اجر نہیں ہے اجر ان کے لیے ہے جن کا انفاق اس سے محفوظ ہو[1]

اجر کی تعبیر قرآن میں آخرت میں عند اللہ قبولیت کی تعبیر ہے اس لیے کہ آخرت کی زندگی ہی ایک ایسی زندگی ہے جہاں انسان اپنے اعمال کی مقبولیت کا اپنی آنکھوں سے نظارہ کرے گا۔ اس میں لطیف اشارہ ہے کہ جن کے اللہ کی راہ میں کیے ہوئے خرچ قبول ہوں گے وہ ہی جنت کے لائق ہوں گے اور اس میں نہ ان کو ماضی کا کوئی غم ہوگا اور نہ مستقبل کا کوئی اندیشہ۔

ان دو فقروں کے درمیان ثُمَّ لانے کی وجہ

شارحینِ قرآن کے یہاں یہ بات بے صد اہمیت رکھتی ہے کہ اس آیت میں دو فقروں کے درمیان بجائے اور کے پھر کیوں لائے ہیں۔ عربی میں اور کے لیے واؤ اور پھر کے معنے کے لیے ثم آتا ہے۔ آیت میں بجائے و کے ثم آیا ہے۔ یہ حرفِ عطف ہے۔ یہ اپنے ماقبل سے اپنے مابعد کے مؤخر ہونے کو بتاتا ہے۔ خواہ یہ مؤخر ہونا بالذات ہو یا مرتبہ کے لحاظ سے ہو یا وضع کے لحاظ سے ہو۔ ماصلاً دونوں کاموں کے زمانی تفاوت کو ظاہر کرتا ہے علامہ آلوسی نے اس کو یہاں تاخرِ زمانی پر محمول کیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہو گا کہ اگرچہ اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت جو کچھ خرچ کیا وہ پورے اخلاص سے کیا لیکن خرچ کرنے کے بعد اگر اپنی زندگی میں کسی وقت بھی احسان جتا دیا یا ایذا دی یا ایسا کر دیا کہ جس میں اسے طعنہ کا ہدف بنا لیا تو اللہ کی راہ میں دیئے ہوئے صدقہ کی قبولیت پامال ہو کر رہ جائے گی اور آلوسی ہی نے الانتصاف سے یہ لطیف نکتہ آفرینی بھی نقل کی ہے کہ یہاں ثم یہ بتانے کے لیے لائے ہیں کہ خرچ کرنے والے احسان نہ جتانے اور ایذا نہ پہنچانے پر مداومت اور ہمیشگی کرتے ہیں اور پوری زندگی کے کسی لمحہ میں کبھی بھی احسان جتانے اور تکلیف دینے کا ارتکاب نہیں کرتے ہیں۔ گویا آیت کا مطلب یہ ہوا کہ جو لوگ پورے

---

[1] تدبر قرآن

اخلاص سے اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں اور زندگی میں آگے چل کر کبھی ایسا موقعہ درپیش آجائے کہ کسی موقعہ پر وہ اسے طعنہ دے دیں تو ان کی محنت کا اللہ کے یہاں کوئی مقام نہیں ہے۔ یہاں حافظ ابن جریر کی یہ بات بڑی برمحل ہے کہ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے راہِ خدا میں خرچ کرنے والے کے لیے قبولیت کی یہ شرط لگائی ہے کہ احسان نہ جتائے اور ایذا نہ دے کیونکہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کا مقصد ہی رضائے الٰہی اور خوشنودیٔ مولیٰ کی طلب اور جستجو ہیں۔ اس طلب میں جب بھی آمیزش ہو گی مقصد فوت ہو جائے گا۔

دلداری کا ایک کلمہ دل آزار صدقہ سے بہتر ہے

۷۸۳۔ ایک میٹھا بول اور ذراسی چشم پوشی اس صدقہ سے بہتر ہے جس کے پیچھے دکھ ہو اور اللہ بے نیاز و بُردبار ہے یعنی مانگنے والے کو نرمی سے جواب دینا اور اس کے اصرار اور بدخوئی پر درگذر کرنا بہتر ہے، اس خیرات سے کہ بار بار اس کو شرمائیے۔ یا احسان رکھے یا طعنہ دے اور غنی ہے کہ کسی مال کی اس کو پروا نہیں ہے جو صدقہ اس کی راہ میں کرتا ہے اپنے واسطے کرتا ہے اور حلیم ہے کہ ستانے پر گرفت میں جلدی نہیں کرتا[1] مطلب یہ ہے کہ ناداری کے وقت جواب میں معقول بات اور مناسب بات کہہ دینا اور اگر سائل بدتمیزی سے غصہ دلا دے یا اصرار سے تنگ کرے تو اس سے درگزر کرنا ہزار درجہ بہتر ہے اس صدقہ سے جس کے بعد آزاد ہو۔ ناداری کی قید اس لیے لگائی ہے کہ استطاعت کے وقت حاجت مند کی مدد نہ کرنا خود بُرا ہے۔ اس کو بہتر کیوں کہا جاتا ہے البتہ ناداری کے وقت نرمی سے جواب دینا اور سائل کی سختی کو ٹال دینا چونکہ موجب ثواب ہے۔ اس لیے اس کو خیر فرمایا ہے اور چونکہ کسی کو تکلیف دینا حرام اور قابلِ گرفت ہے اس لیے اس صدقہ سے خیر کی نفی فرمائی گئی جس میں حرام کی آمیزش ہو۔ تکلیف دینے میں احسان جتانا بھی داخل ہے[2]

قرآن کی دوگونہ اصلاح

قرآن کا نزول کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لیے نہیں ہوا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے ذریعہ ہر طبقہ کے مصلح اور معلم بنا کر روانہ کیے گئے ہیں، غریب و امیر، مسکین و دولت مند دونوں آپ کی نگاہ میں یکساں ہیں اس لیے آپ نے ایک ہی طبقہ کی اصلاح نہیں فرمائی ہے بلکہ دونوں طبقوں کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر برابر بانٹ سے ناپا ہے اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات میں سے دونوں کو مساوی حصہ دیا ہے۔ یہ اخلاقی اصلاح کی وہ نازک

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] بیان القرآن

منزل ہے جس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی اخلاقی معلم کے قدم نہ جم سکے اور نہ وہ اپنے ہاتھ میں ترازو کے دونوں پلڑوں کو برابر رکھ سکے۔ اگر غریبوں کی اصلاح کی خاطر صدقہ و خیرات اور دوسروں کی ہمدردی کے تمام دروازے بند کر دیئے جائیں تو انسانی جوہر شرافت کی بربادی کے ساتھ امراء کا طبقہ اپنے معائب کی فراوانی اور اخلاقی محاسن سے تہی دامن ہو جائے گا اور اگر غرباء کو ہر قسم کی اعانت طلبی کی اجازت دے دی جائے تو انسانوں کی وسیع آبادی کی اخلاقی زندگی تباہ ہو جائے گی۔ اس لیے قرآن نے انسانوں کے دونوں طبقوں کے سامنے وہ ہدایات پیش کیں جن سے دونوں طبقوں کو اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے اخلاقی معیار کی ترقی کا موقع مل گیا۔ اور دونوں کو اپنی اپنی شرافت کے جوہر پیش کرنے کی صورت ہاتھ آگئی

ان تین رکوعوں میں اگرچہ براہِ راست مخاطب دولت مند ہیں مگر ضمناً اور تبعاً غرباء کو بھی سمجھایا جا رہا ہے اس آیت میں دولت مندوں کو سمجھایا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جو کچھ دیا جائے خالصتہ لوجہ اللہ دیا جائے۔ یعنی لینے والے پر نہ کسی قسم کا احسان جتایا جائے اور نہ اس کو ذلیل و رسوا کیا جائے کیونکہ اس سے ایک طرف اگر دینے والے کی اخلاقی پستی اور رذالت ظاہر ہوتی ہے تو دوسری طرف خود لینے والے کی خودداری کی روح اور اخلاقی غیرت کی حس کو صدمہ پہنچتا ہے۔ قرآن نے انہی باتوں کو سامنے رکھ کر یہ تعلیم دی ہے کہ اگر تمہارے پاس دینے کو کچھ نہ ہو تو تمہارا فرض یہ ہے کہ منہ سے میٹھا بول بولو۔ اور اس کی علت یہ بتائی کہ نادار اور مصیبت زدہ کے لیے تمہارے منہ کا دلداری کا ایک کلمہ اس خیرات سے بہتر ہے جس کے بعد زبان کی تلخی ہو۔ اور اگر کوئی مصیبت زدہ دل کا بہت ہی زخمی ہو اور اس کے غلط رویہ سے تمہیں ناگواری ہو تو اس سے درگذر کرو۔ کیونکہ غنا اور حلم میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ رضائے الٰہی کے مطابق انفاق کے لیے ضروری ہے کہ دامان حلم ہاتھ میں ہو۔ اگر ایسا نہیں ہے تو یہ انفاق کا حق ادا نہیں ہو سکتا۔ اگر وہ انفاق کرتا بھی ہے تو بسا اوقات ثواب کمانے کے بجائے اُلٹا اس سے گناہ کما لیتا ہے۔ جن کے پاس مال ہوتا ہے ان کے اندر عموماً ایک احساس برتری پیدا ہو جاتا ہے۔ اس وجہ سے وہ محتاجوں اور سائلوں کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں وہ اکثر مانگنے والوں کو جھڑک دیتے ہیں۔ یہ تمام خرابیاں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ ان کے پاس غنا تو ہوتا ہے لیکن غنا کا جو حلم سے رشتہ ہے وہ موجود نہیں ہوتا۔ قرآن نے دوسرے موقعہ پر جہاں انفاق کی تاکید ہے وہاں احسان کا بھی حکم دیا ہے یعنی انفاق میں حسن کارِ نیکی کا پیچھے پڑھ آئے ہو۔

انفقوا فی سبیل اللہ ولا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ واحسنوا

ان اللہ یحب المحسنین۔

اللہ کی غنا و حلم کی صفات کا تقاضا

اور اسی بنا پر یہاں آیت کا خاتمہ اللہ کی صفت غنی، حلیم پر کیا ہے یعنی واللہ غنی حلیم اللہ بے نیاز اور

بُردبار ہے۔ اس ایک فقرے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں ایک یہ کہ اللہ تمہاری خیرات کا حاجت مند نہیں ہے دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ چونکہ خود بُردبار ہے۔ اس لیے پسند بھی وہی لوگ ہیں جو چھچھورے اور کم ظرف نہ ہوں بلکہ فراخ حوصلہ اور بُردبار ہوں۔ جو خدا تم پر زندگی کے اسباب و وسائل کا بے حساب فیضان کر رہا ہے اور تمہارے قصوروں کے باوجود تمہیں بار بار بخشتا ہے۔ وہ ایسے لوگوں کو کیوں کر پسند کر سکتا ہے جو کسی غریب کو ایک روٹی کھلا دیں تو احسان جتا جتا کر اس کی عزتِ نفس خاک میں ملا دیں، اسی بنا پر حدیث میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس شخص کو قیامت کے روز شرفِ ہمکلامی اور نظرِ عنایت سے محروم رکھے گا جو اپنے عطیہ پر احسان جتاتا ہو[1]

یہاں غنی و حلیم کی صفتوں کے حوالے میں نکتہ یہ ہے کہ اللہ چونکہ غنی ہونے کے ساتھ حلیم بھی ہے اس وجہ سے اپنے بندوں کی تمام کوتاہیوں کے باوجود ان کو اپنے جود و کرم سے محروم نہیں کرتا۔ حلم کے معنے یہ ہیں کہ انتقام کی قدرت کے باوجود کسی ناگوار اور اشتعال انگیز بات کو برداشت کر لیا جائے اور قصور وار سے اس کے بیجے کوئی تعرض نہ کیا جائے۔ یہ قدرت سب سے زیادہ اللہ سبحانہٗ کو ہے لیکن اس قدرت کے باوجود اکثر اپنے بندوں کی برائیوں، نافرمانیوں، اور گناہوں سے وہ چشم پوشی کرتا ہے اور انتقام نہیں لیتا اور اسی لیے اس نے قرآن میں جہاں بھی اپنے آپ کو حلیم کہا ہے ساتھ ہی اپنی بخشش کا بھی ذکر کر دیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ اس کی یہ بخشش اس کے حلم کا نتیجہ ہے۔ واللہ غفور حلیم۔ ان اللہ غفور حلیم۔ انہ کان حلیمًا غفورًا۔ ان سب آیتوں میں اپنی صفت حلیم کے ساتھ اپنی مغفرت کا ذکر کیا ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ اس کی غفاری نعوذ باللہ کسی ضعف یا عدم قدرت کی وجہ سے نہیں بلکہ اس کی شانِ حلیمی کا نتیجہ ہے۔ دوسری جگہ حلم کے ساتھ اپنی صفتِ علم کا ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے۔ واللہ علیم حلیم۔ ان اللہ لعلیم حلیم۔ وکان اللہ علیمًا حلیمًا۔ ان آیتوں سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ وہ انسانوں کی طرح بے جانے بوجھے یا محدود علم کے سبب سے بردباری نہیں کرتا بلکہ پورے علم اور ہر چیز اور ہر نتیجہ سے باخبر ہو کر بردباری فرماتا ہے۔ اس آیت میں اپنی بردباری کے ساتھ اپنی صفتِ استغنا کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ یہاں انفاق اور صدقہ کا تذکرہ ہے اس لیے یہ ظاہر فرما دیا کہ وہ مستغنی ہے اور بردبار ہے یعنی اگر وہ استغنائی شان کی وجہ سے بندوں کو اپنے فضل و کرم سے محروم کر دے تو کون ہے جو کسی نعمت تک رسائی حاصل کر سکے۔ یہ اللہ کی صفت ہی ہے جس کی وجہ سے نیکوکار اور گنہگار سب کے لیے رزق کے خزانے کھلے ہوئے ہیں۔ اگر اس فضل سے تمہارے اندر غنا آیا ہے تو اس کے ساتھ اس کی صفتِ حلم کا عکس بھی اپنے اندر پیدا کرو۔

[1] تفہیم القرآن

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُواْ لَا تُبۡطِلُواْ صَدَقَٰتِكُم بِٱلۡمَنِّ وَٱلۡأَذَىٰ
كَٱلَّذِي يُنفِقُ مَالَهُۥ رِئَآءَ ٱلنَّاسِ وَلَا يُؤۡمِنُ بِٱللَّهِ وَٱلۡيَوۡمِ
ٱلۡأٓخِرِۖ فَمَثَلُهُۥ كَمَثَلِ صَفۡوَانٍ عَلَيۡهِ تُرَابٞ فَأَصَابَهُۥ وَابِلٞ
فَتَرَكَهُۥ صَلۡدٗاۖ لَّا يَقۡدِرُونَ عَلَىٰ شَيۡءٖ مِّمَّا كَسَبُواْۗ وَٱللَّهُ لَا
يَهۡدِي ٱلۡقَوۡمَ ٱلۡكَٰفِرِينَ ٢٦٤

مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور اذیت پہنچا کر رائیگاں نہ کرو[۴۸۴] اُس شخص کی طرح جو محض لوگوں کے دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا[۴۸۵]، لہٰذا ایسے شخص کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر کی ایک چٹان اس پر مٹی کی تہ جم گئی اور اس میں بیج بو یا گیا، جب زور سے پانی برسا تو ساری مٹی مع بیج کے بہہ گئی اور ایک صاف اور سخت چٹان کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔ یہی حال ان ریاکاروں کا بھی ہے[۴۸۶]۔ انھوں نے اپنے خیال میں خیرات کر کے جو کچھ بھی کمایا ہے وہ ریاکاری کی وجہ سے رائیگاں گیا، کچھ بھی ان کے ہاتھ نہ لگا اور اللہ کافروں کو راہ نہیں بتاتا ہے[۴۸۷]۔

ریاکاری کی خیرات اور اس کی مثال

پہلی آیت میں احسان جتانے اور تکلیف دینے کا تذکرہ ضمنی تھا۔ اب اس آیت میں صراحۃً ذکر ہے اور اس کے ساتھ ریاکاری کی خیرات کا بھی حکم بتایا جا رہا ہے۔ من واذیؔ۔ اور ریا میں اس لحاظ سے خاص تعلق ہے کہ صدقہ میں من واذیٰ نہ ہونا شرطِ قبولیت ہے اور ریا نہ ہونا شرطِ صحت ہے۔ حضرت مولانا تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں۔ طاعات کی صحت اور بقاء کے لیے جس طرح ایمان شرط ہے حتیٰ کہ کافر کی کوئی طاعت نہ صحیح ہوتی ہے اور نہ مقبول اور اگر طاعت بحالتِ ایمان کی گئی ہو اور معاذ اللہ بعد میں کافر ہو جائے تو طاعت طاعت نہیں رہتی اسے قرآن کی زبان میں حبط کہتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح ایمان کے علاوہ بھی طاعات کی صحت اور قبولیت کے لیے کچھ شرطیں ہیں جیسے نماز کے لیے وضو شرطِ صحت ہے، اور اخلاص شرطِ قبولیت ہے۔ اسی طرح صدقہ کے لیے بھی ایمان کے علاوہ اخلاص شرطِ صحت اور احسان نہ جتانا اور تکلیف نہ دینا شرطِ قبولیت ہے۔ اسی بنا پر ریاکار اور منافق کے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کو باطل بتایا گیا ہے کیونکہ اس میں شرطِ صحت موجود نہیں ہے۔ اور جس صدقہ میں من واذیٰ ہو اس کو بھی رائیگاں قرار دیا کیونکہ اس میں شرطِ قبولیت مفقود ہے، اور چونکہ ریاکاری پر مبنی صدقہ کا بیکار ہونا زیادہ واضح ہے اس لیے احسان جتا کر اور تکلیف دے کر صدقہ دینے کو ریاکار کے صدقہ سے تشبیہ دی ہے، اور ریاکار کے معاملہ کو بے ایمان ریاکار ہونے کی قید لگا کر اور زیادہ سنگین کر دیا ہے ورنہ صرف بے ایمانی اور صرف ریاکاری ہی صدقہ کی صحت میں مانع ہیں۔ من اور اذیٰ پر مشتمل صدقہ کو ریاکاری کے صدقہ سے تشبیہ دے کر سمجھا دیا کہ یہ بُرائی پچھلی بُرائی سے بھی سخت ہے کیونکہ جو شخص نیکی کو نیکی کے لیے نہیں بلکہ نام و نمود کے لیے کرتا ہے اور اللہ سبحانہٗ کی جگہ انسانوں کی نگاہوں میں بڑائی چاہتا ہے وہ یقیناً خدا پر سچا ایمان نہیں رکھتا۔

۲۸۴۔ اے مسلمانو! اپنی خیرات کو احسان جتا کر اور تکلیف دے کر رائیگاں نہ کرو۔ اس آیت میں ابطال کی تعبیر عدمِ قبولیت اور ثواب کی محرومی کے لیے ہے اور دونوں باتوں میں بہت بڑا فرق ہے کسی چیز کا موجود ہونا اور ہے اور موجود ہونے کے بعد مقبول نہ ہونا اور ہے۔ یعنی صدقہ کا قانونی وجود تو ہو جائے گا مگر عند اللہ مقبول نہ ہوگا۔ کیونکہ صدقہ میں من واذیٰ نہ ہونا صدقہ کی مقبولیت کی شرط ہے۔ صدقہ کی صحت کی شرط نہیں ہے۔ مشہور مفسرِ قرآن ابن عطیہ کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ ابطال کا زور نفسِ صدقہ پر نہیں بلکہ صدقہ کے اجر پر ہے۔ ظاہر ہے کام کیا جائے اور محنت لگائی جائے اور اس کا حاصل دستیاب نہ ہو تو یہ کام کا رائیگاں کرنا ہے۔ شاید اسی بنا پر قرطبی نے ابطال کی اجر و ثواب کی محرومی سے تفسیر کی ہے۔

کیا گناہوں سے نیکیاں رائیگاں ہوجاتی ہیں

اہل سنت والجماعت کا مذہب یہی ہے کہ ہر گناہ نیکی کو ضائع نہیں کرتا جبکہ عقلیت کے مریض کہتے ہیں کہ ہر گناہ سے نیکیاں رائیگاں ہوجاتی ہیں یعنی اگر آپ نے آج جھوٹ بول دیا تو عمر بھر کی آپ کی ساری نیکیاں خواہ یہ عبادات کی شکل میں ہوں یا معاملات واخلاق کی صورت میں ہوں اکارت ہوگئی ہیں۔ اہل سنت والجماعت کا اس موضوع پر نظریہ اس سے مختلف ہے وہ فرماتے ہیں کہ کفر کے علاوہ کوئی چیز گزشتہ نیکیوں کو ضائع اور رائیگاں نہیں کرتی۔ اس آیت میں جو صدقہ من اور اذیٰ سے رائیگاں ہوا ہے تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ گناہ سے نیکی ضائع ہوگئی بلکہ اصل اور بنیادی وجہ یہ ہے کہ صدقہ کی قبولیت کی شرط قرآن نے پہلی آیت ثم لا یتبعون ما انفقوا منا ولا اذیٰ میں یہ بتائی ہے کہ قابل پذیرائی وہ صدقہ ہے جس میں من اور اذیٰ نہ ہو۔ چونکہ من اور اذیٰ نہ ہونا صدقہ کے مقبول ہونے کی بنیادی شرط ہے اس لیے یہاں صدقہ موجود ہونے کے باوجود رائیگاں ہوگیا۔ اور جن احادیث سے بظاہر یہ سمجھا جاتا ہے کہ گناہوں اور برائیوں سے نیکیاں اور طاعات رائیگاں ہوجاتی ہیں تو ان کا مطلب یہ ہے کہ ان کے انوار و برکات سے محرومی ہوجاتی ہے جیسے حدیث میں ہے کہ جب بندہ زنا کرتا ہے تو اس سے ایمان نکل جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کا نور اور برکت نہیں رہتی ہے۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ وہ کافر ہوجاتا ہے۔

بہر حال صدقہ کے باطل ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ عنداللہ مقبول نہیں ہوتا اور ایسے صدقہ میں جس میں احسان جتانے اور دل آزاری کی آمیزش ہو ثواب اور اجر سے محرومی ہوجاتی ہے اور عمل کی دنیا میں چاہے آپ اسے صدقہ کہیں مگر دار جزا میں یہ صدقہ نہیں ہے اور اس کا یہ عمل رائیگاں ہے۔

قانونی نکتہ آفرینی

ابوبکر الجصاص رازی نے اس آیت سے یہ قانونی نکتہ آفرینی خوب کی ہے کہ ایسے تمام کام اور ایسی تمام طاعتیں جو خالص رضائے الٰہی کی خاطر علی وجہ القربت کی جاتی ہیں اس میں کسی دوسری چیز کی آمیزش عامل کو اجر سے محروم کر دیتی ہے۔ اسی بنا پر فقہاء احناف نے تعلیم قرآن اور ان تمام اعمال میں جن کو علی وجہ القربت کہا جاتا ہے۔ اُجرت لینے کی بنا پر قربت سے خارج کر دیا ہے۔ یعنی اگر ایک شخص نے اُجرت لے کر پڑھایا تو اس میں اب قربت ہونے کے معنے نہیں رہے اس کو اللہ کے یہاں اس کا اجر نہ ملے گا اور چونکہ قرآن نے ابطال عمل سے منع کیا ہے اس لیے ایسا کرنا روا نہیں ہے۔ یہ امر آخر ہے کہ متاخرین احناف نے اس پر اُجرت لینے کے جواز کا فتویٰ دے دیا ہے لیکن

آج تک کسی نے دعویٰ نہیں کیا کہ یہاں اُجرت لینے کے بعد آخرت میں بھی اس کی جزا ملے گی۔ الجصاص کا کہنا یہی ہے کہ جب تک ہر قسم کی آمیزش سے عمل قربت خالص نہ ہوگا ثواب نہ ملیگا۔ الفاظ یہ ہے مالم یخلص للہ من القرب فغیر ثاب علیہ فاعلم۔

۷۸۵ ۔ اس شخص کی طرح جو محض لوگوں کے دکھاوے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اور اللہ پر اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتا۔ یعنی صدقہ دے کر محتاج کو ستانے اور اس پر احسان جتانے سے صدقہ کا ثواب جاتا رہتا ہے۔ یا اوروں کو دکھا کر اس لیے صدقہ دیتا ہے کہ لوگ سخی جانیں۔ اس طرح کی بھی خیرات کا ثواب کچھ نہیں رہتا۔[1]

اصل ارشاد میں کالذی ینفق مالہ ریاء الناس ہے۔ اہل ایمان مخاطب ہیں اور ان سے کہا گیا ہے کہ تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنے صدقات احسان جتا کر اور دلآزاری کر کے اس شخص کی طرح رائیگاں نہ کرو جو سخاوت محض نمود و نمائش کے لیے کرتا ہے۔

یہ کون ہے؟ مفسرین کی اکثریت کا خیال ہے کہ یہ منافق ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ جس کی ساتھ تشبیہ دی جاتی ہے اس کا مقام اونچا ہوتا ہے تو یہ ارشاد بتا رہا ہے کہ ریاکاری اور دکھاوے کے لیے مال و دولت خرچ کرنا بہت بڑا سنگین جرم ہے اور یہ ایمان کے منافی ہے۔ اسی بناء پر علماء کا اس پر اجماع ہے کہ دکھاوے اور نمائش کی خاطر کیے گئے اعمال اللہ کے یہاں مقبول نہیں بلکہ مردود ہوتے ہیں۔

عملی زندگی میں ریاء و نمائش

ریاء قتال کے وزن پر مصدر ہے اس کے لغوی معنے دکھاوا اور نمائش کے ہیں۔ انسانی اعمال کی اصل حقیقت ان کی نیت اور غرض پر مبنی ہے اس لیے اعمال کی درستی نادرستی، اچھائی اور برائی کا بہت کچھ مدار نیت اور غرض پر ہے۔ صحیح حدیث میں ہے انما الاعمال بالنیات عمل نیت سے ہے اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کے مصدر کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیتی ہے جس پر عمل کی ساری اٹھی ہوئی عمارت بودی اور کمزور ہو جاتی ہے۔ نمائش کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی اور برائی کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسن ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا کر کے دکھائے۔ غرور بھی اسی شوق کا جذبہ ہے کیونکہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ نہیں اسی لیے قرآن نے ایک موقعہ پر دونوں کو یکجا کر کے ان کی برائی کی ہے۔ جہاد میں مسلمانوں کو حکم ہوا کہ محض اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمائش تمہاری لڑائی کا مقصد نہیں ہے بلکہ حق کی حمایت

---

[1] افادات شیخ الہند رح۔

اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہے۔ فرمایا۔

لاتکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرا و رئاء الناس۔

دیکھو ان لوگوں جیسے نہ ہو جانا جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کی نظروں میں نمائش کرتے ہوئے نکلے۔

یعنی کافروں کا سا چلن اختیار نہ کرو جو ایمان و راستی کی جگہ گھمنڈ اور دکھاوے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں۔ تمہارے کاموں کی بنا خدا پرستانہ عجز و نیاز اور اخلاص پر ہونی چاہیے۔

یہ ریار و نمائش انسان کے ہر اس عمل میں ظاہر ہوتی ہے جو خالصتہً لوجہ اللہ نہ کیا جائے بلکہ اس سے کوئی دنیوی غرض مطلوب ہو۔

اسلام کی اصطلاحی زبان میں کفر کے بعد برائی میں انفاق کا درجہ ہے۔ انفاق کیا ہے؟ ایمان کی جھوٹی نمائش، دل میں کچھ ہو اور زبان پر کچھ۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایمان اور عمل خیر کی حقیقت ریار اور نمائش کے سوا کچھ نہیں رہتی ہے۔

چونکہ ریار اور نمائش کی اصلی شکل وصورت کو بگاڑ دیتی ہے اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآنی ہدایات کی روشنی میں اس کے ایک ایک ریشہ کی بیخ کنی کی ہے اور امت کو اس کے ہر گھات سے آگاہ فرمایا۔

چنانچہ انسان کی فطرت اور عرب کی مخصوص اخلاقی حالت کے لحاظ سے ریاکاری کی جو صورتیں پیدا ہو سکتی تھیں قرآن نے ان سب کی ممانعت فرمائی۔

ان میں پہلی چیز جہاں جذبہ نمائش جوش پر ہوتا ہے داد و دہش ہے جو عام طور پر نیک نامی، شہرت اور عزت کا ذریعہ سمجھی جاتی ہے بالخصوص عرب کے فضائل اخلاق میں نہایت نمایاں حیثیت رکھتی ہے اور لوگ محض نام و نمود کے لیے اپنا کل سرمایہ لٹا دیتے ہیں۔ قرآن نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے موضوع پر یہاں خاص طور سے اس دکھاوے پر قدغن قائم کی اور اس کی تمثیل دے کر پوری وضاحت سے سمجھایا کہ دکھاوے اور نمائش کے لیے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی حیثیت اور نوعیت کیا ہے جیسا کہ آپ عنقریب پڑھیں گے۔

اللہ کی راہ میں جان دینے میں ریاکاری

عرب کے محاسن اخلاق میں سب سے زیادہ نام و نمود کی چیز شجاعت تھی اور قرآن نے جہاد کو فرض کر کے جان و مال کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی مسلمانوں کو دعوت دی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت سے مال خرچ کرنے میں ریاکاری کی حرمت کو مستنبط فرمایا۔ چنانچہ ایک شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ

ایک شخص مالِ غنیمت کے لیے، ایک شخص شہرت کے لیے اور ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لیے لڑتا ہے تو ان میں سے کس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے، فرمایا اس شخص کا جو اس لیے لڑ رہا ہے کہ اللہ کی بات کا بول بالا ہو۔ آپ سے سوال کیا جاتا ہے کہ ایک شخص اظہارِ شجاعت کے لیے لڑتا ہے۔ ایک شخص قومی حمیت سے اور ایک شخص دکھاوے کی خاطر لڑتا ہے کس کا جہاد اللہ کی راہ میں ہے وہی پہلا جواب ملا کہ من قاتل لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا صرف اس کا جو اس لیے جہاد کرتا ہے کہ اللہ کا کلمہ بلند ہو۔

ریاکاری کا ایک مظہر علمی فضیلت ہے

ریاکاری کا ایک بڑا مظہر علمی فضیلت ہے۔ اور یہ فضیلت خاص طور پر قرآن نے پیدا کی تھی۔ اس میں ریاکاری کی جو آمیزش ہو سکتی تھی۔ اس کے ہولناک نتائج سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے آگاہ کیا۔ ایک حدیث میں ہے کہ سب سے پہلے روزِ قیامت اس شخص کے خلاف فیصلہ کیا جائے گا جس نے شہادت حاصل کی۔ یہ شخص اللہ کی جناب میں پیش ہوگا اور اللہ سبحانہ اس پر اپنے احسان جتا کر دریافت کرے گا کہ تم نے ان انعامات سے کیا کام لیا۔ وہ کہے گا کہ میں تیری راہ میں لڑا اور شہید ہوا۔ اللہ فرماتے گا جھوٹ کہتے ہو تم صرف اس لیے لڑے کہ تمہیں لوگ بہادر کہیں۔ اس کے بعد اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ پھر وہ شخص لایا جائے گا جس نے علم حاصل کیا۔ لوگوں کو علم سکھایا اور قرآن پڑھایا۔ اس سے بھی اسی طرح سوال کیا جائے گا۔ اور وہ جواب میں کہے گا کہ میں نے علم سیکھا، علم سکھایا اور تیرے لیے قرآن پڑھا۔ ارشاد ہوگا جھوٹ کہتے ہو تم نے علم اس لیے حاصل کیا کہ تمہیں عالم کہا جائے، قرآن اس لیے پڑھا کہ تمہیں قاری کہا جائے پھر اسی طرح اسے گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔ اس کے بعد ایک دولت مند لایا جائے گا اور اس سے بھی اسی طرح سوال ہوگا۔ وہ کہے گا کہ مال خرچ کرنے کی جو راہیں تجھے پسند ہیں میں نے سب میں اپنا مال خرچ کیا۔ ارشاد ہوگا کہ جھوٹ کہتے ہو تم نے مال اس لیے صرف کیا کہ لوگ تم کو فیاض اور سخی کہیں۔ پھر اس طرح اس کو گھسیٹ کر جہنم میں ڈال دیا جائے گا۔

ملاحظہ فرمایا آپ نے کہ الذی ینفق مالہ رئاء الناس کی سنگینی کو نبوت نے کیسے محسوس کیا اور کن کن ناشی راہوں کی نشاندہی فرمائی۔ قرآن نے صرف اتنی بات فرمائی تھی کہ اس شخص کی طرح نہ ہو جانا جو اپنے مال کو لوگوں کے دکھاوے کے لیے خرچ کرتا ہے۔

آیت قرآنی کا حاصل یہ ہوا کہ جو لوگ انفاق کر کے احسان جتاتے یا دل آزاری کرتے ہیں، ان کی خیرات بالکل اکارت جاتی ہے۔ آخرت میں ان کی خیرات بالکل اکارت ہو جائے گی۔ آخرت میں ان کو اس کا کوئی اجر نہ ملے گا۔ ایسا نہ ہونے کے باوجود ان کا یہ عمل اسی طرح ضائع ہو جائے گا جس طرح اس شخص کا عمل ضائع ہو جاتا ہے جو محض دکھاوے کے لیے

خرچ کرتا ہے اور اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتا ہے۔ اس سے اللہ کی راہ میں دے کر احسان جتلانے اور ایذا دینے کی سنگینی ظاہر کرنی مقصود ہے کہ مرد مومن کے انفاق کو برباد کرنے کے معاملہ میں ان کا مقام بے حد خطرناک ہے۔

مولانا دریابادی کی غلط تشریح

حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں کہ ـــــ باقی یہ فرمانا کہ وہ یقین نہیں رکھتا اللہ پر اور آخرت کے دن پر یہ ابطال صدقہ کے لیے قید یا شرط نہیں ہے کیونکہ صدقہ تو صرف ریاء سے ہی باطل ہو جاتا ہے اگرچہ خرچ کرنے والا مومن کیوں نہ ہو مگر اس قید یعنی لا یومن باللہ والیوم الاخر کا اضافہ اس لیے کیا ہے کہ یہ معلوم ہو جائے کہ ریاکاری مومن کی شان سے بعید ہے یہ منافقین کا کام ہے۔ اور مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ مشبہ بہ میں جو دو قیدیں لگائی گئی ہیں ایک نفاق یعنی لا یومن باللہ والیوم الاخر کی اور دوسری ریا کی یہ محض تقویت تشبیہ کے لیے ہے ورنہ ہر دو فرداً فرداً بھی موجب بطلان ہیں۔ اور مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں۔ اور آخرت پر ایمان رکھنے والا مومن بھی اگر خیرات محض نام و نمود اور ریاء کے لیے کرتا ہے تو اس کا بھی یہی حال ہے کہ اس کو کوئی ثواب نہیں ملتا۔ اور پھر اس جگہ لا یومن باللہ کے اضافہ سے شاید اس طرف اشارہ کرنا منظور ہے کہ ریاکاری اور نام و نمود کے لیے کام کرنا اس شخص سے متصور ہی نہیں جو اللہ تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان رکھتا ہے۔ ریاکاری اس کے ایمان میں خلل کی علامت ہے۔

عام مفسرین نے بھی یہی بات لکھی ہے چنانچہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری میں تصریح کی ہے کہ

یہ ابطال صدقہ کی قید نہیں ہے کیونکہ صدقہ تو محض ریاء سے برباد اور رائیگاں ہو جاتا ہے چاہے یہ کرنے والا مومن ہو۔

ان تصریحات کے باوجود حیرت ہے کہ مولانا دریابادی نے یہ بات کیوں کر لکھ دی ہے دو صورتیں الگ الگ بیان ہوئی ہیں۔ دونوں کا فرق یہ ہے پہلی صورت میں خطاب اہل ایمان سے ہے۔ نفس صدقہ تو ان لوگوں کا قبول ہو جائے گا لیکن احسان جتانے یا اذیت پہنچانے سے ترقی درجات و اضافہ اجر سلب ہو جائے گی۔ دوسری صورت میں ذکر اہل کفر کا ہے۔ یہ جب خدا و آخرت پر ایمان سے محروم ہوں تو ان کے صدقہ و خیرات کے بظاہر جو کچھ بھی مقصود ہو سب کا حاصل دنیا ہی ہو گا۔

شاید مولانا کو فقہا اور اسلام کے قانون دان طبقہ کی اصطلاحی صحت اور قبولیت سے کچھ غلط فہمی ہو گئی۔ اگر حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز کی یہ تشریح پیش نظر ہوتی تو شاید غلط فہمی نہ ہوتی کہ

لا یتبعون ما انفقوا کی قید سے معلوم ہوتا ہے کہ انفاق کے لیے ایمان کے ساتھ کہ شرطِ صحت اور شرطِ قبولیت ہے ایک اخلاص بھی شرطِ صحت ہے اور ترک من واذیٰ شرطِ قبولیت ہے

اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ صدقہ کرنے والا خواہ مومن ہو اگر صدقہ میں اخلاص نہ ہو یعنی اللہ کی خاطر نہیں بلکہ لوگوں کی داد کے لیے کر رہا ہو تو وہ از روئے قرآن باطل ہے۔ ابطالِ صدقہ کا ہرگز وہ مفہوم نہیں ہے جو مولانا دریابادی نے سمجھا ہے اور جو ان کی اس تصریح سے ظاہر ہے کہ۔

یعنی ان ممنوع طریقوں سے اضافہ اجر اور از دیاد ثواب کو نہ مٹا دو۔

یہ مطلب ہے ان کے خیال میں لا تبطلوا صدقاتکم کا آیت میں تشبیہ ہی اس بات میں ہے کہ ثواب سے دونوں محروم ہیں۔ اگرچہ مشبہ بہ میں ثواب سے محرومی کا باعث نفاق ہے اور مشبہ کی محرومی کی وجہ من واذیٰ ہے یہ اس وقت ہے جب مشبہ مومن اور مشبہ بہ منافق ہو۔ اور اگر مشبہ بہ منافق اور عدم ایمان کی قید حقیقی نہ ہو تو پھر مطلب یہ ہوگا کہ ریاکار ہونا مومن کی شان سے بعید ہے۔ اور یہ تقاضائے ایمان کے منافی ہے یعنی اس کی ریاکاری خود ہی اس بات کی دلیل ہے کہ وہ اللہ پر ایمان نہیں رکھتا۔ اس کا محض لوگوں کو دکھانے کے لیے عمل کرنا صریحاً یہ معنے رکھتا ہے کہ مخلوق ہی کو خدا جانتا ہے جس سے وہ اجر چاہتا ہے۔ اللہ سے نہ اسے اجر کی توقع ہے اور نہ اسے یقین ہے کہ ایک روز اعمال کا حساب ہوگا اور اجر عطا کیے جائیں گے۔ حاصل یہی ہے کہ ریاکاری ایمان کی شان نہیں ہے۔ اس صورت میں مشبہ اور مشبہ بہ میں عقائد کا فرق نہ ہوگا۔

ریاکار کی مثال سے توضیح

۷۸۶۔ لہٰذا ایسے شخص کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر کی ایک چٹان اس پر مٹی کی تہ جم گئی ہو اور اس میں بیج بو یا گیا۔ جب زور سے پانی برسا تو ساری مٹی مع بیج کے بہہ گئی اور ایک صاف اور سخت پتھر کے سوا کچھ باقی نہ رہا۔

یعنی جو لوگ دکھاوے کی نیکی کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے پہاڑ کی ایک چٹان جس پر مٹی کی ایک تہ جم گئی ہو۔ ایسی جگہ پر کتنی ہی بارش ہو لیکن کبھی سرسبز نہ ہوگی۔ کیونکہ اس میں پانی سے فائدہ اٹھانے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ پانی جب برسے گا دھل دھلا کر صاف چٹان نکل آئے گی۔ حضرت شاہ عبدالقادر قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں۔ اوپر مثال بیان فرمائی خیرات کی جیسے ایک دانہ بویا اور سات بالیں نکلیں اور ہر بال میں سو دانے۔ یہاں فرمایا کہ نیت میں اخلاص شرط ہے اگر دکھاوے کی نیت سے خرچ کیا تو ایسا ہے جیسے دانہ بویا پتھر میں

جس پر تھوڑی سی مٹی نظر آتی تھی جب مینہ پڑا وہ صاف ہو گیا اس میں کیا اُگے گا۔
اصل مثال میں صفوان، صلدا اور وابل کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں۔ صفوان، اس کا واحد صفوانۃ ہے اس کے معنی صاف، چکنا اور سخت پتھر ہیں۔ صلداً، سپاٹ اور سخت پتھر جس پر کچھ غبار نہ ہو اس کی جمع اصلاد آتی ہے۔ وابل موٹی موٹی بوندوں کی تیز اور لگاتار بارش، چونکہ بارش کے مختلف حالات ہوتے ہیں کبھی ہلکی، کبھی پھوار، کبھی ذرا تیز، کبھی بہت زور کی، اس لیے اہلِ عرب ہر قسم کی بارش کا علیحدہ علیحدہ نام رکھتے ہیں۔ ترتیب یوں ہے رش، طش، طل، نضح، ہطل، وابل، اشیوب۔
اس تمثیل میں بارش سے مراد خیرات ہے۔ چٹان سے مراد اس نیت اور جذبے کی خرابی ہے جس سے خیرات کی گئی ہے، مٹی کی ہلکی تہ سے مراد نیکی کی وہ ظاہری صورت ہے جس کے نیچے نیت کی خرابی چھپی ہوئی ہے۔ اس توضیح کے بعد مثال اچھی طرح سمجھ میں آسکتی ہے۔ بارش، فطری اقتضا تو یہی ہے کہ اس سے روئیدگی ہو اور کھیتی نشو ونما پائے لیکن جب روئیدگی قبول کرنے والی زمین محض برائے نام اُوپر اُوپر ہو۔ اور اس اوپری تہ کے نیچے نری پتھر کی ایک چٹان رکھی ہوئی ہو تو بارش مفید ہونے کے بجائے اُلٹی مضر ہو گی۔ اسی طرح خیرات بھی اگرچہ بھلائیوں کو نشو ونما دینے کی قوت رکھتی ہو مگر اس کے نافع اور سود مند ہونے کے لیے حقیقی اور واقعی نیک نیتی اور اخلاص شرط ہے نیک نیت نہ ہو تو ابرِ کرم کا فیضان بجز اس کے کہ محض ضیاعِ مال ہے اور کچھ نہیں [1]

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس مقام پر یہ مثال کس کی وضاحت کر رہی ہے۔ دو باتیں ذکر ہوئی ہیں ایک یہ کہ احسان جتا کر اور اذیت دے کر صدقہ کرنا دوسرے یہ کہ دکھاوے کے لیے اللہ کی راہ میں خیرات کرنا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیجئے کہ وضاحت مشبہ کی ہو رہی ہے یا مثال سے مشبہ بہ کی توضیح کی گئی ہے؟ مشبہ احسان جتا کر اور ایذا دے کر اللہ کی راہ میں خیرات کرنے والا ہے اور مشبہ بہ لوگوں کے دکھاوے کی خاطر اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والا ہے۔
شارحین قرآن کی عمومی رائے یہ ہے کہ یہ مشبہ بہ کی توضیح کے لیے مثال لائی گئی ہے یعنی ریاکاری اور نمائش کی خاطر راہِ خدا میں خرچ کرنے کی مثال ایسی ہے جیسے پتھر میں کاشت کرے، آلوسی لکھتے ہیں فمثلہ المرائی فی الانفاق یعنی ریاکار کی خرچ کرنے میں مثال یہ ہے، نسفی فرماتے ہیں مثلہ ونفقتہ ریاکار اور اس کے خرچ کی

---

[1] تفہیم القرآن

مثال دی ہے۔ ابن کثیر نے تصریح کی ہے ثم ضرب تعالیٰ مثل ذالک المرائی، پھر اللہ تعالیٰ نے اس ریاکار کی مثال بیان فرمائی ہے۔ حافظ ابن جریر نے پوری قوتِ قلم سے اس پر زور دیا ہے کہ یہ اس شخص کی مثال ہے جو اللہ کی راہ میں ریا اور نمائش کی خاطر خرچ کرتا ہے اور مثلہ کی ضمیر کا مرجع الذی ینفق بتایا ہے۔ صاحب نظام الفرقان علامہ نیساپوری نے بھی ضمیر کا مرجع یہی قرار دیا ہے۔ ابو حیان الاندلسی نے البحر المحیط میں کھول کر بتایا ہے کہ اللہ نے ریاکار کی مثال سے وضاحت کی ہے اور ضمیر کا مرجع الذی ینفق بتایا ہے اور لکھا ہے کہ اگرچہ اختلاف ہے مگر ظاہر قرآن یہی ہے کہ مرجع قریب ہو، اور مشہور مفسر قرآن قاضی بیضاوی کا مختار یہی ہے کہ یہ ریاکار کی مثال ہے۔ آخری دور کے عارف باللہ مفسر قرآن قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بھی اس کو ریاکار کی مثال بتایا ہے۔ چنانچہ لکھتے ہیں کہ فمثلہ ای المرائی اور ہمارے معاصرین میں سے حضرت شیخ الہند، حضرت مولانا اشرف علی نے بیان القرآن میں، مفتی محمد شفیع نے معارف قرآن میں، مولانا آزاد نے ترجمان قرآن میں، مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں اور مولانا محمد ادریس رحمۃ اللہ علیہ نے معارف القرآن میں بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ اس قدر واضح اور صاف معاملہ میں ایک معاصر مفسر نے اس تمثیل کا رُخ بجائے مشبہ کے مشبہ بہ کی طرف کر کے بات کو بے جان کر دیا ہے اور وہ سارا زور جس کی طرف قرآن متوجہ کرنا چاہتا ہے بالکل بے وزن کر دیا ہے۔

اس تمثیل کے بعد اس کا نتیجہ قرآن نے بتایا ہے وہ بھی سُن لیجئے، فرمایا:

۷۸۶۔ انھوں نے اپنے خیال میں جو کچھ بھی کمایا تھا اسے ضائع کر دیا۔ کچھ بھی ان کے ہاتھ نہیں لگا اور اللہ کافروں کو راہ نہیں بتاتا ہے۔

اب فرماتے ہیں کہ نیت شرط ہے اگر کسی نے دکھاوے کی نیت سے صدقہ کیا تو اس کی مثال ایسی سمجھو۔ ایسے ہی صدقات میں ریاکاروں کو کیا ملے گا؟ [1]

یہ فقرہ یا تو پچھلے جملہ کی بیان شدہ تشبیہ میں وجہ شبہ کی وضاحت کے لیے آیا ہے اور یا اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے، یہ سب کچھ سننے کے بعد سننے والا گویا دریافت کر رہا ہے کہ پھر ان کا کیا بنے گا؟ جواب دیا گیا کہ بنتا کیا؟ ان کو کچھ بھی نہ ملے گا۔

یہاں آیت کے آخر میں ارشاد ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کو راستہ نہیں بتاتا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بھیجی ہوئی ہدایات اور آیات جو سب انسانوں کے لیے عام ہیں۔ کافر جو ان ہدایات پر نظر نہیں کرتے بلکہ تمسخر و استہزاء کرتے ہیں اس کے نتیجہ میں اللہ ان کو توفیق سے محروم کر دیتے ہیں جس کا اثر یہ ہے کہ وہ کوئی

---

[1] افاداتِ شیخ الہند

ہدایت قبول نہیں کرتے [1]

اللہ تعالیٰ کافروں کو قیامت کے روز جنت کا راستہ نہیں بتائیں گے کیونکہ کفر کی وجہ سے ان کا کوئی عمل قبول نہیں ہے [2]

لیکن وہ ہدایت ہے جو آخرت میں حاصل ہوگی جس سے بندے اپنی کوششوں کے ثمرات ونتائج سے ہمدوش ہوں گے یہاں بھی ہدایت ہے یعنی جو کافر اور ناشکرے لوگ ہیں وہ اپنے اعمال میں مراد نہ ہوں گے بلکہ ان کے سارے کیے کرائے پر پانی پھر جائے گا۔ [3]

اس کا بھی احتمال ہے کہ لفظ کافر کفر سے نہیں کفران سے ہو۔ یہاں لفظ کافر ناشکرے اور منکر نعمت کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ جو شخص اللہ کی دی ہوئی نعمت کو اس کی رضا کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کی خوشنودی کے لیے خرچ کرتا ہے یا اگر خدا کی راہ میں اذیت دیتا ہے اور احسان جتاتا ہے تو وہ دراصل اپنے اللہ کا ناشکرا اور احسان فراموش ہے۔ اور جب وہ خود ہی اللہ کی رضا نہیں چاہتا تو اللہ اس سے بے نیاز ہے کہ اسے خواہ مخواہ اپنی رضا کا راستہ دکھائے [4]

---

[1] معارف القرآن [2] بیان القرآن [3] تدبر قرآن [4] تفہیم القرآن

وَمَثَلُ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمُ ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ وَتَثْبِيْتًا
مِّنْ اَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍۭ بِرَبْوَةٍ اَصَابَهَا وَابِلٌ فَاٰتَتْ اُكُلَهَا
ضِعْفَيْنِ فَاِنْ لَّمْ يُصِبْهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ ؕ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۲۶۵﴾

اور ان لوگوں کے خرچ کرنے کی مثال جو محض رضائے الٰہی کی تلاش کی خاطر اور دل کے پورے جماؤ کے ساتھ کرتے ہیں ایسی [۴۸۸] ہے جیسے ایک اونچی زمین پر لگا ہوا باغ ہو، اس پر بارش ہوئی تو دو چند پھل آئے اور اگر زور کی بارش نہ ہو تو ہلکی بوندیں بھی اُسے شاداب کرنے کے لیے کافی ہیں [۴۸۹]۔ اور یاد رکھو کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے [۴۹۰]۔

انفاق میں اخلاص و احتساب

پہلی آیت میں مثال دے کر یہ بات سمجھائی گئی تھی کہ جو کچھ خدا کی راہ میں خرچ کیا جاتا ہے اگر یہ دکھاوے کے لیے ہے اور اس کے سامنے نہ خدا ہے اور نہ روزِ جزاء ہے بلکہ صرف چند لوگوں پر اپنی دولت کی دھونس جمانا محلہ ٹولے، بستی یا شہر، ملک یا دُنیا میں نام آوری حاصل کرنا اپنی بڑائی اور کبریائی کا اعلان مقصود ہے تو جیسا کہ قرآن میں فرمایا گیا ہے کہ اس کی مثال پتھر کی چٹان پر کاشت کرنے والے کی ہے، ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ اور اس کے انعام کے دن کو چھوڑ کر جو محض لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرتا ہے وہ یہی کرتا ہے کہ اپنی بڑائی اور دولتمندی

کے نشانات لوگوں کے حافظوں اور دلوں پر قائم کرنا چاہتا ہے، اپنے بچوں کی شادیوں میں دھوم مچانے والے تقریبات پر روپے لٹانے والوں کا مقصد اس کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ لیکن تجربہ شاہد ہے کہ ان لوگوں کی یہ ساری مالی زور آزمائیوں کا اثر عوام کے قلوب میں چند دنوں سے زائد نہیں رہتا۔ ٹھیک اس کی مثال وہی ہے جو قرآن نے بیان کی ہے کہ چٹان پر گرد بیٹھی پانی کا ایک چھینٹا آیا اور سب صاف ہوگیا اور واقعہ بھی یہی ہے کہ چاندی اور سونے کے زور سے یہ لوگ عوام کے دل و دماغ میں جو صاحبزادے کی ختنہ یا شادی کی یاد ٹھونسنا چاہتے ہیں خواہ مخواہ کسی کو کیا پڑی ہے کہ اپنے حافظوں کو اس کی یاد کے لیے ہمیشہ بیدار رکھے تماشا ہوا دیکھ لیا گیا۔ اور لوگ بھول گئے۔ اب اس آیت میں تصویر کا دوسرا رُخ بیان کیا جارہا ہے کہ جو لوگ دکھاوے کے لیے نہیں بلکہ اخلاص و احتساب کے ساتھ اپنے اللہ کو راضی کرنے کے لیے مالوں کو خرچ کرتے ہیں ان کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بلند اور موزوں مقام پہ باغ ہو جب بارش ہوگی تو اس کی شادابی دوگنی ہوجائے گی۔ اگر زور سے بارش نہ ہو تو ہلکی بوندیں بھی اسے شاداب کردیں گی کیونکہ اس میں سرسبزی اور شادابی کی استعداد ہے اس مثال کے ذریعہ اخلاص و احتساب کی طرف متوجہ کیا ہے۔ یہ دونوں خاص دینی اصطلاحیں ہیں۔ اخلاص سے مراد یہ ہے کہ اپنے کو اللہ کا بندہ اور اللہ کو اپنا مولیٰ و مالک سمجھتے ہوئے اس کے احکام کو واجب التعمیل اور اس کی فرمانبرداری کو وسیلہ نجات جانتے ہوئے ہر کام اس کی حکم برداری کی نیت سے اور اس کی رضا جوئی کے لیے کیا جائے یہی ابتغاء مرضات اللہ ہے اور احتساب یہ ہے کہ اللہ نے قرآن میں جو جو وعدے کیے ہیں اور جن جن اعمال پر جو ثواب بتلایا ہے ان کو برحق یقین کرتے ہوئے اور ان پر اپنے آپ کو خوب جماتے ہوئے ثواب موعود حاصل کرنے کی خاطر اللہ کی راہ میں خرچ کیا جائے یہ تثبیتًا من انفسھم ہے۔ یہ دونوں وصف گویا روح دین اور قلب اسلام ہیں۔ ان کے مجموعہ کا خلاصہ یہ ہے کہ زندگی کے تمام کاموں میں احکام کی تعمیل کا محرک اپنے مالک حقیقی کے حکموں کی بجا آوری کا ارادہ اس کی رضا کی فکر اور اُخروی زندگی کا اندیشہ ہو یعنی جو کچھ بھی کیا جائے صرف اس کی رضا جوئی کے لیے اس کے عذاب کے خوف اور اس مقرر کیے ہوئے ثواب کی طمع میں کیا جائے یا اس سے مختصر لفظوں میں یوں کہا جائے کہ۔ حکموں کی تعمیل اور زندگی کی تشکیل میں اصلی عامل اللہ کی چاہت اور ڈر ہی ہو۔ اس طرح زندگی کے ہر چھوٹے بڑے عمل کا ایک خاص قریبی رشتہ لا الہ الا اللہ سے قائم ہوجاتا ہے۔ اس نیت سے چھوٹے سے چھوٹا عمل بہت بڑی قیمتی اور وزنی ہوجاتا ہے۔ آج اگرچہ یہ نایاب ہے مگر قرآن کی اس آیت میں یہ اشارہ مل رہا ہے کہ صحابہ کرام کی زندگیوں میں ایمان والیقان کی طرح اخلاص و احتساب بھی عام تھے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت نے سب کو اس رنگ میں رنگ دیا تھا۔

۷۸۸۔ اور ان لوگوں کے خرچ کرنے کی مثال جو محض رضائے الٰہی کی خاطر اور دل کے جماؤ کے لیے کرتے

ہیں ایسی ہے۔ اصل ارشاد میں دو لفظ آئے ہیں ابتغاء مرضات اور تثبیتًا من انفسھم پہلے لفظ کے معنے میں اللہ سبحانہٗ کی خوشنودی اور رضاجوئی ہے۔ اور اس کا حاصل ہے اخلاص اور دوسرے لفظ تثبیتًا من انفسھم کے معنے عبداللہ ابن عباس سے تصدیق و یقین کے منقول ہیں۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آیت میں اس فقرے کے معنے یہ ہیں کہ وہ اللہ کی راہ میں اللہ کی رضاجوئی کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اس لیے کہ ان کو دل سے یقین ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی اس خیرات کی کامل جزا دے گا جیسا کہ حدیث شریف میں ہے من صام رمضان ایمانا واحتسابًا غفرله ماتقدم من ذنبه یعنی جو شخص رمضان کے روزے رکھے اور وہ اس بات پر ایمان رکھے کہ اللہ نے رمضان کے روزے فرض کیے اور احتسابًا کے معنی یہ ہیں کہ اللہ سے ثواب کی اُمید رکھے۔ اب آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ جو لوگ اللہ کی راہ میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں رضائے الٰہی حاصل کرنے کے لیے اور اس لیے کہ اُن کو اُمید ہے کہ اللہ ان کو اس کی جزا مع درمرحمت فرمائے گا۔ اسی معنے کو حافظ ابن جریر نے اختیار کیا ہے۔ اور بعض آئمہ تفسیر کی رائے یہ ہے کہ تثبیتًا کے معنے یہ ہیں کہ اپنے کو مقام عبودیت اور منزل ایمان میں ایسا ثابت قدم بنا دینا کہ اس کے پائے استقامت میں کوئی لغزش نہ آئے۔ حرص و طمع اور مال کی محبت اس کو اپنی جگہ سے نہ ہلائے۔ اس صورت میں لفظ من بمعنے بعض ہوگا اور فقرے کے معنے یہ ہوں گے کہ جس نے اپنا مال اللہ کی راہ میں اللہ کی خوشنودی اور کچھ اپنے کو ایمان پر جمانے کے لیے دیا۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرکے اگر کچھ ایمان پر جماؤ حاصل ہوا تو جان کو خرچ کرکے پورے ایمان پر جماؤ حاصل ہو گیا۔ یہ معنے علامہ زمخشری نے کشاف میں لکھے ہیں اور امام رازی نے اسے صاحب کشاف کی طرف منسوب کرکے اس کی وجہ کلام حسن و تفسیر لطیف کہہ کر داد دی ہے[1]

تثبیت کے معنے اور اس کا مطلب

تثبیت کی توضیح یہ ہے کہ یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی ہے کہ جس کام میں نفس کو قدرے مشقت ہو اس کے بار بار کرنے سے نفس میں کرتے کرتے ایک ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے جس سے دوسرے اعمال بھی آسان ہو جاتے ہیں اس آیت میں اسی کی ترغیب ہے کہ ہر عمل میں اس کی نیت کرلی جائے کہ دوسرے کے لیے اپنے اندر آمادگی ہوگی اور مجاہدہ اسی کو کہتے ہیں۔ نیز خود اس عمل انفاق کا بھی اس سے جب ملکہ پیدا ہوگا تو اس عمل کو جو کہ رضائے الٰہی کا ذریعہ ہے بار بار کرے گا جس سے رضائے الٰہی کے حصول میں دوام ہوگا لہٰذا اس نیت کا حاصل یہ ہوگا کہ اس وقت

---

[1] معارف القرآن م ا۔

بھی رضا حاصل ہو اور ایسی عادت ہو جائے کہ آئندہ بھی ہمیشہ رضائے الٰہی حاصل کیا کریں [1]

اور اس کو اس طرح بھی پیش کیا گیا ہے کہ

اس فقرے میں بشری نفسیات کی ایک گہری حقیقت بتائی گئی ہے۔ معصیت کی طرح ہر طاعت کا بھی یہ خاصہ ہے کہ وہ اپنے ہم رنگ اعمال کی کشش کا سبب ہوتی ہے۔ چنانچہ ہر عمل صالح کے بعد دوسرے عمل صالح کے لیے آمادگی و پختگی پیدا ہو جاتی ہے۔ انسانی طبیعت میں عمل کے تکرار اور عادت کے بعد اس عمل سے متعلق ایک ملکہ راسخہ پیدا ہو جاتا ہے اور اس سے طبیعت میں مزاحمت کے لیے طاقت پیدا ہو جاتی ہے یہی تثبیتاً من انفسہم کا حاصل ہے [2]

اور اس کو بیان کرنے کے لیے یہ انداز بھی اختیار کیا گیا ہے۔

جس طرح روزے سے مقصود نفس کی تربیت ہے کہ آدمی تقویٰ کے مطالبات پورے کرنے کے لیے اچھی طرح مضبوط ہو جائے اسی طرح انفاق بھی ایک مشق ہے جس سے انسان اپنے آپ پر قابو پاتا ہے اور قرب الٰہی کی راہ اس کے لیے آسان ہو جاتی ہے اور اس سے نفس کو حق پر جمائے رکھنے کی حقیقی تربیت حاصل ہوتی ہے انسان اپنے آپ کو خواہشات نفس کے خلاف چلانے میں جتنا زیادہ مشاق ہوتا جاتا ہے اتنا ہی اس کے لیے قرب الٰہی حاصل کرنا آسان ہو جاتا ہے [3]

حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز نے اس سے استدلال کیا ہے کہ

عمل صالح سے جس طرح حصول اجر مقصود ہوتا ہے۔ اسی طرح اصلاح نفس بھی مقصود ہوتی ہے [4] مطلب یہ ہے کہ ہر عمل اپنی پشت پر تین قسم کے نتائج رکھتا ہے، قانونی، روحانی اور اخلاقی۔ قانونی یہ کہ دنیا میں اس کی قانون کے منشا کے مطابق ادائیگی صحیح ہو۔ روحانی یہ کہ آخرت میں وہ مقبول ہو یعنی قابل اجر ہو۔ اور اخلاقی یہ کہ اس سے کرنے والے کے نفس کی اصلاح ہو۔ نماز کا قانونی نتیجہ یہ ہے کہ قانون اس کی صحت پر مہر تصدیق ثبت کرے روحانی یہ کہ اسے اللہ کے یہاں شرف پذیرائی حاصل ہو اور آخرت میں اس کی جزا ملے اور اخلاقی یہ کہ نماز اس دنیا کی زندگی میں اصلاح نفس کا کام کرے یعنی منکر اور فحشا سے روک دے۔ اخلاقی کو آپ نفس کی نورانیت بھی کہہ سکتے ہیں۔ زبان نبوت میں ان تینوں کے اعتبار سے احکام آتے ہیں۔

اخلاص و احتساب کی مثال

۷۸۹۔ جیسے ایک اونچی زمین پر باغ لگا ہو اور اس پر بارش ہوئی تو دو چند پھل آئے گا اور اگر زور کی بارش

---

[1] بیان القرآن [2] ماجدی [3] تدبر قرآن [4] مسائل السلوک

نہ ہو تو ہلکی بوندیں بھی اسے شاداب کرنے کے لیے کافی ہیں۔ اصل ارشاد میں جنۃ، ربوہ اور طل کے الفاظ آئے ہیں۔ جنت باغ کو کہتے ہیں جن سے بنا ہے۔ درختوں والا ہر وہ باغ جس کے درخت زمین کو چھپالیں جنت کہلاتا ہے۔ ربوہ کے معنے اونچی زمین کے ہیں۔ قرآن میں ایک دوسری جگہ اس کی صفت ذات قرار و معین آئی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اونچے ہونے کے ساتھ ہمواری بھی اس کے لوازم میں سے ہے۔ یہ ربو سے بنا ہے اس کی جمع رُبی آتی ہے اور طل کے بارے میں پہلے پڑھ چکے ہو کہ ہلکی بارش کو کہتے ہیں۔ ریاء و نمائش سے خرچ کرنے والوں کے مقابلے میں یہاں لوگوں کے انفاق کی تمثیل ہے جو اپنے مال کو اللہ کی راہ میں اخلاص اور احتساب کی روح سے سرشار ہو کر خرچ کرتے ہیں۔ فرمایا کہ یہ لوگ ضرور اجر کے مستحق ہیں۔ انھوں نے بہ جانے والی زمین پر باغ لگانے کے بجائے ایسی بلند ہموار اور اچھی آب و ہوا والی زمین پر اپنا باغ لگایا ہے کہ بارش ہو تو اس کو برباد کرنے کے بجائے اس کی بارآوری کو دوگنا کرتی ہے اور اگر بارش نہ ہو تو ہلکی پھوار بھی ایسے ہوا کی خوبی کی وجہ سے اس کے لیے کفایت کر جاتی ہے۔

اس تمثیل میں زور کے مینہ سے بہت مال خرچ کرنا اور پھوار سے تھوڑا مال خرچ کرنا مراد ہے اور دلوں کو ثابت کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ثابت کریں دلوں کو ثواب پانے میں یعنی ان کو یقین ہے کہ اللہ کی راہ میں دینے کا ثواب ضرور ملے گا۔ لہٰذا اگر نیت صحیح ہے تو بہت دینے میں بہت ثواب اور تھوڑا دینا بھی فائدہ سے خالی نہ ہوگا جیسے خالص زمین پر باغ ہے تو جتنا پانی برسے گا اتنا ہی باغ کو فائدہ ہوگا۔ اور نیت درست نہیں تو جس قدر زیادہ خرچ ہوگا اتنا ہی مال ضائع ہوگا کیونکہ زیادہ مال دینے میں ریاء اور نمائش بھی زیادہ ہی ہوگی جیسے پتھر پر دانہ لگایا جائے تو جتنی زور کی بارش ہوگی اتنا ہی نقصان بھی زیادہ ہوگا[1]

اس تمثیل میں جو دو طرح کی بارش وابل اور طل کا ذکر کیا ہے اس سے مقصود اخلاص کے مراتب کا فرق ظاہر کرنا ہے اور چونکہ یہ انفاق ایمان کے ساتھ مقرون ہے۔ من و اذی اور ریاء اس میں نہیں ہے تو ضرور اسے قبول کیا جائے گا اور اس میں اجر و ثواب کی بڑھوتری ہوگی چاہے اخلاص اعلیٰ درجہ کا ہو یا درمیانے کا یا ادنیٰ درجہ کا ہو۔ قبولیت اور بڑھوتری کے لیے کافی ہے۔ اگرچہ مراتب اخلاص کے مختلف ہونے کی وجہ سے قبولیت اور بڑھوتری کے مراتب بھی مختلف ہوں گے۔

گویا تمثیل کی زبان میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اخلاص اگر اعلیٰ درجہ کا وابل زیادہ بارش کی صورت میں نہ ہو پھر بھی محض ایمان کی وجہ سے بشرطِ عدم موانع صدقہ و خیرات کو قبول کر لیا جائے گا۔

---

[1] افادات شیخ الہند [2] بیان القرآن

حضرت شیخ الہند اور حضرت تھانوی کا تعبیری اختلاف

حضرت شیخ الہند اور حضرت مولانا اشرف علی کے بیانوں میں فرق یہ ہے کہ شیخ الہند بارش سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا مراد لیتے ہیں جبکہ مولانا تھانوی بارش سے اخلاص مراد لے رہے ہیں۔ شیخ الہند کی ہمنوائی میں سید سلیمان فرماتے ہیں کہ اس مثال میں ٹیلہ کی اونچی اور صالح زمین سے مراد اچھی نیت اور اخلاص ہے اور بارش سے زیادہ اور اوس سے تھوڑا مال خرچ کرنا اور پھل سے مراد ثواب ہے تو جیسے باغ کسی اچھی زمین میں پانی سے اور وہ نہ ہو تو نمی سے لہلہانے لگتا ہے ایسے ہی اچھی نیت سے اللہ کی راہ میں جو کچھ دیا جائے وہ ایک کے بدلے میں سو ہو جاتا ہے اور مولانا آزاد بھی حضرت شیخ الہند کی تائید میں فرماتے ہیں۔ اس تمثیل میں خیرات کو بارش سے اور زمین کو دل سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اگر زمین ٹھیک ہے یعنی دل میں اخلاص ہے تو جس قدر بھی عمل خیر کیا جائے گا، برکت اور پھل لائے گا۔ اگر زمین درست نہیں ہے یعنی اخلاص نہیں ہے تو پھر کتنی ہی دکھاوے کی خیر خیرات کی جائے سب رائیگاں جائے گی۔ اگر دل میں اخلاص ہے تو تھوڑی خیرات میں برکت و فلاح کا موجب ہو سکتی ہے جس طرح بارش کی چند ہلکی بوندیں بھی ایک باغ کو شاداب کر سکتی ہیں[1]۔ اور مولانا مودودی فرماتے ہیں۔ زور کی بارش سے مراد وہ خیرات ہے جو انتہائی جذبۂ خیر اور کمال درجے کی نیک نیتی کے ساتھ کی جائے اور ہلکی پھوار سے مراد ایسی خیرات ہے جس کے اندر جذبۂ خیر کی شدت نہ ہو[2] اور مولانا محمد ادریس فرماتے ہیں زور کی بارش سے مال خرچ کرنا مراد ہے اور شبنم اور اوس سے تھوڑا مال خرچ کرنا مراد ہے[3]

شارحین قرآن میں سے علامہ آلوسی بغدادی کی بھی حضرت شیخ الہند کو حمایت حاصل ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ تشبیہ مرکب ہے یعنی حالات کے ملے جلے مجموعہ کو ایک دوسرے مجموعہ حالات سے تشبیہ دی ہے۔ اللہ کے لیے خرچ کرنے والوں کو مال کو ٹیلہ پر باغ سے تشبیہ دی ہے اور راہِ خدا میں ان کے زیادہ اور تھوڑے خرچ کو موسلا دار بارش اور اوس سے تشبیہ دی ہے۔

بہرحال مطلب دونوں صحیح ہیں۔ بارش سے اخلاص مراد ہو یا اللہ کی راہ میں دیا ہوا مال مراد ہو۔ دونوں کا اختلاف حقیقت کا اختلاف نہیں بلکہ صرف تعبیر کا اختلاف ہے۔

۷۹۰ ۔ اور یاد رکھو کہ تم جو کچھ بھی کرتے ہو وہ اللہ کی نظر سے پوشیدہ نہیں ہے اس کی نظر میں تمہارے سارے اعمال اور ریا، اخلاص کی حد تک تمہاری نیتوں سے باخبر ہے۔ اس لیے

---

[1] ترجمان القرآن [2] تفہیم القرآن [3] معارف قرآن م ا۔

جو کچھ کرو، جو کچھ کہو، اور جو کچھ سوچو یہ خیال کرلو کہ اللہ سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے۔ اس معنے کے لحاظ سے یہ فقرہ وعید ہے اور اس لحاظ سے کہ اللہ تمہارے اخلاص و احتساب کو دیکھ رہا ہے یہ فقرہ تسکین و تسلی ہے۔

أَيَوَدُّ أَحَدُكُمْ أَنْ تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ نَّخِيلٍ وَّأَعْنَابٍ
تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ لَهُ فِيهَا مِنْ كُلِّ الثَّمَرَاتِ وَ
أَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ
فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ كَذَٰلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمُ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ
تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۶۶﴾ رکوع ۴

کیا تم میں کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اُس کے پاس کھجوروں اور انگوروں
کا ایک سرسبز و شاداب باغ ہو، نہریں اس میں بہہ رہی ہوں،
اُس میں اُس کے لیے ہر طرح کی پیداوار اور پھل پھول ہوں[۱۹۱] اور
عین اُس کے بڑھاپے کے وقت میں جبکہ اس کے کم سن بچے
بھی موجود ہوں، اچانک ایک جھلستی آندھی کی لپیٹ میں
آجائے[۱۹۲] اور اس کے نتیجہ میں پورا باغ نذرِ آتش ہو کر رہ جائے[۱۹۳]
اللہ ایسے ہی تمہارے سامنے اپنی آیات کھول کر بیان کرتا ہے
تاکہ تم حقیقت تک پہنچنے کے لیے غور و فکر سے کام لو[۱۹۴]

عالمِ مادی اور عالمِ معنوی میں ہم آہنگی

پہلی تمثیل میں بتایا گیا تھا کہ اگر دل میں اخلاص نہ ہو تو عمل کی مقدار خواہ کتنی زیادہ ہو اللہ کے نزدیک بے قیمت ہے اور اگر دل میں اخلاص ہو تو عمل کی مقدار خواہ کتنی قلیل ہو اللہ کے نزدیک قیمتی ہے۔ مطلب یہ تھا کہ جو کچھ تم کرتے ہو اس کا ایک جسم ہے، اور ایک اس کی رُوح ہے۔ جسمِ اعمال کے وہ ڈھانچے ہیں جو ہمیں آنکھوں سے نظر آ رہے ہیں ان کو مظاہر کہتے ہیں اور رُوح دل کا وہ جذبہ و اخلاص ہے جو اس کا محرک ہے اس کو مصادر کہتے ہیں۔ بتایا یہ گیا تھا کہ جب تک مصادر صحیح نہ ہوں گے مظاہر کی کوئی قیمت نہ ہو گی۔ اب اس آیت میں تمثیل کے ذریعے انسانی زندگی کے پورے باغ کے متعلق بتایا جا رہا ہے کہ پوری زندگی میں جیسے مصادر ہوں گے ان کے ہی لحاظ سے ان کے مظاہر کو شرفِ قبول حاصل ہوگا۔ مظاہر عالمِ مادی ہے اور مصادر عالمِ معنوی ہے۔ دونوں کے احکام و قوانین یکساں ہیں۔ جو بوؤ گے اور جس طرح بوؤ گے ویسا ہی اور اسی طرح کا پھل پاؤ گے۔ اگر دل کی زمین میں اخلاص ہے اور اخلاص پر عمل کا پودا اُگا ہے تو اس کا پھل قیمتی ہوگا ورنہ پوری زندگی کا باغ، باغ پر محنت آنکھوں کے سامنے اس وقت رائیگاں ہو کر رہ جائے گی جب اس کو اس کی ضرورت ہوگی اور عمل کا دور ختم ہو چکا ہو گا اور اسے معلوم ہو گا کہ اس کی کوئی تخم ریزی بھی پھل نہ لا سکی۔

۷۹۱ ۔ کیا تم میں کوئی یہ پسند کرتا ہے کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک سرسبز و شاداب باغ ہو۔ اصل ارشاد میں نخیل اور اعناب کے الفاظ آئے ہیں۔ نخل اور نخیل اسمِ جنس ہے، کھجوروں کو کہتے ہیں اور اعناب عنبہ کی جمع ہے، انگوروں کو کہتے ہیں۔ ان دونوں میووں کا خاص طور پر نام اس لیے آیا ہے کہ یہ دونوں اہلِ عرب کے لیے خاص اہمیت اور خصوصی معنویت رکھتے تھے۔ اور اس میں ان کے باغ کے بارے میں تصور کی بھی عکاسی ہے۔ ان کے ہاں اچھے باغ کا تصور یہ ہے کہ اس کے کنارے کنارے کھجوروں کے درخت ہوں، درمیان میں انگوروں کی بیلیں ہوں مناسب مواقع پر مختلف فصلوں کی کاشت کے لیے قطعات ہوں۔ باغ بلندی پر ہو اس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں جس کی گولیں باغ میں گھوم رہی ہوں۔ آیت میں لھم فیھا من کل الثمرات سے اسی طرف بھی اشارہ کیا ہے کہ باغ کا مالک باغ کے مادی اور مالی فوائد کی وجہ سے مرفہ الحال اور غنی ہے۔ چنانچہ قرطبی لکھتے ہیں کہ اس فقرے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ اس کے باغ میں ہر قسم کی پیداوار ہوتی تھی۔ اور نسفی فرماتے ہیں کہ اس باغ کے ذریعے اسے سارے مادی فوائد حاصل تھے۔ قاضی بیضاوی نے دونوں باتوں کی نشاندہی کی ہے۔

۷۹۲ ۔ اور مین اس کے بڑھاپے کے وقت میں جبکہ اس کے کم سن بچے بھی موجود ہوں اچانک باغ ایک

جھلستی آندھی کی لپیٹ میں آجائے۔ اصل ارشاد اعصار آیا ہے اس کے معنے بگولے کے ہیں اس کی جمع اعاصیر آتی ہے
اس تمثیل میں حالات کی منظر کشی کی گئی ہے۔
ذرا صورت حال کا تصور کیجئے۔ ایک شخص کی عمر بھر کی کمائی ایک باغ ہے۔ سرسبز و شاداب خوب پھلا پھولا ہوا ہر طرح کے میووں سے لدا ہوا ہے۔ باغ کا مالک بوڑھا ہو جاتا ہے اور اب کسی نئی محنت کے قابل نہیں ہے بچے موجود ہیں مگر کمزور کم سن جو بجائے اس کے کسب معیشت میں باپ کا ہاتھ بٹائیں الٹے اس کے لیے بار ثابت ہو رہے ہیں۔ عین اس وقت شدید ترین حاجت کے وقت یک بیک معلوم ہوتا ہے کہ

۷۹۳۔ اس کا پورا باغ نذر آتش ہو کر رہ جائے۔ یہ ایک باغ اس کی زندگی کا سہارا ہے جس پر اس نے ساری عمر کی محنت لگائی ہے اور جو اس کی زندگی کی ساری ضرورتوں کی بجا آوری کرتا ہے اسی سے اس کی غنائی شاد قائم ہے کہ اچانک ایک آتشیں بگولا اٹھتا ہے اور اس کا باغ اس کی لپیٹ میں آجاتا ہے۔ اس کی امیدوں پر پانی پھر جاتا ہے۔ اس کی آرزوؤں پر اوس پڑ جاتی ہے اور اس کی ساری امنگیں ملیا میٹ ہو کر رہ جاتی ہیں۔
یہی حال اس شخص کا ہو گا جو ساری عمر دکھاوے کی نیکیاں کرتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ عاقبت میں کام آئیں گی لیکن جب عاقبت کا دن آئے گا تو دیکھے گا کہ اس کی ساری محنت رائیگاں گئی اور اس کی کوئی تخم ریزی کام نہ آسکی۔
یہ مثال ان لوگوں کی ہے جو لوگوں کو دکھانے کو صدقہ خیرات کرتے ہیں یا خیرات کر کے احسان جتلاتے ہیں اور ایذا پہنچاتے ہیں [1]
یعنی اسی کے مشابہ یہ بات بھی ہے کہ صدقہ دیا یا کوئی نیک کام کیا جس کی قیامت میں کارآمد ہونے کی توقع ہے اس وقت معلوم ہو گا کہ ہمارے من واذیٰ اور ریاکاری کی وجہ سے ہماری طاعات باطل یا بے برکت ہو گئیں اس وقت کیسی سخت حسرت ہو گی کہ کیسی کیسی آرزوؤں کا خون ہو گیا [2]
حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔
اس تمثیل کا حاصل یہ ہے کہ احسان جتلانے والے اور ریاکاری سے صدقہ کرنے والے کے اعمال شدید احتیاج کے وقت بیکار ہو کر رہ جائیں گے جیسے اس شخص کا باغ شدید احتیاج کے وقت جل کر خاک ہو گیا۔
یعنی یہ مثال ان لوگوں کی ہے جو احسان رکھ کر اپنی خیرات کو ضائع کرتے ہیں۔ جیسے کسی نے جوانی کے

[1] افادات شیخ الہند [2] بیان القرآن

وقت باغ تیار کیا تاکہ ضعیفی کے وقت میں کام آئے اور اس سے فائدہ اٹھائے لیکن جب بڑھاپا آیا اور ضرورت سامنے آئی تو عین ضرورت کے وقت وہ باغ جل گیا۔ اسی طرح صدقہ اور خیرات مثل میوہ دار باغ کے ہے کہ ان کا میوہ آخرت میں کام آتا ہے جب کسی کی نیت بُری ہو، احسان جتائے یا ستائے تو وہ باغ جل کر خاک ہو جاتا ہے پھر اس کا میوہ جو کہ ثواب ہے کیوں کر حاصل ہوگا[1]

حضرت شیخ الہند رح فرماتے ہیں:

جیسے کسی شخص نے جوانی اور قوت کے وقت باغ تیار کیا تاکہ ضعیفی اور بڑھاپے میں اس سے میوہ کھائے اور ضرورت کے وقت کام آئے۔ پھر جب بڑھاپا آیا اور میوے کی پوری حاجت ہوئی تب وہ باغ عین حالتِ احتیاج میں جل گیا یعنی صدقہ مثل باغ میوہ دار کی ہے کہ اس کا میوہ آخرت میں کام آئے گا۔ جب کسی کی نیت بُری ہے تو وہ باغ جل گیا۔ پھر اس کا میوہ ثواب کی صورت میں کیسے ملے گا[2]

یہ پوری زندگی کی تمثیل ہے۔ باغ سے حیاتِ دُنیا کا باغ مراد ہے۔ اس میں ایک انسان ایمان کی زمین پر اعمال و اخلاق کے پودے لگاتا ہے اور اخلاص کے پانی کے بجائے ریاکاری کے پانی سے سیراب کرتا ہے اور آخرت میں اس کے فوائد سے فائدہ اُٹھانے کی آس رکھتا ہے لیکن وہاں اس کی کوئی قیمت نہیں پڑے گی بلکہ غضبِ الٰہی کا بگولا اسے خاکستر بنا کر رکھ دے گا۔ اس لیے اگر تم یہ پسند نہیں کرتے کہ تمہاری عمر بھر کی کمائی ایک ایسے نازک موقع پر تباہ ہو جائے جبکہ تم اس سے فائدہ اٹھانے کے سب سے زیادہ محتاج ہو اور از سرِ نو کمائی کرنے کا بھی موقع باقی نہیں رہا تو یہ بات تم کیسے پسند کر رہے ہو کہ دُنیا میں پوری عمر کام کرنے کے بعد آخرت کی زندگی میں تم اس طرح قدم رکھو کہ وہاں پہنچ کر تمہیں یکایک معلوم ہو کہ تمہارا پورا کارخانہ حیات یہاں کوئی قیمت نہیں رکھتا جو کچھ تم نے دُنیا کے لیے کمایا تھا وہ دُنیا ہی میں رہ گیا آخرت کے لیے کچھ کما کر لائے ہی نہیں کہ یہاں اس سے فائدہ اٹھا سکو۔ وہاں تمہیں اس کا موقع نہیں ملے گا کہ از سرِ نو آخرت کے لیے کمائی کرو۔ آخرت کے لیے کام کرنے کا جو کچھ بھی موقع ہے اسی دُنیا میں ہے یہاں اگر تم آخرت کی فکر کیے بغیر ساری عمر دُنیا ہی کی دھن میں لگے رہے۔ اور اپنی تمام قوتیں اور کوششیں دنیوی فوائد تلاش کرنے میں کھپاتے رہے تو آفتابِ زندگی کے غروب ہونے پر تمہاری حالت بعینہٖ اس بڈھے کی طرح حسرتناک ہوگی جس کی عمر بھر کی کمائی اور جس کی زندگی کا سہارا ایک باغ تھا اور وہ باغ عین عالمِ پیری میں اس وقت جل گیا جبکہ نہ وہ خود نئے سرے سے باغ لگا سکتا ہے اور نہ اس کی اولاد بھی اس قابل ہے کہ اس کی مدد کر سکے[3]

---

[1] معارف قرآن م ا [2] افاداتِ شیخ الہند [3] تفہیم القرآن۔

اس آیت نے یہ بات واضح کردی ہے کہ عالمِ مادی اور عالمِ معنوی دونوں کے احکام اور قوانین میں ہم آہنگی اور یکسانی ہے۔ جو بوؤ گے اور جس طرح بوؤ گے اسی طرح کا حاصل بھی پاؤ گے۔ جس طرح تم مادیات میں دیکھتے ہو کہ اللہ نے ہر عمل کے لیے ایک لازمی نتیجہ ٹھہرا دیا ہے اسی طرح یہاں بھی اعمال و اخلاق کے نتائج ظہور میں آنے کا ایک ضابطہ اور قاعدہ مقرر فرما دیا ہے۔ اعمال و اخلاق کی قبولیت کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ایمان کی زمین پر ان کا پودا لگا دیا جائے بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ ان میں اخلاص کا احتساب کا پانی بھی دیا جائے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ اسلام کا حسن یہ ہے کہ افکار درست ہوں اور ہر عمل کے لیے ہر وقت یہ تصور قائم رکھنے کی کوشش کرے کہ اللہ سبحانہ کی نظر اس کو برابر دیکھ رہی ہے وہ اس سے دور نہیں بہت قریب ہے۔ جو نقل و حرکت کرتا ہے اس کو وہ خوب جانتا ہے۔ اس طرح اسلام کو اپنانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اعمال کی توفیق ارزانی ہوتی ہے۔

تفکر اور اس کی قسمیں

۴۹۷۔ اللہ ایسے ہی کھول کر تمہارے سامنے احکام بیان کرتا ہے تاکہ تم حقیقت تک رسائی کے لیے غور و فکر سے کام لو۔ اس آیت میں یہ فقرہ بہت ہی معنے خیز ہے۔ اس کی معنویت کا تقاضا یہ ہے کہ یہاں اس کے متعلق ضروری اشارات کر دیئے جائیں۔

تفکر فکر سے بنا ہے اس کے معنے سوچنا اور غور کرنا ہے۔ فکر دو طرح کا ہوتا ہے ایک فکر اصطلاحی، دوسرا فکر حقیقی۔ فکر اصطلاحی یہ ہے کہ معنویات میں معلوم کی مدد سے مجہول تک رسائی حاصل ہو جائے۔ اصولیین کی زبان میں اس کے لیے ضروری ہے کہ مقیس اور مقیس علیہ اور دونوں میں رابطہ کا کام دینے والی علت معلوم ہو۔ یہ کام احکام کی حدود میں فقہاء کرتے ہیں۔ اسی کو استنباط، استخراج، اجتہاد اور قیاس مختلف حیثیات کے لحاظ سے کہتے ہیں۔ اس معنے کے لحاظ سے یہاں تفکر لا کر یہ اشارہ کیا گیا ہے کہ جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ ریاکاری روزِ قیامت زندگی میں کیے ہوئے اعمال کو بے نتیجہ بنا دے گی۔ تو غور و فکر سے کام لو کہ جب ریاکاری سے اعمال صالحہ رائیگاں ہو جاتے ہیں تو پھر اگر تمہارے اعمال میں کسی درجہ میں ان گناہوں کی آمیزش ہو جائے جو ریاکاری سے کہیں زیادہ سنگین ہیں۔ ریاکاری کو زبانِ نبوت نے شرک خفی کہا ہے۔ اگر تمہاری عبادتوں میں اور جابرانہ اعمال میں خود شرک ہی کی آمیزش ہو جائے تو پھر تمہارے اعمال کی کیا قیمت پڑے گی۔ یہ غیر اللہ کی قسمیں، یہ اولیاء اللہ کے مزاروں پر چڑھاوے چڑھاتے، چادریں چڑھانے، روپے اور اجناس کی نذریں جو آج کے دورِ انحطاط میں ہماری اسلامی زندگی کی نشانیاں ہیں ان کی کیا قیمت ہو گی اور روزِ قیامت ان کی کیا جزا ملے گی۔ یہ ہماری نامرادیوں کی کیسی کامل تصویر ہو گی جب ہمارے وہ تمام اعمال جن کو ہم دنیا میں نیکیاں بنا کر کر رہے ہیں اور

سمجھ رہے تھے کہ نیکی کر رہے ہیں یحسبون انھم یحسنون لیکن آنکھ کھلتے ہی حقیقت کچھ اور ہی نظر آئے گی کتنے ہیں جن کے حلقوم یا رسول اللہ اور یا علی کے نعرے لگا کر خشک ہو جاتے ہیں اور ان کو یہ خیال تک نہیں آتا کہ یہ صریح شرک ہے جسے قرآن مٹانے آیا ہے۔

ایک قدم اور آگے بڑھائیے۔ ہماری اسلامی زندگی میں اسلام کے نام پر بنائے ہوئے کتنے اعمال، کتنی اوراد، کتنے وظائف اور کتنی رسوم ہیں جن کی عمارت سنت سے ہٹ کر بدعات کی نیرنگیوں پر قائم ہوئی ہے۔ قرآن بتا رہا ہے کہ غور کرو کہ تمہارے ان اعمال کا، ان افکار کا، ان رسوم کا، ان اقدار کا، ان وظائف اور اوراد کا کیا بنے گا جن میں شرک اور بدعت کی آمیزش ہو گی۔ اگر ریاکاری اخلاص سے متصادم ہے اور اس لیے ریاکاری پر مبنی اعمال رائیگاں ہیں تو شرک تو ایمان سے اور بدعت تو نبوت کی اتباع سے بلاواسطہ متصادم ہے ان کی بنیادوں پر اعمال و اقدار کی اٹھتی ہوئی عمارت روزِ قیامت ہمیں اللہ کے غضب سے کیونکر بچائے گی۔ فانا اللہ والی اللہ المشتکی۔

تفکر کے دوسرے معنی یہ ہیں کہ آخرت میں کامیابی کے ذرائع اور وسائل پر غور کیا جائے اور اس راہ میں رکاوٹ بننے والے باریک نفسانی آفات، اعمال کو خراب کرنے والے اسباب کا جائزہ لیا جائے، دُنیا کی بے ثباتی کا زیادہ سے زیادہ یقین اور آخرت کی زندگی کے دوام و بقا کا یقین و اذعان اور اس کی طرف رغبت و میلان ہو اور دل میں اللہ کی ناراضگی کا اندیشہ اور اسے مٹانے اور خوش کرنے کا جوش ہو۔ اصلی اور حقیقی تفکر یہی ہے اس لحاظ سے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہارے سامنے احکام اس لیے کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ تمہارے اندر دُنیا کی بجائے فکرِ آخرت پیدا ہو اور یہاں تم اپنے افکار، علوم، اقدار، اعمال میں ذمہ داری اور مسئولیت کو پیش نظر رکھو اور تم اللہ سے ڈرنے والے، اس کو یاد کرنے والے، اس کے عذاب اور آخرت کے مواخذہ و حساب کے لیے لرزاں و ترساں اور فکر مند رہنے والے ہو جاؤ۔ رات کی تنہائیوں میں آخرت کی بازپرس کو یاد کر کے اور اس کا فکر کر کے آنسو روؤ کہ صحابہ کرام کی طرح داڑھیاں آنسوؤں سے تر ہو جائیں۔ حسن بصری نے آخرت کے لیے صحابہ کرام کی فکر مندی کا منظر کتنے مختصر اور بلیغ فقرے میں پیش کیا ہے کانھم رای عین آخرت کا فکر ان پر ایسا چھایا ہوا تھا کہ گویا میدان حشر اللہ سبحانہ کی عدالت میں پیشی اپنی ساری ہولناکیوں کے ساتھ ان کی آنکھوں کے سامنے تھی۔ اسی وجہ سے وہ غفلت شعار لوگوں کی طرح عیش و آرام اور اطمینان کی زندگی سے بالکل ناآشنا تھے اور خدا طلبی اور فکرِ آخرت نے ان میں دُنیا طلبی کے اس بحران کو سر د کر دیا تھا جس نے دُنیا کی شانتی تنگ کر دی تھی، اور دُنیا کو محض ایک بازار اور منڈی بنا دیا تھا۔ مسابقت کا وہ فکری جذبہ جو انسان کی دبی ہوئی قوتوں کو ابھارتا ہے اور اس کے جوہروں کو چمکاتا ہے جس نے پہلے دُنیا کی طرف متوجہ ہو کر زندگی کو ایک ہمیشہ رہنے والی کشمکش گاہ بنا دیا تھا آخرت

کی فکر نے ان میں شریفانہ انسانی خصائل کو ابھارا اور سیرت کو پاکیزہ بنا دیا۔ اب بھی ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش بھی تھی مگر ان کاموں میں جن سے اللہ راضی ہو اور آخرت کی زندگی میں بناؤ سنوار ہو۔ یہی فکر قرآن کا مطلوب مقصود ہے اور مطلب یہ ہے کہ آیات کو ہم تمہارے سامنے کھول کر بیان کر رہے ہیں تاکہ تم دنیا کے فانی اور آخرت باقی کی حد تک اپنے اعمال کا جائزہ لو اور دنیا میں پارسا ہو کر رہو اور آخرت کی اپنے اندر چاہت پیدا کرو۔

آیت کے مصداق میں ہمہ گیری

اگرچہ آیت صدقات کے بارے میں ہے اور پوری آیت میں تمثیل کے ذریعے یہ سمجھایا گیا ہے کہ یہی حال آخرت میں ان لوگوں کا ہوگا جو اپنے صدقات کو برباد کرنے والی آفتوں سے نہیں بچاتے۔ ان کے خرمن کے لیے بجلی خود ان کی آستینوں میں چھپی ہوئی ہے اور وہ اس وقت نمایاں ہوگی جب ان کے لیے عمل کا کوئی امکان باقی نہ رہے گا لیکن حضرت ابن عباس رضؓ نے اس آیت کے عموم میں پوری زندگی کے اعمالِ حسنہ کو شامل فرمایا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضؓ نے ایک بار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے دریافت کیا بتاؤ کہ قرآن کی اس آیت ایود احدکم ... الخ کا مصداق کون ہے۔ صحابہ نے جواب دیا کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ ایک بات کہو کہ ہم جانتے ہیں یا ہمیں معلوم نہیں ہے۔ یعنی یہ کہنا کہ اللہ جانتا ہے میری بات کا جواب نہیں ہے۔ اللہ جاننے کو میں بھی جانتا ہوں۔ میں تم سے دریافت کر رہا ہوں کہ تم بھی جانتے ہو کہ نہیں؟ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بول پڑے امیر المومنین اس آیت کے بارے میں میرے جی ایک بات آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اجازت ہو تو عرض کروں۔ اور شاید اس انداز کو اختیار کرنے کی وجہ یہ تھی کہ عمر میں چھوٹے تھے۔ ایسا نہ ہو کہ چھوٹا منہ بڑی بات ہو جائے۔ حضرت عمر رضؓ نے حوصلہ افزائی کی اور فرمایا کہ میرے بھتیجے جو کچھ جی میں ہے کہو اپنے کو معمولی خیال نہ کرو۔ اس پر حضرت عبداللہ ابن عباسؓ نے فرمایا کہ یہ زندگی میں انسانی عمل کی تمثیل ہے۔ حضرت عمر رضؓ نے پوچھا لو کون سے عمل کی۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے فرمایا کہ ایک زندگی میں اللہ کی طاعت کرتا رہتا ہے۔ پھر اچانک شیطان کے ورغلانے سے گناہ کی زندگی اپنا لیتا ہے یہاں تک کہ اس کی پوری زندگی گناہوں کی لپیٹ میں آجاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گناہوں کا آتشیں بگولا انسانی زندگی کے خرمنِ طاعت کو جھلس کر رکھ دیتا ہے۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنْفِقُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّآ اَخْرَجْنَا لَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ ۠ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ وَلَسْتُمْ بِاٰخِذِيْهِ اِلَّآ اَنْ تُغْمِضُوْا فِيْهِ ۭ وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ غَنِىٌّ حَمِيْدٌ ۝

اے اہلِ ایمان! جو کچھ تم نے محنت و مزدوری یا تجارت سے کمائی کی ہو[۹۵] یا جو کچھ ہم نے زمین سے تمہارے لیے پیداوار کی ہے[۹۶]۔ اس کے بہترین میں سے کچھ خرچ کرو[۹۷]۔ اور ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لیے بُری سے بُری چیز کا ارادہ کرو[۹۸] حالانکہ وہی چیز اگر تمہیں کوئی دے تو لینے کو تیار نہ ہو مگر یہ اس کے لینے میں جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لو تو دوسری بات ہے[۹۹]۔ یاد رکھو کہ اللہ کی ذات بے نیاز اور ستودہ صفات ہے[۱۰۰]۔

اللہ کی راہ میں بہترین چیز دو

اوّلاً صدقہ کی قیمت بتا کر صدقہ کرنے اور اللہ کی راہ میں دینے کی ترغیب دی۔ پھر صدقہ کی صحت کی اور قبولیت کی الگ شرطیں بیان کیں۔ صدقہ میں صحت کی شرط اخلاص کو قرار دیا اور قبولیت کی شرط من واذی نہ ہونا بتایا اخلاص و ریاکاری دونوں کو علیحدہ علیحدہ تمثیلات سے واضح فرما کر پوری زندگی کے بارے میں ایک تمثیل فرمائی کہ تم میں کون ہے جو یہ بات پسند کرے گا کہ اپنی ساری عمر باغ لگانے میں صرف کر دے اور سمجھے کہ اس کی پیداوار بڑھاپے میں کام آئے گی لیکن جب بڑھاپا آیا تو دیکھے کہ سارا باغ ویران ہو گیا ہے یہی حال اس انسان کا ہے جو ساری عمر لگا دے

کی نیکیاں کرتا رہتا ہے اور سمجھتا ہے کہ آخرت میں کام آئیں گی لیکن جب آخرت کا دن آئے گا تو اسے پتہ لگ جائے گا کہ اس کی ساری محنت رائیگاں گئی۔ اب اس آیت میں واضح کیا جا رہا ہے کہ ایسا نہ کرو کہ جو چیز نکمی اور بیکار ہو اسے خیرات کے نام سے محتاجوں کو دے دو اور سمجھو کہ اس کا تم نے ثواب کما لیا۔ اگر تمہیں کوئی ایسی چیز دے دے تو تم لینا کبھی پسند نہ کرو۔ پھر اگر اپنے لیے نکمی چیز لینا پسند نہیں کرتے ہو تو اپنے محتاج بھائیوں کے لیے کیوں پسند کرتے ہو۔

تمام اخلاقی اور تمدنی ترقی کا دار و مدار صرف بلند ہمتی اور عالی خیالی پر ہے۔ بلند ہمتی کا تقاضا یہ ہے کہ اہلِ ایمان کی نگاہ بلند سے بلند نظریہ پر نہ کہ ٹھہرے اور اس کو دنیا کی تمام چیزیں ہیچ نظر آئیں۔ اس بنا پر اسلام نے یہ اصول قرار دیا ہے کہ اللہ کی راہ میں جو کچھ دیا جائے وہ عمدہ اور بہترین ہو تاکہ مبتذل اور ادنیٰ درجہ کی چیزوں کے دینے اور لینے سے دینے والے اور لینے والے کے اندر پستی اور دنائت نہ پیدا ہو کیونکہ اس سے لینے والے کے اندر حد درجہ کا لالچ اور چھچھوراپن پیدا ہو گا کہ معمولی اور سڑی گلی چیز تک اس کے لالچ سے نہیں بچ سکتی اور دوسری طرف دینے والے کی روح میں بھی اس قسم کی خیرات سے بلندی اور علم کی بجائے نجات، حرص اور کمینہ پن اور تزکیہ کے بجائے اور زیادہ نجاست اور گندگی پیدا ہو گی۔ کیونکہ کوئی بری چیز کسی کو دینے دینے کا منشا دوسرے کی مدد اور خدا کی خوشنودی کا خیال نہیں ہوتا بلکہ مقصد یہ ہوتا ہے کہ اس بے کار اور سڑی گلی چیز سے اپنا دامن اور صحن خانہ صاف ہو۔ اس لیے اس سے دینے والے کے دل میں صفائی کے بجائے اور گندگی پیدا ہوتی ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے ابن جریر کے حوالہ سے بتایا ہے کہ براء بن عازب کہتے ہیں کہ یہ آیت ان انصار کے بارے میں ہے جو کھجوروں کے بدمزے خوشے لا کر مسجدوں میں لٹکا دیتے ہیں اور اصحاب صفہ بھوک کی شدت سے جب بے تاب ہوتے تو مجبوراً ان میں سے دو چار کھجوریں توڑ کر کھا لیتے۔ چونکہ یہ حرکت بری تھی۔ اس لیے قرآن نے ان کو خبردار کیا۔

۷۹۵ ملے اہلِ ایمان جو کچھ تم نے کمائی کی ہو۔ اصل ارشاد میں کسبتم آیا ہے۔ کسب کے معنی جمع کرنا طلب کرنا، نفع کمانا، روزی تلاش کرنا، کھانا آتے ہیں۔ حدیث میں آتا ہے بہترین روٹی اور کمانا وہ ہے جو آدمی محنت کر کے کمائے، اس کی اولاد بھی اس کی کمائی ہوتی ہے ولدہ من کسبہ اولاد کے مال میں سے بقدرِ ضرورت لے لینا جائز ہے۔ ایک اور ارشاد ہے تمہاری اولاد تمہاری بہترین کمائی ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ خدیجۃ الکبریٰ نے یہ پیش فرمایا ہے تکسب المعدوم اور جو چیز نہیں ہے آپ اس کو محنت سے کما لیتے ہیں یعنی تجارت اور کمائی کے ذرائع میں ہوشیار ہیں یا جو چیز لوگوں کے پاس نہیں آپ اسے مہیا کر دیتے ہیں۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ آیت کا مدلول بتا رہا ہے کہ تمام مکاسب اور ذرائع معیشت کا اختیار کرنا جائز ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ مکاسب دو طرح کے ہوتے ہیں۔ ایک اموال کے تبادلہ سے، دوسرے منافع کے تبادلہ سے۔ اموال کے تبادلہ میں تجارت اور منافع میں محنت مزدوری، کرایہ اور ملازمت داخل ہے۔

۷۹۶ - یا جو کچھ ہم نے نکالا ہے تمہارے لیے زمین سے۔ اس میں وہ سب چیزیں داخل ہیں جو زمین سے باہر آتی ہے یا باہر کی جاتی ہیں۔ زراعت تو اس کے مفہوم میں سب سے پہلے داخل ہیں لیکن ساتھ ہی معاون کانیں، دھاتوں کی کانیں، کوئلے اور تیل کے ذخائر، سب اس میں داخل ہیں حتی کہ دفینے بھی اس میں آگئے۔ اگر کانیں بھی اس میں داخل ہیں تو یہ سوال یہاں بے صرامیت رکھتا ہے کہ کانیں کس کی ملکیت ہیں؟

کانوں کی ملکیت

احناف اور حنابلہ اس پر متفق ہیں کہ اگر کسی کی مملوکہ زمین میں پائی جائے تو زمین والے کی ملکیت ہوگی اور اگر غیر مملوکہ زمین میں ہوں تو پانے والے کی ملکیت ہوگی۔ مالکی فقہا اس بارے میں مختلف الرائے ہیں۔ بعض کی رائے یہی ہے جو پیش کی گئی لیکن امام مالکؒ کے اکثر رفقاء کی رائے اس سے مختلف ہے۔ ورنہ امام مالکؒ کی جو رائے پیش کی گئی ہے وہ درج ذیل ہے۔

امام مالکؒ کے بارے میں مجھ تک یہ روایت پہنچی ہے کہ ان سے بربر کی ان کانوں کے بارے میں دریافت کیا گیا جو ان کی زمین میں دریافت ہوئی ہیں۔ فرمایا میرے نزدیک وہ سرکاری ہیں سرکار ہی ان کی مالک ہے۔ میں نے کہا کہ ان کانوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو کسی ایسی زمین میں ہوں جس کے باشندوں نے اسلامی سرکار سے صلح کرلی ہو۔ فرمایا کہ ایسی زمینوں میں جو کانیں نکلیں وہ اس زمین کے مالکوں کی ملکیت ہوں گی۔ امام مالکؒ نے فرمایا کہ جو علاقے بزور قوت فتح ہوں اور ان میں کانیں برآمد ہوں وہ بھی سرکاری ہیں۔ اور یہ سرکار کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے کہ جو طریقہ چاہے اختیار کرے۔

مالکی مسلک کی ایک دوسری کتاب "الشرح الصغیر علی ہامش بلغۃ السالک لاقرب المسالک" میں الشیخ احمد الاردیر رقمطراز ہیں:

کانوں کا علی الاطلاق معاملہ خواہ وہ معدن ہوں یا دوسری معدنیات سرکار سے متعلق ہے۔ خواہ یہ کان کسی شخص کی مملوکہ زمین میں ہو۔

معتمد علیہ رائے یہی ہے کہ کانیں جو کسی شخص کی زمین میں ہوں سرکاری ہوں گی کیونکہ کانوں کی دریافت بدترین لوگ بھی کر سکتے ہیں۔ اس لیے اگر کانوں کو سرکاری قبضہ میں نہ دیا جائے تو فتنہ اور جھگڑا رونما ہونے کا اندیشہ ہے۔

اسی مسئلہ پر علامہ ابن رشد اندلسی نے بدایۃ المجتہد میں ان الفاظ میں روشنی ڈالی ہے۔

کانوں کے بارے میں دو رائیں پیش کی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ وہ ان زمینوں کے تابع نہیں ہیں جن کے

اندر وہ پائی جاتی ہیں خواہ وہ زمین مملوکہ ہو یا غیر مملوکہ۔ ان کانوں کی مالک سرکار ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ کانیں ان زمینوں کے تابع ہیں جن میں وہ پائی جائیں۔ اگر وہ کسی میدان میں یا بزورِ شمشیر فتح ہونے والے علاقہ یا غیر مملوکہ صحراؤں میں پائی جائیں تو سرکاری ہوں گی۔

امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد بن حنبل اور بعض مالکی فقہاء کی یہ رائے ہے کہ جو کان کسی مملوکہ زمین میں پائی جائے وہ مالک زمین کی ملکیت ہوگی اس اُصول پر مبنی ہے کہ کانیں ملکیت کے معاملہ میں زمین کے تابع ہیں۔ قرآن وسنت کی کوئی صریح نص اس اُصول کی تائید نہیں کرتی۔

ملکیت کی حقیقت قرآن کی روشنی میں

اس آیت میں اوّلاً کسب کی نسبت کاسبین کی طرف، ثانیاً اس میں انفاق کا مطالبہ بتاتا ہے کہ قرآن کے نزدیک تصورِ ملکیت کیا ہے۔ فقہ اسلامی میں ملکیت کی متعدد تعریفیں کی گئی ہیں۔ ہمارے نزدیک سب سے زیادہ جامع تعریف وہ ہے جو مشہور حنفی محقق علامہ زین العابدین ابراہیم بن نجیم نے کی ہے۔ یہ تعریف اس تعریف کے مطابق ہے جو شیخ ابن الہمام نے فتح القدیر میں کی ہے۔ ابن نجیم فرماتے ہیں کہ۔

ملکیت تصرف کا وہ اختیار ہے جو شارع کی جانب سے حاصل ہو مگر کسی مانع کی وجہ سے۔

اس تعریف کی رُو سے ضروری ہے کہ ملکیت کا حصول شرعی طور پر ہوا ہو۔ وہی مالکانہ حقوق معتبر ہیں جو شریعت نے دیئے ہوں۔ یہ بات کہ کوئی ملکیت شارع کے صریح اذن یا خاموش تائید کے بغیر حاصل نہیں ہوتی۔ فقہاءِ اسلام کے درمیان اتفاقی اُصول ہے۔ (الملکیۃ ونظریۃ العقد) فقہاءِ اسلام نے اس مسئلہ پر جس زاویہ نگاہ سے غور کیا ہے یہ ہے کہ کائنات اور اس کی تمام اشیاء اللہ کی ملک ہیں اور وہی شارع بھی ہے۔ مالکِ حقیقی کی مرضی جو قرآن وسنت میں مذکور ہے انسانوں کو حقِ ملکیت عطا کرتی ہے۔ مالک وہ ہے جو شریعتِ اسلامی کی رُو سے مالک ہو۔

مذکورہ بالا تعریف میں حقِ ملکیت علی الاطلاق نہیں بلکہ اس میں مانع کی قید موجود ہے اور اس کے ذریعے ان حدود وقیود پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں۔ یہ اشیاءِ مملوکہ کی نوعیت، مالک کی شخصیت اور سماجی حالات کے اعتبار سے مختلف واقع ہوتے ہیں۔ اسی طرح اپنی ملک میں دوسروں کو مداخلت سے باز رکھنے کا حق بھی مختلف حالات میں اور مختلف اشیاء کے سلسلے میں مختلف معنے رکھتا ہے۔

حصولِ ملکیت کی اساس

قرآن نے اس آیت میں کسبتم یعنی تم نے کمایا اور اخرجنا لکم ہم نے زمین سے تمہارے لیے

پیداوار کی بول کر حصول ملکیت کی بنیاد کی طرف بڑا معنی خیز اشارہ کیا ہے کہ حصول ملکیت میں بنیادی چیز قبضہ ہے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رح نے اپنے ایک خط میں اسی بنیادی چیز یعنی قبضہ کو اس طرح سمجھایا ہے کہ

> ملکیت کی علت قبضہ ہے۔ جنگل میں یا دریائی جانوروں، گھاس، لکڑی جو زمین سے پیدا ہوتے ہیں، ان میں ملکیت یہی ہے کہ قبضہ ہو۔ قبضہ سے پہلے اسلام میں فروخت کے ناجائز ہونے کی وجہ بھی یہی ہے کہ چیز خریدار کے قبضہ میں نہ جائیگی۔ غیر مسلم اگر مسلمانوں کے ملک پر غلبہ حاصل کریں اور اس بالادستی کے نتیجہ میں اسلامی ملک پر ان کا قبضہ ہو جائے تو ان کی ملکیت ثابت ہو جاتی ہے اور وہ سب چیزیں مسلمانوں کی ملکیت سے نکل جاتی ہیں۔ بہر حال ملکیت کی اساس قبضہ ہے۔ بیع و شرا، ہبہ و وصیت، میراث اسی قبضہ کے ذرائع ہیں۔

حصول ملکیت کے ذرائع

اور اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جن راہوں سے ملکیت حاصل ہوتی ہے وہ کسب و اخرجنا لکم کے کوزے میں بند ہے خواہ یہ معادن ہوں یا دخائر، تجارت ہو یا صنعت شکار ہو یا ملازمت و اجارہ یہاں تک کہ حصول ملکیت کا آخری ذریعہ ثمرات ملکیت بھی اس میں داخل ہیں۔ اپنے باغ کے پھل، مویشی کی نسل اور اس قسم دوسرے ثمرات اصل مال کے مالک کی ملکیت میں داخل ہو جاتے ہیں۔ یہ بات حق ملکیت کے لازمہ کی حیثیت رکھتی ہے کہ ثمرات ملکیت مالک ہی کا حق سمجھے جائیں بالعموم ان ثمرات کے برآمد ہونے میں مالک کی محنت اور نگرانی کو خاصا دخل ہوتا ہے۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ وراثت بھی حصول ملکیت کے ذرائع میں سے ایک ذریعہ ہے۔ اور مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اسے اس طرح اپنے مخاطبوں کو سمجھایا ہے۔

> میراث اور وصیت میں جب تک مورث اور موصی بقید حیات ہے اور اس کا قبضہ موجود ہے وارث اور موصی کو ان اموال میں تصرف کا کوئی اختیار نہیں ہے اور جب وہ دنیا سے رخصت ہو جاتے ہیں تو ان کا قبضہ بھی ان کی روانگی کے ساتھ ختم ہو جاتا ہے کیونکہ وارث اور مورث دونوں کے قبضے کا اجتماع محال ہے۔ چونکہ اب مورث کا قبضہ ختم ہو چکا ہے اس لیے وارث کا تصرف درست ہے کیونکہ کوئی مانع نہیں ہے۔ وراثت اور وصیت بہ نسبت دوسرے ذرائع کے حصول ملکیت کا زیادہ قوی ذریعہ ہے کیونکہ بیع اور ہبہ میں بائع اور واہب اگرچہ اپنا تعلق توڑتے ہیں مگر ان کی واپسی کا امکان ہے کہ پھر اقالہ کریں لیکن یہاں تو واپسی کا امکان بھی ختم ہو جاتا ہے۔

دراصل اسلام میں فرد کی ملکیت نیابتی ملکیت ہے۔ اصل مالک اللہ ہے جس نے فرد کو زندگی گزارنے کے لیے مال و املاک بطور ذرائع عطا کیے ہیں۔ جب وہ اپنی زندگی پوری کر چکا تو اس کے چھوڑے ہوئے مال کی یہ حیثیت ختم ہو گئی۔ اب یہ بہر صورت دوسروں کے کام آنا ہے۔ یہ ذرائع کن لوگوں کو کس نسبت سے عطا کیے جائیں اس کا فیصلہ کرنے کا حق اصل مالک ہی کو حاصل ہے۔ فرد کو جس مقصد کے تحت حقِ ملکیت ملا تھا وہ اس کی زندگی پوری ہونے کے ساتھ ختم ہو گیا۔ اس کے بعد مالک حقیقی نے انسانوں کے عمومی مفاد و مصالح کے پیشِ نظر ترکہ کی تقسیم کا ایک ضابطہ مقرر کر دیا جو گوناگوں برکات کا حامل ہے۔ اگر فرد کو وصیت کے ذریعہ اپنی ساری ملکیت اپنے منشا کے مطابق دوسروں کو منتقل کرنے کا حق دیا جاتا تو کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ انسانی زندگی کے تمام مصالح کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرتا بلکہ جیسا کہ مولانا محمد قاسم نے لکھا ہے کہ اموال کے بارے میں اوّلاً قرآن نے لوگوں کو وصیت کے ذریعہ اقربا کے حصے مقرر کرنے کا حکم دیا۔ بعد ازیں اسے منسوخ کر کے یوصیکم اللہ فی اولادکم کے ذریعے حصص تقسیم فرما دیئے۔

۹۷۔ اس میں سے اللہ کی راہ میں بہترین خرچ کر۔ دراصل ارشاد میں انفاق آیا ہے اس کے معنے خرچ کرنا ہیں، خرچ کرنے کا حکم دینا خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ قرآن ان اربابِ ثروت کے حقِ ملکیت کو تسلیم کر کے ان کو یہ حکم دے رہا ہے۔ حقِ ملکیت دراصل مختلف حقوق کا مجموعہ ہے۔

استعمال اور تصرف کا حق، کاروبار میں لگانے کا حق۔ انتقالِ ملکیت کا حق، اور بالآخر تحفظ کا حق، حقِ ملکیت ماننے کا مطلب یہ ہے کہ مالک کو اپنی ملکیت میں یہ سب حقوق حاصل ہیں۔ اور لفظِ انفاق ان سب کی اجازت دے رہا ہے۔

حقِ استعمال و تصرف

ہر مالک کو اپنی ملکیت کے استعمال پر پورا حق حاصل ہے۔ یہ استعمال اپنے فائدے کے لیے بھی ہو سکتا ہے اور دوسروں کے فائدے کے لیے بھی۔ اللہ نے اشیاء کائنات پیدا ہی اس لیے کی ہیں کہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔ قرآن نے بار بار انسان کو اس پر ابھارا ہے کہ کائنات میں پھیلی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ اور ان کو اپنے اخروی فوائد کے لیے بطور ذریعہ استعمال کرو۔ استعمال کی بے شمار صورتیں ہوتی ہیں۔ ان طریقوں کی تخصیص و تحدید نہیں کی جا سکتی۔ اسلام نے صرف چند حدود متعین کر دیے ہیں۔ ان حدود کے اندر رہتے ہوئے مالک کو اپنی ہر خواہش کی تسکین کے لیے اپنی ملکیت کو استعمال میں لانے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔

نفع آور کاروبار میں لگانے کا حق

ہر مالک کو یہ حق حاصل ہے اور یہ بھی انفاق کی ایک فرع ہے کہ وہ اپنی املاک کو مزید نفع کمانے کے لیے

استعمال کرے اس مقصد کے تحت اپنی ملکیت کے ذریعے خود کوئی پیداآور کاروبار کر سکتا ہے اور کسی دوسرے کاروباری ذریعے سے بھی اپنا منشا پورا کر سکتا ہے۔ قرآن نے اس حق کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے۔ سرمایہ یا مال و جائیداد کو تجارتی، صنعتی یا زرعی کاروبار میں لگانے کے علاوہ اپنی منقولہ یا غیر منقولہ املاک کو کرایہ پر دینا بھی نفع آور کاروبار کی ایک جائز شکل قرار دیا گیا۔

افسوس ہے کہ اس زمانے میں ملکیت کے ذریعے نفع کمانے کے حق کو بہت اعتراضات کا نشانہ بنایا گیا ہے، حتیٰ کہ جو لوگ حق ملکیت کو تسلیم بھی کرتے ہیں مگر نفع کمانے کے حق کا انکار کرتے ہیں۔ انفرادی ملکیت کو ختم کر کے اجتماعی ملکیت کا نظام قائم کرنے کی تجویز بھی اس مخصوص حق کو ختم کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے۔ ان خیالات کی ہر روز نت نئے رنگ میں تشبیہہ کی جا رہی ہے۔ ضرورت ہے کہ ہم اس حق پر قدرے تفصیلی گفتگو کریں اور یہ واضح کریں کہ قرآن کن دلائل کی بنا پر نفع اور کرایہ کو درست سمجھتا ہے اور اس کے نزدیک نفع اور کرایہ کا تصور کیا ہے؟ اس کے لیے آپ کو ذرا تھوڑی دیر آیت ربا تک انتظار کی زحمت گوارا کرنی ہوگی۔

انتقالِ ملکیت کا حق

ہر مالک کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی ملکیت کو کسی دوسرے کو منتقل کر دے۔ یہ انتقال ملکیت کسی دوسری ملکیت کے عوض بھی ہو سکتا ہے اور بلا عوض بھی ملکیت کو منتقل کرنے کا اختیار حق ملکیت کا ایک اہم جزو ہے۔ یہ حق اس مقصد سے بھی ہم آہنگ ہے جس کے لیے انسانوں کو مالکانہ حقوق عطا کیے گئے ہیں۔ اس حق کے استعمال سے ملکیت کے فوائد مالک سے کسی ایسے فرد یا ادارے کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جسے اس کی ضرورت ہوتی ہے۔ خود مالک کو اس کا معاوضہ یا اس کے بلا عوض دینے کی صورت میں اس سے حاصل ہونے والا اخروی ثواب یا دوسرے دنیوی فوائد اس ملکیت سے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ حق ملکیت کا منشا ان اغراض کی تکمیل ہوتا ہے جو زندگی کو قائم رکھنے والے اور اسے بہتر بنانے کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔ یہ منشا انتقالِ ملکیت کے حق کے بغیر پورا نہیں ہو سکتا۔ اس پر تفصیلی بحث ہم انشاء اللہ آیت ۲۸۲ میں کریں گے۔

اللہ کی راہ میں بہترین چیز دینے کا مطالبہ

اس فقرے میں کہ اللہ کی راہ میں بہترین خرچ کرو۔ بہترین کے لیے طیب کا لفظ آیا ہے۔ یہ لفظ طاب

طیب صفت مشبہ ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں:

اصل میں طیب وہ چیز ہے کہ جس سے حواس لذت اٹھائیں اور جی مزہ پائے۔ طعام طیب، شریعت میں وہ ہے جو جائز طور پر جائز مقدار میں جائز مقام سے حاصل کیا گیا ہو۔ کیونکہ جو کھانا ایسا ہوگا وہ اب بھی اور آئندہ بھی طیب ہی رہے گا، خبیث اور ردی نہ ہوگا ورنہ فی الحال اگر طیب بھی ہو تو آئندہ چل کر مضر ہوگا اور اسی معنے میں ارشاد ہے کلوا من طیبات ما رزقناکم (صاف اور ستھری جو ہم نے تم کو دیں کھاؤ)، اور فکلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً (جو روزی اللہ نے تم کو حلال اور طیب دی وہ کھاؤ)، لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم (جو کچھ اللہ نے حلال کر دی ان میں صاف ستھری چیز کو حرام نہ کرو)

اس آیت میں طیب کو خبیث کے مقابلہ میں ذکر کیا ہے۔ اس لیے علماء نے تین تین معنے کیے ہیں۔ طیب حلال، طاہر، پسندیدہ، خبیث حرام، ناپاک اور ناپسندیدہ، ان ہی معنی کی رعایت سے مترجمین نے ترجمہ کیا ہے لیکن ہمارے خیال میں یہاں طیب سے مراد پسندیدہ ہے۔ کیونکہ قرآن میں یہ حلال کی صفت بن کر آیا ہے۔ اور حلال چیزوں کا مضاف بھی بن کر آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حرام میں طیب ہونے کی صلاحیت نہیں ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ اللہ کی راہ میں اپنی کمائی میں سے بہترین اور عمدہ چیز دو۔ حرام اور ناپاک اس کے مفہوم میں داخل ہے لیکن اس کا منطوق پسندیدہ اور عمدہ ہے۔

طیب و خبیث کا تقابل ذاتی ہے

۷۹۸۔ اور ایسا نہ ہو کہ اس کی راہ میں دینے کے لیے بُری چیز کا ارادہ کرو۔ اس آیت کا اصل مطلب تو یہی ہے کہ اللہ کی راہ میں نکمی اور بُری چیز دینا بُری بات ہے اس کا ارادہ بھی نہ کرو لیکن اس کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ یہ حکم اس شخص کو دیا جا رہا ہے جس کے پاس دونوں قسم کی اچھی اور بُری چیزیں موجود ہوں۔ کیونکہ بُری چیز دینے سے روکا اسی وقت جا سکتا ہے جب دینے والے کے پاس اچھی اور بُری دونوں ہوں۔ اچھی اور بُری کا یہ تقابل اپنی ذاتی املاک میں ہے۔ دوسرے شہریوں کے املاک سے نہیں ہے۔ گھر میں گوشت بھی پکا ہے اور دال بھی اب دال کے مقابلہ میں گوشت بہترین ہے۔ اور اگر آپ کے یہاں صرف دال ہی پکی ہے اور دوسرے شہریوں کے گھر میں گوشت پکا ہے تو اب اچھی اور بُری کا تقابل نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو موجود ہے اس میں سے بہترین اور اچھی چیز اللہ کی راہ میں دو۔ قرآن کا یہ کہنا کہ بُری اور نکمی چیز کا ارادہ نہ کرو اس کی غمازی کر رہا ہے کہ آپ کے پاس دونوں موجود ہیں اگر آپ کے پاس موجود ہی ایک چیز ہے تو پھر کوئی تقابل نہیں ہے۔ اور آگے اس کی

وضاحت یہ بیان فرمائی ہے کہ :

۷۹۹ ۔ حالانکہ وہ ہی چیز اگر تمہیں دی جائے تو لینے کو تیار نہ ہو مگر یہ کہ اس کے لینے میں جان بوجھ کر آنکھیں بند کر لو تو دوسری بات ہے ۔ یعنی بُرے مال سے مراد یہ ہے کہ اگر وہ ہی مال تمہیں لینا پڑ جائے تو آنکھیں نیچے کیے اور دل پر جبر کیے بغیر کبھی نہ لو جس چیز کو تم خود اپنے لیے گوارا نہیں کرتے وہ خدا کی جناب میں پیش کرتے ہو کس قدر شرمناک حرکت ہے حالانکہ سب کچھ اس کا بخشا ہوا ہے ۔ اللہ کی راہ میں تو ایسی چیز دینے کا تمہیں خیال بھی نہ کرنا چاہیے ۔ امام غزالی فرماتے ہیں ۔ اللہ کی راہ میں دینے کے لیے دینے والے کی یہ ڈیوٹی ہے کہ وہ اپنے املاک میں سے سب سے عمدہ ، سب سے زیادہ پسندیدہ اللہ کی راہ میں دے اگر مال کی حلت ہی میں شبہ ہے تو صدقہ کیا ہو گا اور اگر زیادہ پسندیدہ اللہ کی راہ میں نہ دے گا تو یہ جنابِ الٰہی میں بے ادبی اور گستاخی ہو گی ۔ اچھی چیز کو اپنے لیے رکھنا اور ناپسندیدہ کو اللہ کی راہ میں دینا تو یہ اپنے کو اللہ پر ترجیح دینا ہے قرآن عزیز نے اس کی ممانعت فرمائی ہے ۔

غنی و حمید لانے کی وجہ

۸۰۰ ۔ یاد رکھو کہ اللہ کی ذات بے نیاز اور ستودہ صفات ہے ۔ یعنی عند اللہ صدقے کے مقبول ہونے کی یہ بھی شرط ہے کہ اوّلاً حلال کی کمائی ہو ، مال حرام اور مشتبہ نہ ہو ۔ ثانیاً اچھی سے اچھی چیز اللہ کی راہ میں دے بُری چیز خیرات میں دے ۔ اور جان لو کہ اللہ بے پرواہ ہے تمہارا محتاج نہیں ہے اور خوبیوں والا ہے ۔ اگر بہتر سے بہتر چیز دل کے شوق اور محبت سے دے تو اللہ پسند فرماتا ہے [۱] یعنی وہ تمہارے صدقات کا محتاج نہیں ہے کہ جو چیز تمہارے معیار سے گری ہوئی ہو اس کی نذر اس کے دربار میں پیش کرنی چاہو ۔ اس کے یہاں اجر میں کوئی بخل نہیں ہے ۔ اس سے معاملہ کرنے والا کبھی نادم اور خاسر نہیں ہو سکتا ۔ وہ خود ہر طرح سے ستودہ صفات و جامع کمالات ہے ۔ تمہاری داد و دہش سے اس کی محمودیت میں کوئی اضافہ نہیں ہوتا خود تمہارے لیے شرم کی بات ہے کہ ناقص اور ناکارہ چیزوں کی نذر ایسے جامع کمالات کے حضور میں پیش کر رہے ہو ۔ اس سے ضمناً یہ بھی نکل آیا کہ جب وہ ستودہ صفات ہے تو اس کے ہاں مقبولیت بھی ان کو ہی نصیب ہوتی ہے جو خود بھی اپنے اندر اس کی صفاتِ حمیدہ سے کوئی مناسبت رکھتے ہو ۔ مشرک قوموں نے اپنے دیوتاؤں کو نذر اور چڑھاوے کا محتاج مانا ہے ۔ صفت غنی لانے سے اس عقیدے

---

[۱] افاداتِ شیخ الہند ۔

کی تردید ہوگئی۔ اور دیوتاؤں میں کسی کسی حیثیت سے نقص تو سب ہی مشرک قوموں میں مسلم ہے۔ صفتِ حمید نے ان خرافات کی بھی تردید کر دی[1]

یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اللہ کسی کے مال اور کسی کی خیرات کا محتاج نہیں ہے۔ وہ اگر لوگوں سے یہ چاہتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کریں تو اس لیے نہیں کہ اس کے خزانے میں کمی ہے بلکہ اس لیے کہ لوگوں کی وفاداری کا امتحان مقصود ہے۔ پھر غنی کے ساتھ حمید کی صفت بھی لائے یعنی سب سے بے نیاز ہونے کے ساتھ اس کی ذات ستودہ صفات ہے اس کا فیض ہمیشہ جاری رہتا ہے اور سب اس سے فیض یاب ہوتے ہیں نیک بھی اور بد بھی[2]

اس آیتِ قرآنی کے اشارے سے کچھ علماء نے یہ مسئلے بھی مستنبط کیے ہیں۔ مالِ تجارت میں زکوٰۃ فرض ہے اور عشری زمین میں عشر واجب ہے[3]

واقعی بعض علماء نے اس آیتِ قرآنی سے وجوبِ زکوٰۃ اور وجوبِ عشر پر استدلال کیا ہے چنانچہ قرطبی نقل ہیں کہ حضرت علی، عبیدہ السلمانی اور محمد بن سیرین اس آیت میں انفاق سے زکوٰۃ کی ادائیگی مراد لیتے ہیں جبکہ حضرت قتادہ اس کو صدقاتِ نافلہ پر محمول فرماتے ہیں۔ اور احناف میں سے بہت اکابر نے مما اخرجنا لکم من الارض سے وجوبِ عشر پر استدلال کیا ہے جیسا کہ ابوبکر الجصاص رازی نے احکام القرآن میں تصریح کی ہے یہ دونوں موضوع بحث طلب ہیں۔ زکوٰۃ کے بارے میں تفصیلی بحث نذ زکوٰۃ کی مقدار، اموالِ زکوٰۃ کی تفصیل، زکوٰۃ کے مصارف، زکوٰۃ کے مقاصد انشاء اللہ پارہ دہم میں اور زرعی پیداوار پر عشر کی تفصیلات انشاء اللہ پارہ ہشتم میں زیرِ آیت واتوا حقہ یوم حصادہ ہدیہ ناظرین کریں گے۔

---

[1] ماجدی [2] تدبر قرآن [3] بیان القرآن

الشَّيْطٰنُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ وَيَاْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَآءِ ۚ وَاللّٰهُ يَعِدُكُمْ
مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا ۗ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۶۸﴾ يُّؤْتِي الْحِكْمَةَ
مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَمَنْ يُّؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اُوْتِيَ خَيْرًا كَثِيْرًا ۗ وَمَا
يَذَّكَّرُ اِلَّآ اُولُوا الْاَلْبَابِ ﴿۲۶۹﴾

شیطان تمہیں تنگدستی سے ڈراتا ہے اور برائیوں کا حکم دیتا ہے لیکن اللہ تم سے مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے اور یاد رکھو کہ اللہ وسعت وکشائش والا اور سب کچھ جاننے والا ہے [۵۸۰]۔ وہ جسے چاہتا ہے حکمت دیتا ہے اور جسے بھی حکمت عطا کر دی جاتی ہے تو بس بلاشبہ وہ خیر کثیر سے ہمدوش ہو جاتا ہے [۵۸۰-۲]۔ اور نصیحت یاب تو صرف عقل و بصیرت والے ہی ہوتے ہیں [۵۸۰-۳]

دین کی زندگی میں فہم صحیح سب سے بڑی خیر ہے

انسان میں ایسی سمجھ بوجھ کا پیدا ہو جانا کہ دُنیا کے ظاہری اور نمائشی فائدوں ہی میں پھنس کر نہ رہ جائے بلکہ حقیقی نفع و نقصان کو معلوم کر سکے اور اچھائی اور بُرائی کا شناسا ہو جائے۔ یہ وہ دولت ہے کہ جس کے پاس ہوگی وہ ہرگز شیطان کی رہنمائی و قیادت کی پرواہ نہ کرے گا بلکہ اس کشادہ صراطِ مستقیم پر چلے گا جو اللہ نے نبوت کی وساطت سے لوگوں کو دکھائی ہے۔ شیطان کے تنگ نظر ہمنواؤں کی نگاہ میں یہ بڑی ہوشیاری اور عقلمندی ہے

کہ آدمی اپنی دولت کو سنبھال کر رکھے اور ہر وقت مزید کمائی کی فکر میں لگا رہے لیکن جن لوگوں نے حکمت کا نور پایا ہے ان کی نظر میں یہ عین بے وقوفی ہے۔ بصیرت و دانائی ان کے نزدیک یہ ہے کہ آدمی جو کچھ کمائے اُسے اپنی متوسط ضروریات پوری کرنے کے بعد دل کھول کر اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ ایسا شخص ممکن ہے کہ دُنیا کی اس چند روزہ زندگی میں دوسرے کی بہ نسبت بہت زیادہ خوش حال ہو۔ لیکن انسان کے لیے یہ دُنیا کی زندگی پوری زندگی نہیں ہے بلکہ واقعی اور اصلی زندگی کا ایک نہایت چھوٹا سا جزء ہے۔ اس چھوٹے سے حصہ کی خوش حالی کے لیے جو شخص بڑی اور بے پایاں زندگی کی بدحالی مول لیتا ہے وہ حقیقت میں سخت بے وقوف ہے۔ عقل مند دراصل وہی ہے جس نے اس مختصر زندگی میں اپنی دائمی خوشحالی کا بندوبست کر لیا۔

۱۰۸۔ شیطان تمہیں تنگدستی سے ڈراتا اور برائیوں کا حکم دیتا ہے۔ اصل ارشاد فقر اور فحشاء آیا ہے۔ فقر کا لفظ اسم فعل اور مصدر کے طور پر استعمال ہوتا ہے۔ تنگدستی، ناداری، مفلس ہو جانا، محتاج ہو جانا۔ پرویز عبدالرؤف نے لکھا ہے کہ اگر صرف اہل وعیال کی کفالت کے لیے رزق ہو زائد نہ ہو تو ایسا شخص فقیر ہے اتنا بھی نہ ہو تو مسکین ہے۔ اصل میں فقیر اس کو کہتے ہیں جس کے فقار الظہر پشت کے مہرے ٹوٹ گئے ہوں اس کے بعد ہر کمزور کو کہنے لگے۔ استعمال میں مزید توسیع ہوئی تو اس شخص پر اطلاق ہونے لگا جس کے پاس روزی زیادہ نہ ہو۔ مشہور شاعر راعی کہتا ہے ؎

انا الفقیر الذی کانت حلوبتہ

وفق العیال فلم یترک لہ سبد

(میں وہ فقیر ہوں جس کی پاس دودھ دینے والی اونٹنی صرف اہل وعیال کی ضرورت کے لائق دودھ دیتی ہے)۔ (معجم القرآن)

امام راغبؒ نے لکھا ہے کہ:

فقر کا استعمال چار طریقہ پر ہوتا ہے۔ اوّل ضرورت کے لائق روزی نہ ہونا، دوم صرف ضروریات کے لائق ہونا زائد نہ ہونا، سوم فقر نفس کتنا ہی مال ہو مگر نفس حریص ہے۔ چہارم اللہ کی طرف فقر۔

الفحشاء اسم تفضیل واحد مونث، اس سے مذکر فحش آتا ہے، مادہ فحش بُرا کام، (صحاح) وہ قول و عمل جس کی بُرائی کھلی ہو اور اسے سننا یا کرنا بُرا لگے (تاج)، بخل و کنجوسی (قاموس) نہایہ میں ہے کہ فحش فاحشہ ہر بُرے بے شرمی کی بات یا کام کو کہتے ہیں۔ اسی طرح ہر سخت بُرے گناہ اور کبھی فاحشہ زنا کے معنے میں آتا ہے

اور ہر بُری اور قبیح خصلت قول میں ہو یا فعل میں فحشاء ہے۔

اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ جب کسی کے دل میں خیال آئے کہ اللہ کی راہ میں دوں گا تو مفلس ہو جاؤں گا اور حق تعالیٰ کی تاکید سُن کر بھی یہ حالت رہے اور اپنا مال خرچ کرنے کو جی نہ چاہے اور وعدہ الٰہی سے اعراض کرکے وعدۂ شیطانی پر طبیعت کو میلان اور اعتماد ہو تو اس کو یقین کر لینا چاہیے کہ یہ خیال شیطان کی طرف سے ہے یہ نہ کہے کہ شیطان کی تو ہم نے کبھی صورت بھی نہیں دیکھی وہ حکم کیسے کرتا ہے اور اگر یہ خیال آوے کہ صدقہ و خیرات سے گناہ بخشے جائیں گے اور مال میں برکت اور ترقی ہوگی تو یہ خیال اللہ کی طرف سے ہے اور اللہ کا شکر کرے اور اللہ کے خزانہ میں کمی نہیں ہے سب کے ظاہر و باطن، نیت و عمل کو خوب جانتا ہے [1]

روزمرہ کا تجربہ ہے کہ جو چیز نیکی اور بھلائی کے راستہ سے روکتی ہے۔ اور ان کاموں میں مال خرچ کرنے کے لیے آڑ بنتی ہے وہ بھی خیال ہوتا ہے کہ سب کچھ خرچ کر ڈالنے کے بعد پھر اپنی ضرورتوں کے لیے کیا رہ جائے گا۔ قرآن نے الشیطان یعدکم کے فقرے سے یہ تعلیم دے دی ہے کہ یہ خیال تمام تر وسوسہ شیطانی ہے۔ یوں اس خیال کے باطل ہونے کا بہترین پیرایہ اختیار کیا۔ اور دوسرے فقرے میں یہ ذہنیت بنائی کہ اللہ مغفرت اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔ وعدۂ مغفرت کا تعلق آخرت سے ہے اور وعدۂ فضل کا دنیا سے، ماحصل یہ ہے کہ خدائی احکام پر خدائی قانون کے مطابق اگر زندگی بنا لو گے تو دنیا و آخرت کی فلاح و بہبود یقینی ہے۔ شیطانی راہ ہلاکت و بربادی کی اور خدائی راہ فلاح و صلاح کی راہ ہے [2]

ان دونوں فقروں میں جو بات کہی گئی یعنی یہ کہ شیطان تم کو ڈراتا ہے کہ دیکھو راہ خدا میں دو گے یا عمدہ اور نفیس چیزیں تقسیم کرو گے تو دیوالیہ نکل جائے گا۔ فقیر اور محتاج ہو جاؤ گے۔ ایک طرف ڈراتا ہے۔ اور دوسری طرف برائیوں پر ابھارتا ہے اور ان کی ترغیب دیتا ہے۔ جب ایسا ہو تو اللہ کا وعدہ یاد کر لیا کرو۔ اس کا وعدہ یہ ہے کہ جب ہماری راہ میں خرچ کرو گے تو عام دستور کے مطابق ہم تمہارے گناہ بخش دیں گے۔ جیسے دوائیں کھانے سے بیماریاں دور ہوتی ہیں ایسے ہی اللہ کی راہ میں دینے سے گناہ دُھلتے ہیں کیونکہ نیکی اور طاعت گناہوں کا تکفیر کا سبب ہے ان الحسنات یذھبن السیئات نیز یہ کہ ہم تم کو اپنا فضل عطا فرمائیں گے۔ یعنی دنیا میں تمہارے کاروبار میں برکت اور ترقی دیں گے۔

انفاق کی راہ میں شیطانی مزاحمتیں

یہ ان مزاحمتوں کی طرف اشارہ ہے جو شیطان اور اس کی ذریت کی طرف سے انفاق کی راہ میں پیش آتی ہیں

[1] افادات شیخ الہند [2] ماجدی

آدمی جب کسی نیک کام میں خرچ کرنے کا ارادہ کرتا ہے تو شیطان اور اس کے ایجنٹ اس کو دو طرح سے اس کے ارادے سے ہٹانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک تو مستقبل کے موہوم خطرات سے اس کو ڈراتے ہیں کہ فلاں فلاں مشکل کام اس کے آگے پڑے ہیں۔ اس وجہ سے اپنے ہاتھ روکے رکھے ورنہ سخت دشواریوں میں پھنس جائے گا۔ دوسرے اس کو عیاشی مے نوشی، سینما بینی اور اسراف و تبذیر کی دوسری لتوں میں پھنساتے ہیں تاکہ کسی اعلیٰ مقصد میں خرچ کرنے کے لیے کوئی گنجائش اس کے پاس باقی نہ رہے۔ شیطان کا فتنہ بڑا ہی سخت اور شدید ہے۔ جو لوگ اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ اپنی بدمستیوں میں اس طرح ڈوب جاتے ہیں کہ وہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے قابل نہیں رہتے۔ سورۂ بنی اسرائیل میں جہاں قرابت داروں مسکینوں اور مسافروں پر انفاق کا حکم دیا ہے وہاں یہ بھی بتایا ہے کہ تبذیر شیطانی ہتھکنڈا ہے اس سے بچ کر رہنا چاہیے۔ جو لوگ تبذیر کرتے ہیں یعنی خدا کی دی ہوئی نعمتِ دولت کو بے محل خرچ کرتے ہیں مثلاً محض اپنے نفس کی عیش پرستیوں پر اڑاتے ہیں تو وہ شیطان کے بھائی بند ہیں کیونکہ شیطان کی راہ کفران کی راہ ہے اور انھوں نے بھی کفرانِ نعمت کی راہ اختیار کی۔

انفاق پر اللہ کا فضل و مغفرت

دوسرے فقرے میں انفاق پر اس کے مقابلے میں اللہ کے فضل و مغفرت کا ذکر کیا گیا ہے۔ مغفرت یہاں فحشا کے مقابل میں ہے اور فضل کا لفظ فقر کے مقابلے میں آیا ہے۔ یعنی شیطان تو تمہیں اللہ کی راہ میں انفاق کے بجائے نفس کی راہ میں فضول خرچی اور عیاشی کی راہ سجھاتا ہے تاکہ اپنے ماننے والوں کو سیدھا جہنم میں لے جائے لیکن اللہ اپنی راہ میں خرچ کی دعوت دے کر تمہیں مغفرت اور جنت کی طرف بلاتا ہے اسی طرح شیطان اپنے ماننے والوں کو فقر کے ہونے سے ڈراتا ہے لیکن اللہ تم سے اس انفاق کے عوض دنیا و آخرت میں فضل و انعام کا وعدہ کرتا ہے۔

اس تقابل مطالعے سے معلوم ہوا کہ شیطان کے بنائے ہوئے زندگی کے نظام میں جیسے سرتاسر برائیوں کی اشاعت، دولت کا اکتناز، ناداروں کی پریشان حالی سے ناجائز استفادہ اور اخلاقی آوارگی کے ساتھ لوگ افلاس، تنگدستی، معاشی بدحالی رونما ہوتی ہے اور یہ اس کا لازمی نتیجہ ہے ٹھیک اسی طرح نبوت کے لائے ہوئے نظامِ الٰہی میں قدرتی برکتیں، زندگی کی آسائشیں، گناہوں کی تکفیر اور آخرت میں درجات کی بلندیاں ملتی ہیں لیے اللہ اکبر دو فقروں میں دونوں نظاموں کے تقابلی مطالعہ کی کس قدر پرشوکت اور پروقار طریقہ پر عکاسی فرمائی ہے کہ ہر شخص اپنی جگہ محسوس کر سکتا ہے کہ اصلی اور حقیقی زندگی کیا ہے اور آخر میں اللہ کے دو نام واسع اور علیم لا کر اس نظریہ کو مدلل فرما دیا ہے۔ اللہ بڑی سمائی والا ہے اور تمہارے ایک ایک عمل سے واقف ہے، نہ اس کے

پاس دینے میں کمی ہے اور نہ وہ تمہارے کیے ہوئے خرچ سے بے خبر ہے۔

دراصل کفر و نفاق کے بعد مال و دولت کی محبت ہی وہ کثیف غبار ہے جو دل کے آئینہ کو میلا کرتا ہے اور قبولِ حق میں رکاوٹ ہے۔ دُنیا میں اصلاحی تحریکوں کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے۔ اسی لیے قرآن نے جب اپنی دعوت کا آغاز کیا تو سب سے پہلے دلوں کے اس میل کو دھونا چاہا اور جود و سخا داد و دہش کی پر زور تعریف اور جمع مال حرص و طمع اور بخل کی بہت مذمت کی۔ اور اس بات کی کوشش کی کہ اس کی تعلیم کا یہ اثر ہو کہ اس کے پیروؤں کے دلوں سے مال و دولت کی محبت نکل جائے۔

یہی محبت سچائی اور نیکی کے راستہ پر چلنے سے روکتی ہے اور انسان سمجھتا ہے کہ اگر میں نے یہ راستہ اختیار کیا تو میری یہ دولت مجھ سے چھن جائے گی اور میرا مال خرچ ہو جائے گا۔ اسی وسوسہ شیطانی کو اللہ سبحانہٗ نے اس آیت میں دو فقروں میں پیش کیا ہے۔

۸۰۲۔ اور جسے حکمت عطا کر دی جاتی ہے تو بس بلاشبہ وہ خیرِ کثیر سے ہمدوش ہوتا ہے یعنی جس کو چاہتا ہے دین کی باتوں میں دانائی اور خیرات کرنے میں سمجھ عنایت کرتا ہے کہ کس نیت سے، کس مال سے، کس کو، اور کس طرح محتاج کو دینا چاہیے اور جس کو یہ سمجھ عطا ہوئی اس کو بڑی نعمت اور بڑی خوبی ملی [1]

یعنی وہ صحیح فہم جس سے وہ القاءِ رحمانی اور خیال شیطانی میں فرق کرنے لگتا ہے مثلاً جب اس کے دل میں یہ خیال آتا ہے کہ اگر خیرات کروں گا تو مفلس ہو جاؤں گا تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ وسوسہ شیطانی ہے۔ شیطان مجھ کو خیرات سے روکنا چاہتا ہے اور جب یہ خیال آتا ہے کہ خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے گناہوں کی مغفرت ہوگی اور دُنیا میں خرچ کیا ہوا آخرت میں کام آئے گا اور خدا کی راہ میں دینے سے کمی نہیں آتی تو سمجھ لیتا ہے کہ یہ القاءِ رحمانی ہے [2]

حکمت سے مراد صحیح بصیرت اور صحیح قوتِ فیصلہ ہے۔ یہاں اس ارشاد سے مقصود یہ ہے کہ جس شخص کے پاس حکمت کی دولت ہوگی وہ ہرگز شیطان کی بتائی ہوئی راہ پر نہ جائے گا۔ بلکہ اس کشادہ راہ کو اختیار کرے گا جو اللہ نے دکھائی ہے [3]

یہ درست ہے کہ جس کے پاس حکمت کی دولت ہوگی وہ ہرگز شیطان کی راہ پر نہ چلے گا لیکن حکمت کی یہ دولت اس وقت تک کسی کو نہیں ملتی ہے جب تک اس کے دل سے دُنیا کے مال و دولت کی محبت نہ جاتی رہے۔ اسی لیے اللہ سبحانہٗ نے اوپر والی آیت کے بعد ہی نعمتِ حکمت کو بیان کیا ہے یعنی یہ سمجھ لینا کہ شیطان کا یہ وہم دلانا کہ ہم دینے سے محتاج ہو جائیں گے اس کا سراسر دھوکا اور خدا کا یہ وعدہ کہ اس کے فضل و مغفرت

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] معارفِ قرآن [3] تفہیم القرآن

کا دروازہ کھلے گا۔ درست ہے بہت بڑی دانائی کی بات ہے۔

لفظ حکمت کی تشریح ہم اسی صورت کے تشریحی نوٹ نمبر ۲۵۹ پر اور تفصیلی بحث نوٹ نمبر ۲۲۴ میں کر چکے ہیں۔ یہاں اس کا دہرانا باعثِ طوالت ہوگا۔ البتہ اتنی بات یاد رکھنی چاہیے کہ یہ بالذات اور اصلی سرمایہ انبیا کا ہے اور ان کی پیروی کے صدقہ میں پھر دوسروں کو علی قدر المراتب ملتی ہے۔ اس کی اصلی رُوح ایمان و عمل کی وہ پختگی ہے جس کی بنیاد اذعان و یقین پر ہو۔ مطلب یہ ہے کہ حکمت کا اصلی سرچشمہ صرف سینۂ نبوت ہوتا ہے لیکن یہ فیض پیغمبر کی اتباع میں دوسروں کو بھی ملتا ہے جس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنا سرمایہ اس دنیا میں جمع نہیں کرتے بلکہ اس کو زادِ راہ آخرت بناتے ہیں۔ وہ شیطان کے وساوس خواطر اور رہواجس سے مرعوب نہیں ہوتے بلکہ ان میں قوتِ احتساب ہوتی ہے یعنی ان کو اللہ کے وعدوں پر پھر پورا اعتماد ہوتا ہے۔ یہ نعمت اللہ سبحانہٗ جس کو چاہتے ہیں عطا فرماتے ہیں۔ حضرت عبداللہ بن مسعودرضؓ کہتے ہیں کہ ایک موقعہ پر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، رشک و حسد اگر جائز ہے تو صرف دو شخصوں پر ایک وہ شخص جس کو مال کی دولت ملی ہو اور وہ صحیح طور پر خرچ کر رہا ہے دوسرے وہ جسے اللہ نے حکمت سے نوازا ہو اور وہ اس کے ذریعے فیصلے کرتا ہے اور دوسروں کو سکھاتا ہے اور اس میں استاد ہونے کی شان پیدا ہوتی ہے۔

۸۰۲۔ اور نصیحت یاب تو صرف عقل و بصیرت والے ہی ہوتے ہیں۔ اس فقرے نے یہ بات کھول دی ہے کہ حکمت سے قرآن کی کیا مراد ہے، یعنی وہ بصیرت جس کی اساس، روح ایمان اور استقامت عمل پر استوار ہو۔ مطلب یہ ہے کہ دوسری ربانی استعدادوں اور فطری بخششوں کی طرح حکمت کا عطیہ سب کو یکساں نہیں ملتا ہے بلکہ صرف ان کو ملتا ہے جو عقل والے ہیں یعنی جن کی عقل میں نورِ حکمت سے منور ہونے کی صلاحیت ہوتی ہے اور وہ اس دنیا کی نقد مادی لذتوں کو چھوڑ کر عالمِ غیب کی کامرانیوں پر یقین رکھتے ہیں۔

آیت میں خیرِ کثیر اور حکمت میں اس طرح پیوندکاری کی ہے کہ یوں محسوس ہوتا ہے کہ حکمت خیرِ کثیر کے لیے علت ہے جیسے معلول اپنی علت سے جدا نہیں ہوتا ہے ایسے ہی حکمت اور خیرِ کثیر میں بھی جدائی نہیں ہو سکتی۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ حکمت اگر علم صحیح ہے تو خیرِ کثیر عمل نافع ہے اور ذریعہ حکمت عقل سلیم ہے۔ اس موقعہ پر یہ بات بہت اونچی ہے کہ دانائی اور حکمت یہ ہے کہ آج کل کے لیے ذخیرہ کر لیا جائے۔ آج تخم ریزی ایسی کی جائے کہ کل پھل ہی پھل ہاتھ لگیں اور ایمان و طاعت کا ایسا بیمہ کرا دیا جائے جو آئندہ کی دائمی اور غیر منقطع زندگی میں برابر کام آتا ہے۔

وَمَآ اَنۡفَقۡتُمۡ مِّنۡ نَّفَقَةٍ اَوۡ نَذَرۡتُمۡ مِّنۡ نَّذۡرٍ فَاِنَّ اللّٰهَ يَعۡلَمُهٗ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيۡنَ مِنۡ اَنۡصَارٍ ﴿۲۷۰﴾

اور دیکھو جو کچھ بھی، جیسا کچھ اور جتنا کچھ تم خرچ کرتے ہو یا نذر ماننے کے طور پر جو کچھ بھی نکالنا چاہو تو یہ بات یاد رکھو کہ اللہ اسے خوب جانتا ہے[۸۰۵] اور ظلم کار لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ہے[۸۰۶]۔

صدقہ ہو یا نذر سب اللہ کے لیے ہے

اللہ کی راہ میں خروج کرنے کی جن حدود کا مطالعہ اب تک کیا گیا ہے ان کی نوعیت زیادہ مقید ہے۔ وہ یہ بتاتے ہیں کہ مالک کو اپنی ملکیت کو راہِ خدا میں صرف کرنے کے لیے کن حدود میں رہنا چاہیے۔ ان کا منشا یہ ہے کہ خود مالک کے اخروی مفادات اور پھر اجتماعی مفادات کو برائیوں سے بچایا جائے۔ ان حدود کا اہم مقصد یہ بھی ہے کہ انفاق اپنے اصل مقصد کے تابع رہے، اس سے ہٹ کر دوسری اغراض کے تابع نہ ہو جائے لیکن انفاق کا دائرہ محدود اور مقید ہی نہیں ہوتا اس کا دائرہ حدود و قیود سے الگ بھی ہوتا ہے اور اس میں ذمہ داریوں کا دامن وسیع سے وسیع تر بھی ہوتا ہے۔ انفاق کی اسی وسعت اور پہنائی کو بتانے کے لیے اس آیت میں عمومی پیمانہ تعبیر اختیار کیا ہے۔ اولاً انفقتم میں عموم پیدا کرنے کے لیے لفظ پیشانی پر لگایا جو شرطیہ غیر زمانیہ ہونے کی وجہ سے عموم کے معنے دے رہا ہے اور پھر اس کے عموم میں اور قوت پیدا کرنے کے لیے من نفقہ کا اضافہ فرمایا یعنی نفقاتِ واجبہ اور نافلہ سب اس کے احاطہ میں آ گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر مالک کے مال میں ذمہ داریاں بہت زیادہ ہیں۔ اب تک صرف یہ بتایا گیا تھا کہ ہر مالک کو اپنے مال سے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے اور اب بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے ساتھ ہر مالک پر اس کے مال میں اور بھی ذمہ داریاں ہیں۔ یہ ذمہ داریاں یہ ہیں۔

۱۔ نفقات واجبہ، ۲۔ زکوٰۃ ۔ ۳۔ مزید انفاق کی ذمہ داری ۔ ۴۔ قرض و عاریت ۔ ۵۔ حقوق ارتفاق ۔

ان سب ذمہ داریوں کو اس فقرے میں سمیٹ دیا گیا ہے اور ان کے ساتھ دوسری مشترک ذمہ داریاں کی طرف بھی اس میں ارشاد موجود ہے۔

ذمہ داریاں دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ جو قانون کسی فرد پر عائد کرتا ہے خواہ فرض ہو یا نفل، دوسرے وہ جو فرد خود اپنے ذمہ عائد کرتا ہے۔ پہلی قسم کو ما انفقتم میں اور دوسری قسم کو نذرتم من نذر میں بیان کیا ہے۔

۴۸۰ - اور دیکھو جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی تم خرچ کرتے ہو، اس میں انفاق کی ساری ذمہ داریاں آگئیں۔ اہل خاندان کی کفالت کی قانونی ذمہ داریاں، شوہر پر بیوی کا نان و نفقہ، ماں باپ اور اولاد کا نفقہ، دوسرے رشتہ داروں کا نفقہ، فریضہ زکوٰۃ کی ادائیگی، زرعی پیداوار میں عشر کی ادائیگی، اہل حاجت کی حاجت روائی، مہمان نوازی، مانگنے والوں کی دلداری، حالت اضطرار میں مبتلا لوگوں کی دادرسی، ضرورت مند لوگوں کو قرض دینا یا عاریتہ کچھ دینا، اجتماعی اداروں کی اعانت، اجتماعی معاملات میں ہنگامی حالات میں حکومت کی امداد، غرض ہم انفاق کی ساری ذمہ داریوں پر یہ آیت حاوی ہے۔ انفاق کی کوئی نوع اس سے باہر نہیں ہے اور پھر یہ تھوڑا ہو یا زیادہ، خلوت میں ہو یا جلوت میں، اخلاص سے ہو یا ریاکاری سے، من و اذیٰ پر مشتمل ہو یا نہ ہو۔ ملکہ بزرگوں نے یہاں تک لکھ دیا ہے۔

اس میں سب خرچ آگئے وہ بھی جن میں سب شرائط صحت اور قبولیت کی رعایت ہو اور وہ بھی جن میں کل کی یا بعض کی رعایت نہ ہو۔ مثلاً معصیتہ میں ہو یا انفاق میں ریاکاری ہو یا انفاق کر کے احسان جتاتا ہو یا حلال یا عمدہ مال نہ ہو[1]

غرض انفاق کی ہر نوع اور ہر صورت اس میں آگئی ہے لیکن سیاق و سباق کا تقاضا یہی ہے کہ عموم کا دائرہ صرف انفاقی ذمہ داریوں تک رہے کیونکہ قرآن خرچ کرنے والوں میں یہ ذہنیت پیدا کرنا چاہتا ہے کہ جس مد میں جس نوع اور جس قسم میں بھی خرچ کریں اور خرچ کی جس قانونی ذمہ داری کو بھی پورا کریں۔ صرف قانون کا تقاضا ہی پورا کرنے کے لیے نہ کریں بلکہ پورے اخلاص و احتساب کی ذمہ داری کو محسوس کریں۔ کیونکہ ان کے انفاق کی کارگزاری علم الٰہی سے پوشیدہ نہیں۔ یہ شعور کہ اللہ اس کی نیت کو اس کے ضمیر کو اور اس کے حرکت و عمل کو جانتا ہے شامل

---

[1] معارف قرآن

میں احساس تقویٰ پیدا کرتا ہے اور اس طرح وہ اپنے اعمال میں نہ صرف ریاکاری اور نمائشی کارگزاری سے بچ کر رہتا ہے بلکہ تنگدستی کے اندیشہ بخل کی گندگی سے بالا ہو کر اللہ کے وعدے پر مطمئن ہو جاتا ہے اور اسے یقین ہو جاتا ہے کہ مجھے میرے عمل کی آخرت میں ضرور جزا ملے گی۔

۸۰۵ ـ یا نذر ماننے کے طور پر جو کچھ بھی نکالا جاتا ہو۔ اس فقرے میں ان ذمہ داریوں کی یاد دہانی کرائی ہے جو قانون نے تو اس کے ذمہ نہیں لگائی لیکن اس نے خود کوئی خرچ اپنے ذمے عائد کر لیا ہے۔ اسی کو قرآن نے نذر کہا ہے۔ یہاں بھی نذر تم کے بعد من نذر لا کر عموم کی طرف اشارہ کیا ہے۔ مثلاً عبادات بدنیہ کی نذر، عبادات مالیہ کی نذر، مال کی مناسبت سے یہاں ذکر کیا ہے اور پھر نذر مطلق ہو یا معلق اور اس کو پورا کیا گیا ہو یا نہیں سب اس میں داخل ہیں۔

شرعاً نذر ماننا کیسا ہے؟

نذر کا مفہوم یہ ہے کہ آدمی منت مانے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں فلاں کام کروں گا۔ یہ چاہے عبادت بدنی ہو یا مالی۔ یہاں نذر کا مقابلہ انفاق سے کیا ہے اور سیاق و سباق میں انفاق سے مراد صدقہ ہے تو گویا نذر صدقہ کے مقابلے میں ہے اس لیے اسلام میں جیسا کہ احادیث میں ہے صدقہ کے مقابلے میں اسے پسند نہیں کیا گیا ہے یہ دوسری بات ہے کہ اگر کوئی شخص نذر مان لے اور اس میں کوئی قانونی قباحت نہ ہو تو اس کو پورا کرنا ضروری قرار دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ایک قسم کا عہد ہے جو منت ماننے والا اپنے مولیٰ سے کر رہا ہے اور عہد چھوٹا ہو یا بڑا، اگر خلاف شریعت نہیں تو اس کا پورا کرنا واجب ہے اس لیے کہ اللہ کے یہاں ہر عہد سے متعلق خواہ چھوٹا ہو یا بڑا پرسش ہو گی[1]

صدقے کے مقابلہ میں نذر کیوں پسند نہیں۔ کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ان النذر لا یغنی عن شئی منت ماننے سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا نہ اس سے تقدیر بدلتی ہے اور نہ بلائیں دور ہوتی ہیں بلکہ یوں فرمایا ہے کہ اس طرح اللہ سبحانہ بخیل سے کچھ مال نکال لیتے ہیں یعنی یوں تو کچھ وہ اللہ کی راہ میں نہیں دیتا جب پھنس جاتا ہے تو نذریں مانتا ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ نے یوں کر دیا تو میں یوں کروں گا، اتنی خیرات کروں گا۔ اسی وجہ سے ایک حدیث میں نذر کی ممانعت آتی ہے حالانکہ اللہ کی نذر ماننا منع نہیں ہے جیسا کہ قرآن کی آیت بتا رہی ہے اور اس کا پورا کرنا کیوں واجب ہوتا تو ممانعت کی بنیادی وجہ ـــــ نذر کا ارد یلا کا

---

[1] تدبر قرآن

ذریعہ سمجھتا ہے۔ ممکن ہے کہ آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کر نذر صدقہ ہے اور صدقہ بلا کو رد کرتا ہے جیسا کہ حدیث میں آتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ نذر صدقہ نہیں ہے بلکہ صدقہ کو خود اپنے ذمے لگا لینے کا نام ہے اور ایک قسم کا معاوضہ ہے۔ اصل یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضامندی اور خوشنودی کے لیے صدقہ کرے تاکہ بلا نہ آئے۔ بلا کے آنے پر نذر ماننا عوض معاوضہ ہے کہ بلا دور ہو گئی تو اتنا صدقہ کروں گا۔

شرعاً نذر کیا ہے

شرعاً کسی عبادت کو جس کی نظیر اسلام کی عبادات مقصودہ میں موجود ہو اپنے اوپر لازم کر لینا خواہ وہ عبادت مالی ہو یا بدنی نذر کہلاتا ہے۔ آپ نے نذر مانی کہ میں اللہ کے نام پر دس روپے صدقہ کروں گا، یا اتنی نفلیں پڑھوں گا یا دس روزے رکھوں گا یا حج کر جاؤں گا تو یہ نذر ہو گی اور اس کا پورا کرنا واجب ہے لیکن اگر آپ نے نذر مانی کہ میں فلاں مزار پر جاؤں گا تو یہ نذر نہ ہو گی کیونکہ مزاروں پر جانا اسلام میں عبادت نہیں بلکہ زیارت ہے۔ آپ نے نذر مانی کہ میں وضو کروں گا، غسل کروں گا، احرام باندھوں گا، تو یہ نذر نہ ہو گی کیونکہ ان کی حیثیت اسلام میں عبادات مقصودہ کی نہیں ہے۔

نذر کے صحیح ہونے کی بنیادی شرط یہ بھی ہے کہ وہ کسی خدا کی نافرمانی پر مبنی نہ ہو اور نہ دوسرے کی ملکیت میں ہو۔ حدیث میں ہے۔

لا نذر فی معصیۃ اللہ ولا فیما لا یملک

گناہ کی منت نہیں ہے اور نہ اس مال کی جس کا وہ مالک نہیں ہے۔

مثلاً یوں کہنا کہ اگر اللہ تعالیٰ نے مجھ کو چنگا کر دیا تو میں زید کا غلام آزاد کروں گا۔ گناہ کی منت یوں ہے کہ اگر اللہ نے ایسا کیا تو میں شراب پیوں گا۔

معصیت کی نذر میں یہ بھی داخل ہے کہ یہ نذر مانی جائے کہ کسی بزرگ اور ولی کے نام پر چڑھاووں گا اس اعتقاد سے کہ اس سے جلب منفعت یا دفع مضرت ہو گی تو وہ حرام ہے چنانچہ فقہ حنفی کی مشہور متداول اور مستند کتابوں میں یہ مسئلہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔

> یہ بات خوب جان لو کہ وہ نذر و منت جو اکثر عوام مُردوں کے لیے مانتے ہیں اور جو چیز از قسم روپیہ، موم بتی، تیل اور اس قسم کی دیگر چیزیں بزرگوں کی قبروں تک ان سے تقرب حاصل کرنے کے لیے پہنچائی جاتی ہیں۔ مثلاً کوئی کہتا ہے اے میرے آقا کہ اگر میرا گم شدہ آدمی واپس آ گیا، یا میری آرزو پوری کر دی گئی تو میں اتنا سونا اور اتنی چاندی یا اتنا اناج یا اتنی موم بتیاں

یا اتنا تیل دوں گا تو یہ نذر باطل اور حرام ہے اور اس کے بطلان کے کئی وجوہ ہیں ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہ نذر ہے اور نذر عبادت ہے جو مخلوق کے لیے جائز نہیں ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جس کے لیے نذر مانی گئی ہے وہ میت ہے اور نذر کی چیز کو وہ ملکیت میں نہیں لے سکتی۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ نذر ماننے والے کا یہ گمان ہو گا کہ میت اللہ تعالیٰ سے ورے معاملات میں تصرف کرتی ہے۔ یہ اعتقاد کفر ہے۔

(البحر الرائق ج ۲ ص ۱۹۸ شامی ج ۲ ص ۱۷۵)

غور فرمائیے کہ ذمہ دار فقہاء کرام نے کس طرح اولیاء کرام کی قبروں تک تقرب کی نیت سے اشیاء لے جانے کو حرام اور باطل کہا ہے۔ مولانا نعیم الدین مراد آبادی لکھتے ہیں شرع میں نذر عبادت اور قربت مقصودہ ہے اور فقہ حنفی کی قانون کی مستند کتاب فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

ایسی نذر جو اکثر عوام مانتے ہیں کہ نیک شخص کی قبر پر جا کر اس کی چادر اور پردہ ہٹا کر کہتے ہیں اے میرے سردار اگر میری حاجت پوری ہو گئی تو میں آپ کو اتنا سونا دوں گا یہ نذر بالاجماع باطل ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرات اولیاء کرام کے تقرب کے ارادہ سے جو نذر مانی جاتی ہے وہ بالاجماع حرام ہے اور اکثر عوام اس میں مبتلا ہیں۔ ہاں اگر نذر تو صرف اللہ کے لیے مانی ہو اور اولیاء کرام کا نام اس لیے لیا گیا ہو کہ ان کے مزارات پر فقراء اور محتاج رہتے ہیں اور ان کو مستحق سمجھ کر وہاں خرچ کرنا چاہتا ہے تو اس میں مضائقہ نہیں ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث انشاء اللہ پارہ ہشتم اور ہفدہم میں آرہی ہے۔ یہاں اس سے زیادہ بحث کی گنجائش نہیں ہے۔

آئیے پوری آیت پر پھر ایک بار مجموعی نظر ڈال لیجئے۔

یعنی جو کچھ خیرات کی جائے تھوڑی ہو یا بہت، بھلی نیت سے یا بری نیت سے، چھپا کر یا لوگوں کو دکھا کر منت مانی جاتے کسی طرح کی تو بے شک اللہ تعالیٰ کو پورا علم ہے۔ سب کا اور جو لوگ انفاق مال اور نذر میں حکم الٰہی کے خلاف کرتے ہیں ان کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ اللہ جو چاہے ان پر عذاب کرے۔ منت ماننے سے واجب ہو جاتی ہے اب اگر ادا نہ کی گئی تو گنہگار ہو گا اور نذر اللہ کے سوا کسی کی جائز نہیں مگر یہ کہے کہ اللہ کے واسطے فلاں کو دوں گا یا اس کا ثواب فلاں کو پہنچے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے[1]

مطلب ہے کہ جو شخص خدا کی راہ میں کچھ خرچ کرتا ہے یا اس کے لیے کوئی منت مانتا ہے تو وہ اطمینان

---

[1] افادات شیخ الہند

رکھے کہ اللہ سبحانہ اس کی خیرات اور نذر کو اچھی طرح جانتا ہے۔ جانتا ہے سے مقصود اس کا لازم ہے یعنی جب وہ جانتا ہے تو لازماً اس کا اپنے وعدے کے مطابق بدلہ بھی دے گا۔ زبان کا یہ اسلوب عربی زبان میں اور قرآن میں بہت عام ہے [1]

اللہ سبحانہ کے علم واطلاع کا منشا یہ ہے کہ خرچ زیادہ ہو یا کم ہو طاعت میں خرچ ہو یا معصیت میں طاعت میں خرچ کرکے احسان جتاؤ یا سائل کو اذیت پہنچاؤ۔ دکھاوے کے لیے خرچ کرو یا اللہ کے لیے، ردی گھٹیا مال دو یا عمدہ، اسی طرح منت اچھی مانو یا بری، اللہ تعالیٰ کے لیے نذر مانو یا غیر اللہ کے لیے نذر مان کر پوری کرو یا نہ کرو غرض سب باتوں کا ہم کو علم ہے۔ طاعت کو صحیح طور پر بجالاؤ گے اور منت کو صحیح طور پر ادا کرو گے تو ہم تم کو اجر و ثواب عطا کریں گے۔

۸۰۶ ۔ اور ظلم کار لوگوں کا کوئی مددگار نہیں ہے جو قیامت کے دن اُن کو بچا سکے انفاق کے موضوع پر یہاں ظالم وہ لوگ ہیں جو بخل، ریاکاری سے اپنا تزکیہ نہ کرکے اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ اور فقراء اور سائلین کو محروم کرکے ان پر ظلم کرتے ہیں اور جماعت کے اجتماعی کاموں میں مال نہ دے کر امت اور ملت کو اپنی ظلم کاریوں کا نشانہ بناتے ہیں۔ اس میں مسلمان سرمایہ داروں کے لیے بہت بڑی عبرت ہے

وہ تمام لوگ جو اپنے سرمایہ کو بے موقع اور بے محل استعمال کرتے ہیں اس میں داخل ہیں، خواہ ریاکاری اور نمود و نمائش کی خاطر شادیوں میں دولت لٹانے والے، چاہے جائز مصارف میں خرچ کرنے والے یا معصیت پر مبنی نذر کر رہے ہوں، مال کو ضائع کر رہے ہوں، غیر شرعی مصارف میں مال خرچ کر رہے ہوں۔ اسراف اور بے اعتدالی کا شکار ہوں، عیش کوشی اور تنعم میں دولت لگا رہے ہوں۔

---

[1] تدبر قرآن۔

إِن تُبْدُوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۖ وَإِن تُخْفُوهَا وَتُؤْتُوهَا الْفُقَرَاءَ فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَيُكَفِّرُ عَنكُم مِّن سَيِّئَاتِكُمْ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲۷۱﴾

اگر تم کھلے طور پر صدقہ و خیرات کرو تو کیا خوب ہے یہ؟ اور اگر پوشیدہ کرو اور محتاجوں کو دیتے ہو تو اس میں تمہارے لیے بڑی بہتری ہے۔ یہ تمہارے کچھ گناہوں کو تم سے دور کر دے گی اور خوب یاد رکھو تمہارے اعمال سے اللہ باخبر ہے۔

انفاق کے اظہار و اخفا کا ضابطہ

پہلی آیت میں انفاق کے مقصد کی طرف متوجہ کیا تھا۔ اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کی راہ میں دینے کے لیے نمود و نمائش کے جذبہ سے دینے سے جو روکا گیا ہے اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ جب تک پوشیدہ طور پر خرچ نہ کرو خیرات ہی نہ کرو خواہ مخواہ ریاکاری سے بچنے میں تکلف کرو کہ یہ تکلف بجائے خود عمل خیر سے مانع ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ دل میں اخلاص ہونا چاہیے اور اپنی جانب سے کوئی بات دکھاوے اور نمائش کی نہ ہونی چاہیے۔ یعنی اگر ریاکاری کی نیت نہ ہو تو خیرات کو علانیہ دینا اور چھپا کر دینا دونوں جائز ہیں لیکن اگر معاملہ اجتماعی نہیں انفرادی ہو اور شخصی طور پر نادار افراد کو دینا ہو تو چھپا کر دینا بہتر ہے۔ علانیہ دینے میں سائل بے حیائی اور بے غیرتی کا عادی ہو جاتا ہے کیونکہ جب کسی کی ذلت اور فقر و فاقہ کی داستان منظر عام پر آتی ہے تو پھر اپنے کردار پر اُسے زندگی میں ایسے مواقع برابر پیش آتے رہتے ہیں جہاں نیکی کا اظہار ضروری ہو جاتا ہے ایک شخص بھوک پیاس سے نڈھال یا بیماری میں مبتلا سڑک پر تڑپ رہا ہے۔ آپ قریب سے گزر رہے ہیں اور بالکل آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ کھلا کر یا دوا دے کر اس کی جان بچا سکیں لیکن اس اندیشہ سے کہ کہیں ہماری اس خدمت کا شمار ریا

یا نمائش میں نہ ہو جائے اس کے پاس سے کترا کے اور خاموش گزر جائیں۔ یہ تقویٰ نہیں عین معصیت اور انتہائی وہم پرستی ہے یہاں ضرورت فی الفور مدد کی ہے خواہ اس کے لیے بانگ دہل اعلان کرنا پڑے نہ یہ کہ شبہ ریا یا شائبہ نمائش سے بچنے کے لیے گوشہ تنہائی کی تلاش پہلے کی جائے اور پھر امدادی کام ہو۔ جن مذاہب نے نیکی کے اہتمام یا اخفاء میں حد سے زیادہ تاکید ہے اور خدمت خلق کو مخفی رکھنے کے ساتھ محدود و مقید کر دیا ہے ان کی تعلیم قطعاً ناقص، ناتمام یکطرفہ ہے اور انہوں نے زندگی کے شب و روز اس قسم پیش آنے والے بکثرت واقعات کو نظر انداز کر دیا ہے [۱]

۸۰۸۔ اور اگر پوشیدہ کرو اور محتاجوں کو دے دو تو اس میں تمہارے لیے بڑی بہتری ہے۔ یعنی اگر لوگوں کے دکھانے کی نیت نہ ہو تو خیرات کرنا لوگوں کے رو برو بھی بہتر ہے تاکہ اوروں کو بھی شوق اور رغبت ہو اور چھپا کر خیرات کرنا بھی بہتر ہے تاکہ لینے والا نہ شرمائے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اظہار و اخفاء دونوں بہتر ہیں مگر ہر موقع اور مصلحت کا لحاظ ضروری ہے [۲]

صدقات فرض و نفل دونوں کا حکم

مفسرین قرآن نے اس آیت کی تفسیر میں صدقے کے اخفاء کو عام خیرات کے ساتھ مخصوص کیا مگر فرض زکوٰۃ کے لیے اس بنا پر اظہار و اعلان کو مستحسن قرار دیا ہے کہ اس سے اسلام کے ایک رُکن کی اشاعت اور تبلیغ اور دوسروں میں اس کی پیروی کی ترغیب و تشویق ہوتی ہے اور زکوٰۃ دینے والے عدم ادائے زکوٰۃ کی تہمت سے بری خیال کیے جاتے ہیں۔

علامہ آلوسی رقمطراز ہیں:

صدقہ کو پوشیدہ طور پر دینے کی افضلیت صدقہ نفلی میں ہے ورنہ صدقہ فرض کو دوسروں پر ظاہر کر کے دینا افضل ہے۔

علامہ قرطبی لکھتے ہیں۔

جمہور مفسرین کے نزدیک یہ آیت نفلی صدقات کے بارے میں ہے کیونکہ نفل میں اخفاء افضل ہے، فرائض کا یہ حکم نہیں ہے۔

علامہ نسفی فرماتے ہیں۔ علماء کی رائے میں پوشیدہ طور پر دینے کی فضیلت صدقہ نفلی میں ہے

---

[۱] ماجدی [۲] افادات شیخ الہند۔

ورنہ فرائض میں تو اظہار و اعلان ہی افضل ہے۔

جو صدقہ فرض ہو اس کو علانیہ دینا افضل ہے اور جو صدقہ فرض کے سوا ہو اس کا اخفاء زیادہ بہتر ہے یہی اصول تمام اعمال کے لیے ہے کہ فرائض کا علانیہ انجام دینا فضیلت رکھتا ہے اور نوافل کو چھپا کر کرنا اولیٰ ہے [1]

یہاں چونکہ زیر بحث عام صدقات و خیرات ہیں۔ صدقات واجبہ نہیں جو علانیہ دیئے جاتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کو پوشیدہ طور پر دینا بہتر ہے یا علانیہ [2]

لیکن ہمارے نزدیک آیت کریمہ کا مفہوم صاف ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے کا اصلی طریقہ تو وہی ہے جو عہد نبوی میں تھا یعنی یہ کہ زکوٰۃ کی رقم بیت المال یا بیت المال کے عاملوں کے سپرد کی جائے اس لیے اخفاء کا جو فائدہ فقراء کے حق میں ہے وہ اس طرح خود بخود حاصل ہو جاتا ہے لیکن آیت کا اشارہ یہ ہے کہ اگر تم خود براہ راست فقیروں کو دو تو چھپا کر دینا بہتر ہے کہ لینے والے کی عزت سلامت رہے۔ اسی لیے آیت کے جس حصے میں اظہار اور اعلان کی اجازت ہے اس میں فقراء کو براہ راست دینے کا حکم نہیں اور آیت کے جس حصے میں اخفاء کے ساتھ دینے کا ذکر ہے وہاں فقراء کو دینے کی تصریح کی ہے۔ اس لیے اعلان اور اخفاء کا اصلی فرق زکوٰۃ اور عام خیرات کے درمیان نہیں ہے بلکہ ادا کرنے کے طریقے میں ہے کہ اگر بیت المال کے ذریعے ادا کرو تو ظاہر کر کے دو کہ دینے والے اور لینے والے دونوں کا حساب پاک رہے اور تہمت اور بدگمانی کا موقع نہ ملے لیکن اگر کسی سبب سے آپ کو براہ راست مستحقین کو دینا پڑے جس میں حساب کتاب کی ضرورت نہیں اور براہ راست آپ ہی کو ان کو دینا ہے۔ بیت المال کا پردہ درمیان میں نہیں ہے اسی لیے آپ پر یہ فرض عائد ہوتا ہے کہ چھپا کر دیجیے تاکہ دینے والا نمائش سے اور لینے والا ذلت و خواری سے محفوظ رہے۔ پھر ترغیب اعلان و اظہار کی ضرورت اس وقت ہے جب مسلمان کا مذہبی احساس اس قدر کمزور ہو جائے کہ حقوق اسلام ادا کرنے میں اس قسم کی موشگافیوں کی ضرورت ہو۔ ورنہ صحابہ کرام کو ترغیب کے لیے صرف اسلام کا خالص جوش کافی تھا۔

حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں:۔

اس مقام میں اقوال مختلف ہیں مگر احقر کے ذوق میں حسب شہادت ظاہر قرآن اور حدیث امام حسن بصری کا قول جو کبیر میں منقول ہے اصح معلوم ہوتا ہے وہ یہ کہ یہ آیت فرض اور

[1] تفہیم القرآن [2] تدبر قرآن

نفل سب صدقات کو شامل ہے اور سب میں اخفا ہی افضل ہے اس میں دینی مصلحت بھی ہے کہ ریاء سے بُعد ہے لینے والا بھی نہیں شرماتا اور دنیوی مصلحت بھی ہے کہ اپنے مال کی مقدار عام لوگوں پر ظاہر نہیں ہوتی اور آیت میں افضلیت اخفا سے مراد فی نفسہ افضلیت ہے، پس اگر کسی مقام پر کسی عارض مثلاً رفع تہمت یا اُمید اقتدار کی وجہ سے اظہار کو ترجیح ہو جائے تو یہ افضلیت فی نفسہ کے منافی نہیں۔

صدقہ سے تکفیرِ سیّئات ہوتی ہے

۸۰۹ ۔ یہ تمہارے گناہوں کو تم سے دُور کر دے گی اور خوب یاد رکھو اللہ تمہارے اعمال سے باخبر ہے قرآن مجید نے ازالۂ سیّئات کی جہاں اور صورتیں رکھی ہیں وہاں ایک صورت یہ بھی ہے کہ نیکیاں بدیوں کا کفارہ ہوتی رہتی ہیں اور حسنات سیّئات کو محو کرتی رہتی ہیں۔ یہ چیز محض عقیدہ کی نہیں مشاہدہ و تجربہ کی بھی ہے کہ خلق کی نظر سے چھپا کر طاعت اور نیکیوں کی عادت ڈال لی جائے تو ایک عرصہ کی مشق کے بعد نفس کی اصلاح خود بخود ایک بڑی حد تک ہو جاتی ہے اور جو کچھ خرابیاں پھر بھی باقی رہ جائیں ان سے درگزر کے لیے خدائے رحمان و رحیم کا لطف و کرم کافی ہے جو خوبیوں کو خرابیوں کا اور بھلائیوں کو برائیوں کا عوض بنا تا شرم و ندامت نہیں رہتی۔ اور اس لیے اس کا اندیشہ ہے کہ اگر اس کا انسداد نہ کیا جائے تو اظہار و اعلان کا یہ طریقہ دُنیا میں گداگری اور دریوزہ گری اور بھیک مانگنے کے پیشے کی اشاعت کا سبب بن جائے گا اور چھپا کر دینے کی صورت اس لیے بھی اچھی ہے کہ دینے والا نمائش اور شہرت طلبی کی آلائشوں سے اپنے اخلاق کو محفوظ رکھ سکے گا۔ اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

بہترین صدقہ وہ ہے کہ دائیں ہاتھ سے دو تو بائیں کو بھی خبر نہ ہو۔ (صحیح مسلم)

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ رضؓ کے حوالہ سے یہ ارشاد آیا ہے کہ :۔

سات آدمی ایسے ہیں جن کو اللہ سبحانہٗ اس روز سایہ میں جگہ عطا فرمائے گا جبکہ کہیں بھی سایہ نہ ہوگا اوّل عادل سربراہِ مملکت، دوم وہ نوجوان جس کا اٹھان ہی اللہ کی عبادت میں ہوا ہو، سوم وہ دو شخص جن کے مابین تعلق کا مدار محض اللہ ہو، چہارم وہ شخص جس کا دل مسجد میں اٹکا رہے پنجم وہ شخص جو تنہائی میں اللہ کو یاد کر کے روئے، ششم وہ شخص جسے حسن و جمال دعوتِ عیش دے اور وہ اللہ کے خوف سے اس کی دعوت کو قبول نہ کرے ہفتم وہ شخص جو خیرات اس طرح پوشیدہ کرے کہ دائیں ہاتھ خرچ کرے بائیں ہاتھ کو بھی پتہ نہ لگے۔

لیکن بعض مواقع ایسے بھی ہیں جہاں صدقہ و خیرات اور زکاۃ کے اعلان کی ضرورت پیش آتی ہے اور

وہ یہ کہ دوسروں کو ترغیب اور شوق دلانے کی نیت ہو یا خود سائل پیش دستی کر کے مجمع میں سوال کرے یا اور کوئی نیک غرض شامل ہو۔ چنانچہ قرآنِ حکیم نے اس حقیقت کو ان الفاظ میں ظاہر کیا۔

۸۰۷۔ اگر تم کھلے طور پر صدقہ و خیرات کرو تو کیا خوب ہے۔ تمہارے نیک عمل کا دوسرے بھی اتباع کریں گے اور نیک دل لوگ تمہاری اس داد و دہش کو دیکھ کر تمہارے لیے دعا کریں گے کہ اے اللہ ایسے سخی کو زندہ رکھ۔ نیز جب دوسرے مستحقین کو تمہاری اعانت و امداد کا علم ہو گا تو وہ بھی تمہارے وجود اور جود کو اپنے لیے سہارا سمجھیں گے اور تمہارے لیے دعا کریں گے [1]

سیئات کی تکفیر کے لیے اخفاء یعنی صدقہ کو چھپا کر دینا شرط نہیں ہے لیکن خاص طور پر یہاں اخفاء کو اس لیے لایا گیا ہے کہ صرف اخفاء میں بظاہر کوئی فائدہ محسوس نہیں ہوتا لیکن بباطن اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے تکفیر سیئات ہوتی ہے جو اعلان میں نہیں اور اسی لیے واللہ بما تعملون خبیر کا اضافہ فرمایا اور یہ جو فرمایا کہ کچھ گناہوں کو تم سے دُور کر دے گا تو اس کی وجہ یہ ہے کہ ایسے حسنات سے صرف صغیرہ گناہ معاف ہوتے ہیں اور کبیرہ کی معافی کے دو طریقے ہیں ایک توبہ دوسرے فضل و رحمت [2]

---

[1] معارف القرآن م ا [2] بیان القرآن

لَيْسَ عَلَيْكَ هُدٰىهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَمَا
تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا ابْتِغَآءَ
وَجْهِ اللّٰهِ ؕ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ يُّوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ
لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۲﴾

اے پیغمبر یہ بات تمہاری ذمہ داری میں داخل نہیں کہ لوگ ہدایت قبول کرلیں۔ آپ کا کام صرف راہ بتانا ہے یہ اللہ کا کام ہے کہ جسے چاہے ہدایت قبول کرنے کی توفیق عطا فرمائے [۱۸۱] اور مسلمانوں سے کہہ دو کہ جو کچھ بھی تم خرچ کروگے تو تم خود اپنے ہی فائدے کے لیے کروگے اور تمہارے خرچ کرنے کا سب سے بڑا مقصد یہ ہے کہ تمہیں اس سے رضائے الٰہی حاصل ہو اور جو کچھ بھی تم خرچ کروگے مال سے تو اس کا بدلہ تمہیں پورا پورا دیا جائے گا اور تمہاری قطعاً حق تلفی نہ کی جائے گی [۱۸۲]

تمام شہری عام صدقات کے مستحق ہیں

یہ بات بتانے کے بعد کہ صدقات کی ادائیگی میں اعلان و اخفاء کا کام کیا ہے اور کس حد تک ہے

اب بتایا جا رہا ہے کہ صدقات کی ادائیگی میں یگانے اور بیگانے کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ یہ نیکی ہے اور نیکی میں اپنے اور پرائے کی کوئی تمیز نہ ہونی چاہیے۔ پہلی آیت میں اگرچہ لفظ فقراء لاکر اس طرف اشارہ کر دیا تھا کہ خیرات و مبرات میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں بلکہ اس میں تمام شہری یکساں ہیں۔ لیکن اس میں اجمال تھا اسی اجمال کی توضیح زیر نظر آیت میں کی گئی ہے۔ اور ممکن ہے کہ اس ارشاد گرامی کے نازل ہونے سے پہلے کچھ احوال و ظروف بھی ایسے رونما ہو گئے ہوں جن کا یہ آیت جواب بن گئی ہو۔ جیسا کہ ابن جریر نے بتایا ہے کہ مسلمان اپنے غیر مسلم رشتہ داروں اور عام غیر مسلم اہل حاجت کی مدد کرنے میں تامل کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ صرف مسلمان حاجتمندوں کی ہی کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ اس آیت میں کھول کر بتا دیا گیا کہ دلوں میں ہدایت اتار دینے کی ذمہ داری تم پر نہیں ہے۔

جہاں تک ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کرنے کا تعلق ہے قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ اصل اس باب میں محبت و شفقت، ہمدردی و سلوک اور تعاون و سازگاری ہے اس کے سوا کوئی دوسری بات نہیں کہ ہر شہری ایک مسلمان کی ہمدردی، خیرسگالی کا مستحق ہے خواہ اس کا ہم وطن ہو یا نہ ہو، ہم عقیدہ ہو یا نہ ہو اور امتیاز و تفریق کی وہ تمام باتیں جو اس انسانی بھائی چارگی کا رشتہ کاٹتی ہیں۔ خدا کی طرف سے نہیں خود لوگوں کی گڑھی ہوئی ہیں۔ لیکن وہ لوگ جو مسلمانوں سے برسرپیکار ہوں اس حکم میں داخل نہیں ہیں ان کو صدقات دینے جائز نہیں ہیں۔ قرآن میں عدم موالات کے احکام ان ہی سے متعلق ہیں۔ ان کو قانون کی زبان میں حربی کہتے ہیں۔ قرآن نے ان کے ساتھ رفاقت اور سازگاری سے منع کیا ہے۔ سورۂ ممتحنہ میں ہے۔

لاینھاکم اللہ عن الذین لم یقاتلوکم فی الدین ولم یخرجوکم من دیارکم ان تبروھم وتقسطوا الیھم ان اللہ یحب المقسطین۔ انما ینھاکم اللہ عن الذین قاتلوکم فی الدین واخرجوکم من دیارکم وظاھروا علی اخراجکم ان تولوھم ومن یتولھم فاولئک ھم الظالمون۔

اللہ تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ ان کافروں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور انصاف کے ساتھ پیش آؤ، جنھوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی نہیں کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ اللہ تو تمہیں صرف ان لوگوں کی رفاقت اور سازگاری سے روکتا

ہے جنھوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکالا ہے۔ نیز تمہیں جلا وطن کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے پس جو کوئی ایسے لوگوں سے رفاقت و سازگاری رکھے گا تو ایسے لوگ ظلم گار ہیں۔

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ قرآن ان لوگوں سے ہمدردی، خیر سگالی کی اجازت نہیں دیتا جو مسلمانوں سے صاف اس لیے برسرِ پیکار ہیں کہ مسلمان دُنیا میں اسلامی نظامِ حیات قائم کرنا چاہتے ہیں ان کے علاوہ دوسرے تمام غیر مسلموں سے وہ رواداری، ہمدردی، خیر سگالی کی اجازت دیتا ہے اور صدقات کے بارے میں مسلمانوں پر یہ پابندی نہیں لگاتا کہ مسلمان ہی کو دیئے جائیں۔ ہاں صدقات میں سے زکوٰۃ اور عشر کا مصرف صرف مسلمان ہیں۔ ان دو کے علاوہ جس قدر صدقاتِ واجبہ اور نافلہ ہیں سب کے استحقاق میں مسلم اور غیر مسلم برابر ہیں (الجصاص)

ہدایت قبول کرنے کا ضابطہ

۸۱۰ ۔ اے پیغمبر یہ بات تمہاری ذمہ داری میں داخل نہیں ہے کہ لوگ ہدایت قبول کریں آپ کا کام صرف راہ بتانا ہے، یہ اللہ کا کام ہے کہ جسے چاہے ہدایت قبول کرنے کی توفیق ارزانی فرمائے۔ قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ انسانی طبیعت و استعداد کا اختلاف نظری ہے اور اللہ کی مشیت یہی ہوئی کہ یہ اختلاف ظہور میں آئے۔ اگر وہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طرح کی استعداد ایک ہی طرح کی فکری و عملی حالت پر مجبور کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں چاہا۔ اس کی حکمت کا فیصلہ یہی ہوا کہ انسان میں ہر طرح کی حالت پیدا کرنے کی صلاحیت ہو اور ہر طرح کی راہ اس کے سامنے کھول دی جائے۔ اگر وہ اُونچا ہونا چاہے تو زیادہ سے زیادہ اونچا ہو جائے۔ پست ہونا چاہے تو زیادہ سے زیادہ پستی میں جا سکے۔ اسی تنوع استعداد کا نتیجہ ہے کہ فکر و عمل کے ہر گوشہ میں مختلف احوال و کوائف ظہور میں آ گئے۔ ایک کا ذوق دوسرے کے ذوق سے اور ایک کی سمجھ دوسرے کی سمجھ سے مختلف ہو گئی، ایک نے حق کی راہ پسند کی دوسرے نے اس سے انکار کیا اور پھر اسی فکر و عمل کے اختلاف کی وجہ سے ہدایت و ضلالت اور سعادت و شقاوت کی وہ کشمکش رونما ہو گئی جسے قرآن آزمائش حیات کہتا ہے۔ یہاں اس آیت میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ ایمان کوئی ایسی چیز نہیں کہ زور زبردستی سے یا زر کی قوت سے کسی کے حلقوم میں اتار دی جائے۔ رسول کی ذمہ داری لوگوں کی ہدایت کے بارے میں صرف یہ ہے کہ وہ ان کو اللہ کی تعلیمات و ہدایات سے اچھی طرح آگاہ کر دے۔ اگر یہ کام نبی نے کر دیا تو اس کا فرض پورا ہو گیا۔ نبوت کی یہ ذمہ داری نہیں ہے کہ لوگ ان تعلیمات کو قبول

کریں۔ ان کو قبول کرنے کی توفیق دینا اللہ کا کام ہے اور وہ یہ توفیق ان کو دیتا ہے جن کو چاہتا ہے۔ اللہ کے اس چاہنے کے لیے خود اس کا مقرر کردہ قانون ہے اور وہ یہ ہے کہ اس نے ہدایت وضلالت کے بارے میں لوگوں کو آزادی دی ہے جو لوگ ایمان لائیں گے صلہ پائیں گے جو کفر کی راہ اختیار کریں گے وہ سزا سے دوچار ہوں گے۔ یہ اختیار و آزادی خود ان میں اختلاف استعداد کا نتیجہ ہے۔ اس سلسلے میں صدقہ و خیرات اور ہمدردی و خیر سگالی سے دست کش ہو جانا کہ یہ اقدام ان کے لیے قبولِ ہدایت کا دروازہ کھول دے گا۔ بے کار اور بے سود ہے۔ ہدایت نہ تو دولت کے زور سے آتی ہے اور نہ ہی دولت کے نہ ہونے کے خوف سے۔ ہدایت تو صرف اللہ کی توفیق سے نصیب ہوتی ہے۔ دنیوی مال و متاع سے ان کی حاجتیں پوری کرنے میں تم محض اس وجہ سے تامل نہ کرو کہ انھوں نے ہدایت قبول نہیں کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کافر کے ساتھ اس خیال سے سلوک نہ کرنا کہ وہ مسلمان ہو جائے اور اسلام قبول کرلے۔ یہ طریقہ کسی کو ہدایت کرنے کا نہیں ہے اور نہ پیغمبر پر یہ واجب ہے کہ وہ ہر شخص کو ہدایت پر لائے ہدایت کا معاملہ تو اللہ کے سپرد ہے، پیغمبر کا کام نصیحت کرنا اور صحیح راہ کا بتا دینا ہے باقی راہ پر لگا دینا یہ اللہ سبحانہ کی شان اور ان کا کام ہے اور جب بات یہ ہے کہ ہدایت اللہ کے قبضے میں ہے تو پھر حسن سلوک اور نفل صدقات سے کافروں کو محروم کرنا یہ کوئی جذبہ خیر نہیں ہے۔

۱۱۸۔ اور مسلمانوں سے کہہ دو کہ جو کچھ بھی تم خرچ کرو گے تو خود اپنے فائدے ہی کے لیے کرو گے یعنی تم جو کچھ خرچ کرو گے اس کا فائدہ مجھے نہیں ہوگا اور نہ کسی دوسرے پر اس کا احسان ہوگا خود تمہارا اپنا ہی فائدہ ہوگا۔ اور تمہارا منشا بھی یہی ہے کہ تمہیں فائدہ ہو تو اب چاہے کسی کو دو فائدہ تو تمہیں ہی ہوگا۔ اگر صورتحال یہی ہے کہ ہر حال میں فائدہ تمہارا ہی ہے خواہ خرچ کہیں ہو تو پھر اس بحث میں کیوں پڑتے ہو کہ مسلمان کو دیا جائے اور غیر مسلم کو نہ دیا جائے۔ یہاں خیر سے مراد سرمایہ ہے اور قرآن حکیم میں مال کے لیے لفظ خیر متعدد مقامات پر استعمال ہوا ہے۔

اس کے بعد فرمایا ہے کہ ما تنفقون الا ابتغاء وجہ اللہ یعنی تمہارے خرچ کرنے کا مقصد اللہ سبحانہ کی رضا جوئی ہے۔ شارحین قرآن کہتے ہیں کہ یہ فقرہ صورت میں خبر کی ہے لیکن معنے انشا کے ہیں مطلب یہ ہے کہ تم اللہ کی رضا کے سوا کسی اور مقصد کے لیے خرچ نہ کرو۔ لیکن مجھے اس سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ خبر ہی ہے اور انفاق کے موضوع پر صحابہ کی قلبی کیفیات بتانے کے لیے لایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انفاق کے نام پر جو نیکی بھی تم کرتے ہو اس کا فائدہ تم ہی کو ہے کہ اس کے ذریعے اسلام، ایمان اور احسان کی راہوں میں تمہارے اندر رچاؤ آتا ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ تمہارا انفاق میں حال یہ ہے کہ انفاق

میں تمہارے پیشِ نظر ابتغاءِ مرضات یعنی اللہ کی رضاجوئی کے سوا کوئی اور مقصد نہیں ہوتا اور جب انفاق کی نوعیت یہ ہوتی ہے تو اخلاق میں تزکیہ نفوس میں ثبات اور قلوب میں نورانیت کا حاصل ہوجانا ناگزیر ہے۔ اس طرح سے انفاق خواہ کسی پر کیا جائے بہرحال اپنی تاثیر رکھتا ہے کیونکہ اس انفاق کے پیچھے اللہ کی رضاجوئی کی روح کارفرما ہے۔ جس پر خرچ کیا جارہا ہے۔ اس کی رضاجوئی اور تقرب پیشِ نظر نہیں ہے بلکہ آخرت میں بھی یہ تمہارے اللہ سے تقرب کا ذریعہ بن جائے گا اور تمہیں تمہارے عمل کا پورا پورا اجر دیا جائے گا۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں :-

> جب آپ نے صحابہ کو مسلمانوں کے سوا اوروں پر صدقہ کرنے سے روکا اور اس میں مصلحت یہ تھی کہ مال ہی کی غرض سے دینِ حق کی طرف راغب ہوں، آگے فرمایا کہ یہ ثواب جب ہی ملے گی کہ اللہ کی خوشی مطلوب ہوگی تو یہ آیت نازل ہوئی اور اس میں عام حکم آگیا کہ اللہ کی راہ میں جس مال کو دو گے تم کو اس کا ثواب دیا جائے گا۔ مسلم غیر مسلم کسی کی تخصیص نہیں۔ البتہ صدقہ میں یہ ضرور ہے کہ محض لوجہ اللہ ہو[1]

خلاصہ یہ ہے کہ نیت ہی تمہاری اصل میں اپنے نفع حاصل کرنے کی ہے اور واقع میں نفع خاص طور پر تمہیں ہی حاصل ہوگا۔ پھر ان باتوں پر کیوں نظر کی جاتی ہے کہ یہ نفع خاص اس طریق پر حاصل کیا جائے کہ مسلمان ہی کو صدقہ دیں کافر کو نہ دیں۔ شیخ سعدی کا یہ شعر ؎

گر آدمی پرو پیش آتش سجود — تو واپس چرا میکش دست جود

گویا اس آیت کی تفسیر ہے۔

یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ حدیث میں جو آیا ہے کہ تیرا کھانا خاص متقی کھایا کریں اور آیت مومن اور کافر کو دینے کی اجازت دے رہی ہے۔ آیت قرآنی میں طعام حاجت کا حکم بیان کیا گیا ہے جبکہ حدیث میں طعامِ دعوت کا ذکر ہے[2]

اسلام میں اخلاق کی بنیاد

اس آیت میں یہ بات کھول کر بتادی ہے کہ قرآن پاک کے نزدیک ہر قسم کے نیک کاموں کی بنیاد اور غرض و غایت صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی ہے۔ ایک سچے مسلمان کو صرف اسی کی خاطر کام کرنا چاہیے اور اس کے سوا کسی دوسری غرض کو اپنے کام کی بنیاد نہ بنانا چاہیے۔ یہیں آکر فلسفہ اخلاق اور اسلامی قانون کے اصول کا فرق نمایاں ہوتا ہے۔

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] بیان القرآن

حکمائے اخلاق یہ تلاش کرتے ہیں کہ انسانی اخلاق کی غرض و غایت کیا ہوتی ہے اور قرآن یہ تعلیم دیتا ہے کہ انسان کو اپنے اخلاق کی غرض و غایت کیا قرار دینی چاہیے انسان کے پاس دو ہی دولتیں ہیں ایک جان دوسری مال اور انہی دونوں کو خدا کی راہ میں خرچ کرنا ایثار اور حسن عمل ہے۔ یہاں مال کے بارے میں فرمایا ہے۔ اس سے زیادہ صاف اور واضح طور پر یہ حقیقت سورۂ لیل میں بیان کی ہے۔

الذی یوتی مالہ یتزکی وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزی الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ۔

جو اپنا مال صفائی اور پاکی حاصل کرتے ہوئے دیتا ہے کسی کا اس پر احسان نہیں ہے، جس کو ادا کرنے کے لیے دیتا ہو بلکہ وہ اللہ کی ذات کی طلب کے لیے دیتا ہے۔

غرض اگر ہمارے اخلاق و اعمال کی غایت خودغرضی، اور کسی نہ کسی طرح کی ذاتی منفعت ہو تو وہ ثواب کی رُوح سے خالی ہے۔ اور قرآن کی اخلاقی تعلیم اس پستی سے بہت بلند ہے۔ ایک منظر اس کا وہ بھی ہے جہاں مومن کی منزل رضائے الٰہی کی طلب نہیں بلکہ خود ذاتِ الٰہی ہو جاتی ہے۔

ما تنفقون الا ابتغاء وجہ اللہ

تم نہیں خرچ کرتے ہو مگر اللہ کی ذات کو چاہ کر

اخلاقی احکام کی تعمیل اور ادائے حقوق کی تاکید کے سلسلے میں ارشاد فرمایا:

تو رشتہ داروں کا حق ادا کر، غریب کا مسافر کا، ایسا کرنا ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو اللہ کی ذات کو چاہتے ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔ (سورۂ روم)

لِلۡفُقَرَآءِ الَّذِيۡنَ اُحۡصِرُوۡا فِىۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ لَا يَسۡتَطِيۡعُوۡنَ ضَرۡبًا
فِى الۡاَرۡضِ يَحۡسَبُهُمُ الۡجَاهِلُ اَغۡنِيَآءَ مِنَ التَّعَفُّفِ‌ۚ تَعۡرِفُهُمۡ
بِسِيۡمٰهُمۡ‌ۚ لَا يَسۡـَٔلُوۡنَ النَّاسَ اِلۡحَافًا‌ ؕ وَمَا تُنۡفِقُوۡا مِنۡ خَيۡرٍ
فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِيۡمٌ ۝ رکوع ۵

صدقات وخیرات ان فقیروں کا حق ہے جو اللہ کے راستہ میں گھر گئے ہوں
انہیں یہ طاقت نہیں کہ اپنے ذاتی کسب و معاش کے لیے زمین میں
چل پھر سکیں[۵۸۱۲] ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے
کہ یہ مالدار ہیں، تم ان کے چہرے دیکھ کر ان کی حالت پہچان سکتے ہو
لیکن وہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کبھی سوال نہیں کرتے ہیں[۵۸۱۳] جو کچھ
تم نیکی کی راہ میں خرچ کرو گے اس کو اللہ خوب جاننے والا ہے[۵۸۱۴]

قرآن میں فقراء کا چہرہ

خیرات وصدقات کا ایک ضروری مصرف ایسا ہے جس کی طرف ظاہر بین نگاہوں کو توجہ نہیں ہو سکتی یعنی ان کی مدد کرنا جو دنیا کا کام دھندہ چھوڑ کر راہ خدا کی خدمت کے لیے وقف ہو جائیں۔ نہ تو انہیں تجارت کی مقدرت ہے نہ کوئی دوسرا وسیلہ معاش رکھتے ہیں۔ شب و روز دین و ملت کی خدمت میں مشغول رہتے ہیں۔ حالت ان کی حاجت مندوں کی ہے مگر صورت بے نیازوں کی چونکہ ایسے افراد خیر کی خبر گیری جماعت کا ضروری

فرض ہے اس لیے اس آیت میں خصوصیت کے ساتھ اس پر توجہ دلائی کیونکہ لوگ عموماً انہی لوگوں کو خیرات کا مستحق سمجھتے ہیں جو بھیک مانگتے میں چست و چالاک ہوتے لیکن خوددار حاجت مند کو کوئی نہیں پوچھتا حالانکہ سب سے زیادہ مستحق ایسے ہی لوگ ہیں۔

یہ آیت فقراء کے باب میں اصل ہے۔ فقیر اُسے کہتے ہیں جس کے پاس ضروریات زندگی کے لیے کچھ بھی نہ ہو، فقیر کو اس کی خودداری اور عفتِ نفس طلب والحاح کی اجازت نہیں دیتی۔ صحیحین کی ایک حدیث میں خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فقیر کی یہ تعریف کی ہے، جسے ایسے وسائل میسّر نہیں ہوتے کہ تونگر کر دیں جس کا فقر ظاہر نہیں کہ لوگ خیرات دیں جو خود سوال کے لیے کھڑا نہیں ہوتا کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتے اور اسی حدیث میں اس آیت کی طرف حضور نے اشارہ بھی فرمایا ہے۔

بلاشبہ ایسے علماء دین اس آیت کا مصداق ہیں جو دین کی تعلیم و خدمت کے لیے وقف ہو گئے ہوں اور فکرِ معیشت کے لیے ان کے پاس وقت نہ ہو بشرطیکہ انھوں نے تعلیمِ دین کو حصولِ زر کا پیشہ نہ بنایا ہو اور ضرورت سے زیادہ نہ لیتے ہوں اور کسی حال میں خود سائل اور ساعی نہ ہوتے ہوں۔ نیز وہ تمام افراد جو ان کی طرح خدمتِ دین و ملت کے لیے وقف ہو جائیں اور معیشت کا کوئی سامان نہ رکھتے ہوں۔ اس کا مصداق ہیں، کیونکہ آیت میں فی سبیل اللہ آیا ہے اور قرآن کی اصطلاح میں وہ تمام کام جو براہِ راست دین کی حفاظت و تقویت کے لیے ہوں سبیل اللہ ہیں اور چونکہ دین کی حفظ و صیانت میں دفاع کا کام سب سے زیادہ ضروری ہے اس لیے اس لیے استعمال زیادہ تر دفاع کے لیے ہوتا ہے، اگر دفاع درپیش ہے اور لوگوں نے امامِ وقت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے اپنے آپ کو اس کے لیے وقف کر دیا ہے تو اس میں خرچ کیا جائے ورنہ دین کی حفاظت کے دوسرے کاموں میں مثلاً قرآن اور علومِ دینیہ کی ترویج میں، مدارس کے اجراء و قیام میں دعاۃ و مبلغین کے قیام و ترسیل میں، ہدایت و ارشادِ اُمّت کے تمام مفید وسائل میں۔

۸۱۲۔ صدقات و خیرات ان فقیروں کا حق ہے جو اللہ کے راستہ میں گھر گئے ہوں، انہیں یہ طاقت نہیں کہ اپنے ذاتی کسبِ معاش کے لیے زمین میں چل پھر سکیں۔ یعنی ایسوں کو دینا بڑا ثواب ہے جو اللہ کی راہ اور اس کے دین کے نام میں مقید ہو کر چلنے پھرنے کھانے کمانے سے رک رہے ہیں اور کسی طرح پر اپنی حاجت ظاہر نہیں کرتے، جیسے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم تھے۔ اہلِ صفہ نے گھر بار چھوڑ کر حضرت کی صحبت اختیار کی تھی۔ علمِ دین سیکھنے کو اور مفسدین، فتنہ پردازوں پر جہاد کرنے کو، اسی طرح اب بھی جو قرآن حفظ کرے یا علمِ دین میں مشغول ہو تو لوگوں پر لازم ہے کہ ان کی مدد کریں [1]

[1] افاداتِ شیخ الہند۔

مطلب یہ ہے کہ صدقات کے اصل مستحق تو وہ حاجت مند ہیں جن کا ذکر اب آرہا ہے۔ مبتدا یہاں محذوف ہے اصل فقرہ یوں ہے ہذہ الصدقات للفقراء (مدارک) احصروا یعنی دین کے کسی کام میں گھر گئے ہوں اور آزادی سے کسب معاش نہ کر سکتے ہوں۔ اصل مراد یہاں مجاہدین ہیں۔ لیکن لفظ احصار میں بڑی گنجائش ہے یہ گھر جانا وقت کے لحاظ سے ہو یا جسم کے لحاظ سے سب اس کے تحت آتے ہیں۔ ایسے ہی فی سبیل اللہ میں بڑی وسعت ہے، دین کا کوئی سا کام، کوئی سی ضرورت ہو، سب اس میں شامل ہو سکتی ہیں۔ گو اصل مراد جہاد ہے۔ مفسر تھانوی نے کہا ہے کہ آیت کے مصداق ہمارے ملک میں سب سے زیادہ وہ حضرات ہیں جو علوم دین میں مشغول ہیں کہ علم دین میں جس مشغولیت اور انہماک کی ضرورت ہے اس کے ساتھ اگر فکر معاش کی مصروفیت کو جمع کر لیا جائے تو علم دین کی خدمت ناتمام رہ جائے کیونکہ معاشی شورشوں کے ساتھ تعلیمی طمانیتیں جمع نہیں ہو سکتی ہیں [1]

اصحاب صفہ کے فقراء

اس گروہ سے مراد وہ لوگ ہیں جو خدا کے دین کی خدمت میں اپنے آپ کو ہمہ تن وقف کر دیتے ہیں اور سارا وقت دینی خدمات میں صرف کر دینے کی وجہ سے اس قابل نہیں رہتے کہ اپنی معاش پیدا کرنے کے لیے کوئی جدوجہد کر سکیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں اس قسم کے رضا کاروں کا ایک مستقل گروہ تھا جو تاریخ میں اصحاب صفہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہ تین چار سو آدمی تھے جو اپنے اپنے گھر بار چھوڑ کر مدینے آگئے تھے ہر وقت حضور کے ساتھ رہتے، ہر خدمت کے لیے ہر وقت حاضر تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جس مہم پر چاہتے انہیں بھیج دیتے اور جب مدینے سے باہر کوئی کام نہ ہوتا اس وقت یہ مدینے ہی میں رہ کر علم دین حاصل کرتے اور دوسرے بندگان خدا کو اس کی تعلیم دیتے۔ چونکہ یہ لوگ پورا وقت دینے والے کارکن تھے اور اپنی ضروریات فراہم کرنے کے لیے اپنے ذاتی وسائل نہ رکھتے تھے اس لیے اللہ تعالیٰ نے عام مسلمانوں کو توجہ دلائی کہ خاص طور پر ان کی مدد کرنا انفاق فی سبیل اللہ کا بہترین مصرف ہے [2]

خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ دینی خدمت میں مشغول ہوں اور جہاد میں یا طلب علم میں لگے رہتے ہوں ان کی خدمت کرنی چاہیے۔

۸۱۳۔ ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف آدمی گمان کرتا ہے کہ یہ مالدار ہیں۔ جاہل کے معنی بے خبر اور

[1] ماجدی [2] تفہیم القرآن

ناواقف کے ہیں اور تعفف کے معنے خودداری کے ہیں یعنی مقصود سے اپنے کو بتکلف بچانا اور مقصد کو ترک کر دینا یہاں یہ مطلب ہے کہ سوال سے بچتے ہیں اور اپنی حاجت کسی کے روبرو بیان نہیں کرتے۔ سوال سے بالکل بچتے ہیں۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ یہ لوگ خودداری کی وجہ سے کسی کے آگے نہ دستِ سوال دراز کرتے ہیں اور نہ اپنے فقر و فاقہ کا اظہار کرتے ہیں۔ اس وجہ سے جو شخص ان کے حالات سے بے خبر ہے ان کو غنی سمجھتا ہے چونکہ ان کا حال یہ ہے اس لیے قرآن نے اہلِ ثروت کو ان کی پہچان یہ بتائی ہے کہ ـــ تم ان کے چہرے دیکھ کر ان کی حالت پہچان سکتے ہو کیونکہ وہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر کبھی سوال نہیں کرتے۔ اصل ارشاد میں الحاف آیا ہے پلٹنا، سر ہو جانا جیسا کہ عام طور پر ہمارے زمانے کے سائل کرتے ہیں کہ دینے والے کو پیچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ بالکل سوال نہیں کرتے چہ جائے کہ کسی کو لپٹیں یا تنگ کریں۔

قرآن اور دریوزہ گری

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن سوال کرنے کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا ہے اور جب سوال کو اچھی نظر سے نہیں دیکھتا تو سوال کے پیشہ کرنے یعنی دریوزہ گری کو کیونکہ گوارا کر سکتا ہے۔ قرآن ایک ابدی قانون اور ایک جامع نظامِ حیات ہے۔ زندگی کا کوئی چھوٹا سے چھوٹا گوشہ ایسا نہیں جہاں اس کی نظر نہ گئی ہو۔ اور اجتماعی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں جو اس کی گرفت سے باہر ہو۔

اس سلسلے میں یہ بات ذہن نشین ہونی چاہیے کہ دریوزہ گری کا باعث افلاس اور تنگدستی ہے اور افلاس کی دو مختلف نوعیتیں ہیں۔ ایک وہ جو تقاضائے فطرت پیدا ہوتا ہے جس کا تعلق حکمۃ اللہ سے ہے۔ قرآن نے سوسائٹی میں ایسے فقر کے دُور کرنے کے لیے ایک جامع منصوبہ پیش کیا ہے اور سر کمانے والے فرد کو قانون سازی کے ذریعے مجبور کیا ہے کہ اپنی آمدنی کا ایک حصہ کمزور افراد کے لیے نکالے۔ نیز سرکار کو اس بات کا ذمہ دار قرار دیتا ہے کہ کوئی فرد ضروریاتِ زندگی سے محروم نہ رہے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ گیارہویں پارے میں آئے گی۔

محتاجی کی دوسری قسم وہ ہے جو سستی اور کاہلی سے پیدا ہوتی ہے۔ قرآن ایسے مصنوعی افلاس کا سخت مخالف ہے۔ وہ اپنی سوسائٹی کے کسی فرد کو اس راہ پر چلنے سے سختی کے ساتھ روکتا ہے جو اس مصنوعی افلاس کی طرف جاتی ہو۔ وہ نہیں چاہتا کہ اس کا کوئی فرد، عضوِ اشل بن کر زندہ رہے۔ اس لیے وہ بار بار مختلف پیرایوں کے ذریعہ تجارت اور ابتغاءِ فضل، پر ابھارتا ہے اور اسی وجہ سے اس نے دریوزہ گری کی پوری شدت سے مذمت کی ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی اسی رُوح کو مختلف طریقوں سے پیش فرمایا ہے۔ ارشاد ہے:

سوال کرنے والا روزِ قیامت اس طرح اُٹھے گا کہ اس کے چہرے پر گوشت کا ایک ٹکڑا بھی نہ ہوگا۔

یہ حدیث امام مسلم کے علاوہ امام بخاری نے بھی روایت کی ہے اور اس کا مطلب یہی ہے کہ دنیا میں جو ذلت اور رُسوائی گداگری کے سلسلے میں انسان کو اٹھانا پڑتی ہے اس کی تشہیر قیامت کے دن بدترین عنوان سے ہوگی اور اس سے زیادہ بلیغ ارشاد وہ ہے جو سنن نسائی میں ہے۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو شخص لوگوں کے سامنے ایسی حالت میں دستِ سوال دراز کرتا ہے کہ اس کے پاس ما یغنیہ موجود ہے تو وہ روزِ قیامت میں ایسی حالت میں آئے گا کہ اس کے چہرے پر سوال کی خراش موجود ہوگی۔

اس حدیث میں ما یغنیہ (یعنی وہ چیز جو اسے غنی بناتی ہے) کا لفظ آیا ہے۔ یہ تعبیر ذرا مجمل ہے۔ سنن ابوداؤد میں اس کی وضاحت آئی ہے کہ — اگر کسی کے پاس ایک روز کا کھانا ہو تو اس کے لیے سوال کرنا حرام ہے۔ اس سے زیادہ صاف لفظوں میں دوسری جگہ فرمایا ہے کہ "مالدار اور کمائی کی قدرت رکھنے والے کے لیے سوال کرنا حرام ہے۔" آگے فرمایا کہ جو مالدار کما کر کھا سکنے والا مانگ کر کھائے گا وہ گویا جہنم کی آگ کا دھکا ہوا پتھر کھا رہا ہے۔" اس کے بعد فرمایا کہ جس کا جی چاہے یہ کام کم کرے اور جس کا جی چاہے زیادہ کرے۔ سنن نسائی میں ہمیں یہ الفاظ ملتے ہیں —— جو شخص مجھے سوال نہ کرنے کی ضمانت دے گا میں اس کے لیے جنت کی ضمانت دیتا ہوں، صحیح مسلم کی ایک روایت میں اس کو صحت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ خلاصہ یہ کہ غنی اور تندرست انسان کے لیے جو کما کر کھا سکتا ہے سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ ہاں حد درجہ تنگدست اور قرضدار کے لیے سوال کرنا جائز ہے ترمذی میں ہے الا لذی فقر مدقع او غرم مفظع لیکن ان کے لیے بھی سوال کا دائرہ وسیع نہیں کیا گیا بلکہ خاص قسم کی حدبندی کردی گئی ایسے لوگوں سے کہا گیا ہے۔

وان کنت لا بد فاسئل الصالحین

اگر سوال ناگزیر ہی ہو تو نیکوکاروں سے سوال کرو۔

گویا اسلام نے نہایت حکمت کے ساتھ ایک تجربہ کار اور ماہر جراح کی طرح دونوں عمل کیے ہیں۔ اس نے زخم پر نشتر بھی لگایا ہے اور اس پر مرہم بھی رکھا ہے۔ یہ مرہم اس کی وہ مہربانیاں، تسلیاں، بشارتیں اور عملی امداد کی وہ ترکیبیں ہیں جو اس کے دل کی ڈھارس اور اس کی اُمیدوں کا سہارا ہیں اور نشتر اس کی وہ اصلاحات ہیں جو اس نے اس طبقہ کو دفاتِ پستی، کم ہمتی، لالچ، دوسروں کی دست نگری اور ان کے سہارے جینے کی ذلت

سے بچانے کے لیے جاری کیں۔ اس نے اہل حاجت کے لیے دوسروں سے سوال کرنے اور مانگنے کی قانونی ممانعت نہیں کی بلکہ ہر اخلاقی طریق سے ان کو اس ذلت سے باز رکھنے کی کوشش کی ہے اور ان کی کفالت کا بار خود جماعت کے سر پر ڈالا ہے۔

گدائی پر اسلام و عیسائیت کا تقابلی مطالعہ

عام طور سے اس قسم کے وعظ جیسا کہ عیسائی مذہب میں ہے کہ جو کچھ ہے لٹا دو اور غریبوں کو دے دو نہایت اعلیٰ اخلاقی تعلیم ہے لیکن غور سے تصویر کا دوسرا رخ دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ جس شدت سے دولتمندوں کو سب کچھ غریبوں کو دے دینے کی ترغیب دے رہے ہیں اور اس سے دینے والوں کے جذبہ ایثار اور ان کے جود و سخا اور فیاضی کے جوہر کو ترقی دے رہے ہیں اسی شدت سے آپ انسانیت کے کثیر التعداد طبقہ کو گداگری کی لعنت بھیک مانگنے کی پستی اور دوسروں کے سہارے جینے کی ذلت کا خوگر بنا رہے ہیں اور بے محنت کھانے اور بے تلاش پانے کا سبق پڑھا رہے ہیں۔ کیا یہ انسانیت کے لیے رحم ہے کیا یہ نوع بشر کے ساتھ محبت ہے کیا یہ جنس بنی آدم کے ساتھ ہمدردی ہے؟

قرآن کسی ایک طبقہ کی اصلاح کے لیے نہیں آیا وہ انسانوں کے ہر طبقہ کے لیے پیغام رحمت بن کر آیا ہے۔ غریب و امیر اور مسکین و دولت مند دونوں قرآن کی نگاہ میں یکساں ہیں۔ اس لیے قرآن نے کسی ایک طبقہ ہی کی اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا بلکہ دونوں طبقوں کو ترازو کے دونوں پلڑوں میں رکھ کر برابر باٹ سے تولا ہے اور اپنی تعلیمات اور اصلاحات میں دونوں کو مساوی حصہ دیا ہے۔

اس آیت میں کس خوبصورتی اور دلکش انداز میں دونوں کی اصلاح فرمائی ہے۔ ایک طرف امراء اور دولت مندوں سے کہا کہ صدقات کے مستحق فقراء ہیں للفقراء مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ دوسری طرف خوددار اور بے نیاز فقراء کی تعریف کی کہ ان کے اوصاف یہ ہیں:

اول: اللہ کے راستہ میں ان کو روک دیا گیا ہے یعنی یہ اللہ کے دین کی برتری اشاعت اور حفاظت کے عظیم کام میں مشغول ہیں۔ ان کا کام اللہ کی راہ میں محنت کرنا۔ جدوجہد کرنا اور نبوت کی لائی ہوئی ہدایت دعوت کا حلقہ وسیع کرنا۔ غافل اور خدا فراموش انسانوں کو اللہ کی بندگی پر صحیح راستہ پر لگانے کے واسطے محنت مشقت برداشت کرنا، اس راہ میں اپنا چین اپنا وقت اور اپنی جان و مال کی قربانی کرنا ان کی زندگی کا مشن ہے۔

دوم: اس کام کی مصروفیت اور مشغولیت کی وجہ سے یہ اس قدر عدیم الفرصت ہیں کہ ان کے پاس اپنی معیشت اور اپنے گزران کی پابجائی کے لیے اتنا وقت نہیں کہ کاروبار کے لیے کہیں جا سکیں۔ اور اپنے معاشی

مسئلہ کو حالات کے مطابق حل کر سکیں۔

سوم: اس کے باوجود یہ اس قدر خوددار اور عزتِ نفس کے مالک ہیں کہ ہر کہ ومہ ان کی خودداری کی وجہ سے ان کی حاجت مندی کا اندازہ نہیں لگا سکتا ہے بلکہ ناواقف آدمی ان کو دیکھ کر غنی سمجھتا ہے۔

چہارم: خشوع اور تواضع کی جیتی جاگتی تصویریں ہیں۔ نگاہوں میں پستی، آواز میں شیرینی اور عاجزی، چہرے پر نورانیت سے ان کے مسکین و غریب ہونے کا اندازہ ہوتا ہے اور ان کا مخاطب اپنی فراست ہی سے ان کو پہچانتا ہے۔

پنجم: پیشہ ور فقیروں کی طرح نہ یہ لوگوں کے پیچھے پڑتے ہیں اور نہ کسی کے سامنے دستِ سوال دراز کرتے ہیں۔

ایک طرف دولت مندوں سے کہا کہ صدقات فقراء کا حق ہے۔ دوسری طرف فقیروں سے اسی آیت میں کہا کہ خودداری اور تعفف اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہے۔ یہ ہے اس آیت کو وہ بلیغ کلیم جس نے انسانوں کے دونوں طبقوں کو اپنے فیض سے معمور کیا اور دونوں کے لیے اپنے اخلاق کی اصلاح کا موقع بہم پہنچایا۔

۸۱۴ جو کچھ تم نیکی کی راہ میں خرچ کرو گے اس کو اللہ خوب جاننے والا ہے۔ علی العموم اور خاص کر ان لوگوں کا حق کا ذکر اوپر ہوا ہے یعنی ایسے خوددار سائلوں کو تلاش کر کے چپ چپاتے ان کی حاجت روائی کرنا لوگوں سے چھپا رہے گا لیکن خالق سے نہیں چھپے گا۔ وہ تمہارے ہر انفاق سے باخبر ہے اور وہ اس کا بھرپور صلہ دے گا۔

اَلَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ بِالَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَّعَلَانِيَةً فَلَهُمْ اَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۚ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ﴿۲۷۴﴾

جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلم کھلا اور چھپا کر خرچ کرتے ہیں[۸۱۵] ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور ان کو نہ کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے[۸۱۶]

ہر وقت اور ہر حال میں اللہ کی راہ میں انفاق

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اس قدر پسند ہے کہ قرآن نے اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے درجے مقرر کر دیئے ہیں۔ ایک قانونی دوسرے اخلاقی۔ قانونی خیرات و صدقات زکوٰۃ، عشر، نفقاتِ واجبہ پر تفصیلی مباحث اپنے اپنے مواقع پر آئیں گے۔ اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے اس کو بلند سے بلند روحانی ترقی کا ذریعہ بتایا اور بلند ہمت لوگوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔ صحابہ میں دونوں قسم کے لوگ تھے وہ بھی تھے جو کل کے لیے آج اٹھا کر رکھنے کو حرام سمجھتے تھے جیسے حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ، اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدموں میں لا کر ڈال دیتے تھے جیسے حضرت ابوبکر رض، اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ اللہ کی راہ میں یک وقت لٹا دیتے جیسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رض وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے جیسے حضرت علی رض اور بعض انصار کرام، اللہ نے ان کی مدح فرمائی۔

غرض قرآنی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرتِ سلیمہ کے مطابق ہے اور ہر ایک کے یہاں کی

استعداد کے مطابق ترقی درجات کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے جس سے اہل حاجت اور نیک کاموں کے لیے عملاً ہر وقت امداد مل سکے۔ اور ساتھ ہی اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبۂ کمال کے لیے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت اور ترغیب بھی پیش کر دی ہے اور اس کی خوبیاں اور برائیاں بھی بیان کر دی ہیں تاکہ اُمت کے باحوصلہ افراد ہمت کے شہروں سے اڑ کر اس سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔ چنانچہ اس آیت میں ان ہی ارباب کمال کا چہرہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ بلا کسی زمانے کی تخصیص کے اور بلا حالات کے اتار چڑھاؤ کے خیرات کرتے ہیں نہ رات دن کا خیال کرتے ہیں نہ پوشیدہ اور علانیہ کی بحث میں پڑتے ہیں بلکہ جیسا موقعہ ہوتا ہے خرچ کرتے ہیں۔

۸۱۵ ۔ جو لوگ اپنے مال شب و روز کھلم کھلا اور چھپا کر خرچ کرتے ہیں یعنی وہ لوگ جو اپنا سرمایہ ہر حال اور ہر وقت اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ اور خرچ سے کبھی نہیں کتراتے۔ گویا وہ اپنی صلاحیت و استعداد کی وجہ سے کمال کی ایسی منزل پر پہنچ جاتے ہیں کہ مال کی محبت کا ان کے دلوں میں نام و نشان نہیں رہتا۔ رضائے الٰہی کا حصول ہی ان کی زندگی کا دائمی نصب العین بن جاتا ہے ان کو حاجتمندوں کی حاجت روائی کے بغیر چین نہیں آتی۔ بھوکوں کی بھوک کا مداوا، مجاہدوں کی جہاد میں تیاری کے لیے اعانت ان کی طبیعتوں کا تقاضا بن جاتا ہے۔ روایات میں آتا ہے کہ آیت میں صدیق اکبرؓ کی اس دریا دلی کا منظر پیش کیا گیا ہے جب آپ نے ۴۰ ہزار دینار اس طرح اللہ کی راہ میں خرچ کیے دس ہزار دن میں، دس ہزار رات میں، دس ہزار پوشیدہ اور دس ہزار علانیہ۔ اور ابن جریر نے ایک ضعیف سند کے حوالہ سے حضرت علی رضؓ کا کردار پیش کیا ہے کہ آپ نے ۴ درہم خرچ کیے ایک رات میں ایک دن میں، ایک پوشیدہ اور ایک علانیہ۔ ابن المنذر نے انکشاف کیا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوفؓ اور عثمان بن عفانؓ نے جیش عسرۃ میں مال کثیر دیا تھا۔ امام بغوی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس آیت میں ان لوگوں کے کردار کی عکاسی کی ہے جو جہاد کے لیے گھوڑوں کی تربیت کرتے ہیں اور دن رات خلوت و جلوت میں وہ چارہ چرتے رہتے ہیں۔

آیتِ قرآنی کا مدلول

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اگرچہ آیت قرآنی کا منطوق تو اللہ کے راستہ میں خرچ کرنا ہے لیکن اس کے مدلول میں اہل و عیال پر جو کچھ خرچ کیا جاتا ہے وہ بھی داخل ہے۔ سعد بن ابی وقاص رضؓ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عیادت میں جو کچھ فرمایا تھا اس میں اس کی شہادت ہے۔

اے سعد رضائے الٰہی کی خاطر تم جو سرمایہ خرچ کرو گے اس کے ذریعہ اللہ تمہارا درجہ بلند کرے گا یہاں تک کہ جو سرمایہ اپنی بیوی پر بھی خرچ کرو گے اس کا بھی اجر ہے۔

مسند احمد میں عبداللہ بن مسعود رضی کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی آیا ہے۔
مسلمان جو کچھ بھی اپنے اہل و عیال پر خرچ کرتا ہے اگر ایمان کے ساتھ احتساب کی روح اس میں کارفرما ہو وہ بھی صدقہ ہے۔

بہر حال کچھ ہو آیت کا حکم عام ہے جو شخص بھی بلا قید زمانہ اور بلا تخصیص احوال خرچ کرتا رہتا ہے اس کو یہ آیت شامل ہے۔ اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پوشیدہ خیرات علانیہ سے بہتر ہے۔ کیونکہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے خفیہ کو آشکارا پر مقدم کیا ہے۔

۸|۶ - ان کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے اور ان کو نہ کوئی اندیشہ ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔
رب کے پاس اجر ہونا کنایہ ہے۔ عالم آخرت سے یعنی اس عالم عمل کے بعد جو عالم جزا اس کے بعد آ رہا ہے اس میں ان کے عمل کا اجر بالکل محفوظ ہے۔ اور محفوظ بھی ایسا کہ نہ تو آخرت میں اجر نہ ملنے کا کوئی اندیشہ اور ڈر ہوگا اور نہ مل جانے کے بعد چھن جانے کا کوئی غم نہ ہوگا۔ اور یا یہ مطلب ہے کہ اب وہ ایمان و یقین کی اس منزل میں ہیں کہ ان کو اجر نہ ملنے کا اندیشہ نہیں ہے بلکہ ان کو اجر ملنے کا یقین کامل ہے گویا ایمان کے ساتھ ان کو احتساب کی دولت بھی حاصل ہے اور آخرت میں ان کو اس کی جزا میں جو کچھ انعامات عطا فرمائے گا ان کو کسی حال میں کوئی غم نہ ہوگا نہ قبر میں نہ حشر میں۔

دراصل ہماری موجودہ ساری زندگی دو ناخوشگواریوں سے دوچار ہے ایک ڈر دوسرے غم۔ اگر ہمیں یہ ضمانت دے دی جائے کہ زندگی ایسی ہوگی جس میں ڈر اور غم نہ ہوگا تو گویا ہمیں پریشانیوں کے سارے کانٹوں سے نجات مل گئی اور سب سے اچھی زندگی کی ضمانت مل گئی۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کے حسن کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا اس کی شقاوت کی ساری روداد خوف اور غم میں محصور ہے۔ جونہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آ گئیں۔

اَلَّذِيْنَ يَاْكُلُوْنَ الرِّبٰوا لَا يَقُوْمُوْنَ اِلَّا كَمَا يَقُوْمُ الَّذِيْ يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطٰنُ مِنَ الْمَسِّ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْۤا اِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبٰوا ۘ وَاَحَلَّ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَرَّمَ الرِّبٰوا ؕ فَمَنْ جَآءَهٗ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ فَانْتَهٰى فَلَهٗ مَا سَلَفَ ؕ وَاَمْرُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ ؕ وَمَنْ عَادَ فَاُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۞ يَمْحَقُ اللّٰهُ الرِّبٰوا وَيُرْبِي الصَّدَقٰتِ ؕ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ اَثِيْمٍ ۞

جو لوگ سود لیتے ہیں اور اس سے پیٹ پالتے ہیں[۸۱۷] وہ کھڑے نہ ہو سکیں گے مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان کی چھوت نے باولا اور حواس باختہ کر دیا ہو۔ یہ[۸۱۸] اس لیے ہو گا کہ انہوں نے کہا کہ خرید و فروخت بھی سود کی طرح ہے[۸۱۹]۔ حالانکہ خرید و فروخت کو تو اللہ نے حلال کیا ہے اور سود کو حرام[۸۲۰]۔ لہٰذا اب جس کو بھی اس کے پروردگار کی یہ نصیحت پہنچ گئی اور وہ آئندہ سود لینے سے باز آ گیا تو جو کچھ پہلے لے چکا ہے وہ اس کا ہو چکا ہے اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے[۸۲۱]۔ اور جو شخص پھر سود لے گا وہ دوزخی گروہ میں سے ہے ہمیشہ عذاب میں رہنے[۸۲۲] والا۔ اللہ سود کو مٹاتا ہے

اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور یاد رکھو اللہ ناسپاس اور نافرمان سے خوش نہیں ہے[۸۲۳]۔

صدقہ اور سود کا اجتماعی زندگی میں تقابلی مطالعہ

اب تک مالیاتی مسائل کے سلسلے میں صدقات و خیرات، ان کے فضائل، ان کے قیود و شرائط کی نشاندہی ہوئی ہے۔ صدقات اگر ایک طرف معاملاتی زندگی کو آسان سے آسان تر بناتے ہوئے تو دوسری طرف معاملاتی گناہوں کی تکفیر کا سامان کرتے ہیں۔ صدقات کے ذریعہ انسان میں اخلاق و مروت خیر اندیشی اور رفاہِ عامہ کے لیے خیر سگالی کے جذبات کی تربیت ہوتی ہے اس کے بالکل برعکس سود میں محض بے مروتی، ضرر رسانی اور ظلم کی روح کارفرما ہوتی ہے اس لیے صدقات کے بعد سود کا تذکرہ فرمایا ہے اور بتادیا کہ صدقات میں جس قدر خیر ہے سود میں اسی نسبت سے برائی ہے[۱]

دراصل نیکی کی راہ میں خرچ کرنے کی استعداد نشوونما نہیں ہو سکتی تھی اگر اس کا حکم دیتے ہوئے ان باتوں سے بھی نہ روک دیا جائے جو اس کی ضد ہیں انفاق فی سبیل اللہ کے حکم کے ساتھ ہی سود کی بھی ممانعت کردی گئی جو دنیا کی تمام قوموں کی طرح عرب میں بھی رائج تھا۔

اللہ کا دین انسان میں باہمی محبت و ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے اسی لیے اس نے خیرات کا حکم دیا کہ ایک انسان دوسرے انسان کی حاجت روائی کرے اور اس کی احتیاج کو اپنی احتیاج سمجھے، لیکن سود خواری کی ذہنیت بالکل اس کی ضد ہے، سود خوار ایک انسان کو حاجت مند سمجھتا ہے تو اس کی مدد کا جذبہ اس کے اندر پیدا نہیں ہوتا بلکہ چاہتا ہے کہ اس کی احتیاج اور بے بسی سے اپنا کام نکال لے اور اس کی محتاجی کو اپنی دولت مندی کا ذریعہ بناتے۔ خود غرضی کا یہ جذبہ اگر بے روک بڑھتا ہے تو پھر اس حد تک پہنچ جاتا ہے کہ انسان میں انسانی ہمدردی کی بو باس تک نہیں رہتی، ایک بے رحم اور بے پناہ درندہ بن کر رہ جاتا ہے۔ قرآن نے اسی حالت کو آسیب زدگی سے تشبیہ دی ہے جسے عربی میں شیطان کے مس سے تعبیر کرتے ہیں۔ علاوہ بریں سود کا طریقہ سرمایہ داری کی راہوں کو کھولتا اور بڑھاتا ہے اور اسلام کا رخ

---

[۱] افادات شیخ الہند

اس کے خلاف ہے۔ وہ دولت کو پھیلانا چاہتا ہے۔ یمحق اللہ الربا و یربی الصدقات۔ میں صدقات اور سود کا تقابل مطالعہ پیش کر کے سود کی ممانعت کی علت واضح کر دی۔ دینِ حق کا مقصد یہ ہے کہ سود کو مٹائے خیرات کے جذبات کو ترقی دے۔ اگر خیرات کا جذبہ پوری طرح ترقی کر جائے تو سوسائٹی کا کوئی فرد محتاج و مفلس ہی نہیں رہ سکتا۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ سود صدقہ کی بالکل ضد ہے۔ صدقہ کی محرک بلند ہمتی، ہمدردی، فیاضی، ایثار اور رحم دلی ہے اور سود کی محرک بزدلی، خود غرضی، سنگ دلی اور دوسروں کی مشکلات سے فائدہ اٹھانے کی خواہش ہے۔ صدقہ ضرورت مندوں کو سہارا دینا چاہتا ہے اور سود گرے ہوؤں کا خون چوسنا چاہتا ہے۔ دونوں میں ضدین کا تقابل ہے اور فطرت کا اصول یہ ہے کہ کسی چیز کی حقیقت اس وقت تک کھل کر سامنے نہیں آتی جب تک اس کا تقابلی مطالعہ نہ کیا جائے۔ اسی اصول کی بنا پر قرآن نے اکثر چیزوں کے بیان میں یہ اسلوب اختیار کیا ہے کہ تقابلی تصویر پیش کرتا ہے۔ مثلاً اہلِ ایمان کا ذکر ہے تو اس کے ساتھ اہلِ کفر کا بیان آتا ہے جنت کا ذکر ہے تو اس کے ساتھ دوزخ کا بھی ذکر ہے۔ اسی انداز اور اسلوب کو قرآن نے یہاں بھی اپنایا ہے کہ صدقات کے بعد سود کا ذکر کر دیا۔ مقصد یہ ہے کہ ایک کی تاریکی دوسرے کی روشنی کو اور ایک کا جمال دوسرے کی بدصورتی کو بے نقاب اور نمایاں کر سکے۔ چنانچہ یہاں اب سود کے بارے میں ارشاد ہے۔

ربا کی لغوی اور شرعی حقیقت

۸۱۷۔ جو لوگ سود لیتے ہیں اور اس سے پیٹ پالتے ہیں۔ اصل ارشاد میں لفظ ربٰو ہے اس کے معنے بیاج اور سود کے ہیں۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

راس المال اصلی سرمایہ پر جو زیادتی ہو وہ ربا ہے لیکن قانون میں اس زیادتی کو خاص کرتے ہیں جو ایک مخصوص ہی طریقہ پر ہو۔

حافظ ابنِ حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

الربا مقصور ہے اور مد بھی بیان کیا گیا ہے لیکن شاذ ہے یہ ربا، یربو سے بنا ہے اور الف کے ساتھ لکھا جاتا ہے لیکن قرآن کے رسم الخط میں واو کے ساتھ ہے اور ربا کی اصل زیادتی ہے خواہ نفس شے میں ہو جیسے ارشادِ الٰہی ہے اھتزت و ربت (وہ لہلہائی اور بڑھی) یا مقابلہ میں ہو جیسے وہ درہم کے مقابلہ میں ایک درہم۔ کچھ کہتے ہیں کہ دونوں حقیقی معنے ہیں اور کچھ کی رائے میں پہلے حقیقی اور دوسرے مجازی ہیں۔ ابن سریج کہتے ہیں کہ یہ

دوسرے معنے میں حقیقت شرعیہ ہے۔
صاحب معجم المصنفین علامہ محمود حسن ٹونکی رقمطراز ہیں:
ربا اور بیع عربی زبان کے الفاظ ہیں جب تک کوئی اصطلاح شرعی لغوی معنے میں تبدیلی پیدا نہ کرے۔ قرآن وسُنت میں آئے ہوئے الفاظ کے معانی لغت عربی سے معلوم ہوتے ہیں ربا، لغۃ، زیادت ہے اور لسان العرب وغیرہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ حقیقت بیع کی معاہدہ فی تعاوض الاموال ہے لہذا لغوی لحاظ سے ربا، کی تعریف یہ ہے کہ لین دین کے معاہدے میں عوضین مماثلین میں سے ایک عوض کا دوسرے عوض پر زیادت مذکور ہونا یا عوضین میں سے عوض دین پر زیادت مذکور ہونا اور جب معاہدے میں زیادت مذکور ہوتی ہے تو اس زیادت کا نام عرب میں 'ربا' ہے وھو المتعامل فیما بین الناس اور معاہدے میں مذکور ہونے کی وجہ سے اس کو مشروط کہا جائے گا۔
حکیم الامت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں:
ربا وہ قرض ہے جو اس شرط پر ہو کہ قرضدار نے قرض خواہ سے جتنا لیا ہے اس سے زیادہ یا اس سے اچھا واپس کرے۔

عرب میں سُود کا رواج

عرب میں سُود خواری کا عام رواج تھا۔ تمام دولت مند سُود پر لین دین کرتے تھے۔ حضرت عباس ابن عبدالمطلب جو قریش کے سردار اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا تھے۔ تجارت کا کاروبار نہایت وسیع پیمانے پر پھیلا رکھا تھا اور اس تعلق سے سُود خواری میں نہایت شہرت رکھتے تھے چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حجۃ الوداع میں سُود کی حرمت کا اعلان کیا تو سب سے پہلے ان ہی کے سُود کو باطل قرار دیا۔ اور حضرت عثمان اور خالد بن الولید سُود پر قرض دیتے تھے۔ مسعود ثقفی طائف کا مشہور رئیس تھا اور اس کے بھائی عبد یا لیل، حبیب بن ربیعہ نہایت دولت مند تھے۔ بنو مغیرہ ان ہی لوگوں میں سُود پر دادوستد کرتے تھے، چنانچہ جب طائف فتح ہوا اور یہ چاروں بھائی اسلام لائے تو انھوں نے مغیرہ سے سُود کا تقاضا کیا۔
ان کے علاوہ طائف ایک سرسبز اور دولت مند شہر تھا اس لیے وہاں کے لوگ عموماً سُود پر بیوپار کرتے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی، ان میں ایک ضروری شرائطیہ

یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سُود خواری نہ کریں گے۔ اسی طرح یمن کے نجرانی سوداگر بھی سُودی کاروبار کرتے تھے ان سے بھی یہی شرط کی گئی۔

عرب میں رائج سُود کیا تھا؟

سُود کا عام اور متداول طریق یہ تھا کہ ایک مقررہ شرح پر قرض دیتے تھے اور راس المال کی ادائیگی کے لیے میعاد مقرر کر لیتے تھے۔ جب میعاد گزر جاتی تو اس کا تقاضا کرتے تھے۔ اگر مدیون اس کو ادا نہ کر سکتا تو میعاد میں اور اضافہ کر دیتے تھے اور اس کے عوض میں شرح سُود اور بڑھا دیتے۔ اسی نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر رکھی تھی جو سُود در سُود سے زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک میعاد مقرر کر کے کسی کو مثلاً روپیہ دیتے، مدت گزر جانے کے باوجود تقاضا کرنے پر مدیون اس رقم کو ادا نہ کر سکتا تو میعاد اور بڑھا دیتے لیکن اس کے معاوضہ میں اصل قرض میں بھی اضافہ کروا لیتے یہاں تک کہ کبھی اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائداد مستغرق ہو جاتی تھی یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشت کاروں کے ساتھ پیش آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشت کاروں کا تمام طبقہ چند دولت مندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ گرو تھا۔

یاد رہے کہ قرض صرف یہی نہیں کہ مال نقد دے کر مال واپس لیا جائے بلکہ یہ بھی قرض ہی میں داخل ہے کہ چیز دے کر اس کی قیمت اُدھار کی جائے جسے دین کہتے ہیں۔ چیز کی قیمت میں مدت کے اضافہ سے اضافہ بھی وہاں رائج تھا۔ شاہ ولی اللہ نے جو ربا کی تعریف کی ہے اس میں قرض اور دین دونوں داخل ہیں فرماتے ہیں۔ ہر قرض جو اس شرط پر ہو کہ قرضدار نے قرض خواہ سے جتنا لیا تھا اُس سے زیادہ یا اُس سے اچھا واپس کرے۔

حافظ ابن القیم ؒ فرماتے ہیں کہ جاہلیت میں سُود یہ تھا کہ قرض کی ادائیگی میں تاخیر ہوتی اور رقم میں اضافہ ہوتا جوں جوں ادائیگی میں تاخیر ہوتی اسی نسبت سے مال میں اضافہ ہوتا رہتا اور لکھا ہے کہ:

> مقروض پر مالی بار زیادتی کے ساتھ بڑھتا جاتا ہے اور اس طور پر بڑھتا ہے کہ خود اس مال کا نفع اسے نہیں ملتا اور سود خوار کے مال میں اضافہ اس طور پر سے ہوتا ہے کہ اس سے اس کے بھائی کو کچھ نہیں پہنچتا۔ یہی وجہ ہے کہ سُود میں آدمی اپنے بھائی کا مال بغیر وجہ کے باطل طور پر کھاتا ہے۔

مشہور محدث حافظ ابن جریر ؒ نے حضرت امام مجاہد ؒ سے نقل کیا ہے کہ زمانہ جاہلیت میں جو ربا

رائج تھا اور قرآن نے جسے منع کیا ہے وہ یہ ہے کہ کسی کو ایک میعاد مقررہ کے لیے قرض دے کر اس پر اصل پر زیادہ مقررہ زیادتی لی جائے۔ اگر وہ مقررہ میعاد پر وہ قرض ادا نہ کر سکے تو مزید میعاد اس شرط پر زیادہ کر دی جائے کہ سود میں اضافہ ہوگا۔ یہی بات حضرت قتادہ رض اور دوسرے ائمہ تفسیر سے بھی نقل کی ہے۔

اندلس کے مشہور امام تفسیر ابوحیان غرناطی نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں بھی جاہلیت کے رباکی یہی صورت لکھی ہے کہ اُدھار دے کر اس پر نفع لیتے اور جتنی مدت اُدھار کی بڑھ جائے اتنا ہی سود اس پر بڑھاتے کا نام رہا ہے۔

سود خوار کی حواس باختگی

۸/۱۸ ۔ وہ کھڑے نہ ہو سکیں گے مگر اس شخص کی طرح جسے شیطان کی چھوت نے باؤلا اور حواس باختہ کر دیا۔ جمہور شارحین قرآن کے خیال میں کھڑے ہونے سے مراد قیامت میں اُٹھنا ہے اور وہ مطلب یہ بتاتے ہیں۔ سود کھانے والے قیامت کو قبروں سے ایسے اُٹھیں گے جیسے آسیب زدہ اور مجنون[1] حدیث میں ہے کہ کھڑے ہونے سے مراد محشر میں قبر سے اٹھنا ہے کہ سود خوار جب قبر سے اٹھے گا تو اس پاگل و مجنون کی طرح اُٹھے گا جس کو کسی شیطان نے خبطی بنا دیا ہو[2]۔

اصل منظر تو یہ قیامت کے دن کا ہے کہ آخرت میں اپنی قبروں سے اُٹھنے پر یہ سود خوار سیدھے کھڑے نہ ہو سکیں گے، کھڑے ہوں گے بھی تو متوالوں، خبطیوں اور دیوانوں کی طرح گرتے پڑتے لڑکھڑاتے ہوئے۔ لیکن اس کا ایک ہلکا سا رنگ اسی دُنیا میں بھی نظر آتا ہے۔ مہاجن ساہوکار جو روپے کے پیچھے دیوانہ باؤلا ہوتا ہے واقعی ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کو جن بھوت چمٹ گیا ہے، اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے، اس پر سود بیاج ہی سوار رہتا ہے اور جس کی حرص و طمع کی پیاس دُنیا میں اتنی زیادہ ہوتی ہے۔ ضروری ہے کہ اس کا حشر بھی اسی مخبوط، جنون زدہ حالت کے ساتھ ہو، اہل کشف اور محققین کا بیان ہے کہ حشر میں انسان اسی صورت میں اُٹھے گا جس قسم کی سیرۃ اور عادتیں دُنیا میں اس پر غالب ہوں گی[3]۔

اہل عرب دیوانہ آدمی کو مجنوں آسیب زدہ کے لفظ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اور جب کسی شخص کے متعلق یہ کہنا ہوتا ہے کہ وہ پاگل ہو گیا ہے تو یوں کہتے ہیں کہ اُسے جن لگ گیا ہے۔ اسی محاورہ کو استعمال کرتے ہوئے قرآن سود خوار کو اس شخص سے تشبیہ دیتا ہے جو مخبوط الحواس ہو گیا ہو یعنی جس طرح وہ شخص عقل سے خارج

---

[1] افادات شیخ الہند، [2] معارف م شس [3] ماجدی

ہو کر غیر معتدل حرکات کرنے لگتا ہے۔ اسی طرح سُود خوار بھی روپے اور دولت کے پیچھے دیوانہ ہو جاتا ہے اور اپنی خود غرضی کے جنون میں کچھ پروا نہیں کرتا کہ اس کی سُود خواری سے کس کس طرح انسانی محبت واخوت اور ہمدردی کی جڑیں کٹ رہی ہیں۔ اجتماعی فلاح و بہبود پہ کس قدر تباہ کن اثر پڑ رہا ہے اور کتنے لوگوں کی بدحالی سے وہ اپنی خوش حالی کا سامان کر رہا ہے۔ یہ اس کی دیوانگی کا حال اس دنیا میں ہے اور چونکہ آخرت میں انسان اسی حالت میں اٹھایا جائے گا جس حالت میں اس نے دُنیا میں جان دی ہے اس لیے سُود خوار آدمی قیامت کے روز ایک باؤلے مخبوط الحواس انسان کی صورت میں اُٹھے گا لہ

قیامت میں سُود خوار کا بدحواس ہو کر اٹھنا اس کی دنیاوی بدحواسی کی پوری تمثیل ہوگی۔ دنیا میں سُود خوار لوگوں کا بھی یہی حال ہوتا ہے کہ وہ دن رات دوسروں کے مال و دولت چھیننے اور اپنی دولت کو ناجائز طریقوں سے بڑھانے میں ایسے مشغول رہتے ہیں کہ انہیں کسی کارِ خیر کا خیال نہیں آتا۔ تو قیامت میں بھی وہ ایسے ہی حواس کھوئے ہوتے اٹھیں گے۔ بعض مفسرین کہتے ہیں کہ آیت کا مطلب ہے کہ مرگی کے بیمار کی طرح بیہوش ہوں گے۔ جب لوگ قبروں سے نکل کر موقف کی طرف جائیں گے تو سُود خوار مرگی والے کی طرح گرے پڑے ہوں گے۔ یا یہ مطلب ہے کہ کبھی گرتے ہوں گے کبھی اٹھتے ہوں گے اور چونکہ سُود خوار جو غریبوں کے نقصان کرتا ہے اور روپیہ کا خاص طور پر اثر دل و دماغ پر زیادہ ہوتا ہے جیسا کہ عام طور سے کہ مال کے نقصان کا دماغ پر بہت زیادہ اثر پڑتا ہے اس لیے سُود خوار کے دل و دماغ کو قیامت میں بے کار کر دیا جائے گا عوف بن مالک رض کی روایت میں مرفوعاً آیا ہے کہ سُود خوار قیامت کے دن خبطی اور مجنون بن کر کھڑا ہوگا۔ بعض روایات میں سُود خوار کا خون کی نہر میں غوطہ کھانا بھی مروی ہے جیسا کہ معراج کے واقعات میں علامہ زرقانی نے بعض احادیث نقل کی ہیں۔ ان احادیث کا مطلب بھی یہی ہے کہ سرمایہ دار غریبوں کا خون چوستا ہے اس لیے سزا بھی اسی قسم کی تجویز کی گئی ہے۔

انسانی جسم پر آسیب کا اثر

اس فقرے کے مدلول سے علماء نے یہ بات بھی سمجھی ہے کہ جسم انسانی جنات اور شیاطین سے اثر قبول کرتا ہے۔ اسی کو آسیب کا اثر کہتے ہیں۔ خبیث جنات کا جسم انسان پر جو اثر ہوتا ہے اس کو شیطان کا مس کہتے ہیں۔ چنانچہ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں ان لوگوں کے خلاف ایک دلیل

لہ تفہیم القرآن

جو جنات کے اثر اور آسیب کے منکر ہیں۔ لیکن دوسرے شارحین قرآن کو اس سے اختلاف ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ اس تشبیہ سے یہ لازم نہیں آتا کہ قرآن عزیز خود اس عقیدے کی تعلیم دے رہا ہے کہ جنون مس شیطانی ہی سے ہوتا ہے بلکہ قرآن ایسے مواقع پر صرف مخاطبوں کے معتقدات کو دہراتا ہے اور چونکہ اہل عرب کا عقیدہ یہی تھا اس لیے قرآن نے ان کی فہم کی مناسبت اور مذاق کی رعایت سے یہ بات کہہ دی ہے۔ قاضی بیضاوی نے اس تشبیہ پر یہ نوٹ سپرد قلم فرمایا ہے کہ یہ تشبیہ ان کے خیال و اعتقاد کے مطابق آئی ہے۔ ان کا اعتقاد تھا کہ شیطان انسان پر اثر انداز ہوتا ہے اور اس کے نتیجہ میں مرگی ہو جاتی ہے۔ علامہ ابو السعود بھی قاضی صاحب کے ہمنوا ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ آیت قرآنی سے نہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ دماغی توازن کھونے کے حوادث یقیناً شیطانی اثر کا نتیجہ ہیں اور نہ آیت قرآنی اس کی نفی کرتی ہے۔ خود یہ بات کہ انسان پر مختلف صورتوں میں جنات کا اثر ہوتا ہے جسے ہم آسیب کہتے ہیں، علماء کے درمیان مختلف فیہ ہے۔ معتزلہ اور کچھ اہل السنۃ کہتے ہیں کہ شیطان وسوسہ کے سوا کوئی اثر اندازی نہیں کر سکتا۔ اور جمہور اہل سنت کہتے ہیں کہ جنات و شیاطین کے اثر سے انسان بیہوش اور مجنون ہو سکتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ظاہر تشبیہ کا تقاضا ہے۔ اگرچہ آیت کا منطوق یہ نہیں ہے۔ حافظ ابن القیم جوزی فرماتے ہیں کہ اطبا اور فلاسفہ نے بھی اسے تسلیم کیا ہے کہ صرع، بیہوشی یا جنون مختلف اسباب سے ہوتا ہے ان میں بعض اوقات جنات و شیاطین کا اثر بھی اس کا سبب ہوتا ہے۔ جن لوگوں نے انکار کیا ہے ان کے پاس بجز ظاہری استبعاد کے کوئی دلیل نہیں۔

کاروباری نفع اور سُود

۸۱۹ ۔ یہ اس لیے ہوگا کہ انھوں نے کہا کہ خرید و فروخت بھی سُود کی طرح ہے۔ یہ حالت اس واسطے ہوگی کہ انھوں نے حلال و حرام کو یکساں کر دیا اور صرف اس وجہ سے کہ دونوں میں نفع مقصود ہوتا ہے۔ دونوں کو حلال کہا۔ حالانکہ بیع اور ربا میں بڑا فرق ہے کہ بیع کو حق تعالیٰ نے حلال کیا ہے اور سُود کو حرام۔ بیع میں جو نفع ہوتا ہے وہ مال کے مقابلے میں ہوتا ہے جیسا کہ کسی نے ایک روپے کی قیمت کا کپڑا دو روپیہ میں فروخت کیا اور سُود وہ ہوتا ہے جس میں نفع بلا عوض ہو، ایک روپے کے بدلے دو روپے لیے۔ پہلی صورت میں چونکہ کپڑا اور روپیہ دو جدا جدا قسم ہیں، اور نفع اور غرض ہر ایک کی دوسرے سے جداگانہ ہے اس لیے ان میں مساوات اور برابری ناممکن ہے خرید و فروخت کی صورت میں ضرورت اور حاجت سے الگ ہو کر دونوں میں باہم موازنہ کی کوئی صورت نہیں ہو سکتی اور ضرورتیں سب کی مختلف ہیں۔ کسی کو ایک روپے کی اتنی حاجت ہوتی ہے کہ دس روپیہ قیمتی کپڑا بھی بیچ ہوتا ہے اور کوئی کپڑے کا اتنا ضرورت مند ہوتا ہے کہ وہ کپڑا جو بازار میں ایک روپیہ

میں ملتا ہے ضرورت کے تحت دس روپے دے کر بھی خرید لیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص ایک روپیہ والے کپڑے کو ہزار روپیہ میں خریدے گا تو یہ سود نہیں ہوگا کیونکہ دونوں میں موازنہ اور مساوات ممکن نہیں۔ اس کے لیے پیمانہ ضرورت اور رغبت ہے اور اس میں بے حد وحساب تفاوت ہے اس لیے سود ممکن نہیں برخلاف اس کے کہ ایک روپیہ کو دو روپے کے عوض میں فروخت کرے گا تو یہاں دونوں میں مساوات ہے اور اس مساوات کی وجہ سے ایک روپیہ ایک روپیہ کا بدل ہوگا اور دوسرا روپیہ بدل سے خالی ہو کر سود ہوگا اور شرعاً یہ معاملہ حرام ہوگا[۱]

اس فقرے میں سود خواروں کی اس سزا کی وجہ بیان ہوئی ہے کہ ان لوگوں کو یہ سزا کہ روزِ قیامت کو بدحواس ہو کر اٹھیں گے اس لیے ملی ہے کہ انھوں نے دو جرم کیے ایک تو یہ بذریعہ سود کے مال حرام کھایا دوسرے اس کو حلال سمجھنا اور حرام کہنے والوں کے جواب میں یہ کہا کہ بیع و شرا بھی تو ربا کی طرح ہے۔ جس طرح ربا کے ذریعے نفع حاصل کیا جاتا ہے اسی طرح بیع و شرا کے ذریعے نفع مقصود ہوتا ہے۔ اگر سود حرام ہے تو بیع بھی حرام ہے حالانکہ اس کے حرام ہونے کا کوئی قائل نہیں ہے[۲]

دراصل اندازِ تعبیر یوں ہونا چاہیے انما الربا مثل البیع یعنی سود لین دین بیع کی طرح ہے لیکن قرآن کے ان مخاطبوں نے جو سود کو حرام نہیں کہتے تھے اپنی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے یہ اندازِ تعبیر اختیار کیا کہ انما البیع مثل الربوا کہ بیع حلال ہونے میں ربوا کی طرح ہے اس طرح انھوں نے حلت کا اصلی رشتہ ربا کے ساتھ قائم کر کے یہ ظاہر کیا کہ اصلی حلال تو ربا ہے اور بیع تو حلال ہونے میں ربا سے مشابہت کی وجہ سے ثانوی درجہ میں ہے۔ بہرحال ان لوگوں نے فقط اس وجہ سے کہ دونوں میں نفع مقصود ہوتا ہے دونوں کو حلال سمجھ لیا۔ حالانکہ بیع اور ربا میں بڑا فرق ہے[۳]

قدیم جاہلیت اور آج کی روشن خیالی

مطلب یہ ہے کہ آج کل کے روشن خیالوں کی طرح زمانہ جاہلیت کے بیوقوفوں کا بھی یہ کہنا تھا کہ مالی نفع تجارت میں بھی ہوتا ہے پھر جب تجارت حرام نہیں تو سود کیوں حرام ہے؟ ان کے اس نظریے کی خرابی یہ ہے کہ وہ تجارت کی نوعیت اور سود کی نوعیت میں فرق نہیں سمجھتے اور دونوں کو ایک ہی قسم کی چیز سمجھ کر یوں استدلال کرتے ہیں کہ جب تجارت میں لگے ہوئے روپے کا منافع جائز ہے تو قرض پر دیتے ہوئے

---

[۱] افادات شیخ الہند [۲] معارف م ش [۳] معارف قرآن م ا

روپیہ کا منافع کیوں ناجائز ہے؟ اسی طرح کے دلائل موجودہ زمانے کے سُود خوار بھی سُود کے حق میں پیش کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ایک شخص جس روپے سے خود فائدہ اٹھا سکتا تھا اسے وہ قرض پر دوسرے شخص کے حوالے کرتا ہے وہ دوسرا شخص بھی اس سے بہرحال فائدہ ہی اٹھاتا ہے۔ پھر آخر کیا وجہ ہے کہ قرض دینے والے کے روپے سے جو فائدہ قرض لینے والا اٹھا رہا ہے اس میں سے ایک حصّہ وہ قرض دینے والے کو ادا نہ کرے۔ مگر یہ لوگ اس پر غور نہیں کرتے کہ دُنیا میں جتنے کاروبار ہیں خواہ وہ تجارت کے ہوں یا صنعت و حرفت کے یا زراعت اور خواہ انہیں آدمی اپنی محنت سے کرتا ہو یا اپنے سرمایہ اور محنت دونوں سے ان میں سے کوئی بھی ایسا نہیں ہے جس میں آدمی نقصان کا خطرہ مول نہ لیتا ہو۔ اور جس میں آدمی کے لیے لازماً ایک مقررہ منافع کی ضمانت ہو۔ پھر آخر پوری کاروباری دُنیا میں ایک قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا کیوں ہو جو نقصان کے خطرے سے بچ کر ایک مقرر اور لازمی منافع کا حقدار ہو[1] اس پر غور فرمائیے کہ:

تجارت میں نفع و نقصان دونوں کا احتمال ہر وقت لگا رہتا ہے اور تاجر کو نقصان سے بچنے کے لیے وقت، محنت، ذہانت سب کچھ خرچ کرنا پڑتا ہے۔ پھر تجارتی معاملہ تو ہر وقت ختم ہو جاتا ہے برخلاف اس کے مدت اور مہلت کے ساتھ ساتھ سود خوار کے مطالبات کی میزان بھی بڑھتی چلی جاتی ہے یہاں تک کہ اکثر اوقات قرضدار تباہی اور بربادی کے کنارے پر کھڑا ہو جاتا ہے[1]

امام رازی نے تفسیر کبیر میں قفال مروزی سے جو کچھ نقل کیا ہے وہ طرزِ ادا اور تعبیر کی تھوڑی سی تبدیلیوں کے بعد آج بھی پوری طرح پڑھنے کے قابل ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ جو لوگ ایک کاروبار میں اپنا وقت، اپنی محنت، اپنا سرمایہ، اپنی قابلیت رات دن کھپا رہے ہیں اور جن کی سعی و کوشش کے بل پر ہی اس کاروبار کا بار آور ہونا موقوف ہے ان کے لیے تو ایک مقرر منافع کی ضمانت نہ ہو بلکہ نقصان کا سارا خطرہ ان کے سر ہو مگر جس نے صرف اپنا روپیہ انہیں قرض دے دیا ہو وہ بے خطر ایک طے شدہ منافع وصول کرتا چلا جائے۔ یہ آخر کس عقل، کس منطق، اصولِ انصاف اور کس اصولِ معاشیات کی رو سے درست ہے کہ محض مہلت اور تاخیر وقت کے عوض میں منافع وصول کیا جائے اور یہ کس بنا پر صحیح ہے کہ ایک شخص ایک کارخانہ دار کو ۲۰ دن کے لیے بیس ہزار قرض دے اور آج ہی یہ طے کرے کہ آئندہ وہ دس سال تک برابر فی صدی سالانہ کے حساب سے اپنا منافع لینے کا حقدار ہوگا۔ حالانکہ کسی کو پتہ نہیں کہ کارخانہ کے تیار کردہ مال کی قیمتوں کا آئندہ دس سال میں کتنا اتار چڑھاؤ ہوگا اور یہ کہاں کا انصاف ہوگا کہ حادثہ

[1] تفہیم القرآن

کے وقت ملک میں پوری قوم خطرات کا مقابلہ کرے، جان اور مال کی قربانیاں دے مگر پوری قوم میں ایک جنگی قرض دینے والا سرمایہ دار ہی ایسا ہو کہ سو سال گزر جانے پر بھی اپنے قرض کا سود وصول کرتا رہے۔

تاجر اور سود خوار کے سرمایہ میں فرق

ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ قرآن نے ان کے اس نظریہ کو نقل ضرور کیا ہے مگر اس کو نظر انداز کر دیا ہے اس کی تردید نہیں کی ہے اس لیے کہ اس کی لغویت اتنی واضح ہے کہ اس کی تردید کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ یہ بداہتہً باطل اور قیاس کرنے والے کے دماغی توازن کو خراب ہونے کی دلیل ہے۔ ایک تاجر اپنا سرمایہ ایک ایسی مال کی تجارت پر لگاتا ہے جس کی بازار میں طلب ہے وہ محنت، زحمت اور خطرات مول لے کر اس مال کو ان لوگوں کے لیے قابلِ حصول بناتا ہے۔ پھر تاجر اپنے سرمایہ اور مال کو کھلے بازار میں مقابلہ کے لیے پیش کرتا ہے اور اس کے لیے منافع کی شرح بازار کا اتار چڑھاؤ مقرر کرتا ہے۔ ممکن ہے کہ بازار کا اتار چڑھاؤ اسے دیوالیہ بنا دے اور ہو سکتا ہے کہ اسے کچھ نفع حاصل ہو جائے۔

بتائیے کیا نسبت ہے ایک تاجر کے اس جانباز، غیور اور خدمت گزار سرمائے سے ایک سود خوار کے اس سنگ دل، بزدل، بے غیرت اور دشمن انسانیت سرمایہ کو جو تکلیف تو ایک بھی برداشت کرنے کو تیار نہیں لیکن منافع بٹانے کے لیے سر پر سوار ہو جاتا ہے۔

سود خوار کے سرمایہ کے دو بھیس

سود خوار کا سرمایہ دو بھیسوں میں ظاہر ہوتا ہے اور دونوں ہی میں وہ یکساں خونخوار اور بزدل ہے۔ ایک تو یہ بنیوں، پٹھانوں اور یہودیوں کی شکل میں نمودار ہوتا ہے اور اس کو سب ہی جانتے ہیں اور سود خوار کے سرمایہ کا دوسرا بھیس وہ ہے جس میں وہ رفاہی کاموں، اجتماعی منصوبوں اور ملکی اسکیموں کی سرپرستی کے نام سے آتا ہے۔ اس زمانے میں بہت سے لوگ اس بھیس میں اس کو بڑا معصوم سمجھتے ہیں لیکن غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کی بزدلی اور خود غرضی کی فطرتِ بد اس کے اس جامے میں بھی اسی طرح موجود ہے جس طرح پٹھان اور یہودی کے بھیس میں موجود ہے، دونوں صورتوں میں حقیقت کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں صورتوں میں سود خواروں کو صرف یہ پیشِ نظر ہے کہ ان کا سرمایہ محفوظ رہے، مقررہ سود ملتا رہے یا اس کے حساب میں

ـــــــــــ

لہ ماجدی

جمع ہوتا ہے۔اس کے برعکس ایک تاجر کا سرمایہ سب سے پہلے خود کو خطرے میں ڈالتا ہے اس کے لیے ایک لمحہ بھر بھی اس کا امکان نہیں ہے کہ وہ سود خوار کی طرح کسی کمین گاہ میں بیٹھ جائے اور دوسروں سے اپنا نفع وصول کرتا رہے

تجارت اور سود میں فرق

اب اس پر غور فرمائیے کہ تجارت اور سود میں اصولی فرق کیا ہے۔ سود کی خصوصیات کیا ہیں جن کی وجہ سے اس کی نوعیت بیع سے مختلف ہوئی۔

بیع کا اطلاق جس معاملہ پر ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ بائع ایک چیز کو فروخت کے لیے پیش کرتا ہے۔ بیچنے والے اور خریدار کے درمیان اس چیز کی ایک قیمت قرار پاتی ہے۔ اور اس قیمت کے بدلے میں خریدار کے اس چیز کو لیتا ہے۔ یہ معاملہ دو حال سے خالی نہیں ہوتا یا تو بیچنے والا وہ چیز خود محنت کر کے اور اپنا مال اس پر صرف کر کے لایا ہے یا اس نے اس کو کسی دوسرے سے خریدا ہے۔ دونوں صورتوں میں وہ اپنے اصل سرمایہ پر جو اس نے خریدنے یا مہیا کرنے میں صرف کیا تھا اپنے حق محنت کا اضافہ کرتا ہے اور یہی اس کا منافع ہے۔ اس کے مقابلے میں سود یہ ہے کہ ایک شخص اپنا سرمایہ ایک دوسرے شخص کو قرض دیتا ہے اور یہ شرط کر لیتا ہے کہ میں اتنی مدت میں اتنی رقم تجھ سے اصل سرمایہ دار پر زیادہ لوں گا۔ اس معاملہ میں سرمایہ کے مقابلے میں سرمایہ ہے اور مہلت کے مقابلے میں وہ زیادہ رقم ہے جس کی تعیین پہلے بطور ایک شرط کر لی جاتی ہے اسی زائد رقم کا نام سود ہے جو کسی خاص مال یا چیز کا عوض نہیں بلکہ محض مہلت کا معاوضہ ہوتا ہے۔ پس سود کی تعریف یہ ہوئی کہ قرض میں دیئے ہوئے سرمایہ پر جو زائد رقم مدت کے مقابلہ میں شرط اور تعیین کے ساتھ لی جائے وہ سود ہے گویا سرمایہ پر اضافہ، اضافہ کی تعیین مدت کے لحاظ سے اور معاملہ میں اس کا مشروط ہونا۔ یہ تین وہ اجزائے ترکیبی ہیں جن سے سود بنتا ہے اور ہر وہ معاملہ قرض جس میں یہ تینوں اجزاء پائے جاتے ہوں ایک سودی معاملہ ہے۔

ا۔ بیع اور سود میں اصولی فرق یہ ہے کہ بیع میں خریدار اور بیچنے والے کے درمیان منافع کا مبادلہ برابری کے ساتھ ہوتا ہے کیونکہ خریدار اس چیز سے فائدہ اٹھاتا ہے جو اس نے بیچنے والے سے لی ہے اور بیچنے والا اپنی محنت، ذہانت اور وقت کی اجرت لیتا ہے۔ اس کے برعکس سودی لین دین میں منافع کا مبادلہ برابری کے ساتھ نہیں ہوتا، سود لینے والا تو مال کی ایک مقدار لے لیتا ہے لیکن سود دینے والے کو اس کے مقابلے میں صرف مہلت ملتی ہے جس کا نفع بخش ہونا یقینی نہیں۔ اگر قرضدار نے اپنی شخصی ضرورتوں کے لیے قرض لیا ہے تو مہلت اس کے لیے نافع نہیں بلکہ یقیناً نقصان دہ ہے اور اگر اس نے یہ قرض تجارت، زراعت، صنعت و حرفت میں لگانے کی غرض سے لیا ہے تو مہلت میں جیسے اس کے لیے نفع کا امکان ہے اسی طرح نقصان کا بھی

امکان ہے۔ لیکن قرض خواہ بہرحال اس سے نفع کی مقررہ مقدار وصول کرتا ہے خواہ اس کو اپنے کاروبار میں نقصان ہو یا فائدہ۔ پس سُود کا معاملہ یا تو ایک فریق کے فائدے اور دوسرے کے نقصان پر ہوتا ہے یا ایک کے یقینی اور دوسرے کے غیر یقینی فائدے پر۔

۲۔ خرید و فروخت میں بیچنے والا خریدار سے خواہ کتنا نفع کمائے بہرحال وہ صرف ایک بار لیتا ہے لیکن سُود کے معاملہ میں اصلی سرمایہ دینے والا مسلسل اپنے مال پر منافع وصول کرتا رہتا ہے اور وقت کی رفتار کے ساتھ ساتھ اس کا منافع بڑھتا چلا جاتا ہے۔

۳۔ خرید و فروخت میں چیز اور اس کی قیمت کا مبادلہ ہونے کے ساتھ ہی معاملہ ختم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد خریدار کو کوئی چیز بیچنے والے کو واپس دینی نہیں ہوتی لیکن سُود کے معاملے میں مدیون راس المال لے کر صرف کر چکتا ہے اور پھر اس کو وہ صرف شدہ چیز دوبارہ حاصل کر کے سُود کے اضافہ کے ساتھ واپس دینی پڑتی ہے

۴۔ تجارت اور صنعت و حرفت اور زراعت میں انسان محنت اور ذہانت صرف کرتا ہے اور اس کا فائدہ لیتا ہے مگر سُودی کاروبار میں وہ محض اپنا ضرورت سے زائد مال دے کر بلا کسی محنت و مشقت اور صرف مال کے ذریعے دوسروں کی کمائی میں شریک غالب بن جاتا ہے اس کی حیثیت اصطلاحی شریک کی نہیں ہوتی جو نفع و نقصان دونوں میں شریک ہوتا ہے بلکہ وہ ایسا شریک ہوتا ہے جو بلا لحاظ تناسب نفع اپنے مقرر اور مشروط منافع کا دعویدار ہوتا ہے۔[1]

سُود کی حُرمت کا اعلان

۸۲۰۔ حالانکہ خرید و فروخت کو اللہ نے حلال کیا ہے اور سُود کو حرام۔ اس فقرے میں ان لوگوں کو اس بات کا کہ تجارت سُود کی طرح ہے اللہ تعالیٰ نے یہ جواب دیا ہے کہ یہ لوگ بیع کو ربا کی مثل اور برابر قرار دیتے ہیں حالانکہ حکمِ خداوندی ان دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ایک کو حلال قرار دیا اور دوسرے کو حرام، پھر دونوں کیسے برابر ہو سکتے ہیں۔

اس جواب میں یہ بات قابلِ غور ہے کہ ان لوگوں کا اعتراض تو عقلی طور پر تھا کہ جب دونوں معاملوں کا مقصد نفع کمانا ہے تو دونوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہیے سو اللہ تعالیٰ نے ان کے عقلی شبہ کا جواب عقلی طور پر فرق بیان کر کے نہیں دیا بلکہ حاکمانہ انداز میں یہ جواب دیا کہ مالک الملک والملکوت اللہ جل شانہ ہے وہی ہر

[1] سُود

چیز کے نفع وضرر اور بھلے بُرے کو پوری طرح جانتا ہے۔ جب اس نے ایک کو حلال اور دوسرے کو حرام قرار دے دیا تو سمجھ لو کہ جس چیز کو حرام کیا ہے اس میں ضرور کوئی نقصان وضرر اور کوئی خیانت ہے۔ خواہ عام انسان اس کو محسوس کرے یا نہ کرے۔ کیونکہ مجموعہ نظام عالم کی پوری حقیقت اور اس کے نفع وضرر کا احاطہ صرف وہی علیم وخبیر کر سکتا ہے جس کے علم سے کوئی ذرہ جہان چھپا ہوا نہیں ہے۔ عالم کے افراد یا جماعتیں اپنے مصالح اور مضرتوں کو معلوم کرسکتے ہیں لیکن پورے عالم کے نفع وضرر کو نہیں پہچان سکتے۔ بعض چیزیں ایسی ہوتی ہیں کہ وہ کسی شخص یا جماعت کے حق میں مفید نظر آتی ہیں مگر پوری قوم یا ملک کے لیے اس میں مضرت ہوتی ہے [1]

گویا یوں کہا گیا ہے کہ جب حکیم مطلق نے ایک معاملہ کو جائز اور دوسرے کو ناجائز قرار دیا ہے تو اس کے معنے ہی یہ ہیں کہ جائز کے اندر بے شمار منافع ومصالح اور حرام میں بے حد مفاسد ونقصانات ہیں اور بالفرض کسی کی سمجھ میں یہ مصالح ومفاسد نہ بھی آئیں، جب بھی حاکم مطلق کا حکم تو بہر حال واجب العمل ہے۔ اسلام کے جو احسانات ساری دُنیا پر اور بہت روشن نمایاں حیثیت سے ہیں۔ ان ہی سے ایک سُود کی حرمت ہے اس کے مفاسد سب پر روشن ہو چکے تھے اور سب اس سے عاجز ہو چکے تھے لیکن قطعی اور کلی صورت میں حرام اسے دُنیا کے ضابطوں اور شریعتوں میں صرف اسلام نے ہی قرار دیا۔ سُود خوار کے دل میں شقاوت وسنگدلی اور حرص مال اور بلا مشقت مال ہاتھ آجانے سے نفس میں دنائت اور زر پرستی، اور ساہوکاروں کا بُخل اور باہمی حسد ورقابت اور قرضدار بیچارے کی بے حرمتی وتذلیل کے واقعات پیش پا افتادہ تھے لیکن کسی انسانی دماغ میں ان کی بندش کا خیال نہ آیا۔ اصلاح حال کی جو کوشش ہوئی ہیں وہ صرف شرح سُود کی تحدید تک رہی ہیں۔ یونان میں سولن نے انگلستان میں بیکن اور یورپ میں ابائے کلیسا کے جوش اصلاح وافادۂ خلق کی کائنات کل اسی قدر ہے۔ یہ فخر قیامت تک کے لیے عرب کے اُمی کے ساتھ مخصوص ہوگیا کہ اس انسانیت کُش رسم کی حُرمت کی منادی اس کی زبان سے کرائی گئی، اور حرم الربوا کا زلزلہ افگن نعرہ قرآن نے لگایا [2]

نفع آور کاروبار کی صورتیں

دراصل اس آیت نے ہر شخص کو یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنی املاک کو نفع آور کاروبار میں لگائے۔ نفع کمانے کا ذریعہ نقد سرمایہ ہوتا ہے۔ تاریخی طور پر نقد سرمایہ کو نفع آور کاروبار میں لگانے کی چار صورتیں پائی جاتی ہیں۔

۱۔ خود کاروبار کرنا اور اس سے ہونے والے نفع کو اپنا سمجھنا۔

[1] معارف م ش [2] ماجدی

۲۔ کسی کاروبار میں سرمایہ کے ساتھ شریک ہو جانا اور نفع میں طے شدہ نسبت کے مطابق حصہ دار بن جانا۔
۳۔ خود کاروباری عمل میں حصہ نہ لینا بلکہ سرمایہ کو اس شرط پر کسی کاروبار کے سپرد کر دینا کہ وہ نفع کا ایک حصہ مالک کو دے گا۔
۴۔ سرمایہ کو ایک متعین شرح سود پر قرض دینا

پہلی شکل میں نقد سرمایہ کے علاوہ ملکیت کی دوسری قسمیں بھی استعمال کی جاتی ہیں۔ سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگانے کی بعض جدید شکلیں مثلاً کمپنیوں کے حصے خریدنا یا سرکاری بانڈ تمسکات یا بچت کے سرٹیفکیٹ خریدنا بھی معمولی سے فرق کے ساتھ مذکورہ بالا چار شکلوں میں سے کسی نہ کسی شکل کے تحت آجاتی ہیں۔ ذیل میں ہم ہر شکل پر الگ الگ غور کریں گے۔ اصطلاح میں نفع کو ربح اور جبکہ سود کو ربا کہتے ہیں۔

ذاتی کاروبار میں نفع کیا ہے؟

پہلی شکل نفع کمانے کی سب سے ابتدائی اور فطری شکل ہے۔ یہ شکل قرآن کے اس فقرے کا سب سے پہلا مطلق ہے۔ عام طور پر انسانیت نفع کمانے کے اس طریقہ کو صحیح سمجھتی ہے کیونکہ یہ نفع مالک کا کمایا ہوا نفع ہے۔ ایک کاروباری فرد ایک متعین سرمایہ کی مدد سے مختلف پیداوار خدمات اور خام مال کو یکجا کر کے ایک پیداواری عمل شروع کرتا ہے۔ ایک عرصہ تک وہ اس عمل میں مشغول رہتا ہے۔ پھر جب مال تیار ہو جاتا ہے تو بازار میں لا کر فروخت کرتا ہے۔ تیار شدہ مال کی فروخت سے اُسے جو آمدنی ہوتی ہے وہ اس اصل سرمایہ سے زیادہ ہوتی ہے جو اس کی تیاری میں صرف کیا گیا ہے۔ آمدنی اور لاگت کا یہ فرق نفع کہلاتا ہے۔ جس مثال پر ہم غور کر رہے ہیں اس میں اس نفع کے اندر کاروباری فرد کی ان خدمات کا معاوضہ بھی شامل ہے جو اس نے عام منیجر، کاریگر یا مزدور کے طور پر انجام دی ہوں۔ عام طور پر نفع اس اُجرت سے زیادہ ہوتا ہے جو یہ کاروباری فرد کسی دوسری جگہ ملازمت حاصل کر سکتا تھا۔ اگر ہم مجموعی منافع میں سے لاگت کے علاوہ اس اُجرت کو بھی وضع کر دیں تو جو رقم بچتی ہے وہ کاروبار کا خالص منافع کہی جا سکتی ہے۔ اس پر ہم انشاء اللہ تفصیلی بحث اگر انفاس حیات قفس عنصری میں رواں رہے پانچویں پارے میں کریں گے۔

شرکت کا کاروبار اور نفع

سرمایہ کے نفع آور استعمال کی دوسری شکل یہ ہے کہ ایک فرد اپنے سرمائے کے ساتھ دوسرے فرد یا افراد سے مل کر کاروبار کرے۔ کاروبار میں ہر شریک سرمایہ اور کاروباری جدوجہد دونوں کے ساتھ آتا ہے۔ اس

شکل میں نفع و نقصان میں ہر شریک پہلے سے طے شدہ نسبت کے مطابق حصہ دار ہوگا۔ یہ شرکت کی سادہ ترین شکل ہے۔ اس شکل میں اور ذاتی کاروبار میں ہونے والے نفع کے اندر اصولاً کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ اس لیے اس شکل میں نفع کے وقوع اور اس کے استحقاق پر علیحدہ گفتگو کی کوئی ضرورت نہیں۔

شرکت سے متعلق تفصیلی قانونی بحثوں کا مطالعہ اسلامی قانون کی کتابوں کی مدد سے کیا جاسکتا ہے۔ تفصیلات میں مختلف فقہاء کے درمیان جو اختلاف ہے اس کی نشاندہی یہاں ضروری نہیں۔ ہم صرف بعض اہم اور ناگزیر باتوں کا ذکر کرتے ہیں۔ اگر دو فریق برابر سرمایہ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوں تو حضرت امام مالکؒ اور حضرت امام شافعیؒ کے نزدیک ضروری ہے کہ وہ دونوں نفع اور نقصان میں برابر کے شریک ہوں لیکن امام اعظم رح کے نزدیک وہ غیر مساوی نسبتیں بھی طے کر سکتے ہیں کیونکہ اگرچہ ان کا سرمایہ برابر ہے لیکن کاروباری صلاحیتوں اور عملی جدوجہد کے اعتبار سے دونوں کے درمیان فرق ممکن ہے۔ شرکت کی اس عام شکل کو فقہی اصطلاح میں شرکۃ العنان کہتے ہیں۔ اس میں شرکار کی ذمہ داری سرمائے میں ان کے حصوں کی نسبت سے متعین ہوتی ہے۔ کاشانی نے بدائع الصنائع میں، ابن رُشد نے بدایۃ المجتہد میں اس پر بحث کی ہے۔

شرکت کی ایک اختلافی شکل شرکۃ المفاوضہ ہے۔ شرکار اپنے تمام سرمایہ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوتے ہیں۔ لیکن ان سرمایوں کا باہم مساوی ہونا ضروری ہے۔ خسارہ کی شکل میں شرکار کی ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے نفع کی شکل میں ہر شریک کو برابر حصے ملتے ہیں۔ شرکت کی اس شکل کو صرف فقہ حنفی میں صحیح قرار دیا گیا ہے۔

مضاربت کے ذریعے نفع آوری

سرمایہ کو نفع آور کاروبار میں لگانے کی تیسری شکل یہ ہے کہ مالک اپنا سرمایہ کسی کاروباری فرد کے سپرد کرے۔ صاحب سرمایہ صرف سرمایہ فراہم کرے اور کاروباری فریق اسی سرمایہ کے ذریعے کاروبار چلائے۔ یہ مضاربت کی سادہ ترین شکل ہے جس میں ایک شریک صرف سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا شریک صرف کاروباری جدوجہد کرتا ہے سرمایہ نہیں لگاتا۔ کاروبار میں نفع ہوگا تو دونوں فریق اس نفع میں طے شدہ نسبتوں کے مطابق حقدار ہوں گے۔ کاروبار میں نقصان ہوگا تو اس کو سرمایہ لگانے والے برداشت کرے گا۔ کاروباری فریق کو صرف یہ نقصان ہوگا کہ اسے اپنی سعی و جہد کا کوئی صلہ نہ مل سکے گا۔ کسی فریق کے حق میں بہر صورت کسی متعین رقم کی ادائیگی کا معاہدہ نہیں کیا جاسکتا۔ سرمایہ فراہم کرنے والا یہ شرط نہیں پیش کرسکتا کہ نفع ہو یا نقصان اسے ایک متعین رقم ضرور ملنی چاہیے۔ اسی طرح کاروباری جدوجہد کرنے والا فریق یہ شرط نہیں طے کرسکتا کہ نفع ہو یا نقصان اسے ایک متعین رقم ضرور ملنی چاہیے۔ البتہ نفع کی تقسیم کے لیے دونوں فریق باہمی رضامندی سے جو تناسب بھی چاہیں طے کر

سکتے ہیں۔ فقہاء نے اس بات کی صراحت کردی ہے کہ سرمایہ فراہم کرنے والا فریق نقصان کی ذمہ داری کاروباری فریق کے سر نہیں ڈال سکتا۔ وہ یہ طے نہیں کرسکتا کہ نقصان کی صورت میں بھی اپنا اصل سرمایہ واپس لینا چاہیے کاروبار میں خسارے کے باعث اگر پورا سرمایہ بھی ڈوب جائے تو اس کی یا اس کے کسی حصے کی ادائیگی کاروباری فریق کے ذمے نہ ہوگی۔ مضاربت کے سلسلے میں تفصیل مباحث اور اس ضمن میں مختلف مکاتیب فقہ کے درمیان اختلافی امور پر بحث کے لیے بدائع الصنائع کاشانی، ہدایۃ المجتہد ابن رشد اور الفقہ علی المذاہب الاربعہ ملاحظہ ہو۔

کرایہ کے ذریعے نفع آوری

اپنی ملکیت کے ذریعے نفع آور استعمال کی جائز شکلوں میں سے ایک شکل یہ بھی ہے کہ اسے کرایہ پر دیا جائے۔ کرایہ پر صرف وہی چیزیں دی جاسکتی ہیں جو صرف میں نہ آتی ہوں بلکہ استعمال کی جاتی ہوں۔ مثلاً زمین مکان، مشین، فرنیچر، برتن اور دوسری اشیائے صرف اور جانور وغیرہ۔ (بدائع الصنائع)

استعمال اور صرف میں بنیادی فرق یہ ہے کہ استعمال کی جانے والی چیز خود برقرار رہتی ہے اور ایک عرصہ تک اپنے استعمال کرنے والے کو چند فوائد منتقل کرسکتی ہے صرف کی جانے والی چیزوں سے فائدہ اٹھانے کے عمل میں یہ چیزیں بذاتِ خود اپنا وجود کھو بیٹھتی ہے مثلاً کھانے پینے کی چیزیں انسان کے بدن کا جز بن جاتی ہیں یا خام صنعتی مال جو دوسرے مال کی تیاری میں لگ جاتا ہے۔ فقہی اصطلاح میں اشیاء کے صرف کو استہلاک کہا گیا ہے یعنی ایسا استعمال جس میں خود وہ ہلاک ہوجاتی ہے اپنا امتیازی وجود کھو بیٹھتی ہے۔ اس کے برعکس کرایہ پر دی جانے والی چیزیں پوری طرح صرف ہوجانے کے بجائے گھسنے اور پرانے ہونے کی حد تک متاثر ہوتی ہیں۔ استعمال سے ان کی وہ عمر کم ہوجاتی ہے جس کی حد تک وہ مزید استعمال کی جاسکتی ہیں اصولی طور پر اسلامی قانون میں کرایہ بھی کسی چیز کے استعمال کے فائدے کی قیمت کو کہتے ہیں کرایہ پر دی جانے والی چیز اصل مالک ہی کی ملکیت رہتی ہے مگر اس کے فوائد استعمال کرایہ پر لینے والے کی ملکیت بن جاتے ہیں۔ اشیائے صرف کا کرایہ پر لین دین اس لیے درست نہیں ہے کہ وہ ایسے فائدوں کی حامل نہیں ہوتی ہیں جو اصل شے کو برقرار رکھتے ہوئے حاصل کیے جاسکیں۔ ایک صاحبِ بصیرت فقیہ نے کرایہ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے۔

اجارہ لغوی اعتبار سے فائدے کی بیع کا نام ہے اسی لیے اہلِ مدینہ اسے بیع کہتے ہیں اور مراد لیتے ہیں۔ فائدے کی بیع اسی وجہ سے اس معاملہ میں عوض کو اجرت کہا گیا ہے اور اجرت کے لغوی معنے فائدے کے ہیں۔ درختوں یا انگور کی بیلوں کو ان کے پھل کی خاطر کرایہ پر نہیں دیا جاسکتا کیونکہ پھل عین ہیں اور اجارہ منفعت کی بیع کو کہتے ہیں۔ درہم

دینار یا ان کی دھات کا کرایہ پر لین دین جائز نہیں ہے۔

اس میں صراحت کر دی گئی ہے کہ نقد سرمایہ کو کرایہ پر نہیں دیا جاسکتا ہے۔ نقد سرمایے کو خرچ کیے بغیر اس سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا۔ وہ خود باقی رہتے ہوئے اپنے فوائد استعمال منتقل کرنے کی صلاحیت نہیں رکھتا۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ اگر انفاس حیات قائم رہے تو پارہ ۲۰ میں آئے گی۔ ایسے ہی زرعی زمینوں کے کرایے یعنی لگان اور مزارعت کے ذریعے نفع آوری کے مباحث انشاء اللہ پارہ ہشتم میں آئیں گے۔ نفع کمانے کے یہ تمام ذرائع احل اللہ البیع کے عنوان میں داخل ہیں۔

سرمائے کے نفع آور استعمال کی شکل

اس کے بعد دوسرے فقرے وحرم الربوا میں سرمائے کے نفع آور استعمال کی ایک رائج شکل یہ بھی ہے کہ مالک اپنے سرمایہ کو کسی دوسرے فرد کو قرض کے طور پر دے اور اس سے ایک مدت کے بعد اصل رقم کی واپسی اور اس مدت تک ایک متعین سالانہ شرح کے مطابق سود حاصل کرنے کا مطالبہ کر کے معاہدہ کرے۔ اسلام نے اس شکل کو حرام قرار دیا ہے اور اسی کو ربا کہا ہے۔

یہاں ہم ان قرضوں پر لیے جانے والے سود پر بحث نہیں کریں گے جو ضروریات زندگی کی تکمیل اور غیر کاروباری اغراض کے لیے لیے جاتے ہیں۔ اس قسم کے سود کی برائیاں بالکل الم نشرح ہیں۔ ہم یہاں یہ بتانا چاہتے ہیں کہ اس سود کو کیوں حرام قرار دیا گیا ہے جو سرمایہ دار کسی کاروباری فرد سے کاروباری اغراض کے لیے دیئے جانے والے قرض پر وصول کرتا ہے۔

کاروباری قرض پر سود

پیداآور کاروبار عدم تیقن کی فضا میں انجام پاتا ہے۔ نفع ایک غیر یقینی امر ہے۔ کاروبار میں سرمائے کی شرکت لازماً نفع پر منتج نہیں ہوتی کیونکہ کاروبار میں نفع اور نقصان دونوں کا امکان رہتا ہے۔ جب سرمایہ کا کاروبار میں لگنا لازماً نفع کے لیے نتیجہ خیز نہیں تو یہ بات انصاف کے خلاف ہے کہ اس سرمایہ پر بہر صورت ایک متعین سالانہ نفع کا مطالبہ کیا جائے۔ کاروبار میں لگے ہوئے سرمائے پر نفع کی ایک مقرر شرح کا مطالبہ اسی صورت میں حق بجانب ہو سکتا ہے۔ جب خود کاروبار میں نفع کا ہونا اور اس کی مقدار متعین اور یقینی ہو۔ چونکہ ایسا نہیں ہے اس لیے سرمایہ پر ایک متعین شرح سود کی ادائیگی کا مطالبہ درست نہیں قرار دیا جاسکتا۔

نفع آوری سرمایہ کی ذاتی اور لازمی صفت نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو جس کاروبار میں بھی سرمایہ لگایا جاتا نفع

ہوتا۔ سرمایہ کاروباری فیصلوں کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اس کی مدد سے عوامل پیدائش کو یکجا کیا جاسکتا ہے۔ پیداوار حاصل کی جاسکتی ہے لیکن اسے اس بات میں کوئی دخل نہیں کہ اس پیداوار کی فروخت سے آمدنی کتنی ہوتی ہے نفع کا انحصار آمدنی پر ہے نہ کہ پیداوار کی مقدار پر۔ سرمایہ اور سامان سرمایہ پیداواری عمل میں جو حصہ بھی لیتے ہیں وہ پیداوار کی تیاری تک محدود ہے۔ یہ پیداوار بازار میں فروخت ہو سکے گی یا نہیں، کس قیمت پر فروخت ہوگی اور اس کی فروخت سے حاصل ہونے والی مجموعی آمدنی لاگت سے کم ہوگی یا اس سے زیادہ ان باتوں کا انحصار سرمایہ پر نہیں دوسرے امور پر ہے۔ کاروباری فرد سے کاروبار میں لگائے جانے والے قرض سرمایہ پر سود کے مطالبہ کی غیر معقولیت کو سمجھنے کے لیے اس صورتحال پر غور کیجئے کہ جب کاروبار میں خسارہ ہوا ہو۔ ایک طرف تو کاروباری کو خسارے کے باوجود اس قرض کی واپسی کا انتظام کرنا ہے اور دوسری طرف وہ اپنی سعی و جہد کے باوجود ایک عرصہ تک کاروبار کے نتیجہ میں کوئی آمدنی حاصل نہیں کرسکا۔ اس کے ساتھ ہی اس سے یہ مطالبہ کرنے کی کیا بنیاد ہے کہ وہ اپنی جیب سے سود کی رقم بھی ادا کرے؟ چونکہ قرض سرمایہ دینے والا کاروبار میں نقصان کی کوئی ذمہ داری نہیں لیتا اور اپنا پورا سرمایہ واپس لیتا ہے لہٰذا اگر قرض سرمایہ لے کر کاروبار کرنے والے کو نفع ہو تو اس شکل میں بھی سرمایہ دار کو اس نفع میں سے کسی حصہ کا حق نہیں پہنچتا۔ اس کے سرمایہ نے دراصل کاروبار میں کوئی حصہ ہی نہیں لیا ہے۔ یہ بات بظاہر قابلِ تعجب معلوم ہوگی لیکن تھوڑے سے غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہے۔ قرض سرمایہ بحفاظت واپسی کی شرط پر دیا جاتا ہے۔ قرض دیتے وقت سرمایہ دار کاروباری سے اس بات کی قانونی ضمانت حاصل کرلیتا ہے کہ اس کا اصل سرمایہ واپس کردیا جائے گا۔ عام طور پر اس غرض کے لیے کاروباری فرد کو اپنا کارخانہ، کوئی اور جائداد یا کوئی ایسی چیز ضمانت میں دینی پڑتی ہے جس کے ذریعے خسارے کی شکل میں اصل سرمایہ کی بازیافت ممکن ہو۔ کاروباری فرد بلاشبہ قرض لیے ہوئے سرمایہ کو عوامل پیدائش کی فراہمی اور مختلف کاروباری اغراض کے لیے استعمال کرتا ہے لیکن استعمال میں آنے کے باوجود سرمایہ اس خطرے سے بری الذمہ رہتا ہے جو اس استعمال میں مضمر ہے۔ قرض سرمایہ اس عدم تیقن سے بری اور بلند رہتا ہے جو کاروبار کا خاصہ ہے۔ اگر کاروباری فیصلوں کی غیر موزونیت کے سبب سرمایہ کا ایسا استعمال عمل میں آئے جس کے نتیجہ میں کاروبار میں خسارہ ہو تو اس سرمایہ پر کوئی اثر نہیں پڑتا جو عملاً استعمال کیا جارہا ہے اس خسارے کا تمام تر اثر کاروباری فرد پر پڑتا ہے۔ اسے کسی نہ کسی طرح اصل سرمایہ کی واپسی کا اہتمام کرنا پڑتا ہے۔ اگر وہ کسی ذریعے سے اتنا سرمایہ دوبارہ فراہم نہیں کرسکتا تو اس خسارے کا اثر اس کی جائداد پر پڑتا ہے جو اس نے ضمانت میں درج کرائی ہے۔ لہٰذا کاروبار میں پیش آنے والے خطرات اور عدم تیقن کی کیفیت کو برداشت کرنے والی چیز وہ سرمایہ نہیں جو قرض لے کر استعمال کیا جارہا ہے بلکہ اصل سرمایہ کی واپسی کے وہ متبادل ذرائع یا وہ چیزیں ہیں جن کی سرمایہ دار کو ضمانت دی گئی ہے۔

دراصل پیداواری عمل میں سرمایہ کا حصّہ صرف یہ ہے کہ وہ خود کو کاروباری فرد کے ان فیصلوں کا تابع بنائے جو وہ غیر یقینی کاروباری اُمور میں کرتا ہے اور خسارے کا خطرہ مول لے. قرض سرمایہ پیداواری عمل میں یہ حصّہ نہیں لیتا. پھر وہ کونسا عمل ہے جس کے عوض اصل سرمایہ کی واپسی کے ساتھ سُود کا بھی مطالبہ کیا جا سکتا ہے۔

نفع کمانے کے بارے میں اُصولی حقیقت

قرآن کے نزدیک کاروباری اغراض کے لیے دیئے جانے والے قرضوں پر سُود حرام ہے کیونکہ اس کے اُصول کے مطابق سرمایہ دار اسی صورت میں اپنے سرمایہ کے ذریعے نفع کما سکتا ہے جب وہ ہر حال میں کاروباری نتائج میں شریک رہے۔ نفع ہو تو نفع پائے اور نقصان ہو تو نقصان اٹھائے۔ نفع وہی حاصل کر سکتا ہے جو نقصان ہونے کی شکل میں نقصان بھی گوارا کرے۔ نقصان کی ذمّہ داری سے کنارہ کش رہ کر سرمایہ پر نفع کمانے کی کوئی بھی صورت اسلام میں جائز نہیں ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم نے بہت واضح الفاظ میں اس اُصول کی تصریح فرمائی ہے۔

حضرت عائشہ رضؓ کہتی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ فائدہ نقصان اٹھانے کی ذمّہ داری کے ساتھ وابستہ ہے۔

یہ حدیث ابوداؤد میں ہے۔ اسی حدیث کو حاکم نے مستدرک میں بھی اسی مضمون کی دوسری متعدد حدیثوں کے ساتھ روایت کیا ہے۔ بعض حدیثوں سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اُصولی ارشاد کا پس منظر بھی سامنے آتا ہے جو بات اُصولی طور پر سامنے آتی ہے وہ یہ ہے کہ فروخت کی جانے والی چیز کے منافع اور ثمرات سے استفادے کا حق اسے ہے جو اس پر وارد ہو سکنے والے خطرات کا ذمّہ دار ہو۔

ایک دوسرا ارشاد ابوداؤد، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ میں ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا ایک ہی معاملہ میں اُدھار لینا اور تجارتی سودا کرنا دُرست نہیں۔ نہ ایک تجارتی معاملہ میں دو مختلف شرطیں کرنا درست ہے اور نہ اس چیز کا نفع لینا صحیح ہے جس کے نقصان کی ذمّہ داری تم نے نہ لی ہو۔ ایسی چیز کی فروخت بھی صحیح نہیں جو تمہارے پاس موجود نہ ہو۔

ان ارشادات میں ضمان سے مراد ان تمام خطرات کے نتائج کی ذمّہ داری ہے جو کسی چیز پر وارد ہو سکتے ہیں مثلاً اشیاءِ تجارت کے چوری ہو جانے، آگ سے جل جانے یا کسی آفت سماوی کے سبب اچانک تباہ ہو جانے کے نتیجہ میں خسارے کی ذمّہ داری بھی ضمان میں شامل ہے۔ فقہاء کے نزدیک ضمان کا جو مفہوم ہے اسے ہم

اس طرح بیان کر سکتے ہیں کہ یہ قابلِ تامین خطرات اور ناقابلِ تامین خطرات دونوں کو جامع ہے۔ فقہاءِ اسلام نے ضمان کا جو تجزیہ کیا ہے اس میں قابلِ تامین اور ناقابلِ تامین خطرات کے درمیان کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے۔ اُن کے زمانہ میں تامین کا رواج نہ تھا۔ لیکن اس کا اس حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا کہ تمام فقہاءِ اسلام اس اُصول پر متفق ہیں کہ نفع کا استحقاق ضمان سے وابستہ ہے۔ کوئی فرد ضمان سے بری ہو کر نفع کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔ سرمایہ پر نفع اسی وقت کمایا جا سکتا ہے جب کاروبار میں پیش آنے والے خطرات کی ذمہ داری بھی قبول کی جائے۔ اس ذمہ داری میں شرکت کے بغیر سرمایہ پر نفع نہیں کمایا جا سکتا۔

بہر حال اسلام کے نزدیک سرمایہ پر نفع اس وقت مل سکتا ہے جب وہ کاروبار میں اس عدمِ تیقن کے تابع اور خطرانگیزی کا حامل ہو کر داخل ہو جو کاروبار کا خاصہ ہے۔ نقصان سے بری الذمہ ہو کر کاروبار میں داخل ہونے والا سرمایہ نفع کا طالب نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں ہر طرح کے سود کی حرمت کے علاوہ خود یہ اُصول ناجائز ہونے کا ایک قطعی ثبوت ہے[1] کاروباری اغراض کے لیے سود کے نقصانات کے ساتھ ساتھ اپنے ذاتی ضروریات کے لیے قرض پر سود کے حرام ہونے کے اخلاقی اور معاشی نقصان بھی سن لیجئے۔

سود کے اخلاقی و معاشی نقصانات

علماءِ اسلام نے اس موضوع پر قانونی و اخلاقی نقطہ نظر سے تفصیلی بحث کی ہے جو فقہ، اُصول فقہ اور کتب تفسیر میں موجود ہیں لیکن محققین نے اس کے معاشی پہلو پر بھی کافی روشنی ڈالی ہے۔ اور اسلام کے معاشی نظام میں اس کی حُرمت کو اس خوبی کے ساتھ واضح کیا ہے کہ حرمتِ سود کا نظریہ موجودہ جدید اقتصادی نظام میں صرف معذرت خواہی پر مبنی نہیں بلکہ معاشی نقطہ نظر سے جوازِ سود کے نظریہ پر مجوزین کو ایک چیلنج ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ سود معاشی نظام کی ترقی کا باعث ہے اور قرآن کا دعویٰ ہے کہ سود معاشی اور عقلی نقطہ نظر سے انسانی معیشت کے لیے تباہ کن ہے۔

سود اور شاہ ولی اللہ حکیم الاُمت

دُنیائے اسلام کے مشہور فلسفی حکیم الامت شاہ ولی اللہ قمار اور سود کی حرمت پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں: سود باطل اور حرام ہے اور سراسر ظلم ہے۔ اس لیے کہ اس قسم کا قرض لینے والے عام طریقے سے مفلس

[1] اسلام کا نظریہ ملکیت

اور مضطر ہوتے ہیں۔ وہ بیشتر مدت مقررہ پر رقم ادا کرنے سے معذور ہوتے ہیں۔ اس کے نتیجے میں سُود کا اضافہ ہوتا رہتا ہے اور کسی حال میں اس سے گلو خلاصی نہیں ہوتی۔ یہ کاروبار دُنیا میں سنگین جھگڑوں اور عظیم مناقشوں کا باعث بنتا ہے اور جس قوم یا ملک میں بے محنت روپیہ حاصل کرنے کا رواج پڑھ جاتا ہے وہاں عوام پر صنعت و حرفت، زراعت اور تجارت کی صحیح راہیں بند ہو جاتی ہیں۔ معاملات میں اس سے زیادہ سنگین اور پیچیدہ دوسرا کوئی مسئلہ نہیں ہے جس میں ظاہری نفع کی صورت میں حقیقی تباہی و بربادی مضمر ہو۔ دراصل یہ معاملہ خاص قسم کا نشہ ہے جو اللہ کے بتائے ہوئے قانون اور ذرائع آمدنی کے صحیح طریقوں کے استعمال کے خلاف ہر انسان کو ابھارتا ہے اور یہ تمام نشوں سے زیادہ مفسد، عداوت باہمی اور انسان کشی کا ذریعہ بنتا ہے۔ اس لیے اسلام نے سُود کو ظلم اور باطل قرار دیا ہے۔ اور چونکہ سُود کی دو قسمیں ہیں، ایک حقیقی اس کو مطلق اور بغیر کسی استثنا کے حرام قرار دیا اور دوسری ربا رفضل جیسے سونے کے بدلے سونا کی بیشی کے ساتھ لین دین کرنا، اس کے خرید و فروخت کے جواز کو تسلیم کر کے ان تمام صورتوں کو حرام قرار دیا جن کا نتیجہ سُودی لین دین کے موافق نکلتا تھا تاکہ اس غیر فطری کاروبار کا پوری طرح انسداد ہو جائے [1]

سُود اور امام غزالیؒ

حجۃ الاسلام امام غزالی اپنی مشہور کتاب احیاء العلوم میں فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہ کی بے شمار نعمتوں میں سے ایک نعمت یہ بھی ہے کہ اس نے سونا، چاندی جیسی دھاتیں پیدا کر کے درہم و دینار یعنی کرنسی کو وجود عطا کیا۔ اگر ان دھاتوں کی حقیقت پر غور کرو تو پتھروں میں سے ہونے کی وجہ سے انسانی معیشت کی ضرورت کے لیے بیکار ہیں۔ اور اگر ان کے منفعت پر غور کیا جائے تو ان پر دُنیا کے معاشی نظام کا انحصار اور دارو مدار ہے۔ کیونکہ ہر شخص اضطراری طور پر ان کا ضرورت مند ہے، انسان اپنے کھانے، اپنے پینے اور زندگی کی تمام ضروریات کے لیے ان گنت چیزوں کا محتاج ہے۔ اور صورتحال یہ ہے کہ زندگی کی ضرورت کی یہ تمام چیزیں ہر ایک کے پاس موجود نہیں، مثلاً ایک کے پاس زعفران کے گھٹے موجود ہیں مگر اس کی ضروریات اس سے غیر متعلق ہیں اُسے سواری کے لیے اونٹ کی ضرورت ہے۔ اسی طرح ایک شخص کو زعفران درکار ہے لیکن وہ اس کے پاس موجود نہیں ہے اور اونٹ کا مالک ہے جس

[1] حجۃ اللہ البالغہ

کی اُسے قطعاً ضرورت نہیں ہے۔ معاشی نظام کا تقاضا ہے کہ یہ دونوں باہم تبادلہ کرکے اپنی اپنی ضروریات کی پابجائی کریں۔ لیکن معاوضہ اور تبادلہ کی سب سے بڑی اڑچن یہ ہے کہ تبادلہ کے لیے ان مختلف اجناس میں قدر مشترک نہیں ہے۔ ایسے معیار کا ہونا ضروری ہے جو یہ بتا سکے کہ اونٹ کی خریداری کے لیے کتنی زعفران ادا کی جائے یا کس مقدار کے مقابلے میں اونٹ کو فروخت کیا جائے باہم تناسب نہ رکھنے والی اشیاء کی خرید و فروخت کا یہ سلسلہ ہر لحظہ اسی کا طالب ہے کہ تعیینِ مقدار اور صورت ادا کے لیے ایسی چیز کا ہونا از بس ضروری ہے جو متفاوت اشیاء کے درمیان ترازو اور کانٹے کا کام دیتے ہوئے یہ ثابت کر سکے کہ فلاں شے اس صورت سے یا اس متعین مقدار سے دوسری شے کے مساوی ہو سکتی ہے ورنہ معاملاتِ خرید و فروخت ناممکن ہو جائیں گے اور مدنی الطبع انسان کا معاشی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ قدرتِ حق نے مخلوق کو اپنی اس پروردگاری کی جانب رہنمائی فرمائی کہ ان تجربات کو جو اپنی حقیقت کے پیش نظر بے کار نظر آتی تھی اس لیے پیدا کیا ہے کہ یہ انسان کے معاشی نظام کی درست کاری کے لیے متفاوت اور مختلف النوع اشیاء کے درمیان تبادلہ کے وقت باہمی مراتب تعین مقدار اور مساوی و غیر مساوی کا فرق ظاہر کریں اور بیع و شراء میں "ترازوئے عدل" کا کام دیں تو اب درہم و دینار (روپیہ و اشرفی) کے ذریعہ بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ یہ اونٹ مثلاً سو روپیہ کا ہے اور اس کے مقابلے میں زعفران کی یہ مقدار سو روپیہ کی قیمت کو پہنچے گی اور اس طرح دونوں کے درمیان بآسانی تبادلہ ممکن ہو سکے گا۔ اب بائع اور مشتری مختار ہیں کہ نقدین (سونے چاندی کے سکوں) کے ذریعہ جدا جدا دونوں اشیاء کے درمیان معاملہ کریں یا نقدین کی ترازوئے عدل کے مطابق اشیاء کا اشیاء کے ساتھ تبادلہ کرلیں۔

ظاہر ہے کہ اشیاء کے درمیان تبادلہ کا صحیح توازن ایسی شے کے ساتھ ہی ہونا ممکن ہے جو اپنی حقیقت کے لحاظ سے لائق احتیاج نہ ہو اور اس کی ذات ضروریات و حاجاتِ انسانی میں براہِ راست کام نہ دیتی ہو بلکہ وہ ضروریاتِ انسانی کی تکمیل کا ذریعہ بنتی ہو ورنہ یہ دشواری پیش آئے گی کہ جب ایک شخص سونا چاندی (سکوں) کی حقیقت کا محتاج ہے اور مثلاً دوسرا آدمی اس کا محتاج نہیں بلکہ لباس و طعام میں سے کسی شے کا محتاج ہے تو اس صورت میں یہ پہلا شخص (نقدین) سونے چاندی کی اہمیت کو بڑھائے گا اور دوسرا اس کی اہمیت کو گھٹانے کی کوشش کرے گا اور اس طرح کوئی شے ایسی باقی نہیں رہے گی جو متفاوت اشیاء کے درمیان صحیح توازن کو قائم رکھ سکے اور ترازوئے عدل بن سکے اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ نظامِ معاشرت غیر منتظم ہو کر رہ جائے

گا پس اس حقیقتِ حال کے پیشِ نظر کہ سونا چاندی خود مقصود بالذات نہیں بلکہ معاشی اغراض و مقاصد کے لیے ذریعہ اور آلہ ہیں عقل و فطرۃ اور نظامِ معاشی کا تقاضہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق اس لیے فرمائی ہے کہ یہ لوگوں کے ہاتھوں میں (بشکل سکہ) چلتے پھرتے رہیں اور متفاوت اشیاء کے باہمی تبادلہ میں ترازوئے عدل کا کام دیں اور خرید و فروخت میں کسی وقت بھی مقصود بالذات نہ بن سکیں۔ سونے چاندی کی تخلیق کے اس مسئلہ کو دوسری تعبیر کے ساتھ یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے ان حجریات کو دنیا کے معاشی نظام کے استحکام کے لیے مقصود بالذات نہیں بلکہ معاملہ خرید و فروخت میں "ذریعہ اور وسیلہ" بنایا ہے اور یہ اس لیے کہ یہ دھاتیں اپنے اندر یہ کمال رکھتی ہیں کہ جس شخص کے پاس درہم و دینار اور روپیہ پائی موجود ہیں۔ اس کے پاس گویا ضرورت کی ہر شے موجود ہے اور جس نسبت سے ان کا وجود کسی جگہ ہے اسی نسبت سے وہ کائنات کی معاشی ضروریات کی حامل ہیں لیکن اس کے برعکس دنیا کی بہتر سے بہتر شے بھی اگر کسی کے پاس موجود ہے تو وہ یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ اس کے پاس بالقوۃ ہر ایک شے موجود ہے وجہ یہ ہے کہ یہ حجریات (دھاتیں) اگر سکہ کی شکل میں ہوں یا اپنی سادہ حقیقت پر ہوں اور کسی خاص شکل و صورت (مثلاً زیور، برتن) میں تبدیل نہ ہو گئی ہوں تو ان کی نسبت تمام اشیاء کی جانب مساوی ہی رہے گی۔ مثلاً اگر کسی شخص کے پاس ایک روپیہ ہے تو متبادل شکل میں گویا اس کے پاس ہر ایک وہ شے موجود ہے جو اس تعداد کے مساوی ہو لیکن اس کے علاوہ دوسری کسی شے میں یہ قوت موجود نہیں ہے مثلاً ایک گز کپڑا ایک گز کپڑا ہی رہے گا، ایک سیر شکر یا دس سیر گیہوں یا ایک سیر گھی کی شکل اس وقت تک اختیار نہیں کر سکتا جب تک یہی سونا چاندی اس باہمی تبادلہ کے لیے میزانِ عدل بن کر فیصلہ نہ کر دیں تو اب ظاہر ہے کہ ایسی شے جو منفعت عامہ کے لیے اس قدر ضروری اور مختلف و متفاوت اشیاء کی جانب مساوی نسبت رکھتی ہو از بس ضروری ہے کہ وہ نہ خود مقصود بالذات ہو اور نہ دوسری اشیاء کی طرح خاص شکل و صورت (زیور، برتن وغیرہ) میں محدود ہو تاکہ کل اشیاء کے درمیان "وسیلہ" اور "ذریعہ" بن سکے جیسا کہ آئینہ کو اس کا اپنا کوئی رنگ نہیں مگر ہر ایک رنگ کو ظاہر کر دیتا ہے یا جیسا کہ حرف اپنی حقیقت میں کوئی معنی نہیں رکھتا مگر تمام معانی کے اظہار کے لیے واحد ذریعہ ہے خلاصہ یہ ہے کہ حق تعالیٰ نے ان دھاتوں کی تخلیق اسی لیے فرمائی ہے کہ بیع و شراء میں مقصود بالذات "مبیع" نہ بنائی جائیں بلکہ ذریعہ خرید و فروخت (ثمن) قرار دی جائیں اور اسی لیے ان کو "کنز" نہ بنایا جائے بلکہ ہاتھوں میں دائر سائر رکھا جائے تاکہ معاشی نظام میں اختلال واقع نہ ہو۔

دراہم و دنانیر (یعنی سونا چاندی) کی تخلیق اس لیے نہیں ہے کہ یہ حجریات انسان کی معاشی ضروریات میں مقصود بالذات ہیں بلکہ ذریعہ اور وسیلہ ہیں اور یہ کہ یہ اسی وقت وسیلہ ہو سکتی ہیں جبکہ کنز اور خزانہ نہ بنائی جائیں بلکہ لوگوں کے ہاتھوں میں جاری ساری رہیں تاکہ وہ اشیاء کے مبادلہ میں "میزانِ عدل" بن سکیں یہی وہ حقیقت ثابتہ ہے

جس کو چشم بصیرت ہر ایک لمحہ صفحۂ موجودات پر خطِ الٰہی کی ان سطور میں پڑھتی رہتی ہے جن میں نہ حرف ہے اور نہ آواز اور جو آنکھیں اس تحریر کے ادراک سے عاجز ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اُن کے لیے قرآن حکیم میں اس کو بخوبی واضح فرمایا ہے چنانچہ ارشادِ مبارک ہے:

الذین یکنزون الذھب والفضۃ ولا ینفقونھا فی سبیل اللہ فبشرھم بعذاب الیم

جو لوگ خزانہ کرتے ہیں سونے اور چاندی کو اور ان کو اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے پس ان کو (اے محمدؐ) دردناک عذاب کی خوشخبری سنادو۔

اور اسی حقیقت کے پیشِ نظر سونے چاندی کے برتنوں کا استعمال ممنوع قرار پایا اس لیے کہ برتن کی جو غرض ہے۔ یعنی اشیاء کو محفوظ رکھنا، مٹی، لکڑی، بلور، پیتل، تانبا، لوہا جیسی چیزوں کے ظروف سے بھی پوری ہو سکتی ہے لیکن یہ اشیاء چاندی سونے کی طرح مبادلہ اشیاء میں براہِ راست، میزانِ عدل، نہیں بن سکتی ہیں تو اب نقدین (سونا چاندی) کی تخلیق کے مقصد کو باطل کر کے سونے چاندی کے ظروف استعمال کرنے والا بلاشبہ حکمتِ الٰہیہ کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے پس جو شخص اس حقیقت پر نظر رکھتا ہے وہ بخوبی اس حدیث کے مضمون کی حقیقت کو معلوم کر سکتا ہے۔

من شرب فی آنیۃ من ذھب وفضۃ فکانما یجر فی بطنہ نار جھنم۔ (متفق علیہ)

جس شخص نے سونے یا چاندی کے برتن میں پیا (کھایا) تو گویا وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھرتا ہے۔

پس واضح رہے کہ جو شخص بھی سونے، چاندی (روپیہ، اشرفی، درہم و دنانیر) میں، ربوا، کا معاملہ کرتا ہے یعنی کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کرتا ہے وہ اللہ تعالیٰ اس حکمت کی خلاف ورزی کا مرتکب اور معاشی نظام کے اختلال کا باعث ہی بنتا ہے۔ اور ان جحریات کی تخلیق میں فطرتِ الٰہی نے جو قانون وضع کر دیا ہے اس کو توڑ کر ظلم اور کفرانِ نعمت کا باعث ہوتا ہے۔

کوئی شخص یہ اعتراض کرے کہ اگر حقیقتِ حال یہ ہے تو اسلام نے سونے کو چاندی اور چاندی کو سونے کے ساتھ کمی بیشی سے اور ہم جنس نقد کو معیاری تعداد کے ساتھ خرید و فروخت کی اجازت کیوں دی؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سونا اور چاندی دو مختلف حقیقتیں ہیں اس لیے قدر و قیمت کے لحاظ سے بھی دونوں میں فرق نمایاں ہے تو ظاہر ہے کہ مطلوبہ اشیاء کی خرید و فروخت میں اُن کے ذریعہ اور وسیلہ بننے میں بھی ضرور

تفاوت ہوگا مثلاً سونے کے مقابلہ میں چاندی بکثرت ذریعہ بنتی رہتی ہے کیونکہ اس سے مطلوبہ شے کم سے کم مقدار میں بھی حاصل کی جاسکتی ہے۔ پس اگر ان کے مابین کمی بیشی کے ساتھ تبادلہ کی اجازت نہ ہوتی تو بسا اوقات اُن کے وسیلہ اور ذریعہ بننے میں دشواری پیش آجایا کرتی اور لوگوں کو معاشی زندگی میں یُسر اور آسانی کی جگہ عُسر اور دشواری کا مُنہ دیکھنا پڑتا مثلاً اگر کسی کے پاس فقط سونا ہے اور اس کو معمولی اشیاء خریدنی ہیں جو سونے کے دینار یا اشرفی کی قیمت سے دُور کی بھی نسبت نہیں رکھتیں تو اس کے لیے خریداری کی صورت کیا ہوتی پس سونے کا چاندی کے ساتھ اور ایک دینار کا چند درہم اور ایک اشرفی کا چند روپوں کے ساتھ اگر تبادلہ جائز نہ ہوتا تو اس کو مطلوبہ شے کی خریداری میں سخت دشواری پیش آجاتی۔

نیز ایک درہم کا ایک درہم کے ساتھ اور ایک دینار یا اشرفی کا ایک دینار یا اشرفی کے ساتھ تبادلہ اس لیے جائز قرار پایا کہ اس عمل سے معاشی نظام پر مطلق کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا اس لیے کہ اگر یہ دونوں یکساں حیثیت میں ہیں اور کچھ کھرے کھوٹے کا فرق نہیں ہے تو تبادلہ ایک عبث حرکت ہوگی گویا ایسا ہوگا کہ ایک شخص نے ایک درہم یا ایک روپیہ زمین پر رکھ دیا اور پھر ایک منٹ کے بعد اس کو زمین سے اٹھا لیا اور ظاہر ہے کہ کوئی عاقل ایسا نہیں کرے گا اور اگر باہم کھرے اور کھوٹے کا فرق ہے تو مساوات کی صورت میں تو کھرے درہم کا مالک فروخت کرنے پر راضی نہ ہوگا کیونکہ اس کا کھُلا نقصان ہے اور عدم مساوات کی صورت میں اسلام کا نظام معاشی اجازت نہیں دے گا کیونکہ ایسی صورت میں ان حجریات کی تخلیق کا جو مقصود ہے وہ فوت ہوجاتا ہے اور جو حقیقت' اشیاءِ مقصودہ و مطلوبہ کے حصول میں ذریعہ اور وسیلہ بننے کے لیے مخلوق ہوئی ہے وہ مقصود بالذات بن کر معاشی نظام کے نظم میں اختلال کا باعث اور حکمتِ الٰہیہ کے خلاف سبب بن جاتی ہے جیسا کہ سطور بالا میں واضح ہوچکا ہے اور یہی صورتحال ہے اجناس میں ہم جنس کے باہم تبادلہ کی اور اس لیے ان میں بھی مسطورہ بالا حکم عدمِ جواز ہی نافذ ہوگا اور اگر سونا یا چاندی کا ہم جنس تبادلہ اُدھار کی شکل میں بشرطِ مساوات ہو تو (معاشی وجوہ کے علاوہ) اخلاقی نقطہ نظر سے بھی ممنوع ہے کیونکہ حقیقت میں یہ تبادلہ خرید و فروخت کا نہیں بلکہ قرض کا معاملہ ہے اور قرض کی بنیاد بغیر معاوضہ حاجت مند کی حاجت پورا کردینے پر ہے جو سرتاسر اخلاقی مسئلہ ہے اور موجب اجر و ثواب ہے پس جو شخص اس کو اخلاقی وصف سے نکال کر معاوضہ اور مبادلہ کی شکل دیتا ہے دراصل وہ اخلاق کے ایک اہم مسئلہ کی تخریب کا درپے ہے جو مذہب کی نگاہ میں سخت معیوب ہے اس لیے اس اخلاقی مسئلہ کو قانونی مسئلہ بنانا ضروری سمجھا گیا اور عدمِ جواز کا حکم دیا گیا اور اجناس میں اسی طرح کا معاملہ اس لیے بھی ممنوع ہے کہ جو شخص اس قسم کا کاروبار کرتا ہے وہ جب ہی کرسکتا ہے کہ اُس کے پاس غلہ یا دوسری کوئی جنس وافر مقدار میں موجود اور وہ اس سے مستغنی ہو تو ایسی صورت میں وہ "احتکار" کا مرتکب ہے یعنی جنس مذکور کو جو عام حاجات و ضروریات کے لیے ہے

جمع اور خزانہ کر کے یہ چاہتا ہے کہ اس جنس کے نرخ (ارزانی وگرانی) کا معاملہ بازار سے قطع ہو کر اس کے ہاتھ میں آجائے اور اس طرح گویا ان اشیاء کی مقصدِ تخلیق کی خلاف ورزی ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر شریعتِ اسلامیہ میں محتکر (ذخیرہ اندوز) پر لعنت وارد ہوئی۔ اور اس کے حق میں شدید قسم کی وعیدیں بیان کی گئی ہیں [1]

سود اور امام فخر الدین رازی

امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

علماءِ اسلام نے ربٰو کی حرمت پر متعدد دلائل بیان فرمائے ہیں:

۱۔ جو شخص ایک درہم (یا ایک روپیہ) کو دو درہم (یا دو روپے) کے عوض میں فروخت کرتا ہے نقد کا معاملہ ہو یا اُدھار کا تو اس کو ایک درہم (یا ایک روپیہ) مفت ہاتھ آتا ہے جس کے مقابلہ میں اس کی جانب سے کوئی عوض موجود نہیں ہے حالانکہ خرید و فروخت میں جانبین سے معاوضہ اور مبادلہ ضروری شے ہے پس جو درہم یا روپیہ بغیر عوض اس نے حاصل کیا اس میں اس کی جانب سے نہ مال متقوم (اصل) کا کوئی دخل ہے اور نہ محنت کا اور چونکہ انسان کی ضروریات و حاجات کی تکمیل کے لیے مال ازبس ضروری شے ہے اس لیے اس کی حفاظت و عزت انسان کے خون (جان) کے برابر ہے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا ارشاد مبارک ہے حرمۃ مال الانسان کحرمۃ دمہٖ پس جو شخص دوسرے کے مال کو بغیر عوض کے لیتا ہے وہ بلاشبہ سُحت اور ظلم ہے اور اس لیے ایسا معاملہ قطعاً حرام ہے اور اگر اس موقعہ پر یہ کہا جائے کہ درہم زائد اس لیے زائد نہیں ہے کہ بائع یا قرض دینے والے نے جو درہم مشتری یا قرضدار کو ایک مدت کے لیے دیا ہے اگر اس مدت میں وہ اس کے اپنے پاس رہتا تو ممکن تھا کہ وہ اس سے تجارت کے ذریعے نفع حاصل کر سکتا۔ اب جبکہ اس مدت میں اس کے پاس نہ رہا تو یہ قدرتاً زائد اس کا عوض ہے کہ راس المال ’اصل‘ قرضدار کے پاس ایک مدت تک مقید رہا اور قرض خواہ اس سے فائدہ نہ اٹھا سکا کیونکہ اگر اس کے پاس رہتا تو تجارت کے ذریعے فائدہ اٹھا سکتا اور ہو سکتا ہے کہ اس کو اس قدر نفع ہو کہ زائد درہم اس میں سے ادا کر دینے کے قابل ہو جائے لہٰذا اس کو ’قدر زائد‘ کہنا صحیح نہیں بلکہ یہ بھی درحقیقت عوض اور ’اصل‘ ہی ہے۔ اس اعتراض کا جواب یہ ہے کہ جو درہم ’اصل‘ بائع نے مشتری کو یا قرضدار نے قرض خواہ کو دیا ہے وہ اگر اس کے اپنے پاس رہتا تو یہ یقینی نہیں تھا کہ اس سے ضرور نفع حاصل ہوتا بلکہ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ تجارت میں نقصان پا کر اس اصل کو بھی کھو بیٹھتا لیکن دو درہم کے مقابلے میں قرض دینے یا فروخت

[1] احیاء العلوم

کرنے کی شکل میں ایک درہم کا زائد اور مفت ہاتھ آجانا قطعی اور یقینی امر ہے پس امر موہوم کے مقابلہ میں اس یقینی نفع کی اجازت دے دینا معاشی نقطۂ نظر سے ایک جانب کو قصداً نقصان پہنچانا ہے اس لیے حرام ہے۔

۲ - یہ ایک روشن حقیقت ہے کہ معاشی نظام کی بنیادیں صنعت وحرفت، زراعت جیسے ستونوں پر قائم ہیں اور ان ہی کی بدولت کسی ملک میں رفاہیت کے سامان مہیا ہو سکتے ہیں پس اگر معاشی نظام میں ایسے معاملہ (ربوٰ) کی اجازت دے دی جائے جس میں کسب معاش کے ان حقیقی ذرائع کی بجائے بے محنت ایک کے دو اور دو سے بھی زیادہ ہو سکیں تو اس ملک میں ایک مستقل طبقہ ایسا پیدا ہو جائے گا جو ان تمام حقیقی اور صحیح ذرائع کو چھوڑ کر اسی کو ذریعہ معاش بنائے گا اور اس طرح منافع عوام کو نقصان پہنچا کر معاشی نظام کے اختلال کا باعث بن جائے گا اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ اس طرح دولت پر ایک مخصوص طبقہ کا اجارہ ہو جائے گا اور انجام کار عام کساد بازاری پیدا ہو جائے گی۔

۳ - عام طور پر ایک درہم سے کر دو درہم کا معاملہ وہی شخص کر سکتا ہے جو اضطراری حالت میں ہو اور معاشی حاجت وضرورت کے لیے نقدین کا محتاج ہو اور وہی شخص اس کاروبار کو چلا سکتا ہے جس کے پاس سرمایہ بصورت اصل (راس المال) موجود ہو یا یوں کہیے کہ قرض لینے والا اکثر غریب، فقیر اور مضطر ہوگا جو بوجہ مجبوری اپنی حاجت اور ضرورت میں ایک کے دو دینے پر آمادہ ہو جاتے گا اور قرض دینے والا غنی اور سرمایہ دار ہوگا پس اگر اس معاملہ کو جائز رکھا جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ صاحب ضرورت اور زیادہ فقیر اور محتاج ہوتا چلا جائے۔ اور غنی وصاحب دولت آہستہ آہستہ دولت وثروت پر قابض ہو جائے اور جس معاشی نظام کی بنیاد رحمتِ عام پر قائم ہو وہ کس طرح ایسے معاملہ کی اجازت دے سکتا ہے۔

۴ - ربا (سود) کو اس لیے حرام کیا گیا کہ وہ باہمی ہمدردی اور حسن سلوک کا خاتمہ کرتا ہے اس لیے کہ بسا اوقات انسان اپنی ضرورت وحاجت میں قرض پر مجبور ہوتا ہے اس وقت اخلاق کا تقاضا ہے کہ صاحب دولت صاحب حاجت کے ساتھ حسن سلوک اور ہمدردی کا معاملہ کرے اور بغیر کسی معاوضہ کے قرض دے پس اگر کسی معاشی نظام میں ربا کی اجازت ہو تو پھر کوئی شخص بھی آسانی کے ساتھ قرض بغیر معاوضہ پر آمادہ نہیں ہو سکتا اور اس طرح مواساۃ واحسان کا دروازہ بند ہو جاتا ہے [1]

سُود اور مولانا محمد قاسم نانوتوی

اس موقعہ پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے جو داد تحقیق دی ہے اس سے چشم پوشی کرنا خود ظلم ہے بے انصافی

[1] تفسیر کبیر

ہے۔ مولانا کے خیال مبارک میں اسلام کے معاشی نظام میں جن چیزوں سے روکا گیا ہے یا جو حرام ہیں معاملے وہ ہیں کہ ممانعت کی علت خود ان کی ذات میں ہے دوسرے وہ ہیں جن میں ممانعت کی علت ذات میں نہیں بلکہ باہر سے آئی ہے۔ سود اسلام کے معاشی نظام میں ان محرمات میں سے ہے جو بالذات حرام ہیں۔
مولانا فرماتے ہیں:

اسلام کے معاشی نظام میں وہ ناجائز مالی معاملات جن میں معاملے کے باوجود ملکیت ثابت نہیں ہوتی ہے دو قسم ہیں ایک وہ ہیں کہ وجہ ممانعت خود معاملہ میں موجود ہے دوسرے وہ ہیں کہ ممانعت معاملہ کی ذات میں نہیں بلکہ فروخت کنندہ اور خریدار کے احوال وظروف کی وجہ سے آئی ہے۔ پہلی قسم مالیاتی مسائل میں کوئی معاملہ، کوئی لین دین ملکیت کے لیے کسی درجہ میں مفید نہیں ہے نہ مسلمانوں کے حق میں اور نہ کافروں کے حق میں۔ اور جب ممانعت خود معاملہ سے نہیں بلکہ معاملہ کے متعلقات کی وجہ سے ہو۔ وہاں یہ ممکن ہے کہ ایک معاملہ مسلمانوں کو مالکانہ حقوق سے محروم کر دے لیکن غیر مسلموں کے حق ملکیت کے لیے مفید ملک نہیں لیکن کافروں کے لیے مفید ملک ہے یعنی اگر کوئی مسلمان شراب یا سود خریدے گا تو قیمت دینے کے باوجود شرعاً شراب اور سود کا مالک تصور نہ کیا جائے گا لیکن کافر مالک ہو جائے گا وجہ اس کی یہ ہے کہ شراب اور سود قانون اسلامی کی نظر میں مسلمانوں کے لیے مال نہیں ہے کیوں کہ قانون کی زبان میں مال وہ ہے جس میں منافع موجود ہوں اور شراب و سود مسلمان کے حق میں اپنے دامن میں کوئی منفعت نہیں رکھتے منافع کے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مضرتوں کے مقابلے میں اس کی افادی حیثیت زیادہ ہو اور مضرت ہونا یہ ہے کہ منافع کے مقابلے میں نقصان زیادہ ہوں کیونکہ موجودات میں سے کوئی چیز بجمیع الوجوہ نہ مضر ہے اور نہ نافع۔ اگر ایک چیز ایک شخص کے حق میں نافع ہے تو وہ ہی دوسرے کے حق میں ضرر رساں ہے طبیعت ہی میں دیکھ لیجئے ہوا انسانوں اور صحرائی جانوروں کے حق میں نافع ہے لیکن یہی ہوا دریائی جانوروں کے حق میں نافع نہیں ہے۔ پانی دریائی جانوروں کے حق میں سود مند ہے لیکن صحرائی جانوروں کے حق میں نقصان رساں ہے۔ نفع و مضرت کا ہم ذرا بغور مطالعہ کریں تو یہ بات الم نشرح ہو کر سامنے آ جاتی ہے کہ صحرائی جانوروں کی زندگی کا مدار ہوا پر ہے اور دریائی جانوروں کی زندگی کا مدار پانی پر ہے لیکن اس کے باوجود صحرائی جانوروں کو پینے کے لیے پانی اور دریائی جانوروں کو ہوا کی ضرورت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نافع اور مضر ہونے کا مطلب اس کے سوا کچھ

نہیں ہے کہ اس کے نافع مضرتوں کے مقابلے اور مضرتیں منافع کے مقابلے میں زیادہ ہوں نافع ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ بس فائدہ ہی فائدہ ہو اور مضرت کا کوئی شائبہ نہ ہو۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اشیاء میں نفع اور ضرر اضافی ہوتا ہے۔ ایک حیثیت میں ایک کے لیے نافع اور دوسرے کے مضر ہوتی ہے جیسے شراب اور خنزیر، شراب کے موضوع پر منفعت اور مضرت ہونے کا خود قرآن شاہد ہے

فیهما اثم کبیر ومنافع للناس واثمهما اکبر من نفعهما

اور جس کو شراب کی منفعتوں اور مضرتوں تک رسائی حاصل ہے اس کے لیے خنزیر کے منافع و مضار کا پتہ لے لینا کوئی دشوار نہیں ہے۔ اور اگرچہ منافع کے مضرات کا اعتبار اس عالم میں ہے لیکن اتنا بدیہی اور کھلا نہیں کہ ہر کہ ومہ کی اس تک دسترس ہو سکے اور عالم آخرت کے اعتبار سے ان کی مضرت واضح ہے۔ شراب سے انسان کی علمی اور ذہنی قوتیں پامال ہو کر رہ جاتی ہیں۔ چنانچہ حالت سکر میں عقل کا زوال اس پر شاہد ہے سور کے گوشت سے انسان کی قوت عملی میں فساد رونما ہوتا ہے اور طبیعت میں گندگیوں کی طرف میلان اور روح میں ناپاکی کے ساتھ بے غیرتی رونما ہو جاتی ہے۔ یہ بات تجربہ سے ثابت ہو چکی کسی جانور کے گوشت کی کثرت سے رفتہ رفتہ انسان میں اس جانور کے گوشت کا مزاج رونما ہوتا ہے جیسے گرم غذاؤں کا استعمال بارد مزاجوں کو ایک عرصہ کے بعد حار مزاج بنا دیتا ہے اور یہ تمہیں معلوم ہے کہ ہر مزاج کے مطابق اخلاق کی تکوین ہوتی ہے۔ بہرحال شراب سے انسان کی قوت علمی اور خنزیر سے انسان کی قوت عمل پامال ہو جاتی ہے۔ آخرت کا سامان صرف علم وعمل ہے، جسے علم صحیح اور عمل صالح ارزانی ہوتا ہے تو گویا اسے اپنے دعویٰ کی صداقت کے لیے اللہ کی جانب سے ایک دستاویز مل جاتی ہے جن کو اللہ کی جانب سے علم وعمل کی دولت ملی ہے چار گروہ ہیں، انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین۔ انبیاء اور صدیقین اگرچہ عمل میں کم نہیں ہوتے لیکن علم میں ان کو اولیت کا شرف حاصل ہے اور شہداء وصالحین اگرچہ علم سے تہی دامن نہیں ہوتے مگر عمل میں ان کی سرشاریاں شامل ہوتی ہیں۔

بہرحال آخرت میں کامیابی کا دارومدار علمی اور عملی قوت کے درست ہونے پر ہے۔ اگر کوئی چیز ان دونوں کے مزاج کے خلاف ہو وہ آخرت میں ضرر رساں ہے۔ مسلمان اگر شراب اور خنزیر سے منافع حاصل کرنا چاہیں تو کیسے حاصل کر سکتے ہیں جب مسلمان کی غرض اصلی ان کے ذریعے پامال ہو جاتی ہے اس لیے اگر یہ کہا جائے کہ شراب اور خنزیر مسلمان کے حق میں مال نہیں اور کفار کے حق میں مال ہے اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے ہم کہیں فلاں دوا اس شخص کے حق میں مفید ہے اور فلاں شخص کے حق میں مضر ہے۔ الغرض مسلمان کے لیے شراب وخنزیر کی خرید وفروخت سے ملکیت ثابت نہ ہونا اور کافروں کے لیے ثابت ہو جانا

اسی پر مبنی ہے لیکن دوسرے تمام معاشی اور دیوانی مسائل کو اس پر قیاس کرنا چاہیے کیونکہ کچھ معاشی مسائل میں ممانعت کی اساس خود معاملہ کی ذاتی قباحت پر ہوتی ہے۔ اہلِ معاملہ بائع و مشتری کے احوال و ظروف کے پیشِ نظر نہیں ہوتے مثلاً سود، جوا، غصب، چوری کہ یہ بالذات حرام ہیں خود مسلمانوں کے حق میں بھی حرام ہیں اور کفار کے حق میں بھی، سود، جوا، غصب اور چوری کبھی کسی کے حق میں مفید ملک نہیں ہوتے یعنی کوئی شہری ان راہوں سے پیدا آور سرمایہ کا مالک تصور نہیں کیا جا سکتا۔ اگر ہوگا تو ظلم کی راہ سے ہوگا اور اس ملکیت کی حیثیت اس پاک پانی سے ہرگز مختلف نہ ہوگی جس میں نجاست کی آمیزش ہو، بہرحال ملکیت ہو یا نہ ہو لیکن چونکہ یہ اسباب اقسامِ ظلم سے تعلق رکھتے ہیں ایسے اموال کا واپس کرنا واجب ہے۔ اور یہیں سے یہ بات بھی الم نشرح ہوگئی کہ جب ملک میں ظلم کی آمیزش ملکیت کو ظلم بنا دیتی ہے تو کمائی ہوئی دولت اگر بہمہ وجوہ غیر مملوک ہو اس کو ظلم خالص کہیں گے اور اگر ظلم کی آمیزش ہوگی تو مخلوط ہوگی لیکن معاشیات میں ظلم خالص اور ظلم مخلوط ایک سا ہی ہے اس سے ظالم کے مالکانہ حق کو ہرگز ساقط نہیں کیا جا سکتا ہے۔ گفتگو کا موضوع چونکہ سود اور جوا ہے اس لیے ہم ان ہی تک رہنا چاہتے ہیں جیسے پانی سیرابی اور آگ جلانے کے لیے مخلوق ہوئی ہے ایسے ہی ایک مالک سے دوسرے مالک کی طرف تبدیلِ ملکیت کے لیے کچھ معاملات بنائے گئے ہیں۔ ان معاملات کی اساس عدل و انصاف پر قائم ہوئی ہے۔ جوئے اور سود میں سود خواروں اور جوئے بازوں کی کامیابی بغیر معاوضہ اور بلا بدل ہوتی ہے اس لیے دوسروں کا مال یقیناً ظلم و جور سے لیا جاتا ہے اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ ظلم کی قباحت بدیہی ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ظلم اپنی قباحت میں کسی واسطہ کا محتاج نہیں ہے اور کسی چیز کے ذاتی طور پر قبیح ہونے کا یہی مطلب ہے۔ اس بنا پر ربا اور جوئے کا معاملہ خواہ کسی کے ساتھ ہو اور کیسے ہی ہو کسی کے لیے مفید ملکیت نہیں ہے یعنی اس سے کوئی شخص مال اور سرمایہ کا مالک متصور نہ ہوگا۔

دو اعتراض اور ان کا جواب

ممکن ہے یہاں پہنچ کر آپ ذہن میں یہ خلش محسوس کریں کہ اولاً یہ کہ دعویٰ بلا دلیل ناقابلِ پذیرائی ہے۔ یہ درست ہے کہ عدل و انصاف کی خوبی بدیہی ہے لیکن یہ محتاجِ دلیل ہے کہ معاملات کی اساس عدل و انصاف پر ہونی چاہیے۔

ثانیاً فقہاءِ متقدمین نے عقدِ ربا کو عقودِ فاسدہ پر قیاس کر کے بعد قبض مفید ملک قرار دیا ہے اگرچہ اس ملک کو ملکِ خبیث ہی کہا ہے اس صورت میں یہ کہنا کہ ربا پر مشتمل معاملہ مفید ملک نہیں ہے، سمجھ میں نہیں آتا۔

اس کا جواب سننے کے لیے ضروری ہے کہ اولاً یہ بات ذہن نشین کر لی جائے سب جانتے ہیں کہ:

: جیسے مرکب کے لیے اجزاء کا ہونا، اور اضافت کے لیے طرفین کا ہونا ضروری ہے۔ ایسے ہی عرض کے لیے موصوف بالذات سے موصوف بالعرض تک رسائی کی خاطر محرکات اور آلات کی ضرورت ہے، نیز کبھی قبول اثر کی وجہ سے موانع کو ہٹانے کی ضرورت بھی پیش آتی ہے زندگی کے احوال و ظروف اور واقعات و نظریات میں عقلی حیثیت سے کوئی چیز ان صورتوں سے بالا نہیں ہے۔ عقد بھی محرکات کے اقسام میں سے ہے اس بنا پر اگر کہا جائے کہ عقد کے لیے عاقدین اور انعقاد کے لیے منعقدین کا ہونا ضروری ہے تو کوئی بیجا نہیں ہے کیونکہ یہ دونوں اضافی باتیں ہیں اور اضافت کے لیے طرفین کا ہونا ضروری ہے۔ لہٰذا اگر طرفین میں سے ایک بھی نہ ہوگا تو عقد و انعقاد کا وجود نہ ہوگا۔ طرفین کے نہ ہونے کو کبھی تسلیم نہ کیا جائے گا۔ قانون میں جس قدر دیوانی معاملات کی حیثیت باطل کی ہے ان کی صورت یہی ہے مثلاً شریعت میں مردار اور خون کی بیع باطل ہے بظاہر بیچی ہوئی چیز اور قیمت دونوں موجود ہیں مگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو حق و باطل سے اور موجود معدوم سے ممتاز ہو کر سامنے آجائے گا بظاہر ہمیں یہاں مردار اور خون منعقد کی حیثیت میں نظر آتے ہیں مگر واقعہ اس کے برعکس ہے کیونکہ بیع عقد مطلق کو نہیں بلکہ عقد شرعی کو کہتے ہیں۔ بیع کی تعریف یہ ہے کہ مبادلۃ المال بالمال اور سب جانتے ہیں کہ قانون کی نظر میں مردار اور خون مال نہیں ہے۔ مال وہ ہے کہ جس کے دامن سے منفعت وابستہ ہو اور یہاں منفعت نہیں بلکہ مضرت ہی مضرت کا وجود ہے۔ اگر معاملہ میں مال کا ہونا ضروری ہے اور مردار و خون میں مال ہونے کی صلاحیت نہیں ہے اور جب مال نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ مبیع کا وجود نہیں ہے تو اس کا حاصل یہ ہے کہ طرفین میں سے ایک طرف مفقود ہے۔ قانون میں مجہول اور معدوم کی بیع اسی بنا پر ناجائز ہے۔ ان چیزوں کی بیع خرید و فروخت کو جو تمہارے پاس نہیں اسی لیے منع کیا گیا۔ حبل الحبلہ کی بیع کی ممانعت بھی اسی بنا پر ہے۔ پھلوں کے ظہور سے پہلے فروختگی کی ممانعت کا سرچشمہ بھی یہی ہے۔

ثانیاً یہ بھی ذہن نشین ہونا چاہیے کہ تسعیر اللہ سبحانہٗ کا کام ہے۔ حدیث میں ارشاد نبوت ہے ان اللہ ھو المسعر وجہ اس کی یہ ہے کہ معاملات اور ظلم و انصاف کا اس وقت چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے جب حق کے مقابلے میں حق ہو ایسے مواقع پر عقل کا فیصلہ یہی ہے کہ دونوں ساقط الاعتبار قرار دیئے جائیں لیکن حقوق کے تعارض کے وقت میں دونوں کو ساقط قرار دینا زندگی سے دست کش ہونے کے مترادف ہے۔ عدل و انصاف حقوق میں مساوات اور برابری چاہتا ہے۔ اس مساوات اور برابری کے لیے ہمارے پاس کوئی پیمانہ ہونا چاہیے جنس

اور نوع بھی اگرچہ پیمانہ بن سکتا ہے لیکن متحد الاجناس اور متحد الانواع کے لیے بھی پیمانہ درکار ہے تاکہ مساوات اور عدم مساوات کا فیصلہ کیا جا سکے۔ گندم اور جوا گر ناپ کر دی جاتی ہیں تو سونے اور چاندی کو تول کر دیا جاتا ہے یہاں بھی ایک ایسے معیار، میزان اور پیمانہ کی ضرورت ہے کہ مساوات ہو سکے اور عدل و انصاف کے معنے بروئے کار آسکیں۔ اس سے تم اندازہ کر سکتے ہو کہ اصل عقد یہ با قدر کی حد تک عقد فاسد ہے اور قدر زائد کی حد تک بیع باطل ہے اور یہ بات کہ ربا پر مشتمل معاملہ مفید ملک نہیں نفس ربا کے بارے ہے کیونکہ گفتگو کا موضوع یہی ہے۔ اور یہاں سے یہ بات بھی الم نشرح ہو کر سامنے آگئی کہ ربا کے معاملہ میں مسلمان اور کافر برابر ہیں خواہ کوئی بھی ربا پر مشتمل معاملہ کرے وہ مال کا مالک ہوگا اور اس کی ملکیت ثابت نہ ہوگی [1]

ان اکابر حکیم الامت شاہ ولی اللہ، امام غزالی، امام رازی اور مولانا محمد قاسم کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ سود کی حرمت کی اصلی وجہ یہ ہے کہ وہ قطعی طور پر ایک نقصان دہ چیز ہے اور بقول مولانا محمد قاسم اس کی خباثت ذاتی ہے اور یہ خباثت صرف ایک پہلو سے نہیں بلکہ مختلف پہلوؤں سے ہے اخلاقی و روحانی حیثیت سے تمدنی و اجتماعی حیثیت سے اور معاشی حیثیت سے۔

جی چاہتا ہے کہ ہم ان بزرگوں کے بیانات کی روشنی میں ان خباثتوں کا ایک اجمالی جائزہ پیش کریں۔ لیکن آج دورِ جدید میں سود کی جو خباثت منکشف ہوتی ہے اسے پہلے گوش گزار فرمالیجئے۔ وہ یہ کہ سود ایک ایسا عامل ہے جو سرمایہ میں بے حد و حساب اضافہ کرتا ہے۔ یہ اضافہ تو کسی سعی و جہد کا نتیجہ ہوتا ہے نہ کسی طرح کام کا موقع فراہم کرتی ہے کہ وہ افزائش دولت کے سلسلے میں تمام تر اسی ذریعہ پر انحصار کر لیں۔ نتیجۃً اس طبقہ میں سستی کاہلی، سرفانہ، عیاشی اور بدکرداری پھیلتی ہے اور یہ سب کچھ ان محنت کشوں کے بل پر جو دولت کے محتاج ہوتے ہیں اور تنگی کے عالم میں مجبور ہو کر سودی قرض لیتے ہیں۔ اس طرح دو خطرناک اجتماعی امراض پیدا ہو جاتے ہیں سرمایہ میں بے حد حساب اضافہ اور انسانیت کے بلند و پست دو طبقات میں روز افزوں تفریق جو کسی حد پر ٹھہرنے کا نام نہیں لیتی، مزید براں ایک نئے خطرے کے طور پر ایک کاہل اور بے عمل طبقہ کا وجود جو بجز عیش و عشرت کچھ اور کرنے کا نام نہیں لیتا اور دنیا کی ساری نعمتیں بس بیٹھے ہی بیٹھے حاصل کرتا رہتا ہے گویا اس کی دولت مزید دولت کے شکار کے لیے ایک جال ہے۔ ایسا جال جس میں شکار کو مغالطہ دینے کے لیے دانے کی بھی ضرورت نہیں ہے۔ ضرورتمندوں کے غول کے غول اس میں خود بخود پھنستے رہتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ سود کھانا اسلامی تصور ملکیت کے اس بنیادی اصول سے ٹکراتا ہے کہ مال اللہ کا ہے جس میں انسانوں کو نائب بنایا ہے۔

---

[1] مکتوب ہشتم ملخصاً

سود کے اخلاقی مفاسد

آیئے اخلاق و روحانیت کے نقطۂ نظر سے دیکھئے کیونکہ اخلاق اور روح ہی جوہرِ انسانیت ہیں۔ اور اگر کوئی چیز ہمارے اس جوہر کو نقصان پہنچانے والی ہو تو بہرحال وہ قابلِ ترک ہے خواہ کسی دوسرے پہلو سے اس میں کتنے ہی فوائد ہوں۔ اب اگر آپ سود کا نفسیاتی تجزیہ کریں گے تو آپ کو یک نظر معلوم ہو جائے گا کہ روپیہ جمع کرنے کی خواہش سے لے کر سودی کاروبار کے مختلف مرحلوں تک پورا ذہنی عمل خود غرضی، بخل، تنگدلی اور سنگدلی اور زرپرستی جیسی صفات کے زیرِ اثر جاری رہتا ہے اور جتنا جتنا آدمی اس کاروبار میں آگے بڑھتا ہے یہی صفات اس کے اندر نشوونما پاتی ہیں۔

تمدنی و اجتماعی مفاسد

اب تمدنی حیثیت سے دیکھئے۔ ایک ذرا سے غور و خوض سے یہ بات ہر شخص کی سمجھ میں بآسانی آ سکتی ہے کہ جس معاشرے میں افراد ایک دوسرے کے ساتھ خود غرضی کا معاملہ کریں۔ کوئی اپنی ذاتی غرض اور اپنے ذاتی فائدے کے بغیر کسی کے کام نہ آئے۔ ایک کی حاجت مندی دوسرے کے لیے نفع اندوزی کا موقع بن جائے اور مالدار طبقوں کا مفاد نادار طبقوں کے مفاد کی ضد ہو جائے۔ ایسا معاشرہ کبھی مستحکم نہیں ہو سکتا۔ اس کے اجزاء ہمیشہ انتشار و پراگندگی ہی کی طرف مائل رہیں گے۔ اور اگر دوسرے اسباب بھی اس صورتِ حال کے لیے مددگار بن جائیں تو ایسے معاشرہ کے اجزاء کا باہم متصادم ہو جانا بھی کچھ مشکل نہیں ہے۔ اس کے برعکس جس معاشرے کا اجتماعی نظام آپس کی ہمدردی پر مبنی ہو، جس کے افراد ایک دوسرے کے ساتھ فیاضی کا معاملہ کریں جس میں ہر شخص دوسرے کی احتیاج کے موقع پر فراخدلی کے ساتھ مدد کا ہاتھ بڑھائے۔ اور جس میں مالدار لوگ نادار لوگوں کے ساتھ ہمدردانہ اعانت یا کم از کم منصفانہ تعاون کا طریقہ برتیں۔ ایسے معاشرے میں آپس کی محبت اور خیر خواہی اور دلچسپی نشوونما پائے گی۔ اس کے اجزاء ایک دوسرے کے ساتھ پیوستہ اور ایک دوسرے کے پشتیبان ہوں گے۔ اس میں اندرونی نزاع و تصادم کو راہ پانے کا موقع نہ مل سکے گا۔ اس میں باہمی تعاون اور خیر خواہی کی وجہ سے ترقی کی رفتار پہلے معاشرے کی بہ نسبت بہت زیادہ تیز ہو گی۔

ایسا ہی حال بین الاقوامی تعلقات کا بھی ہے ایک قوم دوسری قوم کے ساتھ فیاضی و ہمدردی کا معاملہ کرے اور اس کی مصیبت کے لیے کھلے دل سے مدد کا ہاتھ بڑھائے۔ ممکن نہیں ہے کہ دوسری طرف سے اس کا جواب محبت اور شکر گزاری اور مخلصانہ خیر خواہی کے سوا کسی اور صورت میں ملے۔ اس کے برعکس وہی قوم اگر اپنی ہمسایہ قوم کے ساتھ خود غرضی و تنگدلی کا برتاؤ کرے اور اس کی مشکلات کا ناجائز فائدہ اٹھائے

تو یہ ہو سکتا ہے کہ مال کی صورت میں وہ بہت کچھ نفع اس سے حاصل کرے لیکن یہ کسی طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ پھر اپنے اس شائیلاک قسم کے ہم سایہ کے لیے اس قوم کے دل میں کوئی اخلاص اور محبت اور خیر خواہی رہ جائے۔

سُود کے معاشی نقصانات

اب اس کے معاشی پہلو پر نگاہ ڈالیے۔ سُود کا تعلق معاشی زندگی کے ان معاملات سے ہے جن میں کسی نہ کسی طور پر قرض کا لین دین ہوتا ہے۔ اس کی بدترین مثال مہاجنی سُود ہے جو صرف برِ عظیم پاک و ہند تک ہی محدود نہیں ہے بلکہ ایک عالمگیر بلا ہے۔ یہ وہ بلائے عظیم ہے جس میں ملک کے غریب متوسط الحال طبقوں کی بڑی اکثریت بُری طرح پھنسی ہوئی ہے۔ اس کی وجہ سے قلیل المعاش کارکنوں کی آمدنی کا بڑا حصہ مہاجن لے جاتا ہے، شب و روز کی ان تھک محنت کے بعد جو تھوڑی سی تنخواہیں یا مزدوریاں ان کو ملتی ہیں ان میں سے سُود ادا کرنے کے بعد ان کے پاس اتنا بھی نہیں بچتا کہ وہ دو وقت کی روٹی چلا سکیں۔ یہ چیز صرف یہی نہیں کہ ان کے اخلاق کو بگاڑتی ہے اور انہیں جرائم کی طرف دھکیلتی ہے اور صرف یہی نہیں کہ ان کے معیارِ زندگی کو پست اور ان کی اولاد کے معیارِ تعلیم و تربیت کو پست تر کر دیتی ہے بلکہ اس کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوتا ہے کہ دائمی فکر اور پریشانی ملک کے عام کارکنوں کی قابلیتِ کار کو بہت گھٹا دیتی ہے اور جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی محنت کا پھل دوسرا لیے جا رہا ہے تو اپنے کام سے ان کی دلچسپی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لحاظ سے سُودی کاروبار کی یہ قسم ایک ظلم ہی نہیں ہے بلکہ اس میں اجتماعی معیشت کا بھی بڑا بھاری نقصان ہے۔

اس کا دوسرا معاشی نقصان یہ ہے کہ اس طرح غریب طبقہ کی رہی سہی قوتِ خریداری بھی سُود خوار ساہوکار چھین لے جاتا ہے۔ لاکھوں آدمیوں کی بیروزگاری اور کروڑوں آدمیوں کی ناکافی آمدنی پہلے ہی تجارت و صنعت کے فروغ میں مانع تھی۔ اس پر تم نے اچھی آمدنیاں رکھنے والوں کو یہ راستہ دکھایا کہ وہ خرچ نہ کریں بلکہ زیادہ سے زیادہ پس انداز کیا کریں۔ اس سے کاروبار کو ایک نقصان اور پہنچا۔ اب اس پر مستزاد یہ ہے کہ لاکھوں کروڑوں غریب آدمیوں کو ناکافی تنخواہوں اور مزدوریوں کی شکل میں جو تھوڑی بہت قوتِ خریداری حاصل ہوتی ہے اس کو بھی وہ اپنی ضروریاتِ زندگی خریدنے میں استعمال نہیں کرنے پاتے بلکہ اس کا بڑا حصہ ساہوکار ان سے چھین لیتا ہے اور اس کو اشیاء کی خریداری پر صرف کرنے کے بجائے سوسائٹی کے سر پر مزید سُود طلب قرض چڑھانے میں استعمال کرتا ہے۔ ذرا حساب لگا کر دیکھیے کہ اگر دنیا میں پانچ کروڑ آدمی بھی ایسے ہوں جو مہاجنوں کے پھندے میں پھنسے ہوں اور وہ اوسطاً دس روپے مہینہ ادا کرتے ہوں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ہر ماہ ۵۰ کروڑ روپے کا مال فروخت ہونے سے رہ جاتا ہے اور اتنی بھاری رقم معاشی پیداوار کی طرف پلٹنے کے بجائے مزید سُودی قرضوں کی تخلیق میں ماہ بماہ صرف ہوتی رہتی ہے[1]

[1] مسئلۂ سود۔

سود ترقی کا نہیں بلکہ تنزل کا ذریعہ ہے

۸۲۱ — لہذا اب جس کو بھی اس کے پروردگار کی یہ نصیحت پہنچ گئی اور وہ آئندہ سود لینے سے باز آ گیا تو جو کچھ پہلے لے چکا ہے وہ اس کا ہو چکا ہے اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے، یعنی سود کی حرمت سے جو تم نے سود لیا ہے دنیا میں اس کو مالک کی طرف سے واپس کرنے کا حکم نہیں دیا جاتا یعنی تم کو اس سے مطالبہ کرنے کا حق نہیں اور آخرت میں حق تعالیٰ کو اختیار ہے، چاہے اپنی رحمت سے اسے بخش دے لیکن حرام ہونے کے باوجود بھی اگر کوئی باز نہ آیا بلکہ برابر سود لیتا رہا تو وہ دوزخی ہے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے سامنے اپنی عقلی دلیلوں کو پیش کرنے کی سزا یہی سزا ہے جو فرمائی لہ

اس فقرے میں یہ بتایا گیا ہے کہ سود حرام ہونے سے پہلے جس شخص نے کوئی رقم لی تھی لیکن جب سود کو حرام کر دیا گیا تو اگر آئندہ کے لیے اس نے توبہ کی اور باز آ گیا تو اس سے پہلے جمع شدہ رقم ظاہر شرع کی رو سے اس کی ہو گئی اور باطنی معاملہ اس کا نہ وہ دل سے باز آیا یا منافقانہ توبہ کر لی اس کا یہ معاملہ خدا کے حوالے رہا۔ اگر دل سے توبہ کی ہے تو عند اللہ نافع ہو گی ورنہ کالعدم ہو گی عام لوگوں کو بدگمانی کرنے کا حق نہیں ہے اور جو شخص نصیحت سن کر بھی اسی قول و فعل کی طرف عود کرے تو چونکہ یہ فعل سود خواری گناہ ہے۔ یہ لوگ دوزخ میں جائیں گے اور چونکہ ان کا یہ قول کہ سود مثل بیع کے حلال ہے کفر ہے اس لیے وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ ٢ہ

یہ نہیں فرمایا کہ جو کچھ کھا لیا اسے اللہ معاف کر دے گا بلکہ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ اس کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ جو کھایا سو کھا چکا کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو کھا چکا اسے معاف کر دیا گیا بلکہ اس سے محض قانونی رعایت مراد ہے یعنی جو سود پہلے کھایا جا چکا ہے اسے واپس دینے کا قانوناً مطالبہ نہیں کیا جائے گا۔ اگر اس کا مطالبہ کیا جائے تو مقدمات کا ایک لامتناہی سلسلہ شروع ہو جائے جو کہیں جا کر ختم نہ ہو گا مگر اخلاقی حیثیت سے اس کی نجاست بدستور باقی رہے گی۔ جو مال کسی شخص نے سودی کاروبار سے سمیٹا ہو اگر وہ فی الواقع خدا سے ڈرنے والا ہو گا اور اس کا معاشی و اخلاقی نقطہ نظر واقعی اسلام قبول کرنے کے بعد تبدیل ہو چکا ہو گا تو وہ خود اپنی اس دولت کو جو حرام ذرائع سے آئی تھی اپنی ذات پر خرچ کرنے سے پرہیز کرے گا اور کوشش کرے گا کہ جہاں تک ان حقداروں کا پتہ چلایا جا سکتا ہے جن کا مال اس کے پاس ہے اس حد تک ان کا مال انہیں واپس کر دیا جائے اور جس حصہ مال کے مستحقین کی تحقیق نہ ہو سکے اسے اجتماعی فلاح و بہبود کے کاموں پر صرف کیا جائے۔ یہی عمل اسے خدا کی سزا

لہ افادات شیخ الہند۔

٢ہ معارف قرآن م ش

سے بچا سکے گا۔ رہا وہ شخص جو پہلے کمائے ہوئے مال سے بدستور فائدہ اٹھاتا رہے تو بعید نہیں کہ وہ اپنی اس حرام خوری کی سزا پاکر رہے۔ ؎۱

ربا نسیئہ اور ربا فضل

یہ بات آپ پہلے سن چکے ہیں کہ ربا لغت کی زبان میں زیادتی کو کہتے ہیں۔ علامہ ابن العربی فرماتے ہیں کہ آیتِ قرآنی میں اس سے مراد وہ زیادتی ہے جس کے مقابلے میں کوئی مال نہ ہو بلکہ محض اُدھار ہو اور اس کی میعاد ہو۔ ابوبکر الجصاص نے ربا کے معنے یہ بیان فرمائے ہیں وہ قرض جس میں کسی میعاد کے لیے اس شرط پر قرض دیا جائے کہ قرضدار اس کو اصل مال سے زیادہ کچھ رقم ادا کرے گا۔ خلاصہ یہ کہ اُدھار دے کر اس پر نفع لینا اور جس قدر مدت اُدھار کی بڑھ جائے اتنا ہی سود بڑھا دینے کا نام ربٰو ہے اصطلاحِ شریعت میں اسی کو ربا نسیئہ کہتے ہیں۔ قرآن عزیز میں اسی کو حرام کیا گیا ہے۔ اسی کو رباء القرآن یا ربا القرض کہتے ہیں۔ اس کے حرام ہونے میں اُمت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں اور آج کل جو ربا معاشیات کا مدار سمجھا جاتا ہے وہ یہی ربا ہے ان آیات میں اسی کی حرمت کا اعلان ہوا ہے۔

سود کی حرمت بتدریج ہوئی

یہی ربا ہے جو قرآن میں یکبارگی نہیں بلکہ شراب کی طرح بتدریج حرام ہوا ہے اس موضوع پر اولین آیت قرآن میں یہ آئی ہے۔

وما اتیتم من ربا لیربوا فی اموال الناس فلا یربوا عند اللہ و ما اتیتم من زکوٰۃ تریدون وجہ اللہ فاولئک ھم المضعفون۔

اور جو سود تم دیتے ہو تاکہ لوگوں کے مالوں میں شامل ہو کر وہ بڑھ جائے اللہ کے نزدیک وہ نہیں بڑھتا اور جو زکوٰۃ تم اللہ کی خوشنودی کے لیے دیتے ہو یہی دینے والے درحقیقت اپنا مال بڑھاتے ہیں۔

یعنی سود و بیاج سے گو بظاہر مال بڑھتا دکھائی دیتا ہے لیکن حقیقت میں گھٹ رہا ہے جیسے کسی آدمی

؎۱ تفہیم القرآن

کا بدن ورم سے پھول جائے وہ بیماری یا پیام موت ہے اور زکوٰۃ نکالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مال کم ہو گا فی الحقیقت بڑھتا ہے جیسے کسی مریض کا بدن مسہل و تنقیہ سے گھٹتا دکھائی دے مگر انجام اس کا صحت ہے۔ سُود اور زکوٰۃ کا حال بھی انجام کے اعتبار سے ایسا ہی سمجھ لو۔

اس آیت کے بعد آلِ عمران کی یہ آیت اُتری ہے۔

یا ایھا الذین آمنوا لاتاکلوا الربا اضعافا مضاعفة

اے اہلِ ایمان! بڑھتا اور چڑھتا سود کھانا چھوڑ دو!

بالکل آخر میں یہ آیت نازل ہوئی ہے جس کی تشریح پیش کی جارہی ہے اور جس کے ذریعے سُود کو قطعی طور پر حرام کر دیا بلکہ بتانے والوں نے تو یہاں تک انکشاف کیا ہے کہ یہ آیاتِ قرآنی قرآن کی آیتوں میں باعتبارِ نزول آخری آیات ہیں۔ چنانچہ حضرت فاروقِ اعظم رض فرماتے ہیں۔

آیتِ ربا قرآن کی آخری آیتوں میں ہے اس کی پوری تفصیلات بیان فرمانے سے پہلے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم دنیا سے تشریف لے گئے اس لیے اب احتیاط ضروری ہے۔ ربا کو تو چھوڑنا ہی ہے جس صورت میں ربا کا شُبہ بھی ہو اس کو بھی چھوڑنا چاہیئے۔

بہرحال ربا نسیئہ قرآن کی ان آیات میں حرام کیا گیا ہے۔ اسی کو حافظ ابن القیم ربا جلی اور ربا جاہلیت کہتے ہیں۔ چنانچہ ابن القیم فرماتے ہیں:

ربا کی دو قسمیں ہیں ایک جلی اور دوسرا خفی۔ جلی کو اس لیے حرام کیا گیا ہے کہ اس میں ضررِ عظیم اور شدید مفسدہ موجود ہے۔ ربا جلی ربا نسیئہ کا نام ہے اور یہ وہ ربا ہے جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا۔ مثلاً وہ کسی ضرورت مند کو قرض دیتے اور جب وہ مدّت موعود پر ادا نہ کرتا تو اس شرط پر مدّت کا اضافہ کرتے کہ اس قدر زیادہ دینا پڑے گا اور اس طرح مدّت میں اضافہ کے ساتھ سُود کا اضافہ کرتے جاتے حتیٰ کہ ایک سو کی رقم ہزاروں تک پہنچ جاتی اور اس قسم کا معاملہ وہی لوگ قبول کرتے تھے جو محتاج، مفلس اور نادار ہوتے اور قرض خواہ کی رقم ادا کرنے سے قاصر رہتے۔ وہ جب یہ دیکھتے تھے کہ قرض کی رقم سُود کی وجہ سے ادائے قرض میں مہلت دے دیتا ہے تو تقاضے کی شدت اور عدمِ ادائیگی کی صورت میں قید و بند کی مصیبت سے گھبرا کر جبراً اس اضافہ کو برداشت کرتے جاتے تھے اور وقت گزرتا جاتا حتیٰ کہ نوبت یہ آجاتی کہ تاخیر کی بدولت اضافہ مال کا نقصان شدید سے شدید تر ہو جاتا اس پر مصیبت کا پہاڑ ٹوٹ پڑتا اور قرض کی رقم پر سُود بڑھتے بڑھتے اس کی ساری املاک پر حاوی ہو جاتا اور اس کے نتیجہ میں قرض خواہ

قرضدار کا سارا مال ناجائز طریق پر ہڑپ کر جاتا اور قرضدار پریشان کن حالات سے دوچار ہو جاتا۔ اللہ کی رحمت، حکمت اور اپنی مخلوق پر احسان اس کو مقتضی ہوئے کہ ربا کو حرام کیا جائے۔ [1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حافظ ابن القیم کے خیال مبارک میں ربا نسیئہ اور ربا جاہلیت ایک ہیں ان دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن کی اس آیت میں فلہ ما سلف کی تعبیر بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔ اسامہ کی حدیث دو طرح سے آئی ہے انما الربٰو فی النسیئۃ اور لا ربا الا فی النسیئہ۔ یہی عبداللہ بن عباسؓ، عبداللہ بن مسعودؓ، عبداللہ بن زبیرؓ، اسامہ بن زیدؓ، عطاء بن ابی رباحؒ، سعیدؒ اور عروہؒ کی رائے ہے کہ قرآن میں ربا نسیئہ حرام ہے۔ اور حجۃ الوداع میں اسی کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا ہے:

یاد رکھو جاہلیت کا ہر سود ختم کیا جا رہا ہے اور میں سب سے پہلے عباس بن عبدالمطلب کے سود کو ختم کرتا ہوں۔

سود کی یہی قسم ربا نسیئہ یعنی قرض و ادھار جو اس زمانے میں اہل عرب میں رائج تھا آج بھی معاشی زندگی کے ان معاملات میں سے ہے جن میں کسی نہ کسی صورت سے قرض کا لین دین ہوتا ہے۔ جیسا کہ ہم آئندہ قرضوں کی تفصیل میں بتائیں گے۔

الغرض اصل سود جو از روئے قرآن حرام ہوا وہ ربائے نسیئہ ہے لیکن اسلامی قانون کا ایک خاص مزاج یہ ہے کہ وہ جس چیز کو حرام کرتا ہے تو اجنبی عورت کے ساتھ خلوت میں جمع ہونے اور اجنبی عورت کی طرف دیکھنے پر بھی پابندی لگاتا ہے۔ اسی طرح سود کے مسئلہ میں اصل حکم تو یہ تھا کہ قرض کے معاملات جو سودی لین دین ہوتا ہے وہ قطعاً حرام ہے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس حرام تک پہنچنے کے وسائل پر بھی پابندی لگا دی تاکہ لوگ اس کے قریب بھی نہ پھٹکیں۔ اس کو ربائے فضل کہتے ہیں۔

ربائے فضل کی حقیقت

ایک ہی جنس کی دو چیزوں کی دست بدست لین دین میں زیادتی کو ربائے فضل کہتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام قرار دیا۔ کیونکہ اس سے زیادہ ستانی کا دروازہ کھلتا ہے اور انسان میں وہ ذہنیت پرورش پاتی ہے جس کا آخری ثمرہ سود خواری ہے۔

حافظ ابن القیم جوزی فرماتے ہیں:

---

[1] اعلام الموقعین۔

اور ربا بر فضل کی حرمت سد ذرائع کی بنا پر ہے جیسا کہ حدیث ابی سعید خدری سے بصراحت معلوم ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ایک درہم کو دو درہم کے عوض خرید و فروخت نہ کرو کیونکہ ایسی صورت میں مجھے اندیشہ ہے کہ تم ربا میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ربائے فضل کو اس لیے ناجائز قرار دیا ہے کہ یہ ربا النسیئۃ تک پہنچنے کا ذریعہ ہے اور یہ اس لیے کہ ایک عقل مند آدمی ایک درہم کو دو درہم کے ساتھ اسی صورت میں خرید و فروخت کر سکتا ہے کہ ان دونوں کے درمیان کھرے اور کھوٹے سکے میں تفاوت یا ہلکے اور بھاری کا فرق ہو۔ اگر وہ جنس کی وحدت کا لحاظ نہ کرتے ہوئے صفات کے تفاوت کو معیار قرار دیتا ہے تو یہ تفاوت اس کو نقد معاملہ سے ہٹا کر اُدھار کے لین دین تک بآسانی پہنچا دے گا اور اسی کا نام ربا النسیئۃ ہے۔ اس طرح بالآخر ربا الفضل کے کاروباری رباء النسیئۃ کے مرتکب ہو جائیں گے اس لیے یہ کہنا بیجا نہیں ہے کہ ربا الفضل ربا النسیئۃ کے لیے قریب ترین ذریعہ اور وسیلہ کا کام دیتا ہے اس لیے شارع علیہ السلام کی حکمت نے فیصلہ کیا کہ اُمت پر اس قریب ترین ذریعہ کا دروازہ بھی بند کر دیا جائے اور بلا شبہ یہ حکمت عقل فطرت کے عین مطابق اور سُودی مفاسد کے سدِ باب کے لیے بہترین ہے [1]

اور دوسری جگہ اسی کتاب میں فرماتے ہیں:

شارع حکیم روا رکھتا ہے وہ انسان کی مصالح اور ضروریات پر پابندیاں اس وقت لگاتا ہے جبکہ کسی معاملہ میں ضمنی یا لزومی طور پر ایسا مفسدہ موجود ہو جو مصلحت و ضرورت کے مقابلے میں زیادہ قابلِ لحاظ ہے اور ربا الفضل کی حرمت سے متعلق حکمت بہت سے لوگوں پر مستور ہے۔ حتیٰ کہ بعض متاخرین نے اعتراف کیا ہے کہ میں نہیں کہہ سکتا کہ ربا الفضل کی حُرمت کس حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ حالانکہ گزشتہ سطور میں ہم واضح کر چکے ہیں کہ ربائے فضل کی حرمت شریعت کی عظیم الشان حکمت اور مخلوقِ خدا کی مصالح کی بہترین حفاظت پر مبنی ہے اور یہ کہ ربا کی دو قسمیں ہیں۔

۱۔ رباء النسیئۃ، اس کی حُرمت ان اُمور میں سے ہے جن کو صاحب شریعت نے حرام قرار دینا اہم مقاصد میں سے سمجھا ہے۔

---

[1] اعلام الموقعین

۲- رباءِ فضل، اور اس کی حرمت ذرائع اور وسائل کی حرمت میں سے ہے اس لیے نفوس انسانی کی یہ کمزوری ہے کہ ان کو نقد نفع کی راہیں تنگ نظر آتی ہیں تو پھر وہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح نفع موفر ہی میسر آجائے اور اس طرح ربا النسیئۃ تک پہنچ جاتے ہیں۔ لہٰذا شریعت نے ایسے وسیلہ کو بند کر دینا ہی ضروری سمجھا اور اس لیے رباء الفضل پر بھی ممانعت کی باڑھ لگادی تاکہ رباء النسیئۃ تک کوئی نہ پہنچ سکے۔ اب اہلِ نظر انصاف کریں کہ اس سے بہتر حکمت اور حکم کیا ہو سکتا ہے [1]

رباءِ فضل پر ارشادِ نبوّت

رباءِ فضل کے متعلق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو احکام نقل ہو کر آئے ہیں ان میں اگرچہ صرف چھ چیزوں کا نام آیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

عبادہ بن الصامت سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ سونے کا مبادلہ سونے سے اور چاندی کا مبادلہ چاندی سے اور گیہوں کا گیہوں سے اور جَو کا جَو سے اور کھجور کا کھجور سے اور نمک کا نمک سے اس طرح ہونا چاہیے کہ جیسے کا تھا اور برابر برابر اور دست بدست ہو۔ البتہ اگر مختلف اصناف کی چیزوں کا ایک دوسرے سے مبادلہ ہو تو پھر جس طرح چاہو بشرطیکہ لین دین دست بدست ہو۔

یہ حدیث مسندِ احمد، صحیح مسلم، نسائی، ابنِ ماجہ اور ابو داؤد میں آئی ہے اور یہی حدیث کی مختلف کتابوں میں مختلف الفاظ میں ابو سعید خدری رضؓ اور ابو ہریرہ رضؓ سے بھی آئی ہے۔ ارشادِ نبوّت میں تو صرف یہی چیزیں اموالِ ربویہ قرار دی گئی ہیں جن کا باہمی تبادلہ زیادتی کے ساتھ نہ اُدھار جائز ہے نہ نقد۔

ارشادِ نبوّت پر فقہاء کا تفکّر

بعد کو فقہاءِ اسلام نے اس ارشادِ نبوّت پر غور کیا تو جو خصوصیات ان چھ چیزوں میں تھیں دوسری چیزوں میں بھی انھوں نے محسوس کیں، اسی لیے انھوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس ارشاد کو ایک اصلی قرار دیتے ہوئے ان چیزوں کو بھی ربائی مالوں میں داخل کر دیا جن میں ان کی نگاہ میں وہ خصوصیات موجود ہیں۔

[1] اعلام الموقعین۔

امام شافعیؒ اور قریب قریب امام مالکؒ کے سونا اور چاندی کے بارے میں سوچا کہ اس سے مراد ہر وہ چیز ہے جس میں قیمت بننے کی صلاحیت ہو۔ اب خواہ وہ سونا اور چاندی ہو یا کچھ اور، اسی طرح گیہوں اور جو، نمک اور کھجور کو دیکھ کر ان بزرگوں نے اندازہ کیا کہ ان سے مراد ہر وہ چیز ہے جو کھانے اور پینے کے کام آتی ہو۔ لیکن ربائی اموال کی یہ خصوصیت کہ اس کا ہر فرد دوسرے فرد کا قائم مقام ہوتا ہے اور اس کی یہی خصوصیت ان تلخ کی ذمہ دار ہے جو سُودی کاروبار میں پیش آتے ہیں۔ اس نکتہ پر صرف امام اعظم ابو حنیفہ رح کی نظر پہنچی انھوں نے غور کیا کہ یہ خصوصیت ہر اس چیز میں موجود ہے جس کی ہم جنس ہونے کے ساتھ خرید و فروخت پیمانہ سے یا وزن سے ہوتی ہے اس لیے امام اعظم رح نے ہر اس چیز کو جو ناپ کر یا تول کر بکتی ہو ربائی مال قرار دیا اور ان کے باہمی تبادلہ میں زیادتی کو ناجائز قرار دیا۔ ان اجتہادی دقیقہ سنجیوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ ربا اب ہزاروں چیزوں تک پھیل گیا۔ فقہاء نے تفصیلات میں دفتر کے دفتر تیار کر دیئے لیکن اصل بحث کا خلاصہ وہی ہے جو میں نے عرض کر دیا۔

ایک غلط فہمی

فقہ کی کتابوں میں سُود کے مباحث کو دیکھ کر لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ اسلام نے جس سُود کو حرام کیا ہے، وہ قرض والا موجودہ سُود نہیں بلکہ خرید و فروخت کی چند صورتیں ہیں جن سے منع کیا گیا ہے اور ان کا ہی فقہ کی کتابوں میں ذکر ہے۔ اگر کوئی شخص اس کو آڑ بنا کر اس سُود کی حرمت کو مشتبہ بنانے کی کوشش کرے جس کے سُود ہونے پر نصوص صریحہ وارد ہو چکی ہیں اور اس طریق استدلال سے رخصتوں اور حیلوں کا دروازہ کھولے اور پھر ان دروازوں سے گزر کر اُمت کو سرمایہ داری کے راستہ پر چلنے کی دعوت دے۔ حقیقت اس کا شمار ان لوگوں میں ہو گا جو قرآن کے خنزیر کو عرب کا جنگلی سُؤر اور قرآن کی خمر کو کسی خاص درخت کا رس قرار دے کر خنزیر اور خمر کی حلت کا فتویٰ دے۔ ظاہر ہے اگر اسلام نے اس سُود کو منع نہیں کیا تو کس چیز کو منع کیا ہے؟ کتنے تعجب کی بات ہے کہ جس معاشی سرطان کی تشخیص ارسطو تک کی عقل نے کر لی تھی اسی کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اسلام کی نگاہ معاشیات کے اس زہریلے بگاڑ پر نہ پڑی اور پڑی بھی تو کس چیز پر جس کا نہ اب دُنیا میں رواج ہے اور نہ کسی کو اس کا تجربہ ہے۔ دراصل یہ لوگ خود ہی گمراہ ہیں اور دوسروں کو بھی گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ یاد رکھیے کہ قرآن نے جس سُود کو بالذات حرام قرار دیا ہے اور معاشی جرم بتایا ہے وہ قرض والا موجودہ سُود ہے خواہ یہ نجی ضرورت کے لیے ہو یا کاروبار کی خاطر ہو۔

فقہاء کی دقیقہ سنجیوں کی وجہ

سُود کے موضوع پر اس قسم کے کچھ مسائل کا تذکرہ جن میں بظاہر علمی

دشواریاں نظر آتی ہیں اس لیے ہے کہ اسلام چونکہ قطعی طور پر سود کی بنیاد انسانی معاشیات سے اکھاڑ کر نکال دینا چاہتا ہے اس لیے جہاں بھی اس کی باریک رگ اور ریشے نظر آتے ہیں ان کو فوراً اکھیڑ دیتا ہے اور ایک ایسے خطرناک اور مہلک معاشی جرثومہ کو ختم کرنے کے لیے خود مسلمانوں کو اگر کچھ دشواریوں سے دوچار ہونا پڑتا ہے تو چاہیے کہ نظام کے استحکام کی خاطر اسے گوارا کریں۔ آخر زندگی کے دوسرے پہلوؤں میں بھی اپنے نصب العین کے تحفظ کی خاطر اس سے بھی زیادہ دشواریاں خندہ پیشانی سے برداشت کرتے ہیں،

سونے اور چاندی کے زیورات اور ظروف کی خرید و فروخت میں مساوات اور تقابض کی شرطیں یقیناً سنگین ہیں اور ان کی سنگینی نے صرف عملی دشواری پیدا کر دی ہے لیکن یہ دشواری کیوں پیدا کی گئی؟ کیا صرف سود سے بچنے کے لیے؟ بظاہر یہی سمجھا جاتا ہے لیکن سونے اور چاندی کے زیورات اور ظروف کے بارے میں نبوت کا جو اصل نقطہ نظر ہے وہ لوگوں کی نظروں سے اوجھل ہے، یہ بات سب کو معلوم ہے کہ سونا اور چاندی جن کو اسلامی معاشیات کی اصطلاحی زبان میں نقدین کہا جاتا ہے۔ ان کو نقدین بنانے کی جگہ مقصد بالذات بنا کر زیوروں اور برتنوں کی صورت میں لے آنا ملک کی معاشی زندگی کے لیے بہت بڑا سانحہ ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ معاشی ارتقا میں سب سے بدتر سنگ راہ ہے تو بیجا نہیں ہے۔ ایک معاشی اپنے مفلس ملک کا نوحہ ان الفاظ میں کرتا ہے۔

"ہندوستان کی قدامت پسندی اور جہالت بھی اس ملک کی غربت کی بہت کافی حد تک ذمہ دار ہے جس قدر بھی دولت موجود ہے، اس ملک کے باشندے اس کا صحیح استعمال نہیں جانتے۔ ان کی دولت یا تو زیوارت کی شکل میں ان کی عورتوں کے گلے کا ہار بن گئی ہے یا دفینوں کی صورت میں زمین کے نیچے پڑی ہوئی ہے"

یہ ہندوستان کے بارے میں ایک معاشی کا خیال ہے پاکستان کی صورتحال کچھ اس سے مختلف نہیں ہے اس غریب ملک میں زیور اور برتنوں نے معاشی زندگی کی اس ریڑھ کی ہڈی کو جس مقدار میں بیکار کر دیا ہے اس کا حال معاشیات کے طلبہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ بتانے والوں نے یہاں تک بتا دیا ہے کہ:

"اندازہ لگایا گیا ہے کہ اس وقت پاکستان میں فی کس ۵۰ روپیہ بالکل بیکار موجود ہیں"

گویا سونے اور چاندی کو زیورات کی صورت میں مقید کرنا ملک کی دولت کو بیکار کرنا ہے اور معاشیات میں ایک پیسہ کو بے کار رکھنا گناہ ہے جس کا مطلب یہی ہے کہ سونے اور چاندی کی ایک رتی کا زیور بنانا معاشی حیثیت سے ملک و قوم سے غداری ہے۔ اسلامی معاشیات کے رہبر اعظم نے آج سے ۱۴ سو سال پہلے یہ اعلان فرما کر دنیا والوں کو آگاہ کیا تھا۔

لوگو! سونے اور چاندی کے برتنوں میں پانی نہ پیا کرو اور ان کی پلیٹوں میں کھانا نہ کھایا کرو۔ (صحاح ستہ)

صرف ممانعت پر کفایت نہیں فرمائی بلکہ ملک کے اس معاشی جُرم کے بارے میں یہاں تک فرمایا کہ:
"چاندی کے برتن میں جو کھاتا پیتا ہے جہنم کی آگ میں اس کے پیٹ میں وہ کھولے گا۔" (بخاری)
اس لیے بالاتفاق تمام مدارس فقہ وقانون کا اس پر اتفاق ہے کہ سونے اور چاندی کے برتن کا استعمال ہر مسلمان مرد و زن کے لیے حرام ہے۔ اور جو حکم برتنوں کا ہے مردوں کی حد تک یہی حکم زیورات کا ہے۔ بجز انگوٹھی کے کہ اس کے بارے میں فقہاء کا کچھ اختلاف ہے ہر قسم کے سونے اور چاندی کے زیور مردوں پر حرام ہیں۔

زیورات اور منشاءِ نبوّت

عورتوں کے لیے اگرچہ زیورات کی ایک حد تک اجازت ہے مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات آئے ہیں اور مختلف اوقات میں آپ نے عورتوں کے زیور کے متعلق جو طرزِ عمل اختیار کیا ہے اس کا اگر بغور مطالعہ کیا جائے تو منشاء مبارک یہی معلوم ہوتا ہے کہ عورتیں بھی ملک کے اس سرمائے کو اپنے گلے کا طوق اور ہاتھوں کی بیڑیاں نہ بنائیں۔
ارشاد ہے اور مسند احمد میں موجود ہے۔
اے کاش میری اُمت ہی سونے کا زیور نہ پہنتی۔
"یہ آپ کی مشہور حدیث ہے بلکہ اُمتی فرمایا ہے جس میں مرد و عورت دونوں داخل ہیں۔ اس میں اس تمنا کا اظہار ہے کہ اُمت سونے کا زیور استعمال نہ کرے۔"
بہرحال اگرچہ فقہاءِ اسلام نے قانونی طور پر زیورات کی حرمت کو صرف مردوں تک محدود کیا ہے لیکن بجائے قانون کے اگر ہم نبوت کا منشاء اور آثار زیور پوری کرنے پر آمادہ ہو جائے تو عورتوں سے بھی زیور کا قصہ تمام ہو جاتا تو ہم اسلام نے صراحتہً عورتوں کے لیے اگرچہ سونے چاندی کے زیور کو ممنوع نہیں کیا لیکن سونے چاندی سے سکّہ کے سوا جو چیزیں بھی بنائی جاتی ہیں خواہ وہ زیور ہوں یا برتن ہوں یا کچھ اور ہوں ان کی خرید و فروخت میں ایسی دشواریاں پیدا کر دی ہیں کہ اسلامی نظامِ معیشت رکھنے والی قوم میں آسانی کے ساتھ ان کا چلن نہیں ہو سکتا[1]

مقائضہ کا دستور

اسلام سے پہلے عرب میں بارٹر سسٹم یعنی جنس کو جنس سے خریدنے کا طریقہ رائج تھا اسے فقہاء کی اصطلاحی زبان میں مقائضہ کہتے ہیں۔ اسلام بتدریج اس رواج کو گھٹانا چاہتا تھا۔ علماء معاشیات جانتے ہیں کہ معاشی ارتقاء میں تبادلہ

---

[1] اسلامی معاشیات ملخصاً۔

کے اس طریقے کے بدلنے میں کتنا دخل ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی لیے ایک جنس کی دو چیزوں میں نمبر کے فرق کو سود کے معاملہ میں ناقابلِ لحاظ قرار دیا اور صاف لفظوں میں اعلان کر دیا گیا کہ:

ان کی عمدہ اور ردّی قسمیں دونوں برابر ہیں (بخاری)

اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ واقع میں ان چیزوں کے اقسام میں نمبروں کا تفاوت نہیں ہے بلکہ مقصد یہ ہے کہ اگر اس فرق کی بنا پر زیادتی کی اجازت دی جائے گی تو لوگوں کے لیے سود خواری کی راہ کھل جائے گی اور اس میں اشارہ ہے کہ چیز کا چیز سے بدلنے کا رواج ختم کر کے چیز کو قیمت سے خریدنے کا دستور قائم کیا جائے۔ چنانچہ آپ نے فرمایا ہے:

کھجور (جوادنیٰ قسم کی ہو اسے) بیچ دو اس کی قیمت سے اچھی کھجور خریدو۔

زرِ مبادلہ کی دشواریاں

ارشادِ نبوت سونے کا مبادلہ سونے سے اور چاندی کا مبادلہ چاندی سے برابر برابر ہو کے معاشی نظریہ میں جہاں سود کی بندش اور سرمایہ کے انجماد سے تعلق ہے وہاں اس طرف بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ تمام سکوں کا وزن اور معیار ایک کر دیا جائے تاکہ ایکسچینج کی جو دشواریاں پائی جاتی ہیں دور ہو جائیں اور بٹاون کا قصہ ختم ہو جائے اور چاندی کا چاندی سے اور سونے کا سونے سے جب تبادلہ کیا جائے برابر برابر ہونا چاہیے۔ اس کی صورت اس کے سوا اور کچھ نہیں ہے کہ بین الاقوامی طور پر تمام حکومتیں اپنے اپنے نقرئی اور طلائی سکوں کو ہم وزن کر دیں اور جیسے سال و ہفتہ کے ایام تقریباً تمام ممالک میں یکساں ہوتے ہیں اسی طرح کے وزن کو بھی ساری دنیا میں برابر کر دیا جائے اور بٹاون کے رواج کو مسدود کر دیا جائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا بحیثیت رسولِ عالم ہونے کے دنیا سے یہ مطالبہ اس کا مستحق ہے کہ علماءِ معاشیات اس کے فوائد و ثمرات اور اس کی مخالف موجودہ شکل کے نقصانات واضح کریں۔ مدت ہوئی کہ مصر کے ایک مشہور علمی مجلہ الہلال نے ایک مضمون شائع کیا تھا۔ مضمون نگار نے جنیوا کی مرحوم لیگ آف نیشنز کے سامنے یہ تجویز رکھی تھی کہ:

انجمن اقوام کی وجہ سے اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ کوئی ایسا اساسی اور بنیادی سکہ ایجاد کیا جائے جس پر دنیا کی قوموں کا اتفاق ہو جائے اور سارے جہاں کے باشندے اس پر متحد ہو جائیں۔

کیا یہ مشورہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ سواء بسواء مثلاً بمثل کا ترجمہ نہیں ہے۔

سُود خوار کو دائمی عذاب کی دھمکی

۸۲۲ ۔ اور جو شخص پھر سُود لے گا وہ دوزخی گروہ میں سے ہے ہمیشہ عذاب میں رہنے والا یعنی جو کوئی اس تبلیغ کے بعد بھی جواز سُود کے عقیدے پر قائم رہے گا یا سُود کا معاملہ کرتا ہے گا اس کی سزا جہنم ہے۔ اصل ارشاد میں ومن عاد آیا ہے۔ اس کے معنے واپس ہونے اور لوٹنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کھلی تنبیہہ کے باوجود بھی جو لوگ سودی کاروبار کریں گے وہ دوزخی ہیں اور دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ ایسے لوگوں کے لیے دائمی دوزخ کی سزا کی وجہ یہ ہے کہ ان کا یہ رویہ اس بات کا نہایت واضح ثبوت ہے کہ وہ اللہ سبحانہ کے اس حکم کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے احکام کی نافرمانی اگر جذبات کے غلبے کے سبب ہوتی ہے تو توبہ کے ذریعے اس کی اصلاح ہو سکتی ہے۔ اس کا بھی امکان ہے کہ توبہ سے غفلت کے باوجود اللہ تعالیٰ کسی کو معاف کر دے یا اس کے گناہوں کے بقدر اس کو سزا دے کر رہائی دے لیکن جب نہایت واضح تنبیہہ کے باوجود کوئی حکم کی خلاف ورزی کرتا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اللہ کے حکم کا منکر ہے اور منکروں کا انجام وہی ہے جو اس آیت میں بتایا گیا ہے۔

دارِ حرب کے معاملات

یہاں ابوبکر الجصاص نے عود کے لفظ میں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ کسی مملکت میں اسلامی قانون نافذ ہو جانے کے بعد ان معاملاتِ مالی سے سرکار کوئی تعرض نہ کرے گی جو قانونِ اسلامی کے نفاذ سے پہلے ہو چکے ہیں خواہ وہ کیسے ہی غلط اور اسلامی قانون کے خلاف ہوں یعنی قانونی طور پر ان کو فسخ نہ کیا جائے۔ ہاں قانونِ اسلامی نافذ ہونے کے بعد ایسا کرنے کی اجازت نہ دی جائے گی۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان معاملات پر مبنی اموال حلال ہیں۔ حلال ہونا اور بات ہے اور حرام پر قانونی تعزیر ہونا اور بات ہے اگر کسی کے پاس اس قسم کے اموال موجود ہیں مثلاً سُود کے ذریعے حاصل کیا ہوا مال موجود ہے تو اگرچہ قانون اس پر اس جرم کی پاداش میں مقدمہ نہیں چلائے گا مگر جو قرض عاریت، امانت، خرید و فروخت کے سلسلے میں اس کے ذمہ موجود ہیں ان کی ادائیگی سے سبکدوش نہ ہوگی، بلکہ اس کی ذمہ داری ایمان کے تقاضے سے اور بڑھ جائے گی۔ قرض خواہ کا قرض ادا کرنا ہوگا، صاحبِ عاریت کی عاریت ضرور واپس کرنی ہوگی اور امانت کو اس کی امانت یقیناً سپرد کرنا پڑے گی۔ آیت کا تعلق صرف قانونی گرفت سے ہے فلہ ما سلف اُن عقود سے متعلق ہے جو زمانہ غیر اسلامی میں کیے گئے ہوں، اسلام کے بعد اب اس کا کوئی جواز نہیں رہا ہے اسی طرح اگر کافر اسلام قبول کرے تو اس کے زمانہ کفر کے گناہوں کا بھی یہی حکم ہے کہ وہ سب معاف کر دیئے جاتے ہیں۔ قرآن میں ہے ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف، اگر وہ باز آجائیں تو ان کے گزشتہ گناہ

معاف کر دیئے جائیں گے۔ یعنی زنا، سرقہ، قتل، غارت جیسے جرائم اسلام کے بعد محو کر دیئے جائیں گے اور کیسے محو نہ ہوں جبکہ اسلام کفر و شرک کی تاریکی ہی محو کر چکا ہے۔ کفر ایک موت ہے اور اسلام اس کے بعد حیات نو لیکن جس طرح ایک تندرست آدمی بیمار پڑ سکتا ہے اسی طرح ایک مسلمان سے بھی گناہ سرزد ہو سکتے ہیں۔ اس لیے ایسے اعمال کی ضرورت پھر باقی رہتی ہے جو اس کی اس جدید زندگی کی فرو گذاشتوں کا کفارہ بن جائیں۔ آیت قرآنی نے و من عاد کہہ کر جتا دیا کہ عفو کے اس اعلان کے باوجود اگر کوئی باز نہ آیا۔ اور پھر پہلی حالت پر پلٹا جیسے باز آنے میں دونوں حالتیں ہیں سود لینا۔ سود کو بیع کی طرح سمجھنا اور اس کی حلت کا معتقد ہونا ایسے ہی پلٹنے میں بھی دونوں حالتیں مراد ہیں، سود کی حلت کا اعتقاد اور سود کا لینا۔ قرآن نے دوسرے موقعہ پر بھی یہ دونوں لفظ یعنی انتہا اور عود بولے ہیں ارشاد ہے۔

ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف وان یعودوا فقد مضت سنۃ الاولین۔

اب بھی اگر وہ باز آجائیں تو جو کچھ گزر چکا معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہ پلٹیں گے تو پہلوں کا طور طریقہ گزر چکا ہے۔

یہاں بھی باز آنے سے قتال و غارت گری اور کفر سے باز آنا اور پلٹنے سے کفر و قتال کی طرف پلٹنا مراد ہے، ایسے ہی اس آیت میں بھی سود لینے اور کفر سے باز آنا اور پلٹنے سے کفر اور سود خواری کی طرف واپس آنا مراد ہے۔

دراصل یہاں دو چیزیں ہیں ایک ہے جرم کا ارتکاب اور دوسرے کسی جرم کو اوڑھنا بچھونا بنا لینا جو جرم اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے وہ مجرم کی زندگی کے کسی ایک پہلو ہی کو متاثر نہیں کرتا بلکہ اس کی زندگی کے ہر پہلو کو لپیٹ میں لے لیتا ہے۔ اس کی گفتار، اس کا کردار اور اس کا ایمان و یقین بھی اس کی گرفت سے محفوظ نہیں رہتا۔ اس حالت کو قرآن احاطہ سے تعبیر کرتا ہے احاطت بہ خطیئتہ اور ایسے لوگوں کے بارے میں یقیناً دائمی عذاب ہے۔

سود ترقی کا نہیں بلکہ تنزل کا ذریعہ ہے

۸۲۳ اللہ سود کو مٹاتا ہے اور صدقات کو بڑھاتا ہے اور یاد رکھو اللہ ناسپاس اور نافرمان سے خوش نہیں ہے یعنی سود کے مال میں برکت نہیں ہوتی بلکہ اصل مال بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ارشاد ہے کہ سود کا مال کتنا بھی بڑھ جائے انجام اس کا افلاس ہے اور خیرات کو بڑھانے کا مطلب ہے کہ اس مال میں زیادتی ہے

اور اللہ برکت دیتا ہے اور اس کا ثواب بڑھایا جاتا ہے چنانچہ احادیث میں وارد ہے ۔[1]

آخرت میں تو اس وعدہ وعید دونوں کا مشاہدہ پوری طرح ہو کر رہے گا کہ سُود میں برکت اور خیریت برائے نام بھی نظر نہ آئے گی اور صدقات کا اجر بے حساب ملے گا لیکن دُنیا میں بھی اس کا ظہور کسی نہ کسی حد تک ہوتا ہی رہتا ہے۔ سُود خوار قوموں کا انجام بارہا اس کی خونریزی اور تباہی و بربادی ہی پر ہوتا ہے اور افراد میں بھی مشاہدہ ہے کہ سُود خواری کی عادت بنیوں اور مہاجنوں کے دل میں روپیہ کو فی نفسہٖ محبوب بنا دیتی ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ سُود خوار دولت سے دُنیوی لُطف بھی نہیں اٹھا پاتا۔ اس کے برعکس صدقہ کی برکتیں، ملّی غمخواری و ہمدردی ایک دوسرے کی شارکت و معاونت قوم اور افراد دونوں کے مشاہدے کی چیزیں ہیں ۔[2]

سُوداور صدقہ کا تقابلی مطالعہ

دراصل اس آیت میں سُود اور صدقہ کا تقابلی مطالعہ کر کے ایک اہم اُصولی حقیقت کے چہرے سے نقاب ہٹائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ سُود گو شخصی دولت میں اضافہ کرتا ہے لیکن جماعتی دولت کو برباد کرتا ہے جس سے پوری قوم افلاس کا شکار ہو جاتی ہے اور آخر وہ شخص بھی تباہ ہو جاتا ہے اور صدقہ سے قوم کے نہ کمانے والے افراد کی امداد ہو کر قومی دولت کا معتدل نظام قائم رہتا ہے اور ساری قوم خوشی اور برکت کی زندگی بسر کرتی ہے، اگر سُود لینے والا کسی اتفاقی مالی خطرے میں پڑ جاتا ہے تو اس کی مدد کے لیے جماعت ایک اُنگلی تک نہیں ہلاتی لیکن صدقہ دینے والے کی امداد کے لیے پوری قوم کھڑی ہو جاتی ہے ۔

ایک اور بات یہ ہے کہ سُود خوار اس قدر طماع و حریص ہو جاتے ہیں کہ ان کو کثیر مقدار بھی کم نظر آتی ہے اور جو لوگ صدقہ دینے کے خوگر ہوتے ہیں وہ اس قدر مستغنی اور قانع ہو جاتے ہیں کہ ان کے لیے تھوڑا مال بھی کافی ہوتا ہے۔ سُود خوار اپنے مال کے اضافہ اور ترقی کی حرص میں اتنا آگے بڑھ جاتا ہے کہ جس تلوار سے دوسروں کو قتل کر کے اس کی دولت پر قبضہ کرتا ہے آخر اسی تلوار سے دوسرا اس کو قتل کر کے اس کے تمام اصل و منافع پر بیک وقت قبضہ کر لیتا ہے لیکن صدقہ و خیرات دینے والا جو دوسروں کی دولت ناجائز طریق سے نہیں لوٹتا بلکہ خود دوسروں کو اپنے مال سے دیتا ہے اور سلامت روی کے ساتھ اپنے کاروبار کو چلاتا ہے اس کو کوئی دوسرا بھی نہیں لوٹتا وہ اپنے سرمایہ اور قلیل منافع کو محفوظ رکھتا ہے۔ دُنیا کے بڑے بڑے تجارتی شہروں کی منڈیاں اور کوٹھیاں اس عبرتناک واقعہ کی پوری تصویر ہیں۔ اور یہ ہر روز کا مشاہدہ ہے۔

---

[1] افادات شیخ الہند [2] ماجدی

سود خوار کو دوسروں کو لوٹنے سے اتنی فرصت کہاں ملتی ہے کہ وہ دوسروں کی مدد کا فرض ادا کرے وہ تو ہمیشہ اس تاک میں رہتا ہے کہ دوسرے مصیبتوں اور دقتوں کا نشانہ بنیں۔ اور وہ ان کی پریشانیوں سے مستفید ہو لیکن جو صدقہ دیتے ہیں وہ ہمیشہ قابل ہمدردی افراد کی تلاش میں لگے رہتے ہیں تاکہ وہ اپنے مال و دولت سے اس کی مدد کر کے اس کے زخم دل پر مرہم رکھ سکیں۔

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِندَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٧٧﴾

بلاشبہ جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور ان کے اعمال بھی اچھے ہیں[۸۲۴] اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں[۸۲۵] تو ان کے لیے اُن کے پروردگار کے حضور اُن کا اجر ہے نہ تو اُن کے لیے کسی طرح کا اندیشہ ہو سکتا ہے اور نہ وہ غمگین ہوں[۸۲۶] گے۔

باہمی محبّت و ہمدردی پیدا کرنے کا طریقہ

دینِ حق جو محمد رسُول لے کر آئے ہیں وہ باہم محبت و ہمدردی، اخوت اور خیر سگالی پیدا کرنے آیا ہے اس لیے اس نے خیرات کا حکم دیا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی حاجت روائی کرے اور اس کی احتیاج کو اپنی احتیاج سمجھے لیکن سُود خواری کی ذہنیت بالکل اس کی ضد ہے۔ سُود خوار ایک انسان کو حاجت مند دیکھتا ہے تو اس کی مدد کا جذبہ اس میں پیدا نہیں ہوتا بلکہ چاہتا ہے کہ اس کی احتیاج اور بے بسی سے اپنا کام نکال لے اور اس کی محتاجی کو اپنی دولت مندی کا ذریعہ بنائے خود غرضی کا یہ جذبہ اگر بے روک بڑھتا ہے تو پھر انسان میں انسانی ہمدردی کی بو باس تک باقی نہیں رہتی ایک بے رحم اور بے پناہ درندہ بن کر رہ جاتا ہے انسانی زندگی کو اس بیماری سے چھٹکارا کیوں کر مل سکتا ہے اسی سوال کا جواب قرآن نے اس آیت میں دیا ہے کہ اس سے بچنے کے لیے ضروری ہے اسلامی زندگی اختیار کی جائے۔ اسلامی زندگی یہ ہے کہ افکار و نظریات میں ایمان کو اور کردار و گفتار اور اخلاق میں اعمالِ صالحہ کو اپنایا جائے اور ان کے عملی ثبوت کے لیے بطورِ نشان بندگی نماز اور زکوٰۃ کو اجتماعی

طور پر زندگی کا نشان بنا لیا جائے۔

اسلامی زندگی کیا ہے

۸۲۴۔ بلاشبہ جو لوگ ایمان رکھتے ہیں اور ان کے اعمال بھی اچھے ہیں۔ اس آیت میں سود لینے والے کے مقابلے میں اہل ایمان کے اوصاف اور ان کا انعام ذکر کیا ہے جو سود خوار کے اوصاف و حالات اور اس کے حکم کے خلاف اور ضد ہیں جس سے سود خوار کی پوری تہدید و تشنیع بھی ظاہر ہو گئی۔ ؎[1]

اس آیت کی اس مقام پر معنویت صرف یہی نہیں ہے کہ سود خواروں کے مقابلے میں نیکو کاروں کے اجر کو بیان کیا ہے بلکہ مقام اور موقعہ کا تقاضا ہے کہ اس آیت کے یہاں لانے میں بہت گہری معنویت ہو۔ اس سے پہلی آیت میں ان سود خواروں کو جو سود خواری کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیں اور سود خواری جن کی روح ایمان میں ناسور پیدا کر دے جہنم کی دھمکی دی گئی تھی۔ پھر سود خوار کو کفار اور اثیم کہہ کر پکارا تھا اور بتایا تھا کہ اللہ سبحانہ کو کفر و اثم پسند نہیں ہے۔ سود خوار بیک وقت دو بیماریوں کا شکار ہوتا ہے حبّ مال اور حبّ جاہ کا۔ اور یہی دونوں بیماریاں سود خوار میں تمام عیبوں کا سرچشمہ ہیں۔ اگر یہ دونوں بیماریاں ختم ہو جائیں تو زندگی عیبوں سے پاک ہو جائے گی ان کو ختم کرنے کا واحد راستہ یہ ہے کہ اسلامی زندگی اختیار کرو۔ اسلامی زندگی نام ہے ایمان اور عمل صالح کا، ایمان اگر نظریہ ہے تو عمل صالح اسی نظریہ کی تشکیل ہے۔ دونوں میں فرق یوں سمجھو کہ ہر انسان کا ایک تعلق اپنے خالق کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے خالق کی دوسری مخلوقات کے ساتھ ہے۔ اسی بات کو دوسری عبارت میں یوں کہو کہ انسان کا ایک تعلق اپنے آقا اور مالک کے ساتھ ہے اور دوسرا اپنے آقا اور مولیٰ کے غلاموں کے ساتھ ہے یا یوں کہو کہ اس کا ایک رُخ آسمان کی طرف ہے اور دوسرا زمین کی سمت۔ اس کا ایک لگاؤ عالم غیب سے ہے اور دوسرا عالم شہود سے پہلے کے ساتھ اس کا تعلق ایک مہربان آقا اور فرمانبردار غلام کا ہے اور دوسروں کے ساتھ اس کا تعلق برابر اور بھائی چارے کا ہے، خالق اور مخلوق یا خدا اور بندے کے درمیان جو علاقہ اور رابطہ ہے اس کا تعلق اگر صرف ہمارے ذہنی قویٰ اور قلبی حالات سے ہے تو اس کا نام عقیدہ ہے اور اگر ان قلبی حالات کے ساتھ ہمارے جسم و جان اور مال و جائداد سے بھی ہے تو اس کا نام عبادت ہے۔ باہم انسانوں میں یا انسانوں اور دوسری مخلوقات میں جو علاقہ و ربط ہے اس کی حیثیت سے جو احکام ہم پر عائد ہیں اگر ان کی حیثیت محض قانون کی ہے تو اس کا نام معاملہ ہے اور ان کی حیثیت قانون کی نہیں بلکہ روحانی نصیحتوں اور ہمدردانہ ہدایتوں کی ہے تو اس کا نام اخلاق ہے۔ قرآن کی اصطلاح

[1] افادات شیخ الہند۔

میں پہلے تعلقات کی مضبوطی اور استحکام کا نام ایمان ہے اور دوسرے تیسرے اور چوتھی بجاآوری کا نام عمل صالح ہے۔ یہاں خالص مالیاتی مسئلہ کے درمیان ایمان اور عمل صالح کو موصوفین کا کردار بنا کر پیش کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ صرف انسانی ہمدردی، خیر سگالی کے جذبات ہی کا نام دینِ حق نہیں بلکہ اسلام نام ہے ایمان و عملِ صالح کے مجموعہ کا اس مجموعہ کو اپنانے والے ہی کامیاب ہیں۔ یہاں ایک خاص نکتہ ہے جس کو سمجھے بغیر آگے نہ چلنا چاہیے۔ یہودیوں نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسم و رواج کو دی تھی اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات و فلاح کا دار و مدار رکھا۔ قرآن کی پہلی تکمیلی شان یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے ان دونوں کو جمع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان اور نہ تنہا عمل پر ہے بلکہ ایمان صحیح اور عملِ صالح کی جامعیت پر موقوف ہے الذین آمنوا وعملوا الصلحت دوسری بات یہ ہے کہ وہ ایمان کو صرف ایمان کی بنا پر ترجیح نہیں دیتا بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عمل صالح کی علت ہے یعنی وہ عمل صالح کے لیے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے۔

یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لیے نخلِ ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل سے ہوتی ہے، اب اگر ایسا کوئی شخص نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نظر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بار نہیں پیدا کیا ہے۔ یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم قرار دیتا ہے اس نے مسلمانوں کو یایھا الذین آمنوا کی ندا سے خطاب کیا ہے، بہرحال اسلام ایمان و عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔

اسلامی زندگی کی مرئی نشانیاں

۸۲۵۔ اور نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اس کے ذریعے یہ بتایا ہے کہ اسلام کو اپنانے کے بعد ایک جماعت مسلمانوں کی اس وقت تسلیم کی جاسکتی ہے جب اس کے عمل میں دو باتیں ضرور آجائیں۔ نماز کی جماعت کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی اگر یہ دو عملی باتیں ایک جماعت میں مفقود ہوں گی تو اس کا شمار مسلمانوں میں نہ ہوگا۔ یہ گویا اسلامی زندگی کو اپنانے کی محسوس اور مرئی نشانی ہے۔ زبانِ نبوت نے اسی کو مشرکین سے جنگ کا خاتمہ کے لیے غایت قرار دیا ہے۔ حدیث کے آئمہ خمسہ نے حضرت عبداللہ ابن عمر رضؓ کے حوالہ سے یہ ارشادِ نبوت نقل کیا ہے۔

> میں اس بات پر مامور ہوں کہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ کرتا رہوں جب تک وہ یہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کریں

اور زکوٰۃ ادا کریں۔ جب یہ کریں گے تو مجھ سے اپنی جان و مال کو بچالیں گے۔ ہاں بجز اس صورت کے جو اسلامی قانون کے تحت ہو اس کے بعد ان کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔

یعنی غیر مسلموں سے جنگ چھڑ جائے تو اسے ختم کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ وہ اسلام کو قبول کریں اور اسلام قبول کرنے کے بعد عملی زندگی میں یہ دو باتیں نماز اور زکوٰۃ داخل کریں۔ اس ارشادِ نبوت میں زبان کے اقرار، نماز کی اقامت اور ادائے زکوٰۃ کو مسلمان ہونے کی نشانی قرار دیا ہے۔

نماز و زکوٰۃ کی اسلام میں اہمیت کیوں؟

یہ سوال بھی یہاں بے حد وزنی ہے کہ تمام ارکانِ اسلام میں سے ان دو کو یہ اہمیت کیوں دی گئی ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اس طرف توجہ فرمائی ہے اور انسانی دماغ کی رسائی کی حد تک اسے خوب ہی سمجھایا ہے مولانا فرماتے ہیں:

> عبادت درحقیقت بندگی اور عبدیت کی ایک عملی مشق و تمرین ہے، عبدیت وہ صحیح رشتہ ہے جو بندے اور اس کے معبود کے درمیان قائم ہے، جس قدر بھی آسمانی صحیفے آئے ہیں وہ اسی رشتہ کو سمجھانے اور اس کے حقوق بتانے آئے ہیں باپ بیٹے، دوست، ہمسایہ کے رشتے حتیٰ کہ اُمتی اور رسُول کا رشتہ ایک مخلوق کا دوسری مخلوق کے ساتھ قائم ہو سکتا ہے۔ اسی طرح ان رشتوں میں تعدد کی گنجائش ہے لیکن عبدیت اور معبودیت کا وہ رشتہ ہے جو نہ باہم مخلوقات میں ایک دوسرے سے قائم ہو سکتا ہے اور نہ اس میں دوئی کی گنجائش ہے وہ صرف مخلوق اور اس کے خالق کے درمیان قائم ہے۔ اس رشتہ کو صرف سمجھانا نہیں ہے بلکہ اس کی ایک ایک ادا سے ہمیں رنگین بنانا ہے۔

رشتہ عبادت کے بنیادی عناصر

اس رشتہ کے بنیادی عناصر دو ہیں۔ ایک طاعت دوسرے محبت، ہر غلام کا فرض ہے کہ وہ اپنے مولیٰ کے سامنے ہمہ تن طاعت ہو مگر وہ طاعت نہیں جو ذوقِ محبت سے خالی ہو۔ اس کا فرض ہے کہ وہ اپنے مولیٰ سے محبت کرے مگر وہ محبت نہیں جس میں سر مو خلاف کی گنجائش ہو۔ اسی طاعت و محبت کی خاطر نبوت نے ہمیں اللہ کے ایسے خوبصورت نام بتائے ہیں جن میں حُسن و خوبی کا جلوہ بھی ہے اور ملکوت و سلطنت کا دبدبہ بھی اور بس حکم دیا کہ ہم اس کو ان ناموں سے پکارا کریں۔ اور ان ناموں کے لحاظ سے عبادات میں یہ تقسیم کر دی کہ کچھ عبادات

وہ ہوئیں جو اللہ سبحانہ کی حکومت کا سکہ دل پر قائم کریں اور کچھ وہ جو اس کا جذبۂ محبت ابھارکائیں۔
اب اگر تم ذرا غور کرو گے تو اسلام کی عبادات میں نماز اور زکوٰۃ تمہیں پہلی قسم میں نظر آئیں گی جب کہ روزہ اور حج کا تعلق دوسری قسم سے ہے۔
نماز و زکوٰۃ میں تمام تر بارگاہ سلطنت کا ظہور ہے اور روزہ و حج میں سرتاسر محبوبیت کا جلوہ۔
نماز کیا ہے؟ حاضری کے ایک عام نوٹس پر لباس و جسم کی صفائی اس کے بارگاہ کی حاضری کے لیے تیاری، وکیل کا انتخاب پھر بارگاہ میں پنج گردست بستہ باادب بہ نظام، دائیں بائیں دیکھنے، بات چیت کرنے، کھانے پینے حتیٰ کہ بلاوجہ کھانسنے اور نظریں اٹھانے تک کی ممانعت، آخر میں بذریعہ وکیل درخواست پیش کرنا، پھر باادب سلام کر کے رخصت ہو جانا۔ زکوٰۃ کی حیثیت سرکاری ٹیکس سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ غلام کی طرح اپنی کمائی دوسرے کے حوالہ کر دینا۔
ان دونوں میں اللہ کی حکومت و سلطنت کی روح کام کر رہی ہے اور ان کے ذریعے بندہ کے اللہ سے خالص محکومانہ اور غلامانہ تعلقات استوار ہوتے ہیں جبکہ روزہ اور حج کے ذریعے بندہ کے اللہ سے عاشقانہ تعلقات نشوونما پاتے ہیں۔
غالباً نماز اور زکوٰۃ کو اسلامی زندگی کا نشان بنانے میں یہی راز ہے کہ اس سے بندے کی حکومیت کا اعلان ہوتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ خالص مالیاتی مسائل کے ذکر میں خاص طور پر ان دونوں کا ذکر کیا گیا ہے جو داغ عبدیت کو گوارا کر لیتا ہے۔ اس کے لیے پوری زندگی کو بندگی کے سانچے میں ڈھال لینا آسان ہے۔ انسان فطرتاً داغ عبدیت برداشت نہیں کرتا اس لیے اسلامی زندگی کے لیے بطور علامت نماز اور زکوٰۃ ہی کو نشان بندگی قرار دیا گیا ہے۔

۸۲۶ ۔ ان کے لیے ان کے پروردگار کے حضور ان کا اجر ہے، نہ تو ان کے لیے کسی طرح کا اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے۔ یہ اسلامی نظام حیات کو قبول کرنے کی وہ ضمانت ہے جو دنیا کا کوئی نظام حیات اپنے پیروکاروں کو نہیں دے سکتا۔ نہ سرمایہ دارانہ نظام اور نہ اشتراکی نظام۔ اس میں تین ضمانتیں دی گئی ہیں اور بتایا گیا ہے کہ سرمایہ دارانہ نظام چھوڑ کر جو سود کی اساس پر قائم ہے اگر انسانیت اسلامی نظام حیات کو اپنا لے جو صدقات کی اساس پر قائم ہے تو انسانی زندگی کو قرآن تین قسم کی ضمانتیں دیتا ہے۔
اولاً اسلامی زندگی اختیار کرنے کے بعد ان کے ایک ایک عمل کا اللہ کے یہاں اجر ہے دوسرے نظاموں کی طرح بیگار نہیں ہے اور اجر بھی معمولی نہیں بلکہ اجر غیر ممنون کبھی کم یا ختم ہونے والا اجر نہیں۔
ثانیاً یہ کہ اسلامی زندگی اختیار کرنے کے بعد اللہ سبحانہ ہر قسم خوف اور اندیشہ سے دنیا و آخرت میں

بے نیاز کر دیں گے۔ دُنیا کی ساری زندگی خوف اور اندیشہ کی زندگی ہے۔ مال کے چوری ہو جانے کا اندیشہ، اولاد کے بگڑ جانے کا اندیشہ، اقتدار کے چھن جانے کا اندیشہ، بادشاہ کے بگڑ جانے کا اندیشہ اس نظام کو قبول کرنے کے بعد ہر قسم کے اندیشے اور خوف سے آزادی مل جائے گی۔

ثالثاً اسلامی نظامِ زندگی قبول کرنے کے بعد کوئی غم نہ ہوگا۔ مال نہ ہونے کا غم، اقتدار نہ ہونے کا غم، اعمال کے رائیگاں ہونے کا غم۔

گویا جس کے قدم اسلامی زندگی پر جم گئے اس کے لیے خوف و غم کے کانٹے بے اثر ہو جائیں گے اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا نہ کسی طرح کی غمگینی۔ آخرت کی زندگی میں تو انجام کا اچھا ہونا ظاہر ہے لیکن دُنیا میں بھی جو سکونِ قلب کی یکسوئی، طمانیت خاطر اور قناعت کی مسرتیں ایسے لوگوں کو حاصل رہتی ہیں۔ ان کا اندازہ وہ بدنصیب نہیں کر سکتا جو ہم ۲۴ گھنٹے آنہ پائی کی میزان لگاتا رہتا ہے جو مخلوق کی ایذا رسانی کا خوگر ہو کر پیسہ پیسہ گنتا رہتا ہے اور جس پر ہر گھڑی یہی کھاتہ سنبھالے رکھنے کا بھوت سوار رہتا ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ ایک کردار وہ تھا جو ایک خود غرض، زر پرست قسم کے انسان کا ہے دوسرا کردار ایک خدا پرست۔ فیاض اور ہمدرد انسان کا کردار ہے جو خدا اور خلقِ خدا دونوں کے حقوق کا خیال رکھتا ہے اپنی قوتِ بازو سے خود کما کر کھاتا اور دوسرے بندگانِ خدا کو کھلاتا ہے۔ پہلی قسم کا کردار اللہ کو پسند ہے دُنیا میں اس کردار پر کوئی صالح سوسائٹی نہیں بن سکتی اور آخرت میں ایسے کردار کے لیے غم و اندوہ اور کلفت و مصیبت کے سوا کچھ نہیں برخلاف اس کے اللہ کو دوسرا کردار پسند ہے۔ اس دُنیا میں صالح معاشرہ بنتا ہے اور وہی آخرت میں انسان کے لیے موجبِ فلاح ہے[2]

---

[1] ماجدی [2] تفہیم القرآن

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اتَّقُوا اللّٰهَ وَذَرُوْا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبٰوا اِنْ
كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۲۷۸﴾ فَاِنْ لَّمْ تَفْعَلُوْا فَاْذَنُوْا بِحَرْبٍ مِّنَ
اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ۚ وَاِنْ تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوْسُ اَمْوَالِكُمْ ۚ لَا تَظْلِمُوْنَ
وَلَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۲۷۹﴾ وَاِنْ كَانَ ذُوْ عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ اِلٰى مَيْسَرَةٍ ؕ
وَاَنْ تَصَدَّقُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ﴿۲۸۰﴾

اے اہل ایمان! اگر فی الواقع تم مومن ہو تو اللہ کی نافرمانی سے بچو اور جس قدر سُود کی رقم قرضداروں کے ذمّہ باقی رہ گئی ہے اسے چھوڑ دو۔[۸۲۷] پھر اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو اللہ اور اُس کے رسُول سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔[۸۲۸] پس اگر تم نے اس باغیانہ روش سے توبہ کرلی تو تمہارے لیے اصل رقم لینے کا حق ہے۔[۸۲۹] نہ تمہیں ظلم کرنا ہے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا۔[۸۳۰] اور اگر مقروض تنگ دست ہو تو تمہیں چاہیے کہ اُسے فراخ دستی حاصل ہونے تک مہلت دے دو۔ اگر تمہارے پاس علم ہے تو ایسے تنگ دست کو قرض بطورِ صدقہ بخش دینا زیادہ اچھا ہے۔[۸۳۱]

سُودی کاروبار کرنا ایک فوجداری جرم ہے

یہ آیت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی اور مضمون کی مناسبت سے اس سلسلۂ کلام میں داخل کردی گئی۔ اس سے پہلے سُود اگرچہ ایک ناپسندیدہ چیز سمجھا جاتا تھا مگر قانوناً اسے بند نہیں کیا گیا تھا۔ اس آیت کے نزول کے بعد اسلامی حکومت کے دائرے میں سُودی کاروبار ایک فوجداری جُرم بن گیا۔ عرب کے جو قبیلے سُود کھاتے تھے ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سرکاری طور پر مطلع کردیا کہ اگر اب وہ اس لین دین سے باز نہ آئے تو ان کے خلاف جنگ کی جائے گی۔ نجران کے عیسائیوں کو جب اندرونی خود مختاری دی گئی تو معاہدے میں یہ تصریح کردی گئی کہ اگر تم سُودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ فسخ ہوجائے گا اور ہمارے اور تمہارے درمیان حالتِ جنگ قائم ہوجائے گی[1]

چونکہ سُود کی نوعیت ایک وسیع معاشی فساد کی تھی جس کی اصلاح بغیر اس کے ممکن نہ تھی کہ ملک کا پورا نظام عملاً اسلام کے زیرِ نگیں ہو اس وجہ سے حجۃ الوداع جبکہ اسلامی حکومت کا سیاسی منشور نشر کیا گیا سُود پر بھی قرآن نے ان آیات کے ذریعے آخری ضرب لگادی۔

۸۲۷ ۔ اے اہلِ ایمان! اگر فی الواقع تم مومن ہو تو اللہ کی نافرمانی سے بچو اور جسقدر سُود کی رقم قرضداروں کے ذمہ باقی رہ گئی ہے اسے چھوڑ دو۔ یعنی ممانعت سے پہلے جو سُود لے چکے ہو سو لے چکے لیکن ممانعت کے بعد جو چڑھا ہا اس کو ہرگز نہ مانگو[2] مطلب یہ ہے کہ سُود کی حرمت نازل ہونے سے پہلے عرب میں سود کا عام رواج تھا۔ پہلی آیات میں اس کی ممانعت آئی تو حسبِ عادت تمام مسلمانوں نے سُودی کاروبار بند کردیا لیکن ان حالات میں یہ واقعہ بھی رونما ہوا کہ بنی ثقیف اور بنی مخزوم دو قبیلوں میں پہلے سے سُودی کاروبار ہوتا تھا۔ بنی مخزوم مسلمان ہوگئے تو اسلام لانے کے بعد ان کے لیے سُودی رقم کی ادائیگی ناقابلِ برداشت ہوگئی۔ لیکن بنی ثقیف نے مسلمان نہ ہونے کی وجہ سے اصرار شروع کیا۔ یہ قبیلہ مسلمانوں کا حلیف تھا یہ واقعہ مکہ میں فتح مکہ کے بعد پیش آیا۔ اس وقت مکہ میں اسلامی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ یہ مقدمہ اسلامی عدالت میں آیا۔ مکہ کی عدالت میں حضرت معاذ بن جبلؓ یا حضرت عتاب بن اسید تھے۔ انھوں نے یہ کیس بارگاہِ نبوت میں روانہ کردیا۔ قرآن نے یہ فیصلہ کیا کہ اسلام میں داخل ہونے کے بعد سُود کے تمام معاملات ختم کردیئے جائیں سابقہ سُود وصول نہ کیا جائے صرف راس المال لیا جائے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حجۃ الوداع کے

---

[1] تفہیم القرآن [2] افاداتِ شیخ الہند۔

خطبہ میں اس قانون کا اعلان کیا تو یہ بھی بتادیا کہ یہ قانون کسی خاص شخص یا قوم یا مسلمانوں کے مالی مفادات کے پیش نظر نہیں بلکہ پوری انسانیت کی تعمیر اور صلاح و فلاح کے لیے جاری کیا گیا ہے اس لیے ہم سب سے پہلے مسلمانوں کی جو رقوم غیر مسلموں کے ذمہ واجب الادا ہیں اس کو چھوڑتے ہیں۔ ان کو بھی یہی طرز عمل کرنا چاہیے [1]

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ سود کا تعلق معاشی زندگی کے ان معاملات سے جن میں کسی نہ کسی طور سے قرض کا لین دین ہوتا ہے۔

قرض کی مختلف قسمیں

ایک قسم کے قرضے وہ ہیں جو ضرورت مند لوگ اپنی ذاتی ضروریات کے لیے لیتے ہیں۔

دوسری قسم کے وہ قرضے ہیں جو کاروباری لوگ اپنے نفع آور کاروبار میں استعمال کرنے کے لیے لیتے ہیں۔

تیسری قسم ان قرضوں کی ہے جو حکومتیں اپنے شہریوں سے لیتی ہیں۔

چوتھی قسم ان قرضوں کی ہے جو حکومتیں اپنی ضروریات کی خاطر غیر ممالک کے بازار زر سے لیتی ہیں۔

قرآن کی یہ آیت ہر قسم کے قرضوں کے لیے عام ہے اور اس سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہو رہی ہے کہ قریش کے ضرورت مند حضرات صرف ذاتی ضرورت ہی کے لیے قرض نہ لیتے تھے بلکہ تجارتی اور کاروباری ضروریات کی خاطر تاجر اور کاروباری لوگ قرض لیتے تھے۔ یہ قبیلوں کا قبیلوں سے قرض لینا ضرورت مندی اور حاجت برآری کا قرض نہیں بلکہ نفع آور کاروبار میں تاجروں، ہمناجوں اور زمینداروں کا قرض تھا۔ اگر یہ ذاتی ضرورت کے لیے حاجت مندوں کا قرض ہوتا تو قرآن کے مخاطب یہ کبھی نہ کہتے کہ انما البیع مثل الربوا۔ سود اور کاروبار کی یہ تقابلی تعبیر خود ہی بتا رہی ہے کہ یہ قرض کاروباری ہوتا تھا۔ قریش تجارت پیشہ لوگ اور سودی بیوپاران میں رائج تھا۔ حجۃ الوداع کے خطبہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سود کے ختم کرنے کا اعلان کیا تھا وہ عباسؓ بن عبد المطلب کا سود تھا۔ خطبہ کے الفاظ یہ ہیں۔ اول ربا موضوع ربا العباس ابن عبد المطلب کلہ۔ اور معلوم ہے کہ

[1] معارف القرآن م ش۔

عباس بن عبد المطلب قریش کے سردار تھے۔ ان کا تجارتی کاروبار نہایت وسیع پیمانے پر پھیلا ہوا تھا اور اس سے تعلق سے وہ سود خواری میں نہایت شہرت رکھتے تھے۔ الغرض قریش تاجر بھی تھے اور سود خوار بھی تھے بلکہ طبری نے تو یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ قریش کی تجارت کا بڑا حصہ چاندی کا سامان ہوتا تھا۔ ہم ظاہر بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اس آیت کے مفہوم میں ہر قسم کا قرض داخل ہے خواہ اپنے ضروریات میں خرچ کرنے کے لیے لیا جائے یا پیدا آور کاموں پر لگانے کے لیے۔ کیونکہ اگر قرض ضروریات کے لیے لیا گیا ہے اور اس سے یہ غرض ہے کہ قرض لینے والا اپنی ضروریات میں خرچ کرے تو اس کو اصل کے علاوہ کچھ اور دینے پر مجبور کرنا کسی طرح قرین انصاف نہیں۔ یہی بہت ہے کہ وہ گنجائش ہونے پر اصل کو واپس کر دے اور اگر قرض پیدا آور کاموں میں لگانے کے لیے لیا گیا ہے تو اس پر جو کچھ نفع ہوتا ہے وہ دراصل اس محنت کا ثمرہ ہے جو وہ خود کرتا ہے نہ کہ اس مال کا جو اس نے قرض لیا۔ کیونکہ سرمایہ بلا محنت نفع آور نہیں ہوتا۔ اور قرآن کے نزدیک اصل اہمیت محنت کی ہے۔

آیت سے حضرت مولانا تھانوی کا لطیف استنباط

ایک مسئلہ جو احقر نے اس آیت سے سمجھا ہے یہ ہے کہ دار الحرب میں حربی سے سود لینا حرام ہے کیوں کہ آیت قرآنی میں جس سود کے چھوڑنے کا مطالبہ کیا ہے وہ زمانہ جاہلیت کا بقایا تھا جبکہ مکہ دار الحرب تھا۔ اگر یہ معاملہ جائز ہوتا تو جائز معاملہ سے جو حق واجب ہوتا ہے اس کا مطالبہ ہر حال میں درست ہوتا خواہ مطالبہ کے وقت وہ معاملہ ناجائز ہو مثلاً ایک عیسائی نے دوسرے عیسائی سے ایک روپے کی شراب خریدی ان دونوں کے لیے یہ معاملہ جائز تھا۔ پھر دونوں مسلمان ہو گئے۔ اب باوجودیکہ یہ معاملہ مسلمان ہونے کے بعد ناجائز ہے مگر پہلی رقم کا وصول کرنا درست ہے۔ آیت قرآنی نے گزشتہ سود کو لینے کی اجازت نہیں دی اس لیے معلوم ہوا کہ سود کا معاملہ اس وقت بھی دار حرب میں جائز نہ تھا۔ اور پھر جب دو حربیوں کے مابین سود نا جائز ہے تو مسلمان اور حربی کے مابین سود کا معاملہ کب جائز ہو سکتا ہے؟ باقی رہا لیے ہوئے سود کا واپس نہ کرنا تو یہ اللہ کی جانب سے تخفیف ہے کیونکہ ان کو سود کی حرمت کا علم نہ تھا اور واپسی میں ایک تکلیف مالا یطاق ہے[1] اس تصریح کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ بعض علماء نے یہ مؤقف اختیار کر لیا تھا کہ دار الحرب میں مسلمان حربی کے درمیان سودی معاملہ جائز ہے اور ہندوستان چونکہ دار حرب ہے اس لیے

[1] بیان القرآن

ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے غیر مسلموں سے سُودی کاروبار میں کوئی حرج نہیں۔ اس موضوع پر بہت سے علماء نے دادِ تحقیق دی ہے لیکن سب سے زیادہ بہتر اور خالص علمی انداز میں اس مسئلہ کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اپنے ایک مکتوب میں منقح کیا ہے۔ مکتوب کافی طویل ہے۔ اس لیے یہاں ہم اس کی پوری تفصیل پیش نہیں کر سکتے۔ انشاء اللہ پارہ پنجم میں یہ تفصیلات معاہدین، محاربین کے ضمن میں پیش کی جائیں گی یہاں ہم مولانا کے خط کا آخری حصہ پیش کرتے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں،

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ اولاً ہندوستان کے دارِ حرب ہونے میں کلام ہے۔ اگرچہ میرے نزدیک راجح یہی ہے کہ ہندوستان دار الحرب ہے۔ ثانیاً مسلم مستامن کے لیے حربیوں سے سُود لینے میں اختلاف ہے اور اختلاف بھی ایسا کہ پوری اُمت ایک طرف اور تنہا امام ابو حنیفہؒ اور امام محمدؒ ایک طرف۔ ثالثاً امام ابو حنیفہؒ کی اجازت سے یہ کیسے لازم آگیا کہ سُود لینے والا اس مال کا مالک بھی ہو جاتا ہے۔ فقہی دلائل اور فقہی قرائن کی رُو سے ملکیت کے لیے احراز بدار الاسلام کی شرط ایسی ناگزیر ہے کہ اس کے مانے بغیر چارہ نہیں ہے۔ دارِ حرب میں سُود کا جواز کا مقصد یہ ہے کہ دارِ حرب قیام و قرار کی جگہ نہیں بلکہ یہاں سے ہجرت واجب ہے۔ دار الحرب میں رہنا اور سود و قمار کے ذریعے حاصل شدہ اموال کو کھانا مقصود نہیں۔ یہ کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو عقل کو بالائے طاق رکھ

سُود خواروں کو الٹی میٹم

۸۲۸۔ پس تم نے اگر اس باغیانہ روش سے توبہ نہ کی تو اللہ اور اس کے رسُول سے جنگ کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ اس کی نوعیت بالکل ایک الٹی میٹم کی ہے یعنی اب جو لوگ اس حکم کو نہ مانیں گے وہ اللہ اور اُس کے رسُول کی جانب سے جنگ کے لیے خبردار ہو جائیں۔ سُود کے متعلق جو لہجہ ان آیات کا ہے بعینہٖ یہی لہجہ سُود سے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا خطبہ حجۃ الوداع میں ہے۔

اس آیت سے صاف طور پر یہ بات سامنے آتی ہے کہ اسلامی نظام میں سُودی کاروبار کرنا ایک سنگین فوجداری جرم ہے۔ اگر یہ فرد کا عمل ہے لیکن اگر یہ کام جماعت کرے یا کسی شہر کے باشندے کریں تو ان کی حیثیت باغیوں اور مفسدوں کی ہے جن کی سرکوبی کے لیے عند الضرورت فوجی کارروائی

ؔ بیان القرآن

بھی کی جاسکتی ہے۔ قرآن میں اور بھی بہت سے گناہوں کی ممانعت کا حکم آیا ہے اور ان پر سخت وعیدیں بھی آئی ہیں لیکن ایسا سخت اور سنگین اندازِ تعبیر کسی اور گناہ کے بارے میں قرآن نے اختیار نہیں کیا۔ اسی بنا پر نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلامی قلمرو میں سُود کو روکنے کے لیے سخت کوشش فرمائی۔ آپؐ نے نجران کے عیسائیوں سے جو معاہدہ کیا اس میں صاف طور پر لکھ دیا کہ اگر تم سُودی کاروبار کرو گے تو معاہدہ کالعدم ہو جائے گا اور ہم کو تم سے جنگ کرنی پڑے گی۔ طائف ایک دولت مند اور سرسبز شہر تھا اس لیے وہاں کے لوگ عموماً سُود پر بیوپار کرتے تھے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جن شرائط پر مصالحت کی ان میں ایک ضروری شرط یہ بھی تھی کہ وہ لوگ سُودی کاروبار بند کریں گے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہاں تک فرمایا ہے کہ سُود لینے والے، دینے والے اس کی دستاویز لکھنے والے اور اس پر گواہی دینے والے سب پر اللہ کی لعنت ہے۔

ان تمام سنگینوں کا منشا یہ نہ تھا کہ صرف سُود کی ایک خاص قسم مہاجنی سُود کو بند کیا جائے اور اس کے سوا ہر قسم کے سُود کا دروازہ کھلا رکھا جائے بلکہ احکام کی اس سنگینی اور قرآن کے اس الٹی میٹم سے اصل مقصد سرمایہ دارانہ اخلاق، سرمایہ دارانہ ذہنیت، سرمایہ دارانہ تمدن اور سرمایہ دارانہ نظم معیشت کا کلی استیصال کر کے وہ نظام قائم کرنا تھا جس میں بخل کے بجائے فیاضی، خود غرضی کے بجائے ہمدردی اور امداد باہمی ہو، سُود کی بجائے صدقات اور بنک کی جگہ بیت المال ہو۔ اور سُود کی ہر نوع اسلامی معیشت سے ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے۔ خواہ یہ ذاتی ضرورت کے قرضہ پر لیا جائے یا نفع آور کاروبار میں لگنے والے قرضہ پر ہو اور یا اس قرض پر لیا جائے جو حکومت شہریوں سے لیتی ہے اور پھر یا وہ قرض جو حکومتیں اپنی ضروریات کی خاطر مختلف ممالک کے بازارِ زر سے لیتی ہیں۔

اہلِ علم کی سادہ لوحی اور سُود

وہ اہلِ علم کتنے سادہ لوح ہیں جو سُود کے بارے میں قرآن اور نبوت کے اس سنگین لب و لہجہ کے باوجود تجارتی اور کاروباری سُود کو سُود نہیں سمجھتے۔ اور لوگوں کو بتاتے ہیں اور یہ باور کراتے ہیں کہ یہ منافع ہے سُود نہیں ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ ہم قرض نہیں دیتے امانت رکھتے ہیں۔ کوئی بتاتا ہے کہ ہم سُود نہیں لیتے زرِ ضمانت لیتے ہیں۔ کوئی بتا رہا ہے کہ سود تو صرف اسلامی مملکت میں ہوتا ہے دارِ حرب میں مسلمان حربی یا مسلمان مسلمان سے جو کچھ لیتا ہے وہ سُود نہیں ہے۔ انا للہ فالی اللہ المشتکیٰ۔

بڑے بڑے اس بازارِ زر میں بہک گئے اور بڑی جسارت کے ساتھ جوازِ سُود پر رسالے لکھ گئے۔

یہاں بے پروائی کا عالم یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ سُود کو بھی چھوڑ دو اور اس کے شائبہ کو بھی چھوڑ دو۔ وہ مشتبہات سے دامن بچاتے ہیں اور ہم اصل سے بھی محفوظ نہیں ہیں۔ اللہ بھلا کرے شیخ علامہ عبداللہ دراز کا کہ انھوں نے ۱۹۵۱ء میں پیرس میں ہونے والے مذاکرے میں پوری انسانیت کے سامنے یہ بات کھول کر پیش کر دی کہ اسلام کسی درجہ میں سُود کو گوارا نہیں کرتا۔ اور خواہ اقتصادی احوال وظروف میں کیسے تغیرات رونما ہو چکے لیکن اسلام میں سُود کی ساری انواع قطعاً حرام ہیں۔ فجمیع انواع الربا محرمة تحريما قطعيا۔ شیخ عبدالرزاق سنہوری نے ان کا مقالہ مصادر الحق میں نقل کیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ قرض خواہ صرف کے لیے ہو یا پیدا آوری کے لیے ہو قرض ہے اور اس پر سُود سُود ہے۔ انھوں نے بتایا ہے کہ سُود میں اخلاقی، اجتماعی اور اقتصادی نقصانات کیا ہیں اور کن اسباب سے اسلام نے سُود کو حرام کیا ہے۔ وہ ہر اس سُود کو حرام قرار دیتے ہیں جو قرض خواہ قرضدار سے لیتا ہے خواہ یہ قرض استہلاک ہو یا قرض انتاج ہو۔ قرض استہلاک یہ ہے کہ جس میں قرض لینے کا مقصد اپنی ضروریات میں لگا کر اسے ختم کرنا ہوتا ہے جیسے شادی غمی کے ہر موقع پر قرض لیتے ہیں اور قرض انتاج یہ ہے کہ کاروبار میں لگانے کے لیے قرض لیا جائے تاکہ اس سے سرمایہ میں اضافہ ہو۔ یعنی رقم ختم نہ ہو بلکہ اور بڑھے۔ جیسا کہ آج کل کاروباری لوگ کرتے ہیں۔ ڈاکٹر معروف الدوالیبی قرض انتاج میں سُود کے قائل ہیں۔ اور علامہ السید رضا کا المنار میں بھی یہی میلان ہے۔ مگر علامہ دراز ہر نوع کے سُود کو حرام قرار دیتے ہیں۔ وہ سُود کی تقسیم تو ضرور بتلاتے ہیں ربا حقیقی اور ربا مجازی۔ لیکن ابن القیم کی طرح حکم میں کسی قسم کی کوئی رعایت نہیں دیتے۔ حافظ ابن القیم نے سُود کی قسمیں جلی اور خفی بتا کر یہ رعایت دی ہے کہ جلی حالت اضطرار میں جائز ہوتا ہے اور خفی بحالت ضرورت جائز ہوتا ہے مگر علامہ دراز یہ بھی گوارا نہیں کرتے۔ وہ سُود کی تمام قسموں کو حرام قطعی قرار دیتے ہیں۔ ہم ڈاکٹر معروف الدوالیبی اور سید رشید رضا کا یہ موقف تسلیم کرتے ہیں کہ زمانہ کے حالات بدل چکے ہیں۔ دُنیا کے معاشی حالات میں بڑا انقلاب رونما ہو چکا ہے اور اس انقلاب نے مالی اور تجارتی معاملات کی صورت کچھ سے کچھ کر دی ہے۔ ایسے حالات میں وہ اجتہادی قوانین جو اسلام کے ابتدائی دور حجاز، عراق، شام اور مصر کے معاشی حالات کو پیش نظر رکھ کر تیار کیے گئے تھے، آج موجودہ حالات میں کافی نہیں ہیں۔ ہمیں اس موقف کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہے۔ سوال یہ ہے کہ ان احوال وظروف سے اسلام کس طرح مصالحت کرے ڈاکٹر معروف اور دوسرے جدت پسند حضرات نے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ مصالحت کا نہیں بلکہ شکست خوردگی کا ہے۔ علامہ دراز کا موقف یہ ہے کہ بنیادی طور پر یہ تسلیم کر کے کہ سُود کی ہر نوع حرام ہے۔

موجودہ مالیاتی و معاشی احوال کے قوانین میں تطبیق کا کام کیا جائے۔ اسلام کا معاشی نظام کوئی راہبانہ نظام نہیں کہ دنیا کے احوال و ظروف کو نظر انداز کر دیا جائے مگر یہ کام انفرادی محنت سے نہیں بلکہ اجتماعی کاوش سے پروان چڑھ سکتا ہے۔ دونوں طبقے جدید سیاسیات و اقتصادیات کے ماہرین اور قدیم اسلامی سرمایۂ علمی کے ماہر سر جوڑ کر بیٹھیں اور اس مسئلہ پر غور و فکر سے کام لیں۔ لیکن یہ ہر کہ و مہ کا کام نہیں۔ علامہ دراز فرماتے ہیں کہ اس کے لیے صرف قواعدِ شریعت اور اسلامی علوم سے واقف ہونا کافی نہیں ہے۔ بلکہ ضروری ہے کہ ان میں علم کے ساتھ ورع و تقوی کی وہ قوت بھی ہو جو حق اور باطل میں تمیز کر سکے اور انسان کو ہوائے نفس کی اتباع سے بچا سکے۔ یہ موضوع بہرحال تفصیل طلب ہے اس کے لیے آپ کو کافی دراتنظار کی زحمت برداشت کرنی پڑے گی۔

خُدا کی نافرمانی پر قانونی تعزیر

اس آیت میں سُود نہ چھوڑنے والوں سے جنگ کرنے کا جو حکم دیا گیا ہے اس سے علماء نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ جو شخص اسلامی مملکت میں سُود کھائے اسے توبہ پر مجبور کیا جائے۔ اگر باز نہ آئے تو قتل کر دیا جائے۔ یہ ابنِ عباس، حسن بصری اور ابنِ سیرین کی رائے ہے لیکن دوسرے فقہاء کی رائے میں یہ اس وقت ہے جبکہ وہ سُود کی حلت کا معتقد ہو ورنہ اسے گرفتار کر کے توبہ کرنے تک جیل میں رکھا جائے۔ گویا سُود لینا اور رکھانا اسلامی قانون میں قابلِ دست اندازی پولیس ہے اور عدالت اسے سزا دے سکتی ہے۔ الجصاص نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہی حکم ان تمام گناہوں کا ہے جن پر اللہ نے سزا کی دھمکی دی ہے۔ جبکہ یہ مجرمانہ عمل کھلم کھلا کیا جائے۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہی حکم ان ظالم سلاطین کا بھی ہے جو لوگوں کے اموال ناجائز طور پر وصول کرتے ہیں یا وہ لوگ جو عام شہریوں سے ناجائز ٹیکس وصول کرتے ہیں آگے لکھا ہے کہ یہ لوگ سُود خواروں سے بھی زیادہ سنگین مجرم ہیں۔

اصل رقم کی واپسی کی شرط

۸۲۹ ۔۔ اگر تم نے اس باغیانہ روش سے توبہ کر لی تو تمہیں اصل رقم لینے کا حق ہے یعنی اگر تم توبہ کر لو اور آئندہ کے لیے سُود کی بقایا رقم چھوڑنے کا عزم کر لو تو تمہیں تمہارا اصل سرمایہ مل جائے گا اس میں اصل سرمایہ دینے کو اس شرط کے ساتھ مشروط کیا ہے کہ تم توبہ کر لو اور آئندہ سُود چھوڑنے کا عزم کر لو تب اصل سرمایہ مل جائے گا۔

اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر سُود چھوڑنے کا عزم کر کے توبہ نہ کی تو اصل سرمایہ بھی نہ ملے گا اس کی تفصیل یہ ہے کہ اگر مسلمان ہونے کے باوجود سُود کو حرام ہی نہ سمجھے اس لیے سُود چھوڑنے کے لیے توبہ بھی نہیں کرتا تو یہ شخص مسلمان نہیں ہے یعنی مرتد ہے جس کا حکم یہ ہے کہ مرتد کا مال اس کی مِلک سے نکل جاتا ہے۔ زمانۂ اسلام کی کمائی اس کے مسلمان وارثوں کو مل جائے گی اور جو کفر کے بعد کی کمائی ہے وہ بیت المال میں جمع کر دی جائے۔ اس لیے سُود سے توبہ نہ کرنا اگر حلال سمجھنے کی بنا پر ہو تو اس کو اصل سرمایہ بھی نہ ملے گا۔ اور اگر حلال تو نہیں سمجھتا مگر عملاً باز نہیں آتا اور اس کے ساتھ پارٹی بنا کر حکومتِ اسلامی کا مقابلہ کرتا ہے تو وہ باغی ہے۔ اس کا مال بھی ضبط کر کے سرکاری خزانہ میں داخل کر دیا جائے اور بطورِ امانت رکھا جائے گا اگر توبہ کرے گا تو اس کا مال اس کو واپس دے دیا جائے گا۔ شاید ان ہی مسائل کو سمجھانے کے لیے یہاں بصورتِ شرط جملہ لائے ہیں[1] مطلب یہ ہوا اگر توبہ کرو گے تو اسلامی سرکار تمہیں تمہارا اصلی سرمایہ تمہیں واپس دلا دے گی۔ اگر توبہ نہ کرو گے تو اصلی سرمایہ بھی بحقِ سرکار ضبط ہو جائے گا۔

اسلام میں معاشیات کی اصلی بنیاد

۸۳۰۔ نہ تمہیں ظلم کرتا ہے اور نہ تم پر ظلم کیا جائے گا یعنی پہلے جو سُود تم لے چکے ہو اسے اگر تمہارے اصل مال میں محسوب کر لیں اور اس میں سے کاٹ لیں تو تم پر ظلم اور ممانعت کے بعد کا سُود چڑھا ہوا اگر تم مانگو تو یہ تمہارا ظلم ہے[2] گویا ظالم بننے کی صورت یہ ہے کہ کوئی رقم قرض دی اور وصول کرتے وقت اصل سے زائد وصول کر لی۔ مظلوم بننے کی صورت یہ ہے کہ جتنی رقم قرض لی تھی اب اس سے زیادہ ادا کرنی پڑ گئی ہے[3]

یہ تنبیہ اس لیے ضروری ہوئی کہ جب کوئی اہم معاشی اصلاح عمل میں آتی ہے تو اس سے متاثر ہونے والے طبقات میں بڑی ہلچل پیدا ہو جاتی ہے جن کو اس اصلاح سے نقصان کا اندیشہ ہوتا ہے وہ ایسی تدبیریں اور ایسے حیلے اختیار کرتے ہیں جن سے وہ اپنے آپ کو نقصان سے بچا لے جائیں اور جن کو فائدہ پہنچنے کی توقع ہے وہ فائدے کی اسی مقدار پر قناعت نہیں کرتے جو ان کو قانون پہنچا رہا ہے بلکہ وہ قانون کی حدود سے آگے بڑھ کر ہاتھ مارنا چاہتے ہیں۔ اس افراتفری

---

[1] معارفِ قرآن م ش [2] افاداتِ شیخ الہند [3] ماجدی

اور کشاکش کو روکنے کے لیے اول تو قرآن نے اس کے لیے بہت پہلے سے ذہنوں کو ہموار کیا، پھر جب آخری حکم دیا تو اس کے ساتھ یہ ہدایت فرمادی کہ لا تظلمون ولا تظلمون۔ اسی ہدایت کی یہ برکت تھی کہ پورے عرب میں یہ عظیم معاشی اصلاح بغیر کسی طبقاتی کشاکش کے عمل میں آگئی نہ قرض خواہوں پر کوئی آفت آئی نہ قرضداروں کو کوئی گزند پہنچا بلکہ دونوں اس اصلاح کی برکت سے یکساں مستفید ہوئے۔[1]

قرآن کی بیان کردہ یہ وہ معاشی بنیاد ہے کہ اگر ہم اس پر غور و فکر سے کام لیں تو اس مسئلہ کے خطرناک پہلوؤں تک ہماری رسائی ہوسکتی ہے۔ مثال سے اس کو یوں واضح کیا جاسکتا ہے۔ کہ دنیا کے سارے کاروبار میں معاملہ کے فریقین میں سے ہر ایک دوسرے کے لیے کچھ قربانی کرتا ہے۔ تاجر کپڑا دیتا ہے، خریدار روپیہ ادا کرتا ہے۔ کرایہ کی صورت میں موٹر کے مالک کو اگر کرایہ کا روپیہ ملتا ہے تو جس وقت کرایہ دار اس کی موٹر کو استعمال کرتا رہتا ہے۔ موٹر کے تمام پرزوں کی صفات کارکردگی بتدریج کم ہوتی رہتی ہے۔ یا سال بھر کے بعد جب کرایہ دار مکان واپس کرتا ہے تو مکان اور اس کے اجزا وعناصر اپنی اس حیثیت پر نہیں ہوتے جو کرایہ پر دیتے وقت اس میں موجود تھیں۔ الغرض کرایہ کی صورت میں اگرچہ اصل چیز مالک کو واپس ہوجاتی ہے لیکن صفات کی قربانی اس میں ضرور ہوتی ہے اس کے مقابلے میں جس شخص نے بجائے مکان اور موٹر کے آپ سے دو ہزار روپیہ قرض لیے اور دس سال بعد واپس کیے تو لینے کے وقت آپ اپنے روپوں کو ویسا ہی واپس لیں گے جیسا آپ نے دس سال پہلے دیئے تھے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اس اثنا میں روپے کی صفات میں کوئی تغیر آگیا۔ اس کا مطلب ہوا کہ قرض دینے والا نہ اصل مال کی قربانی کرتا ہے اور نہ صفات کی اب اگر آپ مقروض سے ہر مہینے اس روپیہ کا کرایہ وصول کرتے ہیں تو کیوں؟ آپ کی جانب سے کیا قربانی ہوئی نہ روپے کی ذات کی اور نہ اس کی صفات کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرض دینے والے کی رقم بغیر کسی قربانی کے بالکل محفوظ رہتی ہے برخلاف لینے والے کے کہ اگر اس نے کسی ضرورت سے قرض لیا اور اس میں خرچ کردیا تو روپیہ اور اس کا سود اس طرح دے رہا ہے کہ اس نے اس سے کوئی آمدنی نہیں پیدا کی۔ اور اگر تجارت کے لیے قرض لیا ہے تو تجارت کی کامیابی ہر حال میں ضروری نہیں ہے لیکن قرض خواہ کا روپیہ ہر حال میں محفوظ ہے۔ ایسا شخص جو اپنے کاروبار میں کبھی نفع اور کبھی نقصان اٹھا رہا ہو کیا اس شخص کا مقابلہ کرسکتا ہے جس پر نقصان کے سارے دروازے

[1] تدبر قرآن

بند ہیں۔ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں؟ جو کبھی بیمار نہیں ہوتا اس کی صحت کا مقابلہ وہ کیسے کر سکتا ہے۔ جو کبھی اچھا اور کبھی بیمار ہوتا ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ کاروبار کی یہ صورت اگر کسی قوم یا ملک میں زیادہ مدت تک رہے اور دولت اس طرح یکطرفہ گردش کرتی رہے تو بلاشبہ ملک و قوم کا ایک قلیل طبقہ قوم کے دوسرے افراد کی دولت کو آہستہ آہستہ کھینچ کر خود دولت مند بن جائے گا اور قوم کے اکثر افراد معاشی لاغری کا شکار ہو جائیں گے۔ اور پھر بات یہیں ختم نہیں بلکہ اس کا خطرناک انجام یہ ہوتا ہے کہ ان دولت مندوں کے پاس اگر سرمایہ کی قوت ہوتی ہے تو قوم کی اکثریت اپنے پاس جسمانی قوت رکھتی ہے۔ تنگ آمد بجنگ آمد کے نظریہ کے مطابق قوم کی جسمانی قوت دولت مندوں کی مالی قوت پر شب خون مارتی ہے۔ پھر اس کے بعد جو کچھ ہوتا ہے سب کو معلوم ہے سلطنتیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ امن و امان غارت ہو کر رہ جاتا ہے۔ یہ سب کچھ کیوں ہوتا ہے صرف اس لیے کہ معاشیات میں قرآن کے بتائے ہوئے قانون لا تظلمون ولا تظلمون سے بے رخی برتی جا رہی ہے۔

اسلام اور مقروض

۸۳۱ ۔ اور اگر مقروض تنگدست ہو تو تمہیں چاہیے کہ اسے فراخ دستی حاصل ہونے تک مہلت دو۔ اگر تمہارے پاس علم ہے تو ایسے تنگدست کو بطور قرض صدقہ بخش دینا زیادہ اچھا ہے۔ یعنی جب سود کی ممانعت ہو چکی اور راس کا لینا دینا موقوف ہو گیا تو اب مدیون مفلس سے تقاضا نہ کرنا چاہیے بلکہ مفلس کو مہلت دو اور اگر توفیق ہو تو بخش دو[1]

مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا مدیون تنگدست ہو۔ تمہارا قرض ادا کرنے پر قادر نہ ہو تو حکم شرعی یہ ہے کہ اس کو فراخی اور آسودگی کے وقت تک مہلت دی جائے۔ اگر تم اس کو اپنا قرض معاف ہی کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے۔ سود خواروں کی عادت یہ ہوتی ہے کہ اگر کوئی مدیون مفلس ہے اور میعاد مقررہ پر قرض ادا نہیں کرتا تو سود کی رقم اصل میں داخل کر کے سود در سود کا سلسلہ چلاتے ہیں اور سود کی مقدار بھی اور بڑھا دیتے ہیں۔ یہاں احکم الحاکمین نے یہ قانون بنا دیا کہ اگر مدیون واقعی مفلس ہے۔ ادائے قرض پر قادر نہیں تو اس کو تنگ کرنا جائز نہیں ہے بلکہ اس کو اس

[1] افادات شیخ الہند

وقت تک مہلت دینی چاہیے جب تک کہ وہ ادا کرنے پر قادر نہ ہو جائے۔ ساتھ ہی اس کی ترغیب بھی دے دی کہ اس غریب کو اپنا قرض معاف کر دو تو یہ تمہارے لیے زیادہ بہتر ہے[1]

اسلامی نظام کی اساس

عقائد اسلامی کی طرح قوانین اسلامی کی پوری قدر اس وقت ہوتی ہے جب ان کا تقابلی مطالعہ کیا جائے۔ اسی قرض کے موضوع پر دوسری قوموں کے قوانین دیکھے جائیں تو معلوم ہو جائے کہ قرضداروں کے حق میں سرتاسر ظالمانہ ہیں۔ رومی قانون میں مدیون کو قتل تک کیا جا سکتا ہے اور رومی تاریخ میں دائنوں کی ظلم و زیادتی سے بارہا نوبت بلوؤں تک آگئی ہے۔ ایک اور نکتہ اسلامی نظام معاشیات کی بنیاد مادیات سے بڑھ کر انسانیت، روحانیت اور تقویٰ الٰہی پر رکھی گئی اور یہ خصوصیت اسے دنیا کے تمام جدید و قدیم سارے معاشی نظاموں سے ممتاز کرتی ہے۔

دنیا کی سب سے بڑی ضرورت قرض کے بوجھ کو ہلکا کرنا ہے۔ دنیا میں اسلام ہی ایک ایسا نظام ہے جس نے اس بوجھ کو ہلکا کیا ہے۔ قرضداروں پر احسان کرنا۔ ضرورت مندوں کو قرض دینا اور تنگدست مقروضوں کو مہلت دینا۔ جو قرض ادا کرنے سے معذور ہوں ان کا قرض معاف کر دینا ثواب کا کام بتایا ہے۔

عرب میں سودخواری نے لوگوں کو اس قدر بے رحم اور سنگدل بنا دیا تھا کہ جو لوگ قرض ادا نہیں کر سکتے تھے وہ غلاموں کی طرح فروخت کر دیئے جاتے تھے اور جو قیمت ملتی تھی اس سے ان کا قرض ادا کیا جاتا تھا۔ آج اس تمدن کے زمانہ میں قرض کی زنجیر مقروضوں کے لیے اتنی ہی بھاری ہے بلکہ سرمایہ داری کے نظام نے اس کو اور زیادہ بھاری بنا دیا ہے۔ قرآن حکیم کی اس آیت نے اس سارے نظام کے خلاف احتجاج کیا ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں خود خداوند تعالیٰ کی زبان سے یہ بیان کر کے کہ قیامت کے دن میں خود تین آدمیوں کا فریق ہوں گا جن میں ایک شخص وہ ہے جس نے آزاد شخص کو فروخت کیا اور اس کی قیمت کھائی اس کو اور بھی موکد کر دیا اور قرض کے معاملے تنگدستوں پر احسان کرنے کی متعدد صورتیں بتائی ہیں۔ یعنی مہلت دینا، قرض کا معاف کرنا اور انسانیت کے ساتھ تقاضا کرنا اور اس کو ایسا ثواب کا کام بتایا کہ اگر ایک شخص اس کے سوا نیکی کا اور کوئی کام نہ

[1] معارف قرآن م ش س

کرے تب بھی یہی ایک کام اس کی مغفرت کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ ایک شخص جو نیکی کا کوئی کام نہ کرتا تھا۔ لوگوں کو قرض دیتا تھا اور جب اس کو کوئی مقروض تنگدست نظر آتا تھا تو اپنے ملازموں سے کہتا تھا کہ اس سے درگزر کرو۔ شاید ہم سے خدا درگزر کرے۔ چنانچہ خدا نے اس کے صلے میں اس سے درگزر کیا۔ دوسری حدیث میں ہے کہ تم سے پہلے ایک شخص تھا جس سے موت کے بعد فرشتوں نے سوال کیا کہ تم نے نیکی کا کوئی کام کیا ہے۔ اس نے کہا کوئی نہیں فرشتوں نے کہا کہ ذرا یاد کرو اس نے کہا کہ میں لوگوں کو قرض دیا کرتا تھا۔ اگر مقروض فراخ دست ہوتا تھا تو قرض وصول کرنے میں آسانی کرتا تھا تو اس کو مہلت دیتا تھا یا یہ کہ فراخدست مقروض کو مہلت دیتا اور تنگدست کو چھوڑ دیتا۔

اس قسم کی بہت سی روایتیں ہیں۔ ایک حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جس شخص کو یہ پسند ہو کہ خدا قیامت کی تکلیف سے اس کو نجات دے وہ تنگدست کو مہلت دے یا اس کو معاف کر دے۔

غرض اسلام نے مقروض کے ساتھ بھلائی اور احسان کو کسی خاص معنے میں محدود نہیں کیا ہے بلکہ اس کو نیکی کی راہ میں وسیع کر دیا ہے۔

اس آیت سے علماء نے یہ حکم قانونی نکالا ہے کہ جو شخص ادائے قرض سے تنگ آگیا ہو۔ اسلامی عدالت اس کے قرض خواہوں کو مجبور کرے گی کہ اسے مہلت دیں اور بعض حالات میں وہ پورا قرض یا قرض کا ایک حصہ بھی معاف کرانے کی مجاز ہو گی۔ حدیث میں آتا ہے کہ ایک شخص کے کاروبار میں گھاٹا آگیا۔ اور اس پر قرضوں کا بہت بار چڑھ گیا۔ معاملہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا آپ نے لوگوں سے اپیل کی کہ اپنے اس بھائی کی مدد کرو۔ چنانچہ بہت سے لوگوں نے اس کی مدد کی مگر قرضہ پھر بھی صاف نہ ہوا۔ تب آپ نے اس کے قرض خواہوں سے فرمایا کہ جو کچھ حاضر ہے بس وہی لے کر چھوڑ دو۔ اس سے زیادہ تمہیں نہیں دلوایا جا سکتا [1]

فقہاء کے یہاں اعسار و افلاص کا مستقل باب ہے اور اس کی مستقل قانونی دفعات ہیں اعسار مالی لحاظ سے تنگدست ہو جانے کو کہتے ہیں اور مال فقہاء کی اصطلاح میں مادی موجود اور لوگوں میں قیمتی چیز کو کہتے ہیں۔ اعسار کی حالت میں فقہاء نے تصریح کی ہے کہ دین کی عدم ادائیگی کی حالت میں مدیون کو محبوس کیا جا سکتا ہے لیکن اس کے اموال کو فروخت کر کے قرض کی ادائیگی کی امام ابو حنیفہ تو بالکل اجازت نہیں دیتے امام ابو یوسف اور محمد اس کی اجازت دیتے ہیں۔ اور جو اجازت دیتے ہیں انھوں نے اس کی تصریح

[1] تفہیم القرآن

کی ہے کہ ایک شخص کے رہنے کا مکان، کھانے کے برتن، پہننے کے کپڑے اور وہ آلات جن سے وہ اپنی روزی کماتا ہے کسی حالت میں قرق نہیں کیے جا سکتے۔

اعسار تجارتی اور اعسار ذاتی دونوں الگ الگ ہیں اس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ سورۂ نساء میں آئے گی۔

وَاتَّقُوْا يَوْمًا تُرْجَعُوْنَ فِيْهِ اِلَى اللّٰهِ ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ﴿۲۸۱﴾ رکوع ۳۸

اور دیکھو اُس دن کی رسوائی سے ڈرو جبکہ تم سب اللہ کے حضور میں پیش کیے جاؤ گے[۳۲۱] پھر ایسا ہوگا کہ وہاں ہر شخص کو اس کی کمائی نیکی کی پوری جزا اور بدی کی پوری سزا ملے گی اور کسی کی حق تلفی نہ کی جائے گی[۳۲۲]۔

دنیا کی زندگی آزمائشی نوعیت کی ہے

دنیا کی زندگی اصلی زندگی نہیں۔ زندگی کا جو دور اس دُنیا میں گزرتا ہے اس کا مقصود انسان کی آزمائش ہے۔ انسان کی حیثیت یہاں ایک ذمہ دار اخلاقی وجود کی ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ کون واقعۃً خیر پسند ہیں اور کون ایسے ہیں جو خیر کو چھوڑ کر شر کی طرف جاتے ہیں۔ جب زندگی کا یہ ہنگامی دور ختم ہو جائے گا تو انسان ایک دوسرے دور میں داخل ہوگا جو دائمی ہے اس دوسرے دور میں انسان فلاح وسعادت سے بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے اور دردناک عذاب سے بھی۔ اس بارے میں فیصلہ کن چیز یہ ہوگی کہ اس نے اپنی زندگی کے پہلے دور میں خیر پسندانہ رویہ اختیار کیا یا شر پسندی کا ثبوت دیا۔ زندگی کی اس آزمائشی نوعیت کا تعلق اصلاً فرد سے ہے اور قیامت کے دن حساب وکتاب کے لیے ہر فرد کو الگ الگ پیش ہونا پڑے گا مگر زندگی کی آزمائشی نوعیت کے اصلاً فرد سے متعلق ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا تعلق صرف اس کی انفرادی زندگی سے ہے فرد کی اجتماعی زندگی بھی دُنیا وآخرت میں اس کی کامیابی یا ناکامی میں اتنی ہی اہمیت رکھتی ہے جتنی اس کی انفرادی زندگی۔ اس کا سبب یہ ہے کہ انسانی زندگی اپنی عین فطرت کے اعتبار سے انفرادیت اور اجتماعیت دونوں پر مشتمل ہے

فرد کی بہت سی ذمہ داریاں اس کی اجتماعی زندگی سے تعلق رکھتی ہیں ان ذمہ داریوں کو ادا کیے بغیر وہ زندگی کے اس امتحان میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ یہاں خالص مالیاتی مسائل کے تذکرہ میں آخرت کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ انسان اپنی ذمہ داریوں کو محسوس کرے اور جان لے کہ کام و دہن کی عارضی لذتوں کی خاطر دائمی زندگی کی ناگواریوں کو قبول کر لینا کوئی دانشمندی نہیں ہے۔

اسلامی نظام حیات کو دنیا کے نظاموں سے ممتاز کرنے والی بنیادی چیز یہی ہے کہ وہ انسان میں یہ احساس و شعور پیدا کرتا ہے کہ ایک روز آرہا ہے جس میں ہمیں اللہ کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ خاص مالیات کے موضوع پر صحاح کی مشہور حدیث ہے کہ بندے قیامت کے دن اس وقت تک اپنی ٹانگوں پر کھڑے رہیں گے جب تک چار سوالوں کے جواب سے فارغ نہ ہوں گے ان ہی چار سوالوں میں مالیات کے موضوع پر آدمی سے پوچھا جائے گا۔

عن مالہ من این اکتسبہ وفیم انفقہ؟

یعنی آدمی سے پوچھا جائے گا کہ مال کن ذرائع سے کمایا اور کہاں خرچ کیا؟

موت کے لیے رجوع الی اللہ کی اصطلاح

۸۳۲۔ اور دیکھو اس دن کی پرسش سے ڈرو جبکہ تم سب اللہ کے حضور پیش کیے جاؤ گے موت کے لیے قرآن میں اکثر خدا کی طرف بازگشت یعنی خدا کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے۔ یہ طرز اور بیسیوں آیتوں میں اختیار کیا گیا ہے یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے۔ اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواح انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے جہاں سے آئی تھیں۔ اس بازگشت کے سفر میں ان کا زادِ راہ صرف وہی ہو گا جو اس دنیا دار العمل میں انھوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندرونی و بیرونی اعمال اور اس کے بعد جو ان کی زندگی ہو گی وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہو گی اس آیت میں دو باتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ انسان کی زندگی اسی دنیا میں ختم نہیں ہو جاتی اس کے بعد بھی ایک زندگی ہے دوسرے یہ کہ اس زندگی میں جیسے کچھ اعمال ہوں گے ویسے نتائج دوسری زندگی میں پیش آئیں گے۔ قرآن میں ایمان باللہ کے بعد دوسرا نمبر اسی کا ہے۔

قرآن اور قیامت

یہ بات کہ اس زندگی کے بعد بھی دوسری زندگی ہے۔ قرآن نے اسے مختلف طریقوں مختلف عنوانوں سے پیش کیا ہے اور نئے نئے اسلوب اور قسم قسم کے دلائل سے سمجھایا ہے۔ ہم یہاں تفصیل میں جانا نہیں چاہتے لیکن یہ بتادینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اتنی بات ہر شخص جانتا ہے کہ فرد اور جماعت کے افراد میں ایک خاص قسم کی مناسبت ہے۔ جس طرح شخص پیدا ہوتا ہے بڑھتا ہے۔ بیمار ہوتا ہے، تندرست ہوتا ہے، گنہ گار ہوتا ہے۔ نیکوکار ہوتا ہے، پشیمان ہوتا ہے، محنت کرتا ہے، نیکنام ہوتا ہے بدنام ہوتا ہے۔ خاص طبعی قوانین کی مطابقت سے وہ قوت حاصل کرتا ہے اور ان کی مخالفت سے وہ بیمار اور کمزور ہوتا ہے۔ پھر ایک خاص عمر کو پہنچ کر رفتہ رفتہ اس کے قوائے عمل سرد پڑجاتے ہیں اور وہ مرجاتا ہے۔ بعینہٖ یہی تمام احوال جماعتوں اور قوموں کو بھی پیش آتے ہیں وہ بھی پیدا ہوتی ہیں، بڑھتی ہیں، تندرست ہوتی ہیں، کمزور ہوجاتی ہیں، گنہ گار ہوتی ہیں، نیکوکار بنتی ہیں اور ایک خاص وقت اور عمر کو پہنچ کر ان کے عملی قوای کمزور و مضمحل ہوجاتے ہیں اور وہ فنا ہوجاتی ہیں۔

دنیا میں اسی اصول پر ہزاروں قومیں پیدا ہوکر فنا ہوچکی ہیں جن کے نام بھی تاریخ کے صفحوں پر آج موجود نہیں ہیں تو جس اصول پر اشخاص اور اشخاص کا مجموعہ جماعتیں اور جماعتوں کا مجموعہ قومیں پیدا ہوتی اور فنا ہوتی ہیں، اسی اصول پر تمام اقوام عالم کا یہ مجموعہ جو پیدا ہوتا، بڑھتا اور ترقی کرتا جاتا ہے کیا ایک روز فنا کے آغوش میں جاکر نہ سوجائے گا؟ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے قیامت کے ثبوت میں عاد، ثمود اور فرعون کی تباہی سے قیامت کی عمومی تباہی پر استدلال کیا ہے۔

قرآن اور آخرت میں جزا و سزا

۸۳۳۔ پھر ایسا ہوگا کہ وہاں ہر شخص کو کمائی ہوئی نیکی کی پوری جزا اور بدی کی سزا ملے گی اور کسی کی حق تلفی نہ کی جائے گی یعنی قیامت کو تمام اعمال کی جزا اور سزا ملے گی تو ہر شخص کو اپنی فکر کرلینی چاہیئے اچھے کام کرے یا برے۔ سود لے یا خیرات کرے[1] اس ملکڑے میں دوسری بات کو پیش کیا گیا ہے اور یہ بات دو حصوں سے مرکب ہے ایک یہ کہ سب کو دوسری زندگی ملے گی دوسرے یہ کہ اس

---

[1] افادات شیخ الہند

زندگی میں جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی دوسری زندگی میں نتائج ہوں گے۔ دوسری زندگی میں نتائج کا نام ہی جزا و سزا ہے۔ اس زندگی کے بعد چونکہ دوسری زندگی ہے اس لیے اس کا نام یوم آخر ہے اور چونکہ اس میں اس دنیا کے اعمال کی جزا و سزا ہوگی اس لیے اس کا نام یوم الدین ہے۔ یوم الدین پر ایمان لانے سے قرآن کا منشا یہ ہے کہ لوگ اس کا یقین کریں کہ ان کے ہر عمل کا بدلہ ہے اسی کا نام جزا و سزا ہے۔ درحقیقت اللہ کا دین کا حقیقی تعلق اسی عقیدے سے ہے کہ انسان اپنے اعمال کا ذمہ دار ہے۔ اور اچھا اور برا جیسا کام اس سے صادر ہوتا ہے اس کے مطابق اچھا یا برا معاوضہ اس کو دوسری زندگی میں ملے گا۔

اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد، سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں۔ جس طرح ایک سائنٹسٹ (حکیم) کا کام ان مادی فزیکل اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں سائنس اور حکمت ہے اسی طرح ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء علیہم السلام کا کام ہے اور ان اسی تعلیم کا نام اسلام ہے۔ انبیاء کی اس تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص اور آثار کا ہوتا ہے۔ علم النفس اور علم الاجتماع کی وسعت تحقیق نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔

عقاب و ثواب ردِّ عمل ہے

الغرض یہ مادی و جسمانی زندگی علت و معلول اور ردّ عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام قرآن میں عقاب اور اعمالِ صالحہ کے نتیجہ کا نام ثواب ہے۔ قرآن نے انہی دو اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے۔

غرض جزا و سزا انہی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا اسی اصول کی تشریح میں یہ ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز اللہ سبحانہ فرمائے گا۔ اے میرے بندو یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر تمہیں دے رہا ہوں لہٰذا جو کوئی جزاءِ خیر پائے وہ خدا کا شکر کرے اور

لے افادات شیخ الہند

جس کو برائی ملے وہ خود کو ملامت کرے۔ یہ بات کہ دوسری زندگی میں جزا و سزا کی صورت میں نیکوکاروں اور بدکاروں کو جو کچھ ملے گا اس کی حقیقت کیا ہے؟

اس بارے میں اپنی عقل سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے۔ کیونکہ یہ عالم ہمارے ادراک کی سرحد سے باہر ہے۔ جس مقام کا ہم ادراک نہیں کر سکتے وہاں کے حالات کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں۔ اگر لب کشائی کریں تو یہ گمان ہو گا اس لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ جو کچھ بتلا دیا گیا ہے اس پر یقین کریں اور جو کچھ نہیں بتایا گیا اس کی کاوش میں سرگرداں نہ ہوں۔ اگر سرگرداں ہوں گے تو حقیقت تک رسائی نہ ہو گی البتہ نئے وہموں اور گمانوں میں مبتلا ہوں گے۔ قرآن میں اس زندگی کی پوری تفصیلات بیان کی گئی ہیں۔ ایسے ہی دوزخ اور اس کی ہولناکیوں کو پیش کیا گیا ہے۔ الغرض قیامت، حشر نشر اور جنت و دوزخ کے پورے مناظر قرآن میں آئیں گے۔ ان کو ماننا ہی ایمان بالغیب ہے اور یہ ایمان بالغیب ہی اسلام کی حقیقت کا جوہر ہے اور اسی کے یقین میں ایمان کی اصلی طاقت پوشیدہ ہے۔ قرآن کا بڑا حصہ اسی حیات بعد الموت کی تلقین اور اس پر ایمان کی دعوت پر مشتمل ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے خطبوں میں اس کا حال بیان کرتے تھے۔ جمعہ کے خطبوں میں خصوصیت کے ساتھ سورۂ ق تلاوت کرتے جس میں قیامت کے حالات ہیں۔ قرآن پاک کی تاثیر اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض ہدایت سے ان کی ایسی کایا پلٹ گئی کہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ مناظر ان کے دل و دماغ کی لوح میں نقش ہو گئے تھے۔ دوسری زندگی پر ان کو اس طرح یقین آ گیا جس طرح دنیا کی زندگی پر یقین تھا۔ آخرت کے مواخذہ سے وہ بید کی طرح کانپنے لگے۔ اعمال کی جوابدہی سے وہ ترساں و لرزاں رہنے لگے۔ جزا و سزا کے خوف سے وہ اپنے ہر عمل کی باز پرس خود کرنے لگے جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا تھا۔ دوزخ کا ڈر ان کے دل کے ہر تار کو چھیڑا کرتا تھا۔ ان کی آنکھوں کو اشک بار رکھتا تھا۔ فرائض اور ذمہ داری کو دیانتداری کے ساتھ ادا کرنے پر ہر لحظہ ان کو آمادہ کرتا تھا۔ راحت کی نیند اور آرام دہ بستر سے اٹھا کر ان کو عمل کے میدان میں لے آتا اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لیے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سراپا مصروف جدوجہد بنا دیتا۔ تنہائی اور تاریکیوں میں ان کے دل اور بدن کو برائیوں سے باز رکھتا تھا۔

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدَيْنٍ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى فَاكْتُبُوْهُ ؕ

وَلْيَكْتُبْ بَّيْنَكُمْ كَاتِبٌۢ بِالْعَدْلِ ۪ وَلَا يَاْبَ كَاتِبٌ اَنْ يَّكْتُبَ

كَمَا عَلَّمَهُ اللّٰهُ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللّٰهَ

رَبَّهٗ وَلَا يَبْخَسْ مِنْهُ شَيْئًا ؕ فَاِنْ كَانَ الَّذِىْ عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيْهًا

اَوْ ضَعِيْفًا اَوْ لَا يَسْتَطِيْعُ اَنْ يُّمِلَّ هُوَ فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهٗ بِالْعَدْلِ ؕ

اے اہل ایمان! جب لین دین میں ایک مقررہ مدت کے لیے اُدھار کا معاملہ کرو تو اسے لکھ لیا کرو[۸۳۴]۔ فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے[۸۳۵]۔ اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ نے اسے لکھنا سکھایا ہے اسے لکھ دینا چاہیے[۸۳۶] اور وہ شخص لکھائے جس پر حق آتا ہے اور اسے اللہ اپنے رب سے ڈرنا چاہیے اور جو معاملہ ہوا اُس میں کمی نہ کرے[۸۳۷]۔ اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو، املا نہ کرا سکتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے[۸۳۸]۔

معاملات میں کتابت کی ضرورت

اوّلاً صدقات اور خیرات کی فضیلت بیان کی پھر سُود کی مذمت فرمائی۔ بعدازیں صدقہ

اور سود کا تقابلی مطالعہ پیش کیا اور چونکہ سود کی ضرورت بیشتر قرض اور اُدھار کی حالت میں ہی پیش آتی ہے اس لیے سود کے بعد قرض اور اُدھار کے احکام بیان کیے تاکہ سود سے بچ جائیں اور سرمایہ بھی محفوظ رہے۔ اور پھر صدقہ، سود اور دین میں باہم ایک خاص نسبت ہے۔ صدقہ اگر مالیاتی مسائل میں سراسر رحمت ہے تو سود سراسر ظلم ہے اور دین محض عدل وانصاف اور مقتضائے مروت ہے اسی رعایت سے تینوں کو بالترتیب بیان کیا ہے اور سود کے بعد دین کا ذکر کرکے لوگوں کو یہ غلط فہمی بھی دور کر دی ہے کہ عرب میں زمانہ نزول قرآن کے وقت صرف مہاجنی سود رائج تھا۔ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ نزولِ قرآن کے زمانہ میں تجارتی اور کاروباری قرضے موجود تھے۔ حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں پہلے صدقہ خیرات کی فضیلت بیان فرمائی۔ اس کے بعد ربا اور اس کی حرمت اور برائی مذکور ہوئی۔ اب اس معاملہ کا ذکر ہے جس میں اُدھار ہو اور آئندہ مدت کا وعدہ ہو اس کی نسبت یہ معلوم ہوا کہ ایسا معاملہ جائز ہے مگر چونکہ یہ معاملہ آئندہ مدت کے لیے ہوا ہے، بھول چوک خلاف نزاع کا احتمال ہے اس لیے یہ ضرور ہے کہ اس کا تعین اور ایسا اہتمام کیا جائے کہ آئندہ کوئی قضیہ اور خلاف نہ ہو اس کی صورت یہی ہے کہ ایک کاغذ لکھو جس میں مدت کا تقرر ہو اور دونوں معاملہ والوں کا نام اور معاملہ کی تفصیل، سب باتیں کھول کر لکھی جاویں۔ بہرحال یہاں سودی قرضوں کے سلسلے کو ختم کرنے کے بعد قرض خواہوں اور قرضداروں کو نزاع سے بچانے کے لیے یہ ہدایات دی ہیں۔

اوّل: جب کسی قرض کا لین دین بقیدِ مدت ہو تو اس کی دستاویز لکھ لی جائے۔

دوم: یہ دستاویز لکھنے والا انصاف سے لکھے۔

سوم: جسے لکھنا آتا ہو وہ لکھنے سے انکار نہ کرے۔

چہارم: دستاویز لکھوانے کی ذمہ داری قرض لینے والے پر ہوگی۔

پنجم: اگر قرض لینے والا کم عقل یا ضعیف ہو اور دستاویز لکھانے کی صلاحیت نہ رکھتا ہو تو اس کا ولی یا وکیل اس کا کام کرے۔

۸۲۴۔ اے اہلِ ایمان! لین دین میں جب ایک مقررہ مدت کے لیے اُدھار کا معاملہ کرو تو لکھ لیا کرو۔ اس فقرے سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔ اوّل یہ کہ دین کے معاملات کی دستاویز لکھنی چاہیے تاکہ بھول، چوک اور انکار کے وقت کام آئے۔ دین عربی زبان میں عین کے مقابلہ پر آتا ہے اور یہ ہر اس معاملہ پر بولا جاتا ہے جس میں معاوضہ کے ایک جز کی فی الفور ادائیگی نہ ہو۔ ابنِ عربی نے تصریح کی ہے کہ اہلِ عرب میں عین موجود کو اور دین غیر موجود کو کہتے ہیں۔ فقہاءِ احناف نے عین

اور دین میں یہ جوہری فرق بتایا ہے کہ دین ملک ہوتا ہے جبکہ عین ملک بھی ہوتا ہے اور مال بھی کیونکہ مال وہ ہے جو موجود ہو اور لوگوں میں قیمت رکھتا ہو، جو موجود نہیں وہ ملک تو ہے مگر مال نہیں ہے جبکہ شوافع دین کو بھی مال قرار دیتے ہیں۔

حصولِ ملکیت کے چار ذرائع

عین اور دین میں ملکیت کے حاصل ہونے کے چار ذرائع ہیں۔

اوّل : یہ کہ قیمت بھی موجود ہو اور جو چیز خریدی جا رہی ہے وہ بھی موجود ہو۔

دوم : یہ کہ نہ قیمت موجود ہو اور نہ جو کچھ خریدا جا رہا ہے وہ موجود ہو،

سوم : یہ کہ قیمت موجود ہو مگر چیز موجود نہ ہو۔

چہارم : یہ کہ قیمت موجود نہ ہو مگر چیز موجود ہو۔

ان چاروں صورتوں میں پہلی صورت بالاتفاق جائز ہے اور یہی معاملہ قرآن کی زبان میں تجارت حاضرہ ہے جیسا کہ اسی آیت میں آگے آ رہا ہے۔ دوسری صورت بالاتفاق ناجائز ہے اور اس میں دونوں نہیں ہیں۔ اس میں نہ تو قیمت موجود ہوتی ہے اور نہ چیز موجود ہوتی ہے۔ اسی کو زبانِ نبوت میں بیع الکالی بالکالی کہتے ہیں۔ اگرچہ اس موضوع پر حدیث صحت کے لحاظ سے اس قدر اونچی نہیں ہے لیکن اس کے باوجود اس کے عدم جواز پر سب کا اتفاق ہے۔ آیت میں آخری دو صورتوں کو بیان کیا جا رہا ہے ایک یہ کہ جو چیز خریدی جا رہی ہے وہ موجود ہو لیکن قیمت موجود نہ ہو۔ دوسری صورت یہ ہے کہ قیمت موجود ہو لیکن خود چیز موجود نہ ہو۔ ان دونوں صورتوں کے بارے میں دو ہدایات دے رہا ہے ایک یہ کہ ادھار کے معاملات کی دستاویز لکھی جائے، دوسرے یہ کہ ادھار کا جب معاملہ کیا جائے تو اس کی میعاد ضرور مقرر کی جائے۔ غیر معین مدت کے لئے ادھار لینا اور دینا ناجائز ہے، تاکہ باہم جھگڑا اور فساد نہ ہو۔ اسی وجہ سے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ میعاد بھی ایسی مقرر ہونی چاہیے جس میں کوئی ابہام نہ ہو ماہ تاریخ اور سنہ کی تعیین ہو ایسی میعاد نہ ہو جس میں ابہام ہو جیسے کھیتی کٹنے کے وقت کیونکہ وہ موسم کے اختلاف سے آگے پیچھے ہوتا رہتا ہے۔

انتقالِ ملکیت بذریعہ معاہدہ

دراصل حصولِ ملکیت کا شرعی طریقہ کسی مملوکہ چیز کا شرعاً درست معاہدہ کے ذریعہ ایک مالک سے دوسرے مالک کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ یہ انتقال بالعوض بھی ہوتا اور بلا عوض بھی، بالعوض انتقالِ ملکیت

کی ایک عام شکل بیع کی ہے جس کے ذریعے کسی چیز کی ملکیت فروخت کنندہ سے خریدار کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ معاہدے کو عربی میں عقد کہتے ہیں۔ قانون کی زبان میں انتقال کے مختلف اجزاء یعنی ایجاب و قبول کو باہم ملانے کا نام عقد ہے۔ اگر مزید توضیح کی جائے تو فقہا کی تصریح کے مطابق معاہدے کے تصور میں چار علتیں پائی جاتی ہیں۔

علّت فاعلی یعنی وہ علّت جس کا تعلّق معاہدہ کرنے والوں سے ہوتا ہے۔ علّت مادی یعنی وہ علّت جس کا تعلّق معاملہ یعنی ایجاب و قبول سے ہوتا ہے۔ علّت غائی یعنی وہ علّت جس کا تعلق ظاہری صورت سے ہوتا ہے۔

معاہدات کی تقسیم

اسلامی قانون میں معاہدات کی بلحاظ اہم خصوصیات حسب ذیل تقسیم ہو سکتی ہے۔

اوّل: ۱۔ انتقالِ جائداد بالعوض ۲۔ بلا بدل یا ہبہ سادہ ۳۔ ذریعہ نذر یعنی وقف ۴۔ بنظر قیام توریث۔

دوم: انتقالِ منافعہ ۱۔ معاوضہ جائداد یعنی اجارہ جس میں جائداد کا کرایہ پر دینا، ملازمت وغیرہ
۲۔ بلا معاوضہ جیسے عاریت و ودیعت۔

سوم: معاہدات، رہن، ضمانت، شرکت۔

چہارم: نکاح۔

بیع کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ مال کا مال سے تبادلہ ہے۔ بیع کی بلحاظ مبیع چار قسمیں ہیں۔
بیع صحیح، مقایضہ، صرف، سلم۔

شرائط بیع

بیع کے لئے ضروری ہے کہ مبیع موجود ہو سوائے بیع سلم کے۔ اس لائق ہو کر اس پر قبضہ کیا جا سکے بجز معاہدہ استثنا کے۔ اسی بنا پر مچھلیوں کی تالاب میں جائز نہیں۔ مبیع کا متعیّن اور مقرر ہونا ضروری ہے ورنہ بیع فاسد ہو گی۔ اسی وجہ سے وہ تمام معاملات جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھے ناجائز قرار دیئے۔

بیع سلم اور اس کا حکم

جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ بیع سلم یہ ہے کہ قیمت موجود نہ ہو۔ عبد اللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت خاص طور پر بیع سلم کی اجازت کے لیے نازل ہوتی ہے مگر بیع سلم کے جواز کی بنیادی شرط یہ ہے کہ معاملہ کے وقت مبیع کی نوع اور قسم معلوم ہو اور اس کی مقدار اور نرخ سب مقرر ہوں، تاکہ بعد میں کوئی نزاع پیش نہ آئے لیکن جمہور کی رائے میں آیت عام ہے یعنی جو معاملہ بھی اُدھار کا ہو اس کا حکم یہی ہے۔

آیت میں کتابت کے حکم کی نوعیّت

یہ بات کہ آیت میں کتابت کے حکم کی نوعیت کیا ہے: قانونی یا اخلاقی علماء کے درمیان اختلافی ہے۔ جمہور کی رائے میں اس کی نوعیت اخلاقی ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ آگے آیت کا یہ فقرہ فان امن بعضکم بعضًا بتا رہا ہے کہ کتابت اور شہادت کی ضرورت نہیں ہے دوسرے یہ کہ صدرِ اوّل میں اہلِ ایمان نے معاملات میں اس کا التزام نہیں کیا۔ اگر وہ قرآن سے اس کا قانونی وجوب سمجھتے تو ضرور اس پر عمل پیرا ہوتے اور امام رازی نے اسے اجماع قرار دیا ہے۔ تیسرے یہ کہ قیدِ کتابت معاملات میں ایک بہت بڑی سنگینی ہے اور دین میں سختی اور سنگینی نہیں ہے۔ اس کے برعکس دوسرے علماء کہتے ہیں کہ آیت میں کتابت کا حکم قانونی ہے۔ یہ عطاء ابن ابی رباح، امام شعبی کی رائے ہے۔ یہی ابنِ جریر نے اختیار کیا ہے۔ ان کا استدلال یہ ہے کہ آیت میں امر آیا ہے اور امر کے ذریعے حکم قانونی ہوتا ہے۔ اور آیت میں کتابت کے موضوع پر تاکیدات پے در پے آئی ہیں۔ اوّلاً فاکتبوہ کے ذریعے لکھنے کا حکم ہے۔ ثانیاً انصاف کے ساتھ لکھنے کا حکم ہے۔ ثالثاً کاتب کو لکھنے سے انکار کی ممانعت ہے۔ رابعاً صاحبِ حق کو املا کرانے کا حکم ہے۔ خامساً جو املا کرانے سے معذور ہو اسے حکم دیا گیا ہے کہ اپنے ولی اور وکیل سے یہ کام کرائے۔ گویا کسی کو بھی کتابت نہ کرنے کی چھٹی نہیں ہے۔ باقی آیت فان امن بعضکم بعضًا کا تعلق ضرورت سے ہے یعنی اگر ایسا وقت آجائے کہ لکھنے والا کوئی نہ ہو تو پھر کتابت نہ ہونے کی وجہ سے کاروبار بند نہ کیا جائے اور ابنِ جریر کا کہنا ہے کہ چیز کا رہن رکھنا کتابت کے قائم مقام ہے۔

قرض اور دین میں فرق

فقہا نے قرض کی یہ تعریف کی ہے کہ ایک کا دوسرے سے صرف کے لئے مالِ مثلی لینا جیسے نقد

روپے لینا، گندم لینا، اس شرط پر کہ اسی جیسا واپس کرے گا۔ مال دینے والا مقرض لینے والا مستقرض اور مال قرض کہلاتا ہے۔

قرض میں قانونی نقطہ نظر سے دو باتیں ملحوظ ہوتی ہیں۔ ایک حیثیت میں قرض عاریت ہوتا ہے کیونکہ اس میں دوسرے سے ہمدردی اور خیر خواہی کا جذبہ کارفرما ہوتا ہے اور دوسری حیثیت سے اس میں معاوضہ کی رُوح کارفرما ہوتی ہے کیونکہ مال حفاظت کی خاطر نہیں بلکہ واپسی کی خاطر لیا گیا ہے اور مقصد قرض دار کی اس کے ذریعے ضرورت کی پا بجائی ہے اور پھر قرض خواہ کو اسی طرح واپس کرنا ہے۔ قرض خواہ قبضہ کے بعد اس کا مالک ہو جاتا ہے اور اس کا بدل اس کے ذمہ واجب الادا ہوتا ہے۔ اسی لئے اگر قرض خواہ کو لی ہوئی رقم کی ضرورت نہ ہو تو اسی رقم کا واپس کرنا واجب نہیں ہے بلکہ یہ اس کے اختیار تمیزی اور صوابدید پر موقوف ہے کہ چاہے تو اس کی جگہ اسی جیسی دوسری دے دے۔ اسی لئے قرض امانت نہیں ہے۔ اگر قرض پر کوئی اُفتاد آجائے چوری چوری کریں تو اس کی ذمہ داری قرض خواہ پر ہوگی۔ دُر مختار میں اس کو ایک مستقل عنوان کے تحت بیان کیا ہے۔

دین عربی میں عین کے مقابلے میں آتا ہے نقد کے لئے عین اور اُدھار کے دین بولا جاتا ہے اور اس سے مقصود کاروبار اور لین دین میں اُدھار کا معاملہ کرنا ہے خواہ قیمت اُدھار ہو یا چیز اُدھار ہو۔ آیت میں ادھار کا کاروبار کرنے والوں سے خطاب ہے۔ قرض کا معاملہ اس میں داخل نہیں ہے یعنی جو رقم یا جنس واپسی کی شرط پر لی جاتی ہے اس کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرض میں قبضہ شرط ہے۔ دین میں قبضہ شرط نہیں ہے۔ دین میں مدت مقرر کی جاتی ہے قرض میں مدت مقرر نہیں ہوتی ہے۔

وثیقہ نویس کے لئے عدالت کی شرط

۸۲۵۔ فریقین کے درمیان انصاف کے ساتھ ایک شخص دستاویز تحریر کرے۔ اس میں ایک نہیں متعدد مسائل کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ اولاً لفظ بین لا کر اشارہ کیا ہے کہ دستاویز لکھنے والا دونوں معاملہ کرنے والوں کی موجودگی میں دستاویز لکھے یہ نہ ہو کہ ایک موجود ہو اور دوسرا غائب ہو۔

ثانیاً لفظ عدل لا کر بتایا ہے کہ لکھنے والا عادل ہو اگر بالعدل کاتب کی صفت ہے، اور اگر بالعدل کاتب کی صفت نہیں بلکہ یکتب کے متعلق ہے مطلب یہ ہے کہ عدل کے ساتھ دستاویز لکھے اور ظاہر ہے کہ عدل کرے گا۔ گویا کنائی زبان ارباب معاملہ کو سمجھایا ہے کہ اس کام کے لئے سمجھدار اور عادل کو منتخب کرو۔ قرطبی نے کہا ہے کہ سرکار اسلامی کی ذمہ داری میں یہ بات داخل ہے کہ وثیقہ نویسی کا کام ناپسندیدہ

اور غیر عادل لوگوں کو کرنے کی اجازت نہ دے ۔ عدل میں صرف سیرت کی پختگی ہی کا مطالبہ نہیں بلکہ یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ کاتب وثیقہ نویسی کے فن سے بھی آشنا ہو ۔ کیونکہ ناآشنائے فن سے غیر شعوری طور پر غلط کام کا اندیشہ ہے ۔ علامہ نسفی نے لکھا ہے کہ اس میں عالم وثیقہ نویس سے لکھانے کی طرف اشارہ ہے ۔ علامہ طیبی نے یہاں یہ بات بڑی لطیف لکھی ہے کہ آیت کا منطوق یہی ہے کہ کاتب انصاف کے ساتھ دستاویز لکھے مگر اس کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کاتب عالم ہو ، فقیہ ہو ۔

ثالثاً : اس میں لفظ عدل لا کر یہ بھی بتایا گیا ہے کہ کاتب فریقین میں سے کسی کی طرف مائل نہ ہو بلکہ غیر جانبدار ہو ۔ اگر کاتب کسی کا حمایتی ہوگا تو عدل نہ کر سکے گا ۔ علامہ فیومی مصباح میں فرماتے ہیں کہ عدل کے معنے ہیں معاملات میں میانہ روی سے کام لینے کے یہ جور کے خلاف ہے ۔

رابعاً : الجصاص نے لکھا ہے کہ آیت سے معلوم ہوا ہے کہ وثیقہ نویس جب دستاویز لکھے تو پورے انصاف ، پوری احتیاط سے لکھے اور یہ خیال رکھے کہ تمام شرطیں درست اور قانون کے مطابق جائز ہوں ، دستاویز میں ایسی تعبیر سے دامن بچا کر رکھے جو بہت سے پہلو رکھتی ہو ۔ ایسے الفاظ بھی استعمال نہ کرے جو مشترک ہوں حتی کہ فقہا کے اختلاف سے بھی بچ کر دستاویز مرتب کرے ۔ اللہ اکبر یہ ہے لین دین اور قانونی معاملات کے سلسلے میں ادنیٰ ادنیٰ جزئیات تک کے لئے قرآن کا یہ اہتمام ۔

خامساً : آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ دستاویز لکھنے والا فریقین کے علاوہ کوئی اور ہو ، معاملہ کے فریقین میں اگر کسی کو لکھنا بھی آتا ہو تو وہ خود کام نہ کریں بلکہ کوئی تیسرا غیر جانبدار آدمی یہ کام کرے ۔

وثیقہ نویس عادل ہونے کے ساتھ عالم بھی ہو

۸۳۶ ۔ اور لکھنے والا لکھنے سے انکار نہ کرے جیسا کہ اللہ نے اسے سکھایا ہے ، پس اسے چاہئے کہ لکھ دے ۔ اصل ارشاد میں کما علمہ اللہ آیا ہے ۔ کما دو معنے میں آتا ہے ایک تعلیل دوسرے تشبیہ اگر تعلیل کے لئے ہو تو معنے یہ ہیں کہ چونکہ کاتب کو علم کی نعمت سے اللہ نے مالا مال کر دیا ہے اس لئے اسے انکار نہ کرنا چاہیے جیسے اللہ نے اس کو سکھایا ہے ۔ صورت خواہ کوئی ہو بتانا یہ ہے کہ کاتب کو لکھنے سے انکار نہ کرنا چاہیے ۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ علمہ اللہ میں کونسا علم مراد ہے ۔ محمود آلوسی کا خیال ہے کہ وثیقہ نویسی کا علم مراد ہے ۔ قرطبی نے علم الکتابت ہی مراد لیا ہے اور علامہ نسفی بھی ان کے ہمنوا ہیں ۔ اگر ایسا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وثیقہ نویسی ایک مستقل فن ہے جسے باقاعدہ سکھایا جانا

ہے اور اس میں اس فن سے آشنا ہونے کی مسلمانوں کو تلقین کی جا رہی ہے لیکن ابوبکر الجصاص نے یہاں علم کو عام معنے میں لیا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ اللہ نے عقود صحیحہ اور معاملات جائزہ جو بیان کئے ہیں اور اس بیان کے ذریعے جو کاتب کو علم حاصل ہوا ہے اس کے مطابق لکھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ کاتب کو احکام و قانون کا عالم ہونا چاہیے۔ گویا قرآن کے نزدیک وثیقہ نویس کے لئے ضروری ہے کہ وہ معاملات کے احکام و قوانین سے بھی واقف ہو۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ کاتب اور وثیقہ نویس کے لئے آیت میں جو دو وصف بیان کئے ہیں۔ ایک یہ کہ عادل ہو، دوسرے یہ کہ عالم ہو۔ عدالت کا تعلق سرتا سر سیرت سے ہے اور علم کا تعلق فکر و نظر سے ہے۔ لیکن یہاں سیرت کی خوبی کو پہلے اور علم کو بعد میں پیش کیا ہے حالانکہ اصولی طور پر ذکر پہلے علم اور پھر سیرت کی استقامت کا ہونا چاہیے وجہ اس کی یہ ہے کہ جس شخص میں عدالت کی صفت ہوگی اس کے لئے وثیقہ نویسی کا علم حاصل کر لینا آسان ہے کیونکہ عدالت خود رہنمائی کا کام کرتی ہے لیکن اگر ایک شخص صرف عالم ہو اور عادل نہ ہو تو علم عادل نہیں بناتا۔ یہ امر واقعہ ہے کہ کم علم عادل معاشرے کے لئے۔ اتنا خطرناک نہیں ہوتا جس قدر عدل و تقویٰ اور سیرت کی استقامت سے محروم عالم خطرناک ہوتا ہے۔

کتابت کے حکم کی نوعیت

یہاں ایک نہی اور ایک امر کے ذریعے کاتب کو کہا جا رہا ہے کہ کتابت سے انکار نہ کرو اور چونکہ اللہ نے تمہیں یہ علم دیا ہے اس لئے لکھ دیا کرو۔ اس سے اگرچہ یہ ایک عمومی ضابطہ معلوم ہو رہا ہے کہ ہر ایسا علم جو معاشرے کی عام ضرورت سے متعلق ہو اس کے لئے جب اس کے فن کار کو بلایا جاتے تو اس کی پابجائی اس کے واجبات زندگی میں ہے اور اس تاکید کے ساتھ شاید یہ بات اس لئے کہی گئی ہے کہ عرب اُمی قوم تھی، معاملات سادہ رنگ کے تھے۔ ان میں لکھنے کا رواج نہ تھا، کاغذ بھی کم یاب تھا۔ ایسی قوم کو تحریر معاملات کا اتنا حکم موکد بتاتا ہے کہ اس میں مسلمانوں کے ایک عظیم متمدّن قوم بننے کی طرف اشارہ ہے۔

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ جس شخص کو یہ فن آتا ہو اگر اس سے اس کام کے کرنے کا مطالبہ کیا جائے تو اس پر اس کی پابجائی کہاں تک واجب ہے۔ امام شعبی فرماتے ہیں کہ نماز جنازے کی طرح فرض کفایہ ہے۔ کچھ علماء کہتے ہیں کہ فراغت کے وقت میں پابجائی ضروری ہے۔ امام مجاہد اور عطاء ابن ابی رباح کہتے ہیں کہ مستحب ہے۔ ابوبکر ابن العربی کا خیال یہ ہے کہ یہ اس کے قانونی فرائض میں نہیں ہے لیکن اس کی اخلاقی ذمہ داری ضرور ہے۔ ابوبکر الجصاص نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور

نتیجہ یہی نکالا ہے کہ یہ کاتب کی اخلاقی ذمّہ داری ہے کہ وہ یہ کام کرے اور اس کو یہ حق ہے کہ اس پر جرأت کا مطالبہ کرے اور اُجرت کے لینے میں چونکہ فقہا متفق ہیں اس لئے یہ کہنا دُرست نہیں ہے کہ یہ کاتب کی قانونی ذمّہ داری ہے۔ اور ولا یاب کاتب ان یکتب کما علمہ اللہ سے اس پر استدلال دُرست نہیں ہے کیونکہ اس میں خلافِ عدل لکھنے کی ممانعت ہے۔ یہ ایسا ہی جیسے ہم کسی سے کہیں کہ بغیر وضو قرآن نہ پڑھو، اس سے قرآن پڑھنے کے وجوب پر استدلال درست نہیں ہے۔

دستاویز لکھانا قرضدار کی ذمّہ داری ہے

۸۳۷۔ اور وہ شخص لکھائے جس پر حق آتا ہے اور اس کو اللہ اپنے رب سے ڈرنا چاہیے اور جو معاملہ ہوا ہو اس میں کمی نہ کرے۔ دستاویز کا ماحصل کسی حق کا اپنی طرف اقرار کرنا ہے۔ یہ قدرۃً اسی کو کرنا چاہیے جس کے ذمّہ کوئی حق واجب الادا ہو۔ یہاں دو شخص ہیں ایک لینے والا اور دوسرا دینے والا۔ لینے والا من علیہ الحق ہے اور دینے والا من لہ الحق ہے یا لینے والا مدیون ہے اور دینے والا دائن ہے۔ کاغذ لکھانا قرض خواہ کی نہیں قرضدار کی ذمّہ داری ہے۔ اصل ارشاد میں لیملل آیا ہے۔ یہ املال سے بنا ہے اس کے معنے لکھوانے کے ہیں اس کی دوسری شکل املا ہے جو ہماری زبان میں استعمال ہے۔ دونوں عربی ہیں اور دونوں قرآن میں استعمال ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ آدمی لکھائے جس کے ذمّہ مثلاً کپڑا خریدا اور قیمت اُدھار کی تو جس شخص کے ذمّہ اُدھار ہے۔ وہ دستاویز کا مضمون لکھائے گا کیونکہ یہ اس کی جانب سے اقرار نامہ ہوگا اور جیسے لکھوانا اس کا کام ہے لکھوانے کا سامان مہیّا کرنا، لکھانے کی اُجرت دینا، کاغذ خریدنا بھی اس کی ذمّہ داری ہے۔ علیہ الحق میں ان سب باتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے اور املا کرانے میں خاص طور املا کرانے والے کو دو ہدایتیں کی ہیں۔ ایک یہ کہ املا کرانے والے کو چاہیے کہ وہ اس معاملہ میں خاص طور پر متقیانہ سیرت کا مظاہرہ کرے اور واجب الادا رقم کو پوری پوری لکھائے۔ اس خاص موقعہ پر یہ جتانا کہ اللہ ہی اس کا پروردگار ہے جس نے اسے اپنی نعمتوں سے نوازا ہے اور جس نے قرض خواہ کے قلب کو اس کے لئے رام کر دیا ہے اور اس کو بنیاد بنا کر تقویٰ کی تلقین کرنا صرف اس لئے ہے تاکہ بندے میں یکبارگی جلال اور جمالِ الٰہی کا تاثر پیدا ہو۔ جلال کا تاثر لفظ اللہ سے اور جمال کا لفظ رب سے ترہیب اور ترغیب کی خاطر ہے اس کے بعد املا کرانے والے سے فرمایا کہ املا کراتے وقت حق لکھانے میں کوئی کمی نہ کرے۔ تقویٰ کا حکم دینے کے بعد مراد

یہ ممانعت اس لئے فرمائی ہے کہ بسا اوقات انسان لالچ کا شکار ہو کر کچھ کی کچھ کر لیتا ہے یا اقرار میں کچھ ابہام رکھ دیتا ہے ۔

۸۳۸ ۔ اگر قرض لینے والا خود نادان یا ضعیف ہو یا املا نہ کرا سکتا ہو تو اس کا ولی انصاف کے ساتھ املا کرائے ۔ یعنی جو دین دار اور مدیون ہے وہ اگر بے عقل، بھولا یا سست اور ضعیف ہے۔ مثلاً بچہ ہے یا بہت بوڑھا ہے کہ معاملہ سمجھنے کی سمجھ ہی نہیں رکھتا ہے، یا معاملہ کو کاتب کو بتلا نہیں سکتا تو ایسی صورتوں میں مدیون کے مختار اور وارث اور کارگزار کو چاہیے کہ معاملہ کو انصاف سے بلا کم وکاست لکھوا دے۔ مطلب یہ ہے کہ قرضدار اگر عقلی طور پر کمزور ہو یا نابالغ بچہ ہو یا بوڑھا ہو۔ اور یا گونگا یا پردیسی ملک کی زبان سے ناواقف ہو تو ایسی صورت میں اس کی طرف سے اس کا ولی شرعی یا وکیل، مختار یا پردیسی کے لئے ترجمان لکھائے۔

اس فقرے میں تین صورتیں فرمائی گئی ہیں اگر قرضدار سفیہ ہو یا ضعیف ہو یا پھر لکھوا نہ سکتا ہو تو اس کا ولی عدل وانصاف کے ساتھ دستاویز کا املا کرائے ۔

سفیہ ہونے کا مطلب یہاں عقل کا ناقص، نیم پاگل کبھی کچھ کہتا ہے اور کبھی کچھ۔ بیان القرآن میں ہے کہ سفیہ سے مراد خفیف العقل، المجنون یا معتوہ ہے جو بالکل پاگل نہ ہو بلکہ مختل العقل ہو۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ سفیہ سے مراد وہ شخص ہے جو معاملاتی دستاویز کی املا سے ناواقف ہو۔ چاہے اپنی جگہ عاقل ہو اور ہر قسم کی تمیز اور سلیقہ رکھتا ہو، اور یس اور یہ بھی لکھا ہے کہ یہی معنے مناسب ہیں۔ یہی معنے صاحب روح نے امام مجاہد سے نقل کئے ہیں۔ وہ سفاہت جو تبذیر وا سراف یا مال کو غیر مفید مصارف میں ضائع کرنے کی بنا پر ہوتی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ پارہ چہارم میں آئے گی ۔

ضعیف ہونے سے مراد بچہ یا بوڑھا ہے۔ ایسا بوڑھا کہ کہتا کچھ ہے اور نکلتا کچھ ہے اور عدم استطاعت سے مراد یہ ہے کہ زبان سے گونگا ہو یا غیر ملکی ہو، زبان نہ جانتا ہو، یا کمی اور بیماری کا شکار ہو۔

تینوں صورتوں میں ان کے معاملات کے نافذ اور صحیح ہونے کے لئے ولی کی اجازت ضروری ہے اور ایسا ولی جس کا تصرف ان کے مال میں ہو سکے صرف یہ ہیں باپ دادا، باپ کا وصی، دادا کا وصی، حاکم۔ ان کا ہر معاملہ ولی ان کی جانب سے انجام دے گا لیکن مدیون ولی نہیں بلکہ اصل ہی رہے گا یعنی مدیون ہے۔ اگر کسی نے اپنے آرام کے لئے املا میں کسی کو مختار بنا دیا تو یہ ولایت نہیں وکالت ہوگی۔ اگر زبان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سے ناآشنائی کی وجہ سے ترجمان کی ضرورت ہو تو وہ ہر معتبر آدمی ہو سکتا ہے۔ ان دونوں صورتوں میں ولی بمعنے کارکن ہے جو ولی اصطلاحی وکیل اور ترجمان سب کو شامل ہے۔ [1]

پوری آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ

۱۔ مسلمان جب کوئی ایسا معاملہ کریں جس میں دونوں معاملہ کرنے والوں میں سے کسی ایک کے ذمہ حق باقی رہتا ہو تو اس کے لئے ایک میعاد مقرر ہونی چاہیے اور اسی مقررہ میعاد میں قرض خواہ کو قرضدار سے اپنا مطالبہ کرنا چاہیے۔

۲۔ اس قسم کے معاملات کے لئے مناسب یہ ہے کہ دستاویز لکھ لی جائے۔

۳۔ اگرچہ دستاویز کا لکھنا مناسب ہے لیکن اگر کوئی ضرورت پیش آجائے تو اس حکم میں تاکید آجائے گی۔

۴۔ دستاویز کا لکھنا صرف اسی قسم کے معاملات کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ ہر ایسے معاملہ کا جس میں باہمی نزاع کا خطرہ ہو تحریر کرلینا مناسب ہے۔

۵۔ جس معاملہ کے متعلق کتابت کا حکم ہوا ہے اسی کے متعلق کاتب کو یہ حکم ہے کہ وہ کتابت سے انکار نہ کرے، بلکہ اللہ سبحانہٗ نے جو علم اس کو عطا کیا ہے ضرورت کے وقت اس کو استعمال کرے انکار نہ کرے۔

۶۔ دستاویز کا مضمون لکھوانے کی ذمہ داری اس شخص پر ہے جو مدیون ہے خواہ قیمت کی ادائیگی اس کے ذمہ ہو یا چیز کی۔

۷۔ جو دستاویز کا مضمون املا کرائے اس کو حکم ہے کہ اللہ سے ڈرے اور حق والے کے حق میں کوئی کمی نہ کرے اور لکھوانے میں اس کو نقصان نہ پہنچائے۔

۸۔ اگر سوء اتفاق سے دستاویز لکھوانے والا اس قابل نہ ہو تو اس کا مختار وارث یا کارندہ لکھوا دے۔

۹۔ آیت سے اگرچہ ہر معاملہ میں دین کی کتابت کا حکم معلوم ہوتا ہے۔ جیسے بیع، بیع سلم، اجارہ، قرض بلکہ نکاح، صلح اور خلع بھی مدا ین کے مفہوم میں داخل ہیں۔ لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس نے یہاں اس آیت میں بیع سلم مراد لی ہے۔

احکام میں قانون و اخلاق کی تقسیم

اس موقعہ پر یہ بات سب نے لکھی ہے کہ یہ لکھنا جمہور علماء کے نزدیک مستحب ہے اگر کوئی نہ

[1] بیان القرآن

لکھے لکھائے گنہ گار نہیں۔ صرف یہ مصلحت ہے کہ اختلاف کا احتمال نہ ہو رہے[1] ایسے ہی دوسرے علماء نے بھی تصریح کی ہے۔ قرطبی، آلوسی، نسفی اور الجصاص بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔

دراصل اسلامی قانون کے تمام احکام انسانی مصالح کے محافظ ہیں اور سب کو اللہ سبحانہٗ کی پسندیدگی کی سند حاصل ہے، اس اعتبار سے ان تمام احکام و ہدایات کی تعمیل مطلوب اور پسندیدہ ہے، لیکن ہر حکم یا ہدایت کو لازمی اور واجب التعمیل نہیں قرار دیا گیا ہے۔ فرائض اور اختیاری اعمال کی یہ تقسیم اس بنیادی حکمت سے ہم آہنگ ہے جو نوعِ انسانی کے سلسلہ میں خالقِ کائنات کے پیشِ نظر رہی ہے۔ یعنی ابتلاء و امتحان، کھرے اور کھوٹے، عالی ہمت اور کم ظرف کے درمیان تمیز، بہت سے اعمالِ خیر کو مستحب قرار دے کر قرآن نے اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ فرد اپنے تزکیہ اور ارتقاء میں جتنے مدارج بھی طے کر سکتا ہو کرے اور جو فرد خود کو جتنا اونچا لے جا سکتا ہے لے جائے۔ یہ تقسیم عبادات میں بھی پائی جاتی ہے اور سیاست و معیشت اور زندگی کے دوسرے معاملات میں بھی۔

قرآن نے خود بھی اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ارشاد ہے: ان اللہ یامر بالعدل والاحسان

اللہ تم کو انصاف کرنے اور نیکی کرنے کا حکم دیتا ہے۔

عدل قانونی تقاضا ہے اور احسان اخلاقی برتری اور بزرگی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قانونی ذمہ داریاں عدل کے لئے قائم کی ہیں اور اس کے بعد اخلاقی بزرگیوں کا ذکر کیا ہے جن سے افراد کی روحانی تکمیل ہوتی ہیں۔

بہرحال مالیاتی مسائل میں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قرآن نے اپنی ہدایات میں قانونی اور اخلاقی کی تقسیم کیوں کی ہے یہ تقسیم کس حد تک واضح اور متعین ہے۔ کیا یہ تقسیم اپنی جملہ تفصیلات کے ساتھ دائمی ہے۔ یا چند دائمی اصولوں کی روشنی میں احکام کے قانونی اور اختیاری حلقوں کی سرحدیں زمانہ، حالات اور سماج کے اخلاقی معیار کے ساتھ ساتھ تبدیل بھی ہو سکتی ہیں۔ اس پر تفصیلی بحث ہم انشاء اللہ پانچویں پارے کے آغاز میں کریں گے۔

---

[1] بیان القرآن

وَاسْتَشْهِدُوْا شَهِيْدَيْنِ مِنْ رِّجَالِكُمْ ۚ فَاِنْ لَّمْ يَكُوْنَا رَجُلَيْنِ
فَرَجُلٌ وَّامْرَاَتٰنِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَآءِ اَنْ تَضِلَّ
اِحْدٰىهُمَا فَتُذَكِّرَ اِحْدٰىهُمَا الْاُخْرٰى ؕ وَلَا يَاْبَ الشُّهَدَآءُ اِذَا مَا
دُعُوْا ؕ وَلَا تَسْـَٔمُوْٓا اَنْ تَكْتُبُوْهُ صَغِيْرًا اَوْ كَبِيْرًا اِلٰٓى اَجَلِهٖ ؕ ذٰلِكُمْ
اَقْسَطُ عِنْدَ اللّٰهِ وَاَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ وَاَدْنٰٓى اَلَّا تَرْتَابُوْٓا اِلَّآ اَنْ
تَكُوْنَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيْرُوْنَهَا بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ
اَلَّا تَكْتُبُوْهَا ؕ وَاَشْهِدُوْٓا اِذَا تَبَايَعْتُمْ ۪ وَلَا يُضَآرَّ كَاتِبٌ وَّلَا
شَهِيْدٌ ۬ وَاِنْ تَفْعَلُوْا فَاِنَّهٗ فُسُوْقٌ بِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ وَيُعَلِّمُكُمُ
اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿۲۸۲﴾

اور دستاویز پر دو گواہ اپنے مردوں میں سے[۸۳۹] بنا لو۔ اگر دو مرد نہ
ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے
تو دوسری اسے یاد دلا دے[۸۴۰]۔ اور یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے
ہوں جن کو تم پسند کرتے ہو۔ گواہوں کو جب بھی گواہی کیلئے

بلایا جائے تو انکار نہ کریں۔[۲۴۲] اور معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا میعاد کی تعیین کے ساتھ اس کے قلم بند کرنے میں کاہلی نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک اس میں تمہارے لئے انصاف کی بات ہے اور شہادت قائم ہونے میں زیادہ پائداری ہے۔ اور شک و شبہ نہ ہونے کا کم امکان ہے ہاں جو تجارتی لین دین دست بدست کرتے ہو اس کو اگر نہ لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے لیکن لین دین کرتے وقت گواہ بنا لیا کرو۔ کاتب اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے، ایسا کرو گے تو یہ بدکاری ہے اور اللہ سے ڈرو وہ تم کو سکھلا رہا ہے اور اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔

شہادت اس کی اہلیت اور نصاب

پہلی آیت میں کاتبوں اور وثیقہ نویسوں کی ضرورت بتائی۔ اس آیت میں بتایا کہ صرف دستاویز ہی نہ ہو بلکہ گواہوں کی گواہی بھی ہو۔ اور گواہوں کی یہ گواہی تحریر دستاویز کے علاوہ ہے۔ فقہانے تصریح کی ہے کہ اصل مدار ثبوت انہی گواہوں کی گواہی ہوگی۔ گویا صرف تحریر کافی نہیں ہے اس پر گواہ بھی بنا لیں کہ اگر کسی وقت باہمی نزاع پیش آجائے تو عدالت میں ان گواہوں کی گواہی سے فیصلہ ہو سکے۔ اسی بناء پر فقہانے تصریح کی ہے کہ محض تحریر حجت شرعی نہیں جب تک اس پر شہادت قانونی موجود نہ ہو صرف تحریر پر کوئی فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کتابت اگر یادداشت کے لئے ہے تو شہادت اسی یادداشت کو باوثوق اور معتبر بنانے کے لئے ہے کتابت ایک درجہ میں شہادت میں معین مددگار ہوتی ہے اور دونوں مل کر اہل معاملہ کو ثبوت کی طاقت فراہم کرتی ہیں۔ شاہد کو شہادت پر بھروسہ ہوتا ہے لیکن شک اور ذہول کے وقت میں لکھی ہوئی داستان تذکرہ کا کام دیتی ہے اور کتابت

کا مزید فائدہ اس وقت محسوس ہوتا ہے جب دونوں گواہ دنیا سے رخصت ہو جائیں۔

شہادت اور روایت میں فرق

شہادت کیا ہے؟ فقہا کی اصطلاح میں عدالت میں اثبات حق کے لئے سچی خبر بتا دینے کا نام شہادت ہے۔ شہادت اور روایت میں بنیادی اور جوہری فرق یہی ہے کہ شہادت عدالت میں ہوتی ہے جبکہ روایت کے لئے عدالت شرط نہیں ہے۔ الجصاص نے روایت اور شہادت میں یہ فرق بھی بتایا ہے کہ احکام میں ایک کی روایت قابل پذیرائی ہے لیکن شہادت کے لئے قانون میں دو کا نصاب مقرر ہے۔ روایت میں حکایت معتبر ہے جبکہ شہادت میں حکایت کا قانون کوئی اعتبار نہیں ہے، روایت بطور سند پیش کی جا سکتی ہے کہ حمید نے رشید سے سنا ہے رشید کہتا ہے کہ میں نے داؤد سے، شہادت بطور سند پیش نہیں کی جا سکتی۔ روایت میں قول معتبر ہے۔ شہادت میں ضروری ہے کہ شہادت ہی کے لفظوں میں ہو۔ روایت میں مرد و زن یکساں ہیں لیکن شہادت میں یکساں نہیں۔ روایت و شہادت کے فرق پر تفصیلی بحث السیوطی نے تدریب الراوی میں اور حافظ ابن القیم نے بدائع الفوائد میں کی ہے۔

قرآن نے اس آیت میں صرف شہادت کا نصاب نہیں بلکہ شہادت کی اہلیت کے لئے بنیادی نکتے پیش کئے جن کی اساس پر اسلام کے قانون دان طبقہ نے پورا ضابطہ شہادت مرتب کیا ہے۔

شاہد کے لئے مسلمان آزاد اور بالغ ہونا ضروری ہے

۸۳۹ - اور دستاویز پر دو گواہ اپنے مردوں میں سے بنا لو۔ آیت میں اصل خطاب اہل ایمان سے ہے کیونکہ واستشہدوا کا فقرہ کے تحت ہے۔

اس انداز بیان سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ معاملہ کے دو فریق اگر مسلمان ہوں۔ اور ان میں باہم اختلاف ہو جائے اور معاملہ عدالت میں پہنچ جائے تو دونوں گواہوں کے لئے ضروری ہے کہ وہ مسلمان ہوں۔ اس موضوع پر امت میں دو رائیں نہیں ہیں، ہاں حافظ ابن القیم نے اعلام الموقعین میں البتہ یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ قانون بینہ کی ضرورت ہوتی ہے اور بینہ شریعت میں عام ہے یعنی شہادت ہی بینہ نہیں ہے۔ ہر وہ چیز جس کے ذریعے عدالت کے سامنے حق نمایاں ہو کر آ جائے بینہ ہے جیسے قطعی قرائن، اور اس لحاظ سے کافر کی شہادت بھی بینہ ہو سکتی ہے جبکہ عدالت

کے سامنے اسی ذریعہ سے حق واضح ہوتا ہو۔

دوسری شرط شہادت کے بارے میں آیت کے مدلول سے یہ بھی معلوم ہوئی کہ شہادت دینے والا مسلمان ہونے کے ساتھ آزاد ہو غلام نہ ہو۔ کیونکہ آیت میں معاملات کے بارے میں وہ مسلمان مخاطب ہیں جو اپنے معاملات کو خود کرنے کے مجاز ہیں۔ غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر معاملات میں آزاد نہیں ہوتا اس لئے وہ محل خطاب نہیں ہے۔ اور پھر مِنْ رِّجَالِكُمْ بھی اسی کا مقتضی ہے کہ خطاب آزاد اور ذمّہ دار افراد سے ہے۔ لیکن چونکہ یہ بات قرآن کے مدلول سے سمجھی گئی ہے اس لئے اس میں علماء کے خیالات مختلف ہیں۔ قاضی شریح، امام ابن سیرین، امام ابو ثور، امام عثمان البتی آزادی کو شرط نہیں بتاتے لیکن جمہور کی رائے وہی ہے جو آیت کے مدلول سے معلوم ہو رہی ہے۔

تیسری شرط اسی آیت میں من رجالکم سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ شاہد عاقل و بالغ ہو۔ نابالغ بچوں کی شہادت معتبر نہیں ہے۔ فقہاء میں سے امام ابو حنیفہ، امام شافعی کی رائے یہی ہے۔ البتہ امام مالک بچوں کی شہادت کو کچھ شرطوں کے ساتھ قبول کر لیتے ہیں۔

گواہی میں عورتوں کے دو ہونے کی وجہ

۸۴۰۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد دو عورتیں ہوں تاکہ ایک بھول جائے تو دوسری اسے یاد دلا دے۔ یعنی تم کو چاہیے کہ اس معاملہ پر کم از کم دو گواہ مرد و زن میں سے یا ایک مرد دو عورتیں گواہ بنائی جائیں اور گواہ پسندیدہ یعنی لائق اعتبار اور اعتماد ہوں [1]

قرآن نے دیوانی معاملات میں شہادت کا نصاب دو مرد قرار دیا ہے۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو پھر ایک مرد اور دو عورتیں ہونی چاہیں۔ دو عورتیں ایک مرد کے قائم مقام ہیں۔ اس لئے دونوں کی گواہی ایک شمار ہوگی اور اسی بنا پر عدالت دونوں عورتوں کی گواہی ایک ساتھ لے گی۔ قرآن نے خود اس کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ اگر ایک بھول جاتے تو دوسری یاد کرا دے۔ اور گویا یہی بات ایک مرد کی جگہ شہادت میں دو عورتوں کو لانے کی علت ہے۔ اگر مرد کی جگہ دو عورتوں کو شہادت میں نیابت دینے کی یہی وجہ ہے تو کیا اس لئے ہے کہ نفی الواقع ذہانت اور حافظہ کے اعتبار سے مرد کی قوت یادداشت یا قوت فکر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

عورت سے تخلیقاً ڈبل ہوتی ہے یا اس کی کوئی اور وجہ ہے۔ آلوسی نے بتایا ہے کہ عورتوں میں مزاجی رطوبت کی وجہ سے نسیان کا غلبہ ہوتا ہے۔ بیضاوی نے اس کی وجہ قلتِ ضبط اور نقصانِ عقل بتایا ہے۔ اصل یہ ہے کہ عورت کے مقابلے میں مرد کی ترجیح کی بنیادی وجہ یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فطری طور سے مردوں کو عورتوں پر جسم و طاقت اور عقل و فراست وغیرہ میں جسمانی اور ذہنی فوقیت اور برائی عطا کی ہے، طبی تحقیقات، انسانیت کی پوری تاریخ اور روزانہ کے مشاہدے اس کی تائید میں ہیں خدا کی مخلوق میں صفت و قوت کا یہ اختلاف سماوی مخلوق سے لے کر ارضی مخلوق تک میں موجود ہے۔ اکاہ پر جب نظر کی جاتی ہے تو اس میں بھی شمس و قمر تمام ستاروں میں سب سے زیادہ روشن اور بڑے نظر آتے ہیں۔ پھر ستاروں میں بھی ان کی جسامت اور نورانیت میں بڑا اختلاف ہے۔ زمین میں حیوانات میں بڑا اختلاف ہے اور ان کے مذکر و مونث میں ان کی جسامت اور طاقت کے لحاظ سے کھلا اختلاف نظر آتا ہے یہی اختلاف انسانوں میں بھی مرد و عورت کی صنف میں قوت و ضعف کا اختلاف ہے۔ اس فطری اختلاف پر اگر جدید تحقیقات کی روشنی میں سیر حاصل بحث دیکھنی ہو تو مشہور کتاب المرأة المسلمۃ کا مطالعہ کیجئے۔ اس کا اردو ترجمہ "مسلمان عورت" کے نام سے شائع ہو چکا ہے۔ اس مسئلہ پر بہت کچھ لکھا جا سکتا ہے مگر ہم صرف یہ بتانا چاہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی اتنی بڑی تعداد میں کسی عورت کو منصبِ نبوت پر سرفراز نہیں کیا گیا۔ اسی طرح دنیا کے سربراہوں کی تاریخ میں عورتوں کا حصہ خال خال ہے۔ دین و دنیا کا یہ تاریخی ہم آہنگی اس کی کھلی شہادۃ ہے کہ عورت میں مرد کے مقابلہ ضعف ہے۔

راہِ اعتدال

اصل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد و عورت میں الگ الگ صلاحیتیں رکھی ہیں اور ہر صنف دوسری نوع کی خاص صلاحیتوں سے خالی ہے۔ عالمِ انسانیت کی تکمیل کے لئے ان دونوں کا وجود ضروری ہے۔ انسانیت کو عورتوں کی بھی اتنی ضرورت ہے جتنی کسی ناقص کو اپنے کمال کے لئے ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے عورتوں کے کمال اور ضرورت کا انکار نہیں مگر بات صاف یہ ہے کہ جو صلاحیتیں مرد میں رکھی گئی ہیں وہ ان صلاحیتوں سے برتر ہیں جو عورتوں میں رکھی گئی ہیں۔ نبوت و رسالت تو بڑے مقامات ہیں قانون تو عورت کو روزمرہ کی نماز میں امامت کی اجازت نہیں دیتا بلکہ مسجد میں مقتدیوں کی صفِ اول میں شامل ہونے سے روکتا ہے اور اس سے بھی زیادہ یہ کہ اس کا موقف مردوں کی صفوں کے بعد ہے۔ شرعی نقطۂ نظر سے عورتوں کے مردوں کے ساتھ مساوات کی ہمیں تو کوئی اصل معلوم نہیں ہے۔

عورت عورت ہے اور مرد مرد ہے۔ قرآن نے جہاں عورتوں اور مردوں کے حقوق کا ذکر کیا ہے۔ ولھن مثل الذی علیھن بالمعروف وہاں یہ بات کھول کر کہہ دی کہ وللرجال علیھن درجۃ اور اس خاص درجہ کی توضیح سورۂ نساء پارہ پنجم میں کی ہے۔

اگر صورتِ حال یہی ہے تو پھر یہ سوال کہ نسیان کا احتمال مرد کی شہادت میں کیوں نہیں رکھا گیا بالکل ایسا ہی ہے جیسے جسم و مادیات کی دُنیا میں یہ دریافت کیا جائے کہ حمل و رضاعت کا تعلق صرف عورت ہی سے کیوں رکھا گیا اور مرد کو باوجود طاقتور ہونے کے اس قابل کیوں نہ سمجھا گیا۔

آیت میں فتذکر سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ گواہی کا مدار یاد پر ہے۔ اگر دستاویز دیکھ کر یاد نہ آیا تو گواہی دینا دُرست نہیں ہے [1]

عورتوں کی شہادت

الجصاص رقم طراز ہیں کہ عورتیں مردوں کے ساتھ تمام مالیاتی معاملات میں گواہی دے سکتی ہیں خواہ یہ معاملہ خالص دیوانی ہو یا ازدواجی یا کرایہ اور یا دیت خون بہا کا۔ الغرض ہر معاملے میں عورت گواہ ہو کر اس آیت کی رُو سے پیش ہو سکتی ہے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں ہے۔ حدیث میں ہے کہ حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دایہ کی شہادت کو قبول کیا ہے حالانکہ ولادت مالیاتی مسئلہ نہیں ہے۔ امام ابوحنیفہ اور آپ کے صاحبین صرف فوجداری مقدمات میں عورت کی شہادت قبول نہیں کرتے اس کے سوا زندگی کے سارے مسائل میں عورتوں کی شہادت کو جائز قرار دیتے ہیں۔

ایک گواہ اور قسم سے فیصلہ

اس آیت میں شہادت کا جو نصاب بتایا گیا ہے کہ دو مرد ہوں۔ اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ اس سے امام ابوحنیفہ نے یہ استدلال کیا ہے کہ ایک شہادت اور دوسری شہادت کی جگہ قسم لے کر فیصلہ کرنا جائز نہیں ہے۔ یہی امام ابو یوسف، امام محمد، امام زفر اور ابن شبرمہ کی رائے ہے لیکن اس کے برعکس امام مالک اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ دیوانی مقدمات میں ایک شہادت اور مدعی سے قسم لے کر عدالت فیصلہ کرنے کی مجاز ہے۔ امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ قرآن نے شہادت کی

[1] بیان القرآن

کمیت اور کیفیت دونوں بنیادی ہیں کمیت یہ کہ دو ہوں اور کیفیت یہ کہ مسلمان ہوں، بالغ ہوں اور پسندیدہ ہوں جیسے کیفیت میں کمی درست نہیں ہے ایسے ہی کمیت میں بھی کمی درست نہیں ہے آیت قرآنی کا مقتضا یہی ہے کہ دونوں کا وزن نفاذ حکم میں یکساں ہو۔ عدد کا بھی اور عدالت کا بھی بلکہ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو عدد کا پلڑا عدالت کے مقابلے میں زیادہ وزنی ہے کیونکہ عدد ایک معلوم الحال حقیقت ہے اور اسے ہر شخص یقین کی قوت سے جانتا ہے اس میں ظاہر و باطن کی کوئی تقسیم نہیں ہے برخلاف عدالت کے کہ اس کو جاننے کا ہمارے پاس ذریعہ صرف ظاہر ہے۔ واقعی اور حقیقی طور پر اس کو جاننے کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ جب مرہوم اور غیر متیقن کو چھوڑ کر ہم گواہوں میں غیر عادل لینا گوارا نہیں کر سکتے تو گواہوں کی تعداد میں کمی کو کیونکر گوارا کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے آئمہ اپنے موقف پر قرآن سے نہیں بلکہ اس حدیث سے استدلال کرتے ہیں جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا مختلف حضرات نے یہ عمل بتایا ہے کہ آپ نے شاہد کے ساتھ قسم کے ذریعے مقدمہ کا فیصلہ کیا ہے۔ یہ حدیث مختلف کتابوں میں متعدد صحابہ مثلاً عمر بن الخطاب، ابن عباس، ابوہریرہ، عبداللہ ابن عمر، زید بن ثابت، ابوسعید الخدری، سعد بن عبادہ، عامر بن ربیعہ، سہل بن سعد، عمارہ بن حزم، عمرو بن حزم، مغیرہ ابن شعبہ، بلال ابن الحارث، مسلمہ ابن قیس، انس بن مالک، تمیم الداری اور زینب بنت ثعلبہ سے روایت ہو کر آئی ہے۔ یہ روایت سنداً و تاریخ کے لحاظ سے خواہ کتنی اونچے درجہ کی ہو، لیکن کسی حدیث سے احتجاج کے لئے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ حدیث صحیح ہو بلکہ یہ بھی ضروری ہے کہ مقبول بھی ہو۔ حدیث کے مقبول ہونے کیلئے ضروری ہے کہ:

۱۔ روایت دین کے مسلمہ اصولوں کے خلاف نہ ہو۔

۲۔ معانی قرآن سے متصادم نہ ہو۔

۳۔ سنت مشہورہ کے خلاف نہ ہو۔

۴۔ صحابہ و تابعین کے عمل متوارث کے خلاف نہ ہو۔

جب ان اصولوں کی روشنی میں اس روایت کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ یہ حدیث مقبولیت کے معیار پر پوری نہیں اترتی ہے کیونکہ:

اولاً: یہ روایت دین کے اس مسلمہ اصول کے خلاف ہے کہ شہادت پیش کرنا مدعی کا اور یمین مدعا علیہ کا کام ہے۔ اور یہ حدیث بتاتی ہے کہ یمین بھی مدعی کا کام ہے حالانکہ سنت سے اس ضابطہ کی کلیت معلوم ہو چکی ہے اور سنت بھی ایسی جسے تلقی امت بالقبول حاصل ہے میری مراد وہ ارشاد نبوت

ہے جس میں عدلیہ کا دستور بتاتے ہوئے حضور نے فرمایا ہے کہ البینۃ علی المدعی و الیمین علی من انکر علامہ شاطبی فرماتے ہیں ؛

قوانین عامہ پر جزئی اور خصوصی واقعات اثر انداز نہیں ہوتے کیونکہ قواعد کلیہ قطعی ہوتے ہیں اور حوادث جزئیہ ظنی ہوتے ہیں۔ گمان و وہم سے یقین و اذعان کی عمارت منہدم نہیں ہوتی اور نہ ظن میں یقین کا مدمقابل بننے کی صلاحیت ہے نیز قواعد کلیہ دلائل قطعیہ سے غذا حاصل کرتے ہیں اس لئے ان میں کسی دوسرے احتمال کی گنجائش ہی نہیں ہو سکتی برخلاف حوادث جزئیہ کے کہ ان میں ہر دقت اور ہمہ آن دوسرے احتمالات کا امکان رہتا ہے احادیث آحاد کی حیثیت جزئیات کی ہے اور قواعد کا مقام کلیات کا ہے۔

(الموافقات)

اسلام کے قانون دان طبقہ کا یہ فیصلہ کہ خبر واحد اگر قانون کے کسی مسلمہ قاعدے کے خلاف ہو تو اس پر عمل جائز نہیں دوسری صدی تک مجتہدین کا مسلمہ ہے۔ علامہ شاطبی نے امام مالک کا بھی یہی مذہب قرار دیا ہے اور علامہ ابن عربی نے بھی امام مالک کا راجح مسلک یہی بتایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں :

اگر خبر واحد کسی قاعدہ شریعت کے معارض ہو تو کیا اس پر عمل جائز ہے۔ امام ابوحنیفہ تو فرماتے ہیں کہ ناجائز ہے امام شافعی کہتے ہیں کہ جائز ہے اور امام مالک کا قول مشہور اور قابل اعتماد یہی ہے کہ حدیث کی تائید میں اگر کوئی قاعدہ ہو تو عمل جائز ہے اور اگر نہ ہو تو اسے چھوڑ دینا چاہیے۔

ثانیاً یہ حدیث خواہ اصطلاحی صحت کی کتنی بڑی طاقت رکھتی ہو لیکن مقبول نہیں ہے کیونکہ وہ معانی قرآن سے متصادم ہے۔ قرآن اپنے مدلول اور مفہوم میں اگرچہ قطعی نہیں ہے لیکن اپنے منطوق میں وہ حتمی اور قطعی ہے اور حدیث خبر واحد ہونے کی وجہ سے اپنے منطوق میں ہرگز ہرگز قطعی نہیں ہے ایک حدیث پر صحت اصطلاحی کی خواہ کتنی مہریں لگ جائیں مگر آپ قطعیت کے ساتھ نہیں کہہ سکتے کہ راوی جو کچھ بتا رہا ہے یقیناً یہ الفاظ نبوت ہی ہیں۔

قرآن نے یہ بات کھول کر بتادی ہے کہ شہادت کا نصاب دو مرد یا ایک مرد اور دو عورتیں ہیں۔ اب یہ کہنا کہ نہیں بلکہ نصاب ایک مرد اور ایک قسم ہے۔ معانی قرآن سے صریح متصادم ہے۔ قرآن کی آیت نصاب کے بارے میں قطعی ہے۔ اس موقعہ پر حافظ ابن تیمیہ کا یہ کہنا کہ قرآن نے نصاب شہادت عدالت کے لئے نہیں بلکہ حفظان حقوق کے لئے پیش کیا ہے، ایک ایسی تاویل ہے جسے قرآنی تعبیر کا ذوق گوارا

نہیں کرتا۔ اس حدیث کی رُد سے مدعی کو ایک شہادت پیش کرنے کی ہدایت کی گئی ہے اور دوسری شہادت کے لئے مدعی کے قسم کھانے کو کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ قرآن کے بتلائے ہوئے نصاب شہادت کے خلاف ہے۔ واستشہدوا شہیدین من رجالکم فان لم یکونا رجلین فرجل وامرأتان یہ آیت صراحتہً کہہ رہی ہے کہ شہادت کا نصاب دو ہے۔ اس ارشادِ ربانی کی روشنی میں گواہ دو ہونے چاہئیں اور اگر مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں۔ بہرحال یہ حدیث معانی قرآن سے معارض ہونے کی وجہ سے مقبول نہیں ہے۔

ثالثاً، یہ حدیث سنتِ مشہورہ کے خلاف ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو محسوس پیمانہ صحابہ میں چھوڑا ہے اور جسے جماعت صحابہ نے اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں اپنایا ہے اور جسے خلافتِ راشدہ منشورِ قضا بنا کر تمام ممالکِ اسلامیہ میں قانونی طور پر نافذ کیا ہے یہی حضور کی سنتِ متواترہ ہے چونکہ یہ عملاً متواتر ہے اس لئے اس کے خلاف سند کی بڑی سے بڑی قوت بھی بطور چیلنج قبول نہیں کی جاسکتی۔ اور پھر ایسی روایت سے اس کو نہیں چھوڑا جاسکتا جس کا صحاح میں کہیں وجود نہیں اور جس کے طرق بھی تمام روایتی اور تاریخی طور پر مشکوک ہیں۔ تفصیلات دیکھنی ہوں تو علامہ شوکانی کی کتاب نیل الاوطار دیکھ لی جائے۔ اور بات بھی اسلامی معاشرے میں اتنی اجنبی اور نامانوس کہ امام محمد بن شہاب الزہری جیسا شخص جسے علماءِ مدینہ میں اپنے زمانہ میں اعلم الناس کہا ہے اسے نہیں جانتا اور برملا کہتا ہے کہ بدعت ہے۔ تاریخ کی بے لاگ عدالت موجود ہے اس کا فیصلہ یہ ہے کہ اول من اجازۃ معاویۃ یعنی اس کی اجازت کا سب سے پہلے پروانہ حضرت معاویہ نے دیا۔ اور عطاء ابن ابی رباح فرماتے ہیں کہ:

> میں نے اہلِ مکہ کو دیکھا ہے یہاں مالیاتی مسائل کا کوئی عدالت دو شاہدوں کے بغیر فیصلہ نہ کرتی تھی۔ عبدالملک بن مروان اپنے زمانہ میں ایک گواہ اور قسم سے فیصلہ کرتا تھا۔

یہ تاریخ کی گواہی ہے کہ ایک گواہ اور قسم کے ذریعے مالیاتی اور دیوانی مقدمات کا فیصلہ کرنا نبوت کی نہیں بلکہ معاویہ اور عبدالملک کی سنت ہے۔

رابعاً: یہ حدیث خود صحابہ وتابعین کے عمل متوارث کے خلاف ہے۔ اسی کو السنۃ اور ما علیہ الجماعۃ کہتے ہیں۔ مصر کے مشہور محدث وفقیہ لیث بن سعد نے امام مالک کے نام جو خط لکھا ہے اس میں امام موصوف نے اس معیار کو واضح طور پر پیش فرمایا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

جب کوئی ایسا مسئلہ درپیش آتے جس پر مصر، شام، عراق میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم

کے صحابہؓ نے زمانہ ابوبکرؓ، عمرؓ، عثمانؓ و علیؓ میں عمل کیا ہو اور اسی پر تا آخر حیات رہے ہوں تو ہماری ایسے مسئلہ کے بارے میں رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو ہرگز اس کی اجازت نہ دی جائے گی کہ وہ اب کوئی ایسا کام کریں جو صحابہ اور تابعین میں ان کے اسلاف کے سراسر خلاف ہو۔

(اعلام الموقعین)

لیث بن سعد ہی نے یہ انکشاف کیا ہے کہ زریق بن حکم کہتے ہیں کہ میں عمر بن عبدالعزیزؒ کے زمانہ حکومت میں ان کا عامل تھا مجھے انہوں نے یہ دستاویز لکھ کر روانہ کی تھی کہ :

تم مدینے میں مقدماتِ دیوانی کا فیصلہ ایک گواہ اور قسم سے کرتے رہے ہو اور ہم بھی زمانہ عبدالملک میں ایسا ہی کرتے رہے ہیں، لیکن ہم نے صحابہ کرام کو اس کے خلاف پایا ہے لہٰذا تم کبھی ایسا نہ کرنا بلکہ ہمیشہ مردوں میں سے دو کی گواہی اور اگر دو مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتوں کی گواہی سے مقدمہ کا فیصلہ کرنا۔

حاصل یہ ہے کہ یہ حدیث مسلمہ اصولوں، معانی قرآن، سنت مشہورہ اور صحابہ کے عمل متوارث سے متصادم ہونے کی وجہ سے مقبول نہیں ہے۔

ہم نے بالارادہ حدیث کی تاریخی حیثیت سے بحث نہیں کی کیونکہ کسی حدیث پر اصطلاحی صحت کی خواہ کتنی مہریں ثبت ہو جائیں لیکن اگر وہ دین کے مسلمہ اصولوں، معانی قرآن، سنت مشہورہ اور صحابہ کے عمل متوارث سے متصادم ہو تو مقبول نہیں ہو سکتی۔

حافظ ابن القیم نے الطرق الحکمیہ میں عدالت میں فیصلہ کرنے کے جن طریقوں سے نفیس بحث کی ہے وہ بہت لطیف ہے۔ آپ نے اس سلسلہ میں ۲۵ سے زائد راہوں کی نشاندہی کی ہے لیکن اس میں کچھ باتیں انفرادی فکر کی ہیں، انفرادیت کے باوجود ان میں بھی علمی شان ہے۔

گواہوں کے لئے عدالت شرط ہے

۱۴۸۔ اور یہ گواہ ایسے لوگوں میں سے ہوں جن کو تم پسند کرتے ہو۔ اصل ارشاد ممن ترضون من الشھداء آیا ہے۔ تعبیر کا یہ مختصر سے مختصر پیمانہ اس قدر بلیغ ہے کہ اس کی عمیق معنویت پر غور کر کے بقول الجصاص ماننا پڑتا ہے کہ یہ کلام الٰہی ہے۔ یہ بات مخلوق کی بساط سے باہر ہے کہ اتنے مختصر سے پیمانے میں اتنے معانی، اتنے مطالب، اتنے احکام اور اتنے فوائد کی دولت

بے بہا ہو، اور پھر تعبیر بھی بالکل سادی ہے اور اس سادی سی تعبیر میں تین باتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ گواہ کے لئے ضروری ہے کہ عادل ہو، دوسرے یہ کہ گواہ کے لئے ضروری ہے کہ اس میں عقل و بصیرت کی کمی نہ ہو۔ پہلی تین شرطوں کے ساتھ اگر ان کو بھی ملا لیا جائے تو قرآن نے شہادت کی یہ شرطیں بتائی ہیں۔

اول یہ کہ بالغ ہو،

دوم یہ کہ مسلمان ہو،

سوم یہ کہ آزاد ہو،

چہارم یہ کہ عاقل ہو،

پنجم یہ کہ متہم نہ ہو،

ششم یہ کہ عادل ہو،

یہ مختصر فقرہ یعنی ممن ترضون من الشہداء ہمارے لئے اجتماعی اور سیاسی زندگی میں جو رہنما اصول بتا رہا ہے۔ ذرا ان پر غور فرمائیے اور دیکھئے کہ یہ بلیغ فقرہ کس انداز سے ہماری رہنمائی کر رہا ہے۔

اوّلاً معاشرے میں کسی کی دیانت، امانت اور عدالت جاننے کا ذریعہ ہمارے پاس صرف ظاہر ہے۔ اندر کا حال اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جاننے کا معاملہ یہ کہہ کر کہ جسے تم پسند کرتے ہو ہمارے سپرد کر دیا۔ اب یہ ہمارا کام ہے کہ ہم فیصلہ کریں کہ کون ہمیں پسند ہے اور کون پسند نہیں ہے۔ چونکہ پسند کرنا ہمارا کام ہے اس لئے پسند میں اختلاف ہو سکتا ہے نظر اپنی اپنی پسند اپنی اپنی۔ ایک شخص رشید کی نظر میں پسند ہے مگر وہی حمید کی نظر میں پسندیدہ نہیں ہے۔ لہٰذا پسند کا فیصلہ غالب ظن اور کثرت رائے سے ہوگا اور معلوم ہے کہ شہادت کا مدار صرف تین چیزوں پر ہے ایک یہ کہ شاہد عادل ہو، دوسرے یہ کہ مشکوک نہ ہو، تیسرے یہ کہ ہوشیار اور قوت حافظہ رکھتا ہو۔

عدالت کے لئے ضروری ہے کہ ایمان رکھتے ہوئے محرمات سے بچتا ہو، فرائض و واجبات کی پابندی کرتا ہو، گفتار کا سچا اور رہا تھ کا اچھا ہو۔ زندگی میں قذف کی بنا پر سزا یافتہ نہ ہو۔

مشکوک نہ ہونا یہ ہے کہ شاہد جس کی طرف سے گواہی دے رہا ہو اس کا والد یا اولاد نہ ہو اور دونوں میں ازدواجی تعلق نہ ہو۔ پہلے کسی عدالت میں اس کی شہادت کو رد نہ کیا گیا ہو۔ ان میں ہر بات ایسی ہے جس سے عام نگاہوں میں شاہد کی پوزیشن مشکوک ہو جاتی ہے۔

ہوشیار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ بیوقوف اور ناتجربہ کار نہ ہو کیونکہ ایسے شخص کو دھوکا دے

کہ شاہد بنایا جا سکتا ہے۔

گویا پسند کرنے کا مطلب یہ ہے کہ گواہ اپنی دینداری، غیر جانبداری اور فراست و بصیرت کی وجہ سے تمہارے معیار پر پورے اُترتے ہوں۔

چونکہ پسند کا معیار اجتہادی ہے اس لئے اس میں اختلاف ناگزیر ہے اور اختلاف ہوتا ہے بالخصوص دینداری کا فیصلہ اور عادل ہونے کا پیمانہ نہ صرف یہ کہ مختلف لوگوں میں مختلف رہا ہے بلکہ مختلف زمانوں اور مختلف مکانوں میں مختلف ہوتا ہے۔ الجزائری نے اس پر ایک مبسوط مقالہ سپردِ قلم فرمایا ہے اور حافظ ابنِ تیمیہ فرماتے ہیں کہ عدالت زمان و مکان کے اختلاف سے مختلف ہوتی رہتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ صاحبِ نظر کا فکر، اُس کا علم اور ذوق کے اختلاف کی وجہ سے ایک شخص کی عدالت اختلافی ہو گی۔ اور علوم و افکار چونکہ زمان و مکان کے اختلاف سے مختلف ہوتے رہتے ہیں اس لئے عدالت کا پیمانہ مختلف ہوتا رہے گا۔ الجصاص نے اس موضوع پر کافی مثالیں دی ہیں۔ آپ کی ضیافتِ طبع کے لئے چند مثالیں پیش کرتا ہوں۔

مشہور شریح قاضی کی عدالت میں ربیعہ نامی ایک مقدمہ میں گواہ کی حیثیت سے پیش ہوا شریح نے عدالت میں اسے ربیعہ کہہ کر بلایا وہ چپ رہا، دو بار ایسا ہی ہوا، اس کا عرف کویفر تھا۔ یہ کافر کی تصغیر ہے۔ شریح نے ربیعہ کو کویفر کہہ کر بلایا تو فوراً بول پڑا۔ شریح بولے میں نے تمہیں تمہارے نام سے بلایا تم نے جواب نہیں دیا کویفر کہنے پر بول پڑے۔ اس نے جواباً کہا قبلہ یہ میرا عرف ہے فرمایا جاؤ اور مدعی سے کہا گواہ اور لاؤ دیکھ لیجئے کہ کفر کے کردار پر نہیں اور کافرانہ گفتار پر نہیں بلکہ کویفر جیسے مکروہ نام کی وجہ سے شریح نے ربیعہ کو ناپسند کیا اور شہادت نہ لی۔

امام مسعر بن کرام کہتے ہیں کہ شریح قاضی کی عدالت میں ایک گواہ پیش ہوا، اُس نے تنگ آستینوں والی قمیص پہن رکھی تھی۔ آپ نے اس کی شہادت کو یہ کہہ کر رد کر دیا کہ یہ وضو کیسے کرتا ہو گا۔

ظاہر ہے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات فسق نہیں ہے اور نہ یہ کہ کسی کے عادل نہ ہونے کا کوئی قانونی سبب ہے لیکن اس کے باوجود شہادت اس لئے قبول نہیں کی گئی کہ قاضی کی نظر میں یہ بات ذرا سخافت اور دینی زندگی میں بے پروائی کی غماز ہونے کی وجہ سے ناپسندیدہ تھی اور قرآن نے پسند کو معیار بنایا تھا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ شاہد میں قبولِ شہادت کے لئے عدالت کا مسئلہ اجتہادی ہے۔

مسلمانوں میں اصل عدالت ہے

یہی وجہ ہے کہ عدالت کی تعریف میں علماء نے مختلف خیالات پیش کئے ہیں۔ یہاں یہ سوال بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اگر عدالت کے تعلق ہر شخص کی ظاہری زندگی سے ہے۔ جیسا کہ قاضی ابو یوسف نے عدالت کی تعریف فرمائی ہے کہ عدالت یہ ہے کہ صاحبِ ایمان ان فواحش سے بچ کر رہے جن کے ارتکاب پر اسلامی قانون سزا دیتا ہے، فرائض کی بجا آوری کرے اور اخلاقِ حسنہ کی دولت اس میں چھوٹے گناہوں کے مقابلے میں زیادہ ہو تو وہ عادل ہے اس کی شہادت قبول کی جائے گی۔ تو کیا ایسا شخص جس کی ظاہری زندگی مشکوک نہ ہو اور اس میں کوئی داغ محسوس و مرئی نہ ہو اور وہ عدالت میں گواہی دینے کے لئے پیش ہو تو عدالت کو یہ حق پہنچتا ہے کہ وہ ظاہری حال کو نظر انداز کر کے اس کے احوالِ باطنی کی تحقیق و تفتیش کرے۔

فاروق اعظم نے جو دستورِ قضا حضرت ابو موسیٰ اشعری کو لکھ کر روانہ کیا تھا اس میں یہ بات کھول کر بتا دی تھی کہ:۔

مسلمان سب باہم عادل ہیں ہاں وہ شخص جسے اخلاقی جرم کی پاداش میں سزا مل چکی ہو یا جس پر جھوٹی شہادت کا تجربہ ہو چکا ہو یا تعلقات اور رشتہ نوازی کی وجہ سے لوگوں کی نگاہوں میں مشکوک ہو۔

ابراہیم نخعی سے کہا گیا کہ مسلمانوں میں عادل کون ہے فرمایا جس کی زندگی داغ دار نہ ہو۔ حسن بصری اور امام شعبی کی بھی یہی رائے ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے امام ابو حنیفہ کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ:

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ حاکم کا کام یہ ہے کہ کسی شخص کے عادل ہونے کے باب میں صرف ظاہری حالت کو دیکھے، اس کے بارے میں تحقیق و تفتیش حاکم کے فرائض میں نہیں ہے۔ ہاں اگر عدالت پر مخالف جرح کرے اور شاہد کی پوزیشن کو مشکوک بتلائے تو پھر عدالت اس کی تحقیق کرے۔

اس کے برعکس دوسرے علماء کا فیصلہ اس کے خلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ حاکم کو شاہد کے احوال کا خفیہ اور علانیہ پتہ لینا چاہیے چاہے مقدمہ کا کوئی فریق جرح کرے یا نہ کرے۔ یہ امام شافعی اور امام احمد کا مذہب ہے اور یہی امام ابو یوسف اور امام محمد کی رائے ہے۔ امام مالک فرماتے ہیں

کہ اگر عدالت میں مشہور شخصیت ہو تو پھر تو حاکم کو کوئی جستجو نہ کرنی چاہیے لیکن شک کے مواقع پر پوچھ گچھ کرنی چاہیے۔ خود احناف کے یہاں بھی فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔

عدالت کے موضوع پر اختلاف کا منشا

دراصل امام ابوحنیفہ اور ان ائمہ کے درمیان اس موضوع پر اختلاف حجت دبرہان کا اختلاف نہیں بلکہ عصر و زماں کا اختلاف اس کا اصلی باعث ہے۔ امام اعظم نے جس دور میں زندگی گزاری ہے وہ زمانہ صلاح و تقویٰ ہے۔ وہاں زندگی کے مختلف گوشوں میں خیر ہی خیر۔ عوامی زندگی میں فسق خال خال اور عدل و تقویٰ عام ہے۔ بعد کو آنے والے لوگوں نے جس ماحول کو دیکھا ہے وہ امام اعظم نے نہیں دیکھا ہے۔ الجصاص رقمطراز ہیں کہ اگر امام اعظم کے مشاہدے میں ان بزرگوں کے زمانے کے حالات آتے تو امام اعظم کا بھی وہی فیصلہ ہوتا جو ان بزرگوں نے بعد میں کیا۔ لیکن قاضی ثناء اللہ نے یہاں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ ہمارے زمانے میں اگر کتابوں میں لکھی ہوئی اور ان بزرگوں کی بتائی ہوئی عدالت کے مطابق معاشرے میں چراغ لے کر عادل تلاش کیا جائے تو کوئی بھی اس پیمانے پر پورا نہ اترے گا اور اس کے نتیجے میں سارا عدالتی کاروبار درہم برہم ہو کر رہ جائے گا اور انسانی حقوق پامال ہو جائیں گے۔ اس لئے والفتوی فی زماننا علی قول ابی حنیفہ۔ یعنی ہمارے زمانے میں تو فتویٰ امام اعظم ہی کے ارشاد پر دینا چاہیے۔

امّت کو اجتہاد کی اجازت

ثانیاً، اس فقرے نے یہ بات بھی کھول دی ہے کہ جب شہادت دینے والوں کے بارے میں عدالت اور صلاحیت اجتہادی ہے تو جن احوال و ظروف میں قرآن و سنّت نے قانونی وضاحت پیش نہیں کی ہے ان میں اس آیت کے ذریعے قرآن اپنے مخاطبوں کو ایسے تمام حوادث میں اجتہاد کرنے کا پروانہ دے رہا ہے۔ الشہرستانی رقمطراز ہے۔

> عبادات و معاملات میں حوادث و وقائع بے شمار ہیں اور ہم یہ بات بخوبی جانتے ہیں کہ ہر حادثہ اور واقعہ کے بارے میں نص موجود نہیں اور اس کا تصوّر بھی نہیں ہو سکتا۔ جب نصوص و قوانین گنے چنے ہیں اور واقعات و حوادث ان گنت ہیں تو اجتہاد زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے۔

بلاشبہ اسلامی نظام میں قانون کا ماخذ رائے عام یا کسی خاص طبقہ اور جماعت کے اغراض و مفادات نہیں ہیں اس لئے اس نظام میں قوانین کی بابت مختلف اغراض رکھنے والے طبقوں یا مختلف تصورات رکھنے والی جماعتوں کے مابین کشمکش نہیں پیدا ہو سکتی کیونکہ قانون کا مآخذ تمام تر قرآن و سنت ہے۔ جب کسی معاملہ میں قرآن و سنت کی صاف و صریح ہدایت موجود ہو تو یہ قطعاً ناجائز ہے کہ اس ہدایت کو چھوڑ کر کوئی اپنی عقل و فہم کی رہنمائی قبول کرے لیکن اس کے ساتھ قرآن نے اصولِ اجتہاد کی مناسب رعایت بھی ملحوظ رکھی ہے اور انسان کو موقعہ دیا ہے کہ وہ متذکرہ بالا حدود سے باہر اپنی عقل و فہم کو کام میں لائے جہاں کسی صورتِ حال کی نسبت نبوّت کا علم و عمل دونوں خاموش ہوں وہاں اسلامی معاشرے کے ان افراد کو عقل و استدلال کا حق عطا کیا گیا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم و فضل کی وسعت کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ فکر و اجتہاد کی یہ آزادی غیر مشروط اور بے قید نہیں ہے بلکہ کچھ قیود اور تحدیدات رکھتی ہے، کیونکہ اگر بنیادی امور و مسائل اور اساسی اصولوں کو طے کرنے کے بعد انسانی عقل کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا تو اندیشہ یہ تھا کہ ضمنی قوانین اور تفصیلی ضوابط کا رشتہ اس اساس و بنیاد سے منقطع ہو جاتا جس پر یہ قوانین مبنی ہیں یہی وجہ ہے کہ ضمنی قوانین کی ترتیب اور اصولوں کے عملی انطباق میں اجتہاد اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس میں اصل کی سپرٹ ہاتھ سے نہ جانے پائے یعنی ایسا اجتہاد جو اسلام کی روح اور قرآن و سنت کے بنیادی اصول و احکامات سے منحرف ہو جائز نہیں ہے اسی غرض سے یہ قید لگا دی گئی ہے کہ اجتہاد صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے علم و اطلاع اپنی اصابت رائے اور فکری صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کے اہل ہوں۔ قرآن و سنت پر ایمان راسخ اور یقین کامل رکھتے ہوں اور متقی و متبع شریعت ہوں۔

فکر و اجتہاد کی آزادی نے اسلامی نظام میں بالعموم تین صورتیں اختیار کی ہیں جنہیں علی الترتیب اجماع، قیاس اور استحسان کہتے ہیں یہ درحقیقت فکری اجتہاد کے تین بڑے اصول ہیں جنہیں اسلامی فکر کی ترقی پذیر مطالبات کو پورا کرنے کے لئے ترتیب دیا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ بشرطِ حیات پارہ پنجم میں آ رہی ہے۔

ثالثاً: ترضون من الشہداء نے اس سوال کا جواب بھی خود دے دیا کہ جب حاکم کو شہادت پر مقدمہ فیصلہ کرنے کی اجازت ہے حالانکہ وہ خبر ہونے کی حیثیت میں یقین و اذعان کے لئے مفید نہیں بلکہ زیادہ سے زیادہ غلبہ ظن کا فائدہ دیتی ہے تو پھر تمام دینی امور میں صحابہ اور راویوں کے ذریعے سے آئے ہوئے ارشاداتِ نبوّت بھی موجب للعمل ہیں۔ یہ کہنا از روئے قرآن

درست نہیں ہے کہ خبر میں چونکہ علم ویقین کی طاقت نہیں ہوتی اس لئے اس پر عمل کرنا درست نہیں ہے۔
بہرحال قرآنی آیات کا ہر فقرہ معانی و مطالب کے لحاظ سے 'دریا بحباب اندر' ہے۔ الجصاص نے اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جسے تم پسند کرتے ہو میں وہ سب کچھ داخل ہے جو ایک شخص کے ایمان یقین سے لیکر استقامت سیرت اصابت، اچھی شہرت، دیانتداری اور امانت پسندی، خانگی زندگی سب کو محیط ہے۔

اثبات اور اظہارِ شہادت

۸۴۲۔ گواہوں کو جب بلایا جائے تو انکار نہ کریں۔ یعنی گواہ کو جس وقت گواہ بنانے کے لئے یا اداءِ شہادت کے لئے بلائیں تو اس کو کنارہ یا انکار نہ کرنا چاہیے[1]۔ اس کے دو مطلب بیان کئے گئے ہیں ایک یہ کہ گواہ بننے کے لئے بلاتے جائیں، دوسرا یہ کہ گواہی دینے کے لئے بلائے جائیں۔ ہم نے ترجمہ میں دوسری صورت اختیار کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ صورتیں دو ہیں ایک یہ کہ دستاویز تیار ہو رہی ہے معاملہ درپیش ہے۔ پیش یا افتادہ معاملہ میں شہادت کی ضرورت ہے۔ قرآن بتا رہا ہے کہ جب شہادت بنانے کی ضرورت ہو تو شاہد بننے سے انکار نہ کرنا چاہیے۔ اس موضوع پر علماء کے درمیان اس پر اتفاق ہے کہ شاہد بننے والے کی ذمہ داری اور فرائض میں یہ بات داخل نہیں ہے کہ وہ خود چل کر اہلِ معاملہ کے پاس آئے بلکہ یہ اہلِ معاملہ کی ذمہ داری ہے کہ شاہد کے پاس چل کر آئیں اور اس سے شاہد بننے کی درخواست کریں اور درخواست کے وقت شاہد کی اخلاقی ذمہ داریوں میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ان کی درخواست کو قبول کرے اور شاہد بن جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ شاہد بن جانے کے بعد شاہد کو شہادت کی ادائیگی کے لئے عدالت میں بلایا جائے تو اب یہ شاہد کی قانونی ذمہ داری ہے کہ وہ حاکم کے پاس عدالت میں حاضر ہو اور اس کو دعوت پر انکار کی گنجائش نہیں ہے۔ آیت میں بیک وقت دونوں مطالب کی گنجائش ہے پہلا مطلب قتادہ اور ربیع ابن انس نے بیان کیا ہے اور دوسرا مطلب سعید بن جبیر، عطاء، مجاہد اور امام شعبی نے بتایا ہے۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ دونوں ہی ارشادِ ربانی کا مدلول ہیں۔ الجصاص نے بھی لکھا ہے **الظاهر انه عليهما جميعاً بعموم اللفظ** آیت کے عام الفاظ میں دونوں کی گنجائش ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ دوسرا مطلب

[1] افاداتِ شیخ الہند

منطوقِ قرآنی ہے اور پہلا اس کا مدلول ہے تو زیادہ مناسب ہے اور چونکہ ادائے شہادت شاہد کی قانونی ذمہ داری ہے اس لئے علماء نے شہادت پر اجرت لینے کو حرام لکھا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ شاہد کو اجرت کا لینا اور شھودا کو دینا دونوں حرام ہیں اگر شاہد نے اجرت لے لی تو عدالت اس کی شہادت کو مردود کر سکتی ہے بلکہ اجرت تو درکنار یہاں تک لکھا ہے کہ اگر گواہوں کیلئے کھانا تیار کیا اور انہوں نے کھا لیا تو امام ابو حنیفہ اور امام محمد کے نزدیک ان گواہوں کی شہادت قبول نہ کی جائے گی۔ اگرچہ قاضی ابو یوسف اسمیں کوئی مضائقہ نہیں سمجھتے اور شیخ ابن الہمام نے آنیوالے کے اکرام کی بنیاد پر اسی کو اوجہ قرار دیا ہے۔

کتابت کی افادی حیثیت

۸۴۳۔ معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا میعاد کی تعیین کے ساتھ اس کے قلم بند کرنے میں کوتاہی اور سستی نہ کرو۔ اللہ کے نزدیک اس میں تمہارے لئے انصاف کی بات ہے اور شہادت قائم ہونے کے لئے زیادہ پائیداری ہے اور شک و شبہ نہ ہونے کا کم سے کم امکان ہے۔ یہاں اولاً لکھنے کی تاکید فرمائی، ثانیاً لکھنے کے فوائد اور مصالح بتائے۔ تاکید کی حد تک فرمایا کہ ہر معاملہ جس میں قیمت کی تاجیل ہو یا چیز کی تاجیل ہو چھوٹا ہو یا بڑا ہو اس کے لکھنے میں کسی قسم کی کاہلی اور سستی نہ کرنی چاہیے۔ گویا بتایا ہے کہ جن معاملات میں لکھنے کا عرف ہو خواہ وہ معمولی ہوں یا غیر معمولی ان کو لکھ لینا ہی بہتر ہے۔ یہ اسلام کی اقتصادیات کا ایک اہم اور بنیادی قاعدہ ارشاد ہوا ہے۔ معاملاتی فساد افراد کے اخلاقی اور روحانی ارتقا میں رکاوٹ بن سکتا ہے۔ اس صورت میں فرد کی اخلاقی ترقی کے مواقع کم ہو جاتے ہیں بعض روحانی مفاسد کے پیدا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ عام افراد کے اخلاقی اور روحانی صلاح کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ انسانی حقوق میں بے پروائی سے ان کا دامن محفوظ ہو اور باہمی معاملاتی بگاڑ کا شکار نہ ہوں۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں معاشی اور اقتصادی طاقت کا انحصار افراد کے ہاتھوں میں ہو اس طرح کی اصلاحی تدابیر بہت زیادہ مؤثر ہوتی ہیں اور اس کے نتیجہ میں روحانی ترقی کا مدار افراد کی روحانی ترقی سے وابستہ ہے اور افراد کی روحانی و اخلاقی برتری کا سارا دارومدار ان کے معاملاتی احوال کی درستگی پر ہے اس لئے قرآن خاص طور پر یہاں معاملات میں کتابت کے فوائد اور مصالح کو زیر بحث لایا ہے۔ قرآن نے کتابت کے تین فوائد بتلائے ہیں۔

اولاً، اقسط عند اللہ اللہ کے نزدیک یہ زیادہ انصاف والی بات ہے یعنی ایک کا حق دوسرے کے پاس نہ جلئے گا اور نہ رہے گا۔ اس طرح حقوق العباد کا معاملہ صاف رہے گا۔

گویا کتابت کی راہ سے معاملات میں عدل و انصاف کو پروان چڑھنے کا موقعہ ملے گا۔

ثانیاً، اقوم للشہادہ گواہی زیادہ مستحکم اور پائدار ہوگی یعنی گواہوں کو آسانی رہے گی اور کتابت گواہوں کی معین و مددگار ہوگی اور گواہ بوقت شہادت لکھی ہوئی دستاویز دیکھ کر صحیح صورتحال یاد کر سکے گا۔

ثالثاً، ادنیٰ ان لا ترتابوا شک و شبہ نہ ہونے کا اس طرح کم سے کم امکان رہے گا گویا اہل معاملہ کا جی صاف رہے گا طبیعت کو راحت رہے گی دوسرے سے قلب میں کدورت نہ ہوگی۔

کتابت کے بارے میں پہلے سستی اور کاہلی سے بچنے کا حکم دینا اور پھر اس کے فوائد اور مصالح بتلانے اس بات کا قرینہ ہے کہ قرآن کے نزدیک مسلمانوں کی یہ بہت بڑی اخلاقی ذمہ داری ہے کہ وہ کتابت کرے۔ اخلاقی ذمہ داری کو ہمارے فقہا کی زبان میں استحباب کہتے ہیں یعنی ایسا کرنا اللہ سبحانہ کو پسند ہے۔ قانونی اور اخلاقی ہدایات کی یہ تقسیم انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ انسانی زندگی کو پوری طرح قانون کے شکنجہ میں کس دینا نہ تو مناسب اور مفید ہے نہ ممکن العمل۔ اسی طرح ہر ہدایت کو اختیاری اور اخلاقی ذمہ داری کا درجہ دے دینا انسان کو ہلاکت کے غار میں دھکیل دینے کے مترادف ہے۔ ناسمجھ افراد اور کمزور قوت ارادی کے مالک افراد کو ہلاکت کے منہ میں جانے اور رہے جانے کا اختیار دینا یا پورے سماج کو چند شر پسندوں کے مقابلے میں بے بس کر دینا کسی طرح معقول نہیں ہو سکتا۔

شریعت کی بعض ہدایات ایسی ہیں جن کو عام حالات میں اخلاقی ذمہ داری کا درجہ دیا گیا ہے اور ترغیب و تلقین کے ذریعہ افراد کو ان کی تعمیل پر آمادہ کرنا کافی سمجھا گیا لیکن حالات بدلتے رہتے ہیں اور ان تبدیلیوں کے ساتھ ان احکام کی تعمیل کی اہمیت بھی کم زیادہ ہوتی رہتی ہے اس لئے بعض اخلاقی ہدایات کو مخصوص حالات رونما ہونے پر قانون کے ذریعے بھی نافذ کیا جا سکتا ہے۔

ایک قانونی نکتہ خط کی بنا پر فیصلہ

شروع رکوع سے یہاں تک قرآن نے کتابت کے لئے جو انداز تعبیر اختیار کیا ہے وہ بیحد موکد ہے اور کتابت کے حکم کو بہت زیادہ شدید تاکیدات کے ساتھ پیش کیا ہے آغاز ہی میں اکتبوا کی تعبیر آئی۔ پھر کاتب کو کتابت میں انصاف برتنے کی تلقین ہے۔ پھر کتابت کو تعلیم الٰہی قرار دے کر کاتب کو انکار سے روکا گیا ہے۔ بعد ازیں معاملہ کنندگان کو املا کرانے کا حکم دیا ہے۔ اگر مدیون ناتواں اور بے خبر ہو یا املا کرانے کی استطاعت نہ رکھتا ہو تو مدیون کے ولی کو املا کی خدمت سپرد کی گئی ہے۔

اس پر بھی بس نہیں کتابت کی اہمیت کے پیش نظر چھوٹے بڑے معاملہ میں کتابت میں تساہل کرنے سے منع کیا اور کتابت کے سرگونہ فوائد اور اس کی حکمتیں اور مصلحتیں بتائی ہیں۔ ان تصریحات کی موجودگی میں یہ کہنا کہ مکتوب دستاویز کوئی وثیقہ نہیں ہے اور اس کی علت یہ بیان کرنا کہ چونکہ خط خط میں ہم آہنگی ممکن ہے اور اس طرح دستاویز بنائی جا سکتی ہے بہت حیرت انگیز ہے۔ سوچا جائے کہ اگر دستاویز وثیقہ اور بیّنہ نہیں کیونکہ وہ بناوٹی ہو سکتی ہے تو کیا اسی علت کے پیش نظر شہادت پر اعتماد درست ہے۔ جیسے دستاویز میں تزدیر وہ افتعال کا امکان ہے ایسے ہی شہادت میں بھی اس کا امکان ہے بلکہ اس سے زیادہ امکان ہے۔ خدا کا شکر ہے کہ ہمارے کچھ فقہا کی نظر اس نکتہ پر پہنچ گئی۔ مشہور تو یہی ہے کہ لا یعمل بالخط یعنی لکھی ہوئی دستاویز پر اعتماد نہ کیا جائے اور عدالت اس کی مدد سے فیصلہ نہ کرے۔ لیکن اوّلاً امام محمد نے راوی قاضی اور گواہ کے لئے اجازت دی اور بعد کو آنے والوں نے اسی کو وبہ یفتی کہہ کر پیش کیا۔ بعد ازیں علامہ شامی نے معاملات اور کاروباری زندگی میں یہ کہہ کر کہ

ما یکتب الناس فیما بینهم یجب ان یکون حجة للعرف

دستاویز کو عرف کی بناء پر حجیت و بیّنہ قرار دیا۔ یعنی بتا دیا کہ دستاویز کے ذریعے مقدمات کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ اس کے علاوہ متاخرین احناف میں سے ابو سعود عمادی وغیرہ بھی دعوے کے اثبات میں تحریر اور خط کو قبول کرنے کا فتویٰ دے چکے ہیں اور ظاہر ہے کہ اگر انشاء عقد میں الکتاب کالخطاب کا قاعدہ درست ہے تو وقوع عقد میں خط اور دستاویز کیوں معتبر نہیں ہے۔ علامہ شامی نے فتاویٰ سے نقل کیا ہے کہ اگر کسی نے بطور دستاویز لکھ دیا تو اس پر مال پڑ گیا۔

اس موقع پر انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کا اعتراف کریں کہ حافظ ابن تیمیہ نے مذہب امام احمد پر اپنی رائے کی بنیاد رکھتے ہوئے خط کے قانونی حجت ہونے پر اچھی بحث کی ہے وہ فرماتے ہیں:

> خط کو بطور ثبوت کے تسلیم کرنا جمہور سلف کے اقوال سے ثابت ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے کسی حق کے ثبوت میں اپنے باپ کی تحریر پیش کرتا ہے اور اس کے نزدیک وہ تحریر درست ہے تو جائز ہے کہ وہ اس کی بناء پر دعویٰ کرے۔ اس بنا پر اگر گواہ مر چکا ہو تو اس کی تحریر کی بنا پر عدالت فیصلہ کر دے گی۔ امام احمد اور امام مالک کا مذہب یہی ہے۔ (مختصر الفتاویٰ ص ۶۰۱)

حافظ ابن القیم نے الطرق الحکمیہ میں اس پر مبسوط بحث کی ہے۔

کتابت کے موضوع کو قرآن کا آمیوں کے سامنے اتنا اہم بنا کر پیش کرنا اور اہل ایمان کو اس

کی اتنی تاکید کرنا اس بات کی دلیل ہے کہ اثباتِ دعویٰ کا سب سے اہم طریقہ تحریر ہی ہے۔

روزمرّہ کے نقد کاروبار میں کتابت کا حکم

۸۴۴ - ہاں جو تجارتی لین دین دست بدست کرتے ہو اس کو نہ لکھا جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن لین دین کرتے وقت گواہ بنا لیا کرو۔ یعنی اگر سوداگری کا معاملہ دست بدست ہو جنس کے بدلے یا نقد کی طرح معاملہ ہو مگر ادھار کا قصہ نہ ہو تو اب نہ لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے مگر گواہ بنا لینا اس وقت بھی چاہیے کہ اس معاملہ کے متعلق کوئی نزاع آئندہ پیش آئے تو کام آئے۔[۱] اور اس لئے کہ شاید کل کوئی بات نکل آئے مثلاً بائع کہنے لگے کہ مجھے دام ہی وصول نہیں ہوئے یا یہ چیز میں نے فروخت ہی نہیں کی یا خریدار کہنے لگے کہ میں نے تو واپسی کا اختیار لے لیا تھا یا ابھی تو چیز ہی پوری مجھے نہیں ملی۔[۲] مطلب یہ ہے کہ اگرچہ روزمرّہ کی خرید و فروخت میں بھی تحریر ہونا بہتر ہے۔ جیسا کہ آج کل کیش میمو کا رواج ہے۔ لیکن اگر نہ کیا جائے تو کوئی حرج نہیں ہے۔ اسی طرح ہمسایہ تاجر ایک دوسرے سے رات دن جو لین دین کرتے رہتے ہیں اس کو بھی اگر تحریر میں نہ لایا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔[۳] اس کی وجہ یہ ہے کہ دست گرداں معاملات کثرت سے برابر واقع ہوتے رہتے ہیں اور عموماً مقداریں بھی ان کی خفیف ہوتی ہیں اور عموماً ان میں نزاع اور اختلاف بھی کم ہی ہوتا ہے۔ فقہا نے لکھا ہے کہ ایسے مواقع پر کتابت دستاویز کے التزام میں حرج لازم آتا تھا اس لئے شریعت نے التزام اخلاقی کو یہاں سے ہٹا دیا لیکن اگر کوئی معاملہ ایسا ہو کہ صورت کے اعتبار سے تو بظاہر دست بدست ہو لیکن مالیت زیادہ ہو یا آئندہ اختلاف کا احتمال ہو یا کسی اور اعتبار سے وہاں حالات وہ نہ ہوں جو عموماً تجارتِ حاضرہ یا معاملہ دست گرداں میں ہوا کرتے ہیں تو ایسے مواقع پر ترک کتابت کی علت مفقود ہوگی اور کتابت کا اہتمام مطلوب ہوگا۔[۴]

نقصان پہنچانے کی ابتداء اور جواب کی اجازت نہیں ہے

۸۴۵ - کاتب اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے اور اگر ایسا کرو گے تو یہ بدکاری ہے۔ یعنی لکھنے والا اور گواہ نقصان نہ کرے یعنی مدعی اور مدعا علیہ میں سے کسی کو بھی نقصان نہ دے بلکہ جو حق

---

[۱] افاداتِ شیخ الہند [۲] بیان القرآن [۳] تفہیم القرآن [۴] ماجدی

واجبی ہو وہ ادا کریں[1] اصل ارشاد میں لا یضار آیا ہے۔ یہ ضرر سے باب مفاعلت ہے۔ اس میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ یہ فعل مجہول ہے اور معنے یہ ہیں کہ کاتب اور گواہ کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔ اُردو تراجم میں پہلے معنیٰ کو حضرت شیخ الہند نے اپنایا ہے جبکہ دوسرے معنے کو مولانا اشرف علی، مولانا آزاد اور مولانا مودودی نے اختیار کیا ہے اور معنے فاعلی کو حضرت عمر اور عبداللہ ابن عباس نے اور معنے مفعولی کو عبداللہ بن مسعود نے اپنایا ہے۔ معنے فاعلی کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ کاتب اور گواہ کو ہدایت دی جا رہی ہے کہ خریدار اور فروخت کرنے والے میں کسی کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں ہے۔ نقصان پہنچانا یہ ہے کہ دستاویز میں جو کچھ لکھا جا رہا ہے اس میں تغیر و تبدل کر دے قیمت کم زیادہ لکھ دے یا چیز کی تعداد یا وزن کم زیادہ کر دے۔ اور معنے مفعولی کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ خریدار اور فروخت کنندہ دونوں میں سے کسی کو کاتب اور گواہ کو نقصان پہنچانے کی اجازت نہیں ہے۔ کاتب اور گواہ کو نقصان پہنچانا یہ ہے کہ اپنی مصلحت اور فائدے کے لئے ان کی مصلحت اور فائدے میں خلل انداز ہو اور اُن کو اپنے مشاغل سے ہٹا کر کتابت اور شہادت کا مطالبہ کرے۔ اگر وہ معذرت کریں تو ان پر یہ آواز کسے کہ تم اللہ کے حکم کو نہیں مانتے یا یہ کہ اگر کاتب اجرت مانگے یا گواہ کو آمد و رفت کے لئے خرچ کی ضرورت ہو تو اُن کو مفت کام کرنے پر مجبور کرنا یہ بھی ضرر پہنچانے میں داخل ہے اور حرام ہے۔[2]

بہر حال آیت کا کوئی مفہوم ہو خواہ صورت فاعلی کا یا صورت مفعولی یعنی پہلا یا دوسرا اس میں ایک اصولی قانون کی نشاندہی کی گئی ہے کہ معاملات اور کاروباری زندگی میں کوئی فرد اپنے اختیارات کو اس طرح استعمال نہ کرے کہ اس سے دوسرے افراد کو نقصان پہنچے خواہ یہ نقصان کاتب اور شاہد کی جانب سے بائع اور مشتری کو ہو اور چاہے بائع اور مشتری کی جانب سے کاتب اور شاہد کو ہو، مجہول کے صیغے میں اس طرف اشارہ ہے کہ صرف دانستہ نقصان پہنچانا ہی منع نہیں ہے بلکہ اگر خود مضرت رسانی کا ارادہ بھی نہ رکھتا ہو تو ایسے اقدامات سے بچ کر رہنا چاہیے جس کے نتیجہ میں کسی کو نقصان پہنچتا ہو۔

قرآن و سنت میں ضرر کے ازالہ کو بہت اہمیت دی گئی ہے اور مختلف معاملات کا ذکر کرتے ہوئے مضرت رسانی سے اجتناب کی تاکید کی گئی ہے۔ قرآن میں دوسرے پارے میں پڑھ چکے ہو لا

تضار والدة بولدها ولا مولود له بولده[3]

ترمذی میں بحوالہ ابوبکر الصدیق ارشادِ نبوت ہے کہ:

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] بیان القرآن [3] ماں کو بچہ کی وجہ سے اور ایسے ہی باپ کو نقصان نہ پہنچایا جائے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو کسی مومن کو نقصان پہنچائے یا اس کو فریب دے اس پر اللہ کی لعنت ہے۔

ایک دوسرا ارشاد بھی ترمذی میں ہے:

جو کسی کو نقصان پہنچائے اللہ اس کو نقصان پہنچائے گا اور جو کسی کو تکلیف دے گا اللہ اس کو تکلیف دے گا۔

ابن ماجہ میں عبادہ ابن الصامت کے حوالہ سے ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فیصلہ فرمایا کہ ضرر رسانی جائز نہیں ہے نہ ابتداءً اور نہ جواباً،

امام مالک نے موطا میں اور دارقطنی نے سنن میں بھی لاضرر ولاضرار کے الفاظ ارشاد کے طور پر پیش کئے ہیں۔ یہ اسلامی قانون کا ایک بنیادی قاعدہ ہے اس سے فقہا نے بہت سے انتظامی، اصلاحی قوانین نکالے ہیں۔ یہاں ان قوانین پر تفصیلی بحث کی گنجائش نہیں ہے کیونکہ تفسیر میں ہمارا مقصد تفصیلی ضوابط کا مطالعہ نہیں بلکہ اصولوں کی تعیین ہے۔ تفصیلی ضوابط وقت اور حالات کے اعتبار سے بدلتے رہتے ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ ایسا کرنا فسوق ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ایسا کیا تو یہ تمہاری طرف سے ایسے فسق کا ارتکاب ہوگا جو ہمارے ساتھ چپک کر رہ جائے گا اس سے پیچھا چھڑانا مشکل ہو جائے گا اور یہ تمہارے شانِ ایمان کے بالکل خلاف ہے کہ تم ایسا قدم اٹھاؤ۔

تقویٰ اور تعلیم کا باہمی ربط

۸۴۶ ۔ اور اللہ سے ڈرو اور اللہ تم کو تعلیم دے رہا ہے اور اللہ ہر چیز کو جاننے والا ہے

یعنی ہر وقت تمہیں چوکنا رہنا چاہیے اور زندگی محتاط ہو کر گزارنی چاہیے کہ کہیں اطاعت سے نکلنے پر پکڑ نہ ہو جائے اور تم ان فاسقوں کے زمرے میں شامل نہ ہو جاؤ جن کا ذکر پہلے سن چکے ہو۔

الذین ینقضون عهد الله من بعد میثاقه ویقطعون ما امر الله به ان یوصل ویفسدون فی الارض اولٰئك هم الخاسرون۔

فاسق کون ہیں؟ فاسق وہ ہیں جو احکام الٰہی کی طاعت کا عہد کر کے پھر اسے توڑ ڈالتے ہیں اور جن رشتوں کو خدا نے جوڑنے کا حکم دیا ہے ان کو کاٹتے ہیں بیباک ہیں اور اپنی

سرکشیوں اور بدعملیوں سے ملک میں فساد برپا کرتے ہیں یہی لوگ خسارے والے ہیں۔
اور تم اللہ کی طاعت سے کیسے باہر ہو سکتے ہو جبکہ اللہ تم کو زندگی کے لئے دین و دنیا کی مصالح پر مبنی قوانین سکھا رہا ہے لہٰذا تمہاری زندگی میں طاعت کی سرشاریوں کے سوا کچھ نہ ہونا چاہیے۔ اگر کسی حکم کی مصلحت تمہاری سمجھ میں نہ آئے تو تمہیں یقین کر لینا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز سے واقف ہے۔ جو حکم دے اس کی طاعت کرو خواہ تمہاری سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

آیت میں تین بار لفظ اللہ کمالِ تذکیر اور قوّتِ تاثیر کی خاطر لائے ہیں۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ تینوں جملوں میں لفظ کا تکرار تینوں فقروں کی استقلالی حیثیت بتانے کے لئے ہے پہلے جملے کے ذریعے متقیانہ سیرت پیدا کرنے کی ترغیب دی ہے دوسرا فقرہ نعمت کی یاد دہانی کے لئے ہے اور تیسرا جملہ اللہ سبحانہٗ کی عظمتِ شان کے لئے آیا ہے۔

کیا علم نتیجہ تقویٰ ہے

بعض اہل علم نے یعلمکم اللّٰہ کو فقرہ سابق واتقوا اللّٰہ سے بالکل مربوط پاکر یہ استنباط کیا ہے کہ علم حقیقی عین نتیجہ ہوتا ہے۔ تقویٰ الٰہی کا تقویٰ اختیار کرو اور از خود علم الٰہی مرحمت ہونے لگے گا[1] خواہ یہ استنباط کتنا ہی لطیف ہو لیکن خود عبارتِ قرآنی اس کا ساتھ نہیں دیتی اگر تعبیری پیمانہ قرآنی میں اس طرح ہوتا کہ:

اتقوا اللّٰہ یعلمکم یا اتقوا اللّٰہ فیعلمکم اللّٰہ یا اتقوا اللّٰہ یعلمکم اللّٰہ

تو شاید اس نکتہ آفرینی کی گنجائش ہوتی۔ قرآن نے جو تعبیر اختیار کی ہے وہ واو عطف کے ذریعے واتقوا اللّٰہ ویعلمکم اللّٰہ آیا ہے اور عطف مغایرۃ چاہتا ہے یعنی فقرے دو ہیں اور دونوں الگ ہیں سیبویہ اور دوسرے نحوی اسے پسندیدہ نگاہوں سے نہیں دیکھتے کیونکہ عطف کی یہ تعبیر نہ خبر بننے کی اجازت دیتی ہے اور نہ جزا، اور پھر اس بنیاد پر ترتیب الٹ جاتی ہے۔ مسبب کو سبب فرع کو اصل اور نتیجہ کو مقدمہ قرار دینا پڑے گا۔ عقلی بات یہی ہے کہ علم کا نتیجہ تقویٰ ہوتا ہے۔ علم امام اور تقویٰ ماموم ہے۔ علم قائد اور تقویٰ تابع ہے، علم درخت اور تقویٰ اسی درخت کا پھل ہے۔ علم لدنی یا علم الٰہی کا انکار نہیں یہ اپنی جگہ پر ہے لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ اس تقویٰ

---

[1] ماجدی

ہے بلکہ ایسی صورت چونکہ سفر ہی میں زیادہ تر پیش آسکتی ہے اس لئے خاص طور پر اس کا ذکر کر دیا گیا ہے۔ نیز معاملہ رہن کے لئے یہ شرط بھی نہیں ہے کہ جب دستاویز لکھنا ممکن نہ ہو صرف اسی صورت میں رہن کا معاملہ کیا جائے۔ اس کے علاوہ یہ بھی ایک صورت ممکن ہے کہ جب دستاویز لکھنے پر کوئی قرض دینے پر آمادہ نہ ہو تو قرض کا طالب اپنی کوئی چیز رہن رکھ کر روپیہ لے لیکن قرآن حکیم چونکہ اپنے پیروؤں کو فیاضی کی تعلیم دینا چاہتا ہے اور یہ بات بلند اخلاق سے فروتر ہے کہ ایک شخص مال رکھتا ہو اور وہ ایک ضرورت مند آدمی کو اس کی کوئی چیز رہن رکھے بغیر قرض نہ دے اس لئے قرآن نے قصداً اس کا ذکر نہیں کیا۔ اس سلسلے میں یہ بات بھی معلوم ہونی چاہیئے کہ رہن بالقبض کا مقصد صرف یہ ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے قرض کی واپسی کا اطمینان ہو جائے۔ اسے اپنے دیئے ہوئے مال کے معاوضہ میں شئے مرہونہ سے فائدہ اٹھانے کا حق نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص رہن لئے ہوئے مکان میں خود رہتا ہے یا اس کا کرایہ کھاتا ہے تو در اصل سود کھاتا ہے۔ قرض پر براہِ راست سود لینے اور رہن لی ہوئی چیز سے فائدہ اٹھانے میں اصولاً کوئی فرق نہیں ہے[1]

یہ آیتِ قرآنی رہن کے باب میں اصل ہے اور ضروری ہے کہ بعض مہمات واضح ہو جائیں مثلاً رہن کی قانونی حقیقت، ملکیت مشترکہ کا رہن، رہن کے ضائع ہو جانے کی صورت میں ضمان اور رہن سے انتفاع۔ رہن یہ ہے کہ کوئی مال اس حق کی بنا پر جس کا پورا کرنا اس کے ذریعے ممکن ہو روک لیا جائے صاحب حق یعنی رہن لینے والا مرتہن اور رہن دینے والا راہن کہلاتا ہے۔

رہن کی غرض وغایت صرف یہ ہے کہ قرض دینے والے کو اپنے قرض کی واپسی کے لئے ایک ضمانت مل جائے۔ توثیق واعتماد میں رہن کی حیثیت کفالت کی طرح ہوتی ہے فرق صرف یہ ہوتا ہے کہ رہن میں مرتہن کے ہاتھ میں مال ہوتا ہے اور اس مال کے ذریعے وثوق میں طاقت پیدا ہوتی۔ راہن کو اپنے حق کی پابجائی میں کفالت کے مقابلے میں اس طرح ایک امتیازی شان حاصل ہو جاتی ہے۔ راہن اگر دیوالیہ ہو جائے اور اس کے سرمایہ میں مرہون کے سوا کچھ نہ ہو تو یہ مرتہن ہی کا حق ہوگا۔ باقی قرض خواہوں کو اس میں مداخلت کی اجازت نہ دی جائے گی ہاں اگر مرہون کو فروخت کرنے کے بعد مرتہن کا قرض ادا ہو کر کچھ قیمت بچ جائے گی تو اس کو باقی قرض خواہوں میں تقسیم کیا جائے گا۔

گویا قرآن کے نزدیک رہن بھی دستاویز اور شہادت کی طرح کا ایک وثیقہ ہے لیکن یہ تشبیہ وثوق

---

[1] تفہیم القرآن

میں ہے یعنی اطمینان و اعتماد اس کے ذریعے قرض دینے والے کو اپنے قرض کے بارے میں ویسا ہی حاصل ہو جاتا ہے جیسے کتابت اور شہادت سے ہوتا ہے۔

رہن کی تکمیل کی شرط

رہن کی تکمیل کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ مرہون پر مرتہن کا قبضہ ہو جائے۔ رہن اس وقت تک نہ ہوگا جب تک جائداد مرتہن کے قبضہ میں نہیں دے دی جائے گی۔ رہن بذریعہ معاہدہ عمل میں آتا ہے۔ یہاں مال مرہون محل عقد ہوتا ہے اور اسے قبضہ میں لے کر محبوس کر لینا موضوع عقد ہے، محبوس کرنا ہی رہن کی وہ امتیازی خصوصیت ہے جس کے ذریعے وہ دوسرے معاہدات سے ممتاز ہو جاتا ہے۔ گویا عقد رہن بطور نتیجہ یہ اثر چھوڑ جاتا ہے کہ جیسے مرتہن کو قرضہ کی ادائیگی تک مال مرہون کو روک لینے کا حق حاصل ہو جاتا ہے ایسے ہی مرتہن کی ذمہ داری میں یہ بات داخل ہو جاتی ہے کہ وہ مرہون کی ایسی ہی حفاظت کرے جیسے اپنے مال کی، اور چونکہ حفاظت بغیر قبضہ کے ممکن نہیں اس لئے قبضہ رہن کی بنیادی شرط ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان اموال کا رہن درست نہیں جن میں زوال پذیری کی ازلی طبیعت ہو جیسے برف اور تازہ سبزیاں، یہ نہ محفوظ رہ سکتی ہیں اور نہ محبوس۔

خود قرآن نے بھی فرہان مقبوضہ میں اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور معلوم ہے کہ رہن کے موضوع پر قرآن کی یہی آیت ہے اور اس آیت نے رہن کی اجازت بشرط قبض دی ہے اور قبضہ ہی مرتہن کے لئے اس کے قرضہ کا وثیقہ ہے اگر بغیر قبضہ کے درست ہو جائے تو اس سے وثیقہ کی روح پامال ہو کر رہ جائے اور اس کی حیثیت ان اموال سے کچھ ممتاز نہ رہے گی جن کے بارے میں مرتہن کے پاس کوئی وثیقہ نہیں ہے۔ قبض کو وثیقہ بنایا ہی اس غرض کے لئے گیا ہے کہ یہ مال مرتہن کے پاس محبوس ہو کر قرض کے مقابلہ میں رہے تاکہ مرتہن راہن کی موت یا اس کے دیوالیہ ہونے کی حالت میں اس کے ذریعے اپنے قرض کی بازیابی کر سکے۔ اگر مرتہن کا قبضہ نہ ہو تو پھر اس میں وثیقہ ہونے کے کوئی معنے ہی نہ ہوں گے۔

ملکیتِ مشترکہ کا رہن

چند متعین افراد کو کسی متعین چیز پر جو انفرادی ملکیت کے قابل ہو مشترکہ طور پر مالکانہ حقوق حاصل ہوں۔ ایک مشترکہ مکان جس میں دو بھائی شریک ہوں۔ اس کی ایک واضح مثال ہے۔ اگر

طرح کوئی بھی جائداد یا سامان مشترکہ ملکیت ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں ہر فرد کے حقوق استفادہ محدود اور متعین ہوتے ہیں اور یہ تعیین اس معاہدے کی رو سے ہوتی ہے جس کے تحت مشترکہ ملکیت وجود میں آئی ہے۔ اگر کوئی مشترکہ ملکیت وراثت کے ذریعے وجود میں آئی ہے تو ہر ایک کا حق اس کے شرعی حصے کے بقدر ہوگا۔ اگر چند افراد نے مل کر ایک چیز کو اپنے مشترکہ استعمال کے لئے خریدا ہے تو ہر ایک کا حصہ اس کی ادا کردہ قیمت کی نسبت سے ہوگا۔ مخصوص مشترکہ املاک کے استعمال ان میں تصرف اور ان کے تحفظ کا حق تمام شرکاء کو ان حدود کے اندر حاصل ہوتا ہے جو از روئے معاہدہ متعین ہوں۔ بقیہ حق انتقال ملکیت بعض پابندیوں کا تابع ہوتا ہے۔ ان پابندیوں میں ایک اصولی پابندی یہ بھی ہے کہ اس کا رہن صحیح نہیں ہے خواہ وہ مشترکہ ملکیت قابل تقسیم ہو یا ناقابل تقسیم۔ یہ امام ابوحنیفہ اور آپ کے تلامذہ کی رائے ہے۔ امام مالک اور امام شافعی اس کے جواز کے قائل ہیں۔ امام ابوحنیفہ کا موقف یہ ہے کہ قرآن سے رہن کا قبضہ کے ساتھ ہونا معلوم ہو چکا ہے اور قبضہ ہی وثیقہ کی نیابت کر رہا ہے۔ اگر قبضہ نہیں تو رہن نہیں ہے اس لئے مشترکہ ملکیت کا رہن درست نہیں خواہ یہ قابل تقسیم ہو یا ناقابل تقسیم کیونکہ اشتراک ملکیت ہوتے ہوئے قبضہ نہ ہوگا اور اس طرح وثیقہ کی روح پامال ہو کر رہ جائے گی۔

قرض کو رہن نہیں رکھا جا سکتا

رشید کے دو ہزار روپے بذمہ حمید قرض ہیں۔ رشید ان دو ہزار کو رہن رکھ کر کوئی چیز لینا چاہتا ہے یہ بھی بالاتفاق اسی لئے ناجائز ہے کہ قرض جب تک قرض ہے اس کا قبضہ نہیں مل سکتا۔ قبضہ دین نہیں عین میں ہوتا ہے اس لئے قرض رہن نہیں ہو سکتا۔ اس میں قابل بیان کوئی اختلاف نہیں۔

رہن کے ضائع ہو جانے کی صورت میں تاوان

قرآن میں فرھان مقبوضة کے بعد فان امن بعضکم بعضا فلیؤد الذی اؤتمن امانتہ فقرہ آیا ہے یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ رہن امانت نہیں ہوتا کیونکہ اگر رہن امانت ہوتا تو امانت کا اس پر عطف نہ ہوتا۔ عطف چاہتا ہے کہ مغائرت ہو، اور چونکہ امانت نہیں اس لئے ضروری ہے کہ اگر مرتہن کے پاس رہن ہلاک ہو جائے تو مرتہن پر اس کی ذمہ داری ہو۔ اس موضوع پر تو فقہاء صحابہ و تابعین کا اتفاق ہے کہ مرتہن پر رہن ہلاک ہونے کی صورت میں ضمان آئے گا۔ الجصاص نے

لکھا ہے لا نعلم بينهم خلافاً ہمیں اس بات میں کسی اختلاف کا کوئی پتہ نہیں۔ ہاں البتہ اس پر اتفاق کے باوجود ضمان کی کیفیت میں ان کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر رہن والی چیز اس رقم کی مالیت سے زیادہ قیمتی ہے جس کے عوض اسے رہن رکھا گیا ہے تو وہ برابر سرابر ہے کوئی ضمان نہیں کیونکہ زیادت میں مرتہن رہن ہے۔ اور اگر رہن والی چیز کم قیمت کی ہے تو جو کچھ زیادہ ہے اسے واپس کرنا پڑے گا۔ حضرت عمر کا بھی یہی فیصلہ ہے، امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف اور امام محمد کی بھی یہی رائے ہے۔ ان سب کا موقف یہ ہے کہ رہن کی حیثیت چونکہ زر ضمانت کی سی ہے اس لئے قابلِ ضمان ہے اس کے برعکس امام شافعی اور امام محمد یہ فرماتے ہیں کہ رہن کی حیثیت زرِ ضمانت کی نہیں بلکہ امانت کی ہے۔ اسی فکری اختلاف کے نتیجہ میں ان اکابر کے درمیان رہن کے ضمان میں اختلاف ہوا ہے۔

کیا رہن سے انتفاع جائز ہے

اس کا جواب صرف ہاں یا نہیں میں نہیں دیا سکتا ہے اس کے لئے قدرے تفصیل ضروری ہے۔ اس سوال کے جواب پر غور کرنے کے لئے حسبِ ذیل اُمور سامنے آجاتے ہیں۔

اولاً: اس موضوع پر آئمہ فقہ کا مسلک کیا ہے۔

ثانیاً: آئمہ فقہ میں خود احناف کا منقح اور صاف مسلک کیا ہے۔

ثالثاً: اس موضوع پر خود دلالت قرآنی کیا ہے۔

آئمہ فقہ کا اس موضوع پر مسلک یہ ہے کہ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ رہن یعنی مدیون کو رہن سے فائدہ اُٹھانے کی اجازت نہیں ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ راہن کو رہن سے نفع اٹھانے کی اس وقت اجازت ہے جبکہ مرتہن کو نقصان نہ ہو۔ لیکن اس پر تینوں امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کا اتفاق ہے کہ مرتہن کو رہن سے فائدہ اٹھانے کی ہرگز اجازت نہیں ہے اور امام احمد اس کی اجازت دیتے ہیں۔ آپ نے مکان دو ہزار روپیہ رہن لیا۔ مکان آپ کا نہیں ہے بلکہ رقم آپ کی ہے آپ مرتہن ہیں اور مالک مکان راہن ہے۔

آئمہ احناف کا اگرچہ اس پر پورا پورا اتفاق ہے کہ مرتہن کے لئے راہن کی اجازت کے بغیر رہن سے انتفاع ناجائز ہے۔ لیکن اگر راہن اس کی اجازت دے دے تو پھر اس کا حکم کیا ہے۔ اس بارے میں ان کی آراء مختلف ہیں۔

کا نتیجہ ہے جو علم سے بیگانہ ہو۔ معاملہ اس کے برعکس ہے علم باللہ علم بالشرع رکھتے ہوئے بندہ میں جب مخلصانہ عمل کی سرشاریاں رونما ہوتی ہیں تو ایسے مخلص عالم باعمل کی روح اور اس کا دل اس عالم طبیعت میں ہوتے ہوئے عالم غیب سے ایسا مربوط ہو جاتا ہے کہ اس پر حکمت الٰہیہ کے اسرار و معارف منکشف ہو جاتے ہیں اور اس کے نتیجے میں آخرت اور ملائکہ کے بارے میں وہ کچھ جان لیتا ہے جہاں تک صرف مرد کتابی کی رسائی نہیں ہوتی ہے۔

بندہ کا کام متقیانہ سیرت اختیار کرنا ہے

دراصل یہ دو فقرے بالکل آخر میں عائلیاتی مسائل کے سلسلے میں یہ بتانے کے لئے لائے گئے ہیں کہ ان قوانین کے ذریعے اللہ سبحانہٗ کو خود اپنے اغراض کی تکمیل یا مفادات کا تحفظ مقصود نہیں ہے بلکہ انسانوں کے مفادات و مصالح مقصود ہیں۔ ان مفادات و مصالح کا تعلق دنیا و آخرت دونوں سے ہے۔ دنیا کا حقیقی مفاد آخرت کے مفاد سے ہم آہنگ ہے۔ قانون کے مقصود کو جامع طور پر تقویٰ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ قانون کی وضع و ترتیب کا مقصود یہ ہے کہ بندہ کو اپنی خواہشات کی بندگی سے نکالا جائے تاکہ وہ جس طرح اضطراری طور پر اللہ کا بندہ ہے اسی طرح اختیاری طور پر بھی اس کا بندہ بن جائے۔

(الموافقات)

گویا بندہ کا کام اس مقصد کے پیش نظر تقویٰ اختیار کرنا ہے اور متقیانہ سیرت بنانا ہے اور اس متقیانہ سیرت کی خاطر رہنمائی، تعلیم بندے کا نہیں اللہ کا کام ہے کیونکہ اللہ ہی کے پاس علم محیط ہے۔ متقیانہ سیرت یہ ہے کہ انسانی زندگی قائم رہے۔ خوش اسلوبی اور سہولت کے ساتھ گزاری جائے اور دنیا میں ایسی فلاح نصیب ہو جو فلاح آخرت کا پیش خیمہ ہے۔ مفکرین اسلام اس پر متفق ہیں کہ تقویٰ کا مقصد انسانی مفادات کا تحفظ اور اس کے مصالح کا حصول ہے۔ احکام و قوانین کی بنا الٰہی حکمتوں اور مصالح پر رکھی گئی ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

> قانون اسلامی کی بنا حکمتوں پر رکھی گئی ہے۔ اس میں توجہ معاش اور معاد میں انسانی مصالح کی طرف، قانون اسلامی سرتاسر عدل مجسم رحمت اور سراپا حکمت و مصلحت ہے۔ دنیا و آخرت کی فلاح و سعادت اس سے وابستہ ہے۔

(اعلام الموقعین)

پوری آیت کا خلاصہ

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں یہ باتیں ارشاد فرمائی ہیں :

۱۔ معاملہ پر دو گواہ ضرور بنانے چاہییں ۔

۲۔ یہ دونوں گواہ مرد ہوں ۔

۳۔ مرد نہ ہوں تو ایک مرد اور دو عورتیں ہوں ۔

۴۔ گواہ مسلمان ہوں ، بالغ ہوں ، پسندیدہ اخلاق کے مالک ہوں ۔

۵۔ جو لوگ کسی دستاویز میں گواہ ہوں عند الطلب ان کو گواہی سے گریز کی اجازت نہیں ۔

۶۔ اُدھار لین دین کا معاملہ چھوٹا ہو یا بڑا اگر وہ کسی مدت کے لئے ہے تو اس کو قیدِ تحریر میں لانا چاہیے ۔

۷۔ مذکورہ بالا ہدایت اللہ کے نزدیک حق و عدالت کے قرین گواہی کو ثابت کرنے والی اور شک و نزاع سے بچانے والی ہے ۔

۸۔ دست گرداں لین دین کے لئے کتابت نہ ہونے میں کوئی حرج نہیں ہے ۔

۹۔ اہمیت والی دست گرداں خرید و فروخت پر گواہ بنا لینا چاہیے ۔

۱۰۔ نزاع پیدا ہونے کی صورت میں کاتب یا گواہ کو نقصان پہنچانے کی کوشش کسی فریق کے لئے جائز نہیں ہے ۔ کاتب اور گواہ ایک اہم اجتماعی خدمت انجام دیتے ہیں ۔

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَىٰ سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهَانٌ مَقْبُوضَةٌ ۖ فَإِنْ
أَمِنَ بَعْضُكُمْ بَعْضًا فَلْيُؤَدِّ الَّذِي اؤْتُمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ
رَبَّهُ ۗ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ ۚ وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ آثِمٌ قَلْبُهُ ۗ وَاللَّهُ
بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۲۸۳﴾

رکوع ۳۹

اور اگر تم سفر میں ہو اور کوئی کاتب نہ ملے تو اس صورت میں ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز رہن رکھ کر اس کا قبضہ دے دیا جائے[۸۴۷] پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں سے ایک آدمی دوسرے کا اعتبار کرے تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے وہ امانت واپس کر دے اور اپنے پروردگار کی نافرمانی سے بچے[۸۴۸]۔ اور دیکھو گواہی نہ چھپاؤ جو کوئی گواہی چھپائے گا اپنے دل میں گنہ گار ہوگا[۸۴۹]۔ اور یاد رکھو تم جو کچھ بھی کرتے ہو اللہ کے علم سے پوشیدہ نہیں۔

اُدھار میں رہن کا حکم

قرآن کی اصل توجہ انسان کو ان فرائض کی تعلیم دینے کی طرف ہے جن کا وہ اپنے مقام عبودیت اور منصب خلافت کی وجہ سے مکلف بنایا گیا ہے۔ قرآن کا اصل کام یہ ہے کہ وہ لوگوں کو وہ طریقے اختیار کرنے پر آمادہ کرے جو آن کے متقی بننے کا باعث ہو سکیں۔ لیکن ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ

ہونے کے لئے انسان کو ذرائع اور وسائل کی ضرورت ہے۔ ان کی فراہمی کے بغیر انسان سے فرائض کی بجاآوری کی توقع نہیں ہو سکتی۔ قرآن ان ہی وسائل و ذرائع کی فراہمی کا اہتمام کرتا ہے۔ اور ان کی راہ کی ساری رکاوٹوں کو دور کرتا ہے۔ پہلے آیت میں ادھار کے لین دین کے لئے وثیقہ نویسی اور شہادت پر زور دیا، اور حقوق کے تحفظ کی خاطر فرائض سے آگاہ کیا۔ اب اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر حالت ایسی ہو کہ حقوق کے تحفظ کی خاطر باقاعدہ لکھا پڑھی کرنے کے لئے کوئی کاتب ہی دستیاب نہ ہو اور صاحب معاملہ کسی ضمانت پر ادھار دینے کو تیار نہ ہو تو کیا کیا جائے۔ اس کے لئے قرآن نے زندگی کو آسان بنانے کی خاطر ایک نئی راہ فراہم کر دی یعنی یہ کہ کوئی چیز بطور رہن اس کے قبضے میں کرا دی جائے۔ مرہونہ چیز مالک کی چیز ہے قرض دینے والے کے لئے جائز نہیں کہ اس کی واپسی سے انکار کرے۔ یہ چیز امانت ہے اس کی حفاظت ضروری ہے اور اس سے کسی قسم کا انتفاع ناجائز ہے۔

رہن کے لئے سفر اور کاتب کی قید اتفاقی ہے

۸۴۷۔ اگر تم سفر میں ہو اور کوئی کاتب نہ ملے تو اس صورت میں ایسا ہو سکتا ہے کہ کوئی چیز رہن رکھ کر اس کا قبضہ دے دیا جائے۔ یعنی اگر سفر میں قرض وادھار کا معاملہ کرو اور دستاویز کے کے لئے کوئی کاتب نہ ملے تو قرض کے عوض کوئی چیز مدیون کو اس کے پاس رکھ دینی چاہیے۔ سفر میں رہن کی حاجت بہ سبب حضر کے زیادہ ہوگی کیونکہ حضر میں کتابت و شہادت سے بسہولت صاحب دین کا اطمینان ممکن ہے اس لئے سفر میں رہن کا حکم ہوا، ورنہ حضر میں اور کاتب کی عدم موجودگی میں بھی رہن درست ہے جیسا کہ حدیث میں موجود ہے۔ اگر صاحبِ دین کو مدیون پر اعتماد ہو اور اس کا اعتماد ہو اور اس لئے رہن کا طالب نہ ہو تو مدیون کو لازم ہے کہ صاحبِ دین کا حق پورا پورا ادا کر دے اور خدا سے ڈرتا رہے صاحبِ حق کے حق میں حق کا معاملہ کرے۔[1]

جمہور علماء کا اتفاق ہے کہ رہن جس طرح سفر میں جائز ہے حضر میں بھی جائز ہے۔ یہاں ذکر کی تخصیص سفر کی یہ وجہ ہے کہ سفر میں اس کی ضرورت بہ نسبت حضر کے زیادہ ہوتی ہے کیونکہ اس میں اطمینان کے اور بھی ذرائع ممکن ہیں مثلاً کتابت، اشہاد جو اکثر اوقات سفر میں میسر ہونا دشوار ہے۔[2]

اس کی توضیح یہ ہے کہ آیتِ قرآنی کا یہ مطلب نہیں ہے کہ رہن کا معاملہ صرف سفر ہی میں ہو سکتا

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] بیان القرآن

کتمانِ شہادت شدید ترین گناہ ہے۔

آیت مداینہ کے بعض مہمات

چونکہ یہ آیت قرآنی اسلام کے معاشی نظام میں ایک امتیازی حیثیت رکھتی ہے اس لئے اس کے بعض مہمات کی تشریح ابھی باقی ہے۔ آیت کے ان مہمات کی طرف قرطبی نے اور الجصاص نے اشارات کئے ہیں ضروری ہے کہ ان کے خوانِ علم سے کچھ خوشہ چینی کی جائے تاکہ معالم کے پڑھنے والے آیت کی اہمیت کا کچھ اندازہ کر سکیں۔

بنیادی طور پر اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن انفرادی ملکیت کا اعتراف کرتا ہے اور اس اعتراف کے نتیجے میں وہ یہ بھی مانتا ہے کہ فرد اپنی ملکیت کے تحفظ کا حق رکھتا ہے اور مزید نفع کمانے کی خاطر نفع آور کاروبار میں لگانے کا حق بھی رکھتا ہے۔ اور اس کے نتیجے میں اپنی ملکیت کو استعمال کرنے اور اس کو منتقل کرنے کا بھی حق رکھتا ہے۔ گویا چار حق قرآن کی اس آیت سے معلوم ہو رہے ہیں۔ اوّل حق تحفّظ، دوم حق کاروبار، سوم حق تصرف، چہارم حقِ انتقال۔

ہر شخص کو اپنے املاک کے تحفّظ کا حق ہے

ہر مالک کو اپنی املاک کی حفاظت کرنے کا حق حاصل ہے۔ یہ حق ملکیت کے اوّلین لوازم میں سے ہے۔ حقِ ملکیت کو موثر اور حقیقی بنانے کے لئے ضروری ہے کہ مالک کو اس بات کا اختیار ہو کہ وہ وسائل اختیار کرے کہ کوئی فرد بغیر کسی حق کے اس کی ملکیت میں مداخلت نہ کر سکے۔ قرآن نے مالک کے حقِ تحفّظ کو اس آیت میں واضح طور پر تسلیم کیا ہے۔ الجصاص رقمطراز ہیں کہ:

> ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے مالکوں کو کتابت، شہادت اور رہن کا حکم مال کی حفاظت کی خاطر دیا ہے۔

بلکہ یہاں تک بتایا ہے کہ مال کے تحفّظ کے واجب ہونے کے معاملہ میں ہماری رہنمائی کر رہی ہے۔ اور قرطبی نے ایک قدم اور آگے بڑھا کر کہا کہ یہ آیت اپنے مال کے تحفّظ کے بارے میں نص قاطع ہے۔ اور ان صوفیوں کے خلاف یہ آیت بہت بڑا چیلنج ہے جو معاش گریز نظریات رکھتے ہیں۔ قرطبی فرماتے ہیں۔

> یہ آیت ان راہبانہ تصور رکھنے والے جاہلوں کی پوری پوری تردید ہے جو اموال سے

بے تعلق ہو کر زندگی گزارتے ہیں اور بوقت احتیاج دوسروں کے دستِ نگر ہو جاتے ہیں اور اربابِ دنیا کی دریوزہ گری کرتے ہیں حالانکہ یہ کردار مذموم بھی ہے اور منع بھی۔

ابوالفرج الجوزی تو ان کے اس کردار پر یہاں تک ماتم کر گئے ہیں کہ؛ من قتل دون ماله مجھے ان بناوٹی زاہدوں پر حیرت نہیں جو علم کی بے مائگی کی وجہ سے ایسا کرتے ہیں۔ مجھے تو ان لوگوں پر تعجب ہے جو علم و بصیرت کے باوجود راہبانہ اور جوگیانہ تصوّرات کی اسلام میں گنجائش بتاتے ہیں حالانکہ اُن کو پتہ ہے کہ یہ قانون و عقل کی کھُلی بغاوت ہے۔

بہرحال اس آیت نے مالک کے حقِ تحفّظ کو کتابت، شہادت، اور رہن کے وسائل کے ذریعے واضح طور پر تسلیم کیا ہے بلکہ بعض حالات میں اس کو ضروری قرار دیا ہے تاکہ وہ اہم مقاصد و مصالح ضائع نہ ہو جائیں۔ جو ملکیّت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اپنی ملکیّت کی حفاظت کے لئے ایک انسان اپنی جان تک دے سکتا ہے جو خود اللہ کی ایک مقدس امانت ہے۔ اپنی ملکیّت کی حفاظت میں مارا جانے والا شہادت کا درجہ پاتا ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں عنوان قائم کیا ہے۔

اور اس دعوے کے لئے بطورِ دلیل عبداللہ بن عمرو کی یہ حدیث لاتے ہیں کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا وہ شہید ہے۔

نفع آور کاروبار میں لگانے کا حق

قرآن کی یہ آیت جیسا کہ قرطبی نے لکھا ہے اس پر نص قاطع ہے کہ ہر مالک کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ اپنی املاک کو مزید نفع کمانے کے لئے استعمال کرے اس مقصد کے تحت اپنی ملکیّت کے ذریعے خود کوئی پیدا آور کاروبار کر سکتا ہے۔ قرآن نے اس آیت کی رُو سے نہ صرف اس حق کو تسلیم کیا ہے بلکہ اس کی ترغیب بھی دی ہے کیونکہ نفع کمانے کا ذریعہ زیادہ تر مالک کا نقد سرمایہ ہوتا ہے۔ سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگانے کی صورتوں میں ایک صورت یہ ہے کہ سرمایہ کو ایک متعیّن شرحِ سُود پر قرض دیا جائے قرآن نے پہلے اس صورت کو بیان کیا ہے اور اس پر قانونی پابندی عائد کی جس کی تفصیلات آپ پڑھ چکے ہیں۔ اب اس رکوع میں سرمایہ کو نفع آور کاموں میں لگانے کی دوسری جائز صورتیں بیان کی جارہی ہیں۔ ان جائز صورتوں میں اولین صورت ذاتی کاروبار کی ہے۔ اور اس رکوع میں اسی کو بیان کیا گیا ہے جیسا کہ آپ تفصیلات پڑھ چکے ہیں۔

حقِ استعمال و تصرف

قرآن کی یہ آیت ہر مالک کو یہ حق بھی دیتی ہے کہ وہ اپنی ملکیت کو استعمال کر سکتا ہے اور اس میں تصرف کر سکتا ہے اور یہ تصرف اپنے فائدے کے لئے بھی ہو سکتا ہے اور دوسروں کے فائدے کیلئے بھی۔ قرآن حکیم نے انسان کو اس پر ابھارا ہے کہ کائنات میں پھیلی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھائے۔ استعمال کی بے شمار صورتیں ہوتی ہیں۔ قرآن نے صرف چند حدود متعین کر دی ہیں۔ ان میں رہتے ہوئے ہر مالک کو اپنی ہر خواہش کی تسکین کی خاطر اپنی ملکیت میں تصرف کرنے کا پورا پورا حق حاصل ہے۔ ان طریقوں کی تحدید نہیں ہو سکتی۔ قرآن اگرچہ کوئی معاشی کتاب نہیں لیکن اگر آپ چاہیں تو قرآن سے ان طریقوں کی ایک طویل فہرست قرآنی آیات کی روشنی میں مرتب کی جا سکتی ہے۔ مثلاً زراعت، باغبانی، شکار، شکاری کتے، شکار کے مختلف طریقے، شکاری پرندے، خشکی کا شکار، مویشیوں کی پرورش، بری، بحری جانور، پرندوں کے مختلف اجزاء گوشت، اون، بال، دودھ، شہد وغیرہ سے استفادے کی مختلف نوعیتیں، تجارت، تجارت کے سلسلے میں حیوانی وغیر حیوانی، بری، بحری جانوروں کے ذریعے مواصلات کی سہولتوں کا ذکر صنعت و حرفت اور اس کے مختلف بسیط و مرکب شعبے مثلاً رنگریزی، نجاری، زرگری، ظروف سازی، زرہ سازی، پارچہ بافی، معماری، سنگ تراشی، کان کنی، غواصی مزدوری، مزدوری کی مختلف قسمیں، حکومتی ملازمتیں کاروباری تنظیم وغیرہ، تقریباً وہ ساری چیزیں جن سے بعض معاشی علماء معاشی کتابیں مرتب کرکے اہلِ علم سے دادِ تحسین لے رہے ہیں سب کی طرف قرآن میں اشارات ہیں۔

انتقالِ ملکیت کا حق

یہ آیت یہ بھی بتا رہی ہے کہ ہر مالک کو یہ حق حاصل ہے کہ اپنی ملکیت کسی دوسرے کو منتقل کر دے۔ یہ انتقالِ ملکیت کسی دوسری ملکیت مثلاً نقد سرمایہ کے عوض بھی ہو سکتا ہے اور بلا عوض بھی۔ ملکیت کو منتقل کرنے کا اختیار حقِ ملکیت کا ایک اہم جزو ہے۔ کسی چیز کی فروخت کے ذریعے اس کو دوسرے کی طرف منتقل کرنے کی شکل میں اصل چیز کی ملکیت دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے۔ انتقالِ ملکیت کا حق وہی مالک استعمال کر سکتا ہے جو شریعت کی نگاہ میں اس کا اہل ہو اہلیت کی اوّلین شرط رُشد ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ پارہ چہارم میں آ رہی ہے۔

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِنْ تُبْدُوْا مَا فِيْٓ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تُخْفُوْهُ يُحَاسِبْكُمْ بِهِ اللّٰهُ ؕ فَيَغْفِرُ لِمَنْ يَّشَآءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب ہی اللہ کے لئے ہے اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اُسے ظاہر کر دیا پوشیدہ ہر حال میں اللہ جاننے والا ہے وہ تم سے ضرور حساب لے گا اور پھر یہ اسی کے اختیار میں ہے کہ جسے چاہے بخش دے جسے چاہے عذاب دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔

اللہ کی حاکمیّت اور اُس کا اختیار و ناطق

اسلام کے نظامِ حیات کے تمام اجزاء جس مرکز سے حرکت اور زندگی حاصل کرتے ہیں وہ اللہ کی ذات و صفات کا تصوّر ہے۔ اسلامی معاشرے کے جملہ اعتقادات اور سارے اعمال و افکار اسی تصور کی بنیادوں پر مبنی ہیں۔ قرآن نے صفات الٰہی کی تصریح و توضیح میں جس جامعیت سے کام لیا ہے وہ دُنیا کے اور مذاہب میں مفقود ہے اس کے تمام خارجی ادارے اور تمام نظامات اسی ایک مصدر سے مشتق ہیں۔ اسلامی مملکت کا تصور، اسلام کا قانونی نظام، رسول کی شخصیت اور اس کا منصب اسلامی معاشرے کا اخلاقی ضابطہ، مالیاتی نظام، اعمال و فرائض کی تمام شاخیں غرض کہ اسی نظام کی ہر معمولی سے معمولی چیز بالواسطہ یا بلا واسطہ اسی مرکزی تخیل سے وابستہ ہے۔ انسان کے انفرادی اعمال اور قوموں کی اجتماعی سیرت جو چیز فیصلہ کن طور پر متاثر کرتی ہے اور انہیں عمل کے ایک خاص راستہ پر چلاتی ہے وہ اللہ کی صفات

ایک رائے یہ ہے کہ جائز ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ ناجائز ہے۔ تیسری رائے یہ ہے کہ قضاءً جائز دیانتہً ناجائز ہے، چوتھے یہ کہ اگر معاملہ میں انتفاع کی شرط ہے تو ناجائز ہے اور اگر شرط نہیں تو جائز ہے۔ پانچویں رائے یہ ہے کہ شرط کے درجہ میں حرام ہے اور بلا شرط مکروہ ہے۔

مولانا عبدالحی فرماتے ہیں کہ ان آراء میں چوتھی رائے اقرب الی الصواب ہے یعنی یہ کہ اگر معاملہ میں انتفاع بطور شرط ہو تو ناجائز ہے اور نہ ہو تو جائز ہے۔

اولاً، اس لئے کہ اس صورت میں قرض منفعت گیری کا ذریعہ بن جائے گا۔ قرض جب اس حیثیت میں ہو تو انتفاع ناجائز ہے۔ اس کی حضورؐ نے ممانعت فرمائی ہے۔ حارث ابن اسامہ نے اپنے مسند میں حضرت علی کے حوالہ سے یہ ارشاد نقل کیا ہے کل قرض جر نفعًا فھو ربا یہ روایت تاریخی طور پر اگرچہ مصعب بن سوار کی وجہ سے پایہ صحت کو نہیں پہنچتی ہے لیکن اسے چونکہ صحابہ کے محسوس اور مرئی عمل کی تائید حاصل ہے، اور اسلام کی معاشی نظام میں آئمہ نے اسے اپنایا ہے اس لئے اسے درجہ قبولیت حاصل ہے مصنف ابن ابی شیبہ میں حضرت عطاء ابن ابی رباح کا بیان ہے کہ صحابہ کرام ہر ایسے قرض کو ناپسند کرتے تھے جس سے نفع آوری ہوتی ہو۔ امام بیہقی نے السنن الکبریٰ میں عبداللہ بن مسعود، ابی بن کعب، عبداللہ بن سلام اور عبداللہ بن عباس کے ایسے آثار نقل کئے ہیں جن سے ان کی تائید ہوتی ہے۔ اگرچہ حدیث مرفوع کی حد تک حافظ عسقلانی نے التلخیص الحبیر میں عمر ابن بدر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس موضوع پر مرفوع صحیح نہیں ہے لیکن امام الحرمین اور امام غزالی کو حدیث کی صحت پر اصرار ہے اور روں کا پتہ نہیں مگر حافظ ابن القیم الجوزیہ نے اغاثۃ اللہفان میں جو انداز بیان اختیار کیا ہے اس سے محسوس ہوتا ہے کہ ان کو اس حدیث کی صحت پر بھرپور اعتماد ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

ومنع من القرض الذی جر نفعا وجعلہ ربٰا

حضورؐ نے اس قرض سے منع فرمایا ہے جو نفع آور ہو اور نفع کو سُود قرار دیا ہے۔

اور اسی بنیاد پر قرض خواہ کو قرض دار سے ہدیہ قبول کرنے سے بھی روکا ہے جبکہ ان کے مابین قرض سے پہلے ایسا معاملہ نہ ہو۔ چنانچہ اس پر ابن القیم نے سنن ابن ماجہ کی اس حدیث سے استدلال کیا ہے جس میں یحییٰ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ میں نے حضرت انس بن مالک سے دریافت کیا کہ ہم میں سے ایک شخص اپنے بھائی کو کچھ پیسے قرض دیتا ہے۔ قرض دار کچھ سوغات و ہدیہ ہمیں روانہ کر دیتا ہے کیا یہ جائز ہے۔ حضرت انس نے فرمایا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جب تم کسی کو قرض دو اور قرضدار تمہیں ہدیہ دے یا سواری کی پیش کش کرے تو نہ ہدایہ قبول کرنے کی اجازت اور نہ سواری پر سوار ہونے کی۔ ہاں اگر

پہلے سے تعلقات کی بناء پر دونوں میں ایسے مراسم موجود ہوں تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ تاریخ بخاری میں بھی حدیث حضرت انس کے حوالے سے بغیر اشتنا کے آئی ہے۔ اور صحیح بخاری میں امام بخاری نے ابو بردہ کے حوالے سے انکشاف کیا ہے کہ حضرت ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ میں مدینہ پہنچا تو عبداللہ بن سلام سے میری ملاقات ہوئی۔ انہوں نے مجھ سے کہا آپ تو ایسی جگہ رہتے ہیں جہاں سودی کاروبار عام ہے اگر آپ کا کسی کے ذمہ کوئی حق ہو یعنی قرض ہو اور وہ آپ کو انجیر، جو وغیرہ ہدیۃً دینا چاہئے تو ہرگز نہ لینا کیونکہ یہ سود ہے۔ اسی موضوع پر ابی بن کعب کا بیان سنن سعید بن منصور میں آیا ہے۔ نیز عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن عمرو وغیرہ سے بھی ایسے ہی بیانات منقول ہیں[1]

ان وجوہ سے اگر معاملہ میں انتفاع کی شرط کرلی گئی ہو تو ناجائز ہے۔

ثانیاً: یہ بات کہ اگر معاملہ میں انتفاع کی شرط نہ ہو تو جائز ہے کیونکہ ارشادِ نبوت ہے ؛

گروی رکھے ہوئے جانور کا خرچہ اس شخص کے ذمہ ہے جو اس پر سوار ہو یا اس کا دودھ دوہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی جانور رہن لیا گیا ہو تو اس کا دودھ استعمال کیا جاسکتا ہے اور اس سے سواری اور بار برداری کی خدمت لی جاسکتی ہے کیونکہ یہ اس چارے کا معاوضہ ہے جو مرتہن جانور کو کھلاتا ہے۔ یہ حدیث صحیح بخاری، ترمذی، ابو داؤد اور ابن ماجہ میں آئی ہے۔ حافظ عسقلانی نے التلخیص الجیر میں اس کے مرفوع ہونے کو مخدوش بتایا ہے بلکہ دار قطنی سے موقوف ہونے کا رجحان نقل کیا ہے۔ اگرچہ یہ حدیث شرط نہ ہونے کی صورت میں رہن سے انتفاع کی مرتہن کو اجازت دے رہی ہے لیکن شرط ہونے کا معاملہ اس سے الگ ہے۔ خوب سمجھ لیجئے۔

عرف و رواج بھی شرط ہے

شرط کے بھی دو درجے ہیں ایک یہ کہ فی الواقع مرتہن رہن میں صاف طور پر یہ شرط لگائے کہ راہن اسے انتفاع کی اجازت دے دوسرے یہ کہ عرف ہی یہ ہو کہ جب رہن ہوگا تو مرتہن انتفاع کرے گا۔ جیسے پاکستان و ہندوستان میں اس وقت بھی رواج ہے کہ رہن کا مقصد ہی انتفاع ہوتا ہے۔ شرط کا خواہ ذکر نہ ہو مگر شرط مقصود ہوتی ہے۔ اور فقہا نے ایسے مواقع پر معاشی کاروبار کے لئے ضابطہ یہ بنایا

---

[1] اغاثۃ اللہفان ج ۱ ص ۲۶۲

ہوا ہے کہ المعروف کالمشروط جو بات عرف بن چکی ہو وہ بمنزلہ شرط کے ہے جیسے پہلی صورت سُود
ہونے کی وجہ سے حرام ہے ایسے ہی دوسری صورت بھی عرف ہونے کی وجہ سے حرام ہوگی۔ اگر سُود نہیں
تو سُود کے مشابہ ضرور ہے اور فقہاتے ارشادِ نبوّت کی روشنی میں مشابہ ربا کو بھی ربا کا حکم دیا ہے ہمارے
یہاں جو صورت رائج ہے وہ یہی ہے کہ کاغذ اور دستاویز میں انتفاع کا کوئی ذکر نہیں مگر لینے والا لیتا اسی
لئے ہے کہ انتفاع حاصل کرے گا اور اسی کے بارے میں علامہ شامی نے لکھا ہے۔
عام لوگوں کے حالات کے پیشِ نظر غالب یہی ہے کہ ان کا مقصد رہن لیتے وقت انتفاع
ہوتا ہے ورنہ لوگوں میں اتنی اخلاقی برتری کہاں ہے کہ مفت محض تبرعاً رہن رکھ لیں
اور کوئی انتفاع پیشِ نظر نہ ہو۔ یہ طرزِ عمل خود بمنزلہ شرط ہے اور اس کی وجہ ہی سے
ممانعت کی جاتی ہے۔

فقہا کی اس موضوع پر قانونی تعبیرات بے حد نازک ہیں اس لئے لوگوں نے سمجھ لیا ہے کہ راہن کی
اجازت سے مرتہن کے لئے انتفاع جائز ہے حالانکہ ایسا قطعاً نہیں ہے یہاں بنیاد ہی شرط ہے۔ اگر
معاملہ مشروط ہے خواہ شرط واقعی ہو یا حکمی، یعنی رواج ہی ایسا ہو تو بلا شبہ چاہے راہن اس کی اجازت دے
دے مگر یہ سُود ہے اور حرام ہے۔

رہن امانت ہے اس کی واپسی کا حکم

۸۴۸۔ پھر اگر ایسا ہو کہ تم میں سے ایک شخص دوسرے کا اعتبار کرے تو جس کا اعتبار کیا گیا ہے
وہ امانت واپس کردے اور اللہ اپنے پروردگار کی نافرمانی سے بچے۔ یعنی اگر قرض خواہوں اور قرضداروں
کے مابین معاملات باہمی رواداری اور امن وسکون کی حالت میں ہوں اور باہم ایک دوسرے کا بھرپور
اعتماد اور اعتبار کارفرما ہو اور اس لئے کتابت، شہادت کی ضرورت ہی پیش نہ آتے تو ایسے موقعہ پر
رہن کی جو امانت جس کے پاس رکھی گئی ہے وہ قرض کی رقم لے کر مقروض کی امانت واپس کردے یعنی
لے کر مکر نہ جائے یا دیتے وقت حیلے بہانے نہ کرے۔ یا اس میں بلا اجازت تصرف نہ کرے۔ اگر ایک
بھائی نے اعتماد کرکے کوئی چیز آپ کے سپرد کردی تو اس کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچے۔ احادیث میں امانت
کی بے حد فضیلت آئی ہے۔ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے جائداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں
ہے جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔ اگر کسی کی کوئی چیز آپ
کے پاس ہے تو اس کو مانگنے پر یا یوں ہی اس کا جوں کا توں واپس کرنا امانت ہے اور اگر کسی کا کوئی حق

آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا امانت ہے۔ کسی مجلس میں آپ ہوں اور کچھ باتیں آپ لوگوں کے متعلق سنیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا بھی امانت ہے کسی نے آپ سے بھی کام کے لئے مشورہ لیا تو اس کو سن کر اپنے ہی تک محدود رکھنا اور اس کو اپنے علم کے مطابق صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے۔ اگر کسی کام پر نوکر ہے تو اس نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کر کے وہ کام انجام دے تو یہ بھی امانت ہے اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹہ کا ملازم ہے اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتا ہے یا بے سبب سستی کرتا ہے یا دیر سے آتا اور وقت سے پہلے چلا جاتا ہے تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔ یہ سب باتیں اس آیت کے مدلول میں داخل ہیں۔

دل کا گنہ گار ہوتا

۸۴۹۔ اور دیکھو گواہی کو نہ چھپاؤ جو کوئی گواہی کو چھپائے گا وہ دل میں گنہگار ہوگا اس فقرے کا تعلق پہلے سے ہے لیکن حکم عام ہے یعنی تمام معاملاتِ قانونی اس میں داخل ہیں۔ مثلاً نکاح، مہر، وصیت وغیرہ صرف معاملہ رہن کے ساتھ مخصوص نہیں اور شہادت چھپانے کی ساری صورتیں اس ممانعت کے اندر آتی ہیں مثلاً ادائے شہادت سے گریز کرنا یا شہادت میں واقعات صحیح بیان کرنا، اللہ سبحانہٗ نے اس آیت کے ذریعے کتمانِ شہادت خاص طور پر حقوق کے بارے میں ممانعت کی ہے۔ شہادت میں اگر دو شاہد ہوں اور ان کے علاوہ اور کوئی نہ ہو تو قانونی طور پر ادائے شہادت فرض ہے اور اگر دو کے علاوہ اور بھی ہوں تو پھر شہادت کفایہ ہے۔

آخر میں یہ جو فرمایا ہے کہ جو شہادت چھپائے گا اس کا دل گنہگار ہوگا اگرچہ گنہگار شہادت چھپانے والا ہے لیکن یہاں دل کو گنہگار بتایا ہے کیونکہ کتمانِ شہادت ایک وجودی عمل نہیں بلکہ عدمی عمل ہے۔ وجودی اعمال میں جوارح کام کرتے ہیں اور اعضاء کا کام میں حصہ ہوتا ہے لیکن عدمیات میں جوارح کا نہیں بلکہ قلب کا حصہ ہوتا ہے کیونکہ کتمانِ شہادت نام ہے زبان سے شہادت کو ترک کرنے کے ارادہ کا۔ اور نیت و ارادہ افعالِ قلب سے ہے جوارح سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے اور شہادت کو چھپانے والا بیک وقت دو گناہ کرتا ہے ایک شہادت نہ دینے کا ارادہ دوسرے زبان سے اس کو چھوڑ دینا۔ دوسرے علماء نے یہ بھی لکھا ہے کہ سب سے بڑا گناہ فی الواقع دل ہی کا گناہ ہے۔ چنانچہ کفر جو سارے کبائر سے بڑھ کر کبیرہ ہے، قلب ہی کا گناہ ہے اس لئے اس اسلوب بیان نے خود یہ ظاہر کر دیا کہ

کا تصور ہے جو ان کے ذہن کے مخفی گوشوں اور ان کے شعور خفی میں چھپا ہوا ہے۔ اس لئے جب تک اللہ کی صفات کا مکمل اور صحیح ترین تصور اقوام و افراد کے اعمال کا محرک نہ ہو ان میں نیک عملی اور راست کرداری کا حقیقی جذبہ نہیں پیدا ہو سکتا۔ خواہ وہ نظام کتنا ہی بہتر ہو۔ اللہ کی ذات و صفات کا صحیح تصور انسان کی تکمیلِ ذات اور ارتقائے نفس کی سب سے پہلی اور ضروری شرط ہے کیونکہ کائنات میں شخصیت کے جتنے مظاہر ہیں وہ سب شخصیتِ الٰہی سے ماخوذ ہیں اور تکمیلِ ذات یا ارتقائے نفس نام ہے اس مبتدار اوّل سے قرب حاصل کرنے اور اپنے اندر اس کی صفات پیدا کرنے کا۔ یہی وجہ ہے کہ مسلمانوں کو یہ کہنے کے بعد کہ اللہ کی نافرمانی سے بچنا تمہارا کام ہے اور زندگی کے مختلف گوشوں میں تمہاری رہنمائی کرنا اللہ کا کام ہے۔ یہ بتایا گیا ہے کہ کائنات میں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہے سب اللہ کی ملکیت ہے۔ اس کا علم محیط ہر ذرہ کو اپنے گرفت میں لئے ہوئے ہے۔ تم جو کچھ بھی کرو گے خواہ کیسے کرو اس کا تم کو حساب دینا ہے۔ حضرت شیخ الہند نے اس موقعہ پر یہ بات بڑی قیمتی ارشاد فرمائی ہے کہ:

اس سورت میں اصول و فروع عبادات و معاملات جانی و مالی ہر قسم کے احکام کثرت سے مذکور ہوئے اور شاید اس سورت کو سنام القرآن فرمانے کی بھی یہی وجہ ہے۔ اس لئے مناسب ہے کہ بندوں کو پوری تاکید و تہدید بھی ہر طرح سے فرما دی جائے تاکہ تعمیلِ احکام مذکورہ میں کوتاہی سے اجتناب کریں سوا اسی غرض کے لئے آخر سورت میں احکام بیان فرما کر اس آیت کو بطور تہدید اور تنبیہ ارشاد فرما کر تمام احکام مذکورہ سابقہ کی پابندی پر سب کو مجبور کر دیا اور طلاق و نکاح، قصاص و زکوٰۃ، بیع و ربٰو وغیرہ میں جو اکثر صاحب حیلوں اور اپنی ایجاد کردہ تدبیروں سے کام لیتے ہیں اور ناجائز امور کو جائز بتلانے میں خود رائی اور سینہ زوری سے کام لیتے ہیں ان کو بھی اس میں پوری تنبیہ ہو گئی دیکھئے جس کو ہم پر استحقاقِ عبادت حاصل ہو گا اس کو مالک ہونا چاہیے اور جو ہماری ظاہری اور مخفی تمام اشیاء کا محاسبہ کر سکے اس کو تمام امور کا علم ہونا ضروری ہے اور جو ہماری ظاہری اور مخفی تمام اشیاء کا محاسبہ کر سکے اس کو تمام امور کا علم ہونا ضروری ہے اور جو ہماری تمام چیزوں کا حساب لے سکے اور ہر ایک کے مقابلے میں جزا و سزا دے سکے اس کو تمام چیزوں پر قدرت ہونی ضروری ہے۔ لہٰذا ان ہی تین کمالات یعنی مِلک، علم اور قدرت کو یہاں بیان فرمایا اور انہی کا آیۃ الکرسی میں ارشاد ہو چکا ہے۔ مطلب یہی ہے کہ ذاتِ پاک سبحانہٗ تمام چیزوں کی مالک اور خالق اس کا علم سب کو

محیط، اس کی قدرت سب پر شامل ہے تو پھر اس کی نافرمانی کسی امر ظاہر یا مخفی میں کر کے بندہ کیوں کر نجات پا سکتا ہے۔

۸۵۰ ۔ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب ہی اللہ کے لئے ہے ۔ یعنی زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اللہ سبحانہٗ کی ملکیت ہے۔ اس میں کسی کی کسی نوع سے کوئی شرکت نہیں ہے۔ وہی ساری کائنات کا مالک ہے کیونکہ اسی نے ان سب کو پیدا کیا اور یہ ناممکن ہے کہ خالق کو اپنی مخلوق کا علم نہ ہو کما قال تعالیٰ الا یعلم من خلق اور جب تم یہ سمجھ گئے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کی قدرت اور خالقیت تمام کائنات کو محیط ہے اسی طرح اس کا علم قدیم بھی تمام کائنات کو ہر طرح سے محیط ہے[1] یہ دین کی اولین بنیاد ہے اللہ تعالیٰ کا مالک زمین و آسمان اور ان تمام چیزوں کا جو آسمان و زمین میں ہیں ۔ اللہ ہی کی مِلک ہونا دراصل ہی وہ بنیادی حقیقت ہے جس کی بناء پر انسان کے لئے کوئی دوسرا طرزِ عمل اس کے سوا نہیں ہو سکتا کہ وہ اللہ کے آگے سر اطاعت جھکا دے[2]

یہ فقرہ پہلے فقرے کے لئے بطور دلیل لایا گیا ہے یعنی اللہ تمہارے اعمال کو اس لئے جانتا ہے کہ اس کائنات میں جو کچھ ہے وہ اللہ کی مملوک ہے اور مالک کو اپنی ملکیت کا پورا علم ہوتا ہے۔ انسان بھی دوسری تمام مخلوقات کی طرح اللہ کا مملوک و محکوم ہے لیکن یہ مخلوق بعض خصوصیات کی حامل ہے۔ انسان مقصدِ تخلیق اور حکمتِ وجود سے کچھ رشتے رکھتا ہے۔ اسے نظامِ کائنات میں ایک مخصوص حیثیت عطا کی گئی ہے۔ اس کا ایک امتیاز یہ ہے کہ وہ کائنات کی دوسری موجودات کی تسخیر اور ان کو اپنے فائدے کے لئے استعمال کرنے کی طاقت رکھتا ہے۔ اس امتیازی حیثیت کے عین تقاضے کے مطابق انسان کو اللہ کے حضور ذمہ دار اور جوابدہ بھی گردانا گیا ہے۔ ان قوتوں اور صلاحیتوں کے استعمال کائنات میں جو وسیع مواقع حاصل ہیں ان سے استفادہ کرنے میں انسان اپنے مالک کے حضور جوابدہ ہے اسی حقیقت کو قرآن نے محاسبہ سے تعبیر کیا ہے۔

انسان ایک ذمہ دار اور جوابدہ مخلوق ہے

۸۵۱ ۔ اور جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے تم اسے ظاہر کرو یا پوشیدہ ہر حال میں اللہ جاننے والا ہے۔ وہ تم سے حساب لے گا ۔ اس فقرے میں مزید دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں ایک یہ کہ ہر انسان

---

[1] معارف ام [2] تفہیم القرآن

فرداً فرداً اللہ کے سامنے ذمہ دار اور جوابدہ ہے۔ دوسرے یہ کہ جس بادشاہِ زمین و آسمان کے سامنے انسان جوابدہ ہے وہ غیب و شہادت کا علم رکھنے والا ہے حتیٰ کہ دلوں کے چھپے ہوئے ارادے اور خیالات تک اس سے پوشیدہ نہیں ہیں[1]

مافی انفسکم جو کچھ دلوں کے اندر افعال ارادی و اختیاری میں سے ہے مثلاً کوئی عقیدۂ فاسد یا عزمِ معصیت اس میں وسوسہ اور گزرنے والے خیالات داخل نہیں ہیں کہ وہ حدود مواخذہ سے خارج ہیں۔

وساوس وخواطر کا حکم

یہاں عام ذہنوں میں اس آیت کی ظاہری سطح کو دیکھ کر یہ خلش ہوتی ہے کہ کیا غیر اختیاری خیالات وسوسوں اور خواطر کا بھی حساب ہوگا؟ علماء نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ سب سے زیادہ نفیس بات حضرت مولانا اشرف علی نے فرمائی ہے کہ مافی انفسکم سے امورِ قلبیہ اختیاریہ مراد ہیں، جیسے زبان اور جوارح کے افعال دو قسم کے ہوتے ہیں، اختیاری اور غیر اختیاری، اسی طرح افعالِ قلبیہ بھی دو قسم کے ہیں اختیاری جیسے کفر کا عقیدہ اور غیر اختیاری جیسے بُرے بُرے وسوسے آنا۔ اس میں اختیاری پر مواخذہ ہے غیر اختیاری پر نہیں ہے اور جس طرح زبان و اعضاء میں علاوہ کفر کے باقی میں بخشش و عذاب کا احتمال ہے ایسے ہی افعالِ قلوب میں بھی دونوں احتمال ہیں۔ آیت میں اسی کو بیان کیا گیا ہے کہ معاصی اختیاریہ پر گو وہ افعالِ قلوب ہوں مواخذہ کیا جائے گا[2]

اس طرح اس ارشادِ نبوت کا مطلب بھی صاف ہو گیا جس میں فرمایا ہے کہ:

اللہ تعالیٰ نے میری اُمت کے ان گناہوں سے درگزر فرما لیا جن کو کہا نہیں اور کیا نہیں صرف دل میں خیال کیا۔

امام قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث احکامِ دنیا کے بارے میں ہے۔ طلاق عتاق، بیع اور ہبہ محض دل میں ارادہ کر لینے سے منعقد نہیں ہو جاتے جب تک زبان سے نہ کہے یا عمل نہ کرے۔ اور آیت میں جو کچھ مذکور ہے وہ احکامِ آخرت سے متعلق ہے اس لئے کوئی تعارض نہیں۔ اور دوسرے علماء نے اس شبہ کا جواب یہ دیا ہے کہ حدیث میں دل کے جن گناہوں کی معافی مذکور ہے اس مراد

---

[1] تفہیم القرآن [2] بیان القرآن

وساوس اور غیر اختیاری خیالات ہیں اور آیت میں جن پر محاسبہ کا ذکر ہے اس سے مراد وہ ارادے اور نیتیں ہیں جو انسان اپنے ارادے اور قصد سے دل میں جماتا ہے اور اس پر عمل کرنے کی کوشش کرتا ہے مگر کسی وجہ سے وہ ان پر عمل نہیں کر سکتا۔[1]

مفسرین نے اس مقام پر جو خلش محسوس کی ہے وہ اپنی جگہ کتنی وزنی ہی لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اس کا آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے دراصل یہ سارا معاملہ ہی دوسرا ہے جب تک خالی الذہن ہو کر تحقیق نہ کی جائے اصلیت کا سراغ نہیں مل سکتا۔

سب سے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ پہلی آیت میں **اٰثِمٌ قَلْبُهٗ** کہہ کر کتمان شہادت کو قلب کا گناہ بتایا تھا۔ اس آیت میں قلب کے گناہوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کے حضور میں ابداء اور اخفاء دونوں یکساں ہیں وہ اپنی مملکت میں اختیار ناطق رکھتا ہے اور کائنات کا ذرہ ذرہ اس کی ملک ہے اور بندہ کی حیثیت ایک ذمہ دار جوابدہ کی ہے۔ اسے اپنے اعمال کا اللہ کے حضور میں حساب دینا ہے یہ اعمال خواہ قلب کے ہوں یا زبان کے یا جوارح کے۔

پھر یہ بات سامنے لانی چاہیے کہ قلب کے اعمال کیا ہیں۔ دراصل احکام عبودیت پانچ ہیں واجب، مستحب، حرام، مکروہ اور مباح۔ قلب کے واجبات دو قسم کے ہیں اتفاقی اور اختلافی، اتفاقی واجبات ہیں اخلاص، توکل، محبت، صبر، انابت، خوف، حیا، تصدیق جازم، عبادات میں نیت قلب کے ان اعمال کے واجب ہونے پر پوری امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ ایسے ہی قلب کے محرمات بھی ہیں مثلاً کبر، ریا، عجب، حسد، غفلت، نفاق، اللہ کی رحمت سے مایوسی، اللہ کی تدبیر سے بے اندیشہ ہونا۔ اہل ایمان کی تکلیف پر شادمانی اور ان میں برائی کے رواج کو پسند کرنا۔ حب دنیا حرص، جاہلی عصبیت، ان کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ آیت میں **مَا فِیْٓ اَنْفُسِكُمْ** میں قلب کے یہی رذائل مقصود ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ان رذائل کا اظہار کر دیا چھپا کر کرو اللہ حساب لے گا۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اسی کو ترجیح دی ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

> اگر تم ظاہر کرو اس چیز کو جو تمہارے جی میں ہے یا پوشیدہ کرو، یعنی رذائل کو مثلاً نفاق، ریاکاری، عصبیت، حب دنیا، غصہ، کبر، خود پسندی، حرص، ترک توکل، بے صبری، حسد اور کینہ اور اس جیسے رذائل اللہ روز قیامت تم سے حساب لے گا۔

---

[1] معارف م ش

اسلام میں کچھ عبادات ایسی ہیں جن کا تمام تر تعلق قلبی احوال اور نفس کی اندرونی کیفیتوں سے ہے۔ اگرچہ قرآن کے نزدیک نیکی کا ہر کام جو خدا کی رضاء کے لئے ہو عبادت ہے۔ اس لئے تمام امور خیر خواہ وہ جسمانی ہوں اور یا قلبی ہوں عبادات کے اندر داخل ہیں۔ فقہانے صرف جسمانی عبادات سے بحث کی ہے لیکن صوفیائے کرام نے جسمانی و مالی عبادات کے ساتھ قلبی عبادات کو بھی شامل کر لیا ہے۔ اصل یہ ہے کہ فقہانے اپنا فرض منصب صرف جسمانی اور مالی فریضوں تک محدود رکھا ہے اور صوفیہ نے ان سارے فریضوں کو یکجا کیا ہے جن سے اسلام نے انسان کے قلب و روح کی درستی کا کام لیا ہے۔ معالم القرآن نہ تو فقہ کی کوئی کتاب ہے اور نہ تصوف کی اس کا مقصود ان فرائض کا بتانا ہے جن کی تاکید و توصیف قرآن نے کی ہے اور اسی سے ہم کو اسلام میں ان کی اہمیت کا پتہ چلتا ہے۔

اس قسم کے چند فرائض جن کا مرتبہ عبادات پنجگانہ کے بعد قرآن پاک میں سب سے زیادہ نظر آتا ہے تقویٰ، اخلاص، توکل، صبر اور شکر ہیں۔ یہ وہ فرائض ہیں جن کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور یہ وہ فرائضِ قلبی ہیں جو اسلام کی رُوح اور ہمارے تمام اعمال کا اصلی جوہر ہیں جن کے الگ کر دینے سے وہ تمام عبادات بھی جن پر اسلام نے اس قدر زور دیا ہے جسدِ بے رُوح بن جاتے ہیں۔ یہ بات گو یہاں بے محل ہے مگر کہنے کے قابل ہے کہ فقہ و تصوف کی ایک دوسرے سے علیحدگی نے ایک طرف عبادات کو خشک و بے رُوح اور دوسری طرف اعمال تصوف کو آزاد اور بے قید کر دیا ہے۔

۸۵۲ ۔ اور پھر یہ اسی کے اختیار میں ہے کہ جسے چاہے بخش دے اور جسے چاہے عذاب دے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ اللہ کے اختیار ناطق کا بیان ہے اس کو کسی قانون نے باندھ نہیں رکھا ہے کہ اس کے مطابق عمل کرنے پر وہ مجبور ہو بلکہ وہ مالک و مختار ہے سزا دینے اور معاف کرنے کے کل اختیارات اس کو حاصل ہیں۔[1]

اصل زور اس پر ہے کہ اللہ کی مشیت میں کوئی مزاحمت کرنے والا نہیں ہے اور مقصود اس سے شرک کی نفی ہے۔ لوگوں نے اللہ کی مشیت کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کر لیا تھا قرآن نے اس خیال کی سختی سے تردید کی اور بجا۔ بجا اس حقیقت کو واضح کیا کہ مشیتِ الٰہی کے علاوہ کوئی اور مشیت نہیں ہے۔ تمام دوسری مشیتیں اس کی تابع اور ماتحت ہیں اور اس کے ساتھ اس میں یہ بھی بتانا ہے کہ اللہ بحاظ پر قانون کی حکمرانی نہیں بلکہ قانون پر اس کی حکومت ہے وہ جو چاہے کرے اس سے پوچھنے والا

---

[1] تفہیم القرآن

والا کوئی نہیں ہے
صحیح بخاری و مسلم، ترمذی میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:
اگر مومن کو معلوم ہو کہ اللہ کے پاس کتنا عقاب ہے تو وہ جنت سے مایوس ہو جائے۔
اور اگر کافر کو یہ معلوم ہو کہ اس کی رحمت کتنی وسیع ہے تو وہ بھی جنت سے ناامید نہ ہو۔ شیخ سعدی نے غالباً اسی حقیقت کو ان دو شعروں میں ادا کیا ہے۔

بہ تہدید اگر برکشد تیغ حکم بہ مانند کرو بیاں صم و بکم
دگر در دہد یک صلائے کرم عزازیل گوید نصیبے برم

اسی آیت میں اسی کو یغفر لمن یشاء و یعذب من یشاء سے تعبیر کیا ہے یعنی جو چاہے کر سکتا ہے لیکن اس کی چاہت جیسا کہ اس نے سورۃ انعام رکوع ۱۵ میں بتایا ہے اس کی وسیع حکمت و مصلحت پر مبنی ہے وہ جو چاہے کر سکتا ہے مگر کرتا وہی ہے جو اس کی حکمت اور مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے۔

آمَنَ الرَّسُولُ بِمَآ أُنزِلَ إِلَيْهِ مِن رَّبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ۚ كُلٌّ آمَنَ
بِاللَّهِ وَمَلَٰٓئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ
مِّن رُّسُلِهِ ۚ وَقَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا ۖ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا وَ
إِلَيْكَ الْمَصِيرُ ﴿۲۸۵﴾

رسُول اُس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اُس کے رب کی طرف سے اُس پر نازل ہوئی ہے اور جو لوگ اس رسُول کو ماننے والے ہیں انہوں نے بھی اس ہدایت کو قبول کیا ہے۔ یہ سب اللہ، اُس کے فرشتوں اور اُس کی کتابوں اور اس کے رسُولوں کو یہ کہہ کر مانتے ہیں کہ ہم اللہ کے رسُولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔ اور اُن ہی کا کہنا ہے کہ خداوندا ہم نے تیرا حکم سنا ہے اور ہم نے تیرے احکام کے سامنے سر اطاعت جھکا دیا۔ ہم تیری مغفرت کے طالب ہیں، پروردگارا ہمیں تیری ہی طرف بالآخر لوٹنا ہے۔

سُورت کا خاتمہ

یہ خاتمہ کلام ہے اس لئے جس طرح سورت کا آغاز دین کی بنیادی تعلیمات سے کیا گیا تھا۔ اسی طرح

سورت کو ختم کرتے ہوئے بھی ان تمام اصولی امور کو بیان کر دیا گیا ہے جن پر دینِ اسلام کی اساس ہے۔ سورت کے آغاز میں متقین کا چہرہ پیش کیا گیا تھا کہ وہ غیب پر ایمان رکھتے ہیں اور ما انزل الیک اور ما انزل من قبلک سب کی بلا تفریق تصدیق کرتے ہیں۔ اور آخرت کا خاص طور پر یقین رکھتے ہیں اور عباداتِ بدنیہ مالیہ کو دل و جان سے بجا لاتے ہیں۔ اب خاتمہ میں پھر انہی متقین کا ذکر ہے۔ ان کے ایمان، ان کی والہانہ طاعت اور ان کی دعائی سرشاریوں کا تذکرہ کیا ہے۔ آغاز سورت میں ایمان بالغیب کا اجمالی ذکر تھا۔ یہاں اس غیب کی جس پر پرہیزگاروں کا یہ گروہ محض رسول کی صداقت کے اعتماد پر ایمان لایا تھا تفسیر فرمادی کہ غیب سے اللہ سبحانہٗ، اس کے فرشتے، اس کے نازل فرمودہ صحیفے اور کتابیں اور تمام انبیاء مراد ہیں اور قالوا سمعنا واطعنا گویا یقیمون الصلوٰۃ ومما رزقنٰھم ینفقون کی تفسیر ہے۔ اگر آپ کو خاتمہ بقرہ کا عظمت کا کچھ اندازہ کرنا ہو تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد پڑھیئے کہ:

جس شخص نے رات کو یہ دو آیتیں پڑھ لیں تو یہ اس کے لئے کافی ہیں۔ فاروق اعظمؓ اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ کوئی آدمی جسے کچھ بھی عقل ہو وہ سورہ بقرہ کی ان دو آیتوں کو پڑھے بغیر نہ سوئے گا۔

ایمان میں صحابہ کرام کا مقام

۸۵۳۔ رسول اس ہدایت پر ایمان لایا ہے جو اس کے رب کی جانب سے اس پر نازل کی گئی اور جو لوگ اس رسول کو ماننے والے ہیں۔ انہوں نے بھی اس نازل شدہ ہدایت کو قبول کیا ہے۔ انسان کے تمام افعال، اعمال اور حرکات کا محور اس کے خیالات ہیں۔ یہی اس کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ انہی اصولی خیالات کو ایمان کہتے ہیں۔ یہی وہ نقطہ ہے جس سے انسانی عمل کا ہر خط نکلتا ہے اور اس کے دائرۂ حیات کا ہر خط اسی پر جا کر ختم ہو جاتا ہے۔ ایمان کا تعلق قلب سے ہے۔ پہلی آیت میں اعمال قلبیہ کے بارے میں ایک قانون بتایا گیا تھا۔ اسی کی مناسبت سے یہاں ایمان کا ذکر کیا ہے کیونکہ ایمان بھی قلب کا ایک عمل ہے۔

قلب کی تین کیفیتیں

قرآن حکیم نے قلب کی تین کیفیتیں بیان کی ہیں۔ سب سے پہلے قلب سلیم دوسرا اس کے

میں قلب آثم (گنہ گار دل) اور تیسرا قلب منیب ، رجوع ہونے والا دل ، ہمارے اعمال کا محرک ہمارے اس دل کا ارادہ و نیت ہے اسی بھاپ کی طاقت سے اس مشین کا ہر پرزہ چلتا ہے ۔

آج کل علم نفسیات نے اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کی قلبی اصلاح مقدم ہے اس کے لئے قرآن نے ایمان کا نسخہ تجویز کیا ہے ۔ قرآن نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قابلِ قبول نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادے اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسن عمل کا دارو مدار ہے ۔ غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے اور چونکہ یہ قلب کا عمل ہے اس لئے یہاں خاص طور پر قلبی اعمال کے ذکر میں اس کا تذکرہ کیا ہے ۔

یہاں خاص طور پر سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس فقرے میں اوّلاً ایمانِ رسول کو پیش کیا ہے ۔ اور ایمانِ رسول کے ساتھ صحابہ کے ایمان کا تذکرہ کیا ہے ۔ اس لئے معلوم ہوتا ہے کہ :

اس فقرے کے ذریعے صحابہ کے ایمان کی مدح مقصود ہے لیکن اس مدح کو قوی تر بنانے کے لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی ذکر کیا ہے جس میں اشارہ ہے کہ جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کامل الایمان ہونا بلا شبہ یقینی ہے ایسے ہی صحابہ کرام کا ایمان بھی کامل ہونے کی وجہ سے اس قابل ہے کہ ایمانِ رسول میں اس کا ذکر کیا ہے اگرچہ دونوں میں کامل اور اکمل کی نسبت ہے [1]

پہلے پورا جملہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر میں لایا گیا اس کے بعد مومنین کے ایمان کا علیحدہ تذکرہ کیا گیا ۔ اس میں اشارہ ہے کہ اگرچہ نفس ایمان میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور سب اہلِ ایمان شریک ہیں لیکن درجات ایمان کے اعتبار سے دونوں میں فرق ہے ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایمان مشاہدہ اور سماع کی بنا پر ہے اور دوسرے مسلمانوں کا ایمان بالغیب ہے [2]

اور حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں ۔

وصفِ ایمانی آپ میں بالذات اور مومنین میں بالعرض ہے ، آپ ایمان کے حق میں مومنین کے لئے بمنزلہ والد معنوی ہیں یعنی اوروں کا ایمان آپ کے ایمان سے پیدا ہوا ہے ، آپ کا ایمان صحابہ کے ایمان کی اصل ہے ۔ اوروں کا آپ کے ایمان کی نسل ۔

(تحذیر)

---

[1] بیان القرآن [2] معارف القرآن م ش

غالباً اسی کی طرف انا اول المومنین میں اشارہ ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میرا ذوق یہی کہتا ہے کہ اگر ایمان ایک وصف ہے تو وصف کے لئے ایک موصوف بالذات کا ہونا ضروری ہے اور باقی بالعرض۔ جیسے وجود کا موصوف ذاتی اللہ سبحانہٗ ہے باقی ممکنات اور کائنات کا وجود سب عرضی ہے۔ اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایمان کو سمجھئے کہ آپ کی ذات گرامی صفتِ ایمان سے ذاتی طور پر موصوف ہے اور آپ کے علاوہ باقی سب میں وصفِ ایمان عرضی ہے سب کا ایمان آپ کا فیض ہے لیکن آپ کا ایمان کسی اور کا فیض نہیں آپ پر ہر سلسلہ ایمان ختم ہو جاتا ہے۔

حقائقِ ایمانی کا خلاصہ

۴۸۵۔ یہ سب اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں کو یہ کہہ کر مانتے ہیں کہ ہم رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔ اس آیت میں تفصیلات سے قطع نظر اسلام کے عقائد اور اسلامی طرزِ عمل کا خلاصہ بیان کر دیا گیا ہے اور وہ یہ ہے: اللہ کو، اس کے فرشتوں کو اور اس کی کتابوں کو ماننا، اس کے تمام رسولوں کو تسلیم کرنا بغیر اس کے کہ ان کے درمیان فرق کیا جائے اور اس امر کو تسلیم کرنا کہ آخر کار ہمیں اس کے حضور میں حاضر ہونا ہے۔ اس آخری بات کو والیک المصیر میں ظاہر کیا گیا ہے۔ یہ پانچ امور اسلام کے بنیادی عقائد ہیں۔ ان عقائد کو قبول کرنے کے بعد ایک مسلمان کے لئے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ اللہ کی جانب سے جو حکم بھی اسے پہنچے اس کے لئے سراپا طاعت ہو جائے اور کہے سمعنا واطعنا اور طاعت کی ساری سرشاریوں کے باوجود اپنے حسنِ عمل پر غرہ نہ کرے بلکہ یوں کہے غفرانک ربنا اے ہمارے پروردگار معاف کر دے۔

یہ تمام وہ حقائق ہیں جن پر دل سے یقین کرنا اور زبان سے ان کا اقرار کرنا ضروری ہے ان کے بغیر خالص عمل کا وجود نہیں ہو سکتا۔

اللہ پر ایمان

اللہ تعالیٰ پر ایمان کہ وہ اس دنیا کا تنہا خالق اور مالک ہے اور ہر ظاہر و باطن سے آگاہ ہے تاکہ وہ بھی ہمارے کاموں کا قبلہ مقصود قرار پا سکے اسی کی رضا جوئی اور اسی کی مرضی کی تعمیل ہمارے اعمال کی تنہا غرض و غایت ہو۔ ہم جلوت خلوت میں بھی گناہوں اور برائیوں سے بچ سکیں، اور ہر نیکی کو اس لئے کریں اور ہر برائی سے اس لئے بچیں کہ یہی ہمارے خالق کا حکم اور یہی اس کی مرضی ہے "اس

طرح ہمارے اعمال ناپاک اغراض اور ناجائز خواہشوں سے مبرا ہو کر خالص ہو سکیں۔ اور جس طرح ہمارے جسمانی اعضاء گناہوں سے پاک ہوں، ہمارا دل بھی ناپاک خیالات اور ہوا و ہوس کی آمیزش سے پاک ہو اور اس کے احکام اور اس پیغام کی سچائی پر دل سے ایسا یقین ہو کہ ہمارے ناپاک جذبات، ہمارے غلط استدلالات، ہماری گمراہ خواہشیں بھی اس یقین میں شک و تذبذب پیدا نہ کر سکیں۔

خدا کے فرشتوں پر ایمان

خدا کے فرشتوں پر ایمان لانا واجب ہے کہ وہ خدا اور اس کے رسولوں کے درمیان قاصد اور پیغمبر ہیں۔ مادیت اور روحانیت کے مابین واسطہ ہیں، مخلوقات کو قانونِ الٰہی کے مطابق چلاتے اور ہمارے افعال و اقوال کے ایک ایک حرف کو ہر دم اور ہر لحظہ ضبط کرتے جاتے ہیں تاکہ ہم کو ان کا اچھا یا برا معاوضہ مل سکے۔

قرآن حکیم نے جو فرشتوں کے ایمان پر زور دیا ہے۔ اس کا مقصد شرک کی اس خاص قسم یعنی دیوتا پرستی کا استیصال ہے۔ فرشتے گو نوری ہوتے ہیں، معصوم ہوتے ہیں لیکن بہرحال خالق کائنات کے سامنے انسان ہی کی طرح ایک عاجز و بے بس مخلوق ہوتی ہے۔ اللہ کے ساتھ ان کی ذات یا صفات کو مدغم کر دینا انتہائی حماقت ہے۔

فرشتوں کے متعلق ایک شبہ

فرشتوں کے وجود پر یہ شبہ کہ اگر وہ موجود ہوتے تو نظر کیوں نہیں آتے سخت جاہلانہ شبہ ہے دنیا میں کتنی چیزیں ہیں جو باوجود موجود ہونے کے نظر نہیں آتی ہیں۔ کیا زمانہ حال کی خورد بینوں کی ایجاد سے پہلے کسی نے پانی میں، ہوا میں اور خون کے قطرے قطرے میں وہ جراثیم دیکھے تھے جن کو خورد بین سے آج آنکھ دیکھ سکتی ہے اور کیا کسی آلہ سے بھی ہم اپنی روح کو دیکھ پاتے ہیں تو جس طرح ہماری آنکھ خود اپنی روح کو دیکھنے سے اور بغیر خورد بین کے پانی وغیرہ کے جراثیم کو دیکھنے سے عاجز ہے۔ اسی طرح فرشتوں کو دیکھنے سے بھی وہ قاصر ہے۔ اور پھر کیا اس کی کوئی دلیل ہے کہ جس چیز کو ہم اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتے وہ موجود نہیں ہو سکتی! کیا ہماری آنکھوں اور ہمارے حواس نے کل موجودات کا احاطہ کر لیا ہے۔ ایسی بات اس زمانہ میں جب کہ روز بروز نئے نئے انکشافات ہو رہے ہیں کوئی احمق ہی کہہ سکتا ہے۔ دراصل انسان کا علم اور اس کے علمی ذرائع بہت ہی ناقص اور محدود ہیں۔

اللہ کی کتابوں پر ایمان

اللہ سبحانہٗ کے احکام و ہدایات رسُولوں کے ذریعے انسانوں کو پہنچائے گئے ان کو دور دراز ملکوں اور آئندہ نسلوں تک پہنچانے کے لئے ضروری ہوا کہ وہ تحریری شکلوں یعنی کتابوں اور صحیفوں میں لفظ آواز سے مرکب ہو کر ہمارے سینوں میں محفوظ رہیں اس لئے خدا کی کتابوں اور صحیفوں کی صداقت پر اور جو کچھ ان میں ہے اس کی سچائی پر ایمان لانا ضروری ہے۔ ورنہ رسُولوں کے بعد خدا کے احکام اور ہدایتوں کے جاننے کا ذریعہ مسدود ہو جائے اور ہمارے لئے نیکی و بدی کی تمیز کا کوئی ایسا معیار باقی نہ رہے جس پر تمام ادنیٰ و اعلیٰ، جاہل و عالم، شاہ و گدا سب متفق ہو سکیں۔

اللہ کی کتابوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ یقین کیا جائے کہ اللہ سبحانہٗ نے اپنے رسُولوں کے ذریعے وقتاً فوقتاً ہدایت نامے بھیجے ان میں سب سے آخر اور سب کا خاتم قرآن حکیم ہے جو پہلی سب کتابوں کا مصدق اور مہیمن ہے۔ گویا یہ تمام آسمانی کتابوں کے ضروری مضامین پر حاوی اور سب سے مستغنی کرنے والا خدا کا آخری کلام ہے اور چونکہ وہ کتابیں اب محفوظ نہیں اسلئے اب صرف یہی کتاب ہدایت ہے جو سب کے قائمقام اور سب کی مکمل ہے اور زمانہ آخر تک اس کی حفاظت کی ذمّہ داری خود اللہ سبحانہٗ نے لی ہے۔

اللہ کے رسُولوں پر ایمان

اللہ سبحانہٗ کے رسُولوں پر بھی ایمان لانا ضروری ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے احکام، ہدایات اور اس کی مرضی کا علم ان ہی کے واسطہ سے انسان کو ہوا ہے۔ اگر ان کی صداقت، سچائی اور راست بازی کوئی تسلیم نہ کرے تو پیغامِ ربانی اور احکامِ الٰہی کی صداقت اور سچائی بھی مشکوک و مشتبہ ہو جائے اور انسانوں کے سامنے نیکی، نزاہت اور معصومیت کا کوئی نمونہ موجود نہ رہے جو انسانوں کے قوائے عمل کی تحریک کا باعث بن سکے۔ پھر اچھے اور بُرے، صحیح اور غلط کاموں کے درمیان ہماری عقل کے سوا جو ہمارے جذبات کی محکوم ہے کوئی اور چیز ہمارے سامنے ہماری رہنمائی کے لئے نہیں ہوگی۔

اللہ کے رسُولوں پر ایمان لانا یہ ہے کہ یقین کیا جائے کہ اللہ سبحانہٗ نے اپنے بندوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لئے وقتاً فوقتاً اور مختلف علاقوں میں اپنے برگزیدہ بندوں کو اپنی ہدایت اور رضامندی کا دستور دے کر بھیجا ہے۔ اور انہوں نے پوری امانت و دیانت سے خدا کا وہ پیغام بندوں تک پہنچا دیا اور لوگوں کو راہِ راست پر لانے کی پوری کوشش کی۔ یہ سب پیغمبر اللہ کے برگزیدہ اور صادق بندے

تھے۔ ان سب کی تصدیق کرنا اور بحیثیتِ پیغمبران کا پورا پورا احترام کرنا ایمان کے شرائط میں سے ہے۔

تفریق بین الرسل

۸۵۵ - ہم اللہ کے رسولوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کرتے۔ یعنی یہ نہیں کہ بعض کے قائل ہوں اور بعض کے منکر بلکہ سب کو برحق سمجھتے ہیں اور سب کے مسلکِ ہدایت پر اللہ کی طرف سے ہونے پر یقین رکھتے ہیں۔ یہ مقولہ اہلِ ایمان کا ہے، یہود کی طرح نہیں بجز اپنی نسل یعنی اسرائیلی انبیاء کے اور کسی کو نہ مانیں اور ان میں سے بھی جس کا جی چاہے انکار کر دیں اور نہ عیسائیوں کی طرح کہ ایک اسرائیلی نبی کے ماننے میں تو اس قدر حد سے گزر جائیں کہ پیغمبری سے اٹھا کر الوہیت کے مرتبہ تک پہنچا دیں اور اسماعیلی شاخ سے پیغمبری پانے والے سے عداوت رکھیں۔ انگریزوں میں ایک مشہور مؤرخ گبن ہوا ہے۔ قرآن حکیم اس کے خیال میں کلامِ الٰہی نہیں بلکہ کلامِ محمدی ہے اس کے باوجود وہ اس آیت کی وسعت پر حیرانی سے کہتا ہے:

> محمد کی وسیع المشربی نے اپنے پیشروؤں کے لئے بھی وہی درجہ رکھا جو خود اپنے لئے اور ہبوطِ آدم سے لیکر نزولِ قرآن تک سلسلہ وحی کو قائم رکھا۔[1] (تاریخ زوالِ رومن امپائر)

اس پر اجمالی بحث پارہ اول میں ہو چکی اور تفصیل کیلئے پارہ ششم کا انتظار فرمایئے۔

آخرت کی زندگی پر ایمان

۸۵۶ - ان کا کہنا ہے کہ خداوندا ہم نے تیرا حکم سنا ہے اور ہم نے تیرے احکام کے سامنے سرِ اطاعت جھکا دیا۔ ہم تیری مغفرت کے طالب ہیں۔ پروردگارا ہمیں بالآخر تیری ہی طرف پلٹنا ہے۔ اعمال کی بازپرس اور جوابدہی کا خطرہ نہ ہو اور اس کے مطابق جزا اور سزا کا خیال نہ ہو تو دنیوی قوانین کے باوجود دنیا کے انسانیت سراپا درندگی بن جائے۔ یہی وہ عقیدہ ہے جو انسانوں کو جلوت اور خلوت میں انکی ذمہ داری محسوس کراتا ہے اسلئے روزِ جزا اور یومِ آخرت پر ایمان رکھے بغیر انسانیت کی صلاح و فلاح ناممکن ہے اسی لئے قرآن نے اس پر بے حد زور دیا ہے بلکہ وحی کا بیشتر حصہ اسی کی تبلیغ و تلقین پر مشتمل ہے۔ آخرت پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس حقیقت کا یقین کیا جائے کہ یہ دنیا ایک دن قطعی طور پر فنا کر دی جائے گی اور اسکے بعد اللہ تعالیٰ اپنی خاص قدرت سے پھر سارے مردوں کو زندہ کرے گا اور یہاں جس نے جیسا کیا اسکے مطابق جزا ملے گی۔

[1] ماجدی

لَا يُكَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا ۭ لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا مَا اكْتَسَبَتْ ۭ
رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَآ
اِصْرًا كَمَا حَمَلْتَهٗ عَلَى الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِنَا ۚ رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا
طَاقَةَ لَنَا بِهٖ ۚ وَاعْفُ عَنَّا ۟ وَاغْفِرْ لَنَا ۟ وَارْحَمْنَا ۟ اَنْتَ مَوْلٰىنَا
فَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ ع رکوع

اللہ کسی جان پر اس کی گنجائش سے زیادہ ذمہ داری نہیں[۸۵۷] ڈالتا ہر جان کے لئے وہ ہی ہے جیسی کچھ اُس نے کمائی کی ہے جو کچھ اُس کو پاتا ہے وہ بھی اس کی کمائی ہے اور جس کے لئے اسے جوابدہ ہونا ہے وہ بھی اس کی کمائی ہے[۸۵۸]۔ اہلِ ایمان کی پکار تو یہ ہوتی ہے اے ہمارے پروردگار اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو اس کے لئے ہماری گرفت نہ کیجیو[۸۵۹]۔ خداوندا اور ہم پر بندھنوں اور گرفتاری کا بوجھ نہ ڈال جیسا کہ ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں[۸۶۰]۔ خداوندا اور ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوائیو جس کے اٹھانے کی ہم ناتوانوں میں سکت نہ ہو[۸۶۱]۔ ہم کو معاف کر

دے اور ہماری پردہ پوشی فرما اور ہم پر رحم فرما، تو ہی ہمارا آقا ہے بس ان لوگوں پر مقابلے میں جو کافر ہیں ہماری مدد فرما۔[۸۶۲]

اللہ کا قانونِ محاسبہ

دراصل یہ اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ آیتِ ایمان سے پہلے آیت وان تبدوا مافی انفسکم او تخفوہ یحاسبکم بہ اللہ ہے جب یہ بات بتائی گئی کہ تمہارے دل میں جو کچھ بھی ہوگا خواہ اسے ظاہر کرو یا اسے پوشیدہ کرو اللہ اس کا تم سے حساب لے گا۔ آیت کا منطوق تو قلبی اعمال ہیں جیسا کہ پہلے پڑھ چکے ہو لیکن الفاظِ قرآن چونکہ عام تھے۔ ان کے عموم سے یہ شبہ ہوا کہ انسان کے دل میں غیر اختیاری طور پر جو خیالات آتے رہتے ہیں، جو خواطر اور ہواجس کے درجے کے ہیں کیا ان پر بھی گرفت ہوگی اور ان کا بھی حساب ہوگا۔ کچھ اس خیال سے گھبرا اُٹھے اور بارگاہِ نبوت میں عرض کیا کہ یارسول اللہ! اب تک تو ہم یہ سمجھے ہوئے تھے کہ ہم جو کام اپنے ارادے اور اختیار سے کرتے ہیں حساب ان ہی کا ہوگا۔ غیر اختیاری خیالات جو دل میں آتے ہیں ان کا حساب نہ ہوگا۔ اس پر حضور انور نے فرمایا قولوا سمعنا واطعنا یعنی اشکال محسوس ہو یا دقت لیکن تعمیلِ ارشاد میں ادنیٰ توقف بھی نہ کرو اور سمعنا واطعنا کہو۔ آپ کے ارشاد کی تعمیل میں انشراحِ صدر کے ساتھ یہ کلمات بے ساختہ زبان پر جاری ہوگئے۔ اللہ سبحانہٗ کو صحابہ کے منہ سے نکلے ہوئے یہ بول اتنے پسند آئے کہ قیامت تک کے لئے قرآن بن گئے اور صحابہ کے ایمان کی مدح فرمائی اور شبہ کے ازالہ کے لئے قانونِ محاسبہ کی اہم دفعہ ارشاد ہوئی کہ مقدور سے زیادہ کسی کو تکلیف نہیں دی جاتی۔ اب اگر دل میں گناہ کا خیال آئے اور اس پر عمل نہ کرے تو کچھ گناہ نہیں۔ اور بھول چوک بھی معاف ہے غرض صاف فرمادیا کہ جن باتوں سے بچنا طاقت سے باہر ہے جیسے بُرے کام کا خیال آنا، اس پر مواخذہ نہیں ہاں جو باتیں بندے کے ارادے اور اختیار میں ہیں ان پر مواخذہ ہوگا۔ اس سے شبہ دور ہوگیا۔

قانونِ محاسبہ کی دفعہ اوّل

۸۵۷۔ اللہ کسی جان پر اس کی گنجائش سے زیادہ ذمہ داری نہیں ڈالتا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کسی

شخص کو اس کی طاقت سے زیادہ کام کا حکم نہیں دیتے اس لئے غیر اختیاری طور پر جو خیالات اور وسوسے دل میں آجائیں اور پھر ان پر کوئی عمل نہ ہو وہ سب اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاف ہیں۔ حساب اور مواخذہ صرف ان افعال پر ہوگا جو اختیار اور ارادے سے کئے جائیں[1] یہ اللہ کے قانون محاسبہ کی پہلی دفعہ ہے کہ اللہ کے ہاں انسان کی ذمہ داری اس کی مقدرت کے لحاظ سے ہے۔ ایسا ہرگز نہ ہوگا کہ بندہ ایک کام کرنے کی قدرت نہ رکھتا ہو اور اللہ اس سے باز پرس کرے کہ تو نے فلاں کام کیوں نہیں کیا۔ یا ایک چیز سے بچنا فی الحقیقت اس کی قدرت سے باہر ہے۔ اور اللہ اس پر مواخذہ کرے کہ تو نے اس سے پرہیز کیوں نہ کیا لیکن اپنی مقدرت کا فیصلہ کرنا خود انسان کا کام نہیں ہے۔ اس کا اللہ ہی فیصلہ کر سکتا ہے کہ ایک شخص فی الحقیقت کس چیز کی قدرت رکھتا تھا اور کس چیز کی قدرت نہ رکھتا تھا[2]

گویا یہ ایک قاعدہ کلیہ ہے کہ امر غیر اختیاری کا نہ انسان مکلف ہے اور نہ اس پر مواخذہ ہے۔ اور جس طرح اس قاعدے میں امور قلبیہ غیر اختیاریہ داخل ہیں۔ اسی طرح افعال ظاہریہ غیر اختیاریہ بھی داخل ہیں جیسے وہ افعال جو خطاء اور نسیاناً صادر ہو جائیں کیونکہ باوجود اہتمام کے یاد نہ رہنا بھی اختیار سے خارج۔ لہٰذا اس قاعدے میں دونوں داخل ہیں[3]

اس قاعدے کی مزید وضاحت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں فرمائی ہے جو صحیح مسلم میں بحوالہ ابوہریرہ آئی ہے۔

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ تعالیٰ نے میری امت کے حق میں وہ وساوس جو صرف ان کے دلوں میں گزریں معاف کر دیئے ہیں جب تک وہ اپنی زبان سے ادا نہ کریں یا عملی جامہ نہ پہنائیں۔

جو وساوس اپنے اختیار کے بغیر پیدا ہوں اور بلا توقف دل سے نکل جائیں یا کچھ ٹھہریں مگر اس کو عملی جامہ پہنانے کی دل میں فکر نہ ہو یا کچھ فکر تو پیدا ہو مگر کسی ایک جانب میلان خاطر نہ ہو۔ یہ سب اقسام اس امت کے حق میں معاف کر دیئے گئے ہیں، ہاں اگر کسی جانب رجحان پیدا ہو گیا ہو تو اگر یہ رجحان خیر کی طرف ہے تو اس پر اجر ہے اور اگر برائی کی جانب ہے تو اس پر کوئی گرفت نہیں۔ اور اگر یہ خیال پختہ ہو کر عزم کی صورت اختیار کر گیا ہے تو پھر نیکی میں اجر ہے اور بدی کی صورت میں مواخذہ کا امکان ہے۔ ارشاد نبوت میں جس مرتبہ کی معافی کا اعلان کیا گیا ہے وہ حدیث النفس ہے عزم نہیں

---

[1] معارف القرآن م ش [2] تفہیم القرآن [3] بیان القرآن

یہ یاد رکھنا چاہیے کہ یہاں وساوس و خواطر کی وہی قسم مراد ہے جو کسی قول یا فعل کے ابتدائی مراحل میں پیش آتی ہے۔ عقائد فاسدہ یا اخلاق رذیلہ جن کا تعلق صرف قلب سے ہے جوارح سے نہیں وہ معاف نہیں جیسا کہ پہلے تفصیل پڑھ چکے ہیں۔ لہٰذا اگر اللہ کی وحدانیت، رسول کی رسالت میں وساوس داخل ہو کر تردد کی حد تک پہنچ گئے ہیں تو قابلِ مواخذہ ہیں۔ عقائد کے باب میں عزم ہی عزم درکار ہے۔ اسی طرح رذائل، حسد، کینہ، بدگمانی یہ سب اعمالِ قلبیہ ہیں۔ ارشادِ نبوت سے ان کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔[1]

قانونِ محاسبہ کی دفعہ دوم

۸۵۸ - ہر جان کے لئے وہی ہے جیسی کچھ اس نے کمائی کی ہے اور جس کے لئے اسے جزا یا سزا ہوتا ہے وہ بھی اس کی کمائی ہے۔ یعنی انسان کو ثواب بھی اس کام پر ہوتا ہے جو ارادہ سے کرے۔[2]

یہ اللہ کے قانون مجازات کا دوسرا قاعدہ کلیہ ہے۔ ہر آدمی انعام اسی خدمت پر پائے گا جو اس نے خود انجام دی ہو۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک شخص کی خدمات پر دوسرا انعام پائے۔ اور اسی طرح ہر شخص اسی قصور میں پکڑا جائے ہاں یہ ضرور ہے کہ ایک آدمی نے کسی نیک کام کی بنا رکھی ہو اور دنیا میں ہزاروں سال تک اس کام کے اثرات چلتے رہیں اور یہ سب اس کے کارنامے میں لکھے جائیں اور ایک دوسرے شخص نے کسی برائی کی بنا رکھی ہو اور صدیوں تک دنیا میں اس کا اثر جاری رہے اور وہ اس ظالم اوّل کے حساب میں درج ہوتا رہے گا لیکن اچھا یا برا جو کچھ بھی پھل ہوگا۔ اسی کی سعی اور اسی کے کسب کا نتیجہ ہوگا بہر حال یہ ممکن نہیں ہے کہ جس بھلائی یا جس برائی میں آدمی کی نیت اور سعی و عمل کا کوئی حصہ نہ ہو، اس کی جزا یا سزا اسے مل جائے مکافات عمل کوئی قابلِ انتقال چیز نہیں ہے۔[3]

اسی بات کو حضرت مولانا اشرف علی نے علمی انداز میں اس طرح پیش فرمایا ہے۔ یاد رکھو یہاں جو ثواب و عقاب کا مدار کسب و اکتساب پر رکھا مراد اس سے ثواب و عقاب ابتداً ہے نہ بواسطہ تسبب یا ہبہ۔ کیونکہ دوسرے نصوص سے ثابت ہے کہ نیک یا بد کام کے بانی کو آئندہ کرنے والوں کے عمل سے بھی ثواب و عقاب ہوگا اور یہ بھی ثابت ہے کہ طاعت کر کے دوسرے کو ثواب بخش دے تو ثواب ملے گا۔ لیکن دونوں صورتوں میں ثواب و عقاب ابتداءً یعنی بلاواسطہ نہیں بلکہ بواسطہ سبب

---

[1] ترجمان السنہ [2] معارف قرآن [3] تفہیم القرآن

اور بانی بن جانے کے یا بواسطہ ہبہ کر دینے کے ہے۔ لہٰذا اس شبہہ کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ ان صورتوں
میں دوسرے کو ثواب و عقاب کیسے ہوگیا خصوصاً تسبب تو درحقیقت خود بھی اختیاری ہے۔ البتہ ہبہ
کے بعد مل جانا یہ موھوب لہ کا اختیاری نہیں لیکن ابتداءً نہیں[1]

بہرحال ان دو فقروں میں اسلامی قانون کی دو دستوری دفعات بتا دی گئی ہے ایک یہ کہ مدار
تکلیف ارادہ وسعت اور اہلیت ہے۔ غیر ارادی طور پر اگر کوئی کام کیا۔ کوئی بات منہ سے نکل گئی
وہ قابلِ گرفت نہیں ہے۔ وسعت کا مطلب یہ ہے جس کو ہم کر ہی نہیں سکتے۔ الجصاص نے مثال دی
کہ نابینا کو دیکھنے کا مکلّف بنانا، بہرے کو سننے کا، بغیر ٹانگوں والے کو چلنے کا حکم دینا۔ کھڑے ہو کر
نماز پڑھنے پر قادر نہیں ہے نماز میں کھڑے ہونے کا قانونی طور پر ذمّہ دار نہیں ہے۔ شیخ فانی جو روزہ رکھ
نہیں سکتا وہ مکلّف نہیں ہے کیونکہ اللہ سبحانہٗ بندہ کو کوئی حکم ایسا نہیں دیتے جس کو وہ کر ہی نہیں سکتا۔
دوسری دفعہ یہ ہے کہ جزا و سزا کا مدار انسان کا اپنا کسب ہے اپنے اعمال و افعال پر جزا و سزا ہوگی
قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی اس دستوری دفعہ کا ذکر آیا ہے، ہمارے فقہا نے اسلام کی قانون سازی
میں ان دستوری دفعات کو وسیع پیمانے پر استعمال کیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا محل نہیں ہے۔ انشاءاللہ
اپنے مقام پر اس پر سیر حاصل بحث آئے گی۔

نسیان کے دو درجے

۸۵۹۔ اے ہمارے پروردگار اگر ہم سے بھول چوک ہو جائے تو اس کے لئے ہماری گرفت
نہ کیجیو۔ بھول چوک کے لئے اصل دعا میں نسیان اور خطا کے الفاظ استعمال ہوئے، نسیان یہ ہے کہ
آدمی طاعت کی سرشاریوں میں کوئی چیز بھول جائے اور خطا یہ ہے کہ آدمی اپنی ناسمجھی سے کسی کام کو
غلط طور پر کر دے۔ اگرچہ یہ چیزیں اللہ سبحانہٗ کی طرف سے معاف ہیں۔ معاف شدہ چیزوں کی
درخواست بھی بندے کی جانب سے غایت درجہ خشیت کا اظہار ہے لیکن ابوبکر الجصاص نے نسیان
کو بھی دو درجوں میں تقسیم کر دیا ہے۔ ایک یہ کہ انسان کسی کام کو کسی شبہہ یا کسی غلط فہمی کی بنا پر چھوڑ
دے۔ یہ بھول نہیں ہے لیکن اس پر بھی نسیان بولا جاتا ہے اور لغت میں ان معنے کی گنجائش ہے۔
نسوا اللّٰہ فنسیھم میں یہی معنے ہیں۔ نسیان جو یاد کی ضد آتا ہے وہ بلاشبہ فیما من العبد

---

[1] بیان القرآن

دبینا اللہ معاف ہے اور انسان اس کا مکلف نہیں ہے۔ آخرت میں اس کا مواخذہ نہ ہو گا۔ لیکن مواخذہ نہ ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اب حکم کی پابجائی ختم ہو چکی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے مواقع پر حکم کی پابجائی کو ضروری قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے :

نماز کے وقت میں سو جائے یا بھول جائے تو اسے چاہیے کہ جب یاد آئے نماز پڑھے

فقہا کو اس پر اتفاق ہے کہ نماز، روزہ، زکوٰۃ سب کا حکم یہی ہے کہ اس کی یاد آنے پر قضا ضروری ہے۔ فقہائے احناف نے نماز میں بھول کر بات کرنے والے کا بھی یہی حکم بتایا ہے۔ ان کی رائے میں فرائض کے باب میں جان کر کرنے والا اور بھول کر کرنے والا دونوں برابر ہیں۔ اگر بھول کر نماز چھوڑنے کا حکم ادائیگی کی حد تک یکساں ہے تو بھول کر نماز میں بات کرنے اور جان بوجھ کر بات کرنے کا مقام بھی یکساں ہے۔

خطاء نسیان کا سرچشمہ

نیز خطاء نسیان اگرچہ بظاہر غیر اختیاری ہیں اور داخلِ تکلیف نہیں ہیں لیکن من وجہ اختیاری بھی ہیں اس لئے کہ بسا اوقات خطاء و نسیان غفلت، کوتاہی، بے توجہی، بے احتیاطی اور بے پروائی کی بناء پر ہوتی ہے۔ اور بے پروائی، بے توجہی انسان کا اختیاری عمل ہے اس لئے عقلاً اور شرعاً خطاء اور نسیان پر بھی مواخذہ ہو سکتا ہے۔ واقعہ آدم علیہ السلام میں فنسی ولم نجد لہ عزما اس کا موید ہے۔ اور اسی وجہ سے شریعت میں بہت سے مواقع خطا میں دیت اور ضمان کو واجب قرار دیا ہے کیونکہ یہ خطاء انسان کے تساہل اور بے توجہی کے نتیجہ میں ہوئی ہے اور یہ انسان کا فعل اختیاری ہے اس لئے اللہ سبحانہٗ نے یہ دعا سکھلائی ہے کہ اپنی تقصیرات کو پیشِ نظر رکھ کر اس طرح کہو کہ ربنا لا تؤاخذنا ان نسینا او اخطانا

آیتِ قرآنی کا مفہوم بتا رہا ہے کہ خطا و نسیان پر مواخذہ عقلاً و شرعاً ممتنع نہیں ہے یہ امر واقعہ ہے کہ نشہ آور چیزوں کے استعمال سے غیر اختیاری طور پر افعال سرزد ہوتے ہیں مگر عقلاً و شرعاً شراب پینے والا شخص ان افعال کے مواخذہ سے بری نہیں ہے کیونکہ یہ افعال اگرچہ غیر اختیاری ہیں لیکن ان کا سبب اختیاری ہے۔ اس شخص نے اپنے اختیار کے غلط استعمال سے حفاظت کیوں نہیں کی اس لئے یہ قابلِ گرفت ہے۔ نسیان اگرچہ بالذات غیر اختیاری ہے مگر اس کا سبب عموماً اختیاری ہوتا ہے۔ اسی وجہ سے بسا اوقات بھولنے والے کو بے پروائی کا ملزم گردانا جاتا ہے اور خطاء کار کو سہل انگار

بے اختیار کہتے ہیں ۔[1]

اسلامی احکام میں آسانی

۸۶۰ ۔ خداوندا اور ہم پر بندھنوں اور گرفتاریوں کا بوجھ نہ ڈال جیسا کہ ان لوگوں پر ڈالا جو ہم سے پہلے گزر چکے ہیں۔ اصل ارشاد میں اصر آیا ہے ۔ اصر کے معنے بھاری بوجھ، اصل میں اصر کے معنے اس بوجھ کے ہیں جو اپنے اٹھانے والے کو چلنے سے روک دے یہاں مراد تکالیفِ شاقہ ہیں ۔ بعض پہلی امتوں پر احکام شاق تھے یعنی ہم کو تشریعیات میں احکام شاقہ کا مکلف نہ بنا ۔ گویا دعا میں اشارہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے ہمیں ہمارے دین میں تکالیفِ شاقہ کا مکلّف نہیں بنایا ۔ خود ارشادِ باری ہے ۔ ما جعل علیکم فی الدین من حرج احادیث میں اسلام کے سرتاسر آسان اور سہل ہونے کی بشارت دی ہے ۔ مسند احمد اور ادب مفرد میں حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے الدین یسر دین بہت آسان ہے ۔ مسند احمد کی ایک روایت میں ہے تمہارے سب دینوں میں بہتر وہ ہے جو سب میں آسان ہو ۔ دین میں یہ نرمی اور سہولت ملتِ ابراہیمی کی بنیاد و اساس ہے اور اسی بنیاد پر شریعتِ محمدی کی عمارت اٹھائی گئی ہے ۔ اگر اس پر تفصیلی بحث کی جائے تو تقابلِ ادیان پر ایک اجمالی نظر ڈالنا ہو گی ۔ انشاء اللہ العزیز پارہ ششم میں اس کی اجمالی مباحث ہدیہ ناظرین ہوں گے ۔

دعا میں اطاعت کی توضیح

۸۶۱ ۔ خداوندا اور ایسا بوجھ ہم سے نہ اٹھوائیو جسے اٹھانے کی ہم میں ناتوانوں میں سکت نہ ہو، جس کی ہم کو طاقت نہیں کا مطلب یہ نہیں ہے جس کی ہم کو وسعت یعنی جو ہم کر نہیں سکتے کیونکہ یہ تو پہلے آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ بندے کو ایسا حکم نہیں دیتا جس کو وہ کر نہیں سکتا ۔ اس لئے ظاہر ہے کہ اب یہ دعا کہ اے اللہ ہم سے وہ بوجھ نہ اٹھوائیے جس کو ہم اٹھا ہی نہ سکتے ہوں صحیح نہ ہوگی بلکہ اس دعا میں طاقت نہ ہونے کے معنے یہ ہیں جس کو ہم بمشکل اٹھا سکتے ہوں، اسی طرح طالوت کے لشکریوں کا یہ کہنا لا طاقۃ لنا الیوم بجالوت وجنودہ اس کے معنے یہ نہیں کہ ہم مقابلہ ہی نہیں

[1] معارف مولانا محمد ادریس

کر سکتے بلکہ معنے یہ ہیں کہ ہم بمشکل مقابلہ کر سکتے ہیں۔ اطاقت کے یہی معنے لسان العرب اور تاج العروس میں لکھے ہیں۔ جن مفسرین نے آیت میں احکام اور شرائع مراد لئے ہیں۔ ان پیش نظر اطاقت کے یہی معنے ہیں لیکن ان معنے میں ایک قسم کا تکرار ہے کیونکہ اصراً کے بھی یہی معنے ہیں۔ اس لئے اچھا یہ ہے کہ اصر سے مراد احکام شاقہ ہوں اور مالا طاقۃ میں احکام میں کوتاہی پر عقوبت مراد ہو۔ اور مطلب یہ ہے کہ خداوندا اگر تیرے احکام میں ہم سے کوتاہی ہو جائے تو ہمیں ایسی عقوبت کا نشانہ نہ بنا نا جس کی ہم میں طاقت ہی نہ ہو۔

مولانا ادریس نے اسی کو اس طرح پیش فرمایا ہے کہ لا تحمل علینا اصراً تشریعیات کے متعلق تھی ہم کو احکام شاقہ کا مکلّف نہ بنا اور پہلی اُمتوں کی طرح ہم پر سخت احکام نازل نہ فرما۔ اور یہ دوسری دُعا یعنی ولا تحملنا ما لا طاقۃ لنا بہ تکوینیات کے متعلق ہے یعنی تکوینی اور تقدیری طور پر ہم پر ایسی مصیبتیں اور بلائیں نازل نہ فرما جو ہماری طاقت اور قوتِ برداشت سے باہر ہوں۔ تشریعیات اور تکوینیات میں یہ فرق ہے کہ انسان تشریعیات کا مکلّف ہے مگر دُعا کی تعلیم دونوں کے لئے کی گئی۔

۸۶۲ ۔ ہم کو معاف فرما اور ہماری پردہ پوشی فرما اور ہم پر رحم فرما۔ تو ہی ہمارا آقا ہے پس ان لوگوں کے مقابلہ میں جو کافر ہیں ہماری مدد فرما۔ یعنی اسے پروردگار چونکہ ناقابل برداشت مصائب کا سبب یہی ہماری کوتاہیاں ہیں اس لئے ہم تجھ سے درخواست کرتے ہیں کہ تو ہمیں معاف فرما۔ دُنیا و آخرت کی ذلّت سے ہم کو بچا اور عفو و مغفرت کے بعد ہم آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ ہم پر رحم فرما کیونکہ آپ ہی ہمارے آقا اور ولی نعمت ہیں اور ہم آپ کے غلام اور نام لیوا ہیں بس آپ ہماری اپنے دشمنوں کے مقابلے میں مدد فرمایئے یعنی کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرمایئے۔

دُعاؤں کی رُوح

ان دُعاؤں کا مقصود یہ ہے کہ بے شک ہر طرح کا حق حکومت اور استحقاق عبادت آپ کو ہم پر ثابت ہے مگر اسے پروردگار اپنی رحمت و کرم سے ہمارے لئے روا نہ کئے جائیں جن کے بجا لانے میں ہمیں صعوبت اور بھاری مشقت نہ ہو۔ نہ بھول چوک میں ہم پکڑے جائیں نہ مثل پہلی اُمتوں کے ہم پر شدید حکم اتارے جائیں نہ ہماری طاقت سے باہر کوئی حکم ہم پر مقرر ہو۔ اس سہولت پر بھی ہم سے قصور ہو جائے اس سے درگزر فرما اور معاف کر اور ہم پر رحم فرما۔ حدیث میں ہے کہ یہ سب دُعائیں قبول

ہو گئیں اور جب اس دشواری کے بعد جو حضرات صحابہ کو پیش آ چکی تھی اللہ کی رحمت سے آپ ہر دشواری سے امن مل گیا تو اب اتنا اور بھی ہونا چاہیے کہ کفار پر ہم کو غلبہ عنایت فرما ورنہ ان کی طرف سے مختلف دینی، دنیوی ہر طرح کی مزاحمتیں پیش آ کر جس صعوبت سے اللہ اللہ کر کے اللہ کے فضل سے جان بچی تھی کفار کے غلبہ کی حالت میں پھر وہی کھٹکا موجب بے اطمینانی ہو گا[1]

اس دعا کی پوری رُوح سمجھنے کے لئے یہ بات پیشِ نظر رہنی چاہیے کہ یہ آیات ہجرت تقریباً ایک سال پہلے معراج کے موقع پر نازل ہوئی تھیں جبکہ مکہ میں کفر و اسلام کی کشمکش اپنی انتہا کو پہنچ چکی تھی مسلمانوں پر مصائب و مشکلات کے پہاڑ ٹوٹ رہے تھے اور صرف مکہ ہی نہیں، بلکہ سرزمینِ عرب پر کوئی جگہ ایسی نہ تھی جہاں کسی بندہ خدا نے دینِ حق کی پیروی اختیار کی ہو اور اس کے لئے خدا کی سرزمین پر سانس لینا مشکل نہ کر دیا گیا ہو۔ ان حالات میں مسلمانوں کو تلقین کی گئی کہ اپنے مالک سے اس طرح دعا مانگا کرو۔ ظاہر ہے کہ دینے والا جب خود ہی مانگنے کا ڈھنگ بتائے تو ملنے کا یقین آپ سے آپ پیدا ہوتا ہے اس لئے یہ دعا اس وقت مسلمانوں کے لئے غیر معمولی تسکین قلب کی موجب ہوئی۔ ایک طرف ان رُوح فرسا مظالم کو دیکھئے اور دوسری طرف اس دعا کو دیکھئے جس میں دشمنوں کے خلاف کی تلخی کا شائبہ تک نہیں۔ ایک طرف ان حق پرستوں کی خستہ حالی کو دیکھئے اور دوسری طرف ان بلند اور پاکیزہ جذبات کو دیکھئے جن سے یہ دعا لبریز ہے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اس وقت اہلِ ایمان کو کس طرز کی روحانی و اخلاقی تربیت دی جا رہی تھی[2]

پوری سورت کا خلاصہ

۱۔ انسانیت کو اللہ کی عبادت کی دعوت۔

۲۔ انداد اور ہمسر بنانے کی ممانعت۔

۳۔ نبوت اور وحی کا تذکرہ اور قرآن سے اس پر حجت، اور قرآن کے بارے میں پوری انسانیت کو چیلنج۔

۴۔ رسالت کا اثبات اور اس کی تاریخ دین میں توحید کا مقام،

۵۔ طیبات کے استعمال کی اجازت۔

۶۔ عملی زندگی میں عبادات شعائر نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، عمرہ کا ذکر۔

---

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] تفہیم القرآن

۷۔ دین کی برتری کی خاطر قتال اور انفاقِ مال۔
۸۔ فوجداری احکام میں قصاص، اور اخلاقی احکام میں شراب کی حرمت۔
۹۔ دیوانی معاملات میں جوئے اور سود کی حرمت، دین کے احکام کتابت اور شہادت۔
۱۰۔ معاشرت میں یتامیٰ سے معاملہ، نکاح، طلاق، رضاعت اور عدت کے احکام۔
۱۱۔ ادائے امانت کا وجوب اور کتمانِ شہادت کی حرمت۔
۱۲۔ سورت کا خاتمہ اور اللہ کی بارگاہ میں دعا۔

یہ پوری سورت احکام، امثال اور دلائل کا باغ ہے اسی بنا پر اس سورت کو فسطاطِ قرآن کہا گیا ہے۔

الحمدللہ ۴ا ۱۴ صفر المظفر ۱۳۹۵ بوقت گیارہ بج کر ۳۰ منٹ پر مطابق ۲۶ رفروری ۱۹۷۵ء بدھ کے روز سورۂ بقرہ کی تفسیر اپنے علم کی کوتاہی اور بے بضاعتی کے اعتراف کے ساتھ ختم کر رہا ہوں۔
واقعہ یہ ہے کہ جو کچھ عرض کیا گیا ہے یہ محض اللہ سبحانہٗ کی توفیق اور اس کے فضل و رحمت کے سہارے ہوا ہے ورنہ اپنی ذات کی تنک مجھے ایک رکوع کی تفسیر کی بھی توقع نہ تھی۔ اس ناتوانائی کے وقت، اس علمی بے مائگی اور کم ہمتی اور مزاجی نیرنگی کے باوجود اگر یہ کام ہوا ہے تو یہ محض اللہ سبحانہٗ کا فضل اور اس کی بے پایاں عنایت ہے۔

مَعَالِمُ القُرآن

آلِ عمران

(۳)

سورت کا نام

اس سورت میں ایک جگہ آلِ ابراہیم کے ساتھ آلِ عمران کا ذکر آیا ہے اور عمران حضرت موسیٰ وہارون کے والد کا نام ہے اور پھر اسی رکوع میں عمران کا ذکر ہے۔ یہ عمران حضرت مریم کے والد تھے۔ اس لحاظ سے یہودیوں اور عیسائیوں کا سرچشمہ عمران نامی دو شخص ہوئے ایک عمران حضرت موسیٰ کے والد ہیں اور دوسرے عمران حضرت مریم کے والد ہیں۔ حضرت موسیٰ سے یہودیوں کا دینی سلسلہ اور حضرت مریم سے حضرت عیسیٰ کی والدہ ہونے کی حیثیت سے عیسائیوں کا دینی رشتہ قائم ہے۔ بہرحال چونکہ اس سورت میں نمایاں طور پر آلِ عمران کی بزرگی اور اصطفاء کا ذکر آیا ہے اس لئے پوری سورت کا نام آلِ عمران ہے۔

مقامِ نزول

یہ سورت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدنی زندگی میں آپ پر نازل ہوئی۔ اور البقرہ کے بعد نازل ہوئی ہے۔

زمانۂ نزول

بدر کا واقعہ ۲ھ میں اور اُحد کا واقعہ ۳ھ میں پیش آیا اور وفد نجران ۹ھ میں آیا ہے۔ اس لئے سورت کا زمانۂ نزول ۲ھ اور ۹ھ کے درمیان ہے۔ ابتدائی آیات یعنی آیت ۸۳ تک کے بارے میں ابنِ کثیر نے تصریح کی ہے کہ ۹ھ میں نازل ہوئی۔

موضوع

اس سورت کا موضوع بھی البقرہ کی طرح اجتماعی تقویٰ ہے، البقرہ میں منصب امامت کا علمبردار ہونے کی حیثیت سے اُمتہ وسطاً کہا تھا اور اس سورت میں خیر اُمت فرمایا وہاں شہادت علی الناس کو اُمت کا فریضہ بتایا ہے۔ اس سورت میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو اُمت کا فریضہ بنایا ہے۔ البقرہ میں پوری انسانیت کو متقی بننے کا نیز بہدف نسخہ بتایا تھا اور اس سورت میں اہلِ ایمان سے خاص طور پر یہ مطالبہ کیا ہے کہ اتقوا اللہ حق تقاتہ اس سورت میں ان نقاط کی نشاندہی کی

گئی تھی جو اجتماعی زندگی میں تقویٰ کی تباہی کا باعث ہوتے ہیں اور یہودیوں کی تاریخ سے ایسے چیدہ چیدہ واقعات پیش فرمائے ہیں جس سے ان کو اللہ کی نظروں سے گرا دیا اور تقویٰ سے محروم ہو گئے۔ اس آل عمران میں عیسائیوں کی تاریخ سے وہ واقعات پیش فرمائے جن کی بنا پر وہ گمراہ ہو کر تقویٰ سے محروم ہو گئے۔ اسی لئے سورت میں روئے سخن زیادہ اہلِ ایمان کی طرف ہے اور یا اہل کتاب کی طرف۔ اہلِ ایمان کو تقویٰ کی ہدایت دی ہے اور تقویٰ کے خلاف فکری اور اخلاقی کمزوریوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور پچھلی امتوں کے فکری اور اخلاقی زوال کا عبرتناک نقشہ پیش کر کے بتایا ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں میں ان کی طاعت سے بچ کر رہیں۔ اس طرح یہ دراصل سورۂ بقرہ کا تتمہ ہے اور یہ محسوس ہوتا ہے کہ موضوع دونوں کا ایک ہے۔ سورۂ بقرہ کی ابتداء مفلحین و متقین کے ذکر سے کی گئی اور اس سورت کا خاتمہ مفلحین و متقین پر ہوا۔ واتقوا اللہ لعلکم

شانِ نزول آل عمران

یہ سورت اس زمانہ میں نازل ہوئی ہے۔

الف:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ پہنچتے ہی آبادی کے تمام گروہوں کے درمیان صحیفہ کے نام سے ایک معاہدہ کرا دیا تھا جس کا مقصد یہ تھا کہ شہر کے داخلی صلح و امن میں کوئی خلل نہ آئے اور باہر سے کوئی خطرہ ہو تو تمام گروہ مل کر اور متحد ہو کر اس کا مقابلہ کریں۔ اس معاہدے کے اصل فریق اہلِ ایمان اور یہودی تھے۔ جنگِ بدر میں لشکر اور ساز و سامان کی کثرت کے باوجود قریش کی شکست نے یہودیوں کو چونکا دیا۔ اب ان کو نظر آنے لگا کہ اگر اسلامی تنظیمات بے خلش جاری رہیں تو ان کا وہ اقتدار خاک میں مل جائے گا جو پشت ہا پشت سے ان کو ملا ہوا ہے وہ فی الواقع اپنے آپ کو وہاں کے حکمران سمجھتے تھے۔ اس لئے انہوں نے شرارتوں، ایذا رسانیوں اور سازشوں کا جال بچھا دیا مثلاً

۱۔ اوس و خزرج میں تفرقہ ڈال کر خانہ جنگی کی آگ بھڑکانے کی کوشش، آیت ۹۸ سے آیت ۱۰۱ میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

۲۔ اسلام کے خلاف عداوت کے جنون نے ان کو انتہائی پستی میں گرا دیا تھا کہ پیروانِ اسلام کے مقابلے میں مشرکین کو ترجیح دیتے کہ اہل ایمان کی تکلیف سے ان کو خوشی ہوتی تھی۔ آیت ۱۲۰ میں اس طرف اشارہ ہے۔

۳۔ وہ اس کے لئے بھی تیار تھے کہ اسلام کو قبول کریں کچھ عرصہ بعد مرتد ہو جائیں تاکہ اسلام کے وقار پر ضرب کاری لگا سکیں۔ آیت ۷۲، ۷۳ میں اس کا بیان ہے۔

۴۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے خلاف منصوبہ بندیوں میں بھی آپ کو کوئی تامل نہ

تھا یہاں تک کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت گھر سے نکلتے تو اہلِ ایمان کو یہودیوں کے ہاتھوں آپ کی جان کا خطرہ رہتا۔ حضرت طلحہ مرنے لگے تو وصیت کر دی کہ اگر میرا دم رات کے وقت نکل جائے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر نہ کرنا مبادا کہ آپ جنازے تشریف لائیں اور یہودیوں کے ہاتھوں کوئی حادثہ ہو جائے۔

ب بدر کی شکست کے بعد قریش کے دلوں میں انتقام کی آگ بھڑکی اور تمام جزیرۃ العرب کو انہوں نے اس طرف متوجہ کیا کہ مسلمانوں سے کسی نہ کسی طرح انتقام لیا جائے۔ اس پر مزید یہودیوں کی شہ نے قریش کو شیر بنا دیا اور بالآخر بدر کے ایک سال بعد اُحد کا حادثہ پیش آگیا۔ قریش مکہ کی فوج تین ہزار جنگجوؤں پر مشتمل تھی جس میں اہلِ تھامہ اور بنو کنانہ بھی شامل تھے۔ ان میں سات سو زرہ پوش تھے۔ دو سو گھوڑے، تین ہزار اونٹ اور پندرہ عورتیں ساتھ تھیں۔ مسلمانوں کی تعداد اس وقت ایک ہزار تھی جن میں عبداللہ ابن اُبی کے تین سو آدمی بھی شامل تھے۔ فوج میں صرف ایک سو آدمی زرہ پوش تھے۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک ہزار فوجیوں کے ساتھ مقام شوط میں پہنچے تو عبداللہ ابنِ اُبی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر الگ ہو گیا۔ عذر یہ کر دیا کہ میری رائے کے مطابق مدینے کے اندر رہ کر مقابلہ کیوں نہیں کیا گیا گویا اسلامی لشکر کے افراد سات سو رہ گئے۔ گھوڑے صرف دو تھے۔

یہ پہلا موقع ہے کہ جنگ میں تیر اندازوں کی غلطی کی وجہ سے مسلمانوں کا جانی و مالی نقصان ہوا۔ اور مسلمانوں کو معلوم ہوا کہ ان کے اپنے گھر میں اتنی بڑی تعداد مسلمانوں کے لباس میں مار آستین موجود ہے اور وہ باہر کے دشمنوں سے مل کر خود اپنے بھائیوں کو نقصان پہنچانے پر لگے ہوتے ہیں۔

اس سورت میں ان دونوں باتوں میں سے پہلی بات کے بارے تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے اور اصولی ہدایات واضح کی گئی ہیں اور منافقین کو بے نقاب کیا گیا ہے۔

ج اسی اثنا میں یعنی ۳ھ میں وفود آنے شروع ہوئے لیکن ہجرت کے نویں سال اس کثرت سے وفود آئے کہ سیرۃ طیبہ میں اس سال کا نام سنۃ الوفود ہے۔ اسی سال وفدِ نجران مدینہ منورہ پہنچا ہے۔ میرے نزدیک قاضی سلیمان منصور پوری کی رائے قابلِ ترجیح ہے یعنی یہ کہ نجران کے وفد دو مرتبہ مدینہ منورہ پہنچے۔ تفصیل یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح دوسرے علاقوں کو دعوت نامے بھیجے اسی طرح ایک دعوت نامہ اہلِ نجران کو بھی ارسال فرمایا۔ پہلا وفد شرجیل بن وداعہ، عبداللہ بن شرجیل اور جبار بن قیس پر مشتمل مدینہ منورہ پہنچا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملا، قرآن سنا اور معاہدہ کیا۔ جب یہ وفد مدینہ پہنچا تو ابو علقمہ بشر بن معاویہ یہ سن کر کہ حضور انور نبی موعود ہیں مدینہ منورہ پہنچا

اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر مسلمان ہوگیا اور مدینہ ہی میں رہ پڑا۔ اس کے بعد اسقف اور نجران کے بڑے بڑے حاکم ساٹھ آدمیوں کا وفد لے کر مدینہ منورہ حاضر ہوئے ان میں ۲۴ مشہور سردار تھے۔

یہ حالات تھے جن میں یہ سورت اتری۔ چنانچہ اس میں ان تمام کمزوریوں پر تبصرہ ہے جو اس وقت نمایاں ہوئیں عام اس سے کہ وہ مسلمانوں سے ظاہر ہوئیں یا اہل کتاب سے۔ اس میں اس شک اور تذبذب کی ضلالت بھی واضح کی گئی ہے جس میں عیسائی مبتلا تھے اور اس اختلاف اور انجام بد پر بھی تبصرہ ہے جس کا اظہار منافقین کر رہے تھے۔ ساتھ ہی اس سورت میں مسلمانوں کو ان چالوں سے آگاہ کیا گیا ہے جو ان کو زک پہنچانے کے لئے ان کے دشمن چل رہے تھے اور اُحد کی شکست سے جو اُن کو بد دلی ہوئی تھی اس کو نہایت مؤثر انداز میں دور کیا گیا۔

اس پہلو سے غور کیجئے تو آپ محسوس کریں گے کہ سورۂ بقرہ میں اگر ایمان کی حقیقت واضح کی گئی تھی تو آلِ عمران میں اسلام کی حقیقت بے نقاب کی گئی ہے گویا البقرہ میں ایمان کی دعوت ہے اور آل عمران میں ایمان پر مشتمل نظام کی دعوت ہے۔

---

(۳) سُورَۃُ اٰلِ عِمْرٰنَ مَدَنِیَّۃٌ (۸۹) — اٰیاتہا ۲۰۰ — رکوعاتہا ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓ ۚ﴿۱﴾ اللّٰهُ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ الْحَیُّ الْقَيُّوْمُ ؕ﴿۲﴾ نَزَّلَ عَلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ وَاَنْزَلَ التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ ۙ﴿۳﴾ مِنْ قَبْلُ هُدًى لِّلنَّاسِ وَاَنْزَلَ الْفُرْقَانَ ۬ؕ اِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ لَهُمْ عَذَابٌ شَدِيْدٌ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ ذُو انْتِقَامٍ ﴿۴﴾

المر، اللہ کی وہ ذات گرامی جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ زندہ ہے ہمیشہ رہنے والا[۱]، اس نے آپ پر حق و صداقت کے ساتھ کتاب اتاری ہے[۲]۔ وہ کتاب ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں[۳] اور اسی حی و قیوم ذات نے اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل نازل کی ہے[۴] اور اسی نے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی چیز نازل فرمائی ہے[۵]۔ بلاشبہ جو لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ سب پر غالب اور مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دینے والا ہے[۶]۔

توحید پر صفت حیات اور قومیّت سے استدلال

جب اللہ کی ذات زندہ ہے تو ناگزیر ہے کہ وہ سب کچھ دیکھتا سنتا ہے۔ ہماری دعائیں اور فریادیں اس تک پہنچتی ہیں اپنی حکمت کے مطابق قبول فرماتا ہے زندہ ہے زندہ ہی رہا ہے اور زندہ ہی رہے گا۔ موت کا اس کے لئے کوئی امکان نہیں۔ عیسائی دنیا خداوند خدا زندہ خدا کی تعبیر سے اچھی طرح آگاہ تھی۔ ان کے صحیفوں میں بکثرت یہ تعبیر آئی ہے۔ عیسائی اگرچہ اپنے گمان میں ایک مصلوب خدا کی پرستش کرتے ہیں لیکن وہ بھی زندہ خداوند کی تعبیر سے ناآشنا نہیں تھے اس لئے اس کی یہ کھلی چوٹ ان ہی پر پڑتی ہے کہ ایک طرف وہ زندہ خدا کا تصوّر رکھتے تھے اور دوسری طرف وہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا مان کر ان کی عبادت کرتے ہیں۔

اسی طرح قومیّت اللہ تعالیٰ کی ان بدیہی صفات میں سے ہے جن پر عقلاً ایمان لانا ضروری ہے اور انبیاء کے صحیفوں کی رُو سے عیسائی بھی ان صحیفوں پر ایمان کے مدعی تھے لیکن اس کے باوجود حضرت مسیح کی الوہیت کے قائل ہیں۔

نجران کے ساٹھ عیسائیوں کا ایک وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اس میں تین شخص عبدالمسیح عاقب بحیثیت امارت و سیادت کے، ایہم السید بلحاظ رائے تدبیر کے اور ابوحارثہ بن علقمہ باعتبار سب سے بڑے مذہبی عالم اور لاٹ پادری ہونے کے علاوہ عام شہرت اور امتیاز رکھتے تھے۔ یہ تیسرا شخص نسل میں عرب کے مشہور قبیلہ بنی بکر بن وائل سے تعلق رکھتا تھا پھر پکا نصرانی ہو گیا۔ سلاطینِ روم نے اس کی مذہبی صلاحیت اور مجد و شرف کو دیکھتے ہوئے بڑی تعظیم و تکریم کی، علاوہ بیش قرار مالی امداد کے ذریعے اس کے لئے گرجے تعمیر کئے اور امورِ مذہبی کے اعلیٰ منصب پر مامور کیا۔ یہ وفد بارگاہِ رسالت میں بڑی آن بان سے حاضر ہوا۔ اور متنازع فیہ مسائل میں حضور سے گفتگو کی جس کی پوری تفصیل محمد بن اسحاق کی سیرۃ میں منقول ہے۔ سورۂ آلِ عمران کا ابتدائی حصہ تقریباً اسی آیات تک اسی واقعہ میں نازل ہوا۔ عیسائیوں کا پہلا اور بنیادی عقیدہ یہ تھا کہ مسیح علیہ السلام بعینہٖ خدا یا خدا کے بیٹے یا تین خداؤں میں ایک ہیں۔ اس سورت کے آغاز میں توحید خالص کا دعویٰ کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ کی جو صفات حی و قیوم بیان کی گئی ہیں وہ عیسائیوں کے اس دعوے کو صاف طور پر باطل ٹھہراتی ہیں۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے دوران مناظرہ میں ان سے فرمایا کیا تم نہیں جانتے کہ اللہ تعالیٰ حی اور زندہ ہے جس پر کبھی موت طاری نہیں ہو سکتی۔ اسی نے ساری مخلوقات کو وجود عطا کیا۔ اور امان بقا

پیدا کر کے اُن کو اپنی قدرتِ کاملہ سے تھام رکھا ہے۔ برخلاف اس کے حضرت عیسیٰ پر یقیناً موت دفنا
آکر رہے گی۔ اور ظاہر ہے کہ جو شخص خود اپنی ہستی کو برقرار نہ رکھ سکے دوسری مخلوقات کی ہستی کو کیا برقرار رکھ
سکتا ہے۔ نصاریٰ نے سُن کر اقرار کیا کہ بے شک صحیح ہے۔ شاید انھوں نے غنیمت سمجھا ہوگا کہ آپ اپنے
اعتقاد کے موافق عیسیٰ یاتی علیہ الفناء کا سوال کر رہے ہیں یعنی حضرت عیسیٰ پر موت ضرور آئے گی۔ اگر جواب
نفی میں دیا تو آپ ہمارے عقیدے کے موافق کہ حضرت عیسیٰ مر چکے ہیں ہم کو اور زیادہ صریح طور پر ملزم
بنا سکیں گے۔ اس سے لفظی مناقشہ سے گریز ہی میں مصلحت سمجھی۔ اور ممکن ہے کہ یہ ان فرقوں سے
تعلق رکھتے ہوں جو حضرت عیسیٰ کے بارے میں اسلامی عقیدے کے مطابق صلب و قتل کا انکار کرتے
تھے اور رفع جسمانی کے قائل تھے جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح میں اور الفارق
بین الخالق والمخلوق کے مصنف نے تصریح کی ہے کہ شام و مصر کے نصاریٰ عموماً اسی عقیدے پر تھے۔
مدت کے بعد پولوس نے عقیدہ صلب کی اشاعت کی۔ پھر یہ خیال یورپ سے مصر و شام پہنچا۔ بہرحال
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ان عیسیٰ علیہ الفنا کی تعبیر چھوڑ کر یاتی علیہ الفنا
فرمانا درآں حالیکہ پہلے الفاظ مسیح کی الوہیت کی تردید بھی زیادہ صاف، واضح اور مسکت تھے ظاہر
کرتا ہے کہ موقع الزام میں بھی حضرت مسیح پر موت سے پہلے موت کا اطلاق آپ نے پسند نہیں فرمایا[1]

رسالت پر قرآن کے برحق ہونے سے استدلال

یعنی قرآن حکیم جو عین حکمت کے موافق نہایت برِ وقت سچائی اور انصاف کو اپنی آغوش میں
لے کر اُترا ہے[2]

اس آیت میں پہلے لا الٰہ الا ھو دعویٰ ہے اور الحیّ القیوم اس کی دلیل ہے یعنی خدا کے
یگانہ معبود ہونے کی دلیل اس کا الحیّ القیوم ہونا ہے۔ اب اس فقرے میں حضور انور کی رسالت کا دعویٰ
ہے یعنی کتاب آپ پر اتاری ہے آپ اللہ کے رسول ہیں اس دعوے کی بھی دو دلیلیں پیش فرمائی ہیں ایک
یہ کہ یہ کتاب برحق ہے۔ برحق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن حکیم میں الٰہیات سے متعلق جو مطالب عالیہ
ہیں وہ اس میں عمدہ اور پاکیزہ انداز میں پیش کئے گئے کہ ہر عقلِ سلیم اس کو باور کر سکتی ہے اور عقل و بینش
کے لئے اس میں کوئی گرانی نہیں ہے۔ اور یہ مطلب بھی بتایا گیا ہے کہ یہ اپنے کلام الٰہی ہونے کے لئے کسی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام عثمانی [2] ایضاً

بیرونی دلیل کا محتاج نہیں ہے۔ اس میں جس قدر افکار و نظریات، واقعات و قوانین ہیں ان میں سرتاسر واقعیت ہے۔

کتاب الٰہی برحق ہے کیونکہ وہ دنیا کی ایک قائم اور ثابت حقیقت ہے، جو قوتیں اسے مٹانا چاہیں گی وہ مٹ جائیں گی لیکن قرآن قائم رہیگا عربی میں حق کا خاصہ ثبوت و قیام ہے یعنی جو بات ہو، اٹل ہو، ان مٹ ہو اسے حق کہیں گے، باطل اس کی نقیض ہے ایسی چیز جس میں ثبات و قیام نہ ہو، ٹل جانے والی، مٹ جانے والی باقی نہ رہنے والی۔ چنانچہ قرآن میں ہے لیحق الحق و یبطل الباطل ہے اسی لئے وہ قرآن کو صرف الحق کہتا ہے۔ قد جاءکم الحق کیونکہ اگر قانون قدرت یہی ہے کہ وہ حق و باطل کے تنازع میں حق ہی کو باقی رکھتی ہے تو کسی بات کے امر حق ہونے کے لئے صرف یہی کہہ دینا کافی ہے کہ وہ حق ہے یعنی باقی اور قائم رہنے والی حقیقت ہے۔ اس کا قیام و بقاء خود ہی اپنی حقیقت کا اعلان کرے گا۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ قرآن کے برحق ہونے کے معنے یہ ہیں کہ یہ حقوق میں عدل کا اور اخبار میں راستی اور احکام میں دلائل کا علمبردار ہے۔ امام راغب کی بھی یہی رائے ہے۔ اور آلوسی فرماتے ہیں کہ چونکہ قرآن اپنے کلام الٰہی ہونے کی اپنے آغوش میں مضبوط دلائل رکھتا ہے اس لئے وہ برحق ہے بہرحال مطلب کچھ ہوا اصل زور تو علیک پر ہے یعنی اس پر ہے کہ آپ وہ کتاب لے کر آئے جو حق پر مشتمل ہے اور یہ آپ کے اللہ کی جانب سے رسول ہونے کی دلیل ہے اور یہ کتاب جو آپ لے کر آئے ہیں۔ آپ پر بتدریج نازل ہوئی ہے۔ نزّل، تنزیل سے بنا ہے اور اس میں تدریج کا تخیل تو موجود ہے جیسا کہ بیضاوی اور قرطبی نے القرآن نجوما کہہ کر اشارہ کیا ہے عین اس کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ قرآن کا لفظ لفظ حرف حرف نازل شدہ ہے اور اس میں آپ کی محنت کو کوئی دخل نہیں ہے۔

قرآن حکیم ایک بار کیوں نازل نہیں ہوا

یہ بات کہ قرآن پورے کا پورا ایک بار کیوں نازل نہیں ہوا قرآن کے مہمات معارف میں سے ہے۔ اگرچہ اس پر تفصیل مباحث تو انشاء اللہ پارہ ۱۵ اور پارہ ۱۹ میں آئیں گے مگر یہاں مولانا رحمت اللہ کیرانوی کی زبانی چند مفید باتیں گوش گزار فرمائیے۔

قرآن کریم کا نزول تھوڑی تھوڑی مقدار میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر تیئیس برس میں ہوا۔ تمام قرآن

ایک دم نازل نہیں ہوا۔ اس کی چند وجوہ ہیں۔

۱۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ اُمّی تھے اس لئے اگر سارا قرآن ایک دم نازل ہوتا تو اندیشہ تھا کہ آپ اس کو ضبط اور محفوظ نہ رکھ سکیں، بھول جانے کے قوی امکانات تھے۔

۲۔ اگر قرآن حکیم پورا ایک دم نازل ہوتا تو ممکن تھا کہ آپ لکھے ہوتے پر اعتماد کرتے اور یاد کرنے میں پورا اہتمام نہ ہوتا۔ اب جبکہ اللہ تعالیٰ نے تھوڑا تھوڑا کرکے نازل کیا تو بسہولت اس کو محفوظ کر لیا اور تمام اُمت کے لئے حفظ کی سنّت جاری ہوگئی۔

۳۔ پورا قرآن ایک بار نازل ہونے کی صورت میں اگر سارے احکام بھی اسی طرح ایک بار نازل ہو جاتے تو اُمت کے لئے دشواری اور گرانی پیدا ہو جاتی۔ تھوڑا تھوڑا نازل ہونے کی وجہ سے احکام بھی تھوڑے تھوڑے نازل ہوتے اس لئے ان کا تحمّل اُمت کے لئے آسان ہو گیا۔ ایک صحابی سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا ہم پر احسان و کرم ہے ورنہ ہم لوگ مشرک تھے۔ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پورا دین اور سارا قرآن ایک دم لے آتے تو ہمارے لئے بڑا دشوار ہو جاتا اور اسلام قبول کرنے کی ہمت نہ ہوتی بلکہ ابتداء میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو صرف توحید کی دعوت دی، جب ہم نے اس کو قبول کر لیا اور ایمان کی دعوت اور اس کی شیرینی کا ذائقہ چکھ لیا تو اس کے بعد آہستہ آہستہ تمام احکام ایک ایک کرکے قبول کرتے چلے گئے یہاں تک کہ دین کامل اور مکمل ہو گیا۔

۴۔ جب آپ وقتاً فوقتاً جبریل علیہ السلام سے ملاقات کرتے تو ان کے بار بار آنے سے آپ کے دل کو تقویت حاصل ہوتی جس کی وجہ سے اپنے فریضۂ تبلیغ کی ادائیگی میں آپ مضبوطی کے ساتھ مستعد رہے اور جو مشقتیں نبوت کا لازمہ ہیں ان پر صبر کرتے اور قوم کی ایذا رسانی پر ثابت قدم رہنے میں پختہ رہے۔

۵۔ جب باوجود تھوڑا تھوڑا نازل ہونے کے اس میں اعجاز کی شرطیں پائی گئیں تو اس کا معجزہ ہونا ثابت ہو گیا۔ کیونکہ اگر لوگ اس کے معارضہ پر قادر ہوتے تو بڑی آسانی کے ساتھ تھوڑی مقدار میں نازل شدہ حصے کے برابر کوئی کلام بنا سکتے تھے۔

۶۔ قرآن حکیم ان کے اعتراضات اور موجودہ زمانے میں پیش آنے والے واقعات کے مطابق نازل ہوتا رہتا تھا۔ اس طریقے پر ان کی بصیرت میں ترقی اور اضافہ ہوتا جاتا تھا کیونکہ اس صورت میں قرآنی فصاحت کے ساتھ غیبی امور کی اطلاع اور پیشین گوئی بھی شامل ہوتی جاتی تھی۔

۷۔ قرآن حکیم جب تھوڑی تھوڑی مقدار میں نازل ہوتا اور ادھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے معارضہ کا چیلنج شروع ہی سے دیا تھا تو گویا آپ نے قرآن کے ہر جزء کے بارے میں مستقل چیلنج

کیا۔ جب وہ لوگ ایک ایک جزء کے معارضے سے عاجز آگئے تو سارے قرآن کے معارضے سے ان کا عاجز ہونا بدرجہ اولیٰ معلوم ہوگیا۔ اس طرح لوگوں کا نفس معارضہ سے عاجز ہونا ثابت ہوگیا۔

۸۔ اللہ اور اس کے پیغمبروں کے درمیان سفارت کا منصب ایک عظیم الشان اور جلیل القدر ہے۔ اگر قرآن ایک ہی بار نازل ہو جاتا تو جبریل کے اس منصب کے شرف سے محروم ہو جانے کا احتمال تھا۔ قرآن کے تھوڑا تھوڑا اتارنے کی وجہ سے جبریل علیہ السلام کے لئے یہ شرف باقی رہا۔

رسالت کی دوسری دلیل

۱۔ وہ کتاب ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو اس سے پہلے نازل ہو چکی ہیں۔ یعنی قرآن اگلی کتابوں کی تصدیق کرتا ہے۔ قرآن کا کتب سابقہ کی تصدیق کرنا یہ قرآن کا بنیادی وصف ہے اور یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ قرآن کے پیش کرنے والا اللہ کا رسول ہے۔ یعنی جب میری تعلیم پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جھٹلاتی نہیں تو اس سے صاف معلوم ہوا کہ ان تعلیمات کے اندر کوئی ایک ہی ثابت و قائم حقیقت کام کر رہی ہے۔ کیونکہ اگر مختلف وقتوں، مختلف گوشوں، مختلف قوموں، مختلف ناموں، مختلف پیرایوں اور مختلف زبانوں سے کوئی ایک بات کہی گئی ہو اور باوجود ان تمام اختلافات کے بات ہمیشہ ایک ہی ہو اور ایک ہی مقصد پر زور دیتی ہو تو ماننا پڑے گا کہ ایسی بات کا سرچشمہ ایک ہے۔ کیونکہ بات اس کے بغیر ممکن نہیں کہ سب کا مبدا ایک الہامی زبان مانا جائے۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ چونکہ یہ کتاب تمام اگلی کتابوں کی مصدق ہے۔ اس لئے جو اس کو قبول کرے گا وہ تمام اگلی صداقتوں کو قبول کرے گا یہ مقام قرآن کے سوا کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہے۔

۲۔ اور اسی حی و قیوم کی ذات نے اس سے پہلے لوگوں کی ہدایت کے لئے تورات اور انجیل نازل کی ہے یعنی یہ اگلی کتابیں تورات و انجیل پہلے سے قرآن اور اس کے لانے والے کی طرف رہنمائی کر رہی تھیں اور اپنے اپنے وقت میں مناسب احکام و ہدایات دیتی تھیں گویا اشارۃً کہہ دیا کہ الوہیت یا ابنیت کا عقیدہ کسی آسمانی کتاب میں موجود نہ تھا کیونکہ اصولِ دین کے اعتبار سے تمام کتب سماویہ متفق و متحد ہیں۔ مشرکانہ عقائد کی تعلیم کبھی نہیں دی گئی۔[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

تورات وانجیل

تورات اور انجیل قرآن کی اصطلاح میں دو مستقل آسمانی کتابوں کے نام ہیں۔ قرآن انہی کی تصدیق کرتا ہے۔ موجودہ عرف میں تورات سے مراد عہد نامہ قدیم کی ابتدائی پانچ کتابیں اور انجیل سے مراد عہد نامہ جدید کی چار مشہور انجیلیں ہوتی ہیں۔

قرآن تورات اور انجیل کے نام سے جن کتابوں کو کتاب الٰہی کر کے پیش کرتا اور قرآن جن کی تصدیق کرتا ہے وہ وہ کتابیں ہیں جو حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئی ہیں۔ قرآن کی زبان میں نہ تو تورات بائیبل کی پہلی پانچ کتابوں کا نام ہے اور نہ ہی انجیل عہد نامہ جدید کی چار انجیلوں کا نام ہے۔

دراصل اس وقت لوگ ان کتابوں کی دو قسمیں بیان کرتے ہیں ایک وہ جن کی نسبت یہ دعویٰ کیا جاتا ہے کہ یہ ان پیغمبروں کی ہیں جو حضرت عیسیٰ سے پہلے گزرے دوسری وہ جن کی نسبت ان کا خیال ہے کہ حضرت عیسیٰ کے بعد بذریعہ الہام لکھی گئی ہیں۔ پہلی قسم کو عہدِ عتیق اور دوسری قسم کو عہدِ جدید کہتے ہیں اور ان دونوں کے مجموعہ کا نام بائیبل ہے۔ اس مجموعہ میں جن پانچ کتابوں کو تورات کہتے ہیں وہ یہ ہیں۔

۱۔ سفرِ تکوین، اس کا دوسرا نام سفرِ الخلیقہ ہے۔ یہ لفظ سین کے زیر کے ساتھ سفر ہے عربی میں اس کے معنے صحیفہ کے آتے ہیں۔ تکوین کو اردو میں پیدائش کہتے ہیں۔

اس میں زمین و آسمان کی تخلیق سے لے کر حضرت آدم، حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یوسف کے زمانہ کی تاریخ ہے۔ اس کے ۵۰ باب ہیں۔

۲۔ سفرِ خروج۔ اردو میں اس کا نام خروج ہی ہے اس میں حضرت موسیٰ کی پیدائش سے لے کر ان کی دعوتِ اسلام، فرعون کے غرق اور کوہِ سینا پر اللہ سے ہمکلامی کے واقعات اور تورات کے احکام مذکور ہیں۔ اور یہ بنی اسرائیل کے صحرائے سینا میں خیمہ زن ہونے کے واقعات پر ختم ہو گیا ہے۔ اسے خروج اس لئے کہتے ہیں کہ اس میں بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے کا واقعہ مذکور ہے اس میں ۴۰ باب ہیں۔

۳۔ سفرِ احبار، اردو میں بھی اس کو احبار ہی کہتے ہیں۔ اس میں وہ احکام مذکور ہیں جو بنی اسرائیل کے صحرائے سینا میں خیمہ زن ہونے کے دوران انہیں دیئے گئے۔ اس کے کل ۲۵ باب ہیں۔

۴۔ سفرِ عدد۔ اسے اردو میں گنتی کہتے ہیں۔ اس میں بنی اسرائیل کی مردم شماری سے لے کر ان کے کنعان جانے تک کے احوال اور وہ احکام مذکور ہیں جو حضرت موسیٰ کو دریائے اردن کے کنارے دیئے گئے۔ اس کے کل ۳۶ باب ہیں

۵۔ استثناء ۔ اسے اردو میں بھی استثناء کہتے ہیں۔ اور اس میں وہ احکام ہیں جو گنتی کے بعد حضرت موسیٰ کی وفات تک پیش آئے ۔ اس کے ۳۴ باب ہیں۔

ان پانچ کتابوں کے مجموعہ کو تورات کہتے ہیں۔ اور کبھی کبھی مجازاً عہدِ عتیق کے پورے مجموعہ کو تورات کہہ دیا جاتا ہے۔

کیا یہ تورات حضرت موسیٰ پر نازل شدہ کتاب ہے ؟

امر واقعہ یہ ہے کہ تورات سے مراد عرف قرآن میں اللہ کی وہ وحی ہے جو موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی۔ اور یہ پانچوں کتابیں جن کو آج تورات کہا جاتا ہے خود گواہ ہیں کہ یہ وہ تورات نہیں ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی۔ اس کو حضرت موسیٰ نے خود لکھا اور بنی اسرائیل سے اسے محفوظ رکھنے اور اس پر عمل کرنے کا عہد لیا۔ استثناء باب ۳۱ میں ہے۔

> اور ایسا ہوا کہ جب موسیٰ اس شریعت کی باتوں کو کتاب میں لکھ چکا اور وہ تمام ہوئیں تو موسیٰ نے لاویوں کو جو خداوند کے عہد کے صندوق اٹھاتے تھے فرمایا کہ، اس شریعت کی کتاب کو لے کے خداوند اپنے خدا کے عہد کے صندوق کی ایک بغل میں رکھو تاکہ وہ تمہارے برخلاف گواہ رہے کیونکہ میں تیری بغاوت اور تیری سرکشی کو جانتا ہوں۔ دیکھو ہنوز کہ میں جیسا اور آج کے دن تک تمہارے ساتھ ہوں تم نے خداوند سے بغاوت کی ہے تو میرے مرنے کے بعد کتنا زیادہ کرو گے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے جو کتاب لکھی تھی وہ بنی لاوی کے حوالے کی تھی تاکہ وہ اس کی حفاظت کریں۔ اسی کا نام تورات تھا۔ اس کی ایک کاپی خدا کے عہد کے صندوق میں رکھ دی گئی تھی۔ یہ ایک کتاب کی حیثیت سے بیت المقدس کی تباہی تک محفوظ تھی۔ جب بخت نصر نے یروشلم فتح کیا اور ہیکل سمیت شہر کی اینٹ سے اینٹ بجا دی تو یہ نسخہ بھی ناپید ہو گیا۔ مسیحی علماء نے اس بات کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ خلاصۃ الادلۃ السنیۃ علی صدق اصول الدیانۃ المسیحیہ کا مصنف رقمطراز ہے کہ

> یہ قطعاً محال ہے کہ اب تک حضرت موسیٰ کی اصلی تورات موجود ہو۔ ہمیں پتہ نہیں ہے کہ اس کا انجام کیا ہوا لیکن راجح یہی ہے کہ حضرت موسیٰ کی اصلی تورات بخت نصر کی تباہ کاری کے حادثہ کا نشانہ بن گئی۔ یہی وجہ ہے کہ یہودیوں میں یہ بات طے شدہ ہو چکی ہے کہ مقدس کتابیں گم اور لاپتہ ہو چکی ہیں۔ اب تورات کے نام سے جو کچھ ہے وہ

عزرا نامی شخص کا جمع کردہ ذخیرہ ہے۔

یعنی جب عزرا کے زمانے میں بنی اسرائیل کے لوگ یروشلم پہنچے اور بیت المقدس دوبارہ تعمیر ہوا تو عزرا نے بنی اسرائیل کی پوری تاریخ مرتب کی ہے جو اب بائیبل کی پہلی ۱۷ کتابوں پر مشتمل ہے۔ اس تاریخ کے پانچ بابوں کو تورات کہتے ہیں۔ آپ زیادہ سے زیادہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس میں تورات کی وہ کچھ آیات بھی درج ہیں جو ان کو دستیاب ہو گئی ہیں۔ بہرحال موجود تورات توراتِ موسیٰ نہیں ہے بلکہ اسرائیلی تاریخ کا سرمایہ ہے۔ تاریخ کے اسی سرمایہ میں خواہ اس کی تاریخی حیثیت کچھ ہو۔ وہ آیات بھی حسبِ موقع درج کر دی گئی ہیں جو عزرا اور ان کے بزرگوں کو دستیاب ہو گئیں اور بہت کچھ رہ بھی گئی ہیں۔ اس تاریخی سرمایہ میں جو آیات درج ہو گئی ہیں قرآن کا اسی کے بارے میں یہ اعلان ہے اوتوا نصيبا من الكتاب اور جو اس سرمایۂ تاریخ میں درج ہونے سے رہ گئی ہیں اسی کا قرآن نے نسوا حظا مما ذكروا به کے ذریعے انکشاف کیا ہے۔ قرآن اوتوا نصيبا من الكتاب کو تورات کہتا ہے اور انہیں کی وہ تصدیق کرتا ہے۔ اور یہی اس احتجاج کے لئے کافی ہے کہ اگر وہ تورات کو قائم کرتے اور یہی اس شہادت کے لئے کافی ہے کہ تورات میں حکم الٰہی موجود ہے اور یہی اس چیلنج کے لئے کافی ہے فاتوا بالتوراة ایسے ہی انجیل دراصل نام ہے اس کتاب کا جو مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی ہے اور آج جن کتابوں کو اناجیل اربعہ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے وہ انجیل نہیں بلکہ حضرت مسیح کی سیرت پر لکھی ہوئی کتابیں ہیں۔ ان چاروں کا اجمالی تعارف یہ ہے۔

۱۔ انجیل متی: یہ متی حواری کی طرف منسوب ہے۔ حضرت عیسیٰ کے بارہ حواریوں میں سے تھے۔ آپ کفر ناحوم میں جو فلسطین کا ایک شہر تھا عشر وصول کرنے پر مامور تھے آپ کو شہید کیا گیا مگر یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ کب اور کہاں۔ ان کی انجیل کو عیسائی قدیم ترین انجیل مانتے ہیں۔ اس میں حضرت عیسیٰ کے نسب نامہ سے لے کر عروج تک کے واقعات درج ہیں۔ ضمناً کچھ احکام بھی آتے ہیں۔ اس کے باب ۲۸ ہیں۔

۲۔ انجیل مرقس: یہ حضرت عیسیٰ کے حواری جناب پطرس کے شاگرد ہیں۔ ان کی انجیل سابقہ انبیاء کی بشارتوں سے شروع ہوتی اور حضرت عیسیٰ کے عروجِ آسمان پر ختم ہو جاتی ہے۔ اس کے کل باب ۱۶ ہیں۔

۳۔ انجیل لوقا: یہ اپنے زمانے میں طبیب تھے۔ پولس کے سفروں میں ساتھ رہے تقریباً ۶۳ء میں انتقال ہوا۔ ان کی انجیل حضرت یحیٰی کی پیدائش سے شروع ہوتی ہے اور ۲۴ باب ہیں عروجِ آسمانی تک کے واقعات درج ہیں۔

۴۔ انجیل یوحنا: حبیب بن زبدی، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواریوں میں ممتاز حیثیت رکھتے ہیں۔ انجیل کے علاوہ عہد نامہ جدید کے مجموعہ میں تین خط اور کتاب مکاشفہ بھی آپ کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ آپ نے عمر بھر یہودیوں کے ظلم و ستم برداشت کئے اور پہلی صدی ہی میں آپ کا انتقال ہوا۔ یاد رہے کہ عیسائی حضرات یحییٰ علیہ السلام کو بھی یوحنا کہتے ہیں مگر اس کے ساتھ معمد کی قید ہے یہاں وہ مراد نہیں ہیں۔ ان کی انجیل میں حضرت یحییٰ کی تشریف آوری کے بعد کے حالات سے حضرت عیسیٰ کے عروج آسمانی تک کے حالات درج ہیں اور اس میں ۲۱ باب ہیں۔

ان چاروں کو اناجیل اربعہ کہتے ہیں اور لفظ انجیل ان چاروں کے ساتھ مخصوص ہے قرآن جس انجیل کا ذکر کرتا ہے اس کا ان اناجیل سے کوئی تعلق نہیں ہے وہ ایک ہے اور یہ متعدد ہیں۔ یہ اناجیل حضرت مسیح کی سیرت پاک پر لکھے ہوئے رسالے ہیں۔ ان میں تاریخی بیان کے ساتھ کچھ آیات بھی انجیل کی درج کی گئی ہیں جو ان سیرت نویسوں کو زبانی روایات کے ذریعے پہنچی ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ **نسوا حظا مما ذکروا بہ** عیسائی بھی اپنے رب کی نصیحت کا ایک حصہ فراموش کر بیٹھے۔ جن کو انجیل کہا جاتا ہے خود ان کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔ اس پر تبصرہ انشاء اللہ پارہ ششم میں آئے گا۔[1]

فرقان کے معنے اور اس کا مصداق

۳۔ اور اسی نے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی چیز نازل فرمائی یعنی ہر زمانے کے موافق ایسی چیزیں اتاریں جو حق و باطل، حلال و حرام اور جھوٹ و سچ کے درمیان فیصلہ کرنے والی ہیں۔ اس میں قرآن حکیم، کتب سماویہ، معجزات انبیاء سب داخل ہو گئے اور ادھر بھی اشارہ ہو گیا کہ جن مسائل میں یہود و نصاریٰ جھگڑتے چلے آرہے ہیں ان اختلافات کا فیصلہ بھی قرآن کے ذریعے کر دیا گیا۔[2]

اصل ارشاد میں لفظ فرقان آیا ہے۔ فرقان غفران کی طرح مصدر ہے۔ ہر وہ چیز جس کے ذریعے حق و باطل کے درمیان امتیاز ہو جائے۔ لغوی معنے پر سب کا اتفاق ہے لیکن یہاں موقع و محل کی مناسبت سے فرقان سے کیا مراد ہے۔ اس میں علماء تفسیر کا اختلاف ہے۔ ہمیں مشہور مفسر قرآن حضرت قتادہ کا قول زیادہ پسند ہے کہ فرقان سے مراد یہاں قرآن ہے۔ یہ بات بتلانے کے بعد کہ اللہ نے پہلے لوگوں کی ہدایت

---

[1] تورات و انجیل کی معلومات اظہار الحق مؤلفہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی اور اس کے حاشیہ مرتبہ مولانا تقی عثمانی سے ماخوذ ہیں۔ [2] افادات شیخ الاسلام

کے لئے تورات وانجیل نازل فرمائی تھیں۔ اور اب اللہ نے قرآن کی صورت میں فرقان نازل کیا۔ تورات وانجیل کے ماننے والوں نے چونکہ ان کتابوں میں بہت سے اختلافات پیدا کر دیئے تھے جس کی وجہ سے حق وباطل میں کوئی امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ اس لئے اللہ تعالیٰ نے قرآن کو حق وباطل کے درمیان امتیاز کی کسوٹی بنا کر نازل کیا۔ قرآن میں دوسرے مقام پر قرآن کو فرقان کہا ہے۔

تبارکُ الذی نزل الفرقان علیٰ عبدہ

بابرکت ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر قرآن نازل کیا۔

دوسرے مفسرین نے یہاں فرقان سے دلائل وبراہین مراد لئے۔ ابن جریر کا بھی یہی خیال ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ قرآن کا ذکر نزل علیک الکتاب میں آچکا ہے۔ تکرار میں کوئی معنویت نہیں ہے۔ معاصر مفسرین میں سے مولانا آزاد نے فرقان سے جوہر عقل وتمیز مراد لیا ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

روحانی احتیاجات کے لئے انسان کو دو چیزیں دی گئیں۔ الکتاب اور الفرقان الکتاب خدا کی وحی ہے جو ہدایت وسعادت کی طرف رہنمائی کرتی ہے۔ الفرقان جوہر عقل ہے جو اسے سمجھتا ہے اور قبول کرتا ہے۔ پہلی چیز تعلیم ہے۔ دوسری تعلیم کی استعداد ہے۔ پہلی ہدایت کی قوت فاعلہ ہے دوسری منفعلہ۔

اور سید رشید رضا نے المنار میں اسی بات کو ذرا تعبیر کے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ اس طرح پیش فرمایا ہے:

اللہ پاک نے قرآن میں قرآن کے ساتھ دو لفظوں کی پیوندکاری فرمائی ہے ایک میزان کی دوسرے فرقان کی۔ فرقان وہ ہے جس کے ذریعے ہم افکار ونظریات میں حق معلوم کرتے ہیں۔ میزان وہ ہے جس کے ذریعے ہم حقوق میں حق وعدل معلوم کرتے ہیں۔

تعبیر کے اختلافات سے اگر نظر ہٹالی جائے تو مآل دونوں کا ایک ہے اور غالباً اس مقام پر فرقان کا ذکر کرکے یہ جتانا مقصود ہے کہ اہلِ تورات وانجیل حضرت عیسیٰ کے بارے میں اپنے افکار ونظریات کی حد تک حق سے بیگانہ ہو چکے ہیں۔

الوہیت مسیح کے ابطال کی جانب لطیف اشارہ

۴ ۔ بلاشبہ جو لوگ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں ان کے لئے سخت عذاب ہے اور اللہ سب پر غالب اور مجرموں کو ان کے جرائم کا بدلہ دینے والا ہے۔ یعنی ایسے مجرموں کو نہ سزا دیئے بغیر چھوڑے

گا نہ وہ اس کی زبردست اقتدار سے چھوٹ کر بھاگ سکیں گے اس میں بھی الوہیت مسیح کے ابطال کی لطیف اشارہ ہے کیونکہ جو اختیار و اقتدار کلی اللہ کے لئے ثابت کیا گیا ہے ظاہر ہے کہ وہ مسیح میں نہیں پایا جاتا بلکہ نصاریٰ کے نزدیک حضرت مسیح کسی کو سزا تو کیا دے سکتے خود اپنے کو باوجود سخت تضرع و زاری کے ظالموں کے پنجہ سے نہ چھڑا سکے پھر خدا یا خدا کا بیٹا کیسے بن سکتے ہیں۔ بیٹا وہی کہلاتا ہے جو باپ کی نوع سے ہو لہٰذا خدا کا بیٹا خدا ہونا چاہیے۔ ایک عاجز مخلوق کو حقیقتہً قادرِ مطلق کا بیٹا کہنا باپ اور بیٹے دونوں پر سخت عیب لگاتا ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ تورات و انجیل کے بعد قرآن فرقان کی حیثیت میں آیا ہے۔ تورات جل جل کر خاک ہوئی پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی۔ انجیل میں تحریف جعل تو اسی زمانے میں شروع ہو چکا تھا پھر ترجموں اور سیرت نویسیوں کی کثرت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی۔ یہ صورتِ حال مقتضی ہوئی کہ اللہ تعالیٰ قرآن کو فرقان بنا کر اتارے چنانچہ اس نے یہ کتاب نازل کی۔ اب جو لوگ اس کا انکار کریں گے ان کے لئے اللہ کی طرف سے عذاب ہے۔ وہ عزیز یعنی غالب اور قدرت والا ہے کمزور و ناتواں نہیں ہے کہ کوئی اسے بے بس کر دے۔ اسی طرح وہ انتقام والا ہے یعنی عدل کے معاملے میں غیور ہے سرد مہر اور بے احساس نہیں ہے کہ ان کی پامالی پر راضی ہو جائے۔ لہٰذا ایک عاجز اور مظلوم و مغلوب کو جس پر اس کے دشمن غالب آگئے ہوں خدا کہنا یا خدا کا بیٹا بتانا کھلی نادانی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الہند

إِنَّ اللّٰهَ لَا يَخْفٰى عَلَيْهِ شَيْءٌ فِي الْأَرْضِ وَلَا فِي السَّمَاءِ ﴿٥﴾ هُوَ الَّذِي يُصَوِّرُكُمْ فِي الْأَرْحَامِ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦﴾

بلاشبہ اللہ کے علم سے کوئی بات پوشیدہ نہیں خواہ زمین میں ہو خواہ آسمان میں، یہ اسی کی کارفرمائی ہے کہ جس طرح چاہتا ہے ماں کے شکم میں تمہاری صورت کا ڈیل ڈول اور ناک نقشہ بنا دیتا ہے اور قبل اس کے دُنیا میں قدم رکھو تمہاری حالت اور ضرورت کے مطابق تمہیں ایک موزوں صورت دے دیتا ہے کوئی لائق پرستش نہیں مگر وہی، غالب و توانا ہے کہ اسی کے حکم سے سب کچھ ظہور میں آتا ہے حکمت والا ہے کہ انسان کی پیدائش سے پہلے شکم مادر میں اسکی صورت آرائی کر دیتا ہے۔

توحید پر علم و قدرت سے استدلال

اوپر والی آیت میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی ذات الحی ہے یعنی زندہ ہے۔ اس کے لئے فنا و زوال نہیں قیوم ہے یعنی ہر چیز اس سے قائم ہے وہ اپنے قیام کے لئے کسی کا محتاج نہیں ہے۔ اس کے حی و قیوم ہونے کا مقتضا یہی تھا کہ اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے کیونکہ جس کو بھی شریک کیا جائے گا اسکی حیات

نہ ذاتی ہے۔ اور نہ ازلی وابدی، اللہ تعالیٰ کے زندہ کرنے سے وہ زندہ ہوئے، ان کی حیات اور ان کی زندگی بلاشبہ حادث اور فانی ہے اور جس کا وجود اور جس کی حیات حادث اور فانی ہو وہ معبود نہیں ہو سکتا اور نہ وہ کسی کے لئے کوئی سامانِ حیات پیدا کرتا ہے اور نہ وہ کائنات کے وجود کے تھامنے اور قائم رکھنے پر قادر ہے لہٰذا وہ معبود کیسے ہو سکتا ہے اور پھر وہ ذات گرامی جس کی قیومیت انسان کی زندگی کی تمام احتیاجات پوری کر رہی ہے جسمانی بھی اور روحانی۔ اس نے جس طرح پہلی کا انتظام کیا اسی طرح دوسری کا بھی سامان کیا۔ روحانی احتیاجات کے لئے انسان کو دو چیزیں دی گئی ہیں ایک علم اور دوسرے عمل، پہلی قوت فاعلہ ہے اور دوسرے منفعلہ، اللہ کی طرف سے انبیاء پر علم و عمل کا آنا اس کی واضح دلیل ہے کہ اللہ رب العالمین اور احکم الحاکمین ہے اور انبیاء اللہ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ اقتدار کامل اور اختیار ناطق بیان فرمانے کے بعد اب ان آیات میں اللہ کی توحید اور اس کے الٰہ مطلق ہونے پر اس کے علم محیط سے استدلال کیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح اس کی قیومیت انسانی زندگی کی تمام احتیاجات پوری کر رہی ہے اور اس میں کوئی شریک نہیں ہے اسی طرح اس کا علم بھی محیط ہے۔ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے وہ بے خبر نہیں۔ اس سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں ہے خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی اور خواہ زمین میں پیش آئے یا آسمان میں۔ اللہ کا علم ہر چیز کو اور ہر جگہ محیط ہے۔ اس کے علم کی کارفرمائیوں کا یہ حال ہے کہ انسان کو پیدائش سے پہلے اس کی متناسب اور موزوں صورت دے دیتا ہے۔

۵۔ بے شک اللہ کے علم سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں ہے خواہ زمین میں ہو خواہ آسمان میں۔ یعنی جیسے اس کا اقتدار و اختیار کامل ہے علم بھی محیط ہے۔ عالم کی کوئی چیز چھوٹی یا بڑی ایک لمحہ کے لئے اس سے غائب نہیں سب مجرم و غیر مجرم اور تمام جرموں کی نوعیت و مقدار اس کے علم میں ہے مجرم بھاگ کر روپوش ہونا چاہے تو کہاں ہو سکتا ہے؟ یہیں سے تنبیہ کر دی گئی کہ مسیح علیہ السلام خدا نہیں ہو سکتے کیونکہ ان کو ایسا علم محیط حاصل نہ تھا وہ اسی قدر جانتے تھے جس قدر اللہ ان کو بتلا دیتا جیسا کہ آنحضرت کے جواب میں خود وفد نجران نے اقرار کیا اور آج بھی اناجیل مروجہ سے ثابت ہے۔[1]

: روح المعانی میں بروایت ابن جریر ربیع مفسر سے مروی ہے کہ نصاریٰ کے جواب میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مفصل تقریر میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر اللہ تعالیٰ کی صفت حیات دائمہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔

قومیت کاملہ علم محیط اور قدرتِ عامہ میں منفرد ہونے سے استدلال کیا اور یہ سب مقدمات ان کو ماننے پڑے۔[۱]

کچھ علماء نے اس آیت کو استیناف بیانی قرار دیا ہے اور ایک اٹھے ہوئے سوال کا جواب بنایا ہے: پچھلی آیت میں قرآن کے نہ ماننے والوں کو عذابِ شدید کی دھمکی دی گئی تھی۔ ذہن میں یہ سوال آیا کہ اتنی بڑی دنیا میں اس قدر نافرمانیاں کرنے والے ہیں۔ اللہ کو پتہ ہی کیسے چلے گا جو عذاب دے گا فرمایا کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ اس دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے اس سے وہ بے خبر ہے اُس سے کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں ہے خواہ وہ بڑی ہو یا چھوٹی ہو۔ خواہ زمین میں پیش آئے یا آسمان میں۔

بعض علماء کی رائے یہ ہے کہ ہے تو یہ استیناف لیکن سوال جو ذہن میں آیا ہے اس کا تعلق اس آیت سے نہیں بلکہ اس سے پہلی آیت سے ہے۔ اس سے پہلی آیت میں یہ بتایا تھا کہ اللہ نے قرآن کو کسوٹی بنا کر اتارا ہے اب اس کا انکار سخت عذاب کا موجب ہے۔ سوال یہ اُبھرا ہے کہ اس کے انکار پر عذاب کیوں ہوگا جواب میں بتایا ہے اس لئے کہ وہ کائنات کی حقیقتوں کا جاننے والا ہے۔ لہٰذا جو کتاب اس نے نازل کی ہے وہ سرتاسر حق ہی ہے بلکہ خالص حق صرف اسی میں انسان کو میسر آ سکتا ہے جو اس علیم و دانا کی طرف سے نازل ہو۔[۲]

شکمِ مادر میں صورت گری

۶۔ یہ اسی کی کارفرمائی ہے کہ وہ جس طرح چاہتا ہے شکمِ مادر میں تمہاری تصویر بناتا ہے یعنی اپنے علم و حکمت کے مطابق کمال قدرت سے جیسا اور جس طرح چاہا ماں کے پیٹ میں تمہارا نقشہ بنایا۔ مذکر، مونث، خوبصورت، بدصورت جیسا پیدا کرنا کر دیا۔ ایک پانی کے قطرے کو کتنی پلٹیاں دے کر آدمی کی صورت عطا کی جس کی قدرت کا یہ حال ہے کیا اس کے علم میں کمی ہو سکتی ہے یا کوئی انسان جو خود بھی بطنِ مادر کی تاریکیوں میں رہ کر آیا ہو اور عام بچوں کی طرح کھاتا پیتا پیشاب پاخانہ کرتا ہو اُس خداوند کا بیٹا یا پوتا کہلایا جا سکتا ہے کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔

عیسائیوں کا سوال تھا کہ جب مسیح کا ظاہری باپ کوئی نہیں ہے تو بجز خدا کے کس کو باپ کہیں یصورکم فی الارحام میں اس کا جواب بھی ہو گیا یعنی اللہ کی قدرت ہے رحمِ مادر میں جس طرح چاہے

---

[۱] بیان القرآن [۲] تفہیم القرآن

آدمی کا نقشہ تیار کر دے خواہ ماں باپ دونوں کے ملنے سے یا صرف ماں کی قوت منفعلہ سے اسی لئے آگے فرمایا ھو العزیز الحکیم یعنی زبردست ہے جس کی قدرت کو کوئی محدود نہیں کر سکتا اور حکیم ہے جہاں جیسا مناسب جانتا ہے کرتا ہے۔ حواء کو بدون ماں کے، مسیح کو بدون باپ کے، آدم کو بغیر ماں باپ کے پیدا کر دیا اس کی حکمتوں کا کون اندازہ کر سکے [1]

قادر ہر طرح اور ہر صورت سے ہے باپ محض واسطہ تخلیق ہوتا ہے اور خالق جس واسطہ جب چاہے ہٹا دے یصورکم میں خطاب عام ہے۔ سارے انسان مخاطب ہیں فی الارحام یعنی ماؤں کے رحم میں اور حضرت مسیح کی صورت بھی رحم مادر ہی میں بنی تھی۔ اوپر ذکر اللہ کے علم کامل کا تھا اب اس کی قدرت کاملہ کی طرف اشارہ ہے کہ جس طرح اس کا علم محیط کامل اور غیر محدود ہے۔ اسی طرح اس کی قدرت تخلیق بھی غیر محدود و لامتناہی ہے۔ انسان کا اس کی حد بندی کی کوشش کرنا خود انسان کا جہل ہے [2] اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ جس حی و قیوم کی کارفرمائیوں کا یہ حال ہے کہ انسان کو پیدائش سے پہلے اس کی مناسب اور موزوں صورت دیتا ہے کیا یہ ضروری نہیں کہ پیدائش کے بعد اس کی روحانی فلاح وسعادت کی بھی صورت آرائی کر دیتا [3]

اس میں دو اہم حقیقتوں کی طرف اشارہ ہے ایک یہ کہ تمہاری فطرت کو جیسا وہ جانتا ہے نہ کوئی دوسرا جان سکتا ہے نہ تم خود جان سکتے ہو لہٰذا اس کی رہنمائی پر اعتماد کئے بغیر تمہارے لئے کوئی چارہ نہیں ہے دوسرے یہ کہ جس نے استقرار حمل سے لے کر بعد کے مراحل تک ہر موقع پر تمہاری چھوٹی سے چھوٹی ضرورت تک کو پورا کرنے کا اہتمام کیا کس طرح ممکن تھا کہ وہ دنیا کی زندگی میں تمہاری ہدایت و رہنمائی کا انتظام نہ کرتا حالانکہ تم سب سے بڑھ کر اگر کسی چیز کے محتاج ہو تو وہ یہی ہے [4]

نیساپوری مفسر قرآن نے یہاں پر بات بڑی لطیف لکھی ہے کہ اللہ کی صفت قیومیت کا مقتضا یہ ہے کہ وہ انسانی احتیاجات کی کمیت اور کیفیت سے باخبر ہو اور پھر ان کی بہم رسانی پر بھرپور قدرت رکھتا ہو۔ اللہ کے علم کی وسعتوں اور پہنائیوں کی طرف ان اللہ لا یخفی میں اشارہ کیا ہے اور اللہ کی قدرت کاملہ کو یصورکم فی الارحام میں بتایا ہے اور پھر کمال علم کے دعویٰ کے ثبوت کے لئے یصورکم فی الارحام فرما کر ٹھیٹھ عقلی دلیل کی طرف بھی اشارہ کر دیا ہے خدا کے عالم ہونے کی دلیل یہ ہے کہ رحم مادر میں انسان کو موزوں اور مناسب صورت دیتا ہے۔ پھر صورت

---

[1] افادات شیخ الاسلام، [2] ماجدی، [3] ترجمان القرآن، [4] تفہیم القرآن

کہ اس کارفرمائی تناسب اور موزونیت کے باوجود ایک کا نقش دوسرے کے نقش سے ایک کا رنگ دوسرے کے رنگ سے ایک کی آواز دوسرے کی آواز سے مختلف ہے۔ اوّل صورت گری میں یہ عجیب وغریب ترکیب، ان میں ہم آہنگی اور یکسانی اور پھر یہ اختلاف اللہ کے کمال کی دلیل ہے۔

۷۔ کوئی لائق پرستش نہیں مگر وہی غالب و توانا، دانا و حکیم جس کی قدرت اور حکمت کی کوئی انتہا نہیں۔ اس نے کسی حکمت اور مصلحت ہی سے حضرت مسیح کو بدون باپ کے اور حضرت حواء کو بدون ماں کے اور حضرت آدم کو بغیر ماں اور باپ کے پیدا کیا جس مخلوق کو جس طرح چاہا پیدا فرما دیا اس کی حکمتوں کا کون احاطہ کرسکتا ہے[1]۔

آغاز سورت میں دعویٰ پہلے ہے یعنی لا الٰہ الا ہو اور دلیل بعد میں ہے یعنی الحی القیوم اللہ ہی ہماری پرستاریوں اور عابدانہ اعمال کا مستحق ہے کیونکہ اسی کی ذات الحی القیوم ہے اور یہاں بھی دعویٰ پہلے ہے اور دلیل بعد میں ہے اللہ کی ذات ہی عبادت کے لائق ہے۔ کیونکہ وہی غالب توانا اور حکیم ہے۔

اس طرح اللہ کے الٰہ ہونے کو ثابت کرنے کے لئے اللہ کی چار صفتوں کو بطور دلیل پیش فرمایا ہے ایک حیات دوسری قیوم، تیسرے علم اور چوتھے قدرت۔ یعنی اللہ کے سوا چونکہ کوئی دوسری ہستی بالذات حی و قیوم اور علیم و قدیر نہیں ہے اس لئے ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی ہے جہاں تک توحید عبادت کا تعلق ہے ان قرآنی آیات کا تصور اس درجہ کامل اور بے لچک ہے کہ اس کی نظیر نہیں ہے۔

اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی الوہیت میں بھی یگانہ ہو کیونکہ اس کی یگانگت کی عظمت بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر کوئی ہستی اس کی الاہیت میں شریک مان لی جائے۔ توحید الاہیت دو عناصر سے مرکب ہے ایک ایجابی اور دوسرا سلبی۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ ایک خدا کی عبادت کی جائے۔ دعا و استعانت، رکوع و سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیازمندانہ اعمال اللہ کے لئے کئے جائیں۔ سلبی پہلو یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے نہ بشر کی نہ فرشتہ کی نہ حجر کی۔ توحید الاہیت کی طرف دعوت کے لئے تمام انبیاء روانہ کئے گئے اور حق یہ ہے کہ قرآن سے پہلے کسی نے اس توحید کو نہ منقح کیا اور نہ دلائل و براہین کے ساتھ قرآن کے انداز میں پیش کیا کیونکہ کسی نہ کسی صورت میں شخصیت پرستی، عظمت پرستی نمودار ہوتی رہی۔

---

[1] معارف م ا

یہاں قرآن نے ان چار صفات کے ذریعے توحید الوہیت کا ایسا نقشہ کھینچ دیا کہ اس طرح کی لغزشوں کے تمام دروازے بند ہو گئے گویا اس نے صرف توحید پر ہی زور نہیں دیا بلکہ شرک کی بھی راہیں بند کر دیں۔

غور فرمائیے کہ اگر اللہ کے الہ ہونے کی علت یہ ہے کہ اس کی ذات حیّ وقیوم اور علیم و قدیر ہے تو کائنات ہستی میں کون ہے جس میں یہ صفات موجود ہوں۔ مسیح ابن مریم ہوں یا کوئی اور کوئی بھی ان صفات میں اللہ کا شریک نہیں ہے جو ہمہ وقت موت کا منتظر ہے وہ حیّ کب ہے اور جو اپنے وجود میں خود بننے کا محتاج ہے وہ قیوم کیونکر ہے اور جو عجز و بیچارگی اور حاجتوں کی زندگی رکھتا ہے وہ بیچارہ علیم و قدیر کیسے ہے اگر اللہ کے سوا ان صفات کا موصوف کوئی نہیں تو پھر اللہ کے علاوہ الہ بھی کوئی نہیں ہے۔

هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ عَلَیْکَ الْکِتٰبَ مِنْهُ اٰیٰتٌ مُّحْکَمٰتٌ هُنَّ
اُمُّ الْکِتٰبِ وَاُخَرُ مُتَشٰبِهٰتٌ ؕ فَاَمَّا الَّذِیْنَ فِیْ قُلُوْبِهِمْ زَیْغٌ
فَیَتَّبِعُوْنَ مَا تَشَابَهَ مِنْهُ ابْتِغَآءَ الْفِتْنَةِ وَابْتِغَآءَ تَاْوِیْلِهٖ ۚ
وَمَا یَعْلَمُ تَاْوِیْلَهٗٓ اِلَّا اللّٰهُ ۘ وَالرّٰسِخُوْنَ فِی الْعِلْمِ یَقُوْلُوْنَ
اٰمَنَّا بِهٖ ۙ کُلٌّ مِّنْ عِنْدِ رَبِّنَا ۚ وَمَا یَذَّکَّرُ اِلَّآ
اُولُوا الْاَلْبَابِ ۝

اے پیغمبر وہی حی و قیوم ہے جس نے آپ پر کتاب اتاری ہے اس میں دو قسم کی آیات ہیں کچھ تو محکمات ہیں یہی کتاب کی اصل اساس ہیں[۸] اور دوسری قسم متشابہات کی ہے[۹]۔ پس جو لوگ دل کے ٹیڑھے ہوتے ہیں وہ ان آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو اللہ کی کتاب میں متشابہات ہیں[۱۰]۔ اس سے ان کا مقصد فتنہ جوئی اور متشابہہ کی حقیقت کو کریدنا ہوتا ہے[۱۱]۔ حالانکہ ان کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن جو لوگ علم میں پختہ ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمارا اس پر ایمان ہے

سب کچھ ہمارے پروردگار کی جانب سے ہے اور نصیحت یاب تو صرف عقل و بصیرت والے ہوتے ہیں ۔ ۱۲

آیاتِ قرآنی کی اصولی تقسیم

اللہ سبحانہٗ کی شانِ قومیت کا تقاضا یہی ہے کہ انسان کی زندگی کی ساری ضرورتیں پوری کرے۔ انسانی ضرورتیں دو طرح کی ہیں جسمانی اور روحانی۔ اس نے جس طرح پہلی کا انتظام کیا ہے۔ اسی طرح دوسری کا سامان کیا ہے۔ جسمانی احتیاج کا پہلی آیت میں بیان ہو چکا ہے ۔ ھو الذی یصورکم فی الارحام کیف یشاء روحانی احتیاج کا اس آیت میں بیان ہو رہا ہے کہ وحی کے ذریعے نازل شدہ اللہ کی کتاب ہے جو زندگی میں انسان کے لئے ہدایت و سعادت کی راہ کھولتی ہے گویا جسمانی ضرورتوں کو پورا کرنا صورت گری ہے تو روحانی فلاح و سعادت کا انتظام سیرت آرائی ہے۔

الم البقرہ کے آغاز میں بتایا کہ الذین یومنون بالغیب یعنی عالم دو ہیں ایک عالم غیب دوسرے عالم شہادت ۔ غیب یعنی غیر محسوس شہادت یعنی محسوس۔ انسان علم و ادراک کا ذریعہ انسان کے حواس یعنی دیکھنے، سونگھنے، سننے، چکھنے اور چھونے کی قوتیں ہیں ۔ جو کچھ ان کے ذریعے انسان معلوم کر سکتا ہے وہ اس کے لئے شہادت ہے اور جو معلوم نہیں کر سکتا وہ غیب ہے ۔ قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ انسان ان حقائق پر یقین رکھے جو اگرچہ اس کے لئے غیر محسوس ہیں لیکن اللہ کی وحی نے ان کی خبر دی ہے مثلاً اللہ کی ذات و صفات، ملائکہ کا وجود، وحی و نبوت، مرنے کے بعد زندگی، عذاب و ثواب، دُنیا کی ابتدائی پیدائش، آخرت کی زندگی کے احوال و واردات ۔

یہاں آیاتِ قرآنی کی دو قسمیں بیان کی گئی ہیں ۔ محکمات اور متشابہات، متشابہات سے مقصود وہی بیانات ہیں جن کا تعلق عالمِ غیب سے ہے ۔ قرآن نے بتایا ہے کہ جو علم میں پختہ ہیں اور سمجھ بوجھ رکھتے ہیں وہ ان امور پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کی حقیقت معلوم کرنے کی کاوش میں نہیں پڑتے کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ یہ امور عقلِ انسانی سے بالا ہیں لیکن جو لوگ علم و بصیرت سے کورے ہیں وہ ان میں کاوش کر کے فتنہ پیدا کرتے ہیں ۔

اگر یہ عقلِ انسانی سے بالا ہیں تو ہم ان پر یقین کیوں کریں ؟ اس لئے کہ بغیر اس کے زندگی کا مسئلہ حل

نہیں ہو سکتا۔ ہم وجدانی طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ہماری محسوسات کی سرحد سے بھی آگے کچھ ہونا چاہیے لیکن ہمیں علم و ادراک کے ذریعے کوئی یقینی بصیرت نہیں ملتی۔ اگر اس بارے میں یقین کی کوئی صدا ہے تو وہ صرف الہامی ہدایت کی صدا ہے۔ اگر ہم اس سے ہٹ جائیں۔ تو پھر ہمارے پاس جہل و تاریکی کے سوا کچھ باقی نہ رہے گا۔ اب تک ہم نے علم و ادراک کے ذریعے اس بارے میں جو کچھ معلوم کیا ہے اس میں کوئی یقینی بصیرت ایسی نہیں ہے جو ان حقائق کے خلاف ہو۔ یقینی بصیرت کا لفظ بالا ارادہ کہا ہے کیونکہ عالم غیب کے حقائق کیخلاف آج تک جو کچھ کہا گیا وہ اس سے زیادہ کچھ نہیں ہے کہ بقول حافظ ابن تیمیہ کے عدم علم کا اعتراف ہے جیسا کہ البنوت میں تمام حکمائے قدیم کے بارے میں لکھا ہے اور یا پھر انکار ہے تو اسکی بناء تمام تر گمان و وہم ہے کوئی ثابت شدہ حقیقت نہیں ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ تم گمان و وہم کے حربہ سے یقین و بصیرت کا مقابلہ نہیں کر سکتے

اصل یہ ہے کہ مادی زندگی کے احساسات کی زنجیروں میں ہم کچھ اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان سے آزاد ہو کر جمالی حقیقت کا تصور ہی نہیں کر سکتے، اس کے سوا ہمارے سامنے کوئی ارادہ نہیں ہے کہ جو کچھ بتلایا گیا ہے اس پر یقین کریں اور جو کچھ معلوم نہیں اس کی کاوش میں سرگرداں ہوں گے تو حقیقت کا سراغ نہیں ملے گا۔ البتہ نئے نئے وہموں اور گمانوں میں پڑ جائیں گے۔

قرآن نے اس آیت میں یہ بات کھول کر بتا دی ہے کہ متشابہات کی حقیقت انسان نہیں پا سکتا۔ **مایعلم تاویلہ الا اللہ** گویا علم غیب سے تعلق رکھنے والے سارے معاملات جو ہمارے محسوسات سے بالا ہیں۔ متشابہات کی قسم میں داخل ہیں۔ علم میں ارباب کمال ان کی تگ و دو نہیں کرتے بلکہ کہتے ہیں۔

محکمات کیا ہیں؟

۸۔ اس میں دو قسم کی آیات ہیں کچھ تو محکمات ہیں یہی کتاب الٰہی کی اصل و اساس ہیں۔ محکمات احکام سے بنا ہے اور احکام کا مادہ حکم ہے۔ حکم کے اصلی معنے روکنے کے آتے ہیں۔ اسی سے حکمۃ الفرس گھوڑے کے لگام کو بولتے ہیں اور اسی سے فرمان روا کو حاکم کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگوں کو ظلم سے روکتا ہے اور اسی سے احکام کے معنے پختہ کرنے کے ہیں کیونکہ وہ اپنی پائداری کی وجہ سے اپنے کو تباہی اور خرابی سے روکتا ہے۔ اسی سے احکام کے معنے عمدہ کرنا اور شاندار بنانے کے ہیں کیونکہ اس کی عمدگی لگا ہوں کو روکتی ہے۔ اسی سے حکمت و دانائی کی بات اور کام کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دانائی اور حماقت کے لئے رکاوٹ بنتی ہے۔ دانا، واعظ، عالم، عمدگی سے بات کرنے والے اور ہر موقعہ پر پائدار بات کہنے والے کو

والے حکیم کہتے ہیں ۔ اس سے معلوم ہوا کہ احکام کے دو معنی ہیں پختہ ہونا اور حکمت والا ہونا۔ ان دونوں معانی کے لحاظ سے پورے قرآن کو کتابِ حکیم اور اس کی آیات کو محکم کہا گیا ہے لیکن یہاں قرآن نے چونکہ آیاتِ قرآنی کو محکمات اور متشابہات میں تقسیم کر دیا ہے۔ اس لئے یہاں محکم کے کوئی ایسے خاص معنے ہونے چاہییں جن میں متشابہات کا مدِ مقابل بننے کی صلاحیت ہو۔

شارحینِ قرآن کا اس میں اختلاف ہے کہ محکمات سے یہاں کیا مراد ہے یا آیات محکم کیا ہیں ۔

امام رازی نے عبداللہ بن عباس کی طرف منسوب کر کے بتایا ہے کہ محکم وہ ہیں جو مختلف شریعتوں میں یکساں ہوں جیسے شرک نہ کرنا ، والدین کے حسن سلوک وغیرہ ۔

عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن مسعود کی طرف نسبت کر کے یہ بھی بتایا گیا ہے کہ محکم ناسخ کو کہتے ہیں ۔

امام رازی نے اصم کی طرف منسوب کر کے محکم کی یہ تعریف کی ہے کہ جس کی دلیل صاف اور واضح ہو۔

ابنِ جریر نے امام مجاہد کا نام لے کر محکم کی یہ تعریف کی ہے کہ محکم وہ آیات ہیں جن میں حلال و حرام کا بیان ہو۔

محمد بن جعفر کہتے ہیں کہ محکم وہ آیات ہیں جن میں مطالب کیلئے ایک ہی جامہ ہو ۔

ابو بکر الجصاص فرماتے ہیں کہ محکمات وہ ہیں جن میں سننے والا ایک ہی معنے سمجھے دوسرے معنے کا احتمال نہ ہو ۔

علامہ آلوسی نے آیاتِ محکمہ کی یہ تعریف کی ہے کہ جن کے معانی واضح ہوں جن کا مدلول ظاہر اور تعبیر ایسی پائدار ہو کہ کوئی احتمال نہ ہو۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ محکم وہ آیتِ قرآنی ہے جس سے عربی زبان کا جاننے والا صرف ایک ہی معنے سمجھے اور اس میں اعتبار عرب اول کا ہوگا ہمارے زمانہ کے مدققین کا سمجھنا حجت نہیں ہے۔

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں محکمات وہ آیتیں ہیں جن کے معنے صاف کھلے ہوئے ہیں ۔ ان کے معنے میں کچھ خلش نہ ہو ۔

مولانا اشرف علی فرماتے ہیں :-

آیاتِ محکمات وہ ہیں جن کی مراد ایسے شخص پر بالکل ظاہر ہو جو قواعدِ عربیہ کو اچھی طرح جانتا ہو۔

مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں محکمات وہ آیات ہیں جن کی مراد معلوم متعین ہو خواہ اس وجہ سے کہ لغت کے لحاظ سے کوئی ابہام نہ ہو ۔ نہ عبارت ایک معنے سے زائد معنے رکھتی ہو اور نہ جو

مدلول سمجھا گیا وہ عام قواعد مسلمہ کے خلاف ہو اور یا اس لئے عبارت اور الفاظ میں بلحاظ لغت اگرچہ کئی معنے کا احتمال ہو لیکن شارع کی نصوص یا اجماع معصوم یا دین کے عام مسلمہ اصول سے قطعاً متعین ہو ہو چکا ہو کہ متکلم کی مراد یہ ہے۔

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ محکم سے مقصود وہ مطالب ہیں جو اصل و بنیاد کی حیثیت رکھتے ہوں اور اس لئے انسانی عقل کے لئے صاف صاف اور کھلے احکام ہوں۔ مثلاً توحید و رسالت اور امر و نواہی، حلال و حرام۔

مولانا حسین علی فرماتے ہیں کہ محکم وہ ہیں کہ جن کا معنے متفق علیہ اور مفہوم معقول اور قابلِ فہم ہو۔

مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ محکم پکی اور پختہ چیز کو کہتے ہیں۔ آیاتِ محکمات سے مراد وہ آیات ہیں جن کی زبان بالکل صاف ہو جن کے الفاظ معنے و مدعا پر صاف اور صریح دلالت کرتے ہوں جنہیں تاویلات کا تختہ مشق بنانے کا موقع کم ہی ملتا ہو۔ یہ آیات کتاب کی اصل بنیاد ہیں۔ یعنی قرآن جس غرض کے لئے نازل ہوا ہے اس غرض کو یہی آیات پورا کرتی ہیں۔ انہی میں اسلام کی طرف دنیا کو دعوت دی گئی ہے۔ انہی میں عبرت و نصیحت کی باتیں فرمائی گئی ہیں۔ انہی میں گمراہیوں کی تردید اور صراطِ مستقیم کی توضیح کی گئی ہے۔ انہی میں دین کے اصول بیان کئے گئے ہیں۔ لہٰذا جو شخص طالبِ حق ہو اور یہ جاننے کے لئے قرآن کی طرف رجوع کرے کہ وہ کس راہ پر چلے اور کس راہ پر نہ چلے۔ اس کی پیاس بجھانے کیلئے آیاتِ محکمات ہی اصل مرجع ہیں اور فطرتاً انہی پر اس کی توجہ مرکوز ہو گی اور وہ زیادہ تر انہی سے فائدہ اٹھانے میں مشغول رہے گا۔

مولانا اصلاحی فرماتے ہیں، آیاتِ محکمات سے قرآن کی وہ آیات مراد ہیں جو آفاق و انفس کی طرح بالکل بدیہیات خیر و شر کے مسلمات اور معروف و منکر کے قطعیات و یقینیات پر مشتمل ہیں جن کو دل قبول کرتے ہیں اور جن کو قبول کرنے کے لئے اس کے سوا کوئی شرط نہیں ہے کہ دل سلیم ہو جن کے حق میں ہر عقل گواہی دیتی ہے بشرطیکہ اس پر تعصب، جذبات اور غیر فطری عقلیات کے پردے پڑے ہوئے ہوں۔ انہی محکمات پر صحیح مذہب کی بنیاد ہوتی ہے۔ اس وجہ سے تمام آسمانی مذاہب اور تمام انبیاء سے یہ تواتر کے ساتھ نقل ہوئی ہیں چونکہ فطرتِ انسانی کے اندر ان کی جڑیں نہایت مستحکم ہوتی ہیں۔ شبہات و شکوک کی آندھیاں ان کو ہلانے سے قاصر رہتی ہیں۔ اس وجہ سے قرآن نے ان کو محکمات سے تعبیر کیا ہے۔

ائمہ لغت اور علماءِ قرآن کے ان تمام ارشادات پر ایک غائر نظر ڈالو تو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کل کلاں ایک ہی مفہوم کی مختلف تعبیریں اور ایک ہی حقیقت کی مختلف تفسیریں ہیں۔ محکم عالم شہادت

کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے، جو بالکل پختہ ہو، صحیح و صواب اور حق اس میں اس درجہ نمایاں ہو کر دلیل و برہان اور غور و فکر کی ضرورت نہ ہو۔ مطالب مقرر ہوں، معانی واضح اور صاف ہوں کہ دوسرے معنے کا ان میں احتمال نہ ہو۔ آیات کو قرآن محکمات کہتا ہے اور ان کو ہی وہ اُم الکتاب بتاتا ہے۔

اُم الکتاب ہونے کا مطلب

هُنَّ اُمُّ الْكِتٰبِ محکمات ہی قرآن میں اصل و اساس ہیں۔ اُم ہر چیز کی اصل کو کہتے ہیں۔
ہم معالم القرآن کی جلد اوّل میں بتا آئے ہیں کہ عربی میں اُم کا اطلاق ایسی تمام چیزوں پر ہوتا ہے۔ جن میں شانِ جامعیت ہو یا بہت سی چیزوں میں مقدم ہوں یا پھر ایسی کوئی چیز جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں چنانچہ سر کے درمیانی حصّہ کو اُم الراس کہتے ہیں، فوج کے جھنڈے کو اُم کہتے ہیں اور مکہ کو اُم القریٰ کہا جاتا ہے۔ پس یہاں محکمات کو اُم الکتاب اس لئے کہا گیا ہے کہ ان میں مرکزیت کی شان ہے اور مدار اور معیار ہیں۔ گویا محکمات ہی باقی ساری کتاب الٰہی کا مرجع و مرکز ہیں۔ ان ہی پر سارے مطالب کا مدار ہے۔ ساری شاخیں انہی سے پھوٹتی ہیں اگر نزاع و اختلاف پیدا ہوتا ہے تو اس کا فیصلہ بھی انہی کی کسوٹی پر پرکھ کر ہوتا ہے۔ پھر انہی کا یہ درجہ ہوتا ہے کہ ان کو اصول قرار دے کر ان سے مسائل مستنبط کئے جائیں۔ اور ان مسائل پر اسی طرح اعتماد کیا جائے جس طرح اصول پر اعتماد کیا جاتا ہے۔

علامہ شاطبی نے الموافقات میں لکھا ہے کہ قرآن میں آیاتِ محکمات کی کثرت ہے کیونکہ :۔

اولاً: قرآن نے محکمات کو اُم الکتاب کہا ہے۔ یہ کہنا ہی محکمات کے عام اور زیادہ ہونے کو بتا رہا ہے۔

ثانیاً: اگر محکمات زیادہ نہ ہوں تو قرآن اپنے مخاطبوں کے لئے ہدایت و بیان نہ رہے گا۔ اشتباہ میں ہدایت اور بیان نہیں ہوتا۔

ثالثاً: قانون سازی کے لئے مجتہدین کے غور و فکر کی جولانگاہ قانونی دلائل ہوتے ہیں۔ ان میں باہم ربط اور نظم کا ہونا ضروری ہے۔ خود قرآن میں پورے قرآن کے بارے میں احکمت آیاتہ کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ الاکلیل فی المتشابہ والتاویل میں فرماتے ہیں کہ :۔

اللہ سبحانہ نے کبھی محکم کو متشابہ کے مقابلے میں اور کبھی منسوخ کے مقابلے میں پیش فرمایا ہے محکم اور منسوخ اور محکم اور متشابہ دونوں طرح بولا جاتا ہے۔ قرآن میں ایک موقعہ پر تمام آیات کو محکم اور ایک جگہ تمام آیات کو متشابہ بتایا ہے لیکن آلِ عمران میں آیات کی

دو قسمیں بتائی ہیں ۔ محکم اور متشابہ ۔ خلاصہ یہ ہے کہ محکم ہونے کی تین صورتیں ہیں ۔ اوّل یہ کہ قرآن کے القاء میں محکم ہوں اس کے مقابلے پر القاء شیطان آتا ہے ۔ یعنی محکم وہ القاء رحمانی ہے جو شیطان کے القاء سے بالکل محفوظ ہوتا ہے ۔ دوم یہ کہ قرآن کے القاء میں محکم ہو یعنی منسوخ نہ ہو ۔ سوم یہ کہ تاویل و معنے میں محکم ہو یعنی اپنے مطالب کے لحاظ سے حقیقت مقصودہ کو بتاتا ہو ۔ اس لحاظ سے محکم تین معنے میں آتا ہے ۔

بہر حال محکم سے وہ مطالب مقصود ہیں جو اصل و بنیاد کی حیثیت رکھتے ہیں ۔ اور اس لئے عقلِ انسانی کے لئے صاف صاف اور کھلے احکام ہیں ۔

متشابہات کیا ہیں ؟

۹ ۔ اور دوسری قسم متشابہات ہیں ۔ یہ متشابہہ کی جمع ہے اور تشابہ کے معنے ایک دوسرے کے مشابہ ہونا ہیں ۔ امام راغب نے المفردات میں لکھا ہے کہ شِبہ ، شَبہ کا استعمال ان چیزوں میں ہوتا ہے جو اندرونی یا بیرونی کیفیت میں ایک جیسی ہوں ، مثلاً رنگ ، شکل ، انصاف ، ظلم ، گمراہی ، جہالت وغیرہ اگر ایک چیز دوسری چیز کی طرح ہو تو ایک دوسرے کی شِبہ یا شَبہ کہلائے گی لیکن اگر حسی و معنوی تماثل اتنا گہرا ہو کہ دو چیزوں میں امتیاز نہ ہو سکے تو اس کو شبہ کہا جاتا ہے ۔ جلد اوّل میں اتوا بہ متشابھًا پر نوٹ نمبر ۴۵ میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حقیقت اور مزہ میں اختلاف ہونے کے باوجود صورت و رنگ میں ایسی ہم آہنگی ہوگی کہ ایک کا دوسرے سے امتیاز نہ ہو سکے گا اور اسی ہم آہنگی کی بنا پر پورے قرآن کو کتابًا متشابھًا کہا گیا ہے یعنی حکمت ، استقامت ، ترتیب اور تنظیم میں قرآن کی آیتوں میں ہم آہنگی ہے ۔ علامہ زمخشری نے کشاف میں اسی پر نوٹ لکھا ہے کہ صحت ، پختگی ، صداقت ، نفع رسانی ، تناسبِ الفاظ ، سلاستِ بیانی ، کیفیتِ ترتیب میں اصولی طور پر قرآن کی آیات باہم ایک دوسرے کے متشابہ ہیں ۔

تشابہ اور اشتباہ میں فرق

تشابہ جیسے اصطلاحِ قرآنی ہے ایسے ہی اشتباہ اصطلاحِ نبوت ہے ۔ شاطبی فرماتے ہیں کہ قرآن جسے محکم کہتا ہے زبانِ نبوت میں اسے بیّن کہا گیا ہے اور قرآن نے جیسے متشابہات کی تعبیر اختیار کی ہے زبانِ نبوت میں اس کے لئے مشتبہات بولا گیا ہے گویا اوّل اصطلاحِ قرآنی ہے دوسری اصطلاحِ نبوت

ہے جیسے تشابہ کے لئے یہ آیت قرآنی مرکزی حیثیت رکھتی ہے ایسے ہی اشتباہ کے لئے وہ ارشادِ نبوّت مرکزی حیثیت رکھتا ہے جو بخاری و مسلم میں بحوالہ نعمان بن بشیر آیا ہے کہ :۔

میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم سے سنا ہے کہ حلال بھی صاف اور واضح ہے اور حرام بھی صاف ہے ہاں ان دونوں کے درمیان کچھ مشتبہ باتیں ہیں ان کو بہت سے لوگ نہیں جانتے ہیں۔ جو شخص ان باتوں سے بچتا رہے اس نے اپنے دین اور آبرو کی طرف سے صفائی پیش کردی۔ اور جو ان میں مبتلا ہو گیا وہ یقیناً حرام میں بھی مبتلا ہو کر رہے گا۔ اس کی مثال اس چرواہے کی سی ہے جو اپنے جانوروں کو کسی خاص چراگاہ کے ارد گرد چراتا رہتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ جانور اس کے اندر بھی جا گھسیں۔ یاد رکھو کہ ہر بادشاہ کی ایک چراگاہ مخصوص ہوتی ہے اور اللہ کی مخصوص چراگاہ اس کے محرمات ہیں۔ خوب سن لو کہ انسان کے جسم میں گوشت کا ایک لوتھڑا ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہے تو سارا جسم ٹھیک ہے اور اگر وہ بگڑا ہوا ہے تو سارا جسم بگڑا ہوا ہے۔ یاد رکھو وہ گوشت کا ٹکڑا انسان کا دل ہے۔

اس ارشادِ نبوّت اور آیتِ قرآنی میں کس قدر ہم آہنگی ہے۔ اس کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ محکمات کے مقابلے میں ارشاد میں بیّنات اور متشابہات کے مقابلے میں مشتبہات اور ــــــــــ سے مقابلے میں ارشاد میں قلب کا ذکر ہے۔ آیت میں دو قسم کے دل بتائے ہیں ایک وہ جن میں کجی ہو دوسرے وہ جن میں استقامت ہو۔ ارشادِ نبوّت میں بھی دل کی دو ہی قسمیں قرار دی گئی ہیں۔ ایک صالح دوسرے فاسد۔ آیت میں متشابہات کے بارے میں دل میں کجی رکھنے والوں کا یہ عمل بتایا گیا ہے کہ وہ اس سے فتنہ سامانی کرتے ہیں۔ ارشادِ نبوت میں اسی کے لازم کی طرف یہ کہہ کر ارشاد کیا ہے کہ جو شخص مشتبہات سے دامن بچا کر رکھے گا تو وہ اپنے دین اور آبرو کی طرف سے صفائی پیش کردے گا۔

تشابہ اور اشتباہ میں اس ہم آہنگی کے پیشِ نظر اگر امام شاطبی نے یہ فیصلہ فرمایا ہے کہ متشابہات میں وہ مشتبہات بھی داخل ہیں۔ جن کی طرف مذکورہ بالا ارشادِ نبوّت رہنمائی کر رہا ہے تو کوئی حیرت کی بات نہیں۔

متشابہ میں بھی محکم کی طرح علماء کے مختلف خیالات ہیں۔

الشیخ محمد اعلیٰ تھانوی نے کشاف اصطلاحات الفنون میں، علامہ شاطبی نے الموافقات میں اور حافظ ابن تیمیہ نے الاکلیل فی المتشابہ والتاویل اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ امام راغب اصفہانی نے المفردات میں اور مولانا اشرف علی نے التواجد فی المتشابہ میں اس دامن دراز بحث کو سمیٹنے کی مفید کوشش فرمائی ہے۔

متشابہ کی قسمیں

ہمیں چاہیے کہ متشابہ کا مطالعہ کرنے وقت پہلے اس پر غور کر لیں کہ متشابہ کیا ہے اور اس کا حکم کیا ہے؟ ہماری رائے میں اس موضوع پر حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی پیش فرمودہ رائے سب سے زیادہ قیمتی سرمایہ ہے یعنی متشابہات وہ آیات ہیں جن کی مراد معلوم و متعین کرنے میں کچھ اشتباہ والتباس ہو۔ خواہ اس کی وجہ کچھ ہو۔ اگر اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کا تعلق عالم غیب سے ہے اور اس کی حقیقت کا جاننا ہماری علمی دسترس سے باہر ہے (علامہ شاطبی کی رائے میں یہ متشابہ حقیقی ہے) اور اگر التباس اس لئے ہوا کہ لغت و ترکیب کی وجہ سے الفاظ میں کچھ ابہام ہے یا تعبیر ایک سے زیادہ معنی رکھتی ہے یا ظاہر انداز سے جو کچھ سمجھا گیا ہے وہ دین کے مسلمہ اصولوں کے خلاف ہے۔ ایسا تشابہ اضافی ہے۔ شاطبی لکھتے ہیں کہ اس آیت قرآنی میں متشابہ کی پہلی قسم مراد ہے۔

آیت میں پہلی ہی قسم مراد ہے یعنی اس کی واقفیت اور معرفت کا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے اور نہ ہماری دسترس ان دلائل تک ہے جن کی مدد سے ہم کلام کی مراد سمجھ سکیں۔

مطلب یہ ہے کہ متشابہات سے مراد وہ آیات ہیں جن میں ہمارے مشاہدات و معلومات کی دسترس سے بالا باتیں تشبیہی اور تمثیلی رنگ میں بتائی گئی ہیں۔ یہ آیات جن حقائق سے تعلق رکھتی ہیں۔ وہ بجائے خود واضح ہوتی ہیں لیکن چونکہ ان کا تعلق عالم غیب سے ہوتا ہے اس لئے قرآن ان کو استعارے اور کنائے کی زبان میں پیش کرتا ہے تاکہ علم کے جویا بقدر استعداد اس سے استفادہ کر سکیں اور اس کی اصل صورت اور حقیقت کو اللہ کے حوالے کر دیں۔ یہ آیتیں اللہ کی صفات و افعال یا آخرت کی نعمتوں اور اس کے آلام سے تعلق رکھنے والی ہوتی ہیں۔ ان کا جس حد تک ہمارے لئے سمجھنا ضروری ہے اتنا ہماری سمجھ میں آجاتا ہے اور اس سے ہمارے علم الیقین میں اضافہ ہوتا ہے۔

متشابہات کا فہم و ادراک

اگر متشابہات حقیقی کا سرتاسر تعلق عالم غیب کے حقائق سے ہے تو وہ عالم اگرچہ ہمارے اس زیر تجربہ و زیر مشاہدہ مادی عالم سے بالکل الگ ہے تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اس لئے یہ الفاظ جن مادی خصائص کو متلزم ہیں یا ہم ان کے دیکھنے سننے کے اس جہان میں عادی ہو چکے ہیں۔ ان لفظوں

کوشش کرتے ہیں جو اس دنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں۔ اسی سبب سے بعض کج فہم عالم غیب کے احوال کو شن کران کو غلط معنی کا لبادہ پہنا دیتے ہیں اور ان کی تاویل و تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ و معنے میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ راستہ سخت خطرناک ہے، اسی لئے قرآن نے ان نازک دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے۔ اور ان کو متشابہات کے نام سے پیش کیا ہے۔

بہر حال متشابہ سے مقصود وہ مطالب ہیں جن کا تعلق ماورار عقل حقائق سے ہے اور انسان علم و حواس کے ذریعے ان کا ادراک نہیں کرسکتا۔ اس لئے ناگزیر طور پر ان کو ایسے پیرائے میں بیان کیا جاتا ہے کہ فہم انسانی کے لئے ناقابل برداشت بوجھ نہ ہو اور اس لئے تشبیہہ و مجاز سے خالی نہیں ہوتا۔ اگر ایک انسان کج فہمی سے کاوش کرنا چاہے تو طرح طرح کے معنی و مباحث کے احتمالات پیدا کرسکتا ہے۔

یہی متشابہ حقیقی ہے اور اس کے ساتھ متشابہ اضافی بھی ہے۔ علامہ شاطبی کی رائے میں صریح آیت قرآن کا وہ مصداق و منطوق نہیں ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔ لیس مبدا خل فی صریح الآیۃ۔ یعنی اضافی متشابہ اس آیت میں صراحتاً داخل نہیں ہے۔

کج رو اور کج فکر کے دوگونہ مقاصد

۱۔ بس جو لوگ دل کے ٹیڑھے ہیں وہ ان آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو اللہ کی کتاب میں متشابہ ہیں۔ اصل ارشاد میں فی قلوبھم زیغ آیا ہے۔ زیغ کے اصل معنے کجی، اعتدال سے ہٹنا، امام راغب نے اس کے یہی معنے بتائے ہیں۔ یوں تو انبیاء کی اُمتوں میں جب بگاڑ آتا ہے اسی راہ سے آتا ہے لیکن قرآن نے یہودیوں اور عیسائیوں کے زیغ کی جو تاریخ بیان کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں یہ زیغ کی بیماری خاص طور پر نمایاں تھی۔

یہودیوں کا زیغ سرتا سر عملی تھا جس کی پوری داستان پہلے پارے میں پڑھ چکے ہو۔ اس کے مقابلے میں عیسائیوں کا زیغ عملی اور اعتقادی تھا۔ وہ جیسے تورات کے متشابہات میں پڑنے کی وجہ سے گمراہ ہوئے اسی طرح قرآن میں بھی انکی ساری دلچسپی متشابہات ہی سے تھی وہ ان ہی میں موشگافیاں کرتے تھے۔ مولانا عثمانی نے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ

> نصاری نجران نے تمام دلائل سے عاجز ہو کر بطور معارضہ کیا تھا کہ آخر آپ حضرت مسیح کو کلمۃ اللہ اور روح اللہ مانتے ہیں۔ بس ہمارے اثبات مدعا کے لئے کافی ہے۔

اور حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ :۔

وفد نجران نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہم ضمیر جمع کی تاویل کرکے الٰہ کے تین ہونے پر استدلال کیا۔ حالانکہ یہ متشابہات میں سے ہے لفظ نحن ہم سے وہ واحد بھی مراد ہوتا جس کے ساتھ اسی جیسا کوئی اور ہو اور وہ واحد بھی مراد ہوتا ہے جس کے ساتھ اس کے اعوان و انصار ہوں اور اس سے وہ واحد بھی مراد ہوتا ہے جو اپنی عظمت شان کی وجہ سے سب سے بالا ہو۔ اس لئے یہ لفظ ہم متشابہ ہے کیونکہ لفظ ایک ہے اور معنے میں تنوع ہے۔ (الاکلیل)

اور علامہ شاطبی فرماتے ہیں :۔

عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو تین میں سے تیسرا صیغہ جمع سے استدلال کرکے کہا تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ اللہ کہتا ہے کہ ہم نے کہا، ہم نے پیدا کیا، ہم نے حکم دیا۔ اگر وہ واحد ہوتا تو کہتا میں نے کیا، میں نے پیدا کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ، عیسیٰ اور مریم الٰہ ہیں۔

دین کی زندگی میں فتنہ جوئی

اا۔ اس سے ان کا مقصد فتنہ جوئی اور متشابہ کی حقیقت کو کریدنا ہوتا ہے تاکہ عقائد و احکام کے باب میں اس کلام سے اپنی گمراہیوں کے لئے سند حاصل کریں جن کے دلوں میں حق طلبی، حق جوئی اور صداقت کی تلاش نہیں ہوتی ہے۔ وہ اس اُدھیڑبن میں لگے رہتے ہیں کہ دین میں کوئی نہ کوئی فتنہ برپا کریں اور بجائے اس کے کہ خود دین کی راہ پر چلیں۔ دین کو اپنی راہ پر چلائیں۔ اور یہ لوگ نصوص کو توڑنے مروڑنے میں کوئی باک نہیں رکھتے۔ اس فتنہ انگیزی سے ان کا مقصد مسلمانوں کو تشویش میں ڈالنا ہوتا ہے اور فتنہ گری کے ساتھ ان کا اتباع متشابہات سے یہ مقصد بھی ہوتا ہے کہ متشابہات کو ایسے معنے پہنا دیئے جائیں جو ان کی ہوائے نفس اور میلانِ طبع کی ترجمانی کرسکیں ایسے لوگ اپنی مطلب برآری کے لئے آیاتِ محکمات کو قطعاً نظر انداز کردیتے ہیں۔

مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں کہ

صحیح طریقہ یہ ہے کہ اس دوسری قسم کی آیات یعنی متشابہات کو محکمات کی روشنی میں سمجھا جائے۔ جو معنے محکمات کے خلاف ہوں ان کی قطعاً نفی کی جائے اور متکلم کی مراد وہ بھی جائے۔ جو محکمات کے

خلاف نہ ہو۔ اگر باوجود سعی بلیغ کے متکلم کی مراد تک رسائی نہ ہو سکے تو ہمہ دانی کا دعویٰ نہ کرنا چاہیے قلت علم اور قصور استعداد اس کا سبب سمجھنا چاہیے۔ ایسی تاویلات سے بالکل پرہیز کرنا چاہیے جو دین کے مسلمہ اصولوں اور آیات محکمات کے خلاف ہوں۔ مثلاً قرآن حکیم نے مسیح علیہ السلام کی نسبت تصریح کردی ان ھو الا عبد انعمنا علیہ اور ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم اور ذالک عیسی ابن مریم اور جا بجا ان کی الوہیت کا رد کیا۔ اب ایک شخص ان سب محکمات سے آنکھیں بند کر کے وکلمتہ القاھا الی مریم وروح منہ وغیرہ متشابہات کو لے دوڑے اور اس کے وہ معنے چھوڑ دے جو محکمات کے موافق ہوں اور ایسے معنے بتائے جو کتاب کی عام تصریحات اور متواتر بیانات کے خلاف ہوں۔ یہ کج روی نہیں تو اور کیا ہے بعض قاسی القلب تو چاہتے ہیں کہ اس طرح مغالطہ دے کر لوگوں کو گمراہ کریں۔ یہ ابتغاء فتنہ ہے اور کچھ کمزور عقیدے والے ڈھلمل یقین ایسے متشابہات سے اپنی رائے اور ہوا کے مطابق کھینچ تان کر مطلب نکالنا چاہتے ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کج رو طبیعتیں صاف اور صریح اور بے غبار توحید کے موضوع پر محکمات کو چھوڑ دیتے ہیں مثلاً والھکم الہ واحد اور انني انا اللہ لا الہ الا انا اور ما اتخذ اللہ ولدا، اور ولم یتخذ والدہ اور لم یلد ولم یولد اور ان کو پس نظر انداز کر کے متشابہات کے ہو رہتے ہیں اور ان کو محکمات سے الگ کر کے بے موقع استعمال کرتے ہیں۔ اس کردار سے وہ دو گونہ مقاصد حاصل کرتے ہیں ایک یہ کہ اس طرح وہ لوگوں کی پر سکون زندگی میں فتنہ انگیزی کریں دوسرے یہ کہ دینی زندگی کی حد تک لوگوں میں بے راہ روی پیدا کریں۔ (الاکلیل)

یعنی کھینچ تان کر آیات کو ایسے مطالب کا جامہ پہنا دیں جو ان کی رائے اور ہوائے نفس کے مطابق ہو۔

تاویل اور اس کی حقیقت

۱۲۔ حالانکہ اس کی حقیقت اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ لیکن جو لوگ علم میں پختہ ہوتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمارا اس پر ایمان ہے سب کچھ ہمارے پروردگار کی جانب سے ہے۔ یعنی ان کا صحیح مطلب صرف اللہ ہی کو معلوم ہے۔ وہ ہی اپنے کرم سے جس کو جس قدر آگاہ کرنا چاہے کر دیتا ہے۔ جو لوگ مضبوط علم رکھتے ہیں وہ محکمات و متشابہات سب کو حق جانتے ہیں۔ انہیں یقین ہے کہ دونوں قسم کی آیات ایک ہی سرچشمہ سے آئی ہیں جن میں تناقض کا امکان نہیں۔ اسی لئے وہ متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹا کر مطلب

سمجھتے ہیں اور جو حصہ ان کے دائرۂ فہم سے بالاتر ہوتا ہے۔ اسے اللہ پر چھوڑ دیتے ہیں کہ وہ ہی بہتر جانتا ہے ہم کو ایمان سے کام ہے [1]

مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ ان دو آیتوں میں باعتبار وقف دو مشہور قرأتیں ہیں ایک قرأۃ میں الا اللہ پر وقف ہے اور دوسری قرأت میں الراسخون فی العلم پر وقف ہے۔ اکثر محققین کا رجحان یہی ہے کہ یہ دو جملے ہیں اور پہلا جملہ الا اللہ پر ختم ہو جاتا ہے۔ قرطبی نے صحابہ و تابعین میں عبداللہ بن عباس، عائشہ، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن مسعود، عروۃ ابن الزبیر، ابی ابن کعب اور عمر بن عبدالعزیز کا اور ائمہ لغت و نحو میں کسائی، اخفش، فراء اور ابوعبیدہ کا یہی مسلک قرار دیا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ الا اللہ پر وقف کے ان گنت دلائل ہیں۔ اور یہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام، جمہور تابعین اور جماہیر امت کی رائے ہے۔ (الاکلیل فی المتشابہ والتاویل)

چونکہ اختلاف قرأت نے شارحین قرآن کے یہاں غیر معمولی اہمیت حاصل کرلی ہے اور ایک دامن دراز بحث کا دروازہ کھل گیا ہے اس لئے ہمیں چاہیے کہ آگے قدم بڑھانے سے پہلے یہ سمجھ لیں کہ تاویل کیا ہے؟

تاویل کے لغوی معنے

عربی میں تاویل کے معنے کسی بات کے نتیجے اور مآل کے ہیں اور چونکہ الفاظ کے معانی بھی انکی دلالت کا مآل و مصداق ہوتے ہیں اس لئے مطالب اور معانی کو تاویل بولتے ہیں حافظ ابن تیمیہ نے ایک محقق لغوی کی طرح تاویل کے معنے اس طرح بیان کئے۔

تاویل اوّل یاوّل کا ایسا ہی مصدر ہے جیسے حول یحول سے تحویل اور عول یعول سے تعویل۔ نیز تاویل آل یؤل سے ایسا ہی مصدر متعدی ہے جیسے جال یجول سے تجویل اوّل کے معنے لوٹنا اور تاویل کے معنے لوٹانا۔ اول ہی سے مآل مرجع کے معنے میں آیا ہے۔ اور اسی سے بطور اشتقاق اکبر موئل بنا ہے۔ اس کے معنے بھی مرجع کے ہیں۔ قرآن میں ہے:-

فلن تجد من دونہ موئلا اور بطور اشتقاق صغیر کے اسی سے آل بنتا ہے۔ آل بھی کسی شخص کے لئے اس کا مرجع ہوتی ہے اور آل کا لفظ ایسے بڑے لوگوں کے لئے بولا جاتا ہے جن میں مرجع و مرکز

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بننے کی صلاحیت ہو۔ جیسے آلِ ابراہیم، آلِ فرعون، لفظ اوّل کا وزن افعل ہے اسی لئے اس کا مونث اولیٰ آتا ہے۔ قرآن میں ہے لله الحمد فی الاولی والآخرة پہلے کو اوّل اس لئے کہتے ہیں کہ وہ بعد میں آنے والے اعداد کے لئے مرجع کی حیثیت رکھتا ہے۔

تاویل کے سلف میں معنے

تاویل کا لفظ سلف میں تین معنے میں استعمال ہوا ہے۔

اوّل بمعنے تفسیر و تشریح اور آیت کے معانی بیان کرنا۔ تاویل اس معنے کے لحاظ سے تفسیر کا مرادف ہے، امام ابنِ جریر اپنی تفسیر میں لفظ تاویل انہی معنے میں استعمال کرتے ہیں۔

دوسرے معنے تاویل کے خارج میں مصداق ظاہر ہونا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ا۔ ان دونوں معنی میں جوہری فرق ہے۔ تاویل تفسیر کے معنے میں ایک علمی اور کلامی موضوع ہے۔ اس میں تاویل اگر پہنائے قلب میں ہو تو یہ اس کا وجود ذہنی ہے اگر زبان پر آئے تو یہ اس کا وجود لفظی ہے۔ لیکن تاویل بمعنے مصداق موجود خارجی ہوتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق حوادث گزشتہ سے ہو یا آئندہ سے۔ جب بولا جائے کہ سورج چڑھ گیا تو اس کی تاویل سورج کا واقع میں چڑھنا ہے۔ یعنی تاویل وجود عینی خارجی کا نام ہے لہٰذا اس معنے کے لحاظ سے کسی بات کی تاویل یہ ہوگی کہ اصل حقائق کا خارج میں ظہور ہو۔ اسی معنے میں حضرت یعقوب نے حضرت یوسف سے کہا تھا ویعلمک من تاویل الاحادیث اور یہی مطلب ہے حضرت یوسف کے اس ارشاد کا جو والد اور خاندان کے مصر پہنچنے پر انہوں نے فرمایا کہ ھذا تاویل رؤیای من قبل اور سورۂ نسا میں جہاں قرآن نے اہل ایمان کو اپنے مسائل کتاب و سنّت پر پیش کرنے کا حکم دے کر فرمایا ہے ذالک خیر واحسن تاویلا وہاں بھی تاویل خارجی مصداق کے معنے میں ہے۔

اور اسی معنے میں حضرت عائشہ کی وہ حدیث ہے جس میں فرماتی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رکوع و سجدے میں سبحانک اللھم وبحمدک اللھم اغفرلی کہتے تھے اور قرآن کے اس حکم کی تاویل کرتے ہیں فسبح بحمد ربک واستغفرہ یعنی اس آیت کا خارجی مصداق یہ ہوتا تھا۔ اس معنے میں لفظ تاویل قرآن میں متعدد مقامات

پڑتا ہے۔ مثلاً

هل ينظرون الا تاويله يوم ياتى تاويله

قرآن نے جن واقعات کے قیامت کے روز ہونے کی خبر دی ہے ان کے مصداق خارجی کو یہاں تاویل کہا گیا ہے۔ بلا شبہ اس روز ہونے والے واقعات کا وقت، اس کی مقدار اور اس کی کیفیت کو اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے۔

بہرحال سلف کی زبان میں تاویل دو معنے میں بولا جاتا تھا ایک مآل اور نتیجہ کے معنے میں اور دوسرے تفسیر و تشریح کے معنے میں۔ اگر آیتِ قرآنی میں اول معنی تاویل کے مراد ہوں یعنی مآل و نتیجہ تو اللہ کے سوا متشابہات کی تاویل کوئی نہیں جانتا اور اس صورت میں لفظ اللہ پر وقف ہونا چاہیے اور اگر دوسرے معنے مراد ہوں یعنی تفسیر و تشریح راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں۔ اور قرآن نے اس کی نفی نہیں کی ہے۔

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ متشابہات کی تفسیر اور اس کے معنے اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا بلکہ یہ فرمایا ہے کہ ان کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ اور دونوں میں فرق ہے تاویل نہ جاننے کا مطلب تو یہ ہے کہ اس کے انجام، مآل تک انسانی علم کی دسترس نہیں ہے اور تفسیر نہ جاننے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا کچھ حصہ ایسا بھی ہے جس سے نہ نبوت واقف تھی نہ صحابہ اور نہ اُمت کا کوئی فرد۔ فرماتے ہیں:

یہ بات کسی طرح ممکن نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ایسا کلام نازل کیا ہو جس کے کوئی معنے نہ ہوں اور نہ یہ ممکن ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ساری اُمت اس کے مفہوم سے ناآشنا ہو جیسا کہ بعض متاخرین کہتے ہیں یہ بات بالکل غلط اور باطل ہے۔ ہمارے پاس دلائل کثیرہ کتاب و سنت اور اقوالِ سلف سے اس بات کی تائید میں موجود ہیں کہ سارے قرآن کا علم و تدبر ممکن ہے اور اس بات کی ہمارے پاس قطعی دلیل نہیں کہ راسخین فی العلم آیاتِ متشابہات کی تفسیر سے ناواقف تھے کیونکہ سلف میں ایسے اصحاب کی کافی تعداد ہے جو یہ کہا کرتے تھے کہ وہ متشابہات کی تاویل و تفسیر سے واقف ہیں۔ مثلاً مجاہد، ربیع، ابن انس، محمد بن جعفر بن زبیر خود ابن عباس فرمایا کرتے تھے کہ میں ان راسخین فی العلم میں ہوں جو آیاتِ متشابہات کی تاویل سے واقف ہیں[1]

---

[1] تفسیر سورۂ اخلاص

بہرحال اگر تاویل کے معنے تفسیر کے ہیں تو یہ راسخین فی العلم جانتے ہیں اور یہی ان لوگوں کا مطلب ہے جو بجائے الا اللہ کے والراسخون فی العلم پر وقف کرتے ہیں جیسے امام مجاہد وغیرہ اور اگر تاویل کے معنے انجام مآل کے ہیں تو یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

تاویل متاخرین کی اصطلاحی زبان میں

فقہاء، اصولیین، متکلمین کی زبان میں تاویل نام ہے کسی دلیل کی بنا پر راجح معنے سے ہٹ کر مرجوح معنے مراد لینے کا یعنی کسی لفظ کا ایسا مطلب ٹھہرا لینا جو اس کے ظاہری مدلول سے ہٹا ہوا ہو۔ اس تاویل کے لئے دلیل کی ضرورت ہوتی ہے اور تاویل کرنے والے کے لئے ضروری ہے کہ جس لفظ کی تاویل کرنا چاہتا ہے اس میں تاویل کی گنجائش ثابت کرے اور ظاہر معنے سے ہٹ کر جس دوسرے معنے کو مرکز توجہ بنا رہا ہے اس کی دلیل پیش کرے۔ تاویل کے یہ اصلاحی تعریف قرآن میں نہ ان لوگوں کا مختار ہے جو الا اللہ پر وقف کرتے ہیں اور نہ ان لوگوں کا جو والراسخون فی العلم پر وقف کرتے ہیں۔

کیا صفاتِ الٰہیہ متشابہات میں داخل ہیں

اگر آیت میں متشابہات سے متشابہات حقیقی اور تاویل سے اصطلاحی نہیں بلکہ لغوی یعنی نتیجہ اور مآل کے معنے مراد ہیں تو پھر یہ حقیقت بالکل بے غبار رہے کہ متشابہات کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ اور اگر متشابہات سے حقیقی نہیں بلکہ اضافی اور تاویل بمعنی تفسیر ہو تو پھر متشابہات کا علم راسخین فی العلم کو بھی حاصل ہوتا ہے۔ لیکن یہاں پر سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی صفات متشابہات حقیقی میں داخل نہیں ہیں۔ لیکن ان کا صحیح موقف سمجھنے میں بہتوں کو غلط فہمی ہوئی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ صفات الٰہیہ کے متشابہات میں ہونے کا اگر یہ مطلب ہے کہ ان کے معنے کوئی نہیں ہیں۔ مگر ان کے معانی کو کوئی نہیں جانتا تو یہ سراسر غلط ہے ان کے معانی بھی ہیں اور ان کے معانی کو اہل علم جانتے ہیں۔ البتہ کیفیت کا کسی کو پتہ نہیں ہے۔ کیونکہ کیفیت ان کے لئے نامعلوم ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> صفات کے بارے میں جب ائمہ سے دریافت کیا جاتا تو وہ اصل معنے کی نفی نہیں کرتے تھے بلکہ اسے ثابت کرتے تھے ہاں البتہ کیفیت کی نفی کرتے تھے۔ امام مالک سے جب الرحمٰن علی العرش استویٰ کے بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا کہ استواء معلوم ہے لیکن کیفیت کا ہمیں علم نہیں۔ اس پر ایمان واجب ہے اور اس کے بارے میں پوچھنا

بدعت ہے۔ یہی زمخ کا خیال ہے۔ اسی کو پوری اُمت میں شرفِ قبول حاصل ہے۔ اہل السنہ میں سے کوئی بھی اس کا منکر نہیں ہے۔

(الاکلیل فی المتشابہ والتاویل)

بہرحال حافظ ابنِ تیمیہ نے مدّلل ومفصّل بحث میں ثابت کیا ہے کہ صفات الٰہیہ متشابہات کا مصداق نہیں اور نہ کسی صحابی و تابعی اور خیرالقرون کے کسی محدّث وفقیہ سے ان کا متشابہ ہونا ثابت ہے وہ لکھتے ہیں:

بعض متاخرین آیات واحادیث صفات کو متشابہات میں داخل کرکے ان کے معانی میں تفویض کا مسلک اختیار کیا ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ آیات صفات کے معانی معلوم ہونے پر عموماً مسلمانوں کا اتفاق ہے۔ اور انہوں نے معتزلہ کی تاویلوں کی ہمیشہ مذمّت کی ہے۔ (تفسیر سورۂ اخلاص)

صفات کے بارے میں سلف کا کیا موقف تھا۔ اس سوال پر علماء مختلف الرائے ہیں یعنی کیا سلف صالحین تفویض پر عمل پیرا تھے۔ اور ان پر غور وخوض اس لئے نہ کرتے تھے کہ وہ ان کو متشابہات میں سے سمجھتے تھے اور متشابہات میں غور وخوض سے قرآن نے منع کیا ہے یا وہ ان کی تاویل وتفسیر کرتے اور طالبِ حق کی حیثیت سے بحث وگفتگو کرکے اپنے دلائل پیش کرتے تھے تاکہ کج روی سے محفوظ رہیں۔

اس سلسلے میں حافظ ابن تیمیہ کی رائے یہ ہے کہ سلف صالحین فی الجملہ ظاہر معنے مراد لیتے تھے اور کیفیت کی کرید نہیں کرتے تھے کیونکہ کیفیت کی کرید زیغ ہے۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ:

آیاتِ صفات میں جو شبہات پیدا ہوتے ہیں وہ فلسفہ زدہ عقلیت پسندی سے ہوتے ہیں۔ ان کی ذات سے نہیں پیدا ہوتے کیونکہ وہ ہر اعتبار سے معقول ہیں۔ گمراہی اس وقت پیدا ہوتی ہے جب عقل ان کی کیفیت اور حقیقت کی جستجو میں مصروف ہو جاتی ہے ورنہ ظاہر کا جہاں تک تعلق ہے وہ تو بالکل واضح اور بیّن ہے۔

اگر ذرا غور وفکر سے کام لیا جائے تو ابن تیمیہ اور ارباب تفویض کے مابین کوئی چیز اختلافی نہیں ہے۔ علماء کلام نے بھی سلف کا یہی مسلک بتایا ہے۔ اگر کچھ فرق ہے تو صرف یہ کہ ابن تیمیہ کیفیت میں توقف کرتے ہیں۔ تفسیر میں توقف نہیں کرتے۔ اور ان کے خیال میں سلف کا بھی یہی مسلک ہے۔ امام غزالی نے اس مفہوم کو بڑی خوبی سے اپنی کتاب الجام العوام عن علم الکلام میں پیش کیا ہے مذہب سلف کی حقیقت بیان کرتے ہوئے وہ فرماتے ہیں۔

مذہبِ سلف کی حقیقت یہ ہے اور وہی ہمارے نزدیک حق ہے کہ ان احادیث صفات میں سے جو حدیث بھی کسی عامی شخص کو پہنچے تو اس کے لئے مندرجہ ذیل باتیں ضروری ہیں۔ تقدیس تصدیق اعتراف عجز، سکوت، امساک اور کف۔

اس کے بعد ان پر تفصیلی بحث فرمائی ہے۔

اس کے مقابلے متکلمین میں سے خلف کا نظریہ یہ ہے کہ صفات کے متعلق آیات کو وہ متشابہات میں داخل کرتے ہیں اور ان کی ایسی تاویلات کرتے ہیں جو تنزیہہ سے میل کھاتی ہوں۔

مسلکِ خلف کی توجیہہ کرتے ہوئے علامہ سعد الدین تفتازانی شرح مقاصد میں فرماتے ہیں اور جو کچھ ظاہری شرع کے طور پر وارد ہے اور جسے حقیقی معنے پر محمول کرنا ممتنع ہے مثلاً استوی استوی الرحمٰن علی العرش استوی میں "ید" ید اللہ فوق ایدیھم میں یا عین، لتصنع علی عینی شیخ کہتے ہیں کہ یہ مجازات ہیں۔ چنانچہ استوا مجاز ہے استیلاء اور عظمت الٰہی سے اور ید مجاز ہے قدرت سے اور وجہ مجاز ہے وجود سے۔ اور علماء بیان و بلاغت فرماتے ہیں کہ استوا مجازی طور پر استیلاء کے معنے میں آیا ہے، ید اور یمین سے مجازی طور پر قدرت مراد ہے اسی طرح دیگر الفاظ بھی ہیں۔ یہ مجازی معنے اس لئے اختیار کئے گئے کہ تشبیہ اور تجسیم کی نفی ہو جائے ورنہ درحقیقت یہ معانی عقلیہ کی تمثیلات ہیں۔

(المنار تفسیر قرآن)

صفات پر تفصیلی بحث تو ان شاء اللہ آئندہ پارہ ۱۶ میں آ رہی ہے یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ چونکہ متاخرین ان اصطلاحات کے خوگر ہیں اس لئے قرآن کی تفسیر کرتے ہوئے بھی وہ تاویل اور متشابہ کے اصطلاحی معانی کے اثر سے نہیں بچ سکے۔ چنانچہ قرآن کی لغوی تاویل کو بھی انہوں نے اصطلاحی تاویل سمجھ لیا اور اس پر بحث و استدلال کی پوری عمارت اٹھائی۔

تشابہ کے سلسلہ میں یہ بات آپ علامہ شاطبی کی زبان سے سن چکے ہیں کہ محکمات زیادہ ہیں اور متشابہات گنے چنے ہیں۔

تشابہ قواعد کلیہ میں نہیں ہوتا

آئیے سر راہے یہ بھی علامہ شاطبی ہی کی زبانی سن لیجئے کہ تشابہ جو کچھ بھی ہے اس کا تعلق اسلام کے

ایمان کے بنیادی قواعد کلیہ سے نہیں بلکہ چند جزئیات سے ہے علامہ موصوف نے اس موضوع پر بحث کی ہے اور اسے دلائل کی قوت سے ثابت کیا ہے۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ تشابہ حقیقی قواعد کلیہ میں نہیں بلکہ صرف جزئیات میں ہوتا ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ

اولاً پورے اسلامی نظام کا مطالعہ ہمیں بتاتا ہے کہ تشابہ کہیں بھی قواعد کلیہ اور ضوابط عامہ میں نہیں ہے۔ قواعد کلیہ قرآن میں آیات محکمات میں پیش کئے گئے ہیں۔ خیر و شر کے مسلمات اور معروف منکر کے قطعیات سب محکمات ہیں۔ انہی پر پورے نظام اسلام کی بنیاد ہے۔

ثانیاً: اگر اصول و قواعد میں تشابہ کا عمل دخل مان لیا جائے تو اسلام کے قانونی نظام کا بیشتر حصہ متشابہ ہو کر رہ جائے گا۔ کیونکہ فروع اور جزئیات کی پوری عمارات اصول و قواعد کی اساس پر اٹھتی ہے۔ ظاہر ہے کہ بنیاد کا اشتباہ پوری عمارت کو متشبہ بنا دینے کے مترادف ہے اور اصول متشابہ پر مبنی فروع سب کے سب متشابہ ہوں گے۔ اس صورت میں محکمات کی حیثیت ام الکتاب کی نہ رہے گی۔

متشابہ میں تاویل کی حدود

تشابہ حقیقی سے چونکہ عملی ذمہ داری کا کوئی تعلق نہیں۔ اگر اس کا کوئی وجود ہے اس لئے اس کی تاویل ہماری ذمہ داری میں داخل نہیں ہے۔ کیونکہ اگر تشابہ کے چہرہ اجمال سے قرآنی بیان، حدیث یا اجماع کے ذریعے نقاب ہٹ جائے تو پھر وہ تشابہ حقیقی نہیں اضافی ہے اور اگر چہرہ اجمال سے پردہ نہیں ہٹتا تو پھر وضعی راہوں سے مراد الٰہی کی تعیین نہ علم ہے اور یہ اقدام نہ قابلِ ستائش ہے۔ اسی بنا پر صحابہ اور تابعین سے اس موضوع پر کوئی موشگافی ثابت نہیں ہے اور قرآن کی آیت میں کچھ اشارہ بھی اسی طرف ہے۔ اگرچہ کچھ متاخرین نے راہِ تاویل اختیار کی ہے لیکن ان کی رہنمائی اس راہ میں کچھ سود مند نہیں ہے بلکہ منزلِ مقصود سے اور زیادہ دور کر دیتی ہے یقین و طمانیت کی اگر راہ ہے تو وہ ہی ہے جو سلف صالحین نے اختیار کی ہے اور جس سے متبعین سلف منحرف ہونا پسند نہیں کرتے ہیں۔

ہاں اگر متشابہ حقیقی نہیں بلکہ اضافی ہے تو تاویل اصطلاحی کا میدان کھلا ہے لیکن اس لئے ضروری ہے کہ:

اولاً: تاویل کا مرجع صحیح معنے ہوں۔

ثانیاً: الفاظ میں ان معنی کو اپنانے کی صلاحیت ہو۔

ثالثاً ، عام قواعد مسلمہ کے خلاف نہ ہوں ۔

خلاصہ یہ ہے کہ متشابہ حقیقی میں تاویل سے گریز کیا جائے اور سلف کا دامن تھام کر رہے اور متشابہ اضافی میں تاویل کی اجازت ہے ۔ اب ان دو باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے جو کہتے ہیں کہ متشابہات کی تاویل اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا ان کی مراد متشابہ حقیقی ہے اور تاویل بمعنی مآل وانجام ہے اور جو کہتے ہیں کہ راسخین فی العلم بھی جانتے ہیں ان کی مراد متشابہ اضافی ہے اور تاویل سے تاویل اصطلاحی مراد ہے ۔ بہرحال یہ اختلاف اختلاف نہیں صرف لفظی اور صوری اختلاف ہے ۔ جن لوگوں نے متشابہ حقیقی مراد لیا ہے ان کے نزدیک الا اللہ پر وقف ضروری ہے اور جو لوگ متشابہ اضافی مانتے ہیں وہ والرسخون فی العلم پر عطف کرتے ہیں ۔

رَبَّنَا لَا تُزِغْ قُلُوْبَنَا بَعْدَ اِذْ هَدَيْتَنَا وَهَبْ لَنَا مِنْ لَّدُنْكَ
رَحْمَةً ۚ اِنَّكَ اَنْتَ الْوَهَّابُ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ جَامِعُ النَّاسِ لِيَوْمٍ
لَّا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝ رکوع ۹

ان کی دُعا یہ ہوتی ہے کہ اے ہمارے آقا ہمیں سیدھے راستہ پر لگا دینے کے بعد ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا کر[۱۳] اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔ یقیناً تو ہی بخشش فرمانے والا ہے۔ اے ہمارے پروردگار اس میں کوئی شک نہیں کہ تو ایک دن سب کو اپنے حضور میں جمع کرنے والا ہے[۱۴] یہ تیرا وعدہ ہے اور یقیناً تیرا وعدہ کبھی خلاف نہیں ہوگا۔[۱۵]

اربابِ عقل و بصیرت کی صدائے حال

انبیاء علیہم السلام جب دُنیا میں تشریف لاتے ہیں تو دو قسم کے علوم سے کراتے ہیں ایک وہ جو صرف ان کی ضمانت و صداقت کے اعتماد پر بے چون وچرا تسلیم کر لئے جائیں وہ سرتاسر معقول ہی معقول ہوتے ہیں۔ اگرچہ عقل انسانی بدیہی طور پر ان کا ادراک نہ کر سکے دوسرے وہ علوم ہوتے ہیں جو ہمارے ادراک واحاطۂ عقل میں بھی داخل ہیں ان میں اجتہاد واستنباط کی بڑی حد تک اجازت ہے بلکہ اس پر زور دیا جاتا ہے کہ وہ قرآن کی روشنی میں سنت کی مدد سے اپنی زندگی کا لائحہ عمل حسبِ ضرورت خود بنائیں قرآن حکیم نے گزشتہ اقوام کے تذکرے اور تاریخ کے عبرت آموز واقعات اکٹھے

بار بار دہرائے ہیں تاکہ انہیں پڑھ کر آئندہ زندگی میں پوری بصیرت کے ساتھ چلنے کا سلیقہ آئے۔ دین کے اس حصہ پر غور و خوض کا اہم فائدہ یہ بھی ہے کہ اس حصہ کی معقولیت اور گہرائی کا اندازہ لگانے کے بعد اس کے دوسرے حصہ کی معقولیت کا یقین خود بخود حاصل ہو جاتا ہے۔ متشابہات اور محکمات کی تقسیم کا یہی راز ہے اور راسخین فی العلم کی یہی علامت بتائی ہے کہ جب وہ محکمات سے گزر کر متشابہات تک پہنچیں تو ان کے سامنے یہ کہہ کر کل من عند ربنا عجز و اعتراف کا سر خم کر دیں۔ یہ جہل و جمود نہیں بلکہ رسوخ فی العلم ہے۔ علم کے رسوخ سے ان پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ متشابہات کی حقیقت کا ادراک عقل انسانی کی پہنچ سے باہر ہے۔ وہ خلاف عقل نہیں مگر ماورائے عقل ضرور ہیں۔ انسان ان پر یقین کر سکتا ہے مگر حقیقت نہیں پا سکتا۔ ان کی مرادوں کے درپے ہونے کا نام زیغ اور فطرت کی کجی ہے۔ اسی لئے ارباب بصیرت و عقل کی صدائے حال ہمیشہ یہ ہوتی ہے۔

۱۳۔ اے ہمارے آقا ہمیں سیدھی راہ دکھانے کے بعد ہمارے دلوں میں کجی نہ پیدا فرما۔ اصل ارشاد میں **لا تزغ** آیا ہے یہ ازاغت سے بنا ہے اور ازاغت زیغ کا تعدیہ ہے زیغ کے معنے کج ہونا اور ازاغت کے معنے کج بنا دینا۔ دل کی کجی یہ ہے کہ وہ ہدایت سے ہٹ کر ضلالت کی طرف مائل ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ راسخین فی العلم اپنے کمال علمی اور قوت ایمانی پر مغرور نہیں ہوتے بلکہ ہمیشہ حق تعالیٰ سے استقامت اور مزید فضل و عنایت کے طلب گار رہتے ہیں تاکہ کمائی ہوئی پونجی ضائع نہ ہو جائے اور خدا نکرے دل سیدھے ہونے کے بعد کج نہ کر دیئے جائیں حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم امت کو سنانے کے لئے اکثر یہ دعا کرتے تھے۔ **یا مقلب القلوب ثبت قلبی علیٰ دینک** [1]

صرف یہی نہیں اس موضوع پر اور حدیثیں آئی ہیں۔ اسی حدیث میں ہے کہ صحابہ نے آپ کی زبان مبارک سے یہ دعا سن کر دریافت کر لیا یا رسول اللہ کیا آپ کو کوئی اندیشہ ہے؟ فرمایا میں بے اندیشہ کیونکر ہو سکتا ہوں جب کہ مجھے پتہ ہے کہ دل اللہ کی انگلیوں میں ہے جب چاہے اور جسے چاہے پلٹ دے۔ اور نواس بن سمعان کی روایت میں تصریح ہے چاہے تو سیدھا کر دے اور چاہے تو ٹیڑھا کر دے الفاظ یہ ہیں ان شاء اقامہ وان شاء ازاغہ قلب کے ان حالات کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مثالوں سے سمجھایا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک ارشاد میں قلب کے ان تقلبات کو چڑیا سے تشبیہ دی ہے۔ ایک موقع پر چولہے پر رکھی ہوئی وہ ہانڈی بتایا ہے جس میں کھدا پڑ رہا ہو اور ایک مثال میں بتایا ہے کہ دل کی مثال تو ایسی ہے جیسے کھلے میدان میں پر ہو اور اسے ہوائیں الٹتی پلٹتی رہتی ہوں۔ احیاء العلوم میں امام غزالی نے ان احادیث کو ذکر کیا ہے اور حافظ عراقی نے المغنی میں ان کی تخریج فرمائی ہے۔

اسلامی نظام کی سب سے بڑی نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسان کے دل کو مخاطب کرتا ہے۔ اس کا سارا کاروبار اسی ایک گوشت کے ٹکڑے سے وابستہ ہے۔ عقائد ہوں یا عبادات اخلاق ہوں یا معاملات انسانی اعمال کے ہر گوشہ میں اس کی نظر اسی ایک آئینہ پر رہتی ہے۔ اسی حقیقت کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مشہور حدیث میں یوں ظاہر فرمایا ہے۔

ہوشیار ہو کہ بدن میں گوشت کا ایک ٹکڑا ہے جب وہ درست ہو سارا بدن درست ہوتا ہے اور وہ خراب ہو تو سارا بدن خراب ہو جاتا ہے ہوشیار ہو کہ وہ دل ہے۔

دعا کا منشا یہ ہے کہ اے اللہ ہم کو اس صراطِ مستقیم پر قائم رکھ، ایسا نہ ہو کہ ہمارا دل یہود و نصاریٰ جیسا ہو جائے جو نبوت کا علم و عمل آنے کے باوجود ہدایت سے محروم ہو گئے۔ یوں تو زیغ اہلِ باطل کی عام بیماری ہے لیکن یہود و نصاریٰ اس بیماری میں مبتلا رہے ہیں۔ قرآن نے یہودیوں کے زیغ کا سورۃ صف میں اس طرح ذکر کیا ہے۔

فلما زاغوا ازاغ الله قلوبهم والله لايهدي القوم الفاسقين

جب وہ کج ہو گئے تو اللہ نے بھی ان کے دل کج کر دیئے اور اللہ بدکاروں کو ہدایت نہیں بخشتا۔

یعنی گناہ کرتے کرتے دلوں میں اس قدر سختی آ گئی کہ نیکی کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہی۔ انہوں نے ای کلمۃ اللہ اور روح اللہ کے الفاظ کی تشریح اس انداز میں کی جس سے نصاریٰ کے لئے گمراہی کی راہیں کھلیں اور وہ حضرت مسیح کی الوہیت کے عقیدے میں مبتلا ہو گئے۔ زیغ کے دونوں شکار ہیں مگر دونوں کے زیغ کی نوعیت میں فرق ہے یہودیوں کا زیغ نبوت کے لاتے ہوئے عمل میں ہے اور عیسائیوں کا زیغ نبوت کے پیش کردہ علم میں ہے۔ الغرض قلب و نظر کے زیغ اور متشابہات کی پیروی کے باب میں یہود و نصاریٰ دونوں اگرچہ ایک ہی سطح پر تھے اور یہ بیماری دونوں کا مشترکہ سرمایا تھی لیکن ان کے ذوقی رجحانات الگ الگ تھے۔ یہودیوں کا مقصد زیادہ ابتغاء فتنہ ہوتا تھا جب کہ نصاریٰ کا پیش نہاد ابتغاء تاویل تھا۔ یہ گمراہیاں چونکہ عام تھیں اس لئے راسخین فی العلم نے اللہ سے درخواست

کی ہے کہ اے اللہ ہمیں نبوّت کے لائے ہوئے علم و عمل میں زیغ سے محفوظ رکھنا۔

حق پر استقامت کی دُعا

۱۴۔ اور ہمیں اپنے پاس سے رحمت عطا فرما۔ یہاں رحمت سے حق پر ثابت قدم رہنے کی توفیق مراد ہے۔ اس مختصر لفظ میں تمام نزاکتیں لپٹی ہوئی ہیں اسی لئے قرآن نے بار بار استقامت پر زور دیا ہے اور اسی لئے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم نے استقامت سے عہدہ برآ ہونے کو مشکل قرار دیا ہے۔ چونکہ یہ مقام انتہائی نازک ہے اور اس کا مرجع صرف اللہ کی رحمت ہے اس لئے یہاں رحمت کے نام سے مانگا ہے اور پھر چونکہ استقامت کی یہ نعمت محض اللہ کا فضل و انعام ہے اس لئے لفظ ہبہ لے کر آئے جس کے معنے مفت بلا بدل کے ہیں اور چونکہ ہم اپنی بے چارگی کی وجہ سے اسباب و وسائل سے تہی دامن ہیں اس لئے دعا میں من لدنک فرمایا مطلب یہ ہوا کہ ہمیں حق پر جمنے کی وہ نعمت ارزانی فرمائیے جس کا مصدر آپ کی رحمت ہو۔

چونکہ ایمان بالغیب کی اس منزل تک رسائی آسان نہیں اس لئے یہ دُعا سکھائی گئی۔ گویا تنبیہ فرما دی کہ اگر تم اس وادی کو عبور کرنا چاہتے ہو تو پہلے اپنے قلب کی سلامتی مانگو۔ قلب کی سلامتی یہ ہے کہ اس میں علم غیب کے حقائق کا یقین جازم موجود ہو اور یقین اسی وقت قابل تعریف ہے جبکہ عالم غیب پر ہو ورنہ مشاہدے پر یقین کرنا آسان کام ہے اسی لئے مسند احمد میں حضرت انس نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ کسی بندے کا ایمان اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کا قلب درست نہ ہو جائے۔ اسی اہمیت کے پیش نظر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے اُمت کو یہ دُعا سکھائی ہے اللھم انی اسئلک قلبًا سلیمًا اور ابو داؤد میں حضرت عائشہ کے حوالے سے آیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم جب بیدار ہوتے تو یہ فرماتے:۔

لا الٰہ الا انت سبحانک اللھم استغفرک لذنبی واسئلک
رحمتک اللھم زدنی علمًا ولا تزغ قلبی بعد اذ ھدیتنی
وھب لی من لدنک رحمۃ انک انت الوھاب۔

۱۵۔ اے ہمارے پروردگار اس میں کوئی شک نہیں کہ تو ایک روز سب کو اپنے حضور میں جمع کرنے والا ہے۔ یہ تیرا وعدہ ہے اور تیرا وعدہ یقیناً کبھی خلاف نہیں ہوگا یعنی وہ دن ضرور آئے گا اور زائغین

جن باتوں میں جھگڑتے تھے سب کا دو ٹوک فیصلہ ہو جائے گا۔ پھر ہر ایک مجرم کو اپنی کج روی اور ہٹ دھرمی کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ اسی خوف سے ہم ان کے راستہ سے بیزار اور آپ کی رحمت و استقامت کے طالب ہوتے۔ ہمارا زائغین کے خلاف راستہ اختیار کرنا کسی بدنیتی اور فساد نیت کی بنا پر نہیں محض آخروی فلاح مقصود ہے[1]۔ گویا یہ اس یقین کا اظہار ہے جو راسخین میں آخرت کے بارے میں ہوتا ہے۔ موقع کلام یہاں اشارہ کر رہا ہے کہ دراصل یہی یقین ہے جو دل اور عقل دونوں کا پاسبان ہے۔ یہ نہ ہو تو انسان کے ذہن و فکر کو کوئی چیز بھی آوارگی سے نہیں روک سکتی وہ زندگی کو ایک آسان اور معمولی تماشا گاہ سمجھتا اور اسے ہر طرح گزارنے کے لئے تیار رہتا ہے لیکن جن میں آخرت کا یقین رچ جاتا ہے وہ زندگی کا ہر قدم احتیاط سے اٹھاتا ہے۔ یہ احتیاط ہی ان کو جادہ مستقیم پر رکھتی ہے[2] اور پہلی دعا کے ساتھ اسے یوں مربوط کیا جا سکتا ہے خداوند چونکہ آپ جامع الناس ہیں اس لئے اگر آپ اپنی رحمت سے ہم نابکاروں کے سینوں میں صحیح علوم اور صحیح مطالب کو جمع فرما دیں تو بعید از رحمت نہیں ہے۔ ہم اگر اس کے لائق اور اہل نہیں ہیں مگر آپ کا اہل انابت اور اہل مجاہدہ سے یہ وعدہ ہے کہ جو ہماری طرف رجوع کرتے ہیں۔ اس کو ہم اپنی خاص ہدایت اور توفیق سے سرفراز کرتے ہیں۔ والذین جاھدوا فینا لنھدینھم سبلنا اور ہمیں یقین ہے کہ آپ اپنے وعدے کے خلاف نہیں فرماتے ہیں نہ دنیا میں اور نہ آخرت میں اس لئے ہماری درخواست ہے کہ ہدایت کے بعد ہمیں محروم نہ فرمایئے[3]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام ، [2] تدبرِ قرآن ، [3] معارف مولانا ادریس رح

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَن تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُم
مِّنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمْ وَقُودُ النَّارِ ۝ كَدَأْبِ آلِ فِرْعَوْنَ
وَالَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ ۚ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا فَأَخَذَهُمُ اللَّهُ بِذُنُوبِهِمْ ۗ
وَاللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ قُل لِّلَّذِينَ كَفَرُوا سَتُغْلَبُونَ وَ
تُحْشَرُونَ إِلَىٰ جَهَنَّمَ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ۝

بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے اللہ کی پکڑ کے مقابلے میں اُن کے مال اور اُن کی اولاد اُن کے ہرگز کام نہ آئے گی۔ یہی وہ لوگ ہیں جو آتش دوزخ کا ایندھن بنیں گے۔[۱۶] اُن کا حال بھی ویسا ہی ہے جیسے فرعونیوں اور اُن لوگوں کا تھا۔ جو فرعونیوں سے پہلے ہو چکے ہیں انہوں نے بھی ہماری آیات کو جھٹلایا تھا تو اللہ نے اُن کے گناہوں کی پاداش میں اُن کی گرفت کر لی تھی اور اللہ بڑی سخت سزا دینے والا ہے۔[۱۷] اے پیغمبر راہِ کفر اختیار کرنیوالوں سے کہہ دو کہ تم ضرور مغلوب ہونگے اور تمہیں جہنم کی طرف ہنکایا جائے گا اور جہنم بہت برا ٹھکانہ ہے۔[۱۸]

انکارِ حق کا انجام اور اس کی تاریخ

قرآن میں کفر ایمان کے مقابلے پر بولا جاتا ہے۔ ایمان کے معنے اگر ماننا، قبول کرنا، تسلیم کرنا ہیں تو کفر کے معنے نہ ماننا، انکار کرنا ہیں۔ عربی میں کفر کے اصل معنے چھپانا ہیں۔ کالی رات کو اسی لئے کافر کہتے ہیں کہ وہ ہر چیز کو اپنی تاریکی میں ڈھانپ لیتی ہے۔ کسان کو اسی لئے کافر کہتے ہیں کہ وہ بیج کو زمین میں چھپا دیتا ہے۔ اس لفظ کے استعمال میں یہ بلیغ اشارہ ہے کہ ایمان سے محروم وہی شخص رہتا ہے جو اللہ کے احسانات اور اس کی نعمتوں کو چھپاتا ہے۔ اُس کا شکر ادا نہیں کرتا۔ اور اپنی فطرت و جبلّت پر پردہ ڈالتا ہے۔ اس کے علاوہ بعض مقامات پر یہ لفظ شکر کے مقابلے پر بھی بولا گیا ہے۔ کفرانِ نعمت یہ ہے کہ آدمی اپنے محسن کا احسان نہ مانے اور اسے اپنی قابلیّت یا کسی غیر عنایت و سفارش کا نتیجہ سمجھے۔ یہاں کفر ایمان کے مقابلے پر ہے اور وہ لوگ مراد ہیں جو اپنی مادہ پرستی کے نشہ میں تمام عالم کو صرف اپنے دائرہ محسوسات میں محدود تصور کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کسی اور عالمِ بالا کا تصور صرف ایک وہم پرستی یا مذہبی خوش اعتقادی سے زیادہ نہیں۔ وہ قیادت اور ریاست کے نشہ میں اس کا مذاق اڑاتے ہیں۔ ان کے نزدیک جب عالمِ غیب کی کوئی حقیقت ہی نہیں تو اس کو ماننا بھی بے معنے ہے وہ ایمان کے معنے جہل یا جبری انقیاد کے سوا کچھ نہیں سمجھتے قرآن نے پہلی آیات میں اہلِ ایمان کا تذکرہ کرتے ہوئے غیبی حقائق پر ان کے ایمان کا نقشہ کھینچا اور ان کی عقلیت اور علمیت کو سراہا ہے۔ اب ان کے مقابلے میں ان کا ذکر کرتا ہے جو اس نعمتِ ایمان سے محروم ہیں اور ان اسباب و علل کی نشاندہی کر کے جن کے عزہ میں وہ کفر کے مرتکب ہوتے ہیں کفر کے ہولناک نتائج پیش کرتا ہے اور کفر کی تاریخ بیان کرتا ہے۔

۱۶ ــ بلاشبہ جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے۔ اللہ کی پکڑ کے مقابلے میں ان کے مال اور ان کی اولاد اُن کے ہرگز کام نہ آئے گی۔ قیامت کے ذکر کے ساتھ کافروں کا انجام بھی بتا دیا کہ ان کو کوئی چیز دُنیا و آخرت میں اللہ کی سزا سے نہیں بچا سکتی جیسا کہ میں سورت کے آغاز میں بتا چکا ہوں کہ ان آیات میں اصلی خطاب وفدِ نجران سے ہے۔ امام فخرالدین رازی نے محمد ابن اسحاق کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جس وقت یہ وفد نجران سے بقصدِ مدینہ روانہ ہوا تو اُن کا بڑا پادری ابوحارثہ ابن علقمہ خچر پر سوار تھا۔ خچر نے ٹھوکر کھائی تو اسکے بھائی کرز ابن علقمہ کی زبان سے نکلا تَعِسَ الأبعد ابعد سے معاذ اللہ حضورِ انور مراد تھے۔ ابوحارثہ نے کرز کی زبان کو بُرا کہا۔ کرز نے بڑی حیرت سے اس کی وجہ پوچھی۔

ابو حارثہ نے کہا واللہ ہم خوب جانتے ہیں کہ حضور اقدسؐ ہی نبی منتظر ہیں جن کی بشارت ہماری کتابوں میں دی گئی ہے۔ کرز نے کہا پھر مانتے کیوں نہیں ہو۔ بولا اس لئے کہ اگر ہم حضورؐ پر ایمان لے آئیں تو یہ بادشاہ جو ہمیں بے شمار مال و دولت دے رہے ہیں اور ہمارا اعزاز اکرام کر رہے ہیں۔ سب واپس لیں گے۔ کرز نے یہ بات اپنے جی میں رکھی اور بالآخر یہی بات کرز کے مسلمان ہونے کا سبب بن گئی۔ (رضی اللہ عنہ) میرے نزدیک ان آیات میں ابو حارثہ کے ان ہی کلمات کا جواب ہے گویا دلائل عقلیہ و نقلیہ سے ان کے غلط عقائد کا جواب دے کر متنبہ فرما دیا کہ حق واضح ہو جانے کے بعد جو لوگ محض دنیوی متاع اموال و اولاد وغیرہ کی خاطر ایمان نہیں لاتے وہ خوب سمجھ لیں کہ مال و دولت اور اولاد وغیرہ ان کو دنیا میں خدائی سزا سے بچا سکتے ہیں اور نہ آخرت میں عذاب عظیم سے۔ چنانچہ ان کی تازہ مثال بدر کے موقعہ پر مسلمان اور مشرکین کی لڑائی میں دیکھ چکے ہو۔ دنیا کی یہ بہار چند روزہ ہے۔ مستقبل کی کامیابی ان ہی کے لئے ہے جو اللہ سے ڈرتے اور متقیانہ سیرت اختیار کرتے ہیں اور عموم الفاظ میں یہود و نصاریٰ، مشرکین وغیرہ سب کفار داخل ہو گئے گو اصلی مخاطب نصاریٰ نجران ہیں[1]

آیت اگرچہ عام ہے اور کفر کے موضوع پر ایک ضابطہ اور قانون کی حیثیت رکھتی ہے کہ بارگاہ الٰہی میں کفر اتنا سنگین جرم ہے خواہ اس کا مرتکب کوئی ہو اور چاہے اس کے پاس مادی طاقت کتنی اور کیسی ہو وہ، اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتا۔ یہاں صرف مال و اولاد کا ذکر کیا ہے کیونکہ اس دور میں قرآن کے مخاطبوں کو اسی پر ناز تھا جیسا کہ دوسرے موقعہ پر قرآن نے ان کا دعویٰ نقل کیا ہے کہ نحن اکثر اموالا و اولادا وما نحن بمعذبین ہم مال و اولاد میں بہتات والے ہیں ہمیں عذاب نہ ہوگا۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ دونوں تو تیں اللہ کی گرفت کے مقابلے میں ہرگز کام نہ آئیں گی۔ روز جزا میں جب کفر اپنی اصلی صورت میں نمودار ہوگا تو اللہ نے اس کا جو نتیجہ مقرر کیا ہوا ہے اس سے صرف اس لئے نہیں بچ سکتے ہیں کہ ان کے پاس دنیا میں مال و اولاد کی مادی طاقت موجود تھی۔ سنکھیا کسی کے لئے صرف اس لئے دودھ نہیں بن سکتا کہ اس کے کھانے والا مال و اولاد رکھتا ہے۔

قرآن کی نظر میں کفر کی سنگینی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن حکیم نے ان لوگوں کے اعمال کی مثال جو کفر کو آغوش میں لئے ہوتے ہیں اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور اُن کا کوئی وجود نہیں رہتا[2]

---

[1] افادات شیخ الاسلام ، [2] سورۂ ابراہیم پارہ ۱۳

سورۂ النور میں اہلِ کفر کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت فریبِ نظر سے زیادہ نہیں ہے۔

اس کی ایک اور مثال اسی سورت میں ایسی سخت تاریکی سے دی ہے جس میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہ دے۔

دراصل قرآنی احکام دو قسم کے ہیں۔ ایک کا تعلق دل سے ہے اور جو بمنزلہ اصل ہے۔ قرآن کی زبان میں اس کے وجود کو ایمان اور عدم کو کفر اور فلسفہ کی اصطلاح میں علم و جہل کہتے ہیں اور دوسری قسم وہ ہے جو اس کی فرع اور نتیجہ ہے اور جس کا تعلق اعضاء و جوارح سے ہے اس کو ہم مختصراً عمل اور تفصیلاً عبادات، معاملات اور اخلاق کہتے ہیں۔ کفر کا تعلق قسم اوّل سے ہے۔ دلوں میں ایمان و علم کی ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدہ میں روشنی کی امید کی جا سکتی ہے لیکن جس کا شانۂ دل میں اس نور کا ایک ذرّہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لئے نا امیدی ہے۔ اسی کفر کی وجہ سے اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں اور جہاں ایمان کچھ بھی موجود ہو اعمالِ خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے۔ البتہ اعمالِ شر ہونے کی صورت میں ان کی تلافی دنیا میں مصائب سے آخرت میں عذابِ دوزخ سے یا اللہ کی رحمت سے ہو سکتی ہے اس لئے کفر قانونِ الٰہی کے مطابق ناقابلِ عفو ہے۔

بہرحال آیتِ قرآنی کفر کے بارے میں قانونِ عام ہے۔ خواہ وفدِ نجران کا واقعہ ہو۔ اور اس کے عموم میں وہ بھی داخل ہے اور قرآن نے ان کی ہی اندرونی بیماری سے پردہ ہٹایا ہے کہ یہ درحقیقت مال و اولاد کی محبت ہے جو ان کو قرآن کے پیش کردہ حقائق کے سامنے سرنگوں ہونے سے روک رہی ہے لیکن وہ اپنے اندر کی بیماری پر پردہ ڈالنے کی خاطر متشابہات کا سہارا لے رہے ہیں تاکہ وہ بے نقاب ہو کر نہ رہ جائیں۔

تاریخ سے استشہاد

۱۷۔ ان کا حال بھی ویسا ہی ہے جیسے فرعونیوں اور ان لوگوں کا حال تھا جو ان سے پہلے تھے۔ انہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تو اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا اور اللہ بڑی سخت پکڑ والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ نبوت کے مقابلے میں کفر کا رویہ انہوں نے اختیار کیا ہے یہ کوئی نیا نہیں ہے بلکہ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ان کے کفر و انکار کا رشتہ تاریخ میں فرعونیوں سے ملتا ہے۔ ان کا طرزِ عمل بعینہٖ وہی ہے جو فرعونیوں اور فرعونیوں سے پہلے قوموں کا تھا۔ انہوں نے جان بوجھ کر

دنیا کی محبت کی خاطر نبوت کو جھٹلایا اور اللہ کی آیات کا انکار کیا۔ ان کو بھی یہی نشہ تھا کہ نحن اکثر اموالا و اولادا لیکن ان کے مال و اولاد کچھ بھی کام نہ آیا۔ اسی طرح ان کے حق میں بھی یہ مادی سہارے کچھ کام نہ آئیں گے۔ پہلے کفروا کہا اور فرعونیوں کے ذکر میں کذبوا کہنا اس بات کی دلیل ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ دونوں کے مخاطبوں کا کفر تکذیب تھا۔ جب جرائم دونوں کے مشترک ہیں بلاشبہ سزا میں بھی ضرور ہم آہنگی ہے۔ گویا اشارہ کر دیا کہ قوموں کی موت و حیات کے لئے مقررہ قوانین ہیں اور ان کے نتائج اٹل ہیں۔ جب ایک جماعت کا کفر اور اس کی تکذیب اس حد تک پہنچ جاتی ہے جو جماعتوں کی ہلاکت کے لئے مقرر ہے تو پھر نتائج کا ظہور بھی یکساں ہوتا ہے۔ اور یہ بھی بتایا کہ انسان زور و اقتدار میں کتنا ہی بڑھ جائے مگر وہ حق کا راستہ کبھی نہیں روک سکتا۔ اسے مغلوب ہی ہونا پڑے گا فاخذھم اللہ بذنوبھم میں واضح کر دیا کہ دنیا میں ہر قوم خود ہی اپنی زندگی کا گہوارہ بناتی ہے اور پھر خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر بھی کھودتی ہے۔ یعنی بالآخر اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا اور جب پکڑ لیا تو پھر ان کو کوئی چیز بھی اللہ کی گرفت سے نہیں بچا سکی اس فقرے میں پہلے فاء کر آئے جو نتیجہ کے معنے دیتی ہے۔ پھر بذنوبھم میں باء سببیہ لائے ہیں۔ اس میں اشارہ کر دیا کہ جو کچھ ہوا اس کا سبب ان کے گناہ تھے اور یہ نتیجہ تھا ان اعمالِ کفر و تکذیب کا جو وہ کرتے رہے ہیں۔

آخر میں فرمایا واللہ شدید العقاب یعنی کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتا اور جس طرح وہ پکڑے گئے تمہاری بھی پکڑ ہونے والی ہے۔

قرآن کا تاریخی استدلال

اس آیت میں اجمالی طور پر گزشتہ قوموں کے واقعات سے استشہاد کیا گیا ہے۔ آئندہ قرآن میں تفصیلی طور پر یہ واقعات آرہے ہیں۔ اس سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ قرآن نے تذکیر و موعظت کے لئے جو باتیں بطور دلائل اختیار کی ہیں اور جن کو وہ حجج، براہین، بینات اور بصائر سے تعبیر کرتا ہے ان میں ایک نمایاں استدلال تاریخی استدلال ہے۔ اس نے جہاں گزشتہ قوموں کے حالات بیان کئے ہیں۔ جب ہم ان پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ قرآن کا مقصد اس سے یہ نہیں کہ تورات کی طرح دنیا کی تاریخ بیان کی جائے بلکہ کچھ باتیں ہیں جن کو وہ دلوں میں اتارنا چاہتا ہے اور یہ سرگزشتیں اس کے لئے دلائل ہیں، براہین ہیں اور حجج ہیں۔ مثلاً یہ بات یہاں ذہن نشین کرنا چاہتا ہے کہ

حق کی تکذیب اور اس کے انکار کا خاصہ ہلاکت اور تباہی ہے۔ جس طرح سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہے خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں کھایا جائے۔ اسی طرح انکار حق کے احکام و نتائج بھی یکساں ہیں خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں پیش آئیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اب سے ہزار برس پہلے تو سنکھیا کا خاصہ ہلاکت رہا ہو اور اب زندگی ہو جائے۔ لہٰذا جو کچھ ماضی میں پیش آچکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ یہاں اس بات کو ذہن نشین کرنے کے لئے یہ کیسی پُرشوکت، پُرزنار اور بلیغ تعبیر اختیار کی ہے کہ کدابِ اٰلِ فرعون الذین من قبلھم اسی اجمال کی اگر آپ تشریح دیکھنا چاہتے ہیں تو سورۂ اعراف، سورۂ ہود اور سورۂ الشعراء پڑھیے۔

دنیا و آخرت میں ذلّت

۱۸۔ اے پیغمبر راہِ کفر اختیار کرنے والوں سے کہہ دو کہ تم ضرور مغلوب ہو گے اور تمہیں جہنم کی طرف ہنکایا جائے گا۔ اور جہنم بہت بُرا ٹھکانہ ہے۔ یعنی وقت آگیا ہے کہ تم سب کیا یہود کیا نصاریٰ اور کیا مشرکین عنقریب خدائی لشکر کے سامنے مغلوب ہو کر ہتھیار ڈالو گے۔ یہ تو دنیا کی ذلّت ہوئی اور آخرت میں جو گرم مکان تیار ہے وہ الگ ہے۔ بعض روایات میں ہے کہ بدر سے فاتحانہ واپسی کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلّم نے یہود سے فرمایا کہ تم حق کو قبول کر لو۔ ورنہ جو حال قریش کا ہوا تمہارا ہو گا کہنے لگے کہ آپ اس دھوکہ میں نہ رہیں کہ آپ نے قریش کے چند ناتجربہ کاروں پر فتح حاصل کر لی۔ ہم سے مقابلہ ہو تو پتا لگ جائے گا کہ ہم جنگ آزمودہ سپاہی اور بہادر آدمی ہیں۔ اس پر یہ آیتیں نازل ہوئیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ بدر کی فتح دیکھ کر یہود کچھ تصدیق کی طرف مائل ہونے لگے تھے۔ پھر کہا کہ جلدی نہ کرو دیکھو آئندہ کیا ہوتا ہے۔ دوسرے سال اُحد کی عارضی پسپائی دیکھ کر اُن کے دل سخت ہو گئے اور حوصلے بڑھ گئے۔ حتّٰی کہ عہد شکنی کر کے مسلمانوں سے لڑائی کا سامان کیا۔ کعب بن اشرف ساٹھ سواروں کے ساتھ مکہ جا کر ابوسفیان سے ملا اور کہا کہ ہم تم ایک ہیں۔ متحدہ محاذ قائم کر کے محمد رسول اللہ کا مقابلہ کرنا چاہیے۔ بہرحال تھوڑے ہی دنوں بعد اللہ نے دکھلا دیا کہ جزیرۃ العرب میں مشرک کا نام نہ رہا۔ قریظہ کے بدعہد یہود تلوار کے گھاٹ اتار دیئے گئے۔ بنی نضیر جلا وطن ہو گئے۔ نجران کے عیسائیوں نے ذلیل ہو کر سالانہ جزیہ دینا قبول کر لیا۔ اور تقریباً ایک ہزار سال تک دنیا کی بڑی بڑی مغرور و متکبر قومیں مسلمانوں کی بلندی و برتری کا اعتراف کرتی رہیں فالحمد للہ علی ذالک[1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اس آیت میں قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا ہے کہ آپ اپنے مخاطبوں سے صاف صاف کہہ دیجئے کہ تم اسلام کے مقابلے میں ضرور مغلوب ہوں گے اور تمہاری یہ عددی اکثریت اور سرمایہ کی طاقت تمہارے کام نہ آئے گی۔ یہ حضور انور کی جانب سے پیش گوئی اس زمانہ میں ہوئی ہے جبکہ مخالفتوں کے طوفان ہر سمت سے امڈے ہوئے تھے۔ مشرکین مخالف تھے، یہود و نصاریٰ اسلام کی مخالفت پر کمربستہ تھے۔ ان حالات میں ایسے صاف الفاظ میں کفار کی مغلوبیت کی پیش گوئی کرنا اور پھر اس پیش گوئی کا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پورا ہو جانا رسالت محمدیہ کے چمکتے ہوئے نشانوں میں سے ایک نشان ہے۔

بے حد اہم تاریخی سوال

لیکن یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اگر یہ آیت گرامی بدر کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی ہے جیسا کہ خود قرآن کا سیاق کہہ رہا ہے کیونکہ بدر کے واقعہ کو اس کے لئے بطور دلیل پیش کیا جا رہا ہے۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر نے محمد بن اسحاق کے حوالہ سے یہ واقعہ پیش کیا ہے جس کی تفصیل شیخ الاسلام نے درج فرمادی ہے۔ بدر کا واقعہ ۲ھ میں پیش آیا ہے اور بدر کے بعد اگر یہودیوں سے گفتگو ۳ھ میں ہوئی تو پھر اس کے بعد غزوہ خندق پیش آیا، غزوہ خیبر ہوا اور فتح مکہ ہوئی اس صورت میں کا مصداق سامنے آجاتا ہے لیکن اگر محمد بن اسحاق کے اس بیان کو درست تسلیم کیا جائے کہ آل عمران کی ابتدائی آیات تا آیت ۸۳ وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہیں اور وفد نجران ۹ھ میں آیا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کی یہ آیت بھی ۹ھ میں نازل ہوئی ہے اور پھر اس آیت کا خارج میں مصداق مشکل ہو جاتا ہے۔ یہ ایک تاریخی الجھن ہے۔ اس سے محمد بن اسحاق کی دونوں روایتوں میں سے ایک روایت تاریخی طور پر واقعات کا ساتھ نہیں دیتی ہے۔ اس آیت پر تو نہیں مگر آگے آنے والی ایک آیت پر جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ پوری اہل کتاب کی دنیا سے کہہ دو۔

قل یا اھل الکتب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا وبینکم الا نعبد الا اللہ ولا نشرک بہ شیئا

یہی الجھن حافظ ابن کثیر کو خود بھی پیش آئی ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر محمد بن اسحاق کی روایت کے مطابق یہ آیت ۹ھ میں نازل ہوئی ہے تو صحیحین کی روایت کے مطابق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

نے جو دعوت نامہ ہرقل قیصر روم کو روانہ کیا تھا۔ اس میں یہ آیت کیوں کر لکھ دی جب کہ آلِ عمران کی یہ آیتیں ابھی نازل بھی نہیں ہوئی تھیں۔ کیونکہ یہ دعوت نامہ بخاری کی تصریح کے مطابق فتح مکہ سے پہلے اور صلح حدیبیہ کے بعد روانہ کیا گیا ہے اور خود ابوسفیان جو اس وقت مسلمان نہیں ہے اور ایک عربی تاجر کی حیثیت سے وہاں پہنچے ہوئے تھے۔ قیصر نے ان سے بہت سے سوالات کئے۔ جب قیصر نے یہ دریافت کیا کہ یہ بتاؤ کیا اس مدعی نبوت نے کبھی عہد شکنی بھی کی ہے۔ ابوسفیان کہتے ہیں کہ نہیں۔ لیکن اب ہم معاہدے کی مدت گزار رہے ہیں پتہ نہیں وہ کیا کریں گے۔ یہ اس بات کی تصریح ہے کہ یہ صلح حدیبیہ ۶ھ اور فتح مکہ ۸ھ کے درمیان کا واقعہ ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اگر تاریخی حقائق یہ ہیں تو پھر محمد بن اسحاق کی اس روایت کہ اس سورت کی ۸۰ آیات سے زائد وفد نجران کے موقعہ پر یعنی ۹ھ میں نازل ہوئیں۔ اور صحیحین کی اس روایت میں کہ حضور انور نے آلِ عمران کو مذکورہ بالا آیت قیصر روم کو ۶ھ اور ۸ھ کے درمیان دعوت نامہ میں لکھی ہے مفاہمت کیسے ہو؟ اگرچہ حافظ صاحب موصوف نے مفاہمت کی بہت کوشش کی ہے مثلاً یہ کہ ممکن ہے دعوت نامہ والی آیت دو بار نازل ہوئی ہو ایک بار صلح حدیبیہ سے پہلے دوسری بار فتح مکہ کے بعد۔ یا پھر محمد بن اسحاق کی بات کہ ۸۰ سے زیادہ آیات وفد نجران کے بارے میں نازل ہوئی ہیں محفوظ نہیں ہے۔ یا پھر نجران کا وفد حدیبیہ کی صلح سے پہلے آیا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ عبارت حضور نے خط میں اپنی جانب سے لکھائی اور بعد میں وحی نے اس کی موافقت کی ہو۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ محمد بن اسحاق کی روایت جی کو نہیں لگتی کہ ان آیات کا نزول ۹ھ میں ہوا۔ قرآن کی یہ آیت خود بتا رہی ہے کہ اس سورت کا نزول اس وقت ہوا ہے جبکہ مکہ فتح نہیں ہوا ہے۔ قریظہ زیر نہیں ہوئے اور بنی نضیر کا اجلاء ظہور میں نہیں آیا ہے۔ بدر کی جنگ ہو چکی ہے۔ بلکہ ۳ھ میں اُحد کی لڑائی بھی ہو چکی ہے۔ یہود اور مشرکین مل کر سازشیں کر رہے ہیں۔ اسی موقعہ پر ذی قعدہ ۶ھ اور ۸ھ کے درمیان یہ سورت نازل ہوئی ہے۔ اور اس کو نبوت نے اپنی مخاطب دنیائے کفر کو مخاطب کر کے فرمایا ہے ستغلبون تم عنقریب مغلوب ہو جاؤ گے۔ گویا یہ ۸ھ یعنی ۶۲۹ء عیسوی میں یہ اعلان ہوا ہے۔ ڈاکٹر فلپ ہٹی نے تاریخ عرب میں یہ بات خوب لکھی ہے۔

> اگر کوئی فرد ساتویں صدی میں ایسی پیش گوئی کی جسارت کرتا کہ دس سال کے اندر اندر عرب کی سراسر غیر متمدن اور غیر متعارف سرزمین سے ایک نادیدہ قوت کا ظہور ہونے والا ہے جو وقت کی دونوں عالمی طاقتوں سے ٹکرا جائے گا ایک یعنی ساسانیوں

کی پوری میراث سنبھال لے گی اور دوسری بیز نطینیوں کے بہترین صوبوں پر قبضہ جمائے گی تو لاریب اسے پاگل قرار دیا جاتا لیکن یہی صورت حال پیش آئی۔

یہ ایک مسیحی کے الفاظ ہیں جو اصلاً شامی ہے لیکن عرصہ دراز سے امریکہ میں متوطن ہے۔ عربی مصادر کے حقیقی مطالعہ کے بعد اس نے جو رائے قائم کی وہ بے کم و کاست پیش کر دی۔

قَدْ كَانَ لَكُمْ اٰيَةٌ فِيْ فِئَتَيْنِ الْتَقَتَا ؕ فِئَةٌ تُقَاتِلُ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَاُخْرٰى كَافِرَةٌ يَّرَوْنَهُمْ مِّثْلَيْهِمْ رَاْيَ الْعَيْنِ ؕ وَاللّٰهُ يُؤَيِّدُ بِنَصْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّاُولِي الْاَبْصَارِ

بلاشبہ تمہارے لئے ان دو گروہوں میں بڑی ہی نشانی[19] تھی جو بدر کے میدان میں ایک دوسرے کے مقابل ہوئے تھے اس وقت ایک گروہ تو مٹھی بھر مسلمانوں کا اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا۔ دوسرا منکرین نبوت کا گروہ[20] تھا۔ وہ مسلمانوں کو اپنی آنکھوں سے اپنے سے دوچند دیکھ رہے[21] تھے۔ اور اللہ جس کسی کو چاہتا ہے اپنی مدد سے مددگاری[22] پہنچاتا ہے بلاشبہ اُن لوگوں کے لئے جو چشم بینا رکھتے ہیں اس معاملہ میں بڑی عبرت[23] ہے۔

غزوۂ بدر سے عبرت کی دعوت:۔

اس سے پہلی آیت میں سب کافروں کو مخاطب کر کے کہا گیا تھا اور یہ بات خاص طور پر زبان نبوت سے کہلائی گئی۔ اب اس آیت میں اس بات کے لئے واقعہ بدر کو بطور دلیل پیش کیا گیا ہے بتانا یہ چاہتے ہیں کہ اہل ایمان اور اہل کفر میں اختلاف و نزاع کی جو صورت پیدا ہے اس میں بالآخر کفر کو شکست سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس دعویٰ کی واضح اور صاف دلیل اس واقعہ میں موجود ہے جو قریش اور اہل ایمان کے درمیان میدانِ بدر میں پیش آچکا

ہے۔ اس معرکہ میں حق کو ظاہری اسباب و وسائل کی فرو مائگی کے باوجود کامرانی و فیروزمندی سے سرفراز کیا گیا۔ اور باطل کو ساز و سامان کی فراوانی نیز تعداد کی کثرت کچھ فائدہ نہ پہنچا سکی، وہ سر کے بل شکست فاش کے غار میں گر گئے اور ان کی پیشانی پر ذلت و نامرادی کی آسمانی مہریں ہمیشہ کے لئے لگ گئیں۔ غزوۂ بدر سے باطل کی جاں کنی کا دور شروع ہوا۔ سب سے پہلے فئتین التقتا کے قوائے جنگ کا نقشہ سامنے لایئے۔

الف: فئۃ تقاتل فی سبیل اللہ اہل ایمان کی تعداد تین سو سے کچھ زائد تھی۔ یہ تعداد مختلف روایتوں میں تین سو پانچ تین سو انیس اور تین سو تیرہ بتائی گئی ہے۔ ان میں سے پچھتر ناچیز تھے۔ باقی سب نثار تھے۔ ان کے ساتھ دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے۔ گھوڑوں میں ایک مقداد بن عمرو کا دوسرا مرثد بن ابی مرثد کا تھا۔ اس سلسلے میں زبیر بن العوام اور مصعب بن عمیر کے نام بھی آئے ہیں ہر سواری پر تین تین افراد شریک تھے۔ اور باری باری سوار ہوتے تھے۔ رسول اللہؐ کے شریک مرکب ایک حضرت علیؓ تھے اور دوسرے ابولبابہ جنہیں ابوعمار سے مدینہ منورہ میں قائم مقام کی حیثیت میں واپس کر دیا گیا تھا۔ دونوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ ہم خوشی سے پیدل چلیں گے۔ آپ سواری فرمائیں۔ فرمایا نہ تم دونوں پیادہ روی میں مجھ سے طاقتور ہو اور نہ ثواب حاصل کرنے میں میں بے نیاز ہوں۔

ب: واخریٰ کافرۃ یعنی قریش کی تعداد کم از کم ساڑھے نو سو تھی اور ان کے ساتھ سو گھوڑے تھے۔ اونٹوں کی کثرت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ہر منزل پر وہ نو یا دس اونٹ ذبح کرتے چلے آئے تھے۔ زرہیں اور باقی ساز و سامان جنگ بھی ان کے پاس بہت زیادہ تھا۔

جب مقابلے کی نوبت آئی تو اللہ تعالیٰ کی تائید نصرت اہل ایمان کے حصہ میں آئی اور اس طرح بدر کے واقعہ میں تمام کافروں کے لئے بلا تمیز یہ عبرت تھی کہ مسلمان اپنی قلت تعداد اور بے سرو سامانی کے باوجود کفار کی کثیر تعداد اور بہترین اسلحہ رکھنے والی فوج کے مقابلے میں جس طرح کامیاب ہوئے اس سے صاف معلوم ہوا کہ ان کو اللہ کی تائید حاصل تھی۔

۱۹۔ بلاشبہ تمہارے لئے ان دو گروہوں میں بڑی ہی نشانی تھی جو بدر کے میدان میں ایک دوسرے کے مدمقابل ہوئے۔ اہل مکہ کے مظالم سے مجبور ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی اور مدینہ آئے۔ لیکن قریش مکہ نے یہاں بھی چین سے بیٹھنے نہ دیا۔ ہجرت کے دوسرے سال ایک لشکر تیار ہوا اور مدینہ پر حملہ آور ہو گیا۔ مسلمان بھی مدینہ سے نکلے اور بدر نامی ایک کنوئیں

کے پاس لڑائی ہوئی۔ جنگ بدر سے مقصود یہی لڑائی ہے۔ مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ تھی اور دشمن تین گنا زیادہ تھے۔ قرآن نے اس کو دو جماعتوں کا التقاء (مڈبھیڑ) قرار دیا ہے۔

مڈبھیڑ کی مختصر کیفیت

اس مڈبھیڑ کی مختصر کیفیت یہ ہے کہ دستور کے مطابق پہلے شیبہ اس کا بھائی عتبہ اور اس کا بیٹا ولید میدان میں نکلے۔ مسلمانوں کی طرف سے عوفؓ، معوذؓ اور عبداللہ بن رواحہؓ مقابلے کے لئے اٹھے مگر حضور انورؐ نے ان کو روک دیا اور اپنے خاندان میں سے حمزہؓ، علیؓ اور عبیدہ ابن حارثؓ کو آگے کیا۔ عتبہ، شیبہ اور ولید تینوں مارے گئے لیکن عبیدہ بھی سخت زخمی ہوئے۔ حضرت علیؓ ان کو کندھے پر اٹھا کر لائے مدینہ منورہ واپس ہوتے ہوتے راستہ میں وفات پائی۔ قریش میں سے عبیدہ بن سعید بن العاص لوہے میں ڈوبا ہوا نکلا صرف آنکھیں نظر آتی تھیں۔ زبیر بن العوام نے تاک کر برچھا آنکھوں میں مارا عبیدہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ پھر عام لڑائی شروع ہو گئی۔ قریشِ مکہ کے کئی اکابر مارے گئے۔ معاذ اور معوذ نے عبدالرحمٰن بن عوف سے پوچھا کہ ابوجہل کون ہے؟ جب معلوم ہو گیا تو دونوں نوجوان بازوں کی طرح جھپٹے اور صفوں کو چیرتے ہوتے ابوجہل کے پاس پہنچ گئے، جاتے ہی ایسا سخت وار کیا کہ ابوجہل گر گیا۔ اس کے بیٹے عکرمہ نے معاذ کے بازو پر پیچھے سے تلوار ماری جس سے ہاتھ کٹ گیا لیکن تسمہ لگا رہا۔ نوجوان معاذ نے کٹا ہوا ہاتھ پاؤں تلے دبا کر تسمہ بھی الگ کر دیا کیونکہ وہ جنگ میں حائل ہو رہا تھا پھر عبداللہ بن مسعود نے ابوجہل کا سر کاٹا۔

غرض فئۃ کافرۃ یعنی قریشِ مکہ کے ستر آدمی مارے گئے۔ صحابہ کرامؓ میں سے چودہ شہید ہوئے۔ ان میں سے چھ مہاجرین میں سے اور آٹھ انصار میں سے تھے۔

مہاجرین شہداء:

۱۔ عبیدہ بن حارث، ۲۔ عمیر بن وقاص بعمر ۱۶ سال، ۳۔ عمیر بن عبد عمرو بن نضلہ خزاعی، ۴۔ لعج حضرت عمر کے غلام، ۵۔ صفوان بن بیضا، ۶۔ عاقل بن بکیر لیثی۔

انصار کے شہداء:

۱۔ عمیر بن الحمام، ۲۔ سعد بن خیثمہ اوسی، ۳۔ مبشر بن عبدالمنذر، ۴۔ یزید بن حارث، ۵۔ رافع بن المعلی، ۶۔ حارثہ بن سراقہ، ۷۔ عوف بن عفراء، ۸۔ معوذ بن عفراء۔

یہ ہے التقاء فئتین کا وہ منظر جس کے لئے فئتین التقتا کی بلیغ تعبیر اختیار کی ہے۔

التقاء فئتین میں دعوے کی دلیل

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ قرآن نے حضورؐ کی وساطت سے جو دعویٰ کیا ہے کہ تم مغلوب ہوگے۔ اس فقرے کے ذریعے قرآن نے حضورؐ سے کہا کہ میرے اس دعویٰ کی صداقت کی سب سے بڑی اور عظیم الشان دلیل التقاء فئتین میں ہے یعنی جنگِ بدر میں التقائے فئتین کا نتیجہ اس غلبہ کی تمہید ہے تاہم فیصلہ کن تھا اگر نصیحت پذیری کی استعداد فنا نہ ہوگئی ہوتی تو ان لوگوں کے لئے کافی سرمایۂ نصیحت ہے۔

نظریاتی جنگ

۲۰ ۔ اس وقت ایک گروہ تو مٹھی بھر مسلمانوں کا اللہ کی راہ میں لڑ رہا تھا اور دوسرا منکرین نبوت کا گروہ تھا۔ اس میں بڑا معنی خیز اور بلیغ انداز تعبیر اختیار کیا گیا ہے۔ دو جماعتوں کا ذکر کیا ہے اور ساتھ ہی ان دو جماعتوں کا کردار بتایا ہے لیکن جماعتوں کے ذکر کے موقعہ پر اہل ایمان کے ذکر میں صرف ان کے کردار کا ذکر کیا کہ وہ اللہ کے راستہ میں لڑائی کرتے ہیں مگر ان کی صفتِ ایمان کا ذکر نہیں کیا اور اہل کفر کے ذکر میں ان کے کردار کو ظاہر نہیں کیا لیکن ان کی صفتِ کفر کو بیان کر دیا۔ اس میں اشارہ کر دیا کہ جیسے اللہ کی راہ میں جنگ کرنا ایمان ہی کا خاصا ہے اور ایمان ہی کی زمین پر یہ پودا اُگتا ہے۔ ایسے ہی کفر طاغوت کی راہ میں ہی جنگ کر سکتا ہے قوم کی راہ، وطن کی راہ، پیٹ کی راہ، طاغوت کی راہ ہے۔ اللہ کی راہ صرف ایک ہے کہ اللہ کے نام کا بول بالا کرنے کے لئے جنگ کی جائے۔ کچھ معاصر مفسرین نے یہ بات بھی بتائی ہے کہ

عربی زبان کا یہ معروف اسلوب ہے کہ دو متقابل باتوں میں سے بخیال اختصار ایک متقابل کو حذف کر دیتے ہیں لیکن اس میں کوئی معنویت نہیں ہے۔ فئۃ تقاتل فی سبیل اللہ یہ مسلمانوں کا گروہ ہے جن کی تعداد تین سو سے کچھ زائد تھی جن کے پاس کل ستر اونٹ، دو گھوڑے، چند زرہیں اور آٹھ تلواریں تھیں واخریٰ کافرۃ یہ کافروں کا گروہ ہے، ان کی تعداد تقریباً ایک ہزار تھی جن کے پاس سات سو اونٹ اور ایک سو گھوڑے تھے۔

بدر میں کون کسے دگنا دیکھ رہا تھا؟

۲۱ ۔ وہ اپنی آنکھوں سے مسلمانوں کو اپنے سے دوچند دیکھ رہے تھے یعنی تماشہ یہ تھا کہ ہر ایک فریق کو حریف مقابل اپنے سے دوگنا نظر آتا تھا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ کفار کے دل مسلمانوں کی کثرت کا تصور کر کے مرعوب ہو رہے تھے اور مسلمان اپنے سے دوگنی تعداد دیکھ کر اور زیادہ حق تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوتے اور کامل توکل و استقلال سے اللہ کے وعدے ان یکن منکم مائۃ صابرۃ یغلبوا مائتین پر اعتماد کر کے فتح و نصرت کی امید رکھتے تھے۔ اگر ان کی پوری تعداد جو گنی

ہی منکشف ہوجاتی تو ممکن تھا خوف طاری ہوجاتا۔ اور ہر فریقین کا دگنی تعداد دیکھنا بعض حالات میں تھا۔ ورنہ کچھ حالات ایسے بھی تھے جب ہر ایک کو دوسرے کی جمعیت کم محسوس ہو رہی تھی جیسا کہ سورۃ انفال میں آئے گا۔[1]

مسلمان تین سو تیرہ اور کفار ہزار کے قریب تھے گویا کفار مسلمانوں سے تین حصے زائد تھے اس آیت میں اسی کثرت کو بیان فرمایا ہے کہ کفار آنکھوں سے دیکھ رہے تھے کہ ہمارا گروہ زیادہ ہے مگر پھر بھی انجام دیکھ لیا کہ مسلمان ہی غالب رہے۔ اس سے ہر منصف استدلال کر سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب اپنے دین کو سربلند کرنا چاہتا ہے تو کافروں کی کثرت اور ثروت روک نہیں سکتی۔[2]

آیت یرونھم مثلیھم میں کون کس کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہا تھا؟ اس سوالی کے جواب با ضمیروں کی تعیین میں اہل تفسیر کے درمیان شدید اختلاف ہے۔

سب سے پہلی رائے یہ ہے کہ یرون کا فاعل کفار ہیں اور ھم کا اشارہ مسلمانوں کی طرف ہے یعنی کفار مسلمانوں کو اپنے سے دوگنا دیکھ رہے تھے یعنی مسلمان واقع میں تین سو تیرہ تھے لیکن کافروں کو اپنے سے دوچند یعنی دو ہزار نظر آ رہے تھے۔ سعید بن اوس کہتے ہیں کہ مشرکین نے ایک مسلمان قید کیا۔ مشرکین نے مسلمان قیدی سے دریافت کیا کہ تم کتنے ہو؟ اُس نے بتایا کہ تین سو سے کچھ زیادہ۔ مشرکین نے کہا ہمیں تو تم اپنے سے دوچند نظر آتے تھے یعنی ایک ہزار ۹ سو۔ مولانا آزاد نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے اور مولانا محمد ادریس نے بھی اسی کو پسند کیا ہے اور ہم نے بھی ترجمہ میں اسی کو اپنایا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

خدا کے حکم سے مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کی آنکھوں میں ان کی اپنی تعداد سے دوگنی نظر آنے لگی۔

مفسرین قرآن میں سے آلوسی، نسفی، بیضاوی، ابن کثیر کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔

بہرحال مفسرین قرآن میں سے اچھے اچھے اکابر نے اس کو قبول کیا ہے۔

ایک شبہ کا جواب

ممکن ہے کہ بعض ذہن یہ خلش محسوس کریں کہ سورۂ انفال میں جہاں غزوۂ بدر کا ذکر ہے وہاں یہ بتایا گیا ہے یقللکم فی اعینھم اللہ سبحانہ اے مسلمانو تمہیں کافروں کی نظر میں کم دکھا رہا تھا۔

[1] افادات شیخ الاسلام [2] بیان القرآن

یہ آیت کی اس تشریح کے خلاف ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ لڑائی شروع ہونے سے پہلے مسلمان کافروں کی نظر میں تھوڑے دکھائی دے رہے تھے جیسا کہ سورۂ انفال میں ہے لیکن جب گھمسان کی لڑائی شروع ہو گئی دفعتہً صورتحال بدل گئی۔ اب جو کفار نے میدانِ جنگ پر نظر ڈالی تو دیکھا نقشہ ہی اور ہے۔ فرشتوں کی شرکت سے مسلمانوں کو اتنی افرادی برتری حاصل ہو گئی کہ وہ کفار کی نگاہوں میں ان سے دُگنی نظر آنے لگے۔ لہٰذا دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ آیت زیرِ بحث اور آیت انفال میں زمان و وقت کا فرق ہے۔ انفال میں جس وقت کا ذکر ہے وہ جنگ شروع ہونے سے پہلے ہے اور آیت زیرِ تفسیر میں جنگ شروع ہو جانے کے بعد کا ذکر ہے۔ اسطرح دونوں آیتوں میں پوری پوری ہم آہنگی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ انفال میں آئے گی۔

اس آیت کی تشریح میں دوسری رائے یہ ہے کہ یرونھم میں یرون کا فاعل تو کفار ہیں اور ھم سے مراد مسلمان ہی ہیں اور مثلیھم کی ضمیر کا مرجع بھی مسلمان ہی ہیں اور مطلب یہ ہے کہ کفار مسلمانوں کو اپنے سے نہیں بلکہ مسلمانوں سے دوچند دیکھتے تھے یعنی مسلمان کافروں کی نظر میں بجائے ۳۱۳ کے ۶۲۶ دکھائی دیتے تھے۔ مقصد یہ تھا کہ کافر جب مسلمانوں کی تعداد زیادہ دیکھیں گے تو مرعوب ہو جائیں گے۔

اس آیت میں تیسری رائے یہ ہے یرونھم یرون کا فاعل کافر ہوں اور ھم کا اشارہ بھی کافروں کی طرف ہو اور مثلیھم میں ھم سے مسلمان مراد ہوں اور مطلب یہ ہو کہ کفار اپنے آپ کو مسلمانوں سے دوچند دیکھ رہے تھے۔ یہ دیکھنا بھی کچھ وہم و خیال کا نہیں بلکہ کھلی آنکھوں کا دیکھنا تھا گویا محض یہ بتانا مقصود ہے کہ کثرت کے باوجود اللہ نے قلیل تعداد کو کامیابی عطا فرمادی۔ یہ مولانا اشرف علی کا مختار ہے۔ اسی کو مولانا دریا بادی نے اسلم اور احوط قرار دیا ہے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سے خیالات پیش کئے گئے ہیں۔ ہمیں سب سے پہلی رائے زیادہ پسند ہے۔ وہ معنی کے لحاظ سے بالکل بے غبار ہے۔

اللہ کی تائید و نصرت

۲۲۔ اور اللہ جس کو چاہتا ہے اپنی مدد سے مددگاری کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی تائید عالم ابتلاء میں مصالح تکوینی کے لحاظ سے ہوتی ہے۔ چنانچہ اس موقعہ پر اس کی مشیت و نصرت مومنین سے متعلق ہو گئی اور کافروں کے کام نہ آئی کی تیاری آئی اور

ہ کثرتِ تعداد۔[1]

دراصل فتح اور غلبہ کا اصل مدار تائیدِ خداوندی پر ہے۔ تائیدِ خداوندی کے مقابلے میں کوئی طاقت غالب نہیں آسکتی جیسا کہ بدر کے معرکے میں دنیا نے اس کا تماشا دیکھ لیا۔[2]

اس فقرے میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی تائید و نصرت سے جس کو چاہے نواز سکتا ہے کو اس کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتا اور جس کو وہ اپنی تائید و نصرت سے نوازے اس کے لئے کثرت و قلت کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ چاہے تو قطرے کو دریا اور ذرّے کو آفتاب بنا دے، کتنے کمزور اور ناتواں گروہوں کو اس نے بڑی بڑی فوجوں پر فتح عطا فرمائی ہے۔ فتح و شکست کا اصلی سر رشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے۔[3]

تازیانۂ عبرت

۲۳۔ بلا شبہ اس معاملہ میں ان لوگوں کے لئے جو چشم بینا رکھتے ہیں بڑی ہی عبرت ہے یعنی بہر حال ایک قلیل اور بے سر و سامان جماعت کو ایسی مضبوط جماعت کے مقابلے میں ان پیشینگوئیوں کے موافق جو مکہ میں کی گئی تھیں۔ اس طرح مظفر و منصور کرنا آنکھیں رکھنے والوں کے لئے بہت بڑا عبرت ناک واقعہ ہے۔[4]

اس جنگ میں دو باتیں نہایت سبق آموز ہیں۔

ایک یہ کہ مسلمان اور کفار جس شان سے نکلے اس سے ان دونوں کا اخلاقی فرق ظاہر ہو رہا تھا۔ ایک طرف کافروں کے لشکر میں شرابوں کے دور چل رہے تھے۔ ناچنے اور گانے والی لونڈیاں ساتھ آئی تھیں اور خوب دادِ عیش دی جا رہی تھی۔ جبکہ دوسری طرف مسلمانوں میں پرہیزگاری تھی، خدا ترسی تھی، انتہا درجہ کا اخلاقی انضباط تھا، نمازیں تھیں اور روزے تھے۔ بات بات پر اللہ کا نام تھا اور اللہ ہی کے سامنے دعائیں اور التجائیں تھیں۔ دونوں لشکروں کو دیکھ کر ہر شخص بآسانی معلوم کر سکتا تھا کہ کون اللہ کی راہ میں لڑ رہا ہے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کی غالب قوت سے غافل ہو کر جو لوگ اپنے سر و سامان اور اپنے حامیوں کی کثرت پر پھولے نہ سماتے تھے۔ ان کیلئے یہ واقعہ تازیانۂ عبرت تھا کہ اللہ کس طرح چند مفلس و قلاش غریب الوطن مہاجروں اور مدینے کے کاشتکاروں کی ایک مٹھی بھر جماعت کے ذریعے قریش جیسے قبیلے کو شکست دلوا سکتا ہے جو تمام عربوں کا ملجا و ماویٰ تھا۔[5]

---

[1] ماجدی، [2] معارف م ا، [3] تدبر قرآن، [4] افادات شیخ الاسلام، [5] تفہیم القرآن

زُيِّنَ لِلنَّاسِ حُبُّ الشَّهَوٰتِ مِنَ النِّسَآءِ وَالْبَنِيْنَ وَالْقَنَاطِيْرِ الْمُقَنْطَرَةِ مِنَ الذَّهَبِ وَالْفِضَّةِ وَالْخَيْلِ الْمُسَوَّمَةِ وَالْاَنْعَامِ وَالْحَرْثِ ؕ ذٰلِكَ مَتَاعُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۚ وَاللّٰهُ عِنْدَهٗ حُسْنُ الْمَاٰبِ ﴿۱۴﴾

لوگوں کے لئے چاہتوں[24] یعنی عورتوں[25]، بیٹوں[26]، سونے اور چاندی کے ذخیروں[27]، چنے ہوئے گھوڑوں[28]، مویشیوں[29] اور کھیتی باڑی کی محبّت آراستہ کردی گئی ہے۔ یہی دُنیا کی زندگی کا سامان ہے اور بہتر ٹھکانا تو بس اللہ ہی کے پاس[30] ہے۔

عبرت و موعظت کی راہ میں رکاوٹیں

دنیا کی چاہتوں، نفسانی رغبتوں اور طبعی خواہشوں سے رغبت انسان کی طبیعت ہے چھوٹے ہوں یا بڑے مشرقی ہوں یا مغربی، عہدِ قدیم کے تاریک زمانے والے ہوں یا بجلی کے روشن دنوں میں زندگی گزارنے والے ان تمام چیزوں کی محبّت ہر ایک کی فطرت میں راسخ ہے۔ یہ انسان کی ان خصوصیّات میں سے ایک خصوصیّت ہے جن کا قرآن نے ذکر کیا ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ انسانی فطرت یوں تو قدرت کے راز ہائے گراں مایہ کا ایک لامحدود خزانہ ہے اور قرآن نے مختلف مقامات پر مختلف الفاظ اور مختلف پیرایہ بیان میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن اس آیت میں جس خصوصیت کا ذکر کیا ہے وہ حب الشہوات ہے اسی کو قرآن نے

کہا ہے یعنی الخیر کی محبت میں انتہا پسند ہے۔ اس آیت میں حب الشہوات کے عنوان کے تحت الخیر کے چند امتیازی افراد کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان میں انتہا پسندی کی آراستگی عبرت و موعظت کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اسی راہ سے انسان کنود بنتا ہے ان الانسان لربہ لکنود اور اسی راہ سے انسان میں ہلوعیت آتی ہے ان الانسان خلق ھلوعًا انسان فطرتی لالچی ہے۔ ہلوع عربی زبان کا ایک لفظ ہے۔ انسانی نفسیات کی اس کیفیت کی ترجمانی کرتا ہے جسے قاضی بیضاوی نے شدید الحرص قلیل الصبر کے الفاظ میں پیش کیا ہے۔

قرآن کے لفظ حب الشہوات کا مفاد یہ ہے کہ انسان ان چیزوں کی محبت میں بے انتہا مستغرق ہے کہ ان شہوات کی محبت ہی انسان کی نظر میں محبوب و مزین ہو جاتی ہے۔ اور یہ محبت اتنی تیز ہو جاتی ہے کہ حاصل شدہ نعمتوں کی قدر و قیمت سے غافل ہو جاتا ہے۔ ان کے متعلق کسی قسم کے احساسِ شکر کو اپنے اندر بیدار نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ یافتہ نعمتوں سے بے پروا ہو کر نایافتہ تمناؤں اور آرزوؤں میں الجھا رہتا ہے، پریشان اِدھر سے اُدھر مارا مارا پھرتا ہے، چہرے پر ایسی حالت طاری کرتا ہے کہ گویا اس وقت تک قدرت کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کا اسے کبھی موقعہ ہی نہیں ملا۔ امیر و غریب اس باب میں سب کا حال یہی ہے۔ گویا حُبّ الشہوات کے لفظ سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت میں کھودنے والے نے کوئی ایسی عمیق کھائی کھود دی ہے جو کسی طرح بھرنے کو نہیں آتی ہے۔ 'اور' کے بعد 'اور' کا مطالبہ مسلسل بغیر کسی انقطاع کے پوری شدّت کے ساتھ زندگی بھر اس پر مسلّط رہتا ہے اور پھر یہ مطالبہ اگر ایک چیز تک محدود رہتا تو غنیمت تھا۔ اس آیت میں النساء، البنین، القناطیر المقنطرۃ من الذھب والفضۃ والخیل المسوّمۃ والانعام والحرث کہہ کر اسی کے افراد کو کھول دیا ہے یہ الشہوات کے چند اساسی افراد ہیں پہلے بھی تھے اور اب بھی ہیں۔ تبدیلیاں تو صرف ان کے قالبوں میں ہوتی ہیں۔

۲۴ ۔ لوگوں کے لئے چاہتوں کی محبت آراستہ کر دی گئی ہے۔ یعنی جب آدمی ان میں پھنس کر اللہ سے غافل ہو جائے [1]

اصل ارشاد میں زین للناس حب الشھوات آیا ہے۔ تزئین کے معنی آراستہ کرنا، سجانا،

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اصل میں فعل مجہول آیا ہے اس لئے اس میں شارحین قرآن مختلف ہیں کہ آراستہ کرنے والا کون ہے قرطبی اور آلوسی نے امام بخاری کے حوالہ سے انکشاف کیا ہے کہ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ آراستہ کرنے والی اللہ کی ذات ہے اور قرطبی نے امام حسن بصری کا نام لے کر بتایا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ آراستہ کرنے والا شیطان ہے۔ صاحب انتصاف نے دونوں میں اسی طرح مفاہمت کی ہے کہ باتیں دو ہیں ایک انسانی طبیعت میں چاہتوں کی لٹک اور محبت کی تخلیق ہے اور دوسری ان رغبتوں اور چاہتوں کے حصول کی ترغیب ہے۔ تزئین تخلیق کے معنے میں ہو تو اللہ فاعل ہے اور یہی ترغیب کے معنے میں ہو تو تزئین شیطان کا کام ہے۔ حضرت عمر پہلی بات فرما رہے ہیں اور حضرت حسن بصری نے دوسری بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

دراصل یہاں انسانی طبیعت موضوع ہے یعنی بتایا جا رہا ہے کہ اللہ سبحانہ نے انسانی طبیعت ایسی بنائی ہے کہ الشہوات کی محبت اس میں اس طرح رکھی ہوئی ہے کہ آدمی اس زندگی میں ہر چیز کو اسی کے رنگ میں دیکھتا ہے، حق و باطل کو تولنے کے لئے اسی کو میزان بناتا ہے وہ ہر چیز کو سمجھنے اور پرکھنے کے لئے اسی کو پیمانہ اور کسوٹی قرار دیتا ہے۔ یہ اللہ کی تخلیق ہے اور انسانی فطرت ہے، حقائق اور طبائع اللہ کی بناوٹ ہیں۔ قرآن نے دوسرے موقع پر اس آراستگی کا فلسفہ بھی بتایا ہے۔

زمین میں جو کچھ بھی ہے ہم نے زمین کے لئے اسے زینت بنا دیا اور اس لئے بنایا ہے کہ لوگوں کو آزمالیں کہ کون ایسا ہے جس کے کام زیادہ اچھے ہیں۔ یعنی اس تزئین کی وجہ ابتلاء ہے۔ انسان کی ساری زندگی یہاں ابتلائی ہے۔ اور اس ابتلاء کے لئے حب الشہوات کی تزئین کی تخلیق ہوئی ہے۔ ان ساری سجاوٹوں، آراستگی، پیراستگی کے ہنگاموں میں انسان پر کچھ ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا گیا ہے۔ ان ذمہ داریوں کی پابجائی میں یہ آراستگی ہی سب سے بڑا کانٹا ہے۔ ان کی فریفتگی انسان کو ایسا دیوانہ بنا دیتی ہے کہ وہ خالق اور مخلوق دونوں سے حتیٰ کہ خود اپنی ذات سے بھی بیگانہ بنا دیتی ہے۔ یہ حب شہوات کی تزئین ہر ایک کی فطرت میں راسخ ہے۔ یہی وہ حب شدید ہے جو انسان کو اپنے رب کا ناشکرا بناتی ہے اور یہی وہ ہلوعیت ہے جو انسانوں کے لئے ظلم کا دروازہ کھول دیتی ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں ہے مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ غالباً صحاح کی مشہور حدیث

اگر آدم کے بیٹے کو دو دادیاں مال کی دے دی جائیں تو وہ چاہے گا تیسری وادی کو۔

قرآن کی اسی تزئین کی توضیح و تفسیر ہے۔ بعض صحابہؓ نے شائد اسی بناء پر اس حدیث کو

قرآن کی آیت قرار دے دیا لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حدیث کے بجنسہ یہ الفاظ قرآن میں پائے جاتے ہیں۔ بلکہ مقصد یہ ہے کہ قرآن کے زین للناس کا یہ مفاد ہے۔

شہوات کا لفظ یہاں مشتہیات کے معنے میں ہے یعنی شہوات سے مراد خواہش اور رغبت کی چیزیں مراد ہیں کیونکہ محبوب حقیقتاً وہ مرغوبات ہیں خود رغبت محبوب نہیں لیکن ان میں استغراق اور دیوانگی کو ظاہر کرنے کے لئے شہوات کہہ دیا کیونکہ انسان کی جب ساری زندگی سراپا لذت و شہوت ہو جاتی اور وہ محض بندۂ خواہش ہو کر رہ جائے تو رغبتوں، خواہشوں اور ولولوں کی چاہت اس کی زندگی کا نصب العین بن جاتی ہے۔ آج بھی مقدرت والوں کو دیکھا جاتا ہے کہ کاروں پر کاریں خریدتے چلے جاتے ہیں۔ یہ تزئین حب الشہوات نہیں تو اور کیا ہے۔

انسانی مرغوبات کی قسم اوّل

۲۵۔ عورتوں، مرغوبات اور مشتہیات کے سلسلے میں قرآن نے عورتوں کا سب سے پہلے ذکر کیا۔ یعنی جب ان میں پھنس کر آدمی اللہ سے غافل ہو جائے اسی لئے ارشاد ہے، میرے بعد مردوں کے لئے عورتوں سے زیادہ کوئی ضرر رساں فتنہ نہیں ہے۔ ہاں اگر عورت سے مقصود اعفاف اور اولاد ہو تو وہ مذموم نہیں بلکہ مطلوب و مندوب ہے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ دنیا کی بہترین متاع نیک بیوی ہے کہ اگر اس کی طرف دیکھے تو خوش ہو حکم دے تو فرمانبردار پائے۔ کہیں غائب ہو تو پیٹھ پیچھے شوہر کے مال اور اپنی عصمت کے معاملہ میں اس کی حفاظت کرے۔ اسی طرح جتنی چیزیں آگے متاع دنیا کے سلسلے میں بیان ہوئیں، سب کا محمود اور مذموم ہونا نیت اور طریق کار کے تفاوت سے متفاوت رہے گا۔ مگر چونکہ دنیا میں کثرت ایسے افراد کی ہے جو عیش و عشرت کے ساما توں میں پھنس کر اللہ تعالیٰ کو اور اپنے انجام کو بھول جاتے ہیں اس لئے زین للناس میں سطح کلام عام رکھی گئی ہے[1]

عورتوں کا ذکر حب الشہوات میں سب سے پہلے کیا ہے۔ قرطبی نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے مردوں کی نفسیاتی خواہشات کا سب سے بڑا مرکز یہی ہیں یعنی دنیوی لذتوں اور خواہشوں کا یہی منشا ہیں یہی مطمح نظر ہیں۔ دولت کا بڑا مصرف یہی ہیں۔ اور دُنیوی زندگی میں کسی چیز کی محبت

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کے برابر نہیں ہے۔ کتنے مالداران کی محبت میں فقیر اور کتنے عزت و آبرو کے مالک ان کی وجہ سے ذلیل و رسوا ہیں۔ عورتوں سے حب الشہوات کا جنون جب سر سوں پر سوار ہوتا ہے تو یہ فتنہ دنیا کے فتنوں سے زیادہ طاقتور فتنہ بن کر آتا ہے، اخلاقی حس مفلوج ہو جاتی ہے۔ شرم و حیاء اور غیرت و حمیت ناپید ہو جاتی ہے، فحاشی رونما ہوتی ہے، فحش کاری کے اڈے قائم ہوتے ہیں، زنا اور فسق و فجور عام ہو جاتا ہے اور نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کئے جاتے ہیں۔ امراء القیس عرب کا سب سے بڑا شاعر تھا۔ اُس کے ساتھ شہزادہ اور والیٔ ملک بھی تھا۔ اُس نے اپنی پھوپھی زاد بہن عنیرہ اور دیگر عورتوں کے ساتھ جو افعال شنیعہ اور بے حیائیاں کیں قصیدہ لامیہ میں فخر کے ساتھ تفصیل سے لکھی ہیں۔ اس قصیدہ کے اشعار عرب میں بچہ بچہ کی زبان پر تھے۔ عرب میں اسی حب الشہوات کے نتیجہ میں فاحشہ عورتیں گھروں کے سامنے جھنڈیاں لگا کر بیٹھی تھیں اور صاحب الرایات کہلاتی تھیں۔ اسلام سے پہلے ایسی عورتیں خود مکہ مکرمہ میں تھیں۔ ان میں سے ایک کا نام عناق تھا۔ یہ تو ماضی کی کہانی ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ زمانہ جاہلیت کی داستان ہے۔ آج اسلام سے بیگانہ جاہلیتِ جدیدہ بھی حب الشہوات من النساء کے معاملے میں پرانی جاہلیت سے کچھ مختلف نہیں ہے۔ اس پر تفصیلی بحث پڑھنا چاہتے تو عربی میں العقاد، الغزالی کی کتابیں اور اردو میں مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا ظفیر الدین کی کتابیں پردہ اور اسلام کا نظامِ عفت و عظمت پڑھیے۔

انسانی مرغوبات کی قسم دوم

۲۶۔ بیٹوں، عورتوں کے بعد اولاد کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ اولاد عورتوں ہی کا نتیجہ ہے۔ گویا عورت اگر اصل ہے تو اولاد کی حیثیت فرع کی ہے اور اولاد میں خاص طور پر یہاں بیٹوں کا ذکر اس لئے کیا ہے کہ:

اوّلاً: والد کو لڑکے کے ذریعے دنیا میں شہرت اور نام آوری کی توقع ہوتی ہے اور بڑھاپے میں اسے اپنی امیدوں کا سہارا تصور کرتا ہے۔

ثانیاً: عرف میں لڑکا ہی نسب کے سنگِ میل کی حیثیت رکھتا ہے یعنی اس کے ذریعے نبی اور خاندانی سلسلہ کو بقا حاصل ہوتا ہے۔

ثالثاً: زندگی کے مختلف گوشوں میں جن کارناموں کی توقع لڑکوں سے وابستہ ہوتی ہے وہ

وہ لڑکیوں میں مفقود ہوتی ہے مثلاً فوجی جرنیل، قوم کا لیڈر ہونا اور کسی علم وفن میں امام ہونا۔
رابعاً: عرب عرف میں لڑکے کا ہونا باپ کی نیک نامی اور عزت کا ذریعہ ہے جبکہ وہ لڑکی کو اپنے لئے ذلت اور بدنامی کا سبب تصوّر کرتے ہیں۔

انسانی مرغوبات کی قسم سوم

۲۷۔ القناطیر المقنطرہ، قنطار کی جمع ہے اس کے معنے کثیر اور بہت کے ہیں اور مقنطرہ اس کے ساتھ بطور تاکید آتا ہے۔ جیسے اردو میں ڈھیروں ڈھیر بولتے ہیں۔ مقصود مال کی بہتات کو بتانا ہے یعنی صرف مال کا متوالا نہیں بلکہ مال کی بہتات کے متوالا ہونے کی محبت طبیعت میں رچی ہوئی ہے۔ دلوں کی توجہ کا مرکز مالی ہوتا ہے۔ پورا وقت اسی کی بجاآوری میں صرف ہوتا ہے۔ کیونکہ خواہشوں کی تکمیل اور کام و دہن کی لذت اندوزیوں کے فراہم کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اور اس کے حصول میں آدمی اس قدر کھو یا جاتا ہے کہ اسے طلب حق کی فرصت ہی نہیں ہوتی۔ اور اس کے ساتھ ایسا طبعی لگاؤ ہو جاتا ہے کہ نبوّت کا انکار کرنے والوں میں پیش قدمی بھی کرتا ہے۔

یہاں طبعی محبّت کے تذکرے میں اولاد کا پہلے ذکر کیا ہے لیکن فتنہ اور ابتلاء کے موقعہ پر مال پہلے اور اولاد کا بعد میں ذکر کیا ہے جیسے اموالکم واولادکم فتنۃ کیونکہ بیوی بچوں کو بقائے نسل کی حد تک درجہ مقصودیت حاصل ہے اور مال مقصد نہیں وسیلہ ہے۔ مال کو مقصد وہی شخص بناتا ہے جو حقیقت سے بالکل اندھا بن جائے۔

انسانی مرغوبات کی قسم چہارم

۲۸۔ چنے ہوئے گھوڑوں۔ اصل ارشاد میں الخیل المسومۃ آیا ہے۔ الخیل کا لفظ عربی میں گھوڑے اور اس کے سوار دونوں کے لئے بولا جاتا ہے۔ اس کی وجہ امام راغب نے یہ بتائی ہے کہ یہ خیال سے بنا ہے کیونکہ خیلاء متکبّر کو کہتے ہیں اس لئے کہ وہ اپنے آپ کو دوسرے سے بڑھ کر خیال کرتا ہے۔ اور یہ اسم جمع ہے۔ المسومۃ سوم کے معنے دو آتے ہیں ایک اونٹ کو چراگاہ میں چھوڑے گئے ہیں، دوسرے معنے نشان لگانے کے ہیں۔ الخیل المسومۃ کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں چرنے کے لئے چھوڑے ہوئے اور نشان لگائے گئے۔ امام بخاری نے مجاہد مفسّر قرآن سے اس کے معنے خوبصورت گھوڑے

کے کیئے ہیں ۔
گھوڑے عرب سرمایہ داری کا بہت بڑا شاہکار تھے ، عمدہ گھوڑوں پر وہ بہت فخر کرتے تھے سونا ، چاندی اور گھوڑے عرب کی شہری زندگی میں تمول کا نشان تھے یہاں تک قرآن نے شہری زندگی میں تمول کی راہوں کو بیان کیا ۔ آگے دیہاتی زندگی ہیں جن راہوں سے تمول آتا ہے اس کو بیان کیا جا رہا ہے ۔

انسانی مرغوبات کی قسم پنجم

۲۹ ۔ مویشیوں ۔ اصل ارشاد میں انعام آیا ہے ۔ انعام نعم کی جمع ہے ۔ یعنی اونٹ گائے اور بیل اور بھیڑ بکری وغیرہ جو انسان کا ذریعہ معاش ہیں ۔ دودھ اور گوشت کی غذا انہی سے مہیا ہوتی ہے اور اون ، کھال بھی انہی چوپاؤں سے حاصل ہوتی ہے ۔ صبح و شام کے سہانے وقت میں یہ منظر سامنے آتا ہے کہ دیہات کے مویشی صبح کو آبادی سے نکل کر چراگاہوں کی طرف جاتے ہیں اور شام کو واپس آتے ہیں ۔ قرآن میں ہے ۔

ولکم فیھا جمال حین تریحون وحین تسرحون
تمہارے لئے ان مویشیوں میں سامانِ زینت ہے جب تم شام کو ان کو گھر واپس لاتے ہو اور صبح کو جب ان کو لے جاتے ہو ۔

اس آیت میں بھی انسانی فطرت کی تزئینی جستجو کو ایک لذیذ یافت کی طرف متوجہ کیا گیا ہے

انسانی مرغوبات کی قسم ششم

کھیتی پر انسانی زندگی کا دار و مدار ہے ۔ زراعت اگرچہ ضرورت کے اعتبار سے سب سے اوّل ہے لیکن رغبت اور زینت کے لحاظ سے سب سے آخر ہے ۔ اور ایسا بہت ہی کم ہوتا ہے کہ کھیتی قبولِ حق میں مانع ہو ۔ اور شائد زراعت کو مؤخر کرنے کی وجہ یہ بھی ہو کہ قرآن کے اوّلین مخاطب یعنی قریش کا ماحول زراعت وغیرہ سے بے تعلق تھا ۔ اور ان کا یہ ذریعہ معاش نہ تھا ۔ مدینہ کی زندگی میں انصار کی معیشت زراعت سے تعلق رکھتی تھی اس لئے زراعت کو آخر میں لے آئے ہیں ۔
یہاں ذرائع معاش کو بتانا مقصود نہیں بلکہ صرف حبّ الشہوات کے افراد کو بیان کرنا

پیش نظر ہے۔ اگر معاشی وسائل بتاتے ہوتے تو صنعت، تجارت اور ملازمت کا بھی ذکر ہوتا۔
۳۰ یہی دنیا کی زندگی کا سامان ہے اور بہتر ٹھکانا تو بس اللہ کے پاس ہے یعنی ابدی فلاح ان چیزوں سے حاصل نہیں محض دنیا میں چند روز فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ کامیاب مستقبل اور اچھا ٹھکانا چاہتے ہو جو خدا کے پاس ملے۔ اس کی خوشنودی اور قرب حاصل کرنے کی فکر کرو۔ [1]

اصل ارشاد میں 'متاع' آیا ہے۔ متاع اس چیز کو کہتے ہیں جس سے کسی حیثیت سے کچھ مدت کے لئے نفع حاصل کیا جائے۔ متاع الحیاۃ الدنیا سے مقصود یہ ہے کہ یہ اور اس قسم کی ساری چیزیں بہت زیادہ دل لگانے کے قابل نہیں۔ البتہ دنیوی زندگی برتنے میں مفید و معین یقیناً ہیں۔ سو ان سے اسی حد تک پیار کرنا چاہیے۔ یہ نہ ہو کہ یہ مقاصدِ حیات بن جائیں۔ دنیا خود ہی فانی ہے اور اس کے سارے ساز و سامان بھی فانی۔ [2]

دنیا کی محبت فطری ہے

اس آیت میں دنیا کی چند اہم مرغوبات کا نام لے کر بتایا گیا ہے کہ لوگوں کی نظروں میں ان کی محبت خوشنما بنا دی گئی ہے۔ اس لئے بہت سے لوگ اس کی ظاہری رونق پر فریفتہ ہو کر آخرت کو بھلا بیٹھتے ہیں۔ جن چیزوں کا نام اس جگہ لیا گیا ہے وہ عام طور پر رغبت و محبت کا مرکز ہیں جن میں سب سے پہلے عورت کو اور اس کے بعد اولاد کو بیان کیا ہے کیونکہ دنیا میں انسان جتنی چیزوں کے حاصل کرنے کی فکر میں لگا رہتا ہے۔ ان سب کا اصلی سبب عورت یا اولاد ہے۔ اس کے بعد سونے، چاندی، مویشی اور کھیتی کا ذکر ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کی محبت طبعی طور پر انسان کے دل میں ڈال دی ہے۔ اس میں بہت سی حکمتوں کے ساتھ ایک حکمت یہ بھی ہے کہ انسان کا امتحان لیا جائے کہ ان سرسری ظاہری مرغوبات اور اس کی چند روزہ لذت میں مبتلا ہونے کے بعد وہ اپنے مالک و خالق کو یاد رکھتا ہے یا انہی کی محبت میں الجھ کر اپنے مالک و خالق کو بھلا بیٹھتا ہے۔ [3]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام ، [2] تفسیر ماجدی ، [3] معارفِ قرآن م ش

اشتراکیت اور رہبانیت

قرآن نے الشہوات کے سلسلے میں کچھ اہم خواہشوں کی اس آیت میں تفصیل پیش کی ہے یعنی النساء عورتیں، البنین زینہ اولاد، الذہب والفضہ سونا اور چاندی کے انبار الخیل المسومہ اصل و نشان زدہ خوبصورت گھوڑے الانعام مویشی اور الحرث کھیتی۔ ان کے ذکر میں یہ بھی بتایا ہے کہ ان کی محبت انسان کے لئے سجا دی گئی ہے اور ان کو متاع الحیاۃ الدنیا کہا ہے۔

انسان میں الشہوات کے لئے حب شدید کا جو جذبہ پایا جاتا ہے اس پر قابو کیسے پایا جائے۔ رہبانیت نے کوشش کی کہ جب اندر سے یہ بھر نہیں سکتا تو باہر سے آرزوؤں سے دست بردار کی ڈانٹ لگا دی جائے۔ اور فطرت نے انسانی طبیعت میں جو جذبہ رکھا ہے اسے معدوم کر دیا جائے اشتراکیت نے بھی اسی تجویز کو قبول کیا ہے اور اس کا موقف یہ ہے کہ جیسے بکریاں، مینڈھے، چوہے، کوے، چیلیں وغیرہ ضروریات زندگی کی ایک خاص مقدار کے مہیا ہونے کے بعد مطمئن ہو جاتے ہیں۔ ایسے ہی انسان کے ہر فرد کو بس اتنا ہی دیا جائے جتنا دوسرے کو دیا جاتا ہے۔ ان میں ہر ایک کو زندگی کی ضروریات کی اسی مقدار پر مطمئن ہو جانے کے لئے بزور شمشیر مجبور کیا جائے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ جو کچھ جسے دیا جائے اسی مقدار پر صبر کر کے وہ اپنی آرزوؤں سے دست بردار ہو جائے جن کا طوفان ہر اس شخص میں اُبلتا رہتا ہے جو انسان بن کر اس دنیا میں آیا ہے۔

فرق صرف یہ ہے کہ رہبانیت والوں نے یہ بات صرف زبان اور قلم سے کی تھی۔ لیکن اشتراکیت والوں نے اپنے اس غیر فطری عمل میں تلواروں کی دھار سے کامیاب ہونے کی کوشش کی۔

گویا قرآن کی نظر میں سرمایہ داری یا شاہ ولی اللہ کی اصطلاح میں رفاہیت بالغہ اگر نام ہے حب الشہوات میں انتہا پسندی اور جنون کا تو اشتراکیت نام ہے فطری اور طبعی قوانین سے بغاوت کا۔ سرمایہ داری کا صرف یہی ظلم تھا کہ اس نے سب کو نہیں کچھ کو غربت کی زندگی بسر کرنے پر مجبور کر دیا تھا لیکن اشتراکیت نے یہ دیکھ کر کہ چونکہ سب امیر نہیں ہو سکتے اس لئے سب کو غریب بن جانا چاہیے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ سرمایہ داری میں غریب بن کر جینے کے مواقع جن کو میسر تھے سرمایہ دشمنی کے نظام نے ان غریبوں کو جینے کے حق سے بھی محروم کر دیا۔

قرآن کی راہ مفاہمت ہے

بات طویل ہو جائے گی۔ مختصر یہ ہے کہ حب الشہوات کے موضوع پر ایک گروہ ان لوگوں کا جنہوں نے ان شہوات ہی کے ازالہ کو اپنا نصب العین بنا لیا ہے اور چاہتے ہیں کہ اسی سے الحیاۃ الدنیا کی پیچیدگیوں کا حل تلاش کیا جائے۔ الشہوات سے دستبرداری کا مشورہ جیسا کہ رہبانیت کا خیال ہے یا صفاتی تفاوت کی وجہ سے افرادِ انسانی میں مراتب و مدارج کا جو قدرتی اختلاف ہے اس کا ازالہ خلاصہ دونوں کا یہی ہے کہ انسان شکم مادر سے جو غرائز و صفات لے کر آیا ہے ان کو ختم کر دیا جائے۔ زندگی کی تلخیوں اور سماج کی اُلجھنوں کا واحد علاج اسی کو قرار دیا گیا ہے۔ لیکن قرآن نے اس راہ کی مشکلات کو جس تدبیر سے حل کیا ہے وہ ازالہ نہیں ہے بلکہ امالہ ہے۔ حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں اسی قرآنی تدبیر یعنی امالہ کو ایک تمثیل سے سمجھایا ہے۔

کسی طوفانی سیلاب کے مقابلہ میں اس قسم کی تدبیریں کہ آبادی کو چاروں طرف سے سنگ بست کر دیا جائے (جیسے اشتراکیت چاہتی ہے) یا یہ کہ تلاش کر کر کے ان سرچشموں میں ڈاٹیں لگا دی جائیں جن سے ابل ابل کر پانی آ رہا ہے اور آبادیوں کو تباہی و بربادی کی دھمکیاں دے رہا ہے جیسے رہبانیت چاہتی ہے کہنے کی حد تک تو یہ بھی تدبیریں ہیں اور بڑی مشقت طلب ہیں۔ لیکن ان دونوں گروہوں سے ہٹ کر جو آگے بڑھ گیا اور کسی بلندی پر چڑھ کر کوئی بنجر میدان جو اسے نظر آیا۔ پھاوڑا لے کر ہلکی سی ایک راہ پانی کے نکلنے کے لئے اسی خشک غیر آباد میدان کی طرف اس نے پھیر دی جس کے بعد راہ پا کر خود بخود سیلاب کا پانی خراٹے بھرتا ہوا اسی میدان کی طرف نکل گیا۔

خود ہی انصاف سے بتائیے کہ سیلابی طوفان سے مقابلہ کرنے والوں کے ان تین طبقوں میں نتیجہ کے لحاظ سے کس کی کامیابی کا یقین کریں۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

فکانت ھذہ الفرقۃ ھم اصوب الفرق فی شان انھا

ان تینوں جماعتوں میں آخری جماعت ہی کامیاب ہے۔

یعنی اجڑے میدانوں کی آبادکاری کا جس نے موقعہ فراہم کیا ہے جو پانی غلط راہ پر جا رہا تھا اس کی روانی کو غیر فطری طور پر روکنے کی جگہ صحیح راہ پر جس نے پانی کو لگایا ہے۔ یقیناً یہی وہ طبقہ ہے جس نے پانی کو بربادی سے بچا لیا۔ اسی کی کامیابی یقینی ہے۔ امالہ اسی کو کہتے ہیں۔ قرآن نے زندگی کے ہر شعبہ میں اسی کو اپنایا ہے۔ معاشی راہوں کی ان مشکلات کو الشہوات کے قدرتی قوانین کے نتائج

میں قرآن نے اسی تدبیر سے حل کیا ہے۔ قرآن الشہوات کی اصلاح کے لئے نہ تو معاش گریز رجحانات کا داعی ہے۔ اور نہ انسانوں کو فطرت کے خلاف جکڑ بند کرنا چاہتا ہے اور نہ الشہوات کے لئے اباحت مطلقہ کو پسند کرتا ہے وہ ان سب راہوں سے ہٹ کر امالہ کی صورت میں راہِ اعتدال پیش کرتا ہے۔

یہ راہِ اعتدال کیا ہے۔ آئندہ آیت میں قرآن نے اسی کو کھول کر ان کے سامنے پیش کیا ہے جو کہتے ہیں :-

انسان کو اپنی خواہشوں کو پورا کرنے کے لئے جن مادی چیزوں کی ضرورت ہے وہ محدود ہیں۔ اور اس کی آرزوؤں کی کوئی حد و نہایت نہیں۔ قدرت نے اس کی فطرت میں سیری نہیں دی۔ اس کا دل ہمیشہ ہر وقت نئے نئے مقاصد اور نئی نئی آرزوؤں کا مولد ہے [1]

---

[1] مقصد و منہاج ڈاکٹر ذاکر حسین

قُلْ أَؤُنَبِّئُكُمْ بِخَيْرٍ مِّنْ ذٰلِكُمْ ۚ لِلَّذِينَ اتَّقَوْا عِنْدَ رَبِّهِمْ
جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا وَأَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ
وَّرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ ۗ وَاللّٰهُ بَصِيرٌۢ بِالْعِبَادِ ﴿۱۵﴾ اَلَّذِينَ يَقُولُونَ
رَبَّنَآ إِنَّنَآ اٰمَنَّا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوبَنَا وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۶﴾
اَلصّٰبِرِينَ وَالصّٰدِقِينَ وَالْقٰنِتِينَ وَالْمُنْفِقِينَ وَالْمُسْتَغْفِرِينَ
بِالْأَسْحَارِ ﴿۱۷﴾

اے پیغمبر کہہ دو کیا میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے بھی بہتر کیا ہے؟[۳۱] جو لوگ متقی ہیں اُن کے لئے اُن کے مالک کے پاس باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے، پاک بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوشنودی ہوگی اور اللہ اپنے بندوں کا حال دیکھ رہا ہے[۳۲]۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے مولیٰ ہم ایمان لے آئے ہیں ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے[۳۳]۔ صبر کرنے والے، گفتار و کردار کے سچے، فرماں بردار اور فیاض اور

رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ کے حضور معافی مانگنے والے۔

لامحدود خواہشوں کی کامل تسکین کا مقام

پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ انسان کی حب الشہوات کی طبیعت دُنیا کی اس محدود متاع (سرمایہ) سے تشفی یافتہ نہیں ہو سکتی۔ اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ لامحدود مطالبوں، خواہشوں والے انسان میں بے چینی اور بے اطمینانی کے جو انگارے دہک رہے ہیں اس کا علاج پر اور صرف یہ ہے کہ موجودہ زندگی کو اللہ کی مرضی کے مطابق گزارا جائے تاکہ اللہ کی لامحدود قوتیں بھی انسانی مرضی کے مطابق ہو جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ انسانی فطرت کا رُخ لامحدود کی طرف ہوگا۔ قرآن کی اصطلاح میں اسی کا نام جنات ہے۔ جنات کیا ہیں؟ انسانی فطرت میں قدرت کی جانب سے لامحدود خواہشوں، رغبتوں کی تکمیل کا مقام ہے۔

لکم فیھا ما تشتھی انفسکم ولکم فیھا ما تدعون

تمہارے لئے جنات میں وہ سب کچھ ہے جو تمہارے جی چاہتے ہیں اور وہ سب کچھ ہے جو تم مانگو گے۔

ایک دوسرے موقعہ پر جنت کا تعارف یہ ہے۔

وفیھا ما تشتھیہ الانفس وتلذ الاعین

طبیعتوں کی ساری خواہشیں اور نگاہوں کی ساری لذتیں اس میں ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ موجودہ زندگی میں انسانی فطرت کے اندر خواہشوں اور الشہوات کی جو آگ بھڑک رہی ہے دُنیا کے محدود سرمایہ سے اس کی تسکین ناممکن ہے۔ اس کی پوری تسکین صرف جنات میں ہو سکتی ہے۔ جنت کی زندگی میں لامحدود کمالات والی ذات اپنے لامحدود کمالات کو لامحدود کلمات کے ذریعے ظاہر کرتی رہے گی۔ انسانی احساسات اپنے اردگرد پس وپیش اندر باہر ہر لمحہ ایسی نئی نئی تجلیات کو لگاتار پائیں گے جن کی نہ کوئی حد ہوگی نہ انتہا۔ اور اس طرح حُب الشہوات والی فطرت کو لامحدود مرغوبات، مطلوبات سے متمتع اور لذت گیر ہونے کا ابدالآباد تک موقعہ ملتا رہے گا۔ اس وقت تک جس کی کوئی انتہا نہیں ہے اور جس کا کوئی اختتامی نقطہ نہیں ہے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ اس دُنیا میں ہمیں آرزوؤں اور خواہشوں کی ایک وسیع اور غیر محدود کائنات دی گئی ہے اور اسے ہماری فطرت میں گوندھ دیا گیا ہے لیکن عملاً اپنی ساری خواہشوں اور تمناؤں کے حاصل کرنے کی قدرت نہیں ہے۔ جنّت آخرت کی اس دُنیا کا نام ہے جو ہمارے اعلیٰ ترین تخیل اور ہماری تمناؤں اور آرزوؤں کے مطابق ہوگی۔

بلند سے بلند تر نظر کی دعوت

۱۵۔ اے پیغمبر کہہ دو کیا میں تمہیں بتاؤں کہ ان سے بھی بہتر کیا ہے۔ اس سوالیہ فقرے کے ذریعے قرآن نے اپنے مخاطبوں کو دعوت دی ہے کہ تمہاری کائنات یہی نہیں ہے نظر کو بلند سے بلند تر کرو، اور محدود زاویہ نگاہ کو بدلو۔ یہ تنگ نظری ہے کہ لا محدود خواہشیں رکھتے ہوئے اس دنیا کے متاع قلیل کے ہو کر رہ جاؤ۔ اور اسی زندگی کو ساری زندگی سمجھ لو۔ یہاں اگرچہ لذتیں اور مسرتیں ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ بقائے دوام ہے۔ یہاں کی ہر لذت عارضی اور ہر مسرت آنی جانی ہے۔ یہاں خوشی کا کوئی ایسا ترانہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو۔ یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر وجود کے ساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے۔ انسان یہاں الشہوات کی محبت میں ہزاروں مشکلات اٹھانے اور ہزاروں صدمے سہنے کے بعد ایک مسرت کا پیام سنتا اور خوشی کا منظر دیکھتا ہے مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی نوبت نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر شے آنی جانی ہے۔ لیکن جہاں کا میں تعارف پیش کر رہا ہوں وہاں کی لذتیں جاودانی اور مسرتیں غیر فانی ہیں۔ وہاں حیات ہے موت نہیں ہے، راحت ہے مگر تکلیف نہیں ہے، لذّت ہے مگر الم نہیں۔ مسرّت ہے مگر غم نہیں۔ وہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں اور وہ شادمانی ہے جس کے بعد حزن واندوہ نہیں ہے۔ بلحاظ کیفیت، بلحاظ کمیت اور بلحاظ قیام و دوام اس فانی متاع الحیاۃ الدنیا سے جو تا سر تا سر بے ثبات و بے حقیقت ہے سرتا سر بہتر ہے۔

۱۶۔ جو لوگ متقی ہیں۔ ان کے لئے ان کے مالک کے پاس باغات ہیں، جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ پاک بیویاں ہوں گی اور اللہ کی خوشنودی ہوگی اور اللہ اپنے بندوں کو دیکھ رہا ہے۔ الذین اتقوا جو لوگ متقی ہیں، تقویٰ قرآن کی تمام تعلیمات کا خلاصہ ہے۔ قرآن کی ہر تعلیم کا مقصد ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے۔ قرآن نے البقرہ

کے آغاز ہی میں اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہیں، آخرت میں ہر قسم کی نعمتیں تقویٰ والوں کے لئے ہیں۔ اس دنیا میں اگرچہ بظاہر ابتداء میں اہل تقویٰ کو کسی قدر تکلیفوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ اس سے یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کو مال و دولت، عزت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی ہوتی ہے لیکن دنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں۔ اور اہل تقویٰ اس دنیا کے ظاہری ثمروں کی بناء پر کام کے اچھے برے نتیجوں کا فیصلہ دنیا کے ظاہری چند روزہ اور فوری فائدہ کے لحاظ سے نہیں بلکہ آخرت کے دائمی اور دیرپا فائدے کی بناء پر کرتے ہیں اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمروں پر رہتی ہے تو دنیا بھی اُن کی بن جاتی ہے اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز و فلاح ان ہی کی قسمت میں ہوتی ہے۔

آخرت کی زندگی کے لئے جنات کی تعبیر کیوں

ان متقیوں کو آخرت کی زندگی میں جو کچھ الشہوات کی تکمیل کے لئے دیا جائے گا۔ قرآن نے اس کے لئے باغات کا استعارہ اختیار کیا ہے نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شوریدہ حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز و شاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے اس لئے ان کے لئے یہ لفظ اس مقام پر آخرت کے لئے قرآن نے استعمال کیا ہے۔ مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے۔ اس لئے عرب کی تخصیص بے معنی ہے۔ کیا دنیا کے سرسبز شاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ و راغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہیں۔ اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان ریگستان کی تخصیص نہیں۔ یہ فطرت انسانی کی تصویر ہے، انسان کسی خطہ ارضی میں آباد ہو مگر وہ سرسبز و شاداب قطعات، باغ و بہار اور کنار آب و نہر کو عیش و مسرت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

اس استعارے کے استعمال کا ایک اور نکتہ توجہ کے قابل ہے۔ انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن و غم کی آمیزش بھی ہوتی ہے۔ اہل و عیال اور دولت و مال کے متعلق ہر قسم کی فکریں دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں مگر جب انسان سیر و تفریح کے لئے باغ و چمن کا رخ کرتا ہے، تھوڑی دیر کے لئے وہ ہر غم کو بھول جاتا اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم و الم اس کے ہر گوشہ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے جنات کی تعبیر اختیار کی ہے تاکہ اس سے اخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر سامنے

آجائے۔

جنّت کی بجائے جنات کیوں؟

چونکہ متاعِ دُنیا کے ذکر میں شہوت کی جمع الشہوات لائے تھے۔ اس لئے اس کی مناسبت سے آخرت کے ذکر میں جنت کی جمع جنات کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ انسان چونکہ لامحدود خواہشوں اور تمنّاؤں کی مخلوق ہے اس لئے اس زندگی میں لامحدود کمالات والی ہستی اپنے ان ہی لامحدود کمالات کو لامحدود کلمات کے ذریعے سے جنات کی صورت میں ظاہر کرے گی۔ اور یوں انسان کی جدّت پسند طبیعت اپنی آرزوؤں، خواہشوں اور ولولوں کی تسکین کا سامان کرے گی۔

جنّت میں ہمیشہ کی زندگی

دُنیا کی زندگی اور اس کے تمام سامان کی بنیادی خصوصیّت یہ ہے کہ وہ فانی ہے۔ ہر چیز آنی جانی ہے۔ آخرت میں جنات میں زندگی گزارنے والوں کے بارے میں یہاں فرمایا ہے کہ خالدین فیہا یعنی یہ ہمیشگی کا باغ اس کے مکیں اور اس کی بیش بہا نعتیں اور بہاریں غیر فانی ہیں۔ یہ ہمیشگی کا باغ وہ مملکت ہے جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ابدی جہاں کی نعمت بے انتہا، جہاں کی لذّت غیر منقطع، جہاں کی خوشی غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ قرآن نے اس کا نام جنۃ الخلد و بقائے دوام کا باغ جناتِ عدن (دائمی سکونت کا باغ) دارالخلد ہمیشگی کا گھر رکھا ہے۔

یہاں تعبیّر سادی ہے لیکن دوسرے مقامات پر تاکید اور پُر زور طریقہ تعبیّر اختیار کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ خالدین فیہا ابداً وعد اللہ حقاً ومن اصدق من اللہ قیلاً اس تاکید پر تاکید اور زوردار اندازِ بیان کو دیکھئے کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی ابداً فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا۔ اس پر بھی بس نہیں کی بلکہ یہ بھی اضافہ فرمایا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ پھر مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ اور اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہو سکتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلودِ جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے؟ اس کے علاوہ جنت کی راحتوں اور لذّتوں کی ابدیت اور دوام کی یہ کہہ کر خبر دی ہے ان ھذا لرزقنا مالہ من نفاد یہ ہماری وہ دین ہے جس کو ختم ہونا نہیں ہے کہیں فرمایا فیہا نعیم مقیم۔

اس میں ہمیشہ رہنے والی نعمت ہوگی۔ کہیں ارشاد ہے اکلها دائم جنت کا میوہ دائمی ہے کہیں میووں کے بارے میں انکشاف ہے لا مقطوعة ولا ممنوعة جو نہ ختم ہوں گے اور نہ جن کی روک ہوگی اور یہ توضیح فرمائی اجر غیر ممنون ان کو اجر ملے گا جس کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہوگا۔ فنائے راحت اور انقطاع مسرّت کی تین صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ راحت و مسرّت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے۔ دوسری یہ کہ خود لذّت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ تیسری صورت یہ کہ مسرّت کے اسباب بھی قائم ہوں اور اہل جنت کی زندگی بھی دائمی ہو مگر کچھ دنوں کے بعد ان کو وہاں سے نکال کر الگ کر دیا جائے۔ قرآن کے اس اندازِ بیان نے تینوں صورتوں کی نفی کر دی۔

اس کے بعد ارشاد ہے کہ ازواج مطهرة یعنی پاکیزہ بیویاں رفاقت کے لئے ان کے ساتھ ہوں گی۔ بیوی قرآنی نظریہ کے مطابق سامانِ سکون ہے۔ جنت بھی سرتاسر سکون و طمانیت کا گہوارہ ہے۔ مولانا عثمانی فرماتے ہیں کہ ہر قسم کی صوری و معنوی گندگی سے پاک ہوں گی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اہل جنت کے لئے راحت و لذّت کا ہر قسم کا سامان ہوگا۔ مادی لطف کا بھی، ذہنی لطف کا بھی اور رُوحانی لطف کا بھی۔

ساری نعمتوں کا عطر

آخر میں ساری نعمتوں کا عطر یہ کہہ کر پیش کر دیا ورضوان من الله یہ جنت کے انعامات میں سب سے آخری چیز ہے۔ یعنی اللہ سبحانہٗ کا اپنے بندے سے راضی و خوش ہو جانا کہ اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندے پر عتاب فرمائے گا نہ اس سے ناراض ہوگا بلکہ اس کو اپنی رضا اور خوشنودی کی لازوال نعمت ارزانی فرمائے گا۔ مولانا عثمانی فرماتے ہیں:

اس سے بڑھ کر کیا نعمت ہو سکتی ہے بلکہ جنت اس لئے مطلوب ہے کہ وہ محل رضا ہے۔ متقیوں کے لئے اللہ نے جو نعمتیں رکھی ہیں۔ ان میں جنّت، نہریں، پاک بیویاں اور ان سب کے بعد رُوح کی مسرّت رکھی ہے لیکن ان سب کے بعد اپنی سب سے آخری نعمت اپنی ای رضامندی کو بتایا ہے۔

اسی آیت کی تفسیر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بشارت سنائی ہے کہ اللہ سبحانہٗ اہل جنت کو آواز دے گا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے اے خداوند ہم حاضر ہیں سب بھلائیاں تیرے

پاس ہیں۔ فرمائے گا اب تم خوش ہو گئے ہو، عرض کریں گے۔ پروردگار خوش کیوں نہ ہوں کہ تو نے ہم کو وہ کچھ دیا ہے جو کسی کو نہیں دیا ہے، فرمائے گا کہ کیا میں ان تمام نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں، کہیں گے پروردگار ان سے بہتر کیا ہے۔ فرمائے گا بر کر اپنی رضامندی، خوشی تم پر اتاروں۔ اب اس کے بعد میں تم سے ناراض نہ ہوں گا[1] اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۂ توبہ پارہ ۱۰ میں آئے گی۔

آیت کو ختم اس فقرے پر کیا ہے **واللہ بصیر بالعباد** یعنی بندوں کے تمام اعمال واحوال اس کے سامنے ہیں جو جس جزا کا مستحق ہوگا بلا کم و کاست دی جائے گی۔ دُنیا کی بہار پر مرنے والے اور اس کے فانی مزوں سے پرہیز کرنے والے سب اپنے اپنے ٹھکانے پہنچا دیئے جائیں گے یا یہ مطلب ہے کہ پرہیزگار بندوں پر اللہ کے لطف و کرم کی نگاہ ہے جو دُنیا کی ابلہ فریب سحر کاریوں سے ان کو محفوظ رکھتی ہے چنانچہ حدیث میں ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب اللہ سبحانہٗ کسی بندے کو محبوب رکھتا ہے اسی طرح اسے دُنیا میں پرہیزگار بنا دیتا ہے جیسے تم اپنے مریض کو پانی وغیرہ سے پرہیز کراتے ہو[2]

متقیوں کا چہرہ

۲۳۔ یہ وہ لوگ ہیں جو کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے ہیں تو ہمارے گناہ بخش دے اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچا لے۔

اس آیت میں اور اس کے بعد والی آیت میں اتقیاء کا چہرہ پیش کیا گیا ہے جن کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ ان کو آخرت کی زندگی میں الجنات، ازواج مطہرہ اور رضوان الٰہی حاصل ہوگی۔

اندازِ تعبیر ایسا عجیب و غریب ہے کہ آپ چاہیں تو اسے اُٹھے ہوئے سوال کا جواب قرار دیں۔ گویا پوچھنے والا پوچھ رہا ہے کہ یہ اتقیاء جو آپ کی ان عظیم نوازشوں سے ہمدوش ہوں گے کون ہیں۔ جواب میں ارشاد ہوا ہے۔ **الذین یقولون ربنا**۔۔۔ الخ اور چاہیں تو اس آیت کو **الذین اتقوا** کی توضیح اور صفت بنالیں۔ یعنی وہ لوگ جو کہتے ہیں اور اگر آپ چاہیں تو اسے مدح کہہ دیں یعنی کیا کہنے ہیں ان اربابِ تقویٰ کے۔ آپ جو چاہیں کہہ دیں۔ نتیجہ ایک ہی ہے کہ ان

[1] صحیح بخاری و مسلم، [2] افاداتِ شیخ الاسلام

دو آیتوں میں اہلِ تقویٰ کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے۔

چہرہ کی نمائش میں پہلے اُن کے ایمان کو پیش کیا ہے۔ زندگی کے دن خدا فراموشیوں میں گزر رہے تھے اور نگاہ و دل متاعِ دُنیا کے مرغوبات پر متوالے ہو کر انسان خود اپنے کو بھول چکا ہے۔ یکایک اللہ پر ایمان کی منادی کی آواز پر لبیک کہہ دی۔ اور ایمان کی دعوت کو قبول کر کے آخرت سے رو گرداں کرنے والی راہوں سے ہٹ گئے اور اپنی زندگی کی خود فراموشیوں سے تائب ہو کر ایمان و عمل کی پاکیزہ زندگی میں آگئے تو اپنے ماضی کو یاد کر کے بڑے حسرت ناک انداز میں اللہ کی جناب میں درخواست کر رہے ہیں کہ ربنا اننا امنا فاغفر لنا ذنوبنا وقنا عذاب النار[1]۔ اس دُعائی پیمانے کی بلیغ لطافت پر شارحینِ قرآن نے عجیب وغریب بحث کی ہے۔ دُعا میں محض ایمان کو پیش کر کے گناہوں کی مغفرت کی درخواست کی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ :

اوّلاً : گناہ کے معاف ہونے کے لئے ایمان شرط ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کسی دستور پر عمل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی صداقت اور خوبی کا یقین کریں۔ اگر ایسا نہ ہو تو ہم اس پر ایمانداری کے ساتھ نہ تو عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے نفس و ضمیر پر اس کا اثر ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ ہمارے تمام اعمال ہمارے دل کے تابع ہیں اس لئے جب تک دل نہ بدلے گا ہمارے اعمال میں تغیّر نہیں آسکتا یعنی ہمارے اعمال کی اصلاح تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیرِ اثر ہے اور ایمان کا مقصد دل کی اصلاح ہے کہ اگر یہ دُرست ہو گیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کے ساتھ وابستہ ہیں وہ ایمان ہے اسی لئے وہ اسلامی نظامِ حیات کا اصل الاصول ہے وہ نہ ہو تو ساری نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے اس لئے گناہوں کی مغفرت کے لئے ایمان بنیادی شرط ہے۔

ثانیاً : ایمان کی حیثیت چونکہ اصل کی ہے اور عمل کی فرع کی یا ایمان ملزوم اور اعمال واخلاق اس کے لئے بمنزلہ لوازم ہیں۔ اس لئے اگر عمل کوئی نہ ہو جیسے نومسلموں کی اسلام قبول کرنے کے بعد کی حالت تو ایمان خود اتنی طاقتور چیز ہے کہ اسے گناہوں کی مغفرت کے لئے بطور توسل پیش کیا جا سکتا ہے اور محض ایمان قبول کرنے ہی سے بندے کے لئے رحمتِ حق کے دروازے کھل سکتے ہیں۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

یعنی صرف ایمان ہی مغفرت کے لئے کافی ہو سکتا ہے۔ اس بناء پر امام رازی کا یہ کہنا کہ مجرد ایمان میں استحقاق مغفرت کا سبب بننے کی صلاحیت ہے۔ علامہ آلوسی کا یہ کہنا کہ استحقاق مغفرت کے لئے صرف ایمان کافی ہے بالکل بجا ہے۔

یہاں تک دعائیہ پیرائے کے ذریعے متقیوں کے چہرے کا ایک رخ پیش کیا ہے یعنی باطن، باقی چہرے کا دوسرا رخ یعنی ظاہر جس میں اقوال، اعمال و اخلاق داخل ہیں۔ ان کو دوسری آیت میں بیان کیا جا رہا ہے۔

ایمان کے مظاہر

۳۴۔ صبر کرنے والے، گفتار و کردار کے سچے، فرمانبردار اور فیاض، رات کی آخری گھڑیوں میں اللہ کے حضور معافی مانگنے والے۔ یعنی اللہ کے راستہ میں بڑی بڑی تکلیفیں اٹھا کر بھی اسکی فرمانبرداری پر جمے رہتے اور معصیت سے رکے رہتے ہیں۔ زبان کے دل کے، نیت کے معاملہ کے سچے ہیں۔ پوری تسلیم و انقیاد کے ساتھ خدا کے احکام بجالاتے ہیں۔ خدا کی دی ہوئی دولت کو اس کے بتلائے ہوئے مواقع پر خرچ کرتے ہیں اور پچھلی رات میں اٹھ کر جو طمانیت اور اجابت کا وقت ہوتا ہے لیکن اٹھنا اس وقت سہل نہیں ہوتا، اپنے رب سے تقصیرات اور گناہ معاف کراتے ہیں۔ سورہ ذاریات میں ہے۔

كانوا قليلا من الليل ما يهجعون وبالاسحار هم يستغفرون

رات کو بہت تھوڑا حصہ سوتے ہیں اور سحر میں استغفار کرتے ہیں۔

یعنی اکثر رات عبادت میں گزار دیتے ہیں اور سحر کے وقت استغفار کرتے ہیں کہ خداوندا عبادت میں جو تقصیر ہو گئی اپنے فضل سے معاف فرما۔[1]

پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے ایمان ملزوم اور اعمال اس کے لوازم ہیں یعنی ان دونوں میں اصل و فرع اور لازم و ملزوم کا تعلق ہے جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے۔ اس لئے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں ہو سکتا اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ و بار درخت ہے۔ اس بنا پر جہاں ایمان ہے اس کے عمل تلازم

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

آثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

اس آیت میں ایمان کے جو اہم نتائج بتلائے گئے ہیں یہ ہیں صبر، صدق، قنوت، انفاق اور سحر میں استغفار پہلی آیت میں ایمان کا ذکر تھا اور ایمان کے اقرار کے ساتھ ایمان سے پہلے جو زندگی گزار چکے ہیں۔ اس پر اللہ سے معافی کی طلب گاری کی درخواست تھی۔ یہ درخواست ان کے اس اندرونی شدید احساس ندامت کو ظاہر کر رہی ہے جو ان میں گزری ہوئی زندگی کے بارے میں بیدار ہو چکا ہے قلب کی یہ سلامتی اور پھر یہ آیات ان کے مقام رفیع کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

پھر دونوں آیتوں کی تعبیر میں ایک بلیغ اور لطیف فرق ہے۔ ایمان کو امنّا سے تعبیر کیا ہے جو فعل ہے اور فعل حدوث کو بتاتا ہے یعنی ان کی یہ حالت مومن ہونے کے وقت تھی۔ اور مومن ہونے کے بعد ایمان کے نتائج کو صفت کے صیغوں سے ظاہر کیا ہے اس میں اشارہ ہے کہ ایمان کے یہ نتائج مرتے دم تک ان سے جدا نہیں ہوتے۔ ان میں دوام اور ثبوت تھا مختلف صورتوں اور مختلف وقتوں میں ان نتائج کا ظہور ہوتا رہا ہے۔

ایمان کا اوّلیں مظہر صبر

صبر کا مفہوم یہ ہے کہ منزلِ مقصود کی راہ میں جو مشکلات اور خطرے پیش آئیں، دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں اور مخالفین جو طعن وطنز کریں ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لائیں اور ان سے بددل اور پست ہمت ہونے کے بجائے اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو۔ بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے مگر انہوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے۔

صبر کے لغوی معنے چونکہ روکنے اور سہارنے کے ہیں یعنی اپنے نفس کو اضطراب سے روکنا اور اسے اپنی جگہ قائم رکھنا اس لئے صبر کے مفہوم میں جیسے یہ بات داخل ہے کہ اللہ کی طاعت اور فرمانبرداری کی عمر بھر پورے استقلال اور پامردی سے ادا کرتا رہے ایسے ہی یہ بات بھی داخل ہے کہ اپنے آپ کو زندگی کے ہر موڑ پر اللہ کی نافرمانی اس کے محرمات اور اس کی منہیات سے بچائے رکھے۔ علماء کرام نے صبر علی طاعۃ اللہ اور صبر عن المحارم سے اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور تابعین میں سے حضرت قتادہ سے آیت کی یہی تشریح منقول ہے۔ گویا یہاں صبر کا مفہوم یہ ہے کہ نیک کاموں کو بارِ خاطر، خلافِ طبع اور تکلیف ومشقت کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتا رہے اور بری باتوں سے باوجود اس

کہ ان میں ظاہری خوشی اور رغبتیں موجود ہیں بچتا رہے۔ راتوں کو نرم بستر سے اُٹھ کر خدا کے آگے سربسجود ہونا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت سے کنارہ کش ہو کر نماز پڑھنا، ایوانِ نعمت کی لذتوں سے محروم ہو کر پردے رکھنا، تکلیف و مشقت کے باوجود خطرناک موقعوں پر سچائی سے باز نہ آنا، قبولِ حق کی راہ میں شدائد کو آرام جان کر جھیل لینا، سُود کی دولت سے ہاتھ اٹھا لینا، حُسن و جمال کی بے قید لذت سے متمتع نہ ہونا، غرض شریعت کے احکام کی بجا آوری پھر اس پر عمر بھر استواری صبر کی بہت کڑی منزل ہے۔ بالفاظِ دیگر الشہوات یعنی خواہشوں، رغبتوں سے شدید محبت کے باوجود اللہ کے حکم کی پابجائی میں ان سے بچنا اور رکنا صبر ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ارشاد ہے:

حفت الجنة بالمکاره وحفت النار بالشهوات

جنت ناگواریوں اور دوزخ خواہشوں اور چاہتوں سے ڈھانپ دی گئی ہے۔

یعنی نیکی کے ان کاموں کو کرنا جن کا معاوضہ جنت ہے اس وقت نفس پر شاق گزرتا ہے اور گناہوں کے وہ کام جن کی سزا دوزخ ہے اس وقت دُنیا میں بڑے لذت بخش اور پُرلطف معلوم ہوتے ہیں۔ اس عارضی خوشی و ناخوشی کی پروا کیے بغیر احکامِ الٰہی کی پیروی کرنا بڑے صبر اور برداشت کا کام ہے۔

ایمان کا دوسرا مظہر صدق

صداقت کے معنیٰ عام طور سے سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں مگر قرآن کی اصطلاح میں اس کے بڑے وسیع معنے ہیں جس کے لحاظ سے اس میں گفتار ہی نہیں بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں۔ اور قرآن و حدیث سے ہر ایک کے معنے بتائے ہیں۔ بات میں سچائی، ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی اور دینداری کے مقامات اور مراتب میں سچائی۔ لیکن ذرا اختصار کیجئے تو تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آجاتی ہیں یعنی زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی۔ اور بالفاظ ابن القیم کی زبان میں اسے اقوال، اعمال اور احوال کی صداقت کہہ دیجئے۔ یعنی یہ کہ زبان اور دل میں ہم آہنگی ہو عمل اور قول میں مطابقت ہو۔ ظاہر اور باطن ہم رنگ ہوں۔ عقیدہ و عمل میں ہمنوائی ہو۔ یہ باتیں صدق کے مظاہر میں سے ہیں۔ اور انسانی زندگی کا سارا ظاہر و باطن انہی سے روشن

ہے یہ نہ ہو تو انسان کی ساری معنویت ختم ہو کر رہ جاتی ہے۔ اسی سے انسان روحانی کمال کے اُس مقام پر پہنچ جاتا ہے جسے مرتبہ صدیقیت کہتے ہیں۔ صدیقیت نام ہے بھرپور اخلاص کے ساتھ نبوت کی پوری پوری فرمانبرداری کا اور اسی کے نتیجہ میں مدخلِ صدق، مخرجِ صدق، لسانِ صدق، قدمِ صدق اور مقعدِ صدق کی رونمائی ہوتی ہے۔ یہ گویا روحانی بلندی کا وہ نقطۂ ارتقاء ہے کہ اس سے اوپر ریاضت اور کسب میں دُنیا میں کوئی درجہ کمال نہیں اس کے آگے جو کچھ ہے وہ موہبت ہے۔ یعنی مقامِ نبوت، حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ صدیقیت اور نبوت کے درمیان حد فاصل کوئی چیز نہیں ہے۔ اس موقعہ پر صحیحین میں عبداللہ بن مسعود کے حوالہ سے آیا ہوا وہ ارشادِ نبوت پڑھیے جس میں بتایا گیا ہے کہ :

سچائی اور راستی نیکی کی رہنما ہے اور نیکی جنت کی راہ بتاتی ہے۔ آدمی سچائی اپناتا ہے تا آنکہ بارگاہِ الٰہی میں وہ صدیق لکھ لیا جاتا ہے۔

ایمان کا تیسرا مظہر قنوت

قنوت عربی زبان میں بہت جامع ہے ذکر، دعا، خشوع وخضوع، طاقت وعبادت سب کو حاوی ہے۔ ابن قتیبہ رقمطراز ہیں۔ میری رائے میں اس کے بنیادی معنے طاعت کے ہیں اور اسی رعایت سے اس کا اطلاق، نماز کی ادائیگی اور دعا وغیرہ پر ہوتا ہے۔ اس کی اصلی روح اللہ سبحانہٗ کی جناب میں ادب ونیاز ہے۔ ادب ونیاز اللہ کی نعمتوں کو پیشِ نظر رکھ کر ضمیر کی وہ بیداری ہے جو ہر حالت میں بندے کو اللہ سبحانہٗ کی طرف متوجہ رکھتی ہے۔ آج کل علم نفسیات نے اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لئے اس کے ضمیر کی بیداری مقدم ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی بے نہایت عظمتوں کے احساس سے جو ضمیر میں شعور پیدا ہو جائے اس کا عکس انسان کی زندگی کے مختلف گوشوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ بول چال، وضع قطع، کردار غرض اقوال، اعمال اور اخلاق ہر چیز میں یہ اثر نمایاں ہوتا ہے اسی کا نام قنوت ہے۔

ایمان کا چوتھا مظہر انفاق

انفاق کے معنے خرچ کرنا ہیں۔ نفس کو بخل، تنگ دلی اور دُنیا پرستی جیسے مذموم جذبات کی آلودگیوں سے پاک رکھنے اور روحانی قدروں سے آراستہ کرنے کا ایک مؤثر ترین ذریعہ یہ بھی ہے۔

کہ آدمی اپنا دل پسند مال خوشی خوشی اللہ کے راستے میں لٹائے۔ یہ صرف زکوٰۃ کی مقررہ مقدار ہی ادا نہیں کرتے بلکہ جب بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرنے یا حوصلہ دکھانے کا موقعہ میسر آتا ہے۔ اسے اللہ کا خصوصی انعام سمجھ کر اور دل کھول کر انفاق کرتے ہیں۔ تمام بُرائیوں کی اصل جڑ دُنیا پرستی ہے اور دُنیا کی طرف کھینچنے والی چیزوں میں سب سے زیادہ پُرکشش اور طاقتور مال و دولت ہے۔ اسی لئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مال کو اُمت کے لئے فتنہ قرار دیا ہے۔ اور اُمت کو اس خطرے سے ہوشیار رہنے کی تلقین فرمائی ہے۔

ایمان کا پانچواں مظہر استغفار

استغفار غفر سے بنا ہے۔ لغت میں اس کے معنے گناہ کے اثر سے بچانے کی درخواست کرنا ہیں۔ غفر کے معنے بچانے کے ہیں۔ اسی سے خود کو مغفر کہتے ہیں کیونکہ وہ سر کو تلوار کی ضرب سے بچاتی ہے اور غفار پٹے کو کہتے ہیں کہ وہ آزار کو گرنے سے بچاتا ہے۔ استغفار یہ ہے کہ بندہ اللہ تعالیٰ سے تضرع و زاری کے ساتھ اپنی کوتاہیوں اور گناہوں کے نتائج و آثار سے حفاظت کی درخواست کرے۔ استغفار یہ نہیں ہے کہ آدمی محض زبان سے استغفر اللہ کے الفاظ کہے اور اپنے اندر کوئی ندامت محسوس نہ کرے۔

استغفار کے ساتھ سحری کے وقت قید لگا کر اشارہ کر دیا ہے کہ یہ دُعا کی قبولیت کا بہترین وقت ہے۔

صحابہ کا چہرہ اور آیاتِ قرآنی

اس پوری آیت اور پچھلی آیت کا یہ لفظی پیمانہ اگر اپنا کوئی خارج میں مصداق رکھتا ہے اور نہ رکھنے کی وجہ کیا ہے جب کہ قرآن کا اندازِ تعبیر ہی ایسا ہے تو پھر بلا ریب ان دونوں آیتوں میں صحابہ کے افکار، صحابہ کے اعمال، صحابہ کے اخلاق اور صحابہ کے احوال کی جو نشاندہی کی گئی ہے اس کا جواب نہیں ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بطور دلیل نبوت دو چیزیں پیش کی ہیں۔ ایک علم دوسرے عمل، آپ کے علم کا اگر خارج میں مصداق قرآن ہے تو آپ کے عمل کا مصداق صحابہ کرام کی جماعت ہے۔ یہ جماعت قرآن کے بیان کردہ اوصاف کی مالک ہے۔ اور یہ اوصاف اس پوری جماعت میں رواں دواں ہیں جن کو قرآن نے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ،

کا سرٹیفکیٹ دیا ہے۔ یہ مساوات کی ایک ہی سطح پر اور صداقت کی ایک شمع کے گرد پروانہ وار جمع ہیں۔ سب پر صبر، صداقت، قنوت، انفاق اور استغفار کا یکساں نشہ چھایا ہوا ہے اور سب کے سینوں میں ایمان کا ایک ہی ولولہ موجیں مار رہا ہے۔ زمخشری نے بالکل بجا لکھا ہے کہ واو عطف کے ذریعے ساری اوصاف کو ایک ہی لڑی میں صحابہ کا کمال ظاہر کرنے کے لئے پرو دیا گیا ہے۔

شَهِدَ اللّٰهُ اَنَّهٗ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۙ وَالْمَلٰٓئِكَةُ وَ اُولُوا الْعِلْمِ قَآئِمًۢا

بِالْقِسْطِ ؕ لَاۤ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۞ اِنَّ الدِّيْنَ عِنْدَ اللّٰهِ

الْاِسْلَامُ ۟ وَمَا اخْتَلَفَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ

مَا جَآءَهُمُ الْعِلْمُ بَغْيًاۢ بَيْنَهُمْ ؕ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَاِنَّ اللّٰهَ

سَرِيْعُ الْحِسَابِ ۞ فَاِنْ حَآجُّوْكَ فَقُلْ اَسْلَمْتُ وَجْهِيَ لِلّٰهِ وَ

مَنِ اتَّبَعَنِ ؕ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ وَالْاُمِّيّٖنَ ءَاَسْلَمْتُمْ ؕ

فَاِنْ اَسْلَمُوْا فَقَدِ اهْتَدَوْا ۚ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلٰغُ ؕ

وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِالْعِبَادِ ۞ ع ۲ / ۱۰

یہ بات کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے عدل و انصاف پر

قائم اللہ کی شہادت ہے[۳۵] فرشتوں اور اہل علم کی بھی یہی گواہی ہے[۳۶]

فی الواقع اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہی غالب اور

حکمت و دانائی والا ہے[۳۷]۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام

ہے[۳۸]۔ اہل کتاب نے اس دین میں جو اختلاف کیا ہے تو علم

آنے کے باوجود وہ باہم ضد اور کد کی وجہ سے کیا ہے[۳۹]۔ اور یاد رکھو جو اللہ کی آیتوں سے انکار کرے گا تو اللہ کو بھی حساب لینے میں کچھ دیر نہ لگے گی۔ پھر اگر یہ لوگ جھگڑا کریں[۴۰] تو اے پیغمبر تم کہہ دو میرا اور میرے پیروؤں کا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم نے پورا اسلام اپنا لیا ہے[۴۱] اور اہل کتاب اور عرب کے اُمیوں سے دریافت کرو۔ کیا تم نے بھی اسلام کو قبول کر لیا۔ پس اگر انہوں نے اسلام کو قبول کر لیا تو انہوں نے ہدایت پا لی[۴۲]۔ اور اگر انہوں نے اسلام سے روگردانی کی تو تمہاری ذمہ داری ختم ہے کیونکہ آپ کا کام تو صرف پیغام پہنچا دینا ہے اور اللہ اپنے بندوں کے حال کو دیکھ رہا ہے[۴۳]۔

ایمان کے آثار و نتائج

اس سے پہلی آیت میں ایمان اور اس کے کچھ مظاہر پیش فرمائے تھے۔ اب ان آیات میں ایمان کے نتائج و آثار بطور قاعدہ کلیہ بتلائے جا رہے ہیں۔ ایمان کا لازمی اور ناگزیر تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلق نہ رکھا جائے اور پوری زندگی میں اخلاص کے ساتھ اسکی طاعت کی جائے۔ اللہ سے عابدانہ تعلقات قائم کرنے کے لئے لا الہ الا ھو اور پوری زندگی میں طاعت کے لئے اسلام کی تعبیر اختیار کی ہے۔ گویا توحید اور اسلام ایمان کے لازمی نتائج ہیں۔ توحید نام ہے علم میں سب سے ہٹ کر اللہ ہی کا ہو رہنے کا فکر کی حد تک اس بات کا یقین کہ پوری کائنات کا اللہ تنہا مالک ہے۔ اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں اس کی شہنشاہی میں کسی دوسرے

کا حصہ نہیں اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہ سے اوجھل نہیں۔ سب کمزور ہیں وہ ہی ایک قوت والا ہے سب جاہل ہیں اسی ایک کو علم ہے سب فانی ہیں اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہ ہی ایک بے نیاز ہے۔ سب اس کے بندے ہیں وہ ہی ایک شہنشاہ ہے۔ عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اس کی حکمرانی ہے وہ ہر عیب سے پاک، ہر برائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے۔ وہ ہر قسم کے صفاتِ عدلیہ اوصافِ کمالیہ اور محامد جلیلہ سے متصف ہے۔ اس کے مانند کوئی نہیں، اس کی شبیہ و مثال کوئی نہیں۔

اسلام لغت کی زبان میں طاعت و فرمانبرداری اور اصطلاح میں اللہ سبحانہٗ کی طاعت و فرمانبرداری کو کہتے ہیں۔ اور مسلم وہ ہے جو احکامِ الٰہی کے مطابق چلے اور ان سے سرتابی نہ کرے مثلاً اللہ کا حکم ہے کہ عبادت اسی کی کرو، دعائیں، طلب گاریاں اس کے سامنے ہاتھ پھیلاؤ، استعانت، رکوع و سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے عبادت گزارانہ اعمال میں اپنا رشتہ صرف اللہ سے قائم کرو۔ محبت و اخلاص، انابت و توبہ، خوف و رجا میں اپنے اعمال، اقوال، اذکار کا مرکز اللہ کو بناؤ، اسی کو مصیبتوں میں پکارو، اسی کی دہائی دو، اسی کی تسبیح و تقدیس کرو، اسی کو پناہ و آسرا بناؤ، اسی کی رضا کے جویا رہو۔ توحید کے ان ہی تقاضوں کو زندگی میں پورا کرنے کا نام اسلام ہے۔ اسی اعتبار سے توحید اگر ایمان کے لئے علمی و فکری اساس ہے تو اسلام اسی اساس پر اٹھی ہوئی عمارت کا نام ہے۔ ایمان لانے کے بعد توحید کے ذریعے قرآن اہلِ ایمان کو اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اس کی محبت دنیا کا حاصل اس کی عبادت زندگی کا مقصود اور اس کی یاد دلوں کی راحت ہے۔ اسی توحید کے اثر اور نتیجہ کا نام اسلام ہے۔ یہ اسلام ہی ہے کہ جن کو بھولے سے خدا یاد نہ آتا تھا۔ وہ اس کے سوا سب کچھ بھول گئے اور اس کی راہ میں ہر چیز قربان کرنے کو تیار ہو گئے۔ وہ چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، سوتے جاگتے ہر حال میں اس کی یاد میں سرمست و سرشار رہنے لگے۔ اس سرشاری میں انہوں نے فرائض کی ادائیگی اور اس راہ میں جدّ و جہد اور سرفروشی کو اپنا نصب العین بنایا اور اللہ کا حکم جان کر اس کو پوری مستعدی کے ساتھ بجالائے ان کی محبتِ الٰہی کا درجہ دنیا کی ہر محبت پر غالب آگیا۔ ان کا توکل، ان کا صبر ان کی استقامت، ان کی صداقت، غرض ان کی ہر ادا اسی جذبۂ توحید کا پرتو تھی اور ہر وقت ان کے پیشِ نظر یہ تعلیم تھی۔

الٰھکم الٰہ واحد فلہ اسلموا۔
تمہارا معبود یگانہ معبود ہے پس تم اسی کے فرمانبردار ہو جاؤ۔
اسی بنا پر قرآن نے دین کے لئے اسلام کا لفظ اختیار کیا ہے کیونکہ اسلام کے معنے فرمانبرداری کے ہیں۔ قرآن نے یہ نکتہ بار بار پیش کیا ہے کہ نجات کا مدار توحید و اسلام ہیں۔ ان دونوں میں توحید علم ہے تو اسلام اس کا حال ہے توحید ملزوم ہے تو اسلام اس کا لازمہ ہے یعنی ان دونوں میں لازم و ملزوم کا تعلق ہے جو ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے۔ جس طرح توحید کے بغیر اسلام کا وجود نہیں ہو سکتا اسی طرح اسلام کے بغیر توحید کا عدم اور وجود برابر ہے۔ یعنی اگر آپ لا الٰہ الا اللہ کے نظریہ کو قبول کر کے اس پر عمل نہیں کرتے اور کسی بت کے سامنے سجدہ ریز ہیں اور عابدانہ تعلقات غیر اللہ سے رکھتے ہیں تو پھر آپ کے لا الٰہ الا اللہ کے نظریہ کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

۳۵ ۔ یہ بات اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں عدل و انصاف پر قائم اللہ کی شہادت ہے۔ ابتدا میں نصاریٰ نجران سے خطاب تھا اور نہایت لطیف انداز میں الوہیتِ مسیح کا ابطال اور توحید خالص کا اعلان کر کے ایمان لانے کی ترغیب دی گئی تھی۔ درمیان میں ان موانع کا ذکر کیا جو انسان کو حق واضح ہونے کے باوجود ایمان کے شرف سے محروم رکھتے ہیں یعنی مال، اولاد اور سامانِ عیش و عشرت۔ پھر چند آیات میں مومنین کی صفات بیان فرمانے کے بعد اصل مضمون توحید کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ یعنی توحید خالص کے ماننے میں کیا تردد ہو سکتا ہے جب کہ خود حق اپنی تمام کتابوں میں برابر اس مضمون کی گواہی دیتا رہا ہے اور اس کی فعلی کتاب صحیفہ کائنات کا ایک ایک ورق بلکہ ایک ایک نقطہ شہادت دیتا ہے کہ بندگی کے لائق رب العالمین کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا۔

وفی کل شیئ لہ آیۃ تدل علی انہ واحد
سنریھم آیاتنا فی الآفاق وفی انفسھم حتیٰ یتبین لھم انہ الحق۔ اولم یکفر بربک انہ علی کل شیئ شہید[1]۔

اللہ تعالیٰ کی شہادت تو بطور مجاز ہے۔ مراد یہ ہے کہ اللہ کی ذات و صفات اور اس کے تمام مظاہر و مصنوعات اللہ تعالیٰ کی توحید کی کھلی نشانیاں ہیں[2]۔
اللہ کی یہ گواہی کتبِ سماوی سے ظاہر ہو رہی ہے اور صحیفہ کائنات سے بھی (بیضاوی)

[1] افاداتِ شیخ الہند [2] معارف م ش۔

کتبِ الٰہی کی شہادت دلیلِ نقلی کی اور مصنوعات فطرت کی دلالت دلیلِ عقلی کی حیثیت رکھتی ہے۔

خدا کی وحدانیت اور اس کے قائم بالقسط ہونے کی شہادت کسی ایک ہی پہلو سے نہیں مل رہی ہے بلکہ تین مختلف پہلوؤں سے مل رہی ہے۔ اس کی بنائی ہوئی کائنات کا نظام اور اس کی تاریخ اس کی شہادت دے رہی ہے۔ اس کی پیدا کی ہوئی فطرت اس پر گواہ ہے اور اس کے پیغمبروں نے ہمیشہ اس حقیقت کی منادی کی ہے۔ اس آیت میں یہ بات نہایت اجمال کے ساتھ بیان ہوئی ہے لیکن قرآن کے تیس پاروں میں اس اجمال کی تفصیل پھیلی ہوئی ہے[1]

اللہ تعالیٰ جو تمام کائنات کی حقیقتوں کا براہِ راست علم رکھتا ہے جو تمام موجودات کو بے حجاب دیکھ رہا ہے، جس کی نگاہ سے زمین و آسمان کی کوئی چیز پوشیدہ نہیں اس کی شہادت ہے اور اس سے بڑھ کر معتبر عینی شہادت اور کس کی ہوگی کہ پورے عالم وجود میں اس کی اپنی ذات کے سوا کوئی ایسی ہستی نہیں ہے جو خدائی صفات سے متصف ہو، خدائی کے اقتدار کی مالک ہو اور خدائی کے حقوق کی مستحق ہو[2]

شہادتِ خداوندی اور حافظ ابن القیمؒ

اس موضوع پر حافظ ابن القیم نے جو عجیب و غریب تحقیق فرمائی ہے اسے نظر انداز کرنا خود علم سے بے انصافی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت بزرگ ترین، عظیم ترین، عادل ترین، اور صادق ترین شہادت کی ترجمان ہے۔ شہادت میں معنوی وسعت ہے۔ اس کے معنے حکم کرنا، فیصلہ کرنا، اعلان کرنا، بیان کرنا اور خبر دینا ہیں۔ اس موقع پر سب معنے ہو سکتے ہیں کیونکہ شہادت خواہ کسی معنے میں ہو اس کے چار درجے ہیں۔ اوّل علم و معرفت دوم تکلم و نطق؛ سوم اعلان، چہارم حکم و امر، وحدانیت کے بارے میں اللہ کی شہادت ان چہارگانہ درجات پر حاوی ہے، اللہ اپنی وحدانیت کو جانتا ہے، اللہ نے اپنی وحدانیت کا اعلان بھی کیا ہے، اللہ نے مخلوق کو اس کی خبر بھی دی ہے اور اللہ نے اسے اپنانے کا حکم بھی دیا ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی وحدانیت سے آگاہ کرنے کے لئے اپنے بے شمار انبیاء روانہ کئے، ان سب نے خدا کے یگانہ معبود ہونے کی شہادت دی۔ اللہ کی بھی شہادت ان امتوں کے انبیاء کے

---

[1] تدبرِ قرآن ، [2] تفہیم القرآن

صحیفوں میں موجود ہے۔ قرآن میں ہے:

ما امروا الا لیعبدوا الٰھًا واحداً لا الہ الا ھو سبحانہ عما یشرکون

ان کو جو کچھ حکم دیا گیا تھا وہ اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ ایک خدا کی بندگی کرو۔ کوئی معبود نہیں ہے مگر وہی، اس کی پاکی ہو اس ساجھے سے جو یہ اس میں لگا رہے ہیں۔

ہر پیغمبر کی دعوت کا اوّلین آوازہ بھی رہا ہے کہ اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہٗ

اس معنے کے لحاظ سے پورا قرآن اللہ کی وحدانیت کی شہادت ہے۔ اللہ کا یہ حکم اور امر ہی اللہ کی شہادت ہے۔

دوسری شہادت آفاقی ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے اس کائنات کو جس طرح بنایا ہے اور جس طرح اس کے نظام کو چلا رہا ہے اس سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ اس کے سوا ہماری پرستشوں اور بندگیوں کا مستحق کوئی نہیں۔ یہ فعلی شہادت ہے آئمہ تفسیر نے اسے نت نئے طریقوں سے پیش کیا ہے۔ ابن کیسان کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اپنے عجیب وغریب نظام اور اس نظام کے احکام واتقان کے ذریعے شہادت دے رہا ہے کہ اس کے علاوہ پوجا اور بندگی کے لائق کوئی نہیں یہ اعلام اور اخبار کے مرتبہ میں شہادت ہے۔

نظامِ ربوبیّت سے توحید پر شہادت

اسی سلسلہ میں وہ نظامِ ربوبیّت سے توحید پر شہادت پیش کرتا ہے جو رب العالمین تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے اور جس کی ربوبیّت کا اعتراف تمہارے دل کے ایک ایک ریشے میں موجود ہے اس کے سوا کون اس کا مستحق ہو سکتا ہے کہ بندگی ونیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے۔

ھل من خالق غیر اللہ یرزقکم من السماء والارض لا الہ الا ھو فانی تؤفکون

کیا اللہ کے سوا دوسرا خالق بھی ہے جو تمہیں زمین وآسمان سے روزی دے رہا ہے نہیں ہے کوئی معبود اس کے سوا کہاں بھٹکے جا رہے ہو۔

رحمت سے واحدنیت پر شہادت

جس طرح اللہ سبحانہٗ اپنی ربوبیّت کے مظاہر سے استدلال کرتا ہے اسی طرح وہ رحمت

کے آثار و حقائق کو بھی جا بجا وحدانیت کے لئے شہادت میں پیش کرتا ہے ۔ اس کا موقف ہے کہ کائنات کی ہر چیز میں ایک مقررہ نظام کے ساتھ رحمت و فضل کا ہونا قدرتی طور پر انسان کے لئے اللہ کی شہادت ہے کہ ایک رحمت رکھنے والی ہستی کی کارفرمائیاں یہاں کام کر رہی ہیں کیونکہ ممکن نہیں کہ فضل و رحمت کی یہ پوری کائنات موجود ہو اور فضل و رحمت کا کوئی زندہ ارادہ موجود نہ ہو چنانچہ وہ تمام مقامات جن میں کائنات خلقت کے افادہ و فیضان ، زینت و جمال موزونیت و اعتدال تسویہ و اتقان کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اس میں رحمت کو اللہ کے الٰہ ہونے کے لئے بطور شہادت پیش کیا گیا ہے ۔

الٰهكم اله واحد لا اله الا هو الرحمٰن الرحيم ط

فرشتوں کی شہادت

۳۶ ۔ فرشتوں کی بھی یہی گواہی ہے ۔ ظاہر ہے کہ فرشتوں کی گواہی اللہ کی گواہی کے خلاف کیوں کر ہو سکتی ہے ۔ فرشتہ تو نام ہی اس مخلوق کا ہے جو صدق و حق کے راستہ سے سرتابی نہ کر سکے چنانچہ فرشتوں کی تمجید و تحمید تمام تر توحید و تفرید پر مشتمل ہے [۱]

اللہ کے بعد سب سے زیادہ معتبر شہادت فرشتوں کی ہے کیونکہ وہ سلطنت کائنات کے انتظامی اہلکار ہیں اور وہ براہ راست اپنے ذاتی علم کی بنا پر شہادت دے رہے ہیں کہ اس سلطنت میں اللہ کے سوا کسی کا حکم نہیں چلتا اور اس کے سوا کوئی ہستی ایسی نہیں ہے جس کی طرف زمین و آسمان کے انتظامی معاملات میں وہ رجوع کرتے ہوں [۲] ۔ فرشتوں کی گواہی ایک امر واقعی ہونے سے قطع نظر اس پہلو سے بھی خاص طور پر بیان کی گئی ہیں کہ نادانوں نے ان کو اللہ سبحانہٗ کا ساجھی اور شفاعت یا طلب کا واسطہ قرار دے کر توحید الٰہیت کی نفی کر دی تھی [۳]

اولوا العلم کی شہادت

اور علم والوں کی گواہی بھی یہی ہے ۔ علم والے ہر زمانے میں توحید کی شہادت دیتے رہے ہیں اور آج تو عام طور پر توحید کے خلاف ایک لفظ جہل محض کا مرادف ہے ۔ مشرکین بھی دل

---

[۱] افادات شیخ الاسلام ، [۲] تفہیم القرآن ، [۳] تدبر قرآن

تائید نہیں کرتے۔[1]

ہیں ماننے ہیں کہ علمی اصول کبھی مشرکانہ عقائد کی تائید نہیں کرتے۔ العلم قرآن کی اصطلاحی زبان میں وہ علم ہے جو فرشتوں کے بعد اہلِ علم کی شہادت کا ذکر ہے۔ اس علم کے حاملین نے ہر دور میں اللہ کے یگانہ معبود ہونے کی شہادت انبیاء کی وساطت سے حاصل ہو۔ حافظ ابن کثیر اور امام غزالی فرماتے ہیں کہ اس میں علماء کی بڑی فضیلت ہے اور حافظ ابن القیم دی ہے۔ نے یہاں پر نکتہ آفرینی کی ہے کہ اہلِ علم کے اس مقام پر ذکر میں صرف اہلِ علم کی منقبت ہی نہیں بلکہ اللہ کی جانب سے اہلِ علم کو عدالت کا سرٹیفکیٹ دیا گیا ہے۔

یہاں یہ سوال کہ اہلِ علم کون ہیں اور ان کی شہادت کیا ہے؟

اہلِ علم سے اولاً صحابہ کرام مراد ہیں اور پھر وہ مصلحین و مجددین .... جو ہر دور میں پیدا ہوتے ہیں اور جو اللہ کے دین کو بدعات کی آمیزشوں سے پاک کر کے عقائد کو توحید خالص کی بنیاد پر استوار کرتے ہیں اور ان کی شہادت ایک تو یہ ہے کہ وہ اللہ کے یگانہ معبود ہونے کا اقرار کرتے ہیں اور پھر اقرار کے ساتھ انسانیت کے سامنے اسے بیان کرتے ہیں۔ یہی لوگ روزِ قیامت شہداء کی حیثیت سے پیش ہوں گے اور ان کو ہی دنیا میں شہداء علی الناس کا منصب تفویض کیا گیا ہے۔ علم و عمل، معرفت و اقرار، دعوت و تعلیم، اور وعظ و ارشاد کے ذریعے اس شہادت کی ادائیگی ان کی بہت بڑی ذمہ داری ہے۔

شہادتیں تین ہیں

اللہ کی یعنی اس کی وحی کی، اس کے نظامِ ربوبیت اور اس کی بے پایاں رحمت کی فرشتوں کی یعنی مدبراتِ ارضی و سماوی کی، اولوالعلم کی یعنی اصحابِ علم و بصیرت کی۔

یہ تینوں شہادتیں اعلان کر رہی ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے کہ قائماً بالقسط اگرچہ ترکیب میں اللہ سے حال ہے مگر یہاں ذوالحال اور حال کے درمیان فاصلہ کر کے اسے العلم کے ساتھ رکھا گیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ علم اور عدل ہی پر تمام کارخانۂ ہستی قائم ہے اور علم و عدل انسانی زندگی کی تمام پریشانیوں کا مداوا ہے۔ امام غزالی اور حافظ ابن القیم نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ انشاء اللہ اپنے موقعہ پر آئے گی۔ اس جگہ قائماً بالقسط کو اللہ کا حال

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

قرار دینے میں معنویت یہ ہے کہ اللہ کی جانب سے یہ اعلان کہ عبادت کے لائق اس کے سوا کوئی
نہیں میزانِ عدل ہے۔ اس سے ہٹ کر تشبیہ و اشراک کی راہ اختیار کرنا سراسر ظلم ہے۔ اسی طرح
ذاتِ باری کے لئے صفات کا اقرار کیا جائے مگر ساتھ ہی تجسیم و تعطیل دونوں سے دامنِ توحید
کو داغدار نہ ہونے دیا جائے۔ قرآن نے اس بارے میں جو نقطۂ عدل پیش کیا ہے کہ اللہ بحانہٗ
حسن و خوبی کی ان تمام صفتوں سے جو انسانی فکر میں آسکتی ہیں ، متصف ہے لیکن یہ بھی صاف
اور بے لچک الفاظ میں بتاتا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں ہے۔
توحید کی شہادت میں اللہ بحانہٗ کا عدل کو قائم رکھنا اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ جیسے
توحید کی شہادت علی الاطلاق سب سے بڑا عدل ہے ایسے ہی شرک سے بڑھ کر ظلم ہے۔

۳۷ ۔ فی الواقع اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہی غالب اور حکمت والا ہے۔ بالکل آخر میں قائما
بالقسط کے بعد کلمہ توحید کا اعادہ کیا ہے اور ساتھ ہی یہ فرمایا ہے کہ وہ عزیز و حکیم ہے اس میں اشارہ
ہے کہ انصاف کرنے کے لئے دو باتیں ضروری ہیں ایک یہ کہ زبردست ہو کوئی اس کے فیصلہ سے
سرتابی نہ کرسکے اور حکیم ہو کہ حکمت و دانائی سے پوری طرح جانچ تول کر ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرے
کوئی حکم بے موقع نہ دے ۔ چونکہ حق تعالیٰ عزیز و حکیم ہیں لہٰذا ان کے منصف علی الاطلاق ہونے
میں کیا شبہ ہوسکتا ہے۔
غالباً قائماً بالقسط میں عیسائیوں کے مسئلہ کفارہ کا بھی رد ہوگیا۔ یہ کہاں کا انصاف ہے کہ ساری
دنیا کے جرائم ایک شخص پر لاد دیئے جائیں اور وہ تنہا سزا پاکر سب مجرموں کو ہمیشہ کے لئے بری اور
پاک کردے۔ خدائے عادل و حکیم کی بارگاہ ایسی گستاخیوں سے کہیں بالا و برتر ہے[1]
یہاں یہ نکتہ بھی ملحوظ رہے کہ ایک ہی آیت میں کلمہ توحید کا تکرار ہے اور دونوں جگہ اللہ تعالیٰ
کی دو الگ الگ صفتوں کا حوالہ ہے ۔ پہلے فرمایا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ قائم بالقسط ہے،
پھر فرمایا کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ عزیز و حکیم ہے۔ اس اسلوب میں مخاطب اہلِ کتاب کے
لئے سخت تنبیہ ہے ، مطلب یہ ہے کہ خدا فرشتوں اور تمام حاملینِ علم کی شہادت یہی ہے کہ خدا کے
سوا کوئی الٰہ نہیں اور وہ الٰہ امورِ دنیا سے بے تعلق نہیں ہے کہ لوگوں کو ان کی خواہشات کی دنیا میں شترِ
بے مہار کی طرح چھوڑ دے اور وہ حی و قیوم ہونے کے باوجود ان کا کوئی نوٹس نہ لے وہ تمہاری خواہشوں

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام ۔

کے علی الرغم اپنے نظامِ عدل کو ضرور قائم کرے گا اور اسے کوئی نہ روک سکے گا۔ پھر فرمایا کہ وہ ایسا کیوں نہ کرے جب کہ وہ وحدہٗ لا شریک بھی ہے اور عزیز و حکیم بھی۔ اس کی حکمت اور عزت دونوں کا تقاضا ہے کہ وہ ایسا کرے[1]

اسلام ہی اللہ کا دین ہے

۳۸۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک دین صرف اسلام ہے۔ اسلام کے اصلی معنے سونپ دینے کے ہیں، مذہب اسلام کو بھی اسی لحاظ سے اسلام کہا جاتا ہے کہ ایک مسلم اپنے کو ہمہ تن خدائے واحد کے سپرد کر دینے اور اس کے احکام کے سامنے گردن ڈال دینے کا اقرار کرتا ہے۔ گویا اسلام انقیاد و تسلیم کا اور مسلمانی حکم برداری کا دوسرا نام ہوا۔ یوں تو شروع سے آخر تک تمام پیغمبر یہی مذہب اسلام لے کر آئے اور اپنے اپنے زمانے میں اپنی اپنی قوم کو مناسب وقت احکام پہنچا کر طاعت و فرمانبرداری اور خالص خدائے واحد کی پرستش کی طرف بلاتے رہے ہیں لیکن اس سلسلہ میں خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام دنیا کو جو اکمل، جامع ترین عالمگیر اور ناقابلِ تنسیخ ہدایات دیں وہ تمام شرائع سابقہ حقہ پر مع شئے زائد مشتمل ہونے کی وجہ سے خصوصی رنگ میں اسلام کے نام سے موسوم و ملقب ہوئیں۔ بہرحال اس آیت میں نصاریٰ نجران کے سامنے خصوصاً اور تمام اقوام و ملل کے سامنے عموماً اعلان کیا گیا ہے کہ دین صرف ایک ہی چیز کا نام ہے۔ وہ یہ کر بندہ دل و جان سے اپنے کو خداوند قدوس کے سپرد کر دے اور جس وقت جو حکم اس کی طرف سے ملے بلا چون و چرا گردنِ تسلیم جھکا دے۔ اب جو لوگ خدا کے لئے بیٹے پوتے تجویز کریں۔ مسیح و مریم کی تصویروں اور صلیب کی لکڑی کو پوجیں خنزیر کھائیں، آدمی کو خدا یا خدا کو آدمی بنا دیں۔ انبیاء و اولیاء کو قتل کر ڈالنا معمولی بات سمجھیں۔ دینِ حق کو مٹانے کی ناپاک کوشش کریں۔ مسیح و موسیٰ کی بشارات کے موافق جو پیغمبر ان دونوں سے بڑھ کر شان و نشان لے کر آیا۔ جان بوجھ کر اس کی تکذیب کریں۔ اور اس کے لائے ہوئے احکام کا مذاق کریں۔ یا جو بے وقوف پتھروں، درختوں، ستاروں اور چاند سورج کے آگے سجدہ کریں اور حلال و حرام کا معیار محض ہوائے نفس کو ٹھہرالیں۔ کیا ان میں کوئی جماعت اس لائق ہے کہ اپنے کو مسلم اور ملتِ ابراہیمی کا پیرو کہہ سکے العیاذ باللہ۔

محمد بن اسحاق کی روایت میں وفدِ نجران کے تذکرے میں تصریح ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] تدبر قرآن۔

نے وفد سے کہا کہ اسلام لے آؤ یعنی خدائے قدوس کی طاعت کرو۔ انہوں نے کہا کہ ہم اسلام لا چکے ہیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ جھوٹ بول رہے ہو تمہارا اسلام کیسے درست ہو سکتا ہے جب کہ تم اللہ کا بیٹا مانتے ہو۔ صلیب کو پوجتے ہو اور سور کھاتے ہو۔ (تفسیر کبیر)[1]

الدّین کے معنی عربی زبان میں بدلہ، طاعت اور خضوع کے آتے ہیں۔ اس پر تفصیلی بحث ہم پہلی جلد میں کر چکے ہیں۔ دیکھو اصطلاحاتِ قرآنی۔ اسلام کے معنے بھی لغت میں فرمانبرداری کے ہیں۔ یہاں یہ دونوں لفظ معنے میں نہیں بلکہ اصطلاحی معنے میں ہیں۔ دین کے اصطلاحی معنے نظام کے اور اسلام کے اصطلاحی معنے اس علم وعمل کے جو انبیاء کی وساطت سے آیا ہے اور جسے آخر میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کامل ترین، محبوب ترین اور مؤثر ترین صورت میں لے کر تشریف لائے ہیں۔ اس اندازِ بیان میں دونوں کا معرفہ ہونا بتا رہا ہے کہ اللہ کا مقبول ومحبوب اور پسندیدہ نظام صرف اسلام ہے۔ غرض اسلام وہ دینِ قیم ہے جو ہمیشہ انبیاء کا دین رہا۔ اور موجودہ دینِ اسلام یہود ونصاریٰ کی تحریفات و تصرفات اور فرقہ پرودیوں کو مٹا کر اسی ایک متحدہ دین کی پکار ہے۔ جس کی طرف انبیاء اپنے اپنے زمانے میں ہمیشہ لوگوں کو بلاتے رہے۔ اور یہی وہ دین ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کے ذریعے دوبارہ دنیا میں پیش کیا گیا ہے۔ کیونکہ جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناتمام تھی اور اسلام اس کو لے کر آیا وہ کامل ہے۔ اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نزدیک انسان کے لئے صرف ایک ہی نظامِ زندگی اور ایک ہی طریقۂ حیات صحیح ودرست ہے اور وہ یہ ہے کہ انسان اللہ کو اپنا مالک ومعبود تسلیم کرے اور اس کی بندگی وغلامی میں اپنے آپ کو بالکل سپرد کر دے اور اس کی بندگی بجا لانے کا طریقہ خود نہ ایجاد کرے بلکہ اس نے اپنے پیغمبروں کے ذریعے جو ہدایت روانہ کی ہے ہر کمی وبیشی کے بغیر صرف اسی کی پیروی کرے۔ اسی طرزِ فکر وعمل کا نام اسلام ہے اور یہ بات سراسر بجا ہے کہ کائنات کا خالق ومالک اپنی مخلوقات اور رعیت کے لئے اس اسلام کے سوا کسی دوسرے طرزِ عمل کو جائز تسلیم نہ کرے۔ آدمی اپنی حماقت سے اپنے آپ کو دہریت سے لے کر شرک وبت پرستی تک ہر نظریے کی پیروی کا جائز حقدار سمجھتا ہے مگر فرمانروائے کائنات کی نگاہ میں تو یہ نری بغاوت ہے[2] گویا اس دو لفظی فقرہ میں اس ذہن کی صاف تردید ہے کہ ہر دین دینِ حق ہے اور ہر مسلک خدا ہی کی راہ ہے اور دیر وحرم، کفر وایمان میں فرق لفظی واصطلاحی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ خطِ مستقیم صرف ایک ہی ہے اور وہ اسلام ہے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام، [2] تفہیم القرآن

جو انبیاء کا ہمیشہ سے دین چلا آرہا ہے[1]

ادیانِ میں اختلاف کی وجہ

۳۹ ۔ اہل کتاب نے اس دین میں جو اختلاف کیا ہے علم آنے کے باوجود وہ باہم ضد اور کد کی وجہ سے مختلف ہوئے ہیں ۔ یعنی اسلام ایک واضح اور روشن چیز ہے جس قسم کے دلائل سے موسیٰ یا مسیح کی رسالت یا تورات و انجیل کا کتاب سماوی ہونا ثابت کیا جا سکتا ہے ۔ اس سے بہتر مضبوط اور زندہ دلائل محمد رسول اللہ کی رسالت اور قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے موجود ہیں بلکہ خود وہ کتابیں آپ کی حقانیت کی گواہی دے رہی ہیں ۔ توحید خالص ایک صاف اور واضح موضوع ہے جس کے خلاف باپ بیٹے کا نظریہ محض ایک بے معنے چیستان ہو کر رہ جاتی ہے ۔ جس کی کوئی علمی اصول تائید نہیں کرتا۔ اب جو اہل کتاب مخالفِ اسلام ہو کر ان روشن حقائق کو جھٹلائیں اور حق تعالیٰ کی حکم برداری سے سرتابی کریں بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ محض ضد، حسد، عناد اور جاہ و مال کی حرص میں ایسا کر رہے ہیں جیسا کہ پہلے ان الذین کفروا لن تغنی عنھم اموالھم کے فوائد میں خود ابو حارثہ بن علقمہ رئیس وفد نجران کا اقرار و اعتراف نقل کیا جا چکا ہے ۔ اور ان لوگوں کی قدیم عادت ہے ۔ یہود و نصاریٰ کے جو باہم اختلافات ہوئے یا ہر ایک مذہب میں جو بہت سے فرقے بنے، پھر مخالفت باہمی خوفناک محاربات اور خونریزیوں پر منتہی ہوئی ۔ تاریخ بتلاتی ہے کہ اس کا منشاء عموماً غلط فہمی یا جہل نہ تھا بلکہ اکثر حالات میں محض سیم و زر کی محبت اور جاہ پرستی سے یہ اختلافات پیدا ہوتے ہیں[2]

یہاں ذہن میں یہ خلش محسوس ہوتی ہے ۔ اگر تمام نوعِ انسانی کے لئے اللہ کا مقبول و محبوب دین اسلام ہی ہے اور تمام انبیاء اسی کی دعوت و تبلیغ کے لئے آئے اور اسی کی جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہوئی ہے تو پھر دین کے نام پر اختلاف کیوں ہوا ۔ تمام ایک کیوں نہیں ہوئے ۔ یہ یہودیت، عیسائیت کیا ہے ۔ اور پھر اگر اصلی دین اسلام ہی ہے اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کے داعی ہیں تو یہ انبیاء کو ماننے والے اسے کیوں نہیں مانتے!

ان ہی سوالات کا جواب قرآن کی اس آیت میں پوری وضاحت اور صفائی سے دیا گیا ہے ۔ اس کی توضیح یہ ہے کہ ادیان کا اختلاف دو طرح کا ہے ۔

---

[1] ماجدی ، [2] افاداتِ شیخ الاسلام ،

ایک اختلاف تو وہ ہے جو فی الحقیقت شرائع کے احکام میں پایا جاتا ہے۔ مثلاً ایک مذہب میں نماز کی کوئی خاص صورت ہے اور دوسری میں کوئی اور جیسے اصل نماز سارے انبیاء کے یہاں ہے لیکن نماز کی شکل وصورت مختلف اُمتوں میں الگ الگ ہے، حضرت موسیٰ کی نماز حضرت داؤد کی نماز اور حضرت عیسیٰ کی نماز۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ پارہ ششم میں آئے گی۔

دوسرا اختلاف وہ ہے جو پیروانِ مذاہب نے مذہب کی حقیقی تعلیم سے باغی ہو کر پیدا کر لیا ہے۔ یہ اختلاف دین کا اختلاف نہیں پیروانِ دین کی گمراہی کا نتیجہ ہے۔ اس آیت میں قرآن اسی کو بیان کر رہا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہے کہ ان میں اختلاف اس لئے نہیں ہوا کہ ان کے پاس العلم نہیں آیا تھا اور یہ اس اسلام سے اس لئے منحرف نہیں ہوئے کہ وحی الٰہی نے ان کی رہنمائی نہیں کی تھی۔ اور یہ بے راہ روی کے شکار اس لئے نہیں ہوئے کہ حق کو کھول کر نہیں بیان کیا گیا تھا۔ پیروانِ مذاہب کا راہِ حق سے انحراف کسی خطاء اجتہادی کی بناء پر نہیں تھا بلکہ ان کے اختلاف کی اصلی وجہ یہ اور صرف یہ تھی کہ ان میں انسانیت سے ہٹ کر نفسانیت اور ہوا پرستی آگئی تھی۔ ان لوگوں نے اپنی جائز حد سے بڑھ کر حقوق، فوائد اور امتیازات حاصل کرنا چاہیے اور حب الشہوات کے مطابق اصل دین کے عقائد اصول اور احکام میں ردّ و بدل کر ڈالا، قرآن نے اسی کو یہاں بغیاً بینہم سے تعبیر کیا ہے۔ بغی کے معنے ضد اور عناد کے ہیں۔ ضد وعنادی نے ان میں فرقہ وارانہ جراثیم پیدا کئے ماتفرقوا الا من بعد ماجاءھم العلم بغیاً بینھم اور یہی بغی ان میں فکری اور عملی اختلاف کا باعث بنا جیسا زیرِ تفسیر آیت میں ہے اور یہ بغی ہی نبوّتِ محمدیہ کے انکار کا سبب بنا: بغیاً ان ینزل اللہ من فضلہ یعنی نبوّتِ محمدیہ کے انکار اور اس کی مخالفت کی یہ راہ انہوں نے دیدہ دانستہ اختیار کی۔ اس کا سبب اس ضد اور عناد کے سوا کچھ نہ تھا کہ ان کو اللہ تعالیٰ پر غصّہ تھا کہ اُس نے آخری دین اور آخری رسول کی نعمت سے بنی اسماعیل کو کیوں نوازا بنی اسرائیل میں سے کسی کو رسول کیوں نہیں بنایا؟

اس گمراہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

اوّلاً دینی پیشواؤں کا روحانیت کے نام پر ایک پیشہ ور طبقہ پیدا ہو گیا اور عوامی زندگی روحانی استعباد کا شکار ہو گئی۔

ثانیاً، توہم پرستی اور جہل و کوری کا دروازہ کھل گیا اور اس کے نتیجہ میں عوام کی زندگی استبداد سیاسی کے بھینٹ چڑھ گئی۔

۴۰۔ اور یاد رکھو جو اللہ کی آیتوں سے انکار کرے گا تو اللہ کو بھی حساب دینے میں کچھ دیر نہ لگے گی۔ یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ اس میں اشارہ کر دیا کہ چونکہ اصل دین ایک ہی ہے جو تمام انبیاء کا دین رہا ہے لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کی ضد عناد کی وجہ سے بگڑتا رہا ہے۔ اسی دین ازلی کو لے کر اب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے ہیں اور اسی کا نام اسلام ہے جو اللہ کے نزدیک مقبول ہے اور جو اب ہمیشہ قائم اور باقی رہے گا۔ اگر تمام مذاہب سابقہ اس کو اپنالیں تو فبہا ورنہ جو بھی اب اللہ کی آیات کا انکار کرے گا تو وہ اللہ کی عقوبت سے کسی صورت میں بچ نہیں سکتا۔ اللہ جلدی حساب لینے والا ہے۔

مناظرہ کرنے والوں کو جواب

۴۱۔ پھر اگر یہ لوگ جھگڑا کریں تو اے پیغمبر کہہ دو میرے اور میرے پیروؤں کا طریقہ تو یہ ہے کہ ہم نے پورا اسلام اپنالیا ہے۔ وہ جھگڑتے تھے کہ ہم بھی مسلمان ہیں۔ یہاں اُن کو بتلایا گیا ہے کہ ایسا فرضی اسلام کس کام کا۔ آؤ دیکھو اسلام اسے کہتے ہیں جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے جاں نثار ساتھیوں کے پاس ہے۔ ابھی بیان ہو چکا ہے کہ اسلام نام ہے تسلیم و انقیاد کا یعنی بندہ ہمہ تن اپنے کو خدا کے ہاتھ میں دے دے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اور مہاجرین و انصار کو دیکھ لو کس طرح شرک، بت پرستی، بداخلاقی، فسق و فجور اور ظلم و عدوان کا مقابلہ کرتے ہوئے اپنی جان و مال، وطن، کنبہ، بیوی، بچوں، غرض تمام مرغوب و محبوب چیزیں حق تعالیٰ کی خوشنودی پر نثار کر دیں۔ اور کس طرح ان کا چہرہ اور آنکھیں ہر وقت حکم الٰہی کی طرف لگی رہتی ہیں۔ کہ ادھر سے حکم آئے اور ہم تعمیل کریں۔ اس کے بالمقابل تم اپنا حال دیکھو کہ خود اپنی خلوتوں میں اقرار کرتے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم حق پر ہیں مگر ان پر ایمان لائیں تو دنیا کا مال و جاہ چھنتا ہے۔ بہر حال اگر باوجود وضوح حق کے اسلام کی طرف نہیں آتے تو تم جانو ہم تو اپنے کو ایک خدا سپرد کر چکے ہیں[1]

اسلمت وجھی للہ (میں نے اپنا چہرہ اللہ کے حوالہ کر دیا) یہ اپنی ذات کو اللہ کے حوالہ کرنے کی تعبیر ہے۔ چہرہ انسان کی ذات میں سب سے اعلیٰ و اشرف حصہ ہے۔ جب سب سے اعلیٰ و اشرف حصہ کو حوالے کر دیا گیا تو گویا سب کچھ حوالہ کر دیا۔ یہ اسی طرح کی تعبیر ہے جیسے ہم کسی کی اطاعت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی تعبیر کے لئے سر جھکا دینا بولتے ہیں۔ اس تعبیر میں غایت درجہ تذلل و نیازمندی سپردگی پائی جاتی ہے، حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل کی اسی سپردگی اور فرمانبرداری کو قرآن نے اسلام کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔

فلما اسلما وتله للجبين

جب حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل اسلام لائے اور ابراہیم نے اسماعیل کو پیشانی کے بل ڈال لیا۔

خاص حضرت ابراہیم کے بارے میں ہے۔

اذ قال له ربه اسلم قال اسلمت لرب العالمين

حضرت ابراہیم کے رب نے جب ابراہیم سے کہا کہ فرمانبرداری کر یا اپنے کو سپرد کر دے۔ اس نے کہا کہ میں نے پروردگار عالم کی فرمانبرداری کی یا اپنے کو اس کے سپرد کر دیا ہے۔

یہاں یہ اندازِ بیان اصلاً تو اسلام لانے کو ظاہر کر رہا ہے لیکن ساتھ ہی اس اندازِ تعبیر سے اسلام کی اصلی روح بھی سمجھائی جا رہی ہے تاکہ دینداری اور ملّتِ ابراہیمی کے ان دعویداروں پر جو اسلام کی مخالفت میں بحث و مناظرہ کے لئے تیاریاں کر رہے ہیں واضح ہو جائے کہ وہ کس چیز کے خلاف زور لگا رہے ہیں۔

اسلام کے قبول کرنے پر ہدایت کی بشارت

۴۲ ۔ اور اہلِ کتاب اور عرب کے اُمیوں سے دریافت کرو کہ کیا تم نے بھی اسلام قبول کیا ہے۔ اگر انہوں نے اسلام کو قبول کر لیا تو انہوں نے ہدایات پائی۔ یعنی سوتح لو کیا تم بھی ہماری طرح خدا کے تابعدار بندے بنے ہو یا اب بنتے ہو۔ ایسا ہو تو سمجھ لو کہ سیدھے راستہ پر لگ گئے اور ہمارے بھائی بن گئے [1]

اس آیت میں پوری دنیا کو اسلام قبول کرنے پر ہدایت کی بشارت دی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ہی وہ دین ہے جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہلِ مذاہب نے جو کسی گزشتہ پیغمبر کی اُمت ہوں کھو دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے وہ کامل ہے۔

---

[1] افاداتِ مولانا عثمانی رح

اس لئے یہود و نصاریٰ، مجوس، صابئی اور مشرکین اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق نہیں۔ یہود و نصاریٰ تو کیا خود مسلمان بھی نجات کے مستحق نہیں۔ جب تک مسلمانوں کا ایمان و عمل ٹھیک اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو محمد رسول اللہ دنیا میں لے کر تشریف لائے۔ یہ اصول ہر ایک کے لئے ہے خواہ وہ مسلمان ہوں یا یہودی عیسائی غرض کوئی ہو۔ یہود و نصاریٰ اور اُمیین کو اسلام کی طرف دعوت اسی ہدایت کو پانے کے لئے ہے جو انبیاء کے دینِ ازلی سے عبارت ہے اور جس کو محمد رسول اللہ لے کر اس دنیا میں تشریف لائے اور فلاح و نجات اسی کے ماننے میں منحصر ہے۔

والذین یؤمنون بما انزل الیک وما انزل من قبلک وبالآخرۃ ھم یوقنون اولٰئک علی ھدیً من ربھم واولٰئک ھم المفلحون

اور وہ لوگ جو اسے مانتے ہیں اے پیغمبر جو تیری طرف اتاری گئی اور جو تجھ سے پہلے اترا دونوں کو مانتے ہیں اور پچھلی زندگی پر یقین رکھتے ہیں۔ وہی اپنے پروردگار کی ہدایت پر ہیں اور وہی کامیاب ہیں۔

اُمیین کا مفہوم

عرب جس طرح خارجی اثرات سے پاک تھے اسی طرح صحیفۂ فطرت کے سوا ہر قسم کے کتابی علم سے وہ ناآشنا تھے۔ وہ اُمی تھے تاکہ ایک اُمی معلم کی زبانی تعلیم کے قبول کرنے کے لئے ہر طرح تیار رہیں۔ مولانا عثمانی فرماتے ہیں کہ ان پڑھ کہتے تھے عرب کو کہ ان کے پاس کتبِ سماویہ کا علم نہ تھا۔

دراصل اُمی مدرسی و کتابی تعلیم و تعلیم سے ناآشنا کو کہتے ہیں۔ اُمیین کا لفظ اسماعیلی عربوں کے لئے بطور لقب استعمال ہوتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مدرسی اور رسمی تعلیم و کتابت سے ناآشنا بدوی زندگی پر قائم تھے اور اس طرح بنی اسرائیل کے بالمقابل جو انبیاء کے علوم کے علمبردار تھے۔ اُمیت اُن کے لئے ایک امتیازی علامت تھی۔ حضرت اسماعیل اور ان کی ذریت کی بدویانہ زندگی اور اُمیت کا ذکر تورات میں بھی آیا ہے۔ قرآن نے بھی یہ لفظ عرب کو اہل کتاب سے ممتاز کرنے کے لئے استعمال کیا ہے۔ عرب خود بھی اس لفظ کو اپنے لئے استعمال کرتے تھے۔ بعض احادیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہ لفظ اپنی قوم کے لئے استعمال کیا ہے۔ رویتِ ہلال کی بحث میں آپ دوسری جلد میں یہ حدیث پڑھ چکے ہیں نحن امۃ امیۃ اور اس پر تشریحی نوٹ بھی آپ کے مطالعہ سے گزر چکا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب بھی نبی اُمی آیا ہے اس پر پوری بحث انشاء اللہ پارہ نہم میں آئے گی۔

میدانِ دعوت میں حضور انور کو تسلی

۴۳۔ اگر انہوں نے اسلام سے روگردانی کی تو آپ کا کام ختم ہے کیونکہ آپ کا کام تو صرف پیغام پہنچانا ہے۔ اور اللہ اپنے بندوں کے حال کو دیکھ رہا ہے۔ یعنی آپ کا کام سمجھا دینا اور نشیب و فراز بتا دینا ہے وہ آپ کر چکے ہیں آگے سب بندے اور ان کے اعمال ظاہری و باطنی خدا کی نظر میں ہیں وہ ہر ایک کا بھگتان کر دے گا[1] اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے کہ اگر یہ اسلام کی راہ اختیار نہیں کرتے بلکہ اپنی حماقتوں پر جمے رہتے ہیں تو ان کو ان کے حال پر چھوڑ دو۔ آپ پر ذمہ داری صرف حق پہنچا دینے کی تھی۔ وہ ذمہ داری آپ نے پوری کر دی۔ اب تم اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہو۔ اب ان کا فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے وہ اپنے بندوں کے سارے حالات و معاملات کو دیکھ رہا ہے اور ہر ایک کے ساتھ وہ معاملہ کرے گا جس کا وہ مستحق ہو گا[2]

اس میں یہ بات بڑی اہمیت کے ساتھ بتائی گئی ہے کہ آپ کے ذمہ جو کچھ ہے وہ تو یہ ہے کہ پیغامِ حق لوگوں تک پہنچا دو، محاسبہ اللہ کا کام ہے وہ حساب لے کر رہے گا۔ یہ بات قرآن میں مختلف مقامات پر مختلف اندازوں میں کہی گئی ہے اور جہاں بھی کہی گئی ہے کلمہ حصر کے ساتھ کہی گئی ہے۔ یہاں اگر اندازِ بیان یہ ہے کہ انما علیک البلاغ دوسرے موقعہ پر ہے انما علی رسولنا البلاغ تیسرے موقعہ پر ہے ما علی الرسول الا البلاغ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کا کام اللہ کے احکام کی تبلیغ اور ان کی تشریح ہے۔ اصولیین، فقہا، محدثین اور صوفیاء نے یہی بات کہی ہے اس پر تفصیلی بحث انشاءاللہ پارہ پنجم میں آئے گی۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام، [2] تدبر قرآن

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِآيَاتِ اللَّهِ وَيَقْتُلُونَ النَّبِيِّينَ بِغَيْرِ حَقٍّ
وَيَقْتُلُونَ الَّذِينَ يَأْمُرُونَ بِالْقِسْطِ مِنَ النَّاسِ فَبَشِّرْهُم
بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿۲۱﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وَالْآخِرَةِ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿۲۲﴾

جو لوگ اللہ کی آیات کا کفر کرتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں[۴۴] اور اُن لوگوں کو قتل کرتے ہیں جو حق و عدل کا حکم دیتے ہیں تو اُن کو دردناک عذاب کی خوشخبری سُنا دو[۴۵] یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دُنیا و آخرت دونوں میں اکارت گئے اُن کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔[۴۶]

کفر کے آثار و نتائج

اس سے پہلے آیات میں ایمان کے آثار و نتائج پیش کئے گئے تھے۔ اب اس آیت میں اس کے بالمقابل کفر کے آثار و نتائج بتلائے جا رہے ہیں۔

قرآن نے جن اساسی گمراہیوں کا ذکر کیا ہے۔ اگرچہ ان کی تعداد بارہ ہے لیکن کفر کو ان میں اوّلیت کا درجہ حاصل ہے۔ آپ بھی سن لیجئے۔

کفر و شرک، نفاق، فسق، عصیان، اثم، عدوان، فحشا، منکر، بغی، قول علی اللہ بغیر علم، اتباع راہِ غیر اسلامی۔ اس فہرست میں کفر سب سے پہلے ہے۔

علما نے کفر کی دو قسمیں قرار دی ہیں کفر اکبر، کفر اصغر، کفر اکبر کے لئے نجات نہیں ہے جبکہ کفر اصغر صرف سزا کے بعد قابلِ معافی ہے۔ کفر اکبر کے بھی علما نے درجات بتلائے ہیں کفر تکذیب، کفر استکبار، کفر اعراض، کفر شک اور کفر نفاق۔ قرآن کی اصطلاح میں کفر ایمان کی ضد ہے اور اس لفظ کے استعمال میں اس حقیقت کی طرف بلیغ اشارہ ہے کہ ایمان سے محروم وہی شخص رہتا ہے جو اللہ کی نعمتوں اور اسکے احسانات کو نہیں مانتا، اس کا شکر ادا نہیں کرتا اور اپنی انسانی فطرت وجبلت کے خلاف اقدام کرتا ہے اور اس نہ ماننے کا سبب کہیں تکذیب، کہیں بڑائی، کہیں بے رخی، کہیں شکوک اور کہیں ڈھٹائی پن ہوتا ہے۔

کفر بہر حال کفر ہے خواہ کسی وجہ سے ہو۔ گمراہیوں میں کفر کی گمراہی اس قدر سنگین ہے کہ اس سے ہی ساری گمراہیاں جنم لیتی ہیں اور ذہنیت اس درجہ مسخ ہو جاتی ہے کہ حق وعدالت کی دشمن اور ظلم وفساد کی پرستار بن کر رہ جاتی ہے۔ کفر کی آغوش میں کئے ہوئے اچھے کام بھی بے قیمت ہو جاتے ہیں سو قرآن نے ان کے کاموں کی مثال اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ سورۂ نور میں کفر پسند لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ ان کے وجود کی حقیقت فریب نظر سے زیادہ نہیں ہے۔

اس آیت میں کفر کے جن مظاہر کو پیش کیا ہے وہ دو ہیں ایک انبیاء کا ناحق قتل اور دوسرے زندگی میں ہر اس شخص کی زندگی کو ختم کرنے کے درپے ہو جانا جو حق وعدالت کا علمبردار ہو اور ظلم وفساد کو مٹاتا ہو۔

آیات اللہ کا کفر

۴۴ - جو لوگ اللہ کی آیات کا کفر کرتے ہیں اور نبیوں کو ناحق قتل کرتے ہیں۔

اس آیت میں یہودیوں کی قومی گمراہیوں کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس گروہ کی ذہنیت اس درجہ مسخ ہو گئی ہو کہ عدل وراستبازی کی دشمن اور ظلم وفساد کی شیفتہ ہو اس سے کیونکر امید ہو سکتی ہے کہ وہ حق کو قبول کرے گا۔ ان کا سب سے پہلا اور بنیادی جرم یہ بتایا ہے کہ وہ اللہ کی آیات سے کافرانہ برتاؤ کرتے ہیں اور ان کے کفر کی تاریخ اس قدر طویل ہے کہ زمانہ موسیٰ سے لے کر نزول قرآن تک وہ کفر کرتے رہے۔ اس پر خود ان کی کتابیں گواہ ہیں اور اس میں کوئی قید نہیں لگائی۔ یعنی کسی خاص موقع پر ذکر نہیں کہ انہوں نے وہاں کفر کیا بلکہ عمومی الفاظ میں ان کی قومی خصلت کے چہرے کو پیش کیا ہے۔ یعنی کفران کی قومی زندگی کا نشان ہے۔ آیات اللہ کا لفظ بھی معجزات وخوارق اور اللہ کی نازل شدہ کتابوں

کی آیات سب ہی اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اگر آیات سے اللہ کی کتابوں کی آیات مراد ہیں تو ان سے کفر کرنے کی خود قرآن نے جو مختلف صورتیں بتائی ہیں یہ ہیں کہ اللہ کے روا کردہ احکام میں سے جو حکم ان کے قومی مفاد اور سیاسی مصلحت کے خلاف ہوتا اس کے ماننے سے صاف انکار کرتے۔

کلما جاء ھم رسول بما لا تھوی انفسکم استکبرتم

جب بھی کوئی رسول تمہاری خواہشات کے خلاف کوئی حکم لے کر آتا تو تم اکڑ جاتے۔

دوسرے یہ کہ ایک بات کو جانتے ہوئے کہ اللہ نے فرمائی ہے پوری ڈھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس اس کی خلاف ورزی کرتے اور حکم الٰہی کی کوئی پرواہ نہ کرتے۔

تیسرے یہ کہ حکم الٰہی کو جانتے اور سمجھتے کے باوجود اپنی رائے اور خواہش کے مطابق اسے بدل ڈالتے۔

ان کا دوسرا جرم یہ ہے کہ یقتلون النبیین بغیر حق اول تو نبیوں کا قتل کرنا ہی ایک سنگین جرم ہے اور اس کی سنگینی میں اور اضافہ بغیر حق کے ذریعے پیدا کر دیا۔ یا یوں کہہ لیجئے کہ اول تو ناحق کسی کو قتل کرنا ہی جرم ہے۔ اور پھر ناحق ہونے کے ساتھ اگر مقتول نبی بھی ہو تو اس کی شناعت اور سنگینی کا پوچھنا ہی کیا ہے اور پھر بغیر حق کی قید سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ حقوق کا معاملہ قرآن کی نظر میں کس قدر اہمیت رکھتا ہے خواہ ان حقوق کا تعلق النفس سے ہو یا اموال سے یعنی حق سب سے بالاتر ہے اسی کی عظمت ہے کہ اشخاص اور اصناف کے بدلنے سے نہیں بدلتا۔

قتل انبیاء اور بنی اسرائیل کی تاریخ

بنی اسرائیل نے اپنے جرم کی تاریخ خود ہی تفصیل کے ساتھ بیان کی ہے۔ چنانچہ سلاطین باب ۱۹ آیت ۱۔ ۱۰ میں ہے۔

بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا، تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔

یہ حضرت الیاس کے دعائی کلمات ہیں۔

انہوں نے خدا کے پیغمبروں کو ٹھٹھے میں اڑا دیا اور ان کی باتوں کو ناچیز جانا۔ اور اس کے نبیوں سے بدسلوکی کی یہاں تک کہ خدا کا غضب ایسا بھڑکا کہ کوئی چارہ کار نہ رہا۔

(۲ تواریخ ۳۶ : ۱۶)

تمہاری ہی تلوار پھاڑنے والے شیر ببر کی مانند تمہارے نبیوں کو کھا گئی ہے۔

(یرمیاہ ۲ - ۳۰)

اے اہلِ یعقوب اور اہلِ اسرائیل کے سب خاندانوں خداوند کا کلام سنو۔
خداوند یوں فرماتا ہے کہ تمہارے باپ دادوں نے مجھ میں کون سی ناانصافی فرمائی جو وہ مجھ سے دُور بھاگے اور بطلان کے پیرو ہو گئے اور آپ باطل ہو گئے۔

نحمیاہ ۹ - ۲۶ میں ہے۔
وہ نافرمان نکلے اور تجھ سے پھر گئے اور انہوں نے تیری شریعت کو اپنی پس پشت پھینکا۔ اور تیرے نبیوں کو جو نصیحت دیتے تھے۔ قتل کیا اور انہوں نے کاموں سے تجھے غصّہ دلایا۔

تواریخ ۲ - باب ۲۴ آیت ۲۱ میں ہے۔
پھر جب یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بُت پرستی اور بدکاری ہو گئی، اور زکریا نبی نے اس کے خلاف آواز اٹھائی تو شاہ یہودا کے حکم سے ان کو عین ہیکل سلیمانی میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا گیا۔

ایک اور نبی حضرت عاموس کے متعلق لکھا ہے کہ:
جب انہوں نے سامریہ کی اسرائیلی ریاست کو اس کی گمراہیوں اور بدکاریوں پر ٹوکا۔ اور ان حرکات کے بُرے انجام سے خبردار کیا تو ان کو نوٹس دیا گیا کہ ملک سے نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوّت کرو۔

عاموس باب ۷ آیت ۱۰ - ۱۳

یہ مختصر اقتباسات عہدِ قدیم کے تھے۔ اب عہدِ جدید کے نوشتوں کے ایسے ہی مختصر نمونے ملاحظہ فرمائیے:

تم اپنی نسبت گواہی دیتے ہو کہ ہم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہیں۔ اے یروشلم اے یروشلم تو نبیوں کو قتل کرتی ہے اور جو تیرے پاس بھیجے گئے ان کو سنگسار کرتی ہے۔

متی ۲۳ - ۲۹ - ۳۷، لوقا ۱۲، ۲۴، ۲۵

حضرت یحییٰ (یوحنا) نے جب ان بداخلاقیوں کے خلاف آواز اٹھائی جو یہودیہ کے فرمانروا ہیرودیس کے دربار میں کھلم کھلا ہو رہی تھی تو پہلے وہ قید کئے گئے پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش

پر قوم کے اس صالح ترین آدمی کا سر قلم کر کے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کر دیا۔
مرقس باب ۶ آیت ۱۷-۱۹

سلسلہ اسرائیلی کے خاتم نبوت حضرت عیسیٰ ہیں۔ حال میں اٹلی کے ایک ایڈوکیٹ اور انگلستان کے ایک بیرسٹر نے قدیم کاغذات کی چھان بین کر کے آپ کے مقدمہ کی رودادیں الگ الگ شائع کی ہیں یہ پڑھنے کے لائق ہیں۔ ان سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کے مقدمہ میں یہ نہیں ہوا کہ رومی حاکم عدالت سے سزائے صلیب کا فیصلہ سنانے میں کوئی اجتہادی غلطی ہوئی بلکہ ہوا یہ کہ یہود نے بالکل ایک جھوٹا استغاثہ گڑھا اور پہلے اپنی مذہبی عدالت میں اور پھر ملک کی عام فوجداری عدالت میں بالکل ہی بے ضابطہ کارروائیاں کر کے سزا دلانے میں کامیاب ہو گئے بلکہ لکھا ہے کہ:

جب رومی حاکم پیلاطس نے یہود سے کہا کہ آج عید کے روز میں تمہاری خاطر یسوع اور براباڈاکو دونوں میں سے کس کو رہا کر دوں۔ تو ان کے پورے مجمع نے کہا ڈاکو کو چھوڑ دو اور یسوع کو پھانسی پر لٹکا دو۔

متی باب ۲۷ آیت ۲۱، ۲۶

یہ ہے قرآن کے اس مختصر سے فقرے کی تاریخ غرض قتل انبیاء کا الزام یہود پر قرآن نے لگایا نہیں بلکہ بتایا ہے۔ ان کی فرد جرم کا یہ عنوان قدیم نوشتوں میں موجود ہے۔ قرآن نے صرف تصدیق و توثیق کی ہے۔

اس حقیقت کا اظہار خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے فرمایا ہے۔ مولانا عثمانی فرماتے ہیں۔

حدیث میں ہے کہ بنی اسرائیل نے ایک دن میں تینتالیس نبی اور ایک سو ستر یا ایک سو بارہ صالحین کو شہید کیا۔

حافظ ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کے حوالہ سے پوری روایت یہ لکھی ہے کہ:

ابو عبیدہ ابن الجراح کہتے ہیں کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ روز قیامت سب سے زیادہ عذاب کس کو ہوگا فرمایا اس شخص کو جو نبی کا قاتل ہوگا یا ایسے شخص کو قتل کرے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ ادا کر رہا ہو اس کے بعد حضور انور نے زیر تشریح آیت کی تلاوت فرمائی اور بتایا کہ اے ابو عبیدہ بنی اسرائیل نے صرف ایک روز میں ۴۳ نبیوں کو قتل کیا۔ اسی روز ۱۷۰ آدمی امر بالمعروف کا فریضہ ادا کرنے کے لئے آمادہ ہوئے تو شام تک ان کا بھی کام تمام

کر دیا۔ ان ہی لوگوں کا قرآن کی اس آیت میں تذکرہ ہے۔

علمبردارانِ حق وعدل کو قتل کرنا

۴۵۔ اس آیت میں یہودیوں پر تیسری فردِ جرم یہ لگائی گئی ہے کہ یہ ان لوگوں کے بھی قاتل ہیں جو لوگوں کو اخلاق اور معاملات میں عدل و انصاف کی تلقین کرتے رہے ہیں یعنی ان لوگوں کے خون سے بھی ان کے ہاتھ رنگے ہوئے ہیں جو ان میں اصلاح و تجدید اور حق و عدل کی دعوت لیکر اُٹھے۔

قسط کے معنے عربی میں انصاف کے آتے ہیں۔ پہلے پڑھ آئے ہو کہ دنیا کا سارا کارخانہ جو آسمان سے لے کر زمین تک پھیلا ہوا ہے صرف اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے بل بوتے پر قائم ہے۔ وہ اپنی تمام مخلوقات میں اپنی شہنشاہی پورے انصاف کے ساتھ قائم کئے ہوئے ہے اور یہی اس کی واحدانیت کی دلیل ہے۔ اور اس کا عدل و انصاف صرف نظم و سلطنت ہی کے لئے مخصوص نہیں ہے کہ بلکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اس کی ضرورت ہے اور نظامِ عالم محض قسط کی وجہ سے قائم ہے چنانچہ قرآن نے زندگی کے ہر شعبہ میں انصاف و قسط کو قائم کرنے کا مطالبہ کیا ہے

ذرا دونوں کا تقابلی مطالعہ فرمائیں۔ اللہ کی صفت اگر قائم بالقسط ہے تو اہلِ ایمان سے اسی پر عمل کے مطالبہ میں صرف قائم نہیں بلکہ قوام بننے کا مطالبہ کیا ہے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے کہ وہاں عدل کے خلاف کا امکان ہی نہیں اور یہاں چونکہ ہر وقت اور ہر قدم پر اس کا اندیشہ ہے اس لئے اُمت کو حکم دیتے وقت اس پر زور دیا گیا ہے۔ قرآن نے جہاں دین حق کے تین بنیادی اُصول واضح کئے ہیں وہاں بتایا ہے کہ زندگی میں عدل و انصاف کو قائم کرنا عبادت میں توجہ اور خدا پرستی میں اخلاص اصل اُصول ہیں لیکن ان تینوں میں عدل و انصاف کے بارے میں اندازِ بیان عجیب و دلکش اختیار فرمایا ہے۔

چنانچہ ارشاد ہے۔ **قل امر ربی بالقسط**

اسی اہمیت کی بنا پر انبیاء کے جانشین اپنی دعوت میں اس پر زور دیتے اور اس کی تبلیغ و اشاعت کرتے تھے۔

یہ لفظ قرآن میں ۱۵ بار آیا ہے اور جہاں بھی آیا ہے حقوق کی نگرانی اور تحفظ کے بارے میں آیا ہے یتیموں کے حقوق کی حفاظت کے لئے فرمایا۔

ان تقوموا للیتامی بالقسط .. یتیموں کے حق میں انصاف ملحوظ رکھو۔

عام معاملات میں عدل و انصاف کی سب سے زیادہ ضرورت ہے، اس لئے فرمایا

اوفوا الکیل والمیزان بالقسط اور انصاف کے ساتھ ناپ تول پورا کرو۔

بعض معاصر مفسرین نے قیام بالقسط کی اہمیت کو اس قدر محسوس کیا کہ قیام بالقسط کو ایمانیات میں داخل کر دیا ہے۔ اس کی اہمیت سے کسی ذہین آدمی کو انکار نہیں ہے لیکن ہر اہم بات کو ایمانیات کا جزو بنا دینا دین کی کوئی خدمت نہیں ہے۔

بہر حال یہاں قرآن صرف یہ بتا رہا ہے کہ یہودیوں نے ان لوگوں کے ساتھ بھی وہی معاملہ کیا جو انبیاء کے ساتھ کرتے تھے جو ان کی زندگیوں میں از سرِ نو اللہ کے بتلائے ہوئے نظامِ حق و عدل کو قائم کرنا چاہتے تھے۔ یہودیوں نے اپنے تمام حربوں سے کام لے کر ان کی مخالفت کی اور جس پر بس چلا اس کو قتل کر دیا۔

مولانا عثمانی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ یہاں نصاریٰ نجران اور دوسرے کفار کو سنایا جا رہا ہے کہ احکامِ الٰہی سے منکر ہو کر انبیاء اور انصاف پسند ناصحین سے مقابلہ کرنا اور پرلے درجہ کی شقاوت و سنگدلی سے ان کے خون سے ہاتھ رنگنا معمولی چیز نہیں ایسے لوگ سخت دردناک عذاب کے مستحق ہیں۔

یعنی جن لوگوں کا ہمیشہ شیوہ رہا ہے کہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے رہے، اللہ کے نبیوں کو قتل کرتے رہے۔ اور ان لوگوں کے خون سے ہاتھ رنگتے رہے جو ان میں اصلاح اور عدل و انصاف کی دعوت لے کر اُٹھے یہ کیونکر ممکن ہے کہ آج ان کا مذاق تبدیل ہو جائے۔ جب اللہ کے پیغمبر آپ کے مخاطب اپنے اسلاف ہی کے نقشِ قدم پر چل رہے ہیں تو ان سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ وہ اسلام کی اس دعوت کو قبول کریں گے جو آپ لے کر آئے ہیں۔ پس ان کے لئے اگر آپ کوئی خبر ہے تو بس یہی ہے کہ ان کیلئے دردناک عذاب ہوگا۔

دونوں جہاں کی محرومی

۲۲۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دُنیا و آخرت میں اکارت گئے اور ان کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ یعنی دونوں جہان میں کامیابی سے محروم ہیں۔ ان کی محنت برباد اور ان کی کوششیں اکارت ہوں گی دنیا و آخرت میں جب سزا ملے گی تو کوئی بچانے والا نہ ہوگا۔[1]

یہ بڑی معنے خیز تعبیر ہے، اس کے بیک وقت دو مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ دُنیا کی زندگی

---

[1] افاداتِ مولانا عثمانی

میں دین کے نام پر کئے ہوئے سارے اعمال بیکار ہو جائیں گے اور بیکار ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو ان کے ان اعمال کی جو نیکیاں سمجھ کر کر رہے تھے کوئی قیمت نہ ملے گی ۔ وجہ ظاہر ہے کہ اعمال کی قبولیت کے لئے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ ایمان کی زمین پر ہوں ۔ ایمان کے بغیر خواہ کیسا ہی اچھا ہو وہ قابلِ قبول نہیں ہے کیونکہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادے اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادے کا بھی عدم ہو جاتا ہے ۔ جس پر حسنِ عمل کا دارو مدار ہے ۔ عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا، جس نے زمانۂ جاہلیت میں بڑی نیکیاں کیں مگر بایں ہمہ کافر تھا ۔ اس کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت عائشہ نے ایک دفعہ دریافت کیا کہ یارسول اللہ عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت میں جو نیکی کے کام کئے کیا ان کا ثواب اس کو ملے گا ۔ فرمایا نہیں اے عائشہ کیونکہ کسی دن اس نے یہ نہیں کہا کہ یا الٰہا میرے گناہوں کو قیامت میں بخش دے ۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی وہ کوششیں اور تدبیریں جو وہ قرآن و اسلام یا دوسرے الفاظ میں اسلام کے نظام حیات کی مخالفت میں کر رہے ہیں اکارت جائیں گی اور اسلام کا بول بالا ہو کر رہے گا اور خواہ کفر کی کتنی بڑی یونین اور متحدہ محاذ قائم کریں یہ اپنی کوششوں میں ہرگز ہرگز کامیاب نہ ہوں گے اور جب ناکامیوں کا ان کو سامنا ہو تو بے یار و مددگار ہو کر رہ جائیں گے ۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

نبی کی امتوں میں جب بگاڑ پیدا ہو جاتے تو اصلاح و تجدید کے لئے محنت کرنے کا امر بالمعروف اور برائیوں کے خلاف احتجاج کرنے کا نام نہی عن المنکر ہے ۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ یہ آیتِ قرآنی بتا رہی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر گزشتہ امتوں میں بھی واجب تھا ۔ صحیح مسلم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کے چہرے سے اس ارشاد کے ذریعے نقاب کشائی فرمائی ہے کہ :

مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ نے مبعوث فرمایا اس کو اپنی امت میں سے ایسے مخلص پیرو اور ساتھی ضرور ملے جو اس کے طریقے کو مضبوطی سے اختیار کرتے اور اسکے احکام کا اتباع کرتے پھر ان کے بعد ان کی جگہ ایسے ناخلف آتے جن کا حال یہ ہوتا کہتے وہ جس پر عمل نہ کرتے اور کرتے وہ جس کا حکم نہ ہوتا ۔ لہٰذا جس نے ان سے اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے زبان سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے اور جس نے اپنے دل سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے ۔ اس کے بعد رائی برابر بھی ایمان کا درجہ نہیں ہے ۔

ظاہر ہے کہ اس ارشاد کا اصلی منشا یہ بتانا ہے کہ انبیائے سابقہ کی اُمتوں میں ایسا ہوتا رہا ہے، اور یہ بھی اسی آیت کے ضمن میں قرطبی نے لکھا ہے کہ یہ آیتِ قرآنی اس موضوع پر ایک رہنما اصول کی حیثیت رکھتی ہے کہ اندیشہ قتل کی صورت میں بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا جائز ہے۔ کہنے والے یہاں تک کہہ گئے کہ اگر شہری زندگی چار چیزوں سے ہمدوش ہو تو ہر قسم کی بلا سے محفوظ رہے گی۔

اوّلاً : اقتدار عدل پرور ہو۔

ثانیاً : علماء ہدایت و خیر کے داعی ہوں۔

ثالثاً : مشائخ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے رہے ہوں۔

رابعاً : عورتیں پردے میں ہوں۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُدْعَوْنَ إِلَى كِتَابِ اللَّهِ
لِيَحْكُمَ بَيْنَهُمْ ثُمَّ يَتَوَلَّى فَرِيقٌ مِّنْهُمْ وَهُم مُّعْرِضُونَ ۝
ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَن تَمَسَّنَا النَّارُ إِلَّا أَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ ۖ وَ
غَرَّهُمْ فِي دِينِهِم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ۝ فَكَيْفَ إِذَا جَمَعْنَاهُمْ
لِيَوْمٍ لَّا رَيْبَ فِيهِ وَوُفِّيَتْ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا
يُظْلَمُونَ ۝٢٥

اے پیغمبر کیا تم نے ان لوگوں کی حالت نہیں دیکھی جن کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے[۴۷] انہیں جب اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ اُن میں فیصلہ کر دے تو اس پر اُن کا ایک گروہ اس سے صاف روگرداں ہے اور اصل یہ ہے کہ کتاب اللہ کی طرف سے اُن سب کے رُخ پھرے ہوئے ہیں[۴۸]۔ اور ان کی یہ حالت اس لئے ہوئی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں صرف چند روز کے سوا نہیں چھوئے گی[۴۹]۔ اور اُن کو اُن کے دین کے بارے میں ان کی افترا پردازیوں نے مبتلائے فریب کر دیا ہے[۵۰]۔

اگر صورتِ حال یہی ہے تو ان کا اس وقت کیسا حال ہوگا؟ جب ہم اُن کو اس روز اپنے حضور میں جمع کریں گے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق بدلہ دیا جائے گا اور کسی کیساتھ بے انصافی نہ ہوگی۔

حق بیزاری کے اور مظاہر

اس سے پہلی آیت میں کفر کے آثار و نتائج سے بحث کرتے ہوئے بتایا تھا کہ ان میں قتل انبیاء اور داعیانِ حق و عدالت کی دشمنی جیسے جرائم رونما ہوگئے اور اس کے نتیجے میں ان کے تمام اعمال اکارت ہوگئے۔ اب اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ حق و عدالت کی حد تک ان کی طبائع اس درجہ مسخ ہو چکی ہیں کہ ان کے علماء علم و عمل میں تضاد کے شکار، اپنے بارے میں نجات یافتہ ہونے کا غرور، اور بدعات کے دام فریب میں مبتلا ہو کر اللہ کے قانونِ نجات سے بے خبر ہو چکے ہیں۔ حق بیزاری کے یہ مظاہر اس گروہ میں پیدا ہوتے ہیں جس کی فکری حالت اس قدر مسخ ہو چکی ہو کہ حق کی دشمن اور برائیوں کی پرستار ہو جائے۔ علماء یہود کی یہ گمراہی کہ جس کتاب کو کتاب الٰہی مانتے تھے۔ جب قبولِ حق اور محمد رسول اللہ کی رسالت کے لئے اسی کا حوالہ دیا جاتا تو صاف انکار کر دیتے اور ایسا وہ صرف اس لئے کرتے تھے کہ ان کو یہ زعم فاسد تھا کہ ہم نجات یافتہ ہیں اور اپنے نجات یافتہ ہونے کا گھمنڈ اانہوں نے کچھ رسُوم، کچھ رواجوں اور بدعات و مخترعات کی افترا پردازیوں کی اساس پر بنا رکھا تھا۔ اس نشہ میں وہ اس قدر سرشار تھے کہ ان کو یہ پتہ نہیں تھا کہ اللہ کا قانونِ نجات کیا ہے۔ قرآن نے ان ہی مظاہر کی نشاندہی کی ہے۔

علم اور عمل کا تضاد

۷۴۔ اسے پیغمبر کیا تم نے ان لوگوں کی حالت نہیں دیکھی جن کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے یعنی تھوڑا بہت حصہ فہم کتاب کا ملا۔ آیت میں کتاب سے مراد توریت ہے اور ان لوگوں سے جن کو کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے مراد یہودی اور عیسائی ہیں۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں

کو جو کتاب تورات اور انجیل کے نام سے دی گئی تھی وہ اُن کے ہاتھوں میں نہیں رہی اس کا صرف ایک حصہ ان کے پاس رہ گیا ہے بیشتر حصہ طاقِ نسیان ہو چکا ہے۔

موجودہ تورات وانجیل میں کچھ آیات کتاب الٰہی ہیں

اس سے معلوم ہوا کہ موجودہ تورات وانجیل میں کچھ حصہ اصل تورات وانجیل کا ہے بیشتر تحریف و تصرف کی نذر ہو چکا ہے۔ جن پانچ کتابوں کو آج تورات کہا جاتا ہے اور ان کی نسبت موسیٰ علیہ السلام کی طرف کی جاتی ہے تو ان کے موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہونے اور محفوظ ہونے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ محققین کے نزدیک تاریخی اور روایتی طور پر یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ یہ تورات حضرت موسیٰ کے پانچ سو سال بعد قیدِ تحریر میں آئی ہے اور تاریخی طور پر تا حال یہ بھی ثابت نہیں ہوا کہ حضرت موسیٰ پر نازل شدہ کتاب کس زبان میں تھی۔ یہی حال انجیل کا ہے جسے عہد جدید کہا جاتا ہے، اناجیلِ اربعہ میں بھی کچھ آیات انجیلِ مسیح کی موجود ہیں ورنہ یہ خود انجیل نہیں ہیں بلکہ حضرت مسیح کی تاریخ ہیں۔

قرآن نے تورات وانجیل کے بارے میں جیسے یہاں یہ بتایا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کے پاس تورات وانجیل کا کچھ حصہ محفوظ ہے ایسے ہی دوسرے موقع پر یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ،

نسوا حظا مما ذکروا بہ ۔ یہودی اور عیسائی کتابِ الٰہی کا ایک حصہ فراموش کر بیٹھے ہیں۔

قرآن نے اپنے اس انکشاف کے ذریعے دو اہم حقائق کی طرف رہنمائی کی ہے۔

اوّلاً یہ کہ قرآن اللہ کی جانب سے نازل شدہ کتاب ہے کیونکہ اس حقیقت پر جو اس وقت دنیا کی نظروں سے مخفی تھی۔ آج تیرہ صدیاں گزرنے کے بعد اہلِ علم کا تحقیقی موقف اور خود عیسائیوں کا اعتراف ہے کہ موجودہ توریت وانجیل میں اصل کتابوں کا صرف ایک حصہ ہے اور ان کا حصہ یہودیوں اور عیسائیوں کے پاس نہیں۔

ضرورتِ قرآن کی طرف اشارہ

ثانیاً: ضرورتِ قرآن کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ چونکہ اللہ کی جانب سے آئی ہوئی کتابوں کا ایک حصہ خود حاملین کتاب کے تصرفات اور تحریفات سے طاقِ نسیان ہو گیا اور انسانیت کے سامنے اللہ کی ہدایت نہ رہی تھی اس لئے وہی پرانی ہدایات اب قرآن کے نام سے آئی ہیں۔ قرآن نے دعویٰ نہیں کیا کہ وہی ہدایت ہے اور بقیہ ساری کتابیں موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی

اور کامل ہدایت جو اپنے اپنے دفتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے چونکہ ان کے پیرو اپنی تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات اس کو برباد کر چکے تھے اس لئے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو لے کر آخری بار تشریف لاتے ہیں اور اب وہ ہدایت ہمیشہ کامل رہے گی۔ کبھی ناقص نہ ہوگی کیونکہ یہ صحیفہ ہدایت تحریف و اختلاف اور تغیر سے محفوظ و پاک رہے گا۔ یہ کتاب اللہ ہونے کے ساتھ کلام اللہ ہے۔

کتاب اللہ سے روگردانی

۴۸ ۔ انہیں جب اللہ کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے تاکہ وہ ان میں فیصلہ کرے۔ تو اس پر ان کا ایک گروہ اس سے صاف روگردان ہے۔ یعنی جب انہیں دعوت دی جاتی ہے کہ قرآن کی طرف آؤ جو خود تمہاری تسلیم کردہ کتابوں کی بشارات کے موافق آیا۔ اور تمہارے اختلافات کا ٹھیک ٹھیک فیصلہ کرنے والا ہے تو ان کے علماء کا ایک فریق تغافل برت کر منہ پھیر لیتا ہے۔ حالانکہ قرآن کی طرف دعوت فی الحقیقت تورات وانجیل کی طرف دعوت ہے بلکہ کچھ بعید نہیں کہ اس جگہ کتاب اللہ سے مراد تورات و انجیل ہی ہو یعنی تمہارے نزاعات کا فیصلہ تمہاری ہی کتاب پر چھوڑتے ہیں مگر غضب تو یہ ہے کہ وہ اپنی خواہشات اور پست اغراض کے لئے خود اپنی کتاب کی ہدایات سے بھی منہ پھیر لیتے ہیں نہ اس کی بشارات سنتے ہیں نہ احکام پر کان دھرتے ہیں ۔ چنانچہ رجم زانی کے مسئلہ میں تورات کے حکم منصوص سے صریح روگردانی کی ۔ جیسا کہ سورۂ مائدہ میں آرہا ہے [1]

یعنی ان سے کہا جاتا ہے کہ خدا کی کتاب کو آخری سند مان لو۔ اس کے فیصلے کے آگے سر جھکا دو۔ اور جو کچھ اس کی رُو سے حق ثابت ہو اسے حق اور جو اس کی رُو سے باطل ثابت ہو اسے باطل تسلیم کر لو۔ واضح رہے کہ اس مقام پر خدا کی کتاب سے مراد تورات وانجیل ہے۔[2]

دراصل اس آیت میں کتاب اللہ کے مصداق کی تعین میں شارحین قرآن کا اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ کتاب اللہ سے مراد تورات وانجیل ہے ۔ ابن جریر، ابن کثیر، آلوسی، نسفی، ابوحیان کی رائے یہی ہے بلکہ بقول مولانا ادریس رحمہ اللہ محققین نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب اہل کتاب کو دعوت اسلامی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت

---

[1] افادات شیخ الاسلام ، تفہیم القرآن

کی صداقت جتانے کے لئے ان کی کتاب کی طرف بلایا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ آؤ اس معیار پر پرکھ لو اور اپنی کتاب کو حکم بنا لو اور دیکھ لو کہ تمہاری کتاب کی بتائی ہوئی نشانیوں کے مطابق اسلام کے پیغمبر کی آمد ہوئی ہے کہ نہیں تو یہ لوگ خود کتاب اللہ سے اعراض کرتے ہیں۔ اور تورات و انجیل کو بھی حکم تسلیم نہیں کرتے۔ حالانکہ تورات میں حضرت موسیٰ نے صاف اللہ سبحانہ کے حوالہ سے فرمایا تھا۔

میں ان کے لئے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا۔ وہ سب ان سے کہے گا۔

(استثنا ۱۸-۱۹)

اسی طرح حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ:

وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی رُوح ہے جسے باپ خدا میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔

(یوحنا - ۲۶)

آخر وہ موعود و الامم آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ کے مانند اور بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے آیا ہوں اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی وہ سچائی کی روح ہوں۔ جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے کے لئے آئی ہے۔ لیکن اس کے باوجود یہودیوں اور عیسائیوں نے اعراض سے کام لیا۔ اور ان کا یہ اعراض وقتی نہیں بلکہ کتاب اللہ سے بے رُخی اُن کی قومی خصلت بن چکی ہے۔

نہیں بلکہ ہمیشہ سے ان کی روش ہی یہ رہی ہے۔ اس فقرے میں بیک وقت دو باتیں کہی گئی ہیں۔ ایک طرف اس کے منطوق میں اگر اہلِ کتاب کو سخت ملامت ہے تو دوسری اس کے مدلول میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کے لئے تسلّی و تسکین کا سامان بھی ہے مطلب یہ ہے کہ حق سے اعراض جن کا قومی نشان بن چکا ہے وہ اگر آپ کو رسول نہیں مانتے تو اس سے آپ کو دلگیر نہیں ہونا چاہیے۔ اس میں آپ کا قصور نہیں ہے بلکہ ان کے قومی مزاج کے بگاڑ کا یہ نتیجہ ہے۔

اور کچھ کہتے ہیں کہ کتاب اللہ سے مراد اس آیت میں قرآن ہے۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب ان کو قرآن کی طرف دعوت دی جاتی ہے کہ آؤ اس کے ذریعے ان اختلافات کو رفع کر لو جو دین کے بارے میں موجود ہیں کیونکہ قرآن حکیم کا یہ دعویٰ ہے کہ تمام اختلافات کا فیصلہ کرنے آیا ہے۔

نجات یافتہ ہونے کا غرور

۴۹ ۔ اور ان کی یہ حالت اس لئے ہوئی ہے کہ وہ کہتے ہیں کہ دوزخ کی آگ ہمیں چند روز کے سوا نہیں چھوئے گی۔ یعنی ان کے غرورِ طغیان اور گناہوں پر دلیری کا سبب یہ ہے کہ یہ سزا کی طرف سے بے خوف ہیں۔ ان کے بڑے جھوٹ بنا کر کہہ گئے ہیں کہ ہم میں اگر کوئی سخت گناہ گار بھی ہوگا تو گنتی کے چند روز سے زیادہ عذاب نہ پائے گا۔ جیسا کہ سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے اور اسی طرح کی بہت سی باتیں گڑھ رکھی ہیں۔ مثلاً کہتے تھے کہ ہم تو اللہ کے چہیتے ہیں یا انبیاء کی اولاد ہیں اور اللہ تعالیٰ نے یعقوب کی اولاد سے وعدہ کیا ہوا ہے کہ ان کی اولاد کو سزا نہ دے گا مگر یوں ہی برائے نام قسم کھلانے کو۔ اور نصاریٰ نے کفارے کا مسئلہ نکال کر گناہ و معصیت کا سارا حساب ہی بے باق کر دیا تھا۔

اللھم اعذنا من شرور انفسنا [۱]

یہ اُن کے غرور کی ایک مثال ہے۔ یہود کی صورت میں اپنے لئے دوزخ کے ابدی عذاب کے قائل نہ تھے۔ انہوں نے جنت و دوزخ کو اعمال کا نتیجہ سمجھنے کے لئے یہ خیال کر رکھا تھا کہ وہ خدا کے برگزیدہ امت ہیں۔ اس لئے اُن کے اعمال خواہ کچھ ہوں۔ اوّل تو وہ دوزخ میں نہیں جائیں گے اور اگر بھیجے ہی گئے تو معمولی طور پر کچھ سزا بھگت کر جنت کو واپس کر دیئے جائیں گے۔ ان کے اس واہمہ نے ان کے عوام اور خاص سب کو شریعت کی ذمہ داریوں سے بالکل بے پرواہ کر دیا۔ نجات کے معاملہ میں ان کا سارا اعتماد عمل اور عقیدے کے بجائے اپنی گروہی نسبت پر تھا۔ ان کو اپنے محبوبِ خدا اور خاص خدا کے کنبہ ہونے پر بے انتہا غرور تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ ہم کچھ کریں ہم سے قیامت میں مواخذہ نہ ہوگا۔ اس غلط فہمی میں ان کے عوام اور خواص سب مبتلا تھے وہ سمجھتے تھے کہ ہم خواہ کچھ کریں، بہر حال چونکہ ہم یہودی ہیں لہٰذا جہنم کی آگ ہم پر حرام ہے۔ اور بالفرض اگر ہم کو سزا دی بھی گئی تو بس چند روز کے لئے ہم وہاں جائیں گے۔ اور پھر سیدھے جنت کی طرف پلٹا دیئے جائیں گے۔ مولانا دریا بادی کی تصریح کے مطابق روز دی ہیں جیسا کہ پادری راڈول نے اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں اکابرِ یہود کے حوالہ سے لکھا ہے۔ جن دنوں میں قومِ اسرائیل گوسالہ پرستی میں مبتلا رہی تھی۔ بلکہ بعض یہودی ماخذوں سے تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اسرائیل اپنے کو آتشِ دوزخ کی زد سے بالکل ہی باہر اور محفوظ سمجھتے تھے۔ چنانچہ جیوئش

---

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

انسائیکلوپیڈیا میں یہ عقیدہ یوں نقل ہوا ہے" آتشِ دوزخ گنہ گارانِ قوم یہود کو چھوئے گی ہی نہیں اس لئے وہ درجہنم پر پہنچتے ہی اپنے گناہوں کا اقرار کریں گے اور خدا کے پاس واپس آجائیں گے۔

(جلد ۵ ص ۵۸۳)

بدقسمتی سے آج ہمارے عوام بھی کچھ اسی قسم کی غلط فہمی کا شکار ہیں۔ اُن کا ذہن ہی بن چکا ہے کہ چونکہ ہم آخری پیغمبر کی اُمت ہیں اس لئے ہماری بخشش تو یقینی ہے اور اس بے خوفی کی وجہ سے آج زندگی کے سارے گوشوں میں ہمارا اللہ کی وحی اور نبوّت کے عمل سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے۔

بدعات کا دامِ فریب

۵۰ ۔ اور ان کو دین کی زندگی میں اُن کی افترا پردازیوں نے مبتلائے فریب کر دیا ہے۔ عالمِ غیب کے بارے میں نبوّت کی رہنمائی کے بغیر اپنی جانب سے کوئی بات گڑھ لینا افتراء علی اللہ کذباً ہے اور اسی کو قول علی اللہ بغیر علم کہتے ہیں۔ یہودیوں کے پیشواؤں اور سرداروں نے قسم قسم کے عقائد کا طومار بنا رکھا تھا اور ان ہی میں سے ایک عقیدہ یہ بھی تھا کہ یہودیوں پر آتشِ دوزخ حرام ہے۔ ایسے ہی عیسائیوں نے بھی سارے عالم کے گناہوں کا پشتارہ حضرت مسیح پر ڈال کر اپنے لئے نجات کا دروازہ کھول لیا تھا۔ مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی۔ ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہو گئی تھی۔ بہرحال جرائم میں سب سے زیادہ جُرم یہی ہے بلکہ ادیان و شرائع میں جن برائیوں پر ایکا اور اتفاق پایا جاتا ہے یہ ان میں سے ایک ہے یہ کبھی اور کسی حال میں بھی روا نہیں ہے۔ اس کی سنگینی کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس میں ایک طرف اللہ پر جھوٹ بولا جاتا ہے، دوسری طرف اللہ کے بارے میں ایسی بات کہی جاتی ہے جو اس کے شایانِ شان نہیں۔ دین کی رُوح کا سارا بگاڑ اور دین کی صورت کی تبدیلی کا سرچشمہ یہی ہے حق کو باطل اور باطل کو حق کے لباس میں اسی راہ سے نمایاں کیا جاتا ہے۔ دوست کو دشمن اور دشمن کو دوست یہی بناتا ہے۔ مبغوض کو محبوب اور محبوب کو مبغوض بنانا اس کے بائیں ہاتھ کا کرتب ہے۔ محرمات میں افتراء علی اللہ کذباً سے عظیم جُرم اور اس سے بڑا گناہ کوئی نہیں۔ شرک اور کفر کی یہی اساس ہے گمراہیوں اور بدعات کی پروردگاری اسی کی آغوش کرتی ہے۔ دین کی زندگی میں ہر بدعت افتراء علی اللہ کذباً کا نتیجہ ہے۔ اُمت میں اسلاف اور ائمہ نے سب سے زیادہ احتجاج اسی کے خلاف کیا ہے قرآن کے نزدیک اس جُرم کا مرتکب سب سے بڑا ظالم ہے۔

اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ باندھے۔

اس آیت میں بیان شدہ جرائم پر ذرا غور کریں، کتاب اللہ سے اعراض اپنے نجات یافتہ ہونے کا عقیدہ اور آخر میں افتراء کو بیان کیا گیا ہے۔ جو چیز سب سے زیادہ سنگین ہے اور جس کے برگ وبار سے عقائد و اعمال اور اخلاق پر تباہی آتی ہے اس کو بالکل آخر میں بیان کیا ہے۔ قرآن نے سورہ اعراف میں جہاں محرمات کی فہرست دی ہے وہاں بھی قول علی اللہ بغیر علم کو بالکل آخر میں رکھا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ افتراء علی اللہ فواحش، اثم، بغی، شرک سے زیادہ سنگین جرم ہے۔ ابن القیم نے مدارج السالکین میں اس پر مبسوط مقالہ لکھا ہے۔

قیامت الٰہی صفتوں کا ایک ناگزیر تقاضا ہے

۵۱ ۔ اگر صورتِ حال یہی ہے تو ان کا اس وقت کیا حال ہوگا جب ہم ان کو اس روز اپنے حضور میں جمع کریں گے جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور ہر جان کو اس کی کمائی کے مطابق بدلہ دیا جائے گا اور کسی سے بے انصافی نہ ہوگی۔ یعنی اس وقت پتہ چلے گا کہ کس اندھیرے میں پڑے ہوئے تھے۔ جب محشر میں تمام اوّلین و آخرین اور خود اپنے بزرگوں کے سامنے رسوا ہوں گے اور ہر عمل کا پورا پورا بدلہ ملے گا۔ نہ کفارے کا مسئلہ یاد آئے گا نہ نسبی تعلقات اور من گھڑت عقیدے کام دیں گے[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ زندگی تو مادی ہے جیسی بھی گزرتی ہے گزر جائے گی، لیکن اس زندگی میں یہ لوگ کیا کریں گے جہاں زندگی کی تشکیل ہی اعمال سے ہوگی۔ قرطبی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ اس آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو مخاطب بنا کر کہا جا رہا ہے کہ نجات کے ان ٹھیکیداروں کا اس وقت کیا بنے گا اور ان پر کیا گزرے گی جب ان کی پوری زندگی کے کارنامۂ اعمال کی جزا ان کو ملے گی۔ آخرت کی یہ زندگی چونکہ عالم غیب سے تعلق رکھتی ہے۔ اس لئے قرآن لا ریب فیہ کی قید لگا کر بتاتا ہے کہ اس کا ہونا اتنا یقینی ہے کہ ہر قسم کے شک و شبہ کے گرد و غبار سے بالا ہے۔ مومن ہونے کیلئے جیسے اللہ پر ایمان لانا ضروری ہے ایسے ہی دوسری زندگی پر ایمان ضروری ہے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قیامت کا آنا اور دوسری زندگی ہونا دراصل اللہ تعالیٰ کی بہت سی صفتوں کا ایک ناگزیر تقاضا ہے۔ مثلاً اس کی صفتِ عدل کا، اس کی صفتِ حکمت کا، اس کی صفتِ رحمت کا،

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام۔

اس کی صفت قدر شناسی کا اور اس کی صفتِ حاکیت کا، قیامت کے نہ آنے اور انسانی عمل کے جزا نہ ملنے کی صورت میں یہ بات محض ایک بے بنیاد دعویٰ بن کر رہ جاتی ہے کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا عادل اور حکیم ہے، رحیم اور شکور ہے مالک و فرمانروا ہے۔ اس لئے اللہ پر ایمان رکھنا اور جزا و سزا کا انکار کرنا دونوں باتیں ایمان کی حد تک یکجا نہیں ہو سکتی ہیں۔

اس دن کی ایک خصوصیت تو یہ بیان ہوئی ہے کہ اس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ اس روز ہر نفس کو اس کی کمائی پوری دی جائے۔ کسی کے ساتھ کوئی کمی نہ کی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ کتاب خود سوچ لیں کہ آج ایک من گھڑت عقیدے کے سہارے خوابِ خرگوش کے مزے لے رہے ہیں اس سے بیدار ہونے کے بعد ان کو کس حقیقت سے دوچار ہونا ہے۔[1]

اور ظلم نہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ فرضی جرائم پر سزا نہ ہو گی۔ ان کاموں پر ہو گی جن کا جرم ہونا خود تسلیم کریں گے اور جس قدر سزا کا استحقاق ہو گا اس سے زیادہ نہ دی جائے گی نہ کسی کی ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی ضائع ہو سکے گی۔[2]

---

[1] تدبرِ قرآن۔ [2] افاداتِ شیخ الاسلام

قُلِ اللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ تُؤْتِي الْمُلْكَ مَنْ تَشَآءُ وَتَنْزِعُ الْمُلْكَ
مِمَّنْ تَشَآءُ ۖ وَتُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ ۖ بِيَدِكَ
الْخَيْرُ ۖ اِنَّكَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ تُوْلِجُ الَّيْلَ فِي النَّهَارِ
وَتُوْلِجُ النَّهَارَ فِي الَّيْلِ وَتُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَتُخْرِجُ
الْمَيِّتَ مِنَ الْحَيِّ وَتَرْزُقُ مَنْ تَشَآءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۝

اے پیغمبر کہو خدایا پادشاہی اور جہانداری کا مالک تو ہے جسے چاہے مُلک بخش دے اور جس سے چاہے لے لے، جسے چاہے عزت دے جسے چاہے ذلیل کر دے۔ تیرے ہی ہاتھ میں ہر طرح کی بھلائی ہے اور تُو ہر چیز پر قادر ہے۔ تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تُو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے اور تُو ہی جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور بے جان کو جاندار سے، اور جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔

قرآن کا تصوّرِ مملکت

اللہ سبحانہٗ کی الاہیت دو چیزوں سے عبارت ہے۔ ایک عبادت دوسرے اطاعت یا اِن

کہہ لیجئے ایک پرستش دوسرے بندگی۔ قرآن پرستش اور بندگی دونوں میں شرکت سے روکتا ہے۔ واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا (النساء ۳۶) اللہ کی عبادت کرو اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بناؤ اور وان اطعتموھم انکم لمشرکون اور اگر تم نے ان کی اطاعت کرلی تو تم شرک کرنے والے ہوگئے۔ اس کے گواہ ہیں کہ پرستش اور بندگی میں قرآن شرکت گوارا نہیں کرتا۔

اسی بنا پر قرآن میں شرک کی مغفرت نہ ہونے کا تذکرہ دوبارہ ہوا ہے۔ میری مراد قرآن میں النساء کی آیت ۴۸ - ۱۱۶ ہے یعنی ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ پہلی بار پرستش میں شرک کرنے والوں کی اور دوسری بار بندگی میں شرک کرنے والوں کی عدم مغفرت کا اعلان کیا ہے۔ پرستش میں شرک کے معاملہ کو فقد ضل ضلالا بعیدا پر اور بندگی میں شرک کے معاملہ کو

پر ختم کیا ہے۔ بلاشبہ جیسے دعاؤں، نیازمندیوں، طلب گاریوں میں کسی دوسری ہستی کو خدا کے ساتھ ملانا افتراء ہے ٹھیک اسی طرح فرمانبرداری اور طاعت گزاری میں کسی اور کو اللہ کے ساتھ ملانا ضلال بعید اور بے راہ روی ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ اگر عبادت وطاعت اللہ ہی کے لئے ہے تو پھر مملکت کی ماہیت اور اس کی بنیاد و اساس کے متعلق قرآنی نظریہ کیا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو مسجد کی زندگی ہو یا تختِ حکومت کی زندگی ہر شعبۂ حیات میں بنیادی نظریات اور اساسی اصولوں کا ماخذ انسان کے وہ تصورات ہوتے ہیں جو وہ خود اپنی ذات، اپنے آغاز و انجام اور کائناتِ خلقت سے اپنے تعلق کی نسبت قائم کرتا ہے یہی وہ بنیاد ہے جس پر بالآخر دیگر نظریات و تصورات قائم ہوتے ہیں۔ کیونکہ انسان اپنی تقدیر اپنے مرتبہ اور کائنات سے اپنے تعلق کی بابت جو تصور تعمیر کرے گا وہی اس کے جملہ اعمال و افعال کی تشکیل پر مؤثر ہوگا۔ بالفاظِ دیگر خدا کا تصور ہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس سے اعمال و افکار کی تمام شاخیں پھوٹتی ہیں۔ کسی جماعت کے سیاسی نظریات و عقائد کی حقیقت معلوم کرنی ہو تو سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس کے افراد اپنی تقدیر اپنی ابتداء اپنی انتہا سے اپنے تعلق کی نسبت بالفاظِ دیگر ذاتِ باری کے متعلق کیا تصور رکھتے ہیں۔ کیونکہ خدا کے تصور میں یہ تمام تصورات شامل ہیں۔ اللہ کا تصور بیک وقت انسان کے آغاز، انجام اور اس کی تقدیر کا بھی تصور ہے۔ اور یہی تصور اس کے مرتبہ حیثیت اور کائنات سے اس کے تعلق کو مقرر کرتا ہے۔

اس اعتبار سے غور کیجئے کہ قرآن نے اللہ کا تصور کیا قائم کیا ہے اور انسان کی ذات اور کائنات

سے اس کے تعلق، نیز اس کی تقدیر کی نسبت قرآنی نظریہ کیا ہے۔ قرآنی نقطہ نظر سے سارا ملک اور اقتدار اللہ سبحانہٗ کا ہے۔ اس آیت میں یہی بتایا گیا ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کی اور وہی شریعت وضع کر سکتا ہے۔ دوسرے سارے نظام اس اصول پر مبنی ہیں کہ حاکمیت انسان کی ہے اور وہ اپنے لئے شریعت وضع کرنے کا مجاز ہے۔ یہ دونوں اصول کبھی ایک دوسرے سے مل نہیں سکتے۔

یہ صرف ذاتِ باری کا کمال ہے کہ وہ اپنے حکیمانہ آئین و ضوابط سے سرمو انحراف نہیں کرتا۔ اور اپنے ارادے پر ایسا کامل اقتدار رکھتا ہے کہ جب اور جس طرف چاہتا ہے اسے موڑ دیتا ہے کائنات خارجی بھی اس کے حکم کی بالکل اسی طرح تابع و محکوم ہے۔ جس طرح اس کا ارادہ اس کے اصول و ضوابط کا۔ یہ دوگونہ اقتدار بالکل مکمل ہے۔ اس میں کوئی نقص نہیں کوئی خلا نہیں۔ یہ رخنہ سے پاک اور کمزوری سے غیر ملوث ہے۔

۵۲ ۔ اے پیغمبر کہو خدایا شاہی اور جہانداری کا مالک تو ہے جسے چاہے ملک بخش دے اور جس سے چاہے لے لے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ وفدِ نجران کے رئیس ابوحارثہ بن علقمہ نے کہا تھا کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں تو روم کے بادشاہ جو ہماری مالی مدد کرتے ہیں بند کر دیں گے۔ شاید یہاں دعا و مناجات کے رنگ میں اسی کا جواب دیا گیا ہے کہ جن بادشاہوں کی سلطنت اور ان کی دی ہوئی مدد پر تم مفتون ہو رہے ہو۔ خوب سمجھ لو کہ کل سلطنت و عزت کا اصلی مالک خداوند قدوس ہے۔ اسی کے قبضہ و قدرت میں ہے جس کو چاہے دے اور جس سے چاہے سلب کر لے۔ کیا یہ ممکن نہیں ہے کہ روم و فارس کی حکومتیں چھین کر مسلمانوں کو دے دی جائیں بلکہ وعدہ ہے کہ ضرور دی جائیں گی۔ آج مسلمانوں کی بے سروسامانی اور دشمنوں کی طاقت کو دیکھتے ہوئے یہ چیز تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اسی لئے یہود و منافقین مذاق اڑاتے تھے کہ قریش کے حملہ سے ڈر کر مدینہ کے اردگرد خندق کھودنے والے مسلمان قیصر و کسریٰ کے تاج و تخت پر قبضہ پانے کے خواب دیکھ رہے ہیں۔ لیکن اللہ سبحانہٗ نے چند ہی سالوں میں دکھا دیا کہ روم و فارس کے جن خزانوں کی چابیاں اپنے نبی کے ہاتھ میں دی تھیں۔ فاروق اعظم کے زمانہ میں وہ کس طرح مجاہدین اسلام کے درمیان تقسیم ہوئے۔ اصل یہ ہے کہ یہ مادی سلطنت کیا چیز ہے جب خداوند قادر و حکیم نے روحانی سلطنت کا آخری یعنی رسالت و نبوت بنی اسرائیل سے منتقل کر کے بنی اسماعیل میں پہنچا دی تو روم و عجم کی ظاہری حکومت کا عرب کے خانہ بدوشوں کی طرف منتقل کر دینا کیا مستبعد ہے گویا یہ دعا ایک طرح کی پیش گوئی تھی کہ عنقریب دنیا کی کایا پلٹ ہونے والی ہے جو قوم دنیا سے الگ تھلگ پڑی تھی۔ عزتوں اور سلطنتوں کی مالک ہوگی اور جو بادشاہت کر رہے تھے ان

ان کو اپنی بداعمالیوں کے سبب پستی و ذلّت کے غار میں گرایا جائے گا۔[1]

اسلامی اقتدار کی بشارت

رسول کے واسطہ سے اُمّت کو دُعا کا طریقہ بتایا جا رہا ہے ملک سے مراد سارا جہاں ہے مالک کا لفظ دُعا کے شروع میں لا کر بتا دیا کہ مالکانہ تصرف کا حق اور اختیار اللہ ہی کو حاصل ہے۔ حکومت دنیا اور دے کر چھین لینا صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور نفس بادشاہت یا حکومت میں کوئی تقدس نہیں ہے۔ اس میں رد ہے اس جاہلی عقیدے کا کہ بادشاہی خود ایک درجہ ہے۔ الوہیت کا یا نیم الوہیت کا اور کسی کا بادشاہ ہو جاتا گویا خدا کے اوتار کے مرتبہ پر پہنچ جانا ہے۔ مصر میں فرعون کی پرستش ہوتی رہی۔ ہندوستان میں چندربنسی اور سورج بنسی راجہ مہاراجہ خدائی اوتار سمجھے گئے۔ جاپان میں میکاڈو آج تک مظہر خدا کی حیثیت رکھتا ہے۔ یہ سب اسی عقیدے شاہ پرستی کے مظاہر ہیں۔ قرآن نے بتایا کہ بادشاہی بھی ساری دوسری نعمتوں کی طرح ایک خدائی تصرف ہے۔ اور بادشاہ بھی بندگی بے بسی و بیچارگی میں بالکل ایسا ہی ہوتا ہے جیسے سارے دوسرے بندے۔[2]

یہ آیت گرامی دراصل یہود کے عزل کا اعلان اور اُمّتِ مسلمہ کے تقرر کی بشارت ہے لیکن بات بجائے خبر اور بشارت کے دُعا کے انداز میں کہی گئی ہے۔

اولاً: اس لئے کہ ان آیات کے نزول کے وقت تک حالات ابھی پردے میں تھے اور جو چیز پردے میں ہو اس کے لئے یہی انداز موزوں ہے کہ اُمّت اس کے لئے دُعا کرے۔

ثانیاً، اس لئے کہ اس میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اُمّت اس بشارت کو فخر اور غرور کے ساتھ قبول نہ کرے بلکہ تواضع اور تذلل، احساس، محبوبیت اور دُعا کے ساتھ قبول کرے۔

اسلامی اقتدار میں حاکمیتِ اعلیٰ

اور اس دُعائی پیمانے سے یہ اشارہ بھی مقصود ہے کہ قرآن اس اُمّت کو جس اقتدار کی بشارت دے رہا ہے اس کی عمارت اللہ کے حاکمیت کے تصوّر کی بنیاد پر قائم ہے قرآن کہتا ہے کہ انسانوں کا حقیقی فرمانروا اور حاکم اللہ ہے۔ انسانی معاملات میں بھی حاکمیت کا حق اسی کو پہنچتا ہے۔ اور اس کے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام ، [2] ماجدی

سوا کوئی انسان یا غیر انسانی طاقت بطورِ خود حکم دینے اور فیصلہ کرنے کی مجاز نہیں ہے۔ اللہ کی حاکمیت بزور انسانوں پر مسلط نہیں کی گئی بلکہ الہامی کتابوں کے ذریعے سے اس کا ظہور ہوا ہے۔ ان الہامی کتابوں میں آخری کتاب قرآن ہے۔ یہ پوری انسانیت کو دعوت دے رہا ہے کہ شعور وارادے کے ساتھ اس کی حاکمیت تسلیم کرو اور اس کی طاعت اختیار کرو۔

اس مضمون کی ہمارے اصولیین نے مختلف پہلوؤں سے بڑی وضاحت کی ہے ائمہ اہل السنہ کے چند اقوال اور عبارتیں ملاحظہ فرمایئے۔ تمام اہل السنہ کا حلت وحرمت کے باب میں تحقیقی مسلک یہ ہے کہ یہ تنہا اللہ سبحانہٗ کے اختیار کی چیز ہے، کسی چیز کو حلال کرنا، حرام کرنا صرف اسی کا کام ہے۔ وہ اس میں منفرد ہے یہ خالص اسی کا حق ہے کسی دوسرے کا کسی نوع سے دخل نہیں ہے نہ بالذات کسی کو یہ اختیار حاصل ہے اور نہ ہی یہ اختیار اللہ نے کسی کو تفویض کیا ہے۔ چنانچہ شیخ کمال الدین ابن الہمام فرماتے ہیں :

الحاکم لاخلاف فی انہ اللہ رب العالمین

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حاکم اللہ سبحانہٗ ہی ہے۔

اور علامہ محب اللہ بہاری مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں۔

لاحکم الا من اللہ

حکم صرف اللہ سبحانہٗ کا ہوتا ہے۔

یہی عبارت کم وبیش اصولِ فقہ کی مشہور کتاب التوضیح والتلویح میں ہے۔ اسی مضمون کو علامہ ابن امیر الحاج نے شرح تحریر الاصول میں اور علامہ اسنوی شافعی نے شرح منہاج الاصول میں نہایت شرح وبسط سے بیان کیا ہے کہ حکم تشریعی یعنی قانون سازی صرف اللہ تعالیٰ ہی کا حق ہے۔ الغرض قرآن جس اقتدار کی امت کو بشارت دے رہا ہے۔ اس آیت کی رُو سے اس کی بنیاد اس اصول پر ہے کہ حاکمیت صرف اللہ کی ہے اور وہی شریعت بنانے کا حق رکھتا ہے۔ یہ اسلامی نظام کا اساسی چہرہ ہے۔ اس کے مقابلے پر دوسرے سارے نظام اس اصول پر مبنی ہیں کہ حاکمیت انسان کی ہے اور وہ اپنے لئے شریعت وضع کرنے کا مجاز ہے۔ خواہ یہ نظام جمہوری ہو یا سرمایہ دارانہ ہو اور پھر شیوعیت ہو یا اشتراکیت ہو۔ ان سب کا اسلام سے بنیادی ہی میں تصادم ہے۔

اصل خیر ہے شر اضافی چیز ہے

۵۳ - تیرے ہی ہاتھ میں ہر طرح کی بھلائی ہے اور تو ہی ہر چیز پر قادر ہے۔

بے شک خدا کے ہاتھ میں ہر قسم کی خیر و خوبی ہے اور شر کا پیدا کرنا بھی اس کے اعتبار سے خیر ہی ہے کیونکہ مجموعہ عالم کے اعتبار سے اس میں ہزارہا حکمتیں ہیں۔ حدیث صحیح میں ہے الخیر کله فی یدیك والشر لیس الیك[1]۔ یہاں بیدك الخیر والشر کے بجائے صرف بیدك الخیر فرمایا ہے پہلے آیت میں تقابلی مطالعہ پیش کرنے کے باوجود یعنی یہ کہنے کے باوجود کہ بادشاہت دینا اور دے کر چھین لینا اور عزت دینا اور ذلیل کر دینا اللہ کا کام ہے۔ صرف بیدك الخیر کہنا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اس کی جانب سے جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہو رہا ہے سب خیر ہی خیر ہے۔ دُنیا میں شر جو کچھ بھی ہے وہ ایک نسبتی اور اضافی معاملہ ہے۔ ذاتی طور پر خالص شر کا کوئی وجود نہیں ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ جس چیز کو کوئی شخص یا کوئی قوم برائی سمجھتی ہے وہ اس کے لئے اگرچہ برائی ہوتی ہے لیکن مجموعہ عالم کے اعتبار سے وہ برائی نہیں ہوتی۔ مجموعہ عالم پر نظر رکھنے والا اس حقیقت پر پہنچ سکتا ہے کہ یہاں جو کچھ شر ہے وہ اضافی ہے۔ آپ پورے عالم کو ایک جسم فرض کریں تو جسے آپ شر کہہ رہے ہیں وہ ہی اس کے چہرے کے خال اور بال ہیں۔ بال کو بدن سے جدا کر دینا تو اس سے زیادہ بری چیز نہیں۔ اتنی بری کہ لقمہ میں بال ہو تو آپ منہ تک لے جانے کو تیار نہیں لیکن حسن کی افزائش کا یہی سامان ہوتا ہے جب بدن پر لگا ہوا ہو۔ اس لئے یہاں جو کچھ برائی ہے وہ ایک اضافی چیز ہے اور اللہ سبحانہٗ کی نسبت اور کارخانۂ ہستی کے اعتبار سے کوئی شر نہیں ہے۔

دراصل دُنیا عالم کون و فساد ہے یہاں ہر بننے کے ساتھ بگڑنا ہے اور ہر سمٹنے کے ساتھ بکھرنا۔ لیکن جس طرح سنگ تراش کا توڑنا پھوڑنا بھی اس لئے ہوتا ہے کہ خوبی و دلآویزی کا ایک پیکر تیار کرے۔ اسی طرح کائناتِ عالم کا بگاڑ بھی اسی لئے ہے کہ بناؤ اور خیر کا فیضان ظہور میں آئے۔ ہم ایک عمارت بناتے ہیں لیکن اسکے بنانے کا مطلب کیا ہے؟ کیا یہی نہیں کہ بہت سی بنی ہوئی چیزوں میں برائی آگئی چٹانیں کاٹنے کی برائی اگر نہ ہو، بھٹے اگر نہ دھکائے جائیں، درختوں پر اگر آرا نہ چلایا جائے تو ظاہر ہے عمارت کا خیر بھی ظہور میں نہ آئے۔ یہ راحت و سکون کی خیر جو عمارت میں حاصل ہو رہی ہے کس صورتِ حال کا نتیجہ ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

یقیناً اسی شر اور ہنگامہ تخریب کا۔ اگر تخریب کا یہ شر نہ ہوتا تو عمارت کا یہ خیر بھی وجود میں نہ آتا پس یہی حال اللہ سبحانہٗ کی تعمیری سرگرمیوں کا بھی سمجھو وہ عمارت عالم کا ایک ایک گوشہ تعمیر کرتا رہتا ہے۔ تعمیر و درستگی کی ہی سرگرمیاں ہیں جو ہمیں بعض اوقات شر کی ہولناکیاں محسوس ہوتی ہیں۔ حالانکہ یہاں شر کب ہے جو کچھ ہے خیر ہی خیر ہے۔

دن اور رات کا گھٹنا اور بڑھنا

۵۴۔ تو ہی رات کو دن میں داخل کرتا ہے اور تو ہی دن کو رات میں داخل کرتا ہے۔ یعنی کبھی رات کو گھٹا کر دن کو بڑھا دیتا ہے کبھی اس کا عکس کرتا ہے۔ مثلاً موسم سرما میں ۱۴ گھنٹے کی رات اور دس گھنٹے کا دن ہے۔ چند ماہ بعد رات کے چار گھنٹے کاٹ کر دن میں داخل کر دیئے۔ اب رات دس گھنٹے کی رہ گئی اور دن ۱۴ گھنٹے کا ہو گیا۔ یہ سب الٹ پھیر تیرے ہاتھ میں ہیں کیونکہ شمس و قمر وغیرہ تمام سیارات بدوں تیرے ارادے کے ذرا حرکت نہیں کر سکتے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ کبھی دن بڑے اور کبھی رات بڑی۔[1]

یہ سارے تقلبات و تصرفات بغیر کسی کی شرکت و اعانت کے محض ارادۂ الٰہی سے رات دن ہوتے رہتے ہیں۔ جاہلی قوموں نے رات دن دونوں کو دیوی، دیوتاؤں کی حیثیت دے رکھی ہے۔ آیت میں ان خرافات کا رد آ گیا۔

یہ دن کو رات میں داخل کرنا اور رات کو دن میں داخل کرنا رات کے بعد دن اور دن کے بعد رات کے آمد و شد کی نہایت خوبصورت تشبیہ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ دونوں ایک دوسرے کا پوری سرگرمی سے تعاقب کر رہے ہیں۔ کبھی رات دن کے اندر گھس جاتی ہے کبھی دن رات میں چھپ جاتا ہے۔ یہ چکر پورے تسلسل کے ساتھ چل رہا ہے۔ قرآن میں یہ تشبیہ مختلف اسلوبوں سے بیان ہوتی ہے۔ اسی طرح موت سے زندگی اور زندگی سے موت کے ظاہر ہونے کے نشانات بھی ہر گوشے میں نمایاں ہوتے رہتے ہیں۔ مادیات میں بھی معنویات میں بھی۔

ایک لطیف تعریض

اس میں اس صورتِ حال پر ایک لطیف تعریض ہے جو بنی اسرائیل کی موت اور بنی اسماعیل

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کی زندگی سے نمایاں ہو رہی تھی۔ حضرت ابراہیم نے جو پودا فلسطین کی سرسبز و شاداب زمین پر لگایا اب وہ سوکھ چکا ہے اور جیسا کہ حضرت یحیٰی نے فرمایا کہ اس کی جڑ پر کلہاڑا رکھا ہوا تھا۔ اس کے برعکس جو پودا حضرت ابراہیم نے عرب کی خشک اور بنجر زمین میں لگایا تھا اور جو مرجھایا ہوا پڑا تھا۔ اب اس میں شگوفے نکل رہے تھے اور جیسا کہ حضرت عیسٰی نے فرمایا وہ ایک تناور درخت بن کر ایک عالم کو اپنے سائے کی پناہ میں لینے والا تھا[1]

بعثت کی طرف لطیف تلمیح

۵۵ - اور تو ہی جاندار کو بے جان سے نکالتا ہے اور بے جان کو جاندار سے یعنی بیضہ کو مرغی سے، آدمی کو نطفہ سے، نطفہ کو آدمی سے، جاہل کو عالم سے عالم کو جاہل سے، کامل کو ناقص سے ناقص کو کامل سے نکالنا تیری ہی قدرت کا کام ہے[2]

اس میں بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تلمیح ہے کہ اللہ سبحانہٗ، اس پر قادر ہے کہ جن کو اب تک اُمّی کہا گیا ہے ان میں سے خاتم النبیین والمرسلین کا ظہور ہو اور جو اب تک انبیاء و صدیقین سے نسبی تعلق رکھتے ہیں۔ ان میں سے اشرار و مفسدین ظاہر ہوں۔ اللہ کی شانِ حکیمی نے خاتم النبیین کے ظہور کے لئے عرب میں زمین ہموار کی اور ان کو ایسے اوصاف سے نوازا کہ ان میں ظہورِ نبوّت کی پوری پوری صلاحیّت رونما ہو گئی۔

آخر میں فرمایا جسے چاہتا ہے بے حساب روزی دیتا ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں یہود جانتے تھے کہ پہلے جو بزرگی ہم میں تھی ہمیشہ رہے گی۔ اللہ کی قدرت سے غافل ہیں، جس کو چاہے عزیز کرے سلطنت دے اور جس سے چاہے چھین لے اور ذلیل کر دے اور جاہلوں میں کامل پیدا کر دے جیسے عرب کے اُمّیوں میں سے کئے اور کاملوں میں سے جاہل جیسے بنی اسرائیل میں سے ہوا اور جس کو چاہے حسی و معنوی رزق بے حساب دے دے[3]

---

[1] تدبر قرآن [2] افاداتِ شیخ الاسلام [3] ایضاً

لَا يَتَّخِذِ الْمُؤْمِنُوْنَ الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ
وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ فَلَيْسَ مِنَ اللّٰهِ فِيْ شَيْءٍ اِلَّآ اَنْ تَتَّقُوْا
مِنْهُمْ تُقٰىةً ۭ وَيُحَذِّرُكُمُ اللّٰهُ نَفْسَهٗ ۭ وَاِلَى اللّٰهِ الْمَصِيْرُ ۝

اہل ایمان کافروں کو مومنین کو چھوڑ کر اپنا رفیق نہ بنائیں اور جو بھی ایسا کرے گا تو وہ یاد رکھے کہ اُس کا اللہ سے کوئی بھی سروکار نہ ہوگا۔[۵۶] ہاں اگر تم کسی کے شر سے بچنے کے لئے اپنا بچاؤ چاہتے ہو تو کر سکتے ہو اور دیکھو کہ اللہ تم کو اپنے سے ڈرا رہا ہے اور بالآخر تم سب کو اُسکے حضور میں پیش ہونا ہے۔[۵۷]

اسلامی اقتدار کا ناگزیر تقاضا

اوپر کی آیات سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ اب بنی اسرائیل کی حیثیت ایک برباد گھر کی ہے۔ اب اس کا گرجانا یقینی ہے اور اسلامی نظام حیات کو بپا ہو کر رہنا ہے۔ اسے بپا ہونے کی ذمہ داری چونکہ اہلِ ایمان پر ہے اس لئے ان کو متنبہ کیا گیا ہے کہ چونکہ اب فیصلہ کا وقت آگیا ہے۔ اس لئے اب وقت کا ناگزیر تقاضا یہ ہے کہ اہل ایمان سرگرم عمل ہو جائیں اور زندگی کے کسی موڑ پر کمزوری نہ دکھائیں۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اپنے شخصی علاقوں اور روابط کو اسلامی تعلقات پر ترجیح نہ دیں اور دشمنوں کو اپنا مددگار و رفیق نہ بنائیں۔ میدانِ جنگ گرم ہو چکا ہے۔ ملت اور دشمن کی صفیں الگ الگ ہو چکی ہیں اس لئے ہر شخص کے لئے ضروری ہے کہ اپنے لئے کوئی ایک صف اختیار کرے اور جسے اختیار کرے اسی کا ہو رہے یہ نہ ہو کہ ایک میں ہو کر دوسرے سے بھی ساز باز

رکھے۔ خطاب اگرچہ عام ہے مگر خاص طور پر وہ مسلمان مراد ہیں۔ جو ابھی پوری طرح یکسو نہیں ہوتے تھے بلکہ کچھ اپنے ذاتی مصالح کی وجہ سے اور کچھ اسلام کے مستقبل کے بارے میں جیسا کہ اوپر گزر چکا ہے غیر مطمئن ہونے کے باعث یہود کی طرف میلان رکھتے تھے اور یہود اسلام کے خلاف جو سازشیں کرتے تھے وہ ان کو آلہ کار بنا لیتے تھے۔ ان ہی کو مخاطب کرکے فرمایا ہے کہ اب یہود کے ساتھ دوستی اجڑے گھر کی دربانی ہے۔

۵۶ ۔ اہل ایمان مومنین کو چھوڑ کر کافروں کو رفیق نہ بنائیں اور جو بھی ایسا کرے گا وہ یاد رکھے کہ اس کا اللہ سے کوئی سروکار نہ ہوگا۔ یعنی جب حکومت و سلطنت، جاہ و عزت اور ہر قسم کے تقلبات و تصرفات کی زمام اکیلے خداوند قدوس کے ہاتھ میں ہوئی تو مسلمانوں کو جو صحیح معنے میں اس پر یقین رکھتے ہیں زیب نہیں دیتا کہ اپنے اسلامی بھائیوں کی اخوۃ و دوستی پر اکتفا نہ کرکے خواہ مخواہ دشمنانِ خدا کی موالات و مدارت کی طرف قدم بڑھائیں۔ خدا اور رسول کے دشمن ان کے دوست کبھی نہیں ہو سکتے جو اس خبط میں پڑے گا سمجھ لو خدا کی محبت و دوستی سے اسے کچھ سروکار نہیں۔ ایک مسلمان کی ساری امیدیں اور خوف صرف خداوند رب العزت سے وابستہ ہونی چاہییں۔ اور اس کے اعتماد و وثوق اور محبت و مناصرت کے مستحق وہی لوگ ہیں جو حق تعالیٰ سے اسی قسم کا تعلق رکھتے ہوں[1]

موالات کے موضوع پر اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے مگر سچ یہ ہے کہ بات کھل کر سامنے نہیں آئی کچھ بزرگوں نے موالات، مواسات، مدارات اور معاملات کے نام سے درجات بھی ترتیب دیئے ہیں اور موالات کا دروازہ سب کے لئے بند کرکے مواسات، مدارات اور معاملات کو کچھ کے لئے جائز قرار دیا ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں:

بات یہ ہے کہ دو شخصوں یا دو جماعتوں کے درمیان تعلقات کے مختلف درجات ہوتے ہیں۔ ایک درجہ تعلق قلبی کا ہوتا ہے۔ یہ صرف مومنین کے ساتھ خاص ہے۔ غیر مومن کے ساتھ مومن کا یہ تعلق کسی حال میں جائز نہیں دوسرا درجہ مواسات کا ہے۔ جس کے معنے ہیں ہمدردی و خیر خواہی اور نفع رسانی کے یہ بجز اہل حرب کے مسلمانوں سے برسر پیکار ہیں۔ باقی سب غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔ سورۂ ممتحنہ میں اس کی تفصیل بیان ہوئی ہے۔ تیسرا درجہ مدارات کا ہے جس کے معنی ہیں ظاہری خوش خلقی اور دوستانہ برتاؤ کے یہ بھی تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے جبکہ اس سے مقصود ان

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کو دینی نفع پہنچانا ہو یا وہ اپنے مہمان ہوں یا ان کے شر اور ضرر رسانی سے اپنے آپ کو بچانا مقصود ہو۔ اس آیت میں الا ان تتقوا منھم تقاۃ سے یہی درجہ مدارات مراد ہے یعنی کافروں سے موالات جائز نہیں مگر ایسی حالت میں جب تم ان سے اپنا بچاؤ کرنا چاہو اور چونکہ مدارات میں بھی صورتِ موالات کی ہوتی ہے اس لئے اس کو موالات سے مستثنیٰ کر دیا گیا۔

(بیان القرآن)

چوتھا درجہ معاملات کا ہے کہ ان سے تجارت یا اُجرت و ملازمت اور صنعت و حرفت کے معاملات کئے جائیں۔ یہ تمام غیر مسلموں کے ساتھ جائز ہے۔ بجز ایسی حالت کے کہ ان معاملات سے عام مسلمانوں کو نقصان پہنچتا ہو[1] یہ بھی بتایا گیا ہے کہ

کافروں سے موالات کی تین صورتیں ایک یہ کہ ان کو دینی حیثیت سے محبوب رکھا جائے یہ قطعاً کفر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ دل ان کے مذہب اور دین کو بُرا سمجھے مگر معاملات و تدبیر میں ان سے خوش اسلوبی کے ساتھ پیش آئے۔ یہ بالاجماع جائز بلکہ ایک درجہ میں مستحسن ہے۔ تیسری صورت ان دونوں صورتوں کے مابین ہے۔ وہ یہ کہ دل سے تو ان کے مذہب کو بُرا سمجھے مگر کسی قرابت یا دوستی یا دُنیوی غرض کی وجہ سے ان سے دوستانہ تعلقات رکھے اور ان کی اعانت اور امداد کرے یا کسی وقت مسلمانوں کی جاسوسی کرے۔ یہ صورتِ کفر تو نہیں مگر سخت گناہ ہے[2]

دراصل ان بزرگوں نے اس آیت میں بیان شدہ حکم کو عام زندگی سے متعلق سمجھ لیا ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔

یہاں غیر اسلامی برادری کے لئے قرآن میں دو قسم کے احکام ہیں ایک معیشت و علائق کے عام احکام۔ اور دوسرے جنگ کے احکام انسانی معیشت و علائق کے بارے میں قرآن کے احکام اس قدر واضح اور صاف ہیں کہ ان میں شک و تردد کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہے۔

علائقِ انسانی اور قرآن

بلاشبہ ایک انسان کے دوسرے انسان پر انسانی برادری کی حیثیت سے بھی کچھ فرائض ہیں جن سے عہدہ برآ ہونا ہر مسلمان کا دینی فریضہ ہے۔ قرآن نے تورات کے بعض احکام کو دہرایا ہے جن

---

[1] معارف م ش [2] معارف مولانا محمد ادریس

میں سے ایک یہ ہے ۔

وقولوا للناس حسنا اور لوگوں سے اچھی بات کہو۔

لوگوں سے اچھی بات کہنا اور اچھائی سے پیش آنا انسانی فرض ہے ۔ جس میں کسی دین و مذہب کی کوئی تخصیص نہیں ۔ دین و مذہب اور نسل و قومیت کا اختلاف اس منصفانہ برتاؤ سے باز نہ رکھے اسی لئے فرمایا ہے ۔

لایجرمنکم شنان قوم علی ان لا تعدلوا
کسی قوم کی دشمنی تمہیں اس پر آمادہ نہ کرے کہ تم انصاف نہ کرو ۔

جہاں تک ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کرنے ، نیکی کرنے انصاف کرنے کا تعلق ہے اس میں محبت و شفقت ، ہمدردی اور تعاون و سازگاری اصل ہے ۔ ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے خواہ اُس کا ہم وطن ہو یا نہ ہو ، ہم نسل ہو یا نہ ہو ، ہم عقیدہ ہو یا نہ ہو ۔ قرآن نے یہودیوں کی اس گمراہی کی طرف اسی پارے میں اشارہ کیا ہے جو یہ سمجھتے تھے کہ لین دین میں دیانتداری کے جس قدر احکام ہیں وہ صرف اسی لئے ہیں کہ اپنے ہم مذہب لوگوں سے بدمعاملگی نہ کی جائے ۔ لیکن اگر ایک آدمی یہودی نہ ہو تو اُس کے ساتھ سچائی اور دیانت سے پیش آنا کچھ ضروری نہیں ہے لیس علینا فی الامیین سبیل غرض نسل کے نام پر ہو یا مذہب کے نام پر اس قسم کی تمام باتیں جو انسانی بھائی چارے کا رشتہ منقطع کرتی ہیں اللہ سبحانہ کی طرف سے نہیں ہیں ۔ ابوہریرہ اور انس بن مالک سے روایت ہے کہ حضور انورؐ نے فرمایا :

آپس میں ایک دوسرے کا کینہ نہ رکھو ۔ ایک دوسرے پر حسد نہ کرو اور نہ ایک دوسرے سے منہ پھیرو اور سب مل کر خدا کے بندے اور بھائی بھائی ہو جاؤ ۔

اس حدیث میں انسانی برادری کا وہ نقشہ پیش کیا ہے کہ اگر سچائی سے عمل کیا جائے تو یہ شر اور فساد سے بھری ہوئی دنیا دفعتاً جنت بن جائے ۔

کافروں سے ترکِ موالات

یہ ہیں بینہ قرآن سے آپلے ہوئے انسانی معیشت و علائق کے عام احکام ، باقی رہے جنگ کے احکام وہ بالکل الگ ہیں ۔ جب انسانی قدریں ملیامیٹ ہو جائیں ۔ انسان درندے بن کر دعوتِ حق کو بزورِ شمشیر نابود کر دینے کا فیصلہ کریں ۔ اور اہلِ ایمان پر محض اہلِ ایمان ہونے کی وجہ سے

ظلم دستم ڈھانے لگیں تو قدرتی طور پر جنگ کی حالت پیدا ہو جاتی ہے۔ اب دو فریق ایک دوسرے کے خلاف صف آراء ہوتے ہیں۔ ایک فریق مسلمانوں کا دوسرا فریق کافروں کا۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کو اس آیت میں اور اس قسم کی دوسری آیات میں کہا جا رہا ہے کہ دشمنوں سے رفاقت اور اعانت کے رشتے نہ رکھو تاکہ دوستوں اور دشمنوں میں صاف صاف امتیاز نہ ہو جائے جو دوست ہیں وہ دشمنوں کے کیمپ سے کسی طرح کا تعلق نہ رکھیں۔ جو دشمن ہیں وہ دوستوں سے کسی طرح کی سازش نہ کریں۔ قرآن میں جس قدر احکام ترک موالات کے ہیں وہ سب اسی صورتِ حال سے تعلق رکھتے ہیں۔

ولی کے معنے کارساز، حمایتی اور ساتھی، دوست اور مددگار کے ہیں جس کی طرف ضرورت کے وقت رجوع کیا جائے اور جس کا حمیت و حمایت کے جذبے سے ساتھ دیا جائے۔ فرمایا کہ مسلمانوں کے لئے جائز نہیں کہ وہ کافروں کو اپنا ولی بنائیں لیکن اس کے ساتھ من دون المومنین کی قید کا اضافہ کر دیا ہے یعنی کافروں کے ساتھ صرف اس قسم کی موالات ناجائز ہے جو مسلمانوں کے بالمقابل یا اسلامی مفادات اور مصالح کے خلاف ہو۔ اسلام اور مسلمانوں کا حق اور مفاد تمام حقوق و مفادات پر مقدم ہے اس لئے اہلِ ایمان میں سے کسی فرد کے لئے جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح کے خلاف کسی غیر مسلم سے موالات کا تعلق قائم کرے۔ سورۃ توبہ میں ان علائق کی فہرست دی ہے۔ والد ہونے، اولاد ہونے، بھائی ہونے، شوہر ہونے، خاندان ہونے کی موالات، مالیاتی، کاروباری، رہائشی موالات الغرض کسی قسم کی موالات کی حربی کافر کے لئے اجازت نہیں ہے۔ ان سے ترکِ علائق کا حکم ہے۔

بہر حال قرآن میں جہاں کہیں مسلمانوں کو مشرکین یہود و نصاریٰ سے ترکِ موالات کا حکم دیا گیا ہے تو اس سے مقصود وہی لوگ ہیں جو حربی ہیں اور جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف اعلانِ جنگ کیا ہے، اس موضوع پر فقہاء نے تفصیلی ضوابط مرتب کئے۔ اس موضوع پر امام محمد کی کتاب السیر الکبیر بہترین علمی سرمایہ ہے۔

اپنے بچاؤ کے لئے حربیوں سے موالات

۵۷۔ ہاں اگر تم ان کی جانب سے رونما ہونے والے شر سے بچنے کے لئے اپنا بچاؤ کرنا چاہو تو ایسا کر سکتے ہو۔ یعنی تدبیر و انتظام کے درجے میں کفار کے ضرر سے بچنے کے لئے اپنے بچاؤ کے پہلو اور حفاظت کی کوئی صورت اختیار کر لو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہ ترکِ موالات کے حکم سے

مستثنیٰ ہے[1]۔

یعنی کافروں سے موالات جائز نہیں مگر ایسی حالت میں جبکہ تم ان سے بچاؤ کرنا چاہو۔[2]

اگر کوئی مومن کسی دشمنِ اسلام جماعت کے چنگل میں پھنس گیا اور اسے ان کے ظلم وستم کا خوف ہو تو اس کو اجازت ہے کہ اپنے ایمان کو چھپائے رکھے اور کفار کے ساتھ بظاہر اس طرح رہے کہ گویا انہی میں کا ایک فرد ہے۔ یا اگر اُس کا مسلمان ہونا ظاہر ہوگیا ہو تو اپنی جان بچانے کے لئے وہ کفّار کے ساتھ دوستانہ روّیہ کا اظہار کر سکتا ہے۔ حتّٰی کہ شدید خوف کی حالت میں جو شخص برداشت کی طاقت نہ رکھتا ہو اس کو کلمہ کفر تک کہنے کی رخصت ہے[3]

مولانا ثناء اللہ امرتسری فرماتے ہیں۔ ہاں اگر ان سے ضرر کا اندیشہ ہو تو کسی قسم کا بچاؤ کرلو تو جائز ہے اور دنیاوی معاملات میں ان سے سلوک کرنا چاہو تو کرو اس میں کوئی حرج نہیں۔ حرج اس میں ہے کہ تم دل سے ان کی محبت اور نصیحت کو مومنوں کی محبّت اور بہی خواہی پر ترجیح دو۔

افسوس اس فقرے کا مطلب بتاتے ہوئے مولانا احمد سعیدؒ نے اس کو انسانی زندگی کے پُرامن ماحول سے وابستہ کردیا اور ان کی نظر عالی سے یہ بات بالکل اوجھل ہو کر رہ گئی کہ آیت کا تعلق عام انسانی برادری سے نہیں بلکہ حربی کافروں سے ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

باقی رہی مدارات و ملاطفت یعنی خوش خلقی اور ظاہر طور پر نرمی اور احسان، نفع رسانی اور مشارکت یعنی کسی متحدہ مقصد میں باہم اشتراک یا کافر مہمان کی تواضع، تو یہ سب امور علیحدہ ہیں اور اس کی ممانعت ہے اور نہ یہ چیزیں تمدّنی زندگی میں چل سکتی ہیں۔ مثلاً فرض کیجئے کہ ایک بستی میں کافر اور مسلمان دونوں رہتے ہیں۔ اس پر ڈاکو حملہ کرتے ہیں یا آگ لگ جاتی ہے تو ایسی صورت میں مسلمانوں کا کافروں کے ساتھ باہم تعاون کرنا جائز ہے بلکہ ضروری ہوگا۔ کوئی کافر بطورِ مہمان آجائے تو اس کی مہمان نوازی کرنا ہوگی۔

حالانکہ یہ بات نہ اس آیت کا منطوق ہے نہ مدلول ہے اور نہ مفہوم، آیت تو صرف ان کافروں کے بارے میں ہے جو مسلمان سے برسرِ پیکار ہوں۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] معارف م ش [3] تفہیم القرآن

ایک عجیب بات

یہاں مولانا اصلاحی بڑی عجیب بات لکھ گئے کہ :

یہ جملہ یعنی الا ان تتقوا منھم ... الخ گویا الیس من اللہ فی شیء سے استثنا ہے یعنی اس نفی سے صرف وہی مستثنیٰ ہیں جو ان کفار کی مخالفِ اسلام موالات سے اس طرح بچیں جس طرح اس سے بچنے کا حق ہے۔

شائد یہ بتانا چاہتے ہیں کہ جب تک ایک مسلمان مکمل طور پر ترک موالات پر عمل پیرا نہ ہوگا، اس کا اللہ سے کوئی لگاؤ نہ ہوگا۔ عام مفسرین قرآن کی رائے میں اس آیت میں خاص حالات میں موالات کی اجازت دی جارہی ہے جبکہ مولانا اصلاحی کی رائے میں بجائے اجازت اور رخصت کے حکم میں اور زیادہ سنگینی پیدا کی جارہی ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ صحابہ اور تابعین سے جو تشریحات منقول ہیں وہ مولانا کی مؤید نہیں ہیں۔ مفسرین نے آیت میں استثنا عام احوال سے مانا ہے کہ ترکِ موالات مسلمانوں کے لئے ہر حال میں ضروری ہے لیکن خوف اور اندیشہ ضرر کی حالت اس سے مستثنیٰ ہے یعنی اگر تمہیں دشمن سے ضرر کا اندیشہ ہو یا مسلمانوں کی اجتماعی مصلحت کا تقاضا ہو تو پھر موالات کر سکتے ہو۔ ضرر کے اندیشہ کی بنا پر مسلمان حکومت ہمسایہ غیر مسلم حکومت سے دوستی کا معاہدہ کر سکتی ہے اور ایسے ہی اجتماعی مصلحت کے تقاضے سے کسی بھی غیر مسلم حکومت سے مسلمان حکومت کے لئے حلیف بننا جائز ہے۔ گویا اس فقرے میں اسلام کی یہ آئینی دفعہ بتائی گئی ہے کہ مفاسد کا دور کرنا مصالح کشی پر مقدم ہے۔

اور اگر استثنا منقطع ہے جیسا کہ ظاہر کا تقاضا ہے تو مطلب بالکل واضح اور صاف ہے کہ مسلمانوں سے کہا جارہا ہے کہ تمہیں اہلِ ایمان کے خلاف کافروں سے موالات کی اجازت نہیں ہے لیکن اگر موالات کے ذریعے ان کی جانب سے رونما ہونے والے ضرر سے بچ سکتے ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

اس موضوع پر راہِ اعتدال

اس موضوع پر سب سے اچھی بات وہی ہے جو حضرت مولانا عثمانی شیخ الاسلام نے فرمادی ہے کہ تدبیر و انتظام کے درجے میں کفار کے ضرر عظیم سے اپنے ضروری بچاؤ کے پہلو اور حفاظت

کی صورتیں معقول اور مشروع طریقے پر اختیار کرنا ترک موالات کے حکم سے اسی طرح مستثنیٰ ہیں جیسے سورۂ انفال میں ومن یولھم یومئذ دبرہ سے الا متحرفا لقتال او متحیز الی فئة کو مستثنیٰ کیا گیا ہے۔ جس طرح وہاں تحرف اور تحیز کی حالت میں حقیقۃً فرار من الزحف نہیں محض صورۃً ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں بھی کو حقیقۃً موالات نہیں بلکہ صورۃً موالات سمجھنا چاہیے جس کو ہم مدارات کہتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ آیت کا تعلق عام معیشت کے علائق اور انسانی زندگی سے نہیں بلکہ یہ جنگ کی حالت سے متعلق ہے۔ جیسے عین میدانِ جنگ میں بھاگنا اور لڑائی میں پیٹھ دکھانا سنگین گناہ اور اکبر الکبائر ہے۔ اگر دشمن کی تعداد دگنی بھی ہو پھر بھی میدانِ جنگ سے فرار حرام ہے۔ لیکن اگر پسپائی کسی جنگی مصلحت سے ہو مثلاً پیچھے ہٹ کر حملہ کرنا زیادہ مؤثر ہو یا کچھ فوجی مرکزی فوج سے جُدا ہو گئے ہوں وہ اپنے بچاؤ کے لئے پسپا ہو کر مرکز سے ملنا چاہتے ہوں تو ایسی پسپائی جرم نہیں۔ ٹھیک اسی طرح یہاں بھی موالات کا حکم ہے کہ اگر موالات حربیوں اور دارِ حرب کے مکینوں سے اس لئے کی جا رہی ہے کہ اس سے اہلِ ایمان کی حفاظت مقصود ہے تو یہ موالات جرم نہیں ہے۔

تقیہ کا جواز

جن لوگوں نے اس آیت سے عام حالات میں تقیہ کا جواز نکالا ہے۔ اس کا قرآن کے منطوق مدلول اور مفہوم سے دُور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ انہوں نے یہ بات لغت، نظائر قرآن اور سیاق و سباق ہر چیز کو نظر انداز کر کے کہی ہے۔ علامہ آلوسی نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

موالاتِ کفّار پر خاص تنبیہ

۵۸ ـ اور دیکھو تم کو اپنے سے ڈرا رہا ہے اور بالآخر تم سب کو اس کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ یعنی مومن کے دل میں اصلی ڈر خدا کا ہونا چاہیے کوئی ایسی بات نہ ہو جو اس کی ناراضگی کا سبب ہو مثلاً جماعتِ اسلام سے تجاوز کر کے بے ضرورت کفّار کے ساتھ ظاہری و باطنی موالات کرے یا ضرورت کے وقت صورتِ موالات اختیار کرنے میں حدودِ شرع سے گزر جائے یا محض موہوم و حقیر خطرات کو یقینی اور اہم خطرات ثابت کرنے لگے اور اسی قسم کی مستثنیات یا شرعی رخصتوں کو ہوائے نفس کی پیروی کا حیلہ بنائے۔ اسے یاد رکھنا چاہیے کہ سب کو خداوند قدوس کی عدالت عالیہ میں حاضر

ہونا ہے وہاں چھوٹے جیلے کچھ پیش نہ جائیں گے۔ مومن قوی کی شان تو یہ ہونی چاہیے کہ رخصت سے گزر کر عزیمت پر عمل پیرا ہو اور مخلوق سے زیادہ خالق سے خوف کھائے۔[1]

آخر آیت میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تم کو اپنی ذاتِ عظیم سے ڈراتا ہے۔ ایسا نہ ہو کہ چند روزہ اغراض و مقاصد کی خاطر موالات کفار میں مبتلا ہو کر اللہ جل شانہٗ کو ناراض کر بیٹھو۔[2]

مطلب یہ ہے کہ کہیں انسانوں کا خوف تم پر اتنا چھا جائے کہ خدا کا خوف دل سے نکل جائے۔ انسان حد سے حد تمہاری دنیا بگاڑ سکتے ہیں۔ مگر خدا تمہیں ہمیشگی کا عذاب دے سکتا ہے۔ لہٰذا اپنے بچاؤ کے لئے اگر بدرجہ مجبوری کبھی کفّار کے ساتھ تقیہ کرنا پڑے تو وہ بس اس حد تک ہونا چاہیے کہ اسلام کے مشن اور اسلامی جماعت کے مفاد اور کسی مسلمان کے جان و مال کو نقصان پہنچائے بغیر تم اپنی جان و مال کا تحفظ کر لو لیکن خبردار کفر اور کفّار کی کوئی ایسی خدمت تمہارے ہاتھوں انجام نہ ہونے پائے جس سے اسلام کے مقابلے میں کفر کو فروغ حاصل ہونے اور مسلمانوں پر کفّار کے غالب آجانے کا کوئی امکان ہو خوب سمجھ لو کہ اگر اپنے بچاؤ کے لئے تم نے اللہ کے دین کو یا اہلِ ایمان کی جماعت کو یا کسی ایک فرد مسلم کو بھی نقصان پہنچایا یا خدا کے باغیوں کی کوئی حقیقی خدمت انجام دی تو اللہ کے محاسبہ سے ہرگز نہ بچ سکو گے جانا بہرحال تم کو اسی کے پاس ہے۔[3]

اس فقرے میں دراصل نہایت لطیف انداز میں تنبیہہ کی گئی ہے یعنی یہ کہ اللہ کی شانِ کریمی سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو جانا یہ نہ سمجھنا کہ یہ جرائم اس کے نزدیک جرائم نہیں یا وہ ان جرائم پر گرفت نہیں کر سکتا۔ یہاں اگر درگزر ہو رہی ہے تو اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ دنیا دار ابتلاء ہے دار الجزاء نہیں ہے۔ اصلی جزا اس روز ملے گی جب اس کا عدل ظہور میں آئے گا۔ یہ اگر ابھی ظہور میں نہیں آیا تو اس سے یہ سمجھنا چاہیے کہ ظاہر ہی نہ ہوگا۔ اللہ کے کاموں میں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] معارف م ش [3] تفہیم القرآن

قُلْ إِنْ تُخْفُوا مَا فِي صُدُورِكُمْ أَوْ تُبْدُوهُ يَعْلَمْهُ اللَّهُ ۗ
وَيَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ
شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۹﴾ يَوْمَ تَجِدُ كُلُّ نَفْسٍ مَا عَمِلَتْ مِنْ خَيْرٍ
مُحْضَرًا ۚ وَمَا عَمِلَتْ مِنْ سُوءٍ ۚ تَوَدُّ لَوْ أَنَّ بَيْنَهَا وَبَيْنَهُ
أَمَدًا بَعِيدًا ۗ وَيُحَذِّرُكُمُ اللَّهُ نَفْسَهُ ۗ وَاللَّهُ رَءُوفٌ
بِالْعِبَادِ ﴿۳۰﴾ ع ۳

اے پیغمبر لوگوں سے کہہ دو کہ تمہارے دلوں کے اندر جو کچھ ہے
تم اسے چھپاؤ یا ظاہر کرو، ہر حال میں اللہ اُسے خوب[۵۹] جانتا ہے
اور اتنا ہی نہیں بلکہ آسمان اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس
پر روشن ہے اس کی قدرت کے احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں
ہے[۶۰]۔ اور دیکھو اس آنیوالے دن کو نہ بھولو جس روز ہر انسان
پالے گا جو کچھ اس نے نیک عملی کی تھی اپنے سامنے موجود۔ اور
جو کچھ اس نے بُرائی کی۔ وہ آرزو کرے گا اسے کاش اس میں
اور اس دھاڑے میں ایک بڑی[۶۱] مدت حائل ہو جاتی اور دیکھو

خدا تمہیں اپنے مواخذے سے ڈرا رہا ہے اور اللہ اپنے بندوں کے لئے بڑی مہربانی رکھنے والا ہے [۶۲]

آخرت کی فکر اور ذمہ داری کا احساس

اسلام کے نظام حیات کو جو چیزیں بنیادی طور پر دنیا کے دوسرے نظاموں سے ممتاز کرتی ہیں۔ ان میں اہم ترین فکر آخرت کے ساتھ اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔ قرآن میں ایمان باللہ کے بعد سب سے زیادہ زور اسی پر دیا گیا ہے۔ کیونکہ موجودہ دنیا کے تمام اعمال اور ان کے نتائج کی اصلی اور دائمی بنیاد متزلزل ہو جائے تو اعمالِ انسانی کے نتائج کا ریشہ ریشہ بیخ و بن سے اکھڑ جائے۔ دنیا کی زندگی تو آزمائش کا ایک وقفہ اور عمل کی ایک مہلت کا نام ہے۔ مرنے کے بعد سارے انسان اللہ کے حضور پیش ہوں گے اپنے اعمال کا حساب دیں گے اور ہر ایک اپنے عمل کے مطابق جزا اور سزا پائے گا۔ اعمال کی جزا و سزا کا دارو مدار چونکہ ان کے علم پر ہے اس لئے اس آیت میں پہلے علم الٰہی کی پہنائیوں کا ذکر کیا ہے کہ اللہ سے کوئی چیز چھپی نہیں ہے۔ وہ ہر چیز کو جانتا ہے ایک دن آئے گا۔ جب ہر ایک کے سامنے اس کا سارا کھلا چھپا آجائے گا۔ اس دن اللہ کی عادلانہ شان کا ظہور ہوگا۔ اللہ سبحانہٗ چونکہ اپنے بندوں پر مہربان ہے اس لئے وہ پہلے سے اس دن سے لوگوں کو آگاہ کر رہا ہے تاکہ لوگ اس کے لئے فکرمند ہو کر اپنے اندر ذمہ داری کا احساس پیدا کریں۔

۵۹ ۔ اے پیغمبر لوگوں سے کہہ دو کہ تمہارے دلوں میں جو کچھ ہے تم اُسے چھپاؤ یا ظاہر کرو ہر حال میں اللہ اُسے جانتا ہے۔ یعنی یہ ممکن ہے کہ آدمی اپنے دل کی بات اور نیت آدمیوں سے چھپالے لیکن وہ اس طرح خدا کو فریب نہیں دے سکتا۔

یعنی اس کا علم ہر طرح کامل ہے، جزئیات وکلیات سب پر حاوی حاضر و غائب سب کو شامل ہے اس میں رد ہے یونان کے ان فلاسفر کا جنہوں نے اللہ کی صفتِ علم کو ناقص مانا ہے[۱]

اللہ کا علم حضوری ہے اور سب کا علم حصولی ہے۔ یعنی اللہ کو علم براہ راست واقعہ سے

---

[۱] افاداتِ شیخ الہند [۲] تفسیر ماجدی

ہوتاہے اور یہی علم حضوری ہے اوروں کو علم واقعہ سے نہیں۔ قرآن دلائل اور ذرائع سے ہوتا ہے۔ دھواں اٹھتا ہے، معلوم ہو جاتا ہے کہ آگ لگی ہے، ہوا چلتی ہے، مٹی کی خوشبو سے پتہ لگتا ہے کہ بارش ہو گئی ہے۔ مانسون اٹھتا ہے معلوم ہو جاتا ہے کہ برسات قریب ہے۔ ہواؤں کا تموج بتا دیتا ہے کہ سمندر میں طوفان کس سمت سے آنے والا ہے، الہام ہوتا ہے تو پتہ لگ جاتا ہے، فتح ہونیوالی ہے وحی آتی ہے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ عالم غیب میں کیا ہو رہا ہے۔ یہ سب ذرائع وسائل اور قرائن ہیں۔ ان میں وحی کے ذریعے آنے والا علم قطعی اور یقینی ہے اس کے علاوہ ہر علم ظنی ہے۔ اللہ کو واقعہ کا بلا واسطہ علم ہوتا ہے اور اتنا قطعی ہوتا ہے کہ اس میں تخلف محال ہے۔ یہاں اشیاء اور واقعات اپنے وجود میں اس کے تابع ہیں۔ وہ اشیاء اور واقعات کا تابع نہیں۔ مخلوق کے دائرہ میں کمال یہ ہے کہ اس کا علم واقعہ کے مطابق ہو جائے اور علم الٰہی کا کمال یہ ہے کہ خود اشیاء اور واقعات اپنے وجود میں علم الٰہی کے تابع رہیں۔

کمالِ علم اور کمالِ قدرت

۶۰ ۔ اور اتنا ہی نہیں بلکہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اس پر روشن ہے۔ اسکی قدرت کے احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں ہے۔ یعنی جب علم اس قدر محیط اور قدرت ایسی عام اور تام ہے تو تو مجرم کے لئے اخفائے جرم یا سزا سے بچ جانے کی کوئی صورت نہیں ہے [1]

اللہ کا علم ہر چیز پر حاوی ہے (الطلاق ۱۲)

کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اللہ کی ہمہ گیر واقفیت کی ادنیٰ مثال یہ ہے کہ پیٹ کے تہ بہ تہ تاریکیوں میں وہی انسان کی صورت گری کرتا ہے۔ (آل عمران) وہ علام الغیوب ہے (توبہ ۸) وہ سینوں کے بھید تک جانتا ہے (النمل ۷۴) وہ دلوں کی نیتوں سے واقف ہے۔ (العنکبوت ۱۰) وہ ہر وقت اور ہر آن بندوں کے ساتھ ہے (مجادلہ ۷) وہ اگلی اور پچھلی نسلوں کے حال سے باخبر ہے (الحجر ۲۴) علم الٰہی کا جامع تصور اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمہا الا ھو ویعلم ما فی البر والبحر ۔
وما تسقط من ورقۃ الا یعلمہا ولا حبۃ فی ظلمات الارض و لا

[1] افادات شیخ الاسلام

رطب ولا یابس الا فی کتاب مبین

اور اسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں۔ جنہیں وہ ہی جانتا ہے اور کوئی نہیں جانتا اور وہ جانتا ہے اس کو بھی جو کچھ خشکی میں ہے اور اس کو بھی جو تری میں ہے۔ درخت سے گرنے والا کوئی پتّا ایسا نہیں جس کا اسے علم نہ ہو۔ زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک و تر سب ایک واضح کتاب میں لکھا ہوا ہے۔

قدرت و اختیارِ ناطق

قرآن نے اللہ کی قدرت اور اس کے اختیارِ ناطق کا تفصیلی چہرہ پیش کیا ہے یہاں ہم تفریحِ سخن کی خاطر ناظرینِ معالم کی ضیافتِ طبع کے لئے کچھ اشارات کرتے ہیں۔ مثلاً سب کچھ اللہ کی جانب سے ہوتا ہے (النساء ۷۸) وہ جس کو چاہے بخش دے اور جس کو چاہے سزا دے (المائدہ ۱۸) جس کو چاہے اقتدار دے اور جس سے چاہے چھین لے، عزت و ذلت اسی کے اختیار میں ہے۔ اللہ بھلائی کا سرچشمہ ہے (آلِ عمران ۱۹) کوئی چیز خدا کی قدرت سے باہر نہیں (الفاطر ۴۴) زندگی اور موت اسی کے قبضے میں ہے۔ (النجم ۴۴) وغیرہ وغیرہ

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب اس کے پاس علمِ محیط اور قدرتِ کاملہ ہے تو بتاؤ کہ اللہ سے کوئی چیز کوئی بات، کوئی عمل، کوئی ارادہ اور کوئی حالت کیسے چھپا سکتے ہو وہ صرف تمہارے دلوں کے رازوں سے ہی نہیں بلکہ آسمان و زمین میں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے سب سے باخبر ہے اور اس کی گرفت سے کیوں کر بچ سکتے ہو جب کہ اس کی قدرت سے عالمِ ہستی کی کوئی چیز بھی باہر نہیں ہے۔

اعمال کے دوام و جوہ کا اسلامی عقیدہ

۶۱۔ اور جس روز ہر انسان پائے گا جو کچھ اس نے نیک عملی کی تھی اپنے سامنے موجود اور جو کچھ اس نے برائی کی وہ آرزو کرے گا کہ اے کاش اس میں اور اس دھماڑے میں ایک بڑی مدت حائل ہو جاتی۔ یعنی قیامت کے دن ہر نیکی بدی آدمی کے سامنے حاضر ہوگی۔ عمر بھر کا اعمالنامہ ہاتھ میں پکڑا دیا جائے گا۔ اس وقت مجرمین آرزو کریں گے کہ کاش یہ دن ہم سے دور ہی رہتا۔ یا ہم ہی

اوران بُرے اعمال میں بڑی دُور کا فاصلہ ہوتا تاکہ ان کے قریب بھی نہ جاتے ہیں
دنیا میں جو چیز بھی ایک دفعہ پیدا ہوجاتی ہے پھر وہ بغیر حکم الٰہی فنا نہیں ہوتا۔ اسی طرح اعمال و افعال بھی جو انسان سے ظہور پذیر ہوتے رہتے ہیں وہ فنا نہیں ہوتے۔ موجودہ سائنس جس نے یہ اصول تسلیم کرلیا ہے کہ دنیا میں کوئی حرکت بھی پیدا ہوکر فنا نہیں ہوئی یہاں تک کہ فضا میں ہر آواز اور ہر صدا بھی جو کبھی بلند ہوئی ہے آج موجود ہے اور ہمیشہ موجود رہے گی اور ہم اس کو پکڑ پائیں تو سن سکتے ہیں۔ وہ اعمال و افعال کے دوام و جود کے اسلامی عقیدے کو قبول کرنے میں پس و پیش نہیں کرسکتی۔ دنیا کے ریکارڈ میں انسان کا ہر عمل و فعل ہمیشہ کے لئے محفوظ ہے۔ قرآن نے اس آیت میں اسی اصول کی نشاندہی کی ہے کہ ہر انسان جو اس نے اچھے کام کیئے یا بُرے اُن کو موجود پائے گا۔ یہ بات کہ انسان کا ہر عمل و فعل صحیفہ عالم پر ہمیشہ کے لئے ثبت ہوجاتا ہے۔ اس کو قرآن نے متعدد طریقوں سے پیش کیا ہے مثلاً یہ کہ انسان کی زبان سے جب بھی کوئی لفظ نکلتا ہے خواہ وہ کتنی ہی تنہائی میں بولا جائے۔ خدائی شاہد اس کے سننے میں موجود رہتے ہیں مایلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید[1] کبھی اس کو اعمال کی تحریر و کتابت کے عنوان سے ظاہر کیا ہے ورسلنا لدیھم یکتبون[2] کبھی یہ فرمایا ہے کہ ہر انسان کا نامہ اعمال اس کی گردن میں لٹکا ہوا ہے روز قیامت وہی فرد عمل کی صورت میں انسان کے سامنے کھول دیا جائے گا اور کہا جائے گا کہ اپنا نامہ اعمال پڑھو اقرأ کتابك اپنا اعمال نامہ پڑھ لے۔

اکبر الٰہ آبادی اُردو کے مشہور شاعر ہونے کے ساتھ حکیم و عارف بھی تھے فرمایا کرتے تھے کہ یہ جو ہم ہر وقت بولا کرتے ہیں کہ وقت چلا گیا۔ وقت جاتا کہاں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں چلا جاتا ہے اور وہیں جمع رہتا ہے۔ قیامت کے دن حق تعالیٰ اسی وقت کو واپسی کا حکم دیں گے۔ پس جب وقت واپس آئے گا تو جو کچھ وقت کے اندر ہوتا رہتا ہے ان سب کو لیئے ہوئے آئے گا۔ اس کائنات میں جو کچھ ہوتا رہا ہے سب اس روز بجنسہ دوبارہ واقع ہوکر رہے گا[3]

رجاء و خوف پر مبنی انداز

۶۲۔ اور دیکھو خدا تمہیں اپنے مواخذے سے ڈرا رہا ہے اور اللہ اپنے بندوں کے لئے بڑی مہربانی

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] کوئی بات نہیں بولتا مگر ایک نگران تیار رہتا ہے [3] ہمارے فرستادے انکے پاس لکھتے ہیں۔
[3] تفسیر ماجدی۔

رکھنے والا ہے۔ یہ بھی اس کی مہربانی ہے کہ تم کو اس خوفناک دن کے آنے سے پہلے ڈراتا اور آگاہ کرتا ہے تاکہ برائی کے طریقہ خصوصاً موالاتِ کفار ترک کر کے اور بھلائی کے راستہ پر چل کر اپنے کو خداوند قہار کے غصہ سے بچا لینے کا پیشگی انتظام رکھو۔

قرآن مجید کا یہ خاص طرز ہے کہ عموماً خوف کے ساتھ رجاء اور رجاء کے ساتھ خوف میں ہم آہنگی رکھتا ہے۔ یہاں بھی مضامینِ ترتیب کو معتدل بنانے کے لئے آخر میں واللہ رؤف بالعباد فرمایا یعنی خدا سے ڈر کر اگر برائی چھوڑ دو گے تو پھر اس کی مہربانی تمہارا استقبال کرے گی ناامید ہونے کی وجہ کوئی نہیں ہے۔ آؤ ہم تم کو ایسا دروازہ بتائیں جس میں داخل ہو کر مغفرت و رحمت کے پورے مستحق بلکہ خدا تعالیٰ کے محبوب بن سکتے ہو۔ قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ ویغفر لکم

سورت کا آغاز لا الٰہ الا ھو سے کیا اور پھر اس پر خود اپنی، فرشتوں کی اور اہل علم کی شہادت پیش فرمائی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی ان بنیادی صفات میں سے آخری صفت جسے صفتِ توحید کہتے ہیں ایک خاص اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح عقائد پورے اسلام کی جان ہیں۔ اسی طرح ان عقائد کی جان لا الٰہ الا ھو کا عقیدہ و یقین ہے۔ اگر غور سے دیکھا جائے تو معلوم ہوگا کہ یہ صفت دراصل دوسری تمام صفات ہی کا نقطہ کمال ہے اس لئے صرف یہ ایک صفت تمام صفات کی نمائندگی کرتی ہے۔ جس نے شعور و یقین کے ساتھ کہہ دیا کہ اللہ ہی معبود ہے۔ اس نے فی الواقع اللہ تعالیٰ کی تمام صفتوں پر علم الیقین رکھنے کا اعلان کر دیا۔ اب تک ان آیات میں سمجھا گیا ہے کہ کے اہم اور بنیادی تقاضے یہ ہیں۔

۱۔ اللہ کے سوا کوئی ہستی نہیں جو خود بخود ہو سب اس کی مخلوق، اس کی ملک اور اس کے محتاج ہیں۔ اس کی حیات دائمی ہے سب کو سنبھالے ہوئے ہے۔ الحی القیوم،

۲۔ وہ عزیز ہے وہ ہر کام کی طاقت رکھتا ہے اس کے کسی ارادے کو عملی جامہ پہنانے سے روکا نہیں جا سکتا۔ اس کا کوئی فیصلہ رد نہیں کیا جا سکتا۔

۳۔ وہ حکیم ہے اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے بے مقصد بے نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ ہر کام کے پیچھے اعلیٰ درجہ کی دانائی، حکمت اور مقصدیت ہوتی ہے۔

۴۔ وہ علیم ہے یعنی وہ بات ہر کام ہر حالت کو جانتا ہے کہ کیا ہو رہا ہے، کیا ہوا ہے، کیا ہوگا، سب

[2] افاداتِ شیخ الاسلام

اس کے علم میں ہے کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

۵۔ وہ عادل ہے اس کے ہر کام میں عدل و انصاف ہوتا ہے اس کے تکوینی احکام بھی عادلانہ ہوتے ہیں اور تشریعی بھی۔

۶۔ اس پوری کائنات کا جس کا یہ ہماری دنیا بھی ایک حصہ ہے وہ مالک بھی ہے اور مقتدر اعلیٰ بھی۔ حکم دینے، منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا اصلی حقدار وہی ہے شارع حقیقی اور قانون ساز بھی وہی ہے۔

۷۔ اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی اقتدار نہیں۔ اقتدار اسی کا حق ہے۔ عزت و ذلت اسی کے اختیار میں ہے۔ بھلائی کا سرچشمہ وہی ہے۔ کوئی چیز اس کی قدرت سے باہر نہیں ہے۔ نظام کائنات اللہ ہی کے حکم سے چل رہا ہے۔

۸۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جو اپنے اندر شان الوہیت رکھتا ہو جو پوجے جانے کا مستحق ہو جس کی فرمانبرداری کی جائے جس کی رضا چاہی جائے۔ کوئی نہیں جسے ولی کارساز، حاجت روا سمجھا جائے۔ جس سے دعائیں مانگی جائیں۔ جو کسی کے لئے قانون بناتے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی حق رکھتا ہو اور جس کے لئے بلا قید اطاعت جائز ہو۔

توحید کے یہ بنیادی تقاضے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا بھی انکار ایمان باللہ کو بے معنے بنا دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ساری باتیں لا الٰہ الا ھو کے اصل مفہوم میں شامل ہیں اور کوئی شخص صحیح معنوں میں مسلم نہیں ہو سکتا جب تک یہ عقیدہ اپنے پورے مفہوم کے ساتھ اس کے دل میں نہ اُتر جائے۔

قُلْ إِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللّٰهَ فَاتَّبِعُونِي يُحْبِبْكُمُ اللّٰهُ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ذُنُوبَكُمْ ۗ وَاللّٰهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ۝ قُلْ أَطِيعُوا اللّٰهَ وَالرَّسُولَ ۖ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْكٰفِرِينَ ۝

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت رکھتے ہو تو تمہیں چاہیئے کہ میری پیروی کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تم سے محبت کرے گا اور تمہاری خطائیں بخش دے گا وہ بڑا ہی بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے[۶۳]۔ اے پیغمبر تم کہہ دو فلاح و سعادت صرف یہ ہے کہ تم اللہ کی اور اس کے رسول کی طاعت کرو پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو اللہ کفر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے[۶۴]۔

رسالت محمدیؐ کی امتیازی حیثیت؛

اس وقت مذہبی دنیا میں ایک نظریہ بڑی شہرت اور اہمیت سے پایا جا رہا ہے جسے "وحدت ادیان" کہتے ہیں۔ اس نظریہ کا مفہوم یہ ہے کہ سارے مذاہب سچے ہیں۔ یہ نظریہ واضح طور پر سارے مذہب کی حیثیتیں متعین کر دینے والا نظریہ ہے اس لیے یہ خود اسلام کی بھی حیثیت متعین کر دیتا ہے یعنی یہ کہ وہ ایک سچا مذہب ہے مگر صرف وہی مذہب نہیں بلکہ دوسرے مذاہب بھی اسی کے برابر

ہے ہیں. کیا اسلام کو اپنی یہ حیثیت تسلیم ہے۔ یہ ایک سوال ہے جس کا جواب ملنا نہایت ضروری ہے۔ جواب معلوم کرنے کی ضرورت اس وقت اور شدید ہو جاتی ہے جب کہ کہنے والے یہ بھی کہتے ہوں کہ خود قرآن نے دین کی جو غایت اور رسالت کی جو تاریخ بیان کی ہے وہ اس نظریہ کے خلاف نہیں کیونکہ وہ خود تسلیم کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہر قوم میں نبی روانہ کیے ہیں وہ مانتاہے کہ سارے انبیاء اور ان کے لائے ہوئے دین اللہ ہی کے تھے۔ وہ یہاں تک کہتا ہے کہ اپنی حقیقت کے اعتبار سے سارے دین اسلام ہی کے داعی تھے۔ ایسی حالت میں اس بات کا انکار نہ کرنا چاہیے کہ جس نبی کی بھی پیروی کرلی جائے وہ خدا ہی کی بندگی ہو گی۔

ظاہر ہے کہ یہ مسئلہ دراصل مسئلہ رسالت کا ایک حصہ ہے اس لیے اس سوال کا جو جواب دیا جائے گا وہ قطعی طور پر رسالتِ محمدی کی حیثیت پر مبنی ہوگا۔ اگر آپ کے خیال میں اس رسالت کی حیثیت وہی ہے جو پہلی رسالتوں کی رہی ہے تو اس سوال کا جواب موافقانہ ہوگا ورنہ جواب دوسرا ہو گا۔

ہمیں سب سے پہلے یہ تحقیق کرنی چاہیے کہ رسالت محمدی کی حیثیت کیا ہے؟ وہی جو دوسری رسالتوں کی یا کچھ اور۔ قرآن کہتا ہے کہ آپ کی رسالت دوسری رسالتوں کے مقابلے میں کئی خاص امتیازات کی حامل ہے۔

اولاً یہ کہ آپ کی نبوت عالمگیر ہے۔

ثانیاً یہ کہ آپ کی نبوت جیسے عالمگیر ہے ایسے ہی عالمگیر ہمیشہ کے لیے ہے۔ آپ کے ساتھ نبوت و رسالت کا سلسلہ ختم ہو گیا اور اب قیامت تک کوئی نبی نہ آئے گا۔

ثالثاً آپ جو دین و شریعت لے کر آئے ہیں وہ ہر پہلو سے کامل ہے جب کہ تمام پچھلے دینوں اور شریعتوں میں سے کسی کی یہ شان نہ تھی۔

رابعاً، آپ پر جو کتاب اتری ہے وہ جوں کی توں محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی اس میں ایک لفظ کیا ایک نقطہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے۔

دوسری رسالتوں کے مقابلے میں رسالت محمدی کی اس امتیازی حیثیت کو نگاہ میں رکھئے اور پھر سوچئے کہ اس حیثیت کے لازمی تقاضے کیا ہو سکتے ہیں؟ کیا یہ کہ ان امتیازات کے باوجود اس نبوت کا بھی مرتبہ و مقام ہر پہلو سے ٹھیک وہی ہوگا جو دوسری نبوتوں کا ہے۔ اس سوال کے جواب میں قرآن کا فیصلہ صاف نفی میں ہے۔ قرآن کے نزدیک ان حقائق کا فطری تقاضا لازماً دوسرا ہوگا اور وہ یہ ہے کہ دوسری تمام نبوتیں منسوخ ہو چکی ہیں اب اللہ کے نزدیک محبوب ترین کامل ترین موثر ترین نبوت

صرف محمد رسول اللہ کی ہے۔ ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے۔

۶۳: اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دو کہ اگر تم واقعی اللہ سے محبت کرتے ہو تو تمہیں چاہیے کہ میری پیروی کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو اللہ تم سے محبت کرے گا، تمہاری خطائیں بخش دے گا اور بڑا ہی بخشنے والا اور رحمت رکھنے والا ہے۔ دشمنان خدا کی موالات و محبت سے منع کرنے کے بعد اللہ سبحانہ سے محبت کرنے کا معیار بتلایا ہے یعنی اگر دنیا میں آج کسی شخص کو اپنے مالک حقیقی کی محبت کا دعویٰ ہے تو ضروری ہے کہ اس کو اتباع محمدی کی کسوٹی پر کس کر دیکھ لے سب کھرا کھوٹا معلوم ہو جائے گا جو شخص جس قدر حبیبِ خدا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی راہ پر چلے گا اور آپ کی لائی ہوئی روشنی کو مشعل راہ بنائے گا اسے اسی قدر سمجھنا چاہیے کہ خدا کی محبت کے دعویٰ میں سچا اور کھرا ہے اور جتنا اس دعویٰ میں سچا ہو گا اتنا ہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی میں مضبوط و مستعد ہو گا جس کا پھل یہ ملے کہ حق تعالیٰ اس سے محبت کرے گا اور اللہ کی محبت اور حضور کی اتباع کی برکت سے پچھلے گناہ معاف ہو جائیں گے اور آئندہ طرح طرح کی ظاہری و باطنی مہربانیاں مبذول ہوں گی گویا توحید وغیرہ کے بیان سے فارغ ہو کر یہاں سے نبوت کا بیان شروع ہوا ہے اور پیغمبر آخر الزماں کی دعوت دی گئی [1]۔

یہ آیت قرآنی مہمات معارفِ قرآنی میں سے ہے۔ اس میں۔

اولاً، محبت الٰہی کے لیے نبوت محمدیہ کی پیروی کو بطور شرط پیش کیا گیا ہے۔

ثانیاً، اتباع کو غیر مشروط اور بے قید رکھا گیا ہے۔

ثالثاً، اتباع کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ اللہ تم سے محبت کرے گا تمہارے گناہ بخش دے گا۔

رابعاً اس آیت میں اللہ کا تعارف محب اور محبوب دونوں حیثیتوں سے پیش کیا ہے یعنی وہ محبت خود بھی کرتا ہے اور اس سے محبت کی بھی جاتی ہے۔

اسی بنا پر حافظ ابن القیم نے سلف سے اس آیت کا نام آیۃ محنۃ نقل کیا ہے۔

قرآن کی راہ اعتدال

پہلے خوف کا ذکر کیا تھا اب اللہ سے محبت کرنے کا تذکرہ ہے۔ عام طور سے مخالفوں نے یہ

[1] افادات شیخ الاسلام

سمجھا ہے کہ قرآن نے جس خدا کا تعارف پیش کیا ہے وہ فقط جبار و قہار اور مہیب شہنشاہِ مطلق ہے جس کی ہیبت و جلال سے تمام بندوں کو صرف ڈرتے رہنا چاہیے اس کے گوشہ چشم میں لطف و عنایت کا کوئی گزر نہیں، محبت اور پیار کا نذرانہ اس کے دربار میں قبول نہیں ہوتا۔ وہ اپنے کمزور بندوں پر نہ خود محبت کی نظر رکھتا ہے اور نہ بندوں سے اپنی محبت کا تقاضا کرتا ہے لیکن درحقیقت یہ قرآنی تعلیم کے سرتاسر خلاف ہے اللہ کے جو اسماء صفات قرآن میں آئے ہیں ان میں سے ایک ایک پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ اس کے چند یہ جلال ناموں کو چھوڑ کر جو اس کی قدرت تامہ ملکیت عامہ کی حقیقت کو ظاہر کرتے ہیں بقیہ تمام نام صرف محبت اور پیار لطف اور کرم رحمت اور مہر کی تجلی گاہ ہیں۔

مخالفوں کو اس حقیقت کے سمجھنے میں دو وجہ سے مغالطہ ہوا۔

اولاً، اس لیے کہ قرآن نے اللہ تعالیٰ سے ڈرنے کی بھی انسانوں کو دعوت دی۔

ثانیاً، اس لیے کہ لوگوں نے اظہارِ محبت کی جو اصطلاحیں مقرر کی تھیں۔ قرآن نے ان کی شدت سے مخالفت کی۔

قرآن سے پہلے جو مذاہب موجود تھے وہ اس مسئلہ میں افراط و تفریط کا شکار ہو گئے تھے اور صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے تھے۔ یہودی مذہب کی بنا سرتاسر خوف و خشیت اور سخت گیری پر تھی۔ اس کا خدا فوجوں کا سپہ سالار اور باپ کا بدلہ تیسری پشت تک بیٹوں سے لینے والا تھا۔ حالانکہ یہودیت کے صحیفوں میں خدا کے رحم و کرم اور محبت و شفقت کا ذکر کہیں کہیں موجود ہے اس کے برعکس عیسائیت زیادہ تر خدا کے رحم و کرم، محبت و شفقت کے تذکروں سے معمور گو ایسا نہیں ہے کہ اس میں خدا کے خوف و خشیت کی مطلق تعلیم نہ ہو۔ مگر دونوں مذہبوں کے پیروؤں نے ان دو متقابل تعلیموں کے درمیان راہ اعتدال گم کر دی تھی۔

قرآن نے اس نقطہ اعتدال کو پیش کیا ہے۔ وہ نہ تو اللہ کو محض جبار و قہار اور صرف بنی اسرائیل یا بنی اسماعیل کا خدا مانتا ہے نہ اس کو مجسم انسان انسانوں کا باپ یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا باپ سمجھتا ہے اور نہ تنہا محبت و شفقت کے صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی معرفت یہ بتاتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمٰن و کریم بھی۔ وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی۔ وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے۔ خفا بھی ہوتا ہے ناراض بھی ہوتا ہے۔ اس سے ڈرنا بھی چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے۔

الغرض قرآن نے انسانی زندگی کو خوف و محبت کی افراط و تفریط سے ہٹا کر خوف و محبت کی شاہراہ

اعتدال پر کھڑا کر دیا ہے۔

نبوت محمدیہ کی پیروی شرط محبت الٰہی ہے

حضرت مسیح کا مشہور وعظ ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ ہر معنوی اور روحانی حقیقت ظاہری آثار اور جسمانی علامات سے پہچانی جاتی ہے۔ تمہیں زید کی محبت کا دعویٰ ہے مگر نہ تمہارے دل میں اس کے دیدار کی تڑپ ہے نہ تمہارے سینہ میں صدمۂ فراق کی جلن ہے نہ آنکھوں میں ہجر و جدائی کے آنسو ہیں تو کون تمہارے دعوے کی تصدیق کرے گا۔ اسی طرح اللہ کی محبت اللہ پیار کے دعوے دار تو بہت ہو سکتے ہیں مگر اس غیر مرئی کیفیت کی مادی نشانی اور ظاہری علامت صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی ہے اس آیت میں فاتبعونی کہہ کر اسی شرط اسی علامت اور نشانی کو بتایا گیا ہے۔ یعنی میری راہ پر چلو کیونکہ محبت کا اقتضا یہ ہے کہ محبوب کی مرضی اور خوشی کی تلاش ہو اور یہ بات آپ کی پیروی اور اتباع سے ممکن ہے کیونکہ اللہ کی پسند اور ناپسند کا فیصلہ انسانی عقل نہیں بلکہ نبوت و رسالت کرتی ہے اور بس۔

اتباعِ نبوت کا دائرہ کار

اصل ارشاد فاتبعونی ہے اس کے معنے ہیں میری پیروی کرو۔ قرآن نے اتباع کے لیے کوئی قید نہیں لگائی یعنی یہ نہیں فرمایا کہ اتباع کا ہے میں کی جائے اعمال میں، اخلاق میں، آداب میں، احوال میں افکار و نظریات میں یا زندگی کے کس گوشہ میں۔ اس میں اشارہ ہے کہ قرآن کا مطالبہ بے قید اتباع کا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جو دین لے کر آئے ہیں وہ بندے اور خدا کے درمیان ایک پرائیویٹ معاملہ نہیں، اگر ایسا ہوتا تو آپ کی تعلیمات لازماً انفرادی زندگی کے مسائل تک محدود ہوتیں وہ صرف مسجد کی باتیں بتانے نماز روزے کا حکم دیتے، چند اخلاقیات کی تلقین کر دیتے۔ کچھ معاشرتی ہدائتیں دے دیتے مگر قرآن کا صفحہ صفحہ گواہی دیتا ہے کہ صورت واقعہ یہ نہیں ہے۔ نبوت محمدیہ کی مسند ارشاد عبادت گاہوں اور زندگی کے انفرادی دائروں ہی میں کبھی ہوئی نہیں ہے بلکہ وہ بازاروں، کارخانوں اداروں، معاشی میدانوں، تمدن کے دائروں سیاست اور حکومت کے ایوانوں غرض زندگی کے ایک ایک شعبے میں ہدائتیں دیتی ہے۔ واقعہ یہی ہے کہ نبوت نے انسانی زندگی کے انفرادی اور اجتماعی شعبوں کے متعلق احکام دیئے ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کامل ترین موثر ترین اور

محبوب ترین نظام پیش کیا ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے اس میں روحانی نظام، اخلاقی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام اور قانونی نظام سب موجود ہیں اور قرآن نے ان میں بلاقید اور غیر مشروط اتباع کا مطالبہ کیا ہے۔

حضور انور کی عصمت

اتباع کے موضوع پر اسی اطلاق اور بے قیدی سے حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے نبوت کی عصمت پر استدلال کیا ہے اور بتایا ہے کہ انبیاء قبل از نبوت، بعد از نبوت، صغائر اور کبائر گناہوں سے معصوم ہوتے ہیں یعنی انبیاء سے نہ اعمال و اخلاق کی لغزشیں ہوتی ہیں۔ نہ نفس و شیطان کی دراندازیوں سے ان کے جذبات، اخلاق، افکار اور اعمال متاثر ہوتے ہیں۔

غور کیجئے تو خود محسوس ہوگا کہ نبی کا معصوم ہونا اس مقصد کے لیے بالکل ناگزیر تھا جس کی خاطر رسالت کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے ایک ایسا شخص جس سے اس بات کا برابر کا اندیشہ ہو کہ مثلاً وہ جھوٹ بول سکتا ہے، خیانت کر سکتا ہے۔ نفسانیت کا شکار ہو سکتا ہے، منشاء الٰہی کی غلط ترجمانی کر سکتا ہے ایسے شخص پر لوگ یہ کیسے اعتماد کر سکتے ہیں کہ وہ نبوت کے دعوے میں سچا ہے اور پھر ایسا شخص لوگوں کے لیے عمل کا اعلیٰ نمونہ کیوں کر پیش کر سکتا ہے کیونکہ جس کا خود اپنا دامن داغوں سے پاک نہ ہو وہ دوسروں کو کیا دکھا کر تلقین کر سکتا ہے کہ تمہیں اپنے دامنوں کو اس طرح پاک رکھنا چاہیے۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ۔

جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمارے اندر بھوک اور پیاس ہونے کا علم اس طرح رکھ دیا ہے کہ ہمارے سامنے کوئی معاند کتنی ہی دلیلیں پیش کرے کہ ہم کو بھوک یا پیاس نہیں ہم کبھی اس وجدانی یقین سے جسے خدا نے ہمارے اندر پیدا کر دیا ہے۔ اس معاند کے ان عقلی دلائل سے متاثر ہو کر دستبردار نہیں ہو سکتے اور اپنے یقین کو غلط نہیں کہہ سکتے۔ بعینہ اسی طرح انبیاء کے نفوس قدسیہ کے اندر بھی اللہ تعالیٰ نے خاص قسم کا وجدان و ذوق سلیم رکھ دیا ہے جس کا عمل ہمیشہ صحیح، جس کا احساس ہمیشہ درست اور جس کا فیصلہ ہمیشہ ناطق ہوتا ہے۔

مولانا محمد قاسم کا مسئلہ عصمت پر استدلال

مولانا محمد قاسم نے اس آیت سے حضور انور کی عصمت پر جس انداز سے استدلال کیا ہے اس میں انہوں نے کمال نکتہ سنجی کی ہے۔ فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہ کا قرآن میں ارشاد ہے قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی اور ایسے ہی اللہ کا ارشاد گرامی ہے لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ ان دونوں آیتوں میں جب ہر معاملہ میں آپ کی اتباع کو ضروری قرار دیا ہے اس کے ساتھ قرآن ہی نے یہ بھی بتایا ہے کہ وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون نے انسانوں اور جنات کو صرف اپنی عبادت کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس میں بتایا ہے کہ انسان کی پیدائش کا مقصد عبادت ہے۔

تفصیل یہ ہے کہ ہر چیز کے لیے اس کی ذات کے کچھ لوازم ہوتے ہیں جس جگہ وہ ذات موجود ہوتی ہے وہاں اس کے یہ لوازم بھی ضرور موجود ہوتے ہیں۔ اسی لیے ان کو اس ذات کے لوازم کہا جاتا ہے جیسے آگ اس کے لیے جلانا لازم ہے جہاں آگ ہوگی ضرور جلائی جائے گی۔ اس قاعدہ کے موافق ہمارے سامنے دو قسم کی مخلوق ہیں۔ ملائکہ اور شیاطین۔ ان کی ذات کے لیے بھی کچھ لوازم ضروری ہیں۔ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ شیطان کی ذات کے لیے کفر لازم ہے۔ کان الشیطان لربہ کفورًا اور ملائکہ کے لیے فرمانبرداری لازم ہے وہ فرمانبرداری جس میں سرتابی و نافرمانی کی مطلق گنجائش نہ ہو لا یعصون اللہ ما امرھم ویفعلون ما یومرون۔

چونکہ امر بھی مسلم ہے کہ جو ذات کے لوازم ہوتے ہیں وہ اس ذات کے علاوہ دوسری جگہ نہیں پائے جا سکتے۔ اس لیے ملائکہ میں علاوہ اذعان و فرمانبرداری اور شیطان کے علاوہ کفر و سرکشی کسی دوسری جگہ پائی نہیں جا سکتی۔ لیکن ان دو مخلوق کے سوا میہاں ایک تیسری مخلوق اور نظر آتی ہے یعنی حضرت انسان جس میں یہ دونوں باتیں جمع نظر آتی ہیں۔ ارشاد ہے خلطوا عملا صالحا و اٰخر سیئًا یعنی انہوں نے نیک عمل کے ساتھ کچھ برے عمل بھی کیے ہیں لہٰذا حسب بیان سابق ضروری ہے کہ انسان میں دو قسم کا مادہ موجود ہو مادہ شیطانی بھی مادہ ملکی بھی ورنہ برائی اور بھلائی جو دراصل ان دونوں کی ذات کے لوازم تھے عام بن جائیں گے۔ ان اجزا سے انسان کی ترکیب پر یہ استدلال ایسا ہی ہے جیسا کہ عناصر اربعہ سے اس کی ترکیب پر ظاہر ہے کہ انسان کے لیے عناصر اربعہ

کے اجزاء ترکیبی ہونے کا ثبوت بھی ہمارے پاس بجز اس کے اور کوئی نہیں ہے کہ جو ان عناصر کے لوازم ہیں مثلاً رطوبت، یبوست، برودت اور حرارت یہ سب انسان میں موجود نظر آتے ہیں۔ رطوبت کو دیکھ کر یہ ماننا پڑتا ہے کہ اب جس کے لیے رطوبت لازم ہے انسان میں موجود ہے اسی طرح بقیہ اثرات کو دیکھ کر بھی تسلیم کرنا ضروری ہوگا کہ اس میں مادہ آتش و خاک کے عناصر بھی موجود ہیں ورنہ ایسا کوئی شخص ہے جس نے انسانی آفرینش کے وقت ان اجزاء کا مشاہدہ کیا ہو پس جس طرح ہم نے یہاں صرف لوازم کے وجود سے ان عناصر کے وجود پر استدلال کیا ہے، اسی طرح عام انسانوں میں اعمال صالحہ اور اعمال سیئہ کے اثرات کو دیکھ کر یہ تسلیم کرنا بھی لازم ہوگا کہ اس میں وہ دونوں قوتیں بھی ضرور ہیں جن کے یہ دو لوازم ہیں یعنی مادہ ملکی مادہ شیطانی۔ اس تمہید کے بعد اب یہ ضروری ہوگا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مادہ شیطانی سے مبرا ہوں ورنہ آپ کی ذات اقدس میں بھی اگر یہ مادہ موجود ہو تو لازم آئے گا کہ جو اس کے لوازم ہیں یعنی معصیت وہ بھی آپ کی ذات میں موجود ہو۔ العیاذ باللہ اور اگر یہ تسلیم کر لیا جائے تو جب قرآن کریم ہر معاملہ میں آپ کی اتباع کا حکم دیتا ہے تو یہ بھی لازم ہوگا کہ اس معصیت میں بھی آپ کی اتباع ضروری ہو۔ حالانکہ وما امروا الا لیعبد اللہ مخلصین لہ الدین میں حصر کے ساتھ فرما دیا گیا ہے کہ تم کو صرف عبادت کرنے کا ہی حکم دیا گیا ہے۔ معصیت کا نہیں۔ یہاں اگر معصیت میں بھی آپ کی اتباع تسلیم کی جائے تو یہ حصر باطل ہو جائے گا لہٰذا ماننا پڑے گا کہ آپ میں مادۂ شیطانی جو کہ منشاء گناہ ہے موجود نہیں اور چونکہ گناہ صغیرہ ہو یا کبیرہ دونوں کے صدور کا منشاء مادۂ شیطانی ہے۔ لہٰذہ جب آپ میں یہ مادہ شیطانی نہیں تو آپ کا ہر قسم کی معصیت سے معصوم ہونا بھی ضروری ہے۔ اب رہی یہ بحث کہ اس بیان سے صرف آپ کی ذات کا معصوم ہونا ثابت ہوتا ہے جمیع انبیاء علیہم السلام کا معصوم ہونا کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے۔ تو قرآن کریم میں آپ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ

آپ انبیاء سابقین علیہم السلام کے طریقے کی پیروی کیجئے۔ یہاں بھی آپ کو ان کے طریقے کی پیروی کرنے کا مطلقاً حکم دیا گیا ہے۔ کسی خاص قول و فعل کی تخصیص نہیں کی گئی اور یہ نحو کا قاعدہ ہے کہ جب صلہ حذف کرتے ہیں تو وہاں مراد عموم ہوتا ہے جیسا کہ اللہ اکبر میں دیکھو یہاں یہ بیان نہیں کیا گیا کہ اللہ تعالیٰ کس سے بڑا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ ہر چیز سے بڑا ہے اسی طرح یہاں یہ نہیں فرمایا گیا کہ کس بات میں ان کی پیروی کیجئے تو ثابت ہوا کہ مراد یہی ہے کہ ہر بات میں، لہٰذا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح جملہ انبیاء علیہم السلام کی معصومیت بھی ثابت

ہو گئی۔ اس کے علاوہ قرآن کریم میں ایک اور دلیل بھی ہے جس سے جملہ انبیاء علیہم السلام کی معصومیت ثابت ہوتی ہے عالم الغیب ... الخ فعل ارتضٰی کی ضمیر اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹتی ہے۔ یہاں بھی فعل کو مطلق رکھا گیا ہے جس کا ترجمہ یہ ہے کہ جس کو بھی اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے اور اس کی تفصیل نہیں کی گئی کہ حق تعالیٰ کی اس رضاء کا تعلق ان کے کسی خاص عمل کے یا کسی خاص قول کے ساتھ ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہاں بھی عموم واطلاق ہی مراد ہے اور "من رسول" میں من چونکہ بیانیہ ہے اس لیے ثابت ہوا کہ من ارتضٰی یعنی جن کو اللہ تعالیٰ پسند فرماتا ہے وہ رسول ہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ رسول جتنے بھی ہیں سب کے سب اللہ تعالیٰ کے محبوب ومرتضٰی ہوتے ہیں اور بلا تخصیص ہر بات اور ہر ادا میں محبوب ومرتضٰی ہیں۔ اب اگر ان سے معصیت کا صدور ممکن ہو تو وہ علی العموم محبوب ومرتضٰی کیسے ہو سکتے ہیں اس کے بعد یہ سمجھئے کہ جس طرح چاندی اور سونے کو کسوٹی پر اس لیے کستے ہیں تاکہ اس کا کھرا اور کھوٹا ہونا معلوم ہو جائے۔ یہاں کسوٹی پر گھسنے سے جو لکیریں پیدا ہو جاتی ہیں وہ خود مقصود نہیں ہوتیں بلکہ وہ چاندی اور سونے کے کھرے یا کھوٹے ہونے کا صرف ایک معیار ہوتی ہے اصل قدر وقیمت اسی چاندی اور سونے کی ہوتی ہے۔ اسی طرح عناصر روحانی اخلاق وملکات اور انسانی افعال وکردار کی مثال ہے۔ یہاں بھی اعمال کی تشریح کا اصل مقصد اخلاق حسنہ واخلاق سیئہ کا امتحان ہے چنانچہ ارشاد ہے لیبلوکم ایکم احسن عملاً زندگی اور موت کو ہم نے اس لیے پیدا کیا ہے تاکہ تمہاری آزمائش کریں کہ تم میں بلحاظ عمل کون بہتر ہے۔ دیکھ لیجئے کہ انسان میں داد ودہش کا عمل اس کی گواہی دیتا ہے کہ اس میں ملکہ سخاوت موجود ہے، اس طرح جانبازی اور معرکہ آرائی بتاتی ہے کہ اس میں جوہر شجاعت کارفرما ہے بہرحال انسان کے سارے اعمال درحقیقت اس کے اخلاق وملکات کی دلیل ہوتے ہیں۔ یہاں بھی کسوٹی کے خطوط کی طرح خود یہ اعمال مقاصد نہیں بلکہ اصل مقصد وہ اخلاق وملکات ہیں جن کے یہ مظاہر ہیں۔ بازار قیامت میں قیمت تمام تر ان مظاہر کی نہیں بلکہ ان مصادر کی ہوگی جن کو ہم اخلاق کہتے ہیں۔ اس بنا پر ضروری ہے نبوت کے یہ عناصر روحانی یعنی اخلاق وملکات جو مصدر اعمال ہیں سب کے سب حسنہ ہوں اور اللہ سبحانہٗ کی نگاہ میں پسندیدہ ہوں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ کچھ پسندیدہ اور کچھ ناپسندیدہ۔ اگر ایسا ہو تو قرآن میں من ارتضٰی من رسول کا اطلاق درہم برہم ہو جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ ارتضٰی کے بعد من رسول میں من بیانیہ کا اضافہ کرکے اشارہ کیا ہے کہ مرتضٰی اور پسندیدہ ہونے کے لیے رسول ہونا ضروری ہے یعنی غیر انبیاء کے لیے یہ مقام عصمت نہیں ہے۔ چنانچہ قرآن کی یہ آیت گواہ ہے۔

کذالک لنصرف عنه السوء والفحشاء انه من عبادنا المخلصین۔
ایسے ہی ہم ہٹا دیتے ہیں اس سے برائی اور بدکاری کو یقیناً وہ ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے [1]

رسول کی محبت ایمان کے لوازم سے ہے

اتباع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آیت قرآنی میں اللہ کی محبت کی دلیل اور نشانی بتا کر پیش کرنا اس بات کی طرف ہماری رہنمائی کر رہا ہے کہ رسول کی محبت اللہ کی محبت کے لوازم میں سے ہے کیونکہ رسول کا رشتہ اللہ سے یہی ہے کہ وہ ہمارے اور خدا کے درمیان پیغام پہنچانے والا ہے اور پیغام رساں بھی ایسا عظیم المرتبت جس کا صرف کہا ماننے کی ہیں ہدایت نہیں بلکہ بے قید اس کی پیروی کرنے کا حکم ہے۔ رسول سے اس لیے محبت کی جائے کہ وہ بارگاہ محبت کا پیغامبر ہے۔ قرآن کے محبت کا اصلی محور و مرکز اللہ کی ذات ہے اور یہی اس کا امتیازی مقام ہے۔ کہ انسان کے قلبی علائق کے گوشے صرف اسی ایک ذات پاک کے نام پر تقسیم ہوتے ہیں اسی لیے اذان و اقامت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول اللہ کہہ کر پکارا گیا ہے تاکہ اللہ اکبر کے بعد رسول اللہ کی عظمت و محبت قلب میں خود بخود جاگزیں ہو جائے اسی لیے یہاں فرمایا ہے کہ اگر تم کو اللہ سے محبت ہے تو میری پیروی کرو۔ گویا اصل محور و مرکز خدا ہی کی محبت ہے اور اس کا صحیح معیار رسول کی اطاعت ہے گویا یہ آیت بتاتی ہے کہ رسول کی محبت اللہ کے رسول ہونے کی وجہ سے ہے۔ عیسائی بھی حضرت عیسٰی سے محبت کرتے ہیں مگر اللہ کا رسول سمجھ کر نہیں بلکہ خدا کا بیٹا بنا کر یہ صحیح محبت نہیں ہے۔ محبت یہ ہے کہ صرف اللہ کے نام پر ہو۔ اس علاقہ کو ذرا اور وسعت دو تو رسول کے صحابہ سامنے آتے ہیں ان سے محبت اس لیے ضروری ہے کہ رسول کی محبت ضروری ہے گویا ان کی محبت پیدا کرنے کے لیے رسول کو سامنے رکھنا چاہیے جیسا کہ رسول کی محبت کے لیے خدا کی ذات کو پیش نظر رکھنا چاہیے اس طرح اگرچہ محبت کا دائرہ بہت پھیلتا جائے گا مگر اصل مرکزی نقطہ پھر وہی ایک ذات پاک کی محبت رہے گی۔

---

[1] مکاتیب قاسم العلوم

حضور انور کی محبت کی علامت

جیسے یہاں قرآن نے اللہ کی محبت کی علامت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع بتائی ہے ایسے ہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد میں اپنی محبت کی ایک محسوس اور مرئی نشانی بتائی ہے۔

حضرت انس کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ سے فرمایا ہے کہ اے فرزند اگر یہ کر سکتا ہے کہ صبح و شام اس طرح گزارے کہ تیرے دل میں کسی کے لیے کوئی کھوٹ نہ ہو تو گزارے پھر فرمایا کہ یہ میری سنت ہے اور جو شخص میری سنت سے محبت کرتا ہے وہ ضرور مجھ سے محبت کرتا ہے اور جو شخص مجھ سے محبت کرے گا وہ جنت میں میرے ساتھ ہوگا۔ (ترمذی)

اس ارشاد میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت کی کھلی علامت یہ بتائی گئی ہے کہ آپ کے تمام اوضاع و اطوار نظروں میں محبوب ہو جائیں۔ عبادات ہی میں نہیں کہ اس میں اتباع کرنا فرض ہے بلکہ عبادات کے سوا حضور انور کی عادات و نفسیات و طبیعیات بھی نظروں میں قابلِ اتباع بن جائیں حتیٰ کہ غیر اختیاری جذبات جو اپنے مخالف کے لیے قلب میں موجزن ہوتے ہیں اس لیے دل میں نہ ٹھہریں کہ یہ آپ کی سنت کے خلاف ہیں۔ یہ اسی وقت ہو سکتا ہے جب کہ آپ کی محبت رگ رگ میں سرایت کر چکی ہو۔

رسول کی اتباع کا نتیجہ

آخر میں اتباع رسول کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ یحببکم اللہ اللہ تم سے محبت کرے گا گویا پہلے تم اللہ کے عاشق اور محب تھے عشق و محبت کے دعوی کی صداقت کے لیے اگر تم اتباع رسول کی کسوٹی پر پورے اتر گئے تو اب تم اللہ کے محبوب ہو جاؤ گے۔ اس کے آگے اور کوئی درجہ کمال نہیں ہے جب محبت دونوں جانب رونما ہوتی ہے یعنی اللہ ان سے محبت کرتا ہے اور وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں اور فی الواقع یحبھم و یحبونہ کا مصداق ظہور پذیر ہو جاتا ہے تو قرآن نے بتایا ہے کہ ان محبوبوں میں یہ اوصاف پیدا ہو جاتے ہیں۔

۱۔ اذلۃ علی المومنین اہل ایمان کے مقابلہ میں نہایت نرم ہوں گے۔

۲۔ اعزۃ علی الکافرین دشمنوں کے مقابلے میں نہایت سخت ہوں گے۔
۳۔ یجاھدون فی سبیل اللہ۔ اللہ کے راستہ میں ان تھک محنت کریں گے۔ نبوت کے علم وعمل کو پھیلانے اسے دنیا میں برتر کرنے، پوری دنیا کا مذاق اور مزاج بدلنے کے لیے جدوجہد کا ہنگامہ بپا کر دیں گے۔
۴۔ ولا یخافون لومۃ لائم اور ان کو اس معاملہ میں کسی ملامت گر کی ملامت کا کوئی خوف دامنگیر نہ ہوگا۔
الغرض یہ وہ مقام رفیع ہے اور وہ درجہ کمال ہے کہ اس سے اوپر کسی کمال کا تصور بھی ممکن نہیں۔ اللھم اجعلنی منھم

رسالت محمدی کی پیروی شرط نجات ہے :۔

۶۴۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ تم اللہ ورسول کی طاعت کرو۔ پھر اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو اللہ کفر کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ یہود ونصاریٰ کہتے تھے کہ نحن ابناء اللہ واحباؤہ ہم خدا کے بیٹے اور محبوب ہیں۔ یہاں بتلا دیا گیا کہ کافر کبھی خدا کا محبوب نہیں ہو سکتا۔ اگر واقعی خدا کے محبوب بننا چاہتے ہو تو اس کے احکام کی تعمیل کرو۔ پیغمبر کا کہا مانو اور خدا کے سب سے محبوب کے نقش قدم پہ چلو۔ وفد نجران نے یہ بھی کہا تھا کہ ہم مسیح کی تعظیم وعبادت اللہ کی محبت وتعظیم کی وجہ سے کرتے ہیں اس کا بھی جواب ہوگیا آگے خدا کے چند محبوب بندوں کا حال سنایا گیا اور وفد نجران کی رعایت سے حضرت مسیح کی سوانح زیادہ شرح وبسط سے بیان کی گئی ہے۔ یہ تمہید ہے خاتم الانبیاء کے ذکر مبارک کی جیسا کہ آگے چل کر معلوم ہوگا۔ [1]
اصل یہ ہے کہ روئے سخن آیت میں پوری دنیا کی طرف ہے۔ اس میں خصوصیت کے ساتھ عیسائی اور یہودی مخاطب ہیں تقریر پوری مسلسل اور مربوط ہے پہلے سب کے سامنے دعوت توحید پیش کی گئی اور اس پر ان کے شبہات کا ازالہ کیا گیا۔ گزشتہ آیت سے سب کے سامنے دعوت رسالت کو پیش کیا گیا ہے۔ پہلی آیت میں حضور انور کی اتباع کو شرط محبت اور اس آیت میں حضور انور کی اطاعت کو شرط نجات قرار دیا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسری رسالتوں کے مقابلے میں رسالت محمدی کی جس امتیازی حیثیت کی تمہید میں ابھی ابھی نشاندہی کی گئی ہے ان کو نگاہ میں رکھتے اور پھر اس بات پر غور کیجئے کہ اس امتیازی حیثیت کے تقاضے کیا ہو سکتے ہیں۔ اس کا پہلا اور فطری تقاضا یہ ہے کہ دوسری تمام رسالتیں منسوخ ہو چکی ہیں اور اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک منظور شدہ رسالت صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اسی لیے اتباع کے موقعہ پر آپ کو اپنی ذات کو پیش کرنے کی ہدایت کی گئی ہے کہ تبعونی میری اتباع کرو اور اطاعت کے موقعہ پر رسالت کو پیش کرنے کو کہا گیا۔ اس میں اشارہ ہے کہ ہر ملک ہر قوم اور ہر زمانے کے لیے آپ کی پیروی شرط محبت الٰہی اور آپ کی اطاعت شرط نجات ہے۔ آگے آیات میں ان شبہات کا ازالہ کیا گیا ہے جو یہودی اور عیسائی دنیا کی جانب سے رسالت محمدیہ کے خلاف پیش کیے گئے۔ اور جن کی قرآن نے دوسری مواقع پر نشان دہی کی ہے

إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَىٰ آدَمَ وَنُوحًا وَآلَ إِبْرَاهِيمَ وَآلَ عِمْرَانَ عَلَى الْعَالَمِينَ ۝ ذُرِّيَّةً بَعْضُهَا مِن بَعْضٍ ۗ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ۝

بلاشبہ واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے آدم اور نوح کو اور ابراہیم اور عمران کے گھرانوں کو تمام دنیا میں برگزیدگی عطا فرمائی[65] یہ ایک ہی نسل تھی جس میں بعض بعض سے پیدا ہوئے[66] اور اللہ دعائیں سننے والا اور مصالح عالم کو خوب جاننے والا ہے[67]

مبارک سلسلۂ نبوت

پہلے بتایا گیا ہے کہ جو کوئی اللہ سے محبت رکھنے کا دعویدار ہے تو اُسے چاہیے کہ محمد رسول اللہ کی پیروی کرے۔ اللہ کی محبت کا دعویٰ اور آپ کی اتباع سے انحراف ایک جگہ جمع نہیں ہو سکتے اللہ کا قانون یہ ہے کہ ہدایت خلق کے لیے رسولوں کو مبعوث کرتا رہا ہے۔ محمد رسول اللہ کی تشریف آوری اسی سلسلے کی آخری کڑی ہے اس لیے جو بھی اب رہتی دنیا تک ان کی پیروی کریں گے وہ کامیاب ہوں گے اور جو انکار و سرکشی سے مقابلہ کریں گے وہ ناکام ہوں گے۔ اب اس آیت میں اسی قانون کے تحت کہ اللہ کے رسول مبعوث ہوتے رہے ہیں۔ بتایا جا رہا ہے کہ کہ اللہ کا نبوت و رسالت کے بارے میں قانون یہ ہے کہ آدم و نوح کے بعد انبیاء اولاد ابراہیم میں سے آئے ہیں۔ قرآن میں دوسری جگہ اس کی صراحت ہے وجعلنا فی ذریۃ النبوۃ یعنی حضرت ابراہیم کے بعد بجز ان کی اولاد کسی کو نبوت نہ دی جائے گی چنانچہ جس قدر انبیاء ان کے بعد ہوئے ہیں ان کی ہی اولاد سے ہوئے اسی لیے حضرت ابراہیم کو ابوالانبیاء کہتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کی تین بیویاں تھیں۔ سارہ ہاجرہ اور قطورا۔

سارہ کے بیٹے حضرت اسحاق تھے ان کے دو بیٹے تھے حضرت یعقوب جو بنی اسرائیل کے باپ تھے دوسرے عیسو جن کا لقب ادوم تھا۔ اس سلسلہ میں سے ادوم اپنے بھائی سے الگ ہو کر اپنے چچا اسماعیل کے پاس عرب میں متوطن ہوئے۔ بقیہ سلسلے مصر و شام میں رہے۔

قطورا کے بطن سے تمام اولاد جن میں ایک کا نام مدین تھا عرب ہی میں ان کے باپ نے ان کو بسایا۔ ان میں سے بنو مدین اور ددان کے سوا کسی کا حال معلوم نہیں۔

ہاجرہ کے بطن سے صرف ایک بیٹا پیدا ہوا حضرت اسماعیل۔ انہوں نے بھی عرب ہی میں اپنے باپ کے حکم سے سکونت اختیار کی۔

حضرت ابراہیم کی آل بول کر قرآن نے ان تینوں شاخوں کو یک جا کر دیا۔ یعنی حضرت اسحاق کی شاخ جس کے آخری پیغمبر حضرت عیسیٰ ہیں۔ مدین کی شاخ جن کی اولاد میں حضرت شعیب تھے اور حضرت اسماعیل کی شاخ جن کی اولاد میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آل ابراہیم کے بعد آل عمران کا ذکر خاص اہمیت کی وجہ سے کیا ہے۔ کیونکہ نجرانیوں کا عیسائی وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہے اور ان کو اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس خاندان کا ذکر کیا ہے جس میں حضرت مریم کی ولادت با سعادت ہوئی۔ یہ حضرت مریم کے والد اور حضرت عیسیٰ کے نانا ہیں اس طرح گویا نبوت کا پورا شجرہ طیبہ ہے قرآن کا انداز بیان بتا رہا ہے کہ۔

اولاً، یہودی اور عیسائیوں کو اولادِ ابراہیم میں نبوت کا ہونا مسلم تھا۔ وہ مانتے تھے کہ انبیاء اولاد ابراہیم میں سے ہو گئے ہیں۔ اور یہ بھی ان کی مانی ہوئی بات تھی کہ یہ سارے خاندان ایک دوسرے سے پیوستہ و وابستہ اور ایک دوسرے کی ذریت ہیں۔

ثانیاً، دونوں کو اپنی کتابوں کی بشارتوں کے مطابق ایک آخری پیغمبر کا انتظار تھا۔ قرآن کے سوا کسی اور آسمانی کتاب نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ درجہ کمال پر آیا ہے بلکہ سب نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد اور نبوت آئے گی جو اس کام کو درجہ کمال تک پہنچائے گی۔

اللہ سبحانہ، نے حضرت موسیٰ سے فرمایا۔

میں ان کے بیٹے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔ اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں اور جو کچھ میں اس سے فرماؤں گا وہ سب ان

سے کہے گا۔ (استثنا ۱۸-۱۹)

حضرت مسیح کے جو الفاظ اناجیل مروجہ میں نقل ہوئے ہیں حسب ذیل ہیں اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو اور میرے حکموں پر عمل کروگے اور میں باپ سے درخواست کروں گا تو وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے (یوحنا ۱۴، ۱۵، ۱۶)

ثالثاً، یہودیوں اور عیسائیوں کو یہ بھی مسلم تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اولاد ابراہیم سے بواسطہ اسماعیل ہیں۔

عمران کون ہیں

۶۵: بلاشبہ اللہ نے آدم، نوح کو ابراہیم اور عمران کے گھرانوں کو۔

عمران دو ہیں ایک حضرت موسیٰ کے والد دوسرے حضرت مریم کے والد۔ اکثر سلف وخلف نے یہاں حضرت مریم کے والد مراد لیا ہے کیونکہ آگے اذقالت امرأۃ عمران سے اسی دوسرے عمران کے گھرانے کا قصہ بیان ہو رہا ہے اور غالباً سورۃ کا نام بھی اسی لیے ہوا کہ اس میں عمران ثانی کے گھرانے یعنی حضرت مریم و مسیح کا واقعہ بہت بسط و تفصیل سے بیان ہوا ہے[1] یہاں خاص طور پر ان کے ذکر کی شاید یہ وجہ ہے کہ نجران کی عیسائی حکومت کا وفد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تھا۔ نجران کا علاقہ حجاز اور یمن کے درمیان ہے۔ آبادی تمام تر عیسائی تھی۔ اس موقعہ پر حضرت مریم کے والد کا ذکر خاص اہمیت رکھتا ہے۔ کیونکہ مسیحیوں کی گمراہی کا تمام تر سبب یہ ہے کہ وہ حضرت مسیح کو بندہ اور رسول ماننے کے بجائے اللہ کا بیٹا قرار دیتے ہیں۔ قرآن ان کی یہ بنیادی غلطی آغاز ہی میں رفع کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ آدم، نوح، آل ابراہیم اور آل عمران کے پیغمبر انسان تھے۔ ان میں سے کوئی بھی خدا کا بیٹا نہ تھا۔

عمران ایک عابد زاہد شخص تھے اور اسی زہد و عبادت کی وجہ سے نماز کی امامت بھی ان کے سپرد تھی۔ محمد ابن اسحاق نے عمران کا نسب نامہ یہ لکھا ہے۔ عمران بن باشم بن یشا بن حزقیا بن ابراہیم بن عزریا بن نادش بن اجرہ بن یہوا بن نازم بن مفاسط بن ایشا بن ایان بن رحبعم

[1] افادات شیخ الاسلام

بن سلیمان بن داؤد، اور حافظ ابن عساکر نے ان ناموں کے سوا دوسرے نام بیان کیے ہیں اور ان دونوں بیانات میں کافی اختلاف ہے تاہم اس پر تمام علمائے انساب کا اتفاق ہے کہ عمران حضرت سلیمان علیہ السلام کی اولاد میں سے ہیں۔

اصطفائی فضل و شرف

۲۶ تمام دنیا میں برگزیدگی عطا فرمائی۔ خدا کی مخلوقات میں زمین و آسمان، چاند، سورج ستارے، فرشتے، جن، شجر، حجر سب ہی شامل تھے مگر اس نے اپنے علم محیط اور حکمت بالغہ سے ملکات روحانیہ اور کمالات جسمانیہ کا جو مجموعہ ابو البشر آدم علیہ السلام میں ودیعت کیا وہ مخلوقات میں سے کسی کو نہیں دیا بلکہ آدم کو مسجودِ ملائکہ بنا کر ظاہر فرما دیا کہ آدم کا اعزاز و اکرام اس کی بارگاہ میں ہر مخلوق سے زیادہ ہے۔ آدم کا یہ انتخابی اور اصطفائی فضل و شرف جسے ہم نبوت کہتے ہیں۔ کچھ ان کی ذات تک محدود نہ تھا۔ بلکہ منتقل ہو کر ان کی اولاد میں نوح علیہ السلام کو ملا۔ پھر منتقل ہوتا ہوا حضرت نوح کی اولاد حضرت ابراہیم تک پہنچا۔ یہاں سے ایک نئی صورت پیدا ہو گئی۔ آدم و نوح کے بعد جتنے انسان دنیا میں آباد ہوئے وہ سب ان دونوں کی نسل سے تھے۔ کوئی خاندان دونوں کی ذریت سے باہر نہ تھا برخلاف اس کے حضرت ابراہیم کے بعد ان کی نسل کے علاوہ دنیا میں دوسرے بہت خاندان موجود رہے لیکن جس خدا نے اپنی بے شمار مخلوقات میں سے منصب نبوت کے لیے آدم کا انتخاب کیا تھا اسی کے علم محیط اور اختیار کامل نے آئندہ کے لیے ہزاروں گھرانوں میں سے اس منصب جلیل کے لیے ابراہیم کے گھرانے کو مخصوص فرمایا جس قدر انبیاء و رسل حضرت ابراہیم کے بعد آئے ان ہی کے صاحبزادوں کی نسل سے آئے[1]

اور یہ اصطفائی سلسلہ صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا۔ جب اولاد اسماعیل میں آخری نبی کے ظہور کا وقت آیا اور اس اصطفائی فضل و شرف کو اوپر منتقل فرمایا تو یہاں بھی انتخاب عمل میں آیا صحیح مسلم میں واثلہ ابن الاسقع کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی آیا ہے کہ۔

اللہ نے اولاد اسماعیل میں سے کنانہ کو منتخب فرمایا۔ اور کنانہ میں سے قریش کو اور قریش میں سے بنی ہاشم کو اور بنی ہاشم میں چن کر مجھے پسند فرمایا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ خدا کے بہت سے رسول آئے جن کی صحیح تعداد خدا ہی کو معلوم ہے مگر اس آیت سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ سب سے پہلے منصب نبوت کے لیے دو انسان منتخب ہوئے تھے۔ پھر افراد و اشخاص کے بجائے خاندانوں کا انتخاب کیا گیا۔ خاندانوں میں آل ابراہیم میں اولا بنی اسرائیل کا انتخاب ہوا۔ بنی اسرائیل نے کفر و انحراف کیا تو پھر بنی اسماعیل کا انتخاب عمل میں آیا بنی اسماعیل میں سے آخری رسول روانہ کرکے اس سلسلہ کو ختم کر دیا اور بساط عالم سپٹنے کا اعلان کر دیا۔

اصل ارشاد میں اصطفیٰ آیا ہے اس کے معنے چن کر پسند کرنے کے آتے ہیں۔ اسی سے ہمیں نبوت کے بارے میں دو رہنما اصول معلوم ہوئے ہیں۔

اولاً، یہ انبیاء کی عصمت اور گناہوں سے پاک ہوتے پر دلالت کرتا ہے۔ عام پیغمبروں کے متعلق یہی آیا ہے۔

اللہ یصطفیٰ من الملائکۃ رسلاً و من الناس۔

خدا فرشتوں میں سے اپنے پیغمبر چن کو پسند کرتا ہے چن لیتا ہے اور آدمیوں میں سے۔

ایک آیت میں اصطفاء کے ساتھ انبیاء کے خیر ہونے کا ذکر کیا ہے۔

وانھم عندنا لمن المصطفین الاخیار۔

وہ ہمارے نزدیک چنے ہوئے نیکو کاروں میں سے ہیں۔

ایک اور آیت میں ان کی پیشوائی اور امامت کا ذکر کیا ہے۔

کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت بے گناہی کی شہادت ہو سکتی ہے کہ وہ خدا کی پسند کے چنے ہوئے نیک اور امام و پیشوا تھے۔ ان کا برگزیدہ ہونا، نیک ہونا اور امام ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔

ثانیاً، اس اصطفاء کے لفظ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ نبوت ریاضت اور محنت سے نہیں ملتی ہے۔ اگر نبوت کسب و اکتساب کا نتیجہ ہوتی تو یہ اصطفاء نہ ہوتا۔ بلکہ رسولوں کا بعثت کا مدار عبادت میں سرشاری پہ ہوتا۔ حالانکہ یہاں معاملہ برعکس ہے۔ جتنی زیادہ عبادت ہوئی اتنی رسولوں کی آمد میں تاخیر ہوئی۔ اور جتنی گمراہی نے شدت اختیار کی اسی قدر رسولوں کی آمد کا زمانہ قریب تر ہوتا گیا۔ پھر جب خدا کا کوئی رسول آگیا تو اس کی تباہت میں عبادت کرکے ایک بھی

رسُول نہیں بنا اور جب اس کی تعلیمات کے نقوش مٹنے لگے تو ایسے ایسے رسولوں کی آمد ہوئی جن
کا پہلی شریعت سے کوئی تعلق نہ تھا اس لیے یہ نتیجہ نکالنا مشکل نہیں کہ رسُول کسی عبادت دریافت
سے نہیں بنتے بلکہ ان کو اپنی پسند سے اللہ سبحانہ، منتخب کرتے ہیں۔ ان اللہ اصطفیٰ میں اسی کی طرف
اشارہ ہے یعنی ان کو اللہ نے منتخب کیا ہے ان میں سے خود اپنی محنت سے کوئی رسول نہیں بنا

انبیاء کی بشریت اور اُن کا مقامِ اصطفاء

یہ ایک ہی نسل تھی جس میں سے بعض بعض سے پیدا ہوئے ۔ چونکہ عموماً نسب باپ کی
طرف سے چلتا ہے اور حضرت مسیح علیہ السلام بغیر باپ کے پیدا ہوئے تھے اس لحاظ سے یہ خلش ہو
ہو سکتی تھی کہ ان کو نسل ابراہیم سے مستثنیٰ کرنا پڑے گا۔ اس لیے حق تعالیٰ نے آل عمران اور ذریۃ بعضہا
من بعض فرما کر متنبہ فرما دیا کہ جب حضرت مسیح ماں سے پیدا ہوئے تو ان کا سلسلہ نسب بھی ماں
کی جانب سے لیا جائے گا نہ کہ معاذ اللہ خدا کی طرف سے اور ظاہر ہے کہ ان کی والدہ مریم صدیقہ کے
باپ عمران کا سلسلہ آخر حضرت ابراہیم پر منتہی ہوتا ہے تو آلِ عمران آل ابراہیم کی ایک شاخ ہوئی اور
کوئی پیغمبر آل ابراہیم سے باہر نہ ہوا[1]

یعنی اس تمام سلسلے میں جو حضرت آدم سے شروع ہو کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ختم ہو جاتا
ہے کوئی رسُول ایسا نہیں جو انسان نہ ہو صرف حضرت عیسیٰ کا معاملہ عیسائیوں کی نظر میں مشتبہ تھا اسی کو
ذریت بعض من بعض کہہ کر صاف کر دیا ہے یعنی جب وہ عمران کی بیٹی کی اولاد تھے تو ان کو بھی انسان
ہی ہونا چاہیے ۔ گویا اس آیت کے ذریعے قرآن اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتار رہا ہے کہ
نبی مصطفیٰ، مجتبیٰ اور مرتضیٰ اور دوسری مقدس خصوصیات کے باوجود اللہ کی مخلوق، اللہ کا بندہ اور
آدمی ہوتا ہے۔ وہ خدا، خدا کا اوتار، خدا کا بیٹا اور خدا کا بروز نہیں ہوتا۔ بلکہ حقیقت یہ ہے یہ مسئلہ
بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت قرآن سے پہلے افراط تفریط کی تاریکی میں گم تھی ۔ قرآن
سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے بھی تھے جو رسُول کو ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے وہ ہر قسم
کے گناہ بھی کرتے تھے وہ بد اخلاقیوں کے بھی مرتکب ہوتے تھے وہ کفر بھی کرتے تاہم پیغمبر سمجھے جاتے
تھے دوسری طرف عیسائی تھے جو اپنے نجات دہندہ کو انسانیت سے پاک خود خدا، خدا کا جز یا ناسوت

[1] افادات شیخ الاسلام

ولاہوت کا مجموعہ سمجھتے تھے۔ قربان جایئے قرآن کے اس بلیغانہ انداز کے کہ ایک ہی فقرہ بول کر افراط وتفریط کی تردید کر دی اصطفیٰ کہہ کر انبیاء کی عصمت، پارسائی، خدا کے پسندیدہ ہونے کا اعلان کر دیا اور ذریت بعضہا کہہ کر انبیاء کی بشریت کو واضح کر دیا۔ اس پہ تفصیلی بحث انشاء اللہ پارہ ۵ میں آئے گی۔

۶۸۔ اور اللہ دعائیں سننے والا اور مصالح عالم کو خوب جاننے والا ہے سب کی دعاؤں اور باتوں کو سنتا اور سب کے ظاہری وباطنی احوال واستعداد کو جانتا ہے لہذا یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یونہی اتفاقیہ انتخاب کر لیا ہوگا۔ وہاں ہر کام پورے علم وحکمت پر مبنی ہے[1]

کچھ مفسرین نے اس فقرے کو آئندہ آیت سے جوڑ دیا ہے لیکن مقام استدلال کا تقاضا یہی ہے کہ اس فقرے کا آگے سے نہیں پیچھے سے پیوند ہو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

إِذْ قَالَتِ امْرَأَتُ عِمْرَانَ رَبِّ إِنِّي نَذَرْتُ لَكَ مَا فِي بَطْنِي مُحَرَّرًا فَتَقَبَّلْ مِنِّي ۖ إِنَّكَ أَنتَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ﴿٣٥﴾ فَلَمَّا وَضَعَتْهَا قَالَتْ رَبِّ إِنِّي وَضَعْتُهَا أُنثَىٰ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا وَضَعَتْ وَلَيْسَ الذَّكَرُ كَالْأُنثَىٰ ۖ وَإِنِّي سَمَّيْتُهَا مَرْيَمَ وَإِنِّي أُعِيذُهَا بِكَ وَذُرِّيَّتَهَا مِنَ الشَّيْطَانِ الرَّجِيمِ ﴿٣٦﴾ فَتَقَبَّلَهَا رَبُّهَا بِقَبُولٍ حَسَنٍ وَأَنبَتَهَا نَبَاتًا حَسَنًا وَكَفَّلَهَا زَكَرِيَّا ۖ كُلَّمَا دَخَلَ عَلَيْهَا زَكَرِيَّا الْمِحْرَابَ وَجَدَ عِندَهَا رِزْقًا ۖ قَالَ يَا مَرْيَمُ أَنَّىٰ لَكِ هَٰذَا ۖ قَالَتْ هُوَ مِنْ عِندِ اللَّهِ ۖ إِنَّ اللَّهَ يَرْزُقُ مَن يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ﴿٣٧﴾

یاد کرو اس واقعہ کو جب عمران کی بیوی کہہ رہی تھی کہ میرے پروردگار! میں اس بچہ کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں وہ تیرے ہی لیے وقف ہوگا میری اس پیش کش کو قبول فرما تو سننے والا ہے اور جاننے والا ہے ۶۹ پھر جب

وہ بچی اس کے گھر پیدا ہوئی تو اس نے کہا اے میرے آقا میرے ہاں تو لڑکی پیدا ہو گئی ہے حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا اللہ کو اس کی خبر تھی[۱۸]۔ اور لڑکا لڑکی طرح نہیں ہوتا[۱۹] بہرحال میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا ہے۔ اور میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود کے فتنے سے تیری پناہ میں دیتی ہوں[۲۰]۔ آخر کار اس کے رب نے اس لڑکی کو بخوشی قبول کر لیا اسے بڑی ہی اچھی نشوونما دی اور زکریا کو اس کا سرپرست مقرر کر دیا[۲۱] زکریا جب بھی اس کے پاس محراب میں جاتا تو اس کے پاس کچھ کھانے کا سامان پاتا، پوچھتا یہ کہاں سے تیرے پاس آیا ہے وہ جواب دیتی اللہ کے پاس سے، اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے[۲۲]

نبوتِ محمدیہ پر اہل کتاب کی خلش

یہ بات پہلے معلوم ہو چکی کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو اولاد ابراہیم میں نبوت کا ہونا مسلم تھا۔ اور یہ بھی دونوں گروہ مانتے تھے کہ انبیاء کی بشارتوں کے مطابق ایک پیغمبر آنے والا ہے اور یہ بھی ان کو تسلیم تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم کی اولاد میں سے ہیں اس کے باوجود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی ماننے میں وہ اس لیے پس و پیش کر رہے تھے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خاندان اسرائیل سے نہیں بلکہ خاندان اسماعیل سے ہیں۔ قرآن نے یہ بات بار بار بتائی ہے اور پہلے پارے میں آیتؔ؟

کی تشریح میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ اہل کتاب کا نبوت محمدیہ سے کفر و انکار کسی اجتہادی غلطی کی بنا پر، فکر و نظر کے کسی دھوکے یا مغالطہ کی بنا پر نہیں بلکہ اس غصہ و عناد کا نتیجہ تھا کہ نبوت خاندان اسرائیل سے نکل کر بنی اسماعیل کے ایک فرزند کو کیوں مل رہی ہے ان کا کہنا تھا کہ نومن بما انزل علینا ہم تو اس پر ایمان لائیں گے جو ہم پر نازل ہوا ہے۔ انتظاری نبوت کے بارے میں ان کا خیال یہی تھا کہ نبوت اسرائیل کے خاندان میں آئے گی۔ اس کے لیے ان کا استدلالی موقف کوئی عقلی نہیں بلکہ ٹھیٹھ رواجی تھا۔ ان کا موقف یہ تھا کہ نبوت کے بارے میں رواج، ہماری روایات یہی ہیں کہ اسرائیلی خاندان سے نبی ہوتے ہیں۔ ایک اسماعیلی فرزند کا نبی ہو کر آنا چونکہ ہمارے رواج اور ہماری خاندانی روایات کے خلاف ہے اس لیے آپ کو نبی نہیں مانا جائے گا۔ قرآن بطور استیناف یہاں سے اسی اٹھے ہوئے سوال کا جواب دے رہا ہے اور ان کے گھر سے ایسے واقعات کو چن چن کر پیش کر رہا ہے جو رواج اور خاندانی روایات کے خلاف ہونے کے باوجود ان کے یہاں قابل پذیرائی ہیں اور ان میں سے کسی ایک واقعہ پر کبھی تاریخ میں ان کی آگ عصبیت نہیں پھڑ پھڑائی۔

عمران کی بیوی اور اس کی نذر

جب عمران کی بیوی کہہ رہی تھی کہ میرے پروردگار میں اس بچہ کو جو میرے پیٹ میں ہے تیری نذر کرتی ہوں وہ تیرے ہی لیے وقف ہوگا تو میری پیش کش کو قبول فرما بے شک تو ہی سننے والا اور جاننے والا ہے۔ عمران کی عورت کا نام حنہ بنت فاقوذا ہے اس نے اپنے زمانہ کے رواج کے مطابق نذر مانی تھی کہ خداوند جو بچہ میرے پیٹ میں ہے میں اسے محرر تیرے نام پر آزاد کرتی ہوں۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ وہ تمام دنیوی مشاغل اور قید نکاح سے آزاد ہو کر ہمیشہ خدا کی عبادت اور کلیسا کی خدمت میں رہے گا۔ اے اللہ تو اپنی مہربانی سے میری نذر قبول فرما تو میری عرض کو سنتا میری نیت کو جانتا ہے گویا لطیف انداز میں استدعا ہوئی کہ لڑکا پیدا ہو کیونکہ لڑکیاں اس خدمت کے لیے قبول نہیں کی جاتی تھیں [1]

حضرت مریم کی پیدائش اور ہیکل میں پرورش پانے کے واقعہ سے چاروں انجیلیں خاموش ہیں۔ لیکن انیسویں صدی میں متروک اناجیل کا جو نسخہ ویٹیکان کے کتب خانہ سے برآمد ہوا، اس

[1] افادات شیخ الاسلام

نے حضرت مریم کی پیدائش کا یہ مفقود ٹکڑا مہیا کر دیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کم از کم چوتھی صدی عیسوی کے اوائل تک سرگزشت کا یہ ٹکڑا بھی اسی طرح الہامی یقین کیا جاتا تھا جس طرح بقیہ ٹکڑے یقین کیے جاتے ہیں۔ [1]

حضرت مریم کی ولادت سے قبل آپ کی والدہ ماجدہ نے جو نذر نیاز مانی تھی اس کی بابت بہت سی تفصیلات قدیم ترین مسیحی نوشتوں میں درج تھیں لیکن بزرگان کلیسا نے جب کاٹ چھانٹ کرکے مستند اناجیل اربعہ مرتب کرنا شروع کیں تو ان مضامین اور بیانات کو ان سے خارج کر دیا اور اس کی شہادت آج ان ہی کے اکابر دے رہے ہیں [2] بہرحال عمران کی عورت نے پیٹ میں ہونے والے بچہ کے لیے نذر مانی کہ جو بچہ ہوگا اس کو ہیکل مسجد اقصیٰ کے لیے وقف کر دیا جائے گا۔ بنی اسرائیل میں یہ رسم بہت مقدس سمجھی جاتی تھی کہ وہ اپنی اولاد کو ہیکل کی خدمت کے لیے وقف کر دیں۔

لڑکی کی پیدائش پر افسوس کی وجہ

پھر جب بچی اس کے گھر پیدا ہوئی تو اس نے کہا اے میرے آقا میرے ہاں لڑکی پیدا ہوئی ہے حالانکہ جو کچھ اس نے جنا تھا اللہ کو اس کی خبر تھی۔ یہ حسرت و افسوس سے کہا کیونکہ خلاف توقع یہ واقعہ پیش آیا اور لڑکی قبول کرنے کا دستور نہ تھا [3] یعنی جب مدتِ حمل پوری ہوگئی اور ولادت کا وقت آیا تو حنہ کو معلوم ہوا کہ ان کے بطن سے لڑکا نہیں لڑکی پیدا ہوئی ہے۔ جہاں تک اولاد کا تعلق ہے حنہ کے لیے یہ لڑکی بھی لڑکے سے کم نہ تھی مگر ان کو یہ افسوس ہوا کہ میں نے جو نذر مانی تھی وہ پوری نہ ہو سکے گی۔ کیونکہ ہیکل کی خدمت کے لیے لڑکیوں اور عورتوں کے لینے کا رواج نہ تھا۔

لڑکی کی عظمت و منزلت

اور لڑکا لڑکی کی طرح نہیں ہوتا خیر میں نے اس کا نام مریم رکھ دیا۔ پہلا فقرہ

---

[1] ترجمان القرآن
[2] ماجدی
[3] افادات شیخ الاسلام

حضرت مریم کی بات نہیں بلکہ بطور جملہ معترضہ حق تعالیٰ کا کلام ہے یعنی اسے کیا معلوم کہ یہ مولود کیا ہے؟ اس لڑکی کی قدر و منزلت کو خدا ہی بہتر جانتا ہے۔ جس طرح کے بیٹے کی اس کو خواہش تھی وہ اس بیٹی کے مقام کو کہاں پہنچ سکتا ہے۔ یہ بیٹی بذات خود مبارک و مسعود ہے اور اس کے وجود سے ایک عظیم الشان مبارک و مسعود بیٹے کا وجود منظور ہے ۔ لے

مطلب یہ ہے کہ اس لڑکی کی عظمت و منزلت سے تو اللہ سبحانہ ہی خوب واقف تھا۔ ماں بیچاری کیا سمجھ سکتی تھی ۔

کچھ مفسرین کی رائے یہ ہے کہ یہ فقرہ بھی حضرت مریم ہی کی والدہ کی بات کا حصہ ہے۔ یعنی حضرت مریم کی والدہ کو توقع تھی کہ فرزند نرینہ ہوگا اور اسی توقع پر انہوں نے منت مانی تھی۔ لیکن ولادت توقع کے خلاف لڑکی کی ہوئی۔ اس پر انہوں نے بارگاہ الہٰی میں اپنے تردد کا اظہار کیا کہ یہ تو میں نے لڑکی جنی ہے اور بہرحال وہ بچہ جس کی میں نے نذر مانی تھی میرے خیال کے مطابق لڑکا تھا۔ یہ لڑکی اس کا بدل تو نہیں ہو سکتی ہے لیکن قرآن کی بلیغانہ تعبیر اس مطلب کا ساتھ نہیں دیتی کیونکہ اگر یہ والدہ مریم کی بات ہوتی تو انداز تعبیر یہ نہ ہوتا بلکہ یوں فرماتیں لیست الانثیٰ کالذکر ۔ لے آپ جانتے ہیں کہ وہ لڑکی جو میں نے جنی ہے اس لڑکے کے ہم پلہ نہیں جس کی میں نے نذر مانی تھی ۔

انداز بیان یہی کہہ رہا ہے کہ دونوں فقرے بطور جملہ معترضہ ہیں اور اللہ سبحانہ کا ارشاد ہیں والدہ مریم بچی ہونے پر ایک قسم کے احساس کمتری کا شکار ہو گئیں۔ اللہ سبحانہ، نے ان کے اسی احساس کمتری کی تلافی ان دو فقروں کے ذریعے اس طرح فرمائی کہ اللہ خوب جانتا ہے کہ اس مولود سے کیا کیا عظمتیں وابستہ ہیں۔ ان سے بس اللہ ہی واقف ہے اور وہ لڑکا جیسے مریم کی ماں مانگ رہی تھی اس لڑکی جیسا نہیں ہے جو ہم نے عطا کی ہے۔ یعنی اس لڑکی کی عظمت و منزلت تو کچھ اور ہی ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اسی مطلب کو یہ کہہ کر راجح قرار دیا ہے کہ ھذا التاویل اولیٰ ۔

مریم کی والدہ کی اللہ کی جناب میں دُعاء

خیر میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے اور میں اسے اور اس کی آئندہ نسل کو شیطان مردود

لے افادات شیخ الاسلام

لے تدبر قرآن

کے فتنہ سے تیری پناہ میں دیتی ہوں

اس فقرے میں کہ میں نے اس کا نام مریم رکھا ہے ایک لطیف سا اشارہ ہے حضرت مریم کی یتیمی کی طرف کہ اس بچی کا باپ تو اللہ کو پیارا ہو چکا ہے لہذا نام بھی میں نے اس کا مریم رکھا ہے۔ اگر باپ زندہ ہوتا تو وہ نام رکھتا اور اس کے ساتھ یہ دُعا فرمائی انی اعیذھا بك وذریتھا من الشیطان الرجیم اللہ سبحانہ، نے والدہ مریم کی یہ دُعا قبول فرمائی۔ حدیث میں ہے حضرت ابوہریرہ، فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

کوئی بچہ پیدا نہیں ہوتا ہے مگر شیطان اسے چھوتا ہے جب وہ پیدا ہوتا ہے، پس وہ شیطان کے چھونے سے چیخ اُٹھتا ہے سوائے مریم اور اس کے بیٹے کے۔

حدیث مس شیطان

اس کا مطلب دوسری احادیث کے ملانے سے یہ ہے کہ بچہ اصل فطرت سلیمہ پہ پیدا ہوتا ہے جس کا ظہور بڑے ہو کر عقل و تمیز آنے کے بعد ہوتا ہے لیکن گردو پیش کے حالات اور خارجی اثرات کے سامنے بسا اوقات اصل فطرت دب جاتی ہے جیسے دوسری حدیث میں اس طرح بتایا ہے کہ ابواہ یھود انه او ینصرانه یعنی اس کی والدین اسے یہودی یا عیسائی بنا لیتے ہیں۔ پھر جس طرح ایمان و طاعت کا بیج اس کے جوہر فطرت میں نامحسوس طور پہ موجود ہوتا ہے حالانکہ اس وقت اس کو ایمان تو کیا موٹی موٹی محسوسات کا بھی شعور نہیں ہوتا۔ اسی طرح خارجی اثر اندازی کی ابتداء ولادت کے بعد ایک مسِ شیطانی سے غیر محسوس طور پہ ہوتی ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر شخص مسِ شیطانی کا اثر قبول کرے یا آئندہ چل کر وہ باقی رہے۔ تمام انبیاء علیہم السلام کی عصمت کی ذمہ داری چونکہ حق تعالیٰ نے لی ہے اس لیے اگر فرض کرو ابتلائے ولادت میں ان کو یہ صورت پیش آئی ہو اور مریم اور عیسٰی کی طرح اس ضابطہ سے مستثنیٰ نہ ہوں تو اس میں پھر بھی کوئی شبہ نہیں کہ ان مقدس و معصوم بندوں پر شیطان کی اس حرکت کا کوئی اثر نہیں پڑ سکتا۔ فرق صرف اتنا ہو گا کہ مریم اور عیسٰی کو یہ صورت کسی مصلحت سے پیش ہی نہ آئی ہو دوسروں کو پیش آتی ہو مگر ان پر اثر نہ ہو۔ اس قسم کے جزئی امتیازات فضیلت کلی ثابت کرنے کے لیے کافی نہیں۔ حدیث میں ہے کہ دو بچیاں گا رہی تھیں۔ حضورؐ نے اُدھر سے مُنہ پھیر لیا۔ ابو بکرؓ آئے بچیاں بدستور گاتی رہیں۔ اس کے بعد عمرؓ آئے بچیاں بھاگ گئیں۔ حضورؐ نے فرمایا کہ عمرؓ جس راستہ پر چلتا ہے شیطان وہ راستہ چھوڑ کر بھاگ جاتا ہے کیا اس سے کوئی خوش فہم یہ سمجھ سکتا ہے کہ رسولؐ اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم حضرت عمرؓ کو اپنے سے افضل ثابت کر رہے ہیں۔ لیکن ابو ہریرہ کا اس ارشادِ نبوت کو اس آیت کی تفسیر میں پیش کرنا بظاہر چسپاں نہیں ہوتا الا یہ کہ آیت اعیذھا بک میں واو عطف کو ترتیب کے لیے نہ سمجھا جائے یا حدیث میں استثنا سے صرف مسیح کے مریم سے پیدا ہونے کا واقعہ مراد ہو۔ مریم و مسیح الگ الگ مراد نہ ہوں۔ چنانچہ بخاری کی ایک روایت میں صرف حضرت عیسٰی کے ذکر پر اکتفا ہے [1]

بخاری میں اسی موضوع پر حضرت ابو ہریرہ کی روایت یہ بھی آئی ہے۔

رسول اللہ صلی علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اولادِ آدم کو پیدائش کے وقت شیطان ہر ایک کے پہلوؤں میں انگلیاں مارتا ہے بجز عیسٰی کے کہ شیطان نے ارادہ کیا تھا مگر اس کی انگلیاں حجاب میں رہ گئی تھیں۔

جہاں تک میں سمجھتا ہوں عام انسانوں کی پیدائش کے مقابلہ میں حضرت عیسٰی کی اس خصوصیت کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا گیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ ان کے حق میں ان کی نانی یعنی مریم کی والدہ کی دُعا پوری ہو گئی اور اس طرح پوری ہوئی مطلب یہ ہے کہ انبیاء کے حق میں نہ تو کمال یہ ہے کہ سرے سے ان کے خصوصی امتیازات ہی کا انکار کر دیا جائے اور نہ یہ کہ جو کمال ان کی ذات کے لیے نہ ہو اس کو محض اپنی خوش عقیدگی سے زبردستی ان کے سر تھوپ دیا جائے۔ انبیاء کی شان میں ذرا سا مبالغہ اور ذرا سی گستاخی دونوں بڑی خطرناک غلطیاں ہیں اور وہ پل صراط ہے جس کے دونوں طرف دوزخ ہے۔ یہودی گستاخ ہو گئے اور عیسائی مبالغہ میں پڑ گئے۔ دونوں افراط و تفریط کی راہیں ہیں۔ شاہراہِ اعتدال وہ ہے جو قرآن نے پیش کی ہے۔

مریم کی والدہ کی نذر قبول ہو گئی

آخر کار اُس کے رب نے اس لڑکی کو خوشی قبول کر لیا۔ اسے بڑی اچھی نشو و نما دی اور زکریا کو اس کا سرپرست مقرر کر دیا۔ یعنی اگرچہ لڑکی تھی مگر اللہ تعالیٰ نے لڑکے سے بڑھ کر اسے قبول فرمایا بیت المقدس کے مجاورین کے دلوں میں ڈال دیا کہ عام دستور کے خلاف لڑکی کو قبول کر لیں اور ویسے بھی مریم کو قبول صورت بنایا اور زکریا کی کفالت میں دیا اور اپنی بارگاہ میں حسن قبول سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سرفراز فرمایا۔ جسمانی، روحانی، علمی اور اخلاقی ہر حیثیت سے غیر معمولی طور پر بڑھایا۔ جب مجاورین میں اس کی پرورش کے بارے میں اختلاف ہوا تو قرعہ انتخاب حضرت زکریا کے نام نکلا تاکہ بچی اپنی خالہ کی آغوش شفقت میں تربیت پائے اور حضرت زکریا کے علم و دیانت سے مستفید ہو۔ زکریا نے پوری مراعات اور جد و جہد کی۔ جب مریم سیانی ہو گئیں تو مسجد کے پاس ان کے لیے ایک حجرہ مخصوص کر دیا۔ مریم دن بھر وہاں عبادت وغیرہ میں مشغول رہتی اور رات اپنی خالہ کے گھر گزارتی۔[1]

والدہ مریم کی نذر کو اللہ پاک نے قبول کر لیا۔ خدمت ہیکل کی تاریخ میں بالکل نئی بات تھی۔ مسیحی نوشتوں کے بموجب حضرت مریم تین سال کی عمر میں ہیکل کی خادمہ کی حیثیت سے قبول کر لی گئیں تھیں اور معبد کے چھوٹے بڑے سب خادم اس کمسن بچی کو دیکھ کر بہت خوش ہوتے تھے[2] ؕ ابتھا نباتا حسناً اللہ نے اُسے بڑی اچھی نشو و نما دی کے ایک بلیغ فقرے میں قرآن نے حضرت مریم کے شرف و عظمت کا وہ چہرہ انسانوں کے سامنے پیش کر دیا، کہ بڑے سے بڑے دفاتر میں بھی اس سے اچھا چہرہ نہیں پیش کیا جا سکتا۔ غور فرمایئے کہ وہ کون سی بات ہے جو اس میں نہیں کہی گئی۔ ہر پہلو سے جو کمال ممکن ہے وہ اس میں آگیا۔ قرطبی کہتے ہیں کہ جسمانی ساخت اور بناوٹ میں کوئی کمی اور زیادتی نہ تھی یعنی قامت میں، رنگ و روپ میں، نقش و نگار میں، توازن اور تناسب کا مثالی نمونہ تھیں۔ بیضاوی کہتے ہیں کہ درستگی اور صلاح کے زیور سے آراستہ تھیں۔ آلوسی فرماتے ہیں کہ اللہ کی عبادت و طاعت کا پیکر تھیں۔ ابوحیان کا خیال ہے کہ کارساز ہستی نے خلق و بناوٹ اور اخلاق میں مثالی شخصیت بنائی تھی۔ مولانا دریابادی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ حضرت مریم کے شرف و عظمت کی یہ ساری تفصیلات انجیل میں نہیں ہے۔ انجیل اس قسم کی جزئیات سے بالکل خاموش ہے۔

زکریا کون ہیں

کفلھا زکریا حضرت مریم کو اللہ سبحانہ نے حضرت زکریا کی کفالت میں دے دیا۔ اول تو نبوت کی کفالت اور پھر کفالت کا فیصلہ اللہ کی جانب سے، ان دونوں سے حضرت مریم کی عظمت دو بالا ہو گئی۔

---

[1] افادات شیخ الہند
[2] ماجدی

قرآن نے یہاں زکریا کے نام سے جس شخصیت کا ذکر کیا ہے۔ یہ وہ نہیں جن کا ذکر تورات کے صحیفہ زکریا میں آیا ہے اس لیے کہ تورات میں جن زکریا کا ذکر ہے ان کا ظہور دارا کے زمانے میں ہوا ہے چنانچہ زکریا نبی کی کتاب میں ہے۔

دارا کے دوسرے برس کے آٹھویں مہینے میں خداوند کا کلام زکریا ابن برخیا ابن عدو کو پہنچا۔ (باب ۱-آیت ۱۔)

اور دارا ابن گشتاسب کا زمانہ حضرت مسیح کی ولادت سے پانچ سو سال پہلے ہے کیونکہ وہ کیقباد بن خسرو کے انتقال کے بعد ۵۲۱ ق م میں تخت نشین ہوا۔ قرآن جن زکریا کا ذکر کر رہا ہے وہ حضرت مریم کی والدہ کے مربی ہیں۔ ان کے بیٹے حضرت یحییٰ اور حضرت مسیح کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔

بنی اسرائیل میں کاہن ایک معزز مذہبی عہدہ تھا اور اس کے ذمہ یہ خدمت تھی کہ وہ ہیکل کی مقدس رسوم کی ادائیگی کرے۔ چنانچہ حضرت زکریا بنی اسرائیل میں معزز کاہن تھے اور جلیل القدر پیغمبر بھی۔ چنانچہ قرآن نے ان کو انبیاء کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

وزکریا ویحییٰ وعیسیٰ والیاس کل من الصالحین

اور لوقا کی انجیل میں ان کو کاہن کہا گیا ہے۔

یہودیہ کے بادشاہ ہیرودیس کے زمانے میں ابیاہ کے فریق میں زکریا نام ایک کاہن تھا اور اس کی بیوی ہارون علیہ السلام کی اولاد میں سے تھی۔ اس کا نام الیشع تھا وہ دونوں خدا کے حضور راستباز اور خداوند کے سارے حکموں اور قانون پر بے عیب چلنے والے تھے۔ (باب ۱-۶/۵)

مگر انجیل برنابا میں بصراحت مذکور ہے کہ وہ خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے چنانچہ حضرت مسیح علیہ السلام یہود کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

وہ وقت قریب ہے جب تم پر ان انبیاء کا وبال پڑنے والا ہے جن کو تم نے زکریا کے زمانے تک قتل کیا ہے اور جب کہ زکریا کو ہیکل اور قربان گاہ کے درمیان قتل کیا تھا زکریا علیہ السلام سلالہ داؤد سے تھے اُن کی زوجہ مطہرہ الیشع حضرت ہارون کی ذریت سے تھیں۔ اُن ہی کے خاندان یعنی سلیمان بن داؤد کی نسل سے عمران بن ماثان اور ان کی اہلیہ حنہ بنت فاقوذا نیک نیت انسان تھے۔ اور پارسائی کی زندگی بسر کرتے تھے مگر لاولد تھے حنہ نے منت کے رواج کے مطابق مریم کو ہیکل کی نذر کر دیا لہٰذا مریم کی کفالت اور پرورش حضرت زکریا کے سپرد ہوئی۔ علمائے سیر و تاریخ کہتے ہیں کہ زکریا

یوں بھی مریم کی کفالت کے حقدار تھے اس لیے کہ بشیر بن اسحاق نے المبتدا میں نقل کیا ہے کہ زکریا کی بیوی ایشع اور حضرت مریم کی والدہ حنہ دونوں حقیقی بہنیں ہیں ؎۱

اور خالہ بمنزلہ والدہ کے ہوتی ہے جیساکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمارہ بنت حمزہ رضی اللہ عنہا کے متعلق فرمایا تھا کہ ان کی پرورش حضرت جعفرؓ کی بیوی کریں کیونکہ وہ عمارہ کی خالہ ہیں۔ والخالة بمنزلة الام ؎۲

حضرت مریم کا روحانی فضل وکمال

زکریا جب بھی اس کے پاس محراب میں جاتے تو اس کے پاس کھانے کا سامان پاتے۔ پوچھتے کہ یہ کہاں سے تیرے پاس آیا ہے۔ وہ جواب دیتی اللہ کے پاس سے اللہ جسے چاہتا ہے بے حساب دیتا ہے۔ اکثر سلف کے نزدیک رزق سے مراد ظاہری کھانا ہے کہتے ہیں کہ مریم کے پاس بے موسم میوے آتے گرمی کے پھل سردی میں، سردی کے گرمی میں، اور امام مجاہد سے ایک روایت ہے کہ رزق سے مراد علمی صحیفے ہیں۔ جن کو روحانی غذا کہنا چاہیے۔ بہرحال اب کھلم کھلا مریم کی برکات وکرامات اور غیر معمولی نشانات ظاہر ہونے شروع ہوئے جن کا بار بار مشاہدہ ہوتے پر زکریا سے نہ رہا گیا اور از راہ تعجب پوچھنے لگے کہ مریم یہ چیزیں تم کو کہاں سے پہنچتی ہیں۔ انہوں نے فرمایا کہ خدا کی قدرت اسی طرح مجھ کو یہ چیزیں پہنچاتی ہے۔ جو قیاس وگمان سے باہر ہے ؎۳

امام مجاہد کی یہ روایت کہ رزق سے مراد علم یا وہ صحیفے ہیں جن میں علم تھا۔ حافظ ابن کثیر نے ابن ابی حاتم کے حوالہ سے نقل کی ہے۔ ابن کثیر اور ابن جریر نے امام مجاہد، عکرمہ، سعید بن جبیر، ابو الشعثاء، ابراہیم نخعی، ضحاک، قتادہ، ربیع، ابن انس، عطیہ عوفی، اور سدی کے حوالہ سے رزق کی جو تشریح نقل کی ہے وہ یہی ہے کہ مریم کے پاس بے موسم کے پھل آتے تھے۔ گرمیوں کے موسم میں سرمائی اور سردیوں میں گرمائی، اور اسی کو حافظ ابن کثیر نے اصح زیادہ صحیح کہا ہے۔ حافظ ابن جریر نے امام مجاہد سے تین روایتیں اسی تشریح کے مطابق درج کی ہیں جب کہ ابن ابی حاتم والی

؎۱ فتح الباری
؎۲ بخاری
؎۳ افادات شیخ الاسلام

امام مجاہد کی تشریح کا ذکر بھی نہیں کیا ہے۔

واقعات میں مقام استشہاد

ہمیں یہ دیکھنا چاہیے کہ خود قرآن جس مقصد کے لیے یہ واقعات پیش کر رہا ہے۔ وہ کیا ہے جیسا کہ اس آیت کی تمہید میں ہم بتا چکے ہیں کہ یہودی اور عیسائیوں کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے ماننے میں رکاوٹ یہ نہیں تھی کہ آپ آل ابراہیم سے نہیں بلکہ اصلی رکاوٹ یہ تھی کہ نبوت بنی اسرائیل سے نکل کر بنی اسماعیل میں کیوں چلی گئی اور اس بات کے لیے کہ نبوت اسرائیلی خاندان میں ہو ان کے پاس اس کے سوا کوئی دلیل نہ تھی کہ یہ ہماری روایات اور ہمارے رواج کے خلاف ہے۔ قرآن اپنے مخاطبوں کے اسی خلش کو مٹانا چاہتا ہے اور اسی کی خاطر یہ واقعات پیش کر رہا ہے۔

وہ اپنے مخاطبوں کو بتا رہا ہے کہ اگر تم اپنے رواج، اپنی رسم اور اپنی روایات کے خلاف ہیکل کی خدمت کے لیے لڑکے کے بجائے لڑکی کی نذر کو مانتے ہو۔ اور اس معاملہ میں کبھی تمہیں یہ خیال تک نہیں آتا کہ یہ رواج کے خلاف ہے اور صرف اس لیے مانتے ہو کہ اللہ نے اس کو شرف قبول عطا فرمایا فتقبلها ربها تو پھر کیا وجہ ہے کہ اپنی روایات اپنے رواج کے خلاف محمد رسول اللہ کو اللہ کا پیغمبر نہیں مانتے جب کہ ان کو بھی اللہ نے رسول بنایا ہے۔ وہاں اگر اللہ کی مشیت، اللہ کا فیصلہ قابل پذیرائی ہے تو یہاں کیوں نہیں۔

پھر اگر تم اس واقعہ کی صداقت کو مانتے ہو کہ مریم کے پاس بے موسم کے پھل آتے تھے، اور اس میں رواج، رسم اور روایات کی مخالفت کا کوئی پہلو تمہیں نظر نہیں آتا تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے انکار میں رسم و رواج کی کیوں آڑ لیتے ہو اور اس پر کیوں اصرار کرتے ہو کہ بنی اسرائیل کے خاندان سے ہو۔ جیسے مریم کے پاس تمہارے رواج کے خلاف رزق کا آنا من عند اللہ ہے ٹھیک اسی طرح محمد بن عبد اللہ کا اللہ کا رسول ہونا تمہارے رواج کے خلاف من عند اللہ ہے واللہ یختص برحمتہ من یشاء افسوس کہ عام شارحین قرآن کی نظر سے ان واقعات میں یہ مقصدی روح اوجھل ہو گئی اس لیے مختلف زبانوں پر مختلف باتیں آگئیں۔

تفسیر میں جدت پسندی

کسی نے حضرت مریم کو حضرت زکریا سے علم میں بالا دے دی اور من عند اللہ کے فقرے کو

عقل کی پختگی کی علامت قرار دیا۔ اور یہ نہ سوچا کہ اگر یہ علمی کمال کی بات ہوتی تو اسے قرآن اس انداز سے کیوں پیش کرتا کیونکہ ۔

اولاً علم کوئی ایسی چیز نہیں جس کا وجود مریم کے کمرے ہی کے اندر ہو باہر نہ ہو۔ فقرے میں محراب اور دخول کے الفاظ اس مطلب کا ساتھ نہیں دیتے ۔

ثانیاً، اس میں محسوس اور مرئی چیز کا تکرار کیسے ہوا۔ قرآن میں کلما بتا رہا ہے کہ حضرت زکریا بکثرت حضرت مریم کے کمرے میں جاتے اور جب بھی جاتے وہاں رزق پاتے ۔

ثالثاً، نبی کو غیر نبی سے ممتاز کرنے والی چیز علم ہی ہے۔ اگر امتی، علم الٰہی میں نبی سے بڑھ جاتا ہے تو پھر نبوت میں برتری کیا رہ جاتی ہے ۔ نبی کا سب سے بڑا وصف جو قرآن نے بتایا ہے وہ اس کا علم ہے، نبوت ایک حقیقت ہے جو صرف علم ہی سے بنتی ہے۔ نبی کا علم ہی اسباب سے بالا ہوتا ہے۔ اس لیے یہ کہنا کہ رزق سے مراد علم ہے صحیح نہیں ہے ۔

رابعاً، رزق سے اگر مراد مادی رزق نہ ہو تو پوری آیت تاویل غریب کا ایک ایسا نادر نمونہ بن جائے گی جس کی قرآن میں کوئی مثال نہیں۔ کلما کی، دخول کی، وجود کی، مریم کے پاس ہونے کی۔ غرض کہ ہر لفظ کی تاویل کرنی پڑے گی جسے ایک دیانت دار مفسر کا ذوق قبول نہیں کرتا اور پھر انی لک ھٰذا میں استعجاب و تحسین کی تاویل کا بر چھا چلانا پڑے گا۔

ان وجوہ سے ہمارے نزدیک صاف اور متبادر معنے وہی ہیں جو جمہور نے اختیار کیے ہیں اس مطلب کی موجودگی میں کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے ۔

محراب کیا ہے ؟

اصل میں عبادت گاہ کے اگلے حصہ میں چھوٹے سے خلوہ کو کہتے ہیں جس میں سب سے الگ ہو کر عبادت کرتے ہیں۔ محراب مسجد کو بھی بقول علامہ ازہری محراب اسی لیے کہتے ہیں کہ اس میں امام نماز میں سب سے الگ اور تنہا کھڑا ہوتا ہے۔ ہیکل کے خادموں کے رہنے اور عبادت کے لیے ہیکل کے ادھر اُدھر زاویے حجرے اور خلوت خانے بنے ہوئے تھے۔ انہی میں ایک حجرہ حضرت مریم کا تھا۔ حضرت زکریاؑ ایک تو یوں بھی سردارِ خدام تھے اور اس حیثیت سے ہر خادم و خادمہ کی نگرانی رکھنا آپ کے فرائض میں داخل تھا اور پھر حضرت مریم کے تو آپ بزرگ و سرپرست تھے۔ ان کے حجرے میں قدرتاً آپ کی آمد و رفت زیادہ رہتی۔ قرآن نے ایک ذرا سے لفظ کلما سے اس سارے

مفہوم یعنی حضرت زکریاؑ کی کثرتِ آمد و رفت اور غیر متوقع وجودِ رزق سب کی طرف اشارہ کر دیا۔[1]
لفظ محراب سے لوگوں کا ذہن بالعموم اس محراب کی طرف چلا جاتا ہے جو ہماری مسجدوں میں امام کے کھڑے ہونے کے لیے بنائی جاتی ہے۔ لیکن یہاں محراب سے یہ چیز مراد نہیں ہے۔ صوامع اور کنیسوں میں اصل عبادت گاہ کی عمارت سے متصل سطح زمین سے کافی بلندی پر جو کمرے بنائے جاتے ہیں جن میں عبادت گاہ کے مجاور، خدام رہتے ہیں انہیں محراب کہا جاتا ہے۔[1]

کراماتِ اولیاءؒ کا ثبوت

علماء نے اس آیت کو کراماتِ اولیاءؒ کے ثبوت کے لیے نص قرار دیا ہے۔ الوسی رقمطراز ہیں یہ آیت قرآنی کرامات اولیاء کے لیے دلیل ہے کیونکہ حضرت مریم نبی نہیں ہیں یہی اہل السنہ اور شیعہ کا مسلک ہے۔
بیضاوی اور رازی نے بھی یہی بات لکھی ہے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں فیہ دلالۃ علی کرامات الاولیاء اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے۔ وفی السنۃ نظائر کثیرۃ علمی طور پر کرامت کی حقیقت اور اعجاز و کرامت میں فرق پر تفصیلی مباحث انشاء اللہ آئندہ آئیں گے مگر یہاں اتنی بات ضرور ذہن میں رکھیے کہ معجزہ دلیل ہوتا ہے اور کرامت دلیل نہیں ہوتی ہے کیونکہ معجزہ پیش کرنے والا مدعی ہوتا ہے کرامت جس سے ہوتی ہے وہ مدعی نہیں ہوتا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نبوت چونکہ منصب ہے اس لیے نبی نبوت کا دعویٰ کرتا ہے اور معجزہ نبی کے دعوئ نبوت کی دلیل ہوتا ہے برخلاف ولایت کے کہ وہ منصب نہیں ہے اس لیے ولی مدعی نہیں ہوتا اور اس کی کرامت بھی کسی دعویٰ کی دلیل نہیں ہوتی۔ نبی پر نبوت کا صاحبِ عہدہ منصب ہونے کی وجہ سے اظہار واجب ہے، ولی پر ولایت کا چھپانا ضروری ہے۔

---

[1] ماجدی [1] تفہیم القرآن

هُنَالِكَ دَعَا زَكَرِيَّا رَبَّهٗ ۚ قَالَ رَبِّ هَبْ لِيْ مِنْ لَّدُنْكَ ذُرِّيَّةً
طَيِّبَةً ۚ اِنَّكَ سَمِيْعُ الدُّعَآءِ ﴿۳۸﴾ فَنَادَتْهُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَهُوَ قَآئِمٌ
يُّصَلِّيْ فِي الْمِحْرَابِ ۙ اَنَّ اللّٰهَ يُبَشِّرُكَ بِيَحْيٰى مُصَدِّقًا بِكَلِمَةٍ مِّنَ
اللّٰهِ وَسَيِّدًا وَّحَصُوْرًا وَّنَبِيًّا مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۳۹﴾ قَالَ رَبِّ
اَنّٰى يَكُوْنُ لِيْ غُلٰمٌ وَّقَدْ بَلَغَنِيَ الْكِبَرُ وَامْرَاَتِيْ عَاقِرٌ ؕ قَالَ كَذٰلِكَ
اللّٰهُ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ ﴿۴۰﴾ قَالَ رَبِّ اجْعَلْ لِّيْ اٰيَةً ؕ قَالَ اٰيَتُكَ
اَلَّا تُكَلِّمَ النَّاسَ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ اِلَّا رَمْزًا ؕ وَاذْكُرْ رَّبَّكَ
كَثِيْرًا وَّسَبِّحْ بِالْعَشِيِّ وَالْاِبْكَارِ ﴿۴۱﴾ ع ۴ ۱۱ ۱۲

اسی جگہ زکریا نے اپنے پروردگار سے دعا مانگی تھی۔ خدایا تو مجھے اپنے خاص فضل سے پاک اولاد عطا فرما۔ بلاشبہ تو ہی دعاؤں کا سننے والا ہے۔ پھر پکارا زکریا کو فرشتوں نے اور وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ خدا تجھے یحییٰ کی بشارت دیتا ہے۔ وہ خدا کے حکم سے ایک ہونے والے ظہور کی تصدیق کرنے والا جماعت کا سردار، پارسا اور خدا کے صالح بندوں میں سے ایک

نبی ہو گا[۸۰]۔ زکریا نے جب یہ سنا تو کہا خدایا میرے یہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ حکم الٰہی ہوا اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے[۸۱]۔ اس پر زکریا نے عرض کیا خدایا اس بارے میں میرے لیے کوئی بات بطورِ نشانی ٹھہرا دے[۸۲]۔ ارشاد ہوا نشانی یہ ہے کہ تین دن تک تو بات چیت نہ کرے گا مگر صرف اشارے سے[۸۳] اور اپنے پروردگار کا کثرت کے ساتھ ذکر کر اور صبح و شام اس کی حمد و ثنا میں مشغول رہ[۸۴]۔

حضرت زکریا کی دُعاء اور یحیٰی کی پیدائش :

زکریا علیہ السلام کے کوئی اولاد نہ تھی اور یہ محسوس کرتے تھے کہ اس بات کے علاوہ کہ میں اولاد کی دولت سے محروم ہوں زیادہ فکر اس امر کا ہے کہ میرے بھائی بند ہرگز اس کے اہل نہیں ہیں کہ میرے بعد بنی اسرائیل کی رہنمائی کی خدمت انجام دے سکیں۔ اگر اللہ سبحانہ، مجھے کوئی نیک سیرت بچہ عطا کرے تو مجھے اطمینان ہو جائے کہ بنی اسرائیل کی رہنمائی کا خدمت گزار میرے بعد موجود رہے[۱]۔

چونکہ ان کی عمر بقول ابن کثیر ستر سال اور بقول ثعلبی نوے یا ایک سو بیس سال ہو چکی تھی اور ان کی بیوی بانجھ تھیں اس لیے بہ اسباب ظاہر وہ مایوس ہو چکے تھے کہ اب اولاد ہونے کی کوئی صورت نہیں ہے۔ لیکن جب انہوں نے مریم کے پاس بے موسم پھل دیکھے اور ان کو یہ معلوم ہوا کہ مریم پر خدا کا خاص فضل و انعام ہے تو ان کے دل میں فوراً جوش پیدا ہوا کہ جو ذات مریم کو بغیر موسم کے پھل بخش

---

[۱] فتح الباری

سکتی ہے وہ مجھے بغیر موسم کے اولاد کیوں نہیں دے سکتی۔ بس اسی احساس سے دب کر انہوں نے بارگاہ الٰہی میں دُعا کی رب ھب لی من لدنك ذریة طیبة انك سمیع الدعاء اے میرے پروردگار مجھے اپنے پاس سے صالح اولاد عطا کر تو ہی دعاؤں کا سننے والا ہے۔

۷۵۔ اسی جگہ زکریا نے اپنے پروردگار سے دُعا مانگی۔ ھنالک کی تعبیر بتا رہی ہے کہ حضرت مریمؑ کے پاس بے موسم پھل دیکھ کر حضرت زکریاؑ اس درجہ قدرت الٰہی کی نیرنگیوں سے متاثر ہوئے کہ اولاد کی آرزو جاگ اُٹھی کہ کاش اسی طرح مجھے بھی اللہ بغیر اسباب کے اور بغیر حالات کی ناسازگاری کے اولاد دے دے۔ چنانچہ اس کے لیے انہوں نے اللہ سے دُعا کی یہ کہنا کہ مریم کی حیرت انگیز معرفت کو دیکھ کر حضرت زکریا میں اولاد کی آرزو بھڑک اُٹھی ایک بے معنے اور بے جوڑ بات ہے، مادے کی دُعا میں معنے کا پیوند ہے۔ بے وقت اور بے موسم مادی چیز آتے دیکھ کر زکریا میں اولاد کی مادی امنگ اگر جوان ہوتی ہے تو اس میں تو معنویت ہے لیکن ایک نبی خود ہی اپنے وقت میں معرفت کا خزانہ ہوتا ہے اس میں کسی اُمتی کے اندر معرفت و حکمت کا کوئی چھینٹا دیکھ کر کیا جوش آ سکتا ہے۔

ھنالک کی تعبیر سے علماء میں سے ابوحیان اندلسی نے استدلال کیا ہے کہ مکان اور زمان کو بھی دُعا کی قبولیت میں اثر ہوتا ہے یہاں یہ لفظ ھنالک دونوں معنے دیتا ہے اسی جگہ یا اسی وقت۔

۷۶۔ خدایا تو مجھے اپنے خاص فضل سے صالح اولاد عطا فرما، بلاشبہ تو ہی دُعاؤں کا سننے والا ہے۔ حضرت زکریاؑ بالکل بوڑھے ہو چکے تھے بیوی ان کی بانجھ تھی۔ اولاد کی کوئی ظاہری اُمید نہ تھی مریم کی نیکی اور برکت اور یہ غیر معمولی خوارق دیکھ کر دفعۃً قلب میں ایک جوش اٹھا اور فوری تحریک ہوئی کہ میں بھی اولاد کی دُعا کروں۔ امید ہے کہ مجھے بھی بے موسم میوہ مل جائے یعنی بڑھاپے میں اولاد مرحمت ہو۔[1]

خبر نہیں لوگوں کو قدرت الٰہی کے مظاہر کی نمائش اتنی کیوں ناپسند ہے کہ کوئی کہتا ہے کہ اس نوجوان صالحہ لڑکی کو دیکھ کر فطرۃً حضرت زکریاؑ کے دل میں یہ تمنا ہوئی کہ کاش اللہ انہیں بھی ایسی ہی نیک اولاد عطا کر دے۔ اور کوئی کہتا ہے کہ حضرت مریم کی حیرت انگیز حکمت و معرفت دیکھ کر زکریا اس درجہ متاثر ہوئے کہ اولاد کی آرزو ان میں یک دم بھڑک اٹھی۔ حالانکہ واقعہ یہ ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے بات صاف ہے اور اس میں کوئی ایچ پیچ نہیں کہ حضرت زکریاؑ کی عمر زیادہ ہوچکی تھی جیسا کہ آگے خود قرآن ہی بتا رہا ہے اور بیوی بھی بانجھ ہوچکی تھی۔ اس کی بھی قرآن نے تصریح کی ہے۔ ان حالات میں قدرت الٰہی کا یہ مظاہرہ دیکھ کر کہ جب بھی مریم کے خلوے میں جاتے ہیں۔ مریم کے پاس کھانے کا سامان پاتے ہیں۔ حضرت زکریاؑ کا ذہن پوری قوت کے ساتھ اس طرف منتقل ہوگیا کہ جو اللہ اس پر قادر ہے کہ بلا اسباب ظاہری یہاں یہ تر و تازہ میوے پہنچا دے وہ یقیناً اس پر بھی قادر ہے کہ اس عمر میں مجھے بھی نعمت اولاد مرحمت فرما دے۔ ہمیں قرآن کا مطالعہ نہ تو اس طرح کرنا چاہیے کہ اسے عجائبات کی داستان بنالیں۔ اور نہ عجیب و غریب کے الزام سے بچنے کے لیے اس درجہ پریشان ہونا چاہیے کہ بے جا اور بے موقع تاویل قبول کریں۔

دُعاء زکریاؑ کی لطافت

اس دُعا میں بھی ان حالات کی عکاسی کی گئی ہے جن میں یہ دُعا کی گئی ہے۔ حالات ہی کی مناسبت سے اوّل دعا میں ہب سے لفظ ہب لائے ہیں۔ ہبہ نام ہے اس احسان کا جو بلا بدل ہو۔ عمر رسیدہ ہونے کی وجہ سے باپ کی جانب اور بانجھ ہونے کی وجہ سے ماں کی جانب سے عالم اسباب میں کوئی سبب عادی موجود نہیں ہے اس لیے گویا یوں فرمایا کہ جیسے مریم کو بغیر کسی عادی سبب کے رزق کی فراہمی ہوئی ہے ایسے ہی بغیر کسی عادی سبب کے مجھے بھی اولاد عطا فرما دے اور اسباب کے نہ ہونے کو مزید طاقتور بنانے کے لیے دُعا میں من لدنک فرمایا ہے۔ یعنی یہ بخشش یہ عنایت یہ کرم نوازی اپنے فضل اور اپنی قدرت سے فرما دیجئے جو لوگ عربی زبان سے آشنا ہیں وہ ایسے مواقع پر لفظ لدن کے استعمال سے لطف اندوز ہوسکتے ہیں۔ یہ لفظ استعمال ہی ان مواقع پر ہوتا ہے جہاں اسباب سے بالا قدرت الٰہی کا ظہور رہو یعنی اے مولیٰ اگر آپ چاہیں تو اسباب نہ ہونے کے باوجود محض آپ کے فضل اور آپ کی قدرت سے ایک بوڑھے کی تمنا بر آسکتی ہے اور ایک بانجھ کی گود بھر سکتی ہے۔ اسباب تو محض بہانہ ہیں اصل تو آپ کی قدرت اور قوت ہے۔ آخر میں فرمایا انک سمیع الدعاء یہ ایسا ہے جیسے حضرت ابراہیم نے فرمایا ان ربی لسمیع الدعاء حافظ ابن القیم فرماتے ہیں یہاں لفظ سماع اپنے عام سننے کے معنے میں نہیں بلکہ سمع سے سمع اجابت مراد ہے یعنی آپ ہی تو اپنی مخلوق کی دُعاؤں کے بے حساب قبول کرنے والے ہیں۔

علامہ آلوسی نے اس موقعہ پر یہ بات خوب لکھی ہے کہ قرآن میں حضرت زکریاؑ کے دعا مانگنے

آئے ہیں، ایک یہ ہے دوسرا پیمانہ سورہ مریم میں ہے رب انی وھن العظم منی واشتعل الراس شیبا تیسرا پیمانہ سورہ انبیاء میں ہے رب لا تذرنی فردًا و انت خیر الوارثین پیمانوں کا یہ اختلاف بتا رہا ہے کہ دعا تین بار کی ہے۔ لیکن یہ کوئی ضروری نہیں ممکن ہے کہ ایک وقت میں تینوں پیمانے اختیار کیے ہوں اور اللہ سبحانہ، نے تینوں کو قرآن میں جگہ دے دی۔

اولاد کی خواہش انبیاء کی سنت ہے

علماء نے حضرت زکریاؑ کی دعا اور قرآن کی دوسری آیات سے یہ بھی سمجھا ہے کہ اولاد کی خواہش کرنا ایک امر طبعی ہے اور زہد کیا، کمال زہد کے بھی منافی نہیں ہے۔

قرآن حکیم نے بار بار پیغمبروں کی زبان سے اس قسم کی دعائیں نقل کر کے بتا دیا کہ وہ مذاہب حقیقت سے کتنی دور ہیں جنہوں نے بیوی بچوں کو مطلق صورت میں جنجال قرار دیا ہے۔ ہماری شریعت حقہ میں اولاد کی خواہش تو سنت انبیاء و صدیقین بتائی گئی ہے اور صحیح بخاری میں تو مستقل عنوانات طلب ولد کے فضائل میں ہیں۔ قرطبی لکھتے ہیں یہ آیت ہماری رہنمائی کر رہی ہے کہ اولاد کی خواہش کرنی چاہیے یہ انبیاء کی سنت ہے۔

ایک دوسری آیت میں حق تعالیٰ کا ارشاد ہے ولقد ارسلنا رسلا من قبلك وجعلنا لهم ازواجا وذرية یعنی آپ سے پہلے ہم نے بے شمار پیغمبر روانہ کیے اور ہم نے ان کو بیویاں بھی دی تھیں اور اولاد بھی۔ اب اگر کوئی شخص کسی ذریعہ سے اولاد کو پیدا ہونے سے روکنے کی کوشش کرے تو وہ نہ صرف فطرت الٰہی کے خلاف علم بغاوت بلند کرتا ہے کہ بلکہ انبیاء کی ایک مشترک اور متفق سنت سے بھی محروم ہونے کا سامان کرتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح و اولاد کے مسئلہ کو اتنی اہمیت دی کہ آپ نے اس شخص کو اپنی جماعت میں شامل ہونے کی اجازت نہیں دی جو شادی اور اولاد سے باوجود قدرت کے اعراض کرتا ہو۔ فرمایا۔

نکاح میری سنت ہے جو میری اس سنت سے اعراض کرے وہ مجھ سے نہیں ہے شادی کرو روز قیامت تمہاری کثرت پر میں دوسری امتوں کے مقابلہ میں فخر کروں گا۔

ایک اور آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایسی لوگوں کی تعریف کی ہے جو اولاد اور بیوی کے اور ان کے نیک صالح ہونے کی اللہ سے دعائیں کرتے ہیں۔ ارشاد ہے۔

والذین یقولون ربنا هب لنا من ازواجنا وذریتنا قرة اعین۔

اور عباد الرحمان وہ ہیں جو کہتے ہیں کہ ہمیں بیوی اور بچے ایسے عطا کر جن سے ہماری آنکھیں ٹھنڈی ہوں۔

دُعا کی قبولیت اور یحییٰ کی بشارت

۷۷۔ پھر پکارا زکریا کو فرشتوں نے۔

عام شارحین قرآن نے یہی بنایا ہے کہ ملائکہ جمع بولا گیا ہے مگر مراد فرشتوں کی جماعت نہیں بلکہ صرف جبریل ہیں۔ لیکن پھر ایک ہونے کے باوجود بات کو جمع کے صیغے میں کیوں کہا گیا اس سوال کا جواب لوگوں نے طرح طرح سے دیا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ جب بات کہنے والی بڑی شخصیت ہو تو انداز بیان جمع کا لایا کرتے ہیں، کچھ کی رائے ہے کہ کرتے کچھ ہیں مگر نسبت سب کی طرف کی جاتی ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ اہل عرب کا قاعدہ ہے کہ وہ واحد کی جگہ جمع بولتے ہیں۔ سوار ایک خچر پر ہوتا ہے مگر بولتے ہیں رکب علی البغال، ایک کشتی پر سوار ہو کر آتا ہے مگر کہتے ہیں رکب السفن، بات ایک شخص سے سُنی ہوتی ہے مگر ظاہر یہی کرتے ہیں کہ لوگوں سے سُنی ہے۔ مگر حافظ ابن جریر کی رائے ہمیں زیادہ پسند ہے کہ اگر اللہ سبحانہ، نے پتہ دیا ہے کہ زکریا کو فرشتوں نے کہا تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم یہ کہیں کہ فرشتوں نے نہیں بلکہ فرشتہ نے پکارا۔ دراصل حضرت زکریا نے حالت نماز میں غیبی آواز سُنی۔ چونکہ اُن کے سامنے فرشتوں کا وجود نہ تھا یعنی مشاہدہ کچھ نہ تھا اور آنکھوں سے کوئی چیز نہ دیکھی تھی صرف آواز سُنی تھی اس لیے اللہ سبحانہ، نے فرشتوں کا ذکر فرمایا تاکہ پتہ لگ جائے کہ جو کچھ ہوا وہ ایک غیبی معاملہ تھا اور یہ غیبی معاملہ محض ایک غیبی آواز تھی۔

محراب میں نماز اور اس کا حکم

۷۸۔ اور وہ محراب میں کھڑا نماز پڑھ رہا تھا۔ یعنی ہاتف غیبی نے حضرت زکریا کو اس وقت پکارا جب وہ محراب میں کھڑے نماز پڑھ رہے تھے۔

عام شارحین قرآن نے یصلی کے معنے نماز ہی کے کیے۔ اور آلوسی نے ایک رائے کی بنا پر اس کے معنے دُعا کے لکھے ہیں۔ محراب کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ حجرہ اور خلوہ کو کہتے ہیں۔ اگر صلوٰۃ کے معنے دُعا کے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنے خلوہ یا حجرہ میں کھڑے ہو کر مناجات الٰہی میں مشغول تھے اور اگر صلاۃ سے مراد نماز ہو جیسا کہ عام مفسرین کا خیال ہے تو پھر مطلب یہ کہ حالت نماز میں حضرت زکریا کو فرشتوں نے پکارا۔

محراب میں کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی تعبیر سے یہ شبہ نہ کیجئے کہ نماز باجماعت ہو رہی تھی اور ہماری مساجد کی طرح وہاں محراب موجود تھی اور حضرت زکریا محراب میں کھڑے ہو کر امامت کرا رہے تھے۔ یہاں لفظ محراب ان معنے میں ہرگز نہیں ہے جن معنے میں ہم بولتے ہیں۔ ہماری اصطلاح میں مسجد کے درمیان میں امام کے کھڑے ہونے کی جگہ کو محراب کہتے ہیں اور اسی کو فقہا کی زبان میں طاق امام کہتے ہیں۔ مساجد میں یہ محرابیں زبان میں طاق امام کہتے ہیں۔ مساجد میں یہ محرابیں زمانۂ نبوت اور زمانۂ خلافت راشدہ میں موجود نہ تھیں۔ یہ بعد کی ایجاد ہے۔ گو بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ زمانۂ نبوت سے ہے جیسا کہ کبیری نے ابن الہمام سے نقل کیا ہے مگر احادیث سے اس کی تائید نہیں ہوتی ہے بلکہ علماء کی ایک جماعت نے اسے ناپسند کیا ہے اور علامہ آلوسی نے بڑے زور کے ساتھ یہ دعویٰ کیا ہے۔

ھی من البدع التی لم تکن فی العصر الاول.

اور بتایا ہے کہ بہت سی احادیث میں محرابوں کی ممانعت آئی ہے مثلاً

عبداللہ ابن الحمید کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کہتے ہیں کہ قیامت کی نشانیوں میں سے ایک یہ ہے کہ مساجد میں محرابیں بنائی جائیں گی۔

ایک دوسری روایت ہے،

عبداللہ بن عمر کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ لوگو! ان محرابوں سے بچتے رہنا۔

شاید آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ اگر صورت حال یہی ہے کہ محرابیں نہ زمانۂ نبوت میں تھیں نہ خلافت راشدہ کے دور میں تو پھر ان کا نسب نامہ کیا ہے! علامہ سمہودی نے وفاء الوفا باخبار دار المصطفیٰ میں انکشاف کیا ہے کہ امویوں کے زمانہ میں جب کہ ولید بن عبدالملک سریر آرائے تخت حکومت تھا اور مدینہ کے گورنر عمر بن عبدالعزیز تھے، اس وقت مسجد نبوت میں محراب وجود میں آئی ہے۔

اوروں کا تو پتہ نہیں مگر میں یہی سمجھا ہوں کہ ہمارے فقہائے نے جو امام کو محراب میں تنہا کھڑا ہونے سے منع کیا ہے اور اسے مکروہ قرار دیا ہے تو اس کی علت یہ نہیں ہے جیسا کہ ہمارے بعض فقہاء نے سمجھا ہے کہ اس میں تشبہ باہل الکتاب ہے اور نہ اس کی وجہ یہ ہے کہ بغداد کی کسی مسجد میں محراب کی زمین ارض مغصوبہ تھی جیسا کہ صاحب بدائع نے بتایا ہے اصلی علت یہی ہے کہ چونکہ ان محرابوں کا زمانۂ نبوت میں ہونا ثابت نہیں ہے اس فقہاء نے اس میں تنہا امام کے کھڑا ہونے کو مکروہ قرار دیا ہے صدا اسی بناء پر فقہاء میں محراب کے مسجد کے حصہ ہونے یا نہ ہونے میں اختلاف ہوا ہے۔ اگرچہ۔

علامہ شامی نے محراب کو داخل مسجد ہی قرار دیا ہے۔ اس موضوع پر حافظ جلال الدین السیوطی نے ایک مستقل رسالہ یادگار چھوڑا ہے۔ ہمارے زمانے میں دمشق کے مشہور عالم علامہ جمال الدین قاسمی نے الفوائد میں ہند کے مشہور فاضل مولانا ابوالکلام آزاد نے تذکرۃ الشواہد میں اس پر اچھی اور مفید بحث فرمائی ہے

حضرت یحییٰ کے ہونے کی بشارت

۷۹۔ یقیناً اللہ تجھے یحییٰ کے ہونے کی بشارت دیتا ہے۔ دُعا قبول ہوئی اور بشارت ملی کہ لڑکا ہوگا اس کا نام یحییٰ ہوگا [۱] عہد جدید کے صحیفوں میں ان کا نام یوحنا آیا ہے انجیل میں اس موقعہ پر آتا ہے فرشتہ نے اس سے کہا۔ اے زکریاؑ خوف نہ کر، کیونکہ تیری دُعا سُنی گئی اور تیری بیوی الیشع تیرے لیے بیٹا جنے گی تو اس کا نام یوحنا رکھنا اور تجھے خوشی ہوگی۔ (لوقا، ۱۴ا) حضرت عیسیٰ کے خالہ زاد بھائی۔ اور آپ سے عمر میں حسب روایت انجیل صرف چھ مہینے بڑے تھے ۳۰ء والی شام ہیرود کے حکم سے شہید ہوئے [۲]۔ ہمارے علماء میں سے ثعلبی نے بھی یہی بات کہی ہے کہ عیسیٰ السلام سے چھ ماہ پہلے حضرت یحییٰ کی ولادت ہوئی ۔ (فتح الباری)

اور لوقا کی انجیل میں یہ بھی تصریح ہے کہ جب زکریا کی بیوی الیشع کو حاملہ ہوئے چھ ماہ گزر گئے تب جبرئیل علیہ السلام مریم پر ظاہر ہوئے اور اس نے عیسیٰ کی اس کو بشارت دی۔

حضرت یحییٰ کا قرآنی چہرہ

وہ خدا کے حکم سے ایک ہونے والے ظہور کی تصدیق کرنے والا، سردار، پارسا اور خدا کے صالح بندوں میں سے ایک نبی ہوگا آیت میں اللہ کے حکم سے ایک ہونے والے سے حضرت مسیح مراد ہیں جو خدا کے حکم سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ حضرت یحییٰ لوگوں کو پہلے سے خبر دیتے تھے۔ کہ مسیح پیدا ہونے والے ہیں۔ حصور کے معنے لذات و شہوات سے بہت زیادہ رکنے والا۔ اللہ کی عبادت میں اتنا استغراق کہ عورت کی طرف التفات کی نوبت نہ آئے یہ حضرت یحییٰ کا مخصوص حال تھا جس سے اُمت محمدیہ کے لیے کوئی ضابطہ نہیں بن سکتا۔ ہمارے پیغمبر علیہ السلام کا اعلیٰ امتیاز یہ ہے کہ کمال معاشرت کے ساتھ کمال عبادت کو جمع کر دیا۔ صالح کے معنے شائستہ کے ہیں یعنی نہایت شائستہ

---

[۱] افادات شیخ الاسلام [۲] ماجدی

ہوں گے اور صلاح و رشد کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہوں گے جسے نبوت کہتے ہیں [1]

قرآن نے حضرت یحییٰ کے تعارف میں چار باتیں فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ حضرت یحییٰ خدا کے حکم سے ہونے والے ظہور کی تصدیق کریں گے۔

دوسرے یہ کہ وہ ایک جماعت کی سیادت کریں گے۔

تیسرے یہ کہ وہ انتہائی نیکوکار اور پارسا ہوں گے۔

چوتھے یہ کہ وہ خدا کے نیکوکار بندوں میں سے نبی ہوں گے۔

پہلی بات کے لیے قرآن نے مصدقا بکلمۃ من اللہ کی تعبیر اختیار کی ہے یعنی اللہ کی جانب سے ایک کلمہ کی تصدیق کریں گے اور اس کی بشارت دیں گے۔ یہاں کلمہ سے مراد عام مفسرین کی رائے میں حضرت عیسیٰ ہیں۔ حضرت عیسیٰ کو کلمۃ اللہ کیوں کہتے ہیں اس پر گفتگو تو انشاء اللہ ان کی ولادت کے واقعہ میں ہوگی۔ یہاں تو صرف اتنی بات سمجھ لیجیے کہ چونکہ آپ کی پیدائش اللہ تعالیٰ کے ایک حکم کے ذریعے ہوئی ہے اس لیے کلمۃ اللہ آپ کا لقب ہے۔ لفظ کلمہ قرآن کی اصطلاح ہے اسی کی جمع کلمات آتی ہے تخلیقی کاروبار جس ذریعے سے انجام پا رہا ہے۔ اسی کا نام کلمہ ہے اور اسی کو قرآن "کن" کے لفظ سے یاد کرتا ہے حضرت عیسیٰ کی ولادت بھی اللہ کے لامحدود کلمات میں ایک کلمہ کے ذریعے ہوئی ہے اس لیے حضرت عیسیٰ بھی اللہ کے کلمات میں سے ایک کلمہ ہیں۔ حضرت یحییٰ حضرت عیسیٰ کی تصدیق بھی کریں گے۔ گویا قرآن نے حضرت یحییٰ کی زندگی کا مشن یہ بتایا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کی آمد کے لیے تمہید ہیں۔ زندگی تو زندگی خود ان کی ولادت بھی حضرت مسیح کی ولادت کی ایک طرح سے تصدیق تھی۔ کیونکہ ان کی ولادت بھی حضرت مسیح کی طرح خرق عادت تھی۔

سید کے معنے سردار کے ہیں۔ کتب تفسیر میں اس مقام پر سید کے متعدد معانی بتائے گئے ہیں مثلاً حلیم، عالم، فقیہ، دین و دنیا کا سردار، شریف و پرہیزگار، اللہ کے نزدیک پسندیدہ اور برگزیدہ حضرت یحییٰ کو ان سب معانی کے لحاظ سے سیادت حاصل تھی کیونکہ وہ نبی تھے اور نبی اپنے فرض، اپنی دعوت اور اپنے کام کے لحاظ سے سردار ہوتا ہے۔ وہ لوگوں تک حق کا آوازہ پہنچاتا ہے، اور زندگی میں لوگوں کی قیادت کرتا ہے۔ اس کام کے لیے وہ اللہ کی جانب سے ہر قسم کے سامان لے کر آتا ہے ایک عامی سے لے کر سربراہ مملکت تک دعوت کے میدان میں اس کے مخاطب سب ہوتے ہیں۔ وہ حق کی خاطر سب کو پکارتا ہے اور سب کو تنبیہہ کرتا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حصور حصر سے بنا ہے اس کے معنے بہت رکنے والا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے نزدیک جن چیزوں سے رُکنا ضروری ہے ان سے رکنے والا حصور ہے اور چونکہ یحیٰی علیہ السلام موصوف بہ صفت ہیں اس لیے وہ تمام معانی ان پر صادق آتے ہیں جو حافظ ابن کثیر نے بتلائے ہیں یعنی وہ شخص جو ہر قسم کے گناہ سے محفوظ ہو اور اس کے دل میں معصیت کا خطرہ بھی نہ گزرتا ہو جو اپنے آپ پر پوری طرح قابو رکھتا اور خواہشات نفس کو روکتا ہو اور عبادت میں استغراق کی وجہ سے عورتوں کی طرف سے بے رغبت ہو۔ ان معانی کے علاوہ حصور کے یہ معنے بتانا کہ حصور وہ ہے جو قوت مردانہ ہی نہ رکھتا ہو لغو ہے محققین نے تفاسیر میں اس کی تردید کی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے قاضی عیاض کے حوالہ سے جو بات لکھی ہے وہ بہت اونچی ہے فرماتے ہیں

> قاضی عیاض شفا میں رقمطراز ہیں کہ اللہ سبحانہ، کا حضرت یحیٰی کی مدح میں حصور فرمانا یہ نہیں ہے کہ وہ قوت مردمی نہ رکھتے تھے جیسا کہ کچھ لوگوں کا خیال ہے اس کی حذاق مفسرین نے تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ مدح نہیں بلکہ کمزوری اور عیب ہے۔ اور نقائص سے انبیاء کی شان بالا ہے۔ حصور کے معنے صرف یہ ہیں کہ ان کے دامن پر گناہ کا کوئی داغ نہیں ہے۔ شادت پر قدرت نہ ہونا مرد کی کمزوری ہے جب کہ پوری قدرت کے باوجود اپنے آپ پر قابو رکھنا حسن ہے اور یہ قابو خواہ مجاہدے کے ذریعے ہو جیسے عیسٰی علیہ السلام میں تھا یا اللہ کی نگرانی کی وجہ سے ہو جیسے یحیٰی میں تھا۔ جو شخص نکاح پر قدرت رکھتا ہو اور اس فرض کی ادائیگی کے ساتھ اللہ کی عبادت میں مشغول رہتا ہو تو اس کا بہت اونچا مقام ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت یحیٰی کے حصور ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو جنسیات کا پتہ ہی نہ تھا بلکہ مقصد یہ ہے کہ حضرت یحیٰی معاصی اور فواحش سے بالکل بچے ہوئے تھے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔ حصور مبالغہ کا صیغہ ہے۔ حصر سے مشتق ہے جو فعل متعدی ہے جس کے معنے اپنے اختیار سے روکنے کے ہیں۔ اور حضرت یحیٰی کو حصور اس لیے کہا گیا کہ وہ اپنے اختیار سے اپنے آپ کو شہوات اور لذات کی اتباع سے روکنے والے تھے۔ نیز حق تعالیٰ نے حصور کو مقام مدح میں ذکر کیا ہے اور قابل تعریف فعل اختیاری ہوتا ہے نہ کہ فعل اضطراری۔ عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ ابن عباس سے بھی یہی منقول ہے کہ حصور وہ شخص ہے کہ جو باوجود قدرت کے عورتوں کے قریب نہ جائے شاید حضرت یحیٰی کو الشہوات سے بے رغبتی کا مثالی پیکر بنا کر اس لیے روانہ کیا گیا کہ یہودیوں کی الشہوات میں ڈوبی ہوئی زندگی کا رخ موڑا جائے۔ حضرت یحیٰی کو زاہدانہ و درویشانہ زندگی کا ایسا نمونہ بنا دیا کہ لوگوں

کو اس زمانہ میں عبرت ہو یہ گویا تمہید تھی اس بات کی کہ یہ اُمت آہستہ آہستہ اس نقطہ اعتدال کو قبول کرنے کے قابل ہو جائے جو محمد رسول اللہؐ ۶۰۰ سال بعد لے کر آنے والے تھے لیکن عیسائی دنیا نے حضرت یحیٰی کی اس پارسائی اور زاہدانہ زندگی، معاش گریز رجحانات کا ذریعہ بنا لیا۔ اور اس کو رہبانیت کا نام دے دیا۔ ہم اس پر انشاء اللہ تفصیلی بحث اور اس کا تاریخی تجزیہ بشرط حیات پارہ ۲۷ میں کریں گے۔

بہر حال جیسے اولاد کے لیے ذریت طیبہ کہہ کر دعا فرمائی تھی۔ اللہ نے اُن کی دعا قبول فرمالی۔ چنانچہ بیٹا دیا جو نیکو کار، سردار زہد و ورع میں بے مثال اور والد کی طرح خدا کے برگزیدہ نبی اور اللہ نے ان کو بچپن ہی میں علم و حکمت سے معمور کیا۔ اور ان کی زندگی کا سب سے بڑا کارنامہ یہ تھا کہ وہ عیسیٰ علیہ السلام کی بشارت دیتے اور اُن کی آمد سے قبل رُشد و ہدایت کے لیے زمین ہموار کرتے تھے۔

حضرت زکریا کا فرطِ مسرت میں سوال

۸۱۔ زکریا نے جب یہ سُنا تو کہا خدایا میرے یہاں لڑکا کیسے ہو سکتا ہے جب کہ میں بوڑھا ہو چکا ہوں اور میری بیوی بانجھ ہے۔ حکم الٰہی ہوا۔ اسی طرح اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یعنی اس کی قدرت و مشیت سلسلۂ اسباب کی پابند نہیں۔ اگرچہ اس عالم میں اس کی عادت یہی ہے کہ اسباب عادیہ سے مسببات کو پیدا کرے لیکن کبھی کبھی اسباب عادیہ کے خلاف غیر معمولی طریقہ سے کسی چیز کا پیدا کرنا بھی اس کی خاص عادت ہے۔ اصل یہ ہے کہ مریم صدیقہ کے پاس خارق عادت طریقہ سے رزق کا پہنچنا اور بہت سے غیر معمولی واقعات کا ظہور پذیر ہونا یہ دیکھ کر مریم کے حجرے میں بے ساختہ حضرت زکریا کا دُعا مانگنا، پھر ان کو اور ان کی بانجھ عورت کو بڑھاپے میں غیر معتاد طور پر اولاد ملنا۔ ان سب نشانات قدرت کو اس عظیم الشان آیت الٰہیہ کی تمہید سمجھنا جو مریم کے وجود سے بدون قربان زوج مستقبل قریب ظاہر ہونے والی تھی گویا حضرت یحیٰی کی غیر معتاد ولادت پر کذٰلک یفعل اللہ مایشاء فرمانا تمہید تھا کذا لک یخلق اللہ مایشاء کی جو آگے حضرت مسیح کی غیر معتاد ولادت کے سلسلہ میں آیا چاہتا ہے[1]

حضرت زکریا کو اللہ سبحانہ، کی قدرت میں کوئی شک نہ تھا ان کو یقین کامل تھا کہ حق تعالیٰ بڑھاپے میں بھی اولاد عطا کر سکتے ہیں لیکن بڑھاپے میں بانجھ عورت سے اولاد کا ہونا خارق عادت ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس لیے بارگاہ خداوندی میں خارق امر کی درخواست کو خلاف ادب سمجھا اور خاموش رہے۔ مگر جب حضرت مریم کے خارق عادت احوال آنکھوں سے دیکھے تو درخواست پیش کرنے کی ہمت پیدا ہوئی اور عرض کیا کہ مجھے ایک ولد صالح عطا فرما۔ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بشارت آئی تو فرط مسرت سے فرمایا انی یکون لی غلام میرے لڑکا کیونکر ہوگا۔ چونکہ نا امیدی کے بعد ایک خارق عادت امر کی بشارت ملی اس لیے اس مسرت میں اس کی کیفیت دریافت کرنے لگے تاکہ اس کی پوری کیفیت معلوم ہو جائے۔ بادشاہ اگر کسی شخص کو کوئی بشارت دے اور وہ جوش مسرت میں بادشاہ سے یہ سوال کرے کہ حضور کے اس انعام کی صورت کیا ہوگی۔ تو اس کا یہ سوال بادشاہ کی قدرت میں شک کی بنا پر نہیں بلکہ بطور لذت و فرحت ہے [1] یہ بھی درست ہے کہ سوال غایت مسرت کی وجہ کیا ہو لیکن اصل یہ ہے کہ جب حضرت زکریا کو یحییٰ کی ولادت کی بشارت دی گئی تو وہ اپنے حالات کے تحت اس پر حیران ہوئے اور سان کو تعجب ہوا میں ضعیف العمر اور بیوی بانجھ ہے۔ پھر اس بشارت کے ظہور میں آنے کی صورت کیا ہوگی یہ سوال شک یا انکار کی نوعیت کا نہیں بلکہ نہایت حسین و بلیغ انداز میں یہ پوچھنا ہے کہ ان رکاوٹوں کے باوجود اس بشارت کے ظاہر ہونے کی شکل کیا ہوگی۔

شاہ عبدالقادر یہاں ایک لطیف بات ارشاد فرما گئے۔

انوکھی چیز مانگتے تعجب نہیں آیا جب سنا ہوگا تب تعجب کیا۔ [2]

یہ بات بار بار واضح کی جا چکی ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی جانب سے اس قسم کے سوالات کا یہ مطلب نہیں ہوتا کہ وہ اللہ کی قدرت میں شک کرتے ہیں بلکہ مقصود یہ ہوتا ہے کہ ان کو بتا دیا جائے تو بہتر ہے کہ قدرت کا یہ کرشمہ کس نوعیت سے انجام پانے والا ہے مگر بادی النظر میں سوال کی ظاہری سطح سے تردد مترشح ہوتا ہے اس لیے اللہ کی سنت یہ ہے کہ اول ان کو اسی انداز میں جواب دیا جاتا ہے تاکہ ان کو متنبہ کر دیا جائے کہ ان کا یہ سوال اگرچہ قابل گرفت نہیں ہے تاہم ان کی شان رفیع سے بہت گری بات ہے کہ وہ مقرب بارگاہ الٰہی ہوتے ہوئے اس قسم کے معاملہ میں اظہار تعجب کریں۔ چنانچہ حضرت شاہ عبدالقادر نے اپنے مختصر سے دو جملوں میں اسی جانب اشارہ کیا ہے لیکن ساتھ ہی سوال کی جو حقیقی روح ہے اس کے پیش نظر اصل سوال کا جواب بھی دیا جاتا ہے تاکہ ان کا قلب مطمئن ہو جائے۔

---

[1] معارف مولانا ادریسؒ
[2] موضح القرآن سورہ مریم

اسی حقیقت کے پیش نظر یہاں اولاً زکریا علیہ السلام کے تعجب کے مطابق جواب دیا اور کذٰلک یفعل اللہ ما یشاء کہہ کر قدرت کاملہ کے بے روک ٹوک تصرفات کا اعلان کیا۔ اور سوال کی حقیقی رُوح کے مطابق جواب دیا۔ جواب کا یہ حصہ سورۂ انبیاء میں مذکور ہے یعنی واصلحنالہ زوجہ ہم نے اس کی بیوی کی رکاوٹ کو دُور کر کے ٹھیک کر دیا۔ گویا جواب یہ ہوا کہ بچہ اس طرح ہوا کہ تمہاری اہلیہ ٹھیک اور تندرست ہو کر اولاد کے قابل ہو جائے گی۔

یحییٰ کی ولادت کے لیے نشانی

۸۲۔ زکریا نے فرمایا کہ خداوندا اس بارے میں میرے لیے کوئی بات بطور نشانی ٹھہرا دے جس سے معلوم ہو جائے کہ اب حمل قرار پا گیا ہے تاکہ قرب ولادت کے آثار دیکھ کر تازہ مسرت حاصل ہو اور شکر نعمت میں بیش از بیش مشغول ہوں۔ گویا فرما رہے ہیں کہ ایسی علامت بتا دیجئے کہ جب پیر فرتوت اور ایک بوڑھی بانجھ عورت کے ہاں لڑکے کی ولادت جیسا عجیب اور غیر معمولی واقعہ پیش آنے والا ہو تو اس کی اطلاع مجھے پہلے سے ہو جائے[1]

حضرت زکریا نے بشارت ہاتف غیبی سے سُنی تھی۔ اچھی ساعت اور اچھے حالات میں سُنی تھی۔ ان کا گمان تو یہی تھا کہ یہ بشارت من جانب اللہ ہی ہے لیکن وہ نہایت متواضع متقی اور محتاط تھے اس وجہ سے دل کے ایک گوشہ میں یہ کھٹک تھی کہ ممکن ہے یہ اپنے ہی گنبد دل کی صدائے بازگشت ہو۔ ممکن ہے اس کے اندر نفس کی مخفی آرزوؤں کا کوئی دخل ہو اس وجہ سے انہوں نے اپنے رب سے درخواست کی کہ اے میرے رب میرے لیے کوئی علامت ٹھہرا دیجئے جس سے مجھے یہ اطمینان ہو جائے کہ یہ بشارت آپ کی جانب سے ہے[3]

بشارت کے ظہور کی نشانی

ارشاد ہوا کہ نشانی یہ ہے کہ تین دن تک تو بات چیت نہ کر سے گا مگر اشارے سے یعنی جب تجھ کو یہ حالت پیش آئے کہ تین دن رات لوگوں سے بجز اشارہ کے کوئی بات نہ کر سکے اور تیری زبان خالص ذکر الٰہی کے لیے وقف ہو جائے تو سمجھ لینا کہ اب استقرار حمل ہو گیا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن [3] تدبر قرآن

سبحان اللہ نشانی بھی ایسی مقرر فرمائی کہ نشانی کی نشانی ہو اور اطلاع پانے سے جو غرض ہے وہ علی وجہ الکمال حاصل ہو جائے گویا خدا کے ذکر و شکر کے سوا چاہیں تو زبان سے بات نہ کر سکیں۔ [1]

اگر حضرت زکریا پر یہ حالت غیر اختیاری طور پہ طاری کر دی گئی تو یہ یقیناً اس بات کی قطعی نشانی تھی کہ ان کو بیٹے کی جو بشارت ملی ہے من جانب اللہ ہے اس میں شیطانی وسوسہ کا کوئی دخل نہیں ہے [2]

انجیل کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جیسے کوئی بڑی معصیت حضرت زکریا سے صادر ہوگئی۔ اور اس کی سزا میں ان کی قوت گویائی چند روز کے لیے سلب کر لی گئی۔ چنانچہ انجیل لوقا میں ہے۔

اور دیکھ جس دن تک یہ باتیں واقع نہ ہولیں تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا اس لیے کہ تو نے میری باتوں کا جو اپنے وقت پر پوری ہوں گی یقین نہ کیا۔ جب وہ باہر آیا تو ان سے بول نہ سکا۔ پس انہوں نے معلوم کیا کہ اس نے مقدس رؤیا دیکھی ہے اور وہ ان سے اشارے کرتا تھا اور وہ گونگا ہی رہا۔

(لوقا ۱۔ ۲۰، ۲۲)

قرآن عظیم جو تمام صحیفوں پر مہیمن یا نگران و نگہبان ہے اور ان کی تمام غلطیوں اور غلط بیانیوں کی تصحیح کرتا ہے۔ یہاں بھی قرآن نے حسب معمول اپنا فرض ادا کیا اور حضرت زکریا سے یہ بہتان رفع کر کے صحیح صورت حال یہ بیان کی کہ ایک علامت غیبی کی انہوں نے خود درخواست کی تھی اور ان کی اسی درخواست کو اللہ نے شرف قبول عطا فرما کر یہ علامت غیبی مرحمت فرمائی کہ آپ تسبیح و ذکر الٰہی تو بدستور کرتے رہیں گے البتہ لوگوں سے بات چیت کی قوت آپ کو تین روز کے لیے حاصل نہ رہے گی تین دن کہنے سے راتیں اس میں تبعاً شامل ہو گئیں [3] سورہ مریم میں ثلث لیال کی تصریح بھی آئی ہے۔

ہم نے تین دن بات نہ کرنے کی تفسیر جمہور کے مطابق کی ہے۔ عبداللہ ابن عباس، مجاہد عکرمہ اور دوسرے علماء سے اس کی یہی تفسیر منقول ہے۔ حافظ عماد الدین ابن کثیر فرماتے ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام
[2] تدبر قرآن [3] ماجدی

ان کی زبان تین روز کے لیے بغیر کسی بیماری اور خرابی کے بند ہوگئی اور زید بن اسلم کہتے ہیں کہ ان کی زبان گنگ کے عیب سے پاک ہوتے ہوئے تین روز کے لیے بند ہوگئی تھی اور ان میں یہ قدرت نہ رہی تھی کہ قوم سے اشارے کے سوا بات کر سکیں۔

(ابن کثیر ج ۲ ص ۱۱۲)

سورہ مریم میں جہاں یہ واقعہ بیان ہوا ہے وہاں تصریح ہے کہ۔

ان لا تکلم الناس ثلاث لیال سویا۔

اس آیت میں لفظ سویا آیا ہے۔ اس کے معنے دو طرح کیے گئے ہیں ایک یہ کہ بحالت تندرستی لوگوں سے بات نہ کریں گے دوسرے یہ کہ آپ لگاتار تین راتیں لوگوں سے بات نہ کریں گے جمہور نے پہلے معنے کو اختیار کیا ہے اور اسی کو ابن کثیر نے ترجیح دی ہے۔ لیکن مولانا ابو الکلام آزاد نے ترجمان القرآن میں جمہور کی تفسیر سے جدا تفسیر کی ہے کہ زکریا علیہ السلام سے کہا گیا کہ تم بنی اسرائیل کے روزہ دن کی طرح تین دن کھانے پینے سے باز رہنے کے ساتھ ساتھ خاموشی بھی اختیار کیے رہو تو موعودہ بشارت کا وقت شروع ہو جائے گا چنانچہ فرماتے ہیں۔

انجیل میں ہے زکریا نے کہا، میں یہ بات کس طرح جانوں کیونکہ میں بوڑھا ہوں اور بیوی بانجھ ہے۔ جبریل نے کہا جس دن تک یہ بات واقع نہ ہوگی تو چپکا رہے گا اور بول نہ سکے گا۔ جب زکریا باہر آیا تو وہ لوگوں سے اشارے کرتا تھا بول نہیں سکتا تھا۔

(لوقا۔ ۱۸)

قرآن نے یہ نہیں کہا ہے کہ حضرت زکریا گونگے ہوگئے تھے۔ یہ یقیناً بعد کی تعبیرات ہیں۔ صاف بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ حضرت زکریا کو روزہ رکھنے اور مشغول عبادت رہنے کا حکم ہوا اور یہودیوں کے یہاں روزے کے اعمال میں ایک عمل خاموشی بھی تھی۔

مولانا آزاد کی یہ تفسیر سلف کے خلاف ہے اس لیے قابل قبول نہیں ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ حضرت زکریا گونگے ہوگئے تھے۔ یہ مسلک کسی کا نہیں ہے۔ سلف صالحین بھی کہتے ہیں کہ حضرت زکریا کسی ایسے مرض میں گرفتار نہیں تھے جس کو اخرس کہتے ہیں بلکہ زبان میں قوت گویائی کے صحیح و سالم رہنے کے باوجود علامت کے طور پر تین دن کے لیے من جانب اللہ زبان میں حصر، رکاوٹ واقع ہوگئی تھی۔

نشانی اور شکرِ نعمت میں ہم آہنگی

اور اپنے پروردگار کا کثرت کے ساتھ ذکر کر اور صبح و شام اس کی حمد و ثنا میں مشغول رہ۔ یعنی اس وقت خدا کو بہت کثرت سے یاد کرنا اور صبح و شام تسبیح و تہلیل میں لگے رہنا۔ معلوم ہوتا ہے کہ آدمیوں سے بات نہ کرنا اضطراری تھا تاکہ ان دنوں میں محض ذکر و شکر کے لیے فارغ کر دیے جائیں۔ لیکن خود ذکر و شکر میں مشغول رہنا اضطراری نہ تھا۔ اس لیے اس کا حکم دیا گیا[1] سبحان اللہ کیا نشانی ہے۔ نشانی کی نشانی بھی ہے اور نشانی سے جو غرض تھی یعنی شکرِ نعمت وہ بھی پوری طرح حاصل ہے اور پھر اس پر لُطف یہ ہے کہ ذکر و تسبیح کو تو اختیاری رکھا اور لوگوں سے بات نہ کرنے کی قدرت کو اضطراری تاکہ سوائے ذکر و شکر کے اور کچھ کر ہی نہ سکیں ایک ہی چیز دو مختلف غرضوں کی علامت بن گئی۔ حصول نعمت، اور شکرِ نعمت[2]

واقعہ زکریا میں مقامِ استشہاد

اس واقعہ کو پیش کرنے کا موضوع سے متعلق بنیادی مقصد اہل کتاب کو یہ جتانا ہے کہ محمد رسول اللہ کی نبوت کو نہ ماننے کے لیے تمہارا یہ بہانہ بے جان اور لچر ہے کہ ہم آپ کی نبوت کو اس لیے نہیں مانتے کہ بنی اسرائیل کو چھوڑ کر بنی اسماعیل میں سے نبی آنا ہماری قومی روایات اور رواج کے خلاف ہے۔ یہ واقعہ پیش کر کے قرآن نے اُن کے اس غلط زاویہ نظر پر تیسری ضرب کاری لگائی ہے۔ اور بتایا ہے کہ زکریا کے یہاں جن حالات میں اولاد ہوئی ہے کیا یہ اسرائیلی روایات اور تمہارے خاندانی رسم و رواج کے موافق ہوا ہے۔ اگر زکریا کی اولاد کے بارے میں اپنی رسوم، اپنی روایات کی مخالفت کا کبھی تمہارے اندر کوئی ولولہ نہیں پیدا ہوا اور اسے اسرائیلی روایات کے خلاف ہونے کے باوجود مانتے ہو تو پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے لیے روایات و رسوم کی خلاف ورزی کو کیوں آڑ بناتے ہو۔ پوری اسرائیلی تاریخ پر نگاہ ڈالو اور بتاؤ کہ اس قسم کا واقعہ کہاں اور کب ہوا، اگر جواب نفی میں ہے تو مانتے کیوں ہو۔ مخاطب چونکہ وفد نجران ہے اس لیے اسرائیلی تاریخ میں سے چن چن کر وہ واقعات پیش کیے جن کی اصلی چوٹ عیسائیوں پر پڑتی ہے اور یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ ایک ہی تیر سے وہ متعدد شکار

---

[1] افادات شیخ الاسلام

[2] معارف القرآن مولانا ادریس رح

کرتا ہے۔ ایک طرف حضور انورؐ کی نبوت کی صداقت کے لیے سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسری طرف حضرت مسیح کے بارے میں عیسائیوں کے عقیدہ ابنیت و الوہیت کے گھروندے کو مسمار کرتا ہے حضرت یحییٰ کی ولادت پیش کر کے بتایا ہے کہ جیسے حضرت مسیح کی ولادت میں اعجاز کار فرما ہے ایسے ہی حضرت یحییٰ کی ولادت میں بھی اللہ کی شان قدیری کا مظاہرہ ہے۔ دونوں جگہ قدرت کے مظاہر ہیں۔ اگر یحییٰ کو مظہرِ قدرت نے الٰہ نہیں بتایا تو حضرت مسیح کی پیدائش میں قدرت کے مظاہرہ نے مسیح کو الٰہ کیسے بنا دیا۔ ان یقولون الا کذبًا۔

وَاِذْ قَالَتِ الْمَلٰٓئِكَةُ يٰمَرْيَمُ اِنَّ اللّٰهَ اصْطَفٰكِ وَطَهَّرَكِ
وَاصْطَفٰكِ عَلٰى نِسَآءِ الْعٰلَمِيْنَ ۝ يٰمَرْيَمُ اقْنُتِىْ لِرَبِّكِ
وَاسْجُدِىْ وَارْكَعِىْ مَعَ الرّٰكِعِيْنَ ۝ ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ
الْغَيْبِ نُوْحِيْهِ اِلَيْكَ ۚ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يُلْقُوْنَ اَقْلَامَهُمْ
اَيُّهُمْ يَكْفُلُ مَرْيَمَ ۠ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ اِذْ يَخْتَصِمُوْنَ ۝

اور اس واقعہ کو بیان کر جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ نے تجھے برگزیدگی عطا فرمائی ہے اور تجھے برائیوں سے پاک کر دیا ہے اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھے بزرگی عطا فرمائی ہے[۸۵]۔ اے مریم تو اپنے پروردگار کی طاعت و نیاز میں لگ جا اور سجدہ کر[۸۶]، اور اور رکوع کر رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ اے پیغمبر یہ غیب کی خبریں ان میں سے ہیں جو ہم تمہیں بذریعہ وحی بتا رہے ہیں[۸۸]۔ ورنہ یہ بات تو ظاہر ہے کہ تم ان لوگوں کے پاس موجود نہ تھے جب وہ اس مقصد کی خاطر کہ مریم کی کفالت کون کرے قلم اندازی کر رہے تھے اور نہ تم اس وقت ان کے پاس تھے جب وہ باہم جھگڑ رہے تھے[۸۹]۔

حضرت مریم کی برگزیدگی و قبولیت :

مریم علیہا السلام شب و روز عبادت الٰہی میں رہتیں اور جب خدمت ہیکل کے لیے ان کی نوبت آتی تو اس کو بھی بخوبی انجام دیتی تھیں حتیٰ کہ ان کا زہد و تقویٰ بنی اسرائیل میں ضرب المثل بن گیا۔ اور ان کی ریاضت و عبادت کی مثالیں دی جانے لگیں۔ مریم اسی طرح ایک عرصہ تک اپنے مقدس مشاغل کے ساتھ پاک زندگی بسر کرتی ہیں۔ اور مقدس ہیکل کے سب سے بڑے مجاور حضرت زکریا بھی ان کے زہد و تقویٰ سے بے حد متاثر ہیں۔

قرآن نے اس آیت میں حضرت مریم کی عظمت اور جلالت قدر کو بیان کیا ہے۔ جس انداز سے قرآن نے حضرت مریم کا چہرہ پیش کیا ہے خود انجیل میں اس کا ذرہ بھی نہیں ہے۔ یہ قرآن ہی ہے جس نے حضرت مریم کے تقدس اور ان کی عظمت سے دنیا کو آشنا کیا۔ اور ان کے بچپن، اور ان کی جوانی کے بارے میں علی الاعلان ان کی اصطفائی شان کا اعلان کیا۔ ورنہ یہود کی کتابوں میں ایسی ایسی گندہ روائتیں اس پاک سرشت خاتون کے بارے میں لکھی ہوئی ہیں کہ معالم القرآن کے قاریوں کی ضیافت کے قابل بھی نہیں۔ قرآن نے اس خرافات کی طرف بہ کمال بلاغت طہرک کا لفظ لا کر اشارہ کر دیا ہے اور اسی پر بس نہیں کی مریم کی عظمت شان کو دوبالا کرنے کے لیے مریم کی اللہ کے یہاں مقبولیت اور برگزیدگی کا لفظ اصطفا لا کر اظہار فرمایا اور جیسا پہلے سن چکے ہو کہ اصطفا کے معنے میں عصمت داخل ہے تو گویا ایک ہی فقرے میں مریم کی طہارت، عصمت اور برگزیدگی کے سارے مقامات اور مدارج بیان ہو گئے۔

چونکہ حضرت مریم نہایت مرتاض عابدہ، زاہدہ اور تقویٰ و طہارت میں ضرب المثل تھیں۔ اور ان کو ایک جلیل القدر پیغمبر کی والدہ ہونے کا شرف عطا ہوا ہے اس لیے اللہ سبحانہ کی جانب سے ان کی تقدیس و تطہیر کا یہ اعلان ہوا ہے۔

۸۵ ۔ اور اس واقعہ کو بیان کرو جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ نے تجھے برگزیدگی عطا فرمائی ہے اور تجھے برائیوں سے پاک کر دیا ہے اور تمام دنیا کی عورتوں پر تجھے بزرگی دی ہے۔ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کا قصہ جو ضمنی مناسبات سے درمیان میں آگیا تھا۔ اصطفا آل عمران کی تاکید اور حضرت مسیح کی ولادت کی تمہید تھی۔ یہاں روئے سخن پھر مریم کی طرف ہے۔ چنانچہ مسیح سے پہلے مسیح کی والدہ کے فضل و شرف ذکر فرماتے ہیں یعنی

فرشتوں نے مریم سے کہا کہ اللہ نے تجھے پہلے دن سے چھانٹ دیا کہ باوجود لڑکی ہونے کے اپنی نیاز میں قبول کیا۔ طرح طرح کے احوال رفیعہ اور کرامات سنیہ عنایت فرمائیں۔ ستھرے اخلاق پاک طبیعت، ظاہری اور باطنی نزاہت عطا فرما کر اپنی مسجد کی خدمت کے لائق بنایا اور جہاں کی عورتوں پر تجھ کو بعض وجوہ سے فضیلت بخشی۔ مثلاً ایسی استعداد رکھی کہ بدون مس بشر تنہا اس کے وجود سے حضرت مسیح جیسے ذی عزم پیغمبر پیدا ہوں، یہ امتیاز دنیا کی کسی عورت کو حاصل نہیں ہوا[1]

مولانا عثمانی نے اپنی خداداد ذہانت سے آیت میں اصطفا اور اصطفا کے تکرار کی وجہ جس لطیف انداز میں بیان کی ہے وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ مولانا کے ارشاد گرامی کا خلاصہ یہ ہے کہ اصطفا کے معنے چھانٹ لینے کے ہیں بہت سی چیزوں میں اچھی اور عمدہ چیز کو چھانٹ لینا اصطفا کہلاتا ہے اور چھانٹی ہوئی چیز کو صفی کہتے ہیں۔ حضرت مریم کے لیے یہاں اصطفاء انہی معنے میں ہے یعنی اللہ تعالےٰ نے ان کو خاص کام کے لیے منتخب کیا ہے اور یہ انتخاب دو بار عمل میں آیا ہے۔ ایک بار اس وقت جب باوجود لڑکی ہونے کے ان کو خدمت بیت اللہ کے لیے نیاز میں قبول کیا اور قبول فرمانے کے بعد ان کو کمالات کی مختلف منزلوں سے گزارا۔ اور دوسری بار انتخاب اس وقت عمل میں آیا جب ان کو بغیر مس بشر ولادت مسیح کے ذریعے ان کو فضیلت بخشی۔ یہی وہ عظیم نشانی تھی جس کے ظہور کے لیے حضرت مریم کا انتخاب عمل آیا۔

امانت کی یہ باربرداری اس کی مقتضی ہوئی کہ اللہ سبحانہ، اس کی ذمہ داریوں کی پابجائی کے لیے حضرت مریم کی خصوصی تربیت فرمائے تاکہ وہ آنے والے مراحل میں حالات کا مقابلہ کرنے کے قابل ہو سکیں۔ اسی قابلیت وصلاحیت کو قرآن نے تطہیر سے تعبیر کیا ہے اور اس کے نتیجہ میں حضرت مریم میں ایسی استعداد پیدا ہوگئی کہ اللہ کی تخلیقات میں تخلیق کی عام شاہراہ سے ہٹ کر قدرت الٰہی کا خاص مظہر بن سکیں۔ یہ اصطفاء کوئی معمولی اصطفاء نہیں ہے یہ تمام عالم کی عورتوں پر اصطفاء کوئی معمولی اصطفاء نہیں ہے یہ تمام عالم کی عورتوں پر اصطفاء تھا۔ پوری اللہ کی تاریخ تخلیقات میں مریم کے علاوہ یہ امتیاز کسی کو حاصل نہیں ہوا۔

مولانا نے جو اصطفا کے معنے بیں نکتہ آفرینی کی ہے اس کی روشنی میں اب حضرت مریم کا دنیا کی عورتوں میں امتیاز ایک بے غبار حقیقت ہے لیکن جن بزرگوں کی نگاہ یہاں تک نہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہنچی وہ اس آیت میں حضرت مریم کے لیے اصطفاء کا تکرار دیکھ کر پریشانیوں کا شکار ہو گئے۔ اور اسی پریشاں خیالی کا اظہار انہوں نے یہ کہہ کر کیا کہ مریم علیہا السلام نبیّہ تھیں۔

کیا عورت نبی ہو سکتی ہے؟

اس موضوع پر تفصیلی بحث تو آپ انشاء اللہ تیرہویں پارے میں پڑھیں گے لیکن یہاں اتنی بات ضرور گوش گزار فرما لیجئے۔ کہ علامہ قرطبی اور حافظ ابن حزم اس بات کے قائل ہیں کہ حضرت مریم نبیہ تھیں لیکن قاضی عیاض اور حافظ ابن کثیر نے جمہور کا مسلک یہ بتایا ہے۔ کہ مریم علیہا السلام نبیّہ نہیں تھیں۔ اور امام الحرمین نے اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ مدعیانِ نبوت کے نزدیک حضرت مریم کے نبی ہونے کی یہی آیت سب سے بڑی دلیل ہے یعنی اس مقام پر قرآن میں حضرت مریم کے بارے میں لفظ اصطفاء بتکرار استعمال ہوا ہے۔ مگر یہ دلیل محلِ نظر ہے جیسا کہ انشاء اللہ اپنے موقعہ پر اس کی تفصیل آئے گی۔

دراصل لفظ اصطفاء سے یہاں اس درجہ کمال کی طرف اشارہ مقصود ہے جس کی تشریح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے۔ صحیحین میں ہے۔ ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں۔ کہ جناب رسول اللہ کا ارشاد ہے۔

> مردوں میں سے درجہ کمال کو بہت پہنچے ہیں لیکن عورتوں میں سے درجہ کمال صرف مریم دختر عمران اور آسیہ زوجہ فرعون کو حاصل ہوا ہے اور عائشہ کا مقام عورتوں میں ایسا ہے جیسے تمام کھانے میں ثرید کا۔

ظاہر ہے کہ ارشاد میں جس کمال کی طرف اشارہ کیا ہے وہ نبوت کے علاوہ ہے قرآن نے مریم کے اسی کمال کی ساتویں پارے میں وامہ صدیقہ کہہ کر تعیین بھی کر دی ہے۔ مقام صدیقیت نبوت نہیں ہے۔ نبوت سے کمتر ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے تصریح کی ہے کہ صدیقیت اور نبوت کے درمیان کوئی درجہ حائل نہیں ہے۔

۸۶۔ اے مریم تو اپنے پروردگار کی طاعت و نیاز میں لگ جا اور سجدہ کر۔ یعنی اللہ نے جب ایسی عزت اور بلند مرتبہ تجھ کو عطا کیا ہے تو چاہیئے کہ ہمیشہ اخلاص و تذلل کے ساتھ اپنے پروردگار کے آگے جھکی رہے اور وظائف عبودیت کے انجام دیتے ہیں۔ بیش بیش سرگرمی دکھلا تاکہ حق تعالےٰ نے جس امر عظیم کے بروئے کار لانے کا ذریعہ تجھے تجویز کیا ہے وہ ظہور پذیر

اگرچہ یہ بات بھی ملائکہ ہی حضرت مریم سے فرما رہے ہیں لیکن نام لے کر یہ بات بتانے کی وجہ جیسا کہ علامہ آلوسی نے اس کی نشاندہی کی یہ ہے کہ اب تک جو کچھ کہا گیا تھا وہ تمہید تھی اور اب جو کچھ بتایا جا رہا ہے یہ مقصود بالذات ہے۔ اس موقعہ پر اصطفا پر طاعت و نیاز کو مرتب کرنا بتا رہا ہے کہ گویا یوں کہا گیا ہے کہ چونکہ اللہ نے تجھے قبولیت اور برگزیدگی دی ہے اس لیے طاعت و نیاز میں لگ جانا چاہیئے۔ اگر مریم کی ذات سے نبوت کا کوئی بھی تعلق ہوتا تو انداز تعبیر ایسا نہ ہوتا جس کا سارا تعلق ذاتی اور انفرادی اصلاح سے ہے۔ اس انداز تعبیر کے ذریعے ایک طرف اگر یہودیوں کو یہ بتایا گیا کہ حضرت مریم بڑی عبادت گزار اور طاعت شعار خاتون تھیں تو دوسری طرف عیسائیوں کو یہ سمجھا دیا کہ مریم نہ نعوذ باللہ خدا کی ماں تھیں اور نہ کسی قسم کی دیوی کہ ان کی پرستش کی جائے یا انہیں کسی درجہ میں شریک عبادت کیا جائے۔ بلکہ ان کی ساری بزرگی اور برگزیدگی صرف یہ تھی کہ وہ اپنے مالک و مولی کی مخلص پرستار اور نہایت درجہ کی عبادت گزار و طاعت شعار تھیں[1]

حضرت مریم کی نماز کے ارکان:

۸۷۔ اور رکوع کر تو رکوع کرنے والوں کے ساتھ۔ یعنی جیسے راکعین اللہ کے آگے رکوع کرتے ہیں تو بھی اسی طرح رکوع کرتی رہ یا یہ مطلب ہے کہ جماعت کے ساتھ نماز ادا کر اور چونکہ کم از کم رکوع میں شامل ہونے والا اس رکعت کو پانے والا سمجھا جاتا ہے اس لیے شاید نماز کو بعنوان رکوع تعبیر کیا گیا جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ کے کلام سے فتاویٰ میں مترشح ہوتا ہے۔ اس صورت میں اگر اقنتی میں قنوت سے قیام مراد لیں تو قیام رکوع و سجود تینوں ہیئات نماز کا ذکر آیت میں ہو جائے گا۔ ممکن ہے اس وقت عورتوں کو عام طور پر جماعت میں شریک ہونا جائز ہو یا خاص فتنہ سے مامون ہونے کی صورت میں جائز ہو یا مریم کی خصوصیت ہو یا مریم اپنے حجرہ میں تنہا یا دوسری عورتوں کے ساتھ امام کی اقتدا کرتی ہوئے[2]

حضرت مریم عبادت میں تورات پر عمل کرتی تھیں۔ قرآن نے ان کی نماز کا جو تعارف پیش کیا ہے تورات کے حوالوں سے ان ارکان نماز کا پتہ چلتا ہے۔ ذیل میں ہم ان میں سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ماجری [3] افادات شیخ الاسلام۔

ہر ایک کا حوالہ تورات کے مجموعہ سے نقل کرتے ہیں ۔
قیام ۔ برابر ہام ہنوز خداوند کے حضور میں کھڑا رہا (پیدائش ۱۸ ۔ ۲۲)
رکوع ۔ اور ابراہام زمین تک ان کے آگے جھکا اور بولا اے خداوند (پیدائش ۱۸ ۔ ۲۰)
سجدہ ۔ اور یہ سن کے کہ خداوند نے اسرائیل کی خبرگیری اور ان کے دکھوں پر نظر ثانی کی انہوں نے اپنے سر جھکائے اور سجدے کیے (خروج ۴ ۔ ۳۱)

ان حوالوں سے بخوبی ثابت ہے کہ ابراہیمی ملت میں عبادت اور تعظیم الٰہی کے یہ تینوں ارکان موجود تھے ۔ موجودہ انجیل میں دعا و نماز کا ذکر متی ۶ ۔ ۵ ر ۱۷ ۔ ۲۱ ر ۲۶ ۔ ۳۶ ۔ مرقس ۱۴ ۔ ۳۲ ، لوقا ۲۲ ۔ ۴۱ وغیرہ میں ہے ۔ طریقہ نماز میں ایک انجیل میں ایک ہی موقع کے لیے گھٹنا ٹیکنا جو گویا رکوع ہے (لوقا ۲۲ ۔ ۴۱ ۔) اور دوسری متی میں منہ کے بل گرنا یعنی سجدہ کرنا لکھا ہے ۔ باقی انجیلیں خاموش ہیں ۔

زمانہ نبوت میں یہود و نصاریٰ میں جو لوگ نماز کے پابند تھے ان ارکان کو ادا کرتے تھے ۔ کھڑے ہو کر تورات یا زبور کی آیتیں تلاوت کرتے اور سجدہ بھی کرتے تھے ۔ روایات میں ہے کہ رکوع میں یہودیوں کی دونوں ہاتھ جڑے نہ رہیں ۔ اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہود بھی یہ مختلف ارکان ادا کرتے تھے ۔

نماز میں رکوع میں ملنے والا رکعت پا لیتا ہے ۔

اس آیت میں رکوع کرنے والوں کے ساتھ رکوع کرنے کا حکم کرنا اس بات کا اشارہ ہے کہ نماز باجماعت ادا کرو اس لیے کہ رکوع اگرچہ رتبہ میں سجدے سے کم ہے لیکن راکعین کی معیت کی وجہ سے رکوع بھی قرب خداوندی میں معین و مددگار ہو جاتا ہے ۔ اور یہ بات کہ خاص طور پر نماز باجماعت کے لیے رکوع کا عنوان کیوں اختیار کیا تو اس کی وجہ غالباً یہی ہے کہ جماعت میں شرکت کے لیے رکوع کا پالینا کافی ہے ۔ جیسا کہ ہماری شریعت میں احادیث سے معلوم ہوتا ہے چنانچہ سنن کبریٰ بیہقی میں ہے ۔

حضرت ابوبکرہ کہتے ہیں کہ جب وہ مسجد میں داخل ہوئے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رکوع میں چلے گئے تھے چنانچہ صف میں ملنے سے پہلے ہی وہ تکبیر تحریمہ ادا کر کے رکوع میں چلے گئے ۔ اور آہستہ آہستہ چلتے چلتے صف میں مل گئے آپ نے

ارشاد فرمایا اللہ تعالیٰ تجھے نیکی کرنے پر اور حریص کرے پھر ایسا نہ کرنا۔

امام بیہقی لکھتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمر، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت ابوبکر، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ ابن الزبیر اور حضرت ابوہریرہ وغیرہ بڑی محنت و مشقت سے رکوع میں ملنے کی کوشش کرتے تھے۔ اسی بنا پر جمہور اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر کوئی شخص رکوع کی حالت میں امام کے ساتھ نماز میں شریک ہو جائے تو اگرچہ اس نے سورہ فاتحہ نہ پڑھی ہو اور نہ امام سے سنی ہو لیکن اس کی وہ رکعت اور نماز صحیح ہے۔ چنانچہ امام شافعی لکھتے ہیں کہ رکوع کی حالت میں جس نے امام کو پالیا اس کی وہ رکعت ہو گئی۔ (کتاب الام) شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔ کہ جو شخص امام کو رکوع میں پالے اس کی وہ رکعت سورۂ فاتحہ پڑھے بغیر جائز ہے (شرح مسلم و شرح المہذب) حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں کہ جمہور فقہاء کا اس بات پر کلی اتفاق ہے کہ جس شخص نے امام کو رکوع میں پالیا اور قرأت نہ کی ہو اس کی وہ رکعت اور نماز صحیح ہے۔ امام مالک امام شافعی، امام ابوحنیفہ، امام ثوری، امام اوزاعی، امام ابوثور، امام احمد بن حنبل اور امام اسحاق بن راہویہ کا یہی مسلک ہے اور صحابہ کرام میں حضرت علی حضرت ابن مسعود حضرت زید بن ثابت اور حضرت ابن عمر کا یہی مذہب ہے۔ اور ہم نے تمہید میں ان کی جملہ اسانید درج کردی ہیں۔ (اوجز المسالک) مولانا نواب صدیق حسن خان لکھتے ہیں کہ جمہور کا بھی یہی مسلک ہے کہ جس نے رکوع میں امام کو پالیا ہو اس کی وہ رکعت صحیح ہے (بدر دلالہ دلیل الطالب) مولانا شمس الحق عظیم آبادی لکھتے ہیں کہ قاضی شوکانی نے نیل الاوطار میں پہلے یہ لکھا تھا کہ مدرک رکوع کی وہ رکعت شمار نہ ہو گی۔ لیکن بعد کو جمہور کے مسلک کی طرف رجوع کیا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے فتاوی فتح الربانی میں اس کی تصریح کی ہے کہ امام کے ساتھ رکوع میں مل جانے والے کی رکعت بالکل صحیح ہے۔ بہرحال اس موضوع پر امام بخاری کو چھوڑ کر پوری امت کا اتفاق ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جیسے اسلام میں یہ حکم ہے۔ اسرائیلی شریعت میں بھی یہی حکم تھا کہ رکوع کو پالینا رکعت کو پالینا ہے۔ لیکن سجدہ کو پالینا امام کے ساتھ رکعت پالینا نہیں ہے۔ اس لیے یہاں نہیں بلکہ

موضوع پر آیت سے استشہاد

اصل موضوع تو دنیا کے سامنے اور اہل کتاب کے سامنے اور بالخصوص عیسائیوں کے

وفد نجران کے سامنے یہ بات تھی کہ اللہ کی محبت کی شرط محمد رسول اللہ کی اتباع اور آخرت میں نجات کا مدار محمد رسول اللہ کی طاعت ہے اس زندگی میں جب تک ایک شخص محمد رسول اللہ کا اتباع اور اپنی گردن میں آپ کی طاعت کا قلادہ نہ ڈلے گا نہ وہ دعوئ محبت میں سچا ہے اور نہ اس کی نجات ممکن ہے۔ اہل کتاب کی آپ کی صداقت و دیانت میں کوئی کلام نہ تھا۔ ان کو اس میں بھی کوئی اختلاف نہ تھا کہ آپ آل ابراہیم سے تعلق رکھتے ہیں ان کو ایمان لانے میں صرف یہ عذر تھا کہ آپ کا تعلق بنی اسماعیل سے ہے اور دستور و رواج اور ہماری قومی روایات یہ ہیں کہ انبیاء بنی اسرائیل میں سے آتے رہے ہیں۔ یہ واقعہ پیش کر کے قرآن نے ان کے اس عذر لنگ کو رسوا کیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر مریم سے عورت ہونے کے باوجود ملائکہ سے ہم کلامی اور اس کی شان اصطفائی کو اپنی روایات ملنتے ہو تو محمد رسول اللہ سے جبریل کی ہمکلامی اور رسالت کے لیے ان کی شان اصطفائی کا کیوں انکار کرتے ہو۔ اگر صرف یہی بہانہ ہے کہ یہ ہماری قومی روایات کے خلاف ہے تو پھر مریم کی بزرگی اور برگزیدگی کا بھی انکار کرو کیونکہ اس کے لیے بھی تمہاری قومی روایات میں کوئی نظیر نہیں ہے۔ اگر ان واقعات کو رواج کے خلاف ہونے کے باوجود مانتے ہو تو محمد رسول اللہ کی رسالت کو بھی مانو۔ اب یہی حق ہے اور اس سے باہر جو کچھ ہے وہ سراپا حق نہیں اس میں باطل کی ملاوٹ ہے۔ اللہ کی محبوبیت کا مقام ان کی اتباع اور نجات کا دار مدار ان کی طاعت پر ہے۔ یہ ان تمام صداقتوں کی تصدیق کرتی ہے جو مختلف قوموں، مختلف وقتوں اور مختلف ملکوں میں اللہ کے پیغمبر کے ذریعے آتی رہی ہیں۔

اثباتِ رسالت کی ایک اور دلیل

۸۸۔ اے پیغمبر یہ غیب کی خبروں میں سے ہے جو ہم تمہیں بذریعہ وحی بتا رہے ہیں۔ یعنی ظاہری حیثیت سے آپ کچھ پڑھے لکھے نہیں۔ پہلے سے اہل کتاب کی کوئی معتد بہ صحبت نہیں رہی جن سے واقعات ماضیہ کی ایسی تحقیقی معلومات ہو سکیں اور صحبت ہوتی بھی تو کیا فائدہ لوگ خود ہی اوہام و خرافات کے اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں کسی نے عداوت میں اور کسی نے حد سے زیادہ محبت میں صحیح واقعات کو مسخ کر رکھا تھا۔ پھر اندھے کی آنکھ سے روشنی حاصل ہونے کی کیا توقع؟

اندریں حالات مدنی اور مکی دونوں سورتوں میں ان واقعات کی ایسی صحت اور بسط وتفصیل سے سنانا جو بڑے بڑے مدعیان علم کی آنکھوں کو چکا چوند کردیں اور کسی کو یارائے انکار نہ رہے اس کی کھلی دلیل ہے کہ آپ کو یہ علم بذریعہ وحی دیا گیا ہے کیونکہ آپ نے بچشم خود نہ ان حالات کو دیکھا اور نہ علم حاصل کرنے کا کوئی خارجی ذریعہ آپ کے پاس موجود تھا۔ لہ

مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر یہ واقعات وہ ہیں جو آپ سے کئی سو سال پہلے ایک دوسرے ملک میں پیش آئے اور اب دنیا سے ان کی صحیح تاریخ تک ناپید ہو چکی ہے اور ان کے علم کا ذریعہ بھی کوئی نہیں۔ آپ کا وحی الٰہی کے ذریعے ان واقعات کو بالکل ٹھیک ٹھیک بتانا آپ کی صداقت کی دلیل ہے۔ اگر وحی الٰہی کا فیضان نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ان واقعات پر آپ مطلع ہوتے یہ ظاہر ہے کہ یہ واقعات آپ سے سینکڑوں سال پہلے کے ہیں اور دنیا میں گذشتہ واقعات کے علم وسماعت کے جتنے وسائل ہو سکتے ہیں ان میں سے کوئی وسیلہ بھی تمہارے پاس موجود نہیں ہے اس کے باوجود اگر آپ یہ باتیں بتا رہے ہیں تو بجز وحی الٰہی کے اور ذریعہ کیا ہے اور یہی آپ کے رسول ہونے کی واضح دلیل ہے۔

صداقت نبوت کی اس دلیل کو سمجھنے کے لیے آپ یہ بات ذہن میں رکھیں کہ انسانی طبیعت کی عاجزی اور بے چارگی کا سب سے بڑا دردناک منظر مستقبل سے ناواقفیت ہے انسانی کی بے چین طبیعت مستقبل کے بحر ظلمات میں ہاتھ پاؤں مارتی ہے اور بھٹک کر اپنی نادانی کا اعتراف کر لیتی ہے اسی لیے وہ اس بات پر مجبور ہے کہ جو انسانیت سے مافوق کسی دعویٰ کا مدعی ہو۔ اس کی آزمائش اور امتحان کے لیے اسی بحر بیکراں کی شناوری کو معیار اور سند قرار دے دے چنانچہ اخبار غیب ہی نبوت ورسالت کے ثبوت پر نوع انسانی کے عام افراد کے نزدیک نبی کی صداقت کی ایک دلیل اور حجت قائمہ ہے۔

بنی اسرائیل کے نزدیک یہ وصف نبوت کا اس درجہ لازمہ تھا کہ ان کی زبان میں پیغمبر کا نام ہی پیش گو تھا۔ عربی، عبرانی اور دوسری سامی زبانوں میں (نبی، بیا، نابی، جو پیغمبر کے معنے میں مستعمل ہے اس کے لغوی معنے مخبر اور پیشین گو کے ہیں اور نبوت کے معنے مخبری اور پیشین گوئی کے ہیں۔ اور اسی لیے بنی اسرائیل کے نزدیک نبی اور پیغمبر کی صرف اسی قدر حقیقت ہے کہ وہ غیب کا قاصد ہے اور جہان نادیدہ کا مخبر ہے۔

لہ افادات شیخ الاسلام

چونکہ یہ بات آل عمران کے مخاطبوں یعنی یہودیوں اور عیسائیوں کے مسلمات میں سے تھی اس لیے یہاں قرآن نے اسی کو آپ کی نبوت کی صداقت کی دلیل بنا کر پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اگر نبی کی حقیقت یہی ہے جو تم کہتے ہو تو سوچو کہ محمد رسول اللہ کے پاس ان واقعات کے جاننے کا وحی کے علاوہ کون سا ذریعہ ہے؟ اگر وحی کے ذریعے یہ غیب کی خبریں بتا رہے ہیں تو پھر اللہ کا رسول کیوں نہیں مانتے ہو۔

کفالتِ مریم کے لیے قلم اندازی

۸۹۔ تم ان لوگوں کے پاس موجود نہ تھے جب وہ کفالت مریم کی خاطر قلم اندازیاں کر رہے تھے اور نہ تم اس وقت تھے جب وہ باہم جھگڑ رہے تھے یعنی جب حضرت مریم نذر میں قبول کر لی گئیں تو مسجد کے مجاورین میں جھگڑا ہوا کہ نہیں کس کی نگرانی میں رکھا جائے آخر قرعہ اندازی کی نوبت آئی۔ سب نے اپنے قلم جن سے تورات لکھتے تھے چلتے پانی میں چھوڑ دیے کہ جس کا قلم پانی کے بہاؤ پر نہ بہے بلکہ الٹا پھر جائے اسی کو حقدار سمجھیں، اس میں بھی قرعہ حضرت زکریا کے نام نکلا اور حق حقدار کو پہنچ گیا۔ [1]

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ قرعہ اندازی کا یہ طریقہ صرف حضرت مریم کے لیے ہی اختیار کیا گیا یا دوسرے زیر تربیت خدام کے لیے بھی یہی طریقہ رائج تھا۔ دونوں باتوں کا احتمال ہے اس بات کا بھی کہ تمام نو دارد خدام کی کفالت کا فیصلہ اسی طریقہ سے ہوتا ہے اور اس کا بھی کہ حضرت مریم کی کفالت کا فیصلہ اس طرح کیا گیا ہو۔ وہاں ہیکل میں خدام کے فرائض کی تقسیم کے لیے قرعہ کا طریقہ رائج تھا۔ لوقا میں ذکر ہے کہ جس روز حضرت زکریا کو بیٹے کی بشارت ملی ہے۔ اس روز جس خدمت پر وہ مامور تھے اس کا فیصلہ قرعہ ہی کے ذریعے ہوا تھا۔ [2]

قرآن کا انداز بیان یہی کہہ رہا ہے کہ قرعہ کا یہ اہتمام خاص طور پر حضرت مریم کے لیے کیا گیا تھا اگر ہر خادم کے لیے یہ رواج ہوتا تو قرآن اس کے ذکر کے لیے یہ خصوصی اہتمام نہ فرماتا۔

حضرت مریم کے لیے قرعہ اندازی کی ضرورت اس لیے پیش آئی تھی کہ حضرت مریم کی والدہ نے ان کو خدا کے کام کے لیے ہیکل کی نذر کر دیا تھا اور وہ چونکہ لڑکی تھیں اس لیے یہ ایک

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

نازک مسئلہ بن گیا تھا کہ ہیکل کے مجاوروں میں سے کس کی سرپرستی میں وہ رہیں۔[1]
ہیکل سلیمانی کی نگہداشت کے لیے خادموں کی ایک بڑی جماعت رہتی تھی جیسے بڑی مسجدوں کی جاروب کشوں، فراشوں، دربانوں، مؤذنوں وغیرہ کا پورا عملہ ہوتا ہے۔ حضرت مریم کے والد عمران اپنے زمانہ میں ان خادمانِ حرم کے سردار تھے۔ ان کی وفات پر سوال یہ پیدا ہوا کہ اب مریم کا سرپرست کون ہو، رشتہ ان خادموں میں سب سے قریب حضرت زکریا کا تھا۔ کہ آپ مریم کے خالو تھے۔ طے یہ پایا کہ سوال کا حال فال کے ذریعے کے ذریعہ سے کیا جائے۔ فال کا طریقہ یہ رائج تھا کہ تیے کے قلم جو تورات لکھنے کے ہوتے تھے۔ ان پر تورات ہی کے کچھ کلمات لکھ کر انہیں دریائے یردن میں ڈال دیا جاتا۔ قلم عموماً دریا کے رُخ ہی پر بہتے لیکن کچھ قلم مخالفِ رُخ کو بہتے اور یہی مخالف بہاؤ کامیابی کی علامت سمجھی جاتی۔ جیت ایسے ہی قلم کے مالک کی ہوتی۔ یہی صورت بیان ہوئی اور قرعہ حضرت زکریا کے نام نکلا۔[2]

قرعہ کے ذریعے مہمات کا حل:

امام بخاری نے اس آیت کو بنیاد بنا کر اپنی صحیح میں القرعۃ فی المشکلات کا عنوان قائم کیا ہے اور حافظ ابن القیم نے اس موضوع پر الطرق الحکمیہ میں تفصیلی بحث کی ہے اس موضوع پر سیر حاصل بحث تو انشاءاللہ پارہ ۶ میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنی بات گوش گزار فرما لیجیئے۔

احناف کے نزدیک قرعہ کا حکم یہ ہے کہ جن حقوق کے اسباب شریعت میں معلوم ہوں۔ ان میں قرعہ ناجائز اور داخل قمار ہے۔ مثلاً شے مشترک میں جس کا نام نکل آئے وہ سب کے لے یا جس بچے کے نسب میں اس میں جس کا نام نکل آئے وہی باپ سمجھا جاوے اور جن حقوق کے اسباب رائے کے سپرد ہوں ان میں قرعہ جائز ہے مثلاً مشترک مکان کی تقسیم میں قرعہ سے زید کو شرقی حصہ دینا اور عمر کو غربی۔ یہ اس لیے جائز ہے کہ بلا قرعہ بھی ایسا کرنا شرکاء کے اتفاق سے یا قضائے قاضی جائز ہے۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن۔ [2] ماجری۔

إِذْ قَالَتِ الْمَلَآئِكَةُ يَا مَرْيَمُ إِنَّ اللَّهَ يُبَشِّرُكِ بِكَلِمَةٍ مِّنْهُ
اسْمُهُ الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ وَجِيهًا فِي الدُّنْيَا وَ
الْآخِرَةِ وَمِنَ الْمُقَرَّبِينَ ۝ وَيُكَلِّمُ النَّاسَ فِي الْمَهْدِ
وَكَهْلًا وَمِنَ الصَّالِحِينَ ۝ قَالَتْ رَبِّ أَنَّى يَكُونُ لِي
وَلَدٌ وَلَمْ يَمْسَسْنِي بَشَرٌ قَالَ كَذَٰلِكِ اللَّهُ يَخْلُقُ مَا يَشَاءُ
إِذَا قَضَىٰ أَمْرًا فَإِنَّمَا يَقُولُ لَهُ كُن فَيَكُونُ ۝ وَيُعَلِّمُهُ
الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرَاةَ وَالْإِنجِيلَ ۝

جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے۔ اپنی جانب سے ایک کلمہ کی [91] اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم [91] ہوگا۔ وہ دنیا و آخرت میں ارجمند [92] ہوگا اور اللہ کے مقرب بندوں میں شمار ہوگا [93]۔ اور لوگوں سے بچپنے میں اور بڑی عمر میں یکساں طور پر کلام کرے گا اور اللہ کے بندوں میں ایک مرد صالح ہو [94] گا۔ کہا مریم نے خدایا یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو مجھے تو کسی مرد نے کبھی چھویا تک نہیں۔ ارشاد الٰہی ہوا۔

اسی طرح اللہ جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ وہ جب فیصلہ کرتا ہے کسی کام کا تو حکم دے دیتا ہے کہ ہو جا، اور جیسا کچھ اس نے چاہا تھا ویسا ہی ظہور میں آجاتا ہے[۹۵]۔ اور اسے مریم اللہ اس کو کتاب و حکمت کا علم عطا فرمائے گا نیز تورات اور انجیل کا[۹۶]۔

حضرت مریم کو حضرت عیسیٰ کی بشارت:

سورت کا اصل موضوع اولاً اثبات الوہیت خدائے ذوالجلال، ثانیاً اثبات رسالت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے۔ اثبات رسالت کے سلسلے میں بنی اسرائیل کی تاریخ سے چند واقعات ایسے پیش کیے جو ان کے یہاں ان کی روایات کے خلاف ظہور میں آئے اور اس کے باوجود وہ مانتے ہیں۔ اسی سلسلے میں حضرت مریم کی والدہ کی نذر، حضرت مریم کی ہیکل کی خدمت کے لیے قبولیت، حضرت مریم کو غیر معمولی رزق ملنا۔ حضرت زکریا کو غیر معمولی حالات میں اولاد ملنا، حضرت مریم سے ملائکہ کا ملنا، حضرت مریم کی مقبولیت اور برگزیدگی بیان ہوئی ہے اور اس طرح یہ ایک طرف اثباتِ رسالت کی دلیل ہے۔ اور دوسری طرف حضرت عیسیٰ کے ذکر کی تقریب و تمہید ہے۔ چونکہ اصل مخاطب وفد نجران ہے اس لیے حضرت عیسیٰ کے ذکر سے عیسائیوں پر ان کے اس عقیدے کی غلطی واضح کرنا ہے کہ وہ مسیح علیہ السلام کو خدا یا خدا کا بیٹا اور الٰہ سمجھتے ہیں۔ ان کی معجزانہ ولادت بیان کر کے ایک طرف عیسائیوں کو یہ سمجھایا جا رہا ہے کہ اگر ان کی ولادت کو باوجود اپنی قومی روایات کے خلاف ہونے کے مانتے ہو تو محمد رسول اللہ کی رسالت کو کیوں نہیں مانتے اور دوسری طرف یہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر حضرت یحییٰ کو ان کی اعجازی ولادت نے الٰہ نہیں بنایا تو مسیح محض اپنی غیر معمولی پیدائش کے بل پر الٰہ کیسے ہو سکتے ہیں یہ قرآن کی شان بلاغت ہے کہ وہ غلط کار لوگوں کی غلط کاری کی تردید کرتے ہوئے ارباب کمال کے کسی کمال اور ان کی عظمت کا انکار نہیں کرتا ہے۔ وہ اپنے دیے ہوئے کمالات کو بیان

کرتا ہے۔ مگر اس غلط اندیشی پر گرفت کرتا ہے کہ صاحب کمال الٰہ ہوتا ہے وہ بتاتا ہے کہ الٰہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ صاحب کمال ہی نہیں بلکہ خالق کمال ہو اور ظاہر ہے کہ اس کائنات ہستی میں جو کمال جہاں بھی ہے وہ اس کا ذاتی نہیں بلکہ اللہ سبحانہ، کا فیضان ہے۔ اس لیے الٰہ صرف اللہ کی ذات ہے۔

۹۰ ۔ جب فرشتوں نے کہا اے مریم اللہ تجھ کو بشارت دیتا ہے اپنی جانب سے ایک کلمہ کی حضرت مسیح علیہ السلام کو یہاں اور قرآن و حدیث میں کئی جگہ کلمۃ اللہ فرمایا ہے۔ یوں اللہ کے کلمات بے شمار ہیں جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے۔

قل لو کان البحر مدادا لکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی

کہہ دو کہ اگر سمندر روشنائی بن جائے میرے رب کے کلمات کے لیے تو میرے رب کے کلمات ختم ہونے سے پہلے سمندر ختم ہو جائیں گے۔

قرآن میں کلمۃ اللہ کا مفہوم :

لیکن حضرت مسیح کو کلمۃ اللہ کا حکم) کہنا اس حیثیت سے ہے کہ ان کی پیدائش باپ کے توسط کے بغیر عالم سلسلہ اسباب کے خلاف محض اللہ کے حکم سے ہوئی اور جو فعل اسباب عادیہ کے سلسلہ سے خارج ہو۔ عموماً اس کی نسبت براہ راست حق تعالےٰ کی طرف کر دی جاتی ہے جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں فرمایا ہے

وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمٰی[1]

حضرت عیسیٰ کے کلمۃ اللہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بغیر باپ کے عادت الٰہی کے خلاف اللہ کے حکم سے پیدا ہوئے۔ عیسائیوں کو ابتداً مسیح علیہ السلام کی پیدائش بے پدر کا بھی راز کلمۃ اللہ کہہ کر بتایا گیا تھا۔ مگر انہوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہو کر لفظ کلمہ کو کلام کا ہم معنی سمجھ لیا۔ پھر کلام سے اللہ کی ذاتی صفت کلام مراد لے لی۔ پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اللہ کی اس ذاتی صفت نے مریم کے پیٹ میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کی جو مسیح علیہ السلام کی شکل میں ظاہر ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کی الوہیت کا عقیدہ فاسدہ پیدا ہوا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی فرماتے ہیں۔ تمام لغت عرب میں کہیں کلمہ بمعنے ذات خدا یا اقنوم علم مستعمل نہیں ہے۔ اور قرآن میں جہاں کہیں لفظ کلمہ یا کلمات اللہ کی طرف مضاف ہوکر آیا ہے جیسے کلمۃ اللہ، کلمۃ ربک، کلمات ربہا، کلمتنا، اور کلماتہ سب جگہ معنے کلام خدا یا حکم خدا کے ہیں۔ مثلاً سورۂ توبہ میں ہے کلمۃ اللہ ھی العلیا انعام میں ہے تمت کلمۃ ربك صدقا وعدلاً سورہ صافات میں ہے ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین۔ یعنی پہلے ہوچکا ہے ہمارا حکم اپنے بندوں رسولوں کے حق میں۔ الغرض قرآن کے کے متعدد مقامات پر یہ لفظ بصورت واحد وجمع استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ خدا کے حکم اور احکام کے معنے میں آیا ہے۔ حاصل کلام یہ ہے کہ لفظ کلمہ یا کلمات جب بھی مضاف ہوں اور اضافت اللہ سبحانہ، کی طرف ہو تو تمام قرآن میں کہیں بمعنے ذات خدا یا اقنوم علم استعمال نہیں ہوا۔ حضرت مسیح پر کلمۃ اللہ کا اطلاق صرف اس لیے ہوا ہے کہ حضرت مسیح کی ولادت بغیر باپ کے خلاف عادت الہٰی صرف اللہ تعالیٰ کے امر یعنی کلمہ کُن سے ہوئی ہے۔ یہ ان کو ایک نوع کا اختصاص تھا۔ اور یہودی چونکہ اس میں شبہ کرتے تھے اس لیے خاص طور پر اللہ تعالے نے حضرت مسیح پر کلمۃ اللہ کا اطلاق فرمایا۔ ورنہ ساری مخلوق اللہ ہی کے کلمہ کُن سے پیدا ہوئی ہے اور یہ عربی محاورات میں شائع تھا جیسے مخلوق پر خلق، مقدور پر قدرت اور مرجو پر رجا اور مشتہی پر شہوت کا اطلاق ہوتا ہے۔

عہد عتیق اور جدید کی کتابوں میں بھی بکثرت کلمۃ اللہ اور کلمۃ الرب بمعنی کلام خدا یا حکم خدا آیا ہے۔

زبور ۳۳ - ۶ میں ہے۔

خداوند کے کلام سے آسمان بنے اور ان کے سارے لشکر اس کے منہ کے دم سے۔

اخبار الایام کی پہلی کتاب باب ۱۷ میں ہے۔

اور اسی رات ایسا ہوا کہ خدا کا کلام ناتن کو پہنچا۔

کتاب یوشع کے باب اول میں ہے

خداوند کا کلام بیری کے بیٹے ہوسیع کے پاس پہنچا۔

خداوند کا کلام شروع جو ہوسیع کے وسیلہ سے آیا ہے۔

لوقا کی انجیل میں ہے۔

خدا کا کلام بیابان میں زکریا کے بیٹے یحییٰ کو پہنچا۔
اعمال کے چوتھے باب ۳۱ میں ہے۔
خدا کی بات دلیری سے کہنے لگے۔
اعمال ہی کے چھٹے باب میں ہے۔
تب ان بارہ رسولوں نے سب مریدوں کو بلا کر کہا مناسب نہیں کہ ہم خدا کی بات کو چھوڑ کر غیر کی خدمت کریں۔
اعمال ۱۲۰۔ ۲۴ میں ہے۔
خدا کا کلام پھیل کر بڑھ گیا۔
اعمال ۱۳ میں ہے۔
اور سلامی شہر میں پہنچ کر یہودیوں کی عبادت گاہوں میں خدا کے کلام کا وعظ کہنے لگے چاہا خدا کا کلام سے۔ سبت کے دن کے قریب سارے شہر کی آبادی باہر آئی تا کہ خدا کا کلام سنیں۔
یوحنا باب ۲ اور آیت ۱۴ میں ہے۔
اے جوانو میں نے تمہیں لکھا ہے کہ تم دلیر ہو اور خدا کی بات تم میں رہتی ہے۔
الغرض اور مقامات پر بھی اور ان سب جگہوں میں کلمۃ اللہ بمعنے کلام خدا استعمال ہوا ہے[1]

حضرت عیسیٰ کو مسیح کہنے کی وجہ

۹۱۔ اس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ مسیح اصل عبرانی میں رامشیح، یا مشیحا، ہے جس کے معنے مبارک ہیں، عربی میں آکر مسیح بن گیا۔ باقی دجال کو جو مسیح کہا جاتا ہے وہ بالاجماع عربی ہے جس کی وجہ تسمیہ اپنے موقع پر کئی طرح بیان کی گئی ہے۔ مسیح کا دوسرا لقب عیسیٰ ہے یہ اصل عبرانی میں ایشوع ہے عربی میں آکر عیسیٰ بنا، اس کے معنے سید کے ہیں[2]
مسیح حضرت عیسیٰ کا لقب ہے۔ لقب کے لیے قاعدہ یہ ہے کہ نام سے پہلے اس کو لاتے

[1] ازالۃ الشکوک [2] افادات شیخ الاسلام

ہیں بنی اسرائیل میں یہ روایت رہی ہے کہ ان کے ہاں جو نبی ہونے والا ہوتا اس کے سر پر اس کا پیشرو نبی ایک قسم کا مقدس تیل ملتا اور اس کو اپنا جانشین بناتا۔ جب نبوت کے ساتھ ساتھ بادشاہت کا سلسلہ شروع ہوا تو مسح کرنے کی یہی روایت بادشاہوں کے لیے بھی اختیار کی گئی جو وقت کا نبی ہوتا وہ ہونے والے بادشاہ کے سر پر مقدس تیل ملتا جس سے واضح ہو جاتا کہ یہ مستقبل کا بادشاہ بھی ہے اور خدا کا برگزیدہ بھی۔ حضرت مسیح کے بارے میں انجیلوں سے یہ تو ثابت ہے کہ حضرت یحییٰ نے ان کو بپتسمہ دیا لیکن تیل ملنے کا کوئی ذکر نہیں ہے ممکن ہے کہ اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ بپیدائشی مسیح تھے۔ بخاری شریف ان کا جو حلیہ بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے سر کا حال یہ تھا کہ گویا اس سے تیل ٹپک رہا ہے ممکن ہے کہ ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے ان کو مسیح کا لقب عنایت ہوا ہو۔ انجیل میں ان کے لیے خدا کا مسیح کے الفاظ بھی استعمال ہوئے ہیں[1] لیکن سیّد رشید رضا فرماتے ہیں کہ یہاں لفظ مسیح حضرت عیسیٰ کے لیے بطور عالم بولا گیا ہے، بطور لقب نہیں اور علم کے لیے یہ ضروری نہیں کہ مسمی ان معنے سے بھی موطوف ہو جو اس میں موجود ہوئی اگر آپ کسی کا نام علی رکھتے ہیں تو اس کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس میں بلندی اور برتری بھی موجود ہو۔

ابنِ مریم کہنے کا نکتہ

یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ قرآن حکیم نے اس موقعہ پر ابن مریم کو حضرت مسیح کے لیے بطور جزو علم کے استعمال کیا ہے۔ خود حضرت مریم سے بشارت کے موقعہ پر یہ کہنا کہ تمھیں کلمۃ اللہ کی بشارت دی جاتی ہے جس کا نام مسیح عیسیٰ ابن مریم ہوگا۔ حضرت عیسیٰ کا پتہ بتانا مقصود نہ تھا بلکہ اس پر متنبہ کرتا تھا کہ باپ نہ ہونے کی وجہ سے اس کی نسبت صرف ماں ہی طرف ہوا کرے گی حتیٰ کہ پوری انسانیت کو خدا کی یہ آیت ہمیشہ یاد دلاتے اور حضرت مریم کی بزرگی جتانے کے لیے گویا نام کا جزو بنا دی گئی ہے[2]۔ اور ساتھ ہی ابن مریم کہہ کر قرآن نے ان لوگوں کے لیے گفتگو کی ہر گنجائش ختم کر دی ہے جو کمزور تاویلات کے ذریعے قرآن کی نہایت واضح نصوص کی تحریف کرنا چاہتے ہیں۔ اگر عیسیٰ کسی باپ کے بیٹے تھے تو آخر قرآن کو مسیح

[1] تدبر قرآن　[2] افادات شیخ الاسلام

بن مریم کہنے کے بجائے ان کے باپ کی طرف ان کی نسبت کرتے ہیں کیا رکاوٹ تھی قرآن بھی مسیح بن یوسف کہہ سکتا تھا لیکن ایسا اگر نہیں کیا تو کیوں نہیں کیا [1]

دنیا و آخرت میں حضرت مسیح کی وجاہت:

۹۲۔ وہ دنیا و آخرت میں ارجمند ہوگا۔ ممکن تھا کہ حضرت مریم کو بشارت سن کر تشویش ہو کہ دنیا کس طرح باور کرے گی کہ تنہا عورت سے لڑکا پیدا ہو جائے یقیناً وہ تہمت لگائیں گے اور بچہ کو ہمیشہ برے لقب سے مشہور کر کے ایذا پہنچائیں گے میں کس طرح برائت کروں گی اس لیے وجیھاً فی الدنیا والاخرۃ کہہ کر اطمینان کر دیا کہ خدا اس کو نہ صرف آخرت میں بلکہ دنیا میں بھی بڑی عزت و وجاہت عطا کرے گا اور دشمنوں کے سارے الزامات جھوٹے ثابت کرے گا وجیہ کا لفظ ایسا سمجھو جیسے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا و کان عند اللہ وجیھا گویا جو لوگ وجیہ کہلاتے ہیں ان کو حق تعالےٰ خصوصی طور پر جھوٹے طعن و تشنیع یا الزامات سے بری کرتا ہے۔ حضرت مسیح کے نسب پر جو خبیث باطن طعن کریں گے خدا کو یا انسان کو جھوٹ موٹ ان کا باپ بتائیں گے، یا خلاف واقع ان کو مصلوب و مقتول یا بحالت زندگی مردہ کہیں گے، یا الوہیت وابنیت وغیرہ کے باطل عقائد کی مشرکانہ تعلیم ان کی طرف منسوب کریں گے۔ اس طرح کے تمام الزامات سے حق تعالےٰ دنیا و آخرت میں علانیہ بری ظاہر کر کے ان کی وجاہت و نزاہت کا علی رؤس الاشہاد اعلان فرمائیں گے۔ جو وجاہت ان کو ولادت و بعثت کے بعد دنیا میں حاصل ہوئی اس کی پوری تکمیل نزول کے بعد ہوگی۔ جیسا کہ اہل اسلام کا عقیدہ ہے پھر آخرت میں خصوصیت کے ساتھ ان سے أ انت قلت للناس اتخذونی وامی الھین من کا سوال کر کے اور انعامات خصوصی یاد دلا کر تمام اولین و آخرین کے روبرو وجاہت و کرامت کا اظہار ہوگا جیسا کہ سورہ مائدہ میں مذکور ہے [2]

علماء نے حضرت مسیح علیہ السلام کی اس وجاہت کا جسے قرآن نے پیش کیا ہے۔ اپنے اپنے ذوق کے مطابق مطالعہ کیا ہے اور اسے اپنے انداز میں پیش کیا۔ مثلاً یہ کہ وجاہت کا ظہور پہلی بار اس طرح ہوا کہ پیدا ہونے کے بعد شیر خوارگی کے زمانے میں آپ نے کلام کیا اور کہا

---

[1] تدبر قرآن [2] افادات شیخ الاسلام

گ ہیں اور لوگ سمجھ گئے کہ یہ مولود مسعود نہایت انی عبد اللہ اس کلام کو سنتے ہی بدگمانیاں دور ہوگئیں اور لوگ سمجھ گئے کہ یہ مولود مسعود نہایت مبارک ہے۔ محض خدا کے حکم سے بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ دوسری بار وجاہت اس وقت ظاہر ہوئی کہ جب دشمنوں نے پکڑتے اور قتل کا ارادہ کیا کہ اللہ تعالیٰ نے زندہ اور صحیح وسالم آسمان پر اٹھا لیا۔ باقی وجاہت کی پوری پوری تکمیل نزول من السماء کے بعد ہوگی[1]

اس وجاہت کا پہلو یہ بھی ہے کہ باوجودیکہ سیدنا مسیح بن باپ کے پیدا ہوئے اور بن باپ کے پیدا ہونے والے کسی بچہ کے لیے عام حالات میں کسی عزت و وجاہت کا تصور بھی نہیں ہوسکتا۔ لیکن سیدنا مسیح علیہ السلام چونکہ اللہ تعالیٰ کے کلمہ کُن سے پیدا ہوئے تھے اس وجہ سے اس کا معجزانہ اثر یہ ہوا کہ روز اول سے ان کو خلق کی نگاہوں میں وہ وجاہت حاصل ہوا جو اس عہد میں کسی کو حاصل نہ تھی۔ لوقا کی انجیل سے معلوم ہوتا ہے کہ ۱۲ سال کی عمر میں حضرت مسیح نے پہلی بار ہیکل میں تعلیم دی لیکن اس کم سنی کے باوجود ان کی تعلیم کی حکمت و معرفت کلام کی بلاغت و جزالت اور لب و لہجہ کی عظمت و جلالت کا عالم یہ تھا کہ فقیہ اور فریسی، سردار کاہن اور ہیکل کا تمام عملہ دم بخود رہ گیا۔ وہ حیرانی میں ایک دوسرے سے پوچھتے کہ یہ کون ہے معلوم ہوتا ہے۔ کہ آسمان سے اس کو اختیار ملا ہے۔ یہودیہ کی بستیوں میں جب انہوں نے دعوت کا کام شروع کیا تو ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہلچل مچ گئی۔ لوگ ان پر ہجوم در ہجوم پڑنے لگے۔ فقیہ اور فریسی سب ششدر رہ گئے۔ تھوڑے دنوں میں ان کی وجاہت کا یہ عالم تھا کہ عوام ان کو اسرائیل کا بادشاہ کہنے اور ان کی بادشاہی کا گیت گانے لگے[1]

قرآن نے وجاہت کا اعلان کر کے یہود کی تردید کی ہے کہ تم جس کے حق میں ہر قسم کی توہین و افتراء رکھتے ہو۔ وہ صاحب عزت و اکرام ہیں۔ یہود کی قدیم کتابوں میں حضرت مسیح کی توہین و تحقیر کی کوئی کمی نہیں ہے۔ یہ قرآن ہی کی برکت ہے کہ اس کے نزول کے بعد سے رفتہ رفتہ اب یہود کے لب و لہجہ کی تلخی نرمی میں تبدیل ہو رہی ہے اور تالمود کے الزام دہراتے ہوئے یہود کو شرم آنے لگی ہے۔ آخرت کی وجاہت تو خیر جب ہوگی مگر دنیا کا اعزاز اس سے ظاہر ہے کہ روئے زمین کے ۴۰-۵۰ کروڑ مسلمان آج ان کو اللہ کا پیغمبر برحق مان رہے ہیں۔ ان کا نام بغیر علیہ السلام کے نہیں لیتے ہیں اور کروڑوں کی تعداد عیسائی گو احمقانہ

[1] معارف م ا۱۵ تدبر قرآن

عقیدت ہی کے ساتھ سہی لیکن بہرحال کرتے تو تعظیم و تکریم ہی ہیں۔ یہود کی ایک اقلیت جو ان پر زبان طعن دراز کرتی ہے۔ لیکن ان کو بھی حضرت مسیح کے عہد مبارک میں جسارت نہ ہو سکی اگر جرائت کی بھی تو بعد کے زمانوں میں۔

بہرحال حضرت مسیح کی وجاہت کی بشارت حضرت مریم کو ان کی ولادت کی بشارت کے ساتھ اس لیے دی گئی ہے کہ ان کو اس پہلو سے کوئی مغلجان نہ ہو کہ بن باپ کے پیدا ہونے کے سبب سے بچے کی یا ان کی وجاہت پر کوئی حرف آئے گا۔

مقام قرب الٰہی اور حضرت مسیح؛

۹۳۔ اور ان کا شمار اللہ کے مقرب بندوں میں سے ہوگا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے خاص مقربین میں ان کا شمار ہوگا[1] مطلب یہ ہے کہ بارگاہ ایزدی کے ان مقربین میں ان کا شمار ہوگا۔ جو قرب ذاتی اور صفاتی سے متصف ہوں گے اور تجلیات ربانیہ کے مورد اور مظہر ہوں گے[2]

قرآن عزیز کا یہ کمال اعجاز ہے کہ ایک ایک لفظ سے پورا پورا مضمون ادا ہو جاتا ہے یہاں اس لفظ سے ایک طرف تو آپ کا اصل مقام بتادیا۔ یعنی تقرب الٰہی دوسری طرف یہودیت کے رد میں آپ کی شہادت دے دی۔ تیسری مقرب کی جمع لاکر یہ ظاہر کر دیا کہ اس مقبولیت میں وہ منفرد نہیں ہیں۔ دوسرے بندے بھی ان کے ساتھ شریک ہیں اور مسیح با ایں عظمت و جلال بہرحال عبدیت سے مافوق مرتبہ نہیں رکھتے۔[3]

حضرت عیسیٰ کا بچپنے میں اور بڑے ہو کر یکساں کلام

۹۴۔ اور لوگوں سے بچپنے میں اور بڑی عمر میں یکساں طور پر کلام کرے گا اور اللہ کے بندوں میں ایک مرد صالح ہوگا۔ یعنی نہایت شائستہ اور اعلیٰ درجہ کے نیک ہوں گے اول ماں کی گود میں پھر بڑے ہو کر عجیب و غریب باتیں کریں گے۔ ان الفاظ سے فی الحقیقت حضرت مریم کی پوری تسکین کر دی گئی۔ گزشتہ بشارات سے ممکن تھا یہ خیال کرتیں کہ وجاہت تو جب حاصل ہوگی مگر یہاں تو ولادت کے بعد ہی طعن و تشنیع کا ہدف بننا پڑے گا۔ اس وقت براۃ کی صورت

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف م ا [3] ماجدی

کیا ہوگی؟ اس کا جواب دے دیا کہ گھبراؤ نہیں تم کو زبان ہلانے کی ضرورت نہ پیش آئے گی بلکہ تم کہہ دینا کہ میں نے روزہ رکھ لیا ہے بات نہیں کر سکتی ہوں، بچہ خود ہی جواب دہی کرے گا جیسا کہ سورہ مریم میں پوری تفصیل آئے گی۔

آیت میں تحریف معنوی:

بعض محرفین کہتے ہیں کہ یکلم الناس فی المھد وکھلا سے حضرت مریم کو یہ تسلی دینی تھی کہ بچہ گونگا نہ ہوگا۔ تمام لڑکوں کی طرح بچپن اور کہولت میں باتیں کرے گا۔ لیکن عجیب بات ہے کہ میدان حشر میں بھی لوگ حضرت عیسیٰ کو یوں خطاب کریں گے یا عیسیٰ انت رسول اللہ وکلمة القاھا الی مریم وروح منه وکلمت الناس فی المھد صبیا اور مزہ یہ ہے کہ خود حق تعالیٰ بھی قیامت کے دن فرمائیں گے۔ اذکر نعمتی علیك وعلی والدتك اذ ایدتك بروح القدس تکلم الناس فی المھد وکھلا۔

کیا روز قیامت بھی اس خاص نشان کا بیان فرمانا اسی لیے ہے کہ مریم کو تسلی ہو جائے کہ بچہ گونگا نہیں عام لڑکوں کی طرح بولنے والا ہے۔[1]

گہوارے میں بات کرنا یقیناً حضرت عیسیٰ کا معجزہ تھا۔ اسی معجزے کی بشارت حضرت مریم کو ولادت کی بشارت کے ساتھ اس لیے دی گئی ہے۔ کہ وہ بالکل تسلی رکھیں کہ اللہ تعالیٰ نے اگر ان کو اپنی ایک عظیم نشانی کے ظہور کے لیے واسطہ بنایا ہے تو ان کی آبرو اور عزت کے تحفظ کی خاطر ایسا انتظام کرے گا کہ کسی تہمت طراز کو بدگمانی کے لیے کوئی راستہ نہ ملے گا۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ ایک پاک دامن بے گناہ عورت کو اپنی شان قدیری کے ظہور کا ذریعہ بنائے اور پھر اس کے بچاؤ کا کوئی سامان نہ کرے۔

آیت میں بچپن میں کلام کے ساتھ کہولت کے زمانہ میں بھی کلام کرنے کا ذکر ہے۔ ممکن ہے کہ آپ ذہنوں میں یہ خلش محسوس کریں کہ اس زمانہ میں تو سب ہی باتیں کرتے ہیں اس کی تخصیص کی کیا وجہ ہے؟ ایک وجہ تو یہ ہے کہ گہوارے یعنی بچپنے اور کہولت کے تقابل سے یہ بتانا مقصود ہے کہ گہوارے کی باتیں بچوں کی سی نہ ہوں گی بلکہ اس کے اندر بھی عمر کی پختگی والی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دانائی ہوگی کیونکہ یہ منجانب اللہ ہوں گی۔ اور مفتی محمد شفیع صاحب نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ حضرت عیسیٰ جب دنیا سے اٹھائے گئے جیسا آگے ذکر آرہا ہے اس وقت وہ نوجوان تھے اور زمانہ کہولت کو نہ پہنچے تھے۔ اب جس عمر میں اٹھائے گئے تھے اسی عمر میں واپس آئیں گے بلکہ جس حالت میں اٹھائے گئے تھے۔ اسی حالت میں واپس ہوگی۔ حضرت عبداللہ کے حوالے سے حضور انور کا ارشاد گرامی آیا ہے کہ آپ جب آسمان پر اٹھائے گئے تو اس وقت آپ کے بالوں سے پانی کے قطرے ٹپک رہے تھے۔ اور نواس ابن سمعان کے حوالے سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے کہ آپ تشریف لائیں گے تو پانی کے قطرے ٹپکتے معلوم ہوں گے سر اٹھائیں گے تو بالوں میں سے چاندی کے سے موتی گرتے نظر آئیں گے گویا وہ غسل کر کے ایک دروازے سے گئے اور دوسرے دروازے سے آگئے جس عالم میں نہ دن ہو نہ رات نہ سردی ہو نہ گرمی اور نہ صحت ہو نہ مرض تو پھر اس عالم میں اگر پانی کے قطرے بھی محفوظ رہیں تو تعجب کی کون سی بات ہے اور جب پانی کے قطرے تک باقی ہیں تو پھر صحت جوانی اور عمر کے تغیر کا تو کوئی امکان ہی نہیں ہے اور اب تو اکتشافات وتحقیقات نے بھی ثابت کر دیا ہے کہ ہمارے عناصر سے بنے ہوئے اس کرے سے باہر اگر کچھ بھی چلا جائے وہ خلا میں چکر لگاتا رہے گا وقت و زمان کا کوئی تغیر اس پر اثر انداز نہ ہوگا۔ وہ ہزار سال کے بعد بھی اسی حال پر رہے گا۔ بہر حال حضرت عیسیٰ کی واپسی اسی عمر اور اسی حالت میں ہوگی۔ اور آپ تشریف لانے کے بعد کہولت کا زمانہ پائیں گے اس طرح جیسے ماں کے پیٹ سے نکلنے کے بعد ان کا کلام بچپنے میں معجزہ تھا ایسے ہی عالم بالا کے بطن سے نزول کے بعد زمانہ کہولت میں بھی ان کا کلام معجزہ ہی ہوگا۔

آخر میں صالحین فرما کر اشارہ کر دیا کہ وہ صالحین کے درجے میں سے ہوں گے۔ یعنی ان تمام کمالات کے باوجود ان کا شمار صرف اللہ کے نیک بندوں میں سے ہوا ہے یہ بات نہیں ہے کہ ان کو خلعت الوہیت مل گیا ہے۔ عبد تو بہر حال عبد ہے خواہ وہ کیسا ہی عظمت وکمال کے درجات حاصل کرے۔ وہ نہ خدا کا اوتار ہو سکتا ہے کہ خدائی اس میں حلول کر جائے نہ خود خدا ہو سکتا ہے کہ صورت انسانی میں جلوہ نما ہو۔ عبد کے متعلق خدائی کا تصور عیسائی انداز فکر ہے یہاں قرآن حضرت مسیح کو صالحین میں سے کہہ کر اسی غلط اندیشی پر ضرب کاری لگا رہا ہے۔ کسی بھی عبد کے بارے میں یہ خیال کر اپنے دائرہ عبدیت سے ترقی کر کے خدائی سرحد میں داخل

ہو سکتا ہے سفیہانہ خوش عقیدگی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ قرآن کے یہاں انسان کامل وصالح کی آخری سرحد اور اللہ سبحانہ کے ابتدائی تصور میں کوئی نقطہ مشترک نہیں ہے نہ ذات میں نہ صفات میں۔

حضرت مریم کا تعجب اور اس کا جواب :

۹۵۔ کہا مریم نے خدایا بیکیسے ہو سکتا ہے کہ میرے لڑکا ہو۔ مجھے تو کسی مرد نے کبھی چھوا تک نہیں ہے۔ معلوم ہوا کہ حضرت مریم بشارت سے یہی سمجھیں کہ لڑکا بحالت موجودہ ہونے والا ہے۔ اسی طرح یعنی بدون مس بشر کے ہو جائے گا۔ خلافِ عادت ہونے کی وجہ سے تعجب نہ کرو۔ حق تعالےٰ جو چاہے اور جس طرح چاہے کر دیتا ہے اس کی قدرت کی حد بندی نہیں ہو سکتی۔ ایک کام کا ارادہ کیا اور ہو گیا نہ وہ مادے کا محتاج اور نہ اسباب کا۔[1]

یہ بشارت سن کر حضرت مریم سمجھ گئیں کہ بچہ بغیر باپ کے ہوگا اس لیے حضرت مریم نے اس بشارت کو سن کر بطور تعجب فرمایا کہ بچہ عادۃً بغیر مرد کے تعلق کے نہیں ہوتا۔ اب معلوم نہیں کہ میرے بچہ کیسے ہوگا محض قدرت خداوندی سے یا مجھے نکاح کرنے کا حکم ہوگا؟ جواب میں بتایا کہ ویسے ہی بلا باپ کے بچہ ہوگا کیونکہ اللہ سبحانہ، جو چاہتے ہیں پیدا کرتے ہیں یعنی وہ کسی چیز کے پیدا کرنے میں کسی سبب کے محتاج نہیں۔ اللہ سبحانہ جیسے اس پر قادر ہے کہ وہ اشیا کو بتدریج قانون عادت کے مطابق مادہ اور سبب سے پیدا کرے ایسے ہی وہ اس پر بھی قادر ہے کہ دفعۃً بغیر مادہ اور بغیر اسباب کے کسی چیز کو پیدا کر دے۔ آخر اسی نے تو اپنی قدرت کاملہ سے اسباب کو بلا سبب کے اور مادہ کو بغیر مادے کے پیدا کیا ہے مواد، اسباب اور قوانین کی اس پر حکمرانی نہیں بلکہ اسباب اپنے ہونے میں اس کے محتاج ہیں۔ اس کی شان یہ ہے کہ کہتا ہے کہ ہو جا بس وہ چیز ہو جاتی ہے لہٰذا تم اس بچہ کے بغیر بدون مسِ بشر کے پیدا ہونے پر تعجب نہ کرو۔ اللہ کی غیر محدود قدرت کسی سبب اور مادے کی محتاج نہیں ہے۔[2]

گویا حضرت مریم کو سمجھا یا گیا ہے کہ باوجود اس کے کہ کسی مرد نے تجھے ہاتھ نہیں لگایا تیرے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہاں بچہ پیدا ہوگا۔ یہی کذالك ایسا ہی ہوگا۔ حضرت زکریا کے جواب میں بھی کہا گیا تھا۔ اس کا جو مفہوم وہاں ہے وہی یہاں ہے۔ نیز بعد کا فقرہ بلکہ پچھلا اور اگلا سارا بیان اسی معنیٰ کی تائید کرتا ہے کہ حضرت مریم کو صنفی مواصلت کے بغیر بچہ پیدا ہونے کی بشارت دی گئی ہے۔ اور فی الواقع اسی صورت سے حضرت عیسیٰ کی پیدائش ہوئی [1][2]

ولادت مسیح علیہ السلام کے مسئلہ پر اسلامی تاریخ میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں اور بقول مولانا ثناء اللہ امرتسری اس میں سب کے سب ایک زبان اور متفق ہیں۔ گو اتفاق کی بنا مختلف ہے۔ حضرت عیسیٰ کے مخالف یہود تو اس حیثیت سے آپ کو بے باپ حقیقی مانتے ہیں کہ آپ کی پیدائش کو بدگمان اور گستاخ سے ناجائز اور حرام کی بتاتے ہیں اور عیسائی خدا کا بیٹا بناتے ہیں باپ کے ہونے کے وہ بھی منکر ہیں۔ مسلمان بھی آغاز اسلام سے اسی کے قائل ہیں کہ حضرت مسیح بغیر باپ کے پیدا ہوئے لیکن اس زمانہ میں سر سید احمد خان نے اور بقول مولانا آزاد مصر میں ڈاکٹر توفیق صدقی نے اور پاکستان میں لاہوری مرزائیوں نے اس کا انکار کیا ہے۔ لیکن اس مسئلہ میں موافق و مخالف آراء سے قطع نظر ایک غیر جانبدار منصف جب حضرت مسیح کی پیدائش سے متعلق تمام آیاتِ قرآن کا مطالعہ کرے گا تو اس پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ قرآن حضرت مسیح سے متعلق یہود کی تفریط اور عیسائیوں کے افراط کے خلاف اپنا وہ فرض منصبی ادا کرنا چاہتا ہے جس کے لیے قرآن آیا ہے۔ یہود و نصاریٰ کا موقف حضرت مسیح کے بارے میں درقطعاً مخالف سمتوں میں ہے۔ یہود کہتے ہیں کہ حضرت مسیح کی پیدائش ناجائز تعلق کا نتیجہ ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ کی پیدائش ربانی معجزہ ہے۔ ان حالات میں قرآن نے ان اوہام و ظنون کے خلاف علم و یقین کی راہ دکھاتے ہوئے دونوں کے خلاف یہ فیصلہ دیا ہے کہ راہ حق افراط و تفریط کے درمیان ہے اور صراط مستقیم کی یہی سب سے بڑی شناخت ہے۔ قرآن نے فیصلہ کیا کہ حضرت مسیح کی پیدائش ناجائز تعلق کا نتیجہ نہیں ہے اس کے لیے اس نے حضرت مریم کی پاکی کا اعلان کیا اور پیدائش مسیح کو معجزہ ربانی قرار دیا۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح کی الوہیت کا جو عقیدہ قائم کیا اس کا بہت بڑا ستون یہی واقعہ تھا۔ کہ حضرت مسیح کی پیدائش ایک ربانی معجزہ ہے پیدائش مسیح کے متعلق اگر واقعہ یہ ہے کہ قرآن کے

---

[1] معارف م [2] تفہیم القرآن

نزدیک نہ تو وہ حقیقت تھی جو یہودیوں نے بتائی اور نہ وہ عیسائیوں نے سمجھی بلکہ ایک تیسری بات تھی جو سرسید اور ان کے حواریوں نے سمجھی یعنی مریم کا اپنے شوہر یوسف سے حاملہ ہونا تو کیونکہ اس کے لیے جائز ہو سکتا تھا کہ وہ سب کچھ کہہ دے اور اس بارے میں کچھ نہ کہے اور تہمت لگانے والوں کی کھلم کھلا تردید کردے گمراں کے رد میں ایک حرف نہ کہے جو آپ کی پیدائش کو ربانی معجزہ بتا رہے ہیں۔

یہودیوں اور عیسائیوں کا اختلاف صرف حضرت مسیح کی پیدائش کے بارے ہی میں نہیں بلکہ حضرت مسیح کی ساری باتوں میں ہے دونوں افراط و تفریط کے دوراہے پر کھڑے ہیں یہودی انکار میں اتنے دور نکل گئے کہ انہیں شعبدہ باز اور فریبی سمجھ لیا۔ عیسائی اعتقاد میں اتنے دور نکل گئے کہ انہیں خدا بنا لیا۔ قرآن دونوں کی تردید کرتا ہے۔ اگر پیدائش مسیح کا مسئلہ بھی ایسا ہی تھا تو کیا قرآن کے لیے ضروری نہ تھا کہ پیدائش کے بارے میں یکساں طور پر دونوں کی تردید کر دیتا ہے اور صاف صاف بتلا دیتا کہ حقیقت سے دونوں محروم ہیں۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اگر حضرت مسیح کی پیدائش معجزہ ربانی نہیں تو بس اتنا کہہ دینا کافی تھا کہ تم لوگ غلط کہتے ہو۔ مریم شادی شدہ تھی، فلاں شخص اس کا شوہر تھا اسی کے نطفے سے حضرت عیسٰی پیدا ہوئے یہ مختصر سی بات کہنے کے بجائے اور صاف صاف مسیح بن فلاں کہنے کی جگہ مسیح ابن مریم کہنے کی آخر ضرورت کیا تھی؟ اس موضوع پر تفصیلی مباحث انشاء اللہ پارہ ۱۶ میں آئیں گے۔

حضرت عیسٰی کو کتاب و حکمت کی تعلیم

۴۹۔ اور اے مریم اللہ اس کو کتاب و حکمت کا علم عطا فرمائے گا نیز تورات اور انجیل کا یعنی لکھنا سکھائے گا یا عام کتب ہدایت کا عموماً اور تورات و انجیل کا خصوصاً علم عطا فرمائے گا۔ اور بڑی گہری حکمت کی باتیں تلقین کرے گا۔ اور بندے کے خیال میں ممکن ہے کتاب و حکمت سے مراد قرآن و سنت ہو کیونکہ حضرت مسیح نزول کے بعد قرآن و سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق حکم کریں گے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ ان چیزوں کا علم دیا جائے۔[2]

اس آیت میں شارحین قرآن نے کتاب سے اس کے معنے مصدری مراد لیے ہیں یعنی لکھنا،

---

[1] ترجمان القرآن۔ [2] افادات شیخ الاسلام۔

اور حکمت وہ علم صحیح ہے جس کے ذریعے عمل نافع کا ظہور ہو اور عامل صراط مستقیم پر گامزن ہو سکے یعنی ایسی بصیرت اور فقاہت اللہ سبحانہ عطا فرمائے گا جس کے ذریعے مسائل زندگی اور ان کے اسرار معلوم ہو جائیں گے۔ حکمت جیسے ربانی عطیہ آسمانی فہم اپنی عقل اور نورانی قوت پر بولا جاتا ہے اسی طرح اس قوت کے آثار و نتائج اور اس کی تعلیمات پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ قرآن میں لفظ حکمت کبھی تنہا آیا ہے اور کہیں کتاب کے ساتھ کتاب کے دو معنے قرآن میں ہیں ایک صحیفہ ربانی اور یہ اکثر آیا ہے اور دوسرے نوشتہ الٰہی اور علم الٰہی جیسے لو لا کتاب من اللہ قرآن میں بیشتر کتاب سے مراد آسمانی صحیفہ یا یوں کہو وحی کتابی ہوتی ہے۔ ہمارے خیال میں یہاں بھی کتاب سے مراد آسمانی صحیفہ ہے صرف لکھنا نہیں حکمت کے لغوی معنے دانائی کی بات اور کام کے ہیں۔ یہاں حکمت سے مراد خود انجیل ہے جیسے کتاب سے مراد تورات ہے۔ کیونکہ انجیل میں دلآویز نصیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کو تعلیم ہے۔ حضرت عیسیٰ کو حکمت بھرپور طریقہ پر عطا کی گئی تھی اس کا نتیجہ تھا۔ کہ ان کی ہر بات دانائی اور ان کا ہر کام دانشمندی پر مبنی ہوتا تھا۔ اور چونکہ ان کو یہ قوت حاصل تھی اس لیے اس کے آثار و نتائج بھی اقوال و اعمال کی صورت میں ظاہر ہوتے تھے۔ جن کا نہ صرف اقرار و اعتراف بلکہ ان پر عمل بھی ثبوت کی تصدیق میں داخل ہے۔

وَرَسُوۡلًا اِلٰى بَنِىۡۤ اِسۡرَآءِيۡلَ ۙ اَنِّىۡ قَدۡ جِئۡتُكُمۡ بِاٰيَةٍ مِّنۡ رَّبِّكُمۡ ۙ
اَنِّىۡۤ اَخۡلُقُ لَـكُمۡ مِّنَ الطِّيۡنِ كَهَیْـــَٔةِ الطَّيۡرِ فَاَنۡفُخُ فِيۡهِ
فَيَكُوۡنُ طَيۡرًاۢ بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۚ وَاُبۡرِئُ الۡاَكۡمَهَ وَالۡاَبۡرَصَ وَ
اُحۡىِ الۡمَوۡتٰى بِاِذۡنِ اللّٰهِ ۚ وَاُنَبِّئُكُمۡ بِمَا تَاۡكُلُوۡنَ وَمَا
تَدَّخِرُوۡنَ ۙ فِىۡ بُيُوۡتِكُمۡ ؕ اِنَّ فِىۡ ذٰ لِكَ لَاٰيَةً لَّـكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ
مُّؤۡمِنِيۡنَ ۚ

اور وہ بنی اسرائیل کی طرف اللہ کا رسول[۹] ہوگا۔ اس کا دعویٰ یہ
ہوگا کہ دیکھو میں تمہارے پروردگار کی نشانی لے کر تمہارے پاس
آیا ہوں[۱۰] میں تمہارے لیے مٹی سے ایسی چیز بنا دوں جو پرندے
کی سی صورت رکھتی ہو پھر اس میں پھونک مار دوں اور وہ اللہ کے
حکم سے پرندہ ہو جائے[۱۱]، اور اللہ کے حکم سے اندھوں اور
کوڑھوں کو چنگا کردوں اور مردوں کو زندہ۔ جو کچھ تم کھاتے ہو
اور جو کچھ ذخیرہ بنا کر گھروں میں رکھتے ہو سب تمہیں بتا دوں بلاشبہ
اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم واقعی اللہ پر

ایمان رکھتے ہو۔

رسالت اور دلیلِ رسالت:

جس طرح رات کے بعد دن کی روشنی قانونِ قدرت ہے اسی طرح یہ بھی سنت الٰہی ہے کہ جب عالم انسانیت پر گمراہی چھا جاتی ہے۔ تو اس کے مطلع سے ہدایت کا نور طلوع کرتا ہے اور اگرچہ جس طرح رات کی تاریکی میں چھوٹے بڑے ستارے اپنی جھلملاہٹ سے کچھ نہ کچھ روشنی پیدا کرتے رہتے ہیں اسی طرح عام مصلحین و مجددین کا سلسلہ بھی کسی نہ کسی حد تک ضلالت انسانی کی تاریکی کو کم کرتا رہتا ہے تاہم نبوت و رسالت کی ضیا پاشی کا عالم ہی کچھ اور ہوتا ہے اس کے سامنے لیمپوں اور قمقموں کی جھلملاہٹ بالکل ماند پڑ جاتی ہے اور نبی کا دعوتی علاقہ دفعتہً بقعہ نور بن جاتا ہے۔

سلسلہ مصلحین کی اسی روشنی کا نام ادیان میں نبوت و رسالت ہے۔ عام مصلحین کے ہاتھ میں صرف انسانی عقل و بصیرت کی مشعل ہوتی ہے لیکن مشکوٰۃ نبوت سے خود نور ہدایت ابلتا ہے اس کا سرچشمہ وہ نور السماوات والارض ہوتا ہے جس سے عالم مادی کی آنکھیں خیرہ ہو جاتی ہیں۔ پیغمبر وہ کچھ دیکھتا ہے جو ہم نہیں دیکھتے وہ کچھ سنتا ہے جو ہم نہیں سنتے۔ اس کے عقل و حواس سے ہم ناآشنا اور اس کے احوال و کوائف سے ہم بیگانہ ہوتے ہیں۔ نبوت تو درکنار ولایت جو نبوت کے تحت ہے ہم تو اس کی حقیقت سے بھی بیگانہ ہیں۔ پھر نبوت کا تو ذکر ہی کیا ہے شیخ اکبر فرماتے ہیں۔

> مقام رسالت میں رسول ہی اور مقام نبوت میں نبی ہی کو گفتگو کرنا زیب دیتا ہے انبیاء کے مقام سے جب ہم آشنا ہی نہیں ہیں تو اس کے بارے میں بات ہی کیا کریں۔ (الیواقیت والجواہر)

ہم زیادہ سے زیادہ کہہ سکتے ہیں کہ نبوت کی اصلی روح عالم ناسوت سے ماوراء عالم غیب کے ساتھ تعلق و ربط ہے۔ انسان اسی عالم اسرار و غیوب کو اپنی محدود تعبیر میں عالم قدس عالم روح وغیرہ سے موسوم کرتا ہے۔

حامل رسالت سے عالم ناسوت میں ہوتے ہوئے عالم غیب سے تعلق کو ثابت کرنے

کے لیے نہ ماننے والوں کے لیے بطور اتمام حجت کچھ ایسے واقعات ظہور پذیر ہوتے ہیں جو عام حالات میں باہر نظر آتے ہیں اور ان کی توجیہ و تعلیل سے انسانی عقل اپنے کو درماندہ پاتی ہے۔ ان واقعات کی توجیہ سے چونکہ عقل انسانی عاجز ہے اس لیے ان میں ایک طرح کا غیب نظر آتا ہے اور جس شخص کے تعلق سے ان کا ظہور ہوتا ہے عالم غیب کے ساتھ اس کے روابط کی نشانی و آیت یا تائید غیبی کا کام دیتے ہیں۔ قرآن کی زبان میں ان واقعات کا نام آیات، براہین بینات یا آیات بینات ہے۔ محدثین ان کو دلائل نبوت سے تعبیر کرتے ہیں اور حکماء و متکلمین کی اصطلاح میں انہی کو معجزات کہتے ہیں۔

حضرت عیسیٰ کی بعثت

۹۷۔ اور وہ بنی اسرائیل کی طرف اللہ کا رسول ہوگا۔ اصل ارشاد ہے۔ رسولاً سے پہلے شارحین قرآن ایک فعل محذوف مانتے ہیں۔ ابوحیان غرناطی نے پوری تعبیر یہ بتائی ہے کہ اے مریم ہم عیسیٰ کو رسول بنائیں گے۔ یعنی حضرت یحییٰ کی طرح صرف نبی نہ ہوں گے بلکہ ان کو نبوت کے ساتھ مقام رسالت دیں گے۔ رسول اور نبی میں فرق ہوتا ہے حافظ ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں کہ جب اللہ تعالےٰ کسی کو غیب کی خبریں دے کر نبی بنا دے تو وہ اللہ کا نبی ہو جاتا ہے اور جب تک نہ ماننے والوں کو خدائی پیغام پہنچانے کا حکم نہ ملے وہ نبی ہی رہتا ہے خواہ وہ کسی پہلی شریعت ہی پر عمل کرتا ہے۔ ہاں جب اسے نہ ماننے والوں کو اللہ کے احکام پہنچانے کا حکم ہو جائے اب وہ اللہ کا رسول ہو جاتا ہے حضرت عیسیٰ کی حیثیت ٹھیک ٹھیک وہی ہے جو حضرت موسیٰ کی ہے۔ نبوت کے کفر میں موسیٰ کے مقابلہ میں جو کردار فرعون نے پیش کیا وہ وہی کردار حضرت عیسیٰ کے مقابلے میں بنی اسرائیل نے پیش کیا رسول جس کی طرف آتا ہے اس کے لیے اللہ کی عدالت بن کر آتا ہے، قوم اگر رسول پر ایمان لاتی ہے تو نجات پاتی ہے، اگر ایمان نہیں لاتی اور کفر پر اڑی رہتی ہے تو دو حال سے خالی نہیں ہوتا یا رسول کو ہجرت کا حکم ہو جاتا ہے یا قوم فنا کر دی جاتی ہے رسولوں کی تاریخ میں ہمیں دونوں مثالیں ملتی ہیں۔ ہم اس پر پوری تفصیل سے دوسرے مقام پر بحث کریں گے۔

الی بنی اسرائیل کہہ کر قرآن نے دو اہم باتوں کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ اولاً۔ بنی اسرائیل کی حیثیت حضرت عیسیٰ کے مقابلہ میں وہی ہے۔ جو حضرت موسیٰ کے مقابلے میں فرعون کی تھی۔

ثانیاً یہ کہ حضرت عیسیٰ کی بعثت صرف بنی اسرائیل کی طرف تھی اور اس طرح آپ بھی دوسرے اسرائیلی پیغمبروں کی طرح مقامی اور قومی رسول تھے۔ انجیل خواہ کتنی تحریفات اور تصرفات کا نشانہ بن چکی ہے۔ مگر یہ تصریح اس میں موجود ہے۔ ان بارہ کو یسوع نے بھیجا اور انہیں یہ حکم دے کر روانہ کیا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا اور سامریوں کے کسی شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ اسرائیل گھرانے کی کھوئی بھیڑوں کے پاس جانا۔ (متی ۱۰-۵-۷) اس نے جواب میں کہا کہ بنی اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے سوا اور کسی کے پاس نہیں بھیجا گیا۔ (متی ۱۶-۲۴)

تقریباً دو ہزار سال کی کلیسا کی ساری ملمع سازیوں کے بعد آج خود مسیحی فاضلوں کو اقرار ہے کہ تبلیغ نصرانیت کی عالمگیری ایجاد بندہ ہے ورنہ خود حضرت مسیح کے اس تعلیم کا پتہ نہیں۔ مسیح نے اسرائیل سے باہر اپنے مرید تلاش نہیں کیے (انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا طبع چہارم) اور مسیح تو مسیح حواریوں تک کا بھی یہ خیال نہ تھا۔ اولین شاگردوں کو مسیح کی تعلیم کی عالمگیری کا احساس نہ ہوا۔ (ایضاً ص ۲ ۶۳۲)[1]

نبوت اور معجزات :

۹۸۔ اس کا دعوی یہ ہوگا کہ دیکھو میں تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ یعنی پیغمبر ہو کر اپنی قوم بنی اسرائیل سے یہ فرمائیں گے[2] کہ میں تمہارے پاس اپنے پروردگار کی جانب سے اپنی نبوت و رسالت کی ایک نشانی لے کر آیا ہوں۔ یعنی ایسے معجزات قاہرہ لے کر آیا ہوں جو میری رسالت کی روشن دلیلیں ہیں جن کو دیکھ کر تم بداہتہً یہ جان لوگے کہ یہ معجزات بلاشبہ من ربکم یعنی تمہارے رب کی جانب سے ہیں[3]

آیت کے لفظی معنے نشان کے ہیں۔ یہاں معجزے کے مفہوم میں آیا ہے معجزہ ایسے واقعہ کے ظہور کا نام ہے جو عام و متعارف اسباب سے الگ ہو کر پیغمبر کے ذریعہ سے ہو ایسے غیر عادی واقعہ کا وقوع اس امر کی دلیل ہوتا ہے کہ نصرت حق و تائید الٰہی پیغمبر کے ساتھ ہے معجزہ کا فاعل کائنات کے بڑے چھوٹے معمولی یا غیر معمولی ہر واقعہ کی طرح صرف اللہ تعالےٰ ہوتا ہے۔ پیغمبر محض واسطہ یا ذریعہ ہوتا ہے۔ جو لوگ ایک قادر مطلق کے وجود کے قائل ہیں ان کے لیے کسی بڑے سے بڑے

---

[1] ماجدی [2] افادات شیخ الاسلام [3] معارف م ا

معجزہ کا نفسی امکان تو قابل انکار بلکہ قابل اشتباہ بھی ہو ہی نہیں سکتا۔ طبعی غیر طبعی، مادی غیر مادی، متعارف و مجہول، جلی و خفی اسباب کی تفریق تو بشری تجربات کے لحاظ سے ہے۔ قادر مطلق کے لیے سب بالکل یکساں ہے۔ اب رہا کسی متعین معجزہ کا ثبوت تو اس کا تعلق منطق سے نہیں تاریخ سے، عقل سے نہیں نقل سے درایت سے نہیں روایت سے ہے ظن و تخمین کا یہاں دخل نہیں اب گفتگو صرف سند متصل اور شہادت معتبر ہی ہو گی۔

مولانا عبدالباری صاحب ندوی نے معجزات کے موضوع پر بحث و نظر کے لیے جو خاکہ ترتیب دیا ہے کہ امکان معجزات، شہادت معجزات، استبعاد معجزات، یقین معجزات اور غایت معجزات اس کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں ہے۔

مجھے اگر اس جلد کی ضخامت زیادہ ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو میں یہاں اس موضوع پر حافظ ابن تیمیہ، شاہ ولی اللہ، مولانا محمد قاسم، مولانا اشرف علی اور مولانا شبیر احمد عثمانی کے علوم سے استفادہ کرتا۔ انشاءاللہ پوری تفصیل ساتویں پارے کے آغاز میں سورہ مائدہ کے آخر میں ملے گی

مٹی کا پرندہ اور اعجاز قرآنی :

۹۹۔ میں تمہارے لیے مٹی سے ایسی چیز بنا دوں گا جو پرندے جیسی صورت رکھتی ہو، پھر اس میں پھونک ماروں اور وہ اللہ کے حکم سے پرندہ ہو جائے۔ شکل و صورت بنانے کو خلق سے تعبیر کرنا صرف ظاہری حیثیت سے ہے جیسے حدیث صحیح میں معمولی تصویر بنانے کو خلق سے تعبیر کیا ہے۔ احیوا ما خلقتم یا اللہ کو احسن الخالقین فرما کر بتلا دیا کہ محض ظاہری صورت کے لحاظ سے غیر اللہ پر بھی یہ لفظ بولا جا سکتا ہے۔ اگرچہ حقیقت تخلیق کے لحاظ سے اللہ تعالٰی کے سوا کوئی خالق نہیں کہلا سکتا شاید اسی لیے یہاں یوں نہیں فرمایا۔ انی اخلق لکم من الطین طیراً میں مٹی سے پرندہ بناتا ہوں یوں فرمایا۔ اخلق لکم من الطین کھیئۃ الطیر، میں تمہارے لیے پرندے کی شکل بنا کر اس میں پھونک مارتا ہوں پھر وہ پرندہ اللہ کے حکم سے بن جاتا ہے۔ بہر حال یہ معجزہ آپ نے دکھلایا اور کہتے ہیں کہ بچپن میں بطور "ارہاص" آپ سے یہ خرق عادت ظاہر ہوا تا کہ تہمت لگانے والوں کو ایک چھوٹا سا نمونہ قدرت خداوندی کا دکھلا دیں کہ جب میرے پھونک مارنے پر اللہ تعالٰی مٹی کی بے جان صورت کو جاندار بنا دیتا ہے اسی طرح اگر اس نے بدون مس بشر محض روح القدس کے پھونک مارنے سے ایک برگزیدہ عورت پر روح

عیسوی فائض کردی تو کون سی حیرت کی بات ہے؟ بلکہ حضرت مسیح چونکہ نفخۂ جبریل سے پیدا ہوئے اس لیے اس مسیحائی نفخہ کو اسی نوعیت ولادت کا ایک اثر سمجھنا چاہیئے۔ سورہ مائدہ کے آخر میں حضرت مسیح علیہ السلام کے ان معجزات و خوارق پر دوسرے رنگ میں گفتگو ہوگی۔ وہاں ملاحظہ کیا جائے۔ خلاصہ یہ کہ حضرت مسیح پر کمالات ملکیہ و روحیہ کا غلبہ تھا۔ اسی کے مناسب آثار ظاہر ہوتے تھے لیکن اگر بشر کو ملک پر فضیلت ہے اور اگر ابو البشر کو مسجود ملائکہ بنایا گیا ہے تو کوئی شبہ نہیں کہ جس میں تمام بشریہ کمالات جو عبارت ہے مجموعہ کمالات روحانیہ و جسمانیہ سے اعلیٰ درجہ پر ہوں گے اس کو حضرت مسیح سے افضل ماننا پڑے گا اور وہ ذات قدسی صفات محمد رسول اللہ کی ہے [1]

اخلق فعل خلق کا انتساب جب خالق کی جانب ہوتا ہے تو اس سے مراد نیست سے ہست کرنا عدم سے وجود میں لانا ہوتا ہے اور جب انسان کی جانب ہوتا ہے تو اس سے مراد اندازہ کرنا ایک خاص اندازہ سے بنانا اور صورت پیدا کرنا ہوتا ہے۔ من الطین کے ذریعے اس حقیقت کو اور زیادہ کھول کر بیان کر دیا کہ میں عدم محض سے وجود میں ہرگز نہیں لاتا۔ صرف مادے میں ایک خاص ترکیب و ترتیب کے ساتھ تصرف کر دیتا ہوں [2]

اس معجزے کا ان موجودہ رائج انجیلوں میں سے کسی انجیل میں ذکر نہیں ہے جو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ کلیسا کے نزدیک مستند ہیں۔ لیکن جو انجیل کلیسائے قبط (مصر) کی مستند ہے اس میں یہ صاف درج ہے جیسا کہ ڈاکٹر سج نے اپنی کتاب حکایات خاتون مریم کے مقدمہ نقل کیا ہے کہ وہ پرندوں کی شکل کے جانور بنا دیتے تھے جو اڑ جاتے تھے۔

نظامِ فطرت اور نظام قدرت:

یہاں یہ بات اگر ذہن میں رکھ لی جائے کہ سلسلہ اسباب و علل جو کچھ بھی ہے وہ سب اس عالم کے لیے ہے خالق عالم کے لیے نہیں ہے کیونکہ خود عالم اور اسباب عالم اللہ کی مخلوق ہیں اسباب کے اس مربوط اور غیر متبدل سلسلہ کا نام نظام فطرت ہے۔ لیکن نظام فطرت کے اوپر ایک اور نظام ہے جسے قرآن نظام قدرت کہتا ہے۔ یعنی عالم میں علل اور اسباب کا جو

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ماجدی

نظام ہم دیکھ رہے ہیں یہ نظام قدرت کے تحت ہے۔ اس لیے فطرت ہمہ وقت قدرت کی محتاج ہے شاید اسی نکتہ کو سمجھانے کے لیے پرندے جیسی صورت بنانے کے بعد نفخہ کا ذکر کیا اور جب اس بنائی ہوئی صورت میں جان پڑنے کا وقت آیا تو فرمایا
کو اس طرز پر اس صورت کا پرندہ بن جانا اللہ کی شان قدیری کا اظہار ہے اس کی قدرت فطرت کے تحت نہیں ہے۔ نظام فطرت بھی اسی کا بنایا ہوا ہے۔ کیونکہ وہ حکیم ہے اور نظام قدرت بھی اسی کے قبضہ و اختیار میں ہے کیونکہ وہ عزیز ہے اس کی عزت و صولت کا تقاضا ہے کہ وہ جو چاہے جب چاہے کر سکتا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی حضرت مسیح نے سمجھا دیا ہے کہ یہ تخلیقی کام میرا کارنامہ نہیں ہے۔ میری قوت و قدرت کا نتیجہ نہیں ہے جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہوا ہے محض اللہ کی مشیت اور قدرت سے ہوا ہے۔

مادرزاد نابینا کا بینا اور مردوں کا زندہ ہونا۔

۱۰۰۔ اور اللہ کے حکم سے اندھوں اور کوڑھوں کو چنگا کردوں اور مردوں کو زندہ۔ اس زمانہ میں اطباء و حکماء کا زور تھا۔ حضرت مسیح کو ایسے معجزات مرحمت ہوئے جو لوگوں پر اُن کے سب سے زیادہ ناز فن میں حضرت مسیح کا نمایاں تفوق ثابت کریں بلاشبہ مردہ کو زندہ کرنا حق تعالیٰ کی صفت جیسا کہ باذن اللہ کی قید سے صاف ظاہر ہے مگر مسیح اس کا ذریعہ ہونے کی وجہ سے توسعاً اپنی طرف نسبت کر رہے ہیں۔ یہ کہنا کہ حق تعالیٰ قرآن کریم میں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اعلان کر چکے ہیں کہ ازل سے ابد تک کسی مردہ کو دنیا میں دوبارہ زندہ نہیں کیا جائے گا نرا دعویٰ ہے۔ جس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اگر اس نے قرآن میں
فرماکر یہ بتلایا کہ مرنے والے کی روح اللہ تعالیٰ روک لیتا ہے اور سونے والے کی اس طرح نہیں روکتا تو یہ کب کہا ہے کہ اس کو روک لینے کے بعد دوبارہ اسے چھوڑ دینے کا کوئی اختیار نہیں رہتا۔ یاد رکھو معجزہ وہی ہے جو حق تعالیٰ کی عام عادت کے خلاف مدعی نبوت کی تصدیق کے لیے ظاہر کیا جائے، لہٰذا ایسی آیات کو لے کر جو کسی چیز کی نسبت اللہ کی عام عادت بیان کرتی ہوں یہ استدلال کرنا کہ ان سے معجزات کی نفی ہوتی ہے سرے سے معجزات کا انکار اور اپنی غباوت و حماقت کا اظہار ہے معجزہ اگر عام قانون عادت کے موافق آیا کرے تو اسے معجزہ کیوں کہتے۔ حضرت مسیح کا بن باپ پیدا ہونا یا ابراء اکمہ و ابرص اور احیاء موتیٰ وغیرہ معجزات دکھلانا۔ اہل

اسلام میں تمام سلف وخلف کے نزدیک مسلم رہا ہے، صحابہ و تابعین میں کبھی اس موضوع پر دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ آج جو ملاحدہ یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان خوارق کا ماننا محکمات قرآنی کے خلاف ہے۔ گویا وہ ایسی چیزوں کو محکمات بتلاتا ہے جن کا صحیح مطلب سمجھنے سے ساری امت عاجز رہی یا سب کے سب محکمات کو چھوڑ کر اور متشابہات کے پیچھے پڑ کر کے مصداق بن گئے۔ آج کل کے ملحدین کے سوا متشابہات کو محکمات کی طرف لوٹانے کی کسی کو توفیق نہ ہوئی۔ حق یہ ہے کہ وہ آیات جن کے ظاہری معنے کو ساری امت مانتی چلی آئی ہے۔ محکمات ہیں اور ان کو توڑ مروڑ کر محض استعارات اور تمثیلات کی چیستان بنانا اور معجزات کی نفی پر عام عادات سے استدلال کرنا ہی زائغین کا کام ہے جن سے بچنے کی امت کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہدایت فرمائی ہے[1]۔ اس معجزۂ مسیح کا ذکر انجیلوں میں متعدد مقام پر ہے۔ مثلاً انجیل متی ۹، ۲۷، ۳۰ میں اور انجیل مرقس ۸ : ۲۲، ۲۵ میں لیکن سب سے زیادہ تفصیل انجیل یوحنا ۹ : ۱۔ ۷ میں ہے اور اس میں تصریح اندھے کے مادرزاد یا پیدائشی ہونے کی ہے الابرص کوڑھوں کے اچھا کرنے کا ذکر انجیل میں دو جگہ ہے۔ ایک جگہ ایک کوڑھی کو شفا دینے کا اور دوسری جگہ دس کوڑھوں کو" جب وہ اس پہاڑ سے اترا تو بہت سی بھیڑیں اس کے پیچھے ہولی اور دیکھو ایک کوڑھی نے پاس آکر اسے سجدہ کیا اور کہا اے خداوند اگر تو چاہے تو مجھے پاک صاف کر سکتا ہے اس نے ہاتھ بڑھا کر اسے چھوا اور کہا میں چاہتا ہوں تو پاک صاف ہو جا، وہ فوراً کوڑھ پاک صاف ہو گیا، (متی ۸ : ۱، ۳) اور ایسا ہوا کہ یروشلم کو جاتے ہوئے وہ سامر یہ اور گلیل کے بیچ سے ہو کر جا رہا تھا اور گاؤں میں داخل ہوتے وقت دس کوڑھے اس نے انہیں دیکھ کر کہا جاؤ اپنے تئیں کاہنوں کو دکھاؤ اور ایسا ہوا کہ وہ جاتے جاتے پاک صاف ہو گئے (لوقا ۱۷ : ۱۱، ۱۴) انجیل کے جدید ناقدوں نے طرح طرح پر جرح کر کے پچھلی صدی میں اناجیل اربعہ کا گوشہ گوشہ مجروح کر ڈالا ہے لیکن اتنے جرح پر یہ ناقدین بھی متفق ہیں کہ مسیح کے معجزات شفا بخش ثابت شدہ ہیں (ملاحظہ ہو انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا ج ۱۵ ص ۶۲) نیز انسائیکلوپیڈیا ببلیکا جو خاص انہی تنقیدات کے لیے ہے اس کا کالم ۵۴۴۲ برنابا حواری کی جو انجیل چلی آ رہی ہے اس میں تو معجزہ احیاء اموات کی تصریح بھی موجود ہے (ص ۲۴۷، ۴۴۱) انگریزی ایڈیشن)

[1] افادات شیخ الاسلام

رہیں اور انجیلیں جو موجودہ مسیحیوں کو مسلم اور ان کے نزدیک مستند ہیں وہ بھی اس ذکر سے خالی نہیں بلکہ ان میں متعدد مثالیں اس قسم کے معجزہ کی مذکور ہیں چنانچہ لوقا جو یونان میں طبیبت کی حیثیت سے مشہور تھے ان کی جانب منسوب انجیل میں یہ درج ہے۔ تھوڑے عرصے کے بعد ایسا ہوا کہ وہ نائین نامی ایک شہر کو گیا اور اس کے شاگرد اور بہت سے لوگ اس کے ہمراہ تھے جب وہ شہر کے پھاٹک کے نزدیک پہنچا تو دیکھا ایک مُردے کو باہر لیے جاتے تھے۔ وہ اپنی ماں کا اکلوتا تھا اور وہ بیوہ تھی اور شہر کے بہتیرے لوگ اس کے ساتھ تھے اسے دیکھ کر خداوند کو ترس آیا اور اس سے کہا رو نہیں، پھر اس نے پاس آکر جنازے کو چھوا اور اٹھانے والے کھڑے ہو گئے اور اس نے کہا اے جوان میں تجھ سے کہتا ہوں اُٹھ وہ مردہ اُٹھ بیٹھا اور بولنے لگا اور اس نے اسے اس کی ماں کو سونپ دیا اور سب پر دہشت چھا گئی (لوقا ۷ : ۱۱، ۱۶) نیز (۷ ، ۲۲) انجیل متی (۹ : ۱۸ ، ۲۵) میں ایک تازہ میت (ایک سردار کی لڑکی) کے جلا اٹھانے کا ذکر ہے اور انجیل یوحنا (۱۱ : ۱ ، ۴۴) میں بڑی تفصیل کے ساتھ ایک چار روز کے دفن شدہ مردہ لعزر کے احیاء کا[1]

عقیدۂ معجزات کی قرآنی اصلاح :

عام لوگوں میں انبیاء کی نسبت یہ عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ براہ راست عالم کائنات میں تصرف پر قادر ہیں۔ چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو جس طریقے سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسیٰ کے قبضہ وقدرت میں تھی اور وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کر سکتے تھے یہی بنیادی تعبیر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے پورے دین کی دیوار کج کھڑی کی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن نے نہایت شدت سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات پیغمبر کی قوت اور ارادہ سے نہیں بلکہ اللہ کی مشیت ارادے اور حکم سے ظاہر ہوتے ہیں یہاں جگہ باذن اللہ کی قید لگی ہوئی ہے اور دوسرے موقعہ پر قرآن نے سب سے زیادہ واضح طور پر بتایا ہے کہ۔

---

[1] تفسیر ماجدی

وما كان لرسول ان ياتي باية الا باذن الله۔
کسی رسول میں یہ قدرت نہیں کہ وہ خدا کے حکم کے بغیر کوئی نشانی لائے۔

انجیلوں میں حضرت عیسیٰ کے معجزات جس عبارت اور لب ولہجہ میں بیان ہوئے ہیں ان کا صاف منشا یہ ہے کہ گویا حضرت عیسیٰ کو تمام کائنات کی بادشاہی سپرد کردی گئی ہے اس لیے وہ خاص اپنی قدرت کاملہ اور اختیار سے جو چاہتے تھے کر دیتے تھے لیکن قرآن عزیز نے اس ذہنیت کو قبول نہیں کیا۔ اس نے حضرت عیسیٰ کے تمام معجزات کو بیان کر دیا ہے مگر اس کے ساتھ اس عقیدۂ باطلہ کو بھی رد کرتا گیا ہے اور نہایت تصریح کے ساتھ یہ ظاہر کر دیا کہ جو کچھ ہوا ہے وہ اللہ کے حکم، اس کے ارادے اور قدرت سے ہوا ہے اس میں حضرت عیسیٰ کی قدرت اور طاقت کا کوئی دخل نہیں۔ قرآن حکیم کے اسی اظہار حقیقت اور خالص تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام میں توحید اور نبوت کی حقیقتیں کبھی مشتبہ نہیں ہوئیں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میں الوہیت کا ادنی سا شائبہ بھی مسلمانوں کی علمی اور فکری قوت نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ مشتے نمونہ از خروارے یہاں کچھ اہل علم کی تصریحات ہدیۂ ناظرین کرتا ہوں تاکہ اندازہ ہو سکے کہ اسلام نے دنیا کے مذاہب کے مقابلہ میں توحید کے چہرے کے تقدس کی کیسی حفاظت کی ہے۔

کمال الدین محمد ابن ابی شریف المتوفی ۹۰۵ تحریر فرماتے ہیں:

بلاشبہ معجزہ صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہے۔ (المسامرہ ج ۲ ص ۸۹)

علامہ قاضی عضد الدین عبدالرحمان بن احمد الحنفی المتوفی ۷۵۶ رئیس المتکلمین معجزہ کی شرائط بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

پہلی شرط یہ ہے کہ معجزہ اللہ کا فعل ہو۔

اور پھر آگے معجزے کے حصول کی کیفیت بیان کرتے ہوئے بحث ثانی میں اپنا مذہب بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

معجزہ ہمارے نزدیک فاعل مختار اللہ سبحانہ، کا فعل ہے جسے وہ اس شخص کے ذریعے ظاہر کرتا ہے جس کی نبوت کی اپنی مشیت سے تصدیق کرنا چاہتا ہے۔

علامہ جلال الدین دوانی المتوفی ۹۰۷ معجزہ پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

معجزے کی سات شرطیں ہیں۔ اول یہ ہے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے
(شرح عقائد عضدیہ ص ۹)

اہل السنۃ والجماعت کے مشہور امام توربشتی حنفی لکھتے ہیں :
انبیاء کے معجزات کو اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی صادر نہیں کر سکتا ہے ۔ (معتمد فی المعتقد)
مولانا سید اولاد حسن قنوجی شاگرد رشید شاہ عبد العزیز فرماتے ہیں ۔
معجزہ کا صادر کرنا اور ایمان کا قبول کرنا نبی کی خواہش اور اختیار سے نہیں ہوتا ۔
تاوقتیکہ اللہ نہ چاہے اور ارادہ نہ کرے وہ واقع نہیں ہوتا ۔
حضرت مولانا شاہ عبد الحق محدث دہلوی تحریر فرماتے ہیں ۔
معجزہ نبی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جس کو نبی کے ہاتھ پر وہ ظاہر کرتا ہے ۔ برخلاف دیگر افعال کے کہ اس میں کسب بندہ کی جانب سے اور خلق خدا تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے ۔ معجزہ میں کسب بھی بندہ کی طرف سے نہیں ہوتا ۔ (مدارج النبوۃ جلد ۲ ص ۱۱۶)
حضرت مولانا اسماعیل شہید خوارق پر بحث کرتے رقمطراز ہیں ۔
اس کا بیان اس طرح ہے کہ حق تعالیٰ اپنے مقبول بندوں میں سے کسی کی تصدیق کے لیے اپنی قدرت کاملہ سے عالم تکوین میں کوئی عجیب و غریب تصرف فرمایا ہے نہ یہ کہ خرق عادت صادر کرنے کی قدرت اس مقبول بندے میں ایجاد فرما دیتا ہے اور اس کو اس کے اظہار پر مامور فرما دیتا ہے حاشا وکلا معاملہ یوں نہیں ہے کیونکہ عالم تکوین میں قدرت تو صرف اللہ کی ہے اور بس ۔ (منصب امامت)
بہر حال اسلام کی علمی نمائندگی کرنے والوں نے توحید اور نبوت کی حقیقتوں کو کبھی مشتبہ نہیں ہونے دیا ۔ اور یہ سب کچھ قرآن میں باذن اللہ کی قید سے انہوں نے اخذ کیا ۔ چونکہ انجیل میں اس قسم کی تصریحات موجود نہ تھیں اس لیے حضرت عیسیٰ کے بارے میں مختار کل اور تصرفات کونیہ میں اقتدار کا تصور پیدا ہو گیا ۔

حضرت عیسیٰ کا معجزۂ علمی

۱۰۱ ۔ جو کچھ تم کھاتے ہو اور جو کچھ ذخیرہ رکھتے ہو گھروں میں سب تمہیں بتا دوں آئندہ کے لیے یعنی بعض مغیبات ماضیہ و مستقبلہ پر تم کو مطلع کرتا ہوں ۔ عملی معجزات کے بعد یہ ایک علمی معجزہ ذکر کر دیا ہے بلاشبہ اس میں تمہارے لیے بڑی نشانی ہے اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے

ہو یعنی یہ علامات تم کو اس امر کا اطمینان دینے کے لیے کافی ہیں کہ میں اس خدا کا رسول ہوں جو کائنات کا خالق اور حاکم ذی اقتدار ہے بشرطیکہ تم حق کو ماننے کے لیے تیار رہو ہٹ دھرم نہ ہو[1]

یہ بھی حضرت مسیح کا معجزہ تھا اور معجزات مدار نبوت نہیں بلکہ ثمرہ نبوت ہیں۔ مولانا محمد قاسم فرماتے ہیں کہ مدار نبوت تین باتیں ہیں اول یہ کہ محبت اور اخلاق خداوندی اس قدر ہو کہ ارادہ معصیت کی گنجائش ہی نہ ہو۔ دوسرے یہ کہ وہ اخلاق حمیدہ کے ساتھ موصوف ہوں۔ تیسری حالت عقل وفہم ہے۔ الغرض اصل نبوت دو باتوں کی مقتضی ہے کہ فہم سلیم اور اخلاق حمیدہ ہوں رہے معجزات تو وہ نبوت کے بعد عطا فرمائے جاتے ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ جو اظہار معجزات میں اول ہو اسے نبوت مل گئی ورنہ ناکام رہا۔ معجزات عملی ان کو کہتے ہیں کہ کوئی شخص دعوئے نبوت کرکے ایسا کام کر دکھائے کہ سب اس کام کے کرنے سے عاجز آ جائیں اور معجزہ علمی اس کا نام ہے کہ کوئی شخص دعوئے نبوت کرکے ایسے علوم ظاہر کرے کہ دوسرے افراد اس کے مقابلہ میں عاجز آ جائیں[2] حضرت عیسیٰ کا یہ معجزہ علمی، صوری اور وقتی ہے۔

(بقیہ حاشیہ[1]) افادات شیخ الاسلام

[1] تفہیم القرآن [2] حجۃ الاسلام

وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَلِاُحِلَّ لَكُمْ بَعْضَ
الَّذِيْ حُرِّمَ عَلَيْكُمْ وَجِئْتُكُمْ بِاٰيَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ
اَطِيْعُوْنِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ رَبِّيْ وَ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوْهُ
هٰذَا صِرَاطٌ مُّسْتَقِيْمٌ ۝

اور میں تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں اس تعلیم و ہدایت کی جو تورات میں سے میرے سامنے موجود ہے[۱۰۲] اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے کچھ ان چیزوں کو حلال کردوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں[۱۰۳] دیکھو میں تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے پاس نشانی لے کر آیا ہوں[۱۰۴]۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری طاعت کرو۔ یقین جانو میرا رب اور تمہارا رب صرف اللہ ہے اس لیے تم اسی کی بندگی اختیار کرو یہی صراط مستقیم ہے[۱۰۵]

حضرت عیسیٰ کا مشن اور ان کی دعوت:

پہلی آیت میں حضرت عیسیٰ کی نبوت کے دلائل پیش کیے گئے اس آیت میں دعوتِ نبوت کے مقاصد کو پیش کیا جارہا ہے اور بتایا ہے کہ میری دعوت کی تین خصوصیتیں ہیں۔
اولاً میں اپنے سے پہلی نبوت اور اس کی تعلیمات کی تکذیب نہیں بلکہ تصدیق کرنے

آیا ہوں۔ یہ میرے خدا کا فرستادہ ہونے کا ایک واضح ثبوت ہے۔ اگر میں اللہ کا نبی نہ ہوتا بلکہ بناوٹی ہوتا تو خود ایک نئی راہ پیش کرتا لیکن میں تو اسی اصل دین کو مانتا ہوں اور اسی کی تصدیق کر رہا ہوں جو خدا کی طرف سے اس کے پیغمبر مجھ سے پہلے لائے ہیں۔ حدیث میں ہے الانبیاء اخوۃ من علات وامہاتہم شتی سارے نبی علاتی بھائی ہوتے ہیں جن کا باپ ایک ہوتا ہے اور مائیں مختلف ہوتی ہیں اسی کا نام اخوت نبوت ہے۔ یہ تمام اخوتوں سے بالاتر اخوت ہے۔ ان میں محبت و انس کے وہ جذبات نظر آتے ہیں کہ ہر نبی کو پہلے کے ساتھ ایسی الفت و محبت ہوتی ہے کہ گویا وہ اب زندہ موجود ہیں۔ ایک سعید لڑکا بھی کچھ عرصے کے بعد اپنے والد کی یاد اس طرح تازہ نہیں رکھ سکتا جس طرح ایک نبی دوسرے نبی کی تصدیق کے ذریعے یاد تازہ کرتا رہتا ہے۔ بلکہ النبوات میں حافظ ابن تیمیہ رقم طراز ہیں کہ ہر نبی جس طرح دوسرے نبی کا مصدق ہوتا ہے۔ اسی طرح وہ اس کے معجزات کا بھی مصدق ہوتا ہے اور ان کا پورا پورا احترام کرتا ہے۔

ثانیاً، جو بوجھ بنی اسرائیل کے سروں پر پڑ گیا تھا۔ ان کو ہٹانے آیا ہوں۔ یہ بوجھ کیا تھا، مذہبی احکام کی سختیاں، زندگی کی پابندیاں۔ اس تبدیلی کو تغلیط نہیں بلکہ نسخ کہتے ہیں۔ یہ رسول کا اپنا فعل نہیں ہوتا۔ یہ حق تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے وہ جو احکام چاہتا ہے نازل فرما دیتا ہے اس لیے یہ کہنا بھی بالکل درست ہے کہ رسولوں کے علوم میں مطلقاً کوئی اختلاف نہیں ہوتا نہ اصول میں اور نہ فروع میں۔

ثالثاً، میں علم کے ساتھ عمل کا محسوس پیمانہ لے کر آیا ہوں۔ اسی کو یہاں آیت اور پارہ ۲۵ میں حکمت کہا گیا ہے۔ حکمت کے معنے لغت میں دانائی کی بات کے آتے ہیں مگر یہاں اس سے کیا مقصود ہے وہ علم صحیح جس کے نتیجہ میں عمل نافع رونما ہو۔ اسی وجہ سے امام شافعی نے حکمت سے مراد سنت بتائی ہے۔

ان تین خصوصیات کے ذکر کے بعد حضرت عیسیٰ نے بنی اسرائیل کو دو باتوں کی دعوت دی ہے۔

اول یہ کہ متقیانہ سیرت پیدا کرو اور میری طاعت کرو۔ دوسرے یہ کہ پوری زندگی میں توحید عبادت کو اپناؤ۔ دونوں کا حاصل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے نمائندے کی حیثیت سے میری طاعت کی جائے اور رب ہونے کی حیثیت سے بندگی کے سارے اطوار اللہ کے لیے خاص کر دیے جائیں۔

حضرت مسیح شریعتِ موسوی کے متمم ہیں :

۱۰۲۔ اور میں تصدیق کرنے والا بن کر آیا ہوں اس تعلیم و ہدایت کے لیے جو تورات سے میرے سامنے موجود ہے ۔یعنی میں تورات کی تصدیق کرنے آیا ہوں ۔یہ یاد دلانے کی وجہ یہ ہے ۔ کہ نبیوں کی وساطت سے نبیوں کی امتوں سے اللہ نے یہ عہد لیا تھا کہ تم کتاب و حکمت کے حامل ہو۔ تمہارے پاس جب کوئی نبی کتاب و حکمت کا مصدق بن کر آئے تو اس پر ایمان لانا تمہاری ذمہ داری ہے کیونکہ انبیاء علیہم السلام باہم متحد ہوتے ہیں اور ایک دوسرے کے مصدق اور معین و مددگار ہوتے ہیں انبیاء کی مثال ایسی ہے جیسے کہ ایک بادشاہ ایک ذات میں دو گورنر دو صوبوں میں روانہ کرے تو ہر گورنر پر دوسرے گورنر کے عمل اور اس کی حکمت کی تصدیق اور عند الضرورت اس کی نصرت و اعانت ضروری ہے ۔ اگرچہ دونوں صوبوں کے قوانین اور احکام جزئیہ میں کچھ اختلاف ہو لیکن حکومت کے دستور اساسی میں دونوں متفق ہوتے ہیں ۔ اپنے آپ کو مصدق کہہ کر یہ بتایا ہے کہ میں کوئی نئے دین کی دعوت نہیں دے رہا ہوں ۔ میں شریعت موسوی کو مٹانے نہیں بلکہ اس کی تجدید و تصدیق کے لیے آیا ہوں ۔ یہ بات جس انداز میں یہاں کہی گئی ہے یہ انداز عربی میں کسی بات میں زور پیدا کرنے کے لیے لایا جاتا ہے ۔گویا حضرت مسیح نے بڑے زور اور تاکید سے یہ بات کہی ہے کہ میں تورات کی تردید کرنے نہیں آیا ہوں بلکہ اس کی تائید و تصدیق کرنے آیا ہوں ۔اس قسم کی تصریحات خود مروجہ انجیلوں میں بھی موجود ہیں ۔مثلاً یہ نہ سمجھو کہ میں تورات یا نبیوں کی کتابوں کو منسوخ کرنے آیا ہوں منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں (متی ۵ : ۱۵) آسمان و زمین کا ٹل جانا شریعت سے مراد شریعت موسوی ہی ہوتی ہے ۔

تورات کے کچھ احکام میں تبدیلی :

۱۰۳۔ اور اس لیے آیا ہوں کہ تمہارے لیے کچھ ان چیزوں کو حلال کر دوں جو تم پر حرام کر دی گئی تھیں ۔یعنی تورات کے عام اصول و احکام کو بحال رکھتے ہوئے زمانے کے مناسب حق تعالیٰ کے حکم سے چند جزئی و فرعی تغیرات کروں گا ۔مثلاً بعض احکام میں پہلے جو سختی تھی وہ اب اٹھا دی جائے گی اس کا نام نسخ رکھ لو یا تکمیل اختیار ہے لیے قرآن میں اسی بات کو دوسرے

موقع پر اس طرح پیش کیا ہے۔ ولابین لکم بعض الذی تختلفون فیہ میں تمہارے لیے ان باتوں کو واضح کرنے آیا ہوں جن کے بارے میں تم اختلاف کر رہے تھے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جن چیزوں کو حضرت مسیح نے حلال کیا ہے ان کا تعلق ان چیزوں سے ہے جن کی حلت و حرمت میں علماء یہود کا باہم اختلاف تھا اور یہ اختلاف اصل شریعت میں قیدوں کے اضافہ سے پیدا ہوا تھا۔ اس طرح اس ارشاد الٰہی کی تفسیر میں دو روایتیں ہیں ایک تو وہ ہے جسے حضرت شیخ الاسلام عثمانی نے اختیار کیا ہے اور جسے تابعین میں سے حضرت قتادہ نے پیش کیا ہے اور دوسری رائے یہ ہے کہ جن چیزوں کو بنی اسرائیل کے متشدد علماء نے لوگوں پر حرام کر رکھا تھا اور اس میں ان میں باہم اختلاف تھا۔ ان کو حضرت مسیح نے حلال کر دیا۔ مثلاً سبت کے احترام کا مسئلہ اس قدر اہمیت اختیار کر گیا تھا کہ اس دن کسی بیمار کو شفا کی دعا دینی بھی حرام اور احترام سبت کے خلاف تھی۔ لیکن ہماری رائے میں پہلی تشریح زیادہ اچھی ہے کہ واقعی تورات کے کچھ احکام میں حضرت مسیح نے تغیر اور تبدیلی فرمائی ہے۔ اس وقت بھی اناجیل میں باوجود اس اقرار کے کہ میں تورات کو منسوخ کرنے نہیں آیا ہوں۔ تورات کے بعض احکام کے خلاف احکام موجود ہیں اور ان الفاظ سے کہ میں تورات کو منسوخ کرنے نہیں آیا یہ بتانا تھا کہ تورات بطور بنیاد قائم رہے گی لیکن کچھ تغیر و تبدیلی بدلتے ہوئے حالات کے لحاظ سے ہوگی۔ اور یہ تورات کی تصدیق کے منافی نہیں ہے کیونکہ بقول صاحب روح نسخ کے معنے ابطال حکم کے نہیں بلکہ انتہاء مدت کو بیان کرنے کے ہیں۔

جن لوگوں نے آیت میں دوسرے معنے اختیار کیے ہیں ان کے پیش نظر عیسائی دنیا کی یہ تصریح ہے جس میں تورات کے سب احکام منسوخ ہونے کا اعلان ہے۔ چنانچہ اظہار الحق میں مولانا رحمت اللہ کیرانوی فرماتے ہیں۔

حواریوں نے کامل مشورے کے بعد تورات کے جملہ احکام منسوخ کر دیے سوائے چار کے یعنی بت کا ذبیحہ، خون، گلا گھونٹا ہوا جانور، زنا، ان چاروں کی حرمت باقی رکھی اس سلسلے میں تمام گرجوں کو ہدایت کر دی گئی۔ جو کتاب اعمال کے باب ۱۵ میں منقول ہیں اور اس کی بعض آیات یہ ہیں۔

(بقیہ حاشیہ از افادات شیخ الاسلام

کیونکہ روح القدس نے اور ہم نے مناسب جانا کہ ان ضروری کے سوا تم پر اور
بوجھ نہ ڈالیں کہ تم بتوں کی قربانیوں کے گوشت سے اور لہو سے اور گلا گھونٹے جانوروں
اور حرام کاری سے بچو۔ آیات ۲۸ تا ۲۹

اور ان چاروں چیزوں کی حرمت بھی صرف اس لیے باقی رکھی گئی کہ وہ نو مرید یہودی جو ابھی ابھی عیسائی ہوئے تھے بالکل متنفر نہ ہو جائیں، جو تورات کے احکام اور اس کے طریقوں کو اب بھی محبوب جانتے تھے، پھر جب کچھ عرصہ کے بعد پولس نے یہ اطمینان کر لیا کہ اب یہ رعایت ضروری نہیں ہے تو پہلے تین احکام کو بھی اسی عام فتویٰ کے ذریعے منسوخ کر دیا جس کا ذکر مثال نمبر ۲ میں گزر چکا ہے اور جس پر تمام پروٹسٹنٹ لوگوں کا اجماع ہے، اب تورات کے عملی احکام میں سے زنا کی حرمت کے علاوہ کوئی اور حکم باقی نہیں رہا اور چونکہ شریعت عیسوی میں زنا کے لیے کوئی شرعی سزا مقرر نہیں کی گئی ہے اس لیے عملاً یہ بھی منسوخ ہی ہو گیا۔ نتیجتہً شریعت عیسوی کے ذریعے ان تمام عملی احکام کا نسخ مکمل ہو گیا جو شریعت میں چلے آ رہے تھے۔ خواہ وہ ابدی اور دوامی ہوں یا غیر ابدی۔

گلتیوں کے نام خط باب ۲ آیت ۲۰ میں پولس کہتا ہے کہ

"میں مسیح کے ساتھ مصلوب ہوا ہوں، اور اب میں زندہ نہیں رہا بلکہ مسیح مجھ میں زندہ ہے اور میں جو اب جسم میں زندگی گزارتا ہوں تو خدا کے بیٹے پر ایمان لاتے سے گزارتا ہوں جس نے مجھ سے محبت رکھی ہے اور اپنے آپ کو میرے لیے موت کے حوالے کر دیا، میں خدا کے فضل کو بیکار نہیں کرتا کیونکہ راستبازی اگر شریعت کے وسیلہ سے ملتی تو مسیح کا مرنا عبث ہوتا۔

ڈاکٹر ہمنڈ آیت ۲۰ کی شرح میں کہتا ہے کہ :

"میرے لیے اپنی جان دے کر مجھ کو موسیٰ کی شریعت سے رہائی بخشی"

اور آیت ۲۱ کی شرح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ

"اس نے اس آزادی کو اس لیے اختیار کیا اور مجھ کو نجات کے معاملے میں موسیٰ کی شریعت پر کوئی اعتماد نہیں ہے اور میں موسیٰ کے احکام کو ضروری نہیں سمجھتا، کیونکہ یہ چیز ساری انجیل کو بے فائدہ بنانے والی ہے"۔

ڈاکٹر وٹ بی آیت ۲۱ کی شرح کرتے ہوئے کہتا ہے کہ :

"اگر ایسا ہوتا تو نجات کو موت کے ذریعہ حزید نا ضروری نہ ہوتا اور نہ ایسی موت میں کوئی

خوبی ہو سکتی ہے۔"

اور بابل کہتا ہے کہ :

"اگر یہودیوں کی شریعت ہماری نجات اور عصمت کا ذریعہ ہوتی تو پھر عیسٰی کو جان دینے کی کیا ضرورت تھی، اور اگر یہ شریعت ہماری نجات کا عوض ہے تو پھر مسیح کی موت اس کے لیے کافی نہ ہوگی۔

یہ تمام اقوال اس امر کی شہادت دے رہے ہیں کہ موسیٰ کی شریعت کمل طور پر منسوخ ہو چکی ہے۔

اسی خط کے باب میں کہا گیا ہے کہ :

"جتنے شریعت کے اعمال پر تکیہ کرتے ہیں وہ سب لعنت کے ماتحت ہیں۔"

"شریعت کے وسیلے سے کوئی شخص خدا کے نزدیک راستباز نہیں ٹھہرتا۔"

"شریعت کو ایمان سے کچھ واسطہ نہیں۔"

"مسیح جو ہمارے لیے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا۔"

لارڈ اپنی تفسیر کی جلد ۹ کے صفحہ ۴۸۷ میں ان آیات کو نقل کرنے کے بعد کہتا ہے :

"خیال یہ ہے کہ اس موقع پر حواری کا مقصد یہ ہے جس کو اکثر لوگ سمجھتے ہیں، یعنی شریعت منسوخ ہو چکی ہے۔ یا کم از کم مسیح کی موت اور اس کے سولی پانے کی وجہ سے بیکار ہو گئی ہے۔

پھر اسی جلد کے صفحہ ۴۸۷ پر کہتا ہے کہ

"حواری نے اس موقع پر صاف واضح کر دیا ہے کہ عیسٰی کی موت کا نتیجہ شریعت کے مقررہ احکام کی منسوخی ہے۔"

اسی فکری آوارگی سے بچنے کے لیے یہ معنے اختیار کیے کہ یہودی علماء کی قانونی موشگافیوں نے ہمات اور ان کے مسائل کے بارے میں فکری اختلافات نے جو نارروا پابندیاں عائد کر رکھی تھیں ان کو حضرت مسیح نے ہٹایا ہے۔

توراۃ و انجیل کا تقابلی مطالعہ :

۱۰۴۔ دیکھو میں تمہارے پروردگار کی جانب سے نشانی لے کر آیا ہوں۔ اصل ارشاد میں آیۃ آیا ہے جب کہ پارہ ۲۵ میں آیت میں لفظ آیت کی جگہ حکمۃ آیا ہے

اس آیت قرآنی میں حضرت عیسیٰ، انجیل و تورات کی باہم نسبت بتا رہے ہیں کہ تورات اگر شریعت ہے تو جو کچھ میں لے کر آیا ہوں وہ حکمت ہے۔ یا قرآن ہی کے لفظوں میں یوں کہہ دو کہ تورات اگر ہدایت و نور ہے تو انجیل ہدایت و موعظت ہے۔ یا یوں کہو کہ تورات اگر قانون ہے تو انجیل اخلاق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور برائیوں کے انسداد کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں قانون اور اخلاق اگرچہ دونوں کا منشا ایک ہے مگر ان کے منزل مقصود تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں تنہا ان میں سے ہر ایک میں کمی ہے جس کی تلافی ایک دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روک سکتا ہے۔ مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس کے ذریعے عدل و انصاف کا قیام اور برائیوں کا انسداد کلیتہً نہیں ہو سکتا تورات محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق ہے۔ حضرت مسیح نے اس آیت میں اسی کی طرف متوجہ کیا ہے کہ تورات کی شریعت کا مصدق ہوں لیکن اللہ کی جانب سے اس کی حکمت لے کر آیا ہوں اس لیے تمہارا فرض ہے۔ کہ قانون و حکمت کے قائم کرنے کے لیے تیار ہو جاؤ میں مسیح کے ساتھ خانقاہ، قانون کے ساتھ اخلاق کی طرف متوجہ کرنے آیا ہوں۔

اللہ کی عبادت اور نبی کی طاعت:

۱۰۵۔ لہٰذا اللہ سے ڈرو اور میری طاعت کرو۔ یقین مانو میرا رب اور تمہارا اللہ ایک ہی ہے بس اسی کی بندگی اختیار کرو یہی صراط مستقیم ہے۔ یعنی جب میری صداقت تمہارے سامنے کھل کر آ گئی تو اب اللہ سے ڈر کر میرا کہا مانو۔ اور سب باتوں کی اور سب معاملہ کی بس کی گانٹھ یہ ہے کہ حق تعالیٰ کو میرا اور اپنا رب سمجھو۔ باپ بیٹے کا رشتہ قائم نہ کرو اور اسی کی بندگی کرو۔ سیدھا راستہ رضائے الٰہی تک پہنچنے کا یہ ہی توحید تقویٰ اور پیغمبر کی طاعت ہے[1]

یہ آیت علمی زندگی کے لیے دو اور علمی کے لیے ایک رہنما اصول پیش کر رہی ہے۔ علمی زندگی کے لیے آیت سے بنیادی اور اہم بات یہ معلوم ہو رہی ہے کہ بندہ اور اللہ کا تعلق اب

[1] افادات شیخ الاسلام

باپ کا نہیں بلکہ رب کا ہے۔ موجودہ انجیلوں میں خدا کے لیے میرا باپ اور تمہارا باپ کی جو تعبیر آئی ہے یہاں قرآن حضرت مسیح کی زبان سے ربی و ربکم کہہ کر اسی کی تصحیح کر رہا ہے۔ کہ حضرت مسیح نے جو کچھ فرمایا تھا وہ اب یعنی باپ نہیں بلکہ رب ہے۔

اب اور رب کا تقابلی مطالعہ

اب یعنی باپ اور رب ان دونوں لفظوں کا باہمی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں کا تخیل حضرت مسیح کے مطمع نظر سے کس درجہ پست ہے۔ باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی صورت میں بچپن کے ایک محدود عرصہ تک قائم رہتا ہے اس طرح گویا باپ کو بیٹے کے وجود میں ایک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے۔ مگر یہ تعلق صد درجہ ناقص محدود اور وقتی ہوتا ہے بیٹے کے وجود، قیام و بقا، ضروریات زندگی، سامان حیات، نشوونما اور ارتقاء کسی چیز میں باپ کی ضروریات نہیں ہوتی۔ وہ اپنے باپ سے الگ مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے۔ مگر ذرا غور کرو کیا عبد و معبود، خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور ایک لمحہ کے لیے بھی بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے کیا یہ تعلق باپ اور بیٹے کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہے۔

الوہیت عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک، پیدائش سے وفات تک بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے۔ جو ایک لمحہ کے لیے منقطع نہیں ہو سکتا جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے وہ گہوارۂ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے۔ انسان ذرہ ہو یا بصورت غذا، قطرۂ آب ہو یا قطرۂ خون مضغۂ گوشت ہو یا مشت استخوان شکم مادر میں ہو یا اس سے باہر، جوان، ادھیڑ ہو یا بوڑھا، کوئی آن کوئی لمحہ رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے الفاظ سے مادیت جسمانی، ہم جنسی اور برابری کا جو تصور پیدا ہوتا ہے اس سے لفظ رب یک قلم پاک ہے۔ اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں جن میں نصرانیت اور ہندوبیت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

عملی زندگی کے لیے اس آیت سے جو رہنما اصول معلوم ہوا ہے وہ اللہ کی عبادت اور اللہ

کے رسول کی طاعت ہے۔

اللہ کی عبادت تمام نبیوں کا نصب العین رہا ہے اور جب حقیقت یہ ہے تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ ان حضرات نے بحیثیت نبی جو کچھ بھی بتایا اور سکھایا وہ سارے کا سارا کام عبادت تھا جس عبادت کا اس آیت میں حکم دیا گیا ہے اور جو تمام انبیاء کا مشترکہ مشن ہے۔ اس کا مفہوم و مدعا کیا ہے؟ حافظ ابن تیمیہ نے اس پر ایک رسالہ نامی العبودیت میں اچھی بحث فرمائی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

> عبادت ایک جامع لفظ ہے اس کے اندر وہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال اور اقوال داخل ہیں جو اللہ تعالےٰ کو پسند ہیں اور جو اس کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں۔ مثلاً نماز روزہ، زکوٰۃ، حج، راست گوئی، امانت داری، صلہ رحمی، دیانت، اطاعت والدین وفائے عہد، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ، پڑوسیوں اور یتیموں اور مسکینوں اور مملوکوں کے ساتھ چاہے یہ مملوک انسان ہوں یا حیوان اچھا سلوک ذکر الٰہی، دعاء، تلاوت قرآن اور اسی قسم کے تمام اعمال صالحہ عبادت کے اجزاء ہیں۔ اسی طرح اللہ کی اور اس کے رسول کی محبت رحمت خداوندی کی امید اور عذاب الٰہی کا خوف، خشیت، امانت، اخلاق، صبر، شکر، توکل اور تسلیم ورضا وغیرہ ساری اچھی صفات عبادت میں شامل ہیں۔ (العبودیۃ ص ۲) آگے چل کر ایک جگہ فرماتے ہیں:-
>
> ان نصوص سے جہاں ایک طرف یہ حقیقت روشنی میں آتی ہے کہ عبدیت کسی مخلوق کے شرف و مجد اور اس کی سعادت کی معراج کمال ہے وہاں دوسری طرف یہ امر بھی بے نقاب ہو جاتا ہے کہ دین اپنے تمام اجزاء کے ساتھ عبادت میں داخل ہے سارے انبیاء اللہ کا دین سکھانے آئے تھے جیسا کہ قرآن میں کئی جگہوں پر اس کی صراحت موجود ہے۔ اور پھر ہر نبی نے اپنے مخاطب لوگوں کو فاعبدوا اللہ کی ہدایت کی اس سے معلوم ہوا کہ دین اور عبادت ایک ہی مدعا کی دو تعبیریں ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ کی اس تشریح کے بعد اس میں کوئی شبہ نہیں رہتا کہ عبادت پورے دین کی پیروی کا نام ہے۔ دین کے کسی جزء کے بارے میں خواہ وہ از قسم پرستش ہو یا بندگی یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ عبادت کا کام نہیں ہے۔ امر حق یہ ہے کہ عبادت کا فریضہ ایک ایک حکم شریعت

کی پابجائی سے ہی ادا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک ایسی اکائی ہے جسے ہم تقسیم نہیں کر سکتے۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح انسانی وجود ایک مکمل وحدت ہے جسے مختلف وجودوں میں بانٹا نہیں جا سکتا قرآن نے جیسے عبادت کو انبیاء کا مشن بتایا ہے ایسے ہی اسے انسان کی زندگی کا مقصد قرار دیا ہے

عبادت کا نام آتے ہی فطری طور پر اللہ کے احکام اور مرضیات کا سوال سامنے آجاتا ہے ایک انسان جونہی اپنے پروردگار کا بندہ اور عبادت گزار بن کر رہنے کا فیصلہ کرے گا وہ لامحالہ یہ جاننا چاہے گا کہ اس کے رب کے وہ احکام کیا ہیں جن کی پابجائی کرکے اسے رب کی عبادت کرنی ہے؟ اور ان احکام و مرضیات جاننے کا ذریعہ کیا ہے؟ اس کے جواب میں آپ عقل و وجدان، اجتماعی غور و فکر کا نام لے سکتے ہیں۔ لیکن شان پروردگاری سے یہ بالکل بعید تھا کہ وہ انسان کی اس ضرورت کا سامان نہ کرے جس مالک نے انسان پر رب کی مرضی کی راہ چلنے کی ذمہ داری ڈالی تھی۔ اس کی رحمت اور اس کا انصاف یہ کیسے گوارا کرتا کہ وہ اسے اس راہ سے باخبر کرنے کا ضروری انتظام نہ کرتا۔ چنانچہ اس نے انتظام کیا۔ اس انتظام کا نام قرآن کی زبان میں رسالت ہے نبی کی اطاعت شرط ایمان اور مدار نجات ہے دین کے دائرے میں نبی جو کچھ کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چون و چرا نہ کرے خواہ اس کی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ نبی کی یہ حیثیت خود قرآن نے بتائی ہے۔

ہم رسول کو بھیجتے ہی اس لیے ہیں کہ اس کی اللہ کے حکم سے طاعت کی جائے۔

پھر یہ طاعت بھی ظاہر کی حد تک نہ ہونی چاہیئے بلکہ دل کی پوری رضا اور دماغ کے پورے شعور کے ساتھ ہونی چاہیئے۔ اور ایسا ہونا ضروری بھی ہے کیونکہ انسان اگر اللہ تعالےٰ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اگر اللہ کی عبادت کا طریقہ معلوم کرنے کا ہماری عقل انفرادی اور اجتماعی، ہمارے علوم و فنون ذریعہ نہیں بلکہ اس کے جاننے کا واحد ذریعہ رسالت ہے تو رسول کی کامل اطاعت کیے بغیر اللہ کی عبادت ممکن ہی نہیں ہے۔

بہر حال علمی و عملی زندگی میں یگانہ خدا کی عبادت اور عبادت کے لیے رسول کی اطاعت یہی دو عناصر ہیں جن کی باہم آمیزش سے صراط مستقیم وجود میں آتی ہے۔ اسی کو حضرت مسیح نے اس آیت میں صراط مستقیم فرمایا ہے۔

افسوس کہ عیسائی دنیا اسی صراط مستقیم کو قائم نہ رکھ سکی۔ توحید عبادت اور رسالت کے کاشانے

کو اسکندریہ کے فلسفہ آمیز اصنامی تخیل سراپئیر سے تثلیثی وحدت کی اصل لی گئی اور رایزیز کی جگہ حضرت مریم کو اور ہورس کی جگہ حضرت مسیح کو دی گئی اور اس کے نتیجے میں دامان توحید و رسالت دونوں ان کے ہاتھ سے نکل گئے۔ رب کی جگہ اب باپ اور عبد کی جگہ ابن بیٹے نے لے لی۔

آیت میں ربی و ربکم کہہ کر ایک طرف وفد نجران کو سمجھایا ہے کہ حضرت عیسیٰ کی تعلیم تو اصل یہ ہے کہ اللہ تمہارا اور میرا رب ہے اور تم اسے باپ بنا رہے ہو اور دوسری طرف ربوبیت سے اللہ کی الوہیت پر استدلال کی طرف اشارہ کر دیا۔ یعنی چونکہ اللہ ہی تمہارا اور میرا رب ہے اس لیے الٰہ اور معبود بھی اللہ ہی کو ہونا چاہیے نہ کسی اور کو۔

فَلَمَّآ اَحَسَّ عِيْسٰى مِنْهُمُ الْكُفْرَ قَالَ مَنْ اَنْصَارِيْٓ اِلَى اللّٰهِ ۭ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰهِ ۚ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ ۚ وَاشْهَدْ بِاَنَّا مُسْلِمُوْنَ ﴿﴾ رَبَّنَآ اٰمَنَّا بِمَآ اَنْزَلْتَ وَاتَّبَعْنَا الرَّسُوْلَ فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ﴿﴾

پھر جب ایسا ہوا کہ عیسٰی نے بنی اسرائیل میں اپنے خلاف کفر محسوس کیا[۵۰] تو وہ بول پڑے کون ہے جو اللہ کی راہ میں میری مدد کرتا ہے[۵۱]۔ اس پر حواریوں نے ان کی دعوت قبول کرتے ہوئے جواب دیا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں، ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور آپ گواہ رہیں کہ ہم اس کے فرمانبردار ہیں[۵۲] نیز انہوں نے کہا اے ہمارے مولیٰ جو کچھ تو نے نازل کیا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے اور ہم نے تیرے رسول کی پیروی کی ہے ہمارا نام بھی ان میں درج فرما لیجئے جو حق کی شہادت دینے والے ہیں[۵۳]۔

دعوتی اور فکری جہاد :

یہ وہ جہاد ہے کہ اس کے لیے وقت اور ماحول کی نہ کوئی قید ہے نہ کوئی شرط بلکہ

ہر حال میں ہر ماحول میں، ہر زمانے میں اور ہر جگہ پوری کی جانے والی ذمہ داری ہے اور ذمہ داری بھی ایسی جس کی نہ کوئی ابتداء ہے نہ کوئی انتہا جسے کبھی موقوف کیا ہی نہیں جا سکتا اور جب تک مسلح جہاد کے لیے ضروری حالات اور شرائط مہیا نہ ہو جائیں۔ جہاد حق کا سارا انحصار اسی پر رہتا ہے۔ چنانچہ اکثر انبیاء کی تاریخ بتاتی ہے کہ اُن کی نبوت کا پورا دور اسی جہاد تک محدود رہا اور مسلح جہاد کا وقت ہی نہیں آیا۔ اور واقعہ یہ ہے کہ بنیادی طور پر یہی دعوتی اور فکری جہاد دین کے ساتھ اصل جہاد ہے۔ مسلح جہاد تو ایک مجبوری کا نتیجہ ہے۔ یہ جہاد اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں اتنا اونچا مقام رکھتا ہے کہ وہ اسے اپنی مدد فرمانا ہے اور اس جہاد کرنے والوں کو اپنا مددگار دیتا ہے۔ یہی نصرت دین ہے اور اسی کا نام دعوت الی اللہ ہے

سب جانتے ہیں کہ حضرت عیسٰیؑ کی دعوت اس دور میں داخل ہی نہ ہو سکی تھی جو مسلح جہاد کا دور ہوتا ہے اور وہ تمام تر فکری و دعوتی جہاد ہی تک محدود رہی۔ اس کے باوجود ان کے حواریوں کو اللہ کے انصار (مددگار) کہا گیا۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ ان کو یہ عظیم ترین عزت کا خطاب جس وجہ سے ملا وہ صرف یہ تھی کہ انہوں نے اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچانے کا حق ادا کر دیا تھا۔ اس جگہ حق ادا کر دینے کے لفظوں کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے۔ ان کا مدعا یہ ہے کہ اللہ کے مددگار ہونے کا شرف اہل ایمان کو اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب وہ اس دین کو دوسروں تک پہنچانے میں اپنی فکر و کوشش کو پوری طرح لگا دیتے ہیں۔ جب وہ ناسازگار حالات میں بھی اپنی پکار بلند کرتے ہیں۔ جب وہ خطرات کے طوفانوں میں بھی خاموش نہیں رہتے۔ یہ صرف قیاس کی بات نہیں بلکہ زیر نظر آیت سے ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔ اس میں اس بات کی صراحت موجود ہے کہ حضرت عیسٰیؑ نے انصاری الی اللہ، کے الفاظ اپنے منہ سے اس وقت نکالے تھے جب ان کے مخاطب بنی اسرائیل نے ان کی دعوت کو ٹھکرا دیا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کے اللہ کے مددگار بننے کا فیصلہ اس وقت ہوتا ہے جب دین کی دعوت شدید مخالفتوں کی زد میں آجاتی ہے۔ جو لوگ اس وقت اللہ کی بات لوگوں تک پہنچانے کے لیے محنت کرتے ہیں وہی اللہ کے مددگار ہوتے ہیں۔

۱۰۶ پھر جب ایسا ہوا کہ عیسٰیؑ نے بنی اسرائیل میں اپنے خلاف کفر محسوس کیا یعنی انہوں نے حضرت عیسٰیؑ کا دین قبول نہ کیا بلکہ دشمنی اور ایذا رسانی کے در پے ہو گئے۔[1]

فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ جب حضرت عیسٰی علیہ السلام نے بنی اسرائیل کے علماء اور سرداروں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے رویہ سے یہ محسوس کر لیا کہ یہ لوگ ایمان لانے والے نہیں ہیں تو انہوں نے اپنی ساری توجہ کا مرکز اپنے ان ساتھیوں کو بنا لیا جو اگرچہ جاہ و منصب تو نہیں رکھتے تھے لیکن دولت ایمان سے مالا مال تھے انبیاء علیہم السلام کی یہ سنت رہی ہے کہ اول تو انہوں نے اپنی اپنی قوموں کے باثر لوگوں کو جھنجوڑنے اور جگانے کی کوشش کی ہے لیکن جب انہوں نے یہ دیکھ لیا کہ خواب غفلت کے متوالے کروٹ بدلنے والے نہیں ہیں تو انہوں نے ان کو ان کے حال پر چھوڑ کر اپنی ساری توجہ اپنے غریب اہل ایمان ساتھیوں پر مرکوز کر دی ہے۔ قرآن حکیم میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو کفار سے اعراض کرنے اور اہل ایمان کو تذکیر کرنے کی جو بار بار ہدایت ہوئی ہے۔ وہ اسی مرحلے کی بات ہے اور یہی مرحلہ ہے جس میں سیدنا مسیح علیہ السلام نے دریا کے کنارے ماہی گیروں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اے مچھلیوں کے پکڑنے والو آؤ میں تمہیں آدمیوں کا پکڑنے والا بناؤں۔ ؎

اس فقرے کی پیشانی پر حرف فا بڑی گہری معنویت رکھتی ہے گویا یوں کہا گیا ہے کہ پہلے جب سب کچھ ہو چکا بشارت ولادت، بعثت رسالت، دعوت اور راہ دعوت میں آپ نے ہر طریقہ استعمال کر لیا۔ دن اور رات کام کیا خلوت اور جلوت میں کام کیا اور ہر امکان، ہر انداز سے اُن تک کلمہ حق پہنچایا۔ ان سب باتوں کو کر گزرنے کے بعد جب حضرت عیسیٰ کو اپنے مخاطبوں میں اپنے خلاف معاندانہ میلانات اور کافرانہ اطوار کا صرف علم نہیں بلکہ بقول قاضی بیضاوی ان کا کفر اس درجہ نمایاں اور متحقق ہو گیا کہ حواس سے بھی اس کا ادراک ہونے لگا تو پھر بھی آپ نے مایوس ہو کر کام نہیں چھوڑا بلکہ اللہ کے دین کی برتری کے لیے جدوجہد جاری رکھی اور خدا کی راہ میں محنت کا رخ موڑ دیا۔

اللہ کے دین کی نصرت:

۱۰۷۔ تو وہ بول پڑا کہ کون ہے؟ جو اللہ کی راہ میں میرا مددگار ہے۔ یعنی میرا ساتھ دے اور دین الٰہی کے رواج دینے میں میری مدد کرے ؎

اصل ارشاد من انصاری الی اللہ انصار جمع نصیر کی ہے جیسے اشراف جمع شریف کی آتی ہے۔ میر اکہہ کر اشارہ کیا ہے کہ حالات میں اس قدر ناخوشگواری ہے کہ اس کام کا کرنے والا میں اکیلا ہوں میرا ساتھی کوئی نہیں ہے۔ اللہ کا لفظ منزل مقصود بتانے کے لیے ہے اور الی تک اور طرف

؎ تدبر قرآن ؎ افادات شیخ الاسلام

منزل مقصود کی مسافت کو ظاہر کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں اگرچہ تنہا ہوں لیکن میں نے اس راہ پر چلنے کا عزم کر لیا ہے۔ مجھے اس راستہ میں ساتھیوں کی ضرورت ہے کون ہے جو اس راہ میں میرا ساتھ دیتا ہے۔

آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ کے دین کے لیے نصرت کی دعوت دینا اور اس پر لوگوں کو آمادہ کرنا دین کا اہم تقاضا ہے۔ اسلامی تاریخ میں اوس و خزرج ایمان لائے تو انہوں نے اللہ کے دین کی مدد کی اور انصار کے لقب سے پکارے گئے۔

غیلان بن جریر کہتے ہیں کہ میں نے انس بن مالک سے دریافت کیا کہ آپ لوگ خود اپنے آپ کو انصار کے لقب سے پکارتے تھے یا اللہ تعالیٰ نے آپ کو یہ لقب دیا تھا۔ انہوں نے فرمایا۔ اللہ تعالیٰ نے ہمیں یہ لقب دیا ہے۔[1]

یہاں انصار سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کے دین کو برتر کرنے کے لیے نبوت کا ہاتھ بٹائیں ہجرت کا عمل تو ایک وقتی مطالبہ ہے لیکن دین کی نصرت وقتی نہیں بلکہ دائمی تقاضا ہے بلکہ اگر ذرا غور سے دیکھا جائے تو ہجرت بھی دین کی نصرت کا ایک عمل ہے۔ دین کی نصرت کرنے والوں کے لیے اللہ کے رسول نے ان الفاظ میں دعا کی ہے من نصر دین محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔ اگر آپ کسی کام پر پوری زندگی لگائیں۔ جان نچھاور کر دیں۔ ہر قسم کی قربانی کریں، اس کام میں اگر کوئی آپ کی مدد کرتا ہے تو بلاریب آپ کے دل سے اس کے لیے دعائیں نکلتی ہیں۔ نبوت کی یہ پکار ہر دور، ہر جگہ کے لیے من انصاری الی اللہ؟ جب بھی انسانی زندگی کا نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے رشتہ ٹوٹ جائے گا نبوت کی صدائے غریب یہی ہوگی۔

حواریوں کا جواب

۱۰۸۔ اس پر حواریوں نے کہا کہ ہم اللہ کے مددگار ہیں۔ ہم اس پر ایمان لائے ہیں اور آپ گواہ رہیں کہ ہم اس کے فرمانبردار ہیں۔ اللہ کی مدد کرنا یہی ہے کہ اس کے دین و آئین اور پیغمبروں کی مدد کی جائے۔ جس طرح انصار مدینہ نے اپنے پیغمبر علیہ السلام اور دین حق کی مدد کر کے دکھلائی۔ حواری کون لوگ تھے۔ یہ لقب ان کو کس وجہ سے ہوا۔ علماء کے بہت سے اقوال ہیں مشہور یہ ہے کہ

---

[1] بخاری مناقب انصار

پہلے وہ شخص جو حضرت عیسیٰ کے پیروکار ہوتے دھوبی تھے اور کپڑے صاف کرنے کی وجہ سے حواری کہلاتے تھے۔ حضرت عیسیٰ نے اُن سے کہا کہ کپڑے کیا دھوتے ہو آؤ میں تم کو دل دھونے سکھاؤں وہ ساتھ ہو لیے۔ پھر آپ کے سارے ساتھیوں کو حواری کہنے لگے۔ لہ

حواریین کا قرآنی چہرہ

دراصل عربی زبان میں اس کا مادہ ح و ر ہے۔ حور کے معنے پلٹنے کے ہیں خواہ پلٹنا بلحاظ ذات ہو یا بلحاظ فکر۔ پانی کے حوض میں گھومنے پر حار الماء فی الغدیر بولتے ہیں اور حار فی الامر کے معنی کسی معاملہ میں حیران ہونے کے ہیں۔ اسی سے محور اور محاورہ کے الفاظ بنے ہیں۔ تحویر کے معنے سفید کرنا ہیں (مفردات) حضرت عیسیٰ کے انصار و اصحاب کو حواری کہا جاتا ہے۔ اس کی وجہ تسمیہ کے بارے میں متعدد آراء ہیں۔ ابن الاثیر اور امام راغب کے نزدیک یہ لفظ عربی ہے۔ اکثر ماہرین لغت کے نزدیک انہیں یہ نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ حواری دھوبی کو کہتے ہیں اور حضرت مسیح کے حواری دھوبی تھے کچھ کی آراء میں یہ لفظ حضرت مسیح کے ساتھیوں پر اس لیے بولا گیا ہے کہ وہ لوگوں کو گناہوں کے میل سے پاک و صاف کرتے تھے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ وہ اپنے خلوص نیت اور سیرت کی پاکیزگی کی بنا پر حواری کہلائے۔ الزجاج کا خیال لسان العرب میں منقول ہے الحواریون خلصان الانبیاء بقول علامہ منظور افریقی اپنے نبی کی بڑھ چڑھ کر مدد اور نصرت کرنے والوں کو حواری کہتے ہیں چنانچہ یہ لفظ تاریخ اسلام میں ان بارہ اشخاص پر بھی بولا گیا ہے جنہیں بیعتِ عقبہ کے موقعہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مدینہ کا نقیب مقرر کیا تھا۔ کہا جاتا ہے ان بارہ حواریوں میں نو آدمی قبیلہ خزرج کے تھے اور تین قبیلہ اوس کے۔ ان کے نام حسب ذیل ہیں۔ سعد بن عبادہ، اسعد بن زرارہ، سعد بن الربیع، سعد بن خیثمہ، منذر بن عمرو، عبداللہ بن رواحہ، ابراء بن معرور، رفاعہ ابن عبدالمنذر۔ اسید بن حضیر، عبداللہ بن عمرو عبادہ ابن الصامت، اور رافع بن مالک۔ ایک روایت کے مطابق حضرت زبیر بن العوام کو بھی حواری کا لقب دیا گیا۔

حضرت عیسیٰ کے بارہ حواریوں کے نام یہ ہیں۔ شمعون یعنی پطرس، اس کا بھائی اندریاس یعقوب بن زبدی، یوحنا فلپس برتلمائی توما، متی، یعقوب بن حلفیٰ، تدی، شمعون قناتی، یہوداسکریوطی، لوقا ۲۔ ہو امرقس

لہ افادات شیخ الاسلام

۱۔ ۲) ان بارہ کو حکم دیا گیا تھا کہ غیر قوموں کی طرف نہ جانا بلکہ اسرائیل کے گھرانے کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کے پاس جانا اور چلتے چلتے یہ منادی کرنا کہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔ (متی۔ ۱۰)

ان بارہ کی ایمانی حالت کے بارے میں جو کچھ موجودہ اناجیل میں لکھا ہے۔ وہ ایسا ناگفتنی ہے کہ یہ تسلیم کرنا مشکل معلوم ہوتا ہے کہ ایسے الفاظ پیارے دوستوں کے بارے میں حضرت مسیح کی زبان پر آئے ہوں۔ تفصیل دیکھنی ہو تو اظہار الحق کا مقدمہ دیکھئے لیکن قرآن نے حواریوں کی کمزوریوں کا ذکر نہیں کیا جو انجیل میں موجود ہیں بلکہ اُن کی خوبیوں کا تذکرہ کیا ہے۔ حواریوں پر تفصیلی بحث انشاء اللہ بشرط حیات پارہ ۲۸ میں آئے گی۔

بہر حال حواریوں نے جواب میں حضرت عیسٰی سے کہا نحن انصار اللہ۔ اس جواب میں لطافت یہ ہے کہ حضرت عیسٰی نے سوال میں اپنے مددگار طلب کیے تھے حواری جواب میں اپنے کو خدا کے مددگار کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں۔ اس سے محققین نے یہ نکتہ نکالا ہے۔ کہ اللہ والوں کے ساتھ معاملہ کرنا ایسا ہی ہے جیسا کہ اللہ سے معاملہ کرنا۔ ؎

اس کے بعد حواریوں نے نصرت کے تقاضوں کو سمجھ کر اس کی تفصیل پیش کی ہے۔ اور آمنا باللہ کہہ کر اپنے ایمان کا اظہار کیا ہے اور اظہار ایمان کے تقاضے اسلام کو واضح اور زوردار انداز میں پیش کیا ہے ایمان اگر انسان کی فکری و علمی زندگی ہے تو اس کے مقابلے میں اسلام عملی و اخلاقی زندگی ہے۔ گویا اشاروں میں ہی سمجھا دیا کہ نصرت دین کا ہر اقدام بے معنے اور بے جان ہے۔ اگر دین کی نصرت کرنے والا ایمان و اسلام سے تہی دامن ہے اور جیسے دین کی نصرت بے معنے ہے اسی طرح نصرت دین کے نام نام پر کیے گئے سارے کام، ساری قربانیاں اللہ کے یہاں بے قیمت ہیں اگر آپ ایمان و عمل کی دولت سے مالا مال نہیں ہیں۔

نصرت دین کے تقاضوں میں سے اہم تقاضا اس آیت کی رُو سے یہ ہے کہ اللہ پر سچا ایمان ہو اس کے جملہ احکام کی بلا چون وچرا پیروی کی جائے جو کچھ اس نے اتارا ہے اس کو مانا جائے اور زندگی میں طاعت رسُول کی سرشاریاں ہوں۔

شہادت حق کیا ہے؟

۱۰۹۔ نیز انہوں نے کہا کہ اے ہمارے مولیٰ جو کچھ تُو نے نازل کیا ہے اس پر ہمارا ایمان ہے۔

؎ ماجدی

اور ہم نے تیرے رسُول کی پیروی کی ہے تو ہمارا نام بھی شہادت دینے والوں میں درج فرمالے پیغمبر کے سامنے اقرار کے بعد پروردگار کے سامنے یہ اقرار کیا کہ ہم انجیل پر ایمان لاکر تیرے رسُول کا اتباع کرتے ہیں۔ آپ اپنے فضل و توفیق سے ہمارا نام ماننے والوں کی فہرست میں ثبت فرمالیں۔ گویا ایمان کی رجسٹری ہو جائے کہ پھر لوٹنے کا احتمال نہ رہے [1]

دراصل اس میں دُعا کے انداز میں ان کی جانب سے اداء فرض شہادت کی تمنا اور آرزو ہے کیونکہ یہی شہادت وہ ذمہ داری ہے جو اللہ کی جانب سے نبی پر اور نبی کی اُمت پر ڈالی جاتی ہے شہادت یا گواہی عرف عام میں اس کو کہتے ہیں کہ آدمی کسی واقعہ اور کسی چیز کے بارے میں جو کچھ یقین کے ساتھ جانتا ہے دوسروں کو ٹھیک ٹھیک بتادے۔ اس لیے دین حق کی شہادت کا لغوی اور عرفی مفہوم یہ ہے کہ لوگوں پر نبی کے دین کو جیسا کچھ وہ ہے پوری طرح واضح کردے۔ اب رہا قرآن کا مفہوم تو اگرچہ یہ مفہوم بھی بنیادی طور پر یہی ہے مگر اس میں بڑی وسعت ہے جس کی سنۃ کی روشنی میں تشریح اجمالاً یہ ہے

شہادت کے دو پہلو ہیں قولی اور عملی۔

قولی شہادت۔ قولی شہادت یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد سے لے کر اس کے تفصیلی احکام تک کو غیر مسلموں کے سامنے موزوں ترین الفاظ اور عبارت میں پیش کیا جائے یہاں تک کہ یہ دین ان کے لیے کھُل کر کتاب بن جائے اور ان کے لیے اپنے مسلک کی غلطی اور اسلام کی صداقت پا لینے میں کوئی معقول رکاوٹ باقی نہ رہے۔

عملی شہادت۔ عملی شہادت یہ ہے کہ دین حق کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جائے وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں بھی دیکھ لی جائے۔ اُمت کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں اور پوری اُمت اپنی اجتماعی حیثیت میں سب کے سب اسلام کے عملی ترجمان ہوں۔ انہیں توحید آخرت اور رسالت وغیرہ عقائد پر گہرا یقین ہو اور یہ یقین ان کی ایک ایک ادا سے ٹپک رہا ہو۔ ان کے اخلاق وہ ہوں جن کی اسلام نے تلقین کی ہے ان کے معاملات انہیں خطوط پر انجام پائیں۔ جو کتاب و سنت نے کھینچ دیئے ہیں۔ ان کی معاشرت، ان کی معیشت ان کی سیاست غرض ان کی زندگی کا پورا نظام اور اس نظام کا ایک ایک شعبہ اسی نقشہ کے مطابق تعمیر ہو جو اللہ اور اُس کے رسول نے بنا کر دیا ہے تاکہ دنیا اپنی آنکھوں سے دیکھ لے کہ اسلام کسے کہتے ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس دُعائیہ پیمانے فاکتبنا مع الشاھدین کے فقرے میں آئی ہوئی فایہ سب معانی اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے یعنی چونکہ آپ کی روانہ کردہ کتاب پر ایمان لے آئے ہیں اور ہم نے اپنی زندگی کو آپ کے رسول کی سیرت کے سانچے میں ڈھالیا ہے اس لیے ہمیں گواہی دینے والوں میں لکھ لیجئے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عملی شہادت کا مرتبہ قولی شہادت سے مقدم بھی ہے اور اہم بھی کیونکہ دنیا کی بڑی اکثریت اصلاً عملی دلائل کی زبان سمجھتی ہے۔ عقلی دلائل تک اس کی رسائی بہت کم ہوتی ہے۔

ع ۵

وَمَكَرُوْا وَمَكَرَ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ۝ اِذْ قَالَ اللّٰهُ
يٰعِيْسٰۤى اِنِّىْ مُتَوَفِّيْكَ وَرَافِعُكَ اِلَىَّ وَمُطَهِّرُكَ مِنَ الَّذِيْنَ
كَفَرُوْا وَجَاعِلُ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْكَ فَوْقَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْۤا اِلٰى
يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۚ ثُمَّ اِلَىَّ مَرْجِعُكُمْ فَاَحْكُمُ بَيْنَكُمْ فِيْمَا كُنْتُمْ
فِيْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ۝ فَاَمَّا الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فَاُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا
شَدِيْدًا فِى الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ؗ وَمَا لَهُمْ مِّنْ نّٰصِرِيْنَ ۝
وَاَمَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فَيُوَفِّيْهِمْ اُجُوْرَهُمْ ؕ
وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِيْنَ ۝

پھر ایسا ہوا کہ یہودیوں نے مسیح کے خلاف مخفی اور باریک تدبیریں کیں، اللہ نے بھی جواب میں اپنی خفیہ تدبیر کی اور یاد رکھو اللہ جسے بچانا چاہے تو مخفی تدبیر سے کام لینے والوں میں اللہ سب سے بڑھ کر ہے[ا]۔ یہ اللہ کی ہی خفیہ تدبیر تھی جب اس نے کہا کہ اے عیسیٰ اب میں تجھے پورا پورا لے لوں گا اور تجھے اپنی طرف اٹھا لوں گا[۲]۔ اور جنہوں

نے تیرا انکار کیا ہے ان سے تجھے پاک کر دوں گا۔[۱۱۲]
اور جنہوں نے تیری پیروی کی ہے انہیں قیامت تک
تیرے منکروں پر برتری دوں گا۔[۱۱۳] اور بالآخر سب کو قیامت
کے دن میری ہی طرف لوٹنا ہے اس دن ان باتوں کا
فیصلہ کر دوں گا جن میں لوگ ایک دوسرے سے اختلاف
کر رہے ہیں[۱۱۴]۔

[۱۱۵] پھر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو انہیں
دنیا و آخرت میں دونوں جگہ سخت عذاب دوں گا اور کوئی
بھی عذاب الٰہی سے بچانے میں ان کا مددگار نہ ہوگا اور
جو لوگ ایمان لائے اور ان کے عمل بھی اچھے ہیں تو ان
کو ان کا اجر پورا پورا ملے گا اور خوب جان لو اللہ ظالم کار لوگوں سے
محبت نہیں کرتا[۱۱۵]۔

یہودیوں کی سازش اور خدائی تدبیر:

یہودیوں نے حضرت عیسٰی کے خلاف سازشوں کا جو جال پھیلایا تھا اس کی تفصیلات انجیلوں میں موجود ہیں۔ اگر اس جلد کے ضخیم ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم یہ سارا مواد ایک مناسب ترتیب کے ساتھ یہاں پیش کرتے۔ لیکن ہم یہاں صرف اشارات کرتے ہیں۔ تفصیل انشاء اللہ پارہ ششم میں آئے گی۔ انہوں نے آپ پر روایات اسلاف کو توڑنے اور بزرگوں کی تحقیر کا الزام لگایا۔ ان کے خلاف کفر و ارتداد کے فتوے لگوائے۔ سیاسی طور پر رومیوں کو ان کے خلاف بھڑکایا اور ایسے سوالات حضرت مسیح سے

کیے جن سے ثابت ہو سکے کہ حضرت مسیح قیصر کو خراج دینے سے روکتے ہیں۔ ان کے بارہ شاگردوں میں یہودا نامی کو رشوت دے کر اس پر راضی کر لیا کہ وہ حضرت مسیح کو گرفتار کرائے۔ یہاں قرآن نے ان تمام کی طرف ومکروا کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ اللہ نے ان کی سازشوں کو ناکام کیا۔ کیسے اور کیوں کر کیا؟ اسی اٹھے ہوئے سوال کا جواب قرآن اذ قال اللہ یاعیسیٰ سے دیا ہے۔ یہاں جو تعبیر حضرت عیسیٰ کے بارے میں آئی ہے یہی تعبیر قرآن نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں اختیار کی ہے۔ مراد سورہ انفال کی یہ آیت ہے

واذ یمکربك الذین کفروا لیثبتوك او یقتلوك او یخرجوك و یمکرون و یمکراللہ واللہ خیر الماکرین۔

اور وہ وقت یاد کرو جب مکہ میں کافر تمہارے خلاف اپنی چھپی تدبیروں میں لگے تھے تاکہ تجھے گرفتار کرلیں یا قتل کر دیں یا ملک بدر کر دیں اور وہ اپنی مخفی تدبیریں کر رہے تھے اللہ اپنی تدبیر کر رہا تھا اور اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔

یہاں بھی قریش کی سازش کا ذکر ہے اور اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی تدبیر کا تذکرہ ہے آخر میں دونوں جگہ ایک بات فرمائی گئی ہے کہ واللہ خیر الماکرین۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب گھر سے نکلے تو کفار نے ایسے ہی محاصرہ کر رکھا تھا جیسے حضرت مسیح کی ہجرت کے موقعہ پر دشمنوں نے ان کا گھیراؤ کر رکھا تھا حضور انور بھی بستر پر اپنے خاطیوں کو شبہ میں ڈالنے کے لیے حضرت علی کو سلا کر ہجرت کر گئے اور حضرت عیسیٰ کی آسمانی ہجرت کے موقعہ پر بھی اللہ نے ایک شخص کو حضرت عیسیٰ کی جگہ عیسیٰ شبیہ بنا کر دشمنوں کے ہاتھ میں دے دیا قرآن نے دونوں مقامات پر اللہ کی تدبیر اور کفار کی غلط فہمی کو لفظ مکر سے بیان کیا ہے ان دونوں ہجرتوں کا جب تقابلی مطالعہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ جیسے تدبیر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں قریش کے لیے ضرب کاری تھی ایسے ہی حضرت عیسیٰ کی ہجرت کی تدبیر یہود کے حق میں سمان روح تھی۔ فرق ہے تو صرف دار الہجرت کا ہے۔ حضرت عیسیٰ کے لیے دار الہجرت آسمان ہے اور حضور انور کے لیے مدینہ طیبہ ہے۔ چونکہ حضرت عیسیٰ کا آسمان پر جانا ایک نوع کی ہجرت ہے اس لیے جیسے تمام رسولوں کو ہجرت کے بعد فتح و کامیابی کی بشارت ملی اسی طرح آپ کو بھی اس کے ساتھ کامیابی و فتح مندی کی بشارت ملی ہے۔

مکر تاریخ یہود کی روشنی میں :۔

پھر ایسا ہوا کہ یہودیوں نے مسیح کے خلاف مخفی اور باریک تدبیریں کیں اللہ نے بھی جواب میں

اپنی خفیہ تدبیر کی اور اللہ تھی تدبیر سے کام لینے والوں میں سب سے بڑھ کر ہے مکر کہتے ہیں لطیف و خفیہ تدبیر کو۔ اگر وہ اچھے مقصد کے لیے ہو اچھا ہے اور برائی کے لیے ہو تو برا ہے۔ اسی لیے ولا یحیق المکر السیئ میں مکر کے ساتھ السیئ (برا) کی قید آئی ہے اور یہاں اللہ کو خیر الماکرین کہنے کا مطلب یہ ہے کہ یہود نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے خلاف طرح طرح کی سازشیں اور خفیہ تدبیریں شروع کردیں حتیٰ کہ بادشاہ کے کان بھر دیئے کہ معاذ اللہ ملحد ہے تورات کو بدلنا چاہتا ہے۔ سب کو بددین بنا کر چھوڑے گا۔ اس نے مسیح علیہ السلام کی گرفتاری کا حکم دے دیا۔ اُدھر یہ ہو رہا تھا اور ادھر حق تعالیٰ کی لطیف و خفیہ تدبیر ان کے توڑ میں اپنا کام کر رہی تھی جس کا ذکر آگے آتا ہے بے شک خدا کی تدبیر سب سے مضبوط اور بہتر ہے جسے کوئی توڑ نہیں سکتا[1]

یہاں اس فعل مکروا کا فاعل یہود ہیں۔ یہود کے اکابر اور سرداروں نے حضرت مسیح کی مخالفت اور ایذا کے بہت سے درجے طے کرنے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ حضرت عیسیٰ کو ختم ہی کر دینا چاہیئے۔ چنانچہ پہلے اپنی مذہبی عدالت میں الحاد کا الزام لگا کر آپ کو واجب القتل قرار دیا پھر رومی حاکموں کی ملکی عدالت میں لاکر ان پر بغاوت کا مقدمہ چلایا۔ حضرت عیسیٰ اور آپ کے مخالفین کا یہ معرکہ ملک شام کے صوبہ فلسطین میں پیش آیا تھا۔ شام اس وقت رومی سلطنت کا ایک حصہ تھا اور یہاں کے یہودی باشندوں کو اپنے معاملات میں نیم آزادی اور نیم خود مختاری حاصل تھی جیسے انگریزی حکومت کے تحت والیان ریاست کو حاصل رہتی ہے شہنشاہ روم کی طرف سے ایک نائب السلطنت وائسرائے شام کا مقرر تھا۔ اس کے ماتحت ایک امیر فلسطین کا تھا۔ رومیوں کا مذہب شرک و بت پرستی کا تھا۔ یہود کو اتنا اختیار حاصل تھا کہ اپنے لوگوں کے مقدمات اپنی مذہبی عدالت میں لائیں۔ لیکن سزاؤں کے نفاذ کے لیے انہیں پھر ان مجرموں کو ملکی عدالت کے سامنے لانا پڑتا تھا۔ جرم الحاد میں فتویٰ قتل خود مذہبی عدالت دے سکتی تھی لیکن واقعۃً سزائے موت کا نفاذ صرف رومی ملکی عدالت کے قبضہ میں تھا اور سزائے موت رومی حکومت میں سولی کے ذریعے دی جاتی تھی۔ یہود کی اس گہری اسکیم کی طرف قرآن نے مکروا میں اشارہ کیا ہے۔

قاعدہ مشاکلت اور مکر:۔

مکر اللہ یعنی اللہ نے مخالفین کی ساری تدبیریں، ساری سازشیں، الٹ دیں اور حضرت مسیح کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بچالیا۔ عربی زبان میں ایک قاعدہ مشاکلت کا ہے یعنی فعل کی سزا یا جواب کو بجنسہٖ اسی فعل کے لفظ سے ادا کیا جاتا ہے اور اس طرز ادا میں مطلق کوئی عیب نہیں ہے مثلاً کسی نے زید پر حملہ کیا اور زید نے اس کا جواب دیا تو عربی محاورے میں یوں کہیں گے کہ اس نے زید پر حملہ کیا اور زید نے اس پر حملہ کیا حالانکہ زید کا حملہ، حملہ نہیں بلکہ حملہ کا جواب ہے۔ اس اصل کو ذہن نشین کر لینے کے بعد قرآن عزیز کی اس قسم کی آیتوں سے جو اشکال ذہن میں آتا ہے وہ از خود ساقط ہو جاتا ہے۔

لیکن اس کے علاوہ عربی میں مکر میں کوئی برائی کا پہلو بھی لازمی طور پر نہیں ہوتا بکر محمود بھی ہو سکتا ہے اور مکر مذموم بھی، اصل معنے صرف خفیہ تدبیر یا گہری تدبیر کے یا انگریزی میں پلان PLAN کے ہیں علامہ زبیدی تاج العروس میں رقمطراز ہیں۔

مکر تدبیر، حیلہ کو کہتے ہیں کہ مکر خفیہ تدبیر کا نام ہے۔ البصائر میں مکر کو محمود اور مذموم دونوں طرح کا بتایا ہے۔ محمود وہ ہے جو اچھے کام کے لیے ہو اور مذموم وہ ہے جو بُرے کام کی خاطر کیا جائے۔

امام راغب نے بھی مکر کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ اس لیے اگر کوئی اُردو کے مسکر پر قیاس کر کے مکر اللہ پر اعتراض کرتا ہے تو یہ اس کی اپنی جہالت ہے۔

اللہ کی تدبیر سب سے بہتر

اللہ خیر الماکرین اللہ کی تدبیر سب سے اونچی سب پر غالب ہے۔ اس کا مقابلہ جس طرح کوئی جسمانی قوت اور مادی زور سے نہیں کر سکتا اسی طرح کسی کی عقلی تدبیر اس کے سامنے پیش نہیں جا سکتی چنانچہ یہاں اس کی حکمت و تدبیر کارگر رہی۔ حضرت عیسٰی زندہ و سلامت رہے اور صلیب دیتے وقت یہودی عوام نے ہجوم ازدحام کے گڑبڑ اور وقت کی تنگی سے اور سولی گھر کے رومی سپاہیوں نے شناخت نہ ہونے کی بنا پر یوں کیا کہ حضرت عیسٰی کے ہم قوم میں سے کسی ہم شکل، ہم عمر اور ہم وضع کو سولی پر چڑھا دیا بکلیسا کا آج عام عقیدہ حضرت مسیح کے مصلوب ہونے، صلیب پر وفات پانے اور پھر تیسرے دن جی اُٹھنے کا ہے لیکن مسیحوں کے بعض قدیم فرقوں میں ایک فرقہ باسلیدیہ ٹھیک اسی عقیدے پر رہا ہے ایک یورپین فاضل ڈی بنسن نے پچھلی صدی عیسوی میں ایک مختصر لیکن فاضلانہ کتاب اسلام یا حقیقی مسیحیت کے نام سے لکھی ہے اس کے صفحہ ۱۴۲ کے حاشیہ میں اس نے قدیم مسیحی فرقوں میں سے متعدد کا نام لے کر لکھا ہے کہ فلاں فلاں فرقہ کا عقیدہ مسیح کے رفع جسمانی کا تھا نہ کہ وفات مسیح کا، جس پر اب عیسائی صدیوں سے جمے ہوئے ہیں۔ اسی طرح سیل نے بھی اپنے انگریزی ترجمہ قرآن کے حاشیہ میں اس

عقیدے کے مسیحی فرقوں کے نام گنائے ہیں [1]

یہ واضح رہنا چاہیے کہ یہاں قرآن نے یہود کے مقابلہ میں مکر کا لفظ استعمال کیا ہے جس کے لغوی معنے آپ پڑھ چکے ہیں کہ خفیہ تدبیر کے ہیں۔ اس لفظ کا تقاضا یہ ہے کہ یہودیوں کے مقابلہ میں اللہ کی جانب سے کوئی تدبیر ایسی ہونی چاہیے جس کا دشمنوں کو علم بھی نہ ہو سکے اور نتیجہ کے لحاظ سے وہ اس درجہ ناکام بھی رہیں کہ ان کے مقابلہ میں اللہ سبحانہ، کا خیر الماکرین روز روشن کی طرح واضح ہو جائے۔

حضرت عیسٰی کے لیے پہلی بشارت

یہ اللہ کی خفیہ تدبیر ہی تھی جب اللہ نے کہا کہ اے عیسٰی اب میں تجھے پورا پورا لے لوں گا اور تجھے اپنی طرف اٹھا لوں گا۔ قبل اس کے کہ میں اس کی تفسیر کروں لفظ توفی کی تحقیق کر دینا ضروری سمجھتا ہوں لفظ توفی وفا سے مشتق ہے جس کے معنے پورا کر لے کے ہیں۔ یہ مادہ خواہ کسی شکل اور کسی ہیئت میں ہو مگر اس میں کمال اور تمام کے معنے ضرور ہوتے ہیں۔ اس کے اصلی اور حقیقی معنے کسی چیز کو پورا پورا لینا کہ باقی کچھ نہ رہے۔ قرآن اور حدیث اور کلام عرب میں جس جگہ بھی یہ لفظ استعمال ہوا ہے سب جگہ توفی سے استیفاء اور اکمال اور اتمام کے معنے مراد لیے گئے ہیں۔ توفی سے اگر کسی جگہ موت کے معنے بھی مراد لیے گئے ہیں تو وہ کنایۃً اور لزوماً مراد لیے گئے ہیں۔ کیونکہ استیفاء عمر کے لیے موت لازم ہے۔ توفی عین موت نہیں بلکہ موت توفی کا ایک ثمرہ اور نتیجہ ہے۔ علامہ منظور افریقی نے لسان العرب میں اس کی تصریح کی ہے۔

> میت کی توفی یہ ہے کہ اس کی مدت حیات اس کی زندگی کے ایام، اور سال پورے کر دیے گئے۔

عربی میں توفی موت کے معنے میں مجازاً ایسے ہی آتا ہے جیسے ہم اردو میں کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ کا انتقال یا وصال ہو گیا۔ وصال کے معنے مرنے کے نہیں بلکہ ملنے کے ہیں اور انتقال کے معنے بدلنے کے ہیں۔ بزرگوں کی موت کو موت کے لفظ سے تعبیر کرنا عرف میں خلاف ادب سمجھا جاتا ہے اس لیے بجائے موت کے وصال اور انتقال بولتے ہیں یعنی اپنے رب سے جا ملے اور دار فانی سے دار بقا کی طرف انتقال کر گئے۔ اور کسی اس طرح کہتے ہیں کہ فلاں بزرگ رحلت فرمائے دار بقا

---

[1] ماجدی

ہو گئے یا یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص اس عالم سے رخصت ہو گیا یا فلاں شخص گزر گیا۔ کیا اس استعمال سے کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ وصال انتقال، رحلت اور رخصت کے حقیقی اور اصلی معنے موت کے ہیں۔ ہرگز نہیں بلکہ یہ سمجھتا ہے کہ حقیقی اور اصلی معنے تو اور ہیں۔ تشریف اور تکریم کی غرض سے بزرگوں کی موت کو وصال اور رحلت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ ٹھیک یہی صورت حال لفظ توفی کی ہے کہ اصلی اور حقیقی معنے تو استیفاء اور اکمال کے ہیں مگر بغرض تکریم و تشریف موت کو توفی کے لفظ سے کنایۃً تعبیر کر دیا جاتا ہے جس سے نادان یہ سمجھ بیٹھے کہ توفی کے حقیقی معنے ہی موت کے ہیں علامہ زمخشری اساس میں تصریح فرماتے ہیں کہ۔

وفی بالعہد اور اوفی، اوفی، استوفی اور توفی سب کے معنے پورا کرنا اور پورا دینا اور پورا لینا ہیں۔ مجازی معنے توفی بصیغہ مجہول موت پا لینے کے ہیں۔

ایسے ہی علامہ زبیدی نے تاج العروس شرح قاموس میں یہ بات پوری قوت سے بتائی ہے۔ وفی الشی کے معنے پورا ہونا صفت کا صیغہ وفی اور واف آتا ہے، ہر چیز جو اپنے کمال کو پہنچ جائے اس کے لیے وفی آتا ہے یعنی پوری ہو گئی اسی سے اوفی پورا کرنے کے معنے میں استیفاء اور توفی پورا لینا اور مجازی معنے توفی کے موت آنا توفی فلاں اسی سے مجازاً بولا جاتا ہے۔

قرآن کے استعمال سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے کہ توفی کی حقیقت موت نہیں ہے بلکہ توفی موت کے علاوہ کچھ اور ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔

اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا

اللہ تعالیٰ جانوں کو پورا پورا لے لیتا ہے موت کے وقت اور ان جانوں کو سونے کی حالت میں جو نہیں مرتے ہیں۔

یہ آیت صاف اور ببانگ دہل کہہ رہی ہے کہ توفی کے معنے موت کے نہیں بلکہ توفی کے معنی کچھ اور ہیں جو کبھی موت کے ساتھ جمع ہو جاتے ہیں اور کبھی نیند کے ساتھ۔ اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ موت کی طرح نوم میں بھی جان قبض ہوتی ہے۔ اس آیت میں توفی کے معنے موت کے نہیں بلکہ قبض کرنے کے ہیں۔ صاحب لسان العرب توفی کی حقیقت بیان کر لینے کے بعد مذکورہ بالا آیت کی تفسیر اس طرح بیان کرتے ہیں کہ۔

یعنی مرنے کے وقت جان پوری پوری لے لی جاتی ہے اور نیند کے وقت عقل و ادراک

اور ہوش و تمیز کو پورا پورا لے لیا جاتا ہے۔
حاصل یہ کہ توفی کے معنے تو ہی لینے اور قبضہ کرنے کے ہیں توفی میں کوئی تغیر اور تبدیلی نہیں ہوتا صرف اس کے متعلق میں تبدیلی ہوتی ہے ایک جگہ توفی کا تعلق موت ہے اور دوسری جگہ اس کا تعلق نیند ہوتا ہے ایسے ہی قرآن کی اس آیت۔

وھو الذی یتوفاکم باللیل۔

وہی ہے جو تم کو رات میں پورا پورا لے لیتا ہے۔
میں بھی توفی کے معنے موت کے نہیں ہیں۔ قاضی بیضاوی نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے فان اصلہ قبض الشئ بتمامہ لہٰذا جب ثابت ہوا کہ توفی کے معنے کسی چیز کو پورے طور پر لینے کے ہیں تو موت اور نیند کے لیے جو توفی کا لفظ استعمال ہوا ہے وہ اسی اعتبار سے ہے کہ ان دونوں حالتوں میں اس کی جان پر قبضہ کیا جاتا ہے۔

اسی طرح سورہ نسائیں ہے۔

فامسکوھن فی البیوت حتی یتوفاھن الموت۔

ان کو گھروں میں روک لو یہاں تک کہ موت ان کو اٹھا لے

شاہ ولی اللہ اس کا ترجمہ اس طرح فرماتے ہیں

تا آنکہ عمر ایشاں را تمام کند مرگ

یعنی یہاں تک موت ان کی عمر پوری کر دے۔ اس آیت میں توفی کے معنے اتمام عمر اور اکمال عمر کے لیے گئے ہیں۔

نیز پورے قرآن پر ایک نظر میں ہر انصاف پسند فیصلہ کر سکتا ہے کہ اگر توفی کے معنے واقعی موت کے ہوتے تو قرآن میں یہ ضرور موت کی طرح حیات کے ساتھ استعمال ہوتا۔ آپ قرآن پڑھ جایئے آپ کو موت کے مقابلہ میں حیات کا استعمال ملے گا لیکن کہیں توفی کو حیات کا مقابل بنا کر پیش نہیں کیا گیا اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توفی کی حقیقت موت نہیں ہے اگر توفی کی حقیقت موت ہوتی تو جس طرح جا بجا موت کے مقابلہ میں حیات کا ذکر کیا ہے اسی طرح توفی کے مقابلہ میں حیات کا ذکر ہوتا۔

توفی جنس ہے اس کے تحت تین نوعیں ہیں

ان آیات اور آئمہ لغت کی تصریحات سے یہ بات بخوبی منکشف ہو گئی کہ توفی کی حقیقت موت نہیں

ہے بلکہ توفی ایک جنس ہے اس کے تحت اس کی انواع ہیں جیسے حیوان ایک جنس ہے اس کے تحت انسان گھوڑا، گدھا وغیرہ اس کی انواع ہیں۔ حیوانیت کبھی انسان کے ساتھ ہو کر پائی جاتی ہے اور کبھی گھوڑے کے ساتھ۔ چنانچہ حافظ ابن تیمیہ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح میں فرماتے ہیں۔

عربی زبان میں لفظ توفی کے معنے پورا پورا لینے کے ہیں اور اس کی تین نوع ہیں ایک توفی نوع یعنی خواب اور نیند کی توفی، دوسرے توفی موت یعنی موت کے وقت رُوح کو پورا پورا لینا، تیسرے روح اور جسم کی توفی یعنی رُوح اور جسم دونوں کو پورا پورا لے لینا۔

نوع کی تعیین کے لیے قرینے کی ضرورت:۔

جب یہ ثابت ہوگیا کہ توفی ایک جنس ہے اور نوم، موت اور رفع جسمانی اس کی انواع ہیں اور یہ بات سب جانتے اور مانتے ہیں کہ نوع کی تعیین کے لیے قرینہ کا ہونا لازمی اور ضروری ہے۔ اس لیے جہاں لفظ توفی کے ساتھ موت اور اس کے لوازم کا ذکر ہوگا۔ اس جگہ توفی سے موت مراد لی جائے گی جیسے قرآن کی اس آیت میں

قل یتوفاکم ملك الموت الذی وکل بکم

اس آیت میں ملک الموت قرینہ ہے اس لیے توفی سے موت مراد ہے۔

اور جس جگہ توفی کے ساتھ اس کے اور متعلقات کا ذکر ہوگا اس جگہ توفی سے نوم کے معنے مراد ہوں گے جیسے

وھو الذی یتوفاکم باللیل

لیل (رات)، کے قرینے سے معلوم ہوا کہ اس جگہ توفی سے نوم کے معنے مراد ہیں۔ اسی معنے میں عرب کا مشہور شاعر ابو نواس کہتا ہے۔

فلما توفاہ رسول الکریٰ

نیند کے قاصد نے جب اسے پورا پورا لے لیا

اس شعر میں بھی توفی سے نوم کے معنے مراد ہیں

اور جس جگہ توفی کے ساتھ رفع کا ذکر ہوا اور کوئی قرینہ ہو وہاں توفی سے رفع جسمانی مراد ہوگا[1]

[1] کلمۃ اللہ

جن لوگوں کا مذاق عربیت پختہ نہیں ہے وہ جب دیکھتے ہیں کہ عام لوگ توفی کا استعمال رُوح قبض کرنے اور مار ڈالنے کے لیے کرتے ہیں تو وہ رُوح قبض کرنے ہی کو حقیقی معنے سمجھ لیتے ہیں جو سراسر غلط ہے بلاغت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ محاورات بلغاء میں اس کا استعمال ہمیشہ اس کے حقیقی یعنی پورا لینے کے اعتبار سے ہوتا ہے اور چونکہ موت اور نیند میں بھی یہ بات موجود ہے اس لیے ان دونوں کے لیے بھی یہ لفظ اسی اعتبار سے بولا جاتا ہے۔ علامہ ابوالبقاء کلیات میں رقمطراز ہیں۔

توفی بمعنے موت عام لوگوں کا محاورہ ہے اور بمعنے پورا لینا اور حق وصول کرنا بلغاء کا محاورہ ہے[1]

جب یہ ثابت ہوگیا کہ توفی کے معنے موت کے نہیں تو آئیے اس آیت کی تفسیر سُنیے۔ جب یہود نے حضرت عیسٰی کو قتل کرنے کی تدبیریں شروع کیں اور حضرت مسیح علیہ السلام نے بھی اسے محسوس فرما لیا جیسا کہ فلما احس عیسٰی سے معلوم ہوتا ہے تو اللہ سبحانہ، نے اُس وقت حضرت مسیح کی تسلی فرمائی اور آپ سے چار وعدے فرمائے۔ یا یوں کہو کہ اس بے کسی اور بے بسی کے عالم میں آپ کو مستقبل کے بارے میں چار بشارتوں سے نوازا۔ ان میں سے پہلی بشارت یہ ہے کہ انی متوفیک اے عیسٰی میں تجھے مکمل طور پر پورا پورا لینے والا ہوں، وہ کچھ کریں تیرا بال بیکا نہ کرسکیں گے۔ اگر اس مقام پر توفی کے معنے موت کے ہوں تو یہ موقعہ و محل سے بے جوڑ ہونے کی وجہ سے فقرہ بلاغت کے معیار سے گر جائے گا۔ یہ بات چھوٹی سمجھ والا آدمی سمجھ سکتا ہے کہ جب ہر طرف خون آشام کی طرح دشمن جان کے لیوا ہوں اور تمام تدبیریں، اسکیمیں اور سازشیں اس کے لیے بنا رہے ہوں کہ اُس کے لیے موت کا سامان ہو جائے۔ ایسے موقعہ پر یہ کہنا کہ اے عیسٰی میں تجھے مار دوں گا اس میں عیسٰی کے دشمنوں کے لیے تو مسرت اور بشارت کا سامان ہو سکتا ہے۔ لیکن حضرت عیسٰی کے لیے اس میں مسرت اور بشارت کا کون سا پہلو ہو سکتا ہے؟ حضرت کی تسلی تو صرف اس طرح ہو سکتی ہے کہ ان سے کہا جائے کہ اے عیسٰی گھبراؤ نہیں میں تجھے دشمنوں کے نرغے اور قاتلوں کے گھیرے سے صحیح و سالم نکال لوں گا دشمن تیرا بال بھی بیکا نہ کرسکیں گے اور اس طرح بچا لوں گا کہ دشمنوں کو تیرا سایہ بھی نہ ملے گا۔

اس مقام پر اللہ سبحانہ، کو یہ بتانا مقصود ہے کہ یہود نے حضرت عیسٰی کو مارنے کا جو جال بنا یا تھا اور اس کے لیے جو گہری سازش تیار کی تھی وہ کامیاب نہیں ہوئی اور اللہ نے حضرت عیسٰی کو

---

[1] لغات القرآن جلد دوم

بچانے کی جو تراکیب اور انوکھی تدبیر کی وہی کامیاب اور غالب رہی۔ اگر یہاں توفی سے موت مراد لی جائے تو یہ کوئی ایسی تدبیر نہیں ہے جو یہود کی مغلوبیت اور ناکامی کا ذریعہ ہو بلکہ یہ تو ان کی تمنا بر آنے کا ذریعہ ہے۔ بلاشبہ اس موقعہ پر اللہ سبحانہ، کی جانب سے ایسی تدبیر کی نمائش ہونی چاہیے کہ یہودیوں کو منہ کی کھانی پڑے اور حضرت عیسیٰ مامون و محفوظ رہیں۔

یقیناً توفی بمعنے الموت ایک عام حالت ہے جس سے ہر کہ ومہ کو گزرنا ہے۔ اس میں مومن وکافر، انسان اور حیوان سب شریک ہیں۔ حضرت عیسیٰ ہی کی اس میں کوئی خصوصیت نہیں ہے کہ خاص طور پر ان سے مرنے کا وعدہ کیا جائے۔

قرآن دنیا کے سامنے کھلا ہوا ہے اسے کھول کر دیکھا جاسکتا ہے کہ توفی کا وعدہ اللہ پاک نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کسی سے نہیں کیا۔ واقعاتی حقائق کے تقاضوں کا ہمیں یہاں اعتراف کرنا چاہیے۔ اور واقعات کی گود میں رکھ کر ہمیں یہاں توفی کو سمجھنا چاہیے۔ ہمیں صرف ایک گوشہ ہی کا ہوکر نہ رہ جانا چاہیے دوسرے گوشوں کی بھی خبر رکھنی چاہیے۔ اگر ہم ایسا نہ کریں گے تو علم وتحقیق کی ساری قدریں متزلزل ہو جائیں گی۔

حضرت عیسٰی کو دوسری بشارت

بچا لینے کی بشارت کے ساتھ دوسری بشارت اپنی طرف اٹھا لینے کی ہے۔ اصل ارشاد ورافعك الی آیا ہے۔ اس کے معنے میں بھی توفی کی طرح تحریف کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کے معنے درجہ بلند کرنا ہیں لیکن یہ معنے بہ چند وجوہ غلط ہیں۔

اولاً اس معنے کی موجودگی میں الیٰ کا لفظ بالکل بے معنے ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور قرآن میں کوئی لفظ بھی بے ضرورت استعمال نہیں ہوا ہے۔ اگر صرف درجے کی بلندی کا اظہار مقصود ہوتا تو عربیت کے لحاظ سے رافعك کہہ دینا کافی تھا الیٰ کی ضرورت نہ تھی قرآن میں دیکھ لیجئے جہاں بھی یہ لفظ بلند مرتبہ کے معنے میں آیا ہے بغیر الیٰ کے آیا ہے۔ اگر حرف الیٰ کا صحیح صحیح حق ادا کیا جائے اور یہ حق ادا کرنا ضروری ہے تو رافعك الیّ کے معنے یہ ہوں گے میں تم کو عزت واکرام کے ساتھ اپنی جانب اٹھانے والا ہوں [1]

---

[1] تدبر قرآن

ثانیاً اس لیے کہ جس جگہ لفظ رفع کا مورد یا مفعول یا متعلق جسمانی شے ہو تو اس جگہ یقیناً رفع جسمانی مراد ہوگا۔ اگر اس کا مفعول یا مورد ذکر یا درجہ یا منزلہ ہو تو اس وقت رفع مرتبت اور بلند مقام کے معنے مراد ہوں گے رفعنا فوقکم الطور اور رفع السماوات اور واذ یرفع ابراهیم القواعد من البیت واسماعیل اور رفع ابویه علی العرش۔

میں چونکہ مفعول جسمانی ہے اس لیے یہاں رفع جسمانی مراد ہے۔ اس کے برعکس رفعنا لك ذکرك اور رفعنا بعضهم فوق بعض درجات میں مفعول چونکہ ذکر اور درجات ہیں اس لیے یہاں رفع جسمانی نہیں بلکہ رفعت شان اور بلند مرتبہ مراد ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ لفظ رفع جب کبھی جسمانیات میں استعمال ہوتا ہے تو اس سے رفع جسمانی مراد ہوتا ہے۔ روحانی رفع یا عزت کی موت مراد نہیں ہوتی۔ اس آیت قرآنی میں رافعك میں ضمیر خطاب سے مراد حضرت مسیح کی ذات گرامی ہے اس لیے قطعاً اور یقیناً رفع جسمانی ہی مراد ہے۔ یہ آیت قرآنی حضرت مسیح کے رفع جسمانی کے لیے حتمی اور قطعی وعدہ ہے اسی وعدے کی تکمیل کی اللہ سبحانہ نے پارہ ششم میں بل رفعه اللہ کہہ کر خبر دی ہے[1]

ثالثاً اس لیے کہ یہود مدعیان قتل مسیح ہیں اور آیت قرآنی ان کے اس زعم باطل کی تردید میں ہے اور ظاہر ہے کہ اگر رفع روحانی یا رفع درجات مراد لیا جائے تو تردید کے لیے کوئی معنے ہی نہیں رہتے۔ کیونکہ رفع روحانی یا رفع درجات اور قتل میں باہم کوئی منافات نہیں ہے۔ قتل کی تدبیر کا اس بات کے کہنے سے یہ کیوں کر جواب ہو سکتا ہے کہ ان کے درجات بلند کر دیے جائیں گے ہاں اگر آیت میں رفع جسمانی مراد ہو تو اس میں بلاشبہ ان کے ادعائے قتل کا واشگاف جواب ہے کہ انہوں نے تو داؤ لگایا ہی ہے کہ تم کو قتل کر دیں مگر ہمارا داؤ یہ ہے کہ اے عیسٰی ہم تم کو بچا لیں گے اور صحیح وسالم مع جسم کے اٹھالیں گے۔

غور فرمایئے یہودیوں کی خفیہ تدبیر تو یہ تھی کہ انہوں نے مکروفریب سے حضرت عیسٰی کی موت کا سامان کیا اور حق تعالٰی شانہ، کی خفیہ تدبیر یہ تھی کہ حضرت عیسٰی کو زندہ وسلامت آسمان پر اٹھا لیا واقعہ کی تفصیل انشاءاللہ پارہ ششم میں آرہی ہے[2]

---

[1] کلمۃ اللہ

[2] لغات القرآن

رابعًا، اس لیے کہ قرآن کی یہ پوری تقریر وفد نجران کے سامنے عیسائیوں کے عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید کے لیے پیش کی جارہی ہے اور عیسائیوں میں اس عقیدے کے پیدا ہونے کے اہم ترین اسباب تین تھے۔

۱۔ حضرت عیسٰی کی ولادت

۲۔ اُن کے صریح محسوس ہونے والے معجزات

۳۔ اُن کا آسمان پر اُٹھایا جانا

قرآن نے پہلی بات کی تصدیق کی اور فرمایا کہ مسیح کا بے باپ کے پیدا ہونا محض اللہ کی قدرت کا کرشمہ تھا۔ اللہ جس کو جس طرح چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ یہ غیر معمولی طریق پیدائش ہرگز اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ مسیح خدا تھا یا اس کا خدائی میں کچھ حصہ تھا۔

دوسری بات کی بھی قرآن نے تصدیق کی اور خود حضرت مسیح کے معجزات ایک ایک کر کے گنائے مگر بتا دیا کہ یہ سارے کام اُس نے اللہ کے اذن سے کیے، باختیار خود کچھ بھی نہیں کیا اس لیے ان میں سے بھی کوئی بات ایسی نہیں ہے جس سے یہ نتیجہ نکالا جاسکے کہ مسیح کا خدائی میں کوئی حصہ تھا۔

اب تیسری بات کے متعلق اگر عیسائیوں کی روایت بالکل غلط تھی۔ تب تو ان کے عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید کے لیے ضروری تھا کہ صاف صاف کہہ دیا جاتا کہ جسے تم الہ بنا رہے ہو وہ تو مر کر مٹی میں مل چکا ہے۔ مزید اطمینان چاہتے ہو فلاں مقام پر جا کر دیکھ لو۔ لیکن ایسا کرنے کے بجائے قرآن صرف یہی نہیں کہ اُن کی موت کی تصریح نہیں کرتا بلکہ عیسائیوں کو اُلٹا یہ اور بتا دیتا ہے کہ مسیح تو سرے سے صلیب پر چڑھائے ہی نہیں گئے۔ مسیح کو تو پہلے ہی خدا نے اُٹھا لیا تھا[1]

حضرت عیسٰی کو تیسری بشارت

۱۲ الف اور جنہوں نے تیرا انکار کیا ہے میں تجھے اُن سے پاک کر دوں گا یعنی میں تجھ کو ان ناپاک اور گندے کافروں کے متعفن اور بدبو دار پڑوس سے پاک کر دوں گا اور ایسی پاک و صاف مطہر جگہ میں پہنچا دوں گا جہاں کفر اور عداوت کی نجاست کا رائحہ کریہہ بھی محسوس نہ ہو سکے بلکہ ہر دم فرشتوں کی تسبیح و تقدیس کی خوشبوئیں اُٹھتی ہیں[2]

[1] تفہیم القرآن [2] معارف م ۱

یا مطلب یہ ہے کہ یہود کے سارے مکائد کھل کر رہ جائیں گے اور انہوں نے جیسے گندے الزامات تراشے ہیں سب کی قلعی کھل کر رہ جائے گی۔ [2]

یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ خاتم الانبیاء تشریف لائے اور یہود کے سارے غلط الزامات کو صاف کر دیا۔ [3]

علامہ آلوسی نے دونوں احتمال بتائے ایک یہ کہ حضرت کو یہودیوں سے دُور کر کے یہودیوں کی گندگی سے ان کی تطہیر کر دی جائے، دوسرے یہ کہ ان کو بچا کر یہودیوں کے مکر سے ان کی تطہیر کر دی جائے گی پہلے معنے اگر رفع سے مربوط ہیں تو دوسری احتمال کا توفی سے گہرا ربط ہے۔ ابن کثیر نے پہلے احتمال کو اپنایا ہے۔

حضرت مسیح کو چوتھی بشارت

اور جنہوں نے تیری پیروی کی ہے، انہیں قیامت تک تیری منکروں پر برتری دوں گا۔ یہاں اتباع سے مراد خاص اتباع ہے یعنی اعتقادِ نبوت بس مصداق متبعین کے وہ لوگ ہیں جو آپ کی نبوت کے معتقد ہیں لہٰذا اس میں نصاریٰ اور اہل اسلام دونوں داخل ہیں گو اس وقت نصاریٰ کا اتنا اتباع نجات آخرت کے لیے کافی نہیں ہے کیونکہ وہ دوسرے جز میں حضرت کی پیروی نہیں کرتے یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی خبر دے گئے اور ان پر ایمان لانے کی ہدایت کر گئے لیکن یہاں اتباع کامل مراد نہیں ہے۔ اور منکرین سے یہودی مراد ہیں جو حضرت عیسیٰ کی نبوت کے منکر ہیں آیت کا مطلب یہ ہے کہ اُمتِ محمدیہ اور نصاریٰ ہمیشہ یہود پر حاکم و غالب رہیں گے چنانچہ جلدی وہ وعدہ پورا ہوا اور یہود ذلیل و خوار ہوئے اور سلطنت ان کی برباد ہوئی۔ پھر آج تک یہودی نصاریٰ کے زیر نگیں یا اہل اسلام کے اور قیامت کے قرب تک ایسا ہی رہے گا۔ [4]

واضح الفاظ میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں اس بات کی بشارت ہے کہ حضرت مسیح کے نام لیوا ان کے منکریں پر ہمیشہ غالب رہیں گے۔ تاریخی طور پر یہ ایک امر واقعہ ہے کہ نصاریٰ من حیث القوم اس بشارت کے بعد سے یہود پر ہمیشہ حاکم و غالب رہے ہیں۔ آج بھی جب کہ بظاہر یہود کی ایک چھوٹے سے خطہ میں سلطنت قائم ہو چکی ہے۔ یہ حقیقت اپنی جگہ پر اسی طرح قائم و ثابت ہے جس طرح

---

[1] ماجدی [2] معارف م ش [3] بیان القرآن

پہلے قائم و ثابت تھی اس لیے کہ یہود کی یہ نام نہاد سلطنت قائم ہی نصاریٰ کے ہاتھوں ہوئی ہے اور باقی بھی ان ہی کے رحم و کرم پر ہے[1] منکرین سے آیت میں مراد یہودی ہیں جن کو حضرت عیسٰی نے ایمان لانے کی دعوت دی اور انہوں نے اسے رد کر دیا بخلاف اس کے پیروی کرنے والوں سے مراد اگر صحیح پیروی کرنے والے ہوں تو صرف مسلمان ہیں اور اس سے مراد اگر فی الجملہ آنجناب کے ماننے والے ہوں تو ان میں عیسائی اور مسلمان شامل ہیں[2]

یہ مسلمانوں اور سچے عیسائیوں کا یہودیوں پر غلبہ کس معنے اور کس حیثیت سے ہے؟ قوت دلائل کے لحاظ اور معنوی حیثیت سے تو بالکل ظاہر ہے۔ لیکن اگر مادی، حربی، ملکی اور سیاسی حیثیتیں مراد ہوں پھر بھی اس وقت تک جو کیفیت یہود کی دنیا کے ہر حصہ میں ہے۔ انہیں اس پیشین گوئی کا مصداق بنانے کے لیے بالکل کافی ہے، بہر حال مراد دونوں شقیں ہو سکتی ہیں۔ رازی اور بغوی دونوں کا زمانہ چھٹی صدی ہجری ہے۔ دونوں نے آیت کے تحت لکھا ہے کہ یہود کو دیکھو ہر جگہ ذلیل و خوار حکومت سے محروم ہیں۔ اس کے برعکس عیسائی بڑی بڑی حکومتوں کے مالک ہیں[3]

حضرت عیسٰی کو پانچویں بشارت

اور بالآخر قیامت کے روز سب کو میری طرف لوٹنا ہے اس دن ان باتوں کا فیصلہ کر دوں گا جن میں لوگ ایک دوسرے سے اختلاف کر رہے ہیں۔ یعنی اس بات کا فیصلہ اللہ سبحانہ روز قیامت فرمائے گا کہ یہودیوں اور عیسائیوں میں اپنے تقابلی نظریات میں سچا کون ہے۔

قرآن کا جب ظہور ہوا حضرت عیسٰی کے بارے میں یہودیوں کے عام عقائد یہ تھے۔ کہ ولادت کی حد تک حضرت عیسٰی معاذ اللہ ایک ناجائز تعلق کا نتیجہ ہیں۔ حضرت عیسٰی نبی نہیں بلکہ معاذ اللہ جھوٹے ہیں۔ حضرت عیسٰی نے کوئی معجزات نہیں دکھائے جو کچھ ہوا یہ جھوٹی فسوں کاری تھی حضرت عیسٰی کو یہودیوں نے عدالت کے ذریعہ موت کی سزا دلا دی اس کے مقابلے میں عیسائیوں کے حضرت عیسٰی کے بارے میں بنیادی عقائد یہ تھے۔ حضرت مسیح کی ولادت قدرت الٰہی کا کرشمہ ہے۔ حضرت عیسٰی الٰہ ہیں اور تین میں سے ایک ہیں۔ حضرت عیسٰی نے بہت معجزات دکھائے ہیں حضرت عیسٰی کو آسمان کی طرف اٹھا لیا گیا ہے اور موت کے شکار نہیں ہوئے۔

---

[1] تدبر قرآن [2] تفہیم القرآن [3] ماجدی

اس اختلاف کے فیصلہ کرنے کی دو صورتیں ہیں
ایک یہ کہ حقیقت کو ظاہر کر دیا جائے، دوسرے یہ کہ غلط کاروں کو سزا دی جائے۔ روز قیامت چونکہ مقام جزا ہے اس لیے وہاں فیصلہ جزا و سزا کا ہوگا۔ ورنہ جہاں تک اللہ کی جانب سے اختلافی مسائل میں اظہار حقیقت کا معاملہ ہے تو قرآن کا دعویٰ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی غرض ہی اظہار حقیقت اور تبیین ہے چنانچہ سورہ نمل میں یہ بات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرائض میں بتائی گئی ہے۔

وما انزلنا علیك الكتاب الا لتبین لهم الذی اختلفوا فیه وهدی ورحمة لقوم یومنون

اور ہم نے تم پر یہ کتاب نہیں اتاری مگر اس لیے کہ جن باتوں میں یہ لوگ اختلاف کر رہے ہیں تم ان کی حقیقت ان پر واضح کر دو۔ اور ایمان والوں کے لیے یہ ہدایت و رحمت ہے۔

نبوت نے یہاں دونوں کے درمیان اظہار حقیقت کر کے فیصلہ کر دیا ہے اور صاف بتا دیا کہ حضرت عیسٰی کی ولادت واقعی کرشمہ خداوندی ہے اور یہودی جو اسے ناجائز پیدائش کا نتیجہ قرار دے رہے ہیں غلط ہے اور مریم پر بہتان ہے اور عیسائی جو اسے معجزہ ربانی تصور کرتے ہیں درست ہے لیکن اس بنیاد پر مسیح میں الوہیت کا شائبہ نہیں آیا تخلیق اللہ کا کارنامہ ہے نہ کہ مسیح کا۔

یہودی ان کو جھوٹا کہتے تھے اور عیسائی ان کو خدا بتاتے تھے۔ قرآن نے فیصلہ کر دیا کہ وہ جھوٹے نہیں بلکہ سچے تھے اور خدا نہیں بلکہ خدا کے رسول تھے۔

یہودی کہتے تھے کہ حضرت مسیح معاذ اللہ شعبدہ باز اور فریبی تھے۔ عیسائیوں کا دعویٰ تھا کہ وہ صاحب معجزات تھے۔ قرآن نے یہودیوں کی تکذیب کی اور عیسائیوں کی تصدیق کی اور خود حضرت مسیح کے معجزات ایک ایک کر کے گنائے مگر بتا دیا کہ یہ سارے کام حضرت مسیح نے خود نہیں بلکہ باذن اللہ کیے اس لیے ایسی کوئی بات نہیں کہ اس وجہ سے ان میں الوہیت آجائے۔

یہودیوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے مسیح کو موت کے گھاٹ اتار دیا اور عیسائیوں کا عقیدہ تھا کہ اللہ نے ان کو آسمان کی طرف اٹھالیا۔ قرآن نے ماقتلوہ وماصلبوہ کہہ کر یہودیوں کی کھلی تردید کی اور رافعك الی کہہ کر عیسائیوں کی تائید کی اور صاف صاف فیصلہ کر دیا کہ حضرت مسیح موت کی آغوش میں نہیں گئے بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا ہے۔

گویا اظہار حقیقت کی حد تک تو فیصلہ اللہ نے زبان نبوت کے ذریعے دنیا میں کر دیا آخرت

یں جو کچھ فیصلہ ہوگا وہ جزاو سزا کا ہوگا۔اسی بنا پر اس فیصلہ کی آگے تفصیل بیان ہوئی ہے۔

روز قیامت فیصلہ کیا ہوگا

پھر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے انہیں دنیا و آخرت میں دونوں جگہ سخت عذاب دوں گا اور کوئی بھی عذاب الٰہی سے بچانے میں ان کا مددگار نہ ہوگا اور جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے تو ان کو ان کا پورا پورا اجر ملے گا اور خوب جان لو کہ اللہ ظالموں سے محبت نہیں کرتا
کفر کی راہ یہ ہے کہ حضرت مسیح کی ولادت کو ناجائز تعلق کا نتیجہ قرار دیا جائے۔ انہیں شعبدہ باز اور فریبی سمجھ لیا جائے۔ان کے خوارق اور معجزت کا انکار کیا جائے۔ان کی نبوت ورسالت کو نہ مانا جائے اور یقین کرلیا جائے کہ ان کو قتل کردیا گیا یا ان کو صلیبی موت آگئی اور ولادت میں کرشمہ قدرت کی وجہ سے ان کے بارے میں عبدیت کی جگہ الہیت اور ابنیت اور اقانیم ثلاثہ کا عقیدہ پیدا کرلیا جائے یہ سب کفر کی راہیں ہیں۔ دونوں افراط وتفریط میں کھوئے گئے اور ظالم کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔

اللہ کے رسول اپنی قوم میں عدالت کی حیثیت رکھتے ہیں ان کے ذریعہ سے لازماً قوم کے درمیان حق و باطل کا فیصلہ ہوجاتا ہے۔ رسول اور اس کے ساتھیوں کو غلبہ ہوتا ہے حضرت مسیح ہجرت کرکے جاچکے ہیں۔ان کی ہجرت کا لازمی تقاضا ہے کہ ان کی حضور انور کی طرح واپسی ہو اور عذاب الٰہی کا ظہور ہو اور یہ اس وقت ہوگا جب حضرت عیسٰی علیہ السلام کا نزول ہوگا۔یہی دنیا میں فیصلہ کا وقت ہوگا۔ اختلاف بھی دو قسم کا ہے ایک اہل قرآن کا یہودیوں سے ہے اور دوسرا اہل قرآن کا عیسائیوں سے ہے۔ یہودیوں سے حضرت عیسٰی کے رسول ہونے اُن کی ولادت کے کرشمہ قدرت ہونے اور ان کے مقتول اور مصلوب نہ ہونے میں ہے اور عیسائیوں سے ان کے خدا ہونے، خدا کا بیٹا ہونے میں ہے گویا اصل فریق دو ہیں ایک راہ اعتدال والے اور دوسرے افراط و تفریط والے۔شائد انداز تعبیر کی تبدیلی بھی اسی لیے کی گئی ہے یعنی سب کو مخاطب بنا لیا گیا ہے

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں یہی سوچتا ہوں کہ ارشاد نبوت میں نزول ابن مریم کی جو خبر دی گئی ہے اس میں جو آپ کے تعارف میں دو لفظ زبان نبوت پر آئے ہیں حکماعد لاً یعنی منصف فیصلہ کرنے والے کی حیثیت سے آئیں گے۔حکم وہی ہو سکتا ہے جو فریقین کے نزدیک مسلم ہو۔

حضرت عیسیٰ کی شخصیت چونکہ عیسائیوں اور مسلمانوں دونوں کے نزدیک مسلم ہے اس لیے آپ کو حکم کہا گیا حکم کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ دُنیا کے خاتمہ پر جملہ ادیان کا اختلاف ختم ہو کر وحدت قائم ہو۔ اور اس کے لیے اہل کتاب اور اہل قرآن کا باہم اختلاف ختم ہونا ضروری ہے۔ چونکہ اللہ تعالیٰ کے تمام فیصلے دلائل و براہین کی روشنی میں ہوتے ہیں اس لیے تقاضائے مصلحت یہی ہوا کہ اس مقصد کے لیے ایسی شخصیت آئے جو فریقین کے نزدیک مسلم ہو۔

آیئے اب اس پوری تشریح کو جو ان آیات کے سلسلے میں پیش کی گئی ہے۔ حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کی زبانی سن لیجئے۔

بادشاہ نے لوگوں کو مامور کیا کہ مسیح علیہ السلام کو پکڑیں۔ سُولی پر چڑھائیں اور ایسی عبرتناک سزا دیں جسے دیکھ کر دوسرے لوگ ان کا اتباع کرنے سے رک جائیں (ابن کثیر) خداوند قدوس نے اس کے جواب میں مسیح علیہ السلام کو مطمئن فرمادیا کہ بیں ان اشقیاء کے ارادوں اور منصوبوں کو خاک میں ملا دوں گا۔ یہ چاہتے ہیں کہ تجھے پکڑ کر قتل کریں اور تیری بعثت اور پیدائش سے جو مقصد متعلق ہے اسے پورا نہ ہونے دیں اور اس طرح اللہ تعالیٰ کی نعمت عظیمہ کی بے قدری کریں۔ لیکن میں ان سے اپنی نعمت لے لوں گا۔ تیری عمر مقدر اور جو مقصد عظیم اس سے متعلق ہے پورا کر کے رہوں گا اور تجھ کو پورے کا پورا صحیح سالم بچالوں گا کہ ذرا بھی تیرا بال بیکا نہ کریں۔ بجائے اس کے کہ وہ لے جائیں۔ اللہ تجھے اپنی پناہ میں لے جائے گا۔ وہ صلیب پر چڑھانا چاہتے ہیں اللہ تجھے آسمان پر چڑھائے گا۔ ان کا ارادہ ہے۔ کہ رُسواکن اور عبرتناک سزائیں دے کر لوگوں کو تیری اتباع سے روک دیں لیکن خدا ان کے ناپاک ہاتھ تیرے تک نہ پہنچنے دے گا بلکہ اس گندے اور نجس مجمع کے درمیان سے تجھ کو بالکل پاک و صاف اٹھالے گا۔ اور اس کے بجائے کہ تیری بے عزتی ہو اور لوگ ڈر کر تیری اتباع سے رُک جائیں۔ تیرا اتباع کرنے والوں اور تیرے نام لیواؤں کو قیامت تک منکروں پر غالب وقاہر رکھے گا۔ جب تک تیرا انکار کرنے والے یہود اور اقرار کرنے والے مسلمان یا نصاریٰ دُنیا میں رہیں گے ہمیشہ اقرار کرنے والے منکرین پر فائق وغالب رہیں گے۔ بعدہ ایک وقت آئے گا جب تجھ کو تیرے موافق ومخالف سب لوگوں کو میرے حکم کی طرف لوٹنا ہے۔ اُس وقت میں تمہارے سب جھگڑوں کا دو ٹوک فیصلہ کردوں گا اور سب اختلافات ختم کردوں گا یہ فیصلہ کب ہوگا؟ اس کی جو تفصیل فاما الذین کفروا فاعذبهم عذابًا شديدًا في الدنيا... الخ سے بیان کی گئی ہے وہ بتلاتی ہے کہ آخرت سے پیشتر دنیا ہی میں اس کا نمونہ شروع کر دیا جائے گا یعنی اس وقت تمام کافر عذاب شدید کے نیچے ہوں گے کوئی طاقت ان کی

مدد اور فریاد کو نہ پہنچ سکے گی۔ اس کے بالمقابل جو ایمان والے ہیں ان کو دُنیا و آخرت میں پورا پورا اجر دیا جائے گا اور بے انصاف ظالموں کی پٹر گارٹ دی جائے گی۔

اُمت مرحومہ کا اجماعی عقیدہ

اُمت مرحومہ کا اجماعی عقیدہ ہے کہ جب یہود نے ناپاک تدبیریں پختہ کریں تو حق تعالیٰ نے[1] حضرت مسیح علیہ السلام کو زندہ آسمان پر اٹھالیا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی متواتر احادیث کے موافق قیامت کے قرب میں جب دُنیا کفر و ضلالت اور دجل و شیطنت سے بھر جائے گی۔ اللہ تعالیٰ خاتم انبیاء بنی اسرائیل حضرت مسیح بن مریم کو خاتم الانبیا علی الاطلاق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک نہایت وفادار جرنل کی حیثیت میں نازل کر کے دینا کو دکھلا دے گا کہ انبیاء سابقین کو بارگاہ خاتم النبیین کے ساتھ کس قسم کا تعلق ہے۔ حضرت مسیح دجال کو قتل کریں گے اور اس کے اتباع یہود کو چن چن کر قتل کریں گے۔ کوئی یہودی جان نہ بچا سکے گا۔ شجر و حجر تک پکاریں گے کہ ہمارے پیچھے یہودی ہے۔

---

[1] اس موضوع پر تیس صحابہ سے تقریباً سو حدیثوں میں باسالیب مختلفہ اس مسئلہ کو بتکرار قسمیں کھا کھا کر بتایا گیا ہے۔ اس بڑے ذخیرے میں سے ۳۰ حدیثیں تو ایسی ہیں جن کی تصحیح و تحسین محدثین نے صراحت کے ساتھ ثبت فرمادی ہے اور بقیہ کے متعلق گو صراحتہً ان سے تحسین منقول نہ ہو لیکن کوئی صاف جرح بھی ثابت نہیں ہے۔ اس سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ متواتر حدیث کی جو بڑی سے بڑی مثال پیش کی گئی ہے۔ اس حدیث کا پلہ کسی طرح بھی اس سے کم نہیں ہے۔ ان صحابہ کے اسماء مبارکہ یہ ہیں جن سے احادیث نزول نقل ہو کر ہم تک پہنچی ہیں۔ ان کی تفصیلی روایات دیکھنی ہوں تو محترم جناب مفتی محمد شفیع کی کتاب التصریح بما تواتر من الاحادیث فی نزول المسیح میں ملاحظہ فرمائیں۔

ابو ہریرہ، جابر بن عبداللہ، نواس بن سمعان، عبداللہ بن عمر، حذیفہ بن سید، ثوبان، مجمع، ابو امامہ، ابن مسعود، ابو نفرہ، سمرۃ عبدالرحمان بن جبیر ابوالطفیل، انس، واثلہ، عبداللہ بن سلام، ابن عباس، اوس، عمران، عائشہ، سفینہ، حذیفہ، عبداللہ بن مغفل، عبدالرحمان بن سمرہ، ابو سعید خدری، عمار، ربیع، الحسن، عروہ بن رویم، کعب۔ رضی اللہ عنہم اجمعین۔

حضرت مسیح صلیب کو توڑیں گے۔ نصاریٰ کے باطل عقائد وخیالات کی اصلاح کر کے تمام دُنیا کو ایمان کے راستہ پر ڈالیں گے۔ اس وقت تمام جھگڑوں کا فیصلہ ہو کر اور مذہبی اختلافات مٹ مٹا کر ایک اللہ کا سچا دین اسلام رہ جائے گا۔ اسی وقت کی نسبت فرمایا کہ وان من اھل الکتاب الالیومنن بہ قبل موتہ۔ اس کی پوری تقریر اور رفع مسیح کی کیفیت سورہ نساء پارہ ششم میں آئے گی۔

بہرحال میرے نزدیک ثم الی ربکم مرجعکم صرف آخرت سے متعلق نہیں ہے بلکہ دنیا و آخرت دونوں سے تعلق رکھتا ہے جیسا کہ تفصیل کے موقع پر فی الدنیا والاخرۃ کا لفظ صاف شہادت دے رہا ہے اور یہ اس کا قرینہ ہے کہ الی یوم القیامۃ کے معنے قرب قیامت کے ہیں چنانچہ احادیث صحیحہ میں مصرح ہے کہ قیامت سے پہلے ایک مبارک وقت ضرور آنے والا ہے جب سب اختلافات مٹ مٹا کر ایک دین باقی رہ جائے گا۔

قرآن کے اختیارات لُغویہ

لفظ توفی کے متعلق کلیات ابی البقاء میں ہے کہ توفی کا لفظ عوام کے یہاں موت اور جان لینے کے لیے استعمال ہوتا ہے لیکن بلغا کے یہاں اس کے معنے ہیں پورا وصول کرنا اور ٹھیک لینا گویا ان کے نزدیک موت پر بھی توفی کا اطلاق اسی حیثیت سے ہوا کہ موت میں کوئی عضو خاص نہیں بلکہ خدا کی طرف سے پوری جان وصول کی جاتی ہے۔ اب اگر فرض کرو کہ اللہ تعالیٰ نے کسی کی جان بدن سمیت لے لی تو اسے بطریق اولیٰ توفی کہا جائے گا۔ جن اہل لغت نے توفی کے معنے قبض روح لکھے ہیں۔ انہوں نے یہ نہیں کہا کہ قبض رُوح مع البدن کو توفی نہیں کہتے نہ کوئی ایسا ضابطہ بتلایا ہے۔ کہ جب توفی کا فاعل اللہ تعالیٰ اور مفعول ذی رُوح ہو تو توفی کے معنے موت کے سوا کچھ نہیں۔ ہاں چونکہ عموماً قبض رُوح بغیر بدن ہوتا ہے اس لیے کثرت و عادت کے لحاظ سے اکثر موت کا لفظ اس کے ساتھ لکھ دیتے ہیں ورنہ لفظ کا لغوی مدلول قبض روح مع البدن ہے۔

قرآن نے خود توفی نفس وقبض روح کی دو صورتیں بتائی ہیں۔ موت اور نیند۔ اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا اس تقسیم سے اور انفس کو مفعول بنا کر حین موتھا کی قید لگا کر اشارہ کر دیا ہے کہ توفی اور موت دو الگ الگ چیزیں ہیں۔ جو توفی ہے وہ موت نہیں اور جو موت ہے وہ توفی نہیں ہے اصل یہ ہے کہ قبض رُوح کے مختلف درجے ہیں۔ ایک درجہ وہ ہے جو موت کی صورت میں نمایاں ہو۔ دوسرا درجہ وہ ہے جو نیند کی صورت میں

ظاہر ہو۔ قرآن ان دونوں پر توفی بولتا ہے موت کی تخصیص نہیں ہے چنانچہ یتوفاکم باللیل میں بھی قوم پر توفی بولا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جیسے ان دو آیتوں میں قرآن نے نیند پر توفی کا لفظ استعمال کیا ہے حالانکہ نیند کی حالت میں قبض روح بھی پورے طور پر نہیں ہوتا ٹھیک اسی طرح اس آیت میں یعنی متوفیك میں توفی کا لفظ قرآن نے اگر قبض روح مع البدن پر بولا ہے تو اس میں استحالہ کیا ہے جب کہ توفی کا مدلول لغوی بھی یہی ہے بخصوصاً جب یہ حقیقت بھی پیش نظر ہو کہ موت اور نوم کے لیے توفی کا لفظ قرآن کے اختیارات لغویہ میں سے ہے ورنہ عرب جاہلیت تو اس حقیقت ہی سے ناآشنا تھی کہ موت اور نیند اللہ تعالیٰ کوئی چیز آدمی سے وصول کرنا ہے اسی لیے لفظ توفی موت اور نیند کے معنے میں زمانہ جاہلیت میں شائع نہیں ہے۔ قرآن نے اپنے مخاطبوں کو موت کی حقیقت سمجھانے کے لیے اس لفظ کا استعمال شروع کیا ہے کہ موت یہ نہیں ہے کہ یہاں موجود معدوم ہو رہا ہے بلکہ موت یہ ہے کہ مالک اپنی ملکیت وصول کر رہا ہے اور لے رہا ہے۔ جیسے قرآن کو یہ حق ہے ایسے یہ بھی اس کا حق ہے کہ اس لفظ کو موت اور نیند کی طرح روح مع البدن لینے کے معنے میں استعمال کرے۔

بہرحال آیت میں جمہور کے نزدیک توفی سے موت مراد نہیں ہے اور ابن عباس سے صحیح روایت یہی ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھائے گئے ہیں۔ کمافی روح المعانی۔

زندہ اٹھائے جانے یا دوبارہ نازل ہونے کے موضوع پر سلف صالحین میں سے کسی سے انکار منقول نہیں ہے۔ بلکہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے التلخیص الجبیر میں اس پر اجماع نقل کیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے احادیث نزول کو متواتر کہا ہے اور اکمال میں امام مالک سے اس کی تصریح نقل کی ہے

اس موضوع پر مستقل رسالے اور کتابیں شائع ہو چکی ہیں مگر میں اہل علم کو توجہ دلاتا ہوں کہ ہمارے مخدوم علامہ فقید النظیر حضرت مولانا السید انور شاہ کشمیری نور اللہ مرقدہ نے رسالہ عقیدۃ الاسلام میں جو علمی لعل و جواہر ودیعت کیے ان سے مستفید ہونے کی کوشش کریں۔ میری نظر میں ایسی جامع کتاب اس موضوع پر کوئی نہیں لکھی گئی [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ذٰلِكَ نَتۡلُوۡهُ عَلَيۡكَ مِنَ الۡاٰيٰتِ وَالذِّكۡرِ الۡحَكِيۡمِ ۞ اِنَّ مَثَلَ عِيۡسٰى عِنۡدَ اللّٰهِ كَمَثَلِ اٰدَمَ ؕ خَلَقَهٗ مِنۡ تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهٗ كُنۡ فَيَكُوۡنُ ۞ اَلۡحَقُّ مِنۡ رَّبِّكَ فَلَا تَكُنۡ مِّنَ الۡمُمۡتَرِيۡنَ ۞

اے پیغمبر یہ اللہ کی آیتیں اور حکیمانہ ذکر ہے جو ہم تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں[۵۸]۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک عیسٰی ایسا ہی ہے جیسے آدم۔ اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے کہا کہ ہو جا پس ہو گیا[۵۹]۔ اے پیغمبر یہ تمہارے پروردگار کی جانب سے حق ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں سے مت ہو جانا[۶۰]

اصل موضوع کی طرف التفات:

تمام تفصیلات بیان فرمانے کے بعد روئے سخن پھر اصل کی طرف ہو گیا۔ اصل موضوع یہ تھا کہ اللہ کی محبت کی شرط محمد رسول اللہ کا اتباع اور آخرت میں نجات کا مدار آپ کی طاعت ہے آپ کو بھی اللہ کی جانب سے اصطفائی شان ایسی ہی ملی ہے جیسے ان موصوفین و مذکورین کو ملی ہے اور جن کی شان اصطفائی کو تم بھی مانتے ہو اور پھر ان مذکورین کی شان اصطفائی بیان کرتے ہوئے وہ حقائق بھی زبان وحی پر آگئے جو خود وقت کی علمی طاقتوں اہل کتاب کے یہاں بھی طاق نسیان بن چکے تھے اس لیے حقائق کو بے نقاب کرنے کے بعد فرمایا ذالك نتلوه عليك یعنی یہ حقائق ہم ہی آپ کو بتا رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اُمی جو اُمیوں کی گود میں پلا ہو۔ اور پل کر جوان ہوا ہو۔ علوم و فنون اور تمدن

وتہذیب سے ایک عاری ملک، عاری شہر اور عاری خاندان کے اندر نشو ونما پائی ہو۔ جہاں اہل علم کا وجود نہ تھا۔ وہ خود اس کا خاندان اور اس کا وطن نوشت وخواند کے نقوش وحروف سے نا آشنا تھا گزشتہ صحف انبیاء اور افکار عالیہ کا ایک حرف کبھی اس کے کان میں نہ پڑا تھا۔ علماء اور دانشوروں کا صحبت یافتہ نہ تھا۔ اب اگر وہ اپنی زندگی کا چالیسواں سال گزرنے پر ظاہری نوشت وخواند کے نقوش کا طلسم توڑ کر صحفِ انبیاء اور افکار عالیہ دُنیا کے سامنے یکایک پیش کرتا ہے تو سوچنے کی بات ہے کہاں سے کرتا ہے۔ ان حالات وواقعات سے واقفیت حاصل کرنے کے تین ہی ذریعے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ وہ خود ان واقعات کے وقت موجود ہو۔ دوسرا یہ کہ ان حالات کو کتابوں میں پڑھے، تیسرا یہ کہ اوروں سے سُنے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم اطلاع کے ان تینوں ذرائع سے بیگانہ تھے اور آپ کی اُمیت پر سب کو یقین تھا۔ اس آیت میں قرآن بتاتا ہے کہ جب یہ سب ذرائع منفی ہیں تو آپ کے علم کا ذریعہ اللہ سبحانہٗ کی وحی کے سوا اور کیا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ آپ کی صداقت کی بھی دلیل ہے کہ آپ نا آشنائے تعلیم ہو کر اللہ کی آیات پیش کر رہے ہیں اور ان واقعات کو بتا رہے ہیں جن کی خود علماء اہل کتاب کو بھی ہوا نہیں لگی اور صرف یہی نہیں کہ واقعات کی حد تک آپ حقائق کا اظہار کر رہے ہیں بلکہ دلآویز نصیحتوں اور عالمگیر صداقتوں کے معلم کی حیثیت سے آپ دنیا والوں سے مخاطب ہیں یہ آپ کے اللہ کے رسول ہونے کی نشانی ہے۔

۱۱۶۔ اے پیغمبر یہ اللہ کی آیتیں اور حکیمانہ ذکر ہے جو ہم تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یعنی یہ آپ کا تلاوت آیات کرنا آپ کی صداقت ونبوت کی نشانیوں میں سے ہے۔ ارشاد یہ ہو رہا ہے کہ حضرت مسیح کے حالات وواقعات جن پر یہود ونصاریٰ کی تاریخوں نے غلو وافراط کے پردے ڈال رکھے ہیں۔ یہ جو آپ قرآن کے ذریعے بالکل صحیح ومعتبر طور پر ان کو سنا رہے ہیں یہ خود اس کی دلیل ہے کہ آپ مؤید من اللہ ہیں اور آپ وہی کچھ کہہ رہے ہیں جو عالم الغیب والشادۃ آپ سے کہلا رہا ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ اے اللہ کے رسول یہ اللہ کی آیتیں اور حکیمانہ باتیں ہیں جو ہم تمہارے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ یہ آپ کا خود ساختہ وپرداختہ اور کسی انسان سے آموختہ نہیں یہ قصّہ جو حضرت عیسٰی کا آپ نے بیان فرمایا ہے یعنی ان کی ربانی کرشمہ کے ذریعے پیدائش، ان کے اعجازی کارنامے اور

---

[1] ماجدی

ان کی دشمنوں کے نرغے میں حفاظت اور صحیح و سالم ان کا آسمان پر اٹھا لینا اور اللہ کی جانب سے ان کو بشارتیں، یہ سب اللہ کی آیتیں ہیں جو آپ کو سنائی جارہی ہیں اور یہ تمہارے اللہ کا رسول ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے کیونکہ نہ آپ نے یہ کہیں پڑھا ہے اور نہ آپ ان واقعات میں موجود تھے۔ گویا بتا دیا گیا ہے کہ اس سرگزشت میں جو کچھ بیان ہوا ہے یہ سرتاسر اللہ کی آیات میں جو وحی کے ذریعے اللہ نے آپ کو بتائی ہیں۔ اگر وحی الٰہی کا فیضان نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ ان واقعات کا تمہیں علم ہوتا اور دنیا کے آگے تم اس طرح پیش کر دیتے۔ ظاہر ہے کہ یہ واقعات تم سے سینکڑوں سال پہلے کے ہیں اور دنیا میں گزشتہ واقعات کے علم و سماعت کے جتنے وسائل ہو سکتے ہیں ان میں سے کوئی وسیلہ بھی تمہارے پاس موجود نہیں ہے اس لیے بلاشبہ تم اللہ کے رسول ہو۔

ایک شبہ اور اُس کا جواب:

۱۱۷۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک عیسیٰ ایسا ہی ہے جیسے آدم۔ اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا پھر اس سے کہا کہ ہو جا پس ہو گیا۔ نصاریٰ اس بات پر آنحضرت سے بہت جھگڑے کہ عیسیٰ اللہ کا بندہ نہیں اللہ کا بیٹا ہے۔ آخر کہنے لگے وہ اللہ کا بیٹا نہیں تو بتاؤ کس کا بیٹا ہے اس کے جواب میں قرآن نے ان کو بتایا کہ آدم کے تو نہ باپ تھا نہ ماں عیسیٰ کے باپ نہ ہو تو کون سی حیرت کی بات ہے (موضح القرآن) اس حساب سے تو آدم کو خدا کا بیٹا ثابت کرنے پر زیادہ زور دینا چاہیے، حالانکہ کوئی بھی اس کا قائل نہیں ہے [1]

یعنی یہ جواب ہے اُس مشہور شبہ کا کہ جب مسیح کی پیدائش ساری دُنیا کے عام ضابطے کے خلاف بغیر باپ کے ہوئی تو انہیں بجائے فوق البشر کے محض بشر کیسے تسلیم کیا جائے؟ جواب یہ ہے۔ کہ آدم کو بشر تو تم خود بھی مانتے ہو۔ حالانکہ ان کی پیدائش مسیح سے بھی زیادہ عجیب تر طریقے سے ہوئی یعنی وہاں نہ ماں ہے نہ باپ۔ مخلوق اور حادث ہونے کا مدار کسی خاص متعین طرز ظہور پر نہیں مطلق حدوث پر ہے اور حدوث حضرت عیسیٰ کی پیدائش میں پوری طرح موجود ہے مطلب یہ ہے۔ کہ جس طرح اللہ نے آدم کو مٹی سے پیدا کیا اور اس کو فرمایا کہ ہو جا تو وہ ہو گیا ٹھیک اسی طرح اللہ تعالیٰ نے مسیح کو اپنے کلمہ کن سے پیدا کیا بلکہ پیدائش کے معاملہ میں آدم کو اس لحاظ سے عیسیٰ پر

[1] افادات شیخ الاسلام

فضیلت ہے کہ ان کی ولادت میں نہ باپ کو دخل ہے نہ ماں کو تو جب آدم کو بغیر ماں اور باپ کے پیدا ہو کر معبود نہیں مانتے ہو تو حضرت عیسیٰ کو کیوں معبود مانتے ہو لے

اس آیت میں قرآن نے عیسائیوں کے ان تمام دلائل کو تار عنکبوت بنا کر رکھ دیا جو عیسائی دنیا مسیح کی الوہیت کے سلسلے میں آج تک پیش کرتی آئی ہے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ قدس سرہ العزیز نے اظہار الحق میں عیسائیوں کے دلائل کا تیسری فصل میں ایک مختصر جائزہ پیش فرمایا ہے آئیے اب بھی مولانا کے علوی سے تھوڑا سا استفادہ فرما لیجئے۔ مولانا کا دعویٰ ہے کہ عیسائیوں کا حضرت مسیح بن مریم کو الاہمنا دلائل عقلیہ وقطعیہ اور خود نصوص عیسویہ کی رُو سے ناجائز ہے۔ اس کے بعد مولانا نے ان کے ان چھ دلائل کو منہ توڑ جواب دیا ہے جن کی بنیادوں پر الوہیت مسیح کا انہوں نے گھروندا بنایا ہے لجزاہ اللہ تعالی عن المسلمین ۔

نصاریٰ کے دلائل پر ایک نظر

پہلا استدلال

عیسائی حضرات سب سے پہلے انجیل کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے لیکن یہ دلیل دو وجہ سے انتہائی کمزور ہے۔

اول تو اس لیئے کہ یہ آئتیں ان آیتوں سے متصادم ہیں جن میں حضرت مسیح علیہ السلام کو انسان کا بیٹا کہا گیا ہے۔ اسی طرح حضرت مسیح کو داؤد کا بیٹا کہنے کے بھی معارض ہے لہٰذا اس قسم کی تطبیق ضروری ہے کہ جو عقلی دلائل کے بھی مخالف نہ ہو اور محال بھی لازم نہ آئے۔

دوسرے اس لیے کہ ابن کو اس کے حقیقی معنی میں لینا درست نہیں ہو سکتا کیونکہ اس کے معنی تمام جہان کے آئمہ لغت کے نزدیک متفق علیہ طور پر یہ ہیں کہ جو شخص ماں باپ دونوں کے مشترک نطفہ سے پیدا ہوا ہو اور یہ معنی یہاں پر محال ہے اس لیے کسی ایسے مجازی معنی پر محمول کرنا ضروری ہے جو مسیح کی شان کے مناسب بھی ہوں بالخصوص جب کہ انجیل ہی سے یہ بات بھی معلوم ہو چکی ہے کہ یہ لفظ مسیح کے حق میں راست باز شخص کے معنی میں مستعمل ہوا ہے۔ چنانچہ انجیل مرقس کے پندرھویں باب کی آیت ۳۹ میں ہے۔

لہ ماجدی

اور جو صوبہ دار اس کے سامنے کھڑا تھا اس نے اسے یوں دم دیتے ہوئے دیکھ کر کہا بے شک یہ آدمی خدا کا بیٹا تھا۔

اور لوقا نے اپنی انجیل کے باب ۲۳ آیت ۴۷ میں اس صوبہ دار کا قول اس طرح نقل کیا ہے۔

یہ ماجرا دیکھ کر صوبہ دار نے خدا کی تمجید کی اور کہا بے شک یہ آدمی راست باز تھا۔

دیکھئے انجیل مرقس میں 'خدا کا بیٹا' کا لفظ اور انجیل لوقا میں اس کے بجائے 'راست باز' کا لفظ استعمال ہوا بلکہ اس لفظ کا استعمال صالح شخص کے معنی میں مسیح کے علاوہ دوسروں کے لیے بھی اسی طرح کیا گیا ہے جس طرح بدکار کے حق میں 'ابلیس کا بیٹا' کہا گیا ہے چنانچہ انجیل متی کے باب ۵ میں ہے۔

مبارک ہیں وہ جو صلح کراتے ہیں کیونکہ وہ خدا کے بیٹے کہلائیں گے

پھر آیت ۴۴ میں ہے۔

لیکن میں تم سے کہتا ہوں کہ اپنے دشمنوں سے محبت رکھو اور اپنے ستانے والوں کے لیے دعا کرو اور اپنے بغض رکھنے والوں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور جو لوگ تمہیں گالیاں دیتے ہیں ان پر رحم کرو، تاکہ تم اپنے باپ کے جو آسمان پر ہے بیٹے ٹھہرو،

آیات ۴۴، ۴۵)

ملاحظہ فرمایئے۔ یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے صلح کرنے والوں اور مذکورہ اعمال کرنے والوں پر خدا کے بیٹے کا اطلاق فرمایا ہے اور اللہ کو ان کی نسبت سے باپ قرار دیا ہے اس کے علاوہ انجیل یوحنا کے باب ۸ میں حضرت مسیح علیہ السلام اور یہودیوں کے سوال و جواب بیان کرتے ہوئے آپ کا ارشاد اس طرح نقل کیا گیا ہے۔

تم اپنے باپ کے سے کام کرتے ہو انہوں نے اس سے کہا ہم حرام سے پیدا نہیں ہوئے ہمارا ایک باپ ہے یعنی خدا۔ یسوع نے ان سے کہا اگر خدا تمہارا باپ ہوتا تو تم مجھ سے محبت رکھتے۔

اس کے بعد آیت ۴۴ میں ہے۔

تم اپنے باپ ابلیس سے ہو اور اپنے باپ کی خواہشوں کو پورا کرنا چاہتے ہو وہ شروع ہی سے خونی ہے اور سچائی پر قائم نہیں رہا کیونکہ اس میں سچائی ہے نہیں جب وہ جھوٹ بولتا ہے تو اپنی ہی سے کہتا ہے کیونکہ وہ جھوٹا ہے بلکہ جھوٹ کا باپ ہے۔

پس یہودی مدعی تھے کہ ہمارا باپ ایک ہی ہے یعنی اللہ، اور مسیح کہتے تھے کہ نہیں بلکہ تمہارا باپ شیطان ہے اور ظاہر ہے کہ اللہ اور شیطان حقیقی معنی کے لحاظ سے کسی کے بھی باپ نہیں اس لیے اس لفظ کو معنی مجازی پر محمول کرنا ضروری ہے۔ مقصود یہود کا یہ تھا کہ ہم نیک اور خدا کے فرمانبردار ہیں یوحنا کے پہلے خط باب ۳ آیت میں ہے۔

جو کوئی خدا سے پیدا ہوا ہے وہ گناہ نہیں کرتا کیونکہ اس کا تخم اس میں بنا رہتا ہے بلکہ وہ گناہ کر ہی نہیں سکتا کیونکہ خدا سے پیدا ہوا ہے اسی سے خدا کے فرزند اور ابلیس کے فرزند ظاہر ہوتے ہیں۔ (آیات ۹، ۱۰)

اسی خط کے پانچویں باب میں ہے۔

جس کا یہ ایمان ہے کہ یسوع ہی مسیح ہے وہ خدا سے پیدا ہوا ہے اور جو کوئی والد سے محبت رکھتا ہے وہ اس کی اولاد سے بھی محبت رکھتا ہے جب ہم خدا سے محبت رکھتے اور اس کے حکموں پر عمل کرتے ہیں تو اس سے معلوم ہو جاتا ہے کہ خدا کے فرزندوں سے بھی محبت رکھتے ہیں۔

اور رومیوں کے نام خط کے باب ۸ آیت ۱۴ میں ہے

اس لیے کہ جتنے خدا کی روح کی ہدایت سے چلتے ہیں وہی خدا کے بیٹے ہیں۔

اور فلپیوں کے نام خط کے باب ۲ آیت ۱۴ میں پولس رقمطراز ہے۔

سب کام شکایت اور تکرار کے بغیر کیا کرو تاکہ تم بے عیب اور بھولے ہو کر ٹیڑھے اور کجرو لوگوں میں خدا کے بے نقص فرزند بنے رہو۔

یہ اقوال ہمارے دعوے . . . . پر وضاحت سے دلالت کرتے ہیں اور جب کہ لفظ (اللہ) وغیرہ جیسے الفاظ کے استعمال سے الوہیت ثابت نہیں ہوتی جیسا کہ مقدمہ کے امر رابع سے معلوم ہو چکا تو ابن اللہ جیسے الفاظ سے کیونکہ ثابت ہو سکتا ہے بالخصوص جب کہ ہمارے پیش نظر عہد عتیق وجدید کی کتابوں میں مجاز کا بے شمار استعمال بھی ہے جیسا کہ مقدمہ سے معلوم ہوا اور پھر خاص طور پر جب کہ دونوں عہدوں کی کتابوں میں بے شمار مقامات پر باپ اور بیٹے کے الفاظ کا استعمال پایا جاتا ہے جن میں سے ہم کچھ نمونے کے طور پر نقل کرتے ہیں۔

اس کے علاوہ خروج کے باب ۴ آیت ۲۲ میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد اس طرح مذکور ہے

اور تو نے فرعون سے کہنا کہ خداوند یوں کہتا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پہلوٹھا ہے اور میں تجھے کہہ چکا ہوں کہ میرے بیٹے کو جانے دے تاکہ وہ میری عبادت کرے اور تو نے اسے اب تک جانے دینے سے انکار کیا ہے سو دیکھ میں تیرے بیٹے کو بلکہ تیرے پہلوٹھے کو مار ڈالوں گا۔ (آیات ۲۲، ۲۳)

اس عبارت میں دو جگہ اسرائیل کو خدا کا بیٹا کہا گیا ہے بلکہ پہلوٹھے کا لفظ استعمال کیا گیا ہے زبور نمبر ۸۹ آیت ۱۹ میں اللہ تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے حضرت داؤد علیہ السلام کا ارشاد اس طرح نقل کیا گیا ہے۔

اس وقت تو نے رویا میں اپنے مقدسوں سے کلام کیا اور فرمایا کہ میں نے ایک زبردست کو مددگار بنایا ہے اور قوم میں سے ایک کو چن کر سرفراز کیا ہے میرا بندہ داؤد مجھے مل گیا اپنے مقدس تیل سے میں نے اسے مسح کیا ہے . . . .
وہ مجھے پکار کر کہے گا تو میرا باپ میرا خدا اور میری نجات کی چٹان ہے اور میں اس کو اپنا پہلوٹھا بناؤں گا اور دنیا کا شہنشاہ (آیات ۹ تا ۲۷)

دیکھئے یہاں اللہ کے لیے " باپ " کا لفظ اور داؤد علیہ السلام کے لیے "زبردست" "چنا ہوا"، "مسیح اور" اللہ کا پہلوٹھا" جیسے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں۔ کتاب یسعیاہ باب ۶۳ آیت ۱۶ میں ہے کہ حضرت یسعیاہ علیہ السلام باری تعالیٰ سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

یقیناً تو ہمارا باپ ہے اگرچہ ابرہام ہم سے ناواقف ہو اور اسرائیل ہم کو نہ پہچانے تو اے خداوند ہمارا باپ اور فدیہ دینے والا ہے تیرا نام ازل سے یہی ہے اور اسی کتاب کے باب ۶۴ آیت ۸ میں ہے۔
تو بھی اے خداوند تو ہمارا باپ ہے۔

ان آیتوں میں حضرت یسعیاہ علیہ السلام نے صراحت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو اپنا اور تمام بنی اسرائیل کا باپ قرار دیا ہے

کتاب ایوب باب ۳۸ آیت ۷ میں ہے۔
جب صبح کے ستارے مل کر گاتے تھے اور خدا کے سب بیٹے خوشی سے للکارتے تھے

شروع جواب میں معلوم ہو چکا ہے کہ اللہ کے بیٹے کا اطلاق نیک لوگوں، عیسیٰ پر ایمان لانے والوں محبت کرنے والوں، اللہ کے فرمانبرداروں اور نیک اعمال کرنے والوں پر کیا گیا ہے۔

زبور نمبر ۶۸ کی پانچویں آیت میں ہے۔

خود اپنے مقدس مکان میں یتیموں کا باپ اور بیواؤں کا دادرس ہے۔

یہاں اللہ کو یتیموں کا باپ کہا گیا۔

دوسرا استدلال

انجیل یوحنا باب ۸ آیت ۲۳ میں ہے۔

اُس نے اُن سے کہا تم نیچے کے ہو میں اوپر کا ہوں تم دنیا کے ہو میں دنیا نہیں ہوں۔

حضرت مسیح علیہ السلام کے اس ارشاد سے عیسائی حضرات یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ میں معبود ہوں اور آسمان سے اتر کر انسانی جسم میں آیا ہوں۔ عیسائی حضرات کو اس ارشاد کی یہ تشریح کرنے کی اس لیے ضرورت پیش آئی کہ اس کا ظاہری مفہوم مشاہدہ کے خلاف تھا کیونکہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کھلی آنکھوں اسی دُنیا میں پیدا ہوئے تھے لیکن یہ تاویل دو وجہ سے غلط ہے۔

اوّل تو اس لیے کہ یہ بات عقلی دلائل اور نصوص قطعیہ کے خلاف ہے۔

دوسرے اس لیے کہ اس قسم کی بات حضرت مسیح علیہ السلام نے اپنے شاگردوں کے حق میں بھی فرمائی ہے چنانچہ انجیل یوحنا ہی کے باب ۱۵ کی آیت ۱۹ میں ہے۔

اگر تم دنیا کے ہوتے تو دُنیا اپنوں کو عزیز رکھتی لیکن چونکہ تم دنیا کے نہیں بلکہ میں نے تم کو دنیا میں سے چن لیا ہے اور اس واسطے دنیا تم سے عداوت رکھتی ہے۔

اور یوحنا باب ۱۷ آیت ۱۴ میں ہے۔

جس طرح میں دُنیا کا نہیں وہ بھی دنیا کے نہیں۔

پس مسیح نے اپنے شاگردوں کے حق میں بھی یہی فرمایا کہ وہ اس جہان کے نہیں ہیں ٹھیک جس طرح اپنے لیے یہ بات کہی تھی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ لہٰذا یہ بات اگر الوہیت اور خدائی کو مستلزم ہے جیسا کہ عیسائی حضرات کا خیال ہے تو لازم آتا ہے کہ تمام شاگردان مسیح بھی معبود ہوں۔ خدا کی پناہ بلکہ صحیح مطلب اس کلام کا یہ ہے کہ تم کمینی دنیا کے طالب ہو اور میں ایسا نہیں ہوں بلکہ طالب آخرت اور اللہ کی خوشنودی کا طالب ہوں اور اس قسم کا مجاز اہل زبان کے یہاں بکثرت ہے۔ چنانچہ زاہدوں اور صالحین کے لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اس دنیا کے نہیں ہیں۔

تیسرا استدلال

انجیل یوحنا کے باب ۱۰ آیت ۳۰ میں مذکور ہے کہ۔

میں اور باپ ایک ہیں۔

یہ اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ مسیح اور خدا متحد ہیں۔

یہ دلیل بھی دو وجہ سے درست نہیں۔

اول تو اس لیے کہ عیسائیوں کے نزدیک بھی مسیح نفس ناطقہ رکھنے والے انسان ہیں لہٰذا اس لحاظ سے تو اتحاد ناممکن تھا اس لیے لامحالہ انہیں یہ تاویل کرنی پڑے گی کہ جس طرح وہ انسان کامل ہیں اسی طرح خدائے کامل بھی ہیں۔ لیکن اس تاویل پر پہلے اعتبار سے خدا کے ساتھ معاشرت اور دوسرے لحاظ سے اتحاد لازم آتا ہے اور آپ کو پچھلے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ بات بالکل باطل ہے۔

دوسرے یہ کہ اس قسم کے الفاظ حواریین کے حق میں بھی فرمائے گئے ہیں۔ انجیل یوحنا باب ۱۷ آیت ۲۱ میں ہے۔

تاکہ وہ سب ایک ہوں یعنی جس طرح اے باپ تو مجھ میں ہے اور میں تجھ میں ہوں وہ بھی ہم میں ہوں اور دنیا ایمان لائے کہ تو نے ہی مجھے بھیجا اور وہ جلال جو تو نے مجھے دیا ہے میں نے انہیں دیا ہے تاکہ وہ ایک ہوں جیسے ہم ایک ہیں۔

پس یہ کہنا کہ وہ "سب ایک ہوں" کا جملہ ان کے اتحاد پر دلالت کرتا ہے دوسرے قول میں اپنا خدا کے ساتھ متحد ہونا اور حواریین کے ساتھ متحد ہونا دونوں چیزوں میں یکسانیت ثابت کی ہے اور ظاہر ہے کہ ان سب کا حقیقتاً ایک بن جانا ممکن نہیں اسی طرح مسیح اور خدا کا ایک بن جانا بھی غیر ممکن ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ اللہ کے ساتھ متحد ہونے کے معنی اس کے احکام کی طاعت کرنا اور نیک اعمال کرنا ہے۔ اس قسم کے اتحاد میں واقعی مسیح اور حواریین اور تمام اہل ایمان برابر ہیں۔ ہاں فرق قوت اور ضعف کا ہے۔ اس معنی کے لحاظ سے مسیح کا اتحاد قوی اور شدید ہے اور دوسروں کا ان کی نسبت سے کم۔ اور متحد ہونے کے جو معنی ہم نے عرض کیے وہی معنی یوحنا حواری کے ایک ارشاد سے ثابت ہوتے ہیں جو ان کے پہلے خط باب اوّل آیت ۵ میں اس طرح مذکور ہے۔

اس سے سن کر جو پیغام ہم تمہیں دیتے ہیں وہ یہ ہے کہ خدا نور ہے اور اس میں ذرا بھی تاریکی نہیں اگر ہم کہیں کہ ہماری اس کے ساتھ شراکت ہے اور پھر تاریکی میں چلیں تو ہم جھوٹے ہیں اور حق پر عمل نہیں کرتے لیکن اگر ہم نور میں چلیں جس طرح کہ وہ نور میں ہے تو ہماری آپس میں شراکت ہے۔

اور چھٹی اور ساتویں آیت فارسی تراجم میں اس طرح مذکور ہے۔

اگر گوئیم کہ با درے متحد یم و در ظلمت افتادہ نمائیم در دروغ گوئیم و عمد راستی عمل نہ نمائیم و اگر در روشنائی رفتار نمائیم چنانچہ او در روشنائی ما باشد با یکدیگر متحد ستیم۔ یعنی اگر ہم یہ کہیں کہ ہم اس کے ساتھ متحد ہیں اور اندھیرے میں چلنے لگیں تو ہم جھوٹ بولتے ہیں اور سچ پر عمل نہیں کرتے اور اگر روشنی میں چلیں جیسے وہ روشنی میں ہے تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ متحد ہیں۔

اس میں بجائے شرکت کے لفظ کے اتحاد کا لفظ استعمال ہوا ہے جس سے معلوم ہوا کہ اللہ کے ساتھ شرکت ہونے یا اس کے ساتھ متحد ہونے کا وہی مطلب ہے جو ہم نے عرض کیا ہے۔

چوتھا استدلال

انجیل یوحنا باب ۱۴ آیت ۹ و ۱۰ میں ہے:۔

جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا تو کیونکر کہتا ہے کہ باپ کو ہمیں دکھا۔
کیا تو یقین نہیں کرتا کہ میں باپ میں ہوں اور باپ مجھ میں ہے یہ باتیں جو میں تم سے کہتا ہوں اپنی طرف سے نہیں کہتا لیکن باپ مجھ میں رہ کر اپنے کام کرتا ہے۔

اس عبارت میں حضرت مسیح کا یہ فرمانا کہ "میں باپ ہوں اور باپ مجھ میں ہے" اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ مسیح اور خدا ایک ہیں۔ لیکن یہ دلیل بھی دو وجہ سے کمزور ہے۔

اوّل اس لیے کہ عیسائیوں کے نزدیک دنیا میں خدا کا دیکھا جانا محال ہے جیسا کہ آپ مقدمہ کے امر رابع میں معلوم کر چکے ہیں اس لیے وہ لوگ اس کی تاویل معرفت کے ساتھ کرتے ہیں۔ مگر چونکہ اس طرح مسیح اور خدا کا ایک ہونا لازم نہیں آتا اس لیے کہتے ہیں کہ دوسرے اور تیسرے قول میں جس حلول کا تذکرہ ہے وہ اور حضرت مسیح کی خدائی کی معرفت تمام اہل تثلیث کے نزدیک واجب التاویل ہے یعنی اس سے مراد اتحاد باطنی ہے پھر ان تاویلات کے بعد کہتے ہیں کہ چونکہ مسیح انسان کامل بھی ہیں اور معبود کامل بھی ہیں اس لیے ان کے تینوں اقوال دوسرے لحاظ سے درست ہیں حالانکہ آپ بار بار جان چکے ہیں کہ یہ باطل ہے کیونکہ تاویل کے لیے ضروری ہے کہ وہ دلائل اور نصوص کے خلاف نہ ہو۔

دوسرے اس لیے کہ اس باب کی آیت ۲۰ میں ہے کہ:۔

میں اپنے باپ میں ہوں اور تم مجھ میں اور میں تم میں

اسی طرح تیسری دلیل کے جواب میں آپ نے پڑھا کہ مسیح علیہ السلام نے اپنے حواریوں کے حق میں فرمایا تھا۔

جس طرح اے باپ تو مجھ میں ہے اور میں تجھ میں ہوں وہ بھی ہم میں ہوں۔
اور ظاہر ہے کہ الف ب میں سمایا ہوا ہو اور ب ج میں تو اس سے لازم آتا ہے کہ خود الف بھی ج میں سمایا ہوا ہے۔ اور کرنتھیوں کے نام پہلے خط کے باب ۶ آیت ۱۹ میں ہے۔
کیا تم نہیں جانتے کہ تمہارا بدن رُوح القدس کا مقدس ہے جو تم میں بسا ہوا ہے۔
اور تم کو خدا کی طرف سے ملا ہے اور تم اپنے نہیں۔
اور کرنتھیوں ہی کے نام دوسرے خط کے باب ۶ آیت ۱۶ میں ہے۔
اور خدا کے مقدس کو بتوں سے کیا مناسبت ہے کیونکہ ہم زندہ خدا کا مقدس ہیں چنانچہ خدا نے فرمایا ہے کہ میں ان میں بسوں گا اور ان میں چلوں پھروں گا۔ ۔ ۔ ۔ الخ
اور افسیوں کے نام خط کے باب ۴ آیت ۶ میں ہے۔
اور سب کا خدا اور باپ ایک ہی ہے جو سب کے اوپر اور سب کے درمیان اور سب کے اندر ہے۔

پانچواں استدلال

اور کبھی کبھی وہ مسیح علیہ السلام کے بعض حالات سے استدلال کرتے ہیں چنانچہ ان کے بغیر باپ کے پیدا ہونے سے بھی استدلال کرتے ہیں یہ استدلال نہایت ہی کمزور ہے کیونکہ عالم تمام کا تمام حادث ہے اور عیسائیوں کے خیال کے مطابق اس زمانہ تک اس کے حدوث کو چھ ہزار سال بھی نہیں گزرے اور ساری مخلوق خواہ آسمان ہو یا زمین، جمادات ہوں یا نباتات، حیوانات ہوں یا بنی آدم عیسائیوں کے نزدیک بھی ایک ہفتے کے اندر پیدا ہوئے اور سارے ہی حیوانات بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے تو یہ سب حیوانات بغیر باپ کے پیدا ہونے میں مسیح کے ساتھ شریک ہیں بلکہ اس بات میں مسیح علیہ السلام سے بھی بڑھے ہوئے ہیں کہ یہ بغیر ماں باپ کے بھی پیدا ہوئے۔
اسی طرح کیڑے کوڑوں کی بھی صدہا اقسام ہیں جو برسات کے موسم میں ہر سال بغیر ماں باپ کے پیدا ہوتے ہیں تو یہ بات محض معبود ہونے کی وجہ کیونکر ہو سکتی ہے۔ اگر نوع انسانی کا خیال کیا جائے تو پھر بھی آدم علیہ السلام اس معاملہ میں مسیح علیہ السلام سے بڑھے ہوئے ہیں کیونکہ وہ بغیر ماں کے بھی پیدا ہوئے ہیں۔ اسی طرح صدوق کاہن جو ابراہیم علیہ السلام کا معاصر اور ہم زمانہ تھا اس کا حال عبرانیوں کے نام خط کے باب ۷، آیت ۳ میں اس طرح ذکر کیا گیا ہے۔

یہ بے باپ نہ بے ماں ، بے نسب نامہ ہے نہ اس کی عمر کا شروع نہ زندگی نہ آخر۔
یہ شخص مسیح سے دو باتوں میں بڑھا ہوا نکلا ایک تو بے ماں کے پیدا ہونے میں اور دوسرے یہ کہ اس کی کوئی ابتدا نہیں ہے ۔

چھٹا استدلال

اور کبھی مسیح کے معجزات سے استدلال کرتے ہیں یہ بھی نہایت کمزور اور بودی دلیل ہے کیونکہ ان کا سب سے بڑا معجزہ مُردوں کو زندہ کرنا ہے اس معجزہ کے ثبوت سے قطع نظر کرتے ہوئے اور اس امر کو بھی نظر انداز کرتے ہوئے کہ موجودہ انجیل اس کی تکذیب کرتی ہے . . . میں کہتا ہوں کہ موجودہ انجیل کے مطابق مسیح نے اپنے سولی چڑھائے جانے تک سوائے تین شخصوں کے اور کسی کو زندہ نہیں کیا جیسا کہ آپ کو پہلے باب سے معلوم ہو چکا ہے اس کے برعکس حزقیال علیہ السلام نے ہزار ہا انسانوں کو زندہ کیا جیسا کہ ان کی کتاب کے باب ۳۷ میں تصریح موجود ہے لہٰذا اگر مُردوں کو زندہ کرنا معبود بننے کے لیے کافی ہے تو وہ معبود ہونے کے مسیح سے زیادہ مستحق ہیں ۔اسی طرح الیاس علیہ السلام نے بھی ایک مُردہ کو زندہ کیا جیسا کہ کتاب سلاطین اوّل کے باب ۱۷ میں صاف موجود ہے نیز الیسع علیہ السلام نے ایک مُردہ کو زندہ کیا جیسا کہ کتاب سلاطین کے باب ۴ میں مصرح ہے اور الیسع علیہ السلام سے تو یہ معجزہ ان کی وفات کے بعد بھی صادر ہوا کہ ایک مُردہ اُن کی قبر میں ڈالا گیا جو اللہ کے حکم سے زندہ ہو گیا جیسا کہ اسی کتاب کے باب ۱۳ میں موجود ہے اسی طرح ایک کوڑھی کو اچھا کر دیا جیسا کہ سفر مذکورہ کے باب ۵ میں مذکور ہے ۔

اور کبھی عیسائی لوگ عہد عتیق کی کتابوں کی بعض آیات اور حواریین کے بعض اقوال سے استدلال کرتے ہیں ۔میں نے یہ تمام دلائل اور ان کے جوابات کتاب ازالۃ الاوہام میں نقل کیے ہیں جو صاحب دیکھنا چاہیں اس کو ملاحظہ فرمائیں اس کتاب میں میں نے ان کو اس لیے ذکر نہیں کیا کہ پہلے ہی دلائل نہایت کمزور ہیں اور اگر کمزوری کو نظر انداز بھی کر دیا جائے تب بھی ان سے عیسائیوں کے زعم کے بموجب بھی معبود ہونا ثابت نہیں ہوتا جب تک یہ نہ مانا جائے کہ مسیح علیہ السلام انسان کامل بھی تھے اور معبود کامل بھی ۔اور یہ بات قطعی باطل ہے جیسا کہ بارہا آپ کو معلوم ہو چکا ہے اور دوسرے دلائل کا حال ایسا ہی ہے جیسا کہ عموماً مسیح کے حالات سے استدلال کا ان دلائل کا وہی جواب دیا جائے گا جو مسیح کے اقوال کا دیا گیا ہے جیسا کہ اس فصل کے شروع میں معلوم ہو چکا۔
اور اگر ہم تسلیم بھی کر لیں کہ ان کے بعض اقوال اس معاملہ میں نص ہیں تب بھی کہا جائے گا کہ یہ اقوال

کا اپنا اجتہاد ہے حالانکہ آپ کو باب اول سے معلوم ہو چکا ہے کہ ان کی تمام تحریرات الہامی نہیں ہیں اور ان تحریروں میں غلطیاں بھی صادر ہوئی ہیں اور اختلاف و تناقض بھی یقیناً موجود ہے اسی طرح ان کے مقدس پولس کی بات ہمارے لیے قابل تسلیم نہیں ایک تو اس لیے کہ وہ حواری نہیں نہ ہمارے لیے واجب التسلیم ہے بلکہ ہم تو اس کو معتبر بھی جاننے کے لیے تیار نہیں۔

اب آپ حضرات کو معلوم ہونا چاہیے کہ میں نے جو مسیح کے اقوال نقل کیے اور ان کے معانی بیان کیے محض الزام کی تکمیل کے لیے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ عیسائیوں کا استدلال ان اقوال سے نہایت کمزور ہے اسی طرح حوارین کے اقوال کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ یہ تسلیم کرنے کے بعد کہا ہے کہ یہ حوارین کے ہی اقوال ہیں ورنہ ہمارے نزدیک ان اقوال کا مسیح یا ان کے حوارین کے اقوال ہونا اس لیے ثابت نہیں ہے کہ ان کتابوں میں عموماً اور اس مسئلہ میں خصوصاً بہت تحریفات واقع ہوئی ہیں جیسا کہ آپ کو دوسرے باب سے معلوم ہوا۔ عیسائیوں کی عام عادت اس قسم کے امور میں یہ ہے کہ وہ عبارتوں کو جس طرح چاہتے ہیں بدل ڈالتے ہیں۔ میرا عقیدہ تو یہ ہے کہ مسیح اور ان کے حواری اس قسم کے گندے کفریہ عقیدہ سے یقیناً پاک ہیں اور میں گواہی دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بندے اور رسول ہیں اور عیسٰی بھی اللہ کے بندے اور رسول تھے اور حوارین اللہ کے رسول کے فرستادے اور قاصد تھے۔

اتمام حجت کا آخری نقطہ

اے پیغمبر یہ تمہارے پروردگار کی جانب سے الحق ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو جانا۔ یعنی مسیح علیہ السلام کے متعلق جو کچھ حق تعالیٰ نے فرمایا وہ ہی حق ہے جس میں شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے جو بات تھی بلا کم و کاست سمجھا دی گئی۔ [1]

تحویل قبلہ کے موضوع پر بھی ایسی ہی تعبیر آئی ہے، چونکہ مضمون کے لحاظ سے دونوں میں ہم آہنگی ہے اس لیے تعبیر بھی ایک ہے وہاں بھی قبلہ کے بارے یہود و نصاریٰ حریف کی حیثیت سے موجود تھے۔ اور دونوں کا خود بھی ایک موقف نہ تھا، دونوں قبلہ کے موضوع پر مشرق و مغرب کے چکر میں تھے۔ اور دونوں ارباب علم و فکر، اور مذہب کے اجارہ دار تھے۔ یہاں بھی حضرت مسیح کے بارے

[1] افادات شیخ الاسلام

یں یہودیوں اور عیسائیوں کا اختلاف بالکل متضاد سمتوں کا انتہائی گوشہ بن گیا تھا۔ یہودی ان کی پیدائش کو ناجائز تعلق کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ ان کو شعبدہ باز اور فریبی بتاتے تھے معاذاللہ۔ برخلاف اس کے عیسائی نہ صرف جائز پیدائش بلکہ ایک ربانی معجزہ تصور کرتے تھے اور ان کی اس اعجازی ولادت کو ان کی الوہیت کی دلیل بنا کو پیش کرتے تھے اور یہ اختلاف کسی دلیل کا اختلاف نہیں بلکہ بے علمی اور نادانی پر مبنی اختلاف تھا۔ اور اختلاف صرف حضرت مسیح کی آمد میں نہیں بلکہ آمد ورفت دونوں میں رونما ہوا یہ جو کچھ کہہ رہے ہیں۔ علم کی بنا پر نہیں بلکہ بے علمی کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔ گمان اور خیال کی بنا پر کہہ رہے ہیں مالھم بہٖ من علم اور آپ سے قرآن جو کچھ کہہ رہا ہے یہ واقعہ ہے یہ حقیقت ہے یہ علم وبصیرت ہے الحق من ربک یعنی یہی آپ کے پروردگار کی جانب سے حق ہے قرآن نے ولادت مسیح کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا قول الحق من ربک یہ سچائی کی وہ بات جس میں لوگ شک کر رہے ہیں۔ آپ کے رفع الی السماء کے ذکر کے بعد فرمایا۔

وان الذین اختلفوا فیہ لفی شک منہ مالھم بہٖ من علم۔ ان یتبعون الا الظن۔

اور یقیناً جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا وہ شک میں ہیں ان کو اس کا کوئی علم نہیں ہے وہ صرف گمانوں کے پیروکار ہیں۔

یہ الممترین ہیں یعنی شک کرنے والے ہیں۔ ان کا موقف بے دلیل اور ان کے نظریات کا گھروندا بے بنیاد ہے اور آپ جو کچھ اپنے پروردگار کی جانب سے اس موضوع پر فرمارہے ہیں یہی حق ہے یعنی ثابت ہے ان مٹ ہے اور اٹل ہے۔ بلاشبہ اس وقت ان کی کثرت ہے جن کا موقف علمی نہیں ظنی ہے۔ اور وہ طاقتور بھی ہیں اور اپنی سازشوں کی ذریعہ سے سیاسی جوڑ توڑ بھی کر رہے ہیں۔ اور جو وفد آپ کا مخاطب ہے وہ بخران کے علاقہ پر قابض ہے اس کے مقابلے میں حالات کا فیصلہ ان کے ساتھ ہے لیکن ہر حال خواہ حالات کچھ ہوں حق وہی ہے جو آپ کی زبان سے ظاہر ہو گیا ہے آپ کسی درجہ میں بھی ان کی ہمنوائی نہ کریں۔ اگر یہ حق ہے اور یقیناً حق ہے تو بلاشبہ جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ باطل ہے حق وباطل کی نزاع میں کامیابی حق کے لیے ہے اور ہزیمت وخسران باطل کے لیے ہے یہاں حضور انور کو مخاطب اس لیے نہیں بنایا گیا کہ آپ کو شک نہ کرنے کی ہدایت مقصود ہے بلکہ اس لیے بنایا ہے کہ آپ کے مقابلے میں ان کو ممترین ثابت کرنا مقصود ہے گویا اس میں یہودیوں

اور عیسائیوں کے لیے عتاب ہو رہا ہے۔ لیکن چونکہ وہ لائق خطاب نہیں ہیں اس لیے ان کی بجائے حضور کو مخاطب بنا لیا۔ اور ضمناً اس حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا کہ اگرچہ مسیحی کلیسا نے صدیوں سے الوہیت مسیح کا اعتقاد قائم کر رکھا ہے اور تمام دنیا میں پھیل گیا ہے لیکن آپ کی دعوت اس کے برخلاف کامیاب ہو کر رہے گی کیونکہ مسیح کی الوہیت کا اعتقاد حقیقت کے خلاف ہے

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں تک جو کچھ عیسائیوں کو سمجھایا گیا ہے اسے خلاصہ کے طور پر ذہن میں تازہ کر لیجئے۔

پہلی بات جو ان کے ذہن نشین کرنے کی کوشش کی گئی ہے یہ ہے کہ مسیح کی الوہیت کا اعتقاد تمہارے اندر جن وجوہ سے پیدا ہوا ہے ان میں سے کوئی وجہ ایسے اعتقاد کے لیے صحیح نہیں ایک انسان تھا جس کو اللہ نے اپنی مصلحتوں کے تحت غیر معمولی صورت سے پیدا کیا اور اسے ایسے معجزات عطا کیے جو نبوت کی صریح علامت ہوں۔ اور منکرین حق کو اسے صلیب پر چڑھانے کا موقعہ نہیں دیا بلکہ اس کو اپنے پاس اٹھا لیا۔ مالک کو اختیار ہے کہ اپنے جس بندے کو جس طرح چاہے استعمال کرے۔ محض اس غیر معمولی برتاؤ کو دیکھ کر یہ نتیجہ نکالنا کیسے صحیح ہو سکتا ہے کہ وہ خود مالک تھا یا مالک کا بیٹا یا ملکیت میں شریک تھا۔

دوسری اہم بات جو ان کو سمجھائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مسیح جس چیز کی دعوت دینے آئے تھے وہ وہی چیز تھی جس کی طرف محمد رسول اللہ دعوت دے رہے ہیں۔ دونوں کے مشن میں سرمو فرق نہیں ہے۔

تیسری بات یہ بتائی گئی کہ مسیح کے حواریوں کا مذہب بھی یہی اسلام تھا جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ بعد کی عیسائیت نہ اس کی تعلیم پر قائم رہی جو مسیح علیہ السلام نے دی تھی۔ اور نہ اس مذہب کی پیروی رہی جس کا اتباع مسیح کے حواری کرتے تھے۔ [1]

عیسائیت کا بانی کون ہے؟

آیئے ذرا اس بات کا تاریخی روشنی میں مطالعہ کر لیجئے۔ ان آیات میں قرآن نے یہ بات کھول کر بتا دی کہ حضرت مسیح کی الوہیت کا اعتقاد باطل بعد کی پیداوار ہے۔ ہم پوری دیانتداری اور خلوص کے ساتھ تحقیق کرنے کے بعد اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ موجودہ عیسائیت کے اصل بانی حضرت عیسیٰ السلام

---

[1] تفہیم القرآن

نہیں بلکہ پولس ہے جس کے چودہ خطوط بائبل میں شامل ہیں۔

پولس کا تعارف:

ہم اپنے اس دعویٰ کے دلائل اور اپنی تحقیق کے نکات بیان کرنے سے پہلے پولس کا تعارف کر دینا ضروری سمجھتے ہیں۔

پولس کی ابتدائی زندگی کے حالات تقریباً تاریکی میں ہیں۔ البتہ کتاب اعمال اور اس کے خطوط اتنا معلوم ہوتا ہے کہ وہ ابتداءً میں قبیلہ بن یامین کا ایک کٹر فریسی یہودی تھا۔ اور اس کا اصلی نام ساول ہے۔ فلپیوں کے نام خط میں وہ اپنے بارے میں خود لکھتا ہے۔

آٹھویں دن میرا ختنہ ہوا اور اسرائیل کی قوم اور بنیامین کے قبیلہ کا ہوں، عبرانیوں کا عبرانی اور شریعت کے اعتبار سے فریسی ہوں۔ (فلپیوں ۳: ۵)

اور یہ روم کے شہر ترسس کا باشندہ تھا جیسا کہ اعمال ۲۲، ۲۸ سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کا سب سے پہلا تذکرہ ہمیں کتاب اعمال ۷، ۵ میں ملتا ہے جہاں ان کا نام ساول ذکر کیا گیا ہے اس کے بعد کتاب اعمال کے تین ابواب میں اس کا کردار اس طرح نقل کیا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ کے حواریوں اور ان کے ایمان لانے والوں کا سخت دشمن تھا اور شب و روز انہیں تکلیف پہنچانے اور ان کی بیخ کنی کرنے میں مصروف تھا لیکن پھر اچانک اس نے یہ دعویٰ کیا کہ،

میں نے بھی سمجھا تھا کہ یسوع ناصری کے نام کی طرح طرح سے مخالفت کرنا مجھ پر فرض ہے۔ چنانچہ میں نے یروشلم میں ایسا ہی کیا۔ اور سردار کاہنوں کی طرف سے اختیار پا کر بہت سے مقدسوں کو قید میں ڈالا اور جب وہ قتل کیے جاتے تو میں بھی یہی رائے دیتا تھا بلکہ ان کی مخالفت میں ایسا دیوانہ بنا کر غیر شہروں میں جا کر بھی انہیں ستاتا۔ اسی حال میں سردار کاہنوں سے اختیار اور پروانے لے کر دمشق کو جاتا تھا تو اے بادشاہ! میں نے دوپہر کے وقت راہ میں یہ دیکھا کہ سورج کے نور سے زیادہ ایک نور آسمان سے میرے اور میرے ہم سفروں کے گرد آ گرا آ چکا، جب ہم سب زمین پر گر پڑے تو میں نے عبرانی زبان میں یہ آواز سنی کہ اے ساول، اے ساول! تو مجھے کیوں ستاتا ہے؟ پینے کی آر پر لات مارنا تیرے لیے مشکل ہے، میں نے کہا، اے خداوند تو کون ہے؟ خداوند نے فرمایا، میں یسوع

ہوں ، جسے تو ستاتا ہے ، لیکن اُٹھ ! اپنے پاؤں پر کھڑا ہو ، کیونکہ میں اس لیے
تجھ پر ظاہر ہوا ہوں کہ تجھے اُن چیزوں کا بھی خادم اور گواہ مقرر کروں جن کی
گواہی کے لیے تو نے مجھے دیکھا ہے اور اُن کا بھی جن کی گواہی کے لیے میں
تجھ پر ظاہر ہوا کروں گا اور میں تجھے اس اُمت اور غیر قوموں سے بچاتا
رہوں گا جن کے پاس تجھے اس لیے بھیجتا ہوں کہ تو اُن کی آنکھیں کھول دے
تاکہ اندھیرے سے روشنی کی طرف اور شیطان کے اختیار سے خدا کی
طرف رجوع لائیں اور مجھ پر ایمان لانے کے باعث گناہوں کی معافی
اور مقدسوں میں شریک ہو کر میراث پائیں ۔

(اعمال ۲۶ : ۹ تا ۱۹)

پولس کا دعویٰ یہ تھا کہ اس واقعہ کے بعد سے میں " خداوند یسوع مسیح " پر ایمان لا چکا ہوں اور اس کے بعد اس نے اپنا نام بھی تبدیل کر کے " پولس " رکھ لیا تھا ، شروع میں جب اُس نے یہ دعویٰ کیا تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے حواریوں میں سے کوئی شخص اس بات کی تصدیق کرنے کے لیے تیار نہ تھا کہ جو شخص کل تک حضرت مسیح اور اُن کے شاگردوں کا جانی دشمن تھا ، آج وہ سچے دل کے ساتھ اُن پر ایمان لے آیا ہے ، لیکن ایک جلیل القدر حواری برناباس نے سب سے پہلے اس کی تصدیق کی اور اُن کی تصدیق پر دوسرے حواری بھی مطمئن ہو گئے کتاب اعمال میں ہے ۔

اس (پولس) نے یروشلم میں پہنچ کر شاگردوں میں مل جانے کی کوشش کی اور
سب اس سے ڈرتے تھے کیونکہ اُن کو یقین نہ آتا تھا کہ یہ شاگرد ہے مگر برناباس
نے اُسے اپنے ساتھ رسولوں کے پاس لے جا کر اُن سے بیان کیا کہ اُس نے
اس طرح سے راہ میں خداوند کو دیکھا اور اُس سے باتیں کیں ، اور اُس نے
دمشق میں کیسی دلیری کے ساتھ یسوع کے نام سے منادی کی پس وہ یروشلم میں اُن
کے ساتھ آتا جاتا رہا اور دلیری کے ساتھ خداوند کے نام کی منادی کرتا تھا اور
یونانی مائل یہودیوں کے ساتھ گفتگو اور بحث بھی کرتا تھا مگر وہ اُسے مار ڈالنے
کے درپے تھے ، اور بھائیوں کو جب یہ معلوم ہوا تو اُسے قیصریہ میں لے گئے اور
ترسس کو روانہ کر دیا ۔" (اعمال ۹ : ۲۶ تا ۳۰)

اس کے بعد پولس حواریوں کے ساتھ مل جل کر عیسائیت کی تبلیغ کرتا رہا، اور اسے عیسائی مذہب کا سب سے بڑا پیشوا مانا گیا۔

ہماری تحقیق کا حاصل یہ ہے کہ موجودہ عیسائی مذہب کے بنیادی عقائد و نظریات کا بانی یہی شخص ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام نے ان عقائد کی ہرگز تعلیم نہ دی تھی [1]

---

[1] عیسائیت کیا ہے۔

فَمَنْ حَآجَّكَ فِيهِ مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَكَ مِنَ الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا
نَدْعُ اَبْنَآءَنَا وَاَبْنَآءَكُمْ وَنِسَآءَنَا وَنِسَآءَكُمْ وَاَنْفُسَنَا وَ
اَنْفُسَكُمْ ۟ ثُمَّ نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَّعْنَتَ اللّٰهِ عَلَى الْكٰذِبِيْنَ ۝
اِنَّ هٰذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ ۚ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّا اللّٰهُ ۭ وَاِنَّ
اللّٰهَ لَهُوَ الْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ ۝ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ
بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝ ع

پھر بھی اگر تم سے اس موضوع پر علم و یقین آجانے کے باوجود کوئی جھگڑا کرے تو تم اس سے کہو کہ آؤ فیصلہ کرلیں ہم دونوں فریق میدان میں نکلیں اپنے اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلائیں اور خود بھی شریک ہوں۔ پھر عجز و نیاز کے ساتھ اللہ کے دربار میں التجا کریں کہ اللہ کی ان پر لعنت ہو جو جھوٹے ہیں[۱۱۹]۔ اے پیغمبر یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے بلاشبہ بیان حق ہے اور کوئی معبود نہیں مگر اس کی ذات یگانہ اور یقیناً اسی کی ذات ہے جو سب پر غالب ہے اور تمام کاموں میں حکمت والی ہے[۱۲۰]

پھر اگر یہ لوگ فیصلہ کا یہ طریقہ بھی منظور نہ کریں تو بس یقین کر لو کہ اللہ ان مفسدوں کے حال سے خوب واقف ہے۔ ۱۲۱

وفدِ نجران کو مباہلہ کی دعوت

اس آیت میں عیسائیوں کو مباہلہ کی دعوت دی گئی ہے کہ اگر انہیں حضرت مسیح کی الوہیت پر یقین کامل ہے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے پر آئیں اور دونوں فریق خدا سے دعا مانگیں کہ جو ناحق پر ہو اس پر اللہ کی لعنت ہو۔ مقصد یہ ہے کہ دلیل سے جب گفتگو ختم نہ ہو تو یوں کیا جائے۔ آغاز سورت سے یہاں تک دعوت کی جو ترتیب قائم کی گئی ہے اس کے مدارج یہ ہیں کہ:

اولاً موعظت و ارشاد پر مبنی دعوت پیش کی گئی یہ خالص داعیانہ اور مرشدانہ انداز ہے۔ اللہ سبحانہ کی حیات قیومیت کمال علمی کمال اقتدار کو اچھوتے اور حسین انداز میں پیش کیا گیا۔

ثانیاً، مدعیانہ انداز میں مناظرہ کا طرز اختیار کیا گیا اور دعویٰ کو دلیل کی روشنی میں پیش کیا گیا۔ اس کے لیے حضرت عیسیٰ کی پوری زندگی کا خلاصہ پیش کیا گیا۔

ثالثاً، بتایا گیا کہ حق یہی ہے جو کچھ آپ فرما رہے ہیں اور جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ سرتاسر باطل ہے آپ کے پاس جو کچھ ہے وہ العلم ہے اور واقعہ و حقیقت ہے اور جو کچھ وہ کہہ رہے ہیں وہ محض گمان اور خیال ہے ان کا موقف خالص شک و ریب کی بنیادوں پر قائم ہے اور آپ کا مقام سرتاسر حق ہے۔

رابعاً، چونکہ آپ کا موقف سرتاسر حق ہے اور آپ کا مخاطب نہ وعظ و نصیحت سنتا ہے اور نہ دلائل پر توجہ کرتا ہے گویا نہ قبول حق کے لیے اس کے دل میں آمادگی ہے اور نہ اس کی دماغی استعداد دلائل کو قبول کرتی ہے۔ اب جب کہ وعظ و استدلال کے سارے مراحل طے ہو چکے ہیں، مخاطب دلیل و حجت سے عاری ہے۔ حق اس کے سامنے آفتاب کی طرح روشن اور واضح ہو چکا ہے۔ محض اپنی بات کی پچ اور گروہی تعصب کی وجہ سے قبول حق کے لیے آمادہ نہیں ہے تو اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ مباہلہ کیا جائے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ وفد نجران نے اس آخری چیلنج کو قبول نہیں کیا۔ جس سے یہ بات آخری درجہ میں ثابت ہو گئی کہ حضرت مسیح کے بارے میں وہ اپنے موقف کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ چنانچہ جب ان کو دعوت مباہلہ دی گئی تو انہوں نے حضور سے

اس پر غور کرنے کے لیے مہلت مانگی۔ بعض روایات میں ہے کہ تین روز کی مہلت مانگی اور باہم مشورہ کیا۔ مشورہ کیا ہوا لکھا ہے کہ۔

مشورے میں ان کے سردار نے عاقب سے کہا کہ خدا کی قسم تم خوب جانتے ہو کہ یہ شخص نبی مرسل ہے اگر تم نے اس سے مباہلہ کیا تو ہلاک ہو جاؤ گے واللہ جب بھی کسی قوم نے کسی نبی سے مباہلہ کیا ہے تو اُس کی بربادی و ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے۔ اگر تم ان کی پیروی کرنا نہیں چاہتے ہو تو اس پیغمبر سے صلح کر لو اور اپنے وطن واپس ہو جاؤ۔ (در منثور)

۱۱۹۔ پھر بھی اگر کوئی تم سے اس موضوع پر علم ویقین آجانے کے باوجود جھگڑا کرے تو تم اس سے کہو کہ آؤ فیصلہ کر لیں، ہم دونوں فریق میدان میں نکلیں اپنے اپنے بیٹوں اور عورتوں کو بلائیں اور خود بھی شریک ہوں پھر عجز و نیاز کے ساتھ اللہ کے دربار میں التجا کریں کہ اللہ کی ان پر لعنت ہو جو جھوٹے ہیں اللہ تعالیٰ نے حکم فرمایا کہ نصاریٰ نجران اس قدر سمجھانے پر بھی اگر قائل نہ ہوں تو ان کے ساتھ مباہلہ کرو جس کی زیادہ موثر اور مکمل صورت یہ تجویز کی گئی کہ دونوں فریق اپنی جان اور اولاد سے حاضر ہوں اور خوب گڑگڑا کر دُعا کریں کہ جو کوئی ہم میں جھوٹا ہے اس پر خدا کی لعنت اور عذاب پڑے۔ مباہلہ کی یہ صورت پہلے ہی قدم پر اس بات کا اظہار کر دے گی کہ کون فریق کس حد تک خود اپنے دل میں اپنی صداقت وحقانیت پر وثوق ویقین رکھتا ہے چنانچہ دعوت مباہلہ سُن کر وفد نجران نے مہلت لی کہ ہم باہم مشورہ کر کے جواب دیں گے۔ آخر جلس مشاورت میں ان کے ہوشمند تجربہ کار ذمہ داروں نے کہا کہ اے گروہ نصاریٰ تم یقیناً دلوں میں سمجھ چکے ہو کہ محمد نبی مرسل ہیں اور حضرت مسیح کے بارے میں انہوں نے صاف صاف فیصلہ کن باتیں کہی ہیں۔ تم کو معلوم ہے کہ اللہ نے نبی اسماعیل میں نبی روانہ کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ کچھ بعید نہیں کہ یہ وہی نبی ہوں۔ لہٰذا ایک نبی سے مباہلہ کرنے کا نتیجہ کسی قوم کے حق میں یہ ہی نکل سکتا ہے کہ ان کا کوئی چھوٹا بڑا ہلاکت یا عذاب سے نہ بچے اور پیغمبر کی لعنت کا اثر نسلوں تک پہنچے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے صلح کر لیں اور اپنی بستیوں میں روانہ ہو جائیں۔ کیونکہ سارے عرب سے لڑائی مول لینے کی ہم میں طاقت نہیں۔ یہ تجویز پاس کر کے حضور انورؐ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ حسن حسین، فاطمہ اور علی رضی اللہ عنہم کو ساتھ لے کر باہر تشریف لا رہے تھے۔ یہ نورانی صورتیں دیکھ کر ان کے لاٹ پادری نے کہا کہ میں ایسے پاک چہرے دیکھ رہا ہوں جن کی دُعا پہاڑوں کو ان کی جگہ سے ہلا سکتی ہے۔ ان سے

مباہلہ کر کے ہلاک نہ ہو ورنہ ایک نصرانی زمین پر باقی نہ رہے گا۔ آخر انہوں نے مقابلہ چھوڑ کر سالانہ جزیہ دینا قبول کیا اور صلح کر کے واپس چلے گئے۔ [1]

مباہلہ کا پس منظر

اس کا منظر یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل نجران کو یہ خط لکھا تھا۔ میں تم کو بندوں کی عبادت سے ہٹا کر اللہ کی عبادت کی دعوت دیتا ہوں اور بندوں کی ولایت کی جگہ اللہ کی ولایت کی طرف بلاتا ہوں۔ اگر تم نے یہ دعوت نہ مانی تو تم کو جزیہ دینا ہوگا اور اگر تم نے اس سے بھی انکار کیا تو پھر تم کو جنگ کے بارے میں مطلع کر رہا ہوں۔

یہ خط جب اسقف کے پاس پہنچا تو وہ بہت پریشان ہوا اور نجران کے ایک شخص شرجیل بن وداعہ کو بلا بھیجا۔ یہ ہمدان کا رہنے والا تھا اور ہر اہم بات میں سب سے پہلے اس سے مشورہ لیا جاتا۔ اسقف نے اس کو خط دیا اور کہا اے ابومریم اس بارے میں تمہاری کیا رائے ہے؟ اس نے کہا کہ اللہ نے حضرت ابراہیم سے وعدہ کیا تھا کہ حضرت اسماعیل کی اولاد میں ایک نبی ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ یہ وہی ہوں۔ میں نبوت کے بارے میں کوئی رائے نہیں دے سکتا۔ یہ دنیا کا معاملہ نہیں ہے۔ اس کے بعد اسقف نے عبد اللہ بن شرجیل کو بلایا یہ اہل نجران میں حمیر کا ایک بہت معزز شخص تھا۔ اس نے بھی وہی رائے دی۔ تب اسقف نے جبار بن قیص کو بلایا۔ یہ بنی حارث بن کعب کا ایک معزز شخص تھا اور نجران میں رہتا تھا۔ یاد رہے کہ یہ تینوں شخص عیسائی نہ تھے۔ لیکن بہت دانش مند اور مخلص مانے جاتے تھے۔

جب ان معززین کی رائے معلوم ہو گئی تو اسقف نے پوری بستی آبادی کو بلایا اور خط سنا کر مشورہ دریافت کیا۔ غور و فکر کے بعد رائے یہ قرار پائی کہ شرجیل بن وداعہ، عبد اللہ بن شرجیل اور جبار بن قیص کو مختار جماعت بنا کر مدینہ منورہ بھیجا جائے وہ جو فیصلہ مناسب سمجھیں کر آئیں۔ یہ لوگ مدینہ منورہ پہنچے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے باتیں کیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کی آیات سنیں سیاسی معاہدہ ہوا اور معاہدے میں یہ دفعات تھیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

۱۔ اہل نجران کو رسول اللہ کی حفاظت حاصل ہو گی۔
۲۔ ان کی جانوں، مالوں، مذہب، زمین، جائداد میں کوئی تغیر نہ کیا جائے گا۔
۳۔ نہ ان سے بیگار لی جائے گی نہ عشر اور نہ ان کے علاقہ سے فوج گزرے گی۔

یہ واقعہ امام بیہقی کی کتاب دلائل النبوۃ کے حوالہ سے حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں لکھا ہے اور اس میں مباہلہ کا بھی تذکرہ ہے لیکن ہماری رائے میں مباہلہ کی دعوت ان کو نہیں دی گئی کیونکہ یہ عیسائی نہ تھے۔ اگرچہ عیسائیوں کے معتقد علیہ اور مشیر تھے۔ مباہلہ کی دعوت ان کو نہیں دی گئی ہے وہ دوسرا وفد ہے جس کا محمد بن اسحاق نے تفصیلاً سیرت میں ذکر کیا ہے اور جس کی طرف امام بخاری نے اپنی صحیح میں حضرت حذیفہ کے حوالہ سے اشارہ کیا ہے۔ میرے نزدیک حافظ ابن حجر عسقلانی کی یہ رائے مستحق ترجیح ہے فکانتھما قدمتین یعنی یہ کہ وفد نجران دو مرتبہ مدینہ طیبہ آیا۔

پہلا وفد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان لے کر نجران لوٹا تو اسقف کا چچیرا بھائی ابو علقمہ بشیر بن معاویہ، یہ سن کر کہ رسول اللہ نبی موعود ہیں راستے ہی سے پلٹ کر مدینہ منورہ پہنچا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر اسلام کی بیعت کر کے وہیں رہ پڑا۔

پھر اسقف اور نجران کے بڑے بڑے حاکم ساٹھ آدمیوں کا وفد لے کر مدینہ منورہ آئے ان میں چودہ سردار تھے اور ان کی مرکزی قیادت تین شخص کر رہے تھے۔ اس وفد ہی سے حضرت عیسیٰ کے موضوع پر بات چیت ہوئی اور ان کو ہی دعوت مباہلہ دی گئی۔ آلِ عمران کی آیات اسی وفد کی آمد پر نازل ہوئی ہیں۔ حافظ ابن کثیر رقمطراز ہیں۔ نزل فیھم صدر من آل عمران والمباھلۃ۔

تین حضرات جن کے ہاتھ میں وفد کی قیادت تھی یہ ہیں ابو حارثہ، عاقب اور السید یہ ہی تینوں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرنے والے تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے جو سوالات کیے وہ تاریخ کے اوراق میں آج تک محفوظ ہیں۔

دریافت کیا کیا تمہیں معلوم ہے کہ بیٹا باپ کے مشابہ ہوتا ہے؟ پوچھا کہ کیا تمہیں پتہ نہیں ہے کہ ہمارا رب حی ہے اور مرے گا نہیں اور عیسیٰ علیہ السلام کو موت آئے گی۔

سوال کیا تم جانتے نہیں ہو کہ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہر چیز کو وجود عطا فرمانے والی، اور اس کی نگران، محافظ اور اس کے بقا کا سامان کرنے والی ہے۔

دریافت کیا نہیں پتہ نہیں ہے کہ زمین و آسمان کی کوئی چیز اللہ کے علم سے اوجھل نہیں۔ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ عیسیٰ علیہ السلام کو بجز اس کے کسی چیز کا علم ہے جس کا اللہ نے ان کو علم

دیا ہے ؟ یہ تو اللہ ہی کا کارنامہ ہے کہ وہ رحم مادر میں جیسے چاہتا ہے تصویر بنا دیتا ہے۔
کیا اس سے بے خبر ہو کہ اللہ کھاتا اور پیتا نہیں ہے کیا تمہیں یہ پتہ نہیں ہے کہ عیسیٰ بھی مخلوق وحادث ہونے کے لیے ماں کے پیٹ سے گزر کر آئے ہیں جیسے سب ماؤں کے بیٹوں سے آتے ہیں۔ ماؤں کی گودوں میں پلتے ہیں، کھانا کھاتے ہیں۔ پانی پیتے ہیں اور پیشاب پاخانہ کرتے ہیں۔ عیسیٰ بھی ان ہی اطوار سے گزرے ہیں۔ ان سب سوالات کا جواب ہاں ہاں کے سوا اُن کے پاس کچھ نہ تھا۔ آخر میں حضور انور نے دریافت فرمایا کہ اگر یہ سب صحیح ہے اور تمہیں اقرار ہے تو بتاؤ کہ تمہارے اس غلط خیال کی کہ عیسیٰ الٰہ ہے یا عیسیٰ خدا کا بیٹا ہے کیا قیمت ہے۔

اس مرحلہ پر جب بات پہنچی اور منطقی طریقہ پر جب ان کو لاجواب کر دیا تو ذہنوں میں اُٹھے ہوئے اس سوال کا جواب کہ اگر عیسیٰ کچھ نہیں تو اس کی بے مثال تخلیق کیسے ہوئی ثبت انداز یہ دیا ان مثل عیسیٰ عند اللہ کمثل آدم۔ اسی مرحلہ پر قرآن نے حضور انور کو مباہلہ کی ہدایت کی۔ مباہلہ کی دعوت اسی وفد کو دی گئی جس کی قیادت عاقب، السید وغیرہ کر رہے ہیں جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے۔ جب حضور انورؐ نے ان کو مباہلہ کی دعوت دی تو انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس پر غور و فکر کے لیے مہلت مانگی۔ باہم مشورہ کیا۔ مشورے کے بعد یہ طے ہوا کہ مباہلہ نہ کیا جائے بلکہ آپ سے صلح کر لی جائے۔ یہ تجویز لے کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ ادھر سے حضور انورؐ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت فاطمہ اور حضرت علی کو لیے ہوئے تشریف لائے یہ صحیح مسلم کی روایت ہے لیکن مباہلہ نہیں ہوا اور دوسرے روز معاہدے پر دستخط ہو گئے۔ اس معاہدے کی اہم دفعات یہ تھیں۔

دفعہ ۱۔ نجران کے تمام املاک واموال اور غلام سب اسلام کے محکوم ہیں لیکن اہل اسلام نے اہل نجران پر فضل کیا اور یہ ساری چیزیں چھوڑ دیں۔

دفعہ ۲:۔ اہل نجران دو ہزار حلے ہر سال ادا کریں گے ایک ہزار ماہ رجب میں اور ایک ہزار ماہ صفر میں، حلہ کی قیمت ایک اوقیہ ہوگی۔

دفعہ ۳:۔ زرہیں، گھوڑے، اونٹ وغیرہ بھی اسی حساب میں لی جا سکتی ہیں۔

دفعہ ۴:۔ اہل اسلام کے قاصد کا قیام وطعام بذمہ اہل نجران ہوگا۔ قاصد کی مدت قیام ایک ماہ سے زیادہ نہ ہوگی۔

دفعہ ۵:۔ اگر یمن میں کوئی جھگڑا ہو جائے تو اہل نجران پر لازم ہوگا کہ وہ اسلامی مملکت

کو دفاع کی خاطر تیس زرہیں، تیس گھوڑے اور تیس اونٹ عاریۃً دیں گے۔ اگر یہ ضائع ہو جائیں تو اسلامی مملکت کو اس کو ضمان دینا ہوگا۔

دفعہ ۶:۔ اہل نجران کی جان، ان کا مذہب، ان کے اموال، ان کی جائداد کے لیے اللہ کا جوار اور محمد رسول اللہ کی ذمہ داری ہوگی بشرطیکہ موجودہ حالات میں کوئی تبدیلی نہ آئے۔

دفعہ ۸:۔ ان پر کوئی حملہ نہ کیا جائے گا۔ کوئی فوج ان کے علاقہ میں نہ جائے گی۔

دفعہ ۹:۔ ان میں حقوق کے معاملہ میں ظالم و مظلوم کے درمیان انصاف ہوگا۔

دفعہ ۱۰:۔ اگر کوئی صاحب وجاہت سود دے گا تو اسلامی مملکت کی ذمہ داری ختم ہو جائے گی۔

دفعہ ۱۱:۔ ایک شخص کو دوسرے کے ظلم کی پاداش میں نہ پکڑا جائے گا۔

دفعہ ۱۲:۔ ان تمام دفعات پر اللہ کا جوار اور محمد رسول اللہ کا ذمہ ہے۔

یہ دستاویز جب مکمل ہوگئی تو وفد نے کہا کہ آپ کے اور ہمارے درمیان معاملہ طے ہو چکا ہے اور ہم نے آپ کی ساری باتیں مان لی ہیں۔ اب آپ اپنے ساتھیوں میں سے کوئی امین ہمارے ساتھ روانہ کر دیجئے۔ حضورؐ نے فرمایا ہاں۔ اور ابو عبیدہ سے فرمایا کھڑے ہو جاؤ اور بتاؤ کہ ھذا امین ھذہ الامۃ۔ (بخاری)

مباہلہ کی دعوت کا اصلی مقصد

ذرا ٹھہر جائیے اور اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ

جن معاملات میں بنائے اختلاف کوئی عقلی و استدلالی چیز ہو تو مسئلہ کو طے کرنے کا صحیح طریقہ عقل و استدلال ہی ہے۔ لیکن جب عقل و استدلال کے سارے مراحل طے ہو چکے ہوں۔ مخالف دلیل و حجت سے بالکل عاری ہو۔ حق اس کے سامنے سورج کی طرح روشن ہو اس کے لیے اس سے گریز و فرار کی کوئی راہ نہ ہو تو ایسے موقع کے لیے مباہلہ کا طریقہ آخری چارۂ کار کی حیثیت رکھتا ہے۔ تاریخ سے ثابت ہے کہ نصاریٰ نے قرآن کے اس چیلنج کو قبول کرنے کی جرأت نہیں کی جس سے بات کھل کر سامنے آگئی کہ وہ اپنے موقف کو صحیح نہیں سمجھتے تھے۔ اس کے برعکس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ آپ کو اپنے موقف کی صحت و صداقت پر پورا یقین تھا۔[1]

[1] تدبر قرآن

فیصلہ کی یہ صورت دراصل یہ بتانے کے لیے اختیار کی گئی تھی کہ وفد نجران جان بوجھ کر ہٹ دھرمی کر رہا ہے۔ ادھر جو باتیں بیان کی گئی ہیں اور سوالات حضور اکرم نے ان سے کیے تھے ان میں سے کسی کا جواب بھی ان کے پاس نہ تھا۔ مسیحیت کے مختلف عقائد میں سے کسی کے حق میں بھی وہ اپنی کتب مقدسہ سے ایسی سند نہ پاتے تھے جس کی بنا پر کامل یقین کے ساتھ یہ دعویٰ کر سکتے کہ ان کا عقیدہ امر واقعہ کے عین مطابق ہے۔ پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت۔ آپ کی تعلیم اور آپ کے کارناموں کو دیکھ کر اکثر اہل وفد اپنے دلوں میں آپ کی نبوت کے قائل بھی ہو گئے۔ یا کم از کم اپنے انکار میں متزلزل ہو گئے تھے اس لیے جب ان سے کہا کہ اچھا اگر تم کو اپنے عقیدے کی صداقت کا پورا یقین ہے تو آؤ ہمارے مقابلہ میں دعا کرو کہ جو جھوٹا ہو اس پر خدا کی لعنت تو ان میں سے کوئی اس مقابلہ کے لیے تیار نہ ہوا۔ اس طرح یہ بات تمام عرب کے سامنے کھل کر آگئی کہ نجرانی مسیحیت کے پیشوا اور پادری جن کے تقدس کا سکہ دور دور تک رواں ہے۔ دراصل ایسے عقائد کی پیروی کر رہے ہیں جن کی صداقت پر خود ان کو یقین نہیں ہے [1]

سر ولیم میور مسلمان نہیں انیسویں صدی کے مسیحی تھے اور صرف مسیحی نہیں بلکہ مشنری تھے۔ ان کے قلم سے بھی یہ بات نکل گئی۔

سارے واقعہ میں محمدؐ کے ایمان کی پختگی بالکل نمایاں ہے۔ قرآن کے اس عقیدے کی شہادت کہ ان کا تعلق عالم غیب سے جڑا ہوا ہے اس لیے حق تمام قرآن ہی کے ساتھ ہے دراں حالانکہ ان کے خیال میں مسیحیوں کے پاس بجز ظن و تخمین کے اور کچھ نہ تھا۔ (میور کی لائف آف محمد) [2]

کیا مباہلہ کی مشروعیت بھی باقی ہے

قرآن نے یہ نہیں بتلایا کہ مباہلہ کی صورت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اختیار کی جا سکتی ہے۔ اور یہ کہ مباہلہ کا اثر کیا ہمیشہ وہی ظاہر ہونا چاہیے جو آپ کے مباہلہ میں ظاہر ہونے والا تھا بعض سلف کے طریق عمل اور بعض فقہائے کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مباہلہ کی مشروعیت اب بھی باقی ہے مگر ان چیزوں میں جن کا ثبوت بالکل قطعی ہو۔ یہ ضروری نہیں۔ کہ مباہلہ میں بچوں

---

[1] تفہیم القرآن [2] ماجدی

اور عورتوں کو بھی شریک کیا جائے ۔ نہ مباہلین پر اس قسم کا عذاب آنا ضروری ہے جو حضور انور کے مباہلہ پر آتا جیسا ارشاد ہوا ہے اگر مباہلہ کرتے تو وادی آگ بن کر اُن پر برستی اور اللہ تعالیٰ نجران کا بالکل استیصال کر دیتا ۔ایک سال کے اندر اندر تمام نصاریٰ ہلاک ہو جاتے۔ بلکہ ایک طرح کا اتمام حجت کر کے بحث وجدال سے بالکل الگ ہو جانا ہے ۔اور میرے خیال میں مباہلہ ہر ایک کاذب کے ساتھ نہیں صرف کاذب معاند کے ساتھ ہونا چاہیے ابن کثیر کہتے ہیں ۔ ثم قال تعالیٰ آمرا رسوله صلعم ان يباهل من عاند الحق في امر عيسىٰ بعد ظهور البيان ۔ [1]

رد المختار باب الرجعہ میں بحر سے بحوالہ غایۃ البیان نقل کیا ہے کہ مباہلہ اب بھی ضرورت کے وقت جائز اور مشروع ہے میں کہتا ہوں کہ شریعت میں لعان کا مشروع ہونا مباہلہ کی مشروعیت کی دلیل ہے اور رد محتار باب اللعان میں جواز کے لیے یہ شرط بھی لگائی ہے کہ مباہلہ کرنے والا صادق ہو ۔ میں کہتا ہوں کہ صدق سے مراد صدق قطعی ہے ظنی نہیں ۔مسائل اختلافیہ ظنیہ میں مباہلہ درست نہیں ہے ۔ [2]

بہر حال آیت قرآنی اور واقعہ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ اہل باطل جو مجادل اور معاند ہوں براہین اور دلائل کا ان پر کوئی اور واقعہ اثر نہ ہو تو ان سے مباہلہ کیا جا سکتا ہے ۔اللہ سبحانہ، نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس کے لیے تیار ہوئے ۔گو مباہلہ نہیں ہوا ۔ اور بظاہر اس کی کوئی دلیل نہیں کہ یہ حکم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے ۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے اپنے مخالف کو ایک بار مباہلہ کی دعوت دی تھی ۔

آیت مباہلہ اور حضرت علی کی فضیلت

اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے عام طور پر صحیح مسلم کی یہ حدیث پیش کی جاتی ہے کہ سعد بن وقاص یہی کہتے ہیں کہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی، فاطمہ حسن اور حسین کو بلایا اور فرمایا کہ اے اللہ یہ میرے اہل ہیں اگرچہ مباہلے میں اپنے ساتھ اپنے جگر گوشوں کی شمولیت اس کی سنجیدگی اور اہمیت کو دو چند کر دیتی ہے کیونکہ کوئی شخص جانتے بوجھتے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] بیان القرآن

اپنے فرزند اور اپنے محبوبوں کو داؤ پر نہیں لگاتا ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اور کوئی شریک نہیں ہوا ہے۔ حضور انور ایسے تمام مواقع پر جہاں قربانی کی منزل آتی اپنوں ہی کو آگے کرتے اور دوسرے آپ کی اقتدا کرتے تھے۔ چنانچہ درمنثور جلد اوّل اور روح المعانی میں ہے کہ ابن عسا کر نے امام جعفر صادق سے انہوں نے اپنے والد سے اس آیت کے متعلق روایت کیا ہے کہ آپ نے حضرت ابوبکرؓ کو بھی مع ان کی اولاد کے بلا لیا تھا اور حضرت عمرؓ کو بھی مع ان کی اولاد کے اور حضرت عثمانؓ کو مع ان کی اولاد کے بلایا تھا۔ اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ ابناءنا سے صرف حضرت حسن اور حسین مراد ہوں اور نساءنا سے حضرت فاطمہ اور انفسنا سے حضرت علی مراد ہیں اور اس پر یہ اضافہ کرنا کہ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت علیؓ عین رسول ہیں اور رسول اللہ کی طرح مسلمانوں کے جان اور مال میں تصرف کے حقدار ہیں اس لیے حضرت علیؓ ہی رسول اللہ کی خلافت کے حقدار ہیں ان مزعومات کی قرآن کی تشریح میں کوئی قدر وقیمت نہیں۔ یہ نہ از روئے لغت صحیح ہے اور نہ از روئے روایت و درایت۔ حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں اس پر بہت اچھی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ اس سے نہ حضرت علیؓ کی صحابہ میں افضلیت ثابت ہوتی ہے اور نہ امامت۔ انفسا کی تعبیر سے مساوات ثابت نہیں ہوتی اور اس کی دلیل نہیں بلکہ سچ پوچھو تو یہ امر محال ہے کہ کوئی شخص اُمتی ہو کر پیغمبر کے برابر ہو جائے۔ نہ علی مرتضیٰ اور نہ کوئی اور خود عربی زبان کا ذوق رکھنے والے بھی اس سے مساوات نہیں سمجھتے۔

آیت قرآنی ندع ابناءنا وابناءکم کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے مرد اور تمہارے مرد یعنی جن مردوں کا دین میں ہم سے تعلق ہے اور جن کا دین میں تم سے تعلق ہے اور آیت میں صرف قرابت جنسی مراد ہے اسی لیے ابناءنا اور نساءنا کا ذکر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مرد بیٹے اور عورتیں جن سے ہماری قرابت ہے ان کو ہم لائیں۔ اسی قرابت کے لحاظ سے حضورؐ نے بچوں میں سے حسن اور حسین عورتوں میں سے فاطمہ کو اور مردوں میں سے علی کو بلایا کیونکہ مباہلہ اقرباء ہی کے ذریعے ہو تو مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر اباعد کے ذریعے مباہلہ کیا جائے خواہ وہ افضل ہی کیوں نہ ہوں مقصد حاصل نہیں ہوتا۔

آیت مباہلہ وفد نجران کی آمد پر ۱۰ھ میں نازل ہوئی۔ آپ کے چچاؤں میں بے شک حضرت عباسؓ موجود تھے لیکن عباس چونکہ سابقین اوّلین میں سے نہ تھے اس لیے آپ نے ان کو نہیں بلایا حضرت جعفرؓ کی بھی وفات ہو چکی تھی۔

اس موضوع پر مولانا عبدالشکور لکھنوی نے مفید بحث فرمائی ہے ہم یہاں معالم القرآن کے

ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

اس آیت سے حضرت علی کی خلافت بلافصل تو کیا مطلق خلافت بھی ثابت نہیں ہوتی۔ نہ ان کا تمام صحابہ سے افضل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ جو استدلال مخالفین نے کیا ہے اس میں چند خرابیاں ہیں جن میں بعض حسب ذیل ہیں۔

پہلی خرابی یہ ہے کہ مخالفین کا استدلال آیت پر نہیں بلکہ ایک روایت پر مبنی ہے، کیونکہ حضرت علی، فاطمہ اور حسنین کو ساتھ لینے کا مضمون روایت ہی میں ہے اور اسی پر استدلال کی بنیاد ہے لہٰذا یہ کہنا کہ اس آیت سے خلافت بلافصل ثابت ہوتی ہے بالکل بے اصل ہے۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ حضرت فاطمہ حسنین رضی اللہ عنہم کا بلانا تو بلا اختلاف صحیح روایات میں مذکور ہے مگر حضرت علی کا بلانا تو بلا اختلاف صحیح روایات میں نہیں ہے۔ تفسیر طبری جلد سوم ص ۱۹۲ میں ہے۔

> ہم سے ابن حمید نے بیان کیا وہ کہتے ہیں کہ ہم سے جریر نے بیان کیا وہ کہتے ہیں میں نے مغیرہ سے کہا کہ لوگ نجران کے قصہ میں بیان کرتے ہیں کہ علی بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تھے تو انہوں نے کہا کہ شعبی نے علی کا ذکر نہیں کیا اب میں نہیں جانتا کہ بنی امیہ کا خیال چونکہ حضرت علی کی طرف سے خراب تھا اس وجہ سے شعبی نے ان کا ذکر نہیں کیا یا دراصل تھے ہی نہیں۔

پھر اسی طرح تفسیر میں ایک روایت قتادہ سے منقول ہے۔ اس میں بھی حضرت علی کا ذکر نہیں ہے

تیسری خرابی یہ ہے کہ روایت سے اگر ثابت ہوتا ہے تو زائد از زائد یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان حضرات کو بلایا۔ باقی یہ کہ انفسنا سے مراد حضرت علی ہیں اور فلاں لفظ سے فلاں مراد ہیں۔ یہ مضمون کسی روایت میں نہیں محض رائے کی اختراع ہے اس کو حدیث کی طرف منسوب کرنا یا رسول خدا سے منقول کہنا قطعاً بے بنیاد اور جھوٹ ہے۔

چوتھی خرابی یہ ہے کہ لفظ انفسنا سے حضرت علی کے مراد ہونے پر مفسرین اہل السنہ کا اجماع بتانا محض بہتان ہے بلکہ تمام محققین، مفسرین اس کے خلاف ہیں۔ تفسیر طبری میں ہے۔

> ہم نہیں مانتے کہ انفسنا سے جناب امیر مراد ہیں بلکہ اس سے مراد خود حضور انور ہیں۔

تفسیر معالم التنزیل میں ہے۔

> یہ بھی کہا گیا ہے کہ ابناءنا سے حسن و حسین اور نساءنا سے حضرت فاطمہ اور انفسنا

خود آپ کی ذات اور حضرت علی مراد ہیں۔ اہل عرب چچازاد بھائی کو نفس کہہ دیتے ہیں جیسا کہ قرآن میں لاتلمزوا انفسکم میں دوسرے بھائی مراد ہیں اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ انفسنا سے تمام مسلمان مراد ہیں۔

تفسیر جلالین میں لفظوں کی مراد بتائی ہی نہیں ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ ان کے نزدیک ان الفاظ کے وہی معنے مراد ہیں جو لغت سے سمجھے جاتے ہیں۔ تفسیر کشاف میں ہے۔

ندع ابناءنا و ابناء کم کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص ہم میں سے اور تم میں سے اپنے بیٹوں کو اور عورتوں کو اور اپنے آپ کو مباہلہ کی طرف بلائے۔

تفسیر مدارک میں بھی کشاف کا تتبع ہے۔ تفسیر بیضاوی میں ہے۔

بلائے ہر شخص ہم میں سے اور تم میں سے اپنے آپ کو اور اپنے خاندان کے عزیز تر لوگوں کو۔

پانچویں خرابی یہ ہے کہ ان الفاظ کی خاص مراد جس شخص نے بیان کی ہیں۔ اس کے اس خیال کی بنیاد صرف یہ ہے کہ اس نے دیکھا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس وقت صرف ان ہی حضرات کو بلایا۔ لہٰذا اس نے خیال کیا کہ ان سب الفاظ کا مصداق کسی نہ کسی طرح انہی حضرات کو بتانا چاہیے۔ حالانکہ یہ بنیاد ہی غلط ہے۔ ہاں اگر اہل نجران مباہلہ کر لیتے تو اس وقت دیکھا جاتا کہ حضور کن کن لوگوں کو اپنے ساتھ لے جاتے اگر اس وقت بھی سوا ان حضرات کے کسی کو اپنے ہمراہ نہ لے جاتے تو بے شک ان الفاظ کا مصداق انہی حضرات کو ماننا ضروری ہوتا۔ یقیناً اگر نوبت مباہلہ کی آتی تو آپ اپنی ازواج مطہرات کو ضرور ہمراہ لے جاتے۔ کیونکہ نساءنا سے اور کوئی مراد ہو ہی نہیں سکتا۔

تفسیر بحر محیط میں ہے کہ۔

اگر نجران کے عیسائی مباہلہ کا ارادہ کرتے اور اس کے لیے آتے تو ضرور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو حکم دیتے کہ اپنے اپنے اہل و عیال کو لے کر مباہلہ کے لیے آئیں

چھٹی خرابی یہ ہے کہ انفسنا سے حضرت علی کا مراد ہونا اور نساءنا سے حضرت فاطمہ کا اور ابناءنا سے حضرت حسنین کا لغت عرب اور محاورۂ قرآنی کے خلاف ہے۔

لفظ انفس نفس کی جمع ہے نفس کے معنے کسی شخص کی ذات کے ہیں نہ کہ کسی دوسرے کے پھر لفظ جمع سے شخص واحد کو مراد لینا بھی ناجائز ہے الا مجازاً۔ محاورۂ قرآنی دیکھئے تو قرآن مجید میں کئی جگہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو کئی جگہ تمام اہل مکہ اور تمام مسلمانوں کے انفس سے تعبیر فرمایا ہے۔

لہٰذا صرف حضرت علی کو لفظ انفس سے مراد لینا اور سب کو خارج کر دینا ان آیات کے خلاف ہے لفظ ابناء ابن کی جمع ہے۔ لغت عرب میں اپنے بیٹے کو کہتے ہیں۔ نواسے کو ابن البنت کہتے ہیں۔ قرآن حکیم میں حضور انورؐ کے بارے میں ارشاد ہے کہ آپ کسی مرد کے باپ نہیں ہیں ما کان محمد ابا احد من رجالکم لہٰذا کسی مرد کا آپ کو باپ کہنا اس آیت کے خلاف ہے۔ بلاشبہ احادیث میں حضورؐ نے حضرت حسینؓ کو بیٹا فرمایا ہے لیکن یہ محض اظہار محبت کی خاطر آپ نے مجازاً فرمایا ہے۔ لفظ نساء جمع ہے اس کے معنے عورتوں کے ہیں۔ جب یہ لفظ کسی شخص کی طرف مضاف ہوتا ہے تو اس سے اس شخص کی زوجہ مراد ہوتی ہے۔ قرآن میں یہ لفظ کئی جگہ مضاف ہو کر مستعمل ہوا ہے اور وہاں بالاتفاق زوجہ مراد ہے۔ سورۂ احزاب میں ہے یا نساء النبی یہاں بلا اختلاف آپ کی ازواج مطہرات مراد ہیں لہٰذا اس لفظ سے حضرت فاطمہ کو مراد لینا کسی طرح درست نہیں ہے کسی زبان میں کسی کی بیٹی کو اس کی عورت کہنا درست نہیں ہے۔

مباہلہ کی بنیاد مسیح کی الوہیت ہے

۱۲۰۔ اے پیغمبر یہ جو کچھ بیان کیا گیا ہے بلاشبہ بیان حق ہے اور کوئی معبود نہیں مگر وہ ہی۔ اور یقیناً اللہ کی ذات ہی سب پر غالب اور حکمت والی ہے۔ دعوت مباہلہ کے ساتھ بتلا دیا ہے مباہلہ اس پر کیا جاتا تھا کہ جو کچھ حضرت مسیح کے بارے میں قرآن میں بیان ہوا ہے یہی حق ہے اور اللہ کی ذات ہر قسم کے شرک اور باپ بیٹے کے تعلقات سے پاک ہے۔ وہ اپنی زبردست قوت و حکمت سے جھوٹے اور سچے کے ساتھ وہی معاملہ کرے گا جو اس کے حسب حال ہو۔[1]

مطلب یہ ہے کہ آیت کے دو فقروں میں حضرت مسیح کے بارے میں افراط و تفریط دونوں ذہنوں کی صاف صاف اور واضح تردید کر کے بتا دیا کہ مباہلہ کی بنیاد قرآن کی بیان کردہ حقیقت ہے ان هذا لهو القصص الحق کہہ کر یہودی ذہن کی تردید کر دی کہ قرآن نے ولادت مسیح کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے یہی حق ہے اور یہودی جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سراسر باطل ہے اور وما من الٰہ الا اللہ کہہ کر مسیحیوں کے اس خیال کی تردید کر دی کہ وہ الٰہ تھے اور اقانیم ثلاثہ کا ایک اقنوم تھے یا خدا کے بیٹے تھے۔ قرآن نے ایک ہی آیت میں دونوں کی تردید کی ہے لیکن جہاں تک پیدائش مسیح کے متعلق یہی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اعتقاد ہے۔ قرآن نے تردید میں ایک حرف نہیں بلکہ صرف مسیح کی الوہیت اور ابنیت کی تردید کی ہے اور عیسائیوں سے مباہلہ بھی پیدائش مسیح پر نہیں بلکہ الوہیت مسیح پر ہے۔ حالانکہ امر واقعہ یہ ہے کہ عیسائیوں نے الوہیت اور ابنیت کے لیے جو سہارے تلاش کیے تھے ان میں سب سے بڑا سہارا حضرت مسیح کی ولادت میں اسی اعجاز ربانی کا ظہور تھا اگر قرآن کے نزدیک مسیح کی ابنیت کی طرح یہ اعتقاد بھی بے اصل ہوتا تو وہ الوہیت اور ابنیت کی تردید کرتے ہوئے سب سے پہلا ضرب اسی سہارے پر لگاتا کیونکہ اس کے گرنے کے بعد الوہیت و ابنیت کی ساری عمارت خود بخود زمین بوس ہو جاتی۔ اگر وہ صرف حضرت مسیح کے باپ کا نام لے لیتا تو معاملہ صاف ہو جاتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا بلکہ اس کی طرف اشارہ بھی نہیں واقعہ یہ ہے کہ قرآن کو حضرت مسیح کی اعجازی پیدائش سے انکار ہی نہیں ہے۔ اس کا موقف یہ ہے کہ اعجازی پیدائش سے یہ کیسے لازم آگیا کہ اللہ کا ایک بندہ خدا یا خدا کا بیٹا ہو جائے ایک انسان جو تمام انسانوں کی طرح انسان ہے اور اپنی پیدائش کے لیے ماں کے پیٹ کا اور اپنی بقا کے لیے کھانے کا محتاج ہے وہ خدا یا خدا کا بیٹا کیونکر ہو سکتا ہے۔

الوہیت اللہ ہی میں منحصر ہے اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں۔ اس دعویٰ پر دلیل العزیز الحکیم سے قائم کی ہے۔ یہ دوبار پہلے بھی قرآن میں آچکا ہے۔ عزیز کے معنے غالب جس پر کوئی دسترس نہ پائے عزیز کے ساتھ بار بار حکیم لاکر انسان کی اس غلط فہمی کو دور کرنا مقصود ہے کہ اللہ کے عزیز ہونے کا یہ منشا نہیں ہے کہ وہ لاابالی کی طرح دم کے دم میں جو چاہے کر دیتا ہے بلکہ اس کا قہر، اس کا غلبہ، اس کی قدرت عدل و انصاف اور حکمت و مصلحت پر مبنی ہوتی ہے وہ چونکہ عزیز ہے اس لیے حضرت مسیح کو بغیر باپ کے پیدا کر سکتا ہے۔ اس نے ایسا کیوں کیا ہے اس لیے کہ وہ حکیم ہے۔ اس کی حکمتوں اور مصلحتوں تک بندوں کے علم کی رسائی نہیں ہے۔

اصل موضوع اتباعِ نبوّت کی طرف التفات

۱۲۱۔ پھر بھی اگر یہ لوگ فیصلہ کا یہ طریقہ منظور نہ کریں تو بس یقین کر لو کہ اللہ ان مفسدوں کے حال سے خوب واقف ہے۔ یعنی اگر نہ دلائل سے مانیں نہ مباہلہ پر آمادہ ہوں تو سمجھ لو کہ احقاق مقصود نہیں ہے۔ نہ دل میں اپنے عقائد کی صداقت پر وثوق ہے محض فتنہ و فساد پھیلانا ہی مقصود ہے تو خوب سمجھ لیں کہ اللہ کی نظر میں سب مفسدین ہیں [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ مباہلہ اس قضیہ کو طے کرنے کی آخری صورت تھی لیکن اگر وہ اس پر راضی نہ ہوں تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ وہ حق کی پیروی کرنا نہیں چاہتے بلکہ حق کی مخالفت کر کے خدا کی زمین پر فساد کرنا چاہتے ہیں اس لیے کہ شرک تمام فساد کی جڑ ہے۔ اگر زمین و آسمان میں بہت سے معبود ہوتے تو ان کا سارا نظام تکوینی درہم برہم ہو کر رہ جاتا۔ اسی طرح اگر دین میں شرک کے لیے کوئی گنجائش تسلیم کر لی جائے تو اس سے دنیا کا سارا نظام عدل تباہ ہو جائے [1]

شارحین نے اس فقرے کو مباہلہ سے جوڑ دیا ہے اور مطلب یہی بتایا ہے کہ اگر وہ مباہلہ نہ کریں۔ میری رائے میں یہ آیت مباہلہ سے نہیں بلکہ اصل موضوع سے متعلق ہے۔ موضوع یہ ہے کہ اللہ کی محبت کی شرط محمد رسول اللہ کی اتباع اور اللہ کی گرفت سے آخرت میں بچنے کا واحد راستہ محمد رسول اللہ صلی علیہ وسلم کی طاعت ہے۔ جیسا کہ پہلے قل ان کنتم تحبون اللہ میں یہ بات پوری قوت سے پیش کی جا چکی ہے اس لیے پیش نظر آیت کا مدلول یہ نہیں ہے کہ اگر وہ مباہلہ نہ کریں کیونکہ مباہلہ کی بات ختم ہو چکی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حق کی اس عظیم نمائش کے باوجود اور دعوت کو ہر انداز پر پیش کرنے کے باوجود اگر وہ آپ کی طاعت و اتباع سے روگرداں رہیں تو آپ پروا نہ کیجئے آپ کا فرض ادا ہو چکا ہے۔ آپ بات پہنچانے اور وضاحت حق کے سارے ذرائع اختیار کر چکے ہیں اللہ ان مفسدوں کو خوب جانتا ہے جو دلائل سے تہی دامن ہو کر اور عقیدے کی صداقت پر یقین نہ رکھتے ہوئے ایک باطل پر ڈٹے ہوئے ہیں اور انسانی زندگی میں فکری فساد کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں۔ آپ ان کو نظر انداز کر دیجئے۔

ایک دلچسپ مناظرہ

آیت کی تشریح ختم ہو چکی ہے۔ امام رازی نے یہاں اپنا ایک پادری سے مناظرہ نقل کیا ہے۔ مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے بھی اظہار الحق میں اسے نمایاں جگہ دی ہے۔ ہم بھی یہاں ناظرین معالم القرآن کی ضیافت طبع کے لیے اسے نقل کرتے ہیں۔

اتفاق سے جب میں خوارزم میں تھا تو مجھے اطلاع ملی کہ ایک عیسائی آیا ہے جو اپنے مذہب کی تحقیق اور عمیق علم رکھنے کا مدعی ہے، میں اس کے پاس پہنچا۔ ہم نے گفتگو شروع کی کہنے لگا کہ

---

[1] تدبر قرآن

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کی کیا دلیل ہے؟ میں نے کہا کہ جس طرح موسیٰ اور عیسیٰ کے ہاتھ سے خلاف عادت امور کا صادر ہونا ہم تک روایات کے ذریعہ پہنچا ہے اسی طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے خلاف عادت کاموں کا صدور ہم کو روایات کے ذریعہ پہنچا ہے، لہٰذا اگر ہم تواتر کا انکار کریں یا اُس کو تو تسلیم کریں، لیکن یہ نہ مانیں کہ معجزہ نبی کی سچائی پر دلالت کرتا ہے تو اُس صورت میں تمام انبیاء کی نبوت باطل ہو جاتی ہے، اور اگر ہم تواتر کی صحت بھی تسلیم کریں اور یہ بھی مان لیں کہ معجزہ صدق نبوت کی دلیل ہے اور یہ دونوں چیزیں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں ثابت ہیں تو پھر یقینی طور پر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا اعتراف واجب ہوگا کیونکہ دلیل کی یکسانیت کی صورت میں مدلول کی یکسانیت ضروری ہے۔

اس پر وہ نصرانی کہنے لگا کہ میں عیسیٰ کو نبی نہیں کہتا۔ بلکہ خدا کہتا ہوں۔ میں نے کہا ٹھیک ہے، نبوت میں گفتگو کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے خدا کی پہچان ہو جائے اور تم نے خدا کے بارے میں جو بات کہی ہے وہ اس لیے غلط ہے کہ معبود اس ذات کو کہتے ہیں جو موجود اور واجب الوجود بالذات ہو، نیز اس کے لیے ضروری ہے کہ نہ وہ جسم رکھتا ہو، نہ کسی احاطہ میں ہو نہ عرض ہو۔ ادھر عیسیٰ کی حالت یہ ہے کہ وہ ایک جسم رکھنے والے انسان ہیں۔ جو پہلے ناپید تھے، پھر پیدا ہوئے اور زندہ ہونے کے بعد قتل کر دیئے گئے، ابتداء میں بچے تھے، پھر بڑھے پلے، پھر جوان ہوئے۔ کھاتے پیتے تھے، پاخانہ پیشاب کرتے اور سوتے جاگتے تھے، اور یہ بات عقلاً بدیہی اور کھلی ہے کہ حادث قدیم نہیں ہو سکتا اور محتاج غنی نہیں ہو سکتا۔ متغیر ہونے والا دائمی نہیں ہو سکتا۔ دوسری وجہ اس دلیل کے باطل ہونے کی یہ ہے کہ یہ تم تسلیم کرتے ہو کہ یہود نے عیسیٰ کو گرفتار کیا اور سولی دی اور تختہ پر لٹکا کر ان کی پسلیاں توڑ دیں اور مسیح نے ان سے چھوٹ کر بھاگنے کی امکانی کوشش بھی کی اور روپوش ہونے کی بھی، نیز ان واقعات کے پیش آنے پر گھبراہٹ اور جزع فزع بھی ظاہر کیا اب اگر وہ معبود تھے یا خدا ان میں سمایا ہوا تھا یا وہ خدا کا ایسا جزو تھا جو خدا میں سمایا ہوا تھا تو پھر انہوں نے یہود کو اپنے سے کیوں دفع نہیں کیا؟ اور ان کو نیست و نابود کیوں نہ کیا؟ اور ان کو رونے دھونے اور گھبرانے کی کیا ضرورت تھی؟ اور ان سے نکل بھاگنے کی تدبیر کرنے کی کیا حاجت تھی؟ خدا کی قسم مجھے بے حد تعجب ہوتا ہے کہ کوئی عاقل اس قسم کی بات کس طرح کہہ سکتا ہے؟ اور اس کو صحیح بھی سمجھتا ہو۔ حالانکہ عقل اس کے باطل ہونے پر کھلی شہادت دے رہی ہے۔

تیسری دلیل یہ ہے کہ تین صورتوں میں سے بہر حال ایک شکل قبول کرنا پڑے گی۔ یا تو یہ ماننا پڑے گا کہ خدا وہی جسمانی شخص تھا جو دیکھا جاتا اور نظر آتا تھا۔ یا یہ کہا جائے کہ خدا کا کوئی جزو اس میں سمائے ہوئے تھا اگر یہ تینوں شکلیں باطل ہیں۔

پہلی تو اس لیے کہ عالم کا معبود اگر اس جسم کو مان لیا جائے تو جس وقت یہود نے اسی کو قتل کر دیا تو گویا یہ بات مان لیا جائے کہ یہود نے عالم کے خدا کو قتل کر دیا، پھر عالم خدا کے بغیر کسی طرح باقی رہ گیا! پھر یہ بھی چیز پیش نظر رہنی چاہیے کہ یہود دُنیا کی ذلیل ترین اور کمینی قوم ہے، پھر جس خدا کو ایسے ذلیل لوگ بھی قتل کر دیں تو وہ انتہائی عاجز اور بے بس خدا ہوا،

دوسری صورت اس لیے باطل ہے کہ اگر خدا نہ جسم والا ہے نہ عرض[1] والا تو اُس کا کسی جسم میں سما جانا عقلاً محال ہے، اور اگر وہ جسم رکھتا ہے تو اُس کے کسی جسم میں سمانے سے یہ مراد ہو سکتی ہے کہ اس خدا کے اجزار اس جسم کے اجزار ایک دوسرے سے جدا اور الگ ہیں اور اگر وہ عرض ہو تو محل کا محتاج ہو گا اور خدا دوسرے کا محتاج بنے گا، اور یہ تمام صورتیں نہایت ہی رکیک اور بیہودی ہیں۔

تیسری شکل یعنی یہ کہ خدا کا کچھ حصہ اور اس کے کچھ اجزاء سما گئے ہوں، یہ بھی محال ہے، کیونکہ یہ جزء یا تو خدائی اور الوہیت میں قابلِ لحاظ اور لائق اعتبار ہے، تو اُس جزء کو علیحدہ اور خدا سے جدا ہونے کی شکل میں ضروری ہوا کہ خداوند رہے، اور اگر وہ ایسا جزو رہے جس پر خدا کی خدائی موقوف نہیں تو وہ درحقیقت خدا کا جزو نہیں ہے۔ لہٰذا تمام صورتوں کے بطلان کے ثابت ہونے پر عیسائیوں کا دعویٰ بھی باطل ہوا۔

چوتھی دلیل عیسائیوں کے باطل ہونے کی یہ ہے کہ متواتر طریق سے یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ عیسیٰ کو اللہ کی عبادت اور فرمانبرداری کی طرف بے انتہا رغبت تھی، اور اگر وہ خود خدا ہوتے تو یہ بات محال ہوتی، کیونکہ خدا خود اپنی عبادت نہیں کیا کرتا۔ پس یہ دلائل ان کے دلائل کے فاسد ہونے کو نہایت بہترین طریقہ پر واضح کر رہے ہیں۔

پھر میں نے اُس عیسائی سے کہا کہ تمہارے پاس مسیح کے خدا ہونے کی کیا دلیل ہے؟

کہنے لگا کہ ان کے ہاتھوں مُردوں کو زندہ کر دینے، مادر زاد اندھے اور کوڑھی اچھا کر دینے

---

[1] عرض منطق کی اصطلاح میں اس چیز کو کہتے ہیں جو اپنا کوئی الگ وجود نہ رکھتی ہو بلکہ کسی جسم میں سما کر پائی جاتی ہو مثلاً رنگ و بو، روشنی، تاریکی وغیرہ۔

جیسے عجائبات کا ظہور ان کے خدا ہونے پر دلالت کرتا ہے کیونکہ یہ کام بغیر خدائی طاقت کے ناممکن ہیں۔

میں نے پوچھا کیا تم اس بات کو تسلیم کرتے ہو کہ دلیل کے نہ ہونے سے مدلول کا نہ ہونا لازم نہیں آتا یا یہ تسلیم نہیں کرتے اگر تم کو یہ تسلیم نہیں ہے کہ تمہارے قول سے یہ لازم آتا ہے کہ ازل میں جب عالم موجود نہ تھا تو خدا بھی موجود نہ تھا اور اگر تم مانتے ہو کہ دلیل کا نہ ہونا مدلول کے نہ ہونے کو مستلزم نہیں ہے تو پھر میں کہوں گا کہ جب تم نے عیسٰی کے جسم میں خدا کے سمانے کو جائز مان لیا تو تم کو یہ کیونکر معلوم ہوا کہ خدا میرے اور تمہارے بدن اور جسم میں سمایا ہوا نہیں ہے۔ اسی طرح ہر حیوان کے بدن میں موجود نہیں ہے۔

کہنے لگا اس میں تو ظاہری فرق ہے۔ اس لیے کہ میں نے عیسٰی میں جو خدا کے سمانے کا حکم لگایا ہے تو اس لیے کہ ان سے وہ عجائبات صادر ہوئے اور ایسے عجیب افعال میرے اور تمہارے ہاتھوں سے ظاہر نہیں ہوئے، معلوم ہوا کہ ہم تم میں یہ حلول موجود نہیں ہے

میں نے جواب دیا کہ اب معلوم ہوا کہ تم میری اس بات کو سمجھے ہی نہیں کہ عدم دلیل سے عدم مدلول لازم نہیں آتا، یہ اس لیے کہ ان خلاف عادت امور کا صادر ہونا عیسٰی کے جسم میں خدا کے سمانے کی دلیل ہے۔ اور میرے اور تمہارے ہاتھوں سے ایسے افعال کا صادر نہ ہونا سوائے اس کے اور کچھ نہیں کہ یہ دلیل نہیں پائی گئی۔

پس جب یہ بات ثابت ہو گئی کہ دلیل موجود نہ ہونے سے مدلول کا موجود نہ ہونا لازم نہیں ہے تو پھر میرے اور تمہارے ہاتھوں ان افعال عجیبہ کے ظاہر نہ ہونے سے یہ بات بھی لازم نہیں آئی کہ مجھ میں اور تم میں خدا سمایا ہوا نہیں، بلکہ یہ بھی کہ وہ چوہے بلے، کتے میں سمایا ہوا نہیں ہے۔

پھر میں نے کہا کہ جس مذہب کے ماننے پر کتے، بلی میں خدا کا سمایا ہونا تسلیم کرنا پڑے وہ مذہب نہایت ہی ذلیل اور رکیک ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ لکڑی کا سانپ بن جانا عقل کے نزدیک مردہ کے زندہ ہو جانے سے زیادہ بعید ہے۔ کیونکہ مردہ اور زندہ کے جسم میں جس قدر مشابہت اور یکسانیت ہے، اس قدر لکڑی اور اژدھے میں ہرگز نہیں۔ لہٰذا جب لکڑی کا اژدھا بن جانے سے موسٰی کا خدا ہونا یا خدا کا بیٹا ہونا ضروری نہیں ہوا تو مردہ کو زندہ کر دینا بدرجۂ اولیٰ خدا ہونے کی دلیل نہیں ہو سکتا۔

اس موقع پر وہ عیسائی لاجواب ہو گیا اور بول نہ سکا۔

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ تَعَالَوْا۟ إِلَىٰ كَلِمَةٍ سَوَآءٍۭ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا ٱللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِۦ شَيْـًٔا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِّن دُونِ ٱللَّهِ ۚ فَإِن تَوَلَّوْا۟ فَقُولُوا۟ ٱشْهَدُوا۟ بِأَنَّا مُسْلِمُونَ ﴿٦٤﴾

کہہ دو کہ اے اہل کتاب! اس بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں ہے[۱۲۲] یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں[۱۲۳] اور کسی کو اس کا شریک نہ بنائیں[۱۲۴] اور ہم باہم ایک دوسرے کو خدا کو چھوڑ کر رب نہ بنائیں[۱۲۵] بس اگر یہ لوگ اس بات سے روگردانی اختیار کریں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم اللہ کے فرمانبردار ہیں[۱۲۶]

توحید کامل کی دعوت

توحید کے چار درجے ہیں تین خالص نظری ہیں اور ایک درجہ نظری کے ساتھ زیادہ عملی ہے ضروری ہے کہ پہلے توحید کے ان درجات پر نظر ڈال لی جائے۔

توحید کا درجہ اول یہ ہے کہ کائناتِ ہستی میں واجب الوجود اور خود بخود ہونے والی ہستی اللہ سبحانہ کی ہے۔ اس کے علاوہ نہ کوئی واجب الوجود ہے اور نہ خود بخود ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے حجۃ الاسلام میں اسے اس طرح سمجھایا ہے کہ۔ ہمارا تمہارا وجود پائدار نہیں نہ ازلی ہے

اور نہ ابد تک رہے گا۔ ایک زمانہ تھا کہ ہم پردۂ عدم میں تھے۔ اسی طرح ایک وقت آئے گا کہ ہمارا نام و نشان نہ ہوگا۔ یہ زوال و انفصال باواز بلند کہتا ہے کہ ہمارا وجود خانہ زاد نہیں بلکہ کسی ایسے وجود کا فیضان ہے جو خانہ زاد ہو مستعار نہ ہو۔ اسی وجود کو جو خود بخود ہو مستعار نہ ہو ہم خدا کہتے ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے کہ اس کا وجود خود بخود ہے تو اس کا وجود اس کے لیے ایسا ہی لازم ہے جیسے آفتاب کے لیے دھوپ اور آگ کے لیے گرمی یہ نہیں ہو سکتا کہ آگ ہو اور گرمی نہ ہو ایسے ہی یہ بھی نہیں کہ خدا ہو اور اس کا وجود نہ ہو۔

توحید کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ کائنات جو کچھ جتنی کچھ اور جیسی کچھ ہے یہ صرف اللہ کا تخلیقی کارنامہ ہے اور اس میں کوئی شریک نہیں ہے چونکہ توحید کے یہ دونوں درجے سب کے نزدیک مسلم ہیں اور ان میں مشرکین عرب، یہودیوں اور عیسائیوں کا بھی کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ خود قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ ان کے مسلمات میں سے ہے اس لیے قرآن نے توحید کے ان دونوں درجوں کو موضوع بحث نہیں بنایا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں ھاتان المرتبتان لم تبحث الکتب الالٰھیۃ۔ منشا یہ نہیں کہ قرآن حکیم کی دعوت میں شرک فی الذات کی تردید شامل نہیں بلکہ مقصد یہ ہے کہ قرآن میں جس چیز کو موضوع بحث بنایا گیا ہے وہ یہ نہیں ہے یہ متکلمین کا موضوع ہے اور علم کلام میں اس سے بحث کی جاتی ہے۔

توحید کا تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس کائنات کو بنانے کے بعد چلا کون رہا ہے اور چوتھا درجہ یہ ہے کہ ہمارے نیازمندانہ اعمال اور ہماری عبادت کا مستحق کون ہے۔

توحید کے ان دو درجوں میں انبیاء کے مخاطبوں کا انبیاء سے اختلاف ہے۔ نجومی کہتے ہیں کہ ستارے عبادت کے مستحق ہیں۔ دنیا میں ان کی عبادت ناگزیر ہے اور مشرکین کا خیال ہے کہ بڑے بڑے معاملات کی تدبیر تو اللہ ہی کرتا ہے لیکن دوسرے چھوٹے چھوٹے معاملات اللہ خود نہیں کرتے۔ پہلے کچھ بزرگ ہوئے ہیں جنہوں نے اللہ کی عبادت کی اور اللہ نے ان کی عبادت سے خوش ہو کر خلعت الوہیت ان کو عطا کر دیا ہے اس لیے یہ بزرگ بھی مستحق عبادت ہیں اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے ان کا نظریہ یہ ہے کہ اللہ کی ذات غیب در غیب ہے اس لیے اس کی عبادت ان کی عبادت کی آمیزش کے بغیر قبول نہیں ہوتی۔ اس بنا پر صرف اللہ کی عبادت بے سود ہے ضروری ہے کہ ان کی عبادت کی جائے کیونکہ یہ سنتے بھی ہیں دیکھتے بھی ہیں اپنے عبادت گزاروں کی سفارش بھی کرتے ہیں۔ ان کے معاملات کو سنوارتے ہیں۔ ان کی امداد و نصرت کو

آتے ہیں۔

عیسائی کے خیال میں حضرت عیسیٰ کا دوسری مخلوقات کے مقابلے میں اللہ کے یہاں بہت اونچا مقام ہے وہ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بندہ کہنا بے ادبی اور گستاخی سمجھتے تھے۔ اس بنا پر کچھ حضرت عیسیٰ کو خدا کا بیٹا اور کچھ خدا کہتے ہیں۔ ان کی عبادت کو اللہ کی عبادت سمجھتے ہیں۔

قرآن میں توحید کے یہی دو درجے موضوع بحث ہیں[1] مطلب یہ ہے کہ قرآن کے جملہ ابواب میں اور ہر باب کی تمام فصلوں میں جس نکتہ کی رعایت ملحوظ ہے وہ یہی توحید فی العبادہ ہے۔ اس کا راز یہ ہے کہ مخلوق کی پیدائش سے اصل مقصد توحید فی العبادۃ ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔

عبادت ایک جامع لفظ ہے جو پرستش اور بندگی دونوں کو پوری طرح محیط ہے۔ قرآن نے اپنے ماننے والوں سے پرستش اور اطاعت دونوں کا اللہ کے لیے مطالبہ کیا ہے اور ان دونوں کے مجموعہ کا نام ہی توحید کامل ہے اس آیت میں ان لا نعبد الا اللہ سے پرستش اور ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ۔ سے طاعت اور بندگی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ دونوں میں باریک سا فرق ہے۔ عبادت کی حقیقت غایۃ تذلل اور انتہائی خشوع وخضوع کا اظہار ہے۔ یہ اسی کے لیے مناسب ہے جس میں غایت درجہ عظمت ہو۔ ایسی عظمت کہ اس سے بالا عظمت کا تصور بھی نہ ہو سکے۔ اس درجہ کی عظمت صرف ایک ذات میں منحصر ہے اس میں کسی طور سے کسی کی شرکت کے لیے گنجائش نہیں ہے اس میں ہر قسم کی شرکت شرک ہے۔ لیکن طاعت کے لیے صرف حکمرانی کی لیاقت درکار ہے۔ یہ بطریق نیابت مخلوق میں بھی ہو سکتی ہے اس لیے نیابۃً غیر اللہ کی اطاعت شرک نہیں۔ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اُمت افراط وتفریط کی شکار ہو گئی۔ کچھ نے تاویل کے ذریعے غیر اللہ کی عبادت کا دروازہ کھول ڈالا اور نذر نیاز جیسے سارے عابدانہ اعمال غیر اللہ کے لیے کرنے لگے اور کچھ نے اطاعت مجتہدین کو بھی شرک بنا دیا حتی کہ ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا کہ اطاعت رسُول سے گریز کرنے لگا۔ یہ تمام راہیں حقیقت سے نا آشنا ہونے کی وجہ سے ظہور میں آئی ہیں۔

قرآن نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی طور پر صاف کر دیا ہے۔ طاعت کے بارے میں تو اس نے واضح طور پر کہہ دیا ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ لیکن عبادت کے موضوع پر

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ باب التوحید

اس قسم کی پوری قرآن میں کہیں تصریح نہیں ملتی۔ عبادت کے متعلق صاف حکم ہے کہ امر الا تعبدوا الا ایاہ
لہٰذا مسئلہ اتنا صاف اور واضح ہے جتنا ہو سکتا ہے لیکن تاویل کا دروازہ کب بند ہو سکتا ہے اس کو
عبادت بغیر اللہ کے مشاق اور طاعت رسول سے بیزار دونوں کھٹ کھٹکا رہے ہیں۔

۱۲۲۔ کہہ دو کہ اسے اہل کتاب اس بات کی طرف آجاؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان
یکساں ہے۔ یکساں ہونے کا مطلب یہ کہ یہ سب کے نزدیک مسلم ہے اور مسلم اس لیے کہا گیا کہ سب
شرائع میں اس کی تعلیم ہے اور اجمالاً اہل کتاب بھی اسے مانتے ہیں۔ ۱؎ بتانا یہ ہے کہ آؤ ایسے عقیدے
پر ہم سے اتفاق کر لو جس پر ہم بھی ایمان لائے ہیں۔ اور جس کے صحیح ہونے سے تم بھی انکار نہیں کر سکتے
تمہارے اپنے انبیاء سے بھی یہی عقیدہ منقول ہے۔ تمہاری کتب مقدسہ میں اس کی تعلیم موجود ہے ۲؎

یہ یکساں بات کیا ہے؟ یہ وہ اصول ہے جس کی سب انبیاء نے تعلیم دی۔ اس میں زمان و مکان
کے تغیر کو کوئی دخل نہیں اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں اختلاف پیدا ہوا وہ ہر زمانے اور ہر
مقام میں یکساں رہا۔ یعنی خدا کی توحید اس کی خالص عبادت یہ وہ بنیادی بات ہے جس پر جملہ مذاہب
کا اتفاق ہے۔ آؤ اگر تمہاری مخالفت محض تعصب و نفسانیت کی وجہ سے نہیں ہے اور تم میں حق پذیری
کی کچھ بھی رمق باقی ہے تو اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ دو اور توحید و خدا پرستی کی اس بنیادی
صداقت پر متفق ہو جاؤ جو خود تمہارے یہاں بھی مسلم ہے اگرچہ عملاً فراموش کر دی گئی ہے۔

توحید الوہیت انبیاء کی مشترکہ دعوت ہے

۱۲۳۔ یعنی یہ کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں یعنی تمام انبیاء کی مشترکہ دعوت چونکہ یہ
ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے اس لیے آؤ اس بنیادی بات پر ہم متحد ہو جائیں کہ اللہ
کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے۔ اللہ کی عبادت کے لیے نعبد اللہ کا مثبت انداز تعبیر چھوڑ کر
یہ منفی ان لا نعبد الا اللہ انداز کیوں اختیار کیا؟ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ "آؤ ہم خدا کی عبادت کریں گے
کو چھوڑ کر یہ کیوں فرمایا کہ ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں گے۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے جن کو مخاطب کیا ہے ان کو اللہ کی عبادت سے انکار نہ تھا۔
اس اقرار کے باوجود یہودی جادو، ٹوٹکا اور عملیات کے توہمات میں گرفتار تھے اور طاغوت کی

۱؎ بیان القرآن ۲؎ تفہیم القرآن

عبادت کرتے تھے۔ عیسائی حضرت مریم اور حضرت عیسیٰ اور مسیحی اولیاء اور شہیدوں کی تصویروں، مجسموں، یادگاروں اور مقبروں کی عبادت کرتے تھے۔ اس زمانے میں عیسائیوں کے جو گرجے عرب میں اور خصوصاً ملک حبشہ میں تھے ان میں حضرت عیسیٰ، حضرت مریم اور حواریوں، ولیوں شہیدوں کی تصویریں اور مجسمے نصب تھے عبادت گزار اُن کے آگے دھیان اور مراقبہ میں سر بسجود رہتے صحابہ میں سے جن لوگوں کو حبشہ کی ہجرت کے اثنا میں ان معبدوں کو دیکھنے کا اتفاق ہوا۔ اُن میں سے شاید بعض بی بیوں کی نگاہ میں ان بزرگوں کی تعظیم و تکریم کی یہ مناسب صورت معلوم ہوئی۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض الموت میں بعض ازواج مطہرات نے آپ سے اس کا تذکرہ کیا اور ان کی تصویروں اور مجسموں کے حسن وجمال کو بیان کیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا اللہ سبحانہ یہود و نصاریٰ پر لعنت بھیجے۔ انہوں نے اپنے پیغمبروں کی قبروں کو عبادت گاہ بنا لیا تم ایسا نہ کرنا ان میں جب کوئی نیک آدمی مر جاتا تھا تو وہ اس کی قبر کو عبادت گاہ بنا لیتے تھے اور اس میں اس کی تصویریں کھڑی کر دیتے تھے [۱]

ایڈورڈ گبن نے تاریخ ترقی و زوال روم کی متعدد جلدوں کے خاص الواب میں عیسوی مذہب کے عبادت کے جو حالات بیان کیے ہیں وہ تمام تر حدیث مذکور کی تصدیق و تائید کرتے ہیں خصوصاً تیسری اور پانچویں جلد میں حضرت عیسیٰ، حضرت مریم، سینٹ پال اور متعدد ولیوں شہیدوں کی پرستش کی جو کیفیت درج ہے وہ بالکل اس کے مطابق ہے اور آج تک رومن کیتھولک اور قدیم مسیحی فرقوں کی پرستش گاہوں کے در و دیوار سے قرآن پاک کی صداقت کی آوازیں آرہی ہیں [۲]

بہرحال عیسائیوں اور یہودیوں کو خدا کی عبادت سے انکار نہ تھا اور اللہ کی عبادت ان کے مسلمات میں سے تھی لیکن اس کے باوجود عمل کی زندگی میں غیر اللہ کی عبادت کے بھی مشتاق تھے۔ اس لیے قرآن نے انداز تعبیر وہ اختیار کیا ہے جس سے اُن کی عملی زندگی پر ضرب کاری پڑتی ہے یعنی ان لا نعبد الا اللہ یعنی آؤ اس پر متحد ہو جائیں کہ اللہ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلقات نہ رکھیں گے۔

لوگوں نے یہاں توحید عبادت کو علم کلام کی توحید سمجھ لیا ہے اور اپنے مخاطبوں کو یہ بتلانے کی کوشش کی ہے کہ توحید عبادت کے معنے خدا کو ایک ماننا ہے۔ یہ خالص کلامی انداز فکر ہے اور اسی بنا پر بقول شاہ ولی اللہ اس غلط فہمی میں پڑ گئے کہ توحید عبادت بھی اللہ کے ان

---

[۱] صحیح مسلم [۲] سیرۃ النبیؐ

احکام میں سے ہے جو مختلف ادیان میں مختلف رہا ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اگر صورت حال یہی ہوتی تو توحید خالقیت اور توحید تدبیر کو اللہ سبحانہ، اُن کے سامنے توحید عبادت کے لیے بطور دلیل پیش نہ کرتا۔ قرآن کا مخاطب خدا کے ایک ہونے، خدا کے خالق ہونے اور خدا کے مدبر السماوات والارض ہونے کو مانتا ہے اور یہ بھی تسلیم کرتا ہے کہ جو خالق و مدبر ہے وہ ہی مستحق عبادت ہے لیکن اس کے باوجود وہ عابدانہ تعلقات میں اللہ کے ساتھ دوسروں کو شریک کرتا ہے۔ علامہ آلوسی نے یہاں یہ بات شاید اسی کلامی ذہن کی تردید میں لکھی ہے کہ لا نعبد الا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ ہم اور تم دونوں یگانہ خدا کی عبادت کریں اور عابدانہ تعلقات صرف اسی سے استوار کریں۔ بان توحدہ فی العبادۃ و نخلص فیھا۔ اور حافظ ابن کثیر نے بھی یہ کہہ کر کہ ہم صرف اس یگانہ خدا کی عبادت کریں گے جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہی تمام انبیاء کی دعوت ہے اپنے مخاطبوں کو سمجھایا ہے کہ آیت میں توحید سے توحید عبادت مراد ہے۔

شرک کی ممانعت پر انبیاء کا اتفاق:

۱۲۴ اور ہم کسی کو اُس کا شریک نہ بنائیں۔ حافظ ابن القیم نے الجواب الکافی میں شرک پر ایک مبسوط مقالہ لکھا ہے اور شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس پر اچھی بحث فرمائی ہے۔

ہم یہاں معالم کے ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے شاہ ولی اللہ کا مقالہ پیش کرتے ہیں۔
شرک کی حقیقت صرف یہ ہے کہ کسی بڑے انسان کے بارے میں یہ عقیدت ہو جائے کہ اس سے جو عجیب و غریب افعال صادر ہو رہے ہیں یہ اس صفت کمال سے موصوف ہونے کی وجہ سے ہے جو اللہ سبحانہ کا خاصہ ہے۔ اس کے علاوہ اور کہیں نہیں پائی جاتی۔ انسان میں اس کے پائے جانے کی دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ اللہ اس کو خلعت الوہیت عطا کر دے دوسرے یہ کہ خود خدا اس میں حلول کر جائے یا اسی قسم کے وہ خرافاتی خیالات جو لوگوں میں پائے جاتے ہیں اس عقیدت اور اس تصور کے بعد ان کے ساتھ عابدانہ تعلقات قائم کرنا شرک کہلاتا ہے۔
اصل حقیقت یہ ہے لیکن اس کے قوالب اور صورتیں بہت ہیں۔ قانون صرف شرک کے قوالب کو موضوع بحث بناتا ہے جسے عوام شرکت کے تصور سے اپناتے ہیں۔
یاد رہے کہ قوالب اور صورتیں حالات اور زمانے کے تغیرات اور لوگوں کے احوال و ظروف

اور امکنہ کے اختلاف سے بدلتے رہتے ہیں۔ یہ کوئی ضروری نہیں کہ شرک کا جو قالب مشرکین مکہ میں موجود تھا وہ آج بھی موجود ہو۔ شاہ ولی اللہ نے قرآن کے اولین مخاطبوں میں متعدد قوالب شرک کی نشان دہی کی ہے۔ مثلاً بتوں کو سجدہ کرنا؟ بیمار کی شفا، تنگدست کی تنگدستی دور کرنے کے لیے ان سے مدد مانگنا، مطالب برآری کی خاطر ان کی نذریں اور منتیں ماننا، برکت کی خاطر ان کے ناموں کی تلاوت کرنا، شرکاء کو اللہ کی بیٹیاں اور بیٹے بتانا، اُن کے نام کی قربانیاں کرنا خواہ ذبح کے وقت ان کا نام لے کر یا ستھانوں پر لے جا کر، اس کی تفصیلات انشاء اللہ پارہ ہفتم میں آئیں گی۔

شرکا، اور شرک کے قوالب تاریخی تغیرات کے ساتھ تبدیل ہوتے رہتے ہیں لیکن رُوح شرک مختلف قوموں، مختلف زمانوں اور مختلف مکانوں میں یکساں رہتی ہے۔ قرآن نے اصلاً شرک حرام قرار دیا ہے خواہ شرکاء اور شرک کے قوالب و مظاہر کچھ ہوں۔ اس کی مثال اس طرح سمجھو کہ قرآن نے میسر اور جوئے کو حرام قرار دیا ہے۔ جوا بہر حال حرام ہے خواہ جوئے کی صورتیں اور شکلیں تمدن و تہذیب کے مختلف ہونے کی وجہ سے کتنی ہی تبدیل ہو جائیں۔

قانونی نقطہ نظر سے شرک تو بہر حال شرک ہے خواہ شرکاء کتنے ہی مختلف ہوں اور خواہ قوالب شرک کچھ ہوں۔ اور دل کا پتہ نہیں مگر شاہ ولی اللہ یہاں ایک بہت اہم اور غیر معمولی بات کی طرف اشارہ کر گئے۔ التفہیمات الالٰہیہ میں ان کی تصریح سے جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ شرک کے جو قوالب قرآن و سنت میں مذکور ہیں ان کے ارتکاب پر ہم مرتکب کے ایمان و اسلام کو غیر قانونی قرار دے سکتے ہیں لیکن شرک کے جو قوالب اُس وقت موجود نہ تھے اور آج ظہور میں آئے ان کے ارتکاب کو ہم معصیت اور گناہ تو کہہ سکتے ہیں مگر اس بنیاد پر عدالت میں اس کے مرتکب کے ایمان و اسلام کو قانوناً چیلنج نہیں کر سکتے۔ لیجئے آیئے شاہ صاحب کی زبانی آپ بھی سن لیجئے فرماتے ہیں۔

> جو شخص بھی شہر اجمیر یا سالار مسعود کی قبر پر جاتا ہے اور اس لیے جاتا ہے کہ وہاں جا کر اپنی حاجتوں کو مانگے تو بلاشبہ یہ گناہ کرتا ہے اور گناہ بھی ایسا جو قتل اور زنا سے زیادہ سنگین ہے۔ اس میں اور مصنوعات کے پرستاروں لات وعزیٰ سے مانگنے والے میں پوری پوری مشابہت ہے لیکن ہم اسے کافر نہیں کہتے کیونکہ اس خالص قالب پر شارع کا کوئی بیان نہیں ہے۔
>
> ص ۴۵ ج ۲

اللہ اکبر اللہ کے دین میں اس سے بڑی احتیاط کا ہم آج تصور بھی نہیں کر سکتے۔ حافظ ابن القیم

نے مدارج السالکین میں اپنے زمانہ کے ۷۲ قوالب شرک بیان کیے ہیں انشاء اللہ اس موضوع پر تفصیلی مباحث پارہ پنجم میں آئیں گے۔ اس فقرہ کا مقصود یہ ہے کہ ہم استحقاقِ عبادت میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں گے اور نہ اس شریک کو عبادت کا اہل سمجھیں گے۔ علامہ آلوسی نے یہی مطلب بتایا ہے۔

توحید کا موافق و مخالف تصور:

توحید فی العبادۃ کے تذکرے میں خاص طور پر شرک فی العبادۃ کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ ذہنوں میں کوئی تصور واضح اسی وقت ہوتا ہے جب کہ اس کے مخالف تصور کو بھی ساتھ ہی بیان کر دیا جائے۔ اس لیے اہم اصول و نظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ ان کے مخالف اصولوں اور نظریوں کو ان کے بالمقابل رکھا جائے۔ عقیدۂ توحید سے زیادہ اہمیت کس نظریے اور عقیدے کو حاصل ہو سکتی ہے۔ چنانچہ قرآن نے عقیدۂ توحید بیان کرتے ہوئے بات اسی پر ختم نہیں کی کہ توحید اسے کہتے ہیں اور اس کے دلائل و نتائج یہ ہیں بلکہ پوری تفصیل کے ساتھ یہ بھی بتایا ہے کہ شرک کیا ہے؟ اس کے اعمال کیا ہیں؟ اس کی علامتیں کیا ہیں! حد یہ ہے کہ خود کلمہ توحید میں توحید کا اثبات اور شرک کی نفی ساتھ ساتھ رکھی ہیں یعنی کلمہ توحید یوں نہیں کہ اللہ اکیلا معبود ہے بلکہ اس طرح ہے کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ لا الہ الا اللہ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توحید کا بے آمیز تصور پیدا نہیں ہو سکتا جب تک شرک کی پوری طرح نفی بھی نہ کر دی جائے۔

توحید ربوبیت انبیاء کی مشترکہ پکار ہے:

۱۲۵۔ ہم باہم ایک دوسرے کو خدا کو چھوڑ کر رب نہ بنائیں۔ قرار داد کے پہلے دو حصّوں میں توحید الوہیت بتائی گئی ہے۔ آیت کے اس حصّہ میں توحید ربوبیّت کو پیش کیا جا رہا ہے توحید الوہیت یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کی جائے اور اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے اور توحید ربوبیت یہ ہے کہ اللہ کی طاعت کی جائے اور اللہ کی اجازت کے بغیر کسی کی طاعت نہ کی جائے اصل مطاع اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے کیونکہ رب اس کے علاوہ کوئی نہیں ہے۔ رب کے معنے پرورش کرنے والا، ضروریات بہم پہنچانے والا، تربیت اور نشو و نما دینے والا کفیل اور خبر گیران، سید مطاع سردار ذی اقتدار، جس کا حکم چلے جس کی فوقیت و بالادستی تسلیم کی جائے۔ جس کو تصرف کے اختیارات ہوں۔ اسی بنا پر شارحین قرآن نے اس فقرے کا مدلول طاعت اور اتباع بتایا ہے۔ مشہور مفسر قرآن امام ابن جریر فرماتے

ہیں کہ اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ آؤ ہم اس پر متحد ہو جائیں کہ اللہ کی نافرمانی میں ہم کسی کی طاعت نہ کریں گے۔ یہی معنے آلوسی نے بھی اختیار کیے ہیں اور علامہ قرطبی نے اس کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ ہم کسی بھی چیز کے حلال یا حرام کرنے میں اللہ کو چھوڑ کر کسی کا اتباع نہ کریں گے۔ اور مشہور مفسر قرآن محمد ابن جریر طبری نے اس کو اس طرح سمجھایا ہے کہ اللہ کی نافرمانیوں میں محکوموں کا اپنے حکام کی طاعت کرنا اور رسالتؐ کی فرمانبرداری کو ان کے کہے میں آکر چھوڑ دینا اور لکھا ہے کہ اس آیت میں ربوبیت یہ ہے کہ انسانی زندگی اپنے سرداروں، حاکموں اور قائدوں کی غیر عابدانہ اعمال میں طاعت کرے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ آیت کے پہلے حصہ میں غیر اللہ کی پرستش سے روکا گیا ہے اور آیت کے اس حصہ میں غیر اللہ کی بندگی پر قدغن لگائی گئی ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہودی اور عیسائی اپنے علماء اور مشائخ طریقیت کو تحریم و تحلیل کا مجاز سمجھتے تھے۔ یعنی وہ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس چیز کو چاہیں حلال ٹھہرادیں۔ قرآن حکیم میں جب یہ آیت اتری۔

اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ

ان لوگوں نے اپنے علماء اور درویشوں کو خدا کو چھوڑ کر رب بنا لیا ہے۔

تو حضرت عدی جو حاتم طائی کے صاحبزادے تھے اور اسلام لانے سے پہلے عیسائی تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ ہم لوگ اپنے پیشوایان مذہبی کو اپنا رب تو نہیں بناتے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کیا تم لوگوں کا یہ اعتقاد نہیں کہ یہ لوگ جس چیز کو چاہیں حرام کر دیں اور جس کو چاہیں حلال کر دیں۔ عرض کی ہاں۔ آپ نے فرمایا یہی رب بنانا ہے۔

آیئے اب اس آیت کی تفسیر مولانا عثمانی کی زبانی سن لیجیے۔ مولانا فرماتے ہیں۔

پہلے نقل کیا جا چکا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد نجران سے فرمایا کہ اسلمو (مسلم بن جاؤ) تو کہنے لگے۔ اسلمنا (ہم بھی مسلمان ہیں)، اس سے معلوم ہوا کہ ان کو بھی مسلمان ہونے کا دعویٰ تھا۔ اسی طرح جب یہود و نصاریٰ کے سامنے توحید پیش کی جاتی تو کہتے کہ ہم بھی خدا کو ایک کہتے ہیں بلکہ ہر مذہب والا کسی نہ کسی رنگ میں اوپر جا کر اقرار کرتا ہے کہ بڑا ایک ہی ہے۔ یہاں اسی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ بنیادی عقیدہ خدا کا ایک ہونا اور اپنے کو مسلم ماننا جس پر ہم دونوں متفق ہیں ایسی چیز ہے جو سب کو ایک کر سکتی ہے بشرطیکہ آگے چل کر اپنے تصرف و تحریف سے اس کی حقیقت نہ بدل ڈالیں ضرورت اس کی ہے کہ جس طرح زبان سے مسلم و موحد کہتے ہو حقیقۃً اور عملاً بھی اپنے کو تنہا خدائے وحدہٗ لاشریک کے سپرد

کردو۔ نہ اس کے سوا کسی کی بندگی کرو نہ اس کی صفات خاصہ میں کسی کو اس کا شریک ٹھہراؤ نہ کسی اور عالم فقیر، پیر، پیغمبر کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو صرف رب قدیر کے ساتھ کیا جانا چاہیے۔ مثلاً کسی کو اس کا بیٹا پوتا بنایا نصوص شریعت سے قطع نظر کر کے محض کسی کے حلال و حرام کر دینے پر اشیاء کی حلت و حرمت کا مدار رکھنا جیسا کہ اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ کی تفسیر سے ظاہر ہوتا ہے۔ یہ سب امور دعویٰ اسلام اور توحید کے منافی ہیں۔ ؎

انسانی ربوبیت اور اس کے نتائج

یہودیوں اور عیسائیوں میں انسانی ربوبیت کی جو تصویر مولانا آزاد نے پیش فرمائی ہے وہ صرف خیال انگیز نہیں بلکہ حقائق کی عکاس ہے۔

عیسائیوں میں ایک انسانی بھی ایسا نہیں ہوا جس نے پوپ اور اس کے مقرر کیے ہوئے قادر کو خدا سمجھا ہو اور نہ یہودیوں نے کبھی اپنے ربیوں کو ایسا سمجھا۔ لیکن ان کے عمل کا حال ایسا ہی رہا۔ گویا حق و باطل، حلال و حرام، عذاب و ثواب اور جنت و دوزخ کی تقسیم کا سارا اختیار انہی کے قبضے میں ہے وہ جو حلال کر دیں حلال ہے جو حرام کر دیں حرام ہے جسے چاہیں بخشش کا پروانہ دے دیں، جسے چاہیں محروم و مردود کر دیں۔ جنت کی کنجی بھی ان ہی کے ہاتھ میں ہے دوزخ کا داروغہ بھی ان کے زیر حکم۔ وہ ایسے مقدس ہیں کہ کوئی بات ان کی غلط نہیں ہو سکتی اور اللہ نے انہیں ایسا با اختیار بنایا ہے کہ ان کے حکم سے کوئی بات باہر نہیں۔

اس گمراہی کا نتیجہ یہ نکلا کہ،

اولاً خدا کی کتاب جو اس غرض سے نازل کی گئی تھی کہ لوگ اسے پڑھیں اور اس پر عمل کریں۔ یک قلم بیکار اور بے اثر ہو کر رہ گئی، کیونکہ اس کی جگہ انسانوں کی رائے اور فیصلوں نے لے لی۔

ثانیاً ہدایت کا مرکز عملاً خدا کا حکم نہ رہا انسانوں کا حکم ہو گیا۔

ثالثاً دینی پیشواؤں کا ایک گروہ پیدا ہو گیا جو لوگوں کو اندھا بہرا بنا کر جس طرح چاہتا اپنے اغراض کے لیے کام میں لاتا۔

؎ افادات شیخ الاسلام

رابعاً انسان کی عقلی ترقی کی تمام راہیں بند ہو گئیں۔ کیونکہ جب لوگوں نے اپنی سمجھ بوجھ سے کام لینا چھوڑ دیا اور اپنے بنائے ہوئے پیشواؤں کا حکم بلا دلیل ماننے لگے تو ظاہر ہے کہ پھر عقل کی نشو ونما اور ترقی کے لیے کون سی راہ باقی رہ گئی۔

خامساً توہم پرستی اور جہل و کوری کا دروازہ کھل گیا کیونکہ جب اعتقاد و عمل کا دارو مدار چند انسانوں کی رایوں پر آ ٹھہرا اور دوسروں کو اس کا حق نہ رہا کہ اپنی عقل و بینش سے کام لیں تو ظاہر ہے کہ عقل و بینش کی جگہ جہل و توہم ہی پھیلے گا اور جو خرافات کسی ٹھہرائے ہوئے پیشوا کی زبان سے نکل جائے گی لوگوں کے لیے دلیل و حجت کا کام دے گی۔

سادساً، دینی پیشوا اچھے انسان ہونے کی جگہ بے پناہ دیوتا بن گئے اور ان کی ساری باتوں نے تقدیس و پاکی کا جامہ پہن لیا۔ کیونکہ جب ان کو اپنے پیروؤں کے لیے حکم و تشریع کی غیر مشروط طاقت مل گئی اور اپنے احکام و اعمال میں یک قلم غیر مسئول ہو گئے تو پھر نفس انسانی کی شرارتیں ان سے کچھ بھی کرائیں کم ہے۔ [1]

عبادت اور طاعت کا دائرہ کار

مطالب کی حد تک آیت کی تشریح ختم ہو چکی ہے۔ لیکن بعض مہمات کی تشریح ابھی باقی ہے۔

۱۔ قرآن نے عبادت کا دائرہ جس قدر تنگ رکھا ہے طاعت میں اس قدر تنگی نہیں ہے۔ عبادت تو اللہ کے سوا کسی کے لیے روا نہیں ہے امر ان لا تعبدوا الا ایاہ خدا نے حکم دیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو لیکن یہ کہیں نہیں فرمایا امر ان لا تطیعوا الا ایاہ، اللہ کے سوا کسی کی طاعت نہ کرو بلکہ اس کے برعکس اللہ نے اپنی طاعت کے ساتھ رسول کی طاعت کو شرطِ نجات قرار دیا ہے اور رسول کی طاعت کو اپنی طاعت بنایا ہے۔ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ عبادت کا سرچشمہ اللہ کی الوہیت ہے۔ الا اللہ کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا اور طاعت کا منبع اللہ کی ربوبیت یعنی حاکمیت ہے۔ حاکمیت میں خلافت ممکن ہے یعنی رسول حاکمیت میں اللہ کی نیابت کرتا ہے۔ رسول ہونے کی وجہ سے اللہ کے رسول کی طاعت کی جاتی ہے اور رسول کی نیابت میں اولی الامر کی طاعت کی جاتی ہے۔

یاایھا الذین آمنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔

---

[1] ترجمان القرآن

اے ایمان والو! اللہ کی طاعت کرو اور اللہ کے رسُول کی طاعت کرو اور اپنے میں صاحبان امر کی طاعت کرو۔

گویا اصل طاعت اللہ کی ہے اور رسُول کی طاعت اللہ کا رسول ہونے کی وجہ سے اور رسول کے بعد ہر شخص کی طاعت اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ مطیع رسول ہو خواہ وہ علماء ہوں اولیاء ہوں یا سلاطین و فرمانروا ہوں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا یہ فرمانا بالکل برمحل ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں رسُول کا دامان طاعت نہ ہو اس کی طاعت پر یہ آیت قرآنی ضرب کاری ہے خواہ وہ کوئی ہو حضرت علی مرتضیٰ فرماتے ہیں اللہ کی معصیت میں کسی کی طاعت نہیں ہے اور اسی سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اگر کسی شخص کو کوئی ارشاد نبوت معلوم ہو اور روایتی طور پر وہ بالکل صحیح ہو اور کسی دوسری حدیث سے معارض نہ ہو اور اس کا ناسخ بھی معلوم نہ ہو اور امام ابو حنیفہ کا فتوی اس حدیث کے خلاف ہو اور دوسرے آئمہ میں سے کسی نے اس حدیث کو اپنایا ہو تو ایسی حالت میں ارشادِ نبوت کی پیروی ضروری ہے۔ اگر ایسا نہیں کرے گا تو انخادرب کے جرم کا مرتکب ہو جائے گا۔ بہرحال کسی شخص کی طاعت اس وقت تک ہے جب تک وہ اللہ کے رسُول کا مطیع ہے۔ اور یہ بھی قاضی صاحب ہی نے لکھا ہے کہ عمل بالحدیث کے لیے یہ شرط کہ اسے ائمہ اربعہ میں سے کسی نے اپنایا ہو اس لیے لگائی ہے تاکہ خلاف اجماع پر عمل کا مرتکب نہ ہو۔

بہر حال اصل مطاع اللہ کی ذات ہے اور اللہ کے رسُول کی طاعت رسُول ہونے کی وجہ سے کی جاتی ہے اور رسول کے بعد مجتہدین علماء کی طاعت مطیع رسول ہونے کی وجہ سے کی جاتی ہے اور اطاعت میں کافی لچک ہے۔ رسُول چونکہ رسالت کی وجہ سے عصمت کا حامل ہوتا ہے اس لیے طاعت کو قرآن نے استقلالی حیثیت دی ہے۔

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ اطاعت رسُول کے مستقل ہونے کا یہ مطلب ہے کہ آپ کا ہر حکم ماننا چاہیے خواہ اس کی اصل ہمیں قرآن میں معلوم ہو یا نہ ہو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ کچھ سنتوں کی اصل قرآن میں موجود نہیں ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ رسُول کی اطاعت کے لیے اللہ نے ہمیں اس کا مکلف ہی نہیں بنایا ہے کہ اس کی اصل کتاب اللہ میں تلاش کریں۔ اولی الامر کی طاعت اس طرح واجب نہیں۔ وہ مقید ہے اور کتاب اللہ و سنت رسول اللہ کے ماتحت ہے اس لیے جب تک وہ خدا و رسُول کی مرضی کے مطابق حکم دیں ان کی طاعت کی جائے گی اور جب ان کا خلاف کریں ان کی طاعت نہیں کی جائے گی۔

رسول شارح ہے شارع نہیں ہے

(ب) رسول کی طاعت کے مستقل ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اسلام میں رسول کی حیثیت شارع کی ہے، تمام آئمہ اہل السنہ والجماعت کا اشیاء کی حلت وحرمت کے موضوع پر محققی مسلک یہ ہے کہ یہ تنہا اللہ کے اختیار کی چیز ہے، کسی چیز کو حلال کرنا یا حرام کرنا صرف اسی کا کام ہے۔ وہ اس میں منفرد ہے اور یہ خالص اسی کا حق ہے۔ کسی دوسرے کو اس میں کسی نوع سے دخل نہیں ہے نہ بالذات کسی کو یہ اختیار حاصل ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ اختیار کسی کو سپرد کیا ہے چنانچہ شیخ محقق کمال الدین ابن الہمام فرماتے ہیں۔

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حکم دینے والا صرف اللہ سبحانہ، ہی ہے۔ تحریر ص ۱۸۹ اور علامہ محب اللہ بہاری حنفی مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں۔

حکم صرف اللہ سبحانہ، کی جانب سے ہوتا ہے۔

یہی عبارت کم وبیش اصول فقہ کی مشہور کتاب التوضیح والتلویح میں بھی ہے اور اسی مضمون کو علامہ ابن امیر الحاج نے شرح تحریر الاصول میں اور علامہ اسنوی شافعی نے شرح منہاج الاصول میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حکم تشریعی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت عدی بن حاتم طائی کا واقعہ لکھنے کے بعد لکھا ہے کہ:

اور اس کا راز یہ ہے کہ تحلیل وتحریم اس تکوین کا نام ہے جو عالم ملکوت میں نافذ ہوتی ہے کہ فلاں چیز پر مواخذہ ہوگا یا نہ ہوگا۔ پس یہ تکوین اللہ کی صفات سے ہے رہی تحلیل وتحریم کی نسبت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب تو وہ اس معنے میں ہے کہ آپ کا ارشاد قطعی نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حلال وحرام کرنے کی۔ اور مجتہدین کی طرف تحلیل وتحریم کی نسبت اس معنے میں ہے کہ وہ اس کو نص شارع سے روایت کرتے ہیں یا کلام شارع سے استنباط کرتے ہیں۔

اس موضوع پر اہل السنہ والجماعۃ میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں صوفیائے کرام میں شیخ اکبر قدس اللہ سرہ العزیز کے سب سے بڑے ترجمان امام عبدالوہاب الشعرانی شیخ اکبر کے حوالہ سے لکھتے ہیں۔

ہم یقیناً جانتے ہیں کہ شارع صرف اللہ سبحانہ، کی ذات گرامی ہے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

تو اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچانے والے تھے جن اُمور کا اللہ تعالیٰ ارادہ کرتا اور اپنی طرف سے آپ کوئی بات نہیں فرماتے تھے اور نہ ان اُمور کو بھوتے تھے جن کی تبلیغ کا اللہ تعالیٰ نے آپ کو حکم دیا ہوتا تھا آپ تو اسی کے مطابق ہی تکلم فرماتے تھے۔

(الیواقیت والجواہر)

ہاں شیعہ حضرات کی مشہور اور مستند کتاب اُصول کافی میں ایک عنوان یہ قائم کیا ہے کہ انبیاء علیہم السلام اور آئمہ کرام کو اللہ کی جانب سے دین کے بارے میں اختیارات تفویض ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ اُصول کافی میں ہے۔

بے شک اللہ تعالیٰ اپنی وحدانیت میں منفرد رہا پھر اللہ نے محمد اور علی اور فاطمہ کو پیدا فرمایا۔ ایک ہزار سال تک سلسلہ یوں ہی رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو پیدا کیا اور ان اشیاء کو پیدا کرتے وقت حاضر کیا اور ان کی فرمانبرداری ان اشیاء پر فرض کی اور ان اشیاء کو ان کے سپرد کیا جو وہ چاہتے ہیں حلال کرتے ہیں اور جو چاہتے ہیں حرام کرتے ہیں۔

(اُصول کافی کتاب الحجۃ ج ۲ ص ۱۴۹)

لیکن یہ سب شیعہ حضرات کا مسلک نہیں ہے بلکہ شیعہ حضرات میں سے ایک خاص گروہ ہے جسے المفوضہ کہتے ہیں جن کا یہ مسلک ہے جیسا کہ غنیۃ الطالبین میں حضرت شاہ عبدالقادر جیلانی نے اور شرح المواقف میں میر سید شریف جرجانی نے تصریح کی ہے۔

امام اعظم ابو حنیفہ نے امام جعفر صادق سے جو بیان نقل کیا ہے اس سے واضح ہوتا ہے کہ یہ امام جعفر صادق کا یہ مسلک نہیں ہے۔

امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ میں نے امام جعفر صادق سے دریافت کیا کہ اے ابن رسول اللہ! کیا اللہ تعالیٰ نے اپنا کام اپنے بندوں کے سپرد کر دیا ہے۔ فرمایا معاذ اللہ اللہ کی ذات اس سے بالاتر ہے کہ وہ ربوبیت اپنے بندوں کے سپرد کرے۔

مکتوبات معصومیہ

کیا آئمہ اجتہاد شریعت ساز ہیں؟

ج، کچھ یہاں ان لا یتخذ بعضاً ار باباً من دون اللہ کی تشریح میں اس سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے کہ مسلمان جو اعمال فرعیہ میں آئمہ اجتہاد امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کی تقلید کر رہے ہیں وہ ان ائمہ کو معاذ اللہ اللہ کی ربوبیت میں شریک کر رہے ہیں لیکن شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ایسا سمجھنا اس شخص کے بارے میں تو درست ہے جو کسی مقرر امام اجتہاد کی تقلید کرے اور اس کے بارے میں یہ عقیدت ہو کہ اس سے غلطی محال ہے اور اس کی بات حتماً درست ہے اور ذہن یہ بنا لے کہ اس کے خلاف اگر دلائل بھی ہوں پھر بھی اس کی تقلید نہ چھوڑے گا۔ اگر ایسا ہے تو یقیناً وہ اس آیت کا مصداق ہے لیکن ایسا شخص ہرگز اس کا مصداق نہیں ہے جو دین کی زندگی میں نبوت کی طاعت کر رہا ہو اور حلال و حرام کے سارے اختیارات اللہ کے لیے مانتا ہو لیکن چونکہ اسے حضور انورؐ کے ارشادات کا پورا علم نہیں ہے اور آپ کے مختلف ارشادات میں راہ تطبیق سے واقف نہیں ہے اور نہیں جانتا کہ مسائل کو استنباط کیسے کیا جاتا ہے اس لیے وہ کسی عالم راشد کی اس خیال سے پیروی کرتا ہے کہ اس کی بات درست ہے اور ظاہر میں متبع سنت سے فتویٰ دریافت کرتا ہے اگر اس کی بات اسے خلاف سنت محسوس ہوتی ہے تو فوراً ہٹ جاتا ہے۔ ہمیشہ ایک ہی سے دریافت کیا جائے اور کبھی کسی سے کبھی کسی سے اس سے اصل مسئلہ پہ کوئی حرف نہیں آتا ہے۔
اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ ہم کسی فقیہ کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس پہ فقہ کی وحی آتی ہے، یا ہم پہ اس کی طاعت فرض ہے اور وہ معصوم ہے۔
اس کے برعکس ہم اگر کسی کی تقلید کرتے ہیں تو بس اس وجہ سے کرتے ہیں کہ ہمارے خیال میں وہ امام اجتہاد اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کا عالم ہے اور بس۔ اس کی بات کا ماخذ کتاب و سنت میں صراحۃً مذکور ہوتا ہے۔

ثانیاً اس کی بات کتاب و سنت سے مستنبط ہوتی ہے۔

ثالثاً، قرائن سے معلوم ہوا ہے کہ اس حکم کی نسبت یہ ہے اور اس علت کو بنیاد بنا کر اس نے غیر منصوص کو منصوص پر قیاس کیا ہے اس اعتبار سے اس حکم نسبت بھی حضور انور ہی کی طرف ہوگی۔

اگر ان باتوں میں سے کوئی بات نہ ہوتی تو کوئی مومن کسی مجتہد کی تقلید نہ کرتا۔

اجتہاد و تقلید کی حدود

یہ کہنا کہ تقلید نے علم و بصیرت کی راہوں سے مسلمانوں کو بیگانہ کر دیا اور ان کی عقلی ترقی یکدم رُک گئی۔ حالات کا منصفانہ اور صحیح تجزیہ نہیں ہے۔ اُمت میں بیک وقت اجتہاد و تقلید دونوں کی ضرورت ہے۔ اللہ کی شریعت نہ تو اجتہاد بلا تقلید چاہتی ہے اور نہ تقلید بلا اجتہاد۔ اجتہاد بلا تقلید اگر افراط ہے تو تقلید بلا اجتہاد تفریط ہے۔ عدل کا تقاضا یہ ہے کہ دونوں ہوں اور اپنی اپنی حدود میں ہوں۔ منشا یہ ہے کہ اُمت میں ہر کام جامعیت کے ساتھ اجتماعی رنگ میں ہو۔ اور اس اجتماعیت میں نظم ہو خواہ وہ نظام سیاسی ہو اور یا دینی ہو۔ اس میں نہ تشتت اور پراگندگی ہو جو بدنظمی ہے اور نہ جمود و استبداد، ہو جو جمہوریت کے منافی ہے۔ زندگی کے تمام گوشوں میں اعتدال ہی اسلام کی خصوصیت ہے۔ مثلاً اُمت کے سیاسی نظام میں ایک طرف امارت رکھی تاکہ اُمت میں فوضویت اور انارکی نہ آنے پائے، پھر امارت کے لیے شوریٰ کو ضروری قرار دیا تاکہ استبداد رونما نہ ہو اور اُمت کے اجتماعی فکر کی قوتیں معطل اور بیکار نہ ہو جائیں لہٰذا اسلامی حکومت نہ تو ایسی شخصی حکومت ہے جس میں جمہور کی کوئی مداخلت نہ ہو اور نہ ایسی جمہوریت ہے کہ وہ لامرکزیت کی حد تک پہنچ کر امیر کو معطل اور بیکار کر دے۔ امیر کی شخصیت سے اُمت کی طوائف الملوکی اور پراگندگی کا خاتمہ کیا۔ اور شورائی تشکیل سے امیر کے استبداد کی روک تھام کی۔ ٹھیک اسی طرح اُمت کے قانونی نظام میں اسلام نے نص نہ ہونے کی صورت میں نہ تو عوامی فکر کو اس طرح آزادی عطا کی ہے کہ اُمت کا ہر فرد مجتہد ہو اور کتاب و سنت ہر کہ و مہ کی فکری آوارگی کی جولانگاہ بن جائے اور نہ اس اُمت کو ایسی تقلید جامد میں چھوڑا کہ اس کے قوائے فکر و اجتہاد سرے سے معطل ہو جائیں اور اُمت کی معاشرتی و اجتماعی زندگی مختل ہو کر رہ جائے بلکہ ایک طرف تو جنس اجتہاد کو باقی رکھا جس کی انواع حسب اقتضاء زمانہ آتی اور ختم ہوتی رہیں گی اور دوسری طرف تقلید کو قائم رکھا تا کہ عامی و ناواقف اپنی رائے کو دین کا لباس پہنا کر دین کو آراء و قیاسات کا مجموعہ نہ بنا دے، یعنی اُمت کے علمی تشتت کو تقلیدی سمع و طاعت سے اور تقلیدی جمود کو شان اجتہاد و تحقیق سے دُور کر دیا۔ چنانچہ اُمت اگر مقلد ہے تو وہ اس تقلید میں محقق بھی ہے اور اگر وہ اجتہادی فکر بھی رکھتی ہے تو اس میں اُسوۂ سلف کی مقلد بھی غرض اس اعتدالی درجہ کا یہ اثر ہے کہ ان کے اجتہاد میں تقلید اور تقلید میں شان تحقیق نمایاں ہے۔ اس لیے نہ تو تقلید کو ایک مستقل شریعت بنا کر اس سے جنس اجتہاد کی تردید ہی کوئی موزوں فعل ہو سکتا ہے اور نہ اجتہاد

کو ایک مسلک عام مان کر اس سے تقلید پر ردو انکار کوئی اچھی چیز قرار دی جا سکتی ہے۔ لہ

اس آیت کی ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن سلاطین کے نام دعوتی خطوط لکھے ہیں ان میں عیسائی بادشاہوں کے خطوط میں یہ آیتِ قرآنی ہی دعوتی خط کا اصل جوہر اور مضمون خط کی رُوح ہے۔

حضور انور کا دعوتی خط

آپ نے جو خط اور دعوت نامہ ہرقل قیصر روم کو روانہ کیا اس کے لیے وحیہ بن خلیفہ الکلبی کو قاصد یا سفیر مقرر کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے عام مکاتیب کی طرح یہ مکتوب بھی ہر تکلف سے پاک و مبرا اور صرف حرف مطلب پر مشتمل تھا ارشاد ہوتا ہے۔

انی ادعوك بدعاية الاسلام، اسلم تسلم يوتك الله اجرك مرتين، فان توليت فان عليك اثم اليريسيين، ويا اهل الكتاب تعالوا الى كلمة سواء بيننا وبينكم ان لا نعبد الا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون الله، فان تولوا فقولوا اشهدوا بانا مسلمون۔

میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں اسلام قبول کر لے تمام آفتوں سے محفوظ رہے گا اور اللہ تعالیٰ تجھے دوگونہ اجر عطا فرمائے گا۔ اور اگر روگردانی کی تو تیری پوری رعایا کا وبال تیری گردن پر رہے گا اے اہل کتاب اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ کر اس بات پر آؤ جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں طور پر مسلم ہے یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں ہم میں سے کوئی بھی کسی انسان سے ایسے برتاؤ کا روادار نہ ہو گویا خدا کو چھوڑ کر اسے پروردگار بنا لیا۔ پھر اگر اس سے روگردانی کرو گے تو گواہ رہنا کہ ہم خدا کے فرمانبردار بندے ہیں۔ یعنی اسی کو ماننے والے ہیں۔

اجر کے دوہرا ہونے کا مطلب

دوہرے اجر کا مطلب ہے ایک خود اسلام قبول کرنے کا دوسرے رعایا کے لیے

لہ اجتہاد و تقلید

قبول اسلام کا دروازہ کھول دینے کا اجر۔ اور روگردانی کی حالت میں اپنی محرومی کے علاوہ رعایا کے وبال سے بھی مفر نہ ہوگا۔

یہ مطلب بھی درست ہے لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوہرے اجر کی بشارت صرف عیسائی سربراہان مملکت کو نہیں دی ہے بلکہ ہر عیسائی کو اس تصریح کے ساتھ دی ہے آمن بنبیہ و آمن بمحمد کہ اپنے نبی پر ایمان لایا اور پھر حضورؐ پر ایمان لایا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر کتابی خواہ وہ عیسائی ہو یا یہودی اسے اپنے پیغمبر پر ایمان لانے اور حضور انورؐ پر ایمان لانے کی وجہ سے دوہرا اجر ملے گا۔ ایک اجر اس ایمان کا جو وہ پہلے سیدنا عیسٰی علیہ السلام پر رکھتے اور دوسرا اجر اس ایمان کا جو وہ اب نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے یہی بات قرآن کی اس آیت میں بیان کی گئی ہے۔

اولئك يوتون اجرهم مرتين ۔

یہی لوگ ہیں جن کو دوہرا اجر دیا جائے گا۔

اور یہی بات صحیح بخاری کی اس حدیث میں بیان کی گئی ہے جو صحیح بخاری میں ابو موسٰی اشعری کے حوالہ سے آئی ہے۔

ثلاثة لهم اجران رجل من اهل الكتاب آمن بنبيه وآمن بمحمد

تین شخص ہیں جن کو دوہرا اجر ملے گا ان میں سے ایک وہ ہے جو اہل کتاب میں سے تھا اور اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آیا۔

دراصل ہر شخص کی فطرت ہے کہ اس کو اپنے دین سے ایک والہانہ محبت ہوتی ہے اور دوسرے دین سے رقابت کا تعلق ہوتا ہے اس لیے اپنا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرنا فطرتاً شاق گزرتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ ادیان سماویہ میں کوئی رقابت نہیں ہے۔ اس لیے ان مذاہب کے پیروؤں کو بھی یہی جذبہ رکھنا چاہیے۔ یہ ایک ہی صداقت کی کڑیاں ہیں۔ ایک دین کے مصدق کو دوسرے دین کی تصدیق لازم ہے اس لیے اگر کوئی عیسائی یا یہودی اسلام قبول کرے تو اس کو یہ وسوسہ نہ گزرنا چاہیے کہ اپنے نبی پر اس کا اسلام رائیگاں گیا۔ اگر وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے تو دوہرے اجر کا مستحق ہوگا۔ ہاں یہ یقینی ہے کہ اگر آپ پر ایمان نہ لایا تو پہلے ایمان کا اجر بھی رائیگاں ہو جائے گا کیونکہ رسولوں کے درمیان ایمان میں تفریق نہیں کی جا سکتی جو ایک کا منکر ہے وہ سب کا منکر ہے۔

اس بشارت میں دراصل اہل کتاب کو دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے ایمان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ آپ کی ذات ستودہ صفات پر بھی ایمان لے آئیں اور کیوں ایمان نہ لائیں جب کہ ان سب نبیوں پر ایمان لانا آپ کی دعوت کا جزء ہے۔ آپ پر ایمان لانا ان سب پر ایمان لانا اور آپ کا انکار ان سب کا انکار ہے۔ اگر وہ خدا کے دین اور خدا کے رسولوں کے متعلق فرقہ پرستی کی اسپرٹ رکھیں تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ قرآن اس کو برداشت نہیں کرتا اور اُلٹا ان کا حاصل کردہ اجر بھی ضائع ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ ایمان لانا سب پر ضروری ہے لیکن منہاج طاعت صرف اسلام میں منحصر ہے۔

خط میں اریسین کا مطلب

خط میں یہ ارشاد کہ اگر تو نے روگردانی کی تو اریسین کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔ اصل ارشاد میں علیك اثم الیریسیین کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ یریسیین کیا ہے؟ اس لفظ کے ضبط و تحقیق میں شارحین حدیث کے خیالات مختلف ہیں۔ لیکن تاریخی کی روشنی میں جو بات وزنی ہے یہ ہے کہ عبداللہ بن اریس ایک مشہور پادری تھا۔ یہ اسکندریہ میں پوپ کا منصب رکھتا تھا اور اس کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسیٰ اللہ کی مخلوق اور اس کے بندے ہیں بیٹے یا خدا نہیں بلکہ رسول ہیں اس کا زمانہ وہی تھا جس میں قسطنطین اوّل بانی قسطنطنیہ ہوا ہے۔ شاہان روم میں سب سے پہلے عیسائی مذہب اسی نے اختیار کیا اور وہ اسی اریس پادری کا معتقد تھا اسی لحاظ سے جو لوگ اس کے متبع تھے ان کو اریسیین کہا جاتا۔ ہرقل اور اس کی رعایا بھی چونکہ اس کے پیرو کار تھے اس لیے ان کو اریسی کہا جاتا تھا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے نامہ مبارک میں ہرقل کو یہ تنبیہ فرمائی کہ اگر تو اسلام سے منحرف ہوا تو تیری پیروی میں اریس کے جتنے ماننے والے ہیں تیری رعایا ہونے کی وجہ سے منحرف ہو جائیں گے اس لیے ان کے انحراف کا گناہ بھی تیری گردن پر ہوگا۔ حافظ ابوجعفر طحاوی نے مشکل الآثار میں حافظ ابن حزم نے الفصل فی الملل والنحل میں اور حافظ ابن تیمیہ نے الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن لوگوں نے اریسیین کے معنے رعایا کیے ہیں ان کے پیش نظر یہی نکتہ ہے۔

دعوتی خط کے واقعہ کی تفصیل

۶ھ ہجری مطابق ۶۲۹ء میں حضرت دحیہ کلبی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا خط لے کر روانہ ہوئے تو راستہ میں اُن کو معلوم ہوا کہ حاکم بصریٰ اس وقت بصریٰ میں موجود نہیں ہے حمص میں ایک عرصہ سے اس لیے مقیم ہے کہ قیصر کی زیارت بیت المقدس کا سامان کرے حضرت دحیہ یہ معلوم کر کے حمص روانہ ہو گئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی مشہور محدث ابن السکن کی کتاب صحابہ سے نقل کرتے ہیں کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت دحیہ کے بعد ہی فوراً حضرت عدی بن حاتم طائی کو بھی روانہ کیا تاکہ وہ حضرت دحیہ کی امداد کریں کیونکہ عدی خود عیسائی رہ چکے تھے اور شاہی دربار کے آداب سے خوب واقف تھے۔

حضرت دحیہ نے حمص پہنچ کر حارث غسانی کو والا نامہ دیا۔ حارث نے والا نامہ کو مع حضرت دحیہ کے قیصر کے دربار میں بیت المقدس روانہ کر دیا۔ قیصر کو نامہ مبارک ملا تو اُس نے حکم دیا کہ عرب کا کوئی شخص اگر یہاں موجود ہے تو اس کو لاؤ۔ صلح حدیبیہ کا زمانہ تھا۔ غزہ میں قریب ہی قریش کا تجارتی قافلہ تجارت کے سلسلہ میں مقیم تھا۔ امیر قافلہ ابو سفیان تھا جو ابھی تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ قیصر کے قاصد غزہ پہنچے اور قافلہ والوں کو جا کر لے آئے۔

قیصر نے بڑے تزک و احتشام کے ساتھ دربار شاہی منعقد کیا۔ اور تخت کے چاروں طرف بڑے بڑے امراء اور راہبوں کو صف بستہ بیٹھ جانے کے بعد حکم دیا کہ سفیر، عرب تاجروں اور ترجمان کو بلاؤ جب دربار مکمل ہو گیا تو ہرقل نے عرب تاجروں سے کہا کہ تم میں سے اس مدعی نبوت کا رشتہ دار کون ہے ابو سفیان نے کہا کہ میں۔ قیصر نے ان کو حکم دیا کہ میرے قریب آجاؤ اور ابو سفیان کے باقی ہمراہیوں سے کہا کہ میں اس شخص سے کچھ سوالات کروں گا اگر کسی جواب میں یہ جھوٹ بولے تو تم مجھے مطلع کر دینا۔ ابو سفیان کہتے ہیں کہ بخدا اگر مجھے یہ حیا دامنگیر نہ ہوتی کہ میرے جھوٹ کی یہ لوگ روایت کریں گے تو میں ضرور اس روز کچھ جھوٹ بول دیتا۔

قیصر: اس مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے۔

ابو سفیان: بہت اچھا اور نہایت شریف ہے۔

قیصر: اس خاندان میں پہلے بھی کسی نے دعویٰ نبوت کیا ہے۔

ابوسفیان : نہیں۔

قیصر : اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ ہوا ہے ؟

ابوسفیان: نہیں ۔

قیصر : دعویٰ نبوت سے پہلے کبھی تم نے جھوٹ کا تجربہ کیا ؟

ابوسفیان : ہرگز نہیں ۔

قیصر : ان کے پیروکار بڑے لوگ ہیں یا کمزور ؟

ابوسفیان: کمزور

قیصر : اس کے پیروکار بڑھتے رہتے ہیں یا گھٹتے رہتے ہیں ؟

ابوسفیان: بڑھتے ہیں ۔

قیصر : اس کے متبعین میں سے کوئی ناراض ہو کر علیحدہ ہوتا ہے یا نہیں ؟

ابوسفیان : نہیں ۔

قیصر : کیا اس سے تمہاری کوئی جنگ ہوئی ؟

ابوسفیان: ہاں ۔

قیصر : نتیجہ کیا رہا ۔

ابوسفیان: کبھی ہم غالب ہوئے اور کبھی وہ ۔

قیصر : کیا کبھی اس نے عہد شکنی کی ہے ۔

ابوسفیان : نہیں لیکن ایک معاہدہ ابھی ہمارے اور اس کے درمیان ہوا ہے۔ معلوم نہیں اس میں وہ کیا کریں گے ۔

قیصر نے ابوسفیان کے جوابات کو سن کر کہا کہ انبیاء ہمیشہ شریف خاندان سے ہوتے ہیں۔ اگر اس کے اباء میں کوئی بادشاہ ہوتا تو گمان ہوتا کہ اپنے باپ دادا کا ملک حاصل کرنے کے لیے اس نے دعویٰ نبوت کیا ہے اور انبیاء کے پیروکار ہمیشہ کمزور لوگ ہی ہوتے ہیں اور جس شخص نے انسانوں پر کبھی نہ جھوٹ باندھا ہو وہ خدا پر کیونکر جھوٹ باندھ سکتا ہے اور انبیاء کے پیروکار راسخ الایمان ہوتے ہیں اسی لیے مرتد نہیں ہوتے اور نبوت کو ماننے والے اسی طرح آہستہ آہستہ بڑھتے ہیں ۔ لڑائیوں میں انبیاء کی یہی حالت ہوتی ہے کہ کبھی غالب اور کبھی مغلوب ، لیکن آخری کامیابی ان کی یقینی ہوتی ہے ۔ انبیاء غدار اور عہد شکن نہیں ہوتے ہاں اگر تم

لوگوں میں پہلے کوئی ایسا دعویٰ کرتا تو گمان ہوتا کہ یہ بھی سُن کر ایسا دعویٰ کرتے ہیں پھر دریافت کیا۔
قیصر: اچھا یہ بتاؤ کہ لوگوں کو کس بات کا حکم دیتا ہے؟
ابوسفیان: نماز، روزہ، صلہ رحم اور پاکدامنی کا۔
قیصر: یہ جو کچھ تم نے کہا اگر صحیح ہے تو وہ ضرور نبی ہے۔ ہم یہ تو جانتے تھے کہ ایک نبی کا ظہور ہونے کو ہے مگر یہ معلوم نہ تھا کہ اُن کا ظہور تم لوگوں میں ہوگا۔ میری خواہش ہے کہ کاش ان کی زیارت ہوتی۔ اگر میں ان کے پاس ہوتا تو ان کے پیر دھوتا ان کی حکومت اس مقام تک پہنچے گی جہاں اس وقت میرا قدم ہے۔
اس کے بعد حکم دیا کہ حضور انورؐ کا خط پڑھا جائے۔ ترجمان نے خط پڑھا۔

مقوقس عزیز مصر کے نام خط

ایسے ہی ایک دعوت نامہ حضور انورؐ نے مقوقس کے نام روانہ فرمایا تھا۔ مقوقس اسقف اعظم کے منصب پر فائز تھا اور قیصر نے ۶۳۱ء میں اسے ملکی نظم و نسق کے لیے اپنی طرف سے نمائندہ بنایا تھا۔ مقوقس کسریٰ اور قیصر کی طرح لقب ہے۔ اس کا نام بعض انگریز مورخین نے سائرس لکھا ہے۔ بعض مسلمان مورخین نے جریج لکھا ہے (رحمۃ للعالمین) مولانا حفظ الرحمان نے بلاغ مبین میں بحوالہ اسد الغابہ اسی کی تائید کی ہے۔ مقوقس کے پاس دعوت نامہ لے جانے کے لیے حاطب بن بلتعہ نے اپنے آپ کو پیش کیا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا
حاطب خدا تجھے برکت سے نوازے۔ اس دعوت نامہ کی عبارت بھی وہی تھی جو قیصر روم کے دعوت نامہ کی تھی اور وہ اوپر نقل ہو چکا ہے السیوطی نے حسن المحاضرہ میں لکھا ہے کہ حاطب اسکندریہ پہنچے تو مقوقس کشتی پر دریائے نیل کی سیر کر رہا تھا۔ حاطب نے بھی ایک کشتی کرائے پر لی تاکہ نامہ مبارک جلد مقوقس کے پاس پہنچ جائے۔ مقوقس نے دریافت کیا کہ اگر تمہارا نبی سچا ہے تو خدا سے یہ دُعا کیوں نہیں مانگتا کہ اسے وطن سے نکالنے والے مخالفین تباہ ہو جائیں۔ حاطب نے بے توقف جواب دیا کہ آپ کے عقیدے کے مطابق یہودیوں نے حضرت عیسیٰؑ کو سولی دی۔ انہوں نے خدا سے دُعا مانگ کر دشمنوں کو کیوں ہلاک نہ کرایا۔
مقوقس نے جواب دیا بے شک تو خود بھی دانا ہے اور جس کا تو سفیر ہے وہ بھی دانا و حکیم ہے۔ پھر نامہ مبارک کو ہاتھی دانت کی دو تختیوں میں رکھوا کر سرکاری خزانے میں محفوظ کرا دیا

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عریضہ بڑے اچھے انداز میں لکھا۔ اس میں تھا کہ یہ تو مجھے علم تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے لیکن میرا گمان تھا کہ وہ شام میں ظاہر ہوگا۔ ساتھ ہی حضور انورؐ کی خدمت میں دو معزز قبطی لڑکیاں، قیمتی کپڑا اور خچر روانہ کیا۔ یہی خچر دلدل کے نام سے مشہور رہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد حضرت علی کے پاس رہا۔

دعوت کا اصول

اس آیت سے تبلیغ و دعوت کا یہ اہم اصول معلوم ہوا کہ مخالف العقیدہ شخص اور جماعت کو صرف اس چیز پر جمع ہونے کی اولاً دعوت دی جائے جس پر دونوں کا اتفاق ہو سکتا ہو۔ چنانچہ اسی کے مطابق حضور انورؐ نے ان دو عیسائی سربراہان مملکت ہرقل اور مقوقس کو جب اسلام کی دعوت دی تو ایسے مسئلہ کی طرف دعوت دی جس پر دونوں کا اتفاق تھا یعنی اللہ کی وحدانیت[1]

بحث کا خاتمہ:

۱۲۶- پھر بھی اگر یہ لوگ اس بات سے روگردانی کریں تو تم کہہ دو کہ گواہ رہو کہ ہم مسلم ہیں یعنی تم دعوئے نبوت و اسلام کر کے پھر گئے ہو ہم بحمداللہ اس پر قائم ہیں کہ اپنے کو محض خدائے واحد کے سپرد کر دیا ہے اور اسی کے تابع فرمان ہیں[2] مسلمون کے لفظی معنے فرمانبردار کے ہیں اور یہی اُمت محمدیہ کا اصطلاحی نام بھی ہے کیا اللہ کی شان ہے کہ یہود و نصاریٰ آج بھی مسلمانوں کی توحید خالص کی شہادت دے رہے ہیں۔[3]

---

[1] معارف القرآن م ش
[2] افادات شیخ الاسلام
[3] ماجدی

يَٰٓأَهۡلَ ٱلۡكِتَٰبِ لِمَ تُحَآجُّونَ فِيٓ إِبۡرَٰهِيمَ وَمَآ أُنزِلَتِ ٱلتَّوۡرَىٰةُ
وَٱلۡإِنجِيلُ إِلَّا مِنۢ بَعۡدِهِۦٓۚ أَفَلَا تَعۡقِلُونَ ۝ هَٰٓأَنتُمۡ هَٰٓؤُلَآءِ حَٰجَجۡتُمۡ
فِيمَا لَكُم بِهِۦ عِلۡمٞ فَلِمَ تُحَآجُّونَ فِيمَا لَيۡسَ لَكُم بِهِۦ عِلۡمٞۚ وَٱللَّهُ يَعۡلَمُ
وَأَنتُمۡ لَا تَعۡلَمُونَ ۝ مَا كَانَ إِبۡرَٰهِيمُ يَهُودِيّٗا وَلَا نَصۡرَانِيّٗا
وَلَٰكِن كَانَ حَنِيفٗا مُّسۡلِمٗا وَمَا كَانَ مِنَ ٱلۡمُشۡرِكِينَ ۝ إِنَّ
أَوۡلَى ٱلنَّاسِ بِإِبۡرَٰهِيمَ لَلَّذِينَ ٱتَّبَعُوهُ وَهَٰذَا ٱلنَّبِيُّ وَٱلَّذِينَ
ءَامَنُواْۗ وَٱللَّهُ وَلِيُّ ٱلۡمُؤۡمِنِينَ ۝

اے اہل کتاب تم ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو[۱۲۷] حالانکہ
تورات اور انجیل نازل ہی حضرت ابراہیم کے بعد ہوئی ہیں۔ کیا
اتنی موٹی بات بھی تمہاری عقل میں نہیں آتی ہے[۱۲۸]؟ دیکھو یہ تم
ہی تو ہو کہ تم نے ان باتوں میں جھگڑا کیا جن کے لیے تمہارے
پاس کچھ علم تھا اب تم ان باتوں میں کیوں جھگڑتے ہو جن کے
لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ اور اللہ سب کچھ
جانتا ہے اور تم کچھ نہیں جانتے ہو[۱۲۹] امر واقعہ یہ ہے کہ

ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی اور نہ مشرکین میں سے تھے۔ بلکہ سب سے بیزار اللہ کے فرمانبردار تھے[۱۳۰]۔ فی الحقیقت ابراہیم سے نزدیک تر تو وہ لوگ ہیں جو اُن کے پیروکار تھے۔ اور یہ پیغمبر اور اہل ایمان ہیں اور اللہ اہل ایمان کا مددگار ہے[۱۳۱]۔

عالمی اور بین الاقوامی زاویہ نگاہ:

پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ اے محمد رسول اللہ تم لوگوں کو اس حقیقت کی طرف بلاؤ اور استواری کے ساتھ اس دعوت اور دعویٰ پر قائم رہو اور یہ اعلان کرو کہ اسلام یہ ہے کہ اللہ کی الوہیت اور ربوبیت کی حد تک یگانہ خدا کی پرستاری کریں اور جو کچھ اس کے لیے ہے۔ اس میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کیا جائے اور کوئی انسان دوسرے کو اپنے جیسے ایسا مقدس اور معصوم نہ بنائے گویا اسے خدا بنا لیا ہے۔ الوہیت اور ربوبیت کا یہی طریقہ حضرت ابراہیم کا تھا۔ الوہیت کی خاطر انہوں نے اپنے باپ اور قوم سے کہا کہ ماھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون اور ربوبیت کی خاطر انہوں نے وقت کے سب سے بڑے اقتدار سے محاسبہ کیا اور کہا ربی الذی یحی و یمیت یہودیت اور نصرانیت کی گروہ بندیاں اور رسوم و عقائد سب بعد کی پیداوار ہیں اور دین ابراہیم سے انحراف کا نتیجہ ہیں۔

اس آیت میں حضرت ابراہیم کا تعارف مثبت اور منفی دو پہلو سے پیش کیا ہے یعنی یہ کہ حضرت ابراہیم کیا تھے اور حضرت ابراہیم کیا نہیں تھے؟ فرمایا کہ وہ یہودی نہ تھے، عیسائی نہ تھے اور مشرکین سے ان کا کوئی تعلق نہ تھا اور حنیف و مسلم تھے۔ حنیف حنف سے بنا ہے۔ عربی میں اس کے معنے مڑنے اور جھکنے کے ہیں اس لیے حنیف وہ شخص ہے جو ایک طرف سے جھک کر اور مڑ کر دوسری طرف جائے۔ قرآن حکیم کی آیات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ حنیف کا مقابل مشرک ہے۔ اسی بنا پر قرآن میں جہاں کہیں حنیف کا لفظ آیا ہے۔ اس کے ساتھ شرک کی بھی نفی کی گئی مثلاً حنیفا و ما انا من المشرکین (انعام) حنفاء اللہ غیر المشرکین بہ (حج)

ان اقم وجھک للدین حنیفا و لا تکونن من المشرکین۔ (یونس) بل ملۃ ابراھیم حنیفا وماکان من المشرکین (البقرہ) الغرض اس قسم کی بہت سی آیتوں میں جہاں لفظ حنیف آیا ہے۔ وہاں شرک کی بھی نفی کی گئی ہے۔

ان آیتوں سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ مذہب دراصل حضرت ابراہیم کا تھا اور انہی کی یادگار کے طور پر ان کی نیک دل اولاد میں اس کا کسی قدر حصہ باقی رہ گیا۔ یہود و نصاریٰ کہتے تھے کہ مذہب حق تو یہودیت یا عیسائیت ہے۔ یہ تیسرا مذہب کیا ہے۔ قرآن نے جواب دیا ہے کہ یہ دونوں تو بعد کی شاخیں ہیں۔ اصل مذہب جس کی دعوت حضرت ابراہیم نے دنیا کو دی ہے۔ وہ ایک خدا کی پرستش اور اس کی فرمانبرداری ہے۔ حضرت ابراہیم کے لیے اس آیت میں یہودیت و عیسائیت کے مقابلہ میں مسلم اور مشرکین کے مقابلہ میں حنیف آیا ہے۔

جب پہلی آیت میں بتا دیا گیا کہ اسلام کا زاویہ نگاہ ایک تلم عالمی اور بین الاقوامی ہے تو اس آیت میں حضرت ابراہیم کی شخصیت کا عالمی حیثیت سے تعارف کرایا گیا۔ تورات میں ہے کہ ابراہیم کے لفظی معنی قوموں کے باپ کے ہیں۔ ان کی شخصیت چونکہ قوموں کے باپ کی تھی اس لیے ان کی دعوت بھی بین الاقوامی تھی۔ یہودیت و نصرانیت اور مشرکین کا دعوت ابراہیم سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ سب بعد کی پیداوار ہیں۔ قرآن نے ان کی بے راہ روی ثابت کرنے کے لیے ایک نہایت سیدھا سادہ سوال ان کے سامنے پیش کیا ہے۔ یعنی وہ یہودیوں اور عیسائیوں سے دریافت کرتا ہے کہ یہودیت اور نصرانیت کی تاریخ زیادہ سے زیادہ تورات اور انجیل تک جا سکتی ہے کیونکہ ان کی ہی نسبت سے یہودیت و نصرانیت رونما ہوئی ہیں۔ یہ بات کسی دلیل کی محتاج نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم کے زمانہ میں ان کا وجود ہی نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا کیونکہ یہودیت اور نصرانیت حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے نام پر قائم ہوئی ہیں اور یہ دونوں حضرت ابراہیم سے سیکڑوں برس بعد ہوئے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہودیت اور نصرانیت سے پہلے راہ نجات موجود تھی۔ یہی راہ نجات ابراہیم کی راہ ہے اور یہ صرف یگانہ خدا کی پرستش اور اس کی ہی فرمانبرداری کا نام ہے۔

قرآن کا یہودیوں اور عیسائیوں سے سوال:

۱۲۷۔ اے اہل کتاب تم حضرت ابراہیم کے بارے میں کیوں جھگڑتے ہو قرآن کے اولین مخاطبوں میں تین گروہ تھے۔ یہودی، عیسائی اور مشرکین عرب اور یہ تینوں حضرت ابراہیم کی

شخصیت کو یکساں طور پر عزت و احترام کی نظر سے دیکھتے تھے کیونکہ نبیوں کے مورث اعلیٰ وہی تھے اور تینوں اپنی اپنی بدعات کی حمایت میں ان کے نام نامی کو استعمال کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ یہودیوں کا دعویٰ تھا کہ حضرت ابراہیم یہودی تھے اور عیسائی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم کا تعلق عیسائیت سے تھا۔ یوں یہ فخر یہ دعویٰ ان میں سے ہر گروہ کا ایک دوسرے کے مقابلہ پر ہمیشہ رہا لیکن اسلام کی شروع ہونے کے بعد اسی کی مخالفت میں خاص حربہ جو انہوں نے استعمال کیا وہ یہی تھا۔ کہ یہ نیا دین، دین ابراہیم کے خلاف ہے۔ اصل دین ابراہیم کے قائل ہم ہیں۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم معاذ اللہ ہم کو ہمارے اصلی دین سے ہٹا کر گمراہ کرنا چاہتے ہیں۔ قرآن ان کی بے راہ روی اور گمراہی ظاہر کرنے کے لیے ان سے دریافت کرتا ہے کہ تم لوگ حضرت ابراہیم کے بارے میں یعنی حضرت ابراہیم کے دین و مذہب کے بارے میں کیوں جھگڑا کرتے ہو اور ان پر یہودیت اور عیسائیت کا الزام کیوں لگاتے ہو۔

۱۲۸ حالانکہ تورات و انجیل حضرت ابراہیم کے بعد نازل ہوئی ہیں۔ کیا اتنی موٹی بات بھی تمہاری عقل میں نہیں آتی ہے۔ قرآن یہودیوں اور عیسائیوں سے سوال کرتا ہے کہ تمہارے مذہبوں کی تاریخ زیادہ سے زیادہ تورات اور انجیل کے ظہور تک جا سکتی ہے۔ اچھا بتاؤ تورات اور انجیل سے پہلے بھی ہدایت موجود تھی یا نہیں اگر تھی تو وہ کیا تھی۔ خود اسرائیلی گھرانے کے تمام نبیوں کی راہ کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ وہ یہودیت یا مسیحیت نہ تھی کیونکہ یہ دونوں حضرت موسیٰ اور حضرت مسیح کے نام پر بنی ہیں اور وہ حضرت ابراہیم سے کئی سو برس بعد پیدا ہوئے پھر حضرت ابراہیم یہودی یا نصرانی کیونکر ہوئے؛ ہر بات کے لیے کوئی بنیاد ہوتی ہے۔ مگر اس کی تو کوئی بنیاد ہی نہیں ہے[۱]

مطلب یہ ہے کہ یہودیت و نصرانیت بہر حال تورات و انجیل کے نزول کے بعد پیدا ہوئی اور ابراہیم علیہ السلام ان دونوں کے نزول سے بہت پہلے گزر چکے تھے۔ اب ایک معمولی عقل کا آدمی بھی یہ بات باآسانی سمجھ سکتا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام جس مذہب پر تھے وہ بہر حال یہودیت یا نصرانیت تو نہ تھا پھر اگر حضرت ابراہیم راہ راست پر تھے اور نجات یافتہ تو لامحالہ اس سے لازم آتا ہے کہ آدمی کا راہ راست پر ہونا اور نجات پانا یہودیت و نصرانیت پر موقوف نہیں ہے۔[۲]

---

[۱] تدبر قرآن
[۲] تفہیم القرآن

مسائل میں مجادلہ کی حدود :

۱۲۹ - دیکھو تم ہی تو ہو کہ تم نے ان باتوں میں جھگڑا کیا جن کے بارے میں تمہارے پاس کچھ علم تھا اب تم ان مسائل میں کیوں جھگڑتے ہو جن کے بارے میں تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے اور اللہ سب کچھ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ہو۔ جیسے دعویٰ اسلام و توحید سب میں مشترک تھا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم خلیل اللہ کی تعظیم و تکریم میں بھی سب شریک تھے اور یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک فرقہ دعویٰ کرتا تھا کہ ابراہیم ہمارے دین پر تھے۔ یعنی معاذ اللہ یہودی یا نصرانی تھے۔ اس کا جواب دیا کہ تورات و انجیل جن کے پیروکار یہودی یا نصرانی کہلائے حضرت ابراہیم سے سینکڑوں برس بعد اتری۔ پھر ابراہیم کو یہودی یا نصرانی کیسے کہہ سکتے ہو بلکہ جس طرح کے تم یہودی یا عیسائی ہو۔ اس معنے کے لحاظ سے تو خود حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو بھی یہودی یا نصرانی نہیں کہا جا سکتا۔ اور اگر یہ مطلب ہے کہ حضرت ابراہیم کی شریعت ہمارے مذہب سے زیادہ قریب تھی تو یہ بھی غلط ہے۔ اس کا علم تم کو کہاں سے ہوا۔ تمہاری کتابوں میں مذکور نہیں ہے۔ نہ خدا نے خبر دی ہے نہ تم اس کے لیے کوئی ثبوت پیش کر سکتے ہو پھر ایسی بات میں جھگڑنا جس کا آدمی کو کچھ بھی علم نہ ہو حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ جن چیزوں کی تمہیں کچھ خبر تھی گو نا تمام اور سرسری تھی مثلاً مسیح علیہ السلام کے واقعات یا نبی آخر الزمان کی بشارات وغیرہ ان میں تم جھگڑ چکے ہو۔ لیکن جس چیز سے تمہیں بالکل مس نہیں نہ اس کی کبھی ہوا لگی۔ اسے تو خدا کے سپرد کر دو وہ ہی جانتا ہے کہ ابراہیم کیا تھے اور آج دنیا میں کون سی جماعت کا مسلک اس سے قریب تر ہے[1]

اس آیت سے یہ رہنما اصول ملتا ہے کہ جن کو علم نہ ہو ان کو مسائل میں مناظرہ، مجادلہ اور محاجہ سے دامن بچا کر رکھنا چاہیئے۔ نادان اور بے خبر کو خود قرآن نے سوال کی راہ بتائی ہے۔ فاسئلوا اهل الذكر ان كنتم لا تعلمون ان کو سوال کے ذریعے اپنی علمی تشنگی کے لیے سیرابی کا سامان کرنا چاہیئے دقرطبی نے یہ بات پتے کی لکھی ہے کہ ۔

اس آیت میں جیسے بے خبر کے لیے مسائل میں مجادلہ کرنے کی ممانعت ہے ایسے ہی دوسری آیت وجادلهم بالتي هي احسن میں باخبر کو مجادلہ کرنے کا حکم ہے ۔

---

[1] افادات شیخ الہند ۔

مسائل معلومہ اور مسائل مجہولہ

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس آیت میں یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ کچھ مسائل ایسے ہیں جن کا ان کو علم ہے اور کچھ مسائل ایسے ہیں جن کا ان کو علم نہیں ہے۔ مسائل معلومہ کے بارے میں بحث و مناظرہ ایک درجہ میں معقول ہے لیکن مسائل مجہولہ کے لیے بحث و جدال سرتاسر حماقت ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ مسائل معلومہ کون سے ہیں، جن میں بحث و مناظرہ قرآن کے نزدیک معقول ہے۔

شارحین قرآن کا اس موضوع پر کچھ اختلاف ہے امام ابن جریر فرماتے ہیں۔ مسائل معلومہ سے وہ مسائل مراد ہیں جن کا ذکر تورات وانجیل میں ہے اور جو انبیاء کی وساطت سے یہودیوں اور عیسائیوں کو معلوم ہوئے ہیں اور مسائل مجہولہ سے وہ مسائل مراد ہیں جن کے بارے میں آسمانی کتابیں خاموش ہیں اور نبوت کی کوئی رہنمائی نہیں ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ مسائل معلومہ وہ مسائل ہیں جو تورات وانجیل میں موجود ہیں اور یہودی و عیسائی ان مسائل میں محض عناد کی بناپر نبوت سے بحث و مناظرہ کرتے ہیں۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں مسائل معلومہ سے مراد حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کے حالات ہیں۔ علامہ قرطبی کا ارشاد ہے کہ مسائل معلومہ سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا مسئلہ ہے کیونکہ یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنی کتابوں سے حضور انور کی تشریف کا علم تھا۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ بعض چیزوں کی حلت و حرمت کے بارے میں تمہارے خیال کتنا ہی غلط ہوتا ہم ان کے لیے مذہبی روایات کی کوئی سند ہے۔ مولانا عثمانی کی رائے میں کہ مراد یہ ہے کہ جب تم تورات وانجیل ہی کے مسائل میں جھگڑے ہو حالانکہ وہاں کچھ تو واقفیت اور علم نہیں تھا۔

ہماری رائے میں موقعہ کے لحاظ سے علامہ قرطبی کی رائے قابل ترجیح ہے اگرچہ ان کے اور دوسرے بزرگوں کے خیالات میں کوئی بنیادی اختلاف نہیں ہے۔ صرف اجمال و تفصیل کا اختلاف ہے۔ تفصیل میں امام قرطبی ان مسائل کو جو تورات وانجیل میں موجود ہیں معین فرماتے ہیں اور ان کو مسائل معلومہ میں سے ایک کو متعین کر کے فرماتے ہیں کہ یہ مسئلہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور تشریف آوری سے متعلق ہے۔ قرآن عزیز نے متعدد مقامات پر یہودیوں اور عیسائیوں کو اس پر ملامت کی ہے کہ باوجود اس کے کہ ان کو تورات وانجیل سے حضور انور کا نبی ہونا معلوم ہے

نہیں مانتے۔

ان الذین اوتوا الکتاب یعلمون انہ الحق۔

جن کو پہلے کتاب دی جا چکی ہے یقیناً وہ جانتے ہیں کہ یہ حق ہے۔

دوسرے موقعہ پر ہے۔

الذین اٰتینا ھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفونہ ابناء ھم۔

وہ حضور انور کو ایسے ہی پہچانتے ہیں جیسے وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں

اسی علم و معرفت کا نتیجہ تھا کہ علماء یہود آنے والے نبی کے متعلق تورات کی بیان کردہ مختلف علامات اور نشانیوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر حاضر خدمت ہوتے تھے اور سوالات کرتے تھے اور آپ کا امتحان لیتے تھے اور جب ان کو تشفی ہو جاتی تھی تو وہ مسلمان ہو جاتے تھے۔

کفار عرب کو مخاطب کر کے قرآن نے کہا کہ حضور انور کی صداقت کی دلیل یہ ہے کہ علمائے بنی اسرائیل اس کو جانتے ہیں۔

اولم یکن لھم آیۃ ان یعلمہ علماء بنی اسرائیل۔

کیا ان کو یہ نشان کافی نہیں ہے کہ علماء بنی اسرائیل ان کو جانتے ہیں

بہر حال مالکم بہ علم وہ چیز جس کا تمہیں علم ہے سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت گرامی ہے۔ یہی چیز ان کو اپنی کتابوں کی مدد سے معلوم تھی اور اسی میں عناد کی وجہ سے حضور انور سے بحث و مباحثہ کرتے تھے۔

۱۳۰۔ امر واقعہ یہ ہے کہ ابراہیم نہ یہودی تھے نہ نصرانی اور نہ مشرکین سے تھے بلکہ سب سے بیزار اللہ کے فرمانبردار تھے۔ یعنی ابراہیم نے اپنے تئیں حنیف مسلم کہا ہے۔ حنیف کے معنے جو کوئی ایک راہ حق پکڑے اور سب باطل راہیں چھوڑ دے اور مسلم کے معنے حکم بردار۔ اب خود اندازہ کر لو کہ آج جس نے سب سے ہٹ کر اللہ کی راہ پکڑی ہے اور اپنے کو خالص اللہ کے سپرد کر دیا ہے۔ وہ بھی ابراہیم سے زیادہ اشبہ اور اقرب ہو گا۔[1]

یہاں لفظ حنیف کے معنے عام تراجم میں دو طرح کیے گئے ہیں ایک بیزار اور ہٹے ہوئے کے، دوسرے یکسو اور جھکے ہوئے کے۔ دونوں درست ہیں کیونکہ لغت میں یہ لفظ حنف سے

---

[1] افادات شیخ الہند۔

مشتق ہے۔ عربی میں اس کے معنے مڑنے اور جھکنے کے آتے ہیں اس لیے حنیف وہ شخص ہے جو ایک طرف جھک کر اور مڑ کر دوسری طرف جائے یہ لفظ اچھے اور برے دونوں معنے میں مشتمل ہو سکتا ہے۔ اگر یہ فرض کیا جائے کہ اس نے اچھی بات کو چھوڑ کر بری بات اختیار کی ہے تو حنیف کے وہ معنے ہو سکتے ہیں جس میں عبرانی اور سریانی زبان میں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ یعنی کافر و منافق اور اگر یہ سمجھا جائے کہ برے کام کو ترک کر کے اس نے کوئی اچھا کام پسند کیا ہے تو اس کا وہ مفہوم ہے جس میں اہل عرب اس کو بولتے ہیں یعنی دیندار خدا پرست۔ اس لیے اس لفظ کے اچھے یا برے مفہوم کی تعیین موقع استعمال اور حرف صلہ سے ہوگی۔ اصل میں اس کا ابتدائی استعمال اللہ یا للدین کی تخصیص کے ساتھ ہوتا تھا الحنیف للہ خدا کی طرف جھکنے والا الحنیف للدین سچے مذہب کی طرف جھکنے والا۔ کثرت استعمال اور زبان زدگی عام سے اس قید کی ضرورت نہ رہی اور مطلق حنیف کے معنے خدا کی طرف جھکنے والا ہی سمجھے جانے لگے چنانچہ قرآن عزیز میں یہ لفظ دونوں طرح استعمال ہوا ہے۔ سورہ حج میں ہے۔ حنفاء للہ خدا کی طرف مڑنے والے بن کر لیکن سورہ انفکاک میں بغیر صلہ کے آیا ہے۔ مخلصین لہ الدین حنفاء اپنے اعتقاد کو خالص کر کے مڑنے والا بن کر۔

ہر زبان میں کثرت سے اس قسم کی مثالیں ملیں گی بلکہ اصطلاحات عموماً اسی طرح بنتی ہیں مثال کے لیے حنیف کے ہم معنے لفظ مسلم کو لیجیے۔ مسلم کے اصلی معنے سونپنے والے کے ہیں کوئی شخص اپنے دوست کو کسی دشمن کے حوالہ کر دے تو عربی میں اس کو مسلم کہیں گے اور یہ مذموم معنے ہیں اس کا ابتدائی استعمال مسلم للہ اپنے کو خدا کے سونپ دینے والا تھا۔ قرآن میں ہے من اسلم وجھہ للہ جس نے اپنے آپ کو خدا کے سپرد کر دیا۔ لیکن کثرت استعمال سے صرف مسلم رہ گیا اور معنے وہی مسلم اللہ کے رہے اور اب کسی کو وسوسہ بھی نہیں ہوتا کہ اس کا کوئی برا مفہوم بھی ہے اصل یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی بعثت قوم کے اندر ہوئی تھی حضرت ابراہیم نے دلائل اور عمل دونوں طریقوں سے ان کے مذہب کی تردید کی۔ باطل پرستیوں سے سخت تنفر ظاہر کیا اور خدائے برحق پر ایمان لائے۔ اسی بنا پر انہوں نے خود یا بعد کو ان کے پیرووں نے اپنا لقب حنیف اختیار کیا یعنی ستارہ پرستی سے مڑ کر خدا پرستی کی طرف جھکنے والا اس کی صحت قرآن عزیز کے موقع استعمال سے ثابت ہے۔

یا قوم انی بریئ مما تشرکون، انی وجھت وجھی للذی فطر السموات

والارض حنیفا وما انا من المشرکین ۔

اس آیت میں حنیف کے معنے ستارہ وغیرہ باطل پرستیوں سے ہٹ کر اللہ تعالیٰ کی طرف رخ کرنے والے کے۔ حق کی طرف جھکنے کے لیے باطل سے منہ موڑنا اور باطل سے منہ موڑنے کے لیے حق کی طرف جھکنا لازم ہیں۔ اس لیے دونوں معنے صحیح ہیں۔

حضرت ابراہیم ایک مسلم کی حیثیت سے:

یہاں مسلماً میں اسلام سے خاص شریعت محمدیہ مراد لینے کی ضرورت نہیں ہے بلکہ تسلیم و تفویض اور فرمانبرداری کے معنے ہیں جو تمام انبیاء کا دین رہا ہے اور ابراہیم علیہ السلام نے خصوصیت سے اس نام و لقب کو بہت زیادہ روشن کیا اذ قال لہ ربہٗ اسلم قال اسلمت لرب العالمین حضرت ابراہیم کی سوانح حیات کا ایک ایک حرف بتلاتا ہے کہ وہ ہمہ تن اسلام اور تسلیم و رضا کے پیکر مجسم تھے۔ ذبح اسماعیل کے واقعہ میں فلما اسلما وتلہ للجبین۔ کے الفاظ ان کی شانِ اسلام کو بہت وضاحت سے نمایاں کرتے ہیں[1]

دراصل اسلام کے ایک معنے تو عام ہیں اور دوسرے معنے خاص ہیں جس کا مخاطب آیت بالا میں حضرت ابراہیم کو بنایا گیا ہے یہ وہ استسلام نہیں ہے جس کی طرف امام بخاری نے کتاب الایمان کے باب اذا لم یکن الاسلام علی الحقیقۃ وکان علی الاستسلام میں اشارہ فرمایا ہے بلکہ قدرت الٰہیہ کے قہر و غلبہ کے اس مشاہدے کا نام ہے جس کے بعد انسان کو اپنی قدرت و طاقت کی سب داستاں محض ایک افسانہ نظر آنے لگتی ہے۔ یہ منزل صرف کلمہ طیبہ زبان سے ادا کر لینے سے حاصل نہیں ہوتی ہے۔ بلکہ اسلام کی اس عملی زندگی گزارنے سے حاصل ہوتی ہے۔ جس میں قدم قدم پر یہ سبق ملتا رہتا ہے کہ اس کو درحقیقت کوئی اختیار نہیں ہے نہ وہ اپنی جان کا مالک ہے نہ مال کا اور نہ سونے جاگنے کا۔ حتیٰ کہ نہ کسی نقل و حرکت کا اس کی ہر ہر حرکت و سکون اور اس کا ایک ایک نطق و سکوت سب ان ہدایات کے ماتحت ہے جو اسلام نے اس کو دی ہیں۔ جب وہ شریعت کے امر و نہی کے سامنے اس طرح گردش کرنے کا عادی ہو جاتا ہے تو اب اس پر یہ راز آشکار ہونے لگتا ہے کہ یہ اس پر کوئی جبر نہ تھا۔ بلکہ بندگی کی حقیقت یہی

[1] افادات شیخ الاسلام

تھی۔ جس طرح ایک غلام اپنے نفع ونقصان کی کوئی طاقت نہیں رکھتا اس کے تمام معاملات سب اس کے آقا کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اسی طرح بندۂ مومن کا حال یہ ہوجانا چاہیئے اگر اس کو اس منزل تک رسائی نہیں ہے تو کم از کم اسے زبانی طور پر لاالٰہ الا ہو پڑھ کر اس زمرے کے ساتھ ایک ظاہری مشابہت سے تو محروم نہ رہنا چاہیئے۔ زمین وآسمان کے خزانے سارے اللہ کی ملک ہیں لیکن زمین کے خزانے میں برائے گفتن کچھ تمہارا بھی حصہ لگا دیا گیا ہے۔ لیکن وہ سرکاری خزانہ جس کی مخلوق کو ہوا تک نہیں لگی ہے وہ خالق کے عرش کے نیچے ہے۔ جہاں جنت ہے اسی میں کا ایک در مکنوں یہ کلمہ ہے جب فردا قیامت میں روشن ہوجائے گا تو اس کی قیمت خالق کے سوا کوئی نہیں لگا سکتا ہے۔

دینِ محمدی کی زمین ملتِ ابراہیمی ہے:

۱۳۱۔ فی الحقیقت ابراہیم سے نزدیک تر وہ لوگ ہیں جو ابراہیم کے پیروکار تھے اور یہ پیغمبر ہیں اور اہل ایمان ہیں اور اللہ اہل ایمان کا مددگار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بتلا دیا کہ زیادہ مناسبت ابراہیم سے اس وقت کی امت کو تھی یا پچھلی امتوں میں اس نبی کی امت کو ہے۔ تو یہ امت نام میں بھی اور راہ میں بھی ابراہیم سے مناسبت زیادہ رکھتی ہے اور اس امت کا پیغمبر خلقاً وخلقاً صورتاً وسیرتاً حضرت ابراہیم سے اشبہ ہے اور ان کی دعا کے موافق آیا ہے جیسا کہ سورہ بقرہ میں گزرا ربنا وابعث فیھم رسولا منھم اسی لیے حبشہ کا نصرانی بادشاہ نجاشی مسلمان مہاجرین کو حزبِ ابراہیم کہتا تھا۔ شاید اسی قسم کی مناسبات کی وجہ سے درود شریف میں صلیت علی ابراھیم فرمایا یعنی اس نوعیت اور نمونہ کی صلوٰۃ نازل فرما جو ابراہیم اور آل ابراہیم پر کی تھی۔ جامع ترمذی میں حدیث ہے ان لکل نبی ولاۃ من النبیین وان ولی ابی وخلیل ربی اس مضمون کی تفصیل آئندہ کسی سورت میں انشاء اللہ آئے گی[1]۔

یہاں دو اہم باتوں کی طرف اشارہ ضروری ہے۔

اولاً، یہ کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا یہ دعویٰ کہ حضرت ابراہیم یہودی یا نصرانی تھے۔ اس کا مطلب اگر یہ ہے کہ حضرت ابراہیم تورات وانجیل پر عمل پیرا تھے تو اس کی لغویت تو قطعاً بے غبار

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔

ہے۔ کیونکہ یہ صریح بے عقلی اور حماقت ہے۔ توراۃ حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی جو حضرت ابراہیم سے ایک ہزار سال بعد ہوئے اور انجیل حضرت عیسیٰ پر نازل ہوئی جو حضرت ابراہیم سے دو ہزار سال بعد ہوئے اس لیے حضرت ابراہیم کو دین یہود اور دین مسیح کا پیروکار بتانا تاریخ کا منہ چڑانا ہے اور اگر حضرت ابراہیم کو یہودی یا نصرانی بتانے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے زمانے میں نیکوکاروں اور دینداروں کو یہودی یا نصرانی کہا جاتا تھا تو یہ بات بھی تاریخی حقائق کے خلاف ہے کیونکہ حضرت ابراہیم نے اپنے آپ کو حنیف مسلم کہا ہے۔ ان دونوں لفظوں کے لغوی معنے پڑھ چکے ہو ان پر غور کرو اور خود انصاف سے بتاؤ کہ یہ صفت کس میں موجود ہے؟ اور اگر حضرت ابراہیم کے یہودی یا نصرانی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ سب دینوں میں یہود و نصاریٰ کے دین کو حضرت ابراہیم کے دین سے زیادہ مناسبت ہے تو یہ بات بھی غلط ہے۔ حضرت ابراہیم سے سب سے زیادہ مناسبت ان لوگوں کو ہے جو ان کے اس وقت پیروکار تھے اور آج کل سب سے زیادہ مناسبت حضرت ابراہیم سے امتہ محمدیہ کو ہے کہ جس کا پیغمبر خلقاً وصورۃً وسیرۃً حضرت ابراہیم کے مشابہ ہے مسند احمد میں ہے۔

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں نے عیسیٰ ابن مریم اور موسیٰ علیہ السلام کو دیکھا ہے۔ حضرت عیسیٰ سرخ رنگ والے گھونگر بال والے اور چوڑے سینہ کے تھے اور موسیٰ علیہ السلام گندم گون اور لانبے چوڑے جسم کے تھے۔ رہ گئے حضرت ابراہیم تو وہ مجھ کو دیکھ لو۔

ثانیاً حضرت ابراہیم حنیف تھے اور ان کا مذہب حنیف تھا۔ مسند احمد اور طبرانی کے معجم کبیر میں ہے کہ۔

عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب دینوں میں اللہ کے نزدیک کون سا دین پیارا ہے۔ فرمایا ابراہیم علیہ السلام کا لایا ہوا دین حنیف جو نہایت سہل اور آسان تھا۔ یعنی الحنیفۃ السمحۃ

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ الحنیفہ وہ دین ہے جو ملت ابراہیمی کی طرح شعائراللہ کے استحکام اور شعائر شرک کے استیصال اور رسوم فاسدہ وعقائد باطلہ کے ابطال پر مبنی ہو اور "السمحہ" وہ ہے جس کی تعلیم میں رہبانیت اور ناقابل برداشت مجاہدات نہ ہوں۔ اور اس میں ایسی رخصتیں بھی موجود ہوں کہ اس دین کی علتیں اور حکمتیں ایسی واضح اور صاف ہوں کہ ہر ذی فہم

کی سمجھ میں آسکیں۔[1]

حنیف دراصل وہ ہے جو ہر باطل سے بیزار ہو کر ایک مولیٰ حقیقی کی طرف مڑ چکا ہو۔ حضرت خلیل کی زندگی طفولیت سے لے کر آخر تک اس خصوصیت کا مرقعہ تھی اسی لیے تمام انبیاء میں آپ ہی کی ذات گرامی اس لقب سے مشہور ہوئی۔ ورنہ اللہ کے سارے ہی پیغمبر حنفا تھے اب اصطلاح میں صرف ملت ابراہیم ملت حنیفیہ کہلاتی ہے۔ دین محمدی چونکہ تمام ادیان کی خوبیوں کا مجموعہ ہے۔ اور ملت ابراہیم کی بڑی خصوصیت یعنی خدا پرستی اور جان سپاری اور فرمان برداری تو اس کا امتیازی نشان ہے۔ اس لیے اور ملتوں کی نسبت ملتِ محمدیہ اور دوسرے انبیاء کے مقابلہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیادہ قریب ہیں۔ حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے اپنی تفسیر میں چالیس احکام شمار کیے ہیں جو ملت ابراہیمی اور ملت محمدیہ میں مشترک ہیں۔ گویا دین محمدی کی زمین ملت ابراہیمی ہے اس لیے اس لقب کی سب سے زیادہ یہی ملت ہے۔

انگریز مورخین بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ قدیم اسرائیلی مذہب کا اگر کوئی جانشین ہے تو وہ مسیحیت نہیں، جس کے اندر یونان اور روم کے جاہلی مشرکانہ عقائد جمع ہو گئے ہیں بلکہ اسلام ہے ملاحظہ ہو، مورخین کی تاریخ عالم"۔[2]

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ حضرت ابراہیم سے نسبت صرف خاندان اور نسبت سے حاصل ہونے والی چیز نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق سرتاسر اتباع اور اطاعت سے ہے اس لحاظ سے حضرت ابراہیم سے سب سے زیادہ اولیٰ واقرب یہ پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان پر ایمان لانے والے صحابہ ہیں۔ نہ کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین جنہوں نے دین ابراہیمی کو بالکل مسخ کر دیا ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اللہ اہل ایمان کا ساتھی اور مددگار ہے وہ ایمان والوں کی مدد فرمائے گا اور ان کے مخالفوں پر ان کو غالب فرمائے گا کیونکہ یہی اس دین حق پر ہیں جو حضرت ابراہیم لے کر آئے تھے۔[3]

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ

[2] ماجدی

[3] تدبر قرآن۔

وَدَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ لَوْ يُضِلُّوْنَكُمْ ؕ وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُوْنَ ۞ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَاَنْتُمْ تَشْهَدُوْنَ ۞ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَلْبِسُوْنَ الْحَقَّ بِالْبَاطِلِ وَتَكْتُمُوْنَ الْحَقَّ وَاَنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۞

ع ۱۵

کچھ اہل کتاب یہ بات دل سے پسند کرتے ہیں کہ تم کو گمراہ کردیں۔ حالانکہ وہ تمہیں گمراہ کرنے کی سازشیں کر کے تمہیں نہیں بلکہ خود اپنے ہی کو گمراہی میں ڈالے ہوئے ہیں اور ان کو اس کا شعور نہیں ہے[۱۳۲] اے اہلِ کتاب تم آیات ربانی کا انکار کیوں کرتے ہو حالانکہ تم خود اس کے قائل ہو۔ اے اہل کتاب تم حق میں باطل کی ملاوٹ کیوں کرتے ہو اور حق کو کیوں جان بوجھ کر چھپاتے ہو۔

یہودیوں کی شقاوت کا مظاہرہ

عام یہودیوں کی طرح مدینہ منورہ کے یہودی بھی خاصے مالدار تھے یہودیوں کی بستیاں شمالی جانب دور دور تک تمام تجارتی شاہراہوں پر موجود تھیں ۔ ان میں باہم تجارتی روابط قائم تھے ۔ اور ہر مقام کے یہودی ان روابط سے کم و بیش مالی فائدے اٹھاتے تھے بلکہ کہا جا سکتا ہے کہ اس زمانے کے عرب وشام میں بین الملی اور بین الملکی تجارت پر عملاً یہودیوں ہی کا قبضہ تھا۔ ساتھ ہی وہ تمام اخلاقی بیماریاں بھی ان کے درمیان عام تھیں جو ہمیشہ انسانی گروہوں کے لیے طاعون اور ہیضے کی وباؤں کی طرح مہلک رہی ہیں ۔ مثلاً سود کھانا، جھوٹ بولنا، سازشیں کرنا۔ احکام الٰہی میں ذاتی مفاد کے لیے ردو بدل کر دینا، حسد و بغض وغیرہ ۔ ہجرت تک مدینے کے عرب یعنی اوس و خزرج یہودیوں سے دبے ہوئے تھے ۔ کیونکہ وہ یہودیوں کے مقروض رہتے تھے اور قرض کے سلسلے میں عورتوں اور بچوں کو رہن تک رکھ دیتے تھے ۔

یہودی فطرت ہی یہ ہے کہ وہ جھوٹ ، خیانت ، غداری اور عہد شکنی سے کبھی باز نہیں رہ سکتے تھے ۔ انہوں نے شرارتوں ، ایذا رسانیوں اور سازشوں کا ایک منظم سلسلہ شروع کر دیا تھا۔

قرآن نے ان آیات میں یہودیوں کی زندگی کی ان ہی شقاوتوں کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان لوگوں کو تلاش حق مقصود نہیں بلکہ ان کے پیش نظر صرف شرارت اور فتنہ پردازی ہے ۔ ان آیات میں بالترتیب ان کی چار اخلاقی کمزوریوں اور جماعتی رذائل کو بیان کیا ہے۔

اول، اہل ایمان کو گمراہ کرنے کی سازشیں کرنا ۔

دوم ، جان بوجھ کر آیات الٰہی کا انکار کرنا ۔

سوم ۔ حق میں باطل کی آمیزش کرنا اور حق کو مشتبہ بنانے کی سعی کرنا ۔

چہارم، صداقت اور راستی کو جان بوجھ کر چھپانا۔

اہل ایمان کو گمراہ کرنے کی سازش :

۱۳۲ - کچھ اہل کتاب یہ بات دل سے پسند کرتے ہیں کہ تم کو گمراہ کر دیں حالانکہ وہ تمہیں گمراہ کرنے کی سازشیں کر کے تمہیں نہیں بلکہ خود اپنے ہی کو گمراہی میں ڈالے ہوئے ہیں اور ان کو اس کا شعور نہیں ہے ۔ پہلے کہا تھا ۔ واللہ ولی المومنین یہاں بتلایا کہ جب مومنین کا ولی اللہ تعالیٰ ہے تو یہودیوں کا داؤ اہل ایمان پر کیا چل سکتا ہے ۔ بلاشبہ کچھ اہل کتاب اس کوشش میں ہیں کہ جیسے خود تم کردہ راہ ہیں ۔ مسلمانوں کو بھی راہ حق سے ہٹا دیں لیکن مسلمان ان کے جال میں پھنسنے والے

نہیں ہیں البتہ یہ لوگ اپنی گمراہی کے وبال میں مزید اضافہ کر رہے ہیں۔ ان کی مغویانہ کوششوں کا ضرر خود ان ہی کو پہنچے گا جسے وہ فی الحال نہیں سمجھتے۔[1]

یہود دن رات مسلمانوں کو اسلام سے برگشتہ کرنے کی فکر میں لگے رہتے تھے اور تورات کی ان آیات کی طرف نظر اٹھا کر نہ دیکھتے تھے جو حضور انور کے نبی برحق ہونے کو ظاہر کرتی ہیں اور ایسے ہی وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے معجزات کی طرف بھی نگاہ نہ کرتے تھے جو آپ کی نبوت کے دلائل و شواہد ہیں۔ لہٰذا یہود کی یہ کوشش دوسروں کو بے راہ کرنے کی نہیں بلکہ خود اپنے کو گمراہ کرنے کی ہے لیکن ان کا احساس بھی نہیں کہ ہم کیا کر رہے ہیں اور اس کا کیا انجام ہے۔[2]

مطلب یہ ہے کہ یہ اہل کتاب مسلمانوں کو دین حق سے برگشتہ کرنے میں کوشش کر رہے ہیں حالانکہ اس کوشش سے وہ صرف اپنی ہی محرومی کا سامان کر رہے ہیں۔ قاعدہ کی بات ہے کہ جو شخص اپنی گمراہی کو ہدایت ثابت کرنے کے لیے دیدہ و دانستہ دوسرے کو راہ حق سے ہٹانے کی کوشش کرتا ہے۔ وہ سب سے پہلے خود اپنے ہی کو گمراہی میں مبتلا کرتا ہے لیکن دوسرے کی مخالفت کے جوش میں اس کو اپنی اس حرکت کے اصلی نتیجہ کا احساس تک نہیں ہوتا۔[3]

گویا اہل ایمان کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ اہل کتاب کی تمام سرگرمیاں اس غرض سے ہیں۔ کہ تمہیں ایمان سے ہٹا کر پھر کفر اور ہدایت سے ہٹا کر ضلالت کی حالت میں پلٹا دیں۔ یہ نہ سمجھو کہ ان کی اس تگ و دو کا پس منظر تمہاری خیر خواہی ہے یا تمہارے دین کو برحق سمجھتے ہیں بلکہ یہ محض اس لیے ہے کہ تم کو گمراہ کرنا اور دین حق سے برگشتہ کرنا چاہتے ہیں۔ گویا یہ صرف گمراہ نہیں ہیں بلکہ گمراہی کے داعی اور لیڈر بھی ہیں۔ علامہ آلوسی کا یہ استنباط بالکل برمحل ہے کہ یہ آیت ان کے گمراہ ہونے کو بیان کرنے کے بعد ان کی ضلالت میں قیادت اور راہنمائی کو بتا رہی ہے۔

آیت میں وما یضلون الا انفسھم بڑا ہی معنی خیز اور بلیغ فقرہ ہے۔ ترجمہ تو یہ ہے کہ حالانکہ نہیں گمراہ کرتے مگر اپنے آپ کو مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنی کوششوں میں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اور اہل ایمان میں سے کوئی بھی ان کی بات نہ مانے گا اور اس کے نتیجے میں وہ خود ہی گمراہی کا شکار ہوں گے لیکن آدمی پر جب اپنی گمراہی کو ہدایت ثابت کرنے کے لیے دیدہ و دانستہ دوسرے کو راہِ حق سے ہٹانے کا جنون سوار ہوتا ہے۔ وہ سب سے پہلے خود ہی گمراہ ہوتا ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف قرآن م ا [3] تدبر قرآن

ہوتا۔
اور مخالفت کے جوش میں اس کو اپنی حرکت کے نتیجہ کا احساس تک نہیں ہوتا۔
یہ آیت اس امر کی گویا پیش گوئی ہے کہ اہل کتاب مسلمانوں کو گمراہ کرنے کی کوشش کریں گے
آج بھی کتنے مسیحیوں کے دلوں میں یہ جیتی جاگتی تمنا موجود ہے کہ مسلمان مسیحیت قبول کریں یا نہ
کریں بہرحال اپنے اسلامی عقائد سے تو ضرور ڈگمگا جائیں۔ ہم اس موضوع پر ایک اجمالی تبصرہ پہلے
پارے میں زیر آیت ۱۰۹ کر چکے ہیں باقی تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ پارہ چہارم میں زیر آیت میں امت میں
نمایاں ہے اور ماضی میں رہا ہے۔ حال ہی میں عراق کی مشہور علمی شخصیت علامہ محمد محمود الصواف
نے مدینہ منورہ کے جامعہ اسلامیہ میں اس موضوع پر دو لیکچر دیے ہیں اور مکہ مکرمہ کے دار الثقافہ
کی مساعی کے نتیجے میں وہ زیور طباعت سے آراستہ ہو چکے ہیں۔ ان میں بڑی علمی تاریخی بحث
ہے۔

بعثت کی بشارات اور ان کا انکار

۱۳۲ ۔ اے اہل کتاب تم اللہ کی آیات کا کیوں انکار کرتے ہو حالانکہ تم خود اس کے قائل
ہو۔ یعنی تم تورات وغیرہ کے قائل ہو۔ جس میں پیغمبر عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کے متعلق بشارات
موجود ہیں جن کو تمہارے دل سمجھتے ہیں اور اپنی خلوتوں میں اس کا اقرار کرتے ہو۔ پھر کھلم کھلا قرآن
پر ایمان لاتے اور خاتم الانبیاء کی صداقت کا اقرار کرنے سے کیا چیز مانع ہے خوب سمجھ لو قرآن
کا انکار کرنا، تمام پچھلی کتب سماویہ کا انکار ہے[1]
مطلب یہ ہے کہ اللہ کی ان آیتوں سے جو خود تمہاری کتابوں کے اندر موجود ہیں اور جن میں
نبوت محمدی کی پوری پوری علامتیں اور بشارتیں موجود ہیں کیونکہ انکار کرتے ہو[2]
قرآن کی حقیقت اور حضور انور کی صداقت پر تورات و انجیل میں جو دلائل موجود ہے۔ اور اہل
کتاب ان سے واقف ہیں۔ قرآن اہل کتاب کو ان دلائل کے نہ ماننے پر بھی ملامت کر رہا ہے
عرب و روم اور یہود و نصاریٰ سب کو تورات و انجیل کی بشارتوں کے مطابق ایک آنے والے
پیغمبر کا انتظار تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوسفیان کی زبانی واقعہ پڑھ چکے ہو کہ جب قاصد نبوی
دعوت اسلام لے کر قیصر کے دربار میں پہنچا ہے اور قیصر نے ابوسفیان کو بلا کر حضور انور کے بارے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ماجدی

کچھ سوالات کیے اور ابوسفیان نے ان کے جو جوابات دیے ہیں ان کو سن کر اس نے بھرے دربار میں کہا کہ تم نے جو کچھ بیان کیا اگر وہ سچ ہے تو ایک دن میرے پاؤں کے نیچے کی مٹی اس کے قبضے میں ہوگی۔ مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں ہوگا اگر ممکن ہوتا تو میں خود جا کر اس کی زیارت کرتا اور اگر وہاں ہوتا تو اس کے پاؤں دھوتا۔[1]

قیصر کے محرم راز اور شام کے بشپ ابن ناطور کا بیان سیرۃ کی کتابوں میں آیا ہے کہ قیصر کا خیال تھا کہ ختنہ والے رسول کی پیدائش کا زمانہ قریب ہے اور روبیہ کے ایک مسیحی عارف نے بھی خط لکھ کر قیصر کے خیال کی تائید کی تھی۔ مقوقس شاہ مصر کے دربار میں جو قاصد نبوی خط لے کر گیا تھا۔ وہ بھی یہ جواب لایا کہ ہاں ہم کو بھی یقین تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن خیال تھا کہ وہ شام میں پیدا ہوگا۔ حبش کے عیسائی بادشاہ نے لکھا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ سچے پیغمبر ہیں۔ یاد ہوگا۔ کہ یمن کے شہر نجران سے عیسائیوں کا ایک وفد حاضر خدمت ہوا تھا اور فیصلہ کے لیے یہ قرار پایا تھا کہ دونوں فریق مباہلہ کریں لیکن وفد کے سمجھدار عیسائیوں نے وفد کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ مباہلہ سے منع کیا اور کہا خدا کی قسم اگر یہ سچے پیغمبر ہیں تو ہم ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائیں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کو بھی پیغمبر کی آمد کا انتظار تھا۔ ورقہ ابن نوفل کا واقعہ آپ آئندہ پڑھیں گے کہ وہ زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے۔ بعثت کے پہلے ہی روز جب حضرت خدیجہ آپ کو ورقہ کے پاس لے گئی ہیں۔ تو ورقہ نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور آرزو ظاہر کی کہ کاش میں آپ کی ہجرت تک رہتا تو آپ کی مدد کرتا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کو آنے والے پیغمبر کا اس وقت انتظار تھا۔

ابن سعد، ابن اسحاق، مسند احمد، تاریخ بخاری، مستدرک حاکم، دلائل بیہقی، معجم طبرانی دلائل ابونعیم میں متعدد روایتیں ایسی ہیں جن سے مجموعی طور پر یہ ثابت ہوتا ہے کہ آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور سے پہلے مدینہ کے یہودیوں میں ایک آنے والے پیغمبر کے ظہور کے چرچے رہا کرتے تھے اور انہی سے سن سن کر اوس وخزرج کے مکانوں میں پیغمبر کی بعثت کی خبر بڑی پھیلی ہوئی تھی۔ اور اکثروں کے لیے یہ خبر ہدایت کا باعث بنی۔

قرآن عزیز نے اس آیت کے علاوہ اور بھی متعدد آیات میں یہودیوں کو ان کے اس سابق یقین

---

[1] صحیح بخاری

دعلم کے خلاف ان کے موجودہ اظہار کفر پر ان کو ملامت کی ہے۔
یہ انہی بشارتوں اور پیش گوئیوں کا اثر تھا کہ علماء یہود آنے والے نبی کے متعلق تورات کی بیان کردہ مختلف علامتوں اور نشانیوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر حاضر خدمت ہوتے تھے۔ اور سوالات کرتے تھے اور آپ کا امتحان لیتے تھے۔

اس آیت کا خاتمہ وانتم تشھدون پر کیا گیا۔ یعنی تم تورات وغیرہ کے قائل ہو۔ اس کے باوجود تورات میں آمدہ بشارات کا انکار کرتے ہو۔ گویا یہ انکار نا واقفیت اور لاعلمی کی بنا پر نہیں جان بوجھ کر ان آیتوں میں تحریف کر رہے ہو۔ یہ مطلب اس وقت ہے جب کہ آیت میں آیات اللّٰہ سے تورات وانجیل کی وہ آیات مراد ہوں جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا ذکر ہے یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے متعلق جو بشارتیں تورات وانجیل میں مذکور ہیں تم خود اپنی خلوتوں میں ان کا اقرار کرتے ہو پھر انکار کیوں کرتے ہو؟ امام رازی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ اس آیت کے مخاطب وہ علماء ہیں جو تورات میں آمدہ حضور انور کی نبوت کے دلائل سے واقف تھے۔

اور اگر آیات اللہ سے مراد قرآن کی آیات ہوں پھر معنے یہ ہوں گے حالانکہ اللہ کی آیات کا تم مشاہدہ کر رہے ہو یا بقول مولانا آزاد اس کی نشانیاں تمہارے سامنے ہیں۔ ترجمہ خواہ کوئی ہو۔ دونوں صورتوں میں نفس معنے پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی، اور صحابہ کرام کی زندگیوں پر آپ کی تعلیم وتربیت کے حیرت انگیز اثرات اور وہ بلند پایہ مضامین جو قرآن میں ارشاد ہو رہے تھے یہ ساری چیزیں اللہ تعالے کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو شخص انبیاء کے احوال اور کتب آسمانی کے طرز سے واقف ہو اس کے لیے ان آیات کو دیکھ کر آنحضرت کی نبوت میں شک کرنا بہت ہی مشکل ہے۔ چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ بہت سے اہل کتاب خصوصاً ان کے اہل علم یہ جان چکے تھے کہ حضور انور وہی نبی ہیں جن کی آمد کا وعدہ انبیاء سابقین نے کیا تھا۔ حتیٰ کہ کبھی کبھی حق کی زبردست طاقت سے مجبور ہو کر ان کی زبانیں آپ کی صداقت اور آپ کی پیش کردہ تعلیم کے برحق ہونے کا اعتراف تک کر گزرتی تھیں۔ اسی وجہ سے قرآن بار بار ان کو الزام دیتا ہے کہ اللہ تعالے کی جن آیات کو تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو جن کی حقانیت پر تم خود گواہی دیتے ہو۔ ان کو تم قصداً اپنے نفس کی شرارت سے جھٹلا رہے ہو۔ (حاشیہ بر نسخہ آئندہ)

عوامی گمراہی کے دو حربے :

۱۳۴ اے اہل کتاب تم حق میں باطل کی ملاوٹ کیوں کرتے ہو اور حق کو جان بوجھ کر کیوں چھپاتے ہو۔ تورات کے بعض احکام اغراض دنیوی کی خاطر سرے سے موقوف ہی کر ڈالے تھے بعض آیات میں تحریف لفظی کی تھی کچھ کے معنے بدل دیے تھے اور بعض چیزیں چھپا رکھی تھیں۔ ہر شخص کو خبر نہ کرتے تھے جیسے نبی آخر الزمان کی بشارات ؎

اس آیت میں دو باتوں پر ملامت کی ہے ایک یہ کہ حق میں باطل کی ملاوٹ کیوں کرتے ہو۔ دوسرے یہ کہ جان بوجھ کر حق کو کیوں چھپاتے ہو۔ علماء یہود عوام کو گمراہ کرنے کے لیے یہ دونوں حربے استعمال کرتے تھے۔ جن لوگوں کو تورات میں بیان شدہ بشارتوں کا کچھ علم ہوتا ان کے دلوں میں شبہات پیدا کر کے ان کو یقین دلاتے کہ ان صفات و علامات کا مصداق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی نہیں ہے۔ اس کا نام حق میں باطل کی ملاوٹ ہے اور جو لوگ بے خبر ہوتے ان سے وہ اصل بات ہی کو چھپا لیتے تاکہ وہ اندھیرے میں رہیں یہ کتمان حق ہے اور کا مطلب یہ ہے کہ تم خوب جانتے ہو کہ حق میں باطل کی ملاوٹ اور حق کو چھپانا اور اس طرح لوگوں کو گمراہ کرنا کتنا بڑا سنگین جرم ہے۔

اس آیت کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رکھیے کہ عام عرب کے شہری تعلیم و تدریس سے بالکل بے بہرہ تھے اور ان کے مقابلے میں یہودی پڑھے لکھے تھے بلکہ ان میں ایسے جلیل القدر عالم تھے جن کی شہرت عرب کے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ مسند احمد میں ابو ہریرہ کی روایت میں علماء یہود کا خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر دس علماء یہود اسلام لے آتے تو روئے زمین کے سارے یہودی مسلمان ہو جاتے۔ اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں میں عربوں کے مقابلہ میں تعلیم کا چرچا تھا۔ قرآن نے خود اہل عرب کو امیین کہا ہے جب کہ یہودیوں میں علم کا اقرار کیا ہے اور ان کو علماء بنی اسرائیل کہہ کر پکارا ہے اس وجہ سے عربوں پر یہودیوں کا علمی رعب بہت زیادہ تھا۔ پھر ان کے علماء و مشائخ نے اپنی مذہبی دربار وں کی ظاہری شان و شوکت جما کر اس رعب کو اور

ؔ (بقیہ حاشیہ) تفہیم القرآن
؎ افادات شیخ الاسلام

بھی زیادہ گہرا اور وسیع کر رکھا تھا۔ مدینہ میں ان کے تین قبیلے آباد تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور اور بنو قریظہ۔ ان میں سے بنو قینقاع کے کھیت و باغات نہ تھے۔ یا تو وہ تجارت کرتے تھے یا زرگری، ان کی آبادی بھی بنو نضیر اور بنو قریظہ کی طرح الگ نہ تھی۔ عربوں ہی کی آبادیوں میں رہتے تھے ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ یہ لوگ مدینے میں اسلامی آبادی کے اندر ہی رہتے تھے۔ باقی دونوں قبیلے باغات اور کھیتوں کے مالک تھے۔ بنو نضیر کی بستی جنوبی سرے پر تھی اور وادی مذینب کے دونوں کنارے اس آبادی سے مزین تھے اور اس بستی کے پاس ہی جنوبی جانب ایک ٹیلے پر کعب بن اشرف کا قلعہ تھا۔ بنو قریظہ کی بستی بنو نضیر کے شمال میں عوالی سے مشرقی جانب وادی مہزور کے جنوبی کنارے پر واقع تھی۔ عام یہودیوں کی طرح مدینہ کے یہودی بھی خاصے مالدار تھے۔ خصوصیت کے ساتھ اہل مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے کیونکہ اولاً وہ یہودیوں کے مقروض رہتے ثانیاً یہودی اہل کتاب تھے۔ اور سب کے مقابلے میں اصحاب علم وہنر مانے جاتے تھے۔ جن عربوں کے بچے زندہ نہ رہتے تھے وہ منت مانتے کہ اب بچہ پیدا ہوگا تو اسے یہودی بنادیں گے جیسے ایک ان پڑھ آبادی زیادہ تعلیم یافتہ زیادہ متمدن اور زیادہ نمایاں مذہبی تشخص رکھنے والے ہمسایوں سے متاثر ہوا کرتی ہے۔ ایسے ہی عرب بھی ان سے متاثر تھے۔ ان حالات میں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دعویٰ نبوت کیا اور عوام کے سامنے اسلام کی دعوت پیش کی تو طبعی طور پر عرب کی ان پڑھ آبادی یہودیوں سے جا کر دریافت کرتی کہ ہمیں بتائیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔ چنانچہ یہ سوال مکہ کے لوگوں نے بھی یہودیوں سے بارہا کیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ تشریف لائے تو یہاں بھی بکثرت لوگ یہودی علماء سے جا جا کر دریافت کرتے مگر ان لوگوں نے کبھی لوگوں کو صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا تو مشکل تھا کہ انبیاء بنی اسرائیل کی بشارتوں کے مطابق وہ کسی آنے والے نبی کے منتظر نہیں ہیں۔ صاف صاف اس بات کا اعتراف بھی کرنے کے لیے تیار نہ ہوتے کہ آپ اللہ کے رسول ہیں وہ نہ بشارتوں کی کھل کر تردید کرتے نہ سیدھی طرح آپ کو رسول مان لینے پر آمادہ ہوتے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انہوں نے یہ طریقہ اختیار کیا کہ بشارت سے متعلق آیات میں تاویل و تحریف سے کام لیتے اور اپنی تاویلات باطلہ اور تحریفات کو آیات بشارت کے ساتھ ملا کر اس انداز میں پیش کرتے کہ پوچھنے والوں پر حق مشتبہ ہو کر رہ جاتا۔ اور آیاتِ بشارات کے متعلق کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے۔ جس سے لوگ شکوک و شبہات کے شکار ہو جائیں اور طرح طرح کے الجھن میں ڈالنے والے سوالات چھیڑ دیتے۔ ان

ان کا یہی رویہ تھا جس کی بنا پر ان سے فرمایا جا رہا ہے۔ کہ حق پر باطل کے پردے کیوں ڈالتے ہو اور اپنے جھوٹے پروپیگنڈے اور شریرانہ شبہات و اعتراضات سے حق کو دبانے اور چھپانے کی کوشش کیوں کرتے ہو اور حق و باطل کو غلط ملط کر کے دنیا کو دھوکا نہ دو۔

وَقَالَتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اٰمِنُوْا بِالَّذِیْٓ اُنْزِلَ عَلَى
الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَجْهَ النَّهَارِ وَاكْفُرُوْٓا اٰخِرَهٗ لَعَلَّهُمْ یَرْجِعُوْنَ ﴿۷۲﴾
وَلَا تُؤْمِنُوْٓا اِلَّا لِمَنْ تَبِعَ دِیْنَكُمْ ؕ قُلْ اِنَّ الْهُدٰى هُدَى اللّٰهِ ۙ
اَنْ یُّؤْتٰٓى اَحَدٌ مِّثْلَ مَآ اُوْتِیْتُمْ اَوْ یُحَآجُّوْكُمْ عِنْدَ رَبِّكُمْ ؕ
قُلْ اِنَّ الْفَضْلَ بِیَدِ اللّٰهِ ۚ یُؤْتِیْهِ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِیْمٌ ﴿ۚۙ۷۳﴾
یَّخْتَصُّ بِرَحْمَتِهٖ مَنْ یَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِیْمِ ﴿۷۴﴾

اور دیکھو! اہل کتاب کا ایک گروہ لوگوں سے کہتا ہے کہ ایسا کرو کہ صبح کو اس کتاب پر ایمان لے آؤ جو اہل ایمان پر نازل ہوئی ہے اور پھر شام کو انکار کر دو، اس طرح عجب نہیں کہ وہ یعنی مسلمان (تمہیں پھرتے دیکھ کر) اسلام سے پھر جائیں۔[۱۳۵] اور وہ باہم یہ بھی کہتے ہیں دیکھو ان لوگوں کے سوا جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور کسی کی بات نہ مانو، اے پیغمبر کہہ دو کہ ہدایت تو وہی ہے جو اللہ کی ہدایت ہے۔[۱۳۶] اور وہ کہتے ہیں کہ یہ بات بھی نہ مانو کہ کسی کو وہ دین دیا جا سکتا ہے جیسا تمہیں دین دیا گیا ہے اور

یہ بات بھی نہ مانو کہ پروردگار کے حضور تمہارے خلاف کسی کی حجت چل سکتی ہے[۱۳۷] اے پیغمبر تم ان سے کہہ دو کہ فضل اللہ کے قبضہ و اختیار میں ہے وہ جسے چاہتا ہے اپنے فضل و کرم سے عطا کر دیتا ہے۔ وہ بڑی ہی وسعت والا اور بڑے ہی علم والا ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے نزول کے لیے چن لیتا ہے اور اللہ کی ذات بڑے ہی فضل والی ہے[۱۳۸]

اسلام کے خلاف یہودی علماء کی سازش

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ پہنچے تو آبادی کے تمام گروہوں کے درمیان صحیفہ کے نام سے ایک معاہدہ کرا دیا جس کا مقصد یہ تھا کہ شہر کے داخلی صلح و امن میں کوئی خلل اور رخنہ نہ آنے پائے۔ اور باہر سے کوئی خطرہ نمودار ہو تو تمام گروہ مل کر اور متحد ہو کر اس کا مقابلہ کریں۔ اس معاہدے میں یہودیوں کی حیثیت مساوی رکھی گئی۔ اور ان کے تمام شہری و مذہبی حقوق کی حفاظت کا انتظام کر دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ خیر سگالی کے بھرپور جذبے کے ساتھ ان کو متفقہ مسائل میں اتحاد کی دعوت دی اور برملا سب سے کہہ دیا کہ تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم لیکن اس کے باوجود ان کی پُرفریب طبیعت نے اس مخلصانہ دعوت پر لبیک نہیں کہی بلکہ اس کے برعکس انہوں نے سازشوں کا ایک منظم سلسلہ شروع کر دیا۔ مثلاً یہ کہ وہ اس کے لیے تیار رہتے تھے کہ اسلام قبول کر لیں اور کچھ عرصہ بعد مرتد ہو جائیں تاکہ اسلام کے وقار اور اعتماد پر ضرب لگے عوام سمجھیں کہ اگر یہ دین سچا ہوتا تو اسے قبول کرنے کے بعد چھوڑا کیوں جاتا۔ گویا اپنے حریف کے سامنے اپنے آپ کو اس کا دوست اور ساتھی ظاہر کر کے اندر سے اس کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی جائے اس مقصد کے لیے ان کے لیڈروں نے اپنے کچھ آدمیوں کو اس بات کے لیے تیار کیا کہ وہ

پہلے ایمان و اسلام کا اظہار و اعلان کر کے مسلمانوں میں شامل ہوں۔ پھر اسلام کی کچھ خرابیوں کا اظہار کر کے اس سے علیحدگی اختیار کر لیا کریں۔ اس کا فائدہ ایک تو انہوں نے یہ سوچا ہوگا کہ اس طرح بہت سے جدید العہد مسلمانوں کا اعتماد اسلام پر سے متزلزل ہو جائے وہ یہ سوچنے لگیں گے کہ فی الواقع اسلام میں کوئی خرابی ہے جس کی وجہ سے یہ پڑھے لکھے لوگ اسلام کے قریب آکر اس سے ہٹ گئے۔ دوسرا یہ کہ اس تدبیر سے وہ خود اپنی قوم کے عوام کو اسلام کے اثر سے بچا لیں گے۔

۱۳۵ اور دیکھو اہل کتاب کا ایک گروہ لوگوں سے کہتا ہے کہ ایسا کرو کہ صبح کو اس کتاب پر ایمان لے آؤ جو اہل ایمان پر نازل ہوئی ہے اور پھر شام کو انکار کر دو۔ اس طرح عجب نہیں کہ وہ یعنی مسلمان تمہیں پھرتے دیکھ کر اسلام سے پھر جائیں۔ اس آیت میں اللہ پاک نے اہل کتاب کی خیانتیں اور چالاکیاں ذکر کی ہیں۔ ان میں سے ایک یہ تھی کہ اپنے کچھ آدمی صبح کے وقت بظاہر مسلمان بن جائیں اور مسلمانوں کے ساتھ نماز پڑھیں اور شام کو یہ کہہ کر کہ ہم کو اپنے بڑے بڑے علماء سے تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ یہ وہ نبی نہیں جن کی بشارت دی گئی تھی اور تجربہ سے ان کے حالات بھی اہل حق کی طرح ثابت نہ ہوئے اسلام سے پھر جایا کریں۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ بہت سے ضعیف الایمان ہماری یہ حرکت دیکھ کر اسلام سے پھر جائیں گے۔ اور سمجھ لیں گے کہ مذہب اسلام میں ضرور کوئی عیب و نقص ہوگا جو یہ لوگ داخل ہونے کے بعد اس سے نکلے۔ نیز عرب کے جاہلوں میں اہل کتاب کے علم و فضل کا چرچا تھا اس بنا پر یہ خیال پیدا ہو جائے گا کہ یہ جدید مذہب اگر سچا ہوتا تو ایسے اہل علم اسے رد نہ کرتے بلکہ سب سے آگے بڑھ کر قبول کرتے۔ [1]

یہ ان چالوں میں سے ایک چال تھی جو اطراف مدینہ کے رہنے والے یہودیوں کے لیڈر اور مذہبی پیشوا اسلام کی دعوت کو کمزور کرنے کے لیے چلتے رہتے تھے۔ انہوں نے مسلمانوں کو بد دل کرنے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عامہ خلائق کو بدگمان کرنے کے لیے خفیہ طور پر آدمیوں کو تیار کر کے بھیجنا شروع کیا تاکہ پہلے علانیہ اسلام قبول کریں پھر مرتد ہو جائیں۔ پھر جگہ جگہ لوگوں میں یہ مشہور کرتے پھریں کہ ہم نے اسلام میں اور مسلمانوں میں اور ان کے پیغمبر میں یہ خرابیاں دیکھی ہیں تب ہی تو ہم ان سے الگ ہو گئے ہیں۔ [2]

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] تفہیم القرآن۔

تاریخ یہود میں منافقت کی یہی ایک مثال نہیں خود ان کی کتابوں میں یہ واقعہ بصراحت درج ہے کہ بارہویں صدی عیسوی میں جب اسپین میں اسلامی حکومت تھی تو حکومت کے فرضی مظالم یا واقعی کی بنا پر بہت سے یہود نے اپنے راہبوں کی اجازت اور فتویٰ کے مطابق اپنے قبول اسلام کا اظہار شروع کر دیا تھا۔ درآں حالیکہ دل میں سب کے سب منکر ہی تھے (دجیوز انسائیکلو پیڈیا جلد اول) اور آج یہ جو بڑے بڑے فرنگی محققین یہود و مسیحی مستشرقین نے فرنگی زبانوں میں سیرۂ نبوی لکھنے کا طریقہ اختیار یہ کیا ہے کہ اپنے علم و تحقیق، وسعت مشرب دبے تعصبی کی دھاک بٹھا کر تمہید بڑے زور کی اٹھائے ہیں اور معلوم یہی ہوتا ہے کہ پیغمبر عرب اور مصلح عالم کی لعنت اور مقنن اعظم اور مثیل موسیٰ کی منقبت میں دریا بہا دیں گے لیکن آگے چل کر نتیجہ یہ نکالتے ہیں کہ نعوذ باللہ انہیں کچھ خلل دماغی تھا۔ یا یہود و نصاریٰ کے مضامین کہیں سے سن سنا کر چرا لیتے تھے۔ یہ طرز عمل بھی اسی یہودیانہ تلبیس کا ایک جدید فرنگی نمونہ ہے۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ یہود نے جب بھی کسی ملت کو اپنا نشانہ بنایا ہے اس کے لیے تدبیر یہی اختیار کی ہے کہ اس کے اندر گھس کر اس کو مسخ کرنے کی کوشش کی ہے۔ دین مسیحی کو بگاڑنے کے لیے پالؔ نے جو کامیاب کوشش کی ہے وہ مذاہب کی تاریخ میں ایک نہایت دردناک داستان ہے۔ پھر مسلمانوں کے عقائد و نظریات کو مسخ کرنے کے لیے یہود و نصاریٰ نے جو فتنے خود ہمارے کتب خانوں میں بیٹھ کر ہمدردانہ بھیس میں اٹھائے ہیں وہ بھی کوئی مخفی چیز نہیں ہے۔[2]

یہودیوں کی پُرفریب چالاکی

۱۳۶ ۔ اور وہ باہم یہ بھی کہتے ہیں دیکھو ان لوگوں کے سوا جو تمہارے دین کی پیروی کرتے ہیں اور کسی کی بات نہ مانو۔ یعنی جو یہود مسلمانوں کے پاس جا کر نفاق سے اپنے کو مسلمان ظاہر کریں انہیں یہ برابر ملحوظ رہے کہ وہ سچ مچ مسلمان نہیں بن گئے بلکہ بدستور یہود ہیں اور سچے دل سے انہی کی بات مان سکتے ہیں جو ان کے دین پر چلتا ہو اور شریعت موسوی کی اتباع کا دعویٰ کرتا ہو۔ بعض نے اس فقرے کے معنے یہ بتائے ہیں کہ ظاہری طور پر جو ایمان لاؤ اور اپنے کو مسلمان بتاؤ وہ

---

[1] ماجدی - [2] تدبر قرآن

محض ان لوگوں کی وجہ سے جو تمہارے دین پر چلنے والے نہیں یعنی اس تدبیر سے اپنے ہم مذہبوں کی حفاظت مقصود ہونی چاہیئے کہ وہ مسلمان نہ بن جائیں یا جو بن چکے ہیں اس تدبیر سے واپس آجائیں ؎

یہ یہودیوں کی بات کا بقیہ ہے ایک طرف کچھ لوگوں کو اس کے لیے تیار کیا کہ وہ منافقانہ طور پر ایمان کا اظہار کریں اور پھر انکار کر دیں دوسری طرف یہ ہدایت بھی کر دی کہ صرف اس کی بات مانو جو تمہارے دین کا پیروکار ہو۔ ایمان کے ساتھ جب لام آتا ہے تو اس کے معنے بات ماننے کے آتے ہیں جیسے فآمن له لوط اور ما انت بمو من لنا چونکہ یہودیوں کے خیال میں نبوت پر ان کی اجارہ داری قائم تھی۔ اور اس معاملہ میں وہ اس قدر آگے نکل گئے تھے کہ اپنے سوا پوری انسانیت کو حقارت کی نگاہ سے دیکھتے تھے حتیٰ کہ نیکی اور بدی کا معیار یہ بنا لیا تھا۔ کہ جو کچھ وہ کر رہے ہیں وہ نیکی ہے اور جو کچھ دوسرے کرتے ہیں وہ گناہ ہے۔ اس لیے وہ جن لوگوں کو مذکورہ بالا سازش کے لیے مسلمانوں میں بھیجتے تھے ان کو یہ ہدایت کرتے تھے کہ مسلمانوں میں جا کر مسلمان ہوتے کو تو ظاہر کرو لیکن بات ان کی نہ مانو بلکہ اپنے ہی لوگوں کی مانو اپنے سے باہر بات کسی کی نہ مانو۔ اس صورت میں لام ایمان کا صلہ ہے اور اس کے معنے بات ماننے کے ہیں۔ امام رازی نے اس آیت کی تشریح فرماتے ہوئے لکھا ہے کہ مطلب آیت کا یہ ہے کہ تم صرف اس پیغمبر کی تصدیق کرنا جو تورات کی شریعت کو ہی اپنائے اور جو تورات کے احکام میں تغیر و تبدیل کرے اس کی تصدیق نہ کرنا۔ اس مطلب کی صورت میں امام رازی فرماتے ہیں کہ لام زائد ہے لیکن سلسلہ کلام میں یہودیوں کی جو سازش بیان کی جا رہی ہے اس کا تقاضا یہ نہیں کیونکہ یہ بالاتفاق مفسرین بقول مشہور مفسر قرآن علامہ عطیہ یہودیوں کا مقولہ ہے۔ در اصل اس آیت میں یہودیوں کی انتہائی ذہنی اور اخلاقی گراوٹ کو پیش کیا جا رہا ہے۔ اخلاقی گراوٹ تو یہ بتائی گئی نامسلمان ہونے کے باوجود مسلمانی کا لبادہ پہن کر آتے ہیں اور سازش کے ساتھ پھر نامسلمان ہونے کا اعلان کرتے ہیں۔ اس سے ان کا مقصد مسلمانوں کو اپنی جگہ سے ہلانا ہے۔ اور ذہنی گراوٹ یہ ہے کہ اس سازش میں کام کرنے والوں کو یہ تلقین کی جا رہی ہے کہ اپنے حلقہ سے باہر کسی بھی نیکی کو تسلیم نہیں کرنا۔ اس لیے وہ اپنے گروہ سے باہر سب کے لیے راستی، اور نیکی کا دروازہ بند کر رہے

؎ افادات شیخ الاسلام

ہیں۔ یہ ذہن چونکہ تمام گمراہیوں کے لیے اساس اور سارے فسادات کے لیے بس کی گانٹھ ہے۔
اس لیے قرآن نے سب سے پہلے اسی جرثومہ پر ضرب کاری لگائی کہ یہ کیا گندہ اور ناپاک ذہن
ہے جس میں یہ مبتلا ہیں چنانچہ ارشاد ہے۔ قل ان الھدی ھدی اللہ ھو الھدیٰ ان سے
کہہ دو کہ اصل ہدایت تو اللہ کی ہدایت ہے جس کی تمہیں پیروی کرنی چاہیئے خواہ یہ کہیں ہو نجات
کے حصول کا ذریعہ یہی ہے۔ تمہاری گروہ بندی پر مدار نجات نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ
ہدایت تو اللہ تعالٰی کے دینے سے ملتی ہے، جس کے دل میں اللہ نے نور ہدایت
ڈال دیا تمہاری ان پُرفریب چالاکیوں سے وہ گمراہ ہونے والا نہیں ہے۔

شرعیات پر کسی کی اجارہ داری نہیں:

۱۳۷۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ بات بھی نہ مانو کہ کسی کو دین دیا جا سکتا ہے جیسا کہ تمہیں
دیا گیا ہے اور یہ بھی نہ مانو کہ اللہ کے حضور تمہارے خلاف کسی کی حجت چل سکتی ہے۔
ان دو فقروں کی تشریح میں شارحینِ قرآن مختلف رائیں رکھتے ہیں۔ کچھ کے خیال میں
یہ اللہ کی بات ہے اور اس میں یہودی کردار کی وجہ بیان کی جارہی ہے۔ پوری بات اس
طرح ہے۔ اتکیدون ھذا الکید کراھۃ ان یوتی احد کیا تم یہ داؤ پیچ اور سازشیں اس
ناگواری اور کراہت کی بنا پر کر رہے ہو کہ تمہارے جیسا دین اور شریعت بنی اسماعیل کو کیوں ملا
ہے چنانچہ مولانا عثمانی فرماتے ہیں۔

یہ مکاریاں اور سازشیں محض ازراہِ حسد اس جلن میں کی جاتی ہیں کہ دوسروں کو اس طرح
کی شریعت اور نبوت و رسالت کیوں دی جارہی ہے جیسے پہلے تم کو دی گئی تھی یا مذہبی و دینی
جدوجہد میں دوسرے لوگ تم پر غالب آکر کیوں نکلے جارہے ہیں اور خدا کے آگے تمہیں
ملزم گردان رہے ہیں۔ یہود ہمیشہ اس خیال کی اشاعت کرتے رہے تھے کہ دنیا میں تنہا
ہماری ہی قوم شرعیات کی اجارہ دار ہے، تورات ہم پر اتری موسٰی جیسے اولوالعزم من الرسل
پیغمبر ہم میں آئے۔ پھر عرب کے امیوں کا اس فضل و کمال سے کیا واسطہ؟

تورات کی عظیم الشان پیش گوئی:

لیکن تورات سفر استثنا کی عظیم الشان پیش گوئی غلط نہیں ہو سکتی تھی جس میں بتایا گیا ہے کہ

بنی اسرائیل کے بھائیوں (بنی اسماعیل) میں سے ایک موسٰی جیسا صاحب شریعت مستقل نبی اُٹھائے گا اپنا کلام قرآن کریم اس کے منہ میں ڈالے گا۔ قرآن میں ہے۔

انا ارسلنا الیکم رسولا شاھدا کما ارسلنا الی فرعون رسولا۔

بلاشبہ ہم نے تمہاری طرف ایک عظیم الشان پیغمبر گواہی دینے والا ویسا ہی روانہ کیا جیسے فرعون کی طرف بھیجا تھا۔

چنانچہ بنی اسماعیل کو یہ دولت ملی اور وہ علم وفضل اور حجت وبُرہان اور جدوجہد کے میدان مقابلہ میں نہ صرف بنی اسرائیل بلکہ دنیا میں تمام قوموں پر سبقت لے گئے فالحمد للہ علٰی ذٰلک[1] اور کچھ کے خیال میں یہ اللہ پاک کی بات نہیں بلکہ یہودیوں کی بات ہے اور ان یوتی احد کو لا تومنوا الالمن تبع سے ملاتے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ یہودی علماء نے ان لوگوں کو جن کو سازش کے تحت روانہ کیا تھا یہ ہدایت کی تھی کہ کسی غیر یہودی کی اس بات کو بالکل نہ ماننا کہ نبوت ورسالت بنی اسرائیل کی طرح کسی اور کو بھی مل سکتی ہے یا اور کوئی بھی اللہ کی بارگاہ میں بنی اسرائیل کے خلاف حجت ودلیل پیش کرسکتا ہے۔ یعنی یہودیوں کا یہ اعتقاد ہے اور وہ یہ کہتے ہیں کہ وحی ونبوت کی جو ہدایت ان کو دی گئی ہے وہ صرف انہی کے لیے ہے ممکن نہیں کہ دوسرے انسان یا قوم کو یہ بات حاصل ہوسکے۔ چنانچہ اسی بنا پر وہ کہتے ہیں کہ اپنے مذہب کے علاوہ اور کسی آدمی کی سچائی اور بزرگی تسلیم نہ کرو اور نہ یہ بات مانو کہ تمہارے خلاف یعنی یہودیوں کے خلاف کسی آدمی کی کوئی دلیل خدا کے حضور مقبول ہوسکتی ہے۔

ان کا یہ ذہن کیوں تھا؟

اس لیے کہ ان کے دل میں یہ چور تھا کہ کہیں اس طرح کی دینی سیادت وقیادت بنی اسماعیل کو بھی حاصل نہ ہوجائے جس طرح کی سیادت اب تک ان کو حاصل رہی ہے اور ساتھ ہی یہ اندیشہ بھی دل میں تھا کہ اگر ہماری طرف سے کوئی اعتراف اس نبوت کے حق میں زبان سے نکل گیا تو مسلمان اس کو قیامت کے روز ہمارے خلاف حجت بنائیں گے کہ ہم نے حق واضح ہونے کے باوجود اس کی تکذیب کی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہودیوں کو قرآن کا جواب :

۱۳۸ - اے پیغمبر کہہ دو کہ فضل اللہ کے قبضہ و اختیار میں ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے وہ بڑی وسعت والا ہے اور بڑے ہی علم والا ہے وہ جس کو چاہتا ہے اپنی رحمت کے لیے خاص کر لیتا ہے اور اللہ کی ذات بڑے ہی فضل والی ہے۔ یعنی اللہ کے خزانوں میں کمی نہیں ہے۔ اور اسی کو خبر ہے کہ کس کو کیا بڑائی ملنی چاہیئے۔ نبوت، شریعت، ایمان و اسلام اور ہر قسم کی مادی اور روحانی فضائل و کمالات کا تقسیم کرنا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ جس وقت جیسے مناسب جانے عطا کرتا ہے۔ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ ۔[1]

گویا قرآن نے سازش کرنے والوں کو جتا دیا کہ جس مقصد کی خاطر تم یہ پاپڑ بیل رہے ہو یہ تمہارے اختیار کی بات نہیں ہے۔ عزت و فضیلت اللہ کے قبضہ میں ہے وہ جسے چاہے عطا کردے اور جس سے چاہے چھین لے۔ اسی نے بنی اسرائیل کو دینی قیادت اور نبوت و رسالت کی عزت سے نوازا تھا۔ اب اگر وہ بنی اسماعیل کو اس کے لیے منتخب کر رہا ہے۔ تو تم اللہ کا ہاتھ نہیں پکڑ سکتے اس کا فیصلہ نافذ ہو کر رہے گا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَمِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ مَنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِقِنْطَارٍ يُّؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَّنْ اِنْ تَاْمَنْهُ بِدِيْنَارٍ لَّا يُؤَدِّهٖٓ اِلَيْكَ اِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَآئِمًا ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَالُوْا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْاُمِّيّٖنَ سَبِيْلٌ ۚ وَيَقُوْلُوْنَ عَلَي اللّٰهِ الْكَذِبَ وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ﴿۷۵﴾ بَلٰي مَنْ اَوْفٰى بِعَهْدِهٖ وَاتَّقٰى فَاِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿۷۶﴾

اور کچھ اہلِ کتاب میں ایسے بھی ہیں کہ اگر اُن کے پاس امانت کا ڈھیر بھی رکھو تو مطالبہ پر واپس کر دیں گے[۱۳۹] اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر ان کے پاس ایک دینار بھی بطور امانت رکھو تو وہ اسے اس وقت تک واپس کرنے والے نہیں ہیں جب تک تم ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ،[۱۴۰] یہ اس لیے ہے کہ ان کا کہنا ہے کہ ان امیوں کے معاملہ میں ہم پر کوئی گرفت نہیں ہے[۱۴۱] اور جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ اٹھا رہے ہیں[۱۴۲]۔ ہاں جو لوگ اس کے عہد کو پورا کریں اور اللہ سے ڈریں گے تو بے شک اللہ اپنے

ڈرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ۱۴۳

دُنیوی خیانت اور دینی خیانت میں ہم آہنگی۔

قرآن نے یہاں اور متعدد مقامات پر یہود و نصاریٰ کے علماء و مشائخ کی ایک بہت بڑی گمراہی یہ بتلائی ہے کہ ناجائز طریقہ پر لوگوں کا مال کھا لینے میں بے باک ہو گئے جہاں وہ بادشاہوں اور امیروں کی مطلب برآری کے لیے حلال کو حرام، حرام کو حلال بنا دیتے اور اس کے فتوے کر انعام و اکرام لیتے وہاں ناجائز طریقہ پر مال کھانے کی ایسی صورتیں نکالتے کہ مثلاً فلاں جماعت کافروں اور مشرکوں کی جماعت ہے ان کا مال دھوکے فریب سے بھی کھا لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ ثواب ہے چنانچہ علماء یہود کے مشرکین کے بارے میں ایسے ہی فتوے کا اس آیت میں ذکر کیا ہے۔ اس سے پہلی آیات میں ان کی فکری اور اخلاقی پستیوں کا نمونہ پیش کیا تھا اس آیت میں ان کی معاملاتی بدعنوانیوں کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ قرآن نے ان کا یہ معاملاتی کردار یہاں یہ نمایاں کرنے کے لیے بیان کیا ہے کہ انسانی زندگی میں جو لوگ چند ردیوں کی امانت واپس کرنے میں لیت و لعل کرتے ہیں اور اس کے لیے اس اہتمام سے شرعی حیلے ایجاد کر رکھے ہیں ان سے یہ توقع نہ رکھو کہ تمہارے نبی اور تمہارے مذہب و شریعت کے بارے میں جن پیش گوئیوں کی امانت ان کے سپرد کی گئی ہیں ان کو وہ آسانی سے ادا کریں گے۔ اور مخلوق خدا کے سامنے ان کی شہادت دینے کی ذمہ داری اٹھائیں گے۔ جو لوگ دنیا کی نہایت حقیر چیزوں میں خیانت کرتے ہیں وہ نبوتِ محمدیہ کے بارے میں انبیاء کی بشارت ادا کرنے کے لیے کیسے تیار ہوں گے۔

دیانت ہر حال میں دیانت ہے:

۱۳۹۔ اور کچھ اہل کتاب ایسے بھی ہیں کہ اگر ان کے پاس امانت کے ڈھیر بھی رکھ دیے جائیں تو مطالبہ پر واپس کر دیں گے۔ یہ قرآن کے عدل و انصاف کی نمایاں مثال ہے کہ یہودیوں میں جو اچھے کردار کے لوگ تھے ان کے کردار کی اچھائی کی داد دی بلکہ پہلے انہی کا ذکر کیا ہے۔

تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ اس میدان میں اور آگے بڑھیں یہی لوگ تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے گویا سمجھا دیا گیا ہے کہ جو شخص مخلوق کے معاملہ میں اس درجہ امین ہوگا کہ سونے چاندی کے پورے ڈھیر میں خیانت نہ کرے گا وہ خالق کے معاملہ میں بدرجہ اولیٰ امین ہوگا ایسا شخص تورات کے احکام میں اور نبی آخرالزماں کی بشارتوں میں ذرہ برابر خیانت نہ کرے گا۔ کیونکہ وہ اللہ کی امانت ہیں۔ اس سے مراد اگر یہودی ہیں اور ظاہر یہی ہے تو کیا عنداللہ مقبول بھی ہیں۔ یہ معنے ہے کیونکہ اچھے ہونے کے لیے مقبول ہونا ضروری نہیں ہے۔ اچھے ہونے کا تعلق دنیا کی زندگی سے ہے جب کہ مقبول ہونے کا تعلق آخرت کی زندگی سے ہے اور ظاہر ہے کہ قبولیت کے لیے ایمان شرط ہے۔ مولانا مفتی محمد شفیع صاحب کا یہ فرمانا بالکل برمحل ہے اسلام تعصب اور تنگ نظری سے کام نہیں لیتا بلکہ وہ کھلے دل سے اپنے مخالف کے ہنر کی بھی آپ کے مرتبہ کے مطابق داد دیتا ہے[1]

خیانت ہر حال میں خیانت ہے:

۱۴۰۔ اور ان میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ اگر ان کے پاس ایک دینار رکھو تو اسے اس وقت تک واپس کرنے والے نہیں جب تک ان کے سر پر سوار نہ ہو جاؤ۔ اہل کتاب کی دینی خیانت و نفاق کے سلسلے میں دنیوی خیانت کا ذکر آگیا۔ جس سے اس پر روشنی پڑتی ہے کہ جو لوگ چار پیسہ پر نیت خراب کرلیں اور امانتداری نہ برت سکیں ان سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ خالص دینی معاملات میں امین ثابت ہوں گے چنانچہ بہت سے وہ ہیں جن کے پاس زیادہ تو کیا ایک اشرفی بھی امانت رکھی جائے تو تھوڑی دیر بعد مکر جائیں اور جب تک کوئی تقاضے کے لیے ہر وقت ان کے سر پر نہ کھڑا رہے اور پیچھا کرنے والا نہ ہوں، امانت ادا نہ کریں۔ بلاشبہ ان میں سب کا حال یکساں نہیں ہے۔ کچھ ایسے بھی ہیں جن کے پاس اگر سونے کا ڈھیر رکھ دیا جائے تو ایک رتی بھی خیانت نہ کریں۔ یہی خوش معاملہ اور باامانت لوگ ہیں جو یہودیت سے بیزار ہو کر اسلام کے حلقہ بگوش بنتے جا رہے ہیں۔ مثلاً حضرت عبداللہ بن سلام[2]

یہود کے حب زر کی یہ کتنی سچی تصویر ہے۔ دینار رومی حکومت کا ایک طلائی سکہ ہے۔

---

[1] معارف قرآن م ش۔ [2] افادات شیخ الاسلام

عرب میں بھی مستعمل تھا۔ آج بھی یورپ کے مختلف حصوں میں رائج ہے۔ اردو میں اس کا مفہوم اشرفی ہے۔

اس آیت سے ضمناً یہ اشارہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ دین کی زندگی میں امانت و دیانت کی بڑی قدر و منزلت ہے کیونکہ زندگی میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانتداری اور امانت ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایماندار ہو اور جس کا جس کسی پر جتنا ہو اس کو پوری دیانت سے رتی رتی دے دے۔ قرآن میں امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائیداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ہر مالی قانونی اور اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔ اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے تو اس کے مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت ہے اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو اس کو ادا کرنا بھی امانت ہے، کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا امانت ہے کسی مجلس میں آپ ہوں اور کچھ باتیں آپ دوسروں کے متعلق وہاں سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا امانت ہے۔ اگر کوئی کسی جگہ ملازم ہے تو اس کو ملازمت کی شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو انجام دینا امانت ہے۔ اگر کوئی کسی کا آٹھ گھنٹے کا ملازم ہے اور وہ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتا ہے یا بلا وجہ کام میں سستی کرتا ہے۔ یا دیر سے آتا ہے۔ یا وقت سے پہلے چلا جاتا ہے۔ تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔ اس آیت سے یہ رہنما اصول بھی معلوم ہو رہا ہے کہ جو شخص مالیاتی زندگی میں چار پیسہ پر نیت خراب کر لیتا ہے اور امانت کا پاس نہیں رکھتا تو اس سے دینی معاملات میں امانت دار ہونے کی کیونکر توقع ہو سکتی ہے۔ یہاں اہل کتاب کی دینی خیانت کے ذکر میں خالص دنیوی خیانت کا اسی لیے ذکر کیا ہے۔

اس سے اگر ہم چاہیں تو اپنی زندگی کے مختلف مسائل حل کر سکتے ہیں۔ ایک شخص سے اگر آپ کاروبار اس لیے نہیں کرتے کہ آپ کو اس کی مالیاتی دیانت پر اعتماد نہیں ہے تو آپ اپنے دین کی امامت میں اس کی دیانت پر کیسے اعتماد کر سکتے ہیں؟ اسی پر خلافت، تولیت اور ولایت کو قیاس کیا جا سکتا ہے۔

یہود کا من گھڑت فتویٰ :

الم ا۔ یہ اس لیے ہے کہ ان کا کہنا یہ ہے کہ ان امیوں کے معاملہ میں ہم پر کوئی گرفت

نہیں ہے۔ یعنی پرایا حق کھانے کو یہ مسئلہ بنا لیا کہ عرب کے اُمّی جو ہمارے مذہب پر نہیں ہیں۔ ان کا مال جس طرح ملے روا ہے۔ غیر مذہب والوں کی امانت میں خیانت کی جائے تو کچھ گناہ نہیں ہے خصوصاً وہ عرب جو اپنا آبائی دین چھوڑ کر مسلمان بن گئے ہیں۔ خدا نے ان کا مال ہمارے لیے حلال کر دیا ہے۔ [1]

یہ محض یہودی عوام ہی کا جاہلانہ خیال نہ تھا بلکہ ان کے یہاں مذہبی تعلیم بھی یہی تھی اور ان کے بڑے بڑے مذہبی پیشواؤں کے فقہی احکام بھی ایسے ہی تھے۔ بائیبل قرض اور سود کے مسئلہ میں اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان تفریق کرتی ہے (استثنا ۱۵/۱،۲، ۲۳ : ۲۰) تالمود میں کہا گیا ہے کہ اگر اسرائیلی کا بیل کسی غیر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر کوئی تاوان نہیں۔ مگر غیر اسرائیلی کا بیل اگر اسرائیلی کے بیل کو زخمی کر دے تو اس پر تاوان ہے۔ اگر کسی شخص کو کسی جگہ کوئی گری ہوئی چیز مل جائے تو اسے دیکھنا چاہیئے کہ گرد و پیش میں آبادی کن لوگوں کی ہے۔ اگر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے اعلان کرنا چاہیئے، غیر اسرائیلیوں کی ہو تو اسے بلا اعلان وہ چیز رکھ لینی چاہیئے۔ ابی اشماعیل کہتا ہے کہ اگر اُمّی اور اسرائیلی کا مقدمہ قاضی کے پاس آتے تو قاضی اگر اسرائیلی قانون کے مطابق اپنے بھائی کو جتوا سکتا ہو تو اس کے مطابق اسے کامیاب بنائے اور کہے کہ یہ ہمارا قانون ہے۔ اور اگر امیوں کے قانون کے مطابق جتوا سکتا ہے تو اسی کے تحت کامیاب بنائے اور کہے کہ یہ تمہارا قانون ہے اور اگر دونوں ساتھ نہ دیتے ہوں تو پھر جس حیلے سے بھی وہ اسرائیلی کو کامیاب کر سکتا ہے کرے۔ ربی شموایل کہتا ہے کہ غیر اسرائیلی کی ہر غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیئے۔ (تالمود کی مسلینی) [2]

اس آیت میں قرآن نے امیین سے متعلق بنی اسرائیل کے ذہن اور ان کے مجموعی کردار کو واضح کیا ہے کہ وہ امیوں کی امانتوں میں خیانت کرنے اور ان کے مال کو ہڑپ کر جانے میں کوئی قباحت نہیں سمجھتے بلکہ اسے اپنی دینداری کا حق سمجھتے ہیں۔ ان کا نظریہ یہ ہے کہ تورات میں غصب، خیانت، اور سود خواری کی جو ممانعت ہے اس کا تعلق غیر قوموں خصوصاً کافر قوموں سے نہیں ہے اپنے اس من گھڑت شرعی فتویٰ کے تحت انہوں نے دوسری قوموں سے ہر قسم کی بدمعاملگی جائز کر لی تھی وہ عرب بنی اسماعیل کو بھی اسی فہرست میں داخل کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

مال کو بھی خیانت بدعہدی یا سود وغیرہ کی راہ سے ہڑپ کر جانا ان کے نزدیک کوئی قابل اعتراض بات نہیں تھی۔ اہل عرب یہودی سود خواروں اور مہاجنوں کے پاس اگر کوئی چیز بطور امانت یا رہن رکھتے تو بڑا ہی کوئی قسمت والا ہوتا جو ان کے حلق سے اپنا مال نکالنے میں کامیاب ہوتا۔ وہ اسے دبا بیٹھتے اور اپنے اس فعل کو کار ثواب ثابت کرنے کے لیے انہوں نے اپنے مولویوں سے فتوے بھی حاصل کر رکھے تھے کہ کافروں کا مال ہڑپ کر جانے میں کوئی عیب نہیں ہے [1]

پہلی آیت میں اگر اہل کتاب کی یہ فکری گمراہی بتائی گئی تھی۔ کہ وہ دین و صداقت کو صرف اپنی نسل وگروہ ہی کا ورثہ سمجھتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ ہو نہیں سکتا کہ کوئی شخص ہمارے گروہ میں سے نہ ہو اور پھر دین و صداقت رکھتا ہو۔ یا کسی فرد یا قوم کو ہم سے بہتر دین و صداقت کی کوئی بات مل سکے جو کچھ ملنا تھا ہمیں مل گیا اور اللہ کے خزانہ فیضان و رحمت پر مہر لگ گئی۔ اس آیت میں ان کی یہ عملی گمراہی بتائی گئی ہے کہ وہ اسی بنا پر سمجھتے ہیں کہ لین دین میں دیانت داری کے جس قدر بھی دینی احکام ہیں وہ صرف اس لیے ہیں کہ اپنے ہم مذہب آدمیوں کے ساتھ بدمعاملگی نہ کی جائے لیکن ایک دوسرے مذہب اور گروہ کا ہو تو اس کے ساتھ سچائی اور دیانتداری سے پیش آنا کچھ ضروری نہیں۔ جس طرح بھی ہم کافروں کا مال کھا لیں جائز ہے۔

یہ سرگزشت تو اہل کتاب کی دنیا کی ہے جسے قرآن نے مخاطب کیا تھا لیکن خود مسلمانوں کا کیا حال ہوا جنہیں قرآن کی تبلیغ سپرد کی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ وہ بھی اس گمراہی سے نہ بچ سکے اور انہوں نے دارحرب اور دار اسلام کی آڑ میں وہ سب کچھ کیا جسے قرآن رد کرنے آیا تھا۔ اعتقاداً نہیں عملاً اور سوال یہاں عمل ہی کا ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تمام مفاسد ظہور میں آ گئے جن کا قرآن نے دروازہ بند کرنا چاہا تھا۔ خیانت، جھوٹ اور چوری اور سود حلال ہو کر رہ گئے اور بات بیچارے فقہا کے سر رکھ دی۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی متحدہ ہندوستان میں صرف سود ہی نہیں بلکہ دارحرب کی آڑ میں چوری، رہزنی، خیانت اور جھوٹ کو کار ثواب سمجھ کر کیا جانے لگا۔ ریلوے میں بلا کرایہ سفر کرنا، زیادہ وزن کا سامان بغیر کرایہ کے ریل میں لے جانا، سود لینا، حکومت کے اموال کی چوری کرنا دفاتر سے اسٹیشنری لے آنا سب جائز تصور کیا گیا۔ اور فتویٰ یہ دیا گیا کہ دارحرب میں عقود فاسد جائز ہیں۔

---

[1] تدبر قرآن۔

کیا عقودِ فاسدہ صرف اہل ایمان کے مابین منع ہیں؟

دارِ حرب میں عقود فاسدہ اور سود کے جواز کی بنا یہ بتائی گئی ہے کہ قرآن مجید میں جہاں کہیں کسبِ مال کے ناجائز ذرائع سے روکا گیا ہے وہاں کا لفظ استعمال کیا گیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ مسلمان باہم عقود فاسدہ پر معاملات نہ کیا کریں۔ ظاہر ہے کہ سود بھی کسبِ مال کے ناجائز طریقوں میں سے ایک طریقہ ہے۔ یہ ان بزرگوں کے استدلال کا خلاصہ ہے جو کافروں سے عقود فاسدہ کو جائز بتلاتے ہیں۔ اس میں پہلی اور بنیادی غلطی یہ ہے کہ قرآن کے مقاصد سے نظر بچا کر صرف ظاہری الفاظ سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ قرآن کا عام اندازِ بیان یہ ہے کہ وہ اخلاق اور معاملات کے متعلق جس قدر ہدایات دیتا ہے ان میں صرف اہل ایمان کو مخاطب کرتا ہے اور کہتا ہے کہ تم آپس میں ایسا کرو اور ایسا نہ کرو۔ اس طرزِ بیان میں کچھ دوسری حکمتیں ہیں اس قسم کے اندازِ بیان میں اخلاق اور معاملات کے متعلق جتنے احکام اللہ تعالےٰ نے دیے ہیں۔ ان کو فقہاء امت میں سے کسی نے بھی صرف مسلمانوں کے باہمی معاملات تک محدود قرار نہیں دیا ہے۔ کسی نے یہ نہیں کہا کہ مسلمانوں میں باہم جو افعال حرام ہیں مسلمان اور کافر کے درمیان وہی حلال ہیں۔ اگر ایسا ہو تو اسلامی اخلاقیات کی جڑ ہی کٹ جائے۔

بالفرض اگر بلا دلیل مان لیا جائے کہ صرف لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل کا حکم مسلمانوں کے باہمی معاملات کے لیے خاص ہے اور یہ قاعدہ دوسرے احکام میں جاری نہ ہو گا تو سوال یہ پیدا ہوگا کہ پھر ذمی کافروں کو سودی لین دین سے کیوں روکا گیا ہے۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے غیر مسلموں سے اس قسم کے معاہدے کیوں کیے کہ وہ سودی کاروبار چھوڑ دیں۔ ورنہ معاہدہ کالعدم ہو جائے گا اور فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر کوئی کافر حربی دار اسلام میں امان لے کر آئے تو اس سے بھی سود کا معاملہ کرانا حرام ہے۔

دراصل قانونِ اسلامی کے تین شعبے ہیں، اعتقادی و دستوری اور بین الاقوامی ہمارے فقہی ذخیرے میں ان قوانین کو الگ الگ مرتب نہیں کیا گیا اور نہ ان کو مختلف ناموں سے متعارف کرایا گیا ہے لیکن قرآن و سنت میں ایسے واضح اشارات موجود ہیں جن سے قدرتی طور پر اسلامی قوانین کا ارتقاء تین الگ الگ راہوں پر ہوا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ جس فقیہ اعظم کی قانونی بصیرت اور فقیہانہ نکتہ سنجی نے سب سے زیادہ ان اشارات کو سمجھا اور ان کی بنا پر قانون کے ا(ز)

تینوں شعبوں کی حدود میں ٹھیک ٹھیک امتیاز کیا اور پیچیدہ سے پیچیدہ مسائل میں اس امتیاز کو ملحوظ رکھا وہ حضرت امام ابوحنیفہ ہیں۔ فقہاء اسلام میں سے کوئی بھی اس معاملہ میں ان کا ہمسر نظر نہیں آتا۔ امام اعظم کے کمال کا ایک ادنیٰ ثبوت یہ ہے کہ ۱۲ سو سال پہلے انہوں نے قرآن وسنت سے استنباط کر کے دستوری اور بین الاقوامی قوانین کے جو احکام مدون کیے تھے آج تک دنیا کے قانونی افکار کا ارتقاء ان سے ایک انچ بھی آگے نہیں بڑھا ہے۔ بلکہ زیادہ صحیح یہ ہے کہ دراصل یہ ارتقاء ہوا ہی ان خطوط پر ہے جو ۱۲ صدی پہلے امام اعظم ابوحنیفہ نے کھینچ دیے تھے۔ فقہ حنفی کی بہ نسبت جدید زمانہ کے قوانین میں بظاہر جو ترقی نظر آتی ہے وہ کسی حد تک تمدنی احوال کے تغیرات کا اور زیادہ تر بین الاقوامی معاہدات کا نتیجہ ہے تاہم اصولی حیثیت سے جدید زمانہ کے قوانین بڑی حد تک فقہ حنفی کا چربہ ہیں اور ان کے مطالعہ سے فقہ حنفی کو سمجھنے میں بڑی آسانی ہوتی ہے

دارالحرب اور دارالکفر :

امام اعظم بین المملکتی معاملاتی مسائل میں دارالحرب کی جگہ دارالکفر کی اصطلاح استعمال کرتے ہیں۔ کیونکہ دستوری قانون کی رو سے دارالاسلام کا مدمقابل دار حرب نہیں دارالکفر یعنے علاقہ غیر ہی ہو سکتا ہے۔ حرب اور غیر حرب کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔ جو ممالک اسلامی حکومت سے صلح رکھتے ہیں وہ بھی دارالکفر ہیں۔ اور ان سے بھی وہ سب احکام متعلق ہیں جو اس موضوع پر فقہ میں موجود ہیں۔ لیکن چونکہ اسلام کی ابتدائی صدیوں میں جتنے دار کفر اسلامی سلطنت سے متصل تھے۔ وہ عموماً دار حرب ہی رہتے تھے اس لیے بعد کو فقہاء نے دارالکفر کو دارالحرب کا مترادف سمجھ لیا اور ان دونوں اصطلاحوں کے باریک قانونی فرق کو نظر انداز کر دیا۔

غیر معصوم اور مباح میں فرق :

فقہاء لکھتے ہیں کہ حربی کا مال مباح ہے کیونکہ حربی کا مال معصوم نہیں ہے۔ امام اعظم کے کلام میں کہیں کوئی ایسی تصریح نہیں جس سے یہ ثابت ہوتا ہو کہ وہ غیر معصوم کو مباح کے معنے میں لیتے ہیں۔ وہ حدود اسلام سے باہر کی اشیاء کو غیر معصوم بتلاتے ہیں اور ایسی اشیاء پر دست درازی کرنے والے کے لیے صرف اتنا کہتے ہیں کہ لا شیٔ علیہ لم یقض علیہ اس پر قانوناً کوئی گرفت نہیں یا اس کے خلاف کوئی عدالتی فیصلہ صادر نہ کیا جائے گا لیکن بعد کے فقہاء نے اکثر مقامات

عدم عصمت اور اباحت کو خلط ملط کر دیا جس سے یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ اسلامی مملکت کے حدود سے باہر جو جرائم کیے جائیں ان پر جس طرح حکومت اسلامی باز پرس نہ کرے گی اسی طرح اللہ سبحانہ، بھی باز پرس نہ کرے گا۔ حالانکہ یہ دونوں چیزیں بالکل الگ الگ ہیں آپ سیلون میں کسی کا مال چرا لیجیے، ظاہر ہے پاکستان کی عدالت میں آپ پر مقدمہ نہ چلایا جائے گا دارالاسلام کے قانون کی رو سے آپ بری الذمہ ہیں مگر اس کے یہ معنے کب ہیں کہ اللہ کی عدالت میں بھی آپ چھوٹ جائیں گے۔

اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ کتب فقہ میں دارالحرب کے اندر سود اور قمار اور دوسرے عقود فاسدہ کی اباحت کا مسئلہ جو اس بنیاد پر لکھا گیا ہے۔ کہ حربی کے لیے کوئی عصمت نہیں تو اس کے دو پہلو ہیں۔

ایک یہ کہ دارالحرب سے مراد محض علاقہ غیر ہو۔ اس لحاظ سے یہ مسئلہ دستوری قانون سے تعلق رکھتا ہے اور اس کی نوعیت یہ ہے کہ حربی بمعنی رعیت غیر کے مال کی حفاظت کا ذمہ چونکہ اسلامی حکومت نے نہیں لیا ہے اس لیے حکومت کے حدود عمل سے باہر اسلامی حکومت کا کوئی شہری اگر اس سے سود لے کر یا جوا کھیل کر یا کسی اور ناجائز ذریعہ سے مال لے کر اسلامی علاقہ میں آجائے تو اسلامی حکومت اس پر کوئی مقدمہ قائم نہ کرے گی قطع نظر اس کے کہ خالص ایمانی و اعتقادی نقطہ نظر سے وہ مجرم ہو یا نہ ہو۔

دوسرا پہلو یہ ہے کہ دارحرب سے مراد وہ ملک لیا جائے جس سے بالفعل اسلامی مملکت برسر پیکار ہو اس لحاظ سے یہ مسئلہ تعلقات خارجیہ کے قانون سے تعلق رکھتا ہے۔ جس مملکت سے اسلامی حکومت برسر پیکار ہے اصطلاح میں اس مملکت کو دارالحرب اور اس کے باشندوں کو محاربین یا حربی کہا جاتا ہے۔ ان ہی کے املاک و اموال مباح ہیں۔ لیکن اسلامی قانون نے ان کے اموال کی اباحت کے لیے ناگزیر اور لازمی شرط یہ بتائی ہے کہ ان اموال کا دارالاسلام میں احراز ہو جائے یعنی جب تک حربیوں کے اموال دارحرب میں ہیں مسلمان ان سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ تمام اموال جب تک دارالاسلام میں منتقل نہ ہوں امام ابوحنیفہ کے نزدیک مسلمانوں کی ملک نہیں ہوتے۔

بہر حال حربیوں کا مال دار حرب میں بیٹھ کر کھانے کی فقہاء احناف نے کبھی اجازت نہیں دی ہے اور پھر ان اموال کو حاصل کرنے کے لیے دھوکا، جھوٹ، چوری اور خیانت تو کسی کے

نزدیک بھی روا نہیں ہے۔

افسوس یہ ہے کہ لوگ بزرگوں کے مُنہ سے نکلی ہوئی بات کو خود نہیں سمجھتے ہیں اور بزرگوں کا نام لے کر ہر بُرائی کے جواز کا پروانہ دے دیتے ہیں۔

فتوے کی اساس جھوٹ ہے۔

۱۴۲۔ اور جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ اٹھا رہے ہیں۔ یعنی جان بوجھ کر خدا کی طرف جھوٹی بات منسوب کر رہے ہیں۔ امانت میں خیانت کرنے کی اللہ نے ہرگز اجازت نہیں دی۔ آج بھی اسلامی فقہ کا مسئلہ یہی ہے کہ مسلم ہو یا کافر کسی کی امانت میں خیانت جائز نہیں [1]

یعنی یہ اللہ اور شریعت پر ان کا بہتان ہے اور اس کے خلاف شریعت ہونے کے وہ خود بھی واقف ہیں لیکن محض اپنی خواہشات کی سردی اور حرص دنیا میں انہوں نے اس قسم کے حیلے بہانے ایجاد کر لیے ہیں۔ بعد میں یہی فتوے تحریف کی راہ سے تورات میں داخل ہو گئے یہاں تک کہ اب اگر کوئی تورات کو پڑھے تو وہ عام اخلاقی و انسانی حقوق و معاملات میں یہی محسوس کرتا ہے کہ بنی اسرائیل کے لیے شریعت کچھ اور ہے اور غیر بنی اسرائیل کے لیے جن کو تورات اجنبیوں اور پردیسیوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ کچھ اور تکمیل اخلاق کا باب کھلا جس کو عرف میں تصوف کہتے ہیں [2]

یہودیوں کو قرآن کا جواب :

۱۴۳۔ ہاں جو لوگ اس کے عہد کو پورا کریں گے اور اللہ سے ڈریں گے تو بیشک اللہ ڈرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ یعنی خیانت اور بدعہدی میں گناہ کیوں نہیں جب کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو کوئی خدا کے اور اس کے بندوں کے جائز عہد پورے اور خدا سے ڈر کر تقویٰ کی راہ چلے یعنی فاسد خیالات، مذموم اعمال اور پست اخلاق سے پرہیز کرے اسی سے خدا محبت کرتا ہے اس میں امانت داری کی خصلت بھی آ گئی [3]

امام رازی نے لکھا ہے کہ آیت سے وفاء عہد کی بڑی عظمت معلوم ہو رہی ہے اس

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن [3] افادات شیخ الاسلام

یہ کہ تمام طاعات کا خلاصہ صرف دو ہی چیزیں ہیں۔ ایک احکام الٰہی کی تعظیم دوسرے مخلوق خدا پر شفقت اور وفاء عہد ان دونوں قسموں کی طاعتوں کا مجموعہ ہے۔ دراصل اس آیت میں یہودیوں کو جواب دیا گیا ہے جو اپنی برتری کے زعم فاسد میں مبتلا ہیں اور اس احساس برتری کے تحت وہ دوسروں کے ساتھ مجرمانہ خیانت سے بھی نہیں چوکتے۔ قرآن کہتا کہ ہاں دیانت تو بہرحال دیانت ہے اور خیانت ہر حال میں خیانت ہے۔ دین و مذہب کے اختلاف سے اچھائی اور برائی کے حقائق معطل نہیں ہو سکتے۔ جو شخص بددیانتی کرتا ہے خواہ وہ کسی اعتقاد اور کسی گروہ کے آدمی ساتھ کرے گناہ ہے اور وہ قیامت کے دن خدا کی بخشش و رحمت سے محروم رہے گا۔ کامیاب تو صرف وہ شخص ہے جو ایفاء عہد اور تقویٰ کی دولت لے کر اللہ کے حضور میں پیش ہوگا۔ ایفاء عہد کے ساتھ تقویٰ کی قید ایمانی اور مادی قدروں میں فرق پیدا کرنے کے لیے لگائی گئی۔ اگر آپ ایفاء عہد کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ کی رضا حاصل ہو اس کی نافرمانی سے آپ کا دامن داغدار نہ ہو تو آپ عہد پورا کرنے والے ہیں اور آپ کا شمار متقیوں میں ہے۔ تقویٰ قرآن کے محاورے میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے اور تقویٰ والے اللہ کی محبت اور رضامندی سے سرفراز رہتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ متقی ہوتے ہوئے عہد کا ایفاء اللہ تعالیٰ کی خوشنودی اور پیار کا موجب ہے اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا
أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ
إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝ وَإِنَّ مِنْهُمْ
لَفَرِيقًا يَلْوُونَ أَلْسِنَتَهُمْ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ الْكِتَابِ وَمَا هُوَ
مِنَ الْكِتَابِ ۚ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا هُوَ مِنْ
عِنْدِ اللَّهِ ۚ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ۝

یاد رکھو جو لوگ اللہ کا عہد اور اپنی قسمیں فروخت کر دیتے ہیں (اور دیانت کی جگہ خیانت کرتے ہیں)[۱۲] یہی لوگ ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور روزِ قیامت نہ تو اللہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان پر اس کی نظرِ رحمت ہو گی اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا بس ان کے لیے دردناک عذاب ہو گا۔[۱۲۵] اور اہلِ کتاب میں ان کے رہنماؤں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کتاب اللہ کو پڑھتے ہوئے اس میں الٹ پھیر کرتا ہے تاکہ تم اسے بھی کتاب اللہ سمجھو حالانکہ وہ قطعاً کتاب اللہ کے

احکام نہیں ہیں، اور وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے اور وہ جان بوجھ کر اللہ پر الزام لگا رہے ہیں۔[۱۴۶]

دیانت کی جگہ خیانت کی سزا:

اصل ذکر تو یہاں پیش گوئیوں کا ہے۔ اسی ضمن میں یہ بتلانے کے لیے دینوی معاملہ کا بھی ذکر آیا ہے۔۔۔۔ کہ جب دینوی معاملہ میں ان کی حالت اس قدر ناگفتہ بہ ہے کہ ایک دینار کی امانت سے کر واپس کرنا گوارا نہیں کرتے تو دینی معاملہ میں کتاب کی حفاظت اور پیشین گوئیوں کی حفاظت میں وہ کیونکر قابل اعتبار ہو سکتے ہیں۔ پھر اس بات کی طرف متوجہ کیا کہ دیانت تو ہر حال میں دیانت ہے اور خیانت ہر حال میں خیانت ہے۔ عہد کسی شخص سے ہو سپید رنگ کے آدمی سے، ہو یا کالے رنگ کے آدمی سے۔ فلاسفر سے ہو یا جاہل سے، اپنے ہم مذہب اور ہم قوم سے ہو یا غیر مذہب اور غیر قوم سے سب سے پورا کرنا چاہیئے۔ ایسا ہی امانت کا معاملہ ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب ایام جاہلیت کے خون وغیرہ انتقامات اور حقوق کو کالعدم قرار دیا تو ساتھ ہی فرما دیا الا الامانۃ فانہا مودا ۃ الی البر والفاجر مگر امانت کے حقوق باطل نہیں ہوں گے۔ امانت نیک کی ہو یا بد کا، اس کی ادائیگی ہونی چاہیئے چونکہ امانت اور عہد میں ہر ایک قسم کی ذمہ داریاں آجاتی ہیں اس لیے گویا سمجھا دیا ہے کہ انسان ذمہ داری کا بوجھ نیکیوں کی طرف سے اٹھائے یا بروں کی جانب سے، بڑوں کی طرف سے ہو یا چھوٹوں کی جانب سے پورا ادا ہونا چاہیئے۔ حضرت عبد اللہ بن عباس سے کسی شخص نے دریافت کیا کہ اہل ذمہ کی بعض چھوٹی چھوٹی چیزیں جیسے مرغی، بکری وغیرہ جنگ کے وقت ہم لے لیا کریں۔ آپ نے فرمایا کہ یہ تو اہل کتاب کے قول کی مانند ہے کہ لیس علینا فی الامیین سبیل جب وہ جزیہ ادا کر دیں تو ان کے اموال میں کسی قسم کا تصرف جائز نہیں ہے۔ سوائے اس کے جو اپنی خوشی سے دیں۔ چونکہ عہد و امانت کا کا معاملہ قرآن کی نظر میں بہت بلند ہے اس لیے اس پر وعید بھی سنگین سے سنگین تر آئی ہے۔

۱۴۴۔ یقیناً جو لوگ اللہ کا عہد اور اپنی قسمیں فروخت کر دیتے ہیں اور دیانت کی جگہ خیانت

کرتے ہیں۔ یعنی جو لوگ دنیا کی متاع قلیل لے کر خدا کے عہد اور اپنی قسموں کو توڑ ڈالتے ہیں وہ باہمی معاملات درست رکھتے ہیں نہ خدا سے جو قول و قرار کیا تھا اس پر قائم رہتے ہیں بلکہ مال وجاہ کی حرص میں احکام شرعیہ کو بدلتے رہتے ہیں۔ اور کتب سماویہ میں تحریف کرتے رہتے ہیں۔ ان کا انجام اس آیت میں پیش کیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ یہ یہود میں صفت تھی۔ کہ اللہ نے ان سے اقرار لیا تھا اور قسمیں دی تھیں کہ ہر نبی کے مددگار رہو۔ پھر غرض دنیا کے واسطے پھر گئے اور جو کوئی جھوٹی قسم کھائے دنیا لینے کے واسطے اس کا یہی حال ہے۔[1]

عہد اللہ سے مراد کتاب و شریعت ہے اس لیے کہ کتاب و شریعت کی حیثیت اللہ کے اور اس کے بندوں کے درمیان معاہدے کی ہوتی ہے۔ یہاں اس عام مفہوم میں ایک خاص اشارہ اس عہد کی طرف بھی ہے جو اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بارے میں لیا تھا اور جس کو انہوں نے نہ صرف یہ کہ بھلا دیا تھا بلکہ اس کے آثار انہوں نے اپنی کتابوں سے مٹا ڈالنے کی کوشش کی تھی۔ (ایمانھم یعنی اپنی قسمیں سے مراد وہ قسمیں ہیں جو آپس میں معاملات سے متعلق کھاتے رہتے ہیں اور ثمن قلیل سے دنیوی معاوضہ مراد ہے جو ہمیشہ آخروی اجر کے مقابلہ میں قلیل ہی ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ اگر زیادہ معاوضہ مل رہا ہو تو عہد شکنی اور بد دیانتی جائز ہوگی۔ مفہوم صرف اس قدر ہے کہ اپنے معاہدوں کی پابندی نہ کرنا اور بد معاملگی کرنا کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ واقعہ اس آیت کے پس منظر میں بیان کیا ہے کہ اشعث فرماتے ہیں کہ میرے اور ایک یہودی کے مابین ایک زمین کا معاہدہ تھا۔ یہودی مکر گیا میں نے مقدمہ بارگاہ نبوت میں پیش کیا۔ حضور انور نے مجھ سے ثبوت طلب کیا۔ میں نے جواب دیا کہ میرے پاس کوئی ثبوت نہیں ہے۔ آپ نے یہودی سے فرمایا کہ قسم کھاؤ۔ میں نے عرض کیا یا رسول اللہ یہ تو بے دھڑک قسم کھا کر میرا مال ہڑپ کر جائے گا۔ ایسے ہی بخاری میں عبداللہ بن ابی اوفی کے حوالہ سے بھی ایک واقعہ آتا ہے۔ جس میں بازار میں سامان کی فروختگی کا ذکر ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ

دونوں حدیثوں میں کوئی منافات نہیں ہے ممکن ہے کہ آیت کے نزول کا پس منظر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

واقعہ ہوں۔ لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ ان واقعات کے رونما ہونے پر یہ آیت تلاوت کی گئی ہو اور سننے والوں نے یہ خیال کیا ہو کہ ابھی نازل ہوئی ہے۔ پس منظر خواہ کچھ ہو آیت اپنے مطلب کے لحاظ سے پوری طرح سیاق و سباق سے مربوط ہے۔

خیانت کرنے والوں کا بدترین انجام :

۱۴۵۔ یہی لوگ ہیں جن کا آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے اور روز قیامت نہ تو اللہ ان سے بات کرے گا اور نہ ان پر اس کی نظر رحمت ہوگی اور نہ ان کو گناہوں سے پاک کرے گا ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔

یہ ان لوگوں کے لیے آخرت میں سزا بتائی گئی ہے جو اللہ کے عہد کے بدلے میں حقیر متاع دنیا حاصل کرتے ہیں اور ان کی جو اپنی قسموں کو کمائی کا ذریعہ بناتے ہیں۔ قرآن کی نظر میں دونوں سنگین جرم ہیں اور اتنے سنگین کہ بقول علامہ سید رضا مرحوم قرآن میں بڑے بڑے جرائم مثلاً شراب، جوا، سود، عقوق والدین پر بھی ایسی وعید اور دھمکی نہیں آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں عہد و یمین کا کیا مقام ہے؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی ایک مشہور حدیث میں فرمایا ہے اور حضرت انس کہتے ہیں کہ آپ ہر خطبہ میں اس کو ضرور فرمایا کرتے تھے۔ لادین لمن لا عھد لہ جس میں عہد نہیں اس میں دین نہیں ہے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ ۱۴ پارے میں آئے گی۔

آیت میں جو سزا بتائی گئی ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ

اولاً ان کا آخرت میں کوئی حصہ نہ ہوگا علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ آخرت کی نعمتوں میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا اور اس سے زیادہ سنگین سزا کیا ہوگی؟

ثانیاً، ان سے اللہ سبحانہ کلام نہ کرے گا حالانکہ قیامت میں دربار عام ہوگا مومن و کافر، فاسق و فاجر سب جمع ہوں گے۔ اس دن کی ہمکلامی کوئی رتبہ اور شرف نہیں رکھتی، وہ دن تو عدالت اور فیصلے کا دن ہوگا۔ مجرم اور قصوروار بھی اس کا کلام سنیں گے لیکن یہ لوگ اس روز بھی کلام الٰہی سے محروم ہوں گے۔ غصہ اور سرزنش فرشتوں کے ذریعے ہوگی۔

کلام نہ کرنے کا مطلب :

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ قرآن کی دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے کہ جناب

باری قیامت کے دن ان سے ہمکلام ہوں گے ۔ جواب یہ ہے کہ کلام نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ لطف و رحمت کے ساتھ ان سے کلام نہ ہوگا اور بطور تخویف و تذلیل اللہ ان سے کلام فرمائے گا ، جس سے ان کو سخت صدمہ ہوگا ۔ یا یوں کہہ دیجئے کہ بلاواسطہ ان سے کلام نہ کیا جائے گا بلکہ ملائکہ عذاب کی وساطت سے کلام ہوگا ۔ آیت میں کلام نہ کرنے کی دھمکی سے یہ بات دلالۃ مترشح ہو رہی ہے کہ ہر شخص کے دل میں محبت الٰہی موجود ہے اگرچہ سردست اس کا احساس نہیں ہوتا قیامت میں جب ساری رکاوٹیں دور ہو جائیں گی تو اس محبت کا پورا پورا مظاہرہ ہوگا ۔ اگر ایسا نہ ہو تو پھر اس وعید میں کوئی معنویت نہ رہے گی بلکہ اس کی حیثیت ایسی ہوکر رہ جائے گی کہ کوئی اپنے دشمن سے کہے کہ میں تم سے ناراض ہو جاؤں گا ۔ محبان جان نثاری محبوب کی بے رخی کو درد جانگداز سمجھتے ہیں نہ کہ دشمن ، اس سے معلوم ہوا کہ روز قیامت ہر سینہ محبت الٰہی سے ایسا لبریز ہوگا کہ اللہ سبحانہ کی بے التفاتی عذاب دوزخ سے بھی بدرجہا زیادہ جانکاہ ہوگی ۔

ثالثاً ، اللہ ان کی طرف نہ دیکھے گا ۔ یعنی ان پر رحمت کی نگاہ نہ فرمائے گا ۔ علامہ زمخشری نے اسے ناراضگی کے لیے کنائی زبان قرار دیا ہے یعنی اللہ روز قیامت ان سے ناراض ہو گا ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ حد درجہ معتوب اور مغضوب ہوں گے ۔

رابعاً ، اللہ ان کا تزکیہ نہ فرمائے گا ۔ یعنی ان کو گناہوں کی آلودگی سے پاک نہ کرے گا ۔ گویا بتایا جا رہا ہے کہ اہل ایمان اگرچہ کتنے ہی گنہ گار ہوں مگر دوزخ میں ایک زمانہ معین تک رہ کر اور گناہوں سے پاک ہوکر جنت میں داخل کر دیے جائیں گے برخلاف ان کے کہ یہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے اور کبھی بھی پاک ہوکر جنت میں جانے کے لیے لائق نہ ہوں گے ۔ خیانت و غدر اور بے ایمانی نے ان کو بمنزلہ نجس العین بنا دیا ہے کہ ان کی نجاست دھونے سے بھی دور نہیں ہو گی ۔ ان کی حیثیت خنزیر کی ہوگی کہ کسی حال میں پاک نہیں ہو سکتا ۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے ان کو نبوت اور کتاب کی نعمت سے سرفراز کیا تاکہ دنیا میں ان کا تزکیہ فرمائے لیکن جب انہوں نے اس نعمت کے باوجود گمراہیوں اور آلودگیوں میں ہی رہنا گوارا کیا تو اب اللہ سبحانہ ان کو آخرت میں پاک نہ کرے گا ۔

آخر میں فرمایا کہ ان کو دردناک عذاب ہوگا اور اس قماش کے لیے اور ہو بھی کیا سکتا ہے ۔

عہد ربانی سے فرار کی تدبیر :

۱۴۶ - اور اہل کتاب میں ان کے رہنماؤں کا ایک گروہ ایسا بھی ہے جو کتاب اللہ

کو پڑھتے ہوئے اس میں الٹ پھیر کرتا ہے تاکہ تم اسے بھی کتاب اللہ سمجھو۔ حالانکہ وہ کتاب اللہ نہیں اور وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے اور جان بوجھ کر اللہ پر جھوٹ اٹھارہے ہیں۔ یہ اہل کتاب کی تحریف کا حال بیان ہو رہا ہے یعنی آسمانی کتاب میں کچھ چیزیں اپنی طرف سے گھٹا بڑھا کر ایسے انداز اور لہجے میں پڑھتے ہیں۔ کہ ناواقف سننے والا دھوکہ میں آجائے اور یہ سمجھے کہ یہ بھی آسمانی کتاب کی عبارت ہے۔ یہی نہیں بلکہ زبان سے بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ سب اللہ کے پاس سے حالانکہ نہ وہ مضمون کتاب میں موجود ہے اور نہ خدا کے پاس سے آیا ہے بلکہ خود اس تحریف شدہ کتاب کو بھی بحیثیت مجموعی خدا کی کتاب نہیں کہہ سکتے۔ کیونکہ اس میں طرح طرح کے تصریحات اور جعلسازیاں کی گئی ہیں۔ آج بائبل کے جو نسخے دنیا میں موجود ہیں ان میں باہم شدید اختلاف ہے اور بعض ایسے مضامین درج ہیں جو قطعاً خدا کی جانب سے نہیں ہو سکتے۔ اس کی کچھ تفصیل روح المعانی میں موجود ہے۔ ہمارے علماء نے اس موضوع پر مبسوط بحثیں کی ہیں۔[1]

یہاں اصل ارشاد میں یلوون السنتھم بالکتاب آیا ہے۔ عربی میں اللسان بالکتاب کے معنے کلام کے الٹ پھیر کرنے اور اس کے معنے تحریف کرنے کے ہیں نہ کہ صرف زبان مروڑنے کے چنانچہ سورۂ نساء میں بھی لی لسان تحریف کلام کے معنے میں آیا ہے من الذی ھادوا یحرفون الکلم عن مواضعه و یقولون سمعنا و عصینا غیر مسمع و راعنا لیا بالسنتھم اے پیغمبر یہودیوں میں کچھ ایسے لوگ ہیں جن کا شیوہ ہے کہ لفظوں کو ان کی اصلی جگہ سے ہٹا دیا کرتے ہیں اور جب تم سے ملتے ہیں تو اس خیال سے کہ دین حق خلاف طعن کریں، زبان مروڑ مروڑ کر لفظوں کو بگاڑتے ہیں چنانچہ کہتے ہیں۔

سمعنا و عصینا اور اسمع غیر مسمع اور راعنا۔[2]

ممکن ہے کہ تحریف لفظی کرتے ہوں اور ممکن ہے کہ تفسیر غلط بیان کرتے ہوں۔ تحریف لفظی میں تو دعویٰ ہوتا ہے کہ یہ لفظ ہی منزل من اللہ ہے اور غلط تفسیر میں الفاظ کے منزل من اللہ ہوتے کا تو دعویٰ نہیں ہوتا لیکن یہ دعویٰ ضرور ہوتا ہے کہ یہ تفسیر قواعد شرعیہ سے ثابت ہے اور قواعد شرعیہ کا من جانب اللہ ہونا ظاہر ہے۔[3]

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن [3] بیان القرآن۔

اگرچہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ کتاب الٰہی کے معانی میں تحریف کرتے ہیں یا الفاظ کا الٹ پھیر کر کے کچھ سے کچھ مطلب نکال لیتے ہیں لیکن اس کا اصلی مطلب یہ ہے کہ وہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو جو ان کے مفاد یا ان کے خود ساختہ عقائد و نظریات کے خلاف پڑتا ہو۔ زبان کی گردش سے کچھ بنا دیتے ہیں اور جیسا کہ سید رضا نے لکھا ہے یہ ممکن ہے کہ اپنی من گھڑت باتوں کی قرأت اس لب و لہجہ اور انداز سے کرتے ہوں جو کتاب الٰہی کے لیے مخصوص ہے جس سے سننے والا دھوکہ میں پڑ جائے کہ کتاب الٰہی ہے اور قفال مروزی اس آیت کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں کہ یہود بعض الفاظ کی حرکات اعرابیہ کو زبان مروڑ کر اس طرح پڑھتے ہیں کہ جس سے لفظ کے معنے کچھ کے کچھ ہو جاتے جیسے راعنا کے معنے ایک تو یہ ہیں کہ ہماری طرف التفات کیجئے لیکن یہود اس لفظ کو زبان مروڑ کر اس طرح کہتے کہ معنے کچھ کے کچھ ہو جاتے۔ سمعنا واطعنا کے معنے ہیں ہم نے سنا اور اطاعت کی یہود از راہ شرارت اسے اس طرح ادا کرتے کہ المعنا وعصینا ہو جاتا یعنی ہم نے حکم سنا اور خلاف ورزی کی۔ اسمع کے معنے ہیں ہماری بات سنیے یہودی اس کے ساتھ غیر مسمع بھی بڑھا دیتے جس کے ایک معنے تو یہ ہیں کہ اللہ تمہیں بری بات نہ سنوائے دوسرے یہ بھی ہیں کہ تم بہرے ہو جاؤ۔ لیکن عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یہ آیت ان یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو کعب ابن اشرف یہودی کے پاس تورات لے کر آئے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی ان صفات وعلامات کو تبدیل کیا گیا تھا جو تورات میں آئی تھیں۔ بنی قریظہ نے ان کی لکھی ہوئی تورات کو اور اپنی کتاب میں ملا کر اس کی اس طرح قرأت کرتے کہ سننے والے سمجھتے کہ یہ تورات ہے خلاصہ یہ ہے کہ عبد اللہ بن عباس، مجاہد اور قتادہ کے نزدیک لیّا بالسنتھم سے مراد کتاب خداوندی میں لفظی تحریف اور اپنی طرف سے کتاب الٰہی میں کسی چیز کا ملا دینا ہے جب کہ قفال مروزی کے خیال میں حرکات اعرابیہ کو اس انداز میں توڑ مروڑ کر پڑھنا مراد ہے کہ جس سے معنے تبدیل ہو جائیں میرے خیال میں دونوں باتوں میں کوئی تضاد اور منافات نہیں ہے کیونکہ لی کے معنے پھیرنے اور موڑنے کے ہیں۔ یعنی زبان سے کلام الٰہی اور کتاب خداوندی کو اس طرح مروڑے کہ کلام میں درستی سے ہٹ کر کجی رونما ہو جائے اور اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ کتاب کی اصل عبارت ہی کو مسخ کر دیا جائے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ الفاظ کی حرکات اعرابیہ کو اس طرح توڑ مروڑ کر پڑھا جائے کہ معانی بدل جائیں۔ وہ بھی تحریف ہے اور یہ بھی تحریف ہے۔ یہودیوں میں دونوں قسمیں موجود تھیں۔ کبھی اصل الفاظ ہی کو تبدیل کر دیتے اور کبھی تلفظ و قرأت میں ایسی تبدیلی کرتے جس سے

معانی بدل جاتے۔

گویا یہ اہل کتاب کی ان تدبیروں میں سے ایک تدبیر ہے جس کے ذریعے وہ کتاب الہٰی کی گرفت سے بچتے تھے۔ اس جرم کا ارتکاب یہود و نصاریٰ دونوں ہی کرتے تھے۔ اس سازش کے ذکر کے بعد ان کی جسارت اور ڈھٹائی بتائی ہے کہ یہ حرکت وہ اس مقصد سے کرتے ہیں۔ کہ جو چیز کتاب الہٰی نہیں اس پر کتاب الہٰی کا لیبل لگائیں۔ یعنی ان کی یہ تحریفات دانستہ ہوتی ہیں اور اس لیے ہوتی ہیں تاکہ وہ اپنے مخاطبوں کو دھوکہ دے سکیں اور جو چیز اللہ کی طرف سے نہیں اس کو اللہ کے نام پر پیش کریں۔ قرآن نے بتایا ہے۔ کہ وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔

ماھو من عند اللہ یہ اللہ کی جانب سے ہرگز نہیں ہے۔

مَا كَانَ لِبَشَرٍ اَنْ يُّؤْتِيَهُ اللّٰهُ الْكِتٰبَ وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ثُمَّ يَقُوْلَ
لِلنَّاسِ كُوْنُوْا عِبَادًا لِّيْ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ كُوْنُوْا
رَبّٰنِيّٖنَ بِمَا كُنْتُمْ تُعَلِّمُوْنَ الْكِتٰبَ وَبِمَا كُنْتُمْ
تَدْرُسُوْنَ ۝ وَلَا يَاْمُرَكُمْ اَنْ تَتَّخِذُوا الْمَلٰٓئِكَةَ وَ
النَّبِيّٖنَ اَرْبَابًا ؕ اَيَاْمُرُكُمْ بِالْكُفْرِ بَعْدَ اِذْ اَنْتُمْ
مُّسْلِمُوْنَ ۝

ع

کسی انسان کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ اللہ کی جانب سے انسانوں
کی رہنمائی کے لیے کتاب، حکم اور نبوت سے سرفراز ہو کر آئے۔[147]
پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ[148]
وہ تو یہی کہے گا کہ ربانی بن جاؤ کتاب اللہ کی تعلیم اور اس کے
پڑھنے پڑھانے کے ذریعے۔[149] وہ تم کو ہرگز یہ حکم نہ دے گا کہ
فرشتوں اور نبیوں کو رب بنا لو، کیا یہ ممکن ہے کہ وہ تمہیں کفر
کرنے کا حکم دے باوجودیکہ تم اس کے مسلم ہو۔[150]

رسالت کا جامع نصب العین :

نبوت کا نصب العین یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے اور ایک مخلوق دوسری مخلوق کو معبود نہ بنائے۔ یہ سعادت صرف نبوت کے ساتھ مخصوص ہے اس کے سوا اور کسی کو میسر نہیں بلکہ یہ بجز نبوت کے اور کسی کی زبان سے کبھی ادا نہیں ہوئی۔ نبوت کو نہ ماننے والے اگر خدا تعالےٰ کی توحید کے قائل ہیں تو وہ صرف صفت وجوب میں اس کو واحد کہتے ہیں، استحقاق عبادت میں نہیں۔ نبوت کے نزدیک حق سبحانہ کی ذات جس طرح صفت وجوب میں یکتا و یگانہ ہے اس کا کوئی شریک نہیں اسی طرح استحقاق عبادت میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں۔

یہ بھی نبوت کی خصوصیت ہے کہ ہر نبی اپنے آپ کو دوسرے انسانوں کی طرح اللہ کا بندہ تصور کرتا ہے۔ صرف ایک اللہ کی ذات کو معبود سمجھتا ہے اور لوگوں کو اللہ کی عبادت کی دعوت دیتا ہے۔ اللہ کی ذات گرامی کو حلول واتحاد سے پاک قرار دیتا ہے۔ نبوت کی تعلیمات کا اہم الاصول اور سب سے مزوری جز توحید ہے اور یہی نبوت کے ساز کا اصلی اور ازلی ترانہ ہے ممکن ہے کہ دنیا میں اسلام سے پہلے بہت سے اچھے اور پسندیدہ لوگ گزر چکے ہوں اور ان کی دعوت بھی مفید ہو۔ ان کے اخلاقی مواعظ بھی دل پسند ہوں۔ وہ یونان کے حکیم ہوں یا ہندوستان کے اوتار۔ لیکن ان کی تعلیم میں اگر توحید عبادت کی دعوت شامل نہیں تو وہ نبوت کے رتبہ کے قابل نہیں ہیں۔ کیونکہ پیغمبرانہ تعلیم کی پہچان ہی توحید کی دعوت ہے اگر یہ نہیں تو نبوت بھی نہیں بالفاظ دیگر تعلیم کی حیثیت سے نبوت کی شناخت اسی سے ہوسکتی ہے اسلام سے پہلے جس مدعی نبوت کی تبلیغ کا اہم ترین جز توحید نہیں اس کو دعویٰ نبوت کا کوئی حق نہیں۔ اس آیت میں اہل کتاب کو یہ بنیادی حقیقت سمجھائی جارہی ہے کہ نبوت کا جامع نصب العین توحید ہے۔ وفد نجران کی موجودگی میں کچھ یہودیوں نے کہا کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کیا تم یہ چاہتے ہو کہ تم تمہاری اسی طرح پرستش کریں جیسے عیسائی عیسیٰ ابن مریم کی کرتے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ معاذ اللہ ہم غیر اللہ کی بندگی کریں یا دوسروں کو اس کی دعوت دیں اللہ تعالےٰ نے ہمیں اس کام کے لیے روانہ نہیں کیا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1]

---

[1] بیان القرآن

۷۹ا۔ کسی انسان کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ اللہ کی جانب سے انسانوں کی رہنمائی کے لیے کتاب، حکم اور نبوت سے سرفراز ہو کر ایسے یعنی جس بشر کو حق تعالٰے کتاب، حکمت اور قوت فیصلہ دیتا ہے اور نبوت کے منصب جلیل پر فائز کرتا ہے۔ وہ ٹھیک ٹھیک پیغام الٰہی پہنچا کر لوگوں کو اس کی بندگی اور وفاداری کی طرف متوجہ کرتا ہے [۱]

لفظ حکم اور اس کی معنوی تحقیق :

اصل ارشاد میں کتاب، حکم اور نبوت کے الفاظ آئے، کتاب کے معنے توظاہر ہیں، حکم کے معنے لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں جس کا ترجمہ اردو میں سمجھ بوجھ کا نتیجہ کرسکتے ہیں امام راغب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں۔ کسی چیز پر حکم کرنا یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ چیز ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے۔ عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند کرسکو یا نہ کرسکو عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے۔ حکم کے معنے علم، سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنے کے ہیں جن انبیا پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں ہے اس علم و حکم کا ان کو بھی عطا ہونا ثابت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ وحی کتاب کے علاوہ علم و حکم سے کسی اور عطیہ ربانی کی طرف اشارہ ہے چنانچہ حضرت یوسف کے بارے میں اتینا ہ حکماً وعلماً حضرت لوط کے متعلق ہے کلاً اتینا حکماً وعلماً اور حضرت داؤد اور سلیمان کے بارے میں کلا اتینا حکماً وعلماً ایک موقعہ پر بنی اسرائیل کے لیے اپنی نعمتیں اللہ تعالٰے نے اس انداز میں شمار کی ہیں۔ اتینا بنی اسرائیل الکتاب والحکم والنبوۃ اس سے معلوم ہوا کہ کتاب حکم اور نبوت تین چیزیں ہیں۔ اتینا بنی اسرائیل الکتاب والحکم والنبوۃ

حکم سے مراد حکومت عجمی محاورہ ہے :

ان آیتوں میں حکم حکومت اور سلطنت کے معنے میں نہیں کیونکہ اس معنے میں یہ لفظ خالص اور قدیم عربی میں نہیں آتا ہے۔ یہ اہل عجم کا محاورہ ہے۔ قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوت فیصلہ کے معنے میں استعمال کیا ہے۔ جیسے فاحکم بیننا بالحق اور فاحکم بین الناس بالحق فحکم الی اللہ سب سے بڑھ کر یہ کہ یہی تین یا تین سورہ انعام میں بہت سے پیغمبروں کا نام لے کر کہی گئی ہیں۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

یہ وہ لوگ تھے جن کو ہم نے کتاب حکم اور نبوت دی تھی۔

جن پیغمبروں کے اوپر نام گنائے گئے اور جن کی طرف وہ لوگ کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے یہ ہیں حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت نوح، حضرت داؤد، حضرت سلیمان، حضرت ایوب حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت ہارون، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ، حضرت الیاس، حضرت اسماعیل، حضرت الیسع، حضرت یونس اور حضرت لوط علیہم السلام، ان اٹھارہ ناموں میں حکم بمعنے حکومت وسلطنت ہو تو اس کے مستحق صرف دو ہیں۔ سلیمان اور داؤد اور چاہے کسی طرح اور کسی تاویل سے یوسف اور موسیٰ کو شامل کر لیجیے۔ باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں۔ جن کو حکومت کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ اس لیے بلاشبہ حکم کا لفظ قرآن میں عربیت کے اصلی اور صریح معنے میں مستعمل ہے۔

زیر نظر آیت میں مخاطب اہل کتاب اور جس مقدس بشر کا اس آیت میں ذکر ہے۔ بظاہر اس سے مراد حضرت عیسیٰ ہیں۔ وہ نہ ہوں تو جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اور یہ اس وقت کی بات ہے جب یہود کی پوری قوت مدینہ کے اطراف اور حجاز میں موجود تھی۔ اور اسلام ہنوز ان کے مقابلہ ناتواں اور کمزور تھا۔ ایسی صورت میں جس حکم کے ملنے کا ذکر ان آیتوں میں ہے۔ وہ کتاب اور نبوت ہی کی جنس کی کوئی چیز ہو سکتی ہے کیونکہ حضرت عیسیٰ کو تو حکومت وسلطنت کا ادنیٰ شائبہ بھی عطا نہیں ہوا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وقت تک جب تک بنی اسرائیل اپنی ممتاز قوت کے ساتھ مدینہ اور حجاز میں موجود تھے۔ آیت ان الحکم الا اللہ میں بھی حکم سے مراد فیصلہ اور قضائے ربانی ہے۔ ان وجوہ میں یہ بات ہر قسم کے شبہ سے پاک ہے کہ انبیاء علیہم السلام کو منصب نبوت اور وحی کتاب کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے۔ جس کے صاف صریح معنے کلام عرب، لغت اور قرآن کے قرینوں سے علم فہم، فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کے ہیں اور اس لیے نبی کی اس قوت وطاقت کے علمی وعملی آثار و نتائج بھی ہمارے لیے واجب العمل ہیں۔

نبوت لوگوں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دیتی ہے۔

۱۴۸۔ پھر وہ لوگوں سے کہے کہ اللہ کو چھوڑ کر میرے بندے بن جاؤ۔ یعنی اس کا یہ کام کبھی نہیں ہو سکتا کہ ان کو ایک خالص خدا کی بندگی سے ہٹا کر خود اپنا یا کسی دوسرے کا بندہ بنانے لگے

اس کے تو معنے یہ ہوں گے کہ خداوند قدوس نے جس کو جس منصب کا اہل جان کر بھیجا تھا۔ فی الواقع وہ اس کا اہل نہ تھا۔ دنیا کی کوئی گورنمنٹ بھی اگر کسی شخص کو ایک ذمہ داری کے عہدے پر فائز کرتی ہے تو پہلے دو باتیں سوچ لیتی ہے ایک یہ کہ یہ شخص گورنمنٹ کی پالیسی کو سمجھنے اور اپنے فرائض کو انجام دینے کی لیاقت رکھتا ہے یا نہیں، دوم یہ کہ گورنمنٹ کے احکام کی تعمیل کرنے اور رعایا کو جادہ وفاداری پر قائم رکھنے کی کہاں تک اس سے توقع کی جا سکتی ہے۔ کوئی بادشاہ یا پارلیمنٹ ایسے آدمی کو نائب السلطنت یا سفیر مقرر نہیں کر سکتی جس کی نسبت حکومت کے خلاف بغاوت پھیلانے یا امن کی پالیسی اور احکام سے انحراف کرنے کا ادنیٰ شبہ ہو۔ بے شک یہ ممکن ہے کہ ایک شخص کی وفاداری اور قابلیت کا اندازہ حکومت صحیح طور پر نہ کر سکی ہو لیکن خداوند قدوس کے یہاں یہ بھی ممکن نہیں ہے۔ اگر کسی فرد کی نسبت اس کو علم ہے کہ میری وفاداری اور اطاعت شعاری سے بال برابر تجاوز نہ کرے گا تو محال ہے کہ وہ آگے چل کر اس کے خلاف ثابت ہو سکے ورنہ علم الٰہی کا غلط ہونا لازم آتا ہے۔ العیاذ باللہ۔ یہیں سے عصمت انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ بھی سمجھ میں آ جاتا ہے۔ (کما نبہ علیہ ابو حیان فی البحر وفصلہ مولانا محمد قاسم للعلوم والخیرات فی تصانیفہ) پھر جب انبیاء علیہم السلام ادنیٰ عصیان سے پاک ہیں تو شرک اور خدا کے مقابلے میں بغاوت کرنے کا امکان کہاں باقی رہ سکتا ہے۔ اس میں نصاریٰ کے اس دعویٰ کی بھی تردید ہو گئی جو کہتے ہیں کہ ابنیت والوہیت مسیح کا عقیدہ ہم کو خود مسیح علیہ السلام نے تعلیم کیا ہے اور ان مسلمانوں کو بھی نصیحت کر دی گئی جنہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے درخواست کی تھی کہ ہم سلام کی جگہ آپ کو سجدہ کیا کریں تو کیا حرج ہے۔ اور اہل کتاب پر بھی تعریض ہو گئی جنہوں نے اپنے احبار و رہبان کو خدائی کا درجہ دے رکھا تھا۔ (العیاذ باللہ)[1]

حصول کمال کا تیر بہدف نسخہ:

۱۴۹۔ وہ تو یہی کہے گا کہ کتاب اللہ کی تعلیم اور اس کے پڑھنے کے ذریعے ربانی بن جاؤ۔ موضح القرآن میں ہے جس کو اللہ نبی بنائے وہ لوگوں کو کفر و شرک سے نکال کر مسلمانی میں لائے پھر کیوں کر ان کو کفر سکھلائے گا۔ ہاں تم کو اے اہل کتاب یہ کہتا ہے کہ تم میں آگے جو دینداری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہی کتاب کا پڑھنا اور سکھانا وہ نہیں رہا۔ اب میری صحبت میں بھی رہی کمال حاصل کرو اور عالم فقیہ عارف، مدبر، متقی اور پکے خدا پرست بن جاؤ اور یہ بات قرآن حکیم کے پڑھنے اور پڑھانے اور سیکھنے اور سکھانے سے حاصل ہوتی ہے [1]

اس فقرے میں دو باتیں بتائی گئی ہیں۔ ایک ربانی بن جانے کا حکم اور دوسرے ربانی بننے کا طریق کار۔ پورے فقرے کا مطلب یہ ہے کہ جو نبی جو اللہ کی طرف سے نبوت، کتاب اور حکم کی بخشائشیں لے کر آیا ہے اس لیے نہیں آیا ہے کہ لوگوں کو اپنا بندہ بنائے بلکہ اس کے آنے کا مقصد وحید اور منتہائے نظر یہ ہے کہ لوگوں کو ربانی بننے کا حکم دے۔

ربانی کیا ہے؟ لغوی اعتبار سے ہماری رائے میں رب کی طرف اسم نسبت ہے۔ اہل عرب زور پیدا کرنے کے لیے نسبت میں الف نون بڑھا دیتے ہیں۔ اگر کسی داڑھی والے کو کہنا چاہیں کہ بہت بڑی داڑھی والا ہے۔ یعنی ڈرھیل تو کہتے ہیں لحیانی یہ لحیہ بمعنی داڑھی کی طرف سے اسم نسبت ربی بنا جیسے الہ سے الٰہی اس کو زور تاکید اور مبالغہ کی خاطر ربانی کہتے ہیں۔ یعنی بہت زیادہ خدا رسیدہ۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ کچھ کی رائے میں لفظ ربانی ربان کی طرف منسوب ہے۔ اور کچھ کا خیال ہے کہ رب کی طرف منسوب ہے جو مصدر ہے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ رب کی طرف اسم نسبت ہے جیسے الہ سے الٰہی اسی طرح ربانی ہے اور الف نون کی زیادتی اس میں ایسی ہے جیسے اہل عرب لحیانی اور جسمانی میں کرتے ہیں۔ اور کچھ کا کہنا ہے کہ لفظ ربانی اصل میں سریانی ہے اور یہی زیادہ مناسب ہے۔ لیکن علامہ آلوسی کا کہنا ہے کہ زیادہ صحیح یہی ہے کہ سریانی نہیں بلکہ عربی ہے۔ عربی لا سریانی علی الصحیح۔

ربانی کون ہیں؟

اس موضوع پر سب نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق داد تحقیق دی ہے علامہ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں ایک سے زیادہ اقوال لکھے ہیں۔ سرا ہے آپ بھی کچھ مزہ لے لیجئے۔

حکیم و عالم	قتادہ،
فقیہ	علی، عبداللہ بن عباس
عالم بردبار	قتادہ

[1] افادات شیخ الاسلام

حکیم و فقیہ	ابن عباس
فقیہ عالم	الحسن، الضحاک
صاحب امر	ابن زید
حکیم متقی	ابن جبیر
معلم	زجاج
عالم	مبرد
اللہ کی طاعت میں سرشار	زمخشری
عالم، حکیم، میزبان	عطاء
عالم باعمل	ابن جبیر

امام مجاہد کہتے ہیں کہ ربانی کا مقام حبر سے اونچا ہے۔ حبر عالم کو کہتے ہیں اور ربانی وہ ہے جس میں بیک وقت علم، فقہ، سیاسی بصیرت تدبیر ہو اور شہری زندگی کے معاملات کی ذمہ داری کا حامل ہو۔ اور امام بخاری فرماتے ہیں کہ ربانی وہ ہے جو لوگوں کو اہم علوم سے پہلے معمولی علم سکھائے ان میں کوئی تعارض نہیں ہے سب کا مفاد تقریباً ایک ہے لیکن اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو ان سب کا ماخذ خود قرآن کی اسی آیت میں موجود ہے کیونکہ اس آیت میں ربانی بننے کے حکم ہی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ ساتھ ہی ربانی بننے کا طریقہ بھی بتایا ہے۔ اور وہ یہ ہے بما کنتم تعلمون الکتاب و بما کنتم تدرسون یعنی تم کتاب الٰہی کے تعلیم و تعلم کے ذریعے ربانی بن سکتے ہو۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کی نظر میں ربانی وہ ہے جو تعلیم کا کام کر رہا ہو۔ یا تعلیم جس کا مشغلہ ہو۔ گویا قرآن نے قیامت تک حصول کمال کا یہ تیر بہدف نسخہ بتایا ہے کہ اگر کمال چاہتے ہو تو دو کاموں میں سے ایک کام کرو، کتاب الٰہی کو خود سیکھو اور دوسروں کو سکھاؤ۔ ترتیب طبعی کے لحاظ سے اگرچہ سیکھنا پہلے ہے۔ اور سکھانا بعد میں ہے مگر یہاں سکھانے کا پہلے ذکر کیا گیا ہے کیونکہ درجہ اور بزرگی کے لحاظ سے تعلیم و تعلم میں دوام و استمرار ہو اور یہ بطور صفت اس میں موجود رہوں۔

مفتی محمد عبدہ، مصری کی یہ بات بہت اچھی ہے کہ۔ اس آیت نے بتا دیا کہ ہر انسان کتاب الٰہی کے تعلیم و تعلم اور نشر و اشاعت کے ذریعے ربانی بن سکتا ہے اور یہ بات طے شدہ ہے۔ کہ اللہ کا قرب حاصل علم پر عمل سے ہوتا ہے۔ وہ علم جو انسان میں عمل کا ابھار پیدا نہیں کرتا وہ علم صحیح

نہیں ہے، علم کی صحت کا دارومدار اس پر ہے کہ علم عالم میں صفت اور ملکہ کا درجہ اختیار کرے۔ عمل صفت اور ملکہ ہی کے نتیجہ کو کہتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو کتاب الٰہی کے صرف نقوش ذہن میں مستحضر ہیں اور اس کا کوئی اثر اس کے عمل میں نہیں ہے وہ علمی فیضان کا دوسروں کے لیے ذریعہ نہیں ہو سکتا۔ روز کا مشاہدہ یہی ہے۔ اگر ایک شخص انجینیرنگ کی صرف چند اصطلاحات جانتا ہے اور کمزور سطحی معلومات کا حامل ہے وہ انجینیر نہیں ہو سکتا اور نہ انجینیرنگ کا استاد ہو سکتا ہے۔ چونکہ علم کا لازمہ عمل ہے اس لیے آیت میں عمل کی تصریح نہیں ہے۔ جیسے جزا کے ذکر میں صرف عمل کے ذکر پر اکتفا کر دیا جاتا ہے۔ کیونکہ عمل کے لیے علم لازم ہے۔ علم و عمل میں لازم و ملزوم کی نسبت ہے۔ کہیں صرف لازم کو ذکر کر دیا جاتا ہے اور کہیں صرف ملزوم کو۔

ساری غلط باتوں کی جامع تردید:

۱۵۰۔ کیا یہ ممکن ہے کہ وہ تمہیں کفر کرنے کا حکم دے باوجودیکہ تم اللہ کے فرمانبردار ہو یعنی پہلے تو ربانی اور اللہ والا اور مسلم موحد بنانے میں کوشش کی۔ جب لوگوں نے قبول کر لیا تو کیا پھر انہیں شرک و کفر کی طرف لے جا کر اپنی ساری محنت اور کمائی اپنے ہاتھ سے برباد کرے گا۔ یہ بات سمجھ میں نہیں آسکتی[1] یہ انداز تعبیر بتا رہا ہے۔ کہ انبیاء پرستی، ملائکہ پرستی صاف کفر کے حکم میں داخل ہے۔ آیت سے ان مسلمانوں کو بھی سبق لینا چاہیئے۔ جو اپنے شیوخ و اکابر کی خواہ زندہ ہوں یا مردہ تعظیم و عقیدت میں غلو کی حد تک پہنچ جاتے ہیں۔ جملہ کا سوالیہ انداز اظہار حیرت و انکار کے لیے ہے جیسے اردو میں کہتے ہیں کہ کہیں ایسا ہو سکتا ہے[2]

اس میں ان تمام غلط باتوں کی جامع تردید ہے جو دنیا کی مختلف قوموں نے اللہ سبحانہٗ کے رسولوں کی طرف منسوب کر کے اپنی مذہبی کتابوں میں شامل کر دی ہیں اور جن کی وجہ سے کوئی پیغمبر یا فرشتہ کسی نہ کسی طرح خدا اور معبود قرار پاتا ہے۔ اس آیت میں یہ قاعدہ کلیہ بتایا گیا ہے کہ ایسی کوئی تعلیم جو اللہ کے سوا کسی اور کی بندگی و پرستش سکھاتی ہو اور کسی بندے کو بندگی کی حد سے بڑھا کر خدائی کے مقام تک لے جاتی ہے ہرگز کسی پیغمبر کی دی ہوئی تعلیم نہیں ہو سکتی، جہاں کسی مذہبی کتاب میں یہ چیز نظر آئے تو سمجھ لو کہ یہ گمراہ کن لوگوں کی تحریفات کا نتیجہ ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2]

وَاِذْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ النَّبِيّٖنَ لَمَآ اٰتَيْتُكُمْ مِّنْ كِتٰبٍ وَّحِكْمَةٍ ثُمَّ جَآءَكُمْ رَسُوْلٌ مُّصَدِّقٌ لِّمَا مَعَكُمْ لَتُؤْمِنُنَّ بِهٖ وَلَتَنْصُرُنَّهٗ ؕ قَالَ ءَاَقْرَرْتُمْ وَاَخَذْتُمْ عَلٰى ذٰلِكُمْ اِصْرِيْ ؕ قَالُوْٓا اَقْرَرْنَا ؕ قَالَ فَاشْهَدُوْا وَاَنَا مَعَكُمْ مِّنَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ فَمَنْ تَوَلّٰى بَعْدَ ذٰلِكَ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ۝

اور دیکھو جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت عطا فرمائی ہے پھر تمہارے پاس رسول آئے اس کتاب کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہے تو ضروری ہے کہ تم اسے مانو اور اس کی مدد کرو[۱۵۱] ارشاد الٰہی ہوا کہ کیا تم اس بات کا اقرار کرتے ہو اور اس کی ذمہ داری لیتے ہو۔ انہوں نے عرض کیا بے شک ہم اقرار کرتے ہیں[۱۵۲] اس پر اللہ نے فرمایا ہاں اس پر گواہ رہو اور میں خود بھی تمہارے ساتھ اس پر گواہ ہوں۔ لہٰذا اب جو کوئی اس کے بعد اس سے روگردان ہو تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں[۱۵۳]

انبیاء میں حضورِ انور کا مطلبِ عالی

پہلی آیت میں رسالت کا جامع نصب العین یہ بتایا تھا کہ اللہ کی عبادت کی جائے اور اس کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ اب اس آیت میں یہ بتایا جارہا ہے کہ اللہ کی عبادت نبوت کی رہنمائی کے بغیر نہیں ہوسکتی۔ جیسے یہ ناممکن ہے کہ کوئی نبی لوگوں سے اپنی بندگی کرائے ایسے ہی یہ بھی ناممکن ہے کہ کوئی انسان نبوت کی رہنمائی کے بغیر اللہ کی بندگی کرسکے۔ چونکہ نبوت کے بغیر کوئی شخص اللہ کی بندگی نہیں کرسکتا ہے اس لیے انبیاء پر ایمان لانا اور ان کی بے چون وچرا اطاعت کرنا ہر شخص کا فرض ہے۔

آیت میں اس بات کو ظاہر کرنے کے لیے لفظ رسول لایا گیا ہے۔ رسول کا مقام سمجھنے کے لیے لفظ رسول سے زیادہ صحیح اور آسان کوئی اور لفظ نہیں۔ اس لفظ سے محبت وعظمت کے وہ تمام تقاضے پورے ہوجاتے ہیں جو ایک کامل انسان کے لیے فطرتِ انسانی میں موجزن ہوتے ہیں اور عبد ومعبود کی وہ ساری حدیں بھی محفوظ رہتی ہیں جو کفر وایمان کے درمیان حدِ فاصل کا کام دیتی ہیں۔ اس لیے اللہ سبحانہ کے سب پیغمبروں نے اپنا تعارف اسی لفظ رسول کے ذریعے پیش کیا ہے۔ اور آخر میں قرآن نے سب سے افضل اور سب سے برتر رسول کا تعارف جس لفظ میں پیش کیا وہ یہی لفظ رسول ہے۔ محمد رسول اللہ اور ما محمد الا رسول

اس سے معلوم ہوا کہ یہ کلمہ ایسا پرعظمت ہے کہ نبی الانبیاء کے تعارف کے لیے بھی اس سے زیادہ موزوں کوئی اور کلمہ نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ ہر دور میں مشہور ومعروف تھا۔ اس کے لوازم سب کو معلوم تھے، اس کے فرائض وواجبات سے سب آشنا تھے۔ اس کی شخصیت کے احترام سے سب آگاہ تھے اور یہ تو کسی غبی سے غبی تر انسان کے لیے راز نہ تھا کہ بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان ساری نوازشوں، کرم فرمائیوں کے باوجود برابری اور مساوات کا شائبہ تک ہو۔ اس لیے ہر رسول کا یہ کہہ دینا کہ میں اللہ سبحانہ، کا رسول ہوں ایسا ہی ہے جیسا کہ دنیا کے کسی بادشاہ کا سفیر کہہ دے کہ میں بادشاہ کا فرستادہ ہوں۔ لفظ رسول سے سننے والوں کے دلوں میں وہ ساری عظمتیں بیدار ہوجائیں محبت وتوقیر اطاعت اتباع کے وہ تمام جذبات نمایاں ہوجاتے جو رسول کے لیے ہونے چاہئیں۔ اور اور ساتھ ہی اسی لفظ کے ذریعے وہ تمام حدود بھی نظروں میں گھوم جائیں جو ایک بادشاہ اور اس

سے کے رسول میں فاصل پیدا کرتی ہیں۔ اس لیے محبت وطاعت کے ان جذبات کے ساتھ رسول کو ماننے والوں اور اس پر ایمان لانے والوں کا وہ جوہر توحید بھی شرک و کفر کے غبار سے آلودہ نہ ہوتا۔ جس کی دعوت کے لیے رسول آتا ہے۔ فی الواقع یہ مسئلہ ضروری ہونے کے ساتھ اپنے اندر بے حد نزاکت بھی رکھتا ہے کیونکہ ایک طرف توحید چاہتی ہے۔ کہ صرف اللہ ہی کی طاعت ومحبت ہو۔ دوسری طرف اللہ ہی خود اپنے سوا رسول کی محبت واطاعت کا بھی حکم دیتا ہے۔ قرآن نے بتایا کہ چونکہ رسالت کے تعلق کے بعد رسول کی ہستی بندے اور خدا کے درمیان معلم اور امام کی طرح ایک ذریعہ اور واسطہ ہوتی ہے اس لیے اس کی اطاعت ومحبت خدا ہی کی محبت واطاعت ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔

اس آیت میں کتاب وحکمت کے ساتھ جو رسول کا اہم اور بنیادی وصف پیش کیا ہے۔ وہ مصدق لما معکم ہے

۱۵۱۔ اور دیکھو جب اللہ نے نبیوں سے عہد لیا تھا کہ ہم نے تمہیں کتاب اور حکمت عطا فرمائی ہے پھر تمہارے پاس اگر رسول آئے اس کتاب کی تصدیق کرتا ہو جو تمہارے پاس ہے تو ضروری ہے کہ تم اسے مانو اور اس کی مدد کرو۔ اصل ارشاد میں آیا ہے

اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ اللہ نے بنی اسرائیل سے نبیوں کے بارے میں میثاق لیا تھا۔ اس صورت میں اضافت فاعل کی طرف نہیں بلکہ مفعول کی طرف ہے میثاق یہ تھا کہ جو انبیاء آئیں اور خاص طور پر آخری نبی جب تشریف لائیں تو سب سے آگے بڑھ کر ان پر ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا، دوسرے یہ کہ وہ میثاق جو نبیوں سے لیا گیا تھا اس صورت میں اضافت مفعول کی طرف نہیں فاعل کی طرف ہے۔ میثاق یہ تھا کہ اللہ نے نبیوں میں سے ہر نبی سے یہ عہد لیا تھا کہ جب بھی رسول آئے تو اس پر ایمان اور اس کی مدد کرنا۔ یہ عہد عالم ارواح میں اس ناسوتی دنیا سے قبل لیا تھا اور پھر عالم شہادت میں ہر نبی کے زمانے میں اس عہد کی تجدید ہوتی رہی ہے اور عہد الست کی طرح حضرات انبیاء نے اس عہد کو یاد دلایا تاکہ یاد کے بعد اس عہد کا ایفا کریں۔

آیت میں رسول کا مصداق:

اگر یہ نبیوں سے عہد ہے تو کس کے بارے میں ہے اس کے لیے تھوڑی سی تشریح کی

ضرورت ہے۔ آیت میں ثم جاءکم رسول مصدق لما معکم سے اس کی تعیین ہوتی ہے۔
یہاں رسول سے کون مراد ہے۔ اس موضوع پر حضرات صحابہ وتابعین سے دو رائیں منقول ہیں۔
ایک رائے میں رسول سے عام رسول اور عام نبی مراد ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ رسول سے
خاص جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مراد ہیں۔ اگر آیت میں رسول سے عام رسول مراد ہو
تو آیت کا حاصل یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ نے ہر نبی سے جو حضرت آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ تک
آئے یہ عہد لیا کہ جس کو ہم کتاب وحکمت دے کر روانہ کریں اور اس کے بعد دوسرا نبی آئے جو پہلے انبیاء
کی نبوت اور ان کی کتابوں اور حکمت کی اجمالاً یا تفصیلاً تصدیق کرنے والا ہو تو ضروری ہے۔ کہ
پہلا نبی بعد میں آنے والے نبی کی تصدیق اور اس کی صداقت پر ایمان لائے اور اس کی مدد کرے
یہ نہ ہو کہ پہلے نبی کا علم اور حکمت دوسرے نبی کی تصدیق اور نصرت سے مانع ہو اور اگر خود اس
دوسرے نبی کا زمانہ نہ پائے تو اپنی امت کو اس کی پوری پوری ہدایت کرے کہ اگر بعد میں آنے
والا پیغمبر کا زمانہ پاؤ تو اس پر ایمان لاؤ اور اس کی مدد کرنا۔ اس عموم میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ
وسلم بھی داخل ہیں کیونکہ جب عام طور پر اللہ سبحانہ، یہ عہد لے چکا کہ جو نبی اپنے سے پہلی کتاب و
حکمت کا مصدق آئے اس کی تصدیق اور نصرت ضروری ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق
اور نصرت ضروری ہے تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق ونصرت بطریق عموم اس عہد میں داخل
ہوگی کیونکہ آپ کی ذات گرامی بھی رسول اللہ ہے اور کتب سابقہ تورات وانجیل کی مصدق ہے۔
لہٰذا یہود ونصاریٰ کو اپنے عہد وپیمان کی بنا پر آپ پر ایمان لانا اور آپ کی تائید ونصرت کرنا ضروری
ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہود ونصاریٰ کو انبیاء سابقین کا عہد وپیمان یاد دلا کر عقلی طور پر سمجھایا جائے
تاکہ معقول پسند طبیعتیں کفر اور انکار سے باز آکر آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی نصرت کریں۔
اور اگر ثم جاءکم رسول میں رسول سے خاص محمد رسول اللہ کی ذات گرامی مراد ہو تو
آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے اور انبیاء نے اپنی امتوں سے اس بات کا عہد
لیا کہ اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوں اور تم ان کا زمانہ پاؤ تو ضرور بالضرور ان پر
ایمان لانا اور ان کی مدد کرنا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ آیات سابقہ سے اس آیت تک موضوع سخن
آپ ہی کی نبوت ہے۔ مخاطبوں کو دوسرے نبیوں کی نبوت میں کوئی کلام نہیں اس سبب سے ان کے
منوانے کا یہاں محل نہیں ہے۔ موقعہ اور مقام کا بلیغ تقاضا یہی ہے کہ رسول سے حضور انور صلی
اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی مراد ہے۔ یہی جمہور مفسرین کے نزدیک راجح ہے[1]۔ مولانا عثمانی

نے دونوں میں ہم آہنگی پیدا کردی ہے۔ عام لوگوں کا تو ذکر کیا ہے حق تعالیٰ[1] خود پیغمبروں سے بھی یہ پختہ عہد لے چھوڑا ہے کہ جب تم میں سے کسی نبی کے بعد دوسرا نبی آئے تو ضروری ہے کہ پہلا نبی پچھلے نبی کی صداقت پر ایمان لائے اور اس کی مدد کرے۔ اگر اس کا زمانہ پائے تو بذات خود بھی اور نہ پائے تو اپنی امت کو پوری طرح ہدایت کر جائے کہ بعد میں آنے والے پیغمبر پر ایمان لا کر اس کی اعانت و نصرت کرنا کہ یہ وصیت کر جانا بھی اس کی مدد میں داخل ہے۔

مخزن الکمالات ہستی کی امامت عظمیٰ

اس عام قاعدے سے روز روشن کی طرح واضح ہے کہ خاتم الانبیاء محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے اور ان کی مدد کرنے کا عہد بلا استثنا تمام انبیاء سابقین سے لیا گیا ہو گا۔ اور انہوں نے اپنی اپنی امتوں سے بھی قول و قرار لیے ہوں گے کیونکہ ایک آپ ہی کی مخزن الکمالات ہستی تھی جو عالم غیب میں سب سے پہلے اور عالم شہادت میں سب سے بعد جلوہ افروز ہونے والی تھی اور جس کے بعد کوئی نبی آنے والا ہی نہ تھا اور آپ ہی کا وجود باجود تمام انبیاء سابقین اور کتب سماویہ کی حقانیت پر مہر تصدیق ثبت کرنے والا تھا۔ چنانچہ حضرت علی اور عبداللہ بن عباس سے منقول ہے کہ اس قسم کا عہد تمام انبیاء سے لیا گیا اور خود آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر آج موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کو میری اتباع کے بغیر چارہ نہ ہوتا۔ اور فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام جب نازل ہوں کے تو کتاب اللہ اور تمہارے نبی کی سنت کے مطابق فیصلے کریں گے محشر میں شفاعت کبریٰ کے لیے پیش قدمی اور تمام بنی آدم کا آپ کے جھنڈے تلے جمع ہونا اور شب معراج میں بیت المقدس کے اندر تمام انبیاء کی امامت کرانا حضور کی اسی سیادت عامہ اور امامت عظمیٰ کے آثار ہیں

---

[1] اس ارشاد میں حضرت موسیٰ کی پیروی کا ذکر صرف اس لیے نہیں کہ نبوت محمدیہ جملہ ادیان کے لیے ناسخ ہے اس لیے ہے کہ ازل میں اللہ تعالیٰ نے انبیاء سے اس بات کا عہد لیا تھا کہ اگر انہیں حضور انور کا زمانہ ملے تو وہ آپ پر ایمان لائیں اور آپ کی مدد کریں اس عہد کی رو سے ہر نبی کا فرض ہے کہ اگر وہ آپ کا زمانہ پائے تو آپ پر ایمان لائے اور آپ کا ہی اتباع کرے۔

---

[1] معارف قرآن م ا

سے ہے اللّٰھم صل علیٰ سید نا محمد وعلیٰ آل سید نا محمد وبارك وسلم[1]۔

عالم غیب میں نبوت کی اوّلین نمائش!

یہ بات کہ عالم غیب میں حضور انور کی نبوت کی نمائش سب سے پہلے ہوئی۔ ترمذی کی اس حدیث سے معلوم ہوتی ہے جو حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے ان الفاظ میں آئی ہے۔

صحابہ نے دریافت کیا یارسول اللہ! آپ کو نبوت کب ملی فرمایا اس وقت جب کہ حضرت آدم علیہ السلام ابھی روح اور جسم کے درمیان تھے یعنی ان میں ابھی جان نہیں پڑی تھی۔

حافظ سخاوی فرماتے ہیں کہ اس حدیث کے مشہور الفاظ کنت نبیا وآدم بین الماء والطین ہمیں کسی حدیث کی کتاب میں نہیں مل سکے۔ حافظ سیوطی نے اس کا صاف طور پر انکار کر دیا ہے البتہ اس کے مضمون کو تسلیم کیا ہے۔ علامہ خفاجی شرح شفا میں تحریر فرماتے ہیں کہ اس حدیث سے دو باتیں ثابت ہوتی ہیں، اولاً آپ کا عالم غیب میں حقیقۃً نبوت سے سرفراز ہونا ثانیاً جس طرح صفتِ وجود میں آپ کی ذات گرامی مخلوقات میں سب سے مقدم تھی، اسی طرح صفت نبوت میں بھی آپ کا سب سے مقدم ہونا۔

اس موضوع پر سب سے اچھی بحث حافظ تقی الدین السبکی نے فرمائی ہے۔ موصوف نے اس آیت میثاق کی شرح میں ایک مستقل رسالہ لکھا ہے۔ اس رسالہ کا نام التعظیم والمنۃ فی معنی قولہ تعالیٰ لتومنن بہ ولتنصرنہ ہے۔ اس رسالہ کو علامہ یوسف نبہانی نے پورا کا پورا جواہر البحار میں نقل کر دیا وہ فرماتے ہیں کہ

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم غیب میں انبیاء علیہم السلام سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اسی نمونہ کا عہد لیا گیا تھا۔ جیسا امتوں سے نبیوں کے لیے یا رعایا سے خلفاء کے لیے اطاعت ونصرت کا عہد لیا گیا تھا۔ گویا انبیاء علیہم السلام کے درمیان میں آپ کا منصب عالی وہ تھا جو امتوں میں انبیاء علیہم السلام کا ہوتا ہے۔ اس لیے اور انبیاء تو صرف نبی ہیں اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نبی الانبیاء بھی ہیں۔ یہ حقیقت اگرچہ عالم اجسام میں پوری طرح صاف طور پر عیاں

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔

نہ ہو سکی مگر عالم غیب اور عالم اجسام سے ماوراء عالم میں جہاں بھی دیگر انبیاء کے ساتھ آپ کا اجتماع ہوا ہے ظاہر ہو گئی۔ پہلی بار یہ اجتماع شب معراج میں ہوا ہے جب کہ نماز کے لیے امام کی تلاش ہو رہی تھی۔ اس وقت تمام انبیاء کی صفوں میں امامت کی مستحق آپ ہی کی ذات گرامی ٹھہری گویا۔ امت میں امامت کا جو حق نبی کا ہوتا ہے وہی حق انبیاء میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہوا دوسرا اجتماع میدان حشر میں ہوگا۔ وہاں بھی سب انبیاء آپ ہی کے جھنڈے کے نیچے ہوں گے جیسا کہ ہر امت اپنے اپنے نبی کے جھنڈے کے نیچے ہوگی۔ تیسری بار شفاعت کا مرحلہ ہوگا یہاں بھی سب کے خطیب اور امام آپ ہی ہوں گے بالفاظ دیگر یوں سمجھئے کہ جو منصب نبوت آپ کو اس امت کے لیے حاصل ہے وہی منصب آپ کو انبیاء کے لیے بھی حاصل ہے۔ البتہ اس کا ظہور ان کے ساتھ اجتماع پر موقوف ہے۔ تاریخ میں یہ اجتماع تین جگہ ثابت ہوا ہے اور تینوں جگہ آپ کا یہ منصب عالی ظاہر ہوا ہے اگر اس عالم میں بھی انبیاء کا آپ کے ساتھ اجتماع ثابت ہو جاتا تو یہ حقیقت یہاں بھی آشکارا ہو جاتی۔

دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے لیے جسم عنصری کی شرط صرف تصرفات نبوت کے ظہور کے لیے ہے۔ نفس منصب نبوت کے لیے نہیں کیونکہ کسی حکم کا کسی شرط سے تعلق دو طرح پر ہوتا ہے۔ کبھی فاعل تصرف کے اعتبار سے اور کبھی محل قابل کے لحاظ سے یہاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے لیے جسم عنصری کی شرط فاعل متصرف کی طرف سے نہیں تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو منصب نبوت سے عالم غیب ہی میں سرفراز کر دیا تھا۔ جسم ناسوتی کی شرط تو صرف اس لیے تھی کہ جن کی طرف آپ رسول بن کر آئے ہیں۔ ان میں جسم کے بغیر استفادے کی قابلیت نہ تھی۔ تصرفات نبوت یعنی احکام الٰہی کی تبلیغ اس پر موقوف تھی کہ آپ جسم عنصری میں تشریف لا کر ان سے خطاب کریں۔ اگر مخاطبوں میں ان امور کی صلاحیت ہوتی تو وہ کمال نبوت کا اس سے پہلے ہی ادراک کر لیتے اس لیے قالب انسانی کی شرط یہاں نفس نبوت کے لیے نہیں بلکہ مخاطبوں کے لحاظ سے تھی۔

علامہ خفاجی کو تقی الدین السبکی کی اس رائے سے اختلاف ہے وہ اور انبیاء کے حق میں آپ کا یہ علاقہ تسلیم نہیں کرتے اور فرماتے ہیں کہ صرف تعظیم و توقیر، عظمت و نصرت کے عہد سے اتنا اہم علاقہ ثابت نہیں ہو سکتا لیکن علامہ خفاجی کو سبکی کی دوسری بحث بلا کسی اختلاف کے تسلیم ہے۔ یعنی یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو منصب نبوت سب سے پہلے عالم ارواح

ہی میں مرحمت ہو چکا تھا اور اس حدیث کا منشا صرف یہی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کو آپ کی نبوت کا علم تھا یہ ایک بدیہی اور غیر مفید سی بات ہے [1]

یہاں اتنی بات اور سمجھ لینی چاہیے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے ہر نبی سے یہی عہد لیا جاتا رہا ہے اور اسی بنا پر ہر نبی نے اپنی امت کو بعد کے آنے والے نبی کی خبر دی ہے اور اس کا ساتھ دینے کی ہدایت کی ہے۔ لیکن نہ قرآن میں نہ حدیث میں کہیں بھی اس امر کا پتہ نہیں چلتا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسا عہد لیا گیا ہو یا آپ نے اپنی امت کو کسی بعد کے آنے والے نبی کی خبر دے کر اس پر ایمان لانے کی ہدایت فرمائی ہو [2]

عہد کی تاکید و اہتمام:

۱۵۲۔ ارشاد الٰہی ہوا کہ کیا تم اس بات کا اقرار کرتے ہو اور اس کی ذمہ داری لیتے ہو۔ انہوں نے عرض کیا بے شک ہم اقرار کرتے ہیں۔ یہ الفاظ محض عہد کی تاکید اور اہتمام کے لیے فرمائے کیونکہ جس عہد نامہ پر اللہ تعالیٰ اور پیغمبروں کی گواہی ہو اس سے زیادہ پکی دستاویز اور کہاں ہو سکتی ہے [3]

جو بات جتنی زیادہ اہم ہوتی ہے اسی قدر اس کی تاکید زیادہ ہوتی ہے۔ آیت قرآنی کا رخ بتا رہا ہے کہ یہ عہد ہر نبی سے اور ہر نبی نے اپنی امت سے لیا ہے اسی بنا پر قرآن نے حضور انور کی ذات گرامی کو اہل کتاب کے لیے ماعرفوا جانی پہچانی چیز قرار دیا ہے۔ آپ کی ذات اہل کتاب کے لیے معروف اسی وقت ہو سکتی ہے جب ہر پیغمبر نے اپنی امت سے اس بات کا عہد لیا ہو کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں اور ان کی تائید و نصرت کریں۔ لیکن انہوں نے اس عہد کی کوئی پروا نہیں کی اس عہد کے کچھ آثار تورات و انجیل میں بھی موجود ہیں لیکن ان پر تحریفات کی دھند پڑ چکی ہے۔

عہد و پیمان سے پھر جانے کا انجام:

۱۵۳۔ لہٰذا اب جو کوئی اس کے بعد اس سے روگرداں ہو تو ایسے ہی لوگ فاسق ہیں یعنی جس چیز کا عہد اللہ نے تمام نبیوں سے لیا اور انبیاء نے اپنی اپنی امتوں سے لیا۔ اب اگر دنیا میں کوئی شخص اس سے روگردانی کرے تو بلاشبہ پرلے درجہ کا بدعہد اور نافرمان ہوگا۔ بائبل اعمال رسل باب ۳ آیت ۲۱ میں ہے۔

ضرور ہے کہ آسمان اسے لیے رہے اس وقت تک سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آویں کیونکہ موسیٰ نے اپنے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے ایک نبی میری مانند اٹھائے گا جو کچھ کہے سب سنو [4]

[1] ترجمان السنہ [2] تفہیم القرآن [3] افادات شیخ الاسلام [4] افادات شیخ الاسلام

أَفَغَيْرَ دِينِ اللّٰهِ يَبْغُونَ وَلَهٗٓ أَسْلَمَ مَنْ فِي السَّمٰوٰتِ
وَالْأَرْضِ طَوْعًا وَّكَرْهًا وَّإِلَيْهِ يُرْجَعُونَ ۝ قُلْ اٰمَنَّا
بِاللّٰهِ وَمَآ أُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَآ أُنْزِلَ عَلٰٓى إِبْرٰهِيمَ وَإِسْمٰعِيلَ
وَإِسْحٰقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطِ وَمَآ أُوتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى
وَالنَّبِيُّونَ مِنْ رَّبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْهُمْ وَنَحْنُ لَهٗ
مُسْلِمُونَ ۝ وَمَنْ يَّبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا فَلَنْ يُّقْبَلَ
مِنْهُ وَهُوَ فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِينَ ۝

کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کسی اور دین کو چاہتے ہیں؟
حالانکہ آسمان و زمین میں جو بھی ہے وہ خوشی یا ناخوشی سے اللہ
کے حکم کا فرمانبردار ہے اور بالآخر سب کو اسی کے حضور میں
پیش ہونا ہے[۸۵] اے پیغمبر کہہ دو ہمارا تو اللہ پر ایمان ہے
اور جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور یعقوب کی اولاد
پر نازل ہوا اس پر ایمان رکھتے ہیں نیز جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو
اور خدا کے تمام نبیوں کو خدا کی طرف سے ملا ہے اس پر بھی

ہمارا ایمان ہے۔ ہم ان رسولوں میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کرتے کہ (کسی کو مانیں اور کسی کو نہ مانیں) ہم خدا کے فرمانبردار ہیں۔[۱۵۵] اور دیکھو جو بھی اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کا خواہاں ہوگا وہ اس سے کبھی قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں اور بربادوں سے ہوگا۔[۱۵۶]

اسلام ابدی نجات اور حقیقی کامیابی کا ضامن ہے۔

اس سے پہلی آیت میں میثاق انبیاء کے ذریعے حضور انور کا منصب عالی پوری قوت کے ساتھ عالم غیب میں واضح ہو چکا ہے۔ اور ضمناً یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ حضور انور کی ذات گرامی اس لحاظ سے بہت بڑی امتیازی شان لے کر آئی ہے یعنی صرف اتنی بات نہیں کہ آپ کے بارے میں اللہ نے انبیاء سے عہد لیا اور انبیاء نے اپنی امتوں سے عہد لیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری پر آپ کو ایمان لانا ہے۔ اور آپ کی مدد کرنا ہے بلکہ اس عہد کے تسلسل میں یہ بات بھی موجود ہے کہ آپ کی ذات گرامی تمام مخلوقات کے لیے اللہ کی جانب سے پیغمبر بن کر آئی ہے اور یہ کہ آپ سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔ یعنی جیسے آپ کی بعثت عام اور آپ کی نبوت عالمگیر ہے۔ ایسے ہی ہمیشہ کے لیے بھی ہے آپ کے ساتھ وحی و رسالت کا سلسلہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا۔ دوسری رسالتوں کے مقابلے میں رسالت محمدی کی اس امتیازی شان کو پیش نظر رکھ کر اس بات پر غور فرمائیے کہ اس امتیازی شان کے تقاضے کیا ہیں۔ آئندہ آیات میں اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ اس امتیازی شان کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ کا دین صرف وہ ہے جو محمد رسول اللہ لے کر آئے ہیں۔ اس کے علاوہ جس قدر ادیان ہیں وہ غیر دین اللہ ہیں آپ جو کچھ لے کر آئے ہیں یہی اسلام ہے۔ یعنی تمام نبیوں اور رسولوں کا دین ہے۔ ضروری ہے۔ کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے کیونکہ جب یہ دین ساری دنیا کا دین اور اس کا لانے والا پیغمبر پوری نوع انسانی کا پیغمبر ہے اور ہمیشہ

کے لیے ہے تو اب کسی اور دین اور پیغمبر کی عقلاً گنجائش ہی نہیں ہے ۔
رسول تو آتا ہی اس لیے ہے کہ جن لوگوں کی طرف روانہ کیا گیا ہے وہ اسے اللہ کا رسول تسلیم کریں اور اس کی غیر مشروط طاعت کریں ۔ یہ ایک مسلمہ اصولی حقیقت ہے ۔

وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ

ہم رسول روانہ ہی اس لیے کرتے ہیں کہ اس کی بحکم الٰہی اطاعت کی جائے ۔
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں یہ مسلمہ اصولی حقیقت بے معنی نہیں ہے کوئی وجہ نہیں کہ یہاں بھی اس اصول کا اسی طرح اطلاق نہ ہو جس طرح کہ دوسرے تمام انبیاء کے سلسلے میں ہوتا آیا ہے ۔ اس لیے آپ کا ساری انسانوں کی طرف مبعوث ہونا سارے انبیاء کا اپنی امتوں سے آپ کے بارے میں عہد لینا اور اللہ سبحانہ ، کا سارے انبیاء سے عہد لینا اس بات کا مقتضی ہے کہ ہر انسان اور ہر زمانے کا انسان آپ پر ایمان لائے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین مان کر لازماً اسی کی پیروی کرے ۔ اگر کوئی آپ کو نہیں مانتا اور اسلام کے سوا کوئی اور دین اپناتا ہے ۔ تو وہ صرف آپ کے نہیں بلکہ اس فرمانروائے کائنات کے خلاف بغاوت کرتا ہے جس نے آپ کو پوری دنیا کا ہادی اور آخری نبی بنا کر روانہ کیا ہے ۔

ہمیشہ سے اللہ کا دین ایک ہے :

۱۵۴ ۔ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے علاوہ کسی اور دین کو چاہتے ہیں ۔ حالانکہ آسمان اور زمین میں جو بھی ہے وہ بخوشی و ناخوشی اللہ کے حکم کا فرمانبردار ہے اور بالآخر سب کو اسی کے حضور میں پیش ہونا ہے یعنی اللہ کا دین اسلام رہا ہے جس کے معنے ہیں حکم برداری مطلب یہ ہے کہ جس وقت حق تعالےٰ کا جو حکم کسی راستباز صادق القول پیغمبر کے توسط سے پہنچے اس کے سامنے گردن جھکا دو ۔ بس آج جو احکام و ہدایات سید المرسلین خاتم الانبیاء لے کر آئے ہیں وہی خدا کا دین ہے ۔ کیا اسے چھوڑ کر نجات و فلاح کا کوئی اور راستہ ڈھونڈتے ہیں ۔ خوب سمجھ لیں کہ اللہ کا دین چھوڑ کر کہیں ابدی نجات اور حقیقی فلاح نہیں مل سکتی ۔ آدمی کے لیے یہ سزاوار نہیں ہے کہ اپنی خوشی اور شوق سے اس خدا کی حکم برداری اختیار نہ کرے ۔ جس کے حکم تکوینی کے نیچے تمام آسمان و زمین کی چیزیں ہیں خواہ وہ حکم تکوینی ان کے ارادہ اور خوشی کے توسط سے ہو جیسے فرشتے اور فرمانبردار بندے اللہ کی اطاعت میں یا مجبوری اور لاچاری سے

جیسے عالم کا ذرہ ذرہ ان آثار و حوادث میں جن کا وقوع و ظہور بدون مخلوق کی مشیت و ارادے کے ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ارادہ و مشیت کے تابع ہے۔ سب کو بالآخر جب اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے تو عقل مند کو چاہیئے کہ پہلے سے تیاری رکھے یہاں نافرمانیاں کیں تو وہاں کیا منہ دکھائے گا۔[1]

اسلام کا بنیادی مفہوم

لغت کی رو سے اسلام کے معنے فرمانبرداری کے ہیں لیکن گفتگو جب دین کی زبان میں ہو رہی ہو تو اس وقت اس لفظ کے معنے صرف اس فرمانبرداری کے ہوتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ اور مسلم وہ ہوتا ہے جو احکام الٰہی کے مطابق زندگی گذارے اور ان سے سرتابی نہ کرے۔

تکوینی اسلام کیا ہے؟

احکام الٰہی دو طرح کے ہیں تکوینی اور تشریعی۔

تکوینی احکام ان حکموں کو کہتے ہیں، جن پر چارو ناچار عمل کرنا ہی پڑتا ہے اور جن کی خلاف ورزی ناممکن ہے کیونکہ مخلوق ان کی طاعت کرنے پر مجبور ہے اور اسے پیدائشی طور پر اس بات کی قطعاً آزادی نہیں ہے کہ چاہے تو عمل کرے اور چاہے نہ کرے۔ سورج کا کام ہے کہ روشنی اور گرمی پہنچائے، ہوا کو اس بات کا حکم ہے کہ وہ جانداروں کو زندہ رکھے، پانی کو حکم ہے کہ وہ پیاس بجھائے، آگ کو حکم ہے کہ جلائے اور انسان کو حکم ہے کہ زبان سے بولے کان سے سنے ناک سے سونگھے اور یہ سب کے سب اس بات پر مجبور ہیں کہ ان حکموں کی پابندی کریں کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ان کے بس ہی میں نہیں ہے۔ اس طرح کے احکام کو قوانین طبیعی اور قوانین قدرت بھی کہتے ہیں اور عام طور سے یہی نام زیادہ مشہور ہے۔

تشریعی احکام اللہ سبحانہ کے ان حکموں کو کہتے ہیں جن کی پیروی پیدائشی مجبوری کے ساتھ نہیں بلکہ آزاد مرضی کے ساتھ ہوتی ہے۔ مخلوق کو ان پر عمل کرنے کا بھی اختیار حاصل ہوتا ہے اور عمل نہ کرنے کا بھی مثلاً انسان کو حکم ہے کہ اللہ کی بندگی کرے لیکن وہ ایسا کرنے پر پیدائشی طور پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مجبور نہیں ہے بلکہ اسے اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو اسی ایک خدا کی بندگی کرے اور چاہے تو اس کے ساتھ ہزاروں کو خدا بنا لے اور چاہے تو سرے سے خدا اور خدائی ہی کا انکار کر بیٹھے۔ ان احکام کو شرعی احکام یا شرعی قوانین بھی کہتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کے احکام یکساں طور پر اللہ ہی کے احکام ہیں، دوسری طرف اللہ سبحانہ کی طاعت ہی کا نام اسلام ہے اس لیے ان میں سے ہر ایک کی طاعت اسلام ہی ہوگی۔ یہ ایک صاف اور کھلی ہوئی حقیقت ہے۔

پھر چونکہ جمادات سے لے کر انسانوں اور فرشتوں تک کوئی ایک مخلوق بھی ایسی نہیں ہے جو اپنے خالق کی محکوم نہ ہو اور جس کو تکوینی یا تشریعی کسی طرح کے احکام نہ دیے گئے ہوں۔ اس لیے اسلام اور مسلم ہونے کا مسئلہ صرف انسان ہی تک محدود نہیں رہ جاتا بلکہ پوری کائنات تک وسیع ہو جاتا ہے اور اسلام کسی ایک مخلوق کا نہیں بلکہ ساری مخلوقات کا دین قرار پاتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ ان مخلوقات کا دین بھی اسلام ہے جنہیں ارادہ واختیار کی آزادی سے محروم کر دیا گیا ہے اور جن کو صرف تکوینی احکام دیے گئے ہیں۔ یہ بات کہ بے ارادہ اور بے اختیار مخلوقات کا دین بھی اسلام ہی ہے اور وہ سب کے سب مسلم ہیں صرف عقل وقیاس کی بنا پر نہیں کہی جا رہی ہے بلکہ اس کی اصل قرآن عزیز کی یہی آیت ہے اس آیت میں کرھاً سے یہی تکوینی اسلام مراد ہے۔

تشریعی اور اصطلاحی اسلام

جن مخلوقات کو ارادہ واختیار کی آزادی دی گئی ہے۔ ان کی فطری پوزیشن یہ ہے کہ اگر بہت سی باتوں میں وہ پہلی قسم کی مخلوقات کی طرح مجبور وبے اختیار ہیں تو بہت سے معاملات میں اس طرح مجبور وبے اختیار نہیں ہیں بلکہ پیدائشی طور پر انہیں اس بات کی آزادی ملی ہوئی ہے۔ کہ ان معاملات میں جو روبہ بھی چاہیں اختیار کریں مثلاً انسان کے لیے بعض قوانین یہ ہیں کہ وہ آنکھ سے دیکھنے کا، کان سے سننے کا اور زبان سے بولنے کا کام لے اور کچھ دوسرے قوانین یہ ہیں کہ وہ آنکھ سے فلاں چیز دیکھے فلاں نہ دیکھے، کان سے اس طرح کی باتیں سنے اس طرح کی نہ سنے، زبان سے ایسی باتیں نکلیں ایسی نہ نکلیں۔ پہلی قسم کے قوانین کی پیروی تو وہ لازماً کرتا ہے۔ لیکن دوسری قسم کے قوانین کے بارے اسے کوئی مجبوری نہیں ہے یہی احکام تشریعی

ہیں اس کے لیے اس آیت میں طوعاً کی حسین تعبیر آئی ہے ۔

آیت کا مدعا :

اس آیت کا مدعا یہ ہے کہ کیا لوگ اللہ کے اس دین سے جو محمدؐ رسول اللہ لے کر تشریف لائے ہیں روگرداں ہو کر کوئی اور دین تلاش کرنا چاہتے ہیں حالانکہ پوری کائنات اسی کی فرمانبرداری کر رہی ہے۔ تکوین میں بھی اور تشریع میں بھی۔ تکوین میں مجبوراً فرمانبردار ہیں اور تشریع میں ارادہ و اختیار کے ساتھ۔ یعنی کائنات اور کائنات کی ہر چیز کا دین تو یہی اسلام ہے۔ اب تم اس کائنات کے اندر رہتے ہوئے اسلام کو چھوڑ کر اور کون سا طریقہ زندگی تلاش کر رہے ہو۔ لہٰذا فطرت اور عقل کا تقاضا یہی ہے کہ انسان اپنے محدود دائرہ اختیار میں بھی اسی خالق و مالک کے قوانین کی طوعاً فرمانبرداری کرے جس کے قوانین کی فرماں برداری دائرہ تکوین میں کرھاً کر رہا ہے اس طرح اس کی زندگی پوری کائنات کے ذرے ذرے سے ہم آہنگ ہو جائے گی یہی اسلام ہے اور اسی کی دعوت جناب محمد رسول اللہ لے کر تشریف لائے ہیں۔ پھر اس دینِ فطرت کو چھوڑ کر یہ اہل کتاب کس دین کے طلبگار ہیں؟

مسلمان کا موقف :

۱۵۵۔ اے پیغمبر کہہ دو ہمارا ایمان اللہ پر ہے اور جو کچھ ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور یعقوب کی اولاد پر نازل ہوا اس پر ایمان رکھتے ہیں نیز جو کچھ موسیٰ اور عیسیٰ کو اور خدا کی طرف سے سارے نبیوں کو ملا ہے، اس پر بھی ہمارا ایمان ہے ہم ان میں سے کسی ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کرتے ہم تو خدا کے ہی فرماں بردار ہیں۔ یعنی جو کچھ جس زمانے میں اللہ کی طرف سے اترا یا کسی پیغمبر کو دیا گیا۔ ہم بلا تفریق سب کو حق مانتے ہیں ایک مسلم کا یہ وتیرہ نہیں ہے کہ اللہ کے کچھ پیغمبروں کو مانے کچھ کو نہ مانے، گویا آخر میں ونحن له مسلمون کہہ کر اسلام کی حقیقت واضح کر دی اور آگاہ کر دیا کہ اسلام کسی نبی برحق اور کسی آسمانی کتاب کی تکذیب کا روادار نہیں اس کے نزدیک جس طرح قرآن حکیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا نہ ماننا کفر ہے ایسے ہی کسی ایک نبی یا کتاب سماوی کا نہ ماننا بھی کفر ہے۔

بلاشبہ پیغمبر آخر الزمان کی یہی شان ہونی چاہیے کہ وہ تمام پہلی کتابوں اور نبوتوں کا مصدق

ہو اور اس طرح کی تمام اقوام کو جن کے پاس مقامی نذیر و ہادی آتے رہے تھے جامعیت کبریٰ کے سب سے بڑے جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کا راستہ بتلائے[1]

اسی قسم کی آیت پہلے پارے کے آخر میں گذر چکی ہے وہاں مخاطب یہودی تھے ان کو اسلام کی پوری حقیقت سمجھانا مقصود تھی یہاں اصل مخاطب عیسائی ہیں ان کو اسلام سمجھانا مقصود ہے اس آیت میں اور پہلے پارے والی آیت میں یہ اہم اور بنیادی حقیقت سمجھائی گئی ہے کہ حق، حق ہے۔ وہ زمان و مکان کی تبدیلی سے تبدیل نہیں ہوتا۔ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جس قدر انبیاء آئے اور جس قدر کتابیں آئی ہیں سب ایک ہی ناقوس کی مختلف اوقات اور مختلف جگہوں میں صدائیں تھیں اور سب اسلام تھیں۔ ان میں جو دین بھی آیا وہ اس قوم اس زمانے اور اس علاقے کی ہدایت کے لیے بالکل کافی تھا جس کی خاطر اسے نازل کرنے والے نے نازل کیا۔ لیکن چونکہ ان میں ہر دین، ہر پیغمبر صرف ایک قوم کے لیے تھا تمام انسانوں کے لیے نہ تھا صرف ایک محدود علاقہ کے لیے تھا پوری دنیا کے لیے نہ تھا صرف ایک زمانے اور محدود مدت کے لیے تھا ہمیشہ کے لیے نہ تھا اس لیے قدرتی طور پر اس میں نہ عالمی معاملات و مسائل کے بارے میں ہدایتیں ہوتی تھیں نہ اس کی ساری تعلیمات کا مزاج بین الانسانی ہوتا تھا نہ وہ دور مستقبل کو سامنے رکھ کر گفتگو کرتا تھا غرض جس طرح اس کی مخاطبیت کا دائرہ محدود تھا اسی طرح اس کی تعلیمات کا مجموعہ بھی محدود اور مختصر ہوتا تھا۔ لیکن اللہ تعالیٰ کی جب مشیت اور حکمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ ایسا پیغمبر روانہ کیا جائے جو سب کے لیے ہو اور ہمیشہ کے لیے ہو تو فیصلے کا فطری تقاضا تھا کہ اس بات کا قطعی اعلان کر دیا جائے کہ اس کی دعوت کی پہلی بنیاد ہی یہ ہے کہ تمام رسولوں اور تمام آسمانی کتب کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے۔ یہی یقین کیا جائے کہ سب حق پر تھے سب اللہ سبحانہ، کی سچائی کے پیغمبر تھے۔ سب نے ایک ہی اصل و قانون کی تعلیم دی اور سب کی اس متفقہ تعلیم پر کاربند بنانا ہی میرا مشن ہے اور یہی ہدایت و سعادت کی تنہا راہ ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی جو ہدایت آدم علیہ السلام کے زمانے سے اترنی شروع ہوئی تھی اور جو نوع انسانی کے ذہنی اور تمدنی ارتقاء کے ساتھ ساتھ تفصیل اور وسعت کا رنگ اختیار کرتی چلی آرہی تھی وہ آج ہر پہلو سے مکمل ہو چکی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رسالتِ محمدّی دوسری رسالتوں کے مقابلہ میں،

رسالت محمدی دوسری رسالتوں کے مقابلے میں چند مخصوص امتیازات کی مالک ہے۔
اولاً، یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت عالمگیر ہے۔ آپ زمین کے کسی خاص خطے یا کسی ایک قوم کے لیے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں بلکہ ساری دنیا کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے تشریف لائے ہیں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جو آپ ہی کے لیے خاص ہے آپ سے پہلے جو انبیاء آئے تھے ان میں کسی کی یہ حیثیت نہ تھی۔
ثانیاً، یہ کہ آپ کی نبوت جس طرح عالمگیر ہے اسی طرح ہمیشہ کے لیے بھی ہے۔ آپ کے ساتھ وحی و رسالت کا سلسلہ ختم ہوگیا۔ اب قیامت تک کوئی نبی اور رسول نہ آئے گا۔
ثالثاً، یہ کہ آپ جو دین و شریعت لے کر آئے ہیں وہ ہر پہلو سے کامل ہے جب کہ پچھلے تمام دینوں اور شریعتوں میں سے یہ کسی کی شان نہ تھی۔
رابعاً، یہ کہ آپ پر جو کتاب اتری وہ جوں کی توں محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گی اس میں ایک لفظ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی۔
دوسری رسالتوں کے مقابلے میں رسالت محمدی کی اس امتیازی حیثیت کو نگاہ میں رکھئے اور پھر اس بات پر غور کیجئے کہ اس حیثیت کے کیا تقاضے ہو سکتے ہیں۔ کیا یہ کہ ان امتیازات کے باوجود اس نبوت کا بھی مقام و مرتبہ ہر پہلو سے ٹھیک وہی ہوگا جو دوسری نبوتوں کا ہے اور کیا اسلام کا حق بھی وہی ہے۔ جیسا کہ دوسرے ادیان کا ہے اسی سوال کا جواب آئندہ آیت میں دیا گیا ہے۔

اسلام کی پیروی شرط نجات ہے:

۱۵۶۔ اور دیکھو جو بھی اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کا خواہاں ہوگا وہ اس سے کبھی قبول نہ کیا جائے گا اور وہ آخرت میں تباہ کاروں میں سے ہوگا۔ یعنی جب خدا کا دین اسلام اپنی مکمل صورت میں آ پہنچا ہے تو کوئی جھوٹا یا نامکمل دین قبول نہیں کیا جائے گا۔ طلوع آفتاب کے بعد مٹی کے چراغ جلانا یا گیس، بجلی یا ستاروں کی روشنی تلاش کرنا محض لغو اور کھلی حماقت ہے مقامی نبوتوں اور علاقائی ہدایتوں کا دور گزر چکا۔ اب سب سے بڑی آخری اور عالمگیر نبوت

د ہدایت ہی سے روشنی حاصل کرنی چاہیئے۔ یہ ہی تمام روشنیوں کا خزانہ ہے جس میں پہلی تمام روشنیاں مدغم ہو چکی ہیں۔

فانك شمس والملوك كواكب
اذا طلعت لم يبد منهن كوكب[1]

سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں ہے؟ جواب معلوم کرنے سے پہلے دنیا کے مذاہب پر ایک نظر ڈالیے، کچھ مذہب تو وہ ہیں جو اپنے دامن میں قانون الٰہی ہونے کا ثبوت ہی نہیں رکھتے اس لیے ان کے ساتھ دینِ حق کے تقابل و توازن کا سوال ہی نہیں ہے، ہاں وہ مذاہب جو اپنے پاس آسمانی دین ہونے کا ثبوت رکھتے ہیں ان کو اس سوال کا حق ہے اور ان ہی کے غور و فکر کے لیے یہ اعلان کیا گیا ہے کہ اپنے اپنے زمانے میں تمام مذاہب حق اور کامل ہی تھے لیکن ان کی صداقت اور کمال کی حیثیت وہی تھی جو اپنے اپنے دور میں سلسلہ ارتقاء کی ہر کڑی کی ہوتی ہے۔ کوئی کڑی اپنے دور کے لحاظ سے ناقص نہیں ہوتی مگر یہ بھی واقعہ ہے کہ بعد میں آنے والی ہر کڑی پہلی کڑی کے مقابلہ میں کامل تر ہوتی ہے۔ اگر ایسا نہ ہو تو ارتقاء ہی بے معنے ہو کر رہ جائے۔

دراصل یہاں ناقص اور کامل کا سوال ہی بے محل ہے کیونکہ تقابل تو وہاں ہوتا ہے جہاں دو چیزیں علیحدہ علیحدہ ہوں۔ ایک ہی حقیقت کے مختلف مدارج و مراتب میں نقص و کمال کا سوال بے معنے ہے۔ جو صداقت حضرت آدم کے زمانہ سے شروع ہوئی اس کی حقیقت کبھی نہیں بدلی، اس کے ضروری اجزا ہر زمانے میں محفوظ رہے پھر کچھ دور آئے جن میں دین حق کی شریعتوں کی گرفت ذرا سخت ہوگئی لیکن ارتقاء کی طبعی رفتار کے پیش نظر یہ گرفت پھر ڈھیلی کر دی گئی اور اوامر و نواہی کا بوجھ ہلکا ہو گیا یہاں تک کہ سچائی کی ایسی آسان راہ دکھا دی گئی جس میں نہ تو عمل کے لیے دشواری ہے اور نہ عقل انسانی کے لیے بوجھ ہے اس کا نام اسلام ہے اور اب یہ پیغام کا مخصوص لقب ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی فیصلہ خداوندی کی تشریح اس طرح فرمائی ہے۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس امت میں جس کسی شخص تک خواہ یہودی ہو یا نصرانی میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میرے دین پر ایمان لائے بغیر مرگیا وہ دوزخی ہوگا۔ (مسلم بحوالہ ابوہریرہ)

اس حدیث میں نام اگرچہ یہود و نصاریٰ کے لیے گئے ہیں۔ مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نام مثال کے طور پر لیے گئے ہیں ورنہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ بالکل عام ہے اور ایک کلیہ اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ اسلام ہی ہے جس کا پہلا اعلان یہ ہے کہ آسمانی ادیان کی بنیاد تعصب اور فرقہ بندی پر نہیں ہے۔ ہر دین پہلے دین کا مصدق اور آئندہ کا مبشر بن کر آیا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری نے اللہ کے سب دینوں کی عظمت از سر نو زندہ کر دی۔ سب پیغمبروں کا احترام لازم قرار دیا۔ حضرت عیسیٰ کے منکر کو اسی طرح کافر قرار دیا جیسے محمد رسول اللہ کے انکار کرنے والے کو۔ گزشتہ انبیاء کے دامنوں پر دنیا نے جو دھبے لگا دیے تھے۔ اسلام نے سب کو دھو دیا۔ اللہ کی مقدس کتابوں میں خفیہ سازشوں کا انکشاف کیا اور اس طرح ان کی عظمت رفتہ کو پھر سے قائم کیا۔ اس نے پہلے رسولوں سے کٹ کر اور پہلے دینوں کو جھوٹا کہہ کر کسی نئے دین کی دعوت نہیں دی بلکہ اس حقیقت کی طرف بلایا جس کی ان کے پیغمبر وصیت کر گئے تھے۔ اسلام یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ تورات اور انجیل خدا کی کتابیں نہیں ہیں۔ وہ مانتا ہے کہ خدا کی کتابیں ہیں لیکن وہ کہتا ہے کہ ان کے پیرو کاروں کے تحریفات سے کچھ سے کچھ ہوگئی ہیں۔ اسلام یہ نہیں کہتا کہ محمد عربی کے سوا کسی پر ایمان نہ لاؤ بلکہ وہ خدا کے مقدس رسولوں کی عظمت کا سکہ دلوں میں قائم کرتا ہے۔

فی الواقع جو دین بین الاقوامی حیثیت سے کر آیا ہے اسے ایسے ہی تعلیمات کا مجموعہ بن کر آنا چاہیئے جس میں سب کے لیے یکساں جاذبیت ہو۔ وہ زمانہ ماضی میں کسی صداقت پر عمل کرنے والے کی تغلیط نہ کرتا ہو اور آج جب اپنی طرف دعوت یہ کہہ کر دے رہا ہے کہ تم میری دعوت کی اپنی کتاب سے تصدیق کر لو، اللہ کی مرضی ہے کہ اب منتشر ادیان و ملل کو ایک دین وملت بنائے۔ دنیا کی ابتداء میں ایک ہی دین تھا۔ اس کے خاتمہ پر پھر ایک ہی دین ہی ایک ہی ملت رہ جائے گی صراط مستقیم میں عقلی طور پر تعدد کی گنجائش نہیں اس لیے فرقے اور پارٹیاں جو کچھ بنائی ہیں پیروان مذاہب نے بنائی ہیں۔ باہمی رقابت اور عصبیت کے جراثیم جو کچھ پھیلائے انہوں نے ہی پھیلائے۔ فروعی اختلاف کو دین کی اساس سمجھ لیا اور اساسی مسائل کی اہمیت کو پس پشت ڈال دیا۔ اگر یہود و نصاریٰ غور کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ اسلام ان سے ایسی کسی بات کا بھی مطالبہ نہیں کرتا جو ان کی کتابوں کے خلاف ہو وہ یہ

ضرور کہتا ہے کہ تم نے صحیح طور سے حضرت عیسٰی کو نہیں پہچانا اور حضرت موسٰی کو ٹھیک نہیں سمجھا۔ بس صرف اتنا ہی کر لو کہ اپنے نبی کو صحیح طور پر پہچان لو اور ان کی تعلیمات پر صحیح طور پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ اگر ایسا کر لو گے تو جو رسول اب تمہیں مخاطب کر رہا ہے وہ ہی تمہیں اپنا رسول معلوم ہو گا۔ قرآن کو تم اپنی کتاب سمجھو گے وہ ہی شعلہ طور، وہی ید بیضا، وہی دم عیسٰی دیکھنا ہو تو یہاں آ کر دیکھو۔ تورات کے وہی شوکت احکام انجیل کی وہی سادہ اور رقت انگیز تعلیمات، زبور کی حمد و ثنا کے وہی ترانے پھر سننے ہوں تو یہاں آ کر سنو، یہ اس لیے کہ محمد رسول اللہ خدا کے تمام برگزیدہ انبیاء کی شانوں کا مجموعہ بن کر آئے ہیں۔

حسن یوسف دم عیسٰی ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ وَشَهِدُوا أَنَّ
الرَّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ ۚ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٨٦﴾
أُولَٰئِكَ جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمْ لَعْنَةَ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ
وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمُ
الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا مِنْ بَعْدِ
ذَٰلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٨٩﴾

اللہ ان لوگوں کو ہدایت کی نعمت سے کیونکر نواز سکتا ہے۔ جنہوں نے ایمان کے بعد راہ کفر اختیار کی حالانکہ وہ خود اس بات پر گواہی دے چکے کہ اللہ کا رسول برحق ہے اور ان کے پاس روشن دلیلیں آ چکی ہیں اللہ ظلم کار لوگوں کے لیے ہدایت کی راہ نہیں کھولتا[۱۵۷] ان ظلم پیشہ لوگوں کی جزا یہی ہے کہ ان پر اللہ کی اور فرشتوں اور سارے انسانوں کی پھٹکار ہے[۱۵۸] اسی حالت میں ان کو ہمیشہ رہنا ہوگا نہ ان کی سزا میں تخفیف ہوگی، اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی[۱۵۹]۔ ہاں وہ لوگ بچ جائیں۔

گے جو اس کے بعد توبہ کرکے اپنی اصلاح حال کر لیں، اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے[۱۶۰]

حق شناسی کے بعد اس سے گریز

حق سے انکار کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ ایک شخص نبوت کی تعلیم قبول نہیں کرتا اس لیے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آتی یا اس لیے کہ اس میں طلب صادق نہیں ہے یا اس لیے کہ جو راہ چل رہا ہے اسی پر قانع ہے۔ بہر حال کوئی وجہ ہو وہ نبوت سے متفق نہیں ہوتا دوسرے یہ کہ اس کے سامنے نبوت کی صداقت اور حقانیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے لیکن ظہور حق کے باوجود وہ اس لیے نہیں مانتا کہ اس میں نبوت کے خلاف کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے۔ اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بغض وعناد اور ظلم وشرارت کی سخت سے سخت صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح کا مخالف صرف یہی نہیں کرتا کہ وہ نبوت سے اختلاف رکھتا ہے۔ بلکہ اس کے اندر نبوت کے خلاف بغض وعناد کا ایک غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے وہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ نبوت کو ناکام بنانے کے درپے ہو جاتا ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ وہ ایسا کیوں کرتا ہے۔؟

قرآن بتاتا ہے کہ اس کی دو وجہ ہوتی ہیں ایک حسد دوسرے استکبار۔ اس سورت میں قرآن کے مخاطب اہل کتاب ہیں دونوں حسد اور استکبار کے بیمار ہیں، حسد اس بات پر کہ نبوت بنی اسرائیل سے نکل کر بنی اسماعیل میں پہنچ گئی۔ علامہ آلوسی نے حضرت حسن کے حوالے سے یہ انکشاف کیا ہے کہ اہل کتاب یہود اور نصاریٰ نے اپنی کتابوں میں حضور انور کے اوصاف دیکھے تو آپ کی نبوت کے معترف ہو گئے اور اس کے حق ہونے کا اعلان کرتے رہے لیکن جب حضور انور تشریف لائے تو محض اہل عرب سے حسد کی بنا پر اقرار و ایمان سے گریز کر گئے یہی حالت ہے جسے قرآن انسانی فکر و بصیرت کے تعطل سے تعبیر کرتا ہے۔ اور اسی کے لیے ایمان کے بعد کفر کا بلیغ پیرایہ اختیار کرتا ہے اسی کو شارحین قرآن کفر جحود کہتے ہیں۔

۱۵۷۔ اللہ ان لوگوں کو ہدایت کی نعمت سے کیونکر نواز سکتا ہے جنہوں نے ایمان

کے بعد راہ کفر اختیار کی حالانکہ وہ خود اس بات کی گواہی دے چکے ہیں کہ اللہ کا رسول برحق ہے اور ان کے پاس روشن دلیلیں آچکی ہیں اللہ ظالم کار لوگوں کے لیے ہدایت کی راہ نہیں کھولتا ہے جن لوگوں نے وضوح حق کے بعد جان بوجھ کر کفر اختیار کیا یعنی دل میں یقین رکھتے ہیں۔ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں بلکہ اپنی خاص مجلسوں میں اقرار کرتے ہیں کہ یہ رسول سچا ہے۔ اس کی حقانیت و صداقت کے روشن دلائل، کھلے نشانات اور صاف بشارات ان کو پہنچ چکی ہیں۔ اس پر بھی کبر و حسد اور حبِ جاہ و مال اسلام قبول کرنے اور کفر و عدوان کے چھوڑنے سے مانع ہے۔ جیسا کہ عموماً یہود و نصاریٰ کا حال تھا۔ ایسے ہٹ دھرم، ضدی، معاندین کی نسبت یہ کیونکر توقع ہو سکتی ہے کہ باوجود اس طرح کا رویہ قائم رکھنے کے اللہ تعالےٰ ان کو نجات و فلاح اور اپنی خوشنودی کے راستہ پر لے جائے گا یا جنت تک پہنچنے کی راہ بتائے گا اس کی عادت نہیں کہ ایسے بے انصاف متعصب ظالموں کو حقیقی کامیابی کی راہ دے۔ اسی پر ان بدبختوں کو قیاس کرلو جو قلبی معرفت و یقین کے درجہ سے بڑھ کر ایک مرتبہ مسلمان بھی ہو چکے تھے پھر دنیوی اغراض اور شیطانی اغوا سے مرتد ہو گئے۔ یہ ان پہلوں سے بھی زیادہ کج رو اور بے حیا واقع ہوئے اس لیے ان سے بڑھ کر لعنت و عقوبت کے مستحق ہوں گے[1]

اگرچہ کچھ نے یہ بھی کہا ہے کہ اس آیت میں ایک خاص گروہ کا ذکر ہے جو مسلمان ہو کر پھر دائرہ اسلام سے نکل گیا ہے چنانچہ لباب النقول میں السیوطی نے اس قسم کی روایات کی نشاندہی کی ہے مگر حسن اور ابن عباس سے روایات میں بالتصریح یہ بات کہی گئی ہے کہ ان آیات میں اہل کتاب کا ذکر ہے کفروا بعد ایمانھم یہ نہیں کہ حضور پر ایمان لائے اور پھر کافر ہو گئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کتابی ہونے کی وجہ سے انبیاء پر ایمان رکھتے تھے۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کر کے کافر ہو گئے۔ لا نفرق بین احد منھم کی وجہ سے ایک نبی کا انکار بھی کفر ہے اور اس میں اور زیادہ سنگینی اس سے پیدا ہو گئی کہ آپ کی صداقت اور حقانیت کو مانتے اور جانتے ہوئے منکر ہوئے یعنی ان کو معلوم ہو چکا تھا اور ان کی زبانوں تک سے اس امر کی شہادت ادا ہو چکی تھی کہ آپ نبی برحق ہیں اور جو تعلیم آپ لائے ہیں۔ وہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاء لاتے رہے ہیں۔ اب وہ جو کچھ کر رہے ہیں محض

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تعصب، ضد اور حق دشمنی کی پرانی عادت کا نتیجہ ہے جس کے وہ صدیوں سے خوگر ہیں شہد وا ان الرسول حق کا مطلب یہ ہے کہ درحقیقت یہ لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر چکے ہیں اور یہ بھی اسی مشاہدہ کا نتیجہ ہے۔ کہ علماء یہود آنے والے نبی کے متعلق تورات کی بیان کردہ مختلف علامات اور نشانیوں کو اپنے ذہن میں رکھ کر حاضر خدمت ہوتے تھے اور سوالات کرتے تھے اور آپ کا امتحان لیتے تھے۔ اور جب تسلی ہو جاتی تھی تو وہ مسلمان ہو جاتے تھے آیت میں بتایا گیا ہے کہ جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ دین کی ہدایت پاکر پھر دیدہ ودانستہ منحرف ہو جاتے ہیں اور سچائی کی کوئی دلیل اور حقیقت کی کوئی نشانی بھی ان کے لیے عبرت و بصیرت کا کام نہیں دیتی اور محض ضد اور شرارت سے نبوت کی دعوت کا معاندانہ مقابلہ کر رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ ایسے لوگوں کی اصلاح و ہدایت کی کوئی امید باقی نہیں رہی۔ ایسے لوگ اپنی فطرت اپنی عقل اور اپنی روح پر بہت بڑا ظلم کر رہے ہیں اور یہ سنت الٰہی ہے کہ اللہ سبحانہ ایسے لوگوں کو بامراد نہیں کرتا جو خود اپنے ہاتھوں اپنے نشانات راہ گم کر دیں۔

جزا قانون مکافات کا لازمی نتیجہ ہے۔

۱۵۸۔ ان ظلم پیشہ لوگوں کی سزا یہی ہے کہ ان پر اللہ کی فرشتوں کی اور سارے انسانوں کو پھٹکار رہے۔ یعنی خدا، فرشتے اور مسلمان لوگوں سب ان پر لعنت بھیجتے ہیں بلکہ ہر انسان بلکہ وہ خود بھی اپنے اوپر لعنت کرتے ہیں جب کہتے ہیں کہ ظالموں اور جھوٹوں پر خدا کی لعنت۔ گو اس وقت نہیں سمجھتے کہ یہ لعنت خود ان پر پڑ رہی ہے اور اس لعنت کا اثر ہمیشہ رہے گا۔[1]

جزا قانونِ مکافات کا لازمی نتیجہ ہے یعنی بُرائی ایک ایسی حالت ہے جس کا نتیجہ بُرا ہے۔ اچھائی ایک ایسی حالت ہے جس کا نتیجہ اچھا ہے۔

یہاں قرآن نے ظالموں سے ہدایت کی نفی کی ہے دوسرے مواقع پر فلاح کی نفی کی گئی ہے۔ ایسے تمام مواقع پر یہ قاعدہ یاد رکھنا چاہیئے۔ کہ قرآن نے جہاں ظلم کے کامیابی اور ہدایت کی نفی کی ہے وہاں بھی بتایا ہے کہ اس کا قانون یہ ہے کہ ظلم کے لیے کامیابی وسعادت کی راہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں کھلتی۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ سبحانہ، ہدایت کا دروازہ ان پر بند کر دیتا ہے اور وہ گمراہی کی زندگی پر مجبور کر دیے جاتے ہیں۔ ایسے لوگوں کی سزا یہی ہے کہ ان پر اللہ کی اللہ کے فرشتوں اور ساری مخلوق کی لعنت ہو۔

آیت میں الناس کے ساتھ اجمعین کی تاکید میں بہت گہری معنویت ہے۔ بتایا یہ ہے کہ ہر دور میں ان پر اچھے اور برے سب ہی لعنت کریں گے۔ اچھوں کا لعنت کرنا تو واضح ہے اور برے اس لیے لعنت کریں گے کہ وہ ان کی وجہ سے گمراہ ہوئے۔

عذاب میں دوام:

۱۵۹۔ اسی حالت میں ان کو ہمیشہ رہنا ہوگا نہ تو ان کی سزا میں تخفیف ہوگی اور نہ انہیں مہلت دی جائے گی۔ یعنی اسی لعنت کا اثر ہمیشہ رہے گا۔ دنیا میں پھٹکار اور آخرت میں خدا کی مار۔ انہیں نہ کسی وقت عذاب کی شدت میں کمی محسوس ہوگی اور نہ ذرا سی دیر کے لیے عذاب ملتوی کر کے آرام دیا جائے گا۔[1]

سمجھایا یہ جا رہا ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ آخرت کی سزائیں بھی دنیا کی سزاؤں کی طرح ہیں کہ اگر مجرم چاہے تو مال و دولت خرچ کر کے بچ جائے، نہیں اللہ کی عدالت میں گناہ کا کوئی بدلہ اور فدیہ قبول نہیں ہو سکتا وہاں کا عذاب دائمی ہے اس میں نہ کمی ہے اور نہ عذاب پانے والوں کے لیے کوئی مہلت ہے۔

توبہ کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے:

۱۶۰۔ ہاں وہ لوگ بچ جائیں گے جو اس کے بعد توبہ کر لیں گے اور اپنی اصلاح حال کر لیں۔ اللہ بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے۔ یعنی سخت بے حیا مجرموں اور شدید ترین باغیوں کو کون بادشاہ معافی دے سکتا ہے۔ لیکن یہ اس غفور رحیم کی بارگاہ ہے کہ اس قدر شدید جرائم اور بغاوتوں کے بعد بھی اگر مجرم نادم ہو کر سچے دل سے توبہ اور نیک چال چلن اختیار کرے تو سب گناہ یک قلم معاف کر دیے جاتے ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ توبہ و انابت کی حالت ایک ایسی حالت ہے جو تمام گناہوں کو محو کر دیتی ہے بشرطیکہ سچی توبہ ہو۔ قرآن نے توبہ کی سچائی کے لیے یہاں معیار یہ بتایا ہے کہ واصلحوا بیضاوی نے اس کے دو معنے بتائے ہیں ایک یہ کہ زندگی میں جہاں جہاں بگاڑ پیدا ہوا ہے اس میں بناؤ سنوار کرلیں دوسرے یہ کہ صالحانہ زندگی کو اپنا لیں۔ علامہ آلوسی کی یہاں یہ نکتہ آفرینی قابلِ داد ہے کہ صرف گزشتہ پر ندامت اور آئندہ نہ کرنے کا عہد ہی توبہ کے لیے کافی نہیں ہے جب کہ زندگی میں دوسرے حقوق پامال ہو رہے ہوں۔ حافظ ابن القیم رقمطراز ہیں کہ توبہ کے احکام میں سے یہ بھی ہے کہ گناہ کا تعلق اگر لوگوں کے حقوق سے ہو تو اس کی ادائیگی کرے۔

جو دین تمام ادیان کو ایک بنانے آیا ہے اس کے لیے ضروری تھا کہ وہ تمام اہل مذہب کی سب سے زیادہ مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے کیونکہ مذہب کی تلاش کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ بندہ کو اپنے مالک مولیٰ کے قہر سے نجات حاصل ہو جائے اس لیے اسلام اس کا اعلان کرتا ہے کہ ہر ملک و ملت اور رنگ و نسل کا جو آدمی بھی اس کی آغوش میں آجائے گا اس کے گناہوں کی مغفرت کا وہ ضامن ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ ازْدَادُوا كُفْرًا لَّن تُقْبَلَ
تَوْبَتُهُمْ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿٩٠﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا
وَهُمْ كُفَّارٌ فَلَن يُقْبَلَ مِنْ أَحَدِهِم مِّلْءُ الْأَرْضِ ذَهَبًا وَلَوِ افْتَدَىٰ
بِهِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُم مِّن نَّاصِرِينَ ﴿٩١﴾ ع ۹ / ۱۷

بلاشبہ جن لوگوں نے ایمان کے بعد راہِ کفر اختیار کی اور پھر اپنے کفر ہی میں ترقی کرتے گئے تو ایسے لوگوں کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی اور فی الواقع یہی لوگ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں[۱۶۱] بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کو اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں ان کو موت آئی۔ ان میں سے کوئی اگر پوری زمین کا پلاٹ سونے سے بھر دے پھر بھی قبول نہ ہوگا[۱۶۲] یہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور کوئی بھی ان کا عذاب سے بچانے میں مددگار نہ ہوگا[۱۶۳]

کن لوگوں کی توبہ قبول نہ ہو گی ؟

کفر کی راہ جو لوگ اختیار کرتے ہیں ان کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو کفر سے توبہ کر کے صالحانہ

زندگی اختیار کرلیں۔ ایسے لوگوں کی توبہ قبول ہے کیونکہ یہ لوگ قبولیت توبہ کی شرطیں پوری کر چکے ہیں الا الذین تابوا واصلحوا میں ان کا ہی ذکر کیا گیا ہے دوسرے وہ جو کفر سے توبہ تو کرتے ہیں لیکن ان کی توبہ صحیح نہیں ہوتی مثلاً وہ دل سے توبہ نہیں کرتے صرف زبان سے توبہ کا اظہار کرتے ہیں۔ ایسے لوگ مفاد پرست اور ابن الوقت ہوتے ہیں۔ اپنے مفادات اور مصالح کے تحت توبہ کرتے ہیں یا وقت گذرنے پر توبہ کرتے ہیں مثلاً فرعون نے ڈوبتے وقت توبہ کی ایسے ہی یہ لوگ اس وقت توبہ کریں جب زندگی کی لذتوں سے ہمدوش ہونے کا کوئی موقع نہیں اور موت سر پر کھڑی ہوئی تو ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی کیونکہ توبۂ قبولیت شرط ہی موجود نہیں۔ دل میں ایمان نہیں دل حق کی عداوت اور باطل کی محبت سے لبریز ہے زبان سے توبہ کی جارہی ہے یا توبہ کا وقت نکل چکا ہے۔ اور وقت نکلنے کے بعد مجبور ہو کر توبہ کررہے ہیں۔ آیت لن تقبل توبتھم میں اسی طبقہ کا بیان ہے۔

تیسرے وہ جو تمام عمر کفر پر قائم رہے کافرانہ زندگی گزاری اور ہر روز پوری زندگی کفر میں ہی ترقی کرتے رہے اور بالآخر بغیر توبہ کے مرگئے آخری آیت لن یقبل احدھم ملء الارض میں یہی لوگ مراد ہیں۔

۱۶۱۔ بلاشبہ جن لوگوں نے ایمان کے بعد راہ کفر اختیار کی اور پھر اپنے کفر میں ترقی کرتے گئے تو ایسے لوگوں کی توبہ ہرگز قبول نہ ہوگی اور فی الواقع یہی لوگ راہ سے بھٹکے ہوئے ہیں۔ یعنی جو لوگ حق کو مان کر اور سمجھ کر منکر ہوئے پھر اخیر تک انکار میں ترقی کرتے رہے نہ کبھی کفر سے ہٹنے کا نام لیا نہ حق اور اہل حق کی عداوت ترک کی بلکہ حق پرستوں کے ساتھ بحث ومناظرہ اور جنگ وجدل کرتے رہے جب مرنے کا وقت آیا اور فرشتے جان نکالنے لگے تو توبہ کی سوجھی یا کبھی کسی مصلحت سے ظاہری طور پر الفاظ توبہ کہہ دیتے یا کفر پر قائم رہتے ہوئے بعض دوسرے اعمال سے توبہ کرلی جن کو اپنے تئیں گناہ سمجھے ہوئے تھے یہ توبہ کسی کام کی نہیں ہے۔ بارگاہ رب العزت میں اس کے قبول کی کوئی امید نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کو بھی توبہ نصیب ہی نہ ہوگی۔ جو قبول ہو۔ ان کا کام ہمیشہ گمراہی کی وادیوں میں بھٹکتے رہنا ہے[1]۔

آیت میں کفر میں بڑھنے سے مراد کفر پر اصرار ہے کیونکہ جب کفر پر اصرار ہوتا ہے تو کفر میں

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔

اضافہ ہوتا جاتا ہے۔ عطا اور قتادہ دونوں تابعی ہیں۔ ان کے خیال میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہودی پہلے حضرت موسیٰ اور انبیائے بنی اسرائیل پر ایمان رکھتے تھے۔ حضرت عیسیٰ تشریف لائے ان کا انکار کرکے انہوں نے راہ کفر اختیار کی پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ ان کی بعثت کا انکار کرکے کفر میں اور بڑھوتری پیدا کی۔ لیکن آیت کو اگر عام رکھا جائے یہودیوں کی تخصیص نہیں سب اہل کتاب کا یہی حال ہے اور کفر میں ان کا ترقی کرنا حق کی مخالفت میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینا ہے۔ اور ثم ازدادوا کا مطلب یہ ہے کہ صرف حضور انور کی نبوت کے انکار ہی پر بس نہیں کی بلکہ عملاً مخالفت اور مزاحمت بھی کی اور ظاہر ہے کہ نبوت کی مخالفت بھی خود کفر ہے۔ اور اس طرح لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکنے کی کوشش میں اپنی انفرادی اور اجتماعی کوششیں لگا دیں، شبہات پیدا کیے، بدگمانیاں پھیلائیں۔ دلوں میں وسوسے ڈالے اور بدترین سازشیں اور ریشہ دوانیاں کیں تاکہ نبوت اپنے مشن میں کسی طرح کامیاب نہ ہوسکے۔ ان حالات میں توبہ کیسی۔ ایسے لوگ اگر گھر میں بیٹھ کر توبہ بھی کر لیں تو یہ توبہ قبول نہیں ہوتی۔

ایمان کے بغیر عمل کی کوئی قیمت نہیں:

۱۶۲۔ بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کو اختیار کیا اور کفر ہی کی حالت میں ان کو موت آگئی ان میں سے اگر کوئی پوری زمین کا پلاٹ سونے سے بھر کر بھی دے پھر بھی قبول نہ ہوگا۔ یعنی دنیا کی حکومتوں کی طرح وہاں سونے چاندی کی رشوت نہ چلے گی۔ وہاں تو صرف دولت ایمان کام دے سکتی ہے۔ فرض کرو کہ ایک کافر کے پاس اگر اتنا ڈھیر سونے کا ہو جس سے ساری زمین بھر جائے اور وہ سب کا سب خیرات کر دے تو خدا کے یہاں اس کی ذرہ برابر وقعت نہیں ہے۔ نہ آخرت میں یہ عمل کچھ کام دے گا کیونکہ عمل کی روح ایمان ہے۔ جو عمل روح ایمان سے خالی ہو مردہ عمل ہوگا۔ جو آخرت کی ابدی زندگی میں ہرگز کام نہ آئے گا۔[1]

قرآن عزیز نے ان لوگوں کے کاموں کی مثال جو ایمان سے محروم ہیں اس راکھ سے دی ہے جسے ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر منتشر کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ اسی طرح اس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شخص کے اعمال بھی جو ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہیں۔ سورہ نور میں ایمان کی دولت سے محروم لوگوں کے اعمال کی مثال سراب سے دی گئی ہے کہ اس کے وجود کی حقیقت سراب نظر سے زیادہ نہیں ہے۔ غرض چونکہ ایمان تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر عمل بے بنیاد ہے وہ زندگی میں سیرابی کا اصل سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدے سے خالی ہوتے ہیں۔

آیت میں ذھباً آیا ہے۔ لغت میں سونے کو کہتے ہیں مگر سونا مراد نہیں ہے بلکہ مراد کسی عزیز سے عزیز اور زیادہ سے زیادہ قیمتی شے کے فدیہ سے ہے۔ دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ کوئی شخص آج چاہے کہ حالت کفر میں قائم رہ کر روئے زمین کے برابر روپیہ کارِ خیر میں خرچ کر دے اور اس کے معاوضہ میں قیامت میں نجات حاصل کرے تو ایسا ہرگز نہ ہوگا حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ان سے کوئی نیکی بھی قبول نہ کی جائے گی۔

۱۶۴ یہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے دردناک عذاب ہے اور کوئی بھی ان کو عذاب سے بچانے میں مددگار نہ ہوگا۔ یعنی اگر فرض کر دکافر کے پاس وہاں اتنا مال ہو اور خود اپنی طرف سے درخواست کرکے بطور فدیہ پیش کرے کہ یہ لے کر مجھے چھوڑ دو تب بھی قبول نہیں کیا جا سکتا اور بدون پیش کیے تو پوچھتا ہی کون ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے۔

ان الذین کفروا لو ان لھم ما فی الارض جمیعاً و مثله معه لیفتدوا به من عذاب یوم القیامة ما تقبل منھم و لھم عذاب الیم[1]

عربی زبان کا یہ بڑا بلیغ اسلوب ہے اس میں بظاہر تو ایک چیز کے لازم کی نفی معلوم ہوتی ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ حقیقت میں ملزوم کی نفی ہے۔ امرء القیس نے ایک شعر میں ایک صحرائی راستہ کی تعریف کی ہے کہ لایھتدی بمنارہ اس کی برجیوں سے راستہ معلوم نہیں کیا جاتا۔ اس انداز بیان سے یہ بتانا مقصود ہے کہ اس صحرا میں رہنمائی کے لیے برجیاں اور منارے سرے سے موجود ہی نہیں ہیں۔

اسی اسلوب پر یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ کوئی ان کی مدد کرنے والا ہی موجود نہ ہوگا یہی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حقیقت دوسرے الفاظ میں اس طرح بیان ہوئی ہے۔ ولا ھم ینصرون مخاطب اصل میں یہود و نصاریٰ ہیں۔ ان کو اولادِ انبیاءؑ ہونے کا گھمنڈ تھا اور اس کی بنا پر وہ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ ان کی نجات ان بزرگوں کی مدد سے ہو جائے گی۔ یہ آیت ان کے اس توہم کے خلاف احتجاج ہے اور ان کو بتا رہی ہے کہ آخرت میں کام آنے والی چیز ایمان اور عمل صالح ہے۔

الحمد للہ آج بروز چہار شنبہ ۲۸ر جمادی الثانیہ ۱۳۹۵ھ مطابق ۹ر جولائی ۱۹۷۵ء بوقت ۱۲ بج کر ۳۰ منٹ پر دار العلوم الشہابیہ شہر سیالکوٹ میں تیسرے پارے کی تفسیر سے فراغت ہوئی۔

اللّٰھم وفقنی لا تمام التفسیر وتقبلہ منی انت السمیع العلیم

معالم القرآن

جلد چہارم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

علم وکتاب واٹس ایپ گروپ

ملکیت ـــــ ـــــ ادارہ تعلیمات قرآن، سیالکوٹ
تالیف ـــــ ـــــ حضرت مولانا الحاج محمد علی صاحب صدیقی کاندھلوی
عناوین ـــــ ـــــ ۴۹۶
آیات ـــــ ـــــ ۱۳۲
طابع ـــــ ـــــ حافظ عبد الرشید خاقان
تزئین و آرائش ـــــ ـــــ سید انور حسین نفیس رقم، لاہور
کتابت ـــــ ـــــ محمود احمد، گوجرانوالہ
ناشر ـــــ ـــــ قاری عبد الرحمٰن ایم۔اے
صفحات ـــــ ـــــ ۴۴۰
تاریخ اشاعت ـــــ ـــــ محرم الحرام ۱۳۹۷ھ مطابق جنوری ۱۹۷۷ء
مطبع ـــــ ـــــ زاہد بشیر پرنٹرز
طبع دوم جولائی ۱۹۹۰ء
قیمت ۔ ۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ: دار العلوم الشہابیہ زنگ پورہ روڈ سیالکوٹ شہر
پاکستان

انتساب

میں تفسیر معالم القرآن کی چہارم جلد کو جس میں اُمت کو دین کی تکمیل کی خوشخبری سُنا کر رہتی دُنیا تک قوامیت اور شہادت علی الناس کے منصب جلیل پر فائز کیا گیا ہے قابلِ صد احترام حافظ عبدالرشید خاقان صاحب کے نام منسوب کرتا ہوں جن کی قرآن کی اشاعت میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ دریا دلی سے یہ جلد زیور طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس جذبۂ خیر کو تا دیر قائم رکھے اور ان کے لیے دُنیا اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین۔

قاری عبدالرحمٰن ایم۔اے
ناظم ادارہ تعلیمات قرآن سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

(النساء)

حرفِ آغاز

باسمہٖ سبحانہٗ

معالم القرآن کی تیسری جلد ۳ جمادی الثانی ۱۳۹۶ھ مطابق یکم جون ۱۹۷۶ء میں شائع ہوئی تھی۔ آج پورے چھ ماہ کے بعد اس کی چوتھی جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل و انعام ہے کہ مجھ جیسے سیاہ کار سے وہ اپنے دین کا کام لے رہا ہے اور اپنے بندوں کے دلوں کو اس کے حسنِ قبول کے لیے کھول دیا ہے۔

میری دو دعائیں ہیں ایک یہ کہ اسے اللہ سبحانہٗ حسنِ قبول کی نعمت سے ہمدوش فرمائے اور دوسری یہ کہ وہ اپنے خاص فضل سے اس کام کو پایۂ تکمیل تک پہنچانے کی توفیق عطا فرمائے۔

معالم القرآن کی پہلی جلد شائع ہوئی، میں نے خواب میں دیکھا کہ میں بہت بڑی نہر کے کنارے کھڑا ہوں۔ نہر کی چوڑائی تقریباً دو فرلانگ ہے، اس کے کنارے تقریباً ۳۰ فٹ چوڑے ہیں۔ اس میں پانی دودھ سے مشابہ سپید ہے۔ اور جہاں میں کھڑا ہوں وہاں اونچی جگہ پر معالم القرآن رکھی ہوئی ہے اس خواب سے کام کے لیے الحمدللہ میری ہمت جوان ہو گئی ہے۔ جو کچھ، جیسا کچھ اور جتنا کچھ میرے بس میں ہے اللہ کی توفیق سے میں اسے انجام دے رہا ہوں۔

اکتوبر ۷۵ء میں جب پہلی جلد شائع ہوئی، اس وقت میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ میرا یہ قدم کامیاب ہوگا مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اس نے محض اپنے فضل و کرم سے اسے شرفِ قبول بخشا اور اربابِ فضل و کمال نے اس کو پسند کیا، اس وقت میری مسرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب بزرگوں نے اپنے خطوط میں اس کو سراہا۔ اللہ کے بھروسہ پر کام کر رہا ہوں۔ اس سلسلے میں مجھے کافی محنت سے دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ کام اجتماعی ہے اور میں تنہا کر رہا ہوں۔

چونکہ میرا کام یہ ہے کہ بکھری ہوئی چیزوں کو جمع کروں اس لیے مجھے قدم قدم پر کتابوں کی قلت شدت سے محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ انجمن دارالعلوم الشہابیہ ایک عظیم کتب خانے کی مالک ہے مگر کام

کی عظمت کے سامنے اس کی عظمت بے اثر ہے۔ چنانچہ اسی چوتھی جلد میں جب اسلام کے معاشرتی نظام، نکاح و طلاق کے مسائل سامنے آتے تو ضرورت محسوس ہوئی کہ مختلف مکاتیب فکر کا علمی ذخیرہ موجود ہو تاکہ اس سے استفادہ کیا جائے خصوصاً امامیہ کی کتب حدیث اور فقہ جعفری کی ضرورت محسوس ہوئی۔ انجمن کے کتب خانے میں ایسی کوئی کتاب موجود نہ تھی۔ احباب کے تعاون سے اہل تشیع کی تفسیر و حدیث کی کتابیں مہیا کی گئیں اور تقریباً پانچ ہزار روپے کی کتابیں انجمن کی لائبریری کے لیے خریدی گئی ہیں۔ اگرچہ کتابوں کے بدیر فراہم ہونے کی وجہ سے میں اس جلد میں ان کتابوں سے کوئی استفادہ نہ کر سکا۔ تاہم مجھے پانچویں پارے میں یہ کتابیں قدم قدم پر کام دے رہی ہیں۔

اس جلد میں زیادہ تر زیر بحث اجتماعی قوانین ہیں یعنی یہ بتایا گیا ہے کہ امت کی تکوین کیسے ہوتی ہے اور اس کے لوازم کیا ہیں۔ آخر کے چار رکوع کو چھوڑ کر کہ ان کا تعلق اسلام کے نظام معاشرت سے ہے پورا پارہ اجتماعی قوانین کا ایک خوان نعمت ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ ان قوانین کو کھول کر پیش کیا جائے۔ اس سلسلے میں مجھے اپنی علمی کم مائیگی کا اعتراف ہے اور یہ افسوس کی بات ہے کہ اس موضوع پر کوئی علمی کام نہیں ہوا اس لیے کوئی خاص علمی کتاب موجود نہیں ہے اور اگر موجود ہے تو میرے مبلغ علم کی دسترس سے باہر ہے۔

اس سلسلے میں مجھے بہت محنت کرنی پڑی ہے اور کتابوں کے مطالعوں کے لیے زیادہ وقت نکالنا پڑا۔ کویت کے سفر میں وہاں کی پبلک لائبریریوں میں کافی علمی مواد ملا۔ لیکن کویت کی شبانہ روز کی مصروفیات میں اتنی فرصت نہ ملی کہ کام کیا جائے۔

مجھے اعتراف ہے کہ اس موضوع پر جس انداز سے تفصیلی تبصرہ ہونا چاہیے میں نہ کر سکا ہیں کوشش کروں گا کہ آئندہ اس کمی کو پورا کر دوں۔

احباب سے میری صرف یہ درخواست ہے کہ وہ دعا کریں کہ قرآن کی تشریح و تفسیر میں میرا قلم صراط مستقیم سے تجاوز نہ کرے۔ میں نے اپنے علم کی حد تک اس کی پوری احتیاط کی ہے لیکن اللہ ہی جانتا ہے کہ قدم نے کہاں ٹھوکر کھائی ہے اس لیے اس کی بارگاہ میں دعا ہے کہ

ربنا لا تزغ قلوبنا بعد اذ هديتنا وهب لنا من لدنك رحمة انك انت الوهاب ۔

مقدمہ

باسمہٖ سبحانہٗ

اس میں تذکیر و موعظت کے لیے جو باتیں بطور قوانین اجتماعی اختیار کی ہیں اور جنہیں اس نے سنن، آیات، بیان، ہدایت، اور موعظت سے تعبیر کیا ہے ان میں نمایاں استدلال تکوینِ اُمت کا استدلال ہے۔

تکوینِ اُمت کے سلسلے میں قرآن نے یہ باتیں کھول کر بتائی ہیں کہ

اُمتِ مومنہ ہونے کی حیثیت میں اہلِ کتاب میں سے کسی گروہ کی طاعت ایمان سے محرومی ہے۔

اُمت ہونے کی حیثیت میں تمہاری سیاسی برتری نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے وابستگی پر موقوف ہے۔

نبوت کے علم و عمل سے جُدا ہو کر تمہاری مسلمانہ زندگی کسی صورت میں باقی نہیں رہ سکتی۔

اُمت ہونے کی حیثیت میں تمہارا کام دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اور اسی پر تمہاری دنیوی اور اُخروی فلاح کا دار و مدار ہے۔

افتراق باہمی اور اختلاف راہِ حق سے روگردانی ہے اور اس کا نتیجہ عذابِ عظیم ہے۔

مقصد کی راہ میں مصائب و محن ناگزیر ہیں۔ ان کے بغیر کامیابی ناممکن ہے۔ یہ اور اس قسم کی دوسری باتیں قرآن نے غزوۂ اُحد کے تذکرے میں بیان کی ہیں۔ قرآن نے خود یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس بیان سے اس کا مقصود کیا ہے۔ جیسا کہ اسی پارے کی آیت ۱۳۰ میں آ رہا ہے اور جب ہم اس پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہو جاتا ہے کہ مقصود یہ نہیں ہے کہ غزوۂ اُحد کی مورخین کی طرح تاریخ بیان کی جائے بلکہ کچھ قوانین ہیں جن کا وہ دلوں میں اذعان پیدا کرنا چاہتا ہے اور یہ واقعات اس کے لیے دلیلیں اور حجتیں ہیں، براہین ہیں۔ سمجھ لینا چاہیے کہ اُحد کی یہ سرگزشت دلیل و حجت کیوں کر ہوئی۔ بات بالکل صاف ہے کیونکہ خود قرآن نے کھول کھول کر ہر جگہ بتلا دی ہے۔ یہاں بھی اوّلاً صراحتہً فرمایا کہ تلک الایام نداولہا بین الناس اور پھر تکرار کے ساتھ لامِ تعلیل لا کر اس کی طرف اشارات

کیے ہیں ۔

مولانا آزاد کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ کائنات ہستی کے جس گوشہ پر بھی نظر ڈالو گے تمہیں ایک حقیقت ابھری ہوئی نظر آئے گی بشرطیکہ دیکھنے سے انکار نہ کرو ۔ وہ کہتا ہے "قوانین فطرت کی وحدت" یعنی ہر جگہ ایک ہی قانون ایک ہی طرح پر کام کر رہا ہے ۔ کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اپنے قانون میں دوسروں سے ذرا بھی الگ ہو ۔ بلاشبہ بھیس بہت ہو گئے اور نام بھی یکساں نہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے اور جونہی سامنے کے پردے ہٹاتے ہو اصلیت کی بے لاگ وحدت آ کھڑی ہوتی ہے مثلاً تم کہتے ہو کہ حیوان کے لیے موت و حیات ہے ، پھولوں کے لیے کھلنا اور مرجھانا ہے ، پتھروں کے لیے بننا اور پامال ہونا ہے ۔ اجزا کے لیے ملنا اور بکھر جانا ہے مگر کیا صورتیں بہت ہو گئیں ، نام کئی ہو گئے ، مگر کیا حقیقت بھی متعدد ہو گئی ، وہی قانون جو حیوانات میں موت و حیات تھا نباتات میں بھی مرجھانا اور کھلنا ہوا ، جمادات میں بننا اور پامال ہونا ، اجزا میں ملنا اور بکھرنا ، الفاظ بدلتے جاؤ معنے نہیں بدل سکتے ۔

غور کرو کہ جب کائنات کے ہر گوشہ میں وحدت قانون کی بنیادی اصل کام کر رہی ہے تو کیونکر ہو سکتا ہے کہ اعمال انسانی کا گوشہ اس سے باہر ہو ، اور وہاں بھی کوئی قانون کام نہ کر رہا ہو ، اور وہی اور ایسا ہی نہ ہو جیسا گوشوں میں ہے ۔ قرآن کے نزدیک یہ گوشہ بھی دوسرے گوشوں کے ساتھ جکڑا ہوا ہے ، اسی طرح جس طرح یہاں کا ہر گوشہ دوسرے گوشہ سے مربوط ہے ۔ عالم معنے میں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں کارفرما ہے اور عالم معنے کے بھی وہی احکام اور نتائج ہیں جو دوسرے گوشوں میں نظر آ رہے ہیں ۔ مثلاً اگر عالم مادی میں تم دیکھتے ہو کہ آگ کا خاصہ جلانا ہے اور ایسا نہیں ہو سکتا کہ آگ روشن ہو اور اس کے شعلوں سے ٹھنڈک نکلے ، تو تمہیں اس سے انکار نہیں کرنا چاہیے کہ یہاں بھی کوئی بات آگ کی طرح ہو سکتی ہے اور جب وہ ظہور میں آ جائے تو اس سے گرمی ہی نکلے گی ، ٹھنڈک نہیں نکل سکتی ۔ یعنی مادیات کے خواص کی طرح معنویات کے بھی خواص ہیں اور خواص و نتائج کا ایک ہی عالمگیر قانون یکساں طور پر دونوں جگہ کام کر رہا ہے ۔ اور پھر جس طرح یہاں ہر بات کے لیے فطرت کے مقررہ قوانین ہیں اسی طرح اعمال اور جماعتوں کی سعادت و شقاوت اور حیات و موت کا بھی ایک قانون ہے اور جس طرح فطرت کے تمام قوانین یکساں ہیں ، عالمگیر ہیں ، غیر مبدل ہیں ، اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی طرح رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوتے ہیں ۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر

مختلف نہیں ہو سکتی، جس طرح سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہی ہے خواہ کسی ملک اور عہد میں کھایا جائے۔ اسی طرح قانونِ اجتماعی کے نتائج بھی یکساں ہی ہوں گے خواہ کسی ملک اور عہد میں پیش آئیں یہ نہیں کہ افتراق و اختلاف باہمی اب سے ہزار برس پہلے عذاب عظیم ہو اور اب رحمت عظیمہ ہو جائے، جو کچھ ماضی میں پیش آچکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آجاتے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی کیونکہ فطرت کے قوانین میں تبدیلی نہیں ہے۔ قرآن نے جا بجا اس قانون کو سنۃ اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

اجتماعی قوانین کے لیے قرآن کا حوادث و واقعات سے استدلال فی الواقع طبیعتِ انسانی کا وجدانی اذعان ہے۔ انسان کی ذہنی فطرت کا مطالعہ کرو تمہیں معلوم ہوگا کہ انسان حوادث و واقعات سے بالطبع متاثر ہوتا ہے اور اس کے اندر کوئی چیز ہے جو اسے بتلا دیتی ہے کہ ایک مرتبہ کا حادثہ ایک ہی مرتبہ کا حادثہ نہیں ہے۔ خواص و نتائج دائمی ہیں۔ ایک بچہ پہلی بار آگ میں انگلی ڈالتا ہے اور انگلی جلنے لگتی ہے۔ پھر جب کبھی اس کے سامنے آگ آتی ہے خود بخود ہاتھ کھینچ لیتا ہے کیوں؟ اسی لیے کہ اس کے اندر کوئی چیز ہے جو اسے بتلا دیتی ہے کہ جس چیز نے ایک مرتبہ جلایا ہے وہ ہمیشہ جلائے گی۔ یہ اعتقاد کہ آگ ہمیشہ جلاتی ہے لسے صرف اتنی بات سے حاصل ہو گیا کہ آگ نے ایک مرتبہ جلایا تھا۔

طبیعتِ انسانی کا یہی وجدانی تاثر ہے جس نے ہمارے ذہن میں استقراء کا اعتقاد پیدا کر دیا۔ اب ہمارے تمام علوم و معارف کا یہی سنگ بنیاد ہے۔

قرآن کا دعویٰ یہی ہے کہ اگر تم وجدانی طور پر یہ بات محسوس کرتے ہو کہ خواص و نتائج کا تسلسل ایک حقیقت ہے تو پھر تم کیسے انکار کر سکتے ہو کہ اعمالِ انسانی کے لیے یہ حقیقت معطل ہو گئی اور یہاں ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر تم کہتے ہو کہ فلاں بات سے ایسا نتیجہ ضرور نکلے گا کیونکہ بار بار ایسا ہی ہو چکا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے کہ قرآن بار بار کہتا ہے کہ تم ہی پہلی امت نہیں ہو تم سے پہلے بھی اور بے شمار قومیں اسی زمین میں گزر چکی ہیں۔ ان کی بھی آبادیاں تھیں، قوتیں اور شوکتیں تھیں، سر بفلک عمارتیں تھیں، فکر و عمل کی سرگرمیاں تھیں۔ دُنیا کی سیر کرو، گزری ہوئی سرگزشتیں سنو، مٹی ہوئی نشانیوں کا کھوج لگاؤ اور پھر دیکھو کہ اجتماعی قانون کا کیا عمل درآمد رہ چکا ہے۔ اور اگر ہمیشہ ایسا ہی ہو چکا ہے تو کیا تم سمجھتے ہو کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے لیے اپنا قانونِ حق معطل کر دے گا یا اس طرح بدل دے گا کہ جو چیز کل تک سنکھیا تھی وہ تمہارے لیے شہد ہو جائے۔

غزوۂ اُحد کے ضمن میں یہ ارشاد کہ قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض پتہ دے رہا ہے کہ قرآن کی موعظت و تذکیر کا یہ ایک خاص دائرہ ہے۔ قرآن سے پہلے کسی آسمانی کتاب میں اجتماعی قانون کی نشاندہی نہیں کی گئی۔ شاید اس کی وجہ بقول سید رشید رضا یہ ہے کہ نزول قرآن سے پہلے انسان کی استعداد اجتماعی نابالغ تھی۔

قرآن کی اس تصریح سے معلوم ہو گیا کہ حوادث اور واقعات کا مطالعہ اس سے کرنا چاہیے کہ آئندہ کے لیے عبرت حاصل کی جاسکے یعنی جو کچھ گزر چکا ہے وہ آئندہ کے لیے ذخیرۂ بصیرت ہے اور ماضی کے آئینے میں مستقبل کا چہرہ دیکھا جا سکتا ہے۔

قرآن کی یہ آیت ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم ان سنن کا مطالعہ کریں اور علم و نظر کی کاوشوں کا دوسرے علوم کی طرح لسے مرکز بنائیں۔ بلاشبہ تاریخ میں ابن خلدون پہلا شخص تھا جس نے تاریخ کو فلسفہ کی روشنی میں دیکھا اور اب فلسفۂ تاریخ کی ساری بنیادیں اسی اصل پر پہنچی گئی ہیں لیکن قرآن نے ہم سے جو مطالبہ کیا ہے وہ فلسفۂ تاریخ نہیں بلکہ علم السنن، یا علم الاجتماع ہے اور یہ گہرے افسوس کی بات ہے کہ ہم نے قرآن کا یہ مطالبہ پورا نہیں کیا۔

بلاشبہ صحابہ کرام اس علم کی گہرائیوں سے پوری طرح واقف تھے بہرحال ہمیں پارہ چہارم کے ۱۱ رکوعوں میں اجتماعی قوانین کا مطالعہ اس روشنی میں کرنا چاہیے۔

پارہ چہارم ایک نظر میں

اللہ کی صفات

توحید الوہیت و ربوبیت

رسالت ونبوت

صحابہ کا چہرہ

اُمتِ مسلمہ

دستوری قواعد

اسلامی شعائر

اجتماعی قوانین

اخلاقی قوانین

مالیاتی قوانین

معاشرتی قوانین

سیاسی قوانین

دفاعی قوانین

ایمان وجاہلیت

توکل و تفویض

اذکار و ادعیہ

آخرت کی زندگی

اہلِ کتاب

اصطلاحاتِ قرآنیہ

اسرائیل :- بروزن ابراہیم و اسماعیل اور عجمہ کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ یہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا لقب ہے۔ عبرانی میں اس کے معنے اللہ کے برگزیدہ یا اللہ کے بندے کے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ آپ کے دو نام ہوں، ایک یعقوب دوسرا اسرائیل، ان کی ہی اولاد بنی اسرائیل کہلاتی ہے۔ حضرت ابراہیم کی تین بیویاں ہیں ایک ہاجرہ، دوسرے سارہ تیسری قطورا، ہاجرہ سے حضرت اسماعیل ہوئے۔ یہ نسل بنی اسماعیل کہلائی، ان کا وطن عرب رہا، دوسری بی بی سارہ عراقی کے بطن سے حضرت اسحاق ہوئے۔ حضرت اسحاق کے فرزند حضرت یعقوب عرف اسرائیل ہیں۔ یہ نسل بنی اسرائیل کہلائی، ان کا وطن شام رہا، قدیم جغرافیہ میں فلسطین کوئی الگ ملک نہ تھا بلکہ شام ہی کا حصہ تھا۔

اسراف :- ضرورت سے زیادہ خرچ کرنا، زیادتی کرنا بروزن افعال مصدر ہے۔ اصل میں اسراف ہر کام میں انسان کے حد سے تجاوز کرنے کا نام ہے مگر اس کا استعمال خرچ کے بارے میں زیادہ مشہور ہے۔ یہ قرآن حکیم کی جامع اصطلاح ہے اس کا اطلاق ہر ایسے طرزِ عمل پر ہوتا ہے جو صحیح انسانی اور اسلامی طرزِ عمل سے ہٹا ہوا ہو لیکن صرف مال اور استعمالِ ملکیت کے سلسلہ میں اس کے معنے کچھ محدود ہیں۔ جس غرض کی تکمیل مال و املاک کی ایک مخصوص مقدار صرف کر کے کی جا سکتی ہے۔ اس پر دانستہ اور بلا مزید فائدہ کے زائد مقدار میں صرف کرنا اسراف ہے۔

استطاعت :- اس کا مادہ طوع ہے جس کے معنے انقیاد اور فرمانبرداری کے ہیں اور استطاعۃ میں نیت، تصورِ فعل، مادہ قابلہ اور آلہ کا ہونا ضروری ہے۔ بالفاظِ دیگر ان چیزوں کا بتمام وکمال پایا جانا جن کی وجہ سے فعل سرزد ہو سکے استطاعت کہلاتا ہے۔ فرضیتِ حج کی شرطوں میں استطاعت اہم شرط ہے۔ ارشادِ نبوت میں استطاعت کے لیے سواری اور زادِ راہ کی تعبیر آئی ہے، لیکن مقصد حصر نہیں ہے بلکہ جیسا کہ الجصاص نے لکھا ہے کہ استطاعت صرف یہی نہیں ہے کہ سواری اور زادِ راہ ہو بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ سب چیزیں بتمام وکمال موجود ہوں جن کی وجہ سے

حج کر لیے جا سکے۔ مثلاً راہ میں امن ہو اور خود صحت اور تندرستی ہو وغیرہ وغیرہ۔

اعتصام: عصم کے معنے روکنا اور اعتصام کے معنے اپنے آپ کو روک کر، بچا کر رکھنا ہیں۔ قرآن میں ہے لا عاصم الیوم من امر اللہ آج اللہ کے امر سے بچانے والا کوئی نہیں ہے اور معصوم وہ ہے جسے بچایا گیا ہے۔ اسی سے عصمۃ ہے جس کے اصلی معنے اسی کے ہیں اس کی جمع عصم آتی ہے۔ یہی معنے محمد بن نشوان نے ضیاء العلوم میں لکھے ہیں۔ اور امام ابوبکر عزیزی نزہۃ القلوب میں فرماتے ہیں عصم کے معنے رسیوں کے ہیں اور عصمہ کے معنے کسی چیز کو روک رکھنے کے ہیں۔ اعتصام باللہ سے مراد ہے کہ اللہ کو پکڑ کر یعنی ذریعہ بنا کر اپنے آپ کو بچا لینا۔ یہاں قرآن نے دو اعتصام پیش کیے ایک اعتصام باللہ، دوسرے اعتصام بحبل اللہ۔ دنیا اور آخرت کی سعادت ان دونوں سے وابستہ ہے۔ اعتصام باللہ کے ذریعے انسان ہلاکت سے بچتا ہے اور اعتصام بحبل اللہ ہو تو ضلالت اور گمراہی سے محفوظ رہتا ہے۔ اللہ کو مقصود بنا کر چلنے والا راہ گیر کی حیثیت رکھتا ہے۔ راہ گیر کو دو چیزوں کی ضرورت ہے راہ کی واقفیت اور سلامتی۔ اعتصام بحبل اللہ راہ گیر کی ہدایت کا سامان ہے اور اعتصام باللہ قوت وطاقت کا ذریعہ ہے۔ سلف صالحین سے اعتصام بحبل اللہ کی تفسیر اسی لیے مختلف آئی ہے۔ دین اللہ، جماعۃ، عہد اللہ، قرآن، امر اللہ، اور ہم نے تفسیر میں ان سب کا خلاصہ یہ بتایا ہے کہ نبوت کا لایا ہوا علم وعمل۔

اطمینان: اس کے معنے دل کا چین پانا، آرام پانا ہیں۔ اسی سے حدیث میں ہے الصدق طمانینۃ، سچائی سننے والے کے دل کو مطمئن کر دیتی ہے اور نیکی کے بارے میں ہے البر ما اطمان الیہ القلب، نیکی وہ ہے جس پر دل مطمئن ہو جائے۔

طمانیت وہ سکون ہے جو امن کی قوت سے حاصل ہوتا ہے، طمانیت اور سکینت میں یہ فرق ہے کہ سکینت ایک حالت ہے جو آتی جاتی رہتی ہے لیکن طمانیت کبھی جدا نہیں ہوتی ہے اور سکینہ خوف کے بعد ہوتی ہے جب کہ طمانینت کے لیے خوف ضروری نہیں ہے صوفیاء کرام کے یہاں طمانینت کے تین درجے ہیں ایک دل کی طمانینت، دوسرے روح کی طمانیت تیسرے طمانیت حضور وشہود،

ابتلاء: آزمانا، آزمائش کے دو مقصد ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ امتحان لینے والا اس شخص کی لیاقت وصلاحیت سے پوری طرح باخبر ہو جائے دوسرے یہ کہ اس کی لیاقت وصلاحیت کا تو ممتحن کو پوری طرح علم ہے مگر اوروں کی نظر میں اس کی حالت کو پیش کرنا منظور ہو کہ

وہ کس قابلیت کا مالک ہے۔ قرآن مجید میں جب ابتلاء کی نسبت اللہ سبحانہ کی جانب ہو تو دوسرے معنے مراد ہوتے ہیں۔ دراصل زبانیں دو ہوتی ہیں اور دونوں سے یکساں بلند آہنگی کے ساتھ آمنا باللہ کے نعرے بلند ہوتے رہتے ہیں۔ دراںحالیکہ ایک کا نعرہ نیچے قلب کی گہرائیوں سے اٹھ کر زبان تک آتا ہے اور دوسرے کا وہیں کا وہیں زبان ہی پر جنم لیتا ہے اس لیے ضرورت ہوئی کہ سچ کو جھوٹ سے الگ کیا جائے اور ایمان صادق و ایمان کاذب کے درمیان امتیاز کی کوئی صورت پیدا کی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے امتیاز کی یہ صورت روزِ اول ہی سے متعین فرما رکھی ہے۔ اسی کا نام قرآن میں ابتلاء یعنی قانونِ آزمائش ہے۔

امر بالمعروف:۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرآن حکیم کی دونوں اصطلاحیں ہیں۔ معروف وہ ہے جو قرآن کی نظر میں اچھا ہو اور منکر وہ ہے جو قرآن کی نظر میں بُرا ہو۔ یہ ایک جامع فریضہ ہے جس کا تعلق زندگی کے ہر پہلو سے ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اسلامی حکومتیں خصوصی اہتمام کرتی ہیں۔ یعنی معروف کا حکم دینا اور بُرائی سے لوگوں کو باز رکھنا، مسلمان کی نہ غائب ہونے والی صفت ہے یہ ایمان کی فطرت ہے، یہ اسلام کا خاصہ ہے جہاں مسلمان ہوگا یہ کام بھی ضرور ہوگا اور جو مسلمان ہوگا وہ یہ کام ضرور کرے گا۔ اجتماعی طور پر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے بارے میں قرآن میں ایک سے زیادہ آیات ہیں لیکن یاد رہے کہ جیسے ہر چیز کے اپنی صفت کے لحاظ سے دو درجے ہوتے ہیں ایسے ہی ایمان کے بھی دو درجے ہیں ایک آدمی کا پہلا کمال یہ ہے کہ وہ خود نیکی کا مجسمہ بن جائے اور دوسرا کمال یہ ہے کہ اپنے اثر سے دوسروں کو بھی نیک بنائے۔ اسی دوسرے کمال کا نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے پھر اس کے بھی مراتب ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ موم بتی، بجلی کا قمقمہ، چاند اور سورج سب ہی روشن کرنے والے ہیں مگر روشنی میں ان کے مدارج الگ الگ ہیں۔ موم بتی صرف ایک حجرے کو روشن کر سکتی ہے بجلی کے بلب کی روشنی ایک مکان تک پھیل جاتی ہے چاند کی روشنی زمین اور اس کی اردگرد کی فضا تک محدود ہے مگر سورج ایک جہان کو منور کر دیتا ہے۔ اسی طرح مومن اگر اپنے جیسے ایک انسان کے دل میں ایمان کی شمع روشن کر دے تو یہ درجہ حاصل کرے گا لیکن یہ پہلا مرتبہ ہو گا۔ پھر ایک جماعت ایک قوم ایک ملک میں دعوت الی الخیر کا کام کرے۔ آخری درجہ یہ ہے کہ اس کی دعوت عالمِ انسانی کے لیے عام ہو اور ساری دُنیا کو نیکی کی طرف بلائے۔ پورے ربع مسکون میں اللہ کا فوجدار بن جائے۔ یہ کمال ایما

کا سب سے اونچا درجہ ہے۔ قرآن کا یہی مطالبہ ہے۔

املاء :- جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشوو نما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے پیمانے مقرر ہیں اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشوونما کے بعد ظہور میں آئے۔ اسی صورتِ حال کو تدریج امہال اور املاء کہتے ہیں۔ املاء کے معنے ڈھیل دینے کے ہیں۔ عمل حق اور عمل باطل دونوں کے نتائج کے ظاہر ہونے کے ایک مدت مقرر ہے دونوں کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہوں گے اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہوں گے البتہ حق کے لیے تاجیل اس لیے ہوتی ہے تاکہ اس کی فاتحانہ حیثیت کی نمائش ہو جائے، اور باطل کے لیے اس لیے ہوتی ہے کہ اس کے فنا ہونے پر کمزوری کی تکمیل ہو جائے۔ اس املاء کے لیے کوئی ایک ہی مقررہ مدت نہیں ہے۔ ہر حالت کا ایک خاصہ ہے اور ہر گردو پیش اپنا ایک خاص مقتضا رکھتا ہے ہو سکتا ہے کہ ایک خاص حالت کے لیے مقررہ مقدار بہت تھوڑی ہو اور ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ ہو۔

اجتباء :- اس کے معنے پسند کرنے اور انتخاب کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ قرآن حکیم میں عام طور پر انبیاء کے لیے استعمال ہوا ہے۔ لیکن اُمتِ اسلامیہ کے لیے بھی بولا گیا ہے۔ ایک ایسا لفظ جو عموماً منصب نبوت کی خاطر کیے جانے والے انتخاب کے لیے بولا گیا ہو۔ اسے اگر اُمت کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے تو یہ اُمت کے پیغمبرانہ کام کے ذمہ دار ہونے کی کھلی نشانی ہے۔ اس لفظ کے ذریعے اُمتِ مسلمہ کی مخصوص ذمہ داری کو اجاگر کیا گیا ہے۔ اور یہ اس امت کے ایک ممتاز اور غیر معمولی حیثیت کے مالک ہونے کی دلیل ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت آپ کی آمد سے ہزاروں سال پہلے ہی دی جا چکی تھی۔ اور دُنیا اس بشارت کے ظاہر ہونے کے لیے ایک مدت سے آنکھیں لگائے بیٹھی تھی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ آپ کی اُمت کا تھا۔ ابھی اس کے وجود میں آنے کے لیے شب و روز کی ہزاروں گردشیں باقی تھیں مگر اس کے نام کا اس کے کام کا اور اس کے اوصاف کا پہلے ہی اعلان کر دیا گیا تھا۔

بِر :- بر کے معنے میں چونکہ وسعت کا تصور موجود ہے اس لیے اس سے بر مشتق ہوا جس کے معنے خوب نیکی کرنے کے ہیں۔ اسی رعایت سے اس لفظ کا اصل مفہوم لغتِ عرب میں کسی

کے حق کو پورا کرنا ہے۔ عام اس سے کہ خدا کا حق ہو یا ماں باپ کا حق ہو یا اللہ کے بندوں کا حق ہو ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا ایفا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے جو معاہدات قول و قرار، حلف و ولا، عقود اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہو جاتی ہیں جو عدل یا احسان کے تحت آسکتی ہیں۔ برّ اور بار اس سے صفت کے صیغے آتے ہیں برالوالدیہ اس سعادت مند بیٹے کو کہتے ہیں جو اپنے ماں باپ کا فرمانبردار اور ان کے حقوق کا پورا پورا ادا کرنے والا ہو۔ برّ بالقسم کے معنے ہیں۔ اس نے اپنی قسم پوری کر دی۔

البیت :- بیت کے معنے گھر کے ہیں۔ اصل میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں انسان رات میں بسیرا کرے، یہاں خانہ کعبہ مراد ہے یہی بیت اللہ، البیت الحرام، اور البیت العتیق ہے۔ بیت اللہ اس لیے کہ حضرت ابراہیم کا دستور تھا کہ جہاں کہیں ان کو روحانیت کا کوئی جلوہ نظر آتا وہاں خدا کے نام سے ایک پتھر کھڑا کر کے خدا کا گھر بنا لیتے۔ یہ بات محتاج ثبوت نہیں ہے کہ حضرت ابراہیم کے ہاتھوں جس بیت ایل (بیت اللہ) کی تعمیر کا ذکر ہے اس کا مصداق اگر کوئی ہو سکتا ہے تو مکہ کا بیت اللہ ہی ہو سکتا ہے نہ بیت المقدس، اس لیے کہ بیت المقدس کی تعمیر حضرت ابراہیم کے سینکڑوں سال کے بعد حضرت داؤد اور حضرت سلیمان کے ہاتھوں ہوئی ہے۔ یہ اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہی گھر ملت ابراہیمی کی برکتوں کا مظہر ہے۔ البیت الحرام حرمت والا گھر شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں حرام کے معنے جس جگہ بند رہنا چاہیے اس جگہ کئی باتیں بند ہیں آدمی کو مارنا، جانور کو ستانا اور درخت اور گھاس اکھاڑنا اور گرا پڑا مال اٹھانا، البیت العتیق کے معنے بزرگ گھر، آزاد گھر، پرانا گھر، جو چیز زمانہ قدیم یا مرتبہ میں اونچی ہو اس کو عتیق کہتے ہیں۔ اسی لیے عتیق کے معنے قدیم کے بھی ہیں۔ خانہ کعبہ کو البیت العتیق کیوں کہا گیا اس کی تفصیل آپ پارہ ۱۷ میں پڑھیں گے۔

بطانۃ :- دلی دوست، رازدار، بھیدی، استر، کپڑے کا باطنی حصہ جو جسم سے ملا ہے۔ بطن سے مشتق ہے۔ بطن کا استعمال ہر شے میں ظہر کے خلاف ہوتا ہے۔ اوپر کی جانب کو ظہر اور اندر کی طرف کو بطن بولتے ہیں۔ اور کپڑے کے اوپر کے حصہ کو ظہارہ اور اندرونی نیچے کے حصہ کو جو جسم سے ملا ہے بطانۃ کہتے ہیں جس طرح ہم اپنی زبان میں بولتے ہیں کہ وہ تو اس کا

اوڑھنا بچھونا ہے یعنی وہ اس کو نہایت ہی مرغوب و محبوب ہے اسی طرح بطانۃ الثوب سے بطور استعارہ دلی دوست کے متعلق جو باطنی اُمور کا راز دار ہو بطانۃ کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ آیت میں اللہ سبحانہٗ نے اہلِ ایمان کو یہ ہدایت کی ہے کہ غیر مسلموں کو اپنا رازدار نہ بنائیں۔ یعنی اجتماعی زندگی کے اہم مناصب جن کا اہلِ ایمان کی اجتماعی زندگی سے تعلق ہو وہ غیر مسلموں کو نہ دیں۔ قرآن نے اس حکم کو علی الاطلاق نہیں پیش کیا بلکہ اس میں کچھ قیدیں لگائی ہیں اوّل یہ کہ وہ تمہاری خرابی میں کوتاہی نہ کرتے ہیں دوم یہ کہ تمہارا نقصان ان کو محبوب ہو۔ سوم، یہ کہ ان کی دشمنی ان کے منہ سے عیاں ہو۔

بیان :- لغت میں بیان بلیغ ترین پیرائے میں اظہارِ مقصد کو کہتے ہیں، اصل معنے ظاہر ہونے اور کھل نے کے ہیں۔ ہر ایسی تعبیر جو کلام کے معانی کھول کر نمایاں کر دے بیان ہے۔ البیان والتبیین میں جاحظ رقمطراز ہے کہ بیان کے لفظ میں بڑی جامعیت ہے۔ معنے کے چہرے سے جو چیز نقاب ہٹا دیتی ہے اور ضمیر سے جو چیز پردہ اٹھا دے بیان ہے۔ اسی سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے ان من البیان لسحرا" غرض کہ لفظ لغت میں اظہار اور ظہور کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔

اصولیین نے بیان کی جو تعریف کی ہے اس میں بھی لغوی معنے کی جھلک ہے۔ انہوں نے بیان کی یہ تعریف کی ہے کہ مخاطب کے سامنے معنے کو ظاہر کرنا اور اس کی اس انداز سے توضیح کر پوشیدگی کا نام و نشان نہ رہے۔

بیان کی تعریف میں اصولیین کے یہاں ظہور نہیں بلکہ اظہار معتبر ہے۔ امام شافعی اور احناف میں سے علماء اصول کی اکثریت کا یہی رجحان ہے۔ احناف کی سربراہی فخر الاسلام بزدوی کرتے ہیں[1] چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

"بیان سے مراد اس موضوع پر ہمارے نزدیک اظہار ہے ظہور نہیں۔"

شارح اصول بزدوی عبد العزیز بخاری نے کچھ احناف اور شوافع کی اکثریت کا میلان یہ بتایا ہے کہ یہاں معنے ظہور ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ اصل لغت میں بیان کے معنے ظہور کے ہیں بان ھذا المعنی اور بان الھلال ظہور کے معنے میں بولا جاتا ہے۔

---

[1] رسالہ امام شافعی ص ۲۱، اصول بزدوی، کشف الاسرار ۳، ۸۲۴ دیکھو۔

لیکن حضرت امام شافعی اور فخر الاسلام بزدوی کا موقف دلائل اور واقعات کی روشنی میں زیادہ مضبوط ہے۔ جب یہ کہا جاتے گا کہ بین لی بیانا تو اس سے عربی دان یہی سمجھے گا کہ اس نے میرے سامنے ظاہر کیا اور اس طرح واضح کیا کہ کسی شک کی گنجائش نہ رہی اور جب یہ بولا جاتا ہے کہ فلاں ذو بیان تو اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ فلاں اظہار و توضیح پر قادر ہے۔[1]

خود قرآن حکیم میں لفظ بیان اظہار ہی کے معنے میں آیا ہے ھذا بیان للناس۔ اور ثم ان علینا بیانہٗ مطلب یہی ہے کہ معانی و احکام کا ظاہر کرنا ہمارا کام ہے۔ اور خلق الانسان علمہ البیان میں بھی یہی معنے ہیں۔

علامہ عبدالعزیز بخاری نے یہ بات بڑی پتے کی لکھی ہے کہ جو شخص بیان کو ظہور کے معنے میں لیتا ہے اس کو یہ بات ماننی پڑے گی۔ کہ جو شخص قرآن و سنت میں غور و فکر سے کام نہیں لیتا اس پر بہت سے احکام واجب نہیں ہوتے بلکہ آیات الٰہی میں جو غور و فکر سے کام نہ لے گا اس پر ایمان بھی واجب نہیں کیونکہ ظہور نام ہے علم کا اور وہ موجود نہیں۔ یہ سرتاسر غلط ہے۔[2]

اسی کے لگ بھگ بات شمس الائمہ سرخسی نے بھی لکھی ہے اور بڑی لطیف ہے۔

بیان کی قسمیں

لغوی اور اصطلاحی طور پر بیان کا مطالعہ کرنے کے بعد آئیے اب بیان کی ان قسموں پر ایک نظر ڈال لیجئے جو علماء اصول نے تحریر فرمائی ہیں۔

بیان تقریر، بیان تغییر، بیان تبدیل، بیان تفسیر اور بیان ضرورت۔

امام شافعی نے رسالہ میں "کیف البیان" کے عنوان کے تحت چار صورتیں بیان فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ سبحانہ نے خود اعلان کر دیا کہ یہ فرض ہے اور یہ حرام ہے مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج فرض ہیں، زنا، شراب، مردار کا گوشت، خون، فواحش حرام ہیں وضو کے فرائض

---

[1] اصول سرخسی ص ۲۶، کشف الاسرار ص ۳، مراۃ الاصول شرح مرقاۃ الوصول لملا خسرو ۲ ص ۲۴
[2] کشف الاسرار ص ۸۲، اصول سرخسی ص ۲۶، ۲۸۔

بیان کیے ہیں۔
دوسرے یہ کہ نفس فرضیت کا حکم خود بیان کیا لیکن اس کی تفصیل کیفیت کا بیان زبان نبوت کے حوالہ کر دیا مثلاً نمازوں کی تعداد مقادیر زکوٰۃ اوقات کی تعیین وغیرہ۔
تیسرے یہ کہ خود اپنے رسول کی طاعت فرض قرار دے کر کچھ احکام کو نبوت کے ذریعے بیان کرایا۔
چوتھے یہ کہ ارباب فکر پر تفکر و اجتہاد کو فرض قرار دے کر اجتہاد کے ذریعے احکام کی تعیین کرائی۔
امام شافعی کے بعد اصولیین نے بیان کی چار قسمیں بیان تقریر، بیان تفسیر، بیان تغییر اور بیان تبدیل مقرر کر لی ہیں۔ قاضی ابوزید الدبوسی نے چار ہی قسمیں بتائی ہیں۔
بیان تقریر،
بیان تفسیر،
بیان تغییر، یعنی استثنا
بیان تبدیل، یعنی تعلیق بالشرط
علامہ شمس الدین سرخسی نے ان چار میں دبوسی سے ہم آہنگی کرتے ہوتے پانچویں قسم بیان ضرورت کا اضافہ کیا۔
فخر الاسلام بزدوی نے بھی پانچ ہی قسمیں قائم رکھی ہیں لیکن دبوسی اور سرخسی جسے بیان تغییر اور بیان تبدیل کہتے ہیں۔ بزدوی ان کو بیان تبدیل کہتے ہیں۔ دبوسی بیان ضرورت کو پیش نہیں کرتے ہیں۔
تفسیر قرآن میں ان اقسام میں سے کون سی قسم مفید مدعا ہے۔ اس پر بحث کے لیے ضروری ہے کہ ہم پہلے ان میں سے ہر ایک کا ناظرین کے سامنے چہرہ پیش کریں۔ اس کے لیے آپ کو کچھ انتظار کی زحمت گوارا کرنی پڑے گی۔
توراتے :- اس آسمانی کتاب کا نام ہے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ علامہ زمخشری کی رائے میں تورات اور انجیل دونوں عجمی لفظ ہیں۔ قاضی بیضاوی بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ علامہ شیخزادہ حواشی تفسیر بیضاوی میں رقمطراز ہیں۔ لوگوں کا ان دونوں لفظوں کے متعلق اختلاف ہے کہ آیا یہ اشتقاق اور تصریف کے قانون کے تحت آسکتے ہیں یا نہیں کیونکہ یہ دو مقدس کتابوں کے دو عجمی عبرانی نام ہیں۔ قاضی بیضاوی نے اسی دوسرے خیال کو اختیار کیا ہے اور جو لوگ ان کے اشتقاق کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ تورات وری الزند سے مشتق ہے۔

جس کا استعمال چقماق کی لکڑی کے سلگ کر آگ دینے کے لیے ہوتا ہے چنانچہ وری الزند چقماق کی لکڑی سلگ اٹھی اور اوریتہا انا میں نے اس کو سلگا کر آگ نکالی دونوں طرح مستعمل ہے۔ چونکہ تورات میں وہ ضیا ئے نور تھا جس کے ذریعے انسان ضلالت سے نکل کر ہدایت پر آ جاتا ہے۔ جس طرح کہ اندھیرے سے اجالے میں نکل جاتا ہے اس لیے یہ کتاب تورات سے موسوم ہوئی اور اس کی تائید قرآن کی یہ آیت بھی کرتی ہے ولقد اٰتینا موسیٰ وھارون الفرقان وضیاء یہی فراء اور جمہور کا قول ہے۔ فراء کا بیان ہے کہ اس کا وزن تفعلہ عین کے زیر کے ساتھ ہے پھر زیر کو زبر سے تبدیل کر دیا گیا۔ یہ طائی تلفظ یعنی بنی طی کی زبان ہے۔ اور بعض نے اس کا وزن تفعلہ عین کے زبر سے بتایا ہے۔

راغب اصفہانی کہتے ہیں کہ اس کا وزن فوعلۃ بتایا گیا ہے اور تفعلہ اس لیے نہیں بتایا گیا کہ یہ کم آتا ہے اور تا واو کا بدل ہے۔

تورات وہ کتاب ہے جو خاص حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی تھی موجودہ تورات جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد تصنیف ہوئی اور جس میں کچھ مضامین اصلی تورات کے بھی بطور یادداشت درج کر کے اس کا نام تورات رکھ دیا گیا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث تیسرے پارے میں پڑھیے۔

جنت :۔ اس مقام کا نام جو نیکوکار انسانوں کا دائمی گھر ہوگا۔ قرآن پاک میں عموماً الجنۃ بتایا گیا ہے۔ اور کبھی اس کو مناسب اضافتوں کے ساتھ بھی ادا کیا گیا ہے مثلاً جنۃ النعیم نعمت کا باغ جنۃ الخلد بقائے دوام کا باغ جنۃ الماویٰ پناہ کا باغ۔ جنت کی لذتیں جاودانی اور وہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں۔ جہاں حیات ہے مگر موت نہیں۔ راحت ہے مگر تکلیف نہیں، لذت ہے مگر الم نہیں، مسرت ہے مگر غم نہیں، جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں۔ آخرت کے خانۂ عیش و راحت کے لیے قرآن پاک نے عموماً جنت کا لفظ استعمال کیا ہے ناداں یہ سمجھتے ہیں کہ عرب کے شورہ اور بے حاصل صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز و شاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے۔ اس لیے ان کے لیے یہ لفظ قرآن نے استعمال کیا ہے مگر یہ سمجھنا چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے اس لیے عرب کی تخصیص بے معنے ہے۔ اصل یہ ہے کہ جہاں بیابان و گلستان کی تخصیص نہیں۔ یہ فطرت انسانی کی تصویر ہے۔ جنت ہی مقام رحمت، وہی مقام رضوان ہے اور یہی مقام نور ہے۔ اسی کی طلب پر عبادت گزار مومن کا منتہائے نظر ہے۔ بعض صوفیائے کرام

کا یہ کہنا کہ جس نے قیامت کے اندیشے اور جنت کے لالچ سے اللہ کی عبادت کی اس نے فی الحقیقہ شرک کیا، عالم جذب وشوق اور جوشِ محبت میں نکلے ہوئے الفاظ ہیں جن میں حقیقت سے زیادہ مجذوبیت ہے۔

حج :۔ لغت میں حج کے معنے ارادہ کرنے کے ہیں اور اس سے مقصود خاص مذہبی قصد و ارادے سے کسی مقدس مقام کا سفر ہے لیکن اسلام میں ملک عرب کے شہر مکہ میں جا کر حضرت ابراہیم کی بنائی ہوئی مسجد خانۂ کعبہ کا طواف اور مکہ کے مختلف مقدس مقامات میں حاضر ہو کر کچھ آداب اور اعمال بجالانے کا نام ہے۔ حج بھی اسلام کے پانچ ارکان میں سے ایک رُکن ہے مرد ہو یا عورت عمر میں ایک بار فرض ہے۔ حج کی کچھ شرطیں، کچھ ارکان، کچھ واجبات کچھ سنن اور کچھ منہیات ہیں۔ ارکانِ حج کو مناسک حج کہتے ہیں۔

حدود :۔ حد کی جمع ہے۔ حد اس آڑ اور روک کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کو باہم ملنے سے روکے، قرآن میں یہ لفظ بصیغہ جمع بمعنے قوانین مفروضہ ۱۴ جگہ آیا ہے اور فقہاء کی اصطلاح میں حدود مقررہ واجب سزاؤں کو کہتے ہیں، اور ان کا تعلق اللہ کے حق سے ہوتا ہے۔ مثلاً: حدِ ارتداد، حدِ بغاوت، حدِ زنا، حدِ قذف، حدِ سرقہ، حدِ قطع طریق، حدِ شربِ خمر، اسلامی قانون میں ان حدود کی حیثیت زواجر کی ہے، اسی بنا پر شبہات سے بھی ان کا دفعیہ ہو سکتا ہے اور متہمین تہمت سے بچ سکتے ہیں۔

دعوت الی الخیر :۔ اصل دعوت کا فریضہ تو نبوت کا ہے لیکن نبوت ختم ہونے کی وجہ سے یہی فریضہ اُمت کے سپرد کیا گیا ہے اور اسی فریضہ کی وجہ سے اس اُمت کو خیر اُمت کہا گیا ہے۔ اسی حکم کی تعمیل میں مسلمانوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد پہلا کام جو کیا وہ یہ تھا کہ ٹھیک ٹھیک نبوت کے طریق پر خلافت کی بنیاد رکھی، یہ ادارہ نیکی کی دعوت معروف کے حکم اور منکر سے روکنے کا ایک جماعتی ادارہ تھا جو مسلمانوں نے اس لیے قائم کیا کہ اس جماعت کے فرض کو انجام دے سکیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد اس اُمت کو حق پر استوار رکھنے اور دُنیا کو حق کی دعوت دینے کے لیے اس اُمت پر ڈالا گیا تھا۔ جب تک یہ ادارہ صحیح طریقہ پر قائم رہا اور اپنے فرائض مسلمانوں کے اندر بھی اور باہر بھی انجام دیتا رہا۔ ہر مسلمان اس فرض سے سبکدوش رہا، جو اللہ کی طرف سے عائد کیا گیا تھا اس وقت تک دعوت کا فرض ایک فرض کفایہ تھا۔ اور جماعت کا ادارہ اس کو انجام دے کر جماعت کے تمام افراد کو

اس فرض کی ذمہ داری سے بری کر دیتا تھا لیکن نظامِ خلافت درہم برہم ہوجانے کے بعد اب یہ فریضۂ دعوت اس اُمت کے تمام افراد پر منتقل ہوگیا تھا اور جب تک وہ اس کو انجام دینے کے لیے اس نظام کو قائم نہ کریں اس وقت تک اس فریضہ کے ادا نہ ہونے کا گناہ ہر مسلمان کے ذمہ ہے۔

رُشد:۔ ہدایت، صلاحیت، راہ یابی، بھلائی، راستی، ہوشیاری، حسنِ تدبیر، رشد یرشد کا مصدر ہے ہدایت کی جگہ استعمال ہوتا ہے۔ فقہا کی اصطلاح میں رشد سے مراد دین اور مال کے خرچ کرنے میں صلاحیت ہے۔ صلاح دینی سے مراد یہ ہے کہ ان فواحش و معاصی سے مجتنب رہے جو عدالت کو ساقط کر دیتے ہیں اور مال میں صلاح کا مطلب یہ ہے کہ فضول خرچ نہ ہو یعنی ایسی جگہ مال خرچ نہ کرے کہ جہاں دُنیا کی کوئی خوبی اور کوئی ثواب نہ ہو۔ نیز مال کا صرف کرنا جانتا ہو کہ لین دین میں غبن نہ اٹھائے آیتِ قرآنی فان آنستم منھم رُشدًا کا مفہوم یہ ہے کہ اگر یتیموں سے رشد نہ دیکھا جائے تو ان کو مال سپرد نہ کیا جائے۔ امام شافعی، امام ابو یوسف اور امام محمد کا بھی مذہب ہے لیکن امام ابو حنیفہ کے نزدیک چونکہ اٹھارہ برس سن بلوغ کی آخری حد ہے اس لیے سات برس زائد یعنی پچیس برس کے سن تک اور انتظار کیا جائے کیونکہ سات برس کی مدت تغیرِ احوال کے لیے معتبر ہے بچہ کو اس مدت میں تمیز ہو جاتی ہے اور اس پر نماز کا حکم کیا جاتا ہے لہٰذا اس قدر انتظار کے بعد اس کا مال حوالے کر دیا جائے۔ اگرچہ اس میں رشد نہ ہو۔ یہ امام ابو حنیفہ کی رائے ہے ورنہ فقہ حنفی میں فتویٰ صاحبین کے قول پر ہے۔ عبد الرحمٰن الجزیری الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں رقمطراز ہیں، احناف کہتے ہیں کہ ہمارے مسلک میں مختار اور مفتیٰ بہ یہی ہے کہ سفیہ پر حجر کیا جائے گا۔ سفیہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ فرد جو اپنے مال کا بخوبی انتظام نہ کر سکتا ہو اور اسے حرام کاموں اور لغویات میں اور گناہ کے کاموں میں صرف کرے اور اپنے تصرفات میں تبذیر و اسراف سے کام لے۔ ایسے اسراف میں جس کے سبب حجر کرنا واجب ہو جاتا ہے۔ مغنیوں کو مال دینا، گراں قیمتیں دے کر کبوتر اور مرغ وغیرہ خریدنا شامل ہیں اور جوئے بازی میں مال صرف کرنے یا دوسرے ایسے اخراجات کرنے پر بھی حجر واجب ہے جو شریعت اور عقل کے خلاف ہوں۔

حجر کے معنے لغت میں روکنا ہیں اور شریعت میں اس کے معنے انسان کو اپنے مال میں تصرف کر دینے سے روک دینا ہیں۔ ابن قدامہ لکھتے ہیں کہ رشد کے معنے یہ ہیں کہ مالک اپنے مال کو بے فائدہ کاموں میں صرف ہونے سے بچائے مثلاً غنا، قمار، حرام اشیا اور آلاتِ لہو کے خریدنے سے اور شراب خریدنے سے۔

ربّی :۔ جمع ربیوں ہے، خدا کے طالب، خدا پرست، اللہ والے ہزاروں جماعتیں۔ ربّی ربانی کی طرح ہے۔ یہ امام راغب کا بیان ہے۔ امام بخاری نے اس کے معنے جماعتوں کے بتائے ہیں اور ربیّون کا واحد بتایا ہے یہ معنے اصل میں امام لغت ابوعبیدہ سے منقول ہیں۔ اس صورت میں ربی حسب تصریح قاضی بیضاوی ربّۃ کی طرف بطور مبالغہ منسوب ہے جس کے معنے جماعت کے ہیں۔ امام بغوی لکھتے ہیں ربیّون کثیر کے معنے عبداللہ ابن عباس، مجاہد اور قتادہ نے جماعات کثیرہ کے بیان کیے ہیں اور حضرت عبداللہ بن مسعود نے ہزاروں بتائے ہیں۔ کلبی کا قول ہے کہ ایک ربیہ دس ہزار کا ہوتا ہے، ضحاک ایک ہزار کہتے ہیں حسن بصری نے علماء اور فقہاء ترجمہ کیا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ ربیّون پیروکار ہیں۔ ربانیون حکام اور ربیّون رعیت ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ رب کی طرف منسوب ہے یعنی وہ لوگ رب کی عبادت کرتے ہیں اور ابوحاتم احمد بن حمدان لغوی نے کتاب الزینہ میں تصریح کی ہے کہ یہ سریانی لفظ ہے۔ (الاتقان) امام راغب کا بیان زیادہ قرین صواب ہے اور زمخشری کا بھی یہی بیان ہے۔

عول :۔ اصل میں اس کے معنے انصاف کو چھوڑ کر بڑھتی وصول کرنے کے ہیں۔ عرب والے بولتے ہیں عال المیزان، ترازو جھک گئی۔ عال الحاکم، حاکم نے ناانصافی کی۔ ابن حبان نے حضرت صدیقہ سے ان لا تعولوا کے یہی معنے نقل کیے ہیں کہ تم ناانصافی نہ کرو اور یہی اکثر مفسرین کا قول ہے مگر امام شافعی نے ان لا تعولوا کی تفسیر ان لا تکثر عیالکم سے کی ہے جس کے متعلق محی السنہ بغوی لکھتے ہیں کہ یہ معنے کسی اور نے نہیں بیان کیے، تحقیق تو یہ ہے کہ کثرت عیال کے لیے اعال یعیل اعالۃ بولا جاتا ہے اور قانون وراثت کی اصطلاح میں عول اصل مسئلہ کے مقابلے میں حصص کے زیادہ ہو جانے کا نام ہے وراثت میں مسائل کی تین قسمیں ہیں عادلہ، عائلہ، ناقصہ، عادلہ وہ جن میں مال مقررہ حصص کے برابر ہو، عائلہ وہ جن میں حصص مال سے زیادہ ہوں، ناقصہ وہ جن میں حصص کم ہوں، عول کی بہترین مثال فرائض میں مسئلہ منبریہ ہے۔ حضرت علی مرتضیٰ کوفہ میں ممبر پر ایستادہ تقریر فرما رہے تھے کہ ایک شخص اٹھا اور اس نے دریافت کیا کہ امیرالمومنین میری بیٹی کا شوہر انتقال کر گیا، اس کے ترکہ میں میری بیٹی کا آٹھواں حصہ آتا ہے لیکن وارثوں نے اسے نواں حصہ دیا ہے۔ آپ سے انصاف چاہتا ہوں، آپ نے برجستہ جواب دیا فرمایا کیا تیرے داماد نے دو لڑکیاں وارث چھوڑی ہیں؟ وہ بولا جی ہاں، آپ نے پوچھا کہ مرنے والے کے والدین بھی ہیں اس نے کہا جی ہاں، آپ نے بتایا کہ اس صورت میں بوجہ عول کے تیری بیٹی کا حصہ آٹھویں سے نواں ہو گیا اس کے علاوہ میراث میں اس کا کوئی حصہ نہیں ہے۔

لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰى تُنْفِقُوْا مِمَّا تُحِبُّوْنَ ۚ۬ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَیْءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ بِهٖ عَلِیْمٌ ۝

یاد رکھو تم واقعی نیکی کا درجہ[164] اس وقت تک ہرگز نہ پاؤ گے جب تک راہ خدا میں کچھ ان چیزوں میں سے خرچ نہ کرو گے جن[165] سے تم محبت رکھتے ہو۔ اور دیکھو جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ تم خرچ کرو گے اللہ اس سے باخبر ہے[166]۔

واقعی دینداری کا پیمانہ

اس سے پہلے بتایا گیا تھا کہ اللہ کی عدالت میں گناہوں کا کوئی بدلہ اور فدیہ قبول نہ کیا جائے گا۔ یہاں بتایا جا رہا ہے کہ یہی مال و دولت دنیا میں اللہ کی راہ میں خرچ کرنا بہت بڑی نیکی ہے۔ بلکہ مصنوعی اور حقیقی دینداری کے مابین یہی حدِ فاصل ہے۔ نیکی کا یہ تصور کہ دینداری کی رواجی شکل و صورت اختیار کی جائے، دینداری نہیں ہے۔ چند مذہبی رسوم کی ادائیگی کے بعد زندگی کے سارے تقاضوں اور معاشرے کے سارے حقوق سے بیگانہ رہنا، اور پھر دینداری کا دعویٰ کرنا دعویٰ بلا دلیل ہے۔ [illegible] لغت میں کسی کے حق کو پورا کرنا ہے۔ عام اس سے کہ خدا کا حق ہو ماں باپ کا [illegible] کے بندوں کا حق ہو ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا ایفا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے جو معاہدات، قول و قرار، حلف و والہ اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہو جاتی ہیں جو عدل یا احسان کے تحت آتی ہیں۔

انسان یہاں دوگونہ تعلقات لے کر آیا ہے ایک اس کا تعلق اپنے خالق سے ہے دوسرا اس کا تعلق اللہ کی مخلوق سے ہے، اس لیے انسان پر دو قسم کے حقوق ہیں، اللہ کے حقوق

مالک و مولی اور خالق ہونے کی وجہ سے اور مخلوق کے حقوق اس کائناتِ ارضی کے مکین ہونے کی وجہ سے۔ جب انسان کائناتِ ارضی کا مکین ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی ذمہ داری بھی اس کائنات کی ہر چیز سے متعلق ہے جمادات سے بھی کہ ان کو بے موقع صرف نہ کیا جائے، نباتات سے بھی کہ ان کو نشوونما اور تربیت کا موقعہ دیا جائے۔ حیوانات سے بھی کہ ان کو بے سبب تکلیف نہ دی جائے اور ان کے آرام و آسائش کا خیال رکھا جائے۔ اور انسانوں سے بھی کہ ان کی ہر ضرورت میں مدد کی جائے۔ غرض اسلام نے ان تمام حقوق کو کائنات میں اس طرح تقسیم کیا ہے کہ اس کا دائرہ محیطِ اعظم بن کر پھر آہستہ آہستہ سمٹتا ہوا مرکز پر آکر ختم ہو جاتا ہے۔

دینداری کی حد تک دینداروں کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ دیندار لوگ دینداری کا ایک خاص پیمانہ بنا کر رکھ لیتے ہیں جو صرف چند اوہام، چند رسوم پر مشتمل ہوتا ہے۔ ان رسوم کی بجا آوری کرنے والے کو دینداری کا سرٹیفکیٹ دے دیا جاتا ہے خواہ اس کی پوری زندگی انسانی حقوق سے بالکل بیگانہ ہو چکی ہو قرآن یہاں اسی غلط فہمی کو دور کرنے کے لیے بتا رہا ہے کہ نیک انسان ہونے کا مقام ان سب چیزوں سے بالا ہے۔ نیکی کی اصل رُوح انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ ایمان باللہ کا حقیقی امتحان اسی میں ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے اس لیے صرف رواجی نیکیوں پر یہودیوں کی طرح قناعت نہ کرنی چاہیے۔ اصل چیز اپنی محبوبات اور مرغوبات کو اللہ کی رضا کی خاطر اللہ کی راہ میں قربان کرنا ہے۔

۱۶۴۔ یاد رکھو تم واقعی نیکی کا درجہ اس وقت تک ہرگز نہ پاؤ گے۔ یعنی اعلیٰ درجہ کی نیکی کرنا چاہو تو اپنی محبوب اور عزیز ترین چیزوں میں سے کچھ اللہ کے راستہ میں نکالو۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں یعنی جس چیز سے دل بہت لگا ہو اس کے خرچ کرنے کا بہت درجہ ہے۔ یوں تو ثواب ہر چیز میں ہے۔ شاید یہود و نصاریٰ کے ذکر میں یہ آیت اس لیے نازل فرمائی کہ ان کو اپنی ریاست بہت عزیز تھی جس کی خاطر وہ حضور کی پیروی نہ کرتے تھے اس لیے جب تک وہ بھی اللہ کے راستہ میں نہ چھوڑیں گے درجہ ایمان نہ پائیں گے۔ پہلی آیت سے یہ مناسبت ہوئی کہ وہاں کافر کا مال خرچ کرنا بیکار بتایا تھا۔ اب اس کے مقابلے میں بتایا ہے کہ مومن جو خرچ کرے اس سے نیکی میں کمال حاصل ہوتا ہے [1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

دراصل اس آیت میں لفظ بِرّ لاکر بتایا گیا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے ساتھ وفاداری کی لازمی شرط محبوبات و مرغوبات میں سے راہِ خدا میں خرچ کرنا ہے۔ محبت اور وفاداری کے لیے یہ کسوٹی ایک ایسی کسوٹی ہے جو فی الحقیقت ہر مدعی کا بھرم کھول دینے کے لیے کافی ہے۔ یہودی اس معاملہ میں بالکل صفر تھے۔ وہ محض چند رسوم کی ظاہرداریانہ پیروی کرکے یہ سمجھتے تھے کہ للٰہیت اور خدارسی میں جو مقام ان کا ہے وہ نہ کسی کا ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ قرآن نے جیسے یہاں ان کے زعمِ باطل پر ضرب کاری لگائی ہے ایسے ہی مسلمانوں کو سمجھایا ہے کہ للٰہیت اور نیکی کا درجہ کمال صرف دعووں اور چند رسموں کے ادا کر دینے سے حاصل نہیں ہو جاتا بلکہ اس کے لیے قربانی کی ضرورت ہے۔ دعویٔ ایمان کا حقیقی امتحان صرف انفاق میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے اس لیے صرف رواجی اور رسمی نیکیوں پر قانع ہو کر نہ بیٹھنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ یہ نیکیاں خالص اور بے آمیز نہ ہوں بلکہ ان میں ذاتی مفاد کی خواہش بھی شامل ہو۔ ایمان کا امتحان یہی ہے کہ خدا کی راہ میں اپنی محبوب اور پسندیدہ چیزوں کو خرچ کرو کیونکہ یہ انفاق ہی اعلیٰ درجہ کی نیکی اور ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اس آیتِ گرامی سے یہی سمجھا ہے۔

بخاری و مسلم، ترمذی اور نسائی میں حضرت انس کے حوالہ سے یہ واقعہ آتا ہے کہ ابوطلحہ صحابی کا مدینہ میں نخلستان تھا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مسجد کے سامنے اس کا محل وقوع تھا۔ خود حضور بھی اس نخلستان میں جاتے پانی نوش فرماتے اور یہ باغ ابوطلحہ کے دل کی ایک کلی تھی۔ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی تو ابوطلحہ حضور انور کی خدمتِ اقدس میں حاضر ہوتے اس باغ کا نام بیرحاء تھا۔ حضرت طلحہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے اپنے تمام سرمایہ میں سب سے زیادہ محبوب یہی بیرحاء نخلستان ہے۔ میں اللہ کے راستہ میں خیرات کرتا ہوں، آپ اسے اپنے صوابدید سے جہاں چاہیں خرچ کر لیں۔ حضور نے فرمایا واہ واہ بہت بڑا اور نفع والا سرمایہ ہے۔ میں اس کو تیرے ہی رشتہ داروں میں تقسیم کر دوں گا۔ طلحہ نے کہا کہ جو جی چاہے کیجئے۔ مسلم اور ابوداؤد میں ہے کہ حضور نے یہ باغ حسان بن ثابت اور ابی بن کعب کو دے دیا۔

ابن ابی حاتم نے محمد بن المنکدر کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی تو حضرت زید بن حارثہ اپنا سبل نامی گھوڑا لے کر حضور انور کی خدمت میں حاضر ہوتے اور

یوں گویا ہوئے کہ مجھے اپنی تمام املاک میں یہ گھوڑا سب سے زیادہ محبوب ہے اس لیے یہ میری جانب سے راہ خدا میں صدقہ ہے۔ حضور انور نے ان سے گھوڑا لیا اور ان ہی کے صاحبزادے حضرت اسامہ کو دے دیا۔ زید بن حارثہ اس پر کچھ اندر اندر منقبض ہوتے۔ حضور نے زید کے چہرے سے انقباض پڑھ کر فرمایا بے فکر رہو اللہ نے تمہارا صدقہ قبول فرمالیا۔

عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ اس آیت کے تقاضے سے میں اس قدر متاثر ہوا کہ میں نے اپنی ساری املاک پر جائزہ کی خاطر ایک نگاہ ڈالی میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنی تمام املاک میں مرجانہ نامی کنیز سے محبت ہے۔ میں نے اسے خالصۃً اللہ کے لیے آزاد کر دیا اور اپنے غلام نافع سے اس کی شادی کر دی ۔۔۔ خود حضرت عمر نے اسی تاثر کے تحت اپنی کنیز کو آزاد کیا تھا۔

اس آیت کے مطالبہ کے تحت صحابہ و تابعین میں ایثار و قربانی اور انفاق کے بے شمار واقعات ہیں۔

صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے یہ واقعہ آیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہاں ایک مہمان آیا۔ آپ کے گھر میں مہمان کی ضیافت کا کوئی سامان نہ تھا۔ ایک انصاری ابوطلحہ اس مہمان کو اپنے ساتھ لے گئے۔ انہوں نے مہمان کے سامنے کھانا رکھ دیا اور بیوی کو چراغ گل کرنے کی ہدایت کر دی۔ تاریکی میں آپ مہمان کے ساتھ کھانے پر ہاتھ بڑھاتے رہے مہمان نے کھانا کھالیا۔ خود اور ان کی اہلیہ بھوکے ہی سو گئے صبح ہوئی تو حضور انور نے فرمایا کہ ابوطلحہ اللہ سبحانہ کو آج رات مہمان کے لیے تمہارا کردار بہت پسند آیا اور اسی کردار پر شاباش قرآن نے یہ کہہ کر دی ہے ویؤثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ اپنے آپ پر دوسروں کو تنگی کے باوجود ترجیح دیتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عمر بیماری سے اٹھے تھے اور بے حد کمزور تھے۔ مچھلی کھانے کو جی چاہ رہا تھا۔ مدینہ میں پوری تلاش کے باوجود نہ ملی، ایک روز کے بعد ملی اور ۱½ درہم میں خریدی گئی، روسٹ کی گئی۔ آپ کی خدمت میں نوکر نے لا کر پیش کی، دروازے پر مانگنے والے نے دستک دے دی۔ آپ نے نوکر سے کہا کہ مچھلی روٹی میں رکھ کر مانگنے والے کو دے آؤ۔ نوکر کو دونوں باتیں معلوم تھیں، آپ کا غلبہ اشتیاق اور مچھلی کی دیر بعد دستیابی۔ اس نے فقیر کو دینے میں لیت و لعل سے کام لیا مگر حضرت عبداللہ نے نوکر کو اصرار سے کہا کہ جاؤ فقیر کو دے آؤ۔

نوکر دوڑنے پر گیا اور فقیر کو ایک درہم دے کر آ گیا اور بتایا کہ میں نے فقیر کو پیسے دے دیے ہیں لیجیے مچھلی سے شوق پورا فرمایئے۔ حضرت عبداللہ نے کہا جاؤ وہی مچھلی فقیر کو دے آؤ۔ اور اس سے پیسے بھی واپس نہ لینا۔ بندہ خدا میں نے حضور انور سے سنا ہے کہ جو شخص اپنی چاہت اور خواہش کو دبا کر دوسرے کو اپنے آپ پر ترجیح دیتا ہے اللہ سبحانہ اس کی مغفرت فرما دیتا ہے۔

حضرت فاروق اعظم فرماتے ہیں کہ حضور انور کے صحابہ میں سے ایک شخص کو ہدیۃً سری دی گئی اس نے یہ خیال کر کے کہ فلاں صاحب کو اس کی مجھ سے زیادہ ضرورت ہوگی سری ان کے گھر روانہ کر دی۔ انہوں نے بھی اسی خیال سے آگے روانہ کر دی یہاں تک کہ سری سات گھروں کا چکر لگانے کے بعد پہلے ہی شخص کے پاس آ گئی۔

ابو طالب مکی نے قوت القلوب اور امام غزالی نے احیاء العلوم میں یہ واقعہ لکھا ہے۔

حقوق و فرائض

جیسے لفظ تقویٰ فرائض کی ادائیگی کے لیے آتا ہے ایسے ہی لفظ بِر حقوق کی پاسداری کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے بِر کی ضد عقوق آتا ہے۔ بر اور بار اس سے صفت کے صیغے آتے ہیں برًّا بوالدیہ اس سعادت مند بیٹے کو کہتے ہیں جو اپنے والدین کا فرمانبردار ہو اور ان کے پورے پورے حقوق ادا کرنے والا ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کے معنے میں صرف حقوق ہی داخل ہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ یہ لفظ زیادہ حقوق میں استعمال ہوتا ہے اور فرائض میں کم۔ فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے بچاؤ کے معنے میں ہو تو اس کی ضد فجور آ جاتی ہے۔

انسان کا دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں اور مکینوں سے ایک گونہ لگاؤ ہے۔ اس لگاؤ کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی ترقی و حفاظت میں کوشش کی جائے۔ اس شے سے وہ نفع اٹھایا جائے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے اور ان موقعوں پر اسے صرف کیا جائے جن میں اللہ سبحانہ نے ان کو صرف کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو ہر اس پہلو سے بچایا جائے جس سے اس کی نفع رسانی کو نقصان پہنچے۔ اسی ذمہ داری کا نام حق ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم اس وقت تک ہرگز ابرار نہ ہو گے جب تک اپنی محبوب ترین چیزوں کو اللہ کی راہ میں خرچ نہ کرو۔ بظاہر اس میں صدقات واجبہ اور نافلہ سب داخل ہیں لیکن صحابہ کرام کے واقعات سے معلوم ہوتا ہے کہ آیت کا منشا صدقات نافلہ ہیں۔

اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ صدقات وخیرات میں واقعی فضیلت اور ان کے ذریعے واقعی نیکی کا درجہ اس وقت ملے گا جب رسمی اور رواجی طرز سے ہٹ کر اللہ کی راہ میں اپنی محبوب اور پیاری چیز کو خرچ کرو گے۔ اور ابوبکر الوراق نے اس آیت کو مکارمِ اخلاق کے لیے رہنما بتایا ہے وہ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ فرمارہے ہیں کہ میں تمہارے ساتھ نیک معاملہ اس وقت تک نہ کروں گا جب تک تم اپنے بھائیوں کے ساتھ نیک معاملہ نہ کرو اور اپنے اموال ان پر خرچ نہ کرو۔ جب تم یہ کرلو گے تو میرے کرم اور مہربانیوں کے تم مستحق ہو گے[1]

ایک ارشادِ نبوت جو صحیح مسلم میں نواس بن سمعان کے حوالہ سے آیا ہے اس میں بِر حسنِ اخلاق کو قرار دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے:

نواس بن سمعان کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بِر صرف اچھے اخلاق کا نام ہے اور گناہ وہ ہے جس کی تمہارے دل میں کھٹک ہو اور تمہیں یہ پسند نہ ہو کہ لوگ اس پر مطلع ہوں۔

مسندِ احمد اور مسندِ دارمی میں حضرت وابصہ کے حوالہ سے جو ارشادِ نبوت آیا اس میں بِر کی حقیقت کو اور زیادہ واضح طور پر پیش کیا ہے:

وابصہ کہتے ہیں کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور نے فرمایا کہ وابصہ تو بِر اور اثم کے بارے میں پوچھنے آیا ہے۔ عرض کی جی ہاں! فرمایا کہ تو اپنے دل سے پوچھ۔ بِر وہ ہے جس پر تیرا جی مطمئن ہو اور تیرا دل لگ جاتے اور اثم وہ ہے کہ جس کی کھٹک تیرے جی میں رہے اگرچہ لوگ تجھے کتنے ہی فتوے دیں۔

یہ دونوں ارشاداتِ نبوت واشگاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ بِر کا سرتاسر تعلق لوگوں کے حقوق سے ہے۔

انسانی حقوق جیسے اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں ایسے ہی معاملات میں دیانت وامانت سے بھی تعلق رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک ارشادِ نبوت میں راست گفتار اور سچے کو بار فرمایا ہے چنانچہ مسندِ احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو کے حوالہ سے یہ واقعہ آتا ہے کہ:

---

[1] قرطبی

ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ جنت کا عمل کیا ہے۔ فرمایا سچ بولنا۔ جب بندہ سچ بولتا ہے تو بار(نیکوکار) ہو جاتا ہے۔ اور ایماندار ہوتا ہے اور جب ایماندار ہو جاتا ہے جنت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اس نے دریافت کیا کہ دوزخ کا عمل کیا ہے؟ فرمایا جھوٹ بولنا، جب بندہ جھوٹ بولتا ہے تو فاجر ہو جاتا ہے اور جب فاجر ہوتا ہے تو راہِ کفر اختیار کرتا اور کافر ہوتا ہے تو جہنم میں جاتا ہے۔

ایسے ہی بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے حوالہ سے یہ ارشادِ نبوت اس کی توضیح کرتا ہے کہ:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! راست گوئی کی عادت اختیار کرو کیونکہ راست گوئی بر نیکوکاری کی رہنما ہے اور نیکوکاری یعنی بر انسان کو جنت میں پہنچاتی ہے۔ آدمی سچ بولتا رہتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں اس کا لقب صدیق ہو جاتا ہے اور دیکھو جھوٹ سے بچنا۔ جھوٹ فجور میں مبتلا کرتا ہے اور فجور دوزخ میں پہنچا کر چھوڑتا ہے۔ انسان جھوٹ بولتا رہتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ کی بارگاہ میں اس کا لقب کذاب پڑ جاتا ہے۔

ان ارشاداتِ نبوت کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انسانی حقوق یعنی اخلاق و معاملات میں حسن کاری کا نام بر ہے۔ اگر اخلاق میں ہو تو اس کا مقابل فجور ہے اور معاملات میں ہو تو اس کا مقابل اثم ہے اور اگر اقارب میں ہو تو اس کا مقابل عقوق ہے۔ بہرحال جیسے خداوندی حقوق کی پابجائی کا نام تقویٰ ہے ایسے ہی انسانی حقوق کی ادائیگی کا نام بر ہے۔ اسی بنا پر سفر کی دعا میں دونوں کو مانگا ہے۔

اللھم انا نسئلک فی سفرنا ھذا البر والتقوی

اے اللہ ہم آپ سے اپنے اس سفر میں بر و تقویٰ مانگتے ہیں۔

۱۶۵۔ جن سے تم محبت رکھتے ہو۔ اصل ارشاد یہ ہے کہ:

مما تحبون وہ چیز جسے تم محبوب رکھتے ہو۔ محبوب سے مراد یہاں مال ہے۔ مال و دولت اور سرمائے کے لیے ہی مما تحبون کی کنائی تعبیر اختیار کی ہے۔ صحابہ کے واقعات بھی اسی کی تائید کرتے ہیں۔

اس سے واضح ہوتا ہے کہ اللہ کے نزدیک بزرگی اور فضیلت کا معیار کیا ہے۔ فرمایا سب سے بڑا درجہ انہی کا ہے جنہوں نے اللہ کی راہ میں اپنی محبوبات کی قربانی کی اور ایمان وعمل کی آزمائش میں پورے اترے۔ تمہارے گھڑے ہوئے تقدس و بزرگی کے مناصب اور رواجی بڑائیاں اللہ کے نزدیک کوئی حقیقت نہیں رکھتیں۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ جیسے بنی اسرائیل دینداری کی محض رسوم کی ظاہردارانہ پیروی کرکے یہ سمجھتے تھے کہ جو سب سے بڑا درجہ انہی کا ہے وہ کسی کا نہ ہوا ہے نہ ہوسکتا ہے غلط ہے۔ ایسے ہی آج کل عام مسلمانوں کی عام ذہنیت یہ ہے کہ وہ بھی حقیقی اور واقعی نیکیوں پر رواجی نیکیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگر ایک فاسق وفاجر دولت مند محرم میں سبیل لگا دیتا ہے یا ربیع الاول میں دھوم دھام سے مجلس میلاد کرلیتا ہے یا کوئی درگاہ بنا دیتا ہے تو وہ سمجھ لیتا ہے کہ بہت بڑی نیکی کرلی ہے۔ اور نہیں جانتا کہ اللہ کے نزدیک رواجی نیکیاں نیکیاں نہیں۔ نیکی کا معیار صرف ایمان وعمل اور اللہ کی راہ میں محبوب ترین چیز کی قربانی ہے۔ محبوبیت کا معاملہ اضافی ہے۔ ایک دولت مند کی محبوب اور ایک غریب کی محبوب چیز میں فرق ہے۔ اسی بنا پر قاضی ثناء اللہ نے **ما تحبون** کا مصداق مال کی مختلف قسمیں بتایا ہے فرماتے ہیں کہ محبوب سے مراد تمام اصناف مال ہیں۔ کیونکہ مال کی محبت میں لوگوں کے مذاق مختلف ہیں۔

۱۶۶- اور دیکھو جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی تم خرچ کروگے اللہ اس سے باخبر ہے۔ یعنی اللہ کو معلوم ہے کہ کیسی چیز خرچ کی، کتنی محبوب اور پیاری چیز جس طرح کے مصرف میں جس قدر اخلاص اور حسن نیت سے خرچ کروگے اسی کے موافق اللہ تعالیٰ کے یہاں بدلہ ملنے کی امید رکھو[۱] قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ اس فقرے میں اگرچہ سبب ذکر کیا ہے مگر مراد مسبب ہے گویا علم وخبر سے اس کا لازم مراد ہے یعنی اللہ سبحانہٗ جب تمہارے خرچ کیے ہوتے پیسے پیسے سے واقف ہے تو کوئی وجہ نہیں اس کا اجر ضائع ہو جائے۔

اس جملے میں یہ بھی بتلایا گیا ہے کہ آدمی جو کچھ خرچ کرتا ہے اس کی اصل حقیقت اللہ پر روشن ہے کہ وہ اس کے نزدیک محبوب ہے یا نہیں اور اخلاص کے ساتھ اللہ کی رضا کے لیے خرچ کر رہا ہے، بار بار شہرت کے لیے محض کسی کا دعویٰ اس کے لیے کافی نہیں ہے۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

بلکہ علیم وخبیر جانتا ہے کہ واقع میں کیوں خرچ کر رہا ہے[1]
آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ثواب تو ہر خرچ کرنے سے ملتا ہے جو اللہ کی راہ میں کیا جائے مگر زیادہ ثواب محبوب چیز کے خرچ کرنے سے زیادہ ہوتا ہے[2]

مالِ محبوب، طیّب اور العفو

آپ انفاق کے موضوع پر تیسرے پارے میں پڑھ چکے ہیں کہ

انفقوا من طیبات ما کسبتم

اس آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ دیا جائے وہ کوئی نکمی اور بیکار چیز نہ ہو کہ اس کے دینے سے نفس کی بلندی کے بجائے نفس کی پستی و دنائت ظاہر ہوتی ہے ارشاد ہے۔

انفقوا من طیبات ما کسبتم و مما اخرجنا لکم من الارض

اس میں سے جو تم نے کمایا اور اس میں سے جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا اچھی چیزیں راہ خدا میں خرچ کرو۔

اور آپ انفاق ہی کے موضوع پر دوسرے پارے میں پڑھ چکے ہیں؛

یسئلونک ماذا ینفقون؟ قل العفو

آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ کتنا خرچ کریں فرمادیجئے کہ العفو

یعنی عفو خرچ کریں۔ عفو کے معنے امام رازی اور دوسرے علماء نے یہی بتلائے ہیں کہ "آدمی کی ذات اور اہل وعیال سے جو کچھ بچ جائے"، لسان العرب میں لغت کے مشہور امام فراء سے منقول ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ارشاد جو قل العفو ہے اس سے مراد سرمایہ کا فضل اور بڑھوتری ہے۔

اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سرمایہ کی آمدنی یا اصل کے منافع کو العفو کہتے ہیں اور اس آیت میں بتایا ہے کہ اپنی محبوب چیزوں میں سے جب تک اللہ کی راہ میں خرچ نہ کروگے البر یعنی نیکی میں کمال نہ پاؤگے تو ان تینوں یعنی العفو، طیب اور ما تحبون میں منافات نہیں بلکہ پوری پوری ہم آہنگی ہے۔ اصول یہ ہے کہ انفاق کی اس ذمہ داری کا تعلق ذاتی مال و

---

[1] معارف م ش [2] بیان القرآن

املاک میں صرف اسی حصہ سے ہے جو اپنی ضروریات سے فاضل ہو۔ کوئی آدمی بھی اس کا مکلف نہیں کہ اپنے سرمایہ یا راس المال کو خیرات کرے۔ قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ اصل کو باقی رکھ کر منافع کو اللہ کی راہ میں دے اور جو کچھ دے وہ اچھی اور ستھری چیز دے نکمی اور گری پڑی چیز ایسی نہ دے جو خود بھی لینے کو تیار نہ ہو۔ اور صرف اچھی ہی نہیں بلکہ اپنی پسندیدہ دے۔ پسندیدگی اور محبوبیت صدقہ کی صحت اور قبولیت کی شرط نہیں بلکہ نیکی میں درجہ کمال کی شرط ہے۔ ورنہ از روئے قرآن ہر خرچ راہِ خدا کا خرچ اس وقت قرار پاتا ہے جبکہ اس میں خود غرضی نہ ہو، ریاکاری اور نمائش نہ ہو، احسان جتانے اور اذیت دینے کی کوشش نہ ہو۔ اپنا بدتر مال چھانٹ کر نہ دے بلکہ عمدہ اور بہتر مال دے۔ اور اس میں اللہ کی محبت اور اس کی خوشنودی کے سوا کوئی مقصود نہ ہو۔

مقابلہ کا امتحان

اگر آیت میں نیکی میں درجہ کمال کو بتایا گیا ہے تو اس کا صاف اور واضح لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اگر تم محبت الٰہی کے مدعی ہو تو اس دعوے کی صداقت کا معیار یہ ہے کہ محبوب کی رضا کی خاطر اپنی محبوبات کو قربان کر دو۔

آیت میں حتیٰ تنفقوا کا مفعول مما تحبون ہے۔ یہ اللہ کا بہت بڑا فضل ہے کہ کمال کے لیے ساری محبوبات کو قربان کرنے کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ کچھ کو قربان کرنے کا مطالبہ کیا ہے انسانی محبوبات کیا ہیں یہاں اس کی تفصیل بیان نہیں کی ہے مگر قرآن میں دوسرے مقام پر ان محبوبات کی تفصیل دی ہے۔

تیسرے پارہ میں آیت نمبر ۱۴ میں ہے:

انسان کے لیے دل کی محبت اور چاہت عورتوں میں اولاد میں، چاندی سونے کے ذخیروں میں، چنے ہوئے گھوڑوں میں، مویشیوں میں اور کھیتی باڑی میں ہے۔

اسی طرح سورہ برأت کی آیت نمبر ۲۴ میں ہے

مسلمانو! اگر تمہارے باپ، تمہارے بیٹے، تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، برادری، تمہارا مال جو تم نے کمایا ہے، تمہاری تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہے تمہارے رہنے کے مکانات جو تمہیں پسند ہیں اللہ، اس کے رسول اور اللہ کی راہ

ہیں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک کہ اللہ اپنا حکم لے آئے۔
اس سے معلوم ہوا کہ ما تحبون صرف کھانے پینے کی چیزیں نہیں ہیں بلکہ زندگی کی وہ تمام چیزیں ہیں جن سے ہمیں محبت ہوتی ہے۔ عام غلط فہمی یہ ہے کہ ما تحبون سے صرف کھانے پینے کی چیزیں مراد ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اللہ کے دین کی ایک بڑی اصولی تعلیم لوگوں کی نگاہوں سے اوجھل ہو گئی۔ یہ اسی غلطی کا نتیجہ ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں سے خدا کی راہ میں قربان کرنے کو تو ایک دینی معاملہ سمجھا جاتا ہے لیکن تمدن کے وسیع تر معاملات، مناصب اور مراتب میں ہم اس کا تصور بھی نہیں کرتے کہ ان کو بھی اللہ کی راہ میں قربان کرنا چاہیے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ایک طرف اسلام ہے اور دوسری طرف تمہاری محبوبات، مقابلے کے اس امتحان میں جو بھی اسلام کی خاطر اپنی محبوبات کو قربان کرتا ہے وہ ہی نیکی کے اعلیٰ مقام پر فائز ہے۔

اسلامی نظام اور اشتراکی نظام میں امتیاز

یہ آیت قرآنی بتا رہی ہے کہ اسلام نے معاشی زندگی کی اصلاح میں محض ضابطہ بندی پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اخلاقی تربیت سے بھی اس مقصد کو حاصل کرنے کی کوشش کی ہے اور یہی چیز اشتراکی نظام اور اسلامی نظام کے درمیان حدِ فاصل اور وجہ امتیاز ہے۔
اشتراکیت نے معاشی زندگی کو سدھارنے کے لیے صرف خارج میں ضابطہ بندیاں کرنے پر انحصار کر لیا اور اس حقیقت کو فراموش کر دیا کہ ضابطہ محض جبر اور مادی طاقت کے بل پر قائم ہوتا ہے اور جو نظام محض زور و طاقت اور جبر پر قائم ہو اس کی عمر بہت مختصر ہوتی ہے۔ تمدن کے کسی ضابطہ کو بقا و دوام نصیب نہیں ہو سکتا جب تک جمہور کے اپنے دلوں میں بھی اس مقصد کے حصول کی لگن نہ ہو جسے قانون و ضابطہ بزور و جبر حاصل کرنا چاہتا ہے اشتراکی نظام انسان کی پوری معاشی زندگی کو ضابطہ اور قانون کی بندش میں جکڑ کر رکھ دیتا ہے اور اس کی زندگی کے کسی گوشہ میں بھی انسان کے ارادہ اور مرضی کو آزاد نہیں چھوڑتا اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اشتراکی نظام کے تحت انسان کے اخلاقی احساسات حالتِ تعطل میں رہیں گے اور قدرت کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ کسی قوت کا جمود و تعطل اس کی موت ہے جس دنیا میں ہمدردی، صلہ رحمی، عزیز و اقارب کی امداد غربا کی دستگیری کے مواقع ناپید ہوں۔

جہاں کسی شخص کو انفرادی طور سے اور اپنی آزاد مرضی سے کسی پر رحم کھانے کسی کے کام آنے کسی کو اپنی کمائی میں شریک کرنے کا موقع نہ ہو جس جماعت کے افراد باہمی معاملت اور آپس کے تعلقات میں ایثار و قربانی کی رُوح سے خالی ہوں اس میں اخلاقی احساسات کا نشوونما ناممکن ہے چونکہ اشتراکی نظام کا مقصد ایک ایسی سوسائٹی کی تعمیر ہے جس میں کوئی فرد دوسرے کی معاشی امداد کا محتاج نہ ہوگا اور نہ کوئی شخص دوسروں کی امداد کو اپنا اخلاقی فرض خیال کرے گا اس لیے اس نظام میں انسان کی بعض اعلیٰ خصوصیات اور شریف جذبات مثلاً غربا کی اعانت، حاجت مندوں کی حاجت روائی، بیماروں کی عیادت و خبرگیری اور اس نوع کے دیگر انسانی خصائل بکسر ناپید ہو جائیں گے۔ یہ صحیح ہے کہ اس نظام میں اجتماعی ادارے ان فرائض کو سرانجام دیں گے لیکن اول تو اجتماعی امداد شخصی اعانت کا بدل نہیں ہو سکتی۔ دوسرے جب افراد میں انفرادی طور پر اس صنفِ اخلاق کا نشوونما بند ہو جائے گا تو اجتماعی اداروں کو وہ آدمی کہاں مل سکیں گے، جن کے دل دوسروں کے لیے رحم و شفقت اور ہمدردی و ایثار کے جذبات سے لبریز ہوں، شخصی اعانت اخلاقی احساس کی بیداری اور حرکت کا پیمانہ ہے۔ اجتماعی امداد اور اخلاقی احساس کے مابین کوئی لازمی تعلق نہیں ہے کیونکہ قائم شدہ روایات عام رائے کا دباؤ یا محض جذبۂ تقلید اس نوع کی امداد کا محرک ہو سکتا ہے بخلاف اس کے شخصی اعانت کا جذبہ صرف اخلاقی احساس سے تحریک پاتا ہے اس کے برعکس اسلام معاشی زندگی کے بعض اہم اور ضروری شعبوں کو ضابطہ و قانون کی طاقت کے حوالہ کر کے باقی تمام شعبوں میں انسان کے اخلاقی احساسات کو ان کے عمل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے اور اس کے تصورات کی اصلاح اس کی سیرت و ذہنیت کی تشکیل اور ایک مناسب ماحول کی تخلیق کے ذریعہ سے بالواسطہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ اخلاقی احساسات کا یہ عمل غلط سمت میں نہ جاتے اس طرح اسلام نے دیگر تمام امور کی طرح معاشی امور میں بھی انسان کے آزاد اور باختیار ارادہ کے لیے ایک ایسا میدان چھوڑ دیا ہے جہاں اس پر اخلاقی احساسات کے سوا قانون یا حکومت کا کوئی دباؤ نہیں ہے تاکہ اس میدان میں اس کی اخلاقی آزمائش ہو سکے۔ اگر اشتراکیت کی طرح اسلام نے بھی جملہ معاشی امور کو قانون اور حکومت کے قبضہ میں دے دیا ہوتا تو پھر اس اخلاقی آزمائش کا موقع باقی نہ رہتا جو شخص قانون کی رُو سے اس بات پر مجبور ہو کہ اپنی کمائی ایک لاشخصی ——— ادارہ کے حوالہ کر دے اور پھر اس میں سے صرف اتنا ہی حصہ واپس لے جتنا اس کی ضروریات کے لیے کافی ہو

اس پر اخلاقی اچھائی یا برائی کا حکم کس طرح لگایا جا سکتا ہے کیونکہ اس عمل میں اس کا آزاد ارادہ نہیں بلکہ قانون کا خوف کام کر رہا ہے البتہ اگر حکومت اور قانون کے خوف سے بے پرواہ ہو کر اس سے یہ عمل ہو تا تب اس کے اخلاقی نشوونما کا کوئی اندازہ لگایا جا سکتا اس لیے اسلام نے انفاق فی سبیل اللہ کی پُرزور تلقین کی اور بتایا کہ نیکی حاصل نہیں ہو سکتی اگر خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت انسان میں راسخ نہ ہو جائے لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون۔ گویا حکومت اور قانون کو درمیان میں لائے بغیر اسلام انسان کے اخلاقی احساسات کو اتنا مضبوط دیکھنا چاہتا ہے کہ جہاں خارج سے اس پر کوئی دباؤ یا دُنیا کی ملامت و سرزنش کا کوئی موقع نہ ہو وہاں بھی ایک انسان دوسرے کی اعانت و دستگیری کو اپنا فرض منصبی خیال کرے مسلمانوں کی شناخت بتلاتے ہوئے قرآن حکیم فرماتا ہے ومما رزقنا ھم ینفقون اور یہ وہ لوگ ہیں کہ جو کچھ ہم نے دیا ہے اس میں سے راہِ خدا میں صرف کرتے ہیں الذین ینفقون اموالھم سراً وعلانیۃ وہ لوگ جو اپنے مال کو ظاہر اور پوشیدہ طور سے خدا کی راہ میں صرف کرتے ہیں پورا قرآن انفاق کی تاکید سے بھرا پڑا ہے ۔ اگر وہ سب آیات جمع کر دی جائیں جن میں انفاق کا حکم دیا گیا ہے تو معلوم ہوگا کہ نماز اور زکوٰۃ کے بعد اگر کسی عمل کی بہ تکرار تلقین کی گئی ہے تو وہ انفاق فی سبیل اللہ ہے کیونکہ انفاق فی سبیل اللہ اخلاقی فضیلت رکھنے کے علاوہ معاشی اہمیت کا بھی سرمایہ دار ہے جس جماعت میں انفاق کی روح کام کر رہی ہوگی اس میں غربت و افلاس اور درد و مصیبت کی صدائیں مشکل سے سُنی جا سکیں گی۔ جس سوسائٹی میں غریبوں کی دستگیری محتاجوں کی اعانت، یتیموں کی خبر گیری اور اقربا کی ہمدردی کا جذبہ برسر کار ہو وہاں معاشی تنگدستی کی شکایت ناپید ہو گی جہاں انفاق کی سرگرمیاں ہوں وہاں گردش زر ـــــ میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی اور جہاں اس میں رکاوٹ نہ ہو گی وہاں معاشی خرابیوں کا ایک بڑا دروازہ آپ سے آپ بند ہو جائے گا کیونکہ دُنیا کے اکثر و بیشتر معاشی مفسدات اسی راہ سے اُتے ہیں گردش زر جتنی مکمل ہو گی معاشی زندگی اتنی ہی پُرسکون ہو گی۔ اسی طرح معاشی مساوات کے حصول کی غرض سے اسلام نے وہ تمام تدبیریں اختیار کیں جو اس کے لیے ممکن ہو سکتی تھیں اور اس میدان میں وہ اشتراکیت سے اس کے بلند بانگ دعووں کے باوجود کسی طرح پیچھے نہیں ہے البتہ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اسلام مساوات ـــــ سے زیادہ معاشرتی مساوات ـــــ کا حامی اور مؤید ہے معاشی مساوات لئے صرف اس حد تک مطلوب ہے کہ

اجتماعی دولت کسی خاص طبقہ میں محدود نہ ہونے پائے بلکہ جماعت کے زیادہ سے زیادہ افراد پر تقسیم ہو اور ہر شخص کو اتنی روزی میسر آ جائے کہ وہ اپنی اور اپنے متعلقین کی ابتدائی ضروریات پوری کر سکے اشتراکیت کی طرح اسلام یہ نہیں چاہتا کہ جملہ افراد معاشی حیثیت سے یکساں حالت میں ہوں یا معاشی زندگی کی اونچ نیچ بالکل ہموار اور ہم سطح ہو جائے وہ ذاتی ملکیت کا حق تسلیم کرتا ہے اور معاشی نامساوات کو بُری نظر سے نہیں دیکھتا ہے بشرطیکہ یہ نامساوات ظلم کی حد تک نہ پہنچ جائے البتہ جس چیز کو وہ یکسر مٹا دینا چاہتا ہے وہ یہ ہے کہ دولت یا تمول کی بنا پر افراد کے باہمی تعلقات میں کوئی فرق و امتیاز پیدا ہو یا دولت ہی عزت کا واحد معیار ہو جائے اس معاملہ میں اس کی راہ بالکل الگ ہے چنانچہ اس نے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا۔ ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت دار وہی ہے جس کے دل میں اس کا سب سے زیادہ خوف ہو۔ وہ ایک ایسی سوسائٹی تعمیر کرنے آیا ہے جس میں دولت، علم و ہنر، نسل یا خاندان کوئی بھی عزت کا معیار نہ ہو اور جہاں فرق و امتیاز کی صرف ایک وجہ تسلیم کی جائے۔ اور وہ یہ ہے کہ انسان کو خدا ترسی اور خدا پرستی میں کیا درجہ حاصل ہے۔ معاشرتی مساوات کے حصول کی غرض سے اسلام نے نماز با جماعت کو ہر مسلمان پر لازم قرار دیا ہے یہ ایک بڑا نفسیاتی حربہ ہے جس میں وہ اپنے پیروؤں میں معاشرتی مساوات اور اخوت کی رُوح پیدا کرنا چاہتا ہے۔ ظاہر ہے کہ نماز با جماعت کے التزام میں معاشرتی امتیازات پر ایک کاری ضرب پڑتی ہے۔ مندروں میں یکے بعد دیگرے پوجا پاٹ کرنے یا کلیساؤں میں ہفتہ میں ایک روز کرسیوں اور بنچوں پر بیٹھ کر عبادت کرنے سے اخوت اور مساوات کا وہ احساس نہیں پیدا ہوتا جو مسجد میں روزانہ پانچ وقت ایک ہی صف میں کھڑے ہو کر عبادت کرنے سے پیدا ہوتا ہے یہ بالکل غیر ممکن ہے کہ کسی مقام کے تمام مسلمان بلا فرق و امتیاز روزانہ پانچ وقت مسجد میں اس طرح جمع ہوں اور پھر بھی ان میں باہم وہ بُعد و فصل باقی رہے جو معاشی درجہ بندیوں کی وجہ سے پیدا ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ جو آج کل ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمان اہل ثروت اور اونچے طبقے کے لوگ اگر نماز پڑھتے بھی ہیں تو مساجد میں جماعت کے ساتھ نہیں بلکہ تنہا اپنے مکان کے کسی گوشے میں عیدین اور جمعہ کے موقع پر تو وہ البتہ مسجد میں نظر آتے ہیں مگر روزانہ پانچ وقتوں میں سے ایک وقت بھی ان کی صورت مسجد میں نظر نہیں آتی۔ اس کی وجہ یہی ہے اگر وہ مسجد میں پانچوں وقت کی نماز

اداکرنا شروع کر دیں تو پھر اپنے امتیازات اور معاشرتی مرتبہ کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ معاشرتی مساوات کا قیام معاشی مساوات کے حصول سے کہیں زیادہ اہم اور نتیجہ خیز ہے کیونکہ معاشی مساوات کے حصول کے بعد بھی طبقہ داریت ——— پیدا ہو سکتی ہے۔ اشتراکیت نے انسانی زندگی کے اس نفسیاتی پہلو کو نظر انداز کر دیا کہ طبقاتی امتیازات مختلف شکلوں میں ظہور کر سکتے ہیں۔ طبقہ داریت تنہا دولت اور معاش کی راہ ہی سے نہیں آتی ہے۔ دوسرے راستوں سے بھی اس مہلک مرض کا پھیلنا ممکن ہے اس کا قوی احتمال ہے کہ انسان معاشی حیثیت سے تو ایک دوسرے کے ہم پلہ ہوں لیکن نسل، خاندان، عہدے یا کسی اور اعزاز کی بنا پر ان میں امتیازات پیدا ہو جائیں۔ اس صورتِ حال کی مثالیں ہمیں ہندوؤں کی معاشرت میں بکثرت ملتی ہیں جہاں برہمنیت کسی معاشی مفاد پر نہیں بلکہ مذہبی اقتدار پر مبنی ہے اسی طرح چھتریوں نے اپنی ایک علیحدہ معاشرت بنالی ہے ساہوکار اور تجار مالدار ہونے کے باوجود برہمنوں اور چھتریوں سے کمتر درجہ رکھتے ہیں اشتراکیت کے قیام کے بعد بھی ممکن ہے کہ طبقہ داریت کسی اور شکل میں رونما ہو جائے۔ کسان اور مزدور، عالم اور عامی پرولتاریہ اور اشتراکی حکمرانوں کے مابین طبقاتی امتیازات اور معاشرتی درجہ بندیوں کے حدود فاصل قائم ہو جائیں اور معاشی حیثیت یکساں ہونے کے باوجود ان کے آداب و معاشرت میں نمایاں فرق پیدا ہو جائے۔ اس صورتِ حال کو دفع کرنے کی غرض سے اجتماعی عبادات کا نظام تیار کیا ہے تاکہ مسلمانوں میں باہم کوئی ایسا فرق و امتیاز پیدا نہ ہو جائے جس کی وجہ سے وہ اپنے مشترک نصب العین کے مطابق زندگی بسر نہ کر سکیں یا ان کے معاشرتی اختلافات سیاسی اور مذہبی اختلافات کے سانچے میں ڈھل جائیں۔

بہرحال یہ آیت اپنی شانِ جامعیت کی بنا پر اپنی مثال آپ ہے۔ اس ایک فقرے کے ذریعے مالیات اور معاشیات کے دریا کو کوزے میں بند کر دیا گیا ہے۔

كُلُّ الطَّعَامِ كَانَ حِلًّا لِّبَنِىٓ إِسْرَآءِيلَ إِلَّا مَا حَرَّمَ إِسْرَآءِيلُ
عَلَىٰ نَفْسِهِۦ مِن قَبْلِ أَن تُنَزَّلَ التَّوْرَىٰةُ ۗ قُلْ فَأْتُوا۟ بِالتَّوْرَىٰةِ
فَاتْلُوهَآ إِن كُنتُمْ صَٰدِقِينَ ﴿٩٣﴾ فَمَنِ افْتَرَىٰ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ
مِنۢ بَعْدِ ذَٰلِكَ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ الظَّٰلِمُونَ ﴿٩٤﴾ قُلْ صَدَقَ اللَّهُ ۗ
فَاتَّبِعُوا۟ مِلَّةَ إِبْرَٰهِيمَ حَنِيفًا ۖ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿٩٥﴾

کھانے کی سب چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں[167]، البتہ کھانے کی کچھ چیزیں اسرائیل نے اپنے اوپر خود ہی تورات کے نازل ہونے سے پہلے حرام کر لی تھیں[168]۔ اے پیغمبر! اگر اس بارے میں یہود آپ سے جھگڑتے ہیں تو آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو تو تورات لاؤ اسے پڑھو[169]۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی اللہ پر جھوٹ کی الزام تراشی کرتا ہے تو وہ ہی فی الواقع ظالم ہے[170]۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کچھ اعلان کیا ہے

سچا ہے۔ اگر تم میں سچائی کا کچھ نام ہے تو آؤ ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو جو ایک ہی کا ہو رہا تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔"

اسلام پر یہود کا اعتراض

یہودیوں کی طرف سے خصوصیت سے یہ اعتراض کیا گیا کہ اگر اسلام کی دعوت بھی وہی ہے جو حضرت ابراہیم اور پچھلے نبیوں کی تھی اور آپ فی الواقع ملت ابراہیم کی پیروکاری کے مدعی ہیں تو کیوں قرآن نے بھی ان تمام چیزوں کو حرام نہیں کیا، جو یہودیوں کے یہاں حرام سمجھی جاتی ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا اشارہ اونٹ کے ذبیحہ اور اس کی قربانی کی طرف تھا۔ اس لیے کہ اونٹ عرب کے محبوب ترین اموال میں سے تھا اور یہود کی شریعت میں جیسا کہ احبار میں وارد ہے حرام ہے۔ گویا جب علماء یہود اصول کی حد تک لاجواب ہو گئے اور قرآن کی اس صداقت کا کوئی جواب نہ دے سکے کہ قرآن کی تعلیم اور انبیاء سابقین کی تعلیمات میں سرمو فرق نہیں تو انہوں نے اپنے فقہی ترکش میں سے یہ تیر نکالا کہ آپ نے کھانے کی ان چیزوں کو کیوں حلال قرار دیا ہے جو پچھلے انبیاء کے زمانہ سے حرام چلی آ رہی ہیں؟

اس آیت میں یہودیوں کے اسی اعتراض کا جواب دیا گیا ہے کہ جو چیزیں طیبات میں داخل ہیں اور کھانے پینے کی ہیں وہ سب ابتداءً بنی اسرائیل کے لیے بھی حلال تھیں۔ البتہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے حضرت یعقوب نے کچھ چیزیں اپنے اوپر حرام کر لی تھیں، چنانچہ تورات دیکھ لو کہ اونٹ یا بعض دوسری چیزیں جن کو تم حرام قرار دیتے ہو ان کی حرمت کا کوئی ذکر عہد ابراہیمی میں نہیں ملتا۔ اگر ملتا ہے تو تورات میں ملتا ہے۔

تورات میں ملت ابراہیمی کے برعکس جن طیبات کو حرام قرار دیا گیا ہے وہ دو قسم کی ہیں، اول، وہ جو یہود کی سرکشی کی وجہ سے ان پر حرام ہوئی ہیں۔ قرآن ہی میں یہ مضمون سورۂ نساء

میں اس طرح بیان ہوا ہے کہ بنی اسرائیل کے جرائم کی بنا پر ہم نے بہت سی پاک چیزیں ان پر حرام کر دی ہیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں دیکھو آیت ۱۶۰ سورۃ نسآ اور پھر سورۃ انعام میں ارشاد ہوا ہے کہ ان کی سرکشیوں کی بنا پر ان پر تمام ناخن والے جانور حرام کیے اور بکری اور گائے کی چربی بھی ان کے لیے حرام قرار دی دیکھو آیت ۱۴۶۔

دوم، وہ چیزیں جن سے احتراز اور اجتناب کا تصور یہودیوں میں حضرت یعقوب سے چلا آرہا ہے۔ حضرت یعقوب نے بعض چیزوں کا استعمال چھوڑ دیا۔ اور ان کے بعد ان کی اولاد بھی اس کی تارک رہی۔ حتیٰ کہ یہودی فقہا نے ان کو قانونی محرمات میں شمار کر لیا۔ زیر تفسیر آیت میں اسی کی طرف اشارا ہے۔

جن مفسرین قرآن کی نگاہ محرمات کی پہلی قسم پر ہے۔ انہوں نے آیت زیر تفسیر میں اسرائیل سے مراد بنی اسرائیل لیا ہے اور جن کی نگاہ دوسری قسم کے محرمات پر ہے۔ انہوں نے اسرائیل سے مراد حضرت یعقوب لیا ہے۔ یہی مؤخر الذکر روایت زیادہ مشہور ہے۔

کُلُّ الطعام کیا ہے؟

۱۶۷۔ کھانے کی سب چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں۔ اصل ارشاد میں کل الطعام آیا ہے۔ طعام کے معنے کھانا، خوراک، خوردنی کھانا، جو چیز کھائی جاتے اس کی جمع اطعمہ ہے اور کبھی طعام اسم ہوتا ہے بمعنے اطعام یعنی کھلانا جیسے عطاء اسم ہے بمعنے اعطاء (دیکھو غرائب القرآن نیشاپوری) یہ بھی واضح رہے کہ کچھ اہل لغت نے طعام کے معنے گندم بتاتے ہیں لیکن گیہوں سے اس کی تخصیص صحیح نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ صدقہ فطر کی حدیث میں جو حضرت ابوسعید خدری کے حوالہ سے آئی ہے اس میں صاعا من طعام آیا ہے۔ یہاں بعض ائمہ نے کچھ قرائن کی وجہ سے طعام سے گندم مراد لیا ہے لیکن اور ائمہ نے اس مراد کو تسلیم نہیں کیا اور طعام سے یہاں بھی اس کے عام اور اصل معنے ہی مراد لیے ہیں۔ بعد کو بعض شافعی لغت نویسوں نے اپنے مذہب کی تائید کے لیے طعام کے معنے گندم بتانے شروع کر دیے۔

کل الطعام سے کیا مراد ہے۔ زمخشری کی رائے میں کھانے کی سب چیزیں مراد ہیں۔ لکھا ہے المطاعم کلھا۔ اور بتایا ہے کہ کھانے کی ساری چیزیں نزول تورات سے پہلے بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں۔ نزول تورات کے بعد بنی اسرائیل کی سرکشیوں کی وجہ سے

محرمات کا نزول ہوا ہے۔ قفال مروزی فرماتے ہیں کہ مردار اور خنزیر بنی اسرائیل کے لیے کبھی بھی حلال نہ تھا اس لیے کل الطعام سے کھانے کی ساری چیزیں مراد نہیں ہیں صرف وہ چیزیں مراد ہیں جن کے بارے میں زمانۂ نبوت میں دعویٰ تھا کہ یہ ابراہیم علیہ السلام کی ملت میں حرام تھیں۔ لیکن علامہ آلوسی کا رجحان زمخشری کی طرف ہے جب کہ متاخرین میں سے مولانا حقانی قفال مروزی کے ہمنوا ہیں۔ مولانا ثناء اللہ امرتسری نے یہاں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ مراد تو کل الطعام سے وہی ہے جس میں بحث تھی لیکن کل الطعام میں لفظ کل آنے کی وجہ سے افراد کا استغراق نہیں بلکہ اجزاء کا استغراق مراد ہے اس لیے ترجمہ یہ ہوگا کہ سارا کھانا بنی اسرائیل کے لیے حلال تھا یہ نہیں کہ سارے کھانے حلال تھے۔ اصول میں یہ بات طے ہو چکی ہے کہ:

> کل جب معرف باللام پر آئے تو احاطہ اجزا کا ہوتا ہے اور جب نکرہ پر آوے تو احاطہ افراد کا ہوتا ہے۔ (نور الانوار)

اور ظاہر ہے کہ ارشاد کل الطعام ہے کل طعام نہیں ہے۔ عام تراجم میں یہی ہے کہ سارے کھانے، سب کھانے، کھانے کی تمام چیزیں۔

اونٹ شریعتِ ابراہیم میں حرام نہ تھا۔

۱۶۸۔ البتہ کھانے کی کچھ چیزیں اسرائیل نے اپنے اوپر خود تورات کے نازل ہونے سے پہلے حرام کر لی تھیں۔ یہود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے کہتے تھے کہ تم اپنے کو دینِ ابراہیم پر کیسے کہتے ہو؟ جب کہ وہ چیزیں کھاتے ہو جو ابراہیم کے گھرانے پر اللہ نے حرام کی تھیں جیسے اونٹ کا گوشت اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جتنی چیزیں اب لوگ کھاتے ہیں سب ابراہیم کے وقت میں حلال تھیں جب تک تورات نازل ہوئی۔ بے شک تورات میں خاص بنی اسرائیل پر کچھ چیزیں حرام ہوئی ہیں۔ مگر ایک اونٹ تورات کے نازل ہونے سے پہلے حضرت اسرائیل یعقوب علیہ السلام نے اس کے کھانے سے قسم کھالی تھی۔ ان کی پیروی میں ان کی اولاد نے بھی چھوڑ دیا تھا اور اس قسم کا سبب یہ تھا کہ یعقوب علیہ السلام کو عرق النساء کا درد تھا۔ اس وقت نذر کی کہ اگر صحت پاؤں تو جو چیز میری رغبت کی ہے اسے چھوڑ دوں گا۔ ان کو یہی اونٹ کا گوشت اور دودھ بہت پسند تھا اسے نذر مان کر چھوڑ دیا۔ اس

قسم کی نذر جو تحریم حلال پر مشتمل ہو، ہماری شریعت میں جائز نہیں ہے کما قال تعالیٰ یاایہا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک اگر کرلی تو توڑدے اور قسم کا کفارہ دے (تنبیہہ) پہلی آیت میں محبوب چیز کے خرچ کرنے کا ذکر تھا اس آیت میں حضرت یعقوب کا ایک محبوب چیز کو چھوڑ دینے کا ذکر ہے۔ اس طرح دونوں آیتوں میں مناسبت ہوگئی۔ نیز ان آیات میں متنبہ کر دیا گیا کہ پہلی شریعتوں میں نسخ واقع ہوا ہے جو چیز ایک زمانے میں حلال تھی بعد میں حرام ہوگئی اگر اسی طرح اب شریعت محمدیہ اور پہلی شریعتوں میں حلال و حرام کے اعتبار سے کچھ فرق ہو تو انکار و استبعاد کی کوئی وجہ نہیں [1]

شیخ الاسلام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہودیوں کا اعتراض اونٹ کے گوشت اور دودھ کے بارے میں تھا۔ اور ان کا کہنا یہ تھا کہ اونٹ کا گوشت اور دودھ شریعتِ ابراہیم میں حرام تھا۔ قرآن نے ان کے اس خیال کی یہ کہہ کر تردید کی کہ کھانے کی سب چیزیں حضرت ابراہیم کے زمانے میں حلال تھیں۔ اونٹ کا گوشت تو حضرت یعقوب نے اپنے اوپر حرام کیا تھا۔ حضرت یعقوب نے کیوں حرام کیا تھا اس کا جواب شیخ الاسلام نے یہ دیا ہے کہ ان کو عرق النساء کا درد تھا۔ اس درد سے چھٹکارا پانے کے لیے نذر مانی کہ صحت یاب ہو جاؤں تو اونٹ کا گوشت نہ کھاؤں گا۔

اس واقعہ کا اصل مدار مسند احمد اور حاکم کی وہ روایت ہے جو ابن عباس کے حوالے سے آئی ہے اور جس کی تصحیح کا سہرا حاکم کے سر ہے۔ واقعہ کی یہ تفصیل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان نہیں فرمائی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ اسرائیلی ذرائع سے آمدہ ہے۔ اسرائیلی علوم کا خزانہ تورات ہے۔ تورات میں جب ہم اس واقعہ کا کھوج لگاتے ہیں تو ہمیں تورات کی پہلی کتاب پیدائش باب ۳۲ میں یہ ملتا ہے کہ:

> اور وہ اسی رات اٹھا اور اپنی دونوں بیویوں، دونوں لونڈیوں اور گیارہ بیٹوں کو لے کر ان کو یبوق کے گھاٹ سے پار اتارا۔ اور ان کو لے کر ندی پار کرایا اور اپنا سب کچھ پار بھیج دیا۔ اور یعقوب اکیلا رہ گیا۔ پو پھٹنے کے وقت تک ایک شخص وہاں اس سے کشتی لڑتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اس پر غالب

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نہیں ہوتا تو اس کی ران کو اندر کی جانب سے چھُوا۔ اور یعقوب کی ران کی نس اس کے ساتھ کشتی کرنے میں چڑھ گئی۔ اور اس نے کہا مجھے جانے دے کیونکہ پو پھٹ چلی۔ یعقوب نے کہا کہ جب تک تو مجھے برکت نہ دے میں تجھے جانے نہ دوں گا۔ تب اس نے اس سے پوچھا کہ تیرا نام کیا ہے؟ اس نے جواب دیا یعقوب اس نے کہا کہ آگے تیرا نام یعقوب نہیں بلکہ اسرائیل ہوگا۔ کیونکہ تو نے خدا اور آدمیوں کے ساتھ زور آزمائی کی اور غالب ہوا۔ تب یعقوب نے اس سے کہا کہ میں تیری منت کرتا ہوں تو مجھے اپنا نام بتا دے۔ اس نے کہا تو میرا نام کیوں پوچھتا ہے اور اس نے وہاں برکت دی اور یعقوب نے اس جگہ کا نام فنی ایل رکھ دیا اور کہا کہ میں نے خدا کو روبرو دیکھا تو بھی میری جان بچی رہی۔ اور جب وہ فنی ایل سے گزر رہا تھا تو آفتاب طلوع ہوا اور وہ اپنی ران سے لنگڑاتا تھا۔ اسی سبب سے بنی اسرائیل اس نس کو جو ران میں اندر کی طرف ہے نہیں کھاتے۔ کیونکہ اس شخص نے یعقوب کی ران کی نس جو اندر کی طرف سے چڑھ گئی تھی چھو دیا تھا۔

(دیکھو پیدائش از آیت ۲۲ تا آیت ۳۲ باب ۳۱)

ایسا محسوس ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل کی سرکشیوں کی وجہ سے اونٹ کا گوشت حرام ہوا تھا۔ اس کی فقہی توجیہہ ان کے علماء یوں کرتے ہیں کہ چونکہ اونٹ کی ران میں وہ نس ہوتی ہے اس لیے اونٹ کا گوشت حرام ہے۔ قرآن نے اس آیت میں ان کی تردید کی ہے۔ اس صورت میں الطعام سے اونٹ مراد ہے اور کل الطعام کا مطلب یہ ہے کہ اونٹ جو کھانے میں کام آتا ہے اس کے سارے اجزاء بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے سوائے اس جزء کے جسے حضرت یعقوب نے کسی وجہ سے کھانا چھوڑ دیا تھا۔ وجہ کچھ ہو جو وجہ روایات میں بتائی گئی ہے تورات نے اس کی تفصیل بتائی ہے یعنی عرق النسا کی وجہ سے اگر حضرت یعقوب نے اونٹ کا گوشت چھوڑ دیا تھا تو تورات نے عرق النسا کی وجہ یہ بتائی کہ حضرت یعقوب کو یہ بیماری اللہ سبحانہ سے کشتی میں لگی تھی۔ معاذاللہ۔

ظاہر ہے کہ تورات کے بیان میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔ ہمارے مفسرین نے اپنی خداداد بصیرت سے اصل بات ظاہر کر دی اور واقعہ کے اضافی اجزا کو حذف کر دیا۔ اس صورت میں کل الطعام سے کھانے کے اجزاء مراد ہیں اور اسرائیل سے حضرت یعقوب

مطلب یہ ہے کہ حضرت یعقوب نے اونٹ کے کچھ اجزا سے جو احتراز فرمایا تھا نزول تورات سے پہلے اونٹ کے وہی اجزا حضرت یعقوب نے اپنے اوپر حرام کیے وہ اس سے پہلے کچھ حرام نہ تھا بعد کو بنی اسرائیل نے اسے ممنوع سمجھ لیا۔ باقی رہا حضرت ابراہیم تو ان کی شریعت سے تو اونٹ کی حرمت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ہاں بے شک تورات میں اونٹ کی حرمت کا ذکر ہے۔ چنانچہ احبار میں ہے۔

پھر خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا۔ تم بنی اسرائیل سے کہو کہ زمین کے سب حیوانات میں سے جن جانوروں کو تم کھا سکتے ہو وہ یہ ہیں۔ جانوروں میں جن کے پاؤں الگ اور چرے ہوئے ہوں۔ اور وہ جگالی کرتے ہیں تم ان کو کھاؤ مگر جو جگالی کرتے ہیں یا جن کے پاؤں الگ ہیں ان میں سے تم ان جانوروں کو نہ کھانا یعنی اونٹ کو کیونکہ وہ جگالی کرتا ہے پھر اس کے پاؤں الگ نہیں سو وہ تمہارے لیے ناپاک ہے۔ احبار باب ۱۱ آیت ۱ تا ۵۔

اور معلوم ہے کہ تورات شریعت ابراہیم نہیں بلکہ شریعت موسیٰ ہے۔

یہودی صداقت کا امتحان

۱۶۹ اے پیغمبر اس بارے میں اگر یہود آپ سے جھگڑتے ہیں تو آپ کہہ دیجیے کہ اگر تم اپنے خیال میں سچے ہو تو تورات لاؤ اسے پڑھو۔ یعنی اگر تم سچے ہو کہ یہ چیزیں زمانہ ابراہیم سے حرام تھیں تو لاؤ یہ مضمون خود اپنی کتاب میں دکھلا دو۔ اگر اس میں نہ نکلا تو تمہارے کاذب اور مفتری ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ روایات میں ہے کہ یہود نے یہ زبردست چیلنج منظور نہ کیا۔ اور اس طرح نبی اُمّی کی صداقت پر ایک دلیل قائم ہو گئی [1]

تورات بتاتی ہے کہ اللہ سبحانہ نے نوح علیہ السلام سے فرمایا تھا کہ

ہر چلتا پھرتا جاندار تمہارے کھانے کو ہوگا۔ ہر سبزی کی طرح میں نے سب کا سب تم کو دے دیا۔

(پیدائش باب ۹ آیت ۳)

تورات نے حضرت ابراہیم سے حضرت نوح تک نسب کی جو کڑیاں شمار کرائی ہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان کے مطابق حضرت ابراہیم کی ولادت سے حضرت نوح تک ۔ ۹۰ سال ہوتے ہیں[لہ] ابراہیم کا تورات میں مبسوط ذکر ہے لیکن اس کا کوئی اشارہ بھی نہیں ہے کہ نوح کے لیے جو جانور حلال ہوئے تھے وہ حضرت ابراہیم کے لیے حرام ہو گئے تھے ۔ ہاں اگر ذکر ہے تو احبار میں حضرت موسیٰ و ہارون کی شریعت میں اونٹ کی حرمت کا ذکر ہے ۔ ارشاد ہے کہ اگر تمہارے اس دعوے میں صداقت ہے کہ حضرت ابراہیم پر اونٹ حرام تھا تو آؤ تورات لاؤ اور پڑھ کر بتاؤ کہ ابراہیم کے لیے اونٹ کے حرام ہونے کا کہاں ذکر ہے ۔ اگر تورات میں یہ بات نہیں ہے اور فی الواقع نہیں ہے تو یہ جیسے یہودیوں کے جھوٹا ہونے کی دلیل ہے ویسے ہی حضور انور کی صداقت کی دلیل ہے ۔

حافظ ابن القیم کی تحقیق

اس موقع پر حافظ ابن القیم نے جو تشریح فرمائی ہے وہ قابل تنقید ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ یہودیوں کی ایک گمراہی یہ تھی کہ خدا کی جانب سے آمدہ قوانین و شرائع میں نسخ نہیں مانتے تھے ۔ قرآن نے اس آیت میں ان کے اسی مزعومہ کی تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ نزول تورات سے پہلے سوائے اونٹ کے گوشت کے جسے حضرت یعقوب نے خود حرام کر لیا تھا کھانے کے سارے جانور بنی اسرائیل کے لیے حلال تھے ۔ تورات آئی تو حرمت آئی ۔ اور یہ بات

لہ تورات کی یہ تفصیل کہاں تک تحقیق علمی کے مطابق ہے ۔ اس سوال کا جواب لوگوں نے مختلف دیا ہے ۔ علماء یورپ کا ایک فرقہ ان میں سے اکثر کو لغو سمجھتا ہے لیکن اس سے زیادہ محقق فرقہ کہتا ہے کہ یہ تفصیلات نسبی نہیں بلکہ صرف جغرافی ہیں اور یورپ کا وہ گروہ جو معقول اور منقول میں تطبیق کا عادی ہے وہ سفر تکوین کے بیانات اور علم و بحث کے نتائج کو ایک ہی سمجھتا ہے وہ کہتا ہے کہ تورات میں جو نام گنائے گئے ہیں وہ تلاش و تحقیق کے بعد تھوڑے تغیر کے ساتھ قدیمی تاریخی ناموں سے خواہ وہ خود اشخاص کے ہوں یا ان کے مقامات کے ہوں بالکل مطابق ہیں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ طوفان نوح سے لے کر ابراہیم کی پیدائش تک کا زمانہ اس قدر مختلف ہے کہ اس میں مفاہمت ممکن نہیں ہے ۔

سب جانتے اور مانتے ہیں کہ بنی اسرائیل تورات سے پہلے اپنے باپ کی شریعت کے پابند تھے اور اس شریعت میں جو کچھ حلال تھا وہ اللہ کی جانب سے تھا اور انبیاء بنی اسرائیل کی وساطت سے تھا۔ بعدازیں تورات آئی اور حلال چیزوں کو حرام کیا اور اسی کا نام نسخ ہے۔ پھر فرمایا ہے بتاؤ کیا واقعی تورات کے محرمات حضرت یعقوب کے زمانے میں حرام تھے۔ یا صرف اونٹ کا گوشت ہی یعقوب نے اپنے لیے حرام کیا تھا۔ اگر حضرت یعقوب نے صرف اونٹ کا گوشت ہی حرام کیا تھا اور باقی تمام چیزیں نزول تورات سے پہلے حلال تھیں۔ تورات نے اگر حرام کی ہیں تو پھر نسخ کے بارے میں تمہارے انکار کی خود از روئے تورات کیا قیمت ہے؟ اور یہ تم کیوں کہتے ہو کہ شریعت منسوخ نہیں ہوتی۔ نسخ کے ہرگز یہ معنے نہیں ہیں کہ پہلے خدا نے کسی کام کے کرنے یا نہ کرنے کا حکم دیا مگر اس کا انجام اللہ سبحانہ کو معلوم نہ تھا اس لیے پھر اللہ سبحانہ کی رائے اس کے خلاف قائم ہو گئی اور پہلے حکم کو ختم کر دیا۔ بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہوتا ہے کہ اللہ کو پہلے سے یہ بات معلوم تھی کہ یہ حکم انسانوں پر انسانی استعداد کے مطابق فلاں وقت تک باقی رہے گا پھر منسوخ کر دیا جائے گا۔ پھر جب وہ وقت آجاتا ہے اللہ دوسرا حکم روانہ کر دیتا ہے تو درحقیقت یہ پہلے حکم کی مدت کا اعلان ہے لیکن چونکہ ہمارے علم میں پہلے حکم کی مدت اختتام نہیں ہے۔ اس لیے دوسرے حکم کے آنے پر ہم اپنی کوتاہی علم کی وجہ سے یہ خیال کرتے ہیں کہ حکم میں تبدیلی ہوتی ہے۔ اگر نسخ یہی ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ دلائل کی روشنی میں یہ ثابت چکا ہے اور خود یہودیوں کو مسلم ہے کہ تورات سے پہلے اسرائیلی زندگی شریعت کی پابند تھی۔ اگر تھی اور یقیناً تھی جیسا کہ خود بنی اسرائیل کو اعتراف ہے تو پھر بتایا جائے کہ اس شریعت متقدمہ کے احکام کو تورات نے منسوخ کیا ہے یا نہیں۔ اگر نفی میں جواب ہے تو یہ صاف جھوٹ اور افترا ہے اور اگر جواب اثبات میں ہے تو اسی کا نام نسخ ہے اور اسی کے لیے قرآن کا چیلنج ہے فاتوا بالتورىٰة فاتلوها ان كنتم صادقين۔

آیت کی تفسیریں دونوں ہیں عامہ مفسرین کی بنائی ہوئی بھی اور ابن القیم کی کی ہوئی بھی۔ دونوں میں جوہری فرق ہے۔ مفسرین کی تفسیر پر یہودیوں کا اعتراض یہ ہوگا کہ جب آپ ملت ابراہیم پر ہونے کے مدعی ہیں تو پھر اب ان چیزوں کو حلال کیوں قرار دیتے ہیں جو حضرت ابراہیم پر حرام تھیں۔ اور ابن القیم کی تشریح کی بنا پر ان کا اعتراض یہ ہوگا کہ قرآن چونکہ شریعت

کے احکام کو منسوخ کرتا ہے اس لیے ہم آپ کو پیغمبر نہیں مانتے۔ پہلے اعتراض کا اس آیت کے ذریعے جواب یہ دیا گیا ہے کہ تم جھوٹ بولتے ہو کہ یہ حضرت ابراہیم پر حرام تھیں۔ نزول تورات سے پہلے کھانے کی سب چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں اور حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت موسیٰ تک تمام انبیاء نے ان کو حلال سمجھا۔ ان میں سے اونٹ بھی ہے البتہ تورات کے نازل ہونے سے پہلے یعقوب نے کچھ چیزیں اپنے اوپر حرام کی تھیں اور بس۔ چنانچہ تورات کے اوراق اس کی شہادت دے رہے ہیں۔ اور دوسرے اعتراض کا جواب اس آیت کے ذریعے یہ دیا گیا ہے کہ نزول تورات سے پہلے سب کچھ حلال تھا۔ تورات نازل ہوئی تو حلال چیزیں حرام ہوئی ہیں۔ خود تورات اس کی گواہ ہے لہٰذا تمہارے دعویٰ کی خود تورات تکذیب کر رہی ہے۔

۱۷۰۔ اس کے بعد جو اللہ پر جھوٹ کی الزام تراشی کرتا ہے تو وہ بھی فی الواقع ظالم ہے یعنی بڑی بے انصافی ہوگی اگر اس کے بعد بھی وہی مرغ کی ایک ٹانگ رہی کہ نہیں' یہ چیزیں ابراہیم کے زمانہ سے حرام ہیں اور دین ابراہیم کے اصلی پیرو ہم ہیں۔ [1]

جب قرآن نے بطور دلیل اس بات پر زور دیا کہ اگر تمہیں اس بات کی سچائی سے انکار ہے تو تورات سے یہ ثابت کر کے دکھاؤ کہ واقعی حضرت ابراہیم کے زمانہ سے حرمت چلی آرہی ہے فاتوا بالتوراۃ اتنا ہی نہیں بلکہ اس نے کہا ہے کہ اپنی صداقت کے لیے تورات کی کوئی سی آیت تلاوت کرو۔ تو اب بتا رہا ہے کہ اگر یہی حقیقت ہے اور اس کے خلاف تورات کی کوئی شہادت نہیں پیش کی جا سکتی تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تم اللہ پر جھوٹ کا طوفان اٹھاتے ہو اور ظاہر ہے کہ اللہ پر جھوٹ باندھنے والا بہت بڑا ظالم ہے۔

اس آیت نے یہ بات کھول دی کہ اگر کسی مسئلہ میں کتاب الٰہی رہنمائی نہ کرتی ہو اور کوئی شخص سند کے بغیر اسے خدا کے نام سے پیش کرتا ہے تو وہ افترا علی اللہ کذبا جیسے سنگین جرم کا مرتکب ہے۔

دراصل علم کا رشتہ جب نبوت سے ٹوٹ جاتا ہے تو فکرِ انسانی حلال و حرام کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آزادانہ بہانے بنانا ہے۔ فکر کی اسی آوارگی کے تحت دعووں اور نعروں کا نام افترا علی اللہ کذباً ہے۔ خدا کی مخلوق اور خدا کے بندے ہو کر اللہ کی املاک میں اپنے تصرف اپنے استعمال اور انتفاع کے لیے خود رائی سے کام لینا کتنا سخت باغیانہ جرم ہے۔ کوئی نوکر اگر یہ دعویٰ کرے کہ آقا کے مال میں اپنے تصرف اور اختیارات کی حدیں اسے خود مقرر کر لینے کا حق ہے۔ اور اس معاملہ میں آقا کو کچھ بولنے کا حق نہیں ہے تو اس کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے؟ تمہارا اپنا ملازم اگر تمہارے گھر اور تمہارے گھر کی چیزوں میں اپنے عمل اور استعمال کے لیے اس آزادی و خود مختاری کا دعویٰ کرے تو اس کے ساتھ کیا معاملہ کرو گے۔ جو خود مانتا ہے کہ میں اللہ کی مخلوق ہوں اس کا بندہ ہوں اور یہ بھی جانتا ہے کہ مالک نے یہ بات نہیں فرمائی ہے اور پھر کہتا ہے کہ ہاں فرمائی ہے تو صرف بغاوت نہیں بلکہ بغاوت پر مزید جھوٹ اور افترا پردازی کا جرم ہے۔

۱۷۱۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اللہ نے جو کچھ اعلان کیا ہے سچا ہے اگر تم میں سچائی کا کچھ پاس ہے تو آؤ ابراہیم کے طریقہ کی پیروی کرو جو ایک ہی کا ہو رہا تھا اور شرک کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ یعنی خدا تعالیٰ نے حلال و حرام کے متعلق، نیز اسلام اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے باب میں سچی سچی اور کھری کھری باتیں تم کو سنا دیں جن کو کوئی جھٹلا نہیں سکتا۔ اب چاہیے کہ تم بھی مسلمانوں کی طرح اصلی دین ابراہیم کی پیروی کرو۔ اور اس کے اصول کا اتباع کرو جن میں سب سے بڑی چیز توحید خالص ہے۔ چاہیے کہ تم بھی عزیر و مسیح اور احبار و رہبان کی پرستش چھوڑ کر پکے موحد و مسلم بن جاؤ۔[۱]

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے مجھے جو یہ بات بتائی ہے کہ نزول تورات سے پہلے بنی اسرائیل پر کوئی چیز حرام نہ تھی اس میں اللہ سچا ہے اور اب تمہارے خلاف حجت قائم ہو چکی ہے۔ اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ میں اللہ کا پیغمبر ہوں۔ کیونکہ اگر اللہ کی وحی میری رہنما نہ ہوتی تو میں نہ تمہیں دعوت دیتا اور نہ مجھ پر تمہاری کذب بیانی منکشف ہوتی۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو آؤ اس ملتِ ابراہیم کی پیروی کرو جس کی میں دعوت دے رہا ہوں۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ملت ابراہیم سے مراد

آیت میں ملت ابراہیم سے مراد اسلام اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ اتباع کے موقع پر بجائے ابراہیم کے ملت ابراہیم کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی اتباع اس حیثیت سے مطلوب ہے کہ یہ محمد رسول اللہ کی پیروی ہے، اس حیثیت سے نہیں کہ یہ حضرت ابراہیم کی پیروی ہے کیونکہ حضور انور کی حیثیت ان انبیاء بنی اسرائیل کی نہیں ہے جو موسیٰ کی شریعت کی تبلیغ کا کام کرنے آتے تھے۔ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ انبیاء دو قسم کے ہیں مؤسسین اور مجددین۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء مؤسسین میں ہیں۔ انبیاء مجددین میں سے نہیں۔

حضرت ابراہیم کی شخصیت سے استدلال

آخر میں فرمایا ہے حنیفاً وما کان من المشرکین۔ یہ حضرت ابراہیم کا چہرہ ہے۔ حضرت ابراہیم یہودی، عیسائی اور مشرکین کے لیے یکساں قابل احترام تھے۔ اور قرآن کے اولین مخاطب بھی تینوں تھے۔ قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کی حقیقت واضح کرنے کے لیے ایک نہایت سیدھا سادہ سوال ان تینوں کے سامنے پیش کیا ہے کہ اگر تم واقعی حق کے طالب ہو تو آؤ میری دعوت کا خلاصہ صرف یہ ہے کہ ملت ابراہیم کی پیروی کر لو جو کچھ میں بتا رہا ہوں یہ حضرت ابراہیم نے پیش کی تھی۔ یہی راہ نجات ہے حضرت ابراہیم کی راہ کیا تھی؟ قرآن نے دو لفظوں میں اسے سمیٹ دیا ایک یہ کہ وہ حنیف تھے دوسرے یہ کہ وہ مشرک نہ تھے حنیف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ یہودی اور عیسائی نہ تھے۔ کیونکہ قرآن کی آیتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ حنیف کا مقابل مشرک ہے۔ اسی بنا پر جہاں جہاں قرآن میں حنیف کا لفظ آیا ہے اس کے ساتھ ساتھ شرک کی نفی کی گئی ہے۔ یہاں بھی مشرک کے مقابلے پر ہے اس لیے اب جیسا کہ آپ تیسرے پارے میں پڑھ چکے ہیں کہ

ما کان ابراھیم یھودیاً ولا نصرانیاً ولکن کان حنیفاً مسلماً۔

یہود و نصاریٰ مسلمانوں سے کہتے تھے مذہب حق تو یہودیت یا عیسائیت ہے یہ تیسرا مذہب کون سا ہے؟ قرآن نے جواب دیا کہ یہ دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ اصل مذہب وہ ہے جس

کی دعوت حضرت ابراہیم نے دُنیا کو دی ۔

وقالوا کونوا ھوداً او نصاری تھتدوا قل بل ملۃ ابراھیم حنیفاً (بقرہ)

انہوں نے کہا کہ یہودی یا عیسائی ہو جاؤ تو راہ راست پاؤ گے، کہو نہیں بلکہ ابراہیم موحد کا مذہب اختیار کرو ۔

یعنی ظاہر ہے کہ یہودیت اور عیسائیت حضرت ابراہیم کے بعد کی چیز ہے اس لیے اسلام جس کی میں دعوت دے رہا ہوں ان پچھلی آمیزشوں سے پاک ہے ۔

إِنَّ أَوَّلَ بَيْتٍ وُضِعَ لِلنَّاسِ لَلَّذِي بِبَكَّةَ مُبَارَكًا وَهُدًى
لِّلْعَالَمِينَ ﴿٩٦﴾ فِيهِ آيَاتٌ بَيِّنَاتٌ مَّقَامُ إِبْرَاهِيمَ ۖ وَمَن دَخَلَهُ
كَانَ آمِنًا ۗ وَلِلَّهِ عَلَى النَّاسِ حِجُّ الْبَيْتِ مَنِ اسْتَطَاعَ إِلَيْهِ
سَبِيلًا ۚ وَمَن كَفَرَ فَإِنَّ اللَّهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعَالَمِينَ ﴿٩٧﴾

بلاشبہ سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے بنائی گئی وہ
مکہ میں ہے[162]۔ یہ سراپا برکت ہے[163] اور تمام انسانوں کے لیے چشمہ
ہدایت ہے[164]۔ اس میں کھلی نشانیاں ہیں، اس میں مقام ابراہیم
ہے[165]۔ اور جو شخص اس میں داخل ہوا مامون و محفوظ ہوگیا[166]۔
لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت
رکھتا ہو وہ اس کا حج کرے[167]۔ اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے
انکار کرے گا تو یاد رکھو کہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز
ہے[168]۔

دُنیا میں سب سے پہلی عبادت گاہ

بیت اللہ جس کا دوسرا نام کعبہ اور تیسرا نام البیت الحرام ہے، وہ مقام ہے جو مسلمان عرفا کے خیال میں عرش الٰہی کا سایہ اور اس کی برکتوں اور رحمتوں کا مرکز ہے۔ وہ ازل سے اس دُنیا میں خدا کا معبد اور خدا پرستی کا مرکز تھا۔ سب سے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اسے قرار دیا۔ لیکن حضرت ابراہیم سے بہت پہلے دُنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا۔ حضرت ابراہیم کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدے میں توحید کا چراغ پھر روشن کیا تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چاردیواری بلند کر کے دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے۔ چنانچہ قرآن حکیم کے بیان کے مطابق کعبہ حضرت ابراہیم کے زمانے میں بھی البیت العتیق پرانا گھر تھا کوئی نیا گھر نہ تھا۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل نے مل کر اس گھر کی پرانی بنیادوں کو ڈھونڈ کر پھر نئے سرے سے ان پر چاردیواری کھڑی کی واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت و اسمٰعیل اس سے معلوم ہوا کہ بنیاد پہلے سے پڑی تھی۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل نے اس افتادہ بنیاد کو از سر نو بلند کیا۔ یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے۔ یونان کا مشہور مورّخ ڈیوڈرس جو حضرت عیسٰی سے ایک صدی پہلے گزرا ہے وہ عرب کے ذکر میں لکھتا ہے:

ثمودیوں اور سبا والوں کے درمیان ایک مشہور معبد ہے جس کی تمام عرب بہت بڑی عزّت کرتے ہیں۔ (گبن کی تاریخ، عروج و زوال روم)

اور ثمود کا مقام شام و حجاز کی حدود میں تھا اور سبا کا یمن میں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے اور وہاں کا مشہور معبد جس کی عزّت سارے عرب کرتے ہیں، خانہ کعبہ ہے۔

رومیوں کی تاریخ میں بھی خانہ کعبہ کا ذکر ہے۔ پراکوپس مورّخ لکھتا ہے:

۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار بلیزیر نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا۔ اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کر دے گا۔ اس پر سپہ سالار نے کہا۔

تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں ہے کیونکہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس میں عرب اپنے دو مہینے عبادت کے لیے خاص کرتے ہیں۔ اور اس زمانہ میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں [1]

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا موسم ہے اور حج کا تعلق بیت اللہ سے ہے۔ خانہ کعبہ کی قدامت پر سر ولیم میور لکھتا ہے کہ "مکہ کے مذہب کی نمایاں خصوصیات کے لیے ایک نہایت ہی قدیم زمانہ تجویز کرنا پڑتا ہے۔

بیت المقدس کے متعلق خود بائیبل کی شہادت موجود ہے کہ حضرت موسیٰ کے ساڑھے چار سو برس بعد حضرت سلیمان نے اس کو تعمیر کیا چنانچہ سلاطین ا باب ششم میں ہے:

اور بنی اسرائیل کے ملک مصر سے نکل آنے کے بعد چار سو اسی ویں سال اسرائیل پر سلیمان کی سلطنت کے چوتھے برس زیو کے مہینے میں جو دوسرا مہینہ ہے" ایسا ہوا کہ اس نے خداوند کے لیے گھر بنانا شروع کیا۔ اور جو گھر سلیمان نے خداوند کے لیے بنایا اس کی لمبائی ساٹھ ہاتھ اور چوڑائی بیس ہاتھ اور اونچائی تیس ہاتھ تھی۔ آیت ۱ - ۲ -

اور حضرت سلیمان ہی کے زمانے میں وہ قبلہ اہل توحید قرار دیا گیا۔ چنانچہ سلاطین ا باب ۸ میں ہے:

"تاکہ تیری آنکھیں اس گھر کی طرف یعنی اس جگہ کی طرف جس کی بابت تو نے فرمایا کہ میں اپنا نام وہاں رکھوں گا دن اور رات کھلی رہیں تاکہ تو اس دعا کو سنے جو تیرا بندہ اس مقام کی طرف رخ کرکے تجھ سے کرے گا اور تو اپنے بندے اور اپنی قوم اسرائیل کی مناجات کو جب وہ اس جگہ کی طرف رخ کرکے کریں سن لینا بلکہ تو آسمان پر سے جو تیری سکونت گاہ ہے سن لینا اور سن کر معاف کر دینا۔

(آیت ۲۹ - ۳۰)

برعکس اس کے تمام عرب کی متواتر اور متفق روایات سے ثابت ہے کہ کعبہ کو حضرت ابراہیم نے تعمیر کیا۔ اور وہ حضرت موسیٰ سے آٹھ نو سو برس پہلے گزرے۔ لہٰذا کعبہ کی اولیت ایک ایسی حقیقت ہے جسے ماننے بغیر تاریخ اور علم کی روشنی میں چارہ نہیں ہے۔

---

[1] سیرۃ النبی۔

یہود کا دوسرا اعتراض

۱۷۲۔ بلاشبہ سب سے پہلی عبادت گاہ جو انسانوں کے لیے بنائی گئی وہ مکہ میں ہے۔ مسلمانوں کے اس دعوے پر کہ ہم سب سے زیادہ ابراہیم سے اشبہ اور اقرب ہیں۔ یہود کو یہ بھی اعتراض تھا کہ ابراہیم علیہ السلام نے وطن اصلی عراق چھوڑ کر شام کی طرف ہجرت کی۔ وہیں رہے وہیں وفات پائی۔ بعدہ ان کی اولاد شام میں رہی، کتنے انبیاء اسی مقدس سرزمین میں مبعوث ہوتے سب کا قبلہ بیت المقدس رہا۔ پھر تم حجاز کے رہنے والے جنہوں نے بیت المقدس کو چھوڑ کر کعبہ کو اپنا قبلہ بنا لیا ہے اور سرزمین شام سے دور ایک طرف پڑے ہو کس منہ سے دعوی کر سکتے ہو کہ ابراہیم و ملت ابراہیم سے تم کو زیادہ قرب و مناسبت حاصل ہے۔ اس آیت میں معترضین کو بتایا گیا ہے کہ بیت المقدس وغیرہ تو مقامات مقدسہ بعد میں تعمیر ہوئے۔ دنیا میں سب سے پہلا گھر جو لوگوں کی توجہ الی اللہ کے لیے مقرر کیا گیا اور بطور ایک عبادت گاہ اور نشان ہدایت بنایا گیا وہ یہی کعبہ شریف ہے جو اس مبارک شہر مکہ میں واقع ہے[۱]

یہودیوں کا اعتراض یہ تھا کہ اگر قرآن اور نبوت محمدیہ کی راہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کی راہ سے مختلف نہیں ہے تو کیوں خانہ کعبہ کو بیت المقدس کی جگہ قبلہ مقرر کیا گیا۔ حالانکہ تمام انبیاء بنی اسرائیل بیت المقدس ہی کو قبلہ مقرر کرتے رہے ہیں۔ جواب میں کہا گیا ہے کہ اللہ کی پہلی عبادت گاہ جو حضرت ابراہیم نے تعمیر کی وہ بیت المقدس نہیں خانہ کعبہ ہے۔ قرآن نے اس جواب میں یہی اکتفا نہیں فرمایا کہ حضرت ابراہیم نے پہلی عبادت گاہ مکہ میں بنائی ہے بلکہ یہ بھی بتایا ہے کہ دنیا میں پہلی عبادت گاہ یہی ہے۔ تاریخی طور پر جیسے یہ بات محتاج ثبوت نہیں ہے کہ خانہ کعبہ حضرت ابراہیم کا بنایا ہوا خدا کا گھر ہے ایسے ہی یہ بات بھی از روئے قرآن بے غبار ہے کہ خانہ کعبہ کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی۔ البتہ دیواریں بے نشان تھیں، اللہ سبحانہ نے حضرت ابراہیم کو اس گھر کی جگہ بتادی جسے آپ سورہ حج میں پڑھیں گے۔

واذ بوانا لابراهيم مكان البيت
ہم نے ابراہیم کو اس گھر کی جگہ کا ٹھکانہ بتایا۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

تورات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے یہ معبد موجود تھا۔ کیونکہ سامی دستور کے مطابق یہ ضروری تھا کہ جس مقام پر خدا کی قربانی کی جاتے وہ کوئی معبد یا قربان گاہ ہو۔ اس بنا پر وہ مقام جہاں حضرت ابراہیم، اسماعیل کو قربانی کے لیے لاتے تھے اور جس کے متعلق اپنے خادموں سے کہا کہ وہاں جاکر عبادت کرکے واپس آتا ہوں۔ ضروری ہے کہ وہ کوئی معبد ہو۔ اسی لیے قرآن نے حضرت ابراہیم کی طرف اس گھر کی ایجاد کی نہیں بلکہ تجدید اور تطہیر کی نسبت کی ہے۔ جیسا کہ آپ پہلے پارے میں پڑھ آئے ہیں۔ اس وقت تک اس سرزمین کے لیے عرب کا لفظ بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔ یہ لفظ مجموعہ تورات میں حضرت سلیمان کے زمانے سے ملتا ہے۔ اس سے پہلے اس کا نام پورب یا دکھن کا ملک تھا۔ کیونکہ یہ شام کی جنوبی و مشرقی سمت میں واقع تھا۔ اور کبھی اس کا نام بیابان تھا۔ آخر یہی بیابان اس کا نام پڑ گیا۔ اصل میں پہلا نام عربۃ تھا جو تخفیفاً بعد کو عموماً عرب بولا جانے لگا اور اس کے بعد ملک کے نام سے خود قوم کا نام بھی قرار پاگیا چنانچہ شعرائے عرب کے اشعار سے بھی جو عرب کی تنہا ڈکشنری ہے اس کی تصدیق ہوتی ہے

اسد بن جابل کہتا ہے :

وعربۃ ارض جدّ فی الشرا ھلھا
کما جد فی شرب النقاخ ظماء

اسلام کے بعد بھی یہ نام باقی رہا۔ ابو سفیان کلبی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح میں کہتا ہے :

ابونا رسول اللہ و ابن خلیلہ
بعربۃ بوأنا فنعم المراکب

اب سوال یہ ہے کہ اس ملک کا نام عربہ کیوں قرار پایا۔ اصل یہ ہے کہ تمام سامی زبانوں میں عربہ صحرا اور بادیہ کا مفہوم رکھتا ہے۔ عبرانی میں عربا بیابان اور میدان کو کہتے ہیں۔ اور خود عربی زبان میں اس مفہوم قدیم کے بقایا موجود ہیں۔ عرابۃ کے معنے بدویت کے ہیں اور اعراب اہل بادیہ کو کہتے ہیں۔ قرآن میں لفظ عرب ملک عرب کے لیے کہیں نہیں آیا۔ حضرت اسماعیل کی سکونت کے ذکر میں واد غیر ذی زرع ناقابل کاشت وادی آیا ہے۔ اکثر لوگ اس نام کو عرب کی طبعی حالت کا بیان سمجھتے ہیں۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ عرب کا بعینہٖ ترجمہ ہے چونکہ اس عہد میں اس غیر آباد ملک کا کوئی نام نہ تھا اس لیے خود لفظ غیر آباد ملک اس کا نام

پڑ گیا۔ ؎

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اب تک جو کچھ معلوم ہوا ہے اگر یہ سچ ہے تو ماننا پڑے گا کہ عبادت گاہوں میں سب سے قدیم خانہ کعبہ ہے اس پر تفصیلی بحث انشاءاللہ پارہ سترہ میں البیت العتیق کے تحت آئے گی۔

مکہ کی لغوی تحقیق

آیت میں جہاں یہ بات بتائی گئی ہے کہ عبادت گاہوں میں سب سے پہلا گھر خانہ کعبہ ہے وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ یہ پہلا گھر بکہ میں ہے۔ قرآن میں مکہ کی جگہ بکہ آیا ہے۔ عربی زبان میں میم کو با سے تبدیل کر دیتے ہیں۔ لیکن قدیم زمانے کے بعض محققین کی رائے میں لفظ بکہ بابلی یا کلدانی لفظ ہے جس کے اصلی معنے گھر کے ہیں۔ اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ آبادی اس وقت قائم ہوئی جب بابل و کلدان کے قافلے ادھر سے گزرتے تھے اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور دلیل ہے۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی۔ یہ اس خانہ کعبہ کی قدامت اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے۔ مکہ کا بکہ نام حضرت داؤد کی زبور میں آیا ہے جسے یہود نے بگاڑ کر بکہ کی بجائے بکاء بنا دیا اور اس کو مصدر بنا کر اس کا ترجمہ رونا کر دیا۔ اس آیت میں قرآن نے مکہ کو بکہ کہہ کر مکہ کے اس قدیم نام کی یاد دہانی کر دی جو تورات میں موجود تھا۔

نیز قدیم شامی زبان میں بک کے معنے آبادی یا شہر کے ہیں جیسا کہ آج بھی شام کے ایک نہایت قدیم شہر کا نام بعلبک ہے یعنی بعل دیوتا کا شہر) یہ اس آبادی کی قدامت کی دوسری لغوی شہادت ہے۔

بکہ کا جغرافیائی مقام

بکہ یا مکہ جس کا تیسرا نام اُم القریٰ ہے عرب میں حجاز کا دارالحکومت ہے۔ یہ شہر ایک بوڑھے پیغمبر کی بنا، ایک نوجوان پیغمبر کی ہجرت گاہ اور ایک یتیم پیغمبر کا مولد ہے۔ یہ شہر عرض البلد

؎ ارض القرآن

۲۱ درجہ ۳۸ دقیقہ اور طول البلد ۴۰ درجہ ۹ دقیقہ پر واقع ہے۔ سطح سمندر سے تقریباً ۳۳۰ میٹر بلند ہے۔ چاروں طرف پہاڑوں نے قدرتی دیواریں کھینچ دی ہیں۔ بالفعل شرقاً و غرباً تقریباً ۳ کیلو میٹر لمبا اور جنوباً و شمالاً تقریباً ڈیڑھ کیلو میٹر چوڑا ہے۔

حضرت مسیح سے اڑھائی ہزار برس پہلے یہ کاروان تجارت کی ایک منزل گاہ تھی۔ دو ہزار سال قبل مسیح حضرت ابراہیم نے اپنے فرزند عزیز حضرت اسماعیل کو یہاں آباد کیا۔ باپ بیٹے نے خدا کے نام پر یہاں ایک قربان گاہ بنائی۔ فرزندان اسمٰعیل کی اولاد ایک مدت تک یہاں دیگر قبائل پر بالادست رہی۔ اس کے بعد قحطانی قبائل آتے اور انہوں نے استیلا حاصل کیا۔ بنو اسماعیل میں سے آخر قصی نے یہاں کی ریاست حاصل کی۔ قصی قریش کا پدر اعلیٰ تھا۔ آخر زمانے میں یہاں کے مالک قریش تھے۔ [۱]

خانہ کعبہ برکتوں کا خزانہ ہے

۱۷۳۔ یہ سراپا برکت ہے۔ حق تعالیٰ نے شروع سے اس گھر کو ظاہری و باطنی، حسی و معنوی برکات سے معمور کیا اور سارے جہان کی ہدایت کا سرچشمہ بنایا۔ روئے زمین پر جس کسی مکان میں برکت و ہدایت پائی جاتی ہے اسی برگزیدہ گھر کا ایک پرتو اور عکس سمجھنا چاہیے۔ یہیں سے رسول الثقلین کو اٹھایا مناسک حج ادا کرنے کے لیے سارے جہان کو اسی کی طرف دعوت دی۔ عالمگیر مذہب اسلام کے پیروؤں کو مشرق و مغرب میں اسی کی طرف منہ کرکے نماز پڑھنے کا حکم دیا۔ اس کے طواف کرنے والوں پر عجیب و غریب برکات و انوار کا فیضان فرمایا۔ انبیاء سابقین بھی حج ادا کرنے کے لیے نہایت شوق و ذوق سے تلبیہ پکارتے ہوتے اسی شمع کے پروانے تھے۔ [۲]

بیت اللہ اور البیت المقدس کا تقابلی مطالعہ

برکات کی جو تصویر یہاں شیخ الاسلام نے پیش فرمائی ہے وہ عام مفسرین کی ترجمانی ہے لیکن حضرت مولانا محمد قاسم نے جو خانہ کعبہ اور مسجد اقصیٰ کا تقابلی مطالعہ عارفانہ اور متکلمانہ انداز میں

---

[۱] ارض القرآن [۲] افادات شیخ الاسلام

پیش فرمایا ہے وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ مولانا نے اولاً سمجھایا ہے کہ اللہ سبحانہ کی معبودیت بیک وقت دو شانوں میں جلوہ گر ہے۔ ایک شانِ محبوبیت دوسرے شانِ حاکمیت۔ یہ دو معبد یعنی خانہ کعبہ اور بیت المقدس اللہ سبحانہ کی ان دو شانوں کے مظہر ہیں۔ خانہ کعبہ اللہ کی شانِ محبوبیت کا اور بیت المقدس اللہ کی شانِ حاکمیت کا۔ مولانا فرماتے ہیں۔

شرح اس مدعا کی یہ ہے کہ جب بیت المقدس تجلی گاہ مرتبہ حکومت اور خانہ کعبہ تجلی گاہ مرتبہ محبوبیت ہے تو بیت المقدس کی حیثیت ایک کچہری اور بادشاہ کے دیوانِ عام کی ہوتی اور خانہ کعبہ بمنزلہ محل سرائے شاہی بلکہ بمنزلہ جلوہ گاہ محبوب ہوا۔ اور ظاہر ہے کہ کچہری یا دیوانِ عام صرف مظلوموں کی دادرسی اور ظالموں کی سرکوبی کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا قیام و بقاء عمائدِ رعیت کی طاعت سے وابستہ ہوتا ہے۔ اگر عمائدِ رعیت سرکش ہو جائیں تو پھر دیوانِ عام بیکار ہو جاتا ہے اور اس دور میں اس کی بربادی تعجب خیز نہیں۔ اس کے برعکس دیوانِ خاص اور محل سرائے شاہی چونکہ شب و روز رہنے کے لیے ہوتا ہے۔ اس لیے اس کی نگرانی ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ کوئی مسمار نہ کر سکا اور بیت المقدس بوجہ سرکشی بنی اسرائیل جو اپنے زمانہ میں بمنزلہ عمائدِ رعیت تھے بیکار ہو گیا اور اس کے نتیجہ میں وہ باغیوں اور نافرمانوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا۔ اور پھر حاکمیت کا حاصل ہی تغیر و تبدیلی ہے عزل و نصب ملازمین اور مہمات کی انجام دہی کے لیے تعمیر و تخریب ہو۔ بیت المقدس مظہرِ حاکمیت ہونے کی وجہ سے تغیر و تبدیلی کا بھی مظہر ہے اس لیے اگر وہاں آبادی کی جگہ ویرانی اور ویرانی کی جگہ آبادی ہوتی رہی ہے تو خلافِ عقل نہیں کیونکہ جس چیز میں خاصیت تغیر و تبدیلی ہوتی ہے وہاں تغیر و تبدل ہوتا ہی ہے اور تاثیرِ محبوب یہ ہے کہ ہجوم خلائق اور ہنگامہ اجتماع ہو۔ اگر ویرانہ میں بیٹھ جاتے تو ہر خاص و عام پروانہ وار اسی جگہ قربان ہونے کو تیار ہو جاتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ خانہ کعبہ کے اردگرد ایسا ملک رکھا جو وادِ غیر ذی زرع ہے تاکہ ہر شخص سمجھ لے کہ واقعی یہاں کوئی ایسا دلبر اور محبوب جلوہ افروز ہے جس کے جمال عالم فریب کا ایک عالم دیوانہ ہے یہ ہفت اقلیم کے آدمیوں کی آمد جس میں خانہ کعبہ تمام عالم کے مقاماتِ مقدسہ اور مشاہدِ متبرکہ اور زیارت گاہ ہائے معظمہ سے بالبداہت بالاتفاق ممتاز ہے۔ یہ اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ یہاں جلوۂ محبوبِ حقیقی ہے۔ علاوہ ازیں حکومت خود منجملہ آثارِ محبوبیت ہے کیونکہ مرتبہ وجود جو دراصل صادر اول اور مصداق اسم مالک اور حاکم ہے اس تجلی اول کا رہینِ منت ہے جو

بوجہ اجتماع جملہ محاسن اسم جمیل کا مصداق ہے اس لیے مرتبہ حکومت میں جو کچھ ہوگا وہ مرتبہ محبوبیت کا عکس اور پرتو ہوگا۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ برکات کا خانہ کعبہ سے جدا ہونا ممکن نہیں ہے اور بیت المقدس سے اگر برکات جدا ہو جائیں تو قابل تعجب نہیں ہے غالباً اسی لیے یہاں کعبہ کے بارے میں مبارکاً کی تعبیر آئی ہے اور بیت المقدس کے لیے بارکنا حولہ فرمایا ہے۔ لفظ مبارک صیغہ صفت ہونے کی وجہ سے برکت کے دوام کو بتلاتا ہے اور بارکنا فعل ہونے کی وجہ سے برکت کے حدوث کو ظاہر کر رہا ہے اس لیے خانہ کعبہ سے برکتوں کا جدا ہونا کبھی ممکن نہیں جب کہ بیت المقدس سے ممکن ہے اور چونکہ خانہ کعبہ سے برکات کا علیحدہ ہونا ممکن نہیں اور بیت المقدس سے ممکن ہے اس لیے بیت المقدس کا بے دینوں سے مسمار ہو جانا اور خانہ کعبہ کا مسمار نہ ہونا بعید از عقل نہیں ہے مگر چونکہ برکات کا یہ ارتباط مرتبہ محبوبیت کا نتیجہ ہے۔ اس لیے لفظ مبارک لاکر اشارہ کر دیا کہ اس کی خیر و برکت کبھی منقطع نہ ہوگی۔ گویا جیسے بیت المقدس قبلہ ایک وقت کے لیے تھا اور بالآخر اس کی برکت ایک وقت منقطع ہونے والی تھی یہ صورت اس پاک گھر خانہ کعبہ کی نہ ہوگی۔

خانہ کعبہ کی تباہی پورے عالم کی تباہی ہوگی

ہاں جب بھی محبوبانہ تجلی کبھی غضب کی تجلی کا لبادہ پہن لے گی تو پھر بجائے محبت خوف اور بجائے اجتماع انتشار کی حالت ناگزیر ہوگی یعنی جس وقت صفت غضب کی تجلی کا ظہور ہوگا تو وہ وقت پورے عالم کی تباہی کا ہوگا کیونکہ جیسے خانہ کعبہ وقت ظہور آثار محبوبیت و رحمت مظہر اول تھا ایسے ہی وقت ظہور آثار غضب و جلال بھی یہی مظہر اول ہوگا اس لیے خانہ کعبہ جیسے بوقت ظہور آثار محبوبیت مظہر اول رہا ایسے ہی بوقت ظہور آثار جلال و غضب بھی یہی مظہر اول ہوگا اور خانہ کعبہ کی ویرانی سے ہی کائنات کی ویرانی کا آغاز ہوگا۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بادشاہی مکانات آبادی اور بربادی میں اوروں کے مکانات کی نسبت اول رہتے ہیں۔ یعنی جب دارالخلافہ آباد کیا جاتا ہے تو پہلے محلات شاہی اور گورنمنٹ ہاؤس کے لیے زمین اور میدان مقرر کر کے تعمیر کا آغاز کیا جاتا ہے اور جب دارالحکومت کا انتقال عمل میں آتا ہے تو پھر بھی پہلے شاہی محلات کو اٹھایا جاتا ہے۔ بعد ازیں دوسرے شہریوں کا نمبر آتا ہے، ٹھیک اسی طرح عالم اجسام میں خانہ کعبہ بمنزلہ مکان شاہی ہے کیونکہ یہ تجلی گاہ ربانی اور آئینہ جمال یزدانی

ہے اس لیے بننے میں بھی خانہ کعبہ اوّل رہا اور ویرانی عالم کے وقت بھی اسی کو اوّل رکھیں گے جیسا کہ قرآن کی یہ آیت ان اوّل بیت وضع للناس اس کی اوّلیت کو بتارہی ہے ایسے ہی قرآن کی دوسری آیت جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس (اللہ نے کعبہ عزت والے گھر کو لوگوں کے لیے قیام کا ذریعہ بنایا ہے) یہ بتارہی ہے کہ جب تک یہ گھر یعنی خانہ کعبہ موجود ہے لوگ بھی اس عالم میں قائم ہیں۔ جس روز یہ گھر ویران ہوگا سمجھو کہ پورا عالم ویران ہو جائے گا۔

ہدایت و رحمت کا اجتماع

۱۷۴۔ اور تمام انسانوں کے لیے چشمہ ہدایت ہے۔ ہدایت کے معنے رہنمائی کرنے، راہ دکھانے اور راہ پر لگادینے کے ہیں۔ یعنی خانہ کعبہ لوگوں کو قبلہ عبادت کی راہ بتاتا ہے گویا یہ خانہ ہدایت ہے اس لیے قبلہ عبادت کی معرفت حاصل ہوتی ہے۔ خانہ کعبہ اگر عالمین کے لیے ظہور ہدایت کا ذریعہ ہے تو حضور انور کی ذات گرامی عالمین کے لیے ظہور رحمت کا ذریعہ ہے ہدایت اور رحمت ہی عرفان حق کے وسائل ہیں ایسے لوگوں کے لیے حق شناسی کی کوئی راہ نہیں جو ہدایت و رحمت دونوں سے محروم ہوں۔ قرآن نے ایمان کی زندگی کے لیے ان دونوں کو لازم و ملزوم قرار دیا ہے۔ ایک جگہ ارشاد ہے:

فقد جاءکم بینۃ من ربکم و ھدی و رحمۃ
تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے دلیل اور ہدایت و رحمت آچکی

ایک دوسرے موقعہ پر ہے:

ھذا بصائر من ربکم و ھدی و رحمۃ لقوم یومنون
قرآن تمہارے رب کی جانب سے سرمایہ دلائل اور ان سب کے لیے
جو ایمان رکھتے ہیں ہدایت و رحمت ہے۔

ایک موقعہ پر قرآن کو ھدیً للناس فرمایا ہے اور ایک جگہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمۃ للعالمین کہا ہے۔ زندگی کا سیدھا راستہ مل جانا اور اخلاقی و روحانی زندگی میں حسن و جمال اور نورانیت کا ظہور بھی نبوّت کا مقصد ہے۔ خانہ کعبہ چونکہ ہدیً للعالمین ہے اور حضور انور رحمۃ للعالمین ہیں اس لیے ان دونوں میں ایسا ہی معنوی ربط ہے جیسے قرآن اور حضور انور کی ذات گرامی میں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نے خانہ کعبہ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے

باہمی ربط کو عارفانہ انداز میں جس خوبصورتی کے ساتھ پیش فرمایا ہے وہ گوش گزار فرمالیجئے۔

دیوان عام اور کچہری تک تو ہر شخص کی رسائی ہو سکتی ہے لیکن دیوان خاص، محل سرائے شاہی اور عشرت کدہ محبوب تک ہر شخص کی رسائی ممکن نہیں ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ حبیب رب العالمین اور خاتم النبیین ہیں اس لیے بالاصالت خانہ کعبہ کو آپ کا قبلہ بنایا گیا ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ اس کی توجیہہ عقلی کیا ہے کہ خانہ کعبہ حضور انور کی حاضری کے لیے بنا ہے۔ آپ سے پہلے جو بھی آیا وہ اپنے شوق سے آیا حسب الطلب نہیں آیا۔ تو اس کا جواب یہ ہے کہ معبود کو عابد چاہیے لیکن جتنا ادھر کمال ہو گا اسی قدر اس طرف بھی کمال مطلوب ہو گا۔ عبودیت کے لیے کمال علمی اور کمال عملی کی ایسی ہی ضرورت ہے جیسے پرندے کو اڑنے کے لیے دونوں پروں کی۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ عبودیت نام ہے دلی خشوع وخضوع کے ساتھ ظاہر وباطن کی انقیاد کا اس لیے اولاً عابد کے لیے اللہ سبحانہٗ کے جلال وجمال کا علم ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر علم ظاہر و باطن کا انقیاد ممکن ہی نہیں۔

ثانیاً اسے اخلاق حمیدہ کے حسن سے مالامال ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے بغیر طاعت و انقیاد ہو ہی نہیں سکتی۔ لہٰذا جیسے عبودیت کے لیے علم کی ضرورت ہے ایسے ہی کمال کے لیے اخلاق حمیدہ کی حاجت ہے۔

علم کا تو اس سے اونچے تصور نہیں ہو سکتا کہ عابد خود خاتم صفات حاکمہ سے براہ راست مستفید ہو یعنی درگاہ علمی خداوندی کا تربیت یافتہ ہو اسی کو ہم خاتم النبیین کہتے ہیں اور خاتم ہونے کی وجہ یہی ہے کہ وہ علم خداوندی سے براہ راست استفادہ کرتا ہے اور علم پر صفات حاکمہ ختم ہو جاتی ہیں۔ الغرض جیسے تجلی گاہ محبوبیت مرتبہ میں تجلی گاہ حکومت سے اول ہے ایسے ہی قبلہ اول کے استقبال کے لیے بھی اول ہی درجہ کا نبی ہونا چاہیے اور ایسا نبی سوائے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں، بلاشبہ جس گھر کو ہدی للعالمین ہونا ہے اس کے استقبال کے لیے بھی رحمۃ للعالمین ہونا چاہیے۔

نبوت اللہ سبحانہٗ کی سفارت ہے

دراصل قافلہ نبوت ایک قافلہ سفارت ہے اسی لیے انبیاء علیہم السلام کو رسول کہتے

ہیں۔ اگر نبوت سفارتِ خداوندی کا نام ہے اور انبیاؑ کی حیثیت سفارتی قافلہ کی ہے تو ضروری ہے کہ اس قافلہ میں کوئی سالار بھی ہو۔ نیز نبوت اور سفارت خود ایک وصف ہے اور اوصاف دو قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک وہ کہ جو وصف نبوت، وصف کے حق میں خانہ زاد ہو۔ دوسرے وہ جو موصوف کے حق میں عطاءِ غیر ہو۔ ظاہر ہے کہ وصفِ نبوت میں موصوف بالذات صرف وہ ہوگا جو سب کا خاتم ہوا اور جس کی براہِ راست درگاہِ علمی خداوندی نے تربیت کی ہو اور یہ بات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کسی دوسرے نبی میں نہیں ہے۔ الغرض مرتبہ محبوبیت درگاہ وجوب کا محبوب کوئی ہی ہوگا جو عالم امکان میں اسی طرح مرجع و مآب ہو جیسے عالم وجوب میں یعنی تجلیات ربانی اور صفات یزدانی میں وہ تجلی اول تمام تجلیات کی اصل اور مصدر رہے ایسے ہی عالم امکان میں کمالات کے لیے اصل اور مصدر ہو۔ ایسی ذات گرامی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا مخلوقات میں اور کون ہے۔ علم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے اول ہونا اور جملہ انبیاءؑ کے علوم کا مرجع اور مآب ہونا تو خاتم النبیین سے واضح ہے اس لیے عالمِ امکان میں کمالات علمی ہوں یا کمالات عملی دونوں میں حضور انور کی ذاتِ گرامی پوری کائنات میں اصل اور مصدر ہے یعنی دونوں کمال آپ کی ذات میں بدرجہ کمال موجود ہیں اور جب دونوں کمالات کا آپ کی ذات مرکز ہے تو ظاہر ہے کہ کمال علمی میں اللہ کے جلال و جمال سے آپ کی ذات بدرجہ کمال متاثر ہوگی۔ علم جمال کی تاثیر محبت اور علم جلال کی تاثیر خوف ہے اور ظاہر ہے تاثیر علمی اور تاثیر عملی میں کمال ہوگا تو کمال درجہ کی محبت اور درجہ کمال کا خوف بھی ہوگا اور اس کے نتیجہ میں اللہ کے حضور میں کمال درجہ کا عجز و نیاز اور تذلل ہوگا۔ اسی کا نام کمالِ عبدیت ہے اور اس کے ساتھ کمال علم کی وجہ سے کمالِ انقیاد اور کمال درجہ کی طاعت ہوگی، اسی کا نام کمال عبودیت ہے ادھر کمالِ عبدیت ہے اُدھر کمال معبودیت ہے۔ وہاں اگر جمال ہے تو یہاں محبت ہے وہاں اگر استغنا ہے تو یہاں خوف ہے۔ الغرض چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مرتبہ محبوبیت کے محبوب ہیں اس لیے خانہ کعبہ ان کے لیے مخصوص ہے۔ اس طرح ہُدی للعالمین کے لیے رحمۃ للعالمین ہی مہمانِ خصوصی ہیں۔

آیات بینات کی تشریح

۱۷۵۔ اس میں کھلی نشانیاں ہیں۔ اس میں مقام ابراہیم ہے۔ یعنی طرح طرح کی ظاہر باہر

نشانیاں قدرت نے بیت اللہ کی برکت سے اس سرزمین میں رکھ دی ہیں۔ اسی لیے ہر زمانہ میں مختلف مذاہب والے اس کی غیر معمولی تعظیم کرتے رہے اور ہمیشہ وہاں داخل ہونے والوں کو مامون سمجھا گیا اس کے پاس مقام ابراہیم کی موجودگی پتہ دے رہی ہے کہ یہاں ابراہیم کے قدم آئے ہیں۔ اور اس کی تاریخ جو تمام عرب کے نزدیک بلانکیر مسلم چلی آرہی ہے بتلاتی ہے کہ یہ وہ پتھر ہے کہ جس پر کھڑے ہوکر ابراہیم علیہ السلام نے کعبہ تعمیر کیا تھا۔ اور اللہ کی قدرت سے اس پتھر میں ابراہیم کے قدم کا نشان پڑ گیا تھا جو آج تک محفوظ ہے۔ گویا علاوہ تاریخی روایات کے اس مقدس پتھر کا وجود اس بات کی ٹھوس دلیل ہے کہ یہ گھر طوفان نوح کی تباہی کے بعد حضرت ابراہیم کے ہاتھوں سے تعمیر ہوا۔ جن کی مدد کے لیے حضرت اسماعیل شریک ہوتے۔ جیساکہ پارہ اول کے آخر میں گزر چکا ہے۔[1]

آیات بینات اور مقام ابراہیم بول کر اسلام کی پوری روحانی تاریخ کی طرف اشارا کیا ہے۔ پہلے عام نشانیوں کا اجمالاً ذکر کیا پھر مقام ابراہیم کے لفظ سے خاص نشانی کی طرف اشارا کیا ہے آدم سے لے کر ابراہیم تک اور ابراہیم سے محمد رسول اللہ تک جو کچھ ہوا ہے اس کا تمام تر تعلق ارض حرم کے کوہ وصحرا اور در و دیوار سے ہے۔ یہیں حضرت آدم نے سکونت اختیار کی اور عرش کے سائے میں خدا کا گھر بنایا، یہیں حوا نے آکر آن سے ملاقات کی، یہیں نوح کی کشتی نے آکر دم لیا۔ حضرت ہود اور حضرت صالح نے یہاں پناہ لی، حضرت ابراہیم نے یہاں ہجرت کی، حضرت اسماعیل نے یہاں سکونت اختیار کی، حضرت محمد رسول اللہ نے یہاں ولادت پائی یہیں وہ پہاڑی ہے (صفا) جہاں حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل اپنے گدھے چھوڑ کر اترے۔ یہیں وہ دوسری پہاڑی (مروہ) ہے جس پر باپ نے بیٹے کی قربانی چاہی۔ یہیں وہ چشمہ زمزم ہے، جو حضرت ہاجرہ کو پیاس کے موقعہ پر نظر آیا۔ یہیں وہ خانہ خدا ہے جس کی چہار دیواری کو ابراہیم و اسماعیل نے بلند کیا۔ یہیں وہ مقام ہے جہاں کھڑے ہوکر انہوں نے خدا کے آگے سر جھکائے۔ اسی کے قریب منیٰ، مشعر حرام اور عرفات ہیں جو شعائر اللہ ہیں۔ یہیں وہ حجر اسود ہے جو ابراہیم و اسماعیل کے مقدس ہاتھوں سے مس ہوا۔ یہی وہ سرزمین ہے جہاں ملت ابراہیم کی بنیاد پڑی۔ قرآن نے ان ہی مناظر اور مشاہد کی طرف اس فقرے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں اشارہ کیا ہے فیہ آیات بینات یعنی اس گھر میں ایسی صریح علامتیں پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جناب میں مقبول ہوا ہے۔ اور اسے اللہ نے اپنے گھر کی حیثیت سے پسند فرمایا ہے۔ لق و دق بیابان میں بنایا گیا۔ اور پھر اللہ نے اس کے جوار میں رہنے والوں کی رزق رسانی کا بہتر سے بہتر انتظام فرمایا۔ ڈھائی ہزار برس تک جاہلیت کے سبب سے سارا ملک عرب انتہائی بدامنی کی حالت میں مبتلا رہا۔ مگر اس فساد بھری سرزمین میں کعبہ اور اطراف کعبہ ہی کا ایک خطہ ایسا تھا جس میں امن قائم رہا بلکہ اسی کعبہ کی برکت تھی کہ سال بھر میں چار مہینے کے لیے پورے ملک کو اس کی بدولت امن میسر آجاتا تھا۔ پھر اسی نصف صدی سے پہلے ہی سب دیکھ چکے تھے کہ ابرہہ نے جب کعبہ کی تخریب کے لیے مکہ پر حملہ کیا تو اس کی فوج کس طرح قہر الٰہی کا شکار ہوئی۔ اس واقعہ سے اس وقت عرب کا بچہ بچہ واقف تھا اور اس کے چشم دید گواہ ان آیات کے نزول کے وقت موجود تھے[1] یہ بھی صحیح ہے لیکن امام رازی کی رائے میں آیات بینات سے شعائر حج مراد ہیں جس کی تفصیل آپ سن چکے ہیں۔ فی الواقع ان مشاہد اور مشاعر میں جب کسی زائر کا قدم پہنچتا ہے تو اس کے ادب کی آنکھیں جھک جاتی ہیں، اس کی عقیدت کا سر نیچا ہو جاتا ہے۔ اس کے ایمان کا خون جوش مارنے لگتا ہے۔ اس کے جذبات کا سمندر متلاطم ہو جاتا ہے، جگہ جگہ اس کی پیشانی زمین سے لگتی جاتی ہے، اور محبت کی روح اس کے رگ رگ اور ریشے ریشے میں تڑپنے لگتی ہے، جدھر نظر ڈالتا ہے دل وجد کرتا ہے، آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں اور زبان تسبیح و تہلیل میں مصروف ہو جاتی ہے اور یہی وہ لذت اور لطف ہے جو ایمان کو تازہ، عقیدت کو مضبوط اور شعائر اللہ کی محبت کو زندہ کرتا ہے۔

خانہ کعبہ میں پہلی آیت بینہ

مقام ابراہیم سے آیات بینات کی تفصیل شروع ہوتی ہے یعنی پہلی نشانی مقام ابراہیم ہے۔ آیت میں خانہ کعبہ میں مقام ابراہیم کے ہونے کو ایک کھلا نشان بتایا ہے۔ اس لیے کہ خانہ کعبہ کے ساتھ اور مراسم حج کے ساتھ نامعلوم زمانہ سے حضرت ابراہیم کا نام چلا آرہا ہے۔

[1] تفہیم القرآن

اگر واقعی حضرت ابراہیم یہاں تشریف نہ لاتے ہوتے تو مشرکین عرب کو کیا ضرورت تھی کہ خواہ مخواہ ایک شخص کا تعلق اس گھر سے قائم کریں جو علی الاعلان مشرکانہ اعمال کا باغی اور بت شکن تھا۔ اور اس میں ایک مقام ابراہیم قائم کرکے اس کے مراسم حج کو ان کی طرف منسوب کریں۔

اصل بات یہ ہے کہ بعض باتیں جن کی شہادت زبانی روایات میں پوری نہیں رہ سکتی ہے ان کی شہادت ایک قومی تعامل میں رہ جاتی ہے اور تعامل کی شہادت یقیناً روایتی شہادت سے زیادہ طاقتور ہوتی ہے جس کا انکار نہیں ہو سکتا۔ ایسی ہی ایک شہادت خانہ کعبہ کے ساتھ حضرت ابراہیم کے نام کے تعلق میں موجود ہے۔ یہ آج بھی اہل کتاب پر اتمام حجت کے لیے کافی ہے کہ جس بیت اللہ یا بیت ایل کا ذکر بائیبل میں ہے وہ فی الواقع خانہ کعبہ ہے۔ کیونکہ دُنیا میں یہی ایک گھر ہے جس کا نام بیت اللہ ہے۔

مقامِ ابراہیم کے بارے میں علماء نے دو رائیں اختیار کی ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر ہے جس کے بارے میں یہ مشہور ہے کہ حضرت ابراہیم نے اس پر کھڑے ہو کر خانہ کعبہ تعمیر کیا۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس سے مراد حرم کا پورا علاقہ ہے۔ ہمارے نزدیک موقع محل اور تاریخیت کے لحاظ سے پہلی رائے زیادہ صحیح ہے۔ اس میں خاص اہمیت کی بات یہ ہے کہ نظمِ کلام کے اعتبار سے یہ اس مقصد کو زیادہ واضح کرتی ہے جس کے لیے یہ بات کہی گئی ہے۔ یہاں یہ ثابت کیا جا رہا ہے کہ خانہ کعبہ بناء ابراہیم ہے اور یہی گھر تمام لوگوں کے لیے حضرت ابراہیم نے بطورِ عبادت گاہ بنایا ہے۔ یہودی مدعی تھے کہ اصل ملتِ ابراہیم پر وہ ہیں۔ قرآن نے جواب میں کہا ہے کہ خدا کی پہلی عبادت گاہ جو حضرت ابراہیم نے تعمیر کی وہ بیت المقدس نہیں بلکہ خانہ کعبہ ہے۔

دوسری آیت بینہ خانہ کعبہ کی حُرمت

۱۷۶۔ جو شخص اس میں داخل ہو گیا مامون و محفوظ ہو گیا۔ اس آیت کے ذریعے یہ نشاندہی کی جا رہی ہے کہ حضرت ابراہیم نے خانہ کعبہ بنانے کے بعد اس جگہ کے لیے امن کی جو دعا کی تھی وہ اللہ نے قبول فرمائی تھی۔ چنانچہ یہ علاقہ اس دُعا کی قبولیت کا مظہر ہے۔ حضرت ابراہیم نے اس شہر کے لیے دُعا کی تھی رب اجعل هذا البلد آمناً اے میرے پروردگار اس شہر کو امن کی جگہ بنا دے۔

جس وقت انہوں نے یہ دُعا کی تھی، تمام دُنیا فتنہ و فساد کا گہوارہ بنی ہوئی تھی، دُنیا کا امن امان اٹھ گیا تھا، اطمینان و سکون کی نیند آنکھوں سے اُڑ گئی تھی، دُنیا کی عزت و آبرو معرضِ خطر میں تھی۔ جان و مال کا تحفظ نا ممکن ہو گیا تھا۔ کمزور اور ضعیف لوگوں کے حقوق پامال کر دیے گئے تھے، عدالت کا گھر ویران تھا، حریتِ انسان مفقود تھی اور سکون کی مظلومیت انتہائی حد تک پہنچی ہوئی تھی۔ کرۂ ارض کا کوئی گوشہ ایسا نہ تھا جو ظلم و کفر کی تاریکی سے ظلمت کدہ نہ ہو۔ اس لیے انہوں نے آباد دُنیا کے ناپاک حصوں سے کنارہ کش ہو کر ایک " وادی غیر ذی زرع " میں سکونت اختیار کی۔ وہاں ایک دارِ امن بنایا اور تمام دُنیا کو صلح و سلام کی دعوتِ عام دی۔

یہ اس دُعا کی برکت ہے کہ جو اس میں داخل ہو جائے وہ مامون و محفوظ ہو جاتا ہے۔

آیت میں بیت سے مراد خانہ کعبہ ہی نہیں بلکہ سارا حرم شریف ہے۔ مقامِ ابراہیم کے نام سے جو پتھر رکھا ہے وہ خانہ کعبہ کے اندر نہیں باہر ہے۔ الجصاص نے دُرست لکھا ہے کہ بیت سے مراد یہاں حرم ہے کیونکہ جن آیات کا حوالہ دیا جا رہا ہے وہ حرم کے علاقہ میں ہیں حضرت ابراہیم کی دُعا کے صدقے اس شہر کا امن ہونا خود ایک دلیل ہے حضرت ابراہیم کے آباد ہونے کی۔ حضرت ابراہیم کی دُعا کو اللہ نے ایسا شرف قبول بخشا کہ حرم کا پورا علاقہ ہمیشہ کے لیے امن گاہ بن گیا۔ جاہلیت کے تاریک دَور میں بھی اس گھر کا یہ احترام تھا کہ خُون کے پیاسے دُشمن ایک دوسرے کو وہاں دیکھتے تھے لیکن ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ کرتے تھے۔ اسلام نے بھی اس مقام کے لیے یہ قانون بنا دیا کہ من دخلہ کان اٰمناً۔

فتح مکہ سے دوسرے روز بنو خزاعہ نے ہذیل کے ایک آدمی کو قتل کر دیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ دیا۔ فرمایا۔ لوگو! اللہ تعالیٰ نے جس روز زمین و آسمان پیدا کیے اسی روز مکہ کو مقامِ حرمت قرار دیا۔ یہ اُس وقت سے برابر چلا آ رہا ہے اور قیامت تک اسی طرح رہے گا۔ جو بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اُس کے لیے جائز نہیں کہ مکہ میں کسی کا خُون بہائے یا یہاں سے کوئی درخت کاٹے۔ مجھ سے پہلے کسی شخص کے لیے مکہ حلال نہیں ہوا اور نہ میرے بعد آنے والے کسی شخص کے لیے حلال ہوگا۔ میرے لیے بھی صرف وقتی طور پر اس لیے حلال ہوا ہے کہ اہلِ مکہ پر اظہارِ غضب مقصود تھا۔ سُن لو! اس وقت کے بعد حرمت کل کی طرح لوٹ آئی جو بھی یہاں موجود ہے اور میری بات سُن رہا ہے اسے چاہیے کہ یہ حقیقت ان لوگوں تک پہنچا دے جو یہاں موجود نہیں ہیں۔

ایک خلش اور اس کا ازالہ

یہاں یہ خلش چنداں وقیع نہیں ہے کہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ تلوار سے فتح کیا اور اس میں خانہ کعبہ کا امن گاہ ہونا برقرار نہ رہ سکا۔ کیونکہ اسلامی لشکر ۳ رمضان المبارک ۸ھ ۱۱ فروری ۶۳۰ء کو مکہ مکرمہ میں داخل ہوا جمعۃ المبارک کا دن تھا۔ رسول اللہ نے فرمایا کہ لشکر منزل مقصود کی طرف کوچ کرے اور روانگی سے پہلے اعلان کر دیا، جو ابوسفیان کے گھر میں داخل ہو جائے اسے امن ہے، جو اپنے گھر کا دروازہ بند کرے اسے امن ہے اور جو مسجد حرام میں چلا جائے اسے امن ہے۔ لشکر جا رہا تھا اور ہر جیش اپنے خاص پرچم کے ساتھ گزر رہا تھا۔ ابوسفیان یہ منظر دیکھ رہا تھا کہ انصار کا جیش جس کی سالاری کا پرچم سعد بن عبادہ کے ہاتھ میں تھا آیا۔ سعد بن عبادہ کی نظر ابوسفیان پر پڑی تو دیکھتے ہی پکار کر کہا

الیوم یوم الملحمہ	آج گھمسان کا دن ہے
الیوم تستحل الکعبۃ	آج کعبہ حلال کر دیا جائے گا

یہ محض ایک گونہ تعریض تھی، جس سے ایک پرجوش مجاہد حق قدیم دشمن کو دیکھ کر بے قابو ہو گیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا علم ہوا تو فرمایا:

سعد نے غلط کہا یہ ایسا دن ہے کہ اللہ تعالیٰ کعبہ کی عظمت بڑھائے اور کعبہ کو غلاف چڑھایا جائے گا۔[1]

یہ بھی مذکور ہے کہ علم سعد سے لے کر ان کے فرزند قیس کے حوالہ کر دیا۔

رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم "کدا" کی طرف سے مکہ میں داخل ہوئے۔ یہ اس ٹیلے کا نام ہے جو شہر کے بالائی حصے میں یعنی شمالی جانب ہے۔ اسی طرف جنت معلیٰ ہے جو کہ مکرمہ کا مشہور قبرستان ہے، وہیں آپ کے لیے خیمہ نصب کیا گیا۔ زبیر بن العوام کو حکم ہوا کہ وہ اس راستہ سے آگے بڑھیں جو وادی فاطمہ سے آتا ہے اور شہر مکہ کی مغربی جانب واقع ہے۔ اسی راستہ میں جدہ کا راستہ مل گیا ہے پھر جنوبی و مغربی گوشہ سے یہ شہر کے

[1] بخاری کتاب المغازی

اندر داخل ہو جاتا ہے۔ سعد بن عبادہ والا لشکر اسی راستہ سے کدا کی طرف مڑا تھا۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خیمہ گاہ میں پہنچ گیا تھا۔ خالد بن ولید کو ہدایت فرمائی گئی تھی کہ وہ مسفلہ یعنی مکہ مکرمہ کے زیریں حصہ سے جو جنوبی جانب تھا، شہر میں داخل ہوں، مکہ مکرمہ اور حوالی کے نقشہ سے ظاہر ہو سکتا ہے کہ اس طرح شہر میں آنے والے تمام راستوں پر قبضہ کر لیا گیا تاکہ خونریزی کا کوئی امکان باقی نہ رہے۔ اور احترام کعبہ ہاتھ سے نہ جائے اس لیے یہ سوچنا غلط ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خانہ کعبہ کی حرمت کے خلاف کچھ بھی کیا ہے۔

حرم پاک کا دائرۂ امن

حرم پاک کی یہ حرمت قانونی ہے کیونکہ علماء نے اسے صرف خبر کے درجے میں نہیں بلکہ حکم کے درجے میں رکھ کر یہ قانون نکالا ہے کہ خونی اور قاتل بھی اگر خانہ کعبہ کے اندر پناہ گزین ہو جائے تو اسے وہاں قتل نہیں کیا جا سکتا۔ لیکن حالات ایسے پیدا کیے جائیں گے کہ وہ حرم کے علاقہ سے نکلے۔ ہاں اگر کوئی شخص حرم ہی میں ارتکاب جرم کرے تو پھر اسے حرم ہی میں سزا دی جا سکتی ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ ان کے صاحبین امام زفر، حسن بن زیاد کی رائے ہے اور یہی صحابہ میں عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمر اور عبیداللہ بن عمیر اور تابعین میں سعید بن جبیر، عطا اور طاؤس اور امام شعبی کا موقف ہے لیکن امام شافعی اور امام مالک اس موضوع پر ان بزرگوں کے ہمنوا نہیں ہیں۔ الجصاص نے اول الذکر کی اور قرطبی نے آخر الذکر کو تفصیلاً بیان کیا ہے لیکن اس کے ساتھ اس قانونی حرمت پر سب متفق ہیں کہ نہ وہاں جنگ کی جائے نہ اس کی جھاڑیاں کاٹی جائیں نہ اس کے درخت قطع کیے جائیں نہ وہاں گری ہوئی چیز اٹھائی جائے الا یہ کہ اٹھا کر اصل مالک کو پہنچانا مقصود ہو۔ ان حدود کے اندر جانوروں کا شکار نہیں کیا جا سکتا۔

حج ہمیشہ ہوتا رہے گا

۱۷۷۔ لوگوں پر اللہ کا یہ حق ہے کہ جو اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہو، وہ اس کا حج کرے۔ فعلی پیمانہ چھوڑ کر اسمی پیمانہ اختیار کر کے اشارا کیا ہے کہ بیت اللہ کا حج کوئی وقتی اور ہنگامی حادثہ نہیں بلکہ یہ تا قیام قیامت ہوتا رہے گا کیونکہ جملہ اسمیہ دوام اور ثبوت کے لیے ہوتا ہے۔ نیز اس سے یہ بھی اشارا ملتا ہے کہ بیت اللہ ہمیشہ قائم رہے گا اور لوگ ہمیشہ

حج کرتے رہیں گے۔ مولانا محمد قاسم نے قبلہ نما میں بیت المقدس اور بیت اللہ کے تقابلی مطالعہ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اجمالی اشارات ہم پیش کر چکے ہیں۔ دوسری بات اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ حج ہر اس شخص پر فرض ہے جو حج کرنے کی استطاعت رکھتا ہو۔

جب اُمتِ مسلمہ کا روحانی خاکہ تیار ہو گیا تو حضور انور نے اپنی دعوت کی طرح اسے بھی منظر عام پر نمایاں کرنا چاہا۔ اس غرض سے آپ نے عمرہ کی تیاری کی اور چودہ پندرہ سو کی جمعیت کے ساتھ روانہ ہوئے کہ پہلی بار اپنے آبائی گھر کو حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ کر چلے آئیں۔ لیکن یہ کاروانِ ہدایت راستہ ہی میں بمقام حدیبیہ روک دیا گیا۔ دوسرے سال حسب شرائطِ صلح زیارتِ کعبہ کی اجازت ملی تو آپ مکہ میں قیام کر کے چلے آئے۔ اب اس مصالحت نے راستہ کے تمام نشیب و فراز ہموار کر دیے تھے۔ صرف خانہ کعبہ میں پتھروں کا ایک ڈھیر رہ گیا تھا اسے بھی فتح مکہ نے ہموار کر دیا۔

اب میدان بالکل صاف تھا۔ راستہ میں ایک کنکری بھی سنگِ راہ نہیں ہو سکتی تھی۔ حضرت ابراہیم نے گھر کو جس حالت میں چھوڑا تھا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حالت میں اس پر قبضہ کر لیا۔ تمام عرب نے فتح مکہ کو اسلام و کفر کا معیارِ صداقت بنایا تھا جب مکہ فتح ہوا تو لوگ جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اب وقت آ گیا تھا کہ دُنیا کو اس جدید النشئۃ اُمتِ مسلمہ کے قالبِ روحانی کا منظر عام طور پر دکھایا جاتا۔ اس لیے دوبارہ اسی دعوتِ عامہ کا اعادہ کیا گیا جس کے ذریعے سے حضرت ابراہیم نے تمام عالم میں ایک غلغلہ عام ڈال دیا تھا۔ مگر اس قوت کا فعلی ظہور نبی اُمی پر موقوف تھا۔ اس آیت میں اسی فعلی ظہور کا اعلان ہے وللہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اُمت کی رائے عامہ میں یہ آیت قرآنی حج کی فرضیت بتا رہی ہے۔ ایک سے زیادہ ارشادِ نبوت میں حج کو اسلام کی عبادات میں چوتھا رکن قرار دیا ہے۔ جمہور کے قول کے مطابق حج کی فرضیت ۳ھ غزوہ احد والے سال میں اسی آیت سے ہوئی ہے۔

اسی آیت میں حج کی فرضیت کے شرائط بتائے گئے ہیں۔ یہاں صرف حج کا ذکر ہے جبکہ البقرہ کی آیت واتموا الحج والعمرۃ للہ میں حج اور عمرہ دونوں کا ذکر ہے۔ وہاں چونکہ حج کی فرضیت بتلانا نہیں ہے بلکہ حج اور عمرے کے بارے میں یہ تعلیم پیش نظر ہے کہ اگر کوئی شخص حج یا عمرہ کو بذریعہ احرام شروع کر دے تو اس کا اتمام واجب ہے اور یہاں

اس آیت میں حج کی فرضیت بتلانا مقصود ہے اس لیے خاص طور پر حج کا ذکر کیا ہے۔
ارشاد میں وللہ کو آغاز میں لاکر بتا دیا گیا کہ حج کا تمام تر مقصد اللہ سبحانہ کی رضا ہے۔ حج کا پورا عمل خالص اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ بغیر اخلاص کے عبادت جسم بلا روح کی حیثیت رکھتی ہے کیونکہ اہل عرب کے لیے حج عبادت سے زیادہ تجارت کا ذریعہ بن گیا تھا۔ ان کے لیے حج کی حیثیت تجارتی میلے کی رہ گئی تھی اور وہ تمام مقاصد مرور زمانہ سے ان کی نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئے تھے جن کے لیے حضرت ابراہیم نے اس گھر کی تعمیر فرمائی تھی۔ (یہاں للہ کے لفظ سے مسلمانوں کو حج کے اس مقصد کی طرف متوجہ کیا ہے کہ یہ عبادت اللہ کی رضا حاصل کرنے اور تقویٰ کی تربیت کے لیے مقرر کی گئی ہے نہ کہ میلوں کے انعقاد اور کاروباری سرگرمیوں کے لیے)

یہ واقعہ ہے کہ عرب میں کعبہ کی حیثیت محض ایک عبادت گاہ کی ہی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور اپنے تقدس کی وجہ سے، وہی پورے ملک کی معاشی و تمدنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ حج کے لیے سارا ملک اس کی طرف کھنچ کر آتا اور اس اجتماع کی بدولت عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہوتا، مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم کرتے۔ شاعری کے مقابلوں سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی ہوتی اور تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ یہاں اس آیت میں للہ لاکر خاص طور پر متوجہ کیا ہے کہ یہ سب باتیں ضمنی ہیں حج کا اصل مقصد اللہ کی رضا اور تقویٰ کی تربیت ہے۔ یہ بنیادی مقصد ہرگز نگاہوں سے اوجھل نہ ہونا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ حج کی عبادت اللہ کی خاطر کی جاتے۔ کاروبار کی خاطر، اجتماع کی خاطر، تمدنی روابط کی خاطر اور زبان وادب کی خاطر نہ کی جاتے۔ یہ چیزیں خود بخود حاصل ہو جائیں گی۔ جیسے قرآن نے البقرہ میں اس بات کی تردید کی تھی کہ سفر حج میں کسب معاش سے روحانیت پامال ہوتی ہے۔ ایسے ہی یہاں اس بات کو سمجھا دیا کہ اصل مقصد سے نظر ہٹا کر کسب معاش ہی کو مقصد قرار دینے سے حج کی روحانیت ختم ہو کر رہ جاتی ہے اسلام ایک راہ اعتدال ہے نہ اس کی اجازت دیتا ہے کہ معاش سے ترک تعلق کر لو اور نہ اس کی کہ اللہ سے ترک تعلقات کر کے کاروبار کے ہو کر رہ جاؤ۔

فرضیتِ حج کی شرائط

ارشاد کے اس ٹکڑے میں فرضیت حج کی شرطیں بتائی گئی ہیں من استطاع الیہ سبیلا

جو شخص اس گھر تک پہنچنے کی استطاعت رکھتا ہے۔ استطاعت طوع سے نکلا ہے اس کے معنے بس میں ہونا اور بس میں ہونے کا مطلب یہ ہے کہ کام کی ادائیگی کے وسائل پر قابو ہو۔ راہ جن جن ذرائع سے طے کی جا سکتی ہے ان پر قابو ہونا ہی استطاعت ہے صحت اور تندرستی ہونا، راستہ کا محفوظ ہونا، اخراجات کے لیے رقم کا مہیا ہونا، سواری ہونا سب استطاعت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ الغرض اس آیت کی رُو سے حج فرض ہی ان لوگوں پر ہوا ہے جو ہر پہلو سے اس کی استطاعت رکھتے ہیں۔

۱۷۸۔ اور جو کوئی اس حکم کی پیروی سے انکار کرے گا تو یاد رکھو کہ اللہ تمام جہانوں سے بے نیاز ہے۔ اس گھر میں جمال خداوندی کی کوئی خاص تجلی ہے، جس کی وجہ سے ادائے حج کے لیے ملے مخصوص کیا گیا ہے کیونکہ حج ایک ایسی عبادت ہے جس کی ہر ادا اس جمیل مطلق اور محبوب برحق کے عشق و محبت کے جذبے کا اظہار کرتی ہے۔ پھر ضروری ہے کہ جسے اس کی محبت کا دعویٰ ہو اور بدنی و مالی حیثیت سے بیت اللہ تک پہنچنے کی قدرت رکھتا ہو کم از کم عمر میں ایک بار دیارِ محبوب میں حاضری دے اور دیوانہ وار وہاں کا چکر لگائے۔ جو مدعی محبت اتنی تکلیف اٹھانے سے بھی انکار کرے سمجھ لو کہ جھوٹا عاشق ہے۔ اختیار ہے جہاں چاہے دھکے کھاتا پھرے۔ خود محروم و مہجور رہے گا۔ اس محبوب کو کسی کی کیا پروا پڑی ہے۔ کوئی یہودی ہو کر مرے یا نصرانی ہو کر اس کا کیا بگڑتا ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ تمام کائنات بھی اگر اس کے حکم کا انکار کر دے تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا۔ خانہ کعبہ خداوند ذوالجلال کے نور اور جمال کی تجلی کا گھر ہے۔ محبین اور عاشقین کا یہ فرض ہے کہ اس نور السماوات والارض جمیل مطلق اور محبوب حقیقی کے گھر پر عمر بھر میں ایک بار ضرور حاضری دیں۔ اور اس کے در و دیوار کا دیوانہ وار چکر لگائیں اور اس کے آستانہ کو بوسہ دیں۔ جو شخص خدا کی محبت کا دعویٰ کرے اور اس کے گھر کی حاضری کو فرض نہ سمجھے تو وہ جھوٹا مدعی ہے اور محبوب حقیقی کو کیا پروا ہے کہ ایسا شخص یہودی ہو کر مرتا ہے یا عیسائی۔ دونوں مدعی ہیں کہ حضرت ابراہیم ہمارے امام و پیشوا ہیں مگر جس گھر کو حضرت ابراہیم نے بحکم خداوندی حج اور زیارت کے لیے تعمیر کیا اور لوگوں کو اس کی زیارت اور حج کے لیے پکارا اس کا حج نہیں کرتے [2]

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] معارف قرآن م ا

آیت پر جامع نظر

یہودیوں کا اعتراض یہ تھا کہ اگر قرآن اور نبوت محمدیہ کی راہ حضرت ابراہیم اور ان کی اولاد کی راہ ہے تو کیوں خانہ کعبہ کو بیت المقدس کی جگہ مقرر کیا گیا حالانکہ پچھلے تمام انبیاء کا قبلہ بیت المقدس ہی تھا۔ جواب میں کہا گیا ہے کہ بیت المقدس کو حضرت موسیٰ کے ساڑھے چار سو سال بعد حضرت سلیمان نے تعمیر کیا اور حضرت سلیمان ہی کے زمانہ میں وہ قبلہ بنا جبکہ کعبہ کو حضرت ابراہیم نے تعمیر کیا اور وہ حضرت موسیٰ سے آٹھ نو سو برس پہلے گزرے ہیں۔ نیز حضرت ابراہیم کے بنائے ہوئے میں ایسی خصوصیات پائی جاتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ اللہ کی جناب میں مقبول ہے اور اسے اللہ نے اپنے گھر کی حیثیت سے پسند فرمالیا ہے۔ مثلاً۔

پہلی خصوصیت

یہ کہ خانہ کعبہ سب سے پہلا گھر ہے جو اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس میں کسی کلام کی گنجائش نہیں ہے۔ اسی لیے اس کا حج فرض ہے یہ بھی اس گھر کی شرافت اور بزرگی کی علامت ہے۔ تمام انبیاء حج کی رسوم عبادت یہاں ادا کرتے رہے اور نہایت شوق و ذوق سے اس کی زیارت کو چل چل کر آتے رہے بیت المقدس کا حج کبھی بھی فرض نہیں ہوا۔

دوسری خصوصیّت

خانہ کعبہ کی دوسری خصوصیت یہ ہے کہ وہ مبارک ہے یعنی خیرات و برکات کا سرچشمہ ہے۔ اگرچہ برکات بیت المقدس میں بھی ہیں مگر دونوں میں فرق ہے۔ برکت خانہ کعبہ کی صفت ذاتی ہے جو کبھی اس سے جُدا نہ ہوگی۔ اور بیت المقدس کے لیے برکت ایک صفت عرضی ہے جس کا جُدا ہوجانا ممکن ہے۔ جیسا کہ اس آیت میں لفظ مبارک خانہ کعبہ کے متعلق

اور بیت المقدس کے متعلق سورۂ اسراء میں لفظ بارکنا کا استعمال بتا رہا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بیت المقدس متعدد بار مخالفوں کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوا لیکن خانہ کعبہ پر کبھی مخالفوں کے ہاتھوں یہ نوبت نہیں آئی اس لیے خانہ کعبہ کی برکات ذاتی ہیں۔

تیسری خصوصیت

یہ ہے کہ خانہ کعبہ خانہ ہدایت ہے۔ اس سے قبلہ عبادت کی معرفت حاصل ہوتی ہے خانہ کعبہ عالمین کے لیے ظہور ہدایت کا ذریعہ ہے۔ اسی سمت پر سب نماز ادا کرتے ہیں، گویا یہ بمنزلہ مرکزی نقطہ کے ہے اور روئے زمین پر تمام نمازیوں کی صفیں بمنزلہ دوائر کے ہیں جو اس مرکز کو احاطہ کیے ہوئے ہیں۔ خانہ کعبہ کے انوار و برکات اور تجلیات مساجد کی وساطت سے تمام نمازیوں تک پہنچیں گی۔ اور نماز کی صفوں کو بجلی کی رو کی طرح یکدم منور و روشن کریں گی۔

چوتھی خصوصیت

یہ ہے کہ فیہ آیات بینات یعنی خود اس گھر میں اس کی حرمت اور عظمت کی ظاہر روشن نشانیاں موجود ہیں۔ گویا اس کے دامن کے ساتھ روحانی تاریخ وابستہ ہے۔ آدم سے لے کر حضرت ابراہیم تک اور ابراہیم سے لے کر محمد رسول اللہ تک جو کچھ ہوا ہے اس کا تمام تر تعلق اس مقدس سرزمین کے کوہ و صحرا اور در و دیوار سے ہے۔ یہیں حضرت آدم نے سکونت اختیار کی اور عرش کے سایہ میں خدا کا گھر بنایا، یہیں حوا نے آکر دم لیا اور ان سے ملاقات کی، یہیں نوح کی کشتی آکر رکی، حضرت ہود اور حضرت صالح نے یہاں پناہ لی، حضرت ابراہیم نے یہاں ہجرت کی، حضرت اسماعیل نے یہاں سکونت اختیار کی۔ یہاں وہ نشانیاں اور شعائر ہیں جو شرک و کفر اور دہریت کے بالمقابل خالص توحید کی نمائندگی کرتی ہیں۔

پانچویں خصوصیت

یہ ہے کہ یہاں مقام ابراہیم ہے۔ مقام سے مراد عبداللہ بن عباس، مجاہد اور عطاء بن ابی رباح کے خیال میں حرم کا پورا علاقہ ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ پتھر ہے جس پر حضرت ابراہیم کے قدم مبارک کا بطور اعجاز نشان پڑ گیا تھا۔ اور جس کو بیت اللہ کی تعمیر کے موقعہ پر آپ نے استعمال کیا۔

چھٹی خصوصیت

اگرچہ پورا علاقہ حرم امن ہے مگر اس علاقہ کا مامون ہونا بھی بیت اللہ کی برکت ہے

قرآن کی دوسری آیت میں پورے شہر کو بلد آمن اور البلد الامین کہا ہے اس لیے حرم کا پورا علاقہ امن گاہ ہے۔ اس میں ہر شخص کو بلکہ ہر جاندار کو مامون ہونا چاہیے۔ کسی کی جان سے اس علاقہ میں کھیلنا درست نہیں ہے۔ حرم کا یہ تقدس زمانہ ابراہیم سے آج تک قائم ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کے ہاتھ میں ملت ابراہیم کے جو کچھ آثار باقی رہ گئے تھے۔ ان میں یہ بھی تھا کہ حرم میں اپنے باپ اور بھائی کا قاتل بھی کسی کو ملتا تو انتقام نہ لیتے اور عام جنگ کو حرم میں ناجائز سمجھتے تھے۔

قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تَكْفُرُونَ بِـَٔايَٰتِ ٱللَّهِ وَٱللَّهُ شَهِيدٌ عَلَىٰ مَا تَعْمَلُونَ ﴿٩٨﴾ قُلْ يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ لِمَ تَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ مَنْ ءَامَنَ تَبْغُونَهَا عِوَجًا وَأَنتُمْ شُهَدَآءُ ۗ وَمَا ٱللَّهُ بِغَٰفِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿٩٩﴾

اے پیغمبر! ان اہلِ کتاب یہودیوں اور عیسائیوں سے کہہ دو کہ تم کیوں اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو حالانکہ تمہارے کردار کی ہر کروٹ سے اللہ خوب واقف ہے[۹۸]۔ اے پیغمبر! کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب یہ تمہارا کیا طرزِ عمل ہے کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ سیدھے راستہ سے ہٹ کر ٹیڑھے راستہ پر پڑ جائیں حالانکہ تم کو ان کا صراطِ مستقیم پر ہونا خوب معلوم ہے۔ یاد رکھو اللہ تمہاری حرکتوں سے غافل نہیں ہے[۹۹]۔

اہلِ کتاب کو زجر و توبیخ

یہودیوں کے دونوں سوالات کا صاف اور واضح جواب دینے کے بعد ان سے دو سوال کیے گئے ایک یہ کہ جانتے بوجھتے تم نے نبوت کے ساتھ کافرانہ طرزِ عمل کیوں اختیار کر رکھا ہے؟ دوسرے یہ کہ جو لوگ نبوتِ محمدیہ کو مان چکے ہیں ان کے راستہ میں رکاوٹیں کیوں کھڑی کر رہے ہو؟ ان سوالوں کو سمجھنے کے لیے یہ بات پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ اہلِ عرب عام طور پر ناخواندہ لوگ تھے۔ اور ان کے مقابلے میں یہودیوں کے اندر ویسے بھی تعلیم کا چرچا تھا۔ اور انفرادی طور پر ان میں سے ایسے ایسے عالم تھے جن کی شہرت عرب سے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس لیے عربوں پر یہودیوں کی علمیت کا بہت زیادہ رعب و جلال تھا۔ پھر ان کے علماء نے مذہبی رسوم کی ظاہری شان جما کر دینداری کے کاروبار کو وسیع سے وسیع تر کر رکھا تھا اور پوری دینی زندگی کو دینداری کا پیشہ بنا رکھا تھا۔

اسی پیشہ ورانہ دینداری کی وجہ سے اہلِ مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے۔ کیونکہ ان کے آس پاس بڑے بڑے یہودی قبائل آباد تھے اور ان کی گڑھیاں تھیں۔ رات دن ان سے ملتے اور اس میل جول میں وہ ان سے اسی طرح شدت کے ساتھ متاثر تھے جس طرح ایک ان پڑھ آبادی زیادہ تعلیم یافتہ، زیادہ متمدن، اور زیادہ نمایاں مذہبی تشخص رکھنے والے ہمسایوں سے متاثر ہو سکتی ہے۔ ان حالات میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کا آوازۂ حق بلند کیا اور لوگوں کو اسلام کی طرف بلایا تو قدرتی بات تھی کہ ان پڑھ عرب اہلِ کتاب سے جا کر پوچھتے کہ آپ لوگ بھی ایک نبی کے پیرو ہیں۔ اور ایک کتاب کو مانتے ہیں۔ آپ ہمیں بتائیں کہ حضور انور جو نبوت کا آوازہ بلند کر رہے ہیں۔ ان کے بارے میں اور ان کی تعلیم کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟ لیکن ان علماء نے کبھی لوگوں کو صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا تو اپنی پیشہ ورانہ دینداری کی وجہ سے مشکل تھا کہ جو کچھ پیش کر رہے ہیں وہ صحیح ہے لیکن وہ صاف صاف یہ بھی نہ کہتے تھے کہ جس چیز کی آپ دعوت دے رہے ہیں وہ غلط ہے یا توحید انبیاء، ملائکہ اور آخرت کے بارے میں آپ جو کچھ فرما رہے ہیں وہ غلط ہے یا وہ اخلاقی اصول جن کی آپ تعلیم دے رہے ہیں ان میں سے کوئی چیز غلط ہے۔ نہ وہ سچائی کی کھلی تردید کرتے تھے اور نہ سیدھی طرح اس کو سچائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انہوں نے یہ راستہ اختیار کیا کہ ہر سائل کے دل میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کی جماعت کے خلاف اور آپ کی دعوت کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈالتے، کوئی الزام چسپاں

کرتے۔ کوئی ایسا موقع یا شوشہ چھوڑ دیتے جس سے لوگ شکوک وشبہات میں پڑ جاتے۔ ان کا یہی رویہ پہلے ان دو سوالوں سے ظاہر ہو رہا ہے جو کعبہ کو قبلہ بنانے اور اونٹ کے گوشت کی حرمت کے بارے میں انہوں نے اٹھائے تھے۔ ان دونوں آیتوں میں قرآن ان کے اسی طرز عمل پر ان کو ملامت کر رہا ہے کہ حق واضح ہو جانے کے باوجود تمہارا طرز عمل بہت ہی عجیب ہے کہ خود بھی قبول حق سے محروم ہو اور دوسروں کو بھی راہ حق سے ہٹانے کی کوشش کر رہے ہو۔ جھوٹے اور فرضی شکوک کے ذریعے لوگوں کو یہ باور کرانا چاہتے ہو کہ اسلام صراط مستقیم نہیں ہے۔ اللہ تمہاری ان سازشوں سے بے خبر نہیں ہے۔

۹۹ - اے پیغمبر ان اہل کتاب سے کہہ دو کہ تم کیوں اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے ہو حالانکہ اللہ تمہارے ہر کردار کی ہر کروٹ سے خوب واقف ہے۔ پہلے سے خطاب یہود و نصاریٰ کو کیا جا رہا تھا۔ درمیان میں ان کے کچھ شبہات کا جواب دیا گیا۔ یہاں سے پھر ان کو تنبیہہ و توبیخ کی گئی یعنی حق و صداقت کے واضح دلائل اور قرآن کریم کی ایسی سچی اور پکی باتیں سننے کے باوجود بھی تمہیں کیا ہوا کہ باوجود اہل کتاب ہونے کے برابر کلام اللہ اور اس کے لانے والے کے انکار پر تلے ہوتے ہو۔ یاد رکھو کہ تمہاری سب کارروائیاں خدا کے سامنے ہیں تمہاری نیتوں اور تدبیروں کو وہ خوب جانتا ہے، جس وقت پکڑے گا پورا حساب لے کر چھوڑے گا۔[1]

آیت میں اگر آیات اللہ سے قرآن حکیم کی آیات مراد ہیں تو مطلب وہی ہے جو حضرت شیخ الاسلام قدس اللہ سرہ العزیز بتا رہے ہیں۔ اور اگر ان سے تورات وانجیل کی آیات مراد ہیں تو مطلب یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کے متعلق جو بشارتیں تورات وانجیل کے ورقوں میں موجود ہیں ان کا خارج میں مصداق ماننے سے کیوں انکاری ہو۔ آپ کی نبوت کا انکار تو خود تورات وانجیل کا انکار ہے اور اگر آیات سے مراد معجزات ہیں تو مطلب یہ ہے کہ جب معجزات سے آپ کی نبوت ثابت ہو چکی ہے تو پھر آپ کی نبوت کا کیوں انکار کرتے ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ آیات سے خانہ کعبہ کا قبلہ ابراہیمی ہونا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ملت ابراہیمی پر ہونا مراد ہو تو بات صاف ہے کہ جب تمہیں معلوم ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بالکل برحق ہے اور کعبہ قبلہ ابراہیمی ہے اور اس کا حج فرض ہے تو پھر اس علم و یقین کے باوجود کفر کی

[1] افادات شیخ الاسلام

راہ کیوں اختیار کرتے ہو۔

زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ آیات سے آیات قرآنی مراد ہیں۔ آیات قرآنی ہوں یا آیات تورات و انجیل سب اللہ کی آیات ہیں اور اللہ کی آیات سے کفر کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ کی روانہ کردہ تعلیمات سے جو بات اپنے خیالات یا خواہشات کے خلاف پائی اس کو ماننے سے صاف انکار کر دیا۔ دوسرے یہ کہ ایک بات کو جانتے ہوئے کہ اللہ کا ارشاد ہے، پوری ڈھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی اور حکم الٰہی کی کچھ پروا نہ کی تیسرے یہ کہ ارشاد الٰہی کے مطلب و مفہوم کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق اسے بدل ڈالا۔

یہاں لم تکفرون کے بعد واللہ شہید علی ما تعملون فرمایا ہے اور اسی سورت کی آیت ۷۰ میں فرمایا وانتم تشھدون یعنی حالانکہ تم گواہی دیتے ہو دونوں میں جوہری فرق ہے۔ وہاں انداز بیان ناصحانہ ہے اور یہاں انداز بیان میں تنبیہہ اور توبیخ ہے۔ اس لیے نصیحت کے موقعہ پر مشفقانہ بات فرمائی کہ میاں تم تو خود جانتے ہو اور تنبیہہ کے موقعہ پر زاجرانہ انداز میں فرمایا کہ اللہ تمہاری حرکتوں سے خوب واقف ہے یہ تہدید و توبیخ ہے۔ دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پاکیزہ زندگی، اور صحابہ کرام کی زندگیوں پر آپ کی تعلیم و تربیت کا حیرت انگیز اثر اور وہ بلند پایہ مضامین جو قرآن میں ارشاد ہو رہے ہیں۔ یہ ساری چیزیں اللہ تعالیٰ کی ایسی روشن آیات تھیں کہ جو شخص انبیاء کے احوال اور کتب آسمانی کے طرز سے واقف ہو اس کے لیے ان آیات کا انکار مشکل تھا اس لیے وہاں ناصحانہ انداز میں فرمایا کہ تم خود گواہ ہو اور مشاہدہ کر رہے ہو اس کے باوجود اللہ کی آیات کا انکار کر رہے ہو۔ اور یہاں چونکہ اہل کتاب کے علماء یہ جان چکے تھے کہ حضور وہی نبی ہیں جن کی آمد کا انبیاء سابقین نے وعدہ کیا تھا۔ حتیٰ کہ بعض اوقات حق کی طاقت سے مرعوب ہو کر ان کی زبانیں آپ کی صداقت کا اعتراف کر گزرتی تھیں اس لیے یہاں فرمایا کہ اللہ تمہاری تمام حرکات کو دیکھ رہا ہے وہ جانتا ہے کہ تم قصداً اپنے نفس کی شرارت سے جھٹلا رہے ہو۔

راہِ حق سے ہٹانے پر ملامت

۱۸۰۔ اے پیغمبر کہہ دو! کہ اے اہل کتاب یہ تمہارا کیا طرز عمل ہے کہ اللہ پر ایمان لانے والوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہو اور چاہتے ہو کہ وہ سیدھے راستہ سے ہٹ کر ٹیڑھے راستہ پر پڑ جائیں حالانکہ تم کو ان کا صراط مستقیم پر ہونا خوب معلوم ہے۔ یاد رکھو کہ اللہ تمہاری حرکتوں سے

غافل نہیں ہے۔ یعنی نہ صرف یہ کہ خود ایمان کی سعادت سے محروم ہوتے ہو، دوسروں کو بھی چاہتے ہو کہ اللہ کے راستہ سے روک دو۔ اور جو سعید روحیں شرف بایمان ہو چکی ہیں ان کو اسلام کے فرضی عیب بتلا کر دینِ اسلام سے واپس لے آؤ۔ پھر یہ حرکتیں محض جہل و بے خبری سے نہیں کر رہے ہو بلکہ سمجھ بوجھ کر سیدھی باتوں کو ٹیڑھا ثابت کرنے کی فکر کر رہے ہو۔ تمہارے اس ہیر پھیر سے اللہ بے خبر نہیں۔ مناسب وقت پر اللہ اکٹھی سزا دے گا۔ [1]

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اہلِ کتاب کا کردار یہ ہے کہ وہ اہلِ ایمان کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں اور اس میں ان کا پیشِ نہاد صرف یہ ہے کہ اسلام اور نبوتِ محمدیہ میں فرضی شبہات پیدا کر کے اسلام کی ایسی تصویر پیش کی جائے جس سے اس کے محاسن کو بد سے بدتر شکل میں پیش کیا جا سکے اور اسلامی حقائق میں تحریف کی جائے تاکہ اہلِ ایمان میں اسلام بیزاری کے جراثیم پھیل سکیں اور لوگوں کا یہ ذہن بن سکے کہ اسلام میں انسانی زندگی کے استقبال کی کوئی صلاحیت نہیں ہے۔ قرآن نے اسی کو تبغونہا عوجًا سے تعبیر کیا ہے اور مزہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف یہ ساری کارگزاری وہ یہ جانتے ہوئے کرتے ہیں کہ اسلام راہِ حق ہے۔ نادانی سے بیوقوفی سے نہیں بلکہ جان بوجھ کر یہ کام کر رہے ہیں۔ جانکاری اور واقفیت کی اسی حالت کو وانتم شھداء فرمایا ہے۔

ایک لطیف نکتہ

پہلی آیت کے آخر میں فرمایا تھا واللہ شہیدٌ علی ما تعملون اور یہاں فرمایا وما اللہ بغافلٍ عمّا تعملون دونوں میں باریک فرق ہے پہلی آیت میں ان کے کفر کا ذکر تھا جو ظاہر اور کھلا ہے اور سب کو آنکھوں سے نظر آتا ہے اس لیے فرمایا کہ یہ سب کچھ اللہ کے سامنے ہے اور اللہ دیکھ رہا ہے۔ دوسری آیت میں تدبیروں اور حیلوں کے ذریعے مسلمانوں کو راہِ حق سے ہٹانے کا کردار پیش کیا ہے جو مخفی اور پوشیدہ ہے اس لیے فرمایا کہ اللہ غافل نہیں ہے۔ دونوں جگہ چونکہ کردار مختلف تھا اس لیے الفاظ بھی کردار کے مطابق لائے گئے ہیں۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تُطِيعُوا فَرِيقًا مِّنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ
يَرُدُّوكُم بَعْدَ إِيمَانِكُمْ كَافِرِينَ ﴿۱۰۰﴾ وَكَيْفَ تَكْفُرُونَ وَأَنتُمْ
تُتْلَىٰ عَلَيْكُمْ آيَاتُ اللَّهِ وَفِيكُمْ رَسُولُهُ ۗ وَمَن يَعْتَصِم بِاللَّهِ
فَقَدْ هُدِيَ إِلَىٰ صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿۱۰۱﴾ ع ۱۰

اے اہلِ ایمان! اگر اہلِ کتاب میں سے کسی ایک گروہ کی اطاعت کروگے[۱۸۱] تو وہ تمہیں ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے۔[۱۸۲] اور تم راہِ کُفر کیسے اختیار کر سکتے ہو جبکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیتیں پیش کی جا رہی ہیں اور تم میں اللہ کا رسُول موجود ہے،[۱۸۳] اور یاد رکھو جو بھی اللہ کا دامن مضبوطی سے تھام لے گا وہ ضرور صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جائے گا۔[۱۸۴]

اہلِ کتاب کی طاعت اور اہلِ ایمان

قرآن حکیم محض کتاب تعلیم وتلقین اور صحیفہ وعظ وارشاد نہیں ہے بلکہ کتاب آئین اور

دستور حیات بھی ہے۔ پہلی دو آیتوں میں اہل کتاب کے کفر اور ان کے اغوا کی داستان بیان کی گئی تھی اب ان دو آیتوں میں پہلی آیت پر تفریع کر کے مسلمانوں کے سامنے مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک منفی اصول پیش کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ چونکہ اہل کتاب کا پیش نہاد اسلام کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تشکیکی مواد فراہم کر کے اہل ایمان کو راہ حق سے ہٹانا ہے اس لیے مسلمانوں کے ایمان کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں میں اہل کتاب کی طاعت سے دامن بچا کر رہیں۔ کیونکہ ان کا کردار یہ ہے کہ اہل ایمان کی متاع ایمان کو تباہ کرنے میں دن رات ایک کر رہے ہیں اور اس کے لیے انہوں نے طریق کار یہ اختیار کیا ہے کہ حضور انور کی نبوت، آپ کی دعوت اور قرآن حکیم کے بارے میں زیادہ سے زیادہ تشکیکی سرمایہ جمع کریں۔ نزول قرآن کے وقت یہودی دنیا کے علماء کا یہی حال تھا۔ آج بھی دیکھ لو یہی حال ہے کہ انہوں نے مسلمان نوجوانوں، مسلمان حکمرانوں، مسلمان دانشوروں اور مسلمان رہنماؤں میں اپنے فکری فلسفہ کو اپنے سارے اقتصادی، سیاسی، اور ثقافتی پہلوؤں کے ساتھ نیز اس کی مادہ پرستانہ قومیت کو نافذ کرنے کا عزم مصمم کر لیا ہے وہ اس اسلامی مزاج کے ساتھ جس کی جڑیں اور شاخیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور اس اجتماعی علمی اور ثقافتی ڈھانچہ کے ساتھ مستقل طور پر برسر پیکار اور ان معنوی اور روحانی قوتوں کے ساتھ برسر جنگ ہیں۔ وہ اپنے طرز عمل، نظام تعلیم و تربیت کے ذریعہ اہل ایمان کی اس قوت ایمانی کو برابر ملیامیٹ کرتے جا رہے ہیں۔ جو نہ کارخانوں اور فیکٹریوں میں ملتی ہے اور نہ پرجوش اور ولولہ انگیز تقریروں سے پیدا ہوتی ہے۔

اس آیت کے پس منظر میں شارحین قرآن نے جو احوال و واقعات لکھے ہیں ان کا تعلق اس دور سے ہے۔ ضروری نہیں کہ آج کے زمانہ میں اہل کتاب مسلمانوں کی متاع ایمان پر شب خون مارنے کے لیے وہی اطوار اختیار کریں۔ احوال ظروف بدل جانے کے ساتھ حملہ کرنے کے طریقے اور اطوار بھی بدل گئے جیسا کہ مولانا عثمانی نے زمانہ نبوت کا ایک واقعہ ذکر کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ ـــــ انصار مدینہ کے دو خاندان اوس وخزرج کے باہم اسلام سے پہلے سخت عداوت اور دشمنی تھی۔ ذرا ذرا سی بات پر لڑائی اور خونریزی کا بازار گرم ہو جاتا تھا جو برسوں تک سرد نہ ہوتا تھا۔ چنانچہ "بعاث" کی مشہور جنگ ایک سو بیس سال تک رہی۔ آخر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت پر ان کی قسمت کا ستارہ چمکا۔ اور اسلام کی تعلیم اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض صحبت نے دونوں قبیلوں کو جو صدیوں سے ایک دوسرے کے خون کے

پیاسے رہتے تھے ملا کر شیر و شکر کر دیا اور نہایت مضبوط برادرانہ تعلقات قائم کر دیئے۔ یہود مدینہ کو ان دونوں حریف خاندانوں کا اس طرح مل بیٹھنا اور متفقہ طاقت سے اسلام کی خدمت و حمایت کرنا ایک آنکھ نہ بھاتا تھا۔ ایک اندھے یہودی شماس بن قیس نے کسی فتنہ پرداز شخص کو روانہ کیا کہ جس مجلس میں دونوں خاندان جمع ہوں وہاں کسی ترکیب سے "بعاث" کی لڑائی کا تذکرہ چھیڑ دے۔ چنانچہ اس نے مناسب موقعہ پا کر بعاث کی یاد تازہ کرنے والے اشعار سنانے شروع کر دیئے۔ اشعار سنتے ہی بجھی ہوئی چنگاریاں پھر سلگ گئیں۔ زبانی جنگ سے گزر کر ہتھیاروں کی لڑائی شروع ہونے کو تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جماعت مہاجرین کے ہمراہ موقع پر پہنچ گئے۔ آپ نے فرمایا کہ اے گروہ مسلمین! اللہ سے ڈرو میں تم میں موجود ہوں، پھر یہ جاہلیت کی پکار کیسی؟ اللہ سبحانہ نے تم کو ہدایت دی، اسلام سے مشرف کیا، جاہلیت کی تاریکیوں کو مٹا دیا، کیا ان ہی کفریات کی طرف پھر پلٹنا چاہتے ہو۔ اس پیغمبرانہ آواز کا سننا تھا کہ شیطانی جال کے سب حلقے ایک ایک کر کے سب ٹوٹ گئے، اوس و خزرج نے ہتھیار پھینک دیئے اور ایک دوسرے سے گلے مل کر رونے لگے۔ سب نے سمجھ لیا کہ یہ سب ان دشمنوں کی فتنہ انگیزی تھی۔ اسی واقعہ کے متعلق یہ آیات نازل ہوئیں۔[1]

اگرچہ بہت سے شارحین قرآن نے اس واقعہ کا تذکرہ کیا ہے لیکن محققین کے نزدیک واقعہ روایتی اور تاریخی حیثیت سے کچھ اتنا طاقتور نہیں ہے چنانچہ اسی بنا پر حافظ ابن کثیر نے اس کو پیش نہیں کیا۔ بہر حال واقعہ ہو یا نہ ہو آیت کے الفاظ عام ہیں اور مسلمانوں کو ایک عمومی دستوری ہدایت دی جا رہی ہے کیونکہ العبرۃ بعموم اللفظ لا بخصوص السبب اور یہود و نصاریٰ کی اسلام کے خلاف قیامت تک ہونے والی ریشہ دوانیاں اس کے مفہوم میں داخل ہیں۔ یہودیوں اور عیسائیوں کی جانب سے جو کھلا ہوا پروپیگنڈا اسلام کے خلاف سیاسی، معاشرتی، تاریخی اور جغرافیائی تحریروں کے ذریعے جاری ہے وہ سب اس آیت قرآنی کا مصداق ہیں۔

۱۸۱۔ اے اہل ایمان اگر اہل کتاب میں سے کسی گروہ کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے۔ پہلے اہل کتاب کو ڈانٹا گیا تھا کہ جان بوجھ کر کیوں لوگوں کو گمراہ کرتے پھرتے ہو۔ یہاں مسلمانوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ تم ان مفسدین کے پھندے میں نہ آنا۔ اگر ان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے اشاروں پر چلوگے تو اندیشہ ہے کہ آہستہ آہستہ نورِ ایمان سے نکل کر کفر کے تاریک گڑھے میں دوبارہ نہ جا گرو۔ [1]

اس آیت میں شرط اور جزاء کے پیرائے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ مسلمانو! تمہیں اہلِ کتاب میں سے کسی فریق کی اطاعت ہرگز نہ کرنی چاہیے۔

دوسرے یہ کہ اگر تم نے ایسا کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمہیں دینِ حق سے ہٹا دیں گے اور تم کفر کے دلدل میں جا گروگے۔

پہلی بات کی حد تک آیت کا مطلب واضح ہے کہ قرآن مسلمانوں کو بلا قید اہلِ کتاب کے کسی فریق کی اطاعت سے روک رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ اگر تم نے اپنے اعمال کے کسی گوشہ میں ان کی اطاعت کی تو یہ انجام یقینی ہے کہ تم ایمان کے باوجود کفر کے شکار ہو جاؤگے چاہے یہ کفر اعتقادی نہیں صرف عملی ہو اور خواہ اس کا عنوان کچھ ہو۔

اسلام میں طاعت کی حدود

اسلام میں مطلق اور غیر مشروط طاعت صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہے۔ باقی کسی انسان کی اطاعت غیر محدود اور غیر مشروط نہیں ہے بلکہ اس کی طاعت اس وقت ہے جب وہ اللہ اور رسول کی طاعت کرتا ہو کسی خلافِ شریعت فیصلہ اور کسی ایسے حکم کی تعمیل میں جس سے دین اور امت کو یقینی طور پر نقصان پہنچتا ہو کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ یہ تو خود مسلمانوں کو مسلمانوں کی اطاعت کے بارے میں ہدایت ہے۔ باقی رہے غیر مسلم تو صرف یہی آیت نہیں بلکہ قرآن کی متعدد آیتوں میں مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ ان کی اطاعت نہ کرو۔ اس آیت میں خاص طور پر اہلِ کتاب سے بلا قید کسی فریق کی اطاعت سے جس انداز میں روکا گیا ہے شاید ممانعت کا اس سے زیادہ بلیغ انداز کوئی نہیں۔ کہا یہ گیا ہے کہ اہلِ کتاب میں سے کسی فریق کی بھی اگر اطاعت کروگے تو اس کے نتیجہ میں تمہیں ایمان سے ہاتھ دھونے پڑیں گے۔ کیونکہ یہ اسلام کے ایسے پکے دشمن ہیں کہ جو مسلمان ان کی باتوں میں آجائے گا اس کو کافر بنا کر چھوڑیں گے۔ خاص طور پر اہلِ کتاب اور اہلِ کتاب میں کوئی فریق کہہ کر طاعت سے روکنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کی نظر میں یہ دعوت

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اسلامی کی خطرناک پوزیشن ہے۔ ایک نیک نیت آدمی کو یہ حسن ظن ہو سکتا ہے کہ بھلا اہل کتاب ہوکر یہ لوگ کوئی گمراہی کی بات کیوں کر سوچ سکتے ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ اسلامی دعوت کے مقابلے میں پیروئ نفس، انسان کی مکمل بے راہ روی اور غیر ذمہ داری کی دعوت ہے۔ اس دعوت کی قیادت وامامت تقریباً دو سو برس سے یورپ کی قومیں کر رہی ہیں۔ طبعی طور پر زندگی کے ہر شعبہ اور تمدن کے ہر میدان میں اسلامی دعوت اور اہل کتاب کی دعوت میں تصادم ہوا۔ اس مقابلہ میں اسلامی دعوت کے نمائندوں نے محض اپنی کمزوریوں کی بنا پر شکست کھائی۔ اہل کتاب کے مقابلہ میں مسلمانوں کی اس مکمل شکست، اس مغلوبیت و ذلت کا طبعی اور نفسیاتی اثر یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلمانوں کے دل میں اہل کتاب کی طرف سے سخت عناد اور جذبہ انتقام پیدا ہو۔ اور ان کو اپنا مستقل حریف، حقیقی مد مقابل اور عالمگیر دشمن سمجھیں۔ لیکن کس حیرت اور افسوس کا مقام ہے کہ یہ عظیم الشان حقیقت مسلمانوں کی نظر سے اوجھل ہوگئی اور یہ مسئلہ کہ یہ مد مقابل دعوت ہے، اس کی اطاعت ایمان سے محرومی ہے۔ مسلمانوں کے ذہن سے نکل گیا، وہ اس حقیقت کو بھول گئے کہ وہ اور اہل کتاب دو متقابل دعوتوں، دو متضاد نظام حیات اور دو متضاد تہذیبوں کے علمبردار ہیں۔ اور اس طرح ایک ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں کہ جس قدر ایک نیچا ہوگا دوسرا بلند ہوگا۔ اس امر واقعی کا اہل کتاب کے ہر فرد کو پورا شعور ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں کو اس کا احساس نہیں ہوا ہے۔

اس کا نتیجہ ہے کہ مسلمان زندگی کی ہر شاخ میں ان کے مطیع ہوگئے اور ان کی حالت یہ ہے کہ آخرت پر ایمان کمزور ہوتا جا رہا ہے۔ اصول وصداقت کے مقابلہ میں منافع ومصالح آجل کے مقابلے میں عاجل کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہوگیا ہے۔ اس سے مسلمان با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے مقام سے گر کر ایک بے اصول، ناقابل اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر آتے جا رہے ہیں۔ جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہے بلکہ صرف منافع ومصالح اور اغراض ومقاصد ہیں۔ یہ تبدیلی اس وقت سے ہوئی جب پاکستان و ہندوستان اور تمام اسلامی ممالک کے مسلمانوں نے مغربی تہذیب، مغربی فلسفہ اخلاق اور مغربی معیاروں کو اپنانا شروع کیا اور افادیت ومصلحت کے نام پر ان کی طاعت کو قبول کیا۔
انا للہ فالی اللہ المشتکی۔

اسلامی معاشرہ میں مغربی افکار

۱۸۲۔ وہ تمہیں ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے ۔ گویا یہ نتیجہ ہے اہل کتاب کی اطاعت کا۔ مکمل شکست خوردگی، مکمل سپردگی اور ایک عقیدت مند اور سرگرم مقلد بننے کا۔

وہ کافر کیونکر اور کیسے بناتے ہیں۔ وہ زمانۂ نبوت کی طرح صرف بعاث کی یاد تازہ کرنے کے لیے اشعار نہیں سناتے بلکہ آج ان کے کافر بنانے کا انداز بدلتے ہوتے حالات میں نرالا ہے ۔ وہ کہیں علمیت کا لبادہ اوڑھ کر آتے ہیں اور پورے خلوص اور پورے زور قلم اور انشا پردازی کے ساتھ اسلام کے محقق اور شارح بن کر مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلام کے خلاف بغاوت کے جذبات پیدا کرتے ہیں۔ مثلاً قرآن حکیم کا انسانی فکر کا نتیجہ ہونا، دین و سیاست کی تفریق۔ اسلام کے نظام حکومت سے یکسر بے تعلقی، اور اس کا محض ایک اعتقادی، اخلاقی اور عبادتی نظام ہونا لادینیت کی دعوت، عربی زبان وادب کے اولین ماخذ کی صحت و ثبوت سے انکار، حدیث کی قیمت، حجیت اور سنت کی صحت کا انکار یا تشکیک، عورتوں کی آزادی اور مردوں کے ساتھ مساوات کلی، اور مساوات کلی کی تلقین وتحریک، فقہ اسلامی کو رومن لاکا چربہ قرار دینا، قدیم تہذیبوں کے احیاء کا نعرہ، پاکستان میں دلہر کی، ہندوستان میں اشوک کی اور مصر میں فرعون کی تقدیس، ان کی تہذیب ادب اور کارناموں پر فخر کرنا، مغربی قانون کی بنیاد و اصول پہ قانون سازی اور وطنی قومیت اور مادی سوشلزم کی دعوت، ان سب چیزوں میں مغربی فکر بلکہ مغربی طرز ادا اور تعبیر تک کے گھنے سائے آپ کو ان اسلام کے خیر خواہوں کے دماغوں اور ان کی تحریروں پر اپنے بازو پھیلائے ہوئے نظر آئیں گے۔

اسلامی معاشرہ میں مغربی افکار کے اس فاتحانہ داخلہ اور بردوکے بعد ایمانکے کافرین کی شہادت ایک مستشرق عالم نے بھی دی ہے۔ لے ، اے ، آر ، گب اپنی کتاب ، ویدر اسلام ، میں لکھتا ہے ؛

> اگر ہمیں مغربی اثر و نفوذ کا صحیح پیمانہ درکار ہے اور ہم دیکھنا چاہتے ہیں کہ مغربی ثقافت اسلام کے رگ و پے میں کس طرح سرایت کر گئی ہے تو اس کے لیے ہم کو سطحی مظاہر سے نیچے اترنا ہوگا ۔ ہم کو ان جدید افکار اور نئی تحریکات پر غور کرنا ہوگا جو محض مغربی طریقوں اور اسالیب سے گہرے تاثر کا نتیجہ ہیں۔ مشرقی فکر ان کو پورے طور پر ہضم کر کے ان کو نئی قائم ہونے والی اسلامی سلطنتوں کا اس طرح جزو بنا دینا چاہتا ہے جو ان کے حالات کے ساتھ میل کھا سکے ۔

اس فکری ارتداد میں ان کی کوششیں صرف علمی تحقیقات تک محدود نہیں۔ اگر تنہا یہ پہلو ہوتا تو شاید ہماری بحث کا موضوع ہی نہ ہوتا۔ مسئلہ کا زیادہ سنگین اور دُور رس پہلو یہ ہے کہ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو معقول اور غیر معقول طریقہ پر کمزوریوں کی نشاندہی پر صرف کرتے ہیں، وہ خورد بین سے دیکھتے ہیں اور اپنے قارئین کو دُور بین سے دکھاتے ہیں۔ رائی کا پربت بنانا ان کا ادنیٰ کام ہے۔ وہ اسلام کی تاریک تصویر پیش کرنے میں اس سبک دستی، ہنرمندی اور صبر و سکون سے کام لیتے ہیں جس کی نظیر ملنی مشکل ہے وہ پہلے ایک مقصد تجویز کرتے ہیں اور ایک بات طے کر لیتے ہیں کہ اس کو ثابت کرنا ہے۔ پھر اس مقصد کے لیے ہر طرح کے رطب ویابس مذہب، تاریخ، ادب، افسانہ، شاعری، مستند، غیر مستند ذخیرے سے مواد فراہم کرتے ہیں اور جس سے ذرا بھی ان کی مطلب براری ہوتی ہے۔ اس کو بڑے شوق سے پیش کرتے ہیں اور اس متفرق مواد سے ایک نظریے کا پورا ڈھانچہ تیار کر لیتے ہیں جس کا اجتماعی وجود صرف ان کے ذہن میں ہوتا ہے وہ اکثر ایک برائی بیان کرتے ہیں اور اس کو دماغوں میں بٹھانے کے لیے بڑی فیاضی سے اپنے ممدوح کی دس خوبیاں بیان کرتے ہیں تاکہ پڑھنے والے کا ذہن ان کے انصاف، وسعتِ قلب اور بے تعصبی سے مرعوب ہو کر اس ایک برائی کو قبول کر لے۔ وہ کسی شخصیت یا دعوت کے ماحول کا تاریخی پس منظر، قدرتی و طبعی عوامل و محرکات کا نقشہ ایسی خوبصورتی اور عالمانہ انداز میں پیش کرتے ہیں کہ ذہن اس کو قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اس شخصیت و دعوت کو اس ماحول کا قدرتی ردِ عمل یا اس کا فطری نتیجہ سمجھنے لگتا ہے اور اس کی عظمت و تقدیس اور کسی غیر انسانی سرچشمہ سے اس کے اتصال و تعلق کا منکر ہو جاتا ہے۔ اکثر مستشرقین اپنی تحریروں میں زہر کی ایک مناسب مقدار رکھتے ہیں اور اس کا اہتمام کرتے ہیں کہ وہ تناسب سے بڑھنے نہ پائے اور پڑھنے والے کو متنفر اور بدگمان نہ کرے۔ ان کی تحریریں فکری ارتداد میں بے حد موثر ہیں۔ اور ایک درمیانی استعداد اور قابلیت کا آدمی ان کی زد سے بہت مشکل سے بچ سکتا ہے۔ اہلِ ایمان کو جادۂ ایمان سے ہٹانے کے لیے قرآن، سیرۃ نبوی، فقہ و کلام، صحابہ کرام، تابعین، ائمہ مجتہدین، محدثین و فقہاء، مشائخ و صوفیہ، رواۃِ حدیث، فن جرح و تعدیل، اسماء الرجال، حدیث کی حجیت، تدوینِ حدیث، فقہ اسلامی کے ماخذ، فقہ اسلامی کا ارتقاء ان میں سے ہر موضوع کے متعلق ان کی کتابوں اور تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے جو ایک ایسے ذہین و حساس آدمی کو جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو پورے اسلام سے منحرف کر دینے کے لیے کافی ہے اس کا علمی جائزہ لینا ان کی تحریفات فنی غلطیوں اور ان کے دجل و تلبیس

کو واضح کرنا اس وقت ہمارے دائرہ بحث سے خارج ہے یہ ایک اہم علمی موضوع اور عظیم الشان دینی خدمت ہے جس کے لیے ایک عظیم و منظم ادارہ کی ضرورت ہے۔ ہم یہاں نہایت اختصار کے ساتھ ان کی اس دعوت و تلقین کا خلاصہ پیش کرتے ہیں جو وہ اپنے پڑھے لکھے حوصلہ مند اور ترقی پسند نوجوان قارئین کے سامنے بار بار اور مختلف عنوانوں سے پیش کرتے رہتے ہیں اور جس کو ان نوجوانوں کا ذہن ایک معقول اور بدیہی حقیقت کی طرح قبول کرتا چلا جاتا ہے۔ اس دعوت و تلقین کا اسلامی ممالک کی اصلاح و ترقی کی تحریکات سے قریبی تعلق ہے اور ان کی نوعیت کا اندازہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا اس موقع پر ہم اس خلاصہ کو بطور اقتباس پیش کرتے ہیں جو ایک مصری فاضل ڈاکٹر محمد البہی نے اپنی فاضلانہ کتاب الفکر الاسلامی الحدیث میں پیش کیا ہے اور جو اکثر و بیشتر مستشرقین کی کتابوں کا قدر مشترک اور ان کے خیالات کا عکس ہے۔ اسلامی معاشرہ کی وابستگی اسلام کے ساتھ صرف ایک مختصر وقفہ میں مستحکم رہی۔ یہ وہ تاریخی وقفہ ہے جبکہ اسلامی معاشرہ ابتدائی حالت اور دور طفولیت میں تھا۔ اس ابتدائی حالت اور دور طفولیت نے اس کا موقعہ دیا کہ زندگی اور اسلامی تعلیمات میں مناسبت اور ہم آہنگی پیدا ہو سکے لیکن اس مختصر ابتدائی وقفہ کے ختم ہوتے ہی اسلامی معاشرہ اور اسلام کے درمیان خلیج پڑ گئی۔ اور اسلام زندگی کی رہنمائی کا سرچشمہ نہیں رہا کلچرل سیاسی اقتصادی اور دوسرے خارجی محرکات و عوامل کے نتیجہ میں اسلامی معاشرہ کے اندر زندگی جتنی تبدیل ہوتی رہی اور ترقی کرتی رہی اتنا ہی اسلام اس بدلتی ہوئی اور ترقی کرتی ہوئی زندگی کا ساتھ دینے سے قاصر ہوتا چلا گیا۔ یہ خلیج برابر وسیع ہوتی چلی گئی یہاں تک کہ خلافت اسلامی کے آخری مرکز (جدید ترکی) نے اس کا اعلان کر دیا کہ اسلام اب عام زندگی میں دخل نہ دے سکے گا اور اب اس کی جگہ فرد کے ضمیر میں ہوگی اور یہ فرد بغیر کسی اعلان اور جوش کے اپنی ذات کے لیے اس کا اظہار کر سکے گا اسلامی تعلیمات کا نافذ نہ کر سکنا اجتماعی ضرورت کا عین تقاضا ہے اور یہ نتیجہ ہے روز بروز بدلتی ہوئی زندگی کے ان حالات کا جن کو اسلام اپنی تعلیمات کی روشنی میں اپنے مطابق نہیں بنا سکا اور ان کے اور اپنی تعلیمات کے درمیان ہم آہنگی نہیں پیدا کر سکا۔ اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے پر زور دینے کے معنی اس زمانہ میں اس کے سوا کچھ اور نہیں ہیں کہ زندگی سے کنارہ کشی اختیار کر لی جائے۔ تمدن جدید کے وسائل سے فائدہ اٹھانے میں مسلمان دنیا سے پیچھے رہ جائیں مسلمان ممالک میں غربت، بیماریاں اور جہالت کو بخوشی گوارا کیا جائے جیسا کہ اس وقت سعودی حکومت میں حال ہے یہ وہ تنہا اسلامی ملک ہے جس نے سرکاری طور پر اسلام پر عمل کیا ہے اس لیے وہ اس بات کا نمونہ

ہے کہ اسلام پر عمل کرنے سے کیا نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ تغیر و ترقی جو زندگی کا ایسا عام قانون ہے جس سے مفر نہیں مسلمانوں کو اپنے اسلام کے بارے میں بھی اس سے کام لینا چاہیے تاکہ وہ جدید مغربی دنیا کے قدم بقدم چل سکیں اور کمزوری و بدنظمی کے اسباب سے نجات پا سکیں۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ خود اسلام پر بھی بحیثیت ایک مذہب کے اس قانون کو نافذ کریں اور اس کو زمانہ کے ساتھ بدلنے اور ترقی دینے کی کوشش کریں۔ ملت اسلامی کو بھی تغیر و ترقی کے اس فطری اور ابدی قانون کی پیروی میں مغربی معیار کے مطابق چلنا اور اپنے مشرقی ماحول میں اس سے متاثر ہونا ضروری ہے اس لیے کہ فکر و زندگی کے میدان میں اہل مغرب کے رجحانات طویل انسانی تجربوں کا نتیجہ ہیں۔ اہل مغرب نے ان رجحانات کی تشکیل میں علمی اور سائنٹیفک طریقہ استعمال کیا۔ یہ طریقہ اوہام و خرافات اور مخصوص عقائد سے متاثر نہیں ہوتا اس کے پیش نظر صرف انسانیت کی فلاح ہوتی ہے۔

تقریباً ڈیڑھ دو صدی کے طویل و مسلسل تجربہ کے بعد مستشرقین نے محسوس کیا کہ ان کے طریق کار میں بنیادی غلطی تھی جس کی وجہ سے ان کی جدوجہد کا پورا نتیجہ نہیں نکل رہا تھا اور بعض اوقات اس کے خلاف اسلامی حلقوں میں شدید غصہ اور اشتعال پیدا ہو جاتا تھا جو تبلیغی و دعوتی نقطہ نظر سے خطرناک تھا وہ برابر اپنی مساعی اور ان کے اثرات و نتائج کا حقیقت پسندانہ جائزہ لیتے رہے۔ اب ان نتائج کی روشنی میں انہوں نے طے کیا کہ ان کو اپنے رویہ اور طریق کار میں بنیادی تبدیلی پیدا کرنی چاہیے اور بجائے مسلمانوں کو بدلنے کی کوشش کے اسلام کی جدید تعبیر پیش کرنے اور اصلاح مذہب کی تحریک چلانی چاہیے اور جہاں جہاں تجدد و اصلاح مذہب کی تحریک چل رہی ہے اس کی ہمت افزائی و تائید کرنی چاہیے۔ اس ذہنی تبدیلی اور ایک نئے طریق کار کی حسب ذیل اقتباس سے بخوبی نشاندہی ہوتی ہے۔

اصلاحی تحریکیں دینی تعلیمات کے موجودہ تجربوں کی روشنی میں از سر نو تشریح کرنے کی مخلصانہ کوششیں ہوتی ہیں یا ان کے ذریعہ نئے تجربوں کو دینی تعلیمات کی روشنی میں سمجھنے کی کوشش کی جاتی ہے اور اس لیے وہ (مسیحیت) کے ایک مبلغ کے لیے اولین اہمیت رکھتی ہیں۔ اس کے معنی ہرگز یہ نہیں ہیں کہ ہر نئی تحریک جس کو کہ چند خبطی شروع کر دیں وہ اس کا استحقاق رکھتی ہے کہ اس کا سنجیدگی کے ساتھ مطالعہ کیا جائے۔ ہماری مراد ان تحریکوں سے ہے جن کی حیثیت موجودہ زندگی کے سچے دینی اظہار کی ہے اور جو روزمرہ کے تجربہ کی روحانی تشریح کرنے کی کوشش کرتی ہیں اور پھیلتی جا رہی ہیں اور جس میں روحانی قوتیں حقائق سے نبرد آزما ہیں

بہت ممکن ہے کہ ان میں سے ایک اصلاحی تحریک مسلمانوں کیلیے حضرت عیسیٰ کو سمجھنے کے سلسلہ میں بالآخر اہم ثابت ہوتی۔ آئندہ چند سالوں میں اسلامی ممالک میں (مسیحی) مبلغ کا اصل کارنامہ مسلمان افراد کی اصلاح و احیاء سے زیادہ خود اسلام کی تجدید و احیاء ہو۔ بہرحال یہ کام کا ایک میدان ہے جسے نظرانداز نہیں کیا جاسکتا اور جس سے غفلت نہیں برتی جاسکتی۔ یہ میدان کھلا ہے۔ یہاں معذرت پسندوں کی مثال سے ظاہر ہے جو عیسائیوں اور مسلمانوں کے ساتھ مل کر کرنے کا خیر مقدم کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ اس نصف صدی کے اندر عالمِ اسلام میں اصلاح و ترقی (درحقیقت تجدد و مغربیت) کے جتنے علمبردار پیدا ہوتے ان کے خیالات، اعلانات اور ان کے طریقہ کار میں مستشرقین کی اس دعوت و تلقین کا عکس صاف نظر آئے گا یہاں تک کہ مستشرقین کے ان خیالات کو ان مصلحین و زعماء کے فکر و عمل کی اساس قرار دیا جاسکتا ہے اور اس کو ان کا مشترک منشور کہا جاسکتا ہے۔ ان مستشرقین نے ایک طرف اسلام کے دینی افکار و اقدار کی تحقیر کا کام کیا اور مسیحی مغرب کے افکار و اقدار کی عظمت ثابت کی اور اسلامی تعلیمات و اصول کی ایسی تشریح پیش کی کہ اس سے اسلامی اقدار کی کمزوری ثابت ہو اور ایک تعلیم یافتہ مسلمان کا رابطہ اسلام سے کمزور پڑجاتے اور وہ اسلام کے بارے میں تشکک ہوجائے۔ کم از کم یہ سمجھنے پر مجبور ہو کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کے ساتھ ساز نہیں کرتا اور اس زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ ایک طرف انہوں نے بدلتی ہوئی زندگی اور تغیر پذیر اور ترقی یافتہ زمانہ کا نام لے کر خدا کے آخری اور ابدی دین اور قانون پر عمل کرنے کو روایت پرستی، رجعت پسندی اور قدامت اور دقیانوسیت کا مترادف قرار دیا۔ دوسری طرف اس کے بالکل برعکس انہوں نے ان قدیم ترین تہذیبوں اور زبانوں کے احیاء کی دعوت دی جو اپنی زندگی کی صلاحیت اور ہر طرح کی افادیت کھو کر ماضی کے ملبہ کے نیچے سینکڑوں ہزاروں برس سے مدفون ہیں اور جن کے احیاء کا مقصد مسلم معاشرہ میں انتشار پیدا کرنے، اسلامی وحدت کو پارہ پارہ کرنے، اسلامی تہذیب اور عربی زبان کو نقصان پہنچانے اور جاہلیتِ قدیمہ کو زندہ کرنے کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا چنانچہ انہی کی تحریروں کے اثر اور انہی کے شاگردانِ رشید کے ذریعہ مصر میں فرعونی، عراق میں آشوری، شمالی افریقہ میں بربری، فلسطین و لبنان کے ساحل پر فنیقی تہذیب و زبان کے احیاء کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ اور ان کے مستقل داعی پیدا ہوگئے۔ انہی مستشرقین اور ان کے شاگردوں نے شدومد کے ساتھ یہ کہنا شروع کیا کہ قرآنی عربی فصحیٰ اس

کی ضروریات کو پورا نہیں کرسکتی۔ اس کی بجائے عام ——— اور مقامی زبانوں کو رواج دینا چاہیے اور انہی کو اخبارات اور کتابوں کی زبان بنانا چاہیے۔ یہ بات انہوں نے اتنی خوبصورتی سے اور اتنی بار کہی کہ مصر میں اچھے پڑھے لکھے اور صاحب قلم لوگوں نے اس تحریک کی حمایت شروع کر دی۔ جس کا نتیجہ اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا کہ ہر ملک اور ہر صوبہ کی الگ الگ زبان ہوجاتے۔ قرآن مجید اور اسلامی ادب سے عربوں کا رشتہ کٹ جاتے اور وہ ان کے لیے ایک اجنبی زبان بن جاتے۔ عربی زبان اپنی بین الاقوامی حیثیت ختم کرلے اور عرب اس پورے دینی سرمایہ اور ذخیرے سے محروم ہوکر الحاد و ارتداد اور اختلاف و انتشار کے نذر ہوجائیں۔ اسی طرح انہوں نے عربی رسم الخط کے بجائے لاطینی رسم الخط کے اختیار کرنے کی دعوت دی اور ان کے تلامذہ نے وقتاً فوقتاً اس کی ضرورت ثابت کی اور اس کے فوائد و فضائل بڑی بلند آہنگی سے بیان کیے۔ اس کا نتیجہ بھی اس کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا تھا کہ پوری عرب قوم صحیح طور پر قرآن مجید پڑھنے سے محروم و ناآشنا ہوجائے اور وہ پورا علمی ذخیرہ (جو اپنی وسعت اور علمی قیمت میں بے نظیر ہے) بے معنی اور بے کار ہوکر رہ جاتے۔ ان تجاویز اور مشوروں سے مستشرقین کے حقیقی مقاصد و خیالات ان کی دور بینی اور ان کی اسلام دشمنی کا پورا اندازہ ہوسکتا ہے۔ ان میں سے اکثر کی تصنیفات اسلام کی بنیادوں پر تیشہ چلاتی ہیں۔ اسلامیات کے سرچشموں (بشمول حدیث و فقہ) کو مشکوک قرار دیتی ہیں۔ مسلم معاشرہ میں سخت ذہنی انتشار اور تشکیک و ارتیاب پیدا کرتی ہیں۔ اسلام کے حاملین و شارحین (محدثین و فقہاء) کی علمیت و ذہانت کی طرف سے متشکک بناتی ہیں۔ فاحش علمی غلطیوں مضحکہ خیز غلط فہمیوں زبان و قواعد سے ناواقفیت اور بعض اوقات کھلی تحریفات کی ان میں بکثرت مثالیں ملتی ہیں لیکن ان کی اکثر و بیشتر تصنیفات مغربی و مشرقی دنیا میں مقبول ہیں۔ نیا تعلیم یافتہ طبقہ (جس میں سن رسیدہ اہل علم کی بھی ایک تعداد شامل ہے) اس کی حسن ترتیب، طرز استدلال نتائج کے استنباط اور پیش کرنے کے علمی (سائنٹیفک) طریقہ سے مرعوب اور مسحور ہے اور اس کی تشفی خالص علماء مشرق کی تصنیفات سے نہیں ہوتی۔ مغربی علماء مستشرقین جس وقعت و اعتماد کی نظر سے دیکھے جاتے ہیں اور انہوں نے مشرق میں جو مقام حاصل کرلیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ مشرق وسطٰی کی تینوں موقر مجالس علمیہ میں مستشرقین کی ایک خاص تعداد رکن ہے اور ان کے مطالعہ و آراء سے استفادہ کیا جاتا ہے۔ عالم اسلام اور عالم عربی کی بے مائیگی و کم ہمتی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ خالص اسلامی و عربی موضوعات پر بھی عرصہ دراز سے مستشرقین ہی کی کتابوں پر

دارومدار ہے اور وہ اپنے موضوع پر ایک طرح سے کتاب مقدس کی حیثیت رکھتی ہے۔ تاریخ ادبیات عرب پر نکلسن کی کتاب جس میں برائے نام مسلمان مقالہ نگاروں کی ایک تعداد بھی شامل ہے اسلامی معلومات و حقائق کا سب سے بڑا اور مستند ذخیرہ سمجھا جاتا ہے اور مصر و پاکستان میں اسی کو بنیاد بناکر عربی اور اردو میں منتقل کیا جا رہا ہے اس صورت حال کی اصلاح اور مستشرقین کی تخریبی و تشکیکی اثرات کو روکنے کی صرف یہی صورت ہے کہ ان علمی موضوعات پر مسلمان محققین و اہل نظر قلم اٹھائیں اور مستشرقین کی ان تمام قابل تعریف خصوصیات کو ملحوظ رکھتے ہوئے بلکہ ان کو ترقی دیتے ہوئے جو ان کا حصہ سمجھی جاتی ہیں مستند و صحت مند اسلامی معلومات اور نقطہ نظر پیش کریں یہ ایسی تصنیفات ہوں جو اپنی تحقیقات کی اصلیت، مطالعہ کی وسعت، نظر کی گہرائی اور عمق ماخذ کے استناد و صحت اور اپنے محکم استدلال میں مستشرقین کی کتابوں سے کہیں فائق و ممتاز ہوں۔ ان میں ان کی تمام خوبیاں ہوں اور وہ ان کی کمزوریوں اور عیوب سے پاک ہوں۔ دوسری طرف ان مستشرقین کی کتابوں کا علمی محاسبہ کیا جائے اور ان کی تلبیسات کو بے نقاب کیا جائے۔ متن کے سمجھنے میں ان کی غلط فہمیوں اور ترجمہ و اخذ مطلب میں ان کی غلطیوں کو واضح کیا جائے۔ ان کے ماخذ کی کمزوری اور ان کے اخذ کیے ہوئے نتائج کی غلطی کو روشن کیا جائے اور ان کی دعوت اور تلقین میں ان کی جو بدنیتی، مذہبی اغراض اور سیاسی مقاصد شامل ہیں۔ ان کو طشت از بام کیا جائے اور بتایا جائے کہ یہ اسلام اور ملت اسلامیہ کے خلاف کیسی گہری اور خطرناک سازش ہے۔ اس پہلے مثبت و ایجابی کام (اسلامی موضوعات پر تصنیف) اور اس دوسرے سلبی و جرابی جزو (علمی محاسبہ) کے بغیر دنیائے اسلام کا ذہین و حوصلہ مند طبقہ جو یورپ و امریکہ کی بلند پایہ یونیورسٹیوں یا اپنے ملک کی اعلیٰ تعلیم گاہوں میں تعلیم پاتا ہے اور مغربی زبانوں ہی میں (جن میں وہ زیادہ مہارت رکھتا ہے) اسلامی لٹریچر کا مطالعہ کرنا چاہتا ہے۔ مستشرقین کے زہر آلودہ خیالات کے اثر سے آزاد نہیں ہو سکتا اور جب تک اس اثر سے آزاد نہ ہوا اسلامی ممالک برابر فکری انتشار اور ذہنی ارتداد کے خطرے سے دوچار رہیں گے۔ اور ان ممالک میں تجدد و مغربیت کے علمبردار برابر ان خیالات کا اظہار کرتے رہیں گے اور جب اقتدار ان کے ہاتھ میں آئے گا تو ان کو بروئے کار لانے کی کوشش کریں گے جو اسلام کی روح کے منافی ہے اور ایک ایسے معاشرہ کی تشکیل کرتے ہیں جو صرف نسل و قومیت میں قدیم اسلامی معاشرہ سے مشابہت رکھتا ہے اور جس کا رخ مغرب اور خالص مادیت کی طرف ہوگا اور جس کو دیکھ کر کم سے کم عالم اسلامی کے ان فضلاء اور رہنماؤں سے

یہ کہنا صحیح ہوگا سہ

ترسم نرسی بکعبہ اے اعرابی کیں رہ کہ تو میروی بترکستان است[1]

اہلِ کتاب کی طاعت پر قدغن

۱۸۳ ۔ اور تم راہِ کفر کیسے اختیار کر سکتے ہو جبکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیتیں پیش کی جا رہی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے ۔ یعنی بہت بعید ہے کہ وہ قوم ایمان لائے ۔ پھر کافر بن جائے یا کافروں جیسے کام کرنے لگے جس کے درمیان خدا کا عظیم الشان پیغمبر جلوہ افروز ہو جو شب و روز ان کو اللہ کا رُوح پرور کلام اور اس کی تازہ بتازہ آیات پڑھ کر سناتا رہتا ہے[2]

مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے دینِ حق سے ارتداد کی کب گنجائش ہے جبکہ تم میں قرآن اور سنتِ رسُول موجود اور محفوظ ہے ۔ آیت میں کفر سے مراد اعمالِ کفر کی طرف بازگشت ہے اور کَیف اظہارِ تعجب کے لیے ہے ۔ یعنی اس آیت میں اللہ سبحانہٗ اظہارِ تعجب فرما رہا ہے کہ یہ عظیم الشان حقیقت اہلِ ایمان کی نگاہوں سے کیسے اوجھل ہو جائے گا ۔ یہ مسلہ اپنی اس مرکزیت اور عمومیت کے ساتھ ان کے ذہن سے کیونکر صاف ہو جائے گی ۔ اپنی اور اپنے مستقل عالمگیر حریف کی یہ صحیح پوزیشن ان کی نظر سے کیسے مخفی ہو جائے گی ۔ وہ اس حقیقت کو کیونکر فراموش کر دیں گے کہ وہ اور اہلِ کتاب دو متقابل دعوتوں ، دو متضاد نظامِ حیات اور دو متضاد تہذیبوں کے علمبردار ہیں ۔ ایک ایمان کا داعی ہے ۔ دوسرا کفر کا مبلغ ہے اور اس طرح دونوں ایک ترازو کے دو پلڑوں کی طرح ہیں کہ جس قدر ایک نیچا ہوگا دوسرا اونچا ہوگا ۔ ان میں سے ہر دعوت کے علمبرداروں کا وجود ان کا فروغ اور ان کی طاقت دوسری دعوت کے علمبرداروں کے لیے ایک مستقل مزاحمت ، ایک مسلسل خطرہ اور ایک دائمی کش مکش ہے ۔ اس امرِ واقعی کا اہلِ کتاب کو پورا شعور ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں کو اس کا آج احساس نہیں ہے ۔ اسی حقیقت کو قرآن نے یہاں پوری صراحت اور بلاغت کے ساتھ بیان کیا ہے ۔

اس موقع پر ایک مسلمان کا کیا طرزِ عمل ہونا چاہیے اور اس کے ایمان اور غیرتِ دینی کا کیا تقاضا ہے اس کے لیے قرآن نے حضرت ابراہیم کا نمونہ پیش کیا ہے ۔

---

[1] اسلامیت اور مغربیت کی کشمکش ۔ [2] افاداتِ شیخ الاسلام ۔

قد كانت لكم اسوة حسنة فی ابراهيم والذين معه
یہ اسوۂ حسنہ کیا تھا، یہ بھی قرآن نے پوری قوت اور صراحت سے بتایا ہے :
اذ قالوا لقومهم انا برآء منكم ومما تعبدون من دون الله كفرنا بكم
وبدا بيننا وبينكم العداوة والبغضاء حتى تومنوا بالله وحده
جب انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ہم تم سے اور تمہارے ان معبودوں سے جن کو تم پوجتے
ہو بالکل بیزار ہیں۔ ہم نے تم سے کفر کیا اور ہمارے تمہارے درمیان ہمیشہ کے لیے
عداوت اور بیر ہو گیا تا آنکہ تم یگانہ اللہ پر ایمان لاؤ۔
یہ کتنی عجیب بات ہے کہ اہل کتاب یہودی اور عیسائیوں کو تو اس فرق و اختلاف کا احساس
ہوا اور ان میں اپنے نظام اور دین کے لیے محبت و غیرت زیادہ ہوا اور وہ اپنے مخالفین سے کسی
اتحاد و موالات کے لیے تیار نہ ہوں مگر اہلِ ایمان ذرا سی مصلحت سے ان کی طاعت کر لے لیں۔ اس
فرق کو بھی قرآن نے بیان کیا ہے۔
ولن ترضى عنك اليهود ولا النصارى حتى تتبع ملتهم
تم سے یہودی اور عیسائی اس وقت تک راضی نہیں ہو سکتے جب تک تم ان کی
ملت کے پیروکار نہ ہو جاؤ۔
اس تفصیل و وضاحت کے ساتھ نہ سہی لیکن اجمالی طور پر مسلمانوں کے دلوں میں اب سے کچھ پہلے
تک اہل کتاب کی تہذیب و نظام سے نفرت موجود تھی " کافر فرنگی "، نفرت و حقارت کے لیے ضرب المثل
تھا۔ لیکن ہم کو اس کا اعتراف کرنا چاہیے کہ اس دور میں باوجود اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت
کے علمبردار ہونے کے مغربی نظام و تہذیب نے بتدریج اس نفرت کو ختم کرنا شروع کر دیا۔ یہاں تک
کہ نفرت کی جگہ ان کی طاعت کی رغبت پیدا کر دی۔ پاک و ہند اور عرب ممالک میں اس تبدیلی کی
پوری تاریخ ہے۔ پہلے اس نے ہمارے فکری ارتداد کے لیے ہمارے اندر احساس کمتری پیدا کیا۔ یورپ
کا بالعموم تفوق ذہن پر قائم کیا۔ اس کا پورا نظام نہایت خوبصورت اور آراستہ کر کے دکھایا۔ پھر اس کی محبت
کو قلب و دماغ میں اس طرح اتار دیا کہ تعلیم یافتہ مسلمان کے لیے اس سے انحراف مشکل ہو گیا۔
یہاں تک کہ سیاسی طور پر اگر اس کو اس سے اختلاف بھی ہو تو ذہنی اور تہذیبی حیثیت سے
اس کا ربط اس سے قائم ہے۔ رفتہ رفتہ مسلمانوں کی ذہنیت اتنی تبدیل ہو گئی کہ اس کو دنیا میں اگر
کوئی اپنا حلیف اور سرپرست نظر آتا ہے تو وہ صرف یہودی اور عیسائی۔ اس نے اس حقیقت سے

آنکھیں بند کرلیں جو روزروشن کی طرح ہے کہ اس کا اصلی اور عالمگیر حریف جس سے پہلی صدی ہجری سے اس چودھویں صدی ہجری تک مسلسل معرکہ آرائی رہی ہے اور جو دنیا کی قیادت اور اس کی تعمیر نو میں اس کا اصلی رقیب اور مزاحم ہے۔ وہ یورپ کے یہودی اور عیسائی ہیں۔ اس نے اس نکتہ کو بالکل نہیں سمجھا کہ جب تک ان کا اقتدار قائم ہے اس وقت تک دین کی دعوت پورے طور پر سرسبز نہیں ہو سکتی، اور اس میں وہ طاقت اور جذب کشش پیدا نہیں ہو سکتی جس کی وہ مستحق ہے جب تک اہل کتاب دنیا کے لیے تنہا متقدا و پیشوا ہے اس وقت تک انسانی محاسن و فضائل اور اسلام کے معیار اخلاق کو فروغ نہیں ہو سکتا۔ اس لیے اسلام کی اور بالتبع پوری انسانیت کی عین مصلحت ہے کہ اہل کتاب کو منصب قیادت سے ہٹایا جاتے۔ لیکن افسوس ہے کہ مسلمان ان مسائل پر اس نقطہ نظر سے غور ہی نہیں کرتے۔ وہ یورپ کو پورے طور پر بے نقاب ہونے کے بعد پہچان نہ سکے۔ ان کی نظر اب بھی یردوکسم بعدایا نکمر کا فرین تک نہیں پہنچی ہے اور وہ قومی مصلحتوں اور محدود جغرافی مسائل میں الجھ کر اس عالمگیر ضرورت کو بھول بیٹھے ہیں انا للہ والی اللہ المشتکی۔

آیت میں آیات اللہ سے قرآن حکیم اور رسول سے آپ کی زندگی مراد ہے، یہ قرآن کا طرز ادعائی نہیں بلکہ اظہار واقعہ ہے۔ آج بھی دنیا کی قوموں اور ادیان میں اہل ایمان کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ اپنے پیغمبر کے لائے ہوئے علم و عمل کے وارث ہیں اور اس میں دنیا کی کوئی قوم ان کی شریک و سہیم نہیں ہے۔

۱۰۴۔ اور یاد رکھو جو بھی اللہ تعالیٰ کو مضبوطی سے تھام لے گا وہ ضرور صراط مستقیم پر گامزن ہو جائے گا۔ یعنی سچ تو یہ ہے کہ جس نے ہر طرف سے قطع نظر کر کے ایک خدا کو مضبوط پکڑ لیا اور اسی پر دل سے اعتماد و توکل کیا۔ اسے کوئی طاقت کامیابی کے سیدھے راستہ سے ادھر ادھر نہیں ہٹا سکتی۔[1] اصل ارشاد میں لفظ اعتصام آیا ہے۔

علماء نے اعتصام کے معنے کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنے کے اور تھامنے کے بتائے ہیں۔ اور اللہ کو مضبوطی سے تھامنے کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ اللہ کے دین اور اس کے احکام پر ہر حال میں مصلحت اور مفاد سے بالا ہو کر قائم رہو۔ گویا بتایا گیا ہے کہ جب نبوت کا لایا ہوا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علم وعمل تمہارے پاس موجود ہے تو یہ محرومی اور بدبختی کی انتہا ہو گی کہ دولت مند ہو کر تم کسی دروازے پر بھکاری بن کر جاؤ۔ تمہارا فرض یہ ہے کہ نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل سے چمٹ کر رہو۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی زندگی میں مخلوقات سے ہٹ کر صرف اللہ پر اعتماد اور بھروسہ کرو۔ اسی کی طرف حضرت شیخ الاسلام نے اشارا کیا ہے۔ علامہ آلوسی نے دونوں معنے کی گنجائش بتائی ہے۔ اور علامہ طیبی نے دونوں میں یہ لطیف اور جوہری فرق لکھا ہے کہ پہلی صورت میں آیت کا مفاد یہ ہو گا کہ یوں تو کفر وارتداد ہر حال میں انسان کی بدبختی کا غماز ہیں لیکن جب اللہ کا رسُول تمہارے سامنے قرآن کی تلاوت کر رہا ہے اور تمہیں پتہ ہے کہ ہم دُنیا میں خدائی پیغام کے حامل ہیں تو پھر یہ محرومی اور بدبختی کی انتہا ہے۔ گویا پلٹنے کو برحق اور مدّمقابل کو باطل سمجھنے کے باوجود پھر اہلِ باطل کی تقلید و پیروی اگر کرتے ہو تو یہ دن کی روشنی میں ٹھوکر ہے اور دوسری صورت میں آیت کا منشا یہ ہو گا کہ اگر تم اہلِ کتاب کی پیروی وطاعت، ان کی دسیسہ کاریوں، فریب کاریوں کے اندیشہ سے دب کر کرتے ہو تو تمہیں اس اندیشہ سے بالا ہونا چاہیے اور تمہیں یقین کرنا چاہیے کہ جس کے اللہ سے تعلقات مضبوط ہوتے ہیں اسے اللہ کی جانب سے راہِ راست پر جمے رہنے کی توفیق ارزانی ہوتی ہے۔ پہلے مفاد کی صورت میں یہ فقرہ کفر کے خلاف احتجاج ہے اور دوسری صورت میں یہ جملہ اللہ پر اعتماد و توکل کا شاہکار ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اسی معنے کو نمایاں کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہٗ پر توکل واعتماد ہی ہدایت میں سب سے بڑا سہارا اور گمراہی سے بچنے میں سب سے اونچا سہارا راست روی کے لیے بہترین ذریعہ اور حصولِ مقصد کے لیے سب سے اعلیٰ وسیلہ ہے۔

وحدتِ ادیان اور قرآن

قرآن کی اس آیت نے یہ بات روزِ روشن کی طرح اہلِ ایمان کے سامنے کھول کر رکھ دی ہے کہ اس کے تصورِ دین کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اب صرف اسی کی پیروی کی جائے۔ دوسرے آسمانی مذاہب بھی حق اور ذریعہ نجات رہے ہیں مگر اب ان میں کوئی بھی ایسا دین نہیں ہے جو باطل کی آمیزشوں سے پاک ہو اور اللہ کے حضور قابلِ قبول اور ذریعہ نجات ہو۔ اگر کسی درجہ میں کسی آسمانی دین میں کوئی صداقت ہوتی تو قرآن اس قوت کے ساتھ غیر مشروط انداز میں ہرگز نہ روکتا۔ اس کھلے اور صاف صریح اعلان کے باوجود کچھ لوگ اسلام کی اس حیثیت کو

پورے شرح صدر کے ساتھ تسلیم کرنے کو تیار نہیں ہیں اور ان کے ذہنوں میں دوسرے مذاہب خصوصاً یہودیت اور عیسائیت کے لیے بڑے نرم گوشے ہیں۔ کتنی زبانیں تو صاف کہتی سنائی دیتی ہیں کہ سارے آسمانی مذاہب برحق ہیں کیونکہ بنیادی اصول اور عالمگیر سچائیاں سب میں مشترک ہیں۔ فرق جو کچھ ہے الفاظ اور اصطلاحات کا ہے یا زیادہ سے زیادہ رسوم و مظاہر کا، اور یہ چیزیں ہرگز مدارِ حقیقت نہیں۔ جس طرح اس نظریہ کے ہمارے دنیادار اور دیندار دونوں ہی قسم کے لوگ شکار ہوتے ہیں اور دونوں میں گرفتاری کے محرکات الگ الگ ہیں۔ لیکن قرآن نے اس آیت میں خاص اہلِ کتاب کے کسی گروہ کی اطاعت پر مبتزت کے لاتے ہوتے علم و عمل کے مقابلہ میں قدغن لگا کر اپنے مخاطبوں کے جگہ دماغ میں یہ بات اتار دی ہے کہ بے شک سب ادیان برحق تھے لیکن اب اسلام کے سوا کسی کی اطاعت روا نہیں ہے۔ یہ تنگ نظری نہیں بلکہ سینۂ قرآن سے ابلی ہوئی صدا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ
وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ﴿١٠٢﴾

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ سبحانہ کی نافرمانی سے بچو جیسا کہ اس کی نافرمانی سے بچ کر رہنے کا حق ہے[185] اور (دیکھو) تمہارا مرنا نہ ہو مگر ایسی حالت میں کہ تم سراپا طاعت و فرمانبرداری ہو[186]۔

تقویٰ کی اجتماعی فضا پیدا کرو

گزشتہ آیات میں اہل کتاب کی طاعت کا نتیجہ کفر قرار دینے کے بعد اس کفر کی پذیرائی پر تعجب کا اظہار کیا اور بتایا کہ اسلام کے مکمل نظام حیات کے علمبردار ہونے کے باوجود اہل ایمان کا عملی زندگی میں اہلِ کتاب کی طاعت کرنا حیرت انگیز ہے۔ اب اس آیت میں اسی فہمائش کا تتمہ بیان کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اہل کتاب اسی طرح تمہاری ایمانی زندگی پر حملہ آور رہیں گے ان کے حملوں سے بچنے کی اس آیت میں دو بنیادی تدبیریں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ تم اسلامی زندگی کی حد تک اپنی اجتماعی زندگی میں جماعتی طور پر تقویٰ اختیار کرو۔ اجتماعی عمل کی اولین خصوصیت یہ ہے کہ اس سے ایک خاص قسم کی نفسیاتی فضا پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ فضا برائی سے بچانے میں مددگار ہوگی۔ ایک شخص انفرادی طور پر کسی خاص ذہنی کیفیت کے تحت کوئی کام کر رہا ہو۔ اور اس کے گرد و پیش میں دوسرے لوگوں میں نہ وہ ذہنی کیفیت ہو اور نہ وہ اس کام میں اس کے شریک ہوں تو وہ نہ صرف یہ کہ اپنے آپ کو اس ماحول میں اجنبی پا گا بلکہ خارجی اثر قبول کرے گا۔ اس کی کیفیت ذہنی صرف اس کی ذات تک محدود رہے گی۔ اس کو نشو و نما پانے کے لیے ماحول سے کوئی مدد نہ ملے گی بلکہ خارجی

اثرات اس کیفیت کو بڑھانے کے بجائے اُلٹا گھٹا دیں گے۔ لیکن اگر وہی کیفیت پوری جماعت اور پورے ماحول پر طاری ہو تو معاملہ برعکس ہوگا۔ اس وقت ایک ایسی اجتماعی فضا بن جائے گی جس میں پوری جماعت پر ایک ہی کیفیت چھائی ہوگی۔ اور ہر فرد کی اندرونی کیفیت ماحول کی اعانت سے غذا لے کر بے حد و حساب بڑھتی جائے گی۔ دوسری یہ کہ دشمن کے حملوں سے بچنے اور خارجی اثرات سے محفوظ رہنے کے لیے صرف یہی کافی نہیں کہ ایمان کا اقرار کر لیا جائے بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایمان میں استحکام اور جماؤ ہو۔

۱۰۵۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی اللہ سبحانہٗ کی نافرمانی سے بچو جیسا کہ اس کی نافرمانی سے بچنے کا حق ہے یعنی ہر مسلمان کے دل میں پورا ڈر خدا کا ہونا چاہیے کہ اپنے مقدور بھر پرہیزگاری و تقویٰ کی راہ سے نہ ہٹے[1] تقاۃ اصل میں وقیۃ ہے جیسے تقویٰ اصل میں وقویٰ ہے۔ عربی میں اس کے لغوی معنی بچنے، پرہیز کرنے اور لحاظ کرنے کے ہیں۔ لیکن زبانِ نبوت میں یہ دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ سبحانہٗ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقویٰ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں خدا کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہوتی ہے۔ گویا تقویٰ میں قلبی احساس اور اس کے مطابق پیمانۂ عمل ملحوظ ہوتا ہے اسی لیے جن شارحینِ قرآن کی نظر اس مجموعہ میں اول پر پڑی ہے انہوں نے اس کی تشریح ڈر، خوف اور اندیشہ سے کی ہے اور جن کی نظر دوسرے تک پہنچی، انہوں نے نافرمانی سے بچو سے کی ہے۔ صحابہ سے بھی آیت کی تشریح میں یہ تعبیرًا اختلاف منقول ہے۔ عبداللہ بن مسعود سے مرفوعًا اور موقوفًا یہ بیان نقل ہو کر آیا ہے۔ اگرچہ حافظ ابن کثیر نے تاریخی طور پر اس کو عبداللہ بن مسعود ہی کا بیان قرار دیا ہے۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ:

> حق تقاتہٖ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی ایسی طاعت کی جائے کہ اس میں نافرمانی کا شائبہ نہ ہو۔ اس کو اس طرح یاد کیا جائے کہ غفلت طاری نہ ہو اور اس کا شکر اس طرح ادا کیا جائے کہ اس میں ناشکری کی آمیزش نہ ہو۔

مطلب یہ ہے کہ بندے پر اللہ سبحانہٗ کا ایسا ڈر خوف غالب ہونا چاہیے۔ عبداللہ ابن عباس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فرماتے ہیں :

حق تقاتہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں جان کھپائی جائے اور کسی بھی ملامت گر کی ملامت کے اندیشے سے بے پروا ہو کر یہ کام کیا جاتے اور عدل وانصاف کا دامن نہ چھوڑا جاتے خواہ خود اپنی ذات ، اپنے والدین اور اپنی اولاد کے خلاف کرنا پڑے ۔

مطلب یہ ہے کہ زندگی کے ہر موڑ پر اسلام کو اپنایا جائے ۔ قاضی بیضاوی کا میلان بھی اسی طرف ہے ۔ چنانچہ انہوں نے اس فقرہ پر یہ تشریحی نوٹ قلم بند کیا ہے ۔

فرائض کی بجا آوری اور محرمات سے بچنے میں اپنی کوششوں کو پورے طور پر لگا دینا حق تقاتہ ہے ۔

جبکہ دوسرے مفسرین نے آیت میں تقویٰ کا مدلول قلبی کیفیت کو بنایا ہے ۔

کیا یہ آیت منسوخ ہے

علامہ بغوی معالم التنزیل میں رقمطراز ہیں کہ

اہل تفسیر کا کہنا ہے کہ جب قرآن کریم کی یہ آیت نازل ہوئی تو صحابہ پر اس کا مطالبہ شاق ہوا اور جناب نبوت میں عرض کی کہ اس کی بجا آوری کون کر سکتا ہے ؟ اس پر قرآن کی یہ آیت فاتقوا اللہ ما استطعتم نازل ہوئی اور یہ آیت منسوخ ہو گئی مقاتل کہتے ہیں کہ آل عمران میں صرف یہی آیت منسوخ ہے ۔

اور حافظ ابن کثیر نے سعید بن جبیر ، ابو العالیہ ، ربیع ابن انس ، قتادہ ، مقاتل اور زید بن اسلم کی رائے بھی یہی بتائی ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے ۔ لیکن عبداللہ ابن عباس اور طاؤس کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے ۔

دراصل یہ اختلاف زمانہ نزول کا اختلاف نہیں بلکہ معنیٰ آیت میں فکر کا اختلاف ہے جن کی نظر تقویٰ کے معنے میں قلبی احساس پر ہے ۔ انہوں نے اسے دوسری آیت سے معارض سمجھ کر منسوخ قرار دے دیا اور جن کی نظر تقویٰ کے معنے میں پیمانہ عمل اور قلبی احساس کے تقاضے پر ہے ان کو دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نظر نہیں آیا ۔ ہمیں علامہ زمخشری کی یہ رائے بے حد پسند آئی ہے کہ

فاتقوا اللہ ما استطعتم کا مطلب یہ ہے کہ تقویٰ اور خدا کی نافرمانی سے

بچنے میں اتنا مبالغہ کرو کہ استطاعت بھر تم سے کچھ رہ نہ جائے ۔
یہی اتقوا اللہ حق تقاتہ کا مطلب ہے اس لیے دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے
قاضی بیضاوی بھی علامہ زمخشری کے ہم زبان ہیں۔ وہ دونوں آیتوں کو مماثل قرار دیتے ہیں ۔
دراصل یہ ایک تشریح طلب مضمون ہے جیسے حضرت عبداللہ ابن عباس نے بہت مختصر لفظوں میں بیان کیا ہے۔ اہل کتاب کے حیا سوز معاشرے ، دہشت انگیز ماحول اور گھٹی ہوئی فضا میں ان لوگوں کو جنہوں نے نبوت کی دعوت پر لبیک کہی ہے بتایا جا رہا ہے کہ اہل کتاب کی ظالمانہ چیرہ دستی اور ان کی ایمان سوز سازشوں سے بچنے کی اولین تدبیر یہ ہے کہ پوری قوت سے اپنے اندر اجتماعی تقویٰ پیدا کیا جائے۔ اہل کتاب جو کچھ کہہ رہے ہیں اور جو کچھ کر رہے ہیں یہ سب کی سب اندھی قوتیں ہیں، جن میں نہ تو فہم حقیقت ہے اور نہ عقل و دانش کی روشنی ہے اور نہ انسانیت کی منزل مقصود کا کوئی نشان۔ یہ تمام قوتیں وقتی حالات اور ہنگامی تقاضوں کی مخلوق ہیں اور اس وقت تک اہل ایمان کے ایمانوں پر شب خون مارتی رہیں گی جب تک ایمان ایک تازہ جاندار طاقت بن کر انہیں تباہ و برباد نہ کر دے۔ اور ایمان کے جاندار رہنے کا دار و مدار صرف زبانی اقرار سے نہیں بلکہ یقین کی شدت اور عمل کی پختگی پر ہے جس طرح درخت کی مضبوطی اور زندگی جڑوں کی طاقت پر منحصر ہوتی ہے اور جڑوں سے درختوں کو اپنی پوری نشوونما کا سامان ملتا ہے۔ اسی طرح اسلام دنیا میں ایک زندہ اور کارفرما قوت کی حیثیت سے اسی وقت ابھرتا ہے جب اس کے پیرووں کے دل و دماغ ایمان کی روشنی سے منور اور یقین کی پختگی اور شدت سے مالا مال ہوں۔ آیت میں ایمان کے حوالہ سے خطاب کرنا اور پھر اتقوا اللہ حق تقاتہ کا حکم دینا اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے کیونکہ ایمان ہی وہ مرکزی قوت ہے جس سے اسلامی نظام کے مختلف اجزاء ترکیبی اپنی زندگی اور قوت کے لیے غذا حاصل کرتے ہیں۔ ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ ایک مسلمان نظام ہائے باطل کے مقابلے میں اسلامی نظام کا بول بالا کرنے کے لیے بیتاب ہو۔ اور اس راہ میں سب سے پہلی قربانی یہ ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں میں جہاں جہاں اللہ کی نافرمانی ہو رہی ہے اور جس طرح ہو رہی ہے اس سے یک قلم کنارہ کش ہو جائے ذاتی منفعت ، ملکی مصلحت اور قومی مفادات اس راہ میں اگر رکاوٹ ہوں تو ٹھکرا دے۔ حضرت عمر نے ابی ابن کعب سے پوچھا تھا کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے؟ انہوں نے کہا اما سلکت طریقا ذا شوک؟ تم کبھی ایسے راستہ میں نہیں چلے جس میں کانٹے ہوں فرمایا ہاں۔ کہا ،

فما عملت ؟ اس حالت میں تم نے کیا کیا ؟ فرمایا میں نے کوشش کی کہ کانٹوں سے بچ کر نکل جاؤں۔ کہا کہ فذالک التقوی بس یہی تقویٰ ہے۔

بہر حال اہل کتاب کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ رہنے کی قرآن نے اولین تدبیر یہ بتائی ہے کہ من حیث الجماعۃ اہل ایمان کو برائیوں سے بچ کر رہنا چاہیے۔

ایمان میں جماؤ پیدا کرو

۱۸۶۔ اور دیکھو تمہارا مرنا نہ ہو مگر ایسی حالت میں کہ تم سراپا طاعت و فرمانبرداری ہو یعنی شیاطین چاہتے ہیں کہ تمہارا قدم اسلام کے راستہ سے ڈگمگا دیں۔ تم کو چاہیے کہ انہیں مایوس کر دو اور مرتے دم تک کوئی حرکت مسلمانی کے خلاف نہ کرو۔ تمہارا جینا اور مرنا خالص اسلام پر ہونا چاہیے [1] مطلب یہ ہے کہ اسلام پر جیے رہو اور موت تک اسلامی زندگی کی حفاظت کرو۔ یعنی تم پر کوئی لمحہ ایسا نہ آئے کہ کامل فرمانبرداری کی حالت نہ ہو۔ ابن کثیر فرماتے ہیں صحت اور سلامتی کی حالت میں اسلام کی حفاظت کرو تاکہ تمہاری موت اسلام پر ہو۔

عجیب بات ہے کہ کچھ شارحین قرآن نے یہاں اسلام کو اخلاص کے معنی میں لے کر مطلب یہ بتایا ہے کہ تم سر تا سر اللہ کے لیے ہو جاؤ۔ اور کچھ نے اسلام کو ایمان قلبی کے معنے کا لبادہ پہنا دیا ہے حالانکہ قرآن خود اہل ایمان سے مخاطب ہے اور ان کو بتا رہا ہے کہ ایمان کا ناگزیر تقاضا یہ ہے کہ تقویٰ اختیار کرو اور پوری زندگی اسلام پر کاربند رہو۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میرا ذوق یہ کہتا ہے کہ تقویٰ آیت میں محارم اور منہیات سے بچنے کے لیے اور اسلام فضائل اور محاسن سمیٹنے کے لیے بولا گیا ہے اور بتایا یہ جا رہا ہے کہ ایمان صرف ایک درخت ہے لیکن اس کی افادیت اس وقت تک اقوام دنیا کے مقابلہ میں متصور نہیں ہو سکتی جب تک تمہارا دامن خدا کی نافرمانی کے رذائل سے پاک اور اللہ کی طاعت و فرمانبرداری کے زیور سے آراستہ نہ ہو گا۔

مسلمان کا سب سے بڑا مقصد

اصل یہ ہے کہ اسلام کی امامت بڑی نازک اور وسیع صفات کی طلب گار ہے جو جماعت اس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

منصب پر فائز ہو اس کے لیے ذاتی صلاح وتقویٰ اور طاعت کے علاوہ جہاد واجتہاد کی صلاحیت بھی ناگزیر ہے۔ یہ دو لفظ بہت سادہ اور ہلکے ہیں لیکن معانی ومطالب سے لبریز۔ جہاد سے مراد ہے عزیز اور اہم ترین مقصد کی خاطر اپنی طاقت اور وسائل کو صرف کر دینا۔ مسلمان کا سب سے بڑا مقصد اللہ کی فرمانبرداری، اس کی خوشنودی کا حصول اور اس کی بادشاہی اور احکام کے سامنے سپردگی اور سرافگندگی ہے۔ اس کی خاطر ہر اس عقیدہ، تربیت، اخلاق، تہذیب وتمدن، اغراض وخواہشات کے خلاف جو اس میں مزاحم ہوں ایک طویل جدوجہد کرنا اور ان تمام داخلی مطاعوں کے خلاف جو اللہ کی فرمانبرداری وطاعت میں حریف ورقیب ہوں اپوزیشن بن جانا مسلمان کا فرض ہے۔ اور اس کے لیے ضروری ہے کہ اللہ کے احکام کو اپنی ذات پر نافذ کرے اوامر کی پاسبجائی کرے، محرمات سے بچ کر رہے۔ پہلے کا نام اسلام اور دوسرے کا نام تقویٰ ہے اور یہ طاعت وتقویٰ ان کی پوری زندگی میں نمایاں ہو۔ دین واخلاق اور قوت وسیاست اسی کے مطابق ہوں۔ ان کی حکومت، تعلیم وتمدن، ان کے عقیدے، تربیت، دین واخلاق کا اعلیٰ نمونہ ہوں۔ وہ حکام کی حیثیت میں ہوں یا معمولی کارکنوں کی، پولیس کی حیثیت میں ہوں یا فوج کی، مزدور ہوں یا کارخانہ دار، والد ہوں یا اولاد ہمیشہ محتاط وپاک دامن ودیانت دار، امانت دار، خداترس اور منکسر مزاج ہوں۔ یہی معنے ہیں اتقوا اللہ حق تقاتہ اور لا تموتن الا وانتم مسلمون کے۔

وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا وَّلَا تَفَرَّقُوا ۠ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ اِذْ كُنْتُمْ اَعْدَآءً فَاَلَّفَ بَيْنَ قُلُوْبِكُمْ فَاَصْبَحْتُمْ
بِنِعْمَتِهٖٓ اِخْوَانًا ۚ وَكُنْتُمْ عَلٰى شَفَا حُفْرَةٍ مِّنَ النَّارِ فَاَنْقَذَكُمْ مِّنْهَا ۭ
كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ۝

[۱۸۶] اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑ لو اور اس سے جدا نہ ہو[۱۸۷] اور اللہ کے اس انعام کو یاد رکھو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اسی نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی۔ بس اسی کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہو گئے تھے[۱۸۸]۔ حالانکہ تم اپنے ماضی میں آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے، اللہ نے تم کو بچا لیا[۱۸۹]۔ اسی طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے کھول کر پیش کرتا ہے تاکہ تم کامیابی کی راہ پالو۔[۱۹۰]

اجتماع وائتلاف

اہلِ کتاب کی جانب سے خطرہ کی نشاندہی کرنے کے بعد اس سے بچنے کی تدابیر بتائی ہیں۔ اولین اور بنیادی تدبیر یہ بتائی کہ زندگی اور موت دونوں کی منزلوں میں اللہ کے تابع فرمان رہو، محرمات سے دامن بچا کر رکھو اور اوامر کی حد تک طاعت کی سرشاریوں کا مظاہرہ کرو، یہی تقویٰ اور اسلام ہے۔ اب　　　　اسی خطرہ سے بچنے کے لیے دوسری تدبیر اس آیت میں بتائی جارہی ہے خطرہ چونکہ عظیم ہے اس لیے اس سے بچنے کی تدابیر بھی عظیم اور ٹھوس ہیں۔ خطرہ کو ایک بار پھر ذہن میں تازہ کر لیجیے یعنی یہ کہ اہلِ کتاب طرح طرح کے ہتھکنڈوں سے اہلِ ایمان کو دینِ حق سے ہٹانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ یہود و نصاریٰ کی طرف سے جو کھلا ہوا زبردست اور منظم پروپیگنڈا اسلام کے خلاف سیاسی، معاشرتی "تاریخی، جغرافی تحریروں کے ذریعے مسلمانوں میں جاری رہتا ہے وہ اسی کے مظاہر ہیں۔ مقصد ان ساری سرگرمیوں اور کوششوں کا یہی ہے کہ مسلمان اگر یہودیت و مسیحیت کو نہ ہی قبول کریں پھر بھی کم از کم اسلام سے تو ضرور برگشتہ ہو کر رہیں۔ یردوکم بعد ایمانکم کافرین سورۃ بقرہ کی آیت نمبر ۱۰۱ میں بھی اسی خطرہ سے آگاہ کیا گیا تھا وہاں جو بات اجمالاً کہی گئی تھی یہاں اسی کی تفصیل ہے۔

قرآن کی اس آیت میں اسی خطرہ سے بچنے کی دوسری تدبیر بتائی جارہی ہے۔ تدبیر یہ ہے کہ اہلِ ایمان پوری اجتماعی قوت کے ساتھ مل جل کر اللہ کی رسی کو مضبوط تھام لیں اور اس سے کبھی جدا نہ ہوں۔ یہی اصل مقصد ہے۔ اس سے ہٹ جانے کے بعد اسلامی زندگی کا شیرازہ قائم نہیں رہ سکتا۔ یہی اہلِ ایمان میں زندگی کی حرارت اور سعی و طلب کا ولولہ پیدا کر سکتا ہے اور یہی اہلِ ایمان کے تمام اقدار و معیارات کا سرچشمہ اور ماخذ ہے تمدنی اور معاشرتی نظام درحقیقت اسی مقصد کا تابع ہوتا ہے

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ اسلامی عروج و ترقی اور اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا اگر تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب وہ قوت ہے جو مسلمانوں کو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ اسی کے ذریعے مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، ایک مرکز، ایک سلسلے، ایک وجود، ایک طاقت اور رائے۔ فرد واحد یا اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ جمع ہوتی ہیں اور تمام مواد، قوی، اعمال اور

افراد پر ایک اجتماعی حالت طاری ہوجاتی ہے تاآنکہ ہر قوت اکٹھی، ہر عمل باہم گرجڑا اور ملا ہوا، ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی، ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہوجاتا ہے۔ کسی چیز، کسی گوشے اور کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ جدائی، انتشار اور الگ الگ، جز، جز، فرد فرد ہوکر رہنے والی حالت نہیں ہوتی۔ یہی اعتصام بحبل اللہ ہے۔

اعتصام بحبل اللہ

۱۸۷۔ اور سب مل کر اللہ کی رسی کو مضبوط پکڑلو اور اس سے جدا نہ ہو یعنی سب مل کر قرآن کو مضبوط تھامے رہو جو خدا کی مضبوط رسی ہے۔ یہ رسی ٹوٹ تو نہیں سکتی ہاں چھوٹ سکتی ہے۔ اگر سب مل کر اسے پوری قوت سے مضبوط تھامے رہوگے۔ کوئی شیطان شر انگیزی میں کامیاب نہ ہوسکے گا اور انفرادی زندگی کی طرح اجتماعی زندگی بھی غیر متزلزل اور ناقابل اختلال ہوجائے گی۔ قرآن کریم سے تمسک کرنا ہی وہ چیز ہے جس سے بکھری ہوئی قوتیں جمع ہوتی ہیں اور ایک مردہ قوم تازہ زندگی حاصل کرسکتی ہے لیکن تمسک بالقرآن کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن کو اپنی آراء و اہوا کا تختہ مشق بنالیا جائے بلکہ اس کا مطلب وہی ہوگا جو احادیث صحیحہ اور سلف صالحین کی متفقہ تصریحات کے خلاف نہ ہو۔[1]

اللہ کی رسی سے مراد قرآن ہے۔ عبداللہ بن مسعود راوی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کتاب اللہ ھو حبل اللہ الممدود من السماء الی الارض یعنی کتاب اللہ اللہ تعالیٰ کی رسی ہے جو آسمان سے زمین تک لٹکی ہوئی ہے (ابن کثیر) زید بن ارقم کی روایت میں حبل اللہ ھو القرآن کے الفاظ آئے ہیں۔[2]

یعنی قرآن حکیم اور دین اسلام اور شریعت کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے رہو۔ جس طرح رسی کو مضبوط پکڑلینا اوپر سے گرنے سے بچاتا ہے اور نیچے سے اوپر تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم اور دین اسلام کو مضبوطی سے تھام لینا بندے کو خدا تک پہنچاتا ہے اور آگ میں گرنے سے بچالیتا ہے اور خدا کی رسی اس قدر مضبوط ہے کہ ٹوٹ تو نہیں سکتی البتہ غفلت کی بناپر ہاتھ سے چھوٹ سکتی ہے۔[3]

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف م ش [3] معارف م ا

اللہ کی رسی سے مراد اس کا دین ہے۔ اور اس کو رسی سے اس لیے تعبیر کیا گیا ہے کہ یہی وہ رشتہ ہے جو ایک طرف اہلِ ایمان کا تعلق اللہ سے قائم کرتا ہے اور دوسری طرف تمام ایمان لانے والوں کو باہم ملا کر ایک جماعت بناتا ہے اس رسی کو مضبوط پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں کی نگاہ میں اصل اہمیت دین کی ہو۔ اسی سے ان کو دلچسپی ہو، اسی کی اقامت میں وہ کوشاں رہیں۔ اور اس کی خدمت کے لیے آپس میں تعاون کریں جہاں دین کی اساسی تعلیمات اور اس کی اقامت کے نصب العین سے مسلمان ہٹے اور ان کی توجہات اور دلچسپیاں جزئیات و فروع کی طرف منعطف ہوئیں۔ پھر ان میں لازماً وہی تفرقہ و اختلاف رونما ہو جائے گا جو اس سے پہلے انبیاء علیہم السلام کی اُمتوں کو ان کے اصل مقصدِ حیات سے منحرف کر کے دُنیا و آخرت کی رسوائیوں میں مبتلا کر چکا ہے [1]

حبل اللہ کی تعبیری بلاغت

اعتصام تو لغت کی زبان میں عصم سے بنا ہے، عصم کے معنے روک دینا اور اعتصام کے معنے رکنا آتے ہیں۔ اسی سے اعتصام میں کسی چیز کو مضبوطی سے پکڑنے اور تھامنے کے معنے پیدا ہو گئے ہیں، حبل اللہ کے معنے اللہ کی رسی ہیں۔ اعتصام بحبل اللہ کے معنے اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لینا اور پکڑ لینا ہیں۔ پہلی آیت میں اللہ کو تھام لینے اور مضبوطی سے پکڑ لینے کا حکم تھا اس میں اجمال تھا۔ اب اس آیت میں اس کی وضاحت ہے کہ اللہ کو تھام لینا یہ ہے کہ اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لو۔

اللہ کی رسی سے کیا مراد ہے۔ کچھ کی رائیں اس موضوع پر آپ پڑھ آئے ہیں۔ ابوحیان الاندلسی نے لکھا ہے کہ حبل اللہ کی مراد متعین کرنے میں ایک سے زیادہ باتیں کہی گئی ہیں مثلاً عہدِ قرآن، دین، طاعت، توبہ، توحید، جماعۃ اور اسلام، سب شارحینِ قرآن کی تفسیر ان کے ارد گرد گھومتی ہے۔ ابن جریر، ابن کثیر، زمخشری، آلوسی، ابوحیان، قرطبی، بیضاوی، بغوی، اور خازن سب کے سب ایک زبان ہیں۔ حبل اللہ سے مراد قرآن ہونے کی ایک حدیث مرفوع سے بھی تائید ہوتی ہے۔ اوروں نے تو نہیں مگر آلوسی نے اسی کو تفسیر میں اولیت دی ہے۔

[1] تفہیم القرآن

عبداللہ بن مسعود سے بسند صحیح یہی تفسیر منقول ہے۔ قتادہ بن دعامہ سے بھی یہی تفسیر آئی ہے۔ ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے حضرت ابوسعید خدری کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے،

قرآن ہی اللہ کی وہ رسی ہے جو آسمان سے زمین کی طرف دراز کی گئی ہے۔

یہ سب باتیں درست ہیں۔ ان میں باہم کوئی مخالفت نہیں ہے۔ اگر آیت کے سیاق و سباق پر تھوڑا سا غور کیا جائے تو یہ حقیقت الم نشرح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ اولاً اللہ سبحانہ نے اہلِ ایمان کو اہل کتاب کی طاعت سے اس اندیشے اور خطرے کے تحت روکا کہ یردوکم بعد ایمانکم کافرین اور بعد ازیں اس پر تعجب ظاہر فرمایا کہ تم نبوت کی راہ سے آتے ہوئے علم و عمل کے علمبردار ہو کر دوسروں کی طاعت کیوں کر کر سکتے ہو۔ تمہارا ایمان ایک عہد و میثاق کے ذریعے وجود میں آیا ہے۔ یہ میثاق اس اقرار سے عبارت ہے کہ مسلمان انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے نبوت کے علم و عمل کو اپنی زندگی اور اپنے افکار و اعمال کے لیے قبول کرتے ہیں۔ یہ اقرار ہے اس بات کا کہ آئندہ سے مسلمان کسی اور علم و عمل پر اپنی فکری اور عملی توانیں صرف نہ کریں گے۔ اور اسی طرح اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جملہ امور و مسائل میں وہ کسی اور قانون و ضابطہ یا کسی دوسرے آئین و دستور کی رہنمائی نہیں قبول کریں گے بلکہ اس علم اور عمل میں اپنے لیے ہدایت تلاش کریں گے جو انہیں نبوت کے ذریعے ملا ہے۔ اس میثاق کے ہوتے ہوتے کسی اور نظام کی اطاعت حیرت افزا اور تعجب خیز ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ کتاب اللہ اور رسول اللہ سے ربط اور قرآن و سنت سے وابستگی ہی اعتصام باللہ ہے اور یہ اعتصام ہی اس دنیا میں صراطِ مستقیم کا رہنما ہے۔ اس کے علاوہ ہر اعتصام خواہ یہ یہودیت کا ہو یا عیسائیت کا، اور چاہے یہ وطنیت کا ہو یا قومیت کا، مادیت کا ہو یا معاش کا صراطِ مستقیم کا رہنما نہیں بلکہ سُبلِ متفرقہ کا رہنما ہے۔ بعد ازیں اہل ایمان کو اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے اور اہل کتاب کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ رہنے کی متعدد عملی تدبیریں بتائی ہیں۔ ان میں بنیادی اور اولین تدبیر یہ بتائی ہے کہ اسلامی زندگی کی خاطر تمہارے ایمان میں ثبات اور استحکام ہونا چاہیے۔ استحکام یہ ہے کہ تمہاری ساری زندگی میں طاعت کی سرشاریاں ہوں اور زندگی میں پھیلی ہوئی خدا کی نافرمانیوں سے تمہارا دامن محفوظ ہو۔ اب اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ صرف انفرادی زندگی ہی میں نہیں بلکہ تمہیں قانونی، اخلاقی، سیاسی اور عائلی زندگی کے تمام گوشوں میں اجتماعی طور پر

اللہ کی رسی کو تھام کر رہنا چاہیے اور اس سے زندگی کا کوئی گوشہ جدا نہ ہونا چاہیے۔ تمہاری مختلف کارکن قوتیں اسی مقام، اسی مرکز، اسی سلسلہ، اسی وجود، اسی طاقت میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ یکجا ہونی چاہئیں۔ اور تمام اعمال اور قوتوں پر ایک ایسی اجتماعی کیفیت طاری ہو۔ ہر قوت سمٹی ہوئی، ہر عمل باہم ملا ہوا اور ہر شخص زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو۔ کوئی چیز، کوئی گوشہ، کوئی عمل اس سے علیحدہ نہ ہو۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر قائم رہنے کی ہر نمازی نماز کی ہر رکعت میں اللہ کی جناب میں درخواست کرتا ہے۔ اسی کو قرآن نے انبیاء، شہداء، صدیقین اور صالحین کی راہ بتایا ہے۔ آیات اللہ و رسولہ اللہ کی کتاب اور اللہ کا رسول یعنی نبوت کی راہ سے آیا ہوا علم و عمل۔ یہی وہ حبل اللہ ہے جس کے اعتصام کا قرآن اس آیت میں مطالبہ کر رہا ہے۔ اس میں لطیف اشارہ اس حقیقت کی طرف کیا گیا ہے کہ نظامِ اسلام کی حقیقی کسوٹی اعتصام بکتاب اللہ و رسول اللہ ہے۔ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ مسلمان نقطہ ہائے باطل کے مقابلہ میں نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کا بول بالا کرے اور زندگی کے ہر گوشہ میں اس سے وابستہ ہو کسی حال میں اس سے جدائی گوارا نہ کرے۔

علم و عمل کے لیے حبل کی تعبیر

شارحین قرآن نے تو اس موقعہ پر حبل اللہ لانے کی ایک سے زیادہ وجوہ بتائی ہیں۔ کسی نے اسے تمثیل بنایا اور کسی نے استعارے کی زبان قرار دیا۔ آلوسی بغدادی، ابو حیان اندلسی، زمخشری نے اس پر خوب دادِ تحقیق دی ہے اور کچھ نے تمثیل و تشبیہ سے الگ ہو کر حبل اللہ کی تعبیر کی وجہ یہ قرار دی ہے کہ یہ اللہ سے تعلق کا ایک ذریعہ ہے۔ یہ سب باتیں صحیح ہیں مگر اپنا ذوق یہ کہتا ہے کہ پہلی آیت میں کتاب اللہ اور رسول اللہ کا ذکر آیا ہے۔ کتاب اللہ سے مراد علمِ نبوت ہے اور رسول اللہ سے نبوت کا عمل مراد ہے۔ لفظ حبل لا کر قرآن نے علم و عمل نبوت کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ جیسے ہم عربی میں حبل اور اردو میں رسی کہتے ہیں۔ وہ ایک اور منفرد چیز کا نام نہیں بلکہ ایک ہی جیسی دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ دونوں صرف مل کر نہیں بلکہ ایک دوسرے پر چڑھ کر حبل اور رسی کہلاتے ہیں۔ یہی حال نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کا ہے۔ فکر کی حد تک یہ دونوں الگ الگ ہیں مگر عمل کی حدود میں دونوں برابر ہیں۔ ان دونوں کی اسی ہم آہنگی کی طرف قرآن نے لفظ حبل بول کر اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جب تک

اُمت کے افکار و اعمال نبوت کے علم و عمل سے وابستہ رہیں گے۔ اُمت اہل کتاب کی دسیسہ کاریوں سے محفوظ رہے گی۔ شاید یہی وجہ ہے کہ سورۃ فاتحہ میں نبوت کے علم و عمل والی ہستیوں کی راہ کو صراطِ مستقیم قرار دینے کے بعد اہل کتاب کے اسی خطرے کی طرف غیرالمغضوب علیھم ولا الضالین کہہ کر اشارا کیا ہے۔ گویا اہل کتاب کا فتنہ قرآن کی نظر میں اتنا عظیم ہے کہ اس سے محفوظ رہنے کی ہر مسلمان نماز میں درخواست کرتا ہے۔

اعتصام بحبل اللہ کا مدلول

یہ تو اس آیتِ قرآنی کا منطوق ہے لیکن اسی کا مدلول یہ بھی ہے کہ اگر مسلمانوں میں اعتصام بحبل اللہ یعنی نبوت کے علم و عمل سے وابستگی رہی تو ان میں یگانگت، اتحاد، اجتماع اور ایتلاف کی فضا قائم رہے گی۔ گویا بتا دیا کہ اُمت میں اتحاد، ایتلاف، امتزاج اور نظم کا ذریعہ صرف اعتصام بحبل اللہ ہے۔ اس سے ہٹ کر اتحاد کا تصور ایک لفظ بے معنے ہے۔ یہ امر واقعہ ہے اور تاریخ کی بے لاگ شہادت موجود ہے کہ مسلمانوں کی اسلامی زندگی کا اصلی دور وہی تھا جب ان کی اجتماعی و انفرادی، مادی و معنوی، اعتقادی و عملی زندگی کے تمام گوشے نبوت کے علم و عمل سے وابستہ تھے۔ اور ان کے تنزل و ادبار کی اصلی بنیاد اسی وقت پڑی جب ان کی زندگی کے مختلف شعبوں میں نبوت کے علم و عمل کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ ابتداء میں ہر ذرہ مجتمع تھا، ہر طاقت سمٹی ہوئی تھی، ہر چیز بندھی ہوئی تھی لیکن بتدریج نبوت کے علم و عمل سے علیحدگی کی ایسی ہوا چلی کہ ہر بندھن کھلا، ہر جماؤ پھیلا، ہر ملی جلی اور اکٹھی طاقت الگ الگ ہو کر منتشر ہو گئی۔ قرآن نے ولا تفرقوا کہہ کر خبردار کیا تھا کہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے جُدا نہ ہونا مگر افسوس کہ ہم نے اس پر عمل نہیں کیا اور اس کے نتیجے میں مسلمان ہر موڑ پر تنزل کے شکار ہیں۔ اور نبوت کے علم و عمل سے ہٹ کر ذلیل ہیں۔ چونکہ اعتصام بحبل اللہ کا منطوق، اتحاد و اتفاق سمجھ لیا گیا اس لیے ولا تفرقوا کے معنے کسی نشست ہی صحیح نہ رہے۔ کسی نے اس کے معنے بتائے کہ فرقہ فرقہ نہ ہو۔ کسی نے کہا جُدا جُدا نہ ہو اور کسی نے بتایا کہ متفرق اور پراگندہ نہ ہو۔ حالانکہ اتحاد و اجتماع خود اعتصام بحبل اللہ نہیں بلکہ اس کا مدلول اور لازم ہے۔ محققین کی نگاہ اس پر گئی اور انہوں نے بتایا کہ تفرق کا منطوق نبوت کے علم و عمل سے ہٹنا اور جُدا ہونا ہے۔ ابن جریر رقمطراز ہیں ولا تتفرقوا عن دین اللہ اللہ کے دین سے جُدا نہ ہو

الوسی نے پوری قوت سے بتایا کہ لا تتفرقوا عن الحق الذی امرتم بالاعتصام بہ جس حق سے تمہیں چمٹے جانے کا حکم ہے اس سے جُدا نہ ہو۔

مغرب زدگی کے خلاف احتجاج

قرآن کی ہدایت کہ اعتصام بحبل اللہ کرو۔ یعنی نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے اپنی زندگی کی ہر شاخ میں چمٹ کر رہو اس سے کہیں بھی جُدا نہ ہو مسلمانانِ عالم، ان کے رہنماؤں اور ان کے حکمرانوں میں مغرب زدگی کے خلاف ایک زبردست احتجاج ہے۔ موجودہ عالمِ اسلام مغرب زدگی کے راستہ پر جس طرح سے گامزن ہے اور اس آیت کے خلاف جس انداز سے پیش قدمی کر رہا ہے، اس کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان سب رہنماؤں اور لیڈروں نے اہلِ کتاب کے فکری فلسفہ کو اپنے سارے اقتصادی، سیاسی اور ثقافتی پہلوؤں کے ساتھ نیز ان کی مادہ پرستانہ قومیت کو اپنانے کا عزمِ مصمم کر لیا ہے۔ وہ اس اسلامی مزاج کے ساتھ جس کی جڑیں اور شاخیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور اس کے علمی، اجتماعی، ثقافتی ڈھانچہ کے ساتھ مستقل طور پر برسرِ پیکار ہیں اور معنوی اور روحانی قوتوں کے ساتھ برسرِ جنگ ہیں۔ وہ اپنے طرزِ عمل، نظامِ تعلیم و تربیت اور اعلانات کے ذریعے قوم کی اس قوتِ ایمانی اور جذبۂ دینی کو غیر شعوری طور پر داؤ پر لگا رہے ہیں، اور اہلِ کتاب کی طاعت کو ترقی کا ذریعہ سمجھ کر دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ بے شک یہ رہنما وقتاً فوقتاً اسلام سے اپنی وابستگی اور دلچسپی کا بھی اظہار کرتے رہتے ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ اب بھی اسلام ان کے اور عوام کے درمیان سب سے بڑا اور طاقتور رابطہ ہے اور اس کا نام لیے بغیر وہ لاکھوں عوام کے دلوں پر حکومت نہیں کر سکتے۔ لیکن اسلام کا مفہوم ان کے ذہن میں وہ نہیں ہوتا جو واقعی ہے۔ اسلام سے ان کے نزدیک وہ اصلاح شدہ مذہب ہے جو مغربی تمدن اور مغربی افکار کے ساتھ ہم آہنگ ہو سکے اور ان کی قوم پرستی کا ساتھ دے سکے اور عقائد و اخلاقیات میں محدود رہ کر ان کی آئین سازی اور ان کے سیاسی مصالح و مسائل میں مزاحم نہ ہو۔ اس طرح ڈاکٹر سالم کی یہ رائے کچھ زیادہ مبالغہ آمیز نہیں ہے۔

اس مقصد کے لیے "قومیت" نے کامل اتحاد اسلام سے پیدا کیا ہے۔ لیکن جس اسلام کو قومیت نے اپنایا ہے یہ وہ قدیم بالکل خشک اسلام نہیں ہے بلکہ یہ بالکل

تبدیل شدہ اسلام جدید ہے، محمد رسول اللہ اور قرآن کے نام بے شک لیے جاتے ہیں۔
مگر اس لیے کہ ہر اس چیز کے لیے سند جواز ہاتھ آئے جسے قوم پرور اختیار کرنا چاہیں
عرب قومیت کو عوام میں مقبولیت اسی اسلام سے پیچھے ہٹنے سے حاصل ہوتی ہے۔

اعتصام بحبل اللہ کے لوازم

اگر یہ حقیقت ہے کہ اعتصام بحبل اللہ قرآن کا مطالبہ ہے اور اعتصام بحبل اللہ کی حقیقت یہی ہے کہ مسلمان زندگی کے تمام شعبوں میں اس سے وابستہ رہیں اور کسی ایک شاخ میں بھی اس سے جُدا نہ ہوں تو اس کا مطلب صاف اور واضح یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں نبوت کی راہ سے آنے ہوتے علم و عمل کی واقفیت عام ہو اور جس چیز پر وہ ایمان لائے ہیں وہ ان کے لیے شعوری ہو۔ کیونکہ اگر کسی نظام کی پشت پر اس کے ماننے والوں میں اس کے جاننے والوں کی عددی طاقت نہ ہو تو اس نظام کے زندگی کے ہر گوشہ میں قائم ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ایک ٹھیٹھ عقلی بات ہے کہ نظام خواہ کوئی ہو جب تک اس کے جاننے والوں کی طاقت اس کی پشت پناہی نہ کرے گی۔ اس کے قیام، اس کے اظہار کا اس عالم میں کوئی امکان نہیں ہو سکتا۔

عہد رسالت کے مسلمانوں کو آج کل کے مسلمانوں سے یہی چیز ممیز کرتی ہے کہ ان میں اسلام کا شعور اور اس کا علم عام تھا۔ آج اگر ہزار میں سے ۹۹۹ مسلمان اسلام سے ناآشنا ہیں تو صحابہ میں ایک فیصد بھی مسلمان اسلام سے ناواقف اور بے خبر نہ تھا۔ ان میں اسلام کی لگن اور اس کا عشق تھا۔ اور ان کو اسلام سے ایسی شدید محبت تھی کہ اس کے لیے کوئی قربانی نہ تھی جسے انہوں نے گوارا نہ کیا ہو اور کوئی مشقت نہ تھی جو انہوں نے نہ سہی ہو۔ اسلام آشنائی کی طلب ان کے دل میں اسی آیت کے مطالبہ اعتصام بحبل اللہ کی وجہ سے اور ذمہ داری کے احساس سے خود بخود پیدا ہوئی تھی۔ چونکہ اسلام کو حق ماننے کے بعد ان کا دل و دماغ سب طریقوں سے باغی اور منحرف ہو گیا تھا۔

اس نئے نظام کی بنیاد پر زندگی کی تعمیر نو کی خاطر ان کو اسلامی معلومات کی ضرورت تھی اس لیے ہر شخص اسلام کی تعلیمات حاصل کرنے کا خود بخود شائق تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ لاکھ سے زیادہ مسلمانوں میں کوئی ایک بھی ایسا نہ تھا جو اسلام سے ناواقف ہو۔ زمانہ نبوت میں اطراف عرب سے مختلف قبائل کے لوگ حاضر خدمت ہوتے اور تعلیم حاصل کر کے واپس جاتے۔ اصحاب صفہ مستقل طور پر آستانۂ رسالت پر مقیم رہتے اور ہر وقت کی تعلیمات سے باخبر رہتے۔ محدثین نے صحابہ کی ان علمی

مرشادیوں پر مستقل عنوان قائم کیے ہیں۔ چنانچہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں کتاب العلم میں دو عنوانوں کے ذریعے صحابہ کی طلب علم کی کیفیت پر بحث کی ہے۔ ایک عنوان ہے الخروج فی طلب العلم یعنی تلاش علم کی خاطر سفر کرنا۔ دوسرا عنوان ہے الرحلۃ فی المسئلۃ النازلۃ پیش پا افتادہ مسئلہ دریافت کرنے کے لیے گھر سے بے گھر ہونا۔ پہلے عنوان کے تحت امام بخاری فرماتے ہیں کہ حضرت جابر بن عبداللہ نے حضرت عبداللہ بن انیس سے ایک حدیث سننے کی خاطر ایک ماہ کی مسافت والا سفر کیا۔

امام دارمی نے اپنی سنن میں بروایت عبداللہ بن بریدہ بیان کیا ہے کہ ایک صحابی سفر کرکے حضرت فضالہ ابن عبید کے پاس مصر پہنچے۔ یہ اس وقت اپنی اونٹنی کو چارہ ڈال رہے تھے۔ ان کو دیکھتے ہی بولے مرحبا۔ صحابی مذکور نے فضالہ سے کہا کہ میں آپ کی ملاقات کے لیے نہیں آیا بلکہ کام آیا ہوں۔ عرض یہ ہے کہ میں نے اور آپ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک ارشاد سُنا ہے۔ مجھے اُمید ہے کہ وہ آپ کے علم میں ہوگی۔ فضالہ نے دریافت کیا کہ وہ کون سی ؟ صحابی مذکور نے کہا کہ فلاں حدیث جس میں یہ ہے۔[1]

اسی طرح کا ایک واقعہ محدث حاکم نے معرفۃ علوم الحدیث میں حضرت ابوایوب انصاری کا نقل کیا ہے کہ وہ بھی حضرت عقبہ ابن عامر کی خدمت میں صرف ایک حدیث کی خاطر سفر کرکے مصر تشریف لے گئے۔ چنانچہ جب وہ مسلمہ بن مخلد انصاری کے مکان پر پہنچے جو اس وقت مصر کے گورنر تھے تو ان کو اطلاع دی۔ مسلمہ جلدی سے باہر آئے معانقہ کیا پوچھا کیسے تشریف آوری ہوئی فرمایا میں نے ایک ارشاد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا تھا۔ اب سوائے میرے اور عقبہ کے اور کوئی حضور انور سے اس ارشاد کا سننے والا باقی نہیں اس لیے کسی کو بھیج دو جو مجھے ان کے مکان کا پتہ بتائے مسلمہ نے فوراً آدمی روانہ کر دیا۔ حضرت عقبہ کو اطلاع ہوئی تو جلدی سے باہر آکر معانقہ کیا اور پوچھنے لگے اے ابوایوب کیسے آنا ہوا؟ جواب دیا مسلمان کی پردہ پوشی کے بارے میں میں نے ایک ارشاد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا تھا۔ اب تمہارے اور میرے سوا اور کوئی اس کا سننے والا باقی نہیں ہے۔ عقبہ بولے ہاں۔ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے:

من ستر علی مومن فی الدنیا خزیۃ سترہ اللہ یوم القیامہ

---

[1] سنن دارمی

جو دُنیا میں کسی رسوائی پر مسلمان کی پردہ پوشی کرے گا اللہ تعالیٰ روزِ قیامت اس کی پردہ پوشی فرمائے گا۔

حضرت ابو ایوب انصاری نے سُن کر کہا تم نے سچ کہا یہ کہہ کر سواری کا رُخ کیا اور سوار ہو کر واپس ہو گئے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ علومِ نبوت کی طلب و تلاش کے لیے صحابہ کی سرشاریاں اور اس بارے میں ان کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس کس قدر تھا؟

اللہ سبحانہٗ کا انعام

۱۸۸۔ اور اللہ کے اس انعام کو یاد کرو کہ تم ایک دوسرے کے دشمن تھے اس نے تمہارے دلوں میں الفت پیدا کی۔ بس اسی کے فضل و کرم سے تم بھائی بھائی ہو گئے۔ یعنی صدیوں کی عداوتیں اور کینے نکال کر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت سے تم کو بھائی بھائی بنا دیا جس سے تمہارا دین اور دُنیا دونوں درست ہو گئے اور ایسی ساکھ قائم ہو گئی جسے دیکھ کر تمہارے دشمن مرعوب ہوتے ہیں۔ یہ برادرانہ اتحاد اللہ کی اتنی بڑی نعمت ہے جو روئے زمین کا خزانہ خرچ کر کے میسر نہ آسکتی تھی [1]

آیت میں نعمت کا لفظ مکرر آیا ہے اور سارا زور اسی پر ہے اس میں یہ پہلو قابلِ غور ہے۔ یعنی نعمت اللہ پر کیوں زور دیا گیا آنا کہہ دینا کافی تھا اذکروا اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم اخوانا۔ یہ بات خصوصیت کے ساتھ کیوں کہی گئی کہ اللہ کی نعمت کو یاد کرو۔

اس لیے کہ مسلمانوں کی اجتماعی شیرازہ بندی کا مقام اس کے بغیر نمایاں نہیں ہو سکتا تھا۔

انسان جب بھی کسی مقصد کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے تو مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب و آرزو ہی وہ اصلی قوت ہے جو اس کے اعمال میں حرکت پیدا کرتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ اخوت اور بھائی چارہ جو تم دیکھ رہے ہو خود بخود وجود میں نہیں آ گیا۔ سوچو اور غور کرو کہ حضور انور کی تشریف آوری سے پہلے عرب کا بچہ بچہ خون کا

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

پیاسا اور ایک قبیلہ دوسرے قبیلہ کا دشمن تھا۔ ایک ایک خون کا بدلہ کئی کئی پشتوں تک لیا کرتے تھے رسول اللہ اور کتاب اللہ نے تو اپنے ساتھ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے اور وہ دین کا رشتہ تھا جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملا دیا۔ دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ اور خاندانی و قبائلی اتحاد سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگت ان میں پیدا کر دی۔ مفسرین قرآن نے اپنے ذوق کے مطابق بھی سمجھا ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں اللہ کی نعمتوں میں سے وہ ہدایت و توفیق ہے جو تمہیں اسلام کی طرف لائی ہے۔ ابوبکر الجصاص فرماتے ہیں نعمت سے مراد اسلام ہے۔ قرطبی لکھتے ہیں کہ اللہ نے اپنی نعمت یاد دلائی ہے اور سب سے بڑی نعمت اسلام اور حضور انور کی پیروی ہے اسی کے ذریعے عداوت کی جگہ محبت اور انتشار کی جگہ اتحاد وجود میں آیا ہے۔ تعبیر میں اگرچہ اختلاف ہے مگر مقصد سب کا ایک ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ارشاد میں نعمت سے کتاب اللہ اور رسول اللہ مراد ہیں۔ یعنی نبوت کا کمال علم اور کمال عمل اللہ کی سب سے بڑی نعمت ہیں۔ نعمت دراصل اس حالت کو کہتے ہیں جس میں دل خوشی محسوس کرے۔ مسلمانوں کو اللہ نے دو قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے ایک علم دوسرا عمل، قرآن نے علم و عمل کے اسی مجموعہ کو نعمت قرار دیا ہے اور اس کے حاملین کے راستہ کو صراطِ مستقیم بتایا ہے صراط الذین انعمت علیھم یہاں نبوت کے کمال علم اور کمال عمل کے لیے کتاب اللہ اور رسول اللہ کی تعبیر آئی ہے۔ اسی بنا پر حبل اللہ کی تفسیر میں لوگوں نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق مختلف باتیں کہی ہیں۔ کچھ علماء صحابہ نے قرآن، کچھ نے اللہ کا دین اور کچھ بزرگوں نے اللہ کا عہد بتایا ہے۔ مقصد سب کا ایک ہے کہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے امت کی وابستگی میں امت کی وحدت کا راز پوشیدہ ہے۔

سب سے بڑا اخلاقی وصف

سید رشید رضا لکھتے ہیں کہ اس ارشاد کے ذریعے قرآن نے صحابہ کرام کی اخوت ایمانی کا چہرہ پیش فرمایا ہے۔ مکہ کے مہاجر جب بے خانماں ہو کر اور اپنا سب کچھ مکہ میں چھوڑ کر مدینہ آئے۔ تو ان کو انصار نے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ ان کو اپنے گھر دیے، باغ دیے، کھیت دیے، اپنی محنتوں میں ان کو شریک کیا اور خود ہر طرح کی تکلیفیں اٹھا کر ان کو آرام پہنچایا۔ پھر جب بنی نضیر کی زمین مسلمانوں کے ہاتھ آئی اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انصاریوں کے سوا باقی زمین مہاجرین

کوڑے دی تو انصار نے ہنسی خوشی اس فیصلہ کو تسلیم کر لیا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی یہ ادا ایسی پسند آئی کہ قرآن میں ذکر کیا۔

والذین تبوؤا الدار والایمان من قبلھم

آگ سے بھرا ہوا گڑھا

۱۸۹ ۔ حالانکہ تم اپنے ماضی میں آگ سے بھرے ہوئے ایک گڑھے کے کنارے پر کھڑے تھے اللہ نے تم کو اس سے بچا لیا۔ یعنی کفر و عصیان کی بدولت دوزخ کے بالکل کنارے پر کھڑے تھے کہ موت آئی اور اس میں گرے۔ خدا تعالیٰ نے تمہارا ہاتھ پکڑ کر بچا لیا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ایمان و اتقان کی روشنی سینوں میں ڈالی۔ حق تعالیٰ کے ان عظیم الشان دینی و دنیوی احسانات کو یاد رکھو گے تو کبھی گمراہی کی طرف واپس نہ جاؤ گے[1]

یہ اشارہ ہے اس حالت کی طرف جس میں اسلام سے پہلے عرب مبتلا تھے۔ قبائل کی باہمی عداوتیں، بات بات پر ان کی لڑائیاں اور شب و روز کی کشت و خون جن کی بدولت قریب تھا کہ پوری عرب قوم نیست و نابود ہو جاتی۔ اس آگ میں جل مرنے سے اگر کسی نے انہیں بچایا تو وہ یہی نعمت اسلام تھی۔ یہ آیات جس وقت نازل ہوئیں اس سے تین چار سال پہلے ہی مدینہ کے لوگ مسلمان ہوئے تھے۔ اور اسلام کی یہ جیتی جاگتی نعمت سب دیکھ رہے تھے کہ اوس و خزرج کے وہ قبیلے جو سالہا سال ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے باہم مل کر شیر و شکر ہو چکے تھے اور یہ دونوں قبیلے مکہ سے آنے والے مہاجرین کے ساتھ ایسے بے نظیر ایثار و محبت کا برتاؤ کر رہے تھے جو ایک خاندان کے لوگ بھی آپس میں نہیں کرتے[2]

ارشاد میں نار سے نارِ جہنم مراد ہے یا نارِ حرب، صاحب تفہیم کی رائے میں آگ سے جنگ و جدال کی آگ مراد ہے۔ مفتی محمد عبدہ مصری کی ان کو ہمنوائی حاصل ہے جب کہ جمہور شارحین قرآن کے خیال میں نار سے نارِ جہنم مراد ہے جیسا کہ شیخ الاسلام کی تعبیر بتا رہی ہے۔ علامہ آلوسی نے آیت میں جنگ کی آگ کو ظاہر کے خلاف قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ حملھا علی نار الحرب بعید۔ ہم بھی جمہور کے ساتھ ہیں۔ بے شک اتحاد و اتفاق بھی نعمت ہے لیکن اصل نعمت

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

وہ چیز ہے جس کے ذریعے اتفاق ہو ورنہ اتفاق واخوت کے تو اور بھی مظاہر ہیں۔

دُنیائے عرب کا عمومی جائزہ

قرآن اس ارشاد گرامی کے ذریعے عرب کے عمومی جائزے کی طرف اشارا کر رہا ہے۔ انبیاء اور ان کی تعلیمات سے بعد، ایک جزیرہ نما میں صدیوں سے مقید رہنے کی وجہ سے اور باپ دادا کے دین اور قومی روایات پر سختی سے قائم ہونے کی وجہ سے وہ دینی اخلاقی حیثیت سے بہت گر چکے تھے چھٹی صدی میں وہ تنزل وانحطاط کے آخری نقطہ پر تھے۔ کھلی ہوئی بت پرستی میں مبتلا اور اس میں دُنیا کے امام تھے۔ اخلاقی واجتماعی امراض ان کی سوسائٹی کو گھن کی طرح کھائے تھے۔

غیراللہ کی پرستش

جہالت وجاہلیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ غیراللہ کی پرستش کا عقیدہ مقبول وعام اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و ربوبیت کا تصور رکم ورا اور خواص میں محدود ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پوری قوم بتوں اور مورتیوں کی صاف صاف پرستش میں مشغول ہو گئی اور اللہ سے ان کا عملاً وقلباً تعلق منقطع ہو کر دوسرے معبودوں اور بتوں سے قائم ہو گیا تھا اور عبودیت و بندگی کے اظہار کے طریقے اور اعمال انہیں کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گئے تھے اور پورے ملک میں کھلی بت پرستی خدا سے بے تعلقی اور صریح شرک کا دور دورہ تھا۔ شامی فاضل محمد عزت اللہ دروزہ نے اپنی کتاب سیرۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم من القرآن میں اس پر سیرحاصل بحث کی ہے۔

اخلاقی واجتماعی امراض

اخلاقی اعتبار سے ان کے اندر بہت سی بیماریاں گھر کر گئی تھیں۔ شراب عام طور پر پی جاتی تھی اور ان کی گھٹی میں پڑی تھی۔ اس کا تذکرہ، ان کی ادبیات اور شاعری کی بہت بڑی جگہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ عربی زبان میں جس کے نام اس کثرت سے ہیں اور ان ناموں سے جن باریک فرقوں کا لحاظ رکھا گیا اس سے اس کی مقبولیت اور عمومیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ ابن سیدہ نے المخصص میں ان ناموں سے الخمر کے تحت بحث کی ہے۔ شراب کی دکانیں برسرِ راہ تھیں اور علامت کے طور پر ان پر جھنڈا لہراتا تھا۔ جاہلیت کے مشہور شعراء مثلاً طرفہ اور لبید بن ربیعہ جو عرب کا

مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی محفل کا چوتھا ممبر ہے اس کے کلام سے اندازہ ہوتا ہے کہ شراب نوشی کا کیا عالم تھا۔ انتہا یہ کہ تجارت کا لفظ شراب فروشی کا مرادف بن گیا تھا۔

شراب نوشی کے ساتھ ان میں قمار بازی کا بھی عام رواج ہو گیا تھا۔ عرب کے مال و دولت کا تمام سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا اس لیے جوا بھی ان کے ذریعے کھیلا جاتا تھا۔ جوا جاہلی زندگی میں بڑائی اور خوبی کی بات تھی اور اس میں شرکت نہ کرنا پست ہمتی اور مردہ دلی کی علامت تھی۔ اور ایسے شخص کو برم کا خطاب ملتا تھا۔ تفسیر کبیر میں امام رازی نے تفصیل پیش کی ہے۔ جو لوگ برم کا خطاب کر لیتے تھے ان سے شادی بیاہ کرنا ننگ و عار فعال کہا جاتا تھا۔ چنانچہ ایک جاہلی محمد بن خالد اپنی بیوی کو وصیت کرتا ہے۔

وازا هلكت فلا تريدي عاجزا

عنسا ولا برما ولا مغرا لا

اگر میں مر جاؤں تو میرے بعد تو عاجز، کمزور اور جوئے میں شریک نہ ہونے والے اور سفر میں لوگوں سے علیحدگی پسند سے شادی نہ کرنا۔

حجاز کے عرب اور یہودی سودی لین دین اور سود در سود کا معاملہ کرتے۔ اس سلسلے میں بڑی بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے کرتے۔ زنا کو کچھ زیادہ معیوب بات نہ سمجھا جاتا۔ اور اس کے واقعات عربوں کی زندگی میں کمیاب نہ تھے۔ اس کے بہت سے اقسام اور طریقے رائج تھے۔ زنان بازاری اور پیشہ ور عورتوں کے اڈے بھی موجود تھے اور شراب خانوں میں بھی اس کا انتظام تھا۔

خاندانی عصبیت

قبیلے اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر عصبیت اور جتھہ بندی عرب میں بڑی سخت تھی۔ اس عصبیت کی بنیاد جاہلی مزاج تھا۔ وہ اپنے بھائی اور حلیف کی مدد کرنا ہر حال میں ضروری سمجھتے خواہ وہ برسر حق ہو یا برسر باطل۔

عربی معاشرہ مختلف طبقات اور الگ الگ حیثیات کے خاندانوں اور گھرانوں پر مشتمل تھا۔ ایک خاندان دوسرے خاندان سے اپنے کو بلند و برتر سمجھتا تھا۔ بعض خاندان دوسرے خاندانوں یا عام انسانوں کے ساتھ بہت سی رسوم میں شرکت پسند نہیں کرتے۔ ایک طبقہ پیدائشی آقاؤں کا تھا۔ ایک طبقہ کم حیثیت لوگوں کا تھا جس سے بیگار لی جاتی اور کچھ عوام اور بازاری تھے۔

جنگ جوئی

ذرا ذرا سی بات پر لڑ مرنا اور ایک دوسرے کا سر کاٹ لینا ان کے نزدیک کوئی بات ہی نہ تھی۔ ہر قبیلہ دوسرے قبیلہ سے اور ہر خاندان دوسرے خاندان سے برسرپیکار رہتا۔ ہر بچہ اپنے باپ اور عزیزوں کے قاتل سے انتقام لینے کے جذبہ میں پرورش پاتا تھا اور جوان ہو کر اس فرض کو انجام دیتا۔ اس طرح ایک لڑائی کا سلسلہ برسوں تک قائم رہتا۔ ان ہی لڑائیوں کو اہل ادب اور مورخین ایام العرب کہتے ہیں جن کی تعداد سینکڑوں سے متجاوز ہے۔ میدانی نیشاپوری المتوفی ۵۱۸ھ نے کتاب الامثال میں ان میں سے ۱۳۲ لڑائیوں کے نام بتانے کے بعد لکھا ہے۔

یہ فن شمار کا استقصاء نہیں کرسکتا اس لیے جو کچھ میں نے بیان کیا ہے اسی پر میں نے قناعت کی۔ (جلد ۴ ص ۱۷۳)

لوٹ مار اور غارت گری

عرب میں لوٹ مار نے اگرچہ ہر قبیلہ کو راہزن بنا دیا تھا تاہم بعض قبائل میں اس قسم کے خاص خاص جتھے قائم ہو گئے تھے جنہوں نے راہزنی کو اپنا ذریعہ معاش اور عام مشغلہ بنا لیا تھا۔ اس قسم کے لوگوں کو لصوص کہتے اور قبیلہ طے کو عرب میں عام طور پر جو شہرت حاصل تھی وہ اسی گروہ کی بدولت تھی۔ قبیلہ طے کے عیسائی سردار عدی بن حاتم مسلمان ہو کر جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آئے اور آپ نے ان سے پیش گوئی کی کہ وہ دن آئے گا جب بصرہ سے ایک پردہ نشین عورت بے خوف و خطر حضرموت کا سفر کرے گی تو وہ چونکہ قبیلہ طے کے سردار تھے اور ان کو اس قبیلہ کے ڈاکوؤں کا حال معلوم تھا اس لیے ان کو تعجب ہوا کہ پھر طے کے لصوص کیا ہو جائیں گے۔

چوری

ڈاکہ کے علاوہ اقتصادی حالات کی مجبوری سے بدوؤں میں چوری کا رواج بھی تھا۔ مختلف قبیلوں کے ایسے بہادر جو قبیلہ میں کوئی نمایاں حیثیت نہ رکھتے تھے وہ خصوصیت کے ساتھ اس پیشہ کو اختیار کرتے۔

عام بدوعربوں میں یہ برائی جتنی عام ہو گئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو گا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

ان مردوں اور عورتوں سے جو اسلام قبول کرنے آتے دوسری باتوں کے ساتھ اس بات کا بھی معاہدہ لیتے تھے کہ وہ آئندہ چوری نہ کریں گے بلکہ خود اللہ سبحانہ نے قرآن میں آپ کو اس کا معاہدہ لینے کا حکم دیا تھا۔ چوری کرنے کے عجیب عجیب طریقے ایجاد کر لیے تھے۔ ایک شخص نے اپنی چھڑی کے کنارے ایک ایک ٹیڑھا لوہا (محجن) لگا رکھا تھا۔ حج کے زمانے میں آتا اور جب حاجیوں کو غافل پاتا تو اس لوہے کے سہارے سے ان کے اسباب کو کھینچ لیتا۔ جس طرح عرب میں طے کے ڈاکو لوٹ مار میں مشہور تھے اسی طرح بعض قبائل چوری میں شہرت عام رکھتے تھے۔ چنانچہ اسلم، غفار، مزینہ اور جہینہ کے قبائل تمام عرب میں اس بنا پر بدنام تھے کہ وہ خاص طور پر حاجیوں کے مال و اسباب چوری کرتے تھے۔

سفاکی و بے رحمی

رات دن کی لوٹ مار اور کشت و خون سے ان میں درندوں کے تمام اوصاف پیدا ہو گئے تھے۔ زندہ اونٹ اور دنبہ کے کوہان اور چکیاں کاٹ کر کباب لگاتے اور یہ ان کی بڑی غذا تھی۔ زندہ جانوروں کو درخت وغیرہ سے باندھ دیتے اور ان پر تیر اندازی کی مشق کرتے۔ لڑائیوں میں حاملہ عورتوں کے پیٹ چاک کر ڈالتے۔ مقتولوں کی ناک کاٹ ڈالتے اور عورتیں ان کے ہار بنا کر پہنتی تھیں۔ منت مانتے کہ دشمن کو قتل کریں گے تو اس کی کھوپڑی میں شراب پئیں گے۔ سزا دینے کا یہ ایک طریقہ تھا کہ مجرم کو درخت کی ٹہنیاں جھکا کر اس کے اعضاء ان میں باندھ دیتے پھر ٹہنیوں کو چھوڑ دیتے۔ مجرم کا بدن چر کر ٹہنیوں کے ساتھ رہ جاتا۔ کبھی کبھی عورتوں کو گھوڑے کی دم سے باندھ کر گھوڑے سرپٹ دوڑا دیتے اُن کے بدن کے ٹکڑے اڑ جاتے۔ اس قسم کی سزائیں اکثر عرب کے سلاطین اور روساء دیتے۔

قرآن کی اس آیت میں کنتم علی شفا حفرۃ من النار کی بلیغ تعبیر کے ذریعے ان ہی حالات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نبوت کا علم و عمل آیا اس کے ذریعے اللہ نے تمہیں جہنم سے بچا لیا ورنہ تم تو اپنے ان اعمال و افکار کی وجہ سے دوزخ کے کنارے پر کھڑے تھے۔ یعنی جہنم میں جانے کے لیے صرف مرنے کی دیر تھی۔ اگر تم اس حالت میں مر جاتے تو تمہارا دوزخ کے سوا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ ایسے وقت میں اللہ نے تمہاری مدد کی کہ تمہیں کتاب اللہ اور رسول اللہ کی نعمت سے نوازا اور اس طرح جہنم سے بچا لیا۔

فلاح کا سیدھا راستہ

۱۹۰۔ اسی طرح اللہ اپنی نشانیاں تمہارے سامنے کھول کر پیش کرتا ہے تاکہ تم راہ پالو۔
یعنی یہ باتیں اس قدر کھول کھول کر بیان کرنے سے مقصود یہ ہے کہ ہمیشہ ٹھیک راستہ پر چلتے رہو ایسی مہلک وخطرناک غلطی کا پھر اعادہ نہ کرو اور کسی شیطان کے اغوا سے استقامت کی راہ نہ چھوڑو۔[1]

مطلب یہ ہے کہ تمہاری دین و دُنیا میں کامیابی نبوّت کے لائے ہوئے علم و عمل سے وابستگی میں ہے۔ اس سے ہٹ کر اہلِ کتاب سے رشتہ جوڑنے میں تمہارے لیے فلاح نہیں ہے۔ نبوّت کے علم و عمل سے اگر زندگی کے تمام گوشوں میں ربط قائم رہتا ہے تو پھر سمجھ لو کہ یہ اعتصام باللہ ہے اور تمہارے قدم اس صراطِ مستقیم پر ہیں جو انبیاؑ و صدیقین، شہداء اور صالحین کی شاہراہ ہے۔ اگر اس سے ہٹ کر زندگی کے مختلف احوال میں یہود و نصاریٰ سے تم نے رشتہ قائم کیا ہے تو پھر سمجھ لو کہ یہ المغضوب علیھم والضالین کی وہ راہ ہے جس سے قرآن تمہیں ہٹانا چاہتا ہے۔ اگر نبوّت کے علم و عمل سے وابستہ رہ کر اعتصام باللہ کے علمبردار رہے تو کامیاب ہوگے۔ اللہ کی ذات جامع الکمالات ہے اور اس کا رسُول مجمع الکمالات ہے: جامع الکمالات کی جانب سے مجمع الکمالات جو علم و عمل لے کر تشریف لاتے وہ دُنیا کا جامع ترین اور کامل ترین نظام ہے۔ ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ یہ فرامین اور احکام کھول کر اس لیے بیان ہو رہے ہیں کہ تم آئندہ زندگی کے مختلف گوشوں اور نئے نئے حالات کے مختلف موڑوں میں اس نظام کے ذریعے ہدایت پاؤ اور ہدایت پاتے پاتے اس مقام پر پہنچ جاؤ کہ تمہارا چہرہ یہ ہو جائے اولٰئک علیٰ ھدی من ربھم اور اس طرح تم پر زندگی میں فلاح و سعادت کی وہ تمام راہیں کھل جائیں گی جو رضائے الٰہی کا سامان ہیں چونکہ روحانی ترقیوں کی انتہا کوئی نہیں ہے اس لیے نبوّت کے لائے ہوئے علم و عمل کی روشنی میں زندگی کے مختلف مراحل میں جب اُمت اجتماعی طور پر حرکت کرے گی تو ہدایت کے نئے نئے دروازے کھلتے جائیں گے اور اس میں اضافہ ہوتا جائے گا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نوعِ انسانی کی پوری کامیابی

اس آیت کا یہ انکشاف بہتوں کے لیے حیران کن ہوگا کہ نبوت کے علم وعمل سے وابستگی میں نوعِ انسانی کی پوری کامیابی وسعادت حاصل ہوگی اور نبوت کی قیادت میں جو قدم بھی اٹھے گا وہ صحیح ہوگا اور صحیح منزل کی طرف اٹھے گا۔ دُنیا کو ہر قسم کا اطمینان اور فارغ البالی ہر طرح کی سرسبزی وشادابی اور خیر وبرکت حاصل ہوگی۔ نبوت کا علم وعمل ہی اسلامی مملکت کی ابتداء اور اس کی نشوونما کا مرکزی نقطہ ہے۔ اسلامی مملکت دراصل ایک عہد ومیثاق کے بعد وجود میں آئی ہے۔ جو ذاتِ الٰہی اور مسلمانوں کے مابین منعقد ہوا تھا۔ یہ میثاق اس اقرار سے عبارت تھا کہ مسلمان انفرادی واجتماعی حیثیت سے نبوت کے علم وعمل کو اپنی زندگی اور اپنے افکار واعمال کے لیے قبول کرتے ہیں۔ یہ اقرار تھا اس بات کا کہ آئندہ مسلمان کسی دوسرے علم وعمل پر اپنی فکری اور عملی قوتیں صرف نہیں کریں گے اور اپنی انفرادی واجتماعی زندگی کے جملہ مسائل میں وہ کسی اور قانون وضابطہ یا کسی دوسرے آئین ودستور کی اطاعت قبول نہیں کریں گے بلکہ صرف نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل میں اپنے لیے ہدایت تلاش کریں گے۔ نبوت کے اس علم وعمل نے جس کی اطاعت کا عہد مسلمانوں نے ایمان کے ذریعہ کیا تھا۔ ان کی زندگی کے مقاصد ان کے اصولِ کار نیز ان کی معیشت وسیاست اور حیاتِ عائلی کا پورا خاکہ تیار کر دیا۔ لہٰذا اب ان کے تمام قانونی، سیاسی، عائلی اور دیگر تمام مسائل میں جو نبوت کے علم وعمل کی حدود میں آتے ہیں۔ اہلِ ایمان کی ایک ہی راہ ہو سکتی ہے جو بالکل متحد اور شائبہ اختلاف سے پاک ہے۔ مقاصد کی یک جہتی اور اصولوں کی ہم آہنگی نے اسلامی معاشرہ میں وہ حالت پیدا کر دی جو آج کی سیاسی زبان میں ارادۂ عامہ کے وجود کی شرط ہے۔

وَلْتَكُنْ مِّنْكُمْ اُمَّةٌ يَّدْعُوْنَ اِلَى الْخَيْرِ وَيَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ

وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ﴿۱۰۴﴾

اور دیکھو! ضروری ہے کہ تم میں[۱۹۱] ایسی ایک جماعت ضرور ہو جو بھلائی کی دعوت دے[۱۹۲] اور نیکی کا حکم دے برائی سے روکے[۱۹۳] اور بلاشبہ ایسے ہی لوگ کامیابی حاصل کرنے والے ہیں[۱۹۴]۔

عالم کی نجات کی فکر کرو

شخصی نجات کو اجتماعی نجات سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔ انفرادی زندگی میں کوئی شخص راست کرداری اور نیک عملی کی راہ میں استوار نہیں ہو سکتا جب تک اس کا اجتماعی ماحول ان صفات کی نشوونما کے لیے سازگار نہ ہو۔ بڑے انسانوں اور مستثنیٰ شخصیتوں کو چھوڑ کر عام انسانوں کی ذہنیت اور سیرت بالکلیہ ان معاشرتی معیارات اور اخلاقی اقدار سے مبنی ہے جو ان کے خاندان اور سوسائٹی میں رائج اور حکمران ہوتے ہیں۔ جس معاشرے میں غلط معیارات، باطل اقدار اور پست اخلاقی تصورات کی فرماں روائی ہو وہاں کوئی شخص محض اپنے شخصی اعمال کی بنا پر مشکل ہی سے نجات کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے۔ ایسے معاشرے میں فرد کی نجات کا دارومدار اس بات پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے گردوپیش کو بدلنے اور اپنی سوسائٹی کے اخلاقی تصورات اور معاشرتی معیارات کو درست کرنے کے لیے کیا کر رہا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں پر یہ فرض عائد کیا ہے کہ وہ جہاں کہیں برائی دیکھیں اسے مٹانے کے لیے جدوجہد کریں کیونکہ جو شخص کسی برائی پر صبر کرتا ہے اور اسے دور کرنے کی کوشش نہیں

کرنا وہ درحقیقت اپنی شخصی نجات کے امکانات کو کم کر رہا ہے مختصر یہ کہ اپنی نجات چاہتے ہو تو دُنیا بھر کی نجات کی فکر کرو۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کو صرف اعمال کی اصلاح کا حکم نہیں دیا گیا ہے بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر انہیں تمام انسانوں کی بھلائی اور بُرائی کا ذمہ دار ٹھہرایا ہے۔ زیرِ تشریح آیتِ قرآنی میں اللہ سبحانہ نے اسی اہم موضوع کی طرف اہلِ ایمان کو متوجہ کیا ہے اسی کو دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کہتے ہیں۔

امام رازی کی یہ تقابلی نکتہ آفرینی قابلِ قدر ہے کہ اللہ سبحانہ نے ابتدائی آیات یعنی ۹۸ اور ۹۹ میں اہلِ کتاب کی دو اجتماعی کمزوریوں کی نشاندہی فرمائی۔ ایک یہ کہ وہ ذاتی طور پر کفر کی آماجگاہ ہیں دوسرے یہ کہ وہ اجتماعی طور پر دوسروں کو کافر بنانے کی فکر میں ہیں۔ اس کے مقابلے میں پہلے اہلِ ایمان کو نبوت کا لایا ہوا علم وعمل اپنانے کی دعوت دی اور پھر اسی علم وعمل کو سوغات بنا کر دوسروں کے سامنے پیش کرنے کی ہدایت فرمائی۔ اور آلوسی فرماتے ہیں کہ پہلی آیات میں اہلِ ایمان کی اپنی صلاح ودرستگی کے بارے میں ہدایت کی تھی اب اس آیت میں دوسروں کی اصلاح کی ذمہ داری سپرد کی گئی ہے تاکہ اس طرح اہلِ ایمان ہادی اور مہدی بن سکیں۔ گویا پہلے کمال کا نسخہ بتایا اب دوسروں کی تکمیل کا طریقہ بتایا جا رہا ہے۔

کچھ کی ذمہ داری یا سب کی

۱۹۱۔ اور دیکھو ضروری ہے کہ تم میں سے ایک ایسی جماعت ضرور ہو۔ اصل ارشاد میں و لتکن منکم امۃ آیا ہے۔ اس میں شارحینِ قرآن کا اختلاف ہے کہ ارشاد میں لفظ مِن کچھ کے معنے میں ہے یا توضیح کے لیے آیا ہے۔ امام رازی کو اس پر اصرار ہے کہ اس آیت میں کچھ کی نہیں سب کی ذمہ داری بتائی جا رہی ہے۔ کیونکہ اولاً آنے والی آیت کنتم خیر امۃ میں اسی عمل کو اُمت کی خیریت کا مرکزی نقطہ بتایا جا رہا ہے۔ ثانیاً اسلام نے مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ جہاں بھی کہیں بُرائی دیکھیں اسے مٹانے کی ہر ممکن جدوجہد کریں۔ ارشاد ہے کہ

> جو شخص تم میں سے بُرائی دیکھے اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اس کی اصلاح کرے اگر اس کی قدرت نہ رکھتا ہو تو زبان سے اور اگر اس کی بھی قدرت نہ ہو تو کم از کم دل سے اسے ضرور بُرا سمجھے اور یہ ایمان کا ضعیف ترین درجہ ہے۔

اس لحاظ سے آیت میں لفظ مِن کچھ کے معنے میں نہیں بلکہ توضیح و بیان کے معنے لے رہا ہے

اور فقرہ کے معنے یہ ہیں کہ ضروری ہے کہ تم کو ایسی اُمت ہونا چاہیے۔ پوری اُمت کو اس کا مکلف بنانے کی وجہ یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسروں کی بھلائی اور بُرائی کا ذمہ دار سمجھے گا وہ لازماً اپنی اصلاح کی بھی کوشش کرے گا ورنہ سوسائٹی خود اسے ملامت کرے گی کہ دوسروں کو نصیحت کرنے سے پہلے اسے اپنے اعمال درست کرنے چاہئیں۔ نیز اس فرض کی انجام دہی میں اس کا ضمیر بھی اس احتساب کرتا رہے گا۔

یہ کیسی اچھی منطقی ترتیب ہے کہ اولین طور پر باطل نظامات کے پیدا کیے ہوئے نظریات و افکار کو توڑنے کی ہدایت کی یا ایھا الذین آمنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین پھر اسلامی معیار خیر و شر کو قائم کرنے کی یہ کہہ کر تلقین فرمائی یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہٖ اور لا تموتن الا وانتم مسلمون اور بعد ازیں معیارِ خیر و شر کے لیے محسوس و مرئی قانون بتایا کہ واعتصموا بحبل اللہ اور اب جب کہ خیر و شر کا تصوّر اور حق و باطل کا معیار عملاً قائم ہو گیا تو اسے باقی رکھنے کا ٹھوس منصوبہ بتایا۔ یہی بات شیخ الاسلام نے کیسے اچھوتے انداز میں فرمائی ہے ، تقوٰی اعتصام بحبل اللہ اتحاد و اتفاق ، قومی زندگی ، اسلامی مواخات یہ سب چیزیں اس وقت باقی رہ سکتی ہیں جبکہ مسلمانوں میں ایک جماعت خاص دعوت و ارشاد کے لیے قائم رہے۔ اس کا وظیفہ یہ ہی ہو کہ اپنے قول و عمل سے دنیا کو قرآن و سنت کی طرف بلائے اور جب لوگوں کو اچھے کاموں میں سست یا بُرائیوں میں مبتلا دیکھے اس وقت بھلائی کی طرف متوجہ کرنے اور بُرائی سے روکنے میں اپنی مقدور کے موافق کوتاہی نہ کرے۔ [1]

یاد رہے کہ یہ کام اگرچہ سب کی ذمہ داری ہے لیکن کچھ کے کرنے سے سب کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے گی۔ مطلب یہ ہے کہ فرض تو سب کا ہے لیکن عمل سب سے مطلوب نہیں ہے بالفاظِ دیگر اس آیت میں جو ذمہ داریاں اُمت پر ڈالی گئی ہیں وہ اُمت پر فرض ہیں۔ یعنی اگرچہ افراد کے لیے ان کی حیثیت اخلاقی ہدایات کی ہے لیکن پورے اجتماع کے لیے وہ فرض کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جو افراد ان ہدایات کی تکمیل کے لیے ضروری وسائل رکھتے ہوں ان کو چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر ان کو بجا لائیں تاکہ متعلقہ اجتماعی مصلحت کا تحفظ ہو سکے۔ اصطلاحی الفاظ میں یہ حکم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فرض کفایہ کہلاتے ہیں۔

انفرادی اور اجتماعی مقاصد

فرض کفایہ کے تحت عموماً ایسے احکام آتے ہیں جن کا تعلق پورے اجتماع کے مفاد و مصالح سے ہے۔ ان مفادات و مصالح کا تحفظ ضروری ہے۔ لہٰذا ان احکام کی تعمیل اور متعلقہ امور کا انجام پانا لازمی ہے۔ فرض کفایہ کی تعریف شیخ ابن الہمام نے التقریر التحبیر میں ابن امیر الحاج کے حوالہ سے ان الفاظ میں کی ہے :

فرض کا مسئلہ یہ وہ کام ہے جس کا پورا ہونا شارع کو قطعی طور پر مقصود ہے۔ بلالحاظ اس کے کہ اسے کون انجام دیتا ہے اس میں نماز جنازہ جیسے امور بھی شامل ہیں اور ضروری صنعتوں جیسے دنیوی امور بھی۔

علامہ شاطبی نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

علماء اصول کا کہنا ہے کہ کفائی حکم کا مخاطب اجتماع ہوتا ہے لیکن جب بعض افراد اسے بجا لاتے ہیں تو باقی افراد سے یہ فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ ان کا یہ کہنا اس حکم کی مجموعی حیثیت کے اعتبار سے درست ہے مگر جہاں تک اس کے جزئیات کا تعلق ہے یہ مسئلہ تفصیل طلب ہے۔

عام حالات میں معاشرے کے کسی فرد کے لیے فرض کفایہ کی حیثیت ایک ایسی اخلاقی ذمہ داری کی ہے جسے پورا کرنا بہتر ہے لیکن اس کے نہ کرنے پر اسے قابل ملامت یا مجرم نہیں گردانا جاسکتا۔ فرماتے ہیں :

فرائض کفایہ افراد کے لیے اخلاقی ہدایات کی حیثیت رکھتے ہیں [1]

امام شاطبی نے شریعت کے مقاصد اصلیہ کو ضروری انفرادی مقاصد اور ضروری اجتماعی مقاصد پر تقسیم کر کے فرض کفایہ کی تشریح اس طرح کی ہے۔

ان کے کفائی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کے حاصل کرنے کی ذمہ داری کسی مخصوص فرد پر نہیں بلکہ علی العموم سارے مکلفین پر ہے تاکہ وہ عام احوال درست

---

[1] الموافقات

رہیں جن کے بغیر انفرادی حالات درست نہیں رہ سکتے۔ مقاصد کی یہ قسم پہلی قسم یعنی ضروری انفرادی مقاصد کی تکمیل کرتی ہے اور اسی کی طرح ضروری ہے کیونکہ عینی یعنی انفرادی مقاصد بغیر کفائی مقاصد کی تکمیل کے حاصل نہیں ہو سکتے۔ کفائی مقاصد کا تعلق تمام بندگان خدا کے مشترکہ مصالح کے تحفظ سے ہے۔ اس اعتبار سے کفائی احکام کا مخاطب ایک ایسے امر کا مخاطب ہے جو مخصوص طور پر اسی پر نہیں عائد ہوتا۔ کیونکہ ان کاموں کا حکم اسے اس لیے نہیں دیا گیا ہے کہ ان کا تعلق صرف اس کی ذات سے ہے۔ ایسا ہوتا تو یہ حکم بھی عینی ہو جاتا۔ ان کا مکلف بنانے کا منشا یہ ہے کہ انسانی زندگی قائم رہے۔ فرد کی اصل حیثیت بندگان خدا کے درمیان اپنی قدرت و استعداد کے مطابق خدا کے خلیفہ کی ہے مگر ایک فرد اتنی استعداد نہیں رکھتا ہے کہ وہ اپنے ذاتی حالات درست رکھ سکے اور اپنے سارے اہل و عیال کی مصالح کی نگرانی کرتا ہے، کجا یہ کہ پورے قبیلہ یا ساری انسانیت کے مصالح کا تحفظ عمل میں لا سکے۔ اسی وجہ سے اللہ تعالیٰ نے مشترکہ انسانی ضروریات کی تکمیل کی ذمہ داری تمام لوگوں پر ڈالی ہے اور اسی بنا پر ریاست کا قیام عمل میں آیا ہے۔[1]

شاطبی کی اس تشریح سے فرض کفایہ کی وہ نوعیت اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے جس پر ہم یہاں زور دینا چاہتے ہیں۔ ان فرائض کا تعلق ان اہم اجتماعی مصالح سے ہوتا ہے جن کا تحفظ ضروری ہے لہٰذا ان فرائض کی تعمیل ضروری ہے۔ یہ ایسے مصالح ہیں جن کے تحفظ پر بڑی حد تک انفرادی مصالح کا تحفظ بھی منحصر ہے۔ علمائے اصول فقہ کی تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ معاشرے میں جو لوگ بھی کفائی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی دوسرے افراد کی بہ نسبت زیادہ صلاحیت رکھتے ہوں ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ ان کو پورا کریں۔ باقی لوگوں کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ اس کا اہتمام کریں کہ ایسے صاحب استعداد و صلاحیت افراد ان ذمہ داریوں کی طرف متوجہ ہوں۔ جیسا کہ شاطبی کی مذکورہ بالا عبارت سے واضح ہوتا ہے کہ کفائی امور کی انجام دہی کی نگران ریاست ہے اور انہی امور کا تحفظ بڑی حد تک ریاست کو وجود میں لانے کا سبب بھی ہے۔ افراد اگر اپنا اخلاقی فرض پہچانتے ہوں اور ان کے رضاکارانہ عمل سے یہ امور کما حقہ انجام پا جائیں تو ریاست کو قانونی ذرائع اختیار کرنے

---

[1] الموافقات

کی ضرورت نہ پیش آئے۔ لیکن اگر ایسا نہ ہو تو اسے مناسب اقدامات کے ذریعے اس کا اہتمام کرنا ہوگا کہ یہ کام انجام پائیں۔ وہ معاشرے کی نمائندگی کرتے ہوئے ان امور کی بجاآوری کا اہتمام براہ راست خود بھی کر سکتی ہے۔ پہلی صورت میں اسے اس بات کا حق ہوگا کہ وہ اصحاب استطاعت سے ان کاموں کے لیے مطلوبہ ذرائع و وسائل کی فراہمی کا مطالبہ کرے اور دوسری صورت میں وہ صاحب استعداد افراد کو ان امور کی انجام دہی پر مجبور کرنے کے لیے مناسب قوانین وضع کرے۔

یہ بحث دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے سلسلے میں بنیادی اہمیت کی حامل ہے اس اہمیت کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ یہ اس نوعیت کے کام ہیں کہ ان کی بجاآوری ہر کردم کا کام نہیں ہے۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ:

> ظاہر ہے کہ یہ کام وہی حضرات کر سکتے ہیں جو معروف و منکر کا علم رکھنے اور قرآن و سنت سے باخبر ہونے کے ساتھ ذی ہوش اور موقع شناس ہوں۔ ورنہ بہت ممکن ہے کہ ایک جاہل آدمی معروف کو منکر یا منکر کو معروف خیال کر کے بجائے اصلاح کے سارا نظام ہی مختل کر دے یا ایک منکر کی اصلاح کا ایسا طریقہ اختیار کرے جو اس سے بھی زیادہ منکرات کے حدوث کا سبب ہو جائے یا نرمی کی جگہ سختی اور سختی کے موقع پر نرمی برتنے لگے شاید اسی لیے مسلمانوں میں سے ایک مخصوص جماعت کو اس منصب پر مامور کیا گیا جو ہر طرح دعوت الی الخیر، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی اہل ہو۔ حدیث میں ہے کہ جب لوگ منکرات میں پھنس جائیں اور کوئی روکنے والا نہ ہو تو عام عذاب آنے کا اندیشہ ہے باقی یہ کہ کن حالات میں اور کن اوقات میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ترک میں آدمی معذور سمجھا جا سکتا ہے اور کن مواقع میں واجب یا مستحب ہے اس کی تفصیل کا یہ موقع نہیں ہے۔ ابوبکر رازی نے احکام القرآن میں اس پر نہایت مبسوط کلام کیا ہے۔ [1]

دعوت الی الخیر

۱۹۲۔ جو بھلائی کی دعوت دے۔ عربی میں خیر کے معنے میں بڑی وسعت ہے ایسے تمام

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اعمال خیر کہلاتے ہیں جو فضائل کے درجے کے ہوں۔ اس کی جزئیات اس کثرت سے ہیں کہ ان کا احاطہ بھی مشکل ہے افکار و اعمال، اخلاق، معاملاتی اقدار، معاشرتی آداب سب اس کے دامن میں سمٹے ہوتے ہیں۔ اسلام صرف ایک کائناتی نظریہ نہیں بلکہ وہ انسان کی جہات انفرادی و اجتماعی کی تعمیر و تاسیس کا ایک عملی پروگرام ہے۔ یوں تو ہر مذہب انسانی زندگی کو ایک مخصوص اخلاقی سانچہ میں ڈھالتا ہے اور افراد انسانی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنا اخلاقی رویہ تبدیل کریں لیکن اسلام اس بارے میں دیگر ادیان و مذاہب پر فوقیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے کردار و عمل کی اس تبدیلی کو جس کا مطالبہ ہر مذہب میں موجود ہے انسان کی خانگی عائلی اور معاشرتی زندگی کے محدود دائرے سے وسیع کر کے ساری انسانی زندگی پر محیط کر دیا۔ نیز اس نے اخلاق اور خیر کے اصولوں اور دینی اقدار کو انسان کی جہات اجتماعی پر بھی پھیلا دیا جس میں اس کی سیاسی اور معاشی زندگی بھی شامل ہے۔ اسلام اپنے پیروؤں سے صرف اللہ کی ذات و صفات کے اقرار کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ انہیں عالم انسانیت کی اجتماعی فلاح و صلاح کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور ان سے مطالبہ کرتا ہے کہ اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہیئت اجتماعی میں وہ بنیادی تبدیلیاں عمل میں لائیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے اقرار میں صادق ہیں جس حد تک انسان اپنی انفرادی، عائلی اور اجتماعی زندگی میں یہ تبدیلیاں پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے اسی حد تک اس کا ایمان ناقص رہتا ہے۔ غرض کہ اسلام صرف ایک طرز فکر نہیں ہے جو انسانی زندگی کی اجتماعی فلاح و بہبود اور اس کے نظام اجتماعی کے صلاح و فساد سے بالکل بے تعلق ہو بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک جیتا جاگتا دستور العمل ہے جس کو سوغات بنا کر پیش کرنا ایک مسلمان کا فرض ہے۔ قرآن اسی کو دعوت الی الخیر کہتا ہے چونکہ اس میں برائی اور شر کا کوئی پہلو نہیں سرتا سر خیر ہے اور سب کے لیے خیر ہے اس لیے آیت قرآنی میں اسے خیر کہا گیا ہے اسی بنا پر ابن جریر نے خیر کی تشریح اسلام سے کی ہے۔

ظاہر ہے کہ اگر خیر سے مراد اسلام ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ خود حضور انور کا ارشاد ہے کہ الخیر اتباع القرآن و سنتی اگر یہ روایت تاریخی طور پر صحیح ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ نبوت کے علم و عمل ہی کا نام اسلام ہے۔ قرآن کا اسلام کو خیر کہہ کر پکارنا بتا رہا ہے کہ اسلام پوری انسانیت کے لیے سرتا سر خیر کا پیغام ہے۔

اسلام کی سوغات لے کر نکلو

قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ اسلام کو تحفہ، سوغات بنا کر دُنیا کے انسانوں کے سامنے لے جانا مسلمانوں کا مشن ہے۔ اس فریضہ کی ادائیگی مسلمانوں کا اجتماعی فریضہ ہے۔ دعوت کے لفظی معنے بلانے کے ہیں اور اصطلاح میں اس کے معنے ہیں کہ جس چیز کو نبوت کے علم وعمل نے اچھا سمجھا ہے اور اچھا سمجھ کر جسے ہم نے اپنایا ہے اس کی اچھائی اور خوبی کی طرف دوسرے لوگوں، دوسری قوموں اور ملکوں کو دعوت دیں۔

دعوت کی اہمیت

قرآن نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا۔ اور خدا کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں حقدار قرار دیا اس لیے اپنی دعوت کے لیے قریش وغیر قریش، حجاز و یمن، عرب و عجم، ہند و روم کی تخصیص نہیں کی بلکہ دُنیا کی ہر قوم، ہر زبان اور ہر گوشہ میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا۔ قرآن کی متعدد آیتوں میں اس فرض کی اہمیت بتائی گئی ہے۔ حضرت علی سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے علی تمہاری کوشش سے ایک آدمی کا بھی دین حق کو قبول کر لینا دُنیا کی بڑی سے بڑی دولت سے بڑھ کر ہے۔[1]

دراصل اسلام سچائی کا ایک بہتا چشمہ ہے جو آہستہ آہستہ قدرتی رفتار سے پہلے اپنے قریب کی زمین کو پھر آگے پھر اس سے آگے کو سیراب کرتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ زمین کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے۔ اس کے لیے قرآن نے یہ انتظام کیا ہے کہ مسلمانوں پر یہ فرض قرار دیا کہ ان میں ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو دعوت الی الخیر کا کام کرے اور لگاتار کرتی رہے انداز بیان بھی بتا رہا ہے کہ یہ کام انفرادی تلقین و ہدایت سے نہیں بلکہ اجتماعی طور پر ہونا چاہیے اور اجتماع کی نیابت اسلامی حکومت کرتی ہے اسے اپنے اختیار و قوت سے یہ کام انجام دینا چاہیے مفتی محمد شفیع صاحب کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ اگر حکومت یہ فریضہ انجام نہ دے تو تمام مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ ایسی جماعت قائم کریں۔

---

[1] صحیح مسلم

دعوت اور اس کے لوازم

دعوت کے کام کو صحیح طریقے سے انجام دینے کے لیے چند باتیں ضروری ہیں۔ اوّلاً یہ کہ اسلام کے بنیادی عقائد پر علم و عقل کی ایسی دلیلیں اور فطرت و وجدان کی ایسی شہادتیں مہیا کی جائیں جن سے ان کی سچائی بالکل آشکارا ہو جائے۔ قرآن نے توحید و رسالت اور آخرت پر جس زور سے اور جس ہمہ گیر انداز میں دلائل پیش کیے ہیں اس کا اتباع دعوتِ اسلام کی بڑی اور بنیادی ضرورت ہے۔ اسی طرح زندگی کے مختلف شعبوں میں اسلام نے جو احکام دیے ہیں انہیں بھی تفصیل سے پیش کیا جاتے اور یہ بتایا جائے کہ وہ زندگی کے مسائل کس حسن و خوبی سے حل کر دیتا ہے۔ اور اس کی پیروی کس طرح دنیوی زندگی کی بھی خوشگواریوں کی ضامن ہے۔ مطلب یہ ہے کہ داعی اسلام سے بھرپور آشنائی رکھتا ہو۔

ثانیاً غیر اسلام پر سنجیدہ تنقید کی جائے اس تنقید کے لیے قدرتی طور پر ضروری ہے کہ پہلے ان افکار و نظریات سے گہری واقفیت حاصل کی جائے جن کی غیر اسلامی دنیا پیروی کر رہی ہے اور جو اس وقت کے مذہبوں، تہذیبوں، فلسفوں اور نظاموں کی بنیاد ہیں۔ اچھی طرح معلوم کیا جائے کہ وہ کیا دلیلیں ہیں جن پر یہ نظریات قائم ہیں۔ اس کے بعد ان نظریات کی پوری قوت سے تردید کی جائے۔ اور اس طرح کی جائے کہ ان کا غیر عقلی، غیر منطقی اور غیر فطری ہونا بالکل کھل جائے۔ پھر اسی کے ساتھ ساتھ ان نظریات کے پیدا کیے ہوئے ان عملی نتائج کو بھی انگلی رکھ کر بتایا جائے جنہیں کسی طرح بھی انسانیت کے لیے خوش آئند نہیں کہا جا سکتا۔ غیر اسلام کی یہ مدلل تردید دعوتِ اسلام کی راہ کا ایک ناگزیر مرحلہ ہے اور اس کے بغیر یہ فریضہ صحیح طور سے ادا ہو ہی نہیں سکتا کیونکہ اسلام کی دعوت ایک نئی تعمیر کی حیثیت رکھتی ہے۔

ثالثاً اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کا یہ کام دلنشیں اور جدید ترین انداز کا ہو۔ اس زبان میں جس سے وقت کا انسان مانوس ہے، اس طرز سے ہو جو آج کے ذہنوں کو اپیل کر سکتا ہو۔ اس طریقے کا جسے سائنس کا یہ دور بحث و استدلال کا طریقہ تسلیم کرتا ہو کیونکہ اسلام کو حق اور غیر اسلام کو باطل ثابت کرنے کی یہ کوشش محض ایک علمی مناظرے کی خاطر نہیں بلکہ اسلام کی دعوت کی توضیح کے لیے ہے۔ وہ توضیح توضیح نہیں جس کے بعد بھی مخاطب بات کو نہ پا سکے اور وہ دعوت دعوت نہیں کہی جا سکتی جو اپنے پیغام کو دلوں اور دماغوں تک نہ پہنچا دے۔ اس

لیے ضروری ہے کہ اپنی بات کہتے وقت مخاطب کا ذہن اور اس کا ذوق بھی لازماً سامنے رہے۔ اور بحث و استدلال کا انداز وہ ہو جسے وہ بحث و استدلال کا انداز سمجھتا ہو۔ قرآن حکیم نے اپنی دعوت پیش کرنے کے لیے زبان اندازِ بیان اور طرزِ استدلال وہی اختیار کیا جس سے اہل عرب مانوس تھے۔

رابعاً اس دعوت کے پیچھے کوئی قومی غرور کوئی حریفانہ جذبہ اور کوئی مناظرانہ ذوق ہرگز کام کر رہا ہو بلکہ زبان و قلب سے جو کچھ نکلے اخلاص و للہیت کے ساتھ نکلے۔ محض اپنے فرض کے احساس اور بنی آدم کی محبت اور خیرخواہی کی بنا پر نکلے۔ اس حال میں نکلے کہ بندگانِ خدا کی گمراہیوں پر اندر سے دل کڑھ رہا ہو اور انہیں ایسا محسوس ہو رہا ہو کہ یہ اسلام کا داعی ہم سے کچھ لے نہیں رہا ہے بلکہ ہمیں کچھ دے رہا ہے اور ایک بڑی نعمت دے رہا ہے۔

خامساً اسلام کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جائے وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں موجود ہو اسی لیے دعوت کی ہدایت سے پہلے اہل ایمان کو یہ تلقین کی ہے کہ تم اللہ کی نافرمانی سے اس طرح بچو جیسے کہ حق ہے اور اوامر الٰہیہ کے سامنے سر جھکا دو اور اللہ کی رسی مضبوطی سے تھام لو۔ کیونکہ اگر چراغ میں روشنی نہ ہو تو وہ چراغ ہی نہیں، برف میں ٹھنڈک نہ ہو تو وہ برف نہیں اور آگ میں گرمی نہ ہو تو وہ آگ ہی نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اللہ سبحانہ نے تمام اہل ایمان کو مخاطب کرکے پورے زور کے ساتھ فرمایا کہ اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا وانتم مسلمون اور واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر مسلمان میں لازمی طور پر یہ صفات ہونی چاہئیں۔ اُمت کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں اور پوری اُمت اپنی اجتماعی حیثیت میں سب کے سب اسلام کے عملاً ترجمان ہوں، انہیں توحید، آخرت اور رسالت وغیرہ عقائد پر گہرا یقین ہو اور یہ یقین ان کی ایک ایک ادا سے ٹپک رہا ہو۔ ان کے اخلاق وہ ہوں جن کی اسلام نے تلقین کی ہے۔ ان کے معاملات ان ہی خطوط پر انجام پائیں جو کتاب و سنۃ نے مقرر کر دیے۔ ان کی معاشرت ان کی معیشت اور ان کی سیاست غرض ان کی زندگی کا پورا نظام اور اس نظام کی ایک ایک شاخ اسی نقشہ کے مطابق تعمیر ہو جو اللہ اور رسولؐ نے بنا کر دیا ہے۔ تاکہ دُنیا اپنی آنکھوں سے بھی دیکھ لے کہ اسلام کسے کہتے ہیں وہ کس قسم کے افراد کس قسم کا معاشرہ اور کس قسم کا اسٹیٹ وجود میں لانا چاہتا ہے۔

عملی دعوت کا مرتبہ علمی دعوت سے مقدم تر بھی ہے اور اہم تر بھی۔ ایک تو اس لیے کہ جب تک

کوئی شخص یا گروہ خود ہی کسی دین کی پیروی نہ کررہا ہو۔ اسے کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کو اس کی پیروی کی دعوت دے نہ صرف یہ کہ ایسی دعوت دینا اسے زیب نہیں دیتا بلکہ نتیجہ کے اعتبار سے بھی یہ ایک ایسی کوشش ہے جس کا شاید کسی پر کوئی اثر پڑسکے۔ دوسرے اس لیے کہ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت اصلاً عملی دلائل ہی کی زبان سمجھتی ہے۔ عقلی دلائل تک اس کی رسائی بہت کم ہوتی ہے۔

یہ ہے یدعون الی الخیر کا پورا مفہوم اور معیاری طریقہ۔ اُمتِ مسلمہ کی عملی کوششیں اس معیار کے جس حد تک قریب پہنچیں گی اسی حد تک وہ اپنے فرض میں کامیاب اور اپنے مقصد میں بامراد ثابت ہوں گی اور جس حد تک یہ کوششیں اس معیار سے دُور ہوں گی اسی حد تک وہ ناکام و نامراد رہے گی۔

ہم اس موقعہ پر وہ تمام تصریحات قصداً چھوڑ رہے ہیں جن کا ذخیرہ شرح شرعۃ الاسلام، احیاء العلوم اور اتحاف السادۃ المتقین میں موجود ہے کہ داعی کے لیے عادل ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ ہماری رائے میں یہ تفصیل امر بالمعروف نہی عن المنکر اور احتساب سے متعلق ہے اور اس کا قانونی درجہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و عمل سے اور قرآن حکیم نے دعوت کی جو حقیقت ہمیں بتائی ہے وہ تمام تر یہی ہے۔ دعوت کا حق سب سے اوّل اس شخص کو حاصل ہے جو خود ایمان و عمل صالح کا پیکر ہو۔ قرآن نے خالص دعوت کے موضوع پر داعی کے کردار کے لیے دوسری قید لگائی من احسن قولا ممن دعا الی اللہ وعمل صالحاً وقال اننی من المسلمین۔ اس شخص سے زیادہ اچھی بات والا کون ہوگا جو اللہ کی طرف دعوت دے اور عمل صالح کرے اور کہے کہ میں فرمانبرداروں میں سے ہوں۔ بہرحال یہ مقام زیادہ تفصیل کا متحمل نہیں ہے۔

امر بالمعروف

معروف کا جانا پہچانا، یعنی ایسا کام جس کی اچھائی جانی پہچانی ہو۔ عرف یعرف سے مفعول کا صیغہ ہے۔ امام رازی تفسیر کبیر میں لکھتے ہیں :

عرف عارفہ معروف ہر اس امر کو کہتے ہیں جس کے بارے میں معلوم ہو کہ اس کا کرنا ضروری اور اس کا ہونا اس کے نہ ہونے سے بہتر ہے۔

قاضی شوکانی لکھتے ہیں کہ ہر وہ اچھی عادت جس کو عقل پسند کرے اور جی اس پر مطمئن ہو معروف کا لفظ قرآن و حدیث میں بہت جگہ آیا ہے اس کے معنے ہر نیک کام جس میں اللہ کی

اطاعت ہو یا لوگوں سے اچھا سلوک ہو یا جس کام کی قانون نے ترغیب دی ہو۔ معروف حسن صحبت اور معاشرہ کو بھی کہتے ہیں۔ مروت اور احسان کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن میں حسن گفتار، حسن اخلاق، حسن کردار، حسن معاملہ، حسن معاشرہ، حسن سلوک، حسن ادا اور انسانی اقدار سے متعلق ہر نیکی کو معروف کہا گیا، حدیث ہے کل معروف صدقہ ہر نیکی صدقہ ہے۔ ایک اور ارشاد ہے معروف یعنی حسن سلوک والے قیامت کے روز معروف کی وجہ سے بخشے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دنیا میں غریبوں پر رحم کرکے ان سے اچھا سلوک کرتے ہیں۔ گویا قرآن وسنت کی زبان میں لفظ معروف تمام اخلاقی، مالیاتی، انتظامی، معاشی، تمدنی، تہذیبی، سیاسی فضائل اور خوبیوں کے لیے ایک جامع لفظ ہے۔ خالص فوجداری ضابطہ کو بیان کرتے ہوئے جب یہ بتایا کہ قتل صرف فوجداری جرم نہیں بلکہ فرد پر شخصی حیثیت میں دیوانی بھی ہے جان کا بدلہ جان یا پھر جان کا بدلہ مال ہو۔ اگر کوئی کچھ مال نہیں لیتا اور معاف کر دیتا ہے تو مقتول کے وارثوں کو چاہیے کہ مطالبہ میں معروف کو اپنائیں یعنی رقم کا مطالبہ معقولیت اور آدمیت سے کرو فاتباع بالمعروف۔ خالص دیوانی معاملہ میں ارشاد ہے الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف یعنی پسندیدہ طریقہ پر، عقل کی رعایت سے حاجت کا لحاظ کرکے حسن معاملت اور حسن معاشرت دونوں قسم کے احکام کے موقعہ پر قرآن میں یہ لفظ کثرت سے آیا ہے۔ معاشرۂ انسانی میں ساری اخلاقی قدروں اور سارے حقوق کو اگر کوئی لفظ اپنے دامن میں سمیٹتا ہے تو وہ یہی لفظ معروف ہے۔ اخلاق میں زبان کی سچائی، دل کی سچائی، عمل کی سچائی، عفت و پاکبازی، دیانتداری اور امانت، شرم وحیا، رحم، سخاوت، عدل وانصاف، عہد کی پابندی، احسان، عفو ودرگزر، حلم وبردباری، رفق ولطف، تواضع وخاکساری، خوش کلامی، ایثار، اعتدال اور میانہ روی اور حقوق میں والدین کا حق، اولاد کا حق، تعلیم وتربیت، حقوق زوجین، اہل قرابت کے حقوق، ہمسایہ کے حقوق، بیوہ کے ساتھ حسن سلوک، یتیموں کے حقوق، حاجت مندوں کے، بیمار کے حقوق، غلاموں کے حقوق، مہمان کے حقوق، مسلمانوں کے باہمی حقوق، انسانی برادری کے حقوق، جانوروں کے حقوق یہ سب معروف ہیں۔

ارشاد ہے صنائع المعروف تدفع میتۃ السوء وتقی مصارع الھوان معروف کا کردار خواہ کچھ ہو یہ بری موت کے لیے دافع ہے اور ذلت ورسوائی سے بچاتا ہے۔

ایک اور ارشاد ہے معروف سے زیادہ بزرگی والی چیز سوائے معروف کے ثواب کے کچھ نہیں ہے۔

امام غزالی نے احیاء العلوم میں امر بالمعروف کے ارکان وشرائط پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

آزادیٔ اظہارِ رائے

جسے آج کی سیاسی زبان میں آزادیٔ اظہار کہتے ہیں قرآن اسے امر بالمعروف کہتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ نیکی کا حکم کرنا نہ صرف مسلمان کا حق ہے بلکہ یہ اس کا فرض ہے۔ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ مسلمان کا یہ فرض ہے کہ وہ بھلائی کے لیے لوگوں سے کہے۔ مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اسلامی معاشرے کو پاکیزہ رکھے۔

پہلے فقرے میں دعوتی جہاد کو بتایا تھا اب اس فقرے کے ذریعے داخلی جہاد کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ داخلی جہاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں نیکیوں، خوبیوں، اور اچھائیوں کی حوصلہ افزائی کی جائے اور ان کو پروان چڑھنے کے وسائل کو بروئے کار لایا جائے۔ اسی کا نام امر بالمعروف ہے۔ امر کا لفظ بتا رہا ہے کہ یہ کام انفرادی طور پر کرنے کا نہیں بلکہ اجتماعی طور پر کرنے کا ہے اور اس انداز پر کرنے کا ہے کہ یہ کام کرنے والا ایک آمر کی حیثیت میں معاشرے کے سامنے آئے۔

نہی عن المنکر

۱۹۳۔ برائی سے روکے۔ انسانی زندگی اپنی عین فطرت کے اعتبار سے اجتماعیت پسند ہے۔ افراد کے جملہ مادی اور روحانی مفادات اجتماعی اہتمام کے طالب ہیں۔ یہ اجتماعیت صرف مفادات کے تحفظ کے لیے نہیں بلکہ افراد کے جملہ مفاسد کو دور کرنے کی خاطر وجود میں آتی ہے۔ مادی حالات کی بہتری ہو یا معاشرتی فضا کی وابستگی، سیاسی نظم و استحکام ہو یا روحانی تربیت و تزکیہ بغیر اجتماعی کوششوں کے ان مفاسد کو پوری طرح دور کرنا ممکن نہیں ہے۔ زندگی کی صحیح تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ افراد میں اس کی لگن پائی جائے اور اجتماع ان تعمیری کوششوں کی ذمہ داری لے۔ کیونکہ اگر سماج غلط رخ پر جا رہا ہو تو اس کے انجام سے ہر فرد کو دوچار ہونا پڑے گا خواہ اس کا ذاتی رجحان کچھ بھی ہو۔ زندگی کی اس اجتماعی نوعیت کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک تمثیل کے ذریعے سمجھایا ہے۔

> اللہ سبحانہٗ کی مقرر کردہ حدود کی پابندی کرنے والوں اور ان سے تجاوز کرنے والوں کی مثال بالکل ایسی ہے کہ کچھ لوگ ایک کشتی کے اوپر نیچے کے حصوں میں

پرسے ڈالیں۔ ایک گروہ کو اوپر کا حصہ ملے اور دوسرے گروہ کو نیچے کا حصہ۔ نیچے والوں کو جب پانی کی ضرورت پیش آتی ہو تو اوپر جانا پڑتا ہو۔ یہ دیکھ کر وہ یہ اسکیم بنائیں کہ اگر ہم اپنے حصہ میں کشتی کے پیندے میں ایک سوراخ کرلیں تو اوپر والوں کو زحمت دینے سے بچ جائیں گے۔ نیچے والوں کی اسکیم پر اگر اوپر والے خاموش رہ جائیں اور جو کچھ وہ چاہتے ہیں ان کو کرگزرنے دیں تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ سب ایک ہی ساتھ ہلاک ہوں گے اور اگر اوپر والے نیچے والوں کو روک دیں گے تو خود بھی محفوظ رہیں گے اور سب کو تباہی سے بچالیں گے۔[1]

گویا زندگی کی یہ کشتی چند افراد کی حماقت سے ڈوب سکتی ہے اور جب کشتی ڈوبے تو پوری اُمت ڈوبے گی۔ لہٰذا اجتماع کا فرض ہے کہ اپنے افراد پر نگاہ رکھے۔ ایسا کرنے میں خود اس کی بھلائی مضمر ہے اور ان غلط کار افراد کی بھی۔ کوئی اس غلط فہمی میں مبتلا نہ ہے کہ آزمائش کی انفرادی نوعیت کا مطلب یہ ہے کہ افراد کو سماج دشمن سرگرمیوں کی بھی اجازت ہونی چاہیے۔ قرآن اس سادہ لوحی سے بری ہے اس کا اصول یہ ہے کہ اجتماعی مفاد کی خاطر غلط کار کو ایسی حرکتوں سے باز رکھا جاتے خواہ اس کے لیے سیاسی طاقت اور جبر سے کام لینا پڑے اگر اجتماع اس فرض کی انجام دہی میں کوتاہی کرے گا تو اس کا وبال پورے اجتماع کو بھگتنا پڑے گا۔

کمال ایمان کے دو درجے

پہلا کمال تو آپ سُن چکے ہیں یعنی اللہ کی نافرمانی سے بچنا، اوامرالٰہیہ کے سامنے سرنگوں ہونا، اللہ کی رسی مضبوط تھامنا۔ یہ کمال تو ذات مومن کے ساتھ صفت ایمان کے قیام کے لیے ناگزیر ہے۔ لہٰذا ہر مومن میں اس کمال کے کسی نہ کسی درجہ کا ہونا ضروری ہے۔ اگر یہ نہ ہو پھر وہ مومن ہی نہیں ہے۔ دوسرا کمال جس کا ہونا مومن کے لیے نہیں بلکہ اس کے کامل و مکمل اور بلند مرتبہ و عالی شان مومن ہونے کے لیے ضروری ہے۔ وہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ کمال ایمان کے یہ درجے جن کا قرآن نے یہاں ذکر کیا ہے صرف اعتبار میں دو ہیں ورنہ حقیقت میں دونوں ایک ہیں۔ جس شخص کے دل میں ایمان راسخ موجود ہوگا اس کے لیے یہ کب ممکن ہے کہ برائی دیکھے اور اسے

---

[1] بخاری کتاب الشرکہ

مٹانے کی کوشش نہ کرے۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

مجھ سے پہلے کسی اُمت میں اللہ سبحانہ نے کسی نبی کو روانہ نہیں کیا مگر اس کی اُمت میں ایسے لوگ ضرور گزرے ہیں جو اس کے معین، مددگار، اس کے طریق کار کے متبع اور اس کے ہر حکم کے پیروکار ہوتے تھے۔ پھر ان کے بعد ان کے جانشین کچھ ایسے بداطوار ہوتے جن کے قول وعمل میں بڑا فرق تھا جو بات اپنی زبان سے کہتے اس پر عمل نہ کرتے اور وہ کام کرتے جن کا ان کو حکم نہ تھا۔ جس شخص نے ان سے اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے زبان سے ان کی تردید کی وہ مومن ہے اور جس نے صرف قلبی ناگواری پر کفایت کی وہ بھی مومن ہے اس کے بعد ایمان کا ایک رائی کے برابر بھی جز نہیں ہے [1]

امام مسلم نے اس حدیث کو طارق ابن شہاب کے واسطہ سے بھی روایت کیا ہے اس میں ان مراتب ثلاثہ کو وقتی استطاعت وقدرت کے ساتھ مقید کیا ہے۔ ارشاد ہے۔

تم میں جو شخص کوئی بات شریعت کے خلاف دیکھے اسے چاہیے کہ اپنے ہاتھ سے اصلاح کردے اگر اتنی قدرت نہ ہو تو زبان سے اس کی مخالفت کرے اگر یہ بھی نہ کر سکے تو اس سے کیا کم کہ اپنے دل میں اس کی ناگواری برابر محسوس کرتا ہے اور یہ ایمان کا سب سے کمزور درجہ ہے۔ [2]

ظاہر ہے کہ یہ ارشاد صرف ایک خبر کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایک ہدایت اور حکم کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کا مقصد دراصل اُمت مسلمہ کو یہ بتانا ہے کہ آئندہ چل کر اسے یہ حالات درپیش آئیں گے اور جب یہ حالات پیش آئیں تو اسے کیا کچھ کرنا ہوگا۔

اس حدیث سے دو باتیں واضح ہو جاتی ہیں۔ اول یہ کہ مسلم معاشرے کے اندر جو بُرائی بھی رونما ہو اسے ختم کر دینے کی کوشش جہاد ہے۔ دوم یہ کہ اس جہاد کی عملی صورتیں کیا کیا ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایمانی مرتبہ کیا ہے ؟

سب سے افضل صورت یہ ہے کہ اس بُرائی یا ضلالت کے خلاف مناسب انداز میں طاقت استعمال کی جائے اور اپنے ہاتھوں سے پکڑ کر اس کا گلا گھونٹ دیا جائے لیکن اگر اتنی جرأت

---

[1] مشکوٰۃ [2] صحیح مسلم

نہ ہو کہ کسی معنے اور کسی شکل میں بھی ہاتھ کی قوت استعمال کی جاسکے تو پھر زبان کی قوت سے کام لیا جائے، برائی کو کھلم کھلا برائی کہا جائے، نصیحت کی جائے، سمجھایا جائے، آخرت یاد دلائی جائے اور جب ان باتوں سے کام نہ چلے تو موقع و محل کے مطابق زجر و تنبیہ بھی کی جائے۔ اور اگر اتنی ہمت بھی نہ ہو تو ایسا لازماً کیا جائے کہ اس برائی کے خلاف دل بے چینی سے بھر جائے۔ آنکھوں میں وہ کانٹا بن کر چبھتی رہے، آرزو کی جائے کہ یہ برائی جلد سے جلد مٹ جائے دعائیں کی جائیں۔

مسلم معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے رہنے کی یہ تین عملی شکلیں ہیں اور یہی تین شکلیں ممکن بھی ہیں۔ ان میں ہر شکل جہاد ہے۔ کیونکہ یہ حق کے قائم رہنے اور اسلام کی دعوت کی کوششوں کا ایک حصہ ہے۔ اور حق کی خاطر کوشش کا نام ہی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

ایمان کے تین درجے

اس ارشاد نبوت میں ایمان کے تین درجے بتائے گئے ہیں۔ اعلیٰ، درمیانہ اور ادنیٰ۔ ان میں سے ہر ایک درجہ کا تقاضا جدا اور ہر ایک کی علامت علیحدہ علیحدہ ہے۔ سب سے ادنیٰ درجہ کی علامت یہ ہے کہ منکرات سے دل میں ہر وقت نفرت و کراہت ہو یعنی جب کہیں کوئی منکر نظر آئے تو فوراً دل میں اس کے خلاف ناگواری محسوس ہو۔ قرآن میں بھی اس کی طرف اشارا موجود ہے۔

وکرہ الیکم الکفر والفسوق والعصیان

اور اللہ نے تمہارے دلوں میں کفر بدکاری اور اپنی نافرمانی کے خلاف کراہت ڈال دی ہے۔

اس کراہت کے بھی مرتبے ہیں سب سے اعلیٰ یہ ہے کہ خدا کی زمین سے کفر و فسق کو اپنی قوت بازو سے مٹا ڈالے اور اس سے کم یہ کہ دل میں اس کے خلاف ناگواری محسوس کرے۔ اگر اتنا احساس بھی نہیں تو سمجھ لینا چاہیے کہ اب اس میں ایمان کی کوئی نشانی بھی نہیں ہے۔ اگر ایسا شخص تمہیں نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں ازالہ منکر کے لیے ایمان کے مطابق دل کی ناگواری بھی موجود نہیں ہے تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں اثر پیدا نہیں کیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے کتاب الایمان

میں لکھا ہے کہ ایمان صرف تصدیق کا نام نہیں بلکہ تصدیق و اعمال کے مجموعہ کا نام ہے۔ اسی مجموعہ پر اجر و ثواب کا وعدہ کیا گیا ہے۔ اس لیے اس ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اس تمام میں جن باتوں پر اجر و ثواب کا وعدہ ہے ان میں نہی عن المنکر کے سلسلے میں صرف یہی تین باتیں ہیں۔ برائی کو ہاتھ سے مٹانا ان میں سب سے اونچا ہے اور انکار قلبی سب سے کمتر ہے۔ اگر کسی کا ہاتھ ازالہ منکر کے لیے حرکت نہیں کرتا۔ اس کی زبان روکنے کے لیے نہیں ہلتی اور اس کا قلب اندرونی طور پر انکار کے لیے آمادہ نہیں ہوتا تو اب اس کے بعد اعمال ایمانی میں ایسا کوئی عمل نہیں ہے جس کی ادائیگی پر اس کو کسی ادنیٰ ثواب کا بھی استحقاق ہو۔ محدثین کے یہاں چونکہ اعمال ایمان کے اجزا شمار ہوتے ہیں اس لیے اس حدیث میں اجزاء ایمان کی نفی سے اعمال کی نفی مراد ہے۔ اور اس کے بعد ایمان کا رائی برابر بھی درجہ باقی نہیں ہے کا ٹھیک مطلب یہی ہے یعنی انکار قلبی کے بعد اب رائی برابر بھی ایمان کا کوئی جز نہیں ہے جس پر اجر مرتب ہو سکے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ اس کے بعد وہ شخص مومن ہی نہیں رہتا۔

اسلام میں محکمہ احتساب

امام غزالی نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا عنوان قائم کر کے اسی کے تحت احتساب کو بیان کیا ہے۔ دراصل امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایک جامع فریضہ ہے جس کا تعلق زندگی کے ہر پہلو سے ہے اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے اسلامی حکومتیں خصوصی اہتمام کرتی ہیں اور تاریخ یہ بتاتی ہے کہ ابتدائی دور میں ہی اسلامی حکومتوں نے ایک علیحدہ شعبہ قائم کر دیا تھا جس کا نام حسبہ رکھا تھا۔ اس شعبہ کا کام یہ تھا کہ اگر کسی معروف کو عملاً ترک کیا جا رہا ہو یا کسی منکر کا ارتکاب ہو رہا ہو۔ اور یہ خرابیاں علانیہ نمودار ہو جائیں تو ان کو دُور کیا جائے اور ان کا سدباب کیا جائے۔ ماوردی اور ابو یعلی نے الاحکام السلطانیہ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔ اس موضوع پر جو تصانیف ہمارے پیش نظر ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس شعبہ کا دائرہ بہت وسیع تھا۔ مثال کے طور پر ہم علامہ محمد بن محمد بن احمد القرشی المعروف بابن الاخوۃ کی کتاب معالم القربۃ فی احکام الحسبۃ کا مختصر تعارف کرائیں گے۔ مصنف نے اپنے زمانہ کی مختلف صنعتوں، پیشوں اور کاروباری سرگرمیوں کا جائزہ لے کر اصلاح اُمور کی نشاندہی کی ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اور علامہ مرتضیٰ زبیدی نے اتحاف السادۃ المتقین میں مساجد، بازار، شاہراہوں، حماموں، ہوٹلوں اور عام شہری زندگی کے منکرات کا تذکرہ کیا ہے۔ ان مباحث کے علاوہ ابن الاخوہ نے احتساب کی اہمیت

اس کے آداب اور اس کے دوسرے متعلقات پر گفتگو کی ہے۔ کتاب کے آخر میں مصنف رقمطراز ہے۔

ان منکرات کے قبیل کی بہت سی اور چیزیں ہیں جن پر اسی طرح بحث کی جا سکتی ہے اور جو انہی کی طرح حرام ہیں۔ آپ ان کے بارے میں اپنی قوتِ فیصلہ استعمال کیجئے اور جن امور کی نوعیت صاف اور واضح نہ ہو ان کے بارے میں اپنے علم کی رہنمائی میں فیصلہ کیجئے بدعت پر خاموشی اختیار کر لینا اس پر راضی ہو جانے کے مترادف ہے۔ منکرات کی یہ بحث طویل ہے کیونکہ منکرات بے شمار ہیں اور ان کا احاطہ ممکن نہیں ہے۔

یہ بحث بے حد طویل الذیل ہے۔ ابھی اس سلسلے میں بہت کچھ کہنا باقی ہے۔ تفصیل انشاء اللہ پارہ ششم میں ملے گی۔

کامیاب و کامران جماعت

۴ ۱۹۔ بلاشبہ یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ فلاح عربی زبان میں بڑے وسیع معنے رکھتا ہے۔ دُنیا و آخرت کی ساری خوبیوں کا جامع ہے۔ اس لیے المفلحون کا پورا ترجمہ کامیاب و کامران اور بامراد وغیرہ کسی اُردو لفظ سے ہونا دشوار ہے۔ امامِ لغت زبیدی کا قول ہے کہ زبان وادب کے ماہروں کا فیصلہ ہے کہ عربی زبان میں جامعیت خیر کے لیے فلاح سے بڑھ کر کوئی لفظ موجود نہیں ہے۔

یہ انداز عربی زبان میں حصر و خصوصیت کے معنے بتانے کے لیے آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فلاح کامل بس ان میں محصور ہے اور بقول مولانا محمد اور بس جو ایسا نہیں کرتے وہ ہر طرح نقصان اور خسارے میں ہیں۔ امام غزالی فرماتے ہیں کہ،

یہ فقرہ بتا رہا ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر فلاح کا مدار ہے۔

اور علامہ زبیدی رقمطراز ہیں کہ:

فلاح ان میں ہی ہے ان کے علاوہ نہیں ہے۔ فلاح دو قسم کی ہے دنیوی اور اُخروی۔ دُنیوی یہ کہ موجودہ زندگی خوش حال اور سعادت سے ہمدوش ہو جائے اور اُخروی یہ کہ چار چیزیں حاصل ہو جائیں۔ اوّل ایسی زندگی جس کو موت نہ ہو، دوم ایسی عزت جس میں ذلت کا نام و نشان نہ ہو، سوم ایسا غنا کہ جس میں فقر نہ ہو، چہارم ایسا علم کہ جس میں نادانی نہ ہو۔[1]

---

[1] اتحاف السادۃ المتقین۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ تَفَرَّقُوا وَاخْتَلَفُوا مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنٰتُ ۚ وَأُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ عَظِيمٌ ۙ يَوْمَ تَبْيَضُّ وُجُوهٌ وَّتَسْوَدُّ وُجُوهٌ ۚ فَأَمَّا الَّذِينَ اسْوَدَّتْ وُجُوهُهُمْ أَكَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿١٠٦﴾ وَأَمَّا الَّذِينَ ابْيَضَّتْ وُجُوهُهُمْ فَفِي رَحْمَةِ اللّٰهِ ۖ هُمْ فِيهَا خٰلِدُونَ ﴿١٠٧﴾

اوران لوگوں کی طرح نہ ہونا جو جدا جدا ہو گئے اور کھلی واضح آیات آنے کے باوجود باہم اختلاف میں پڑ گئے[۱۹۵]۔ اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے[۱۹۶]۔ جس روز کچھ چہرے تو چمکیں گے اور کچھ سیاہ ہوں گے[۱۹۷]۔ جن کے چہرے کالے ہوں گے ان سے کہا جائے گا تم نے ایمان کے بعد راہِ کفر کیوں اختیار کی تھی اب اس کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو[۱۹۸]۔ اور جن لوگوں کے چہروں پر چمک ہو گی وہ اللہ کی رحمت میں

ہوں گے وہ ہمیشہ رحمتِ الٰہی میں رہیں گے۔[199]

نبوت کے علم وعمل سے جدائی اور اختلاف

جس طرح نسل وتوارث کے رشتوں نے خاندان کی بنیاد ڈالی ہے اسی طرح کتاب اللہ اور رسول اللہ سے ایمان وطاعت کے رشتوں نے اجتماعیت کی بنیاد استوار کی ہے۔ اسی کو قرآن نے حبل اللہ کہہ کر پکارا ہے۔ اسی کو ہم نبوت کا علم وعمل اور زبانِ شریعت میں کتاب وسنت کہتے ہیں۔ اجتماعیت افراد کے فطری رجحانات ودواعی سے ابھرتی ہے۔ اجتماعِ افراد کے جذبۂ اخوت وتعاون کا عملی مظہر ہے افراد اس کے ذریعے اپنے مشترکہ مقاصد حاصل کرتے ہیں۔ اجتماع فرد کے لیے رحمت ہے کہ یہ ہر فرد کے تمام مادی اور روحانی مفادات کا نگران ومحافظ ہے اور ان کی ترقی وتزکیہ کا ذریعہ ہے۔ اسی کے بطن سے ریاست اور دوسرے اجتماعی ادارے جنم لیتے ہیں جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تعمیر وتزکیہ کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں۔

قرآن نبوت کے علم وعمل کے ذریعے اپنے ماننے والوں کے تمام افراد میں ایسی اجتماعیت چاہتا ہے وہ کہتا ہے کہ تمام افرادِ اُمت دراصل ایک ہی گھرانے کے مختلف افراد ہیں۔ نبوت کے علم وعمل سے رشتہ ان کا نسب ہے۔ بلاشبہ ان میں سے ہر فرد کا فرض ہے کہ اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے ذریعے اس رشتہ کو قائم رکھے۔ اس کا یہ حق نہیں ہے کہ اپنی نیکی کو اپنے ہی لیے سمجھے اور اپنے بھائیوں کی اس کے ذریعے خدمت نہ کرے۔

ایمان کا دامن امر بالمعروف کی ذمہ داری سے بندھا ہوا ہے۔ یہ دونوں لازم وملزوم ہیں۔ تم ان کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کر سکتے۔ یہاں نبوت کے علم وعمل سے وابستہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی ذمہ داری اٹھائی جائے۔ اگر تم نبوت کے علم وعمل سے وابستہ نہیں ہو تو تم پر کوئی ذمہ داری نہیں اس لیے کسی حال میں نبوت کے علم وعمل سے جدا نہ ہو۔ اس سے جدائی تمہارے رشتہ وحدت کو پامال کر دے گی۔ یہی دُنیا میں تمہارے قیام وبقا کی اصلی بنیاد ہیں۔ اس سے ہٹ کر تم اختلاف کا شکار ہو جاؤ گے اور جس نے نبوت کے علم وعمل سے وابستہ زندگی کی جگہ اس سے علیحدگی اور اختلاف کی بے نتیجہ زندگی اختیار کی تو اس کے لیے عذاب عظیم ہے۔

اُمتوں میں تفرق اور اختلاف

۱۹۵ ۔ اور ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو جُدا جُدا ہو گئے ۔ اور کھلی واضح آیات کے باوجود باہم اختلاف میں پڑ گئے ۔ یعنی یہود و نصاریٰ کی طرح مت بنو جو خُدا تعالیٰ کے صاف احکام پہنچنے کے بعد محض اوہام و اہوا کی پیروی کر کے اُصول میں متفرق اور فروع میں مختلف ہو گئے ۔ آخر فرقہ بندیوں نے ان کے مذہب و قومیت کو تباہ کر ڈالا ۔ اور سب کے سب عذاب الٰہی کے نیچے آگئے ۔ [1]

یہ اشارہ ان اُمتوں کی طرف ہے جنہوں نے خدا کے پیغمبروں سے دین حق کی صاف اور سیدھی تعلیمات پائیں مگر کچھ مدت گزر جانے کے بعد اساس دین کو چھوڑ دیا ۔ اور غیر متعلق ضمنی و فروعی مسائل کی بنیاد پر الگ الگ فرقے بنانے شروع کیے ۔ پھر فضول لایعنی باتوں پر جھگڑے میں ایسے مشغول ہوئے کہ نہ انہیں اس کام کا ہوش رہا جو اللہ نے سپرد کیا تھا اور نہ عقیدہ و اخلاق کے ان بنیادی اصولوں سے کوئی دلچسپی رہی جن پر درحقیقت انسان کی فلاح و سعادت کا دار و مدار ہے ۔ [2]

نظم کلام کی روشنی میں ان آیات پر غور کیجئے تو یہ حقائق سامنے آئیں گے کہ اعتصام بحبل اللہ سے محروم ہو جانے کے بعد اہل کتاب اختلاف و انتشار میں مبتلا ہو گئے اور یہ انتشار و اختلاف درحقیقت ایمان کے بعد کفر کی طرف پلٹ جانے کے ہم معنے ہے اور پھر یہ کہ جن لوگوں کو اللہ سبحانہٗ یہ سرفرازی بخشتا ہے کہ ان کے ہاتھ میں نبوت کے علم و عمل کی رسی پکڑاتا ہے ۔ اگر وہ اپنی شامت اعمال سے اس رسی کو چھوڑ کر دوسری اور کوئی رسی پکڑ لیتے ہیں تو ان کو ذلت و رسوائی کا منہ دیکھنا پڑے گا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو اس دُنیا کی زندگی میں نبوت کے علم و عمل سے ہٹ کر دوسروں کے علم و عمل کے ہو کر رہ گئے اور نبوت کی صاف اور واضح رہنمائی کے ہوتے ہوئے نبوت کے علم و عمل میں اختلاف کے شکار ہو گئے ۔

مفتی محمد شفیع مدظلہ فرماتے ہیں کہ یہ درحقیقت آیت واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا کا تتمہ ہے اسی آیت میں مرکز وحدت اعتصام بحبل اللہ کی طرف دعوت دی گئی اور اشارۃً بتلایا گیا کہ اجتماع اور اتحاد تمام اُمت اور قوم کو ایک شخص واحد میں تبدیل کر دیتا ہے ۔ پھر دعوت الی الخیر ، امر بالمعروف

---

[1] افادات شیخ الاسلام ۔ [2] تفہیم القرآن

اور نہی عن المنکر سے اسی وحدت واجتماع کو غذا فراہم کی پھر ولا تکونوا کالذین تفرقوا سے یہ ہدایت کی ہے کہ تفرق واختلاف نے پچھلی اُمتوں کو تباہ کر دیا۔ ان سے عبرت حاصل کرو اور اپنے میں یہ مرض پیدا نہ ہونے دو۔[1]

نئی اُمت اور نئی زندگی

اس اعتصام بحبل اللہ یعنی نبوت کے علم وعمل کے ذریعے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جان بلب انسانیت میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ انسانیت کے وہ ذخائر جو خام اشیا کی شکل میں پڑے تھے جن کی افادیت اور مصرف کی کسی کو خبر نہ تھی جن کو جہالت کفر اور کم ہمتی نے برباد کر رکھا تھا۔ آپ نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ اس میں خدا کی مدد سے ایمان وعقیدہ پیدا فرما دیا زندگی کی نئی رُوح پھونک دی۔ دبی ہوئی صلاحیتیں ابھار دیں اور اندرونی استعدادیں اجاگر کر دیں۔ پھر ہر ایک کو اس کی صحیح جگہ عطا فرمائی۔ گویا کہ اسی کے لیے اس کا وجود تھا اور گویا کہ جگہ خالی تھی اور اس کی منتظر تھی۔ وہ بے جان پتھر تھا اب نبوت کے علم وعمل کے ذریعے ایک جیتا جاگتا انسان بن گیا۔ وہ بے حس وحرکت مردہ تھا اب وہ زندہ ہو کر دُنیا پر حکومت کرنے لگا۔ پہلے نابینا تھا جس کو خود راستہ کا پتہ نہ تھا اب ساری دُنیا کا رہبر ورہنما بن گیا۔ پہلے وہ منتشر تنکے تھے اب وہ ایک جاندار وحدت کے حامل بن گئے۔ نبوت کے علم وعمل سے عرب کی برباد شدہ قوم میں ایسا انقلاب پیدا ہوا کہ دُنیا نے تھوڑے ہی عرصہ میں ان میں وہ عظیم الشان شخصیتیں دیکھیں جو اعجوبہ روزگار اور دُنیا کی تاریخ میں یادگار ہیں۔ تھوڑے عرصہ ہی میں متمدن دُنیا نے دیکھ لیا کہ وہ خام اشیا جو بکھری پڑی تھیں جن کی معاصر قوموں نے ذرا قدر نہ کی تھی اور پڑوسی ملکوں نے جن کا مذاق اڑایا تھا اعتصام بحبل اللہ کے ذریعے ایک ایسا مجموعہ تیار ہوا کہ انسانی تاریخ نے اس سے زیادہ متوازن ومکمل مجموعہ کمالات نہیں دیکھا۔ ایسا مجموعہ جو انسانی زندگی کے ہر شعبہ کی صلاحیت رکھتا ہے۔ دین ودُنیا کی ہر ضرورت کے لیے اس کے پاس سامان موجود ہے۔ قرآن ان ہی سے کہہ رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ نبوت کا علم وعمل اور اعتصام بحبل اللہ اصل طاقت ہے۔ اس سے جدائی جب ہوگی تنزل وادبار کا اسی وقت آغاز ہو جائے گا۔ اجتماع وائتلاف کی جگہ اشتات وانتشار کی نحوست چھا جائے گی۔ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے کہ نبوت کے

---

[1] معارف (مستفاد)

علم و عمل سے جدا ہو کر سب کچھ رکھنے کے باوجود سب کچھ کھو بیٹھے۔ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل ترقی کی جگہ تنزل، عزت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی اور بالآخر زندگی کی جگہ موت ان پر چھا گئی ہے۔

حدیث افتراق اُمت

قرطبی، آلوسی، ابن کثیر اور دوسرے شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے حدیث افتراق کو نمایاں جگہ دی ہے۔

امام ترمذی نے حدیث افتراق روایت کرنے والوں میں چار صحابہ کا ذکر کیا ہے جن میں حضرت ابو ہریرہ اور عبداللہ بن عمرو کی روایت تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے۔ حضرت سعد اور عوف بن مالک کا صرف حوالہ دیا ہے۔ ابو ہریرہ کی روایت کو صحیح اور عبداللہ کی روایت کو غریب کہا ہے۔

ابو ہریرہ کی روایت یہ ہے کہ

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ یہود ۷۱ اور ۷۲ فرقے بنے اور نصاریٰ بھی اسی طرح۔ اور میری اُمت تہتر فرقوں میں بٹ جائے گی۔ (ترمذی)

حافظ سخاوی نے مقاصد حسنہ میں اس حدیث کی صحت کرتا ہے اور شیخ محمد طاہر نے تذکرۃ الموضوعات میں اسے نقل فرما کر خاموشی اختیار فرمائی ہے۔ شارح سفر السعادہ نے امام ترمذی کے پیش کردہ ناموں پر گیارہ صحابہ کا اور اضافہ فرمایا ہے۔ انس بن مالک، جابر، ابن مسعود، علی مرتضیٰ، عمرو بن عوف، عویمر، ابو الدرداء، ابو معاویہ، ابن عمر، واثلہ، اس طرح اس حدیث کے راویوں کی تعداد پندرہ تک پہنچ جاتی ہے۔

ان روایات میں کمی و بیشی ہے۔ ابو ہریرہ کی روایت میں صرف ۷۳ فرقے ہونے کی خبر ہے لیکن کچھ میں ایک کے نجات یافتہ ہونے اور باقی کے ہالک ہونے کی اور کچھ میں ایک کے سوا سب کے نجات یافتہ ہونے کی خبر ہے جیسے اہل علم کے مابین ان روایات کے ثبوت اور عدم میں کلاً و جزاً اختلاف ہے ایسے ہی ۷۳ کے عدد میں بھی اختلاف ہے اور پھر اس میں بھی اختلاف ہے کہ اُمت سے اُمت دعوت مراد ہے یا اُمت اجابت۔

علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے بڑی جرأت سے سفر السعادہ کے خاتمہ میں اپنا یہ فیصلہ لکھ دیا ہے۔

اس موضوع پر کوئی روایت قطعاً ثابت نہیں ہوئی۔

اور حافظ ابن حزم نے بھی اس حدیث کے ساتھ ایک اور حدیث کے بارے میں اپنا فیصلہ لکھا ہے۔

یہ دونوں حدیثیں روایتی نقطہ نظر سے بالکل صحیح نہیں ہیں۔

حافظ نورالدین ہیثمی نے مجمع الزوائد میں اس روایت کے تمام طرق پر تفصیلی بحث کی ہے چنانچہ حضرت انس کی روایت کو بطریق مسند ابی یعلی نقل فرما کر لکھتے ہیں:

اس میں ایک راوی یزید الرقاشی ہے جس کو جمہور نے ضعیف قرار دیا ہے اور معمولی سی اس کی توثیق بھی کی گئی ہے۔ بقیہ تمام راوی صحیح کے راوی ہیں۔

ایک دوسرے مقام پر ساتویں جلد میں اسی حدیث کا دوسرا طریقہ پیش کر کے لکھا ہے

اس کو ابو یعلی نے روایت کیا ہے اور اس میں ابو معشر راوی ہے اس میں ضعف ہے۔

حضرت ابوامامہ کی روایت کے متعلق فرماتے ہیں:

اس کو ابن ماجہ اور ترمذی نے روایت کیا ہے اور طبرانی نے بھی روایت کیا ہے۔ اس کے سارے راوی ثقہ ہیں۔

لیکن ساتویں جلد میں تصریح کی ہے کہ

اس حدیث کو طبرانی نے اوسط میں روایت کیا ہے اور معجم کبیر میں بھی اسی کے قریب قریب الفاظ ہیں۔ اس میں ایک راوی ابوغالب ہے یحییٰ ابن معین نے اسے ثقہ کہا ہے۔ بقیہ معجم اوسط کے سب راوی ثقہ ہیں اور اسی طرح معجم کبیر کی ایک اسناد کا حال ہے۔

حضرت سعد بن ابی وقاص کی روایت مسند بزار سے نقل کر کے لکھتے ہیں:

مسند بزار میں اس کو روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی موسیٰ ابن عبیدہ ضعیف ہے۔

پھر حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت کے بارے میں فرماتے ہیں،

اس کو ابو یعلی نے روایت کیا ہے۔ اس میں ایک راوی لیث بن ابی سلیم ہے جو مدلس ہے بقیہ راوی ثقہ ہیں۔

حضرت ابوالدرداء، ابوامامہ واثلہ اور انس کی روایات کے متعلق بتایا ہے:

اسے طبرانی نے روایت کیا ہے اور اس میں ایک راوی کثیر بن مروان ہے اور یہ بہت ضعیف ہے۔

اس کے بعد عمرو بن عوف کی روایت بحوالہ طبرانی کر کے اپنی رائے ان الفاظ میں پیش کی ہے:

اس میں ایک راوی کثیر بن عبداللہ ضعیف ہے۔ ترمذی نے اس کی ایک حدیث کی تحسین بھی کی ہے۔ بقیہ تمام راوی ثقہ اور قابل اعتبار ہیں۔

باب افتراق امت کے خاتمہ پر حضرت عبداللہ بن مسعود کی حدیث پر تحریر فرماتے ہیں:

اس حدیث کو طبرانی نے روایت کیا ہے دو سندوں سے ایک سند کے راوی وہی ہیں جو صحیح کے راوی ہیں سوائے بکیر بن معروف کے کہ وہ صحیح کا راوی نہیں ہے مگر امام احمد نے اس کی توثیق کی ہے۔

عوف بن مالک کی روایت مستدرک حاکم میں ہے اس کے بارے میں خود حاکم کی رائے یہ ہے کہ یہ حدیث بخاری و مسلم کی شرط پر صحیح ہے۔ علامہ شاطبی نے حضرت علی کی روایت نقل کر کے لکھا ہے کہ میں اس کی صحت کی ذمہ داری نہیں لیتا ہوں اور ابو ہریرہ کی حدیث نقل کر کے حاکم فرماتے ہیں کہ یہ اسانید ایسی ہیں کہ ان کی بنا پر حدیث کو صحیح کہا جا سکتا ہے۔ اتنی بات کو امام ذہبی نے بھی تسلیم کیا ہے۔

بہر حال پندرہ صحابہ میں سے تیرہ صحابہ کی احادیث پر علماء کے یہ خیالات ہیں۔ ان میں ابو ہریرہ، عبداللہ بن عمرو، انس، ابو امامہ، عمرو بن عوف، معاویہ، ابن عمر، عوف بن مالک کی روایات صحیح یا حسن کے درجہ پر آ سکتی ہیں۔ بقیہ روایات کی اسانید اگرچہ ضعیف ہیں مگر تعدد طرق کا لحاظ رکھتے ہوئے وہ بھی بالکل نظر انداز کرنے کے لائق نہیں ہیں۔

ان تمام روایات میں صرف ابو ہریرہ کی روایت جسے ابو داؤد، ترمذی اور ابن ماجہ نے روایت کیا ہے ایسی ہے جس کے بارے میں کوئی قابل ذکر قدح نہیں کی گئی ہے لیکن اس میں ایک فرقہ کے ناجی ہونے اور باقی کے ناری ہونے کی زیادتی نہیں۔ ابو داؤد کی زیادتی والی روایت کو محمد بن عمرو اللیثی کی وجہ سے قابل پذیرائی نہیں سمجھا گیا ہے۔ حاکم نے اس حدیث کو بھی علی شرط مسلم کہا ہے لیکن حافظ ذہبی نے یہ کہہ کر حاکم کی رائے کو بے وزن بنا دیا ہے کہ محمد بن عمرو لیثی منفرد ہو کر ناقابل احتجاج ہے۔ ابن ماجہ، بیہقی اور حدیث کی دوسری کتابوں میں یہ حدیث ضرور آئی ہے لیکن کسی میں روایت عبدالرحمٰن ابن زیاد بن انعم ہے، کسی میں کثیر بن عبداللہ، کسی میں

عباد بن یوسف، راشد بن سعد کہیں ولید بن مسلم اور دوسری روایات میں مواہیل کی بھیڑ ہے تفصیل دیکھنی ہو تو احادیث کشاف پر حافظ زیلعی کی تخریج دیکھو۔ خواہ کچھ ہو اتنی بات صاف ہے کہ جو حدیث اتنے صحابہ سے صحیح اور حسن طریقوں سے روایت ہو کر آتی ہو بے اصل نہیں ہے۔ حافظ ابن القیم کے ابوداؤد کے حاشیہ پر انداز بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ بھی اسے بے اصل قرار نہیں دیتے۔ حافظ ابن حزم چونکہ تعدد طرق سے جبر نقصان کے قائل نہیں ہیں اس لیے وہ اسے صحیح نہیں مانتے، مگر بقول مولانا بدر عالم میرٹھی کہ اگر ایک طرف حافظ ابن الجوزی کا تشدد اُمت میں ضرب المثل ہے تو اس کے ساتھ ہی حافظ ابن حزم کی زبان کا سیف حجاج ہونا بھی مشہور ہے۔

اختلاف سے مراد

تفرق کا مطلب تو آپ سن آئے کہ نبوت کے علم و عمل سے جُدا ہونا اور ہٹ جانا مراد ہے۔ قرآن نے بنی اسرائیل کی اجتماعی زندگی کی سب سے بڑی کمزوری یہ بتائی ہے کہ تم کچھ کتاب الٰہی کو مانتے ہو اور کچھ کو نہیں مانتے۔ یعنی نبوت کے لاتے ہوئے علم کا جو حصہ ان کے مفادات کا ساتھ دیتا ہے اسے مانتے ہیں اور جو ان کے اجتماعی مفادات اور قومی تقاضوں سے متصادم ہوتے ہیں ان کو نہیں مانتے۔ یہی نبوت کے لاتے ہوئے علم سے جُدا ہونا ہے۔ اور جب نبوت کے علم سے جُدائی ہوگئی تو لازماً کتاب الٰہی ان کی فکری آوارگی کا نشانہ بن گئی۔ واضح ہدایات کے باوجود خود کتاب اللہ میں اختلاف کر بیٹھے۔ کتاب اللہ علم و حقیقت ہے۔ اور اختلاف جہل و ظن سے پیدا ہوتا ہے۔ جب علم و حقیقت آجائے تو اختلاف باقی نہ رہنا چاہیے پھر جو لوگ کتاب اللہ کے نزول کے بعد بھی اختلاف میں مبتلا ہو جاتے ہیں وہ شقاق بعید میں پڑ جاتے ہیں۔ اہل کتاب کی سب سے بڑی گمراہی یہ تھی کہ دین حق کے علم اور کتاب اللہ کے حصول کے بعد بھی باہمی اختلافات میں پڑ گئے اور وحدت ضائع کر کے الگ الگ ٹولیوں میں بٹ گئے ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤ اور ایک دین پر جمع ہونے کی جگہ فرقوں میں بٹ جاؤ۔

اختلاف سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کا جواب شارحین قرآن نے مفصل دیا ہے۔ شیخ الاسلام مولانا عثمانی فرماتے ہیں:

اس آیت سے ان اختلافات اور فرقہ بندیوں کا مذموم ہونا معلوم ہوا جو شریعت کے صاف

احکام پر مطلع ہونے کے بعد پیدا کیے جائیں۔ افسوس ہے کہ آج مسلمان کہلانے والوں میں سینکڑوں فرقے شریعتِ اسلامیہ کے صاف و صریح اور مسلم و محکم اصول سے الگ ہو کر اور ان میں اختلاف ڈال کر اس عذاب کے نیچے آئے ہوتے ہیں۔ تاہم اسی طوفانِ بے تمیزی میں اللہ و رسول کے وعدے کے موافق ایک عظیم الشان جماعت بحمد اللہ خدا کی رسی کو مضبوط تھامے ہوتے ما انا علیہ واصحابی کے مسلک پر قائم ہے اور تا قیامِ قیامت قائم رہے گی۔ باقی فروعی اختلافات جو زمانہ صحابہ اور ائمہ مجتہدین میں ہوتے ان کو آیت حاضرہ سے کوئی تعلق نہیں۔ فروعی اختلاف کے اسباب پر حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی تصانیف میں کافی و شافی بحث کی ہے [1]

حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اختلاف کے موضوع پر تفصیلی بحث فرمائی ہے احکام الائتلاف فی احکام الاختلاف کے نام سے ایک رسالہ سپردِ قلم فرمایا ہے۔ آپ نے اختلاف کو دس قسموں میں تقسیم فرما کر ہر ایک کا حکم شرح و بسط سے بتایا ہے اور مثالوں سے توضیح کی ہے۔ ان دس قسموں میں چھ قسمیں اختلاف حقیقی کی اور چار اختلاف غیر حقیقی کی ہیں۔ ہم یہاں مولانا موصوف کے بیان کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں :

اختلاف کی قسم اول یہ ہے کہ اختلاف کسی دنیوی معاملہ میں ہو اور اس کا منشا صحیح ہو۔ جیسے ڈاکٹروں کا طریق علاج میں اختلاف کوئی ایلوپیتھک، کوئی ہومیوپیتھک، کوئی ویدک اور کوئی یونانی طب کو اپنا کر علاج کرتا ہے۔ یا دو ڈاکٹروں کا تشخیص میں اختلاف اور اس کے نتیجہ میں تدبیر میں اختلاف۔ یا دو وکیلوں کا مقدمہ کی پیروی میں اختلاف، ایسے ہی روزمرہ کی زندگی میں اربابِ تجربہ اور اصحابِ رائے کا اختلاف۔ یہ اختلاف جب تک حدود میں رہے مذموم نہیں ہے بلکہ یہ اختلاف دراصل اسی مشورے کا ایک حصہ ہے جس کی ترغیب و تاکید خود قرآن و سنت میں موجود ہے۔

اختلاف کی دوسری قسم یہ ہے کہ اختلاف دنیوی معاملہ میں ہو مگر اس کا منشا محض نفسانیت ہو یہ بلاشبہ مذموم ہے۔ قرآن و سنت میں اس اختلاف کی مذمت کی گئی ہے۔

اختلاف کی تیسری قسم یہ ہے کہ اختلاف کسی دنیوی معاملہ میں ہو اور اس کا تعلق اصول سے نہیں بلکہ فروع سے ہو اور منشا دلیل ہو خواہ یہ دلیل منصوص ہو یا مجتہد فیہ۔ یہ اختلاف امت میں زمانۂ نبوت سے چلا آرہا ہے۔ اس اختلاف کے اسباب سے حافظ ابن تیمیہ نے رفع الملام

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

میں اور شاہ ولی اللہ نے الانصاف میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس اختلاف کے محمود و مقبول ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

اختلاف کی چوتھی قسم یہ ہے کہ اختلاف ایسے امور دینی میں ہو جن کا تعلق اصول سے نہیں بلکہ فروع سے ہے اور بلادلیل محض لڑنے سے ہو۔ اس اختلاف کا حکم یہ ہے کہ یہ سخت معصیت اور مذموم ہے

اختلاف کی پانچویں قسم یہ ہے کہ اختلاف ایسے دینی معاملہ میں ہو جس کا تعلق فروع سے نہیں بلکہ اصول سے ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ یہ اختلاف کفر و ایمان ہے۔ کفر و ایمان کی کش مکش کا قرآن میں ذکر ہے۔

اختلاف کی چھٹی قسم یہ ہے کہ اختلاف ایسے دینی معاملہ میں ہو جس کا تعلق اصول سے ہے اور سنت و بدعت کے درجہ میں ہے۔ اس اختلاف کا حکم بھی یہی ہے کہ علمبرداران سنت کو اہل بدعت سے بچ کر رہنا چاہیے بدعت سے مراد وہ بدعت ہے جو باتفاق اہل حق بدعت ہو اور جس میں اہل حق کو اجتہاد کی گنجائش ہو وہ بمنزلہ مسائل اختلافی ہے۔

اختلاف کی ساتویں قسم یہ ہے کہ اختلاف غیر حقیقی ہو اور بندے کے کردار سے متعلق ہو جیسے اسباب معیشت کا اختلاف۔ یہ اختلاف محمود ہے۔

اختلاف کی آٹھویں قسم یہ کہ اختلاف غیر حقیقی ہو اور تکوین سے متعلق ہو۔ جیسے اختلاف طبائع، اختلاف صور، اختلاف الوان اور اختلاف امزجہ، یہ اختلاف حکمت الٰہی پر مبنی ہے اس کے مذموم ہونے کا وسوسہ بھی لانا حکمت تکوین پر قدغن لگانا ہے۔

اختلاف کی نویں قسم یہ ہے کہ اختلاف غیر حقیقی ہو اور خود قانون شریعت میں ہو۔ مثلاً قراتوں کا اختلاف۔ یہ اختلاف بھی مذموم نہیں ہے۔

اختلاف کی دسویں قسم یہ ہے کہ مختلف شریعتوں میں اور مختلف زمانوں میں ہے، یہ اختلاف بھی حکمت الٰہی پر مبنی ہے۔

اختلاف کی ان تمام قسموں میں سے اختلاف مذموم صرف چار ہیں یعنی قسم دوم، چہارم، پنجم اور ششم اور وہ بھی جانبین سے نہیں بلکہ اہل باطل کی جانب سے اور صاحب حق کی جانب سے یہ اقسام بھی محمود ہیں اور بقیہ چھ قسمیں علی الاطلاق محمود ہیں۔

ایک غلط فہمی کا ازالہ

عام غلط فہمی یہ ہوگئی ہے کہ آیت قرآنی واعتصموا بحبل اللہ جمیعا ولا تفرقوا میں لوگ

جمیعًا اور لاتفرقوا کو دیکھتے ہیں اور واعتصموا بحبل اللہ کو نظرانداز کر دیتے ہیں حالانکہ یہ حکم کی جان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم سب اعتصام بحبل اللہ اختیار کرو اور اس سے تفرق مت کرو کہ کوئی اعتصام کرے اور کوئی نہ کرے۔ لہٰذا اصل جوہر اور مقصد اعتصام بحبل اللہ ہے نہ کہ اجتماع اور بالذات منع ترک اعتصام ہے نہ کہ تفرق۔ لہٰذا اگر اعتصام میں تفرق ہوتا ہو بایں طور کہ کچھ اعتصام کریں اور کچھ نہ کریں تو اس تفرق سے بچنے کے لیے اعتصام کو نہ چھوڑیں گے بلکہ اعتصام کی خاطر تفرق کو گوارا کر لیں گے۔ اور اگر ترک اعتصام سے اجتماع حاصل ہوتا ہو بایں طور کہ سب نے اعتصام ترک کر دیا ہو اور سب بے دینی پر جمع ہو گئے ہوں تو اس اجتماع کے لیے اعتصام ترک نہ کریں گے بلکہ اعتصام کے لیے اجتماع کو چھوڑ دیں گے[1]۔

یہاں حافظ ابوبکر الجصاص نے جو نکتہ آفرینی فرمائی ہے وہ بھی بڑی قیمتی ہے۔ فرماتے ہیں:

> اسلامی شریعت میں احکام مختلف قسم کے ہیں کچھ تو ایسے ہیں جن میں اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ہر حال میں ان میں اختلاف ممنوع ہے لیکن کچھ احکام ایسے بھی ہیں جو کبھی واجب ہوتے ہیں اور کبھی ناجائز، ان میں اختلاف کی گنجائش ہے جیسے نماز روزے میں پاک و ناپاک عورت کے حکم کا اختلاف، مقیم و مسافر کا نماز کے قصر اور اتمام میں اختلاف، یہ اختلاف ممنوع نہیں ہے۔ اگر ہر نوع کا اختلاف مذموم ہو تو پھر شریعت کے احکام میں بھی اختلاف نہ ہو۔ اور پھر نصوص میں جب اختلاف کی گنجائش ہے اجتہاد میں بھی اختلاف ہو سکتا ہے۔ دو مجتہد زوجین کے نان و نفقہ وغیرہ میں مختلف ہو سکتے ہیں اگر اجتہادی اختلاف مذموم ہوتا تو صحابہ کرام میں اس کا مظاہرہ نہ ہوتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ خود صحابہ میں یہ اختلاف موجود ہے اور اس موضوع پر ان سے کوئی نکیر منقول نہیں ہے۔ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ اُن کا اس پر اتفاق ہے[2]۔

یہ تمام تفصیل اس صورت میں ہے جب کہ تفرقوا کا مطلب فرقہ ہونا اور اختلاف کا مقصد دین میں اختلاف ڈالنا ہو۔ جیسا کہ بہت سے شارحین قرآن نے ایسا ہی سمجھا ہے لیکن اگر تفرق سے مراد نبوت کے لاتے ہوئے علم و عمل سے جدا ہونا اور اختلاف سے کتاب الٰہی میں اختلاف

---

[1] بوادر النوادر [2] احکام القرآن

مراد ہو یا تفرق سے جماعت کا تفرقہ اور اختلاف سے دین کا اختلاف مراد ہو جیسا کہ قرآن کی آیت
و قالت الیہود لیست النصارٰی علی شیئٍ و قالت النصارٰی لیست الیہود علی شیئٍ
سے معلوم ہوتا ہے تو پھر اس سے وہ اختلاف خود بخود خارج ہو جائے گا جو وضوح بینات
سے پہلے کا ہے جس کو اجتہادی اختلاف کہتے ہیں کیونکہ یہ اختلاف فروعی ہوتا ہے اور فروعی
اختلاف باعث تیسیر ہے۔ اصولی اختلاف ایسا خطرناک مہلکہ ہے جس سے حضرات انبیاء نے
نے سخت خوف محسوس کیا ہے اس کی براہ راست زد معاشرہ اسلامی کی رُوح اجتماعیت پر
پڑتی ہے۔ اسی لیے اس رُوح کو پامال کرنے والوں کو زبان نبوت نے کافر کہہ کر پکارا ہے۔
لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ باہم
ایک دوسرے کی گردنیں مارنے لگو۔ ایک اور ارشاد میں اسی اختلاف کا اندیشہ محسوس کرتے
ہوتے فرمایا:

بخدا مجھے تمہارے بارے میں فقر کا اندیشہ نہیں ہے لیکن میں ڈرتا ہوں کہ
دُنیا تم پر کشادہ ہو جاتے جس طرح تم سے پہلے دوسری قوموں کے لیے کشادہ ہوئی
اور تم اس میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہو اور اسی طرح ہلاک ہو جاؤ گے
جس طرح تم سے پہلے دوسری قومیں ہلاک ہو گئیں۔ تم حسد کرو گے پھر باہم بغض و بیر
کرو گے پھر باہم اُلجھ جاؤ گے۔

جو شخص دمشق، بغداد، قرطبہ، غرناطہ اور دوسرے اسلامی شہروں کی تاریخ تمدن سے واقف
ہے اور اس اخلاقی اجتماعی انحطاط پر نظر رکھتا ہے جو مسلمانوں میں ان کی تہذیب کے عروج کے
کے زمانے میں ظاہر ہوا وہ حرف بحرف ان پیشین گوئیوں کی تصدیق کرے گا جو نبی کریم صلی اللہ
علیہ وسلم کا معجزہ ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ مستقبل کے آئینے میں دیکھ رہے ہیں اور سب
کچھ مشاہدے کے بعد فرماتے ہیں حالانکہ یہ سب کچھ زیر تفسیر آیت قرآنی کی پکار اور نبوت کی
حکمت و فراست ہے۔

بہرحال اس اجتماعیت کو قرآن نے جس کی اساس اعتصام بحبل اللہ ہے اصل بنیاد قرار دیا
ہے اور اس سلسلۂ اجتماع سے نکل جانے کو اسلام سے خروج بتایا ہے

اعتصام بحبل اللہ سے روگردانی کا نتیجہ

۱۹۶۔ اور یہی لوگ ہیں جن کے لیے بہت بڑا عذاب ہے یعنی جو لوگ دُنیا کی اس زندگی میں

اپنا رشتہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے توڑ کر رکھیں گے اور واضح احکام کے باوجود ان کے علم و عمل میں اختلاف ہوگا تو ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔ جن کی طرح ہونے سے قرآن نے یہاں اہل ایمان کو روکا ہے البقرہ کی آیت ۸۵ میں ان کا تعارف اس طرح پیش کیا ہے۔

تم کتاب الٰہی کا کچھ حصہ مانتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔ یاد رکھو تم میں جو شخص ایسا کرے گا اس کو اس کی پاداش میں دنیا کی ذلت و رسوائی ملے گی اور روز قیامت ان کو سخت سے سخت عذاب ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ زندگی میں جب نبوت کے علم و عمل سے رشتہ ٹوٹ جاتا ہے تو اس کے نتیجے میں اصول و صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح آجل کے مقابلے میں عاجل کو ترجیح دینے کی بیماری پیدا ہو جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں ایک بے اصول، ناقابل اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی سطح پر آجاتے ہیں۔ ان کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں بلکہ صرف منافع اور اغراض رہ جاتے ہیں اور عذاب الٰہی ان کو اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ جب مسلمانوں کی اندرونی حالت میں انقلاب آیا وہ اعتصام بحبل اللہ کو بھول گئے۔ لوگوں پر نبوت کے علم و عمل کی جگہ اپنے بنائے ہوئے قوانین نافذ کرنے لگے۔ قید و بند سے آزاد ایک قسم کی اباحی زندگی گزارنے لگے گویا نہ وہ نبی کی امت ہیں اور نہ ان کا نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل پر ایمان ہے۔ نہ حساب کا ڈر ہے اور نہ آخرت کا خوف۔ وہ ان جاہلی قوموں سے پوری طرح مشابہ ہوگئے جن سے وہ کل تک جنگ کرتے رہے اب وہ تمدن، اجتماع، سیاست، اخلاق، معاشرت اور بہت سی چیزوں میں ان مغضوبین و ضالین کے مشابہ ہوگئے جن سے اللہ ناراض ہوا تھا اور جن پر اللہ کا غضب نازل ہوا تھا۔ مسلمانوں کے پیش نظر کوئی صحیح اور اعلیٰ مقصد نہ رہا۔ ان کی تگ و دو اور جد و جہد کھانے پینے اور عیش و عشرت تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اپنے ہم جنسوں کی طرح وہ بھی دنیا میں انسانوں کا ایک گلہ ہو کر رہ گئے بلکہ ان کے بعض بادشاہ اور سلاطین تو دوسری قوموں کے جبابرہ اور فراعنہ سے بازی لے گئے۔ ان کے دولت مندوں میں تکبر پیدا ہوگیا۔ ان کے سردار اور اکابر قوم فسق و فجور میں مبتلا ہوگئے یہاں تک کہ جب اس امت کے فساق و فجار، بغض و حسد، جاہ طلبی، دنیا پرستی، عیش پسندی، آخرت سے غفلت، خون ریزی، بے حیائی، حق تلفی، بدعہدی، بے وفائی، حدود اللہ سے تجاوز، ظلم و بے انصافی، اسراف و تبذیر اور فواحش و منکرات وغیرہ

مختلف جرائم میں دوسری قوموں سے سبقت لے گئے تو ان پر بھی غضب الٰہی نازل ہوا۔ اور باوجود اس کے کہ ان کے نام اسلامی تھے اللہ کی نظروں میں حقیر ہو گئے اور باوجود اپنی وسیع سلطنت، لاتعداد افواج، بے شمار خزانوں اور اپنی شاندار تہذیب کے وہ لوگوں کی نگاہوں میں بے وقعت ہو گئے۔ لوگوں کے دلوں سے ان کی عظمت و ہیبت جاتی رہی اور وہ ان پر جری ہو گئے۔

چہروں کی سپیدی و سیاہی

۱۹۷۔ جس روز کچھ چہرے تو چمکیں گے اور کچھ سیاہ ہوں گے۔ یعنی بعضوں کے چہروں پر ایمان و تقویٰ کا نور چمکتا ہوگا اور عزت و وقار کے ساتھ شاداں و فرحاں نظر آئیں گے۔ ان کے برخلاف بعضوں کے منہ کفر و ایمان یا فسق و فجور کی سیاہی سے کالے ہوں گے۔ صورت سے ذلت و رسوائی ٹپک رہی ہوگی گویا ہر ایک کا ظاہر باطن کا آئینہ بن جائے گا۔[1]

چہرے کی سیاہی اور سپیدی سے متعلق قرآن میں متعدد الفاظ آئے ہیں۔ بیاض، سواد، غبرہ، قترہ، اور نضرہ، جمہور مفسرین کے نزدیک سفیدی سے مراد نور ایمان کی سفیدی ہے یعنی مومنین کے چہرے نور ایمان سے روشن اور غایت مسرت سے خنداں اور فرحاں ہوں گے اور سیاہی سے مراد کفر کی سیاہی ہے یعنی کافروں کے چہروں پر کفر کی کدورت چھائی ہوگی اور اوپر سے فسق و فجور کی ظلمت اور زیادہ تیرہ و تاریک کر دے گی۔[2]

مطلب یہ ہے کہ آخرت میں روحوں کو جو اجسام ملیں گے وہ حقیقۃً ان کے اعمال ہی کے ظل و عکس ہوں گے یعنی جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی ان کو جسم عنایت ہوں گے۔ چنانچہ اس دنیا کے جسمانی رنگ کے لحاظ سے خواہ کوئی کالا ہو یا گورا۔ مگر اس دنیا میں اس کا یہ کالا پن اور گورا پن اعمال کی سیاہی و سپیدی کی صورت میں بدل جائے گا۔ یعنی ہمارے آخرت میں جسمانی قالب ہمارے دنیوی اعمال کے مطابق ہوں گے۔

ایمان کے بعد کفر کی راہ

۱۹۸۔ جن کے چہرے کالے ہوں گے ان سے کہا جائے گا تم نے ایمان کے بعد راہ کفر

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] معارف قرآن م ش

کیوں اختیار کی تھی۔ اب اس کی پاداش میں عذاب کا مزہ چکھو۔ یہ الفاظ مرتدین، منافقین، اہل کتاب، عام کفار یا مبتدعین و فساق و فجار سب کو کہے جاسکتے ہیں۔ مرتد تو اسی کو کہتے ہیں جو ایمان لانے کے بعد کافر ہو جاتے۔ منافق زبان سے اقرار کے بعد دل میں کافر رہتا ہے۔ اہل کتاب اپنے نبیوں اور کتابوں پر ایمان کے مدعی ہیں۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ ان کی سب بشارتوں کو جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق دی گئی تھیں تسلیم کریں اور ان کی ہدایات کے موافق حضور پر ایمان لائیں مگر وہ انکار میں سب سے آگے رہتے ہیں گویا اپنے نبی اور کتاب پر ایمان لانے کے بعد کافر بن رہے ہیں۔ مبتدعین کا زبان سے تو دعویٰ یہ ہوتا ہے کہ ہم قرآن وسنت کے متبع ہیں اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لا چکے ہیں مگر اس کے بعد بہت سی بے اصل اور باطل چیزیں دین میں شامل کر کے یا بعض ضروریات دین کا انکار کر کے اصلی دین سے نکل جاتے ہیں۔ اس طرح وہ بھی ایک درجہ میں اکفرتم بعد ایمانکم کے مخاطب ہو گئے، رہے فساق جن کا عقیدہ صحیح ہو اگر ان سے یہ خطاب ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ ایمان لانے کے بعد کافروں جیسے عمل کیوں کیے گویا کفر سے کفر عملی مراد ہوگا۔ اور اگر عام کفار کے حق میں یہ خطاب مانا جائے تو یہ حاصل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے سب کو دین فطرت پر پیدا کیا۔ اس فطرت ایمانی کو ضائع کر کے کیوں کافر بنے۔ باقی سیاق آیات سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں کفر سے کفر عملی یعنی اختلاف و تفریق مذموم مراد ہو واللہ اعلم [1]

اس آیت قرآنی میں دُنیا کی زندگی میں نبوت کے علم و عمل سے جدا رہنے اور زندگی کو اختلاف کا گہوارہ بنانے کو کفر کہا ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے البقرہ میں یہودیوں کو ان کی بدعملی پر متنبہ کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔ اگرچہ کچھ علماء نے آیت میں کفر کی زد سے امت مسلمہ کو بچانے کے لیے دور از کار بحثیں چھیڑ دی ہیں۔ کسی نے کہا کہ یہ منافقین کے بارے میں ہے۔ کسی نے بتایا کافروں کے بارے میں ہے اور کسی نے اہل کتاب پر بات رکھ دی لیکن ان میں سے کوئی بات بھی قرآن کے سیاق کے موافق نہیں۔ مخاطب تو یاایھا الذین آمنوا ہیں صاحب روح المعانی علامہ آلوسی نے حضرت علی، عبداللہ بن عباس، ابوامامہ اور ابوسعید خدری کی طرف نسبت کر کے یہ انکشاف کیا ہے انھم من اھل البدع

---

[1] افادات شیخ الاسلام

والاھواء من ھذہ الامۃ ابن کثیر نے بھی عبداللہ بن عباس کے حوالے سے یہی بات پیش فرمائی ہے۔ سیاقِ قرآنی کا تقاضا یہی ہے کہ آیت میں کفر سے کفرِ عملی مراد ہو۔ جب گناہ شدید ہوتا ہے تو محاوراتِ شرعیہ میں اس کی شدت کے پیشِ نظر اس پر کفر کا اطلاق کر دیا جاتا ہے۔ قرآن وحدیث میں کفر کا اطلاق کچھ لغت کے قریب قریب ہے۔ کفر لغت میں حق ناشناسی کو کہتے ہیں۔ اس لیے جہاں جہاں حق شناسی کی زیادہ ضرورت ہے اگر وہاں اس فریضہ کی ادائیگی میں کوتاہی ہو جائے تو قرآن ایسی حق ناشناسی کو کفر کہتا ہے۔ نبوت کے علم وعمل کو حبل اللہ کی صورت میں نعمت لے کر پھر اس سے جدا ہو جانا اور عملی زندگی کو اختلاف کی آماجگاہ بنا لینا کفر نہیں تو اور کیا ہے؟

پھر ان آیات میں خالص اجتماعی قانون کے تحت پوری امت مخاطب ہے اور اس کو اجتماعی ہدایات دی جا رہی ہیں کہ ۔

۱۔ اللہ کی نافرمانی سے بچ کر رہو جیسے نافرمانی سے بچ کر رہنے کا حق ہے
۲۔ تمہاری موت خالص مطیع و فرمانبردار کی موت ہو ۔
۳۔ تمہیں اپنی اجتماعی زندگی کو اعتصام بحبل اللہ کی اساس پر قائم کرنا چاہیے ۔
۴۔ تمہاری اجتماعی زندگی میں حبل اللہ سے کبھی جدائی نہ ہو۔
۵۔ حبل اللہ اللہ کی نعمت ہے ۔
۶۔ اعتصام بحبل اللہ کو قائم رکھنے کے لیے تمہیں دعوت الی الخیر کا نظام قائم کرنا چاہیے ۔
۷۔ امر بالمعروف کے لیے تمہارے اندر ایک جماعت ہونی چاہیے ۔
۸۔ نہی عن المنکر کی خاطر تمہیں اجتماعی طور پر کام کرنا چاہیے ۔
۹۔ تمہیں اپنی زندگی میں متفرقین کی کاپی نہ کرنی چاہیے ۔
۱۰۔ تمہیں مختلفین کی تقلید کی ہرگز اجازت نہیں ہے ۔

اگر معاملہ اجتماعی نہیں بلکہ انفرادی ہوتا تو بات کچھ اور ہوتی لیکن یہ معاملہ خالص اجتماعی ہے جماعت کو من حیث الجماعۃ ایماندار اس وقت تسلیم کیا جا سکتا ہے جب وہ زبان سے اقرار کرے اور من حیث الجماعۃ اس اقرار پر عمل پیرا ہو۔ اگر ان دونوں باتوں میں سے ایک بھی مفقود ہو تو اس کا شمار اہلِ اخلاص میں نہ ہوگا۔ اس اعتبار سے ایک فرد کی حالت میں اور ایک جماعت کی حالت میں جو فرق ہے اسے نظرانداز نہ کرنا چاہیے۔ فقہا نے بھی ترکِ صلاۃ میں اسے ملحوظ

رکھا ہے۔ اگر ایک فرد قیامِ صلاۃ میں کوتاہی کرتا ہے تو گنہ گار ہے لیکن اگر ایک جماعت بحیثیتِ جماعت ترکِ صلاۃ کرتی ہے تو وہ ہرگز اپنے اپنے دعویٰ ایمان میں مخلص نہیں ہے۔ کفر جیسے ایمان یعنے تصدیق کے مقابلہ پر بولا جاتا ہے ٹھیک ایسے ہی ایمان یعنے اخلاص کے مقابلہ پر بھی آتا ہے۔

یہ درست ہے کہ اسلام دراصل صرف شہادتین کا نام ہے مگر اس کے کچھ مخصوص افعال بھی ہیں جو اس کی اس شہادت باطنی کے گواہ کہلاتے ہیں۔ ان افعال کو شہادتین کے ساتھ اتنا گہرا ربط ہے کہ گویا یہ افعال ان کا ایک قالب ہیں اس لیے ان کا اختیار کر لینا اسلام اور ان کا ترک کرنا کفر سے موسوم ہوتا ہے۔ اسی طرح کفر بھی اسلامی عقائد کے برخلاف عقائد کا نام ہے لیکن کافرانہ زندگی کے بھی کچھ لوازم ہیں جو بعض اوقات خود تو کفر نہیں ہوتے مگر انسان کے کافر ہونے کا بیّن ثبوت ہوتے ہیں۔ قرآن و سنت میں اس قسم کے افعال کو بھی کفر کے افعال کہا گیا ہے اور ایمان کے لیے یہ پسند نہیں کیا گیا کہ اس کی زندگی میں یہ افعال کفر نظر آئیں۔ اسلام کے بعد اس قسم کے افعال سے کافر تو نہیں کہا جا سکتا مگر اس کفر نما اسلام کو اسلام کہنا بھی مشکل ہے مسلمان کو چاہیے کہ جس طرح وہ کفر و شرک سے بچتا ہے اسی طرح ایسے افعال سے بھی بچتا رہے جن کو کفر کی زندگی کے افعال سے بہت قریبی علاقہ ہو۔

اہلِ ایمان کے لیے مقامِ رحمت

۱۹۹۔ اور جن لوگوں کے چہروں پر چمک ہو گی وہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور ہمیشہ رحمتِ الٰہی میں رہیں گے۔ یعنی جنت میں کیونکہ جنت محض عمل سے نہیں ملتی۔ عمل کے بعد خدا کی رحمت سے ملتی ہے۔ اور وہ ہی جگہ ہے جہاں اللہ تعالیٰ نے ہر قسم کی رحمت کے سامان کیے ہیں۔

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد[1]

اللہ کی رحمت کب نہیں اور کہاں نہیں؟ مگر دُنیا کے فطری قوانین کے مطابق اس دُنیا میں ایسے واقعات اور حوادث بھی پیش آتے ہیں جن کو ہم رحمت کے بجائے زحمت سے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

تعبیر کرتے ہیں۔ پھر یہ بھی واقعہ ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی بدولت اللہ سبحانہٗ کے قہر و غضب میں مبتلا ہونا پڑتا ہے۔ لیکن ایک عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غضب کا نام و نشان نہ ہوگا وہاں ہر طرف اس کی رحمت اور فیض کرم کی بارش ہوگی اور اس کی رحمت کے سوا وہاں کوئی منظر کہیں اور کبھی دکھائی نہ دے گا۔

تِلْكَ اٰيٰتُ اللّٰهِ نَتْلُوْهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ ؕ وَمَا اللّٰهُ يُرِيْدُ ظُلْمًا

لِّلْعٰلَمِيْنَ ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ؕ وَاِلَى اللّٰهِ

تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ ۝ ع ۱۱ ۲

اے پیغمبر یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمہارے سامنے فی الواقع پیش کر رہے ہیں اور یہ بات نہیں کہ اللہ سب جہانوں پر ظلم کرنا چاہے۔[۲۰۰] اور یاد رکھو آسمان و زمین میں جو کچھ ہے، سب اللہ ہی کے لیے ہے اور ساری باتیں بالآخر اللہ کی طرف لوٹنے والی ہیں۔[۲۰۱]

نبوت کا علم و عمل پوری کائنات کے لیے رحمت ہے

پہلی دو آیتوں میں عذاب و رحمت کا تقابلی مطالعہ پیش کر کے بتایا تھا کہ اصل رحمت ہے۔ اگر رحمت نہ ہوتی تو یہ کائنات عدم سے وجود میں نہ آتی اور وجود میں آنے کے بعد ربوبیت کا یہ کارخانہ بھی نہ ہوتا۔ صفت قہر و غضب پوری تمامیت کے باوجود مستحقین پر اترنے کے لیے بھی مشیت کا انتظار کرتی ہے مگر یہ صفت رحمت ہے کہ ہر چیز کو بلا تفریق محیط ہے اور عالم کا کوئی گوشہ نہیں جسے صفت رحمت سے حصہ نہ ملا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو اس لیے پیدا نہیں فرمایا کہ وہ ان کو پیدا کر کے عذاب دے

بلکہ اس لیے پیدا کیا ہے کہ اس کی رحمت کا ظہور ہو اسی لیے سورۂ فاتحہ میں صفتِ ربوبیت کے بعد رحمٰن و رحیم کی صفت لائی گئی ہے۔ اس سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ کی اصلی صفت رحمت ہے یعنی رحمت اس کی ذاتی صفت ہے۔ اب اگر کوئی اپنے آپ پر ظلم کر کے گناہ کرتا ہے اور اس لیے اپنے آپ کو رحمتِ الٰہی سے دُور کر لیتا ہے تو یہ خود انسان کا فعل ہے۔

اس آیت میں قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ جو رحمت پوری کائنات میں کار فرما ہے کیونکر ممکن ہے کہ انسان کی معنوی ہدایت اور انفرادی و اجتماعی صلاح و سعادت کے لیے اس کے پاس کوئی فیضان نہ ہو۔ اگر تم سب جگہ اس کی رحمت کو مانتے ہو تو یہاں کیوں نہیں مانتے۔ نبوت کے علم و عمل کا فیضان بھی اسی کی رحمت کا ظہور ہے۔ قرآن نے حضورِ انور کے رسُول اللہ ہونے کو جیسے عالمین کے لیے رحمت کہا ہے ایسے ہی نزولِ قرآن یعنی کتاب اللہ کو بھی رحمت اللہ بتایا ہے۔ اس آیت میں بنیادی طور پر اسی حقیقت کو تلك آیات اللہ نتلوھا علیك بالحق کے ذریعے بے نقاب کیا گیا ہے۔

اللہ کی رحمت کی وسعت

۲۰۰۔ اے پیغمبر یہ اللہ کی آیات ہیں جو ہم تمہارے سامنے فی الواقع پیش کر رہے ہیں اور یہ بات نہیں کہ اللہ سب جہان والوں پر ظلم کرنا چاہے۔ یعنی حقیقی معنے میں ظلم تو وہاں ممکن ہی نہیں ہے لیکن ظاہری طور پر جسے تم ظلم کہہ سکتے ہو اس کا صدور بھی اللہ تعالیٰ سے نہیں ہوتا مثلاً ایسے سخت احکام بندوں کو بھیجے جن سے غرض محض ستانا ہو یا مستحقِ رحمت کو عذاب کرنے لگے یا تھوڑی سزا کی جگہ زائد سزا جاری کر دے یا کسی کی ادنیٰ ترین نیکی کی جزا نہ دے وغیر ذالک۔ خوب سمجھ لو اس کا جو حکم ہے خالص بندوں کی تربیت کے لیے اور جو معاملہ کسی کے ساتھ ہے عین حکمت و مصلحت کے موافق ہے۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ یہاں جو کچھ ہے وہ اپنے اعمال کا نتیجہ ہے اس لیے عذاب اور رحمت جو کچھ ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ جیسی دُنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا سیرابی، بھوک کا تکلیف، بیماری کا بے آرامی، گرنے کا چوٹ، زہر کا

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

موت، شہد کا شیرینی غرض ہر اچھے اور بُرے عمل کا ایک لازمی جسمانی نتیجہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح نبوّت کے لائے ہوئے علم و عمل سے جُدا ہونے اور زندگی کے تمام گوشوں کو اس سے الگ کرنے کا لازمی نتیجہ عذاب عظیم ہے جو دُنیا میں ہمیں ملتا رہتا ہے اسی طرح اپنے اس کردار کا نتیجہ آخرت میں بھی ملنے والا ہے اگر ہم نبوت کے علم و عمل سے چمٹ کر رہیں تو اللہ کی رحمت میں ہوں گے اور اگر اس سے جُدا ہو کر رہیں گے تو اللہ کے عذاب کا نشانہ بنیں گے۔ جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمّہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر کیوں مر گئے یا گرنے سے ہم کو چوٹ کیوں آئی۔ اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہمیں نبوت کے علم و عمل سے روگرداں ہونے کے بعد عذاب عظیم کیوں ہوا؟۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت رحمت سے ہم کو نبوّت کے ذریعے اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع کر دیا ہے اور بتا دیا ہے کہ یہ اللہ کی آیتیں ہیں جو بالکل حقیقت پر مبنی ہیں اور اپنے پیغمبر کے ذریعے سُنا رہے ہیں۔ "تلاوت سے کتاب اللہ اور علیک سے رسُول اللہ مراد ہے۔ ان دونوں کا ظہور ایک امر واقعہ اور حقیقت ہے اور ان کے ذریعے اللہ اپنے بندوں پر رحمت کرنا چاہتا ہے۔ اس کے باوجود بھی اگر ہم باز نہ آئیں اور نبوّت کے علم و عمل سے روگرداں رہیں تو اب ہمیں ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو رحمت کے لیے بنایا ہے عذاب کے لیے نہیں لیکن انسان خود اپنے عمل سے خدا کی رحمت کے بجائے اس کے عذاب کا سزاوار ہوتا ہے۔ عبداللہ بن عباس نے آیت ولا یزالون مختلفین الا من رحم ربك ولذالك خلقهم لوگ مختلف ہی رہیں مگر ہاں جس پر تیرے پروردگار نے رحم فرمایا اور اسی لیے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے۔ کی تفسیر میں فرمایا ہے:

للرحمة خلقهم ولم يخلقهم للعذاب

اللہ نے انسانوں کو رحمت کے لیے پیدا کیا ہے عذاب کے لیے نہیں

ہم نے نبوّت کے علم و عمل سے جُدا ہونے والوں اور اختلاف کرنے والوں کے لیے جو عذاب تیار کیا ہے وہ ظلم نہیں بلکہ ان کے اعمال کی سزا ہے۔ ہم تو ان پر رحمت ہی کرنا چاہتے ہیں لیکن وہ ہماری رحمت میں داخل ہونا ہی نہیں چاہتے۔

اسلامی نظریہ مملکت

۱۰۲ - اور یاد رکھو آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے اور ساری باتیں بالآخر اللہ کی طرف لوٹنے والی ہیں۔ یعنی جب اللہ کی مملوک و مخلوق ہے اور ہر کام کا انجام اس کے ہاتھ میں ہے تو ظلم کیونکر اور کس لیے کیا جائے۔ [1]

یہ گویا پہلی آیت میں بیان کی ہوئی بات کی علت بتائی جارہی ہے۔ پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ نبوت کے علم و عمل سے روگردانی کرنے والوں کے لیے جو عذابِ عظیم کا قانون بنایا گیا ہے۔ اس تشریع میں اللہ سبحانہ بندوں پر ظلم نہیں کرنا چاہتا ہے بلکہ یہ اس کی جانب سے اپنے بندوں کے لیے رحمت کا دروازہ کھولنا ہے اور وہ عالمین پر ظلم کیسے کرسکتا ہے اور کیونکر کرسکتا ہے جب کہ پوری کائنات اس کی مخلوق اور مملوک ہے۔ خالق و مالک اپنے ملک میں ہر قسم کے تصرف کا مجاز ہے۔ ظلم تو ملک غیر میں تصرف کرنے کا نام ہے اور عالمین میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کی مخلوق اور مملوک نہ ہو۔ پھر اللہ سبحانہ ظلم کا ارادہ کیسے کرسکتا ہے۔ ہاں تمام کائنات کا اس کی ملک ہونا اس کو مقتضی ہے کہ وہ اپنے ملک میں جو چاہے تصرف کرے وہ ظلم نہیں عین عدل ہے اس لیے یہاں جس ظلم کی تردید کی جارہی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ نبوت کے علم و عمل کے ذریعے اللہ سبحانہ جو انسانوں کے لیے ہدایت و سعادت کے لیے قانون پیش کر رہا ہے۔ یہ بندوں کے مفاد کی خاطر ہے ظلم نہیں سرتاسر رحمت ہے۔

قرآن کا یہ حکم کہ واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً ولا تفرقوا یعنی نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو اپناؤ اس سے جدا نہ ہو اس پر گواہ ہے کہ قرآن زندگی کے ایسے تصور کو قبول نہیں کرتا جس میں اجتماعیت نہ ہو کیونکہ اس کا عطا کیا ہوا ضابطۂ حیات اجتماعیت کی عدم موجودگی میں پوری طرح نافذ نہیں کیا جاسکتا۔ نبوت کا لایا ہوا نظام ایک قانونی نظام ہے اور کوئی قانونی نظام موثر نہیں ہوسکتا جب تک اجتماعیت کی طاقت اس کے پس پشت نہ ہو۔ یہی وجہ ہے کہ جہاں مسلمانوں کی کوئی حکومت موجود نہ ہو وہاں بھی ان کو حکم ہے کہ وہ جماعتی زندگی بسر کریں۔

اب سوال یہ ہے کہ اجتماعیت کی ماہیت اور اس کی بنیاد و اساس کیا ہے۔ قرآن نے اس آیت میں بتایا ہے کہ ساری کائنات میں ملکیت اور اس میں اقتدار اللہ کا ہے۔ انسان کی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

حیثیت مالک کی نہیں مملوک کی ہے۔ اللہ نے نبوت کے ذریعے ایک مکمل علم و عمل انسان کو دیا ہے اور اس لیے دیا ہے کہ وہ اس علم و عمل کو خود اپنی زندگی اور اس کے معاملات کے لیے چراغ راہ بناتے اور دوسروں کو بھی اس کے مطابق چلانے کی کوشش کرے۔ اس کام کے لیے اسے کچھ اختیارات دیے گئے ہیں اور اسی مقصد کے حصول کے لیے کائنات خارجی اور اس کی لاتعداد قوتوں کو انسان کا خادم بنایا گیا ہے۔ انسان اس لیے نہیں ہے کہ وہ خارج کا غلام بن کر رہے۔ اس کا شرف و امتیاز یہ ہے کہ وہ خارج اور اس کی قوتوں پر اپنے ارادے کو موثر کرے اور جس کی مخلوق و مملوک ہے۔ اس کی ذات و صفات سے قرب پیدا کرے تاکہ اس کی ذات ذات الٰہی کا پرتو بن جاتے اور پھر چونکہ خدا کا بندہ ہونے کی حیثیت میں انسان کا کمال مطلوب یہ ہے کہ وہ ذات باری کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قرب پیدا کرے اس لیے اسے بھی دو گونہ قرب کا حامل ہونا چاہیے۔ ایک طرف تو اسے اپنے ماحول اور گرد و پیش میں ان سب چیزوں کو اللہ کا زیر فرمان بنانا چاہیے جن پر اسے اختیار ہے اور دوسری طرف اسے ارادے کو اپنے نفس و خواہشات پر حکمران بنانا چاہیے تاکہ وہ بے قیدی اور بے عنانی سے آلودہ نہ ہو۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ ۗ وَلَوْ آمَنَ أَهْلُ الْكِتَابِ لَكَانَ خَيْرًا لَهُمْ ۚ مِنْهُمُ الْمُؤْمِنُونَ وَأَكْثَرُهُمُ الْفَاسِقُونَ ۝

وہ بہترین اُمت تم ہی ہو جسے انسانوں کی قیادت اور رہنمائی کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔[۲۰۲] تم نیکی کا حکم دیتے ہو، بُرائی سے روکتے ہو۔[۲۰۳] اور اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔[۲۰۴] یہ اہلِ کتاب اگر ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ ان میں سے کچھ ایمان والے ہیں مگر ان میں بیشتر نافرمان ہیں۔[۲۰۵]

اسلام کی مخصوص حیثیت کا مخصوص تقاضا

یہ بات بتا دینے کے بعد کہ اسلام نام ہے نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے وابستہ ہو جانے اور چمٹ جانے کا۔ اور اس سے جُدائی عذاب عظیم کو دعوت دینا ہے۔ اس علم و عمل کا ظہور خالق کائنات کی جانب سے بندوں کے لیے رحمت کا ظہور ہے۔ اور اس کائنات کے سارے مالکانہ حقوق اللہ کو حاصل ہیں اور اس میں ہونے والے معاملات کا مرجع اللہ کی ذات ہے ایک ایسا مسئلہ سامنے آ گیا ہے جس کی وضاحت ضروری ہے کہ اگر حقیقت یہی ہے تو ضروری ہے کہ لے دُنیا کے گوشے گوشے تک

پہنچنا چاہیے اور برابر پہنچتے رہنا چاہیے۔ قوم قوم کے سامنے اس کی وضاحت ہونی چاہیے اور یہ اہم ہوتی رہنی چاہیے۔ فرد فرد کو اس کا پیغام دیا جانا چاہیے ورنہ دُنیا اس کو پہچان نہ سکے گی۔ یہ ایک عظیم اہمیت کا مسئلہ ہے۔ اگلی کا جواب شیخ الاسلام کی زبانی سنیے :

گزشتہ رکوع میں فرمایا تھا یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ، درمیان میں اسی کے مناسب کچھ اوامر و نواہی اور وعدہ وعید آگئے۔ یہاں سے پھر اسی اول مضمون کی تکمیل کی جاتی ہے۔ یعنی اے مسلمانو! اللہ تعالیٰ نے تم کو تمام اُمتوں میں بہترین اُمت قرار دیا ہے۔ اس کے علم ازل میں پہلے یہی مقدر ہو چکا تھا جس کی خبر بعض انبیاء سابقین کو بھی دی گئی تھی کہ جس طرح نبی آخر الزمان محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام نبیوں سے افضل ہوں گے۔ آپ کی اُمت بھی جملہ اُمم و اقوام پر گوئے سبقت لے جائے گی۔ کیونکہ اس کو سب سے اشرف و افضل پیغمبر نصیب ہوگا، اودم و اکمل شریعت ملے گی۔ علوم و معارف کے دروازے اس پر کھول دیے جائیں گے۔ ایمان عمل و تقویٰ کی تمام شاخیں اس کی محنت اور قربانیوں سے سرسبز و شاداب ہوں گے۔ وہ کسی خاص قوم و نسب یا مخصوص ملک و قوم میں محصور نہ ہوگی۔ بلکہ اس کا دائرہ عمل سارے عالم کو اور انسانی زندگی کے تمام شعبوں کو محیط ہوگا۔ گویا اس کا وجود ہی اس لیے ہوگا کہ دوسروں کی خیر خواہی کرے اور جہاں تک ممکن ہو انہیں جنت کے دروازے پر لا کر کھڑا کر دے۔ اخرجت للناس میں اسی طرف اشارہ ہے، یوں سمجھ لو اس سورت کے نویں رکوع میں واذ اخذ اللہ میثاق النبیین سے نبی کریم کی امامت و جامعیت کبریٰ کا بیان ہوا تھا۔ دسویں رکوع میں ان اول بیت وضع للناس سے اس اُمت کے قبلہ کی برتری دکھلائی گئی تھی۔ گیارھویں میں واعتصموا بحبل اللہ جمیعاً سے اس اُمت کی کتاب و شریعت کی مضبوطی کا اظہار فرمایا۔ اب یہاں بارھویں رکوع کے آغاز سے دوسری اُمتوں کے مقابلے میں خود اُمت مرحومہ کی فضیلت و عظمت بیان ہو رہی ہے[1]

جماعتی نصب العین

۲۰۲ ۔ وہ بہترین اُمت تم ہی تو ہو جسے انسانوں کی قیادت کے لیے وجود میں لایا گیا ہے۔ تمام اُمتوں میں بہتر اُمت کہہ کر اس اصل عظیم کی طرف اشارہ کر دیا کہ مسلمانوں کا جماعتی نصب العین یہ نہیں قرار دیا گیا کہ وہ طاقتور قوم بنیں یا سب سے برتر گروہ ہوں کیونکہ طاقت اور برتری میں جماعتی گھمنڈ اور

[1] افادات شیخ الاسلام

قومی حرص و آز کا لگاؤ تھا اور یہ بات انسانیت کے امن و سلام اور مساوات و اخوت کے منافی تھی۔ بس صرف خیر اور بہتر ہونے پر زور دیا گیا جس کی تمام تر روح اخلاقی اور معنوی محاسن پر مبنی ہے جس جماعت کا یہ نصب العین ہو گا کہ وہ سب سے اچھی اور نیک ہو وہ کسی مادی طاقتوں کے غرور اور قومی نخوت و برتری کے مفاسد سے آلودہ نہیں ہو سکتی۔ له

یہ تعبیر صاف بتا رہی ہے کہ یہ اُمت صرف اسی طرح کی ایک اُمت نہیں ہے جس طرح کی اُمتیں اب تک وجود میں آتی رہی ہیں بلکہ ایسی اُمت ہے جو باقی ساری نوع انسانی کی ہادی اور پوری انسانیت کی پاسبانی بنا کر روانہ کی گئی ہے اخرجت للناس کے ساتھ لفظ خیر بتا رہا ہے کہ ان میں انسانیت کی اپنے تمام گوشوں اور محاسن کے ساتھ نمود تھی۔ اخلاقی اور اعلیٰ روحانی تربیت عجیب و غریب اعتدال اور غیر معمولی جامعیت جس کی مثال تاریخ میں کم ملتی ہے ان میں درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی۔ اور پھر مکمل مادی تیاری اور وسیع عقل کی بنا پر ان کے لیے ممکن تھا کہ وہ انسانی گروہ کو اس کے اعلیٰ روحانی و اخلاقی اور مادی مقصد و کمال تک پہنچا سکیں۔ ان میں ہر پہلو خیر ہی کا حامل تھا۔ زبان نبوت نے جس دور کو خیر القرون کہا ہے اس کی خیریت کا تمام تر تعلق دور والوں سے ہے۔ مکان اور زماں کی خیریت کا رشتہ اہل زماں اور اہل مکان سے وابستہ ہے۔ ہمیں تاریخ میں ایسے دور کا علم نہیں جو تمام حیثیتوں سے مکمل اور کامیاب خیریت کا دور ہو۔ خلافت راشدہ کا دور ہی ایسا دور ہے جس میں انسانیت کے لیے خیر ہی خیر تھی۔ اس دور میں روحانی و اخلاقی، دینی و علمی وسائل سے تہذیب خیر اور تمدن خیر کے وجود میں لانے میں ایک دوسرے کے مددگار رہتے، اس دور میں حکومت میں خیر تھی اور حکومت اپنی تمام سیاسی و مادی قوت کے ساتھ جو تمام معاصر قوتوں سے فائق و برتر تھی۔ اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دیتے تھے، اور اخلاقی تعلیمات زندگی اور نظام حکومت کے لیے میزان کا درجہ رکھتی تھیں۔ تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاق اور فضیلت بھی اپنے عروج پر تھی۔ فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق و روحانیت کی ترقی بھی جاری تھی۔ یہ نتیجہ تھا ان کے خیر اُمت ہونے کا اور ان کے عقیدے اور تربیت کا۔ اس لیے کہ وہ جہاں اور جس حال میں ہوتے دین و اخلاق میں خیر کا نمونہ اعلیٰ تھے، وہ حکام کی حیثیت میں ہوتے یا معمولی کارکنوں کی پولیس کی حیثیت میں یا فوج کی ہمیشہ محتاط پاک دامن، دیانتدار،

له ترجمان القرآن

امانت شعار، خداترس اور سراپا خیر ہوتے ۔

دُنیا کے بارے میں اسلامی نقطۂ نظر

وہ اس عالم کو اللہ کی مملکت سمجھتے تھے جس میں اللہ نے بحیثیت مسلمان کے اہلِ زمین کا نگران اور اتالیق مقرر کیا تھا۔ ان کو حکم تھا کہ خیر بن کر رہیں اور پوری انسانیت کے مفاد کو سوچیں۔ خیر کے نقطہ سے ان کو سمجھایا گیا تھا کہ ان کا فرض ہے کہ وہ پورے عالم کی رفتار سیرت واخلاق اور رجحانات کا جائزہ لیتے رہیں، جو راہِ راست سے منحرف ہو جاتے اس کو صراطِ مستقیم پر لگائیں۔ جو اعتدال سے بڑھ جاتے اس میں اعتدال پیدا کریں۔ کجی کو دُور کرتے رہیں، رخنوں کو بھرتے رہیں۔ کمزور کو طاقتور سے اس کا حق دلائیں۔ مظلوم کا ظالم سے انصاف کرائیں اور خدا کی زمین میں نبوت کا لایا ہوا علم و عمل قائم کریں، وہ روٹی کے نام پر نہیں، وطن کے نام پر نہیں، پیسہ کے نام پر نہیں، رنگ اور نسل کے نام پر نہیں اور زبان کے نام پر نہیں بلکہ صرف اور صرف اعتصام بحبل اللہ کے نام پر انسانیت کو بلائیں۔

اُمت کی خاص ذمہ داری

۲۰۳۔ تم نیکی کا حکم دیتے ہو برائی سے روکتے ہو۔ "منکر"، بُرے کاموں میں کفر، شرک، بدعات، رسوم قبیحہ، فسق وفجور اور ہر قسم کی بداخلاقی اور نامعقول باتیں شامل ہیں۔ ان سے روکنا بھی کئی طرح کا ہے، کبھی زبان سے کبھی ہاتھ سے، کبھی قلم سے کبھی تلوار سے، غرض ہر قسم کا جہاد اس میں داخل ہے۔ یہ صفت جس قدر عموم اور اہتمام سے اُمتِ محمدیہ میں پائی گئی۔ پہلی اُمتوں میں اس کی نظیر نہیں ملتی [1]

اس سے معلوم ہوا کہ پچھلی اُمتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی تھیں اور وہ یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کریں تو اُمتِ مسلمہ اس عام ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ایک خاص ذمہ داری اور بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ پوری دُنیا کے سامنے نیکی کا حکم کرے اور بُرائی سے منع کرے اور یہ کام اسی طرح کرے جس طرح کرنے کا حق ہے اور جس کا عملی نمونہ اس کا رسُول اس کے سامنے رکھ گیا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

دراصل اس موضوع پر صورتِ واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پوری دُنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی تھے لیکن اس عالمگیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی عملی شکل اللہ تعالیٰ نے یہ متعین فرمائی ہے کہ آپ اپنا قائم مقام ایک ایسا گروہ تیار کریں جو اپنے ایمان میں اتنا پختہ اور اپنے عمل میں اتنا معیاری مسلم ہو کہ آپ کے بعد آپ ہی کی طرح امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دے۔ اس طرح حقیقت واقعی برقرار باقی ہے کہ آپ کی بعثت اہلِ عرب کی طرف تو براہِ راست تھی مگر باقی دُنیا کی طرف اس اُمت کے توسط سے تھی جسے آپ تیار کر گئے تھے اور جو نسلاً بعد نسلٍ تیار ہوتی رہے گی۔ اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد اب قیامت تک یہ کام اس اُمت کا ہے کہ دُنیا کے سامنے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیتی رہے مختصر یہ کہ یہ اُمت اپنے مجموعی وجود میں اپنے پیغمبر کی قائم مقام ہے اور بحیثیت اُمت اس کی زندگی کا مشن وہی ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا تھا۔

اُمتِ مسلمہ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ یہی اس کے وجود کا کل مقصد بن جاتی ہے۔ یہ ارشاد کہ تمہارا کام نیکی کا حکم دینا اور برائی سے روکنا ہے۔ اس اُمت کی حیثیت صاف طور پر بھی مقرر کرتا ہے یہی اس کے وجود کا پہلا اور آخری مقصد ہے۔ کسی چیز کی قدر و قیمت اسی وقت تک باقی رہتی ہے جب تک وہ اپنے وجود کے مقصد کو پورا کرتی ہے۔ اس مقصد سے بے تعلق ہو جانے کے بعد وہ اپنی ساری اہمیت کھو دیتی ہے۔ اس لیے اُمتِ مسلمہ کی اصل قدر و قیمت یعنی اس کا خیر اُمت ہونا امر بالمعروف، نہی عن المنکر پر موقوف ہے۔ وہ خیرِ اُمت فی الواقع اس وقت تک ہے جب دُنیا کے سامنے اپنا یہ فرض ادا کرتی رہتی ہے۔ یعنی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی اس اُمت کے خیرِ اُمت ہونے کی علت ہے۔ امام رازی نے یہاں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے۔

> یہ ایک نئی بات ہے اور اس کا مقصد اُمت کے خیرِ اُمت ہونے کی علت بتانا ہے۔ پہلے آپ بولتے ہیں رشید نیک ہے وہ لوگوں کو کھانا کھلاتا اور کپڑے پہناتا ہے یعنی کھانا کھلانا اور کپڑے پہنانا رشید کے نیک ہونے کی علت ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ علم الاصول میں یہ بات واضح طور پر سامنے آچکی ہے کہ اگر حکم کسی صفت کے ساتھ مل کر آتا ہے تو وہ صفت اس حکم کی علت ہوتی ہے۔ اس آیت میں اللہ پاک نے اس اُمت کے خیرِ اُمت ہونے کا اعلان کیا ہے اور اعلان کے ساتھ یہ حکم بھی بتایا ہے کہ اس کا کام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ

اُمت کے خیرِ اُمت ہونے کی علت امر بالمعروف نہی عن المنکر اور ایمان ہے[1]

اس کا واضح لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اُمتِ مسلمہ اس وقت خیرِ اُمت کہلانے کی مستحق ہے جب وہ بحالت ایمان امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے فریضہ کو انجام دے۔ اور اگر وہ اس فریضہ کو انجام نہ دے گی تو خیرِ اُمت کے استحقاق سے محروم ہو جائے گی بلکہ حد یہ ہے کہ وہ اپنے اصل نام مسلم تک کی مستحق نہ ہو گی۔ کیونکہ اس کا یہ نام محض ایک نام نہیں بلکہ صفاتی نام ہے اور اسے مخصوص طور پر صرف اس لیے ملا ہے کہ اس کی مسلمانہ ذمہ داریاں دوسری اُمتوں کے مقابلے میں دوہری ہیں۔ سورۂ حج میں ان الفاظ کو غور سے پڑھیے۔

هو اجتباكم وما جعل عليكم في الدين من حرج
ملة ابيكم ابراهيم هو سمّٰكم المسلمين من
قبل وفي هذا ليكون الرسول شهيدا عليكم و
تكونوا شهداء على الناس ط

اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے۔ اپنے باپ ابراہیم کے راستہ کی پیروی کرو۔ اس نے پہلے ہی سے تمہارا نام مسلم رکھا ہے تاکہ رسول تمہارے لیے دین حق کا گواہ ہو اور تم دوسرے تمام لوگوں کے لیے گواہ ہو جاؤ۔

اس آیت میں اُمتِ مسلمہ کی مخصوص حیثیت اور اس کی مخصوص ذمہ داری دونوں چیزوں کو اجاگر کر دیا ہے۔ سب سے پہلے اجتباکم کو غور سے دیکھئے۔ یہ لفظ عام طور سے قرآن حکیم میں انبیاء کے لیے بولا گیا ہے ایک ایسا لفظ جو عموماً منصبِ نبوت کے لیے بولا گیا ہو اسے اگر ایک اُمت کے لیے بھی استعمال کیا گیا ہے تو یہ اُمت کے کارِ نبوت کے حامل ہونے کی کھلی نشانی ہے۔ اس کے بعد هو سمّٰكم المسلمين من قبل پر غور فرمایئے کہ خاص طور پر اسی اُمت کا نام مسلم رکھا ہے اور آج نہیں بلکہ مدتوں پہلے اسے یہ خطاب عطا ہو چکا تھا یہ اس اُمت کے ممتاز اور غیر معمولی حیثیت کے مالک ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ اس کے یہ معنے ہیں کہ جس طرح نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت آپ کی آمد سے ہزاروں سال پہلے ہی دی جا چکی تھی

---

[1] مفاتیح الغیب

اور دُنیا میں بشارت کے ظاہر ہونے کے لیے ایک مدت سے انتظار میں تھی۔ کچھ ایسا ہی معاملہ آپ کی اُمت کا بھی تھا۔ ابھی اس کے وجود میں آنے کے لیے شب و روز کی ہزاروں لاکھوں گردشیں باقی تھیں مگر اس کے نام کا اس کے کام کا اور اس کے اوصاف کا پہلے ہی اعلان کر دیا گیا تھا۔

ایمان کا ناگزیر تقاضا

۲۰۴ ۔ اور اللہ پر ایمان رکھتے ہیں۔ اس کی توحید پر، اس کے رسولوں پر اور کتابوں پر ایمان لانا بھی اس میں داخل ہے۔ اور سچ تو یہ ہے کہ توحید خالص و کامل کا اتنا شیوع و اہتمام کبھی کسی اُمت میں نہیں رہا جو بحمد للہ اس اُمت میں رہا ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے فرمایا جو شخص تم میں سے چاہتا ہے کہ اس اُمت خیر الامم میں شامل ہو اسے چاہیے کہ اللہ کی شرط پوری کرے یعنی امر بالمعروف نہی المنکر اور ایمان باللہ جس کا حاصل ہے خود دُرست ہو کر دوسروں کو دُرست کرنا، یہ شان حضرات صحابہ کی تھی [1]

مطلب یہ ہے کہ اس اُمت کی خیریت جن اُمور کے ساتھ وابستہ کی گئی ہے ان سب میں ایمان باللہ کی صفت ہے اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر اس کا ناگزیر تقاضا اور لوازم ہیں۔ اسلام میں ایمان کی علامت صرف پیشانی پر نماز کا نشان، ہونٹوں پر روزوں کی خشکی اور بروقت زکوٰۃ کی ادائیگی قرار نہیں دی گئی بلکہ اس کی ایک بڑی علامت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ایمان باللہ اور امر بالمعروف میں بڑا گہرا ربط ہے۔ ایمان صرف ان اعمال کے ادا کرنے سے پایہ کمال کو نہیں پہنچتا جن سے ایک انسان کی صرف ذاتی تکمیل ہوتی ہے بلکہ اس کا معیار وہ اعمال ہیں جن سے پورے عالم کے نفوس کی تکمیل ہوتی ہے۔ اس اُمت کی تخلیق کا منشا صرف اپنے کمالات علمیہ وعملیہ کی تکمیل نہیں بلکہ عالم کی تمام مخلوقات کی تکمیل کی ذمہ داری بھی اسی کے سر ہے اور یہی اس کا طغرائے امتیاز ہے اور اسی بنا پر اسے تمام اُمتوں پر فضیلت دی گئی ہے۔ یہی چیز اسلام کو رہبانیت سے ممتاز کرتی ہے۔ رہبانیت صرف ذات کی تکمیل چاہتی ہے جب کہ اسلام صرف ذات کی نہیں بلکہ عالم کی تکمیل کا علمبردار ہے۔

ایک یورپین نومسلم عالم نے اسلام کے اس امتیاز کو بڑی خوبی سے بیان کیا ہے اس کا اقتباس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نامناسب نہ ہوگا

"اسلام عیسائیت کی طرح دُنیا کے متعلق بُری رائے نہیں رکھتا۔ اس کی تعلیم ہے کہ ہم دنیوی زندگی کی قدر و قیمت میں موجودہ مغربی تہذیب کی طرح مبالغہ نہ کریں۔ عیسائیت دُنیاوی زندگی کی مذمت کرتی ہے اور اس سے نفرت رکھتی ہے۔ موجودہ یورپ عیسائی رُوح کے خلاف زندگی پر ایسا گرتا ہے جیسے بوالہوس کھانے پر وہ اس کو نگلتا تو ہے مگر اس کی عزت کرنا نہیں جانتا۔ اسلام ان دونوں کے برعکس زندگی کو سکون و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ زندگی کی پرستش نہیں کرتا ہے بلکہ ایک بلند تر زندگی کے سفر کی ایک ضروری منزل سمجھتا ہے جس سے گزر جاتا ہے۔ اس بنا پر انسان کو اس کی تحقیر اور اپنی اس دنیوی زندگی کی بے وقعتی نہ کرنی چاہیے۔ زندگی کے سفر میں ہمارا اس دنیا سے گزرنا ضروری اور اللہ کے یہاں مقدر ہو چکا ہے۔ پس انسان کی زندگی اپنی پوری قیمت رکھتی ہے لیکن ہم کو یہ نہیں سوچنا چاہیے کہ وہ محض ایک واسطہ اور آلہ ہے اور اس کی قیمت اس سے زیادہ نہیں جو ایک واسطہ اور آلہ کی ہوتی ہے۔ اسلام اس مادہ پرستانہ نظریہ کا روادار نہیں جس کا نعرہ ہے کہ میری سلطنت بھی دُنیا ہے اور نہ وہ عیسائیت سے متفق ہے جو زندگی کی تحقیر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ دُنیا میری سلطنت نہیں، اسلام کی راہ ان دونوں کے درمیان ہے"

مادی ترقی و خوشحالی نہ مقصود بالذات ہے اور نہ ناپسندیدہ۔ ہماری ساری کوششوں اور جدوجہد کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ایسے انفرادی و اجتماعی حالات پیدا ہو جائیں اور ایسا ماحول قائم ہو جائے اور اگر موجود ہے تو ہم اس کو باقی رکھیں جو انسان کی اخلاقی طاقت کی ترقی میں مددگار ہو۔ اس اصول کے مطابق اسلام مسلمانوں میں ہر چھوٹے بڑے کام کے موقعہ پر اخلاقی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اسلام کا مذہبی نظام انجیل کی اس تقسیم کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ قیصر کا حق قیصر کو دے دو اور اللہ کا حق اللہ کو دو۔ اس لیے کہ اسلام ہماری زندگی کی ضروریات کو اخلاق و اعمال کی قسموں میں تقسیم کرنے کا روادار نہیں۔ اس کے نزدیک انتخاب کا ایک ہی حق ہے وہ یہ کہ انسان یا تو حق کو اختیار کر لے یا باطل کو۔ اس کے نزدیک درمیانی چیز کوئی نہیں ہے وہ عمل پر اس لیے زور دیتا ہے کہ وہ اخلاق کا ایک لازمی جزو ہے۔ اسلامی تعلیمات کی رُو سے ہر فرد مسلم کو اپنے آپ کو ماحول اور اس کے گرد و پیش کے واقعات کا شخصی طور پر جواب دہ سمجھنا چاہیے۔ اور اپنے تئیں دینی جد و جہد کے لیے مامور اور ہر وقت ہر سمت میں حق کے قیام اور باطل کے زوال کا ذمہ دار تصور کرنا چاہیے قرآن میں ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر

وتومنون باللہ لے

ایمان کی قید اور اس کی تاخیر کی وجہ

یہ بات بہت زیادہ قابلِ غور ہے کہ جب ایک انسان کے ذاتی کمال کے لیے قوتِ ایمانی کی ضرورت ہے تو اس اُمت کے لیے جس کو یہ دعوت دی گئی ہو کہ وہ تمام دُنیا کی طاقتوں کو چیلنج دے کر ان کی نفسیاتی اور اخلاقی تکمیل کرے، کتنے عزم اور کتنی قوت کی ضرورت ہوگی۔ ایمان باللہ کے بغیر یہ کام ہو نہیں سکتا۔ یہ صفت جتنی کامل ہوگی مسلمان اتنا ہی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے لیے بے تاب ہوگا۔ اگر بدنصیبی سے وہ اس بے قراری سے خالی ہو چکا ہے تو جب تک اس میں نورِ ایمانی کا ذرہ موجود ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ اس کا دل احساسِ ناگواری سے خالی نہ ہو۔ اگر اس میں یہ احساسِ ناگواری بھی نہیں تو پھر سمجھنا چاہیے کہ اس میں غیرتِ ایمانی کا کوئی شائبہ بھی نہیں۔ صحیح مسلم کی اس حدیث کا مطلب یہی ہے جس میں فرمایا ہے کہ اس کے بعد ایمان کا ایک رائی کے دانہ کے برابر بھی حصہ نہیں ہے۔

امام رازی نے اس سوال کا جواب اچھا لکھا ہے کہ اگر ایمان ساری طاقتوں کے لیے بنیاد و اساس ہے تو پھر اس کو آخر میں کیوں لایا گیا؟ جواب یہ دیا ہے کہ ایمان باللہ تمام اُمتوں میں ایک قدرِ مشترک کی حیثیت رکھتا ہے اور سب ایمان باللہ کے مدعی ہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے دوسری اُمتوں کے مقابلہ میں مسلمانوں کی خیریت کا اعلان کیا اور اس کی علت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قرار دی۔ صرف ایمان کو اس کی علت نہیں بتایا، بعد میں ایمان لانے کی وجہ یہ ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے خیریت کی علت ہونے اور اُمت کی خیریت میں اس کے موثر ہونے کے لیے ایمان شرط ہے۔ اگر ایمان نہ ہوگا تو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں بالذات یہ صلاحیت نہیں ہے کہ وہ اُمت کی خیریت کی علت بن سکیں۔ اور مفتی محمد عبدہ مصری نے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ ایمان کی تاخیر یہ بتانے کے لیے کی گئی ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہی ایمان کے محافظ اور پاسبان ہیں۔ ارشادِ نبوت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ اگر امر بالمعروف اور نہی عن المنکر قلب کی ناگواری کے درجے میں بھی نہ ہے تو پھر سمجھ لو کہ ایمان کا رائی برابر بھی حصہ نہیں ہے۔ اور علامہ رشید رضا فرماتے

لے انسانی دُنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

ہیں کہ اس میں اہلِ کتاب پر لطیف طنز ہے کیونکہ وہ مدعیٔ ایمان ہونے کے باوجود امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام نہ دیتے تھے۔ ایمان کا تو ان کا بھی دعویٰ تھا۔ امر بالمعروف کو پہلے لاکر بتا دیا کہ تمہارا ایمان صحیح نہیں کیونکہ نتائج ایمان ناپید ہیں۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لیے نخلِ ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل سے ہی ہو سکتی ہے۔ اگر ایک گروہ ہمیں امنا باللہ والیوم الاخر کہتا ہوا نظر آتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس ایمان کے مطابق کوئی بہتر تغیر نظر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان نے اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بار پیدا نہیں کیا ہے۔

اہلِ کتاب سے خیر امت میں شامل ہونے کا مطالبہ

۲۰۵ - یہ اہلِ کتاب اگر ایمان لے آتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ یعنی اگر اہلِ کتاب ایمان لے آتے تو وہ بھی اس خیر الامم میں شامل ہو جاتے جس سے دنیا میں عزت بڑھتی اور آخرت میں دوہرا اجر ملتا۔ مگر افسوس ہے ان میں سے چند افراد کے سوا مثلاً عبداللہ بن سلام یا نجاشی وغیرہ کسی نے حق قبول نہیں کیا باوجود وضوحِ حق کے نافرمانی ہی پر اڑے رہے۔[1]

گویا اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ اگر یہود و نصاریٰ سے ایمان و ہدایت کی روح مفقود نہ ہو گئی ہوتی تو وہ آج اس نعمتِ خیر و برکت کے مستحق ہوتے لیکن ان کی بڑی تعداد استعدادِ ایمانی سے محروم ہو گئی۔[2]

یہاں یہ غلط فہمی نہ ہو کہ قرآن اہلِ کتاب کے یہودی اور عیسائی ہونے ہوئے ان میں کچھ کے ایماندار ہونے کا اقرار کر رہا ہے۔ شارحینِ قرآن کا یہ کہنا بالکل صحیح ہے کہ المؤمنون سے وہ اہلِ کتاب مراد ہیں جنہوں نے اسلام قبول کر لیا تھا اور لَوْ اٰمَنَ سے جس ایمان کی توقع باندھی جا رہی ہے وہ وہی ایمان ہے جس کا قرآن نے فان آمنوا بمثل ما امنتم بہ میں مطالبہ کیا ہے۔ یہود و نصاریٰ اور اہلِ کتاب کو تعلیماتِ نبوت کی طرف دعوت اسی ہدایت کے پالینے کے لیے جو اسلام یعنی انبیاء کے دینِ ازلی سے عبارت ہے اور جس کو لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے ہیں۔ اس کے بغیر ان کو ہدایت نہیں ہو سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ یہود و نصاریٰ کو نبوتِ محمدی کی دعوت

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] ترجمان القرآن

جہاں دی گئی ہے ہدایت کی بشارت بھی سنائی گئی ہے چنانچہ تیسرے پارے میں پڑھ چکے ہو۔

قل للذین اوتوالکتاب والامیین ءَاسلمتم فان اسلموا فقد اھتدوا۔

اے پیغمبر ان سے جن کو کتاب دی گئی اور عرب کے جاہلوں سے کہہ دو کہ کیا تم اسلام لے آتے ہو اگر وہ اسلام لے آئے تو انہوں نے سیدھی راہ پالی۔

اس لیے آیت میں المؤمنون سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جن میں استعداد ایمانی موجود تھی اور جنہوں نے محمد رسول اللہ کی نبوت کی دعوت پر لبیک کہی نہ کہ ان یہودیوں اور عیسائیوں کی جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے اور انہوں نے دعوت نبوت کو قبول نہیں کیا تھا۔ اگر ایسا ہو تو قرآن کا یہ مطالبہ آمنوا بما انزلت مصدقا لما معکم بے معنے ہو کر رہ جاتا ہے۔

شارحین قرآن نے یہاں المؤمنون سے عبداللہ بن سلام اور وہ تمام یہودی مراد لیے ہیں جو اسلام کی نعمت سے مالامال ہوگئے تھے۔ قرآن و سنت میں یہ بات واشگاف الفاظ میں واضح کردی گئی ہے کہ دین محمدی کا قبول کرنا تمام انسانوں پر اس لیے ضروری ہے کہ وہ دین ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیروؤں کی تحریف و تصرف سے برباد ہوگیا تھا اسی کو نبوت محمدی لے کر آئی ہے۔ اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کا نبی خاتم النبیین، اس کا دین کامل دین اور اس کا صحیفہ تمام صحف الہی پر مہیمن اور حاوی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے۔

لَنْ يَّضُرُّوْكُمْ اِلَّآ اَذًى ۭ وَاِنْ يُّقَاتِلُوْكُمْ يُوَلُّوْكُمُ الْاَدْبَارَ ۣ ثُمَّ لَا يُنْصَرُوْنَ ﴿١١١﴾
ضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الذِّلَّةُ اَيْنَ مَا ثُقِفُوْٓا اِلَّا بِحَبْلٍ مِّنَ اللّٰهِ وَحَبْلٍ
مِّنَ النَّاسِ وَبَاۗءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰهِ وَضُرِبَتْ عَلَيْهِمُ الْمَسْكَنَةُ ۭ
ذٰلِكَ بِاَنَّھُمْ كَانُوْا يَكْفُرُوْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَيَقْتُلُوْنَ الْاَنْۢبِيَاۗءَ
بِغَيْرِ حَقٍّ ۭ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ﴿١١٢﴾

تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے زیادہ سے زیادہ کچھ اذیت پہنچا
سکتے ہیں اور اگر یہ تم سے لڑیں گے تو میدانِ مقابلہ میں پیٹھ ہی
دکھلائیں گے پھر ان کو کہیں سے مدد نہ ملے گی[۲۰۶]۔ یہ جہاں بھی
تھے ان پر ذلّت کی مار پڑی الّا یہ کہ کہیں اللہ کے عہد یا انسانوں
کے عہد سے پناہ[۲۰۷] مل گئی۔ یہ اللہ کے غضب میں آ گئے محتاجی
اور بدحالی میں مبتلا[۲۰۸] ہو گئے۔ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ کی آیتوں کا
انکار کرتے تھے اور انبیائؑ کے ناحق قتل میں دلیر[۲۰۹] تھے۔ یہ

ان کی نافرمانیوں اور سرکشیوں کا انجام ہے[۲۱۰]۔

خیرِ اُمت ہونے کے نتائج

یہ آیت قرآنی اپنے موقعہ کے لحاظ سے بہت گہری معنویت کی حامل ہے ۔ اگرچہ بظاہر پیوند کرتی نہیں مگر انتہائی مربوط ہے ۔ یوں سمجھو کہ پہلے رکوع میں جو کچھ بتایا گیا ہے وہ اگر شرط ہے تو یہ اس کی جزا ہے وہ اگر مقدمات ہیں تو یہ اس کا نتیجہ ہے ۔ اس سے پہلی آیت میں اہلِ اسلام کو دوسری اُمتوں کے مقابلے میں "خیر اُمۃ" کا لقب دیا گیا ہے اور اس لقب کی اساس امر بالمعروف ، نہی عن المنکر اور ایمان کو قرار دیا ۔ ایمان کے تو سب مدعی ہیں مگر ایمان کے لوازم سے تہی دامن ہیں ۔ بتایا کہ اہل اسلام کے خیر اُمۃ ہونے کی وجہ ان میں ایمان کے ساتھ ایمان کے لوازم امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا علی وجہ الکمال ظہور ہے ۔ اس سے پہلے رکوع میں ایمان کے لوازم ایک ایک کر کے شمار کیے ۔

بات کا آغاز یہاں سے ہوا کہ تمہیں اہلِ کتاب میں سے کسی فریق کی ہرگز طاعت نہ کرنی چاہیے اگر ایسا کرو گے تو عظیم خطرہ کا شکار ہو جاؤ گے ۔ خطرہ یہ ہے کہ یردوکم بعد ایمانکم کافرین تمہیں ایمان کے باوجود کافر بنالیں گے ۔ پھر اس خطرہ سے بچنے کی مفصل تدبیر بتائی ہے کہ اجتماعی طور پر

اولاً زندگی کے تمام گوشوں میں رذائل سے بچ کر رہو

ثانیاً تمہارے دامن میں زیادہ سے زیادہ فضائل کا ذخیرہ ہو

ثالثاً اجتماعی طور پر تم انسانیت کے سامنے نبوت کے لاتے ہوئے علم و عمل کے علمبردار بن کر رہو

رابعاً تمہاری اجتماعی زندگی کے کسی گوشہ میں نبوت کے علم و عمل سے بیگانگی اور جدائی نہ ہو ۔

خامساً اجتماعی زندگی کا سارا شیرازہ اعتصام بحبل اللہ کی اساس پر قائم ہو ۔

سادساً جماعتی حیثیت سے تم دعوت الی الخیر کے علمبردار ہو

سابعاً امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمہارا جماعتی نشان ہو ۔

ثامناً نبوت کے علم و عمل سے جدا ہونے والوں کی تمہاری زندگی میں قطعاً کاپی نہ ہو ۔

ان سب باتوں کے ساتھ اگر تم دُنیا میں اچھائی کے پھیلانے اور بُرائی کو مٹانے کا کام ایمان کی اساس پر کرو گے تو تم خیر اُمت ہو ۔ اگر تم خیرِ اُمت بن کر رہے یعنی اگر تم زندگی کے تمام گوشوں میں

اجتماعی طور پر خدا سے ڈرتے رہے، اس کی نافرمانیوں سے بچ کر رہے اور تمہاری اجتماعی زندگی ایک مطیع و فرمانبردار کی رہی، زندگی کے تمام گوشوں میں نبوت کے علم و عمل سے وابستہ رہے اور اس سے بیگانے نہ ہوتے اور اجتماعی زندگی کا قوام تم نے اعتصام بحبل اللہ پر استوار کیا، اور اجتماعی طور پر اچھائی کے پھیلانے اور برائی کے مٹانے کو تم نے اپنا نصب العین قرار دیا —— تو پھر یاد رکھو کہ لن یضرکم الا اذی یہ اہل کتاب جو اپنی سازشوں سے تمہیں کافر بنانے کی فکر میں ہیں وہ تمہارا کچھ بھی نہیں بگاڑ سکیں گے سوائے اس کے کہ دل کے پھپھولے زبان کے کچوکوں سے نکال لیں اور بس۔ اگر تمہارا ان اوصاف کے زیور سے آراستہ ہو کر ان اہل کتاب سے مقابلہ ہوا تو میدان تمہارے ہاتھ میں ہوگا وہ ہزیمت سے دوچار ہوں گے۔ ان کی اب تک کی تاریخ یہ ہے کہ اپنی بدعملیوں اور سرکشیوں سے مغضوب الٰہی ہو رہے ہیں اور دنیا کا کوئی گوشہ نہیں جہاں اپنے بل بوتے پر زندگی بسر کر رہے ہوں۔ جہاں کہیں بھی پناہ ملی ذلت و نامرادی کی پناہ تھی۔ یعنی یا تو اہل کتاب ہونے کی وجہ سے لوگوں نے چھوڑ دیا ہے یا پھر حکمران قوموں نے محکومیت کے قول و قرار پر زندگی کی مہلت دی ہے۔ چنانچہ پہلی عرب میں تھی دوسری روم و ایران میں، لہٰذا کوئی وجہ نہیں کہ تم ان کی مخالفانہ سرگرمیوں سے اندیشناک ہو وہ ہزار سازشیں کریں ناکام ہوں گے بشرطیکہ تم خیر امت بنے رہے۔

یہودیوں کی ہزیمت کی پیشین گوئی

۲۰۶۔ تو وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے زیادہ سے زیادہ کچھ اذیت پہنچا سکتے ہیں۔ اور اگر تم سے لڑیں گے تو میدان مقابلہ میں تمہیں پیٹھ ہی دکھلائیں، پھر ان کو کہیں سے مدد نہیں ملے گی۔ یعنی اکثر ان میں نافرمان ہیں تو ہونے دو۔ تم کو ان کی اکثریت یا مادی ساز و سامان سے خوف کھانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اے خیر الامم خدا کا وعدہ ہے کہ یہ شیطانی لشکر تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا بشرطیکہ تم اپنے کو خیر الامم ثابت کرو۔ بس یہ اتنا ہی کر سکتے ہیں کہ زبان سے گالی دیں اور نامردوں کی طرح تم کو برا بھلا کہتے پھریں یا کوئی چھوٹی موٹی عارضی تکلیف پہنچائیں باقی تم پر غالب و مسلط ہو جائیں یا کوئی بڑا قومی نقصان پہنچا سکیں یہ کبھی نہ ہوگا۔ اگر لڑائی میں تمہارے مقابلہ میں آئے تو پیٹھ دکھا جائیں گے اور کسی طرف سے ان کو مدد نہ پہنچ سکے گی جو ان کی ہزیمت کو روک دے۔ یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی صحابہ رضی اللہ عنہم کے زمانہ میں یہودیوں

کا یہی حشر ہوا۔ اسلام اور مسلمانوں کی تباہی کے لیے انہوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا مگر بال بیکا نہ کر سکے جہاں مقابلہ ہوا حمرِ مستنفرہ کی طرح بھاگے ہر موقع پر اللہ کی نصرت و امداد خیر الامم کے شاملِ حال رہی۔ دشمن بدحواسی اور بے کسی کی حالت میں مقہور و مخذول ہو کر بھاگے یا قید ہوئے یا رعیت بن کر رہے یا جہنم میں پہنچ گئے۔ [1]

دراصل اذیٰ کے معنے دکھ اور تکلیف کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان کی جڑ کٹ چکی ہے ان کے اندر اب اتنا دم خم باقی نہیں ہے کہ تمہیں کوئی بڑا نقصان پہنچا سکیں بس زیادہ سے زیادہ جو یہ کر سکتے ہیں وہ یہ کہ اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کے لیے کچھ طعن و تشنیع، کچھ زبان درازی اور کچھ افترا پردازی و تہمت تراشی کر لیں اس سے زیادہ کا حوصلہ ان کے اندر نہیں ہے اور اگر یہ تم سے لڑنے کے لیے نکلے تو پیٹھ دکھائیں گے اور پھر ایسے ذلیل و خوار ہوں گے کہ کسی طرف سے بھی ان کی کوئی مدد نہیں ہو گی۔ بعد کے واقعات نے قرآن کی اس پیش گوئی کی حرف بحرف تصدیق کر دی۔ یہود سے پورے سات سال تک مقابلہ درپیش رہا۔ یہود عرب میں بڑی طاقت رکھتے تھے۔ تمام مالی کاروبار ان کے قبضہ میں تھا۔ ان کے پاس بکثرت دولت تھی۔ عربوں سے تہذیب و تمدن اور علوم و فنون میں علانیہ فائق تھے۔ ہر طرح کے سامانِ جنگ رکھتے تھے اور فنِ جنگ سے بھی کما حقہ واقف تھے۔ مدینہ سے لے کر حدودِ شام تک ان کے تجارتی قلعوں کی مسلسل قطاریں تھیں اور ادھر مسلمانوں کے پاس ان میں سے کوئی چیز نہ تھی۔ بایں حالات قرآن نے اعلان کیا کہ مسلمانو! اگر تم نے خیر الامۃ ہونے کی ذمہ داریاں پوری کیں تو ضروری ہے کہ

اولاً یہ تمہیں اپنے بڑے بڑے مضبوط قلعوں کے باوجود، بڑے بڑے خزانوں کے مالک ہونے کے باوجود ہرگز کوئی قابلِ ذکر نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔

ثانیاً اگر تم سے مقابلہ اور مقاتلہ کی نوبت آئی تو ہرگز غلبہ نہ پا سکیں گے بلکہ الٹی شکست کھا کر بھاگیں گے۔

ثالثاً، یہ کہ عرب کے جن قبائل کی حمایت کا ان کو غرہ ہے ان میں سے کوئی ان کی مدد کو نہ آئے گا اور نہ مدینہ کے منافقین ہی ان کے کام آئیں گے۔

تاریخ گواہ ہے کہ تینوں پیش گوئیاں حرف بحرف پوری ہوئی ہیں۔ یہ ایک طرف نبوت کی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

صداقت کی دلیل ہے تو دوسری طرف اس بات کی کھلی شہادت ہے کہ پوری جماعت صحابہ نے خیرالامۃ ہونے کی ان تمام ذمہ داریوں کو انجام دیا جو یہاں قرآن نے قوانین کی صورت میں پیش کی ہیں۔ کتاب اللہ اور رسول اللہ کی رہنمائی میں ان کی تربیت ہوئی۔ کتاب اللہ برابر ان کے دلوں کو طاقت اور گرمی بخشتی رہی۔ رسول اللہ کی مجلسوں سے ان کو استحکام، خواہشاتِ نفس پر قابو، رضائے الٰہی کی سچی طلب اور اس کی راہ میں اپنے کو مٹانے کی عادت، جنت سے عشق، علم کی حرص، دین کی سمجھ اور احتسابِ نفس کی دولت حاصل ہوئی وہ لوگ چستی و سستی میں رسول اللہ کی اطاعت کرتے، جس حال میں ہوتے خدا کی راہ میں کھڑے ہو جاتے۔ ان کے لیے دنیا سے بے تعلقی آسان ہو گئی تھی۔ اہل وعیال کے مصائب برداشت کرنے کے عادی بن گئے تھے۔ قرآن کی آیات وہ بے شمار احکام لائیں جن کے وہ مانوس نہ تھے۔ وہ لوگ مع اپنے قلوب کے مع اپنے ہاتھ پاؤں کے مع اپنی روحوں کے اسلام کے دامن میں آگئے۔ رسول اللہ نے کسی فیصلہ پر ان کو کبھی قلبی یا ذہنی کش مکش پیش نہ آئی۔ جس بات کا آپ فیصلہ فرما دیتے ذرا اختلاف کی گنجائش باقی نہ رہتی۔ یہ وہ لوگ تھے جن کو ان کے افکار و اعمال، اخلاق اور احوال کی بنا پر قرآن نے خیرالامۃ کا لقب دے کر جہان کی قیادت ان کے سپرد کی۔ گویا جب شیطان کے اثرات ان کے نفوس سے زائل ہو گئے بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ جب ان کے نفوس کے اثرات خود ان سے دور ہو گئے، نفسانیت کا خاتمہ ہو گیا۔ دنیا میں رہتے ہوئے آخرت اور نقد سودے کے بازار میں آخرت کے قرض کو دنیا کے نقد پر ترجیح دینے لگے نہ کسی مصیبت سے گھبراتے نہ کسی نعمت پر اتراتے، فقر ان کی راہ میں رکاوٹ نہ بنتا، دولت سرکشی پیدا نہ کرتی، تجارت غافل نہ کرتی، کسی طاقت سے نہ دبتے، اللہ کی زمین پر اکڑنے کا خیال بھی نہ آتا۔ بگاڑ اور تخریب کا وہم بھی نہ ہوتا۔ لوگوں کے لیے وہ میزان عدل تھے۔ وہ انصاف کے علمبردار تھے۔ اللہ سبحانہٗ کے گواہ تھے۔ اللہ نے اپنی زمین کو ان کے قدموں میں ڈال دیا اور دنیا کو ان کے لیے مسخر کر دیا۔ وہ عالم کے محافظ اور اللہ کے داعی بن گئے اور قرآن نے ان کو اطمینان دلا دیا کہ لن یضرّوکم الا اذیٰ

یہودیوں کی ذلت و رسوائی

۲۰۷۔ یہ جہاں بھی تھے ان پر ذلت کی مار پڑی الا یہ کہ کہیں اللہ کے عہد اور کہیں انسانوں کے عہد سے ان کو کچھ پناہ مل گئی ہے۔ یہ تمثیل اہل کتاب میں سے خاص کر یہود کے بارے میں نازل

ہوتی ہیں جیسا کہ سیاق کلام اور قرآن کی دوسری آیات سے ظاہر ہے یعنی یہود پر ہمیشہ کے لیے ذلت کی مہر ثبت کر دی گئی ہے۔ یہ بدبخت جہاں کہیں بھی پائے جائیں ذلت کا نقش ان سے محو نہیں ہو سکتا۔ بڑے بڑے کروڑ پتی یہودی بھی آزادی اور خود مختاری سے اپنے جان و مال کی حفاظت نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی آزاد حکومت کسی جگہ نہیں الا یہ کہ اللہ کے عہد یعنی بعض بچی کچھی رسمیں تورات کی عمل میں لاتے ہیں اس کے طفیل سے پڑے ہیں اور کہیں انسانوں کے عہد سے یعنی کسی کی رعیت ہیں اس کی پناہ میں پڑے ہیں کذا فی الموضح۔ بعض مفسرین نے حبل من اللہ وحبل من الناس سے اللہ کا ذمہ اور مسلمانوں کا عہد مراد لیا ہے۔ یعنی بجز اس کے کہ مسلمانوں سے عہد کر کے خدا کے ذمہ میں آجائیں۔ بعض کہتے ہیں کہ حبل من اللہ سے اسلام مراد ہے یعنی اسلام لا کر اس ذلت سے نکل سکتے ہیں یا معاہد بن کر کیونکہ معاہدہ بھی جان و مال کی طرف سے مامون کر دیتا ہے واللہ اعلم[1]

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں اگر کہیں ان کو تھوڑا بہت امن چین نصیب ہوا ہے تو وہ ان کو اپنے بل بوتے پر قائم کیا ہوا امن و چین نہیں ہے بلکہ دوسروں کی حمایت اور مہربانی کا نتیجہ ہے۔ کہیں کسی مسلم حکومت نے ان کو خدا کے نام پر امان دے دی ہے اور کہیں کسی غیر مسلم حکومت نے انہیں اپنی حمایت میں لے لیا۔ اسی طرح بسا اوقات انہیں دنیا میں کہیں زور پکڑنے کا موقع مل گیا ہے لیکن وہ بھی اپنے زور بازو سے نہیں بلکہ محض بیاتے مردی ہمسایہ[2]

گویا سمجھایا یہ جا رہا ہے کہ اگر کہیں یہ قائم ہیں تو اپنی سطوت و عزت کے اعتماد پر نہیں بلکہ یا تو اللہ والوں کے کسی معاہدے نے ان کو امان دے رکھی ہے یا اپنے پاس پڑوس کے قبائل سے انہوں نے کوئی اسی قسم کا سہارا حاصل کر رکھا ہے۔ یہ سہارے وقتی اور عارضی ہیں۔ چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابتداءً ان کے مختلف قبائل سے جو معاہدے کیے تھے ان کی عہد شکنیوں اور شرارتوں کی وجہ سے بعد میں وہ ختم کر دیے گئے اور یہ یا تو اپنے جرائم کی پاداش میں قتل کر دیے گئے یا جلا وطن کر دیے گئے۔ دوسرے قبائل سے انہوں نے جو معاہدے کر رکھے تھے وہ قبائل بھی آہستہ آہستہ اسلام کے زیر اثر آ گئے تو وہ معاہدے بھی عملاً بے اثر ہو گئے۔ جس درخت کی اپنی جڑیں کھوکھلی ہوں۔ وہ تھونیوں کے سہارے آخر کب تک کھڑا رہ سکتا ہے۔ اس زمانے میں یہود کی نام نہاد سلطنت بھی اسی حکم میں داخل ہے کیونکہ وہ بھی اپنے بل بوتے پر نہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] تفہیم القرآن

بلکہ حبل من الناس امریکہ اور انگلستان کے سہارے پر کھڑی ہے اور جو چیز دوسرے کے سہارے کھڑی ہو اس کا کھڑا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔[1]

اصل ارشاد حبل من الناس ہے۔ یہ مومن و کافر دونوں کو شامل ہے اس میں یہ صورت بھی داخل ہے کہ یہ لوگ مسلمانوں سے معاہدہ کرلیں اور بے فکر ہوجائیں اور یہ بھی محتمل ہے کہ دوسری غیر مسلم طاقتوں سے معاہدہ صلح کرکے محفوظ ہوجائیں جیسا کہ حکومت اسرائیل کی موجودہ صورت ہے کہ کسی صاحب بصیرت پر یہ امر مخفی نہیں ہے کہ اسرائیل کی حکومت درحقیقت اہل یورپ کی ایک مشترکہ چھاؤنی سے زیادہ نہیں ہے۔ اس کی جو کچھ قوت نظر آتی ہے وہ سب غیروں کے بل بوتے پر ہے۔ اگر امریکہ و برطانیہ، روس وغیرہ آج اس پر سے اپنا ہاتھ اٹھالیں تو وہ ایک دن اپنا وجود قائم نہیں رکھ سکتا۔[2]

یہودیوں پر غضب الٰہی

۲۰۸۔ یہ اللہ کے غضب میں آگئے۔ محتاجی اور بدحالی میں مبتلا ہوگئے۔ باؤا کے معنے اور بھی کیے گئے ہیں لیکن اکثر کی رائے میں اس کے معنے استحقاق کے ہیں۔ یہودیوں پر اس قدرتی غضب کا ظہور برابر انسانوں کے ہاتھوں ہوتا رہا ہے۔ اولین طور پر بابل کے حملے نے بنی اسرائیل کی نسل اور قومیت کو ہلاک و منتشر کردیا تھا لیکن ایک سو سال کے بعد حالات نے پھر کروٹ لی اور یہودی جمعیت کا جسم مردہ پھر زندہ ہوگیا۔ دوسری بار رومیوں نے حملہ کیا۔ یہ یہودیوں کی آخری ہلاکت تھی اس کے بعد پھر سنبھل نہ سکے۔ اس آخری زمانہ میں ہٹلر جیسے چنگیزی فرمانروا کی یہود دشمنی اور یہود بیزاری تاریخ داں طبقہ سے پوشیدہ نہیں ہے۔ یہودیوں کی اسی مغضوبیت کی تلافی امریکہ و برطانیہ اور روس کی ملی جلی سازش سے اسرائیل کے ذریعے کی گئی ہے۔ غضب کے ساتھ دوسری بات یہودیوں کے بارے میں یہ بتائی ہے کہ وہ محتاجی اور بدحالی میں مبتلا ہوگئے اصل ارشاد میں لفظ مسکنت آیا ہے۔ عام شارحین قرآن نے اس کے معنے محتاجی اور مفلسی کے کیے ہیں لیکن دوسرے مفسرین نے اس کے معنے جزیہ کے کیے ہیں اور جزیہ سے مراد یہ ہے کہ یہود پر دوسروں کا محکوم بن کر رہنا تھوپ دیا گیا ہے۔ ذلت تھوپنے کے ذکر میں

---

[1] تدبر قرآن۔ [2] معارف قرآن م ش

۱۷ بحبل من اللہ وحبل من الناس کا استثنا ہے مگر مسکنت کے لیے کوئی استثنا نہیں ہے

کفر بآیات اللہ اور قتل انبیاء

۲۰۹ ۔ یہ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کی آیتوں کا انکار کرتے تھے اور انبیا کے ناحق قتل میں دلیر تھے ۔
کفر کی مختلف صورتیں ہو سکتی ہیں ۔ ایک یہ کہ اللہ کی روانہ فرمودہ تعلیمات میں سے جو بات اپنے خیالات اور خواہشات کے خلاف پائی اس کے ماننے سے صاف انکار کر دیا ۔ دوسرے یہ کہ ایک بات کو یہ جانتے ہوئے کہ اللہ نے فرمائی ہے پوری ڈھٹائی اور سرکشی کے ساتھ اس کی خلاف ورزی کی اور حکم الٰہی کی کچھ پروا نہ کی ۔ تیسرے یہ کہ ارشاد الٰہی کے مفہوم کو اچھی طرح جاننے اور سمجھنے کے باوجود اپنی خواہش کے مطابق اسے بدل ڈالا ۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جن افعال کا قالب اتنا خطرناک ہو کہ ان میں صریح کفر کی اتنی قریب استعداد موجود ہو کہ ذرا غفلت کرنے سے وہ کھلا کفر بن جاتے ۔ قرآن و سنت ان میں منطقی تحلیل پسند نہیں کرتے بلکہ ان کو بھی کفر ہی کے ذیل میں شمار کرتے ہیں ۔ اس اختلاف نظر اور اختلاف اسلوب کی وجہ سے مزاج فقاہت اس قسم کی بہت سی آیات میں تاویل کر دیتا ہے ۔ یہ اختلاف نہیں صرف اختلاف نظر اور طریقہ تعبیر کا اختلاف ہے ۔

ناحق اللہ کے نبیوں کو قتل کرتے تھے یعنی دوسری بیہودگیاں اور شرارتیں تو تھیں حد یہ ہے کہ قتل تک سے بھی نہ چوکے اور یہ بھی اگر کانوا یکفرون پر ہی عطف ہے جیسا کہ عبارت کا تقاضا ہے تو مطلب یہ ہے کہ قتل نبی کا ایک واقعہ نہیں بلکہ ان کی پوری زندگی نبیوں کے قتل جیسے سنگین جرم سے آلودہ تھی اور قومی حیثیت سے وہ اس کے مجرم عادی تھے ۔

آیت میں قتل انبیاء کا جرم بیان کرتے ہوئے بغیر حق کی قید لگائی ہے ۔ نبی کا قتل تو ہمیشہ ہی ناحق ہوتا ہے نبی کے قتل کے جائز ہونے کی کوئی صورت ہی نہیں ۔ قرآن کا مقصد اس اضافہ سے یہ بتانا ہے کہ خود ان کے معیار سے بھی یہ قتل ناحق اور ناجائز ہے یعنی خلاف عدل تو تھا ہی قانون وقت اور ضابطہ بھی اس کی اجازت نہ دیتا تھا ۔

قتل انبیاء کے جرم کی تاریخ خود ان کی زبانی

بنی اسرائیل نے اپنے اس جرم کو تاریخ میں خود تفصیل کے ساتھ بیان کیا ہے ۔ مثال کے طور پر ہم بائبل سے چند واقعات یہاں نقل کرتے ہیں ۔

۱۔ حضرت سلیمان کے بعد جب بنی اسرائیل کی سلطنت تقسیم ہوکر دو ریاستوں یروشلم کی دولت یہودیہ اور سامریہ کی دولت اسرائیل میں بٹ گئی تو ان میں باہم لڑائیوں کا سلسلہ شروع ہوا اور نوبت یہاں تک آئی کہ یہودیہ کی ریاست نے اپنے ہی بھائیوں کے خلاف دمشق کی آرامی سلطنت سے مدد مانگی۔ اس پر خدا کے حکم سے حنانی نبی نے یہودیہ کے فرمانروا آسا کو سخت تنبیہہ کی۔ مگر آسا نے اس تنبیہہ کو قبول کرنے کے بجائے خدا کے پیغمبر کو جیل بھیج دیا۔ ۲۔ تواریخ، باب ۱۶ آیت ۷۔۱۰۔

۲۔ حضرت الیاس نے جب بعل کی پرستش پر یہودیوں کو ملامت کی اور ازسرنو توحید کی دعوت کا صور پھونکنا شروع کیا تو سامریہ کا اسرائیلی بادشاہ اخی اب اپنی مشرک بیوی کی خاطر ہاتھ دھو کر ان کی جان کا لیوا ہو گیا۔ حتیٰ کہ انہیں جزیرہ نما سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی۔ اس موقعہ پر جو دعا حضرت الیاس نے مانگی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں:

"بنی اسرائیل نے تیرے عہد کو ترک کیا ... تیرے نبیوں کو تلوار سے قتل کیا اور ایک میں ہی اکیلا بچا ہوں سو وہ میری جان لینے کے درپے ہیں۔ (۱۔ سلاطین باب ۱۹ آیت ۱۔۱۰)

۳۔ ایک اور نبی حضرت میکایاہ کو اسی اخی اب نے حق گوئی کے جرم میں جیل بھیج دیا اور حکم دیا کہ اس شخص کو مصیبت کی روٹی کھلانا اور مصیبت کا پانی پلانا (سلاطین)

۴۔ پھر جب یہودیہ کی ریاست میں علانیہ بت پرستی اور بدکاری ہونے لگی اور زکریا نبی نے اس کے خلاف آواز بلند کی تو شاہ یہودا یواس کے حکم سے انہیں عین ہیکل سلیمانی میں مقدس اور قربان گاہ کے درمیان سنگسار کر دیا۔　(۲۔ تواریخ باب ۲۴ آیت ۲۱)

۵۔ اس کے بعد جب سامریہ کی اسرائیلی ریاست آشوریوں کے ہاتھوں ختم ہوئی اور یروشلم کی یہودی ریاست پر تباہی کا طوفان کھڑا ہوا تو یرمیاہ نبی اپنی قوم کے زوال کا ماتم کرنے اٹھے اور کوچے کوچے انہوں نے پکارنا شروع کیا کہ سنبھل جاؤ ورنہ تمہارا انجام سامریہ سے بھی بدتر ہوگا مگر قوم کی جانب سے جو جواب ملا وہ یہ تھا کہ ہر طرف سے ان پر لعنت اور پھٹکار ہوئی پیٹے گئے اور قید ہوئے۔ رسی سے باندھ کر کیچڑ بھرے حوض میں لٹکا دیئے گئے تاکہ بھوک اور پیاس سے وہیں مر جائیں اور ان پر الزام لگایا گیا کہ وہ قوم کے غدار ہیں۔ بیرونی دشمنوں سے ملے ہوئے ہیں۔ (یرمیاہ باب ۱۵، ۱۸، ۲۰، ۳۶ تا ۴۰)

۶۔ ایک نبی حضرت عاموس کے بارے میں لکھا ہے کہ جب انہوں نے سامریہ کی اسرائیلی ریاست کو اس کی گمراہیوں اور بدکاریوں پر ٹوکا اور ان حرکات کے برے انجام سے خبردار کیا تو انہیں نوٹس دیا گیا کہ ملک سے نکل جاؤ اور باہر جا کر نبوت کرو (عاموس باب ۷ آیت ۱۰۔۱۳۔

۷۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام نے جب ان بداخلاقیوں کے خلاف آواز اٹھائی۔ جو یہودیہ کے فرمانروا ہیرودیس کے دربار میں کھلم کھلا ہو رہی تھیں تو پہلے وہ قید کیے گئے پھر بادشاہ نے اپنی معشوقہ کی فرمائش پر قوم کے اس صالح ترین آدمی کا سر قلم کرکے ایک تھال میں رکھ کر اس کی نذر کر دیا۔

(مرقس باب ۶ آیت ۱۷-۲۹)

۸۔ آخر میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر بنی اسرائیل کے علماء اور سرداران قوم کا غصہ بھڑکا۔ ان کے خلاف جھوٹا مقدمہ تیار کیا گیا۔ رومی عدالت سے ان کے قتل کا فیصلہ لیا گیا اور جب رومی حاکم پیلاطس نے یہود سے کہا کہ آج عید کے روز تمہاری خاطر یسوع اور براباڈاکو دونوں میں سے کس کو رہا کروں تو ان کے پورے مجمع نے بالاتفاق پکار کر کہا کہ براباکو چھوڑ دے اور یسوع کو پھانسی پر لٹکا۔

(متی باب ۲۷ آیت ۲۰ تا ۲۶)

یہ ہے اس قوم کی داستان جرائم کا ایک نہایت شرمناک باب جس کی طرف قرآن کی اس آیت میں مختصر اشارا کیا گیا ہے۔[۱]

سرکشی اور نافرمانی

۲۱۰ ۔ یہ ان کی نافرمانیوں اور سرکشیوں کا انجام ہے۔ یعنی نافرمانیاں کرتے کرتے حد سے نکل گئے۔ جس کا انتہائی اثر یہ تھا کہ اللہ کی صریح آیتوں کے انکار اور معصوم پیغمبروں کے قتل پر آمادہ ہو گئے۔[۲]

اس کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی بغاوت اور سرکشی کے عادی مجرم تھے۔ ایک گناہ دوسرے گناہ کا ذریعہ بن جاتا ہے۔ ارشاد میں بتایا ہے کہ کفر اور قتل انبیاء جیسے جرائم ان میں اس لیے پیدا ہو گئے تھے کہ وہ عصیان اور عدوان یعنی خلوت و جلوت میں خدا کی نافرمانی میں بے باک ہو چکے تھے۔ ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب بن جاتا ہے۔ عصیان و عدوان نے ان کو کفر اور قتل انبیاء تک پہنچا دیا۔ قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ جس طرح چھوٹی طاعت بڑی طاعت کی طرف لے جاتی ہے چھوٹی معصیت بھی بڑی معصیت تک پہنچا دیتی ہے۔

یہ فقرہ دراصل یہ بتانے کے لیے ہے کہ جس طرح صحت بدن کی ایک نشانی یہ ہے کہ زبان کا

---

[۱] تفہیم القرآن [۲] افادات شیخ الاسلام

ذائقہ درست ہو اور اس میں میٹھی چیز میٹھی اور کڑوی چیز کڑوی معلوم ہو اسی طرح صحت ایمان کی علامت یہ ہے کہ ایمان کا ذائقہ درست ہو۔ اس میں طاعت و عصیان کا صحیح صحیح امتیاز باقی ہو۔ اگر یہ امتیاز باقی نہ رہے تو سمجھ لو کہ بیماری اُلٹی ہے۔ یہی حال اس شخص کا ہوتا ہے جو گناہوں کا خوگر ہو جاتا ہے۔ اب اس میں طاعت و عصیان کا احساس ختم ہو جاتا ہے۔ اور یہ احساس کی پامالی سنگین گناہوں کا ذریعہ بن جاتی ہے۔ اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ — مومن اپنے گناہوں سے اس طرح ڈرتا ہے جیسے وہ پہاڑ کے نیچے بیٹھا ہو اور ڈر رہا ہو کہ اب گرا۔ اور فاجر آدمی ان کو اس طرح حقیر سمجھتا ہے جیسے مکھی اس کی ناک کے پاس سے گزر گئی اور اس نے اپنے ہاتھ کی حرکت سے اڑا دی۔

لَيْسُوْا سَوَآءً ۭ مِنْ اَھْلِ الْكِتٰبِ اُمَّةٌ قَاۗىِٕمَةٌ يَّتْلُوْنَ اٰيٰتِ اللّٰهِ اٰنَاۗءَ
الَّيْلِ وَھُمْ يَسْجُدُوْنَ ۝ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَ
يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُسَارِعُوْنَ فِي الْخَيْرٰتِ ۭ
وَاُولٰۗىِٕكَ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝ وَمَا يَفْعَلُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَنْ
يُّكْفَرُوْهُ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ۝

یہ سارے ایک جیسے نہیں ہیں[۲۱۱]- ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ ہدایت پر قائم ہیں[۲۱۲]۔ راتوں کو اللہ کی آیات تلاوت کرتے ہیں اور جناب الٰہی میں سجدہ ریز ہوتے ہیں[۲۱۳] - اللہ اور روز آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔ بھلائی کے سارے کاموں میں دوڑ دھوپ مچاتے ہیں یہ نیکو کار لوگ ہیں[۲۱۴]۔ اور جو نیکی بھی یہ کریں گے اس کی ضرور قدر کی جائے گی اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے[۲۱۵]۔

سارے اہل کتاب کا حال یکساں نہیں

قرآن نے اس بات پر زور دیا ہے کہ وہ پچھلی کتابوں کا مصدق ہے اور اہل کتاب سے مطالبہ کرتا ہے کہ آمنوا بما انزلت مصدقا لما معکم اس کتاب پر ایمان لاؤ جو تمہاری کتاب کی تصدیق کرتی ہے یعنی جب میری تعلیم تمہارے مقدس نوشتوں کے خلاف کوئی نیا دین نہیں پیش کرتی بلکہ سرتاسر مصدق اور موید ہے تو پھر تم میری دعوت کیوں قبول نہیں کرتے اور میرے خلاف اعلانِ جنگ کیوں کرتے ہو۔ اس بات کا ثبوت کہ نبوتِ محمدیہ کی پیروی کے بغیر ہدایت اور نجات نہیں ہے۔ خود قرآن میں موجود ہے اور ایسا ثبوت موجود ہے جس کے آگے جھکنے سے صرف ناانصافی اور خودپرستی ہی روک سکتی ہے۔ اگر یہ بات قرآن کے نزدیک صحیح ہوتی کہ ایک یہودی، یہودی رہتے ہوتے اور ایک عیسائی، عیسائی رہتے ہوئے ہدایت پر گامزن ہے تو اس کا بالکل منطقی تقاضا یہ تھا کہ قرآن اہل کتاب کو ایمان و اسلام کی ہرگز دعوت نہ دیتا کیونکہ وہ خود صاحب کتاب تھے۔ اگر دعوت دیتا بھی تو کم از کم اسلام لانے کے مطالبے پر اصرار نہ کرتا۔ لیکن ساری دُنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہے قرآن نے اہل کتاب کو بھی اسلام کی اسی طرح دعوت دی ہے جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے اپنی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا جیسا کہ ان کے لیے ضروری قرار دیا۔

یا ایھا الذین اوتوا الکتاب آمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم من قبل ان نطمس وجوھا فنردھا علی ادبارھا او نلعنھم۔

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی ہے ایمان لاؤ تم اس کتاب پر جو ہم نے اتاری جب کہ اس کتاب کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے قبل اس کے کہ ہم چہروں کو بگاڑ دیں یا انہیں پیٹھوں کی طرف پھیر دیں یا ان پر لعنت کریں۔

نہ صرف یہ کہ آپ نے اہل کتاب کو ایمان لانے کی دعوت دی بلکہ دعوت بھی اس شرط کے ساتھ دی کہ ایمان بھی اسی طرح لاؤ جیسے ابوبکر و عمر ایمان لائے ہیں۔ اگر ایسا ایمان لائیں گے تو پھر ان کو ہدایت ہوگی ورنہ نہیں۔

فان آمنوا بمثل ما آمنتم بہ فقد اھتدوا

اگر اہل کتاب ویسا ہی ایمان لے آئیں جیسا کہ تم لائے ہو تو پھر وہ ہدایت پر آجائیں گے اور نہ صرف یہ کہ قرآن نے ان کو ایمان لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول

نہیں کیا ان کو صاف لفظوں میں کفر کا مرتکب اور دوزخی قرار دیا۔ حتیٰ کہ بعض مقامات پر قرآن کے اس انکار کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ بدترین کفر اور انہیں صرف کافر نہیں بلکہ پکا کافر کہا گیا۔

اولئک ھم الکافرون حقا

اس آیت میں اہل کتاب کو ان کے جس کردار کی بنا پر پکا کافر کہا گیا ہے وہ صرف یہ تھا کہ وہ جہاں دوسرے انبیاء کو اللہ کا رسول مانتے تھے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو رسول ماننے کے لیے تیار نہ تھے۔

غرض قرآن حکیم نے اہل کتاب کے انکار اسلام کو بھی ٹھیک وہی حیثیت دی ہے جو مشرکوں کے انکار کو دی تھی۔ اور نتائج بھی دونوں کے ایک ہی بتاتے ہیں۔ اس نے اہل کتاب کے لیے ایسی کوئی گنجائش نہیں چھوڑی کہ وہ اسلام کے بجائے اپنے دین پر قائم رہتے ہوئے اللہ کے یہاں ہدایت یافتہ اور نجات کے مستحق ہو سکتے ہیں۔ جیساکہ مصر و ہند کے شارحین قرآن کے انداز بیان سے مترشح ہوتا ہے چنانچہ زیر تشریح آیت پر ایک مایہ ناز مفسر قرآن رقمطراز ہیں:

> یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ان راست باز انسانوں کے ایمان و عمل کا پوری فراخدلی کے ساتھ اعتراف کیا ہے جو نزول کے وقت مختلف مذاہب میں موجود تھے اور جنہوں نے اپنے مذہبوں کی حقیقی روح ضائع نہیں کی تھی۔

ایسا سمجھنا قرآن کو بازیچہ اطفال بنا لینے کے مترادف ہے۔ اس آیت میں قرآن صرف یہ بتانا چاہتا ہے کہ حق ناشناسی اور اسلام سے متعلق اپنے طرز عمل کے لحاظ سے اہل کتاب سارے یکساں نہیں۔ اوپر جو کچھ بیان ہوا یہ اہل کتاب کی اکثریت کا حال ہے۔ باقی ان میں سے بعض حق شناس، انصاف دوست بھی تھے اور وہ بالآخر مشرف بہ اسلام ہو کر رہے۔ ان کا چہرہ اس آیت میں پیش کیا گیا ہے۔

اہل کتاب مومن و کافر یکساں نہیں

۱۱۳۔ یہ سارے ایک جیسے نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ سب اہل کتاب اسی طرح کے نہیں ہیں جن کا اوپر چہرہ پیش کیا گیا ہے۔ یہاں سے ان یہودیوں کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے جو حق شناسی کا ذوق رکھتے تھے اور انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کو قبول کر لیا تھا اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ قرآن ان یہودیوں کے مناقب بیان کر رہا ہے جو قرآن کی تکذیب اور

کفر کر رہے ہیں۔ قرآن نے خود یہودیوں کے انکار قرآن کا تذکرہ اور پھر اس پر اپنا تبصرہ ان لفظوں میں کیا ہے۔

وإذا قيل لهم آمنوا بما أنزل الله قالوا نؤمن بما أنزل علينا ويكفرون بما وراءه

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اس کتاب پر ایمان لاؤ جو اللہ نے اتاری ہے تو وہ کہتے ہیں کہ ہم اس پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اتاری گئی اور اس طرح وہ اس کے سوا کا انکار کرتے ہیں۔

کیا اس جواب کے باوجود قرآن ان یہودیوں کا تعارف کرا سکتا ہے جو خود قرآن کا انکار کرتے ہیں۔ ان کا فیصلہ یہ تھا کہ جب ہمارے پاس بھی خدا ہی کا بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اس کی پیروی کرنا کافی نہیں ہے۔ آخر پھر کسی چیز کو اپنانا ہمارے لیے ضروری کیوں؟ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے اس فلسفہ کو اللہ سبحانہ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں کہتا بلکہ اسے صاف طور پر کفر کا فلسفہ قرار دیتا ہے۔ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عموم رسالت اور ختم نبوت کا لازمی تقاضا ہے کہ آخرت کی نجات اس اسلام پر موقوف ہے جس کی دعوت آپ لے کر آئے ہیں اور اس اسلام کا خلاصہ یہ ہے کہ سب نبیوں کی تصدیق کرتے ہوئے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی جائے۔ واضح بات ہے کہ اللہ تعالیٰ جن شریعتوں کو منسوخ کر چکا ہے ان کی پیروی پر وہ کوئی اجر کیسے دے گا۔

ومن يبتغ غير الاسلام دينا فلن يقبل منه وهو في الآخرة من الخاسرين۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلہ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے اس امت میں سے جس کسی بھی شخص تک یہودی ہو یا عیسائی میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا وہ دوزخی ہوگا۔

غرض جہاں تک نبوت محمدیہ کے اپنے فیصلے کا تعلق ہے قرآن وسنت میں دو ٹوک انداز میں موجود ہے یعنی یہ کہ نبوت محمدیہ کی پیروی سارے انسانوں کے لیے ضروری اور شرط نجات ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جسے اس کا پیغام پہنچا ہی نہ ہو جیسا کہ لا یسمع بی کی قید لگا کر آپ نے واضح فرما دیا ہے آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے اپنے جن پیغمبروں کا دور پیغمبری ختم کر دیا۔ انہی کی اطاعت

اور پیروی پر اصرار کرنے والوں کو وہ اپنا وفادار قرار دے اور اپنے اس پیغمبر کی اطاعت اور پیروی سے انکار کے باوجود انہیں بغاوت کی سزا نہ دے جسے وہ اس دور کے لیے اپنا جہانی اور ابدی پیغمبر اور اپنی عالمگیر شریعت قرار دے چکا ہے۔ بہرحال اللہ سبحانہ بتا رہا ہے کہ سارے اہل کتاب اوصاف سے تہی دامن نہیں کچھ انصاف طبیعت ایسے بھی ہیں جنہوں نے نبوت کے لاتے ہوتے حق کو قبول کر لیا ہے جیسے عبداللہ بن سلام، ثعلبہ ابن سعید، اسید بن سعید اور اسید بن عبید۔

عبداللہ بن سلام کا اسلام

عبداللہ بن سلام جن کا اصل نام حصین تھا۔ مدینہ منورہ کے ایک ذی علم اور دولت مند یہودی تھے سلیم الفطرت ہونے کے باعث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر سنتے ہی اسلام کی طرف مائل ہو گئے۔ قبا میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو پہنچے تو اہل و عیال کے ساتھ اسلام قبول کر لیا۔ وہ چاہتے تھے کہ تمام یہودی اسلام کے حلقہ میں آجائیں۔ چنانچہ عرض کیا یا رسول اللہ آپ بالفعل میرا اسلام ظاہر نہ فرمائیں۔ میں چھپ جاتا ہوں۔ آپ یہودیوں سے میرے بارے میں پوچھیں۔ اگر وہ میرے متعلق اچھی رائے دیں تو فرمائیں کہ اگر وہ اسلام قبول کرے تو کیا تم سب قبول کر لو گے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عمائد یہود کو بلا کر اسلام کی تلقین کی۔ ساتھ ہی عبداللہ بن سلام کے بارے میں دریافت کیا۔ یہودی بولے وہ ہمارا سردار ہے۔ سردار کا بیٹا ہے۔ اس کے علم و فضل کی بھی تعریف کی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پوچھا کہ اگر وہ اسلام قبول کر لے تو آپ لوگ بھی اس کی پیروی کریں گے۔ انہوں نے کہا نعوذ باللہ ایسا ہو سکتا ہے کہ عبداللہ اسلام قبول کر لے۔ اس پر عبداللہ باہر آگئے اور یہودیوں کو سمجھایا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی ہیں جن کا ذکر ہماری کتابوں میں آیا ہے انکار کی طرف قدم نہ اٹھاؤ۔ یہودی یہ سن کر مبہوت ہو گئے۔ پھر بولے اس کی بات کو ہم نہیں مانتے یہ جھوٹا ہے۔ بہرحال عبداللہ نے اسلام قبول کر لیا۔

اہل ایمان جادۂ حق پر قائم ہیں

۲۱۲۔ ان میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راہ ہدایت پر قائم ہیں۔ اصل ارشاد اُمّۃٌ قائمۃٌ آیا ہے زمخشری نے اس کی تشریح مستقیمہ او عادلہ سے کی ہے۔ لکڑی کے سیدھا کرنے کے لیے اقمتہ بولا جاتا ہے۔ جب سیدھی ہو جائے تو قائمہ اور مستقیمہ بولتے ہیں۔ یعنی ایسی جماعت جو ٹھیک ٹھاک

ہے جس میں فکر کی کوئی کجی اور عمل کا کوئی زیغ نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ یہودیت اور عیسائیت اگر افراط و تفریط میں تو ان دونوں کے درمیان نقطہ اعتدال اسلام ہے۔ جیسا کہ سورۂ فاتحہ میں یہ بات پوری قوت سے بتائی گئی ہے۔ اسلام سے مشرف ہونے کے بعد اہل کتاب کی سب سے بڑی خوبی یہ بتائی گئی ہے کہ یہ اُمّۃ قائمۃ ہے یعنی جس راہ کو انہوں نے اپنا لیا ہے وہ بالکل ٹھیک اور سیدھی ہے اس میں اعتدال ہے افراط و تفریط نہیں، زندگی کے تمام گوشوں میں کام آنے والی ہے۔ فرد اور جماعت کے حق میں صلاح و فلاح کی ضمانت دیتی ہے۔ اس میں کہیں کوئی اونچ نیچ نہیں ہے زندگی کے ہر موقعہ اور ہر گوشہ کے لیے رہنما ہے۔ منزل تک پہنچانے والی ہے کشادہ ہے۔

سید رشید رضا کو اس پر حیرت ہے کہ قرآن اہل کتاب کو اُمّۃ قائمۃ کیسے کہہ رہا ہے جبکہ خود قرآن کا دعویٰ ہے کہ اہل کتاب خود اپنی کتابوں کے بیشتر حصوں سے محروم ہو چکے ہیں اور جو کچھ ان کے پاس موجود ہے وہ قطعاً محرف اور مبدل ہے۔ اس حیرت کی وجہ یہ ہے کہ سید صاحب مرحوم نے آیت اُمّۃ قائمۃ کا مصداق یہودیوں کو بحالت یہودیت قرار دیا ہے۔ اور سید صاحب ہی کی پیروی میں مولانا آزاد کا بھی میلان یہی ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ہمارا مطالعہ قرآنی ہمیں ان کی ہمنوائی کی اجازت نہیں دیتا جیسا کہ معالم القرآن کے ناظرین کو ہم پہلے بتا چکے ہیں۔

رات کو تلاوت اور سجدہ

۲۱۳۔ راتوں کو اللہ کی آیات کی تلاوت کرتے ہیں اور جناب الٰہی میں سجدہ ریز رہتے ہیں۔
شارحین قرآن کہتے ہیں کہ یہ فقرہ بھی قائمۃ کی طرح اُمّۃ کی صفت ہے گویا دین حق اور اسلام پر قائم ہو جانا پہلی صفت ہے اور تلاوت قرآن ان کی دوسری صفت ہے۔ یعنی یہ وہ گروہ ہے جو اسلام پر قائم ہے اور رات کے وقتوں میں کتاب الٰہی کی تلاوت کرتا ہے اور نماز پڑھتا ہے، رات کی نماز اور تلاوت کا پیوند قرینہ ہے اس بات کا کہ یہ ان کی شبانہ نماز یعنی تہجد کا تذکرہ ہو رہا ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ تہجد گزار ہیں۔ رات کے اوقات میں نماز میں تلاوت قرآن روحانی تزکیہ اور صفائے باطن کے لیے بہترین تریاق ہے۔ سجدہ کا لفظ بول کر نماز کی طرف اشارہ قرآن کا انداز ہے گویا بتایا گیا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے بعد ان کو ستھری اور پاک زندگی نصیب ہوئی ہے۔ یہ ان کے دل سے مسلمان ہونے کی علامت ہے۔ حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ اسلام کی خوبصورتی یہ ہے کہ عقائد درست ہوں۔ ظاہر و باطن سے اسلام قبول کر لیا جائے اور ہر عمل کے وقت یہ تصور قائم رہے کہ

قادر مطلق کی نظر اسے دیکھ رہی ہے وہ اس سے دُور نہیں بہت قریب ہے اور اتنا قریب ہے کہ رگِ جان بھی اتنی قریب نہیں جو نقل و حرکت وہ کرتا ہے اس کو خوب جانتا ہے۔ رات میں ان کی تلاوتِ قرآن اور اللہ کی جناب میں سجدے ان کے ان اوصاف کو نمایاں کر رہے ہیں۔

ایمان اور اس کے لوازم

۲۱۴۔ اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں بھلائی کے سارے کاموں میں دوڑ دھوپ مچاتے ہیں، یہ نیکوکار لوگ ہیں۔ یعنی سب اہلِ کتاب کا حال یکساں نہیں۔ اتنے بُروں میں کچھ اچھے بھی ہیں۔ ان ہی مسوخ اشقیا کے درمیان چند سعید روحیں ہیں جن کو حق تعالیٰ نے قبولِ حق کی توفیق دی اور اسلام کی آغوش میں آگئے اور جادۂ حق پر ایسے مستقیم ہوگئے کہ کوئی طاقت ہلا نہیں سکتی۔ وہ رات کی تاریکی میں میٹھی نیند اور نرم بستر چھوڑ کر خدا کے سامنے کھڑے ہوتے ہیں۔ اپنے مالک کے سامنے خضوع و تذلل اختیار کرتے ہیں، جبینِ نیاز زمین پر رکھتے ہیں، نماز میں اس کا کلام پڑھتے ہیں۔ اللہ پر اور یومِ آخر پر ایمان رکھتے ہیں۔ خالص توحید کے قائل ہیں، قیامت کے دن سے ڈرتے ہیں۔ اور جب کسی نیک کام کی طرف پکارا جائے لپک کر ایک دوسرے سے آگے نکلنا چاہتے ہیں۔ پھر نہ صرف یہ کہ خود راہِ راست پر ہیں دوسروں کو بھی سیدھے راستہ پر لانا چاہتے ہیں۔ بلاشبہ ان یہود میں سے یہ لوگ ہیں جن کو خدا نے نیک بختی اور صلاح و رشد کا خاص حصہ عطا فرمایا ہے[1]

اسی سورت کے آخر میں اہلِ ایمان کے ساتھ ان ہی اہلِ کتاب کا خصوصیت سے ذکر کیا ہے جنہوں نے دعوتِ نبوت کا مقابلہ نہیں کیا بلکہ پوری سچائی کے ساتھ دعوتِ نبوت کو قبول کیا۔ فرمایا کہ ان کے لیے کوئی کھٹکا نہیں ہے وہ اپنی راست بازی اور نیک عملی کا ضرور اجر پائیں گے۔ ارشاد ہے:

وان من اهل الكتاب لمن يؤمن بالله وما انزل اليكم وما انزل اليهم خاشعين لله لا يشترون بآيات الله ثمنا قليلا، اولئك لهم اجرهم عند ربهم

اور یقیناً اہلِ کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے اس پر اور جو کچھ ان پر نازل ہوا ہے اس پر ایمان رکھتے ہیں

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ان کے دل اللہ کے آگے جھکے ہوتے ہیں وہ اللہ کی آیتوں کو تھوڑی قیمت پر فروخت نہیں کرتے بلاشبہ ایسے لوگوں کے لیے ان کے رب کے پاس اجر ہے۔

یہاں بھی ان کا ذکر ہے اور یہ تذکرہ اس لیے کیا ہے کہ مجموعی حیثیت سے پوری سورت میں اہل کتاب کی شدید مذمت ہوتی ہے اس لیے بتا دیا کہ ان میں سارے خراب نہیں ہیں کچھ راست باز بھی ہیں۔ ان کے ایمان وعمل کی اللہ کے یہاں قدر ہے۔ یہ اپنی کتب سابقہ پر بھی قائم رہے اور دولت اسلام سے بھی مشرف ہوئے۔

اہل کتاب کو ایمان وعمل کا اجر ملے گا

۱۱۵ - اور جو نیکی بھی کریں گے اس کی ضرور قدر کی جائے گی اور اللہ پرہیزگاروں کو خوب جانتا ہے۔ بلکہ ان کو دگنا اجر ملے گا جیسا کہ دوسری جگہ ارشاد ہے اولٰئک یؤتون اجرھم مرتین بما صبروا اور حدیث صحیح میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی تشریح فرما دی [1] شیخ الاسلام نے جس حدیث صحیح کی طرف اشارہ کیا ہے وہ صحیح بخاری میں بحوالہ ابو موسیٰ اشعری اس طرح آئی ہے کہ:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے تین شخصوں کو دوہرا اجر ملے گا، ایک وہ اہل کتاب جو اپنے نبی پر ایمان لایا پھر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔

دراصل ہر شخص کی فطرت ہے کہ اس کو اپنے دین سے والہانہ محبت اور دوسرے دین سے رقابت کا تعلق ہوتا ہے اس لیے اپنا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرنا شاق گزرتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ ادیان حقہ میں کوئی چشمک اور رقابت نہیں ہے، پارٹیاں نہیں ہیں اس لیے ان مذاہب کے ماننے والوں کو بھی یہی جذبات رکھنے چاہئیں کہ یہ ایک ہی صداقت کی کڑیاں ہیں ایک دین کے مصدق کو دوسرے دین کی تصدیق لازم ہے۔ اب اگر کوئی اہل کتاب اسلام قبول کرے تو اس کو یہ وسوسہ نہ گزرنا چاہیے کہ اپنے نبی پر اس کا ایمان رائیگاں چلا گیا بلکہ اگر وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئے تو وہ دوہرے اجر کا مستحق ہوگا۔ ہاں یہ یقینی ہے کہ اگر ایمان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہ لایا تو پہلے ایمان کا اجر بھی نہ ملے گا۔ کیونکہ رسولوں کے درمیان ایمان کے بارے میں تفریق نہیں کی جا سکتی۔ جو ایک کا منکر ہے وہ سب ہی کا منکر ہے۔ اس آیت میں دراصل اہل کتاب کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ اپنا ایمان قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ آپ کی ذات ستودہ صفات پر بھی ایمان لائیں جب کہ سب نبیوں پر ایمان لانا آپ کی دعوت ہے۔ لہٰذا آپ پر ایمان لانا سب نبیوں پر ایمان لانا ہے۔ اور آپ کا انکار کرنا سب کا انکار ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَنْ تُغْنِيَ عَنْهُمْ أَمْوَالُهُمْ وَلَا أَوْلَادُهُمْ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۖ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ۝ مَثَلُ مَا يُنْفِقُونَ فِي هَٰذِهِ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا كَمَثَلِ رِيحٍ فِيهَا صِرٌّ أَصَابَتْ حَرْثَ قَوْمٍ ظَلَمُوا أَنْفُسَهُمْ فَأَهْلَكَتْهُ ۚ وَمَا ظَلَمَهُمُ اللَّهُ وَلَٰكِنْ أَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُونَ ۝

بلاشبہ جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ہے تو ان کو نہ ان کا مال اور دولت اللہ کے عذاب سے بچا سکے گا اور نہ ان کی اولاد، وہ دوزخی ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے[۲۱۶]۔ دنیا کی اس زندگی میں یہ لوگ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس ہوا کا چلنا جس میں پالا ہو اور ان لوگوں کی کھیتی پر آن پڑی ہو جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا ہو اور اسے برباد کر دے[۲۱۷] اور یاد رکھو اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا یہ خود اپنے ہاتھوں

اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔[۲۱۸]

کُفر کی زندگی میں کیے گئے اعمال

اس سے پہلی آیات میں ان اہلِ کتاب کا چہرہ پیش کیا جنہوں نے نبوتِ محمدیہ کی دعوت کو قبول کر لیا۔ اب ان آیات میں ان کا تعارف ہے جنہوں نے اہلِ کتاب ہونے کے غرہ میں نبوتِ محمدیہ کو نہیں مانا اور کفر پر اڑے رہے۔ جو صداقت حضرت آدم کے زمانے سے شروع ہوئی اس کی حقیقت کبھی نہیں بدلی لیکن دورِ ارتقائی کی طبعی رفتار کے پیش نظر کچھ تغیر و تبدیل ہوتی رہی یہاں تک کہ سچائی کی حقیقی راہ دکھائی گئی جس میں نزولِ عمل کی سعیٔ آدرِ ہی عقل کے لیے بوجھ ہے اسی کا نام اسلام ہے۔ اور اب یہ پیغام محمد کا مخصوص لقب ہے۔ ارتقاء کی ان ہی منزلوں کی طرف آیت اکمال و اتمام میں اشارا ہے لفظ کمال میں دین کی اسی ارتقائی حرکت کی طرف اشارہ ہے۔ قرآن حکیم کی سب سے بڑی خصوصیت مصدق لما معکم کا حاصل بھی یہی ہے اور لا نفرق بین احد من رسلہ کی دستوری دفعہ بھی اسی لیے ہے۔ یعنی یہ سب ایک ہی صداقت کی کڑیاں تھیں جو یکے بعد دیگرے ظاہر ہوتی رہی ہیں۔ ان کی صورتیں بے شک مختلف ہیں مگر حقیقت ایک ہی تھی اس لیے یہاں تسلیم و انکار کی تفریق برداشت نہیں کی جا سکتی۔ ایک کا ماننے والا اس کا مکلف ہے کہ دوسرے کو بھی مانے اسی طرح ایک کا انکار کرنے والا اس جرم کا بھی مرتکب ہے کہ اس نے سب کا انکار کر دیا ہے۔ ان انبیاء میں افضل و مفضول ہونے کے باوجود تخمیر کے تحت اس لیے ناموزوں ہے کہ یہ سب ایک ہی پیغام اور ایک ہی صداقت کے حامل تھے۔ سورت کے آغاز میں یہ آیت عیسائی دنیا کو یہ بتانے کے لیے لاتے تھے کہ نبوتِ محمدیہ کا انکار اگر ان کی زندگی میں ہوگا تو آخرت کی زندگی میں ان کو کوئی چیز عذاب الٰہی سے نہ بچا سکے گی یہاں یہی آیت یہودیوں کو سمجھانے کے لیے آئی ہے کہ اگر تمہارے دامن میں نبوت کا کفر ہوگا تو تمہیں تمہارا سرمایہ اور تمہاری اولاد دوزخ سے نہ بچا سکیں گے اور بتایا کہ اس دنیا کی زندگی میں اپنی رسمی اور رواجی دینداری کے لیے جو کچھ وہ خرچ کرتے ہیں اس کی حیثیت اس کھیتی سے زیادہ کچھ نہیں جس پر پالا پڑا ہو اور اس کے نتیجے میں کھیتی برباد ہو گئی ہو۔

ایمان کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں

۲۱۶ ۔ بلاشبہ جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے تو ان کو نہ ان کا مال و دولت کام آئے گا اور نہ ان کی اولاد، وہ دوزخی ہیں ہمیشہ اس میں رہیں گے۔ صالحین و متقین کے بالمقابل یہاں کافروں کا حال و انجام ذکر فرماتے ہیں۔ پہلے فرمایا تھا وما یفعلوا من خیرٍ فلن یکفروہ یعنی مومنین کی ادنیٰ ترین نیکی بھی کام آئے گی۔ ان کے کسی بھلے کام کی بے قدری نہیں کی جائے گی اس کے برخلاف کافر جو کچھ مال و دولت دُنیا میں خرچ کرے خواہ اپنے نزدیک بڑا ثواب اور خیرات کا کام سمجھتا ہو۔ آخرت میں اس کی کوئی قدر و قیمت اور پرسش نہیں کیونکہ ایمان و معرفت کی رُوح نہ ہونے سے اس کا ہر ایک عمل بے جان اور مُردہ ہے۔ اس کی جزا بھی ایسی ہی فانی و زائل اس دارِ فانی میں مل جائے گی۔ عمل کی ابدی حفاظت کرنے والی چیز ایمان و ایقان ہے۔[1]

آج کل علمِ نفسیات نے یہ مسئلہ بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لیے اس کی قلبی اصلاح مقدم ہے۔ اور انسان کے دل اور ارادے پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا ایمان ہے۔ صحیح اور صالح عمل کے لیے یہ ضروری ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائے اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدے کے تحت ہم تمام کام انجام دیں۔

جس طرح اقلیدس کی کوئی شکل چند اصول موضوعہ اور اصول متعارفہ کے مانے بغیر نہ بن سکتی ہے نہ ثابت ہو سکتی ہے۔ اسی طرح انسان کا کوئی عمل صحیح اور دُرست نہیں ہو سکتا۔ جب تک اس کے لیے بھی چند مبادی اور چند اصول موضوعہ ہم پہلے تسلیم نہ کر لیں۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لیے ہم کو رہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں۔ وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے۔ اس لیے پابزنجیر عقل کے ذریعے ہم اپنے خیالات ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے۔ اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط ذہنی تصورات کے ذریعے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور پر

[1] افادات شیخ الاسلام

گیا ہے۔ اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قابلِ قبول نہیں سمجھا ہے۔ غرض ایمان تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر عمل بے بنیاد ہے۔ وہ ہماری سیرابی کا اصل سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں ہے۔ کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدہ سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ اللہ کے وجود کا اقرار اور اس کی رضامندی ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے۔ یہ نہ ہو تو ہمارے تمام کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں۔ وہ ہمارے دل کا نور ہے۔ وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک ہے۔

کافرانہ زندگی میں عمل کی مثال

۱۱۷۔ دنیا کی اس زندگی میں کافر جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کی مثال ایسی ہے جیسے اس ہوا کا چلنا جس میں پالا ہو اور ان لوگوں کی کھیتی پر آن پڑی ہو جنہوں نے اپنے آپ پر ظلم کیا اور اسے برباد کر دے۔ یعنی ایمان کے بغیر عمل کی مثال ایسی سمجھو جیسے کسی شریر ظالم نے کھیتی یا باغ لگایا اور اس کو پالے سے بچانے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ چند روز اس کی سرسبزی و شادابی دیکھ کر خوش ہوتا رہا اور بہت کچھ امیدیں باندھتا رہا۔ یکایک اس کی شرارت و بدبختی سے سرد ہوا چلی۔ برف پالا اس قدر گرا کہ یکبارگی ساری لہلہاتی کھیتی تباہ ہو کر رہ گئی۔ آخر اس بربادی پر کفِ افسوس ملتا رہ گیا نہ امیدیں پوری ہوئیں نہ احتیاج کے وقت اس کی پیداوار سے منتفع ہوا۔ اور چونکہ یہ تباہی ظلم و شرارت کی سزا تھی اس لیے اس مصیبت پر کوئی اجر اُخروی بھی نہ ملا جیسے کہ مومنین کو ملتا ہے یعنی یہ مثال ان کفار کی ہے جو کفر و شرک پر قائم رہتے ہوئے اپنے خیال میں بہت خیرات کرتے ہیں بالخصوص وہ بدبخت جن کا زورِ قوت اور پیسہ حق اور اہلِ حق کی دشمنی پر خرچ ہوتا ہے تو ان کا پوچھنا ہی کیا ہے وہ نہ صرف بے کار خرچ کرتے ہیں بلکہ روپیہ پیسہ خرچ کر کے اپنے لیے اور زیادہ وبال خریدتے ہیں۔ ان سب کو یاد رکھنا چاہیے کہ مال ہو یا اولاد کوئی چیز عذابِ الٰہی سے نہ بچا سکے گی اور متقین کے مقابلہ میں وہ اپنی توقعات میں کامیاب ہوں گے[1]

دراصل اس مثال میں کھیتی سے مراد یہ کشتِ حیات ہے جس کی فصل آدمی کو آخرت میں کاٹنی ہے۔ ہوا سے مراد وہ اوپری جذبۂ خیر ہے جس کی بنا پر کفار رفاہِ عام کے کاموں اور خیرات وغیرہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

میں دولت صرف کرتے ہیں۔ اور پالے سے مراد صحیح ایمان اور ضابطہ خداوندی کی پیروی کا فقدان ہے جس کی وجہ سے ان کی پوری زندگی غلط ہو کر رہ گئی ہے۔ اللہ تعالیٰ اس تمثیل سے یہ بتانا چاہتا ہے کہ جس طرح ہوا کھیتوں کی پرورش کے لیے مفید ہے لیکن اگر اسی ہوا میں پالا ہو تو وہ کھیتی کو پرورش کرنے کے بجائے اسے تباہ کر ڈالتی ہے۔ اسی طرح خیرات بھی اگرچہ انسان کی مزرعہ آخرت کو پرورش کرنے والی چیز ہے مگر جب اس کے اندر کفر کا زہر ملا ہوا ہو تو یہی خیرات مفید ہونے کے بجائے الٹی مہلک بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کا مالک اللہ ہے اور اس مال کا مالک بھی اللہ ہی ہے جس میں انسان تصرف کر رہا ہے۔ اب اگر اللہ کا یہ غلام اپنے مالک کے اقتدار اعلیٰ کو تسلیم نہیں کرتا، یا اس کی بندگی کے ساتھ کسی اور کی ناجائز بندگی بھی شریک کرتا ہے اور اللہ کے مال اور اس کی مملکت میں تصرف کرتے ہوئے اس کے قانون وضابطہ کی اطاعت نہیں کرتا تو اس کے یہ تمام تصرفات از سر تا پا جرم بن جاتے ہیں۔ اجر ملنا کیسا وہ تو اس کا مستحق ہے کہ ان تمام حرکات کے لیے اس پر فوجداری کا مقدمہ قائم کیا جائے۔ اس کی خیرات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک نوکر اپنے آقا کی اجازت کے بغیر اس کا خزانہ کھولے اور جہاں جہاں اپنی دانست میں مناسب سمجھے خرچ کر ڈالے[1]

ان کا ظالمانہ کردار اور اس کے نتائج

۲۱۸ - اور یاد رکھو اللہ نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ وہ خود اپنے آپ ہی پر ظلم کرتے ہیں۔ یہ نہ سمجھا جائے کہ کافر کی کوئی نیکی قبول نہیں کی جاتی تو اس پر معاذاللہ خدا کی جانب سے کوئی ظلم ہوا ہے۔ نہیں یہ ظلم تو انہوں نے اپنی جانوں پر خود کیا ہے نہ کفر اختیار کرتے اور نہ یہ روز بد دیکھنا پڑتا[2] یعنی کفر و شرک کے پالے سے اپنی آخرت کی کھیتی خراب کی اور ضرورت کے وقت کف افسوس ملتے رہ گئے[3] یہ جو کچھ ہوا ان کے باغیانہ کردار کی وجہ سے ہوا۔

اس فقرے میں اگر ایک طرف یہ بتایا گیا ہے کہ دین کے سارے مطالبات اور اللہ سبحانہ کے سارے اوامر و نواہی کا رشتہ بندوں کی منفعتوں اور مضرتوں سے وابستہ ہے۔ اللہ سبحانہ اگر کسی کام کے کرنے کو کہتا ہے تو اس میں خود بندوں کا فائدہ ہوتا ہے۔ اللہ کا کوئی فائدہ نہیں اور اگر وہ کسی کام سے روکتا ہے تو اس میں بندوں کا اپنا نقصان ہے اللہ کا کوئی نقصان نہیں۔

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام [3] معارف م ا

تو دوسری طرف ولکن انفسھم یظلمون میں یہ اشارہ بھی کر دیا کہ اللہ سبحانہٗ کی گوناں گوں نعمتوں کا اور بار بار کی درگزر کا بنی اسرائیل کی مادہ پرست فطرت پر کوئی اثر نہ تھا۔ نعمتوں کی فراوانی کے باوجود یہ نافرمانیاں کرتے تھے۔ اس سے ظاہر ہے کہ گناہوں کی مشق و تمرین نے ان کی فطرت کو مسخ کر دیا تھا۔ کیونکہ جب بھی گناہوں سے گناہ کا احساس رخصت ہو جاتا ہے وہ لوگوں کی فطرت سلیم کو مسخ کر ڈالتا ہے اس سے سوسائٹی کی ساری خوبیاں اور اس کے سارے افراد کے سارے فضائل ایک ایک کر کے رخصت ہو جاتے یہاں ظلم کا لفظ اگرچہ قرآن میں کئی معنے میں آیا ہے مگر یہاں کفر و شرک اور عصیان کے معنے میں ہے اللہ کا ظلم نہ کرنا یہ ہے کہ وہ بغیر جرم کے سزا نہیں دیتا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَتَّخِذُوا بِطَانَةً مِّن دُونِكُمْ لَا يَأْلُونَكُمْ
خَبَالًا وَدُّوا مَا عَنِتُّمْ ۚ قَدْ بَدَتِ الْبَغْضَاءُ مِنْ أَفْوَاهِهِمْ ۖ
وَمَا تُخْفِي صُدُورُهُمْ أَكْبَرُ ۚ قَدْ بَيَّنَّا لَكُمُ الْآيَاتِ إِن كُنتُمْ
تَعْقِلُونَ ۝ هَا أَنتُمْ أُولَاءِ تُحِبُّونَهُمْ وَلَا يُحِبُّونَكُمْ وَتُؤْمِنُونَ
بِالْكِتَابِ كُلِّهِ ۚ وَإِذَا لَقُوكُمْ قَالُوا آمَنَّا ۖ وَإِذَا خَلَوْا عَضُّوا عَلَيْكُمُ
الْأَنَامِلَ مِنَ الْغَيْظِ ۚ قُلْ مُوتُوا بِغَيْظِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ بِذَاتِ
الصُّدُورِ ۝ إِن تَمْسَسْكُمْ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ وَإِن تُصِبْكُمْ
سَيِّئَةٌ يَفْرَحُوا بِهَا ۖ وَإِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا لَا يَضُرُّكُمْ كَيْدُهُمْ
شَيْئًا ۗ إِنَّ اللَّهَ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ۝ ع ۱۲ ۳

۲۱۹
اے ایمان والو! اپنی جماعت کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ وہ تمہارے خلاف میں کمی کرنے والے نہیں تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہ ہی ان کو پسند ہے تمہاری دشمنی ان کے

مونہوں سے ظاہر ہے اور تمہارے خلاف جو کچھ ان کے اندر ہے
وہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ ہم نے تمہارے سامنے اپنی آیات
کھول کر رکھ دی ہیں اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو[۲۲۰]۔ یہ تم ہی تو ہو کہ
تم ان سے محبت کرتے ہو مگر وہ تو تم سے محبت نہیں رکھتے
اور تم ساری کتاب پر ایمان رکھتے ہو[۲۲۱]۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو
کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن جب اکیلے ہوتے ہیں
تو تمہارے خلاف جوشِ غضب میں اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں[۲۲۲]
ان سے کہہ دو کہ اپنے غصہ میں جل مرو اللہ دلوں کے چھپے ہوئے
رازوں کو خوب جانتا ہے[۲۲۳]۔ اگر تمہارے لیے کوئی بھلائی کی بات
ہوتی ہے تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور اگر تم پر کوئی اُفتاد آجاتے
تو وہ خوشیاں مناتے ہیں[۲۲۴]۔ اور دیکھو اگر تم صبر سے کام لوگے
اور تقویٰ کا دامن تھامے رکھو گے تو ان کی کوئی تدبیر تمہارے

خلاف کارگر نہ ہوگی۔ اللہ ان کی ساری کرتوتوں کا گھیرا ڈالے ہوتے ہے۔[۲۲۵]

یہودیوں سے تعلقات ختم کرو

مدینہ منورہ میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ ان میں سے بنو قینقاع کے کھیت یا باغ نہ تھے یا تو وہ تجارت کرتے تھے یا زرگری۔ ان کی آبادی بھی بنو نضیر یا بنو قریظہ کی طرح الگ نہ تھی، عربوں ہی کی آبادی میں وہ رہتے تھے۔ ممکن ہے مختلف مقامات پر ان کے کئی خاندان اکٹھے بستے ہوں۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے کہ یہ لوگ مدینے میں اسلامی آبادی کے اندر رہتے تھے۔ دوسری جگہ فرماتے ہیں کہ قینقاع کی بستی تو آج کل محض میدان ہے۔ اس سے نتیجہ نکلتا ہے کہ جہاں ساڑھے تیرہ سو سال پہلے بنو قینقاع کے مکانات تھے وہاں پھر مکان نہ بنے اور وہ حصہ میدان کی شکل میں باقی رہ گیا۔ باقی دونوں یہودی قبیلوں کے باغات بھی تھے اور کھیت بھی۔ بنو نضیر کی بستی جنوبی سرے پر تھی اور وادی مذینیب کے دونوں کنارے اس آبادی سے مزین تھے اور اس بستی کے پاس ہی جنوب کی جانب ایک ٹیلے پر کعب ابن اشرف کا قلعہ تھا جس کے کھنڈر اب تک باقی ہیں۔

عام یہودیوں کی طرح مدینہ منورہ کے یہودی بھی خاصے مالدار تھے۔ یہودیوں کی بستیاں شمالی جانب دُور دور تک تمام تجارتی شاہراہوں پر موجود تھیں۔ ان میں باہم تجارتی روابط قائم تھے۔ اور ہر مقام کے یہودی ان روابط سے کم و بیش مالی فائدہ اٹھاتے تھے بلکہ کہا جاسکتا ہے کہ اس زمانے میں عرب و شام کی بین الملی اور بین الملکی تجارت پر عملاً یہودیوں ہی کا قبضہ تھا۔ ہجرت تک مدینہ کے اوس و خزرج عرب یہودیوں سے دبے ہوئے تھے کیونکہ اول وہ یہودیوں کے مقروض رہتے تھے۔ اور قرض کے سلسلے میں عورتوں اور بچوں تک کو رہن رکھتے تھے۔ یہودی اہل کتاب تھے اور دوسروں کے مقابلے میں اصحاب علم و ہنر مانے جاتے تھے۔ ان کے ساتھ اوس و خزرج کے لوگوں کے قدیم زمانہ سے تعلقات تھے۔ انفرادی طور پر بھی ان قبیلوں کے افراد ان کے افراد سے دوستانہ

تعلقات رکھتے تھے۔ اور قبائلی حیثیت سے بھی یہ اور وہ ایک دوسرے کے ہمسایہ اور حلیف تھے۔ جب اوس و خزرج کے قبیلے مسلمان ہو گئے تو اس کے بعد بھی وہ یہودیوں کے ساتھ وہی پرانے تعلقات نباہتے رہے۔ اور ان کے افراد اپنے سابق یہودی دوستوں سے اسی محبت و خلوص کے ساتھ ملتے رہے۔ لیکن یہودیوں کو نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے مشن سے جو عداوت تھی اس کی بنا پر وہ کسی ایسے شخص سے مخلصانہ محبت رکھنے کے لیے تیار نہ تھے جو اس نئی تحریک میں شامل ہو گیا ہو۔ انہوں نے اوس و خزرج کے ساتھ ظاہر میں تو وہی تعلقات رکھے جو پہلے سے چلے آ رہے تھے مگر دل میں اب وہ ان کے سخت دشمن ہو چکے تھے اور اس ظاہری دوستی سے ناجائز فائدہ اٹھا کر ہر وقت اس کوشش میں لگے رہتے تھے کہ کسی طرح مسلمانوں کی جماعت میں اندرونی فتنہ و فساد برپا کر دیں۔ اور ان کے جماعتی راز معلوم کر کے ان کے دشمنوں تک پہنچائیں۔ اللہ تعالیٰ یہاں ان کی اسی منافقانہ روش سے مسلمانوں کو محتاط رہنے کی ہدایت فرما رہا ہے۔

۲۱۹ — اے ایمان والو! اپنی جماعت کے سوا دوسروں کو اپنا رازدار نہ بناؤ۔ بعض کہتے ہیں یہ آیات یہود کے متعلق نازل ہوئیں کیونکہ بعض مسلمان جوار و ہمسائگی کے حلیف دوستانہ معاہدہ وغیرہ کی بنا پر جو تعلقات قبل از اسلام ان سے رکھتے چلے آ رہے تھے بعد از اسلام بھی بدستور ان پر قائم رہے اور دوستی پر اعتماد کر کے ان سے مسلمانوں کے بعض رازدارانہ مشوروں کے اخفا کا بھی اہتمام نہ کیا اور بعض کے نزدیک یہ آیتیں منافقین کے حق میں نازل ہوئیں۔ کیونکہ عام طور پر لوگ ظاہر میں ان کو مسلمان سمجھ کر ان سے پوری احتیاط نہ کرتے تھے جس سے سخت نقصان پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ حق تعالیٰ نے یہاں صاف صاف آگاہ کر دیا کہ مسلمان اپنے اسلامی بھائیوں کے سوا کسی کو بھیدی اور رازدار نہ بنائیں [1]

چونکہ اہل کتاب بھی قریش کی طرح تمہاری مخالفت پر کمر بستہ ہو گئے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ تم بھی ان سے چوکنے ہو جاؤ اور انہیں ہمراز اور معتمد نہ بناؤ۔ ان کی دشمنی تو ان کی باتوں سے ہی ظاہر ہے لیکن دلوں میں جو کچھ چھپا ہے وہ اس سے بھی زیادہ ہے [2]

بطانہ کے معنے

بطانہ بطن سے بنا ہے اس کا استعمال ظہر کے خلاف ہوتا ہے بالائی جانب کو ظہر اور اندرونی جانب کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] ترجمان قرآن

بطن کہتے ہیں ۔ اور کپڑے کے بالائی حصہ ابرے کو ظہارہ اور زیریں حصہ استر کو بطانہ کہتے ہیں ۔ پھر یہیں سے بطور استعارہ دلی دوست رازدار اور معتمد کے معنے میں بولا جاتا ہے ۔ عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں بطانہ کے معنے یہ بتاتے ہیں بطانۃ الرجل صاحب سرّہ و داخلۃ امرہ الذی یشاورہ فی احوالہ یعنی بطانہ کسی شخص کے دلی رازدار دوست اور اس کے معاملات میں دراندازِ صاحبِ مشورہ کو کہا جاتا ہے ۔ اقرب الموارد میں بطانہ سے مراد آدمی کے اہل و عیال اور اس کے خواص اور محرمانِ راز بتائی ہے ۔ امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں بھی یہی معنے لکھے ہیں ۔ حاصل یہ ہے کہ بطانہ اس شخص کو کہتے ہیں جس کو رازدار ، دلی اور دوست سمجھا جاتے اور اس کو اپنے معاملات میں معتمد اور مشیر بنایا جائے ۔

اس آیت میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اپنی ملت کے سوا کسی کو اس طرح کا معتمد اور مشیر نہ بناؤ کہ اس سے اپنے اور اپنی ملت و حکومت کے راز کھول دو۔[1]

دراصل پہلے بتایا گیا تھا کہ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی اگر تم نے اہلِ کتاب میں سے کسی فریق کی اطاعت کا قلادہ اپنی گردنوں میں ڈال لیا تو نتیجہ یہ ہوگا کہ مومن ہونے کے باوجود تمہیں کافر بنالیں ۔ بعد ازیں اس خطرے سے بچنے کی عملی تدابیر بتائی ہیں ۔ عملی تدابیر بتانے کے بعد فرمایا تھا کہ اگر تم نے ان کی پاسداری کی تو یہ اہلِ کتاب تمہارا بال بھی بینکا نہ کر سکیں گے ۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ یہی اہلِ کتاب یعنی یہودی جو مدینہ میں آباد ہیں اور جن سے تمہارے عہد و پیمان اور جوار کے تعلقات ہیں ان کو اپنا رازدار نہ بناؤ ۔ آیت میں محطِ نظر من دونکم کی قید ہے ۔ یعنی ان یہودیوں کے ساتھ صرف اس قسم کی بطانہ ناجائز ہے جو مسلمانوں کے بالمقابل یا ان کے مفاد و مصالح کے خلاف ہو ۔ اسلام اور مسلمانوں کا حق اور مفاد دوسرے تمام حقوق اور مفادات پر مقدم ہے ۔ اس لیے مسلمانوں کے کسی اجتماعی ادارے کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح کے برخلاف کفار کے ساتھ بطانہ کا تعلق قائم کرے ۔

یہود دشمنی کی تصویر

۲۲۰ ۔ وہ تمہارے خلاف میں کمی کرنے والے نہیں ، تمہیں جس چیز سے نقصان پہنچے وہ ہی

---

[1] معارف مفسّس

ان کو پسند ہے. تمہاری دشمنی ان کے مونہوں سے ظاہر ہے اور تمہارے خلاف جو کچھ ان کے اندر ہے وہ اس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ ہم نے تمہارے سامنے اپنی آیات کھول کر رکھدی ہیں۔ اگر تم سمجھ بوجھ رکھتے ہو۔ یعنی یہ لوگ ہمیشہ اس کوشش میں رہتے ہیں کہ تمہیں پاگل بنا کر نقصان پہنچائیں۔ اور دینا و دنیوی خرابیوں میں مبتلا کریں۔ ان کی خواہش اسی میں ہے کہ تم تکلیف میں رہو اور کسی نہ کسی تدبیر سے تم کو دینی یا دنیوی ضرر پہنچ جائے جو دشمنی اور بغض ان کے دلوں میں ہے تو وہ بہت ہی زیادہ ہے. لیکن بسا اوقات عداوت و غیظ کے جذبات سے مغلوب ہو کر کھلم کھلا ایسی باتیں کر گزرتے ہیں جو ان کی گہری دشمنی کا صاف پتہ دیتی ہیں۔ مارے دشمنی اور حسد کے ان کی زبان قابو میں نہیں رہتی۔ بس عقلمند آدمی کا کام نہیں ہے کہ ایسے خبیث باطنی دشمنوں کو اپنا رازدار بناتے. خدا تعالیٰ نے دوست دشمن کے پتے اور موالات وغیرہ کے احکام کھول کر بتلا دیے جس میں عقل ہوگی ان سے کام لے گا۔ موالات کفار کے متعلق کچھ تفصیل پہلے اس سورت میں گزر چکی ہے اور کچھ مائدہ وغیرہ میں آئے گی۔[1]

بطانۃ سے کیا مراد ہے

عام شارحین قرآن نے بطانۃ کے مفہوم اور مراد متعین کرنے میں بات کو بہت پھیلا دیا ہے قرطبی رقمطراز ہیں،

اس آیت کے ذریعہ اللہ سبحانہ نے اہل ایمان کو کافروں، یہودیوں اور اہل اہوا کو مسلمانوں کے معاملات میں دخیل بنانے سے روکا ہے۔

اس کا مطلب یہ بتایا گیا ہے کہ قانون اسلام کے منکروں اور باغیوں سے تعلقات ایک خاص حد سے آگے بڑھانے کی اجازت کسی مسلم کو یا اسلامی اسٹیٹ کی رعایا کو نہیں کہ اس سے فرد اور ملت کے لیے ضرر کے اندیشے اور خطرے کھلے ہوتے ہیں۔[2]

فقہاء کرام نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مسلمان حاکم کے لیے جائز نہیں کہ اہل ذمہ میں سے کسی کافر کو اپنا منشی اور پیش کار بنائے۔[3]

اس کا حاصل یہ ہے کہ ان بزرگوں کی نظر میں ایک اسلامی ریاست میں غیر مسلموں کے لیے

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] [3] ماجدی۔

ملازمتوں کے سارے دروازے بند ہیں۔ بلکہ کچھ کے خیال میں یہ معاملہ صرف ریاست کا نہیں بلکہ ہر فرد مسلم کا ہے یعنی ان کے خیال مبارک میں نجی طور پر کسی مسلمان کے لیے غیر مسلم کو ملازم رکھنا ناجائز ہے[1] اسی کے نتیجہ میں ـــ مسلمانوں کے طرزِ عمل کے خلاف احتجاج کرنا پڑا بلکہ موزوں الفاظ میں ان کو اپنے ماضی کا مرثیہ لکھنا پڑا۔ چنانچہ علامہ قرطبی حسرت قلق اور درد کے لہجے میں لکھتے ہیں :

اس زمانے میں حالات میں ایسا انقلاب آگیا کہ یہود و نصاریٰ کو رازدار و امین بنالیا گیا اور اس طرح وہ نادان حاکموں اور سربراہوں پر مسلط ہوگئے ۔

لیکن کیا یہ قرآن کا منطوق ، مدلول اور مفہوم ہے ؟ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ ان میں سے کچھ بھی نہیں ہے ۔ جہاں قرآن نے علی الاطلاق غیر مسلموں کو معتمد بنانے سے منع نہیں کیا ہے بلکہ ان کا واضح اور صاف چہرہ بھی پیش کیا ہے جن کو معتمد بنانا منع ہے ۔ اس چہرہ نمائی کے لیے قرآن نے ان کے چار اوصاف بتائے ہیں ۔

اوّل یہ کہ جن غیر مسلموں کو معتمد و مشیر بنانا منع ہے ۔ وہ مسلمانوں کے فساد کرنے میں کوئی کمی نہیں کرتے ہیں ۔ یعنی فتنہ انگیزی اور تمہاری تباہی میں کوئی کسر نہیں چھوڑیں گے لا یالونکم خبالا کا مفہوم یہی ہے خبال کے معنے بگاڑ اور فساد کے ہیں ۔

دوم یہ کہ وہ تمہارے لیے اس کے متمنی ہیں کہ تمہیں اس راہ میں ٹھوکریں لگیں اور تم زحمتوں میں پھنسو۔ عنت کے معنے مشقت اور تکلیف کے ہیں ۔

سوم یہ کہ ان کے مونہوں سے تمہاری دشمنی عیاں ہے یعنی ان کی باتوں سے بغض و عداوت ٹپک رہی ہے یعنی بغض و عداوت اس قدر ہے کہ اس کو ضبط نہیں کرسکتے اور نہ وہ ان کے چھپانے سے چھپ سکتا ہے اندر سے اچھل کر اور اُبل کر منہ پر آتا ہے ۔

چہارم یہ کہ تمہاری دُشمنی و عداوت ان کے دلوں میں جو چھپی ہوئی ہے وہ اس سے کہیں زیادہ ہے جو ظاہر ہوچکی ہے ۔

بلاشبہ جن غیر مسلموں میں یہ اوصاف پائے جائیں ان کے لیے اسلامی مملکت میں اجتماعی اداروں کے سارے دروازے بند ہیں اور قرطبی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ صرف اہلِ کفر کے لیے

---

[1] جیسا کہ دریا بادی فرماتے ہیں کہ یہ اجازت کسی مسلم کو یا اسلامی اسٹیٹ کی رعایا کو نہیں کہ اس سے فرد اور ملت دونوں کو ضرر اندیشہ اور خطرے کھلے ہوئے ہیں ۔

نہیں اہلِ اہوا کے لیے بھی اجازت نہیں ہے لیکن جن غیر مسلموں کے بارے میں تجربے سے معلوم ہو جائے کہ ان میں اہلِ ایمان کے لیے کوئی فتنہ انگیزی نہیں وہ اہلِ ایمان کے لیے مصائب اور تکالیف کو پسند نہیں کرتے۔ ان میں بغض وعداوت نہیں ہے اور ان کے دل مسلمانوں کی دشمنی سے پاک ہیں تو قرآن چند محفوظ مناصب کے علاوہ ان کو تمام ملازمتوں میں داخل ہونے کا حق دیتا ہے اور اس معاملہ میں ان سے کوئی تعصب روا نہیں رکھتا مسلمان اور غیر مسلم دونوں کے لیے اہلیت کا معیار ایک ہی ہوگا اور اہل آدمیوں کا بلا امتیاز انتخاب کیا جائے گا۔

محفوظ مناصب سے مراد

محفوظ مناصب سے مراد ایسے مناصب ہیں جو اسلام کے اصولی نظام میں کلیدی حیثیت رکھتے ہیں ان مناصب کی فہرست کافی غور وخوض اور قرآن وسنت کے مطالعہ کے بعد ماہرین کی ایک جماعت بنا سکتی ہے۔ بطور ایک قاعدہ کلیہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ جن خدمات کا تعلق پالیسیوں کی تشکیل اور محکموں کی رہنمائی سے ہو وہ سب کلیدی اہمیت رکھنے والی خدمات ہیں۔ اور ایک اصولی نظام میں ایسی خدمات صرف انہی لوگوں سے لی جا سکتی ہیں جو اس کے اصولوں پر اعتقاد رکھتے ہوں خواہ یہ عہدہ رئیس مملکت کے منشی اور پی اے کا ہو کہ یہ رازداری کا مقام ہے کہ

فاروق اعظم حضرت عمر بن الخطاب سے کہا گیا کہ یہاں ایک غیر مسلم لڑکا ہے جو بڑا اچھا کاتب ہے اگر اس کو آپ اپنا میر منشی بنالیں تو بہتر ہو اس پر فاروق اعظم نے فرمایا۔ اگر میں ایسا کروں تو مسلمانوں کو چھوڑ کر غیروں کو راز دار بنا لوں گا۔

یا جیسا کہ قرطبی ہی نے نقل کیا ہے کہ

حضرت عمر نے فرمایا کہ اہلِ کتاب سے سرکاری محکموں میں کام نہ لو کیونکہ یہ رشوت کو حلال سمجھتے ہیں۔

ان خدمات کو مستثنیٰ کرنے کے بعد باقی تمام نظم ونسق میں بڑے سے بڑے عہدوں پر بھی غیر مسلم شہریوں کو اپنی اہلیت کے لحاظ سے مقرر کیا جا سکتا ہے۔

قرآن نے یہی پالیسی غیر مسلموں سے ولایت اور موالات کے بارے میں بھی اختیار کی ہے۔ اس نے کھلے لفظوں میں بتایا ہے کہ،

خدا تمہیں اس بات سے نہیں روکتا کہ ان غیر مسلموں کے ساتھ اچھا سلوک کرو اور

انصاف کے ساتھ پیش آؤ جنہوں نے دین کے بارے میں تم سے لڑائی نہیں کی۔ اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالا۔ خدا تو تمہیں صرف ان لوگوں کی رفاقت سے روکتا ہے جنہوں نے تم سے دین کے بارے میں لڑائی کی ہے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نکال دیا ہے نیز تمہیں جلا وطن کرنے میں ایک دوسرے کی مدد کی ہے۔

اسی پالیسی کی بنا پر مسلمانوں نے اپنے زمانۂ اقتدار میں غیر مسلم شہریوں کو ان کی صلاحیت و قابلیت کے لحاظ سے معاشرہ میں معزز جگہ دی، مسلمان حکمرانوں نے ان کو بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا ان کے اصحاب علم و کمال کی قدر کی اور ان کا اعزاز و اکرام کیا مگر اس سلسلے میں چند باتوں کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے۔

اسلام میں مذہب اور سیاست جُدا جُدا نہیں ہیں بلکہ ایک دوسرے سے وابستہ ہیں۔ اسلامی حکومت کا بنیادی مقصد اسلامی نظام کا قیام اور اس کے احکام کا نفاذ ہے اس لیے حکومت کے بہت سے شعبوں میں اسلامی احکام سے واقفیت ضروری ہے اس کے بغیر کام نہیں چل سکتا۔ مثلاً ریاست کی صدارت، مجلس شوریٰ یا عدالت یا قضاۃ کا محکمہ یا وہ انتظامی اور فوجی شعبے جن میں حکام کو اسلامی فرائض ادا کرتے ہوتے ہیں۔ ان شعبوں میں غیر مسلم کام نہیں دے سکتے لیکن جن شعبوں میں مذہبی احکام سے واقفیت ضروری نہیں تھی مثلاً دفاتر شعبۂ مال، طب و حفظان صحت، علوم و فنون کی تعلیم اور اسی قبیل کے دوسرے شعبے ان میں ابتدا ہی سے غیر مسلم تھے۔

حضرت عمرؓ کے زمانے میں جو ملک فتح ہوئے ان کی زبانیں مختلف تھیں، عراق و ایران کی فارسی، مصر کی قبطی، شام کی رومی تھی۔ اور یہاں کی سابق حکومتوں کے دفاتر بھی ان ہی زبانوں میں تھے اس لیے حضرت عمرؓ نے بھی اس کو باقی اور اس کے پرانے عملہ کو برقرار رکھا۔ عبدالملک کے زمانے تک یہی صورت حال رہی، سب سے پہلے اس نے عربی کو حکومت کی زبان قرار دیا۔ اس وقت غیر مسلموں کا تعلیم یافتہ طبقہ عربی سے واقف ہو چکا تھا۔ حضرت عمرؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت علیؓ اور حضرت معاویہؓ کے دور خلافت میں اسی پر عمل رہا۔ بنو امیہ کی عربی عصبیت مشہور ہے لیکن اُموی دور میں جب شام کے عیسائیوں اور رومیوں سے ربط و ضبط بڑھا تو حضرت معاویہؓ نے ابن اثال عیسائی کو حمص کا کلکٹر مقرر کیا اور سرجون اور منصور رومی کو مالیات کے ذمہ دار عہدوں پر مامور کیا[1]

[1] یعقوبی۔ خلط الشام کر دعلی۔

عباسیوں کے زمانے میں غیر مسلموں کے لیے بڑے بڑے عہدوں کے دروازے بالکل کھل گئے اور دینی شعبوں کو چھوڑ کر کوئی شعبہ ایسا نہ تھا جس میں عیسائی، یہودی، صابی اور مجوسی عہدے دار نہ رہے ہوں حتیٰ کہ وزارت تک پہنچے، وزارت کے بعد سب سے بڑا عہدہ کاتب یعنی چیف سیکرٹری کا ہوتا تھا جو شاہی احکام و فرامین لکھتا تھا۔ اس کے لیے صاحب وجاہت اور ادیب و انشا پرداز ہونا ضروری تھا مسلم اور غیر مسلم کی کوئی قید نہ تھی۔ چنانچہ عباسیوں کے دور میں متعدد صابی اور مجوسی اس عہدے پر مامور ہوتے۔ ان میں ابوہلال عسکری تاریخ اسلام کا نامور ادیب گزرا ہے اس کو عباسی خلفاء اور دیلمی حکمرانوں کے دربار میں بڑا رسوخ حاصل تھا اور اس دور میں بڑے بڑے عہدوں پر ممتاز رہا[1]۔ تمام خلافت میں اکثر سفیر عیسائی ہوتے تھے۔

دراصل قرآنی آیات میں قیود کی وجہ سے معاملہ اجتہادی تھا۔ جوں جوں اعتماد کی فضا بحال ہوتی تعلقات میں خوشگواری آتی گئی۔ حالات تبدیل ہوتے گئے۔ ممانعت میں اسی قدر ڈھیل پیدا ہو گئی۔ حافظ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں یہی پہلو اختیار کیا ہے وہ فرماتے ہیں،

اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو ان غیر مسلموں کی خدمات حاصل کرنے سے منع کیا ہے۔ جن کا اسلام اور اہل ایمان سے غداری اور فریب کاری نمایاں ہو کر سامنے آگئی ہو چاہے یہ ظاہری اور واضح دلائل سے ثابت ہوئی ہو اور خواہ ان کے کردار سے معلوم ہوتی ہو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ تمام غیر مسلموں کا حکم نہیں بلکہ صرف ان کے بارے میں ہے جن کی عداوت نبوت اور اہل ایمان کے لیے کھل کر سامنے آگئی۔ ظاہر ہے کہ معاندین اور مخالفین کے لیے یہ حکم قرین انصاف ہے۔

یہ واقعہ اور حقیقت ہے کہ تاریخ میں مخالفین کے بارے میں اہل ایمان کی رواداری جادۂ اعتدال سے ہٹ گئی اور ان کو اپنی اس اجتہادی غلطی کی بہت بڑی قیمت ادا کرنی پڑی۔ اگر وہ اعتدال پر رہتے اور محفوظ مناصب کے لیے غیر مسلم شہریوں کے لیے دروازے نہ کھولتے تو یہ روز بد نہ دیکھتے۔

بہر حال بطانت کا معاملہ سارے کا سارا ولایت اور موالات جیسا ہے جو ولایت اور موالات کی حدود ہیں وہی بطانت کی حدود ہیں۔

---

[1] معجم الادبار

اہلِ ایمان کی رواداری

۱۲۱ - یہ تم ہی تو ہو کہ تم ان سے محبت کرتے ہو مگر وہ تو تم سے محبت نہیں کرتے ہیں حالانکہ تم ساری کتابوں کو مانتے ہو۔ یعنی یہ کیسی بے موقعہ بات ہے کہ تم ان کی دوستی کا دم بھرتے ہو اور وہ تمہارے دوست نہیں بلکہ جڑ کاٹنے والے دشمن ہیں۔ اور طرفہ یہ ہے کہ تم تمام آسمانی کتابوں کو مانتے ہو خواہ وہ کسی قوم کی ہوں اور کسی زمانے میں کسی پیغمبر پر نازل ہوئی ہوں۔ جن کے خدا نے نام بتلا دیے ان پر علی التعیین اور جن کے نام نہیں بتلائے ان پر بالاجمال ایمان رکھتے ہو۔ اس کے برخلاف یہ لوگ تمہاری کتاب اور پیغمبر کو نہیں مانتے بلکہ خود اپنی کتابوں پر بھی ان کا ایمان صحیح نہیں۔ اس لحاظ سے چاہیے تھا کہ وہ تم سے قدرے محبت کرتے اور تم ان سے سخت نفور و بیزار رہتے مگر یہاں معاملہ برعکس ہو رہا ہے [1]

اس آیت میں قرآن نے کھلے لفظوں میں بتایا ہے کہ مسلمان اپنی سادگی اور خلوص کی وجہ سے یہود سے محبت رکھتے ہیں اور یہود بھی کون؟ جو اہلِ ایمان کی عداوت میں سب سے زیادہ پیش پیش تھے اور جنہوں نے شرارتوں، ایذا رسانیوں اور سازشوں کا ایک منظم سلسلہ شروع کر رکھا تھا۔ مثلاً اوس و خزرج کے درمیان تفرقہ ڈال کر خانہ جنگی کی وہی آگ بھڑکانے کی کوشش کی جو چند سال پیشتر تک دونوں گروہوں کی بربادی کا باعث بن چکی تھی اور وہ یہودیوں کے دست نگر بن کر رہ گئے تھے اس کے باوجود مسلمان یہود سے محبت رکھتے تھے۔ بلاشبہ یہ رحم و کرم اور محبت اسلام نے ان میں پیدا کی تھی۔ مسلمان اس کے اس حد تک خوگر ہو چکے تھے کہ قرآن کو ان کی اس سادگی پر ٹوکنا پڑا۔

اہلِ ایمان کی سادگی و شرافت

بخاری و مسلم میں حضرت ابو ہریرہ سے جنت اور دوزخ کے ایک طویل مکالمہ کے ذیل میں نقل کیا گیا ہے کہ جنت کہے گی۔

مجھ میں کیا کمی ہے کہ میرے اندر صرف وہی لوگ آئیں گے جو سب سے کمزور گرے پڑے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اور بھولے بھالے ہوں گے۔

اس حدیث میں غرارۃ (سادگی) کی اسی صفت کی طرف اشارا ہے۔ صاحب مجمع البحار نے اس کی تشریح یوں کی ہے کہ:

مومن طبعاً اس کو ناپسند کرتا ہے کہ لوگوں کی عیب جوئی میں لگا رہے یہ نہیں کہ وہ بیوقوف اور جاہل ہوتا ہے۔ اس کا بھولا پن اور سادگی اس کی طبیعت کی شرافت کا تقاضا ہوتی ہے وہ اس کو ناپسند کرتا ہے کہ لوگوں کے عیوب نکال کر ان کے منہ پر مارتا رہے۔

اسی کے قریب ایک اور حدیث ہے جو ان الفاظ مروی ہے اکثرا ھل الجنۃ بلہ، اکثر اہل جنت بھولے اور سادے ہوتے ہیں۔ حافظ سخاوی نے المقاصد الحسنہ میں اس کے جملہ طرق نقل کر کے سب کو ضعیف قرار دیا ہے۔ اگرچہ حدیث مذکور ان الفاظ میں ضعیف ہے لیکن بڑے بڑے علماء و محدثین نے اس کی جو تشریح کی اس سے اس کی معنویت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حافظ سخاوی تشریح سے نقل کرتے ہیں کہ یہ وہ لوگ ہیں جن کے دل ذکر اللہ میں فنا ہو کر ماسوا سے غافل ہو چکے ہوں، ابو عثمان فرماتے ہیں ابلہ وہ شخص ہے جو دنیا کے معاملہ میں ناسمجھ اور آخرت کے معاملہ میں سمجھدار ہو۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں ابلہ وہ شخص ہے جو بری باتوں کے لیے نابینا اور بھلی باتوں کے لیے بینا ہو۔ امام ابن قتیبہ لکھتے ہیں ابلہ سے یہاں وہ لوگ مراد ہیں جن کے سینے لوگوں کی طرف سے صاف ہوں اور مخلوق کی عیب جوئی کی عادت سے وہ اتنے دور ہوں گویا غافل ہیں۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ ابلہ وہ شخص ہے جس کے قلب میں عبادتِ الٰہی میں مشغول رہنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے محارم کا خطرہ بھی نہ گزرتا ہو۔ علامہ طاہر فتنی صاحبِ مجمع البحار فرماتے ہیں ابلہ سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا سینہ صاف ہوتا ہے اور لوگوں کی طرف ہمیشہ نیک گمان رکھتے ہیں۔ توجہ الی اللہ کی وجہ سے وہ دنیا کے خداع و فریب سے بے خبر ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ کہ حدیث اگرچہ ضعیف ہے مگر حضرت ابوہریرہ کے مذکورہ بالا بیان کی شرح کرنے کے لیے کافی ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم یہودیوں کو اپنا ہم راز بنانے میں غلطی کرو گے۔ تم ان پر لٹو ہو ان کو تو تم ایک آنکھ بھی نہیں بھاتے ہو۔ یہ تمہارے نیک اور سادہ ہونے کی وجہ سے ہے حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

اس فقرے کے ذریعے اللہ سبحانہ نے اہل ایمان اور اہلِ کتاب دونوں کا چہرہ

پیش فرمایا ہے۔ فرمایا کہ اہلِ ایمان تو اپنے مخالفین کے ساتھ رحمت و رافت کا معاملہ کرتے ہیں جب کہ اہلِ کتاب کا اہلِ ایمان کے ساتھ معاملہ بالکل برعکس ہے۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں بخدا مومن تو منافق سے بھی رحمت اور محبت کا معاملہ کرتا ہے۔

گویا قرآن کے نقطۂ نظر سے اہلِ ایمان منافق اور اہلِ کتاب کے لیے محبت و رحمت ہوتے ہیں۔ شاید قرآن کی اسی رُوح کو علماء نے سمجھا اور اہل السنۃ والجماعت کی یہ نشانی بتائی کہ وہ اپنے مخالفوں کے لیے رحمت ہوتے ہیں چنانچہ حافظ ابن تیمیہ رقمطراز ہیں:

ان من علامة اهل السنة ان يرحموا المخالف ولا يقطعوا اخوته في الدين۔

اہل السنۃ والجماعت کی ایک نشانی یہ ہے کہ وہ اپنے مخالفوں کے لیے سراپا رحمت ہوتے ہیں اور دینی اخوت کے قاطع نہیں ہوتے۔

آخر میں فرمایا وتؤمنون بالكتٰب كله اس کا مطلب عام شارحین قرآن نے یہی بتایا ہے کہ تم ساری کتابوں کو مانتے ہو۔ یعنی یہ عجیب ماجرا ہے کہ شکایت بجائے اس کے کہ تمہیں ان سے ہوتی ان کو تم سے ہے تم تو قرآن کے ساتھ تورات کو بھی مانتے ہو اس لیے ان کو تم سے شکایت ہونے کی کوئی معقول وجہ نہیں ہے البتہ شکایت اگر ہو سکتی تھی تو تمہیں ان سے ہو سکتی تھی کیونکہ وہ قرآن کو نہیں مانتے [1]

مطلب یہ ہے کہ تم تو ان کی کتابوں پر ایمان رکھتے ہو وہ پھر بھی تم سے محبت نہیں کرتے اور وہ تو تمہاری کتاب کو مانتے نہیں تم پھر بھی ان سے محبت کرتے ہو۔ گویا اشاروں اشاروں میں سمجھا دیا کہ وہ اپنے باطل میں تم سے زیادہ سخت جان ہیں۔ یہ اس صورت میں ہے جب کہ کتاب کو اسم جنس قرار دے کر کلہ کو اس کی تاکید بنایا جائے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کی یہی رائے ہے۔ لیکن کتاب کو اسم جنس نہیں بلکہ اپنے حال پر رکھا جاتے اور کلہ کو اسی کی تاکید قرار دیا جائے تو یہ اہلِ کتاب پر ان کے کردار پر ایک تعریض ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہیں تو یہ اہلِ کتاب مگر یہ ساری کتاب کو نہیں مانتے، کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کا انکار کرتے ہیں وہ تو چونکہ کتاب الٰہی کے ان تمام حصوں کو نہیں مانتے جو ان کے مفادات سے ٹکراتے ہوں۔ وقت آنے پر وہ اپنوں کی گردن ناپتے ہیں۔ مفادات کی

---

[1] تفہیم القرآن

حدود میں وہ بیگانوں کا مال ہڑپ کر جاتے ہیں اور تم تو ساری کتاب کو مانتے ہو اور اس لیے زندگی کے ہر مرحلہ پر تمہارے سامنے اللہ کی کتاب ہوتی ہے۔ برخلاف ان کے کہ یہ محض اپنے مفادات کی حد تک کتاب اللہ کو مانتے ہیں۔

دوغلہ پن اور ابن الوقتی

۲۲۲ ۔ جب وہ تم سے ملتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن جب اکیلے ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف جوشِ غضب میں اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں۔ منافقین تو کہتے ہی تھے، عام یہود و نصاریٰ بھی بحث و گفتگو میں آمنّا ہم مسلمان ہیں کہہ کر یہ مطلب لیتے تھے کہ ہم اپنی کتابوں پر ایمان رکھتے ہیں اور ان کو تسلیم کرتے ہیں۔ مگر اسلام کا عروج اور مسلمانوں کی باہمی الفت دیکھ کر یہ لوگ جلے مرتے ہیں اور چونکہ اس کے خلاف کچھ بس نہیں چلتا اس لیے فرطِ غیظ و غضب سے دانت پیستے اور اپنی انگلیاں کاٹ کاٹ کر کھاتے ہیں [1] ایمان باللہ کے دعویٰ سے یہود کا مقصود محض اپنے کو قرآن کی گرفت سے بچانا تھا ان کا مطلب یہ تھا کہ ہمارے اوپر قرآن میں جو آتی لے دے ہو رہی ہے یہ بالکل غلط ہے ہم بھی اللہ پر ایمان رکھتے ہیں دینداری اور خدا پرستی تنہا مسلمانوں ہی کا حق نہیں ہے۔ اس دھونس سے وہ اپنے خلاف مسلمانوں کی زبانیں بند کرنا چاہتے تھے حالانکہ یہ حقیقت ان سے مخفی نہیں تھی کہ قرآن ان سے جس ایمان و اسلام کا مطالبہ کر رہا ہے وہ اس سے بالکل مختلف ہے جس کے یہ مدعی ہیں۔ قرآن کا مطالبہ ان سے جس ایمان و اسلام کے لیے تھا وہ صرف اس شکل میں پورا ہو سکتا تھا جب وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خود قرآن پر اس طرح ایمان لاتے جس طرح مسلمان ایمان لائے تھے۔ چونکہ یہ لوگ اس بات سے اچھی طرح واقف ہوتے ہوئے بات نباہنے کی کوشش کر رہے تھے اس وجہ سے قرآن نے ان کی کوشش کا یہ کہہ کر بھرم چوراہے میں پھوڑ دیا۔ لیکن جب اکیلے ہوتے ہیں تو تمہارے خلاف جوشِ غضب میں اپنی انگلیاں کاٹتے ہیں عضوا علیکم الانامل من الغیظ کاٹ کاٹ کھانا عربی محاورے میں کنایہ شدید جھنجلاہٹ سے ہے جیسے اردو محاورے میں اپنی بوٹیاں نوچنا، دانت پیسنا وغیرہ ہے گویا یہ کہہ کر قرآن نے ان کا یہ راز کھول دیا ہے کہ یہ لوگ جب مسلمانوں کے پاس آتے ہیں تو ان پر اثر جمانے کی کوشش

[1] افادات شیخ الاسلام

کہتے ہیں کہ گویا ان کے اور مسلمانوں کے درمیان سرے سے کوئی تفاوت ہی نہیں ہے لیکن جب یہ اپنی مجلسوں میں جاتے ہیں تو خود بھی اندر اندر غصہ سے جل جل کر مسلمانوں کے خلاف دانت پیستے ہیں اور اسلام کا عروج اور مسلمانوں کی باہمی الفت دیکھ کر جلتے ہیں ۔

یہودیوں کا حسد اور اس کا سبب

۲۲۳ ۔ ان سے کہہ دو کہ اپنے غصہ میں جل مرو اللہ دلوں کے چھپے ہوئے رازوں کو خوب جانتا ہے ۔ یعنی خدا تعالیٰ اسلام اور مسلمانوں کو اور زیادہ ترقیات و فتوحات عنایت فرمائے گا تم غیظ کھا کھا کر مرتے رہو ۔ اگر ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر جاؤ گے تب بھی تمہاری آرزوئیں پوری نہ ہوں گی خدا اسلام کو غالب اور سربلند کر کے رہے گا ۔ اسی لیے مسلمانوں کو ان شریروں کے باطنی حالات پر مطلع کیا اور سزا بھی ان کو ایسی دے گا جو اندرونی شرارتوں اور خفیہ عداوتوں کے مناسب ہو گی [۱] غیظ و غضب کی بے اعتدالی بہت بڑی برائی ہے ۔ بہت سے ظالمانہ اور بیدردانہ کام انسان صرف غیظ و غضب میں کر بیٹھتا ہے ۔ اور بعد کو اکثر ندامت اور پشیمانی ہوتی ہے اسی سے بغض و عداوت نشو و نما پاتی ہے اور اسی سے حسد رونما ہوتا ہے ۔ مسلمانوں کے ساتھ یہود اسی لیے حسد رکھتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوق حاصل تھا لیکن اسلام کی وجہ سے ان کا یہ تفوق جاتا رہا اس لیے وہ اسلام کی بیخ کنی پر آمادہ ہو گئے ۔

۲۲۴ ۔ اگر تمہارے لیے کوئی بھلائی کی بات ہوتی ہے تو ان کو ناگوار ہوتا ہے اور اگر تم پر کوئی افتاد آ جائے تو وہ خوشیاں مناتے ہیں ۔ یعنی اگر تمہاری ذرا سی بھلائی دیکھتے ہیں مثلاً مسلمانوں کا اتحاد و یک جہتی یا دشمنوں پر غلبہ تو حسد کی آگ میں بھننے لگتے ہیں اور جہاں تم پر کوئی مصیبت نظر آئی ہے خوشی کے مارے پھولے نہیں سماتے ۔ بھلا ایسی کینہ توز قوم سے ہمدردی اور خیر خواہی کی کیا توقع ہو سکتی ہے جو دوستی کا ہاتھ ان کی طرف بڑھایا جائے [۲] یہ کیونکر ممکن ہے کہ ایک شخص کے نزدیک برائی اور بھلائی یکساں ہوں ۔ اس لیے ایک دشمن کی طبعی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اس کے دشمن پر مصیبت آئے اور جب یہ مصیبت آتی ہے تو وہ خوش ہوتا ہے ۔ اس کے بجائے جب خدا اس پر کوئی احسان کرتا ہے تو وہ اس کو پسند نہیں کرتا اور اسی کا نام حسد ہے ۔ اس آیت میں یہی بات

۱، ۲؎ افادات شیخ الاسلام

ظاہر کی گئی ہے کہ بغض وعداوت کی وجہ سے یہ لوگ اس مقام پر پہنچ گئے ہیں۔ خوبیوں کے لیے آیت میں مَسّ جس کے معنے چھونے کے ہیں اور بُرائی کے لیے اصابہ جس کے معنے لگنے کے ہیں بولا گیا ہے اس میں گویا اشارا ہے کہ ان کے لیے مسلمانوں کی تھوڑی سی خوشحالی غمگینی کا باعث ہوجاتی ہے لیکن بدحالی جب اُلٹ پلٹ ہوجاتی ہے تو یہ لوگ شاداں ہوتے ہیں۔

صبر وتقویٰ کی تلقین

۲۲۵- اور دیکھو اگر تم صبر سے کام لوگے اور تقویٰ کا دامن تھامے رکھو گے تو ان کی کوئی تدبیر تمہارے خلاف کارگر نہ ہوگی اللہ ان کی ساری کرتوتوں کا گھیرا ڈالے ہوتے ہے۔ ممکن تھا کسی کو یہ خیال آتا کہ جب ان سے دوستانہ تعلقات نہ رکھیں گے تو وہ زیادہ غیظ وغضب میں آکر ہمارے خلاف تدبیریں کریں گے اور بیش از بیش نقصان پہنچانا چاہیں گے اس کا جواب دیا کہ تم صبر واستقلال اور تقویٰ وطہارت پر ٹھیک ٹھیک قائم رہوگے تو ان کا کوئی داؤ فریب تم پر کارگر نہ ہوگا۔ جو کارروائیاں سب خدا کے علم میں ہیں۔ اور اس کو ہر وقت قدرت حاصل ہے کہ ان کا تار پود بکھیر دے تم اپنا معاملہ خدا سے صاف رکھو پھر تمہارے راستہ سے سب کانٹے صاف کر دیے جائیں گے[1]

یہود کے کید اور مکر اور مخالفین کے عناد ومخالفت سے بچنے کا اس فقرہ میں سہل الحصول اور آسان نسخہ بتایا ہے کہ تم صابر اور متقی بن کر رہو کوئی تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔ صبر وتقویٰ ان دو لفظوں میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو اس سے پہلے پورے رکوع میں کہا تھا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ یہودی خطرے سے بچنے کی تدابیر کی پورے رکوع میں تفصیل بتائی تھی کہ اگر تمہارے دامن میں تقویٰ ہو اور تم زندگی کے تمام گوشوں میں نبوت کے علم وعمل سے وابستہ رہے۔ تم دعوت الی الخیر امر بالمعروف نہی عن المنکر کا کام کروگے تو یہودی تمہارا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔ اب اس ساری تفصیل کو صبر وتقویٰ کے دو مختصر لفظوں میں سمیٹ دیا ہے۔ صبر کے لغوی معنے روکنے اور سہارنے کے ہیں۔ یعنی اپنے نفس کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے۔ اس کے معنے بے چارگی اور مجبوری کے نہیں ہیں بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں۔ اسی لیے اس کا اولین مفہوم یہ ہے کہ ہر قسم کی تکلیف اٹھا کر اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اپنے مقصد میں جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آغاز میں لوگوں کے سامنے دعوتِ اسلام پیش کی تو عرب کا ایک ایک ذرہ آپ کی مخالفت میں سرگرم جولاں ہو گیا۔ ہر طرف عداوت اور دشمنی کے مظاہرے ہونے لگے اور گوشہ گوشہ سے قدم قدم پر مخالفتیں اور رکاوٹیں پیش کی جانے لگیں تو اس وقت بشریت کے تقاضے سے آپ کو اضطراب ہوا اور کامیابی کی منزل دُور نظر آنے لگی۔ اس وقت تسلی کا یہ پیغام آیا کہ اضطراب اور گھبراہٹ کی ضرورت نہیں ہے۔ آپ مستعدی سے اپنے کام میں لگے رہیں اللہ آپ کا نگہبان ہے۔ اللہ کا فیصلہ اپنے وقت پر آئے گا واصبر لحکم ربک فانک باعیننا اس انتظار کی کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بے کسی و بیچارگی اور بے بسی سامنے ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی جذبہ دلوں کو کمزور کر رہا ہو حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی پوری امید رکھنی چاہیے بالکل یہی صورتِ حال مدینے میں مسلمانوں کو پیش آ رہی تھی کہ جب مدینہ میں یہودیوں کی اطاعت سے بھی روک دیا گیا۔ یہودیوں کے اعمال کی کامیابی پر قدغن قائم کر دی گئی اور بالآخر ان کو ہمراز اور معتمد بنانے پر پابندی لگا دی گئی تو اس کا نتیجہ لازماً یہ ہوگا کہ ان کی جانب سے اہلِ اسلام کی مخالفت کا طوفان اٹھے گا اور وہ بیش از بیش نقصان پہنچائیں گے اس اندیشہ کے جواب میں فرمادیا کہ اگر تم نے صبر سے کام لیا اور تمہارے پائے استقامت میں جنبش نہ آئی اور ساتھ ہی جن کاموں کے کرنے سے تمہیں روکا گیا ہے ان میں خدا کی نافرمانی سے بچے رہے یعنی یہودیوں کو اپنا محرمِ راز بنانے سے بچے رہے تو پھر ان کا مکر و فریب تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا۔ ان کے کردار کی ایک ایک کروٹ پر اللہ کی نگاہ ہے۔

وَاِذْ غَدَوْتَ مِنْ اَهْلِكَ تُبَوِّئُ الْمُؤْمِنِيْنَ مَقَاعِدَ لِلْقِتَالِ ؕ
وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝ اِذْ هَمَّتْ طَّآئِفَتٰنِ مِنْكُمْ اَنْ تَفْشَلَا ۙ
وَاللّٰهُ وَلِيُّهُمَا ؕ وَعَلَى اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُوْنَ ۝ وَلَقَدْ
نَصَرَكُمُ اللّٰهُ بِبَدْرٍ وَّاَنْتُمْ اَذِلَّةٌ ۚ فَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ ۝

اور اے پیغمبر! اس وقت کو یاد کرو جب تم سویرے اپنے گھر سے نکلے
اور اُحد کے میدان میں لڑائی کے لیے مسلمانوں کو جا بجا مورچوں
پر بٹھا رہے تھے[۲۲۶]، اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے
جب تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا تھا کہ ہمت ہار دیں
(اور واپس لوٹ جائیں) حالانکہ اللہ ان کا مددگار تھا جو ایمان رکھنے
والے ہیں انہیں ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیئے[۲۲۷]۔ اور یاد رکھو
یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے بدر کے میدان میں تمہیں مدد دی تھی
حالانکہ تم گری ہوئی حالت میں تھے بس اللہ سے ڈرو اور اس

کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم شکر گزار ہو سکو۔ ۲۴۸

جنگ بدر اور اُحد سے استشہاد

جنگ بدر اور اُحد کے تجربوں سے استشہاد جن کے نتائج نے ثابت کر دیا تھا کہ صبر و تقویٰ کے بغیر کبھی نصرت و کامرانی حاصل نہیں ہو سکتی۔ جنگ بدر کے موقعہ پر دونوں قوتیں موجود تھیں اس لیے تمہاری مٹھی بھر تعداد نے دشمن کی بہت بڑی تعداد کو شکست دے دی۔ لیکن اُحد کے میدان میں تم نے کمزوری دکھلائی۔ صبر و تقویٰ کی آزمائش میں پورے نہ اترے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ نقصان ہوا۔ اس غزوہ میں بعض مسلمان منافقین کی مغویانہ حرکات سے کچھ اثر پذیر ہو گئے تھے اور قریب تھا کہ مسلمانوں کے دو قبیلے صبر و تقویٰ کا دامن چھوڑ بیٹھیں جس سے منافقین کو خوش ہونے کا موقعہ ہاتھ آجائے مگر اللہ نے دستگیری فرمائی اور ان کو بچا لیا۔

قریش مکہ کا انتقام

غزوۂ اُحد کی بنیاد تو اسی وقت پڑ گئی تھی جب قریش بدر میں شکست فاش کھا کر مکہ واپس ہوئے ان کے دل میں انتقام کی آگ بھڑک رہی تھی اور اس کی تسکین کی خاطر وہ ہر ممکن اقدام کے لیے دیوانے ہو رہے تھے۔

ابن ہشام اور طبقات ابن سعد کا بیان ہے کہ قریش بدر سے مکہ لوٹے تو جس تجارتی قافلے کی حفاظت کے لیے وہ نکلے تھے اور ابوجہل کی فتنہ انگیزی کے باعث غزوہ بدر پیش آیا تھا۔ اس کے افراد دارالندوہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ چنانچہ چند اکابر نے ابوسفیان سے کہا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم میں سے اچھے آدمیوں کا قلع قمع کر دیا ہے اس لیے روپے سے ہماری مدد کرو تاکہ ہم اپنے مقتولین کا بدلہ لے سکیں۔ ابوسفیان نے اپنی طرف سے اور خاندان عبدالمناف کی طرف سے اسے منظور کر لیا۔ قافلے میں ایک ہزار اونٹ تھے اور پچاس ہزار دینار کا مال۔ اصل سرمایہ مالکوں کو لوٹا دیا گیا۔ منافع رکھ لیا گیا جس کی مجموعی مقدار پچاس ہزار روپیہ تھی۔

جنگ کی تیاری

صفوان بن اُمیہ جنگ کے لیے تیاری میں پیش پیش تھا۔ ابوعزہ شاعر جنگ بدر کے قیدیوں میں شامل تھا۔ اس کے پاس فدیہ کے لیے کچھ نہ تھا۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملتجی ہوا کہ میں کثیر العیال اور ضرورت مند ہوں۔ اس وقت مجھ پر احسان فرمائیں۔ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے احسان رکھ کر رہا کر دیا۔ وہ قریش کی نئی تیاریوں میں شرکت کے لیے تیار نہ تھا۔ لیکن صفوان بن اُمیہ نے لالچ دے کر ساتھ ملا لیا۔ اس نے اور مسافع بن عبدالمناف نے بنوکنانہ کو قریش کی معیت پر آمادہ کرنے کے لیے انتہائی سرگرمی سے کام لیا۔

قریش کی فوج

قریش کی تیاریوں کے متعلق تمام خبریں عباس کے ذریعے سے رسُول اللہ کو مل گئیں جو اگرچہ اس وقت تک مسلمان نہیں ہوئے تھے مگر رسُول اللہ کی خیر خواہی میں وہ سب کچھ کرنے کے لیے تیار تھے جو ان کے امکان میں تھا۔ بہرحال قریش مکہ کی فوج تین ہزار جنگ جوؤں پر مشتمل تھی جس میں اہل تہامہ اور بنوکنانہ بھی شامل تھے۔ ان میں سات سو زرہ پوش تھے دو سو گھوڑے تین ہزار اونٹ اور پندرہ عورتیں ساتھ تھیں۔ مولانا شبلی مرحوم فرماتے ہیں۔ لڑائیوں میں ثابت قدمی اور جوش جنگ کا بڑا ذریعہ خاتونانِ حرم تھیں جس لڑائی میں خاتونیں ہوتیں عرب جانوں پر کھیل جاتے تھے کہ شکست ہوئی تو عورت بے حرمت ہو گی اگرچہ جنگ حنین میں عورتوں، بچوں بلکہ مال کا ساتھ ہونا مخالفوں کو کچھ فائدہ نہ پہنچا سکا اور دُرید بن صمہ کی رائے دُرست ثابت ہوئی تھی کہ جب پاؤں اکھڑ جاتے ہیں تو کوئی چیز روک نہیں سکتی میدانِ جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے۔

مشورہ اور فیصلہ

پھر صحابہ کو بلا کر مشورہ کیا گیا۔ مہاجرین وانصار میں سے اکابر کی رائے یہ تھی کہ عورتوں اور بچوں کو گڑھیوں (آطام) میں بھیج دیا جائے جن کی تعداد مدینے میں خاصی تھی اور خود شہر میں مورچے بنا کر دشمن کا مقابلہ کیا جائے۔ رسُول اللہ کی رائے مبارک بھی یہی تھی اور عجیب بات یہ ہے کہ عبداللہ بن ابی کی رائے بھی یہی تھی جسے طبری کے بیان کے مطابق پہلی مرتبہ مشورے میں شریک کیا گیا تھا، لیکن

وجوانوں کی بڑی تعداد نے شہر سے باہر نکل کر مقابلے پر زور دیا ان کے جوش اور گرمی خون کا تقاضا یہی تھا۔ آخر اندازہ ہوا کہ کثرت اسی رائے کے حق میں ہے۔ جمعہ کا دن تھا حضور انور نے نماز جمعہ پڑھائی جہاد پر وعظ فرمایا ارشاد ہوا کہ جب تک صبر کرو گے مدد ہوگی۔ پھر آپ مکان میں تشریف لے گئے۔ زرہ پہنی جنگ کا دوسرا سامان لیا لوگ صفیں باندھے آپ کے منتظر تھے۔ اس اثنا میں سعد بن معاذ اور اُسید بن حضیر نے نوجوانوں سے کہا کہ باہر نکل کر مقابلے پر اصرار مناسب نہ تھا بہتر ہے کہ اب بھی معاملہ حضور انور کے سپرد کر دو۔ خود نوجوانوں کو بھی اپنے اصرار پر پشیمانی ہوئی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسلح ہو کر برآمد ہوتے تو باہر نکل کر مقابلے پر اصرار کرنے والے تمام لوگوں نے ندامت کا اظہار کرتے ہوئے عرض کیا کہ ہم اپنی رائے سے دستبردار ہوتے ہیں آپ کو جو مناسب معلوم ہو وہی کریں۔ حضور انور نے فرمایا پیغمبر کے لیے زیبا نہیں کہ ہتھیار پہن کر اتار دے جب تک اللہ اس کے اور دشمن کے درمیان فیصلہ نہ کر دے جب تک معاملہ مشورے کی منزل میں تھا رائے بدلی جا سکتی تھی جب فیصلہ ہو چکا تو اب رائے بدلنا اور معاملے کو از سر نو معرض گفتگو میں ڈالنا مناسب نہ تھا یہ طریقہ عزیمت و ہمت کے لیے ضعف و نا استواری کا باعث ہو سکتا تھا۔

مدینہ منورہ کی آبادی

مدینہ منورہ کے مشرق مغرب اور جنوب میں کھجور کے گھنے باغ تھے ان میں سے گزرتے ہوئے کسی بستی یا محلہ پر حملہ آسان نہ تھا کیونکہ باغوں میں سے دشمن کا صرف ایک ایک آدمی بمشکل آگے بڑھ سکتا تھا اس صورت میں حملہ آور بآسانی مارے جاتے صرف شمالی جانب سے حملہ ہو سکتا تھا اس لیے قریش نے شمالی و مغربی جانب پر پڑاؤ ڈالا تھا پھر پوری آبادی ایک مقام پر نہ تھی بلکہ پہاڑوں کے درمیان وسیع میدان میں بکھری ہوئی بستیاں یا محلے آباد تھے۔ بعض قبیلوں نے اپنی زمینوں اور باغوں کے پاس آبادی کا انتظام کر لیا تھا اور کئی دو منزلہ گڑھیاں بنائی گئی تھیں۔ وہ ہر خطرے کے وقت بچوں اور عورتوں کو گڑھیوں کی بالائی منزلوں پر پہنچا دیتے اور خود فارغ البال ہو کر حملہ آوروں کا مقابلہ کرتے۔

اسلامی لشکر

مدینہ منورہ سے رسول اللہ عصر کے وقت نکلے آپ نے تین نیزے طلب فرماتے اور تین جھنڈے

بنائے۔ ایک حباب بن منذر کو عطا ہوا دوسرا اُسید بن حضیر اور تیسرا علی بن ابی طالب کو حضورِ انور گھوڑے پر سوار ہوئے کمان کندھے پر ڈالی نیزہ ہاتھ میں لیا مسلمانوں کی کل تعداد اس وقت ایک ہزار تھی جن میں عبداللہ بن ابی کے تین سو آدمی بھی شامل تھے۔ لشکر میں صرف ایک سو آدمی زرہ پوش تھے۔ سعد بن معاذ اور سعد بن عبادہ مرکب مبارک کے آگے آگے دوڑ رہے تھے باقی لشکری دائیں بائیں اور پیچھے تھے۔ حضورِ انور نے مشرقی جانب کے حرے یعنی حرہ واقم کے دامن کا راستہ اختیار فرمایا جدھر بنی عبدالاشہل کی بستی تھی۔ جب آپ مقام شوط میں پہنچے تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر الگ ہوگیا۔ عذر یہ پیش کیا کہ میری رائے کے مطابق مدینے کے اندر رہ کر مقابلہ نہیں کیا گیا گویا اسلامی لشکر کے افراد صرف سات سو رہ گئے ساتھ دو گھوڑے تھے طبقات ابن سعد میں ہے رسول اللہ شیخین میں شب باش ہوتے محمد بن مسلمہ کو پچاس آدمیوں کے ساتھ پہرہ داری پر مامور فرمایا گیا یہ اصحاب رات بھر لشکر کے گرد گشت کرتے رہے۔ رات کے پچھلے حصے میں ابوخیثمہ حارثی کو رہبر بنایا اور اُحد کی جانب روانہ ہوتے۔ الشفرہ پہنچے تو نماز کا وقت ہوگیا۔ وہاں آپ نے بلال کو اذان کا حکم دیا اور نماز پڑھائی۔ پھر جبلِ اُحد کے پاس اس مقام پر پہنچ گئے جسے بظاہر پہلے سے فوج کی ترتیب کے لیے تجویز فرما رکھا تھا۔

جبلِ اُحد

جبلِ اُحد مدینے کے شمال میں قریباً تین میل پر شرقاً غرباً بخطِ مستقیم پھیلا ہوا ہے۔ اس کی جنوبی جانب وسط میں نعل نما خلا ہے جو خاصا وسیع ہے یعنی یہاں سے پہاڑ پیچھے کی طرف ہٹ گیا ہے۔ اسی کا ذکر کرتے ہوئے ابن ہشام میں ہے کہ رسول اللہ نزل الشعب من احد فی عدوۃ الوادی الی جبل یعنی آپ ایک گھاٹی میں اترے۔ یہ مقام وادی قنات سے پہاڑ کی جانب اونچائی میں واقع ہے جہاں سے یہ خلا یا جھکاؤ شروع ہوتا ہے وہاں سے جبلِ اُحد کے ساتھ ساتھ وادی قنات گزرتی ہے جس میں بارش کے ساتھ خاصا پانی بہنے لگتا ہے بارش نہ ہو تو یہ عموماً خشک ہوتی ہے۔ قنات کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی طرف ہے۔ خلا کی زمین قنات سے اونچی ہے اس کے عین سامنے وادی کے جنوبی کنارے پر ایک چھوٹا سا ٹیلا ہے جسے جبل عینین کہتے ہیں یعنی دو چشموں والا ٹیلا۔ کیونکہ اس سے دو چشمے نکلتے ہیں۔ جنگ اُحد کے بعد اسے جبل الرماۃ بھی کہنے لگے یعنی وہ ٹیلا جس پر تیر انداز(1)، کا مورچہ تھا رسول اللہ نے اُحد کے اسی جھکاؤ کو صف بندی

کے لیے منتخب فرمایا۔ پشت پر پہاڑ تھا۔ عینین پر پچاس تیر انداز مقرر فرمالیے جن کی سالاری عبداللہ بن جبیر کو سونپی اور تاکید فرمادی کہ ہمیں فتح ہو یا شکست مگر تیر اندازوں کو کسی بھی حالت میں جگہ نہ چھوڑنی چاہیے وہ ٹیلے پر بدستور جمے رہیں اور مقرر مورچے سے اِدھر اُدھر نہ ہوں۔

تیر اندازوں کے مورچے کی اہمیت

قریش مغربی جانب سے صف بند ہوکر لڑائی کے لیے آسکتے تھے کیونکہ ان کی لشکرگاہ مغرب ہی کی جانب تھی۔ مسلمانوں کے لیے نعل نما خلا میں صف بند ہوکر دشمن کے مقابلے کے لیے مغربی جانب کا رُخ کرلینا ناگزیر تھا۔

صرف ایک خطرہ تھا کہ جب گھمسان کا رن پڑے تو مبادا کوئی فوج مسلمانوں پر عقب سے حملہ کردے اس طرح وہ دو لشکروں کے درمیان گھر جائیں۔ جبل عینین کے تیر اندازوں کا اولین وظیفہ یہی قرار دیا گیا کہ وہ عقب سے حملہ کرنے والی ہر فوج کو روکیں اور اس کا رُخ پلٹ دیں۔ مسلمان مغربی جانب دشمن کو پیچھے ہٹانے ہوتے کتنی ہی دُور نکل جاتے اگر ان کا عقب محفوظ رہتا تو کوئی خطرہ ان کے لیے پریشانی کا باعث نہیں ہوسکتا تھا۔ اگر خدانخواستہ قریش کثرت تعداد کی بنا پر مسلمانوں کو دھکیلتے ہوئے جھکاؤ کی طرف لے آتے تو جبل عینین کے تیر انداز اپنی قادر اندازی سے قریش کے لشکر میں بھی افراتفری ڈال سکتے تھے اور اپنے بھائیوں سے دُشمن کا دباؤ بھی دُور کرسکتے تھے۔ غرض تیر اندازوں کے دو وظیفے تھے اور دونوں کو جنگ میں انتہائی اہمیت حاصل تھی۔ ۱۔ مسلمانوں کے عقب کو ہر حملہ آور سے محفوظ رکھنا، ۲۔ قریش کا دباؤ بڑھے تو ان کی قوت کو درہم برہم کرنے کے لیے امداد دینا۔ یہ دونوں وظیفے اصل مورچے پر قائم و استوار رہنے ہی سے پورے ہوسکتے تھے اس لیے رسول اللہ نے تاکید فرمادی تھی کہ لڑائی کا انجام خواہ کچھ ہو مگر تیر انداز کسی بھی حالت میں جگہ نہ چھوڑیں۔ طبقات کے بیان کے مطابق ان سے کہہ دیا گیا تھا اگر تم دیکھو کہ ہمیں مال غنیمت مل رہا ہے تو ہمارے ساتھ شریک نہ ہونا اور اگر تم دیکھو کہ ہم قتل ہو رہے ہیں تو ہماری مدد نہ کرنا۔

قریش کی صف آرائی

قریش کی صف آرائی کے متعلق جو تفصیلات روایات میں ملتی ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے کہ رسالہ دو سو گھوڑوں پر مشتمل تھا۔ ایک سو گھوڑے لشکر کے میمنہ پر تھے اور ایک سو میسرہ پر۔ میمنہ پر خالد بن

ولید مامور ہوتے جو اس وقت تک اسلام نہیں لائے تھے۔ میسرہ عکرمہ بن ابی جہل کے حوالے کر دیا گیا ایک سو تیر اندازوں کی کمان عبد ابن ربیعہ کو سونپی گئی۔ قلب کی فوج آگے بڑھی تو اس کے پیچھے عورتیں ذہین سجا سجا کر اور اشعار گا گا کر مردوں کو جوش دلا رہی تھیں۔ قریش نے علم طلحہ بن ابی طلحہ کو دیا جو عبدالدار کے خاندان سے تھا۔ رسول اللہ نے یہ سنا تو اسلامی علم مصعب بن عمیر کے حوالے کر دیا وہ بھی عبدالدار کے خاندان سے تھے۔

آغازِ جنگ

جنگ کی ابتدا ابوعامر فاسق سے ہوئی وہ قبیلہ اوس میں سے تھا خدا جانے اسے کیوں یہ خیال ہو گیا تھا کہ میرے ہم قوم مجھے دیکھتے ہی رسول اللہ کا ساتھ چھوڑ دیں گے۔ اس کے ساتھ متفرق آدمیوں کا ایک گروہ تھا۔

انصار نے اسے دیکھتے ہی کہا او فاسق خدا تجھے بینائی سے محروم کرے۔ اس نے اور اس کے ساتھیوں نے پتھر بھی پھینکے پھر یہ کہتا ہوا لوٹ گیا کہ میرے دور ہو جانے کے باعث میری قوم کے خیالات بگڑ گئے ہیں۔ ابوسفیان نے طلحہ بن ابی طلحہ سے کہا کہ بدر میں بھی ہمارا جھنڈا عبدالدار ہی کے پاس تھا وہاں ہم پر جو مصیبت آئی اس کا ذکر غیر ضروری ہے لوگ جھنڈا ہی دیکھ کر میدان جنگ میں ثابت قدم رہتے ہیں جھنڈا جگہ سے ہٹ جاتے تو سب کے پاؤں اکھڑ جاتے ہیں لہٰذا بنو عبدالدار یا تو اطمینان دلاؤ کہ جھنڈے کو بہرحال بلند رکھو گے یا اسے چھوڑ دو تاکہ ہم خود سنبھال لیں۔ بنو عبدالدار نے جھنڈے کی حفاظت کے متعلق پورا اطمینان دلایا اور اس فرض کی بجاآوری میں خاندان کے بیشتر افراد کٹوا دیئے۔

بنو عبدالدار کی تباہی

مسلمان تیر اندازوں نے قبیلہ ہوازن کا رخ پھیر دیا تو طلحہ بن ابی طلحہ (علمدار قریش) نے جوش کے عالم میں کہا کہ کوئی ہے جو مجھ سے جنگ کرے۔ علی بن ابی طالب آگے بڑھے اور ایسی ضرب لگائی کہ طلحہ کی کھوپڑی پھٹ گئی اور وہ گر گیا۔ اس کے بعد جھنڈے کی حفاظت میں بنو عبدالدار کو شدید جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ طلحہ کے بھائی عثمان بن ابی طلحہ کو حمزہ نے اور ابوسعید بن ابی طلحہ کو سعد بن ابی وقاص نے قتل کیا۔ طلحہ کے تین بیٹے، مسافع، کلاب اور جلاس یکے بعد دیگرے مارے گئے

پھر خاندان عبدالدار ہی سے ارطاۃ بن شرجیل اور قاسط بن شریح نیز خاندان کا ایک غلام صواب موت کے گھاٹ اترے گویا اس خاندان نے جھنڈے کی حفاظت میں باری باری نو جانیں دیں۔ قریش ہزیمت اٹھا کر بھاگ نکلے۔ مسلمانوں نے تعاقب کیا اور انہیں میدان جنگ سے نکال دیا ساتھ ہی مال غنیمت جمع کرنے لگے۔

تیراندازوں کی غلطی

تیراندازوں کے سرعسکر عبداللہ بن جبیر اپنے ساتھیوں کو بار بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد دلاتے تھے اور کہتے تھے کہ ہمیں حضور انور کے حکم سے تجاوز نہ کرو گا باقی سب کو بھی اس فرمان کا پورا پاس تھا لیکن وہ کہتے تھے کہ اس فرمان کا یہ مطلب نہیں کہ دشمن میدان جنگ بھی چھوڑ دے تو بدستور مورچے پر جمے رہو۔ چنانچہ چالیس تیرانداز جبل عینین سے اتر کر مال غنیمت سمیٹنے میں مشغول ہو گئے اور صرف دس اپنے سرعسکر کے ساتھ مورچے پر قائم و استوار رہے۔ اسی غلطی نے دشمن کو ایک ایسی تدبیر پر عمل پیرائی کا موقعہ دیا جس سے مسلمانوں کی بدیہی فتح شدید جانی نقصان میں بدل گئی۔

خالد بن ولید کا حملہ

خالد بن ولید کو قدرت کی طرف سے غیر معمولی جنگی صلاحیتیں عطا ہوئی تھیں۔ انہوں نے فوراً بھانپ لیا کہ اپنی شکست کی تلافی کا بہترین ذریعہ کیا ہے چنانچہ فوراً اپنا رسالہ لے کر جبل احد کی شمالی جانب سے ہوتے ہوئے مشرقی سمت آ گئے۔ جبل عینین اور احد کے درمیان سے ان مسلمانوں پر حملہ کر دیا جن کا رخ بھاگنے والے قریش کے تعاقب میں مغربی جانب تھا۔ نیز وہ مال غنیمت سمیٹنے میں مصروف تھے۔ عکرمہ بن ابی جہل بھی خالد کے ساتھ ہو گیا۔ ایسے ہی حملے کی روک تھام کے لیے تیرانداز جبل عینین پر بٹھائے گئے تھے لیکن انہوں نے رسول اللہ کے تاکیدی حکم کی تعبیر ظاہری حالات کے پیش نظر ایسے انداز میں کر لی جس سے ان کی نیت پر زد نہیں پڑتی تاہم اس نقصان کا اندازہ کون کر سکتا ہے جو اس تعبیر سے اسلامی لشکر ملت اسلامیہ اور خود مقاصد تبلیغ کو پہنچا پھر یہی تعبیر قریش مکہ کی مزاحمت کو ختم کرنے میں موجب تاخیر ہوئی جو اسلام اور عربوں کے درمیان ایک دیوار کی حیثیت میں کھڑے ہو گئے تھے۔ خالد کا حملہ اس درجہ ناگہانی تھا گویا یکا یک ایک بجلی مسلمانوں کے خرمن تنظیم و ترتیب پر آ گری اور ان کی شاندار فتح شدید نقصان میں بدل گئی۔ جن چالیس تیراندازوں نے

مورچہ چھوڑنے کی غلطی کی تھی کچھ نہیں کہا جاسکتا کہ ان کا انجام کیا ہوا لیکن جن دس نیک بختوں نے عبداللہ بن جبیر کی سرکردگی میں مورچہ نہیں چھوڑا تھا وہ بھی شہادت پا گئے۔

نزول آفات

جب تک جبل عینین کا مورچہ قائم تھا مسلمان جس طرف بڑھتے تھے گرد و پیش مورت بکھرتے جاتے تھے۔ خالد کے حملے نے صورت حالات بالکل منقلب کر ڈالی۔ حمزہ بن عبدالمطلب، ارطاۃ بن شرجیل کو قتل کر کے سباع بن عبدالعزیٰ کی طرف بڑھ رہے تھے۔ عین اس وقت وحشی نے حملے سے پیدا شدہ افراتفری دیکھ کر جبل عینین کے پاس سے حربہ حمزہ کی طرف پھینکا جو ناف سے اوپر ان کے پیٹ میں گھسا اور ٹانگوں کے بیچ میں سے نکل گیا وہ لڑکھڑائے، گرے اور جاں بحق ہو گئے۔ مصعب بن عمیر اسلامی فوج کے علمدار تھے۔ ان کا داہنا ہاتھ کٹ گیا تو علم بائیں ہاتھ میں تھام لیا۔ وہ بھی قلم ہو گیا تو علم کو سینے سے لگا لیا۔ اسی حالت میں انہیں عمرو بن قمیہ نے شہید کر دیا۔ مصعب شکل اور وضع قطع میں رسول اللہ سے مشابہ تھے۔ اسی بنا پر ابن قمیہ نے دعویٰ کیا تھا کہ وہ محمد کو قتل کر آیا ہے۔ ابو عامر فاسق کفر و شرک کی حمایت میں مصروف تگ و دو تھا لیکن اس کے فرزند ارجمند حنظلہ جان ہتھیلی پر رکھے راہ حق میں سرگرم جہاد تھے۔ اتفاقاً حنظلہ کی مڈبھیڑ ابوسفیان سے ہو گئی قریب تھا ابوسفیان کا خاتمہ حنظلہ کے مقدس ہاتھوں سے ہو جاتا کہ مشرکین میں سے شداد بن الاسود نے حنظلہ کو شہید کر دیا۔

مسلمانوں کے تین گروہ

خالد کے اس حملے نے مسلمانوں میں جو ابتری پیدا کی اس کی وجہ سے وہ تین گروہ ہو گئے۔ ان میں ایک چھوٹا سا گروہ میدان سے بھاگ گیا۔ ان میں سے کچھ مدینہ پہنچ گئے۔ اور کچھ اس سے بھی آگے مشرقی جانب نکل گئے۔ روایتوں میں دو مقاموں کا ذکر آیا ہے اول منقی دوم جلعب۔ یہ دونوں الحوص نام مقام کے قریب بتائے گئے ہیں اور الحوص مدینہ منورہ کے مشرق میں کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ دوسرے گروہ نے میدان تو نہ چھوڑا لیکن حضور انور کی شہادت ان پر بجلی کی طرح گری اور تعطل کی سی کیفیت طاری ہو گئی اور ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ یکایک کیا صورت پیش آ گئی اور اس عالم میں کیا کرنا چاہیے؟ تیسرا گروہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد اسی طرح جاں نثاری اور فداکاری میں سرگرم عمل رہا جس طرح پروانے شمع پر جان قربان کرتے وقت گرد و پیش کے حالات سے بالکل بے پروا ہوتے ہیں۔

اس گروہ میں ابوبکر، علی، سعد بن ابی وقاص اور مہاجرین و انصار میں سے اور لوگ شامل تھے۔

رسول اللہ کو چشم زخم

خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات بھی چشم زخم سے محفوظ نہ رہی۔ سعد بن ابی وقاص کے بھائی عتبہ بن ابی وقاص نے جو مسلمان نہیں ہوا تھا حضور انور کا نیچے کا داہنا دانت شہید کر دیا اور اسی کی ضرب سے لب مبارک پر بھی زخم آیا۔ عبداللہ بن شہاب نے پیشانی مبارک کو زخمی کیا۔ عمرو بن قمیہ نے ایک پتھر اس زور سے مارا کہ دو کڑیاں رخسار مبارک میں گھس گئیں ایسے ہی حالات میں زبان حق ترجمان پر یہ الفاظ آئے وہ قوم کیا فلاح پا سکتی ہے جو اپنے نبی کا چہرہ خون سے رنگین کرتی ہے۔ پھر آپ کی شفقت و رحمت بے پایاں ہی فرماتی رہی۔ اے خدا میری قوم کو راہ ہدایت دکھا دے یہ نہیں جانتے کہ کیا کر رہے ہیں یا انہیں معاف کر دے۔ ابوعامر فاسق نے جو گڑھے خفیہ خفیہ کھدوائے تھے اور مسلمانوں کو ان کا پتہ نہیں لگ سکا تھا ان میں سے ایک میں رسول اللہ بھی گر گئے۔ علی بن ابی طالب نے آپ کا دست مبارک پکڑا۔ طلحہ بن عبیداللہ نے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ ابوعبیدہ بن الجراح نے دانتوں کی کڑیاں یکے بعد دیگرے کھینچ کر نکالیں اور اس عمل میں ان کے آگے کے دو دانت گر گئے۔ ابوسعید الخدری کے والد مالک بن سنان نے چہرہ مبارک سے خون چوس کر نکالا۔

انسانی فداکاری کے معجزے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس تھوڑے سے صحابہ رہ گئے تھے۔ اسلامی لشکر میں خالد کے حملے سے افراتفری پیدا ہوئی تو قریش از سر نو منظم ہو کر حملوں پر آمادہ ہو گئے۔ حضور انور نے فرمایا۔ کون اپنی جان اللہ کی راہ میں نثار کرتا ہے۔ ایک انصاری جن کا نام ایک روایت میں زیاد بن السکن اور دوسری روایت میں عمارہ بن زیاد بن السکن آیا ہے پانچ یا سات انصار کو لے کر کھڑے ہو گئے ایک ایک نے لڑتے لڑتے جان دے دی۔ سب سے آخر میں زیاد بن السکن یا عمارہ بن زیاد بن السکن زخموں سے چور ہو کر گر گئے حضور انور نے فرمایا اسے میرے قریب لے آؤ پھر اس پاکباز مجاہد نے اپنا رخسار پائے مبارک پر رکھ لیا اسی حالت میں وہ جان بحق ہو گئے۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا ان کا لاشہ قریب لاؤ لوگ اٹھا کر لائے کچھ کچھ جان باقی تھی قدموں پر منہ رکھ دیا اور اسی حالت میں جان دے دی۔

بجز نازرفتہ باشد زجہاں نیازمندے کہ بوقت جاں سپردن بسرش رسیدہ باشی

ام عمارہ (نسیبہ بنت کعب المازینہ) نے بھی بڑی دلیری سے رسول اللہ کی حفاظت کا حق ادا کیا۔ تلوار سے عمرو بن قمیہ کے کئی ضربیں لگائیں لیکن اس نے دو زرہیں پہن رکھی تھیں اس لیے محفوظ رہا خود ابن قمیہ نے ام عمارہ کے کندھے پر شدید زخم لگایا جس کا نشان مدت العمر باقی رہا یہی ام عمارہ ہیں جن کے فرزند حبیب بن زید بن عاصم نے مسیلمہ کذاب کو قتل کیا تھا۔ ابو دجانہ نے اپنے جسم کو حضور انور کے لیے ڈھال بنا رکھا تھا۔ تیر پر تیر کھاتے گئے حتیٰ کہ جسم چھلنی ہو گیا مگر ذرا بھی جنبش نہ کی تاکہ کوئی تیر حضور انور تک نہ پہنچنے پائے۔ طلحہ نے بھی یہ فرض بوجہ احسن انجام دیا۔ سعد بن وقاص کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تیر دیتے جاتے تھے۔ ساتھ ہی فرماتے تھے ارم فداک ابی وامی (میرے ماں باپ قربان چلاتے جاؤ) سعد مدت العمر اس محبت بھرے ارشادِ مقدس پر فخر کرتے رہے۔ ابن قمیہ نے حضور انور پر ایک سخت وار کیا۔ اس وار کو طلحہ نے اپنے برہنہ ہاتھ پر روکا جس سے ہاتھ کٹ گیا اور ابن قمیہ کے وار کا زور کم ہو گیا۔ نیز رسول اللہ نے دو زرہیں پہن رکھی تھیں اس لیے آپ بفضل اللہ گزند سے محفوظ رہے۔

انس اور ابن عوف

انس بن مالک کے چچا انس بن نضیر بعض صحابہ کے پاس پہنچے جو ہاتھ پر ہاتھ رکھے بیٹھے تھے۔ ان میں عمر اور طلحہ بن عبید اللہ بھی تھے۔ پوچھا آپ لوگ کس لیے بیٹھے ہیں جواب ملا کہ رسول اللہ شہید ہو گئے، انس نے کہا پھر آپ کے بعد زندگی کس کام کی۔ اٹھو اور اس مقصد کے لیے مر مٹو جس کے لیے رسول اللہ مر مٹے۔ یہ کہتے ہی انس کفار سے جنگ میں مشغول ہو گئے اور جب تک شہادت نہ پاگئے قتال سے نہ رکے بیان کیا جاتا ہے کہ ان کے جسم پر کم و بیش ستر زخم تھے نعش پہچانی نہیں جاتی تھی۔ انس کی ہمشیرہ نے انگلیاں دیکھ کر پہچانا۔ عبد الرحمن بن عوف کے منہ پر ایک پتھر لگا جس سے ان کا اگلا دانت ٹوٹ گیا اور بیس یا اس سے بھی زیادہ زخم لگے۔ بعض زخم پاؤں پر لگے تھے جن کی وجہ سے وہ لنگڑے ہو گئے۔

مسلمانوں کو بشارت

جس صحابی نے سب سے پہلے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہچانا، وہ کعب بن مالک تھے۔ انہوں نے پکار کر کہا مسلمانو بشارت ہو یہ رسول اللہ ہیں۔ جو صحابہ مایوس اور دل شکستہ بیٹھے تھے یہ بشارت سنتے ہی ان کے جسموں میں گویا از سرِ نو جان پڑ گئی وہ سب حضور انور کی طرف دوڑے۔ حضور انور گھاٹی کی

طرف چلے۔ ابوبکر، عمر، علی، طلحہ بن عبید اللہ، زبیر بن عوام، حارث بن صمہ اور بعض دوسرے مسلمان آپ کے ساتھ تھے آپ چٹان پر چڑھنا چاہتے تھے۔ طلحہ بن عبید اللہ نیچے بیٹھ گئے اور ان کی مدد سے حضور انور چٹان پر چڑھے قریش کا ایک گروہ پہاڑ پر چڑھ آیا تھا۔ عمر بن خطاب اور بعض دوسرے اصحاب نے زبردست مقابلہ کر کے اس گروہ کو پہاڑ سے اترنے پر مجبور کر دیا۔ علی بن ابی طالب اپنی سپر میں احد کے چشمے سے جس کا نام مہراس تھا پانی لاتے اور رسول اللہ کی خدمت میں پیش کیا۔ آپ کو اس میں سے بدبو آئی لہٰذا پانی پیا نہیں البتہ اس سے چہرہ مبارک کا خون دھویا۔

حسیل اور ثابت

حذیفہ کے والد ماجد حسیل بن جابر (الیمان) اور ثابت بن وقش بہت سن رسیدہ تھے انہیں عورتوں اور بچوں کے ساتھ گڑھی میں بٹھا دیا گیا۔ انہوں نے باہم بات چیت کر کے طے کیا کہ ہماری عمریں تو اب پوری ہو چکی ہیں کیوں نہ تلواریں لے کر نکلیں اور مسلمانوں سے جا ملیں شاید اللہ تعالیٰ شہادت کا شرف بخشے چنانچہ دونوں بزرگ تلواریں لے کر نکل پڑے۔ ثابت بن وقش تو مشرکوں کے ہاتھ سے شہید ہوئے لیکن حسیل بن جابر کو غلط فہمی سے مسلمانوں ہی نے شہید کر دیا انہیں خیال بھی نہیں ہو سکتا تھا کہ حسیل جنگ کے لیے آگئے ہیں یہی سمجھتے رہے کہ قریش مکہ میں سے کوئی شخص ہے رسول اللہ نے خون بہا دلانا چاہا لیکن حذیفہ نے معاف کر دیا۔

اُصیرم

بنی عبدالاشہل میں سے عمرو بن ثابت بن وقش اصیرم کر کے مشہور تھے۔ وہ قبول اسلام پر آمادہ نہیں ہوئے تھے۔ رسول اللہ جنگ کے لیے نکلے تو اصیرم نے خود ہی اسلام قبول کر لیا اور مسلمانوں میں شامل ہو کر لڑتے لڑتے زخموں سے چور ہو کر گر گئے۔ عبدالاشہل کے آدمی میدان جنگ میں اپنے مقتولین ڈھونڈ رہے تھے۔ اصیرم کو سخت زخمی دیکھا تو حیران ہوئے کہ انہیں کیا چیز یہاں لائی خود اصیرم سے پوچھا تو انہوں نے کہا میں اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لایا پھر تلوار لے کر لڑتا رہا اور اب جو میری حالت ہے وہ آپ لوگوں کے سامنے ہے یہ کہہ کر وفات پا گئے۔ رسول اللہ نے حالات سنے تو فرمایا:

انہ من اھل الجنۃ وہ جنتیوں میں سے ہے۔

عمرو بن الجموح

عمرو بن جموح لنگڑے تھے آپ کے چار بہادر فرزند غزوۂ اُحد میں شریک تھے اور والد کو روکتے تھے۔ عمرو حضور انور کی خدمت میں پہنچے اور عرض کیا کہ میرے بیٹے روک رہے ہیں لیکن خدا کی قسم میری تمنا ہے کہ لنگڑے پن ہی کی حالت میں جنت کی سرزمین روندتا پھروں۔ حضور انور نے فرمایا تمہیں اللہ نے معذور قرار دیا ہے تم پر جہاد فرض نہیں۔ بیٹوں سے فرمایا کہ تم والد کو منع نہ کریں۔ چنانچہ عمرو بن جموح جنگ میں شریک ہوئے اور شہادت پائی آپ کے ساتھ ایک فرزند خلاد و دو غلاموں سلیم اور ابوایمن نیز عبداللہ بن عمرو بن حرام (برادر اہلیہ عمرو بن جموح) بھی شہید ہوئے عمرو کی اہلیہ ہند بنت عمرو بن حرام، شوہر بیٹے اور بھائی کی نعشیں میدانِ اُحد سے اونٹ پر لاد کر مدینے لا رہی تھی راستے میں اونٹ بیٹھ گیا اور نہ چلا۔ آخر تمام نعشیں پھر میدانِ اُحد میں پہنچائی گئیں جہاں عمرو بن جموح اور عبداللہ عمرو بن حرام کو ایک قبر میں دفن کیا گیا۔

سعد بن الربیع

سعد بن الربیع مدینے کے رؤسا میں سے تھے انہیں عبدالرحمٰن بن عوف کا بھائی بنایا گیا تھا۔ رسُول اللہ نے فرمایا کہ سعد بن ربیع کی خبر لاؤ ایک انصاری میدان میں گئے۔ ہر طرف آوازیں دیں کوئی جواب نہ ملا۔ پھر خیال آیا کہ رسُول اللہ کا نام لے کر پکارنا چاہیے۔ یہ آواز سعد کے کان میں پڑے تو شاید جواب دیں چنانچہ انصاری بھائی نے پکار کر کہا سعد بن ربیع کہاں ہیں مجھے رسُول اللہ نے ان کے پاس بھیجا ہے یہ سنتے ہی سعد کے تن نیم مردہ میں بجلی کی لہر دوڑ گئی دھیمی آواز میں جواب دیا میں یہاں ہوں۔ انصاری بھائی نے سعد کو مقتولین میں پایا۔ ان پر نزع کی حالت طاری تھی ان سے کہا گیا کہ رسُول اللہ نے آپ کی حالت دریافت کی ہے۔ سعد بولے رسُول اللہ کی خدمت میں میرا اسلام عرض کرنا اور کہنا کہ خدا کے رسُولوں کو ان کے پیرووں کی قربانی اور اخلاص کی وجہ سے جو ثواب ملا کرتا ہے آپ کو وہ ثواب تمام نبیوں سے بڑھ چڑھ کر ملے قوم سے کہنا کہ تم میں زندگی کا سانس ہوتے ہوئے رسُول اللہ کو خدانخواستہ کوئی تکلیف پہنچ گئی تو خدا کو مُنہ دکھانے کے قابل نہ ہو گے۔ کیونکہ تم نے لیلۃ العقبہ میں رسُول اللہ پر فدا ہونے کی بیعت کی تھی یہ کہتے ہی عالم بقا کو سدھارے جسم پر صرف نیزے کے بارہ زخم تھے۔

ابی بن خلف

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم چٹان پر چڑھ گئے تو ابی بن خلف آپ کا پتہ لگا کر یہ کہتا ہوا پہنچا۔ اگر محمد بچ گئے تو میں زندہ نہیں رہوں گا۔ مسلمان چاہتے تھے کہ انہیں ابی سے لڑنے کی اجازت ہو حضور نے فرمایا اسے آنے دو وہ قریب آیا تو آپ نے نیزہ سے کہ اس کی گردن پر مارا وہ گھوڑے سے لڑکھڑا کر گرا اگرچہ بظاہر زخم معمولی معلوم ہوتا تھا لیکن ابی پکار پکار کر کہہ رہا تھا قتلنی واللہ محمد خدا کی قسم مجھے محمد نے قتل کر دیا۔ چنانچہ واپسی پر مقام سرف میں مر گیا۔

رسول اللہ کی تلوار

اس غزوہ کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں اپنی تلوار اسے دوں گا جو اس کا حق ادا کرے۔ دوسرے اصحاب کے علاوہ زبیر بن العوام کو اس تلوار کی خواہش خصوصیت سے تھی لیکن وہ ابو دجانہ کو دے دی گئی۔ ابو دجانہ کے پاس ایک سرخ پٹی تھی وہ جب اسے نکال کر سر پر باندھ لیتے تھے تو ان میں ایک خاص جوش پیدا ہو جاتا تھا اور کوئی ان کے مقابلے پر سلامت نہ رہ سکتا تھا تلوار لے کر انہوں نے سرخ پٹی سر پر باندھ لی اور رجز کے ترانے گاتے ہوئے میدان جنگ میں نکل پڑے جدھر رخ کرتے تھے افراتفری پڑ جاتی تھی زبیر کو بطور خاص خیال تھا کہ دیکھیں ابو دجانہ کون سے کارنامے انجام دیتے ہیں۔ ابو دجانہ صفوں کو چیرتے ہوئے بڑھے تو ابو سفیان کی اہلیہ ہندہ سامنے آگئی جو مردوں کو جوش دلا رہی تھی۔ ابو دجانہ نے ہندہ پر تلوار اٹھائی تو اس نے چیخ ماری اور مردوں کو امداد کے لیے بلایا مگر کوئی نہ آیا اس اثنا میں ابو دجانہ نے خود تلوار نیچی کر لی۔ بعد میں زبیر نے ابو دجانہ سے پوچھا۔ پہلے تلوار اٹھائی پھر نیچی کیوں کر لی جواب ملا میرا دل اس پر راضی نہ ہوا کہ رسول اللہ کی تلوار عورت پر چلاؤں اور عورت بھی وہ جس کا محافظ کوئی مرد نہ ہو۔ زبیر کہتے ہیں اس وقت میں سمجھا کہ ابو دجانہ نے رسول اللہ کی تلوار کا حق جس طرح ادا کیا شاید میں نہ کر سکتا۔

اللہ اعلیٰ واجل

ابو سفیان اور اس کے ساتھی میدان میں پھر پھر کر رسول اللہ، ابو بکر، اور عمر کی نعشیں تلاش کرتے رہے پھر ابو سفیان پہاڑ پر چڑھ کر اس مقام کے قریب پہنچا جہاں مسلمانوں تک اس کی آواز جا سکتی

تھی۔ اس نے پہلے پوچھا مسلمانو! تم میں محمد ہیں، حضور انور نے فرمایا کوئی جواب نہ دیا جائے۔ پھر باری باری ابوبکر، عمر کے متعلق پوچھا کچھ جواب نہ ملا تو ابوسفیان نے کہا سب مارے گئے زندہ ہوتے تو ضرور جواب دیتے۔ عمر چپ نہ رہ سکے اور بولے دشمنِ خدا تو جھوٹ کہتا ہے ہم سب زندہ ہیں۔ یہ سن کر کہا پھر ابن قمیہ جھوٹ کہتا ہے کیونکہ میں تمہیں اس سے زیادہ سچا سمجھتا ہوں۔ پھر ابوسفیان نے اپنے خاص بت ھبل کا نام لے کر کہا تیرے لیے سربلندی ہو۔ حضور انور کے ارشاد کے مطابق مسلمانوں نے نعرہ لگایا اللہ اعلیٰ و اجل۔ ابوسفیان نے کہا لنا عزیٰ ولا عزیٰ لکم ہمارے لیے عزیٰ ہے تمہارے لیے کوئی عزیٰ نہیں۔ حضور انور نے فرمایا

اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم۔ اللہ ہمارا مددگار ہے تمہارا مددگار کوئی نہیں۔

پھر وہ یہ کہتا ہوا رخصت ہو گیا کہ ہمارے اور تمہارے درمیان آئندہ انہی دنوں میں بمقام بدر جنگ کا وعدہ رہا۔

شہداء کی تدفین

لڑائی عموماً ختم ہو گئی لیکن قریشِ مکہ شقاوت و بے دردی سے باز نہ رہے۔ انہوں نے مقتول اسلامی شخصیتوں کو بگاڑا جن میں سے حمزہ، عبداللہ بن جحش اور مصعب بن عمیر بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں۔ اس میں سب سے پیش پیش ابوسفیان کی اہلیہ ہندہ تھی۔ حمزہ کی ہمشیرہ حضرت صفیہ کو بھائی کی شہادت کی خبر ملی تو وہ نعش دیکھنے کے لیے آئیں۔ رسول اللہ نے نعش کی حالت کے پیش نظر انہیں روکا وہ بولیں میں ماجرا سن چکی ہوں لیکن خدا کی راہ میں یہ کوئی بڑی قربانی نہیں چنانچہ بھائی کی لاش کے ٹکڑے دیکھے اور انا للہ وانا الیہ راجعون کہہ کر دعائے مغفرت کرتی ہوئی لوٹ گئیں۔ رسول اللہ نے تمام شہداء کو اُحد کے دامن میں دفن کرا دیا۔ بعض قبروں میں دو دو شہیدوں کو رکھا گیا انہیں غسل بھی دیا گیا اور اس وقت نمازِ جنازہ بھی نہ پڑھی گئی۔ مولانا شبلی فرماتے ہیں آٹھ برس کے بعد جب آپ ادھر سے گزرے تو بے اختیار آپ پر رقت طاری ہوئی اس طرح آپ نے پُر درد کلمات فرمائے جیسے کوئی زندوں اور مردوں سے رخصت ہو رہا ہے۔ مصعب بن عمیر کا سر ڈھانکتے تو پاؤں کھل جاتے پاؤں ڈھانکتے تو سر کھل جاتا آخر پاؤں کو اذخر کی گھاس ڈال کر چھپایا گیا۔ بعد میں ایک مرتبہ عبدالرحمٰن بن عوف کے سامنے افطاری کے لیے کھانا آیا تو شاید ذرا پُرتکلف تھا۔ یہ دیکھتے ہی انہیں اُحد کا زمانہ یاد آ گیا جب بدنوں کو چھپانے کے لیے گھاس کاٹ کاٹ کر ڈالتے تھے۔ عبدالرحمٰن بے تاب ہو کر رونے

لگے اور کھانا چھوڑ کر اٹھ گئے۔

شہداء کی تعداد

شہدائے اُحد کی تعداد عموماً ستر بتائی جاتی ہے۔ المشاہد میں جو تعداد بیان کی گئی ہے اس کی مختصر کیفیت یہ ہے :

مہاجرین	۵
انصار (خزرج)	۵۴
انصار (اوس)	۳۶
متفرق اصحاب	۱۳
	۱۰۸

یہ کل ایک سو آٹھ بنتے ہیں۔ متفق علیہ تعداد جو ستر بتائی جاتی ہے لیکن میں سمجھتا ہوں کہ بعض صحابؓ کے نام اس میں نہیں آئے۔

مسئلہ تاریخ

غزوۂ اُحد کی تاریخ میں بھی اختلاف ہے۔ ابن ہشام جوامع الیسرہ وغیرہ کے مطابق یہ غزوہ ۵ رشوال سنہ ۳ھ (۳۱ مارچ ۶۲۵ء) کو پیش آیا دن ہفتے کا تھا۔ طبقات ابن سعد میں اس کی تاریخ ۷ رشوال سنہ ۳ھ ۲۳ مارچ ۶۲۵ء مرقوم ہے اس روز بھی ہفتہ ہی تھا۔

عام کیفیت

مسلمانوں کے لیے غزوۂ اُحد کا نتیجہ بہت بڑے صدمے کا باعث تھا خصوصاً انصار میں سے بہت سے جلیل القدر اصحاب نے شہادت پائی تھی۔ با ایں ہمہ اسلام اور رسُول اللہ کی ذات بابرکات سے ان کی محبت کا یہ عالم تھا کہ اسے الفاظ کا لباس پہنانا ممکن نہیں۔ ایک انصاری خاتون کا ذکر آپ نے کئی مرتبہ پڑھا ہو گا کہ صحابہ کرام میدانِ اُحد سے لوٹے تو وہ خاتون حالات معلوم کرنے کے لیے اُحد کی طرف آ رہی تھی جب اسے بتایا گیا کہ تیرا باپ بھائی اور شوہر شہید ہو گئے تو اس نے بے تابانہ پوچھا رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا کیا حال ہے۔ بتایا گیا کہ آپ بفضل اللہ خیریت سے ہیں تو وہ بے اختیار

برلیں کل مصیبۃ بعدک جلل آپ زندہ ہیں تو سب مصیبتیں ہیچ ہیں۔

میں بھی اور باپ بھی شوہر بھی برادر بھی فدا		اے شہ دیں تیرے ہوتے ہوئے کیا چیز ہیں ہم

حضرت سعد بن معاذ رئیس اوس کے بھائی عمرو بن معاذ اُحد میں شہید ہو گئے تھے۔ رسُول اللہ سعد کی عمر رسیدہ والدہ سے ان کے بیٹے کی تعزیت کرنا چاہتے تھے۔ سعد بن معاذ خود والدہ کو آپ کے پاس لے آتے تاکہ آپ ان کے پاس جانے کی زحمت نہ اٹھائیں۔ آپ نے بیٹے کی شہادت پر اظہار ہمدردی فرمایا تو والدہ سعد نے عرض کیا یا رسُول اللہ جب آپ سلامت ہیں تو ہمیں کوئی غم نہیں ہے پھر شہداءِ اُحد کی قدر و منزلت کے باب میں کیا کہا جاتے۔

سعد بن ربیع کی صاحبزادی اُم سعد ایک مرتبہ حضرت ابو بکر سے ملاقات کے لیے آئی تو خلیفہ وقت نے اُم سعد کے لیے کپڑا بچھایا اور اس پر بٹھایا۔ عمر آتے اور پوچھا کون ہیں۔ خلیفہ نے جواب دیا کہ اس کی صاحبزادی ہیں جو رسُول اللہ کے نزدیک تم سے اور مجھ سے بہتر تھے۔ خلیفہ رسول اللہ وہ کیوں کر؟ فرمایا اس نے رسُول اللہ کے زمانے میں جنت کا راستہ لیا اور ہم تم یہیں باقی ہیں۔

شکست یا فتح

زیادہ تر لوگوں کا تاثر یہ ہے کہ مسلمانوں کو اُحد میں شکست ہوئی میرے نزدیک یہ تاثر صحیح نہیں۔ بلاشبہ اس جنگ میں تیر اندازوں کے جیش کی غلطی کے باعث مسلمانوں کا جانی نقصان بہت ہوا لیکن شکست وہ ہوتی ہے جس میں شکست خوردہ میدان چھوڑ دیتا ہے اُحد میں ایسا کوئی واقعہ پیش نہیں آیا تھا قریش مکہ مسلمانوں کو نقصان پہنچا کر رخصت ہو گئے۔ اگلے روز مسلمانوں نے حمراء الاسد تک قریش کا تعاقب کیا اور تین روز وہاں ٹھہرے رہے اس لیے اُحد کو شکست قرار دینے کی کوئی معقول وجہ سمجھ میں نہیں آتی۔

اُحد میں جنگ کے مورچے

۱۲۲۔ اے پیغمبر اس وقت کو یاد کرو جب تم سویرے اپنے گھر سے نکلے اور اُحد کے میدان میں لڑائی کے لیے مسلمانوں کو جابجا مورچوں پر بٹھا رہے تھے۔

اصل ارشاد میں غدوت آیا ہے جو غدو سے بنا ہے جس کے معنے صبح کو نکلنے کے آتے ہیں بر زوال آفتاب تک کے وقت پر بولا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ ہفتہ کے روز ہر شوال المکرم

۳ھ کو صبح کے وقت گھر سے نکلے۔ یہاں حافظ ابن کثیرؒ نے حافظ ابن جریرؒ کے حوالہ سے اس سوال کو بے حد اہمیت دی ہے کہ تاریخ تو یہ بتاتی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جمعہ کے روز بعد نماز جمعہ اُحد کے میدان کی طرف تشریف لے گئے لیکن قرآن کہتا ہے کہ صبح کو روانہ ہوئے۔ دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے روانگی تو جمعہ ہی کے روز ہوئی تھی اور بعد نماز ہی ہوئی لیکن جنگ کی خاطر آپ مورچہ بندی کے لیے ہفتہ کے دن صبح کو میدانِ اُحد میں تشریف لائے۔

اس موقع پر صاحب معارف قرآن کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ آیت میں یہ بھی بتا دیا ہے کہ سفر کی ابتداء کہاں سے ہوئی من اھلک کے لفظ سے اشارہ ہے کہ سفر کا آغاز اس جگہ سے جگہ ہوا جہاں آپ کے اہل وعیال موجود تھے ان کو مدینہ ہی میں چھوڑ کر آپ نکل کھڑے ہوئے حالانکہ مدینہ ہی پر حملہ ہونے والا تھا۔ اس میں اشارا ہے کہ جب اللہ کا حکم آجائے تو حکم کی تعمیل میں اہل وعیال کی محبت سنگ راہ نہ ہونی چاہیے۔

مسلمانوں کو مورچوں میں بٹھانے کے لیے قرآن نے تبوئ المومنین مقاعد للقتال کی خوبصورت اور دلآویز تعبیر اختیار کی ہے۔ عربی میں بوا یبوء کے معنے ٹھہرانا، ٹھکانا دینا، مقیم کرنا، مامور کرنا، مقاعد مقعد کی جمع ہے جس کے معنے بیٹھنے کی جگہ کے ہیں۔ لیکن وسیع استعمال میں اس کے معنے گھات لگانے کی جگہ کے بھی ہیں اور قرینہ موجود ہو تو اس سے جنگ کا مورچہ بھی مراد ہو سکتا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ مورچہ بندی کیسے کی؟

کفار نے اپنے لشکر کی صف بندی اس طرح کی کہ سواروں کے ایک حصہ پر خالد بن ولید کو افسر مقرر کیا اور عکرمہ ابن ابی جہل کو باقی رسالے کا افسر بنایا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی عمرو بن عوف کے سردار عبداللہ بن جبیر کو قادر تیر اندازوں کا افسر بنا کر جبلِ عینین کے قریب تعینات کیا مصعب بن عمیر کو علم دیا گیا۔ سواروں کا جو مختصر رسالہ تھا وہ زبیر کے ماتحت کیا گیا اور اس کی حفاظت کے لیے کچھ تیر انداز مقرر کیے۔ تیر اندازوں کو تاکیدی حکم دیا گیا کہ جنگ کے حالات خواہ کچھ ہوں اپنی جگہ سے نہ ہٹیں۔ ایک اور مختصر سا دستہ حضور انور نے جبلِ اُحد کے عقب میں متعین فرمایا تاکہ کفار درہ سے نکل کر لشکر اسلام پر حملہ آور نہ ہو سکیں اور اگر کوئی آدمی میدان چھوڑ کر بھاگتا ہے تو اسے پکڑ لے۔ یہ ہے تبوئ المومنین مقاعد للقتال کی واقعاتی تصویر۔

اللہ پر اعتماد ہی کامیابی کی کلید ہے

۲۲۷۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے جبکہ تم میں سے دو جماعتوں نے ارادہ کیا تھا کہ ہمت ہار دیں اور واپس لوٹ جائیں حالانکہ اللہ ان کا مددگار تھا جو ایمان رکھنے والے ہیں انہیں ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ حافظ ابن جریر کی یہ رائے قیمتی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ تمہاری باتوں کو اس وقت سن رہا تھا جب تمہارے دو گروہ بزدلی دکھانے کو سوچ رہے تھے۔

جب آپ بنفسِ نفیس فوجی قاعدے کے مطابق صفیں ترتیب دے رہے تھے اسی اثنا میں عبداللہ ابن ابی کی علیحدگی سے دو قبیلے بنو حارثہ اور بنو سلمہ کے دلوں میں کچھ کمزوری پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کی قلیل جمعیت پر نظر کر کے دل چھوڑنے لگے اور خیال آیا کہ میدان سے سرک جائیں مگر حق تعالیٰ نے ان کی مدد کی اور دستگیری فرمائی۔ دلوں کو مضبوط کر دیا اور سمجھا دیا کہ مسلمانوں کا بھروسہ تنہا اللہ کی اعانت و نصرت پر ہونا چاہیے۔ تعداد و سامان وغیرہ کچھ نہیں۔ جب وہ منظفر و منصور کرنا چاہے تو سب سامان رکھے رہ جاتے ہیں اور غیبی تائید سے فتح مبین حاصل ہو جاتی ہے، جیسے معرکہ بدر میں، لہٰذا مسلمانوں کو صرف اللہ سے ڈرنا چاہیے تاکہ اس کی طرف سے مزید انعام و احسان ہو[1]

یہ درست ہے کہ عرب جنگ کے خوگر تھے۔ ان کا جنگی نظام بہتر تھا، ان کی سپاہ میں تعاون اور ایک دوسرے پر فدا ہونے کا جذبہ بہت بڑھا ہوا تھا۔ وہ اپنے امیر اور قائد کے پوری طرح مطیع تھے ان کو اللہ کی راہ میں جان دینے کا شوق تھا۔ لیکن ہر صاحبِ عقل آدمی سمجھ سکتا ہے کہ نظام کوئی مصنوعی اور میکانکی شے نہیں جو محض عسکری تنظیم، فنونِ جنگ یا ریاضی کے قواعد سے حاصل ہو جاتے، پتھروں کی آپ کیسی ہی صف قائم کر دیں، ان کو کتنی ہی عمدہ ترتیب سے چنیں، ستونوں اور دیوار کو آپ ریاضی کے کتنے ہی مکمل قاعدے سے کھڑا کریں اس کی تنظیم اور صف بندی سے کوئی نتیجہ نہیں نکلے گا۔ غرض کہ نظامِ جنگ کوئی اہمیت نہیں رکھتا۔ اہم وہ جذبہ ہے جو لڑنے والوں کے دماغوں پر مسلط ہوتا ہے وہ روح اور مقصد ہے جس کے لیے فوج لڑتی ہے۔ اپنے مقصد سے عقیدت اور وابستگی ایسی طاقت ہے جس سے انسانوں میں غیر معمولی شجاعت پیدا ہو جاتی ہے اور ان سے ایسے محیرالعقول کارنامے صادر ہوتے ہیں کہ فلاسفہ اور مورخین ان کی توجیہ سے عاجز رہتے ہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن نے اس آیت میں بتایا ہے کہ اہل حق کی کامیابی کا راز اللہ کی ولایت اور اس پر بھرپور اعتماد میں ہے جب یہ یقین ہوتا ہے کہ اللہ ان کی مدد کا ضامن ہے۔ اس نے ان سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے اور خدا کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا ہے تو قلت و کثرت کا سوال ان کے لیے ہیچ ہو جاتا ہے۔ خطرات کا خوف ان کے دلوں سے جاتا رہتا ہے اسی لیے یہاں ان کو ہدایت کی گئی ہے کہ وعلی اللہ فلیتوکل المومنون۔ اس فقرے نے یہ بات کھول دی کہ کثرت عدد اور ساز و سامان پر مسلمانوں کو اعتماد نہ کرنا چاہیے بلکہ بقدر استطاعت مادی سامان جمع کرنے کے بعد بھروسہ صرف اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے۔ بنو حارثہ اور بنو سلمہ میں کمزوری اور کم ہمتی کا جو وسوسہ پیدا ہوا تھا وہ مادے کی کمی کی وجہ سے ہوا تھا اس لیے ان کے وسوسہ کا علاج توکل سے کیا گیا۔

توکل انسان کی اعلیٰ صفات میں سے ہے محققین صوفیا نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے یہاں صرف اس قدر جان لینا کافی ہے کہ توکل کے یہ معنے نہیں ہیں کہ تمام اسباب ظاہری سے بیگانہ ہو کر اللہ پر اعتماد کیا جائے۔ بلکہ توکل یہ ہے کہ تمام ظاہری اسباب کی فراہمی کے بعد نتائج کے ظہور کے لیے اللہ پر اعتماد کرے۔ ان اسباب پر نہ اعتماد کرے اور نہ فخر و ناز کرے۔ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوۂ حسنہ ہمارے سامنے ہے۔ اسی جنگ احد میں مسلمانوں کی فوج کو جنگ کے لیے منظم کرنا اپنی قدرت کے موافق اسلحہ اور دیگر سامان فراہم کرنا، محاذ جنگ پر پہنچ کر مناسب حال و مقام نقشہ جنگ تیار کرنا، مختلف موریچے بنا کر صحابہ کرام کو ان پر بٹھانا۔ یہ مادی وسائل اور اسباب حضور انور نے خود اختیار فرما کر بتلا دیا کہ ترک اسباب کا نام توکل نہیں۔ ہاں مومن اور غیر مومن میں فرق یہ ہے کہ مومن سارے سامان اور سب مادی طاقتیں حسب قدرت جمع کرنے کے بعد بھروسہ اعتماد صرف اللہ پر کرتا ہے جبکہ غیر مومن صرف مادی طاقت پر بھروسہ کرتا ہے اور بس [1]

بدر میں کامیابی کا راز

۲۲۸۔ اور یاد رکھو کہ اللہ نے بدر کے میدان میں تمہیں مدد دی ہے حالانکہ تم گری ہوئی حالت میں تھے بس اللہ سے ڈرو اور اس کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم اس کے شکر گزار ہو سکو۔ غزوہ بدر پر تفصیلی تبصرہ تو انشاء اللہ سورہ انفال میں آئے گا۔ یہاں موقعہ کی مناسبت سے اتنی بات گوش گزار فرمالیجیے

[1] معارف م ۳۵

کہ بدر مدینہ منورہ سے قریباً ۸۰ میل مغرب مائل بجنوب اس شاہراہ پر واقع ہے جو زمانہ قدیم سے شام اور مکہ مکرمہ کے درمیان تجارتی قافلوں کی جولانگاہ رہی ہے۔ مدینہ منورہ سے مکہ مکرمہ جانے کے اور راستے بھی ہیں جن میں سے بعض کا فاصلہ نسبتاً کم ہے مگر لوگ بدر سے ہو کر بھی آتے جاتے تھے اور حال میں جو پختہ سڑک موٹروں کے لیے حرمین شریفین کے درمیان بنائی گئی ہے وہ بدر سے ہوتی ہوئی گئی ہے۔ بحیرہ احمر کے ساحل سے اس مقام کا فاصلہ دس بارہ میل ہوگا۔ بدر بیضوی شکل کے میدان میں واقع ہے جسے چاروں طرف سے پہاڑوں نے گھیر رکھا ہے۔ اس میدان کا طول ساڑھے سات میل اور عرض چار میل ہے۔ اردگرد پہاڑوں کے نام الگ الگ ہیں۔ آبادی خاصی بڑی ہے۔ ڈاکٹر حمید اللہ فرماتے ہیں کہ کئی سو مکان پتھر کے بنے ہوئے ہیں جنہیں مقامی اصطلاح میں قصر کہتے ہیں۔ میدان سنگلاخ ہے۔ یعنی سنگریزے یا چھوٹے چھوٹے گول پتھر جا بجا بکھرے ہوئے ہیں البتہ جنوبی و مغربی حصے کی زمین نرم ہے۔ یہاں ریگ رواں اکٹھی ہو جاتی ہے۔ بدر میں کنوئیں بھی ہیں اور چشمے بھی۔ بڑا چشمہ جس کی حیثیت آغاز میں زمین دوز نہر کی ہے۔ اسی سے نخلستانوں، باغوں اور کھیتوں کی آبیاری ہوتی ہے۔ اسلام اور کفر کے درمیان اسی مقام پر سب سے پہلا تصادم ہوا۔ اس غزوہ نے گویا اسلام کی اور اس طرح بالواسطہ ساری دنیا کی تاریخ ہی کا پانسہ پلٹ دیا تھا۔ فرنگی مورخین بھی اس کی اہمیت کے پوری طرح قائل ہیں۔

قرآن نے یہاں مسلمانوں کو توجہ دلائی ہے کہ تم اس سے پہلے بدر کے دن بے سروسامانی کی حالت میں تھے مگر اللہ نے ساری ناسازگاریوں کے باوجود تمہاری مدد کی تھی۔ تمہاری تعداد بھی دشمن کے مقابلہ میں کم تھی۔ اب بھی صبر و تقویٰ پیدا کرو تو اللہ کی مدد تمہارے استقبال کے لیے تیار ہے۔

إِذْ تَقُولُ لِلْمُؤْمِنِينَ أَلَن يَكْفِيَكُمْ أَن يُمِدَّكُمْ رَبُّكُم بِثَلَاثَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُنزَلِينَ ۝ بَلَىٰ ۚ إِن تَصْبِرُوا وَتَتَّقُوا وَيَأْتُوكُم مِّن فَوْرِهِمْ هَٰذَا يُمْدِدْكُمْ رَبُّكُم بِخَمْسَةِ آلَافٍ مِّنَ الْمَلَائِكَةِ مُسَوِّمِينَ ۝ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ لَكُمْ وَلِتَطْمَئِنَّ قُلُوبُكُم بِهِ ۗ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْحَكِيمِ ۝ لِيَقْطَعَ طَرَفًا مِّنَ الَّذِينَ كَفَرُوا أَوْ يَكْبِتَهُمْ فَيَنقَلِبُوا خَائِبِينَ ۝

اے پیغمبر وہ وقت بھی یاد کرو جب تم اہلِ ایمان سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ سبحانہ تمہاری تین ہزار نازل کردہ فرشتوں سے مدد کرے[۲۲۹] ؟ ہاں بلاشبہ اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے اور دشمن کا تم پر فوری حملہ ہو جائے تو تمہارا پروردگار صرف تین ہزار سے نہیں بلکہ پانچ ہزار نشان رکھنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے[۲۳۰] گا

اور دیکھو یہ بات اس لیے ہے کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دلوں میں اس کے ذریعے اطمینان آجائے ورنہ یاد رکھو فتح و نصرت کا مرکز تو اللہ کی ذات ہے جو سب پر غالب اور بڑی حکمت والا ہے[۲۳۱] اور نیز اس لیے تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک حصہ کاٹ دے یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ نامراد ہو کر وہ پسپا ہو جائیں۔[۲۳۲]

ملائکہ کا نزول اور اس کا پس منظر

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اس آیت کریمہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے جس ارشاد کی اللہ سبحانہ نے خبر دی ہے وہ آپ نے اہل ایمان سے کب فرمائی؟ بدر کے روز یا اُحد کے دن، ابن کثیر نے بڑے بڑے تابعین کے حوالہ سے دونوں باتیں لکھی ہیں۔ حسن بصری، عامر الشعبی، ربیع ابن انس کہتے ہیں کہ یہ حضور نے مسلمانوں سے بدر والے دن فرمایا تھا۔ امام مجاہد، عکرمہ، ضحاک اور زہری فرماتے ہیں کہ آپ نے یہ بات اُحد کے دن فرمائی۔ اسی اختلاف کے نتیجہ میں قرآن کی عبارت میں اذ تقول کی پیوندکاری میں اختلاف ہو گیا جنہوں نے بدر کے دن کی بات پر زور دیا انہوں نے اذ تقول کو نصرکم سے جوڑ دیا یعنی اللہ نے بدر کے روز اس وقت تمہاری مدد کی تھی جب اے پیغمبر تم اہل ایمان سے یہ کہہ رہے تھے اور جنہوں نے اسے اُحد کی بات قرار دی انہوں نے اذ تقول کا پیوند غدوت سے قائم کر دیا یعنی جب اُحد والے دن آپ صبح کے وقت گھر سے نکل کر صحابہ کی مورچہ بندی فرما رہے تھے یعنی جس وقت آپ صحابہ سے کہہ رہے تھے۔ بہر حال کچھ ہو بات بدر کی یا اُحد کی اس پر سب متفق

ہیں کہ ملائکہ کا نزول ہوا۔ بدر میں یہ بات آپ نے اس وقت فرمائی جب مسلمانوں کو اس خبر سے پریشانی ہوئی کہ مشرکین کی مدد کے لیے کرز بن جابر محاربی آرہا ہے۔ اس ڈر کو مسلمانوں کے دلوں سے دور کرنے اور ان کی ڈھارس بندھانے کے لیے ان سے کہا کہ گھبرانے کی بات نہیں تمہاری مدد کے لیے فرشتے آرہے ہیں لیکن ادھر کرز نہ اپنی جماعت کے ساتھ آیا اور نہ اللہ نے پانچ ہزار فرشتوں کی کمک روانہ کی۔ اور اُحد میں یہ بات آپ نے اس وقت فرمائی جب عبداللہ بن ابی اپنے تین سو ساتھیوں کو لے کر واپس ہو گیا اور مسلمانوں کی بعض جماعتوں میں جیسا کہ اوپر والی آیت میں ذکر ہے اس سے بددلی پھیلی۔ آپ نے فرمایا کہ اگر تین سو آدمی الگ ہو گئے تو کیا بات ہے کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ اللہ تین سو کم ور اور پست ہمت آدمیوں کی جگہ تین ہزار تازہ دم اتارے ہوئے فرشتوں کے ذریعے تمہاری مدد فرمائے۔ اتارے ہوئے سے مقصود اس امر کی طرف اشارہ ہے کہ وہ اسی کارِ خاص کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے تازہ دم کمک کے طور پر آسمان سے اتارے جائیں گے۔

۲۲۹۔ اے پیغمبر وہ وقت یاد کرو جب اہلِ ایمان سے کہہ رہے تھے کہ کیا تمہارے لیے یہ کافی نہیں ہے کہ اللہ سبحانہٗ تمہاری تین ہزار نازل کردہ فرشتوں سے مدد کرے۔ یعنی جو آسمان سے خاص اسی کام کے لیے اتارے گئے ہوں اکثر علماء کے نزدیک راجح یہ ہے کہ یہ واقعہ غزوۂ بدر کا ہے جب کفار کی جمعیت اور تیاری دیکھ کر مسلمانوں کو تشویش ہوئی تو آپ نے تسلی کے لیے ایسا فرمایا چنانچہ فرشتوں کی کمک آسمان سے پہنچی۔ سورۂ انفال میں اس کا مفصل ذکر آئے گا وہیں نزولِ ملائکہ کی حکمت اور عددِ ملائکہ کے ظاہری تعارض پر کلام کیا جائے گا[1] امدادِ غیبی کے موقعہ پر صفتِ ربوبیت کا اظہار اور وہ بھی مخاطبوں کی طرف اضافت کے ساتھ بہترین پیرایۂ بلاغت اور اسلوبِ بیان ہے۔ آج کے ماہرینِ حرب پر خوب روشن ہے کہ سپاہ کی ہمت قائم رکھنا ان کے مورل کا درست رکھنا جنگ میں کامیابی کا کتنا بڑا اور اہم عنصر ہے۔[2]

آلوسی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ نفی میں تاکید اور زور یہ بتا رہا ہے کہ مخاطبوں میں سامان کی کمی اور تعداد کی قلت سے بہت مایوسی چھائی ہوئی تھی۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام۔
[2] تفسیر ماجدی

نصرتِ غیبی کی شرطیں

۲۳۰ - ہاں بلاشبہ اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے اور دشمن کا تم پر فوری حملہ ہو گا تو تمہارا پروردگار صرف تین ہزار سے نہیں بلکہ پانچ ہزار نشان رکھنے والے فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ یعنی تین ہزار بے شک کافی ہیں تاہم اگر تم نے صبر و استقلال کا ثبوت دیا اور تقویٰ اختیار کر کے نافرمانی سے بچتے رہے اور کفار کی فوج ایک دم تم پر لوٹ پڑے تو تین ہزار کے بجائے پانچ ہزار فرشتے بھیج دیے جائیں گے جن کی خاص علامتیں ہوں گی اور ان کے گھوڑوں پر بھی خاص نشان ہوں گے۔ چونکہ بدر میں کفار کی تعداد ایک ہزار تھی۔ اولاً اس کے مناسب ایک ہزار فرشتوں کا وعدہ فرمایا جیسا کہ سورۂ انفال میں ہے۔ پھر مسلمانوں میں گھبراہٹ دور کرنے کے لیے تعداد تگنی کر دی گئی کیونکہ کفار کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی اس کے بعد شعبی کی روایت کے مطابق جب مسلمانوں کو یہ خبر ملی کہ کرز بن جابر بڑی کمک لے کر مشرکین کی مدد کے لیے آرہا ہے تو ایک جدید اضطراب پیدا ہو گیا۔ اس وقت مزید تسکین کے لیے وعدہ فرمایا کہ اگر تم صبر و تقویٰ سے کام لو گے تو ہم پانچ ہزار فرشتوں سے تمہاری مدد کریں گے اگر مشرکین کی کمک بالکل ناگہانی طور پر آ پہنچے تب بھی فکر نہ کرو خدا تعالیٰ تمہاری بروقت مدد کرے گا۔ شاید پانچ ہزار کا عدد اس لیے رکھا ہو کہ فوج کے پانچ حصے ہوتے تھے۔ ہر ایک حصہ کو ایک ہزار کی کمک پہنچا دی جائے گی۔ چونکہ کرز بن جابر کی مدد مشرکین کو نہیں پہنچی اس لیے کچھ کہتے ہیں کہ پانچ ہزار کا وعدہ پورا نہیں کیا گیا کیونکہ وہ یاتوکم من فورھم پر معلق تھا اور بعض کا قول ہے کہ پانچ ہزار فرشتے نازل ہوئے۔ مزید تفصیل سورۂ انفال میں آرہی ہے[1]

یہ تمام تشریح اس بنیاد پر ہے کہ حضور انور کا یہ ارشاد بدر میں تھا اور قرآن اسی تاریخی واقعہ کو بیان کر رہا ہے لیکن جن بزرگوں کی رائے میں اس ارشاد کا تعلق اُحد سے ہے وہ فرماتے ہیں کہ اُحد میں بھی مسلمانوں کی تعداد کفار کے مقابلہ میں بہت کم تھی۔ مسلمانوں کو یہ دیکھ کر اضطراب ہوا۔ لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے تسلی دی کہ اپنی قلتِ تعداد اور بے سروسامانی پر نہ جاؤ۔ اللہ پاک اپنے ہزاروں فرشتوں سے تمہاری مدد کرے گا۔ اللہ سبحانہٗ نے اپنے نبی کی تائید فرمائی اور اپنے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

فضل سے اس پر دو ہزار کا اضافہ فرما دیا لیکن تین شرطوں کے ساتھ۔ اول یہ کہ تم صبر کا مظاہرہ کرو۔ دوسرے یہ کہ تم میں تقویٰ ہو، تیسرے یہ کہ دشمن تم پر اچانک حملہ کرئے۔ جنگ اُحد کے واقعات شاہد ہیں کہ جب جنگ شروع ہوئی تو مسلمانوں کے ہاتھوں سے صبر کا سر رشتہ ہاتھ سے چھوٹ گیا اس لیے خدا کے وعدۂ نصرت سے وہ محروم رہ گئے مگر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود اقدس کی حفاظت کے لیے دو فرشتے ساتھ تھے۔ حضرت سعد بن ابی وقاص فرماتے ہیں کہ میں نے غزوۂ اُحد میں دو سفید پوش آدمیوں کو دیکھا جو آپ کی طرف سے سخت جانبازی کے ساتھ لڑ رہے تھے۔ میں نے ان کو نہ اس سے پہلے دیکھا تھا نہ اس کے بعد دیکھا[1] صحیح مسلم کی روایت ہے کہ یہ دونوں فرشتے جبریل و میکائیل تھے۔

فرشتوں کی آمد کی غرض

۱۲۶۔ اور دیکھو یہ بات اس لیے ہوگی کہ تم خوش ہو جاؤ اور تمہارے دلوں میں اس کے ذریعے اطمینان آجائے ورنہ یاد رکھو فتح و نصرت کا مرکز تو اللہ کی ذات ہے جو سب پر غالب اور بڑی حکمت والا ہے۔ یعنی یہ سب غیبی سامان غیر معمولی طور پر ظاہری اسباب کی صورت میں محض اس لیے مہیا کیے گئے کہ تمہارے دلوں سے اضطراب و ہراس دور ہو کر سکون و اطمینان نصیب ہو ورنہ خدا کی مدد کچھ ان چیزوں پر محدود و مقصود نہیں، نہ اسباب کی پابند ہے وہ چاہے تو محض اپنی قدرت سے بدون فرشتوں کے تمہارا کام بنادے یا بدون تمہارے توسط کے کفار کو خائب و خاسر کردے یا ایک فرشتے سے وہ کام لے لے جو پانچ ہزار سے لیا جاتا ہے۔ فرشتے بھی جو امداد پہنچاتے ہیں وہ اسی خداوند قدوس کی قدرت و مشیت سے پہنچا سکتے ہیں مستقل طاقت و اختیار کسی میں نہیں اُگے یہ اس کی حکمت ہے کہ کس موقعہ پر کس قسم کے اسباب و وسائط سے کام لینا مناسب ہے تکوینیات کے رازوں کا کوئی احاطہ نہیں کرسکتا۔

حدیث از مطرب و مے گو و راز دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمارا۔[2]

اس آیت میں ماجعلہ اللہ اللہ نے نہیں بنایا اس کی ضمیر کے مرجع میں علماء کے خیالات مختلف

[1][2] افادات شیخ الاسلام۔

ہیں کسی نے وعدہ امداد کو مرجع بنایا ہے اور کسی نے تقول کے قول کو۔ ہمارے خیال میں قول کو مرجع بنانا زیادہ اچھا ہے کیونکہ ان آیات میں اللہ کی جانب سے ملائکہ کی امداد کا کوئی وعدہ نہیں۔ صرف حضور انور کے ارشاد کو اللہ پاک نے نقل کیا ہے۔ یعنی یہ بتایا ہے کہ اللہ کے رسول نے صحابہ سے یوں کہا۔ اب اس آیت میں حضور انور کے ارشاد کا فائدہ بتایا جا رہا ہے یعنی آپ نے صحابہ سے یہ بات کیوں فرمائی۔ اس لیے فرمائی تاکہ اے مخاطبو تمہیں فتح کی بشارت اور خوشی حاصل ہو اور تاکہ تمہارے دلوں کو اضطراب اور پریشانی سے اطمینان حاصل ہو۔ اور تمہارے دل اس سے مطمئن ہو جائیں۔ اس طرح حضور انور کے کہنے کی دو حکمتیں بتائی ہیں ایک بشارت فتح اور دوسرے اطمینان قلب یعنی دو باتیں یہاں تسلی دینے کے لیے کافی تھیں کہ نفع بھی حاصل ہو اور مجاہد ضرر سے بھی بچیں۔ اگر ضمیر کا مرجع وعدۂ نصرت ہو جیسا کہ بعض کا خیال ہے تو مطلب یہ ہے کہ اس موقع پر اللہ نے فرشتوں کے ذریعے جو تمہاری مدد کا خاص طور پر وعدہ فرمایا تو یہ اس لیے کہ یہ تمہارے لیے خوشی کا باعث ہو اور تمہیں مخالفین کے رویے جو بزدلی ہوئی ہے وہ دور ہو جائے اور یہ جو فرمایا کہ مدد تو بس اللہ کی طرف سے ہے تو مطلب یہ ہے کہ حقیقۃً متصرف تو اللہ کی ذات ہے۔ فرشتے ہوں یا کوئی اور کسی کا بھی ذریعہ امداد ہونا سبب ظاہری کے درجے سے زیادہ نہیں ہے یعنی کامیابی اور فتح تو اللہ کے قبضے میں ہے اور وہ اسباب کے محتاج نہیں ہیں لیکن وہ حکیم ہیں اس لیے نظام عالم کو اسی حکمت کے تحت قائم رکھا ہے اس لیے تمہیں صرف اسباب پر بھروسہ نہ کرنا چاہیے۔ کیونکہ وہ عزیز ہیں یعنی اس پر قادر ہیں کہ جب اور جیسے بلا اسباب ظاہر بلکہ خلاف اسباب ظاہر فتح دلائے اور کامیاب کر دے۔ وہ حکیم ہیں یعنی عام فطرت بشری کی رعایت سے اسباب ظاہر کو فراہم کر دے۔

اللہ کی مدد کا مقصد

۱۲۷۔ اور اس لیے تاکہ کفر کی راہ چلنے والوں کا ایک حصہ کاٹ دے یا ان کو ایسی ذلیل شکست دے کہ نامراد ہو کر واپس ہو جائیں۔ یعنی فرشتے بھیجنے سے مقصود تمہاری مدد کرنا کہ تمہارے دل مضبوط ہوں اور خدا کی طرف سے بشارت و طمانیت پاکر پوری دلجمعی اور پامردی کے ساتھ دشمن کا مقابلہ کرو جس سے یہ غرض تھی کہ کافروں کا زور ٹوٹے۔ ان کا بازو کٹ جائے۔ پرانے نامور مشرک کچھ مارے جائیں، کچھ ذلیل و خوار ہوں اور بقیۃ السیف بہزار رسوائی و ناکامی واپس ہو جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی واقعہ ہوا۔ ستر سردار جن میں امت کا فرعون ابوجہل بھی تھا مارے گئے۔ ستر قید ہوئے۔ نہایت ذلیل اور نامراد

ہوکر مکہ واپس جانا پڑا۔[1]

عام شارحین قرآن کی رائے میں اس کا تعلق بھی واقعہ بدر سے ہے اور وہ اس لیے اس کا پیوند لقد نصرکم اللہ سے قائم کرتے ہیں لیکن کچھ کی رائے ہیں اس کا تعلق واقعہ اُحد سے ہے اور یہ وما النصر سے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی مدد کا مقصد صرف یہ ہے کہ منکرین حق کے ایک گروہ کو صفحۂ ہستی سے مٹایا جاتے یا ان میں سے کچھ کو اس قدر ذلیل و رسوا کیا جائے کہ وہ ناکام و نامراد ہوکر واپس ہو۔ کبت کے معنے رسوا کر دینا، توڑ دینا، کسی کو اٹھاکر پھینک دینا اور پچھاڑ دینا۔ اور آؤ تنویع کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں میں سے ایک بات ہوجائے یا دونوں باتیں ہوجائیں۔

ارباب سیرۃ کا بیان ہے کہ مشرکین کے مقتولین احد میں ۲۰ تھے۔ سیرۃ ابن ہشام میں ۲۲ بتائی ہے مگر حیرت ہے کہ ایک طرف یہ کہا جاتا ہے کہ حضرت حمزہ ہی نے صرف ۳۰ مارے۔ اور دوسری طرف یہ بتایا جاتا ہے کہ صرف ۲۰ مارے گئے۔ دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ مشرکین مسلمان شہداء کی لاشوں کے ساتھ بدسلوکی کرتے تھے اس لیے انہوں نے اس اندیشہ سے کہ کہیں مسلمان بھی ہمارے مقتولین کے ساتھ بھی برتاؤ نہ کریں اپنے مقتولین کو دفن کر دیا۔ لڑائی کے ختم ہونے پر ان کے مقتولین کی جو تعداد ۲۰ معلوم ہوئی وہ ان کی ہے جو دفن نہ ہوسکے۔ ورنہ ان کے مقتولین کی تعداد کافی تھی۔

اُحد میں لیقطع طرفا من الذین کی واقعاتی تفسیر اگر آپ دیکھنا چاہتے ہیں تو سیرۃ کی کتابوں میں واقعات کا مطالعہ کیجیے۔ آغاز جنگ میں عرب اُصول جنگ کے مطابق سب سے پہلے انفرادی مقابلہ ہوا۔ اس انفرادی مقابلہ میں مشرکین سے گیارہ آدمی میدان میں آئے گیارہ میں سے ابوعامر فاسق کے علاوہ کوئی بچ کر نہیں گیا۔ اس کے بعد عام لڑائی شروع ہوئی۔ حضرت ابودجانہ کے بارے میں لکھا ہے کہ ابودجانہ صفوں کو چیرتے چلے جاتے۔ جو سامنے آتا اسی کی لاش زمین پر ہوتی تھی حضرت حمزہ کے حملہ سے کفار سخت پریشان تھے جس پر تلوار اٹھاتے اسی کی لاش زمین پر آتی۔ اس عام لڑائی کا نتیجہ یہ بھی لکھا ہے کہ

مسلمانوں کے ان دلیرانہ حملوں سے قریش کے میدان جنگ سے پیر اکھڑ گئے،
اِدھر اُدھر منہ چھپا کر اور پشت دکھا کر بھاگنے لگے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ذرا سوچئے کہ قریش کی فوجی نفری ۳ ہزار ہے ان میں ۷۰۰ زرہ پوش دو سو گھوڑے تین ہزار اونٹ ہیں۔ کیا یہ بات آپ کا ذہن باور کر سکتا ہے کہ صرف ۱۰ یا ۱۲ آدمیوں کے قتل نے تین ہزار کی مسلح فوج کو پسپا کر دیا ہو اور پاؤں اکھاڑ دیے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ مورخین مشرکین کے مقتولین کی جو تعداد بتاتے ہیں وہ صرف انفرادی مقابلے کی ہے۔ عام جنگ شروع ہونے اور فتح ہو جانے کے بعد چونکہ جنگ کا نقشہ اچانک تبدیل ہو گیا تھا اور ایسی ہنگامی حالت پیدا ہو گئی کہ ابھی پڑ گئی اور کسی کو اتنی فرصت ہی نہ ملی کہ ان کے مقتولین کو شمار کرتا۔

لَيْسَ لَكَ مِنَ الْأَمْرِ شَيْءٌ أَوْ يَتُوبَ عَلَيْهِمْ أَوْ يُعَذِّبَهُمْ فَإِنَّهُمْ
ظَٰلِمُونَ ﴿١٢٨﴾ وَلِلَّهِ مَا فِي السَّمَٰوَٰتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ يَغْفِرُ لِمَن
يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَن يَشَاءُ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٢٩﴾ ع ۱۳ / ۴

اے پیغمبر اس معاملہ میں تمہارا کوئی دخل نہیں، چاہے ان سے درگزر کرے اور چاہے تو ان کو عذاب دے کیونکہ وہ یقیناً ظالم ہیں۔[۲۳۳] آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ کے لیے ہے وہ جسے چاہے بخش دے، جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔[۲۳۴]

تعذیب و مغفرت اللہ ہی کا کام ہے

اس پر اتفاق ہے کہ یہ آیت غزوہ اُحد کے بارے میں آئی ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں بحوالہ انس آیا ہے کہ غزوہ اُحد میں جب آپ کا دندان مبارک شہید ہوا تو آپ نے فرمایا وہ لوگ کیسے فلاح پا سکتے ہیں کہ جنہوں نے اپنے پیغمبر کے چہرے کو زخمی کیا ہو حالانکہ پیغمبر ان کو خدا کی طرف بلا رہا ہے۔ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ اسی بخاری میں بحوالہ عبداللہ ابن عمر آیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُحد کے دن جب یہ دعا فرمائی اے اللہ ابوسفیان پر لعنت برسا اے اللہ حارث بن ہشام پر لعنت کر اے اللہ سہیل اور

صفوان ابن امیہ کو اپنی رحمت سے دُور کر تو یہ آیت نازل ہوئی۔ اگر واقعہ یہی ہے کہ یہ آیت اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو پھر اس سے پہلی آیات بھی یقیناً اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں کیونکہ لیس لک من الامر شیئ جملہ معترضہ ہے۔ اصل فقرہ لیقطع طرفاً سے شروع ہو کر فانھم ظالمون پر ختم ہوا ہے۔ او یتوب علیھم کا او یکبتھم پر عطف ہے۔ حافظ ابن جریر نے پورے فقرے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ کی نصرت اس لیے آئی ہے تاکہ وہ کافروں کو ہلاک کر دے یا ان کو ذلیل و رسوا کرے۔ یا ان کو توبہ کی توفیق دے یا ان کو عذاب دے آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ بھی احتمال ہے کہ او یتوب میں او حتیٰ کے معنے میں ہو لیکن پہلی بات زیادہ درست ہے کیونکہ مخلوق کا کوئی معاملہ خالق کے سوا کسی سے متعلق نہیں ہے اور لیس لک من الامر شیئ کا مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر میری مخلوق کا معاملہ تمہارے سپرد نہیں ہے۔ تمہارا کام تو میرے احکام کو پہنچانا اور چلانا ہے باقی سارا معاملہ اللہ کے سپرد ہے اور ان کا فیصلہ کرنا بھی اللہ کا کام ہے نہ کسی اور کا۔ یہ میرا کام ہے کہ میں فیصلہ کروں کہ کون کفر سے توبہ کرتا ہے اور کس کو کفر کی پاداش میں عذاب ہوتا ہے دنیا میں قتل و ہلاکت کے ذریعے اور آخرت میں عذاب کے ذریعے[1]

گویا اس جملہ معترضہ کے ذریعے بتا دیا کہ ظلم و کفر کرنے والوں کی بدعملیاں کتنی ہی سخت کیوں نہ ہوں لیکن نبوت کو ہدایت سے مایوس نہ ہونا چاہیے اور نہ رحمت و بخشش کی طلب کے سوا کوئی اور جذبہ اپنے اندر پیدا کرنا چاہیے۔ بخشنا نہ بخشنا خدا کا کام ہے اور اسی پر چھوڑ دینا چاہیے۔ جنگ اُحد میں خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر دشمنوں نے پے درپے حملے کیے اور آپ کو ختم کرنا چاہا تاہم اللہ سبحانہ نے پسند نہیں کیا کہ دشمنوں کی ہدایت و بخشش کے سوا کوئی جذبہ آپ کے قلب مطہر میں پیدا ہو صلی اللہ علیہ وسلم

۱۲۸ - اے پیغمبر تمہارا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں، چاہے ان سے درگزر کرے اور چاہے ان کو عذاب دے کیونکہ وہ یقیناً ظالم ہیں۔ اُحد میں ستر صحابہ شہید ہوئے، جن میں حضور کے چچا سید الشہداء حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے۔ مشرکین نے نہایت وحشیانہ طور پر شہداء کا مُثلہ کیا، ناک کان وغیرہ کاٹے، پیٹ چاک کیے۔ حتیٰ کہ حضرت حمزہ کا جگر نکال کر ہندہ نے چبایا۔ مفصل واقعہ آگے آئے گا۔ خلاصہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی اس لڑائی میں چشم زخم پہنچا۔ سامنے کے چار دانتوں میں نیچے کا دایاں دندان مبارک شہید ہوا۔ خود کی کڑیاں کٹ کر رخسار مبارک میں گھس گئیں، پیشانی مبارک

---

[1] ابن جریر

زخمی ہوئی اور بدن مبارک لہولہان تھا۔ اسی حالت میں آپ کا پائے مبارک لڑکھڑایا اور زمین پر گر کر بیہوش ہو گئے۔ کفار نے مشہور کر دیا "ان محمداً قد قُتِلَ" (حضور صلی اللہ علیہ وسلم شہید ہو گئے) اس سے مجمع بدحواس ہو گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ کو ہوش آیا۔ اس وقت زبان مبارک سے نکلا کہ وہ قوم کیوں کر فلاح پائے گی جس نے اپنے نبی کا چہرہ زخمی کر دیا جو ان کو خدا کی طرف بلاتا تھا۔ مشرکین کے وحشیانہ تشدد و مظالم کو دیکھ کر آپ سے رہا نہ گیا۔ اور ان میں سے چند نامور اشخاص کے حق میں آپ نے بددعا کا ارادہ کیا یا شروع کر دی جس میں ظاہر ہے کہ آپ ہر طرح حق بجانب تھے۔ مگر خدا تعالیٰ کو منظور تھا کہ آپ اپنے منصب جلیل کے موافق اس سے بھی بلند مقام پر کھڑے ہوں کہ وہ ظلم کرتے جائیں۔ آپ خاموش رہیں۔ جتنی بات کا آپ کو حکم ہے مثلاً دعوت و تبلیغ و جہاد وغیرہ اسے انجام دیتے رہیں باقی ان کا انجام خدا کے حوالے کریں۔ اس کی جو حکمت ہو گی کرے گا۔ آپ کی بددعا سے وہ ہلاک کر دیے جائیں۔ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ ان ہی دشمنوں کو اسلام کا محافظ اور آپ کا جاں نثار عاشق بنا دیا جائے۔ چنانچہ جن لوگوں کے حق میں آپ بددعا کرتے تھے چند روز کے بعد سب کو خدا تعالیٰ نے آپ کے قدموں میں لا ڈالا۔ اور اسلام کا جانباز سپاہی بنا دیا۔ غرض لیس لک من الامر شیئ میں آنحضرت کو متنبہ فرما دیا کہ بندہ کو اختیار نہیں نہ اس کا علم محیط ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہے سو کرے۔ اگرچہ کافر تمہارے دشمن ہیں اور ظلم پر ہیں لیکن چاہے تو وہ ان کو ہدایت دے دے چاہے عذاب کرے تم اپنی طرف سے بددعا نہ کرو۔ بعض روایات میں ان آیات کا شان نزول کچھ اور بھی آیا ہے۔ یہاں تفصیل کی گنجائش نہیں [1]

ایک ضروری نکتہ

جس طرح جنگ بدر کی فتح سے مسلمانوں کی تربیت مد نظر تھی۔ اسی جنگ کی "ناکامی" میں بھی تربیت کا پہلو پوشیدہ تھا۔ ایک دوڑنے والے کی مشق کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہوتا کہ بے روک ٹوک دوڑتا چلا جائے بلکہ اس کی بھی ضرورت ہے کہ ایک دو مرتبہ گر کر گرنے اور سنبھلنے کا سبق سیکھ لے بدر کی فتح مندی نے استعداد و سعی کی برکتیں دکھا دی تھیں ضرورت تھی کہ اب کمزوری و تغافل کے نتائج کا بھی تجربہ ہو جائے۔ چنانچہ اُحد کے حادثہ نے یہ مقصد پورا کر دیا۔

بدر کی فتح اور تائید الٰہی کی بشارتوں نے بہت سے مسلمانوں میں یہ نشہ پیدا ہو گیا تھا کہ نبوت کی

[1] افادات شیخ الاسلام

دُعاوزاری اور آپ کے استغفار کے نتیجے میں اللہ نے ساری بے سروسامانیوں کے باوجود کامیابی عطا فرمائی۔ وہ یہ سمجھ کر کہ اللہ کا رسول اب بھی ہم میں موجود ہے اللہ کی مدد ضرور آئے گی سعی و تدبیر کی طرف سے کچھ بے پروا ہو گئے اور سمجھنے لگے کہ ہم کوشش کریں یا نہ کریں ہر حال میں ہمارے لیے فتح ہی فتح ہے۔ اس قسم کے تصورات ابتدائی فتح مندیوں کے بعد پیدا ہو جایا کرتے ہیں لیکن اسلام دینِ فطرت ہے دینِ خوارق نہیں اس لیے ضروری تھا کہ اس ذہن کی نشوونما روک دی جائے کہ نبوت و رسالت خدائی پیغام پہنچانے کا نام ہے۔ کائناتی نظام کو چلانے کا نام نہیں ہے۔ اس طرح قرآن نے مخاطبوں کے ذہنوں میں توحید کا یہ کامل ترین، موثر ترین اور محبوب ترین نقش اُتار دیا کہ کائنات کا مدبر اور اس میں تصرف کرنے والا صرف اللہ تعالیٰ ہے اس کا کوئی مشیر اور وزیر نہیں ہے۔ حالات کے اس بحران اور مصائب کے ہجوم میں قرآن کا حضور انور کو مخاطب کر کے یہ کہنا لیس لک من الامر شیئاً آپ کا اس معاملہ میں کوئی دخل نہیں ہے۔ جہاں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ دُعا و طلبگاری، یاری و مددگاری، استعانت اور استغاثہ توکل و اعتماد میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے وہاں اس کی بھی دلیل ہے کہ اللہ کی تائید و نصرت کا وعدہ برحق ہے۔ لیکن اس کے تمام کاموں کی طرح اس کی تائید و نصرت کے بھی قوانین و ضوابط ہیں اور ضروری ہے کہ ان ہی کے مطابق نتائج بھی ظہور میں آئیں۔ جو جماعت کمزوری و غفلت میں مبتلا ہو جائے گی صبر و ثبات میں پوری نہ اترے گی اور جو اطاعت و تنظیم میں کچی ہو گی وہ خدا کی تائید و نصرت کی مستحق نہیں ہو سکتی۔

اللہ اختیارِ ناطق کا مالک ہے

۲۳۴ ۔ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے اللہ کے لیے ہے وہ جسے چاہے بخش دے جسے چاہے عذاب دے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی تمام زمین و آسمان میں خدائے واحد کا اختیار چلتا ہے سب اسی کی مملوک و مخلوق ہے وہ جس کو مناسب جانے ایمان کی توفیق دے کر بخش دے اور جسے چاہے کفر کی سزا میں پکڑ لے۔ شاید آخر میں واللہ غفور رحیم فرما کر اشارہ کر دیا کہ ان لوگوں کو جن کے حق میں آپ بددعا کرنا چاہتے تھے ایمان دے کر مغفرت و رحمت کا مورد بنا دے گا۔[1] یہاں سے یہ بات بھی الم نشرح ہو گئی کہ جس شخص پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے عذاب ثابت اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مشق ہو جاتے تو اس کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں چھڑا سکتے۔ ان بے خبروں کی ستم ظریفی اس کے مقابلے میں قابلِ افسوس ہے جو بھرے مجمعوں اور جلسوں میں یہ شعر پڑھا کرتے ہیں :

خدا جس کو پکڑے چھڑا لے محمد　　　محمد جو پکڑے چھڑا کوئی نہیں سکتا

اور ایسے ہی جس پر اللہ کی جانب سے رحمت ثابت ہو جاتے اس کے لیے پیغمبر کو بد دعا کرنے کا بھی حق نہیں ہے۔ صحیح بخاری کے حوالے سے سُن آئے ہو کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت صفوان، حضرت سہیل اور حضرت حارث ابن ہشام کے لیے بد دعا مانگی جبکہ یہ تینوں حضرات کافر و مشرک تھے اور آپ کو تکلیف دینے میں کوئی کمی نہ کرتے تھے چونکہ یہ حضرات حق تعالیٰ کے علم میں مسلمان ہونے والے تھے اس لیے اللہ سبحانہ نے آپ کو اس دعا سے روک دیا۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ یہ تینوں فتح مکہ میں مشرف باسلام ہوئے۔

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا بد دعا کرنا اجتہاد تھا اس سے پہلے آپ کو ممانعت نہیں کی گئی تھی اس لیے آپ کی عصمت پر کوئی حرف نہیں آتا۔ اس آیت میں اس اختیار پر جو نفی فرمائی ہے اس کی مزید تاکید ہے اور اس پر دلیل ہے کہ یہ اختیار تمہیں کیوں نہیں ہے اور ہم کو کیوں ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ نے پیغمبر کی تربیت فرمائی کہ بندے کو اختیار نہیں ہے اللہ تعالیٰ جو چاہے سو کرے اگرچہ کافر تمہارے دشمن ہیں اور ظلم پر ہیں لیکن چاہے ان کو ہدایت دے　　　اور چاہے ان کو عذاب کرے اپنی طرف سے بد دعا نہ کرو۔[1]

یہ اُمت بھی کیا خوش قسمت ہے کہ اللہ تعالیٰ عذاب کے لیے پیغمبر سے دریافت کرے تو پیغمبر رضامند نہ ہو جیسا کہ طائف میں ہوا اور کبھی پیغمبر بد دعا پر آمادہ ہوں تو اللہ تعالیٰ روک دے۔

صد شکر کہ ہستیم میاں دو کریم

آخر میں غفور رحیم ہونے کا اعلان فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ وہ معاف کرنے اور مہربانی کرنے میں بڑا فیاض ہے بشرطیکہ قانون میں ملزم کے لیے تھوڑی سی بھی گنجائش ہو۔

---

[1] موضح القرآن

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَأْكُلُوا الرِّبَا أَضْعَافًا مُضَاعَفَةً ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۝ وَاتَّقُوا النَّارَ الَّتِي أُعِدَّتْ لِلْكَافِرِينَ ۝ وَأَطِيعُوا
اللَّهَ وَالرَّسُولَ لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُونَ ۝

اے ایمان والو! سُود مت کھاؤ دگنا چوگنا[۲۳۵] بنا کر اور اللہ کی
نافرمانی سے بچو تاکہ فلاح سے ہمدوش[۲۳۶] ہو جاؤ۔ اور دیکھو
اس آگ سے ڈرو جو کُفر کی راہ چلنے والوں کے لیے تیار کی
گئی ہے[۲۳۷]۔ اللہ اور اس کے رسُول کی اطاعت کرو تاکہ
رحمتِ الٰہی کے مستحق[۲۳۸] ہو جاؤ۔

مال و دولت کی طمع کی پرہیز

اس موقع پر سُود کی حرمت کا ذکر بظاہر کچھ عجیب سا معلوم ہوتا ہے اس لیے شارحینِ قرآن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق بات کو مرتبط بنانے کے لیے اچھی اچھی باتیں لکھی ہیں۔

شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

جنگِ اُحد کے سلسلے میں سُود کی ممانعت کا ذکر بظاہر بے جوڑ معلوم ہوتا ہے مگر شاید یہ مناسبت ہو کہ اوپر از ہمت طائفتان میں جہاد کے موقعہ پر نامردی دکھلانے کا ذکر ہوا تھا اور سُود کھانے

نامردی پیدا ہوتی ہے دو سبب سے، ایک یہ کہ مال حرام کھانے سے توفیق طاعت کم ہوتی ہے اور بڑی طاعت جہاد ہے دوسرے یہ کہ سُود لینا انتہائی بُخل پر دلالت کرتا ہے کیونکہ سود خور چاہتا ہے کہ اپنا مال جتنا دیا تھا لے لے اور بیچ میں کسی کا کام نکلا یہ بھی مفت نہ چھوڑے اس کا علیحدہ معاوضہ لے تو جس کو مال میں اتنا بُخل ہو کر خدا کے لیے کسی کی ذرہ بھر ہمدردی نہ کر سکے وہ خدا کی راہ میں جان کب دے گا۔

ابوحیان نے لکھا ہے کہ اس وقت یہودیوں سے مسلمانوں کے سُودی معاملات اکثر ہوتے رہتے تھے اسی لیے ان سے تعلقات منقطع کرنا مشکل تھا چونکہ پہلے ۷ تتخذوا بطانۃ من دونکم کا حکم ہو چکا ہے اور اُحد کے قصے میں بھی یہود کی حرکات کو بہت دخل تھا اس لیے متنبہ فرمایا کہ سُودی لین دین ترک کر دو ورنہ اس کی وجہ سے خواہی نہ خواہی ان ملعونوں کے ساتھ تعلقات رہیں گے جو آئندہ نقصان اٹھانے کا موجب ہوں گے۔[1]

مولانا اشرف علی فرماتے ہیں :

ذیل آیت واذ تغدوت للمؤمنین عنوان فائدہ میں لکھا گیا ہے کہ اُحد میں عدم نصرت بسبب اختلال تقوٰی کے ہوا ایک اختلال قبل واقعہ کے دوسرا عین واقعہ میں۔ اس سے ثابت ہوا کہ بعض اوقات خطایائے سابقہ دوسری خطاؤں کے صدور اور بعض طاعات میں خلل ہو جانے کا سبب ہو جاتی ہیں اس لیے آگے تقوٰی کی تاکید اور اس کے بعض فروع مہمہ کی تصریح اور بڑے معاصی سے مثل ربوا کے اجتناب کا حکم فرماتے ہیں تاکہ پابند حدود شرعیہ رہیں تو آئندہ پھر کسی موقعہ پر کوئی مضرت پیش نہ آوے۔[2]

مولانا آزاد فرماتے ہیں :

اے پیروانِ دعوتِ حق جو ٹھوکر تمہیں جنگ اُحد میں لگی ہے اگر چاہتے ہو کہ اس سے عبرت پکڑو تو چاہیے کہ ان آلودگیوں سے پاک و صاف ہو جاؤ جو تمہارے دلوں میں کمزوری کا روگ پیدا کرنے والی ہیں۔ ازاں جملہ مال و دولت کی حرص ہے جب تک یہ روگ دلوں میں موجود ہے جاں فروشی کی سچی روح پیدا نہیں ہو سکتی۔ چونکہ اُحد میں مورچہ چھوڑنے والوں کی لغزش کا اصلی سبب مال و دولت کی طمع تھی۔ اور مال و دولت کی طمع کا ایک بڑا آلہ سُود کا لین دین تھا۔ اس لیے خصوصیت کے ساتھ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] بیان القرآن

یہاں اس کا ذکر کیا گیا۔ سُود در سُود کی وجہ سے بڑی بڑی رقمیں قرضداروں کے سر چڑھ گئی تھیں قدرتی طور پر ان کا چھوڑنا لوگوں پر شاق گزرتا تھا۔ پس حکم الٰہی ہوا کہ تمہارے دلوں کے تزکیہ کے لیے اسی بات میں سب سے بڑی آزمائش ہے۔ لہٰذا سُود در سُود کی وجہ سے کتنی ہی رقم قرضداروں پر کیوں نہ چڑھ گئی ہو لیکن اسے یک قلم چھوڑ دو [1]

مولانا مودودی فرماتے ہیں ؛

اُحد کی شکست کا ایک بڑا سبب یہ تھا کہ مسلمان عین کامیابی کے موقعہ پر مال کی طمع سے مغلوب ہو گئے اور اپنے کام کو تکمیل تک پہنچانے کے بجائے غنیمت کو لوٹنے لگے۔ اس لیے حکیم مطلق نے اس حالت کی اصلاح کے لیے زر پرستی کے سرچشمے پر بند باندھنا ضروری سمجھا اور حکم دیا کہ سُود خواری سے باز آجاؤ جس میں آدمی رات دن اپنے نفع کے بڑھنے اور چڑھنے کا حساب لگاتا رہتا ہے اور جس کی وجہ سے آدمی کے اندر روپے کی حرص بے حد بڑھتی چلی جاتی ہے [2]

مولانا محمد ادریس فرماتے ہیں ؛

گزشتہ آیات میں صبر و تقویٰ کا حکم تھا اور کفار کے ساتھ دوستی اور ان کو رازدار بنانے کی ممانعت تھی۔ اب ان آیات میں پھر صبر و تقویٰ کو بیان کرتے ہیں کہ صبر و تقویٰ کیا چیز ہے اور صابر و متقی کون لوگ ہیں اور ان کے اوصاف کیا ہیں ؟ جن میں سب سے پہلے سُود کی ممانعت فرمائی [3]

۲۳۵۔ اے ایمان والو سُود مت کھاؤ دُگنا چوگنا بنا کر۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تھوڑا سُود لے لیا کرو لوٹنے پر دو نامت لو۔ بات یہ ہے کہ جاہلیت میں سُود اسی طرح لیا جاتا تھا جیسے ہمارے یہاں کے بنیئے لیتے ہیں۔ سو روپے دیے اور سُود در سُود بڑھاتے چلے گئے یہاں تک کہ سو روپے میں ہزاروں روپے کی جائدادوں کے مالک بن بیٹھے۔ اسی صورت کو یہاں اضعافاً مضاعفۃ سے تعبیر فرمایا یعنی اوّل سُود حرام ہے اور یہ صورت تو بہت ہی زیادہ قبیح و شنیع ہے جیسے کوئی کہے میاں مسجد میں گالیاں مت بکو، اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسجد سے باہر گالیاں بکنے کی اجازت ہے بلکہ تقبیح و تشنیع کے موقعہ پر ایسے الفاظ بولے جاتے ہیں [4]

مطلب یہ ہے کہ اضعافاً مضاعفۃ کی قید صرف سُود کے گھناؤنے پن کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ قرآن میں اس کی متعدد مثالیں ہیں مثلاً لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق اس میں ممانعت

---

[1] ترجمان القرآن [2] تفہیم القرآن [3] معارف م ا [4] افادات شیخ الاسلام

درحقیقت قتل کی ہے خشیۃ املاق کی قید محض اس کی کراہت اور قباحت کو واضح تر کرنے کے لیے ہے اور جیسے لا تکرھوا فتیٰتکم علی البغاء ان اردن تحصنا اپنی لونڈیوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو اگر وہ قیدِ نکاح میں آنا چاہتی ہیں۔ اس میں بھی مقصود مطلق اکراہ کی ممانعت ہے ان اردن تحصنا کی قید محض اس کے گھناؤنے پن کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اسی طرح یہاں اضعافاً مضاعفۃً کی قید محض صورتِ حال کی تصویر اور اس کے گھناؤنے پن کو بتانے کے لیے ہے۔ اس سے یہ مقصود نہیں ہے کہ اسلام میں ممنوع صرف سود در سود ہے۔ عرب میں یہ دستور تھا اور ایسا ہی دستور تمام سودخواروں میں ہے کہ جب قرضہ کی میعاد پوری ہو جاتی اور قرضہ ادا نہ ہوتا تو سود کو اصل رقم میں بڑھا کر پھر از سر نو اس پر سود لگایا جاتا اور یوں تھوڑی مدت میں مدیون کی ناداری سے ایک چھوٹی سی رقم بڑی بھاری رقم بن جاتی لیکن اس نے ترقی کر کے ایک نہایت ظالمانہ صورت اختیار کر لی تھی جو سود در سود سے بھی زیادہ خطرناک تھی یعنی ایک میعاد متعینہ کے لیے کسی کو مثلاً سو روپیہ دیتے تھے۔ جب مدت گزر چکتی اور تقاضا پر مدیون اس رقم کو ادا نہ کر سکتا تو میعاد اور بڑھا دیتے تھے لیکن اس کے معاوضے میں راس المال میں بھی اضافہ کروا لیتے یہاں تک کہ کبھی یہ اضافہ دوگنی چوگنی مقدار تک پہنچ جاتا اسی طرح اضافہ ہوتے ہوتے مدیون کی کل جائداد مستغرق ہو جاتی۔ یہ معاملہ زیادہ تر غریبوں اور کاشتکاروں کے ساتھ پیش آتا جس کا نتیجہ یہ تھا کہ غریبوں اور کاشت کاروں کا تمام طبقہ چند دولت مندوں اور خصوصاً یہودیوں کے ہاتھ میں گرو ہو جاتا۔ قرآن کی یہ آیت اسی صورتِ حال کو ختم کرنے کا اعلان کر رہی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ بس یہی ناجائز ہے اور ربا تی جائز ہے۔ اسی صورتِ حال کا نقشہ حضرت زید نے اپنے اس بیان میں پیش کیا ہے :

> زمانہ جاہلیت میں سود کا یہ طریقہ رائج تھا کہ جانور کی صورت میں جب مدت گزر جاتی تو قرض خواہ قرضدار کے پاس آتا اور کہتا ادائیگی کرتے ہو یا اضافہ کرتے ہو۔ قرضدار کے پاس اگر ادائیگی کی وسعت ہوتی تو ادا کر دیتا ورنہ آئندہ پر محول کر دیتا۔ اگر ایک سال کی اونٹنی کا بچہ واجب الادا ہوتا تو اگلے سال دو سالہ اونٹنی کا بچہ وصول کرتا پھر تیسرے سال تین سالہ عمر کا بچہ وصول کرتا، چوتھے سال چار سالہ بچہ اسی طرح اس کے آگے سلسلہ جاری ہو جاتا۔ اور رقم کی صورت میں قرض خواہ قرضدار کے پاس آتا۔ اور وصول نہ ہونے کی صورت میں اسے آئندہ سال دوگنا کر دیتا۔ اگر دوسرے سال ادائیگی

نہ ہوتی تو اسے پھر دوگنا کر دیتا ایک سو روپیہ آئندہ سال دو سو ہو جاتا اور پھر سال گزرنے پر چار سو۔ پھر سال گزرنے پر آٹھ سو، اسی طرح پھر ہر سال بڑھتا رہتا۔

یہی ربوٰ آج کے دور میں سُود مرکب کہلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرض خواہ کی پوزیشن بغیر کسی قربانی کے بالکل محفوظ رہتی ہے بخلاف قرضدار کے کہ اگر اس نے کسی ضرورت سے قرض لیا اور اس میں خرچ کر دیا تو روپیہ اور اس کا سُود اس طرح دے رہا ہے کہ اس نے اس روپے سے کوئی آمدنی پیدا نہیں کی۔ اور اگر تجارت وغیرہ کے لیے لیا ہے تو تجارت کی کامیابی ہر حال میں ضروری نہیں ہے لیکن قرض دینے والے کا روپیہ بالکل محفوظ اور اس کی دن دوگنی آمدنی بھی۔ ایسا شخص جو اپنے کاروبار میں کبھی نفع اٹھاتا ہو اور کبھی نقصان کیا اس شخص کا مقابلہ کر سکتا ہے جس پر نقصان کے سارے دروازے بند ہوں اور صرف نفع کیا نفع؟ اضعافاً مضاعفۃ دو گنے ہو گنے کے حساب سے منافع کے دروازے اس پر کھلے ہوتے ہوں۔ کیا دونوں برابر ہو سکتے ہیں جو کبھی بیمار نہیں ہوتا اس کی صحت کا مقابلہ وہ کیسے کر سکتا ہے جو کبھی اچھا کبھی بیمار ہوتا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر کسی ملک میں ذرا زیادہ مدت تک اس قسم کی یک طرفہ دولت کی گردش ہوتی ہے تو نتیجہ یہی ہے کہ ملک کا ایک قلیل طبقہ یعنی ایسے لوگ جن کی آمدنی مصارف سے زیادہ ہو جب یہ اپنے روپے کو سُود کی راہ پر ڈال دیں تو ان کا بھی روپیہ ملک کے اکثر افراد کے گھروں میں پہنچ کر آہستہ آہستہ ان کی دولت کو کھینچ کر قرض دینے والوں کی جیبوں میں پہنچا دیتا ہے اور ایک سو سال کے بعد قوم کے اکثر افراد بدترین معاشی لاغری میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

خطرناک نتیجہ

بات یہیں آکر نہیں رُک جاتی۔ ان دولت مندوں کے پاس اگر دولت اور سرمایہ کی قوت ہوتی ہے تو ملک کی اکثریت اپنے پاس جسمانی طاقت رکھتی ہے۔ تنگ آکر ان سُود خواروں کی مالی قوت پر جسمانی قوت کا شدید حملہ ہوتا ہے اس کے نتیجے میں سلطنتیں تباہ ہوتی ہیں۔ امن وامان غارت ہوتا ہے، غرباء بھوکے غضبناک بھیڑیوں کی طرح دولت مندوں کو چیر پھاڑ دیتے ہیں۔ تاریخ ان نتائج کو یورپ میں دُہرا رہی ہے۔ یہ سب کس چیز کا نتیجہ ہے۔ یہی معاشی کاروبار میں لا تاکلوا الربوا اضعافا مضاعفۃ کے قانون کی خلاف ورزی کا نتیجہ ہے۔

خود سوچو کہ سود خوار کو جب اس کا روپیہ بجنسہٖ واپس مل جاتا ہے تو بغیر کسی قربانی کے دوگنا

قرض خواہوں سے سُود کا روپیہ کس بنیاد پر لیتا ہے ۔ ارسطو کا یہ سوال بڑا معنی خیز ہے
کیا تمہارے روپے بچے دیتے ہیں ۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ جس ملک میں اس قسم کے لین دین کی جب قانونی اجازت ہو گی اور اس کے دائرے میں وسعت ہو گی تو سرمایہ داروں کا طبقہ ملک کے اکثر افراد کے لیے شدید معاشی ضرر کا باعث ہو جائے گا۔ اس قسم کا کاروبار اسی ملک میں پروان چڑھتا ہے جس کے باشندے اپنے آپ کو صرف اپنے لیے یا اپنے خاندان ہی کے لیے سمجھتے ہوں اور اپنے ملک شہر گاؤں کے دوسرے افراد سے ان کو کوئی تعلق نہ ہو۔

حیرت ہے کہ یورپ آج قومیت اور ویلفیئر سٹیٹ کے دعوے کا اپنے آپ کو ساری دُنیا میں علمبردار کہتا ہے۔ اس نے صرف یہی نہیں کیا ہے کہ چند ساہوکاروں اور پیشہ ور سُود خواروں ہی کو اس کاروبار کی اجازت دے رکھی ہے بلکہ بنکنگ سسٹم جاری کر کے اس نے موقع فراہم کر دیا ہے کہ جن کو سُود خواری کی فرصت نہیں وہ بھی اب باسانی سُود خواروں کی کمیٹی میں شامل ہو کر ملک کی اکثریت کا معاشی خون چوسنے میں مشغول ہوں۔ اور اس لیے مغربی سُود خواری نے اپنے ردِ عمل کو دُنیا پر جلد ظاہر کر دیا۔ یہ ایک حیثیت سے اچھا ہوا ہلکے بخار سے تیز بخار کا ابھر آ جانا مریض کو چونکا دینے کے لیے زیادہ مفید ہے۔ آج یورپ اشتراکی حیوانوں کے زبانوں سے محفوظ ہو رہا ہے سُودی کاروبار کو اختیار کر کے اس نے قدرت کو جنگ کا اعلان کر دیا، چیلنج قبول کیا گیا۔ اسی سُود کے بل بوتے پر وہ جنگ لڑی جا رہی ہے جس کی نظیر دُنیا نے پہلے نہ دیکھی تھی۔ ماہرین کا بیان ہے کہ سُود پر باسانی حکومتوں کو اگر روپیہ قرض نہ ملتا تو روزانہ کروڑ ہا روپے کی رقم کی فراہمی کا قطعاً امکان نہ تھا۔ گویا آج سُود ہی اعلانِ جنگ اور اس ہولناک جنگ کا ذریعہ بنا ہوا ہے۔ انسانوں کی کمائی ہوئی آمدنی دھواں بن بن کر کچھ ہواؤں میں کچھ جہاز تارپیڈو اور خدا جانے کیا کیا بن کر سمندر کے پانیوں میں برباد ہو رہی ہے ۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ جنگِ اُحد کے ذکر میں قرآن نے سُود کے مسئلہ کو چھیڑا ہی اس لیے ہے کہ عموماً دُنیا نے جنگ کی کامیابی کا دارومدار سُود ہی کو قرار دیا ہے اور یہ صرف آج کی بات نہیں کہ سُود کے روپے سے جنگ کو جاری رکھا جاتا ہے اور جس قدر جو قوم زیادہ سُودی روپیہ لے سکتی ہے اسی پر اس کی جنگ میں کامیابی کا دارومدار ہے بلکہ عرب میں بھی جنگ کا انحصار بہت کچھ سُود پر تھا۔ اسی سورۂ بقرہ میں جنگ کے ذکر میں شراب اور جُوئے سے منع

کیا تھا تو اب جنگ ہی کے ذکر میں سود سے روکا ہے۔ چنانچہ کچھ مفسرین نے بھی اس طرف اشارہ کیا ہے کہ مشرکوں کے پاس مال اور سرمایہ سود سے جمع ہوتا تھا اور یہی جمع شدہ سرمایہ وہ فوج پر خرچ کرتے تھے۔

معاشی زندگی کا عظیم مفسدہ

یہ امر واقعہ اور حقیقت ہے کہ سود خواہ مفرد ہو یا مرکب اسلام نے اسے ممنوع قرار دے کر معاشی زندگی کے ایک بہت بڑے مفسدہ کو جڑ سے اکھاڑ دیا۔ سود کی وجہ سے زبردست ساہوکاروں اور سرمایہ داروں کے لیے یہ ممکن ہو جاتا ہے کہ وہ غریبوں کا خون چوسیں اور ان کی گاڑھی کمائی سے اپنی دولت میں مزید اضافہ کریں۔ سود کا عام رواج دولت کی نامساوی تقسیم کا بھی سبب ہے جس سوسائٹی میں یہ رواج عام ہوگا اس پر ہمیشہ طبقاتی کشمکش اور غربت و فلاکت کی لعنت مسلط رہے گی۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ قرآن نے ہر طرح کے سود کو ممنوع قرار دیا ہے خواہ یہ مفرد ہو یا مرکب اور چاہے یہ تجارتی اور کاروباری ہو یا اس کی نوعیت کچھ اور ہو یہ بالکل غلط ہے جیسا کہ آج کل بہت سے تجدد پسند اصحاب کہا کرتے ہیں کہ تجارتی اور معاشی کاروبار کے سلسلے میں جو سود لیا جاتا ہے اس کی نوعیت اس سود سے بالکل مختلف ہے جس کی قرآن نے ممانعت کی ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ اسلامی احکام کی رو سے ہر قسم کا سود قطعاً ناجائز ہے جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ موجودہ معاشی اور کاروباری سود چیز ہی اور ہے وہ شاید اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ موجودہ نظام سرمایہ داری کی بنیاد یہی سود ہے اور آج چونکہ سود کو ممنوع قرار دے دیں تو یہ نظام اپنی موجودہ شکل میں باقی نہیں رہ سکتا۔ سود میں سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ جو شخص اپنا روپیہ کاروبار میں لگاتا ہے اسے کاروبار کے نفع و نقصان سے کوئی دلچسپی نہیں ہوتی بلکہ وہ سود کی معینہ رقم حاصل کرنے پر قانع ہو جاتا ہے۔ اس طرح وہ کاروبار سے منفعت تو حاصل کر لیتا ہے لیکن نقصان کی صورت میں کوئی ذمہ داری قبول نہیں کرتا۔ یہ اعتراض کوئی وزن نہیں رکھتا کہ سود کے بغیر سرمایہ جمع کرنا ممکن نہیں ہے اور بغیر سرمایہ کے بڑے پیمانہ پر صنعتوں کو چلانا محال ہے حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ اگر سود کو مٹا کر اس کی جگہ منافع کی بنیاد پر معاشی تنظیم استوار کی جائے تو اس کی وجہ سے موجودہ زمانے کی بے شمار معاشی خرابیاں اصلاح پذیر ہو سکتی ہیں۔

سُود اور منافع میں فرق

سُود اور منافع میں بڑا فرق یہ ہے کہ سُود ایک معیّنہ رقم ہے لیکن منافع میں رقم کا تعین نہیں ہو سکتا۔ اگر ایک شخص اپنی جمع کی ہوئی رقم پر ۵ فی صد سُود حاصل کرتا ہے تو اسے بالکل ٹھیک ٹھیک معلوم ہوتا ہے کہ سال کے ختم پر اتنی رقم ملے گی لیکن اگر کاروبار اصول منفعت پر چل رہا ہو اور اسے بتا دیا جاتے کہ اتنا فیصد حصّہ منافع کا ملے گا پھر بھی وہ یہ نہیں کہہ سکتا کہ سال کے ختم پر اسے کیا ملے گا کیونکہ پہلے تو وہ یہی نہیں جانتا کہ تجارت میں نفع ہوگا یا نقصان اور اگر نفع کا تعین بھی ہے پھر بھی وہ اپنا حصّہ مقرر نہیں کر سکتا۔

سُود کی وجہ سے روپیہ لگانے والوں کو معاشی اور تجارتی کاروبار سے کوئی دلچسپی نہیں رہتی ہے انہیں تو سال کے ختم پر سُود کی وصولی سے مطلب ہے اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ آنکھ بند کر کے وہ اپنا روپیہ بنکوں کے حوالے کر دیتے ہیں لیکن بنکوں کی پالیسی پر انہیں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ نہ تو بنک کی کارروائیوں پر انہیں تنقید یا نکتہ چینی کا کوئی حق ہوتا ہے اور نہ ان کا کوئی نمائندہ بنک کے معاملات میں اپنی کوئی آواز رکھتا ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بنک کا پورا کاروبار بڑے سرمایہ داروں کے مفاد و اغراض کا تابع ہو رہتا ہے۔ پھر چونکہ بنکنگ کا پورا نظام ایک محدود جماعت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لیے بطور لازمی نتیجہ کے ساری تجارت، ساری صنعت اور سارے مالی ذرائع پر بھی یہی محدود جماعت قابض رہتی ہے کیونکہ بنکنگ نظام تجارت و صنعت کی بنیاد ہے۔ کوئی تجارت کوئی صنعت بنکوں کے تعاون یا ان کی امداد کے بغیر اپنا وجود باقی نہیں رکھ سکتی ہے اس کا نتیجہ ظاہر ہے۔ مالی نظام جس طبقے کے ہاتھ میں ہوگا۔ تجارت و صنعت پر بھی اسی کا قبضہ ہو گا۔ اسی صورتِ حال سے متاثر ہو کر ایک انگریز مصنف نے بطورِ طنز لکھا ہے کہ بنک آف انگلینڈ کا صدر زارِ روس سے کئی گنا زیادہ اقتدار و اختیار کا مالک ہوتا ہے۔ یہ استعارہ نہیں بلکہ حقیقت ہے۔

اگر سُود کی جگہ معاشی کاروبار کی بنیاد منافع پر رکھی جائے تو ہر شخص اپنا روپیہ لگانے میں بڑی احتیاط سے کام لے گا کیونکہ وہ اس صورت میں صرف نفع کا شریک نہ ہوگا نقصان میں بھی اسے شرکت کرنی پڑے گی۔ مجبور ہو کر روپیہ لگانے والے بنک کے انتظام میں موثر نمائندگی کا مطالبہ کریں گے اور بنک کے کاروبار اور اس کی پالیسی پر نظر رکھیں گے[1]

[1] نظامِ اسلام

انشورنس اور اسلام

اس زمانے میں دوسرے مسائل کے ساتھ تامین انشورنس کا معاملہ بھی بہت زیادہ عام ہو چکا ہے اس کی بنیاد سُود اور جوئے پر ہے۔ ان دونوں کی حرمت اسلام میں بدیہی ہے۔ ان میں اُمت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔

یہ بات کہ انشورنس جوا اور سُود اپنے دامن میں کیسے سمیٹے ہوتے ہے تحقیق طلب نہیں ہاں البتہ ذرا تفصیل طلب ہے۔

لکھنؤ کی مجلس تحقیقات شرعیہ نے اس موضوع پر ایک سوالنامہ مرتب کرکے شائع کیا اس کا جواب مولانا مفتی محمد شفیع صاحب اور مفتی ولی حسن ٹونکی نے دیا ہے۔ دارالاشاعت کراچی نے ان جوابوں کو شائع کر دیا ہے۔ دونوں جواب اپنے موضوع پر مفید معلومات کے حامل ہیں مفتی ولی حسن صاحب کا جواب چونکہ مفصل ہے اس لیے میں یہاں ناظرین معالم القرآن کی ضیافت طبع کے لیے اس کا ایک اقتباس پیش کرتا ہوں۔

کہا جاتا ہے کہ بیمہ کی ابتداء دہلی کے تاجران اسلحہ سے ہوئی۔ ان لوگوں نے یہ دیکھ کر کہ بعض تاجروں کا مالِ تجارت سمندر میں ضائع ہو جاتا ہے جس کے نتیجہ میں وہ انتہائی تنگدستی کا شکار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ اس صورتِ حال کا حل یہ نکالا کہ اگر کسی شخص کا مالِ تجارت سمندر میں ضائع ہو جاتے تو تمام تاجر مل کر اس کی معاونت کے طور پر اسے ہر ماہ یا ہر سال ایک مقررہ رقم ادا کیا کریں۔ یہی تحریک ترقی کرکے جہازوں کے بیمہ تک پہنچی کہ ہر ایک ممبر ایک مقررہ رقم ادا کرے تاکہ اس قسم کے حوادث و خطرات کے موقعہ پر نقصان کا کچھ نہ کچھ تدارک کیا جا سکے۔

یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ سب سے پہلے اندلس کی مسلم حکومت کے دور میں بحری تجارت میں حصہ لینے والے مسلمانوں نے تجارتی بیمہ کی طرح ڈالی۔ ابتداء میں بیمہ کی سادہ صورت تھی۔ بعد میں اس کی نئی نئی صورتیں نکلتی رہیں۔ اور تجربے ہوتے رہے۔ ہالینڈ اس تجربہ میں پیش پیش رہا۔ موجودہ دور میں بیمہ کاری کا نظام سب سے زیادہ مقبول ہے۔ جسے سرمایہ کارانہ نظامِ بیمہ کہا جاتا ہے۔ اب دُنیا کی حکومتیں بیمہ کو لازمی قرار دے رہی ہیں جسے ریاستی بیمہ کے نام سے موسوم کیا جاتا ہے۔ بیمہ کی ابتداء سنہ ۱۴۰۰ء سے ہوئی، ابتداء ہوتے ہی اسے بہت زیادہ فروغ ہوا۔ اور اس کے مقدمات اس کثرت سے عدالتوں میں آنے لگے کہ سنہ ۱۴۳۵ء میں اس کے لیے خاص عدالتیں مقرر ہوئیں جو

صرف بیمہ کے مقدمات کی سماعت کرتی تھیں۔ بیمہ بحری کے بہت عرصہ بعد بیمہ بری شروع ہوا۔
آل عثمان کے زمانہ حکومت میں جب ترکی حکومت کے تجارتی تعلقات یورپ کے ملکوں سے قائم ہوئے تو یورپین تاجروں کے توسط سے بیمہ اسلامی ملکوں میں داخل ہوا اور اس کے بارے میں علماء وقت سے سوالات شروع ہوئے۔ چنانچہ تیرھویں صدی ہجری کے مشہور فقیہ علامہ ابن عابدین الشامی تحریر فرماتے ہیں :

طریقہ یہ ہوگیا ہے کہ تاجر جب کسی حربی سے کوئی بحری جہاز کرایہ پر لیتے ہیں تو اس کا کرایہ ادا کرنے کے ساتھ ہی ساتھ دارالحرب کے کسی باشندے کو اپنے علاقہ میں مقیم رہتا ہے کچھ رقم اس شرط پر دیتے ہیں کہ جہاز میں لدے ہوئے مال کے آتش زدگی، غرقابی اور لوٹ مار ہو جانے کی صورت میں یہ شخص مال کا ضامن ہوگا اور اس کو رقم "سوکرہ" (بیمہ کی رقم) کہا جاتا ہے۔ اس کا ایجنٹ ہمارے ملک کے ساحلی شہروں میں شاہی اجازت نامہ کے بعد مستامن بن کر رہتا ہے جو تاجروں سے بیمہ کی رقم وصول کرتا ہے اور مال کے ہلاک ہو جانے کی صورت میں تاجروں کا پورا پورا معاوضہ ادا کرتا ہے۔ [1]

اس سے معلوم ہوا کہ بیمہ بحری کو اس زمانے میں خاصا فروغ ہو چکا تھا۔ یورپین ممالک سے جو جہاز کرایہ پر لیے جاتے تھے ان کا لازمی طور پر بیمہ کرایا جاتا تھا۔ بیمہ کمپنیوں کا عمل دخل ترکی حکومت میں جاری تھا۔ بیمہ کمپنیوں کے ایجنٹ ترکی کی بندرگاہوں پر باضابطہ سلطانی اجازت کے بعد مقیم تھے اور انہوں نے اپنے دفاتر قائم کر لیے تھے یہاں تک کہ اہل علم کے پاس اس سے متعلق سوالات آنے لگے اور کتب فتاویٰ میں رد المحتار وہ منفرد کتاب ہے جس میں انشورنس اور بیمہ کے متعلق تفصیل سے جواب دیا گیا ہے۔

بیمہ کی ابتدا جس جذبے کے تحت ہوئی اور جن ارتقائی منزلوں سے گزرا وہ سب کے سامنے ہے لیکن اس کا انجام فاضل جلیل استاذ علامہ ابوزہرہ کے الفاظ میں یہ ہے :

اگرچہ اس کی اصلیت تو تعاون محض تھی لیکن اس کا انجام بھی ہر اس ادارہ کی طرح ہوا جو یہودیوں کے ہاتھ میں پڑا۔ یہودیوں نے اس نظام کو جس کی بنیاد تعاون علی البر والتقویٰ پر تھی ایک ایسے نظام میں تبدیل کر دیا جس میں جوا اور سود دونوں

---

[1] رد المحتار ج ۳ ص ۲۴۵۔

موجود ہیں [1]

مصر و شام میں اس پر بحثیں مدت سے ہو رہی ہیں۔ وہاں بیمہ کے نظام کو سمجھانے کے لیے متعدد کتابیں لکھی جا چکی ہیں۔

مصر میں تین چار سال پہلے نئے مسائل پر غور کرنے کے لیے ایک مجلس ترتیب دی گئی تھی، جس میں استاذ ابوزہرہ، استاد خلاف اور دیگر علماء شریک ہوتے۔ اس کے پہلے اجلاس میں جو مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی کی زیر صدارت منعقد ہوا۔ بیمہ کا مسئلہ پیش کیا گیا۔ اس جلسہ کی پوری روداد مجلہ لواء الاسلام قاہرہ میں شائع ہوئی۔

پھر شام کے مشہور فاضل مصطفیٰ الزرقا نے مجلہ حضارۃ الاسلام (دمشق) کے صفحات پر عقد التامین و موقف الشریعہ کے عنوان سے بحث چھیڑی اور علماء کو دعوت دی کہ وہ اس مسئلہ پر خامہ فرسائی کریں چنانچہ استاذ ابوزہرہ نے استاذ الزرقا کے جواب میں نہایت مدلل مقالہ سپرد قلم فرمایا۔

استاذ الزرقا کے مضمون سے یہ بھی معلوم ہوا کہ علماء مصر و شام اس مسئلہ میں مختلف الخیال ہیں۔ اگرچہ اکثریت کا یہی خیال ہے کہ بیمہ ناجائز ہے اور جب تک بیمہ کے موجودہ نظام کو تبدیل نہ کیا جائے مسلمانوں کے لیے قابلِ قبول نہیں ہے۔ مختلف الخیال حضرات کی آراء اور ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ ہر قسم کا بیمہ جائز ہے۔ یہ حضرات بیمہ کے موجودہ نظام کو برقرار رکھتے ہوئے اس کی حلت اور جواز کے قائل ہیں۔ ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے کہ بیمہ امداد باہمی کی ایک شکل ہے۔ تعاون اور امداد باہمی اسلامی حکم ہے۔ جیسے بیع بالوفا کو گوارا کر لیا۔ اسی طرح اس کو بھی گوارا کر لیا جاتے۔ بیمہ کمپنی ضرورت مندوں کو قرض دیتی ہے اور اس پر جو سُود لگاتی ہے یا بیمہ دار کو اصل مع منافع دیا جاتا ہے وہ شرعی ربا سُود نہیں ہے۔

دوسرا گروہ جس کی قیادت استاذ زرقا کرتے ہیں ان کا خیال ہے کہ غیر سُودی بیمہ جائز ہے۔ بیمہ میں اگر قباحت ہے تو وہ سُود ہے اس کو ختم کرنے کے بعد بیمہ کی ہمہ اقسام جائز ہیں۔ ان حضرات کے دلائل کا تجزیہ اس طرح کیا جا سکتا ہے۔

---

[1] لواء الاسلام بحوالہ ماہنامہ برہان

الف، عقدِ موالات پر قیاس کہ اس میں ایک غیر شخص دیت وغیرہ کی ذمہ داری قبول کر لیتا ہے اور اس کے معاوضہ میں میراث کا حقدار ہو جاتا ہے ایسے ہی بیمہ بھی ہے۔
ب، ودیعت باجر اور مسئلہ ضمان خطر الطریق میں بیمہ کی بعض صورتوں کو داخل کیا جا سکتا ہے [1]

[1] استاذ مصطفیٰ الزرقا نے اپنی شہرہ آفاق کتاب المدخل الفقہی العام میں اس موضوع پر دو جگہ بحث کی ہے۔ یہاں اس علمی بحث کا پیش کر دینا مفید ہے۔
عقدِ موالاۃ میں انشورنس اور تامین کے جواز اور صحت کی بنیاد بننے کی پوری پوری صلاحیت ہے یہ آج کل تجارتی معاملات میں رائج ہے۔ مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ تجارتی سامان اور اثاثہ نقصان سے محفوظ رہے اور اس نقصان کے بدلے میں کمپنی مالک کو وہ رقم ادا کرے جو معاملہ میں طے ہو جاتے اور مالک کمپنی کو معمولی رقم دے۔ علماء اور مفتیانِ کرام اس معاملہ کی صحت میں متردد ہیں اور کچھ اس کو حرام قرار دیتے ہیں۔ میری اپنی رائے یہ ہے کہ یہ معاملہ قطعاً درست ہے اور اسلامی شریعت کے اصول اس میں رکاوٹ نہیں ہیں۔ اس طریقہ سے تاجر اور دوسرے حضرات کو جو نقصان برداشت کرنا پڑتا ہے ان سے تعاون کیا جاتا ہے بجائے اس کے کہ فردِ واحد نقصان برداشت کرے کمپنی نقصان برداشت کر لیتی ہے۔ آج کے دور میں جبکہ تمام بیرونی تجارتیں حمل و نقل کے ان تیز رفتار ذرائع کی موجودگی میں خطروں سے دوچار رہتی ہیں اس کی بے حد ضرورت ہے کوئی تاجر اس کے بغیر اپنی مایہ کے بارے میں مطمئن نہیں ہوتا ہے۔ ہمارے فقہاء نے مقررہ صورتوں ضمان خطر طریق کی صحت کو بیان کیا ہے اس کی صورت یہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ اس راستہ میں چلو راستہ قابلِ اطمینان ہے اگر تم پر کوئی افتاد آئی تو میں ذمہ دار ہوں۔ راستہ میں لوٹ لیا گیا تو ضامن کو ضمان دینا ہوگا (ردمختار کتاب الکفالہ)
انشورنس کے جواز کے لیے اصول شریعت اور فقہ میں ہم کو کوئی صریح نص نہیں ملتی ہے کیونکہ یہ معاملہ نیا ہے۔ یہاں صرف قیاسی دلائل کافی ہیں۔ ہاں مرحوم ابن عابدین شامی نے اس کو موضوع بحث بنایا ہے لیکن انہوں نے اس پر دوسرے زاویہ نظر سے غور کیا اور وہ اپنے غور و فکر کے نتیجہ میں اسے ناجائز کہتے ہیں۔

ج - مالکیہ کے نزدیک اگر کوئی شخص کسی سے وعدہ کرے بدون کسی عقد کے تو وہ وعدہ لازم ہو جاتا ہے اور نقصان کی صورت میں وعدہ کرنے پر معاوضہ نقصان ضروری ہوتا ہے
تیسرا گروہ جس کی قیادت استاذ ابو زہرہ کے ہاتھ میں ہے اس کا قائل ہے کہ بیمہ مطلقاً ناجائز ہے ان کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے :

۱- بیمہ اپنی اصل وضع میں قمار ہے جبکہ مدت مقررہ کے اختتام سے قبل ہی بیمہ دار کی موت واقع ہو جائے یا ربوٰ ہے جبکہ کل اقساط کی ادائیگی کے بعد بیمہ دار بیمہ شدہ مع منافع حاصل کرے قمار اور ربوٰ دونوں حرام ہیں۔
۲- بیمہ میں صفقتان فی صفقة[1] پایا جاتا ہے اس کی ممانعت نص حدیث سے ثابت ہے اور اس پر ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔
۳- بیمہ سے نظام میراث درہم برہم ہو جاتا ہے کیونکہ بیمہ دار کے نامزد کردہ شخص کو بیمہ کی رقم ادا کی جاتی ہے جبکہ ہر شرعی وارث مال متروکہ کا حقدار ہے۔
۴- یہ عقد صرف[2] ہے جس میں مجلس میں قبضہ ضروری ہے اور یہاں یہ شرط مفقود ہے۔
۵- عقیدہ تقدیر پر ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ پیش آنے والے حوادث اللہ تعالیٰ کے سپرد کر دیے جائیں اور یہاں بیمہ کرنے والے اس عقیدے سے فرار کرتے ہیں۔

ابن عابدین شامی کا فتویٰ

علامہ ابن عابدین شامی نے انشورنس کا مسئلہ ردمحتار میں ستامن کے باب میں ذکر کیا ہے۔ ان تاجروں کو ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینا جائز نہیں ہے کیونکہ یہ التزام ما لا یلزم کی صورت ہے یعنی جو چیز قانوناً لازم اور ضروری نہیں ہے اس کو اپنے ذمہ لازم کرنا ہے۔ اگر یہ کہا جائے کہ امانت رکھنے والا امانت کی حفاظت پر اجرت وصول کرے اور مال ضائع ہو جائے تو وہ ضامن ہوتا ہے تو اس کا جواب یہ ہے کہ بیمہ کے مسئلہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے

---

[1] یعنی ایک معاملہ کے ختم ہونے سے پہلے اس میں دوسرا معاملہ داخل کر دیا جائے۔
[2] عقد صرف روپے کی بیع روپے یا سونے چاندی کی باہم بیع کو صرف کہتے ہیں۔ اس میں شرط ہے کہ معاملہ کرنے کے بعد مجلس ختم ہونے سے پہلے مال پر قبضہ کرلیں۔

کیونکہ یہاں مال بیمہ کمپنی کی تحویل میں نہیں ہوتا بلکہ بحری جہازوں کے یا اس کے مالکوں کے ہاتھ میں ہوتا ہے اور اگر یہ صورت ہو کہ بیمہ کمپنی ہی کا جہاز بھی ہو پھر بھی ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینا درست نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں بیمہ کمپنی اجیر مشترک ہے جس نے مال کی حفاظت اور مال کے لے جانے دونوں کی اجرت لی ہے اور ظاہر ہے کہ اجیر مشترک ناگہانی مال کے تلف ہو جانے کی صورت میں ضامن نہیں ہوتا۔ اگر یہ خدشہ ہو کہ باب الکفالت میں یہ مسئلہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے شخص سے کہا کہ اس راستہ پر سفر کرو راستہ قابل اطمینان ہے۔ شخص مذکور نے سفر کیا۔ سفر میں مال ضائع ہو گیا تو راستہ کا اطمینان دلانے والا ضامن نہیں ہوگا اس کے برعکس اگر اس نے ضمانت لی اور کہا کہ تیرا مال چھیننے کی صورت میں، میں ضامن ہوں راستہ میں مال ضائع ہو گیا تو ضمانت دینے والا شخص نقصان کا معاوضہ دے گا۔ صاحب درمختار نے دونوں مسئلوں میں فرق اس طرح کیا ہے کہ دوسرے مسئلہ میں ضمانت کے الفاظ صراحۃً موجود ہیں پہلے میں نہیں۔ اور جامع الفصولین میں اس فرق کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ قاعدہ یہ ہے کہ جسے دھوکہ دیا جائے وہ دھوکہ باز سے ضمان لینے کا اس وقت حقدار ہے جبکہ دھوکہ عقد معاوضہ میں ہو۔ یا دھوکہ باز نے مال کے محفوظ رہنے کی ذمہ داری قبول کی ہو مثلاً ایک شخص کسی چکی والے کے پاس گیہوں پسانے گیا۔ چکی والے نے اس سے کہا کہ اس برتن میں ڈال دو۔ اتفاق سے برتن میں سوراخ تھا اور چکی والا اس سے واقف بھی تھا پھر بھی اس نے گیہوں برتن میں ڈالنے کے لیے کہا۔ گیہوں سب ضائع ہو گئے۔ چکی کا مالک نقصان کا ضامن ہوگا کیونکہ اس نے عقد ہی میں دھوکہ دیا ہے حالانکہ معاملہ کا تقاضا یہ تھا کہ مال کی حفاظت ہو۔ میں کہتا ہوں کہ اس میں یہ قید ناگزیر ہے کہ دھوکہ دینے والا نقصان سے واقف ہو اور دوسرا اس سے ناواقف ہو۔ ظاہر ہے کہ بیمہ کمپنیوں کا مقصد تاجروں کو دھوکہ دینا نہیں ہوتا اور نہ ان کو جہاز کے ڈوب جانے یا آگ لگ جانے کا علم ہوتا ہے۔ رہا عام خطرہ تو وہ تاجر اور بیمہ کمپنی دونوں کو ہوتا ہے کیونکہ تاجر بیمہ کراتے ہی اس وقت ہیں جب ان کو خطرہ ہو اور ہلاک شدہ مال کا معاوضہ لینے کی طمع ہو لہٰذا بیمہ کے مسئلہ کو اس پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اگر مسلمان تاجر کا کوئی حربی شریک ہو اور وہ دارالحرب میں بیمہ کمپنی سے معاملہ طے کرے اور مال ہلاک ہونے کی صورت میں معاوضہ کی رقم میں کچھ مسلمان تاجر کا بھی حصہ لگائے تو یہ رقم مسلمان کے لیے حلال ہے کیونکہ عقد فاسد دارالحرب میں رہنے والے دو شخصوں کے درمیان ہوا ہے اور دارالحرب والوں کا مال ان کی رضامندی سے مسلمانوں کو

پہنچا ہے لہٰذا اس کے لینے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ مسلمان تاجر دارالحرب میں ہوتا ہے اور وہاں ان کے سامنے یہ معاملہ طے کرتا ہے اور معاوضہ دارالاسلام میں لیتا ہے۔ کبھی اس کے برعکس بھی صورت ہوتی ہے یعنی معاملہ دارالاسلام میں ہوا اور وصولی دارالحرب میں ہوتی۔ پہلی صورت میں معاوضہ لینا جائز ہے کیونکہ دارالحرب میں طے کیا ہوا معاملہ کالعدم سمجھا جائے گا۔ اور یہ کہیں گے کہ حربی کا مال اس کی خوشی سے لیا گیا ہے اس لیے جائز ہے دوسری صورت میں چونکہ عقد دارالاسلام میں قرار پایا ہے اس لیے عقد پر فساد کا حکم لگایا جائے گا اور معاوضہ ناجائز ہوگا۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ ساتویں پارے میں آئے گی۔

کامیابی اہلِ تقویٰ کے لیے ہے

۲۳۶۔ اور اللہ کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم فلاح سے ہمدوش ہو جاؤ۔ یعنی سود کھانا چھوڑ دو اس میں کوئی بھلا نہیں بلکہ تمہارا بھلا اس میں ہے کہ خدا سے ڈر کر سود کھانا چھوڑ دو[۱] مطلب یہ ہے کہ ناداروں، حاجت مندوں اور غریبوں کے معاملہ میں اللہ سے ڈرو۔ قرض کی صورت میں ان کے ساتھ ایسا معاملہ نہ کرو جو ان کی زندگی کی تباہی کا باعث ہو جائے۔ آیت میں فلاح کو تقویٰ پر مرتب کرکے ان کے لزوم کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ فلاح و کامیابی یا دُنیا میں عافیت کے ساتھ زندگی بسر کرنے کا راز تقویٰ سے وابستگی میں ہے۔ اگر قرآن کی ساری تعلیمات کا خلاصہ ہم صرف ایک لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو ہم اس کو لفظ تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں۔ اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی رُوح پیدا کرنا ہے۔ قرآن نے اپنی دوسری سطر کے شروع میں یہ اعلان کیا ہے ھدی للمتقین اس کی تعلیم سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہیں۔ اسلام کی ساری عبادتوں کا منشا اسی تقویٰ کا حصول ہے۔ ایمان اگر فکری تطہیر ہے تو تقویٰ اسی فکری تطہیر کے بعد عملی تطہیر کا نام ہے۔ گویا ایمان کے بعد ہر مومن کا دوسرا قدم یہ ہونا چاہیے کہ وہ یہ دیکھے کہ میرے اس ایمان میں کتنی طاقت، کیسی کچھ عملی تاثیر اور کتنی زندگی ہے۔ وہ روزمرہ کے معاملات میں ہم کو خداپرستانہ زندگی اختیار کرنے پر کتنا ابھارتا ہے ہم اس کے تقاضوں کو کہاں تک پورا کرتے ہیں؟ اگر اس عملی جائزے میں آپ کو یہ حقیقت محسوس

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

ہو کر کثر یا بیشتر کر ہمارے عمل کی باگ ڈور خوفِ آخرت کے ہاتھوں سے چھوٹ جاتی ہے تو خود ساختہ تاویلوں اور حیلہ جوئیوں کی روش عام سے بچ کر ایک سیدھے مسلمان کی طرح اپنی کوتاہیوں کا دل میں اعتراف کر لینا چاہیے اور یقین کر لینا چاہیے کہ جس خوفِ آخرت کے ذکر سے ہماری زبان کو اتنا تعلق ہے اس کے تذکرہ اور تبلیغ سے ہمارے دلوں کو اتنا تعلق نہیں ہے اور ہمارے اندر جو ایمان ہے اس کی رُوح فی الواقع ابھی تک غفلت اور پژمردگی کی حالت میں ہے۔ اس احساس و اعتراف کے بعد دوسرا فرض یہ ہے کہ اس صورتِ حال کا علاج کیا جائے۔ یہ علاج کیا ہے تقویٰ اسی علاج کا نام ہے یعنی دل میں اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کی جائے دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقویٰ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی بنا پر ہر کام میں اللہ کے حکم کے مطابق عمل کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہو جائے۔

کفر ناقابلِ معافی جُرم ہے

۱۳۷۔ اور دیکھو اس آگ سے ڈرو جو کُفر کی راہ چلنے والوں کے لیے تیار کی گئی ہے یعنی سُود کھانے والا دوزخ میں جاتا ہے جو اصل میں کافروں کے لیے بنائی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہنم کی آگ اصلاً کافروں ہی کے لیے ہے۔ کہیں تم کافروں جیسے اعمال کر کے اپنے کو ان کی پیٹ میں نہ لے آنا۔ اکثر ائمہ تعبیر اس طرف گئے ہیں کہ یہ وعید ان لوگوں کے لیے ہے جو سود خواری کو حلال سمجھتے ہوں اور اس لیے حدودِ کفر میں داخل ہیں۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ یہ اہلِ ایمان کو ڈانٹ بتائی جا رہی ہے تاکہ وہ سُود کو حلال نہ سمجھیں۔ امام ابو حنیفہ سے منقول ہے کہ یہ آیت بہت ہی ڈرانے والی ہے کیونکہ اس میں دوزخ سے جو فی الواقع کفر کی سزا ہے ان لوگوں کو بھی ڈرایا گیا ہے جو اللہ کی حرام کی ہوئی چیزوں سے نہیں بچتے ہیں۔ (مدارک)

دراصل احکامِ الٰہی اور شریعتِ ربانی کی کھلی ہوئی دو قسمیں ہیں۔ ایک کا تعلق دل سے ہے اور جو بمنزلہ اصل کے ہے اسی کو قرآن کی زبان میں ایمان، فلسفہ کی اصطلاح میں علم اور تصوف کی بولی میں عرفان کہتے ہیں۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو اس عقیدہ اول کی فرع اور نتیجہ ہے اور جس کا تعلق اعضاء و جوارح سے ہے اس کو ہم مختصراً عمل کہتے ہیں۔ شرک و کفر کے گناہ کا تعلق اصلاً قسمِ اول سے ہے اور دوسرے گناہوں کا تعلق قسمِ دوم سے۔ دلوں میں ایمان،

علم اور عرفان کی اگر ایک کرن بھی ہو تو اس ظلمت کدے کی روشنی کی اُمید کسی طرح کی جا سکتی ہے مگر جس کا نشانۂ دل میں اس نور کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لیے نا اُمیدی ہے۔ اسی لیے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہوتے ہیں اور جہاں ایمان کی کچھ بھی رمق موجود ہے اعمال خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے۔ البتہ اعمال شر کا بھی ساتھ ساتھ وجود ہے جن کی تلافی عذاب دوزخ سے یا خدا کی رحمت سے ہو سکتی ہے اور نجات مل سکتی ہے۔ ایمان علم و عرفان جس کی حقیقت ایمان بالغیب ہے اس کا حصول موت کے بعد ہماری کوشش کا نتیجہ نہیں بلکہ خود ان حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہوگا اس بنا پر کفر و شرک کے گناہ کی مغفرت کی اُمید قانونِ الٰہی کے مطابق ناممکن ہے۔ البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

سمجھنے کے لیے ان دونوں کی کمل ہوتی مثال یہ ہے کہ دُنیا میں تعلیمی امتحان کے لیے ۳۳ نمبر کم از کم فرض کیے گئے ہیں۔ اب اگر کسی کا پرچہ بالکل سادہ ہے اور اس لیے اس کا نمبر صفر محض ہے۔ تو رحم دل سے رحم دل ممتحن کے لیے بھی یہ ناممکن ہے کہ اس کو ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ میں بھی کامیاب کر سکے۔ لیکن جس نے کچھ جوابات لکھے ہیں اور کچھ چھوڑ دیے ہیں اور کچھ غلط لکھے ہیں تو اگر وہ ۲۹، ۳۰ کے قریب بھی پہنچ گیا ہے تو رحم دل ممتحن ۳۳ تک اس کو پہنچا کر ادنیٰ درجہ میں کامیاب کر سکتا ہے

الغرض ایمان و عرفان کے مجرم جن کا نام مشرک و کافر ہے اپنے ناقابلِ تلافی نتیجہ کے بھگتے بغیر عذاب دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ان کی دنیوی زندگی کا عرفانی فقدان رحمتِ الٰہی کو اپنے اندر جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا۔

نظم و طاعت پر زور

۱۳۲۔ اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کرو تاکہ رحمتِ الٰہی کے مستحق ہو جاؤ۔ رسول کا حکم ماننا بھی فی الحقیقت خدا ہی کا حکم ماننا ہے کیونکہ خدا نے حکم دیا ہے کہ ہم پیغمبر کا حکم مانیں اور ان کی پوری طاعت کریں۔ جن اُمتوں کو عبادت اور طاعت میں فرق نظر نہ آیا وہ طاعت رسول کو شرک کہنے لگے۔ چونکہ جنگِ اُحد میں رسول کے حکم کی خلاف ورزی ہوئی جیسا کہ آگے آتا ہے اس لیے آئندہ کے لیے ہوشیار کیا جاتا ہے کہ اللہ کی رحمت فلاح و کامیابی کی اُمید اسی وقت ہو سکتی ہے جب اللہ اور اس کے رسول کے کہے پر چلو۔[1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

پہلے بتایا تھا کہ فلاح چاہتے ہو تو تقویٰ اختیار کرو۔ یہاں بتایا کہ اللہ کی رحمت سے ہمدوش ہونا چاہتے ہو تو اللہ و رسول کی طاعت کرو۔ گویا بتا دیا کہ مسلمان ہونے کی حیثیت میں اصل کامیابی تمہاری یہ نہیں ہے کہ تمہیں مالِ غنیمت مل جاتے بلکہ اصلی کامیابی یہ ہے کہ تم پر اللہ کی رحمت کے دروازے کھل جائیں۔ رحمتِ حق سے قریب ہونے کا راستہ صرف یہ ہے کہ تم اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کرو۔ جنگ اُحد میں شکست کا اصلی سبب یہی تھا کہ نظم و طاعت یعنی ڈسپلن کی رُوح پوری طرح پیدا نہیں ہوئی تھی اس لیے ضروری ہوا کہ اب کسی ایسی بات پر زور دیا جائے جس کی فوری تعمیل میں طاعت و فرمانبرداری کی پوری پوری آزمائش ہو جائے۔ اس امتحان کے لیے ایک زبردست اور عظیم پرچہ امتحان مقرر کیا گیا اور وہ یہ کہ سُود لینا چھوڑ دو ظاہر ہے کہ اس سے بڑی آزمائش اور کیا ہو سکتی تھی سُود کی حرمت سے قرض خواہوں کو ایک ایسی بات چھوڑ دینی پڑتی تھی جسے صدیوں سے اپنا جائز حق سمجھتے رہے تھے اور ان کی مال و دولت کی افزائش کا سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ چنانچہ سُود پر قدغن قائم کرنے کے بعد فوراً اللہ اور رسول کی طاعت پر زور دیا۔ اور زور بھی ایسا کہ اس پر خدا کی رحمت کو موقوف کر دیا۔

طاعت اور عبادت میں فرق

عبادت نام ہے انتہائی تذلل اور بے نہایت خشوع و خضوع کے اظہار کا۔ یہ اسی کے لیے مناسب ہے جس میں انتہائی عظمت موجود ہو۔ ایسی عظمت کہ اس سے برتر وہم و گمان میں بھی نہ آسکے اس درجہ کی عظمت صرف ایک ذات میں منحصر ہے۔ اس لیے اس میں غیر مستقل طور پر بھی کسی شرکت کی گنجائش نہیں۔ اس میں ہر قسم کی شرکت شرک ہے۔ اور اطاعت کے لیے صرف حکمرانی کی لیاقت درکار ہے۔ یہ بطریق نیابت اجازت کے بعد مخلوق میں بھی پیدا ہو سکتی ہے اس لیے نیابۃً غیر اللہ کی اطاعت شرک نہیں ہے۔ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے اُمت کے چند فرق افراط و تفریط کے شکار ہو گئے۔ کچھ تو تاویل کر کے غیر اللہ کی عبادت کو جائز بتانے لگے اور کچھ نے مجتہدین کی اطاعت کو بھی شرک کہہ دیا اور کچھ نے اطاعتِ رسُول کو بھی شرک کا ایک شعبہ قرار دے دیا۔ یہ تمام راہیں حقیقت سے ناآشنا ہونے کی دلیل ہیں۔ قرآن نے اس موضوع کو علمی اور عملی دونوں پہلوؤں سے واضح کر دیا ہے۔ علمی لحاظ سے تو اس نے یہ واضح کر دیا ہے کہ رسُول کی اطاعت اللہ کی اطاعت سے علیحدہ نہیں ہے اس کو مستقل طاعت سمجھنا ہی غلط ہے۔

من یطع الرسول فقد اطاع اللہ

عبادت کے موضوع پر اس قسم کا کہیں ایک فقرہ بھی نہیں آیا ہے جس سے یہ وسوسہ پیدا ہوسکے کہ غیر اللہ کی عبادت کسی حالت میں اللہ تعالیٰ کی عبادت ہوسکتی ہے اور عملی دائرے میں رسُول کی اطاعت اور اولوالامر کی اطاعت کو خود قرآن نے ضروری قرار دیا پھر اس کو شرک کیسے کہا جاسکتا ہے اس کے برعکس عبادت میں کسی کی شرکت کو کسی نہج سے بھی گوارا نہیں کیا بلکہ ایک ادنیٰ سی ریاکاری کی نیت کو بھی شرک سے تعبیر کیا ہے اور فوز و فلاح کے لیے اس سے بچنا شرطِ اول قرار دے دیا پس جتنی بات قرآن کریم سے بغیر تاویل کے صاف اور صریح طور پر سمجھی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ اس کے حکم کے تحت کچھ اشخاص یا جماعتوں کی اطاعت تو جائز ہے اور عبادت میں اس کا حکم ہی یہ ہے کہ

امر الا تعبدوا الا ایاہ

اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ پارۂ پنجم میں آرہی ہے -

وَسَارِعُوْٓا اِلٰى مَغْفِرَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَجَنَّةٍ عَرْضُهَا السَّمٰوٰتُ
وَالْاَرْضُ ۙ اُعِدَّتْ لِلْمُتَّقِيْنَ ۝ الَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ فِي السَّرَّآءِ
وَالضَّرَّآءِ وَالْكٰظِمِيْنَ الْغَيْظَ وَالْعَافِيْنَ عَنِ النَّاسِ ۭ وَاللّٰهُ
يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ اِذَا فَعَلُوْا فَاحِشَةً اَوْ ظَلَمُوْٓا
اَنْفُسَھُمْ ذَكَرُوا اللّٰهَ فَاسْتَغْفَرُوْا لِذُنُوْبِهِمْ ۠ وَمَنْ يَّغْفِرُ الذُّنُوْبَ
اِلَّا اللّٰهُ ڞ وَلَمْ يُصِرُّوْا عَلٰي مَا فَعَلُوْا وَھُمْ يَعْلَمُوْنَ ۝ اُولٰۗىِٕكَ
جَزَاۗؤُھُمْ مَّغْفِرَةٌ مِّنْ رَّبِّھِمْ وَجَنّٰتٌ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ
خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَنِعْمَ اَجْرُ الْعٰمِلِيْنَ ۝

اور دوڑ کر چلو اپنے پروردگار کی بخشش کی طرف[239] اور اس جنت کی طرف جس کی پہنائی آسمان و زمین ہیں[240] اور ایسی جنت جو ان متقی لوگوں کے لیے تیار کی گئی ہے[241]۔ جو خوشحالی اور تنگ حالی میں خرچ کرتے ہیں[242]، اور جو غصہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو

معاف کرتے ہیں[۲۴۳] اور اللہ نیکوکار لوگوں سے محبت کرتا ہے[۲۴۴] اور وہ لوگ جن کا حال یہ ہے کہ جب ان سے کوئی سخت بُرائی کی بات ہوجاتی ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کرکے اپنے پر ظلم کر بیٹھتے ہیں[۲۴۵] تو فوراً اللہ کی یاد ان میں جاگ اٹھتی ہے اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں[۲۴۶]، اور اللہ کے سوا گناہوں کو معاف کون کرتا ہے[۲۴۷] اور جو کچھ کر چکے ہیں اس پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے[۲۴۸]۔ بلاشبہ یہی لوگ ہیں کہ ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس یہ ہے کہ ان کو معاف کردے اور ان کی جزا ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ہمیشہ انہی باغوں میں رہیں گے، کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا[۲۴۹]۔

سُود اور صدقہ کا تقابلی مطالعہ

سُود کی حُرمت کا اعلان کرنے کے بعد صدقہ و انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر کیا ہے اور اس کے لیے اسلوب بھی بڑا ہی جذباتی اختیار فرمایا ہے ۔ د سارعوا یعنی دوڑ دھوپ مچادو، دوڑ کر

چلو یا نیز کام ہو جاؤ۔ سُود خواری جس معاشرے میں ہوتی ہے اس کے اندر سُود خواری کی وجہ سے دو قسم کے اخلاقی امراض پیدا ہو جاتے ہیں۔ سُود لینے والے میں حرص، طمع، بخل اور خود غرضی اور سُود دینے والوں میں نفرت، غصہ اور بغض وحسد۔ اس آیت میں اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو بتا رہا ہے کہ سُود خواری سے جو اخلاقی رذایل پیدا ہوتے ہیں ان کے بالکل برعکس انفاق فی سبیل اللہ اور صدقہ سے دوسری قسم کے فضائل پیدا ہوتے ہیں اور اللہ کی بخشش اور جنت فضائل ہی سے حاصل ہو سکتی ہے نہ کہ رذائل سے۔

اسلام کی یہ سب سے بڑی خوبی ہے کہ رذائل کو وہ ضابطہ اور قانون کی بندش میں جکڑ دیتا ہے۔ لیکن فضائل کی حد تک انسانوں کے ارادے اور مرضی سے اپیل کرتا ہے۔ اگر وہ فضائل میں بھی ضابطہ اور قانون کی بندش قائم کر دیتا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا کہ انسان کے اخلاقی احساسات حالت تعطل میں رہتے اور قدرت کا عالمگیر قانون یہ ہے کہ کسی قوت کا جمود و تعطل اس کی موت ہے جس دُنیا میں ہمدردی، صلہ رحمی، عزیز و اقربا کی امداد، غربا کی دستگیری کے مواقع ناپید ہوں جہاں کسی شخص کو انفرادی طور پر اور اپنی آزاد مرضی سے کسی پر رحم کھانے، غصہ کو پینے، کسی کے کام آنے، کسی کو اپنی کمائی میں شریک کرنے کا موقع نہ ہو۔ جس جماعت کے افراد باہمی معاملات اور آپس کے تعلقات میں ایثار و قربانی کی رُوح سے خالی ہوں۔ اس میں اخلاقی احساسات کا نشوونما ناممکن ہے۔ قرآن رذائل کے بعض اہم اور ضروری شعبوں کو ضابطہ اور قانون کی طاقت کے حوالے کر کے باقی تمام شعبوں میں انسان کے اخلاقی احساسات کو ان کے عمل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے۔ اسی لیے قرآن نے سُود پر قدغن قائم کرنے کے بعد انفاق فی سبیل اللہ کی پرزور تلقین کی اور بتایا کہ سارعوا الی مغفرۃ من ربکم و جنۃ گویا حکومت اور قانون کو حرکت میں لائے بغیر قرآن ایک مومن کے اخلاقی احساسات کو اتنا مضبوط دیکھنا چاہتا ہے جہاں خارج سے اس پر کوئی دباؤ یا دُنیا کی ملامت و سرزنش کا کوئی موقع نہ ہو وہاں بھی ایک انسان دوسرے انسان کی اعانت و دستگیری، درگزر اور عفو کو اپنا فرض منصبی خیال کرے۔ پورا قرآن انفاق کی ترغیب سے بھرا ہوا ہے۔ بلاشبہ جس جماعت میں انفاق فی سبیل اللہ کی رُوح کام کر رہی ہوگی۔ اس میں غربت، افلاس اور درد و مصیبت کی صدائیں مشکل سے سُنی جا سکیں گی۔ جس سوسائٹی میں غریبوں کی دستگیری، محتاجوں کی اعانت، یتیموں کی خبر گیری، اور اقربا کی ہمدردی کا جذبہ برسرِ کار ہو۔ وہاں معاشی تنگدستی کی شکایت ناپید ہوگی۔ جہاں انفاق کی سرگرمیاں ہوں

وہاں گردش میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ اور جہاں اس میں رکاوٹ ہو گی وہاں معاشی خرابیوں کا ایک بڑا دروازہ آپ سے آپ بند ہو گا۔ کیونکہ دُنیا کے اکثر و بیشتر معاشی مفسدات اسی راہ سے آتے ہیں۔ گردش زر جتنی مکمل ہو گی معاشی زندگی اتنی ہی پرسکون ہو گی۔

خدا کی بخشائش کے لیے تیز گامی

۲۳۹ ـ اور دوڑ کر چلو اپنے پروردگار کی بخشائش کی طرف۔ یعنی ان اعمال و اخلاق کی طرف جھپٹو جو حسب وعدہ خداوندی اس کی بخشش اور جنت کا مستحق بناتے ہیں [1]

آیت میں مغفرت سے مراد اسباب مغفرت ہیں یعنی وہ اعمال صالحہ جو باعث مغفرت ہیں صحابہؓ و تابعین سے مغفرت کی تفسیر مختلف آتی ہے لیکن حاصل سب کا ایک ہے۔ علی بن ابی طالب فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ادائے فرائض میں جلدی کرو۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اسلام کو، ابوالعالیہ نے ہجرت کو اس کا مصداق بتایا ہے۔ انس بن مالک نے تکبیر اولیٰ کہا ہے۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ طاعات میں سرشاریاں دکھاؤ، ضحاک کا کہنا ہے کہ جہاد کرو۔ قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ سب کا حاصل یہی ہے کہ اسباب مغفرت اختیار کرو اور وہ کام کرو کہ جن سے اللہ کی مغفرت کے مستحق ہو جاؤ۔ رذائل سے دامن پاک رکھو اور فضائل و محاسن کا سرمایہ فراہم کرو۔ سود سے بچو اور صدقہ میں بڑھو۔ بلکہ عارفین کہتے ہیں کہ ہر وقت جو چیز اس وقت کے لحاظ سے خیر و مصلحت ہو اس کی طرف تیز گام ہونا ہی مسارعۃ الی المغفرۃ من ربکم کا مدلول ہے۔

مغفرت کا جنت سے پہلے ذکر

آیت میں جنت پر مغفرت کو مقدم لا کر اشارہ کر دیا کہ جنت حاصل کر لینا مغفرت الٰہی کے بغیر ناممکن ہے۔ انسان اگر تمام عمر بھی نیکیاں کرتا ہے۔ اور گناہوں سے کنارہ کش ہے پھر بھی اس کے اعمال جنت کی قیمت نہیں ہیں۔ جنت صرف مغفرت ہی کے ذریعے ملے گی اور مغفرت اللہ سبحانہ کا فضل ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے:۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

راستی اور حق کو اختیار کرو۔ میانہ روی کو اپناؤ اور فضل الٰہی پر خوشیاں مناؤ۔ کیونکہ کسی شخص کو اس کا عمل جنت میں لے جانے کی علت نہیں ہے۔ صحابہ نے دریافت کیا کہ کیا آپ کا عمل بھی جنت میں لے جانے کی علت نہیں فرمایا نہیں میرا عمل بھی جنت میں نہیں پہنچا تے گا تاآنکہ اللہ مجھے اپنی رحمت میں نہ ڈھانپ لے۔

مطلب یہ ہے کہ ہمارے اعمال جنت کی قیمت نہیں اور جنت میں جانے کی علت نہیں ہیں بلکہ بہانہ اور سبب ہیں، علت تو صرف اللہ کی مغفرت اور رحمت ہے۔ قرآن میں جن مقامات پر جنت کے ذکر میں بما کانوا یعملون آیا ہے وہاں با، مقابلہ نہیں بلکہ باسببیہ ہے یعنی اعمال جنت میں جانے کا سبب ضرور ہیں مگر اعمال جنت کا بدل اور اس کی قیمت نہیں ہیں۔

تیز گامی اور نماز

اصل ارشاد میں سارعوا آیا ہے۔ اس کا مصدر مسارعت ہے۔ اس کے معنے مسابقت اور مبادرت کے ہیں اور اس کا منشا یہ ہے کہ نیک کاموں میں تیز گامی اور دوڑ دھوپ مچانی چاہیے۔ لیکن نماز نیکیوں میں سب سے بڑی نیکی ہے۔ ایک حدیث میں ارشاد ہے۔

نماز کے لیے دوڑتے بھاگتے نہ آیا کرو بلکہ اس طرح آؤ کہ تم سراپا سکون و وقار ہو۔

آیت قرآنی کہتی ہے کہ تیز گام ہو جاؤ مگر نماز کے بارے میں ارشاد ہے کہ دوڑ دھوپ نہ مچاؤ۔ آیت قرآنی میں مسارعت سے اہتمام مقصود ہے اور ہر وقت دوڑ دھوپ روح اہتمام کے خلاف ہے۔ شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ نماز کے موضوع پر اس مخصوص ادب میں جو بڑی حقیقت پوشیدہ ہے وہ یہ ہے کہ نماز کے لیے جب ایک خاص جگہ مقرر کر دی گئی ہے۔ اس کے لیے اذان کے ذریعے اعلان بھی ہو گیا اور آنکھوں سے نظر آ رہا ہے کہ مختلف سمتوں سے مختلف جماعتیں کسی ایک مقصد کی خاطر ایک جگہ جمع ہونے آ رہی ہیں۔ اگر وہ بھاگ بھاگ کر جائیں گے تو دیکھنے والوں کے دماغ میں یہ نقشہ آ سکتا ہے کہ جس طرح اور مذاہب میں ان کے معبود کسی ایک جگہ رکھے ہوتے ہیں شاید ان کا معبود بھی کسی مسجد میں رکھا ہوا ہے جس کی طرف یہ والہانہ انداز میں بھاگے جا رہے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ تم مت بھاگا کرو بلکہ اس طرح جایا کرو کہ ہر دیکھنے والا سمجھ جائے کہ جہاں تم جا رہے ہو وہاں کچھ بھی نہیں ہے۔ تم ایسے معبود کی عبادت کرتے ہو جو یہاں بھی ہے اور

وہاں بھی۔ ہر حال میں وہ تمہارے ساتھ ہے وہ تمہاری رگِ جان سے بھی زیادہ تم سے قریب ہے۔

آخرت میں مقامِ عیش وراحت

۲۰۴ - اور اس جنت کی طرف جس کی پہنائی آسمان وزمین ہیں۔ چونکہ آدمی کے دماغ میں آسمان وزمین کی وسعت سے زیادہ اور کوئی وسعت نہیں آسکتی تھی اس لیے سمجھانے کے لیے جنت کے عرض کو اسی سے تشبیہہ دی گئی گویا بتا دیا کہ جنت کا عرض زیادہ سے زیادہ سمجھو پھر جب عرض یہ ہے تو طول کا حال خدا جانے کیا کچھ ہوگا[1] مطلب یہ ہے کہ جنت بے انتہا وسیع ہے۔ جنت کی بجنسہٖ پیمائش بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ صرف اس کی بے انتہا وسعت اور گنجائش کا اظہار مقصود ہے۔ عربی محاورے میں انتہائے وسعت کے اظہار کا یہی پیرایہ ادا ہے۔

آخرت کے خانۂ عیش وراحت کے لیے قرآن پاک نے عموماً جنت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نادان اس کی وجہ یہ قرار دیتے ہیں کہ عرب کے شور و بے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز و شاداب باغوں ہی کی ہو سکتی ہے اس لیے ان کے لیے یہ لفظ اس مقامِ آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں بلکہ پوری دُنیا ہے اس لیے عرب کی تخصیص بے معنے ہے۔ کیا دُنیا کے سرسبز و شاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ و راغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان و گلستان کی تخصیص نہیں یہ فطرتِ انسانی کی تصویر ہے۔ انسان کسی خطۂ ارضی میں آباد ہو مگر وہ سرسبز و شاداب قطعات باغ و بہار اور کنارِ آب و نہر کو عیش وراحت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی رُوح وجد کرتی ہے۔

اس استعارے کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے۔ انسان کا گھر وہ عیش خانہ ہوتا ہے جس میں حزن وغم کی آمیزش بھی شامل ہوتی ہے۔ اہل وعیال اور دولت ومال کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں۔ مگر جب انسان سیر و تفریح کے لیے باغ و چمن کا رُخ کرتا ہے تھوڑی دیر کے لیے وہ ہر غم کو بھول جاتا ہے اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم والم اس کے ہر گوشۂ خاطر سے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

دُور ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے اس لفظ کو اسی لیے استعمال کیا ہے تاکہ اس سے اخروی عیش و مسرت، شادی و خوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر کھیچ جاتے۔

جنت اہلِ تقویٰ کا مقام ہے

۲۴۱ - ایسی جنت جو متقی انسانوں کے لیے تیار کی گئی ہے۔ یہ بات قرآن میں بار بار دُہرائی گئی ہے کہ جنت اہلِ تقویٰ کا مقام ہے۔ کہیں فرمایا ہے کہ ان المتقین فی مقام امین اور کہیں بتایا ان المتقین فی جنات و نعیم۔ کبھی ارشاد ہوا ان المتقین فی جنات و عیون اور کبھی اعلان کیا ان المتقین فی جنات و نھر اور کبھی اظہار کیا ان المتقین فی ظلال و عیون اور کہیں منادی کی گئی ان للمتقین عند ربھم جنات النعیم۔ اور کہیں بشارت سنائی گئی ان للمتقین مفازاً۔ بلاشبہ کامیاب اہلِ تقویٰ ہیں اور ان کو محبوبیت، معیت اور قبولیت کا شرف حاصل ہے۔ یہ بات کہ اہلِ تقویٰ کون ہیں؟ اس کے لیے آپ کو معالم القرآن کی دوسری جلد میں آیت نمبر ۲۳۲ کا مطالعہ کرنا چاہیے اس میں اہلِ تقویٰ کا پورا چہرہ پیش کیا گیا ہے جس میں عقائد، اعمال، اخلاق کی تقویٰ پر مبنی پوری تصویر کھینچی گئی ہے اور جس کے بارے میں محققین نے لکھا ہے کہ یہ اسلام کے بنیادی مسائل کے موضوع پر اہم ترین آیت ہے۔ یگانے تو یگانے حق پوش بیگانے بھی اس آیتِ قرآنی کی عظمت کا لوہا مان گئے۔

جاں فروشی اور ایثار و قربانی

۲۴۲ - جو خوش حالی اور تنگ حالی میں خرچ کرتے ہیں۔ یعنی نہ عیش و خوشی میں خدا کو بھولتے ہیں نہ تنگی و تکلیف کے وقت خرچ کرنے سے جان چراتے ہیں۔ ہر موقع پر اور ہر حال میں حسب مقدرت خرچ کرنے کے لیے تیار رہتے ہیں۔ سُود خواروں کی طرح بخیل اور پیسہ کے پجاری نہیں گویا جانی جہاد کے ساتھ مالی جہاد بھی کرتے ہیں[1]

یہاں سُود کے مقابلے میں انفاق کا ذکر کیا ہے۔ سُود خواری حرص، طمع، بخل اور ظلم کا مجموعہ ہے۔ حرص و طمع تو یوں کہ سُود خوار اس سُود کے ذریعے چاہتا ہے کہ ساری دولت سمٹ کر اس کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پاس آجاتے ۔ بخل یوں کہ وہ کسی مقروض کے ساتھ کوئی رعایت کرنا نہیں چاہتا اور نہ کسی کارِخیر میں دے کر اپنے سر لیتے میں کی پسند کرتا ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے سُود خواری کا ذکر انفاق فی سبیل اللہ کے مقابلے پر کیا ہے اور ظلم یوں کہ وہ سُود اور سُود در سُود کے ذریعے لوگوں کو ان کی محنتوں سے محروم کرتا ہے اور رحم نہیں کرتا ۔ اسی لیے سُود کی ممانعت کے موقع پر لا تظلمون ولا تظلمون فرمایا ہے ۔ اس کے برعکس انفاق کے معنے اپنے کسی حق کو خوشی کے ساتھ دوسرے کے حوالے کرنے کے ہیں اور اس کی بہت سی صورتیں ہیں ۔ اپنا حق کسی کو معاف کر دینا ۔ اپنا بچا ہوا مال کسی کو دے دینا ۔ اپنی ضرورت کا خیال کیے بغیر کسی دوسرے کو دینا ، اپنی ضرورت کو روک کر کسی کو دینا ۔ دوسرے کے لیے اپنے جسم کی قوت کو خرچ کرنا اپنے دماغ کی قوت کو خرچ کرنا ۔ اپنی آبرو کو خطرے میں ڈال دینا ، دوسروں کو بچانے کے لیے یا حق کی حمایت میں اپنی جان دے دینا ، یہ سب انفاق کی ادنیٰ اور اعلیٰ قسمیں ہیں جن کے امتیاز کے لیے الگ الگ نام رکھے گئے ہیں ۔

اس سے معلوم ہوا کہ انفاق کتنے وسیع معنے کو گھیرے ہوئے اور اخلاق کی کتنی ضمنی تعلیمات کو محیط ہے اور ان سب کا منشا یہ ہے کہ اپنی ذات سے دوسروں کو فائدہ پہنچایا جائے ۔

ایمان کے بعد اسلام کے دو سب سے اہم رُکن نماز اور زکوٰۃ ہیں ۔ زکوٰۃ کی اصلی رُوح بھی انفاق ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں انفاق کی حیثیت بالکل بنیادی ہے یعنی جس طرح نماز کی عبادت ہر قسم کے حقوق الٰہی کی بنیاد ہے اسی طرح انفاق بندوں کے ہر قسم کے حقوق کی اساس ہے ۔ جب تک کسی میں یہ وصف پیدا نہ ہوگا اس میں اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ہمدردی اور محبت کا جذبہ نہ ہوگا ۔

ان متقین کا قرآن نے پہلا وصف یہ بیان کیا ہے جن کے لیے جنت تیار کی گئی ہے کہ وہ سرّاء اور ضرّاء دونوں حالتوں میں خرچ کرتے ہیں یعنی خوش حالی اور بدحالی صحت اور مرض ، خوشی اور غمی کی حالت میں خرچ کرتے ہیں ۔

متقین کی اس صفت کا تعلق سراسر حقوق العباد سے ہے جبکہ آنے والی صفت یعنی ذکر اللہ کا تعلق حقوق اللہ سے ہے ۔ حقوق العباد سے متعلق صفت کو پہلے لا کر اشارا فرما دیا کہ اگرچہ اصل کے اعتبار سے حقوق اللہ مقدم ہیں لیکن حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ایک جوہری فرق ہے ۔ اللہ سبحانہ نے جو حقوق اپنے سے متعلق بندوں پر لازم کیے ہیں ان سے اللہ سبحانہ کی کوئی اپنی منفعت وابستہ نہیں ہے اور عدم ادائیگی سے اللہ کا کوئی نقصان نہیں ہوتا ۔ اس کی ذات غنی ہے

برخلاف حقوق العباد کے کہ وہ انسانی ضرورت سے متعلق ہیں۔ ان کی عدم ادائیگی سے متعلقہ افراد کا نقصان ہوتا ہے اس لیے زندگی میں حقوق العباد کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اسی اہمیت کی خاطر یہاں حقوق العباد کو پہلے لاتے ہیں۔

انسانی زندگی دو ہی حالتوں سے عبارت ہے خوشی اور غم، خوش حالی اور بدحالی۔ خوش حالی میں انسان پھول کر اتراہٹ اور گھمنڈ کا شکار ہو جاتا ہے اور اس کے نتیجے میں خدا فراموش ہو جاتا ہے اور جب تنگی اور مصیبت ہو تو مایوسی اور ناشکری کی تصویر بن جاتا ہے۔ قرآن نے یہ دو لفظ بول کر بتا دیا کہ اللہ کے مقبول بندے وہ ہیں جو ہر حال میں انفاق کرتے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ اس کی شقاوت کی ساری سرگزشت جس طرح سُود خواری میں سمٹی ہوئی ہے ایسے ہی اس کی سعادت کی ساری کہانی انفاق میں محصور ہے۔ سُود خواری کی لعنت سے بچ کر انفاق کی رُوح جس میں آگئی سمجھ لو ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں۔

اخلاقی فضائل کی تعلیم

۲۴۳۔ اور جو غصّہ کو پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ اس میں اہلِ تقویٰ کی یہ صفت بیان کی گئی ہے کہ وہ غصّہ کو پی جاتے ہیں۔ اصل ارشاد میں الفاظ یہ آئے ہیں کہ والکاظمین الغیظ کظم کہتے ہیں غصّہ کے ضبط کر جانے کو۔ یعنی یہ وہ لوگ ہیں جو غصّہ سے مغلوب نہیں ہوتے بلکہ اس سے مقابلہ کر کے اسے زیر کر لیتے ہیں اور اپنے اوپر قابو رکھتے ہیں۔

غیظ و غضب سے بچنا

غیظ و غضب کی بے اعتدالی بھی بہت بڑی بُرائی ہے۔ بہت سے ظالمانہ اور بے دردانہ کام انسان صرف غیظ و غضب اور غصّہ میں کر بیٹھتا ہے اور بعد کو اکثر نادم و پشیمان ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن نے اچھے مسلمانوں کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ اپنے غصّہ کو دبا لیتے ہیں۔ اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ پہلوان وہ نہیں ہے جو دوسروں کو پچھاڑ دے بلکہ پہلوان وہ ہے جو غصّہ میں اپنے کو قابو میں رکھے[1]

[1] صحیح مسلم و صحیح بخاری

حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جاریہ ابن قدامہ، حضرت ابوالدرداء وغیرہ کئی صحابہ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے اکر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی کہ یارسول اللہ مجھے کوئی نصیحت فرمایئے ارشاد ہوا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ اس کو یہ معمولی بات معلوم ہوئی تو اس نے دوبارہ سہ بارہ عرض کی۔ آپ نے ہر دفعہ یہی فرمایا کہ غصہ نہ کیا کرو۔ مسند احمد میں ہے کہ ان صاحب کا بیان ہے کہ پھر میں نے دل میں غور کیا تو معلوم ہوا کہ غصہ فی الواقع ساری برائیوں کے لیے بس کی گانٹھ ہے۔

مشہور صحابی حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ ایک بار آپ نے بعد نماز عصر صحابہ کو نصیحتیں فرمائیں، جن میں سے ایک یہ تھی۔ فرمایا آدم کے بیٹے کئی طبقوں میں پیدا کیے گئے ہیں ان میں کوئی ایسا ہے جس کو غصہ دیر میں آتا ہے اور سکون جلد ہو جاتا ہے اور کسی کو غصہ بھی جلد آتا ہے اور دور بھی جلد ہو جاتا ہے تو ان دونوں میں ایک بات کی دوسری بات سے اصلاح ہو جاتی ہے۔ اور کوئی ایسا ہے کہ اس کو غصہ جلد آجاتا ہے اور دفع بہت دیر میں ہوتا ہے۔ تو ہاں ان میں سب سے اچھا وہ ہے جس کو غصہ دیر میں آتے اور دور جلد ہو جاتے اور ان میں سب سے برا وہ ہے جس کو غصہ جلد آجاتا ہو اور دور بہت دیر میں ہوتا ہو۔ ہاں غصہ ابن آدم کے دل کی ایک چنگاری ہے۔ دیکھتے نہیں اس کی آنکھیں لال اور اس کی رگیں پھول جاتی ہیں تو جس کو اپنے غصہ کا احساس ہو اس کو چاہیے کہ وہ زمین سے لگ جائے۔

ابوداؤد میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہیے کہ وضو کرلے۔

حضرت ابوذر کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہے تو چاہیے کہ بیٹھ جائے اگر اس سے بھی کم نہ ہو تو چاہیے کہ لیٹ جائے۔[1]

صحیحین میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو صاحبوں میں کچھ باتیں ہوئیں۔ ان میں سے ایک صاحب کو غصہ آیا کہ چہرہ لال ہو گیا اور رگیں پھول گئیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھا اور فرمایا کہ مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ اس کو کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے اور وہ یہ ہے۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔

---

[1] صحیح بخاری۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں ایک روحانی اور دو ظاہری۔ روحانی تو وہی ہے جس کا ذکر قرآن پاک میں بھی ہے۔

" واما ینزغنک من الشیطان نزغ فاستعذ باللہ

اگر آپ کو شیطان کی جانب سے چھیڑ محسوس ہو تو فوراً اللہ کی پناہ مانگیے۔

یعنی یہ کہ غصہ چونکہ شیطان کی جانب سے ہے اس لیے جب غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہیے اور دعائی پیمانہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اعوذ باللہ بتایا ہے۔ اللہ سبحانہ اس کی دعا سنے گا اور شیطان کی اس چھیڑ سے اس کو محفوظ کر لے گا۔

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے، بیٹھا ہو تو لیٹ جائے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت ہٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا۔ دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کرلے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سُرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی اور غصہ کی گرمی دُور ہو جائے گی۔

عفو و درگزر

اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ غصہ کو پی جانا ہی بڑا کمال ہے اس پر مزید یہ کہ لوگوں کی زیادتی یا غلطیوں کو بالکل معاف کر دیتے ہیں[1] انسان کا سکون کی حالت میں معاف کر دینا آسان ہے لیکن غصہ کی حالت میں جب وہ قابو سے باہر ہو جاتا ہے معاف کرنا آسان نہیں ہے لیکن اس ارشادِ ربانی کی روشنی یہ ہے کہ ایمان کامل کی ایک پہچان یہ بھی ہے کہ جن میں یہ جوہر ہوتا ہے وہ اس حالت میں بھی اپنے آپ کو قابو میں رکھتے ہیں اور قصور والوں کو معاف کر دیتے ہیں۔ یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے اللہ سبحانہ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے۔

زیرِ تشریح آیت میں اہلِ تقویٰ کے دو وصف ہیں۔ ایک ہر حال میں انفاق یعنی خرچ کرنا دوسرے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

لوگوں کو معاف کرنا اور درگزر کرنا۔ اور ان کے لیے مغفرت اور جنت دو جزائیں رکھی ہیں۔ اس سے ادھر خیال جاتا ہے کہ ہر حال میں خدا کی راہ میں دینے کا تو معاوضہ وہ جنت ہے جس کی پہنائی آسمان و زمین ہے اور غصہ کو روکنے اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا خدا کی مغفرت ہوگی۔ انفاق یعنی تم نے یہاں سب کچھ دیا ہے جان دی ہے مال دیا ہے وقت دیا ہے غرض سب کچھ دیا ہے اس دین کے مقابلہ میں ہم وہاں جنت دیں گے اور تم نے یہاں غصہ پیا ہے اور عفو و درگزر سے کام لیا ہے اس کے بدلے میں ہم وہاں تمہیں معاف کریں گے اور درگزر سے کام لیں گے۔

عفو و درگزر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت اور قدرت کا جز شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دنائت پسندی کے مرادف ہو جاتے۔ اسی لیے اسلام نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دو جو ذلت اور پستی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ اسلام نے عفو و درگزر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی باقی رہتی ہے ارشاد ہے کہ:

برائی کا بدلہ برائی ہے۔ اس پر بھی جو معاف کر دے اور صلح کرے تو اس کا ثواب اللہ کے ذمہ ہے۔

برائی کا بدلہ برائی جماعت کا قانون ہے اور عفو و درگزر افراد کا اخلاقی کمال ہے۔ جماعتی قانون کی قوت ہوتے ہوتے افراد کا آپس میں عفو و درگزر سے کام لینا ایک مثالی بلند اخلاقی ہے۔

احسان اور نیکوکاری

۳۴۴۔ اور اللہ نیکوکار بندوں سے محبت کرتا ہے۔ یعنی نہ صرف معاف کرتے ہیں بلکہ احسان اور نیکی سے پیش آتے ہیں۔ غالباً پہلے جن لوگوں کی نسبت بددعا کرنے سے روکا تھا۔ یہاں ان کے متعلق غصہ دبانے اور عفو و درگزر سے کام لینے کی ترغیب دی ہے۔ نیز جن بعض صحابہ نے جنگ اُحد میں حکم عدولی کی تھی یا فرار اختیار کیا تھا۔ ان کی تقصیر معاف کرنے اور شان عفو احسان اختیار کرنے کی طرف متوجہ کیا گیا ہے[1]۔ اصل ارشاد میں محسنین کا لفظ آیا ہے۔ عربی میں

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔

احسان کے معنے اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقے سے کرنے کے ہیں۔ اُردو میں جن معنوں میں ہم احسان کا لفظ بولتے ہیں عربی میں جب وہ خاص معنے مراد ہوں گے تو عموماً اس کا استعمال مشتقات میں الی باب کے صلے کے ساتھ ہوگا۔ قرآن پاک میں جہاں جہاں محسن یا محسنون اور محسنین کے الفاظ بلا صلہ آتے ہیں ان سے حسب موقع احسان کرنے، اچھے کام کرنے یا کام کو اچھائی سے کرنے کے معنے لیے جائیں گے۔ اس اچھے کام کرنے یا اچھائی سے کام کرنے کی وسعت میں احسان و کرم بھی داخل ہے لیکن وہ اسی میں محدود نہیں ہے جیسے

ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین اور واللہ یحب المحسنین

بہرحال احسان ایک ایسی صفت ہے جو ہر نیکی کے کام کو محیط ہے اور اس لیے اس کی صورتیں اتنی بے شمار ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ ان تمام صورتوں کی ایک عام شکل یہ نکلتی ہے کہ دوسرے کے ساتھ ایسا ایک سلوک کرنا جس سے اس کا دل خوش ہو اور اس کو آرام پہنچے۔

رذائل اخلاق سے بچ کر رہنے کی تعلیم

۲۴۵۔ اور وہ لوگ جن کا حال یہ ہے کہ جب ان سے کوئی سخت بُرائی کی بات ہو جاتی ہے یا کسی گناہ کا ارتکاب کر کے اپنے آپ پر ظلم کر بیٹھتے ہیں۔ یعنی کھلم کھلا کوئی بے حیائی کا کام کر بیٹھیں جس کا اثر دوسروں تک متعدی ہو یا کسی اور بُری حرکت کے مرتکب ہوں جس کا ضرر ان ہی کی ذات تک محدود رہے لے

فضائلِ اخلاق بیان فرمانے کے بعد یہاں رذائل کو بیان کیا جا رہا ہے۔ رذائل دو قسم کے ہیں ایک وہ جن سے معاشرہ متاثر ہو۔ دوسرے وہ جس سے صرف کرنے والے کی ذات متاثر ہو۔ اوّل متعدی گناہ اور دوم ذاتی گناہ کہلاتے ہیں۔ متعدی رذائل کے لیے قرآن نے فاحشہ کی تعبیر اختیار کی ہے اور ذاتی گناہ کے لیے ظلمِ نفس بولا ہے۔ فاحشہ کا لفظ فحش سے بنا ہے جس کے اصلی معنے حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے لازمی معنے بُرائی کے ہیں۔ کیونکہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا بُرائی ہے یا یہ کہ جو بُرائی حد سے بڑھ جائے وہ فاحشہ کہلاتی ہے۔ قرآن پاک نے حدودِ الٰہی سے تعدی اور تجاوز کے لیے بھی

لے افادات شیخ الاسلام

فاحشہ اور فحشاء کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حدیں مقرر کی ہیں۔ اب جو ان حدود سے آگے بڑھتا ہے وہ فحشا اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اسی لیے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا گیا ہے اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش اور فحش کاری پر ہوتا ہے جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔

ظلم کا لفظ قرآن پاک میں کئی معنوں میں آیا ہے۔ ظلم کے معنے وضع الشئی فی غیر محلہ کے ہیں یعنی جو بات جس جگہ ہونی چاہیے وہاں نہ ہو بے محل ہو تو لغت میں اس حالت کو ظلم کہیں گے۔ اسی لیے قرآن نے شرک کو ظلم عظیم کہا ہے کیونکہ اس سے زیادہ کوئی بات بے محل نہیں ہو سکتی اور یہ ظاہر ہے کہ کسی چیز کا اپنی جگہ پر نہ ہونا ایک ایسی حالت ہے جو ظلم ہے اطاعت کی جگہ عصیان بھی ظلم ہے۔ اسی لیے شارحین قرآن نے ظلمِ نفس کے معنے گناہ کیے ہیں۔

اللہ سے معافی کی طلبگاری

۲۴۶۔ فوراً اللہ کی یاد ان میں جاگ اٹھتی ہے اور اس سے اپنے گناہوں کی معافی مانگتے ہیں۔ لفظ ذکر کی تعبیر اختیار کر کے اشارا کر دیا ہے کہ ان سے نافرمانیاں پورے قصد و تمرد کے بعد خباثتِ نفس کی بنا پر سرزد نہیں ہوتی ہیں بلکہ وقتی طور پر احکامِ الٰہی کا ذہول ان کے ذہن سے ہو جاتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ گاہ گاہ لغزشوں کا صادر ہوتے رہنا قرب و تعلق مع اللہ کے منافی نہیں ہے اصل اور مقدم چیز ہر غلطی کی اور کوتاہی کی تلافی اور تدارک کی فکر اور مناسب تدبیر ہے۔ صحیح اور معتبر استغفار وہی ہے جو محض زبان سے نہیں دل کی حسرت اور ندامت کے ساتھ اور اس عزم کے ساتھ ہو کر اب وہ گناہ دوبارہ نہیں ہونے پاتے گا ورنہ اگر ہاتھ میں تسبیح چل رہی ہے اور دل بدستور گناہوں سے لذت یاب ہو رہا ہے تو بزرگوں کا کہنا ہے کہ یہ استغفار خود محتاجِ استغفار ہے اور عجب نہیں کہ ایسی استغفار کا شمار استہزاء میں ہو جائے[1]

گناہوں کی بخشش کرنا اللہ ہی کا کام ہے

۲۴۷۔ اور اللہ کے سوا کون گناہ معاف کرتا ہے۔ اس فقرے کے ذریعے صرف اتنی ہی

---

[1] تفسیر ماجدی

بات نہیں بتائی جارہی ہے کہ گناہوں کی معافی صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے کسی اور کے ہاتھ میں نہیں ہے بلکہ جیسا کہ علامہ آلوسی نے محققین کی طرف نسبت کرکے لکھا ہے کہ یہ فقرہ ہمارے لیے اس کے علاوہ اور بہت سی باتوں کے لیے رہنما اصول بتا رہا ہے۔ یہ باتیں کچھ اللہ کی جانب سے ہیں اور کچھ بندے کی جانب سے، اللہ کی جانب سے ہونے والی باتوں میں جو کچھ اس فقرے کے ذریعے قرآن اپنے مخاطبوں کو سمجھانا چاہتا ہے یہ ہے کہ،

اولاً لفظ اللہ کا استعمال اور پھر فقرے کی ساخت اخباری نہیں انشائی بنا کر یہ بتانے کے لیے ہے کہ اللہ کی ذات وسیع مغفرت والی ہے گویا مخاطبوں سے پوچھا گیا ہے کیا تمہیں ایسی ذات کا علم ہے جو سب گناہوں کو معاف کرنے کی قدرت رکھتی ہے چھوٹے ہوں یا بڑے گزشتہ ہوں یا پیوستہ سوائے اس کے جس کی رحمت کی وسعتوں میں ہر چیز سمٹی ہوتی ہے۔

ثانیاً یہ کہ اس فقرے کو اپنے مقام سے ہٹا کر جملہ معترضہ بنا کر لایا گیا ہے اس سے یہ بتانا مقصود ہے کہ جب بھی استغفار کی جائے گی تو اس کے نتیجہ میں لازماً مغفرت آئے گی۔

ثالثاً یہ کہ ذنب کی جمع ذنوب پر الف لام اس مقصد کی خاطر لگایا ہے کہ گناہ خواہ کتنے ہوں جب بارگاہِ الٰہی میں مغفرت کے لیے دستِ سوال پھیلایا جائے گا سب کے لیے رحمتِ الٰہی کی جانب سے مغفرت کا پروانہ مل جائے گا۔

رابعاً جملہ کو حصر کے انداز میں پیش کرکے خبردار کیا گیا ہے کہ گنہ گاروں کے لیے پناہ اللہ کے کرم و فضل کے سوا کسی کا کوئی رحم و کرم نہیں ہے۔

خامساً گناہوں کی بخشش کی نسبت اللہ سبحانہٗ کی طرف کرکے بتایا ہے کہ استغفار کے بعد بخشش کا ہونا یقینی ہے۔

یہ باتیں تو اس فقرے میں وہ ہیں جن کا تعلق اللہ سبحانہٗ سے ہے اب وہ بھی سن لیجیے جن کا تعلق خود بندوں سے ہے۔

اولاً رحمت و مغفرت سے جملہ کا آغاز کرکے بندوں کو عظیم بشارت دی ہے۔

ثانیاً بندہ جب اس بے پایاں مہربانی اور توبہ کے لیے اس عظیم اہتمام کو دیکھے گا تو اس میں گناہوں سے مغفرت کے لیے خود بخود ایک قسم کا جوش پیدا ہوگا۔

ثالثاً سارے گناہوں کا ذکر کرکے مغفرت کے بارے میں مایوسیوں کی جڑ اکھاڑ دی اسی لیے لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کی اسی فقرہ کو علت بنا کر لاتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے ان اللہ یغفر

الذنوب جمیعاً۔

رابعاً یہ کہ گناہوں کا بلا قید ذکر فرمایا اس میں فاحشۃ اور ظلم نفس کی کوئی قید نہیں لگائی حالانکہ بات کا تقاضا یہی تھا کہ یوں کہا جاتے کہ من یفعل الفاحشۃ او یظلم نفسہ وذکر اللہ فاستغفر فیغفر اللہ یعنی جو شخص بدکاری کرے گا یا اپنے آپ پر ظلم کرے گا اور اللہ کو یاد کر کے اپنے گناہوں کی معافی مانگے گا اللہ اسے معاف کرے گا لیکن عبارت میں گناہوں کو بلا قید اس لیے لایا گیا کہ بتا دیا جائے کہ اللہ کی مغفرت عظیم سے عظیم تر ہے خواہ گناہ کتنے ہی ہوں اس کی مغفرت کے ناپیدا کنار سمندر کے سامنے بندوں کے گناہوں کی حیثیت قطرہ کی بھی نہیں۔ مشہور پیمانہ استغفار میں اسی کی طرف اشارہ ہے رب مغفرتک اوسع من ذنوبی ورحمتک ارجی عندی من عملی

دراصل خدائی صفات کمالیہ کا یہ کمال ہے کہ ہر ایک اپنی جگہ اتنی کامل ہے کہ ایک کا نظارہ دوسرے کے تصور سے غافل بنا دیتا ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات کا کمال یہ ہے کہ اس کی ہر شان ہر وقت یکساں اپنی نمود رکھتی ہے وہ عین رحمت کے حال میں غضب اور عین غضب میں رحمت و مغفرت کرتا رہتا ہے۔ ارشاد ہے۔

نبی عبادی انی انا الغفور الرحیم وان عذابی ھو العذاب الالیم

غیر محدود مغفرت و رحمت کے تصور سے انسان عاجز ہے۔ ایک ارشاد نبوت میں بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رحمت کے سو حصے کیے۔ ننانوے حصے تو اپنے لیے محفوظ رکھے ہیں۔ صرف ایک حصہ زمین والوں کو بخشا ہے یہی ایک حصہ ہے جس سے مخلوق باہم ایک دوسرے کے ساتھ رحمت کا معاملہ کرتی ہے یہاں تک کہ جانور اپنا پاؤں اپنے بچے سے ہٹا لیتا ہے اس خوف سے کہ کہیں اس پر پڑ نہ جاتے۔

سمجھانا یہ ہے کہ تمام عالم میں پھیلی ہوئی رحمت اور تنہا خدا کی اس رحمت و مغفرت میں جو یوم حساب میں بندوں کے لیے ظاہر ہوگی کیا تفاوت ہے اسی تفاوت کو ذہن نشین کرنے کے لیے ارشاد نبوت میں ایک فرضی حساب اور قرآن میں یہ انشائی پیمانہ اختیار کیا گیا ہے تاکہ فکر انسانی کو غیر محدود مغفرت اور لا متناہی رحمت کے اندازہ کرنے کا راستہ مل جاتے۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ درجات جنت سو ہیں اور جنت میں جا چونکہ بلا رحمت الٰہیہ ہو نہیں سکتا اس لیے ہر درجہ کے مقابلہ میں رحمت کا ایک جز بتا دیا گیا ہے۔

اللھم اجعلنی منھم

گناہوں پر اصرار نہ کرنا

۲۴۸ - اور جو کچھ کر چکے ہیں اس پر جان بوجھ کر اصرار نہیں کرتے۔ یعنی خدا کی عظمت و جلال اس کے عذاب و ثواب، اس کے حقوق و احکام، اس کی عدالت کی پیشی اور وعدہ و وعید کو دل سے یاد کر کے زبان سے بھی اس کی یاد شروع کر دی۔ خوفزدہ اور مضطرب ہو کر اسے پکارا۔ اس کے سامنے سر بسجود ہوئے جیسا کہ صلاۃ التوبہ کی حدیث میں آیا ہے۔ پھر جو شرعی طریقہ گناہوں کے معاف کرانے کا ہے اس کے موافق معافی اور بخشش طلب کی مثلاً اہل حقوق کے حقوق ادا کیے یا ان سے معاف کرائے اور اللہ کے سامنے توبہ و استغفار کیا اس کے حضور میں حاضر ہو گئے۔ یہ لوگ بھی دوسرے درجہ کے متقین ہیں جن کے لیے جنت تیار کی گئی ہے۔ حق تعالیٰ ان تائبین کے گناہ معاف کر کے ان کو اپنی جنت میں جگہ دے گا اور جو توبہ یا اور عمل نیک کیے ہوں گے۔ ان کا بہترین معاوضہ ملے گا[1]

جان بوجھ کر کرنے کی نہیں بلکہ اصرار نہ کرنے کی قید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ دیدہ و دانستہ گناہوں پر اصرار نہیں کرتے یہ مطلب نہیں کہ وہ جان بوجھ کر گناہ کرتے ہیں۔ اور پھر تعبیر کو زیادہ لطیف اور بلیغ بنانے کے لیے یہ بات ذکر نہیں فرمائی کہ کیا جانتے ہوئے وہ اصرار نہیں کرتے یعنی یعلمون کا مفعول ذکر نہیں کیا۔ قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ وہ گناہ کو گناہ جانتے ہوئے گناہ پر محض خوفِ خداوندی کی وجہ سے اصرار نہیں کرتے۔ یہ نہیں کہ کسل مندی یا طبعی کراہت کی بنا پر گناہ نہیں کرتے کیونکہ جزا بنیتِ طاعت اپنے آپ کو گناہ سے روکنے پر ملتی ہے صرف کسی کام کے نہ کرنے پر جزا نہیں ملتی ہے۔ ہاں نہ کرنا سزا سے ضرور مانع ہو جاتا ہے مفسر ضحاک کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ وہ جانتے ہیں کہ مغفرت اللہ ہی کی دسترس میں ہے۔ الحسین بن الفضل کہتے ہیں کہ ان کو پتہ ہے کہ ان کو بخشنے والا مولیٰ و مالک ہے۔ ایک حدیث قدسی سے جسے شیخین نے بحوالہ ابی ہریرہ روایت کیا ہے اس کی تائید ہوتی ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے کہ ایک بندہ نے گناہ کیا اور کہا کہ اے اللہ میرے گناہ کو معاف کر دے۔ اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں میرے بندے نے گناہ کیا اور یہ جانا کہ اس کا کوئی رب بھی ہے جو گناہ کو بخشتا ہے اور اس پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

گرفت کرتا ہے کچھ مدت بعد پھر وہ گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے اے رب میرا گناہ بخش دے۔ حق تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرماتا ہے میرے بندہ نے گناہ کیا اور یہ جانتا ہے کہ اس کا کوئی مالک ہے جو اسے بخشتا ہے اور اس پر مواخذہ کرتا ہے۔ پھر کچھ مدت بعد وہ گناہ کرتا ہے اور کہتا ہے کہ اے میرے رب مجھے بخش دے۔ اللہ سبحانہٗ فرماتا ہے میرے بندے نے گناہ کیا ہے اور وہ جانتا ہے کہ اس کا مولیٰ مالک ہے جو گناہوں کو بخشتا اور اس پر مواخذہ کرتا ہے تو اب جو چاہے کر میں نے تجھے بخش دیا۔

یعنی خدا کی رحمت پر اعتماد اور اس کی مغفرت پر پورا یقین رکھنے کی دھن میں اس کی بخشش کا سب سے بڑا سامان ہیں۔ حدیث انا عند ظن عبدی بی کا بھی یہی مفہوم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کا اپنے بندہ سے معاملہ اس کے اعتماد و وثوق کے مطابق ہوتا ہے۔ اگر اس کو یقین ہے کہ گناہوں پر گرفت یا چشم پوشی کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں تو اللہ تعالیٰ بھی اس کے اس حسن عقیدت کا خلاف کرنا پسند نہیں کرتا اور اس کے لیے مغفرت کا اعلان کر دیتا ہے۔ اسی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ توبہ کرنے والے بندہ مومن کو حب الٰہی کی بشارت دی ہے۔ ارشاد ہے:

اللہ سبحانہٗ اپنے اس مومن بندے سے محبت کرتا ہے جو فتنوں کی آماجگاہ بنے اور ہمیشہ توبہ کرتا ہے۔ (احمد)

جب گناہ بندے کے خمیر میں ہے تو توبہ ضرور اس کی صفت ہونی چاہیے لہٰذا اگر وہ اپنی فطرت کی بنا پر طرح طرح کے فتنوں میں گرفتار ہوتا ہے مگر ہر بار اپنی صفت توبہ و استغفار کو فراموش نہیں کرتا تو وہ اللہ سبحانہٗ کی نظروں میں کیوں نہ محبوب ہو۔ یہاں محبت اس کے تکرار جرم پر نہیں بلکہ ہر بار اس کی صفت توبہ و استغفار پر ہے۔ یہ انداز بیان اس لیے اختیار نہیں کیا گیا ہے کہ گنہگار اپنے گناہوں پر اصرار کریں بلکہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ جو نادم و شرمسار ہیں وہ دل شکستہ نہ ہوں اور اپنی اس ندامت کی بدولت عصیاں کے بعد بھی خدا تعالیٰ کی محبت کی خوشخبری سن لیں۔ ندامت پر محبت کی خوشخبری بندہ میں گناہ کی جرأت پیدا نہیں کرتی ہے بلکہ اس کی فطرت سے معصیت اور نافرمانی کا تخم جڑ سے نکال دیتی ہے۔

اعمال کی جزا

۲۴۹۔ بلاشبہ یہی لوگ ہیں کہ ان کی جزا ان کے پروردگار کے پاس یہ ہے کہ ان کو معاف

کریمے اور ایسے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ہمیشہ ان ہی باغوں میں رہیں گے۔ کیسا اچھا بدلہ ہے نیک عمل کرنے والوں کا۔ مطلب یہ ہے کہ ان اوصاف کے رکھنے والوں کو مغفرت سے نوازا جائے گا اور وہ جنت جو متقیوں کے لیے تیار کی گئی ہے اس میں ان کو داخل کیا جائے گا، باغ اور ان کے محلات کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ اب تک متقیوں کے پانچ اوصاف بیان ہوتے ہیں۔

اول یہ کہ یہ لوگ خوش حالی اور بدحالی میں اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہیں

دوم یہ کہ یہ لوگ اپنے غیظ و غضب اور غصہ پر پورا پورا قابو رکھتے ہیں۔

سوم یہ کہ یہ لوگ لوگوں کو ان کی کوتاہیوں پر معاف کرتے ہیں

چہارم یہ کہ یہ لوگ اپنے تمام کاموں میں حسن کار ہیں

پنجم یہ کہ اگر ان سے کبھی کوتاہی و نافرمانی ہو جاتی ہے تو ان میں توبہ و استغفار کی روح بیدار ہو جاتی ہے۔

ان اوصاف کے رکھنے والوں کی طرف اولٰئک سے اشارہ کیا ہے اور آخر میں نعم اجر العاملین فرما کر اشارہ کر دیا کہ یہ جزا ان کے اعمال کی ہے۔ اس لیے اے اہل ایمان تمہیں ان نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے میدانِ عمل میں مسارعت کرنی چاہیے۔ کیونکہ ایمان و عمل ہی ان مراتب تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔

آیتِ قرآنی میں صحابہ کا چہرہ

ایک زمانہ وہ تھا جب ان کے شعراء طنزاً کہتے تھے

امرت ثم بعث ثم نشر		حدیث خرافة یا ام عمر

کیا مرنا ہے پھر جینا ہے اور پھر اکٹھا ہونا ہے		اے عمر کی ماں یہ خرافات کی بات ہے۔

لیکن قرآن پاک کی تاثیر اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیض تربیت سے نہ صرف ان کا انکار اقرار سے بدل گیا بلکہ چند سال ہی کے بعد یہ طنز انکار رمز یقین سے بدل گیا اور اس وقت عرب کا شاعر یہ کہنے لگا کہ ہم آسمان تک پہنچ گئے اور خدا سے امید ہے کہ ہم اس سے بھی اونچے جائیں گے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم دریافت فرماتے ہیں کہ آسمان سے بھی بلند جگہ کیا ہے عرض کیا۔ یا رسول جنت ہے آپ فرماتے ہیں انشاء اللہ

دیکھو جن کی نظریں زمین سے اونچی نہیں جاتی ہیں۔ ان کا تخیل آسمان سے بھی اونچا جانے لگا۔

جن کو مرکر پھر جینا دور از عقل معلوم ہوتا تھا۔ جن کو آخرت کے مواخذے کا کوئی ڈر نہ تھا، جن کو اپنے اعمال کی جوابدہی کی کوئی پروا نہ تھی۔ جو جزا و سزا کے مفہوم سے بیگانہ تھے جو جنت و دوزخ کے تصور سے نا آشنا تھے وہ اس ہولناک منظر سے ڈرنے لگے۔ دوسری زندگی پر ان کو اس طرح یقین آگیا جس طرح آج کی زندگی پر ہے۔ آخرت کے مواخذے سے وہ بید کی طرح کانپنے لگے۔ اعمال کی جوابدہی سے ترساں و لرزاں رہنے لگے۔ جزا و سزا کے اندیشے سے وہ اپنے ہر عمل کی باز پرس خود کرنے لگے۔ جنت کا اشتیاق ان کو بڑی سے بڑی قربانی پر آمادہ کر دیتا آخرت کے عقیدے اور جنت کے اشتیاق نے ان میں مسارعت کی ایسی رُوح پھونک دی تھی جو بالکل خارق عادت تھی۔ ان میں جنت کا عجیب و غریب شوق اور زندگی کی تحقیر پیدا کر دی تھی۔ جنت کا نقشہ ان کی آنکھوں کے سامنے اس طرح تھا جیسے وہ آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں وہ اس طرح جنت کی طرف تیز گام تھے جیسے نامہ بر کبوتر اپنی اڑان میں کسی چیز کی پروا نہیں کرتا اور اپنی منزل پر پہنچ کر دم لیتا ہے۔

معرکہ اُحد میں جب کہ بہت سے میدان چھوڑ چکے تھے حضرت انس ابن النضر بڑھے۔ انہوں نے سعد بن معاذ کو سامنے دیکھا تو کہنے لگے اے سعد بن معاذ خدا کی قسم جنت کی خوشبو اُحد پہاڑ کے اس طرف سے آ رہی ہے۔ انس بن مالک کہتے ہیں کہ ہم نے اسی سے زیادہ زخم ان کے جسم پر پائے کچھ تلوار کے تھے، کچھ نیزے کے اور کچھ تیروں کے تھے۔ ہم نے اس حال میں دیکھا کہ مشرکین نے ان کے جسم کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا تھا جس کی وجہ سے سوائے ان کی بہن کے کسی نے ان کو انگلی کے پورسے شناخت کیا اور کوئی نہ پہچان سکا[1]

بدر میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب فرمایا سارعوا الی مغفرۃ من ربکم و جنۃ عرضھا السمٰوات والارض بڑھو اس جنت کی طرف جس کی پہنائی آسمان و زمین ہیں تو عمر بن حمام انصاری نے کہا کہ یا رسُول اللہ اس کی پہنائی آسمان و زمین ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں، کیا تم کو شک ہے کہنے لگے نہیں یا رسُول اللہ۔ میری یہ تمنا تھی کہ میں اس کو پا لیتا۔ آپ نے فرمایا ہاں پا لوگے۔ وہ چند کھجور کے دانے نکال کر کھانے لگے پھر بولے کہ اگر ان کھجوروں کے کھا لینے کا انتظار کروں گا تو بہت وقت لگ جائے گا

---

[1] بخاری و مسلم۔

پھر تمام کھجوریں پھینک دیں اور میدان میں کود پڑے اور شہادت پائی [1]
یہ اور اس قسم کے واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ صحابہ کرام اس آیت گرامی کا کیسے مصداق تھے۔ اسی مسارعت کی تلقین نے ان کو راحت کے خواب اور آرام کے بستر سے چونکا دیا تھا۔ اور ہر نیک کام اور عمدہ عمل کے لیے ان کو ہمہ تن سرگرم اور سرتاپا مصروف جدوجہد بنا دیا تھا تنہائی اور تاریکیوں میں ان کے دل اور بدن کو برائیوں سے بچا لیا تھا ان کے دماغ اور دل کے صفحات ہر وقت اللہ سبحانہ کے سامنے کھلے رہتے تھے۔

---

[1] مسلم

قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ سُنَنٌ فَسِيرُوا فِي الْأَرْضِ فَانْظُرُوا
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُكَذِّبِينَ ۝ هٰذَا بَيَانٌ لِّلنَّاسِ وَهُدًى
وَّمَوْعِظَةٌ لِّلْمُتَّقِينَ ۝ وَلَا تَهِنُوا وَلَا تَحْزَنُوا وَأَنْتُمُ الْأَعْلَوْنَ
إِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ ۝ إِنْ يَّمْسَسْكُمْ قَرْحٌ فَقَدْ مَسَّ الْقَوْمَ
قَرْحٌ مِّثْلُهُ ۚ وَتِلْكَ الْأَيَّامُ نُدَاوِلُهَا بَيْنَ النَّاسِ ۚ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ
الَّذِينَ آمَنُوا وَيَتَّخِذَ مِنْكُمْ شُهَدَاءَ ۗ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظّٰلِمِينَ ۝
وَلِيُمَحِّصَ اللّٰهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَيَمْحَقَ الْكٰفِرِينَ ۝

یقیناً تم سے پہلے دستور و قوانین رہ چکے ہیں لہٰذا دُنیا کی سیر کرو اور
دیکھو جو لوگ احکامِ حق جھٹلانے والے تھے ان کا انجام کیا ہوا[۲۵۰] ؟
یہ لوگوں کے لیے ایک بیان ہے اور اہلِ تقویٰ کے لیے ہدایت
اور موعظت ہے[۲۵۱]۔ اور نہ ہمت ہارو اور نہ غمگین ہو تم ہی سربلند
ہو بشرطیکہ تم مومن ہو۔[۲۵۲] اگر تمہیں کوئی زخم پہنچتا ہے تو اسی جیسا

لوگوں کو زخم پہلے پہنچ چکا ہے۔[۲۵۳] اور در اصل یہ ایام ہیں جن کو ہم لوگوں کے درمیان اِدھر اُدھر کرتے رہتے ہیں[۲۵۴] (اور دیکھو یہ اس لیے بھی ہوا ہے) تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے شہداء بنا دے اور اللہ ظلم کار لوگوں کو پسند نہیں کرتا[۲۵۵] (اور اس لیے ہوا) کہ جو لوگ ایمان والے ہیں ان کو تمام کمزوریوں سے پاک وصاف کر دے اور اس لیے ہوا ہے کہ منکرینِ حق کو ملیا میٹ کر دے۔[۲۵۶]

اجتماعی قوانین دائمی ہیں

اسلام کا اولین مقصد حیات یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جن سے کفر کا وجود عبارت ہے۔ دُنیا کے ہر دوسرے وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کی بقاء کا آرزومند اور کشمکش حیات میں مبتلا ہے اور اس میدان میں ایمان اس کا تنہا مد مقابل ہے۔ کیونکہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے کفر کی ضد ہے ایمان اور کفر کے درمیان مصالحت ناممکن اور ان کی لڑائی بلافصل قائم ہے۔ یہ لڑائی دُنیا کی تمام دوسری لڑائیوں پر حاوی اور ان سے مافوق ہے بلکہ اور جتنی لڑائیاں اور نزاعیں ہیں ان کا سلسلہ کہیں نہ کہیں جا کر اس لڑائی سے ضرور ملتا ہے کفر کی طاقتیں اسلام کی ترقی میں مزاحم ہوتی ہیں۔ لیکن ان کی یہ مزاحمت حق وصداقت کی سعی کمال کا سبب بن جاتی ہے جس طرح انسان کو اپنے خارجی ماحول کی مخالف قوتوں سے کشمکش کرنا پڑتی ہے اور یہی کشمکش اسے صیقل کرتی ہے جس سے بالآخر وہ اپنے ماحول پر غلبہ حاصل کرتا ہے اسی طرح اسلام بھی کفر سے نبرد آزما ہو کر اپنے قویٰ کو مضبوط اور اپنی داخلی صلاحیتوں کو اجاگر کرنا

چاہتا ہے لیکن ایمان وکفر کی اس کشمکش میں کامیابی اور فتح مندی کے کچھ قوانین وضوابط ہیں۔ ان پر عمل پیرا ہونا ضروری ہے جیسے آگ جلاتی ہے، پانی ٹھنڈک پیدا کرتا ہے۔ سنکھیا کھانے سے موت اور دودھ سے طاقت آتی ہے ٹھیک اسی طرح اجتماعی زندگی کی کامیابی کے لیے بھی کچھ معنوی قوانین ہیں۔ ان کو قرآن سنن کہہ کر پکارتا ہے یعنی قوموں کے عروج وزوال کے قوانین وضوابط، قرآن یہاں اسی کی طرف صراحۃً متوجہ کر رہا ہے اور بقول مفتی عبدہ مصری یہ بہت افسوس کی بات ہے کہ ہم نے قرآن کے بیان کردہ ان اجتماعی قوانین کو ایک فن اور علم بنا کر دوسرے علوم کی طرح مدون نہیں کیا جیسے علم کلام علم اصول اور علم الفقہ، لیکن میرا اپنا خیال یہ ہے کہ زمانہ کے اثرات اور مسلمانوں کی بے توجہی سے یہ حصہ عام احساس کے دائرے سے دور اور اہل فکر کی نظروں سے اوجھل رہا ہے ورنہ نظری حیثیت سے یہ پہلو موجود ضرور ہے اور شاید حالات، تقاضے اور ضروریات اس کو فن بنا کر پیش کر دیں۔

بہرحال یہ آیات سنن اجتماعیہ کے موضوع پر ہیں۔

قیام حق میں سنن الٰہیہ

۲۵۰۔ یقیناً تم سے پہلے دستور و قوانین ہو چکے ہیں لہٰذا دنیا کی سیر کرو اور دیکھو جو لوگ احکام جھٹلانے والے تھے ان کا انجام کیا ہوا۔ یعنی تم سے پہلے بہت قومیں اور ملتیں گزر چکی ہیں۔ بڑے بڑے واقعات پیش آ چکے۔ خدا تعالیٰ کی عادت بھی بار بار معلوم کرا دی گئی کہ ان میں سے جنہوں نے انبیاء علیہم السلام کی عداوت اور حق کی تکذیب پر کمر باندھی اور خدا و رسول کی تصدیق و طاعت سے منہ پھیر کر حرام خوری اور ظلم وعصیان پر اصرار کرتے رہے ان کا کیسا برا انجام ہوا یقین نہ ہو تو زمین میں چل پھر کر ان کی تباہی کے آثار دیکھ لو جو آج بھی تمہارے ملک کے قریب ہیں۔ ان واقعات پر غور کرنے سے معرکہ اُحد کے دونوں فریقوں کو سبق لینا چاہیے یعنی مشرکین جو پیغمبر خدا کی عداوت میں حق کو کچلنے کے لیے نکلے اپنی تھوڑی سی عارضی کامیابی پر مغرور نہ ہوں کہ ان کا آخری انجام بجز ہلاکت و بربادی کے کچھ نہیں اور مسلمان کفار کی سختیوں اور وحشیانہ دراز دستیوں یا اپنی ہنگامی حالت سے ملول و مایوس نہ ہوں کہ آخر حق غالب ہو کر رہے گا۔ قدیم سے سنۃ اللہ یہی ہے جو ٹل نہیں سکتی [1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اصل ارشاد میں لفظ سنن آیا ہے یہ سنت کی جمع ہے اور سنت طریقہ کو کہتے ہیں۔ لیکن ہر طریقہ کو نہیں بلکہ وہ طریقہ جو چل چل کر خوب روند دیا گیا ہے یا وہ سیرت جس کی پیروی کی جا رہی ہو یا وہ مثال جس کی کاپی کی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ حق و باطل کی کشمکش میں انسانی زندگی کا رشتہ قوانین وضوابط سے وابستہ ہے نہ یہ اٹکل اور تخمین ہے اور نہ جبر واستبداد ہے۔

سنن الٰہیہ کا قرآن کے دوسرے مواقع پر بھی ذکر آیا ہے۔ بدر کے واقعہ میں ہے فقد مضت سنة الاولین امتوں کے احوال کے ذکر میں ہے و قد خلت سنة الاولین اور یہ بھی قرآن ہی نے بتایا ہے کہ اللہ کی سنت تبدیل نہیں ہوتی جیسا کہ سورۃ بنی اسرائیل، سورۃ احزاب اور سورۃ فتح میں ہے۔

قرآن میں سنت کا مفہوم

قرآن میں "سنت" کا ایک خاص مفہوم ہے اور اسی اصطلاح خاص میں یہ لفظ کئی جگہ قرآن میں آیا ہے۔

خیر و شر، حق و باطل، نور و ظلمت اور ظلم و انصاف جب باہم ٹکراتے ہیں تو بالآخر اللہ سبحانہ خیر کو شر پر حق کو باطل پر اور انصاف کو ظلم پر فتح اور کامیابی عطا کرتا ہے۔ گنہگار اور مجرم قومیں جب حق کی دعوت قبول نہیں کرتیں اور پند و موعظت ان کے لیے موثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان قوموں پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے اور بالآخر وہ بجلی کی کڑک، آسمان کی گرج، زلزلے کی تھرتھراہٹ آندھی کی گڑگڑاہٹ، دریا کے طوفان، پہاڑ کی آتش فشانی یا دشمن کی تلوار سے ہلاک و برباد ہو جاتی ہیں۔ یہ سنت الٰہی ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی اور اس میں کبھی کوئی فرق نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے اسی مفہوم میں آیا ہے۔ ان آیات قرآنی کو پڑھیے

قریش حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے نکالنے کی تیاری کرتے ہیں اور دعوت نبوت کو قبول کرنے سے صاف انکار کر دیتے ہیں اللہ تعالیٰ فرماتا ہے

سنة من قد ارسلنا قبلك من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحويلا

ہم تم سے پہلے پیغمبر روانہ کر چکے ہیں ان سب کے معاملہ میں ہمارا ایسا ہی قاعدہ رہا ہے اور ہمارے قاعدوں کو کبھی تبدیل نہ دیکھو گے۔

مدینے کے منافقین اپنی شرارت سے باز نہیں آتے۔ اللہ فرماتا ہے کہ وہ جہاں پائے جائیں

پکڑ لیے جائیں اور ان کو قتل کر دیا جاتے ارشاد ہے:

سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا

یہ اللہ کا قاعدہ ہے ان لوگوں میں جو پہلے ہو چکے اور اللہ کے دستور کو بدلتے نہ پائے گا۔

حدیبیہ کے موقعہ پر کفار قریش کو تنبیہ اور اہل ایمان کو تسکین دی جاتی ہے کہ اگر یہ کافر تم سے لڑتے تو پیٹھ پھیر دیتے پھر ان کو کوئی مددگار نہ ملتا۔ ارشاد ہے،

سنۃ اللہ التی قد خلت من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا

اللہ کا یہ دستور پہلے سے چلا آتا ہے اور تم اللہ کے دستور کو بدلتے نہ پاؤ گے

بہر حال سنن سے وہ ضابطے اور قاعدے مراد ہیں جن کے تحت اللہ سبحانہ قوموں کے ساتھ معاملہ کرتا ہے۔ ایک قوم اگر اللہ کے احکام و ہدایات کی تعمیل اور اس کے روانہ کردہ رسولوں کی پیروی کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو آبرومند کرتا ہے۔

برعکس اس کے اگر کوئی قوم خدا کے احکام و قوانین کی نافرمانی اور اس کے رسولوں کی تکذیب کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اس کو تباہ کر دیتا ہے لیکن مکذبین کی اس تباہی اور مومنین کی فتح مندی کے بھی کچھ قوانین و ضوابط ہیں۔ یعنی جب حق و باطل میں کشمکش ہوتی ہے تو اہل حق کو غلبہ اس وقت ہوتا ہے جب ان میں حق کی بھرپور لگن ہونے کے ساتھ حق کے ساتھ علم و عمل میں پوری وابستگی ہو۔ اہل باطل کی ان کے اعمال میں کاپی نہ ہو اور اہل باطل سے ان کے روابط اور علائق نہ ہوں اور بالآخر میدان مقابلہ میں ان میں صبر و تقویٰ کی روح کار فرما ہو۔

زمین میں چلو اور دیکھو قوموں پر کیا بیتی ہے تاکہ تمہیں علی وجہ البصیرت پتہ لگ جائے کہ کامیابی اور ناکامی کے ضوابط کیا ہیں۔ گویا بتا دیا گیا کہ جو کچھ تمہیں پیش آ رہا ہے تو صرف تمہارے ہی لیے نہیں ہوا ہے بلکہ ہمیشہ قانون الٰہی کی ایسی ہی کار فرمائیاں رہ چکی ہیں جو جماعت احکام حق پر عمل کرتی ہے کامیاب ہوتی ہے جو اعراض کرتی ہے تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔ دنیا میں نکلو اس کے ہر گوشے میں تم دیکھو گے کہ برباد شدہ قوموں کے آثار، اجڑی ہوئی آبادی کے کھنڈرات سر بفلک محلوں کی گری ہوئی دیواریں زبان حال سے اپنا افسانہ عبرت سنا رہی ہیں[1]

---

[1] ترجمان القرآن

قوانینِ اجتماع اہلِ ایمان کے لیے ہدایت ہیں

۲۵۱ - یہ لوگوں کے لیے ایک بیان ہے اور اہلِ تقویٰ کے لیے ہدایت و موعظت ہے یعنی عام لوگوں کے کان کھول کر سننے کے لیے قرآن میں یہ مضامین بیان کیے جا رہے ہیں جن کو سن کر خدا سے ڈرنے والے ہدایت و نصیحت حاصل کرتے ہیں باقی جس کے دل میں خوفِ خدا نہ ہو وہ ناصحانہ تنبیہات سے کیا منتفع ہو سکتا ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ فتح و شکست کے قوانین ہیں تو سب کے لیے لیکن متقین کے لیے یہ رہنمائی کا کام دینے والے اور نصیحت کا پیغام ہیں۔ یعنی نتائج کا اللہ کے مقرر کردہ قوانین کے مطابق ظہور سب کے لیے حجت ہے۔ گویا اس میں مشرکین اور منافقین پر ایک طنز ہے جو یہ کہتے تھے کہ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رسول ہوتے تو اُحد میں آپ کو تکلیف نہ ہوتی۔ دندان مبارک شہید نہ ہوتا۔ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ کے قوانین سب کے لیے یکساں ہیں۔ خواہ کوئی ہو۔ جب بھی فوج اپنے قائد کی اطاعت نہیں کرے گی۔ اس کے نتائج لازماً یہی پیدا ہوں گے جو اُحد میں رونما ہوتے قتل، باہمی تنازع، اختلاف اور انتشار کا ہر جگہ حکم یہی ہے۔ اس لحاظ سے جو بات قد خلت من قبلکم سنن میں کہی گئی ہے۔ پوری انسانیت کے لیے بیان ہے لیکن اہلِ تقویٰ کے لیے بھی قوانینِ زندگی میں خصوصاً رہنما اصول ہیں اور جن احوال و ظروف کے تحت اللہ سبحانہٗ کی جانب سے یہ قواعد آئے ہیں وہ سراپا موعظت و نصیحت ہیں۔

برتری اور غلبہ اہلِ ایمان کے لیے ہے

۲۵۲ - اور نہ ہمت ہارو اور نہ غمگین ہو تم ہی سر بلند ہو بشرطیکہ مومن ہو۔ یہ آیات جنگِ اُحد کے بارے میں نازل ہوئی ہیں۔ جب مسلمان مجاہدین زخموں سے چور چور ہو رہے تھے ان کے بڑے بڑے بہادروں کی لاشیں آنکھوں کے سامنے مثلہ کی ہوئی پڑی تھیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اشقیانے مجروح کر دیا تھا اور بظاہر کامل ہزیمت کا سامان نظر آ رہا تھا۔ اس ہجوم شدائد میں خداوند قدوس کی آواز سنائی دی۔ دیکھو! سختیوں سے گھبرا کر دشمنانِ خدا کے مقابلہ میں نامردی اور سستی

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نہ آنے پاتے۔ پیش آمدہ حوادث پر غمگین ہو کر بیٹھ رہنا ایمان کا شیوہ نہیں ہے۔ یاد رکھو آج بھی تم ہی معزز اور سربلند ہو کر حق کی حمایت میں تکلیفیں اٹھا رہے ہو اور جانیں دے رہے ہو اور یقیناً آخری فتح بھی تمہاری ہے۔ انجام کار تم ہی غالب ہو کر رہو گے بشرطیکہ ایمان وایقان کے راستے پر مستقیم رہو اور حق تعالیٰ کے وعدوں پر کامل وثوق رکھتے ہوئے اطاعتِ رسول اور جہاد فی سبیل اللہ سے قدم پیچھے نہ ہٹاؤ۔ اس خدائی آرزو نے ٹوٹے ہوئے دلوں کو جوڑ دیا اور پژمردہ جسموں میں حیات تازہ پھونک دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ کفار جو بظاہر غالب آ رہے تھے زخم خوردہ مجاہدین کے جوابی حملہ کی تاب نہ لا سکے اور سر پاؤں پر رکھ کر میدان سے بھاگ گئے[1]

اصل ارشاد میں لا تھنوا آیا ہے یہ وہن سے بنا ہے۔ عمل، ارادے، کردار اور رائے کی کمزوری کو کہتے ہیں اور حزن کسی محبوب اور پسندیدہ کے گم ہونے پر قلق اور ارمان کو کہتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جنگ اور اس کے لوازم میں کمزوری کا مظاہرہ نہ کرو اور جس افتاد کا تم شکار ہو چکے ہو اس پر رنجیدہ نہ ہو جو کچھ ہونا تھا ہو چکا تھا۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار صحابہ سے فرمایا قریب ہے کہ قومیں تم پر حملہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کو اس طرح پکاریں گے جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالے پر گرتے ہیں صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا یہ اس لیے ہو گا کہ ہماری تعداد کم ہو گی فرمایا نہیں بلکہ تمہاری تعداد بہت زیادہ ہو گی لیکن تم سیلاب کے خس و خاشاک کی طرح ہو جاؤ گے۔ صحابہ نے پوچھا کہ یا رسول اللہ اس کا سبب کیا ہو گا؟ آپ نے فرمایا تمہارے اندر وہن پیدا ہو جائے گا۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ وہن کیا ہے؟ فرمایا حب الدنیا وکراھیۃ الموت دنیا کی محبت اور موت کی ناگواری۔ اس حدیث سے معلوم ہوا کہ عزم و حوصلہ اور عمل و ارادے کی وہ پستی جو دنیا اور دنیا کی زندگی کی محبت اور موت کی ناگواری سے پیدا ہوتی ہے اور انسان کو راہِ حق میں جہاد سے روکتی ہے وہ "وہن" ہے۔ یہ حدیث اس لفظ کی بہترین تشریح ہے یہاں بھی لا تھنوا سے یہی مراد ہے کہ اُحد میں جو تمہیں افتاد پیش آئی ہے اس سے مرعوب اور خوفزدہ ہو کر ہمت نہ ہارو گویا پوری بات یوں ہے لا تھنوا فیما اصابکم ولا تحزنوا علی ما فاتکم نہ اس شکست کی وجہ سے ہمت ہارو اور نہ اس نقصان کا

[1] افادات شیخ الاسلام

کوئی غم کرو۔[1]

صحابہ کا مقامِ رفیع

اگرچہ شارحینِ قرآن نے اس آیت پر بہت کچھ لکھا ہے مگر ہمیں زیادہ پسند یہ ہے کہ انتم الاعلون کا فقرہ جملہ معترضہ ہے اور آئندہ کے لیے بشارت کی خاطر لایا گیا ہے۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو پھر یہ کمزوری کیوں؟ اور ماضی پر افسوس و ملال کیوں؟ جو کچھ ہو چکا ہو چکا آئندہ تم ہی سر بلند رہو گے۔ علامہ قرطبی نے یہ بات بہت اونچی لکھی ہے کہ اسی بشارت کے نتیجے میں اُحد کے بعد حضور کے زمانے میں اور حضور کے بعد ہر اس مہم میں جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صحابی بھی شریک ہوا ہے کبھی ناکامی اور شکست نہیں ہوئی ہے۔

اس فقرے میں ہم صحابہ کرام کا چہرہ بھی دیکھ سکتے ہیں جو بات اللہ سبحانہٗ نے فرعون کے مقابلہ میں حضرت موسیٰ سے کہی تھی، انك انت الاعلیٰ وہی بات اللہ سبحانہٗ نے کفر کے مقابلہ میں صحابہ سے فرمائی ہے: وانتم الاعلون

امرِ واقعہ یہ ہے کہ صحابہ کرام کا یہ یقین کہ اللہ ان کا مددگار ہے اور ان کی کامیابی کا ذمہ دار ہے اس کا ثبوت ان کے ہر قول و فعل سے ملتا ہے۔ ان کے دلوں کا اطمینان اور خود اعتمادی انتم الاعلون کا نتیجہ تھی۔ جنگ یرموک میں جب امراء نے حضرت ابوبکر و عمر کو اپنی مشکلات کا حال لکھا۔ رومیوں کی کثرتِ تعداد اور ان کی جنگی تیاری کی اطلاع دی تو انہوں نے لکھا۔

تم سب مجتمع رہو اور ایک فوج بن کر مشرکین کا مقابلہ کرو تم اللہ کے مددگار رہو۔ اللہ اپنے مددگاروں کی مدد کرتا ہے تم کو قلت سے کوئی نقصان نہیں پہنچ سکتا۔ ہاں اگر نقصان پہنچ سکتا ہے تو اپنے گناہوں سے پس ان سے بچتے رہو۔[2]

اسی طرح جب حضرت عمر نے نہاوند کے معرکہ میں عراق جانے کا ارادہ کیا اور اپنے ساتھیوں سے مشورہ کیا تو حضرت علی نے کہا۔

اے امیر المومنین! اس معاملہ میں کامیابی اور ناکامی کا دارومدار قلت و کثرت پر نہیں ہے۔ اللہ نے اپنے دین کو غالب بنایا ہے۔ اپنی فوج کو عزت دی اور ملائکہ

---

[1] تدبر قرآن [2] البدایہ والنہایہ۔

کے ذریعے اس کی مدد کی یہاں تک کہ اسلام کو یہ قوت حاصل ہوئی۔ ہمیں خدا کے وعدے پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ وہ اپنے وعدہ کو ضرور پورا کرے گا اور اپنی فوج کی مدد کرے گا۔[1]

اسی انتم الاعلون کی بشارت کی بدولت مسلمانوں میں عجیب قسم کی بے خوفی پیدا ہوگئی تھی وہ اپنی جانوں کو خطرے میں ڈال دیتے تھے اور ایسے ایسے کام کر گزرتے تھے جو انسانی طاقت سے باہر ہیں یہ واقعہ بھی کچھ کم عجیب نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے گھوڑے دریائے دجلہ میں ڈال دیے اور اطمینان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے چلتے رہے گویا وہ دریا میں نہیں خشکی پر چل رہے ہیں۔

اس عقیدے نے مسلمانوں میں بے پناہ قوت پیدا کر دی تھی کیسے ہی ناخوشگوار اور ناموافق حالات پیش آتے ان کے عزم وارادے میں کوئی ضعف نہ آتا۔ ان کے سکون واطمینان میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ تعداد اور ساز و سامان کو وہ ہیچ سمجھنے لگے تھے مادہ اور اسباب کی پرستش سے وہ بے نیاز ہو چکے تھے ان کا عقیدہ تھا کہ ہمیں اللہ نے برتر ہونے کی بشارت دی ہے۔ اسی کی قوت سے ہم لڑتے اور اسی کی برکت سے ہم فتح پاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اس جذبہ کا بڑا احترام تھا اور اسی کو اپنی عزیز ترین متاع اور اصل قوت یقین کرتے تھے وہ جانتے تھے کہ ہمیں جو کچھ عزت حاصل ہوئی ہے وہ انتم الاعلون کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے چنانچہ جب کوئی فتح ہوتی تو وہ کہتے کہ یہ وہ ہے جس کا ہم سے اللہ نے وعدہ کیا تھا اور ان کے ایمان و طاعت میں اور اضافہ ہو جاتا۔

جنگ یرموک کے دن ابو عبیدہ کے پاس ایک شخص آیا اور اس نے کہا کہ میں شہادت کے لیے بالکل تیار ہوں اور انشاء اللہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پہنچوں گا۔ آپ کوئی پیغام دینا چاہتے ہیں تو دے دیجئے۔ انہوں نے فرمایا ہاں آپ کو میرا سلام کہنا اور عرض کرنا کہ یا رسول اللہ ہم نے اپنے خدا کا وعدہ سچا پایا۔[2]

اُحد میں افتاد اور صحابہ کو تسلی

۲۵۳ ۔ اگر تمہیں کوئی زخم پہنچتا ہے تو اسی جیسا زخم اس سے پہلے لوگوں کو پہنچ چکا ہے۔ مسلمان کو جو جنگ میں شدید نقصان اٹھانا پڑا تھا اس سے سخت شکستہ خاطر تھے۔ مزید براں منافقوں اور دشمنوں کے طعنے سن کر اور زیادہ اذیت پہنچتی تھی کیونکہ منافقین کہتے تھے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1][2] البدایہ والنہایہ

سچے نبی ہوتے تو یہ نقصانات کیوں پہنچتے ۔ یا تھوڑی دیر کے لیے بھی یہ عارضی ہزیمت کیوں پیش آئی۔ حق تعالیٰ نے ان آیات میں مسلمانوں کو تسلی دی کہ اگر اس لڑائی میں تم کو زخم پہنچا یا تکلیف اٹھانی پڑی تو اس طرح کے حوادث فریق مقابل کو پیش آ چکے ہیں ۔ اُحد میں تمہارے پچھتر آدمی شہید اور بہت سے زخمی ہوئے تو ایک سال پہلے بدر میں ان کے ستر آدمی جہنم رسید اور بہت سے زخمی ہو چکے ہیں اور خود اس لڑائی میں بھی ابتداء میں ان کے بہت آدمی مارے گئے جیسا کہ ولقد صدقکم اللہ وعدہ کے الفاظ سے ظاہر ہے ۔ پھر بدر میں ان کے ستر آدمی ذلت کے ساتھ قید ہوئے۔ تمہارے ایک فرد نے بھی یہ ذلت قبول نہ کی بہرحال اپنے نقصان کا ان کے نقصان سے مقابلہ کرو تو غم وافسوس کا کوئی موقعہ نہیں ہے نہ ان کے لیے کبر و غرور سے سر اٹھانے کی جگہ ہے [1]

اشارہ ہے جنگ بدر کی طرف مطلب یہ ہے کہ جب اس چوٹ کو کھا کر کافر پست ہمت نہیں ہوئے تو اس چوٹ پر تم کیوں ہمت ہارتے ہو [2]

دراصل سمجھانی یہ بات ہے کہ مقاصد کی راہ میں تکلیفیں اور محنتیں مومن کو بھی پیش آتی ہیں اور کافر کو بھی ۔ لیکن مومن کے لیے ان کا جھیلنا آسان ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے سامنے ایسی اُمیدیں رکھتا ہے جو کافر کو میسر نہیں وہ یقین رکھتا ہے کہ میں جو کچھ جھیل رہا ہوں حق کی راہ میں ہے۔ اور میرے لیے دنیا میں بھی کامیابی ہے اور آخرت میں بھی۔

قرح دونوں طرح آیا ہے قاف کے زبر کے ساتھ بھی اور پیش کے ساتھ بھی ، دونوں کے معنے جراحت اور زخم کے ہیں ۔ چونکہ غزوۂ اُحد میں مسلمان شہید بھی ہوئے اور زخمی بھی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زخم سے مسلمانوں کو صدمہ بھی ہوا اور بظاہر ہزیمت بھی ہوئی ۔ مطلب یہ ہے کہ تمہیں آئندہ کو ہمت ہارنے اور جو کچھ ہو چکا ہے اس پر غم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اگر ان کے ہتھیاروں نے روز اُحد تمہارے اندر جولانیاں دکھائی ہیں تو اس جیسی جولانی بدر کے دن تمہارے ہتھیار بھی دکھا چکے ہیں اس سے عبرت پکڑنی چاہیے اور آئندہ کے لیے اپنے اعمال کی نگہداشت کرنی چاہیے ۔ یہ نہ ہو کہ اس کی کوفت میں ایسے کھوئے جاؤ کہ آئندہ کے لیے ہمت ہار بیٹھو ۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام ۔ [2] تفہیم القرآن ۔

ایک اجتماعی قانون

۲۵۴ - اور در اصل یہ ایام ہیں جن کو ہم لوگوں کے درمیان ادلتے بدلتے رہتے ہیں۔ یعنی ہماری ہمیشہ یہ عادت رہی ہے کہ سختی، نرمی، دکھ سکھ، تکلیف و راحت کے دنوں کو لوگوں میں ادلتے بدلتے رہتے ہیں جس میں بہت سی حکمتیں مضمر ہیں۔ پھر جب وہ دکھ اٹھا کر باطل کی حمایت میں ہمت نہیں ہارتے تو تم حق کی حمایت میں کیوں کر ہمت ہار سکتے ہو[1]

یہ بھی آیت نمبر ۱۳۰ کی طرح ایک اہم اجتماعی قانون کی نشاندہی کر رہی ہے یعنی یہ بھی اللہ سبحانہ کا ضابطہ ہے کہ کبھی کسی کو فاتح اور کسی کو مفتوح بناتے ہیں۔ اس عالم تکوین میں کسی کے ساتھ نمایاں اور خصوصی معاملہ نہیں ہے۔ یہاں انسان اپنے اعمال کے نتائج سے بندھا ہوا ہے اور جو برائی بھی اسے پیش آتی ہے خود اسی کے اعمال کی پیداوار ہے۔ ہمارا قانون یہ ہے کہ مومن ہوں یا کافر دونوں کے سامنے یکساں طریقہ پر دنیوی نتائج کا دروازہ کھول دیا ہے۔ گزشتہ سال تم کو غلبہ ہوا تھا اب کے سال تمہارے مخالف غالب آ گئے۔ یہ تو ہمارا طریقہ ہے۔ یہ دستور نہ صرف قوموں اور جماعتوں میں رائج ہے بلکہ افراد میں بھی پایا جاتا ہے۔ کبھی کوئی سربلند ہوتا ہے کبھی کوئی کبھی کوئی خاندان آبرومند ہوتا ہے اور کبھی کوئی۔ کبھی کوئی قوم برسرِ اقتدار ہوتی ہے اور کبھی کوئی۔ یاد رہے آیت میں الناس کا لفظ جماعت قوم یا گروہ کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ افراد پر اس کا اطلاق نہیں ہوتا۔ اس فقرے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ حق و باطل کی کشمکش میں اس عالم دنیا میں اعمال و اسباب کے مطابق نتائج پیدا کرتا ہے اور شکست و فتح کے اسباب عام انسانوں میں یکساں رکھتا ہے۔ ہرقل بادشاہ روم نے جب ابوسفیان سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق طویل سوالات کیے تو ان میں ایک سوال آپ کی فتح و شکست کے متعلق بھی تھا۔ پھر جب اس کو یہ معلوم ہو گیا کہ آپ کو شکست بھی ہوتی ہے تو وہ بے ساختہ بول پڑا کہ رسولوں کی شان یہی ہے وہ شکست بھی کھاتے ہیں مگر آخر کار بول بالا انہی کا ہوتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر اُحد کے میدان میں اللہ کی یہ سنت بھی پوری ہو گئی اور اس دردانگیز منظر کے ساتھ پوری ہوئی کہ روئے انور زخمی ہے۔ دندان مبارک شہید ہے اور سر مبارک کا خود چکنا چور ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کیا اب بھی اس شبہ کا کوئی موقعہ ہے۔ کہ رسول بشر نہیں ہوتے۔ اللہ کی فتح و شکست میں جو سنت نہیں جانتے ان کو اگر تردد ہو تو ہو مگر اس سے جو واقف تھے ان میں بادشاہ ہرقل جیسے دانا نے تو آپ کی شکست ہی کو صداقت کی علامات میں شمار کر لیا۔[1]

اللہ کا قانون آزمائش

۲۵۵- (اور دیکھو یہ اس لیے ہوا ہے) تاکہ اللہ ایمان والوں کو جان لے اور تم میں سے شہداء بنا دے اور اللہ ظلم کار لوگوں کو پسند نہیں کرتا یعنی سچے ایمان والوں کو منافقوں سے الگ کر کے دونوں کا رنگ صاف صاف اور جدا جدا نظر آنے لگے۔ اور ظالمین سے مراد اگر مشرکین ہیں جو اُحد میں فریق مقابل تھے تو یہ مطلب ہے کہ ان کی عارضی کامیابی کا سبب یہ نہیں کہ خدا ان سے محبت کرتا ہے بلکہ دوسرے اسباب ہیں اور منافقین مراد ہوں جو عین موقعہ پر مسلمانوں سے الگ ہو گئے تو بتلا دیا کہ وہ خدا کے نزدیک مبغوض تھے اس لیے ایمان و شہادت کے مقام سے انہیں دُور پھینک دیا۔[2]

اس فقرے کا واو عطف کے ذریعے آغاز بتا رہا ہے کہ یہاں معطوف محذوف ہے اسے ہم نے ترجمہ میں ظاہر کر دیا ہے۔ شارحین قرآن نے یہاں معطوف علیہ اپنے اپنے مذاق کے مطابق مقرر کیا ہے۔ کسی نے بتایا ہے کہ ہم نے یہ کام اس لیے کیا ہے تاکہ زمانے کے اولنے بدلنے کی ہماری سنت کو نفاذ کا موقعہ مل جاتے اور معلوم ہو جاتے کہ مومن کون ہے اور منافق کون۔ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ اصل میں بات یوں تھی کہ ہم زمانے کو انسانوں میں بہت حکمتوں اور مصلحتوں کی خاطر اولتے بدلتے رہتے ہیں اور اس لیے کہ پتہ لگ جاتے کہ اہل ایمان خود جادۂ ایمان پر دوسروں کے مقابلہ میں کیسے ممتاز ہیں۔ ہمارے نزدیک پہلے میں قانون اجتماعی بیان کرنے کے بعد اس آیت میں قانون ابتلا بیان کیا جا رہا ہے۔ اور یہ اس کی تمہید ہے۔ اصل عبارت یوں تھی کہ اللہ نے اُحد میں یہ حالات اس لیے رونما کیے ہیں تاکہ اللہ تم کو آزمائے اور تاکہ جان لے کہ ایمان والے کون ہیں اور تاکہ تم میں سے شہداء بنا دے۔ ظاہر بات ہے کہ ادعائے ایمان کی اگر صداقت معلوم کی جا سکتی ہے تو صرف ایک طریقے سے اور وہ ہے ایمان کے تقاضوں پر عمل کرنے کا

[1] ترجمان السنۃ [2] افادات شیخ الاسلام

جائزہ۔ کسی چھپی ہوئی اور ان دیکھی حقیقت کا وجود اسی وقت تسلیم کیا جاسکتا ہے جب اس کے لوازم کا مشاہدہ ہو جاتے۔ یہی لوازم اور مقتضیات وہ معیار ہیں جن پر کسی شے کے واقعی وجود کو جانچا اور پرکھا جاسکتا ہے اور پھر اس کے ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ کیا جاسکتا ہے۔

یوں تو دنیا کا کوئی مقصد نہیں جو بغیر کسی جدوجہد کے محض زبانی دعوے سے پورا ہو جائے مگر وہ مقصد جو اپنی عظمت میں آپ ہی نظیر ہو اس کے لیے سعی و جہد کی کوئی معمولی مقدار ہرگز کافی نہیں ہو سکتی۔ اللہ پر ایمان، اس کی بندگی، اس کے دین کی پیروی اور پھر اس کی اقامت کا مقصد وہ مقصد ہے جس کے لیے بڑی ہی سخت عزیمت کی ضرورت ہے۔ آپ کوئی مقصد لے کر اُٹھیں، راہ میں کہیں نہ کہیں روکاوٹیں ضرور پیش آئیں گی لیکن یہ مقصود گراں تو ایسا ہے جس کی راہ میں دُور دُور تک پہاڑی چٹانوں، گہرے غاروں، سنگلاخ وادیوں کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔

یعنی بات صرف اتنی نہیں ہے کہ اس عالم کے دستور کے مطابق جس طرح اور مقاصد کا حصول کم و بیش کچھ نہ کچھ قربانیوں پر موقوف ہے اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں بلکہ قرآن کہتا ہے کہ یہاں عام دستور سے بھی زیادہ کہیں زیادہ مشکلیں برداشت کرنی ہوتی ہیں۔ تحویل قبلہ کے موقع پر بھی ایسی ہی تعبیر آئی تھی لنعلم من یتبع الرسول ممن ینقلب علی عقبیہ تاکہ ہم جان لیں کہ کون رسول کی سچی پیروی کرتا ہے اور کون اوعائے پیروی میں خام کار ہے۔ گویا صداقت ایمانی کی جانچ اللہ سبحانہ کی نگاہوں میں اتنی اہمیت رکھتی ہے کہ اس کے لیے اصل قبلہ کے اعلان کو بھی ایک عرصہ تک ملتوی رکھا۔ مطلب یہ ہے کہ اُحد میں یہ حالات اس لیے رونما ہوئے ہیں تاکہ تمہارا ایمان و اخلاص کھل کر سامنے آجاتے اور دوسری حکمت یہ ہے کہ اللہ تم میں سے شہداء بنائے۔ اصل الفاظ ہیں ویتخذ منکم شھداء اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ تم میں سے کچھ شہید لینا چاہتا تھا یعنی کچھ لوگوں کو شہادت کی عزت بخشنا چاہتا تھا اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان اور منافقین کے مخلوط گروہ میں سے ان لوگوں کو چھانٹ لینا چاہتا تھا جو فی الواقع شہداء علی الناس ہیں۔ یعنی اس منصب جلیل کے اہل ہیں جس پر ہم نے اُمت مسلمہ کو سرفراز کیا ہے۔[1] قرآن کا سیاق تو بادی النظر میں اسی کو چاہتا ہے کہ پہلے معنے مراد ہوں۔ لیکن اصل موضوع کا تقاضا بھی ہے کہ دوسرے معنے مراد ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کی بنیاد پر

---

[1] تفہیم القرآن

اہلِ ایمان کو اُمت وسط، خیر اُمت بنایا گیا ہے اور جس مخصوص ذمہ داری کی خاطر اہلِ ایمان مجتبیٰ اور مصطفیٰ بنائے گئے ہیں۔ احد کی گرمی کے ذریعے اللہ سبحانہٗ اس مقصدِ عظیم کے لیے اہلِ ایمان کو تیار کرنا چاہتا ہے۔ اس بھٹی سے نکلنے کے بعد اہلِ ایمان شہادت علی الناس کی ذمہ داری پوری کر سکیں گے اور آخر میں فرمایا ہے کہ اللہ ظلم کار لوگوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ یہ ایک شبہ کو دور کرنے کے لیے جملہ معترضہ لاتے ہیں کہ یہ نہ سمجھ لینا کہ ظالموں کے ساتھ ہماری کوئی ہمدردی ہے یا ہم کافروں اور مشرکوں کو پسند کرتے ہیں، ہماری پسندیدہ چیز تو ایمان وطاعت اور صبر واستقلال ہے۔ یہ باتیں جس میں ہوں گی وہ ہمارا محبوب ہے۔ کافر ومشرک میں یہ باتیں کہاں ہیں جو وہ ہمارے محبوب اور پسندیدہ ہوں گے اور نہ یہ فتح وشکست پر موقوف ہے کہ کوئی یہ سمجھ لے کہ جس کی فتح ہوئی وہی خدا کا دوست ہے اور جس کی شکست ہوئی وہ خدا مبغوض ہے۔ فتح وشکست تو جنگ کے لازمی نتائج ہیں ان سے محبت نہیں جانچی جاتی ہے۔

ایمان کا نکھار اور کفر کا خاتمہ

۲۵۶۔ اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ جو ایمان والے ہیں اللہ ان کو تمام کمزوریوں سے پاک و صاف کر دے اور اس لیے ہوا کہ اللہ منکرین حق کو ملیامیٹ کر دے یعنی فتح وشکست تو بدلتی چیز ہے مسلمانوں کو مقام شہادت عطا کرنا تھا۔ مومن ومنافق کا پرکھنا، مسلمانوں کو سدھارنا یا گناہوں سے پاک کرنا اور کافروں کو آہستہ آہستہ مٹا دینا منظور تھا کہ جب وہ اپنے عارضی غلبہ اور وقتی کامیابی پر مسرور ومغرور ہو کر کفر وطغیان میں بیش از بیش غلو کریں گے۔ خدا کے قہر وغضب کے اور زیادہ مستحق ہوں گے۔ اس واسطے یہ عارضی ہزیمت مسلمانوں کی ہوئی ورنہ اللہ کافروں سے راضی نہیں ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ ہم چاہتے ہیں کہ اہلِ ایمان کے اعمال واخلاق کو نکھار دیں اور ان سے میل وکچیل کو صاف کر دیں۔ تمحیص کے معنے ہیں نکھارنا۔ جس طرح سونے چاندی کو گلا کر ان کا میل کچیل صاف کرتے ہیں۔ اسی طرح ہمارا مقصد یہ تھا کہ تم کو مصائب وشدائد میں مبتلا کر کے ہر قسم کے میل و کچیل سے صاف کر دیں اور تمہارے اخلاق واعمال کو نکھار دیں۔ اور آخری بات یہ فرمائی کہ اس

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

طرح ہم کافروں کو آہستہ آہستہ مٹا دیں۔ محق کے معنے تھوڑا تھوڑا کسی چیز کو کم کر دینا جس طرح چاند کا نور آہستہ آہستہ روز بروز کم ہوتا رہتا ہے اور آخر ایک دن سب نور ختم ہو جاتا ہے اسی طرح ہماری حکمت یہ ہے کہ آہستہ آہستہ کر کے کافروں کی قوت ختم کر دیں۔ اگر ہر سال تمہارا ہی غلبہ رہے تو کفر مقابلے کے لیے تیار نہ ہوگا۔ اور اگر کبھی تم بھی مغلوب ہو جاؤ گے تو پھر ان کا حوصلہ بڑھ جائے گا اور وہ تم سے لڑنے کو آئیں گے اور اس طرح ہم ان کا آہستہ آہستہ زور توڑ دیں گے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں۔

> یعنی فتح و شکست بدلتی چیز ہے اور مسلمانوں کو شہادت کا درجہ ملنا تھا اور مومن و منافق کا پرکھنا منظور تھا اور مسلمانوں کو سدھارنا اس واسطے اتنی شکست ہوئی ورنہ اللہ تو کافروں سے راضی نہیں ہے۔

سبحان اللہ حضرت شاہ صاحب نے کس قدر مختصر اور جامع خلاصہ بیان کیا ہے۔ یہ حضرت شاہ صاحب ہی کا کمال ہے کہ یعلم کا ترجمہ پرکھنا اور یمحص کا ترجمہ سدھارنا کیا ہے۔ بھلا اس اردو کا جواب کیا ہو سکتا ہے۔

أَمْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَعْلَمِ اللّٰهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا
مِنْكُمْ وَيَعْلَمَ الصّٰبِرِينَ ۝ وَلَقَدْ كُنْتُمْ تَمَنَّوْنَ الْمَوْتَ
مِنْ قَبْلِ أَنْ تَلْقَوْهُ فَقَدْ رَأَيْتُمُوهُ وَأَنْتُمْ تَنْظُرُونَ ۝ ع ۱۳

کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ ابھی اللہ نے تم میں سے ان لوگوں کو ممتاز نہیں کیا جو جہاد کرنے والے ہیں۔ اور نہ ان لوگوں کو نمایاں کیا ہے جو صبر کرنے والے ہیں[۲۵۷]۔ اور بلاشبہ تم تو موت کی ملاقات سے پہلے ہی راہ حق میں مرنے کی تمنائیں کرتے تھے۔ بلاشبہ موت تمہاری آنکھوں کے سامنے تھی اور تم دیکھ رہے تھے[۲۵۸]۔

ایمان باللہ کا حقیقی امتحان

زمانۂ نبوت میں جن لوگوں نے ایمان قبول کیا تھا اور جس پر انہوں نے اپنی زندگی کی بنیادیں استوار کی تھیں وہ ایک جاندار انقلاب انگیز اور متحرک نظام فکر و عمل تھا جس کا خمیر جہاد و صبر کی ولولہ انگیزیوں اور جنون نوازیوں سے تیار ہوا تھا جس میں ایثار و قربانی کی ایک دنیا آباد تھی اور جس میں افراد

کی شخصی نجات کا نہیں بلکہ عالم انسانیت کی نجات کا تصور اور جذبہ کارفرما تھا۔ جہاد فی سبیل اللہ ان کے اخلاص و اتقاء کا پیمانہ تھا۔ اسلامی نصب العین کی ترقی اور اسلامی نظام تمدن اور طرز فکر کی تبلیغ ان کی زندگی کا اتنا عظیم سرمایہ تھا کہ اگر کبھی ان سے اس کام میں کوتاہی ہو جاتی تو ساری ریاضتیں اور محنتیں ان کی نگاہ میں بیکار ہو جاتیں۔

ذرا غور فرمائیے یہ مخاطبت کن لوگوں سے کی جارہی ہے ان سے جن کی نمازیں اور عبادتیں بحر خلوص وللہیت سے معمور تھیں۔ جن کے اعمال صالحہ اور فضائل اخلاق دنیا کی ساری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ جن کے درجات اور علو مرتبت پر خود قرآن گواہی دے رہا ہے اس کے باوجود ان سے کہا جارہا ہے ام حسبتم ان تدخلوا الجنۃ کہ جنت میں داخلہ کے لیے صرف ایمان کا دعویٰ نہیں بلکہ اس کے لوازم جہاد اور صبر کا ہونا ضروری ہے آج جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں کہ ہمارا دعویٰ ایمان، اسلامی نام، نبی کا اُمتی ہونا اور مسلمان ہونا اخروی نجات و فلاح کے لیے کافی ہے انہیں غور کرنا چاہیے کہ جب صحابہ کرام سے قرآن داخلہ جنت کے لیے جہاد کا مطالبہ کر رہا ہے تو ہم لوگ کس شمار و قطار میں ہیں جب کہ ہم خدا کے دین کو بلند کرنے اور اسلام کو دنیا پر غالب کرنے کے لیے ادنیٰ ترین قربانی دینے پر بھی تیار نہیں ہیں یہاں تک کہ ہمارے قلوب بھی اس تمنا اور آرزو سے خالی ہو چکے ہیں کہ خدا کی زمین پر اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کے عطا کیے ہوئے قانون سعادت اور ضابطہ حیات کا بول بالا ہو ایمان باللہ کا حقیقی امتحان صرف جہاد میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے۔ اپنے ایمان کا امتحان کرنا چاہتے ہو تو قرآن کے اس سوال کا جواب سوچو۔

۲۵۷۔ کیا تم نے یہ سمجھ لیا ہے کہ تم یوں ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ اللہ نے ابھی تم میں سے ان لوگوں کو ممتاز نہیں کیا جو جہاد کرنے والے ہیں اور نہ ان لوگوں کو نمایاں کیا ہے جو صبر کرنے والے ہیں۔ یعنی جنت کے جن اعلیٰ مقامات اور بلند درجات پر خدا تم کو پہنچانا چاہتا ہے کیا تم سمجھتے ہو کہ بس یوں ہی آرام سے تم پہنچ جاؤ گے۔ اور خدا تمہارا امتحان نے کر یہ نہ دیکھے گا کہ تم میں کتنے خدا کی راہ میں لڑنے والے اور کتنے لڑائی کے وقت میں ثابت قدم رہنے والے ہیں ایسا خیال نہ کرنا مقامات عالیہ پر وہ ہی لوگ فائز کیے جاتے ہیں جو خدا کے راستہ میں ہر قسم کی سختیاں جھیلنے اور قربانیاں پیش کرنے کے لیے تیار ہوں۔

یہ رتبہ بلند ملا جس کو مل گیا ہر مدعی کے واسطے دار و رسن کہاں [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ کیا تمہارا یہ خیال ہے کہ محض مسلمان ہونے کی بنا پر بغیر جہاد کیے اور بغیر تکلیف اُٹھائے ہی جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔ خوب جان لو کہ جب تک حق تعالیٰ تمہارا امتحان لے کر مجاہدین کو غیر مجاہدین سے اور صابرین کو غیر صابرین سے لوگوں کی نظر میں واضح طور پر جُدا اور ممتاز نہ کر دے گا۔ اس وقت تک درجاتِ عالیہ کی تمنا ایک خیال خام ہے۔ [1]

راہِ حق میں آزمائشیں ناگزیر ہیں

اُحد کی شکست سے جو لوگ بددل ہوئے تھے ان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تمہارا یہ گمان تھا کہ حق کی راہ خطرات اور آزمائشوں سے خالی ہے اور تم اسلام کا دعویٰ کر کے ایک ٹھنڈی سڑک سے سیدھے جنت میں داخل ہو جاؤ گے تو یہ تمہارا خیال غلط ہے۔ خدا کی جنت میں کوئی شخص اس وقت تک داخل نہیں ہو سکتا جب تک امتحان سے یہ متعین نہ ہو جائے کہ یہ اللہ کی راہ میں جہاد کا ولولہ رکھتا ہے یا نہیں اور حق کے لیے آزمائشوں کی تاب لا سکتا ہے یا نہیں چنانچہ اسی چیز کی آزمائش کے لیے یہ اُحد کی آزمائش پیش آئی۔ [2]

اس حق کی خاطر جو نبوت کی راہ سے آیا ہے اور جسے اپنایا اور قبول کیا گیا ہے عیش و آرام، اہل و عیال اور جان و مال ہر چیز کو قربان کر دینا جہاد ہے۔

یہ دُنیا خیر و شر دونوں کا مسکن ہے۔ یہاں بھلائی کی بھی طاقتیں موجود ہیں اور بُرائی کی بھی۔ اور دونوں کو اپنے طور پر کام کرنے کی پوری آزادی ملی ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں اور ایک دوسرے کو زیر کر لینے کے لیے برابر جان لگاتی رہتی ہیں اس لیے یہ ایک فطری سی بات ہے کہ اسلام کی راہ اگر روکی جائے تو اس کے لیے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان رکاوٹوں کے بارے میں اہلِ ایمان کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟

قرآن اس سوال کے جواب میں ہدایت دیتا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی جائے مسلسل کی جائے اور آخر تک کی جائے۔ اسی کوشش کو قرآن کی زبان میں جہاد کہتے ہیں۔ جہاد کے لفظی معنے یہ ہیں کہ کسی کام کے لیے اپنی کوششیں صرف کر ڈالی جائیں اور مقصد تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری طاقت نچوڑ دی جائے۔ اس لیے اللہ کی راہ میں جہاد

---

[1] معارف م [2] تدبر قرآن

کرنے کا مفہوم یہ ہوا کہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر اس کے دین کی پیروی اور شہادت کا حق ادا کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالا جاتے جو بس میں ہو۔

ظاہر بات ہے کہ کسی مقصد کے لیے جو جدوجہد کی جاتی ہے اس کا حالات سے گہرا تعلق ہوتا ہے جیسے حالات ہوتے ہیں انہی کی مناسبت سے جدوجہد کی شکلیں بھی اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ موقع پرستی نہیں ہے بلکہ عین اصول پسندی ہے کیونکہ کوئی جدوجہد محض جدوجہد کی خاطر نہیں ہوتی بلکہ کسی مقصد کی خاطر ہوتی ہے اور کسی مقصد کی واقعی خدمت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کے لیے جدوجہد کا طریقہ وقت اور ماحول کو سامنے رکھ کر مقرر کیا گیا ہو اس لیے جہاد فی سبیل اللہ کی شکل کب اور کیا ہو اس کا تعین حالات ہی کرتے ہیں۔ اسلام نے اصولی طور پر مختلف حالات کے لیے اس کی جو مختلف قسمیں مقرر کر دی ہیں وہ تین ہیں۔ داخلی جہاد، دعوتی اور فکری جہاد اور مسلح جہاد۔ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کی صورت میں داخلی جہاد کا ذکر کیا گیا ہے اور دعوت الی الخیر کے عنوان سے دعوتی اور فکری جہاد کا تذکرہ ہوا اب اُحد کے موضوع پر مسلح جہاد کا ذکر ہو رہا ہے۔ جہاد خواہ کوئی ہو جب عزم و ہمت کے ساتھ میدان میں اتر جائے تو بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی کے مظاہرے کا نام صبر ہے۔ قرآن نے لفظ صبر کو اس معنے میں بارہا استعمال کیا ہے اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف کے حامل بنتے صادق القول اور راست باز ٹھہرایا ہے کہ انہوں نے اللہ سے جو وعدہ کیا تھا سچا کر دکھایا۔ اگر مسلح جہاد آن پڑے تو قرآن نے اس میں کامیابی کی چار شرطیں بتاتی ہیں۔ خدا کی یاد، اللہ و رسول کی طاعت، باہم اتحاد اور میدان جنگ میں بہادرانہ صبر و استقامت۔

> اے ایمان والو جب حملہ آوروں کی کسی جماعت سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو لڑائی میں ثابت قدم رہو اور زیادہ سے زیادہ اللہ کو یاد کرو تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ اور اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانو اور آپس میں جھگڑا نہ کرو۔ ایسا کرو گے تو تمہاری طاقت سست پڑ جاتے گی اور صبر کرو اللہ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے
>
> (پارہ ۱۰ سورہ ۸ آیت ۴۵، ۴۶)

حق کے مددگاروں کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گزرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو شکست دے دی ہے۔ قرآن نے یہ نکتہ اپنے ماننے والوں کو اسی وقت بتا

دیا تھا جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی بڑی تھی۔ تاریخِ اسلام میں مجاہدینِ اسلام کے سنہری کارنامے اس کا واضح اور بین ثبوت ہیں۔

غزوۂ بدر میں صرف ۳۱۳ جاں نثاروں کی بے مثال بہادری اور صابرانہ مقابلہ میں ایک ہزار مسلح آہن پوش فوج کو ذلت آمیز شکست ہوئی۔ ۷۰ کافر مارے گئے اور ۷۰ قیدی بنا لیے گئے اور باقی میدان چھوڑ کر بھاگ گئے۔

جنگ خندق میں تین ہزار مسلمان تھے اور مقابلہ میں چوبیس ہزار سے زیادہ تھے۔ کفر کی فوجوں کا تلاطم خیز سمندر تھا۔ لیکن اہلِ ایمان کے صابرانہ مقابلہ اور اللہ کی غیبی امداد و تائید نے بالآخر کافروں کو بھاگنے پر مجبور کر دیا اور وہ تقریباً ایک ماہ تک مدینہ منورہ کا محاصرہ رکھنے کے باوجود بے نیل مرام واپس چلے گئے۔

خیبر کی لڑائی میں سولہ سو بلکہ صحیح روایت کے مطابق پندرہ سو مجاہدینِ اسلام کا مقابلہ بیس ہزار یہودیوں سے ہوا اور چند روز کی صبر آزما لڑائی کے بعد خیبر کا سارا علاقہ فتح ہو گیا اور یہودیوں نے ہتھیار ڈال دیے۔ اس لڑائی میں صرف بیس مسلمان شہید ہوئے اور ترانوے یہودی مارے گئے۔

جنگ قادسیہ میں تیس ہزار سے زیادہ مسلمان تھے اور ان کے مقابلہ میں ایک لاکھ بیس ہزار ایرانی تھے اس جنگ میں اللہ تعالیٰ نے کامیابی اہلِ ایمان کو عطا فرمائی۔

جنگ یرموک میں بتیس ہزار مسلمان تھے اور مقابلہ میں دو لاکھ رومی تھے لیکن یہ میدان بھی اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو دیا اور کافروں کو شکست فاش ہوئی۔

جنگ ہسپانیہ میں بارہ ہزار مسلمان تھے اور مقابلہ میں ایک لاکھ فوج تھی مگر کامیابی مسلمانوں کو ہوئی۔

فاتح مصر حضرت عمرو بن العاص نے امیر المومنین عمر سے ایک فوجی مہم کے لیے تین ہزار کی کمک طلب کی۔ حضرت عمر نے تین حضرات روانہ کیے اور فرمایا کہ یہ تین ہزار ہیں۔ ان حضرات کے نام یہ ہیں حضرت خارجہ ابن حذافہ، حضرت زبیر بن العوام اور حضرت مقداد بن الاسود رسول السلام کی خلافت راشدہ ہی کے دور میں ایک معرکہ میں غالباً جنگ یرموک کے کسی محاذ پر صرف ساٹھ مسلمانوں کا ساٹھ ہزار سے مقابلہ ہوا لیکن فتح مسلمانوں کو نصیب ہوئی۔ کافروں نے شکست کھائی اور پیٹھ دکھا کر بھاگ نکلے۔ جنگ ختم ہونے پر جب لاشیں شمار کی گئیں تو معلوم ہوا کہ صرف ۱۰ لاشیں مسلمانوں کی ہیں اور دس ہزار لاشیں بیگانوں کی ہیں۔ اس شعر میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

عندی ستون لھم ستون الفاً

و مع ھذا تولوا مدبرینا

بہرحال مطلب یہ ہے کہ جہاد پوری طرح ہو اور اس جہاد میں مصائب اور تکالیف کو برابر برداشت کیا جائے ورنہ چھوٹی موٹی جھڑپیں ہوتی رہتی ہیں۔ یعلم کا مطلب وہی ہے جو پہلے بتایا جا چکا ہے۔ دوسرے پارے میں اس کی تفصیل حضرت شیخ الہند کی زبانی سُن چکے ہو نہ جاننے سے مراد شئی کی نفی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ کے علم کا تعلق معلومات سے ہوتا ہے جب علم کی نفی فرمادی تو معلومات جو علم کا متعلق ہیں ان کی نفی خود بخود ہو گئی جیسے بولتے ہیں ما علم اللہ فیہ خیرا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فلاں شخص میں خیر نہیں ہے اگر ہوتی تو علم الٰہی میں ہوتی۔ یہاں بھی مطلب ہے کہ نہ تم میں سے کسی نے اب تک جم کر جہاد کیا اور نہ جہاد کے مصائب پر صبر کیا اگر کوئی ایسا کرتا تو اللہ تعالیٰ کے علم کا اس سے تعلق ہوتا اور وہ اس کی معلومات میں سے ہوتا۔

دوسری صورت وہ ہے جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ابھی جہاد کرنے والوں کو جہاد نہ کرنے والوں سے ممتاز نہیں فرمایا نہ صابرین کو غیر صابرین سے نمایاں کیا ہے۔

راہِ حق میں مرنے کی تمنائیں کرنا

۱۴۳ ۔ اور بلاشبہ تم تو موت کی ملاقات سے پہلے ہی راہِ حق میں مرنے کی تمنائیں کرتے تھے۔ بلاشبہ موت تمہاری آنکھوں کے سامنے تھی اور تم دیکھ رہے تھے۔ جو صحابہ بدر کی شرکت سے محروم رہ گئے تھے۔ شہدائے بدر کے فضائل سُن سُن کر تمنائیں کرتے کہ خدا ہم کو کوئی موقع لائے جو ہم بھی خدا کی راہ میں مارے جائیں اور شہادت کے مراتب حاصل کریں۔ انہی حضرات نے اُحد میں یہ مشورہ دیا تھا کہ مدینہ سے باہر نکل کر لڑنا چاہیے۔ ان کو فرمایا کہ جس چیز کی پہلے تمنا رکھتے تھے وہ تمہاری آنکھوں کے سامنے آچکی ہے۔ اب آگے بڑھنے کے بجائے پیچھے ہٹنا کیسا؟ حدیث میں ہے کہ لقائے عدو کی تمنا نہ کرو اور جب ایسا موقع درپیش آجائے تو ثابت قدم رہو۔[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ کچھ مسلمان شہدائے بدر کے فضائل سن کر شہادت کی تمنائیں کرنے لگے کہ کاش ہمیں بھی ایسا کوئی موقعہ مل جائے اور ہم بھی شہادت کا درجہ پائیں اور ان فضائل کو حاصل کریں جو شہدائے بدر کو حاصل ہوتے تھے ان کو اس آیت میں تنبیہ ہے کہ یا تو شوق شہادت کا یہ عالم تھا اور یا اب یہ حالت ہے کہ جب شہادت کا موقعہ آیا اور شہادت کا سامان نظر آیا اور مرنے اور جان دینے کا وقت آیا تو میدان چھوڑ نکلے۔

تمنائے شہادت

آیت میں تمنائے شہادت پر نکیر نہیں بلکہ اس کے موقع سے فائدہ نہ اٹھانے پر نکیر ہے۔ شہادت کی تمنا تو خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

میری چاہت اور مرضی یہ ہے کہ اللہ کے راستہ میں قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں، پھر قتل کیا جاؤں پھر زندہ کیا جاؤں پھر قتل کیا جاؤں۔

خدا کی راہ میں جان دینے کی آرزو سب آرزوؤں سے بالا ہے۔ جب ہجرت کے دوسرے سال ماہ رمضان میں حق و باطل اور اسلام و کفر کے پہلے معرکہ جنگ بدر کی تیاری ہوئی تو جلیل القدر صحابی حضرت سعد بن ابی وقاص کے کمسن بھائی عمیر بن ابی وقاص کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے واپس کرنا چاہا کہ یہ کمسنی میں دشمن سے کیا مقابلہ کرے گا لیکن حضرت عمیر رو پڑے۔ آپ نے ان کا یہ جذبہ اور تڑپ دیکھ کر انہیں اجازت مرحمت فرمادی اور خود اپنے دست مبارک سے ان کے گلے میں تلوار لٹکائی۔ (مستدرک حاکم)

اسی جنگ بدر کے موقع پر حضرت سعد بن خیثمہ کا یہ واقعہ منقول ہے کہ جب حضرت سعد اور ان کے والد حضرت خیثمہ دونوں جنگ بدر میں شرکت پر مصر ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم میں سے ایک جہاد میں شریک ہو اور دوسرا اہل خانہ کی خبر گیری کرے۔ حضرت خیثمہ نے اپنے فرزند سے کہا کہ تم یہاں رہو میں جاتا ہوں۔ حضرت سعد نے فرمایا کہ اگر جنت کے بغیر اور کوئی سودا ہوتا تو میں آپ کو ترجیح دیتا۔ لیکن یہ معاملہ تو جنت کا ہے لہٰذا میں خود اس میں شریک ہوں گا اور امید ہے کہ مجھے شہادت کی دولت نصیب ہوگی بالآخر دونوں نے قرعہ اندازی کی تو قرعہ حضرت سعد کے نام نکلا اور وہ غزوۂ بدر میں شریک ہوئے اور شہید ہوئے۔ (مستدرک حاکم)

غزوہ اُحد کے معرکہ سے ایک روز پہلے حضرت عبداللہ بن جحش نے اللہ تعالیٰ سے دُعا مانگی کہ اے میرے مالک میں تجھ سے یہ التجا کرتا ہوں کہ جب کل دشمنوں سے میری ملاقات ہو تو وہ مجھے پہلے قتل کریں کہ میرا پیٹ چاک کر دیں میری ناک اور کان تک کاٹ ڈالیں تاکہ جب میں تیرے دربار میں حاضر ہوں اور تو مجھ سے سوال کرے کہ یہ کارروائی کیوں ہوئی ہے تو میں عرض کروں کہ اے مالک یہ محض تیری رضا کے لیے۔ (مستدرک حاکم)

یہ اور اس قسم کے واقعات سے صحابہ کی تمنائے شہادت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

شدید غلط فہمی اور تباہ کن خوش گمانی

ہم قرآن میں یہ اور اس قسم کی دوسری آیات پڑھتے ہیں اور گزر جاتے ہیں اور نہیں سوچتے کہ قرآن ہم سے کیا مطالبہ کرتا ہے؟ یہ سوال کم ذہنوں میں آتا ہے۔ انسان اپنے آپ کو رعایتیں دینے میں بہت فراخدل واقع ہوا ہے اس لیے اس بے فکری پر کوئی خاص حیرت نہیں ہے۔ اگرچہ اس بے فکری کے نتائج اس قدر ہولناک ہیں کہ ان کی نظیر ملنی مشکل ہے۔ لوگ جب قرآن میں اس قسم کی آیات پڑھتے ہیں تو ان پاک نفسوں کو ان کی استقامت ایمانی پر جی کھول کر ہدیۂ عقیدت پیش کرتے ہیں اور پیش کر کے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کی آیات میں خود ان کے لیے کوئی درس ہدایت نہیں ہے بلکہ کچھ بعید نہیں کہ وہ دل ہی دل میں اللہ کا شکر ادا کرتے ہوں کہ ہم اس بھاری آزمائش سے محفوظ رکھے گئے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو بڑی شدید غلط فہمی بلکہ ایک تباہ کن خوش فہمی ہے۔ ان لوگوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ قانون آزمائش کا تعلق نہ نبوت اور بعثت سے ہے اور نہ حضور کی رفاقت اور صحبت سے بلکہ ادعائے ایمان سے ہے۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ نبی کی رفاقت کا امتحان لیا جانا ضروری ہے بلکہ یہ کہتا ہے کہ ایمان کے دعویٰ کرنے والوں کا دعویٰ پرکھا جانا ضروری ہے۔ ہر صاحب نظر دیکھ سکتا ہے کہ اس طرح کی آیتوں میں جس چیز کو اللہ سبحانہٗ نے وجہ امتحان بلکہ مورد امتحان قرار دیا ہے وہ ایمان ہے۔ وہ کہتا ہے کہ جنت کا ملنا ایمان پر اور خود ایمان کا کارآمد ہونا اس کے ثمرات و نتائج یعنی راہ حق کے مجاہدات اور صبر و ثبات پر موقوف ہے اس کا یہ اعلان فلیعلمن اللہ الذین آمنوا وہ جان کر رہے گا کہ کون ایمان والا ہے۔ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ آزمائشوں کا مبنیٰ صرف دعویٰ ایمان ہے اور ایمانی دعویٰ کا سچا ہونا لوازم ایمانی پر موقوف ہے ورنہ جہاں تک

جاننے کا تعلق ہے کیا چیز ہے جو اللہ کے علم میں نہیں۔

قرآن کی ان تصریحات سے اس بے بنیاد نظریہ کی کوئی قیمت نہیں رہتی کہ اللہ تعالیٰ کا قانون ابتلا و آزمائش صرف اصحاب نبی سے تعلق رکھتا ہے۔ عام اہل ایمان پر نہ اس کا اطلاق ہوتا ہے نہ نفاذ۔ یہ نظریہ نہیں بلکہ نفس کی ایک خواہش ہے جس نے تصور اور نظریہ کا لبادہ اوڑھ لیا ہے۔

وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ؕ
اَفَاۡئِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ؕ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ
عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْـًٔا ؕ وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ ۝
وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ تَمُوْتَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ كِتٰبًا مُّؤَجَّلًا ؕ وَمَنْ
يُّرِدْ ثَوَابَ الدُّنْيَا نُؤْتِهٖ مِنْهَا ۚ وَمَنْ يُّرِدْ ثَوَابَ الْاٰخِرَةِ نُؤْتِهٖ
مِنْهَا ؕ وَسَنَجْزِى الشّٰكِرِيْنَ ۝

اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس اللہ کے رسول
ہیں،[٢٥٩] آپ سے پہلے اور رسول بھی ہوتے ہیں،[٢٦٠] اگر آپ کا وصال
ہو جاتے یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے
یاد رکھو جو بھی اُلٹے پاؤں پھرے گا وہ اللہ کا ہرگز کچھ نہ بگاڑے گا
اور اللہ اپنے شکرگزار بندوں کو جزا دے گا۔[٢٦١] اور دیکھو اللہ کے حکم
کے بغیر کوئی جان مر نہیں سکتی[٢٦٢] موت کا وقت مقرر ہے۔ اور

جو بھی دُنیا کے فائدے پر نظر رکھتا ہے ہم اسے دُنیا میں سے دیں گے اور جو آخرت کے ثواب کے لیے ارادہ کرتا ہے وہ آخرت کا ثواب پائے گا ہم اپنے شکر گزار بندوں کو ضرور اجر عطا کریں گے۔"[۲۶۳]

بنائے کار اصول و عقائد ہیں

اُحد میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنفس نفیس نقشہ جنگ قائم کیا۔ تمام منیبں درست فرمانے کے بعد پہاڑ کا ایک درہ باقی رہ گیا۔ جہاں سے اندیشہ تھا کہ دشمن لشکر اسلام پر حملہ آور ہو جائے۔ اس پر آپ نے پچاس تیر اندازوں کو جن کے سردار حضرت عبداللہ بن جبیر تھے مامور فرما کر تاکید کر دی کہ ہم خواہ کسی حالت میں ہوں تم یہاں سے نہ ہلنا، مسلمان غالب ہوں یا مغلوب، حتیٰ کہ اگر تم دیکھو کہ پرندے ان کا گوشت نوچ کر کھا رہے ہیں تب بھی اپنی جگہ نہ چھوڑنا وانا لن نزال غالبین ما ثبتم مکانکم (بغوی) ہم برابر اس وقت تک غالب رہیں گے جب تک تم اپنی جگہ قائم رہو گے۔ الغرض فوج کو پوری ہدایت دینے کے بعد جنگ شروع کی گئی۔ میدان کارزار گرم تھا۔ غازیان اسلام بڑھ بڑھ کر جوہر شجاعت دکھا رہے تھے۔ ابو دجانہ، علی مرتضیٰ اور دوسرے مجاہدین کی بسالت و بے جگری کے سامنے مشرکین کی کمریں ٹوٹ گئیں۔ ان کو راہِ فرار کے سوا اب کوئی راستہ نظر نہ آتا تھا کہ حق تعالیٰ نے اپنا وعدہ پورا کر دکھایا۔ کفار کو شکست فاش ہوئی۔ وہ بدحواس ہو کر بھاگے۔ ان کی عورتیں جو غیرت دلانے کو آئی تھیں پائنچے چڑھا کر ادھر اُدھر بھاگتی نظر آئیں۔ مجاہدین نے مال غنیمت پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ یہ منظر جب تیر اندازوں نے دیکھا تو سمجھے کہ اب فتح کامل ہو چکی۔ دشمن بھاگ رہا ہے یہاں ٹھہرنا بیکار ہے چل کر دشمن کا تعاقب کریں اور غنیمت میں حصہ لیں۔ عبداللہ بن جبیر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یاد دلایا۔ وہ سمجھے کہ آپ کے ارشاد کا اصلی منشا ہم پورا کر چکے ہیں یہاں ٹھہرنے کی حاجت نہیں۔ یہ خیال کر کے سب غنیمت پر جا پڑے۔ صرف عبداللہ بن جبیر اور ان کے گیارہ ساتھی درہ کی حفاظت پر باقی رہ گئے۔ مشرکین کے سواروں کا دستہ خالد بن ولید کے زیر کمان تھا جو اس وقت

تک حضرت اور رضی اللہ عنہ نہیں ہٹے تھے۔ انہوں نے پلٹ کر درّے کی طرف حملہ کر دیا۔ دس بارہ تیر انداز ڈھائی سو سواروں کی یلغار کو کہاں روک سکتے تھے۔ تاہم عبداللہ بن جبیر اور ان کے رفقاء نے مدافعت میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی، اسی میں جان دے دی۔ مسلمان مجاہدین اپنے عقب سے مطمئن تھے کہ ناگہانی مشرکین کا رسالہ ان کے سروں پر آ پہنچا اور سامنے سے مشرکین کی فوج جو بھاگی جا رہی تھی پیچھے پلٹ پڑی۔ مسلمان دونوں طرف سے گھر گئے اور بہت زور کا رن پڑا، کتنے ہی مسلمان شہید اور زخمی ہوئے۔ اسی افراتفری میں ابن قمیہ نے ایک بھاری پتھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پھینکا۔ جس سے دندان مبارک شہید اور چہرۂ اقدس زخمی ہوا۔ ابن قمیہ نے چاہا کہ آپ کو قتل کرے مگر مصعب بن عمیر نے جن کے ہاتھ میں اسلام کا جھنڈا تھا مدافعت کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم زخم کی شدت سے زمین پر گرے کسی شیطان نے آواز لگا دی کہ آپ قتل کر دیئے گئے۔ یہ سنتے ہی مسلمانوں کے ہوش اڑ گئے اور پاؤں اکھڑ گئے۔ بعض مسلمان ہاتھ پاؤں چھوڑ کر بیٹھ رہے۔ کچھ ضعفا کو خیال ہوا کہ مشرکین کے سردار ابوسفیان سے امن حاصل کر لیں۔ کچھ منافقین کہنے لگے کہ جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم قتل کر دیئے گئے تو اسلام چھوڑ کر اپنے مذہب قدیم میں واپس چلا جانا چاہیے۔ اس وقت انس بن مالک کے چچا انس بن النضر نے کہا کہ اگر محمد قتل ہو گئے تو اب محمد تو مقتول نہیں ہوتے حضور کے بعد تمہارا زندہ رہنا کس کام کا؟ جس چیز پر آپ قتل ہوئے تم بھی اسی پر کٹ مرو۔ اور جس چیز پر آپ نے جان دی ہے اسی پر تم بھی جان دے دو۔ یہ کہہ کر آگے بڑھے حملہ کیا لڑے اور شہید ہوئے رضی اللہ عنہ۔ اسی اثنا میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے آواز دی الی عباد اللہ انا رسول اللہ اللہ کے بندو ادھر آؤ میں اللہ کا رسول ہوں۔ کعب بن مالک آپ کو پہچان کر چلائے مسلمانو! بشارت ہو رسول اللہ یہاں موجود ہیں آواز کا سننا تھا کہ مسلمان ادھر ہی سمٹنا شروع ہو گئے۔ تیس صحابہ نے آپ کے قریب ہو کر مدافعت کی اور مشرکین کی فوج کو منتشر کیا۔ اس موقعہ پر سعد بن ابی وقاص، طلحہ، ابوطلحہ اور قتادہ بن النعمان نے بڑی جانبازیاں دکھائیں۔ آخر مشرکین میدان چھوڑ کر چلے جانے پر مجبور ہوئے۔ ان آیات میں ان ہی واقعات کی عکاسی کی گئی ہے۔

۲۵۹ ۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے سوا کچھ نہیں کہ بس اللہ کے رسول ہیں۔ یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم آخر خدا تو نہیں ایک رسول ہیں[1]۔ محمد اسم مبارک قرآن میں پہلی بار آیا ہے۔ اس پر علماء نے

[1] افادات شیخ الاسلام

بہت کچھ لکھا ہے ۔ یہاں ہم مولانا بدرعالم مرحوم اور مولانا عبدالرحمان ندوی کے مقالات کے کچھ اقتباسات ہدیہ ناظرین کرتے ہیں ۔

آپ کا اسم نامی خلاصہ حیات کا ترجمہ ہے

نام مبارک کا عام اور سادہ ترجمہ یہ ہے کہ وہ ذات جس کی تعریف کی گئی اس ترجمہ کی صحت میں کوئی کلام نہیں ہے ۔ لیکن اس جامعیت کبریٰ برزخ کامل اور مقصود آفرینش کے فضائل و کمالات کے سامنے ترجمہ ہیچ ہے ۔ خدا کے تمام نبی اس کے نزدیک موجب توصیف ہیں ۔ دنیا کے تمام حکیم ، فاتح عام انسانوں کی نظروں میں لائق مدح و ستائش ہیں ۔ اس لیے اس ترجمہ کی صحت کو پورے طور پر تسلیم کرتے ہوئے تفحص کو اور زیادہ وسعت دیں ۔ صاحب مفردات محمد کے معنے لکھتے ہیں الذی جمعت فیہ الخصال المحمودۃ یعنی مختصر لفظوں میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ لفظ محمد کے معنی مجموعہ خوبی کے ہیں ۔

اے کہ تو مجموعہ خوبی بچہ نامت خوانم

کارساز قدرت کی وسعت لامحدود ، اس کے کرشمے ناقابل شمار اس کی تخلیق کا دروازہ ہمیشہ کے لیے وا ہے ۔ غور کرنے سے ہم اپنی عقل کے مطابق اس فیصلہ پر پہنچتے ہیں کہ قدرت نے تخلیق انواع کے لیے ایک معیار مقرر کیا ہے ۔ مخلوقات کی ہر نوع کا ایک درجہ کمال ہے کہ جس کے آگے اس کا قدم نہیں بڑھتا ، حیوانات ، نباتات اور جمادات تک میں اس کے شواہد مل سکتے ہیں صورتیں ایک ہیں ، شکلیں متحد ہیں اوصاف مختلف ہیں لیکن ان مختلف اوصاف کی ایک انتہا ہے جسے جنس اعلیٰ سے تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ جس کے آگے کوئی درجہ نہیں ہے ۔ ہر نوع میں جنس اعلیٰ کو جس پر اوصاف جامعیت کے ساتھ جا کر ختم ہو جاتے ہیں ، ہم مقصود فطرت اور نقطہ تخلیق کہتے ہیں ۔ اس نقطہ تخلیق کی اصطلاح کو پوری تشریح کے ساتھ ذہن میں رکھنا چاہیے ۔ یہ بات تھوڑے سے غور سے سمجھ میں آ سکتی ہے ۔

مگر دوسری تمام انواع کی طرح اس مقصود فطرت کو انسانوں کی جماعت میں بھی تلاش کرنا ضروری ہے ۔ دوسری مخلوقات اور انسانوں میں ایک عام اور بیّن فرق یہ ہے کہ وہاں نوع کے سینکڑوں افراد ہیں اور یہاں اوصاف و خصوصیات کے اعتبار سے ہر ہر فرد اپنے مقام پر نوع مستقل ہے ۔ آفرینش انسان کی مجمل یا مفصل تاریخ پر ایک اجمالی نظر بتلا سکتی ہے کہ آج بھی انسان کی شکل و

شباہت، اس کے اعضاء و جوارح اس کا ڈھانچہ جسمانی ساخت ٹھیک وہی ہے۔ سب چیزیں وہی ہیں جو دُنیا کے پہلے انسان کی تھیں لیکن دماغی کیفیتوں کا حال ان سے جُدا گانہ ہے۔ ان میں برابر ارتقاء و اختلاف جاری ہے۔ اگر انسان کے اس ارتقائے دماغی پر غور کیا جائے تو صاف معلوم ہوتا ہے کہ ماقبل و مابعد ازیوں زبانوں کی تاریخ میں ارتقائے دماغی کی آخر ترین سرحد اگر کوئی ہو سکتی ہے تو وہ ذات قدسی صفات آقائے نامدار رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے صاحب قاموس نے لفظ حمد کے ایک معنے قضاءِ الحق کے بھی بتائے ہیں۔ پس لفظ محمد کے ایک معنے یہ بھی ہیں وہ جس کا حق پورا کر دیا گیا ہو یعنی اللہ کی جانب سے نوعِ انسان کو جس سرحدِ کمال تک پہنچانا مقصود تھا اور انسان کا اپنے خالق پر جو حق مقرر تھا وہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر پورا کر دیا گیا علم و عمل، خَلق و خُلق، دماغ وکیریکٹر ارتقائے ذہنی ارتقائے عملی یہی دو چیزیں انسان کا خلاصہ اور اس کی کائنات تخلیق کا لب لباب ہیں۔ اول ثانی کے لیے بنیاد ہے عمل علم پر کیریکٹر دماغ پر خُلق خَلق پر قائم ہے۔ یہ ایک عجیب نکتہ ہے کہ جتنی بھی کسی انسان کی حالت مکمل ہوگی اسی قدر اس کی خُلقی کیفیت راسخ اور مستحکم ہوگی۔ ایک کا کمال دوسرے کے کمال کی علامت اور ایک کا نقصان دوسرے کے نقصان کی نشانی ہے۔ تاریخی طور پر یہ بھی ثابت ہے کہ کیریکٹر اور اخلاق کی جملہ شاخوں کی پختگی اور تکمیل کا جو نمونہ آنحضرت کی ذات مبارک نے پیش کیا عالمِ انسانی اس کی نظیر سے عاجز ہے حتیٰ کہ خود دُشمنوں کے اقرار سے اس کو فرمادیا گیا انک لعلی خلق عظیم محاوراتِ عرب سے حمد کے معنے یہ بھی معلوم ہوتے ہیں کہ کسی کام کو اپنی قدرت کے مطابق انجام دینا۔ حماسیات میں نیزے کے بھرپور حملے کے موقعہ پر حمدت بلادہ کا محاورہ مشہور ہے یعنی میں نے وار پورا کیا۔ اس معنے کو سامنے رکھتے ہوتے اور اوپر کے مضمون کو پیشِ نظر رکھ کر بے تامل کہا جا سکتا ہے کہ لفظ محمد کے معنے مخلوق کامل کے ہیں۔

منجملہ دیگر کمالات نبوت کے ایک کمال خود حضور کا نام نامی ہے۔ یہ زندہ جاوید معجزہ زمانہ بعثت سے تاحال اپنے فضائل کی شہادتیں پیش کر رہا ہے۔ صاحب قاموس نے لکھا ہے محمد الذی یحمد مرۃ بعد مرۃ جس کی تعریف کا سلسلہ کبھی ختم نہ ہو۔ تعریف کے بعد تعریف اور توصیف پر توصیف ہوتی رہے۔ زمانہ جوں جوں بڑھتا جا رہا ہے اور انسان اپنی بساط کے مطابق ترقی کر رہا ہے محض اعتقاداً نہیں بلکہ واقعتہً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات سے پردہ اُٹھتا جا رہا ہے۔ علماء و فضلائے یورپ کی اکثریت تاریخِ اسلام کے تحت اپنا مطالعہ جس قدر گہرا کرتی جا رہی

ہے۔ دُنیا کی مختلف پریشانیوں اور بے قراریوں کو معدوم کرنے کی جتنی ضرورت ان کے خیال میں بڑھتی جا رہی ہے با دل ناخواستہ ان کو اسی راہ کی طرف آنا پڑتا ہے اور اعتراف کرنا پڑتا ہے کہ بلا شبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قانون دُنیا کی ضرورتوں کا کفیل اور ان کی زندگی انسان کے لیے ایک بہترین نمونہ ہے۔ اہل ایشیا کا رجحان طبعی جتنا روحانیت اور سادگی کی طرف بڑھ رہا ہے اسی قدر وہ پیغمبر عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے قریب تر ہوتا جا رہا ہے۔ یہ دُنیا کا صرف واحد معجزہ ہے کہ نام مبارک تیرہ سو سال پہلے سے اس آنے والی حالت کا پتہ دے رہا ہے۔ مستقبل میں دُنیا کی عمر جس قدر دراز ہو گی خواہ وہ اپنی موجودہ حالت میں ترقی کرے جس کی بظاہر اُمید نہیں ہے اور خواہ اپنے پچھلے سبق دُہرائے دونوں حالتوں میں اسے کمالات نبوت کے اعتراف سے چارہ نہ ہوگا۔ اس حیثیت سے نام مبارک کا ترجمہ سلسلہ اوصاف و محامد ہوگا۔

حضور کا نام آپ کی زندگی کا آئینہ دار ہے

جیسا کہ اوپر کہا گیا ہے کہ عام طور سے اشخاص کے نام اور اوصاف باہم کوئی نسبت نہیں رکھتے۔ شاذ و نادر اتفاقی حیثیت سے تناسب بھی مل جاتا ہے اور ایسا کبھی نہیں ہوا کہ کسی انسان کا وہ نام رکھا گیا ہو جو اس کی تمام حیات کا آئینہ اور اس کے شعبہائے زندگی کی تفصیل ہو۔ مگر حضور انور کا نام نامی اس سے مستثنیٰ ہے۔ اسی مطابقت سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس خاص نام رکھنے کی ضرورت عبدالمطلب کو غیبی تحریک سے ہوئی۔ اب غور کیا جائے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا خلاصہ دوست و دُشمن کی یکساں تنقید، حاضر و غائب کی رائے زنی کا ماحصل اس کے سوا کچھ نہیں کہ علم و عمل ظاہر و باطن، خلق و خُلق ہر حیثیت سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی قابل تعریف تھی۔ اور اسی خلاصہ حیات کا ترجمہ ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم۔

نام میں ختم نبوت کی دلیل

اس سے بھی زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ آپ کا نام نہ صرف نبی ہونے بلکہ خاتم النبیین ہونے کی بھی دلیل ہے۔ کمال علم و کمال اخلاق بھی انبیاء علیہم السلام کی مخصوص اور ممتاز صفات میں سے ہیں دوسرے انبیاء علیہم سلام کا کمال علمی و عملی کسی ایک خاص صفت میں مخصوص تھا لیکن حضور کی جامعیت آپ کی سوانح و تعلیمات سے معلوم کی جا سکتی ہے۔ لفظ محمد کے معنے مجموعہ خوبی اور مخلوق کامل

کے جو ہم اوپر بیان کر آئے ہیں اس کے آگے کوئی نقطہ نہیں ہے۔ اسی حالت پر کمال کلی کی انتہا اور معارف کا اختتام ہے جس کے بعد نہ کسی نبی کی حاجت نہ کسی نبی کا وجود ممکن ہے۔

مستشرقین یورپ میں سے جن لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت پاک کا مطالعہ کیا ہے وہ باوجود ہزار سعی تنقیص کے اعتراف کمال پر مجبور ہوتے ہیں۔ بعثت کے حالات سیرت طیبہ تعلیم و تلقین اپنے اندر کچھ ایسی کشش رکھتی ہے کہ مخالف سے مخالف اور سخت سے سخت حریف اعتراف پر مجبور ہو جاتا ہے۔ اسی خاصیت اور بے اختیارانہ کشش کو نام مبارک محمد میں بیان کیا گیا۔ لفظ محمد عربی زبان میں تحمید سے بنا ہے جو باب تفعیل کا مصدر ہے۔ اس باب کے معنوی خواص میں سے کسی کام کا وجود میں آنا اس طور سے مانا جاتا ہے کہ گویا کسی مخفی طاقت نے اس کو وجود میں آنے کے لیے مجبور کیا جیسے صَرَّفَ پھیر دیا یعنی کسی طاقت نے بے اختیار کر کے پھیر دیا اسی طرح لفظ محمد کے معنے ہیں وہ جس کی بے اختیار تعریف کی گئی ہو۔ اس معنے سے قوت جاذبہ اور کشش اصلی کی طرف اشارہ ہے۔

اس باب کی دوسری خاصیت یہ بھی ہے کہ وہ کسی کام کو اس طور پر ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ وہ اپنے تمام پہلوؤں کا استقصا کیے ہوتے ہے کوئی اس سے چھوٹا ہوا نہیں۔ بولا جاتا ہے قتلہ تقتیلا یعنی اس کو بوٹی بوٹی کر دیا اس کا لحاظ رکھتے ہوتے نام مبارک کے معنے یہ معلوم ہوتے ہیں کہ محمد یعنی جس کا جز جز قابل تعریف ہے۔ اصلاح نفس، تدبیر منزل اور تدبیر مدن کی وہ کون کا شاخ ہے جس کا عملی نمونہ ذات قدسی صفات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش نہیں کر دیا۔ انبیاء علیہم السلام کا تمام تر سلسلہ عالم میں ایک خاص ترتیب و نظام کے ساتھ آیا اور ہر ایک اپنے اندر کوئی نہ کوئی کمال اخلاقی یا عرفانی یا انتظامی لایا۔ یہ بابرکت سلسلہ جب اپنی حد نہایت کو پہنچا تو ضرورت ہوئی کہ عالم انسانی کے سامنے ایک ایسا نمونہ کامل پیش کیا جاتے جو ان تمام صفات کا مجمع اور فضائل کا آئینہ ہو جس کی زندگی کو سامنے رکھ کر موسویا نہ مستی مسیحانہ اخلاق ابراہیمی محبت بیک وقت نظر کے سامنے آتے اور پھر اپنے ان تمام اوصاف میں وہ اپنے متقدمین سے بالاتر ہو۔ وہ ہستی کی جامع اور برزخ کامل ذات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ اسی لیے حضرت مسیح نے اپنی بشارت میں لفظ احمد فرمایا۔ یعنی وہ آئے گا جو اپنے تمام پہلے آنے والوں کا سردار اور سب پر فائق ہو گا۔

دنیا کے تمام مذاہب کے برعکس اسلام اپنی تاریخ میں بالکل علیحدہ ہے وہ جن جن ملکوں

ہیں گیا اور جن جماعتوں میں پھیلا اخلاق ورُوحانیت سے گیا۔ تلوار اسلام میں روحانیت اور مذہب کے داخلہ کے بعد گئی ہے۔ افریقیہ اور ہندوستان کی نظریں اس معاملہ میں بہت صاف ہیں۔ اس خالص نعمت تبلیغ کو بھی نام مبارک میں ظاہر کیا گیا ہے۔ بس لفظ محمد کے ایک معنے یہ بھی قرار دیے جا سکتے ہیں کہ وہ جس کے ساتھ خوش اسلوبی خوش تدبیری نے ترقی کی۔ آپ کی تعلیم کا انتشار آپ کا لایا ہوا دین خدا کی خاص مرضی اور خاص تدبیر سے عالم میں پھیل گیا جس کی سرعت اور بغیر جدوجہد رفتار ترقی سے اس وقت بھی دُنیا حیران ہے۔

الغرض اسلام کی تمام معنوی خوبیوں کے ساتھ ساتھ پیغمبر اسلام کا نام مبارک بھی اپنے معانی کے لحاظ سے مختلف خوبیوں کا مرقع بہتیرے فضائل کا خلاصہ ہے۔ اگر آپ اس ساری تفصیل کا نچوڑ دیکھنا چاہتے ہیں تو تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا یہ بیان پڑھیے کہ قاموس میں حمد کے معنے شکر، رضا، قضا حق اور تحمید کے معنے تابڑ توڑ تعریف کرنے کے لکھے ہیں اور بتایا ہے کہ اسی سے لفظ محمد ہے جس کے معنے مرۃ بعد مرۃ تعریف کیے گئے ہیں۔ میرے خیال میں بے نہایت محمد کے ہیں امام بغوی فرماتے ہیں محمد وہ ہے جو تمام خوبیوں اور محامد کا استغراق رکھتا ہو۔ خوبیوں اور تعریفوں کا ظرف وہی ہو سکتا ہے جو ہر پہلو میں کمال ہی کمال رکھتا ہو۔ تحمید تحمد سے زیادہ ہے اس کا مستحق وہ نہیں جو صرف اس کی اہلیت رکھتا ہو بلکہ وہ ہے جو ہر قسم کے کمال پر تا ابد غالب ہو۔ حسان بن ثابت فرماتے ہیں:

أَلَمْ تَرَ أَنَّ اللّٰهَ أَرْسَلَ عَبْدَهُ　　بِبُرْهَانِهِ وَاللّٰهُ أَعْلَىٰ وَأَمْجَدُ
وَشَقَّ لَهُ مِنْ إِسْمِهِ لِيُجِلَّهُ　　فَذُو الْعَرْشِ مَحْمُوْدٌ وَهٰذَا مُحَمَّدُ

احمد و محمد صلی اللہ علیہ وسلم

قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارک بے نظیر تھی آپ کے یہ اسما بھی بے مثل ہی تھے۔ آپ سے پہلے کسی کے ذہن میں ان اسماء کا خطور بھی نہ ہوا تھا کہ جب آپ کی ولادت کا زمانہ نزدیک آگیا کاہنوں منجموں اور اہل کتاب نے نام لے کر آپ کی بشارتیں دیں تو لوگوں نے اس نبی کی طمع میں اپنی اولاد کا نام محمد و احمد رکھنا شروع کر دیا۔ جہاں تک تاریخ سے ثابت ہوتا ہے جن کے نام محمد و احمد رکھے گئے تھے ان کی کل تعداد چھ تک ہے ساتواں کوئی شخص ثابت نہیں ہوتا۔ سہیلی صرف تین بتلاتے ہیں۔ ۱۔ محمد بن سفیان

بن مجاشع ، ۲۔ محمد بن احیحۃ بن الجلاح ، ۳۔ محمد بن عمران بن ربیعہ ، سہیلی سے پہلے ابوعبداللہ بن خالویہ کا خیال بھی یہی تھا۔ حافظ ابن حجرؒ آٹھویں صدی میں جب پھر اس کے درپے ہوتے تو انہوں نے ان کی تعداد بیس تک پہنچا دی اور تکرار و اوہام حذف کرنے کے بعد منقح تعداد پندرہ قرار دی جس میں سب سے زیادہ مشہور محمد بن عدی ربیعہ ہیں۔ ان کا واقعہ بغوی ، ابن سعد ، ابن شاہین اور ابن السکن ، وغیرہم نے اس طرح بیان کیا ہے کہ خلیفہ عبداللہ نے محمد بن عدی سے پوچھا تمہارے والد نے تمہارا نام زمانہ جاہلیت میں محمد کیسے رکھ دیا انہوں نے جواب دیا اس کے متعلق جیسا تم نے مجھ سے پوچھا ہے ایسا ہی میں نے اپنے والد سے پوچھا تھا انہوں نے فرمایا تھا کہ میں قبیلہ بنی تمیم کے تین اور شخصوں کے ہمراہ ابن جفنہ غسانی کی ملاقات کے لیے ایک مرتبہ شام کی طرف روانہ ہوا۔ ہم ایک ایسے چشمے پر جا کر اترے جو گرجا کے قریب تھا گرجا کا منتظم ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا ایک نبی مبعوث ہونے والے ہیں تم دوڑ کر ان کو قبول کر لینا ہم نے کہا ان کا نام ، اس نے کہا ان کا نام محمد ہے جب اس سفر سے ہم واپس ہوئے تو اتفاقاً ہم سب کے یہاں لڑکے پیدا ہوتے اور اس لیے ہم سب نے اپنے اپنے لڑکوں کا نام محمد رکھ دیا۔ اس کے بعد حافظ ابن حجر نے اور اشخاص کے نام بھی بہ تفصیل تحریر کیے ہیں۔ دیکھو فتح الباری باب اسماء النبی صلی اللہ علیہ وسلم ، حافظ سہیلی فرماتے ہیں کہ تورات میں آپ کا جو اسم مبارک مذکور ہے وہ احمد ہے حافظ ابن قیم اس رائے سے متفق نہیں وہ اس پر اصرار کرتے ہیں کہ تورات میں آپ کی آمد کی پیش گوئی اسم محمد کے ساتھ بھی صاف موجود ہے ۔ اس کے بعد حافظ ابن قیم اسم محمد کی شرح کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ محمد وہ ہے جس میں بکثرت تعریف کے اوصاف پائے جائیں۔ محمود بھی اسم مفعول کا صیغہ ہے مگر جو مبالغہ باب تفعیل میں ہوتا ہے وہ ثلاثی مجرد میں نہیں ہوتا اس لیے محمد محمود سے زیادہ بلیغ ہے ۔

محمد اس کو کہتے ہیں جس کی اتنی تعریف کی جائے جتنی کسی اور بشر کی نہ کی جاتے اسی لیے تورات میں آپ کا نام محمد ہی ذکر کیا گیا ہے کیونکہ آپ کے اوصافِ حمیدہ آپ کی امت اور آپ کے دین کے فضائل و کمالات کا اتنی کثرت سے اس میں ذکر ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام جیسے اولوالعزم رسول کو بھی آپ کی امت میں ہونے کی آرزو ہونے لگی۔ احمد یہ اسم تفضیل کا صیغہ ہے اسم فاعل اور اسم مفعول دونوں معنی میں مستعمل ہو سکتا ہے۔ پہلی صورت میں اس کے معنی ہیں احمد الحامدین لربہ یعنی تمام تعریف کرنے والوں میں اپنے پروردگار کی سب سے زیادہ تعریف کرنے والا - دوسری صورت میں اس کے معنی ہیں احق الناس واولاھم بان یحمد ، تمام لوگوں میں سب سے زیادہ تعریف کے قابل اور

ثنا کا مستحق اس بنا پر محمد و احمد میں فرق یہ ہے کہ اگر محمد وہ ہے جس کی تعریف اپنے اوصاف جمیلہ کی وجہ سے سب سے زیادہ کی جاتے اور احمد وہ ہے جس کی تعریف سب سے بہتر اور عمدہ کی جاتے۔ پس محمد بلحاظ کمیت ہے اور احمد بلحاظ کیفیت ہے۔ دونوں ناموں کا خلاصہ یہ ہے کہ آپ اپنے خلق و خصائل کی وجہ سے اس کے مستحق ہیں کہ سب سے زیادہ اور سب سے کامل تعریف آپ کی ہو۔ اس تحقیق کے بعد ان دونوں مضمونوں کے لحاظ سے سطحِ عالم پر نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ یہ اسمائے حسنیٰ حقیقت اور جتنی صداقت کے ساتھ آپ کی ذات مبارک پر چسپاں ہیں اتنے کسی اور پر نہیں۔ اگر یہاں اسم تفضیل کو اسم مفعول کے معنی میں لیجیے تو خالق سے مخلوق تک انبیا علیہم السلام سے لے کر جن و ملک تک حیوانات سے لے کر جمادات تک غرض ہر ذی رُوح اور غیر ذی رُوح سب ہی نے آپ کی تعریفیں کی ہیں اور آج بھی چالیس کروڑ انسانوں کی زبانیں دن میں نہ معلوم کتنی بار آپ کی تعریف کے لیے متحرک رہتی ہیں حتیٰ کہ کفار میں بھی ایک طبقہ ایسا ہے جو اگرچہ آپ کا دین تسلیم نہیں کرتا مگر آپ کی دیانت و امانت، عدل و انصاف، صداقت و راستبازی، ہوش و خرد کا ثناخواں ہے اس لیے اگر اپنے خیال میں آپ ذرا علیحدہ ہو کر ازل سے ابد تک کی دُنیا کی طرف کان لگائیں تو جس کی سب سے زیادہ اور سب سے بہتر تعریف آپ کے کان سنیں گے وہ مبارک ہستی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ہستی ہوگی۔

نہ دانم آں گل رعنا چہ رنگ و بو دارد
کہ مرغ ہر چمنے گفت گوئی او دارد

اس لیے محمد یا احمد (بمعنی اسم مفعول) نام کی مستحق جتنی کہ آپ کی ذات ہو سکتی ہے اتنی کسی اور کی نہیں ہو سکتی اور اگر احمد کو اسم فاعل کے معنے میں لیجیے تو بھی اس اسم مبارک کی سب سے زیادہ مستحق آپ ہی کی ذات پاک ہے کیونکہ جس قدر خدا کی تعریف آپ نے کی ہے اتنی کسی بشر نے نہیں کی اور اسی طرح اپنی اُمت کو بھی موقعہ بموقعہ خدا کی اتنی حمد سکھائی کہ کتب مقدسہ میں اس اُمت کا لقب ہی حمادون پڑ گیا۔ یعنی خدا کی بہت تعریف کرنے والی اُمت۔ صحیحین میں ہے کہ حشر میں جب شفاعت کے لیے آپ تشریف لے جائیں گے تو آپ پر خدا کی حمد و ثنا کا دروازہ کھولا جائے گا جو اس سے پیشتر کسی پر نہیں کھولا گیا تھا۔ پس سب انبیا تو حماد ہیں اور ان حمادوں میں آپ احمد ہیں۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ پہلے آپ احمد تھے پھر محمد ہوتے کیونکہ سب سے پہلے آپ نے خدا کی تعریف کی پھر آپ کے بعد مخلوق نے آپ کی تعریف کی اسی طرح حشر میں سب سے پہلے

آپ ہی خدا کی حمد کریں گے جب آپ کی سفارش سے حساب شروع ہو جائے گا تو پھر اہلِ حشر آپ کی حمد کریں گے اس لیے پہلے آپ احمد ہیں اور بعد میں محمد۔ بلحاظِ وجود بھی پہلے آپ احمد ہیں اور بعد میں محمد۔ اسی وجہ سے کتبِ سابقہ میں آپ کی بشارت اسم احمد سے مذکور ہے اور جب عالمِ وجود میں تشریف لے آئے تو محمد کے نام سے پکارے گئے (دیکھو فتح الباری) خلاصہ یہ ہے کہ احمد بمعنی محمد ہو یا بمعنی احمد الحامدین ہر ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ حمد کو ہر پہلو سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ بہت بڑی خصوصیت حاصل ہے اسی بنا پر سورۃ الحمد خاص کر آپ ہی کو مرحمت ہوئی۔ آپ کی ہی اُمت کا لقب حمادون ہوا اور حشر میں لواء الحمد (حمد کا جھنڈا) آپ کے ہی ہاتھوں میں ہوگا اور آپ ہی کے مخصوص مقام کا نام محمود ہے آپ کی شریعت میں بھی کھانے کے بعد پینے کے بعد، دعا کے بعد، سفر سے واپسی کے بعد غرض بہت سے مختلف مواقع پر خدا کی حمد سکھائی گئی پھر یہ مختلف اور متنوع تعریفیں جب ہر زمانہ میں بے شمار انسانوں کی زبانوں سے ہوتی ہیں وہ درحقیقت آپ ہی کی تعلیم کا نتیجہ ہے اس لیے ان تمام تعریفوں کو بجا طور پر آپ کی طرف منسوب کیا جا سکتا ہے اس کے بعد اب سوچو کہ جتنی خدا کی تعریف فضائے عالم میں آپ کے ذریعہ سے گونجی کیا کبھی کسی اور کے ذریعے سے گونجی ہے اور اسی کے ساتھ جتنی کثرت کے ساتھ خدا کی غیر متناہی مخلوق نے آپ کی تعریفیں کیں اتنی کسی اور شخصیت کی ہیں۔ پس ہر اعتبار سے حمد کی جتنی خصوصیت آپ کی ذات کے ساتھ ثابت ہوتی ہے اتنی کسی اور ذات کے ساتھ نہیں ہوتی اس لیے احمد و محمد نام پانے کے لیے بھی آپ ہی کی ذات منتخب ہونی چاہیے۔ اسی لیے آپ سے پہلے بھی جس نے یہ نام رکھا آپ کی اتباع میں رکھا اور بعد میں بھی جس نے اس نام کو اختیار کیا آپ ہی کی اتباع میں کیا

اللھم صل وسلم وبارک علیہ،

شیخ اکبر یہاں ایک اور عجیب نکتہ لکھ گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ حمد ہمیشہ آخر میں ہوتی ہے جب ہم کھا پی کر فارغ ہو لیتے ہیں تو خدا کی حمد کرتے ہیں۔ جب سفر ختم کر کے گھر واپس آتے ہیں تو خدا کی حمد کرتے ہیں۔ اسی طرح جب دُنیا کا طویل و عریض سفر ختم کر کے جنت میں داخل ہوں گے تو خدا کی حمد کریں گے واخر دعونا ان الحمد للہ رب العالمین (دیکھو روح زلف ج ا ص ۱۲۴) اس دستور کے مطابق مناسب ہے کہ جب سلسلہ رسالت ختم ہو تو یہاں بھی آخر میں خدا کی حمد ہو اس لیے سب سے آخر میں آتے ان کا نام محمد رکھا گیا بے شک جو ذات پاک کہ حسن و خوبی کی تمام رعنائیوں اور زیبائشوں کا مجموعہ ہو اس کے اسماء بھی حسن و خوبی کا مجموعہ ہونے چاہئیں۔

لفظِ رسُول کی تشریح

اس فقرے نے بتادیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ خدا ہیں نہ خدا کا کوئی جُز نہ مظہرِ خدا نہ بروز نہ اوتار۔ وہ تو صرف رسُول ہیں۔ رسُول کا صحیح مقام سمجھنے کے لیے خود لفظ رسُول سے زیادہ صحیح اور آسان کوئی لفظ نہیں ہے۔ اس لفظ سے محبت اور عظمت کے وہ تمام تقاضے بھی پورے ہوجاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے لیے فطرتِ انسانی میں موجزن ہوتے ہیں۔ اور عبد و معبود کی وہ ساری حدود بھی محفوظ ہوجاتی ہیں جو کفر و ایمان کے درمیان خطِ فاصل ہوسکتی ہیں اسی لیے خدا تعالیٰ کے سب رسُولوں نے اسی لفظ سے اپنا تعارف پیش کیا ہے اور آخر میں قرآن حکیم نے سب سے افضل اور سب سے برتر رسُول کا تعارف بھی جس لفظ میں پیش کیا ہے وہ بھی لفظ رسُول ہے وما محمد الا رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم صرف اللہ کے رسُول ہیں اس کے سوا الوہیت کا اپنے اندر شائبہ تک نہیں رکھتے۔

معلوم ہوا کہ یہ کلمہ ایسا پُرعظمت کلمہ ہے کہ نبی الانبیاءؑ کے تعارف کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی کلمہ نہیں ہے۔ صوفیا نے بڑے بڑے مجاہدات کے بعد یہاں کچھ خوشنما کلمات استعمال کیے ہیں وجود کا نقطۂ اول، حقیقۃ الحقائق، برزخیۃ الکبریٰ مگر انصاف یہ ہے کہ ان کلمات سے کچھ غلط فہمیاں تو ضرور پیدا ہوگئیں لیکن آپ کا صحیح مقام پھر بھی اتنا معلوم نہ ہوسکا جتنا لفظ رسُول سے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسُول کا لفظ ہر دور میں مشہور و معروف تھا۔ اس کے لوازم سب کے ذہن نشین تھے اس کے فرائض و خدمات سب کو معلوم تھے۔ اس کی شخصیت اور احترام سے سب آشنا تھے اور یہ تو کسی ناسمجھ سے ناسمجھ انسان پر بھی پوشیدہ نہ تھا کہ بادشاہ اور اس کے رسُول کے درمیان نوازش و کرم کے سوا برابری اور مساوات کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا اس لیے جب کوئی رسُول دنیا میں آتا تو یہی کہہ دیتا کہ میں احکم الحاکمین ملک الملوک کا ایک ایسا ہی رسُول ہوں جیسا کہ دُنیا کے بادشاہوں کے رسُول ہوتے ہیں۔ بس اسی ایک لفظ سے سامعین کے دلوں میں وہ ساری عظمتیں دوڑنے لگتیں۔ محبت و توقیر اطاعت و فرمانبرداری کے وہ تمام جذبات اُمنڈ آتے جو ایسے رسُول کے لیے اُمنڈنا چاہئیں اور بیک وقت وہ تمام حدود بھی سامنے آجاتیں جو ایک بادشاہ اور اس کے رسُول کے درمیان فاصل رہنی چاہئیں۔ اسی لیے محبت و طاعت کے ان تمام جذبات کے ساتھ ان کا جوہرِ توحید بھی کفر و شرک کی گرد سے آلودہ نہ ہوتا۔

ہمیشہ دُنیا میں رہنا نبوت کا کام نہیں ہے

۲۷۰۔ آپ سے پہلے اور رسُول بھی ہو چکے ہیں۔ ان سے پہلے کتنے رسُول گزر چکے ہیں۔ جن کے بعد ان کے متبعین نے دین کو سنبھالا اور جان و مال فدا کر کے قائم کیا[1] ان سب نے اپنے وقت پر دُنیا کو خیر باد کہا سو یہ بھی اپنے وقت موعود پر وفات پائیں گے اور اس میں کوئی بات حیرت کی ہو گی اور نہ کوئی پہلو آپ کی اہانت کا نکلے گا۔ اس فقرے کی تشریح کو اُردو کے عام شارحین قرآن نے اپنی تشریحات میں بالکل نظرانداز کر دیا ہے اس لیے ہم یہاں کچھ عربی تفاسیر کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں۔ نسفی اور زمخشری رقمطراز ہیں۔

آپ سے پہلے رسُول جا چکے ہیں آپ بھی ایسے ہی تشریف لے جائیں گے جیسے سب گئے۔ ان انبیاؑ کی روانگی کے بعد ان کے متبعین ہی دین کو نبھانے والے تھے۔ مسلمانو! تمہیں بھی آپ کے دُنیا سے روانہ ہو جانے کے بعد آپ کے دین کو تھامنا ہو گا کیونکہ انبیاؑ کی بعثت کا مقصد لوگوں تک خدا کا پیغام پہنچانا ہے لوگوں میں نبیوں کا رہنا مقصود نہیں ہے۔

امام رازی علیہ الرحمۃ فرماتے ہیں:

آیت کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے انبیاؑ بھی روانہ ہو گئے آپ بھی روانہ ہو جائیں گے تمہارا کام یہ ہے کہ ان کے روانہ ہونے کے بعد ان کی دعوت اور پیغام کو زندہ رکھو کیونکہ نبوت کی غرض صرف اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔

ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوسرے انبیاؑ کی طرح اللہ کا پیغام پہنچانے آئے ہیں۔ انبیاؑ کے لائے ہوئے خدائی پیغام کے بقاء میں نبیوں کا رہنا شرط نہیں ہے بلکہ دستور یہی ہے کہ انبیاؑ تشریف لے جاتے ہیں اور ان کی لائی ہوئی شریعتیں باقی رہتی ہیں۔ سب انبیاؑ آئے اور تشریف لے گئے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ان ہی میں سے ایک ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علامہ قرطبی فرماتے ہیں :

اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے بتایا ہے کہ

نبی ہمیشہ اپنی قوم میں باقی نہیں رہتے ۔ نبوت کی دعوت اور اس کی تعلیمات سے وابستگی ہونی چاہیے چاہے نبی موت یا قتل کے ذریعے دنیا سے روانہ ہو جائے ۔

حافظ ابن جریر لکھتے ہیں :

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی دوسرے رسولوں کی طرح رسول ہیں جن کو اللہ نے دنیا میں اپنی عبادت اور طاعت کی دعوت کے لیے روانہ فرمایا ہے وہ دنیا سے روانہ ہو گئے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کبھی اللہ سبحانہٗ ایک روز یہی معاملہ کرنے والا ہے ۔

سید رشید رضا لکھتے ہیں :

خلاصہ مطلب یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جامہ انسانیت میں ملبوس خدا کے پیغمبر ہیں ۔ آپ سے پہلے بھی پیغمبر ہوتے ہیں کچھ انتقال فرما گئے اور کچھ شہید ہو گئے کسی کے لیے یہاں بقا تے دوام نہیں ہوا ہے ۔ آپ کو بھی اس راہ سے گزرنا ہے یعنی آپ کو بھی دنیا سے جانا ہے جیسا کہ آپ سے پہلے جا چکے ہیں ۔ بقاء دوام تو صرف اللہ کے لیے ہے اور یہ بات مومن کو زیب نہیں کہ وہ اللہ کے سوا کسی کے لیے بقاء و دوام کا اعتقاد رکھے ۔

حضرت ابو بکر الصدیق کی استقامت

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا حادثہ صحابہ کے لیے اس قدر سخت تھا اور بقول حافظ ابن القیم کہ اُحد میں آپ کی وفات کی خبر اڑا کر صحابہ کرام کو وفات کے حادثہ کے لیے تیار کیا گیا اور ان کو تربیت دی گئی کہ ایسا ہونا ہے اس کے لیے پہلے ہی تیار ہو جانا چاہیے ۔ اس کے باوجود جب حادثہ رونما ہوا تو سب کے ہوش و حواس پر بجلی گر گئی کسی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا ہو گا ۔ اُحد میں وفات کی خبر سن کر حضرت انس بن النضر نے کہا تھا

لوگو! اگر حضور کی وفات ہو گئی تو کیا بات ہے رب محمد تو زندہ ہے تم بھی اسی کام پر کٹ مرو جس پر حضور اللہ کو پیارے ہو گئے تلوار سونتی اور حملہ کر دیا تا آنکہ جام شہادت نوش کر گئے ۔

لیکن جب فی الواقع یہ حادثہ پیش آ ہی گیا۔ تاریخ میں لکھا ہے کہ حضرت ابوبکرؓ صبح کی نماز کے بعد حضور انور کی طبع مبارک بظاہر بہتر دیکھ کر سُنح چلے گئے تھے وہ وفات کی خبر سُن کر آئے تو مسجد اور حجرہ عائشہؓ میں قیامت برپا تھی۔ انتہائی رقّتِ قلب کے باوجود اب حضرت ابوبکرؓ استقامت و استواری کی چٹان تھے کیونکہ اب اس متاعِ عزیز کا تحفظ سب سے پہلا کام تھا جو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اُمت کے لیے چھوڑ گئے تھے۔

اس باب میں متعدد روایتیں ہیں۔ ان سب کا خلاصہ یہ ہے کہ معمول کے مطابق رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے کے لیے اجازت طلب کی۔ لوگوں نے کہا کہ آج آپ کے پاس جانے کے لیے اجازت کی ضرورت نہیں وہ بولے کیا تم سچ کہتے ہو؟ حضرت عائشہؓ کی روایت ہے کہ جنہ آتے ہی چہرہ مبارک سے چادر اُٹھائی اور انا اللہ وانا الیہ راجعون پڑھا پھر فرمایا کہ واللہ رسُول اللہ کی وفات ہوگئی ہے۔ پھر آپ کے سر مبارک کی جانب سے ہٹ گئے اور کہا ہائے نبی! منہ جھکایا اور آپ کے چہرے کو بوسہ دیا پھر کہا ہائے خلیل! منہ جھکایا اور پیشانی کو بوسہ دیا پھر کہا ہائے صفی منہ جھکایا اور پیشانی کو بوسہ دیا۔ پھر چادر اُٹھا کر باہر چلے گئے ایک روایت میں ہے کہ چہرہ مبارک کھول کر بوسہ دیا اور روئے، ساتھ ہی کہا میرے والدین آپ پر قربان ہوں بخدا اللہ آپ پر دو موتیں کبھی جمع نہ کرے گا جو موت آپ پر لکھی جا چکی تھی اس کا ذائقہ آپ نے چکھ لیا اب ابد تک موت آپ کا دامن نہ چھو سکے گی۔ ایک روایت میں ہے کہ آپ نے یہ بھی کہا کہ طبت حیا وطبت میتا میرے والدین آپ پر قربان ہوں آپ کی زندگی بھی کتنی پاکیزہ تھی اور موت بھی کتنی پاکیزہ ہے۔ مسجد میں پہنچے تو حضرت عمرؓ لوگوں سے مخاطب ہو کر کہہ رہے تھے کہ میں کسی کو یہ کہتے نہ سنوں کہ حضور انور وفات پا گئے۔ انہیں بلایا گیا ہے جس طرح حضرت موسیٰ کو بلایا گیا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ عمرؓ چپ ہو جاؤ۔ پھر منبر پر چڑھے۔ حمد و ثنا کے بعد سب سے پہلے یہ آیت پڑھی۔

انک میت وانھم میتون تو بھی مرنے والا ہے اور وہ بھی مرنے والے ہیں۔ پھر فرمایا تم میں سے جو شخص محمد رسُول اللہ کی عبادت کرتا تھا تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ محمد مصطفیٰ تو وفات پا گئے اور تم میں سے جو شخص اللہ کی عبادت کرتا تھا اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ زندہ ہے اور کبھی وفات نہ پائے گا۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے وما محمد الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل اسی مختصر سی تقریر نے سب کو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کا یقین دلا دیا جنہیں احساس تھا کہ وفات پا گئے وہ بھی منزلِ یقین پر پہنچ گئے۔ کچھ نے تو اعتراف کیا

کہ جب تک حضرت ابوبکر نے یہ آیت نہیں پڑھی تھی اس وقت تک احساس نہ تھا کہ یہ آیت بھی نازل ہو چکی ہے۔ حضرت عمر نے یہ آیت سنی تو کہا میرے پاؤں ٹوٹ گئے اور کھڑے رہنے کی تاب مجھ میں نہ رہی اور یقین ہو گیا کہ واقعی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دُنیا سے رحلت فرما گئے۔

آیت کی تشریح ختم ہو گئی مگر ایک ضروری بات رہ گئی۔ اس کی طرف شیخ الاسلام نے اشارہ کیا ہے وہ بھی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں قد خلت من قبلہ الرسل میں خلت خلو سے مشتق ہے جس کے معنے ہو چکنے اور گزرنے اور چھوڑ کر چلے جانے کے ہیں۔ اس کے لیے موت لازم نہیں جیسے فرمایا واذا لقوا الذین آمنوا قالوا آمنا واذا خلوا الی شیاطینھم یعنی جب تمہیں چھوڑ کر چلے جاتے ہیں۔ نیز الرسل میں لام استغراق نہیں جنس ہے۔ کیونکہ یہاں اثبات مدعا میں استغراق کو کوئی دخل نہیں ہے۔ بعینہٖ اسی قسم کا جملہ حضرت مسیح کے بارے میں فرمایا: ما المسیح ابن مریم الا رسول قد خلت من قبلہ الرسل کیا لام استغراق ہے کہ اس کے معنے یہ ہوں گے کہ تمام پیغمبر حضرت مسیح سے پہلے ہو چکے ہیں کوئی ان کے بعد آنے والا نہیں رہا۔ لامحالہ لام جنس لینا ہوگا وہ ہی یہاں لیا جائے۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ عبداللہ بن مسعودؓ کے مصحف اور ابن عباس کی قرأت میں الرسل نہیں رسلٌ نکرہ ہے باقی خلو کی تفصیل میں صرف موت یا قتل کا ذکر اس لیے کیا کہ موت طبعی بہرحال آنے والی تھی اور قتل کی خبر اس وقت مشہور کی گئی تھی۔ اور چونکہ صورت موت کا وقوع میں آنا مقدر تھا اس لیے اس کو قتل پر مقدم کیا۔ ابوبکر الصدیق نے حضور کی وفات کے وقت سب صحابہ کے مجمع میں یہ پوری آیت تلاوت کی بلکہ آیت انک میت بھی پڑھی تو لوگ قد خلت اور افائن مات اور انک میت سے خلو اور موت پر جواز و عدم استبعاد پر متنبہ ہو گئے جو صدیق اکبر کی غرض تھی۔ موت کے واقع ہو چکنے پر نہ صدیق اکبر نے اس سے استدلال کیا نہ کسی اور نے یہ سمجھا۔ اگر یہ الفاظ موت کے واقع ہو چکنے کی خبر دیتے تو چاہیے تھا کہ نزول آیت کے وقت یعنی وفات سے، سال پہلے ہی سمجھ لیا جاتا کہ آپ کی وفات ہو چکی ہے۔ اس تقریر سے بعض محرفین کی سب تحریفات ہباءً منثوراً ہو جاتی ہیں بخوف تطویل ہم زیادہ بسط نہیں کرسکتے" اہل علم کے لیے اشارات کافی ہیں۔

ادائے فرض میں کوتاہی روا نہیں

۱۴۶۔ اگر آپ کا وصال ہو جاتے یا قتل کر دیے جائیں تو کیا تم اُلٹے پاؤں پلٹ جاؤ گے۔ یاد

رکھو جو بھی اُلٹے پاؤں پلٹے گا وہ ہرگز اللہ کا کچھ نہ بگاڑے گا اور اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو جزا دے گا۔
یعنی آپ کا اس دنیا سے گزر جانا کچھ اچنبا نہیں ہے۔ اس وقت نہ سہی اگر کسی وقت آپ کی وفات ہو گئی یا شہید کر دیے گئے تو کیا تم دین کی خدمت و حفاظت کے راستہ سے اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے اور جہاد فی سبیل اللہ ترک کر دو گے جیسے اس وقت محض قتل کی خبر سن کر بہت سے لوگ حوصلہ چھوڑ بیٹھے تھے یا منافقین کے مشورے کے موافق العیاذ باللہ سرے سے دین کو خیر باد کہہ دو گے تم سے ایسی اُمید ہرگز نہیں ہے اور اگر کسی نے ایسا کیا تو اپنا ہی نقصان کرے گا اللہ کا کیا بگاڑ سکتا ہے وہ تمہاری مدد کا محتاج نہیں بلکہ تم شکر کرو اگر اس نے تمہیں اپنے دین کی خدمت کا موقع دے دیا۔

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمی کنی منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت

اور شکر یہی ہے کہ تم بیش از بیش خدمت دین میں مضبوط و ثابت ہو۔ اس سے یہ بھی اشارہ نکلتا ہے کہ حضور انور کی وفات پر کچھ لوگ دین سے پھر جائیں گے اور جو قائم رہیں گے ان کو بڑا ثواب ہے اسی طرح ہوا کہ کچھ حضور انور کے وصال مبارک کے بعد مرتد ہو گئے۔ صدیق اکبر نے ان کو پھر مسلمان کیا اور کچھ مارے گئے۔ [1]

دراصل اس آیت میں اس اصل عظیم کا اعلان ہے کہ بنائے کار اصول و عقائد ہیں نہ کہ شخصیت و افراد۔ شخصیت کتنی بڑی کیوں نہ ہو لیکن اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ کسی اصل اور سچائی کی راہ دکھانے والی ہے۔ لہٰذا اگر کسی وجہ سے شخصیت ہم میں موجود نہ رہے یا درمیان سے ہٹ جائے تو ہم سچائی کی راہ سے کیوں منہ موڑیں۔ سچائی کی وجہ سے شخصیت قبول کی جاتی ہے۔ یہ بات نہیں ہے کہ شخصیت کی وجہ سے سچائی سچائی ہو گئی ہو۔ جنگ اُحد میں کسی مخالف نے یہ بات اُڑا دی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کو پیارے ہو گئے۔ یہ سن کر بہت سے مسلمانوں کے دل بیٹھ گئے۔ کچھ نے کہا کہ جب پیغمبر نہیں رہے تو لڑنے سے کیا فائدہ۔ کچھ لوگ جو علانیہ منافق تھے انہوں نے علانیہ کہنا شروع کر دیا کہ اگر یہ نبی ہوتے تو ممکن نہ تھا کہ جنگ میں مارے جاتے۔ یہاں اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور ظاہر ہے کہ ان کو بھی ایک روز دنیا سے جانا ہے لہٰذا اگر وہ دنیا سے رحلت فرماتے دار بقا ہو جائیں گے تو کیا تم حق پرستی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی راہ سے ہٹ جاؤ گے اور تمہاری حق پرستی حق کے لیے نہیں بلکہ محض ایک خاص شخصیت کے لیے تھی۔ فرض کرو کہ جنگ احد والی بات صحیح ہوتی تو کیا حضور کی موت کے ساتھ تمہاری حق پرستی پر بھی موت طاری ہو جاتی۔ اگر تم حق کے لیے لڑ رہے تھے تو جس طرح وہ ان کی زندگی میں حق تھا اسی طرح وہ ان کی وفات کے بعد بھی حق ہے اور ہمیشہ حق رہے گا۔[1]

موت ایک نوشتہ الٰہی ہے

۲۶۲۔ اور دیکھو اللہ کے حکم کے بغیر کوئی جان نہیں مر سکتی جب کوئی شخص بغیر حکم الٰہی مر نہیں سکتا خواہ کتنے ہی اسباب موت جمع ہوں۔ اور ہر ایک کی موت وقت مقررہ پر آنی ضرور ہے خواہ بیماری سے ہو یا قتل سے یا کسی اور سبب سے تو خدا پر توکل کرنے والوں کو اس سے گھبرانا نہ چاہیے اور نہ کسی بڑے یا چھوٹے کی موت کو سن کر مایوس اور بد دل ہو کر بیٹھنا چاہیے۔[2]

اس سے یہ بات مسلمانوں کے ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ موت کے خوف سے تمہارا بھاگنا فضول ہے۔ کوئی شخص نہ تو اللہ کے مقرر کیے ہوئے وقت سے پہلے مر سکتا ہے اور نہ اس کے بعد جی سکتا ہے لہٰذا تم کو فکر موت سے بچنے کی نہیں بلکہ اس بات کی ہونی چاہیے کہ زندگی کی جو مہلت بھی تمہیں حاصل ہے اس میں تمہاری محنت و کوشش کا مقصود کیا ہے دنیا یا آخرت۔[3]

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ ہر شخص کی موت نوشتہ الٰہی ہے جب تک اس نوشتہ کی مقرر مدت پوری نہیں ہوتی اس وقت تک کسی کی موت نہیں آتی۔ موت جب بھی آئے گی حکم خداوندی سے آئے گی اس کے بغیر نہیں آسکتی اور پھر جب آئے گی وقت موعود پر آئے گی اس سے پہلے نہیں آسکتی خواہ خطرات کیسے ہی شدید ہوں۔ ان حقائق کا اگر استحضار ہے تو موت کا طبعی خوف بھی حد اعتدال پر قائم رہے۔

کتاباً موجّلاً کی تشریح

کتاباً موجّلاً یعنی موت کا وقت لکھا ہوا ہے جس میں تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔ موت کی اسی تاجیل

---

[1] ترجمان القرآن [2] افادات شیخ الاسلام [3] تفہیم القرآن

کو دوسری جگہ تقدیر کہا ہے نحن قدرنا بینکم الموت یعنی ہر شخص کی زندگی کے لیے اللہ نے ایک پیمانہ مقرر کر دیا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے کائنات کے ہر حصہ اور ہر پہلو کے متعلق اپنے احکام مقرر فرما دیے ہیں جن کی طاعت اس پر واجب ہے۔ علیٰ ہذا انسانوں کی ترقی و زوال اموت و حیات، بیماری و صحت، دولت و افلاس، آرام و تکلیف، سعادت و شقاوت ہر ایک کے اصول و قواعد مقرر فرما دیے ہیں۔ غرض ان کو آرام و تکلیف جو بھی پیش آتی ہے۔ خدا کے علم و اجازت سے پیش آتی ہے ما اصاب من مصیبۃ الا باذن اللہ اور چونکہ تقدیر سے کوئی چیز ہٹ نہیں سکتی اس لیے مقدر کو نوشتۂ الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں کہ جس طرح لکھی ہوئی بات قائم رہتی ہے مٹتی اور بدلتی نہیں ہے ایسے ہی یہ بات بھی مٹ نہیں سکتی اور بدلتی نہیں ہے۔

طالبِ دُنیا اور طالبِ آخرت

۲۶۳ - اور جو بھی دُنیا کے فائدے پر نظر رکھے گا ہم اسے دُنیا میں سے دیں گے اور جو آخرت کے ثواب کا ارادہ کرتا ہے۔ وہ آخرت کا ثواب پائے گا ہم اپنے شکر گزار بندوں کو ضرور اجر عطا کریں گے یعنی اگر چاہیں گا قال عجلنا لہٗ فیھا ما نشاء لمن نرید اور آخرت کے ارادہ کرنے والوں کو آخرت میں یقیناً بدلہ ملے گا۔ اس آیت کے پہلے جملہ میں ان لوگوں پر تعریض ہے۔ جنہوں نے مالِ غنیمت کی طمع میں حکم عدولی کی اور دوسرے میں ان کا ذکر ہے جو برابر فرمانبرداری میں ثابت قدم رہے اور آخر میں فرمایا کہ جو لوگ اس دین پر ثابت قدم رہیں گے ان کو دین بھی ملے گا اور دُنیا بھی لیکن جو کوئی اس نعمت کی قدر جانے کذا فی الموضح [1]

اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے اس کمزوری کی نشاندہی فرمائی ہے کہ انسان کی نظر مادی فوائد پر ہے اور روحانی فوائد اس کی نگاہ میں بے حقیقت ہیں۔ وہ اپنی تمام محنتوں اور کوششوں کا قبلہ توجہ دنیوی منافع کو قرار دیتے ہیں۔ ان کو اندیشہ ہوتا ہے کہ اگر روحانی فوائد کے پیچھے پڑے تو دُنیا کے فوائد سے محروم ہو جائیں گے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ حقیقت نہیں ہے۔ دُنیا کے طالبوں کو دُنیا سے اتنا ہی حصہ ملتا ہے جتنا ان کے لیے مقدر ہوتا ہے اور وہ آخرت کے اجر سے بالکل محروم رہتے ہیں اس کے برعکس جو آخرت کا طالب ہوتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو آخرت کے انعامات سے نوازتا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

اور دُنیا میں بھی اس کو اس قدر دیتا ہے جتنا اس کے لیے مقدر ہوتا ہے۔

آیت میں ثواب کا لفظ آیا ہے ثواب کے معنے ہیں نیتجہ عمل۔ ثواب دُنیا سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو انسان کو اس کی سعی و عمل کے نیتجے ہیں اسی دُنیا کی زندگی میں حاصل ہوں اور ثواب آخرت سے مراد وہ فوائد و منافع ہیں جو اس سعی و عمل کے نیتجے میں آخرت کی پائدار زندگی میں حاصل ہوں گے۔ اسلام کے نقطۂ نظر سے انسانی اخلاق کے معاملہ میں فیصلہ کن سوال یہی ہے کہ اس کارزار حیات میں جو دوڑدھوپ آدمی کر رہا ہے اس میں آیا وہ دُنیوی نتائج پر نگاہ رکھتا ہے یا اخروی نتائج پر[1]

قرآن میں شکر کا مفہوم

یہ جو فرمایا ہے کہ ہم شکر کرنے والوں کو ان کی جزا ضرور دیں گے۔ یہ فقرہ نہ صرف پہلی بات کی تاکید اور تائید ہے بلکہ جو کچھ پہلے کہا گیا ہے اس میں اور اضافہ کا وعدہ ہے اور یہ اضافہ کیا اور کتنا ہوگا؟ اس کی جلالتِ قدر کو ظاہر کرنے کے لیے سین تاکید لگایا ہے اور جزا میں ابہام رکھا ہے پہلی آیت میں نیک اعمال بجا لانے والوں کو شاکرین کہا اور اس آیت میں آخرت میں ثواب کا ارادہ رکھنے والوں کو شاکرین کہا ہے۔ لغت میں شکر کے معنے جانور میں تھوڑے سے چارہ ملنے پر بھی ترو تازگی ہونا اور دودھ زیادہ دینا ہیں۔ اس سے انسانوں کے محاورے میں یہ معنے پیدا ہوئے کہ کوئی کسی کا تھوڑا سا بھی کام کردے تو دوسرا اس کی پوری قدر کرے۔ یہ قدر شناسی تین طرح ہوتی ہے 'دل سے' زبان سے اور ہاتھ پاؤں سے۔ یعنی دل میں اس کی قدر شناسی کا جذبہ ہو زبان سے اس کے کاموں کا اقرار ہو اور ہاتھ پاؤں سے اس کے ان کاموں کے جواب میں ایسے افعال صادر ہوں کہ کام کرنے والے کی بڑائی کو ظاہر کریں۔

اللہ تعالیٰ نے ہم کو دوسری نعمتوں کے ساتھ سب سے بڑی نعمت دین کی مرحمت فرمائی ہے۔ آیت میں شاکرین سے وہ لوگ مراد ہیں جو اللہ کی اس نعمت کے قدر شناس ہوں کہ اس نے دین کی صحیح تعلیم دے کر انہیں دُنیا اور اس کی محدود زندگی سے بہت زیادہ وسیع 'ایک ناپیداکنار عالم کی خبر دی اور ان کو اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ انسانی سعی و عمل کے نتائج صرف اس دُنیا کی

---

[1] تفہیم القرآن

چند سالہ زندگی تک محدود نہیں ہیں بلکہ اس زندگی کے بعد ایک دوسرے عالم تک ان کا سلسلہ دراز ہے۔ یہ وسعتِ نظر یہ دُور بینی، عاقبت اندیشی حاصل ہونے کے بعد جو شخص اپنی کوششوں اور محنتوں کو اس دُنیوی زندگی کے ابتدائی مراحل میں بار آور ہوتے نہ دیکھے یا اس کا برعکس نتیجہ نکلتا دیکھے اور اس کے باوجود اللہ پر بھروسہ کرکے وہ کام کرتا چلا جائے جس کے بارے میں اللہ نے اسے یقین دلایا ہے کہ آخرت میں اس کا نتیجہ بہتر ہے وہ شکرگزار بندہ ہے۔ اس کے برعکس جو لوگ اس کے بعد بھی دنیا پرستی کی تنگ نظری میں مبتلا ہوں جن کا حال یہ ہے کہ دُنیا میں جن غلط کوششوں کے بظاہر اچھے نتائج نکلتے ہیں ان کی طرف وہ آخرت کے بُرے نتائج کی پروا کیے بغیر جھک پڑیں اور جن صحیح کوششوں کے یہاں بار آور ہونے کی اُمید نہ ہو یا جن سے یہاں نقصان پہنچنے کا خطرہ ہو ان میں آخرت کے نتائج خیر کی اُمید پر اپنا وقت اپنا مال اور اپنی قوتیں صرف کرنے کے لیے تیار نہ ہوں وہ ناشکرے ہیں اور اس علم کے ناقدر شناس ہیں جو اللہ نے ان کو نبوّت کے ذریعے عطا کیا ہے۔

وَكَاَيِّنْ مِّنْ نَّبِيٍّ قٰتَلَ مَعَهٗ رِبِّيُّوْنَ كَثِيْرٌ ۚ فَمَا وَهَنُوْا لِمَآ
اَصَابَهُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَمَا ضَعُفُوْا وَمَا اسْتَكَانُوْا ۗ
وَاللّٰهُ يُحِبُّ الصّٰبِرِيْنَ ۝ وَمَا كَانَ قَوْلَهُمْ اِلَّآ اَنْ قَالُوْا رَبَّنَا
اغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَاِسْرَافَنَا فِيْٓ اَمْرِنَا وَثَبِّتْ اَقْدَامَنَا وَانْصُرْنَا
عَلَى الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ فَاٰتٰىهُمُ اللّٰهُ ثَوَابَ الدُّنْيَا وَحُسْنَ ثَوَابِ
الْاٰخِرَةِ ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ ع

(اور دیکھو) کتنے ہی نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے اللہ والوں نے جنگ میں حصہ لیا بس اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر آتی ہیں ان کی وجہ سے کبھی وہ بے ہمت نہیں ہوتے اور نہ کمزور پڑے اور نہ وہ ظالموں کے سامنے سرنگوں ہوتے اور اللہ ان کو دوست رکھتا ہے جو صبر کرتے ہیں[۲۶۴]۔ ان کی دُعا بس یہ ہوتی تھی کہ اے ہمارے رب ہماری غلطیوں اور

کوتاہیوں سے درگزر فرما۔ ہم سے ہمارے کام میں جو زیادتیاں ہوئی ہیں ان کو معاف فرما، ہمارے قدم جما دے اور کافروں کے مقابلے پر ہماری مدد فرما[۲۶۵]۔ ان کو اللہ نے دنیا میں اجر عطا فرمایا اور آخرت کا بھی بہتر ثواب دیا اور اللہ نیکوکار لوگوں ہی کو پسند کرتا ہے[۲۶۶]۔

قانونِ آزمائش کی تاریخ

اس آیت میں قانونِ آزمائش کی تاریخ بیان کی جا رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جو کچھ اُحد میں تمہارے ساتھ ہوا ہے وہ صرف تمہارے ساتھ نہیں ہوا بلکہ جب سے حق و باطل کی کشمکش کا آغاز ہوا ہے اسی وقت سے ایسا ہوتا آیا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب خدیجۃ الکبریٰ ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں ورقہ نے حضور کے آغازِ نبوت کی داستان سُن کر پہلے یہ بات کہی کہ یہ وہی فرشتہ ہے جو حضرت موسیٰ پر اللہ نے اتارا تھا اور پھر بتایا کہ اے کاش میں آپ کے زمانہ نبوت میں تنومند اور توانا ہوتا۔ اے کاش میں اس وقت زندہ ہوتا جب آپ کی قوم آپ کو شہر بدر کرے گی۔ حضور انور نے بڑی حیرت سے دریافت کیا کیا میری قوم مجھے نکال دے گی۔ ورقہ نے کہا جی ہاں۔ جب بھی کوئی خدا کا رسول اللہ کا دین لے کر آیا ہے ہمیشہ اس سے دشمنی کی گئی ہے یعنی نبوت کی تاریخ یہی ہے۔

زندگی ہاریں مصائب کا طوفان آتا ہے۔ ستر مسلمان خاک و خون میں لت پت ہو کر راہِ خدا میں جان دیتے ہیں۔ کچھ مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے اس حزن و ملال کا ازالہ پچھلے پیغمبروں کی زندگی میں قانونِ آزمائش کے نفاذ کی رُوداد سُنا کر کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آزمائش کی یہ صورت روزِ اول ہی سے متعین فرما رکھی ہے۔ یہاں کامیاب وہ ہے جو آزمائشوں میں

نہ تو بے ہمت ہو نہ کمزور پڑے اور نہ کسی حال میں ظالموں کے سامنے عجز و بے چارگی کا اظہار کرے۔ وہن، ضعف اور استکانتہ لفصم ایمان کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتی۔

۲۶۴ - اور دیکھو کتنے ہی نبی ہیں جن کے ساتھ ہو کر اللہ والوں نے جنگ میں حصہ لیا۔ اللہ کی راہ میں جو مصیبتیں ان پر آئی ہیں ان کی وجہ سے نہ وہ بے ہمت ہوتے نہ کمزور پڑے اور نہ وہ ظالموں کے سامنے سرنگوں ہوتے اور اللہ ان کو دوست رکھتا ہے جو صبر کرتے ہیں۔ یعنی تم سے پہلے بہت اللہ والوں نے نبیوں کے ساتھ ہو کر کفار سے جنگ کی ہے جس میں بہت تکلیفیں اور سختیاں ان کو اٹھانی پڑی ہیں لیکن ان شدائد و مصائب سے نہ ان کے ارادوں میں سستی ہوئی نہ ہمت ہارے نہ کمزوری دکھائی نہ دشمن کے سامنے دبے اللہ تعالیٰ ایسے ثابت قدم رہنے والوں سے خاص محبت کرتا ہے۔ یہ ان مسلمانوں کو تنبیہہ فرمائی اور غیرت دلائی جنھوں نے احد میں کمزوری دکھائی تھی حتیٰ کہ بعض نے یہ کہہ دیا تھا کہ کسی کو بیچ میں ڈال کر ابو سفیان سے امن حاصل کر لیا جائے مطلب یہ ہے کہ جب پہلی امتوں کے حق پرستوں نے مصائب و شدائد میں اس قدر صبر و استقلال کا ثبوت دیا تو اس امت کو جو خیر الامم ہے ان سے بڑھ کر صبر و استقامت کا ثبوت دینا چاہیے[1]

آیت کا مطلب واضح اور صاف لفظوں میں یہ ہے کہ تاریخ میں اس سے پہلے بھی ایسی مثالیں گزر چکی ہیں کہ اللہ کے نبیوں نے جہاد کیا ہے اور اس جہاد میں اللہ کے بہت نیک بندے شامل ہوئے ہیں اور ان کو اس راہ میں مصیبتوں، ہزیمتوں سے بھی سابقہ پیش آیا ہے لیکن اس چیز کا اثر ان پر یہ نہیں پڑا کہ وہ ہمت ہار جائیں، بھڑ ولا پن دکھائیں یا دشمن کے آگے گھٹنے ٹیک دیں بلکہ انہوں نے راہ حق میں استقامت دکھائی اور اللہ ایسے ہی لوگوں کو دوست رکھتا ہے۔ یہاں اس حقیقت کی طرف توجہ دلانا ہے کہ نہ تو نبی اور اس کے صحابہ کے لیے جنگ پیش آنا کوئی انوکھی بات ہے اور نہ مصائب و شدائد سے ان کا گزرنا کوئی نیا حادثہ ہے۔ یہ تو انبیاء کی ایک سنت اور خدا کے قانون آزمائش کا ایک لازمی تقاضا ہے۔ کوئی اس غلط فہمی میں نہ رہے کہ جو نبی ہوتا ہے وہ اور اس کے ساتھی اللہ کے قانون آزمائش سے گزرے بغیر ہی منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ مولانا دریابادی نے کیسی لطیف بات لکھی ہے کہ جہاد کی سنت انبیاء قدیم کے وقت سے چلی آتی ہے اور اس راہ کے رہرووں کو برابر ان منزلوں سے گزرنا پڑا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں جنگ کے موضوع پر تین چیزوں کی نفی فرما کر ایک بات کا اثبات کیا ہے۔ جن تین کی نفی فرمائی ہے یہ ہیں۔ وہن، ضعف اور استکانۃ اور جس چیز کو ثابت کیا ہے بلکہ جسے مدارِ محبت قرار دیا ہے وہ صبر ہے۔

وہن کے معنے پہلے بتائے جا چکے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کی محبت اور موت کی ناگواری کو وہن قرار دیا ہے۔ اصل یہی ہے اور بے ہمتی یا قتادہ کے لفظوں میں عاجزی یا زجاج کی رائے کے مطابق بزدلی اور نامردی اس کا نتیجہ ہیں۔ بلاشبہ جسے حبِّ دُنیا کا روگ لگ جائے، اس میں نامردی، بے ہمتی اور عجز و بے چارگی کی بیماریاں ناگزیر ہیں۔ ضعف یہ ہے کہ میدان میں نکلے مگر کمزوری دکھاتے اور اس کو ارادہ کی کمزوری کے لیے بھی بولا جاتا ہے۔ لسان العرب میں وہن اور ضعف دونوں کے معنے اس طرح بتائے ہیں کہ دشمن سے جنگ میں نہ توقف کیا اور نہ بزدل ہوئے۔

استکانۃ یہ ہے کہ لاچار ہو کر حریف کے آگے گڑگڑانے لگے۔ اس کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ امام راغب اصفہانی نے اس کا اشتقاق کان سے مان کر اسے استفعال کے وزن پر بتایا ہے اور لسان العرب میں اس کا مادہ سکن یا سکون مان کر افتعال کے وزن پر بتایا ہے۔ مادہ کچھ ہو معنے دونوں کے ایک ہیں عاجزی اختیار کرنا۔ اگر استفعال کہا جاتے تو استکنوا ہونا چاہیے۔ صاحب لسان نے اشباع کا سہارا لیا ہے۔ کچھ ہو ان تینوں میں گہرا معنوی ربط ہے۔ موت سے خوف اور دُنیا کی محبت سے دل میں جو بزدلی پیدا ہوتی ہے یہ وہن ہے اس وہن سے ارادے اور عمل میں جو تعطل رونما ہوتا ہے یہ ضعف ہے اور اس ضعف سے مدِ مقابل کے سامنے گڑگڑانے کا جو نتیجہ ظاہر ہوتا ہے اس کا نام استکانۃ ہے۔ آخر میں واللہ یحب الصابرین کہہ کر غلط فہمیوں کے ان توبرتو پردوں کو چاک کر دیا ہے جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرے پر پڑے ہوتے ہیں۔ اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کی مجبوری سے درگزر کا نام نہیں ہے بلکہ دل کی انتہائی قوت، ہمت کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات اور مصائب کو خدا کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لاتے کا نام ہے۔ ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آنے پر بھی دل برداشتہ نہ ہو ہمت سے کام لے ارادہ میں قوت پیدا کرے اور اپوزیشن کے سامنے تن کر رہے۔

مصائب کے ہجوم میں اللہ کا سہارا

۲۶۵ - ان کی دُعا بس یہ ہوتی تھی کہ اے ہمارے رب ہماری غلطیوں اور کوتاہیوں سے درگزر فرما، ہم سے ہمارے کام میں جو زیادتیاں ہوتی ہیں ان کو معاف فرما اور ہمارے قدم جما اور کافروں کے مقابلے پر ہماری مدد فرما۔ یعنی مصائب و شدائد کے ہجوم میں نہ گھبراہٹ کی کوئی بات کی نہ مقابلہ سے ہٹ جانے اور دشمن کی اطاعت قبول کرنے کا ایک لفظ زبان سے نکلا بولے تو یہ بولے کہ خداوندا تو ہم سب کی تقصیرات اور زیادتیوں کو معاف فرمائے ہمارے دلوں کو مضبوط اور مستقل رکھ، تاکہ ہمارا قدم جادہ حق سے نہ لڑکھڑاتے اور ہم کو کافروں کے مقابلے میں مدد پہنچا۔ وہ سمجھے کہ بسا اوقات مصیبتوں کے آنے میں لوگوں کے گناہوں اور کوتاہیوں کو دخل ہوتا ہے اور ہم میں کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ اس سے کبھی تقصیر نہیں ہوتی ہوگی۔ بہرحال بجائے اس کے کہ گھبرا کر مخلوق کی طرف جھکتے اپنے خالق و مالک کی طرف جھکے [1]

گویا اس کردار کے ساتھ جس کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ میدان جنگ میں یہ اللہ والے بے ہمت نہیں ہوتے ان کے ارادوں میں کمزوری نمایاں نہیں ہوتی اور اپنے مدمقابل کے آگے نہیں گڑگڑاتے۔ ان اللہ والوں کی گفتار یہ تھی کہ اے اللہ ہماری گزشتہ ناکامی کے قصور کو جو ہماری کوتاہی ذنب یا زیادتی (اسراف) سے سرزد ہوا ہے معاف فرما اور ہمیں مزید ثبات قدم عطا کر کے دشمنوں پر کامیابی بخش۔ اس سے اشارہ ہو گیا کہ ان لوگوں کے کردار میں کیا لغزش ہوئی۔ زبان تک ان کے کلمات تمجید و تحمید اور اعتراف عجز و قصور کے لیے وقف رہی۔

نیز اس میں تعلیم ہے کہ جب مصیبت آوے ظاہری تدبیر کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے بھی دُعا کرے اور اپنے گناہ بخشوائے کہ اکثر مصیبت کا سبب گناہ ہوتا ہے۔

غم چو بینی زود استغفار کن [2]

قرآن نے اپنے پیروؤں میں میدان جنگ میں مقابلہ کا جو طریق کار بتایا ہے اگرچہ اس میں مادی قوتوں کو یکسر نظر انداز نہیں کیا گیا لیکن اس نے مقابلہ میں کامیابی کی عمارت اس پر قائم نہیں کی ہے بلکہ آپ آگے چل کر قرآن ہی میں سورۂ منافقون میں پڑھیں گے کہ قرآن نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] بیان القرآن

منافقین کے جسمانی طول وعرض اور موٹاپے کا مذاق اڑایا ہے کہ چونکہ ان کا یہ دکھاوے کا قالب ایمان و یقین سے خالی ہے اس لیے ان میں بہادری نہیں ہے۔ اسی بنا پر وہ اپنے پیروؤں میں شجاعت کا جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد اللہ سے لگاؤ، اس کی محبت اور اس پر یقین رکھنا ہے یہاں اگر ایک طرف ان کی مادیت اور جسمانیت کا اشارہ کیا تو دوسری طرف ان کی معنویت اور روحانیت کو صراحۃً سراہا۔

اسی لیے نفسیات و اخلاق کے علماء اس اعتراف پر مجبور ہوئے ہیں کہ میدانِ جنگ میں ثبات اور جماؤ کا جو مظاہرہ اہلِ ایمان کرتے ہیں وہ منکرین کو نصیب نہیں ہے۔

یہاں اور وہاں کی کامیابی

۲۶۶۔ ان کو اللہ نے دُنیا میں بھی اجر عطا فرمایا اور آخرت کا بھی بہترین ثواب دیا اور اللہ نیکوکار لوگوں کو پسند کرتا ہے یعنی دُنیا میں ان کی فتح وظفر کا سکہ بٹھا دیا۔ وجاہت و قبول عطا کیا اور آخرت کا جو بہترین ثواب ملا اس کا تو پوچھنا ہی کیا ہے۔ دیکھو جو لوگ اللہ تعالیٰ سے اپنا معاملہ ٹھیک رکھیں اور نیک کام کریں ان سے خدا ایسی محبت کرتا ہے اور ایسا پھل دیتا ہے [1]

گویا ان کو یہ صلہ ملا کہ دُنیا میں بھی اللہ نے ان کو اقتدار و حکومت سے نوازا اور آخرت میں بھی ان کے لیے نہایت اعلیٰ صلہ و انعام موجود ہے [2]

آیت کا آخری فقرہ یعنی ان اللہ یحب المحسنین کہ اللہ حسن کاروں سے محبت کرتا ہے گہری معنویت رکھتا ہے اس سے پہلے پڑھ چکے ہو کہ واللہ یحب الصابرین اللہ محبت کرتا ہے صبر کرنے والوں سے۔ قرآن میں اس قسم کی تعبیر مختلف اعمال کے بارے میں آتی ہے مثلاً توبہ، توکل، اقساط، تقویٰ، قتال فی سبیل اللہ، طہارت یعنی ایمان و عملِ صالح کے بعد ان ذریعوں سے اللہ کی محبت اور پیار کی دولت ملتی ہے۔

مسندِ احمد میں ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ سبحانہٗ تین قسم کے آدمیوں سے محبت کرتا ہے اور تین قسم کے آدمیوں سے پیار نہیں کرتا۔ محبت ان سے کرتا ہے جو اس کی راہ میں خلوصِ نیت سے اپنی جان فدا کرتے ہیں۔ اور ان سے جو اپنے پڑوسی کے ظلم پر صبر

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

کرتے ہیں اور ان سے جو وضو کر کے خدا کی یاد کے لیے اس وقت اُٹھتے ہیں جب قافلہ رات کے سفر سے تھک کر آرام کے لیے بستر لگاتا ہے اور خدا کی محبت سے تین محروم ہیں۔ اترانے والا مغرور، احسان دھرنے والا بخیل، جھوٹی قسمیں کھا کر مال فروخت کرنے والا سوداگر[1]

صحیح مسلم کی روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب خدا کسی بندے کو چاہتا ہے تو فرشتہ خاص جبریل سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندے کو پیار کرتا ہوں تم بھی اس کو پیار کرو تو جبریل بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں۔ پھر زمین میں اس کو ہر دلعزیزی اور حسن قبول بخش جاتا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے رسول اللہ کا ارشاد نقل ہوا ہے کہ اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں کہ جو بندہ اپنی طاعتوں سے میری قربت کو تلاش کرتا رہتا ہے تو میں اس سے محبت کرنے لگتا ہوں۔ یہاں تک کہ میں اس کا کان بن جاتا ہوں جس سے وہ سنتا ہے اور اس کی آنکھ ہو جاتا ہوں جس سے وہ دیکھتا ہے، ہاتھ بن جاتا ہوں جس سے وہ پکڑتا ہے اور پاؤں بن جاتا ہوں جس سے وہ چلتا ہے۔ یہ دولت یہ نعمت، یہ سعادت قرآن کے سوا اور کہیں نہیں ملتی ہے۔

اللّٰھم اجعلنی منھم

---

[1] مسند احمد بسند ابوذر

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنْ تُطِيعُوا الَّذِينَ كَفَرُوا يَرُدُّوكُمْ عَلَىٰ أَعْقَابِكُمْ فَتَنْقَلِبُوا خَاسِرِينَ ﴿١٤٩﴾ بَلِ اللَّهُ مَوْلَاكُمْ ۖ وَهُوَ خَيْرُ النَّاصِرِينَ ﴿١٥٠﴾ سَنُلْقِي فِي قُلُوبِ الَّذِينَ كَفَرُوا الرُّعْبَ بِمَا أَشْرَكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا ۖ وَمَأْوَاهُمُ النَّارُ ۚ وَبِئْسَ مَثْوَى الظَّالِمِينَ ﴿١٥١﴾ وَلَقَدْ صَدَقَكُمُ اللَّهُ وَعْدَهُ إِذْ تَحُسُّونَهُمْ بِإِذْنِهِ ۖ حَتَّىٰ إِذَا فَشِلْتُمْ وَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ وَعَصَيْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا أَرَاكُمْ مَا تُحِبُّونَ ۚ مِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الدُّنْيَا وَمِنْكُمْ مَنْ يُرِيدُ الْآخِرَةَ ۚ ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ ۖ وَلَقَدْ عَفَا عَنْكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٥٢﴾

اے اہل ایمان! اگر تم ان لوگوں کا کہا مانو گے جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے تو یاد رکھو کہ وہ تمہیں راہ حق سے الٹے پاؤں پھیر دیں گے اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔[٢٦٧] یہ دشمنان حق

تمہارے کام نہ آئیں گے، بلکہ اللہ تمہارا کارساز ہے اور مددگاروں میں وہ ہی سب سے بہتر مددگار ہے[٢٦٨]۔ عنقریب وہ وقت آرہا ہے کہ جب ہم اہلِ کفر کے دلوں میں تمہاری ہیبت ڈال دیں گے۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو شریک کیا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے، اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ ظالموں کی قیام گاہ بہت ہی بُری ہے[٢٦٩] اور دیکھو یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے اپنا وعدۂ نصرت سچا کر دکھایا تھا جب کہ تم اس کے حکم سے بے دریغ قتل کر رہے[٢٧٠] تھے۔ مگر جب تم نے کمزوری کا مظاہرہ کیا اور اس معاملہ میں باہم دگر جھگڑنے لگے اور باوجودیکہ اللہ نے تمہیں تمہاری محبوب چیز یعنی فتح کا جلوہ دکھادیا تھا تم نافرمانی کر بیٹھے[٢٧١]۔ تم میں سے کچھ لوگ دُنیا کے طالب تھے اور کچھ تم میں سے آخرت کی خواہش رکھتے تھے[٢٧٢]

پھر اللہ نے تم کو دشمن کی جانب سے اس لیے ہٹا دیا کہ وہ تمہاری آزمائش کرے[۲۶۳]۔ بلاشبہ اور فی الواقع اللہ نے تم کو معاف کر دیا اور اللہ تو اہلِ ایمان پر بڑی مہربانی والا ہے[۲۶۴]۔

آزمائشوں کا تنوع

آیاتِ سابقہ سے یہ بات روزِ روشن کی طرح الم نشرح ہو کر سامنے آگئی کہ ایمان کی راہ میں قدم رکھنے والوں کو ہمیشہ آزمائشوں کے دور سے گزرنا پڑا ہے۔ ایک نظری انسان کو تو اتنی روشنی کافی ہے لیکن ایک عملی انسان کو ایسے انسان کو جو اس کا علم صرف برائے علم نہیں بلکہ برائے عمل چاہتا ہو اس سے زیادہ تیز روشنی کی ضرورت ہے۔ وہ چونکہ دُور کا تماشائی نہیں بلکہ بذاتِ خود اس راستہ کا راہرو ہے۔ اس لیے وہ اس کے ایک ایک نشیب و فراز کو دیکھنا چاہتا ہے وہ بس اتنا جان کر خاموش اور بے فکر نہ ہوگا کہ ایمان کی راہ مشکلات سے گھری ہوئی ہے بلکہ اسے تجسس ہوگا کہ یہ مشکلیں کس طرح کی ہوں گی تاکہ ان کے لیے وہ پہلے سے اپنے دل و دماغ کو تیار کرے۔ اور اچانک ان کا سامنا ہو جانے پر انتشار فکر و عمل کا شکار نہ ہو جاتے اس لیے تین رکوع میں ان مشکلات و مصائب کا تفصیلی جائزہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ کا یہ قانونِ آزمائش کن کن صورتوں میں ظاہر ہوتا ہے اور کن کن طریقوں سے علمبردارانِ حق کو آزمایا جاتا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آزمائشیں ہمہ جہتی ہوتی ہیں۔ انسان کو ہر طرف سے ٹھونک بجا کر دیکھا جاتا ہے۔ اس کے دل و دماغ کا ایک ایک گوشہ چھانا جاتا ہے اور اس کے جذبات کا کوئی تار نہیں جس پر مضرابِ ابتلاء کی ضرب نہ پڑتی ہو۔ ان آزمائشوں کو ہم حسبِ ذیل قسموں میں تبدیل کرتے ہیں۔

چکمے اور دلفریب باتیں

۲۶۸۔ اے اہلِ ایمان اگر تم ان لوگوں کا کہا مانو گے جنہوں نے راہِ کفر اختیار کی تو یاد رکھو وہ

تمہیں راہِ حق سے اُلٹے پاؤں ہٹا دیں گے اور نتیجہ یہ نکلے گا کہ تم تباہ ہو جاؤ گے۔ یعنی جنگِ اُحد میں اہلِ ایمان کے دل ٹوٹے تو کافروں اور منافقوں نے موقع پا یا الزام اور طعنے دینے لگے۔ بعض خیرخواہی کے پردے میں سمجھانے لگے تاکہ آئندہ لڑائی پر دلیری نہ کریں۔ حق تعالیٰ خبردار کرتا ہے کہ دشمن کا فریب مت کھاؤ۔ اگر خدا نہ کرے تم ان کے چکموں میں آ گئے تو جس ظلمت سے تمہیں خدا نے نکالا ہے پھر اُلٹے پاؤں اسی میں جا گرو گے اور رفتہ رفتہ دینِ حق کا دامن ہاتھ سے چھوٹ جائے گا۔ جس کا نتیجہ دُنیا و آخرت کے خسارے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ پہلے اہلِ حق اور اللہ والوں کی راہ پر چلنے کی ترغیب دی تھی۔ یہاں بد باطن اور شریر انسانوں کا کہا ماننے سے منع کیا تا کہ اہلِ ایمان ہوشیار ہو جائیں اور اپنا نفع و نقصان سمجھ سکیں۔[1]

منافقین اور یہودی اُحد کی شکست کے بعد مسلمانوں میں خیال پھیلانے کی کوشش کر رہے تھے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اگر واقعی نبی ہوتے تو شکست کیوں کھاتے۔ یہ تو ایک معمولی آدمی ہیں ان کا معاملہ بھی دوسرے آدمیوں کی طرح ہے آج فتح ہے تو کل شکست خدا کی جس حمایت و نصرت کا انہوں نے تم کو یقین دلا رکھا ہے وہ محض ایک ڈھونگ ہے۔[2]

یہ پروپیگنڈہ اُحد کی ناکامی کو سامنے رکھ کر دراصل بدر کی فتح کے اثرات کو مٹانے کے لیے تھا انہوں نے اپنے منظم پروپیگنڈے سے مسلمانوں کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ تمہارا یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے کہ حضور انور خدا کے فرستادے ہیں۔ اور ان کو خدا اور فرشتوں کی مدد حاصل ہے اگر بات یہ ہوتی تو تم اُحد میں شکست کیوں کھاتے۔ بدر میں تم نے فتح حاصل کی۔ اُحد میں ہم فتحیاب رہے یہ تدبیر اور وسائل کا کھیل ہے۔ اس کو خدا اور اس کے فرشتوں سے وابستہ کرنا اور اپنے آپ کو خدا کی مدد کا اجارہ دار سمجھ کر بیٹھنا محض طفلانہ خام خیالی ہے۔[3]

عوام فریب پروپیگنڈے کی یہ ایک مثال ہے۔ نفسیاتِ انسانی کی روشنی میں ذرا اس کا جائزہ لیجئے اور دیکھئے کہ انہوں نے اہلِ ایمان کی قوتِ فیصلہ پر کیسا زبردست شب خون مارا ہو گا اور اہلِ ایمان بھی وہ جو مصیبت زدہ ہوں اور پھر اس کا اندازہ کیجئے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں پر کیا بیتی ہو گی جب وہ دیکھتے کہ ان کی گھنٹوں دنوں اور مہینوں کی داعیانہ مساعی کا حاصل بس ایک چلتے ہوئے فقرے کی نذر ہو گیا مگر اللہ سبحانہٗ نے کیا فرمایا یہ کہ دلوں کو نہ ٹوٹنے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن [3] تدبر قرآن

دو۔ ان کا کہنا نہ مانو ہمیشہ یوں ہی ہوتا آیا ہے اور اب بھی یوں ہی ہوگا۔ اگر دعوتِ حق سے تمہیں قلبی تعلق ہے اور چاہتے ہو کہ یہ کامیاب ہو تو اس کا یہ طریق نہیں ہے کہ ان باتوں کو سنو اور ان کو مانو۔ اگر ان کا کہا مانو گے تو پھر تمہارے قدم دعوتِ حق پر جمے نہ رہیں گے۔ اس میں تمہاری تباہی ہے اس کا صحیح طریق کار یہ ہے کہ ان کا کہا مانو بلکہ اللہ کا کہا مانو۔

دشمنانِ حق کی نہیں اللہ کی طاعت کرو

۲۶۸۔ یہ دشمنانِ حق تمہارے کام نہ آئیں گے بلکہ اللہ تمہارا کارساز ہے اور مددگاروں میں وہی سب سے بہتر مددگار ہے۔ لہٰذا تمہیں اسی کا کہا ماننا چاہیے۔ اسی کی مدد پر بھروسہ کرنا چاہیے جس کی مدد پر خدا ہو اس کو کیا حاجت ہے کہ دشمنانِ خدا کی مدد کا منتظر رہے یا ان کے سامنے گردن طاعت خم کرے۔ حدیث میں ہے کہ اُحد سے واپسی کے وقت ابوسفیان نے ہبل کی جے پکاری اور کہا لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم آپ نے فرمایا کہ جواب دو کہ اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم[1]

شیخ الاسلام نے جس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل صحیح بخاری میں اس طرح آئی ہے کہ اُحد کے دن جب مسلمان بہت سا نقصان اٹھا کر آخر میں پھر ایک جگہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم زخموں کی تاب نہ لا کر گر گئے تھے اور آپ کے وصال کی خبر بھی مشہور ہو گئی تھی تو ابوسفیان نے میدان سے واپس ہوتے وقت بلند آواز سے کہا کہ کیا قوم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں؟ تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جواب نہ دو پھر اس نے کہا کیا قوم میں ابوبکر ہیں پھر آپ نے فرمایا کہ جواب نہ دو پھر اس نے کہا کیا قوم میں عمر بن الخطاب ہیں اور ساتھ ہی کہا کہ اگر یہ لوگ زندہ ہوتے تو جواب دیتے۔ تب حضرت عمر نے فرمایا کہ ہم سب تم کو ذلیل کرنے کے لیے زندہ ہیں۔ تب ابوسفیان پکارا "اعلی ھبل" یعنی ہبل بت کی جے۔ حضور انور نے فرمایا کہ جواب دو اللہ اعلی و اجل اللہ ہی سب سے بلند اور سب سے زیادہ جلال والا ہے۔ پھر ابوسفیان نے کہا لنا العزیٰ ولا عزیٰ لکم ہمارا اُتت عزیٰ ہے تمہارا کوئی عزیٰ نہیں ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جواب دو اللہ مولانا ولا مولیٰ لکم اللہ ہمارا مددگار ہے تمہارا کوئی مددگار نہیں۔ آیت کے الفاظ بل اللہ مولٰکم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں اس طرف اشارا معلوم ہوتا ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم توحید الٰہی کی حد تک کس قدر غیور تھے جب اپنی زندگی یا موت کا سوال ہوا تو خاموشی کا حکم دیا۔ لیکن جب بُت کی بڑائی کی گئی تو چونکہ یہ توحید الٰہی پر حملہ تھا اس لیے آپ نے فوراً جواب دینے کا حکم دیا اور بتایا کہ ہم یعنی مسلمان کبھی ذلیل نہیں ہو سکتے کیونکہ ہمارا مولیٰ اور مددگار اللہ ہے۔ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے :

ذالک بان اللہ مولی الذین آمنوا وان الکافرین لا مولی لھم

اللہ اہل ایمان کا مددگار ہے اور کافروں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔

علامہ آلوسی نے یہ لطیف بات بتائی ہے کہ یہ فقرہ دو طرح سے پڑھا گیا ہے۔ ایک صورت تو وہی ہے جو آپ دیکھ رہے ہیں یعنی بل اللہ میں اللہ کی ہ پر پیش ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ کفار تمہارے کارساز نہیں ہیں کہ تم ان کی اطاعت کرو اور نہ وہ تمہارے مددگار ہیں بلکہ اللہ تمہارا مددگار ہے۔ اس صورت میں یہ جملہ اسمیہ ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اللہ کی ہ پر زبر پڑھو اور اسے فعل محذوف کا مفعول بناؤ۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ ان کفار کی اطاعت نہ کرو بلکہ اس اللہ کی اطاعت کرو جو تمہارا آقا و مالک ہے۔ مولانا عثمانی کا میلان دوسری طرف ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم کفار کی اس لیے اطاعت کرتے ہو کہ ان سے تمہیں مدد ملے گی۔ یہ نادانی ہے کیونکہ یہ تو خود عاجز ہیں تمہیں تو اللہ کی اطاعت کرنی چاہیے کہ وہ فی الواقع کارساز و مددگار ہے۔

رُعب وہیبت اور اس کی وجہ

۲۶۹۔ عنقریب وہ وقت آرہا ہے جب ہم اہل کفر کے دلوں میں ہیبت ڈال دیں گے۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کے ساتھ ان کو شریک کیا ہے جن کے شریک ہونے پر اللہ نے کوئی دلیل نازل نہیں کی ہے اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ ظالموں کی قیامگاہ بہت بُری ہے۔ یہ تو تمہارا امتحان تھا۔ اب کافروں کے دل میں ایسی ہیبت اور رُعب ڈالیں گے کہ وہ باوجود تمہارے زخمی اور کمزور ہونے اور نقصان اٹھانے کے تم پر پلٹ کر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکیں۔ چنانچہ یہی ہوا۔ ابوسفیان اپنی فوج لے کر بے نیل مرام میدان سے بھاگا۔ راستہ میں ایک مرتبہ خیال بھی آیا کہ ایک تھکی ماندہ زخم خوردہ فوج کو ہم یوں ہی آزاد چھوڑ کر چلے آئے۔

چلو پھر واپس ہو کر ان کا کام تمام کر دیں مگر ہیبت حق اور رعب اسلام کے اثر سے ہمت نہ ہوئی کہ اس خیال کو عمل میں لا سکے برخلاف اس کے مسلمان مجاہدین نے حمراء الاسد تک ان کا تعاقب کیا اور اس کے بعد کبھی موقعہ نہ دیا کہ احد کے واقعات کا اعادہ ہو سکے۔ مشرک خواہ کتنا ہی زور دکھائے اس کا دل کمزور ہوتا ہے جیسا معبود ویسے عابد ضعف الطالب والمطلوب اور ایسے ہی اصل زور قوت تو اللہ کی تائید و امداد سے حاصل ہے جس سے کفار و مشرکین بلا شبہ محروم ہیں۔ اسی لیے جب تک مسلمان مسلمان رہے ہمیشہ کفار ان سے خائف و مرعوب رہے بلکہ ہم آج تک مشاہدہ کرتے ہیں کہ باوجود مسلمانوں کے سخت انتشار و تشتت اور ضعف و تنزل کے دنیا کی تمام کافر طاقتیں اس سوئے ہوئے زخمی شیر سے ڈرتی رہتی ہیں اور ہمیشہ فکر رکھتی ہیں کہ کہیں یہ شیر بیدار نہ ہو جائے۔ علمی اور مذہبی مناظروں میں بھی اسلام کا یہی رعب مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ حدیث میں آپ نے فرمایا کہ میرا رعب ایک ماہ کی مسافت سے دشمنوں کے دل میں ڈال دیا جاتا ہے بے شک اسی کا اثر ہے جو امت مسلمہ کو ملا۔[1]

تاریخ کی بے لاگ عدالت کا فیصلہ ہے کہ احد کے میدان میں باوجود اہل ایمان کو اس قدر نقصان پہنچانے کے کفار کے دلوں میں مسلمانوں کا رعب تھا ان کو صاف معلوم ہو گیا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بقید حیات ہیں اور ابوبکر و عمر زندہ ہیں جیسا کہ صحیح بخاری کی اس حدیث سے ظاہر ہے جو اوپر ہدیہ ناظرین کی جا چکی ہے۔ اس کے باوجود ابوسفیان نے جب دیکھا کہ مسلمان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے گرد جمع ہو گئے تو اس نے اپنی بہتری اس میں دیکھی فوراً مکہ کی راہ لے۔ اور رعب کی وجہ سے ابوسفیان اگلے سال باوجود وعدے کے مقابلہ کے لیے نہ آیا اور جنگ احزاب میں جب دس ہزار آدمیوں کو لے کر آیا تب بھی راتوں رات یہ عظیم الشان لشکر جس کے سامنے مسلمانوں کی کوئی حقیقت نہ تھی بھاگ اٹھا اور پھر اس کے بعد تو ایسے مرعوب ہوئے کہ نہ صرف خود ان کے حملوں کا انقطاع ہو گیا بلکہ جب ۸ھ میں ان کی عہد شکنی کی وجہ سے حضور انور دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ کی طرف روانہ ہوئے تو کوئی مقابلہ نہ کر سکے۔

حضور انور کا رعب آپ کے خصائص میں سے ہے

جس حدیث کی طرف شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں اشارہ کیا ہے وہ صحیحین میں حضرت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جابر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اس طرح آئی ہے :

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے پانچ چیزیں ایسی دی گئی ہیں جو مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کو نہیں دی گئیں ہیں۔ مجھے رُعب اور دھاک کے ذریعے فتح و نصرت دی گئی، میرے لیے تمام رُوئے زمین مسجد بنادی گئی۔ غنیمت کا مال میرے لیے حلال کیا گیا اور مجھ سے پہلے کسی پیغمبر کے لیے حلال نہ تھا۔ شفاعت کا مرتبہ عنایت ہوا۔ مجھ سے پہلے انبیاء خاص اپنی اپنی قوموں کی طرف مبعوث ہوتے تھے اور میں تمام دُنیا کے لیے مبعوث ہو کر آیا ہوں۔

ہم یہاں صرف "رُعب و نصرت" کے موضوع پر قرآن و حدیث کی روشنی میں ایک اجمالی نظر ڈالنا چاہتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پہلے جو انبیاء دُنیا میں آئے وہ دو قسم کے تھے یا وہ بظاہر کمزور بے یار و مددگار رہتے اور ان کو دنیوی طاقت کا کوئی حصّہ عطا نہیں ہوا تھا۔ انبیاء کی بڑی تعداد ایسی تھی۔ دوسرے وہ انبیاء ہیں جن کو دُنیا کی ظاہری طاقت بھی دی گئی اور وہ صرف چند ہیں، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد اور حضرت سلیمان مگر ان میں سے کسی کو بھی رُعب و ہیبت کا انعام عطا نہیں ہوا اور تاریخ اس بیان پر شاہد ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا آغاز اگرچہ ابراہیمی بیچارگی اور مسیحی غربت سے ہوا مگر انجام موسوی طاقت داؤدی سلطنت اور سلیمانی شان و شکوہ پر ہوا۔ اور ان سب ما فوق یہ تھا کہ آپ کی تمام تر قوت، طاقت، رُعب و ہیبت سب خدا کی راہ میں صرف ہوتی۔ اس سے گم گشتوں نے راستہ پایا۔ بھولوں نے یاد کیا، سننے والوں نے آواز دی اور یہ اثر پیدا ہوا کہ آپ جس راستے سے نکل گئے گنہ گار اور مجرم سر طاعت خم کر دیتے اور اپنی سیہ کاریوں پر ندامت کا اظہار کرتے۔ متعدد حدیثوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا مجھے فتح و نصرت، رُعب و ہیبت دی گئی ہے۔ علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں فنون جنگ پر بحث کرتے ہوئے نہایت خوبی سے بتایا ہے کہ لڑائیوں میں کسی ایک فریق کی جو فتح ہوتی ہے وہ اسی وقت ہوتی ہے جب دوسرے فریق پر پہلے کی خداداد مرعوبیت چھا جاتی ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ شرف اس لیے عطا ہوا ہے کہ مزید خونریزی کے بغیر ملک میں امن و امان ہو جائے اور صدائے حق کے لیے راستہ صاف ہو جائے۔ اللہ سبحانہٗ نے اس

آیت میں یہ وصف عطا کرنے کا وعدہ فرمایا چنانچہ یہ وعدہ پورا ہوا اور قرآن نے اس کی شہادت دی۔
وقذف فی قلوبھم الرعب بڑے بڑے دل گردے کے بہادر زرہ میں تلوار بجا بجا کر آتے مگر جب رُوئے روشن پر نظر پڑتی تو کانپ کر رہ گئے۔ بڑے بڑے سرکش قبائل آپ کا نام سن کر دم بخود ہو جاتے۔ مدینہ کے آس پاس کے یہود جو بڑے بڑے قلعوں میں بیٹھ کر فرمانروائی کرتے تھے اور جن کو اپنی فوجی قوت اور طاقت پر ناز تھا جب انہوں نے سرتابی کی بے لڑے بھڑے آپ کے سامنے اطاعت کی گردن ڈال دی۔ خیبر کے قلعہ نشین یہود جو سب سے زیادہ مضبوط تھے جب ایک صبح ان کے قلعوں کے سامنے دفعتہً اسلام طلوع ہوا تو ان کے منہ سے بے ساختہ چیخ نکل گئی کہ "محمد کا لشکر" ابوسفیان جو بارہا ایک فریق مقابل کی حیثیت سے میدان جنگ میں فوجوں کے پرے لگاتا رہا فتح مکہ کے دن جب حضرت عباس اس کو لے کر اسلام کے موجزن دریائے الہٰی کا نظارہ دکھا رہے تھے اور رنگ برنگ کے علم نگاہوں کے سامنے سے گزر رہے تھے تو ہر نئے دستہ اور نئے علم کو دیکھ کر کانپ کانپ اٹھتا تھا۔

ہیبت حق است ایں از خلق نیست
ہیبت ایں مرد صاحب دلق نیست (رومی) [1]

اور یہ جو فرمایا کہ نبوت کے مدمقابل ہونے کی وجہ یہ تھی اشرکوا باللہ تو امر واقعہ یہ ہے کہ نزول قرآن کے وقت اہل ایمان کی جو جماعت پیدا ہو گئی تھی اس کے مقابلے میں مشرکین عرب کا یہی حال تھا۔ وہ تعداد میں بہت اور سروسامان میں طاقتور تھے مگر اللہ پر ایمان و یقین کی دولت سے محروم تھے۔ مسلمان تعداد میں تھوڑے اور سروسامان سے محروم تھے مگر ایمان و یقین کی روح سے معمور تھے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ قلت کی ہیبت سے کثرت کے دل کانپ اٹھے اور مٹھی بھر انسانوں نے عرب کی پوری دنیا کو شکست دے دی۔ اور اس فقرے کو مرعوبیت کی دلیل بنا کر اس اجتماعی قانون کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ جن لوگوں کے سامنے ایمان و یقین کی کوئی روشن و ثابت حقیقت نہیں ہوتی اور خدا کو چھوڑ کر اعتقاد و پرستش کے بہت سے ٹھکانے بنا لیتے ہیں ان کے اندر عزم و یقین کی وہ روح پیدا نہیں ہو سکتی جو اہل حق و ایمان کے لیے مخصوص ہے۔ وہ جب کبھی کسی ایسی جماعت کے مقابلے میں نکلیں گے جو ایمان و یقین کی روح سے معمور

[1] سیرۃ النبی

ہو گی تو خواہ وہ کتنی شان و شوکت رکھتے ہوں لیکن کبھی اسے مرعوب نہ کر سکیں گے۔

اُحد میں وعدۂ نصرت پورا ہو گیا تھا

۱۵۲۔ اور دیکھو یہ حقیقت ہے کہ اللہ نے اپنا وعدۂ نصرت سچا کر دکھایا تھا جب کہ تم اس کے حکم سے بیدریغ قتل کر رہے تھے۔ نبی کریم نے پہلے ہی فرما دیا تھا کہ اگر صبر و استقلال سے کام لوگے حق تم کو غالب کرے گا۔ چنانچہ اللہ سبحانہٗ نے اپنا وعدہ ابتداء جنگ میں سچا کر دکھایا۔ انہوں نے خدا کے حکم سے کفار کو مار مار کر ڈھیر کر دیا۔ سات یا نو آدمی جن کے ہاتھ مشرکین کے جھنڈے تھے سب وہیں کھیت ہوئے آخر بدحواس ہو کر بھاگے۔ مسلمان فتح و کامرانی کا چہرہ صاف دیکھ رہے تھے اور اموالِ غنیمت ان کے سامنے پڑے تھے کہ تیر اندازوں کی غلطی سے خالد بن الولید نے فائدہ اٹھایا اور یک بیک لڑائی کا نقشہ بدل دیا جیسا کہ ہم پہلے بتا چکے ہیں۔[1]

یہ گویا ایک شبہ کا جواب ہے کہ اگر خیر الناصرین نے امداد و اعانت کا وعدہ فرمایا تھا تو پھر اُحد میں یہ ہزیمت اور شکست کیوں ہوئی۔ اس کے جواب میں اللہ سبحانہٗ ارشاد فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنا وعدۂ نصرت اس موقعہ پر بھی پورا کر دیا۔ اس وعدہ سے عام وعدۂ نصرت مراد ہے اور کچھ کی رائے ہے کہ وہ وعدہ مراد ہے جو بلیٰ ان تصبروا و تتقوا میں کیا گیا تھا۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ وعدہ سے حضور انور کا وہ وعدہ مراد ہے جو آپ نے اُحد میں آغازِ جنگ میں کیا تھا۔ کہ اگر تم صبر و استقلال سے کام لوگے تو اللہ سبحانہٗ تم کو غالب کرے گا۔ حافظ ابن جریر کا میلان بھی اسی طرف ہے اور شیخ الاسلام نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے۔ آیت میں نصرت کا وعدہ پورا کرنے کی عالمِ واقعات میں صورت یہ بتائی ہے کہ اذ تحسونھم باذنہٖ حس کے معنے قتل کے آتے ہیں جنہیں مقتول کر کہتے ہیں۔ مسلمانوں کا کافروں کو قتل کرنا اور یہاں تک قتل کرنا کہ وہ میدانِ جنگ سے بھاگ اُٹھے۔ تاریخی واقعات ہیں۔ کفار کے لشکر کو مسلمانوں نے یہاں تک تہ تیغ کیا کہ ان کا صاحبِ لواء مارا گیا بلکہ نو آدمی جن کے ہاتھ میں جھنڈا تھا سب یکے بعد دیگرے مارے گئے اور یہ بھی تاریخ سے معلوم ہوا ہے کہ ان میں اس قدر لوگ زخمی ہو گئے تھے کہ آخر سواریوں کے ناکافی ہونے کی وجہ سے ایک دوسرے کو پیٹھ پر اٹھا کر لے گئے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اور کچھ عیسائی مورخین کا یہ لکھنا کہ یہ شکست نہیں بلکہ قریش کی ایک جنگی چال تھی حقائق سے چشم پوشی ہے۔ کوئی واقعہ جنگ اس کی تائید نہیں کرتا۔ جن کی تباہی کے لیے اس قدر سامان جنگ لے کر آئے ان کو اسی طرح چھوڑ کر چلے جانا صاف بتاتا ہے کہ یہ کوئی چال نہ تھی۔ حقیقت اور امر واقعہ یہ ہے کہ مشرکین ہزیمت اور شکست سے دوچار ہو چکے تھے۔ اگر مسلمانوں کی غلطی سے خالد بن ولید فائدہ نہ اٹھاتے۔ مسلمانوں سے کیا غلطی ہوئی۔ اسی کا قرآن نے آگے جواب دیا ہے۔

فشل، تنازع اور عصیان کا نتیجہ

۱۷۱۔ مگر جب تم نے کمزوری دکھائی اور اس معاملہ میں باہم جھگڑنے لگے اور باوجودیکہ اللہ نے تمہیں تمہاری محبوب چیز یعنی فتح کا جلوہ دکھا دیا تھا تم نافرمانی کر بیٹھے۔ یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو حکم تیراندازوں کو دیا تھا اس کے خلاف کیا اور آپس میں جھگڑنے لگے۔ کوئی کہتا تھا کہ ہمیں یہیں جمار رہنا چاہیے۔ اکثر نے کہا کہ اب یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں چل کر غنیمت حاصل کرنی چاہیے۔ آخر اکثر تیرانداز اپنی جگہ چھوڑ بیٹھے۔ مشرکین نے اسی راستہ سے دفعۃً حملہ کر دیا۔ دوسری طرف حضور کے قتل کی خبر مشہور ہوئی ان چیزوں نے قلوب میں کمزوری پیدا کر دی جس کا نتیجہ فشل و جبن کی صورت میں ظاہر ہوا گویا فشل کا سبب تنازع اور تنازع کا سبب عصیان تھا۔[1]

مطلب یہ ہے کہ منافق جنگ احد کی شکست یاد دلا کر تمہیں ڈراتے ہیں تاکہ آئندہ دشمنوں کے مقابلہ کی جرأت نہ کرو۔ لیکن تم اچھی طرح جانتے ہو کہ احد کے میدان میں جو کچھ پیش آیا اس کی حقیقت کیا ہے؟ خدا کا وعدۂ نصرت اس موقعہ پر بھی پورا ہوا اور دشمنوں کے قدم اکھڑ گئے تھے لیکن جب تم نے عین میدان جنگ میں حکم رسول کی نافرمانی کی اور ایک گروہ مال غنیمت لوٹنے کی خاطر مورچہ چھوڑ کر تتر بتر ہو گیا تو میدان جنگ کی ہوا پلٹ گئی۔ اور فتح نے شکست کی صورت اختیار کر لی۔ لہٰذا یہ جو کچھ ہوا دشمنوں کی طاقت و کثرت سے نہیں ہوا بلکہ خود تمہاری نافرمانی سبب ہمتی آپس کے جھگڑے سے ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ دشمنوں کی طاقت و کثرت سے مرعوب ہو بلکہ یہ ہونا چاہیے کہ اپنے اندر صبر و تقویٰ کی سچی روح پیدا کرو۔[2]

اس آیت میں یہ بات کھول دی کہ ما تحبون وہ چیز جو تمہیں پسند اور محبوب تھی یعنی فتح تین باتوں

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن

کی وجہ سے آئی ہوئی واپس ہوگئی۔ وہ تین باتیں یہ ہیں۔ فشل، تنازع فی الامر اور عصیان۔
فشل کے معنے سست پڑجانے، ڈھیلے پڑجانے اور کمزوری دکھانے کے ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ جہاں وہ چھ باتیں بتائی ہیں جو فتح و کامرانی کا اصلی سرچشمہ ہیں وہاں بتایا ہے کہ ثابت قدم رہو، اللہ کو بہت یاد کرو۔ اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کرو، باہمی نزاع سے دور رہو ورنہ بے ہمت اور سست پڑجاؤ گے۔ مشکلات کا خندہ پیشانی سے استقبال کرو۔ غور کرو اُحد میں ان چھ باتوں سے کیسی بے رُخی برتی گئی۔ غنیمت کو دیکھ کر یادِ الٰہی سے غفلت ہوئی اور جہاں جم جانے کا حکم ہوا وہاں سے ہٹ گئے۔ حضور انور نے اس سلسلہ میں جو حکم دیا کہ

تم کو اپنی جگہ نہیں چھوڑنا۔ اگر تم دیکھو کہ ہم ان پر غالب آگئے تم اپنی جگہ نہ چھوڑو۔ اگر دیکھو کہ وہ ہم پر غالب آگئے ہیں تو تم ہرگز ہماری مدد کے لیے نہ آنا۔[1]

تم نے اس ارشادِ گرامی کی تاویل کرکے اس کی مراد میں باہم تنازعہ کر لیا اور اس کے نتیجہ میں اللہ کے رسول کی طاعت کا دامن تمہارے ہاتھ سے چھوٹ کر عصیان کی بھیانک شکل نمایاں ہوگئی۔ بالآخر تم میں سستی آگئی اور تم بے ہمت ہو کر رہ گئے اور بنی بنائی بات آنکھوں دیکھتے دیکھتے بگڑ گئی۔

اس میں اس قانونِ اجتماعی کی طرف اشارہ ہے کہ فشل، تنازعہ اور عصیان وہ جراثیم ہیں جن کے نتیجہ میں صرف ناکامی نہیں بلکہ آئی ہوئی کامیابی بھی واپس ہو جاتی ہے خواہ یہ جراثیم کہیں ہوں ہم تو کس گنتی کے بھتوے ہیں اس معاملہ میں تو قانون نے ان کا بھی لحاظ نہیں کیا جن کے اعمالِ صالحہ اور فضائل و اخلاق دُنیا کی ساری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے۔ جن کے درجات اور علوِ ہمت پر خود قرآن گواہ ہے۔

عشقِ رسُول کی قرآن میں اہمیت

۲۷۲۔ کچھ تم میں سے دُنیا کے طالب تھے اور کچھ تم میں سے آخرت کی خواہش رکھتے تھے یعنی کچھ لوگ دنیوی متاع مالِ غنیمت کی خوشی میں پھسل پڑے جس کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑا۔ حضرت عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے میں نے کبھی محسوس نہیں کیا

[1] صحیح بخاری۔

تھا کہ ہم میں کوئی شخص دنیا کا طالب بھی ہے[1] ان الفاظ میں سب کا نہیں بلکہ ان پچاس کا چھٹ پیش کیا ہے جو تیر اندازی پر متعین کیے گئے من یرید الدنیا وہ لوگ ہیں جو مالِ غنیمت کو حاصل کرنے کے لیے اپنی جگہ چھوڑ بیٹھے اور حکم کی نافرمانی کی اور من یرید الاخرۃ میں عبداللہ بن جبیر اور ان کے وہ ساتھی جنہوں نے اپنی جگہ نہیں چھوڑی۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے جب از روئے قانون مالِ غنیمت حلال ہے اور تقسیم کے وقت میں سب کو حصہ ملتا ہے تو ان پچاس تیر اندازوں میں سے چالیس نے یہ سمجھ کر کہ فتح ہو چکی، دشمن پاؤں سر پر رکھ کر بھاگ رہا ہے مالِ غنیمت لینے کا ارادہ کیا اور اس کے لیے عملاً قدم بھی اٹھا دیا تو اس میں ایسی کون سی سنگینی ہے جس کی وجہ سے قرآن نے ان مقدسین کو طالب دنیا اور اس کا مرید کہا ہے۔ اس کا جواب بہتوں نے دیا ہے مگر جو لطافت حضرت مولانا اشرف علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے بیان میں ہے وہ اور کہیں نہیں ہے۔ فرماتے ہیں،

آیت میں دنیا بالذات مراد نہیں ہے اور اس پر قرینہ عقلی یہ ہے کہ اگر یہ حضرات مالِ غنیمت جمع بھی نہ کرتے پھر بھی اختتامِ جنگ پر حسبِ قانونِ شرعی یقیناً وہ شریک اور مستحق غنیمت ہوتے اس سے معلوم ہوا کہ ان کے اس اقدام میں بھی آخرت ہی مقصود تھی کہ مورچہ کی حفاظت کا ثواب حاصل کرنے کے بعد ترہیب و تخریب کا ثواب بھی حاصل کریں۔ لیکن چونکہ ثواب حاصل کرنے کا یہ طریق نص اور ارشادِ نبوت کے خلاف تھا۔ اس لیے قابلِ ستائش نہیں ہے۔ اگرچہ خطائے اجتہادی کی وجہ سے ان کو قانون کا مجرم نہ کہا جائے گا۔ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے عبداللہ بن مسعود کے اس بیان کا جس کا حوالہ شیخ الاسلام نے دیا ہے مطلب یہ بتایا ہے کہ پوری جماعت صحابہ میں ایک شخص بھی ان چالیس کے علاوہ کوئی طالبِ دنیا نہ تھا اور یہ چالیس بھی صرف اس روز اور اس وقت اور بس۔

میرے خیال میں بات کچھ اور ہے انداز سخن اور پیرایۂ بیان میں یہ سنگینی یقیناً ان ذہنوں کے لیے ضرور بوجھ ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے صحابہ کے تعلقات محض قانونی سمجھتے ہیں بلاشبہ قانونی تعلقات کی حد تک یہ لب و لہجہ سنگین ہے لیکن صحابہ کے حضور سے صرف قانونی تعلقات نہیں بلکہ محبت و وداد کے تعلقات بھی تھے۔ اس لب و لہجہ اور اندازِ بیان میں جذباتی

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

عنصر زیادہ کارفرما ہے۔ بلاشبہ یہ جذباتی عنصر کہیں بھی اس طرح نمایاں طور پر آشکارا نہیں ہوا جتنا مسلمانوں اور ان کے رسول کے درمیان تعلقات کی نوعیت میں۔ دنیا کی تاریخ آپ کے سامنے ہے۔ کسی تحریک کے لیڈر نے آج تک اپنے متبعین کے مودت و محبت کا ایسا استوار اور ناقابل شکست پیمان نہیں لیا جو رسول عربی نے پیروان دعوت سے کیا اور کسی واحد انسان نے نوع انسانی کی مسلسل نسلوں سے متواتر زمان و مکان کے لامحدود بعد کے باوجود کبھی اتنا خراج عقیدت و الفت وصول نہیں کیا جتنا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے لے۔ روسو، مارکس، نطشے سے محبت کیے بغیر ان کے فلسفہ حیات کا اتباع کیا جاسکتا ہے لیکن اسلام کی یہ خصوصیت ہے کہ جب تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کو انتہا درجہ کی محبت نہ ہو۔ آپ خواہ عقلی طور پر اس کی پیش کردہ دعوت کے قائل بھی ہوں۔ آپ صحیح معنوں میں مسلمان کامل نہیں کہلا سکتے۔ عصبیت کی تلخ و تند تعریض کے بعد چاہنے والوں کو یہ بدیا لدنیا کہہ کر گدگدایا ہے۔ اتباع، ڈسپلن، اطاعت ہر ایک لیڈر اپنے پیروکاروں سے ان کی توقع رکھے گا لیکن محبت نہیں بلکہ اجتبت سب سے زیادہ محبت غالباً آج تک کسی نے اپنے پیروؤں سے یہ توقع نہیں رکھی اور نہ ایسا تقاضا کیا۔

نبوت پر صحابہ کی جاں نثاری

۲۷۳- پھر اللہ نے تم کو دشمن کی جانب سے ہٹا دیا تاکہ وہ تم کو آزمائے یعنی یا تو وہ تمہارے سامنے سے بھاگ رہے تھے اب تم ان کے آگے سے بھاگنے لگے، تمہاری غلطی اور کوتاہی سے معاملہ الٹ گیا اور اس میں بھی تمہاری آزمائش تھی تاکہ پکے اور کچے صاف ظاہر ہو جائیں لے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا رخ دشمنوں کی طرف سے پھرا دیا تاکہ تمہیں اس حادثہ سے آزمائیں۔ یہ دنیا دار ابتلا ہے یہاں کبھی فتح و نصرت میں امتحان ہوتا ہے اور کبھی مصائب و آلام کے ذریعے امتحان ہوتا ہے۔ کامیابی کی غرض یہ ہوتی ہے کہ دیکھیں کہاں تک شکر بجا لاتے ہیں اور مصائب و آلام اور ناکامی اس لیے آتی ہے کہ پتہ لگ جائے کہاں تک صبر کرتے ہیں۔

یہ تعبیر کس قدر جذبات محبت سے لبریز ہے یہ نہیں فرمایا کہ جب تم کافروں کے مقابلے میں پسپائی اختیار کر گئے تھے بلکہ فرمایا کہ جب تم کو اللہ تعالیٰ نے کافروں سے ہٹا دیا تھا۔ ہٹانا اللہ نے

لے افادات شیخ الاسلام

اپنی طرف اس لیے منسوب کیا کہ جب ایک گروہ نے غلطی کی اور اس غلطی کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑا تو چونکہ یہ ایک غلطی کی سزا تھی جو اللہ نے دی اس لیے اس کی نسبت اللہ نے اپنی طرف کی ہے اور اس کی غرض یہ تھی کہ اہل کمال کے کمالات کا اظہار ہو جائے اور جن میں کمزوری ہے ان کی کمزوری بے نقاب ہو جائے۔ چنانچہ جانفشانی، جواں مردی، شجاعت اور ہمت کا جو مظاہرہ صحابہ نے کیا اس کی نظیر تاریخ میں ملنی مشکل ہے۔ باوجود اس خبر کے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کو پیارے ہو گئے۔ وہ دشمن کے مقابلہ سے رُکے نہیں اور قتال میں مصروف رہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ابن قمیہ حملہ آور ہوتا ہے تو مصعب بن عمیر حضور انور کی حفاظت میں اپنی جان دے دیتے ہیں۔ ایک شخص تلوار کا وار کرتا ہے تو طلحہ اپنا ہاتھ کٹوا دیتے ہیں اور حضور انور پر آنچ نہیں آنے دیتے۔ عشاقِ نبوت ایک آہنی دیوار سے زیادہ مضبوط دیوار کی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اس آہنی دیوار میں سے جب ایک شخص گرتا ہے تو دوسرا فوراً اس کی جگہ لے لیتا ہے اور دشمن اپنی آہنی سخت گرفت کے باوجود حضور انور تک پہنچنے میں ناکام رہتا ہے۔ ابودجانہ کون ابودجانہ وہی جو آغاز جنگ میں مبارزت کے لیے اکڑتے ہوئے نکلے تھے اور حضور نے ان کی چال کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ یہ چال اللہ کہیں اور کبھی پسند نہیں کرتا مگر ابودجانہ کی یہ چال اللہ کو پسند ہے دشمن کی طرف پیٹھ کر کے حضور انور کے سامنے ڈھال بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں سوچئے کہ صرف دس پندرہ آدمیوں کے بھاگ جانے پر کیا سات سو صحابہ پر کوئی عقلمند آدمی بزدلی کا الزام لے سکتا ہے اسی لیے فرمایا کہ تم نہیں ہٹے اللہ نے تم کو دشمن سے ہٹا دیا اور اس لیے ہٹایا تھا کہ اللہ کے قانونِ آزمائش کا تقاضا پورا ہو جائے۔

غیر مشروط معافی کا پروانہ

۴۷۔۲۔ بلاشبہ فی الواقع اللہ نے تم کو معاف کر دیا اور اللہ تو اہلِ ایمان پر بڑی مہربانی والا ہے یعنی جو غلطی ہوئی اللہ نے اسے بالکل معاف کر دیا اب کسی کو جائز نہیں ہے کہ ان پر اس حرکت کی وجہ سے طعن و تشنیع کرے اور اللہ تو اہلِ ایمان پر بہت ہی مہربان ہے یعنی ان کی کوتاہیوں کو معاف کر دیتا ہے اور عتاب میں لطف و شفقت کا پہلو ملحوظ رکھتا ہے [1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام۔

اس آیت سے صحابہ کے حال پر بڑی عنایت معلوم ہوتی کہ عتاب میں چند در چند تسلیاں دی جارہی ہیں ایک یہ کہ یہ سزا نہ تھی بلکہ اس میں تمہاری مصلحت تھی۔ پھر مواخذہ آخرت سے معافی کا اعلان کر کے بے فکر کر دیا۔[1]

آیات کی تشریحات ختم ہو چکی ہیں۔ لیکن ان سے جو اجتماعی قوانین دلالۃً معلوم ہو رہے ہیں لیجئے ان پر بھی ایک اچٹتی نظر ڈال لیجئے یہ آیات بتا رہی ہیں کہ

۱۔ امیر کی مخالفت اور اس کی نافرمانی کا خمیازہ سب کو بھگتنا پڑتا ہے۔

۲۔ پیغمبر کی عدول حکمی خواہ عوام کی جانب سے ہو مگر عتاب میں خواص بھی مبتلا ہو جاتے ہیں۔

۳۔ عصیان سے نعمت سلب ہو جاتی ہے جیسا کہ فتح کی نعمت ہاتھ سے جاتی رہی۔

۴۔ جس طرح ایک نیکی سے دوسری نیکی کی توفیق ہوتی ہے ایسے ہی ایک غلطی سے بہت سی غلطیوں کے لیے راہ ہموار ہو جاتی ہے۔

۵۔ دنیا کی رغبت بعض دفعہ بہت سی خطاؤں کا باعث ہو جاتی ہے۔

۶۔ اجتہادی غلطی قابلِ عفو ہے بلکہ حدیث میں اجر کی بھی بشارت آئی ہے۔

۷۔ صحابہ کرام کا اللہ سبحانہٗ کے یہاں بہت اونچا مقام ہے۔

۸۔ دنیوی مصائب کفارۂ سیئات کا کام دیتے ہیں اور اخروی گرفت کو ہٹا دیتے ہیں۔

---

[1] بیان القرآن

إِذْ تُصْعِدُونَ وَلَا تَلْوُونَ عَلَىٰ أَحَدٍ وَالرَّسُولُ يَدْعُوكُمْ فِي
أُخْرَاكُمْ فَأَثَابَكُمْ غَمًّا بِغَمٍّ لِّكَيْلَا تَحْزَنُوا عَلَىٰ مَا فَاتَكُمْ وَلَا مَا
أَصَابَكُمْ ۗ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ۞ ثُمَّ أَنزَلَ عَلَيْكُم مِّن
بَعْدِ الْغَمِّ أَمَنَةً نُّعَاسًا يَغْشَىٰ طَائِفَةً مِّنكُمْ ۖ وَطَائِفَةٌ قَدْ
أَهَمَّتْهُمْ أَنفُسُهُمْ يَظُنُّونَ بِاللَّهِ غَيْرَ الْحَقِّ ظَنَّ الْجَاهِلِيَّةِ ۖ
يَقُولُونَ هَل لَّنَا مِنَ الْأَمْرِ مِن شَيْءٍ ۗ قُلْ إِنَّ الْأَمْرَ كُلَّهُ لِلَّهِ ۗ
يُخْفُونَ فِي أَنفُسِهِم مَّا لَا يُبْدُونَ لَكَ ۖ يَقُولُونَ لَوْ كَانَ لَنَا مِنَ
الْأَمْرِ شَيْءٌ مَّا قُتِلْنَا هَاهُنَا ۗ قُل لَّوْ كُنتُمْ فِي بُيُوتِكُمْ لَبَرَزَ الَّذِينَ
كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقَتْلُ إِلَىٰ مَضَاجِعِهِمْ ۖ وَلِيَبْتَلِيَ اللَّهُ مَا فِي صُدُورِكُمْ
وَلِيُمَحِّصَ مَا فِي قُلُوبِكُمْ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۞

اس وقت کو یاد کرو جب تم چڑھے جا رہے تھے اور کسی کو تم پلٹ کر بھی
نہ دیکھتے تھے اور رسول تمہارے پیچھے تم [۲۸۵] کو پکار رہا تھا۔ پھر اللہ نے

تم کو ایک غم کے بدلے دوسرا غم دے دیا تاکہ تم آئندہ کسی چیز کے
ہاتھ سے نکل جانے اور کسی مصیبت کے پیش آنے پر غمگین نہ ہو
اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پورا باخبر ہے[۲۸۶]۔ پھر اللہ نے
اس رنج کے بعد تم پر اطمینان نازل کیا یعنی نیند جو تم میں سے ایک
گروہ پر بالکل چھا رہی تھی[۲۸۷]، اور ایک کو صرف اپنی ہی فکر دامنگیر
تھی[۲۸۸]۔ یہ لوگ اللہ کے بارے میں ناحق زمانۂ جاہلیت کے گمان کر رہے
تھے[۲۸۹]۔ یہ گروہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا اس میں ہمارے اختیار کی کیا بات
تھی[۲۸۰]۔ اے پیغمبر تم ان سے کہہ دو اسی پر کیا موقوف ہے سارے
معاملات اللہ ہی کے اختیار میں ہیں[۲۸۱]۔ اصل یہ ہے جو کچھ ان کے
دلوں میں ہے وہ آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے، ان کا اصل
مطلب یہ ہے کہ اگر قیادت کے اختیارات ہمارے قبضہ میں ہوتے
تو ہم یہاں نہ مارے جاتے[۲۸۲]۔ ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں

میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کا مارا جانا لکھا ہوا تھا وہ ضرور اپنی قتل گاہوں تک پہنچ جاتے۔[283] اور یہ صورت حال تو اس لیے پیش آئی ہے کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں چھپا ہوا ہے اسے آزمائے یعنی ظاہر کر دے اور جو کچھ کدورتیں تمہارے دلوں میں ہیں ان کو صاف کر دے اور اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو سینوں میں ہے۔[284]

قانونِ آزمائش کے ذریعے تربیت

ان آیات میں جو کچھ بتایا گیا ہے اس کو اچھی طرح سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ اوپر والی آیت پر ایک نظر ڈال لی جائے۔ اوپر فرمایا تھا ثُمَّ صَرَفَكُمْ عَنْهُمْ لِيَبْتَلِيَكُمْ اللہ نے تم کو دشمن سے ہٹا دیا تاکہ تمہارے لیے اپنا قانونِ آزمائش استعمال کرے اس کے بعد یہ واضح فرمایا کہ یہ ابتلا یعنی قانونِ آزمائش اس لیے حرکت میں آیا کہ اللہ نے یہ پسند فرمایا کہ اہلِ ایمان کو سزا دینے کے بجائے ان کو معاف کرے اور ان پر اپنا فضل فرمائے۔ اس کے بعد ان آیات میں غمًا بغم تک اس ابتلا کی تفصیل بتائی ہے۔ بعد ازیں اس ابتلا کا فائدہ بتایا ہے۔

یہ حقیقت الم نشرح ہے کہ ابتلا خدا کا عذاب نہیں بلکہ اس کی رحمت ہے۔ عذاب کا نشانہ کفار ہوتے ہیں اور ابتلا اہلِ ایمان کے لیے ہوتا ہے۔ عذاب کا مقصد کفار کا استیصال ہوتا ہے اور ابتلا کا مقصد اہلِ ایمان کی تربیت ہوتا ہے ایک موت ہے دوسرا زندگی۔ اللہ کا دستور ہے کہ جب تک اللہ تعالیٰ کسی کو باقی رکھنا چاہتا ہے اس وقت تک وہ اس کے جرموں پر اس طرح کی سزا نہیں دیتا جس طرح کی سزا مجرموں اور باغیوں کو دی جاتی ہے بلکہ مختلف آزمائشوں اور امتحانوں کے ذریعے ان کے اندر پیدا ہونے والی بیماریوں کو وہ دور فرماتا رہتا ہے۔

جس طرح جنگ بدر کی فتح مندی سے مسلمانوں کی تربیت مدنظر تھی اسی طرح جنگ اُحد کی عارضی شکست میں بھی تربیت کا پہلو پوشیدہ تھا۔ ایک دوڑنے والے کی مشق کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہوتا کہ بے روک ٹوک دوڑتا چلا جائے بلکہ اس کی بھی ضرورت ہوتی ہے کہ ایک دو مرتبہ گر گر کر گرنے اور سنبھلنے کا بھی سبق سیکھ لے۔ بدر کی فتح مندی نے استعداد و سعی کی برکتیں دکھلا دی تھیں۔ ضرورت تھی کہ اب کمزوری و تغافل کے نتائج کا بھی تجربہ ہو جائے چنانچہ اُحد کے حادثہ نے یہ مقصد پورا کر دیا۔

بدر کی فتح اور تائید الٰہی کی بشارتوں نے بہت سے مسلمانوں میں ایک طرح کی بے پروائی اور غفلت پیدا کر دی تھی۔ وہ سعی و تدبیر کی کاوشوں سے بے نیاز ہو گئے اور سمجھنے لگے تھے کہ ہم کوشش کریں یا نہ کریں ہر حال میں فتح ہماری ہے۔ اس طرح کی خام خیالیاں ابتدائی فتح مندیوں کے بعد پیدا ہو جایا کرتی ہیں لیکن یہ ایک خطرناک حالت ہوتی ہے اس کا نتیجہ غفلت اور بے پروائی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ ضروری تھا کہ اس کی نشو و نما روک دی جائے۔ اُحد کے تجربہ نے مسلمانوں کو بتلا دیا کہ اللہ کی تائید و نصرت کا وعدہ برحق ہے لیکن اس کے تمام کاموں کی طرح اس کی تائید و نصرت کے بھی کچھ قوانین و ضوابط ہیں اور ضروری ہے کہ ان کے مطابق نتائج ظہور میں آئیں۔ جو جماعت کمزوری و غفلت میں مبتلا ہو جاتے گی صبر و ثبات میں پوری نہیں اترے گی طاعت و نظام میں کچی ہو گی وہ اللہ سبحانہ کی نصرت کے قابل نہیں ہو سکتی۔ قرآن نے پہلے بھی اس مصلحت کی طرف اشارہ کیا تھا اور یہاں صراحۃً فرمایا لیبتلیکم اور لیبتلی اللہ ما فی صدورکم ـــــ

حکیم الامت مولانا اشرف علی نے اپنے مخصوص حکیمانہ انداز میں اسی بات کو اس طرح پیش فرمایا ہے۔

یہاں لیبتلیکم میں صحابہ کے حال پر عنایت مترشح ہوتی ہے کہ اس سے اخلاق کی تربیت مقصود تھی تاکہ مصائب کے عادی ہو کر ان میں استقلال و ثبات رونما ہو اور خواص عباد پر جو مصائب آتے ہیں ان میں بھی حکمتیں ہوتی ہیں۔ ابن بلائے دوست تطہیر شما است۔

چونکہ قبض آمد تو در وے بہ بیں　　　تازہ باش و چیں میفگن بر جبیں

چونکہ قبضے آیدت اے راہ رو　　　آں صلاح تست آئس دل مشو

اُحد میں نبوت کی پکار

۲۷۵۔ اس وقت کو یاد کرو جب تم چڑھے جا رہے تھے اور کسی کو تم پلٹ کر بھی نہ دیکھتے تھے اور رسول تمہارے پیچھے تم کو پکار رہا تھا یعنی تم بھاگ کر پہاڑوں اور جنگلوں کو چڑھے جا رہے تھے۔

اور گھبراہٹ میں پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھتے تھے اس وقت خدا کا پیغمبر بدستور اپنی جگہ کھڑا تم کو اس قبیح حرکت سے روک رہا تھا اور اپنی طرف بلا رہا تھا مگر تم شورش و اضطراب میں آواز کہاں سننے والے تھے۔ آخر جب کعب بن مالک چلائے تب لوگوں نے سنا اور واپس آکر اپنے نبی کے گرد جمع ہو گئے۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ جب مسلمانوں کی بڑی تعداد مضطرب ہو کر بھاگ رہی تھی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم چند جان نثاروں کے حلقے میں کھڑے پکار رہے تھے الی عباد اللہ الی عباد اللہ اے اللہ کے بندو کہاں جاتے ہو میری طرف میری طرف آؤ۔ ان آیات میں اسی واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جب مسلمانوں پر اچانک دو طرف سے حملہ ہوا اور ان کی صفوں میں ابتری پھیل گئی تو کچھ لوگ مدینہ کی طرف بھاگ گئے اور اُحد پر چڑھ گئے مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک انچ اپنی جگہ سے نہ ہٹے۔ دشمنوں کا چاروں طرف ہجوم تھا۔ دس بارہ آدمیوں کی مٹھی بھر جماعت پاس رہ گئی تھی مگر اللہ کا رسول اس نازک موقعہ پر بھی پہاڑ کی طرح اپنی جگہ جما ہوا تھا اور بھاگنے والوں کو پکار رہا تھا الی عباد اللہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت

اس آیت میں اُحد میں جس منظر کو پیش کیا گیا ہے وہ بے حد دردناک ہونے کے ساتھ خطرناک بھی ہے مسلمان دشمن کی زد میں آکر بھاگ رہے ہیں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ان کو آواز دے رہے ہیں۔ ایسے خطرناک موقعہ پر اپنے آپ کو سنبھالنا، اپنے آپ کو آگے بڑھانا، دشمن کے حملہ کی زد میں اپنے کو کر دینا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال شجاعت کی غمازی کر رہا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اللہ کی مدد پر کس قدر اعتماد تھا کہ میدان جنگ میں دشمن کے غلبہ کے وقت آپ سب سے آگے ہو کر گویا دشمن کو اپنے اوپر حملہ کرنے کی دعوت دیتے ہیں اور آپ نے صرف یہی نہیں کہ آواز دی بلکہ آپ خود صحابہ کی ایک جماعت کے ساتھ اس گھیرے سے باہر نکلنے کے لیے سامنے آئے جو مشرکین کی فوجوں نے مسلمانوں کے گرد ڈال رکھا تھا۔ اس طرح آپ نے دنیا کے سامنے یہ نمونہ پیش کر دیا کہ ایک جرنیل کو میدان جنگ میں کامیابی حاصل کرنے کے لیے اپنے آپ کو اس طرح آگے کرنا چاہیے اور اپنے سپاہیوں کو یہ دکھانا چاہیے کہ وہ جان کی کچھ پرواہ نہیں کرتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اس آواز ہی کا نتیجہ تھا کہ مسلمانوں نے آپ کے گرد جمع ہونا شروع

---

[1] افادات شیخ الاسلام تفہیم القرآن

کیا اور ان کی منتشر جمعیت مجتمع ہو گئی۔ گویا اس طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو اس مضبوط نرغے سے بچانے میں کامیاب ہو گئے۔ حضرت علی مرتضیٰ نے آپ کی شجاعت کا نقشہ اس طرح پیش فرمایا ہے :

جب میدان جنگ گرم ہوتا اور گھمسان کی جنگ ہوتی تو ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کے ذریعے اپنا بچاؤ کرتے۔ آپ ہم میں سب سے زیادہ دشمن کے قریب ہوتے [1]

صحیح مسلم میں صحابہ کا یہ تاثر بھی بتایا گیا ہے کہ :

ہم میں سب سے بہادر وہ سمجھا جاتا تھا جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب کھڑا ہوتا تھا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا تنہا نو اور سات آدمیوں کے ساتھ رہ جانا حدیث سے ثابت ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ باقی سب لوگ بھاگ گئے تھے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ایک طرف اکیلے رہ گئے تھے اور فوج منتشر حالت میں تھی اور اسی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر سخت حملہ ہوا یہاں تک کہ سات آدمی انصار میں سے یکے بعد دیگرے آپ کی حفاظت میں جنگ کرتے ہوئے مارے گئے۔ حضرت طلحہ کے جسم پر ستر زخم آئے اور ان کی انگلیاں بھی کٹ گئیں اور آخر میں جب ابی بن خلف نے حملہ کیا تو آپ نے اپنا نیزہ اسے مارا اور ساتھ ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ :

اشتد غضب اللہ علی من قتل رسول اللہ بیدہ

اللہ غضبناک ہوتا ہے اس پر جسے اللہ کا رسول اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔

اس کے علاوہ آپ نے کبھی کسی جنگ میں کسی کو اپنے ہاتھ سے قتل نہیں کیا۔

حضور نے صحابہ کو کب پکارا ؟

آیت کی تشریح ختم ہے لیکن یدعوکم کے سلسلہ میں ایک ضروری بات رہ گئی ہے وہ یہ کہ آپ کی اس پکار کا وقت کون سا ہے ؟ یعنی جنگ کے کس مرحلہ پر آپ نے لوگوں کو پکارا۔ عام شارحین قرآن نے یہی لکھا ہے کہ صحابہ ہزیمت خوردہ فوج کی طرح سراسیمہ اور بدحواس بھاگے

[1] مسند امام احمد

چلے جاتے تھے اور حضور انور کی وفات کی خبر سن کر اور بھی حواس باختہ ہو گئے۔ ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نشیب میں سے پکارا اس لیے جب آپ کی آواز نہ سنی گئی تو کعب بن مالک نے للکارا چنانچہ کعب کی آواز پر سب جمع ہو گئے۔ چونکہ بات ایسی نامناسب تھی کہ رسول کا پکارنا اور مسلمانوں کا پلٹ کر نہ دیکھنا سنگین جرم تھا۔ اس پر عتاب فرمایا اور تنبیہ کی کہ اگر تم ذرا توجہ کے ساتھ سنتے تو تم کو معلوم ہو جاتا کہ یہ پکار واجب التعمیل ہے۔ لیکن حضرت شاہ صاحب نے اس پکار کا وقت جو بتایا ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجئے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ جب ابتداءً فتح ہوئی اور کافر بھاگے جا رہے تھے تو مسلمانوں نے تعاقب کیا تاکہ ہر کافر جس قدر مال چھوڑ جائیں اچھا ہے کیونکہ ہم ان کا پیچھا کریں گے تو یہ سب سامان چھوڑ کر چلے جائیں گے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس وقت پکار رہے تھے کہ واپس آجاؤ اور غنیمت کے لالچ میں دور نہ جاؤ۔ اگر غور سے دیکھو تو شاہ صاحب کی بات میں معنویت ہے۔ کیونکہ مسلمانوں کی جانب سے مشرکین کی فوج کا تعاقب ہی اس موقع پر ہزیمت کا باعث ہوا ہے۔ نہ وہ تعاقب میں آگے جاتے اور نہ تیر انداز اپنا مورچہ چھوڑتے اور نہ خالد بن ولید خالی مورچہ دیکھ کر حملہ آور ہوتے بہرحال گنجائش دونوں مطالب کی ہے۔

غم بالائے غم کا ابتلاء

۲۷۶۔ پھر اللہ نے تم کو ایک غم کے بدلے دوسرا غم دے دیا تاکہ تم آئندہ کسی چیز کے ہاتھ سے نکل جانے اور کسی مصیبت کے پیش آنے پر غمگین نہ ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس سے پورا باخبر ہے۔ یعنی تم نے رسول کا دل تنگ کیا اس کے بدلے تم پر تنگی آئی۔ غم کا بدلہ غم ملا تاکہ آگے یاد رہے کہ ہر حالت میں حکم رسول پر چلنا چاہیے خواہ کوئی نفع کی چیز مثلاً غنیمت وغیرہ ہاتھ سے جاتے یا کچھ بلا سامنے آتے۔

اکثر مفسرین نے فاثابکم غما بغم کے معنے یوں بتائے ہیں کہ خدا نے تم کو غم پر غم دیا۔ یعنی ایک غم تو ابتداءِ فتح کے فوت ہونے کا تھا۔ دوسرا اپنے آدمیوں کے مارے جانے اور زخمی ہونے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر مشہور ہونے کا کچھ نے یہ مطلب بتایا ہے کہ فتح و کامرانی کے فوت ہونے، غنیمت کے ہاتھ سے نکل جانے اور نقصان جانی و مالی اٹھانے کا جو غم تھا اس کے عوض میں ایک ایسا بڑا غم دیا جس نے سب غموں کو بھلا دیا یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شہادت کی خبر اسی غم کی شدت میں آگے پیچھے کا کچھ ہوش نہ رہا،

حتیٰ کہ حضور کی آواز بھی نہ سنی جیسا کہ ایک طرف ہمہ تن ملتفت ہونے کے وقت دوسری طرف سے ذہول و غفلت پیش آجاتی ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ سبحانہ تمہارے احوال اور نیتوں کو جانتا ہے اور اسی کے موافق معاملہ کرتا ہے[1]

شارحین قرآن کے بیان کردہ مطالب کی طرف شیخ الاسلام نے ایک سرسری اشارہ کر دیا ہے حضور انور کا عصیان حضور انور کے غم کا باعث ہوا۔ یہ عصیان کب رونما ہوا۔ ہزیمت کے وقت میں یا اس وقت جب فتح کی سرشاریوں میں مسلمان فوج مشرکین کا تعاقب کر رہی تھی اور حضور پکار رہے تھے جیسا کہ شاہ عبدالقادر کی رائے ہے۔ عصیان خواہ کسی وقت ہوا ہو اس سے نبوت کو غم ہوا اور نبوت کے اسی غم کی پاداش میں سب کو غم بھگتنا پڑا۔ اور اگر غماً بغم کا یہ مطلب ہو کہ اللہ نے تم کو غم پر غم دیا تو غم بالائے غم ظاہری ہے۔ ابتدائی کامرانی کے فوت ہونے کا غم، پھر مسلمانوں کے مارے جانے اور زخمی ہونے کا غم، پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خبر وفات کا غم۔

صحابہ کرام کی حضور انور سے محبت

اصل بات یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پکار پر الی عباد اللہ انی رسول اللہ دشمن نے اپنے حملہ کا پورا زور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ڈالا۔ آپ کے گرد صرف بارہ صحابہ موجود تھے یعنی ابوبکر، عمر، علی، طلحہ، زبیر، ابو عبیدہ، حارث ابن الصامت اور کچھ دوسرے مسلمان۔ قبل اس کے کہ آپ کی آواز پر دوسرے صحابہ جمع ہوں دشمن نے آپ کو سخت زخم پہنچائے یہاں تک کہ آپ گر گئے۔ ادھر کعب بن مالک کی نگاہ آپ پر پڑی اور انہوں نے پہچان کر للکارا کہ البشرو اخو شجری ہو کہ حضور بقید حیات ہیں۔ اس آواز نے منتشر مسلمانوں کو جمع کر دیا۔ پہلا غم تو یہ تھا کہ دشمن ان کے تعاقب سے بچ گیا اور الٹا ان کو مصیبت میں گرفتار ہونا پڑا مگر اب جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت دیکھی تو سب اپنا غم بھول گئے اور اس کے ساتھ نبوت کے زخم کا چرکہ لگ گیا۔ کیونکہ صحابہ کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے جو محبت تھی وہ ایسی شدید تھی کہ آپ کی تکلیف کو دیکھتے ہی ان کو اپنے سب غم بھول گئے۔ وہاں میدان جنگ میں تو مرد تھے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرادی تکلیف سے بچانے کے لیے اپنی گردنیں کٹانے کو تیار رہتے تھے بلکہ اس میں راحت پاتے تھے۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب آپ پر حملہ ہوا تو آپ کی حفاظت کی خاطر بارہ میں سے سات آدمیوں نے اپنی جانیں قربان کر دیں اور یہ ساتوں انصار تھے۔ مدینہ میں عورتوں نے اپنے رشتہ داروں، بیٹوں، بھائیوں کی شہادت پر افسوس نہیں کیا جب ان کو معلوم ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم زندہ ہیں۔

آگے اس کی حکمت بتائی ہے کہ غم بالاتے غم کے تمہارا تم اس لیے ہوتے تاکہ آئندہ کوئی چیز تمہارے ہاتھ سے جاتی رہے یا زمانہ کی بڑی سے بڑی مصیبتاً افتاد تم پر آجاتے تو تم کو صدمہ نہ ہو اور اس کو برداشت کرنے کے خوگر ہو جاؤ آخر میں بتا دیا کہ اللہ سبحانہ ہر شخص کے اعمال اور اس کی نیت سے باخبر ہے جو کچھ کرو یہ سوچ کر کرو کہ اللہ تعالیٰ کو تمام کاموں کی خبر ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ تم نے رسول کا دل تنگ کیا اس کے بدلے تم پر تنگی آئی تاکہ آئندہ نبی کے حکم پر چلنا تمہیں یاد رہے خواہ کچھ ہو۔

میدانِ جنگ میں نیند

۲۷۷۔ پھر اللہ نے اس رنج کے بعد تم پر اطمینان نازل کیا یعنی نیند جو تم میں سے ایک گروہ پر چھا رہی تھی۔ یعنی اس جنگ میں جن کو شہید ہونا تھا ہو چکے اور جن کو ہٹنا تھا ہٹ گئے اور جو میدان میں باقی رہ گئے ان میں سے مخلص مسلمانوں پر اللہ نے ایک دم غنودگی طاری کر دی۔ لوگ کھڑے کھڑے اونگھنے لگے۔ حضرت طلحہ رضی اللہ عنہ کے ہاتھ سے تلوار چھوٹ کر زمین پر گری۔ یہ ایک حسی اثر ۱۳ باطنی سکون و اطمینان کا تھا جو ایسے ہنگامہ رستخیز میں مومنین کے قلوب پر محض خدا کے فضل و کرم سے وارد ہوا۔ اس کے بعد دشمن کا خوف و ہراس سب کافور ہو گیا۔ یہ کیفیت عین اس وقت پیش آئی جب لشکرِ مجاہدین میں نظم و ضبط قائم نہ رہا تھا۔ بیسیوں لاشیں خاک و خون میں تڑپ رہی تھیں۔ سپاہی زخموں سے چور ہو رہے تھے۔ حضور کے قتل کی افواہ لے رہے تھے ہوش و حواس کھو دیے تھے۔ گویا یہ سونا بیدار ہونے کا پیش خیمہ تھا۔ غنودگی طاری کر کے ان کی ساری تھکن دور کر دی گئی اور متنبہ فرما دیا کہ خوف و ہراس اور تشویش و اضطراب کا وقت جا چکا۔ اب مامون و مطمئن ہو کر اپنا فرض انجام دو۔ فوراً صحابہ نے حضور کے اردگرد جمع ہو کر لڑائی کا محاذ قائم کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد مطلع صاف تھا دشمن سامنے سے بھاگتا نظر آیا۔ عبد اللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ لڑائی کے موقعہ پر اونگھ اور نیند کا طاری ہونا اللہ کی طرف سے فتح و ظفر کی علامت ہے۔ حضرت علی کی فوج

صفین میں ایسا ہی واقعہ پیش آیا[1]

نیند اطمینان و راحت کا ذریعہ بھی ہے اور دل کے اطمینان اور دماغ کی یکسوئی کی نشانی بھی جس کا ذہن پریشان اور دماغ منتشر ہو اس کی نیند اُڑ جایا کرتی ہے اور ایسے شخص کے لیے کوئی کام عزم و حوصلہ اور استقلال و عزیمت کے ساتھ کرنا ممکن نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے دوران جنگ فوج کے لیے سونے کا موقع ملنا اور اس موقع سے فائدہ اٹھانا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ نیند کی اسی اہمیت کے پیش نظر دشمن فوج کے حوصلے پست کرنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اس کو سونے کا موقع نہ دیا جائے۔ یہ اللہ کا بڑا ہی فضل ہے کہ کسی فوج کو سونے کا موقع مل جائے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا سکے کیونکہ اس سے فائدہ اٹھانا صرف موقع ملنے ہی پر منحصر نہیں بلکہ اس کا بہت کچھ انحصار سونے والے کی ذہنی و قلبی صلاحیت پر بھی موقوف ہے[2]

امنۃ نعاسًا کا یہ مطلب ہے کہ ایک ایسی غنودگی طاری کر دی گئی جو امن و سکون والی تھی اور جس سے مسلمانوں کا خوف و ہراس اور ہر قسم کی پریشانی اور خطرات سب دُور ہو گئے تھے اور سارا غم غلط ہو گیا یغشی طائفۃ سے یہ مراد ہے کہ اس غنودگی کا مسلمانوں پر گہرا اثر ہوا۔

دراصل اس سے یہ ظاہر کرنا مقصود ہے کہ مسلمانوں نے اگرچہ تکلیف اٹھائی مگر شکست نہیں کھائی کیونکہ وہ میدان جنگ میں موجود رہے وہ ایسے مطمئن اور دشمن سے ایسے بے خوف تھے کہ ان کو نیند آ گئی ورنہ معرکۂ جنگ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے بہادروں کی آنکھ سے نیند اُڑ جاتی ہے مگر مایۂ تسکین عالم کا یہ اعجاز تھا کہ بدر و اُحد کے کارزاروں میں مسلمان سپاہیوں کی بے خطری و بے خوفی کے لیے ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ کر دیا گیا تاکہ کسی خوف و خطر کا خیال کیے بغیر وہ اپنے فرض کو انجام دیں۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ جس جماعت پر نیند طاری کی گئی تھی وہ جماعت ان اہل ایمان کی تھی جو یقین و ثبات اور استقامت و توکل کی پوری صداقت کے حامل تھے اور ان کو یہ یقین تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسول کی ضرور مدد کرے گا۔

ان کو اپنی ہی پڑی ہوئی ہے

۲۷۸۔ اور ایک گروہ کو اپنی ہی فکر دامنگیر تھی۔ یہ بزدل اور ڈرپوک منافقین ہیں جن کو نہ اسلام

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

کی فکر تھی نہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی۔ محض اپنی جان بچانے کی فکر میں ڈوبے ہوتے تھے کہ کہیں ابو سفیان کی فوج نے دوبارہ حملہ کر دیا تو ہمارا کیا حشر ہوگا اس خوف و فکر میں اونگھ یا نیند کہاں تھی؟

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دل کے کچے یا منافق تھے انہیں اپنی جانوں ہی کی فکر لگی رہی اگر دیکھئے یہاں سے بچ کر بھی جانا ہوگا۔ اپنی جان کی فکر بجائے خود کوئی بری بات نہیں لیکن یہاں مراد یہ ہے کہ ان منافقین کو اپنی ہی پڑی ہوئی تھی۔ نہ دین کی کوئی فکر تھی اور نہ رسول کا کوئی خیال تھا۔ یہ اطمینان اور امن کی نیند سے بالکل محروم تھے۔ انہیں تو یہ فکر تھی کہ یہاں سے کس طرح جان بچا کر نکلیں۔ حق تعالیٰ نے مسلمانوں پر اونگھ نازل کر کے ان کے دلوں سے دشمنوں کا خوف دور کر دیا۔ منافقین پر نہ نیند طاری کی اس لیے ان پر دشمنوں کا خوف مستولی رہا اور خوف کی وجہ سے منافقوں کو اپنی جانوں کی فکر پڑ گئی۔

اللہ سبحانہٗ کے بارے میں بدگمانی

۲۷۹۔ یہ گروہ کہہ رہا تھا کہ جو کچھ ہوا اس میں ہمارے اختیار کی کیا بات تھی۔ یعنی وہ اللہ کے وعدے کہاں گئے؟ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام کا قصہ ختم ہوا۔ اب پیغمبر اور مسلمان گھر واپس جانے والے نہیں۔ سب یہیں کام آئیں گے جیسے دوسری جگہ فرمایا بل ظننتم ان لن ینقلب الرسول والمومنون الی اھلیھم ابداً (فتح رکوع ۲)[۲]

اصل ارشاد یظنون باللہ غیر الحق ظن الجاھلیۃ ہے معنے یہ ہیں کہ وہ اللہ کے بارے میں خلاف حقیقت جاہلیت کے خیالات رکھتے تھے۔

یہ خیالات کیا تھے؟

اس موضوع پر شارحین قرآن کے خیالات مختلف ہیں ایک خیال تو وہی ہے جس کی ترجمانی شیخ الاسلام فرما رہے ہیں کہ ان کا ظن اور خیال جسے قرآن یہاں غیر الحق اور ظن الجاہلیہ قرار دے رہا ہے اور جسے قرآن نے سورۂ فتح میں ان کی طرف منسوب کر کے نقل کیا ہے یعنی ان کی یہ آرزو کہ حضور انور اور اہل ایمان جنگ سے صحیح واپس نہ آئیں گے۔ اس حیثیت سے یہ بلاشبہ ظن ہے کہ مستقبل کے بارے میں یہ محض تخمین اور اٹکل سے بات کہی گئی ہے۔ لیکن اس میں خلاف حقیقت اور جاہلیت

---

[۲] افادات شیخ الاسلام

والے گمان ہونے کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ یہ اللہ کے بارے میں ہے بلکہ ان کا یہ خیال خود حضور اور مسلمانوں کے بارے میں ہے۔

اس بنا پر کچھ شارحین قرآن کی رائے یہ ہے کہ اللہ کے بارے میں خلاف حقیقت اور جاہلیت والے گمان کی تشریح خود آنے والی آیت کر رہی ہے گویا یہ اجمال ہے اور آگے اس کی تفصیل ہے۔ یہاں تو اس بدگمانی کا صرف چہرہ پیش کیا جا رہا ہے کہ وہ خلاف حقیقت ہے اور اس سے بڑھ کر یہ جاہلیت کی یادگار ہے۔ جاہلیت محاورۂ قرآنی میں علوم نبوت سے بیگانہ دور کا نام ہے۔

چہ میگوئیاں

۲۸۰۔ یہ لوگ کہہ رہے تھے کہ جو کچھ ہوا اس میں اختیار کی کیا بات ہے یعنی جو جو کچھ بھی ہمارا کام بنا ہے یا بالکل بگڑ چکا یا یہ کہ ہم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے والوں کے ہاتھ میں کچھ بھی فتح و ظفر آئی یا یہ معنے کہ اللہ نے جو چاہا سو کیا ہمارا یا کسی کا کیا اختیار یہ تو الفاظ کے ظاہری معنے تھے لیکن جو دل میں نیت تھی وہ آگے آ رہی ہے[1]

یہ دراصل ایک اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے جب یہ کہا گیا کہ وہ خلاف حقیقت اور زمانۂ جاہلیت کے خیالات رکھتے ہیں معاً سوال پیدا ہوا کہ وہ خیال کیا ہے جواب دیا گیا کہ وہ کہتے ہیں کہ جو کچھ ہوا اس میں ہمارے اختیار کی کیا بات تھی؟ یعنی اس میں ہمارا کیا قصور ہے اگر خدا فتح و نصرت دیتا تو ایسی حالت کیوں پیش آتی۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ عہد جاہلیت کے سے خیالات ہیں اور ان دلوں میں نہیں گزر سکتے جو اسلام کی تعلیم سے روشن ہو چکے ہیں۔ بلا شبہ فتح و نصرت اللہ ہی کے ہاتھ میں ہے لیکن فتح و نصرت ان کو ہی دیتا ہے جو صبر و تقویٰ میں پکے ہوتے ہیں[2]

یہ ان کے ظن جاہلیت کی ایک مثال ہے اسی کے گھناؤنے پن کو ظاہر کرنے کے لیے پہلے تمہید پیش کی گئی ہے۔ بتانا یہ ہے کہ یہ لوگ ادعائے ایمان کے باوجود اب تک خدا کی صفات اور انسانی زندگی سے اس کے تعلق کے باب میں ذہن صاف نہیں رکھتے ہیں۔

اسے آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ لشکر میں جو منافق تھے ان کی حالت یہ تھی کہ ایک طرف

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن

اللہ تعالیٰ کے بارے میں مختلف قسم کے جاہلانہ خیالات قائم کر رہے تھے اور جب کوئی ان سے دریافت کرتا کہ یہ شکست کیوں ہوئی تو ایک معصوم سا فقرہ کہہ دیتے کہ ہمارے اختیار میں کوئی چیز نہیں ہے اور ہمیں کوئی اختیار نہیں ہے۔ لوگ یہ سمجھتے کہ یہ پختہ مسلمان ہیں کامیابی اور ناکامی کو اللہ تعالیٰ کی مشیت کے حوالے کر رہے ہیں۔

اگرچہ اس فقرے کے اور مطالب بھی ہو سکتے ہیں مثلاً یہ کہ کچھ بنے گا یا سب بگڑا رہے گا اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کچھ غنیمت وغیرہ مسلمانوں کے ہاتھ لگے گی یا خالی ہاتھ رہیں گے مگر ہم نے جو مطلب اختیار کیا ہے وہ زیادہ قرینِ قیاس ہے اور اس میں معنویت ہے۔

اللہ سبحانہٗ کی حقیقی عظمت

۱۸۱ ۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اسی پر کیا موقوف ہے سارے معاملات اللہ ہی کے اختیار میں ہیں۔ یعنی منافقین کا یہ قول هل لنا من الامر من شئ ایک ایسی بات ہے جو ہے تو صحیح مگر یہ کہہ کر وہ ناجائز فائدہ اٹھا رہے ہیں بے شک یہ صحیح ہے کہ تمہارے ہاتھ میں کچھ نہیں ہے سب اللہ کے ہاتھ میں ہے جس کو چاہے بنائے جس کو چاہے بگاڑے، غالب کرے یا مغلوب، اُفت بھیجے یا راحت، کامیاب کرے یا ناکام ایک ہی واقعہ کو ایک قوم کے حق میں رحمت اور دوسری کے لیے نعمت بنا دے سب اس کے قبضے میں ہے مگر تم اس بات سے اپنے دل میں جو معنے لے رہے ہو خدا تعالیٰ دل کے چور سے واقف ہے جسے آگے بیان کیا جاتا ہے[1]

اس جواب میں بہت گہری معنویت ہے اہلِ عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے۔ قدرت کے کارخانے کا تنہا مالک سمجھتے تھے اور خلق کے بعد امر کی حدود میں اللہ کے ساتھی اور ساجھی بناتے تھے۔ قرآن نے اس خدا کا جلوہ نمایاں کیا جو آسمان سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ اس کی بادشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں۔ اس کے کارخانۂ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دُنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں۔ منافقین کے اس مقولہ هل لنا من الامر میں اگر امر سے مراد حکومت ہے۔ جیسا کہ

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کہ مفسرین نے بتایا ہے یعنی حکومت میں ہمارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ قرآن نے اس آیت میں کھول کر جواب دیا ہے کہ الامر سب کا سب اللہ کے لیے ہے واقعی اس میں تمہارا کوئی حصہ نہیں ہے۔ سب کچھ اللہ ہی کرتا ہے کیونکہ سب کمزور ہیں وہ ہی ایک قوت والا ہے۔ سب جاہل ہیں اسی ایک کو علم ہے، سب فانی ہیں اسی ایک کو بقا ہے، سب محتاج ہیں وہ ہی ایک بے نیاز ہے۔ سب مامور ہیں وہ ہی ایک آمر ہے، سب محکوم ہیں وہی ایک حاکم ہے، سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے اس لیے الامر کلہ، للہ یعنی صرف جنگ میں مدد کا معاملہ ہی اس کے قبضے میں نہیں بلکہ سارے ہی معاملات اللہ کے قبضے میں ہیں۔

کمزوری بے نقاب ہو گئی

۲۸۲۔ اصل یہ ہے کہ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے وہ ظاہر نہیں کرتے۔ ان کا مطلب یہ ہے کہ اگر قیادت و حکومت کے اختیارات ہمارے قبضہ میں ہوتے تو ہم یہاں نہ مارے جاتے۔ اصل دل کا چور یہ تھا ھل لنا من الامر شیء کہہ کر دل میں یہ مطلب لیتے تھے اور پکے مسلمانوں سے علیحدہ ہو کر آپس میں ہی کہتے ہوں گے کہ میاں شروع میں ہماری رائے نہ مانی۔ چند جوشیلے اور ناتجربہ کار نوجوانوں کے کہنے پر مدینہ سے باہر لڑنے چلے آئے۔ آخر منہ کی کھائی۔ اگر کچھ کام ہمارے اختیار میں ہوتا اور ہمارے مشورے پر عمل کیا جاتا تو اس قدر نقصان کیوں اٹھاتے۔ ہماری برادری کے اتنے آدمی مارے گئے یہ کیوں مارے جاتے۔ یا یہ مطلب ہے کہ اگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے کے موافق فتح و ظفر اور غلبہ مسلمانوں کے لیے ہے تو یہ قتل و جرح کی مصیبت ہم پر کیوں ٹوٹتی ہے۔[1]

بتانا یہ ہے کہ جو کچھ ان کے دلوں میں بھرا ہوا ہے اور جو کچھ ان کے جی میں پوشیدہ ہے اسے پیغمبر یہ لوگ اسے آپ کے سامنے ظاہر نہیں کرتے اور کھل کر نہیں کہتے۔ ظاہر میں وہ سیدھی سی اور معصوم بات کہہ رہے ہیں لیکن ان کا اصلی منشا یہ ہے کہ اگر ہمارا کچھ اختیار چلتا اور ہماری بات مانی جاتی اور ہماری رائے پر عمل ہوتا تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا اور ہم اس جنگ میں قتل نہ کیے جاتے اور جو لوگ مقتول ہوئے ہیں وہ قتل نہ ہوتے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک بے حد اہم سوال

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ جب منافقین لڑائی کے آغاز سے پہلے ہی میدان جنگ سے عبداللہ ابن ابی کی سرگردگی میں واپس ہو گئے تھے تو پھر میدان جنگ میں قرآن کن لوگوں کا چہرہ پیش کر رہا ہے۔

سید رشید رضا کہتے ہیں کہ قرآن کمزور مسلمانوں کا ذکر کر رہا ہے هذه الطائفة من المومنين الضعفاء اور شاہ عبدالقادر بھی یہی فرماتے ہیں جیسا کہ ابھی آپ پڑھیں گے لیکن عام شارحین قرآن اس گروہ کو منافقین ہی کا گروہ قرار دیتے ہیں۔ اب یہی دو ہی صورتیں ہیں کہ یا تو یہ باتیں منافقین نے مدینہ میں کہی ہیں یا شکست کی خبر سن کر جہاں اور لوگ آتے گئے تھے آئیں، یہ منافقین بھی آ دھمکے اور یا پھر میدان جنگ کے مسلمانوں میں ایک عنصر منافقوں کا تھا۔ شیخ الاسلام کا میلان پہلی صورت کی طرف ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

" بظاہر یہ باتیں منافقین نے مدینہ میں کہیں کیونکہ عبداللہ بن ابی جنگ شروع ہونے سے پیشتر اپنی جمعیت کو ساتھ لے کر واپس ہو گیا تھا اس صورت میں ههنا یہاں کا اشارہ قرب کی وجہ سے اُحد کی طرف ہو گا لیکن بعض روایات میں ایک منافق معتب بن قشیر کا میدان جنگ میں یہ باتیں کرنا ثابت ہے تو شاید کچھ منافقین عبداللہ بن ابی کے ہمراہ کسی مصلحت سے واپس نہ ہوتے ہوں۔"

موت کا وقت مقرر ہے

۲۸۳ - ان سے کہہ دو کہ اگر تم اپنے گھروں میں بھی ہوتے تو جن لوگوں کا مارا جانا لکھا ہے وہ ضرور اپنی قتل گاہوں تک پہنچ جاتے۔ یعنی اس طعن و تشنیع یا حسرت و افسوس سے کچھ حاصل نہیں ہے اللہ تعالیٰ نے ہر ایک کی جو اجل موت کی جگہ، سبب اور وقت لکھ دیا ہے کبھی ٹل نہیں سکتا ہے اگر تم گھروں میں گھسے بیٹھے رہتے اور فرض کرو تمہاری ہی رائے سنی جاتی پھر بھی جن کی قسمت میں اُحد کے قریب جس جس پڑاؤ پر مارا جانا لکھا جا چکا تھا وہ کسی نہ کسی سبب سے ضرور ادھر نکلتے اور وہیں مارے جاتے۔ یہ خدا کا انعام ہے کہ جہاں مارا جانا مقدر تھا مارے گئے۔ اگر اللہ کے راستہ میں خوشی کے ساتھ بہادروں کی موت شہید ہوئے۔ پھر اس پر پچھتانے اور افسوس کرنے کا

کیا موقعہ؟ مردانِ خدا کو اپنے اوپر قیاس نہ کرو۔[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ خیال کرنا کہ اگر ہم اس لڑائی میں شریک نہ ہوتے تو مارے نہ جاتے سراپا غلط ہے جن کی قسمت میں یہاں موت لکھی تھی وہ خود آکر اپنے اپنے مقام پر مارا جاتا۔

انسان کی کمزوری کی اصلی وجہ موت کا ڈر ہے اس زہر کا تریاق یہ عقیدہ ہے کہ ہر آدمی کی موت کا وقت مقرر ہے جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے اور نہ بلائے آسکتا ہے۔ اس لیے کسی خطرہ کے مقام سے بھاگنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے بار بار اس عقیدے کی تلقین کی ہے کہ جس کو جہاں مرنا ہوتا ہے وہیں مرتا ہے۔

اس میں ایک طرف اگر منافقین کو ان کے زعم فاسد کا جواب دے کر بے نقاب کیا ہے دوسری طرف یہ بھی اشارہ کر دیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جو صحابہ رہ گئے تھے اور جنہوں نے خالد کے حملے سے اسلامی لشکر میں افراتفری کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدافعت میں انسانی فداکاری کے معجزے دکھائے تھے وہ اللہ کی راہ میں شہید ہوتے۔ وہ اس طرح جان دینے کو تیار تھے کہ اگر مدینے میں بھی جنگ ہوتی وہ اپنے گھروں میں چھپے بیٹھے نہ رہتے بلکہ دشمن کے مقابلہ پر نکل کر جاں نثاری کا سچا نمونہ دکھاتے۔

دودھ کا دودھ پانی کا پانی

۲۸۴۔ اور یہ صورتِ حال تو اس لیے پیش آئی ہے کہ جو کچھ تمہارے سینوں میں چھپا ہوا ہے اسے آزمائے یعنی ظاہر کر دے اور جو کچھ کدورتیں تمہارے دلوں میں ہیں ان کو صاف کر دے اور اللہ وہ سب کچھ جانتا ہے جو تمہارے سینوں میں ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تو دلوں کے پوشیدہ بھید جانتا ہے اس سے کسی کی کوئی حالت پوشیدہ نہیں ہے۔ مقصود یہ تھا کہ تم سب کو ایک آزمائش میں ڈالا جائے تاکہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے وہ باہر نکل پڑے۔ امتحان کی بھٹی میں کھرا کھوٹا الگ ہو جائے۔ مخلصین کامیابی کا صلہ پائیں اور ان کے قلوب آئندہ کے لیے وساوس اور کمزوریوں سے پاک و صاف ہوں۔ منافقین کا اندرونی نفاق کھل جائے اور لوگ صاف طور پر ان کے خبثِ باطن کو سمجھنے لگیں۔[2]

---

[2] افاداتِ شیخ الاسلام

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ اس شکست سے جن کو شہید ہونا تھا ہو چکے اور جن کو ہٹنا تھا ہٹ گئے اور جو میدان میں باقی رہ گئے ان پر اونگھ آئی۔ اس کے بعد رعب اور وحشت دور ہو گیا اور اتنی دیر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی غشی رہی۔ پھر جب ہوشیار ہوتے سب نے حضور کے پاس جمع ہو کر پھر لڑائی قائم کی اور سست ایمان والے کہنے لگے کہ کچھ بھی کام ہمارے ہاتھ سے ظاہر ہو یعنے کہ اس شکست کے بعد کچھ بھی ہمارا کام بنا رہے گا یا بالکل بگڑ چکا ہے یا یہ معنے کہ اللہ نے جو چاہا سو کیا ہمارا کیا اختیار اور نیت میں یہ معنے تھے کہ ہمارے مشورے پر عمل نہیں کیا جو اتنے لوگ مرے اللہ نے دونوں معنوں کا جواب دیا اور بتا دیا کہ اللہ کو اس میں حکمت منظور تھی تاکہ صادق اور منافق معلوم ہو جائیں۔ (موضح القرآن)

إِنَّ الَّذِينَ تَوَلَّوْا مِنكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ إِنَّمَا اسْتَزَلَّهُمُ
الشَّيْطَانُ بِبَعْضِ مَا كَسَبُوا ۖ وَلَقَدْ عَفَا اللَّهُ عَنْهُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ
غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿١٥٥﴾ ع ۱۶

بلاشبہ تم میں سے جن لوگوں نے اس روز لڑائی سے منہ موڑ لیا تھا جس روز دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلے پر آئیں[۲۸۵] تو ان کی اس لغزش کا باعث صرف یہ تھا کہ بعض کمزوریوں کی وجہ سے جو انہوں نے پیدا کر لی تھیں شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے یعنی یہ بات نہ تھی کہ ان کے ایمان میں فتور آگیا تھا[۲۸۶]۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے ان کی یہ لغزش معاف کر دی ہے وہ یقیناً بخشنے والا اور بُردبار ہے[۲۸۷]۔

میدان جنگ سے بھاگنے والوں کی معافی

اوپر آیت ۱۲۲ میں گزر چکا ہے کہ منافقین کی شرارت سے کچھ کمزور قسم کے مسلمان بھی متاثر

ہوتے لیکن فوراً سنبھل گئے۔ ان میں ایک چھوٹا سا گروہ کمزوری کا شکار ہو گیا اور میدان جنگ سے بھاگ گیا۔ ان بھاگنے والوں کی تعداد کس قدر تھی؟ روایات میں عموماً قیاس سے کام لیا گیا ہے۔ کچھ کہتے ہیں ایک تہائی فوج بھاگ گئی تھی ایک تہائی زخمی ہوتے اور ایک تہائی میدان میں رہے۔ دونوں باتیں بالبداہت غلط ہیں۔ مسلمانوں کی تعداد اگر سات سو ہے تو ان میں سے اگر صرف دو سو افراد ہی حضور کے ساتھ رہ جاتے تو تین ہزار کفار مکہ کی فوج ان کو میدان جنگ میں چھوڑ کر کبھی مکہ واپس نہ ہوتی۔ ابوالقاسم بلخی نے تو حد کر دی کہ ۱۳ النفوس قدسی کو چھوڑ کر سب کو بھگا دیا۔ آپ یوں کہہ سکتے ہیں کہ اس سے مراد صرف وہ لوگ ہیں جو کفار کے دوبارہ حملے کی ابتداء میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہ گئے کیونکہ سب لوگ تعاقب میں لگے ہوتے تھے۔

دراصل بات یہ ہے کہ خالد کے حملے نے مسلمانوں میں جو ابتری پیدا کی اس کی وجہ سے مسلمانوں میں دو گروہ ہو گئے ان میں سے ایک چھوٹا سا گروہ میدان سے بھاگ گیا ان میں سے بعض مدینے پہنچے اور بعض اس سے بھی آگے مشرقی جانب نکل گئے۔ روایتوں میں دو مقاموں کا ذکر آیا ہے اول "منقی" دوم "جلعب" یہ دونوں اعوص نامی مقام کے قریب بتائے گئے ہیں۔ اعوص مدینہ کے مشرق میں کئی میل کے فاصلے پر ہے۔ دوسرے گروہ نے میدان تو نہ چھوڑا لیکن رسول اللہ کی وفات کی خبر ان پر بجلی بن کر گری اور تعطل کی سی کیفیت طاری کر دی اور ان میں ہی وہ بھی تھے جو حضور انور کی ذات گرامی کے گرد جان نثاری اور فدا کاری میں سرگرم عمل تھے۔ امام رازی بھی اسی نتیجے پر پہنچے ہیں چنانچہ وہ قفال مروزی کے حوالہ سے نقل کرتے ہیں:

> والذی تدل علیہ الاخبار فی الجملۃ ان نفرا منھم تولوا وبعدوا منھم من دخل المدینۃ ومنھم من ذھب الی سائر الجوانب واما الاکثرون فانھم نزلوا عند الجبل واجتمعوا ھناک
>
> روایات تاریخی سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک چھوٹی ٹولی بھاگ گئی تھی اور دور نکل گئی۔ کچھ مدینے گئے اور کچھ اطراف میں چلے گئے لیکن اکثریت پہاڑ کے دامن میں جمع ہو گئی۔

یہ بات عقل بھی باور کرتی ہے۔ دونوں جگہ مبالغہ سے کام لیا گیا ہے پہلے حملہ میں جب مشرکین کو شکست ہوئی تو وہاں اس میں مبالغہ سے کام لیا گیا کہ تین ہزار کی فوج صرف اٹھارہ کے

مرنے پر بھاگ گئی اور یہاں مبالغہ کیا کہ ایک تہائی رہ گئے سب بھاگ گئے نہ یہ صحیح ہے اور نہ وہ

۲۸۵ - بلاشبہ تم میں سے جن لوگوں نے اس روز لڑائی سے منہ موڑ لیا تھا جس روز دونوں فوجیں ایک دوسرے کے مقابلہ پر آئیں ۔ یعنی جس دن احد کے میدان میں دو جماعتیں باہم نبرد آزما ہوئی تھیں اور آپس میں بھڑی تھیں اس دن جو لوگ میدان سے ہٹ گئے اور جنہوں نے پشت پھیری تھی ۔ یہ سوال کہ بھاگنے والوں میں کون کون تھے ؟ اکثر روایات میں مخلصین میں سے صرف حضرت عثمانؓ کا اور ان کے ساتھ دو انصار سعد اور عقبہ کا نام پایا جاتا ہے ۔

شیعہ اور خوارج نے حضرت عثمانؓ کے نام کو بہت اچھالا ہے اور اپنے خیال میں اس کو بھی خلافت کی نااہلیت کے لیے بطور دلیل پیش کیا ہے ۔ علامہ آلوسی نے اس کا قانونی جواب دیا ہے کہ ہم صحابہ میں نہ تو عصمت کے قائل ہیں اور نہ ہی خلافت کے لیے عصمت کو شرط گردانتے ہیں ۔ مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ صحابہ کے بعض معاندین نے اس واقعہ سے صحابہ پر خصوصاً حضرت عثمانؓ پر طعن کیا ہے اور اس سے عدم صلاحیت خلافت مستنبط کی ہے لیکن محض مہمل بات ہے ۔ جب اللہ تعالیٰ نے معاف کر دیا اب دوسروں کو مواخذہ کرنے کا کیا حق ہے ۔ رہا قصۂ خلافت کا تو اہل حق کے نزدیک خلافت کے لیے عصمت شرط نہیں ہے ۔ بہی صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا فیصلہ ہے کہ

> عثمان بن موہب کہتے ہیں کہ ایک شخص حج کے لیے بیت اللہ آیا ۔ وہاں اس نے کئی لوگ بیٹھے دیکھے اور پوچھا کہ یہ کون لوگ ہیں ۔ بتانے والوں نے بتایا کہ قریش ہیں ۔ اس نے کہا کہ یہ بوڑھا ان میں کون ہے ؟ لوگوں نے کہا کہ عبداللہ بن عمرؓ ، وہ شخص عبداللہ بن عمرؓ کے پاس آیا اور بولا کہ میں آپ سے کچھ پوچھتا ہوں کیا آپ مجھے جواب دیں گے چنانچہ وہ بولا کہ میں اس گھر کی حرمت کی قسم دے کر آپ سے پوچھتا ہوں کہ کیا احد والے دن حضرت عثمانؓ بھاگ گئے تھے ؟ فرمایا ہاں ، پھر بولا کیا بدر کے روز حضرت غائب تھے اور اس میں شریک نہ تھے فرمایا کہ ہاں ، بولا کیا تم جانتے ہو کہ بیعت الرضوان میں موجود نہ تھے فرمایا ہاں ۔ اس شخص نے اللہ اکبر کہا ۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا آؤ میں تم کو بتا دوں اور تمہارے سوالات کی وضاحت کر دوں ۔ فرمایا کہ احد کے دن بھاگ جانا تو میں گواہی دیتا ہوں کہ احد میں بھاگنے والوں کو اللہ نے معاف کر دیا اور بدر کے دن ان کی غیر حاضری اس لیے تھی کہ آپ کی اہلیہ محترمہ یعنی حضور انور

صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحبزادی بیمار تھیں حضور انور نے خود ان کو ان کی تیمارداری کا حکم دیا اور فرمایا کہ تم کو اتنا ہی ثواب ملے گا جتنا اس شخص کو جو جنگ میں شریک ہوگا اور ایک آدمی کا حصہ بھی مال غنیمت سے ملے گا۔ آپ کی بیعت الرضوان سے غیر حاضری، تو بات یہ ہے کہ اگر عثمان سے زیادہ کوئی عزت و شان والا ہوتا تو حضور انور اسی کو مکہ روانہ کرتے، آپ نے عثمان کو سفیر بنا کر روانہ کیا۔ بیعۃ الرضوان میں حضور انور نے اپنا دایاں ہاتھ بائیں ہاتھ پر رکھ کر فرمایا تھا کہ یہ عثمان کا ہاتھ ہے اور اسے عثمان کی بیعت قرار دیا۔ پوچھنے والے سے عبداللہ بن عمر نے آخر میں فرمایا جاؤ اور ان باتوں کو ساتھ لے جاؤ۔

لغزش کا باعث

۲۸۶۔ نوان کی اس لغزش کا باعث صرف یہ تھا کہ بعض کمزوریوں کی وجہ سے جو انہوں نے پیدا کر لی تھیں شیطان نے ان کے قدم ڈگمگا دیے۔ یعنی یہ بات نہ تھی کہ ان کے ایمان میں کوئی فتور تھا۔ مخلصین سے بھی بعض اوقات کوئی چھوٹا بڑا گناہ سرزد ہو جاتا ہے اور جس طرح ایک طاعت سے دوسری طاعت کی توفیق ملتی ہے۔ ایک گناہ کی نحوست سے شیطان کو موقع ملتا ہے کہ دوسری غلطیوں اور لغزشوں کی طرف آمادہ کرے۔ جنگ احد میں بھی جو مخلص مسلمان پیچھے ہٹ گئے تھے کسی پچھلے گناہ کی نحوست سے شیطان نے بہکا کر ان کا قدم ڈگمگا دیا۔ چنانچہ ایک گناہ تو یہی تھا کہ تیر اندازوں کی بڑی تعداد نے حضور انور کے حکم کی پابندی نہ کی۔ [1] شیخ الاسلام کے خیال مبارک میں ماکسبوا سے مراد تیر اندازوں کی وہ نافرمانی ہے جو انہوں نے مورچہ چھوڑ کر کی۔ یہ نافرمانی سبب بن گئی دوسری نافرمانی میدان جنگ سے بھاگنے کی۔ اور یہ سمجھانے کے لیے کہ ان کا یہ بھاگنا نافرمانی تھی مگر یہ نافرمانی دیدہ دانستہ نہ تھی بلکہ شیطان کے ازلال کی وجہ سے بمقتضائے بشریت لغزش قدم تھی استزلھم الشیطان کا اضافہ فرمایا۔

ایک گناہ دوسرے گناہ کا سبب

شیخ الاسلام نے پوری قوت سے یہ بات سمجھائی ہے کہ آیت قرآنی بتا رہی ہے کہ ایک گناہ دوسرے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

گناہ کا سبب ہو جاتا ہے جیسے ایک نیکی دوسری نیکی کا ذریعہ ہو جاتی ہے یعنی اعمال حسنہ اور سیئہ میں تجاذب کا قانون جاری ہے جب انسان ایک نیک کام کرتا ہے تو تجربہ شاہد ہے کہ اس کو دوسری نیکیوں کی توفیق مل جاتی ہے اس کے دل میں نیک اعمال کی رغبت بڑھ جاتی ہے اسی طرح انسان کوئی گناہ کرتا ہے تو وہ اس کے لیے دوسرے گناہوں کی راہ ہموار کر دیتا ہے دل میں گناہ کی رغبت ہو جاتی ہے۔[1]

سب کو معافی کا پروانہ مل گیا

۲۸۷۔ بہرحال یہ واقعہ ہے کہ اللہ نے ان کی یہ لغزش معاف فرما دی ہے وہ یقیناً بخشنے والا بُردبار ہے۔ یعنی ان حضرات پر اب کوئی گناہ نہیں رہا۔ اللہ تعالیٰ کلیۃً ان کی تقصیر معاف فرما چکا ہے کسی کو طعن و ملامت کا حق نہیں ہے۔[2]

صحابہ کرام کے بارے میں اہل السنۃ والجماعۃ کے اس موقف کی یہ آیت کھلے لفظوں میں تائید کرتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اگرچہ گناہوں سے معصوم نہیں ہیں لیکن اس کے باوجود امت کے لیے جائز نہیں ہے کہ ان کی طرف کسی برائی یا عیب کو منسوب کرے۔ غور کرو کہ جب اللہ سبحانہ نے ان کی اتنی بڑی غلطی کو معاف کر کے ان کے ساتھ لطف و کرم کا معاملہ کیا اور ان کو تمام رضوان مرحمت فرمایا تو پھر ہماری کیا حیثیت ہے کہ ہم ان میں سے کسی کی برائی کا تذکرہ کریں۔ اسی بنا پر اہل السنۃ والجماعۃ نے بطور مسلک یہ پالیسی اپنائی ہوئی ہے کہ صحابہ پر طعن و اعتراض سے پرہیز ضروری ہے۔ عقائد نسفی میں ہے:

صحابہ کرام کا ذکر ہمیشہ خیر اور بھلائی ہی سے کرے۔

شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں:

جمیع صحابہ کرام کا تزکیہ اور ان کی مدح و ثنا تمام اہل السنۃ کا اعتقاد ہے

شرح مواقف میں ہے:

تمام صحابہ کی تعظیم ضروری ہے اور ان پر طعن ناجائز ہے۔[3]

---

[1][3] معارف قرآن م ش [2] افادات شیخ الاسلام

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ كَفَرُوا وَقَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ
إِذَا ضَرَبُوا فِي الْأَرْضِ أَوْ كَانُوا غُزًّى لَّوْ كَانُوا عِندَنَا مَا مَاتُوا
وَمَا قُتِلُوا لِيَجْعَلَ اللَّهُ ذَٰلِكَ حَسْرَةً فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ يُحْيِي
وَيُمِيتُ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿﴾ وَلَئِن قُتِلْتُمْ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ أَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللَّهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿﴾
وَلَئِن مُّتُّمْ أَوْ قُتِلْتُمْ لَإِلَى اللَّهِ تُحْشَرُونَ ﴿﴾

اے اہل ایمان ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے راہ کفر اختیار کی[288] اور انہوں نے اپنے سفر میں جانے والے یا جنگ میں شریک ہونے والے بھائیوں[289] سے کہا کہ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے، اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے[290] ورنہ اصل میں جلانا اور مارنا تو اللہ ہی کا کام ہے[291]، اور اللہ

تمہاری حرکات پر خوب نگران[۲۹۲] ہے۔ اور اگر تم اللہ کی راہ میں
قتل کر دیے گئے یا مر گئے تو اللہ کی جو بخشش اور رحمت تمہارے
لیے ہے ان ساری چیزوں سے اچھی ہے جنہیں پونجی بنا کر
وہ جمع کرتے رہتے ہیں[۲۹۳]۔ اور دیکھو خواہ تم اپنی موت مر جاؤ
یا مارے جاؤ ہر حال میں تمہیں سمٹ کر اللہ کے حضور میں[۲۹۴] جانا ہے۔

فرائض سے فرار میں زندگی کا بچاؤ نہیں

اس اُمت کو اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح، آزادی، دولت مندی، سربلندی، اقتدار اور بین الاقوامی احترام وغیرہ اسی وقت میسر آ سکتا ہے جب وہ اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع اُمت ہو۔ یعنی ایک طرف تو اس کی ترکیب ایسے افراد سے ہو جو تقویٰ کے سچے اور طاعت کے مخلص ہوں۔ دوسری طرف اس میں وہ مضبوط اجتماعی تنظیم ہو جس کی اساس اعتصام بحبل اللہ یعنی نبوت کا لایا ہوا علم و عمل ہو۔ اس کے بغیر قرآن کی نظر میں کوئی جماعت اُمت نہیں ہو سکتی۔

اس معاملے میں اس کو نہ دوسری قوموں پر قیاس کیا جا سکتا ہے اور نہ اسے دوسروں کی کاپی کرنے کی اجازت ہے۔ پہلے بھی لا تکونوا کالذین تفرقوا میں اہل کتاب کی تقلید سے منع کیا تھا اب اس آیت میں لا تکونوا کالذین کفروا کہہ کر منافقین کا کردار اپنانے سے روکا ہے۔ کیونکہ دوسری قومیں اپنی ساری نافرمانیوں کے باوجود اونچے سے اونچا اقتدار حاصل کر سکتی ہیں لیکن اُمتِ مسلمہ کے لیے اس طرح کا کوئی امکان نہیں ہے اس کے لیے عزت و اقتدار پانے کی صرف ایک راہ ہے اور وہ ہے نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کے اپنانے کی راہ، اللہ کی فرمانبرداری کی روش اور اللہ کی راہ میں قربانیاں پیش کرنے کی صراطِ مستقیم۔

اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ اُمت مسلمہ کے لیے عروج وزوال کا قانون اللہ تعالیٰ نے وہ نہیں رکھا ہے جو دوسری قوموں کے لیے مقرر ہے۔ دوسری قوموں کے لیے اس کا قانون یہ ہے کہ اگر وہ کچھ بنیادی قسم کی انسانی اخلاقیات اپنے اندر پیدا کرلیں اور ترقی کی ضروری مادی تدبیریں اختیار کرلیں تو اوپر اٹھ سکتی ہیں لیکن اُمت کے لیے صرف یہی چیزیں ترقی کا زینہ بننے کے لیے کافی نہیں ہیں کیونکہ یہ اُمت اس دُنیا میں اللہ کے دین کی علمبردار اور دوسری قوموں کے سامنے حق کی گواہ ہے دوسری کسی قوم کی یہ پوزیشن نہیں ہے۔ پوزیشن کا یہ اختلاف قطعی طور پر حقوق اور ذمہ داریوں کا اختلاف چاہتا ہے اور حقوق و ذمہ داریوں کا اختلاف ضروری قرار دیتا ہے کہ وہ ضابطے بھی مختلف ہوں جن کے مطابق معاملہ ہونا چاہیے اس لیے یہاں مسلمانوں کو نصیحت کی جارہی ہے کہ کفار و منافقین کی روش کی تقلید سے اپنے آپ کو محفوظ رکھو وہ موت اور زندگی کو اپنی تدبیروں کے تحت سمجھتے ہیں۔ حالانکہ موت اور زندگی کا معاملہ اللہ کے قبضے میں ہے وہ جس کو چاہتا ہے موت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے زندگی دیتا ہے۔ اس نے جس کی موت جس وقت جس شکل اور جس مقام پر لکھ دی ہے وہ آکر رہے گی۔ اگرچہ وہ بچنے کی کیسی تدبیریں کرلے۔ فرائض سے فرار میں زندگی کا ہرگز بچاؤ نہیں موت تو ہر حال میں آکر رہے گی یہ تو ممکن ہے کہ فرائض رہ جائیں لیکن یہ ناممکن ہے کہ زندگی رہ جائے زندگی تو بہر حال جاکر رہے گی۔

۲۸۸ ۔ اے اہل ایمان ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے راہ کفر اختیار کی۔ یعنی تم ان کافر منافقوں کی طرح ایسے لغو خیالات کو زنہار دل میں جگہ نہ دو کہ گھر میں بیٹھے رہتے تو موت نہ آتی: مارے جاتے [1]

اس آیت میں الذین کفروا سے کون لوگ مراد ہیں۔ شارحین قرآن کی اکثریت کہتی ہے کہ اس سے منافق مراد ہیں۔ مسلمانوں کو ہدایت ہو رہی ہے کہ تم ان منافقوں کی طرح نہ ہو جاؤ کر ان جیسی باتیں کرنے لگو۔ اس قسم کی باتیں کرنا ایمان سے محروم ہونے کی علامت ہے۔ امام رازی نے یہاں منافقین کے حق میں الذین کفروا کے اطلاق سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ صرف ایمان کا دعویٰ مسلمان ہونے کے لیے کافی نہیں ہے جب تک قلب کی تصدیق بھی اس کی ہمنوا نہ ہو۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن منافق کو کافر نہ کہتا جب کہ منافق اسلام کا زبانی دعویٰ کرتا ہے۔ اسی بنا پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فقہا نے زبان کے اقرار کو شرطِ ایمان قرار دیا ہے لیکن جب تک اقرار و تصدیق کے ساتھ التزامِ طاعت اور انقیادِ قلبی نہ ہو ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ غور فرمایئے ہرقل اور اس جیسے اور اہلِ کتاب نے تصدیق ضرور کی اور زبانی اقرار بھی کیا مگر کیا ایک لمحہ کے لیے بھی اپنا قدیم مذہب چھوڑ کر دین اسلام کو عملاً اپنایا؟ کیا آپ اس کو صرف تصدیق و اقرار کی بنا پر اہلِ ایمان میں شمار کر یں گے؟ انقیادِ باطن، التزامِ طاعت، عہد و فاداری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا ایک مرتبہ رہتا ہے۔ ایمان کے وجودِ ذہنی کے لیے ضروری ہے کہ یہ علم ایسی صفتِ نفس بن جائے کہ قلب اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر لینے پر مجبور ہو جائے۔ اسی کو عملِ قلب کہتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ ایمان صرف تصدیق نہیں ہے بلکہ التزامِ طاعت اور انقیادِ قلبی بھی اس کا اہم جزء ہے۔ اگر ایک شخص تصدیق کرتا ہے مگر عہد و فاداری نہیں کرتا وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح ایک شخص فرمانبرداری کے لیے تو آمادہ ہے مگر قلب و زبان تصدیق کے لیے آمادہ نہیں تو یہ بھی مومن نہیں ہے۔ عالمِ واقعات میں ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی مصمم ہو۔ اسی کا نام شرعی تصدیق ہے اور منافق اسی سے محروم ہوتا ہے۔

منافقین مسلمانوں میں ملے جلے تھے

۲۸۹۔ انہوں نے سفر میں جانے والے یا جنگ میں شریک ہونے والے بھائیوں سے کہا۔ یعنی منافق ظاہر میں مسلمان بنے ہوئے تھے اس لیے مسلمانوں کو اپنا بھائی کہا یا اس لیے کہ نسبی طور پر وہ اور انصار مدینہ برادری کے بھائی بند تھے اور چونکہ یہ بات خیر خواہی اور ہمدردی کے پیرائے میں کہتے ہیں اس لیے لفظ اخوان سے تعبیر کیا[1] ان توجیہات کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ عام طور پر یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ منافقوں کا گروہ کا فروں کا کوئی خاص سازشی گروہ تھا حالانکہ ایسا نہیں بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے جن کو قرآن منافق کہتا ہے انہوں نے اسلام کو بطورِ دین و اعتقاد اسی طرح اختیار کر لیا تھا جس طرح دوسرے مسلمانوں نے، چنانچہ قرآن میں ان کے تعارف میں کفروا بعد اسلامھم اسلام لا کر پھر کفر کی باتیں کیں آیا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

وہ اپنے کو مسلمان سمجھتے تھے، ان کی بیویاں ان کو مسلمان سمجھتی تھیں۔ ان کے بچے ان کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ان کے گھر کا ہر فرد یقین کرتا تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔ وہ نماز پڑھتے تھے روزہ رکھتے تھے۔ اسلام کے طور طریقے پر اولاد کی پرورش کرتے تھے۔ اس کے باوجود قرآن کا فیصلہ ہے کہ وہ مسلمان نہیں ہیں کیونکہ اسلام کا گھونٹ تو انہوں نے پی لیا تھا لیکن حلق کے نیچے نہیں اترا تھا۔ کسی تعلیم کو اختیار کر لینے کے بعد یقین و عمل کی جو رُوح پیدا ہونی چاہیے اس سے یک قلم محروم تھے۔ اخلاص و صداقت کے لیے ان کے دلوں میں کوئی جگہ نہ تھی۔ وہ اللہ کا کلام سنتے مگر اس لیے نہیں کہ عمل کریں بلکہ اس لیے کہ محض سنتے رہیں۔ وہ نماز پڑھتے مگر بے دلی کے ساتھ خیرات کرتے مگر مجبور ہو کر ان کے دلوں میں دین سے زیادہ دُنیا کا عشق تھا۔ اسلام کے جو احکام ان کی شخصی اغراض کے خلاف نہ ہوتے ان پر خوشی خوشی عمل کرتے۔ اور جو خلاف ہوتے ان سے نکل بھاگتے۔ جب کبھی خوشحالیوں کا موقعہ ہوتا تو وہ سب سے پہلے مسلمان ہوتے اور جب کبھی قربانیوں کا موقعہ آجاتا تو سب سے آخری صفوں میں بھی دکھائی نہ دیتے۔ جہاد کے تصور سے ان کی رُوحیں لرز جاتیں۔ انفاق کا حکم ان کے لیے موت کا سامان ہوتا۔ اسلام کے دُشمنوں سے سازگاریاں رکھنے میں کوئی تامل نہ ہوتا[1] وہ مسلمانوں میں رہتے اس لیے ان کو بھائی کہہ کر پکارتے تھے۔

غلط خیالی اور غلط بیانی

۲۹۰۔ اگر وہ ہمارے پاس ہوتے تو نہ مارے جاتے اور نہ قتل ہوتے۔ اللہ اس قسم کی باتوں کو ان کے دلوں میں حسرت و اندوہ کا سبب بنا دیتا ہے۔ یعنی خواہ مخواہ باہر نکل کر مرے ہمارے پاس اپنے گھروں میں پڑے رہتے تو کیوں مرتے یا کیوں مارے جاتے۔ یہ کہنا اس غرض سے تھا کہ سننے والے مسلمانوں کے دلوں میں حسرت و افسوس پیدا ہو کہ واقعی بے سوچے سمجھے نکل کھڑے ہونے اور لڑائی کی آگ میں کود پڑنے کا یہ نتیجہ ہوا، گھر رہتے تو یہ مصیبت کیوں دیکھنی پڑتی مگر مسلمان ایسے کچے نہ تھے جو ان چکموں میں آجاتے۔ ان باتوں سے اُلٹا منافقین کا بھرم کھل گیا۔ بعض مفسرین نے لیجعل اللہ میں لام کو لام عاقبت لے کر معنے یوں کیے کہ منافقین کی زبانوں اور دلوں پر یہ باتیں جاری کی گئیں کہ خدا ان کو ہمیشہ حسرت و افسوس کی آگ میں جلتا چھوڑ دے اور دوسری حسرت ان کو یہ رہے کہ مسلمان ہماری طرح نہ ہوتے اور ہماری باتوں پر کسی نے کان نہ دھرا۔ گویا اس طرح

---

[1] ترجمان قرآن

یجعل کا تعلق لاتکونوا سے بھی ہو سکتا ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ ایسے خیالات دماغ میں موجزن ہونا اور ان کا زبان پر لانا یہ خود ایک وبال ان کی منافقت اور نورِ ایمان سے محرومی کا ہے۔ دل میں ایقان تو ہوتا ہی نہیں جو تسکین پیدا کرتا ہے اس لیے ہر امر تکوینی و تقدیری سے ان کے دلوں میں حسرت اور کڑھن کا اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے [2]
یعنی یہ باتیں حقیقت پر مبنی نہیں ہیں حقیقت تو یہ ہے کہ قضائے الٰہی کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتی مگر جو لوگ اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور سب کچھ تدبیروں ہی پر موقوف رکھتے ہیں ان کے لیے اس قسم کے قیاسات بس داغِ حسرت بن کر رہ جاتے ہیں اور وہ ہاتھ ملتے رہ جاتے ہیں کہ کاش یوں ہوتا تو یوں ہو جاتا [3]

واضح لفظوں میں اہلِ ایمان سے کہا گیا ہے کہ چونکہ یہ لوگ تقدیرِ الٰہی کے منکر ہیں اور اللہ تعالیٰ پر صحیح اعتقاد نہیں رکھتے اس لیے ایسی باتیں کہا کرتے ہیں کہیں تم اے مسلمانو ایسی باتیں کر کے ان کی طرح نہ ہو جانا آگے اس غلط بات کا نتیجہ بتایا ہے کہ جس خیال کی بنا پر یہ بات ان کے منہ سے نکلتی ہے یہ غلط خیالی اور غلط بیانی ان کے لیے موجب حسرت و پشیمانی بنائے کیونکہ تقدیرِ الٰہی کے منکروں کو ہر حادثہ پر یہی حسرت ہوتی ہے کہ ہائے اگر فلاں تدبیر اختیار کرتے تو شاید یہ کام ہو جاتا۔

جلانا اور مارنا اللہ کا کام ہے

۲۹۱ ۔ ورنہ اصل میں جلانا اور مارنا اللہ ہی کا کام ہے۔ یعنی مارنا جلانا اللہ کا کام ہے۔ بہتیرے آدمی عمر بھر سفر کرتے ہیں اور لڑائیوں میں جاتے ہیں۔ مگر موت گھر میں بستر پر آتی ہے اور کتنے ہی آدمی گھر کے کونے میں پڑے رہنے کے خوگر ہیں لیکن اخیر میں خدا کوئی سبب کھڑا کر دیتا ہے کہ وہ باہر نکلیں اور وہیں مریں یا مارے جائیں۔ بندہ کی روک تھام سے یہ چیز ٹلنے والی اور بدلنے والی نہیں ہے۔ حضرت خالد بن الولید رضی اللہ عنہ نے وفات کے وقت فرمایا کہ میرے بدن پر ایک بالشت بھر جگہ تلوار یا نیزے کے زخم سے خالی نہیں مگر آج میں ایک اونٹ کی طرح گھر میں مر رہا ہوں —
فلا نامت عین الجبناء خدا کرے یہ دیکھ کر نامردوں کی آنکھیں کھلیں [4]
واقعہ یہ ہے کہ موت و زندگی دونوں تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہیں۔ اس مسبب الاسباب و علت

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] ماجدی [3] تفہیم [4] افاداتِ شیخ الاسلام

حقیقی کو چھوڑ کر نظر ظاہری اور فوری اسباب پر جانا اور سفر جہاد کو موت یا علت تامہ قرار دینا کیسی جاہلیت اور سفاہت ہے۔ امریکہ میں اس وقت سوشیالوجی (عمرانیات) کا ایک ماہر فاضل ڈینی سن اپنی کتاب EMOTION A BASIS OF CIVILISATION میں ایک جگہ لکھتا ہے "مسلمانوں کے اس عقیدہ تقدیر یا امر تکوینی کو خدا کو تفویض کر دینے کی عادت نے نیز عقیدہ شہادت نے مسلمانوں میں معرکہ جنگ کے اندر بڑی ہی قوت اور استقامت پیدا کر دی تھی۔ اس امریکی فاضل کا ایمان نہ عقیدہ تقدیر پر ہے اور نہ عقیدہ شہادت پر، اس کے باوجود بھی وہ ان عقیدوں کی نافعیت اور ان کی افادی حیثیت کی داد دینے پر اپنے آپ کو بے اختیار مجبور پا رہا ہے[1]

کردار میں کفار کی کاپی کرنا

۲۹۲۔ اور اللہ تمہاری حرکات پر خوب نگراں ہے۔ منافقین و کفار کس راستے پر جا رہے ہیں۔ اور مسلمان کہاں تک ان کے تشبہ اور پیروی سے علیحدہ رہتے ہیں۔ ہر ایک کو اس کی حالت کے مناسب بدلہ ملے گا[2]

مطلب یہ ہے کہ اللہ کی نگاہ میں تمہاری ساری عملی زندگی ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ تم کہاں کہاں اور کس کس گوشہ میں کفار و منافقین کی کاپی کر رہے ہو۔ گویا پہلے اقوال میں کفار کی تقلید سے روکا تھا اور اب اعمال میں ان جیسا طرز عمل ان جیسی روش اختیار کرنے سے منع کیا جا رہا ہے اللہ کو نہ یہ پسند ہے اور نہ وہ۔ اور ان دونوں میں ممانعت سے افکار میں کفار کی تقلید و پیروی کی ممانعت خود بخود نکل آتی ہے اور قرآن نے اس معاملہ میں یہ سنگینی اس لیے اختیار کی ہے کہ اُمّت مسلمہ دنیائے کفر کی اپوزیشن ہے اور اسے کفر کے مقابلے میں اپوزیشن ہی رہ کر زندہ رہنا ہے اگر کفر و ایمان کے درمیان مصالحت ممکن نہیں تو پھر مومنین کو کفار کی پیروی، تقلید، اور ان کی روش کو اپنانے کی گنجائش کیوں کر ہو سکتی ہے۔ اس سورت میں قرآن یہ بات مختلف پیرایوں اور مختلف اندازوں میں بتا چکا ہے کہیں فرمایا یا ایھا الذین آمنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین اور پھر فرمایا ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ماجاءھم البینات واولٰئک لھم عذاب عظیم اور پھر بتایا یا ایھا الذین

---

[1] ماجدی [2] افادات شیخ الاسلام

آمنوا ان تطیعوا الذین کفروا یردوکم علی اعقابکم فتنقلبوا خاسرین اور اب ارشاد ہو رہا ہے یا ایھا الذین آمنوا لا تکونوا کالذین کفروا اور آخر میں یہ دھمکی دی گئی ان اللہ بما تعملون بصیر سب کا لب لباب یہ ہے کہ کفار کی تقلید اور پیروی نہ کرو اور کہیں ذکرو۔ آیات قرآنی کے اسی زور کی وجہ سے حضور انور کا ارشاد ہے کہ

جس شخص نے کسی قوم کے ساتھ مشابہت اختیار کی وہ اسی میں سے ہو جاتے گا۔

یہ حدیث ابو داؤد میں آتی ہے۔ اسی حدیث کو سامنے رکھ کر صحابہ و تابعین اور تمام سلف صالحین نے ہر قسم کی مثیلاً تبدیل ہیئت اور تبدیل معاشرہ کو نفرت کی نگاہوں سے دیکھا ہے۔ اس موضوع کے تفصیلی مباحث کا یہ محل نہیں ہے۔ حافظ ابن تیمیہ کی اقتضاء الصراط المستقیم اور اردو دان طبقہ کے لیے جناب قاری محمد طیب کی التشبہ فی الاسلام میں اس پر سیر حاصل بحث ہے۔

اہل ایمان کے لیے بشارت

۲۹۳۔ اور اگر تم اللہ کی راہ میں قتل کر دیے گئے یا مر گئے تو اللہ کی بخشش و رحمت تمہارے لیے ان ساری چیزوں سے اچھی ہے جنہیں پونجی بنا کر وہ جمع کرتے رہتے ہیں۔ کفار و منافقین چونکہ دنیا کے بندے تھے۔ ان کی ساری دوڑ دھوپ صرف دنیوی فوائد کی خاطر تھی۔ اور ان کی بڑی خواہش یہ تھی کہ ان کی عمریں لمبی ہوں اور وہ دنیا میں رہ کر خوب مزے کریں۔ سفر میں مرنے والوں، اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے بارے میں ان کی بات ان کے باطنی خیالات اور قلبی رجحانات کی ترجمان تھی وہاں اس سے یہ بھی ممکن تھا کہ کہیں مسلمانوں میں کم ہمتی کا وسوسہ پیدا نہ ہو جائے اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں اہل ایمان کو جہاد کی ترغیب دی۔ یعنی اے ایمان والو اگر تم میں سے کوئی اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہوئے قتل کر دیا جائے یا طبعی موت سے مر جائے تم کو غم کرنے کی ضرورت نہیں ہے کیونکہ اللہ کی مغفرت و رحمت ان نفسانی حظوظ اور دنیوی منافع سے کہیں بہتر ہے جن کو حاصل کرنے میں یہ کفار و منافقین دن رات لگے ہوتے ہیں[1]

اس آیت سے اللہ تعالیٰ کا مقصود اہل ایمان کو جہاد کی ترغیب دینا ہے اور یہ سمجھانا ہے کہ جہاد

---

[1] جواہر القرآن۔

میں مارا جانا دُنیا کی زندگی سے کہیں بہتر ہے اس لیے کہ زندگی کا فائدہ بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ انسان زندہ رہ کر اپنی محنت و مشقت سے کچھ مال و متاع جمع کرے اور چند روزہ زندگی میں اس سے فائدہ اٹھائے اس کے برعکس راہِ خدا میں مارے جانے یا مر جانے سے اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کا جو صلہ ملتا ہے وہ تمام دُنیا کے مال و متاع سے کہیں بہتر ہے کیونکہ دُنیا کی تمام لذتوں اور منفعتوں میں مضرتوں کی آمیزش ہے۔ دُنیا کی کوئی خیر ایسی نہیں کہ جس میں نفع ہی نفع ہو اور نقصان نہ ہو۔ پھر یہ فانی اور چند روزہ ہے لہٰذا دنیوی مال و متاع کے فوت ہو جانے کو موجب حسرت نہ سمجھو بلکہ ترکِ جہاد پر افسوس کرو۔له

گویا بتایا گیا ہے کہ سچا مومن وہ ہے جو موت سے نہیں ڈرتا اور کبھی اس ڈر سے قدم پیچھے نہیں ہٹاتا۔ موت سے تو کسی حال میں مفر نہیں پھر کیوں نہ اس موت کا استقبال کیا جائے جو حق کی راہ میں آئے اور جس کا نتیجہ اللہ کی مغفرت اور رحمت ہو۔

کفار کے اس کہنے کا کہ اگر ہمارے پاس ہوتے تو نہ مرتے اور نہ قتل ہوتے دو جواب دیے ہیں ایک جواب تو یہ دیا ہے کہ احیاء و اماتت اللہ کے قبضے میں ہے خواہ کوئی سفر میں ہو یا حضر میں میدانِ جنگ میں یا مجلس صلح میں، دوسرا جواب یہ دیا ہے مرنا تو ہر حال ہے پھر بجائے اس کے کہ گھر میں ایڑیاں رگڑ کر مر جاؤ اگر اللہ کی راہ میں تمہیں شہید کر دیا جاتے یا اپنی موت سے ہی راہِ خدا میں مر جاؤ تو جو مغفرت اور رحمت اللہ تعالیٰ کی جانب سے میسر آئے گی وہ ان چیزوں سے بدرجہا بہتر ہے جو یہ کافر لوگ گھر میں بیٹھ کر جمع کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ کہ اول تو جہاد اور سفر کو موت میں کوئی خاص دخل نہیں بلکہ موت اور زندگی میں حقیقی دخل اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور اگر فرض کرو کہ سفر اور جہاد کو موت میں کوئی دخل ہے۔ پھر بھی جہاد اور سفر میں مرنا اللہ تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت کا موجب ہے اور اللہ کی یہ مغفرت و رحمت اس دولت و سرمائے سے کہیں بہتر ہے جو یہ لوگ جمع کرتے ہیں اور جس کی خاطر یہ زندگی پر جان دیتے ہیں۔ مال جمع کرنے کی نسبت کفار کی طرف کی گئی ہے کیونکہ مال و دولت کے جمع کرنے پر محنت اور وقت لگانا دُنیا دار اور دُنیا پرست کا کام ہے۔ ایمان دار مال جمع نہیں کرتا بلکہ خرچ کرتا ہے۔ ومما رزقنٰھم ینفقون

سب کی بالآخر اللہ کے حضور میں پیشی

۲۹۴۔ اور دیکھو خواہ تم اپنی موت مر جاؤ یا مارے جاؤ ہر حال میں تمہیں اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔

له معارف قرآن ج ا۔

یعنی فرض کرو کہ تم سفر یا جہاد میں نہ نکلے اور فی الحال موت سے بچ گئے مگر ضروری ہے کہ کبھی نہ کبھی مرو گے یا مارے جاؤ گے پھر بہرحال خدا کے سامنے سب کو جمع ہونا ہے اس وقت پتہ چل جائے گا کہ جو خوش قسمت اللہ کی راہ میں نیک کام کرتے ہوئے مرے یا مارے گئے تھے ان کو خدا تعالیٰ کی بخشش و مہربانی سے کیسا وافر حصہ ملا جس کے سامنے تمہاری دُنیا کی کمائی اور جمع کی ہوئی دولت و ثروت سب ہیچ ہے الحاصل اگر منافقین کا قول ہی تسلیم کر لیا جائے کہ گھر سے نہ نکلتے تو نہ مارے جاتے تب بھی سراسر خسارہ تھا کیونکہ اس صورت میں اس موت سے محروم رہ جاتے جس پر ایسی لاکھوں زندگیاں قربان کی جا سکتی ہیں بلکہ جو حقیقت میں موت نہیں حیات ابدی ہے۔

فنا فی اللہ کی تہ میں بقا کا راز مضمر ہے جو جینا ہے تو مرنے کے لیے تیار ہو جاؤ۔[1]

اس آیت کریمہ نے موت کے مسئلہ کو اس خوبی سے واضح کیا ہے کہ اس کی تائید کے لیے مزید کسی تشریح کی ضرورت نہیں ہے یہ اسی عقیدے کا نتیجہ تھا کہ صحابہ کرام کی گردنیں عین جنگ کی حالت میں اللہ سبحانہ کے حضور میں جھک جاتی تھیں اور ان کو موت سے کوئی اندیشہ اور خوف نہ ہوتا تھا۔ مالی بیچارگی، مصیبت، عزیزوں کی جدائی کسی موقعہ پر وہ رحمتِ الٰہی سے مایوس نہ ہوتے تھے اور ہر خطرناک سے خطرناک کام کے لیے وہ قدم اُٹھا بیٹھتے تھے کیونکہ ان کو یقین تھا کہ موت اپنے وقت پر آ کر رہے گی اور جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا اس لیے ان کے دلوں میں وہ عزم ہوتا تھا کہ نہ اس کو پہاڑ روک سکتے تھے نہ سمندر بہا لے جا سکتے تھے نہ حوادث کا طوفان اس کو اکھاڑ سکتا تھا اور نہ بھڑکتی ہوئی آگ کے شعلے اس کو جلا سکتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ نیک کام پر نکلے یا مارے گئے تو نکلنے پر افسوس نہ کرے کہ اس میں انکار آتا ہے تقدیر کا اور آخرت کا فائدہ نہ دیکھنا دُنیا کے جینے کو عزیز رکھنا یہ سب خصلت ہے کافروں کی۔ (موضح)

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فَبِمَا رَحْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ لِنْتَ لَهُمْ ۚ وَلَوْ كُنْتَ فَظًّا غَلِيظَ
الْقَلْبِ لَانْفَضُّوا مِنْ حَوْلِكَ ۖ فَاعْفُ عَنْهُمْ وَاسْتَغْفِرْ لَهُمْ
وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ ۚ فَإِذَا عَزَمْتَ فَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۚ إِنَّ
اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَوَكِّلِينَ ﴿﴾ إِنْ يَنْصُرْكُمُ اللّٰهُ فَلَا غَالِبَ لَكُمْ ۖ
وَإِنْ يَخْذُلْكُمْ فَمَنْ ذَا الَّذِي يَنْصُرُكُمْ مِّنْ بَعْدِهِ ۗ وَعَلَى
اللّٰهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿﴾

اے اللہ کے رسول یہ اللہ کی بڑی ہی رحمت ہے کہ آپ لوگوں کے لیے
بڑے ہی نرم مزاج واقع ہوتے ہیں[۲۹۵] ورنہ اگر آپ کہیں سخت مزاج
اور سنگ دل ہوتے تو یہ لوگ آپ کے اردگرد سے بچھڑ جاتے[۲۹۶].
پس ان لوگوں کا قصور معاف کر دو اور اللہ سے بھی ان کے لیے
بخشش مانگو اور نیز اس طرح کے کاموں میں ان سے مشورہ
کر لیا کرو پھر جب آپ کا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جاتے تو اللہ پر

بھروسہ کرو۔ اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسے پر کام کرتے[297] ہیں ۔ اللہ آپ کی مدد پر ہو تو کوئی طاقت آپ پر غالب آنے والی نہیں ہے اور اگر وہ آپ کو چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو آپ کی مدد کر سکتا ہے۔ اہلِ ایمان کو چاہیے کہ اللہ ہی کی ذات پر بھروسہ رکھیں[298]۔

رحمت و شفقت پر مبنی سیاسی نظام

اب تک قرآن نے اسلام کا سیاسی نظریہ، اسلام کا تصورِ قومیت اور نبوت کے علم و عمل کو قانون کا ماخذ بتایا ہے۔ اس آیت میں نظمِ مملکت کے سلسلے میں سب سے پہلی چیز جس کی طرف ہمیں متوجہ کیا جا رہا ہے یہ ہے کہ اس کی بنیاد سرتاسر شہریوں سے رحمت و شفقت پر مبنی ہے۔ یعنی قرآن ایسا سیاسی نظام چاہتا ہے جس کی عمارت رحمت و شفقت اور شوریٰ پر قائم کی گئی ہو۔ استبداد و تشدد اور جبر و اکراہ پر نہیں اسے سمجھانے کے لیے یہ مقام کس قدر موزوں ہے ۔

آپ غور کریں کہ دشمن سے مقابلہ ہے اور اہلِ ایمان ایسے جرم کا ارتکاب کرتے ہیں کہ جس میں فوجی عدالتیں دلیل، اپیل اور وکیل تک کی اجازت نہیں دیتی ہیں۔ قرآن ان کو عین میدانِ جنگ میں فشل، تنازع فی الامر اور عصیان جیسے سنگین جرائم کا مرتکب قرار دے چکا ہے ۔اس مرحلہ پر کون سربراہ اس قسم کے جرائم سے چشم پوشی کرتا ہے ۔ قرآن نے اسی موقعہ سے فائدہ اٹھا کر بات سے بات پیدا کر لی ہے اور حضورِ انور کو مخاطب کر کے بتایا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں اور رسول ہونے کی حیثیت میں آپ کی ذات سرتاسر شفقت و رحمت ہے ۔ آپ کا نظام سیاسی رحمت، شفقت پر مبنی ہونا چاہیے ۔ بے شک یہ سنگین جرائم کے مرتکب ہیں لیکن آپ ان کو معاف کر دیجئے ۔ اور صرف قانون اور ضابطہ کی معافی

نہیں بلکہ آپ کی شفقت کا تقاضا ہے کہ آپ ان کے لیے مغفرت کی دعا کریں اور زیادہ اعتماد کی ایسی فضا بحال کیجئے کہ حکومت کے معاملات میں یہ آپ کے مشیر ہوں بالفاظِ دیگر یہ کہہ کر اعلان کیا گیا ہے کہ ایسے مجرموں کو بھی مسائل میں رائے زنی سے محروم نہ کیا جائے اور ان سے ووٹ کا حق سلب نہ کیا جائے کیا حد ہے اس رحمت کی آج دنیا کی کوئی حکومت بھی اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔

آپ کی رحمت و شفقت

۲۹۵ - اللہ کے رسول یہ خدا کی بڑی ہی رحمت ہے کہ آپ لوگوں کے لیے بڑے ہی نرم مزاج واقع ہوئے ہیں۔ اصل ارشاد میں لنت لهم کے الفاظ آئے ہیں۔ یہ لین سے بنا ہے اس کے معنے نرم ہونے کے آتے ہیں۔ اسی سے صفت کا صیغہ لین آتا ہے۔ حضرت موسیٰ و ہارون کو جو آداب تبلیغ سکھائے جاتے ہیں قرآن نے ان کا ذکر کیا ہے۔

فقولا له قولا لينا   تم دونوں اس سے نرم بات کہنا

لیکن یہاں صرف بات کو نرم نہیں بلکہ آپ کی ذات گرامی سر تا سر نرم کہا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ آپ بات نرم کہتے ہیں بلکہ فرمایا کہ آپ ان کے لیے سراپا نرم ہیں۔ ایک ایسی ذات گرامی میں یہ وصف نہایت اہم ہے جو دنیا میں حق کی اقامت کا فریضہ لے کر آیا ہو تاکہ ایک طرف لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو، دوسری طرف وہ اس کے حلقہ اطاعت میں خوش دلی اور جوش محبت کے ساتھ داخل ہوں۔ اسی لیے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں یہ وصف سب سے نمایاں طور پر رکھا گیا اور اللہ تعالیٰ نے اس کو خاص اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری، عفو و درگزر، چشم پوشی اور خوش خلقی غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام ہے جس میں شان جمالی پائی جاتی ہے یہی لین، نرمی، رفق و تلطف ہے۔ جس طرح حسن فطرت، زینت و آرائش سے دوبالا ہو جاتا ہے اسی طرح لین و رفق سے انسان کا اخلاقی حسن دوچند ہو جاتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حضرت عائشہ کو یہ حقیقت ان لفظوں میں سمجھائی۔

نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے۔

اس میں جس چیز کا لفظ کتنا عام ہے اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بناتی اور

سختی بگاڑتی ہے الا یہ کہ قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارم اخلاق کا جو بیان حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اس میں نرمی اور سختی کے مواقع میں امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے۔ ام المومنین فرماتی ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے انتقام نہیں لیا البتہ جب احکام الٰہی کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ اس کو سزا دیتے۔ جن میں آپ نے مسلمانوں بلکہ ازواج مطہرات تک پر کسی کسی بات میں سختی برتی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں:

> گویا امام بخاری اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکلیفوں پر صبر کرتے تھے وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہے لیکن خدا کے حق میں آپ اس سختی سے کام لیتے تھے جس کا خدا نے حکم دیا ہے۔ فتح الباری جلد ۱۰ ص ۲۲۹۔

جیسا کہ فاثابکم غما بغم میں پڑھ آئے ہو کہ تم نے رسول کا دل تنگ کیا۔ اس کے بدلے تم پر تنگی آئی۔ بلاشبہ اس سے آپ کے قلب میں ملال و رنج ہونا ناگزیر اور اس ملال و رنج کے نتیجہ میں آپ کی پالیسی میں سختی رونما ہونے کا اندیشہ تھا اس لیے فرمایا کہ یہ صرف اللہ سبحانہٗ کی رحمت ہے کہ آپ ان کے لیے نرم ہو گئے۔ شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ جب آپ کی ذات تھی سراسر لین و نرم تو پھر اس موقعہ پر خاص طور پر یہ کیوں کہا کہ صرف اللہ کی رحمت سے آپ ان کے لیے نرم ہو گئے۔ بات یہ ہے کہ جب ان احکام کی تعمیل میں جو کسی فوج کو دیے گئے ہوں فروگذاشت ہوتی ہے یا ان احکام کی تعمیل نہیں ہوتی ہے تو قواعد جنگ کا تقاضا ہے کہ سخت سے سخت سزا دی جائے۔ یہ موقعہ لینت کے اظہار کا نہیں بلکہ شدت کے اظہار کا ہوتا ہے۔ پھر حضور انور کے ارشاد کی نافرمانی ہوئی جس کے نتیجہ میں اہل ایمان ہولناک مصیبت کا شکار ہوئے۔ حالات کا تقاضا تھا کہ سنگین سے سنگین تر سزا دی جائے لیکن عین اس موقعہ پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی کو کچھ نہ کہنا ظاہر کرتا ہے کہ آپ کی اس نرمی میں اللہ کی خاص رحمت کا ہاتھ تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے آپ کی نرمی کو یہاں بیان کیا ورنہ آپ کے اخلاق میں نرمی کے کوائف ناقابل شمار ہیں۔

یہاں خاص طور پر آپ کی نرمی کو سنانے میں یہ جتانا مقصود ہے کہ اسلام کے نظام حیات کو چلانے والے اہل ایمان جو دوسروں کے لیے پیشرو ہونے والے ہیں اور جن کے ہاتھ زمام قیادت

آنے والی ہے وہ اس قسم کے اخلاق اپنے اندر پیدا کریں چنانچہ ایک ارشاد نبوت میں بھی اس طرف اشارہ ہے :

اللہ کو کوئی حلم اور نرمی سربراہِ مملکت کے حلم اور نرمی سے زیادہ پسند نہیں اور کوئی جہل سربراہِ مملکت کی جہالت سے زیادہ اللہ کے نزدیک ناپسندیدہ نہیں ہے ۔

مکمل سپردگی رحیمانہ اخلاق کا نتیجہ ہے

۲۹۶ - ورنہ اگر تم کہیں سخت مزاج اور سنگ دل ہوتے تو یہ لوگ تمہارے گرد سے بچھڑ جاتے

اصل ارشاد میں فظا اور غلیظ القلب کے الفاظ آئے ہیں ۔ فظ کے معنے درشت خو ، در اصل برے اخلاق کی سختی کو کہتے ہیں ۔ یہ لفظ ایسے شخص کے لیے بولا جاتا ہے جس کے ساتھ رہنا لوگ پسند نہ کرتے ہوں اور غلیظ القلب کے معنے سخت دل کے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی ذات گرامی میں نرمی کی جگہ سختی اور خوش مزاجی کی جگہ سخت مزاجی ہوتی تو نہ تو اللہ کے بندے آپ کی بات سنتے اور نہ عقیدت و محبت سے لبریز اطاعت کرتے ۔ یہ آپ کے کریمانہ ، رحیمانہ ، شفیقانہ اخلاق کا کارنامہ ہے کہ عرب نے ساری جہالتوں ، خرابیوں اور غلاظتوں کے باوجود مکمل طور پر آپ کو اپنی قیادت سونپ دی ۔ قانونِ الٰہی کو بے چون وچرا تسلیم کر لیا اور خواہشات و خودسری سے مکمل طور پر دستبردار ہو گئے وہ ایسے غلام بن گئے جو نہ اپنے مال کا مالک ہے نہ اپنی جان کا ۔ جو مالک کی مرضی اور اجازت کے بغیر ادنیٰ سے ادنیٰ تصرف بھی نہیں کر سکتا ۔ ان کی صلح و جنگ ، دشمنی و دوستی ، خوشی و ناراضگی ، عطا و محرومی اور صلہ و قطع رحمی سب اللہ کے رسول کے حکم کے تابع تھی ۔ جو کچھ بھی کرتے آپ کے حکم کے موافق کرتے ۔

قرآن نے یہ کہہ کر اشارہ کر دیا کہ جس قیادت کی بنیاد فظاظت اور غلاظت قلب پر ہو گی وہ اسلامی قیادت نہیں ہے ۔ اس میں عام شہری مجبورانہ طاعت تو کر سکتے ہیں لیکن دل کی پوری خوشنودی اور دماغ کے پورے سکون کے ساتھ ہمنوائی نہ کریں گے ۔ مسجد کی امامت ، مدارس کی معلمی ، خانقاہ کی مشیخت ، انجمنوں کی سربراہی یا پھر ملک و حکومت کی صدارت ان میں سے ہر جگہ قیادت کے اسلامی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کا دامن فظاظت اور غلاظت کی گندگی سے بے داغ اور پاک ہو ۔ اگرچہ ابوبکر الجصاص نے اس کی وسعتوں پر دعوت کا پشتہ باندھنے کی کوشش کی ہے لیکن قرآن کا سیاق و سباق بتا رہا ہے کہ یہ دعوت عام ہے

خواہ زندگی کے کسی گوشہ میں ہو۔

معافی دیجئے اور اللہ سے ان کیلئے مغفرت مانگیے

۲۹۰۔ پس ان لوگوں کو معاف کردو اور اللہ سے بھی ان کے لیے بخشش کی دعا کرو اور نیز اس طرح کے کاموں میں ان سے مشورہ کر لیا کرو۔ پھر جب تمہارا عزم کسی رائے پر مستحکم ہو جائے تو اللہ پر بھروسہ کرو اللہ کو وہ لوگ پسند ہیں جو اسی کے بھروسہ پر کام کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو ان کی کوتاہیوں پر متنبہ فرمانے اور معافی کا اعلان سنانے کے بعد نصیحت کی تھی کہ آئندہ اس مارِ آستین جماعت کی باتوں سے فریب مت کھانا، اس آیت میں ان کے عفو و تقصیر کی تکمیل کی گئی ہے۔ چونکہ جنگ احد میں سخت خوفناک غلطی اور زبردست کوتاہی مسلمانوں سے ہوئی تھی۔ شاید آپ کا دل خفا ہوا ہوگا اور چاہا ہوگا کہ آئندہ ان سے مشورہ لے کر کام نہ کیا جائے اس لیے حق تعالیٰ نے نہایت عجیب و غریب پیرایہ میں ان کی سفارش کی۔ اول اپنی طرف سے معافی کا اعلان کیا کیونکہ خدا کو معلوم تھا کہ آپ کا غصہ اور رنج خالص اپنے پروردگار کے لیے ہوتا ہے۔ پھر فرمایا فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم یعنی اللہ کی کتنی بڑی رحمت آپ پر اور ان پر ہے کہ آپ کو اس قدر خوش اخلاق بنا دیا۔ کوئی اور ہوتا تو خدا جانے ایسے سخت معاملہ میں کیا رویہ اختیار کرتا۔ یہ کچھ اللہ کی مہربانی ہے کہ آپ جیسا شفیق اور نرم دل پیغمبر ان کو مل گیا۔ فرض کیجئے اگر خدا نہ کردہ آپ کا دل سخت ہوتا اور مزاج میں شدت ہوتی تو یہ قوم آپ کے گرد کہاں جمع ہوتی ان سے کوئی غلطی ہوتی اور آپ سخت پکڑ کرتے تو شرم و دہشت کے مارے پاس بھی نہ پھٹکتے۔ اس طرح یہ لوگ بڑی خیر و سعادت سے محروم رہ جاتے اور جمعیت اسلامی کا شیرازہ بکھر جاتا لیکن حق تعالیٰ نے آپ کو نرم دل اور نرم خو بنایا۔ آپ اصلاح کے ساتھ ان کی کوتاہیوں سے اغماض کرتے رہیے سو یہ کوتاہی بھی جہاں تک آپ کے حقوق کا تعلق ہے معاف کر دیجئے اور گو خدا اپنا حق معاف کر چکا ہے تاہم ان کی مزید دلجوئی اور تطییب خاطر کے لیے ہم سے بھی ان کے لیے معافی طلب کریں تاکہ یہ شکستہ دل آپ کی خوشنودی اور انبساط محسوس کر کے بالکل مطمئن اور منشرح ہو جائیں اور صرف معاف کر دینا ہی نہیں بلکہ آئندہ بدستور ان سے معاملات میں مشورہ لیا کریں۔ مشاورت کے بعد جب ایک بات طے ہو جائے اور پختہ ارادہ کر لیا جائے۔ پھر خدا پر توکل کر کے اس کو بلا پس و پیش کر گزریے۔ خدا تعالیٰ متوکلین کو پسند کرتا ہے اور ان کا کام بنا دیتا ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت کی ضروری تشریح تو آپ شیخ الاسلام کی زبانی سن چکے ہیں لیکن ضروری ہے کہ سیاق و سباق کے لحاظ سے بحیثیت مجموعی اس پر ایک نظر ڈال لی جائے تاکہ اس آیت کرامی کی موعظتیں اور عبرتیں پوری وضاحت کے ساتھ سامنے آجائیں۔ اس سلسلہ میں حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

اسلامی حکومت کا مزاج

یہ آیت قرآنی بتاتی ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کا ایک ممتاز مزاج ہے۔ یہ حکومت ایک داعی کی حیثیت رکھتی ہے یہ اپنے دائرہ اختیار میں دین کو قائم کرنے کی کوشش کرتی ہے اور اقوام دنیا کے سامنے اسلام کے پیغام کو پیش کرتی ہے اس حکومت کی حیثیت مبلغ داعی اور معلم کی ہے اور اس کا سارا کام محبت، اخوت، رحم، نرمی و شفقت اور ہمدردی کی بنیادوں پر انجام پائے گا اور یہی اس کا امتیازی نشان ہے فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم میں اسی طرف اشارہ ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آپ کی امت کے افراد نے آپ سے ایسی محبت اور ایسی جاعت کی ہے جس کی مثال عشاق اور اہل محبت کی تاریخ میں ملنے میں نہیں آتی ہے۔ آپ کی طاعت و تابعداری میں اپنے آپ کو بالکل مٹا دینے اور گھر بار لٹا دینے کے ایسے واقعات پیش آئے جو نہ آپ سے قبل پیش آتے تھے اور نہ آئندہ ان کی امید ہے۔

اطاعت و تابعداری محبت و شفقت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب صحابہ کرام محبت کی دولت سے مالا مال ہو گئے تو انہوں نے اپنی ساری طاقت آپ کی اطاعت میں صرف کر دی۔ اس کی بہترین مثال سعد بن معاذ کا وہ قول ہے جو انہوں نے اپنی اور جماعت انصار کی جانب سے بدر سے پہلے کہا تھا۔

میں انصار کی طرف سے مشرح صدر کے ساتھ کہتا ہوں اور ان کی جانب سے جواب بھی دیتا ہوں کہ آپ جہاں چاہیں مقیم ہوں، جس کا تعلق چاہیں قائم کریں اور جس کا چاہیں توڑ دیں اور ہمارے مال و دولت سے جو چاہیں لے لیں اور جو چاہیں دے دیں۔ جو کچھ آپ ہم سے لے لیں گے وہ اس سے زیادہ محبوب ہوگا جو آپ چھوڑ دیں گے اور جس بارے میں جو کچھ حکم فرمائیں گے ہم اس کے تابع ہوں گے بخدا اگر آپ برک غملان چلے جائیں تو ہم بھی آپ کے ساتھ چل پڑیں گے اور خدا کی قسم اگر آپ سمندر میں گھوڑے ڈال دیں گے تو ہم بھی اس میں کود پڑیں گے[1]

[1] زاد المعاد

اسلامی حکومت میں مشورے کی حیثیت

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کا ایک اہم رکن مشورہ ہے جس بات کو یہاں حضور کو امر کے درجے میں پیش کیا ہے اسی کو قرآن ہی میں دوسری جگہ اہل ایمان کے اوصاف میں خیر کے انداز میں پیش کیا ہے۔ قرآن میں ہے وامرھم شوریٰ بینھم اس لیے مشورہ اسلامی طرز حکومت کا ایک اہم ستون ہے اور مشورے کے بغیر اجتماعی کام چلانا نہ صرف یہ کہ جاہلیت کا طریقہ ہے بلکہ اللہ کے مقرر کیے ہوتے ضابطہ کی صریح خلاف ورزی ہے۔

ان دونوں آیتوں کو ملا کر یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو جاتی ہے کہ آیت میں امر سے مراد حکومت ہے اسی سے قرآن میں ارباب حکومت کے لیے اولی الامر آیا ہے۔

اس بنیادی حقیقت کے بعد ہمارے سامنے یہ اہم سوال آتا ہے کہ اگر مشورہ اسلام کے سیاسی نظام کا اہم رکن ہے تو پھر اس کی حدود کار یا اس کا دائرہ کار کیا ہے۔ حضرت علیؓ کا بیان ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ اگر آپ کے بعد ہمیں کوئی ایسا معاملہ پیش آجائے جس کے بارے میں نہ قرآن میں حکم ہو اور نہ آپ سے ہم نے کچھ سنا ہو تو ہم کیا کریں فرمایا:

میری امت کے عابد لوگوں کو جمع کر لو اور اس معاملے کو باہم مشورے کے لیے پیش کر دو۔
کسی ایک شخص کی رائے پر فیصلہ نہ کر ڈالو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زندگی کی پھیلی ہوئی تمام وسعتیں مشورے کی حدود میں الا یہ کہ کوئی معاملہ ایسا ہو جس میں قرآن و سنت کا کوئی ناطق فیصلہ موجود ہو۔ صدر ریاست کے تقرر سے لے کر تشکیل اور تنظیم حکومت تک کے تمام سیاسی اور اجتماعی شعبے مشورے کے رہین منت ہیں یعنی مسلمانوں کا کوئی اجتماعی کام مشورے کے بغیر انجام نہ پانا چاہیے۔ یہ حکم نہایت وسیع معنے میں ہے لیکن اس میں شوریٰ کی کوئی خاص صورت مقرر نہیں کی گئی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے احکام ساری دنیا کے لیے ہیں اور ہمیشہ کے لیے ہیں۔ اگر شوریٰ کا کوئی خاص طریقہ مقرر کر دیا جاتا تو وہ عالمگیر اور ابدی نہ ہو سکتا۔ شوریٰ براہ راست تمام لوگوں سے ہو یا لوگوں کے نمائندوں سے۔ یہ نمائندے عوام کے ووٹوں سے منتخب ہوں یا خواص کے ووٹوں سے، انتخاب مملکت گیر ہو یا صرف صدر مقام میں انتخاب الیکشن کی صورت میں ہو یا ایسے لوگ لیے جائیں جن کی نمائندہ حیثیت معروف ہو۔ مجلس شوریٰ ایک ایوانی ہو یا دو ایوانی۔ یہ ایسے سوالات ہیں جن کا ایک جواب ہر سوسائٹی اور ہر تمدن

کے لیے یکساں موزوں نہیں ہوسکتا۔ ان کے جواب کی مختلف صورتیں مختلف حالات کے لیے ہوسکتی ہیں اور حالات کی تبدیلی سے نئی نئی صورتیں اختیار کی جاسکتی ہیں اس لیے اسلام کے نظام سیاسی میں نبوت نے ان امور کو کھلا چھوڑ دیا ہے نہ کسی خاص شکل کو مقرر کیا اور نہ کسی خاص شکل کو ممنوع قرار دیا۔ حضرت مفتی صاحب نے یہ بات بالکل برمحل لکھی ہے کہ — شورائیت اور مشورہ کو اسلامی حکومت کے لیے اساسی اور بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ حتیٰ کہ اگر امیر مملکت مشورے سے آزاد ہوجاتے یا ایسے لوگوں سے مشورہ لے جو شرعی نقطۂ نظر سے مشورے کے اہل نہ ہوں تو اس کا عزل کرنا واجب ہے۔

ابن عطیہ کہتے ہیں کہ شورائیت شریعت کے قواعد اور بنیادی اصولوں میں سے ہے جو امیر کہ اہل علم اور اہل دین سے مشورہ نہ کرے اس کا معزول کرنا واجب ہے اور یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں

(البحر المحیط لابی حیان[1])

شوریٰ کی بنیاد پر حکومت کی تشکیل کیسے ہو۔ صدرِ مملکت کا تقرر اور مجلس شوریٰ کیسے وجود میں آئے۔ اس پر تفصیلی مباحث انشاء اللہ پارہ پنجم میں آئیں گی۔

ہر حال میں اللہ پر بھروسہ کرو

۲۹۸۔ اللہ تمہاری مدد پر ہو تو کوئی طاقت تم پر غالب آنے والی نہیں ہے اور اگر وہ تمہیں چھوڑ دے تو اس کے بعد کون ہے جو تمہاری مدد کر سکتا ہے۔ اہل ایمان کو چاہیے کہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں۔ پہلے آپ کو فرمایا تھا بھروسہ کرو اللہ پر یہاں بتلا دیا کہ بھروسہ کے لائق ایسی ہی ذات ہوسکتی ہے جو سب سے زبردست اور غالب ہو۔ سب مسلمانوں کو اس کی امداد پر توکل کرنا چاہیے۔ گویا مسلمانوں کی تقصیر خود معاف کرنے اور اپنے پیغمبر سے معاف کرا دینے کے بعد ان کو نصیحت کی جاتی ہے کہ کسی کے کہنے سننے میں نہ آئیں۔ خالص خدا پر بھروسہ رکھیں اس کی مدد ہوگی تو کوئی طاقت تم پر غالب نہیں آسکتی جیسے بدر میں دیکھ چکے ہو اور کسی مصلحت سے وہ مدد نہ کرے تو پھر کوئی مدد نہیں کر سکتا جیسا کہ اُحد میں تجربہ ہوگیا۔[2]

اس آیت گرامی میں اللہ کی نصرت کا ذکر کر کے بتایا ہے کہ اہل ایمان کا اصلی سرمایہ اور واقعی قوت

[1] معارف قرآن م سش [2] افادات شیخ الاسلام

اللہ پر توکل ہے اور یہ توکل ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ توکل قرآن پاک کی اصطلاح میں بے حد اہمیت رکھتا ہے عام لوگ اس کے معنے یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کیلیے جدوجہد اور کوشش نہ کی جائے بلکہ چپ چاپ ہاتھ پاؤں توڑے کسی حجرے یا خانقاہ میں بیٹھے رہو اور یہ سمجھو کہ خدا کو جو کچھ کرنا ہے وہ خود کرے گا۔ یعنی تقدیر میں جو کچھ ہے وہ ہو کر رہے گا۔ اسباب اور تدبیر کی ضرورت نہیں ہے لیکن یہ سراسر وہم ہے اور مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے جس کو اسلام سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

توکل کے معنے

توکل کے لفظی معنے بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں خدا پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں۔ لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا، کسی کام کے کرنے نہ کرنے میں؟ غلط کار لوگوں نے ترکِ عمل اسباب و تدبیر سے بے پروائی اور خود کام نہ کرکے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل رکھا ہے۔ حالانکہ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادہ و عزم اور تدبیر و کوشش کے ساتھ انجام دینے اور اس کے نتائج کے لیے اپنی کوشش و محنت پر نہیں بلکہ اللہ پر یقین رکھنے کا۔ اگر تدبیر اور جدوجہد و کوشش نہ کرنے کا نام توکل ہوتا تو قرآن میں تلاشِ رزق کے لیے فامشوا فی مناکبھا و کلوا من رزقہ اور جنگ کی خاطر یاایھا الذین آمنوا خذوا حذرکم اور اعدوا لھم ما استطعتم کا حکم نہ ہوتا بلکہ اللہ تعالیٰ انبیاء ہی کو روانہ نہ کرتا اور ان کو اپنی تبلیغ رسالت کے لیے جدوجہد اور سعی و سرگرمی کی تاکید نہ کرتا۔ اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا۔ نہ بدر و احد اور خندق و حنین میں سواروں، تیر اندازوں، زرہ پوشوں اور تیغ آزماؤں کی ضرورت پڑتی اور نہ رسُول کو ایک ایک قبیلے کے پاس جاجا کر حق کی دعوت کا پیغام سنانے کی حاجت ہوتی۔

توکل میں مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے۔ اس آیت میں حکم ہو رہا ہے کہ جب کوئی لڑائی یا کوئی اجتماعی مشکل پیش آجائے تو سب سے پہلے لوگوں سے اس کے متعلق مشورہ کرلو۔ مشورے کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اس کو انجام دینے کا عزم کرلو اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کردو اور خدا پر توکل اور بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا ضرور نتیجہ پیدا کرے گا۔ اگر نتیجہ حسبِ دلخواہ نہ نکلے تو اس کو خدا کی مصلحت اور حکمت سمجھو اور اس سے مایوس اور بوڑے نہ بنو اور جب خاطر خواہ نتیجہ نکلے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور کاوشوں کا نتیجہ ہے بلکہ یہ سمجھو کہ اللہ تعالیٰ کا تم پر فضل و کرم ہوا اور اسی نے

تم کو کامیاب و بامراد بنایا ہے۔

اس آیت نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت واضح کر دی ہے کہ توکل بے دست و پائی اور ترک عمل کا نام نہیں بلکہ پورے عزم و ارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر اور نتیجہ کو خدا کے بھروسہ پر چھوڑ دینے اور یہ یقین کرنے کا نام ہے کہ خدا مدد کرے تو ہم کو کوئی ناکام نہیں کر سکتا۔

احادیث اس موضوع پر بے شمار ہیں۔ مسند احمد اور صحیحین میں بحوالہ عبداللہ ابن عباس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

میری امت میں ستر ہزار اشخاص بغیر حساب وکتاب کے جنت میں جائیں گے یہ وہ لوگ ہوں گے جو تعویذ گنڈا نہیں کرتے جو شگون بد کے قائل نہیں، جو داغ نہیں کرتے بلکہ اپنے پروردگار پر توکل رکھتے ہیں۔

ایک بدوی اونٹ پر سوار ہو کر آیا اور سوال کیا کہ یا رسول اللہ میں اونٹ کو یوں ہی کھلا چھوڑ کر توکل کروں یا اس کو باندھ کر، ارشاد ہوا کہ اس کو باندھ کر اللہ پر بھروسہ کرو

بر توکل زانوئے اشتر بہ بند

یہ روایت سند کے لحاظ سے قوی نہیں مگر حقیقت کی رو سے اس کا مفہوم قرآن پاک کے منشاء سے ہم آہنگ ہے۔

ایک اور موقعہ پر ارشاد ہوا کہ اگر تم خدا پر توکل کرتے جیسا کہ توکل کرنے کا حق ہے تو خدا تم کو ویسے ہی روزی پہنچاتا جیسا کہ پرندوں کو پہنچاتا ہے۔ صبح کو بھوکے جاتے ہیں اور شام کو سیر ہو کر واپس آتے ہیں[1]

اس موضوع پر سلف صالحین سے جو نقول ہم تک پہنچی ہیں وہ بھی بہت ہی واضح ہیں۔

ایک شخص نے امام احمد سے دریافت کیا میں متوکلاً علی اللہ حج کا ارادہ رکھتا ہوں۔ فرمایا کہ قافلہ کے ساتھ نہ جاؤ تنہا جاؤ۔ بولا میں تو قافلہ کے ساتھ جاؤں گا فرمایا کہ پھر لوگوں کے ناشتہ دانوں پر توکل کرو گے اللہ پر نہیں۔

امام احمد ہی کے صاحبزادے کہتے ہیں کہ میں نے اپنے والد سے کہا حضرت یہ لوگ متوکلین کہتے

---

[1] ترمذی۔

ہیں کہ ہمارا کام بیٹھنا ہے روزی پہنچانا اللہ کے ذمہ ہے فرمایا کہ یہ بات قطعاً بیہودہ ہے اللہ سبحانہٗ فرماتا ہے اذا الصلاۃ من یوم الجمعۃ الخ

امام غزالی فرماتے ہیں اللہ کی سنت کے خلاف کرنا شرطِ توکل نہیں ہے۔

جنید بغدادی کے شیخ ابوحفص کہتے ہیں کہ میں نے بیس سال تک توکل کو راز بنائے رکھا اور کبھی بازار نہیں چھوڑا۔

وَمَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَغُلَّ ۚ وَمَنْ يَغْلُلْ يَأْتِ بِمَا غَلَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۚ

ثُمَّ تُوَفّٰى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝

أَفَمَنِ اتَّبَعَ رِضْوَانَ اللّٰهِ كَمَنْ بَآءَ بِسَخَطٍ مِّنَ اللّٰهِ وَمَأْوٰىهُ

جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ۝ هُمْ دَرَجٰتٌ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَاللّٰهُ

بَصِيْرٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ۝

کسی نبی کا یہ کام نہیں ہو سکتا کہ وہ خیانت کر جائے اور جو کوئی خیانت
کرے گا تو وہ خیانت سمیت روزِ قیامت پیش ہو گا۔ پھر ہر شخص
کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر کوئی ظلم نہ
ہو گا[۲۹۹]۔ کیا ایسا آدمی جو رضائے الٰہی کا پیروکار ہو اس شخص کی
طرح ہو سکتا ہے جس نے اللہ کی ناراضگی میں اپنا ٹھکانہ بنایا ہو
اور جس کا ڈیرہ جہنم ہے[۳۰۰]۔ اللہ کے یہاں لوگوں کے الگ الگ
درجے ہیں اور جیسے کچھ ان کے اعمال ہیں اللہ دیکھ رہا ہے[۳۰۱]۔

عصمت نبوت کا مقام

شارحین قرآن اس آیت کی تشریح میں مختلف الخیال ہیں، کچھ کہتے ہیں کہ جن تیر اندازوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عقب کی حفاظت کے لیے بٹھایا تھا۔ انہوں نے جب دیکھا کہ دشمن کا لشکر لوٹا جا رہا ہے تو ان کو اندیشہ ہوا کہ کہیں ساری غنیمت انہی لوگوں کو نہ مل جائے جو اسے لوٹ رہے ہیں اور ہم تقسیم کے موقعہ پر محروم رہ جائیں۔ اس بنا پر انہوں نے اپنی جگہ چھوڑ دی تھی۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ واپس تشریف لائے تو آپ نے ان لوگوں کو بلا کر اس نافرمانی کی وجہ دریافت کی۔ انہوں نے جواب میں کچھ عذر پیش کیے جو نہایت کمزور تھے اس پر حضور نے فرمایا بل ظننتم انا نغل ولا نقسم لکم بلکہ تمہارا خیال تھا کہ ہم تمہارے ساتھ خیانت کریں گے اور تم کو حصہ نہ دیں گے۔ اس آیت کا اشارہ اسی معاملہ کی طرف ہے[1]

واقعہ حسب روایت ترمذی یہ ہے کہ غزوہ بدر میں مال غنیمت میں ایک چادر گم ہو گئی تھی کچھ لوگوں نے کہا کہ شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لی ہے۔ یہ کہنے والے اگر منافق تھے تو کوئی بعید بات نہیں اور ممکن ہے کہ کوئی ناسمجھ مسلمان ہی ہو تو اس نے یہ سمجھا ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کا اختیار ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔[2]

صاحب جواہر القرآن کا میلان بھی اسی طرف ہے اور مولانا محمد ادریس نے یہ دونوں روایات درج فرما کر لکھا ہے کہ — بہر حال آیت غزوۂ احد سے متعلق ہو یا غزوہ بدر سے مقصود ایک بے عنوانی پر تنبیہ ہے گزشتہ آیات میں جنگ احد کی ایک کوتاہی کو بیان فرمایا اور اس آیت میں جنگ بدر کی ایک کوتاہی یاد دلادی ساور یہ بتلا دیا کہ منصب نبوت کے ساتھ خیانت جمع نہیں ہو سکتی۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں،

مترجم گوید کہ چوں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم متصرف بودند در مال غنیمت ایں آیت نازل شد تا کسے گمان خیانت نہ کند۔

یعنی چونکہ مالیاتی نظام یعنی غنیمت پر حضور ہی کا تصرف تھا اور آپ ہی کے صوابدید پر موقوف تھا اس لیے یہاں خاص طور پر مال غنیمت کے بارے میں آگاہ کر دیا۔ شاہ عبد القادر نے موضح القرآن میں ان سب باتوں میں ہم آہنگی پیدا کر دی ہے۔

اس سے مراد مسلمانوں کی خاطر جمع کرنی ہے یہ نہ جانیں کہ حضرت نے ہم کو ظاہر میں معاف

[1] تفہیم [2] معارف القرآن م سثل

کر دیا اور دل میں خفا ہیں۔ پھر کبھی خفگی نکالیں گے۔ یہ نبیوں کا کام نہیں ہے کہ دل میں کچھ اور ظاہر میں کچھ۔ یا مسلمانوں کو کچھ سمجھانا ہے کہ حضرت پر گمان نہ کریں کہ غنیمت کا مال کچھ چھپا رکھیں۔ شاید اس لیے فرمایا کہ وہ تیر انداز مورچہ چھوڑ کر دوڑے غنیمت کو۔ کیا حضرت ان کو حصہ نہ دیتے یا بعض چیز چھپا رکھتے اور کہتے ہیں کہ بدر کی لڑائی میں ایک چیز گم ہو گئی، کسی نے کہا کہ شاید حضرت نے اپنے واسطے رکھی ہو گی اس پر یہ آیت اتری۔

حضرت شاہ صاحب نے جس بات کو اولیت دی اور جو ان کی خداداد ذہنیت کا شاہکار ہے وہ بے حد لطیف ہے۔ قرآن کے سیاق و سباق سے بے حد مربوط ہے۔ وشاورھم فی الامر کے بعد یہ بات کہ تم بالکل مطمئن رہو۔ تمہارے لیے نبوت کی جانب سے یہ معافی نامہ دائمی ہے اور یہ خیال بھی دل میں نہ لانا کہ کبھی مال غنیمت کی تقسیم کے موقعہ پر تمہاری ان غلطیوں کا جو تم سے اُحد میں ہو چکی ہیں نبوت ایکشن لے گی۔ یہ شان نبوت نہیں ہے یعنی یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ نبی ہو کر یہ کام کرے۔

یہ بھی ممکن ہے کہ کچھ منافقوں کے اس اعتراض کا بھی جواب ہو کہ ہم نے مشورہ دیا تھا کہ شہر کے اندر رہ کر مقابلہ کیا جائے لیکن انہوں نے ہماری اور ہمارے بھائیوں کی کوئی پروا نہ کی اور ان کو ایک بالکل نامناسب مقام پر لے جا کر دشمن سے مروا دیا یہ قوم کی بدخواہی اور بے وفائی ہے۔ قرآن نے اس آیت میں ان کے الزام کی تردید کی ہے کہ تمہارا یہ الزام بالکل جھوٹ ہے کوئی نبی اپنی اُمت کے ساتھ کبھی بے وفائی اور بدعہدی نہیں کر سکتا۔

بہرحال کچھ ہو یہ آیت گرامی اگر ایک طرف اہل ایمان سے کہہ رہی ہے کہ جب حضور انور تمہیں معاف کر چکے ہیں تو تمہارا فرض یہ ہونا چاہیے کہ ان کے تمام احکام وعزائم کی بے چون وچرا اطاعت کرو وہ اللہ کے نبی ہیں اور ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ اللہ کا نبی خلق خدا کی امامت وپیشوائی کے فرائض میں کسی طرح کی خیانت کرے۔ دوسری طرف یہ اُمت بتا رہی ہے کہ نبی کی ذات معصوم اور بے گناہ ہے۔ یہود میں چونکہ پیشین گو ہونے کے علاوہ نبی کا کوئی صحیح تخیل نہیں ہے۔ اس لیے ان کی کتابوں میں انبیائے کرام کی طرف ایسی باتیں منسوب کی گئی ہیں جو ان کی شان نبوت کے سراسر منافی ہیں۔ عیسائیوں میں صرف ایک مسیح کی ذات معصوم مانی جاتی ہے لیکن اسلام میں یہ عقیدہ ہر نبی اور رسول کی نسبت عام ہے۔ اس کے نزدیک تمام انبیاء اور رسول

ناہوں سے پاک اور معصوم ہیں۔

۲۹۹۔ کسی نبی کا یہ کام نہیں ہوسکتا کہ وہ خیانت کر جائے اور جو کوئی خیانت کرے گا تو وہ خیانت سمیت روز قیامت پیش ہوگا۔ پھر ہر شخص کو اس کی کمائی کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور کسی پر کوئی ظلم نہ ہوگا۔

اس سے غرض یا تو مسلمانوں کی پوری طرح خاطر جمع کرنا ہے تاکہ یہ وسوسہ نہ لائیں کہ شاید حضرت نے ہم کو بظاہر معاف کر دیا اور دل میں خفا ہیں پھر کبھی خفگی نکالیں گے۔ یہ کام نبیوں کا نہیں کہ دل میں کچھ ظاہر میں کچھ یا مسلمانوں کو سمجھانا ہے کہ حضرت کی عظمت و عصمت و امانت کو پوری طرح مستحضر رکھیں۔ آپ کی نسبت کبھی کوئی لغو اور بیہودہ خیال نہ لائیں مثلاً یہ گمان نہ کریں کہ غنیمت کا کچھ مال چھپا رکھیں گے العیاذ باللہ۔ شاید یہ اس واسطے فرمایا کہ وہ تیرانداز غنیمت کے لیے مورچہ چھوڑ کر دوڑے تھے۔ کیا حضرت ان کو حصہ نہ دیتے یا کچھ چھپا لیتے۔ اور بعض روایات میں ہے کہ بدر کی لڑائی میں ایک چیز غنیمت میں گم ہوگئی تھی۔ کسی نے کہا کہ شاید حضرت نے اپنے واسطے رکھی ہوگی۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بہرحال مسلمانوں کو یہ سمجھانا ہے کہ اگر حضور اپنی نرم خوئی اور خوش خلقی سے تمہاری غلطیوں کو معاف کرتے ہیں تو تم کو حضور کی عظمت شان اور عصمت و نزاہت کا بہت زیادہ پاس رکھنا چاہیے۔ کسی قسم کا کفر در بارگیک خیال مومنین کے پاس نہ آنے پائے۔ دوسری طرف چونکہ آپ کی شفقت یاد دلا کر جنگ احد کے متعلق مسلمانوں کی کوتاہی کو معاف کرایا جا رہا تھا۔ اسی ذیل میں ایک دوسری کوتاہی بھی یاد دلا دی جو بدر سے ہی متعلق تھی کہ آپ اپنی نرم خوئی سے اس پر بھی کچھ دھیان نہ کریں۔ غلول کے اصل معنے غنیمت میں خیانت کرنے کے ہیں۔ لیکن کبھی مطلق خیانت کے معنے میں آتا ہے بلکہ بعض اوقات محض ایک چیز کے چھپا لینے پر اس کا اطلاق ہوتا ہے جیسے عبداللہ ابن مسعود نے فرمایا غلوا مصاحفکم اپنے قرآن چھپا لو۔[1]

آیت کی ضروری تشریح ہو چکی ہے لیکن کچھ بحث طلب امور باقی ہیں۔

غلول کے معنے

عربی زبان میں غل کے معنے کسی چیز کو چپکے سے لے لینا ہے جیسے چوری۔ اس کا زیادہ استعمال

[1] افادات شیخ القرآن

تقسیم سے پہلے مالِ غنیمت میں چوری پر ہوتا ہے۔ دراصل یہ لفظ غلل سے بنا ہے اس کے معنے درخت کے ریشوں میں پانی پہنچنے کے ہیں۔ خیانت کو بھی غلول اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ کسی کی ملک میں چپکے سے ناجائز طور پر دراندازی ہوتی ہے۔ اسی سے کینہ کو غل کہتے ہیں اور پیاس کی شدت کو غلیل کہتے ہیں۔ یہ لفظ دراصل نصح کا متقابل آتا ہے جس کے معنے خیر خواہی اور خیر سگالی کے ہیں۔ اصحاب لغت میں سے زجاج نے ماکان للنبی ان یغل کی تشریح جیسا کہ صاحب لسان العرب نے تصریح کی ہے ماکان للنبی ان یخون امتہ سے کی ہے یعنی نبی اپنی امت سے خیانت نہیں کرتا۔ نیز یہ لفظ قرآن میں متعدد جگہ غش، عداوت، کینہ اور حسد کے معنے میں استعمال ہوا ہے لا تجعل فی قلوبنا غلاً" اب اس فقرے کے معنے یوں ہوں گے کہ نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ وہ خیانت کرے۔ یہ اندازِ تعبیر زیادہ بلیغ ہے اس سے کہ یوں کہا جاتا کہ نبی خیانت نہیں کرتا ہے۔ گویا پہلے انداز میں امکان خیانت کی نفی ہے جب کہ دوسرے میں صرف خیانت کرنے کی نفی ہے۔ شاید امام رازی کی اسی نکتہ پر نظر پہنچی کہ آپ نے لکھا ہے ان النبوۃ والخیانۃ لا یجتمعان نبوت اور خیانت دونوں یکجا نہیں ہو سکتی ہیں۔ اور ابوحیان اندلسی نے بھی ایسی بات لکھی ہے کہ :

> مطلب یہ ہے کہ نبی سے ایسا ہونا ممکن ہی نہیں ہے کیونکہ غلول معصیت ہے اور پیغمبر معصوم ہوتا ہے اور نفی میں اشارۃ سمجھا دیا گیا ہے کہ اس کا نبی کے بارے میں وہم بھی درست نہیں ہے۔

اس موقعہ پر خاص طور پر حضور انور کا ذکر صرف اس پس منظر کی خاطر نہیں ہے جو روایات میں آیا ہے بلکہ امت کے اجتماعی ادارے کے سربراہ کی حیثیت سے ہے۔ اسی حیثیت سے آپ کو مشورے کا حکم آیا ہے ورنہ جاننے والے جانتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسول کو کسی مشورے کی حاجت نہیں۔ گویا حضور کا ذکر اس پیش منظر کی خاطر ہے کہ امت کے اجتماعی ادارے کے حضور کے بعد سربراہ بننے والے سمجھ لیں کہ عام فوجی تو درکنار خود سربراہ مملکت بھی اس کا مجاز نہیں ہے کہ اس میں خیانت کرے اور چپکے سے اس میں کچھ لے لے۔

غلول کا حکم اور اجتماعی ادارے

افراد کا جذبہ تعاون اور اجتماع کا احساس ذمہ داری مختلف اداروں کو قیام عمل میں لاتا ہے جو

کسی نہ کسی نوع سے انسانی زندگی کی تعمیر و تزکیہ میں حصہ لیتے ہیں ۔ افراد کا ارادہ اور اجتماعی ضرورت کا احساس مختلف اداروں کو مختلف درجوں میں وہ اخلاقی یا قانونی قوت عطا کرتا ہے جو ان کے عمل کے لیے ضروری ہیں ۔ دین فطرت ان اداروں کا ایک مقام تسلیم کرتا ہے ۔ اسلام نے اجتماع کو قیام دین، دعوت الی الخیر، شہادت علی الناس، امر بالمعروف نہی عن المنکر کی جو ذمہ داریاں سونپی ہیں، حکومت ان کی اولین ذمہ دار قرار پاتی ہے ۔ افراد کا اسلامی شعور اس مرکزی ادارہ سے اپنے مقصدِ زندگی کے حصول میں ہر ممکن مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے ۔ اسلامی حکومت کے مالیاتی ذرائع میں سے ایک اہم مالی ذریعہ غنائم ہیں ۔ غنیمت وہ مال ہے جو حالتِ جنگ میں مخالف فوج سے حاصل ہو ۔ یہ اموال سرکاری ہوتے ہیں ان میں تقسیم کے بعد پانچواں حصہ غنیمت کا ہوتا ہے ۔ قرآن نے اس مالی ذریعہ کا نام لے کر بتایا ہے کہ یہ سربراہ کی کوئی ملکیت نہیں بلکہ اُمت کا اشتراکی سرمایہ ہے ۔ اس میں چوری پوری اُمت کی چوری ہے اور یہ صرف مالِ غنیمت ہی کا حکم نہیں بلکہ حکومت کے تمام مشترکہ املاک کا بھی حکم ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ سرکاری ملازموں کے تحائف اور ہدایا کا بھی حکم غلول ہی کا ہے اور روزِ قیامت اس کے ساتھ معاملہ بھی وہی ہوگا جو مالِ غنیمت میں چوری کرنے والے سے ہوگا ۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں اور ابوداؤد نے اپنی سنن میں مشہور صحابی ابوحمید الساعدی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قبیلہ ازد کے ایک شخص لتبیہ کے صاحبزادے کو ایک جگہ کا عامل (کلکٹر) مقرر کیا ۔ جب وہ صدقات کی وصولیابی کے بعد حضور انور کی خدمت گرامی میں آئے تو بولے کہ یا رسول اللہ اس قدر مال تو سرکاری خزانہ کا ہے اور یہ میرا ہے کیونکہ لوگوں نے مجھے ہدیہ میں دیا ہے ۔ حضور انور نے مسلمانوں کو جمع کر کے تقریر فرمائی کہ

"اس عامل کا کیا حال ہے کہ ہم اس کو ایک کام کے لیے مقرر کرتے ہیں اور جب وہ واپس آتا ہے تو کہتا ہے کہ یہ سرکار کا ہے اور یہ لوگوں نے مجھے ہدیہ دیا ہے ۔ وہ اپنے باپ کے گھر بیٹھا رہے پھر دیکھے کہ اسے کون ہدیہ دیتا ہے ۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے ۔ کہ تم میں سے جو شخص بھی جس چیز کی خیانت کرے گا روزِ قیامت اللہ کے دربار میں اسے لے کر پیش ہوگا ۔ اگر وہ اونٹ ہے تو اونٹ گردن پر لائے ہوگا اور وہ اَبڑاتا ہوگا اور اگر وہ بکری ہے تو بکری گردن پر لائے ہوگا اور وہ بکری مَیں مَیں کرتی ہوگی ۔ پھر دونوں ہاتھ اٹھا کر فرمایا اے اللہ میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا اے اللہ میں نے تیرا پیغام پہنچا دیا ۔

سنن ابوداؤد میں حضرت بریدہ کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے کہ

جسے ہم سرکاری ملازم رکھ لیتے ہیں اور اسے تنخواہ دیتے ہیں تو تنخواہ کے علاوہ جو کچھ وہ لیتا ہے وہ غلول ہے ۔

غلول کی آخرت میں سزا

قرآن نے سزا کے ضمن میں پہلی بات یہ بتائی ہے کہ ایسا شخص اپنی خیانت سمیت اللہ کے حضور پیش ہوگا مطلب یہ ہے کہ خیانت چھپی نہ رہے گی ۔ ایک روز آئے گا وہ ظاہر ہو جائے گی ۔ شارحین قرآن کہتے ہیں کہ جس قدر خیانت کی ہے بطور سزا خیانت کا مال روزِ قیامت اس پر لادا جائے گا تاکہ میدانِ حشر میں ذلیل و رسوا ہو ۔

احادیث میں یہ بات بوضاحت سمجھائی گئی ہے کہ جس نے جو چیز چھپائی ہوگی وہ روزِ قیامت اس طرح حاضر ہوگا کہ وہ چیز اس کی گردن پر لدی ہوئی ہوگی ۔ کسی کی گردن پر اونٹ ، کسی کی گردن پر گھوڑا ہوگا ۔ ان روایات میں سب سے زیادہ صحیح وہ روایت ہے جو امام بخاری و مسلم نے بحوالہ ابوہریرہ پیش کی ہے جس میں مختلف چیزوں کا نام لے کر آپ نے بتایا ہے کہ اونٹ کی چوری کرنے والا جنابِ الٰہی میں اس طرح پیش ہوگا کہ اونٹ اس کی گردن پر لدا ہوگا اور ایڑا رہا ہو گا ۔ یہ شخص مجھے پکار کر کہے گا کہ اغثنی یا رسول اللہ اے اللہ کے رسول میری مدد کیجئے میں جواب دوں گا کہ میں کچھ نہیں کر سکتا ۔ میں نے تو تجھے اللہ کا پیغام پہنچا دیا تھا ۔ کچھ علماء نے اس سارے معاملہ کو تمثیل کہہ کر بے حقیقت بنانے کی کوشش کی ہے لیکن یہ صحیح نہیں ہے ۔

عالمِ آخرت کا فہم و ادراک

دراصل عالمِ آخرت میں جو کچھ ہوگا وہ اگرچہ ہمارے زیرِ تجربہ مادی عالم سے بالکل الگ ہے تاہم چونکہ انسانی فہم کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں اس لیے یہ الفاظ جن مادی خصائص کو متلزم ہیں یا ان کے دیکھنے یا سننے کے اس دُنیا میں عادی ہو گئے ہیں ان لفظوں کو سُن کر بعینہٖ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دُنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں ۔ اسی وجہ سے کچھ لوگ وہاں کے وقائع اور احوال کو سُن کر ان ... سے بعض کو محال سمجھتے ہیں اور کچھ ان کی تشریح و تاویل اس طرح کرتے ہیں کہ نفظ و معنے میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا ۔ یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں ۔ اسی لیے قرآن نے

ان نازک اور دقیق اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاسر مادی کہہ کر عالم آخرت کو عالم آب وگل بنا دیا ہے اور نہ عقل وخرد کے بعض نادان مدعیوں کی طرح ان کو مادے سے اتنا بلند و برتر کر دیا ہے کہ ان کا وجود ہی موہوم و فرضی ہو گیا ہے بلکہ انسانی عقلوں کا اختلاف، مراتب کا لحاظ کر کے بزم کے اہل نظر اور تماشائیوں دونوں کی تشفی وتسکین کا سامان بہم پہنچایا ہے۔ ان اخروی وقائع کے مختلف مفہوموں اور مصداقوں کا لحاظ کر کے قرآن نے ایسے نپے تلے الفاظ اختیار کیے ہیں جن سے ایک فلسفی بھی بہرہ یاب ہو سکتا ہے اور ایک عامی بھی اور دونوں اپنی اپنی جگہ پر اپنے اپنے ایمان کا لطف اٹھا سکتے ہیں۔ اس عالم میں چھوٹے سے چھوٹے جرثقیل کے آلہ سے بڑے بڑے جہاز اوپر اٹھا لیے جاتے ہیں تو اس عالم میں اگر ایک شخص اونٹ اٹھا کر لے آئے تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔

گناہ کی پوری سزا

ہر شخص کو اس کی کمائی کی پوری پوری جزا ملے گی اور کسی پر ظلم بالکل نہ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ اوّلاً لوگوں کو ان کی بدعملیوں اور خیانتوں کی نمائش کی جائیگی اور بعد ازیں ان کو ان کے اعمال کی جزا ملے گی۔ غرض یہ خیانت کرنے والے قیامت کے روز اللہ کے مغضوب اور معتوب ہوں گے۔

سعادت وشقاوت کا ضابطہ

۳۰۰۔ کیا ایسا آدمی جو رضائے الٰہی کا پیروکار ہو اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس نے اللہ کی ناراضگی میں اپنا ٹھکانا بنا لیا ہو اور جس کا ڈیرہ دوزخ ہو۔ یعنی پیغمبر جو بہرحال بس خدا کی مرضی کا تابع بلکہ دوسروں کو بھی اللہ کی مرضی کا تابع بنانا چاہتا ہے۔ کیا ان لوگوں کے ایسے کام کر سکتا ہے جو خدا کے غضب کے نیچے اور دوزخ کے مستحق ہیں ممکن نہیں[1] گویا بتا دیا کہ دنیا میں سچے انسان کی زندگی جھوٹے انسان سے اپنی ہر بات میں اس درجہ مختلف ہوتی ہے کہ ممکن نہیں کہ کسی طرح دھوکا ہو سکے۔ ایک بدکار آدمی بناوٹ سے اپنے آپ کو کتنا ہی نیک ظاہر کرے لیکن بناوٹ پھر بناوٹ ہے کوئی نہ کوئی بات ایسی ضرور کر بیٹھے گا کہ اصلیت آشکارا ہو جائے۔

---

[1] افادات شیخ القرآن

قرآن نے سعادت وشقاوت کا اس آیت میں تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے اور پیش بھی عام انداز میں کیا ہے اور اسلوب بھی سوالیہ اپنایا ہے۔ قرآن کی نظر میں رضائے الٰہی کا پیروکار وہ ہے جو اس مجموعہ آئین پر عمل کرتا ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانی زندگی کے لیے لے کر آئے۔ یہ صرف زبانی قول کا نام نہیں ہے اس لیے جو شخص اس مجموعہ پر جتنا زیادہ عمل پیرا ہو گا اس کو رضائے الٰہی کی پیروی میں اتنا ہی زیادہ مکمل شمار کیا جائے گا اور جو عمل میں جتنا پیچھے رہ جاتے گا وہ اتنا ہی اللہ کی ناراضگی کا حقدار ہو گا۔ اس لیے یہاں یہ بات کھول کر بتا دی کہ ایک شخص جو رضائے الٰہی کا ہمہ وقت جویاں اور رضائے حق کا بالکل تابع ہو گیا وہ اس شخص جیسا اللہ کی نظر میں کب ہو سکتا ہے جو غضب الٰہی کا مستحق ہو۔ اسی لیے علماء نے اس آیت میں رضائے الٰہی اور ناراضگی کا مصداق مقرر فرمانے میں مختلف خیالات ظاہر کیے ہیں۔ ابن اسحاق کہتے ہیں کہ رضائے الٰہی کی پیروی یہ ہے کہ عملی زندگی میں دامان طاعت تھام کر رکھے اور ناراضگی یہ ہے کہ اپنی عملی زندگی میں معاصی سے دوچار ہو۔ امام حسن اور ضحاک کہتے ہیں کہ رضائے الٰہی کی پیروی یہ ہے کہ مال غنیمت میں غلول سے بچ کر رہے اور ناراضگی یہ ہے کہ مال غنیمت میں چوری کرے۔ امام جبائی کہتے ہیں کہ رضائے الٰہی کی پیروی یہ ہے کہ مومنانہ زندگی بسر کرتے ہوتے راہ خدا میں محنتوں اور قربانیوں کو اپنائے اور ناراضگی یہ ہے کہ راہ خدا میں قربانیوں سے گریزپائی کرے۔

اعمال کے مطابق درجات

۱۰۳ ۔ اللہ کے یہاں لوگوں کے الگ الگ درجات ہیں اور جیسے کچھ ان کے اعمال ہیں اللہ دیکھ رہا ہے۔ یعنی نبی اور سب خلقت برابر نہیں۔ طمع وغیرہ کے پست و ذلیل کام نبیوں سے نہیں ہو سکتے۔ حق تعالیٰ سب کو جانتا ہے کہ کون کس درجہ کا ہے اور سب کے کام دیکھتا ہے۔ کیا وہ ایسی پست طبیعت والوں کو منصب نبوت پر سرفراز فرمائے گا[1] مطلب یہ ہے کہ رضائے الٰہی کا تابع اور اللہ کی ناراضگی کا سامان کرنے والا یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ اس قسم کے لوگوں کے اللہ کے یہاں مختلف درجات ہیں۔ گویا ہر فرد اور ہر گروہ کے لیے اس کے اعمال کے مطابق مختلف درجے ہیں۔ اگر اچھے اعمال ہیں تو اچھائی کے درجے ہیں۔ اگر برے اعمال ہیں تو برائی کے درجے ہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

اور انہی کے مطابق عواقب و نتائج پیش آتے ہیں۔ یعنی جو لوگ اللہ کی رضا پر چلنے والے ہیں ان کے لیے انعام واکرام اور درجاتِ محبوبیت ہوں گے اور جو راہِ حق کی مخالفت کر کے غضبِ خداوندی کے خریدار ہوتے ان کے لیے ذلت و رسوائی اور درجاتِ مبغوضیت ہوں گے۔

شیخ الاسلام نے جو مطلب بتایا ہے کہ نبی اور سب خلقت برابر نہیں ہے۔ اس میں حضرت شاہ عبدالقادر کی ترجمانی کی گئی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ نبی اور سب خلق برابر نہیں۔ یہ مطلب اس وقت ہے جب کہ من اتبع سے حضور انور کی ذات گرامی اور من باء سے بددیانت اور خائن مراد ہو یعنی نبی اور غیر نبی کا تقابل کر رہا ہے لیکن اگر یہاں قرآن نبی و غیر نبی کا نہیں بلکہ عام قاعدے کے مطابق اچھے اور برے کا مقابلہ پیش کر رہا ہے تو پھر حضرت شاہ صاحب اور شیخ الاسلام کی پیش فرمودہ تحقیق کے مطابق خلاصہ مطلب یہ ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہو سکے کیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔

لَقَدْ مَنَّ اللّٰهُ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ اِذْ بَعَثَ فِيْهِمْ رَسُوْلًا مِّنْ اَنْفُسِهِمْ
يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ ۚ وَاِنْ
كَانُوْا مِنْ قَبْلُ لَفِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝

بلاشبہ فی الواقع اللہ کا اہلِ ایمان پر بڑا ہی احسان ہے کہ اس نے ان کے درمیان خود ان میں سے ایک ایسا عظیم المرتبت پیغمبر بھیجا[۳۰۲] جو اللہ کی آیات تلاوت کرتا ہے اور ان کی زندگیوں میں بناؤ سنوار کرتا ہے۔ اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے[۳۰۳]، حالانکہ یہی لوگ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے[۳۰۴]۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ

یہ آیت دراصل پہلے مضمون کا تتمہ ہے۔ اس سے پہلی آیات میں اگرچہ ہر نبی سے غلول (خیانت) کی نفی کی گئی ہے اور فرمایا ہے کہ نبی جو خدا کی خوشنودی کی ہمیشہ پیروی کرتے ہیں وہ ان کی مانند نہیں ہو سکتے جو خدا کی خفگی کماتے ہیں مگر خصوصیت کے ساتھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اشارہ ہے اور بتایا گیا ہے کہ نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ اس سے ایسا جرم سرزد ہو سکے کیونکہ اللہ کی رضامندی کا طالب اس کی ناخوشی کے کام کا مرتکب نہیں ہو سکتا اور جو دوسروں کو احکامِ الٰہی سنائے خود

اس سے ان احکام کی خلاف ورزی ممکن نہیں اور جو دوسروں کو پاک وصاف کرنے پر مامور ہے وہ خود گنہ گار اور ناپاک نہیں ہو سکتا۔

اس آیت میں اس عظیم احسان کا اظہار کیا گیا ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی شکل میں اہل ایمان پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا یہ احسان یہاں تین مختلف پہلوؤں سے ظاہر کیا گیا ہے۔

ایک اس پہلو سے کہ آپ انسان ہونے کے ساتھ عربی ہیں تاکہ زبان کی اجنبیت، نسل و نسب کی غیریت، رجحانات اور میلانات کی بیگانگی اور ماضی وحاضر سے بے خبری کسی تعصب اور بدگمانی کا باعث نہ بنے اور لوگ آپ پر اپنے ہی باپ اور بھائی کی حیثیت سے اعتماد کر سکیں اور آپ کی آواز کو خود اپنے ضمیر کی آواز کی طرح پہچان اور سن سکیں۔ اس حقیقت کا اظہار من انفسکم سے ہو رہا ہے۔

دوسرے آپ کے مقصد اور مشن کے پہلو سے کہ آپ اللہ کی آیتیں سناتے ہیں، تمہیں تمام عقلی، اخلاقی اور عملی گمراہیوں سے پاک کرتے ہیں اور تمہیں کتاب وحکمت کی تعلیم دیتے ہیں۔ بھلا جس کے فیوض و برکات سے تمہارا اجتماعی وانفرادی اور ظاہری و باطنی زندگی کا ہر گوشہ یوں منور ہو رہا ہے اس سے زیادہ نیکوکار و دیانتدار بھی کوئی ہو سکتا ہے؟

تیسرے مخاطبوں کی ضرورت کے پہلو سے اہل عرب دین وشریعت سے بیگانے اور نبوت و رسالت سے ناآشنا لوگ تھے۔ ایک زمانہ دراز سے کفر وجاہلیت کی تاریکیوں میں بھٹک رہے تھے، اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے ان کی دستگیری فرمائی اور ان کو گمراہی کی وادیوں سے نکال کر ہدایت کی صراط مستقیم پر کھڑا کر دیا۔

۲۰۲۔ بلاشبہ فی الواقع اللہ کا اہل ایمان پر بہت بڑا احسان ہے کہ اس نے ان کے درمیان خود ان میں سے ایک ایسا عظیم المرتبت پیغمبر بھیجا جس کے پاس بیٹھنا، بات چیت کرنا، زبان سمجھنا اور ہر قسم کے انوار و برکات کا استفادہ کرنا آسان ہے۔ اس کے احوال، اخلاق، سوانح زندگی، امانت و دیانت، خداترسی، پاکبازی سے وہ اچھی طرح واقف ہیں، اپنی ہی قوم اور کنبے کے آدمی سے جب معجزات ظاہر ہونے دیکھتے ہیں تو یقین لانے میں زیادہ سہولت ہوتی ہے۔ فرض کرو کہ کوئی جن یا فرشتہ رسول بنا کر بھیجا جاتا تو معجزات دیکھ کر یہ خیال کر لینا ممکن تھا کہ چونکہ جنس بشر سے جداگانہ مخلوق ہے۔ شاید یہ خوارق اس کی خاص صورت نوعیہ اور طبیعت ملکیہ وجنیہ کا نتیجہ ہوں۔ ہمارا اس سے عاجز رہ جانا دلیل نبوت نہیں ہو سکتا۔ بہرحال مومنین کو خدا کا احسان ماننا چاہیے کہ اس نے ایسا رسول روانہ کیا جس

سے بے تکلف فیض حاصل کر سکتے ہیں اور وہ باوجود معزز ترین اور بلند ترین منصب پر فائز ہونے کے ان ہی کے مجمع میں نہایت نرم خوئی اور ملاطفت کے ساتھ گھلا ملا رہتا ہے صلی اللہ علیہ وسلم[1]

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دو قسم کے کمالات بیان فرماتے ہیں کمالاتِ ظاہری، کمالاتِ معنوی۔

سراپائے نبوت

کمالاتِ ظاہری یعنی آپ کا انسان ہونا، آپ کا عربی ہونا اور آپ کا ظاہری حسن و جمال جسے اربابِ سیرۃ کی زبان میں خلق رسول اللہ کہا جاتا ہے۔ ظاہری حسن و جمال کے موضوع پر سب سے زیادہ جامع چہرہ وہ ہے جو امام ترمذی نے بحوالہ الحسن بن علی ان کے ماموں ہند بن ابی ہالہ کی زبانی پیش فرمایا ہے کہ:

آپ کا چہرۂ مبارک ماہ بدر کی طرح چمکتا تھا۔ آپ کا قد مبارک بالکل متوسط قد والے آدمی کے قد سے کسی قدر زیادہ لیکن زیادہ لانبے قد والے آدمی سے پست تھا۔ سر مبارک اعتدال کے ساتھ بڑا تھا، بال مبارک کسی قدر بل کھائے ہوئے تھے اگر سر کے بالوں میں اتفاقاً مانگ نکل آتی تو رہنے دیتے ورنہ آپ خود مانگ نکالنے کا اہتمام نہ فرماتے۔ جس زمانے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بال مبارک زیادہ ہوتے تو کان کی لو سے متجاوز ہوتے۔ آپ کا رنگ نہایت چمکدار تھا اور پیشانی مبارک کشادہ آپ کے ابرو خمدار باریک اور گنجان تھے۔ دونوں ابرو جُدا جُدا تھے ایک دوسرے سے ملے ہوئے نہ تھے۔ ان دونوں کے درمیان ایک رگ تھی جو غصہ کے وقت اُبھر جاتی تھی۔ آپ کی ناک مبارک بلندی مائل تھی اور اس پر ایک نور چمکتا تھا۔ آپ کی داڑھی مبارک بھرپور اور گنجان تھی۔ آنکھ مبارک کی پتلی نہایت سیاہ تھی، رخسار مبارک ہموار اور ہلکے تھے۔ آپ کا دہن مبارک اعتدال کے ساتھ فراخ تھا، آپ کے دندان مبارک باریک آبدار تھے اور ان میں سامنے کے دانتوں میں ذرا سی ریخ تھی۔ سینے سے ناف تک بالوں کی باریک دھاری تھی۔ آپ کی گردن مبارک ایسی خوبصورت اور باریک

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

تھی جیسا کہ مورتی کی گردن صاف تراشی ہوئی ہوتی ہے اور رنگ میں چاندی جیسی صاف اور خوبصورت تھی، آپ کے سب اعضا نہایت معتدل اور پُرگوشت تھے اور بدن گھٹا ہوا تھا۔ پیٹ اور سینہ مبارک ہموار تھا لیکن سینہ فراخ اور چوڑا تھا۔ آپ کے دونوں مونڈھوں کے درمیان قدرے زیادہ فصل تھا۔ جوڑوں کی ہڈیاں قوی اور کلاں تھیں کپڑا اتارنے کی حالت میں آپ کا بدن روشن و چمکدار نظر آتا تھا۔ ناف اور سینہ کے درمیان ایک لکیر کی طرح سے بالوں کی باریک دھاری تھی۔ اس لکیر کے علاوہ دونوں چھاتیاں اور پیٹ بالوں سے خالی تھا۔ البتہ دونوں بازو کندھوں اور سینے کے بالائی حصّہ پر بال تھے۔ آپ کی کلائیاں دراز تھیں اور ہتھیلیاں فراخ، نیز ہتھیلیاں اور دونوں قدم گداز پُرگوشت تھے۔ ہاتھ پاؤں کی انگلیاں تناسب کے ساتھ لانبی تھیں۔ آپ کے تلوے قدرے گہرے تھے اور قدم ہموار تھے کہ پانی ان کے صاف ستھرا اور ان کی ملائمت کی وجہ سے ان پر ٹھہرتا نہ تھا فوراً ڈھل جاتا تھا جب آپ چلتے تو قوت سے قدم اٹھاتے اور آگے کو جھک کر تشریف لے جاتے۔ قدم زمین پر آہستہ پڑتا زور سے نہیں پڑتا تھا۔ آپ تیز رفتار تھے اور ذرا کشادہ قدم رکھتے تھے۔ چھوٹے چھوٹے قدم نہیں رکھتے تھے۔ جب آپ چلتے تو ایسا معلوم ہوتا گویا پستی میں اُتر رہے ہیں جب کسی طرف توجہ فرماتے تو پورے بدن سے پھر کر توجہ فرماتے۔ آپ کی نظر نیچی رہتی تھی آپ کی نظر بہ نسبت آسمان کے زمین کی طرف زیادہ رہتی۔ چلنے میں آپ صحابہ کو آگے کرتے اور جس سے ملتے سلام کرنے میں پہل کرتے [1]

شخصیت آئینۂ ایام میں

محمد صلی اللہ علیہ وسلم بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبد مناف بن قصی بن کلاب بن مرہ بن کعب بن لوی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ بن خزیمہ بن مدرکہ بن الیاس بن مضر بن نزار بن معد بن عدنان۔

یہ وہ سلسلہ نسب ہے جس کو خود زبانِ وحی ترجمان نے صحیح اور درست فرمایا ہے اور اس

[1] شمائل ترمذی

یہ کی ہے کہ ،

نبی وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ تبلیغِ احکام کی خاطر روانہ فرماتا ہے ۔

(شرح عقائد جلالی)

محقق احناف شیخ ابن الہمام لکھتے ہیں ،

نبی وہ انسان ہے جس کو اللہ تعالیٰ اپنے نازل کیے ہوئے احکام کی تبلیغ کے لیے مبعوث کرتا ہے اور اسی کو رسُول کہتے ہیں ۔ اس لحاظ سے دونوں میں کوئی فرق نہیں نہیں ۔

(المسایرہ مع المسامرہ)

حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندی فرماتے ہیں ،

اے بھائی حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اس بلند شان اور مرتبہ کے بشر تھے اور حدوث و امکان کے داغ سے موصوف تھے ۔

(مکتوب ۳، دفتر اول)

یعنی نہ تو آپ قدیم او ر واجب تھے اور نہ ازلی و ابدی تھے بلکہ بشر حادث اور ممکن تھے ۔ اور دوسرے مقام پر ارشاد فرماتے ہیں ۔

تو نہیں دیکھتا کہ حضرات انبیاء عام لوگوں کے ساتھ نفسِ انسانیت میں برابر ہیں اور حقیقت و ذات کے لحاظ سے سب کے برابر ہیں ۔

(دفتر اول حصہ چہارم ص ۱۲۸)

بہرحال مطلب یہ ہے کہ ان ہی کی جنس اور قوم میں کا ایک آدمی رسُول بنا کر روانہ کیا حقیقت یہ ہے کہ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت تاریکی میں گم ہو گئی تھی اور قرآن کے فیضان سے وہ روشن ہوئی ۔ اس نے بتایا کہ رسُول ایک طرف مخلوق محض صرف انسان اور پورا بندہ اور خدا کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ ہوتا ہے اور دوسری طرف وہ خدا کا برگزیدہ ، معصوم ، نیک اور خدا کی قدرت سے فیض پاکر برکتوں ، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب و غریب اُمور صادر کرنے والا ہوتا ہے ۔

حضور کے عربی ہونے کا احسان

یہ بات بھی سوچنے کی ہے کہ اللہ سبحانہ نے قرآن کے اوّلین مخاطبوں پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

کے عربی ہونے کا احسان جتایا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو اس کی وجہ یہی سمجھتا ہوں کہ نبیوں میں بڑا درجہ اس کا ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ منشا الٰہی یہ ہوتا ہے کہ اس نبی کے ذریعے سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعے سے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس نبی کی ذاتی بعثت کا نام بعثت اولیٰ اور اس کی قوم کی دوسری قوموں کی ہدایت کے لیے نامزدگی بعثت ثانیہ ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی پہلی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

هوالذی بعث فی الامیین رسولا منهم

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے

كنتم خير امة اخرجت للناس

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ بعثت ان کی اُمت کے لیے ہوئی ویسے ہی ان کی اُمت کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی۔ چونکہ عربی ہونے کی حیثیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضان سے اولین طور پر اہل عرب مستفید ہوتے اور باقی دُنیا ان کی وساطت سے ہوئی گویا کہ منصب قیادت اور شہادت علی الناس کا فرض انجام دینے کی خاطر حضور انور سے فیض حاصل کرنے کا ان کو شرف حاصل ہوا۔ اس لیے قرآن نے ان پر حضور کے عربی ہونے کا احسان جتایا ہے۔

نبوت کے کمالات معنوی

۳۰۳۔ جو اللہ کی آیات کی تلاوت کرتا ہے اور ان کی زندگیوں میں بناؤ سنوار کرتا ہے اور ان کی کتاب وحکمت کی تعلیم دیتا ہے۔ اس مضمون کی آیت سورۂ بقرہ میں دو جگہ گزر چکی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی چار شانیں ہیں۔ اول تلاوت آیات اللہ کی آیات پڑھ کر سنانا جن کے ظاہری معنے وہ لوگ اہل زبان ہونے کی وجہ سے سمجھ لیتے تھے اور اس پر عمل کرتے تھے دوم تزکیہ نفوس انسانی الاکثروں اور تمام مراتب شرک ومعصیت سے ان کو پاک کرنا اور دلوں کو مانجھ کر صیقل کرنا یہ چیز آیات اللہ کے عام مضامین پر عمل کرنے حضور کی صحبت اور قلبی توجہ وتصرف سے باذن اللہ حاصل ہوتی تھی۔ سوم تعلیم کتاب کتاب کی مراد بتلانا اس کی ضرورت خاص خاص مواقع میں پیش آتی تھی مثلاً ایک لفظ کے کچھ معنے عام تبادر اور

محاورہ عام کے لحاظ سے سمجھ کر صحابہ کو کوئی اشکال پیش آیا۔ اس وقت آپ کتاب اللہ کی اصلی مراد جو قرائن سے متعین ہوتی تھی بیان فرما کر شبہات کا ازالہ فرما دیتے تھے جیسے الذین آمنوا و لم یلبسوا ایمانھم بظلم اور دوسرے مقامات میں ہوا۔ چہارم تعلیم حکمت (حکمت کی گہری باتیں سکھانا) اور قرآن حکیم کے غامض اسرار و لطائف اور شریعت کے دقیق و عمیق علل پر مطلع کرنا خواہ تصریحاً ہو یا اشارۃً۔ آپ نے خدا کی توفیق و اعانت سے علم و عمل کے ان اعلیٰ مراتب پر اس درماندہ قوم کو فائز کیا جو صدیوں سے انتہائی جہل و حیرت اور صریح گمراہی میں غرق تھی آپ کی چند روزہ تعلیم و صحبت سے وہ ساری دنیا کے لیے ہادی و معلم بن گئی۔ لہٰذا انہیں چاہیے کہ اس نعمت عظمیٰ کی قدر پہچانیں اور کبھی بھولے سے ایسی حرکت نہ کریں جس سے آپ کا دل متالم ہو۔[1]

درحقیقت بعثت نبوی ان چاروں شعبوں پر مشتمل ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح دنیا کو نیا آسمانی صحیفہ عطا کیا، نیا علم و حکمت عطا کیا۔ اسی طرح نئے اخلاق، نئے جذبات و کیفیات، نیا یقین و ایمان، نیا ذوق و شوق، نئی بلند نظری، نیا جذبہ ایثار، نیا شوق آخرت، نیا جذبہ زہد و قناعت دنیا کی متاع حقیر اور دولت فانی کی تحقیر، نئی صحبت و الفت، حسن سلوک و ہمدردی بر و مواسات مکارم اخلاق، اسی طرح سے نیا ذوق عبادت، خوف و خشیت، توبہ و انابت، دعا و تضرع کی دولت عطا فرمائی اور ان ہی خصوصیتوں کی بنیاد پر وہ نیا اسلامی معاشرہ اور دینی ماحول قائم ہوا جس کو عہد رسالت اور عہد صحابہ کے لفظ سے عام طور پر تعبیر کیا جاتا ہے۔ صحابہ کرام ان چاروں شعبوں کے کامل ترین نمائندے اور بہترین نمونہ تھے۔ اگر ان شعبہائے نبوت کو عام زندگی میں جلوہ گر دیکھنا ہو تو صحابہ کو دیکھ لیا جائے۔

یوں تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت و رسالت و تعلیم ان تمام سعادتوں کا سرچشمہ تھی اور اسی سے یہ پوری زندگی اور قرن اول کا اسلامی معاشرہ وجود میں آیا۔ لیکن اگر اس کے طریق عمل کی تفصیل اور اس کے ذرائع و وسائل کی تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ اس محیر العقول انقلاب کا ذریعہ اور اس نئے معاشرہ اور نئی امت کی تشکیل کے عناصر و ارکان یہ چار چیزیں ہیں

۱۔ قرآن حکیم

۲۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی، آپ کی زندگی اور تزکیہ۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

۳ - آپ کی تعلیم و تلقین
۴ - آپ کے حکیمانہ ارشادات، مواعظ و نصائح ۔

اگر غور کیا جائے گا تو معلوم ہو گا کہ بعثت نبوی کے متعدد نتائج کے کامل ظہور میں اور جدید امت کی تعمیر و تشکیل میں ان چاروں عناصر و ارکان کا دخل ہے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ان چاروں کے بغیر ایک مکمل معاشرہ، مکمل زندگی اور ایک ایسی ہیئت اجتماعی جس میں عقائد، اعمال، اخلاق، جذبات، اذواق، رجحانات، تعلقات سب ہی ہوں وجود میں نہیں آسکتی۔ زندگی کے لیے زندگی شرط ہے دیے سے دیا جلتا ہے۔ صحابہ اور ان کے صحیح جانشینوں کی زندگی میں ہمیں عقائد و اعمال کے ساتھ جو خالص اسلامی اخلاق اور اس کے ساتھ اعلیٰ اذواق اور گہرے دینی جذبات اور دینی کیفیات ملتی ہیں وہ صرف تلاوت کتاب کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کامل ترین، موثر ترین، محبوب ترین زندگی کا بھی اثر ہے جو شب و روز ان کے ساتھ رہتی تھی۔ اس سیرت و اخلاق کا یہی نتیجہ ہے جو ان کے آنکھوں کے سامنے تھی اور ان مجالس اور صحبتوں کا بھی فیض ہے اور ان ارشادات و نصائح و تلقین کا بھی جس سے وہ حیات طیبہ میں برابر مستفید ہوتے تھے ان سب کے مجموعہ سے اسلام کا وہ خاص مزاج وجود میں آیا جس میں صرف قواعد و ضوابط اور ان کی قانونی پابندی نہ تھی بلکہ ان پر عمل کرنے کے محرکات و ترغیبات، اور عمل کی صحیح کیفیات اور روح بھی تھی۔ حدود کی پابندی اور حقوق کی ادائیگی کے ساتھ لطیف احساسات اور مکارم اخلاق کے وقائع بھی تھے۔ ان چاروں میں قرآن کی تلاوت اور قرآن کی تعلیم کے ساتھ اس آیت میں تزکیہ اور حکمت کے دو لفظ فیصلہ کے قابل ہیں۔

تزکیہ کے لفظی معنے پاک و صاف کرنا، نکھارنا، میل کچیل دور کرنا ہیں۔ خود قرآن نے اس لفظ کو اس معنے میں استعمال کیا ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کیا جائے۔ مثلاً قد افلح من زکٰھا اور قد افلح من تزکی اور ما یدریک لعلہ یزکی ان آیتوں سے پتہ لگتا ہے کہ قرآن حکیم میں اس تزکیہ کا مفہوم کیا ہے جس کو قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت قرار دیا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوس انسانی کو جلا دیں۔ ان کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اور ان کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف ستھرا بنائیں۔

اس کے بعد دوسرا لفظ حکمت ہے۔ اگرچہ اس لفظ کی پوری تشریح اس سے پہلے دوسرے اور

تیسرے پارے میں ہو چکی ہے مگر یہاں یہ بتا دینا مناسب ہے کہ حکمت کا لفظ قرآن میں اس علم و عرفان کے معنے میں آیا ہے جو نور الٰہی کی صورت میں نبی کے سینہ میں ودیعت رکھا جاتا ہے اور جس کے آثار و مظاہر رسول کی زبان سے کبھی مصالح و اسرار اور کبھی سنن و احکام کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں۔ یہاں کتاب کے ساتھ حکمت کا ذکر اس بات کی دلیل ہے کہ تعلیم حکمت تعلیم کتاب سے زائد چیز ہے اس بنا پر جو لوگ حکمت سے سنت مراد لیتے ہیں ان کی بات میں بڑا وزن ہے۔

دراصل حضور انور کی ذات گرامی آپ کا تزکیہ اور آپ کی حکمت اسلام کے لیے وہ فضا اور ماحول مہیا کرتے ہیں جس میں اسلام کا پودا سرسبز و شاداب ہوتا ہے۔ اسلام کسی خشک اخلاقی ضابطہ یا قانونی مجموعہ کا نام نہیں ہے۔ وہ جذبات، واقعات اور عملی مثالوں کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتا۔ ان جذبات و واقعات اور عملی مثالوں کا سب سے بہتر اور مستند مجموعہ وہ ہے جو خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے متعلق اور آپ کے حالات زندگی پر مشتمل ہو۔ یہودی، عیسائی اور ایشیا کے دوسرے مذاہب اس لیے بہت جلد مفلوج ہو کر رہ گئے کہ ان کے پاس ان کے پیغمبروں کی زندگی کے مستند واقعات اور ایمان افروز کلام کا مجموعہ محفوظ نہیں تھا اور ان کو نبوت کے تزکیہ و حکمت کی وہ ذہنی فضا میسر نہیں تھی جس میں پیروان مذاہب دینی نشوونما اور ترقی حاصل کرتے ہیں اور مادیت و الحاد کے حملوں سے محفوظ رہتے ہیں ان مذاہب اور اقوام کی اپنے پیغمبروں کی سیرۃ اور مستند واقعات زندگی کے بارے میں تہی دامنی اور بے بضاعتی اب ایک تاریخی مسلمہ حقیقت بن گئی ہے۔

اسلام کے آخری اور دائمی ہونے کا ایک ثبوت یہ بھی ہے کہ یہ حادثہ اس کو پیش نہیں آیا جس دینی و روحانی ماحول میں اور جن ذہنی کیفیات کے ساتھ صحابہ نے زندگی گزاری اس پورے ماحول کو تزکیہ اور حکمت کے ذریعے قیامت تک کے لیے محفوظ کر دیا گیا[1] غالباً یہی وجہ ہے۔ یہاں اس آیت کی پیشانی پر لقد من اللہ کا عنوان لگایا ہے۔

بعثت سے پہلے عرب کی حالت

۴۰۳۔ حالانکہ یہی لوگ اس سے پہلے صریح گمراہی میں تھے۔ اس فقرے کے ذریعے قبل از نبوت عرب کی پوری تاریخ کا چہرہ پیش کر دیا ہے۔ انبیاء اور ان کی تعلیمات سے بعد ایک جزیرہ نما

---

[1] معارف کا جیتی لفظ

میں صدیوں سے مستبد رہنے کی وجہ سے اور باپ دادا کے دین اور قومی روایات پر سختی سے قائم ہونے کے سبب وہ دینی اخلاقی حیثیت سے بہت گر چکے تھے، چھٹی صدی میں وہ تنزل و انحطاط کے آخری نقطہ پر تھے۔ کملی ہوئی بت پرستی میں مبتلا اور اس دنیا کے امام تھے۔ اخلاقی و اجتماعی امراض ان کی سوسائٹی کو گھن کی طرح کھا رہے تھے۔ غرض مذاہب کے اکثر محاسن سے وہ محروم اور جاہلی زندگی کی بدترین خصوصیتوں اور مصائب میں مبتلا تھے۔

دور جاہلیت کے بت

جہالت و جاہلیت کی ترقی کے ساتھ ساتھ غیر اللہ کی پرستش کا عقیدہ مقبول و عام اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت و ربوبیت کا تصور کمزور اور خواص میں محدود ہوتا چلا گیا یہاں تک کہ رفتہ رفتہ پوری قوم بتوں اور مورتیوں کی (جن کو کسی زمانہ میں شفیع اور واسطہ یا مرکز توجہ بنانے کے لیے اختیار کیا گیا تھا) صاف صاف پرستش میں مشغول ہو گئی اور اللہ تعالیٰ سے (جس کا خالق کائنات اور رب الارباب کی حیثیت سے اب بھی اقرار تھا) عملاً و قلباً تعلق منقطع ہو کر دوسرے معبودوں اور بتوں سے قائم ہو گیا تھا اور عبودیت و بندگی کے اظہار کے طریقے اور اعمال (سجدہ قربانی، حلف، دعا و استعانت) انہی کے ساتھ مخصوص ہو کر رہ گئے تھے اور ملک میں کھلی بت پرستی خدا سے بے تعلقی اور صریح شرک کا دور دورہ تھا عرب میں ہر ہر قبیلہ ہر ہر شہر اور ہر ہر علاقہ کا ایک خاص بت تھا بلکہ ہر گھر کا بت جدا تھا۔ کلبی کا بیان ہے کہ مکہ مکرمہ کے ہر گھر کا ایک بت تھا جس کی گھر والے پرستش کرتے تھے جب کوئی شخص سفر کا ارادہ کرتا تو روانگی کے وقت گھر پر اس کا آخری کام یہ ہوتا کہ اپنے بت کو حصول برکت کے لیے چھوتا اور جب سفر سے واپس آتا تو گھر پہنچ کر پہلا کام یہ کرتا کہ اپنے بت کو تبرکاً ہاتھ لگاتا۔ بتوں کے بارے میں بڑا غلو اور انہماک تھا۔ کسی نے تو ایک بت خانہ بنا رکھا تھا کسی نے بت تیار کر لیا تھا جو بت خانہ نہیں بنا سکتا تھا یا بت تیار نہیں کر سکتا تھا وہ حرم کے سامنے ایک پتھر گاڑ دیتا یا حرم کے علاوہ جہاں بہتر سمجھتا پتھر گاڑ کر اس کے اردگرد اس شان سے طواف کرتا جس طرح بیت اللہ کے گرد طواف کیا جاتا ہے۔ ان پتھروں کو وہ انصاب کہا کرتے تھے۔ خود خانہ کعبہ کے اندر (وہ خانہ کعبہ جو صرف اللہ کی عبادت کے لیے بنایا گیا تھا) اور اس کے صحن میں ۳۶۰ بت تھے۔ بتوں اور دیوتاؤں کی پوجا کرتے کرتے یہ لوگ اس حد تک بڑھ گئے کہ پتھر کی قسم سے جو کچھ مل جاتا اس کو پوجتے۔ بخاری میں ابو رجاء العطاردی سے روایت ہے کہ ہم لوگ پتھر کو پوجتے تھے۔ اگر کوئی اس سے اچھے قسم کا

پتھر مل جاتا تو اس کو پھینک کر اس نئے پتھر کو لے لیتے اور اگر پتھر نہ پاتے تو مٹی کا ایک ڈھیر بنانے اور اس پر بکری کو لاکر دوہتے پھر اسی کا طواف کرتے۔ کلبی کا بیان ہے کہ کوئی شخص سفر میں کسی نئے مقام پر اترتا تو چار پتھرے آتا جو پتھر اس کو اچھا معلوم ہوتا اس کو معبود قرار دیتا اور باقی تین پتھروں کو اپنی ہانڈی کا پتھر بناتا اور جب وہاں سے جاتا تو سب پتھروں کو چھوڑ جاتا۔

معبودوں کی کثرت

مشرکوں کا ہر زمانہ اور ہر ملک میں جو حال رہا ہے وہی حال عرب کا تھا ان کے متعدد اور مختلف معبود تھے جن میں فرشتے، جن، ستارے سب شامل تھے۔ فرشتوں کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ یہ اللہ کی بیٹیاں ہیں اس لیے ان سے شفاعت کے طلبگار ہوتے ان کی پرستش کرتے اور ان کو وسیلہ بناتے۔ جنّوں کو اللہ کا شریک کار سمجھتے۔ ان کی قدرت اور اثر اندازی پر ایمان رکھتے اور ان کی پرستش کرتے۔

کلبی کا بیان ہے کہ قبیلہ خزاعہ کی ایک شاخ بنو ملیح تھی جو جنّوں کو پوجتی تھی۔ صاعد کی روایت ہے کہ قبیلہ حمیر آفتاب کی پرستش کرتا۔ کنانہ کا قبیلہ چاند کا پرستار تھا۔ بنو تمیم دبران کی لخم وجذام مشتری کی، قبیلہ طے سہیل کی، بنو قیس شعریٰ کی اور بنو اسد عطارد کی پرستش کرتا تھا۔

اخلاقی و اجتماعی امراض

اخلاقی اعتبار سے ان کے اندر بہت سی بیماریاں اور امراض گھر کیے ہوئے تھے اور اس کے اسباب واضح ہیں۔ شراب عام طور سے پی جاتی تھی اور ان کی گھٹی میں پڑی تھی اس کا تذکرہ ان کی ادبیات اور شاعری کی بہت بڑی جگہ کو گھیرے ہوئے ہے۔ عربی زبان میں اس کے نام جس کثرت سے ہیں اور ان ناموں میں جن باریک فرقوں اور پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا ہے اس سے اس کی مقبولیت و عمومیت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ شراب کی دکانیں برسرراہ تھیں اور علامت کے طور پر ان پر پھریرا لہراتا، جُوا جاہلی زندگی میں بڑی اور خوبی کی بات تھی اور اس میں شرکت نہ کرنا پست ہمتی اور مردہ دلی کی دلیل تھی۔ تابعی عالم قتادہ کا بیان ہے کہ زمانہ جاہلیت میں ایک شخص اپنے گھر بار کو داؤں پر رکھ دیتا۔ پھر لٹا ہوا حسرت سے اپنے مال کو دوسروں کے ہاتھ میں دیکھتا اس سے نفرت و عداوت کی آگ بھڑکتی اور جنگوں کی نوبت آتی۔

حجاز کے عرب اور یہودی سودی لین دین اور سود در سود کا معاملہ کرتے۔ اس سلسلہ میں بڑی بے رحمی اور سخت دلی کے مظاہرے ہوتے، زنا کو کچھ زیادہ معیوب بات نہ سمجھا جاتا اور اس کے واقعات عربوں کی زندگی میں کمیاب نہ تھے اس کے بہت سے اقسام اور طریقے رائج تھے۔ زنان بازاری اور پیشہ ور عورتوں کے اڈے بھی موجود تھے اور شراب خانوں میں بھی اس کا انتظام تھا۔

عورت کا درجہ

جاہلی معاشرہ میں عورت کے ساتھ ظلم و بدسلوکی عام طور سے روا سمجھی جاتی تھی۔ اس کے حقوق پامال کیے جاتے اس کا مال مرد اپنا مال سمجھتے وہ ترکہ اور میراث میں کچھ حصہ نہ پاتی۔ شوہر کے مرنے یا طلاق لینے کے بعد اس کو اجازت نہ تھی کہ اپنی پسند سے دوسرا نکاح کر سکے دوسرے سامان اور حیوانات کی طرح وہ بھی وراثت میں منتقل ہوتی رہتی تھی۔ مرد تو اپنا پورا پورا حق وصول کرتا لیکن عورت اپنے حقوق سے مستفید نہیں ہو سکتی تھی۔ کھانے میں بہت سی ایسی چیزیں تھیں جو مردوں کے لیے خاص تھیں اور عورتیں ان سے محروم تھیں۔ لڑکیوں سے نفرت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ انہیں زندہ درگور کرنے کا بھی رواج تھا۔ ہثیم بن عدی نے ذکر کیا ہے کہ زندہ درگور کرنے کا اصول عرب کے تمام ہی قبائل میں رائج تھا۔ ایک اس پر عمل کرتا دس چھوڑتے تھے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک رہا جب تک اسلام نہیں آیا۔ بعض ننگ و عار کی بنا پر بعض خرچ و مفلسی کے ڈر سے اولاد کو قتل کرتے۔ عرب کے بعض شرفاء و رؤساء ایسے موقعہ پر بچوں کو خرید لیتے اور ان کی جان بچاتے۔ صعصعہ بن ناجیہ کا بیان ہے کہ اسلام کے ظہور کے وقت تک میں تین سو زندہ درگور ہونے والی لڑکیوں کو فدیہ دے کر بچا چکا تھا۔ بعض اوقات کسی سفر یا شغولیت کی وجہ سے لڑکی سیانی ہو جاتی اور دفن کرنے کی نوبت نہ آتی تو جاہل باپ دھوکہ دے کر اس کو لے جاتا اور بڑی بے دردی سے اس کو زندہ درگور کر آتا۔ اسلام لانے کے بعد بعض عربوں نے اس سلسلہ کے بڑے المناک اور رقت انگیز واقعات بیان کیے ہیں۔

قبائلی و خاندانی عصبیت و امتیاز

قبیلے اور رشتہ داریوں کی بنیاد پر عصبیت اور جتھہ بندی عرب میں بڑی سخت تھی۔ اس عصبیت کی بنیاد جاہلی مزاج تھا جس کی روح اس مشہور جملہ سے ظاہر ہوتی ہے انصر اخاک ظالما او مظلوما

یعنی اپنے بھائی کی امداد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم، چنانچہ وہ اپنے حلیف اور بھائی کی ہر حال میں مدد کرنا ضروری سمجھتے تھے خواہ وہ برسرِ حق ہو یا برسرِ باطل! عربی معاشرہ مختلف طبقات اور الگ الگ حیثیت کے خاندانوں اور گھرانوں پر مشتمل تھا۔ ایک خاندان دوسرے سے اپنے کو بلند و برتر سمجھتا تھا بعض خاندان دوسرے خاندانوں یا عام انسانوں کے ساتھ بہت سی رسوم و عادات میں شرکت پسند نہیں کرتے تھے یہاں تک کہ حج کے بعض مناسک میں قریش عام حجاج سے الگ تھلگ اور ممتاز رہتے تھے۔ وہ عرفات میں عام لوگوں کے ساتھ ٹھہرنا عار کی بات سمجھتے تھے۔ اُسے جانے میں پیش قدمی کرتے تھے۔ ایک طبقہ پیدائشی آقاؤں کا تھا، ایک طبقہ کم حیثیت لوگوں کا جس سے بیگار لیا جاتا اور کام پر لگایا جاتا کچھ عوام اور بازاری لوگ تھے۔

جنگجو فطرت

عرب فطرۃً جنگجو واقع ہوئے تھے اور ان کی صحرائی اور غیر متمدن زندگی کا تقاضا بھی یہی تھا۔ جنگ ان کے لیے زندگی کی ایک ضرورت سے آگے بڑھ کر تفریح اور دل بستگی کا سامان بن گئی تھی جس کے بغیر ان کا جینا مشکل تھا۔ ایک شاعر فخر یہ کہتا ہے کہ اگر ہم کو کوئی حریف قبیلہ نہیں ملتا تو اس خواہش کی تسکین کے لیے ہم اپنے برادر حلیف قبیلہ پر حملہ کر دیتے ہیں۔ ایک عرب شاعر دعا کرتا ہے کہ میرا گھوڑا سواری کے قابل ہو جائے تو اللہ قبائل میں جنگ کی آگ بھڑکا دے تاکہ مجھے اپنے گھوڑے اور اپنی تلوار سے جوہر دکھانے کا موقع ملے۔

جنگ کرنا اور خون بہانا ان کے لیے معمولی کام تھا۔ جنگ کو بھڑکانے کے لیے معمولی واقعات کافی تھے۔ وائل کی اولاد بکر و تغلب کے درمیان چالیس سال تک جنگ جاری رہی جس میں پانی کی طرح خون بہا۔ ایک سردار مہلہل نے اس کا نقشہ اس طرح کھینچا ہے کہ دونوں خاندان مٹ گئے۔ ماؤں نے اپنی اولاد کھوئی، بچے یتیم ہوئے، آنسو خشک نہیں ہوتے لاشیں دفن نہیں کی جاتیں۔ پورا جزیرہ عرب گویا شکاری کا جال تھا۔ کوئی شخص نہیں جانتا تھا کہ کہاں لوٹ لیا جائے گا اور کب دھوکے سے قتل کر دیا جائے گا۔ لوگ قافلوں میں اپنے ساتھیوں کے درمیان سے اچک لیے جاتے تھے یہاں تک کہ عظیم الشان سلطنتوں کو اپنے قافلوں اور سفارتوں کے لیے چوکی پہرہ اور مضبوط بدرقہ اور قبائل کے سرداروں کی ضمانت کی ضرورت پڑتی تھی [1]

[1] انسانی دنیا پر مسلمانوں کے عروج و زوال کا اثر

الغرض حضور انور کی تشریف آوری سے پہلے عرب دُنیا پر عقائد، معاملات، عبادات اور اخلاق ہر اعتبار سے اندھیرا ہی اندھیرا چھایا ہوا تھا اور آبادی صحیح معنوں میں فی ضلال مبین کی تصویر تھی ۔

أَوَلَمَّا أَصَابَتْكُم مُّصِيبَةٌ قَدْ أَصَبْتُم مِّثْلَيْهَا قُلْتُمْ أَنَّىٰ هَٰذَا ۖ
قُلْ هُوَ مِنْ عِندِ أَنفُسِكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٦٥﴾
وَمَا أَصَابَكُمْ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعَانِ فَبِإِذْنِ اللَّهِ وَلِيَعْلَمَ
الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٦٦﴾ وَلِيَعْلَمَ الَّذِينَ نَافَقُوا ۚ وَقِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا
قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أَوِ ادْفَعُوا ۖ قَالُوا لَوْ نَعْلَمُ قِتَالًا لَّاتَّبَعْنَاكُمْ ۗ
هُمْ لِلْكُفْرِ يَوْمَئِذٍ أَقْرَبُ مِنْهُمْ لِلْإِيمَانِ ۚ يَقُولُونَ
بِأَفْوَاهِهِم مَّا لَيْسَ فِي قُلُوبِهِمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِمَا يَكْتُمُونَ ﴿١٦٧﴾
الَّذِينَ قَالُوا لِإِخْوَانِهِمْ وَقَعَدُوا لَوْ أَطَاعُونَا مَا قُتِلُوا ۗ قُلْ فَادْرَءُوا
عَنْ أَنفُسِكُمُ الْمَوْتَ إِن كُنتُمْ صَادِقِينَ ﴿١٦٨﴾

یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آ پڑی تو تم کہنے لگے
یہ کہاں سے آئی ؟ حالانکہ جنگ بدر میں اس سے دوگنی مصیبت
تمہارے ہاتھوں فریق مخالف پر پڑ چکی ہے ۳۰۵ ۔ اے پیغمبر ان سے

کہہ دو کہ یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے اللہ ہر چیز پر قادر ہے[306]۔ اور دیکھو دو گروہوں میں مقابلہ کے دن جو اُفتاد تم پر آئی تھی وہ اللہ ہی کے حکم سے آئی اور اس لیے آئی کہ اللہ ان لوگوں کو نمایاں اور ممتاز کر دے جو منافق ہیں[307] اور جن سے کہا گیا تھا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا مدافعت کرو یعنی دشمن کا حملہ روکو[308] تو کہنے لگے کہ اگر ہمیں علم ہوتا کہ جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارا ساتھ دیتے[309]۔ یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے وہ ایمان کی بہ نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے[310]۔ وہ اپنی زبانوں سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہوتی ہیں۔ اور جو کچھ وہ دلوں میں چھپائے ہوئے ہیں اللہ ان کو خوب جانتا ہے[311]۔ جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ خود تو بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں سے کہہ رہے ہیں کہ اگر وہ

ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو اچھا اگر تم واقعی سچے ہو تو اپنی موت کو ٹال کر دکھانا۔[۳۱۲]

ایک غلط فہمی کا ازالہ

صحابہ تو خیر حقیقت شناس تھے اور کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو سکتے تھے مگر عام لوگ اس غلط فہمی میں مبتلا تھے کہ جو شخص خدا کا رسول ہو اس کو اور اس کے ساتھیوں کو ہر قسم کی تکلیفوں اور مصیبتوں سے محفوظ ہونا چاہیے۔ جب وہ کسی مہم پر نکلیں تو ان کے ساتھ خدا کے فرشتوں کی مدد ہونی چاہیے۔ جب انہیں کوئی جنگ پیش آئے تو ضروری ہے کہ وہ اس میں کامیاب ہوں۔ اس خیال کے لوگوں کو اُحد کی شکست سے طبعی طور پر بڑا دھکا لگا۔ وہ اس سوچ میں پڑ گئے کہ اگر اسلام ایک سچا دین ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فی الواقع اللہ کے رسول ہیں تو یہ شکست کہاں سے آئی؟ کمزوروں کی اس نفسیاتی کیفیت سے منافقین نے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور اس شکست کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف ایک دلیل کے طور پر لوگوں کے سامنے پیش کرنا شروع کر دیا۔ قرآن نے اس آیت میں اور اس کے بعد کی آیات میں تفصیل کے ساتھ اس غلط فہمی کو دور کیا ہے اور اہل ایمان کو جو آزمائشیں آتی ہیں ان کی حکمت بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ جنگ کا معاملہ منافقوں کے لیے جو مخلص مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے زندگی بسر کر رہے تھے ایک فیصلہ کن آزمائش تھی۔ اس موقعہ پر ان کا نفاق پوری طرح کھل کر سامنے آگیا۔ جنگ کے ابتدائی مشورے سے لے کر جنگ کے بعد تک کوئی موقعہ ایسا نہیں آیا کہ فتنہ پردازی سے باز رہے ہوں۔ جب کثرت رائے سے یہ رائے قرار پائی کہ شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا چاہیے تو لوگوں کو بہکانے لگے کہ باہر نکل کر لڑنا موت کے منہ میں جانا ہے۔ جب ان سے کہا گیا کہ اچھا شہر کی مدافعت کرو تو طرح طرح کے حیلے بہانے تراشنے لگے کہتے تھے کہ ہمیں امید نہیں کہ لڑائی کی نوبت آئے اگر امید ہوتی تو ضرور تیاری کرتے۔ پھر جب لوگوں کی کمزوری اور نافرمانی سے فتح ہوتے ہوتے شکست ہو گئی تو انہیں فتنہ و شرارت کا نیا موقعہ ہاتھ آگیا۔ کبھی کہتے کہ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ہماری بات نہیں مانی گئی۔ مقصود یہ تھا کہ کسی نہ کسی طرح مسلمانوں میں

بددلی، مایوسی اور ہراس پیدا کریں اور ان کی کوئی بات بھی ٹھیک طور پر نہ بن سکے ۔

جواب کی تمہید

۳۰۵ ۔ یہ تمہارا کیا حال ہے کہ جب تم پر مصیبت آ پڑی تو تم کہنے لگے کہ یہ کہاں سے آ گئی، حالانکہ جنگ بدر میں اس سے دوگنی مصیبت تمہارے ہاتھوں فریق مخالف پر پڑ چکی ہے ۔ پہلے سے اُحد کا قصہ چلا آ رہا تھا۔ درمیان میں جو کوتاہی ہوئی تھی اس کے عفو کا ذکر ہوا اور اسی کی مناسبت سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اخلاق و حقوق یاد دلاتے گئے۔ اب پھر اُحد کے قصہ کی طرف عود کیا جاتا ہے یعنی جنگ اُحد میں جو تکلیف اور نقصان اٹھانا پڑا کیا اس پر تم تعجب سے کہتے ہو کہ یہ مصیبت کہاں سے آ گئی ہم تو مسلمان مجاہد تھے جو خدا کے راستہ میں اس کے دشمنوں سے لڑنے کے لیے نکلے تھے اللہ تعالیٰ پیغمبر کی زبانی نصرت و امداد کا وعدہ فرما چکا تھا۔ پھر یہ مصیبت ہم پر کیوں آئی اور کدھر سے نازل ہو گئی۔ ایسا کہتے وقت سوچنا چاہیے کہ جس قدر تکلیف تم پر پہنچی اس سے دو چند تکلیف ان کو تم سے پہنچ چکی ہے ۔ اُحد میں تمہارے تقریباً ستر آدمی شہید ہوئے، بدر میں ان کے ستر مارے گئے اور ستر تمہارے ہاتھ قید ہوئے جن پر تم کو پورا قابو حاصل تھا چاہتے تو قتل کر ڈالتے۔ پھر اُحد میں بھی ابتداءً ان کے بیس سے زائد قتل ہو چکے تھے ۔ اگر تھوڑی دیر کے لیے تم کو ہزیمت ہوئی تو بدر میں ان کو تباہ کن ہزیمت مل چکی تھی۔ اور اُحد میں جب تم جم کر لڑے وہ منہزم ہوتے پھر آخر میں میدان چھوڑ کر چلے گئے۔ ایسی صورت میں انصافاً تم کو اپنی تکلیف کا شکوہ کرنے اور زیادہ بددل ہونے کا حق نہیں ہے [1]

اس فقرے میں قرآن نے اس شبہ کے بارے میں کہ جب اللہ کا رسول ہمارے اندر موجود ہے اور اللہ کی تائید و نصرت ہمارے ساتھ ہے تو ہمیں شکست کیوں ہوئی۔ پہلے یہ سمجھایا ہے کہ قد اصبتم مثلیھا یعنی جو اُفتاد تم پر آئی ہے تو تم یہ دریافت کر رہے ہو کہ یہ کیوں آئی، حالانکہ اس سے پہلے تمہاری جانب سے تمہارے دشمن پر ایسی دو چند اُفتاد آ چکی ہے۔ اس دو چند میں بدر کی طرف اشارہ ہے کہ اس میں کفار کے ۷۰ آدمی مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے اور ۷۰ قید ہوئے اس لیے جب تم ان کو پہلے ڈبل تکلیف پہنچا چکے ہو تو اب اگر اسی کی سنگل اُفتاد تم پر آگئی ہے تو

[1] افادات شیخ الاسلام

گھبراتے کیوں ہو؟ ایک چھوٹے سے گروہ سے ایک عظیم الشان اور طاقتور فوج کو دو چند مصیبت پہنچ جانا صاف بتاتا ہے کہ اللہ کی مدد تمہارے ساتھ ہے۔

شبہ کا صحیح اور واقعی جواب

۳۰۶ ۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ یہ مصیبت تمہاری اپنی لائی ہوئی ہے۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے یعنی اگر غور کرو تو تم خود ہی اس مصیبت کا سبب بنے ہو۔ تم نے جوش میں اگر پیغمبر کی اور بہت سے تجربہ کاروں کی رائے قبول نہ کی۔ اپنی پسند اور اختیار سے مدینہ کے باہر محاذِ جنگ قائم کیا۔ پھر باوجود نہی شدید کے تیر اندازوں نے اہم مورچہ چھوڑ کر مرکز خالی کر دیا۔ اور ایک سال پہلے جب اساریٰ بدر کے متعلق تمہیں اختیار دیا گیا تھا کہ انہیں قتل کر دو اور یا انہیں فدیہ لے کر چھوڑ دو اس شرط پر کہ آئندہ اتنے ہی آدمی تم سے لیے جائیں گے تو تم نے فدیہ کی صورت اختیار کی اور شرط کو قبول کر لیا۔ اب وہی شرط پوری کرائی گئی تو تعجب و انکار کا کیا موقعہ ہے۔ یہ چیز تو خود اپنی جانب سے قبول کر چکے تھے اساریٰ بدر کا پورا قصہ سورۂ انفال میں آ رہا ہے[1]

یہاں حقیقی جواب دیا گیا ہے کہ یہ تمہاری اپنی جانب سے ہے یعنی تم سے کوئی غلطی ہوئی ہے جس کا نتیجہ یہ برآمد ہوا ہے اور آئی ہوئی اللہ کی مدد رک گئی۔ تم نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی نافرمانی کی تھی جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ عصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون بس قصور تمہارا ہے اگر تم درہ چھوڑ کر نہ جاتے اور اس طرح اللہ کے رسول کی نافرمانی نہ کرتے تو وہ کچھ نہ ہوتا جو ہو گیا۔ یعنی یہ تمہاری اپنی کمزوریوں اور غلطیوں کا نتیجہ ہے کہ تم نے صبر کا دامن ہاتھ سے چھوڑا۔ بعض کام تقویٰ کے خلاف کیے، حکم کی خلاف ورزی کی، مال کے لالچ میں پڑ گئے۔ اس کے نتیجہ میں وہ کچھ ہوا جو تم دیکھ رہے ہو۔

آخر میں ان اللہ علی کل شیء قدیر کہہ کر اشارہ کر دیا کہ یوں تو اللہ نے تمہیں سمجھا دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کیسا قادر ہے کہ جب اس کی نصرت شاملِ حال ہو تو کمزوری بھی قوت بن جاتی ہے اور یا یہ مراد ہے کہ جب مومن اطاعت کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی نصرت کی قدرت نمائی کا نظارہ دکھاتا ہے اور جب اس سے نافرمانی وقوع میں آتی ہے تو اپنی نصرت کو روک دیتا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نفاق کا کھلا چہرہ

۳۰۷ - اور دیکھو دو گروہوں میں مقابلے کے دن جو نقصان تم پر آئی تھی وہ اللہ ہی کے حکم سے آئی اور اس لیے آئی کہ اللہ ان لوگوں کو نمایاں اور ممتاز کر دے جو منافق ہیں۔ یعنی جب چاہے جس کو چاہے غالب اور جب چاہے مغلوب کر دے۔ مغلوب کرنا اس لیے نہیں کہ وہ اس وقت غالب کرنے پہ قادر نہ تھا بلکہ اس لیے ہے کہ تمہارے کسب و اختیار سے صورت حال ایسی پیدا ہو گئی کہ کلی غلبہ عطا کرنے میں مصلحت نہ تھی۔ بہرحال جو کچھ ہوا اس کے حکم و مشیت سے ہوا جس کا سبب تم تھے اور حکمت یہ تھی کہ ایک طرف ہر مومن و مخلص کے ایمان و اخلاص کا اور دوسری جانب ہر منافق کے نفاق کا درجہ ظاہر ہو جائے۔ کھرے کھوٹے اور پکے پکے میں کسی کو کوئی التباس نہ رہے [1]

اب یہاں اس ابتلا کی حکمت واضح کی ہے کہ یہ جو کچھ پیش آیا ہے اس سے مقصود یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سچے مسلمانوں اور منافقوں کو اچھی طرح نمایاں کر دے تاکہ ہر شخص کھلی آنکھوں سے دیکھ لے کہ کون لوگ جماعت کے اندر قابل اعتماد ہیں کون لوگ نہیں۔ مقصد یہ ہے کہ یہ آزمائش جماعتی تطہیر کے لیے ضروری تھی۔ اگر مخلصین اور منافقین دونوں اسی طرح ملے جلے رہتے تو معلوم نہیں مفسد عناصر کس وقت پوری جماعت کو لے ڈوبتے [2]

منافق کی لغوی حقیقت اور وجہ تسمیہ

اصل ارشاد میں ولیعلم الذین نافقوا آیا ہے۔ نافقوا کا مصدر منافقت ہے منافقت نفق سے بنا ہے جس کے معنے گزرنے اور ختم ہونے کے آتے ہیں۔ اسی لیے خرچ کرنے کو انفاق کہتے ہیں اور اسی سے نفق اس راستہ کو کہتے ہیں جو دوسری طرف نکل جاتے اور زمین میں وہ سرنگ جو دوسری طرف نکل جاتے۔ ابن الانباری کی رائے میں منافق اسی نفق بمعنے سرنگ سے بنا ہے منافق بھی اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اسی طرح چھپ جاتا ہے جیسے آدمی سرنگ میں چھپ جاتا ہے اور کچھ کی رائے میں منافق نافقاء سے بنا ہے جس کے معنی گوہ کے بھٹ کے آتے ہیں۔ ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ گوہ اپنے بھٹ کے دو راستے رکھتی ہے ایک کا نام قاصعاء اور دوسرے کا نام نافقاء ہے۔ اسے

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

جب ایک راستہ سے تلاش کیا جاتا ہے تو دوسرے راستے سے نکل جاتی ہے۔ ایسے ہی منافق کا حال ہوتا ہے اہل ایمان کے سامنے وہ ایمان کے دروازے سے اور کفار کے سامنے وہ کفر کے دروازے سے نمایاں ہوتا ہے۔ اور جب ایک راہ میں وہ تکلیفوں کا شکار ہوتا ہے تو فوراً دوسری راہ میں پناہ لیتا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ گوہ جب اپنا بھٹ بناتی ہے تو اس کے دہانے کو بہت چھوٹا اور مختصر رکھتی ہے جب اسے کسی خطرہ کا اندیشہ ہوتا ہے تو دہانے پر سے مٹی ہٹا کر باہر ہو جاتی ہے۔ منافق اپنے قلب و ضمیر میں کفر کی الائش کو چھپا کر رکھتا ہے اور جب اس کو اس کے کفر پر ملامت کرتے ہو تو کفر کی مٹی جھاڑ کر اسلام کا لبادہ اوڑھ لیتا ہے۔ ان میں ابو عبیدہ کی رائے زیادہ وزنی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنہوں نے منافقانہ روش اختیار کر رکھی ہے۔ غزوۂ احد کی شکست نے ان کو شاہراہِ عام پر بے نقاب کر دیا۔

تعبیر میں یہ لطافت پیدا کی ہے کہ اہل ایمان کے لیے مومنین کا لفظ لائے ہیں لیکن اہل نفاق کے لیے منافقین نہیں فرمایا بلکہ نافقوا فرمایا ہے۔ صفت کا صیغہ دوام اور ثبوت بتاتا ہے جب کہ فعل تجدد اور حدوث ظاہر کرتا ہے۔ اہل ایمان میں ایمان صفت راسخہ ہے لیکن منافقین میں نفاق صفت نہیں بلکہ وقت کے تقاضوں کے تحت ہنگامی طور پر نمایاں ہو جاتی ہے ان میں بہتوں کو اللہ نے بعد میں توبہ کی توفیق دی ہے۔

اللہ کا کلمہ بلند کرو یا قوم کو بچالو

۲۰۸۔ اور جن سے کہا گیا تھا کہ آؤ اللہ کی راہ میں جنگ کرو یا مدافعت کرو۔ یعنی دشمن کا حملہ روکو۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے جب رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی تین سو آدمیوں کو ساتھ لے کر واپس جانے لگا۔ اس وقت کہا گیا تھا کہ عین موقع پر کہاں بھاگتے ہو۔ آؤ اگر اسلام کے دعوے میں سچے ہو تو اللہ کی راہ میں لڑو ورنہ کم از کم دشمن کی مدافعت میں حصہ لو۔ یعنی مجمع میں شریک رہو تاکہ کثرتِ تعداد کا اثر دشمن پر پڑے یا یہ کہ خدا کی راہ میں دین کی خاطر نہیں لڑتے تو حمیتِ وطنی و قومی یا اپنے اموال و اولاد کی حفاظت کے لیے دشمن کی مدافعت کرو۔ کیونکہ دشمن اگر کامیاب ہوا تو انتقام لینے میں مومنین و منافقین کی تمیز نہ کرے گا۔ عام مسلمانوں کی طرح تم بھی نقصان اٹھاؤ گے غرض ان پر طرح طرح سے ان کے مذاق کے موافق اتمام حجت کیا گیا تاکہ جو کچھ دلوں میں ہے علانیہ ظاہر ہو جائے۔[۱]

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

اصل ارشاد میں قاتلوا فی سبیل اللہ او ادفعوا آیا ہے۔ قتال فی سبیل اللہ کے معنے تو یہی ہیں کہ اللہ کی راہ میں اللہ کے کلمہ کا بول بالا کرنے کے لیے لڑو۔ اور دفع کے معنے کسی چیز کو قوت کے ساتھ ہٹا دینے کے ہیں جب اس کے ساتھ عن ہو تو اس کے معنے حمایت کرنے کے ہیں مگر یہاں چونکہ یہ جملہ کے اور قتال کے مقابلہ میں آیا ہے اس لیے شارحین قرآن نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ کم از کم شریک رہو تاکہ تمہاری وجہ سے ہماری تعداد زیادہ نظر آئے اور کافر مرعوب ہو جائیں اور اس طرح تم لڑائی میں نہ سہی مدافعت میں تو شریک ہو۔ اگر خدا نخواستہ مسلمان اس جنگ میں مغلوب ہو گئے اور مدینہ پر حملہ ہو گیا تو کافر سب کو بلا امتیاز قتل کریں گے اور سب کو لوٹیں گے۔ اس لیے اگر لڑتے نہیں تو دشمن کی مدافعت کرو۔ اور کچھ شارحین قرآن نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ اگر تم اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے لڑنا نہیں چاہتے تو آؤ اپنے بال بچوں، اپنی قوم اور اپنے وطن ہی کے لیے لڑو۔ علامہ قرطبیؒ نے یہی مطلب اپنایا ہے۔ بہرحال مطلب دونوں ہیں اب یہ آپ کے اختیار تمیزی اور صوابدید پر موقوف ہے کہ جو مطلب چاہیں قبول کر لیں۔

خوئے بدرا بہانہ بسیار

۳۰۹۔ تو کہنے لگے کہ اگر ہمیں علم ہوتا کہ جنگ ہو گی تو ہم ضرور تمہارا ساتھ دیتے۔ یعنی لڑائی ہوتی نظر نہیں آتی خواہ مخواہ کا ڈھونگ ہے۔ اگر ہمیں معلوم ہوتا کہ واقعی لڑائی ہونے والی ہے تو ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔ جب لڑائی دیکھیں گے شامل ہو جائیں گے۔ یا یہ مطلب تھا کہ کوئی ڈھنگ کا مقابلہ ہوتا تو ہم ساتھ دیتے بھلا یہ کوئی مقابلہ ہے کہ ایک طرف تین ہزار کا لشکر اور دوسری طرف ایک ہزار بے سر و سامان آدمی۔ یہ لڑائی کیا ہے محض اپنے کو ہلاکت میں ڈالنا ہے۔ یا لو نعلم قتالا سے یہ ظاہر کرنا چاہتے تھے کہ صاحب ہم فنون جنگ اور لڑائی کے قاعدوں سے واقف ہوتے تو آپ کے ساتھ رہتے یا دل میں طعن دیا کہ ہمارے مشورے پر نہ چلے اوروں کی رائے پر عمل کیا تو ہم کو لڑائی کے قاعدوں سے ناواقف سمجھے اور آپ واقف بنے۔ پھر ہمیں ساتھ کیوں لیتے ہو بہرحال جھوٹے حیلے کر کے چلے گئے۔

دراصل عبداللہ بن ابی جب تین سو منافقوں کو اپنے ساتھ لے کر راستہ سے پلٹنے لگا تو بعض

لہ افادات شیخ الاسلام

مسلمانوں نے جا کر اسے سمجھانے کی کوشش کی اور ساتھ چلنے کے لیے راضی کرنا چاہا مگر اس نے جواب دیا کہ ہمیں یقین ہے کہ آج جنگ نہ ہوگی اس لیے ہم جا رہے ہیں۔ ورنہ اگر ہمیں توقع ہوتی کہ آج جنگ ہوگی تو ہم ضرور تمہارے ساتھ چلتے۔[1] گویا ان کے خیال میں جنگ نہیں صریح خودکشی تھی۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ دشمن اوّل تو تعداد میں تم سے چوگنا پھر ساز و سامان میں کہیں زائد ایسی حالت میں شہر سے باہر نکل کر مقابلہ کرنا سارے اصول جنگ کے خلاف صریح دیوانگی ہے۔

وہ ایمان کے نہیں بلکہ کفر کے قریب ہیں

۳۱۰۔ یہ بات جب وہ کہہ رہے تھے وہ ایمان کی بہ نسبت کفر کے زیادہ قریب تھے یعنی منافقین دل سے کافر اور زبان سے ایمان کا اظہار کرتے تھے اور اسی زبانی اسلام کی بنا پر مسلمانوں سے ملے جلے رہتے تھے اس وقت اور عین موقع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں کو چھوڑ کر چلے جانے اور جھوٹے حیلے تراشنے سے اچھی طرح نفاق کی قلعی کھل گئی۔ اب ظاہر میں بہ نسبت ایمان کے کفر سے زیادہ قریب ہو گئے اور اپنے فعل سے مسلمانوں کو نقصان اور کافروں کو تقویت پہنچائی۔[2]

اُحد کے دن ان کی عملی زندگی کا ذکر کرنے کے بعد اس آیت میں ان کے کردار کی وجہ بتائی گئی ہے کہ اس کی اصل علت یہ ہے کہ اس روز بہ نسبت ایمان کے یہ کفر کے زیادہ قریب تھے اور کفر ہی ان کے اس کردار کی علت ہے۔ یہ گویا حق سبحانہ کی جانب سے ان پر کفر کا فتویٰ ان کی عملی زندگی کا نقشہ پیش کرنے کے بعد لگایا گیا ہے۔ ان کے سرحد ایمان سے دُور اور سرحد کفر سے قریب ہونے کی بنیادی وجہ قرآن کے نزدیک یہی ہے کہ اسلام کے برخلاف ان کے منصوبے ان کا نصب العین تھے۔ خدا اور رسُول کے ساتھ استہزاء ان کے ساتھ عداوت اور مسلمانوں میں باہم تفریق ان کا پروگرام ہے۔ ہر نازک مرحلہ پر مسلمانوں کے قدم اکھاڑنا ان کی سکیم میں داخل ہے دشمنوں سے ساز باز کرنا راہِ حق میں قربانی سے گریز، دینِ حق کے بارے میں زبانوں میں آوارگی ان کا دن رات کا مشغلہ ہے۔

ظاہر و باطن میں اختلاف

۳۱۱۔ اور وہ زبانوں سے وہ کچھ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں ہے اور جو کچھ وہ دلوں

[1] تفسیر القرآن　[2] افاداتِ شیخ الاسلام

میں چھپاتے ہوتے ہیں اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ یعنی زبان سے لو نعلم قتالا لاتبعنا کہ کہتے ہیں اور جو کچھ دل میں ہے صاف نہیں کہتے۔ دل میں یہ تھا کہ اچھا ہے مسلمان مغلوب ہوں اور ہم خوشی سے بغلیں بجائیں لیکن اور یا مطلب یہ ہے کہ زبانوں سے اسلام کا اقرار کرتے ہیں مگر قلوب ایمان سے خالی ہیں و لما یدخل الایمان فی قلوبکم منہ اور دل کا ذکر کر کے دراصل ان کے نفاق کی عکاسی کی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ ان کا ظاہر ان کے باطن سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زبانوں سے وہ کچھ کہتے ہیں جس کا قلوب میں کوئی وجود نہیں ہے۔ مثلاً ابھی جو دو باتیں انہوں نے کہی ہیں ایک یہ کہ ہمیں لڑائی کا علم نہ تھا دوسرے یہ کہ اگر ہمیں علم ہوتا تو لڑائی میں تمہارا ساتھ دیتے یہ ان دونوں باتوں میں جھوٹے ہیں۔ ان کو پتہ تھا اور پتہ ہونے کے باوجود انہوں نے جنگ سے گریز پائی اختیار کی ہے۔

موت سے بے پرواہ ہوکر فرض ادا کرو

۲۱۲ - جن لوگوں کا حال یہ ہے کہ خود تو بیٹھے رہے اور اپنے بھائیوں سے کہتے ہیں کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے تو نہ مارے جاتے ہیں اے پیغمبر ان سے کہہ دو اچھا اگر تم واقعی سچے ہو تو اپنی موت کو ٹال کر دکھاؤ۔ یعنی خود تو نامرد بن کر بیٹھے رہے اور اپنی برادری کے بھائیوں انصار مدینہ سے کہتے ہیں کہ ہماری بات مان کر گھر میں بیٹھے رہتے تو مارے نہ جاتے۔ اچھا اگر گھر میں بیٹھ رہنے سے جان بچتی ہے تو دیکھیں موت کو گھر میں کیسے نہ آنے دیں گے۔ اگر یہاں رہ کر بھی موت پیچھا نہیں چھوڑتی تو پھر بہادروں کی طرح میدان میں عزت کی موت کیوں نہ مریں[1]

یہ بھی ان دو غلے لوگوں کا ذکر ہے۔ یعنی کہنے والے وہ لوگ ہیں جو جنگ میں شریک نہیں ہوئے وہ ان لوگوں کے بارے میں جو شریک جنگ ہوتے اور جنہوں نے ایمان کا تقاضا پورا کیا ہے کہتے ہیں کہ اگر وہ ہماری بات مان لیتے اور جنگ میں شریک نہ ہوتے تو قتل نہ ہوتے قرآن نے جواب دیا ہے کہ اگر یہ سچ ہے تو تم گھر میں بیٹھے اپنی موت ٹال سکتے ہو تو ٹال کر دکھاؤ۔ گویا سمجھا دیا کہ جنگ زندگی کی ضرورت ہے۔ ایمان کی فطری مانگ اور اس پر دین کا بقا موقوف ہے۔ اس کا مقام کوئی معمولی مقام نہیں ہے۔ صرف اتنا نہیں کہ اللہ کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کلمہ کو بلند کرنے کے لیے لڑنا اللہ کی محبت اور مغفرت اور رحمت کا حقدار بنا دیتا ہے بلکہ اس کی نگاہ میں تو وہ لوگ بھی اونچا مقام رکھتے ہیں جو لڑنے والوں کی صرف بالواسطہ مدد کرتے ہیں۔ جب دین کا مطالبہ سامنے ہو اور اس کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو تو چاہیے کہ اس کے کرنے میں جان رہے یا جاتے وہ کام کرنا ہی پڑے گا۔ یہ کوئی اصول نہیں کہ اگر ایک کام کے کرنے میں موت کا خطرہ ہو تو وہ کام نہ کیا جائے۔

وَلَا تَحْسَبَنَّ الَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِىْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَمْوَاتًا ۭ بَلْ اَحْيَاۗءٌ عِنْدَ
رَبِّهِمْ يُرْزَقُوْنَ ۝ فَرِحِيْنَ بِمَآ اٰتٰىھُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۙ وَ
يَسْتَبْشِرُوْنَ بِالَّذِيْنَ لَمْ يَلْحَقُوْا بِهِمْ مِّنْ خَلْفِھِمْ ۙ اَلَّا خَوْفٌ
عَلَيْهِمْ وَلَا ھُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ يَسْتَبْشِرُوْنَ بِنِعْمَةٍ مِّنَ اللّٰهِ وَفَضْلٍ ۙ
وَّاَنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ اَجْرَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہوتے ہیں ان کی نسبت یہ خیال نہ
کرنا کہ وہ مرے ہیں نہیں بلکہ وہ زندہ ہیں، اپنے پروردگار کے حضور
ان کو روزی ملتی ہے[۳۱۳]۔ اللہ نے اپنے فضل وکرم سے ان کو جو
کچھ عطا کیا ہے اس سے وہ خوش حال ہیں[۳۱۴]، اور جو لوگ ان
کے پیچھے دنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی ان سے نہیں ملے ہیں
ان کے لیے خوش ہو رہے ہیں کہ نہ تو ان کے لیے کسی قسم کا اندیشہ
ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے[۳۱۵]۔ وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے

عطیوں سے مسرور رہیں اور اس بات سے کہ اللہ اہل ایمان کا
اجر ضائع نہیں کرتا ہے۔[۳۱۶]

مرتبہ شہادت

ہرگز نمیرد آنکہ دلش زندہ شد بعشق ثبت است بر جریدہ عالم دوام ما

تمام مذاہب میں اسلام ہی وہ مذہب ہے جس نے اپنے پیرووں میں شجاعت اور بہادری کے جوہر پیدا کرنے کی کوشش کی ہے۔ اسلام سے پہلے دُنیا کی عام حالت پر نظر کرکے لوگوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ چونکہ ہر قسم کا ظلم و ستم اسی قوت کا نتیجہ ہے اس لیے یہ مٹانے کے قابل ہے لیکن قرآن کی تعلیم نے یہ نکتہ سمجھایا کہ قوت بذاتہٖ کوئی بُری چیز نہیں ہے بلکہ اس کے استعمال کا موقعہ بُرا ہوتا ہے اس لیے قرآن نے بہادری اور شجاعت کو سراہا اور اس کے مواقع کی تعیین کی کہ اس کو حق کی مدد اور باطل کو مٹانے کے لیے کام میں لانا چاہیے کیونکہ اگر نیکوں میں یہ قوت نہ ہو تو وہ ظلم و ستم کی روک تھام اور باطل قوتوں کا بہادرانہ مقابلہ نہ کرسکیں گے اور نہ اسلام کا مقدس فریضہ جہاد کامیاب ہوسکے۔ اسلام شجاعت کا جو جوہر پیدا کرنا چاہتا ہے اس کی بنیاد چند مضبوط عقائد پر رکھی ہے جو صحیح ایمان اور غیر متزلزل یقین کے لازمی نتائج ہیں۔ اسی سورت میں بتایا گیا ہے کہ

۱۔ جو کچھ ہوتا ہے اللہ کے حکم سے ہوتا ہے۔ تعداد کی قلت و کثرت کوئی چیز نہیں۔ صرف فضل الٰہی اور نصرت خداوندی چاہیے۔

۲۔ ہر آدمی کی موت کا وقت مقرر ہے جب وہ آجاتے تو کسی طرح ٹالے ٹل نہیں سکتی اور جب تک نہ آئے اس کو مار نہیں سکتا۔

۳۔ خدا کی راہ میں مارا جانا زندگی کا بہترین مصرف ہے اس کے خون کے پانی سے گناہوں کا سارا دفتر دُھل جاتا ہے۔

انسان کی کمزوری اور بزدلی کا اصلی راز موت کا ڈر ہے۔ قرآن نے پہلے اس زہر کا تریاق یہ کہہ کر مہیا کیا کہ موت کا وقت مقرر ہے اس لیے کسی خطرہ سے بھاگنے کی کوئی وجہ نہیں۔ قرآن نے

بار بار اس کی تلقین کی ہے اور بتایا ہے وما کان لنفس ان تموت الا باذن اللہ کتابا موجلا یہ خیال کرنا کہ چونکہ لڑائی میں شریک ہوتے اس لیے مارے گئے غلط ہے کیونکہ مارنا جلانا اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اور جس کو چاہے موت دے اور جسے چاہے زندہ رکھے۔ مسلمانوں سے کہا گیا کہ تم کافروں جیسا یہ عقیدہ نہ رکھو۔ یہ کہنا کہ اگر یہ مقتول لڑائی میں نہ جاتا تو مارا نہ جاتا سرتاسر غلط ہے کیونکہ کوئی شخص موت سے بچ نہیں سکتا۔

انسان کو بزدل بنانے والی چیز خود زندگی کی محبت ہے۔ قرآن نے اس کے لیے یہ تریاق مہیا کیا ہے کہ میدان جنگ میں مرنے والوں سے یہ کہا کہ تم سب سے بڑی دولت نثار کررہے ہو وہ زندگی ہے۔ یہ زندگی ان کو از سر نو اسی وقت دے دی جائے گی۔ اس عقیدہ کی تعلیم نے اس خیال باطل کا کہ شہید مر جاتے ہیں ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور کہہ دیا گیا کہ ان کو مردہ خیال نہ کرو خدا کے پاس زندہ ہیں۔ ان کی زندگی کو اگرچہ اس دنیا کے لوگ جان نہیں سکتے۔ پھر بھی ان کو زبان سے بھی مُردہ نہ کہنا چاہیے۔

موت کی جگہ حیاتِ جاودانی

۳۱۳۔ جو لوگ اللہ کی راہ میں قتل ہو گئے ان کی نسبت یہ خیال نہ کرنا کہ وہ مُردے ہیں نہیں بلکہ وہ زندہ ہیں اپنے پروردگار کے حضور ان کو روزی ملتی ہے یعنی گھر میں بیٹھے رہنے سے موت ترک نہیں سکتی ہاں آدمی اس موت سے محروم رہتا ہے جس کو موت کے بجائے حیاتِ جاودانی کہنا چاہیے شہیدوں کو مرنے کے بعد ایک خاص طرح کی زندگی ملتی ہے جو اور مردوں کو نہیں ملتی ہے۔ ان کو حق تعالیٰ کا ممتاز قرب حاصل ہوتا ہے بڑے عالی درجات اور مقامات پر فائز ہوتے ہیں۔ جنت کا رزق ان کو آزادی سے پہنچتا ہے جس طرح ہم اعلیٰ درجہ کے ہوائی جہازوں میں بیٹھ کر ذرا سی دیر میں جہاں چاہیں اڑ کر چلے جاتے ہیں۔ شہداء کی ارواح حواصل طیور خضر میں داخل ہو کر جنت کی سیر کرتی رہتی ہیں۔ ان طیور خضر کی کیفیت و کلانی کو اللہ ہی جانے وہاں کی چیزیں ہمارے احاطہ خیال میں کہاں آسکتی ہیں [1]

حیاتِ شہداء کے بارے میں قرآن حکیم کی دو آیتیں ہیں ایک تو یہی زیر تفسیر آیت اور دوسری

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

آیت البقرہ ۱۵۴ گزر چکی ہے یہاں فرمایا کہ شہدار کو مُردے مت سمجھو اور وہاں فرمایا کہ شہدار کو مُردے نہ کہو۔
عالم تین ہیں دُنیا، برزخ اور آخرت - ان تینوں میں فرق یہ ہے کہ اس موجودہ دُنیا میں جسم زیادہ نمایاں اور رُوح پوشیدہ ہے اور رُوح کو جو کچھ مسرّت و تکلیف یہاں پہنچتی ہے وہ صرف اس مادی جسم کے واسطے سے پہنچتی ہے۔ ورنہ درحقیقت اس کی براہِ راست راحت و لذّت کا اس مادی دُنیا میں کوئی امکان نہیں دوسرے عالم میں جس کو برزخ کہا گیا ہے رُوح نمایاں ہو گی اور جسم چھپ جائے گا وہاں جو کچھ راحت و تکلیف پہنچے گی وہ دراصل رُوح کو پہنچے گی اور جسم اس کی نسبت میں ضمناً اس سے متاثر ہو گا۔ لیکن اس تیسرے عالم میں جسے آخرت یا جنت و دوزخ کہتے ہیں رُوح اور جسم دونوں نمایاں ہوں گے اور دونوں کی تکلیف و راحت کے مظاہر بالکل الگ ہوں گے۔
بتانے والے بتاتے ہیں کہ قتل کے بعد شہدار کو جو زندگی ملتی ہے وہ برزخی ہے مگر سوال یہ ہے کہ اگر فی الواقع شہدار کو برزخ میں حیات ملتی ہے تو اس میں ان کی تخصیص کیا ہے وہ تو ہر مرنے والے کو ملتی ہے یعنی مرنے کے بعد اس کی رُوح زندہ رہتی ہے۔ راحت و تکلیف سے سب ہی اس عالم میں دوچار ہوتے ہیں۔ راحت و تکلیف کا یہ احساس اصلاً رُوح کو ہوتا ہے اور جسم اس کی نسبت میں ضمناً متاثر ہوتا ہے۔ اگر شہدار کی زندگی بھی برزخ میں سب کی طرح ہے تو پھر یہ کیوں کہا گیا ہے کہ علّاً یہ خیال بھی نہ کرنا کہ وہ مُردہ ہیں اور قولاً زبان سے بھی نہ کہنا کہ وہ مُردہ ہیں۔ جب ان کو قتل کر دیا گیا ہے اور ان کی روحیں عنصری بدنوں سے پرواز کر چکی ہیں اور اس طرح جدا ہو چکی ہیں کہ روحوں کا جسموں سے کوئی تعلق نہیں رہا تو پھر مُردہ نہیں تو اور کیا ہیں؟ ہماری زبان میں موت اسی کا نام ہے اگر آپ کہتے ہیں کہ وہ عالمِ برزخ میں زندہ ہیں تو وہاں تو سب ہی زندہ ہوتے ہیں۔ یہ سب کہتے ہیں کہ ان کی زندگی برزخی ہے۔ لیکن اس سوال کا جواب بہت کم نے دیا ہے۔ صاحبِ معارف القرآن نے قرطبی کے حوالہ سے صرف اتنا بتایا ہے کہ شہدار کو اللہ کی طرف سے رزق ملتا ہے اور رزق زندہ آدمی کو ملا کرتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس دُنیا سے رخصت ہوتے ہی شہدار کے لیے رزقِ جنت جاری ہو جاتا ہے اور ایک خاص قسم کی زندگی مل جاتی ہے جو عام مُردوں سے ممتاز حیثیت کی ہے[1] اور صاحب جواہر القرآن لکھتے ہیں کہ "شہادت کے بعد ان کو جو زندگی ملتی ہے وہ دنیوی نہیں ہوتی بلکہ اس سے مختلف ہوتی ہے جب وہ دُنیا میں زندہ تھے ان کی زندگی بھی دُنیوی تھی یعنی رُوح اور

---

[1] معارف قرآن م سش

بدن دونوں کے ملاپ سے زندہ تھے لیکن موت سے دُنیوی زندگی ختم ہوگئی اور برزخ کا زمانہ شروع ہو گیا اب اس زندگی کو برزخی کہا جائے گا اور یہ زندگی بلا مشارکت بدنِ عنصری صرف رُوح کے لیے ہوگی۔[1]

دراصل عالمِ برزخ ارواح و نفوس کی دُنیا ہے۔ اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے وہ مرنے والے کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے جو ہو بہو اس کے جسمِ خاکی کا مثنیٰ ہوتا ہے۔ رُوحِ انسانی اسی جسمِ مثالی کے عذاب و راحت سے متاثر ہوتی ہے کیونکہ اعمال کی اصل ذمہ دار رُوح ہے جسمِ خاکی نہیں کل نفس بما کسبت رھینۃ اس لیے اصل مکلف رُوح ہے جسم نہیں جسم بمنزلہ آلہ ہے۔ دُنیا میں اس کا ایک جسمِ خاکی تھا۔ برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا تاہم اس کو اپنے جسمِ خاکی سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی اور اتنی ہی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مسلمان مردوں کو قبر میں جاتا دیکھتے ہیں۔

بعض ایسی سعید روحیں بھی ہوتی ہیں جن کو اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم سے اس عالمِ برزخ میں جسم خاکی کی شکل و صورت کی قید سے آزاد کر کے کوئی دوسرا مثالی جسم عطا کر دیتا ہے جیسا کہ احادیث میں آیا ہے کہ مومن کامل کی رُوح پرندوں کی شکل میں جنت میں اڑتی پھرتی ہے[2] اور خصوصاً شہداء کے متعلق آیا ہے کہ وہ سبز پرندوں کی شکل میں ہوں گے اور عرشِ الٰہی کی قندیلیں ان کا آشیانہ ہوں گی۔ گویا وہ پاکباز رُوحیں جنہوں نے اپنے خاکی جسموں کی فانی زندگیوں کو مادی خوشیوں اور زوال پذیر عشرتوں کو خدا کی راہ میں قربان کیا تو ان کو اللہ کی طرف سے ایک مثالی جسم غیر فانی زندگی اور روحانی عیش و عشرت کی لازوال دولت اسی وقت عنایت کر دی جاتی ہے۔

بہرحال یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ شہداء کو عالمِ برزخ میں حیات ملتی ہے۔ اس میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں لیکن کیفیتِ حیات میں اختلاف ہے۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی اسے معنوی مانتے ہیں چنانچہ مدارج النبوۃ میں حیات النبی پر بحث کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

حیاتِ شہداء مقاتلین فی سبیل اللہ است کہ آں معنوی اخروی است عند اللہ

مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں یہ نہیں کہ مثل شہداء ان ابدان کو چھوڑ کر اور ابدان سے تعلق ہو جاتا ہے چنانچہ وہ نیل الاطار میں لکھتے ہیں :

ورد النص فی کتاب اللہ فی حق الشہداء انھم احیاء یرزقون وان الحیاۃ

---

[1] جواہر القرآن [2] سنن ابن ماجہ۔

فیہ متعلقة بالجہد

شہداء کی پُرمسرت زندگی

۳۱۴ ۔ اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ان کو جو کچھ عطا کیا ہے اس سے وہ خوش حال ہیں یعنی اس وقت شہداء بے حد مسرور اور مُبتہج نظر آتے ہیں کہ اللہ نے اپنے فضل سے دولتِ شہادت عنایت فرمائی، اپنی عظیم نعمتوں سے نوازا اور اپنے فضل سے ہر آن مزید انعامات کا سلسلہ قائم کر دیا ۔ جو وعدے شہیدوں کے لیے پیغمبروں کی زبانی کیے گئے تھے انہیں آنکھوں سے مشاہدہ کر کے بے حد و بے انتہا خوش ہوتے ہیں[1]

یہ اس پُرمسرت زندگی کی تفصیل ہے جس کا مقام قرآن نے خدا کے پاس بتایا ہے ۔ یہ ان کو محض اللہ کے فضل سے بلا واسطہ اور بلا محنت اور بلا مشقت اور بغیر حساب و کتاب اللہ نے دی ہے دُنیا کے رزق میں اوّل تو محنت و مشقت سے اور آخر میں ملنے کے بعد یہ غم ہوتا ہے کہ کہیں چھن نہ جائے ۔ شہداء کو اللہ کے پاس سے جو رزق ملتا ہے اوّل تو اس میں اسباب و وسائل کا واسطہ نہیں ہوتا اور پھر یہ کہ اس میں کسی قسم کی محنت و مشقت نہیں ہوتی ۔ مزید برآں کہ اس کے زوال کا بھی کوئی اندیشہ نہیں ہوتا اور یہ بے مثال فرحت و مسرت بھی ان کی بے مثال حیات کی دلیل ہے فرحت کا تعلق زندگی سے ہے ۔ شہداء ان انعامات کو دیکھ کر بے حد خوش ہوتے ہیں ۔

کاش پیچھے رہنے والے بھی قربانیاں کریں

۳۱۵ ۔ اور جو لوگ ان کے پیچھے دُنیا میں رہ گئے ہیں اور ابھی ان سے نہیں ملے ہیں ان کے لیے خوش ہو رہے ہیں کہ نہ تو ان کے لیے کسی قسم کا اندیشہ ہے اور نہ وہ غمگین ہوں گے ۔ یعنی نہ صرف یہ کہ اپنی حالت پر شاداں و فرحاں ہوتے ہیں بلکہ اپنے ان مسلمان بھائیوں کا تصور کر کے بھی انہیں ایک خاص خوشی حاصل ہوتی ہے جن کو اپنے پیچھے جہاد فی سبیل اللہ اور دوسرے اُمورِ خیر میں مشغول چھوڑ آئے ہیں کہ وہ بھی اگر ہماری طرح اللہ کی راہ میں مارے گئے یا کم از کم ایمان پر مرے تو اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ایسی ہی پُر لطف اور بے خوف زندگی کے مزے لوٹیں گے

---

[1] ، [2] افاداتِ شیخ الاسلام

نہ ان کو اپنے آگے کا ڈر ہوگا اور نہ پیچھے کا غم مامون و مطمئن سیدھے خدا کی رحمت میں داخل ہو جائیں گے۔
بعض روایات میں آیا ہے کہ شہداء احد یا شہداء بیر معونہ نے خدا کے ہاں پہنچ کر تمنا کی تھی کہ کاش ہمارے اس عیش و تنعم کی خبر کوئی ہمارے بھائیوں کو پہنچا دے تاکہ وہ بھی اس زندگی کی طرف جھپٹیں اور جہاد سے جان نہ چرائیں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا میں پہنچاتا ہوں۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں اور ان کو مطلع کیا گیا کہ ہم نے تمہاری تمنا تمہارے بھائیوں تک پہنچا دی۔ اس پر وہ اور زیادہ خوش ہوئے[1]

اس آیت میں اہل ایمان کو بتایا ہے کہ حصول مقصد کے لیے جو لوگ اپنی جان دیتے ہیں وہ اور جو ان کے پیچھے رہ جاتے ہیں وہ یہ دونوں گروہ خوش قسمت ہیں۔ گروہ اول یعنی شہداء تو ان خوشیوں اور راحتوں کو پالیتا ہے جو اہل ایمان و عمل کو بعد الموت ملنے والی ہیں اور جو پیچھے رہ جاتے ہیں ان کے لیے یہ بشارت ہے کہ وہ کامیاب ہوں گے۔ ان کو دشمنوں کا خوف نہ رہے گا اور نہ ان کو یہ حزن اور غم ہوگا کہ انہوں نے اللہ کی راہ میں قربانی کیوں کی اور جس طرح اللہ تعالیٰ دنیا والوں کو بتا دیتا ہے کہ شہداء اللہ کی نعمتوں سے بہرہ یاب ہوئے ہیں اسی طرح وہ شہداء کو بتاتا ہے کہ بعد میں رہنے والے کامیاب ہو گئے ہیں یا یوں کہہ دیجئے کہ شہداء اپنے ان مخلص ساتھیوں کی طرف سے بھی مطمئن ہوتے ہیں جو ابھی تک شہید ہو کر ان تک نہیں پہنچے اور یہ اطمینان اس بنا پر ہوتا ہے کہ جو بشارتیں سنا کرتے تھے ان سے خود سودمند ہو رہے ہیں اس لیے پُر امید ہیں کہ ساتھی بھی شہید ہوں گے تو وہ بھی ہر قسم کے خوف اور ہر قسم کے غم سے مامون ہوں گے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ لم یلحقوا بھم سے شہید اور غیر شہید سب اہل ایمان مراد ہوں اور مطلب یہ ہو کہ جو مسلمان ہمارے پیچھے رہ گئے ہیں اور ابھی نہیں آئے اگر وہ شہید ہو کر آئیں گے تب تو ہمارے ساتھ مل ہی جائیں گے اور اگر اپنی موت سے بھی مر کر آئے اور ایمان و خلوص لے کر آئے تب بھی ہر قسم کے خوف و حزن سے مامون ہوں گے۔ خلاصہ یہ کہ وہ ان دونوں قسم کی خوشیوں سے لذت اندوز ہو رہے ہیں ایک تو یہ کہ خود عیش اور مزے میں ہیں اور آزادی کے ساتھ سبز پرندوں کے پوٹوں میں ہر جگہ کی سیر کرتے پھرتے ہیں دوسرے یہ کہ پیچھے رہنے والوں کی طرف سے مطمئن ہیں کہ وہ آ جائیں گے تو ان کو بھی ایک خاص اور پر لطف زندگی میسر آئے گی۔ اگر شہید ہو کر آتے تو سبحان اللہ اور اگر شہید نہ ہوتے اور ایمان و اخلاص کی نعمت لے کر آتے پھر بھی مامون زندگی کے وارث ہوں گے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

بعض علمائے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ عالی مقام اہلِ ایمان کے ساتھ ان کی ذریت اور ان کے اخلاف میں سے ان لوگوں کو بھی جمع کر دیا جائے گا جن کا خاتمہ ایمان پر ہوگا اگرچہ اپنے عمل کے لحاظ سے یہ ان کے درجہ کے نہ ہوں یہ شہیداء اور صدیقین پر اللہ کا خاص فضل ہوگا کہ ان کی مسرت کی تکمیل کے لیے ان کی باایمان ذریت کو ان کے ساتھ جمع کر دیا جائے گا اور اس مقصد کی خاطر اسلاف کا درجہ نیچا نہیں کیا جائے گا اخلاف کا درجہ بلند کر دیا جائے گا [1]

علامہ ابن کثیر نے کچھ علماء سے اس آیت کی تشریح اس طرح بھی نقل کی ہے کہ شہید کے پاس ایک رجسٹر لایا جائے گا جس میں ان لوگوں کے نام ہوں گے جو اہلِ ایمان برادری میں سے اس کے پاس آنے والے ہیں وہ اس بشارت سے ایسا شاداں و فرحاں ہوگا جیسا کہ دُنیا میں لوگ اپنے کسی غائب عزیز کی آمد کی بشارت سُن کر خوش ہوتے ہیں [2]

اہلِ ایمان کے لیے محرومی نہیں ہے

۳۱۶ ۔ وہ اللہ کی نعمت اور فضل کے عطیوں سے مسرور ہیں اور اس بات سے کہ اللہ اہلِ ایمان کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے یعنی اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرکے اس پر بے انتہا خوش ہوتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی محنت ضائع نہیں کرتا ہے بلکہ خیال و گمان سے بڑھ کر بدلہ دیتا ہے [3]

مطلب یہ ہے کہ ان کو مشاہدہ ہو جائے گا کہ اللہ سبحانہٗ اہلِ ایمان کے اجر کو رائیگاں نہیں کرتے ۔ غرض شہداء اپنی نعمتوں کو دیکھ کر خوش ہوں گے اور دوسروں کے متعلق یہ معلوم کرکے خوش ہوں گے کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرتے ۔ ان دونوں خوشیوں کا سبب صراحۃً ذکر فرمایا کہ وہ خوش ہیں ۔ ایک تو اس وجہ سے کہ وہ خود اچھی حالت میں ہیں اور دوسرے اس لیے کہ وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اہلِ ایمان کے اجر کو ضائع نہیں کرتا بلکہ جو مسلمان جس مرتبہ کا عمل لے کر آتا ہے اس کو اس کے مرتبہ کے موافق درجہ اور ثواب دیتا ہے اس مسرت و شادمانی سے بڑھ کر اور کیا مسرت ہوگی کہ کوئی شخص خود اپنی جانب سے اور اپنے متعلقین کی جانب سے مطمئن اور پُر امید ہو ۔

---

[1] تدبر قرآن ج [2] معارف قرآن ج ا [3] افادات شیخ الاسلام

الَّذِينَ اسْتَجَابُوا لِلَّهِ وَالرَّسُولِ مِنْ بَعْدِ مَا أَصَابَهُمُ
الْقَرْحُ ۚ لِلَّذِينَ أَحْسَنُوا مِنْهُمْ وَاتَّقَوْا أَجْرٌ عَظِيمٌ ۝
الَّذِينَ قَالَ لَهُمُ النَّاسُ إِنَّ النَّاسَ قَدْ جَمَعُوا لَكُمْ
فَاخْشَوْهُمْ فَزَادَهُمْ إِيمَانًا ۖ وَقَالُوا حَسْبُنَا اللَّهُ وَنِعْمَ
الْوَكِيلُ ۝ فَانْقَلَبُوا بِنِعْمَةٍ مِنَ اللَّهِ وَفَضْلٍ
لَمْ يَمْسَسْهُمْ سُوءٌ ۙ وَاتَّبَعُوا رِضْوَانَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ ذُو فَضْلٍ
عَظِيمٍ ۝ إِنَّمَا ذَٰلِكُمُ الشَّيْطَانُ يُخَوِّفُ أَوْلِيَاءَهُ فَلَا تَخَافُوهُمْ
وَخَافُونِ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ ۝

جن لوگوں نے زخم کھانے کے باوجود اللہ اور رسول کی پکار کو اپنایا۔
ان میں نیکوکاروں اور اہل تقویٰ کے لیے بہت بڑا اجر[۳۱۷] ہے۔ یہ وہی
لوگ ہیں جن سے کچھ آدمی کہتے تھے کہ دشمنوں نے تمہاری خاطر بہت
بڑی جمعیت اکٹھی کی ہے لہٰذا ان سے ڈرتے رہو لیکن یہ سن کر

اُن کا ایمان اور بڑھ گیا اور وہ بول پڑے ہمارے لیے اللہ کافی ہے
اور وہی بہترین کارساز ہے[318]۔ آخر کار وہ اللہ کی نعمت اور فضل سے
شادکام واپس آگئے ان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی وہ اللہ کی
خوشنودی پر گامزن ہو گئے اور اللہ بڑے ہی فضل والا ہے[319]۔ اس
کے سوا کچھ نہیں کہ وہ مخبر ایک شیطان ہے جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے
ڈراتا ہے اگر تم ایمان رکھتے ہو تو ان سے نہ ڈرو بلکہ اللہ سے ڈرو[320]۔

تکلیف کے باوجود فداکاری کے مظاہرے

ابوسفیان جب اُحد سے مکہ واپس گیا تو راستہ میں خیال آیا کہ ہم نے بڑی غلطی کی، ہزیمت یافتہ اور زخم خوردہ مسلمانوں کو یوں ہی چھوڑ کر چلے آئے۔ مشورے ہونے لگے کہ پھر مدینہ واپس چل کر ان کا قصہ تمام کریں۔ حضور انور کو خبر ہوئی تو اعلان فرما دیا کہ جو لوگ کل ہمارے ساتھ لڑائی میں شریک تھے رخِ دشمن کا تعاقب کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ مسلمان مجاہدین باوجودیکہ "تازہ زخم کھائے ہوئے تھے اللہ اور رسُول کی پکار پر نکل پڑے۔ آپ ان مجاہدین کی جمعیت لے کر مقام "حمراء الاسد" تک پہنچے۔ ابوسفیان کے دل میں یہ سُن کر کہ مسلمان اس کے تعاقب میں چلے آرہے ہیں سخت رُعب و دہشت طاری ہوئی دوبارہ حملہ کا ارادہ فسخ کر کے مکہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ عبدالقیس کا ایک تجارتی قافلہ مدینہ آرہا تھا — ابوسفیان نے ان لوگوں کو کچھ دے کر آمادہ کیا کہ وہ مدینہ پہنچ کر ایسی خبریں شائع کریں جن کو سن کر مسلمان ہماری طرف سے مرعوب و خوفزدہ ہو جائیں۔ انہوں نے مدینہ پہنچ کر کہنا شروع کیا کہ مکہ والوں نے بڑا بھاری لشکر اور سامان مسلمانوں کے دلوں میں استیصال کی غرض سے تیار کیا ہے۔ یہ سُن کر مسلمانوں کے دلوں

خوف کی جگہ جوش ایمان بڑھ گیا اور کفار کی جمعیت کا حال سن کر کہنے لگے حسبنا اللہ ونعم الوکیل ساری دنیا کے مقابلے میں اکیلا خدا ہی ہم کو کافی ہے ۔

بعض کہتے ہیں کہ جنگ احد کے تمام ہونے پر ابوسفیان نے اعلان کیا تھا کہ آئندہ سال بدر پر پھر لڑائی ہے حضور انور نے ابوسفیان کا یہ چیلنج قبول کیا۔ جب اگلا سال آیا حضرت نے لوگوں کو حکم دیا کہ جہاد کے لیے چلو۔ اگر کوئی نہ جائے گا پھر بھی اللہ کا رسول تنہا جائے گا۔ ادھر ابوسفیان مکہ سے فوج لے کر نکلا تھوڑی دور چل کر ہمت ٹوٹ گئی، رعب چھاگیا، قحط سالی کا عذر کر کے چاہا کہ مکہ واپس چلا جائے مگر صورت ایسی ہو کہ الزام مسلمانوں پر رہے۔ ایک شخص مدینہ جاتا تھا۔ اس کو کچھ دیا کہ وہاں پہنچ کر اس طرف کی ایسی خبریں مشہور کرنا جن کو سن کر مسلمان ڈر جائیں اور جنگ کو نہ نکلیں۔ وہ مدینہ پہنچ کر کہنے لگا کہ مکہ والوں نے بڑی بھاری جمعیت اکٹھی کی ہے تم کو لڑنا مناسب نہیں ہے۔ مسلمانوں کو اللہ تعالیٰ نے استقلال دیا۔ انہوں نے کہا کہ ہم کو اللہ کافی ہے۔ آخر مسلمان حسب وعدہ بدر پہنچے۔ وہاں بڑا بازار لگتا تھا تین روز رہ کر تجارت کر کے خوب نفع کما کر مدینہ واپس آئے۔ اس غزوہ کو بدر صغریٰ کہتے ہیں۔ اس وقت جن لوگوں نے رفاقت کی اور تیار ہوئے ان کو یہ بشارت ہے کہ احد میں زخم کھا کر اور نقصان اٹھا کر پھر ایسی جرأت کی مسلمان کی اس جرأت و مستعدی کی خبر سن کر مشرکین راستہ سے لوٹ گئے۔ چنانچہ مکہ والوں نے اس مہم کا نام 'جیش السویق'، رکھ دیا یعنی وہ لشکر جو محض ستو پینے گیا تھا پی کر واپس آگیا۔[1]

ان آیات کے پس منظر میں حمراء الاسد کا واقعہ ہو یا بدر صغریٰ دونوں میں صحابہ کرام خوش اور کامیاب واپس آئے لیکن اس موقعہ پر بھی منافقوں نے دشمنوں سے مل کر ہر طرح کی شرارتیں کیں۔ دشمن چاہتے تھے کہ ڈر جانے کی حالت ان کے حصے میں نہ آئے مسلمانوں کے حصے میں آتے اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ مسلمان جنگ کے لیے آمادہ نہ ہوں۔ چنانچہ مسلمانوں کو خوفزدہ کرنے کے لیے مخبر روانہ کیے گئے۔ اور بہت سی جھوٹی افواہیں اڑائی گئیں۔ منافق انہیں پھیلاتے اور مسلمانوں کو سرگرمی سے باز رکھنا چاہتے یہاں ان تمام باتوں کی طرف اشارہ ہے اور منافقوں کو آخری مہلت دی گئی ہے کہ اپنی منافقانہ روش سے باز آجائیں ورنہ وقت آگیا ہے کہ اللہ ان کے چہروں سے نفاق کا پردہ اٹھا دے گا۔

ان آیات میں منافقوں کی جو نفسیاتی حالت دکھائی گئی ہے وہ کوئی مخصوص صورت حال نہیں ہے اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ جماعت کے کمزور اور مذبذب افراد ہمیشہ ایسی ہی صورت حال

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پیدا کر دیا کرتے ہیں[1]

غزوۂ حمراء الاسد میں صحابہ کی فدا کاری

۱۷۲ ۔ جن لوگوں نے زخم کھانے کے باوجود اللہ اور اس کے رسُول کی پکار کو اپنایا ۔ ان میں نیکو کاروں اور اہلِ تقویٰ کے لیے بہت بڑا اجر ہے ۔ جنگ اُحد سے پلٹ کر جب مشرکین کئی منزل دُور چلے گئے تو انہیں ہوش آیا اور انہوں نے باہم کہا کہ ہم نے یہ کیا حرکت کی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی طاقت ختم کر دینے کا جو موقعہ ملا تھا اسے کھو کر چلے آئے ۔ چنانچہ ایک جگہ ٹھہر کر انہوں نے مشورہ کیا کہ دوبارہ حملہ کیا جائے لیکن پھر ہمت نہ پڑی اور مکہ واپس ہو گئے ۔ ادھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی یہ اندیشہ تھا کہ یہ لوگ کہیں پھر نہ پلٹ آئیں اس لیے جنگ اُحد کے دوسرے روز آپ نے مسلمانوں کو جمع کر کے فرمایا کہ کفار کے تعاقب میں چلنا چاہیے ۔ یہ اگرچہ نہایت نازک موقعہ تھا مگر پھر بھی سچے مومن جاں نثاری کے لیے تیار ہو گئے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حمراء الاسد تک گئے جو مدینہ سے آٹھ میل کے فاصلے پر ہے ۔ اس آیت میں ان ہی فدا کاروں کی طرف اشارہ ہے[2] غزوۂ اُحد ۱۵ شوال ۳ھ مطابق ۳۱ مارچ ۶۲۵ء کو ہوا تھا ۔ ہفتہ کا دن تھا ۔ اگرچہ قریش کا لشکر میدانِ جنگ سے روانہ ہو گیا تھا لیکن خطرہ تھا کہ وہ لوگ دوبارہ حملہ نہ کر دیں ۔ اس لیے رات کو مدینہ منورہ میں پہرے کا زبردست انتظام کیا گیا ۔ ۱۶ شوال ۳ھ مطابق یکم اپریل ۶۲۵ء کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قریش کے تعاقب کا حکم دیا یہ بھی صراحت کر دی کہ صرف وہی لوگ اس مہم میں شریک ہوں جو غزوۂ اُحد میں شریک تھے ۔ چنانچہ مجروحین پٹیاں باندھے ہوئے تعاقب کی مہم میں شریک ہوئے ۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہمراہ تھے ۔ آپ نے حمراء الاسد میں قیام فرمایا ۔ اس رات مقامِ نزول میں جگہ جگہ آگ روشن کی گئی تاکہ دیکھنے والوں کو معلوم ہو کہ بہت بڑا لشکر ٹھہرا ہوا ہے ۔ اگرچہ قبیلہ بنو خزاعہ مسلمان نہ ہوا تھا مگر وہ لوگ کچھ مسلمانوں کے ہمدرد تھے ۔ معبد خزاعی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا واپس ہوا تو دیکھا کہ قریش الروحا میں ٹھہرے ہوئے ہیں اور فیصلہ کن حملے کے مسئلہ پر بحث کر رہے ہیں ۔ معبد نے ان سے کہا کہ میں نے ایسا ہیبت انگیز لشکر کبھی نہیں دیکھا جیسا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہے اور وہ حمراء الاسد

---

[1] ترجمان القرآن [2] تفہیم القرآن

ہیں ہیں۔ یہ سن کر قریش مکہ روانہ ہوگئے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پیر، منگل ۸، ۹ شوال کو حمراء الاسد میں قیام پذیر رہے اور بدھ ۱۰ شوال کو مراجعت فرمائی۔

عام شارحین قرآن کی رائے یہی ہے کہ یہ آیت قرآنی اور اگلی آیات اسی واقعہ کی طرف اشارہ کررہی ہیں لیکن امام مجاہد اور عکرمہ کی رائے ہے کہ ان آیات میں غزوہ بدر کبریٰ کی طرف اشارہ ہے۔ شاہ عبدالقادر اور مولانا آزاد کا رجحان بھی اسی طرف ہے۔ کچھ ہو اس آیت میں صحابہ کی جان نثاری اور اسلام کی خاطر فداکاری کی مدح کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شہداء کے وہ بھائی جو ان کے پیچھے رہ گئے ان کے کیا کہنے ہیں انہوں نے ایسے سنگین حالات میں اللہ و رسول کے حکم کو شرف پذیرائی بخشا اور خدا کے رسول کی آواز پر لبیک کہی جب کہ وہ زخموں سے نڈھال ہو رہے تھے۔ اصل ارشاد میں الذین استجابوا آیا ہے۔ استجابت کے معنے قبول کرنے کے آتے ہیں۔ ان معنے میں یہ لفظ قرآن میں کئی جگہ آیا ہے۔ درمیان میں مدح میں اور زور پیدا کرنے کے لیے فرمایا ہے کہ ان میں احسان و تقویٰ علی وجہ الکمال موجود ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ان میں کچھ محسن اور کچھ غیر محسن تھے اور کچھ متقی اور کچھ غیر متقی تھے بلکہ یہ اعلان ہے جو ایسے موقعہ پر ہوتا ہے کہ جو وفادار رہے اس کو انعام ملے گا خواہ سب کے سب وفادار ثابت ہوں۔ اور ظاہر ہے کہ جنہوں نے باوجود زخمی ہونے کے فداکاری کا یہ مظاہرہ کیا کہ اللہ کے رسول کی دعوت جہاد قبول کی بلاشبہ وہ سب ہی محسن اور سب ہی متقی تھے اور سب ہی اجر عظیم کے مستحق تھے۔ مولانا عثمانی فرماتے ہیں کہ:

> یہ جو فرمایا للذین احسنوا منھم واتقوا محض ان کی مدح سرائی اور تنویہ شان کے لیے ہے ورنہ سب کے سب ایسے ہی تھے۔

ہاں اس سے یہ ضرور پتہ چلتا ہے کہ کوئی کام خواہ کیسا ہی اچھا ہو اور کرنے والا اس کے لیے کیسی ہی جاں نثاری کرے اللہ کے یہاں اس کی قدر و قیمت اسی وقت پڑے گی جب اس میں احسان و تقویٰ ہوگا۔

نبوت کی اصطلاحی زبان میں احسان

احسان کی حقیقت مختصر سے مختصر لفظوں میں یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے بارے میں بندے کے قلب کو ایسا یقین و اطمینان نصیب ہو جاتے جیسا کہ کسی حقیقت کے مشاہدے سے ہو جایا کرتا ہے جس کے بعد اس کے خلاف کسی وہم اور وسوسہ کی بھی گنجائش نہیں ہوتی۔ پھر اس کے نتیجہ میں

اللہ کے ساتھ عبدیت کا وہ رابطہ پیدا ہوجائے جس کی وجہ سے قلب ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد اور اس کی عظمت و محبت سے معمور رہے۔ اور پھر اس بندہ کی عبادت، اس کے اخلاق، اس کی معاشرت اور اس کے سارے معاملات یعنی اس کی پوری زندگی کی رُوح بھی ایمان و یقین اور یہی رابطہ عبدیت بن جائے پھر وہ جو کچھ کرے اسی ایمان اور رابطہ عبدیت کے داعیہ سے اور اسی کے تقاضے کے مطابق کرے اور اس طرح اس کی قالبی اور ظاہری زندگی بھی اسی قلبی و باطنی رنگ سے رنگین ہو جائے۔ صبغۃ اللہ و من احسن من اللہ صبغۃ۔

احسان کی یہ حقیقت معلوم ہوجانے کے بعد ہر شخص آپ سے آپ سمجھ لے سکتا ہے کہ یہ دین و ایمان کا کمال ہے اور جس کو جتنی یہ دولت نصیب ہو اتنا ہی اس کا دین کمال والا ہے اور جس میں اس لحاظ سے جتنی کمی ہو اتنی ہی اس کے دین کے کمال میں کمی ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مشہور حدیث جو حدیث جبریل کے نام سے مشہور ہے اس میں آپ نے احسان کی یہ تعریف کی ہے الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ احسان یہ ہے کہ تم اللہ کی اس طرح عبادت کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگرچہ تم اسے فی الواقع نہیں دیکھتے مگر وہ تو تمہیں حقیقۃً دیکھ رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ بندہ کی یہ حالت ہوجائے کہ عابدانہ زندگی اس طرح گزارے اور اپنے ہر کام میں اللہ تعالیٰ کا ایسا ادب ملحوظ رکھے کہ گویا اللہ سبحانہ اس کے سامنے ہے اور وہ اسے دیکھ رہا ہے ظاہر ہے یہ کیفیت جب ہی پیدا ہوتی ہے جب کہ بندہ کو حقیقت یقین حاصل ہوجائے اور وہ اس کے قلب پر اس طرح چھا جائے کہ اللہ تعالیٰ کی ہستی گویا ہر وقت اس کے سامنے رہے۔

پھر اس نور یقین، اس حضوری نسبت اور احسانی کیفیت کا قدرتی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق کے مقابلے میں سارے تعلقات فنا ہوجاتے ہیں۔ پھر اس کے تمام ظاہری و باطنی اعمال مثلاً دشمنی دوستی، کسی سے ملنا، نہ ملنا، لینا اور دینا سب اللہ کے لیے ہوجاتے ہیں۔ صحابہ کرام کو یہی دولت حاصل تھی اور ان کا خاص سرمایہ یہی نعمت تھی۔ یعنی یہ نور یقین اور اس سے پیدا ہونے والا رابطہ عبدیت اور کیفیت خشیت و محبت ان میں درجہ کمال میں موجود تھی۔

ہمارے اس صدی کے ربانی عالم اور محقق صوفی حضرت مولانا گنگوہی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں۔

یہ انتہا سب طرق کی ہے... صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین نے اپنا تمام

خاں دہال اور آبروجان کیوں دی تھی کیا دیکھا تھا۔ یہی کہ فیض صحبت فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے نور یقین حاصل ہو گیا تھا۔ بس اسی پر سب کام کا مدار تھا حضرت سیدی عبدالقادر جیلانی خواجہ معین الدین چشتی اور سید الطائفہ بہاؤ الدین بخاری کیوں بڑے ہو گئے اسی وجہ سے بڑے ہوئے تھے چند سطر کے بعد فرماتے ہیں کہ،

اس نسبت کا نام احسان ہے کہ بعثت جناب فخر رسل علیہ السلام کی اس کے ہی واسطے تھی اور جملہ صحابہ اس نسبت کے حامل تھے علی حسب مراتبہم۔

(مکاتیب رشیدیہ ص ۱۸)

اسی کے لیے تصوف کی زبان میں حضور، یاد داشت، نسبت، احسانی کیفیت کی تعبیرات ہیں۔ بہرحال بتایا جا رہا ہے کہ للذین احسنوا منھم کا فقرہ مقام مدح میں آیا ہے اور اس کے ذریعے نسبت احسانی میں صحابہ کا چہرہ پیش کیا ہے۔

غور کیجیے کہ یہ مدح کن لوگوں کی کی جا رہی ہے ان کی جن کی نمازیں یکسر خلوص وللہیت سے معمور تھیں جن کے اعمال صالحہ اور فضائل اخلاق کی دنیا کی ساری تاریخ میں نظیر نہیں ہے جن کے درجات او علو مرتبت پر خود قرآن گواہ ہے۔ اس کے باوجود ان کی مدح احسان و تقویٰ کو بنیاد بنا کر وہاں کی گئی جہاں زندگی کی محبتوں اور الفتوں نے ستم رسیدہ ہونے، زخمی ہونے کے باوجود دین حق کی اقامت کی خاطر اللہ کے رسول کی دعوت پر لبیک کہنے میں کوئی چیز رکاوٹ نہ بنی۔

آج جو لوگ خیال کرتے ہیں کہ ہماری نمازیں اور دعائیں، ہمارے اوراد و وظائف نسبت احسانی کے لیے کافی ہیں انہیں غور کرنا چاہیے کہ جب صحابہ کرام کو ان کی نمازوں اور عبادتوں اور اعمال صالحہ کے باوجود نسبت احسانی کا علمبردار دین حق کی نصرت کرنے پر بتایا جا رہا ہے تو ہم لوگوں کی عبادتیں کس شمار و قطار میں ہوں گی جب کہ ہم خدا کے دین کو غالب کرنے کے لیے ادنیٰ ترین قربانی کرنے کو بھی تیار نہیں ہیں یہاں تک کہ ہمارے قلوب بھی اس تمنا اور آرزو سے خالی ہو چکے ہیں کہ خدا کی زمین پر اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کے عطا کیے ہوئے قانون سعادت اور ضابطہ حیات کا بول بالا ہو۔

ایک اور لطیف نکتہ

اس واقعہ میں مشرکین کے تعاقب میں جانے کا حکم اللہ کے رسول نے دیا تھا۔ قرآن میں اس کا

حکم کسی آیت میں مذکور نہیں ہے اس کے باوجود جب اللہ سبحانہ نے صحابہ کی جاں نثاری اور اطاعت شعاری کو سراہا تو فرمایا کہ یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ اور اس کے رسول کا کہا مانا الذین استجابوا للہ و الرسول اس میں ان لوگوں کے لیے بہت بڑی عبرت ہے جو حدیث کا انکار کرتے ہیں اور رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد کی بتلاتے ہیں۔ ان کے سمجھنے کے لیے یہ جملہ کافی ہے کہ رسول کے حکم کو اللہ نے اپنا حکم قرار دیا ہے۔

غزوۂ بدر صغریٰ میں صحابہ کی فداکاری

۳۱۸ - یہ وہی لوگ ہیں جن سے کچھ آدمی کہتے تھے کہ دشمنوں نے تمہاری خاطر بہت بڑی جمعیت اکٹھی کی ہے لہٰذا ان سے ڈرتے رہو لیکن یہ سن کر ان کا ایمان اور بڑھ گیا اور وہ بول پڑے ہمارے لیے اللہ کافی ہے اور وہی بہترین کارساز ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ پہلی آیت یعنی الذین استجابوا غزوۂ حمراء الاسد کے بارے میں نازل ہوئی اور اس آیت میں غزوۂ بدر صغریٰ میں صحابہ کی فداکاری کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔

غزوۂ احد سے پلٹتے ہوئے ابوسفیان مسلمانوں کو چیلنج دے گیا تھا کہ آئندہ سال بدر میں ہمارا تمہارا پھر مقابلہ ہوگا مگر جب وعدے کا وقت قریب آیا تو اس کی ہمت نے جواب دے دیا کیونکہ اس سال مکہ میں قحط تھا۔ لہٰذا اس نے پہلو بچانے کے لیے یہ تدبیر کی کہ خفیہ طور پر ایک شخص کو روانہ کیا جس نے مدینے پہنچ کر مسلمانوں میں یہ خبریں مشہور کرنی شروع کر دیں کہ اس سال مشرکین نے زبردست تیاری کی ہے اور ایسا بھاری لشکر جمع کر رہے ہیں جس کا مقابلہ تمام عرب میں کوئی نہ کر سکے گا۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ مسلمان خوفزدہ ہو کر اپنی جگہ رہ جائیں اور مقابلہ پر نہ آنے کی ذمہ داری انہی پر رہے ابوسفیان کی اس چال کا یہ اثر ہوا کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر کی طرف چلنے کے لیے مسلمانوں سے اپیل کی تو اس کا کوئی ہمت افزا جواب نہ ملا۔ آخر کار اللہ کے رسول نے بھرے مجمع میں اعلان کیا کہ اگر کوئی نہ جائے گا تو میں اکیلا جاؤں گا اس پر پندرہ سو فداکار آپ کے ساتھ چلنے کے لیے کھڑے ہو گئے اور آپ انہی کو لے کر بدر تشریف لے گئے۔ ادھر سے ابوسفیان دو ہزار کی جمعیت لے کر چلا۔ دو روز کی مسافت تک جا کر اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ اس سال لڑنا مناسب معلوم نہیں ہوتا آئندہ سال آئیں گے[1]

---

[1] تفہیم القرآن

ذی قعدہ ۴ھ مطابق اوائل اپریل ۶۲۶ء قریب آیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر پہنچنے کے لیے تیار ہو گئے آپ کے ساتھ ۱۵۰۰ سو غازی اور دس گھوڑے تھے۔ ذی قعدہ کا چاند طلوع ہوتے ہی بدر میں میلہ شروع ہوتا تھا اور وہاں خوب تجارت ہوتی تھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بدر میں ۸ ذی قعدہ مطابق ۱۲ اپریل ۶۲۶ء تک قیام پذیر رہے۔ ۱۸ ذی قعدہ کے بعد واپس آ گئے۔

آیت میں دو جگہ الناس آیا ہے۔ پہلے الناس سے نعیم بن مسعود مراد ہے۔ نعیم اگرچہ تنہا تھا لیکن بہت کی ترجمانی کر رہا تھا اس لیے اس کو الناس کہہ دیا اور دوسرے الناس سے کفارِ مکہ مراد ہیں۔

ابو سفیان لشکر لے کر مر الظہران تک پہنچا تھا کہ ایک دل چھوڑ بیٹھا اور واپسی کا ارادہ کر لیا۔ اتفاق سے اسے نعیم بن مسعود اشجعی مل گیا۔ ابو سفیان نے اس سے کہا کہ میں محمد اور ان کے ساتھیوں سے وعدہ کر آیا ہوں کہ بدر کے میلے کے ایام میں آئندہ سال جنگ ہو گی لیکن اب میری رائے ہے کہ لڑنا مناسب نہیں اس لیے اے نعیم اچھا یہ ہے کہ تم مدینہ جا کر مسلمانوں میں یہ خبر مشہور کرو کہ قریش نے تمہارے لیے ایک عظیم لشکر تیار کیا ہے تاکہ مسلمان خوفزدہ ہو جائیں اور ان کی ہمتیں ٹوٹ جائیں اور ڈر کر میدان میں نہ آئیں۔ ابو سفیان نے نعیم بن مسعود سے کہا کہ اس کام کی اجرت میں تم کو میں دس اونٹ دوں گا۔ نعیم انعام کا لالچ پا کر مدینہ پہنچا اور یہ پروپیگنڈہ کیا۔ صحابہ نے نعیم کے اس پروپیگنڈے کا جو جواب دیا ہے قرآن نے اس کو یہاں نقل کیا ہے کہ یہ پروپیگنڈا بجائے اس کے کہ ان کے اندر خوف و ہراس پیدا کرتا ان کے عزم و ایمان کی بڑھوتری کا سبب ہو گیا۔ اصحاب عزم و ایمان کو یہ پروپیگنڈہ بجائے ضعیف کرنے کے اور زیادہ پُرعزم اور پُر حوصلہ بنا دیتا ہے۔ ہر آزمائش ان کی خفیہ صلاحیتوں کے لیے مہمیز کا کام دیتی ہے اور ہر امتحان ان کے لیے فتح مندی کا ایک نیا میدان کھولتا ہے۔ انہوں نے اس پروپیگنڈے کے جواب میں کہا کہ حسبنا اللہ و نعم الوکیل یہ ان کے اضافہ ایمان کا مظہر ہے اہل ایمان کی تمام قوت و طاقت کا خزانہ درحقیقت یہی حسبنا اللہ کا عقیدہ ہے۔ اس کا ثبوت ان کے ہر قول و فعل سے ملتا ہے۔ ان کے دلوں کا اطمینان اور خود اعتمادی اسی عقیدہ کا نتیجہ تھی۔ اس عقیدے کی بدولت صحابہ میں عجیب و غریب بے خوفی کی کیفیت پیدا ہو گئی تھی۔ وہ جانوں کو خطرے میں ڈال دیتے تھے اور ایسے ایسے کام کر گزرتے تھے جو انسانی طاقت سے باہر ہیں۔ یہ واقعہ بھی کچھ کم عجیب و غریب نہیں کہ مسلمانوں نے اپنے گھوڑے دریائے دجلہ میں ڈال دیے اور اطمینان کے ساتھ گفتگو کرتے ہوئے چلتے رہے گویا وہ دریا میں نہیں خشکی پر چل رہے تھے۔ ایرانی یہ منظر دیکھ کر کہنے لگے "دیو آ گئے" دیو آ گئے اور دیوانے دیوانے پکار اٹھے۔ اس موقع پر سلمان فارسی حضرت سعد بن

ابی وقاص کے ہمراہ تھے۔ حضرت سعد نے فرمایا حسبنا اللہ ونعم الوکیل اللہ ہمارے لیے کافی ہے اور وہ بہترین کارساز ہے۔ خدا کی قسم اللہ اپنے دوستوں کی مدد کرے گا اپنے دشمنوں کو شکست دے گا اور اپنے دین کو غالب کرے گا۔ اگر فوج میں سرکشی اور ایسے گناہ نہ ہوتے جو نیکیوں پر غالب آجائیں۔

اس عقیدہ نے مسلمانوں کے دلوں میں بے پناہ قوت پیدا کر دی تھی۔ کیسے ہی ناخوشگوار اور ناموافق حالات پیش آتے ان کے عزم وارادے میں کوئی ضعف نہ آتا۔ ان کے سکون واطمینان میں کوئی فرق نہ پڑتا۔ تعداد اور ساز وسامان کو وہ ہیچ سمجھنے لگے۔ مادہ اور اسباب کی پرستش سے وہ بے نیاز ہو چکے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ وہ اللہ کی قوت سے لڑتے ہیں اور اسلام کی برکت سے فتح پاتے ہیں۔ ان کے دلوں میں اسی دینی جذبہ کا بڑا احترام تھا اور اسی کو اپنی عزیز ترین اور اصل قوت یقین کرتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ انہیں جو کچھ عزت نصیب ہوتی ہے اسی کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔

رضائے الٰہی کی طلبگاری

۲۱۹۔ آخرکار وہ اللہ کی نعمت اور فضل سے شادکام واپس آگئے ان کو کسی قسم کی کوئی تکلیف نہیں ہوئی وہ اللہ کی خوشنودی پر گامزن ہوگئے اور اللہ بڑے ہی فضل والا ہے۔ یعنی اللہ کا فضل دیکھو نہ کچھ لڑائی کرنی پڑی، نہ کانٹا چبھا، مفت میں ثواب کمایا، تجارت میں نفع حاصل کر کے اور دشمنوں پر دھاک بٹھا کر اللہ تعالیٰ کی خوشنودی لیے ہوئے صحیح وسلامت گھر واپس آگئے[1]۔

نعمت سے مراد عزت، سلامتی، عافیت، ثواب دشمن پر دھاک وغیرہ اور فضل سے، اور مال تجارت کا نفع ہے لم یمسسھم سوء کا مطلب یہ ہے کہ جب مقابلہ نہیں ہوا تو مسلمانوں کو کوئی گزند ہی نہیں پہنچا۔ رضائے الٰہی کی اتباع کا مطلب یہ ہے کہ باوجود حالات کے ناسازگار ہونے کے پھر نکل کھڑے ہوئے اور زخموں کی پرواکیے بغیر خدا کے حکم کی تعمیل کرنے کو چل کھڑے ہوئے۔ اور رضائے الٰہی پر ہی دراصل تمام مہربانیوں کا دارومدار ہے۔ گویا سب سے بڑی چیز ان کو اس سفر میں جو ملی وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوگیا۔ یہی فلاح دارین کی کنجی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب دواعی قلب اور حرکات جوارح سب رضائے الٰہی کے تابع ہوگئے تو یہ اس بات کی علامت

[1] افادات شیخ الاسلام

ہو گئی کہ اب ایمان ان کے ظاہر و باطن میں رچ گیا ہے قلب و زبان میں پوری یک رنگی اور پوری صداقت رونما ہو چکی ہے اور یہ بھی اس سے معلوم ہوا کہ نفس انسانی جب ترقی کے اس مقام یعنی رضوان اللہ پر جا پہنچتا ہے تو وہ اس قابل ہو جاتا ہے کہ اللہ سبحانہ اپنے خاص فضل سے اس کو نوازے۔ شاید صوفیائے کرام اسی کو فنا و بقا کے نام سے یاد کرتے ہیں اور یہی نسبت احسانی کا حاصل ہے۔

اللہ سے ڈرنا ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے

۲۲۰- اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ محض ایک شیطان ہے جو تمہیں اپنے ساتھیوں سے ڈراتا ہے۔ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو ان سے نہ ڈرو بلکہ اللہ سے ڈرو یعنی جو ادھر سے آ کر مرعوب کن خبریں پھیلاتا ہے وہ شیطان ہے۔ شیطان کے اغوا سے ایسا کر رہا ہے جس کی غرض یہ ہے کہ اپنے چیلے چانٹوں اور بھائی بندوں کا رعب تم پر ڈال کر خوفزدہ کر دے۔ سو تم اگر ایمان رکھتے ہو اور ضرور رکھتے ہو، جس کا ثبوت عملاً دے چکے ہو تو ان شیطانوں سے اصلاً نہ ڈرو صرف مجھ سے ڈرتے رہو۔[1]

ہر کہ ترسید از حق و تقویٰ گزید ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

مطلب یہ ہے کہ ڈرانے والے سب شیطان کی طرف سے تھے اور اس طرح وہ تم پر اپنا اور اپنے ساتھیوں کا رعب جمانا چاہتا تھا تو تم شیطان اور اس کے ساتھیوں سے نہ ڈرو بلکہ صرف اللہ سے ڈرو اگر تم سچے مومن ہو۔ ظاہر ہے کہ یہاں شیطان اور اس کے اولیاء سے اشارہ قریش اور ان کے ساتھیوں کی طرف ہے اور ان سے جس ڈر کی ممانعت کی گئی ہے یہ وہ ڈر ہے جس کا ہوا منافقین دکھا رہے تھے کہ ان کے ڈر سے خدا کے دین کے احکام کو پس پشت ڈال دیا جائے۔[2]

اسلام میں خوف خدا کی تعلیم

یہ واقعہ ہے کہ قرآن نے اپنی تعلیم میں خدا کی محبت کے ساتھ اس کے خوف کو بھی جگہ دی ہے۔ انسانوں میں تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں خوف اور محبت۔ یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی۔ ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ ادعائے محبت کا نتیجہ ناز، تبختر، اور کبھی بے ادبی اور کبھی اپنے مہربان و محبوب پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

غایت اعتماد کی بنا پر نافرمانی بھی ہے اور ظاہر ہے کہ جذبۂ محبت کے ان لوازم اور اثرات کا انسداد صرف خوف کے جذبے سے ہو سکتا ہے اس لیے خالق و مخلوق کے درمیانی رابطہ کی تکمیل نہ تنہا خوف سے ہو سکتی ہے اور نہ تنہا محبت سے بلکہ ان دونوں کے اشتراک، امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل ہو سکتا ہے۔ قرآن نے اسی نقطۂ اعتدال کو پیش کیا ہے وہ نہ تو اللہ کو محض جبار سمجھتا ہے اور نہ صرف رحم وکرم اور محبت و شفقت کی صفات سے اس کو متصف کرتا ہے بلکہ وہ خدا کی نسبت یقین رکھتا ہے کہ وہ اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے اور رحمان و کریم بھی، وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور و رحیم بھی۔ وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی کرتا ہے خفا بھی ہوتا ہے اور نوازتا بھی ہے۔ اس سے ڈرنا بھی چاہیے اور اس سے محبت بھی کرنی چاہیے۔ الغرض قرآن کا نصب العین یہ ہے کہ وہ خوف و محبت کے کناروں سے ہٹا کر جہاں سے ہر وقت نیچے گرنے کا خطرہ ہے خوف و محبت کے بیچ کی شاہراہ میں انسانوں کو کھڑا کرتا ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ الایمان بین الرجاء والخوف ایمان خوف و امید کے درمیان ہے کہ تنہا خوف لوگوں کو خدا کے رحم سے ناامید اور محض رحم وکرم پر بھروسہ ان کو خود سر اور گستاخ بنا دیتا ہے۔ ایمان کے بعد انسان کی زندگی کو سنوارنے اور فلاح تک پہنچنے میں سب سے بڑا دخل اللہ تعالیٰ کے خوف و خشیت اور اللہ کی محبت کو ہے۔

وَلَا يَحْزُنْكَ الَّذِيْنَ يُسَارِعُوْنَ فِي الْكُفْرِ ۚ اِنَّهُمْ لَنْ يَّضُرُّوا
اللّٰهَ شَيْـًٔا ۗ يُرِيْدُ اللّٰهُ اَلَّا يَجْعَلَ لَهُمْ حَظًّا فِي الْاٰخِرَةِ ۚ وَلَهُمْ
عَذَابٌ عَظِيْمٌ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اشْتَرَوُا الْكُفْرَ بِالْاِيْمَانِ
لَنْ يَّضُرُّوا اللّٰهَ شَيْـًٔا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ۝ وَلَا يَحْسَبَنَّ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اَنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ خَيْرٌ لِّاَنْفُسِهِمْ ۗ اِنَّمَا نُمْلِيْ لَهُمْ
لِيَزْدَادُوْٓا اِثْمًا ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝ مَا كَانَ اللّٰهُ لِيَذَرَ
الْمُؤْمِنِيْنَ عَلٰي مَآ اَنْتُمْ عَلَيْهِ حَتّٰي يَمِيْزَ الْخَبِيْثَ مِنَ الطَّيِّبِ ۭ
وَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيُطْلِعَكُمْ عَلَي الْغَيْبِ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَجْتَبِيْ مِنْ
رُّسُلِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ ۠ فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهٖ ۚ وَاِنْ تُؤْمِنُوْا وَتَتَّقُوْا
فَلَكُمْ اَجْرٌ عَظِيْمٌ ۝

اور اے پیغمبر جو لوگ آج راہ کفر میں دوڑ دھوپ مچا رہے ہیں ان کی سرگرمیاں تمہیں آزردہ[۳۲۱] خاطر نہ کریں۔ بلاشبہ یہ لوگ

اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔[۳۲۲] اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔[۳۲۳] بلاشبہ جنہوں نے مایہ ایمان دے کر کفر کا سودا کیا ہے وہ اللہ کو کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ ان کے لیے پاداشِ عمل میں دردناک عذاب تیار ہے[۳۲۴]۔ اور یہ جو ہم ان لوگوں کو جنہوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے ڈھیل دے رہے ہیں تو اس سے وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ڈھیل ان کے حق میں بہتر ہے ہم ان کو اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ اپنے گناہ میں اور ترقی کر جائیں اور بالآخر ان کے لیے رُسواکن عذاب ہے[۳۲۵]۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ اہلِ ایمان کو اسی حالت میں چھوڑ دے جس حالت میں تم آج کل اپنے آپ کو پاتے ہو، وہ ضرور پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا[۳۲۶]۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں ہے،

کہ وہ اس بارے میں تم کو غیب کی خبریں دے دے۔ غیب کی باتیں بتانے کے لیے تو وہ اپنے رسولوں میں سے جسے چاہتا ہے، منتخب کر لیتا ہے[۳۲۷]۔ لہٰذا اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لے آؤ، اگر تم ایمان لے آؤ گے اور برائیوں سے بچو گے تو تم کو بہت بڑا اجر ملے گا[۳۲۸]۔

بقائے حق اور فنائے باطل کے لیے قانون

جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے پیمانے مقرر ہیں اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کے نشو و نما پانے کے بعد ظہور میں آتے۔

مدینہ کی زندگی میں یہودیوں کو جو چیز اسلام سے روک رہی تھی اور منافقین زیادہ تر ان ہی میں سے تھے ان میں سب سے اہم ان کی سیاسی اور معاشی ضرورتیں تھیں۔ یہ لوگ سیاسی طور پر مسلمان ہو گئے تھے لیکن اس میں مخلص نہ تھے۔ یہ لوگ اس طمع خام میں مبتلا ہو گئے کہ قریش کی حمایت کر کے اسلام کے سیاسی مکان کو ڈھایا جا سکتا ہے چنانچہ ان کی تمام سرگرمیاں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت اور کفر و اہل کفر کی حمایت کے لیے وقف ہو گئیں۔ اس صورتِ حال سے نبوت کو طبعاً پریشانی ہوتی، قرآن نے نبوت کو یہ کہہ کر یہاں تسلی دی ہے کہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے ان کی یہ سرگرمیاں اللہ کے دین کو نقصان نہ پہنچا سکیں گی۔ جو لوگ کفر کو ایمان پر ترجیح دے رہے ہیں اللہ نے ان کی معاندانہ سرگرمیوں کے باوجود ان کو جو ڈھیل دے رکھی ہے یہ اللہ کا قانونِ امہال ہے۔ حق و باطل کی کشمکش میں دونوں

کے نتائج کے ظہور کے لیے ایک وقت مقرر ہے۔ دونوں کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہوں گے۔ اپنے وقتِ مقررہ پر ظاہر ہوں گے۔ اس قانونِ اہمال کو برا اپنی کامیابی سمجھ رہے ہیں حالانکہ یہ ان کی کامیابی نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ یہ چاہتا ہے کہ ان پر حجت تمام ہو جائے اور ان کے گناہوں کا پیمانہ چھلک جائے تاکہ جب ان کی کشتی حیات ڈوبے تو پھر اسے اُبھرنے کا موقعہ نہ ملے۔

حکمتِ الٰہی نے دُنیا کا کارخانہ کچھ اس طرح چلایا ہے کہ یہاں نیکی و بدی، حق اور باطل، عدل و ظلم، دونوں کو مہلت ملتی ہے اور خدا کا قانون یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ مہلت اور ڈھیل دے۔ اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔ یہ بات دیکھنی چاہیے کہ آخر کی کامیابی کس کے حصہ میں آتی ہے عمل حق کے لیے بالآخر بقا اور عمل باطل کے لیے بالآخر نیست و نابود ہو جانا ہے۔

منافقوں کو قانونِ اہمال کے مطابق بہت مہلت دی جا چکی ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ اللہ سچے مومنوں میں اور ان میں امتیاز کر دے۔ باقی رہی یہ بات کہ اللہ اپنے کلام میں منافقوں کو نام بنام کیوں ذکر نہیں کرتا تو یہ اس کی سنت کے خلاف ہے۔ اس کی سنت اس بارے میں یہی ہے کہ جو شخص اپنے فساد سے باز نہ آئے گا خود اس کا فساد ہی اس کی بروقت تشہیر کر دے گا۔

۲۲۱ ۔ اور اے پیغمبر جو لوگ راہِ کفر میں دوڑ دھوپ مچا رہے ہیں۔ ان کی سرگرمیاں تمہیں آزردہ خاطر نہ کریں۔ یعنی ان لوگوں کے لیے آپ غم اور فکر نہ کریں۔ اور ان کی حرکتوں سے آزردہ خاطر نہ ہوں۔ جو کفر کی حمایت اور اعانت میں دوڑ دھوپ مچا رہے ہیں اور آپ سے لڑنے کے لیے ریشہ دوانیاں کر رہے ہیں اور اسلام کو مٹانے کے درپے ہیں۔ آپ ان کی پروا نہ کیجئے اور نہ ان کی کارروائیوں سے غمگین ہوجیئے۔ بلاشبہ اس وقت ان کی تمام سرگرمیاں اسلام اور مسلمانوں کی مخالفت کفر اور اہل کفر کی حمایت کے لیے وقف ہو گئی ہیں۔ اصل ارشاد میں ان کا چہرہ یسارعون فی الکفر کے ذریعے پیش کیا گیا ہے اس سے لطیف اشارہ ہے کہ ان کی انفرادی اور اجتماعی کوششیں اس وقت اسلام کی بیخ کنی میں مصروف ہیں۔ دین کے بارے میں ان کی زبانیں جھوٹ اور بے لگام ہیں۔ وہ راہِ نفاق میں ایک دوسرے کے رفیق و معاون ہیں۔ راہِ حق میں کام کرنے والوں کے خلاف آوازے کستے ہیں اور اسلام کے سیاسی نظام کے خلاف ہر سازش میں پیش پیش ہیں۔ اسلام کے اجتماعی مسائل میں طرح طرح کی فتنہ اندازیاں کرتے ہیں۔ اس تمام صورتِ حال کے لیے یُسارعون فی الکفر کی تعبیر کیسی بلیغ ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود قرآن کہہ رہا ہے کہ آپ ان کی یہ حالت دیکھ کر اسلام کے بارے میں آزردہ خاطر نہ ہوں۔

آزردہ کیوں نہ ہوں

۳۲۲۔ بلاشبہ یہ لوگ اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے کیونکہ یہ لوگ اپنی سازشوں اور ریشہ دوانیوں سے اللہ کے دین کا کچھ نقصان نہ کر سکیں گے۔ نظامِ حق بہرحال غالب ہو کر رہے گا۔ مقصود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے کہ آپ کو بڑی فکر اس کی ہے کہ منافقین کی چالوں سے کہیں اسلام کے نظام کو نقصان نہ پہنچے سو اطمینان رکھئے ان کی چالیں ذرا بھی کامیاب نہ ہوں گی۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ آپ غمگین کیوں ہوتے ہیں ان کا مقابلہ آپ سے نہیں بلکہ اللہ سے ہے اور اللہ کے مقابلہ میں ان کی زور آزمائی اللہ کا کچھ نہ بگاڑ سکے گی۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں یعنی منافق لوگ جہاں مسلمانوں کی گردنیں نیچی دیکھتے ہیں کفر کی باتیں کرنے لگتے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ منافقوں کے اس کھل جانے سے جس کو یہاں قرآن نے یسارعون فی الکفر سے تعبیر کیا ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قلق ہوا اور آپ کا قلق اور ملال صرف اس لیے تھا کہ ان کے طرزِ عمل سے اللہ کے دین کو نقصان پہنچے گا اور اہلِ ایمان پر بُرا اثر پڑے گا۔ قرآن نے اس سے آپ کو مطمئن کر دیا کہ اللہ کے دین کو یہ لوگ کوئی نقصان نہ پہنچا سکیں گے اور جب دین کی طرف سے اللہ سبحانہٗ ضمانت لے رہے ہیں تو آپ کو رنجیدہ ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور خدا کو نقصان نہ پہنچانے کا مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے۔

جنت سے محرومی

۳۲۳۔ اللہ کا ارادہ یہ ہے کہ ان کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہ رکھے اور بالآخر ان کو سخت سزا ملنے والی ہے۔ یعنی شیطان کی دھمکیوں سے مومن نہیں ڈرتے۔ ہاں منافق اس کی باتیں سن کر کفر کی طرف دوڑتے ہیں۔ آپ ان منافقوں کی حرکات سے کچھ غمگین اور فکرمند نہ ہوں۔ یہ اللہ کے دین اور اس کے پیغمبر کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے اپنا ہی نقصان کرتے ہیں۔ ان کا حد سے زیادہ نفاق پتہ دے رہا ہے کہ حق تعالیٰ انہیں انجام کار حقیقی کامیابی اور فوائد سے محروم رکھے گا اور بہت سخت سزا دے گا۔ جو لوگ ایسے معاند اور شریر ہوں اللہ کی عادت ان کے ساتھ یہی ہے۔ ایسوں کے غم میں اپنے کو زیادہ گھلانے کی ضرورت نہیں ہے [1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

واقعہ یہ ہے کہ انہم لن یضروا اللہ میں غم نہ کرنے کی علت بتائی گئی تھی اور یرید اللہ میں اللہ کو نقصان نہ پہنچانے کی وضاحت پیش کی گئی ہے۔ آخرت میں حصہ نہ ہونے سے مراد جنت اور اس کی نعمتوں سے محروم ہونا ہے۔ ان لوگوں کی بے فکری کی یہ زندگی آخرت میں ان کی محرومیوں کا باعث ہوگی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

جو شخص ڈرتا ہے وہ شروع رات میں چل دیتا ہے اور جو شروع رات میں چل دیتا ہے وہ عافیت کے ساتھ منزل پر پہنچ جاتا ہے۔ یاد رکھو اللہ کا سودا سستا نہیں بہت مہنگا اور بہت قیمتی ہے۔ یاد رکھو اللہ کا وہ سودا جنت ہے۔

(ترمذی عن ابی ہریرہ)

عرب کا عام دستور تھا کہ مسافروں کے قافلے رات کے آخری حصہ میں چلتے تھے اور رہزنوں کے حملے بھی عموماً سحری کے وقت میں ہوتے تھے۔ اس کا قدرتی نتیجہ یہ تھا کہ جس مسافر یا جس قافلے کو رہزنوں کے حملے کا خوف ہوتا وہ بجائے آخری رات کے شروع رات میں چل دیتا اور اس تدبیر سے وہ بحفاظت وعافیت منزل پہ پہنچ جاتا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس مثال سے سمجھایا ہے کہ جس طرح رہزنوں کے حملے سے ڈرنے والے مسافر اپنے آرام اور اپنی نیند کو قربان کر کے چل دیتے ہیں۔ اسی طرح انجام کا فکر رکھنے والے اور دوزخ سے ڈرنے والے مسافر آخرت کو چاہیے کہ جنت تک پہنچنے کے لیے اپنی راحتوں، لذتوں اور خواہشوں کو قربان کرے اور منزل مقصود کی طرف تیز گامی سے چلے۔ اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ بندہ اللہ سے جو کچھ لینا چاہتا ہے وہ کوئی سستی اور کم قیمت چیز نہیں ہے کہ یوں ہی مفت مل جائے گی بلکہ وہ نہایت گراں قدر اور بیش قیمت چیز ہے جو جان و مال اور خواہشات نفس کی قربانی سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔ اور منافق ایمان کے سارے دعووں کے باوجود ایمان کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتا اس لیے آیت گرامی میں اس کی اسی ارادی حالت کو تکوینی طور پر پیش کیا ہے کہ اللہ نہیں چاہتا ہے کہ ان کو آخرت میں جنت ملے۔ یہاں ارادہ اور چاہنا اس معنے میں نہیں کہ اللہ کو یہ بات پسند ہے یا اس کی مرضی کے موافق ہے بلکہ یہ تکوینی بات ہے یعنی مریض کی بد پرہیزی کا یہ تکوینی اثر ہے کہ حکیم اس سے دست کش ہو جاتے اور جس کا نتیجہ یہ ہو کہ بیمار ابدی طور پر روحانی زندگی سے محروم ہو جاتے اور کفر کی موت مر جاتے۔ یہ بات بارہا لکھی جا چکی ہے کہ ہر بری بات کا ایک اثر ہوتا ہے بعینہ جیسے ہر بد پرہیزی کا ایک اثر ہوتا ہے۔ بد پرہیزی کا انتہائی اثر

موت ہے اور روحانی بد پرہیزی کا اثر آخرت میں اجر و ثواب سے محرومی ہے۔ یہ اصل حقیقت ہے گناہ اور اس کے انجام کی اور اسی کے لیے قرآن نے یہ بلیغ اور مؤثر تعبیر اختیار کی ہے۔ یرید اللہ ان لا یجعل لھم حظا فی الاخرۃ اسی کو اللہ سبحانہٗ اضلال کہتے ہیں۔ اس کو خوب سمجھ لینا چاہیے۔ جب نافرمانی کے خوگر ہوگے اور بد پرہیزی سے باز نہ آؤ گے تو نتیجہ یہی ہوگا اور روحانی لذتوں، راحتوں اور نعمتوں سے محروم ہو جاؤ گے۔

ایمان کے بدلے کفر کا سودا

۳۲۴۔ بلاشبہ جنہوں نے مایہ ایمان دے کر کفر کا سودا کیا وہ اللہ کو ہرگز نقصان نہ پہنچا سکیں گے۔ ان کے لیے پاداش عمل میں دردناک عذاب تیار ہے۔ یعنی جنہوں نے ایمانی فطرت کو بدل کر کفر اختیار کیا خواہ یہود ہوں یا نصاریٰ، مشرکین ہوں یا منافقین یا کوئی اور وہ سب مل کر بھی اللہ کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے۔ ہاں اپنے پاؤں پر خود اپنے ہاتھ سے کلہاڑی مار رہے ہیں جس کا نتیجہ ان کو دردناک صورت میں بھگتنا پڑے گا۔[1]

اگرچہ آیت قرآنی کے الفاظ عام ہیں لیکن جس سیاق میں یہاں یہ آیت آئی ہے اس کا تقاضا یہی ہے کہ اس کا مصداق منافقین ہوں اور معلوم ہے کہ منافقین کا زیادہ تر تعلق یہود سے ہے اس سے پہلے مختلف اندازوں میں یہ مضمون قرآن میں تین بار آچکا ہے اولاً مدعیان ایمان کے بارے میں آیا ہے جنہوں نے ایمان کے دعوے کے باوجود ایمان کا کوئی تقاضا اپنی زندگی میں پورا نہیں کیا

اولئک الذین اشتروا الضلالۃ بالھدیٰ

یہی لوگ ہیں جنہوں نے گمراہی کو ہدایت کے بدلے میں خرید لیا

یہ بھی دراصل یہودی تھے۔ پھر خاص ان یہود کے ذکر میں اسی آیت کا تذکرہ آیا جہاں قرآن نے ان پر یہ سنگین الزام لگایا کہ افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض اور پھر فرمایا کہ:

اولئک الذین اشتروا الحیاۃ الدنیا بالاخرۃ

یہی لوگ ہیں جنہوں نے آخرت کے بدلے دُنیا مول لی ہے

پھر یہودیوں پر کتمان حق کا الزام عائد کیا اور اس کا نتیجہ یہ قرار دیا کہ:

---

[1] انفلات شیخ الاسلام

اولئک الذین اشتروا الضلالۃ بالھدیٰ

اب یہاں بھی مدینہ کی زندگی میں بھی یہودی اسلام کا لباس پہن کر مسلمانوں میں موجود ہیں۔ اور ایمان کے بلند بانگ دعووں کے باوجود ایمان کی راہ میں قربانی سے گریزاں ہیں۔ ان کا آخرت پر ایمان کمزور ہے اس کے نتیجہ میں وہ اصُول وصداقت کے مقابلے میں منافع اور مصالح کو ترجیح دیتے ہیں اور ان میں آجل کے مقابلہ میں عاجل سے پیار کی بیماری پیدا ہو گئی ہے اور اس طرح وہ بے اصُول، ناقابلِ اعتبار، ابن الوقت، مصلحت کیش اور منفعت کوش بن کر رہ گئے۔ قرآن نے اسی صورتِ حال کے لیے اشترا الکفر بالایمان کا استعارہ استعمال کیا ہے اور بتایا ہے کہ جو بھی اس صلاحیت اور استعداد کو چھوڑ کر جس سے ایک شخص ایمان قبول کرتا ہے اس استعداد اور صلاحیت سے کام لے گا جو کُفر قبول کرنے میں ممد ومعاون ہوتی ہے تو ایسے لوگ سُن لیں کہ وہ اللہ کے دین کا کوئی نقصان نہیں کر سکیں گے اور ان کا انجام اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کو دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۔

قانونِ املاء وتمہیل

۳۲۵ ۔ اور یہ جو ہم ان لوگوں کو جنہوں نے راہ کُفر اختیار کر رکھی ہے ڈھیل دے رہے ہیں تو اس سے وہ یہ نہ سمجھیں کہ یہ ڈھیل ان کے حق میں بہتر ہے ہم ان کو اس لیے ڈھیل دے رہے ہیں کہ وہ اپنے گناہوں میں اور ترقی کر جائیں اور بالآخر ان کے لیے رسُوا کن عذاب ہے۔ یعنی ممکن ہے کہ کافروں کو اپنی لمبی عمریں خوشحالی اور دولت وثروت وغیرہ کی فراوانی دیکھ کر خیال ہو کہ ایسے مغضوب ومطرود ہوتے تو ہم کو اتنی فراخی اور مہلت کیوں دی جاتی اور ایسی اچھی حالت میں کیوں رکھے جاتے سو واضح رہے کہ یہ مہلت دینا ان کے حق میں کچھ بھلی بات نہیں۔ مہلت دینے کا نتیجہ تو یہی ہوگا کہ جن کو گناہ سمیٹ کر کفر پر مرنا ہے وہ اپنے اختیار اور آزادی سے خوب جی بھر کر ارمان نکال لیں اور گناہوں کا ذخیرہ فراہم کر لیں وہ سمجھتے رہیں کہ ہم بڑی عزت سے ہیں حالانکہ ذلیل وخوار کرنے والا عذاب ان کے لیے تیار ہے۔ اب سوچ لیں کہ مہلت دینا ان جیسوں کے حق میں بھلا ہوا یا بُرا نعوذ باللہ [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں قانونِ امہال کی طرف اشارہ ہے اور منافقین و یہود کی نسبت خبر دی ہے کہ جزائے عمل کا قانون ان کی طرف سے غافل نہیں ہے وہ بتدریج اس نتیجہ تک پہنچ کر رہیں گے جو کفر و نفاق کا لازمی نتیجہ ہے چنانچہ دُنیا نے دیکھ لیا کہ چند برسوں کے اندر یہودِ مدینہ کی ساری طاقت نابود ہو گئی۔

قرآن اس قانون کو ڈھیل دینے، عفو و درگزر کرنے اور ایک خاص مدت تک زندگی دینے سے تعبیر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ ہر غلطی کو درست کرنے کے لیے، ہر نقصان کی تلافی کرنے کے لیے ہر لغزش کو سنبھل جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مہلت مل جائے اور اس کا دروازہ کسی پر بند نہ ہو۔

دولت وعزت مقبولیت کی علامت نہیں

گویا اس آیت میں کافروں کے ظاہری عیش و عشرت اور عزت و غلبہ کی وجہ بیان فرمائی اور یہ بتایا کہ دنیا میں مجرم کو فوری عذاب نہ آنا اور اس کی گرفت میں جلدی نہ ہونا کچھ اس کے حق میں اچھا نہیں ہے۔ ان کا یہ خیال کرنا کہ دنیوی عیش و عشرت اور کثرتِ مال وجاہ اور عارضی فتح و کامرانی ان کی مقبولیت کی دلیل ہے بالکل غلط اور خلافِ واقع ہے۔ یہ مقبولیت نہیں بلکہ اللہ کا قانون املاء، امہال، تاجیل اور تمتیع ہے۔ اور امہال و تاجیل کی یہ فرصتیں نہ ہوتیں تو دُنیا میں ایک وجود بھی فرصتِ حیات سے فائدہ نہ اُٹھا سکتا۔ ہر غلطی، ہر کمزوری، ہر نقصان اور ہر فساد اچانک بیک دفعہ بربادی و ہلاکت کا باعث ہو جاتا۔ لوگ اس مہلتِ اصلاح سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اسے ازدیادِ اثم کا ذریعہ بنا لیتے ہیں۔ اور جتنا اسے موقعہ ملتا ہے وہ گناہ پر گناہ کرتا جاتا ہے۔ امہال اصل میں تو سبب تھا اصلاح کا لیکن لوگوں نے اسے سبب بنا لیا ازدیادِ اثم کا اور اس کو زندگی میں اپنا لیا۔ لوگوں کے اس اختیار کو بتانے کے لیے لیزدادوا اثما کی بلیغ تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ قرآن کی بلاغت ہے

مصائب و حوادث مغضوبیت کی دلیل نہیں ہیں

۳۲۶۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ اہل ایمان کو اسی حالت میں چھوڑ دے جس حالت میں تم آج کل اپنے آپ کو پاتے ہو وہ ضرور پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کر کے رہے گا۔ یعنی جس طرح خوشحالی اور مہلت دینا کفار کے حق میں مقبولیت کی دلیل نہیں ہے۔ اسی طرح اگر مخلص اہل ایمان کو مصائب اور ناخوشگوار حوادث پیش آئیں جیسے جنگ اُحد میں آئے یہ اس کی

دلیل نہیں کہ وہ اللہ کے نزدیک مغضوب ہیں۔ بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو اس گڈمڈ حالت پر چھوڑنا نہیں چاہتا جس پر اب تک رہے ہیں یعنی بہت سے کافر ازراہِ نفاق کلمہ پڑھ کر دھوکہ دینے کے لیے ان میں ملے جلے رہتے ہیں جن کے ظاہر حال پر منافق کا لفظ کہنا مشکل تھا لہٰذا ضروری ہے کہ اللہ سبحانہٗ ایسے واقعات و حالات رونما کرے جو کھرے کو کھوٹے سے اور پاک کو ناپاک سے کھلے طور پر جُدا کر دیں۔[1]

اس آیت میں اللہ نے اپنا یہ قانون بتایا ہے کہ جنہوں نے اسلام کا گھونٹ تو پی لیا ہے لیکن حلق سے نیچے نہیں اترا ہے۔ کسی تعلیم کو اختیار کر لینے کے بعد یقین و عمل کی جو رُوح پیدا ہونی چاہیے اس سے یک قلم محروم ہیں، اخلاص و صداقت کے لیے ان میں کوئی جگہ نہیں ہے۔ اسلام کے جو احکام ان کی شخصی اغراض کے موافق ہیں ان پر خوش خوش عمل کرتے جو خلاف ہوتے ان سے نکل بھاگنا چاہتے۔ جب کبھی خوشحالیوں کا موقعہ ہوتا ہے تو وہ دعویٰ اسلام میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں لیکن قربانیوں کے موقعہ پر آخری صفوں میں بھی نظر نہ آتے۔ جہاد کے تصور سے ان کی روحیں لرز جاتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ ہیں کہ ایمان قبول کر لینے کے بعد ان کی ایمانی محبت کا یہ حال ہے کہ انہوں نے راہِ حق کی صرف مصیبتیں جھیلی نہیں ہیں بلکہ دل کی پوری خوشحالی اور رُوح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگیاں اُن میں بسر کر ڈالیں۔ ان میں سے جو لوگ اوّل دعوت میں ایمان لائے تھے ان پر شب و روز کی جان کاہیوں اور قربانیوں کا عرصہ گزر گیا۔ لیکن اس تمام مدت میں کہیں سے یہ بات دکھائی نہ دی کہ مصیبتوں کی کڑواہٹ ان کے چہروں پر کبھی کھلی ہو۔ جان کی قربانیوں کے وقت انہوں نے اس طرح خوش خوش گردنیں کٹوا دیں۔ گویا زندگی کی سب سے بڑی خوشی زندگی میں نہیں بلکہ موت میں تھی۔

اب تک یہ دونوں ملے جلے تھے۔ خام پختہ، خبیث و طیّب اور مخلص و منافق ہر قسم کے افراد پر مشتمل اسلامی جماعت تھی۔ یہ بات اللہ کی حکمت کے خلاف تھی کہ جو جماعت تمام دُنیا کی قیادت کے لیے مبعوث ہوئی ہے وہ اس طرح اچھے بُرے، فاسد و صالح کا مکسچر بنی رہے۔ چنانچہ دونوں میں امتیاز پیدا کرنا چاہا۔ اس کی صورت اللہ سبحانہٗ نے اپنی سنت کے مطابق یہ اختیار کی کہ جہاد فی سبیل اللہ کو ایمان باللہ کے لیے حقیقی کسوٹی بنا کر سب کے سامنے

[1] افادات شیخ الاسلام

رکھ دیا۔ کیونکہ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ انسان معبودانِ باطل کے مقابلے خدا کا بول بالا کرنے کے لیے بے تاب ہو اور اس کی راہ میں جان لڑانے پر آمادہ ہو۔ دُنیا کی اور نیکیوں میں ذاتی منفعت کی توقع اور خواہشاتِ نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے لیکن خدا کی راہ میں جاں نثاری صرف محبت کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ ماں باپ کی خبر گیری میں رضائے الٰہی سے زیادہ والدین کی محبت کا جذبہ کارفرما ہو سکتا ہے۔ غریب رشتہ داروں اور فقراء و مساکین کی امداد بنی نوع انسان کی عام ہمدردی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے لیکن خدا کے دین کے لیے سر دے دینا صرف رضائے الٰہی کے لیے ہو سکتا ہے جس میں اور جذبہ کی آمیزش ممکن نہیں ہے۔

ایمان باللہ کے اسی حقیقی امتحان کا موقعہ جنگِ اُحد نے فراہم کیا یہی وہ کسوٹی بن گئی جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو گئی۔ قرآن کہتا ہے کہ اُحد میں مصائب کے ہجوم نے خبیث و طیب کو الگ الگ کر دیا ہے اور اللہ کا قانون یہی ہے کہ اچھوں کو بُروں سے ممتاز کرنے کے لیے وہ دونوں کو مصائب میں ڈالتا ہے تاکہ خام اور پختہ مخلص اور منافق دونوں الگ الگ ہو جائیں۔

غیب کی خبریں بتانا اللہ کی سنت نہیں

۳۲۷ ۔ مگر اللہ کا یہ طریقہ نہیں کہ وہ اس بارے میں تم کو غیب کی خبریں دے دے۔ غیب کی باتیں بتانے کے لیے تو وہ اپنے رسُولوں میں سے جسے چاہتا ہے منتخب کر لیتا ہے۔ یعنی بے شک خدا کو آسان تھا کہ تمام مسلمانوں کو بدوں امتحان میں ڈالے منافقوں کے ناموں اور کاموں سے مطلع کر دیتا۔ لیکن اس کی حکمت و مصلحت اس کی مقتضی نہیں ہے کہ لوگوں کو اس قسم کے غیوب سے آگاہ کر دیا کرے۔ ہاں اس کام کے لیے اپنے رسُولوں کا انتخاب کر کے جس قدر غیوب یقینی کی اطلاع دینا چاہے دے دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ عام لوگوں کو بلاواسطہ کسی غیب کی یقینی اطلاع نہیں دی جاتی، انبیاء علیہم السلام کو دی جاتی ہے مگر جس قدر اللہ چاہے[1]

یعنی اس کی ایک صورت یہ بھی تھی کہ مسلمانوں کو منافقوں کے نام بتا دیے جاتے اور ان کو غیبی معاملات کی اطلاع دے دیتا اس طرح ان کو معلوم ہو جاتا کہ کون مخلص ہے اور کون منافق لیکن یہ بات اللہ کی سنت کے خلاف ہے کہ وہ اپنے غیوب پر ہر شخص کو مطلع کرے۔ غیب کی

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

باتوں کی خبر وہ صرف اپنے رسولوں کو دیتا ہے اور وہ بھی جسے چاہتا ہے اور جس قدر چاہتا ہے۔ اسلام کے عقیدے میں غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ قرآن میں یہ بات کھول کر بیان کی گئی ہے۔

غیب کی حقیقت

قرآن حکیم میں اس لفظ کے استعمال کے تمام مواقع پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اطلاق ان امور پر ہوتا ہے جن کا علم انسان کو دلائل، ذرائع و وسائل اور قرآن کے ذریعے حاصل نہ ہو۔ فراست، کشف، الہام اور وحی کے ذریعے اہل ایمان، ارباب ولایت اور انبیاء کو یہ علم حاصل ہوتا ہے لیکن ان ذرائع میں وحی کا ذریعہ سب سے زیادہ طاقتور اور یقینی ہوتا ہے اس راہ سے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ قطعی ہے اور اس کے سوا جن راہوں سے علم آتا ہے وہ ظنی ہے۔ اسی بنا پر شریعت میں وحی حجت و دلیل ہے لیکن الہام و کشف حجت و دلیل نہیں ہے۔ اگر یوں کہا جائے کہ غیبی علم وہ ہے جو خود بخود ہو اور اس میں واسطہ اور ذریعہ نہ ہو۔ ایسا علم صرف اس کا ہو سکتا ہے جس کی ذات خود بخود ہو۔ اللہ تعالیٰ کی ذات خود بخود ہے اس لیے اس کا علم بھی خود بخود ہے یعنی اپنے علم میں کسی ذریعہ اور واسطہ کا محتاج نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کو بلا واسطہ واقعہ کا علم ہوتا ہے اور اتنا قطعی ہوتا ہے کہ اس کا تخلف محال ہے۔ یہاں تک کہ موجودات اپنے وجود میں اس کے علم کے تابع ہیں وہ موجودات کا تابع نہیں ہے۔ علم الٰہی کا کمال یہ ہے کہ خود موجودات اپنے لباس وجود میں علم الٰہی کے تابع رہیں۔ زمخشری نے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ غیب سے مراد وہ مخفی اور پوشیدہ چیزیں ہیں جن تک بلا واسطہ اللہ کے سوا کسی کے علم کی رسائی نہیں ہے وہ فرماتے ہیں:

الخفی الذی لا ینفذ ابتداء الا علم اللطیف الخبیر

قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ انبیاء کو غیب کا علم بذریعہ وحی ہوتا ہے چنانچہ شارحین قرآن نے یہ بات صراحۃً لکھی ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں:

فیوحی الیہ فیخبرہ ببعض المغیبات ج ۱ ص ۵۶

اللہ سبحانہٗ انبیاء کو وحی کے ذریعے کچھ مغیبات کی خبر دیتا ہے۔

اس لیے کسی شخص کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں کہ وہ غیب داں ہے کیونکہ ایسا کہنا درحقیقت اس بات کا دعویٰ ہے کہ اس کا علم ذاتی اور خود بخود ہے اور نبی کے بارے میں ایسا کہنے کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ آپ وحی کے ذریعے کا انکار کر رہے ہیں جب آپ کہتے ہیں

نبی وہ انسان ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آئے۔

اور پھر آپ کہتے ہیں کہ نبی غیب دان ہے تو درحقیقت آپ ذریعہ وحی کا انکار کرتے ہیں۔ یہ سید شریف کے لفظوں میں یہ صریح تناقض ہے کیونکہ نبی کے لیے وحی کو علمی ذریعہ مان کر نبی کو غیب دان کہنا اس ذریعہ کی نفی ہے۔ میر صاحب کے الفاظ یہ ہیں یتبادر منہ تعلق علمہ بہ ابتداء فیکون تناقضا۔ آپ نے یہ بات بارہا سنی ہو گی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر غار حرا میں جب سب سے پہلی وحی آئی۔ اور آپ نے غار حرا کی ساری کہانی گھر آکر خدیجہ کو سنائی تو خدیجۃ الکبریٰ آپ کو ورقہ بن نوفل کے پاس لے گئیں۔ ورقہ بن نوفل زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے، عبرانی کتابت جانتے تھے اس لیے انجیل لکھا کرتے تھے۔ حضرت خدیجہ نے ورقہ سے کہا، ذرا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا حال سنیے۔ ورقہ نے حضور انور سے غار حرا کی ساری کہانی سنی اور سن کر اپنا یہ تاثر ظاہر کیا کہ ھذا ھو الناموس الذی نزل اللہ علی موسیٰ، یہ وہی ناموس فرشتہ ہے جو اللہ نے موسیٰ پر اتارا تھا۔ یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ ورقہ نے عیسائی ہونے کے باوجود حضرت موسیٰ کا کیوں ذکر کیا۔ ابوالقاسم السہیلی کے حوالہ سے شارحین بخاری نے جو وجہ بتائی ہے وہی گوش گزار کرنا چاہتا ہوں۔ ورقہ نے حضرت عیسیٰ کا ذکر اس لیے نہیں کیا کہ عیسائی حضرت عیسیٰ کی غیب دانی کے قائل ہیں۔ بذریعہ وحی ان کے علم کو نہیں مانتے۔ برخلاف یہودیوں کے کہ وہ حضرت موسیٰ کی غیب دانی کے مدعی نہیں بلکہ ان پر سلسلہ وحی کے قائل ہیں چونکہ حضور نے اپنے علم کے لیے وحی کو ذریعہ بتایا تھا اس لیے ورقہ نے حضرت موسیٰ کا ذکر کیا۔

بہرحال نبوت کے علم کے لیے وحی کو ذریعہ مان کر یہ کہنا کہ نبی غیب دان ہے نبی کے علم کے خود بخود ہونے کا دعویٰ ہے۔ اس سے ان لوگوں کی غلطی بھی سامنے آگئی جو لوگوں کی ذاتی اور عطائی کے الفاظ بول کر رہنمائی کرتے رہتے ہیں جس ذات اور ہستی کا خود اپنا وجود ہی ذاتی نہ ہو اس کے بارے میں یہ سوال کہاں سے اور کیسے پیدا ہو گیا کہ اس کا علم یا کوئی صفت ذاتی ہو سکتی ہے جب موصوف کا وجود عطائی ہے تو اس کی صفت بھی عطائی ہو گی۔ اور عطائی ہونے کی صورت یہی ہے کہ آپ پر اللہ کی وحی آتی ہے اور ظاہر ہے کہ وحی ان ہی امور غیبیہ کی ہوتی تھی جن کا تعلق فریضہ رسالت سے ہے اس پر انشاء اللہ تفصیلی بحث پارہ ۳۰ میں آئے گی۔

اہلِ نفاق کو ایمان و تقویٰ کی دعوت

۳۲۸۔ لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لاؤ۔ اگر تم ایمان لے آؤ گے اور برائیوں سے

ہوگئے تو تم کو بہت بڑا اجر ملے گا۔ یعنی خدا کا جو خاص معاملہ پیغمبروں سے ہے اور پاک و ناپاک کرنے کی نسبت جو عام عادت حق تعالیٰ کی رہی ہے اس میں زیادہ کاوش کی ضرورت نہیں ہے۔ تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ و رسول کی باتوں پر یقین رکھو اور تقویٰ و پرہیزگاری پر قائم رہو یہ کر لیا تو سب کچھ کما لیا۔[1]

اس آیت میں اہل ایمان سے خطاب ہے یا اہل نفاق سے۔ شیخ الاسلام کا رجحان پہلی بات کی طرف ہے جبکہ کچھ مفسرین نے اسے نفاق کی طرف التفات قرار دیا ہے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہاں ایمان سے اخلاص مراد ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی بھی صفت اخلاص سے تفسیر فرماتے ہیں۔ امام رازی نے بھی منافقین کو مخاطب قرار دیا ہے۔ اگر التفات منافقین کی جانب ہو تو مطلب یہ ہے کہ اللہ اور اس کے رسول پر اخلاص سے ایمان لاؤ اور بے چون و چرا ان کی باتوں کو مانو۔ اور اگر تم اخلاص سے ایمان لے آؤ گے اور حضور انور پر نکتہ چینی اور ان کی نافرمانی سے بچ کر رہو گے تو تم کو بجائے عذاب عظیم کے اجر عظیم ملے گا۔ گویا یوں کہا گیا ہے کہ اگر اب بھی تم ایمان لے آئے اور برائیوں سے بچے تو تمہارے لیے اجر عظیم ہے۔

اور جو صورت شیخ الاسلام نے اختیار کی ہے کہ آمنوا کے مخاطب خود اہل ایمان ہیں یہی ابوحیان اندلسی، قرطبی، زمخشری نے اختیار کی ہے۔ اس صورت میں معنی یہ ہیں۔ ابوحیان فرماتے ہیں کہ یہاں پر ایمان باللہ کا مطلب یہ ہے کہ صرف اللہ ہی کو قادر مانو اور صرف اسے عالم الغیب سمجھو اور رسولوں پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندے ہیں۔ قرطبی لکھتے ہیں کہ تمہارا کام تو باور کرانا ہے غیب پر مطلع ہونے کا اشتیاق تمہارا کام نہیں۔ یہ اور اسی قسم کی تشریحات شارحین نے پیش کی ہیں لیکن صاف بات وہی ہے جو ہم نے عرض کر دی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَلَا يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَبْخَلُونَ بِمَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِنْ فَضْلِهِ هُوَ
خَيْرًا لَّهُمْ بَلْ هُوَ شَرٌّ لَّهُمْ سَيُطَوَّقُونَ مَا بَخِلُوا بِهِ يَوْمَ
الْقِيَامَةِ وَلِلَّهِ مِيرَاثُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
خَبِيرٌ ۝ لَقَدْ سَمِعَ اللَّهُ قَوْلَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ فَقِيرٌ وَنَحْنُ
أَغْنِيَاءُ سَنَكْتُبُ مَا قَالُوا وَقَتْلَهُمُ الْأَنبِيَاءَ بِغَيْرِ حَقٍّ وَ
نَقُولُ ذُوقُوا عَذَابَ الْحَرِيقِ ۝ ذَٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيكُمْ
وَأَنَّ اللَّهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيدِ ۝

جن لوگوں کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا ہے اور وہ مال خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں یہ ہرگز نہ خیال کریں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے (نہیں) وہ تو ان کے لیے بہت بڑی برائی ہے، جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں عنقریب قیامت کے دن اس کو ان کے گلوں کا ہار بنا دیا جائے[۳۲۹] گا۔ زمین و آسمان

کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے
باخبر ہے[۳۳۰]۔ بلاشبہ فی الواقع اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی جو کہتے
ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں[۳۳۱]۔ ان کی یہ باتیں اور ان کا
انبیاء کو ناحق قتل کرنا ہم ضرور لکھ لیں گے اور فیصلہ کے وقت
ہم ان سے کہیں گے عذاب جہنم کا مزہ چکھو[۳۳۲] یہ تمہاری اپنے
ہاتھوں کی آگے روانہ کی ہوئی بلا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر ظلم
کرنے والا نہیں ہے[۳۳۳]۔

راہِ خدا میں مال کی قربانی

منافقوں پر جنہوں نے مصلحتِ وقت دیکھ کر دعوتِ اسلام کا ساتھ دیا تھا راہ حق میں مال و دولت کا خرچ کرنا بہت شاق گزرتا تھا وہ خود بھی بخل کرتے تھے اور دوسروں کو بھی بخل کی تلقین کرتے تھے۔ بخل بھی اساسی بداخلاقیوں میں سے ہے یعنی ایسی بداخلاقی جو بہت سی بداخلاقیوں کی جڑ ہے خیانت، بددیانتی، بے مروتی، بے رحمی، بدسلوکی اور روناًت اسی سے پیدا ہوتی ہیں۔ طمع، لالچ، تنگ نظری، کم ہمتی، پست طبعی اور بہت سی برائیاں اسی ایک جڑ کی مختلف شاخیں ہیں۔ قرآن نے جھوٹ کے بعد سب سے پہلے اسی جڑ پر ضرب کاری لگائی اور انفاق مال کو مسلمانوں کا ضروری فرض قرار دیا۔ اسی فرض کا نام اسلام کی اصطلاحی زبان میں زکوٰۃ ہے اور صرف زکوٰۃ ہی نہیں بلکہ زکوٰۃ ادا کرنے کے بعد بھی مالدار آدمی پر مزید انفاقِ مال کی ذمہ داری باقی رہتی ہے۔ رہا یہ

سوال کہ اس مزید ذمہ داری کے حدود کیا ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ یہ حدود اہل حاجت کی ضروریات اور اجتماعی کاموں کے مالی تقاضوں سے متعین ہوتے ہیں۔ مالدار لوگوں پر بحیثیت مجموعی اس حد تک مزید انفاق کی ذمہ داری ہے جس حد تک اہل حاجت کی حاجت روائی اور وقت کے ایمانی تقاضوں کی انجام دہی کے لیے درکار ہوگی۔ آپ البقرہ میں یہ اصول پڑھ چکے ہیں کہ ہر شخص اپنی ضروریات سے فاضل سرمایہ کو راہ خدا میں صرف کرنے کا مکلف ہے یسئلونک ماذا ینفقون قل العفو؛ البقرہ ۲۱۹۔ یعنی جو کچھ اپنی ضروریات سے زیادہ ہو اسے اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چاہیے منافقین پر اللہ کی راہ میں خرچ کی ذمہ داری بہت بڑی سرگرانی تھی۔

ان آیات میں منافقین کی جو نفسیاتی حالت پیش کی گئی ہے وہ کوئی مخصوص صورتِ حال نہیں ہے بلکہ جماعت کے کمزور اور مذبذب افراد میں ہمیشہ ایسی ہی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے۔

۱۷۹ - جن لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے نوازا ہے اور وہ مال خرچ کرنے میں بخل سے کام لیتے ہیں یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ یہ ان کے حق میں اچھا ہے نہیں وہ تو ان کے لیے بہت بڑی برائی ہے۔ جو کچھ وہ اپنی کنجوسی سے جمع کر رہے ہیں عنقریب روزِ قیامت اس کو ان کے گلوں کا ہار بنا دیا جائے گا۔

ابتدا سورت کا بڑا حصہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ سے متعلق تھا۔ درمیان میں خاص مناسبات وجوہ کی بنا پر غزوۂ احد کی تفصیلات آگئیں۔ انہیں بقدر کفایت تمام کرکے یہاں سے پھر اہلِ کتاب کی شنائع بیان کی جاتی ہیں۔ چونکہ ان میں سے یہود کا معاملہ بہت مضرت رساں اور تکلیف دہ تھا۔ منافقین بھی اکثر ان میں ہی سے تھے۔ اور اوپر کی آیت میں آگاہ کیا گیا تھا کہ خدا تعالیٰ اب خبیث کو طیب سے جدا کرکے رہے گا سو یہ جدائی جس طرح جانی و بدنی جہاد کے وقت ظاہر ہوتی تھی اسی طرح مالی جہاد کے وقت بھی کھرا کھوٹا اور کچا پکا صاف طور پر الگ ہو جاتا تھا۔ اس لیے بتلا دیا کہ یہود و منافقین جیسے جہاد کے موقعہ سے بھاگتے ہیں مال خرچ کرنے سے بھی جی چراتے ہیں۔ لیکن جس طرح جہاد سے بچ کر دنیا میں چند روز کی مہلت حاصل کر لینا ان کے حق میں بہتر نہیں ایسے ہی بخل کرکے بہت مال اکٹھا کر لینا بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ اگر دنیا میں فرض کرو کوئی مصیبت پیش نہ بھی آئی تو قیامت کے دن یقیناً یہ جمع کیا ہوا مال عذاب کی صورت میں ان کے گلے کا ہار بن جائے گا۔ اس میں مسلمانوں کو بھی آگاہ کر دیا کہ زکوٰۃ دینے اور ضروری مصارف میں خرچ کرنے سے کبھی جی نہ چرائیں ورنہ جو شخص بخل و حرص وغیرہ رذیل خصلتوں میں یہود و

منافقین کی روش اختیار کرے اسے اپنے درجہ کے موافق اسی طرح کی سزا کا منتظر رہنا چاہیے ۔ چنانچہ احادیث صحیحہ سے ثابت ہے کہ مانعین زکوٰۃ کا مال سخت زہریلے سانپ کی صورت میں منتقل ہو کر ان کے گلے میں ڈالا جائے گا۔[1]

اہل نفاق جس طرح اپنی جان کے معاملے میں چور رہتے ہیں اسی طرح اپنے مال کے معاملے میں بھی چور ہوتے ہیں۔ اس وجہ سے ان کی اس کمزوری پر بھی تنبیہ فرمائی تاکہ مسلمان اس بیماری سے بھی ہوشیار رہیں۔ فرمایا کہ جو لوگ خدا کی راہ میں اپنا مال خرچ کرنے سے دریغ کرتے ہیں دراں حالیکہ وہ خدا ہی کا بخشا ہوا ہے اور خدا نے ان کو کسی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ محض اپنے فضل سے بخشا ہے ۔ وہ یہ نہ سمجھیں کہ اپنے مستقبل کی مصلحت کے لیے وہ کوئی بڑا کام کر رہے ہیں۔ خدا کے حقوق و فرائض سے چرا چرا کر جو مال جمع کیا جا رہا ہے وہ قیامت کے دن ان کی گردن کا بوجھل طوق بنے گا اور سونے کے جو طوق آج زینت و فخر کا ذریعہ بنے ہوئے ہیں یہ سانپوں اور اژدہوں کی شکل میں تبدیل ہو جائیں گے ۔[1]

مطلب یہ ہے کہ جس دولت کو انہوں نے بخالت کے مارے دنیا میں اپنے گلے کا ہار بنا رکھا ہے وہ قیامت کے عالم میں واقعی ان کے گلے کا ہار بن کر نظر آئے گا ۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ :

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جس شخص کو اللہ نے مال دیا پھر اس نے اس کی زکوٰۃ ادا نہیں کی تو قیامت کے دن یہ مال ایک زہریلا سانپ بن کر اس کے گلے کا طوق بنا دیا جائے گا اور اس شخص کی باچھیں پکڑے گا اور کہے گا میں تیرا مال ہوں، تیرا سرمایہ ہوں ۔ پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی یہی آیت تلاوت فرمائی ۔ (نسائی)

جو بخیل ہوتا ہے اس کو خلق خدا اور خدا کے کاموں سے کوئی محبت نہیں ہوتی ۔ اس کی محبت کا مرکز صرف دولت ہوتی ہے اور اسی کو زندگی کا مقصود جانتے ہیں یقیناً ایسے لوگ خدا کی محبت سے محروم ہوتے ہیں

قرآن میں بخیل کا واقعی چہرہ

قرآن نے ایک موقعہ پر بخیل کا بڑا ہی عجیب و غریب چہرہ پیش کیا ہے، ارشاد ہے :

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

واما من بخل واستغنی وکذب بالحسنی

جو بخیل بنا اور بے پروا ہوا اور اچھی باتوں کی تکذیب کی

یعنی جو لوگ داد و دہش کی جگہ بخل کا رویہ اختیار کرتے ہیں، کیوں کرتے ہیں؟ اس لیے کہ مال و دولت، روپے پیسے میں ان کو یہ خاصیت محسوس ہوتی ہے کہ یہ دوسروں سے آدمی کو بے نیاز کر دیتا ہے۔ اور بظاہر دولت میں کچھ یہ خصوصیت نظر بھی آتی ہے۔ ایک غریب آدمی آج کی ضرورتوں کے پورا ہونے کے بعد پریشان رہتا ہے کہ کل کیا ہوگا اپنی ضرورتوں کے لیے کس کس کے پاس جانا پڑے گا کس کس سے کہنا ہوگا لیکن اسی کے مقابلے میں جس کا سرمایہ کسی بنک میں جمع ہے اس کو کوئی غم نہیں ہے۔ ہر ضرورت کے بارے میں مطمئن رہتا ہے کہ دولت موجود ہے جس کھانے کی خواہش ہوگی اسے کھا سکتا ہے جس لباس کو جی چاہے گا پہن سکتا ہے جہاں جانے کی ضرورت ہوگی جا سکتا ہے۔ دولت کے بارے میں استغنا کا یہی نظریہ ارباب بخل پر مسلط ہوتا ہے۔ دولت کے متعلق یہی احساس بخیلوں کو اپنے سوا ہر دوسرے سے بے نیاز بنا دیتا ہے۔ نہ صرف انسانوں بلکہ بتدریج قلب میں ایسی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے جو اس کو خدا سے بھی بے تعلق بنا دیتی ہے اور خدا کی ضرورت تو اسے ہوتی ہے جو اپنے آپ کو بے سہارا پاتا ہو اور سرمایہ دار خواہ واقع میں کتنا بے سہارا ہو لیکن دولت کا اس کو ایسا نشہ ہوتا ہے جو اس کے اندر بے سہارا ہونے کا احساس ہی پیدا نہیں ہونے دیتا۔ یہ اس کے اندر کی ایک کیفیت ہے۔ اس کیفیت کا چور لے ہیں جو چیز جا بجا پھوٹتی ہے وہ ہے وکذب بالحسنیٰ جھٹلاتا ہے وہ اچھی بات کو۔ یہی چیز اس کے باطن کا راز افشا کرتی ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے کہ الحسنیٰ ہر اچھی بات کو بخیل جھٹلاتا ہے اس کے دل سے انسانیت کی ہمدردی نکل جاتی ہے صلہ رحمی، غربا پروری، حسن سلوک غرض تمام اخلاقی خوبیاں، کردار کی بلندیاں، اس کی نگاہوں میں حماقت اور نادانی بن جاتی ہیں، اپنی تمام بے مروتیوں، بداخلاقیوں کے متعلق دل میں وہ ایک ہی جواب رکھتا ہے کہ کوئی میرا کیا کرے گا اس کے نتیجہ میں اگرچہ اسے ہر قسم کی رسوائیوں سے دوچار ہونا پڑے۔

۰ پوری کائنات کا مالک اللہ ہے

۳۳۰۔ زمین و آسمان کی میراث اللہ ہی کے لیے ہے اور تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے

باخبر ہے یعنی آخر تم مر جاؤ گے اور سب مال اسی کا ہو رہے گا جس کا حقیقت میں پہلے سے تھا۔ انسان اپنے اختیار سے دے تو ثواب پائے، بخل وسخاوت جو کچھ بھی کرو گے اور جیسی نیت سے کرو گے خدا تعالیٰ سب کی خبر رکھتا ہے اسی کے موافق دے گا۔[1]

مطلب یہ ہے کہ زمین و آسمان کی جو چیز بھی کوئی مخلوق استعمال کر رہی ہے وہ اصل اللہ کی ملک ہے اور اس پر مخلوق کا قبضہ و تصرف عارضی ہے۔ ہر ایک کو اپنے مقبوضات سے بہرحال بے دخل ہونا ہے اور آخر کار سب کچھ اللہ ہی کے پاس رہ جانا ہے۔ لہٰذا عقلمند وہ ہے جو اس عارضی قبضہ کے دوران اللہ کے مال کو اللہ کی راہ میں دل کھول کر صرف کرتا ہے اور سخت بیوقوف ہے وہ جو اسے بچا بچا کر رکھنے کی کوشش کرتا ہے۔[2]

کچھ لوگوں نے اس آیت گرامی کا مصداق زکوٰۃ نہ دینے والوں کو بتایا ہے لیکن صحیح یہ ہے کہ ہر قسم کے حقوق واجبہ کی ادائیگی میں بخل کرنے والے مراد ہیں خواہ وہ اپنا نفس ہو یا اپنے اہل وعیال ہوں یا حاجت مند اعزیز و اقارب ہوں یا جہاد غرض جن حقوق کا پورا کرنا ضروری ہے ان سب میں کوتاہی اور بخل کرنے والے شامل ہیں۔ اسی طرح علم کے بخیل اور کتمان حق کرنے والے مال کے بخلا سے بھی زیادہ بدتر ہیں۔ آیت کے آخر میں بخلا کی حماقت کو ظاہر کیا ہے کہ یہ لوگ اتنی بات نہیں سمجھتے کہ سب کی موت کے بعد اس کائنات کا وارث اللہ ہی ہے۔ یہ سب کچھ اسی کی ملک ہے اور آخر میں وہی رہے گا وہی سب کا مالک ہوگا۔ پھر بھی تو جو کچھ تمہارے پاس ہے وہ اسی کا ہوگا اور اگر اپنی زندگی میں راہ خدا میں خرچ کر دو اور حقوق واجبہ ادا کر دو تو اللہ کے یہاں اجر کے مستحق ہو گے۔ گویا یہ سب کچھ خدا نے تمہیں بطور امانت دیا ہوا ہے۔ اور اس کا مقصد ہمارا امتحان ہے وہ اس بات سے پوری طرح باخبر ہے کہ ہم نے اس کی بخشی ہوئی نعمتوں میں کس طرح کا تصرف کیا ہے اور اپنے اس علم کے مطابق وہ جزا یا سزا دے گا۔

جناب الٰہی میں بے ادبی اور گستاخی

۱۸۱۔ بلاشبہ فی الواقع اللہ نے ان لوگوں کی بات سن لی جو کہتے ہیں کہ اللہ فقیر ہے اور ہم غنی ہیں۔ یعنی اتنا ہی نہیں کہ یہود انتہائی بخل کی وجہ سے پیسہ خرچ کرنا نہیں چاہتے بلکہ جب خدا کی

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

راہ میں خرچ کرنے کا حکم سنتے ہیں تو مذاق اڑاتے ہیں اور حق تعالیٰ کی جناب میں گستاخانہ کلمات بکتے بھی نہیں شرماتے چنانچہ جب آیت من ذاالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً نازل ہوئی کہنے لگے کہ اللہ ہم سے قرض مانگتا ہے تو اللہ فقیر و محتاج اور ہم غنی و مالدار ہیں۔ حالانکہ ایک غبی اور کوڑ مغز بھی سمجھ سکتا ہے کہ انفاق فی وجوہ الخیر کو قرض سے تعبیر فرمانے میں انتہائی رحمت و شفقت کا اظہار تھا۔ ظاہر ہے کہ خدا کا اپنا دیا ہوا مال ہم سے ہماری مصالح میں ہمارے ہی دنیوی و اخروی فائدے کے لیے خرچ کراتا ہے۔ اس کو ہمارے خرچ سے کوئی نفع نہیں پہنچ سکتا اور بفرض محال پہنچے بھی تو مال اور ہر چیز اسی کی مملوک ہے۔ پھر حقیقی معنے میں اس کو قرض کیسے کہہ سکتے ہیں یہ اس کا کمال کرم و احسان ہے کہ اس خرچ کا بہترین معاوضہ دینا بھی اپنے ذمہ کر لیا اور اس کو لفظ قرض سے ادا کر کے اس لزوم کو بے حد مؤکد و مسجل کر دیا۔ مگر یہود اپنی کور چشمی اور خبث باطن سے احسان ماننے کے بجائے ان لفظوں کی ہنسی اڑانے لگے اور اللہ تعالیٰ کی جناب رفیع میں تمسخر اپنا کرنے سے باز نہ رہے اس کو فرمایا کہ اللہ نے تمہاری باتیں سن لیں۔ اس پر جو کارروائی ہوگی اس کے منتظر رہو۔[1]

دراصل یہاں سلسلہ بیان کا وہ حصہ جو جنگ اُحد سے شروع ہوا تھا ختم ہوتا ہے اور وہی بیان پھر چھڑ جاتا ہے جو اس ذکر سے پہلے تھا یعنی اہل کتاب سے مخاطبت اور دعوت حق کی فتح مندی کا اعلان' چونکہ اُحد کے بیان میں منافقوں کا ذکر درمیان میں آگیا تھا اور منافقوں کا گروہ بالعموم یہودیوں سے تعلق رکھتا تھا اس لیے سلسلۂ بیان خود بخود یہودیوں کی طرف مڑ گیا ہے۔

ہر دعوت کے ابتدائی دور کی طرح اسلام کا ابتدائی زمانہ بھی تنگی اور سختی کا زمانہ تھا، اور اللہ کے دین کا بول بالا کرنے کے لیے مال کی ضرورت برابر پیش آتی رہتی تھی۔ منافقوں پر یہ بات شاق گزرتی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ وہ کہتے کہ یہ جو بار بار خدا کے نام پر مال طلب کیا جا رہا ہے تو کیا خدا محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور محمد بن اسحاق نے حضرت عبد اللہ ابن عباس کے حوالے سے اسی زمانہ کا یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر ایک روز یہود کے بیت المدراس میں تشریف لے گئے وہاں بہت سے یہودی اپنے بہت بڑے عالم فنحاص کے گرد جمع تھے۔ فنحاص کے ساتھ ان کا ایک اور بہت بڑا عالم بھی موجود تھا جس کا

[1] افادات شیخ الاسلام

نام الشیع تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا اے فنحاص تو اللہ سے ڈر اور اسلام قبول کر لے۔ تو خوب جانتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور تمہارے پاس اللہ کی جانب سے حق لے کر آئے ہیں اور آپ کی صفات تم تورات اور انجیل میں پاتے ہو۔ اس پر فنحاص نے کہا کہ ہم کو اللہ کی کوئی ضرورت نہیں بلکہ خود اللہ تعالیٰ ہمارا محتاج ہے ہم اس سے غنی ہیں۔ اگر وہ غنی ہوتا تو ہمارے آگے عاجزی کیوں کرتا اور ہم سے قرض کیوں مانگتا۔ اور تمہارا نبی تو ہم کو سود کھانے سے منع کرتے ہیں اور اللہ تعالیٰ اگر غنی ہوتا تو وہ سود کیوں دیتا اور سود پر قرض کیوں لیتا۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے فنحاص کے منہ پر ایک طمانچہ کس دیا اور فرمایا کہ اگر تمہارے اور ہمارے مابین معاہدہ نہ ہوتا تو قسم اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے میں تجھ کو قتل کر دیتا۔ تم ہماری تکذیب کر سکتے ہو تو کرو لیکن اللہ سبحانہٗ کی شان میں گستاخی نہ کرو۔ اس واقعہ کے بعد فنحاص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا اور حضرت ابوبکرؓ کی شکایت کی۔ حضور نے حضرت ابوبکرؓ کو طلب کیا اور واقعہ دریافت کیا۔ حضرت ابوبکرؓ نے تمام واقعہ عرض کر دیا اور یہ بھی کہا کہ اللہ تعالیٰ کی شان میں گستاخی کرنے سے مجھے غصہ آگیا اور میں نے اس کے طمانچہ مارا۔ فنحاص نے اپنے الفاظ سے انکار کیا۔ قرآن میں ان ہی پیش پا افتادہ حالات کی عکاسی کی گئی ہے اور لقد سمع اللہ کے ارشاد میں ان کے لیے دھمکی ہے۔ تعبیر کا یہ انداز جیسے یہاں تہدید اور وعید ہے ایسے ہی سمع اللہ لمن حمدہ میں بشارت اور وعدہ ہے۔

اصل میں یہ بات منافقین نے کہی تھی مگر چونکہ وہ بالعموم یہودی تھے جو اسلام کا لبادہ پہن کر مصلحت کی خاطر اپنے مسلمان ہونے کی نمائش کر رہے تھے اس لیے ان کے اس کہنے کو اصل ہی کی طرف منسوب کر دیا اور پھر یہود اور منافقین کا ذکر یہاں ایک جا کرنا اور دونوں کے لیے ضمیر بھی ایک ہی لانا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ سنگین بات کہہ کر منافقین بھی یہود کی اسی برادری میں شامل ہو گئے ہیں، جس سے نکل کر انہوں نے اسلام میں داخل ہونے کا ڈھونگ رچایا تھا۔

بے ادبی اور گستاخی کی سزا

۳۳۲۔ ان کی یہ باتیں اور ان کا انبیاء کو ناحق قتل کرنا ہم ضرور لکھ لیں گے اور فیصلہ کے وقت ہم ان سے کہیں گے کہ عذاب جہنم کا مزہ چکھو۔ یعنی عام ضابطہ کے مطابق یہ ملعون اور ناپاک اقوال تمہارے دفتر سیئات میں درج کرائے دیتے ہیں۔ جہاں تمہاری قوم کے دوسرے ملعون اور

ناپاک افعال درج ہیں مثلاً معصوم نبیوں کا ناحق خون بہانا۔ کیونکہ جیسے یہ نالائق جملہ ایک نمونہ ہے تمہاری خدا شناسی کا ایسے ہی وہ نالائق کام نمونہ ہے تمہاری تعظیم انبیا کا جب یہ پوری مسل پیش ہو گی اس وقت کہا جائے گا کہ لو اپنی شرارتوں کے مزے چکھ لو۔ اور جس طرح تم نے طعن و تمسخر سے اولیاء اللہ کے دل جلاتے تھے اب عذاب الٰہی کی بھٹی میں جلتے رہو[1]

فن بلاغت کے اداشناس اندازہ کر سکتے ہیں منکتب ما قالوا کے دو لفظوں کے اندر جو قہر و غضب چھپا ہوا ہے اس کی تعبیر ہم عاجزوں کے قلم سے صفحوں میں بھی ممکن نہیں ہے۔ پھر اس سے زیادہ بلیغ بات یہ ہے کہ اسی پر عطف کر دیا ہے و قتلھم الانبیاء بغیر حق کا۔ اس سے اس جرم کی سنگینی اور زیادہ کر دی۔ گویا جناب الٰہی میں گستاخی اور بے ادبی قتل انبیاء جیسا سنگین فوجداری جرم ہے۔ یہ قتل انبیاء کا جرم بلاشبہ یہود کا ہے۔ اس کو یہاں صرف اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ منافق زیادہ تر وہی لوگ تھے جو یہودیت چھوڑ کر مسلمان ہوتے تھے۔

اگرچہ انبیاء کو ان کے بڑوں نے قتل کیا تھا لیکن یہ لوگ اپنے بڑوں کی مذمت نہ کرتے تھے بلکہ ان کے اس فعل پر راضی تھے اس لیے ان کی طرف بھی قتل انبیاء کی نسبت کر دی۔ اس کے بعد صراحۃً وعید کا ذکر کیا ہے کہ ہم جس وقت ان کو سزا دیں گے تو یوں فرمائیں گے خواہ یہ وقت قبر میں ہو یا میدان حشر میں ہو یا جہنم میں ڈالتے وقت۔

اصل ارشاد میں ذوقوا عذاب الحریق آیا ہے۔ ذوق کے معنے اصل میں تھوڑی سی چیز چیز کو منہ میں رکھ کر چکھنے کے ہیں۔ لیکن اب استعمال میں وسعت ہو گئی ہے اور ہر قسم کے محسوسات کے ادراک پر بولا جاتا ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ مال اکثر کھانے پینے کے کام میں آتا ہے اور یہ لوگ بخیل تھے۔ اس کی مناسبت سے ذوقوا کہا جائے گا اور یہ بھی ممکن ہے کہ چونکہ یہود نے ان اقوال سے انبیاء کے متبعین کو تکلیف دی ہے اور مسلمانوں کے قلوب کو جلایا ہے اس لیے اس کے عوض اسی جیسا عذاب ان کے لیے مقرر کر دیا۔

جُرم کی سزا عدل و انصاف کا تقاضا ہے

۲۳۳۔ یہ تمہاری اپنے ہاتھوں کی آگے روانہ کی گئی بلا ہے اور اللہ اپنے بندوں پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ظلم کرنے والا نہیں ہے یعنی جو کمایا تھا سامنے آیا۔ خدا کے یہاں ذرہ برابر ظلم نہیں ہے۔ ان اللہ لا یظلم مثقال ذرۃ۔ اگر بفرض محال ظلم کرنا خدا کی صفت ہوتی تو اس کی دوسری صفات کی طرح وہ بھی کامل ہی ہوتی اس لیے اگر معاذ اللہ خدا کو ظالم فرض کیا جاتے تو پھر ظالم کیا ظلام ہی کہنا پڑے گا۔ اس کا ایک رتی ظلم بھی پہاڑوں سے کم نہیں ہو سکتا۔ گویا ظلام کا صیغہ لا کر متنبہ کر دیا کہ اس کی بارگاہ میں ادنیٰ سے ادنیٰ ظلم تجویز کرنا انتہائی ظالم قرار دینے کے مترادف ہے تعالی اللہ عما یقول الظالمون علوا کبیرا۔[1]

گویا دو باتیں سمجھا دی گئی ہیں

ایک یہ کہ جنت و دوزخ انسان کے اپنے کردار کا نتیجہ ہے۔ جس طرح دُنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے۔ مثلاً کھانے کا شکم سیری پینے کا سیرابی، بھوک کا تکلیف، بیماری کا بے آرامی، اگرنے کا چوٹ، زہر کا موت، شہد کا مٹھاس غرض ہر اچھے بُرے فعل کا ایک لازمی نتیجہ ہے جو دُنیا میں ہمارے عمل کے بعد ہم کو ملتا رہتا ہے۔ اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک لازمی نتیجہ آخرت میں ملنے والا ہے، جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر کیوں مر گئے۔ اسی طرح یہ سوال بھی ہم نہیں کر سکتے کہ ہم کو ان اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی کہ دونوں ہمارے اعمال کے یکساں نتیجے ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرمادیا ہے۔ ہم کو اس کے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا، عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا پھر انبیاء روانہ کیے۔ اس پر اگر انسان باز نہ آتے اور ان اعمال کا ارتکاب کرے تو انسان کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا بلکہ وہ عادل ہے۔ مجرمین کو سزا دینا اس کی عدالت کا تقاضا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں پر ظلم نہیں کیا یہ سزا تمہارے ہی اعمال کی صورت ہے۔ اصل ارشاد میں ظلم کی نفی کے لیے ظلام آیا ہے۔ لیس بظلام للعبید میں مبالغہ کی نفی مراد نہیں بلکہ نفی میں مبالغہ مراد ہے جیسا کہ بخاری کی روایت میں بار بار آیا ہے حدثنی البراء و ھو غیر کذوب۔ کذوب مبالغہ کا صیغہ ہے اور غیر کذوب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے۔۔۔ وہ نہیں کہ زیادہ جھوٹ نہیں بولتا بلکہ مطلق نفی میں مبالغہ مقصود ہے یعنی بالکل جھوٹ نہیں بولتا۔ اسی طرح ظلام سے نفی میں مبالغہ مقصود ہے یعنی اللہ پر بالکل ظلم نہیں کرتا اور بعض علماء کہتے ہیں کہ ظلام اسم نسبت ہے جیسے صباغ، تمار، عطار اور حداد کے معنی ہیں کہ اللہ کو ظلم سے کوئی بھی نسبت نہیں ہے۔

اَلَّذِيْنَ قَالُوْۤا اِنَّ اللّٰهَ عَهِدَ اِلَيْنَاۤ اَلَّا نُؤْمِنَ لِرَسُوْلٍ حَتّٰى يَاْتِيَنَا بِقُرْبَانٍ تَاْكُلُهُ النَّارُ ؕ قُلْ قَدْ جَآءَكُمْ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِىْ بِالْبَيِّنٰتِ وَبِالَّذِىْ قُلْتُمْ فَلِمَ قَتَلْتُمُوْهُمْ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقَدْ كُذِّبَ رُسُلٌ مِّنْ قَبْلِكَ جَآءُوْ بِالْبَيِّنٰتِ وَالزُّبُرِ وَالْكِتٰبِ الْمُنِيْرِ ۞

جنہوں نے کہا کہ اللہ نے ہم کو حکم دے رکھا ہے کہ ہم کسی رسول کی بات اس وقت تک نہ مانیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی قربانی نہ لائے جسے آگ کھا لیتی ہو[۳۲۴]۔ اے پیغمبر تم ان سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے بہت رسول تمہارے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے اور وہ بات بھی لے کر آتے جو تم کہہ رہے ہو۔ اگر تم سچے ہو تو پھر تم نے ان کو کیوں قتل کیا تھا[۳۲۵]۔ اے پیغمبر یہ لوگ اس کے باوجود بھی تمہاری

تکذیب کرتے ہیں تو آپ سے پہلے بہت سے ایسے رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے جو واضح دلائل ، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آتے تھے ۔ ۳۳۶

سوختنی قربانی کا مطالبہ

مدینہ کے علمائے یہود جب دعوتِ اسلام کے خلاف تمام دلیلوں میں ہار گئے تو آخر ڈھونڈ ڈھانڈ کر یہ بات نکالی کہ ہمیں تورات میں سوختنی قربانی کا حکم دیا گیا ہے اس لیے ہم اس نبی کو سچا مانیں گے جو سوختنی قربانی کے عمل کے ساتھ آیا ہو۔ سوختنی قربانی سے مقصود یہ ہے کہ یہودی جانوروں کی قربانی کر کے ان کا گوشت آگ میں جلا دیا کرتے تھے[1] بائیبل میں متعدد مقامات پر یہ ذکر آیا ہے کہ خدا کے ہاں کسی قربانی کے مقبول ہونے کی علامت یہ تھی کہ غیب سے ایک آگ نمودار ہو کر اسے بھسم کر دیتی تھی ۔ (قضاۃ ۶ : ۲۰، ۲۱، ۱۳ ، ۱۹ ، ۲۰) نیز یہ ذکر بھی بائیبل میں آتا ہے کہ بعض مواقع پر کوئی نبی سوختنی قربانی کرتا تھا اور ایک غیبی آگ آ کر اسے کھا لیتی (احبار ۹، ۲۴، ۲ تواریخ ۷، ۱، ۲) ، لیکن یہ کسی جگہ بھی نہیں لکھا کہ اس طرح کی قربانی نبوت کی کوئی ضرور علامت ہے یا یہ کہ جس شخص کو یہ معجزہ نہ دیا گیا ہو وہ ہرگز نبی نہیں ہو سکتا ۔ یہ محض ایک من گھڑت بہانہ تھا جو یہودیوں نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار کرنے کے لیے تصنیف کیا تھا لیکن اس سے بڑھ کر ان کی حق دشمنی کا ثبوت یہ تھا کہ خود انبیاء بنی اسرائیل میں سے بعض نبی ایسے گزرے ہیں جنہوں نے آتشیں قربانی کا معجزہ پیش کیا اور پھر بھی یہ جرائم پیشہ لوگ ان کے قتل سے باز نہ رہے ۔ مثال کے طور پر بائبل میں حضرت الیاس کے متعلق لکھا ہے کہ انہوں نے بعل کے پجاریوں کو چیلنج دیا کہ مجمع عام میں ایک بیل کی قربانی تم

---

[1] ترجمان القرآن

کرو اور ایک کی میں قربانی کرتا ہوں۔ جس کی قربانی کو غیبی آگ کھالے وہی حق پر ہے چنانچہ ایک خلق کثیر کے سامنے یہ مقابلہ ہوا اور غیبی آگ نے حضرت الیاس کی قربانی کھالی لیکن اس کا جو کچھ نتیجہ نکلا وہ یہ تھا کہ اسرائیل کے بادشاہ کی بیل پرست ملکہ حضرت الیاس کی دشمن ہوگئی اور وہ زن پرست بادشاہ اپنی ملکہ کی خاطر ان کے قتل کے درپے ہوگیا اور ان کو مجبوراً ملک سے نکل کر جزیرہ نمائے سینا کے پہاڑوں میں پناہ لینی پڑی (سلاطین باب ۱۸، ۱۹)۔[1]

۴۳۳۔ جنہوں نے کہا کہ اللہ نے ہمیں حکم دیا ہے کہ ہم کسی رسول کی بات اس وقت تک نہ مانیں جب تک وہ ہمارے پاس ایسی نذر لائے جسے آگ کھالیتی ہو کچھ پیغمبروں سے یہ معجزہ ظاہر ہوا تھا کہ قربانی یا کوئی چیز اللہ نام یا نیاز کی تو آسمان سے آگ اسے آکر کھا گئی یہ علامت تھی اس کے قبول ہونے کی چنانچہ موجودہ بائبل میں بھی سلیمان علیہ السلام کے متعلق ایسا واقعہ مذکور ہے۔ اب یہود کو بہانہ ہاتھ آگیا کہ ہم کو یہ حکم ہے کہ جس سے یہ معجزہ نہ دیکھیں اس پر یقین نہ لاویں اور یہ محض جھوٹا بہانہ تھا۔ اس قسم کا کوئی حکم ان کی کتابوں میں موجود نہ تھا نہ آج موجود ہے اور نہ ہر ایک نبی کی نسبت یہ ثابت کیا جا سکتا ہے کہ اس کو یہ معجزہ ملا تھا۔ ہر پیغمبر کو حق تعالیٰ نے اوقات و احوال کے مطابق معجزات دیے ہیں ضروری نہیں کہ ہر نبی ایک ہی معجزہ دکھلائے تو سچا ثابت ہو۔[2]

اس آیت میں یہود کی جس شرارت کا حوالہ دیا ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں کو چپ کرنے کے لیے یہ کہتے تھے کہ ہمیں تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ ہدایت ہے کہ ہم کسی شخص کے دعوائے رسالت کی اس وقت تک تصدیق ہی نہ کریں جب تک اس سے یہ معجزہ نہ صادر ہو کہ وہ ایسی قربانی پیش کرے جس کو کھانے کے لیے قبولیت کے طور پر آسمان سے آگ اترے۔ یہ بات یہود شرارت کی وجہ سے کہتے تھے۔ تورات میں کچھ انبیاء بنی اسرائیل سے اس معجزے کا صادر ہونا مذکور ہے لیکن یہ کہیں مذکور نہیں ہے کہ یہ معجزہ لوازم و شرائط نبوت ہے۔ جب تک کوئی نبی یہ معجزہ نہ دکھاتے اس کا دعوائے نبوت ہی قابل غور نہیں ہے۔[3]

مطلب یہ ہے کہ ان کی دو باتیں تھیں ایک تو یہ ان اللہ عھد الینا اور دوسری جو اس کو لازم ہے یعنی یہ کہ اگر آپ یہ بات کر دکھائیں تو ہم آپ کی نبوت پر ایمان لے آئیں۔ پہلی بات تو ان کی بلا دلیل تھی صرف ان کی اپنی تراشیدہ تھی اسی لیے انہوں نے اس کو

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام [3] تدبر قرآن

بلا دلیل پیش نہیں کیا اور یہ بات بھی غلط ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی خاص معجزے کے ساتھ ایک ایسے نبی کی نبوت پر ایمان لانے کو موقوف کردے جس کی نبوت کتبِ سماویہ سے ثابت ہو البتہ یہ ضرور ہے کہ انبیاء علیہم السلام سے معجزات کا ظہور ہوتا ہے اور ان معجزات کو ان کے دعویٰ نبوت کی تقویت میں دخل بھی ہوتا ہے لیکن کسی خاص معجزے کے ساتھ ان کو مقید کر دینا یہ تو بالکل ہی مہمل بات ہے بلکہ اگر کسی قوم نے اپنے نبی سے کوئی خاص معجزہ طلب ہی کیا ہے تو اس میں احتیاط برتی گئی ہے اور ہمیشہ منہ مانگا معجزہ دکھانے سے انکار کیا گیا ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ اگر منہ مانگا معجزہ دیکھنے کے بعد کوئی قوم ایمان نہ لائے گی تو اس کو عذاب سے بالکل ختم کر دیا جائے گا۔ لہٰذا جب عام طور پر قوموں کے منہ مانگے معجزات دکھانے سے انکار ہی کیا گیا ہے اور ایمان نہ لانے کی حالت میں ان معجزات کو عذاب اور استیصال کا سبب قرار دیا گیا ہے تو کسی نبی کی نبوت کو کسی مخصوص معجزے کے ساتھ وابستہ کر دینا کوئی معنے نہیں رکھتا۔

قرآن کا یہودیوں کو جواب

۲۳۵ ۔ اے پیغمبر تم ان سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے بہت رسول تمہارے پاس کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے اور وہ بات بھی لے کر آئے جو تم کہہ رہے ہو اگر تم سچے ہو تو پھر تم نے ان کو کیوں قتل کیا تھا۔ یعنی اگر واقعی اپنے دعوے میں سچے ہو اور اسی خاص معجزے کے دکھلانے پر تمہارا ایمان لانا موقوف ہے تو پہلے ایسے نبیوں کو تم نے کیوں قتل کیا ہے جو اپنی صداقت کی کھلی نشانیوں کے ساتھ خاص یہ معجزہ بھی لے کر آئے تھے۔ تمہارے اسلاف کا یہ فعل جس پر آج تک تم بھی راضی ہو کیا اس کی دلیل نہیں ہے کہ یہ سب تمہاری حیلہ سازی اور ہٹ دھرمی ہے کہ کوئی پیغمبر جب تک خاص یہی معجزہ نہ دکھلائے گا، ہم نہ مانیں گے۔[1]

چونکہ یہود نے حضور کی نبوت پر ایمان نہ لانے کا یہ عذر محض شرارت سے تراشا تھا اس لیے قرآن نے ان کے ذہن کو سامنے رکھ کر جواب دے دیا کہ ان سے کہہ دو کہ مجھ سے پہلے ایسے رسول آچکے ہیں جو نہایت واضح نشانیاں لے کر آئے اور وہ معجزہ بھی انہوں نے دکھایا جس کا تم نے ذکر کیا تو تم نے ان کو کیوں قتل کیا؟ تمہارا یہ فعل بتا رہا ہے کہ تم اپنی اس بات میں بھی جھوٹے ہو۔ اگر

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

تمہیں یہ معجزہ بھی دکھا دیا جاتے پھر بھی تم اپنی ضد ہی پر اڑے رہو گے۔ اور ایمان نہ لانے کا کوئی اور بہانہ تلاش کر لو گے [1]

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اچھا اگر کسی نبی کی نبوت کا یہی معیار ہے جو تم کہتے ہو تو تم نے ان انبیاء کو کیوں قتل کیا جو علاوہ اور معجزات کے یہ معجزہ بھی لے کر آتے تھے۔ گویا ان کی نبوت فریقین کے نزدیک مسلم تھی۔ ہمارے نزدیک تو اس لیے کہ وہ صاحب معجزات تھے اور صاحب معجزات ہونا ان کی نبوت کے لیے کافی ہے اور تمہارے نزدیک اس لیے کہ وہ آگ کا معجزہ لے کر آتے تھے اس کے باوجود تم نے ان کو قتل کیا۔ اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ تمہارے نزدیک نہ تو کسی مدعی نبوت کی نبوت کا یہ معیار ہے اور نہ خدا کا یہ حکم ہے۔ اور اگر میرے ہاتھ سے یہ معجزہ ظاہر بھی ہو جائے پھر بھی تم مجھے نبی تسلیم نہ کرو گے کیونکہ اس خاص معجزے کے ظاہر کرنے والوں کو تم قتل کر چکے ہو پھر تم سے کیا توقع ہو سکتی ہے؟

ایک شبہ کا جواب

شاید آپ کے ذہن میں یہاں خلش ہو کہ ان کا مطالبہ پورا کر کے دیکھ لیا جاتا اس میں کیا حرج تھا۔ جواب یہ ہے کہ ان کا یہ مطالبہ بر بنائے عناد تھا صدق دل سے نہ تھا۔ نیز اس کے بعد اگر یہ لوگ ایمان نہ لاتے تو بلا شبہ یہ عذاب استیصال کے مستحق ہو جاتے اور اس امت پر عذاب استیصال مقصود نہیں ہے اور سب سے بڑی بات یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا زمانۂ نبوت دورِ علمی ہے، اس میں عقلی مباحث اور علمی دلائل کو اہمیت حاصل ہے۔ قانونی ترقیاں چاہتی ہیں کہ قانون سے بحث کی جائے اور علمی طور پر اپنی صداقت کا دنیا سے اعتراف کرایا جائے۔ اسی بنا پر دلیل نبوت کے طور پر آپ کو معجزہ علمی دیا گیا ہے یعنی قرآن شریف، یہ معجزہ قیامت تک رہنے والا ہے اس لیے جس رسول کی رسالت پر شواہد عقلیہ اور نقلیہ موجود ہوں اور جس کا کمال اور بنی نوع انسان کے لیے ہدایت ہونا ظاہر ہو اس پیغمبر کو ہر منہ مانگے معجزے کی تعمیل ضروری نہیں ہے۔

تکذیب سے آزردہ خاطر نہ ہوں

۱۸۴ — اے پیغمبر یہ لوگ اگر اس کے باوجود بھی تمہاری تکذیب کرتے ہیں تو آپ سے پہلے

---

[1] تدبر قرآن

بہت سے ایسے رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے جو واضح دلائل، صحیفے اور روشن کتاب لے کر آئے تھے آپ کو تسلی دی جاتی ہے کہ ان ملعونوں کی کج بحثی اور ہٹ دھرمی سے ملول اور دل گیر نہ ہوں اور نہ دوسرے مکذبین کی پرواکریں۔ آپ سے پہلے کتنے رسول جھٹلائے جا چکے ہیں جو صاف نشانیاں، معجزے چھوٹے صحیفے اور بڑی روشن کتابیں لے کر آئے تھے۔ انبیاء صادقین کی تکذیب معاندین کی قدیم عادت رہی ہے آپ کو کچھ انوکھی بات پیش نہیں آئی۔[1]

مطلب یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جارہا ہے کہ آپ غمگین نہ ہوں۔ اگر یہ تکذیب کرتے ہیں تو یہ تکذیب آپ کی کسی کوتاہی کی بنا پر نہیں ہے اور نہ اس وجہ سے ہے کہ تم ان کے حسب منشا ان کو معجزہ نہیں دکھایا ہے بلکہ اس کا واحد سبب یہ ہے کہ یہ لوگ تم پر ایمان لانا نہیں چاہتے۔ یہ معاملہ خاص تم ہی کو نہیں پیش آیا ہے تم سے پہلے بھی بہت سے رسولوں کی تکذیب ہو چکی ہے۔ حالانکہ وہ معجزے، صحیفے اور روشن کتاب سب کچھ لے کر آتے تھے۔ یہاں تین لفظ استعمال ہوئے بینات، زبر اور کتاب منیر۔

بینات کے معنے واضح اور روشن کے ہیں۔ یہ لفظ آیات کی صفت کے طور پر آیا ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں یہ لفظ تنہا بغیر موصوف کے استعمال ہوا ہے دو معنے میں آیا ہے واضح اور مسکت دلائل کے معنے میں یا حسی معجزات کے معنے میں۔

زبر، زبور کی جمع ہے۔ اس کے معنے ٹکڑے، قطعے اور صحیفے کے ہیں۔ مزامیر داؤد کے لیے اس کا استعمال معروف ہے۔ یہاں اس سے مراد انبیاء کے وہ صحائف ہیں جو تورات کے مجموعہ میں شامل ہیں۔ کتاب منیر سے مراد تورات ہے۔ قرآن سے پہلے کی نازل شدہ چیزوں میں سے تورات ہی ہے جو اس لفظ کا اصلی مصداق ہو سکتی ہے۔[2]

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ معاندین ایک قسم کے عادی مجرم اور تکذیب پیشہ لوگ ہیں۔ ان کا دستور ہمیشہ یہی رہا ہے اور اپنے اپنے زمانے میں ہر پیغمبر کے ساتھ ان کا یہی سلوک رہا ہے خواہ وہ پیغمبر بڑے بڑے معجزات لے کر آیا خواہ چھوٹے چھوٹے صحائف لے کر آیا یا کوئی بڑی کتاب جیسے تورات، انجیل اور زبور لے کر آیا۔ بڑی کتاب کو نشان اور مضامین کے اعتبار سے منیر اور روشن فرمایا ہے جب ان کی عادت ہی یہ ہے اور ہر پیغمبر صاحب کتاب اور صاحب معجزات کے ساتھ ان کا سلوک یہ رہا ہے تو مرگ انبوہ جشن دارد آپ کیوں ملول خاطر ہوں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

كُلُّ نَفْسٍ ذَآئِقَةُ الْمَوْتِ ؕ وَاِنَّمَا تُوَفَّوْنَ اُجُوْرَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ

فَمَنْ زُحْزِحَ عَنِ النَّارِ وَاُدْخِلَ الْجَنَّةَ فَقَدْ فَازَ ؕ وَمَا الْحَيٰوةُ

الدُّنْيَآ اِلَّا مَتَاعُ الْغُرُوْرِ ۝ لَتُبْلَوُنَّ فِيْٓ اَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ ۟ وَ

لَتَسْمَعُنَّ مِنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَمِنَ الَّذِيْنَ

اَشْرَكُوْٓا اَذًى كَثِيْرًا ؕ وَاِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا فَاِنَّ ذٰلِكَ

مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ ۝

ہر جان کو موت سے دوچار ہونا ہے اور روزِ قیامت تمہیں تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔[۳۲۷] لہٰذا جو شخص دوزخ سے دُور رکھا جائے گا اور جنت میں داخل کیا جائے گا، فی الواقع وہی کامیاب ہے اور دیکھو دُنیا کی زندگی سامان فریب کے سوا کچھ نہیں ہے۔[۳۲۸] حتماً اور یقیناً تمہیں جان و مال کی آزمائشوں سے ہو کر گزرنا ہے اور اہل کتاب اور مشرکین سے تمہیں

تکلیف دہ باتیں ضرور سننی ہیں، اور اگر تم صبر کا دامن تھامے رکھو گے اور تقویٰ کو اپنا شعار بناؤ گے تو یہ بڑے ہی عزم اور ہمت کی بات ہو گی۔[۳۳۹]

اُمت کی ذمہ داری اور اس کے لیے قربانی

جیسے شروع پارے میں آیت ۹۸، ۹۹ اور ۱۰۰ میں یہود کا کردار ذکر کرنے کے بعد اُمتِ مسلمہ کو اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کیا گیا تھا اور آیت ۱۰۱ سے لے کر آیت ۱۱۰ تک واضح کیا تھا کہ تمہارا کام پچھلی اُمتوں کی طرح صرف یہ نہیں ہے کہ اس دین کی مخلصانہ پیروی کرتے رہو۔ اس عام ذمہ داری کے ساتھ یہ خاص ذمہ داری بھی تمہاری ہے کہ جو پیغام اللہ کے نبی نے تم تک پہنچایا ہے تم اسے پوری انسانیت تک پہنچاؤ۔ اُمت کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ وہی اس کے وجود کا حقیقی مقصد ہے۔ اللہ سبحانہٗ کا یہ فرمانا کہ کنتم خیر اُمۃ اس اُمت کی حیثیت کو صاف طور پر مقرر کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ یہ اُمت صرف اسی طرح کی اُمت نہیں ہے جس طرح کی اُمتیں اب تک وجود میں آتی رہی ہیں بلکہ ایسی اُمت ہے جو ساری نوعِ انسانی کی ہادی اور پوری انسانیت کی پاسبان بنائی گئی ہے۔ یہاں پھر یہودیوں کا کردار پیش کرنے کے بعد اُمتِ مسلمہ کو مخاطب کیا ہے کہ قیامِ حق کی عظیم خدمت کی ذمہ داری تم پر ڈالی گئی ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ تمہیں اس راہ کی تمام آزمائشوں سے بھی گزرنا پڑے۔ یہ کام دعووں، نعروں، جلسوں، نسبتوں، نسبتوں اور نجات کے انفرادی تصور سے نہ ہو گا، اس کے لیے جان و مال کی قربانی کرنی ہو گی، سخت کلامیوں، دل آزاریوں اور ایذا رسانیوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اہلِ کتاب اور مشرکینِ عرب دونوں تمہاری مخالفت میں کمر بستہ ہو گئے ہیں وہ طرح طرح کی تمہیں اذیتیں پہنچائیں گے اور تمہیں برداشت کرنی پڑیں گی۔ تمہاری کامیابی کے لیے اصل چیز صبر و تقویٰ ہے۔ اگر تم نے صبر کیا اور تقویٰ کا سر رشتہ ہاتھ سے نہ دیا تو یقین کرو کہ بالآخر کامیابی تمہاری ہے۔

۲۲۷ - ہر جان کو موت سے دوچار ہونا ہے اور روزِ قیامت تمہیں تمہارے اعمال کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا یعنی موت کا مزہ سب کو چکھنا ہے اس کے بعد قیامت کے روز ہر جھوٹے سچے اور مصدق و مکذب کو اپنے اپنے کیے کا پورا بدلہ مل کر رہے گا۔ پورے کا یہ مطلب ہے کہ کچھ تھوڑا سا ممکن ہے قیامت سے پہلے ہی مل جائے مثلاً دنیا میں یا قبر میں۔[1]

کچھ کی رائے میں یہ آیت تتمہ ہے پہلے مضمون کا جس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی تھی اور مطلب یہ ہے کہ رہی یہ بات کہ ایسے عادی مجرموں کو اور تحمل و برداشت کرنے والے اہل ایمان کو یوں ہی چھوڑ دیا جاتا تو یہ بات نہیں ہے بلکہ تم سب کو مرنا اور موت کا مزہ چکھنا ہے اور روزِ قیامت ہر ایک کو اپنے کیے کا اجر حاصل کرنا اور پھل بھگتنا ہے۔[2]

اور کچھ کا خیال ہے کہ پہلے اس حقیقت کو واضح کیا گیا تھا کہ اگر کبھی کسی جگہ کافروں کو غلبہ ہو جائے اور مسلمان مصائب میں مبتلا ہو جائیں تو یہ کوئی حیرت کی بات نہیں اور نہ غمگین ہونے کی کیونکہ دُنیا کی رنج و راحت چند روزہ ہے۔ کوئی جاندار موت سے نہیں بچ سکتا۔ اور دُنیا کی راحت و تکلیف اکثر دُنیا ہی میں حالات بدل کر ختم ہو جاتی ہے اور بالفرض اگر دُنیا میں نہ بدلی تو موت پر سب کا خاتمہ ہو جانا یقینی ہے۔ عقل مند کا کام اس چند روزہ راحت و رنج کے حصر میں پڑا رہنا نہیں بلکہ مابعد الموت کی فکر کرنا ہے اسی لیے اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ ہر جاندار موت کا مزہ چکھے گا۔[3]

اور کچھ کہتے ہیں کہ اس میں تہدید اور تسلین دونوں پہلو ہیں منافقین و معاندین کے لیے یہ تہدید ہے اور اہل ایمان کے لیے پیام تسکین ہے۔[4]

لیکن ہماری رائے میں علامہ سید رضا کی رائے زیادہ پسندیدہ ہے کہ اُمت دعوت کو اس کی عظیم ذمہ داری کے پیش نظر آئندہ آیت میں جو بات کہی جا رہی ہے کہ تمہیں اس ذمہ داری کی بجا آوری میں جانی اور مالی قربانیوں کی راہ سے گزرنا پڑے گا۔ یہ آیت گرامی اسی کی تمہید ہے کیونکہ طبیعت کی کمزوری یہ ہے کہ ہر شخص موت کے اندیشہ سے قربانیوں سے گزرتا ہے۔ قرآن نے پہلے ہی اس کا تریاق یہ کہہ کر پیش کر دیا کہ کل نفس ذائقۃ الموت ہر شخص کو موت سے دوچار ہونا ہے جو نہ ٹالے ٹل سکتا ہے اور نہ بلائے آ سکتا ہے اس لیے قربانی کے کسی کام اور جان و مال

[1] افادات شیخ الاسلام [2] کشف الرحمٰن [3] معارف م ش [4] تدبر قرآن

ہے کسی ابتلاء سے گھبرانا نہ چاہیے بلکہ اس کا خندہ پیشانی سے استقبال کرنا چاہیے ۔ صرف یہی نہیں بتایا کہ ہر شخص کو موت سے دوچار ہونا ہے بلکہ پیچھے یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ موت کا وقت مقرر ہے اور یہ بھی تلقین کی گئی ہے کہ اللہ کے حکم کے بغیر کوئی نہیں مرتا ہے ۔

موت زندگی کا طبعی تمہ ہے

اور یہ قرآن کا بہت ہی بلیغ انداز ہے کہ بجائے یہ کہنے کے کہ تم سب کو ایک روز موت کی آغوش میں جانا ہے ۔ یہ فرمایا کہ ہر جان کو موت سے دوچار ہونا ہے ۔ اس اندازِ بیان کے ذریعے یہ بات ذہن نشین کر دی کہ خواہ کوئی اور کیسا ہو سب کو مرنا ہے ۔ گویا اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ موت ایک طبعی تمہ و تکملہ ہے حیات کا ، اسے نیکوکاری اور بدکاری سے کوئی تعلق نہیں اور نہ یہ انسان کے لیے بطور سزا مقرر ہوئی ہے ۔ اس میں یہود و نصاریٰ دونوں کی تردید ہو گئی ہے جن کے عقیدے میں موت نام ہے گناہ کی سزا یا نتیجے کا ۔ انجیل کے صحیفوں میں ہے جس طرح ایک آدمی کے سبب سے گناہ دُنیا میں آیا اور گناہ کے سبب موت دُنیا میں آئی اور موت سب میں پھیل گئی ۔ (رومیوں ۵ : ۱۲) گناہ کی مزدوری موت ہے (رومیوں ۶ ، ۱۳) خواہش حاملہ ہو کر گناہ کو جنتی ہے اور گناہ جب بڑھ چکا تو موت پیدا کرتا ہے (یعقوب ۱ ، ۱۵) یہود کا عقیدہ کہ موت نتیجہ ہوتی ہے شخصی گناہ کا ، ان کی معتبر و مستند کتاب جیوز انسائیکلو پیڈیا ج ۴ ص ۴۸۳ میں درج ہے ۔ بہرحال دُنیا میں ہر شخص کے لیے مرنا ہے یہاں کسی کے لیے دائمی زندگی نہیں ۔ اصلی سوال مرنے کا نہیں سوال تو یہ ہے انما توفون اجورکم یوم القیامۃ کہ گو یہاں جزائی نیکیوں کی جزا وقتاً فوقتاً تھوڑی تھوڑی کرکے شہرت تعریف ، ہر دل عزیزی اور دولت کی صورت میں ملتی رہتی ہے مگر پوری زندگی کی مجموعی جزا جب ملے گی اس وقت کیا بنے گا ؟ آج کوئی شخص یہاں قانونِ مکافات کی گرفت سے بچ بھی گیا تو اس کی یہ محفوظیت عارضی ہے کہ یہ دنیوی زندگی سلسلۂ حیات کا ایک بہت ہی ناقص اور ناتمام حصہ ہے ۔

زندگی کے اصلی اور آخری نتائج

۲۳۸ ۔ لہٰذا جو شخص دوزخ سے دُور رکھا جائے گا اور جنت میں داخل کیا جائے گا فی الواقع وہی کامیاب ہے اور دُنیا کی زندگی سامانِ فریب کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ یعنی دُنیا کی عارضی بہار

اور ظاہری ٹیپ ٹاپ بہت دھوکہ میں ڈالنے والی چیز ہے جس پر مفتون ہو کر اکثر بے وقوف آخرت سے غافل ہو جاتے ہیں۔ حالانکہ اصلی کامیابی یہ ہے کہ یہاں رہ کر انجام کو سوچے اور وہ کام کرے جو عذاب الٰہی سے بچانے والا اور جنت تک پہنچانے والا ہو[1] مطلب یہ ہے کہ اس دُنیا کی زندگی میں جو نتائج رونما ہوتے ہیں ان ہی کو اگر کوئی اصلی اور آخری نتائج سمجھ بیٹھے اور ان ہی پر حق و باطل اور فلاح و خسران کے فیصلے کا مدار رکھے تو درحقیقت وہ سخت دھوکہ میں مبتلا ہو جائے گا۔ یہاں کسی پر نعمتوں کی بارش ہونا اس بات کا ثبوت نہیں ہے کہ وہی حق پر ہے اور اسی کو اللہ کی بارگاہ میں قبولیت بھی حاصل ہے اور اسی طرح یہاں کسی کا مصائب و مشکلات میں مبتلا ہونا بھی لازمی طور پر یہ معنے نہیں رکھتا کہ وہ باطل پر ہے اور مردود بارگاہِ الٰہی ہے اکثر اوقات اس ابتدائی مرحلے کے نتائج آخری نتائج کے برعکس ہوتے ہیں جو حیاتِ ابدی کے مرحلے میں پیش آنے والے ہیں اور اصل اعتبار انہی نتائج کا ہے[2]

دُنیا سرمایہ فریب ہے۔

وما الحیاۃ الدنیا الامتاع الغرور میں یہ بتایا گیا ہے کہ انسانی زندگی کے مقصد کو سمجھنے میں غلطی نہ کرنا چاہیے۔ مراد وہی پائے گا اور کامیابی سے فی الواقع وہی ہمدوش ہو گا جو جہنم کی لپیٹوں سے بچ کر جنت میں پہنچ جائے گا۔ اس زندگی کا اصل مقصد تو یہ ہے لیکن کچھ لوگ دُنیا ہی کو مقصود سمجھ لیتے ہیں اور اسی حیوانی زندگی کو انسانی زندگی کی غرض و غایت بنا لیتے ہیں۔ قرآن بتا رہا ہے کہ اس کی حیثیت مقصد کی نہیں ہے جو اسے مقصد بنا کر زندگی گزار رہا ہے وہ دھوکہ کھا رہا ہے اور دھوکہ دینے والا دھوکہ دے رہا ہے وما یعدھم الشیطان الا غرورًا جن اعمال و افعال کا کوئی نتیجہ نہیں، وہ باور کراتا ہے کہ یہی نتیجہ خیز ہیں۔ جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا۔ وہ سکھاتا ہے کہ سب کچھ اسی میں ملتا ہے۔

لوگ یہاں بھی دو راہے پر کھڑے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جو اسلام کو دُنیا کا ایک معاشی نظام قرار دینا چاہتے ہیں وہ اس قسم کی آیتوں کے ذکر سے بھی پرہیز کرتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جن پر معاش گریز نظریات کا غلبہ ہے وہ ان ہی آیتوں سے پہلے خیال والوں کی تردید کرتے ہیں حالانکہ نہ وہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

غلط ہے اور ہر غلط ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد کے ذریعے قرآن کے نقطۂ نظر کو سمجھایا ہے۔ ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ،

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز منبر پر تشریف فرما ہوئے اور ہم لوگ آپ کے اردگرد بیٹھ گئے۔ آپ نے فرمایا بلاشبہ میں اپنے بعد جس چیز کا اندیشہ محسوس کر رہا ہوں یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ تم پر دنیا کی رونق اور بہار کھول دے گا۔ ایک شخص بول پڑا اے اللہ کے رسول کیا خیر اور بھلائی ہی برائی کو جنم دے گی ؟ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے، لوگوں نے چہ میگوئیاں کرنی شروع کر دیں کہ حضور انور تو ایک بات فرما رہے تھے تیرے سے تو کوئی بات نہیں کر رہے تھے کہ خواہ مخواہ سوال کر دیا۔ اسی حال میں دیکھا گیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی نازل ہونے لگی۔ فرمایا کہ سوال کرنے والا کہاں ہے۔ پھر بتایا کہ اچھی چیز اور خیر سے اچھے ہی نتائج نکلتے ہیں۔ پھر فرمایا کہ دیکھو یہ سرمایہ اور دولت سرسبز شیریں چیز ہے لیکن برساتی نالوں کے کنارے جو ہریالی اور سبزی اُگتی ہے وہی مہلک ہوتی ہے مگر ایسے مویشی جو صرف ہری ہری دوب کو چرتے ہیں پھر جب ان کے دونوں پہلو برابر ہو جاتے ہیں تو دھوپ میں جا بیٹھتے ہیں ، گوبر اور پیشاب کرتے ہیں۔ پھر جا کر چرنے لگتے ہیں۔ یہی حال دنیا اور اس کی دولت کا ہے۔ بڑا میٹھا ہے جب لینے والا اس کو حق کے ساتھ لے اور راہ حق میں اسے خرچ کرے تو یہ بہترین امداد ہے اور ایسا سرمایہ دار بہت اچھا ہے۔ (بخاری)

دھوکے کا سامان اور دھوکے کا سرمایہ دنیوی زندگی کو اس لیے فرمایا ہے کہ اس کی ظاہری رونق کو دیکھ کر آدمی اس میں پھنس جاتا ہے اور چند دن کے بعد کھوٹے مال کی حقیقت اور اس کی قلعی کھل جاتی ہے اور چونکہ عارضی چیز ہے اس لیے اس میں انہماک کی اور اس کو مقصود بالذات بنانے کی ممانعت کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس زندگی کو مطلوب اور مقصود بالذات نہ سمجھو اور اس سے محبت نہ کرو بلکہ اس کو حصول آخرت کا ذریعہ بناؤ۔ حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ یہ دنیا ایسا سامان ہے جو چھوڑ دیا جائے گا اور لوگوں کو مضمحل کر کے رہے گا۔ تم اس سامان سے جس قدر ہو سکے اللہ تعالیٰ کی طاعت حاصل کرو۔ حضرت علی نے فرمایا ہے کہ یہ ہاتھ لگانے میں بڑی نرم ہے مگر اس کا زہر قاتل اور جان لیوا ہے۔ بعض حضرات فرماتے

ہیں کہ تشبیہ آخرت کے مقابلہ میں ہے اور اس شخص کی تشبیہ ہے جو آخرت کے مقابلہ میں دُنیا کو ترجیح دے ورنہ اگر کوئی دُنیا کو آخرت کے حصول کا ذریعہ بنائے تو اس کے لیے نعم المال الصالح للرجل الصالح آیا ہے گویا منشا یہ ہے کہ مقصود بالذات خیال کرو تو بُری چیز ہے اور اگر نیکیاں کماؤ اور مال دے کر جنت خرید لو تو اچھی چیز ہے۔

مصائب کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ

۲۳۹ ۔ حتماً اور یقیناً تمہیں جان و مال کی آزمائشوں سے ہو کر گزرنا ہے اور اہل کتاب و مشرکین سے تمہیں تکلیف دہ باتیں ضرور سننی ہیں۔ اور اگر تم صبر کا دامن تھامے رکھو گے اور تقویٰ کو اپنا شعار بناؤ گے تو بڑے ہی عزم اور ہمت کی بات ہے۔ یہ خطاب مسلمانوں کو ہے کہ آئندہ بھی جان و مال میں تمہاری آزمائش ہو گی اور ہر قسم کی قربانیاں کرنی پڑیں گی۔ قتل کیا جانا، زخمی ہونا، قید و بند کی تکلیف ہونا، بیمار پڑنا، اموال کا تلف ہونا، اقارب کا چھوٹنا اس طرح کی سختیاں پیش آئیں گی۔ نیز اہل کتاب اور مشرکین کی زبانوں سے بہت جگر خراش اور دل آزار باتیں سننا پڑیں گی ان سب کا علاج صبر و تقویٰ ہے۔ اگر صبر و استقلال اور پرہیزگاری سے ان سختیوں کا مقابلہ کرو گے تو یہ بڑی ہمت اور اولوالعزمی کا کام ہو گا جس کی تاکید حق تعالیٰ نے فرمائی ہے[1]

اس آیت میں اہل ایمان کو سمجھایا ہے کہ دین حق کو قائم کرنے کی جو ذمہ داری تم پر ڈالی گئی ہے اور یہ کام جو تمہارے سپرد کیا گیا ہے تو اس کی خاطر تمہیں قربانیاں کرنی ہوں گی۔ اس کے لیے تمہیں وطن سے بے وطن ہونا اپنے کاروبار کو نقصان پہنچانا اپنی عمر بھر کا اندوختہ لٹانا، اپنی جمی ہوئی تجارتوں پر پانی پھیرنا، اپنی کھیتی باڑی اور باغات کو ویران کرنا۔ اپنے عیش و تنعم کو خیرباد کہنا، دُنیا کی تمام کامیابیوں اور خوش حالیوں سے آنکھیں بند کر لینا پانی کی طرح اپنا خون بہانا اور اپنے بچوں کو یتیم اور عورتوں کو بیوہ کرنا ہو گا۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ اس فرض کی انجام دہی کا بجائے خود مصائب کی بدلیاں بن جانا یقینی ہے اور یہ بدلیاں ٹوٹ ٹوٹ کر برستی ہیں یعنی ایسا ہو کر رہتا ہے کہ اس میدان میں قدم رکھتے ہی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

خیرخواہی کا جواب جاہلی حمیت سے ملے، میٹھے بول کا جواب گالیوں سے اور دلیلوں کا جواب پتھر دل سے دیا جائے۔ لیکن اس عظیم ذمہ داری کا تقاضا یہ ہے کہ ان مطالبوں اور حکموں کو ٹھکرا دیا جائے اور ساری مخالفتوں کے باوجود اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی کی دعوت دی جائے، بلا کسی خوف ملامت کے دی جائے اور حالات کا دباؤ خواہ کیسا ہی سخت ہو کسی مصالحت کا خیال تک ذہن میں نہ لایا جائے اور حقیقت یہ ہے کہ دعوتی سرگرمیوں پر جہاد کا صحیح معنوں میں اطلاق ہوتا ہی ان پر ہے جب وہ مخالفتوں کے طوفان میں انجام دی جائیں۔

منشا یہ ہے کہ ابھی کیا ہے اور غزوۂ اُحد میں تم نے کیا دیکھا ہے ابھی نہ معلوم اور کیا کیا امتحان تم پر آئیں گے۔ اگر دنیا میں اسلام کا پیغام پہنچانے اور اعلاء کلمۃ اللہ کی غرض سے زندہ رہنا ہے تو قدم قدم پر بدمعاشوں، اوباشوں اور شرارت پسندوں کی رکاوٹ کو دور کرنا پڑے گا اور روزمرہ جارحانہ کارروائیوں کی مدافعت کرنی ہوگی اور جب تک اقتدار پر اسلام کا قبضہ نہ ہوگا یہ سلسلہ جاری رہے گا، لہٰذا تمہیں صبر و استقلال کا دامن نہ چھوڑنا چاہیے اور تقویٰ کا پابند رہنا چاہیے۔ اگر ایسا کرو گے تو انجام کے اعتبار سے تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ کیونکہ یہ کام معزز اُمور سے ہیں یا یہ کام ان کاموں میں سے ہیں جن کے کرنے کی اللہ نے تاکید فرمائی ہے۔ عزم کے معنے ہیں کسی رائے پر اس طرح قائم رہنا کہ اس کو کر گزرنا عزیمت اور رخصت اُردو میں بھی بولتے ہیں۔ اور قانون کی زبان میں تو یہ اصطلاحات عام طور پر استعمال ہوتی ہیں۔ یہاں دو معنے ہیں ایک تو یہ کہ ایسا کام جسے کرنے کی ہر شخص کو رغبت کرنی چاہیے اور ہمت سے کر گزرنا چاہیے اور دوسرے معنے یہ ہیں کہ یہ اللہ کی جانب سے تاکیدی احکام ہیں۔ جن کو پورا کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ شرط کی جزا یا تو محذوف ہے یعنی اگر صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے تو یہ تمہارے حق میں بہتر ہو گا اس صورت میں فان ذالك من عزم الامور دلیل اور علت ہے۔

بارگاہِ نبوت کا گستاخ کعب بن اشرف

کچھ شارحین قرآن کا خیال ہے کہ کعب بن اشرف یہودی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اکثر ہجو کے اشعار کہتا تھا۔ اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے اور کچھ روایات سے پہلے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بدر سے پہلے نازل ہوئی ہے چنانچہ شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

بخاری کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ آیت بدر سے پہلے نازل

ہوئی۔ قتال کا حکم اس کے بعد ہوا۔ تاہم صبر و تقویٰ کے حکم کی مشروعیت قتال کے باوجود فی الجملہ باقی ہے جس پر آخر تک عمل ہوتا۔ ہاں صبر و عفو اور تغلیظ و تشدید کے مواقع کا پہچاننا ضروری ہے جو نصوص شرعیہ سے معلوم ہو سکتے ہیں۔ اس آیت کو یہاں رکھنے سے شاید غرض یہ ہے کہ تم ان کفار و منافقین کی گستاخیوں اور شرارتوں پر حد سے زیادہ طیش مت کھاؤ۔ ابھی بہت کچھ سننا پڑے گا اور تکلیفیں اٹھانی پڑیں گی۔ صبر و استقلال سے ان کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار رہو۔

لیکن قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو اس پر اصرار ہے کہ کعب بن اشرف کی زبان درازیوں اور گستاخیوں ہی کی طرف اس میں اشارہ ہے۔

کعب بن اشرف کون ہے؟ مورخین لکھتے ہیں کہ کعب بن اشرف ابتدائی اسلامی دور میں مدینہ کا ایک بہت بڑا فتنہ تھا۔ جو شر و فساد پھیلانے میں تنہا ایک بڑے گروہ سے کم نہ تھا۔ اس کا باپ قبیلہ طے سے تھا جس نے بنو نضیر کے رئیس ابو رافع سلام بن الحقیق کی بیٹی سے شادی کی تھی۔ اسی نضر یہودی عورت کا بیٹا کعب تھا جس نے بنو نضیر کی آبادی سے جنوبی جانب ایک ٹیلے پر قلعہ بنا لیا تھا۔ وہ دولت مند تھا۔ باپ کی وجہ سے عربوں میں اور ماں کی وجہ سے یہودیوں میں اسے بڑا رسوخ حاصل تھا۔ سب سے آخر میں یہ کہ مشہور شاعر تھا اور اس زمانے میں شاعروں کو لوگ عموماً قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ زندگی کے ظاہری اسباب کی سازگاری کے ساتھ بہت بداخلاق، خود پسند، متکبر اور اور اسلام دشمن تھا۔ یہودی علماء کے لیے اس نے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ ایک موقعہ پر انہوں نے کہہ دیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم وہی نبی ہیں جن کے آنے کی خبر یہودی صحیفوں میں ہے۔ کعب نے ان کے وظیفے بند کر دیے جب ان علماء نے اپنی غلطی کا اقرار کیا تو وظیفے جاری کر دیے۔ اگرچہ وہ بھی مدینہ منورہ کے ابتدائی عہد نامہ صلح و امن میں شریک تھا مگر شروع ہی سے اس نے قریش مکہ اور دوسرے اسلام دشمن عناصر سے خاص روابط پیدا کر لیے تھے۔ قریش کے جو سردار جنگ میں مارے گئے تھے، ان کے مرثیے لکھ کر چالیس آدمیوں کے ساتھ مکہ گیا۔ مرثیہ پڑھ کر خود بھی رویا اور قریش کو بھی رلایا۔ ساتھ ہی قریش سے عہد لیا کہ جنگ بدر کا بدلہ لیں گے۔ واپس آ کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجو میں اشعار کہے۔ شعر کہہ کہہ کر حضور انور کے خلاف لوگوں کو بھڑکاتا۔ اپنے قصیدوں کی تشبیب میں مسلم خواتین کا ذکر نہایت نازیبا طریق پر کرتا۔ دولت مند اور با اقتدار شخص کی حسن اخلاق مر جائے اور خوف خدا اس کے دل میں نہ رہے تو وہ سب کے لیے آفت کا پرکالا بن جاتا ہے۔

اس فتنہ عظیمہ کی سرکوبی ناگزیر ہوگئی تو محمد بن مسلمہ نے اس کے ختم کرنے کی ذمہ داری لی۔ ابونائلہ سلکان بن سلامہ، عباد بن بشیر، حارث بن اوس اور ابوعبس بن جبر ساتھ ہوگئے۔ ابونائلہ کعب کے رضاعی بھائی تھے۔ معلوم ہوا ہے کہ سب سے پہلے دن کے وقت وہی ملے اور کہا کہ حضور انور ہم سے صدقہ مانگتے ہیں اور ہم تنگ دست ہیں مہربانی فرما کر ہمیں خوراک کے لیے دسق دو دسق غلہ دیجئے۔ کعب یہ سن کر خوشی سے اچھل پڑا اور بولا ابھی کیا ہوا ہے وہ دن دور نہیں جب تم بیزار ہو کر اسے چھوڑ دو گے۔

ابونائلہ۔ بخراب تو ان کی اتباع اختیار کر چکے ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلے کا انجام کیا ہوتا ہے تم یہ بتاؤ کہ قرض دو گے یا نہیں۔

کعب۔ دے دوں گا بشرطیکہ کچھ رہن رکھو۔

ابونائلہ۔ کیا چیز؟

کعب۔ اپنی عورتیں رکھ دو۔

ابونائلہ۔ تمہارے حسن و جمال کی وجہ سے ہمیں اپنی عورتوں پر اعتماد نہیں ہو سکتا۔

کعب۔ پھر بچے رکھ دو۔

ابونائلہ۔ اس سے ہم عرب میں بدنام ہو جائیں گے البتہ ہم ہتھیار رہن رکھ سکتے ہیں حالانکہ ہمیں ان کی آج کل بہت ضرورت ہے۔

کعب اس پر راضی ہو گیا اور ابونائلہ نے واپس جا کر ساتھیوں کو سب کچھ بتا دیا۔ چاندنی رات میں یہ سب نکل کر کعب کے قلعہ کے نیچے پہنچے۔ اسے آواز دی۔ اندر سے آیا۔ قلعہ سے نکل کر تمام رفیق کعب کے ساتھ ٹہلتے رہے۔ کعب نے عطر لگا رکھا تھا۔ محمد بن مسلمہ نے کہا تمہارے سر سے لپٹیں اٹھ رہی ہیں اجازت ہو تو ذرا سونگھ لوں، کعب نے کہا کہ ضرور۔ بس اس کا سر پکڑتے ہی ساتھیوں سے کہا کہ اب اسے ختم کر دو۔ چنانچہ وہ چند لمحات میں ختم کر دیا گیا، سر کاٹ لیا گیا۔ اسی وقت سارے ساتھی مدینہ پہنچے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں مہم کے کامیاب انجام کی کیفیت پیش کر دی۔

وَإِذْ أَخَذَ اللَّهُ مِيثَاقَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَتُبَيِّنُنَّهُ لِلنَّاسِ
وَلَا تَكْتُمُونَهُ فَنَبَذُوهُ وَرَاءَ ظُهُورِهِمْ وَاشْتَرَوْا بِهِ ثَمَنًا
قَلِيلًا ۖ فَبِئْسَ مَا يَشْتَرُونَ ﴿﴾ لَا تَحْسَبَنَّ الَّذِينَ يَفْرَحُونَ
بِمَا أَتَوا وَّيُحِبُّونَ أَن يُحْمَدُوا بِمَا لَمْ يَفْعَلُوا فَلَا تَحْسَبَنَّهُم
بِمَفَازَةٍ مِّنَ الْعَذَابِ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿﴾

اور یاد رکھو اس وقت کو جب اللہ نے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی یہ عہد لیا تھا [۲۴۰] کہ تمہیں اس کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا [۲۴۱] ہوگا، اور ان کو پوشیدہ رکھنا نہ ہوگا [۲۴۲]۔ لیکن انہوں نے کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور اسے تھوڑی قیمت پر فروخت کر ڈالا، کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں [۲۴۳]۔ تم ان لوگوں کو عذاب سے ہرگز محفوظ نہ سمجھو جو اپنے کردار پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کو ان کاموں پر سراہا جائے جو انہوں نے

کبھی نہیں کیے، فی الواقع ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ۲۲۲

اُمت کی تعلیم و تربیت اصلاح و ارشاد

اللہ نے اہل کتاب کو کتاب عطا فرمائی تھی اور ان سے عہد لیا تھا کہ اس کے احکام کی تعلیم و تبلیغ کرنا اپنا فرض سمجھیں، لیکن وہ طرح طرح کی گمراہیوں میں مبتلا ہو گئے اور عہد الٰہی فراموش کر دیا۔ اس کے باوجود ان کو اہل کتاب ہونے کا گھمنڈ ہے وہ چاہتے ہیں کہ دنیا اس بات پر ان کی تعریف کرے جو نہ انہوں نے کی ہے اور نہ کرنے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔ اہل کتاب کے تذکرہ میں مسلمانوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ صرف اللہ کی کتاب کو ماننے سے وہ ہرگز مقصود ہاتھ میں نہ آسکے گا جس کے لیے تم مبعوث کیے گئے ہو۔ یعنی اقامتِ دین کی عظیم خدمت، جب تک کتاب کے ماننے والوں میں کتاب کے جاننے والوں کی عددی طاقت نہ ہو گی۔ کوئی آئین، کوئی دستور، کوئی نظامِ حیات صرف ماننے کی قوت سے برسرِ اقتدار نہیں آسکتا جب تک اس کے ماننے والوں میں اس کے جاننے والے نہ ہوں۔ اگر کسی آئین و دستور کی پشت پر کوئی علمی طاقت نہیں ہے تو اس کا مطلب کھلے لفظوں میں یہ ہے کہ اس پر ایمان اس کے ماننے والوں میں شعور و ادراک کی منزل تک نہیں پہنچا ہے اور اس کی وجہ سے عائد ہونے والی ذمہ داریوں کا احساس ان میں بیدار نہیں ہوا ہے۔

اہل کتاب کی دینی زندگی کی تباہی کا باعث صرف یہ تھا کہ ان کے عوام کا علم میں کتاب الٰہی سے رابطہ ٹوٹ کر صرف چند مخصوص افراد میں سمٹ گیا تھا اس کے نتیجہ میں علم دین کے لیے ایک مخصوص طبقہ نے جنم لے لیا تھا اور قوم کی پوری دینی زندگی پیشہ وروں کا روبار ہو کر رہ گئی تھی۔ قرآن سمجھاتا ہے کہ اللہ نے تم کو اسلامی قیادت اور بالواسطہ دنیا کی رہنمائی کی زمام دی ہے تمہیں اپنی اس ذمہ داری کو سمجھنا چاہیے اور ان اہل کتاب کی کاپی کرکے تاریخ کو نہ دہرانا چاہیے۔

ضرورت ہے کہ تمہارے ہر فرد کا انفرادی طور پر اللہ کی کتاب سے براہ راست تعلق ہو، عقیدہ، اعمال و اخلاق، تربیت و تہذیب، نفس کی آراستگی، سیرت کی بلندی و تکمیل، فضائل میں قرآن اور رسول کا کردار ہوتا ہو۔ تمہارے میلانات و رجحانات، ذہنیت و طرزِ فکر، قرآن و سنت کے عکاس ہوں۔ گویا پہلے یہ بتایا تھا کہ اس عظیم کام کی راہ میں بڑی رکاوٹیں پیش آئیں گی ان کو دور کرنے

کے لیے بڑی قربانیاں دینی ہوں گی اور اب بتایا جا رہا ہے کہ اس عظیم کام کے لیے علم و عمل کے ذریعے ہر فرد کو اللہ کی کتاب سے تعلقات مضبوط کرنے ہوں گے۔

بنی اسرائیل سے عہد کی تاریخ

۱۸۷۔ اور یاد کرو اس وقت کو جب اللہ نے ان لوگوں سے جن کو کتاب دی گئی تھی یہ عہد لیا تھا۔ یعنی انہیں یہ تو یاد رہ گیا کہ بعض پیغمبروں کو آگ میں جلنے والی قربانی بطور نشان کے دی گئی تھی مگر یہ یاد نہ رہا کہ اللہ نے اپنی کتاب ان کو سپرد کرتے وقت ان سے کیا عہد لیا تھا اور کس خدمت عظیمہ کی ذمہ داری ان پر ڈالی تھی۔ یہاں جس عہد کا ذکر کیا گیا ہے اس کا ذکر جگہ جگہ بائیبل میں آتا ہے۔ بخصوصاً کتاب استثنا میں حضرت موسیٰ کی جو آخری تقریر نقل کی گئی ہے اس میں تو وہ بار بار بنی اسرائیل سے عہد لیتے ہیں کہ جو احکام میں نے تم کو پہنچائے ہیں۔ انہیں اپنے دل میں نقش کرنا، اپنی آیندہ نسلوں کو سکھانا، گھر بیٹھے راہ چلتے لیٹتے اور اٹھتے ہر وقت ان کا چرچا کرنا، اپنے گھر کی چوکھٹوں پر اور اپنے پھاٹکوں پر ان کو لکھ دینا (۶: ۴-۹) پھر انہوں نے اپنی آخری وصیت میں تاکید کی کہ فلسطین کی سرحد میں داخل ہونے کے بعد پہلا کام یہ کرنا کہ کوہ عیبال پر بڑے بڑے پتھر نصب کر کے تورات کے احکام ان پر کندہ کر دینا (۲۷: ۲-۴) نیز بنی لاوی کو تورات کا ایک نسخہ دے کر ہدایت فرمائی کہ ہر ساتویں برس عید خیام کے موقعہ پر قوم کے مردوں، عورتوں، بچوں سب کو جگہ جگہ جمع کر کے یہ پوری کتاب لفظ بلفظ ان کو سناتے رہنا، لیکن اس پر بھی کتاب اللہ سے بنی اسرائیل کی غفلت رفتہ رفتہ یہاں تک بڑھی کہ حضرت موسیٰ کے سات سو برس بعد ہیکل سلیمانی کے سجادہ نشین اور یروشلم کے یہودی فرمانروا تک کو یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے ہاں تورات نامی بھی کوئی کتاب موجود ہے۔ (۲ سلاطین ۲۲، ۸، ۱۳)[1]

اس سے بھی زیادہ صراحت کے ساتھ اس حکم کی شہادت موجودہ محرف تورات و انجیل دے رہی ہیں۔ تم اس کلام میں جو میں تمہیں فرماتا ہوں کچھ زیادہ نہ کیجیو اور نہ اس میں کم کیجیو (استثنا ۴: ۲) اس نے ۔۔۔۔ بنی اسرائیل میں ایک شریعت کی بنا رکھی جس کی بابت اس نے ہمارے باپ دادوں کو حکم کیا کہ وہ لے اپنی اولاد کو سکھلا دیں تاکہ آنے والی پشت میں وہ فرزند پیدا ہوں جو دین سیکھیں

---

[1] تفہیم القرآن

اور وہ اسے اپنی اولاد کو سکھلا دیں (زبور ۷۸: ۵-۶) جو کچھ میں تم سے اندھیرے میں کہتا ہوں اُجالے میں کہو اور جو کچھ تم کان میں سنتے ہو اس کی کوٹھوں پر منادی کرو (متی ۱۰: ۲۷)

اگرچہ تورات، زبور، انجیل سب ہی میں اس عہد کے اشارات موجود ہیں لیکن ہم حتماً پورے وثوق و اعتماد سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ قرآن کی مراد بھی مواثیق و عہود ہیں۔ قرآن نے بلاقید اس میثاق کا ذکر کیا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس اور ابن جبیر کے خیال میں الذین اوتوا الکتاب سے یہود کے علماء و احبار مراد ہیں۔ اور حضرت علقمہ کی رائے میں علماء یہود اور احبار نصاریٰ مراد ہیں۔

اُمت کی علمی تربیت

۱۴۳۔ تمہیں اس کتاب کی تعلیمات کو لوگوں میں پھیلانا ہے۔ اصل ارشاد میں لتبیننه لفظ آیا ہے۔ تبیین کے معنے خوب کھول کر بیان کرنے کے ہیں اس وزن پر جو الفاظ عربی میں آتے ہیں ان میں دو باتیں ملحوظ ہوتی ہیں۔ ایک بہتات اور دوسرے تدریج۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ کام بہت کرنا ہے اور دیر تک آہستہ آہستہ کرنا ہے خود تعلیم و تربیت کا مزاج بھی یہی ہے کہ زیادہ سے زیادہ ہو دیر تک ہو اور بتدریج ہو علمی کمالات جس قدر ہیں ان میں یہ تینوں باتیں بمنزلہ شرط کے ہیں۔ اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ اس کتاب کے تعلیم و تعلم کا ایک مسلسل منظم، دیرپا نظام قائم کیا جائے اور اس طرح عام افرادِ اُمت کا علمی رشتہ کتابِ الٰہی سے جوڑ دیا جائے تاکہ کتابِ الٰہی کا علم زیادہ سے زیادہ عام ہو جائے۔ یہاں بیان اور للناس کے الفاظ بتا رہے ہیں کہ بات علماء سے متعلق ہو رہی ہے اور ان کو ان کے فرائض بتائے جا رہے ہیں۔ کتابِ الٰہی کو کھول کر بیان کرنا علماء کے فرائض میں ہے اور بات کے لیے اندازِ تعبیر بھی قسمیہ اختیار کیا ہے۔ یعنی بخدا انہیں ضرور بالضرور یہ کام کرنا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جیسے علماء کے فرائض میں کتاب الٰہی کا سکھانا ہے۔ ایسے ہی عام لوگوں کے فرائض میں کتاب الٰہی کا سیکھنا داخل ہے۔ اسی سلسلے کا ایک ارشادِ نبوت سن لیجئے تاکہ آپ کو معلوم ہو جائے کہ دین کی تعلیم و تربیت کا نبوت کی نظر میں کیا مقام ہے۔ عبدالرحمان بن ابزی بیان کرتے ہیں:

ایک روز جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس میں مسلمانوں کے بعض گروہوں اور قبیلوں کی تعریف کی، اس کے بعد فرمایا بعض دوسرے گروہوں اور قبیلوں کا یہ کیا حال ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں میں دین کی

سمجھ اور اس کا شعور پیدا کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ ان کو تعلیم دیتے ہیں نہ نصیحت کرتے ہیں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض بھی ادا نہیں کرتے۔ اس کے بعد آپ نے رُوئے سخن بدلتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگوں کا یہ کیا حال ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں سے علمِ دین اور اس کا فہم و شعور حاصل کرنے کی کوشش نہیں کرتے اور نہ وہ ان سے نصیحت لینے کے لیے جاتے ہیں خدا کی قسم دین کا علم اور دین کی سمجھ رکھنے والے ہر گروہ کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے پڑوسیوں کی تعلیم کا اہتمام کرے اور ان میں دین کی سمجھ پیدا کرنے کی کوشش کرے اور ان کو وعظ و نصیحت کیا کرے اور بری باتوں سے ان کو روکا کرے اور اچھی باتوں کے لیے ان سے کہا کرے اور اسی طرح ان کے لیے ضروری ہے کہ وہ اپنے علم رکھنے والے پڑوسیوں سے علم حاصل کیا کریں اور نصیحت لیا کریں اور دین کو سمجھنے کی کوشش کیا کریں۔ بہرحال جاننے والوں کے لیے نہ جاننے والوں کو بتانا اور نہ جاننے والوں کے لیے جاننے والوں سے سیکھنا ان کے دینی فرائض میں سے ہے اور ہر گروہ کو چاہیے کہ وہ اپنا یہ فرض ادا کیا کرے اور اگر کسی گروہ نے اپنے اس فریضہ کی ادائیگی میں غفلت اور کوتاہی کی تو میں ان کو سخت جلدی سزا دلواؤں گا۔

اس حدیث سے یہ بات بہت وضاحت کے ساتھ معلوم ہو گئی کہ دین کی تعلیم اور ناواقفوں کی تعلیم و تربیت اور فلاح و ارشاد کے بارے میں اس اُمت کی ذمہ داری کیا ہے؟ اور اگر دہ اس ذمہ داری کو ادا نہ کرے تو اللہ اور رسُول کے نزدیک وہ کتنے بڑے جرم کی مرتکب ہے؟ مفتی محمد عبدہ نے یہ بات بڑی دردانگیز فرمائی ہے۔

اس میں ہمارے لیے بہت بڑی عبرت ہے ہماری کتاب قرآن حکیم ہے۔ دُنیا میں کوئی کتاب اتنی زبانی یاد نہیں کی گئی جتنی یہ کتاب، اتنی کوئی کتاب دُنیا میں نشر نہیں ہوئی جتنی قرآن حکیم۔ قرنِ اوّل سے اب تک مسلمان ہر جگہ اس کے حافظ ہیں اور اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ تلاوت کا عالم یہ ہے کہ سڑکوں، بازاروں، شادی اور غمی کی رسموں میں قرآن کی تلاوت ہوتی ہے۔ لیکن اس سب کے باوجود مسلمانوں نے اجتماعی طور پر اس کے بیان کرنے کا فریضہ اور لوگوں تک خدا کے پیغام کو پہنچانے کا کام چھوڑ دیا ہے۔ اس کے نتیجہ میں مسلمان اس کی رہنمائی سے محروم ہو چکے ہیں۔

کتمانِ علمِ حق سنگین جرم ہے

۲۴۲ - اور ان کو پوشیدہ رکھنا نہ ہو گا - بیان کے بعد کتمان کی ممانعت خود بیان میں زور پیدا کرنے کے لیے ہے - یہاں دو باتیں ہیں اور دونوں رُوح کے اعتبار سے جُدا جُدا ہیں ایک یہ کہ کتاب اللہ سے واقفیت ہو مگر غیر قانونی یعنی تاویل و تحریف کی اوٹ میں اور یہ نتیجہ ہے کتاب اللہ کے بیان نہ کرنے کا اور دوسری یہ کہ کتاب اللہ سے بالکل عام لوگوں میں بے خبری ہو اور یہ نتیجہ ہے کتاب اللہ کے کتمان کا -

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ ظاہر کا تقاضا تو یہ تھا کہ اندازِ بیان یہ ہونا چاہیے کہ اوّلاً کتمان سے ممانعت ہو اور پھر بیان کی تلقین ہو - کیونکہ بیان کہتے ہیں کسی چیز کے اظہار کو - ترتیب ایسا ہونی چاہیے کہ چھپاؤ مت ظاہر کر دو اور کہا یوں گیا کہ ظاہر کرو اور چھپاؤ مت - اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے اہم کو مقدم کیا اور غیر اہم کو بعد میں ذکر کیا ہے - کتمان جہل بسیط کی تلقین ہے یعنی دین سے بے خبری کی اور بیان جہل مرکب کا شاہکار ہے یعنی کسی ایسی چیز کو دین سمجھ لینا جو دین نہیں - جہل بسیط جہل مرکب کے مقابلہ میں کمتر ہے کیونکہ ایسے شخص کے راہ پر آجانے کا امکان ہے اگر کتاب تک اس کی رسائی ہو جائے برخلاف جہل مرکب کے اس سے یکبارگی پیچھا چھڑانا مشکل ہے کتاب ہونے کے باوجود جہل مرکب والا گمراہ ہی رہتا ہے -

قرآن کی نظر میں علم کا کتمان بھی سنگین جُرم ہے - حافظ ابن کثیر نے اس آیتِ قرآنی سے خود اُمتِ محمدیہ کے علماء کے لیے یہ بات سمجھی ہے کہ :

> اس میں علماء کو تنبیہہ ہے کہ خبردار ان کی راہ نہ چلنا، اگر ایسا کرو گے تو ان ہی نتائج سے تمہیں بھی دو چار ہونا پڑے گا جن سے وہ ہوئے، علماء کی ذمہ داری میں یہ بات داخل ہے کہ وہ علم نافع لوگوں تک پہنچائیں - حدیث میں کتمانِ علم پر سخت وعید آئی ہے - حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے، علم کے بارے میں جس سے دریافت کیا گیا اور اس نے اس کو چھپا لیا تو روزِ قیامت اسے آگ کا لگام ڈالا جائے گا - اللھم اعذنا آمین آمین آمین -

مطلب یہ ہے کہ یہ آیت گرامی صرف یہودیوں کی داستان تاریخ سنانے کے لیے نہیں ہے بلکہ اُمتِ مسلمہ کو اس سنگین جرم سے بچانے کے لیے آئی ہے - علامہ آلوسی لکھتے ہیں حکمِ آیت

عام ہے ، اعتبار عموم لفظ کا ہے کسی خاص سبب کا نہیں ۔ قرطبی فرماتے ہیں یہ آیت ان تمام لوگوں کے خلاف احتجاج ہے جو کتمان علم کے مجرم ہوں ۔ چونکہ عموم کی وجہ سے اس آیت کی گرفت سخت ہے اس لیے کچھ لوگوں نے آیت کی گرفت سے بچنے کے لیے مختلف راہیں تلاش کی ہیں مثلاً یہ کہ یہ اس عالم کے بارے ہے ہیں جس سے اللہ کا حکم دریافت کیا جائے اور وہ اسے چھپائے اور یا یہ اس صورت میں ہے جبکہ اس کے سوا کوئی دوسرا شخص وہاں مسئلہ بتانے والا نہ ہو لیکن اہل علم نے اس سے اتفاق نہیں کیا ہے ان کا موقف یہ ہے کہ قرآن میں صرف کتمان علم کا ذکر نہیں ہے بلکہ تبیان علم کو بھی اس آیت میں امت کا ایک مقدس اجتماعی فرض قرار دیا ہے اور اس فرض کی پابجائی نہ کرنے پر دوسرے موقع پر وعید بھی آئی ہے ، بلکہ بتانے والوں نے یہاں تک بتا دیا کہ بیان اور تبیین کی دونوں صورتیں اس کے مفہوم میں داخل ہیں ۔ ایک یہ کہ قرآن کی دعوت غیر مسلموں کو دی جائے دوسرے یہ کہ قرآنی تعلیمات سے خود مسلمانوں کو آشنا کیا جائے یعنی تبلیغ و ارشاد دونوں اس آیت کی رو سے ضروری ہیں اور یہ آیت گرامی اس موضوع پر قرآن کی دوسری آیت سے زیادہ بلیغ ہے مثلاً و لتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر اور اس میں میثاق اور قسم کی وجہ سے زیادہ زور ہے ۔

ہاں البتہ یہ کہا جا سکتا ہے کہ

اوّلاً اس فرض کی ادائیگی یعنی بیان کی حد تک سب کا عمل مطلوب نہیں ہے ۔ کچھ کے کرنے سے سب ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو سکتے ہیں لیکن کچھ کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پورے ضلع میں صرف انفرادی ذمہ داری اس کی پابجائی کے لیے کافی ہے نہیں بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہر جگہ مسلمانوں میں ایک جماعت یہ کام کرنے والی ہو ۔

ثانیاً یہ کتمان کی حد تک اگر کسی دقیق مسئلہ کو کسی دینی مصلحت سے کسی بدفہم کے روبرو ذکر نہ کیا جائے تاکہ اس کے لیے فتنہ کا ذریعہ نہ ہو تو یہ کتمان نہیں ہے اور اس کتمان پر قرآن کی وہ وعید نہیں ہے جو آپ دوسرے پارے میں پڑھ چکے ہیں ۔

کتابِ الٰہی کا کاروبار

۳۴۳ ۔ لیکن انہوں نے کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال دیا اور اسے تھوڑی قیمت پر فروخت کر ڈالا ، کتنا برا کاروبار ہے جو یہ کر رہے ہیں ۔ یعنی علماء اہل کتاب سے عہد لیا گیا تھا

کہ جو احکام بشارات کتاب اللہ میں ہیں ان کو صاف صاف لوگوں کے سامنے بیان کریں گے اور کوئی بات نہیں چھپائیں گے نہ ہیر پھیر کر کے ان کے معنے بدلیں گے۔ مگر انہوں نے ذرہ برابر پروا نہیں کی اور دنیا کے تھوڑے نفع کی خاطر سب عہد و پیمان توڑ کر احکام شریعت بدل ڈالے، آیات اللہ میں لفظی اور معنوی تحریفات کیں۔ جس چیز کا ظاہر کرنا سب سے زیادہ ضروری تھا، یعنی پیغمبر آخر الزمان کی بشارت اسی کو سب سے زیادہ چھپایا۔ جس قدر مال خرچ کرنے میں بخل کرتے اس سے زیادہ علم خرچ کرنے میں کنجوسی دکھائی اور اس کنجوسی کا منشا بھی مال و جاہ اور دنیا کی منفعت کے سوا کچھ نہ تھا۔ یہاں ضمناً مسلمان اہل علم کو متنبہ کر دیا کہ تم دنیا کی محبت میں پھنس کر ایسا نہ کرنا۔[1]

قرآن نے اس آیت میں علمائے یہود پر دو سنگین الزام عائد کیے ہیں ایک یہ کہ انہوں نے کتاب اللہ کو نظر انداز کر دیا ہے اور اس کے ساتھ ان کا معاملہ کتاب اللہ کا نہیں ہے۔ پیٹھ پیچھے پھینک دینا استعارہ ہے پروا نہ کرنے اور توجہ نہ کرنے سے۔ یعنی ان کی توجہات کا مرکز کتاب اللہ نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ انہوں نے اس کے عوض حقیر قیمت حاصل کی ہے۔ حقیر اس لیے کہ یہ دین فروشی محض اغراض دنیوی کی خاطر کرتے تھے اور دنیا کا بڑے سے بڑا فائدہ بھی اگر دین کو فروخت کر کے حاصل کیا جائے تو بہر حال وہ ثمن قلیل ہی ہے۔

اصل ارشاد میں فنبذوہ وراء ظھورھم واشتروا بہ ثمنا قلیلا کے الفاظ آئے ہیں۔ یہاں ضمیر منصوب اور مجرور کا مرجع مقرر کرنے میں شارحین قرآن نے دو راہیں اختیار کی ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس کا مرجع میثاق ہے اور کچھ کی رائے میں ضمیر کا مرجع کتاب اللہ ہے۔ ہماری رائے میں جو کہتے ہیں کہ ضمیر کا مرجع کتاب ہے ان کی بات قرین صواب ہے۔ قرآن کی دوسری آیات اس کی تائید کرتی ہیں۔

پہلے پارے میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ

ولما جاءھم رسول من عند اللہ مصدق لما معھم نبذ فریق من الذین اوتوا الکتاب کتاب اللہ وراء ظھورھم کانھم لا یعلمون

اور جب ان کے پاس اللہ کی جانب سے ایک ایسا رسول آیا جو اس کتاب کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تصدیق کرتا تھا جو ان کے پاس ہے تو اہل کتاب کے ایک فریق نے کتاب اللہ کو
اس طرح پس پشت ڈال دیا گویا وہ جانتے ہی نہیں ہیں ۔
دیکھ لیجئے اس آیت میں نبذ کا مفعول کتاب اللہ لفظوں میں موجود ہے اور اس میں کوئی
اختلاف نہیں ہے ۔
دوسرے پارے میں آپ پڑھ چکے ہیں ۔
ان الذین یکتمون ما انزل اللہ من الکتاب ویشترون بہ ثمنا قلیلا
بلاشبہ جو لوگ اللہ کی نازل کردہ چیز یعنی کتاب کو چھپاتے ہیں اور حاصل کرتے ہیں
اس کے ذریعہ حقیر معاوضے کو ۔
یہاں بھی بہ کا مرجع کتاب ہے ۔ الغرض اس آیت میں ضمیر منصوب اور ضمیر کا مرجع کتاب اللہ
ہے میثاق نہیں ہے ۔

کتاب اللہ کو پس پشت ڈال دینا

آیت میں کتاب اللہ سے مراد تورات ہے اور پس پشت ڈالنے سے مراد اس سے بے التفاتی اور بے توجہی ہے اور مطلب یہ ہے کہ تورات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی علامتیں اور پیشین گوئیاں اور ان پر ایمان لانے کی تاکید جو درج ہے سب کو نظر انداز کر دیا، سب سے بے توجہ ہو گئے ۔ گویا پس پشت ڈالنا یہ ہے کہ کتاب اللہ کو کتاب اللہ مان کر اس پر عمل چھوڑ دیا جاتے ، اپنی زندگی میں اس کے مطالبات کو شرف پذیرائی نہ دیا جاتے اور اس کی زد سے بچنے کے لیے اس میں تاویل کی جاتے بلکہ اس میں تحریف سے بھی گریز نہ کیا جاتے ۔ یہ گویا کتمان کتاب اللہ کی تشریح ہوئی ہے ۔ یہاں کتاب اللہ کو تھوڑی قیمت پر فروخت کرنے کو بطور علت پیش کیا ہے اور سمجھایا کہ یہ درحقیقت کتمان کی علت ہے ۔ اب تین باتیں ہیں ایک کتمان کتاب اللہ دوسرے کتاب اللہ کو پس پشت ڈالنا تیسرے کتاب اللہ کے ذریعے حقیر مایہ حاصل کرنا ۔ ان میں باہم منطقی ربط ہے ۔

قرآن نے یہاں ثمن قلیل کو کھول کر بیان نہیں کیا کیونکہ یہ بات اس قدر واضح ہے کہ اس کے لیے کسی مزید وضاحت کی ضرورت نہیں ۔
کتاب اللہ کو پس پشت ڈالنے کی تین صورتیں ہیں ایک یہ کہ اس پر عمل نہ کیا جاتے دوسرے

یہ کہ اس میں تاویل کر دی جاتی تیسرے یہ کہ اس میں تحریف کر دی جاتی۔ انسانی طبیعت کی یہ عام کمزوری ہے کہ وحی الٰہی کے مقابلے میں وہ اپنے ہوائے نفس کی بالاتری چاہتی ہے اور وحی کے ذریعے آتے ہوئے جو احکام اسے اپنی خواہشوں، اپنی ناقص عقل یا اپنی محدود معلومات کے خلاف نظر آتے ہیں ان کا انکار کر دیتا ہے اور اگر مانتا ہے تو تاویل و تحریف کے زور سے ان کی زد سے بچنے کی سر توڑ کوشش کرتا ہے۔ یہودیوں کی ان ہی تاویلات، تحریفات اور ترک عمل کو قرآن نے نبذ دراء ظھورھم کہا ہے اور تاویل و تحریف کے ذریعے کتاب اللہ کو پس پشت ڈالنے کا یہ سارا عمل محض اپنے ذاتی مفادات کی خاطر کیا جاتا۔ اسی کو قرآن نے یہاں اشترا کہا ہے اور دوسرے موقعہ پر اکل اموال الناس بالباطل فرمایا ہے۔

یہودیوں اور عیسائیوں کی مذہبی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ وہ بادشاہوں اور امیروں کی مطلب برآریوں کے لیے حلال کو حرام، حرام کو حلال بنا دیتے اور اس کے فتوے دے کر انعام و اکرام لیتے۔ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنانے کا یہ مطلب نہیں کہ وہ شریعت کے کسی حکم کا انکار کر دیتے تھے بلکہ یہ ہے کہ اس کے حکموں کو اپنی تاویلات و تصرفات کے ذریعے ایسا کر لیتے کہ امیروں کی ہوائے نفس پوری ہو جائے۔

مدینہ کے رؤسائے یہود نے اسی مقصد کی خاطر علمائے یہود کے وظائف مقرر کر رکھے تھے کہ وہ حضور انور کی تشریف آوری کے متعلق تورات میں آمدہ بشارات کی تاویل کریں اور ان میں تحریف کریں۔

نکمے پن پر تحسین کی خواہش

۴۴۳ - تم ان لوگوں کو ہرگز عذاب سے محفوظ نہ سمجھو جو اپنے کردار پر خوش ہیں اور چاہتے ہیں کہ ان کو ان کاموں پر سراہا جائے جو انہوں نے کبھی نہیں کیے ہیں۔ فی الواقع ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ یہود مسئلے غلط بتاتے، رشوتیں کھاتے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفات و بشارات جان بوجھ کر چھپاتے تھے۔ پھر خوش ہوتے کہ ہماری چالاکیوں کو کوئی پکڑ نہیں سکتا۔ اور امید رکھتے کہ لوگ ہماری تعریف کریں کہ بڑے عالم اور دیندار و حق پرست ہیں۔ دوسری طرف منافقین کا بھی یہی حال تھا جب جہاد کا وقت آتا گھروں میں چھپ کر بیٹھ جاتے اور اپنی اس حرکت پر خوش ہوتے کہ دیکھو کیسے جان بچائی ہے۔ جب حضور انور جہاد سے تشریف لاتے

توغیر حاضری کے جھوٹے بہانے پیش کرکے چاہتے کہ آپ سے اپنی تعریف کرائیں۔ ان سب کو بتلادیا گیا کہ یہ باتیں دُنیا و آخرت میں خدا کے عذاب سے بچا نہیں سکتی ہیں ۔ اوّل تو ایسے لوگ دُنیا ہی میں رُسوا ہوتے ہیں اور کسی وجہ سے یہاں بچ گئے تو وہاں کسی تدبیر سے چھوٹ نہیں سکتے۔ اگرچہ آیت میں تذکرہ یہود و منافقین کا ہے لیکن مسلمانوں کو بھی سنانا ہے کہ بُرے کام کرکے خوش نہ ہوں۔ بھلا کر کے اترائیں نہیں اور جو اچھا کام نہیں کیا ہے اس پر تعریف کے اُمیدوار نہ رہیں بلکہ کرنے کے بعد بھی مدح سرائی کی ہوس نہ رکھیں لے

یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا اور چاہتے ہیں کہ ایسے کاموں پر ان کی تعریف کی جائے جو انہوں نے نہیں کیے۔ مثلاً وہ تقویٰ سے کوسوں دور رہ کر یہ سننا چاہتے ہیں کہ بڑے متقی ہیں پوری زندگی دین کے نام پر کاروباری ہونے کے باوجود وہ دیندار اور پارسا کا لیبل لگانے کے ضرور خواہاں ہیں۔ دین کے خلاف ریشہ دوانیاں اور سازشیں کرنے کے باوجود وہ اپنے تئیں خادم دین کا نعرہ ضرور لگوانا چاہتے ہیں۔ اللہ کے قانون سے علم و عمل میں بیگانے ہیں مگر حامئ شریعت کہلوانا چاہتے ہیں۔ اعمال میں فساد اور اخلاق میں گندگی کا گہوارہ ہیں مگر مصلح اور مزکّی کہلوانے کے خواہش مند ہیں۔ امر واقعہ یہ ہے کہ کچھ بھی نہیں ہیں یا یوں کہہ دیجیے کہ اپنے حق میں یہ ڈھنڈورہ پٹوانا چاہتے ہیں کہ بڑے ایثار پیشہ، مخلص اور دیانتدار ہیں اور ملت کے بڑے خیرخواہ ہیں حالانکہ معاملہ برعکس ہے۔ اس سے زیادہ صفائی کے ساتھ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب پر اللہ تعالیٰ نے کتاب کی جو ذمہ داری ڈالی ہے اور اس کے اظہار و اعلان، اس کی تعلیم و تبیین اور اس کے اجراء و نفاذ سے متعلق جو عہد اُن سے لیا اس کا کوئی جُز بھی انہوں نے پورا نہیں کیا بلکہ اُلٹا کتمان، نبذ کتاب اللہ وراء ظہورہم، تاویل، تحریف اور تصرفات جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب کیا اور کتاب اللہ کو اپنی دنیوی اغراض کے حصول کا ذریعہ بنایا لیکن اس کے باوجود ان کی خواہش یہ ہے کہ انہیں حامل کتاب سمجھا جائے۔ انہیں خدا کی برگزیدہ امّت قرار دیا جائے اور ان کو دُنیا و آخرت دونوں میں اللہ کے تمام فضل و انعام اور تمام لُطف و احسان کا حق دار مانا جائے ؎

اس ارشاد میں مسلمانوں کے لیے بھی بڑی عبرت ہے کہ با اُصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت

لے افادات شیخ الاسلام ؎ تدبر قرآن

اُمت کے مقام بلند سے گر کر ایک بے اُصول، ناقابلِ اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت کیش قوم کی سطح پر جانے کے باوجود اور انسان کی عبدیت اس کے خدا کے سامنے ذمّہ داری و جوابدہی اور وحی و تعلیماتِ پیغمبر کی دعوت کے علمبردار ہونے کے باوجود اس سے بیگانہ ہو کر ان قوموں کی اطاعت میں لذت محسوس کرنا جو دُنیا میں پیروئ نفس اور انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمّہ داری چاہتی ہیں۔ اور پھر اپنے آپ کو خیر اُمّت کہنا اور اللہ کے جملہ انعامات و احسانات کا اپنے کو مستحق سمجھنا بلاشبہ اس آیت گرامی کا مصداق ہے۔ غرض اگر کنتم خیر اُمّۃ نے یہ بتایا ہے کہ اُمت مسلمہ کا مقام کیا ہے اس آیت نے ساری دُنیا کو یہ حقیقت بھی سمجھا دی ہے کہ اس مقام کی وجہ سے اس کا وہ کام ہے جو اس کے سپرد کیا گیا ہے اگر وہ اس کام کو انجام دیتی ہے تو یقیناً خیر اُمت ہے اور اگر انجام نہیں دیتی ہے تو اگرچہ وہ خود اپنے کو خیر اُمّت کہے مگر فی الواقع یحبون ان یحمدوا بما لم یفعلوا کی واقعی تفسیر ہے۔

وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ۝ ع
اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاخْتِلَافِ الَّيْلِ وَالنَّهَارِ لَاٰيٰتٍ
لِّاُولِي الْاَلْبَابِ ۝ الَّذِيْنَ يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُوْدًا وَّعَلٰى
جُنُوْبِهِمْ وَيَتَفَكَّرُوْنَ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ رَبَّنَا مَا
خَلَقْتَ هٰذَا بَاطِلًا ۚ سُبْحٰنَكَ فَقِنَا عَذَابَ النَّارِ ۝ رَبَّنَآ اِنَّكَ مَنْ
تُدْخِلِ النَّارَ فَقَدْ اَخْزَيْتَهٗ ۭ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ۝
رَبَّنَآ اِنَّنَا سَمِعْنَا مُنَادِيًا يُّنَادِيْ لِلْاِيْمَانِ اَنْ اٰمِنُوْا بِرَبِّكُمْ فَاٰمَنَّا ڰ
رَبَّنَا فَاغْفِرْ لَنَا ذُنُوْبَنَا وَكَفِّرْ عَنَّا سَيِّاٰتِنَا وَتَوَفَّنَا مَعَ
الْاَبْرَارِ ۝ رَبَّنَا وَاٰتِنَا مَا وَعَدْتَّنَا عَلٰى رُسُلِكَ وَلَا تُخْزِنَا يَوْمَ
الْقِيٰمَةِ ۭ اِنَّكَ لَا تُخْلِفُ الْمِيْعَادَ ۝

زمین و آسمان کا مالک اللہ ہے اور اللہ کی قدرت کے احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں ہے[۳۴۵]۔ بلاشبہ آسمان و زمین کی پیدائش

ہیں اور رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں ارباب
دانش کے لیے بڑی نشانیاں ہیں[۳۴۶]۔ وہ ارباب دانش جو اٹھتے
بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں[۳۴۷] اور آسمان و
زمین کی خلقت میں غور و فکر کرتے ہیں[۳۴۸] (اس ذکر اور فکر کا نتیجہ
یہ ہے کہ وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں) خدایا یہ سب کچھ تو نے
فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے، تو پاک ہے اس سے
کہ عبث کام کرے خدایا ہمیں عذاب دوزخ سے بچا لیجیو[۳۴۹]،
خدایا جسے تو نے دوزخ میں ڈالا درحقیقت تو نے اسے بڑی
ہی خواری میں ڈالا اور ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا[۳۵۰]۔ خدایا
ہم نے ایک منادی کرنے والے کی پکار سنی جو ایمان کی طرف
آواز دے رہا ہے اور کہتا ہے کہ لوگو! اپنے پروردگار پر ایمان
لاؤ ہم نے اس کی دعوت ایمان قبول کر لی[۳۵۱]، خدایا بس تو ہمارے

قصوروں کو بخش دے، ہماری بُرائیاں مٹا دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ فرما[۳۵۲]۔ خدایا جو وعدے تو نے اپنے رسُولوں کی زبانی کیے ہیں وہ سب ہمیں عطا فرما اور روزِ قیامت ہمیں رُسوا نہ کر بے شک تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرنے والا نہیں ہے[۳۵۳]۔

اللہ کا ذکر اور کائنات میں فکر کلیدِ کامیابی ہے

اصلی مخاطب اہلِ ایمان ہیں پہلے ان سے کہا تھا کہ اقامتِ حق کی عظیم خدمت جو تم نے اپنے سر لی ہے۔ اس کے لیے تمہیں سر دھڑ کی بازی لگانی ہوگی اور اس راہ کی تمام آزمائشوں سے تمہیں گزرنا ہوگا۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ مخالفین کی جانب سے حالات کیسے ہی ناخوشگوار ہوں آسمان و زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کے زیرِ فرمان ہے اگر وہ تمہیں کامیابی عطا کرنا چاہے تو اس کی راہ کون روک سکتا ہے لیکن کامیابی کی شرط یہ ہے کہ راہِ حق میں استوار رہو۔ استواری اور استقامت کا سرچشمہ اللہ کا ذکر اور کائنات میں تفکر ہے۔ ذکر سے مقصود یہ ہے کہ اللہ کی یاد سے تمہارا دل خالی نہ ہے اور فکر سے مقصود یہ ہے کہ آسمان و زمین کی خلقت اور کائنات فطرت کے حوادث و مظاہر میں غور و فکر کرتے رہو۔ ذکر سے تمہارے دل کی غفلت دُور ہو گی فکر سے تم پر حقائق کی معرفت کے دروازے کھلتے جائیں گے۔ جن لوگوں کے دل غفلت سے پاک ہوتے اور کائنات میں تفکر کرتے ہیں ان پر یہ حقیقت کھل جاتی ہے کہ یہ تمام کارخانۂ ہستی اور اس کا عجیب و غریب نظام بغیر کسی اعلیٰ مقصد اور نتیجہ کے نہیں ہو سکتا اور ضروری ہے کہ انسان کی دنیوی زندگی کے بعد بھی کوئی دوسری زندگی ہو اور جو کچھ اس زندگی میں کیا جاتا ہے اس کے نتائج اس زندگی میں پیش آئیں۔

۲۴۵ - زمین وآسمان کا مالک اللہ ہے اور اللہ کی قدرت کے احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں ہے
یعنی جب زمین وآسمان میں اسی کی سلطنت ہے تو مجرم بھاگ کر پناہ کہاں لے سکتا ہے اور جو ہر چیز پر قادر ہے اس کے نفوذ و اختیار سے کون باہر ہو سکتا ہے[1] یہ اوپر والی دھمکی کی تصدیق و توثیق ہے مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کی بادشاہی خدا ہی کے اختیار میں ہے اس میں کسی اور کے زور واثر کا کوئی دخل نہیں ہے جو لوگ خدا سے سرکشی کر رہے ہیں وہ ہر وقت خدا کی مٹھی میں ہیں اور خدا ہر چیز پر قادر ہے[2] لہذا ایسے قادر مطلق کے عذاب سے چھٹکارا پانے کی کوئی سبیل نہیں اور خصوصاً جو گستاخ آسمان و زمین کے مالک کو فقیر کہتا ہو۔ ایسے گستاخ کی تو عذاب سے رہائی نہیں ہو سکتی کیونکہ جس کی سلطنت آسمان و زمین کو محیط ہو اس کا مجرم بھاگ کر آخر کہاں جائے گا[3]

اگرچہ سارے شارحین قرآن نے اس آیت کو قریب ترین فقرے ولهم عذاب الیم کے ساتھ مربوط کر کے یہی مطلب بتایا ہے جو آپ نے پڑھا ہے لیکن دراصل اس کا تعلق سباق میں اصل موضوع سے ہے اور سباق میں ان فی خلق السماوات کے لیے بمنزلہ دعویٰ ہے۔ سباق میں اصل موضوع یہ ہے کہ اہل ایمان کو طاغوتی قوتوں کے مقابلے میں ان کی بے بسی اور بے کسی کے پیش نظر تسلی دی جارہی ہے اور اسی تسلی کے سلسلے میں یہودیوں کی تاریخ سے ان خاص اطوار کا ذکر کیا ہے جن سے امت کو بچانا مقصود ہے۔ یہ آیت اپنے موضوع سے متعلق ہے گویا یوں کہا گیا ہے کہ اے اہل ایمان غمگین نہ ہو، کمزوری کا مظاہرہ نہ کرو۔ صبر کا دامن تھامے رکھو، متقیانہ سیرت اختیار کرو۔ اپنے عزائم میں پختگی پیدا کرو۔ نگاہ کو بلند تر رکھو۔ حق کو ڈنکے کی چوٹ کہو اور کسی کی وجہ سے کچھ مت چھپاؤ اور نہ حق کا کسی سے کوئی سودا کرو نہ اپنے اعمال پر اتراؤ اور نہ ان کاموں پر جو تم نہیں کرتے ستائش کے خواہاں ہو۔ تمہاری مہمات میں اللہ تمہیں کافی ہے۔ کیونکہ آسمان و زمین میں فرمانروائی اس کی ہے وہ جسے چاہتا ہے جو کچھ چاہتا ہے دیتا ہے۔ کوئی چیز اس کے احاطہ قدرت سے باہر نہیں ہے۔ جو لوگ تمہیں دبئیں گے خواہ وہ اہل کتاب ہوں یا مشرکین ان کے مقابلہ پر وہ ضرور تمہاری مدد کرے گا۔ سارے معاملات کا مرجع اللہ کی ذات ہے۔ اس طرح اس آیت کے ذریعے حضور انور اور اہل ایمان کو تسلی دی اور مدد کا وعدہ ہے اور نبوت کے مخالفین پر تعریض ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن [3] معارف م ا

یہ سورت کا خاتمہ ہے اور اس آیت کی حیثیت وہی ہے جو البقرہ میں و للہ ما فی السماوات و ما فی الارض کی ہے۔ دونوں سورتوں کا آغاز کتاب اللہ کے تعارف سے اور دونوں کا انجام اللہ سبحانہٗ کی ثناء و تمجید اور اہل ایمان کی دعا پر ہے۔ یہ آیت گرامی بھی یہاں اسی کی تمہید ہے اس لیے خاتمہ کی آیات کا ربط قریب نہیں بلکہ پوری سورت کے موضوع میں تلاش کرنا چاہیے۔

توحید خالقیت سے حاکمیت پر استدلال

۳۴۶۔ بلاشبہ آسمان و زمین کی پیدائش میں اور رات دن کے ایک کے بعد ایک آتے رہنے میں ارباب دانش کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ یعنی عقل مند آدمی جب زمین و آسمان کی پیدائش اور ان کے عجیب و غریب احوال و روابط اور دن رات کے مضبوط و محکم نظام میں غور کرتا ہے تو اس کو یقین کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا مرتب و منظم سلسلہ ضرور کسی مختار کل اور قادر مطلق فرمانروا کے ہاتھ میں ہے، جس نے اپنے عظیم ارادہ و اختیار سے ہر چھوٹی بڑی مخلوق کی حد بندی کر رکھی ہے۔ کسی چیز کی مجال نہیں کہ اپنے محدود دائرۂ عمل سے باہر قدم نکال سکے۔ اگر اس عظیم الشان مشین کا ایک پرزہ یا اس کارخانہ کا ایک مزدور بھی مالک علی الاطلاق کی قدرت و اختیار سے باہر ہوتا تو مجموعہ عالم کا یہ مکمل و محکم نظام ہرگز قائم نہ رہ سکتا[1]

یعنی ان نشانیوں سے ہر شخص بآسانی حقیقت تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ وہ خدا سے غافل نہ ہو اور آثار کائنات کو جانوروں کی طرح نہ دیکھے بلکہ غور و فکر کے ساتھ مشاہدہ کرے[2]

آسمان و زمین کی خلقت اور رات دن کی آمد و شد میں جو نشانیاں ہیں ان کی طرف یہاں صرف اجمالی اشارہ ہے ان کی تفصیل پورے قرآن میں پھیلی ہوئی ہے۔ قرآن نے بڑی وضاحت کے ساتھ گوناگوں پہلوؤں سے آفاق کی ان نشانیوں کو نمایاں کیا ہے جو شہادت دیتی ہیں کہ اس کائنات کے پیچھے صرف ایک عظیم طاقت ہی نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ عظیم حکمت بھی ہے۔ صرف بے پناہ قدرت ہی نہیں ہے بلکہ بے پایاں رافت و رحمت بھی ہے، صرف بے اندازہ کثرت ہی نہیں ہے بلکہ اس کثرت کے اندر نہایت حیرت انگیز توافق و توازن بھی ہے۔ یہ چیز ظاہر کرتی ہے کہ اس دنیا کا پیدا ہونا نہ تو کوئی اتفاقی سانحہ ہے نہ کھیل ہے بلکہ ایک قدیر حکیم عزیز و غفور اور

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن۔

سمیع و بصیر کی بنائی ہوئی دُنیا ہے۔ اس وجہ سے یہ بات اس کی فطرت کے خلاف ہے کہ یہ خیر و شر اور نیک و بد کے درمیان امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے یا یوں ہی تمام ہو جائے[1]

اللہ سبحانہ کے مالک و ملک ہونے کی پہلی دلیل یہ پیش فرمائی ہے کہ اس کائنات علوی اور سفلی کی تخلیق میں چونکہ اللہ کے سوا کسی کو دخل نہیں ہے نہ سوائے خدا کے یہ کسی نے بنایا ہے اس لیے اللہ کے سوا کوئی مالک اور ملک نہیں ہے۔

اور اللہ کے مالک و ملک ہونے کی دوسری دلیل یہ پیش فرمائی ہے کہ اللہ کی ذات صرف اس کائنات کی خالق ہی نہیں بلکہ اس کو چلانے والا بھی وہی ہے۔ یہ اسی کی ذات ہے جس نے رات اور دن کا نظام قائم کیا ہے۔ کبھی رات بڑی ہے دن چھوٹا ہے اور کبھی دن بڑا رات چھوٹی ہے۔ گویا تاریکی اور روشنی ہی کا اختلاف نہیں بلکہ تاریکی اور روشنی کی کمیت کا اختلاف اور اس اختلاف کے نتیجے میں موسمیاتی اختلاف بھی اسی کا قائم کردہ ہے۔ اس اختلاف میں حکمتِ الٰہی کی کتنی ہی نشانیاں موجود ہیں۔ یہ بات کہ شب و روز کی آمد و شد کی دو مختلف حالتیں ٹھہرا دی گئی ہیں اور وقت کی نوعیت ہر معین مقدار کے بعد بدلتی رہتی ہے زندگی کے لیے بڑی تسکین وہ و دلبستگی کا ذریعہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور وقت ہمیشہ ایک حالت پر رہتا تو دُنیا میں زندہ رہنا دشوار ہو جاتا۔ الغرض رات دن کا یہ اختلاف ایک بہت بڑی شہادت ہے اس بات کی کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا مالک اور ملک کوئی نہیں ہے۔

اربابِ دانش ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں

۱۹۱۔ وہ اربابِ دانش جو اُٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ یعنی کسی حال میں خدا سے غافل نہیں ہوتے۔ اس کی یاد ہمہ وقت ان کے دل میں اور زبان پر جاری رہتی ہے جیسے حدیث میں رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کی نسبت حضرت عائشہ صدیقہ نے فرمایا کہ کان یذکر اللہ علی کل احیانہ۔ نماز بھی خدا کی بہت بڑی یاد ہے اسی لیے آپ نے فرمایا کہ جو نماز کھڑے ہو کر نہ پڑھ سکے بیٹھ کر پڑھ لے اور جو بیٹھ کر نہ پڑھ سکے لیٹ کر پڑھ لے۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ جس رات یہ آیاتِ قرآنی نازل ہوئیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلّم کھڑے بیٹھے لیٹے،

---

[1] تدبر قرآن

ہر حال میں اللہ کو یاد کرکے رہتے تھے لے

جہاں تک ذکر الٰہی کا تعلق ہے وہ ہر حال میں مطلوب ہے اس کے لیے قیام وقعود، نرمی وگرمی اور صبح وشام کی کوئی قید نہیں ہے انسان کی مادی زندگی کے بقا کے لیے جس طرح سانس کی آمد ورفت ضروری ہے اسی طرح اس کی روحانی زندگی کے بقا کے لیے اللہ کی یاد ضروری ہے اور قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ اولوالالباب کی خاص اور اولین صفت یہی ہے کہ وہ اللہ کو یاد کرتے ہیں۔ ذکر ہی قرآن میں ان عبادات میں سے ایک عبادت ہے جس کی کثرت کا قرآن نے جگہ جگہ مطالبہ کیا ہے ظاہر ہے ذکر صرف زبان سے الفاظ ادا کرنے کا نام نہیں اس کے ساتھ دل کی معیت اور قلب کا حضور بھی ہونا چاہیے۔

قوانین طبعی اور قواعد تکوینی پر غور وفکر

۳۴۸۔ اور آسمان وزمین کی خلقت میں غور وفکر کرتے ہیں اور سمجھ جاتے ہیں کہ ان کو کسی بڑے علیم وحکیم اور قدرت والے نے بنایا ہے۔ آسمان وزمین میں غور وفکر کرنے سے ان کا مقصد اللہ سبحانہ کی معرفت حاصل کرنا ہے۔ اور جب مصنوعات میں غور وفکر کرنے سے خالق کی معرفت حاصل ہو جاتی ہے، اس کی عظمت اور اس کی عظیم قدرت اور علم وحکمت اسے معلوم ہو تی ہے اور اس کے عجائب قدرت کو دیکھ کر دل اس کی محبت اور عظمت سے لبریز ہو جاتا ہے تو اللہ سبحانہ کی تسبیح و تقدیس میں محو ہو جاتے ہیں۔ کائنات طبعی کے ان عظیم الشان موجودات کے قوانین طبعی اور قواعد تکوینی سے صانع اعظم وخالق عالم کی قدرت حکمت، صنعت پر استدلال کرتے رہنا عبادت ہے۔ قاضی بیضاوی نے اسے افضل العبادات بتایا ہے اور امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ فقرہ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ صدیقین کا بزرگ ترین مرتبہ اللہ کی ذات اور صفات کے دلائل پر غور وفکر کرنا ہے کاش آج ہمارے مفکرین، ماہر فن، فن ہیئت فلکیات ارضیات وغیرہ علوم طبعی پر قرآنی نقطہ نظر سے قلم اٹھاتے۔

قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ہدایت وسعادت کی راہ عقل وتفکر کی راہ ہے۔ اور گمراہی وشقاوت کا سرچشمہ جہل وکوری اور حواس وتفکر کو بیکار کر دینا ہے۔ جو لوگ خدا کی دی

لے افادات شیخ الاسلام

ہوئی عقل سے کام نہیں لیتے یا ہوائے نفس سے اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ذہن و ادراک کی قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے تفکر کی جگہ جگہ دعوت دی ہے یہاں آسمان و زمین کی خلقت میں تفکر کا تذکرہ ہے۔ دوسرے موقعہ پر خود اپنے اندر تفکر کرنے کی تلقین ہے اولم یتفکروا فی انفسھم کہیں آیاتِ تکوینی میں تفکر کی دعوت ہے ان فی ذالک لآیات لقوم یتفکرون اور کبھی آیاتِ تشریعی میں تفکر کا مطالبہ ہے۔ کذالک یبین اللہ لکم الآیات لعلکم تتفکرون کہیں احوال و ظروف پر تفکر کا حکم ہے اولم یتفکروا ما بصاحبھم من جنۃ اور کہیں فرمایا ہے کہ اغراض و خواہشات سے پاک ہو کر تفکر کرو۔ الگ الگ بھی نیک نیتی کے ساتھ اور دو دو چار چار آدمی بھی سر جوڑ کر تفکر کریں ان تقوموا للہ مثنی و فرادی ثم تتفکروا۔

یہاں قرآن نے تفکر سے پہلے ذکر لا کر اشارہ کر دیا کہ جس عقل میں ذکر کی نورانیت نہ ہو اور وہ یادِ الٰہی سے بیگانی ہو اس کا تفکر مقصودِ قرآن نہیں اور نہ قرآن کی نظر میں وہ اولوالالباب یعنی اربابِ دانش ہیں قرآن کے اولوالالباب وہ ہیں جو اللہ کو یاد کرتے ہوئے تفکر سے کام لیتے ہوں۔ مناطقہ تو فکر کی یہ تعریف کرتے ہیں کہ جانی ہوئی باتوں کو اس انداز سے ترتیب دینا کہ انجان بات کا پتہ لگ جائے۔ ظاہر ہے کہ اس معنے کے اعتبار سے تفکر کی وسعتوں میں صرف وہ ہی چیزیں آ سکتی ہیں جن کی قلب میں تصویر آ سکے۔ اسی لیے ارشاد ہے کہ اللہ کے انعامات میں تفکر کرو خود اللہ میں تفکر نہ کرو۔ کیونکہ فکرِ انسانی میں اللہ کی ذات کا کوئی تصور نہیں لیکن عرفا کی اصطلاح میں تفکر نام ہے مطلوب کی تلاش کی خاطر قلب کو مطلوب کی طرف متوجہ کرنے کا۔ اور شیخ اسمٰعیل بروی نے تفکر کی بڑی لفظی تعریف کی ہے کہ فکرِ انسانی کا مقصود کی تلاش میں لگ جانا۔ اللہ سبحانہ کی خلقت میں تفکر، اللہ سبحانہ کی توحید میں تفکر، اعمال و احوال کے معانی میں تفکر، علم و معرفت میں تفکر، طلب و ارادہ میں تفکر، منافع اور مضار کے معلوم کرنے کی راہ میں تفکر، تفکر کی بھی چھ قسمیں ہیں اور ابن القیم لکھتے ہیں یہی مجال افکار العقلا اہلِ دانش کی فکری جولانگاہ اسی میں ہوتی ہے۔

اہلِ ذکر و فکر کا تاثر

۳۴۹ - اس ذکر و فکر کا نتیجہ یہ ہے کہ وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں خدایا یہ سب کچھ تو نے

فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے۔ تو پاک ہے اس سے کہ عبث کام کرے۔ یعنی ذکر و فکر کے بعد کہنے لگے کہ خداوندا یہ عظیم الشان کارخانہ آپ نے بیکار پیدا نہیں کیا جس کا کوئی مقصد نہ ہو۔ یقیناً ان عجیب و غریب حکیمانہ انتظامات کا سلسلہ کسی عظیم و جلیل نتیجہ پر منتہی ہونا چاہیے گویا یہاں سے ان کا ذہن تصورِ آخرت کی طرف منتقل ہو گیا جو فی الحقیقت دُنیا کی موجودہ زندگی کا آخری نتیجہ ہے۔ اسی لیے آگے دوزخ کے عذاب سے محفوظ رہنے کی دُعا کی اور درمیان میں خدا کی تسبیح و تنزیہ بیان کر کے اشارہ کر دیا کہ جو احمق قدرت کے ایسے اوصاف و صریح نشان دیکھتے ہوئے تجھ کو نہ پہچانیں یا تیری شان کو گھٹائیں یا کارخانہ عالم کو محض عبث و لعب سمجھیں۔ تیری بارگاہ ان سب کی خرافات سے پاک ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین اور دیگر مصنوعاتِ الٰہیہ میں غور و فکر کرنا وہ ہی محمود ہو سکتا ہے جس کا نتیجہ اللہ کی یاد اور آخرت کی طرف توجہ ہو۔ باقی جو مادہ پرست ان مصنوعات کے تاروں میں الجھ کر رہ جائیں اور خالق کی صحیح معرفت تک نہ پہنچ سکیں خواہ دُنیا انہیں بڑا محقق اور سائنس داں کہے مگر قرآن کی زبان میں وہ اولوالالباب نہیں ہیں بلکہ پرلے درجے کے جاہل اور احمق ہیں[1]

مطلب یہ ہے کہ جب وہ نظامِ کائنات کا بغور مشاہدہ کرتے ہیں تو یہ حقیقت ان پر کھل جاتی ہے کہ یہ سراسر حکیمانہ نظام ہے اور یہ بات سراسر حکمت کے خلاف ہے کہ جس مخلوق میں اللہ نے اخلاقی حس پیدا کی ہو جسے تصرف کے اختیارات دیے ہوں، جسے عقل و تمیز عطا کی ہو اس سے اس کی حیاتِ دُنیا کے اعمال پر باز پرس نہ ہو اور لسے نیکی پر جزا اور بدی پر سزا نہ دی جائے۔ اس طرح نظامِ کائنات پر غور کرنے سے انہیں آخرت کا یقین حاصل ہو جاتا ہے اور وہ خدا کی سزا سے پناہ مانگنے لگتے ہیں[2]

شاہراہِ اعتدال

اس آیت نے افراط و تفریط کے درمیان دُنیا کے سامنے شاہراہِ اعتدال پیش کر دی ہے اب تک ایسا ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے کہ جب کسی قوم نے خدا کے ذکر کی طرف توجہ کی تو علوم و فنون سے غافل ہو گئی اور جب علوم و فنون کی طرف جھکے تو یادِ الٰہی سے بے رُخ ہو گئے چنانچہ مسیحیت اور یہودیت کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔ اول الذکر صرف یادِ الٰہی کے ہو کر رہ گئے جبکہ

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

آخرالذکر اللہ کو فراموش کر کے علوم و فنون کے ہو گئے اور اب دونوں میں خداگریز رجحانات اور دونوں خدانا شناس اور خدا کے کھلم کھلا باغیوں کی حیثیت میں دنیا کے سامنے ہیں۔ اس خدا فراموشی کا نتیجہ ہے کہ ان کی وساطت سے دنیا میں وطنیت، قومیت، مادیت اور لامذہبیت کی بیماریاں عام ہوتی جا رہی ہیں۔ یہ سب کچھ اس لیے ہو رہا ہے کہ تفکر کا رشتہ ذکر سے وابستہ نہیں رہا۔ اس اساس پر جو نظام حکومت قائم ہو رہا ہے اس کی حیثیت ایک محفوظ منظم ترقی یافتہ تجارتی ادارے کی ہوتی ہے۔ یہ حکومت بنیادی طور پر لوگوں کی نفع رسانی کے لیے نہیں بلکہ لوگوں کے استحصال کے لیے قائم ہوتی ہے۔ وہ سرے سے کوئی اخلاقی پیغام اور اصلاحی مقصد نہیں رکھتی ہے۔ نہ اس کے پیش نظر ملک یا قوم کی اخلاقی، روحانی ترقی، انسانوں کی ہدایت، انسانیت کی حقیقی فلاح و بہبود ہوتی ہے۔ قدرتی طور پر اس کی اصلی توجہ آمدنی کے ایسے ذرائع میں نفع اٹھانے کی تدابیر اور سرکاری محاصل و مطالبات کی طرف ہوتی ہے۔ اس غرض کے لیے وہ بے تکلف اخلاق و شرافت کے اصول کو نظر انداز کر دیتی ہے۔ اور اخلاقی تعلیمات و مصالح کو پس پشت ڈال دیتی ہے۔ جہاں کہیں اخلاقیات و مالیات کا تصادم ہوتا ہے وہاں وہ ہمیشہ مالیات کو ترجیح دیتی ہے۔ ہر مسئلہ میں اس کا نقطہ نظر معاشی و اقتصادی ہوتا ہے۔ اس طرز کی حکومت جو ذکر سے بیگانہ ہو کر صرف تفکر کی زمین پر بنتی، پلتی اور جوان ہوتی ہے۔ بداخلاقی و بےحیائی کی بہت سی قسموں کو کچھ قانونی قیود کے ساتھ جائز قرار دیتی ہے۔ عصمت فروشی کا پیشہ اس حکومت میں جائز ہوتا ہے۔ وہ خود وسیع پیمانے پر سودی کاروبار کرتی ہے۔ یہ صورت حال اس وقت ہوتی ہے جب قیادت ان لوگوں کے ہاتھوں میں ہوتی ہے جو ذکر سے بیگانہ ہو کر صرف فکر و فن کی تخلیق ہوتے ہیں۔

ان کے مقابلے میں وہ لوگ جو تفکر سے بیگانہ ہو کر ذکر سے اپنا رشتہ قائم رکھتے ہیں اس کے نتیجے میں خانگی زندگی کی بنیادیں متزلزل ہو جاتی ہیں۔ دلوں سے اعزہ کا احترام کافور ہو جاتا ہے۔ ماں باپ کے ساتھ شقاوت قلبی اور اعزہ و اقارب کے ساتھ احسان فراموشی کی جس کثرت سے ان راہوں میں نظیریں ملتی ہیں اس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ یہ زاہدان صحرا اور عابدان مرتاض اپنی ماؤں کی دل شکنی کرتے ہیں، بیویوں کے حقوق پامال کرتے ہیں۔ ان کا مقصود زندگی صرف یہ ہوتا ہے کہ خود ان کو نجات اخروی حاصل ہو جائے ان کو اس سے کوئی غرض نہیں کہ انسانیت جیتے یا مرے۔ تاریخ میں جو واقعات لکھے ہیں۔ ان کو پڑھ کر

آج بھی انسو نکل آتے ہیں۔ عورتوں کے سائے سے وہ بھاگتے ہیں۔ ان کا سایہ پڑ جانے سے اور راستہ میں اتفاقاً سامنا ہو جانے سے وہ سمجھتے تھے کہ ساری عمر کی عبادت اور خدا کی یاد خاک میں مل جاتی ہے۔ اپنی ماؤں، بہنوں، بیویوں سے بات کرنا بھی وہ گناہ کبیرہ سمجھتے ہیں۔

وہ ارباب تفکر تھے اور یہ اصحاب ذکر۔ قرآن نے اس افراط و تفریط کے درمیان شاہراہ اعتدال پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ ارباب دانش نہ یہ ہیں اور نہ وہ۔ بلکہ ارباب دانش قرآن کے نقطہ نظر سے وہ ہیں جو ذکر اور فکر دونوں میں ہم آہنگی رکھیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسا قرآن نے البقرہ میں خدا کے یاد کرنے والوں کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک وہ ہیں جو کہتے ہیں ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حسنۃ و قنا عذاب النار اور ایک وہ ہیں جو کہتے ہیں آتنا فی الدنیا۔ یہاں قرآن نے اپوزیشن کا ذکر نہیں کیا بلکہ مطلوب مقصود کی تصریح کر دی ہے یعنی ان ارباب دانش کا جو ذکر اور فکر دونوں کو تھام کر چلیں۔ اور قرآن نے اسی پر مبنی متوازن انسانی مجموعہ کو اُمت وسط اور خیر اُمت کہا ہے۔ یہ ذکر اور فکر کی ہم آہنگی ہے کہ اس خیر اُمت نے اپنی تہذیب کی خود بنیاد ڈالی تھی حکومت کی نیو اٹھائی حالانکہ اس کو اس سے پہلے کبھی تجربہ نہ تھا۔ اس کے باوجود اس کو ذرا ضرورت پیش نہ آئی کہ کسی قوم سے کوئی آدمی مستعار لے یا کسی انتظام میں کسی حکومت سے مدد چاہے ان ارباب ذکر و فکر نے ایسی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ جس کا سکہ دو براعظموں کے وسیع رقبے میں چلتا تھا۔ اس کے ہر شعبے اور ہر ضرورت کے لیے متعدد آدمی ایسے ملے جو اپنی لیاقت کارکردگی امانت و دیانت قوت و احساس ذمہ داری بے نظیر تھے۔ یہ عالمگیر سلطنت قائم ہوئی تو اسی خیر اُمت نے اس کو پورے فکر و فن کے آدمی فراہم کیے جن میں کوئی عادل حاکم تھا۔ کوئی امانت دار، خازن، کوئی منصف قاضی تھا اور کوئی عبادت گزار قائد اور کوئی متقی فوجی تھا۔ ذکر و فکر پر مبنی اس تربیت کی برکت سے جس کا کام مسلسل جاری تھا اور اس اسلامی دعوت کی مدد سے جو مستقل چل رہی تھی۔ اس اسلامی حکومت کو اہل ترین خدا ترس، فرض شناس و مستعد کارکن ملتے تھے۔ حکومت کی ذمہ داری ان ہی اشخاص کے سپرد کی جاتی جو ذکر و فکر کے جامع ہوتے جو اپنے کو بجائے تحصیلدار کے داعی سمجھتے جن کی شخصیت میں صلاحیت و صلاح اور ذکر و فکر کا صحیح امتزاج ہوتا۔

دوزخ کا عذاب سراسر رسوائی ہے

۳۵۰۔ خدایا جسے تو نے دوزخ میں ڈالا درحقیقت تو نے اسے بڑی خواری میں ڈالا اور

ایسے ظالموں کا کوئی مددگار نہ ہوگا۔ جو شخص جتنی دیر دوزخ میں رہے گا اسی قدر رسوائی سمجھو۔ اس قاعدے سے دائمی عذاب صرف کفار کے لیے ہے جن آیات میں عام مومنین سے خزی و رسوائی کی نفی کی گئی ہے وہاں یہی معنے سمجھنے چاہئیں[1]۔ اور جس کو خدا دوزخ میں ڈالنا چاہے کوئی حمایت کرکے بچا نہیں سکتا۔ ہاں جن کو ابتدا میں یا آخر میں چھوڑ دینا اور معاف کر دینا ہی منظور ہوگا جیسے عصاۃ مومنین کو ان کے لیے شفعاء کو اجازت ہوگی کہ شفاعت کرکے بخشوائیں وہ اس کے مخالف نہیں ہے بلکہ آیات و احادیث صحیح سے ثابت ہے۔ گویا دعا کے اس مرحلے پر پہنچ کر دعا مانگنے والا رب جلیل کی شاہانہ ہیبت و جلال کا آنکھوں سے مشاہدہ کرتا ہے اور مشاہدے کی اس کیفیت میں اسے اس قدر استغراق ہو جاتا ہے کہ اسے یہ یقین ہو جاتا ہے کہ اس ذات کے خلاف کہیں استغاثہ نہیں ہو سکتا۔ جس سے وہ ناراض ہو اس کا بس اس کے علاوہ کہیں ٹھکانا نہیں۔ مشاہدے کی اسی کیفیت کا اظہار وہ اس طرح کرتا ہے کہ بات ربنا سے شروع کرتا اور کمال یقین کو ان لگا کر ظاہر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ جسے تو جہنم میں داخل کرے گا اس کے لیے رسوائی ہی رسوائی ہے۔ حکماء اسلام نے آیت سے یہ لطیف استنباط کیا ہے کہ عذاب روحانی عذاب جسمانی سے بھی بڑھ کر زبردست و شدید ہے۔ کیونکہ قرآن نے رسوائی کا ذکر عذاب دوزخ کے بعد کیا ہے اور دوزخ میں داخل ہونے والوں کو ظالم کہہ کر ایک طرف ان کے اعمال کی شفاعت پر تعریض کی ہے اور دوسری طرف ان کے جہنم میں جانے کی علت بتا دی ہے۔

ظالم ہر وہ شخص ہے جو جادۂ اعتدال سے ہٹ جائے اور صراط مستقیم کو چھوڑ دے۔ لہذا ہر ظالم کو سزا اس کے ظلم کے مطابق دی جائے گی۔ یہاں اس کہنے میں شاید کوئی معنویت نہیں ہے کہ ظالم سے مراد کافر ہے جیسا کہ نسفی اور قرطبی نے نکتہ آفرینی کی۔ جیسے یہ کہنا معقول ہے کہ جتنی دیر دوزخ میں رہے گا اتنی ہی رسوائی ہوگی ایسے ہی یہ بھی معقول ہے کہ جس قدر ظلم کی مقدار ہوگی۔ اسی کے مطابق دوزخ میں رہے گا اور ظلم ہی کی مقدار کے پیش نظر شفاعت بھی ہوگی۔ قرآن میں گنہگاروں کو بھی ظالم کہا ہے فمنهم ظالم لنفسه اور دوسرے مواقع پر بھی ظالم کا اطلاق عاصی پر ہوا ہے۔

ایمان کی منادی

۱۹۳۔ خدایا ہم نے ایک منادی کرنے والے کی پکار سنی جو ایمان کی طرف آواز دے رہا تھا اور کہہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رہا تھا کہ لوگو! اپنے پروردگار پر ایمان لاؤ ہم نے اس کی دعوتِ ایمان قبول کر لی۔ یعنی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جنہوں نے بڑی اونچی آواز سے دنیا کو پکارا یا قرآن حکیم جس کی آواز گھر گھر میں پہنچ گئی۔ پہلے ایمان عقلی کا ذکر تھا۔ یہ ایمان سمعی ہوا جس میں ایمان بالرسول اور ایمان بالقرآن بھی داخل ہو گیا[1] مطلب یہ ہے کہ یہی مشاہدہ ان کو اس بات پر مطمئن کر دیتا ہے کہ پیغمبر اس کائنات اور اس کے آغاز و انجام کے متعلق جو نقطۂ نظر پیش کرتے ہیں اور زندگی کا جو راستہ بتاتے ہیں وہ سراسر حق ہے[2]

آیت میں منادی سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی ہے اور آپ کی ذات کے لیے یہاں یہ تعبیر آپ کی دعوت کی عظمت اور بزرگی ظاہر کرنے کے لیے اختیار کی گئی۔ اگر منادی سے آپ کی ذات ہی مراد ہے تو پھر آیت میں اہلِ دانش اور اولوالالباب کا حضرات صحابہ اولین مصداق ہیں جنہوں نے آپ کی دعوت کو بلاواسطہ سُنا اور سننے کے بعد شرفِ پذیرائی عطا فرمایا اور صحابہ ہی کا ایمانی مقام ظاہر کرنے کے لیے فَاٰمَنَّا کی پیشانی پر حرف فا لگایا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ صحابہ کرام نے ذکر و فکر کے بعد ایمان کی دعوت کو اپنانے میں دیر نہیں کی بلکہ فوری طور پر نبوت کی دعوتِ ایمانی کا استقبال کیا۔ صحابہ نے حضور کی دعوتِ ایمانی کو مخاطب اول ہونے کی وجہ سے بلاواسطہ سُنا ہے اور صحابہ کے علاوہ تمام اُمت نے حضور کی دعوتِ ایمانی کو بالواسطہ سُنا ہے۔ امام رازی اور آلوسی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی خوب کی ہے کہ منادی اور اس کے ساتھ اس کے فعل ینادی کا اجتماع حضورِ انور کی شانِ گرامی کو ظاہر کر رہا ہے کیونکہ صرف منادی سے یہ پتہ نہیں چلتا تھا کہ پکارنے والا کا ہے کو پکار رہا ہے۔ فعل لا کر بتا دیا کہ یہ جنگ کی منادی نہیں، قومیت اور وطنیت کی منادی نہیں، آگ بجھانے یا اور کسی کام کی منادی نہیں بلکہ ایمان کی منادی ہے۔ کمالاتِ انسانی کی منادی ہے۔ یہ منادی نبوت کی کنجی ہے جس سے محمد رسول اللہ نے انسانی فطرت کے بند تالے کھولے ہیں اور اس کے ذریعے اٰمنّا کہنے والوں کو دُنیا کی قوموں پر نگراں اور اتالیق مقرر کیا ہے اور اب وہ اس پر مامور ہیں کہ قوموں کی رفتار سیرت و اخلاق اور رجحانات کا جائزہ لیتے رہیں جو راہِ راست سے ہٹ جائے اس کو صراطِ مستقیم پر لگائیں، جو اعتدال سے بڑھ جاتے اس میں اعتدال پیدا کریں، کجی کو دُور کرتے رہیں، رخنوں کو بھرتے رہیں، کمزور کو طاقتور سے اس کا حق دلائیں۔ مظلوم کا ظالم سے انصاف کرائیں اور خدا کی زمین میں انصاف و امن قائم رکھیں آمنوا بربکم فاٰمنّا

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

سے امام منصور ماتریدی نے یہ نکتہ خوب نکالا ہے کہ اپنے ایمان کو انشاء اللہ کے ساتھ مقید و مشروط کرنا درست نہیں ہے۔

بخشش کی طلبگاری

۳۵۲۔ خدایا بس تو ہمارے قصوروں کو بخش دے۔ ہماری برائیاں مٹا دے اور ہمارا خاتمہ نیک لوگوں کے ساتھ فرما یعنی ہمارے بڑے گناہ بخش دے اور چھوٹی موٹی برائیوں پر پردہ ڈال دے اور جب اٹھانا ہو تو نیک بندوں کے زمرے میں شامل کر کے دنیا سے اٹھا لیجئے اس دعا کے آخری فقرے میں اللہ کے وفادار بندوں کے زمرے میں شامل کیے جانے کی تمنا کا اظہار ہے یعنی جب ہمارا خاتمہ ہو تو ہمیں ان کی معیت نصیب فرما جو آخر دم تک تیرے عہد و پیمان پر مضبوط رہے۔ لفظ بر پر ہم پارے کے آغاز میں بحث کر چکے ہیں کہ اس لفظ کی اصلی رُوح وفاداری، پابندی عہد و میثاق اور ادائے حقوق و فرائض ہے۔ اس پہلو سے غور کیجئے تو یہاں ان اہلِ کتاب پر لطیف تعریض ہے جن سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تائید و حمایت کا عہد لیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس عہد کے برخلاف سارا زور اس کی مخالفت میں صرف کر دیا [۱]

ہمیں اپنے وعدوں کا مصداق بنا دے

۳۵۳۔ خدایا جو وعدے تو نے اپنے رسولوں کی زبانی کیے ہیں وہ سب ہمیں عطا فرما اور روزِ قیامت ہمیں رُسوا نہ کر بے شک تو اپنے وعدے کی خلاف ورزی کرنے والا نہیں ہے۔ یعنی اپنے پیغمبروں کی تصدیق کرنے پر جو وعدے آپ نے کیے ہیں مثلاً دنیا میں اللہ کے دشمنوں پر آخر کار منصور و غالب کرنا اور آخرت میں جنت و رضوان سے سرفراز فرمانا ان سے اس طرح بہرہ اندوز کیجئے کہ قیامت کے دن ہماری کسی قسم کی ادنیٰ سے ادنیٰ رُسوائی بھی نہ ہو۔ اور آپ کے ہاں تو وعدہ خلافی کا احتمال نہیں، ہم میں احتمال ہے کہ مبادا ایسی غلطی کر نہ بیٹھیں جو آپ کے وعدوں سے مستفید نہ ہو سکیں۔ اس لیے درخواست ہے کہ ہم کو ان اعمال پر مستقیم رہنے کی توفیق دیجئے جس کی آپ کے وعدوں سے متمتع ہونے کے لیے ضرورت ہے۔ گویا انہیں

[۱] افادات شیخ الاسلام [۲] تدبر [۳] افادات شیخ الاسلام

اس امر میں تو شک نہیں ہے کہ اللہ اپنے وعدوں کو پورا کرے گا یا نہیں۔ البتہ تردد اس میں ہے کہ آیا ان وعدوں کے مصداق ہم بھی قرار پاتے ہیں یا نہیں، اس لیے وہ اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ ان وعدوں کا ہمیں مصداق بنا دے اور ہمارے ساتھ انہیں پورا کر کہیں ایسا نہ ہو کہ دنیا میں تو ہم پیغمبروں پہ ایمان لا کر کفار کی تضحیک اور طعن و تشنیع کے ہدف بنے ہی ہیں۔ قیامت میں بھی ان کافروں کے سامنے ہماری رسوائی ہو اور وہ ہم پر پھبتی کسیں کہ ایمان لا کر بھی ان کا بھلا نہ ہوا[1]

---

[1] تفہیم القرآن

فَاسْتَجَابَ لَهُمْ رَبُّهُمْ أَنِّي لَا أُضِيعُ عَمَلَ عَامِلٍ مِّنكُم مِّن ذَكَرٍ أَوْ
أُنثَىٰ ۖ بَعْضُكُم مِّن بَعْضٍ ۖ فَالَّذِينَ هَاجَرُوا وَأُخْرِجُوا مِن
دِيَارِهِمْ وَأُوذُوا فِي سَبِيلِي وَقَاتَلُوا وَقُتِلُوا لَأُكَفِّرَنَّ عَنْهُمْ
سَيِّئَاتِهِمْ وَلَأُدْخِلَنَّهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ
ثَوَابًا مِّنْ عِندِ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ عِندَهُ حُسْنُ الثَّوَابِ ﴿١٩٥﴾

ان کے رب نے ان کی دعاؤں کو یہ کہہ کر شرف قبولیت بخشا کہ میں تم میں سے کسی کے عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو[۲۵۴] لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو میری راہ میں اپنے گھر سے نکالے گئے اور ستائے گئے اور میری خاطر لڑے اور مارے گئے[۲۵۵] ان کے سب قصور معاف کر دوں گا اور ان کو ایسے باغات میں داخل کر دوں گا جن کے

نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کا ثواب ہوگا [356]

اور بہترین جزا اللہ کے پاس ہے۔ [357]

راہِ حق میں قربانیاں اور اللہ کے یہاں ان کا مقام

اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتا۔ عمل حق ایک ایسی حقیقت ہے جو ضائع ہو ہی نہیں سکتی جو لوگ حق پرستی کی راہ میں طرح طرح کی مصیبتیں برداشت کر رہے ہیں۔ وہ یقین رکھیں کہ ان کے اعمال کے ثمرات کبھی ضائع ہونے والے نہیں ہیں اور جس طرح سچا ایمان اور اس کے مطابق قربانی آخرت کی فلاح کے لیے ضروری ہے اسی طرح دنیا کی فلاح کے لیے بھی ضروری ہے۔ یعنی دنیوی برکتوں کے دروازے اہل ایمان پر اس وقت کھولے جاتے ہیں۔ جب وہ ایمان و عمل کی شرط پوری کرتے ہیں یعنی جہاں اللہ سبحانہ کا یہ ایک عمومی وعدہ ہے کہ وہ اپنے دین کے ماننے والوں کو اخروی فلاح کے ساتھ دنیوی فلاح سے بھی نوازتا ہے۔ جیسا یہاں لادخلنھم جنات سے پہلے لاکفرن عنھم سیاتھم کا اشارہ بتا رہا ہے وہاں اللہ کا یہ بھی ایک عمومی ضابطہ ہے کہ یہ ایمان و عمل کی لازمی شرط کے ساتھ مشروط ہے جیسا کہ ہجرت، ایذا، مقاتلہ اور قتل کے الفاظ سے مترشح ہو رہا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان اور اس کے تقاضوں کو پورا کیے بغیر صرف آخرت ہی کی نہیں دنیا کی بھی فلاح ہاتھ نہیں آسکتی۔ دین کے بغیر صحیح معنے میں اہل ایمان کو دنیا بھی نہیں مل سکتی۔ یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے۔ کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ افراد کو بھی اپنی انفرادی زندگیوں کی دنیوی فلاح مثلاً امن و سکون، عزت و محبوبیت اسی وقت ملے گی جب وہ اپنی حد تک ایسے خداشناس ہوں اور آخرت پسند ہوں جیسا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ایک ارشادِ گرامی میں اسی حقیقت کی وضاحت فرمائی ہے:

جس نے اپنی کل کی فکر ایک ہی فکر یعنی آخرت کی فکر کو بنا لیا اللہ تعالیٰ اس کو کل دنیا کا انتظام کر دینے کے لیے کافی ہے اور جس کے ذہن کو بے شمار افکارِ دنیا نے

منتشر کر رکھا ہو اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ اس دُنیا کی کس گھاٹی میں ہلاک ہوتا ہے۔
(ابن ماجہ)

ایک اور ارشادِ نبوی اس موضوع پر پوری صراحت سے ہماری رہنمائی کرتا ہے :

جو شخص آخرت کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے اللہ تعالیٰ اس کے معاملات کو درست کر دیتا ہے اور اس کے دل کو غنی بنا دیتا ہے اور دُنیا تابع فرمان بن کر اس کے حضور کھڑی ہوتی ہے۔ (ابن ماجہ)

اسی طرح اُمت کو بھی اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح اسی وقت میسّر آسکتی ہے جب اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع وہ اُمت ہو، جس کا چہرہ قرآن ان آیات میں پیش کر رہا ہے۔ اس معاملہ میں اس اُمت کو دوسری قوموں پر قیاس کرنا صحیح نہ ہوگا۔ دوسری قومیں اپنی ساری نافرمانیوں کے باوجود اونچے سے اونچا اقتدار حاصل کر سکتی ہیں لیکن اُمتِ مسلمہ کے لیے اس طرح کا کوئی امکان نہیں ہے۔ اس کے لیے عزت واقتدار پانے کی بس ایک ہی راہ ہے اور وہ ہے ایمان کی راہ، اللہ کی فرمانبرداری، قربانیوں کی راہ اور دُنیا میں شہادتِ حق کی صراطِ مستقیم۔

دُعاؤں کی قبولیت کی بشارت

۳۵۴۔ ان کے رب نے ان کی دُعاؤں کو یہ کہہ کر شرفِ قبولیت بخشا کہ میں تم میں سے کسی کے عمل کو ضائع کرنے والا نہیں ہوں خواہ مرد ہو یا عورت تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو یعنی مرد ہو یا عورت ہمارے یہاں کسی کی محنت ضائع نہیں جاتی۔ جو کام کرے گا اس کا پھل پائے گا۔ یہاں عمل شرط ہے نیک عمل کر کے ایک عورت بھی اپنی استعداد کے مطابق آخرت کے وہ درجات حاصل کر سکتی ہے جو مرد حاصل کر سکتے ہیں۔ جب تم مرد و عورت ایک نوعِ انسانی کے افراد ہو، ایک آدم سے پیدا ہوتے ایک رشتہ ایمانی میں منسلک ہو، ایک اجتماعی زندگی اور امورِ معاشرت میں شریک رہتے ہو تو اعمال کے نتائج اور ان کے ثمرات میں بھی لینے کو ایک ہی سمجھو۔ روایات میں ہے کہ ام سلمہؓ نے عرض کیا تھا یا رسول اللہ قرآن میں کہیں ہم عورتوں کی ہجرت وغیرہ اعمالِ حسنہ کا بالتخصیص ذکر نہیں آتا۔ اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

گویا تم سب انسان ہو اور میری نگاہ میں یکساں ہو۔ میرے یہاں دستور نہیں ہے کہ عورت اور مرد، آقا اور غلام، کالے اور گورے، اونچ اور نیچ کے لیے انصاف کے اصول اور فیصلے کے معیار الگ الگ ہوں۔[1]

ایمان و عمل میں عورت کا مقام

لاوضح لاکر بتا دیا ہے کہ عمل پر ثمرات و نتائج کا مرتب کرنا محض اللہ کے قبضے میں ہے بعضکم من بعض یہ تصریح ہے اس بات کی کہ انسانیت مرد و عورت میں مشترک ہے اس لیے حکم بھی دونوں کا مشترک ہے۔ دونوں جنسوں کے درمیان اشتراک انسانیت کی یہ تعلیم ساتویں صدی میں قرآن دے رہا ہے جبکہ انگلستان اور ہندوستان دونوں جگہ عورت ہونا خود ایک جرم تھا اور عورت کا وجود گندگی کے مرادف تھا۔ عورت غریب محض اس لیے کہ عورت تھی درجات سے اعمال کے ثوابوں سے محروم تھی اس گمراہی کو مٹانے کے لیے قرآن نے صراحۃً بتا دیا ہے مرد و عورت ہونے کا عمل اور اجر عمل پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نماز اس کی بھی قبول اور اس کی بھی، روزہ، زکوٰۃ، حج اور تمام اعمال کا یہی حال ہے۔ دراصل ساتویں صدی مسیحی میں جب قرآن نے یہ آواز بلند کی تو دنیا اس حقیقت سے یک قلم ناآشنا تھی کہ مردوں کے مقابلے میں عورتوں کے اعمال بھی قابل پذیرائی ہو سکتے ہیں۔ منو کے قانون نے عورت کی ہستی صرف اس شکل میں دیکھی تھی کہ وہ مرد کے لیے اولاد کی پیدائش کا ذریعہ ہے اور اس کی نجات اس پر موقوف ہے کہ مرد کی خدمت گزاری میں اپنی زندگی فنا کر دے۔ یہودی قانون عورت کو مرد کی جائداد تصور کرتا تھا اور خاندانی زندگی میں اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔ مسیحی کلیسا کا فیصلہ یہ تھا کہ انسان ہونے کی حیثیت سے مرد و عورت یکساں نہیں ہیں انسان صرف مرد ہے اور عورت میں انسانی رُوح کی جگہ ایک دوسری رُوح بولتی ہے۔ رومی قانون نے بھی عورت کی جگہ مرد سے بدرجہا نیچی رکھی۔ لیکن قرآن نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ انسانیت دونوں کا مشترکہ سرمایہ ہے اور انسان ہونے میں دونوں برابر ہیں بعضکم من بعض مرد ہو یا عورت سب ایک دوسرے کی جنس ہیں اور عمل کے نتائج کا قانون سب کے لیے یکساں ہے۔ قرآن نے یہ ایک فقرہ بول کر انسان کی معاشرتی زندگی میں سب سے بڑے انقلاب کا اعلان کر دیا۔

---

[1] تفہیم القرآن

البقرہ میں قرآن نے عورتوں اور مردوں کے حقوق میں مساوات کا اعلان کیا تھا اور اس آیت میں دونوں کے ایمان وعمل اور اجر و ثواب میں برابری کا۔

انفرادی زندگی کے اعمال

چونکہ قرآن انفرادی اور اجتماعی زندگی کی دنیوی اور اخروی فلاح کا منشور ہے اس لیے وہ فرد اور اجتماع دونوں کو مخاطب کرتا ہے۔ اس آیت کرامی نے پہلے فرد کی دنیوی اور اخروی فلاح کی دستوری دفعہ بتائی ہے کہ ایمان و عمل کے میدان میں ہر فرد ایک ذمہ دار ہستی ہے سے دنیا میں ایمان و عمل کا سرمایہ فراہم کرنا اور آخرت میں خدا کے حضور جوابدہ ہونا ہے۔ اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ہر فرد کو اپنی عملی زندگی میں کچھ اختیارات ہوں جن سے کام لیتے ہوئے وہ اپنی دنیا اور عافیت سنوار سکے۔ ہر فرد کو وہ وسائل حاصل ہونے چاہئیں جو زندگی کو قائم رکھنے ترقی دینے اس کا تزکیہ کرنے میں اس کے مددگار ہو سکیں۔ اسی طرح ہر فرد اس کا حق رکھتا ہے کہ وہ اپنے ماحول کی تشکیل اجتماعی اداروں کے قیام اور ان کی مصالح جیسے اہم امور میں دخل دے ان امور میں سارے افراد کی حیثیت مساوی ہے۔ مرد و عورت سب ان ابتدائی، تمدنی اور معاشرتی اعمال میں یکساں شریک ہیں۔ اس آیت میں اسی دستوری دفعہ کو واضح کیا گیا ہے۔

اجتماعی زندگی کے اعمال

۳۵۵ - لہٰذا جن لوگوں نے میری خاطر اپنے وطن چھوڑے اور جو گھر سے بے گھر کیے گئے اور جن کو میری راہ میں تکلیفیں دی گئیں اور میری خاطر لڑے اور میرے لیے مارے گئے۔ یعنی جب کسی عمل کرنے والے کا چھوٹا موٹا عمل بھی ضائع نہیں ہوتا تو پھر ان مردان خدا کا پوچھنا ہی کیا ہے؟ جنہوں نے کفر و عصیان چھوڑنے کے ساتھ دار الکفر بھی چھوڑ دیا۔ وطن خویش اقارب، اہل و عیال اور مال و منال سب کو خیر باد کہہ دیا اور دارالاسلام کی طرف نکل کھڑے ہوتے، کفار نے ان پر وہ ظلم توڑے کہ گھروں میں بیٹھنا محال ہو گیا۔ وطن چھوڑنے اور گھر بار ترک کرنے پر بھی دشمنوں نے چین نہ لینے دیا۔ طرح طرح کی ایذائیں پہنچاتے رہے اور یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ وہ میرا نام لیتے تھے اور میرا کلمہ پڑھتے تھے۔ یخرجون الرسول و ایاکم ان تومنوا باللہ ربکم اور و ما نقموا منھم الا ان یومنوا باللہ العزیز الحمید آخر وہ میرے راستہ میں

لڑے اور لڑ کر جان دے دی[1]

اس آیت میں بتایا ہے کہ افراد اجتماع کا اصل سرمایہ ہیں انہی کے سد پار پر اجتماع کی صالحیت کا انحصار ہے اور ان ہی کی کامیابی اجتماع کا مقصود ہے۔ افراد جب مل جل کر کام کرتے ہیں تو اس سے ہیئت اجتماعی وجود میں آتی ہے اور قرآن کے نزدیک اجتماع ایک بامقصد ہیئت ہے۔ اس کے مقاصد اور مزاج کا مطالعہ بتاتا ہے کہ فرد و اجتماع کے مابین کسی ٹکراؤ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اجتماعیت افراد ہی کے مقاصد کی تکمیل کا ذریعہ ہے۔ افراد اس کے ذریعے اپنے مشترکہ مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اجتماع فرد کے لیے رحمت ہے کہ یہ ہر فرد کی تمام مادی اور روحانی مفادات کا نگران و محافظ اور ان کی ترقی اور تزکیہ کا ذریعہ ہے اسی کے بطن سے ہجرت، جہاد، راہِ خدا میں مصائب جھیلنا اور مرنے مارنے کے اجتماعی اعمال جنم لیتے ہیں۔ اس اجتماعی عمل میں جو لوگ سر دھڑ کی بازیاں لگا کر اترے تھے۔ سب ایک سے ایک بڑھ کر قربانیاں کر رہے تھے اور ایمان و اسلام کے جرم میں معاندینِ اسلام کے ہاتھوں لرزہ خیز مظالم کا ہدف بن رہے تھے۔ خاص طور پر کمزوروں یعنی عورتوں، غلاموں پر جو ستم ڈھائے جا رہے تھے ان کو سن کر آج بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ یہ نبوت کا اعجازی کارنامہ ہے کہ ان کی یہ ستم رانیاں کسی ایک شخص کو بھی نبوت سے ہٹانے میں کامیاب ہو سکیں۔

اس آیت میں ان پانچ باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو اس دنیا میں قوموں اور ملکوں کے بقاء و قیام کی اصل بنیاد ہیں۔ یعنی جماعت، سمع و طاعت، ہجرت اور جہاد اجتماعیت کی طرف الذین اشارہ کر رہا ہے۔ سمع و طاعت کے لیے ان اعمال کی نسبت خود بول رہی ہے کہ یہ سننے والے اور طاعت کی سرشاری سے مالامال تھے۔ ہجرت کے لیے لفظ ہاجروا اور جہاد کے لیے قاتلوا آیا ہے۔ دُنیا میں کوئی اُمت زندہ نہیں رہ سکتی جس کی اجتماعی ہستی ان پانچ عناصر سے مرکب نہ ہو۔ سعی و عمل کا کوئی گوشہ ہو ان اصولِ خمسہ کے بغیر کامیابی نہیں مل سکتی۔ مٹھی بھر گیہوں کی تلاش میں ہو یا قطب شمالی یا چاند اور مریخ کی تحقیقات کرو کوئی چیز بھی جماعت سمع و طاعت اور ہجرت و جہاد کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ دُنیا نے آج تک جو کچھ پایا ہے وہ سب ان پانچ سچائیوں میں پایا ہے۔

حارث اشعری کی اس حدیث میں جسے مسند میں امام احمد نے روایت کیا ہے جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کی حیاتِ اجتماعی کے لیے ان پانچ باتوں کا صراحۃً ذکر کیا ہے۔ ارشاد ہے:

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لوگو! میں تم کو ان پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے جماعت،
سمع، طاعت، ہجرت اور جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی
باہر ہو تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی
زندگی کو جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا
کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو اور اپنے گمان میں اپنے کو
مسلمان سمجھتا ہو۔

قرآن کی اس آیت میں ان پانچ باتوں میں سے صراحتاً جن کو بیان کیا ہے وہ ہجرت اور جہاد ہیں۔ باقی تین باتیں تبعاً سمجھ میں آ رہی ہیں۔

ہجرت کا حاصل یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینا اور حصول مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں ان سب کو ترک کر دینا خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشیں ہوں حتیٰ کہ قوم ہو ملک ہو وطن ہو اہل و عیال ہوں سب کو چھوڑ دینا۔

جہاد کے معنے یہ ہیں کہ اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کی راہ میں رکاوٹوں کو دور کرنے کے لیے اپنی جان و مال سے کمال درجہ کوشش و محنت کرنا۔ قرآن میں یہاں لفظ "قتال" لاکر جہاد ہی بتایا ہے۔

جہاد اور قتال میں نسبت

یہاں ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ اکثر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جہاد اور قتال دونوں ہم معنے ہیں۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ قرآن پاک میں دونوں لفظ الگ الگ استعمال ہوئے ہیں اس لیے جہاد فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں جہاد کرنا اور قتال فی سبیل اللہ خدا کی راہ میں لڑنا ان دونوں لفظوں کے ایک معنے نہیں ہیں بلکہ ان دونوں میں عام و خاص کی نسبت ہے۔ یعنی ہر جہاد قتال نہیں ہے بلکہ جہاد کی قسموں میں سے ایک اعلیٰ ترقسم قتال ہے چنانچہ آپ آگے چل کر سورۂ نساء میں پڑھیں گے المجاهدون فی سبیل اللہ باموالهم وانفسهم اس میں جہاد کی دو صریح قسمیں بیان کی ہیں جہاد بالنفس اور جہاد بالمال یعنی اپنی جان کے ذریعے جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعے جہاد کرنا، جان کے ذریعے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کی حمایت اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے ہر قسم کی جانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے یہاں تک کہ اپنی جان جوکھوں میں ڈال دے آگ میں جلایا جائے، سولی پر لٹکایا جائے۔ تیر اور نیزے سے چھد جانے کے لیے ہر وقت آمادہ اور تیار رہے۔ مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ حق کو کامیاب اور

سربلند کرنے کے لیے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کے لیے تیار ہے۔ جان اور مال کی باطل محبت فرد اور جماعت دونوں کی ترقی وسعادت کی راہ میں رکاوٹ ہے اگر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل موحد ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ جسمانی اور روحانی ہر قسم کی ترقی کا اصل اصول یہی ہے۔ اس کے سوا کچھ اور نہیں۔

بہرحال اس فقرے میں اُمت کے اجتماعی اعمال کی نشان دہی کی گئی ہے جن پر دنیا و آخرت میں اجتماع کی کامیابی کا انحصار ہے۔ زندگی میں کامیابی کے لیے پہلے فقرے میں انفرادی اعمال کا اور اس آیت میں اجتماعی اعمال کا تذکرہ کر کے اب آگے آیت میں اجتماعی اعمال کے دُنیوی اور اخروی نتائج بتائے ہیں۔

دُنیوی اور اخروی جزا کا اعلان

۳۵۶ ۔ ان کے سب قصور معاف کر دوں گا۔ اور ان کو ایسے باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یعنی یہ بندے ہیں جن کی تمام تقصیرات معاف کر دی گئی ہیں اور جنت ان کا انتظار کر رہی ہے[1]

اصل ارشاد میں سیئات کا لفظ آیا ہے۔ یہ سارسوء سے بنا ہے۔ اس کی مراد میں شارحین قرآن نے طول طویل بحثیں کی ہیں اور ان بحثوں سے مختلف گوشوں میں نکل گئے ہیں۔ مدارج السالکین میں حافظ ابن القیم نے سیئات کے موضوع پر ایک سے زیادہ اقوال نقل کر دیے ہیں۔

دراصل اس کی معنوی وسعت حالات وظروف کی وسعتوں اور پہنائیوں کی رہین منت ہے مشتے نمونہ از خروارے آپ بھی دیکھ لیجئے۔ مالک بن فعول کہتے ہیں کہ سیئات اہل سنۃ کے گناہ ہیں، کچھ کہتے ہیں کہ خطا و نسیان سیئات ہیں سدی کے خیال میں کبائر کے مقدمات اور توابع کا نام سیئات ہے۔ اور امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔

سیئۃ اور حسنۃ دو قسم پر ہیں ایک باعتبار عقل و شرع جیسے وہ کام جن کا ذکر اس آیت میں ہے من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا و من جاء بالسیئۃ ... الخ دوسرے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حسنہ اور سیئہ باعتبار طبع کہ طبیعت پسند کرے یا ناگوار سمجھے جیسے ارشاد ہے فاذا جاءتھم الحسنۃ قالوا لنا ھذہ وان تصبھم سیئۃ یطیروا بموسیٰ ومن معہ۔

دراصل احوال دو قسم کے ہیں انفرادی اور اجتماعی۔ اسی اعتبار سے سیئات بھی دو قسم کی ہیں انفرادی اور اجتماعی۔ یہاں اجتماعی سیئات مراد ہیں۔ قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر اجتماعی خوش حالیوں کے لیے حسنہ اور اجتماعی بدحالیوں کے لیے سیئہ کہا گیا ہے ایک دعا میں قرآن میں دنیا اور آخرت دونوں کی اجتماعی خوشحالیوں کو حسنہ کہا ہے:

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار

اسی بارے میں مدینہ کے یہود اور منافقین کا ذکر کرتے ہوئے ان کا یہ چہرہ پیش کیا ہے۔

ان تمسسکم حسنۃ تسؤھم وان تصبکم سیئۃ یفرحوا بھا

اگر تم کو کوئی بھلائی پہنچے تو ان کو غمگین بنا دیتی ہے اور تم کو کوئی برائی پہنچے تو اس سے وہ خوش ہوتے ہیں۔

یہاں سارے شارحین قرآن نے حسنہ سے اہل ایمان کی اس دنیا میں اجتماعی خوش حالی اور سیئہ سے اجتماعی بدحالی مراد لی ہے۔ میرے خیال میں اس آیت میں سیئات سے اجتماعی بدحالیاں مراد ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ ان کے ان اعمال کے نتیجے میں ان کو یہ جزاء عطا فرمائے گا کہ اولاً اس دنیا میں ان کی بدحالیاں دور کر دے گا۔ اور ثانیاً آخرت میں ان کو ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یہاں اگرچہ احد کی شکست کا داغ تازہ تازہ ہے لیکن اہل ایمان کے حوصلے بلند ہیں اس لیے دنیوی کامیابی کا پہلے ذکر کیا اور صلح حدیبیہ کے موقعہ پر اہل ایمان کمزور ہیں دنیوی کامیابی کی منزل دور ہے اس لیے دنیوی کامیابی کا ذکر بعد میں کیا ہے اور ارشاد ہے لیدخل المومنین والمومنات جنات تجری من تحتھا الانھار ویکفر عنھم سیاٰتھم

بہترین جزا آخرت میں ہے

۲۵۷۔ یہ اللہ کی طرف سے ان کا ثواب ہوگا اور بہترین جزا اللہ کے پاس ہے۔ یعنی اچھا بدلہ تو خدا ہی کے پاس ہے اور کہیں سے نہیں مل سکتا یا یہ مطلب ہو کہ اس بدلے سے بھی اچھا خدا کے پاس ہے یعنی اس کا دیدار مبارک رزقنا اللہ وسائر المومنین [1]

[1] فوائد شیخ الاسلام

ثواب، ثاب یثوب ثوباً کے اصل معنے رجوع کرنے اور لوٹنے کے ہیں۔ اسی سے ثواب ہے جس کے معنے اس ثمرے اور نتیجے کے ہیں جو کسی عمل کرنے والے کے عمل کے ردعمل کے طور پر اس کو حاصل ہو۔ اگرچہ لفظ میں گنجائش خیر اور شر دونوں کی ہے لیکن اس کا غالب استعمال اچھے عمل کے اچھے ردعمل کے لیے ہے بندوں کے حقیر اعمال پر اللہ تعالیٰ جو ابدی اور لازوال انعامات عطا فرمائے گا ان کو ثواب کے لفظ سے تعبیر کر کے رب کریم نے بندوں کے اعمال کی قدر و قیمت بڑھائی ہے ورنہ ذرّے اور پہاڑ میں کیا نسبت ہے؟ من عند اللہ واللہ عندہ حسن الثواب سے اسی بعد کو رفع کیا ہے یعنی ہے تو تمہارے ہی عمل کا بدلہ لیکن ہے اللہ کے پاس سے جس کے پاس حسن ثواب کے خزانے ہیں۔ وہ داتا جس کو چاہے دے اس کے پاس کیا کمی ہے؟[1]

آئیے اب ذرا اس پوری آیت پر ایک نظر ڈالیے اور سوچئے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نبوت کے علم و عمل کے ذریعے کس طرح جاں بلب انسانیت میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی اور کیسے آپ نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ ان میں اللہ کی مدد سے ایمان و عقیدے کی آبیاری کی۔ زندگی کی نئی رُوح پھونک دی، دبی ہوئی صلاحیتیں اجاگر کر دیں۔ پھر ہر ایک کو اس کی صحیح جگہ عطا فرمائی گویا اسی کے لیے اس کا وجود تھا اور گویا کہ جگہ خالی تھی اور اس کی منتظر تھی۔ وہ بے جان پتھر تھے اب وہ انسان بن گئے، پہلے نابینا تھے جن کو خود راستہ کا پتہ نہ تھا اب وہ ساری دُنیا کے رہبر بن گئے۔ پہلے نادان تھے اب وہ دُنیا کے عظیم عالموں میں شمار ہونے لگے جن سے علم کی نہریں بہتی ہیں۔ اور حکمت ان کی زبان پر جاری ہو جاتی ہے۔ قلب کے سچے، علم کے گہرے اور تکلف سے دُور بات کرتے ہیں تو زمانہ ہمہ تن گوش ہو کر سننے لگتا ہے، خطاب کرتے ہیں تو دُنیا کے مورّخ کا قلم لکھنے میں مشغول ہو جاتا ہے کہ کوئی لفظ ضائع نہ ہو۔ یہ لاکفرن عنہم سیئاتھم کی واقعاتی تفسیر ہے

---

[1] تدبر قرآن

لَا يَغُرَّنَّكَ تَقَلُّبُ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي الْبِلَادِ ﴿١٩٦﴾ مَتَاعٌ قَلِيلٌ
ثُمَّ مَأْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ وَبِئْسَ الْمِهَادُ ﴿١٩٧﴾ لٰكِنِ الَّذِينَ اتَّقَوْا
رَبَّهُمْ لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَا
نُزُلًا مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۗ وَمَا عِنْدَ اللّٰهِ خَيْرٌ لِّلْأَبْرَارِ ﴿١٩٨﴾ وَاِنَّ
مِنْ أَهْلِ الْكِتٰبِ لَمَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَمَآ أُنْزِلَ إِلَيْكُمْ وَ
مَآ أُنْزِلَ إِلَيْهِمْ خٰشِعِينَ لِلّٰهِ ۙ لَا يَشْتَرُونَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
ثَمَنًا قَلِيلًا ۗ أُولٰٓئِكَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ۗ إِنَّ اللّٰهَ
سَرِيعُ الْحِسَابِ ﴿١٩٩﴾

اے پیغمبر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کا ملکوں میں
سیر و گردش کرنا آپ کو دھوکے میں نہ ڈال دے یہ جو کچھ ہے
محض تھوڑا سا فائدہ اٹھانا ہے پھر بالآخر ان کا ٹھکانا جہنم ہے
اور یہ کیسا بُرا مقام ہے[۳۵۸]۔ لیکن جن لوگوں نے متقیانہ سیرت

اختیار کی ہے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے[۳۵۹]۔ یہ ان کے لیے اللہ کی جانب سے مہمانی ہو گی اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ نیکو کاروں کے لیے بہتر ہے[۳۶۰]۔ بلاشبہ اہلِ کتاب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو تم پر اتاری گئی ہے اور اس کتاب پر بھی جو ان پر نازل کی گئی ہے، اللہ کے آگے جھکے ہوتے ہیں اور اللہ کی آیات کا تھوڑی قیمت پر سودا نہیں کرتے، یہی لوگ ہیں جن کا اجر اللہ کے پاس ہے اور اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا[۳۶۱]۔

سعادت و کامرانی کا شرارت و سرکشی سے مقابلہ

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز　　چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

اسلامی نظامِ حیات کا اولین مقصدِ حیات یہ ہے کہ شر و فساد اور کفر و جاہلیت کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جن سے کفر کا وجود عبارت ہے۔ دنیا کے ہر دوسرے وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کے بقا کا آرزومند اور کشمکش حیات میں مبتلا ہے۔ اور اس میدان میں اسلام اس کا تنہا حریف اور مدِمقابل ہے

کیونکہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے کفر کی ضد ہے۔ اسلام اور کفر کے درمیان مصالحت ناممکن اور ان کی لڑائی بلافصل قائم ہے یہ لڑائی دنیا کی دوسری تمام لڑائیوں پر حاوی اور ان سے مافوق ہے بلکہ اور جتنی نزاعیں اور لڑائیاں ہیں ان کا سلسلہ کہیں نہ کہیں جاکر اس لڑائی سے ضرور ملتا ہے۔ کفر کی طاقتیں اسلام کے سفر اقتدار میں مزاحم ہوتی ہیں لیکن ان کی یہ مزاحمت حق وصداقت کی سعی کمال کا سبب بن جاتی ہے جس طرح انسان کو اپنے خارجی ماحول کی مخالف قوتوں سے کشمکش کرنا پڑتی ہے اور یہی کشمکش اس کی قوتوں کو صیقل کرتی ہے جس سے بالآخر وہ اپنے ماحول پر غلبہ حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام بھی کفر سے جنگ آزما ہو کر اپنے قویٰ کو مضبوط اور اپنی داخلی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ کفر و اسلام کا یہ تقابل اور ان دونوں کا تصادم اسلام کی قوت حیات کی افزونی اور کفر کے ضعف و شکست پر ختم ہوتی ہے۔ ان آیات میں کفر و اسلام کا یہی تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے کہ کفر کا عروج ایمان کے مقابلہ میں وقتی ہے۔ یہ چمک دمک محض چند روزہ ہے۔ حقیقی اور ابدی کامیابی ایمان و تقویٰ کے لیے ہے اور ان کی کامیابی کا آخر کوئی نہیں ہے۔ سورت کی ابتداء اس بیان سے ہوئی تھی کہ اللہ نے روحانی سعادت کے لیے نبوت کے ذریعے نظام حیات روانہ کیا ہے۔ اس کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ اسے قبول کرتے ہیں سعادت و کامرانی پاتے ہیں جو شرارت و سرکشی سے مقابلہ کرتے ہیں نامراد رہتے ہیں۔ اب اس سورت کا انجام بھی اسی بیان پر ہوا ہے۔ گویا سورت کے تمام بیانوں کا خلاصہ یہ ہے کہ دعوت قرآن کے مخالف کتنی ہی سعی و تدبیر کریں اور بظاہر عارضی طور پر کتنے ہی خوش حال نظر آئیں لیکن بالآخر ہونا یہی ہے کہ دعوت قرآن کامیاب ہو۔

۲۵۸ ۔ اے پیغمبر جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کا ملکوں میں سیر و گردش کرنا آپ کو دھوکے میں نہ ڈال دے یہ جو کچھ ہے محض تھوڑا سا فائدہ اٹھانا ہے پھر بالآخر ان کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ کیسا برا مقام ہے یعنی کفار جو ادھر ادھر تجارت وغیرہ کرکے دولت کماتے اور اکڑتے پھرتے ہیں اہل ایمان کو چاہیے کہ ان سے دھوکہ نہ کھائیں۔ یہ محض چند روز کی بہار ہے اگر ایک شخص کو چار روز پلاؤ قورمہ کھلانے کے بعد پھانسی یا حبس دوام کی سزا دی جائے تو وہ کیا خوش عیش ہوا خوش عیش وہ ہے جو تھوڑی سی محنت اور تکلیف اٹھا کر ہمیشہ کے لیے اعلیٰ درجہ کی راحت و آرائش کا سامان مہیا کرے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لا یغرنک خطاب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے آپ کی اُمت کو ہے جیسا کہ عام طور پر حکم سردار اور حاکم کے نام ہوتا ہے مگر مقصود اس کے متبعین اور ماتحت ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ علیٰ سبیل التبادل ہر شخص مخاطب ہو۔ تقلب کے معنے لوٹ پوٹ چلت پرت آنا جانا خواہ وہ تجارت کی غرض سے ہو یا نفع کی غرض سے ہو۔ بہرحال شہر بشہر ان کا جانا اور دنیوی منافع اور مکاسب کا حاصل کرنا اور سیر و تفریح کے مزے اڑانا یہ باعث رشک نہ ہونا چاہیے اور اس سے کسی مغالطہ میں مبتلا نہ ہونا چاہیے جیسا کہ بعض لوگوں کو خیال ہو جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے دشمن تو دُنیا بھر کے مزے لوٹتے پھرتے ہیں اور ہم اللہ تعالیٰ پر ایمان رکھتے ہیں پھر ہر قسم کے مصائب میں مبتلا ہیں تو کافروں کا یہ عیش اور یہ عارضی فائدہ قابلِ التفات نہ ہونا چاہیے۔ یہ مزے آخرت کے مقابلے میں اول تو حیثیت نہیں رکھتے۔ پھر یہ لوگ آخرت میں ہر قسم کے فائدے سے محروم ہیں، کیونکہ ان کا آخری ٹھکانا دوزخ ہے۔

اس آیت میں موقع کلام دلیل ہے کہ اس سے مراد اس وقت کفار کا ملک کے حالات و معاملات میں وہ آزادانہ و خود مختارانہ تصرف ہے۔ جو مسلمانوں کے مقابلے میں ان کو حاصل تھا۔ اس وقت تک مسلمان کمزور تھے اور کفار اپنی سطوت کے گھمنڈ میں ہر جگہ دندناتے پھر رہے تھے اور کمزور مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے تھے ان ہی کمزور مظلوم مسلمانوں کی اس میں حوصلہ افزائی کی گئی ہے اطمینان دلایا ہے کہ اس وقت کفار کو جو ملک میں غلبہ اور زور حاصل ہے اس سے کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیے یہ چمک دمک محض چند روزہ ہے اس کے بعد ان کا ٹھکانا جہنم ہے[1]

آیت میں کفار کی دُنیوی ترقیوں کو متاع قلیل کہا ہے۔ یہ بات اسی وقت کے کافروں کے لیے نہیں بلکہ ہر دور، ہر عہد اور ہر زمانہ کے کافروں کے بارے میں ہے۔ کفر نام ہے پیروی نفس، انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمہ داری کی دعوت کا۔ اس دعوت کی قیادت دُنیا کی مختلف جاہلی قومیں اور تہذیبیں کرتی رہی ہیں اور اب تقریباً دو صدیوں سے تقدیر الٰہی نے اس کی قیادت اور امامت کا فیصلہ یورپ کی قوموں کے حق میں کیا اس وقت یورپ کفر کی عالمگیر نمائندگی کر رہا ہے اور ایسی طاقت اور ایسے اسلحہ کے ساتھ کفر کی قیادت اس سے صدیوں پہلے ہمارے علم میں کسی قوم نے نہیں کی، آج بھی قرآن کی یہی پکار ہے کہ اہلِ ایمان ان کی طاقت کو اسی

---

[1] تدبر قرآن

نظر سے دیکھیں کہ یہ متاع قلیل ہے اور آخرت کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ دُنیا کی اس قلت کو سمجھنے کے لیے صحیح مسلم کی یہ روایت پڑھیے کہ مستورد بن شداد کہتے ہیں کہ میں نے جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے آپ فرماتے تھے کہ دُنیا کی مثال آخرت کے مقابلے میں بس ایسی ہے جیسے تم میں سے کوئی شخص اپنی ایک انگلی دریا میں ڈال کر نکالے اور پھر دیکھے کہ انگلی پر پانی کی کتنی مقدار ہے۔

مطلب یہ ہے کہ دُنیا آخرت کے مقابلے میں اتنی ہی بے حقیقت اور بے حیثیت ہے جتنا دریا کے مقابلے میں انگلی پر لگا ہوا پانی۔ اور دراصل قلت دُنیا کے لیے یہ مثال بھی صرف سمجھانے کے لیے دی گئی ہے ورنہ فی الحقیقت دُنیا کو آخرت سے یہ نسبت بھی نہیں ہے۔ دُنیا اور جو کچھ دُنیا میں ہے سب محدود اور متناہی ہے اور آخرت لامحدود اور غیر متناہی ہے اور ریاضی کا مسلم مسئلہ ہے کہ محدود اور لامحدود کے درمیان کوئی نسبت نہیں ہوتی۔ مسند احمد اور ترمذی میں اسی مسئلہ کو ایک اور انداز سے سمجھایا ہے ارشاد ہے :

اگر اللہ کے نزدیک دُنیا کی قدر و قیمت مچھر کے پر کے برابر بھی ہوتی تو کسی کافر کو وہ ایک گھونٹ پانی بھی نہ پینے دیتا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ اور رسُول کے نہ ماننے والوں کو دُنیا سے جو کچھ مل رہا ہے اور جیسا کہ دیکھا جا رہا ہے خوب مل رہا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ اللہ کے نزدیک دُنیا نہایت ہی حقیر اور بے قیمت ہے۔ قرآن نے دُنیا کو ان کی نظروں میں اس درجہ حقیر بنا دیا تھا کہ وہ حکومت کے عہدوں اور منصبوں پہ پروانہ وار نہ گرتے تھے بلکہ وہ ان کو قبول کرنے سے گریز کرتے تھے اور ان کی ذمہ داریوں سے لرزہ براندام ہوتے تھے ان میں سے ہر ایک پیچھے ہٹتا تھا۔ اور اپنے کو اس بار کا سزاوار نہیں سمجھتا تھا چہ جائیکہ وہ اپنا نام حکومت کے لیے پیش کرے۔ اپنے منہ سے اپنی تعریف کرے۔ پھر جب وہ کسی ذمہ داری کو اپنے ہاتھ میں لیتے تو اس کو مال غنیمت یا لقمہ تر نہ سمجھتے بلکہ اس کو اپنے ذمہ ایک امانت اور اللہ کی طرف سے آزمائش سمجھتے اور یقین رکھتے کہ اللہ کے سامنے ان کو حاضر ہونا ہے اور چھوٹی بڑی چیز کا جواب دینا ہے۔

یہ سب کچھ اس لیے تھا کہ قرآن نے ایک طویل عرصہ تک ان کی تربیت کی اور ان کو دنیا کے مقصود نہ بنانے کی تعلیم دی۔

اہلِ تقویٰ کا مقام اور ان کی کامیابی

۱۹۸ - لیکن جن لوگوں نے متقیانہ سیرت اختیار کی ہے ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ہمیشہ اسی میں رہیں گے یعنی اب اس عیش و کامرانی کا اس چند روزہ بہار سے مقابلہ کر دو کہ یہ بہتر ہے یا وہ۔[1]

آیت میں صرف لفظ تقویٰ بول کر بشارت دی ہے ۔ قرآن میں تقویٰ اپنی معنوی وسعتوں کی وجہ سے اپنے اندر ایسی شان جامعیت رکھتا ہے کہ اگر ہم ساری قرآنی تعلیمات کا خلاصہ صرف ایک لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں ۔ قرآن کی ہر تعلیم کا مقصد اپنی ہر تعلیم میں اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی رُوح کو پیدا کرنا ہے ۔ قاضی بیضاوی نے تقویٰ کی اسی جامعیت کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اس شخص کو بھی متقی کہا جاتا ہے جو کفر و شرک سے بچتا ہے اور اس شخص پر بھی لفظ متقی کا اطلاق ہوتا ہے جو ہر قسم کے گناہوں سے بچتا ہے ۔ اور جو ماسویٰ اللہ کو چھوڑ کر اللہ ہی کا ہو جاتا ہے ۔ اس کو بھی متقی کہتے ہیں اس لیے جس طرح ایک باخدا اور خدارسیدہ شخص متقی ہوتا ہے اسی طرح وہ گنہ گار مسلمان بھی متقی ہے جو صرف کفر و شرک اور بدعت سے بچتا ہے ۔ آیت میں تقویٰ کا اطلاق بتا رہا ہے کہ مراد یہاں تقویٰ کی فردِ کامل ہے یعنی جو افکار و عقائد، معاملات، معاشرت، اخلاق و اعمال میں متقی ہو اسی کی رعایت سے ہم نے ترجمہ یہ کیا ہے جو متقیانہ سیرت رکھتے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ گو بظاہر ابتدا میں اہلِ تقویٰ کو کتنی ہی بلائیں اور مصیبتیں آئیں یا بہت سی حرام اور مشتبہ لیکن بظاہر بہت سی عمدہ چیزوں سے محروم ہونا پڑے ۔ ظاہری کامیابی کی بہت سی ناجائز کوششوں اور ناروا راستوں سے پرہیز کرنا پڑے اور اس سے یہ سمجھا جائے کہ ان کو مال و دولت ، عزّت و شہرت اور جاہ و منصب سے محرومی رہی ۔ لیکن دُنیا کے تنگ نظر صرف فوری اور عاجل کامیابی ہی کو کامیابی سمجھتے ہیں اور یہ خیال کرتے ہیں کہ اسی دُنیا کے ظاہری ثمروں کی بنا پر کام کے اچھے اور بُرے نتیجوں کا فیصلہ کر لینا چاہیے ، حالانکہ جو جتنا دُور بین ہے اسی قدر وہ اپنے کام کے فوری نہیں بلکہ آخری نتیجہ پر نظر رکھتا ہے حقیقی دُور بین اور عاقبت اندیش وہ ہیں جو کام کی اچھائی بُرائی کا فیصلہ دُنیا کے ظاہری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چندروزہ اور فوری فائدے کے لحاظ سے نہیں بلکہ آخرت کے دائمی اور دیرپا فائدے کی بنا پر کرتے ہیں اور جب ان کی نظر آخرت کے ثمروں پر رہتی ہے تو دُنیا بھی ان کی بن جاتی ہے اور یہاں اور وہاں دونوں جگہ کامیابی اور فوز ان ہی کی قسمت میں ہوتی ہے۔

خدا کے وفا شعار بندے

۳۶۰ - ہو ان کے لیے اللہ کی جانب سے مہمانی ہو گی اور جو کچھ اللہ کے پاس ہے وہ ابرار کے لیے بہترین ہے۔ مہمانی اس لیے کہا کہ مہمان کو اپنے کھانے پینے کی کچھ فکر نہیں ہوتی۔ عزت و آرام سے بیٹھے بٹھائے ہر چیز تیار ملتی ہے[1]

یہاں ابرار استعمال ہوا ہے یہ بار کی جمع ہے۔ بار اور متقی میں فرق ہے۔ بار کا درجہ متقیوں سے بڑھا ہوا ہے کیونکہ متقی اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے آپ کو اللہ سبحانہٗ کی ناراضگی کے اسباب سے بچالے اور یہ بات صرف محرمات کے چھوڑ دینے اور واجبات کے بجالانے سے حاصل ہو سکتی ہے۔ اور ابرار بر بمقابلہ بحر سے مشتق ہے جس کے مفہوم میں وسعت داخل ہے لہٰذا ابرار کے مفہوم میں تمام نیکیوں کا بجالانا داخل ہے خواہ فرائض ہوں یا نوافل۔ مطلب یہ ہوا کہ جنات تجری من تحتہا الانہار متقین کی مہمانی ہے اور ابرار کے لیے اللہ کے پاس جو کچھ الطاف و عنایات ہوں گی۔ وہ اس سے کہیں بہتر ہوں گی لہٰذا تمہیں اس کی فکر کرنی چاہیے[2]

بَر یا بَار کا اصل مفہوم عربی لغت میں کسی کے حق کو پورا کرنا ہے عام اس سے کہ خدا کا حق ہو یا اللہ کے بندوں کا حق ہو ان بنیادی حقوق کے علاوہ ان حقوق کا ایفا بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے جو معاہدات، قول و قرار، حلف و ولا، عقود اور قسموں سے پیدا ہوتے ہیں۔ اس لفظ کی اس وسعت کی وجہ سے وہ ساری نیکیاں اس کے تحت جمع ہو جاتی ہیں جو عدل یا احسان کے تحت آسکتی ہیں اس سے معلوم ہوا کہ حقوق واجبات ہوں یا نیکیاں اور بھلائیاں سب اس کے مفہوم میں شامل ہیں۔ گویا اصل رُوح ایفائے عہد اور ادائے حقوق و فرائض ہے۔ عام اس سے کہ یہ خدا کے حقوق ہوں یا بندوں کے یہاں ایک طرف ما عند اللہ خیر للابرار کہہ کو ان اہل ایمان کو ابرار بننے کی دعوت دی ہے جنہوں نے دُعا مانگی تھی توفنا مع الابرار دوسری طرف اہل کتاب پر تعریض

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف قرآن م ا

کی ہے کہ تم ایفائے عہد اور ادائے حقوق میں بالکل صفر ہو بعض چند رسوم کی ظاہر دارانہ پیروی کرکے یہ سمجھتے ہو کہ خدا کی وفاداری میں جو مقام ان کا ہے وہ کسی کا نہ ہوا ہے نہ ہو سکتا ہے۔

اہلِ کتاب میں سے اہلِ تقویٰ

۲۶۱ - بلاشبہ اہلِ کتاب میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں، اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو تمہاری طرف روانہ کی گئی اور اس کتاب پر بھی جو ان پر نازل کی گئی۔ اللہ کے آگے جھکے ہوئے اور اللہ کی آیات کا تھوڑی قیمت پر سودا نہیں کرتے یہی لوگ ہیں جن کا اجر اللہ کے پاس ہے اور اللہ حساب چکانے میں دیر نہیں لگاتا ہے۔ اوپر عام متقین کا ذکر ہوا، اب اہلِ کتاب میں سے جو متقی ہیں ان کا خصوصیت سے ذکر فرماتے ہیں یعنی جو اہلِ کتاب اللہ پر ٹھیک ٹھیک ایمان لاتے، قرآن کو مانا اور چونکہ خود قرآن تورات و انجیل کی تصدیق کرتا ہے ان کو بھی مانا مگر اس طرح نہیں جس طرح دنیا پرست احبار مانتے تھے کہ تھوڑے سے دنیوی فائدے کی خاطر آیات اللہ کو چھپا لیا یا بدل ڈالا بلکہ خدا کے آگے عاجزی اور اخلاص سے گرے اور جس طرح اس نے کتابیں اتاری تھیں ٹھیک ٹھیک اسی اصل رنگ میں ان کو تسلیم کیا۔ نہ بشارات کو چھپایا نہ احکام کو بدلا ایسے پاکباز حق پرست اہلِ کتاب کے لیے اللہ کے ہاں مخصوص اجر ہے چنانچہ قرآن و حدیث سے ثابت ہے کہ ایسے اہلِ کتاب کو دوہرا اجر ملے گا[1]

قرآن میں ایک دوسرے موقع پر ارشاد ہے اولٰئک یؤتون اجرهم مرتین یہ وہ لوگ ہیں جن کو اجر دوبارہ دیا جائے گا۔ یعنی ایک اجر اس ایمان کا جو وہ پہلے حضرت عیسٰی پر لائے تھے اور دوسرا اجر اس ایمان کا جو وہ اب محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم پر لاتے ہیں۔ یہی بات اس حدیث میں بیان کی گئی ہے جو بخاری و مسلم نے ابو موسٰی اشعری کے حوالہ سے روایت کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ثلثة لهم اجران رجل من اهل الكتاب آمن بنبيه و آمن بمحمد صلی الله علیه وسلم تین شخص ہیں جن کو دوہرا اجر ملے گا ان میں سے ایک وہ ہے جو اہلِ کتاب میں سے تھا اور اپنے نبی پر ایمان رکھتا تھا۔ پھر محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا۔

دراصل ہر شخص کی طبیعت ہے کہ اس کو اپنے دین سے ایک والہانہ محبت اور دوسرے دین سے رقابت کا تعلق ہوتا ہے اس لیے اپنا دین چھوڑ کر دوسرا دین اختیار کرنا فطرتاً شاق گزرتا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن یہ کہتا ہے کہ ادیان سماویہ میں کوئی رقابت نہیں ہے پارٹیاں نہیں ہیں۔ اس لیے ان مذاہب کے پیروؤں کو یہی جذبہ رکھنا چاہیے۔ یہ ایک ہی صداقت کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ایک دین کے مصدق کو دوسرے دین کی تصدیق لازم ہے اس لیے اگر کوئی اہل کتاب اسلام قبول کرتا ہے تو یہ اس کو ہرگز وسوسہ نہ گزرنا چاہیے کہ اپنے نبی پر اس کا ایمان رائیگاں ہو جائے گا بلکہ اگر وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان لے آئے تو دوہرے اجر کا مستحق ہوگا۔ ہاں یہ یقینی ہے کہ اگر آپ پر ایمان نہ لایا تو پہلے ایمان کا اجر بھی حبط ہو جائے گا کیونکہ رسولوں کے درمیان ایمان کے بارے میں تفریق نہیں کی جا سکتی۔ جو ایک کا منکر ہے وہ سب ہی کا منکر ہے۔ اس بشارت میں دراصل اہل کتاب کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے ایمان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی یہی صورت ہے کہ آپ کی ذات ستودہ صفات پر بھی ایمان لائیں۔ اور کیوں ایمان نہ لائیں جبکہ ان نبیوں پر ایمان لانا آپ کی دعوت کا جزء ہے لہٰذا آپ پر ایمان لانا ان سب پر ایمان اور آپ کا انکار ان سب کا انکار ہے اس لیے اگر وہ خدا کے دین یا خدا کے رسولوں کے متعلق فرقہ پرستی کے جذبات رکھیں تو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اسلام اس کو برداشت نہ کرے گا۔ اور الٹا ان کا حاصل کردہ اجر بھی برباد ہو جائے گا۔ خلاصہ یہ کہ ایمان لانا سب پر ضروری ہے لیکن منہاج طاعت صرف اسلام میں منحصر ہے۔

یہ کیسا لطیف اور حسین انداز بیان ہے کہ سورت کا آغاز و انجام قطعاً یکساں ہے۔ آغاز سورت اہل کفر، اہل کتاب اور اہل ایمان سے کیا اور انجام بھی تینوں کے ذکر پر کیا۔ آل عمران کے آغاز میں اہل کتاب کو اپوزیشن بنا کر پیش کیا اور انجام میں اہل کتاب کی تحسین فرمائی جو اپنی سابقہ کتب پر قائم رہے اور دولت اسلام سے بھی مشرف ہوئے جیسے البقرہ کے شروع میں المتقین کا چہرہ پیش کرتے ہوئے دونوں کا ذکر کیا تھا ان کا بھی جو مشرکین میں سے ایمان لائے اور ان کا بھی جو اہل کتاب میں سے ایمان لائے۔ یہاں بھی دونوں کو متقین میں شمار کیا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اصْبِرُوا وَصَابِرُوا وَرَابِطُوا قف وَاتَّقُوا اللَّهَ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿۲۰۰﴾

اے اہل ایمان! صبر کرو اور مقابلے کے لیے تیار رہو، اور ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جاؤ اور ہر حال میں خدا سے ڈرتے رہو تاکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ [۳۶۲]

اہل ایمان کے لیے فلاح و کامیابی کا منشور

یہ آیتِ قرآن سورت کے تمام بیانات کا خلاصہ ہے اس میں اللہ سبحانہ نے اہلِ ایمان کو فلاح و کامیابی کا منشور دیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر مومنین صالحین کی جماعت خالصتہً اخلاقی و روحانی مقاصد کے لیے نظامِ حق کی جدوجہد کر رہی ہو تو اس کی کامیابی بالکل یقینی ہے اور محض طبعی اسباب و عوامل یا مادی سروسامان اس کی کامیابی یا ناکامی پر موثر نہ ہوں گے۔ اس آیت میں اہلِ ایمان سے اللہ کا وعدہ قطعی اور غیر مشتبہ ہے یعنی اگر اہل ایمان ایمان کے تقاضوں کو پورا کریں اور اپنی طرف سے سعی و تدبیر میں کوئی کوتاہی نہ کریں تو ان کی کامیابی محض اس بنا پر مشتبہ نہ ہوگی کہ اسباب مادی یا کثرتِ تعداد کے لحاظ سے متقابل جماعتیں اس پر فوقیت رکھتی ہیں بلکہ متقابل قوتیں کتنے ہی زبردست آلات و اسباب سے مسلح ہوں۔ کامیابی انہی کی ہوگی جو صبر سے کام لیں۔ راہِ عمل میں ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جائیں، ایک دوسرے کو صبر کی ترغیب دیں اور اللہ سے ڈرتے رہیں۔ جو اپنے قومی، طبقاتی اور دُنیوی مفادات کے لیے نہیں بلکہ پورے عالم انسانی کی اخلاقی و روحانی فلاح کے لیے مصروفِ جدوجہد ہیں۔

یہ بات ذہن میں رکھیے کہ دُنیا میں ہر گروہ کے لیے ہر فرد کے لیے اور ہر عقیدے کے لیے خواہ وہ

حق ہو یا باطل کامیابی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں یہاں تک کہ جو شخص گمراہی اور فساد کی راہ اختیار کرتا ہے وہ بھی اپنے سعی و عمل کے مطابق کامیابی حاصل کرتا ہے اور کائنات کی کوئی قوت اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی تخلیق کچھ ایسی فطرت پر عمل میں آئی ہے کہ اس کی وسیع گردیں ہر سعی کے لیے راہ ہموار ہوتی ہے غرض کہ دنیا میں کسی حرکت اور کسی عمل کے لیے مزاحمت نہیں ہے، عدم مزاحمت اس کا بنیادی قانون ہے۔ البتہ کسی فرد یا گروہ کو جو خود قدم نہ اٹھائے کائنات میں آپ ہی آپ کامیاب نہیں کرتی۔ محض خلوص نیت دعائیں اور آرزوئیں خواہ وہ مومن کی ہوں اسے کامیاب نہیں کر سکتی ہیں جب تک عمل کی طاقت اس کے پس پشت نہ ہو لیکن اہل ایمان کے لیے خالق کائنات نے یہ گنجائش رکھی ہے کہ اگر وہ سعی و عمل کے قانون کے مطابق کام کریں اور اپنے مقصد کے لیے ابتدائی قدم اٹھا دیں تو کائنات کی تمام قوتیں ان کی مساعدت کرنے لگتی ہیں مگر یہ مساعدت حرکت و اقدام اور سعی و عمل کے ساتھ مشروط ہے ان تنصروا اللہ ینصرکم۔

۳۶۲۔ اے اہل ایمان صبر کرو اور مقابلے کے لیے تیار رہو، ایک دوسرے کے ساتھ بندھ جاؤ اور ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو تاکہ اپنے مقصد میں کامیاب ہو۔ خاتمہ پر اہل ایمان کو ایک نہایت جامع و مانع نصیحت فرمائی ہے جو گویا ساری سورت کا ماحصل ہے۔ یعنی اگر کامیاب ہونا اور دنیا و آخرت میں بامراد ہونا چاہتے ہو تو سختیاں اٹھا کر بھی طاعت کرو اور اس پر جمے رہو۔ معصیت سے رکو، دشمن کے مقابلے میں مضبوطی اور ثابت قدمی دکھلاؤ۔ اسلام اور حدود اسلام کی حفاظت میں لگے رہو جہاں سے دشمن کے حملہ آور ہونے کا خطرہ ہو وہاں آہنی دیوار کی طرح سینہ سپر ہو کر ڈٹ جاؤ واعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل ترھبون بہ عدو اللہ وعدوکم اور ہر وقت ہر کام میں خدا سے ڈرتے رہو۔ یہ کر لیا تو سمجھو مراد کو پہنچ گئے اللھم اجعلنا مفلحین و فائزین بفضلک و رحمتک فی الدنیا والاخرۃ۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تہجد کے لیے بیدار ہوتے تو آسمان کی طرف نظر اٹھا کر یہ دس آیتیں ان فی خلق السماوات سے ختم سورت تک تلاوت کرتے تھے [1]

یہ سورۂ آل عمران کی آخری آیت ہے۔ اس میں وہ تمام بنیادی ہدایات یکجا کر دی ہیں جن کی پیروی اہل ایمان کو اپنی اجتماعی زندگی میں کامیابی اور فلاح سے ہمدوش ہونے کے لیے ضروری ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

اول صبر دوسرے مصابرہ تیسرے مرابطہ اور چوتھے تقویٰ۔

صبر کے لغوی معنے اور اس کی قسمیں

صبر کے لغوی معنے روکنے اور سہارنے کے ہیں یعنی اپنے کو اضطراب اور گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا، یہی صبر کی معنوی حقیقت ہے۔ اس کے معنے بے بسی کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں ہیں۔ بلکہ پامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ سے حافظ ابن القیم نے صبر کی حقیقت کو ایک لطیف مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔
حضرت یوسف پر دو ابتلا آئے اور دونوں میں انہوں نے صبر کا مظاہرہ کیا۔ ایک یہ کہ بھائیوں نے ان پر جبر کیا اور ان کو چاہ کنعان میں ڈال دیا، دوسرے یہ کہ عزیز مصر کی بیوی نے ان کو دعوت گناہ دی۔ دونوں میں حضرت یوسف نے صبر کیا لیکن صبر کامل وہ ہے جو دعوت گناہ پر کیا۔ چاہ کنعان میں تو صرف ایک مجبوری اور بے بسی ہے کیونکہ اس میں حضرت یوسف کے ارادہ و اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے لیکن دعوتِ گناہ پر جو آپ نے صبر کیا ہے وہ واقعی صبر ہے کیونکہ یہاں گناہ سے بچنے میں آپ کے ارادے اختیار اور رضامندی کو پورا پورا دخل ہے۔ اپنے نفس سے جنگ ہے۔ احوال وظروف سارے کے سارے گناہ کے موافق ہیں۔ آپ جوان ہیں اور جوانی کی بھرپور قوت موجود ہے، غیر شادی شدہ ہیں، مسافر ہیں، ہم چشموں کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ آزاد نہیں ہیں۔ عورت حسن وجمال والی ہے اور صاحب منصب ہے اور خود گناہ کی داعی ہے اور پھر دعوت نہ قبول کرنے پر جیل کی دھمکی دے رہی ہے۔ ان حالات میں حضرت یوسف کا صبر واقعی صبر ہے۔
بہرحال صبر کے معنے ارادہ واختیار کے ساتھ کسی حق پر اپنے آپ کو مزاحمتوں کے مقابلے میں جمائے رکھنا ہیں اور اپنے آپ کو بے قرار نہ ہونے دینا اور زبان پر شکوہ نہ لانا اور اعضا میں اضطراب نہ ہونے دینا صبر ہے۔ حافظ ابن القیم نے صبر کی تین قسمیں لکھی ہیں اور یہ تینوں اس کے لغوی معنے روکنے سہارنے اور جمانے کے لحاظ سے ہیں۔ صبر علی الطاعات، صبر عن المعاصی صبر علی البلایا۔

صبر علی الطاعات

اس میں صبر کے معنے جمانے کے ہیں۔ دل کی ساری ناگواریوں اور حالات کی ساری ناسازگاریوں کے باوجود احکام خداوندی کو عمر بھر پورے استقلال اور مضبوطی سے ادا کرنا صبر ہے۔

ہر حال اور ہر کام میں اللہ کے حکم کی فرمانبرداری اور عبودیت پر ثبات نفس انسانی کا سب سے بڑا امتحان ہے اسی لیے حکم ہے ،

واصطبر لعبادتہ اس کی بندگی پر جما رہ

ایک اور آیت میں نماز پڑھتے رہنے اور اپنے اہل و عیال پر بھی اس کی تاکید رکھنے کے سلسلے میں ہے ،

وامر اھلک بالصلوٰۃ اپنے گھر والوں کو نماز کا حکم کرو۔

واصطبر علیہا اور اس پر جمے رہو۔

نیک کاموں کو بار خاطر ، خلاف طبع اور تکلیف و مشقت ہونے کے باوجود خوشی خوشی عمر بھر کرتے رہنا۔ بری باتوں سے باوجود اس کے کہ ان میں ظاہری خوشی اور آرام ہے بچتے رہنا ، راتوں کو نرم بستروں سے اٹھ کر اللہ کے حضور میں سربسجود ہونا ، صبح کو خواب سحر کی لذت سے کنارہ کش ہو کر تہجد پڑھنا ، الوان نعمت کی لذتوں سے محروم رہ کر روزے رکھنا ، تکلیف و مشقت کے باوجود خطرناک موقعوں پر سچائی سے باز نہ آنا قبول حق کی راہ میں شدائد کو آرام اور راحت جان کر جھیل لینا۔ غرض قرآن و سنت کے احکام کی بجاآوری اور پھر اس پر عمر بھر استواری اور پائداری صبر علی الطاعات ہے اور یہ صبر کی بہت کڑی منزل ہے ۔

صبر عن المعاصی

اپنے کو خدا کی نافرمانیوں سے روکنا اور جن چیزوں سے قرآن و سنت نے منع کر دیا ہے ان سے اپنے آپ کو بچا کر رکھنا ۔ گناہوں کے سارے کام جو اس وقت دنیا میں بڑے پر لطف اور لذت بخش معلوم ہوتے ہیں ۔ اس عارضی و ہنگامی خوشی و ناخوشی کی پرواکیے بغیر احکام الٰہی کی پیروی کرنا اور محرمات سے بچنا ، سود کی دولت سے دستکش ہونا حسن و جمال کی بے قید لذت سے فائدہ نہ اٹھانا نرے صبر اور برداشت کا کام ہے ۔ کسی قارون کے خزانہ مال و دولت کی فراوانی اور اسباب عیش کی بہتات کو دیکھ کر اگر کسی کے منہ میں پانی بھر آتے اور اس وقت مال حرام کی کثرت سے اپنے آپ کو روکے تو یہ بڑی قوت کا کام ہے ۔

صبر علی المصائب

لڑائی پیش آجانے کے وقت میدان جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ

صبر ہے۔ قرآن نے اس لفظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے اور بتایا ہے کہ حق کے مددگاروں کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر کی روحانی قوت سے ہوتی ہے۔ میدان کارزار میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ وہ اپنی عددی قلت کی پرواہ نہ کریں اور صبر و ثبات کے ساتھ اپنے سے دو چند کا مقابلہ کریں اور تسلی دی گئی کہ اللہ تعالیٰ کی مدد ان ہی لوگوں کے ساتھ ہوتی ہے جو صبر سے کام لیتے ہیں۔

قرآن کی اس آیت کا یہ تینوں قسمیں منطوق ہیں۔ یعنی فلاح و کامیابی کی اوّلین اور بنیادی شرط یہ ہے کہ اوّل ایمان تمہارے اندر طاعت کی سرشاریاں ہوں اور گناہوں سے تمہارا دامن آلودہ نہ ہو اور میدان جنگ میں ثابت قدمی اور استقامت کا مظاہرہ ہو۔ جنگ یرموک کے موقعہ پر جب امراء نے حضرت ابوبکر و عمر رضی اللہ عنہما کو اپنی مشکلات کا حال لکھا۔ رومیوں کی کثرت تعداد اور ان کی جنگی تیاریوں کی اطلاع دی تو انہوں نے جواب دیا۔

> تم سب مجتمع رہو اور ایک فوج بن کر مقابلہ کرو تم اللہ کے مددگار ہو۔ اللہ اپنے مددگاروں کی مدد کرتا ہے کافروں کی مدد نہیں کرتا تم کو قلت کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ ہاں اگر تمہیں نقصان پہنچ سکتا ہے تو اپنے گناہوں سے ان سے بچ کر رہو۔ [1]

موطا امام مالک میں زید بن اسلم کے حوالہ سے حضرت ابو عبیدہ کے ایک اور جنگ میں ایک اور خط کا ذکر ہے کہ انہوں نے حضرت عمر کو لکھا ہے کہ دشمن کی فوجی قوت زیادہ ہے۔ حضرت عمر نے ان کو یہ جواب دیا:

> بندہ مومن پر جب کوئی افتاد آتی ہے تو اللہ سبحانہ اس کے بعد راہ کھول دیتے ہیں اور یقین کرو کہ ایک مشکل دو آسانیوں پر ہرگز غالب نہ ہوگی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے
> یا ایھا الذین آمنوا اصبروا وصابروا ورابطوا واتقوا اللہ لعلکم تفلحون۔

مصابرہ کے لغوی معنے اور اس کے تقاضے

مصابرہ کے معنے ہیں اپنے حریف کے مقابلہ میں ثابت قدم رہنا اور اس وصف میں دشمن پر بازی لے جانے کی کوشش کرنا اور من حیث الجماعۃ اس کا مظاہرہ کرنا، مطلب یہ ہے کہ میدان جہاد میں تمہارا صبر کافروں کے صبر پر غالب رہنا چاہیے اس چیز کی تاکید اس موقع پر اس لیے

---

[1] البدایہ

کی گئی کہ اس معاملے میں مسلمانوں اور ان کے دشمنوں کے درمیان عملاً مسلح کشمکش شروع ہوگئی تھی اور اس کشمکش میں آخری کامیابی اس گروہ کے لیے مقدر تھی جو اپنے حریف پر استقلال اور پامردی کے میدان میں بازی لے جا سکے۔ میدانِ جنگ میں فتح و شکست کا اصل انحصار تعداد اور اسلحہ پر نہیں بلکہ اخلاق و کردار پر ہوتا ہے۔ اس لیے مصابرہ کا تقاضا یہ ہے کہ اگر اہل حق کا اہل باطل اہل ایمان کا اہل کفر سے مقابلہ ہو جائے تو ایسی پامردی، استقامت کا مظاہرہ کیا جائے کہ دشمن کی پامردی اور استقامت پر اہل ایمان کی پامردی اور استقامت غالب رہے۔ یعنی جو مصیبتیں مخالفین اور معاندین کے ہاتھوں پیش آئیں ان کو برداشت کرو۔ بیضاوی، قرطبی اور الجصاص نے یہی معنے بتاتے ہیں۔ اصل معنے مقابلہ میں صبر کا مظاہرہ کرنے کے اور مضبوط جمے رہنے کے ہیں۔ یہ مد مقابل خواہ میدانِ جنگ میں کافر ہوں یا میدانِ عبادت میں خواہشات ہوں۔ چنانچہ امام راغب نے اس کے یہ معنے لکھے ہیں کہ عبادت پر اپنے آپ کو جمائے رکھو اور اپنی خواہشات سے جنگ کرتے رہو۔

مرابطہ کے لغوی معنے اور اس کے تقاضے

مرابطہ کے لغت میں معنے محافظت، نگرانی کرنے اور چوکی و پہرہ دینے کے ہیں۔ اسی کا دوسرا مصدر رباط آتا ہے۔ قرآن میں رباط الخیل اسی سے آیا ہے اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل علامہ خازن فرماتے ہیں کہ مرابطہ کی اصل یہ ہے کہ ادھر کے لوگ اپنے گھوڑے اور ادھر کے لوگ اپنے گھوڑے اس طرح باندھ لیں کہ فریقین میں سے ہر ایک دوسرے سے جنگ کے لیے مستعد رہے۔ گھوڑے بندھے رکھنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس سامانِ جنگ اور ایک مستقل فوج ہر وقت تیار رہنی چاہیے تاکہ بوقت ضرورت فوراً جنگی کارروائی کر سکو یہ نہ ہو کہ خطرے کے وقت گھبراہٹ میں جلدی جلدی رضاکار، اسلحہ اور سامانِ رسد جمع کرنے کی فکر کی جائے اور اس اثنا میں کہ یہ تیاری مکمل ہو دشمن اپنا کام کر جائے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ مرابطہ ربط سے بنا ہے ربط کے معنے باندھنے کے آتے ہیں۔ مرابطہ کو مرابطہ اس لیے کہتے ہیں کیونکہ مرابطین خطرہ کے پیش نظر اپنے گھوڑے باندھے رکھتے ہیں، پھر ہر اس شخص کو کہنے لگے جو سرحد پر اقامت گزیں ہو اور اس کے ساتھ اس کو بھی مرابط کہنے لگے جو کسی طاعت کی انتظار میں اپنے کو باندھ کر رکھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد کیا میں تم کو ایسا کام نہ بتا دوں جو خطاؤں کو مٹا دے اور درجوں کو اونچا کرے۔ پھر آپ نے فرمایا کہ ناگواری کے وقت اچھی طرح وضو کرنا، مساجد کی طرف بکثرت جانا اور ایک نماز کے بعد دوسری نماز کا انتظار کرنا

یہی رباط ہے، یہی رباط ہے، یہی رباط ہے (مسلم نسائی) اسی معنے میں ہے۔

زمانہ کے احوال وظروف بدل جانے سے قوت وطاقت کے پیمانے بدل گئے ہیں۔ زمانہ نبوت میں قوت تیراندازی تھی آج تیراندازی کو جگہ بندوق کی نشانہ بازی اور بمباری اور رباط الخیل کی جگہ ٹینکوں اور ہوائی جہازوں نے لی ہے۔

اس آیت کی معنویت کو صرف شارحین قرآن نے نہیں دوسرے بزرگوں نے بھی اپنے فکر ومطالعہ کا مرکز بتایا ہے۔ آیئے آپ بھی لطف اندوز ہوجایئے۔ اصبروا اللہ کی طاعت پر اپنے کو جمائے رکھو۔ صابروا اللہ کی راہ میں قلب کی پوری خوشنودی کے ساتھ ناخوشگواریوں کا استقبال کرو رابطوا اللہ کی طرف اپنے مرکب شوق اسرار کے ساتھ باندھ لو، کچھ کہتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں صبر کرو، اللہ کی مدد سے مقابلہ کرو اور اپنے کو اللہ کے ساتھ باندھے رکھو، کچھ نے بتایا ہے کہ خوشحالی پر صبر کرو، تنگ حالی اور بدحالی کا مقابلہ کرو اور دشمن کے گھر میں مرابطہ ہوکر رہو اور ہر قدم پر اللہ کی نافرمانی سے بچو۔

تقویٰ اور اس کے تقاضے

زندگی کے مختلف حالات میں اللہ کی نافرمانی سے بچنا، اللہ کے غضب سے اور اس کی ناراضگی سے بچنا اور اجتماعی زندگی میں کہیں خدا کی نافرمانی کو نہ اپنانا تقویٰ ہے اور کوئی شخص صحیح معنے میں اس وقت تک متقی نہیں ہوسکتا جب تک اسے یہ پتہ نہ ہو کہ اللہ سبحانہ کن باتوں سے ناراض ہوتے اور کن سے راضی اور اس کا پتہ اس وقت تک نہیں لگتا جب تک قرآن وسنت کا مطالعہ نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ متقی ہونے کے لیے علم کا ہونا ضروری ہے۔

البقرہ میں اہل تقویٰ کا پورا حلیہ پڑھ آئے۔ اس میں نہ صرف عام حلیہ بلکہ ایک ایک خط وخال نمایاں کردیا ہے اور بتادیا ہے کہ یہی خدا کی نظر میں متقی ہیں۔

قرآن نے اس آیت میں اہل ایمان کی اجتماعی دنیوی فلاح کو ان باتوں کے ہونے پر موقوف کیا ہے ایمان، صبر، مصابرہ، مرابطہ اور تقویٰ یہ جیسے آخرت کی فلاح کی ناگزیر شرطیں ہیں ایسے ہی دنیوی فلاح کی بھی ان ہی کی ضمانت ہے یعنی دنیوی برکتوں اور کامیابی کے دروازے مسلمانوں پر اس وقت کھولے جاتے ہیں جب وہ ان شرطوں کو پورا کرتے ہیں۔

مَعَالِمُ القُرآن

النسآء

(۴)

سُورت کا نام

اس سُورت میں عورتوں سے متعلق احکام ہیں اس لیے اس کا نام سورۃ النساء ہے یعنی وہ سُورت جس میں عورتوں کے احکام کا ذکر ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اس سورت میں عورتوں کے علاوہ دوسرے احکام نہیں ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سُورت کے آغاز میں عورتوں کے احکام بیان کیے گئے ہیں، اس لیے دوسری سورتوں سے ممتاز کرنے کے لیے اس کا نام سورۃ النساء ہوا۔

سُورت کا موضوع

اس سورت کا موضوع بھی البقرہ، آل عمران کی طرح اجتماعی تقویٰ ہے۔ البقرہ میں منصب امامت کا علمبردار ہونے کی حیثیت سے اُمت وسطاً کہا تھا۔ اور آل عمران میں خیر اُمت فرمایا۔ البقرہ میں شہادت علی الناس کو اُمت کا فریضہ بتایا، آل عمران میں امر بالمعروف، نہی عن المنکر کو اُمت کا فریضہ بتایا ہے اور اس سُورت میں اُمت کو اجتماعی زندگی میں امانت کی ذمہ داری کا حامل بتایا ہے یعنی حکومت کی ذمہ داری سپرد کی گئی اور حکومت کے مصادر قانون بتانے۔ البقرہ میں پوری انسانیت کو متقی بننے کا تیر بہدف نسخہ بتایا۔ آل عمران میں خاص طور اہل ایمان سے مطالبہ کیا ہے کہ اتقوا اللہ حق تقاتہ۔ اس سُورت میں معاشرتی اور خاندانی زندگی میں تقویٰ پہ زور دیا ہے۔ بیوہ عورتوں کا سوال، مرنے والوں کے نابالغ بچوں کا مسئلہ، تعدد ازواج کا مسئلہ، عورتوں کی حلت وحرمت کا مسئلہ، کون کون سی عورتوں سے نکاح ناجائز ہے اور کن سے جائز ہے تعداد ازواج کی صورت میں عورتوں کے باہمی حقوق، بیوی سے سلوک، میاں بیوی کی باہم پوزیشن، مرد کی ذمہ داری اور عورت کی ذمہ داری، عورت اور مرد کے مابین جھگڑا اور اس کا تصفیہ، تصفیہ حقوق میں عدل وانصاف سے کام لینا اور کسی کی سفارش اور چکنی چپڑی باتوں میں نہ آجانا، بڑھتی ہوئی سوسائٹی کے پیش نظر اہل قرابت کے ساتھ سلوک، گود پیٹ کے رشتوں کی حفاظت اور باہم حسن سلوک پھر پڑوسیوں کے حقوق۔ یہ سب باتیں آپ کو اس سورت میں ملیں گی۔ پھر جماعت کی اخلاقی اصلاح کے سلسلے میں شراب بندی کی تحریک اور اس کی طرف تدریجی اقدام، سفر اور غزوات میں بعض سہولتوں کا اعلان، میدان جنگ میں نماز کا طریقہ، ان تمام باتوں کے ساتھ یہود کی توبیخ، نصاریٰ کو فہمائش کفار عرب کو تنبیہہ منافقوں کے لیے وعید، اہل ایمان کو لغو اور بیہودہ کو سائٹی سے روکنے کے احکام۔ یہ سُورت اس لحاظ سے آل عمران کا تتمہ ہے کہ اس میں معاشرتی تقویٰ کو

واضح طور پر بیان کیا ہے گویا یوں سمجھ کر اسلامی معاشرے کے لیے سورۃ بقرہ میں جو ہدایات دی گئی تھیں سورۃ نساء میں کھول کر بتایا گیا کہ اہل ایمان کو اجتماعی تقویٰ کیسے پیدا کرنا چاہیے۔ خاندان کی تنظیم کے اصول بتائے گئے ازدواجی زندگی میں قانونی پابندیاں عائد کی گئیں۔ عورتوں اور مردوں کے حقوق مقرر کیے گئے یتیموں کے حقوق کا اعلان کیا گیا۔ وراثت کی تقسیم کا ضابطہ مقرر ہوا۔ معاشی معاملات اور خانگی جھگڑوں کی اصلاح کا طریقہ بتایا گیا۔ تعزیری قانون کی بنیاد رکھی گئی، طہارت و پاکیزگی کے احکام دیے گئے۔ جیسا کہ پہلے اشارہ کر چکا ہوں کہ جیسے البقرہ اور آل عمران میں امت پر پوری انسانی دنیا کی اصلاح کی ذمہ داری ڈالی گئی تھی اور امت کو شہداء علی الناس اور خیر امت کا منصب فائز کیا گیا تھا۔ اس سورت میں یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے کہ اس منصب پر کھڑے ہونے اور اس عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے بعد جب انسانی زندگی کی قیادت کی گاڑی اس امت کو لے کر چلنی پڑے گی تو اسے کیسے چلایا جائے اور حکومت کیسے کی جائے۔ سب سے پہلے یہ واضح کیا کہ حکومت ایک امانت ہے اور اسے امانت ہی سمجھ کر نبھانا ہے۔ پھر نظم مملکت کے دستوری ماخذ بتائے۔ اسلامی دستور کی بنیادیں بتائیں۔ اسلام میں قانون سازی کا دائرہ عمل اور اس میں اجتہاد کا مقام، قانون سازی، شوریٰ اور اجماع، انسان کے بنیادی حقوق، غیر مسلموں کے حقوق، اسلام اور عدالت کے فرائض اور قضا کے آداب اس میں واضح کیے گئے۔

زمانہ نزول اور مقام

مقام کے لحاظ سے تو اس سورت کا نزول مدینہ طیبہ میں ہوا۔ قرطبی کہتے ہیں کہ ایک آیت کو مستثنیٰ کر کے تمام سورت مدینہ میں نازل ہوئی۔ مستثنیٰ آیت سے ان کی مراد ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا ہے اگرچہ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان کو چابی دیتے وقت یہ آیت پڑھی۔ شاید بزرگوں نے حضور کے پڑھنے ہی سے یہ نتیجہ اخذ کر لیا کہ یہ آیت مکہ میں نازل ہوئی۔

زمانہ نزول کی حد تک ہم حتماً کچھ نہیں کہہ سکتے لیکن امام بخاری نے صحیح میں جو حضرت عائشہ کا بیان درج کیا ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ سورۃ نساء اس وقت نازل ہوئی جب میں رسول اللہ کی اہلیہ ہو چکی تھی اور اس پر اتفاق ہے کہ حضرت عائشہ کی رخصتی ہجرت کے پہلے سال ہو چکی تھی، اس کا مطلب صاف لفظوں میں یہ ہے کہ یہ پوری سورت ۳ھ کے اوائل سے ۴ھ کے

اواخر تک نازل ہوچکی تھی ۔

شانِ نزول سورۃ نسآ

پوری سورت یکبارگی نازل نہیں ہوئی بلکہ مختلف فصلوں کی صورت میں نازل ہوئی ہے لیکن جس دور میں نازل ہوئی ہے وہ وقت وہ ہے جبکہ اہل ایمان ایک قابل توجہ جماعت بن چکے تھے۔ بڑے بڑے درباروں میں ان کے تذکرے ہورہے تھے، سوسائٹی بتدریج بڑھ رہی تھی اور سوسائٹی کی ضروریات بھی وسیع سے وسیع تر ہورہی تھیں۔ کاروباری، تجارتی، تمدنی اور سیاسی تعلقات مختلف ممالک اور مختلف قوموں سے وسیع ہورہے تھے۔ ان حالات کے تحت یہ سورت مختلف فصلوں، مختلف بابوں اور مختلف عنوانوں کے ساتھ سنہ ۳ھ سے شروع ہوکر سنہ ۵ھ کے اوائل تک نازل ہوتی رہی ہے۔ پوری فصلیں نازل ہونے کے بعد اسے سورۃ نسآ کے نام سے پکارا گیا ۔

---

(٤) سُوْرَةُ النِّسَآءِ مَدَنِيَّةٌ (٩٢)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمُ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ
وَّاحِدَةٍ وَّخَلَقَ مِنْهَا زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيْرًا
وَّنِسَآءً ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْ تَسَآءَلُوْنَ بِهٖ وَالْاَرْحَامَ ۭ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلَيْكُمْ رَقِيْبًا ①

اے انسانو! تم اپنے پروردگار سے ڈرو، جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بکثرت مرد اور عورت پھیلا دیئے۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو (بگاڑنے سے) پرہیز کرو یقین مانو کہ اللہ تم پر نگران ہے۔

عائلی نظام

انسانی تمدن کی بنیاد ایک مرد اور عورت کی باہمی رفاقت سے وجود میں آتی ہے۔ انہی دو انسانوں سے مل کر بننے والا چھوٹا سا اجتماعی دائرہ انسان کی تمدنی زندگی کی سب سے پہلی کڑی ہے۔ گویا خاندان افرادِ انسانی کے فطری میلانات کا براہ راست نتیجہ ہے۔ فطری میلانات کے بغیر خاندان کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ فرض کیجئے کہ اگر انسان ان فطری جذبات سے خالی ہوتا تو کیا خاندانی نظام وجود میں آ سکتا تھا۔ ماں باپ بھائی بہن بیوی شوہر داماد اور خسر کے جو رشتے خاندان بناتے ہیں ان کا وجود نہ ہوتا بہرحال خاندانی زندگی جس شکل میں آج موجود ہے اور ہمیشہ سے موجود رہی ہے وہ صاف طور پر دو انسانوں کے فطری میلانات کی پیداوار ہے۔ خاندان کا وجود درحقیقت انسانی کوششوں کا رہینِ منت نہیں بلکہ فطری اسباب کا نتیجہ ہے۔ جو چیز خاندانی نظام کو استحکام بخشتی ہے اور اس کے وجود کو موثر بناتی ہے وہ باہمی الفت کی فطری کشش خاندانی روایات سے لبستگی اور وہ خلقی خصوصیات ہیں جو ایک مورث کی اولاد ہونے کی وجہ سے افراد خاندان میں مشترک ہوتی ہیں۔ یہ تمام محرکات خاندان کو ایک منظم اجتماعی دائرہ بناتے ہیں۔ اللہ نے خاندانی نظام کچھ اس طرح بنایا ہے کہ پہلے انسان کی تخلیق فردِ واحد سے ہوتی ہے۔ پھر اس کی نسل سے بے شمار افراد پیدا ہوتے ہیں۔ پھر ہر فرد کی نسل سے الگ الگ سلسلے قائم ہو جاتے ہیں۔ پھر یہ سلسلے پھیلتے ہیں اور رفتہ رفتہ خاندانوں، قبیلوں، گروہوں اور بستیوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ اس صورتِ حال نے افراد کے باہمی اجتماع و اتحاد کے لیے صلہ رحمی یعنی نسلی قرابت کا رشتہ پیدا کر دیا ہے اور سوسائٹی کا نظام اسی پر قائم ہے۔ اگر اس رشتے کے موثرات نہ ہوتے تو انسان کی زندگی میں انفرادیت کی جگہ اجتماعیت نہ پیدا ہوتی۔

یہ رشتہ باہمی الفت و مساعدت کے جذبات پیدا کرتا اور ایک فرد کو دوسرے فرد کے ساتھ ملائے رکھتا ہے۔ لہٰذا نظامِ معاشرت کی درستگی کے لیے ضروری ہے کہ صلہ رحمی کے حقوق کی حفاظت کی جائے۔

ا۔ اے انسانو! تم اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا بنایا اور ان دونوں سے بکثرت مرد و عورت پھیلائے۔ یعنی حضرت آدم علیہ السلام سے اوّل تو حضرت حوا کو ان کی بائیں پسلی سے نکالا۔ پھر ان دونوں سے تمام مردوں اور عورتوں کو پیدا

کیا اور دُنیا میں پھیلایا۔ تو حقیقت میں تمام آدمی ایک جان اور ایک شخص سے اللہ تعالیٰ نے پیدا کیے مطلب یہ ہے کہ جب تم سب کو عدم سے وجود میں لانے والا اور پھر تم کو باقی اور قائم رکھنے والا وہی ہے تو اس سے ڈرنا اور اس کی فرمانبرداری ضروری بات ہے۔ اس سے اشارہ ہوگیا دو مضمونوں کی طرف اوّل یہ کہ اللہ تعالیٰ تم سب کا خالق اور موجد ہے۔ دوسرے یہ کہ تمام آدمیوں کے لیے سبب وجود کہ جس سے اللہ تعالیٰ نے سب کو پیدا کیا ایک ہی جان یعنی ابوالبشر حضرت آدم ہے جس سے معلوم ہوگیا کہ ہمارا اصلی تعلق اللہ سے ہے کیونکہ وہ علت تامہ ہے اور اس کے معلول میں جس قدر تعلق اور قرب اور علاقہ احتیاج ہوتا ہے وہ کسی میں ممکن نہیں۔ اس کے بعد وہ تعلق اور قرب ہے جو افراد انسانی میں باہم پایا جاتا ہے کیونکہ ان کا سبب وجود اور مخلوق منہ بالکل شے واحد ہے جس سے معلوم ہوگیا کہ اوّل تو ہمارے ذمہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت لازم ہونی چاہیے کہ وہ ہمارا خالق ہے اس کے بعد تمام مخلوقات میں خصوصاً اپنے نبی کی رعایت اور ان کے ساتھ حسن سلوک کرنا ہم پر ضروری ہونا چاہیے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہم سب کے لیے مخلوق منہ اور سبب وجود ایک چیز کو مقرر فرمایا تو جو قرب اور جو اتحاد افراد انسانی میں باہم موجود ہے وہ کسی دوسری چیز کے ساتھ حاصل نہیں اسی لیے شرعاً اور عقلاً آدمیوں میں باہم حسن سلوک ایسا ضروری اور بدسلوکی اس قدر مذموم ہے جو اوروں کے ساتھ نہیں جس کی تفصیل نصوص اور احکام شرعیہ میں موجود ہے۔ شیخ سعدی علیہ الرحمۃ نے اس مضمون کو بیان کیا ہے۔

بنی آدم اعضائے یکدیگر اند — چو بعضے از بعضے اگر گشتہ اند
چو عضوے بدرد آورد روزگار — دگر عضوہا را نماند قرار

تو اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی خالقیت ظاہر فرما کر اپنی طاعت کا حکم دیا اور بنی آدم کے اتحاد اصلی کو جتا کر اس طرف اشارہ کر دیا کہ باہم ایک ہو کر رہو۔ چنانچہ آیت کے آئندہ حصہ سے اس اشارے کو ظاہر کر دیا۔ [1]

اس آیت میں اصل اور بالذات تو حکم یہ ہے کہ متقیانہ سیرت اختیار کرو۔ اور خدا کی نافرمانی سے بچو۔ اس تقویٰ سے مراد یہ ہے کہ یہ مخلوق آپ سے آپ وجود میں نہیں آتی بلکہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہے جو سب کا خالق بھی ہے اور سب کا رب بھی، اس لیے کسی کے لیے روا نہیں ہے کہ

[1] افادات شیخ الاسلام۔

اس مخلوق کو ایک بے مالک اور بے راعی آوارہ گلہ سمجھ کر اس میں دھاندلی مچائے اور اس کو اپنے ظلم و تعدی کا نشانہ بناتے بلکہ ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اس معاملہ میں متقیانہ سیرت اختیار کرکے انصاف اور رحم کی روش اختیار کرے لے

آیت کے آغاز میں اس دعوے کے بعد کہ انہیں اللہ کی فرمانبرداری کرنی چاہیے اس کی یہ دلیل پیش کی ہے کہ وہ تمہارا رب ہے یعنی نظامِ ربوبیت سے توحیدِ طاعت پر استدلال کیا ہے یعنی جو رب تمام کائنات کی پرورش کر رہا ہے اور جس کی ربوبیت کا اقرار تم خود کرتے ہو۔ اس کے سوا کون بالذات اس کا مستحق ہے کہ اس کی طاعت کا قلادہ گردن میں ڈالا جائے۔ اس کے بعد اسی استدلال کی وضاحت کی گئی ہے اور اس وضاحت میں تین چیزیں پیش کی ہیں۔ ایک کہ تمام انسانیت نفس واحدہ سے اللہ نے پیدا فرمائی ہے دوسرے یہ کہ اسی سے اللہ نے اس کا جوڑا پیدا کیا اور تیسری یہ کہ ان دونوں سے مردوں اور عورتوں کی یہ کثرت ظاہر ہوتی ہے۔

نفسِ واحدہ سے انسانیت کی تخلیق

پہلی بات یعنی تمام انسانیت نفس واحدہ سے پیدا فرمائی ہے۔ اصل ارشاد کے الفاظ یہ ہیں۔ خلقکم من نفس واحدۃ ۔ عام شارحین قرآن نے یہاں نفس واحدہ سے مراد حضرت آدم کو لیا ہے اور علامہ آلوسی نے اسی کو فقہاء اور محدثین کی طرف منسوب کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمام نسلِ انسانی ایک ہی آدم کا گھرانہ ہے۔ سب کو اللہ تعالیٰ نے ایک ہی آدم و حوا کی نسل سے پیدا کیا ہے۔ نسلِ آدم ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ اس پہلو سے عربی، عجمی، احمر و اسود اور افریقی و ایشیائی میں کوئی فرق نہیں سب خدا کی مخلوق اور آدم کی اولاد ہیں خدا اور رحم کا رشتہ سب کے درمیان مشترک ہے۔ اس کا فطری تقاضا یہ ہے کہ سب ایک ہی خدا کی بندگی کرنے والے اور ایک ہی مشترک گھرانے کے افراد کی طرح آپس میں حق و انصاف اور مہر و محبت کے تعلقات رکھنے والے بن کر زندگی بسر کریں [2]

تم کو ایک جان سے پیدا کیا یعنی نوعِ انسان کی تخلیق ابتداءً ایک فرد سے ہوئی۔ دوسری جگہ قرآن نے خود اس کی تشریح کی ہے کہ وہ پہلا انسان آدم تھا جس سے دنیا میں نسلِ انسانی پھیلی [3]

وحدتِ نوعِ انسانی کا یہ سبق اپنے عملی اور دُور رس نتائج کے اعتبار سے کتنا اہم ہے، آخری

لے تدبر قرآن [2] [3] تفہیم القرآن۔

جدِ اعلیٰ ہر گورے اور ہر کالے کے ہر وحشی اور ہر مہذب کے ہر ہندی اور چینی کے ہر حبشی اور ہر فرنگی کے ایک ہی ہیں اور وہ آدم ہیں یہ نہیں کہ فلاں نسل کے مورثِ اعلیٰ کوئی اور ہیں اور فلاں نسل کے کوئی اور۔ اور نہ یہ کہ برہمن ذات والے برہما جی کے منہ سے پیدا ہوئے اور کھشتری نسل والے ان کے سینہ سے اور ویش جاتی والے ان کے پیٹ سے اور شودر ذات ان کی ٹانگوں سے اصلاً انسان سب ایک ہیں۔

امام رازی نے اپنی تفسیر میں نفس واحدہ کی تین توجیہیں نقل کی ہیں۔ ایک یہ کہ ہر انسان کو مخاطب کیا ہے کہ ایک ہی انسان سے پیدا کیا یعنی باپ سے یہ قفال مروزی کا خیال ہے دوسرے یہ کہ اہل عرب سے خطاب ہے اور مراد ان کا مورثِ اعلیٰ ہے یعنی اللہ نے تمہیں قصی بن کلاب سے پیدا کیا اور تیسرے یہ کہ نفس واحدہ سے مراد آدم ہیں۔ آلوسی نے اہل تشیع میں سے اس موضوع پر امامیہ کی یہ روایت نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے باپ آدم سے پہلے تیس آدم پیدا کیے ہر دو آدم کے درمیان ایک ہزار سال تھے اور ان کے بعد دُنیا پچاس ہزار سال ویران رہی۔ پھر پچاس ہزار سال آباد ہوئی۔ پھر ہمارے جدِ امجد آدم علیہ السلام پیدا ہوئے اور امام محمد بن علی الباقر سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اس آدم سے پہلے جو ہمارے باپ ہیں دس لاکھ آدم یا اس سے بھی زیادہ پیدا ہوئے۔ لیکن علامہ آلوسی نے یہ نقل کرنے کے بعد یہ بھی لکھ دیا ہے کہ یہ اہل السنۃ والجماعۃ کا مسلک نہیں ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہاں نفس واحدہ سے حضرت آدم ہی مراد ہیں اور حضرت آدم کی پیدائش ایک تکوینی ارادے کے تحت ہوئی تھی۔ مسئلہ ارتقاء سے متاثر ہو کر قرآن کی تاویل ظلم عظیم ہے اس موضوع پر قرآن کے تفصیلی بیانات اور مسئلہ ارتقاء کا گہرا مطالعہ کرنے کے بعد مفاہمت کی کوئی صورت ممکن نہیں ہے۔ یہ سعی خام صرف ان لوگوں نے کی ہے جنہوں نے یا تو مسئلہ ارتقاء کے اطراف و جوانب کو ملحوظ نہیں رکھا یا قرآن حکیم میں بے جا تاویل کی اہمیت محسوس نہیں کی۔ مرکزِ حیات روح اور پراٹوپلازم کے مابین تطبیق کی کوشش کی جا رہی ہے اور یہ سب کچھ مرعوبیت کے نتائج ہیں۔ پہلے فلسفہ قدیم سے دُنیا متاثر تھی اور اب فلسفہ جدید سے مرعوب ہے۔

مسئلہ ارتقاء کس حد تک کس معنے میں صحیح ہے یا نہیں؟ قرآن حکیم کو اس سے مطلق سروکار نہیں انسان بہرصورت اور بہرحال خلق ضرور ہوا ہے۔ قرآن انسان کی مخلوقیت کو بار بار نمایاں کر رہا ہے اور ہر اس نظریہ اور عقیدے کی تردید کر رہا ہے جو انسان کی تخلیق کے منافی ہے۔

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جو لوگ رُوحِ اسلامی اور پروٹو پلازم کے مابین مصالحت کی سعی کر رہے ہیں۔ ان میں مصر اور ہندوستان کے نئے مفسرین ہیں۔ ان کو یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جو لوگ

پروٹوپلازم کے قائل ہیں وہ اس حیات کو محض مادی حیات قرار دیتے ہیں ان کے خیال میں انسانی حیات و موت کی حقیقت ٹھیک اسی طرح ہے جس طرح کہ نباتات کی حیات و موت۔ ان میں نشوونما کی استعداد پیدا ہونے کا نام حیات ہے اور اس استعداد کے نہ ہونے کا نام موت۔ اور قرآن حیات و موت کا تعلق تمام تر عالمِ غیب سے وابستہ کرتا ہے۔ رُوح ایک غیبی حقیقت ہے اس کے نفخ سے انسانی حیات وجود میں آتی ہے۔ پھر اس غیبی حقیقت کے نکل جانے کو موت سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ قرآن کے نزدیک موت و حیات وہ نہیں ہے جو اُردو کا شاعر پیش کرتا ہے۔

زندگی کیا ہے عناصر میں ظہور ترتیب
موت کیا ہے ان ہی اجزا کا پریشاں ہونا

امام رازی نے اپنے مذاق کے مطابق اس مسئلہ کو اپنی تفسیر میں دو جگہ پیش کیا ہے اور لکھا ہے کہ انسانوں کی یہ کثرت عقلی لحاظ سے کسی ایک انسان پر جاکر ختم ہونی چاہیے لابد من انتهاء الناس الی انسان۔

خلاصہ یہ کہ قرآن حکیم کی تعلیم کی بنا پر نسلِ انسانی کی ابتدا حضرت آدم سے ہوئی اور تمام انسانوں کے لیے ان کا وجود اساس ہے۔ اسی وجود کو قرآن نے نفسِ واحدہ کہا ہے اسی کو آدم اور اسی کو بشر بتایا ہے۔

خلق منہا زوجہا کی تشریح

یعنی اسی نفسِ واحدہ سے اللہ نے اس کا جوڑا پیدا کیا ہے۔ اس فقرے کی تشریح میں شارحینِ قرآن مختلف الخیال ہیں۔

کچھ بزرگوں کا خیال تو وہی ہے جسے شیخ الاسلام نے پیش کیا ہے کہ حضرت آدم سے اول حضرت حوا کو ان کی بائیں پسلی سے نکالا۔ اصل بات یہ ہے کہ تخلیقِ حوا کی تفصیلی کیفیت سے قرآن خاموش ہے، جس مشہور حدیث کی بنا پر حضرت حوا کا حضرت آدم کی پسلی سے پیدا ہونا بیان کیا جاتا ہے۔ اس میں ذکر نہ حضرت آدم کا اور نہ حضرت حوا کا بلکہ اس میں محض عورت کی کج سرشتی کے لیے ایک بلیغ استعارہ ہے۔ حدیث بخاری و مسلم میں اس طرح ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں سے حسنِ سلوک کرو۔ کیونکہ یہ پسلی کی مخلوق ہے اور پسلیوں میں سب سے زیادہ کج اونچی ہوتی ہے۔ اگر تم اسے

سیدھا کروگے تو توڑ دوگے اور اگر چھوڑ دوگے تو ٹیڑھی رہے گی۔
اور بخاری کی دوسری روایت میں بجائے استعارے کے کھلے لفظوں میں تشبیہ آئی ہے۔ حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورت پسلی کی طرح ہے اگر سیدھا کروگے تو توڑ دوگے۔ (صحیح بخاری کتاب النکاح)

اور یہی حدیث امام مسلم نے بھی کتاب الرضاع میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے نقل کی ہے۔
اسی لیے کچھ شارحین حدیث نے اس حدیث کی شرح اس طرح کی ہے کہ یہ فطرت انسانی کی کجی کی طرف اشارہ ہے۔ چنانچہ صاحب مجمع البحار نے بخاری کے مشہور شارح کرمانی سے یہی معنے نقل کیے اور پھر زبان وادب کے لحاظ سے ضلع بمعنے پسلی ایک ثانوی مفہوم ہے۔ اصل معنے کجی اور انحراف کے ہیں۔ جیسا کہ زمخشری نے فائق میں اور ابن الاثیر نہایہ میں تصریح کی ہے۔
شاید آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ اگر حوا کی تخلیق سے قرآن خاموش ہے اور کوئی صریح ارشادِ پیغمبر بھی موجود نہیں تو پھر حوا کی تخلیق کی یہ تفصیلی کیفیت کیسے معلوم ہوئی؟ دراصل اس موضوع پر تورات میں یہ بیان آیا ہے:

خداوند خدا نے آدم پر بھاری نیند بھیجی وہ سو گیا اور اس نے اس کی پسلیوں سے ایک پسلی نکالی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک صورت بنا کر آدم کے پاس بھیجی۔ (پیدائش ۲: ۲۲، ۲۳)

اور تلمود میں اور زیادہ تفصیل کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ حضرت حوا کو حضرت آدم کی دائیں جانب کی تیرھویں پسلی سے پیدا کیا گیا تھا۔ یہ ان بزرگوں کا خیال ہے جو کہ حوا کی تخلیق آدم کی پسلی سے نہیں مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ بہتر یہی ہے کہ بات کو اسی طرح مجمل رہنے دیا جائے جس طرح اللہ نے اسے مجمل رکھا ہے اور اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے اور آیت کا یہ مطلب بتاتے ہیں کہ اللہ نے اسی کی جنس سے اس کا جوڑا بنایا۔ اس معنے کی قرآن کی دوسری آیات سے تائید ہوتی ہے مثلاً جعل لکم من انفسکم ازواجاً ظاہر ہے کہ اس کے معنے یہی ہو سکتے ہیں کہ اللہ نے تمہارے لیے تمہاری ہی جنس سے بیویاں بنائیں۔ اس کے یہ معنے کوئی نہیں لے سکتا کہ یہ بیویاں ہر ایک کے اندر سے پیدا ہوئیں۔
یہ تو ان بزرگوں کے موقف کی ترجمانی ہے جن کا خیال ہے کہ حوا آدم کی پسلی سے پیدا نہیں

ہوتی ہیں۔ آئیے اب ذرا ان کی باتیں بھی سن لیجئے جن کو اس پر اصرار ہے کہ حضرت حوا آدم کی پسلی ہی سے پیدا ہوئی ہیں اور آیت قرآنی کا منطوق یہی ہے۔ چنانچہ حضرت مولانا بدرعالم ان کی ترجمانی فرماتے ہوئے رقمطراز ہیں:

حضرت حوا کی تخلیق کے متعلق قرآنی و حدیثی بیان ہمارے پاس صرف یہی ایک ہے اور اس کے خلاف کوئی دوسرا بیان موجود نہیں ہے۔ حضرت حوا کی حضرت آدم کی پسلی سے گو پیدائش فہم سے بالاتر بات ہے۔ لیکن حدیث کے الفاظ پر ذرا غور کر لیا جائے تو راہ کی دشواری ختم ہو جاتی ہے۔ حدیث میں حضرت حوا کے بارے میں ولد کا لفظ نہیں بلکہ خلق آیا ہے یعنی ان کی ولادت کا ذکر نہیں بلکہ تخلیق کا بیان ہے۔ چونکہ اردو زبان میں دونوں کا ترجمہ یکساں ہے اس لیے یہاں خواہ مخواہ الجھن سی ہو گئی ہے۔ حدیث یہ نہیں کہتی کہ حضرت حوا کی ولادت پسلی سے ہوئی تھی بلکہ یہ کہتی ہے کہ ان کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے یعنی جس طرح حضرت آدم مٹی سے بنائے گئے تھے حضرت حوا ضلع آدم یعنی ان کی پسلی سے بنائی گئیں۔ ہمارے نزدیک تو انسان کی انسان سے تخلیق اتنی بعید نہیں جتنی کہ انسان کی مٹی سے بعید ہے۔ اس حدیث کے بیان کو اگر سورۂ نسآء کی اس آیت کی روشنی میں دیکھا جائے تو اس کی مزید تصدیق ہوتی ہے۔ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی یہ کثرت نہ تو براہ راست ابتداءً پیدا کی گئی ہے اور نہ صرف ایک وحدت سے پیدا کی گئی ہے بلکہ ایک تدریجی عمل کے ذریعے یہ سب کچھ ہوا ہے اور اس کی صورت یہ ہوئی کہ پہلے ایک نفس کی تخلیق ہوئی پھر اسی سے اس کے جوڑے کی تخلیق ہوئی، پھر ان دونوں سے انسانوں کی یہ کثرت پیدا کی گئی۔ اب اگر فرض کرو کہ حضرت حوا کی تخلیق بھی حضرت آدم کی طرح مستقل ہوتی تو سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان کا مادہ تخلیق کیا تھا۔ قرآن کریم اور حدیث میں مذکورہ بالا صورت کے علاوہ اس باب میں کوئی بیان نہیں۔ نیز اگر حضرت حوا کی تخلیق بھی مستقل مانی جائے تو پھر انسانوں کی کثرت کے ظہور کے لیے جو انداز بیان اختیار کیا گیا ہے اس کی بجائے سیدھی بات یہ تھی کہ ہم نے اس کثرت کو آدم و حوا سے پیدا کیا ہے جیسا کہ حضرت حوا کی تخلیق کا ذکر کرنے کے بعد بھی اندازِ اختیار کیا ہے وبث منهما رجالاً كثيرا و نساءً

سورۂ بقرہ میں امام قرطبی نے صرف اسی تفسیر کو ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے کہ عربی زبان میں عورت کو امرأۃ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ المرء سے بنی ہے جس کے معنے مرد کے ہیں اور اس کا نام حوا بھی اس لیے رکھا گیا کہ وہ ایک حی یعنی زندہ ہستی سے بنائی گئی۔ گویا یہ حقیقت

حضرت حوا کی تخلیق سے لے کر ان کے نام تک میں سرایت کر گئی ہے بلکہ احکام میں بھی اس کا اثر یہاں تک ظاہر ہوا کہ امام شافعی کے مذہب میں شیر خوار لڑکے کا پیشاب بہ نسبت شیر خوار بچی کے نجاست میں خفیف سمجھا گیا۔ جب امام شافعی سے اس فرق کی وجہ پوچھی گئی تو انہوں نے یہ نکتہ آفرینی فرمائی کہ نوعِ انسانی میں مرد کی پیدائش آب و گل سے ہوتی ہے اور وہ پاک ہے اور عورت کی تخلیق گوشت خون سے ہوتی ہے اور وہ ناپاک ہے اس لیے نوعِ انسانی میں بھی اپنی اصل کے احکام باقی رہ گئے۔ امام موصوف کا یہ بیان صرف ایک علمی نکتہ ہے ورنہ مسئلہ کی بنیاد صحیح حدیثوں پر ہے فروع کی تفصیلات کا یہ محل نہیں ہے۔

نیز عقلی طور پر بھی تخلیق کی چار ہی صورتیں ہیں۔

اولاً ـــــ والدین کے بغیر پیدائش ہو جائے جیسے حضرت آدم کی تخلیق

ثانیاً ـــــ والدین کے ذریعے پیدائش ہو جیسے کہ عام معمول ہے۔

ثالثاً ـــــ صرف والدہ سے پیدائش ہو جیسا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام

اب صرف ایک صورت باقی رہتی ہے جس میں صرف مذکر سے تخلیق ہو۔ اگر حدیث مذکور میں تاویل نہ کی جائے اور خلق منہا زوجہا کے منہ میں کچھ اور مطلب نہ ڈالا جائے تو حضرت حوا کی تخلیق اسی چوتھی صورت کا مصداق ہو گی ورنہ دائرہ تخلیق میں صرف یہی ایک صورت ہو گی جس کی مثال نہ ہو گی۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ دوسری صورت کے علاوہ سب صورتیں عقلاً ناقابلِ فہم ہیں۔ اسی لیے نصاریٰ نے اگرچہ حضرت مسیح کی پیدائش کا صرف والدہ سے اعتراف تو کر لیا لیکن پورے طور پر اسے سمجھ نہ سکے حتیٰ کہ مافوق الفہم ہونے کی وجہ سے اعتراف کے باوجود اسے ابنیت کی دلیل بنا لیا۔ اور دوسری طرف یہود نے اس خلقت کے غیر معقول ہونے کی وجہ سے حضرت مریم پر بہتان لگا دیا۔ حضرت حوا کی شخصیت حضرت آدم کے اہم واقعات میں اس طرح گم ہے کہ یہاں نئے نئے محققین صاف طور پر علانیہ تو کچھ نہیں کہتے مگر ان کے دلوں میں تخلیق کی اس نوع میں کچھ شبہات ضرور ہیں۔

ہماری رائے میں مذکورہ بالا حدیث خلق منہا زوجہا کے اجمال کا بیان ہے اور اس تخلیق کا نکتہ بھی قرآن نے دوسری جگہ خود بیان کر دیا ہے۔ ارشاد ہے جعل منہا زوجہا لیسکن الیہا سورۃ نسآ میں خلق منہا زوجہا اور سورۃ اعراف میں جعل منہا ہے اور دونوں جگہ حضرت حوا کا ذکر ہے مگر سورۃ اعراف میں اس کی حکمت بیان کی گئی ہے اور یہ حکمت بھی یہی چاہتی ہے کہ حوا آدم ہی سے بنائی گئی تھیں۔ کیونکہ انسان میں انس جتنی ہم جنس سے ہوتی ہے۔

اس سے زیادہ کشش اس کی طرف ہوتی ہے جو خود اسی سے پیدا شدہ ہو۔ اسی لیے جو محبت اپنی اولاد سے ہوتی ہے وہ کسی دوسرے کے ساتھ نہیں ہوتی ہے۔ اجنبی مرد و عورت کے درمیان عقد نکاح کے فوراً بعد جس محبت کا مشاہدہ ہوتا ہے اس سے یہ اندازہ کر لینا کچھ بعید نہیں کہ ان کے اصول میں ضرور کوئی ایسا رشتہ ہونا چاہیے۔ حضرت حوا کی حضرت آدم سے تخلیق نہ ہوتی تو نسل انسانی میں کسی مرد کو کسی عورت کی طرف کبھی رغبت نہ ہوتی۔

شاید آپ یہ سوچیں کہ آدم سے حوا کی تخلیق کیوں کر ہوئی۔ میں خود سائنس کا طالب علم نہیں مگر آپ کے ذہنی اور دماغی سکون کی خاطر مشہور ڈاکٹر مرحوم رفیع الدین کا وہ بیان پیش کرتا ہوں جو انہوں نے قرآن اور علم جدید کتاب میں حوالہ قلم کیا ہے فرماتے ہیں:

> قرآن میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عورت کو مرد کے پہلو سے پیدا کیا ہے۔ یہ تصور بشر کی فوری تخلیق سے نہیں بلکہ تدریجی ارتقائی تخلیق سے مطابقت رکھتا ہے۔ اگر خدا نے آدم کا پتلا بنا کر اسے پھونک سے فی الفور زندہ کر دیا تھا تو وہ حوا کو بھی اس کے ساتھ ہی اسی طرح پیدا کر سکتا تھا۔ انسان جیسے ایک ترقی یافتہ جاندار کا کوئی ٹکڑا ایک مکمل جاندار نہیں ہو سکتا۔ مرد کے پہلو سے عورت کے پیدا ہونے کی حقیقت یہ ہے کہ جسد انسانی کی اولین صورت ایک جونک کی طرح ایک ہی خلیہ پر مشتمل تھی اور ایک خلیہ کے جاندار کے توالد کا طریق یہ ہے کہ وہ بڑھ کر خود بخود دو حصوں میں منقسم ہو جاتا ہے جن میں ہر ایک حصہ ایک مکمل جاندار ہوتا ہے۔ پھر بدنی ارتقاء کے اگلے مراحل پر ایک حصہ مادہ کے فرائض کے لیے اور دوسرا حصہ نر کے فرائض کے لیے موزوں ہوتا ہے اور پھر جسمانی ارتقاء کی انتہا پر جب انسان کا ظہور ہوتا ہے تو اپنے اجداد کی طرح وہ بھی ازدواج کی شکل میں ہوتا ہے۔
>
> (قرآن اور علم جدید)

اصل یہ ہے کہ کیفیت کی تفصیل کا تعلق تو ایسے عالم سے ہے جس کے لیے ہماری تعبیرات کام نہیں دے سکتی ہیں۔ ہماری ہر تعبیر کسی ایسی حالت کا تصور پیدا کرے گی جو ہمیں پیش آتی رہتی ہے لیکن تکوین کے جو معاملات ہیں ان کی نوعیت ہی دوسری ہے وہ ہماری محسوسات و مفہومات کے دائرے سے باہر کے معاملات ہیں اس لیے صرف وہ ہی کچھ ماننا چاہیے جس کی قرآن و سنت رہنمائی کر رہے ہیں۔

مردوں اور عورتوں کی کثرت

اصل ارشاد میں و بث منھما رجالاً کثیراً و نساء کے الفاظ ہیں مطلب یہ ہے کہ جس طرح آدم تمام انسانوں کے باپ ہیں ایسے ہی حوا، تمام انسانوں کی ماں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے حوا، کو آدم ہی سے بنایا ہے اس لیے عورت کوئی ذلیل، حقیر، فروتر اور فطری گنہ گار مخلوق نہیں ہے بلکہ وہ بھی شرف انسانیت میں برابر کی شریک ہے۔ اس کو حقیر و ذلیل سمجھ کر نہ اس کو حقوق سے محروم کیا جا سکتا ہے نہ کمزور خیال کر کے اس کو ظلم و ستم کا نشانہ بنایا جا سکتا ہے۔ آلوسی نے ابوالبقاء سے یہ نکتہ خوب نقل کیا ہے کہ یہاں لفظ کثیر رجال کی صفت نہیں ہے بلکہ اس کا موصوف محذوف ہے یعنی بثاً کثیرا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں ہی سے زمین میں مردوں اور عورتوں کا بہت پھیلاؤ ہوا ہے۔ آدم کے وقت سے لے کر اب تک جو آبادی ہر ملک اور ہر زمانہ میں رہی ہے اس کے مجموعہ پر بھی اگر کثیر کا اطلاق نہ ہو گا تو اور کس پر ہو گا۔

اہل قرابت کے حقوق

۲۔ اور اس اللہ سے ڈرو جس کا واسطہ دے کر تم ایک دوسرے سے سوال کرتے ہو اور رشتہ و قرابت کے تعلقات کو بگاڑنے سے پرہیز کرو، یقین مانو کہ اللہ تم پر نگران ہے۔ خالق اور رب یعنی موجد اور منعم ہونے کے علاوہ اللہ سے ڈرنے اور اس کی طاعت کے وجوب کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ تم اس کا واسطہ دے کر باہم ایک دوسرے سے اپنے حقوق اور فوائد طلب کرتے ہو اور آپس میں اس کی قسمیں دیتے ہو اور ان پر اطمینان حاصل کرتے ہو۔ یعنی اپنے باہمی معاملات اور حاجات عارضہ میں اسی کا ذریعہ پکڑتے ہو۔ مطلب یہ ہوا کہ وجود اور بقا ہی میں احتیاج منحصر نہیں بلکہ تمام حاجتوں اور کاموں میں بھی اس کے محتاج ہو اس لیے اس کی اطاعت کا ضروری ہونا اور بھی محقق اور ثابت ہو گیا۔ اس کے بعد تم کو حکم یہ ہے کہ قرابت سے بھی ڈرو یعنی اہل قرابت کے حقوق ادا کرتے رہو اور قطع رحم اور بدسلوکی سے بچو۔ بنی نوع یعنی تمام افراد انسانی کے ساتھ علی العموم سلوک کرنا تو آیت کے پہلے حصہ میں آ چکا تھا۔ اہل قرابت کے ساتھ چونکہ قرب و اتحاد مخصوص اور بڑھا ہوا ہے اس لیے ان کی بدسلوکی سے خاص طور پر ڈرایا گیا کیونکہ ان کے حقوق دیگر افراد انسانی سے زیادہ ہیں چنانچہ حدیث قدسی میں ہے۔

اللہ سبحانہ نے رحم سے خطاب کرکے فرمایا میں اللہ ہوں میں رحمان ہوں، رحم شکم مادر کا نام رحمان اپنے نام سے میں نے نکالا ہے جس نے تجھ کو ملایا اس کو میں نے ملایا اور جس نے تجھ کو کاٹا اس کو میں نے کاٹا ہے۔

ایک اور ارشاد میں حسن تعبیر کا اس سے بھی زیادہ نازک طریقہ اختیار فرمایا ہے:

جب اللہ نے مخلوقات کو پیدا کیا تو رحم انسانی نے اس رحمت والے خدا کا دامن (اصل میں حقوہ ہے) تھام لیا۔ اللہ نے فرمایا ٹھہر جا۔ یہ اس کا مسکن ہوگا جو تیری گرہ کاٹنے سے بچے گا کیا تو اس سے خوش نہیں کہ جو تجھ کو ملائے اس کو میں اپنے سے ملاؤں اور جو تجھ کو کاٹے اس کو میں اپنے سے کاٹوں[1]

ایک اور ارشاد ہے کہ:

رحم رحمان سے ہے اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے جو اسے قطع کرے گا میں اسے قطع کروں گا اور جو اسے ملائے گا میں اسے ملاؤں گا۔

ایک اور حدیث ہے کہ:

رحم عرش الٰہی کے نیچے لٹکا ہوا ہے اور وہ کہتا ہے کہ سن لو جو مجھ کو ملائے گا اللہ اس کو ملائے گا اور جو مجھے قطع کرے گا اللہ اسے قطع کرے گا۔

یہ ارشادات اس پر شاہد ہیں اور رحم کے اختصاص مذکور اور تعلق کی طرف مشیر ہیں تو اب نتیجہ یہ نکلا کہ معدن وجود اور منشاء وجود کے اتحاد کے باعث تو تمام بنی آدم میں رعایت حقوق اور حسن سلوک ضروری ہے اس کے بعد اگر کسی موقعہ پر کسی خصوصیت کی وجہ سے اتحاد میں زیادتی ہوجائے جیسے اقارب میں یا کسی موقع پر شدت احتیاج پائی جائے گی جیسے یتامیٰ اور مساکین وغیرہ تو وہاں رعایت حقوق میں بھی ترقی ہوجائے گی۔ ان کے علاوہ جب حکم خداوندی بھی صاف آگیا کہ ارحام کے حقوق کی رعایت اور حفاظت بھی رکھو تو اب یہ تاکید انتہا کو پہنچ گئی۔ چنانچہ اس سورت میں بیشتر احکام اسی تعلق عام اور دیگر تعلقات خاصہ کے بارے میں مذکور ہیں گویا سلسلے احکام اس قانون کلی کی جو یہاں ذکر ہوا ہے تفصیل ہیں۔[2]

یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اس ارشاد میں والارحام کو جمہور قراء نے میم کو زبر کے ساتھ پڑھا ہے اس لیے اس کا عطف لفظ اللہ پر ہوگا یعنی جو واتقوا اللہ میں واقع ہے اور ترجمہ اس طرح

---

[1] صحیح بخاری [2] افادات شیخ الاسلام

ہو گا کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرو اور قرابتوں سے ڈرو۔ یعنی نہ اللہ کی نافرمانی کرو اور نہ اہلِ قرابت سے قطع رحمی کرو، بلکہ ان سے صلہ رحمی کرو اور ان کے حقوق ادا کرتے رہو۔ شیخ الاسلام نے اسی کو اختیار کیا ہے۔

اور بعض قراء نے والارحام کو میم کے زیر کے ساتھ پڑھا ہے اور اس کا عطف تساءلون بہ میں ضمیر مجرور پر کیا ہے اس صورت میں ترجمہ اس طرح ہو گا کہ اللہ سے ڈرو جس کے واسطہ سے سوال کرتے ہو اور رحموں اور قرابتوں کے واسطے سے بھی تم سوال کرتے ہو۔ اہل عرب کی عادت تھی کہ جب اپنے کسی رشتہ دار کے پاس حاجت لے کر جاتے تو یوں سوال کرتے اسئلک باللّٰہ بالرحم میں تجھ سے اللہ اور قرابت کا واسطہ دے کر سوال کرتا ہوں۔

اسی دستور کے مطابق اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں کہ جب تم اللہ تعالیٰ کی عظمت اور حقوق رحم و قرابت کو جانتے ہو اور اس کا واسطہ دے کر لوگوں سے سوال کرتے ہو تو پھر اس پر عمل کیوں نہیں کرتے۔ خدا سے ڈرو اور اعزاء و اقرباء کے حقوق شریعت کے موافق ادا کیا کرو۔[1]

علامہ آلوسی نے اس پر بڑی طویل بحث کی ہے بہرحال ہمارے نزدیک زبر والی قرات راجح ہے۔ یہاں قرآن نے اللہ کے ساتھ ارحام کا ذکر کر کے اہلِ قرابت کی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے اسی حقِ قرابت کو عربی زبان کے محاورے میں صلہ رحم کہتے ہیں۔ قرآن کی اخلاقی تعلیم میں صلہ رحم اور حقوقِ قرابت کی اہمیت سب سے زیادہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کی طرف بار بار توجہ دلائی ہے۔ قرآن حکیم کی کم از کم بارہ آیتوں میں اس کی صریح تاکید ہے اور اس کو انسان کا احسان نہیں بلکہ فرض قرار دیا ہے۔ آیت میں والارحام لاکر اشارہ کیا ہے کہ رحم مادری تعلقاتِ قرابت کی جڑ ہے۔ کسی معاملہ میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوقِ محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے۔ یہ اشتراک کہیں ہم عمری، کہیں ہم درسی، کہیں ہمسائگی، کہیں ہم مذاقی، کہیں ہم پیشگی، کہیں ہم وطنی اور کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس اشتراک کے عقدِ محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے جانبین کے حقوق کی نگہداشت اور فرائضِ محبت کی ادائیگی واجب ہے لیکن ان تمام بندھنوں کے ٹوٹ جانے والے اشتراک کل سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن رحمِ مادر ہے۔ یہ ہم رحمی خالقِ فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے جو متفرق انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دستِ قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے

---

[1] معارف مولانا محمد ادریس

ماہر ہے۔ اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے اور اس کو اس قدر اہمیت حاصل ہے کہ آگے چل کر چونکہ باہمی حقوق بیان کرنے ہیں اور خصوصیت کے ساتھ خاندانی بہتری اور استواری کے لیے ضروری قوانین بتانے ہیں اس لیے تمہید اس طرح اٹھائی گئی ہے کہ ایک طرف اللہ سے ڈرنے اور اس کی ناراضگی سے بچنے کی بتکرار تاکید کی دوسری طرف یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ تمام انسان ایک ماں اور باپ سے ہیں اور ایک دوسرے کا خون اور گوشت ہیں تیسری طرف ارحام کا ذکر کر کے حق شناسی اور رحم سے وفاداری مخاطبوں کے جملۂ دماغ میں اتار دی۔ یہ گویا مقدمہ اور تمہید ہے ان قوانین کے لیے جو معاشرہ کی اصلاح کے لیے آگے بیان ہو رہے ہیں۔

آخر میں فرمایا ہے کہ ان اللہ کان علیکم رقیباً یقین مانو کہ اللہ تم پر نگرانی کر رہا ہے یعنی تمہارے تمام احوال و اعمال سے واقف ہے اس کے حکم کی متابعت کر دگے تو ثواب پاؤ گے۔ ورنہ مستحق عذاب ہو گے اور تمہارے تعلقات ارحام اور ان کے مراتب اور ہر ایک کے مناسب اس کے حقوق کو بھی خوب جانتا ہے اس لیے اس کے متعلق جو تم کو حکم دے اس کو حق سمجھو اور اس پر عمل کرو[لہ] رقیب کے معنے دیکھ بھال کرنے والا، نگہبان اطلاع رکھنے والا) اردو اور فارسی کے شعراء اس لفظ کو بہت استعمال کرتے ہیں اور باوجود بکثرت مستعمل ہونے کے پھر اس لفظ نے اپنے حقیقی معنے کو ترک نہیں کیا۔ اس نگرانی میں انسان کے ذاتی، خانگی اجتماعی سارے معاملات آگئے۔ اگر اس کا استحضار رہے تو خانگی زندگیاں کس قدر خوشگوار ہو جائیں۔

خطبہ نکاح میں اس آیت کی تلاوت

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس آیت کو دوسری دو آیتوں کے ساتھ خطبۂ نکاح میں تلاوت کرتے تھے۔ اس آیت میں انسانیت کے پہلے جوڑے کی پیدائش کا ذکر ہے جس سے کروڑوں مرد عورت پیدا ہوتے اور پھر اس واقعہ کو تمہید بنا کر یہ نتیجہ ذہن نشین کرایا ہے تو پھر چاہیے کہ ہم اپنے کاروبار اور معاملات میں اپنے اس خالق کا اور ان رحموں اور رشتوں کا لحاظ کریں جو ہماری تخلیق کا ذریعہ اور واسطہ ہیں۔ غور سے دیکھو تو معلوم ہو گا کہ ہر قسم کی قرابتوں اور رشتہ داریوں کی جڑ بھی نکاح ہے۔ یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ پیدا نہ ہو سکتا اس لیے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ

[لہ] افادات شیخ الاسلام

اسی کی بدولت وجود میں آیا ہے اور اس نقطہ خیال سے بھی دُنیا میں نکاح کی اہمیت بہت بڑی ہے کہ اسی سے ساری دُنیا کے عزیزانہ مہر و محبت اور اُلفت و مودت کا آغاز ہوتا ہے۔

دراصل اس آیت میں انسانی اقدار کی طرف رہنمائی کی گئی اور ان ہی قدروں کو بتانے کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت خطبۂ نکاح میں تلاوت کرتے تھے تاکہ عورتوں کے بارے میں کمتری کا ذہن اوّل وہلہ میں ختم ہو جائے دوسری دو آیتیں آپ جو تلاوت کرتے تھے۔ ان میں ایک آل عمران کی آیت یا ایھا الذین امنوا اتقوا اللہ حق تقاتہ ولا تموتن الا و انتم مسلمون اور دوسری سورہ احزاب کی آیت یا ایھا الذین آمنوا اتقوا اللہ وقولوا قولا سدیداً الی اخر الآیۃ۔ پہلی آیت میں ایمانی قدروں اور دوسری آیت میں اخلاقی قدروں کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

وَاٰتُوا الْيَتٰمٰۤى اَمْوَالَهُمْ وَلَا تَتَبَدَّلُوا الْخَبِيْثَ بِالطَّيِّبِ ۪ وَلَا تَاْكُلُوْۤا
اَمْوَالَهُمْ اِلٰۤى اَمْوَالِكُمْ ؕ اِنَّهٗ كَانَ حُوْبًا كَبِيْرًا ﴿۲﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ
اَلَّا تُقْسِطُوْا فِى الْيَتٰمٰى فَانْكِحُوْا مَا طَابَ لَكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ مَثْنٰى وَ
ثُلٰثَ وَرُبٰعَ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً اَوْ مَا مَلَكَتْ
اَيْمَانُكُمْ ؕ ذٰلِكَ اَدْنٰۤى اَلَّا تَعُوْلُوْا ﴿۳﴾ وَاٰتُوا النِّسَآءَ صَدُقٰتِهِنَّ نِحْلَةً ؕ
فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَىْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـًٔـا مَّرِيْٓـًٔـا ﴿۴﴾

اور یتیموں کے مال ان کے حوالے کر دو اور اچھے مال کو برے
مال سے نہ تبدیل کرو۔ اور ان کا مال اپنے مالوں کے ساتھ ملا
کر خورد برد نہ کرو بلاشبہ یہ بہت بڑا گناہ ہے[۲]۔ اور اگر
تمہیں اس بات کا اندیشہ ہو کہ تم یتیم بچیوں کے معاملے میں
انصاف نہ کر سکو گے تو جو عورتیں تمہیں پسند ہوں ان سے
نکاح کر لو دو دو تین تین چار چار۔ اور اگر تمہیں اندیشہ ہو

کہ تم ان میں انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی عورت سے
شادی کرو یا پھر ان عورتوں کو بیوی بنا کر رکھو جو تمہارے قبضے
میں آئی ہیں۔ یہ بے انصافی سے بچنے کے لیے زیادہ قریب ہے۔
اور عورتوں کے مہر خوشدلی کے ساتھ فرض جانتے ہوئے
ادا کرو۔ ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو تم اسے مزے
سے کھا سکتے ہو۔

یتامیٰ کے حقوق

[illegible]

[illegible]

لیے یتیم کی تربیت کتنی ضروری ہے یہ والد کی ذات ہے جو اپنی چھوٹی اولاد کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و فلاح کی کفیل ہوتی ہے۔ اس کو دین و دُنیا میں ہر طرح بامراد بنانے کی کوشش کرتی ہے۔ اس کے لیے معاشی فراوانی کے ذرائع سوچتی ہے اور اس کی زندگی کو ہر طرح خوش گوار بنانے اور اخلاقی و معاشی تباہیوں سے محفوظ رکھنے کی تدبیریں اختیار کرتی ہے اور اس طرح اس کو صالح تمدن کا ایک لائق شہری بناتی ہے۔ اگر بچے اپنے باپ کی کفالت اور تربیت سے محروم ہو جائیں جیسا کہ اُحد میں ستر صحابہ کی شہادت سے ہوا اور ان کی تربیت کا کوئی قانونی نظم نہ ہو تو نتیجہ اس کے سوا کیا ہے کہ ان کا نشوونما غلط ماحول میں ہوگا جس کی وجہ سے وہ ناشائستہ اطوار سے قریب اور اخلاق حسنہ اور کمالات انسانی سے دُور ہوتے جائیں گے۔ ان آیات میں قرآن نے صرف اخلاقی نہیں بلکہ قانونی طور پر اسی کا انتظام کیا ہے اور اُحد کے بعد مسلمان جس نئی صورت حال سے دوچار ہوئے تھے اس کے تحت نئی ہدایات دی گئی ہیں۔ ان میں اولیت یتیموں کو دی گئی ہے۔ ان کے حقوق کا ذکر کیا گیا۔

یتیموں کے مال کی حفاظت

۲۔ اور یتیموں کے مال ان کے حوالے کر دو اور اچھے مال کو بُرے مال سے نہ تبدیل کرو اور ان کا مال اپنے مالوں کے ساتھ ملا کر خورد بُرد نہ کرو بلاشبہ یہ بہت بڑا گناہ ہے۔ یعنی یتیم بچے جن کا باپ مر گیا ہو ان کے ولی اور سرپرست کو یہ حکم ہے کہ جب وہ بالغ ہو جائیں تو ان کا مال ان کے سپرد کر دے اور زمانہ تولیت میں یتیموں کی کسی اچھی چیز کو لے کر اس کے معاوضہ میں بُری اور گھٹیا چیز ان کے مال میں شامل نہ کرے اور ان کے مال کو اپنے مال کے ساتھ ملا کر نہ کھاتے۔ مثلاً ولی کو اجازت ہے کہ اپنا اور یتیم کا نقصان نہ ہونے پاتے۔ یہ نہ ہو کہ اس شرکت کے بہانہ سے یتیم کا مال کھا جائے اور اپنا نفع کرے کیونکہ یتیم کا مال کھانا سخت گناہ کی بات ہے۔ احکام متعلقہ ارحام میں یتیموں کے حکم کو شاید اس لیے مقدم کیا کہ یتیم اپنی بے سرو سامانی، مجبوری، بے چارگی اور بے کسی کے باعث رعایت و حفاظت اور شفقت کا نہایت محتاج ہے۔ اور اسی اہتمام کی وجہ سے تبدیل اور شرکت کے نقصان کی بھی کھول کر ممانعت فرما دی۔ اور آئندہ متعدد آیات میں یتیموں کے چند احکام ارشاد ہوئے ہیں جن سے اہتمام مذکور ظاہر و باہر معلوم ہوتا ہے اور یہ تمام احکام اور تاکیدات جملہ یتیموں کے حق میں ہیں۔ البتہ وہ یتیم جو قرابت دار ہیں ان

[illegible]

[illegible]

[illegible] کے لیے ان کو پھسلا پھسلا کر ان کی وراثت ہتھیا لیتے تھے۔ [illegible] ان میں مال ہو، پر یتیم بچوں کے ساتھ سخت سلوک ہوتا تھا۔ قرآن پاک میں ان کی اس شکل کا ذکر کیا ہے۔

فذلک الذی یدع الیتیم یہی ہے جو یتیم کو دھکے دیتا ہے۔

ایک دوسری جگہ [illegible] یتیموں کے مال [illegible] ان کو ہڑپ کر جاتے تھے۔

وتاکلون التراث اکلا لما [illegible]

یتامیٰ کے متعلق اخلاقی ہدایات

[illegible]

[illegible]

ظلم و ستم کے گرفتاروں کی گردنوں کو چھڑا کر، بھوکوں کو کھلا کر اور یتیموں کی خدمت کر کے

اواطعام فی یوم ذی مسغبۃ یتیما ذا مقربۃ

بھوک والے دن میں کسی رشتہ دار یتیم کو کھانا کھلا کر

نیک اور نیک بختوں کی تعریف میں فرمایا کہ وہ یہ ہیں

ویطعمون الطعام علی حبہ مسکیناً و یتیماً و اسیراً

اور اس کی محبت کے ساتھ غریب، یتیم اور قیدی کو کھانا کھلاتے ہیں

یتامیٰ کے بارے میں قانونی ہدایات

مدینہ میں آنے کے بعد ان اخلاقی ہدایتوں نے قانون کی صورت اختیار کر لی۔ اس سورت میں اس بے کس گروہ کے متعلق خاص قانونی ہدایات آئی ہیں۔ اس آیت میں تین قانونی دفعات ہیں۔

اول جو لوگ یتیموں کے نگران اور محافظ ہوں انہیں چاہیے کہ ان کا مال ان کو دیانتداری کے ساتھ حوالے کر دیں۔

دوم ایسا نہ کرو کہ ان کی اچھی چیز کو ناکارہ چیز سے بدل ڈالو۔

سوم ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر خورد برد نہ کرو۔

سب سے پہلی دفعہ کے لیے اصل ارشاد یہ ہے کہ آتوا الیتامیٰ اموالھم اس میں روئے سخن یتیموں کے اولیاء اور سرپرستوں کی طرف ہے اور اس کا عطف اوپر واتقوا اللہ پر ہے۔ یعنی تقویٰ کا اس موقعہ پر اولین تقاضا یہ ہے کہ اے سرپرستو اور اے متولیو ان یتیموں کے مال ان کے بالغ ہونے پر ان کے حوالہ کر دو اور اس کے لیے یہ ہرگز ضروری نہیں کہ تم ان کی جانب سے مطالبہ کا انتظار کرو۔ یہاں یہ عجیب نکتہ ہے کہ اب جبکہ وہ بالغ ہو چکے ہیں ان کو یتیم کہا جا رہا ہے اور ان کو جائداد اور سامان سپرد کیا جا رہا ہے۔ یہ استصحاب کہلاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ جو یتیم تھے اور اب بالغ ہو کر اپنا زمانہ یتیمی ختم کر چکے ہیں۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یتیم ابی طالب کہتے ہیں۔ اور حضرت مولانا اشرف علی نے یہاں یتامیٰ کو اپنے معنے میں رکھ کر یعنی بن باپ کے نابالغ بچے مطلب یہ بتایا ہے کہ دیا۔ کو حکم ہے کہ ان کی یتیمی کے زمانے میں ان کی تعلیم و تربیت ان کی رہائش خوراک پر خرچ کرتے رہو۔ اب دینے کے معنے حوالہ کرنے کے نہیں بلکہ ان پر خرچ کرنے کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ ان کے اموال ان پر خرچ کرو خود نہ کھاؤ اور اس معاملہ میں پھونک پھونک

[illegible] یہ تشریح ہے کہ [illegible] یتیموں کے [illegible]
[illegible] بیان [illegible] [illegible] کی [illegible] [illegible] کا [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] کو [illegible] کرنے کی [illegible]
[illegible] [illegible]
[illegible] سوم پہلو کے بعد [illegible] صاحب فرماتے ہیں کہ:

اس آیت میں [illegible] کی حفاظت
[illegible] وقت [illegible] اس کے [illegible]
[illegible] یتیم کے [illegible]
[illegible] اس کی [illegible]
[illegible] [illegible] سکے۔

اس تفسیر کی دوسری وجہ یہ ہے کہ [illegible] تبدیل [illegible]
[illegible] ولا تتبدلوا الخبیث بالطیب [illegible]
[illegible] تبدیل [illegible]
[illegible] تہمت [illegible]
تہمت [illegible] لیکن [illegible]
[illegible] مال سے تبدیل نہ کرو [illegible] یتیم کے مال [illegible]
یتیم [illegible]
[illegible] اس کی [illegible]
[illegible] مال سے تبدیل [illegible] یتیم [illegible]
[illegible] چیزوں کے [illegible]

اس تفسیر کی تیسری وجہ یہ ہے کہ [illegible]
[illegible]
[illegible] لیکن [illegible]
[illegible] شامل کر [illegible]

ہیں اور یتیم کو بھی کھلاتے ہیں اور سمجھتے یہ ہیں کہ ہم تو ان کی خدمت کر رہے ہیں اور کام چونکہ بے حساب ہوتا ہے اس لیے ظاہر میں گرفت بھی کوئی نہیں۔ قرآن نے یہاں اسی کمزوری کا ذکر کیا ہے اور تنبیہہ فرمادی ہے کہ یتامیٰ کے اموال کا حساب بالکل علیحدہ رکھو اور اگر ملانا ہی ناگزیر ہو تو حساب صاف رکھو جس میں تمہیں یہ یقین ہو کہ یتیم کا مال تمہارے ذاتی خرچ میں نہیں آیا۔

اس انداز بیان سے ایک طرف یہ اشارہ فرمادیا کہ یتیموں کے مالوں میں خورد برد کرنے والے عموماً مالدار لوگ ہوتے ہیں دوسری طرف یہ جتا دیا کہ یتیموں کے کچھ سرپرست جن کے سینے خوف خدا سے خالی ہوتے ہیں۔ اوّل تو یتیموں کا سارا حق ہی دبا بیٹھتے ہیں اور اگر دبا نہیں بیٹھتے تو اس میں خورد برد کرنے کی نیت سے انتظامی سہولت کی نمائش کر کے ان کے مال کو اپنے مال سے ملا لیتے ہیں اور اس طرح اپنے لیے ہاتھ رنگنے کے مواقع پیدا کر لیتے ہیں۔ ان کو اس آیت میں بتایا ہے کہ یتیموں کا مال محفوظ رکھو خود ہضم کرنے کی کوشش نہ کرو۔ پھر اس مقصد کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال ہوتے ہیں ان کے متعلق واضح لفظوں میں کہہ دیا کہ ان کے مال کی حفاظت کرو اور یہ حفاظت ایسی ہو کہ نہ اپنا ناقص مال ان کے اچھے مال سے بدلنے کی تدبیریں کرو اور نہ ان کا مال اپنے مال کے ساتھ ملا کر اس کو خورد برد کرنے کی کوشش کرو۔ ہاں اگر ایک شخص انتظامی سہولت کی خاطر کسی یتیم کے مال یا اس کے کاروبار کو اپنے کاروبار میں شامل کرے تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے۔ اس سوال کا جواب آپ سورۂ بقرہ کی آیت ۲۲۰ میں پڑھ چکے ہیں وان تخالطوھم فاخوانکم واللہ یعلم المفسد من المصلح اس میں اجازت بھی دے دی اور تنبیہہ بھی فرمادی کہ یہ بات ہر شخص یاد رکھے کہ اللہ تعالیٰ سے یہ بات مخفی نہیں رہ سکتی کہ اس اشتراک سے کس کے پیش نظر یتیم کی بہبود ہے اور کون یتیم کا مال کھانا چاہتا ہے۔

صحابہ اس تعلیم کا نمونہ تھے

قرآن کی اس تعلیم کا واقعات کی دنیا میں اگر مشاہدہ کرنا ہو تو صحابہ کرام کو دیکھو۔ انھوں نے صرف یہی نہیں کیا کہ یتیموں کو ان کا حصہ دینے اور ان کے مال و دولت میں نگرانی برتنے لگے بلکہ ان کی جائدادوں کی حفاظت میں فیاضی اور سیرچشمی کا پورا ثبوت دیا۔ ایک بار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں ایک یتیم کا مقدمہ آ گیا۔ یتیم نے ایک شخص پر نخلستان کے متعلق دعویٰ کیا مگر وہ دعویٰ ثابت نہ ہو سکا اور آپ نے وہ نخلستان مدعا علیہ کو دلا دیا۔ وہ یتیم اس پر رو پڑا۔ آپ کو

[illegible] فرمایا کہ تم یہ نقصان دہ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

[illegible] قرآن [illegible]
[illegible]
قرآن حکیم نے جب [illegible]
کی بنیاد [illegible] اسلام کی حکومت دنیا کی [illegible]
مصر، شام، عراق، ہندوستان جہاں جہاں مسلمانوں نے اپنی حکومتوں کی بنیاد [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
شادیوں کا انتظام کرے۔

چار تک شادی کی اجازت

۴۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

جو تم کو مرغوب ہوں ان سے ایک چھوڑ چار تک نکاح کی تم کو اجازت ہے۔ قاعدہ شریعت کے مطابق ان سے نکاح کر لو تاکہ یتیم لڑکیوں کو نقصان نہ پہنچے کیونکہ تم ان کے حقوق کے نگران رہو گے اور خود تم بھی کسی گناہ میں مبتلا نہ ہو گے۔ جاننا چاہیے کہ مسلمان آزاد کے لیے زیادہ سے زیادہ چار کی اور غلام کے لیے زیادہ سے زیادہ دو عورتوں سے نکاح کی اجازت ہے اور حدیثوں میں بھی اس کی تصریح ہے اور ائمہ دین کا بھی اس پر اتفاق ہے اور تمام اُمت کے لیے یہی حکم ہے۔ صرف رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے کہ اس سے زائد کی اجازت ہے۔

یتیم لڑکیوں کی تیسری صورت یہ بھی حدیث میں آئی ہے کہ جس یتیم لڑکی کی طرف صورت اور مال دونوں وجہ سے بے رغبتی ہوتی تھی اس کا نکاح ولی دوسری جگہ کر دیتا تھا مگر ظاہر ہے کہ اس کا اس ارشاد سے کوئی تعلق نہیں ہے[1]

شیخ الاسلام کی پیش فرمودہ تشریح اختصار کے ساتھ بے حد جامع ہے۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضرت عائشہ اس کی تشریح میں فرماتی ہیں کہ زمانہ جاہلیت میں جو یتیم بچیاں لوگوں کی سرپرستی اور تربیت میں ہوتی تھیں ان کے ولی ان کے سرمایہ میں حصہ دار ہونے اور ان کے حسن و جمال کی وجہ سے یا اس خیال سے کہ ان کی جانب سے آواز اٹھانے والا کوئی نہیں، ہم جس طرح چاہیں ان کو رکھیں گے وہ ان کے ساتھ خود نکاح کر لیتے تھے اور پھر ان سے ناروا سلوک کرتے تھے۔ اس پر یہ ارشاد ہوا کہ اگر تم کو اندیشہ ہے کہ یتیم لڑکیوں کے ساتھ انصاف نہ کر سکو گے تو دوسری عورتیں دُنیا میں موجود ہیں ان میں سے جو تمہیں پسند آئے اس سے نکاح کر لو۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت عائشہ ہی کا بیان ہے کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے اور اگر لڑکی مالدار ہونے کے ساتھ حسن و جمال کی مالک بھی ہوتی تو لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے شادی کر لیں اور مہر و نفقہ ادا کیے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں سے فیض یاب ہوں اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اس سے خود نکاح کرتے اور نہ کسی دوسری جگہ اس کی شادی ہونے دیتے تاکہ اس کی جانب سے اس کے سرمایہ کے بارے میں کوئی آواز بلند کرنے والا پیدا نہ ہو جائے۔

اس تشریح کی بنیاد پر یتامیٰ سے یتیم لڑکیاں اور نساء سے عام عورتیں مراد ہیں اور آیت کا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حصہ ہے لہٰذا کبیرہ [illegible] میں [illegible] ہے [illegible] بعض [illegible] ہے، ہم ان [illegible] کہ وہ
کا [illegible] ہو [illegible] ہی [illegible] کرے [illegible]

حافظ ابن کثیر نے [illegible] حضرت ابن عباس کی یہ تشریح نقل کی ہے کہ
جاہلیت میں ... [illegible] ... کرتا تھا [illegible]
[illegible]
[illegible] ... اللہ تعالیٰ نے [illegible] ... کہ [illegible]
[illegible] ... کی [illegible] ... تو [illegible]
[illegible] کر [illegible]۔

حافظ ابن جریر نے سعید بن جبیر اور قتادہ سے یہ تشریح نقل کی ہے کہ [illegible] نہیں [illegible]
[illegible] اہل جاہلیت [illegible] ان کے [illegible] ... کے [illegible]
کے [illegible] ان کے [illegible] ... قبول [illegible] ہیں۔ [illegible] قرآن [illegible]
اور پھر [illegible] کے کام کرتے رہے [illegible] ... لکھ کر [illegible]
[illegible] کے ساتھ [illegible] کرنے [illegible] ... ہوں،
[illegible] شروع [illegible] کر [illegible] کرو۔

[illegible] ... ہیں اور قرآن [illegible] ہوا ہے۔ [illegible]
جریر نے اپنی تفسیر میں [illegible] کو ترجیح دی ہے کہ

[illegible] ... بہتر [illegible] تفسیر [illegible] ہے [illegible] تشریح [illegible] نہیں
کے [illegible] ... نہیں [illegible] ... ہو
[illegible] ... کہ [illegible]
[illegible] ... ہے جس کے [illegible] ... میں [illegible]
[illegible] ہو۔

[illegible] قرآن [illegible] ... حضرت [illegible] ... کی تشریح [illegible]
[illegible] ... ابن جریر [illegible]
[illegible] ... قرآن [illegible] ... آں [illegible]
ابن جریر [illegible] ... حضرت [illegible] ... [illegible]

ابن کثیر، قرطبی، آلوسی وغیرہ۔

بعض معاصر بزرگوں نے اس کی تشریح یہ بھی کی ہے کہ اگر تم یتیموں کے ساتھ ویسے انصاف نہیں کر سکتے تو ان عورتوں سے نکاح کر لو جن کے ساتھ یتیم بچے ہیں یعنی ان یتیموں کی ماؤں کے ساتھ صاحب تفہیم القرآن تو یہ کہہ کر خاموش ہو گئے کہ آیت قرآنی کا ایک مفہوم یہ بھی ہو سکتا ہے مگر مولانا اصلاحی نے اسے قرآن کا منطوق قرار دیا ہے اور اس کے منطوق ہونے پر ان کو بے حد اصرار ہے لیکن سوچنے کی بات ہے کہ ان آیات کا جس ماحول میں نزول ہو رہا ہے وہاں کی شہری زندگی خاندان اور قبیلوں سے عبارت ہے۔ انصار میں تو وہ باہم نسبی قرابت رکھتے ہیں اور مہاجر ہیں تو ان کی قرابت اظہر من الشمس ہے قرآن نے ایک مقام پر ان متولیوں کا جو نقشہ کھینچا ہے جو یتیموں کے جوان ہو جانے کے ڈر سے ان کے باپوں کی متروکہ وراثت کو جلد کھا کر ہضم کرنا چاہتے ہیں ظاہر ہے کہ یا دلیا ان یتامیٰ کے اہل قرابت ہوتے تھے۔ باپ مرگیا ہے اس کی اولاد یتیم ہے، داماد جنگ میں کام آگیا، اس کی اولاد والد کے سائے سے محروم ہے، بہنوئی حادثہ کا شکار ہو گیا اب اس کی اولاد بے کسی اور بے بسی کی تصویر ہے، پھوپھا مرگیا ہے اس کے بچے یتیم ہیں، خالو اللہ کو پیارا ہو گیا اس کے بچے بے سہارا ہیں۔ غور فرمایئے آپ ان یتامیٰ میں سے جو آپ کے اہل قرابت ہیں کن کی ماؤں سے شادی کریں گے۔ کیا آپ اپنے باپ کی بیوی، اپنی بیٹی، اپنی بہن، اپنی پھوپھی، اپنی خالہ سے شادی کر کے ان یتیم بچوں کا سہارا بنیں گے۔ اہل قرابت بھی ہیں اور ان ہی کی ولایت بھی آپ کو حاصل ہے ورنہ جہاں قرابت نہیں وہاں آپ کی ولایت بھی نہیں ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اگر آیت کا منطوق یہ ہو تو عملی زندگی میں اس کی تطبیق واقعات کی حد تک نہ ہونے کے برابر ہو گی۔ یہ کہنا کہ یتامیٰ کا استعمال صرف نابالغ بچیوں کے لیے نہ عربی زبان میں معلوم ہے نہ قرآن مجید اور حدیث میں صحیح نہیں ہے۔ حدیث میں ہے ولا تنکحوا الیتامیٰ حتیٰ تستامروهن فاذا سکتن فهو اذنها اور پھر قرآن میں فانکحوا ما طاب لکم من النساء میں لفظ نساء کو خاص کرنا اور کہنا کہ یہاں یتیم بچوں کی مائیں مراد ہیں۔ کچھ اچھا نہیں ہے۔ بہرحال یہ تشریح ہماری رائے میں نہ قرآن کی اس آیت کا منطوق ہے نہ مدلول ہے اور نہ مفہوم۔

ہمارے علم میں اس تشریح کا اولین سہرا لاہوری احمدی جماعت کے سربراہ کے سر ہے۔ انہوں نے اپنی تفسیر میں یہ راہ ایک اور توجیہہ کے عنوان سے اختیار کی ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

ایک اور توجیہہ بھی ہو سکتی ہے اور وہ یہ کہ یہاں مراد ما طاب لکم من النساء

یہ صورت بنتا ہو یعنی یتیم بچوں کی بیوہ ماں ہو، یہ مقصد ۔ وہ بچے جو بن والد یتیم
بچے ہیں آیت کا مطلب یوں ہے اگر تم ڈرو کہ یتیم بچوں کے معاملے میں
انصاف نہ کر سکو گے تو ان عورتوں سے جن کے وہ بچے ہیں نکاح کر لو، کہ اس طرح
تمہیں بچوں کی سرپرستی کرنے کے لیے ان کی فطری و شرعی حیثیت حاصل
ہو جائے گی۔

لیکن یہ بات کہ یہ صورت صرف بیوہ کی اولاد تک ہی ہو گی۔ یتیموں، بیوائوں، [illegible]
بھتیجوں، بھانجیوں، خالہ زادوں، رضاعی بہنوں، لڑکیوں، بچیوں کے بچوں [illegible]
بیویوں کی خالاؤں میں یہ بات لازم ہو گی اس لیے کہ قرآن نے یہاں مراد لی ہے
یہی جن کی قرابت کی وجہ سے اور ان سے اپنے رشتہ کی وجہ سے اٹھایا جا سکتا ہے
اس آیت کے بعض پہلوؤں کی تشریح رہ گئی ہے جو ضروری ہے کہ ان پر ایک نظر ڈال
لی جائے۔

۔ مثنیٰ و ثلاث و رباع سے مراد کیا ہے۔ اس قسم کے الفاظ اعداد عربی میں ایک معنی تک
محدود ہو کر استعمال ہوتے ہیں احاد، ثناء، ثلاث، رباع، خماس، سداس، سباع، ثمان،
تساع، عشار وغیرہ صورت میں سے مرحد، مثنیٰ، مثلث، مربع، مخمس، مسدس،
مسبع، مثمن، متسع اور معشر دونوں ایک سے لیتے ہیں۔ چونکہ اشتقاق شمول
درست ہے۔ چاہے نسبت ہو یا کسی بھی زبان کا اختلاف ہے۔ اور جیسے چھٹے نمبر
کے بعد میں شک ہے کہ ثابت نہیں ہے اور امام بخاری کا یہی خیال ہے۔ یعنی اثنین
اثنین، ثلاثہ ثلاثہ، اربعہ اربعہ وغیرہ لیکن قرآن کے مقام پر ان معنوں میں
والے معنی کو لینا مراد نہیں یعنی خیال نہیں کہ ایک ہی شخص دو دو، تین تین، چار چار
کو کہہ کر مطلب یہ ہے کہ اگر ایک کی اس کے حق کے مطابق دو کی اجازت ہے تو
اس کے مطابق تین کی اجازت ہے اور تیسرے کو چوتھی بیوی تک کا ذکر
کے متعلق ہے، اس کی صورت یوں ہے کہ معنی یہ ہوں گے تم میں سے کوئی
دو دو یعنی تین تین چار چار ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر شخص کا نکاح
جن عورتوں میں سے دو، ثلث، تین، خواہ چار سے، یہ مطلب نہیں ہے کہ تم تمام
اکٹھے کر کے نو سے اٹھارہ مطلب ہوتا ہے کہ ہر شخص نو سے جیسا کہ بعض لوگوں نے سمجھا

ملا کر جمع کرکے نو بیویوں کا اس سے جواز تلاش کیا ہے۔ اور کچھ نے اسی کے سہارے ۱۸ تک کا راستہ ہموار کیا ہے۔ قرطبی نے درست لکھا ہے کہ ھذا کلہ جہل باللسان والسنۃ یعنی زبان سے بے خبری اور سنت سے ناواقفیت ہے۔ بہرحال اس آیت کی رو سے ہی تمام فقہاء کا اس پر اتفاق ہے۔ اور اس میں دو رائیں نہیں ہیں کہ اس آیت کی رو سے چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کو ایک وقت میں منع کر دیا گیا ہے۔ علامہ شوکانی کا یہ کہنا کہ فالادلی ان یستدل علی تحریم الزیادۃ علی الاربع بالسنۃ لا بالقرآن چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کے حرام ہونے پر قرآن سے نہیں بلکہ سنت سے استدلال کرنا زیادہ اچھا ہے اور نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ کا فتح البیان میں ان کی ہمنوائی کرنا اپنے اندر کوئی معنویت نہیں رکھتا ہے۔ حالانکہ قرآن کی یہ ترکیب خود بتا رہی ہے کہ چار سے زیادہ بیویاں رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔ اور علامہ قرطبی کا یہ کہنا صحیح ہے کہ ایسی سوچ خود اجماع اُمت سے تصادم ہے۔ قرآن کے علاوہ روایات سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے چنانچہ ابوداؤد میں ہے کہ حارث بن قیس کہتے ہیں کہ میں مسلمان ہوا۔ اس سے پہلے میرے نکاح میں آٹھ بیویاں تھیں۔ میں نے حضور انور کی خدمت میں عرض کیا۔ حضور انور نے فرمایا کہ ان میں سے چار رکھ لو۔ طائف کا رئیس غیلان جب مسلمان ہوا تو اس کی دس بیویاں تھیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ ان میں سے چار بیویاں رکھ لو اور باقی سے علیحدگی اختیار کر لو۔ بہرحال اسلام نے چار کی حد بندی کی ہے اول اجازت دیتے ہوئے ہم کے عدد پر بس کر دینا خود اس اجازت کی حد بندی قرآن کر رہا ہے دوسرے صحابہ کا عمل اس پر گواہ ہے، تیسرے روایات سے تائید ہوتی ہے گویا قرآن سنۃ اور اجماع تینوں نے ازدواجی زندگی کے لیے چار کی حد بندی کی ہے۔

نکاح میں پسندیدگی

اس آیت میں من النساء سے پہلے ما طاب لکم ارشاد ہوا ہے۔ اگرچہ حسن بصری اور ابن جبیر نے اس کی تفسیر ما حل سے فرمائی ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ ان عورتوں سے نکاح کرو جن سے تمہارے لیے نکاح حلال ہے یعنی محرمات کو قیدِ نکاح میں نہ لاؤ اور زنا سے بچ کر رہو لیکن قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو اس میں اجمال کی بو محسوس ہوتی ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہاں طاب اپنے معنے میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو تمہیں پسند ہوں ان سے نکاح کرو۔ اہل ایمان کے لیے پسند کا معیار کیا ہے؟ اسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھول کر سمجھایا ہے ارشاد ہے:

اور دجہ سے شادی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کو ذلت کا نشانہ بنائے گا اور جو شخص مال کی وجہ سے شادی کرے گا اللہ سبحانہٗ اس کی غربت میں اضافہ کرے گا اور جو شخص حسب کو پیش نظر رکھ کر شادی کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے لیے دنائت کا دروازہ کھول دے گا اور جو شخص کسی عورت سے صرف اس لیے شادی کرتا ہے کہ اس کی نگاہ میں پارسائی، اس کے اخلاق میں عفت اور اس میں صلہ رحمی رہے تو اللہ تعالیٰ مرد کے لیے عورت میں اور عورت کے لیے مرد میں برکت کرتا ہے۔

یہ حدیث شیخ ابن الہمام نے طبرانی کے حوالہ سے نقل کی ہے اور علامہ شامی نے رد محتار میں پیش کی ہے۔

تعدد ازدواج کے لیے عدل شرط ہے

۵۔ اور اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم ان سے انصاف نہیں کر سکو گے تو پھر ایک ہی عورت سے شادی کرو، یا پھر ان کو بیوی بنا کر رکھو جو تمہارے قبضے میں آئی ہیں بے انصافی سے بچنے کے لیے یہ زیادہ قرین صواب ہے۔ یعنی اگر تم کو اس کا ڈر ہو کہ کئی عورتوں میں انصاف اور مساوات کے مطابق معاملہ نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی نکاح پر قناعت کر لو یا صرف لونڈیوں پر ایک ہو یا زیادہ بس کرو یا چاہو تو ایک منکوحہ کے ساتھ ایک یا چند لونڈیوں کو جمع کر لو۔ اور صرف ایک عورت سے نکاح کرنے میں یا فقط اپنی لونڈی یا لونڈیوں پر قناعت کرنے میں یا ایک نکاح کے ساتھ ایک لونڈی یا چند لونڈیوں کو جمع کرنے میں اس بات کی توقع ہے کہ تم بے انصافی اور خلاف عدل سے محفوظ رہو۔ کیونکہ زوجات کے جو حقوق ہیں وہ اپنی مملوکہ لونڈی کے نہیں ہیں کہ ان میں عدل نہ ہونے سے تم پر مواخذہ ہو نہ ان کے لیے مہر ہے نہ معاشرت کے لیے کوئی حد مقرر ہے۔ جس کی کئی عورتیں ہوں تو اس پر واجب ہے کہ کھانے پینے اور لینے دینے میں ان کو برابر رکھے اور رات کو ان کے پاس رہنے میں باری برابر باندھے۔ اگر برابری نہ کرے گا تو قیامت کو وہ مفلوج ہو گا ایک کروٹ گھستی چلی جائے گی اور کسی کے نکاح میں ایک حرہ اور ایک لونڈی ہو تو لونڈی کو حرہ سے نصف باری ملے گی اور جو لونڈی اپنے ملک میں ہو اس کا باری میں کوئی حق مقرر نہیں مالک کی خوشی پر ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں دو باتوں پر زور دیا گیا ہے، ایک تعدد ازدواج کے سلسلہ میں کہ ایک کی جگہ دو
چار بیویاں کرنے کی صورت میں نکاح میں یکساں حقوق یا برابر کا برتاؤ کرنے کی شرط۔
چنانچہ آیت سے صرف دو باتیں ثابت ہوتی ہیں۔ ایک یہ کہ تعدد ازدواج کی اجازت ہے۔ دوسری یہ
کہ یہ تعداد چار تک محدود ہے۔ چار سے زیادہ کی اجازت نہیں ہے اور اجازت دینے کا
صرف مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی چاہے تو چار کی حد تک نکاح کرے اور اس میں کوئی حرج نہ ہوگا۔
یہ مطلب نہیں کہ نکاح آپ پر واجب ہے مگر نکاح کرنے والا اگر کرے تو [illegible]۔ اس آیت میں چار تک
کی اجازت کے ساتھ یہ شرط اور زیادہ کی ہے کہ اس تعدد کے لازمی ہونے کی شرط یہ ہے کہ ان میں عدل کرے۔
یعنی اگر تم عدل قائم نہیں کر سکتے اور یہ شرط پوری نہیں کرتے تو پھر تمہیں صرف ایک عورت سے
نکاح کرنا چاہیے۔ ایک عورت سے زیادہ نکاح کرنے کی اجازت نہیں، یعنی تمہارے لیے ایک سے
زیادہ نکاح کرنا جائز نہیں ہے۔ جائز نہ ہونے کا مطلب یہاں یہ ہے کہ ایسا کرنے والا
گناہگار ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ نکاح ہی نہ ہوگا۔
آیت میں جس عدل کے قائم کرنے کا حکم ہے وہ یہ ہے کہ نان و نفقہ، معاشرت و شب باشی
وغیرہ میں ان کے ساتھ یکساں برتاؤ کرے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عدل سے یہی مراد ہے کہ حقوق میں
مساوات ہو۔ [illegible] کے تقسیم کی چیز [illegible] شب باشی کہ کوئی بیوی کے لیے کپڑے اور کھانے کے
بغیر نہ ہو [illegible] قلبی محبت کا سوال ہے اس میں مساوات قدرت سے باہر
ہے اور اس بارے میں شریعت نے کوئی گرفت نہیں کی ہے۔ [illegible] ولن تستطیعوا
ان تعدلوا بین النساء ولو حرصتم [illegible] یہاں عدل سے [illegible]
قلبی اور محبت قلبی مراد ہے۔ [illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]
[illegible]

انہ فرض ان یعدل اوان لا یجور۔ غالباً فقہائے یہ بات اسی آیت کے آخری فقرے سے معلوم کی ہے کہ ان لا تعولوا۔ تاکہ تم ظلم نہ کرو۔ اگرچہ امام شافعی نے معنے یہ کیے ہیں کہ تمہارے عیال زیادہ نہ ہوں لیکن یہ اصل لغت کے خلاف ہے۔ لغت میں عول کے معنے میل کے ہیں عال المیزاب اس وقت بولا جاتا ہے جب ترازو کا پلڑا ایک طرف جھک جائے اور عال الحاکم اس وقت بولتے ہیں جب حاکم فیصلہ میں ظلم کی طرف جھک جائے اسی لیے عول کو جور اور طریق عدل سے ہٹ جانے کے معنے میں استعمال کیا جاتا ہے۔ جمہور نے ان تعولوا کی تفسیر ان تجوروا سے کی ہے اور ابن ابی حاتم نے حضرت عائشہ کے حوالہ سے یہی تفسیر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کی ہے۔ اگرچہ خود ابن ابی حاتم نے اپنے والد کے حوالہ سے اس کو حضرت عائشہ ہی کا ارشاد بتایا ہے۔ ابن عباس، حسن، مجاہد، شعبی، عکرمہ اور قتادہ نے اس کی لاتمیلوا سے فرمائی ہے۔ لیکن حاصل دونوں کا ایک ہے۔ لہٰذا قرآن کی اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ جو شخص دو بیویوں کے درمیان عدل نہیں کرتا وہ ظالم ہے۔ تعددِ ازواج کی اجازت سے اس کو فائدہ اٹھانے کا کوئی حق نہیں ہے۔ قانون ایسی حالت میں اس کی بیوی کی داد رسی کرے گا اور عورت کو حق دے گا کہ وہ اس ظالم کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کرے۔ بہرحال آیت میں عدل کے معنے ظلم نہ کرنے کے ہیں۔

ایک شبہ اور اُس کا ازالہ

بعض ہوا پرستوں نے یہاں تحریف کی ہے اور کہا ہے کہ یہ تعددِ ازواج کی نفی کر رہی ہے اور وجہ یہ بتاتی ہے کہ یہاں فرمایا ہے کہ اگر عدل نہ ہو سکے تو ایک شادی کرو اور دوسری آیت میں بتایا ہے کہ لن تستطیعوا ان تعدلوا عدل کرنا عورتوں کے درمیان ہرگز تمہارے بس میں نہیں ہے۔ دونوں آیتوں کے ملانے سے پتہ چل گیا ہے کہ ایک سے زیادہ شادی جائز نہیں ہے۔ یہ بہت بڑا مغالطہ ہے کیونکہ دونوں آیتوں میں عدل جدا جدا ہے۔ پہلی آیت میں عدل سے مراد عدل فی الحقوق الواجبہ ہے اور دوسری آیت میں عدل سے مراد عدل فی المحبتہ ہے۔ پہلی بات اختیاری ہے اور دوسری غیر اختیاری ہے۔ اختیاری کا قرآن نے مطالبہ کیا ہے اور غیر اختیاری کے بارے میں فرما دیا کہ یہ تمہارے بس کا روگ نہیں ہے۔

تعددِ ازواج تمدنی اور اخلاقی ضرورت ہے

نیز یہ آیت گرامی تعددِ ازواج کی اس شرط کے ساتھ اجازت دیتی ہے کہ عدل قائم کیا جائے۔ اس

[illegible]

مگر حقیقت یہ ہے کہ قرآن نے [illegible] ۔ قرآن نے اس کا [illegible] تعدد ازدواج [illegible] [illegible] تسلیم کیا اور کہیں [illegible] ۔ قرآن [illegible] [illegible] پر قابو پالیا ہے۔ قرآن نے انسانی جذبات احساس کو [illegible] [illegible] جبلت [illegible] [illegible] اگر ایک عورت [illegible] [illegible] تو ایسی صورت میں [illegible] ہے۔

اس کا [illegible] احساس [illegible] [illegible] جبلت ہے [illegible]

کرتی وہ کچھ بھی ہو غداری اور مطابق فطرت نہیں ہو سکتی۔ یہی سبب ہے کہ تاریخ جب سے ساتھ دیتی ہے داعیانِ توحید نے اس دستور کو نہ صرف جائز رکھا ہے بلکہ اس پر عمل کر کے اس کو اور زیادہ طاقتور بنایا ہے۔ حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت موسیٰ، حضرت داؤد، حضرت سلیمان میں سے کسی کے یہاں بھی ایک بیوی کی سند نہیں ملتی ہے بلکہ بعض کی حرم سرا تو کثرتِ تعداد کے لیے مشہور ہے۔ ہندو قدیم میں اکابر ہنود کی بابت بھی روایتیں وحدت کی نہیں تعدد ہی کی ہیں۔

بعض لوگ اہلِ مغرب کی مسیحیت زدہ رائے سے مغلوب ہو کر یہ ثابت کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ قرآن کا اصل مقصد ازواج کے طریقے کو مٹا دینا تھا مگر چونکہ یہ طریقہ بہت رواج پا چکا تھا۔ اس لیے اس پر صرف پابندیاں عائد کر کے چھوڑ دیا گیا لیکن اس قسم کی باتیں دراصل محض ذہنی غلامی کا نتیجہ ہیں۔ تعددِ ازواج کا بجائے خود ایک برائی ہونا ناقابلِ تسلیم ہے کیونکہ بعض حالات میں یہ چیز ایک تمدنی اور اخلاقی ضرورت بن جاتی ہے اگر اس کی اجازت نہ ہو تو پھر وہ لوگ جو ایک عورت پر قانع نہیں ہو سکتے حصارِ نکاح سے باہر صنفی بدامنی پھیلانے لگتے ہیں جس کے نقصانات تمدن و اخلاق کے لیے اس سے بہت زیادہ ہیں جو تعددِ ازواج سے پہنچ سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے ان لوگوں کو اس کی اجازت دی ہے جو اس کی ضرورت محسوس کریں [1]۔

شاید آپ کا ذہن یہاں یہ خلش محسوس کرے کہ قرآن نے تعددِ ازواج کے لیے ضرورتوں کی تفصیل کیوں نہیں بتائی ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ جن امور کا تعلق انسانی ضروریات کے مختلف پہلوؤں سے ہے اور قوموں اور زمانوں اور حالات کے تغیر سے بدلتا رہتا ہے وہاں قرآن حکیم تفصیلات سے بالا صرف کلیات پیش کرتا ہے مثلاً طلاق کے موضوع پر قرآن نے یہ کہیں نہیں بتایا کہ فلاں فلاں ضرورت کے تحت آدمی طلاق دے سکتا ہے۔ حالانکہ یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ طلاق ضرورت ہی کے تحت دی جاتی ہے۔ یہی حال یہاں تعددِ ازواج کا ہے۔

تعددِ ازواج اور مخالفین

اب تو یہ چیز اتنی عیاں ہو چکی ہے کہ بحث و مباحثہ کی ضرورت باقی ہی نہیں رہی۔ تعددِ ازواج کے مخالفین کو بھی حالات کے پیشِ نظر اس بات کو ماننا ہی پڑا کہ اسلام کا قانونِ تعددِ ازواج درست ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن

کسی مذہب اور دھرم کا ماننے والا بشرطیکہ وہ دُور اندیش اور تجربہ کار ہو، تعددِ ازواج ،، کے جواز سے انکار نہیں کر سکتا اور نہ کسی مذہب و دین میں اس کا انکار کیا گیا ہے بلکہ سب ہی میں اس کی اجازت دی گئی ہے خصوصاً اسلام نے جن قیود کے ساتھ تعدد کی اجازت دی ہے اس کی ضرورت کا تو انکار ہو ہی نہیں سکتا۔ مگر عجیب بات ہے کہ یورپ نے اسلام کے تعددِ ازدواج کے قانون کو اپنا نشانہ بنالیا ہے وہی یورپ جس کے ہاں نسوانی ناموس کی کوئی قیمت باقی نہیں رہی ہے بلکہ لٹ رہا ہے لٹایا جا رہا ہے، بر سرِ بازار سب کچھ ہو رہا ہے لیکن دیکھنے والے دیکھتے ہیں اور صرف دیکھتے رہتے ہیں۔ یورپ میں مرد و عورت کے تعلقات میں بے باکیوں کی کیفیت جو حد سے گزر چکی ہے اسی کو دیکھ کر اور دوسرے حالات سے متاثر ہو کر یورپ ہی کے بعض اربابِ فکر نے تعددِ ازدواج کے جواز کو تسلیم کر لیا ہے بلکہ اس کے جواز کو ضروری قرار دیا ہے۔

اہلِ یورپ کا اعترافِ حق

لندن کے ایک اسکول کی ایک اُستانی مس میری سمتھ نے اپنی ایک کتاب میں لکھا ہے:

یک زوجی کا جو قاعدہ برطانیہ میں چلا ہوا ہے وہ تمام تر غلط ہے۔ مردوں کو دوسری شادی کی اجازت ملنی چاہیے۔

میری سمتھ کی اس کتاب کے متعلق سنڈے ٹریبون ڈربن نٹال مورخہ ۲۸ر نومبر ۱۹۵۱ء میں اس کے لندنی وقائع نگار لکھتے ہیں:

یقین ہے کہ ۲۵ سال سے اوپر عمر کی پچیس لاکھ بیوائیں جو اس وقت برطانیہ میں موجود ہیں دلچسپی اور قدر سے اس کتاب کو ہاتھوں ہاتھ لیں گی۔

ان اقتباسات سے اندازہ لگائیے کہ تعددِ ازدواج جس کی اسلام نے ناگزیر ضرورت کے وقت اجازت دی ہے قانونِ فطرت کے کتنا مطابق ہے اور حالات نے لوگوں کو اسلام کے اس قانون حقانیت کا کیسا یقین دلایا ہے۔

یہی میری سمتھ اپنی کتاب میں ایک جگہ لکھتی ہے،

،، چونکہ اس ملک برطانیہ میں عورتوں کی تعداد مردوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اس لیے ہر عورت شوہر کو پانے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔،،

اس کے بعد اس نے کہا ہے۔ ایک بیوی کا رواج ناکام ہو چکا ہے اور یہ رواج بھی سائنٹیفک

نہیں ہے۔

انگلستان میں بے راہ روی کو روکنے کے لیے سترھویں صدی سے کثرتِ ازدواج کا چرچا شروع کیا گیا۔ چنانچہ ۱۶۵۸ء میں ایک شخص نے زناکاری اور نومولود حرامی بچوں کی اموات کو روکنے کے لیے کثرتِ ازدواج کی حمایت میں ایک پمفلٹ شائع کیا۔ اس کے ایک صدی بعد انگلستان کے ایک قابل اعتماد اور صاحبِ کردار پادری نے اس مسئلہ کی تائید میں ایک کتاب لکھی، مشہور ماہر جنسیات جیمس ہلٹن نے فحاشی اور زناکاری کو روکنے کے لیے کثرتِ ازدواج کے طریقہ کو اختیار کرنے کی رائے دی[1]

شوپنہار نے اپنا خیال ظاہر کرتے ہوئے لکھا تھا،

ایک بیوی پر اکتفا کرنے والے کہاں ہیں؟ میں انہیں دیکھنا چاہتا ہوں ہم میں سے ہر شخص "کثرتِ ازدواج" کا قائل ہے چونکہ ہر آدمی کو متعدد عورتوں کی ضرورت پڑتی ہے اس لیے مرد پر کسی قسم کی تحدید عائد نہ ہونی چاہیے۔

مشہور ماہر جنسیات کیلجن اپنی کتاب میں لکھتا ہے:

گو انگلستان میں کثرتِ ازدواج کے اصول پر بالعموم عمل ہوتا ہے لیکن سوسائٹی اور قانون نے ابھی اس چیز کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ سوسائٹی ان اشخاص کے اعمال پر خاموش رہتی ہے۔ جو ایک بیوی یا شوہر سے شادی کر کے دو یا تین درشتاؤں یا آشناؤں سے تعلقات رکھتے ہیں لیکن سوسائٹی چیخ اٹھتی ہے جب کوئی شخص یہ تحریک پیش کرتا ہے کہ مرد کو ایک سے زائد عورتوں سے شادی کی اجازت دی جانی چاہیے[1]

علامہ عبدالعزیز شاویش مصری نے ایک واقعہ لکھا ہے پڑھنے کے لائق ہے۔" لندن میں ایک ہسپانوی شخص سے ملنے کا اتفاق ہوا، ہم نے بہت سے اسلامی مسائل پر تبادلہ خیالات کیا اور جیسے ہی تعددِ ازدواج پر بحث چھڑی تو اس شخص نے کہا کاش اگر میں بھی مسلمان ہوتا تو ایک اور بیوی کر لیتا۔ میں نے اس سے اس کی وجہ دریافت کی۔ اس نے کہا کہ میری بیوی کو جنون ہو گیا ہے اور اس پر کئی سال گزر چکے ہیں جس کی وجہ سے مجھے مجبوراً آشنائیاں کرنی پڑتی ہیں۔ کیونکہ میں دوسری بیوی نہیں کر سکتا۔ اگر میرے پاس دوسری جائز بیوی ہوتی تو اس سے میری

---

[1] اسلام اور جنسیات

جائز اولاد ہوتی جو میری کثیر دولت کی وارث بنتی۔ میری آنکھوں کی ٹھنڈک اور بہتر رفیق ہوتی اور مجھے اس سے اطمینان اور سکون حاصل ہوتا۔

مسز برڈسل کال کنز صدر ینگ وومین کرسچن ایسوسی ایشن نے واشنگٹن میں بنکنگ کمیٹی کے سامنے بیان دیتے ہوئے کہا ہے:

> امریکہ میں چودہ سال سے اوپر کی جوان لڑکیوں کی تعداد ایک کروڑ بیس لاکھ ہے جو سب کی سب کنواری ہیں۔ ان کے مقابلے میں کنواروں کی تعداد نوّے لاکھ ہے۔ اس حساب سے تیس لاکھ کنواری لڑکیوں کے لیے شوہروں کا ملنا محال ہے۔ کیونکہ جنگ نے مردوں اور عورتوں کا عددی توازن بہت بڑی حد تک خراب کر دیا ہے[1]

بتایا جائے کہ ایسی حالت میں کیا کیا جائے گا۔ اگر تعدد ازدواج کی اجازت نہیں دی جاتی ہے تو پھر عفت و عصمت کو دنیا کی کون سی طاقت بچا سکتی ہے اور بفرض محال بچ بھی جائے تو اس ظلم عظیم کا وبال کس کے سر آئے گا اور ان تیس تیس لاکھ تعداد کی گریہ وزاری اور ان کے نالہ و شیون کیا کچھ نہ کریں گے جس نے یہ لکھا بالکل سچ لکھا:

> لوگ سمجھتے ہیں تعدد ازدواجی اور وحدت ازدواجی میں مقابلہ ہے لیکن یہ غلط ہے۔ اصل میں مقابلہ ہے محدود ازدواجی کا لامحدود حرامکاری سے۔ اسلام بعض سخت شرائط کے تحت محدود تعدد ازدواجی کی اجازت اس لیے دیتا ہے کہ لامحدود حرام کاری کا سدِ باب ہو لیکن جو وحدت ازدواجی کے قائل ہیں ان کے پاس لامحدود حرام کاری کے انسداد کا کوئی علاج نہیں۔ اسی لیے تو وہ تعدد ازدواجی کے خلاف زہر افشانی کرتے ہیں۔ مگر یہ آواز بلند نہیں کرتے کہ ایک عورت والے مرد کو دوسری جگہ شہوانی بھوک کی سیری کے لیے منہ کالا نہ کرنا چاہیے[2]

کنیز سے بیوی کے تعلقات

اس آیت میں او ما ملکت ایمانکم کے الفاظ آئے ہیں اس کے معنے ہیں کہ وہ عورتیں جن کے تمہارے دائیں ہاتھ مالک ہیں۔ محاورے میں اس سے مراد شرعی مملوک اور غلام اور

---

[1]، [2] زمزم ۱۹۵۱ء

کنیزیں ہوتی ہیں جن کا اب مدت دراز سے ہندوستان بلکہ دنیا کے اکثر ملکوں میں کہیں وجود نہیں ہے۔

اسیرانِ جنگ کا معاملہ ہمیشہ ایک اہم اور دشوار مسئلہ رہا ہے یعنی یہ کہ جو مرد اور عورتیں شکست خوردہ غنیم کے ہاں سے گرفتار ہو کر آئیں ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ انہیں کہاں اور کیسے رکھا جائے کسی نے اس کا حل جبری مزدوری یا بیگار کو نکالا، کسی نے کچھ اور۔ اسلام نے یہ حکم دیا کہ بجائے اس کے کہ ایک بڑی آبادی کا بوجھ حکومت پر ڈالا جائے۔ اس تعداد کو افراد میں تقسیم کر دیا اور ہر فرد اس نو وارد کو اپنے خاندان کا جز بنا لے اس سے کام ہر طرح کا لے لیکن اس کے آرام کا بھی ہر طرح لحاظ رکھے اور ان میں جو عورتیں ہوں ان کو گرفتار کرنے والا ہر سپاہی ان سے مباشرت کا مجاز نہیں ہے بلکہ اسلامی قانون یہ ہے کہ ایسی عورتیں حکومت کے حوالے کر دی جائیں حکومت کو اختیار ہے کہ چاہے ان کو رہا کر دے چاہے ان سے فدیہ لے، چاہے ان کا تبادلہ ان قیدیوں سے کرے جو دشمن کے ہاتھ میں ہوں اور چاہے انہیں سپاہیوں میں تقسیم کر دے۔ ایک سپاہی صرف اس عورت ہی سے تمتع کرنے کا مجاز ہے جو حکومت کی طرف سے باقاعدہ اس کی ملک میں دی گئی ہے۔ حکومت کی جانب سے یہ تملیک خود اعلان نکاح کے قائمقام ہے۔ اور اس تملیک کے بعد کوئی سپاہی اس وقت تک اس سے مباشرت نہ کرے گا جب تک کہ ایک مرتبہ اس عورت کو ماہواری نہ آجائے اور یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے۔ حکومت کی جانب سے یہ تملیک ایسا ہی قانونی فعل ہے جیسا نکاح۔ اس کے لیے کسی مزید ایجاب و قبول کی ضرورت نہیں ہے اور یہ لوگ آسان شرائط پر اپنی آزادی ہر وقت خرید سکتے ہیں بلکہ ان کے آزاد کرنے کی طرح طرح کی فضیلتیں خود قرآن نے بتائی ہیں اور احادیث میں عتاق کا اس کے لیے مستقل باب ہے۔

حیرت ہے کہ ایسے صاف سیدھے شریفانہ، حکیمانہ قانون سے لوگ خواہ مخواہ گھبراتے اور شرم محسوس کرتے ہیں اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ آگے آرہی ہے۔

بہرحال ما ملکت ایمانکم سے مراد لونڈیاں ہیں یعنی وہ عورتیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں اور حکومت کی طرف سے لوگوں میں تقسیم کر دی جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ایک آزاد خاندانی بیوی کا بھی بار برداشت نہ کر سکو تو پھر لونڈی سے نکاح کر لو جیسا کہ رکوع ۴ میں آرہا ہے یا یہ کہ اگر ایک سے زیادہ عورتوں کی تمہیں ضرورت ہو اور آزاد خاندانی بیویوں کے درمیان تمہارے لیے عدل رکھنا مشکل ہو تو لونڈیوں کی طرف رجوع کرو کیونکہ ان کی وجہ سے تم پر ذمہ داریوں کا بوجھ کم پڑے گا۔ اس کی تشریح میں شارحین قرآن کے خیالات مختلف ہیں۔ اصل ارشاد یہ ہے۔ فان

ؔ تفہیم القرآن

خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ تم چند عورتوں کے درمیان انصاف نہ کر سکو گے تو ایک سے یا اپنی مملوکہ سے۔ قرطبی، آلوسی، ابن جریر، ابن کثیر کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں چند عورتوں کے درمیان بے انصافی کا اندیشہ ہو تو بس ایک پر اکتفا کرنا یا ان باندیوں پر جو تمہاری مملوک ہیں۔ اور ہمارے مفسرین میں سے شیخ الاسلام، مولانا اشرف علی تھانوی، مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا محمد ادریس، مولانا احمد سعید، مولانا حسین علی اور دوسروں کا میلان بھی یہی ہے۔ لیکن جہاں قرآن کا تعبیری انداز اس کی ہمنوائی نہیں کرتا۔ نفس مسئلہ کی صحت سے انکار نہیں ہے یعنی یہ بات اپنی جگہ درست ہے کہ ملک یمین میں آئی ہوئی عورتوں سے مالک تمتع کر سکتا ہے اور ایسی عورتوں سے مالک آزاد کر کے نکاح بھی کر سکتا ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اس آیت قرآنی کا منطوق کیا ہے۔

ہمیں یہاں ابوبکر الجصاص رازی کی رائے پسند ہے۔ انہوں نے ایک تفصیلی نوٹ لکھا ہے وہ فرماتے ہیں:

> قرآن کی یہ آیت جیسے چار آزاد عورتوں سے شادی کرنے کی اجازت دے رہی ہے ایسے ہی چار کنیزوں سے بھی نکاح کرنے کی رخصت دے رہی ہے۔ اب یہ شادی کرنے والے کے اختیار تمیزی اور صوابدید پر موقوف ہے کہ آزاد عورتوں سے کرے یا کنیزوں سے۔ اور یہ اس لیے کہ ما ملکت ایمانکم خود مستقل فقرہ نہیں ہے بلکہ اپنے پہلے فقرے کے ساتھ مربوط ہے۔ یہاں فعل محذوف ہے اور بلاشبہ محذوف وہ ہی فعل ہونا چاہیے جو پہلے آچکا ہے ایسے فعل کو ہم محذوف نہیں مان سکتے ہیں جس کا پہلے کوئی ذکر نہیں۔ آیت میں پہلے نکاح کا لفظ آیا ہے یعنی فانکحوا ما طاب اس لیے تقدیر عبارت یوں ہو گی فانکحوا ما ملکت ایمانکم ظاہر ہے کہ نکاح سے اگر پہلے عقد مراد ہے تو یہاں بھی عقد ہی مراد ہو گا۔ شاید آپ یہ خلش محسوس کریں کہ اگر یہاں نکاح کو محذوف مان کر اس کو وطی کے معنے میں لیا جائے تو کیا حرج ہے جواب یہ ہے کہ ایک ہی فقرے میں ملفوظ میں ایک معنے اور محذوف میں دوسرے معنے مراد لینا درست نہیں ہے۔ اس صورت میں ایک فقرے کے ایک لفظ میں ملفوظ ہونے کی صورت میں معنے مجازی اور محذوف ہونے کی حالت میں معنے حقیقی مراد ہوں گے اور یہ جمع بین الحقیقت والمجاز درست نہیں۔ اور اگر آپ کے

ذہن میں یہ وسوسہ آئے کہ چونکہ ملک یمین کی نسبت قرآن نے مخاطبوں کی طرف کی ہے اور مالک ہونے کی صورت میں وطی ہو سکتی ہے مگر عقد نہیں ہو سکتا اس لیے ہمیں یہاں محذوف میں وطی ہی کے معنے لینے ہوں گے کیونکہ کوئی مالک اپنی مملوکہ سے نکاح نہیں کر سکتا جواب یہ ہے کہ ملک کی نسبت جماعت کی طرف ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم اوروں کی مملوکہ سے نکاح کر لو۔ چنانچہ قرآن کی اس آیت ومن لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنات المومنات فمن ما ملکت ایمانکم کا سب ہی یہ مطلب بتاتے ہیں کہ جو آزاد عورت سے نکاح نہیں کر سکتا تو ایسا شخص آپس میں کسی مسلمان لونڈی سے نکاح کر لے، اس آیت میں بھی ملک یمین کی اضافت مالکوں ہی کی طرف ہے۔ یہاں بھی یہی صورت حال ہے اس لیے یہاں انکحوا محذوف ہے اور وہ بمعنے عقد ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس آیت کا منطوق یہ نہیں ہے کہ قرآن کنیزوں سے مباشرت اور تمتع کی ملک یمین کی بنا پر اجازت لے رہا ہے اس کے لیے قرآن کی دوسری آیات ہیں۔ یہاں تو نکاح کا مسئلہ بتایا جا رہا ہے کہ اگر عدل نہ کر سکو تو ایک سے نکاح کر لو اور اگر ایک بھی میسر نہ آئے تو ما ملکت ایمانکم سے نکاح کر لو۔ علامہ شوکانی اور نواب صدیق حسن خاں نے انکحوا فعل مقدر مان کر نکاح کو بطریق ملک بمعنے وطی قرار دیا ہے۔

بہر حال آیت قرآنی کا وہ مطلب جو الجصاص نے پیش کیا ہے قرآن کے انداز تعبیر کے زیادہ قریب ہے اور جو مطلب شارحین قرآن نے لیا ہے انداز تعبیر اس کی ہمنوائی نہیں کرتا ہے۔

بیویوں کے مہر ادا کرو

۴۔ اور عورتوں کے مہر خوش دلی کے ساتھ فرض جانتے ہوئے ادا کرو ہاں اگر وہ اپنی خوشی سے کچھ چھوڑ دیں تو تم لے مزے سے کھا سکتے ہو۔ یعنی جن عورتوں سے نکاح کرو ان کے مہر خوشدلی اور رغبت کے ساتھ خود ادا کرو ان کا کوئی حامی اور تقاضا کر کے وصول کرنے والا ہو یا نہ ہو۔ ایسا کرو تو پھر یتیم لڑکیوں سے نکاح کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ حرج تو جب ہے کہ مہر دینے میں یا ان کے کسی حق کے ادا کرنے میں گرانی ہو۔ اور اگر عورت اپنی خوشی سے مہر میں سے کوئی مقدار شوہر کو معاف کر دے یا لے کر پھر زوج کو ہبہ کر دے تو اس میں کوئی حرج نہیں شوہر اس کو خوشی سے کھا لے۔ جو کھانا لذیذ ہو اور طبیعت اس کو رغبت کے ساتھ قبول کرے اس کو ہنیئ کہتے

ہیں اور جو کھانا ہضم ہو کر بالکل جزوِ بدن ہو جائے اور موجب صحت اور قوت ہو اس کو مری کہتے ہیں۔[1]

پہلی آیت میں نکاح اور اس آیت میں نکاح کی بنیادی اہمیت والی چیز مہر کے احکام کا ذکر ہے سب سے پہلے مہر کی حیثیت کے بارے میں اس آیت سے قرآن کے نقطہ نگاہ پر روشنی پڑتی ہے۔ یہاں دو لفظ ارشاد ہوتے ہیں نحلہ اور صدقات۔ نحلہ وہ عطیہ جو تبرع کے طور پر ہو یعنی اس کا معاوضہ کوئی نہ ہو۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ نحلہ سے مراد ہبہ اس لیے ہے کہ نحل شہد کی مکھی جب کسی جگہ بیٹھتی ہے تو اس کو نقصان نہیں پہنچاتی ہے بلکہ موجب نفع ہوتی ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ نحلہ اس عطیہ کو کہتے ہیں جو خوشی خوشی کسی معاوضہ کی اُس کے بغیر دیا جائے صدقات جمع ہے اس کا واحد صدقہ ہے اس کے معنے مہر کے ہیں۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ مہر کی حیثیت قیمت کی نہیں ہے بلکہ ایک نذرانہ اور تحفہ و سوغات کی ہے جو شوہر بغرض اکرام و اعزاز براہِ راست بیوی کو پیش کرنا اپنے اوپر واجب کر لیتا ہے۔ الجصاص نے مہر کو نحلہ کہنے کی یہ وجہ خوب بتاتی ہے کہ چونکہ شوہر اس کے عوض میں کسی چیز کا مالک نہیں ہوتا ہے اس لیے یہ نحلہ ہے۔

مہر کے بارے میں خود عرب عورتوں پر کئی قسم کے ناروا کردار موجود تھے۔ ایک یہ کہ مہر لڑکی لینے کی حقدار نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ لڑکی کے اولیاء اسے اپنا حق سمجھ کر لے وصول کرتے تھے۔ قرآن نے آتوا النساء فرما کر یہ راستہ بند کر دیا کہ یہ مہر کی رقم بیویوں کو دو نہ کہ ان کے اولیاء والدین کو۔ آتوا کا خطاب دونوں کو ہے شوہر کو بھی اور لڑکی کے ولی کو بھی۔ اگر شوہر مخاطب ہیں تو مطلب یہ ہے کہ اپنی بیوی کا مہر خود اپنی اہلیہ کو دو اور کسی کو نہ دو اور اگر لڑکی کے اولیا مخاطب ہیں تو مطلب یہ ہے کہ اگر لڑکیوں کا مہر تمہیں وصول ہو جائے تو یہ لڑکیوں ہی کو دے دو ان کی اجازت کے بغیر اس میں کوئی تصرف نہ کرو۔

دوسرے یہ کہ وہ مہر کو ایک قسم کا تاوان سمجھتے تھے لفظ نحلہ لا کر بتا دیا کہ یہ تاوان نہیں ہے بلکہ وہ تحفہ ہے جو خوش دلی سے دیا جائے۔

تیسرے یہ کہ بہت سے شوہر یہ خیال کر کے کہ بیوی مجبور ہے دباؤ ڈال کر مہر معاف کرا لیتے۔ قرآن نے فان طبن کہہ کر معاملہ بالکل واضح اور صاف کر دیا کہ بیوی کی طرف سے یہ ابراء بغیر کسی جبر اور دباؤ کے اور شوہر کے کسی مکر و فریب کے ہونا چاہیے۔ یہ یاد رہے کہ اگر مہر کے واپس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کر دیا جائے تو یہ ہبہ ہے اور اگر بغیر وصول کیے معاف کر دیں تو ابرا ہے۔ دونوں جائز ہیں اور آیت دونوں کو شامل ہے۔ (بیان القرآن)

طیب نفس کی تشریح

آیت میں طیب نفس کی قید اپنے اندر گہری معنویت رکھتی ہے۔ شریعت کا ضابطہ یہ ہے کہ کسی کا مال دوسرے کے لیے اس وقت تک حلال نہیں ہوتا جب تک وہ طیب خاطر سے نہ دے۔
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی یہی بات بطور قاعدہ کلیہ بیان فرمائی ہے۔

اچھی طرح سمجھ لو کہ کسی دوسرے شخص کے لیے کسی کا مال اس وقت تک حلال نہیں ہوتا جب تک وہ جی کی خوشی سے نہ دے۔
(مشکوٰۃ شریف)

یہ ایک عظیم ضابطہ ہے اس کے تحت اگر آپ چاہیں بہت سے سوالات کا جواب تلاش کر سکتے ہیں۔ عورتوں کا مہر، کو معاف کر دینا، بہنوں کا بھائیوں کے حق میں میراث سے دست بردار ہونا، مساجد یا مدارس میں دباؤ کے تحت چندہ وصول کرنا سب کا حکم یہی ہے کہ اگر طیب خاطر سے نہ ہو تو کسی صورت میں حلال نہیں ہے[1]

حضرت عمر اور قاضی شریح کا فیصلہ یہ ہے کہ اگر کسی عورت نے اپنے شوہر کو پورا مہر معاف کر دیا یا اس کا کوئی حصہ معاف کر دیا اور بعد میں وہ اس کا پھر مطالبہ کرے تو شوہر اس کی ادائیگی پر مجبور کیا جائے گا کیونکہ اس کا مطالبہ کرنا یہ معنے رکھتا ہے کہ وہ اپنی خوشی سے معاف کرنا نہیں چاہتی ہے[2]

بہر حال اس آیت میں یہ بات ارشاد فرمائی ہے کہ مہر عورت کا ایک حق ہے جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے فرض کیا گیا ہے لہٰذا اس حق کو فریضہ سمجھ کر خوش دلی کے ساتھ عورت کو ادا کیا کرو۔ البتہ اگر عورتیں اپنے حق سے اور اس فریضہ میں سے جو اللہ نے ان کے لیے مقرر کیا ہے اپنی خوشی سے تم کو معاف کر دیں اور چھوڑ دیں تو اس کا برتنا اور کھانا جائز ہے۔

آخر میں فرمایا ہے فکلوہ ھنیٓا مریٓا کھاؤ تم اسے مزے دار اور خوشگوار سمجھ کر کھانے

---

[1] معارف مفتی ملخصاً [2] تفہیم القرآن

سے تعبیر کی وجہ یہ ہے کہ مال سے جو منافع حاصل کیے جاتے ہیں ان میں اہم نفع اور بڑی غرض کھانا ہے ورنہ یہ مقصد نہیں ہے کہ عورت جو مہر تم کو واپس کرے اس کو سوائے کھانے کے اور کسی کام میں نہ لاؤ یہ بھی مال ہے جس طرح اور اموال موہوبہ میں تصرف جائز ہے اسی طرح واپس شدہ مہر میں بھی ہر قسم کا تصرف جائز ہے۔

اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جبر واکراہ سے جو مہر معاف کر دیا جائے وہ اللہ کے نزدیک معاف نہیں ہوتا اور یہ بھی معلوم ہوا کہ مہر عورت کی ملک ہے اس میں بغیر اس کی مرضی کے کسی کو تصرف کا اختیار نہیں ہے۔

وَلَا تُؤْتُوا السُّفَهَاءَ أَمْوَالَكُمُ الَّتِي جَعَلَ اللَّهُ لَكُمْ قِيَامًا وَارْزُقُوهُمْ فِيهَا وَاكْسُوهُمْ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝ وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ فَإِنْ آنَسْتُم مِّنْهُمْ رُشْدًا فَادْفَعُوا إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ ۖ وَلَا تَأْكُلُوهَا إِسْرَافًا وَبِدَارًا أَن يَكْبَرُوا ۚ وَمَن كَانَ غَنِيًّا فَلْيَسْتَعْفِفْ ۖ وَمَن كَانَ فَقِيرًا فَلْيَأْكُلْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِذَا دَفَعْتُمْ إِلَيْهِمْ أَمْوَالَهُمْ فَأَشْهِدُوا عَلَيْهِمْ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ حَسِيبًا ۝

اور اے سرپرستو! تم اپنے وہ مال جن کو اللہ نے تمہارے لیے قیام کا ذریعہ بنایا ہے بیوقوفوں کے سپرد نہ کرو ہاں ان کے مال میں سے ان کے کھانے اور پہننے کا انتظام کرو اور ان کو معقول بات کہتے رہو"۔ اور یتیموں کے عقل و شعور کا جائزہ لیتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان میں صلاحیت و

اہلیت دیکھو تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو[12]۔ اور اس خوف سے کہ کہیں وہ بڑے نہ ہو جائیں ان کے مالوں کو فضول خرچی کر کے جلدی جلدی نہ کھا پی ڈالو[13]۔ اور یاد رکھو کہ یتیم کا جو سرپرست مالدار ہو اسے چاہیے کہ یتیم کے مال سے بالکل پرہیز کرے اور جو حاجتمند ہو وہ بقدرِ حاجت دستور کے موافق لے سکتا ہے[14]۔ پھر جب تم یتیموں کے مال ان کے سپرد کرو تو تمہیں ان پر گواہ بنا لینا چاہیے اور دیکھو محاسبہ کے لیے اللہ کا محاسبہ کافی ہے[15]۔

اسلام میں مال و دولت کی حیثیت

آیات بالا میں یہ حکم دیا تھا کہ یتیموں کے اموال ان کے سپرد کر دو اب ان میں ارشاد ہو رہا ہے کہ یتامیٰ کو ان کے اموال کب سپرد کیے جائیں۔ اور اس ضمن میں مال کے بارے میں اسلامی نقطہ نظر کی وضاحت کی جا رہی ہے کہ اللہ نے اسے لوگوں کے قیام و بقا کا ایک ذریعہ بنایا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر انفرادی حق کے ساتھ خاندانی اور اجتماعی بہبود و فلاح کا بھی ایک پہلو ہے اور یہ تصور پیدا کیا کہ ہر فرد کی ملکیت سے جماعت کے کچھ حقوق وابستہ ہیں۔ اس لیے نتیجۃً ہر انفرادی ملکیت اجتماعی ملکیت ہے۔ اس کے ضائع ہونے سے جماعت کی حق تلفی ہو سکتی ہے لہٰذا ہر وہ پیسہ جو ایک فرد بے محل صرف کرتا ہے یا ضائع کرتا ہے وہ جماعت کے بہت سے منافع اور بہت سے اجتماعی فوائد کو ضائع کرتا ہے اور جماعتی ملکیت میں ناجائز تصرف کرتا ہے۔

یہاں ناسمجھ یتیموں اور بے سلیقہ جوانوں کے ذاتی اموال واملاک کو جماعت کا مال قرار دیا ہے اور اس کو جماعت کی زندگی اور معیشت کا دارومدار بتایا گیا ہے اور اسی بنا پر ان کے حوالہ کرنے سے منع کیا گیا ہے۔ اگرچہ وہ ان کی ذاتی ملکیت ہے۔ اس پہلو سے اس کی بربادی میں ایک ہی کا نقصان نہیں ہے بلکہ پورے خاندان اور بالآخر پورے معاشرے کا نقصان ہے۔ یہ چیز مقتضی ہے کہ کوئی ایسی شکل اختیار نہ کی جائے جو کسی مال کی بربادی کا باعث ہو۔ اور بقول حضرت مفتی محمد شفیع صاحب ان آیات میں ایک طرف مال کی اہمیت اور انسانی معاش میں اس کا دخل ہونا بیان فرماکر اس کی حفاظت کا داعیہ قلوب میں پیدا کیا گیا دوسری طرف حفاظت مال کے سلسلے میں ایک عام کوتاہی کی اصلاح فرمائی یعنی یہ کہ کچھ لوگ مال کی محبت سے مغلوب ہو کر ناتجربہ کار نابالغ بچوں اور ناواقف عورتوں کے حوالہ کر دیتے ہیں جس کا لازمی نتیجہ مال کی بربادی اور افلاس و تنگدستی کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اور اس کے ساتھ ہی ان آیات میں اشارہ کر دیا ہے کہ مال کو ضائع کرنا، اسراف اور بے اعتدالی سے خرچ کرنا ممنوع ہے۔

مالکانہ تصرفات پر پابندی

۱۱۔ اور اے سرپرستو! تم اپنے وہ مال جن کو اللہ نے تمہارے لیے قیام کا ذریعہ بنایا ہے بیوقوفوں کے سپرد نہ کرو ہاں ان کے مال میں سے ان کے کھانے اور پینے کا انتظام کرو اور ان کو معقول بات کہتے رہو۔ یعنی بے سمجھ لڑکوں کے ہاتھ میں ان کا مال مت دو کہ جس کو اللہ نے آدمیوں کے لیے سامان معیشت بنایا ہے بلکہ اس کی پوری حفاظت کرو اور اندیشہ ہلاکت سے بچاؤ اور جب تک ان کو نفع و نقصان کا ہوش نہ آئے اس وقت تک ان کو اس میں سے کھلاؤ، پہناؤ اور تسلی کرتے رہو کہ یہ سب مال تمہارا ہی ہے۔ ہم تو تمہاری خیر خواہی کرتے ہیں جب سمجھدار ہو جاؤ گے تم کو ہی دے دیں گے[1]

مفسرین کا اختلاف ہے کہ سفہاء سے کون لوگ مراد ہیں؟ کچھ کہتے ہیں کہ اس سے یتیم اور عورتیں مراد ہیں۔ عبداللہ ابن عباس اور عبداللہ بن مسعود کی رائے میں سفہا سے مخاطبین کے بچے اور عورتیں مراد ہیں اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ مال حق تعالیٰ کی نعمت ہے جو تمہارا ذریعہ معاش ہے ایسا مت کرو کہ اپنا مال بیوی اور بچوں کو دے کر خالی ہاتھ رہ جاؤ اور پھر ان کے دست نگر ہو جاؤ اور بعض کی رائے یہ ہے کہ تخصیص کسی کی نہیں ہے۔ سفہاء سے ایسے تمام لوگ مراد ہیں جن کو اپنے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مال کی حفاظت کا سلیقہ نہ آتا ہو اور جو اپنی بیوقوفی سے مال کو ضائع اور برباد کرتے ہوں خواہ وہ یتامیٰ ہوں اور خواہ اپنے بیوی اور بچے ہوں [1] ابن جریر نے اسی کو اختیار کیا ہے اور لکھا ہے کہ آیت کا خطاب پوری امت سے ہے۔ اس لحاظ سے یہ آیت وسیع معنے کی حامل ہے۔ اس میں امت کو یہ جامع ہدایت دی گئی ہے کہ مال جو ذریعۂ قیامِ زندگی ہے بہرحال ایسے نادان لوگوں کے اختیار و تصرف میں نہ ہونا چاہیے جو اسے غلط طریقے سے استعمال کر کے نظامِ تمدن و معیشت اور بالآخر نظامِ اخلاق کو خراب کر دیں۔ حقوقِ ملکیت جو کسی شخص کو اپنے املاک پر حاصل ہیں اس قدر غیر محدود نہیں ہیں کہ اگر وہ ان کو صحیح طور پر استعمال کرنے کا اہل نہ ہو اور اس کے استعمال سے اجتماعی فساد برپا کر دے تب بھی اس کے وہ حقوق سلب نہ ہوں۔ جہاں تک آدمی کی ضروریاتِ زندگی کا تعلق ہے وہ تو ضرور پوری ہونی چاہئیں لیکن جہاں تک حقوقِ مالکانہ کے آزادانہ استعمال کا تعلق ہے اس پر یہ پابندی عائد ہونی چاہیے کہ یہ استعمال اخلاق و تمدن اور اجتماعی معیشت کے لیے صریحاً مضر نہ ہو۔ اس ہدایت کے مطابق چھوٹے پیمانے پر ہر صاحبِ مال کو اس امر کا لحاظ رکھنا چاہیے کہ وہ اپنا مال جس کے حوالے کر رہا ہے وہ اس کے استعمال کی صلاحیت رکھتا ہے یا نہیں اور بڑے پیمانے پر حکومتِ اسلامی کو اس امر کا انتظام کرنا چاہیے کہ جو لوگ اپنے اموال پر خود مالکانہ تصرف کے اہل نہ ہوں یا جو لوگ اپنی دولت کو برے طریقوں سے استعمال کر رہے ہوں ان کی املاک کو وہ اپنے انتظام میں لے اور ان کی ضروریاتِ زندگی کا بندوبست کر دے [2]

دراصل انسان کو مال اور مالکانہ حقوق ضروریاتِ زندگی کی تکمیل اور اعلیٰ مقاصدِ حیات کی تحصیل کے لیے ذریعہ کے طور پر دیے گئے ہیں تبذیر و اسراف اور اضاعتِ مال سے فرد کے اپنے مصالح بھی مجروح ہوتے ہیں اور اجتماع کا بھی نقصان ہوتا ہے اپنے مال میں اس طرح کے غلط اور غیر مفید تصرفات کرنے والا قانونِ اسلامی کی نظر میں سفیہ کہلاتا ہے اور اس کے خرید و فروخت اور انتقالِ ملکیت کے حقوق پر قانونی پابندی عائد کر دی جاتی ہے۔ اس اصول پر قانونِ اسلامی کے چاروں مدارس کا اتفاق ہے حنفی مدرسۂ فکر میں اگرچہ مختار قول یہی ہے لیکن امام ابوحنیفہ کسی عاقل و بالغ آزاد مالک پر تبذیر و اسراف یا اضاعتِ مال کی بنا پر قدغن قائم کرنے کے قائل نہیں ہیں مگر جمہور فقہاءِ اسلام تبذیر، اسراف اور مال کو ضائع کرنے کی بنا پر مالکانہ تصرف پر پابندی لگانے کے قائل ہیں اور اس کو فقہاء

---

[1] معارف م ۱ - [2] تفہیم

کی اصطلاح قانون میں حجر کہتے ہیں۔

احناف کے مسلک کو صاحب ہدایہ نے اس طرح پیش کیا ہے اس سے پہلے وہ یہ بتا چکے ہیں کہ خود امام ابوحنیفہ عاقل بالغ آزاد مرد پر حجر کرنا درست نہیں سمجھتے۔

ابویوسف اور محمد نے کہا ہے اور یہی شافعی کا قول بھی ہے کہ سفیہ پر حجر کیا جائے گا اور اسے اپنے مال میں تصرف سے روکا جائے گا کیونکہ وہ اپنے مال کو تقاضائے عقل کے خلاف کاموں میں صرف کر کے تبذیر کا ارتکاب کرتا ہے اس کے مصالح کی نگرانی کے طور پر اس پر بھی اسی طرح حجر کیا جاتے گا جیسے بچے پر کیا جاتا ہے بلکہ اس پر حجر کرنا زیادہ ضروری ہے کیونکہ بچے سے تو تبذیر کا صرف احتمال ہے اور اس عاقل و بالغ فرد سے تبذیر عملاً صادر ہو چکی ہے۔ (ہدایہ جلد ۳)

ہدایہ کے ایک شارح سید جلال الدین الخوارزمی نے سفہ کی تشریح ان الفاظ میں کی ہے :

سفہ منشائے شریعت کے خلاف عمل، خواہشات نفس کی پیروی اور تقاضائے عقل کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ سفیہ کو اخراجات میں اسراف و تبذیر کی عادت ہوتی ہے وہ ایسے تصرفات کرتا ہے جن کا کوئی مقصد نہیں ہوتا یا ایسا مقصد ہوتا ہے جسے دیندار اصحاب عقل معقول مقصد نہیں سمجھتے مثلاً مغنیوں کو مال دینا یا اڑنے والے کبوتروں کو بھاری قیمت ادا کر کے خریدنا، عام تصرفات میں فراخ دستی سے کام لینا، نیکی اور احسان کے کاموں میں فراخ دلی کا مظاہرہ شریعت کے نزدیک پسندیدہ ہے، البتہ ان کاموں میں بھی اسراف حرام ہے جس طرح کھانے اور پہننے میں اسراف حرام ہے۔

(کفایہ شرح ہدایہ)

ہدایہ کے ایک دوسرے شارح قاضی زادہ کی وضاحت یہ ہے :

ہدایہ کی شرح عنایہ میں شارح نے لکھا ہے کہ یہاں فساد سے مراد سفہ ہے۔ یہ ایک عقل کا ہلکا پن ہے جو آدمی پر طاری ہو جاتا ہے تو اسے باوجود اس کے کہ اس کی عقل سلامت رہتی ہے، شریعت اور عقل کے منشا کے خلاف عمل پر آمادہ کر دیتا ہے۔ فقہاء کے یہاں یہ اصطلاح صرف مال میں تبذیر اور اسے عقل و شریعت کے تقاضے کے خلاف ضائع کرنے کا مفہوم رکھتی ہے۔

(تکملہ فتح القدیر جلد ۰)

امام شمس الدین نے بھی المبسوط میں اسی کا قدر مشترک لکھا ہے:

سفہ مقتضائے شریعت کے خلاف عمل کا نام ہے وہ خواہشات نفس کی پیروی اور عقل و خرد کے تقاضے کی خلاف ورزی کا نام ہے۔ عام تصرفات میں فراخ دستی سے کام لینا اور نیکی و احسان کے کاموں میں فراخ دلی کا مظاہرہ شرعاً پسندیدہ ہے لیکن ان کاموں میں تبذیر و اسراف سے کام لینا شریعت اور عرف عام دونوں میں برا ہے۔
(المبسوط ج ۲۴)

عبدالرحمان الجزیری نے الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں اس کی پوری توضیح کی ہے:

احناف کہتے ہیں کہ ہمارے مسلک میں مختار اور مفتیٰ کی رائے یہی ہے کہ سفیہ پر حجر کیا جائے گا۔ سفیہ کی تعریف یہ ہے کہ وہ فرد جو اپنے مال کا بخوبی انتظام نہ کر سکتا ہو اور اسے حرام کاموں اور لغویات میں اور گناہ کے کاموں میں صرف کرے، اپنے تصرفات میں تبذیر و اسراف سے کام لے۔ ایسے اسراف میں جس کے سبب حجر کرنا واجب ہے مغنیوں کو مال دینا، گراں قیمت دے کر کبوتر و مرغ وغیرہ خریدنا شامل ہیں اور جوئے بازی میں مال صرف کرنے یا دوسرے ایسے اخراجات کرنے پر بھی حجر واجب ہے، جو عقل و شرع کے خلاف ہوں۔ اسی طرح اگر فرد اپنا سارا مال اچھے کاموں مثلاً مدرسہ، مسجد یا ہسپتال کی تعمیر میں صرف کر دے تو بھی وہ سفیہ قرار پائے گا اور اس پر حجر کیا جائے گا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کار خیر کا مکلف اسی وقت بنایا ہے جب اس کی مالی حالت اس کی اجازت دیتی ہو یعنی وہ کار ہائے خیر کی وجہ سے مال خرچ کر کے نادار نہ ہو جائے۔

مال کو اللہ نے سرمایہ حیات بتایا ہے

قرآن نے یہ بلیغ فقرہ جعل اللہ لکم قیاماً بول کر ایک بہت بڑے اجتماعی مسئلہ کی طرف اشارہ کیا ہے اور مال کی اہمیت اور اس کی قدر بتائی ہے۔ میانہ روی اور اقتصاد کے موضوع پر اجتماعی زندگی میں اس سے زیادہ بلیغ بات نہیں کہی جا سکتی ہے۔ اس میں ایک طرف اگر میانہ روی کی ترغیب اور اس کے فوائد بتائے ہیں تو دوسری طرف اسراف و تبذیر سے گریز کی تلقین ہے۔ گویا فرمایا ہے کہ تمہارے انفرادی منافع اور تمہاری اجتماعی مصلحتوں کا مال کے ساتھ گہرا اور

بنیادی تعلق ہے۔ یہ مال جب تک راشدین اور میانہ رو انسانوں کے ہاتھوں میں رہے گا اس وقت تک یہ بہترین نتائج کا حامل ہوگا اور جب بھی مال ناعاقبت اندیش، غلط کار اور فضول و لغو میں لٹانے والوں کے ہاتھ میں ہوگا تو نہ انفرادی منافع اس کے ذریعے حاصل ہوں گے اور نہ اجتماعی مصالح کے لیے اس کی افادی حیثیت قائم رہے گی۔ یہ اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے جس میں وہ منفرد ہے زندگی کی تمام شاخوں کی طرح قرآن اموال کے موضوع پر بھی اقتصاد و اعتدال کی تلقین کر رہا ہے۔ یہ قرآن کی اولین خوبی ہے کہ اس کا راستہ افراط و تفریط کے درمیان رہتا ہے۔ اسی لفظ قیام کی خود قرآن نے دوسرے موقعہ پر یہ تشریح کی ہے:

والذین اذا انفقوا لم یسرفوا ولم یقتروا وکان بین ذالک قواما
جب خرچ کرتے ہیں نہ اسراف کرتے ہیں اور نہ کمی کرتے ہیں بلکہ اس کے درمیان ہوتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی اقتصاد و اعتدال کی اپنے ارشادات میں تلقین فرمائی ہے حضرت حذیفہ صحابی کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دولت مندی میں میانہ روی کتنی اچھی ہے، محتاجی میں میانہ روی کیسی اچھی ہے اور عبادت میں میانہ روی کیسی اچھی ہے۔

غرض یہ ہے کہ نہ اتنا دولت مند ہو کر قارون وقت بن کر حق سے غافل ہو جائے نہ اتنا محتاج ہو کر پریشان خاطر ہو کر حق سے محروم رہ جائے۔ لوگ دولت مند ہو کر اس قدر شان و شکوہ، عز و جاہ اور عیش و تنعم کی زندگی بسر کرتے ہیں کہ اعتدال سے خارج ہو جاتے ہیں اور بعض لوگ محتاج ہو کر اتنے دنی اور متبذل ہو جاتے ہیں کہ صبر خودداری اور تمام شریفانہ اعمال کھو دیتے ہیں۔ ان دونوں حالتوں میں قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ دولت مندی کی حالت میں نہ حد سے زیادہ بلند ہونا چاہیے اور نہ محتاجی کی حالت میں اپنی حیثیت سے گرنا چاہیے۔

تقابلی مطالعہ

مال کے بارے میں حفاظت مال کے قرآنی نقطہ نظر پر شاید کچھ کو حیرت ہو لیکن شاید ان کو پتہ نہیں ہے کہ قرآن ہی میں اسی مال کا مختلف عنوانوں سے ذکر آیا ہے کہیں تجارت، کہیں لین دین، کہیں رہن، کہیں وصیت، کہیں وراثت، کہیں عورتوں کا مہر، کہیں اموال کی حفاظت کے

یسے گویا یہ ساری تصریحات بتا رہی ہیں کہ قرآن کا نقطہ نظر کیا ہے ۔ قرآن نے مال کو نہیں مال کے غلط استعمال کو برا کہا ہے ۔ قرآن نے یہ بھی نہیں فرمایا کہ مالدار بیسے ا ما ں ہ دشاہت میں داخل ہونا مشکل ہے (انجیل متی) اور یہ بھی نہیں بتایا کہ دیکھو میں تم سے کہتا ہوں کہ سوئی کے ناکے سے اونٹ کا گزر جانا ممکن ہے مگر مالدار کا آسمانی بادشاہت میں داخل ہونا ناممکن ہے ۔ اور یہ بھی نہیں کہا کہ تم اللہ اور مال کی خدمت نہیں کر سکتے ۔ بلکہ اس نے بتایا ہے کہ جنت ان پارساؤں کے لیے تیار کی گئی ہے جو اللہ کی رضا کی خاطر اپنے مال خوش حالی اور تنگدستی میں خرچ کرتے ہیں ۔ دونوں کا تقابلی مطالعہ کرو ۔

آخر میں ارشاد فرمایا کہ وارزقوا ھم فیھا واکسوھم وقولوا لھم قولا معروفاً اور اس مال میں سے ان سفہاء کو کھلاتے پلاتے رہو اور ان سے بھلائی کی بات کہتے رہو مطلب یہ ہے کہ اسی سرمایہ سے ان کی ضروریات پوری کرنے کا انتظام کرو ۔ ان کی راحت و آسائش کے سامان کرتے رہو اور بجائے ان کے ہاتھ میں دے دینے کے ان سے تسلی کی باتیں کرتے رہو کہ یہ بلکہ تمہاری ہی ہے تمہاری ہمدردی کا تقاضا ہے کہ اسے تمہارے ہاتھ میں نہ دیا جائے بلکہ انتظار کیا جائے کہ تم میں پوری طرح سمجھ آجائے ان کی یہ سفاہت ان کے نان و نفقہ میں حائل نہیں ہو سکتی ۔

رزق بولا ہے مگر اخراجات کی ساری صورتیں مراد ہیں ان کا کھانا ، ان کا رہنا اور ان کی خانہ آبادی وغیرہ لباس کو خاص طور پر ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عموماً لوگ اس میں بے پروائی اور تساہل سے کام لیتے ہیں اور یہ فرمایا کہ فیہا اس میں سے یہ نہیں فرمایا منہا اس سے ۔ اس میں اشارہ ہے کہ مال اور سرمایہ کو کھلا کر ختم نہ کیا جائے بلکہ اسے کاروبار میں لگا کر اس کے منافع سے ان کے اخراجات کو پورا کیا جائے تاکہ اصل مال محفوظ رہے اور قول معروف میں ان کی تربیت کے لیے خاص اہتمام کی ضرورت بتائی ہے ۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ یہاں قول معروف سے مراد تادیب و تنبیہ ہے ۔ اور قفال مروزی کہتے ہیں کہ ان کے ساتھ غلاموں کی سی معاشرت اختیار نہ کرو بلکہ ان کو نیکیوں کی طرف توجہ دلاتے رہو اور بتاتے رہو کہ اسراف مال کا انجام اچھا نہیں ہوتا ۔

اور اگر آیت میں سفہاء سے مراد یتامیٰ ہوں جیسا کہ سعید بن جبیر کی رائے ہے تو پھر آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ حکم جو تمہیں دیا گیا ہے کہ یتیموں کا مال ان کے سپرد کر دو تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اگر وہ بالکل نادان اور بے سمجھ ہوں پھر بھی جو کچھ ان کا ہے ان کو دے دو ۔ اگر وہ

بھی نادان ہے تو سرپرست کا فرض ہے کہ وہ اس کا مال اپنی حفاظت اور نگرانی میں رکھے البتہ اس کو کھلاتے اور پہناتے اور اس کی دلداری کرتا رہے تاکہ اس کو اطمینان رہے کہ یہ نگرانی اس کے فائدے کے لیے ہے۔ ذمہ داری سنبھالنے کے قابل ہو جانے کے بعد اس کی ہر چیز اس کو ملنی ہے۔

یتامیٰ کی عقل و شعور کا جائزہ

۲۱۔ اور یتیموں کے عقل و شعور کا جائزہ لیتے رہو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہنچ جائیں پھر اگر تم ان میں صلاحیت و اہلیت دیکھو تو ان کے مال ان کے سپرد کر دو۔ یعنی یتیموں کو سدھاتے اور آزماتے رہو۔ بلوغ کے وقت تک پھر بلوغ کے بعد اگر ان میں اپنے نفع و نقصان کی سمجھ اور حفاظت اور انتظام مال کا سلیقہ پاؤ تو ان کا مال ان کے حوالہ کر دو۔ یتیموں کے سدھانے اور آزمانے کی عمدہ صورت یہی ہے کہ کم قیمت پر معمولی چیزوں کی ان سے خرید و فروخت کرائی جائے اور اس کا طریقہ اُن کو بتایا جائے اس سے معلوم ہوا کہ نابالغ کی بیع و شراء ولی کی اجازت سے دُرست ہے۔ امام ابو حنیفہ کا مذہب یہی ہے اور اگر بالغ ہو کر بھی اس میں ہوشیاری نہ آئے تو امام ابو حنیفہ کا مذہب یہ ہے کہ پچیس برس کی عمر تک انتظار کرو۔ اس عرصہ میں جب اس کو سمجھ آجائے مال اس کے حوالہ کر دو ورنہ پچیس سال پر ہر حال میں اس کا مال اس کو دے دو پوری سمجھ آئے یا نہ آئے [1]

اس ارشاد میں دو ہدایتیں ہیں ایک قرآن کے منطوق سے معلوم ہو رہی ہے اور دوسری قرآن کے مدلول سے۔ جو بات اس آیت میں مدلول سے معلوم ہو رہی ہے یہ ہے کہ قرآن نے یتیموں کا جائزہ لینے کی ہدایت کی ہے۔

یہ جائزہ لینا کیا ہے؟ اصل ارشاد میں ابتلا آیا ہے۔ اس کے معنے آزمانے، جانچنے کے ہیں۔ اس کی کیفیت میں علماء کا اختلاف ہے، کچھ کہتے ہیں کہ ابتلاء یہ ہے کہ وصی اس کی اخلاقی حالت کا بغور مطالعہ کرے تاکہ اسے معلوم ہو سکے کہ وہ کہاں تک اپنے فرائض کی ادائیگی کر سکتا ہے اور کچھ کی رائے یہ ہے کہ جائزہ لینا یہ ہے کہ کچھ سرمایہ دے کر اس سے کاروبار کرائے تاکہ وصی کو حقیقتِ حال کا پتہ لگ جائے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ ابتلا یہ ہے کہ گھر کے نظامِ خرچ کو دیکھے اور اس کو بتائے کہ اخراجات کا نظام کیسے چلتا ہے۔ لیکن ابوبکر الجصاص کہتے ہیں کہ ابتلا مخصوص نہیں

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

بلکہ عمومی ہونا چاہیے اور ہر پہلو سے ہونا چاہیے۔ ان کی عقل کا ان کے حالات اور ان کے تصرفات میں ان کی مہارت کا بھی، سب چیزوں میں جائزہ ہونا چاہیے اور یہ اختیار، ابتلا اور جائزہ ولی اور وصی کی جانب سے ہو۔ یہ جائزہ لینے کی ہدایت بتا رہی ہے کہ ان یتامیٰ کے معاملات نپٹنے میں اولیاء کی اجازت سے جائز ہیں۔ ان کے تصرفات پر ان کے لین دین اور ان کے کاروبار پر قطعاً کوئی قدغن نہیں اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نابالغ اگر ولی کی اجازت سے خرید و فروخت کرے تو جائز ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔

دوسری ہدایت جو اس آیت کے منطوق سے معلوم ہو رہی ہے یہ ہے کہ یتیموں کو ان کا مال حوالہ کرنے کی دو شرطیں ہیں ایک یہ کہ وہ بالغ ہو جائیں دوسرے یہ کہ ان میں رشد یعنی مال کے استعمال کرنے کی صحیح صلاحیت اور اہلیت آ جائے۔ پہلی شرط کی حد تک سب کا اتفاق ہے بلوغ کی عمر حنفیہ کے یہاں لڑکے کے لیے ۱۸ سال ہے اور لڑکی کے لیے ۱۷ سال ہے۔ لیکن امام مالک، امام شافعی اور امام اعظم ابوحنیفہ کے دونوں شاگردوں ابو یوسف اور امام محمد کی رائے میں بلوغ کی عمر ۱۵ سال ہے اور اسی پر احناف کے یہاں عمل ہے اور اصل بلوغ کی علامات انزال اور حیض ہیں اگر یہ نہ ہوں تو پھر مفتی بہ ۱۵ سال ہے۔ احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔

دوسری شرط یعنی رشد کے بارے میں ائمہ کے نقطہ ہائے نظر مختلف ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور امام مالک مالی تصرفات اور معاملات میں صلاحیت کو رشد کہتے ہیں جبکہ امام شافعی اور امام کے نزدیک رشد میں مالی تصرفات کی معقولیت کے پہلو بہ پہلو مالک کا صالح اور راست باز ہونا بھی ضروری ہے۔ علامہ نووی منہاج الطالبین میں رقمطراز ہیں:

> رشد، دین اور مال دونوں میں صالح ہونے کا نام ہے لہٰذا صاحب رشد وہ ہے جو ایسے حرام کام نہ کرے جس سے اس کی راست بازی (عدالت) ختم ہو جائے اور تبذیر نہ کرے مثلاً تجارتی معاملات میں کھلا نقصان گوارا نہ کرے اور اپنے مال کو سمندر میں نہ ڈالے یا ایسے حرام کاموں میں نہ صرف کرے صحیح رائے یہ ہے کہ صدقہ اور کار ہائے خیر یا خوراک اور لباس میں اپنی حیثیت سے زیادہ مال خرچ کرنا تبذیر نہیں ہے۔

اور علامہ ابن قدامہ المغنی میں لکھتے ہیں:

> اور رشد کے معنے یہ ہیں کہ مالک اپنے مال کو بے فائدہ کاموں میں صرف ہونے سے بچائے مثلاً غنا، قمار، حرام اشیاء اور آلات لہو کے خریدنے سے

اور اس مال کو فساد کا ذریعہ نہ بنائے۔ ایسا کام کرنے والا صاحب رشد نہ قرار پائے گا کیونکہ یہ اپنے مال کی تبذیر اور اسے غیر مفید کاموں میں ضائع کرتا ہے۔

اور اس شرط یعنی رشد کے بارے میں امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے کہ اگر سن بلوغ کو پہنچنے پر یتیم میں رشد نہ پایا جائے تو یتیم کے ولی کو زیادہ سے زیادہ سات سال اور انتظار کرنا چاہیے۔ پھر خواہ رشد پایا جائے یا نہ پایا جائے اس کا مال اس کے حوالے کر دینا چاہیے۔ اور امام ابویوسف امام محمد امام شافعی اور امام احمد کی رائے یہ ہے کہ مال حوالہ کیے جانے کے لیے بہرحال رشد کا پایا جانا ناگزیر ہے۔

بہرحال اس آیت قرآنی میں یہ حکم دیا گیا ہے کہ مالکانہ تصرفات کے لیے رشد ضروری ہے اور مالک سفیہ ہو تو اسے مالکانہ تصرفات کا موقعہ نہ دینا چاہیے۔ فقہائے سفہ اور رشد کی جو تعریفیں کی ہیں ان کا مطالعہ اوپر کیا جا چکا ہے۔

بلاغت کا ایک عجیب نکتہ

ان آیات پاک میں بلاغت کا ایک عجیب نکتہ ہے۔ غور کرو کہ آیت کے شروع ولا تؤتوا السفہاء اموالکم میں جہاں متولیوں کو ناسمجھ یتیموں کے اموال کو اپنے پاس رکھنے کا حکم ہے وہاں مال کی نسبت متولیوں کی طرف ہے کہ تم اپنا مال ان کو نہ دو، اور آیت کے آخر میں جہاں بلوغ اور سن رشد کے بعد متولیوں کو حکم ہے کہ یتیموں کو مال واپس کریں وہاں مال کی نسبت یتیموں کی طرف کی گئی ہے ادفعوا اموالہم تم ان کا مال ان کو واپس کر دو۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ جب تک یہ امانت متولیوں کے پاس رہے تو اس کی ایسی حفاظت اور نگہداشت کرنی چاہیے جیسے اپنے مال کی اور جب واپسی کی نوبت آئے تو اس طرح ایک ایک تنکا چن کر واپس کیا جائے جیسا کسی غیر کا مال دیانت کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے جس پر تمہارا کوئی حق نہیں ہے۔

مال یتامیٰ میں اسراف اور بدار

۱۳۔ اور اس خوف سے کہ کہیں وہ بڑے نہ ہو جائیں ان کے مالوں کو فضول خرچی کر کے جلدی جلدی نہ کھا پی ڈالو۔ یعنی یتیم کے مال کو ضرورت سے زیادہ صرف کرنا منع ہے مثلاً ایک پیسے کی جگہ دو پیسے صرف کر دو اور یہ بھی منع ہے کہ اس بات سے گھبرا کر کہ یتیم بڑے ہو کر اپنا

مال ہم سے لے لیں گے خرچ کرنے میں جلدی کرنے لگو خلاصہ یہ ہوا کہ یتیم کے مال کو بقدرِ ضرورت اور بوقت ضرورت صرف کرنا چاہیے لے

اس آیت میں یتیموں کے مال میں دو باتوں سے روکا ہے ایک اسراف دوسرے بدار۔ اسراف قرآن حکیم کی ایک جامع اصطلاح ہے اس کا اطلاق ہر ایسے طرزِ عمل پر ہوتا ہے جو صحیح انسانی اور اسلامی طرزِ عمل سے ہٹا ہوا ہو لیکن صرف مال کے سلسلے میں اس کے معنے کچھ محدود ہیں جس غرض کی تکمیل مال کی ایک مخصوص مقدار صرف کرکے کی جاسکتی ہے۔ اس پر دانستہ اور بلا مزید فائدے کے زائد مقدار میں صرف کرنا اسراف ہے قاموس میں ہے کہ سرف قصد یعنی میانہ روی کی ضد ہے اور جوہری نے صحاح میں لکھا ہے کہ کردار میں حد سے بڑھ جانے کا نام اسراف ہے۔ انفاق میں کبھی کمیت اور کبھی کیفیت کے لحاظ سے اسراف ہوتا ہے اس لیے ہم کہہ سکتے ہیں کہ اسراف نام ہے ضروریات کی تکمیل کے لیے مقدار یا معنی معیار کے اعتبار سے زائد از ضروریات مال صرف کرنے کا۔

بدار یہ ہے کہ مال کو جلدی جلدی ختم کر دیا جائے۔ قرآن نے ان دونوں سے منع کیا ہے اور کرنے والے یہ دونوں کام صرف اس اندیشہ سے کریں کہ یتامیٰ اگر بڑے ہو جائیں گے تو ہمیں ان کا مال ان کو دینا پڑے گا یعنی متولیوں کو جو یتیم کے مال کو بد دیانتی اور اسراف سے خرچ کریں اور جو یتیموں کے مال کو اس ڈر سے جلدی جلدی خرچ کرکے برابر کر دیں کہ یہ بڑے ہو کر تقاضا کرنہ بیٹھیں تنبیہہ فرمائی ہے۔

یتیم کے غریب ولی کو حقِ خدمت

۱۴ - اور یاد رکھو کہ یتیم کا جو سرپرست مالدار ہو اسے چاہیے کہ یتیم کے مال سے بالکل پرہیز کرے اور جو حاجتمند ہو وہ بقدرِ حاجت دستور کے مطابق لے سکتا ہے۔ یعنی یتیم کا ولی اس کا مال اپنے خرچ میں نہ لائے اور اگر یتیم کی پرورش کرنے والا محتاج ہو تو البتہ اپنی خدمت کرنے کے موافق یتیم کے مال میں سے دریا ہے لے مگر غنی کو کچھ لینا ہرگز جائز نہیں ہے لے مطلب یہ ہے کہ سرپرست اگر مستغنی آدمی ہو تو اس کو یتیم کے مال میں سے کچھ لینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ اگر غریب ہو تو دستور کے مطابق اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے لے

سادے لفظوں میں منشا یہ ہے کہ صاحبِ جائداد یتیموں کے متولی اگر خود کھلتے پیتے ہوں تو ان

لے لے افاداتِ شیخ الاسلام لے تدبر قرآن

کے لیے ان یتیموں کی جائداد کی دیکھ بھال اور نگرانی کا معاوضہ قبول کرنا بھی خلاف اخلاق ہے اور اگر تنگدست ہوں تو منصفانہ معاوضہ لینے کی قانونی اجازت ہے ۔

اکل بالمعروف کا نظری اور واقعاتی تجزیہ

منصفانہ معاوضہ یا دستور کے مطابق سے قرآن کے معروف کی تشریح کی گئی ہے لیکن شارحین اور فقہا نے اس موضوع پر مختلف خیالات پیش کیے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ معروف کے مطابق لینے کا مطلب یہ ہے کہ ضرورت کے موقعہ پر مال یتیم میں سے قرض لے لے خوش حالی آنے پر ادائیگی کرے۔ یہ فاروق اعظم، عبداللہ ابن عباس، عبیدہ، ابن جبیر، شعبی، مجاہد اور ابوالعالیہ کی رائے ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ متولی اگر حاجت مند ہو تو ضرورت کے مطابق اس کو لینا جائز ہے اور اس کے ذمہ یہ قرض نہیں کیونکہ یہ اس کی نگرانی کا حق ہے لیکن اس کی کیفیت میں یہ بتایا ہے کہ بھوک کی مقدار میں کھائے اور کپڑے صرف ستر کے ڈھانپنے تک استعمال کرے۔ قیمتی کپڑوں کی ہرگز اجازت نہیں ہے اور امام شعبی فرماتے ہیں کہ منافع میں سے کھائے اصل سرمایہ کو ہاتھ نہ لگائے، جانور موجود ہوں تو ان کا دودھ استعمال کر سکتا ہے لیکن خود جانور کو کھانے اور فروخت کرنے کی اجازت نہیں ہے ۔

اکل بالمعروف کا یہ مجرد نظریاتی تجزیہ بات کو پوری طرح واضح نہیں کر سکتا۔ اب ہم چند ایسی احادیث کا مطالعہ کریں گے جو ناواز متولی کے لیے یتیم کے مال سے معروف کے مطابق فائدہ اٹھانے کی اجازت ثابت کرنے کے ساتھ اس کے تصور کی بھی وضاحت کرتی ہیں ۔

ابوداؤد، نسائی اور ابن ماجہ میں ہے :

> ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ یارسول اللہ میں غریب آدمی ہوں، میرے پاس کچھ بھی نہیں ہے۔ ایک یتیم کا سرپرست ہوں، فرمایا کہ تم یتیم کے مال میں سے لے سکتے ہو بشرطیکہ اسراف نہ کرو اور یتیم کے مال کو جلدی ختم کرنا مقصد نہ ہو اور اپنے سرمایہ کو بچا کر رکھنا پیش نظر نہ ہو۔

مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمر کے سوال کے جواب میں بھی حضور انور نے یہی بات ارشاد فرمائی ہے۔ ان ارشادات سے معلوم ہوتا ہے کہ اکل بالمعروف کی اجازت کا مقصد انسان کو یتیم کے مال میں ایک معتدل اور متوازن روش پر قائم رکھنا ہے۔ یہ اسی وقت ممکن ہے کہ انسان اس معاملہ میں ذمہ داری کی ضرورت اور نزاکت کو محسوس کرے۔ مطلب یہ ہے کہ ذمہ داریوں کی نوعیت جائداد کی حیثیت مقامی

حالات کے اعتبار سے ایسا فائدہ اٹھائے جو معقولیت کی حدود کے اندر ہو۔

یتیم کے مال پر گواہی

۱۵۔ پھر جب تم یتیموں کے مال ان کے سپرد کرو تو تمہیں ان پر گواہ بنا لینا چاہیے اور دیکھو محاسبہ کے لیے بس اللہ کا محاسبہ کافی ہے۔ یعنی جب کسی بچہ کا باپ مر جاتے تو چاہیے کہ چند مسلمانوں کے رُوبرو یتیم کا مال لکھ کر امانت دار کو سپرد کر دیں۔ جب یتیم بالغ اور ہوشیار ہو جائے تو اس تحریر کے موافق اس کا مال اس کے حوالے کر دیں اور جو کچھ خرچ ہوا ہو اس کو سمجھا دیں اور جو کچھ یتیم کے حوالہ کیا جائے گواہوں کو دکھلا کر حوالہ کر دیں۔ تاکہ کسی وقت اختلاف ہو تو بسہولت طے ہو سکے اور اللہ تعالیٰ ہر ہر چیز کا حساب لینے والا کافی ہے اس کو کسی حساب اور شہادت کی حاجت نہیں ہے یہ سب باتیں تمہاری سہولت اور صفائی کی وجہ سے مقرر فرمائیں۔ جاننا چاہیے کہ یتیم کا مال لینے اور دینے کے وقت گواہ کرنا اور اس کو لکھ لینا مستحب ہے[1]

اس آیت میں شہادت کی نوعیت کے بارے میں فقہاً کا اختلاف ہے۔ مالکیہ اور شوافع اسے واجب کہتے ہیں جبکہ احناف اسے مستحب قرار دیتے ہیں۔ گویا اول الذکر کے خیال میں یہاں امر وجوب کے لیے ہے اور آخر الذکر اس امر کو محض استحبابی اور ارشادی کہتے ہیں۔ سیاق قرآنی میں اب تک یہاں جس قدر اوامر گزرے ہیں ان پر بھی سب متفق ہیں کہ قطعاً تحریم کی رہنما ہیں۔ پھر عقلی طور پر اگر شہادت کا منشا اور مقصد رفع نزاع بالقول قاضی ثناء اللہ پانی پتی دفع تہمت اور انقطاع خصومت ہے یا بقول علامہ قرطبی مال کی حفاظت اور زوال تہمت ہے تو پھر یہاں شہادت کو ضروری ہونا چاہیے اور اگر شہادت کا مقصد صرف آئندہ دعوؤں سے حفاظت ہے جیسا کہ علامہ شوکانی اور نواب صدیق حسن خاں کا خیال ہے تو پھر یہاں شہادت کا درجہ استحبابی ہونا چاہیے۔

دراصل بنائے اختلاف صرف یہ نہیں ہے واقعی صورت حال یہ ہے کہ متولی، ولی اور وصی کی حیثیت میں فکری اختلاف ہے۔ شوافع کی نظر میں متولی کی حیثیت وکیل کی ہے جبکہ احناف کی رائے میں متولی کی حیثیت امین کی ہے۔ حیثیت کے اسی اختلاف کی وجہ سے محققین احناف نے صاف کہہ دیا ہے کہ متولی اور وصی جو یتیم کے مال میں سے حق خدمت لے گا وہ بطور اجرت نہیں ہے جبکہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شوافع کے نزدیک یہ بطور اجرت ہے۔ اور اسی بنا پر اگر وصی یتیم کے بالغ ہونے کے بعد یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں یتیم کا مال دے چکا ہوں یا میں اس پر سارا خرچ کر چکا ہوں تو اس کی صداقت کو تسلیم کیا جائے گا اور اس سے گواہی کا مطالبہ نہ کیا جائے گا کیونکہ وہ امین ہے لیکن امام مالک اور شافعی اس کے دعویٰ کو بغیر شہادت نہیں مانیں گے کیونکہ یہ وکیل ہے۔ ابوبکر الجصاص نے اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور مسئلہ کے تمام پہلوؤں کا قانونی جائزہ لیا ہے۔ مال یتیم اور اس کی نگرانی کی حد تک قرآن نے جو اہمیت دی ہے کہ اس نے اس موضوع پر یہاں بارہ حکم دیے ہیں ان میں چار نہی ہیں اور آٹھ امر ہیں۔ یہ اہمیت بتا رہی ہے کہ متولی کی حیثیت صرف امین ہی کی نہیں ہے بلکہ اس پر امین سے بڑھ کر ذمہ داری ہے یہ یتیم کے مال کو صرف محفوظ رکھنے کا نہیں بلکہ اسے بڑھانے کا بھی ذمہ دار ہے۔ اسے حق الخدمت لینے کی بھی اجازت ہے وہ اس کے اموال کا نگران اور تنظیم میں سے یتامیٰ کے امتحان لینے کی ذمہ داری بھی اس پر ڈالی گئی ہے۔ جنسی بلوغ کے ساتھ عقلی بلوغ ہو جانے پر اسے مال سپرد کرنے کا بھی حکم ہے اور سپرد کرتے وقت اسے گواہ بنا لینے کی بھی ہدایت ہوئی ہے۔

لِلرِّجَالِ نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ وَلِلنِّسَاءِ
نَصِيبٌ مِّمَّا تَرَكَ الْوَالِدَانِ وَالْأَقْرَبُونَ مِمَّا قَلَّ مِنْهُ أَوْ كَثُرَ
نَصِيبًا مَّفْرُوضًا ۝ وَإِذَا حَضَرَ الْقِسْمَةَ أُولُوا الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ
وَالْمَسَاكِينُ فَارْزُقُوهُم مِّنْهُ وَقُولُوا لَهُمْ قَوْلًا مَّعْرُوفًا ۝
وَلْيَخْشَ الَّذِينَ لَوْ تَرَكُوا مِنْ خَلْفِهِمْ ذُرِّيَّةً ضِعَافًا خَافُوا عَلَيْهِمْ
فَلْيَتَّقُوا اللَّهَ وَلْيَقُولُوا قَوْلًا سَدِيدًا ۝ إِنَّ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ
أَمْوَالَ الْيَتَامَىٰ ظُلْمًا إِنَّمَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ نَارًا
وَسَيَصْلَوْنَ سَعِيرًا ۝ ع

مردوں کے لیے اس مال میں حصّہ ہے جو والدین اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصّہ ہے جو ماں باپ اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو، چاہے تھوڑا ہو یا بہت اور یہ حصّہ خدا کا مقرر کردہ ہے۔ اور جب تقسیم کے موقع پر

کنبہ کے لوگ اور یتیم اور مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو، اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔[12] اور لوگوں کو اس بات کو سوچ کر ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے پس چاہیے کہ وہ خدا کا خوف کریں اور راستی کی بات کریں۔[13] جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں، درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی بھڑکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔[14]

قانونِ وراثت کا اجمالی تصور اور اس کے اصول

یتامیٰ کے تحفظِ حقوق کے بعد اب یہ تمہید ہے اس قانونِ وراثت کی جس میں مردوں اور عورتوں کے ان کے والدین اور اقربا کے ترکے میں سے حصے مقرر کیے گئے ہیں۔ ظلم میں یتیم بچے اور عورتیں ایک سا سر جیسے ہیں، اہلِ عرب جیسے یتیم بچوں کو حقوقِ وراثت سے محروم کرتے تھے ایسے ہی عورتوں کو بھی وراثت کا حقدار قرار نہ دیتے تھے۔ ان کا ذہن یہ بن گیا تھا کہ وراثت تو صرف گھوڑے کی پیٹھ پر سوار ہو کر جنگ کرنے والے کا حصہ ہے اور جہاں عورت ہونا اور یتیم ہونا دونوں جمع ہو جائیں وہاں ظلم حد درجہ بے باک ہو کر سامنے آجاتا ہے۔ اتفاق کی بات ہے کہ ایسا ہی واقعہ زمانۂ نبوت میں پیش آگیا۔ اوس بن ثابت

کا انتقال ہوگیا۔ وارثوں میں دو لڑکیاں ایک بچہ اور ایک بیوی چھوڑ گئے۔ عرب کے دستور کے مطابق ان کے چچازاد بھائیوں نے آکر مرحوم کی جائداد پر قبضہ کر لیا۔ اولاد اور بیوی کو کچھ نہ دیا۔ عورت تو عورت ہونے کی وجہ سے وراثت کی حقدار نہ تھی اس لیے بیوی اور دونوں بچیاں تو یوں ہی محروم ہوگئیں اور لڑکا نابالغ ہونے کے جرم میں محروم ہوگیا۔ اوس بن ثابت کی اہلیہ نے یہ بھی چاہا کہ چچازاد بھائی ان دونوں لڑکیوں سے شادی کر لیں مگر وہ اس کے لیے تیار نہ ہوتے۔ یہ صورت حال اوس کی اہلیہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں پیش کر دی اور اپنے بچوں کی بے کسی اور بے بسی کی شکایت کی۔ ابھی تک قرآن میں قانون وراثت نازل نہ ہوا تھا اس لیے آپ نے توقف فرمایا آپ کو اطمینان تھا کہ وحی الٰہی اس ظالمانہ رسم کو ضرور بدلے گی۔ اس آیت میں ان ہی حالات کی عکاسی کی گئی ہے اور واضح طور پر قانونی وراثت کے پانچ بنیادی اور اہم نکتے بتا دیے ہیں۔ ایک یہ کہ میراث صرف مردوں ہی کا حصہ نہیں بلکہ عورتیں بھی اس کی حقدار ہیں۔ دوسرے یہ کہ میراث بہرحال تقسیم ہونی چاہیے خواہ وہ کتنی کم ہو حتیٰ کہ اگر مرنے والے نے صرف ایک گز کپڑا چھوڑا ہے اور دس وارث ہیں تو اسے بھی دس حصوں میں تقسیم ہونا چاہیے۔ تیسرے یہ کہ وراثت کا قانون ہر قسم کے اموال واملاک پر جاری ہوگا۔ چوتھے یہ کہ میراث کا حق دار اس وقت ہوتا ہے جب مورث کوئی مال چھوڑ کر مرا ہو۔ پانچویں یہ کہ قریب تر رشتہ دار کی موجودگی میں بعید تر رشتہ دار میراث نہ پائے گا۔

ان ہی پنجگانہ اصول پر قانون میراث کی ساری عمارت قائم ہے۔

۱۱۔ مردوں کے لیے اُس مال میں حصہ ہے جو والدین اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو ۔ اور عورتوں کے لیے بھی اس مال میں حصہ ہے جو والدین اور رشتہ داروں نے چھوڑا ہو چاہے تھوڑا ہو یا بہت اور یہ حصہ خدا کا مقرر کردہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے سے پہلے یہ رسم تھی کہ بیٹیوں کو چھوٹی ہوں یا بڑی میراث نہ دیتے تھے اور بیٹے جو نابالغ ہوتے تھے ان کو بھی میراث نہ ملتی۔ صرف مردوں کو جو بڑے اور دشمنوں سے مقابلہ کے کام کے ہوتے تھے وہ وارث سمجھے جاتے تھے جس کی وجہ سے یتیم بچوں کو میراث سے کچھ نہ ملتا تھا۔ ان کے بارے میں یہ آیت اتری جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ماں باپ اور دیگر قرابت والوں کے مال متروکہ میں سے مردوں یعنی بیٹوں کو خواہ وہ بچے ہوں یا جوان ان کو حصہ ملے گا اور عورتوں یعنی بیٹیوں کو بھی بالغ ہوں یا نابالغ ہوں ماں باپ وغیرہ اقارب کے ترکہ میں سے ان کا حصہ دیا جائے گا اور یہ حصے مقرر کیے ہوئے ہیں جن کا دینا ضروری ہے خواہ مال تھوڑا ہو یا بہت۔ اس سے اہل جاہلیت کی مذموم رسم کا ابطال ہوگیا اور یتیموں وغیرہ کی حفاظت فرما کر ان کی حق تلفی کو روک دیا۔ اس آیت میں حق والوں کا حق اور اس کا تقرر اور تعین بالاجمال بتلایا

گیا ہے آئندہ رکوع میں وارثوں کے حصہ کی تفصیل آتی ہے۔

قرابت وراثت کی بنیاد ہے

وراثت کا بہت گہرا تعلق خاندانی نظام اور عائلی زندگی سے ہے۔ وراثت کا نظام خاندان کو تسلسل بخشنے اور اسے ایک وحدت کے طور پر برقرار رکھنے میں بہت اہم حصہ لیتا ہے۔ خاندان کے مختلف افراد کے درمیان باہمی تعاون اور خدمت کا جو تعلق قائم ہے اسے باقی رکھنے اور مستحکم کرنے میں جہاں طبعی اور جذباتی عوامل کو دخل ہے وہاں مادی اور معاشی عوامل بھی کچھ اہم نہیں ہیں۔

اسلام کے قانونِ وراثت اور محروم افرادِ خاندان کی کفالت کے بارے میں اس کے ضوابط کا ایک دوسرے کے ساتھ ملا کر مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس نے معاشی زندگی میں خاندانی تعلقات کو کتنی اہمیت دی ہے۔ جن رشتہ داروں کو ایک فرد کے مرنے کے بعد اس کے ترکہ میں حصہ دار بنایا گیا ہے۔ انہی رشتہ داروں پر یہ ذمہ داری ڈالی گئی ہے کہ اس فرد کی زندگی میں بہ شرط ضرورت اس کی کفالت کریں۔ اس طرح اسلام میں خاندان کا ادارہ فرد کے بنیادی مفادات کا محافظ اور اس کی ناگزیر ضروریاتِ زندگی کا کفیل بنایا گیا ہے۔

اس اُصول کا تقاضا ہے کہ استحقاقِ وراثت کی بنیاد ولادت اور قرابت ہو۔ قرآن کی اس آیت نے اسی حقیقت کو مما ترك الوالدان والاقربون کہہ کر بے نقاب کیا ہے یعنی وراثت کا استحقاق دو وجہ سے ہوتا ہے ایک ولادت، دوسرے قرابت۔ چونکہ قرابت کے لفظ کا معنوی دائرہ بے حد وسیع تھا اس لیے اس کو اقربون کہہ کر تنگ کر دیا یعنی وراثت کے لیے مطلق قرابت کافی نہیں ہے بلکہ رشتہ میں اقرب ہونا شرط ہے۔

اقرب کی شرط کیوں لگائی گئی ہے؟ اس لیے کہ اگر اقربیت کو شرط نہ مانا جائے تو ہر مرنے والے کی وراثت دُنیا کی انسانی برادری پر تقسیم ہوگی۔ کیونکہ اولادِ آدم ہونے میں سب کو قرابت حاصل ہے۔ اقربون لا کر قرآن نے اس ضابطہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ اگر نزدیک و دُور کے رشتہ دار جمع ہوں تو قریبی رشتہ دار کو بعید پر ترجیح دے کر اقرب کی موجودگی میں قریب کو اور قریب کی موجودگی میں بعید کو اور بعید کی موجودگی میں ابعد کو حصہ نہ دیا جائے گا۔

لہ افادات شیخ الاسلام

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہے کہ انتقالِ ملکیت کی یہ صورت ضرورت کی بنیاد پر نہیں بلکہ قرابت کی بنا پر ہے اس لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ رشتہ داروں میں جو زیادہ غریب ہوں ان کو وراثت کا زیادہ حقدار سمجھا جاتے بلکہ جس کا میت سے قریب ترخونی رشتہ ہوگا وہ حقدار ہوگا اگرچہ وہ دولت مند ہو۔

اگر اس قرآنی اصول کو پیش نظر رکھا جائے تو یتیم پوتے کی وراثت کا مسئلہ خود بخود حل ہو جاتا ہے یتیم پوتا اگرچہ بیٹے کے مقابلہ میں زیادہ ضرورت مند ہو لیکن اقربیت کے اس قرآنی اصول کی وجہ سے وہ مستحق وراثت نہیں ہو سکتا وہ اولوالقربیٰ میں داخل ضرور ہے مگر بیٹے کی موجودگی میں اقرب نہیں ہے۔ ہاں اس کی ضرورت کی خاطر دوسرے انتظامات کیے جائیں گے جیسا کہ آنے والی آیت اسی قسم کے انتظام کی رہنمائی کر رہی ہے۔

آیت میں مما قل منہ او کثر یہ ضابطہ بھی بتا دیا کہ میت کے اموال و املاک میں جو کچھ جتنا کچھ بھی ہے سب قابل تقسیم وراثت ہے[1]

آیت کے بالکل آخر میں نصیبا مفروضا فرما کر وراثت کو انتقال ملکیت کی تمام صورتوں سے ممتاز کر دیا اور بتا دیا کہ اس صورت کو تمام معاملاتی معاہداتی صورتوں سے ممتاز کرنے والی چیز یہ ہے کہ اس میں مالک کی رضامندی شرط نہیں ہے۔ یہ انتقال مالک کی مرضی سے قطع نظر بلکہ بعض اوقات اس کے علی الرغم اللہ سبحانہ کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ نے ان رشتوں کو تفصیل کے ساتھ بیان کر دیا ہے جن کے پائے جانے پر میت کی ملکیت کے مقررہ حصے متعین افراد کو منتقل ہوں۔ یہ اللہ کے مقرر کردہ حصے ہیں، ان میں نہ فرد کو اور نہ ادارے کو اپنی رائے اور قیاس سے کمی بیشی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

محروم الارث رشتہ داروں کی دلداری

۸- اور جب تقسیم کے موقعہ پر کنبہ کے لوگ اور یتیم و مسکین آئیں تو اس مال میں سے ان کو بھی کچھ دو اور ان کے ساتھ بھلے مانسوں کی سی بات کرو۔ یعنی تقسیم میراث کے وقت برادری اور کنبے کے لوگ جمع ہوں تو جو رشتہ دار ایسے ہوں جن کو میراث میں حصہ نہیں پہنچتا۔ جو یتیم و محتاج ہوں

[1] معارف م شفیع ملخصاً

ان کو کچھ کھلا کر رخصت کر دیا کوئی چیز ترکہ میں سے حسب موقع ان کو بھی دے دو کہ یہ سلوک کرنا مستحب ہے اور اگر مال میراث میں سے کچھ کھلانے پلانے کا موقعہ نہ ہو مثلاً وہ یتیموں کا مال ہے اور میت نے وصیت بھی نہیں کی تو ان لوگوں کو معقول بات کہہ کر رخصت کر دو یعنی نرمی سے عذر کر دو کہ یہ مال یتیموں کا ہے اور میت نے وصیت بھی نہیں کی ہے اس لیے ہم مجبور ہیں۔ ابتدائے سورت میں بیان ہو چکا ہے کہ تمام قرابت والے درجہ بدرجہ سلوک اور مراعات کے مستحق ہیں اور یتامیٰ اور مساکین بھی اور جو قریب یتیم اور مسکین بھی ہو تو اس کی رعایت اور بھی زیادہ ہونی چاہیے۔ اس تقسیم میراث کے وقت ان کو حتی الوسع کچھ نہ کچھ دینا چاہیے۔ اگر کسی وجہ سے وارث نہ ہو تو حسن سلوک سے محروم نہ رہیں لے

خطاب آیت کے وارثوں سے ہے اور ان کو ہدایت فرمائی جا رہی ہے کہ میراث کی تقسیم کے موقعہ پر جو دُور نزدیک کے رشتہ دار اور کنبہ کے غریب مسکین لوگ اور یتیم بچے آجائیں۔ ان کے ساتھ تنگ دلی نہ برتو۔ میراث میں از روئے شرع ان کا حصہ نہیں ہے تو نہ سہی۔ وسعتِ قلب سے کام لے کر ترکہ میں سے ان کو کچھ نہ کچھ دے دو اور ان کے ساتھ وہ دل شکن باتیں نہ کرو جو ایسے مواقع پر بالعموم چھوٹے دل کے کم ظرف لوگ کیا کرتے ہیں ۲ے

مطلب یہ ہے کہ جو دُور کے رشتہ دار اور یتیم و مسکین میراث میں حصہ پانے سے محروم ہوں۔ اگر وہ تقسیم میراث کے موقعہ پر آجائیں تو میراث پانے والوں کا اخلاقی فرض ہے کہ اس مال میں سے بااختیار خود کچھ حصہ ان کو بھی دے دیں جو ان کے لیے ایک قسم کا صدقہ اور باعثِ ثواب ہے۔ اور ایسے وقت میں جبکہ ایک مال بغیر کسی محنت کے محض اللہ کے فضل سے ان کو مل رہا ہو تو صدقہ کا داعیہ خود بھی دل میں ہونا چاہیے۔ اسی کی ایک نظیر قرآن میں ایک جگہ اور ہے، ارشاد ہے:

کلوا من ثمرہ اذا اثمر واٰتوا حقہ یوم حصادہ

باغ کے پھل دیتے وقت اس کا پھل کھاؤ اور کٹائی کے وقت اس کا حق نکال کر فقراء اور مساکین کو بھی دو۔

خلاصہ یہ کہ میراث کی تقسیم کے وقت اگر کچھ دُور کے رشتہ دار یتیم و مسکین وغیرہ جمع ہو جائیں جن کا قانون کے مطابق میراث میں کوئی حصہ نہیں ہے تو ان کے آجانے سے تنگدل نہ ہو بلکہ جو مال اللہ نے تمہیں بلا محنت دیا ہے اُس میں سے بطور شکر ان کو بھی کچھ دے دو اور یہ غنیمت سمجھو کہ

لے افادات شیخ الاسلام ۲ے تفہیم القرآن

خرچ کا ایک موقعہ مل گیا۔ اس موقعہ پر ان لوگوں کو کچھ نہ کچھ دے دینے سے ان دور کے رشتہ داروں کی دل شکنی اور حسرت کا ازالہ ہوگیا اور اس میں مرنے والے کا محروم الارث پوتا بھی آگیا۔ اس کے چچاؤں اور پھوپھیوں کو چاہیے کہ اس کو اپنے حصہ میں سے بخوشی کچھ دے دیں لے

بے بس اور کمزور اولاد

۱۳ ۔ اور لوگوں کو اس بات کو سوچ کر ڈرنا چاہیے کہ اگر وہ خود اپنے پیچھے بے بس اولاد چھوڑتے تو مرتے وقت انہیں اپنے بچوں کے حق میں کیسے کچھ اندیشے لاحق ہوتے پس چاہیے کہ وہ خدا سے ڈریں اور راستی کی بات کریں۔ یہ ارشاد اصل میں تو یتیم کے ولی اور وصی کے لیے ہے درجہ بدرجہ اوروں کو بھی اس کا خیال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے مرنے کے بعد جیسا ہر کوئی اس بات سے ڈرتا ہے کہ میری اولاد کے ساتھ سختی اور برائی سے معاملہ کیا جاتے۔ ایسا ہی تم کو بھی چاہیے کہ یتیم کے ساتھ وہ معاملہ کرو جو اپنے بعد اپنی اولاد کے ساتھ پسند کرتے ہو اور اللہ سے ڈرو اور یتیموں سے سیدھی اور اچھی بات کہو یعنی جس سے ان کا دل نہ ٹوٹے اور ان کا نقصان نہ ہو بلکہ ان کی اصلاح ہو۔ ٹے

یہ فطرتِ انسانی سے ایک قسم کی اپیل ہے کہ جس طرح اگر تم مرجاؤ اور تمہاری چھوٹی اولاد رہ جائے تو تم یہ چاہتے ہو کہ دوسرے اس پر رحم کریں اور اس کے کفیل ہوں اسی طرح تم بھی مسکینوں اور یتیموں کی خبر گیری کرو۔ آیت فلیتقوا اللہ کے ذریعے تقویٰ پر زور دیا گیا ہے اور اس کی تاکید کی گئی ہے ایک مطلب تو یہ ہے کہ اللہ سے ڈرتے رہیں کہ کہیں ان کے خود چھوٹے بچوں کے ساتھ یہ معاملہ پیش نہ آجاتے اور یہ مطلب ہے کہ اس کا پورا اہتمام کریں کہ مرنے والے کا ترکہ اس کی اولاد کو پورا پورا پہنچ جاتے اور ہر ایسے طریقہ سے پرہیز کریں جس میں اولاد کے حصے پر کوئی ناگوار اثر پڑتا ہو۔ اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ آپ کسی مسلمان کو کوئی ایسی وصیت کرتے دیکھیں جس سے اس کی اولاد اور دوسرے وارثوں کو نقصان کا خطرہ ہو تو آپ پر ضروری ہے کہ اس کو ایسی وصیت سے روکیں جیسا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سعد بن ابی وقاص کو پورا مال یا آدھا مال صدقہ کرنے سے روک دیا۔ کیونکہ پورا مال یا آدھا مال صدقہ کر دیا جاتا تو

لے معارف م ش لے افادات شیخ الاسلام

وارثوں کا حصہ ختم کر دیا جاتا۔ نیز اس کے عموم میں یہ بھی داخل ہے کہ یتیم بچوں کے اولیاء ان کے مال کی حفاظت اور پھر بالغ ہونے کے بعد ان کو پورا پورا دینے کا اہتمام کریں۔ اس میں کسی قسم کی کوتاہی نہ کریں اور سوچ لیں کہ اگر وہ چاہتے ہیں کہ ان کے بعد ان کی اولاد کے ساتھ لوگ اچھا معاملہ کریں اور وہ پریشان نہ ہوں تو ان کو دوسروں کی اولاد کے ساتھ بہتر سلوک کرنا چاہیے [1]

یتامیٰ کا مال کھانے کی سنگین سزا

۱۴۔ جو لوگ ظلم کے ساتھ یتیموں کا مال کھاتے ہیں درحقیقت وہ اپنے پیٹ آگ سے بھرتے ہیں اور وہ ضرور جہنم کی دھکتی ہوئی آگ میں جھونکے جائیں گے۔ آیات متعددہ سابقہ میں یتیموں کے مال کے متعلق مختلف طریقہ سے احتیاط برتنے کا حکم دیا اور ان کے مال میں خیانت کو بڑا گناہ بتایا تھا۔ اب اخیر میں مال یتیم میں خیانت کرنے پر وعید شدید بیان فرما کر اس حکم کو خوب موکد کر دیا کہ جو کوئی یتیم کا مال بلا استحقاق کھاتا ہے وہ اپنے پیٹ میں جہنم کی آگ بھر رہا ہے یعنی اس کھانے کا انجام یہ ہوگا اور جملہ اخیر میں اس کو ظاہر کر دیا [2]

مطلب یہ ہے کہ بلا استحقاق شرعی ایسا کرتے ہیں اور یہی ظلم ہے۔ اگر شرعی حق کے ساتھ ایسا کریں یعنی فقیر ہوں اور اجرت کے طور پر کچھ کھالیں تو اس کا حکم پہلے گزر چکا ہے اور جس طرح یتیم کا مال خود کھانا حرام ہے دوسروں کو کھلانا بھی حرام ہے بلکہ اس کے مال میں سے صدقہ خیرات کرنا بھی حرام ہے۔ ہمارے یہاں لوگ اس بلا میں مبتلا ہیں کہ نابالغوں کا مال تیجے، دسویں اور چالیسویں کے نام سے کھاتے اور کھلاتے ہیں یہ سب حرام ہے۔ صاحب معارف القرآن کا یہ فرمانا بالکل بجا ہے کہ میت کے بدن کے کپڑے بھی ترکہ میں شامل ہوتے ہیں۔ ان کو حساب میں لگائے بغیر یونہی صدقہ کر دیتے ہیں۔ بعض تانبے اور پیتل کے برتن تقسیم کیے بغیر فقیروں کو دے دیتے ہیں۔ حالانکہ ان سب میں نابالغ یتیم بچوں اور غیر حاضر ورثاء کا حق ہے۔ ایسے ہی میت کو قبرستان لے جاتے وقت جو چادر جنازے کے اوپر ڈالی جاتی ہے وہ کفن میں شامل نہیں ہے اس کو میت کے ترکہ سے خریدنا جائز نہیں کیونکہ وہ مال مشترک ہے کوئی شخص خود اپنی جانب سے چادر ڈال دے تو جائز ہے۔ بعض جگہ نماز جنازہ پڑھانے والے امام کے لیے کفن ہی کپڑے میں سے جا نماز تیار کی جاتی ہے۔ اور یہ

---

[1] معارف م ش [2] افادات شیخ الاسلام

جانماز دام کرلے دی جاتی ہے۔ یہ کفن کی ضرورت سے نا ئد ہے۔ وہ تیموں کے مشترک مال میں سے اس کا خریدنا جائز نہیں ہے۔ اسی طرح بعض علاقوں میں میت کے غسل کے لیے برتن خرید ے جاتے ہیں پھر ان کو ضائع کر دیا جاتا ہے۔ اوّل تو نئے خریدنے کی ضرورت نہیں ہے اور اگر خرید لیے جائیں تو توڑنا جائز نہیں ہے۔ ایسے ہی ترکہ کی تقسیم سے پہلے اس میں سے مہمانوں کی خاطر تواضع کرنا اور صدقہ وخیرات کرنا جائز نہیں ہے کیونکہ مرنے کے بعد اب یہ سب مال تمام وارثوں کا ہے۔ اور ان میں یتیم بھی ہوتے ہیں۔ پہلے ترکہ تقسیم کیا جائے اس کے بعد اگر وارث اپنے مال میں سے اپنی مرضی سے میت کے حق میں صدقہ وخیرات کریں تو ان کو اختیار ہے۔ تقسیم سے پہلے بھی وارثوں سے اجازت لے کر صدقہ وخیرات نہ کریں کیونکہ جو یتیم ہیں ان کی اجازت تو نابالغ ہونے کی وجہ سے معتبر نہیں اور جو بالغ ہیں وہ بھی ضروری نہیں کہ خوش دلی سے اجازت دیں۔ شریعت میں صرف وہ مال حلال ہے جو دینے والا طیب خاطر سے نہ دے لے

اور یہ ارشاد کہ یتیم کا مال کھانے والے آگ کھاتے ہیں یہ انجام کے اعتبار سے فرمایا ہے۔ اعمال جو جسم اور مادے سے بالکل الگ ہیں اِس عالم میں اپنے مناسب قالب میں مجسم ہو جاتے ہیں۔ اس قسم کی تمثیلات قرآن اور حدیث دونوں میں آئی ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ مجھے دکھایا گیا کہ کچھ لوگ آگ کے انگارے کھا رہے ہیں اور وہی انگارے ہگ رہے ہیں۔ آپ کو بتایا گیا کہ یہ وہ لوگ ہیں جو یتیموں کا مال ظلماً کھاتے تھے۔ اس قسم کے اعمال اور معانی اپنے جن تمثیلی پیکروں میں نظر آتے ہیں وہ درحقیقت ان اعمال و معانی سے تمثیلی مشابہت رکھتے ہیں۔ مثلاً ایک صحیح حدیث میں ہے کہ بخیل کا مال سانپ کی صورت میں گلے کا ہار ہو کر نظر آئے گا۔ یعنی وہ مال سونے اور چاندی کے سانپ کی صورت میں ہوگا۔ اسی طرح ظلماً یتیم کا کھایا ہوا مال آگ کی صورت میں نمودار ہوگا۔

معارف م شش

يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ ۖ لِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْأُنْثَيَيْنِ ۚ فَإِنْ كُنَّ
نِسَاءً فَوْقَ اثْنَتَيْنِ فَلَهُنَّ ثُلُثَا مَا تَرَكَ ۖ وَإِنْ كَانَتْ وَاحِدَةً
فَلَهَا النِّصْفُ ۚ وَلِأَبَوَيْهِ لِكُلِّ وَاحِدٍ مِنْهُمَا السُّدُسُ مِمَّا تَرَكَ
إِنْ كَانَ لَهُ وَلَدٌ ۚ فَإِنْ لَمْ يَكُنْ لَهُ وَلَدٌ وَوَرِثَهُ أَبَوَاهُ فَلِأُمِّهِ
الثُّلُثُ ۚ فَإِنْ كَانَ لَهُ إِخْوَةٌ فَلِأُمِّهِ السُّدُسُ ۚ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
يُوصِي بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ آبَاؤُكُمْ وَأَبْنَاؤُكُمْ لَا تَدْرُونَ أَيُّهُمْ أَقْرَبُ لَكُمْ
نَفْعًا ۚ فَرِيضَةً مِنَ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١١﴾

تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تم کو ہدایت کرتا ہے کہ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے[۱۵]۔ اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں تو ان کو ترکہ کا دو تہائی حصہ دیا جائے اور اگر لڑکی ایک ہی ہو تو ترکہ میں سے اسے آدھا دیا جائے[۱۶]۔ اگر میت اولاد والی ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملنا چاہیے۔ اور اگر میت صاحبِ

اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ ملے گا اور اگر میت کے بھائی بہن بھی موجود ہوں تو والدہ چھٹے حصہ کی حقدار ہو گی۔" یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے جبکہ پہلے میت کی وصیت پوری کر دی جائے اور اس کا قرض ادا کر دیا جائے۔ تمہارے باپ دادا بھی ہیں اور تمہاری اولاد بھی مگر تم نہیں جانتے کہ نفع رسانی کے لحاظ سے کون سا رشتہ تم سے زیادہ قریب ہے، یہ اللہ کی جانب سے حصے مقرر ہوتے ہیں اللہ بہت بڑے علم اور بہت زیادہ دانائی والا ہے[19]۔

قانونِ میراث کی تفصیل

قانونِ وراثت کے اجمالی تصور کے بعد یہ قانونِ میراث کی تفصیل ہے۔ تفصیل کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہاں قانونِ وراثت کی جزئیات بیان ہوں گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہاں وراثت کے اصولی کلیات کو پیش کیا جائے گا۔ یہی قرآن کی شانِ جامعیت ہے یعنی اس کے جامع ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس منتشر اور مختلف جزئیات کے احکام کلیات کی صورت میں بیان کیے گئے ہیں۔ علامہ شاطبی غرناطی اپنی مشہور کتاب الموافقات میں لکھتے ہیں:

قرآن حکیم مختصر ہونے کے باوجود جامع ہے اور جامعیت یہی ہے کہ اس میں

اصول و کلیات کو جمع کر دیا گیا ہے۔

وراثت نام ہے خونی رشتہ کی بنا پر ملکیت کے ایک فرد سے دوسرے فرد کی طرف منتقل ہو جانے کا۔ تملیک کی یہ صورت دوسری تمام صورتوں سے اس حیثیت سے ممتاز ہے کہ اس میں مالک کی رضامندی اور طیب خاطر شرط نہیں ہے جبکہ دوسری تمام صورتوں میں یہ بنیادی شرط ہے۔ یہ تملیک مالک کی رضامندی سے قطع نظر بلکہ بعض اوقات مالک کی مرضی کے خلاف قرآن وسنت کے حکم کے تحت ہوتی ہے۔ قرآن وسنت نے ان رشتوں کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے جن کے پائے جانے پر مرنے والے کی ملکیت کے مقررہ حصے متعین افراد کو ملیں گے۔ بعض مغربی ممالک کے توریث اولاد اکبر کے قانون کے برخلاف یہ ضابطہ مرنے والے کی جائداد کو عموماً متعدد افراد کے درمیان تقسیم کر دیتا ہے جس میں مرد وعورت دونوں شامل ہوتے ہیں۔

چونکہ وراثت پر بعض بنیادی اعتراض کیے گئے ہیں اس لیے اس پر اجمالی بحث بے محل نہ ہوگی۔

وراثت پر پہلا اعتراض اور اس کا جواب

جان لاک اور جان اسٹارٹ مل نے وراثت کے خلاف یہ دلیل پیش کی ہے کہ یہ بات تصورِ ملکیت کے منافی ہے یا کم از کم یہ کہ اس سے اخذ نہیں کی جا سکتی کہ مالک کی ملکیت اس کی مرضی سے قطع نظر لازماً چند متعین رشتہ داروں کا حق قرار پائے۔ ملکیت کا تصور یہ چاہتا ہے کہ مالک کو اس بات کا حق دیا جائے کہ وہ اپنے آپ اپنی جائداد جس کو چاہے منتقل کر دے۔ گویا وصیت کا مطلق حق تصورِ ملکیت سے زیادہ مناسبت رکھتا ہے۔

یہ اعتراض ملکیت کے مطلق تصور پر مبنی ہے اور اس لیے قرآن کے نزدیک ناقابل قبول ہے۔ اولاد، ماں باپ اور دوسرے قریبی اعزا کے خونی رشتہ کو ترکہ کی تقسیم کی بنیاد بنانے کے بجائے پورے ترکہ پر وصیت نافذ کرنے کا حق ملکیت کے اسی مطلق تصور سے مناسبت رکھتا ہے۔ اسلام میں فرد کی ملکیت دراصل نیابتی ملکیت ہے اصل مالک اللہ سبحانہ ہے جس نے فرد کو اپنی زندگی گزارنے کے لیے مال و املاک بطور ذرائع عطا کیے ہیں۔ جب وہ زندگی پوری کر چکا تو اس کے چھوڑے ہوئے مال کی یہ حیثیت ختم ہو گئی۔ اب اسے بہرحال دوسروں کے کام آنا ہے۔ یہ ذرائع کن لوگوں کو کس نسبت سے عطا کیے جائیں۔ اس کا فیصلہ کرنے کا حق اصل مالک ہی کو ہے۔ اگر فرد کو وصیت کے ذریعے اپنی ساری املاک اپنے منشا کے مطابق دوسروں کو منتقل کرنے کا حق

دیا جاتا تو کوئی ضروری نہ تھا بلکہ اس کا بہت کم امکان تھا کہ وہ انسانی زندگی کے ان تمام مصالح کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرتا۔

وراثت میں یہ اصول پیش نظر رکھا گیا ہے کہ جن رشتہ داروں کو فرد کے مرنے کے بعد حصہ دار بنایا گیا انہی رشتہ داروں پر یہ ذمہ داری بھی ڈالی گئی ہے کہ اس فرد کی زندگی میں بشرط ضرورت اور بقدر ضرورت اس کی معاشی کفالت کریں۔ اسی کو نفقات واجبہ کہتے ہیں۔ اگر ترکے میں مختلف رشتہ داروں کے اضافی حقوق نہ متعین کیے جاتے بلکہ مالک کو وصیت کا مطلق حق دے دیا جاتا تو یہ اصول قائم نہیں رہ سکتا تھا۔ اس بنا پر قرآن نے ورثاء کے اضافی حصے متعین کر لیے اور مالک کو اس میں کسی قسم کے ردو بدل کا اختیار نہیں دیا ہے۔

وراثت پر دوسرا اعتراض اور اس کا جواب

دوسرا اعتراض یہ ہے کہ اس طرح ایک فرد کو بغیر اس کی محنت کے اور بلا لحاظ اس کے کہ وہ لائق ہے یا نالائق مفت دولت ملتی ہے جو انصاف کے خلاف اور مصالح کے منافی ہے۔ مناسب یہ ہے کہ مرنے والے کا ترکہ ریاست کے خزانہ میں داخل کر دیا جائے۔ سوشلسٹ مفکرین بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ یہ اعتراض بھی ملکیت کے بارے میں ایک ایسا نقطہ نظر ظاہر کرتا ہے جو اسلام کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے۔ معترضین کا موقف یہ ہے کہ کسی فرد کو بغیر محنت کے ملکیت نہ حاصل ہو۔ بغیر محنت کے ملکیت کا حصول وہ صرف ریاست کے لیے جائز سمجھتے ہیں۔ اسلام کے نزدیک ملکیت صرف محنت پر منحصر نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق چند مفید انسانیت اعمال و وظائف سے بھی ہے جو ملکیت کے شرعی استعمال سے وابستہ ہیں۔ وارث کو جو دولت بغیر محنت کے ہاتھ آتی ہے وہ بالعموم اس کے کسی قریبی رشتہ دار کی محنت کا پھل ہوتی ہے۔ اس رشتہ دار کو اپنی زندگی میں بشرط ضرورت اپنے ہونے والے وارث کے پھل سے فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے۔ پھر یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی سماجی نظام اس بات کی ضمانت نہیں دے سکتا کہ ہر فرد اپنی محنت کے پھل سے خود ہی فائدہ اٹھائے کسی دوسرے کو اس سے فائدہ نہ پہنچے۔ انسان صرف اپنی ضروریات کی تکمیل کے لیے محنت نہیں کرتا بلکہ اپنی اولاد اپنے ماں باپ اور دوسرے قریبی اعزا کی کفالت یا امداد بھی پیش نظر رکھتا ہے۔ انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ یہ دولت ایسے افراد کے کام آتے جن کا اس سے مستفید ہونا نہ صرف یہ کہ مالک کے نزدیک

پسندیدہ تھا بلکہ جن کو فائدہ پہنچانے کا جذبہ اس کی معاشی جدوجہد، دولت کمانے، پس انداز کرنے اور بطور ترکہ چھوڑ جانے کا ایک زبردست محرک تھا۔

اگر وراثت کا طریقہ ختم کر دیا جائے اور مرنے والے کی ساری املاک سرکار کو منتقل کر دی جائیں تو کسبِ دولت کا ایک اہم محرک ختم ہو جائے گا

اسلام نے اس بات کا پورا اہتمام کیا ہے کہ انفرادی ملکیت مفادِ عامہ کے تابع رہے۔ اسلامی ضابطہ میراث کی برکات سے سماج کا بہت بڑا حصہ مستفید ہوتا ہے نہ کوئی محدود طبقہ۔ اس کے تحت بہت سے بے سہارا بچوں اور بچیوں، بیواؤں، عمر رسیدہ بوڑھوں اور کمزور و بے سہارا لوگوں کو سہارا مل جاتا ہے۔

وراثت میں اولاد کا حصّہ

۱۵۔ تمہاری اولاد کے بارے میں اللہ تم کو ہدایت کرتا ہے کہ۔ مرد کا حصہ دو عورتوں کے برابر ہے۔ اوپر اقاربِ میت کے وارث ہونے کا ذکر تھا اور ان کے حصوں کے تقرر اور تعیین کی طرف اجمالی اشارہ تھا۔ اب اقارب اور ان کے حصوں کی تفصیل ہے۔ نیز اس سے پہلے یتیموں کے حق میں تشدد اور تاکیدات کا ذکر ہو رہا تھا جس سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ اقاربِ میت میں اگر کوئی یتیم ہو تو اس کا حصہ دینے میں بہت ہی احتیاط اور اہتمام چاہیے۔ اہلِ عرب کی قدیم رسم کے موافق ان کو میراث سے محروم کر دینا سخت ظلم اور بڑا گناہ ہے۔ اب اقارب میں سب سے پہلے اولاد کے حصہ کو بیان فرمایا کہ اگر کسی میت کی اولاد بیٹا بیٹی دونوں ہوں تو ان کی میراث دینے کا قاعدہ یہ ہے کہ ایک لڑکا دو لڑکیوں کے برابر حصہ پائے گا۔ اور اگر ایک بیٹا دو بیٹیاں ہوں گی تو نصف مال بیٹے کا اور نصف دو بیٹیوں کا ہو گا اور ایک بیٹا اور ایک بیٹی ہو گی تو دو ثلث بیٹے کا اور ایک ثلث بیٹی کا ہو گا۔[1]

یہاں چند حقائق قابلِ غور ہیں۔

اوّلاً، یوصیکم اللہ کہہ کر یہ یاد دلایا ہے کہ یہ احکام کسی بندے کے تجویز کیے ہوئے نہیں حکیمِ مطلق اور دانائے غیب حاکم برحق کے ارشاد کیے ہوئے ہیں۔ اور پھر اسے اپنی وصیت سے تعبیر کیا ہے۔ وصیت کا صحیح مفہوم عربی زبان میں یہ ہے کہ کوئی شخص کسی پر یہ ذمہ داری ڈالے کہ جب

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

فلاں صورت پیش آئے تو وہ فلاں طریقہ یا فلاں طرزِ عمل اختیار کرے۔ اس میں وصیت کرنے والے کی پیش بینی، خیر خواہی اور شفقت کا پہلو بھی مضمر ہوتا ہے اور اس کے اندر ایک عہد اور معاہدے کی ذمہ داری بھی پائی جاتی ہے لفظ کے ان تمام مضمرات کو ادا کرنے کے لیے اردو میں کوئی لفظ نہیں ترجمہ میں ہدایت کا لفظ بھی اس کے مفہوم پر پوری طرح حاوی نہیں ہے لیکن بہرحال گزارہ ہو سکتا ہے۔

ثانیاً، اس آیت میں ایک قانون عام بیان فرمادیا کہ ہر لڑکے کو لڑکی سے ڈبل حصہ ملے گا خواہ ایک لڑکا اور ایک لڑکی ہو اور چاہے ایک لڑکا اور متعدد لڑکیاں ہوں اور چاہے متعدد لڑکے اور ایک لڑکی ہو۔ اس کے لیے یہ بلیغ تعبیر اختیار فرمائی ہے للذکر مثل حظ الانثیین لڑکے کو دو لڑکیوں جیسا ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ للانثیین مثل حظ الذکر دو لڑکیوں کو ایک لڑکے جیسا۔ یا للانثی نصف حظ الذکر عورت کا حصہ مرد سے آدھا ملے گا۔ اس میں اس رواجی ذہن کی تردید ہے جو عورتوں کو وراثت سے محروم کرتا تھا۔

ثالثاً، یہ بات کہ مرد کو عورت کے مقابلہ میں دوگنا کیوں دیا گیا۔ اس میں حکمت کیا ہے۔ شارحین قرآن نے اس پر مختلف انداز میں داد تحقیق دی ہے۔

چونکہ شریعت نے خاندانی زندگی میں مرد پر زیادہ معاشی ذمہ داریوں کا بوجھ ڈالا ہے اور عورت کو بہت سی معاشی ذمہ داریوں کے بار سے سبکدوش کر دیا گیا ہے۔ لہٰذا انصاف کا تقاضا یہی تھا کہ میراث میں عورت کا حصہ مرد کی بہ نسبت کم رکھا جاتا[1]

اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کے نظامِ معاشرت میں کفالتی ذمہ داریاں اللہ تعالیٰ نے تمام مرد ہی پر ڈالی ہیں۔ عورت پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ مرد ہی بیوی کے نان و نفقہ کا بھی ذمہ دار ٹھہرایا گیا ہے۔ قرآن نے واضح طور پر یہ بات بتا دی ہے کہ اپنے خلقی اوصاف کے لحاظ سے مرد ہی اس کا اہل ہے کہ وہ خاندان کا قوام ہو اور یہ قوامیت خاندان کے نظم اور اس کے قیام و بقا کے لیے ناگزیر ہے۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ مرد کو اس کی ذمہ داریوں کے لحاظ سے کچھ حقوق میں ترجیح ہو[2]

لیکن آئیے ذرا اس موضوع پر ایک اور پہلو سے غور فرمائیے یہ صحیح ہے کہ قرآن نے صرف عورتوں کے حقوق کا اعتقاد ہی نہیں پیدا کیا بلکہ صاف صاف اعلان کر دیا کہ حقوق کے اعتبار سے مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ ولھن مثل الذی علیھن اور یہ بھی درست ہے کہ جہاں

---

[1] تفہیم القرآن [2] تدبر قرآن

تک معیشتی اور مالیاتی استقلال کا تعلق ہے۔ قرآن نے مرد و عورت دونوں کے استقلال کا اعلان کیا ہے۔

للرجال نصیب مما اکتسبوا وللنساء نصیب مما اکتسبن

اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ وراثت میں قرآن نے حقداری کی حد تک مرد و عورت دونوں کی برابری کا اعلان کیا ہے۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان والاقربون مما قل منہ او کثر

اس کے باوجود ترتیب اور تقسیم حقوق میں عورت کو مرد سے نصف دیا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ نہیں ہے کہ عورت کمزور ہے جیسا کہ علامہ آلوسی کی رائے ہے۔ اگر یہی بات ہو تو پھر معاملہ برعکس ہونا چاہیے یعنی کمزور کو ڈبل اور طاقتور کو سنگل ملنا چاہیے۔ اور اس بات میں بھی کوئی خاص وزن نہیں ہے کہ مرد کو خاندانی زندگی میں قوام بنایا ہے اور یہ بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورت کی فطری ساخت، جسمانی ترکیب اور عضویاتی فرائض نے اسے اس قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ تربیت نسل کے ساتھ کوئی اور کام کرے۔

واقعی وجہ اس کی یہ ہے کہ عورت کو اپنے باپ کی میراث میں لڑکے کے مقابلہ میں آدھا اس لیے دیا گیا ہے کہ عورت کو مہر کی صورت میں شوہر کی جانب سے جو رقم ملنے والی ہے وہ اس کمی کو پورا کر دے گی اسے واقعات کی دنیا میں مثال سے یوں سمجھئے کہ رشید کا انتقال ہوا ہے۔ اس نے دو بالغ بچے حمید اور فریدہ چھوڑے ہیں اور اس کا ترکہ تین ہزار روپیہ ہے، ظاہر ہے کہ دو ہزار حمید کو ملیں گے اور ایک ہزار فریدہ کو۔ دونوں کی شادی ہوئی ہے۔ حمید کو اپنی بیوی کو ایک ہزار مہر دینا ہے اور فریدہ کو اپنے شوہر سے ایک ہزار مہر لینا ہے۔ حمید پر اپنے بیوی کے نان و نفقہ کی ذمہ داری ہے لیکن فریدہ پر اپنے بھی نان و نفقہ کی ذمہ داری نہیں ہے۔ مہر کے بارے میں پڑھ چکے ہو۔ واتوا النساء صدقاتھن نحلۃ اور آگے پڑھو گے وا تیتم احداھن قنطارا فلا تاخذوا منہ شیئا اب آپ ہی خدا لگتی انصاف سے فرمایئے کہ کس کو زائد ملا؛ لڑکی کو یا لڑکے کو۔ لڑکے کے پاس صرف ایک ہزار ہے اور اس میں اس پر خانگی ذمہ داریاں ہیں اور لڑکی کے پاس دو ہزار ہیں اور اس پر خرچ کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ لڑکے پر مہر کی ذمہ داری ہے اس لیے اس کو ڈبل دیا گیا ہے لڑکی کو مہر لینا ہے اس لیے اس کو سنگل دیا گیا ہے اور یہ وجہ ہے کہ

شوہر کے مرجانے پر بیوی کو چوتھائی اور آٹھواں دیا ہے اور بیوی کے مرجانے پر شوہر کو اس کا ڈبل یعنی نصف اور چوتھائی دیا جاتا ہے۔ کیونکہ بیوی کے مرجانے پر شوہر کو دوسری شادی کرنی ہے اس کو مہر دینا ہے اور شوہر کے مرجانے پر بیوی کو دوسری شادی کرنی ہے اس کو مہر لینا ہے۔ اسے دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ چونکہ لڑکی کفالتی ذمہ داریوں کے لحاظ سے تنہا ہے برخلاف لڑکے کے کہ اس پر اپنی اور بیوی دونوں کی ذمہ داریاں ہیں جس کی ذمہ داریاں ڈبل ہیں۔ اس کو بروئے انصاف حصہ بھی ڈبل ملنا چاہیئے۔
مابعا اگرچہ لفظ اولاد عام ہے۔ لیکن اسلامی قانون کی تشریحات میں اس سے کچھ خارج کیے گئے ہیں مثلاً کافر بیٹا، باپ کا قاتل اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد۔

کافر اولاد وارث نہیں

والدین مسلمان ہوں اور اس کی اولاد کافر ہو۔ مسلمان والدین کی میراث کافر اولاد کو نہیں ملتی ہے فقہاء نے تصریح کی ہے کہ دینی اختلاف وراثت سے مانع ہے۔ صدر اول سے آج تک مسلمانوں کا اس پر عمل ہے۔ یہ گویا عملاً سنتِ متواترہ ہے۔ صحیحین میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اس موضوع پر یہ قیمتی ارشاد گرامی ہے لا یرث المسلم الکافر ولا الکافر المسلم یعنی مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا۔ اسی پر امت کا اجماع ہے۔ یہی ائمہ اربعہ اور عامہ فقہاء کا مسلک ہے۔
یہی حکم مرتد کا بھی ہے یعنی وہ جو برضا و رغبت اسلام کو چھوڑ دے وہ بھی اس میں داخل نہیں ہے اور مسلمان والدین کا وارث نہیں ہو سکتا ہے۔

اپنے والدین کا قاتل وارث نہیں ہوتا

یعنی ایسا لڑکا جو اپنے باپ کا قاتل ہو وہ باپ کی میراث کا حقدار نہیں ہے۔ یہ گویا قاتل کو مالی سزا ہے۔ اور یہ ان لوگوں کے لیے جو سرمایہ پر قبضہ کرنے کے لیے اس قسم کے جرائم کا ارتکاب کرتے ہیں ایک تازیانہ ہے۔ قتل کے ساتھ وارث کی راہ اگر کھول دی جاتی تو انسانی زندگی کا دین و سلام خطرہ میں پڑ جاتا۔ احناف کی رائے میں ہر وہ قتل جس کی سزا قصاص یا کفارہ ہو وراثت سے مانع ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت کا یہی فیصلہ ہے اور حضرت عمرؓ کے حوالہ سے حضور انور کا ارشاد گرامی بھی موطا امام مالک میں یہی نقل ہو کر آیا ہے کہ لیس لقاتل شیئٌ قاتل کا کوئی حصہ نہیں ہے احناف کے یہاں قاتل کے وراثت سے محروم ہونے کے لیے جیسے یہ ضروری ہے کہ قتل ناحق ہو

ایسے ہی یہ بھی ضروری ہے کہ قاتل عاقل و بالغ ہو، نابالغ نے اگر قتل کر دیا اور مجنون سے اگر یہ حرکت سرزد ہو گئی تو وہ محروم نہ ہوگا اور قتل ناحق کا مطلب یہ ہے کہ اس پر کوئی قانونی حق نہ ہو۔ اگر قانونی حق ہو مثلاً قصاص یا حد میں کسی بیٹے نے عدالت کے فیصلہ کے بعد قتل کیا یا باپ اپنے بیٹے پر حملہ آور ہوا اور بیٹے نے دفاع کیا اور قتل ہو گیا۔ اس قتل سے لڑکا وراثت سے محروم نہ ہو گا۔

حضور انور کے ترکہ میں وراثت نہیں

حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ حدیث اور اجماع اہل حق سے اس آیت سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مستثنیٰ ہیں، اسی لیے صدیق اکبر نے فدک وغیرہ کو میراث میں تقسیم نہیں کیا۔ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہم یعنی انبیاء علیہم السلام کی جماعت کا کوئی وارث نہیں ہوتا، ہم جو کچھ چھوڑ کر جاتے ہیں وہ سب راہ خدا میں صدقہ ہے۔ اگر اس حدیث کو خبر واحد تسلیم کر لیا جائے پھر بھی چونکہ صدیق اکبر نے حضور انور سے بلاواسطہ سنی تھی اس لیے ان کی حد تک قرآن عزیز کی طرح قطعی ہے۔ یا یوں کہہ دیجئے کہ اس حدیث نے انبیاء کے اموال و املاک کا وقف ہونا ثابت ہوتا ہے اور وقف میں بالاجماع میراث نہیں۔[1]

یہ حقیقت ہے کہ عام انسان جب مر جاتے ہیں تو ان کا ترکہ ان کے عزیزوں میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور انبیاء کی شان یہاں بھی مختلف نظر آئی۔ ان کی میراث کسی کو نہیں ملتی ہے وہ سب راہِ خدا میں صرف کی جاتی ہے۔ سبحان اللہ جو ہستیاں اپنی حیات میں دنیوی طمع کا کوئی داغ اپنے ساتھ نہیں رکھتی ہیں ان کے لیے یہ بھی مناسب نہیں سمجھا گیا کہ ان کی وفات کے بعد بھی ان پر اس داغ کے لگانے کی کوئی دشمن کوشش کر سکے۔ جو پورے زمانۂ دعوت میں یہ اعلان کرتے رہتے لا اسئلکم علیہ اجراً اور جو ذات گرامی اپنے اور اپنی اولاد کے حق میں زکوٰۃ کو یہ کہہ کر حرام قرار دیتی رہی ہے لا تحل لمحمد و لا لاٰل محمد وہ یہ کب گوارا کر سکتی تھی کہ دنیا کو یہ کہنے کا موقعہ دے کہ ذاتِ نبوت اپنی اولاد کے لیے سرمایہ چھوڑ گئی۔ یہی نبوت کے خصائص میں سے ایک خصوصیت ہے۔ ذرا غور فرمائیے کہ ان کی موت عام بشر تو درکنار شہداء کی موت سے بھی کتنی ممتاز ہے۔ شہداء کے حق میں قرآن عزیز نے اگرچہ لفظ حیات بولا ہے اور ان کو رزق ملنے کی

---

[1] بیان القرآن

بھی بشارت دی ہے۔ اور شہداء کو احیاء عند ربھم کہنے کے باوجود ان کی بیویوں کو نکاح کرنے سے نہیں روکا اور ان کے ترکہ کو عام انسانوں کی طرح تقسیم کرنے کا حکم دیا۔ لیکن نبوت کے حق میں ان کو اتنا اہم سمجھا گیا کہ ازواج مطہرات پر ہمیشہ کے لیے یہ پابندی لگا دی گئی ولا ان تنکحوا ازواجه من بعدہ ابدا اس میں نبوت کا احترام تھا کیونکہ نبوت کے والد ہونے کی نسبت ساری اُمت کے ساتھ تھی اس لیے تمام اُمت کے حق میں نبی کی ازواج کو مائیں کہا گیا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ نبی ہونے کی وجہ جہاں دوسری ساری شانوں میں آپ اپنا نمایاں مقام رکھتے ہیں تو ترکہ میں بھی اگر اللہ نے آپ کو یہ نمایاں خصوصیت دی ہے کہ اس میں وراثت نہیں یہ پوری اُمت کا مشترکہ سرمایہ ہے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے؟ اس لیے آیت یوصیکم اللہ فی اولادکم نبوت کے حق میں عام مخصوص البعض ہے۔ حدیث نبوی چونکہ قرآن کی شرح کرتی ہے۔ اس لیے اس کا یہ حق ہے کہ احکام عامہ قرآنی کے معنے بتلاتے ہوئے یہ رہنمائی کرے کہ اس کے سب افراد مراد ہیں یا بعض۔ اس تشریح کو عرف اصول میں تخصیص کہتے ہیں۔ علماء اصول کی اس میں گفتگو ہے کہ،

> عام اپنے افراد کو یقینی اور قطعی بتاتا ہے یا ظنی، جمہور اور اکثر کا مذہب یہ ہے کہ ظنی، جو لوگ قطعی مانتے ہیں وہ قرآنیات کے عام حکم کو خبر واحد سے خاص نہیں کرتے اور جو ظنی مانتے ہیں وہ خبر واحد سے بھی تخصیص کر لیتے ہیں لیکن یہ اختلاف بھی اس صورت میں ہے جبکہ عام کی تخصیص کسی حکم سے نہ ہو چکی ہو۔ اگر پہلے بھی کوئی تخصیص ہو چکی ہے تو پھر آیت تخصیص کی کر لینا درست ہے۔ (تلویح)

اگرچہ پیش نظر معاملہ میں دونوں صورتیں درست ہیں لیکن ہم یہاں دوسری صورت اختیار کرتے ہیں کیونکہ یہ آیت پہلے ہی مخصوص البعض ہے، فی اولادکم کی عموم سے ان کو سب مستثنیٰ کرتے ہیں۔

۱۔ بیٹا غلام ہو۔
۲۔ بیٹا قاتل ہو۔
۳۔ بیٹا کافر ہو۔

بہ باتفاق اس آیت کے عموم سے خارج ہیں۔ یعنی یہ اولاد اپنے باپ کی میراث سے حصہ پائے گی جیسے یہ افراد سب کے نزدیک اس آیت کے عموم سے مستثنیٰ ہیں۔ ایسے ہی نبی کی وراثت بھی مستثنیٰ ہے۔ دلیل اس تخصیص کی وہی حدیث ہے۔ جو امام بخاری نے بروایت ابی بکر صدیق

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اور کلینی نے بروایت امام ابوعبداللہ موقوف اور مرفوع روایت کی ہے حدیث یہ ہے۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا نورث ما ترکنا ہ صدقۃ

حضور کا ارشاد ہے ہم نبیوں کا کوئی وارث نہیں ہم جو کچھ چھوڑ کر جاتے ہیں صدقہ ہے۔

اولاً، چونکہ یہ ارشاد صدیق اکبر نے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سُنا ہے اس لیے علم قطعی اور یقینی ہے۔ اور جو بات حضور انور سے بلا واسطہ براہ راست سنی جائے اس پر عمل کرنا فرض ہے اس پر بھی سب کا اتفاق ہے۔

تواتر اور عدم تواتر کا سوال ان لوگوں کے لیے ہے جنہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نہیں کی اور حضور کا ارشاد گرامی دوسروں کے واسطہ سے ان کو پہنچا۔ اور جو شخص خود براہِ راست حضور انور سے سُن رہا ہے اس کے حق میں یہ ارشاد متواتر سے زیادہ قطعی ہے بلکہ یہ کہا جائے کہ مشاہدہ عینی سے بھی یقینی ہے تو کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

ثانیاً، خبر واحد ہونے کی صورت میں اس حدیث کے راوی صرف حضرت ابوبکر ہی نہیں بلکہ دفترِ حدیث میں یہ ارشادِ نبوت حضرت حذیفہ، حضرت زبیر، حضرت ابوالدرداء، حضرت ابوہریرہ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت عباس، حضرت عثمان، اور حضرت علی سے بھی روایت ہو کر آیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ارشادِ نبوت تمام صحابہ میں شہرت رکھتا تھا، اور اپنی پشت پر تواتر کی پوری طاقت رکھتا تھا اور حدیث متواتر سے قرآن کی تخصیص سب مانتے ہیں۔

اس آیت میراث کی لا نورث ما ترکنا ہ صدقۃ سے تخصیص ٹھیک ایسے ہی کی گئی ہے جیسے انما الصدقات للفقراء والمساکین کے عموم سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی آل کی لا تحل لمحمد ولا لآل محمد تخصیص کی گئی ہے۔ یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کی اولاد کو زکوٰۃ اور صدقات کا لینا حرام ہے۔

ذرا اس آیت پر اس پہلو سے بھی ایک نظر ڈالیے کہ آیت کا سیاق و سباق یہ بتلا رہا ہے کہ یوصیکم اللہ فی اولادکم میں حکم صرف اُمت کے لیے ہے۔ ذاتِ نبوت اس میں شریک نہیں ہے۔ اس سے پہلے فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع میں اُمت مخاطب ہے کیونکہ حضور انور کی ذاتِ گرامی سورۂ احزاب کی آیت یا ایھا النبی انا احللنا لک ازواجک اللاتی آتیت اجورھن کی وجہ سے چار کی تحدید سے مستثنیٰ ہے۔ سورۂ احزاب کی یہ آیت علانیہ کہہ رہی ہے کہ حضور انور

کے لیے چار سے زیادہ بھی نکاح جائز ہے ایک قدم اور آگے بڑھیے۔ اُمت کو یہاں حکم ہو رہا ہے کہ
اتوا النساء صدقٰتھن نحلۃ عورتوں کو ان کے مہر خوشی سے دو۔ آیت اگرچہ بظاہر عام ہے لیکن
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس حکم سے مستثنیٰ اور خاص ہیں جیسا کہ سورۃ احزاب کی یہ آیت ان وھبت
نفسھا للنبی ان اراد النبی ان یستنکحھا خالصۃ لک من دون المومنین بتا رہی ہے کہ حضور انور
نکاح میں مہر کی قید سے مستثنیٰ ہیں۔

اور سنیے یہاں اُمت کو خطاب ہے فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ۔ یہ آیت بتا رہی ہے
کہ عورتوں میں عدل سب پر واجب ہے لیکن سورۃ احزاب کی آیت ترجی من تشاء منھن وتوی
الیک من تشاء کہہ رہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس سے مستثنیٰ ہیں۔

آخر ان سب استثناؤں پر اگر ہمیں حیرت نہیں ہوتی تو میراث کے استثناء پر تعجب کیوں ہے
مال وجائداد میں میراث کا جاری ہونا اُمتیوں کا حکم ہے ذات نبوت اس سے مستثنیٰ ہے [1]

ہم نے یہاں اشارات کیے ہیں انشاء اللہ اس پر تفصیلی مباحث پارہ ۲۸ سورۃ حشر میں بشرطِ حیات
آئیں گے۔

دو سے زیادہ لڑکیوں کا حصّہ

۱۶۔ اگر عورتیں دو سے زیادہ ہوں تو ان کو دو تہائی ترکہ دیا جائے گا اور اگر لڑکی ایک ہی ہو تو
کل ترکہ میں سے اسے آدھا دیا جائے گا یعنی اگر کسی میت نے اولاد میں صرف عورتیں یعنی بیٹیاں ہی
چھوڑیں، بیٹا نہیں چھوڑا تو وہ اگر دو سے زیادہ ہوں تب بھی ان کو دو تہائی ملے گا اور اگر ایک
ہی لڑکی چھوڑی تو اس کو میت کے ترکہ کا نصف ملے گا۔ یہ بات سمجھنے کی ہے کہ للذکر مثل حظ
الانثیین کے ذیل میں معلوم ہو چکا ہے کہ ایک بیٹی کو ایک بیٹے کے ساتھ ایک ثلث ملے گا تو
اس سے معلوم ہو گیا کہ ایک بیٹی کو دوسری بیٹی کے ساتھ بطریق اولیٰ ثلث ملے گا کیونکہ بیٹے کا
حصّہ بیٹی سے زیادہ ہے تو جب بیٹے کی وجہ سے اس کا حصّہ ایک ثلث سے کم نہیں ہوا تو دوسری
بیٹی کی وجہ کیسے کم ہو سکتا ہے۔ چونکہ دو بیٹیوں کا حکم پہلی آیت سے معلوم ہو چکا تھا۔ اس لیے
اس آیت میں دو بیٹیوں سے زائد کا حکم بتا دیا۔ تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کر دو بیٹیوں کا حق جب ایک

[1] معارف قرآن ص ۱۱

بیٹی سے زیادہ ہے تو شاذ تین یا چار بیٹیوں کا حق دو بیٹیوں سے زائد ہوگا۔ یہ بات ہرگز نہیں بلکہ بیٹیاں جب ایک سے زیادہ ہوں گی دو ہوں یا دس ان کو دو ثلث ہی ملے گا۔

اب تک اولاد کے وارث ہونے کی دو صورتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ لڑکا اور لڑکی دونوں طرح کی اولاد ہو۔ دوسری یہ کہ صرف دختری اولاد ہو۔ اس کی دو صورتیں ہیں ایک ہو یا ایک سے زائد۔ اب صرف ایک صورت باقی رہ گئی ہے کہ صرف پسری اولاد ہو اس کا حکم یہ ہے کہ ساری میراث اس کو مل جائے گی خواہ بیٹا ایک ہو یا زائد ہو[1]

مولانا محمد ادریس نے اسے اس طرح سمجھایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں دو سے زائد لڑکیوں کا حصہ بیان کیا ہے لیکن دو لڑکیوں کا حصہ صراحتہً بیان نہیں کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ گزشتہ آیت للذکر مثل حظ الانثیین سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ایک لڑکے کا حصہ دو لڑکیوں کے برابر ہے یعنی دو تہائی تو اس سے خود یہ بات بھی کھل کر سامنے آگئی ہے کہ دو لڑکیوں کا حصہ دو تہائی ہے۔ نیز اللہ سبحانہ نے اس آیت میں ایک لڑکی اور تین اور تین سے زیادہ لڑکیوں کا حکم بیان فرمایا اور بہنوں کی میراث میں دو بہنوں کا دو تہائی حصہ بیان کیا فان کانتا اثنتین فلھما الثلثان۔ لہٰذا جب دو بہنوں کا حصہ دو تہائی ہے تو دو لڑکیوں کا حصہ بدرجہ اولیٰ دو تہائی ہونا چاہیے۔ کیونکہ لڑکیاں بہ نسبت بہنوں کے زیادہ قریب ہیں[2]

یہاں تک صرف نظریاتی بحث ہے آئیے اسی کا واقعات کی روشنی میں مطالعہ کریں۔

حضرت جابر کہتے ہیں کہ سعد بن ربیع کی بیوی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئیں اور عرض کیا کہ یا رسول اللہ! سعد بن ربیع کی دو لڑکیاں ہیں اور ان کا باپ آپ کے ہمراہ جنگ اُحد میں اللہ کو پیارا ہوگیا اور ان کا جو سرمایہ تھا وہ سارا کا سارا ان کے چچا نے لے لیا ہے اور سعد کی بیٹیوں کو کچھ نہیں دیا ہے بغیر مال کے ان کا نکاح نہیں ہو سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ ان کے بارے میں فیصلہ فرمائے گا۔ حضرت جابر کہتے ہیں کہ پھر جب سورۃ نساء کی یہ آیت نازل ہوئی تو حضور انور نے فرمایا کہ اس عورت اور لڑکیوں کے چچا کو بلاؤ۔ آپ نے لڑکیوں کے چچا سے فرمایا کہ دونوں لڑکیوں کو کل مال کا دو تہائی دے دو ان کی ماں کو آٹھواں حصہ اور جو بچے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف م ا۔

وہ تم خود رکھ لو۔

مطلب یہ ہے کہ اگر سعد کی جائداد ۳۰ ہزار ہے تو ۱۶ ہزار روپیہ لڑکیوں کو اور تین ہزار روپیہ لڑکیوں کی والدہ کو اور باقی پانچ ہزار روپیہ چچا کو ملے گا۔

اب یہ آپ کے اختیار تمیزی اور صوابدید پر موقوف ہے کہ دو لڑکیوں کے لیے دو تہائی کو منطوق قرآنی سے اخذ کر لیجئے جیسا کہ شیخ الاسلام اور مولانا ادریس نے کیا ہے اور جیسا کہ ابو مسلم اصفہانی کی رائے ہے اور چاہے اسے ارشادِ نبوت سے واقعات کی روشنی میں معلوم کر لیجئے جیسا کہ مفتی محمد شفیع صاحب کا میلان ہے اور یا پھر دو بہنوں پر قیاس کر کے دو بہنوں کو دو تہائی حصہ دیجئے حضرت مولانا اشرف علی کا میلان بھی منطوقِ قرآنی کی طرف ہے چنانچہ فرماتے ہیں۔ اور اگر دو لڑکیاں ہوں تب تو دو تہائی ملنا بالکل ظاہر ہے۔ کیونکہ ان میں ایک لڑکی کی جگہ لڑکا ہوتا تو اس لڑکی کا حصہ باوجودیکہ بھائی سے کم ہے۔ ایک تہائی سے نہ گھٹتا۔ لہٰذا جب دوسری بھی لڑکی ہے تب تو تہائی سے کسی طرح گھٹ نہیں سکتا۔ اور دونوں لڑکیاں یکساں حالت میں ہیں پس ایک تہائی اس کا بھی ہوگا دونوں کا مل کر دو تہائی ہوا[1]

میراث میں والدین کا حصہ

۱۷۔ اگر میت اولاد والی ہو تو اس کے والدین میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملنا چاہیے۔ اور اگر میت صاحبِ اولاد نہ ہو اور والدین ہی اس کے وارث ہوں تو ماں کو تیسرا حصہ ملے گا۔ اور اگر میت کے بھائی بہن بھی موجود ہوں تو والدہ چھٹے حصہ کی حقدار ہوگی۔ اب ماں باپ کی میراث کی تین صورتیں بیان فرماتے ہیں۔

اول یہ کہ میت کی اولاد ہو بیٹا ہو یا بیٹی تو میت کے ماں باپ کو ترکہ میت میں سے ہر ایک کو چھٹا حصہ ملے گا۔

دوسری صورت یہ ہے کہ میت کی اولاد کچھ نہ ہو اور صرف ماں باپ ہی وارث ہوں تو اس کی ماں کو ایک ثلث ملے گا یعنی باقی دو ثلث اس کے باپ کو ملیں گے۔

تیسری صورت یہ ہے کہ اگر میت کے ایک سے زیادہ بھائی بہن ہوں خواہ حقیقی ہوں یا صرف

[1] بیان القرآن

باپ یا صرف ماں میں مشترک ہوں اور اولاد بالکل نہ ہو تو اب اس کی ماں کو چھٹا ملے گا۔ یعنی باقی سب اس کے باپ کو ملے گا۔ بھائی بہن کو کچھ نہ ملے گا اور اگر صرف ایک بھائی اور ایک بہن ہو تو ماں کو ایک ثلث اور باپ کو دو ثلث ملیں گے[1]

تیسری صورت میں ماں کا حصہ ثلث ⅓ کی جگہ سدس ⅙ ہو گیا۔ فرائض کی زبان میں اس کو حجب نقصان کہتے ہیں۔ حجب کے معنے روکنے کے ہیں۔ یہ رکاوٹ دو طرح ہوتی ہے ایک تو کسی کو دوسرے کی وجہ سے ساری میراث سے محروم کر دیا جائے اسے حرمان کہتے ہیں جیسے برادر زادہ محروم ہو جاتا ہے جبکہ برادر موجود ہو۔ برادر محروم ہو جاتا ہے جب اپنا بیٹا موجود ہو، پوتا محروم ہو جاتا ہے جب بیٹا موجود ہو، دادی محروم ہو جاتی ہے جب ماں موجود ہو، سوتیلی بہن محروم ہو جاتی ہے جب حقیقی بھائی موجود ہو، دوسرے یہ کہ کسی کے حصہ کو دوسرے کی وجہ سے کم کر دیا جائے یہاں ماں کا حصہ اسی بنا پر کم ہوا ہے۔

یہ سوال یہاں بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ جن کی وجہ سے ماں کا حصہ کم ہوا ہے ان کو کچھ نہیں ملا ہے اور بھائیوں کی موجودگی ہیں باقی باپ کو مل جائے گا۔ جمہور کا مذہب یہی ہے کہ بھائیوں کا ہونا اگرچہ ماں کو تیسرا حصہ حاصل کرنے ہیں روک ہے مگر بھائیوں کو کچھ نہ ملے گا لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ ماں کا جو حصہ کم ہوا ہے وہ بھائیوں کو ملے گا۔ مگر مشکل یہ ہے کہ قرآن یہاں بھائیوں کے بارے میں خاموش ہے۔ اس لیے جمہور کی بات بقول سید رشید رضا منطوق قرآنی کے زیادہ قریب ہے۔ ایسے ہی اس موضوع پر بھی عبداللہ ابن عباس کی راہ جمہور سے الگ ہے جبکہ بھائی بہن دو دو ہوں۔ جمہور والدہ کو ⅙ دے کر باقی باپ کو دیتے ہیں۔ ابن عباس کہتے ہیں کہ لفظ اخوۃ عربی میں دو پر نہیں جمع پر بولا جاتا ہے۔ اکثر صحابہ کی جمہور کو حمایت حاصل ہے اور اسی پر صدر اول سے اب تک عمل ہے۔ ہاں ان کا اس پر اتفاق ہے کہ اگر ایک بھائی یا ایک بہن ہو گی تو وہ ماں کے تیسرے حصہ پانے میں رکاوٹ نہ ہوں گے۔ حاصل یہ ہے کہ بھائی بہن ہونے کی صورت میں ماں کا حصہ ⅓ سے ⅙ ہو جائے گا۔ اس طرح ماں کے حصہ میں سے جو ⅙ لیا گیا ہے وہ باپ کے حصہ میں ڈالا جائے گا کیونکہ اس صورت میں باپ کی ذمہ داریاں بڑھ جاتی ہیں۔ یہ واضح رہے کہ اگر میت کے والدین زندہ ہوں تو اس کے بھائی اور بہنوں کو کوئی حصہ نہیں ملتا۔

ماں باپ کا حق اگرچہ اولاد سے کہیں زیادہ ہے لیکن اللہ سبحانہ نے میت کے ترکہ میں سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ماں باپ کا حصہ اولاد کے حصہ سے کم رکھا ہے کیونکہ جب آدمی صاحب اولاد ہو کر مرتا ہے زیادہ تر اس عمر میں اس کے والدین بوڑھے ہو جاتے ہیں اور ان کی عمر کا تھوڑا حصہ باقی رہ جاتا ہے۔ ان کو زیادہ مال کی ضرورت نہیں ہوتی بخلاف اولاد کے کہ وہ کم عمر ہونے کی وجہ سے زیادہ ضرورت مند ہوتے ہیں۔ نیز ماں باپ کے پاس اپنا اندوختہ اور اپنے والدین کا کچھ ترکہ بھی ہوتا ہے اور میت کی اولاد کا سرمایہ سردست صرف باپ کی کمائی ہوتی ہے اس لیے شریعت نے بہ نسبت ماں باپ کے اولاد کا زیادہ حصہ رکھا ہے۔

حقوق متقدمہ علی المیراث

۱۸ - یہ سب حصے اس وقت نکالے جائیں گے جبکہ پہلے میت کی وصیت پوری کر دی جائے اور اس کا قرض ادا کر دیا جاتے۔ یعنی جس قدر وارثوں کے حصے گزر چکے ہیں۔ یہ سب میت کی وصیت اور اس کے قرض کو جدا کرنے کے بعد وارثوں کو دیے جائیں گے۔ اور وارثوں کا مال وہی ہوگا جو بقدار وصیت و قرض کے نکال لینے کے بعد باقی رہے گا اور نصف اسی کا مراد ہے نہ کہ تمام مال کا۔

سب سے پہلے میت کے مال سے اس کا کفن دفن ہونا چاہیے۔ اس سے جو کچھ بچے وہ اس کے قرض میں دیا جائے۔ پھر جو باقی رہے اس کو میت کی وصیت پورا کرنے میں ایک تہائی تک خرچ کیا جائے اس کے بعد جو کچھ رہے وارثوں پر تقسیم کیا جائے[1]

میت جو مال چھوڑ کر مرے اس مال سے چار حقوق وابستہ ہیں اول تجہیز، دوم قرض کی ادائیگی، سوم وصیت، چہارم ورثہ میں تقسیم۔

سب سے پہلا اور بنیادی حق تجہیز ہے، تجہیز میں میت کو غسل دینا، کفن دینا، قبرستان تک پہنچانا اور دفن کرنا سب داخل ہیں۔ اگر مرنے والا سرمایہ چھوڑ کر مرا ہے تو درجہ کفایت میں ان کی پابجائی سب سے پہلے ضروری ہے۔ اگر میت نے ترکہ نہیں چھوڑا تو پھر ان کاموں کی پابجائی کی ذمہ داری اس پر آتی ہے جس کے ذمہ اس کے اقربا میں سے اس کا نان و نفقہ واجب ہے اگر اقربا میں ایسا کوئی موجود نہ ہو تو پھر اس کی ذمہ داری کا بوجھ اسلامی حکومت کے سرکاری خزانے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پر ہے۔ اگر حکومت کے سرکاری خزانہ میں بھی کچھ نہ ہو تو پھر اس قرض کو عام مسلمان ادا کریں گے۔ بیوی خواہ غنی ہو یا فقیر اس کی تجہیز اس شخص پر ہے جس کے ذمے اس کی زندگی میں اس کا نان و نفقہ واجب ہوتا ہے۔ یہ قاضی ابو یوسف، امام مالک اور امام شافعی کی رائے ہے۔ امام محمد، امام شعبی اور امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ شوہر کے ذمے بیوی کی تجہیز نہیں ہے لیکن فتویٰ قاضی ابو یوسف کے قول پر ہے یعنی شوہر کے ذمے بیوی کا کفن دفن ہے۔

علامہ ابن عابد شامی رقمطراز ہیں

شوہر کے ذمہ بیوی کو کفن دینا اور اس کی تجہیز ہے لیکن یہ دونوں مسنون طریقہ پر ہوں، علی ہذا خوشبو، غسل کی اجرت، قبرستان تک لے جانا اور دفن کرنا شوہر کی ذمہ داری ہے۔ لیکن وہ چیزیں جو بطور بدعت معاشرے میں موجود ہیں ان کی ذمہ داری شوہر پر نہیں۔ مثلاً قرآن خوانی کا انتظام، تین دن کا کھانا وغیرہ۔

دوسرا حق قرض کی ادائیگی ہے۔ تجہیز و تکفین کے بعد یہ دیکھا جائے گا کہ میت کے ذمہ قرض کیا ہے۔ کاروباری زندگی میں اس کو کیا دینا ہے۔ کسی کا نقد لیا ہوا سرمایہ اس کے ذمہ کیا ہے۔ اس کے کارخانے میں اگر کاریگر، مزدور اور ملازم ہیں تو ان کی تنخواہیں کتنی ہیں۔ اس کی بیوی کا مہر کتنا ہے اور قرضوں کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ زمانہ صحت کے ہوں مرض وفات کے قرض، زمانہ صحت کے قرضوں کے بعد ادا کیے جائیں گے۔

ان کے علاوہ وہ قرض جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے مثلاً زکوٰۃ، نذر، صدقہ، کفارہ، روزوں کا فدیہ اور حج بدل کی ادائیگی، حنفیہ کا مذہب اس میں یہ ہے کہ جب تک میت وصیت نہ کرے اس کی ادائیگی واجب نہیں ہے۔ اگر وصیت ہو تو صرف ایک تہائی ادائیگی ہوگی۔

تیسرا حق وصیت ہے، کسی کو بلا عوض بعد از موت مالک بنانے کا نام وصیت ہے۔ یہاں قرآن میں بار بار من بعد وصیۃ کی تاکید، تکرار اور زور بتا رہا ہے کہ کوئی وصیت ہے جس کا پورا کرنا ضروری ہے لیکن عام خیال یہی ہے کہ وصیت واجب نہیں محض مستحب ہے۔ ہم البقرہ میں حاشیہ ۱۱۵ میں بتا آئے ہیں کہ آیت وصیت اور آیت میراث میں مفاہمت ممکن ہے اور آیت میراث یعنی یوصیکم اللہ آیت وصیت کتب علیکم اذا حضر احدکم الموت ان ترک خیرا الوصیۃ للوالدین والاقربین بالمعروف کی شرح ہے۔ کیونکہ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے وصیت کرنے کا حکم فرمایا تھا مگر چونکہ اس وصیت میں کمی زیادتی کرنا انسانی طبیعت سے کچھ بعید نہ تھا اس لیے

خدائے عالم الغیب نے اس وصیت کی آپ ہی شرح فرمادی بلکہ اس فعل کو جو اس کی شرح مشتمل ہوا خاص اپنی طرف منسوب کیا اور فرمایا یوصیکم اللہ اس جگہ یحکم، یامر اور یقضی جیسے الفاظ کو چھوڑ کر یوصی لانا اس بات کی طرف اشارا ہے کہ ایصاء اس فعل وصیت کی شرح ہے جس میں اجمال تھا۔ اب آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ اپنے وارثوں کے حق میں جن کے حصے اللہ نے متعین فرما دیے ہیں۔ یہ وصیت کرنا تم پر فرض ہے کہ اپنے حصے شریعت کے مطابق لیں کوئی کسی پر ظلم و زیادتی نہ کرے۔ لیکن ان ورثائے کے علاوہ اور لوگ بھی میت کے دور نزدیک کا تعلق رکھنے والے ہوتے ہیں ان کی نسبت قانون وراثت نے کوئی وصیت نہیں کی ہے بلکہ یہ میت کے اختیار صوابدید پر موقوف ہے من بعد وصیۃ میں اسی کی طرف اشارا ہے لیکن اس وصیت کو کھلا اور آزاد نہیں چھوڑا بلکہ اس پر بھی ایک تہائی کی پابندی لگادی۔ تہائی کی قید سے غیر مضار کی شرح ہوگئی یعنی وصیت کسی کو نقصان نہ دیتی ہو اور وارث کے حق میں لا وصیۃ لوارث کی قید لگاکر یوصیکم اللہ کو کتب علیکم کی شرح بنادیا۔ خلاصہ دونوں آیتوں کا یہ ہوا کہ جن کے حق میں اللہ نے حصے مقرر کردیے ان کی نسبت تو مقرر حصص کے لیے وصیت کی ضرورت نہیں ہے ان کی وصیت وہی ہے جو اللہ نے کر دی ہے اور جن لوگوں کے حصص مقرر نہیں ہیں ان کے حق میں میت کو تہائی مال تک وصیت کرنے کی اجازت ہے۔ مثلاً کوئی یتیم پوتا موجود ہے اور وہ اپنے چچا یا تاے کی موجودگی کی وجہ سے محروم الارث ہے اس کے لیے وصیت کرے لیکن یہ وصیت کل ملکیت میں سے ⅓ یا اس سے کچھ کم میں کرے۔

وصیت واجبہ

علامہ شیخ حسنین مخلوف مفتی دیار مصریہ نے اپنی کتاب المواریث میں یہ عنوان قائم کیا ہے اور لکھا ہے کہ جمہور کے نزدیک اپنے سرمائے کے کسی حصہ کے بارے میں کسی کے لیے وصیت نہیں ہے جیسا کہ حافظ ابن عبد البر محدث مغرب نے تصریح کی ہے۔ اگر ایک شخص اپنا ایک حقیقی بیٹا اور ایک دوسرے بیٹے کا بچہ جس کی وفات مرنے والے کی زندگی میں ہوگئی ہے چھوڑ کر مرتا ہے تو اس پوتے کو نہ بطور وراثت کچھ ملتا ہے اس لیے کہ وہ حقیقی بیٹے کی موجودگی میں قانون وراثت کی رو سے وارث نہیں ہے اور نہ از راہ وصیت کچھ ملتا ہے کیونکہ جمہور کی رائے میں وصیت واجب نہیں ہے۔ اسی الجھن اور مشکل کا حل بعض ائمہ سلف کی آراء کی مدد سے یہ تلاش کیا گیا ہے کہ وصیت کے ذریعے

اس کا علاج کیا جائے۔ مصری حکومت نے سنہ ۴۶ میں قانونِ وصیت نافذ کیا ہے اور اس کا خلاصہ یہ ہے کہ میت کے ترکہ میں سے اس پوتے کو بطورِ وصیت حصہ دیا جائے جس کا باپ دادا کی زندگی میں وفات پا گیا اور اس حصہ کی مقدار ایک تہائی سے زائد نہ ہو۔ اور یہ بھی اسی قانون کی ایک ذیلی دفعہ ہے کہ اس وصیت کا نفاذ تمام وصایا پر مقدم کیا جائے اور اسی کو وصیت واجبہ کہتے ہیں۔

اس دفعہ کے لیے جو علمی سہارا تلاش کیا گیا ہے یہ ہے کہ اگرچہ جدبا کہ اصول میں فخر الاسلام بزدوی نے تصریح کی ہے کہ عام شہریوں کے حق میں وصیت کا وجوب نہیں ہے ہاں ان لوگوں کے حق میں استحباب ہے جن کے اقرباء اور والدین قانونِ وراثت کی رُو سے حقدار نہ ہوں اور جمہور کی رائے یہی ہے کہ وصیت کا وجوب منسوخ ہے لیکن یہاں کچھ اکابر ایسے بھی ہیں جن کا موقف یہ ہے کہ وصیت کا یہ وجوب ورثاء کے حق میں منسوخ ہے لیکن ان اقربا اور والدین کے حق میں وجوب باقی ہے جو قانونِ وراثت کی رُو سے محروم ہوتے ہیں۔ قتادہ اور جابر بن زید کا یہی مذہب ہے۔ ظاہر یہ میں حافظ ابن حزم بھی غیر وارث اقرباء کے لیے وصیت کے وجوب کو مانتے ہیں۔ مصری قانون نے غیر وارث کے لیے وجوب وصیت کا پروانہ اسی بنیاد پر دیا ہے۔ اسی کو وہ وصیتِ واجبہ کہتے ہیں۔

یہاں آیت میں وصیت کا ذکر قرض پر مقدم کیا گیا ہے کہ وصیت بھی اپنی ذات کے لحاظ سے میراث کی طرح ہے یعنی جیسے میراث نام ہے تملیک بلا عوض کا ایسے ہی وصیت نام ہے مالک کی جانب تملیک بلا عوض کا۔ میراث بھی بعد الموت اور وصیت بھی بعد الموت ہوتی ہے۔ ورثاء کے لیے وصیت کی پابجائی شاق ہوتی ہے اور اس بنا پر ممکن تھا کہ ورثاء نظر انداز کر جائیں اس لیے وصیت کا پہلے ذکر کر دیا یا یوں کہہ دو کہ قرض کا ہونا ہر مرنے والے پر ضروری نہیں ہے یا یوں کہو کہ وصیت کو پہلے اس لیے ذکر کیا ہے کہ جب کوئی وصیت کرے گا تو اس میں قرض کا ذکر تو خود کرے گا اس لیے صرف وصیت کی تعمیل میں قرض کی ادائیگی آجاتی ہے۔ ورنہ حکم کے اعتبار سے اُمت کا اس پر اجماع ہے کہ قرض وصیت پر مقدم ہے۔ یعنی اگر میت کے ذمہ قرض ہو تو سب سے پہلے میت کے ترکہ میں سے وہ ادا کیا جائے پھر وصیت پوری کی جائے گی اس کے بعد وراثت تقسیم ہوگی۔

ترکہ کی تقسیم اللہ کے حکم سے ہے

۱۹۔ تمہارے باپ دادا بھی ہیں اور تمہاری اولاد بھی مگر تم نہیں جانتے ہو کہ نفع رسانی کے لحاظ سے کون سا رشتہ تم سے زیادہ قریب ہے۔ یہ اللہ کی جانب سے حصے مقرر ہیں اور اللہ بڑے علم اور بہت

زیادہ دانائی والا ہے ۔ آیات بالا میں دو میراث کا ذکر کیا ہے اولاد کی اور والدین کی ۔ اب ارشاد ہوتا ہے کہ چونکہ یہ بات تم کو معلوم نہیں ہے کہ کس سے تم کو نفع پہنچے گا اور کتنا نفع پہنچے گا اس لیے تم کو اس میں دخل نہ دینا چاہیے جو کچھ کسی کا حصہ اللہ نے مقرر فرما دیا ہے اس کی پابندی کرو کہ اس کو تمام چیزوں کی خبر بھی ہے اور بڑا حکمت والا بھی ہے[1]

قرآن حکیم کی اس آیت نے بتا دیا ہے کہ میراث کے جو حصے اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمائے ہیں وہ اس کا طے شدہ حکم ہے ، اس میں کسی کو ذرائے زنی یا کمی بیشی کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اور ہمیں پورے اطمینان قلب سے اس کو قبول کر لینا چاہیے ۔ ہمارے خالق و مالک کا یہ حکم بہترین حکمت و مصلحت پر مبنی ہے[2]

گویا یہ جواب ہے ان سب نادانوں کو جو میراث کے اس خدائی قانون کو نہیں سمجھتے اور اپنی ناقص عقل سے اس کسر کو پورا کرنا چاہتے ہیں جو ان کے نزدیک اللہ کے قانون میں رہ گئی ہے[3]

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے یہ تنبیہہ فرمائی ہے کہ یہ تقسیم اللہ تعالیٰ کے علم اور اس کی حکمت پر مبنی ہے نہ مالک کو اس میں کسی قسم کے ردو بدل کا اختیار ہے اور نہ اور کسی اجتماعی ادارے کو ۔ مالک کی خواہشیں ، برادری کا رواج اور حکومت کا قانون جو بھی اس تقسیم میں مزاحم ہو کر آئے گا اس کی مزاحمت خدا کی حکمت اور علم سے مزاحمت ہے ۔ جو لوگ اس کے خلاف قدم اٹھاتے ہیں خواہ وہ تیونس ، انڈونیشیا ، الجزائر ، مصر ، شام ، ایران اور پاکستان میں کہیں اٹھاتے ہیں وہ خدا کے علم و حکمت کی تحقیر کرتے ہیں ۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف م ش [3] تفہیم القرآن

وَلَكُمْ نِصْفُ مَا تَرَكَ أَزْوَاجُكُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّهُنَّ وَلَدٌ ۚ
فَإِنْ كَانَ لَهُنَّ وَلَدٌ فَلَكُمُ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْنَ مِنْ بَعْدِ وَصِيَّةٍ
يُوصِينَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۚ وَلَهُنَّ الرُّبُعُ مِمَّا تَرَكْتُمْ إِنْ لَّمْ يَكُنْ لَّكُمْ
وَلَدٌ ۚ فَإِنْ كَانَ لَكُمْ وَلَدٌ فَلَهُنَّ الثُّمُنُ مِمَّا تَرَكْتُمْ مِّنْ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ تُوصُونَ بِهَا أَوْ دَيْنٍ ۗ وَإِنْ كَانَ رَجُلٌ يُّورَثُ كَلٰلَةً
أَوِ امْرَأَةٌ وَّلَهٗ أَخٌ أَوْ أُخْتٌ فَلِكُلِّ وَاحِدٍ مِّنْهُمَا السُّدُسُ ۚ
فَإِنْ كَانُوا أَكْثَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَهُمْ شُرَكَاءُ فِي الثُّلُثِ مِنْ بَعْدِ
وَصِيَّةٍ يُّوصٰى بِهَا أَوْ دَيْنٍ غَيْرَ مُضَارٍّ ۚ وَصِيَّةً مِّنَ اللّٰهِ ۗ
وَاللّٰهُ عَلِيمٌ حَلِيمٌ ﴿۱۲﴾

اور تمہاری بیویاں جو کچھ ترکے میں چھوڑ کر جائیں اس میں سے آدھا
حصہ تمہیں ملے گا بشرطیکہ ان کے اولاد نہ ہو، اور اولاد ہونے
کی صورت میں تمہیں چوتھائی ملے گا لیکن یہ اس وقت ملے گا

جبکہ پہلے اس کی وصیت کی تعمیل کردی جائے یا قرض جو انہوں نے چھوڑا ہے اس کی ادائیگی ہو جائے[۲۰]۔ اور تمہارے چھوڑے ہوئے سرمایہ میں ان کا چوتھائی حصہ ہے بشرطیکہ تمہارے اولاد نہ ہو اور اولاد ہونے کی صورت میں ان کا آٹھواں حصہ ہے، بعد اس کے کہ تمہاری وصیت کی تعمیل ہو جائے اور قرض کی ادائیگی ہو جائے[۲۱]۔ اگر مورث مرد ہو یا عورت کلالہ ہو مگر اس کا بھائی یا بہن ہوں تو بھائی بہن میں سے ہر ایک کو چھٹا ملے گا[۲۲]۔ اور اگر بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب کل ترکہ کے تہائی میں شریک ہوں گے جبکہ وہ وصیت پوری کردی جائے جو مرنے والے کی جانب سے کی گئی ہے اور قرض کی ادائیگی ہو جائے بشرطیکہ وہ نقصان دہ نہ ہو[۲۳]۔ یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے اور اللہ دانا اور بہت بُردبار ہے[۲۴]۔

عائلی زندگی اور وراثت

وراثت کا بہت بڑا تعلق خاندانی نظام کے ساتھ عائلی زندگی سے بھی ہے۔ والدین اور اولاد کے بعد قریب ترین تعلقات کی فہرست میں تیسرا درجہ میاں اور بیوی کا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جس طرح والدین کی تفصیل بوڑھوں کی تسکین روحانی کا ذریعہ اور اولاد کے حقوق کی تفصیل پر ننھے ننھے بچوں کی ہستی اور زندگی کا مدار تھا۔ اسی طرح حقوق زوجین کی تشریح پر جوانوں بلکہ پوری عائلی زندگی کے عیش و مسرت کا انحصار ہے۔ وراثت جیسے خاندان کو تسلسل بخشنے اور اسے وحدت کے طور قائم رکھنے میں بہت اہم حصہ لیتی ہے، اسی طرح عائلی زندگی کے استحکام میں اس کا بہت بڑا حصہ ہے، میاں بیوی کی رفاقت کو قرآن باہمی اخلاص و محبت کا تعلق قرار دیتا ہے اور اس کو خدا کی نشانیوں میں سے ایک نشانی قرار دیتا ہے۔ شوہر زندگی میں بیوی کے معاشی مفادات کا محافظ اور بیوی شوہر کی عزت وآبرو کی نگران بن کر رہتی ہے۔ مرنے کے بعد شوہر بیوی کا ترکہ اس لیے پاتا ہے کہ اس نے زندگی میں اس کے معاشی مفادات کی ذمہ داری قبول کی ہے اور بیوی شوہر کا ترکہ اس لیے پاتی ہے کہ وہ پوری زندگی شوہر کی خدمت کرتی رہی ہے۔

غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ ہر قسم کی قرابتوں، رشتہ داریوں کی جڑ بھی ازدواجی تعلق ہے۔ یہ نہ ہوتا تو دنیا کا کوئی رشتہ وجود میں نہ آتا اس لیے دنیا کی ہر قرابت اور تعلق کا رشتہ اسی کی بدولت وجود میں آیا ہے۔ اور اس نقطہ نظر سے دنیا میں زوجین کو بہت بڑی اہمیت حاصل ہے کہ اسی سے ساری دنیا کے عزیزانہ مہر و محبت اور الفت و مودت کا آغاز ہوتا ہے۔ میاں بیوی کے درمیان باہمی کفالت اور خدمت کا جو تعلق قائم ہے اسے باقی رکھنے اور مستحکم کرنے میں جہاں طبعی اور جذباتی عوامل کو دخل ہے وہاں مادی اور معاشی عوامل بھی کچھ کم نہیں۔ اسلام کے قانون وراثت کا اس روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو اندازہ ہوگا کہ اس نے خاندانی زندگی میں ازدواجی زندگی کو کتنی اہمیت دی ہے

زوجین کا حصہ

۲۰۔ اور تمہاری بیویاں جو کچھ ترکہ میں چھوڑ کر جائیں اس میں سے آدھا حصہ تمہیں ملے گا بشرطیکہ ان کی اولاد نہ ہو اور اولاد ہونے کی صورت میں تمہیں چوتھائی ملے گا۔ لیکن یہ اس وقت ملے گا جبکہ پہلے اس کی وصیت کی تعمیل کر دی جائے یا قرض جو انہوں نے چھوڑا ہے اس کی ادائیگی ہو جائے

اب زوجین کی میراث کو بیان فرمایا ہے کہ مرد کو اس کی بیوی کے مال میں سے آدھا ملے گا اگر عورت کے کوئی اولاد نہ ہو اگر عورت کے اولاد ہے خواہ ایک ہی بیٹا یا بیٹی ہو اور اسی مرد سے یا پہلے شوہر سے ہو تو مرد کو عورت کے ترکہ میں سے ایک چوتھائی ملے گا قرض اور وصیت کے بعد[1]

بیوی کی میراث

اس آیت میں اولاً شوہر کی وراثت بتائی گئی ہے کہ شوہر کو بیوی کی جانب سے جو میراث ملتی ہے وہ دو طرح کی ہے۔

اول نصف یعنی آدھی یہ اس وقت شوہر کو ملے گی جب بیوی کی اولاد نہ ہو اولاد میں بیٹا، وہ نہ ہو تو بیٹے کا بیٹا نیچے تک، بیٹی، وہ نہ ہو تو بیٹے کی بیٹی۔

دوم چوتھائی یہ اس وقت ملے گا جبکہ بیوی کے کوئی اولاد ہو اس سے یا پہلے شوہر سے ہو۔ یہ یاد رہے کہ ولد کا اطلاق مورث کی اس فرع اصل پر ہوتا ہے جو عصبہ ہو کر وارث بننے والی ہو یا فرض کے ذریعے پہلے کی مثال بیٹا اور دوسرے کی مثال بیٹی اور بیٹے کی بیٹی۔ ایسے ہی فرع جو وارث ہو جیسے بیٹی کا بچہ اس پر ولد کا اطلاق نہیں ہوتا۔ ابوبکر الجصاص یوصیکم اللہ فی اولادکم کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> اہل علم کا اس پر اتفاق ہے کہ لفظ ولد کا اطلاق محض صلبی اولاد پر ہوتا ہے، لڑکا ہو یا لڑکی، اور پوتے پر اس وقت ہوتا ہے جب حقیقی لڑکا موجود نہ ہو اور بیٹی کی اولاد پر ولد نہیں بولا جاتا۔

بیوی نے اگر انتقال کے وقت شوہر اور حقیقی بہن وارث چھوڑے ہیں تو شوہر کو نصف ہی ملے گا کیونکہ ولد موجود نہیں اور باقی نصف بہن کو مل جائے گا۔

اور اگر وفات کے وقت وارث شوہر اور پوتا ہو تو شوہر کو چوتھائی ملے گا اور باقی پوتے کو مل جائے گا۔

اور اگر وفات کے وقت شوہر کے ساتھ صرف اپنی بیٹی کا لڑکا وارث چھوڑا ہے تو شوہر کو نصف ملے گا اور باقی بیٹی کے لڑکے کو ذوی الارحام ہونے کی وجہ سے ملے گا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور اگر مرنے والی کے بعد ورثہ میں شوہر ہو، حقیقی بھائی ہو اور مرنے والی کا وہ بیٹا موجود ہو جس نے اسے قتل کیا ہے تو شوہر کو آدھا اور بھائی کو آدھا اور بیٹا ماں کا قاتل ہونے کی وجہ سے محروم الارث ہوگا۔ عامہ صحابہ اور جمہور ائمہ کی یہی رائے ہے۔

شوہر کی میراث

۱۲۱- اور تمہارے چھوڑے ہوئے سرمایہ میں ان کا چوتھائی ہے بشرطیکہ تمہارے اولاد نہ ہو اور اولاد ہونے کی صورت میں ان کا آٹھواں ہے۔ بعد اس کے کہ تمہاری وصیت کی تعمیل ہو جائے اور قرض کی ادائیگی ہو جائے۔ یعنی اسی طرح عورت کو اس کے خاوند کے مال میں سے چوتھائی ملے گا۔ اگر مرد کی اولاد کچھ نہ ہو۔ اور اگر مرد کے اولاد ہے خواہ اسی عورت سے ہو یا پہلی بیوی سے ہو تو عورت کو آٹھواں حصہ ملے گا خاوند کے اس مال میں سے جو وصیت اور قرض ادا کرنے کے بعد بچے گا۔ مال کی ہر قسم میں سے نقد ہو یا جنس سلاح ہو یا زیور، حویلی ہو یا باغ، باقی رہا عورت کا مہر وہ میراث سے جدا قرض میں داخل ہے یہ کل دو صورتیں ہوئیں جیسا کہ مرد کی میراث میں دو صورتیں تھیں [1]

خواہ ایک بیوی ہو یا کئی بیویاں ہوں اولاد ہونے کی صورت میں وہ ⅛ اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں ¼ کی حصہ دار ہوں گی اور یہ ⅛ یا ¼ سب بیویوں میں برابر تقسیم کیا جائے گا [2]

اور یہ بھی دیکھنا چاہیے کہ بیوی کا مہر ادا ہو گیا ہے یا نہیں۔ اگر بیوی کا مہر واجب الادا ہے تو دوسرے قرضوں کی طرح اولاً کل مال میں سے دین مہر ادا کیا جائے گا اس کے بعد میراث تقسیم ہوگی مہر لینے کے بعد عورت میراث میں بھی حصہ لے گی۔ اگر میت کا مال اتنا ہے کہ مہر ادا کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا پھر دوسرے قرضوں کی طرح پورے مال سے مہر ادا کرنا ہوگا اور کسی وارث کو کوئی حصہ نہ ملے گا [3]

اس آیت میں بیوی کی وراثت بتائی کہ بیوی کو شوہر کی جانب سے جو میراث ملتی ہے وہ دو طرح کی ہے۔

اول ربع یعنی چوتھائی، یہ اس وقت جبکہ شوہر اپنے وارثوں میں اپنی کوئی اولاد نہ چھوڑ کر مرے۔ یہ اولاد خواہ لڑکا ہو یا لڑکی، پوتا ہو یا پوتی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم [3] معارف م شفیع

دوسرے ثمن یعنی آٹھواں یہ اس وقت جبکہ شوہر کے اولاد ہو خواہ اس بیوی سے یا دوسری بیوی سے ہو۔

اگر شوہر کی وفات ہوئی اور اس نے ایک اپنا بیٹا اور بیوی وارث چھوڑے تو بیوی کو ⅛ ملے گا اور باقی بیٹے کو۔

اگر شوہر بیوی اور اپنی بیٹی کی بیٹی چھوڑ کر مرا تو بیوی کو چوتھائی ملے گا اور باقی بیٹی کی بیٹی کو ذوی الارحام ہونے کی وجہ سے ملے گا۔

میاں بیوی میں وراثت کی شرط

زوجیت کی بنا پر وراثت کا استحقاق پیدا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ

۱۔ دونوں میں ازدواجی تعلق اسلامی قانون کے مطابق صحیح ہو باطل اور فاسد نہ ہو۔ باطل وہ تمام صورتیں جو قرآن نے حرام کر دی ہیں۔ یعنی محرمات میں سے کسی سے نکاح کر لینا۔ مسلمان عورت کا کسی غیر مسلم سے نکاح ہونا۔ اور فاسد یہ کہ شرائط نکاح میں سے کسی شرط کا نہ ہونا۔

۲۔ دونوں میں نکاحی تعلق وقت وفات فی الواقع یا حکماً موجود ہو۔ فی الواقع تو سب جانتے ہیں۔ حکماً یہ کہ شوہر نے بیوی کو طلاق رجعی دی ہو اور بیوی عدت گزار رہی ہو کہ شوہر کی وفات ہو جائے یا بیوی کی وفات ہو جائے دونوں اس صورت میں میراث کے حقدار ہوں گے اس پہ ائمہ اربعہ کا اتفاق ہے۔

غراوین اور عمریتین

آیئے اب پورا خلاصہ گوش گزار فرما لیجئے۔ اگر بیوی مرگئی اور صاحب اولاد ہے تو شوہر کو چوتھا اور اگر صاحب اولاد نہیں ہے تو نصف۔ اور اگر شوہر مرگیا ہے اور بیوی زندہ ہے اور اولاد نہیں ہے تو بیوی کو چوتھا اور اگر اولاد ہے تو آٹھواں حصہ، ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو اسی حصہ میں شریک ہوں گی۔ لیکن اس صورت میں یہ ذکر نہیں فرمایا کہ شوہر، بیوی ہوں اور ان کے والدین بھی تو پھر حصوں کی تقسیم کیسے ہوگی۔ صورتیں دو ہوں گی۔

شوہر مرگیا ہے ورثہ میں بیوی، ماں اور باپ چھوڑے ہیں۔ اور بیوی مرگئی ہے اور ورثہ میں شوہر اور ماں باپ چھوڑے ہیں۔ دوسری صورت میں اگر شوہر کو آدھا دیا جاتا ہے اور ایک تہائی

ماں کو تو باپ کا حصہ ½ رہ جاتا ہے جو ماں سے نصف ہے۔ اور اگر اولاد میں لڑکیاں ہوں، والدین بھی ہوں اور شوہر بھی تو لڑکیوں کو دو تہائی چاہیے اور والدین کو ایک تہائی تو خاوند کو کچھ نہیں ملتا ہے پہلی صورت میں یعنی اولاد نہ ہو ماں باپ ہوں اور خاوند یا بیوی ہو تو اکثر یہ کہتے ہیں کہ خاوند یا بیوی پہلے اپنا حصہ لیں گے اور باقی کی ایک تہائی ماں کو اور دو تہائی والد کو دیا جائے گا اس طرح حصص ٹھیک ہوں گے۔ یہی صحیح ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہی حضرت عمر حضرت عثمان اور حضرت علی کا کہنا ہے اور یہی عبداللہ بن مسعود اور زید بن ثابت فرماتے ہیں۔ فقہاء سبعہ، ائمہ اربعہ اور جمہور علماء کی یہی رائے ہے۔ ابن القیم فرماتے ہیں کہ عمر بن الخطاب اور زید بن ثابت نے یہاں شوہر کی موجودگی کو اس پر قیاس کیا ہے جبکہ شوہر موجود نہ تھا۔ اس وقت باپ کے لیے ماں کا ڈبل ہوتا ہے۔ اور شوہر اور بیوی کے حصہ لینے کے بعد باقی مال کو کل مال تصور کر کے یہ فیصلہ دیا ہے یہ بہترین قیاس ہے۔

بہرحال وہ کہتے ہیں کہ خاوند یا بیوی کو دے کر باقی مال ماں باپ کے حصص کے لیے کل قرار پائے گا اور ان کے حق میں ترکہ وہی ہے جو خاوند اور بیوی کو دینے کے بعد باقی رہ جائے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ باقی ماترک نہیں ہے اس لیے یہ فیصلہ درست نہیں ہے، لیکن آپ کی یہ خلش بے محل ہے کیونکہ ماترک ہر ایک کے لیے الگ الگ ہے۔ اگر قرض ہو تو پہلے قرض ادا ہونا چاہیے، قرض ادا ہو جانے کے بعد بھی ماترک ہے۔ اور اگر وصیت ہو تو اسے پورا کرنا چاہیے اب بھی ماترک ہے۔ اسی طرح اگر خاوند اور بیوی ہو تو پہلے ان کو ملنا چاہیے۔ اب بھی ماترک ہے۔ اب اس ماترک میں سے ماں کو ایک تہائی اور دو تہائی باپ کو ملنا چاہیے اور بقیہ اولاد کو۔ جس انداز سے اللہ سبحانہ نے حصے مقرر فرمائے ہیں وہ خود اس اصول کی صداقت کے گواہ ہیں۔ کیونکہ سب سے پہلے یہ بتایا ہے کہ صرف اولاد ہو، والدین بھی ہوں۔ پھر بتایا کہ والدین ہوں اور اولاد ہو یا نہ ہو۔ تیسری صورت یہ بتائی کہ شوہر یا بیوی ہو تو ظاہر بات ہے کہ جس طرح ماں باپ کو دے کر بقیہ اولاد کو ملتا ہے اسی طرح اگر شوہر اور بیوی کے ساتھ والدین ہوں تو شوہر اور بیوی کو دے کر ماں باپ کو دیا جائیگا

فرائض میں طوا،

فرض وہ حصہ کہلاتا ہے جو شرعاً ترکہ میں وارث کے لیے مقرر ہے۔ قرآن کے مقرر کردہ فرض صرف چھ ہیں۔ آدھا، چوتھائی، آٹھواں، دو تہائی، تہائی اور چھٹا۔ یعنی نصف، ربع، ثمن، ثلثان، ثلث اور سدس۔

اصحاب فرض بارہ ہیں میاں بیوی یہ دونوں علاقہ زوجیت کی وجہ سے وارث ہوتے ہیں۔ ان کے علاوہ باقی قرابت اور نسبت کی وجہ سے جو وارث ہونے ہیں یہ ہیں۔ باپ، ماں، بیٹی، لڑکے کی بیٹی، سگی بہن، اخیافی بہن، اخیافی بھائی، دادا، دادی۔

کچھ ایسے ہیں جن کے حصے مقرر نہیں ہیں لیکن اصحاب فرض سے جو کچھ باقی رہ جاتا ہے وہ لے لیتے ہیں یا اصحاب فرض نہ ہونے کی صورت میں سب کچھ لے لیتے ہیں۔ ان کو عصبات کہتے ہیں تشریح شیخ الاسلام کے افادات میں آرہی ہے۔

کچھ ایسے ہیں جو نہ اصحاب فرض ہیں اور نہ عصبات ہیں ان کو ذوی الارحام کہتے ہیں۔

ترکہ کی تقسیم کے موقعہ پر سب سے پہلے ان کے آگے رکھا جائے گا جن کے حصص قرآن نے مقرر کر دیے ہیں۔ ہر فرض والے کو اس کا حصہ دیا جائے گا۔

اصول مسائل سات ہیں ۲، ۳، ۴، ۶، ۸، ۱۲، ۲۴۔

کبھی اصحاب فرض کے حصے اصل مسئلہ کے برابر ہوتے ہیں۔ مثلاً عورت کا انتقال ہوا ہے۔ اس نے وارثوں میں ایک شوہر اور ایک حقیقی بہن چھوڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ مسئلہ صاف ہے کل مال کو ۲ پر تقسیم کر کے ایک شوہر کو اور ایک بہن کو دیں گے۔ یہ تو فرض اور حصص میں برابری کی مثال ہے۔

کبھی اصحاب فرض کو دے کر حصص بچ جائیں گے مثلاً ایک شخص مرا ہے اس نے ورثہ میں ایک بیوی، دو بیٹیاں اور ایک حقیقی بھائی چھوڑا ہے بیوی کو ۱/۸، بیٹیوں کو دو تہائی دے کر پھر بچتا ہے مثلاً ۲۴ میں سے دو تہائی ۱۶ بیٹیوں کو دیا اور ۳ بیوی کو، اب ۵ باقی رہ گئے یہ بھائی کو دیے جائیں گے اس کو فریضہ عادلہ کہتے ہیں۔

کبھی اصحاب فرض کو دینے کے بعد حصص باقی رہیں گے مگر لینے والا حقدار کوئی نہ ہوگا۔ مثلاً ایک شخص مرا ہے اس نے دو بہنیں اور ایک ماں وارث چھوڑے ہیں۔ دو بہنوں کو اگر دو تہائی اور ماں کو چھٹا دیتے ہیں اور ۲۴ میں سے ۱۶ بہنوں کو اور ۴ ماں کو دیتے ہیں تو چار پھر بھی باقی رہتے ہیں اور عصبہ کوئی نہیں ہے اس کو فریضہ ناقصہ کہتے ہیں۔

کبھی اصل مسئلہ پر حصص زیادہ ہو جاتے ہیں مثلاً ایک شخص نے مرتے وقت ورثہ میں بیوی دو لڑکیاں اور والدین چھوڑے۔ اگر بیوی کو آٹھواں اور لڑکیوں کو دو تہائی اور ماں باپ کو ایک تہائی دیتے ہیں حصے پورے نہیں ہوتے مثلاً ۲۴ میں سے ۳ بیوی کو اور ۱۶ لڑکیوں کو دے دیے گئے تو پھر

والدین کے ۸ نہیں بچتے ہیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے اس مشکل کا حل یہ پیش کیا تھا کہ ۲۴ کی جگہ ۲۷ بنائے جائیں جن میں سے ۱۶ لڑکیوں کو دیے جائیں آٹھ ماں باپ کو تین بیوی کو، اسی کو عول کہتے ہیں اور اس مسئلہ کو عائلہ بولتے ہیں۔ عول کا سہرا بھی بقول ابن عباس حضرت عمر ہی کے سر پر ہے اور یہ بھی اولیات عمر بن الخطاب سے ہے۔

ابن قدامہ نے مغنی میں مسائل کی تین قسمیں کی ہیں عادلہ عائلہ اور ردیہ، شمس الدین سرخسی نے المبسوط میں ردیہ کو ناقصہ کے نام سے پکارا ہے۔

اخیافی بہن بھائیوں کی میراث

۲۲۔ اگر مورث مرد ہو یا عورت کلالہ ہو مگر اس کا کوئی بھائی یا بہن ہو تو بھائی بہن میں سے ہر ایک کے لیے چھٹا حصہ ہے۔ یہاں سے اخیافی بھائی بہن کی میراث کا ذکر ہے جو کہ صرف ماں میں شریک ہوں سو جاننا چاہیے کہ باپ اور بیٹے کے ہوتے ہوتے بھائی اور بہن کو کچھ نہیں ملتا۔ ہاں اگر باپ اور بیٹا نہ ہوگا تو بھائی اور بہن کو میراث ملے گی۔

بھائی اور بہن تین طرح کے ہیں۔ سگے جو ماں اور باپ دونوں میں شریک ہوں جن کو عینی کہتے ہیں۔ یا وہ سوتیلے جو صرف باپ میں شریک ہوں جن کو علاتی کہتے ہیں، یا وہ سوتیلے جو صرف ماں میں شریک ہوں جن کو اخیافی کہتے ہیں۔ اس آیت میں آخری قسم یعنی اخیافی کا ذکر ہے۔ چنانچہ متعدد صحابہ کی قراۃ میں و لہ اخ او اخت کے ساتھ من الام کا کلمہ صریح موجود ہے اور اس تفسیر پر سب کا اجماع ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس میت کے خواہ مرد ہو یا عورت ماں باپ بیٹا بیٹی کچھ نہ ہو اور اس کا بھائی یا بہن اخیافی ہو تو ان دونوں میں سے ہر ایک کو چھٹا ملے گا۔ مرد و عورت یعنی اخیافی بھائی بہن کا حصہ برابر ہے کمی زیادتی نہیں۔ باقی رہے دو قسم کے بھائی بہن یعنی عینی اور علاتی تو ان دونوں قسموں کا حکم مثل اولاد کے ہے۔ بشرطیکہ میت کے باپ بیٹا کچھ نہ ہو مقدم عینی ہے وہ نہ ہو تو پھر علاتی۔ اسی سورت کے آخر میں ان دونوں کی میراث کا ذکر آئے گا[1]

کلالہ کی معنوی تحقیق

کلالہ جس کا نہ والد ہو نہ اولاد ہو، یہ تکللہ النسب سے بنا ہے جس کے معنے ہیں نسب نے اس کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

گھیر لیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ کلالہ اس وارث کو کہتے ہیں جو نہ میت کا والد ہو اور نہ اس کی اولاد ہو۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ باپ بیٹا آدمی کے دو کنارے ہیں تو جب مرتے وقت نہ باپ چھوڑے نہ بیٹا تو گویا دونوں کنارے اس کے مٹ گئے، اس لیے اس کو کلالہ کہتے ہیں۔ اور کچھ کی رائے ہے کہ جو چیز گھیرے اس کو اکلیل کہتے ہیں اور میت کو کلالہ اس وجہ سے کہا کہ دوسرے وارث اس کو گھیر لیتے ہیں۔ شریعت کی اصطلاحی زبان میں کلالہ وہ میت ہے جس کی نہ اولاد ہو اور نہ والد ہو، یعنی نہ اوپر کا رشتہ ہو نہ نیچے کا، صدیق اکبر نے کلالہ کی یہی تعریف کی ہے۔ اور ابن کثیر فرماتے ہیں، یہی حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت زید بن ثابت کا کہنا ہے، تابعین میں امام شعبی، نخعی، حسن بصری، قتادہ، جابر بن زید اور الحکم کی بھی یہی رائے ہے۔ اہل مدینہ، اہل کوفہ، اہل بصرہ کا یہی فیصلہ ہے، فقہاء سبعہ اور ائمہ اربعہ کا یہی موقف ہے بلکہ بتلانے والوں نے تو بتایا ہے کہ اسی پر اجماع ہے۔ اس کے برعکس اہل لغت کہتے ہیں کہ کلالہ اس وارث کو کہتے ہیں جو میت کا نہ باپ ہو اور نہ اولاد ہو۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ بظاہر اصطلاح شریعت اور اہل لغت کے مابین تضاد ہے مگر ہیں دونوں صحیح کیونکہ جس میت کا بلا واسطہ وارث نہ ہو دوسرے وارث ہوں تو میت کا رشتہ دوسروں سے کمزور ہوگا کیونکہ بالواسطہ ہوگا۔ اسی لیے ان وارثوں کا رشتہ میت سے کمزور ہوگا جو میت کی اولاد میں سے نہ ہوں اور باپ بھی نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ کلال کے معنے ضعف کے ہیں اور بالواسطہ رشتہ بلا واسطہ رشتہ کے مقابلے میں ایک کمزور رشتہ ہے۔ اس لیے دونوں پر اطلاق صحیح ہے۔

دراصل کلالہ کی اصل کلال ہے اور کلال کے معنے کمزوری کے ہیں۔ اعشیٰ کہتا ہے،

فآلیت لا ارثی لہا من کلالۃ

ولا من حفا حتی تلاقی محمدا

جب تک اونٹنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تک نہ پہنچا دے گی مجھے اس کی تھکاوٹ اور فرسودہ پائی پر رحم نہ آئے گا۔ اسی سے وہ تلوار جو کند ہوگئی ہو کلیل اور اسی طرح وہ زبان جس میں گویائی نہ ہے اور وہ آنکھ جس کی بینائی کمزور ہو جائے کلیل کہلاتی ہے۔ اسی سے وہ کمزور جو اپنا بوجھ نہ اٹھا سکے کل کہلاتا ہے۔ خدیجۃ الکبریٰ نے حضور انور سے کہا کلا انک لتحمل الکل، ہرگز نہیں آپ تو ان کا بوجھ اٹھاتے ہیں جو خود کمزوری کی وجہ سے اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے اور یہی معنے ہیں اس ارشاد کے کہ من ترک مالا فلورثتہ ومن ترک کلا فالی وعلی۔ جو شخص مال و اسباب چھوڑ جائے گا وہ اس کے وارثوں کو ملے گا اور جو بوجھ چھوڑ کر جائے گا وہ میرے ذمہ ہے۔ توسیع استعمال کے

بعد عرف میں کلالہ سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں جو منقطع الطرفین ہوں نہ ان کے والدین ہوں اور نہ اولاد، اور جو شخص آباؤ اجداد کی خصوصیات سے محروم ہو اس کو بھی کلالہ کہا جاتا ہے ایک شاعر کہتا ہے،

ورثتم قناة الملك غير كلالة
عن ابنی مناف عبد شمس وهاشم

عبد مناف کے دونوں بیٹوں عبد شمس اور ہاشم سے تم کو حکومت کا نیزہ میراث میں تو ملا ہے مگر تم خود ان کی خصوصیات سے بے بہرہ ہو (راغب) قریب کے رشتے کو چھوڑ کر دور کے رشتہ دار کو بھی کلالہ کہتے ہیں۔ الجصاص رقمطراز ہیں کہ احادیث میں کلالہ مورث اور وارث دونوں کے لیے بولا گیا ہے شیخ الاسلام نے یہاں یہ بات لطیف فرمائی ہے کہ:

کلالہ کی جو تفسیر کی گئی ہے کہ باپ اور بیٹا نہ ہو سب کو مسلم ہے مگر امام ابو حنیفہ دادی اور پوتی کی بھی نفی کرتے ہیں اور جو حکم باپ بیٹے کا ہے وہی حکم دادی اور پوتی کا ہے اور حضرات صحابہ کے وقت سے یہ اختلاف علماء میں چلا آتا ہے۔

بہرحال اس آیت کے متعلق مفسرین کا اجماع ہے کہ اس میں بھائی اور بہنوں سے اخیافی بھائی اور بہن مراد ہیں۔ یعنی جو میت کے ساتھ صرف ماں کی طرف سے رشتہ رکھتے ہیں اور باپ ان کا دوسرا ہو۔

وراثت میں ایک سے زیادہ بہن بھائی کا حکم

۲۳۔ اور اگر بھائی بہن ایک سے زیادہ ہوں تو وہ سب کل ترکہ کے تہائی میں شریک ہوں گے جبکہ وصیت پوری کر دی جائے جو مرنے والے کی جانب سے کی گئی ہے اور قرض کی ادائیگی ہو جائے بشرطیکہ وہ نقصان رساں نہ ہو۔ یعنی اگر اخیافی بہن یا بھائی ایک سے زیادہ ہوں تو ان سب کو ایک تہائی مال میراث میں ملے گا اور پہلی صورت میں سدس اور دوسری صورت میں ثلث جو دیا جائے گا تو وصیت اور دین کے بعد جو باقی رہے گا اس کا سدس اور ثلث دیا جائے گا اور وصیت میراث پر جب مقدم ہوگی کہ اوروں کو نقصان نہ پہنچایا ہو اور نقصان کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ تہائی مال سے زیادہ کی وصیت ہو دوسرے یہ کہ جس وارث کو میراث میں سے حصہ ملے گا اس کے لیے کچھ وصیت بھی کر جائے۔ یہ دونوں صورتیں درست نہیں ہیں۔ البتہ اگر سب وارث اس کو قبول کر لیں تو خیر ورنہ یہ وصیت مردود ہے یہاں چونکہ وارثوں سے اندیشہ تھا کہ ترکہ میت میں سے میت کا دین اور وصیت ادا نہ کریں اور

تمام مال آپ ہی رکھ لیں اس لیے میراث کے ساتھ بار بار دین اور وصیت کا حکم تاکیداً بیان کیا گیا ہے اور وصیت چونکہ تبرع و احسان ہے اور بسا اوقات کوئی شخص معین اس کا مستحق نہیں ہوتا اور اس وجہ سے اس کے ضائع ہونے کا قوی احتمال تھا اس لیے بغرض اہتمام و احتیاط وصیت کو ہر جگہ دین سے پہلے ذکر کیا حالانکہ وصیت کا درجہ دین کے بعد ہے جیسا پہلے بتایا جا چکا ہے۔ نیز وصیت حق مورث ہے۔ جیسے تجہیز و تکفین بخلاف وراثت اور دین کے کہ وہ دوسروں کا حق ہے تو اس حیثیت سے وصیت دین سے مقدم ہے اور یہاں جو غیر مضار کی قید لگائی ہے یہ قید مقامات سابقہ میں بھی معتبر ہوگی۔[1]

آیت کی تشریح ختم ہو چکی ہے مگر کچھ مباحث باقی ہیں ان پر بحث ضروری ہے۔

اسلام میں وصیت کا مقام

اول یہ کہ قرآن نے اس رکوع میں بار بار وصیت کے لیے پورا کرنے کی تاکید کی ہے۔ اس تاکید اور تکرار کی توجیہات تو آپ شیخ الاسلام کی زبانی سن چکے ہو لیکن یہ بات یہاں سمجھنے کی ہے کہ وصیت کے ذریعے مالک اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس کی وفات کے بعد اس کے ترکہ کا ایک حصہ متعین فرد یا افراد کی ملکیت ہو جائے۔

وصیت کی درستگی کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں ایک یہ کہ ایک تہائی میں ہو دوسرے یہ کہ کسی وارث کے لیے نہ ہو۔

اول یعنی ایک تہائی کی تحدید جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صاف اور واضح ارشاد سے ثابت ہے اور تمام مکاتبِ فقہ کے درمیان متفق علیہ ہے۔

> سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میری عیادت کے لیے تشریف لائے میں مکہ میں تھا اور آپ کو یہ بات ناپسند تھی کہ کوئی اس جگہ مرے جہاں سے اس نے ہجرت کی تھی چنانچہ آپ نے فرمایا۔ اللہ ابن عفراء پر رحم فرمائے۔ میں نے عرض کیا کہ میں اپنے سارے مال کے بارے میں وصیت کر جاؤں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ میں نے عرض کیا کہ پھر نصف مال کی حد تک؟ آپ نے فرمایا نہیں، میں نے عرض کیا کہ پھر ایک تہائی مال کی، آپ نے فرمایا کہ ہاں ایک تہائی بھی بہت ہے تو اپنے ورثا کو مالدار

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

چھوڑ جائے یہ بات اس سے اچھی ہے کہ انہیں محتاج چھوڑے اور وہ لوگوں سے مانگتے پھریں[1]

ایک تہائی ترکہ کی حد تک اسلام نے وصیت کا حق دے کر اہم انسانی مفادات کا تحفظ کیا ہے مثلاً بعض اوقات مالک کا کوئی رشتہ دار دوسرے قریبی ورثاء کے موجود ہونے کی وجہ سے ترکہ میں حصہ دار نہیں ہوتا جیسا کہ وصیت واجبہ کے عنوان میں۔ بیٹے کی موجودگی میں پوتے کے بارے میں بتائے ہیں۔ یا اس سے تعلق یا کسی اور مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے کہ ترکہ میں اسے بھی حصہ ملے۔ حق وصیت کے ذریعے مالک کو اس بات کا موقعہ ملتا ہے کہ ایسے رشتہ داروں کے حق میں کچھ مال چھوڑ جائے۔ اسی طرح اس حق سے کسی محسن کے احسان کا بدلہ دینے کسی کمزور کو سہارا دینے، رفاہِ عامہ یا دینی کاموں کے نگران کسی ادارے کی مدد کرنے کے بھی مواقع ملتے ہیں۔ وصیت کے محرکات زیادہ تر یہی ہیں اور عملاً ان اغراض کے علاوہ کسی اور غرض کے لیے اس حق کو بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔

اگر کسی فرد کا کوئی وارث نہ ہو تو احناف کے نزدیک وہ اپنے پورے ترکہ پر وصیت کا حق استعمال کر سکتا ہے[2] کیونکہ اس حق کی تحدید کا اصل مقصد ورثاء کے حق کا تحفظ ہے۔ لیکن امام مالک اور امام اوزاعی اس صورت میں بھی ایک تہائی سے زائد میں وصیت کو درست نہیں سمجھتے کیونکہ جب کوئی متعین فرد اس کا وارث نہیں ہے تو یہ پوری قوم کا سرمایہ ہے اور اس شخص کو لوگوں کے حق کو کالعدم کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

دوم، وصیت کا حق ورثاء کے علاوہ دوسروں کو مال منتقل کرنے کے لیے دیا گیا ہے۔ کسی ایسے شخص کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی جو وارث کی حیثیت سے ترکہ کے ایک حصہ کا حقدار ہو۔ وارث کے حق میں وصیت عملاً اس تناسب میں ترمیم کر دیتی ہے جس کے مطابق مال کو شرعاً تقسیم ہونا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے وارث کے حق میں وصیت کی ممانعت فرماتے وقت اس نکتہ کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔

شرجیل بن حسنہ کہتے ہیں کہ میں نے ابوامامہ کو یہ کہتے سنا ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سنا ہے کہ اللہ نے ہر حقدار کے لیے اس کا حق مقرر کر دیا ہے لہٰذا کسی وارث کے حق میں کوئی وصیت نہیں ہے[3]

---

[1] بخاری کتاب الوصایا۔ [2] احکام القرآن ج ۲ بدائع الصنائع ج ۴ ہدایۃ المجید ج ۲ [3] ابوداؤد۔

جمہور فقہاء کے نزدیک اگر تمام ورثاء اس پر رضامندی کا اظہار کریں تو کسی وارث کے حق میں بھی وصیت کی جاسکتی ہے۔ ان کے نزدیک ایک وارث کے حق میں وصیت سے ممانعت کا مقصد دوسرے ورثاء کے حق کا تحفظ ہے۔ اگر وہ بخوشی اپنے حق کے ایک حصہ سے دوسرے وارث کے حق میں دستبردار ہونے کو تیار ہوں تو اس کی ممانعت کی کوئی وجہ باقی نہیں رہتی ہے۔ لیکن الجصاص نے لکھا ہے کہ وصیت میں صرف وصیت کرنے والے کی زندگی میں ورثہ کی اجازت کافی نہیں ہے۔ اصل اجازت یہ ہے کہ مرنے کے بعد ورثاء اس اجازت کو برقرار رکھیں [1]

وصیت میں ضرار

غیر مضار یعنی نقصان رساں نہ ہو۔ وصیت میں ضرر رسانی یہ ہے کہ ایسے طور پر وصیت کی جائے جس سے مستحق رشتہ داروں کے حقوق تلف ہوتے ہیں۔ مثلاً وصیت نامہ میں کسی اجنبی کے لیے مال کا اقرار کرے یا کسی کے قرض کا فرضی تذکرہ کردے۔ اور مقصد یہ ہو کہ محض حقداروں کو حق سے محروم کردے۔ ایک حدیث موقوف میں اس قسم کے اضرار کو کبائر میں شمار کیا ہے۔ الاضرار فی الوصیۃ من الکبائر، یعنی وصیت میں نقصان رسانی بڑے گناہوں میں سے ہے۔ مضار خود ضرار سے بنا ہے اور حضور انور نے پوری اسلامی زندگی کے بارے میں یہ ضابطہ بتایا ہے کہ لاضرر ولا ضرار فی الاسلام ضرر کے معنے دوسرے کو نقصان پہنچانا اور ضرار کہتے ہیں نقصان کے بدلے میں نقصان کرنا اسلام میں دونوں کی ممانعت ہے۔ یہ حدیث اگرچہ روایتی طور پر درجہ حسن میں ہے مگر یہ آیت قرآنی اور دوسری آیات اس کی صحت کی بہت بڑی ضمانت ہیں۔ ہمارے فقہاء نے اسے ایک کلیہ کے طور پر اختیار کر کے عام شہری زندگی کے لیے اس سے ایک سے زیادہ قاعدے اور ضابطے بنائے۔ لیجئے آپ بھی کچھ سن لیجئے۔ ایک قاعدہ ہے۔

ضرر اور نقصان کی بقدر امکان مدافعت کی جائے گی۔ یہ قاعدہ بتا رہا ہے کہ نقصان کے اندیشے کے تحت اس سے بچاؤ کی تدبیر بقدر استطاعت اختیار کی جائے گی۔ وبا کے پھیلنے کے اندیشے سے مکانوں، بازاروں اور گلیوں کی صفائی ایسی لیے کی جاتی ہے انفرادی اور اجتماعی زندگی میں جہاں اندیشہ نقصان ہو وہاں بقدر امکان نقصان سے بچنے کے وسائل اختیار کیے جائیں گے۔

---

[1] احکام القرآن

اجتماعی زندگی میں جرائم کی سزائیں اسی لیے دی جاتی ہیں. فساد اور بدامنی کی تمام راہوں پر قدغن اسی لیے قائم کیا جاتا ہے۔

انفرادی زندگی میں مفلس عیلون پر پابندی اسی لیے ہے۔ مشترکہ جائیداد کی ایک حصہ دار کے مطالبہ پر جبری تقسیم بھی دفع ضرر کے لیے ہے۔

ایک اور قاعدہ ہے کہ نقصان کو لازماً مٹایا جائے گا. یعنی نقصان ہو جانے کے بعد اس کا ازالہ ناگزیر ہے۔ اجتماعی زندگی میں اگر کسی کا پرنالہ راہ گزرنے والوں کو نقصان پہنچاتا ہے تو پرنالہ کو ہٹایا جائے گا. گلیوں میں جانور باندھنے سے روکا جائے گا۔ اور انفرادی زندگی میں اگر کسی شخص کے درخت کی شاخیں کسی پڑوسی کے گھر میں لٹک کر اسے نقصان دے رہی ہیں تو ان کو ہٹایا جائے گا۔

ایک اور قاعدہ ہے کہ نقصان کو نقصان کے ذریعے نہیں ہٹایا جائے گا۔ نقصان کا ازالہ ایک نقصان کو رونما کرکے نہ کیا جائے گا کیونکہ یہ ازالہ نہیں ہے غریب باپ کے نان نفقہ کی ذمہ داری کا بوجھ غریب بیٹے پر نہ ڈالا جائے گا۔

ایک اور قاعدہ ہے بڑے نقصان کو چھوٹے نقصان کے ذریعے ہٹا دیا جائے گا. غریب رشتہ داروں کے نان ونفقہ کی ذمہ داری سرمایہ دار اقارب پر ڈالی جائے گی۔ اگر کسی کی مرغی کسی کا قیمتی موتی کھا گئی تو موتی والا مرغی کی قیمت دے کر اسے ذبح کرنے کا مجاز ہے۔

ایک اور قاعدہ ہے کہ دو برائیوں اور نقصانوں میں سے معمولی کو اختیار کر لیا جائے گا یا اس کو یوں کہہ دیجیے کہ جب دو برائیاں متعارض ہو جائیں اور ہلکی برائی کو گوارا کرکے بڑی برائی دور کی جا سکتی ہے تو ہلکی کو قبول کر لیا جائے گا۔

عورت مرگئی ہے پیٹ میں بچہ ہے، بچہ کی زندگی کی توقع ہے تو بچہ کی خاطر مردہ عورت کا پیٹ چاک کر دیا جائے گا۔ آپ کسی کو برائی میں مبتلا دیکھتے ہیں اور آپ انکار منکر کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں لیکن آپ کو اندیشہ ہے کہ اگر ان کو روکا گیا تو یہ ڈاکہ ماریں گے یا اور کوئی سنگین جرم کر بیٹھیں گے۔ تو آپ کو تبلیغ ملتوی کر دینی چاہیے۔

ایک اور قاعدہ ہے کہ عمومی ضرر کو ہٹانے کے لیے خصوصی نقصان برداشت کر لیا جائے گا۔ بازار میں ان پڑھ ڈاکٹر دکان کھولے ہوئے ہے۔ عوامی نقصان کی خاطر اس کی پریکٹس پر پابندی لگائی جا سکتی ہے۔ لوگوں نے اشیائے ضرورت کی ذخیرہ اندوزی کر لی عوام کو نقصان سے بچانے کی خاطر مجسٹریٹ کو حق ہے کہ ذخیرہ اندوزوں کے سٹاک کو کھلے بازار فروخت کرنے پر مجبور کرے۔

فقہاء نے قیمتوں کے کنٹرول کا جواز بھی اسی سے نکالا ہے۔ محلہ میں آگ لگ گئی ہے عمومی نقصان سے بچنے کے لیے آگ کے قریب مکانات کا گرادینا جائز ہے۔

مطلب یہ ہے کہ ضرار صرف قرض اور وصیت ہی میں ناجائز نہیں بلکہ زندگی کی تمام شاخوں میں ممنوع ہے مگر خاص طور پر کلالہ کے معاملہ میں اللہ سبحانہ' نے اس کا ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ جس شخص کے نہ اولاد ہو اور نہ ماں باپ اس میں عموماً یہ میلان پیدا ہوتا ہے کہ اپنی جائداد کو کسی نہ کسی طرح تلف کر جائے اور نسبتہً دور کے رشتہ داروں کو حصہ پانے سے محروم کردے۔

قانون وراثت کا خلاصہ

۴۲۔ یہ اللہ کی طرف سے حکم ہے اور اللہ دانا اور بہت بُردبار ہے۔ شروع رکوع سے یہاں تک جو میراثیں بیان فرمائی ہیں وہ پانچ ہیں، بیٹا، بیٹی اور ماں باپ، زوج اور زوجہ، اور اخیافی بھائی ہیں۔ ان پانچوں کو ذوی الفروض اور حصہ دار کہتے ہیں۔ ان پانچوں کی میراث کو بیان فرماکر بطور تاکید فرمادیا کہ یہ حکم ہے اللہ کا اس کی تعمیل ضروری ہے اور اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے، کس نے اطاعت کی، کس نے نافرمانی کی، کس نے میراث وصیت و دین میں حق و انصاف کے موافق کیا، کس نے بے انصافی کی اور ضرر پہنچایا، باقی ظلم و بے انصافی کی سزا میں تاخیر ہونے سے کوئی شخص دھوکہ میں نہ پڑ جائے کیونکہ حق تعالیٰ کا حلم بھی بہت کامل ہے۔

جاننا چاہیے کہ ذوی الفروض کے سواجن کا بیان ہوچکا ایک دوسرے قسم کے وارث ہیں جن کو عصبہ کہتے ہیں ان کے لیے کوئی حصہ مثل نصف ثلث وغیرہ مقرر نہیں ہے بلکہ ذوی الفروض سے جو کچھ بچ رہے گا وہ ان کو ملے گا مثلاً اگر کسی کے عصبہ ہو اور ذوی الفروض میں سے کوئی نہ ہو تو اس کا تمام مال عصبہ کو ملے گا اور اگر دونوں ہوں تو ذوی الفروض کو دے کر جو کچھ بچے گا وہ عصبہ کو ملے گا اور اگر کچھ نہ بچا تو عصبہ کو کچھ نہ ملے گا۔

عصبہ کسے کہتے ہیں

عصبہ اصل میں تو وہ ہے جو مرد ہو عورت نہ ہو اور اس میں اور میت میں عورت کا واسطہ بھی نہ ہو۔ اور اس کے چار درجے ہیں اوّل درجہ میں بیٹا اور پوتا ہے دوسرے درجہ میں باپ اور دادا تیسرے درجہ میں بھائی اور بھتیجا ہے، چوتھے درجہ میں چچا اور اس کا بیٹا یا اس کا پوتا۔ اگر کسی

شخص ہوں تو جو میت کے زیادہ قریب ہے وہ مقدم ہوگا جیسے پوتے کے مقابلہ میں بیٹا، بھتیجے کے مقابلہ میں بھائی مقدم ہے۔ پھر سوتیلے سے حقیقی مقدم ہے اور ان چاروں کے سوا اولاد میں اور بھائیوں میں مرد کے ساتھ عورت بھی عصبہ ہوتی ہے یعنی بیٹے کے ساتھ بیٹی اور بھائی کے ساتھ بہن بھی عصبہ ہوگی۔ یہ عصبہ اصلی نہیں ہے بلکہ غیر اصلی ہے۔ اولاد اور بھائیوں کے سوا عورت عصبہ نہ ہوگی۔ مثلاً چچا کا بیٹا عصبہ ہے مگر اس کے ساتھ ہو کر چچا زاد بہن عصبہ نہیں ہو سکتی۔

ان دونوں قسم مذکورہ بالا یعنی ذوی الفروض اور عصبہ کے سوا امام اعظم ابوحنیفہ کے نزدیک ایک وارث کی تیسری قسم ذوی الارحام ہیں یعنی ایسی قرابت والے کہ ان میں اور میت میں عورت کا واسطہ ہو اور ذوی الفروض میں نہ ہو اور عصبہ بھی نہ ہو جیسے نواسا، نانا اور بھانجا، ماموں، خالہ، پھوپھی اور ان کی اولاد۔ جب کسی میت کے ذوی الفروض اور عصبہ کوئی بھی نہ ہوگا تو اس کی میراث ذوی الارحام کو ملے گی۔ تفصیل کتب فرائض میں مذکور ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ اللہ سبحانہ دانا و بُردبار ہے شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ مقام چونکہ حکم، فرمان اور قانون کا ہے اس لیے مقام کے لحاظ سے یہاں علم و حکمت کا ذکر ہونا چاہیے اگر گناہوں کی معافی، توبہ کی قبولیت کا ذکر ہوتا تو پھر علم و حلم کا ہونا تو مناسب تھا۔ اس میں کیا حکمت ہے کہ علم و حکمت کو چھوڑ کر علم و حلم کا حوالہ دیا ہے۔ جواب یہ ہے کہ یہاں صفت علم لا کر متنبہ کیا ہے کہ اللہ کی حدود، اللہ کے قوانین کی نافرمانی کرنے والوں کو اللہ خوب جانتا ہے اور اس علم کے نتیجے میں قانون کی حدود توڑنے والوں کی ضمناً سزا کی طرف اشارہ آگیا ہے اس لیے اللہ کی صفت علم کا اس وسوسہ کا ازالہ کرنے کے لیے ذکر کیا ہے کہ عذاب اور گرفت میں تاخیر اس لیے نہیں ہوگی کہ اللہ کو تمہاری قانون شکنیوں اور نافرمانیوں کا علم نہیں ہے بلکہ اس لیے ہے کہ اللہ کی ذات حلیم ہے اور حلیم کا مطلب یہ ہے کہ وہ ذات گرامی جو نافرمانی پر سزا میں جلدی نہ کرے۔

اور اسے یوں بھی سمجھیے کہ اللہ تعالیٰ کی صفت علم کا اظہار دو وجہ سے کیا گیا ہے ایک یہ کہ اگر اس قانون کی خلاف ورزی کی گئی تو اللہ کی گرفت سے آدمی بچ نہ سکے گا، دوسرے یہ کہ اللہ نے جو حصے جس طرح مقرر کر دیے ہیں وہ بالکل صحیح ہیں کیونکہ بندوں کی مصلحت جس چیز میں ہے اللہ اس کو خود بندوں سے زیادہ بہتر جانتا ہے اور اللہ کی صفت حلم یعنی اس کی نرم خوئی کا ذکر اس لیے فرمایا کہ اللہ نے یہ قوانین مقرر کرنے میں سختی نہیں کی ہے بلکہ ایسے قاعدے مقرر کیے ہیں جن میں بندوں کے لیے زیادہ سے زیادہ سہولت ہے تاکہ وہ مشقت اور تنگی میں مبتلا نہ ہوں[1]

.....

[1] تفہیم

تِلْكَ حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ يُدْخِلْهُ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ
مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۚ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ۝
وَمَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَيَتَعَدَّ حُدُوْدَهٗ يُدْخِلْهُ نَارًا
خَالِدًا فِيْهَا ۠ وَلَهٗ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ ۝

یہ اللہ کی مقرر کردہ حدود ہیں[25]۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا اسے اللہ ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں چل رہی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہے گا اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے[26]۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کر جائے گا[27]۔ اسے اللہ آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے اہانت آمیز عذاب ہے[28]۔

حدود میں طاعت و عصیان

قانونِ وراثت بیان کرنے کے بعد اس آیت میں اللہ و رسول کی طاعت کو سراہا گیا ہے اور اس کی جزا بتائی گئی اور خدا اور رسول کے عصیان کو بُرا کہا گیا ہے اور اس کی سزا کا ذکر ہوا ہے۔ یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت، پند و موعظت اور سمجھانے کا ہوتا ہے لیکن جو خوش قسمت اقرارِ نبوت کی سعادت حاصل کر لیں تو پھر ان کا تعلق رسول سے اتباع و پیروی اور اطاعت کا ہو جاتا ہے اور اس کے بعد رسول ان کو تبلیغ ہی نہیں بلکہ امر و نہی بھی کرتا ہے۔ کوئی حکومت دوسرے ملک کے کسی باشندے کو اپنی رعایا نہیں بناتی ہے لیکن اگر کوئی شخص برضا و رغبت اس حکومت کی رعایا بن جائے تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جاتا ہے کیونکہ رعایا بننے کے معنے ہی اس کے قانون کو قبول کرنے کے ہیں۔

یہ آیت ایک بڑی خوفناک آیت ہے جس میں ان لوگوں کو عذاب کی دھمکی دی گئی ہے جو اللہ تعالیٰ کے مقرر کیے ہوئے قانونِ وراثت میں تبدیلی کو جائز سمجھیں یا ان دوسری قانونی حدود کو توڑ دیں جو خدا نے اپنی کتاب میں واضح طور پر مقرر کر دی ہیں اور اسے اپنا علمی کارنامہ قرار دیں جیسے آج کل ایران، انڈونیشیا، مصر، تیونس، الجزائر اور پاکستان میں عائلی قوانین کے نام پر ہو رہا ہے۔ اللہ اکبر اس قدر سخت وعید کے ہوتے ہوئے بھی اہلِ ایمان نے قانونِ ازدواج اور قانونِ وراثت میں تبدیلیاں کی ہیں۔ اس کے ثبوت کے لیے ان قومی رہنماؤں اور سیاسی لیڈروں کے بیانات ان کے مضامین، ان کے اعلانات و منشور اور ان کی عملی کارروائیاں اور اقدامات اور وہ معاملہ جو یہ لوگ ان جماعتوں کے ساتھ کرتے ہیں جو ان رجحانات پر تنقید کرتی ہیں بالکل کافی ہے۔ شاید آپ کو یاد ہو کہ نومبر ۱۹۶۳ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے اپنے ڈھاکہ کے اجلاس میں اس عائلی قانون کو منظور کیا اور ان تمام ترمیموں کو جو اس بنیاد پر پیش کی گئیں کہ یہ قانون قرآن و سنت کے نصوص و تصریحات اور اجماع و تعامل کے خلاف ہے مسترد کر دیا۔ اسلام کے منصوص و اجماعی مسائل کے بارے میں ان رہنماؤں کا یہ رویہ تعدی حدود اللہ کا شاہکار ہے۔

اس قانونِ وراثت کے معاملہ میں جو نافرمانیاں کی گئی ہیں وہ خدا کے خلاف کھلی بغاوت کی حد تک پہنچی ہوئی ہیں۔ کہیں عورتوں کو طلاق ہونے پر میراث کا حقدار بنایا جا رہا ہے، کہیں صلبی اولاد کی موجودگی میں پوتوں کو میراث دی جا رہی ہے کہیں سرے سے میراث کی تقسیم کو چھوڑ کر مشترک

خاندانی جائداد کا اعلان ہو رہا ہے کہیں عورتوں اور مردوں کا برابر حصہ بنایا جا رہا ہے اور اب کہیں میت کے ترکہ میں وفات ٹیکس کا اضافہ ہو رہا ہے اور کہیں یہ کہا جا رہا ہے کہ وراثت کا طریقہ ختم کر کے مرنے والے کا ترکہ ریاست کے خزانے میں داخل کر دیا جائے۔ انا اللہ فالی اللہ المشتکی ۔

۲۵ ۔ یہ اللہ کی حدود ہیں ۔ حد اس آڑ اور روک کو کہتے ہیں جو دو چیزوں کو آپس میں ملنے سے روکے ۔ تلک اسم اشارہ ہے اور اس کا مشار الیہ وہ تمام احکام ہیں جو شروع سورت سے یہاں تک بیان ہوئے ہیں یعنی معاشرتی، عائلی اور وراثت کے قوانین، ان کو یہاں حدود اللہ کہا گیا ہے۔ یعنی یہ کسی انسانی فکر کی تخلیق نہیں بلکہ اللہ کے قوانین ہیں ۔ قرآن نے اسی لفظ سے مشتق لفظ محادّہ ان لوگوں کے لیے استعمال کیا ہے جو خدا کی حدود کو نہیں مانتے اور ان کے مقابلہ میں کچھ دوسری حدیں مقرر کر لیتے ہیں چنانچہ ارشاد ہے :

ان الذین یحادون اللہ ورسولہ کبتوا کما کبت الذین من قبلھم

بلاشبہ وہ لوگ خوار کر دیے جائیں گے جو اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کرتے ہیں جس طرح ان سے پہلے لوگ ذلیل و خوار کر دیے گئے ہیں ۔

مشہور مفسر قرآن ابن جریر طبری نے اس آیت کی یہ تفسیر کی ہے یعنی وہ لوگ جو اللہ کی حدود اور اس کے فرائض کے معاملہ میں اس کی مخالفت کرتے ہیں اور اس کی مقرر کی ہوئی حدوں کی جگہ دوسری حدود مقرر کرتے ہیں ۔ قاضی بیضاوی نے اس کی تشریح یوں کی ہے یعنی اللہ اور اس کے رسول سے مخاصمت اور جھگڑا کرتے ہیں یا ان کی مقرر کی ہوئی حدوں کے سوا دوسری حدیں خود وضع کر لیتے ہیں یا دوسروں کی وضع کردہ حدوں کو اختیار کرتے ہیں ۔ علامہ آلوسی بغدادی نے بیضاوی کی اس تفسیر سے اتفاق کرتے ہوئے شیخ الاسلام کا یہ قول نقل کیا ہے کہ اس آیت میں ان سربراہان مملکت اور حکام کے لیے سخت وعید ہے جنہوں نے شریعت کی مقرر کردہ حدود کے خلاف بہت سے احکام وضع کر لیے ہیں اور ان کا نام قانون رکھا ہے ۔ اس مقام پر علامہ آلوسی شرعی قوانین کے مقابلے میں وضعی قوانین کی آئینی حیثیت پر مقابلہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

اس شخص کے کفر میں تو کوئی شبہ نہیں ہے جو اس قانون کو مستحسن اور شریعت کے مقابلہ میں افضل قرار دیتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ زیادہ حکیمانہ اور قوم کے لیے زیادہ مناسب اور موزوں ہے اور جب کسی معاملہ میں اس سے کہا جاتا ہے کہ اللہ و رسول کا فیصلہ اس بارے میں یہ ہے تو اس پر اسے غصہ آجاتا ہے جیسا کہ ہم کچھ ان لوگوں سے ملے ہیں جن پر

اللہ کی پھٹکار پڑی ہوئی ہے۔

اللہ اور اس کے رسول کی طاعت

۲۶۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی فرمانبرداری کرے گا اسے اللہ ایسے باغات میں داخل کرے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔
آلوسی لکھتے ہیں کہ جو بھی احکام و فرائض میں اللہ و رسول کی فرمانبرداری کرے گا اسے یہ جزا ملے گی۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ تقسیم میراث میں جو بھی اللہ و رسول کی حدود کو مانے گا اور ان پر عمل کرے گا ابن کثیر رقمطراز ہیں کہ جو بھی ان حدود و فرائض میں اللہ و رسول کی طاعت کرے گا نہ کسی وارث کو اس کے حصہ سے زیادہ دے گا اور نہ کسی کو اس کے حصہ سے کم دے گا بلکہ اللہ کے حکم اس کے فیصلہ اور اس کی تقسیم کو اپنائے گا اس کو یہ جزا ملے گی۔
اس آیت میں قرآن نے اللہ و رسول کی طاعت کو کامیابی کا ضامن قرار دیا ہے۔ اس سلسلے میں ہمیں ایک غلط فہمی کو دور کرنا ہے جو کچھ لوگوں کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت طاعت کے سمجھنے میں پیش آئی ہے۔ قرآن حکیم میں متعدد آیات اس معنے کی ہیں کہ رسول کی طاعت کرو۔ اور یہ بھی قرآن میں ہے کہ من یطع الرسول فقد اطاع اللہ رسول کی طاعت اللہ کی طاعت ہے۔ اس سے آج کل کے کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہوا ہے کہ رسول کی طاعت صرف قرآن تک محدود ہے۔ قرآن سے باہر اس کی کوئی طاعت نہیں ہے اور اس فریب خوردگی کی اساس ان کی یہ فکری گمراہی ہے کہ رسول کا فرض صرف پیغام پہنچانا ہے یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو انسانوں تک پہنچا دینا اس کا کام ہے۔ اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح نہ اس کا منصب ہے اور نہ اس کا حق ہے ان کے خیال میں رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی ہے۔
شاید ان کو یہ دھوکہ اس آیت کے علاوہ لفظ رسول سے ہوا ہے جس کے لفظی معنے قاصد اور پیغامبر کے ہیں لیکن یہ لوگ خیال نہیں کرتے ہیں کہ جہاں قرآن میں ان کو رسول کہا گیا ہے وہاں نبی خبر پانے والا بھی تو کہا گیا ہے۔ بشیر خوشخبری دینے والا نذیر ڈرانے والا، سراج منیر روشن کرنے والا چراغ، صاحب حکمت، صاحب خلق عظیم، صاحب مقام محمود، مجتبیٰ، مصطفیٰ، مبین، معلم، مزکی، داعی الی اللہ، حاکم، مطاع، آمر اور ناہی بھی تو کہا گیا ہے۔ کیا یہ اوصاف و القاب رسول کی اسی حیثیت کو ظاہر کرتے ہیں کہ وہ قرآن پہنچانے والا ہے جس کو قرآن کے مفہوم و معنی سے

ایک معمولی قاصد کی طرح کوئی سروکار نہیں ہے۔ اس کے پیغام کے مفہوم و معنے کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر عربی داں کو حق حاصل ہے اور اس کی حقیقت تک پہنچ جانے کا ہر شخص مدعی ہے۔ مگر خود صاحب پیغام کو اپنی رسالت کے وقت نہ مفہوم و معنے کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا اس کو حق تھا۔ ان ھذا لشیئ عجاب۔ اس موضوع کے تفصیلی مباحث انشاء اللہ بشرط حیات آپ کو پانچویں پارے میں ملیں گے۔

خدائی حدود سے تجاوز

۱۴۔ اور جو شخص اللہ اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا، اور اس کی مقرر کی ہوئی حدود سے تجاوز کر جائے گا۔ قرطبی نے تجاوز کے معنے مخالفت کرنے کے بتاتے ہیں اور علامہ آلوسی نے یہاں جائز سمجھنے کی قید کا اضافہ ضروری سمجھا ہے۔ شاید موصوف یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ آیت قرآنی میں معتزلہ کی حمایت نہیں ہے کیونکہ اشاعرہ اور معتزلہ میں یہ مسئلہ نزاعی ہے کہ آیا گنہ گار مسلمان بھی ہمیشہ جہنم میں رہے گا یا نہیں۔ اشاعرہ کہتے ہیں دخول تو گناہوں کی پاداش میں ہوگا مگر خلود نہ ہوگا۔ اور معتزلہ کہتے ہیں کہ خلود بھی ہوگا۔ اشاعرہ کی حمایت میں قرطبی نے یہاں یہ نوٹ لکھا ہے کہ اگر یہ گناہ کبیرہ ہے تو پھر لفظ خلود مدت کے لیے بطور استعارہ ہے اور حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں اس آیت میں دو قسم کے لوگوں کا ذکر ہے ایک مطیع کامل دوسرا عاصی کامل۔ اور ایک قسم اس میں غیر مذکور ہے یعنی اعتقاداً مطیع ہو اور عملاً تقصیروار ہو، بظاہر عاصی کامل سے مراد کافر ہے۔ اس تاویل کی بھی ضرورت اسی لیے پیش آئی ہے کہ گنہ گار کے لیے اشاعرہ کے نزدیک خلود نہیں ہے۔

دراصل یہاں حالتیں دو ہیں ایک یہ کہ انسان طبیعت اور ماحول سے مغلوب ہو کر گناہ کرتا ہے دوسری یہ کہ طبیعت اور ماحول پر غالب ہو کر گناہ کرتا اور اس حالت میں وہ گناہ کو گناہ ہی تصور نہیں کرتا ہے۔ ان بزرگوں کو اپنے ماحول میں جن سے سابقہ پڑا ہے وہ بلاشبہ ایسے ہوں گے۔ لیکن آپ اس شخص کے بارے میں کیا رائے قائم کریں گے جو رواج کے مقابلہ میں برملا یہ کہہ رہا ہو میں اسلام کا قانون وراثت نہیں مانتا۔ اور اقتدار کے نشہ میں علانیہ یہ کہتا ہو کہ قرآن کے یہ قوانین اس دور کے لیے نہیں ہیں۔ یہ لوگ یقیناً مغلوب نہیں بلکہ غالب ہیں۔

تعدی حدود اللہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ تمہاری عائلی زندگی اور وراثت کے لیے اللہ کی حدود

ہیں جس طرح تم اپنے رقبوں اور اپنی چراگاہوں کے اردگرد حد بندیاں کرتے ہو اور یہ نہیں چاہتے ہو کہ کوئی ان حدوں کو توڑے اور اگر کوئی ان حدود میں مداخلت کرتا ہے تو تم اس کو اپنی ملکیت میں مداخلت اور اپنی عزت وغیرت کے لیے ایک چیلنج تصور کرتے ہو اسی طرح خدا نے بھی اپنے محارم کے اردگرد حدیں قائم کر دیں۔ ان کو توڑنا اور ان سے تجاوز کرنا یہ اللہ کی عزت وغیرت کو چیلنج کرنا ہے اور جو اس کی عزت کو ہاتھ لگاتا ہے اس کا انجام جہنم کے سوا کچھ نہیں ہے۔

۲۸۔ اللہ اس کو آگ میں داخل کرے گا جس میں وہ ہمیشہ رہے گا اور اس کے لیے اہانت آمیز عذاب ہے۔ یعنی تمام احکام مذکورہ سابقہ متعلق حقوق یتامیٰ وصیت اور میراث اللہ کے مقرر فرمودہ ضابطے اور قاعدے ہیں اور جو کوئی طاعت کرے گا احکام الٰہی کی جن میں حکم وصیت و میراث بھی داخل ہے اس کے لیے ہمیشہ کو جنت ہے اور جو کوئی نافرمانی کرے گا اور حدود خداوندی سے بالکل خارج ہو جائے گا وہ ہمیشہ کو ذلت کے ساتھ عذاب جہنم میں گرفتار رہے گا[1] میراث اور یتامیٰ کی بحث کو ان دو آیتوں پر ختم کرنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہ معاملات قرآن کی نظر میں بے حد اہمیت والے اور بہت ہی غور طلب ہیں۔ ان میں کوتاہی سنگین گناہ ہے۔ اور قرآن کے مقابلہ میں رسوم اور قانون کو ترجیح دینا اور ان پر اڑنا کفر ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَالّٰتِیْ یَاْتِیْنَ الْفَاحِشَةَ مِنْ نِّسَآىِٕكُمْ فَاسْتَشْهِدُوْا
عَلَیْهِنَّ اَرْبَعَةً مِّنْكُمْ ۚ فَاِنْ شَهِدُوْا فَاَمْسِكُوْهُنَّ فِی
الْبُیُوْتِ حَتّٰی یَتَوَفّٰىهُنَّ الْمَوْتُ اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِیْلًا ﴿۱۵﴾
وَالَّذٰنِ یَاْتِیٰنِهَا مِنْكُمْ فَاٰذُوْهُمَا ۚ فَاِنْ تَابَا وَاَصْلَحَا
فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ تَوَّابًا رَّحِیْمًا ﴿۱۶﴾

اور تمہاری عورتوں میں جو بدکاری کی مرتکب ہوں[۲۹] تو ان کے بارے میں اپنے میں سے چار آدمیوں کی گواہی لو[۳۰]، اگر چار گواہ گواہی دے دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کی عمر پوری کر دے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے[۳۱] اور جو دو مرد تم میں سے اس بدکاری کے مرتکب ہوں تو ان دونوں کو اذیت پہنچاؤ[۳۲]۔ پھر اگر وہ توبہ کر لیں اور اصلاح حال کر لیں تو انہیں چھوڑ دو بلاشبہ اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنے

والا مہربان ہے۔ [۳۲]

رذائل میں اصلی فاحشہ ہے

جن برائیوں سے قرآن نے بچنے کا حکم دیا ہے ان میں اوّلین درجہ فاحشہ کا ہے یعنی جس کی برائی کو ہر عقلمند آدمی جانتا اور مانتا ہے اور جس کی بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی و بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔ یعنی اس کی دینی و دنیوی ترقیوں کی راہیں مسدود اور سعادت و اقبال کا دروازہ ان پر بند ہو جاتا ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں جہاں رذائل کی تحریم کا اعلان ہے وہاں فواحش کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ خلوت میں ہوں یا جلوت میں سب حرام ہیں ارشاد ہے انما حرم ربی الفواحش ما ظهر منها وما بطن یعنی اللہ نے بدکاری کی ساری باتیں جو کھلے طور پر ہوں یا چھپا کر کی جائیں حرام کر دی ہیں۔

یہاں عورتوں کا ذکر پہلے لانے کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ میراث میں عورتیں ہی موضوع بنی ہوئی تھیں اور ان ہی کی میراث کو بتانا اصل مقصود تھا۔ اس لیے اس موقعہ پر بھی بات کا آغاز ان ہی سے کیا گیا ہے۔ اوپر کی آیات میں ان مفاسد کے دروازے بند کیے گئے تھے جو مال کی حد سے بڑھی ہوئی طمع سے پیدا ہوتے ہیں اور معاشرے میں فساد اور قطع رحم کا باعث ہوتے ہیں۔ اب آگے جنسی انتشار اور شہوانی بے قیدی پر پابندی عائد کی جارہی ہے اس لیے کہ یہ بے قیدی بھی حرص مال کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ معاشرے کو بازیچۂ شیطان بنا دیتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ یہ سورت ۳ھ سے لے کر ۵ھ کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئی۔ اُحد کی شکست نے اطراف و نواح کے مشرک قبائل، یہودی ہمسایوں اور گھر کے منافقوں کی ہمتیں زیادہ بڑھا دی تھیں اور اہل ایمان ہر طرف سے خطرات میں گھرے ہوئے تھے۔ ان حالات میں یہ تو ممکن نہ تھا کہ اسلامی حدود و تعزیرات کا نفاذ ہو اور نہ ہی یہ بات قرین مصلحت تھی کہ فواحش کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا جائے اس لیے کہ اس سے بدکاری کے اس رجحان کو شہ ملتی تھی جو اس وقت عرب سوسائٹی میں رائج تھا۔ اس لیے یہاں بجائے کسی سنگین

سزا کے عمر قید کی سزا تجویز فرما دی۔ یہ سزا فی الجملہ خرابیوں کو دُور کرنے کے لیے مفید تھی۔ اور یہیں سے آئندہ سنگین سزا کے لیے یہ کہہ کر اَوْ یَجْعَلَ اللّٰهُ لَهُنَّ سَبِيلًا زمین ہموار کر دی۔

۲۹۔ اور تمہاری عورتوں میں جو بدکاری کی مرتکب ہوں اصل ارشاد میں فاحشۃ آیا ہے اس کی جمع فواحش آتی ہے اور اسی کی دوسری صورت قرآن میں فحشاء بھی استعمال ہوتی ہے۔ یہ لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے اصلی معنے حد سے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے لازمی معنے قبح اور برائی کے ہیں۔ کیونکہ جس چیز کی جو حد اللہ سبحانہ نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا برائی پایہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جاتے وہ فحشاء اور فاحشہ ہے قرآن نے زنا اور لواطت دونوں کو فاحشہ کہا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی ہے کہ اللہ سبحانہ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حدیں مقرر کر دی ہیں۔ اب جو ان حدوں سے آگے بڑھ جاتا ہے وہ فحشاء اور فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے جس کی ہر نوع سے اللہ سبحانہ نے اپنے بندوں کو باز رہنے کی تاکید کی۔ امام رازی رقمطراز ہیں کہ یہاں باتفاق مفسرین فاحشہ سے مراد زنا ہے۔ اگرچہ نسا کا لفظ عام ہے مگر کُم کی اضافت نے اسے اہل ایمان کی عورتوں کے ساتھ خاص کر دیا ہے یعنی مسلمان عورتیں اگر اس جرم کا ارتکاب کر لیں تو ان کا حکم کیا ہے۔ اور غالباً اس تخصیص کی وجہ اس پس منظر میں ہے جس سے اہل ایمان اس وقت دوچار تھے۔ اور یہی اس اضافت ہی سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ مسلمان عورتیں شادی شدہ ہوں، کیونکہ تمہاری عورتوں کا مطلب ہی یہ ہے کہ تمہاری بیویاں، اگر اہل ایمان نہیں اور شادی شدہ نہیں ہیں پھر وہ اس جرم کا ارتکاب کرتی ہیں تو قرآن یہاں ان کی سزا کے بارے میں خاموش ہے۔

یہاں یتامیٰ اور مواریث کو بیان کر کے اب دیگر احکام متعلقہ اقارب کو بتلایا جاتا ہے پہلے عورتوں کے متعلق چند باتیں ارشاد ہوتی ہیں جن کا خلاصہ یہ ہے کہ عورتوں کی تادیب و سیاست ضروری ہے اور ان پر کسی قسم کی تعدی اور ظلم بھی نہ کیا جائے۔ اہل جاہلیت کے یہاں عورتوں کی بابت دونوں باتوں میں بہت بے اعتدالیاں ہوتی تھیں اور اس آیت میں تادیب کے بارے میں حکم ہے کہ اگر کسی کی بیوی کا مرتکب زنا ہونا معلوم ہو جائے تو ایسا کرنا چاہیے [1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نصاب شہادت اور اس کی تفصیل

۲۰۔ قرآن کے بارے میں اپنے میں سے چار گواہوں کی گواہی لو۔ یعنی اس کے لیے مسلمانوں میں سے چار گواہ عاقل بالغ آزاد قائم ہونے چاہئیں۔ چار اس لیے کہ معاملہ سنگین اور نازک ہے۔ اس کی سنگینی تو یہی ہے کہ یہ بدترین کردار کا مظاہرہ ہے اور نزاکت یہ ہے کہ ایک مسلمان عورت کی آبرو اور عزت کا سوال ہے اور صرف عورت کا نہیں بلکہ اس کے شوہر کی آبرو کا سوال ہے نہیں بلکہ اس کے پورے خاندان کے وقار کا معاملہ ہے۔ نیز جب کردار کے ہیرو دو ہیں تو گواہی بھی ایک کے لیے دوہری چاہیے اس کا مجموعہ یقیناً چار ہوگا۔ کیونکہ قرآن میں شہادت کا نصاب دو سے کم نہیں ہے۔ مخاطب عام اہل ایمان ہیں۔ عوامی حالات کی کفالت عوام ہی کرتے ہیں اور اسی کفالت کے پیش نظر حکام کا مقرر کرنا عوام کا کام ہے اور حکام عوام کی جانب سے نیابتہً احکام نافذ کرتے ہیں اور حدود قائم کرتے ہیں۔ چار گواہوں سے مرد مراد ہیں۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ زمانۂ نبوت اور زمانۂ خلافت ابوبکر و عمر میں اس قسم کے معاملات میں عورتوں کی شہادت ناقابل قبول ہوتی تھی۔ اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آتی ہے کہ قرآن میں جو ایک مرد کی جگہ دو عورتوں کی شہادت لینے کی اجازت دی ہے اس کا تعلق حدود سے نہیں بلکہ دیوانی معاملات سے ہے۔ اس میں ایک قسم کی بہت گہری معاشرتی مصلحت ہے۔ یعنی یہ کہ قرآن چاہتا ہے کہ عورتوں کو ایسے مواقع اور مناظر سے بھی دور رکھا جائے جہاں فواحش کے جرائم اور ان کی سزاؤں کے نظارے ہوتے ہیں۔ اس قسم کے مناظر بھی انسان کے جذبات و میلانات پر اثر انداز ہوتے ہیں:

یہ شہادت علمی اور خبری نہ ہو بلکہ عینی ہونی چاہیے۔ اس میں اندازہ و تخمین نہ ہو۔ خلاصہ یہ ہے کہ چار شہادتیں ہوں،

۱۔ مسلمان ہوں غیر مسلم نہ ہوں،

۲۔ آزاد ہوں غلام نہ ہوں،

۳۔ عاقل ہوں مجنون نہ ہوں،

۴۔ بالغ ہوں نابالغ نہ ہوں،

لہ افادات شیخ الاسلام

۵۔ مرد ہوں عورتیں نہ ہوں،
۶۔ علمی گواہی نہ ہو یعنی گواہ ہوں۔
شرائط میں اس سنگینی کی وجہ یہ ہے کہ اس قسم کا کردار پورے خاندان کے وقار کو دھکا لگا دیتا ہے۔ اور سوسائٹی میں ایسے کردار کا آدمی بے آبرو ہو کر رہ جاتا ہے کیونکہ یہ فاحشہ کا مرتکب ہے جس کے معنے بہت بڑی برائی کے ہیں۔ اور یہ اس بُرائی کی سنگینی تو ہے کہ قرآن نے یہ نہیں کہا کہ زنا نہ کرو بلکہ فرمایا ولا تقربوا الزنا زنا کے قریب نہ جاؤ۔ یہ نصیحت جس انداز سے کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے اس طرز ادا نے نہ صرف یہ کہ اس فعل بد ہی سے بچنے کی تاکید کی بلکہ اس سے قریب ہو کر گزرنے کی بھی ممانعت کی اس سے یہ نکتہ پیدا ہوا کہ جس طرح اس بدکاری سے بچنا شرافت ہے اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنا شرافت ہے۔

بدکاری پر عورت کو عمر قید کی سزا

۳۱۔ اگر چار گواہ گواہی دیں تو ان کو گھروں میں بند رکھو یہاں تک کہ موت ان کی عمر پوری کر دے یا اللہ ان کے لیے کوئی راستہ نکال دے' یعنی اگر چار آدمی گواہی دے دیں تو اس عورت کو گھر میں مقید رکھنا چاہیے۔ گھر سے باہر جانا اور کسی سے ملنا انتظاماً بالکل روک دیا جائے یہاں تک کہ وہ عورت مرجائے۔ یا اللہ تعالیٰ اس کے لیے کوئی حکم اور سزا مقرر فرمائے۔ اس وقت تک زانیہ کے لیے کوئی حد مقرر نہیں ہوئی تھی۔ اس کا وعدہ فرمایا۔ چنانچہ کچھ عرصہ بعد سورۃ نور میں اس کی حد نازل ہوئی کہ باکرہ کے لیے سو کوڑے اور ثیبہ کے واسطے سنگسار کرنا ہے[1] جمہور شارحین قرآن نے آیت کی یہی تشریح کی ہے اور اس ارشاد او یجعل اللہ لهن سبیلا کا یہی مطلب بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ وحی کے ذریعے آئندہ زنا کی سزا نازل فرمائے گا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ گھروں میں روکنا کوئی حد نہیں ہے بلکہ حد زنا نازل ہونے تک روکنے کا حکم ہے۔ عبادہ ابن الصامت کی اس حدیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جو صحیح مسلم میں آئی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے سے لے لو، میرے سے لے لو۔ بلاشبہ اللہ نے ان کے لیے راہ بنا دی ہے کہ باکرہ لڑکی اور غیر شادی شدہ لڑکا یہ کام کریں گے تو ان کے سو دُرّے اور شہر بدر کی سزا ملے گی اور ثیبہ یہ کام کرے گی تو اسے سو دُرّے اور سنگساری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سزا دی جائے گی۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ یہ گھروں میں روک لینے کا حکم اب بھی باقی ہے۔ ہر شخص کو حد کے قائم ہونے تک گھر میں روکا جائے گا۔ ہدایہ میں ہے کہ حاکم زانی کو عدالتی تحقیقات تک محبوس رکھے گا اور جرم ثابت ہونے کے بعد سزا دے گا۔

مردوں کے لیے بدکاری پر تادیب

۳۲ - جو دو مرد تم میں سے اس بدکاری کے مرتکب ہوں تو ان دونوں کو اذیت پہنچاؤ۔ یعنی دو شخص خواہ ایک مرد اور ایک عورت ہو، خواہ دونوں مرد ہوں، اگر فعل بد کریں تو ان کی سزا مجملاً ایذا دینا ارشاد فرمایا زبان سے ہاتھ سے بقدر ضرورت ان کو تنبیہ و تادیب کرنے کا حکم ہوا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس وقت تک زنا اور لواطت کی سزا اور لواطت دونوں کا حکم یہی تھا کہ حاکم اور قاضی کے نزدیک زجر و عبرت کے لیے جتنی سزا اور شتم و ضرب مناسب ہو اتنی سزا دی جائے۔ اس کے بعد حسب وعدہ حد زنا جب نازل ہوئی تو لواطت کے لیے کوئی حد جداگانہ مقرر نہ فرمائی وہی سزا باقی رہی جو پہلے تھی یا اس کی سزا تلوار سے قتل کرنا یا کسی اور طریقے سے مار ڈالنا ہے۔

اس آیت کو بہت سے علماء نے زنا پر محمول کیا ہے اور بعض نے لواطت پر اور بعض نے دونوں کو شامل رکھا ہے[1]

ان دونوں آیتوں کی تشریح میں علماء تفسیر مختلف الخیال ہیں۔ جمہور کا خیال تو یہی ہے کہ ان دونوں آیتوں میں زنا کی سزا بیان کی گئی ہے۔ پہلی آیت صرف زانیہ عورت کے بارے میں ہے اور ان کی یہ سزا تجویز ہوئی ہے کہ انہیں تاحکم ثانی قید رکھا جائے۔ دوسری آیت زانی مرد اور زانیہ عورت دونوں کے بارے میں ہے کہ ان دونوں کو اذیت دی جائے یعنی مارا پیٹا جائے سخت سست کہا جائے اور ان کی تذلیل کی جائے۔ زنا کے متعلق یہ ابتدائی حکم تھا۔ بعد میں سورۂ نور کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں مرد و عورت دونوں کے لیے ایک ہی حکم دیا گیا کہ ان کو سو سو کوڑے لگائے جائیں۔

اہل عرب چونکہ اس وقت تک کسی باقاعدہ حکومت کے ماتحت رہنے اور عدالت و قانون کے نظام کی اطاعت کرنے کے عادی نہ تھے اس لیے یہ بات حکمت کے خلاف ہوتی۔ اگر اسلامی حکومت قائم ہوتے ہی ایک قانون تعزیرات بنا کر دفعتہً ان پر نافذ کر دیا جاتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو رفتہ رفتہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تعزیری قوانین کا خوگر بنانے کے لیے پہلے زنا کے متعلق یہ سزائیں تجویز فرمائیں پھر بتدریج زنا، قذف اور سرقہ کی حدیں مقرر کیں اور بالآخر اسی بنا پر تعزیرات کا وہ مفصل قانون بنا جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفاء راشدین کی حکومت میں نافذ تھا[1]

بے حیا عورتوں پر پابندی

بے حیا عورت کے متعلق قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ جب اس کی بے حیائی ظاہر ہو چکی ہو تو اس پر پابندی عائد کر دی جائے اور خیال رکھا جائے کہ وہ گھر کی چار دیواری سے نکلنے نہ پائے کیونکہ اس کا نکلنا ہر اعتبار سے نقصان دہ ہے یا عورت خود بے حیائی کے کام کا موقع ڈھونڈ نکالے گی یا بُرے مرد خواہ مخواہ اسے چھیڑیں گے۔ گو وہ نہ بھی جائے کیونکہ یہ بات بڑی حد تک درست ہے کہ جس نے ایک مرتبہ زنا کر لیا اس سے دوبارہ اس جُرم کا ارتکاب بعید نہیں ہے۔ ہاں شادی کے ذریعے اگر شادی نہیں ہوئی ہے اصلاح کی اُمید کی جاتی ہے۔ قرآن کی اس آیت سے نکالنے والوں نے عورتوں پر یہ پابندی لگائی۔ چنانچہ صاحب کشاف علامہ زمخشری نے لکھا ہے:

> یہ بھی جائز ہے کہ یہ آیت منسوخ نہ ہو اور حد کا ذکر یہاں اس لیے چھوڑ دیا گیا ہو کہ یہ کتاب وسنت سے معلوم ہے اور یہاں اس کی تاکید کی جا رہی ہو کہ زناکار عورتوں پر حد کے اجراء کے بعد گھروں میں رہنے کی پابندی لگا دی جائے کہ اب وہ سزا سے محفوظ ہیں جو گھر سے نکلنے اور مردوں سے اختلاط کا نتیجہ ہے[2]

یعنی یہ ضروری ہے کہ زناکار مرد اور عورت کے ساتھ سلوک اس طرح ہو کہ وہ محسوس کریں کہ جو کچھ کیا بہت بُرا کیا، اتنا بُرا کہ سماج اور سوسائٹی بھی اسے برداشت نہیں کر سکتی ہے اور اس طرح وہ اپنے کیے پر پچھتائے کسی لفظ سے اس کے بُرے فعل پر تائید کا پہلو نہ پیدا ہونے پائے تاکہ دوسروں پر بھی یہ معاملہ اثر انداز ہو۔

سحاقت اور لواطت

امام رازی نے ابومسلم اصفہانی سے ان آیات کی یہ تشریح نقل کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلی آیت میں

---

[1] تفہیم [2] کشاف

دو عورتوں کے باہمی ناجائز تعلق کی سزا بتائی ہے اس کو سحاقت کہتے ہیں اور دوسری آیت میں دو مردوں کے درمیان ناجائز تعلق کا ذکر کیا ہے اس کو لواطت کہتے ہیں۔ ان آیات میں زنا کی سزا کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی پہلی آیت کے بارے میں رائے پڑھ چکے ہیں کہ اس کے منسوخ ہونے کے قائل نہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس میں عدالت کی تحقیقات تک محبوس کرنے کا حکم ہے دوسری آیت کے بارے میں وہ ابومسلم اصفہانی کے ہمنوا ہیں چنانچہ فرماتے ہیں،

میرے نزدیک الذان یاتیانھا کا مصداق وہ لوگ ہیں جو عمل قوم لوط کرتے ہیں۔

خواہ امام مجاہد نے بھی آیت کی یہی تفسیر بیان کی ہے۔ اس تفسیر پر لوگوں نے دو اعتراض کیے ہیں۔ ایک یہ کہ فاحشہ کی تفسیر سحاقت اور لواطت سے کرنی اجماع کے خلاف ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر آیت کی یہ تفسیر ہوتی تو صحابہ کرام لواطت کی حد میں مختلف الخیال نہ ہوتے۔ پہلے اعتراض کا جواب امام رازی نے یہ دیا ہے کہ امام مجاہد کا تفسیر کرنا بتا رہا ہے کہ اجماع نہیں ہے۔ تفسیر و تشریح قرآن کے موضوع پر کسی آیت کی نئی تاویل و تشریح جو متقدمین سے منقول نہ ہو ممنوع نہیں ہے اور صحابہ کے اختلاف کی حد تک کہا جا سکتا ہے کہ صحابہ کرام ضرورت کے وقت قرآن کی تشریح و تعبیر کرتے تھے ورنہ وہاں تفسیر قرآن کا کوئی حلقہ نہ تھا۔ ابومسلم اور قاضی ثناء اللہ کے علاوہ دیگر اکابر نے بھی اس کو اختیار کیا ہے۔ قرآن کا انداز تعبیر کچھ اسی کا مؤید ہے۔ یہ بھی زنا کی طرح معاشرے میں شاہراہ پر پیش آنے والے مسائل ہیں۔ ان کو گلیاں اور پگڈنڈیاں کہہ کر نظرانداز نہیں کیا جا سکتا۔ یہ بھی انسانی زندگی کے لیے قانون و اخلاق کی شاہراہ ہے۔ ہاں یہ بات وزنی ہے کہ صحابہ نے لواطت کی سزا میں کیوں اختلاف کیا ہے اس کا جواب صاف اور واضح یہ ہے کہ چونکہ قرآن نے فاذوھما میں ایذا کے چہرۂ اجمال سے پردہ نہیں اٹھایا اور اس کو حکام کے صوابدید اور اجتہاد کے لیے چھوڑ دیا اس لیے دوسرے مسائل کی طرح اس میں بھی اختلاف ہو گیا۔

زنا کے مبادی سے تحفظ

پہلی آیت میں الفاحشۃ سے مراد زنا نہیں بلکہ مبادی زنا ہیں یعنی بے حیائی، یہاں قرآن نے راہ بتائی ہے کہ کس طرح عورتوں کو زنا سے بچانے کے لیے وقت پر اس کا انسداد کرنا چاہیے۔ علاج یہ ہے کہ جب کسی عورت سے مبادی زنا کا ارتکاب ثابت ہو تو اس کا فوری علاج یہ ہے کہ ان کو گھروں میں بند کر دیا جائے یعنی ان کی آزادی سلب کر دی جائے اور ان کو باہر نکلنے سے قطعاً روک دیا جائے یہاں تک کہ اسی حالت میں ان پر موت آ جائے یا اللہ ان کے لیے کوئی راہ نکال دے اور وہ راہ تو بہ ہے اور اگر بے نکاحی

عورتیں ہوں تو شادی سے بھی ان کی حالت سدھر سکتی ہے۔ اس طرح آزادی کے روک دینے سے دو غرضیں حاصل ہوتی ہیں ایک یہ کہ ان کو خود بدی میں مبتلا ہونے کا موقعہ نہیں ملتا دوسرے یہ کہ وہ دوسروں کے لیے نمونہ بد نہیں بنتی ہیں اور مردوں کے لیے ایسا کردار پیدا ہونے پر سزا کو فہمائش تنبیہہ اور زجر تک محدود رکھا ہے۔

آیت کی یہ تشریح کچھ جاندار اور معنے خیز نہیں ہے۔

کیا یہ آیات منسوخ ہیں

جمہور شارحین قرآن نے ان آیات کی جو تشریح کی ہے اس کی بنیاد پر یہ آیات قرآنی منسوخ ہیں۔ لیکن دوسرے اکابر اس کو منسوخ نہیں مانتے ہیں۔ جو لوگ اسے منسوخ کہتے ہیں ان میں اختلاف ہے کہ ناسخ کیا ہے؟ کچھ کہتے ہیں کہ یہ آیت صحیح مسلم کی عبادہ ابن الصامت والی حدیث البکر بالبکر جلد مائۃ وتغریب عام والثیب بالثیب جلد مائۃ والرجم سے منسوخ ہے۔ اور پھر یہ حدیث منسوخ ہے قرآن کی آیت فاجلدوا کل واحد منھما مائۃ جلدہ سے اور آیت منسوخ ہے رجم سے۔ اور کچھ کی رائے ہے کہ قرآن کی یہ آیت قرآن کی دوسری آیت سے جو سورۃ نور میں ہے منسوخ ہے۔ لیکن امام رازی نے علامہ خطابی صاحب معالم السنن کا اپنی تفسیر میں ایک بیان نقل کیا ہے۔ اس بیان میں علامہ خطابی نے جمہور کے موقف کی حمایت کے باوجود یہ موقف اختیار کیا ہے کہ اس آیت اور حدیث میں قطعاً کوئی نسخ نہیں ہے سنیئے آپ بھی لطف اٹھائیے، فرماتے ہیں۔

> اس آیت اور حدیث عبادہ میں قطعاً نسخ نہیں ہوا کیونکہ قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ امساک فی البیوت کا عرصہ تمہید ہے ان کے لیے اللہ کی جانب سے راہ پیدا ہونے تک راہ کی حد تک آیت قرآنی مجمل ہے۔ ارشاد نبوت جو عبادہ ابن الصامت کے حوالہ سے آیا ہے وہ اسی اجمال کا بیان ہے اور یہی حدیث قرآن کی آیت فاجلدوا کل واحد کے لیے مخصص بھی ہے گویا ارشاد نبوت بیک وقت ایک آیت قرآنی کے لیے بیان اور دوسری آیت کے لیے مخصص بن کر آیا ہے۔ میرے خیال میں یہ زیادہ اچھا ہے اس سے کہ یہ کہا جائے کہ یہ آیت حدیث سے منسوخ ہے اور حدیث قرآن کی آیت جلد سے منسوخ ہے۔

بہرحال خلاصہ یہ ہے کہ شارحین قرآن کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ ان آیات میں جس برائی کا ذکر کیا گیا ہے اس سے مقصود زنا ہے اور جس سزا کا حکم دیا گیا ہے وہ اوائل اسلام میں دی جاتی تھی۔

بعد کہ جب سُورۃ نور نازل ہوگئی تو زنا کی حد مقرر ہوگئی اور یہ سزا باقی نہیں رہی لیکن ایک جماعت اس طرف گئی ہے
کہ ان آیات میں اور سورۃ نور میں ایک ہی جرم کی سزائیں نہیں بیان کی گئی ہیں بلکہ دو مختلف جرائم کا ذکر
کیا گیا ہے یہاں جس بدچلنی کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس سے مقصود وہ بدچلنی ہے جو دو عورتیں اور دو مرد آپس
میں کریں اور سورۃ نور میں زنا کا ذکر ہے بس دونوں احکام اپنی جگہ باقی ہیں [1]

درستگی اعمال کے بعد کچھ نہ ہو

۳۳۔ اگر وہ توبہ کرلیں اور اصلاح حال کرلیں تو انہیں چھوڑ دو بے شک اللہ بڑا ہی توبہ قبول
کرنے والا اور مہربان ہے یعنی اس کے بعد اگر وہ بدکاری سے توبہ کرلیں اور آئندہ کو اپنے اعمال کو درست کرلیں
تو اب ان کے پیچھے نہ پڑو اور زجر و ملامت سے ستانا چھوڑ دو۔ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کی توبہ قبول کرنے
والا اور ان پر مہربانی فرمانے والا ہے تم کو بھی ایسا ہی کرنا چاہیے [2] یہاں توبہ اور اصلاح کے دو لفظ
آئے ہیں۔ توبہ کے معنے بدکاری سے علم و عمل اور حال کے اعتبار سے ہٹ جانا اور اصلاح کے معنے آئندہ
دُرست رہنے کا عزم کرلینا۔ علماء نے لکھا ہے کہ توبہ کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ گناہ سے
ہٹ جائے اور آئندہ نہ کرنے کا عزم جازم کرے یہ دونوں شرطیں اس آیت سے معلوم ہو رہی ہیں
اور تیسری شرط ان دونوں کا لازمہ ہے یعنی جو کرچکا ہے اس پر ندامت ہو ظاہر ہے جو کسی مقام سے
ہٹ کر اپنے لیے دوسرا مقام تجویز کرتا ہے وہ اسی لیے کرتا ہے کہ اسے اپنے کیے پر ندامت ہے۔
لیکن کیا اس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر گناہ سے توبہ کرنے کے بعد پھر وہی گناہ کرتا ہے تو کیا اس کی توبہ
باطل ہوجاتی ہے اگرچہ کچھ نے یہی سمجھا ہے لیکن حافظ ابن القیم نے محققین کا خیال یہی بتایا ہے کہ
پہلی توبہ ٹھیک ہے اپنی جگہ ہے اس کا موجودہ گناہ موجودہ ہے پرانا نہیں ہے۔ اگر اس نے پہلی
بار توبہ پورے عزم سے کی ہے تو گناہ کے پھر ارتکاب سے پہلے گناہ کا وبال واپس نہ آئے گا۔

---

[1] ترجمان القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

إِنَّمَا التَّوْبَةُ عَلَى اللَّهِ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السُّوءَ بِجَهَالَةٍ ثُمَّ
يَتُوبُونَ مِن قَرِيبٍ فَأُولَٰئِكَ يَتُوبُ اللَّهُ عَلَيْهِمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ
عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧﴾ وَلَيْسَتِ التَّوْبَةُ لِلَّذِينَ يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ
حَتَّىٰ إِذَا حَضَرَ أَحَدَهُمُ الْمَوْتُ قَالَ إِنِّي تُبْتُ الْآنَ وَلَا الَّذِينَ
يَمُوتُونَ وَهُمْ كُفَّارٌ ۚ أُولَٰئِكَ أَعْتَدْنَا لَهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا ﴿١٨﴾

اللہ کے حضور ان ہی لوگوں کی توبہ کو قبولیت حاصل ہوتی ہے جو
بُرائی کی کوئی بات یا کام نادانی اور حماقت میں کر گزرتے ہیں
اور پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں، ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نظر
عنایت متوجہ کرتا ہے وہ یقیناً سب کچھ جاننے والا اور حکمت
والا ہے"۔ اور ان لوگوں کی توبہ توبہ نہیں ہے جو بُرائیاں
کیے جاتے ہیں تا آنکہ جب ان میں سے کسی کی موت کا
وقت آجاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اب میں نے توبہ کر لی۔ اور

اسی طرح ان لوگوں کی بھی کوئی توبہ نہیں جو کفر کی حالت میں مرتے ہیں ان ہی لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ [۳۵]

توبہ اور اس کی قبولیت کی شرطیں

انسان کے تمام کاروبار میں اصل چیز اس کا دل ہے۔ اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے ناپاک بنتا ہے۔ انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگزاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی بدکرداری و بدعنوانی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیے نکوکاری کا خدا سے مستحکم وعدہ کرلے اس کا نام توبہ ہے۔ یہ توبہ گنہ گار سے گنہ گار انسان کو بھی خدا کی محبت کی آغوش میں لاکر ڈال دیتی ہے۔ آدم علیہ السلام کا قصور اور پھر ان کی توبہ اور رحمتِ الٰہی کا رجوع واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوش رحمت کس طرح گنہ گار انسان کو واپس لینے کے لیے ہمیشہ وا رہتی ہے۔ رحمتِ الٰہی کے اس پُرجوش نظارہ کی جو کیفیت قرآن میں نظر آتی ہے وہ کہیں نہیں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کیفیات اور اصول و شرائط کو جس شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمایا وہ گویا رب العالمین کی طرف سے رحمۃ للعالمین کا خاص حصہ تھا۔ مسند احمد میں حضرت علی کے حوالے سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کا ارشاد ہے:۔

> اللہ سبحانہٗ اس مومن بندے سے محبت رکھتا ہے جو فتنوں میں مبتلا ہے اور ہمیشہ توبہ کرتا ہے۔

جب گناہ بندہ کی طبیعت ہے تو پھر توبہ ضرور اس کی صفت ہونی چاہیے۔ لہٰذا اگر وہ غلط علم، غلط افتادِ طبع اور غلط ماحول سے طرح طرح کے فتنوں کا شکار ہوتا رہتا ہے مگر کبھی اپنی توبہ کی صفت کو فراموش نہیں کرتا تو وہ ارحم الرّاحمین کی نظر میں کیوں نہ پیارا ہو۔ یہاں محبت اس کے

تکرارِ جرم پر نہیں بلکہ اس کی صحت توبہ پر ہے۔ یہ انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا کہ گنہگار اپنے گناہوں پر اصرار کریں بلکہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ جو نادم و شرمسار رہیں وہ دل شکستہ نہ ہوں۔ ایک توبہ کی بھلائی اس کے گناہوں کے سارے دفتر کو دھو کر اس کی جگہ آپ لے لے گی یبدل اللہ سیاتھم حسنات اور یہی اس کی شانِ رحمت کا تقاضا ہے۔ یہاں تک کہ پورا اور اُڈا کو بھی اپنے گناہوں سے توبہ کر لیں تو ان کو بھی بشارت ہے۔ ابوطالب مکی نے قوت القلوب میں مقامات یقین نو بتاتے ہیں ان میں اوّلین درجہ توبہ ہے۔ صاحب عوارف نے مقامات کے ذکر میں توبہ کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے۔ امام غزالی نے احیاء میں توبہ کی حقیقت یہ بتائی ہے کہ توبہ نام ہے تین بالترتیب چیزوں کے ہونے کا۔ علم، حال اور عمل، شیخ مرتضیٰ زبیدی نے ان تینوں پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں اس پر بہت عمیق اور دلچسپ تحقیق فرمائی ہے اور متعدد عنوانوں کے تحت توبہ پر بڑا جامع تبصرہ کیا ہے۔ لیکن توبہ کس کے لیے اور کس شرط کے ساتھ ہے۔ قرآن کی ان آیات میں اسی سوال کا جواب ہے۔ اور یہ سوال اس لیے پیدا ہوا کہ گزشتہ آیت میں یہ بتایا تھا کہ جو لوگ بدکاری کے مرتکب ہوں جب وہ توبہ کر کے اپنی اصلاح کر لیں تو ان کو کچھ نہ کہو۔ اس آیت میں توبہ کی قبولیت کی شرط بتائی جاتی ہے۔

۳۴۔ اللہ کے حضور ان ہی لوگوں کی توبہ کو شرفِ قبولیت حاصل ہوتا ہے جو بُرائی کی کوئی بات یا کام نادانی اور حماقت میں کر گزرتے ہیں پھر فوراً توبہ کر لیتے ہیں ایسے ہی لوگ ہیں جن پر اللہ نظرِ عنایت متوجہ کرتا ہے وہ یقیناً سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ یعنی توبہ تو بے شک ایسی چیز ہے کہ زنا اور لواطت جیسے سنگین جرم بھی اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ معاف فرما دیتا ہے جیسا کہ پہلی آیت سے معلوم ہوا لیکن اس کا بھی ضرور لحاظ رکھو کہ اللہ تعالیٰ نے جو اپنے فضل سے قبول توبہ کا ذمہ لیا ہے وہ اصل میں ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو ناواقفیت اور نادانی سے کوئی صغیرہ یا کبیرہ گناہ کر لیتے ہیں مگر جب اپنی خرابی پر متنبہ اور مطلع ہوتے ہیں تو جبھی نادم ہوتے ہیں اور توبہ کرتے ہیں، سو ایسوں کی خطائیں اللہ ضرور معاف کر دیتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے۔ اس کو معلوم ہے کس نے نادانی سے گناہ کیا اور کس نے اخلاص سے توبہ کی اور حکمت والا ہے۔ جس توبہ کا قبول کرنا موافقِ حکمت ہوتا ہے اس کو قبول فرما لیتا ہے۔

جہالت اور قریب کی قید سے معلوم ہو گیا کہ جو شخص گناہ کو کرے نادانی سے اور تنبیہ کے بعد توبہ کرے جلدی سے تو بقاعدہ عدل و حکمت اس کی توبہ مقبول ہونی ضروری ہے اور جس نے جان بوجھ کر دیدہ و دانستہ اللہ کی نافرمانی پر جرأت کی یا اطلاع کے بعد اس نے توبہ میں تاخیر کی اور پہلی ہی حالت پر قائم رہا تو بقاعدہ عدل و انصاف اس کی خطا اصل میں معافی کے قابل نہیں ہے

اس کا قبول کرلینا محض اللہ کا فضل ہے۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں کی توبہ کو قبول کرلیتا ہے یہ اس کا احسان ہے مگر ذمہ داری صرف پہلی صورت میں ہے باقی میں نہیں ہے [1]

اس آیت میں جہالت اور قریب کی قیدیں معنے خیز اور بے حد اہمیت رکھتی ہیں۔ جہالت کے معنے یہاں نہ جاننے اور عدم علم کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنے اس حماقت اور بیوقوفی کے ہیں جس کے تحت آدمی وہ کام کر بیٹھتا ہے جو تقاضائے عقل کے خلاف ہوتا ہے۔ اس معنے کے لحاظ سے اللہ کی ہر نافرمانی جہالت ہے خواہ وہ معمولی ہو یا غیر معمولی۔ عربی میں جہل و جہالت ان معنے میں استعمال ہوتے ہیں۔

الا لا یجھلن احد علینا فنجھل فوق جھل الجاھلینا

خبردار کوئی ہمارے خلاف حماقت کا مظاہرہ نہ کرے پھر ہم بھی تمام احمقوں سے زیادہ حماقت کا اظہار کریں گے۔

یہ جہالت یعنے حماقت تین وجہ سے ہوتی ہے، طبیعت کی غلط افتاد ماحول اور گرد و پیش کی ناہمواری اور معلومات کی کمی سے یعنی غلط معلومات، طبیعت کے تقاضے اور رسوم و ضوابط کی پیچیدہ دستی سے انسان حماقت کرتا ہے اور اس حماقت کے تحت اللہ کی نافرمانی کرتا ہے۔ الغرض اس دنیا میں خدا کی ہر نافرمانی خواہ بالارادہ ہو یا بلاارادہ حماقت اور جہالت ہے۔ ابوحیان اندلسی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ صحابہ اور تابعین کا اس پر اجماع ہے کہ جو شخص بالارادہ کوئی گناہ کرے اور جان بوجھ کر کرے توبہ کا دروازہ اس کے لیے بھی کھلا ہوا ہے اور کون ہے جو جان بوجھ کر نہیں کرتا ہے اس لیے آیت کے معنے یہ نہیں کہ جو لوگ نادانی سے گناہ کرتے ہیں ان کی توبہ قبول ہوگی ورنہ نہیں، بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ حماقت سے گناہ کر بیٹھتے ہیں اور اس پر اصرار نہیں کرتے اور فوراً توبہ کر لیتے ہیں اللہ ان کی توبہ قبول کر لیتے ہیں اور فوراً کا مطلب یہ نہیں کہ گناہ کے فوراً بعد ہی توبہ ہوگی تو قبول ہوگی ورنہ نہیں بلکہ انسان کی پوری زندگی موت تک فوراً کا مصداق ہے کیونکہ جو چیز آنے والی ہے وہ قریب ہے قیامت بھی آنے والی ہے وہ بھی قریب ہے۔ ارشادِ نبوت ہے کہ جب تک غرغرہ کی حالت نہ ہو توبہ قبول ہے۔

اس آیت میں من قریب کا لفظ بڑھا کر اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ انسان کی ساری زندگی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تھوڑی ہے اور موت جس کو وہ دُور سمجھتا ہے وہ بہت قریب ہے[1]

قریب کی دو حالتیں ہیں ایک یہ کہ زندگی سے ناامیدی ہو جائے لیکن ابھی تک عالمِ آخرت کے احوال اور اہوال نظر نہیں آئے اس حالت کو یاس کہتے ہیں اور دوسری حالت یہ ہے کہ احوال بھی نظر آنے لگیں اس کو حالت بِاس کہتے ہیں۔ پہلی حالت میں کافر کا ایمان اور گنہ گار کی توبہ دونوں مقبول ہیں اور دوسری حالت میں دونوں مقبول نہیں ہیں۔ محققین کا مذہب یہی ہے اور ظاہر قرآن سے بھی سمجھ میں آتا ہے[2]

امام بخاری فرماتے ہیں کہ زنا و سرقہ کے بعد اگر زندگی کے آخری لمحات میں بھی اسلام نصیب ہو جائے یا ان گناہوں سے توبہ کرے تو اس کے یہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

ایک بے حد اہم سوال

یہاں اہل علم میں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اگر ایک شخص کسی گناہ سے ایسی حالت میں توبہ کرتا ہے جب اس کی زندگی میں دوسرے بے شمار گناہ موجود ہیں اور ان پر اصرار بھی ہے کیا ایسی حالت میں اس گناہ سے توبہ صحیح ہے جس کے بارے میں توبہ کر رہا ہے مثلاً ایک شخص سود سے توبہ کرتا ہے لیکن وہ نماز بھی نہیں پڑھتا، جھوٹ بھی بولتا ہے، زنا بھی کرتا ہے، چوری بھی کرتا ہے تو کیا اس حالت میں اس کی سود سے توبہ کو شرف قبولیت مل جائے گا۔ یہ موضوع اگرچہ تفصیل طلب ہے لیکن حافظ ابن القیم نے فیصلہ کن اور راجح بات جو بتائی ہے وہ گوش گزار فرما لیجئے۔ فرماتے ہیں۔ ایسے گناہ سے تو توبہ صحیح نہیں جبکہ اسی قسم کے گناہ اس کی زندگی میں موجود ہوں ہاں ایسے گناہوں سے توبہ درست ہے جبکہ دوسری قسم کے گناہوں سے اس کا دامن آلودہ ہو۔ اسے مثال سے سمجھئے ایک شخص سود خوار بھی ہے اور شرابی بھی، سود سے توبہ کرتا ہے مگر شراب سے باز نہیں آتا۔ سود سے اس کی توبہ درست ہے اور ایک شخص سود کھاتا ہے اور سود کی دو قسموں میں سے ربا فضل سے توبہ کرتا ہے مگر ربا اصلی نسیئہ سے توبہ نہیں کرتا، یا افیم سے توبہ کرتا ہے مگر شراب پیتا رہتا ہے اس کی توبہ درست نہیں ہے اس کی پوزیشن اس شخص سے قطعاً مختلف نہیں ہے۔ جو حمیدہ نامی عورت سے زنا کی توبہ کرتا ہے مگر نسیمہ نامی سے منہ کالا کرتا رہتا ہے۔ یا انگوری شراب سے توبہ کرتا ہے مگر دوسری

---

[1] معارف م سشی [2] بیان القرآن

شراب میں مبتلا رہتا ہے۔ اس کی توبہ توبہ نہیں ہے۔ یہ گناہ سے توبہ نہیں کر رہا ہے بلکہ گناہ کی ایک نوع سے ہٹ کر دوسری نوع کی طرف جانے کی راہ ہموار کر رہا ہے۔ یہ ہرگز اس شخص کی طرح نہیں جو معصیت کی ایک جنس سے توبہ کر رہا ہو جبکہ معصیت ہی کی دوسری جنس میں مبتلا ہو۔ شراب سے توبہ کرتا ہے، اور چوری میں مبتلا ہے اس کی شراب سے توبہ قابلِ قبول ہے۔ جس گناہ سے توبہ کرے گا اس کی توبہ صحیح ہے اور جس سے نہ کرے گا اس کا مواخذہ ہوگا۔

جرائم پیشہ لوگوں کی توبہ

۳۵ - اور ان لوگوں کی توبہ توبہ نہیں جو برائیاں کیے جاتے ہیں تا آنکہ جب ان میں سے کسی کی موت کا وقت آجاتا ہے تو کہتے ہیں کہ اب میں نے توبہ کرلی اور اسی طرح ان لوگوں کی بھی کوئی توبہ نہیں ہے جو کفر کی حالت میں مرجاتے ہیں ان ہی لوگوں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یعنی ایسے لوگوں کی توبہ قبول نہیں ہوتی جو برابر گناہ کیے جاتے ہیں اور باز نہیں آتے یہاں تک کہ موت ہی نظر آگئی تو اس وقت کہنے لگا کہ اب میں توبہ کرتا ہوں اور نہ ان کی توبہ قبول ہوگی جو کفر پر مر گئے اور اس کے بعد عذابِ آخرت کو دیکھ کر توبہ کریں ایسے لوگوں کے واسطے عذابِ شدید تیار ہے۔

جاننا چاہیے کہ یہ دونوں آیتیں جو توبہ کے قبول ہونے اور نہ ہونے کے موضوع پر یہاں آئی ہیں۔ ہم نے ان کا جو مطلب بتایا ہے یہ بعض اکابر محققین کی تحقیق کے مطابق ہے اور اس میں یہ خوبی ہے کہ قید جہالت اور لفظ قریب دونوں اپنے ظاہری معنے پر ہیں اور علی اللہ کے معنے بھی آسانی سے بن گئے۔ اور اس موقعہ پر قبول اور عدمِ قبول توبہ کے ذکر فرمانے سے جو مقصد ہے یعنی توبہ کیف ما اتفق مقبول نہیں۔ اور توبہ کی چند صورتیں ہیں۔ اور ان کی مقبولیت میں باہم فرق ہے تاکہ کوئی توبہ کے اعتماد پر معاصی پر جری نہ ہو جائے۔ یہ مقصد بھی اس صورت میں خوب حاصل ہو جاتا ہے مگر مفسرین حضرات نے علی العموم جو ان آیتوں کا مطلب ارشاد فرمایا ہے تو قید جہالت کو قید احترازی اور شرطی نہیں بلکہ قید واقعی فرماتے ہیں اور کہتے ہیں کہ گناہ ہمیشہ نادانی اور حماقت سے ہوتا ہے اور قریب کے معنے یہ لیتے ہیں کہ حضورِ موت سے پہلے جس قدر وقت ہے وہ قریب ہی ہے کیونکہ دنیا کی زندگی قلیل ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اللہ کا توبہ قبول کرنے کا وعدہ ان سے ہے کہ سفاہت اور عدمِ انجام بینی سے گناہ کر لیتے ہیں اور پھر موت کے آنے سے پہلے تائب ہو جاتے ہیں اور جو لوگ کہ موت کا مشاہدہ کر چکے ہیں اور نزع کی حالت کو پہنچ چکے ہیں یا جو لوگ کفر پر مر چکے ان کی توبہ ہرگز قبول

نہ ہوگی۔ اس تقریر کے موافق توبہ کرنے والوں کی دو صورتیں ہیں۔ جو تقریر اول میں مذکور ہوئیں شق اول یعنی قبول توبہ میں شمار ہوں گی۔

جب موت کا یقین ہو چکے اور دوسرا عالم نظر آنے لگے تو اس وقت کی توبہ قبول نہیں اور عالم آخرت کے دیکھنے سے پہلے کی توبہ قبول ہوتی ہے۔ اتنا فرق ہے کہ حسب تقریر اول صورت اولیٰ میں تو قبول توبہ قاعدۂ عدل و انصاف کے موافق ہے اور دوسری صورتوں میں قبول توبہ اس کا محض فضل ہے [1]

یہاں توبہ کا لفظ اللہ اور بندے دونوں کے لیے استعمال ہوا ہے۔ توبہ کے معنے رجوع اور پلٹنے کے ہیں۔ گناہ کے بعد بندے کا خدا سے توبہ کرنا یہ معنے رکھتا ہے کہ ایک غلام جو اپنے آقا کا نافرمان بن کر اس سے منہ پھیر گیا تھا اب اپنے کیے پر پشیمان ہے اور اطاعت و فرمانبرداری کی طرف پلٹ آیا ہے اور خدا کی طرف سے بندے پر توبہ یہ معنے رکھتی ہے کہ غلام کی طرف سے مالک کی نظر عنایت جو پھر گئی تھی وہ از سر نو اس کی طرف منعطف ہو گئی [2]

اس تفصیل سے توبہ کے بارے میں چند اہم حقائق واضح ہو کر سامنے آ گئے۔

توبہ کی توفیق اور قبولیت

۱۔ بندہ کی توبہ اللہ کی دو توبوں کے درمیان ہوتی ہے۔ ایک بندے کی توبہ سے پہلے اور ایک اس کے بعد۔ اللہ کی جانب سے پہلی توبہ یہ ہے کہ وہ بندے کو اپنی بارگاہ میں توفیق توبہ ارزانی فرماتا ہے۔ اور دوسری توبہ یہ کہ اللہ سبحانہٗ بندے کی توبہ کو شرف قبول عطا فرماتا ہے۔

تاب علیہم لیتوبوا ان اللہ ھو التواب الرحیم

مہربان ہوا ان پر اللہ تاکہ وہ توبہ کریں یقیناً اللہ توبہ قبول کرنے والا رحیم ہے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ اولاً اللہ نے ان پر مہربانی کی اس کی یہ مہربانی ان کی توبہ کا سبب ہوئی اور پھر جب انہوں نے توبہ کی تو اللہ نے اس کو شرف قبول بخشا۔ گویا اللہ کی اولین مہربانی یعنی توبہ ان کی توبہ کی علت ہوئی۔ اس لحاظ سے اللہ بھی تواب ہے بندہ بھی تواب ہے۔ بندے کی توبہ اپنے کیے پر پشیمان ہو کر اللہ کی طاعت و فرمان کی طرف پلٹنا ہے اور اللہ کی توبہ کی دو قسمیں ہیں ایک توفیق دوسرے قبولیت۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم۔

اسباب گناہ نہ ہوں پھر توبہ

۲۔ گنہ گار اگر اسباب معصیت نہ ہونے کے بعد توبہ کرے کیا اس کی توبہ درست ہے؟ مثلاً جھوٹ بولنے والا، تہمت لگانے والا، جھوٹا گواہ اگر ان کی زبانیں گنگ ہو جائیں یا کٹ جائیں کہ اب جھوٹ بولنا ان کی قدرت میں نہیں ہے۔ زانی اگر نامرد ہو جائے کہ اب زنا پر قادر نہیں ہے، چور کے ہاتھ اور پاؤں کٹ جائیں کہ اب چوری پر قدرت ختم ہے یعنی معصیت کے اسباب و دواعی بھی اگر ناپید ہو جائیں تو پھر اس کی پہلے گناہوں سے توبہ صحیح ہے یا نہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس کی توبہ صحیح نہیں ہے اور صحیح یہ ہے کہ ان کی توبہ بھی صحیح ہے۔ اس لیے کہ توبہ کے سارے ارکان موجود ہیں اور ان میں سے اپنے کیے پر ندامت اس کی قدرت میں ہے۔ حضور انور نے ندامت کی اسی قوت کو اس ارشاد سے واضح کیا ہے جو مسند احمد میں ہے یعنی الندم توبۃ ندامت توبہ ہے جب ندامت اور پشیمانی موجود ہے اور یہی توبہ کے ارکان میں بنیادی حیثیت رکھتی ہے اور اس کا نفس بھی اسے اپنے کیے پر ملامت کر رہا ہے تو توبہ کے صحیح نہ ہونے کے کوئی معنے نہیں۔ شریعت میں نیت صحیح ہونے پر عاجز عن الطاعۃ کو فاعل طاعت کے مرتبہ میں رکھا ہے۔ حدیث صحیح ہے۔

بندہ جب بیمار ہو جاتا ہے یا مسافر ہو جاتا ہے تو اس کے لیے زمانہ صحت اور قیام ہی کا عمل لکھا جاتا ہے۔

توبہ کی صحت کا دارومدار

۳۔ کیا توبہ کے صحیح ہونے کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ جس گناہ سے توبہ کر رہا ہے وہ پھر کبھی نہ ہو۔ اس میں فیصلہ کن اور صحیح رائے یہی ہے کہ توبہ کی صحت کی یہ شرط نہیں ہے۔ توبہ کی صحت کا دارومدار اس پر ہے۔ ۱۔ گناہ سے ہٹ جائے، ۲۔ جو کچھ کر چکا اس پر ندامت کا اظہار کرے، ۳۔ آئندہ نہ کرنے کا عزم جازم کرے۔ اگر توبہ کے وقت میں نہ کرنے کا عزم جازم موجود ہے۔ اور اس کے بعد پھر اسی گناہ سے اس کا دامن آلودہ ہو جاتا ہے تو یہ اس کا گناہ پر نیا اقدام ہے اس کا پہلی توبہ پر کوئی اثر نہ ہوگا۔ معاملہ کی بنیاد اس قانون پر ہے کہ بندہ جب کسی گناہ سے توبہ کر لیتا ہے اور پھر اسی گناہ کا ارتکاب کر لیتا ہے تو کیا توبہ سے پہلا گناہ جس سے توبہ کی تھی پھر واپس آجاتا ہے۔ اگر مر جائے کیا دونوں کی سزا کا مستحق ہوگا؟ یا پہلا ختم ہو چکا ہے دوسری بار کے گناہ کی سزا ملے گی؟

اس سوال کے جواب میں کہنے والوں نے اگرچہ بہت کچھ کہا ہے مگر اہل السنۃ والجماعۃ اس سوال کا جواب ایک ہی دیتے ہیں کہ جس گناہ سے پہلے توبہ کر چکا ہے واپس نہ ہوگا وہ توبہ سے ختم ہو کر کالعدم ہو چکا ہے اب وہ معدوم موجود نہ ہوگا۔ اب جو کچھ ہے وہ موجودہ گناہ ہے اور اس کو از سر نو کرتا ہے۔ علماء نے لکھا ہے کہ توبہ کی صحت کے لیے موت تک عصمت شرط نہیں ہے صحت توبہ کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ندامت ہو اور بالفعل گناہ سے ہٹ جائے اور نہ کرنے کا عزم کرے۔ یہ تین چیزیں گناہ کو ناپید کر دیتی ہیں۔ گناہ کی حیثیت ارتداد کی نہیں ہے جس سے تمام اعمال حیات کالعدم ہو کر رہ جاتے ہیں یہ کفر ہی ہے جو تمام نیکیوں کو رائیگاں کر دیتا ہے۔ گناہ سابقہ نیکیوں کو رائیگاں نہیں کرتا۔ آخر توبہ ہی تو حسنات میں عظیم تر حسنہ ہے اگر یہ گناہ سے ناپید ہوتی ہے تو دوسری نیکیاں بھی ختم ہو سکتی ہیں، ایسا سوچنا بھی غلط ہے اس سے تو خوارج اور معتزلہ کے مسلک کی بو آتی ہے۔ خوارج تو گناہ سے کافر بتا کر جہنم میں پہنچاتے ہیں اور معتزلہ کافر تو نہیں بتاتے مگر فاسق بتا کر گنہ گار کو ہمیشہ جہنم میں رکھتے ہیں۔ قرآن و سنت کی روشنی میں دونوں راہیں غلط ہیں۔ عقل و نقل اور تقاضائے عدل کے خلاف ہیں واللہ لا یظلم مثقال ذرۃ،

قرآن میں اللہ سبحانہ نے توبہ کی قبولیت کو استغفار اور عدم اصرار پر ضرور معلق کیا ہے لیکن پھر نہ کرنے کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے۔ توبہ کا استمرار خود توبہ کے کمال اور اس کے نافع ہونے کی شرط ہے لیکن ماضی کی توبہ کے صحیح ہونے کی شرط نہیں ہے۔

اہل السنۃ والجماعۃ کے مسلک کے مطابق یہ بہت ممکن ہے کہ ایک شخص مختلف حالات میں عداوت الٰہی اور محبت کا گہوارہ ہو نماز پڑھتا ہے مگر روزہ نہیں رکھتا۔ ایک کی جزا اور دوسرے کی سزا ملے گی بلکہ ایک ہی شخص مختلف حالات میں اخلاص و نفاق اور ایمان و کفر کا جامع ہو۔ قرآن میں اہل ایمان کے لیے مقارنت شرک بتایا ہے یا یوں کہہ دیجیے مقارنت شرک کے باوجود اہل ایمان کہا ہے حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

> اگر اس شرک کے ساتھ نبوت کا بھی انکار ہو تو ایسا ایمان قطعاً سودمند نہیں ہے لیکن اگر نبوت کی تصدیق کرتا ہے اور مختلف انواع کے شرکوں کے دھبے دامن کو لگے ہوتے ہیں تو ان کے دھبے ان کو ایمان بالرسل اور ایمان بالیوم الآخر سے نہیں نکالیں گے یہ لوگ بہت بڑی وعید کے مستحق ہیں۔ ان کا شرک دو قسم کا ہے خفی اور جلی، خفی تو معاف ہو جائے گا مگر جلی کو اللہ توبہ کے بغیر معاف نہ کرے گا۔[1]

[1] مدارج السالکین

توبہ کے بعد سابق درجہ

۳- یہ پہلے سن ہو کر توبہ یقین کے مقامات میں سے اولین مقام ہے اور اس سے خواہ کوئی کمال کے کتنے درجات طے کر جاتے بے نیاز نہیں ہے لیکن یہاں یہ سوال بے حد اہم ہے کہ گناہ سے توبہ کے بعد کیا بندہ گناہ سے پہلے مقام پر پہنچ سکتا ہے یا نہیں صوفیا اور عرفا کا اس میں اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ پہنچ جاتا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ نہیں، حافظ ابن تیمیہ نے یہاں بڑے پتے کی بات بتائی ہے کہ یہ اپنی اپنی صلاحیت، استعداد اور قابلیت کی بات ہے۔ کچھ ایسے ہیں جو نہیں پہنچتے، کچھ ایسے ہیں جو پہنچ جاتے ہیں اور کچھ ایسے ہیں جو پہلے سے زیادہ اونچے مقام پر پہنچ جاتے ہیں اور یہی صحیح ہے۔

کافر و عاصی کا تقابلی مطالعہ

کافر کا کفر سے توبہ کرنا اور عاصی کا معصیت سے توبہ کرنا دونوں صورت کے اعتبار سے یکساں ہیں مگر وزن کے اعتبار سے مختلف ہیں۔ کافر کے لیے بھی قرآن نے عفو و کرم کے قانون کو ان لفظوں میں پیش کیا ہے:

ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف

اگر وہ باز آجائیں تو ان کے پچھلے قصور سب معاف کر دیے جائیں گے۔

ایسے ہی قرآن نے گنہگاروں کی مغفرت کی خبر بھی سنائی:

لا تقنطوا من رحمۃ اللہ ان اللہ یغفر الذنوب جمیعاً

مایوس نہ ہو اللہ کی رحمت سے اللہ سارے گناہ بخش دے گا۔

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ معافی کا قانون کیا ہے؟ فرمایا جو لوگ گناہ جذبات سے مغلوب ہو کر یا ماحول سے مجبور ہو کر یا راہ سے بے خبر ہو کر کرتے ہیں لیکن جب عمل کی اس جہالت کا پردہ ہٹتا ہے تو شرمندہ ہو کر اپنے قصور کی معافی مانگ لیتے ہیں ایسے بندوں کے لیے میری رحمت کا دروازہ ہر وقت کھلا ہے۔ گناہ خواہ کیسے ہوں سب معاف ہو جائیں گے۔ ہاں وہ لوگ جو خدا سے بے خوف اور بے پروا ہو کر تمام عمر گناہ پر گناہ کیے چلے جاتے ہیں اور ملک الموت کے سامنے آنے پر معافی مانگتے ہیں ان کی توبہ توبہ نہیں ہے۔ اب امتحان کی مہلت پوری ہو چکی ہے اور کتاب زندگی کا آخری ورق الٹ چکا ہے اب توبہ کا موقع نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا يَحِلُّ لَكُمْ أَنْ تَرِثُوا النِّسَاءَ كَرْهًا ۖ وَلَا
تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ إِلَّا أَنْ يَأْتِينَ
بِفَاحِشَةٍ مُبَيِّنَةٍ ۚ وَعَاشِرُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ
فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا ﴿١٩﴾ وَإِنْ أَرَدْتُمُ
اسْتِبْدَالَ زَوْجٍ مَكَانَ زَوْجٍ وَآتَيْتُمْ إِحْدَاهُنَّ قِنْطَارًا فَلَا
تَأْخُذُوا مِنْهُ شَيْئًا ۚ أَتَأْخُذُونَهُ بُهْتَانًا وَإِثْمًا مُبِينًا ﴿٢٠﴾
وَكَيْفَ تَأْخُذُونَهُ وَقَدْ أَفْضَىٰ بَعْضُكُمْ إِلَىٰ بَعْضٍ وَأَخَذْنَ
مِنْكُمْ مِيثَاقًا غَلِيظًا ﴿٢١﴾

اے اہل ایمان! تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ عورتوں کو زبردستی اپنی میراث بنالو، اور نہ یہ حلال ہے کہ جو کچھ تم ان کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ لینے کی خاطر ان کو تنگ کرو، ہاں اگر وہ علانیہ بدکاری کا ارتکاب کریں[۳۶]، اور تم ان کے ساتھ اچھے طریقہ سے رہو سہو،

پھر اگر تمہیں وہ ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو اور اللہ نے اسی میں تمہارے لیے بہت کچھ بہتری رکھ دی ہو[۳۷]۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کرو تو چاہے تم نے اُسے ڈھیروں ڈھیر مال دیا ہو اُس میں سے کچھ واپس نہ لینا، کیا تم اسے بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لوگے[۳۸]۔ آخر تم اسے کیسے لوگے حالانکہ تم دونوں ایک دوسرے سے میاں بیوی کے تعلقات رکھ چکے ہو اور تمہاری بیویاں تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں[۳۹]۔

عرب جاہلیت کے مکروہ رواج کی اصلاح

پہلے اسلام سے پہلے عام طور پر یہ عقیدہ پھیلا ہوا تھا کہ مال و جائداد کی وراثت میں لڑکیوں کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ قرآن نے اس گمراہی کا ازالہ کیا اور یہ اصول قائم کیا کہ حقدار ہونے کی حیثیت سے مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔ اسی طرح عرب جاہلیت میں عورتوں کے ساتھ جو ناانصافیاں کی جاتی تھیں ان میں ایک ناانصافی یہ بھی تھی کہ اگر کوئی شخص مر جاتا تو جیسے اس کا مال و متاع وارثوں کے قبضے میں چلا جاتا اسی طرح اس کی بیویوں پر بھی وہ قابض و متصرف ہو جاتے،

دوسرے مختلف طریقوں سے عورتوں کو مجبور کیا جاتا کہ اپنا مہر چھوڑ دیں،

تیسرے یہ کہ ان کی یہ سر توڑ کوشش ہوتی تھی کہ جو کچھ مال و متاع عورتوں کے قبضے میں ہے مردوں کے قبضے میں چلا جائے۔

چوتھے یہ کہ بعض اوقات بیوی کا کوئی قصور نہ ہوتا اور وہ شوہر کو پسند نہ ہوتی لیکن وہ اسے طلاق دے کر اس لیے جدا نہ کرتا تاکہ زیور اور مہر جو لے دے چکا تنگ آکر واپس کر دے۔ قانون وراثت بیان کرنے کے بعد حدود سے تعدی کا قانون بیان کیا تھا۔ پھر اس قانون کی خاص صورتیں بیان کیں۔ ان میں ایک صورت یہ تھی کہ مرد یا عورت بدکاری کے مرتکب ہو جائیں ان کی سزا بیان کر کے بتایا کہ اگر مرد توبہ کر لیں تو پھر کچھ نہ کہو۔ اس کے بعد توبہ کی قبولیت کی شرطیں بتائی ہیں اب عورتوں کے ساتھ ہونے والی ناانصافیوں کو بیان کیا جا رہا ہے۔

۲۶ ۔ اے اہل ایمان تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ عورتوں کو زبردستی اپنی میراث بنا لو اور نہ یہ حلال ہے کہ جو کچھ تم ان کو دے چکے ہو اس میں سے کچھ لینے کی خاطر ان کو تنگ کرو۔ ہاں اگر وہ علانیہ بدکاری کا ارتکاب کریں۔ حسب بیان سابق عورتوں کی بدافعالی کی بابت تادیب و سیاست کا حکم دے کر اب اہل جاہلیت کی اس ظلم و تعدی کو روکا جاتا ہے جو وہ عورتوں پر طرح طرح سے کرتے تھے۔ من جملہ ان صورتوں کے ایک صورت یہ تھی کہ جب کوئی مر جاتا تو اس کی عورت کو میت کا سوتیلا بیٹا یا بھائی یا اور کوئی وارث لے لیتا۔ پھر چاہتا تو اس سے نکاح کر لیتا یا بغیر نکاح ہی اپنے گھر میں رکھتا یا کسی سے نکاح کر کے اس کا مہر کل یا بعض لے لیتا یا ساری عمر اس کو اپنی قید میں رکھتا اور اس کے مال کا وارث ہوتا یہ آیت اس کے بارے میں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جب کوئی مر جائے تو اس کی عورت اپنے نکاح کی مختار ہے میت کے بھائی اور اس کے کسی وارث کو یہ اختیار نہیں ہے کہ زبردستی اپنے نکاح میں لے لے نہ وہ عورت کو نکاح سے روک سکتے ہیں کہ وہ مجبور ہو کر خاوند کے ورثہ سے جو اس کو ملا تھا کچھ پھیر دے۔ ہاں اگر صریح بدچلنی کریں تو ان کو روکنا چاہیے[1]

مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے یہ حلال نہیں ہے کہ تم عورت کو میت کا ترکہ سمجھ کر اس کے وارث بن جاؤ اور زبردستی اس سے نکاح کر لو یا کسی دوسرے سے نکاح کرا دو اور اس کا مہر خود کھا جاؤ یا ان کو نکاح سے روکے رکھو تاکہ جب وہ مر جائیں تو ان کے مال کے وارث بن جاؤ۔[2]

اس آیت میں کرھاً بمعنے جبر کی قید بطور شرط نہیں ہے یعنی یہ مطلب نہیں ہے کہ عورتوں

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف م ا۔

کی رضامندی سے ان کا مالک بن جانا درست ہے بلکہ یہاں واقعہ کے لیے ضروری ہے کہ عورتوں کی جان و مال کا بلا وجہ شرعی و عقلی مالک بن بیٹھنا ظاہر ہے کہ جبراً ہی ہو سکتا ہے اس پر کوئی ہوش و عقل والی عورت خوش کب ہو سکتی ہے۔ (بحر محیط) اسی بنا پر شریعت نے اس معاملہ میں عورت کی رضامندی کو مؤثر قرار نہیں دیا۔ کوئی عورت اگر حماقت سے کسی کی مملوکہ بننے پر رضامند بھی ہو جائے تو اسلامی قانون اس پر راضی نہیں کہ کوئی آزاد انسان کسی کی ملک ہو۔

یہاں یہ نکتہ بلاغت خاص طور پر توجہ کے لائق ہے کہ ظلم و فساد سے ممانعت کے لیے عام تعبیر اور انداز بیان کو چھوڑ کر عدم تحلیل کی تعبیر اختیار کی ہے یعنی بجائے اس کے کہ یوں کہتے کہ ظلم نہ کرو۔ یوں ارشاد ہوا ہے کہ تمہارے لیے یہ ظلم حلال نہیں ہے اس میں اس کے شدید اور سنگین گناہ ہونے کے ساتھ اس طرف بھی اشارہ ہے کہ کسی نے کسی بالغ لڑکی سے بغیر اس کی رضا اور رغبت کے شادی کر بھی لی تو شرعاً وہ حلال نہیں ہے بلکہ نہ ہونے کے برابر تصور ہوگا۔ ایسے رشتہ سے نہ ان میں ازدواجی تعلق قائم ہوگا اور نہ ہی وراثت و نسب کے علائق ہوں گے۔

ٹھیک اسی طرح اگر کسی نے کسی عورت کو مجبور کر کے اس سے دیا ہوا مہر واپس لے لیا یا واجب الاداء مہر کو جبراً معاف کرا لیا تو یہ جبری واپسی یا معافی شرعاً ناقابل اعتبار ہے[1]

زیادہ واضح لفظوں میں یوں سمجھو کہ اس آیت میں جاہلیت عرب کی اس ناپاک اور قبیح رسم کی اصلاح کی ہے کہ ان کے بعض طبقات میں یہ رواج تھا کہ مورث کی جائداد اور اس کے مال مویشی کی طرح اس کی بیوی بھی وارث کی طرف وراثت میں منتقل ہو جاتی تھی۔ حد یہ ہے کہ باپ کی منکوحہ بیوی پر بھی بیٹے قبضہ کر لیتے۔ قرآن نے یہاں کھول کر بتا دیا کہ عورت متروکہ جائداد نہیں ہے بلکہ آزاد ہے اس کے ساتھ وراثت کا معاملہ جائز نہیں یہ انسان ہے مال نہیں ہے وہ اپنی مرضی کی مالکہ اور شریعت کی حدود میں آزاد ہے۔

دوسرے فقرے لا تعضلوھن کے ذریعے یہ بات ذہن نشین کرائی ہے کہ مہر یا میراث پر قبضہ کرنے کی خاطر عورتوں کو تنگ نہ کرو۔ عضل کے معنے تنگ کرنے، زچ کرنے اور روکنے کے آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی کو ناپسند ہو اور چھوٹ چھٹاؤ کی نوبت آئے تو اس سے اپنا دیا دلایا واپس لینے کے لیے اس کو تنگ نہ کرے۔ یہ جملہ نیا جملہ ہے اس کے ذریعے عورتوں کو تنگ نہ کرنے

---

[1] معارف م سس۔

ان کو نقصان پہنچانے کی ممانعت کی گئی اور نقصان پہنچانے کی نوعیت کو بھی کھول کر بتا دیا کہ عورت کو مہر کے نام پر یا دوسرے طریقہ پر جو کچھ بھی دے چکے ہو خواہ وہ کتنا ہو اس تنگ کرنے کے پس منظر میں اس کا واپس لینا مقصد ہو یہاں دو چیزیں ہیں، ایک عورت کو تنگ کرنا اور دوسرے دیے ہوئے سامان کو واپس لینے کے لیے تنگ کرنا۔ اصل منشا تنگ کرنے اور نقصان پہنچانے کی ممانعت ہے اور دی ہوئی چیز واپس لینے کی علت واقعات کے تحت ہے۔ کیونکہ اسی موضوع پر البقرہ میں آیت نمبر ۲۳۱ گزر چکی ہے۔ ولا تمسکوا ھن ضرارا لتعتدوا اس میں تصریح ہے کہ عورت کو نقصان پہنچانا منع ہے اور عورت کی دی ہوئی چیز کے بارے میں آیت ۲۲۹ میں کھول کر بتایا ہے کہ لا یحل لکم ان تاخذوا مما اتیتموھن شیئا عورتوں کو دی ہوئی چیز کو واپس لینا تمہارے لیے حلال نہیں ہے۔

عورتوں کو شوہر کے انتخاب میں اختیار

تنگ کرنے کی یہاں بھی ممانعت ہے اور آیت ۲۳۲ البقرہ میں بھی ممانعت ہے فلا تعضلوھن ان ینکحن ازواجھن اذا تراضوا بینھم بالمعروف تم اس میں رکاوٹ نہ بنو کہ وہ اپنے زیر تجویز شوہروں سے نکاح کر لیں جبکہ وہ دستور کے مطابق راضی ہوں۔ ان تصریحات کی موجودگی میں آیت قرآنی کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ کسی حال اور کسی وقت بھی تم عورت کو تنگ کرنے، اس کی راہ میں رکاوٹ بننے اور اس کی آزادی کو سلب کرنے کے مجاز نہیں ہو۔ حاصل یہ ہے کہ قرآن میں عضل سے منع کیا گیا ہے۔ عضل کے معنے تنگ کرنے اور رکاوٹ ڈالنے کے ہیں۔ اسی سے الداء العضال ناقابل علاج بیماری کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شادی کے معاملہ میں عورتوں کی راہ میں رکاوٹ نہ ڈالو۔ خطاب شوہروں کو ہو یا اولیاء کو اور یا پھر سارے مسلمانوں کو اس سے سمجھ میں یہی آ رہا ہے کہ قرآن نے چونکہ جوان لڑکی کو نکاح کرنے کی آزادی دی ہے۔ اولیاء کو، شوہروں کو اور عام مسلمانوں کو اس آزادی کے سلب کرنے سے منع کیا جا رہا ہے۔ اگر بالغہ لڑکی کا یہ حق ہی تسلیم نہ کیا جائے کہ وہ اپنے ازدواجی معاملہ میں آزاد ہے تو یہ کہنا ہی بے معنے ہے کہ تم ان کی ازدواجی زندگی میں رکاوٹ نہ بنو۔

عورتیں جن کو پاکستان کے ماحول میں ہم مجبور سمجھتے ہیں قرآن نے ان کو اتنا مجبور نہیں کیا جتنا سمجھا جاتا ہے۔ بالغ لڑکوں کی طرح بالغ لڑکیوں کو بھی اس باب میں بڑی حد تک آزادی ہے۔ نکاح کے باب میں بالغ لڑکیوں کی رضا اور ان کی اجازت ہر حالت میں ضروری ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

شوہر دیدہ عورت کی شادی اس وقت تک نہ کی جائے جب تک اس کا حکم حاصل نہ کر لیا جائے اور کنواری عورت کا نکاح بھی اس وقت تک نہ کیا جائے جب تک اس کی اجازت نہ حاصل کر لی جائے۔ (صحیح بخاری)

دوسری حدیث میں اس سے بھی زیادہ واضح ارشاد ہے:

شوہر دیدہ عورت خود اپنی ذات کی ولی سے زیادہ حقدار ہے اور کنواری کے نکاح کے وقت اس کی اجازت اس کا خاموش رہنا ہے۔ (صحیح مسلم)

تیسری حدیث کے الفاظ یہ ہیں ارشاد ہے:

وہ عورت جو شوہر دیکھ چکی ہو بذاتِ خود ولی سے زیادہ حقدار ہے اور کنواری سے اس کا باپ اجازت حاصل کرلے اور اس کی اجازت اس کا خاموش رہنا ہے۔ (مسلم)

ان ارشادات میں جو لب ولہجہ اختیار کیا گیا ہے اور جو باتیں بیان کی گئی ہیں ان پر ذرا سنجیدگی سے غور کریں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ عورتوں کو شادی کے باب میں مختار بنایا گیا ہے اور یہی لا تعضلوھن کا منشا ہے یہ صرف نظریہ نہیں آیئے ذرا سے واقعات کی روشنی میں بھی پڑھ لیجئے۔ حضرت خنساؓ کے والد نے کسی شخص سے ان کی شادی کر دی۔ حضرت خنساؓ کو یہ رشتہ پسند نہ آیا۔ دربارِ نبوت میں حاضر ہوئیں، اور درخواست کی، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خنساؓ کی درخواست قبول فرمائی اور ان کے باپ کے کیے ہوئے نکاح کو رد فرما دیا۔ بخاری باب اذا زوج ابنتہ وھی کارھۃ فنکاحہ مردود۔

دوسرا واقعہ حضرت عبداللہ بن عباس بیان فرماتے ہیں کہ ایک جوان لڑکی حضور انور کی خدمت گرامی میں آئی اور بیان کیا کہ میرے باپ نے جس سے میری شادی کی ہے وہ مجھے پسند نہیں ہے۔ حضور انور نے اس عورت کو اختیار دیا جی چاہے باقی رکھو اور جی چاہے رد کر دو۔

ابن ماجہ باب من زوج ابنتہ وھی کارھۃ

باپ کو بھی جبر کا اختیار نہیں

ایک واقعہ بریدہ بیان کرتے ہیں کہ ایک نوجوان عورت دربارِ نبوت میں حاضر ہوئی اور بیان کیا کہ میرے والد محترم نے میری شادی میرے چچازاد بھائی سے کر دی، وہ مجھے پسند نہیں ہے۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں اس نکاح کو باقی رکھنے نہ رکھنے کا اختیار ہے۔ عورت نے یہ سن کر اطمینان کی سانس لی اور بولی کہ

میرے ماں باپ نے جو کچھ کیا اس کی اجازت دے چکی ہوں۔ لیکن اس وقت سوال اور حضور سے جواب حاصل کرنے کا مقصد یہ تھا کہ عورتوں کو سبق دوں کہ باپ کے ہاتھ میں یہ نہیں ہے کہ بالغ لڑکی کی رضا حاصل کیے بغیر شادی کردے الفاظ یہ ہیں ،

اردت ان تعلم النساء ان لیس الی الاباء من الامر شیئ

میں چاہتی ہوں کہ عورتوں کو پتہ لگ جائے کہ ان کے باپ دادا کے ہاتھ میں ان کی شادی کے معاملہ میں کچھ نہیں ہے ۔

ان ارشادات و واقعات کا مطالعہ کرنے کے بعد اس کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے کہ بالغ عورت کو شادی کے معاملہ میں تنگ نہیں کیا جا سکتا بلکہ شوہر کے انتخاب میں اسے پورا اختیار حاصل ہے ۔

اختلاف کے وقت عورت قابل ترجیح

یہاں یہ سوال بے حد اہم ہے کہ اگر عورت کی رائے اور ولی کی رائے میں ٹکراؤ ہو جائے تو ایسے مواقع پر کیا فیصلہ کیا جائے۔ اس سوال کے جواب میں دو حرفی بات یہ ہے کہ عورت کی مرضی مقدم ہوگی اور اسی کی رائے کو شرعاً ترجیح ہوگی کیونکہ شادی عورت کی ہو رہی ہے عفت و عصمت کا تعلق عورت سے ہے۔ ولی کی نہ شادی ہو رہی ہے اور نہ اس کے نباہنے کی ذمہ داری اس پر ہے ۔ زمانہ نبوت کے فیصلے اور واقعات موجود ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے عورت کی رضا کو ترجیح دی۔ باپ کا کیا ہوا نکاح بھی رد فرمادیا مگر عورت کی مرضی کے خلاف فیصلہ نہیں فرمایا۔ پھر قرآن نے عورت کو اپنا معاملہ منشا نے کی پوری آزادی دی ہے ۔ عورت انسان ہے عقل و فہم کی مالک ہے وہ کوئی عضو معطل نہیں کہ بغیر ولی کی اجازت کے کوئی کام نہ کر سکے ۔

ولی کو حق مشورہ اور اس کا لحاظ

نابالغہ لڑکی کا نکاح البتہ اس کی اجازت کے بغیر ولی کر سکتا ہے اس کے معاملہ میں باپ کو بھی اختیار ہے اور دوسرے اولیاء کو بھی، مگر باپ کا اختیار اتنا مضبوط ہے کہ بلوغ کے بعد لڑکی کو خیار بلوغ حاصل نہ ہوگا۔ حضرت عائشہ صدیقہ کا خود اپنا بیان ہے کہ میری شادی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس وقت ہوئی جب میری عمر چھ سال کی تھی۔ (ابن ماجہ)

دراصل نکاح کا مسئلہ ایک اہم مسئلہ ہے اس لیے جو کچھ کیا جائے خوب سوچ سمجھ کر کیا جائے۔

ولی بھی اپنی حد تک اطمینانی شکل پیدا کرلیں اور جس کی شادی ہو رہی ہے وہ بھی سکون قلب پالیں۔ اس لیے نکاح میں حتی الوسع عورت اور ولی دونوں کی موافقت ضروری ہے تاکہ کام خوش اسلوبی سے انجام پا سکے۔ اس موضوع پر سید انور شاہ کشمیری کی رائے بے حد قیمتی ہے لیجئے آپ بھی سن لیجئے فرماتے ہیں،

ایسے معاملات میں جن کا تعلق جماعت سے ہے شریعت نے طرفین کی رعایت ملحوظ رکھی ہے اور ایسے موضوع پر مجموعہ احادیث کو پیش نظر رکھ کر فیصلہ کرنا چاہیے، صرف ایک جانب کو سامنے رکھ کر جو فیصلہ بھی ہو گا اس سے مراد قانون تک پہنچنا مشکل ہے مثلاً زکوٰۃ کا معاملہ ہے اس معاملہ کا زکوٰۃ دینے والے اور زکوٰۃ وصول کنندہ دونوں سے تعلق ہے۔ زکوٰۃ دینے والے کے متعلق آیا ہے کہ اگر اس کے پاس زکوٰۃ وصول کنندہ ہے تو وہ اسے خوش کرے جو مانگے اور دوسری طرف زکوٰۃ وصول کنندہ کو ہدایت ہے کہ خبردار لوگوں کا بہترین مال زکوٰۃ میں نہ لینا۔ مظلوم کی دعا سے ڈرو اس کے اور خدا کے درمیان کوئی آڑ نہیں ہے۔ خود میاں بیوی کے مسئلہ پر غور کیجئے۔ ایک طرف بیوی کو حکم ہے کہ شوہر کو خوش رکھو مگر دوسری طرف شوہر کو بتایا جا رہا ہے کہ تم میں کامل ایمان والا وہ ہے جو اخلاق میں سب سے اچھا ہو اور اپنی بیوی کے لیے بہترین ہو۔

ٹھیک اسی طرح عورت اور اس کے ولی کا معاملہ ہے۔ عورت کو کہا جا رہا ہے کہ تمہارے نکاح میں ولی کا حق ہے اور اس قدر حق ہے کہ بغیر اس کی اجازت کے نکاح باطل ہے اور ولی سے کہا جا رہا ہے کہ عورت اپنے حق کی تم سے زیادہ حقدار ہے گویا ولی کو اس میں دخل دینے کی ضرورت نہیں۔ لیکن اس موضوع سے متعلق تمام ارشادات اگر پیش نظر ہوں تو فیصلہ یہی ہو گا کہ دونوں پر ذمہ داری ہے کہ ایک دوسرے کی بات کا پاس رکھیں۔ عورت کو ولی کی بات کا اور ولی کو عورت کی رضا کا۔ نہ ولی اس حد تک زیادتی کرے کہ عورت اپنے جائز حق سے محروم ہو جائے اور نہ عورت اتنی بے راہ روی اختیار کرے کہ ولی اور خاندان کے لیے باعث ننگ و عار ہو جائے۔

خاندان کی حد تک بالغہ عورت پر ولی کو جبر کا بالکل اختیار نہیں ہے۔ ولی اور عورت کی رائے میں جب اختلاف ہو تو بالغہ عورت کی رائے کو ترجیح ہو گی جس کی قرآن و حدیث سے تائید ہے[1]

حضرت مولانا انور شاہ رحمہ اللہ کی یہ رائے صرف اسی ایک مسئلہ میں نہیں بلکہ ہر اجتماعی مسئلہ میں قابل عمل اور لائق ترجیح ہے۔ انہوں نے جو بات فرمائی ہے وہ منشاء شریعت کو ظاہر کر رہی ہے۔

---

[1] فیض الباری

حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اس کی جو لطیف ترجمہ بیان کی ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اگرچہ انداز بیان مختلف ہے اور یہ بے غبار حقیقت ہے کہ سید انور شاہ کا انداز سب سے اچھا اور عمدہ ہے فرماتے ہیں:

"نکاح میں تنہا عورت کی رائے جائز نہیں ہے کیونکہ ان کا غور و فکر نسبتہً زیادہ ہمت نہیں رکھتا۔ پھر مردوں کو عورتوں پر قوام بنایا گیا ہے۔ ارباب حل و عقد مرد ہی ہیں پھر معاملہ ایسا ہے کہ عورت انجام دے تو بے حیائی سے تعبیر ہوا اور اشتباق و نکاح میں تمیز قائم رکھنے کی خاطر اولیاء کا ہونا ضروری ہے تاکہ اس کی شہرت ہو سکے۔ اس لیے عورت کو ولی کی رائے لینی چاہیے مگر ولی کو یہ بھی اختیار نہیں ہے کہ صرف اپنی رائے سے عورت کی شادی کرے کیونکہ معاملہ عورت کا ہے اور اپنا معاملہ جو خود عورت سمجھتی ہے مرد نہیں سمجھ سکتا ہے۔ نفع و نقصان عورت کو پہنچنے والا ہے اس لیے حکم اس سے لینا ضروری ہے [1]

امام نووی شافعی المذہب ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ لڑکی کی رائے کو ولی کی رائے پر ترجیح ہو گی۔ ان کے الفاظ یہ ہیں:

عورت کا حق ولی کے حق سے زیادہ موکد ہے اگر ولی کسی کفو سے اس کی شادی کرنا چاہے اور لڑکی آمادہ نہ ہو تو اس کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اور اگر خود عورت کسی کفو سے شادی کرنے کا ارادہ کرے اور اس کا ولی راضی نہ ہو تو ولی کو مجبور کیا جائے گا۔ اگر ولی اصرار کرے گا تو عدالت اس کی شادی کر دے گی۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ عورت کا حق موکد اور راجح ہے [2]

بہرحال عورت بالغہ کو تنگ نہیں کیا جا سکتا اور مجبور نہیں کیا جا سکتا۔

عورتوں کو تنگ کرنے کا جواز

یہاں ایک استثنا بھی ہے۔ اصل ارشاد یہ ہے الا ان یاتین بفاحشۃ مبینۃ فاحشہ سے مراد عبداللہ ابن عباس، قتادہ اور الضحاک کی رائے میں شوہر کی نافرمانی اور کج خلقی ہے۔ اور یہی

[1] حجۃ اللہ البالغۃ [2] شرح مسلم نووی

عبداللہ ابن عباس کا خیال ہے اور مطلب یہ ہے کہ تمہیں عورتوں کو کسی حال میں اور کسی وقت تنگ کرنے کی اجازت نہیں ہے لیکن ہاں اگر وہ تمہاری طاعت نہ کریں اور نازیب وغیرہ سے بھی درست نہ ہوں تو پھر تمہیں اس کی اجازت ہے کہ تم ان کو تنگ کرو اور تنگ کرنے کی صورت یہ ہے کہ اگر تم اسے اپنے سے جدا کرنا چاہتے ہو تو اس وقت تک نہ کرو جب تک وہ تمہارا دیا ہوا مال واپس نہ کرے یا واجب الادا مہر کو معاف نہ کرے۔ لیکن فاحشہ کے ہونے کے لیے صرف گمان اور شبہ کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ واضح اور صاف ہو۔ اگر اس قسم کی کوئی بات اس سے صادر نہیں ہوئی تو وہ بدستور اپنی وفاداری اور پاک دامنی پر قائم ہے تو صرف دیا ہوا سرمایہ واپس لینے کی خاطر اسے تنگ کرنا جائز نہیں اور یہ عقل انصاف اور شرافت کے بالکل منافی ہے، قابل نفرت چیز صرف اخلاقی فساد ہے خواہ یہ زنا کی صورت میں ہو جیسا کہ امام حسن کی رائے ہے اور چاہے شوہر کی نافرمانی، بدزبانی اور مشتبہ چال چلن کی صورت میں ہو۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ پارہ پنجم کے آغاز ہی میں آرہی ہے یعنی اگر فاحشہ سے شوہر کی نافرمانی مراد ہے تو تنگ کرنے کا پیمانہ قرآن نے خود جو بتایا ہے وہ پانچویں پارے میں آرہا ہے اور اگر زنا مراد ہے تو اس کے لیے ثبوت کی ضرورت ہے۔ اس کی سزا قاضی کا فرض ہے۔

عورتوں سے حُسنِ معاشرت

۳۷۔ اور تم ان کے ساتھ اچھے طریقے سے رہو سہو۔ پھر اگر وہ تمہیں ناپسند ہوں تو ہو سکتا ہے کہ ایک چیز تمہیں پسند نہ ہو اور اللہ نے اسی میں تمہارے لیے بہت کچھ بہتری رکھ دی ہو یعنی عورتوں کے ساتھ گفتگو اور معاملات میں اخلاق اور سلوک سے معاملہ رکھو۔ جاہلیت میں جیسا ذلت اور سختی کا برتاؤ عورتوں کے ساتھ کیا جاتا تھا اس کو چھوڑ دو۔ پھر اگر تم کو کسی عورت کی کوئی خو اور عادت خوش نہ لگے تو صبر کرو شاید اس میں کوئی خوبی بھی ہو اور ممکن ہے کہ تم کو ناپسندیدہ ہو کوئی چیز اور اللہ تعالیٰ اس میں تمہارے لیے کوئی بڑی منفعت دینی یا دنیوی رکھ دے لہٰذا تمہیں تحمل اور برداشت سے کام لینا چاہیے اور بدخو کے ساتھ بدخوئی نہ کرنی چاہیے [1]

اس آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں ایک یہ کہ عورتوں کے ساتھ معاشرت اور رہن سہن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بہترین ہونا چاہیے، دوسری یہ کہ مردوں کو اگر ان کی بیویاں ناپسند ہوں اور طبیعت کے تقاضے کے خلاف معلوم ہوں تو ایسے وقت میں جذبات کی جگہ عقل سے کام لینا چاہیے اور ناگواری کو برداشت کرنا چاہیے کیونکہ یہ کوئی عجیب بات نہیں ہے کہ انسان کو اپنی افتادِ طبع کی وجہ سے ایک چیز ناپسند ہو اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس میں کوئی منفعت پوشیدہ ہو جو اس کے لیے دین و دنیا دونوں میں موجبِ خیر و برکت ہو اور سب سے اہم حکیمانہ نکتہ وہ ہے جس کی طرف اس ارشادِ نبوی میں اشارہ ہے :

> کوئی مسلمان مرد کسی مسلمان عورت کو اس لیے مبغوض نہ رکھے کہ اس کی کوئی عادت ناگوارِ خاطر ہے کیونکہ اگر عادت ناپسند ہے اس کی تو کوئی دوسری عادت پسندیدہ ہوگی۔ (مسلم باب الوصیۃ بالنساء)

اور یہ واقعہ ہے کہ بُرے پہلوؤں کے ساتھ بھلائی کے پہلو بھی عموماً عورتوں میں پائے جاتے ہیں لہٰذا آدمی کو چاہیے کہ برائیوں کی تلافی بھلائی کے پہلو سے کرتا ہے۔ زندگی میں یہ کوئی حیرت انگیز واقعہ نہیں کہ میاں بیوی میں کشیدگی پیدا ہو جاتی ہے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں شیطان کو ورغلانے کا موقعہ ہاتھ آتا ہے۔ پھر اس وقت اور بھی جبکہ عورتیں نازک طبع تند خو اور تلون مزاج ہوتی ہیں اس لیے قرآن نے ان حقائق و واقعات سے چشم پوشی نہیں کی۔ عورتوں کی فطری کمزوری کو پیش نظر رکھ کر مردوں کو اس سلسلے میں مفید ہدایتیں دی ہیں تاکہ مرد و عورت کی باہمی زندگی میں ناخوشگواری نہ آنے پاتے اور اگر عورتوں کے کسی قول و فعل سے کوئی اذیت پہنچے تو حسنِ اخلاق کا مظاہرہ کریں اور صبر و تحمل سے کام لیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر عورت خوبصورت نہ ہو یا اس میں کوئی ایسا نقص ہو جس کی بنا پر وہ شوہر کو پسند نہ آئے تو یہ مناسب نہیں ہے کہ شوہر فوراً دل برداشتہ ہو کر اسے چھوڑ دینے پر آمادہ ہو جائے حتی الامکان اسے صبر و تحمل سے کام لینا چاہیے۔ بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک عورت خوبصورت نہیں ہوتی مگر اس میں کچھ دوسری خوبیاں ایسی ہوتی ہیں جو ازدواجی زندگی میں حسنِ صورت سے زیادہ اہمیت رکھتی ہیں اگر اسے اپنی خوبیوں کے اظہار کا موقعہ ملے تو وہی شوہر جو ابتداء میں محض اس کی صورت کی خرابی سے دل برداشتہ ہو رہا تھا اس کے حسنِ سیرت پر فریفتہ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح بسا اوقات ازدواجی زندگی کی ابتداء میں عورت کی کچھ باتیں شوہر کو ناگوار محسوس ہوتی ہیں اور وہ اس سے بددل ہو جاتا ہے لیکن اگر وہ صبر سے کام لے اور عورت کے تمام امکانات کو بروئے کار آنے کا موقعہ دے تو اس پر خود ثابت ہو جاتا ہے کہ اس کی بیوی برائیوں سے بڑھ کر خوبیاں رکھتی ہے لہٰذا یہ بات مناسب نہیں ہے کہ

ازدواجی زندگی کا رشتہ منقطع کرنے میں جلد بازی سے کام لے بیٹھے[1] عورت میں کمزوریاں ہی نہیں بہت سی خوبیاں بھی ہیں جو مرد کو بہت بھاتی ہیں اور جن سے مرد کو قلبی سکون واطمینان میسر ہوتا ہے اس لیے عورت کی ایک پہلو کی کمزوری کو سامنے ہی نہ رکھنا چاہیے۔

تجربات کی دنیا میں اسے ماننا پڑے گا کہ عورت عموماً جفاکش قناعت پسند، شوہر پر جان چھڑکنے والی، بچوں کی پرورش پر نثار، گھریلو معاملات کی بہترین منتظم اور اخلاص ووفا کی پیکر ہوتی ہے کہا جاسکتا ہے کہ عورت میں کمزوری سے زیادہ خیر اور بھلائی کے پہلو ہیں۔

عورت کی محنت وجفاکشی کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے جب گردش زمانہ کی وجہ سے مصائب کا ہجوم ہوتا ہے اور اس کا شوہر کسی وجہ سے مصیبت وتکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔ جدید تحقیق نے بھی اسے ثابت کر دیا ہے۔ علامہ لومبروز لکھتے ہیں:

> حمل اور وضع کی شدید تکلیف پر غور کرو اور دیکھو عورت دنیا میں کیسے کیسے آلام اور مصائب کی متحمل ہوسکتی ہے۔ اگر مرد کی طرح اس کا احساس قوی ہوتا تو ان تمام تکلیفوں کی کیونکر متحمل ہوسکتی درحقیقت نوع انسانی کی یہ بڑی خوش قسمتی ہے کہ قدرت نے اس کو قوی احساس سے محروم رکھا ہے ورنہ بنی نوع انسان کے نازک اور تکلیف دہ فرائض کی انجام دہی ایک غیر ممکن بات ہوجاتی[2]

بیوی کو دے کر کچھ واپس نہ لو

۳۸۔ اور اگر تم ایک بیوی کی جگہ دوسری بیوی لانے کا ارادہ کرو تو چاہے تم نے اسے ڈھیروں ڈھیر مال دیا ہو اس میں سے کچھ واپس نہ لو کیا تم بہتان لگا کر اور صریح ظلم کر کے واپس لوگے۔ اسلام سے پہلے یہ بھی ہوتا تھا کہ جب کوئی چاہتا کہ پہلی عورت کو چھوڑ کر دوسری عورت سے شادی کرے تو پہلی عورت پر تہمت لگاتا اور مختلف طریقوں سے اس پر زیادتی اور سختی کرتا کہ مجبور ہو کر مہر واپس کر دے اور نکاح جدید میں کام آئے یہ آیت اس کی ممانعت میں نازل ہوئی کہ جب پہلی عورت کو چھوڑ کر دوسری کرو اور پہلی عورت کو بہت سا مال دے چکے ہو تو اب اس میں سے کچھ بھی واپس نہ لو۔ کیا تم بہتان باندھ کر اور صریح ظلم کر کے پہلی بیوی سے وہ مال لینا چاہتے ہو یہ ہرگز جائز نہیں[3]

---

[1] تفہیم القرآن [2] مسلمان عورت [3] افادات شیخ الاسلام

چونکہ پہلی آیت میں یہ بات بتائی جاچکی ہے کہ اگر عورت نافرمان اور بدخو ہو تو اس سے مہر واپس لے کر یا مہر معاف کرا کے طلاق دینا جائز ہے۔ اب اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اگر عورت نافرمان اور بدخلق نہ ہو اور شوہر کسی ضرورت سے موجودہ بیوی کو طلاق دے کر دوسری شادی کرنا چاہتا ہے تو شوہر کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ اپنا دیا ہوا مال بیوی سے واپس لے یا واجب الادا مہر کو واپس کرائے کیونکہ عورت کا کوئی قصور نہیں ہے خواہ یہ رقم کتنی خطیر کیوں نہ ہو۔ قرآن نے اسی مال کی واپسی کو بہتان اور اثم مبین قرار دیا ہے۔ بہتان اس لیے کہ جب تمہیں معلوم ہو چکا ہے کہ دیا ہوا مال صرف اس وقت واپس لیا جاسکتا ہے جب عورت فاحشہ مبینہ کا ارتکاب کرے تو یہ جاننے کے باوجود تمہارا عورت سے مال واپس لینا اس بات کا اعلان ہے کہ تمہاری بیوی نے فاحشہ مبینہ کا ارتکاب کیا ہے۔ چاہے تم یہ بات زبان سے نہ کہو مگر تمہارا کردار یہی کہہ رہا ہے اور اس طرح تم اپنے کردار سے اس پر بہتان لگا رہے ہو[1]

مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اپنے حالات کے تقاضوں سے اس فیصلہ پر پہنچ ہی گیا ہے کہ ایک بیوی کو چھوڑ کر دوسری بیوی کرے تو وہ یہ کسی حال میں نہ کرے کہ جو کچھ اس نے پہلی بیوی کو دیا ہے اس کو واپس لینے کی کوشش کرے یہاں تک کہ اگر اس کو ڈھیروں ڈھیر سونا بھی دیا ہے پھر بھی اس کے لیے جائز نہیں کہ وہ اسے واپس لینے کی کوشش کرے۔

قنطار کے متعلق ہم تیسری جلد میں بحث کر چکے ہیں۔ استعمال میں اس سے مراد مال کثیر ہوتا ہے جیسے ہم منوں مال، ڈھیروں مال بولتے ہیں۔ عربی میں اسی مفہوم کو قنطار سے تعبیر کرتے ہیں۔ اگرچہ آیت کا منطوق تو یہ ہے کہ اگر تم ڈھیروں مال دے چکے ہو پھر بھی اس کی واپسی کا مطالبہ درست نہیں ہے اگر یہاں مال سے مراد مہر ہے تو اس سے مہر کی زیادتی کے لیے پروانہ مترشح ہوتا ہے حالانکہ ارشاد نبوت میں مہر کی زیادتی کی ممانعت آئی ہے۔ چنانچہ قرطبی نے لکھا ہے کہ یہ آیت دلیل ہے مہر میں زیادتی کے لیے جواز کی۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ آیت قرآنی مہر کے بارے میں نص نہیں ہے عورت کو شوہر کی جانب سے جو کچھ دیا جاتا ہے وہ صرف مہر ہی نہیں ہے مہر کے علاوہ بھی بہت کچھ دیا جاتا ہے۔ ہدایا، تحف، سوغات اور عطایا سب ہی کچھ خوشگوار تعلقات میں دیے جاتے ہیں اور پھر یہاں جو کچھ کہا گیا ہے وہ بطور مبالغہ تمثیل کے درجے میں ہے یہ ایسا ہی ہے۔ جیسے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بنا مساجد کی ترغیب دیتے ہوئے فرمایا کہ جس نے اللہ کی خاطر مسجد بنائی

[1] معارف ج ۲ ص ۳۶۴ ملخصاً

خواہ چیل کے آشیانے جیسی ہو اللہ اس کے لیے جنت میں گھر بنائے گا ظاہر ہے کہ یہ تقلیل میں تشبیہ ہے تشبیہ و تمثیل سے احکام ثابت نہیں ہوتے ہیں۔

کچھ لوگوں نے اپنے اس فکر کو درست بنانے کے لیے اس واقعہ سے بھی استدلال کیا ہے کہ حضرت عمر نے ایک بار مسجد میں سر منبر مہر کی زیادتی سے روکا لیکن ایک ضعیفہ کے کہنے پر اس کا جواز تسلیم کر لیا۔ حضرت مولانا اشرف علی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ حضرت عمر کا جواز کو مان لینا اس لیے تھا کہ مخاطب اس کو حرام نہ سمجھنے لگیں۔ اس سے مہر کی زیادتی کا مکروہ نہ ہونا معلوم ثابت نہیں ہوتا اور نہ حضرت عمر پر کوئی اعتراض لازم آتا ہے۔[1]

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ یہ حضرت عمر کی جانب سے کسر نفسی اور تواضع کا اظہار تھا اور تواضع سے مقصود معاشرے میں قرآن فہمی کی صلاحیت کی حوصلہ افزائی تھی۔ آپ حضرت کے جواب کو پڑھیں تو آپ بھی ایسا ہی سمجھیں گے۔ مسروق کی روایت جسے حافظ ابو یعلی موصلی اور سعید بن منصور نے امام شعبی کے حوالہ سے پیش کیا ہے اس کے الفاظ یہ ہیں اللھم عفوا کل الناس افقہ من عمر۔ ورنہ مہروں میں زیادتی کی کراہت کے لیے جو موقف فاروق اعظم نے اختیار کیا تھا وہ اس کی اجازت نہیں دیتا ہے۔ مسند امام احمد میں ابوالعجفاء السلمی کے حوالہ سے جو روایت آتی ہے اس میں صاف طور پر ہے کہ:

عورتوں کے مہر میں گرانی نہ کرو، مہر کی زیادتی اگر دنیا میں بڑائی کی اور اللہ کے یہاں تقویٰ کی بات ہوتی تو اس کے سب سے زیادہ حقدار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوتے۔ آپ نے اپنی بیٹیوں میں سے کسی بیٹی کا اور اپنی بیویوں سے کسی بیوی کا نکاح میں بارہ اوقیہ سے زیادہ مہر نہیں باندھا۔[2]

بعض روایات میں ساڑھے بارہ اوقیہ آتا ہے ایک اوقیہ چالیس درہم کا بارہ اوقیہ چار سو اسی درہم اور ساڑھے بارہ اقیہ پانچ سو درہم ہوئے۔ یہ روایت مسند احمد کے ساتھ سنن اربعہ میں موجود ہے۔

اس موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے جو امت کو ہدایات ملی ہیں ان میں یہی تلقین ہے۔ ایک ارشاد ہے کہ بہترین بیوی وہ ہے جس کا مہر معمولی ہو۔ ایک اور ارشاد ہے عورت کی برکت یہ ہے کہ معاملہ آسان ہو اور مہر تھوڑا ہو۔ ایک اور حدیث ہے سب سے عظیم برکت والی

---

[1] بیان القرآن [2] ابن کثیر

وہ بیوی ہے جس کا مہر معمولی ہو۔ اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ معاشرے میں مہروں کی زیادتی شادی کی قانونی وسعتوں پر پابندی عائد کرتی ہے اور شادی پر پابندی شہری زندگی بدکاری اور بدچلنی کو رواج دے رہی ہے۔

نکاح زوجین کے درمیان پختہ عہد ہے

۲۹۔ آخر تم اسے کیسے لوگے حالانکہ تم باہم ایک دوسرے سے میاں بیوی کے تعلقات رکھ چکے ہو اور تمہاری بیویاں تم سے پختہ عہد لے چکی ہیں۔ یعنی جب مرد اور عورت نکاح کے بعد مل چکے اور صحبت کی نوبت آ چکی تو اس کے معاوضہ میں تمام مہر دینا مرد پر واجب ہو چکا تو اب کس وجہ سے مرد اس مہر کو واپس لے سکتا ہے اور در صورت مہر ادا نہ کرنے کے کیسے اس کے مہر کو دبا سکتا ہے اب تو بجز اس کے کہ عورت ہی اپنی خوشی سے معاف کر بیٹھے کوئی صورت رستگاری کی نہیں ہو سکتی اور وہ عورتیں تو بہت مضبوط اور گاڑھا اقرار تم سے لے چکی ہیں جس کی وجہ سے وہ تمہارے قبضہ و قدرت میں آ چکی ہیں اور تم ان سے پورے فائدے اٹھا چکے۔ ورنہ تمہیں ان پر تصرف کا کیا اختیار تھا اب اس قدر تکمیل اور قبضہ کامل اور تصرف تام کے بعد عورتوں کے مہر کو واپس لینا یا ان کا مہر نہ دینا کیسے ہو سکتا ہے۔

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جیسے مجامعت کے بعد پورا مہر شوہر کے ذمہ لازم ہو جاتا ہے ایسا ہی اگر مجامعت کی تو نوبت نہ آتے مگر خلوت صحیحہ ہو گئی پھر بھی پورا مہر واجب الادا ہو گا۔ ہاں اگر خلوت صحیحہ کی بھی نوبت نہ آتے اور شوہر نے طلاق دے دی تو پھر نصف مہر ادا کرنا ہو گا[1]

اصل ارشاد وقد افضی بعضکم الی بعض آیا ہے اس کے معنے کسی کے پاس پہنچنا اور اس کے ساتھ تنہائی میں ہونا ہے۔ اسی طرح افضی الی فلان بسرہ کے معنے ہیں اس نے فلانے کے آگے اپنے سارے بھید بے نقاب کر دیے۔ یہ میاں بیوی کے ازدواجی تعلقات کی نہایت جامع اور اور شائستہ تعبیر ہے دونوں ایک دوسرے کے لیے اسی طرح بے نقاب ہو جاتے ہیں کہ ان کے ظاہر و باطن اور احساسات و جذبات کا کوئی گوشہ اور کوئی پہلو ایک دوسرے سے مخفی نہیں رہتا۔ اسی لیے دو مرد ایک کپڑے میں سوئیں یا دو عورتیں ایک کپڑے میں سوئیں اس کو بھی زبان

[1] افادات شیخ الاسلام

نبوت نے افضاء سے تعبیر کیا ہے۔

لا یفضی الرجل الی الرجل ولا تفضی المراۃ الی المراۃ فی ثوب واحد

کوئی مرد دوسرے مرد کے ساتھ اور کوئی عورت دوسری عورت کے ساتھ ایک کپڑے میں نہ لیٹے۔

میاں بیوی کے تنہائی کے تعلقات کے لیے بھی زبان نبوت نے یہ لفظ استعمال کیا ہے۔

لوگوں میں اللہ کے نزدیک بدترین وہ شخص ہے جو اپنی بیوی کے پاس جاتے اور اس کی بیوی اس سے ملے پھر مرد اس بات کو نشر کرے[1]

اصل الفاظ یفضی الی امراتہ ہیں اس سے معلوم ہوا کہ افضاء کے اصل معنے فضا میں ہونے یعنی تنہائی اور خالی جگہ میں ہونے کے ہیں۔ اس لیے امام ابوحنیفہ نے صرف خلوت ہو جانے سے پورا مہر واجب کر دیا خواہ مجامعت ہو یا نہ ہو۔ امام طحاوی فرماتے ہیں کہ اس پر صحابہ کا اجماع ہے۔ ابن المنذر کہتے ہیں کہ حضرت عمر، حضرت علی، حضرت زید بن ثابت، حضرت عبداللہ بن عمر، حضرت جابر، حضرت معاذ بن جبل اور حضرت ابوہریرہ کا یہی فیصلہ ہے۔ زرارہ بن اوفی سے ابوعبید نے نقل کیا ہے کہ خلفاء راشدین نے خلوت ہونے پر پورے مہر اور عدت کے واجب ہونے کا فیصلہ فرمایا ہے۔

اس جملہ میں یہ واضح کیا ہے کہ اگر دیا ہوا مال مہر ہے تو عورت اس کی مستحق اور مالک ہو چکی ہے کیونکہ وہ اپنے کو شوہر کے حوالہ کر چکی ہے لہٰذا اب مہر کی واپسی کے کوئی معنے نہیں ہیں اور اگر دیا ہوا مال تحفہ ہدیہ کا ہے تو بھی اس کی واپسی ممکن نہیں ہے کیونکہ میاں بیوی جو آپس میں ایک دوسرے کو ہبہ کریں اس کی واپسی شرعاً ناجائز ہے۔ غرض ازدواجی تعلق ہبہ کی واپسی میں مانع ہے[2]

نکاح میثاق غلیظ ہے

آخر میں فرمایا اخذن منکم میثاقاً غلیظاً ان عورتوں نے تم سے مضبوط عہد لیا ہے ظاہر ہے کہ میثاق غلیظ سے مراد یہاں عقد نکاح ہی ہے اس کے سوا کسی اور میثاق کا نہ یہاں کوئی قرینہ ہے نہ اس کی کوئی تاریخی شہادت، پھر سوال پیدا ہوتا ہے کہ عقد نکاح کی ذمہ داری کو یہاں میثاق غلیظ سے کیوں تعبیر فرمایا ہے۔ میرے نزدیک اس کی وجہ یہ ہے کہ عقد نکاح کی اصل عرفی اور شرعی

---

[1] مسلم [2] معارف م ش

حقیقت یہی ہے کہ دو گواہوں کی موجودگی میں میاں بیوی کے درمیان حقوق اور ذمہ داریوں کا مضبوط عہد ہوتا ہے جس کے ذریعے سے دونوں زندگی بھر کے سنجوگ کے عزم کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑ جاتے ہیں اور دونوں یکساں طور پر حقوق بھی حاصل کرتے ہیں اور یکساں طور پر ایک دوسرے کے لیے ذمہ داریاں بھی اٹھاتے ہیں۔ بظاہر تو اس میثاق کے الفاظ نہایت سادہ اور مختصر ہیں لیکن اس کے مضمرات اور تضمنات بہت ہیں اور یہ مضمرات و تضمنات ہر مہذب سوسائٹی اور ہر شریعت میں معلوم و معروف ہیں۔ یہ امر بھی ایک حقیقت ہے کہ میثاق بندھتا تو ہے میاں اور بیوی کے درمیان لیکن اس میں گرہ اللہ سبحانہ کے حکم سے لگتی ہے اور جس طرح مخلوق اس کی گواہ ہوتی ہے خالق بھی اس کا گواہ ہوتا ہے۔ پھر اس کے میثاق غلیظ ہونے میں کیا شبہ رہا۔ یہاں اس رشتہ کو اس لفظ سے تعبیر فرما کر قرآن نے اس کی اصلی عظمت ظاہر کر دی ہے کہ مرد کو کسی حال میں بھی یہ بھولنا نہ چاہیے کہ بیوی کے ساتھ اس کا تعلق کچے دھاگے سے نہیں بندھا ہے بلکہ یہ رشتہ نہایت محکم رشتہ ہے اور اس کے تحت جس طرح مرد کے حقوق ہیں اسی طرح بیوی کے بھی حقوق ہیں جن سے مرد کے لیے فرار کی گنجائش نہیں ہے اگر وہ ان سے بھاگنے کی کوشش کرے گا تو اپنی فتوت کو بھی رسوا کرے گا اور اپنے خدا کو بھی ناراض کرے گا[1]

---

[1] تدبر قرآن۔

وَلَا تَنْكِحُوْا مَا نَكَحَ اٰبَآؤُكُمْ مِّنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ
اِنَّهٗ كَانَ فَاحِشَةً وَّمَقْتًا ؕ وَسَآءَ سَبِيْلًا ۟ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ
اُمَّهٰتُكُمْ وَبَنٰتُكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ وَعَمّٰتُكُمْ وَخٰلٰتُكُمْ وَبَنٰتُ الْاَخِ وَبَنٰتُ
الْاُخْتِ وَاُمَّهٰتُكُمُ الّٰتِيْٓ اَرْضَعْنَكُمْ وَاَخَوٰتُكُمْ مِّنَ الرَّضَاعَةِ وَ
اُمَّهٰتُ نِسَآئِكُمْ وَرَبَآئِبُكُمُ الّٰتِيْ فِيْ حُجُوْرِكُمْ مِّنْ
نِّسَآئِكُمُ الّٰتِيْ دَخَلْتُمْ بِهِنَّ فَاِنْ لَّمْ تَكُوْنُوْا دَخَلْتُمْ بِهِنَّ
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ وَحَلَآئِلُ اَبْنَآئِكُمُ الَّذِيْنَ مِنْ اَصْلَابِكُمْ ۙ
وَاَنْ تَجْمَعُوْا بَيْنَ الْاُخْتَيْنِ اِلَّا مَا قَدْ سَلَفَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
غَفُوْرًا رَّحِيْمًا ۟

اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن کو تمہارے باپ نکاح میں لا چکے ہوں ہاں جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا، بلاشبہ یہ بڑی بے حیائی کی بات، مکروہ شیوہ اور بُرا دستور تھا، تم پر ان

عورتوں سے نکاح حرام کر دیا گیا ہے تمہاری مائیں، تمہاری بیٹیاں، تمہاری بہنیں، تمہاری پھوپھیاں، تمہاری خالائیں، تمہاری بھتیجیاں، تمہاری بھانجیاں[۴۱]، تمہاری دودھ پلانے والی مائیں، تمہاری دودھ شریک بہنیں[۴۲]، تمہاری خوشدامنیں، تمہاری بیویوں کی وہ لڑکیاں جو تمہاری گود میں پرورش پاتی ہیں بشرطیکہ ان بیویوں سے عقدِ نکاح کے بعد زناشوئی کا تعلق بھی ہو چکا ہو، اگر ایسا نہیں تو پھر ان لڑکیوں سے نکاح میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، اور تمہاری حقیقی بیٹوں کی بیویاں اور دو بہنوں کو جمع کرنا[۴۳]، ہاں جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا، اللہ بخشنے والا رحمکار ہے۔[۴۴]

ازدواجی تعلقات پر پابندی

ازدواجی تعلق کیا ہے؟ کیا وہ معاشی اغراض کے لیے تعاون کی ایک بہترین شکل ہے؟ کیا وہ صنفی میلانات اور جنسی خواہشات کی تکمیل کا نام ہے کیا وہ جسمانی تکلیفوں کو دور کرنے کے لیے

وقت کی ضرورت ہے کیا وہ ایسا رشتہ ہے جس کا ہونا نہ ہونے سے بہتر ہے۔

قرآن بتلاتا ہے کہ نکاح اجتماع کے واجبات میں سے ہے، انفرادی زندگی کی شورشوں کے لیے سراپا تسکین وسکینت اور مردوں اور عورتوں کے لیے مودت ورحمت کا ذریعہ ہے۔ قرآن نے نکاح کو میاں اور بیوی کے مابین میثاق کہا ہے اس کی وجہ یہی ہے کہ عقد نکاح کی اصل عرفی اور شرعی حقیقت یہی ہے کہ وہ میاں اور بیوی کے درمیان حقوق اور ذمہ داریوں کا معاہدہ ہوتا ہے جس کے ذریعے دونوں زندگی بھر کے سنجوگ کے عزم کے ساتھ ایک دوسرے کے ساتھ جڑتے ہیں اور دونوں یکساں طور پر مودت ورحمت کا تعلق پیدا کرتے ہیں اور یکساں طور پر ایک دوسرے کی ذمہ داریاں اٹھاتے ہیں، مودت و رحمت ازدواجی زندگی کا خاصہ ہے۔ مودت چاہتی ہے کہ دونوں میں ایک دوسرے کا احساس ہو اور رحمت چاہتی ہے رحم وشفقت کی فراوانی ہو یہ دونوں خاصے اجتماعی زندگی کی ضرورت ہیں۔ نفس انسانی کی تہذیب کی تکمیل کے لیے ضرورت تھی کہ مودت ہو اور ضرورت تھی کہ جو کچھ ہو اس میں حسن وخوبی ہو۔ یہی ضرورت بجائے خود ازدواجی زندگی کی ایک علت ہو گئی۔

اسی بنا پر ازدواجی تعلقات کو ان عورتوں تک محدود کر دیا جن میں زوجیت کے ذریعے مودت و رحمت کا بھرپور ظہور ہو اور جن عورتوں سے قرابت کی بنا پر پہلے ہی مودت ورحمت موجود رہے۔ ان سے شادی پر قرآن نے پابندی لگا دی ہے۔ ساری محرمات اسی قبیل سے ہیں۔ قرآن نہیں چاہتا کہ قرابت اور زوجیت کی محبتوں میں اختلاط ہو خواہ یہ قرابت ولادت کے ذریعے ہو یا رضاعت کے اور یا پھر سسرالی رشتہ کی راہ سے حافظ ابن القیم نے مفتاح دارالسعادۃ میں بالکل بجا فرمایا ہے کہ انسانی عقل اور فطرت یہ ہرگز گوارا نہیں کرتی کہ ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ سے جنسی تعلق پیدا کیا جائے۔ اس طرح انسانی زندگی حیوانی زندگی سے ممتاز ہوتی ہے۔ یہی قانون فطرت ہے جس نے مرد وعورت میں فعل وانفعال اور جذب وانجذاب کے کچھ ایسے وجدانی احساسات ودیعت کر دیئے کہ ہر جنس دوسری جنس سے ملنے کی قدرتی طلب رکھتی ہے اور دونوں کے ملنے سے ازدواجی زندگی کی ایک کامل معیشت وجود میں آتی ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ اس لیے ہے تاکہ محبت وسکون ہو اور دو ہستیوں کی باہمی رفاقت اور اشتراک سے زندگی کی محنتیں اور مشقتیں گوارا ہو جائیں۔ پھر اسی ازدواجی زندگی سے توالد وتناسل کا سلسلہ قائم ہوتا ہے کہ ہر وجود پیدا ہوتا ہے اور ہر وجود پیدا کرتا ہے۔ ایک طرف وہ نسب کا رشتہ رکھتا ہے جو اسے پچھلوں سے جوڑتا ہے دوسری طرف صہر یعنی دامادی رشتہ رکھتا ہے جو اسے آگے آنے والوں سے مربوط کرتا ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ ایک شخص کی یگانگت

وسیع دائرے کی کثرت میں پھیل جاتی ہے اور اس طرح خاندان وجود میں آجاتا ہے۔ اگر محرمات سے ازدواجی رشتہ کی اجازت دی جاتی تو یہ وسعتیں سمٹ کر رہ جاتیں اور انسانی، نوعی اور اجتماعی اقدار کی نشوونما نہ ہوتی۔

باپ کی منکوحہ سے نکاح

۴۰۔ اور ان عورتوں سے نکاح نہ کرو جن کو تمہارے باپ نکاح میں لا چکے ہیں، ہاں جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا، بلاشبہ یہ بڑی بے حیائی کی بات ہے مکروہ شیوہ اور بُرا دستور ہے۔ جاہلیت والے اپنی سوتیلی ماں اور بعض دیگر محرمات سے بھی نکاح کر لیتے تھے، جس کا تذکرہ پہلے ہو چکا ہے اس کی ممانعت کی جاتی ہے کہ جن عورتوں سے تمہارے باپ نے نکاح کیا ہو ان سے نکاح نہ کرو یہ بے حیائی اللہ کے غضب اور نفرت کی بات ہے اور بہت بُرا طریقہ ہے۔ زمانۂ جاہلیت میں بھی سمجھدار لوگ اس کو مذموم سمجھتے تھے اور اس نکاح کو نکاح مقت اور اس نکاح سے جو اولاد ہوتی اس کو مقتی کہتے تھے۔ ایسے نکاح جو ہو چکے ہیں ہو چکے آئندہ ہرگز ایسا نہ ہو۔ اسلامی قانون میں یہ فعل فوجداری جرم ہے اور قابلِ دست اندازی پولیس ہے۔ ابوداؤد، نسائی اور مسند احمد میں یہ روایات ملتی ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جرم کے ارتکاب کرنے والوں کو موت کی اور ضبطی جائداد کی سزا دی ہے اور ابن ماجہ نے ابن عباس سے جو روایت نقل کی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ قاعدہ کلیہ ارشاد فرمایا تھا کہ جو شخص محرمات میں سے کسی کے ساتھ زنا کرے اسے قتل کر دو۔ فقہاء کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف ہے۔ امام احمد تو اسی بات کے قائل ہیں کہ ایسے شخص کو قتل کیا جائے اور اس کا مال ضبط کیا جائے۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ اگر اس نے محرمات میں سے کسی کے ساتھ زنا کی ہو تو اس پر حدِ زنا جاری ہوگی اور اگر نکاح کیا ہو تو اسے سخت عبرتناک سزا دی جائے گی۔[1]

محرمات میں سب سے پہلے منکوحہ والد کو بیان کرنے کی وجہ یہ ہے کہ عرب میں یہ صورت رائج تھی، اسی لیے اس کی مذمت کے لیے انداز بھی وہ اختیار کیا ہے جو قرآن میں دوسری جگہ زنا کے لیے اختیار کیا ہے بلکہ اس سے بھی زیادہ سنگین زنا کو صرف فاحشہ فرمایا ہے لیکن باپ کی منکوحہ سے نکاح کو

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام، تفہیم القرآن

فاحشہ، مقت اور ساء سبیلا کہا ہے یعنی بے حیائی بھی ہے مکروہ شیوہ بھی ہے اور بُرا دستور بھی، یہ تینوں الفاظ یہاں بول کر تین الگ الگ اشارے کیے ہیں۔ فاحشہ یہ دستور بجائے خود اور عقلاً بھی بڑی بے حیائی کی چیز ہے مقتاً مذاق سلیم رکھنے والوں کے لیے بڑی گندی چیز تھا۔ مقت کہتے ہیں ایسی بُری چیز کہ جسے دیکھ کر ہی گھن آئے۔ خود اہل جاہلیت بھی اسے بُری نگاہ سے دیکھتے تھے اور اس کا نام ہی نکاح المقت پڑ گیا تھا ساء سبیلاً یعنی اس کے نتائج بھی بڑے قبیح تھے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ برائی کے تین درجے ہیں عقلاً برائی قانونی بُرائی اور عرفی بُرائی۔ قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ باپ کی منکوحہ سے ازدواجی تعلق میں تینوں قسم کی برائیاں ہیں، یہ عقلی طور پر بھی بُرا ہے اس کے لیے فاحشہ بولا ہے شرعاً اور قانوناً بھی یہ کام بُرا ہے اس کے لیے مقت فرمایا ہے اور عرف وعادت اس کو بُرا سمجھتے ہیں اس کے لیے ساء سبیلاً کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ علامہ آلوسی نے یہ لکتہ خوب لکھا ہے کہ

تینوں قسم کی برائیوں کا اجتماع اگر ہو جائے تو یہ ایسی بُرائی ہے کہ اس سے اوپر کا تصور بھی نہیں ہے۔

اُصول وفروع کی حرمت

قرآن میں اگرچہ تعبیری انداز آیا ہے مگر عُلماء نے اس سے یہ نتیجہ اخذ کیا ہے کہ باپ ہو یا دادا، یا اس سے اوپر کا سلسلہ اسی طرح نانا ہو یا پڑنانا یا اس کا بالا سلسلہ سب کی حُرمت برابر ہے شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

باپ کی منکوحہ کا جو حکم ہے اسی حکم میں دادے اور نانے کی منکوحہ بھی ہے کتنا ہی اوپر کا دادا اور نانا کیوں نہ ہو۔

اسی طرح بیٹے کی بیوی، پوتے کی بیوی سے نکاح دُرست نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُصول و فروع سب حرام ہیں نہ باپ بیٹے کی منکوحہ سے اور نہ بیٹا باپ کی منکوحہ سے نکاح کر سکتا ہے۔

یہاں آیت میں لفظ نکاح عقد کے معنے میں ہے۔ اگرچہ نکاح کے معنے دونوں آتے ہیں عقد کے اور صحبت کے اور دونوں معنوں میں یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔ اس میں عُلماء کا اختلاف ہے کہ حقیقی معنے کون سے ہیں۔ احناف کہتے ہیں کہ وطی اور صحبت کے معنے میں اگر لفظ نکاح آئے تو معنے حقیقی ہیں اور عقد کے معنے میں ہو تو مجازی ہیں اور شوافع کو اصرار ہے کہ عقد کے معنے حقیقی ہیں اور صحبت کے معنے مجازی ہیں۔ اگرچہ احناف نے اس آیت میں لفظ نکاح کو بمعنے صحبت

لے کر باپ کی داشتہ سے بھی نکاح حرام کیا ہے لیکن اس پر احناف اور شوافع متفق ہیں کہ باپ کی منکوحہ سے بیٹے کا نکاح مطلق ناجائز ہے خواہ باپ نے اپنی منکوحہ سے صحبت کی یا نہ کی ہو چنانچہ علامی شامی رقمطراز ہیں وتحرم زوجة الاصل والفرع بمجرد العقد دخل بها اولا احناف یہاں پریشانی کا شکار ہیں۔ ایک طرف وہ باپ کی منکوحہ کو بیٹے کے لیے مطلق عقد کی بنا پر حرام قرار دیتے ہیں اور دوسری طرف وہ اسی آیت کے سہارے باپ کی مزنیہ کو محرمات میں شمار کرتے ہیں اور ساتھ ہی وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ جمع بین الحقیقت والمجاز ناجائز ہے۔ الجصاص اور آلوسی کو اس پر اصرار ہے کہ آیت میں نکاح کے معنے وطی اور صحبت کے ہیں۔ اگر ایسا ہے تو پھر باپ کی منکوحہ صرف عقد نکاح سے ناجائز نہ ہونی چاہیے الجصاص نے اس کا حل یہ تلاش کیا ہے او جبنا التحریم بالعقد بغیر الایۃ ہم نے باپ کی منکوحہ کی تحریم عقد کی بنا پر اس آیت سے نہیں دوسری آیت سے ثابت کیا ہے ابوحیان اندلسی نے البحرالمحیط میں نکاح کو اس آیت میں عقد کے معنے میں لے کر باپ کی منکوحہ سے نکاح کی حرمت ثابت کی ہے اور وطی حرام سے مزنیہ کی حرمت کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ دوسری دلیل سے ثابت ہے۔ اور زیلعی منکوحہ اور مزنیہ دونوں کی حرمت آیت سے ثابت کرتے ہیں اور کلام منفی میں جمع بین الحقیقت والمجاز کے جواز کو مانتے ہیں لیکن دوسرے اکابر کو علامہ زیلعی سے اتفاق نہیں ہے۔ بہرحال مسئلہ پیچیدہ ہے۔ لیکن اتنی بات واضح ہے کہ باپ کی منکوحہ سے نکاح کی حرمت اجماعی ہے اور مزنیہ سے اختلافی ہے۔ علامہ کاشانی نے اس پر جامع تبصرہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں ؛

باپ کی منکوحہ کی قرآن کی اس آیت سے حرمت ثابت ہے لفظ نکاح بولا جاتا ہے اور اس سے عقد مراد ہوتا ہے خواہ باپ نے خلوت کی ہو یا نہ کی ہو کیونکہ لفظ نکاح میں جیسے عقد کے معنے ہیں ایسے ہی صحبت اور وطی کے معنے ہیں۔ دونوں معنوں کے لحاظ سے حرمت ثابت ہوگی۔ نیز باپ کی منکوحہ سے نکاح کبھی قطع رحم کا ذریعہ ہو سکتا ہے۔ مثلاً باپ نے طلاق دے دی اور کچھ روز کے بعد اسے پشیمانی ہوتی اور اس کا ارادہ پھر نکاح کا ہوا، اگر بیٹا بھی امیدوار ہو جائے تو یہ باپ بیٹے میں باہم کینے اور عداوت کا سامان ہوگا اور یہی قطع رحم ہے۔ باپ کے علاوہ دادا پردادا کی منکوحہ اجماع سے حرام ہے اور آیت کے مدلول سے نہ کہ منطوق سے۔

ہمیں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ اس آیت گرامی کے منطوق سے باپ کی داشتہ اور مزنیہ کی حرمت کو ثابت کرنا ایک کمزور سہارا ہے الاستدلال بھذہ الایۃ ضعیف۔

ہاں اگر وطی حلال پر قیاس کرکے اس کی حرمت پیش کی جائے تو درست ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی کا میلان بھی یہی ہے فرماتے ہیں۔

جب باپ کی موطوءہ حکمیہ سے نکاح حرام ہے تو جو اس کی موطوءہ حقیقیہ ہو اگرچہ بغیر نکاح ہو اس سے بدرجہ اولیٰ نکاح حرام ہے۔

بہرحال اس امر میں اختلاف ہے کہ جس عورت سے باپ کا ناجائز تعلق ہو چکا ہو وہ بھی بیٹے پر حرام ہے یا نہیں۔ سلف میں سے کچھ اس کی حرمت کے قائل نہیں ہیں۔ چنانچہ الجصاص لکھتے ہیں کہ امام رازی، امام لیث بن سعد، امام ربیعہ الرای، امام مالک اور امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ زنا سے حرمت ثابت نہیں ہوتی اور کچھ کا خیال یہ ہے کہ زنا سے بھی حرمت ثابت ہو جاتی ہے یعنی جس عورت سے باپ نے زنا کرلیا ہے وہ بیٹے کے لیے حرام ہو گئی۔ الجصاص لکھتے ہیں کہ یہ سعید بن المسیب، سلیمان بن یسار، سالم بن عبداللہ، مجاہد عطا ابن ابی رباح، ابراہیم نخعی، عامر الشعبی، حماد، ابوحنیفہ، ابویوسف، محمد، زفر اور اوزاعی کا مذہب ہے۔

اسی طرح سلف میں اس موضوع پر بھی اختلاف رہا ہے کہ جس عورت سے بیٹے کا ناجائز تعلق ہو وہ باپ پر حرام ہے یا نہیں اور جس مرد سے ماں یا بیٹی کا ناجائز تعلق، ہا ہو یا بعد میں ہو جائے اس سے نکاح ماں اور بیٹی دونوں کے لیے حرام ہے یا نہیں۔

علاقہ نسب کی وجہ سے نکاح حرام ہے

۱۴ - تم پر ان عورتوں سے نکاح حرام کر دیا گیا ہے۔

تمہاری مائیں،
تمہاری بیٹیاں،
تمہاری بہنیں،
تمہاری پھوپھیاں،
تمہاری خالائیں،
تمہاری بھتیجیاں،
تمہاری بھانجیاں۔

سوتیلی ماں کی حرمت بیان کرنے کے بعد اب جن عورتوں سے نکاح جائز نہیں ان سب کو بیان

فرماتے ہیں۔ وہ عورتیں چند قسم کی ہیں اول ان کو بیان کیا جاتا ہے جو علاقہ نسب کی وجہ سے حرام ہیں۔ اور وہ سات ہیں، ماں، بیٹی، بہن، پھوپھی، خالہ، بھتیجی اور بھانجی، ان میں سے کسی کے ساتھ کسی کا نکاح جائز نہیں ہے۔ ماں کے حکم میں دادی، نانی اوپر تک کی سب داخل ہیں۔ ایسے ہی بیٹی میں پوتی اور نواسی نیچے تک کی سب داخل ہیں اور بہن میں علاتی اخیافی اور عینی سب داخل ہیں اور پھوپھی میں باپ دادا اور اوپر تک کی پشتوں کی بہن سگی ہو یا سوتیلی سب آگئیں۔ اور خالہ میں ماں اور نانی اور نانی کی نانی سب کی بہن تینوں قسم کی داخل ہیں اور بھتیجی میں تینوں قسم کے بھائیوں کی اولاد اور اولاد کی اولاد داخل ہیں[1]

شیخ الاسلام نے اجمالاً جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ محرمات کی تین قسمیں ہیں ایک وہ جو قرابت کی وجہ سے حرام ہیں دوسرے وہ جو مصاہرت کی وجہ سے حرام ہیں، تیسرے وہ جو رضاعت کی وجہ سے حرام ہیں۔ اس آیت میں بنات الاخت تک پہلی قسم کو بیان کیا گیا ہے۔

قرابت کی وجہ سے محرمات میں پہلی قسم

قرابت کی وجہ سے جن عورتوں سے نکاح حرام ہے اس کی سات قسمیں ہیں۔ ان میں سب سے پہلی قسم مائیں ہیں۔ ماں کا اطلاق سگی یا سوتیلی دونوں پر ہوتا ہے۔ نیز اس کے مدلول میں ماں کی ماں اور باپ کی ماں بھی داخل ہے۔ علامہ کاشانی رقمطراز ہیں کہ ماں کی حرمت قرآن کی آیت کا منطوق ہے اور دادی، نانی، پردادی، پرنانی تا آخر سب کی حرمت اس آیت کا مدلول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بطور عموم مجاز اصول سب کے سب حرام ہیں۔

دوسری قسم

بیٹیاں۔ بیٹیوں سے ازدواجی تعلق حرام ہے۔ بیٹی کے حکم میں پوتی اور نواسی بھی شامل ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ بیٹی، نواسی، پڑنواسی پوتی پڑپوتی ان سب سے نکاح حرام ہے۔ اور سوتیلی جو دوسرے شوہر کی ہو اور بیوی ساتھ لائی ہو اس کا حکم آگے آرہا ہے اور جو لڑکی گود لے کر پالی ہو اس کا حکم پارہ ۲۱ میں آرہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بطور عموم مجاز سب فروع سے نکاح ناجائز ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ ناجائز تعلقات کے نتیجہ میں جو لڑکی ہوئی ہو وہ بھی حرام ہے یا نہیں امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کے نزدیک عموم نص کی وجہ سے اس سے بھی ازدواجی تعلقات ناجائز ہیں۔ اور امام شافعی اس کو محرمات میں شمار نہیں کرتے۔ لیکن سوچنے کی بات ہے کہ کسی شخص کے نکاح میں ایسی لڑکی کا ہونا جس کے بارے میں خود جانتا ہو کہ وہ اسی کے غلط کردار کا نتیجہ ہے۔ مذاق سلیم کبھی گوارا نہیں کرتا۔ امام شافعی کے پیش نظر اس معاملہ میں قانون کے ظاہری الفاظ ہیں جبکہ دوسرے ائمہ کے پیش نظر قانون کی روح ہے بے شک قانون میں ایسی لڑکی کو اس بدکار کی لڑکی نہیں کہا جاتا۔ اس کی وجہ تو صرف یہ ہے کہ اس طرح بدکاری کی تشہیر ہوتی ہے لیکن اس وجہ سے حقیقت کا انکار نہیں کیا جاسکتا۔

تیسری قسم

ہمشیرگان یعنی بہنوں سے بھی شادی کرنا حرام ہے۔ اس میں حقیقی اور سوتیلی بہنیں سب داخل ہیں خواہ وہ ماں سے شریک ہوں یا باپ سے شریک ہوں۔

چوتھی قسم

پھوپھیاں، پھوپھیوں سے بھی ازدواجی تعلقات ناجائز ہیں۔ علامہ کاشانی رقمطراز ہیں کہ پھوپھیوں کے مدلول میں باپ کی بہن، دادا کی بہن پڑدادا کی بہن سگی ہو یا سوتیلی سب داخل ہیں اور اس پر امت کا اجماع ہے۔

پانچویں قسم

خالائیں، خالاؤں سے نکاح حرام ہے اس کے مدلول میں ماں نانی پڑنانی سب کی بہنیں داخل ہیں۔ چاہے یہ سگی ہوں یا باپ شریک ہوں اور یا ماں شریک سگے اور سوتیلے کا کوئی فرق نہیں ہے اور اس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔ دادا کی خالہ خواہ سگی ہو یا سوتیلی اس کا بھی یہی حکم ہے۔

چھٹی قسم

بھتیجیاں، ان سے بھی نکاح حرام ہے خواہ سگی ہو یا سوتیلی ان میں کوئی فرق نہیں سگے بھائی، باپ شریک بھائی، ماں شریک بھائی کی لڑکیاں اور اولاد کی اولاد سب سے نکاح حرام ہے۔

ساتویں قسم

بھانجیاں، یعنی بھانجیوں سے نکاح حرام ہے، چاہے یہ بھانجیاں حقیقی بہن کی اولاد ہوں یا باپ شریک بہن کی یا ماں شریک بہن کی اولاد ہوں اور خواہ ان کی اولاد کی اولاد ہوں سب سے نکاح حرام ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اپنے اصول اپنے فروع اپنے ماں باپ کے فروع اور اپنے ماں باپ کے اصول کے فروع سے نکاح حرام ہے۔

اپنے اصول سے مراد اپنے ماں باپ، اپنے دادا پردادا، نانا پرنانا، دادی پردادی، نانی پرنانی وغیرہ ہیں۔ اپنے فروع سے مراد اپنی اولاد اور اولاد کی اولاد آخر تک ہے۔

والدین کے فروع سے مراد بھائی بہن اور ان کی اولاد آخر تک ہے۔ اپنی ماں اور باپ کے اصول کے فروع سے مراد چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ ہے۔ لیکن ان کی حرمت صرف ایک بیٹ تک رہتی ہے۔ اسی لیے چچا، پھوپھی، ماموں، خالہ کی اولاد سے نکاح جائز ہے۔ ماں باپ کے چچا، ماموں، پھوپھی، خالہ اسی چوتھی قسم میں داخل ہیں کیونکہ وہ بھی ماں باپ کے اصول کے فروع ہیں ان سے بھی نکاح حرام ہے مگر ان کی اولاد سے جو اپنے ماں باپ کی چچازاد یا ماموں زاد بھائی بہن ہوں نکاح جائز ہے خلاصہ یہ ہے کہ اس قسم میں حرمت صرف ایک بطن تک رہتی ہے۔ ایک بطن کے بعد حرمت جاتی رہتی ہے۔

نسب کی یہ چاروں قسمیں جو یہاں بیان ہوئی ہیں اسی حالت میں حرام ہیں جبکہ ان کا رشتہ نکاح حلال سے ہوا ہو۔ اور اگر ان سے رشتہ زنا وغیرہ سے ہوا ہو تو ان چاروں قسموں میں سے پہلی دو قسمیں تو بدستور حرام رہیں گی۔ یعنی اصول اور اپنے فروع یعنی زنا کے ماں باپ اور ان ماں باپ کے ماں باپ وغیرہ، آخر سلسلہ تک اور زنا کی اولاد اور اولاد کی اولاد آخر تک بدستور حرام رہیں گی۔ ہاں تیسری قسم اور چوتھی قسم میں صرف ماں کے فروع آخر تک اور ماں کے اصول کے فروع ایک بطن تک بدستور حرام رہیں گی۔ اور باپ کے فروع اور باپ کے اصول کے فروع حرام نہیں ہیں اخیافی بھائی بہن اور ماموں خالہ تو حرام ہوں گی اور علاتی بھائی بہن، اور چچا پھوپھی حرام نہ ہوں گے[1]

---

[1] فتح القدیر۔

دُودھ کے رشتہ دار

۲۴۔ تمہاری وہ دودھ پلانے والی مائیں اور تمہاری دودھ شریک بہنیں، محرماتِ نسبی کے بعد اب محرماتِ رضاعی کو بیان کیا جاتا ہے اور وہ دو ہیں ماں اور بہن۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ ساتوں رشتے جو نسب میں بیان ہوئے رضاعت میں بھی حرام ہیں یعنی رضاعی بیٹی اور پھوپھی، خالہ اور بھتیجی اور بھانجی بھی حرام ہیں چنانچہ حدیثوں میں یہ حکم موجود ہے[1]

دودھ پینے سے ایک تعلق دُودھ پینے والے اور پلانے والے کے درمیان پیدا ہوتا ہے۔ دُودھ کے اس تعلق کو قرآن نے نسبی تعلق جیسا قرار دیا ہے۔ مثلاً جس عورت نے دُودھ پلایا ہے، دُودھ پینے والے بچے کی رضاعی ماں اور اس عورت کا شوہر اس کا رضاعی باپ اور ان ماں باپ کی اولاد اس بچہ کے رضاعی بہن بھائی ہیں۔ رضاعی ماں کی ماں، رضاعی نانی باپ رضاعی نانا، رضاعی ماں کا بھائی رضاعی ماموں بہن رضاعی خالہ۔ اور رضاعی باپ کی ماں رضاعی دادی، باپ رضاعی دادا، بھائی رضاعی چچا، بہن، رضاعی پھوپھی غرض تمام رشتے یہاں بھی نسب کی طرح قائم ہو جائیں گے۔ مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ دُودھ پلانے والی کے رشتہ دار تو اس بچہ کے رشتہ دار ہوں گے یعنی دودھ پلانے والی خود بھی اور اس کا شوہر بھی اور ان کے اصول وفروع بھی اور اصول کی فروع بھی۔ لیکن دُودھ پینے والے کی طرف سے صرف وہ بچہ خود رشتہ دار ہوگا اور اس کی اولاد اور اگر وہ مرد ہے تو اس کی بیوی اور اگر عورت ہے تو اس کا شوہر رشتہ دار ہو جائے گا۔ دودھ پینے والے کے اصول اور اصول کے فروع سے اس دُودھ پلانے والی کا کوئی تعلق نہ پیدا ہوگا۔ ایک محقق فاضل نے ان تعلقات کو ایک شعر میں نہایت خوبی سے پیش کیا ہے۔

از جانب شیردہ ہمہ خویش شوند　　　　ذرجانب شیرخوارہ زوجان فروع

اس شعر کو صاحب شرح الوقایہ نے نقل کیا ہے۔ واقعی عجیب جامع شعر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ دُودھ پلانے والی کی طرف سے سب لوگ عزیز ہو جاتے ہیں اور دُودھ پینے والے بچہ کی طرف سے صرف وہ دونوں میاں بیوی اور اس بچہ کی اولاد عزیز ہوتی ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن جن لوگوں میں باہم دُودھ کا رشتہ قائم ہو جاتا ہے۔ ان میں ان رشتوں میں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نکاح ناجائز ہے جن میں نسب کے ذریعے حرام ہے۔ یعنی نسب کے رشتہ سے جو نکاح آپس میں حرام ہے دودھ کے رشتہ سے بھی حرام ہے۔ اور اس پر پوری امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں کہ ایک لڑکے اور لڑکی نے جس عورت کا دودھ پیا ہو اس کے لیے وہ عورت ماں کے حکم میں اور اس کا شوہر باپ کے حکم میں ہے اور تمام وہ رشتے جو حقیقی ماں اور باپ کے تعلق سے حرام ہوتے ہیں رضاعی ماں اور باپ کے تعلق سے بھی حرام ہو جاتے ہیں۔

قرآن میں اخوانکم کے بعد من الرضاعۃ کی قید لگا کر اشارہ موجود ہے کہ جو رشتے نسب کے ذریعے حرام ہیں وہ رضاعت کے ذریعے بھی حرام ہیں یعنی پھوپھیاں، خالائیں، بھتیجیاں اور بھانجیاں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ قرآن کے مبین ہیں اس لیے آپ نے اپنے ارشادات میں یہ بات کھول کر سمجھا دی ہے۔ صحیح بخاری، صحیح مسلم میں بحوالہ عائشہ صدیقہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بیان ہے کہ یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من النسب، ایک روایت میں یحرم من الرضاعۃ ما یحرم من الولادۃ یعنی جو رشتے نسب اور ولادت سے حرام ہیں وہ رضاعت سے بھی حرام ہیں۔

دودھ سے رشتہ کب قائم ہوتا ہے

دودھ پینے کے ذریعے جو رشتہ قائم ہوتا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ دودھ پینے کے زمانے میں پیا جائے یعنی جس بچہ نے دودھ پیا ہے اس کی عمر دودھ پیتے وقت دو برس کے اندر اندر ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انما الرضاعۃ من المجاعۃ یعنی رضاعت سے جو حرمت ثابت ہوگی جس زمانے میں دودھ ہی سے بچہ کی نشوونما ہوتی ہے۔

البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ دودھ پلانے کی مدت کتنی ہے۔ امام ابوحنیفہ کا مشہور قول یہ ہے کہ دودھ پلانے کی مدت اڑھائی سال ہے اور اس مدت میں دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی، لیکن دوسرے ائمہ امام شافعی، امام احمد، امام ابو یوسف، امام محمد اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ بچہ کو دودھ پلانے کی مدت دو سال ہے۔ دو سال ہی کے زمانہ میں دودھ پینے سے رضاعت ثابت ہوگی حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت ابو ہریرہ اور حضرت عبداللہ بن عمر کا بھی یہی مسلک ہے۔ اسی پر امام محمد کا فتویٰ بھی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ رضاعت میں اعتبار صرف اس زمانے میں دودھ پینے کا ہے جبکہ بچہ کا دودھ چھڑایا نہ جا چکا ہو اور دودھ ہی اس کی غذا کا دار و مدار ہو۔ دودھ چھڑانے کے بعد اگر کسی بچہ نے کسی عورت کا دودھ پی لیا ہو تو اس سے حرمتِ رضاعت ثابت نہ ہوگی، بشرطیکہ دودھ

دو سال پورا ہونے پر چھڑایا گیا ہو۔

کتنی مقدار سے رشتہ قائم ہوتا ہے

دُودھ پلانے کے زمانے میں دُودھ کی مقدار خواہ کتنی ہو، تھوڑی ہو یا زیادہ، ہر طرح سے رضاعت کا حکم ثابت ہو جائے گا۔ صحابہ میں حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ، حضرت عبداللہ ابن عباسؓ، حضرت عبداللہ ابن عمرؓ، تابعین میں حسن بصری، سعید بن المسیب، طاؤس یمانی، ابراہیم نخعی، زہری اور شعبی اور ائمہ میں ابوحنیفہ، ابویوسف، محمد، زفر، مالک، الثوری، الاوزاعی اور لیث کا مذہب یہی ہے بلکہ الجصاص نے لیث کے حوالہ سے لکھا ہے کہ مسلمانوں کا اس پر اجماع ہے کہ جتنی مقدار سے روزہ دار کا روزہ ٹوٹ جاتا ہے اتنی مقدار میں اگر بچہ کسی عورت کا دُودھ پی لے تو حرمتِ رضاعت ثابت ہو جاتی ہے لیکن امام احمد بن حنبل کے نزدیک تین مرتبہ سے اور امام شافعی کے نزدیک پانچ بار پینے سے یہ حرمت ثابت ہوتی ہے۔

سسرالی رشتہ میں نکاح

۴۳۔ تمہاری خوشدامنیں، تمہاری بیویوں کی وہ لڑکیاں جو تمہاری گود میں پرورش پاتی ہیں بشرطیکہ ان بیویوں سے عقدِ نکاح کے بعد زناشوئی کا تعلق بھی ہو چکا ہو۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ان لڑکیوں سے نکاح میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ اور تمہاری حقیقی بیٹوں کی بیویاں اور دو بہنوں کو جمع کرنا۔ اب محرماتِ مصاہرت کا ذکر ہے یعنی علاقہ نکاح کی وجہ سے جن سے نکاح حرام ہوتا ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں، اوّل وہ کہ ان سے ہمیشہ کے لیے نکاح حرام ہے اور وہ بیوی کی ماں یعنی خوشدامن اور اس زوجہ کی بیٹی ہے جس زوجہ سے تم نے صحبت کی ہو۔ لیکن اگر صحبت سے پہلے کسی کو طلاق دے دی ہو تو اس کی بیٹی سے نکاح ہو سکتا ہے۔ اور تمہارے بیٹوں کی عورتیں ہیں اور اس میں نیچے تک کے پوتوں اور نواسوں کی عورتیں داخل ہیں کہ ان سے کبھی تمہارا نکاح نہیں ہو سکتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے کہ ان سے ہمیشہ کے لیے نکاح کی ممانعت نہ ہو بلکہ جب تک کوئی عورت تمہارے نکاح میں رہے اس وقت تک اس عورت کی ان قرابت والی عورتوں سے نکاح کی ممانعت رہی۔ جب اس عورت کو طلاق دے دی یا وہ مرگئی تو ان سے نکاح دُرست ہو جائے گا اور وہ زوجہ کی بہن ہے کہ زوجہ کی موجودگی میں تو اس سے نکاح نہیں ہو سکتا اور بعد میں دُرست ہے اور یہی حکم ہے زوجہ کی

پھوپھی اور خالہ اور بھتیجی اور بھانجی کا، یہ جو فرمایا کہ عورتیں تمہارے بیٹوں کی جو کہ تمہاری پشت سے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے بیٹے یا پوتے نسبی ہوں منہ بولے یعنی لے پالک نہ ہوں جس کو تبنّیٰ کہتے ہیں رضاعی سے احتراز نہیں ہے [1]

دراصل یہاں چار باتیں یا قانون کی چار دفعات بیان ہوتی ہیں۔

۱۔ بیویوں کی ماؤں یعنی خوشدامنوں سے نکاح حرام ہے۔

۲۔ بیویوں کی لڑکیوں سے نکاح حرام ہے۔

۳۔ بیٹوں کی بیویوں سے نکاح حرام ہے۔

۴۔ ایک وقت میں دو بہنوں سے ازدواجی تعلق حرام ہے۔

بیویوں کی مائیں حرام ہیں

اول یعنی بیویوں کی ماؤں سے نکاح حرام ہے یعنی کوئی شخص اپنی خوشدامن سے ازدواجی تعلقات قائم کرنے کا مجاز نہیں ہے خواہ صرف نکاح ہی ہوا ہو اور ابھی رخصتی عمل میں نہ آئی ہو۔ اس پر ائمہ اربعہ امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی اور امام احمد کا اتفاق ہے۔ حافظ ابوجعفر طحاوی فرماتے ہیں کہ یہاں تک جن جن عورتوں سے نکاح کی ممانعت آئی ہے سب محکمات سے ہیں اور سب کا اتفاق ہے کہ ان میں سے کسی سے نکاحی تعلق جائز نہیں ہے سوائے ان عورتوں کی ماؤں کے جن سے نکاح کے بعد رخصتی سے پہلے ازدواجی تعلق ختم ہو گیا ہے۔ اس میں جمہور سلف بھی کہتے ہیں کہ منکوحہ کی ماں سے نکاح حرام ہے۔ صرف حضرت علی کی رائے یہ ہے کہ جب تک رخصتی نہ ہو ساس حرام نہیں ہوتی لیکن قرطبی کہتے ہیں کہ حضرت علی کی یہ رائے محدثین کے نزدیک تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہی ہے کہ حضرت علی بھی جمہور کے ہمنوا ہیں۔

بیویوں کی ماؤں سے صرف مائیں ہی مراد نہیں بلکہ اس کے مدلول میں بیویوں کی نانیاں، دادیاں، پڑدادیاں آخر تک خواہ نسبی ہوں یا رضاعی ہوں سب داخل ہیں۔ اور نسبی میں چاہے حقیقی ہوں، باپ شریک یا ماں شریک ہوں۔ اور امام ابوحنیفہ کی رائے میں جس طرح منکوحہ بیوی کی ماں حرام ہے اسی طرح اس عورت کی ماں بھی حرام ہے جس کے ساتھ شبہ میں ہم بستری کی گئی ہو یا جس کے ساتھ زنا

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کیا ہو۔

بیویوں کی لڑکیاں حرام ہیں

دوم بیویوں کی لڑکیوں سے نکاح حرام ہے لیکن شرط یہ ہے کہ ان لڑکیوں کی ماؤں سے نکاح کے بعد رخصتی بھی عمل میں آچکی ہو۔ اگر صرف نکاح ہوا اور رخصتی سے پہلے طلاق ہو گئی یا منکوحہ مرگئی تو پھر بیوی کی بیٹی سے نکاح جائز ہے۔ ربائب جمع ربیبۃ کی ہے جس کے معنے اس زیر پرورش لڑکی کے جو اگلے شوہر سے ہو ربیبۃ اسے اس لیے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنی ماں کے دوسرے شوہر کے آغوش تربیت میں ہوتی ہے۔ اس کے ساتھ التی فی حجورکم (وہ جو تمہاری گودوں میں ہیں) کے الفاظ محض اس رشتہ کی نزاکت ظاہر کرنے کے لیے ہیں ورنہ یہ کوئی قید اور شرط نہیں۔ یعنی ایسی لڑکی کا حرام ہونا اس شرط پر موقوف نہیں کہ وہ تمہاری گود میں پرورش پا رہی ہے۔ ائمہ فقہ کا اس پر اتفاق ہے کہ سوتیلی بیٹی آدمی پر بہرحال حرام ہے خواہ اس نے سوتیلے باپ کے گھر میں پرورش پائی ہو یا نہ پائی ہو حجور حجر کی جمع ہے۔ اس کے معنے حفاظت کے ہیں اور چونکہ گود میں بھی بچہ کی حفاظت ہوتی ہے اس لیے اس کو حجر کہتے ہیں بلکہ یہ اس کے مرادی معنے ہیں ورنہ اصل میں لفظ حجر کے معنے روکنے کے ہیں۔ حفاظت اس لیے کہتے ہیں کہ جو شخص بچہ کو اپنی حفاظت میں لیتا ہے وہ اس کے اموال اور دیگر حالات میں تصرف سے اسے روکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ لڑکیاں جو تمہاری بیویوں کے ان کے پہلے شوہروں سے ہوں ان کے حرام ہونے کی شرط یہ ہے کہ ان کی ماؤں سے نکاح کے بعد تمہارے زناشوئی کے تعلقات ہو چکے ہوں۔ یعنی ان کی رخصتی ہو چکی ہو۔ رخصتی کے لیے قرآن نے دخلتم بھن کا بلیغ استعارہ اختیار کیا ہے۔ اس سے فقہائے نے یہ بات سمجھی ہے کہ حرمت میں اصلی مؤثر جماع اور صحبت ہے اسی لیے امام ابوحنیفہ نے بتایا ہے کہ جس عورت سے ناجائز تعلق ہو جائے تو اس کے اصول و فروع بھی حرام ہو جاتے ہیں بلکہ جس عورت کو شہوت سے ہاتھ لگایا ہو اس کا بھی یہی حکم ہے اس موضوع کی بہترین تشریح حضرت مولانا اشرف علی نے فرمائی ہے۔

یہ آیت اس بات میں تو نص ہے کہ حرمت مصاہرت بنت المنکوحہ کی موقوف ہے اس منکوحہ سے دخول پر اور اس حرمت کے لیے اس سے صرف نکاح کافی نہیں ہے۔ رہی یہ بات کہ صورت دخول میں حرمت میں مؤثر کیا چیز ہے؟ نکاح بشرط دخول یا دخول محض اور دخول بشرط نکاح اور یا پھر دونوں کا مجموعہ، یہ سب احتمالات ہیں کیونکہ تتبع احکام سے سب میں علت مؤثرہ ہونے کی صلاحیت

معلوم ہوتی ہے چنانچہ کچھ احکام میں محض نکاح مؤثر ہے جیسے بیویوں کی ماؤں کی حرمت اور بیٹوں کی بیویوں اور باپ کی بیوی کی حرمت، اور کچھ احکام میں صرف دخول بلا نکاح ہی مؤثر ہے جیسے موطوءہ بالشبہ کا عنصر اور کچھ احکام میں دونوں نکاح اور دخول میں سے ایک بشرط الآخر موثر ہے جیسے نکاح کے بعد خلوت صحیحہ سے پورے مہر کا واجب ہونا اور کچھ احکام میں نکاح اور دخول دونوں مؤثر ہیں جیسے رجم کر اس میں صرف نکاح بشرط دخول کو موثر نہ کہیں گے اور ایسے ہی دخول کے مؤثر کہنے کا بھی کوئی قرینہ نہیں ہے۔ یہ بھی مؤثر نہیں لہٰذا مجموعہ ہی موثر ہے۔ اس سے ثابت ہوگیا کہ علت ہونے کی صلاحیت سب میں ہے اس لیے ثابت ہوا کہ ربائب کی حرمت مصاہرت کی علت صرف دخول ہے اور جب دخول کا علت موثرہ ہونا قرآن سے ثابت ہوگیا تو غیر ربائب میں بھی قیاس سے حکم متعدی ہوگا۔ اور چونکہ موطوءہ کے تمام اصول و فروع میں اسی طرح تمام اصول و فروع کے موطوآت میں کوئی فصل کا قائل نہیں اس لیے بنات الموطوءہ میں حرمت مصاہرت کا حکم سب کے لیے یکساں ہوگا۔[1]

بیٹوں کی لڑکیوں سے نکاح حرام ہے

سوم بیٹوں کی بیویوں سے نکاح حرام ہے۔ اصل ارشاد میں الفاظ یہ ہیں وحلائل ابنائکم الذین من اصلابکم حلائل حلیلۃ کی جمع ہے حل سے بنا ہے جس کے معنے کھو لنے اور حلال ہونے کے ہیں حلیل خاوند کو اور حلیلہ بیوی کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لیے حلال ہیں مطلب یہ ہے کہ بیٹے کی بیوی حرام ہے اور بیٹے کے عموم میں پوتا اور نواسا بھی داخل ہیں۔ ان کی بیویاں بھی دادا اور نانا پر حرام ہیں اور اس کے عموم میں وہ عورتیں بھی بالاجماع داخل ہیں جن سے بیٹوں نے ملک یمین یا شبہ کی بنا پر صحبت کی ہو اور امام ابوحنیفہ کی رائے یہ ہے وہ اس کے مدلول میں داخل ہیں جن سے بیٹوں نے غیر قانونی تعلقات قائم کیے ہوں۔ الذین من اصلابکم جو بیٹے تمہاری پشتوں سے ہوں کا اضافہ یہ بتانے کے لیے ہے کہ جس آدمی نے بیٹا بنا لیا جسے ہمارے پالک کہتے ہیں اس کی بیوی حرام نہیں ہے شوہر کی موت یا طلاق کے بعد یہ پالک کے باپ سے نکاح کر سکتی ہے۔ حرام صرف اس بیٹے کی بیوی ہے جو آدمی کی اپنی صلب سے ہو اور رضاعی بیٹا اگرچہ اس قید کی وجہ سے خارج ہے لیکن ارشاد نبوت نے اسے داخل کر دیا ہے حضور کا فرمان ہے :

[1] بوادر والنوادر

رضاعت سے وہ سب رشتے حرام ہیں جو نسب سے حرام ہیں اور اس پر پوری امت کا اتفاق ہے۔

علامہ کاشانی نے اس موقعہ پر یہ بات خوب لکھی ہے کہ آیت قرآنی میں صلب کا ذکر یہاں خاصیت کی خاطر ہے ورنہ بیٹا تو ہوتا ہی صلب سے ہے جیسے قرآن میں ہے ولا طائر یطیر بجناحیہ پرندہ تو اڑتا ہی اپنے دوبازوں سے ہے۔ اور یا بیٹوں کی قسمیں بتانے کے لیے ہے کیونکہ بیٹا صلبی بھی ہوتا ہے رضاعی بھی اور متبنّٰی بھی، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے زید بن حارثہ کی بیوی سے طلاق کے بعد شادی کی تو کہنے والوں نے کہہ دیا کہ اپنے بیٹے کی بیوی سے شادی کی ہے قرآن نے من اصلابکم کی قید یہی بتانے کے لیے لگائی ہے کہ متبنّٰی کی بیوی حرام نہیں۔

ایک وقت میں دو بہنوں سے نکاح

چہارم، دو بہنوں سے ایک وقت میں ازدواجی تعلقات حرام ہیں۔ یہ اجتماع خواہ نکاح میں ہو یا ملک یمین میں ہو، ناجائز ہے۔ اور پھر یہ دو بہنیں حقیقی ہوں، علاتی ہوں، یا اخیافی، نسب کے اعتبار سے ہوں یا رضاعی، یہ حکم سب کو شامل ہے۔ ارشاد نبوت اور امت کے اجماع سے یہ بات معلوم ہوئی ہے کہ خالہ بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کا بھی یہی حکم ہے۔ ارشاد ہے۔

کسی بھی بھتیجی اور اس کی پھوپھی کو نکاح میں جمع نہ کیا جائے اور بھانجی اور اس کی خالہ کو بھی جمع نہ کیا جائے۔

فقہائے نے اس معاملہ میں یہ اصول بنایا ہے کہ ایسی دو عورتوں کا جمع کرنا بہرحال حرام ہے جن میں سے کوئی اگر بالفرض مرد ہو تو اس سے دوسری کا نکاح ناجائز ہو۔ فقہا نے یہ قاعدہ قرآن کی اسی آیت سے معلوم کیا ہے کہ اگر دو بہنوں سے ایک مرد فرض کر لی جائے تو اس کا نکاح بھائی بہن ہونے کی وجہ سے دوسرے کے ساتھ ناجائز ہوگا، بہرحال ایسی دو عورتوں کو نکاح میں جمع کرنا ناجائز ہے خواہ اس طرح کرے کہ ایک ہی وقت میں ان دونوں سے نکاح کرے یا اس طرح کرے کہ ایک پہلے سے نکاح میں ہے اب دوسری سے نکاح کر لے۔ اور اگر ایک کو طلاق دے چکا تھا اس کے بعد دوسری سے نکاح کیا تو اگر اس مطلقہ کی عدت نہیں گزری تو یہ جمع بھی ناجائز ہے۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ اگر دونوں کے ساتھ یکدم نکاح کیا ہے تو دونوں کا نکاح باطل ہو جائے گا اور اگر ایک کے ساتھ پہلے کیا ہے اور اس کے بعد دوسری کے ساتھ تو اگر

اس کو یہ یاد نہ ہے کہ کس کے ساتھ پہلے نکاح کیا تھا پھر بھی دونوں کا نکاح باطل اور کالعدم ہوگا۔ اور اگر یاد ہے تو جس سے پہلے نکاح ہوا ہے صحیح ہوگا اور دوسری کا نکاح باطل ہو جائے گا۔

۴۴ - ہاں جو پہلے ہو چکا سو ہو چکا، اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسلامی قانون سے پہلے زمانہ جاہلیت میں جو کچھ ہوتا رہا اس پر گرفت نہ ہوگی۔ یہ فقرہ ولا تنکحوا ما نکح اٰباؤکم کے بعد بھی آیا اور یہاں بھی دوبارہ آیا ہے۔ دونوں جگہ مطلب ایک ہے کہ زمانۂ جاہلیت میں تم جو کچھ کر چکے ہو اب اسلام کے بعد اس پر تم سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ مواخذہ نہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ نہ آخرت میں اس کی سزا ہوگی اور نہ دنیا میں۔ یہ مطلب نہیں کہ جو نکاح ہو چکا ہے وہ اب باقی رہ سکتا ہے۔

تمدنی اور معاشرتی مسائل میں جاہلیت کے غلط طریقوں کو حرام قرار دیتے ہوئے قرآن میں یہ بات ضرور آتی ہے کہ جو کچھ ہو چکا سو ہو چکا۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ ایک یہ کہ نادانی کے زمانے میں جو غلطیاں تم کرتے رہے ہو ان پر کوئی گرفت نہ ہوگی، بشرطیکہ اب حکم آجانے کے بعد اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لو۔ اور جو غلط کام ہیں ان کو چھوڑ دو۔ دوسرے یہ کہ زمانہ سابق کے کسی طریقے کو اب اگر حرام قرار دیا گیا ہے تو اس سے یہ نتیجہ نکالنا صحیح نہیں ہے کہ پچھلے قانون یا رسم و رواج کے مطابق جو کام پہلے کیے جا چکے ہیں ان کو کالعدم اور ان سے پیدا شدہ نتائج کو ناجائز، اور عائد شدہ ذمہ داریوں کو لازماً ساقط بھی کیا جا رہا ہے۔ مثلاً اگر سوتیلی ماں سے نکاح کو حرام کیا گیا ہے یا دو بہنوں کو ایک نکاح میں جمع کرنے کو حرام قرار دیا گیا ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اب تک جتنے لوگوں نے ایسے نکاح کیے تھے ان کی اولاد حرامی قرار دی جا رہی ہے اور اپنے باپوں کے مال میں ان کا حق وراثت ساقط کیا جا رہا ہے، بالفاظِ دیگر قانون ماضی پر لاگو نہ ہوگا کہ اس کو بنیاد قرار دے کر تمام پچھلے رشتوں کی تحقیق ہو اور اس کی روشنی میں جائز و ناجائز کے احکام صادر ہوں۔ یہ چیز عملاً ناممکن ہے۔

الحمد للہ چوتھی جلد میرے قلم سے ۴۴۴ صفحات پر مشتمل ۲۳ رشعبان المکرم ۱۳۹۶ھ بروز جمعۃ المبارک مطابق ۲۰ راگست ۱۹۷۶ء بوقت ۱/۲ ۸ بجے صبح ختم ہوئی۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم و تب علینا انک انت التواب الرحیم۔

معالم القرآن

جلد پنجم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

علم و کتاب واٹس ایپ گروپ

نام ـــــ معالم القرآن
موضوع ـــــ تشریح و تفسیر
ملکیت ـــــ ادارۂ تعلیمات قرآن، سیالکوٹ
تالیف ـــــ حضرت مولانا الحاج محمد علی صاحب الصدیقی الکاندھلوی
عناوین ـــــ ۳۷۳
آیات ـــــ ۵۴
طابع ـــــ حافظ عبدالرشید خاقان
تزئین و آرائش ـــــ سید انور حسین نفیس رقم، لاہور
کتابت ـــــ محمود احمد، گوجرانوالہ
ناشر ـــــ قاری عبدالرحمان، ایم اے
صفحات ـــــ ۶۷۷
تاریخ اشاعت ـــــ شوال المکرم ۱۳۹۷ھ مطابق ستمبر، اکتوبر ۱۹۷۷ء
مطبع ـــــ زاہد بشیر پرنٹرز
جولائی ۱۹۹۰ء

قیمت ۔ ۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ

دار العلوم الشہابیہ، رنگ پورہ روڈ، سیالکوٹ شہر، (پاکستان)

انتساب

میں تفسیر معالم القرآن کی پانچویں جلد کو جس میں اُمت کو دین کی تکمیل کی خوشخبری سُنا کر رہتی دُنیا تک توامیت اور شہادت علی الناس کے منصب جلیل پر فائز کیا گیا ہے قابلِ صد احترام حافظ عبدالرشید خاقان صاحب کے نام منسُوب کرتا ہوں جن کی قرآن کی اشاعت میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ دریا دلی سے یہ جلد زیور طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس جذبۂ خیر کو تا دیر قائم رکھے اور ان کے لیے دُنیا اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین۔

قاری عبدالرحمٰن ایم۔اے
ناظم ادارہ تعلیمات قرآن سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

حرفِ آغاز

باسمہٖ تعالیٰ

معالم القرآن کی چوتھی جلد محرم الحرام سنہ ۹۰ھ مطابق جنوری سنہ [illegible]ء کو شائع ہوئی تھی، آج پورے چھ ماہ کے بعد اس کی پانچویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

اگرچہ اس بار کام میں ایک ہنگامی رکاوٹ سے دوچار ہونا پڑا اور پورے دو ماہ تفسیر کا کام نہ ہو سکا لیکن اس غیر ارادی تعطل کے باوجود الحمدللہ پانچویں جلد مکمل ہو گئی۔ رکاوٹ سے میری مراد زمانہ اسیری ہے۔ اوّل سیالکوٹ جیل اور پھر بہاولپور جیل۔ مورخہ ۲۵ مارچ بعد از نماز جمعہ ایک پر ہجوم جلوس میں مجھے گرفتار کیا گیا، مورخہ ۶ اپریل کو انتظامیہ نے فرضی روئدادِ مقدمہ تیار کر کے مجھے تین ماہ قید اور پانچ سو روپے جرمانے کی سزا سنا دی۔ اسی روز رات کے ۹ بجے مجھے اور میرے پندرہ ساتھیوں کو بہاولپور جیل روانہ کر دیا گیا۔

جیل جانے کی یہ سعادت پاکستان میں احیائے اسلام کے لیے حاصل ہوئی۔ بنانے والوں نے پاکستان اسلام کے نام پر بنا تو لیا مگر انگریز کی ذہنی غلامی کی وجہ سے انگریز کے ورثہ کفر و مادیت سے ابھی تک پاکستان کو نجات نہیں ملی۔ اور میرا عقیدہ ہے کہ اس کے زوال کے بغیر پاکستان میں دین و اخلاق کا عروج اور اسلام کی دعوت کا پھلنا اور پھولنا مشکل ہے، یہ صرف کسی ایک شعبۂ زندگی اور کسی ایک جماعت کی اسلام کے نظامِ حیات سے روگردانی کا سوال نہیں۔ سوال ایک پوری تہذیب، ایک مستقل نظامِ فکر اور ایک عالمگیر دعوت کا ہے جو نبوت کے علم و عمل، اس کی تعلیمات اور اس کے نتائج و اثرات کے بالکل منافی ہے۔

خیر یہ داستان طویل ہے اس کی تفصیلات تو انشاء اللہ مجوزہ کتاب "سیالکوٹ جیل سے بہاولپور

جیل تک،، میں آپ پڑھیں گے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حالات کی غلط کروٹ المدرسۃ تفسیر کے کام پر اثر انداز نہیں ہوتی۔ ۳ مئی،، در کو رہائی ہوئی اور ۴ مئی ۷۸ء سے پھر کام شروع کر دیا۔

اس جلد میں مجھے جن علمی گہواروں سے استفادہ کرنے کا موقعہ ہے ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ ابوبکر بن العربی مالکی	عارضۃ الاحوذی
۲۔ مفتی احمد یار خاں	کنز العرفان
۳۔ الشیخ ابوعلی الفضل بن الحسن الطبرسی	مجمع البیان
۴۔ شیخ الطائفہ ابوجعفر محمد بن الحسن الطوسی	تہذیب الاحکام
۵۔ 〃 〃 〃	الاستبصار
۶۔ الشیخ ابوجعفر محمد بن یعقوب الکلینی الرازی	الفروع من الکافی
۷۔ الحافظ ابومحمد علی بن حزم الظاہری	المحلی
۸۔ الامام علاء الدین ابوبکر بن مسعود الکاشانی	بدائع الصنائع
۹۔ الشیخ عبدالعزیز محدث دہلوی	تحفہ اثنا عشریہ
۱۰۔ امام مالک بن انس	المدونۃ الکبری
۱۱۔ ابوجعفر الصدوق محمد بن علی بن بابویہ القمی	من لا یحضرہ الفقیہ

ان کے علاوہ میں نے خاص مسائل کی تحقیق کے لیے اس جلد میں مولانا محمد مالک کاندھلوی شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور، مولانا محمد تقی عثمانی مدیر البلاغ دارالعلوم کراچی، اور مولانا عبدالرشید نعمانی شیخ الحدیث جامعہ اسلامیہ سے بھی خط و کتابت کے ذریعے استفادہ کیا ہے، فجزاھم اللہ عنی خیر الجزاء،

اصل یہ ہے کہ میں تو بکھری ہوئی دولت کو یکجا کر رہا ہوں ورنہ اپنی ذات کی حد تک حال یہ ہے کہ:

نہ گلم نہ برگِ سبزم نہ درخت سایہ دارم　　　در حیرتم کہ دہقاں بچہ کار کشت مارا

یہ احباب کی پر خلوص دعاؤں کا صدقہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے مجھے اس کام کے کرنے کی توفیق عطا فرمائی، اور احباب ہی سے میری درخواست ہے کہ وہ اللہ کی جناب میں اس عظیم کام کی تکمیل کے لیے دعا کریں عالمِ اسباب میں میرے علم اور جسم کی کمزوریاں اس راہ میں ہر قدم پر آڑے آتی ہیں، کسی نے سچ کہا ہے

ذھب الذین یعاش فی اکنافھم　　　بقی الذین حیاتھم لا تنفع

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

مُقَدّمہ

سورۃ انبیاء میں اللہ سبحانہ نے قرآن کا یہ چہرہ پیش کیا ہے لقد انزلنا الیکم کتابا فیہ ذکرکم اس کا ترجمہ حضرت شیخ الہند نے اس طرح فرمایا ہے کہ "ہم نے اتاری ہے تمہاری طرف کتاب اس میں تمہارا ذکر ہے" یہ آیت بتاتی ہے کہ قرآن ایک صاف، شفاف، سچا، وفادار، دیانتدار آئینہ ہے۔ جس میں ہر شخص اپنے خدوخال دیکھ سکتا ہے۔ معاشرے میں اپنا مقام پہچان سکتا ہے اور خدا کے نزدیک اپنا مرتبہ معلوم کر سکتا ہے۔ کیوں قرآن انسانوں کے اخلاق و اوصاف بیان کرتا ہے اور اس میں انسانیت کے اعلیٰ اور ادنیٰ ہر طرح کے نمونہ کی تصویریں موجود ہیں۔ فیہ ذکرکم یعنی اس کتاب میں تمہارا بیان ہے۔ تمہارے حالات و اوصاف مذکور ہیں جیسا کہ بہت سے علماء نے سمجھا ہے۔ سلف قرآن کو ایک زندہ بولنے والی اور زندگی سے لبریز کتاب تصور کرتے تھے ان کے نزدیک قرآن کوئی تاریخی اور آثار قدیمہ کی چیز نہ تھی جس کا زندہ لوگوں سے بدلتی ہوئی انسانی زندگی اور انسانیت کے ان بے شمار لامحدود نمونوں جو ہر زمان و مکان میں موجود رہتی ہیں کوئی تعلق نہ ہو۔ ہمارے اسلاف اپنے اخلاق و اوصاف اور اپنے اندرون کو بخوبی جانتے تھے۔ ہر چیز ان کے سامنے روشن اور عیاں تھی۔ وہ اسی قرآن سے رہنمائی حاصل کرتے تھے۔ اسی عجیب و غریب کتاب میں اپنے چہرے ڈھونڈتے اور اپنے اخلاق و اطوار کی سچی اور صحیح تصویر تلاش کرتے تھے اور بہت آسانی سے خود کو اس کتاب میں پا جاتے تھے اور پہچان لیتے تھے۔ اگر ذکر خیر ہوتا تو خدا کا شکر ادا کرتے اور اگر کچھ اور ہوتا تو استغفار کرتے اور اپنی اصلاح کی کوشش کرتے تھے۔ اس آیت کی تلاوت

پر مجھے سیدنا احنف بن قیس کا ایک واقعہ یاد آیا حضرت احنف بن قیس کبار تابعین میں سے ہیں سیدنا علی بن ابی طالب رضی اللہ عنہ کے مخصوص ترین اصحاب میں ان کا شمار ہے، حلم میں ضرب المثل تھے۔ مگر اس کے باوجود جب غصہ ہو جاتے تو ان کی غیرت و محبت میں جوش آجاتا، لوگ کہتے تھے کہ جب احنف کو غصہ آتا ہے تو ان کے ساتھ ایک لاکھ تلواریں غضبناک ہو جاتی ہیں۔ یہ واقعہ میں نے ابو عبداللہ محمد بن النصر المروزی (متوفی ۲۹۴ھ) کی تصنیف "قیام اللیل" میں پڑھا ہے۔ مصنف امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ علیہ کے ارشد تلامذہ میں تھے۔

واقعہ یہ ہے کہ ایک روز حضرت احنف بن قیس تشریف فرما تھے کہ انہوں نے کسی کو یہ آیت پڑھتے ہوئے سنا تو چونک پڑے اور فرمایا ' ذرا قرآن مجید لانا میں اپنا ذکر تلاش کر وں اور معلوم کروں کہ میں کس کے ساتھ ہوں اور کس سے مشابہ ہوں۔

قرآن مجید کھولا تو اس آیت پر نظر پڑی جس میں کچھ لوگوں کے متعلق ارشاد ہے،

رات کے تھوڑے سے حصے میں سوتے تھے، اور اوقات سحر میں بخشش مانگا کرتے تھے اور ان کے مال میں مانگنے والے اور نہ مانگنے والے دونوں کا حق ہوتا تھا۔

(الذاریات۔ ۱۷-۱۹)

پھر یہ آیت گزری

ان کے پہلو بچھونوں سے الگ رہتے ہیں، (اور) وہ اپنے پروردگار کو خوف و اُمید سے پکارتے ہیں، اور جو مال ہم نے ان کو دیا ہے اس میں خرچ کرتے ہیں۔

(السجدہ۔ ۱۶)

پھر ان کے سامنے ایک گروہ آیا جس کی تعریف اس طرح کی گئی ہے،

اور جو اپنے پروردگار کے آگے سجدہ کر کے عجز و ادب سے کھڑے رہ کر راتیں بسر کرتے ہیں۔ (الفرقان۔ ۶۴)

پھر ان کا گزر ایسے لوگوں کے پاس سے ہوا جن کا قرآن مجید میں اس طرح ذکر ہے،

جو آسودگی اور تنگی میں (اپنا مال خدا کی راہ میں) خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو روکتے ہیں اور لوگوں کے قصور معاف کرتے ہیں اور خدا نیکو کاروں کو دوست رکھتا ہے۔

(آل عمران۔ ۱۳۴)

پھر ان کے سامنے کچھ نمونے آئے جن کا تعارف اس طرح کرایا گیا ہے:

اور دوسروں کو اپنی جانوں سے مقدم رکھتے ہیں، خواہ ان کو خود احتیاج ہی ہو، اور جو شخص حرص نفس سے بچالیا گیا تو ایسے ہی لوگ مراد پانے والے ہیں۔

(الحشر۔ ۹)

پھر یہ سامنے آئی۔

اور جو بڑے بڑے گناہوں اور بے حیائی کی باتوں سے پرہیز کرتے ہیں، اور جب غصہ آتا ہے تو معاف کر دیتے ہیں اور جو اپنے پروردگار کا فرمان قبول کرتے ہیں، اور نماز پڑھتے ہیں اور اپنے کام آپس کے مشورے سے کرتے ہیں اور جو مال ہم نے ان کو عطا فرمایا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

(الشوریٰ ۳۷، ۳۸)

پھر رک گئے اور فرمایا اے اللہ یہاں تو میں اپنے آپ کو نہیں پارہا ہوں اور دوسری جگہ تلاش کرنا شروع کیا تو ایک جماعت کا تذکرہ دیکھا۔

ان کا یہ حال تھا کہ جب ان سے کہا جاتا تھا کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں تو غرور کرتے تھے اور کہتے تھے بھلا ہم ایک دیوانہ شاعر کے کہنے سے کہیں اپنے معبودوں کو چھوڑ دینے والے ہیں (الصف۔ ۳۵، ۳۶)

پھر ان کا ذکر گزرا:

اور جب تنہا خدا کا ذکر کیا جاتا ہے تو جو لوگ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ان کے دل منقبض ہو جاتے ہیں اور جب اس کے سوا اوروں کا ذکر کیا جاتا ہے خوش ہو جاتے ہیں۔

(الزمر۔ ۴۵)

پھر ان حضرات کا تذکرہ سامنے آیا جن سے سوال کیا جائے گا:

(سوال ہوگا) تم دوزخ میں کیوں پڑے وہ جواب دیں گے کہ ہم نماز نہیں پڑھتے تھے اور نہ فقیروں کو کھانا کھلاتے تھے اور اہل باطل کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے اور روز جزا کو جھٹلاتے تھے یہاں تک کہ موت آگئی۔ (المدثر ۴۲، ۴۷)

پھر ٹھہر گئے اور فرمایا: اے اللہ میں تیری بارگاہ میں ان لوگوں سے برأت ظاہر کرتا ہوں اس کے بعد ورق الٹتے رہے اور تلاش کرتے رہے آخر کار جب اس آیت پر نظر پڑی:

اور کچھ اور لوگ ہیں کہ اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں انہوں نے اچھے اور برے

عملوں کو ملا جلا دیا تھا، قریب ہے کہ خدا ان پر مہربانی سے توبہ فرمائے بے شک خدا بخشنے والا مہربان ہے۔ (التوبہ۔ ۱۰۲)

تو فرمانے لگے : «خدا نہ کرے میں انہی لوگوں میں سے ہوں۔»

آئیے ہم بھی اپنا ذکر اور اپنی تصویر پوری دیانتداری اور سنجیدگی سے قرآن میں تلاش کریں قرآن بشیر بھی ہے اور نذیر بھی، صالحین کے ساتھ کفار و مشرکین کا بھی تذکرہ اس میں موجود ہے، قرآن افراد اور جماعتوں دونوں کی تصویر کشی کرتا ہے۔

ارشاد ہے :

اور کوئی شخص تو ایسا ہے جس کی گفتگو دنیا کی زندگی میں تم کو دلکش معلوم ہوتی ہے اور وہ اپنے مافی الضمیر پر خدا کو گواہ بناتا ہے، حالانکہ وہ سخت جھگڑالو ہے اور جب پیٹھ پھیر کر چلا جاتا ہے تو زمین میں دوڑتا پھرتا ہے تاکہ اس میں فتنہ انگیزی کرے، اور کھیتی کو (برباد) اور (انسانوں اور حیوانوں کی) نسل کو نابود کردے اور خدا فتنہ انگیزی کو پسند نہیں کرتا اور جب اس سے کہا جاتا ہے کہ خدا سے خوف کر۔ تو غرور اس کو گناہ میں پھنسا دیتا ہے سو ایسے کو جہنم سزاوار ہے اور وہ بہت برا ٹھکانا ہے۔

(البقرہ۔ ۲۰۴۔ ۲۰۶)

پھر اس کے بعد ارشاد ہے :

اور کوئی شخص ایسا ہے کہ خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے اپنی جان بیچ ڈالتا ہے اور خدا بندوں پر بہت مہربان ہے۔ (البقرہ ۲۰۷)

ایک جماعت کا ذکر اس طرح ہے :

اے ایمان والو! اگر کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو خدا ایسے لوگ پیدا کردے گا جن کو وہ دوست رکھے اور جسے وہ دوست رکھیں اور جو مومنوں کے حق میں نرمی کریں اور کافروں سے سختی سے پیش آئیں، خدا کی راہ میں جہاد کریں اور کسی ملامت کرنے والے سے نہ ڈریں، یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور خدا بڑی کشائش والا اور جاننے والا ہے۔ (المائدہ، ۵۴)

ایک دوسری جماعت کا تذکرہ اس طرح ہے :

مومنوں میں کتنے ہی ایسے شخص ہیں، جو اقرار انہوں نے خدا سے کیا تھا اس کو

سچ کر دکھایا تو ان میں بعض ایسے ہیں جو اپنی نذر سے فارغ ہو گئے اور بعض ایسے ہیں جو انتظار کر رہے ہیں اور انہوں نے (اپنے قول کو) ذرا بھی نہیں بدلا۔

(الاحزاب، ۲۳)

شکر اور احسان شناسی کی ترغیب دلاتے ہوئے قرآن انبیاؑ اور ان کے متبعین کا ذکر کرتا ہے اور ناشکری، احسان فراموشی، غرور اور حسن سلوک کا جواب بدسلوکی سے دینے کی مذمت کرتے ہوئے اور اس کے انجام بد سے ڈراتے ہوئے فرماتا ہے:

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہوں نے خدا کے احسان کو ناشکری سے بدل دیا اور اپنی قوم کو تباہی کے گھر میں اتارا۔ (ابراہیم، ۲۸)

اور اس کی مثال ایک بستی سے دیتا ہے جس نے خدا کی نعمتوں کو فراموش کر دیا اور جس کے افراد اپنی خوشحالی پر اترانے لگے، ارشاد ہے:

اور خدا ایک بستی کی مثال بیان فرماتا ہے کہ (ہر طرح) امن چین سے بستی تھی ہر طرف سے رزق با فراغت چلا آتا تھا مگر ان لوگوں نے خدا کی ناشکری کی تو خدا نے ان کے اعمال کے سبب ان کو بھوک اور خوف کا لباس پہنا کر (ناشکری کا) مزہ چکھا دیا۔

(النحل، ۱۱۲)

یہ انسانی اور اخلاقی نمونے جو قرآن نے مختلف ناموں سے پیش کیے ہیں کہیں کسی مطلق العنان فرمانروا کے نام سے مثلاً فرعون، کہیں کسی سرکش وزیر یا امیر کے نام سے مثلاً ھامان، کہیں کسی متکبر اور بخیل سرمایہ دار کے نام سے مثلاً قارون، کہیں کسی ظالم و جابر قوم کے نام سے مثلاً عاد، کہیں کسی مشہور اور ماہر صنعت کے نام سے مثلاً ثمود، یہ تمام لازوال انسانی نمونے ہیں جو کسی زمان و مکان کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں اور یہ تمام نمونے انسانی فطرت کے مختلف کمزور پہلوؤں اور گوشوں کی نمائندگی کرتے ہیں۔ قرآن کریم نے ان افراد اور جماعتوں کے انجام پر بھی روشنی ڈالی ہے اور صفائی کے ساتھ کہا ہے کہ جو بھی ان کے نقش قدم پر چلے گا اور ان کو اپنا رہنما اور قائد تسلیم کرے گا اس کا انجام بھی وہی ہوگا جو ان افراد اور جماعتوں کا ہوا۔

جو لوگ پہلے گزر چکے ہیں ان میں بھی خدا کا یہی دستور رہا ہے اور خدا کا حکم مقرر ہو چکا ہے۔

(الاحزاب، ۳۸)

دریائے کابل سے دریائے یرموک تک

پارہ پنجم ایک نظر میں

صفاتِ الٰہی

رحمت الٰہی ۲۵، ۲۹، ۶۴، ۱۰۰، ۱۰۶، ۱۱۰، ۱۲۹۔

علم و خبر　۲۶، ۳۲، ۳۵، ۳۹، ۴۲، ۷۰، ۹۲، ۹۴، ۱۰۴، ۱۲۷، ۱۲۸، ۱۳۵، ۱۴۷۔

نرمی کرنا اور معاف کرنا،　۲۶، ۲۷، ۴۳، ۴۸، ۶۴، ۹۹، ۱۰۶، ۱۱۰، ۱۱۲، ۱۲۹۔

اللہ سبحانہ کی قوت، قدرت، اختیار، احاطہ اور غلبہ　۳۰، ۵۶، ۱۰۸، ۱۳۳۔

اللہ کی ذات حاکمیت، اقتدار، پادشاہی،　۴۷۔

اللہ کی ذات کارساز، ولی، مددگار اور وکیل ہے　۴۵، ۸۱، ۱۳۲

اللہ کی ذات بصیر ہے　۳۳، ۵۸، ۸۶

اللہ کی ذات دانائی اور حکمت والی ہے　۲۴، ۲۶، ۵۱، ۹۲، ۱۰۴، ۱۳۰۔

اللہ کی ذات وسعتوں والی ہے　۱۳۰،

اللہ کی ذات سننے والی ہے　۵۸،

اللہ کی ذات مالک ہے　۱۳۲،

توحید الوہیت وربوبیت

رسالت ونبوت

دستوری قواعد

صحابہ کا چہرہ

اسلامی شعائر

اجتماعی قوانین

اخلاقی قوانین

مالیاتی قوانین

عرب میں دستور تھا کہ یتیم لڑکی اگر خوبصورت اور مالدار ہوتی تو سرپرست بطمع زر خود نکاح کر کے اسے نقصان پہنچاتا یا دوسرے سے نکاح کر دیتا مگر اس شرط پر کہ مال کا

سیاسی قوانین

دفاعی قوانین

آخرت کی زندگی

نفاق کا چہرہ

معاشرتی قوانین

ایمان واسلام

فوجداری قوانین

اصطلاحاتِ قرآنی

احصان: یہ لفظ لغت میں مختلف معانی کے لیے آتا ہے، حریت، عفت، تزویج، اسلام اور قید میں رکھنا، قرآن میں احصن جس موقعہ پر آیا ہے وہاں منکوحہ بنانے کے معنے میں ہے اور اور قید سے بھی یہاں قیدِ نکاح مراد ہے۔ اسی سے محصنات کا لفظ ہے جو ان عورتوں کے لیے بولا جاتا ہے جو کسی کی قیدِ نکاح میں ہوں۔ نیز یہ لونڈیوں کے متابل لفظ کی حیثیت سے بھی استعمال ہوا ہے۔ اس صورت میں اس کا اطلاق حرائر اور شریف زادیوں پر ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ ان دونوں معنے میں آیا ہے۔ احصان کی قیدِ نکاح کو سفاح سے ممتاز کرنے کے لیے۔ نکاح کا اصل مقصد اسی وقت پورا ہوتا ہے جب اس کے ساتھ احصان پایا جائے۔ قرآن نے احصان کی قید لگا کر متعہ کے اس مکروہ رواج کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا ہے جو زمانۂ جاہلیت میں رائج تھا۔

اجور: اجر کی جمع ہے۔ مزدوری، ثواب، مہر، بدلہ کے معنے میں آتا ہے۔ عورتوں کے لیے نکاح میں مال اور مہر کی شرط لگانے سے ایک مقصد تو یہ ہے کہ عورتوں کے معاملے میں اکراہ یا توارث کے ان امکانات کا بالکل سدِّ باب ہو جائے جن کی طرف چوتھے پارے میں اشارات گزر چکے۔ اگرچہ اس کا بہت کچھ سدِّ باب رحم کے رشتوں کو حرام قرار دینے سے بھی ہو گیا تھا۔ لیکن قیدِ مہر سے اس کو اور بھی مسدود کر دیا۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ نکاح کے معاملے کو ایک سنجیدہ معاہدے کی حیثیت حاصل ہو جائے اسے لڑکوں کا

کمیل نہ بنایا جائے جس معاملے کے ساتھ ادار مال کی شرط لگی اور اس ادائے مال کی حیثیت محض ایک تبرع اور احسان کی نہ ہو بلکہ ایک فریضہ کی ہو حتیٰ کہ اگر وہ مذکور نہ بھی ہو، پھر بھی لازماً مضمر سمجھا جائے اور عورت کی حیثیت عرفی کے اعتبار سے اس کی ادائیگی واجب قرار پائے قانوناً اور عرفاً ایک اہم اور سنجیدہ معاملہ بن جاتا ہے کہ کوئی بھی ذی ہوش آدمی ایسے معاہدے میں ایک پارٹی بننے کی جرأت نہ کرے گا جب تک وہ سو بار سوچ کر اس میں شرکت کی ذمہ داریوں کو ادا کرنے کے لیے اپنے آپ کو تیار نہ کرے ان مصالح سے نکاح میں اجر کی شرط ضروری ہوئی ہے۔

اراءت ربانی: یہ لفظ قرآن میں اس وحی کے لیے بھی بولا گیا کہ خواب میں ہوتی ہے جیساکہ سورۂ انفال میں ہے اور اس رہنمائی کے لیے بھی آیا ہے جو فہم و فراست کے ذریعے اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہوتی ہے یعنی وحی کتابی کے اصول و کلیات کے تحت اپنے نور بصیرت اور فہم حکمت کے ذریعے نبی جو فیصلے کرتا ہے یہ اللہ کی جانب سے اراءت ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ اے پیغمبر کتاب کے احکام اور قوانین کو سے کر اس فہم کے ذریعے جو کچھ اللہ تجھ کو سمجھائے اور دکھائے تو لوگوں کے درمیان فیصلہ اور انصاف کرے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو بھی سمجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا وہ آپ کے عمل اور قضایا اور فیصلوں کی صورتوں میں محفوظ ہے اور اسلامی قانون کا وحی الٰہی کے بعد دوسرا ماخذ ہے۔

استمتاع:۔ اس کا مادہ متع ہے، اسی سے تمتع، استمتاع اور تمتیع آتے ہیں۔ استمتاع کے معنے ہیں طلب تمتع یعنی دیر تک نفع اٹھانا، عربی میں بولتے ہیں استمتع الرجل بولدہٖ یعنی آدمی نے اپنے بیٹے سے فائدہ اٹھایا، اس لیے استمتاع کے لغوی معنے صرف فائدہ اٹھانے کے ہیں نہ کہ تعلقات زناشوئی کے۔ اور متعہ کے معنے ایسی عورت سے فائدہ اٹھانے کے ہیں جسے تم اپنی بنا کر ہمیشہ رکھنا نہیں چاہتے ہو۔ دیکھو لسان العرب یا جیساکہ امام راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ ایک مرد ایک عورت سے شرط کر لیتا تھا کہ مال کی مقررہ مقدار اسے دے گا اور مقررہ وقت تک اس سے فائدہ اٹھائے گا۔ استمتاع عام ہے اور متعہ عرب لغت میں خاص معنے میں استعمال ہوا ہے۔ بڑے چھوٹے انسان کا ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا اور باپ کا بیٹے سے فائدہ اٹھانا استمتاع ہے۔ لسان العرب میں زجاج کی رائے نقل کی ہے کہ اس آیت میں استمتاع کو متعہ کے

معنے میں سے کہ کچھ لوگوں نے لغت سے نادانی کی وجہ سے سنگین غلطی کی ہے۔ اور شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ کچھ لوگوں کا یہ خیال کہ یہ آیت متعہ کے موضوع پر نازل ہوئی ہے۔ قطعاً غلط ہے اور اس سلسلے میں عبداللہ بن مسعود کی روایت ایک من گھڑت افسانہ ہے۔ خواہ یہ روایت اہل سنت کی کتابوں میں درج ہے کیونکہ آیت کی یہ تشریح نظم قرآنی کے خلاف ہے اور آگے فرماتے ہیں کہ

"ہر تفسیر کہ خلاف نظم قرآنی باشد گو روایت از صحابہ کنند مسموع و مقبول نیست۔"

یہ درست ہے کہ متعہ عرب میں رائج تھا اس لیے اگر نزول حکم قرآنی سے پہلے حضور انور نے کسی جنگ میں اس کی اجازت دی ہو تو وہ دوسری بات ہے اجازت نزول حکم سے پہلے کی ہے۔ جب قرآن نازل ہو گیا تو روایات میں ممانعت بھی آگئی۔ اب اجازت کو پیش کرنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی شراب کے متعلق کسی روایت کو پیش کرے۔ یہ بداخلاقی نہیں تو اور کیا ہے؛

الامانات، امانت کی جمع ہے۔ یہ لفظ قرآن کی اصطلاح میں وسیع معنے میں بولا جاتا ہے۔ افکار اعمال، اخلاق، معاملات احوال سب پر حاوی ہے۔ ابن الاثیر نے نہایہ میں تصریح کی ہے کہ امانت کا لفظ طاعت، عبادت، ودیعت، ثقہ اور امان پر بولا جاتا ہے۔ شارحین قرآن کی تشریح کے مطابق اس کی وسعت میں وہ امانت الٰہی بھی داخل ہے جس کا نام عدل و انصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے۔ پہلی بات زمخشری نے کشاف میں دوسری بات محدث ابن جریر نے تفسیر میں لکھی۔ اور وہ امانتیں بھی اس میں داخل ہیں جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔ ایمان اور امانت دونوں کا مادہ امن ہے اسی لیے طبرانی کبیر میں ہے کہ آپ نے فرمایا جس میں امانت نہیں اس میں ایمان نہیں ہے۔ اور اسی لیے ارشاد ہے کہ امانت لوگوں کے دلوں کی جڑ میں اتری ہے یعنی ان کی فطرت میں ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے کپڑا اور مالی اشیا تک محدود نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھے بلکہ ہر مالی، سیاسی، قانونی، اجتماعی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔

آیت انا عرضنا الامانۃ علی السموات والارض والجبال میں امانت سے تمام مفسرین کے نزدیک تکلیف شرعی مراد ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر موضح القرآن میں رقمطراز ہیں:

امانت کیا ہے؟ پرائی چیز رکھنی اپنی خواہش کو روک کر، آسمان و زمین وغیرہ میں اپنی خواہش کچھ نہیں ہے یا ہے تو وہ ہی ہے جس پر وہ قائم ہیں۔ انسان میں خواہش اور ہے اور حکم اس کے خلاف ہے اس پرائی چیز یعنی حکم کو برخلاف اپنے جی کے تھامنا بڑا زور چاہتا ہے اس کا انجام یہ کہ منکروں کے قصور پر پکڑا جائے اور ماننے والوں کا قصور معاف کیا جائے۔ اب بھی حکم ہے کسی کی امانت کوئی جان کر ضائع کر دے تو بدلہ دینا پڑ جائے اور بے اختیار ہو جائے تو کچھ نہیں۔

امانی :- جھوٹی آرزوئیں خیالات کے انداز سے، ٹھہرائی ہوئی امیدیں بروزن افاعیل بتشدید یاء ہے۔ امنیۃ کی جمع جس کے معنے کسی ٹھہرائی ہوئی تمنا کے ہیں۔ بعض مفسرین نے امانی کے معنے جھوٹی باتوں کے اور بعض نے بغیر سمجھے بوجھے پڑھ لینے کے بیان کیے ہیں۔ چونکہ جھوٹی بات میں ایک بے حقیقت چیز کا ٹھہرانا ہوتا ہے اور بے سمجھے بوجھے پڑھنا اندازے پر چلنا ہوتا ہے اس لیے یہ دونوں معنے بھی امنیہ سے مراد ہو سکتے ہیں ومنھم امیون لا یعلمون الکتاب الا امانی میں یہی معنے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہودی اپنی کتاب کی اصل حقیقت سے تو واقف نہیں ہیں کہ اس میں ان کو کیا تعلیم دی گئی ہے۔ بس ان کے ذہن میں کچھ تمنائیں اور خواہشات ہیں جو اگرچہ بالکل بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں لیکن ان کے علماء کی غلط تعلیم سے ان کے اندر رچی ہوئی ہیں۔ وہ اپنی کتاب کو اپنی انہی خواہشات کا مجموعہ سمجھتے ہیں۔ ان کے خیال میں ان کی کتاب ان کے اوپر کوئی ذمہ داری عائد نہیں کرتی بلکہ صرف ان کی ان خواہشات کی سند تصدیق عطا کرنے کے لیے نازل ہوئی ہے۔ قرآن حکیم نے ان کی اس قسم کی بعض آرزوؤں کا حوالہ دیا ہے۔ قرآن نے ان آرزوؤں کی حیثیت کو بھی واضح کیا ہے کہ ان کی یہ تمام آرزوئیں محض یہود اور ان کے علماء کے ذہن کی تخلیقات ہیں۔ ان کو اصل حقیقت سے کوئی دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

استنباط : اس کا مادہ نبط ہے اور نبط البیر کے معنے کنوئیں کو کھود کر پانی نکالنے کے ہیں اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے کسی بات کی تہ کو پہنچنے اور اس کی حقیقت کو پانے کے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اسی سے مجتہدین کا استنباط ہے جب وہ اپنے فہم اور اجتہاد

سے مخفی معنے نکال لیتے ہیں اس لیے صاحب تاج العروس نے استنباط کے معنے استخراج لکھے ہیں یعنی ایک بات کی تہ تک پہنچ کر صحیح نتیجہ نکالنا۔ استنباط کے لغوی معنے تو یہی ہیں کہ ایک بات کی تہ تک پہنچ کر صحیح نتیجہ نکالنا مگر اصطلاحاً اس سے مراد اجتہاد ہے یعنی یہ معلوم کرنے کی انتہائی کوشش کرنا کہ مسئلہ زیر بحث اسلام کا حکم یا اس کا منشا کیا ہے۔ بعض لوگ غلطی سے استنباط کو بالکل آزادانہ رائے کے استعمال کے معنے میں لیتے ہیں، حالانکہ ایسا سمجھنا غلطی ہے۔ اسلام میں اصل قانون قرآن و سنت ہے۔ انسان جو قانون سازی بذریعہ استنباط کرتے ہیں وہ لازماً یا تو اصل قانون سے ماخوذ ہونی چاہیے یا پھر ان حدود کے اندر ہونی چاہیے جن میں وہ استعمال رائے کی آزادی دیتا ہے اس سے بے نیاز ہو کر جو استنباط کیا جاتے وہ نہ اسلامی استنباط ہے اور نہ اسلام کے قانون نظام میں اس کا کوئی مقام ہے۔ یہاں اولی الامر کے ساتھ استنباط کا لفظ بتا دیا کہ قرآن اسلامی حکومت میں اولوالامر کے اندر کس قسم کے اوصاف کا خواہاں ہے۔ اولوالامر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ان میں قرآن و سنت کا اتنا علم ہو کہ جس سے آدمی نہ صرف جزوی احکام اور ان کے مواقع سے واقف ہو بلکہ شریعت کے کلیات اور اس کے مقاصد کو بھی اچھی طرح سمجھتا ہو۔ اس کو ایک طرف یہ معلوم ہو کہ انسانی زندگی کی اصلاح کے لیے قانون اسلامی کی مجموعی اسکیم کیا ہے اور دوسری طرف یہ جانے کہ اس مجموعی اسکیم میں زندگی کے ہر شعبے کا کیا مقام ہے۔ اسلام اس کی تشکیل کن خطوط پر کرنا چاہتا ہے اور اس کی تشکیل میں اس کے پیش نظر مصالح کیا ہیں۔

اولوالامر: اولو جمع ہے اس کا واحد نہیں لیکن بعض ذو کو اس کا واحد کہتے ہیں۔ اس کے معنے والا اس کا مونث ذات بمعنی والی آتا ہے۔ اس کی جمع اولات آتی ہے۔ الامر کے معنے حکم کے ہیں اور اس کے معنے کام، معاملہ حالت بھی ہیں۔ امر بمعنی حکم کی سے امارت بمعنے حکومت آتا ہے جیسے ولایت اور سیاست، جب یہ حکم کے معنے میں ہو تو اس کی جمع اوامر آتی ہے اور دوسرے معنے میں ہو تو جمع امور آتی ہے۔ امر بمعنے حکم کے لیے آمر اور مامور ضروری ہیں۔ آمر میں وجاہت اور مامور میں طاعت امر کا تقاضا ہے۔ اولوالامر کون ہیں۔ اس میں اچھی خاصی قیل و قال ہوتی ہے۔ حافظ ابن

القیم نے اعلام میں لکھا ہے کہ ایک روایت میں عبداللہ بن عباس، جابر بن عبداللہ، الحسن البصری، ابوالعالیہ عطا بن ابی رباح، الضحاک اور مجاہد کہتے ہیں کہ اولوالامر سے مراد علماء ہیں۔ ابوہریرہ اور ایک روایت میں عبداللہ بن عباس، ایک روایت میں زید بن اسلم السدی اور مقاتل کہتے ہیں کہ اولوالامر سے مراد حکام و فرمانروا ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ امراء کی طاعت بھی اسی وقت ضروری ہے جب وہ نبوت کے علم و عمل کے مطابق حکم دیں، اگر یہ خود عالم نہ ہوں تو امراء کی طاعت علماء کی طاعت کے تابع ہے کیونکہ طاعت تو معروف میں ہوتی ہے اور نبوت کے علم کی ہوتی ہے جیسے علماء کی طاعت، رسول کی طاعت کے تابع ہے ایسے ہی امراء کی طاعت علماء کی طاعت کے تابع ہے اور چونکہ اسلامی نظام کا قوام علماء اور امراء سے وابستہ ہے اس لیے ان دونوں کی طاعت ناگزیر ہے۔ ان ہی دو طبقوں کا بناؤ سنوار اور بگاڑ پورے عالم کے فساد و صلاح کا دارومدار ہے۔ عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں۔

انسانی زندگی میں یہ دونوں قسمیں ہی مدارِ صلاح و فساد ہیں۔ ان کی درستگی سے جہاں درست اور ان کے بگاڑ سے جہاں بگڑ جاتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ اسلام کے عہدِ اول میں علماء ہی امراء ہوتے تھے۔ غیر علماء کو امارت سپرد نہ کی جاتی تھی اس لیے وہاں یہ سوال ہی پیدا نہ ہوتا کہ طاعت کس کی ہو بعد کو زمانۂ استبداد میں جب اسلام ناآشنا اقتدار پر جبراً قابض ہو گئے اور علماء کو اقتدار سے محروم کر دیا گیا تو یہ سوال ابھر آیا کہ امراء اگر علماء نہ ہوں تو ان کے اوامر کی بھی بجا آوری ضروری ہے۔ اسلامی نظام میں ہر شعبۂ زندگی میں سربراہی کے لیے اسلام شناسی ناگزیر ہے۔

اخلاص: میر سید شریف نے لکھا ہے کہ اخلاص کے معنے لغت میں طاعات میں دکھاوا نہ کرنا اور اصطلاح میں اخلاص نام ہے ہر ملاوٹ کے شائبہ سے دل کو صاف رکھنا، اور علامہ الشیخ محمد اعلیٰ التھانوی نے صوفیا سے اخلاص کی تعریف یہ نقل کی ہے، اخلاص یہ ہے کہ تمام حرکات، سکنات، اٹھنا، بیٹھنا، کردار و گفتار اور زندگی کی ساری کردگی اللہ کے لیے ہو۔ اور حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین شرح منازل السائرین عارف ہروی سے یہ تعریف نقل کی ہے کہ اخلاص کہتے ہیں عمل کو ہر ملاوٹ سے پاک و صاف کر دینے کو۔ اخلاص کی حقیقت مقرر کرنے میں تعبیرات مختلف ہیں لیکن مآل سب کا ایک ہے۔

قرآن میں ان تمام آیات پر غور کرنے سے جن میں اخلاص کا مطالبہ ہے۔ دو باتیں بالکل بے نقاب ہوکر سامنے آجاتی ہیں۔ ایک یہ کہ اخلاص اللہ کے لیے ہو اور دوسرے یہ کہ دین میں ہو۔ ان آیات کو غور سے پڑھیے الا للہ الدین الخالص فاعبد اللہ مخلصا لہ الدین، قل انی امرت ان اعبد اللہ مخلصا لہ الدین۔ قل اللہ اعبد مخلصا لہ دینی و ادعوہ مخلصین لہ الدین، وادعوا اللہ مخلصین لہ الدین، و ما امروا الا لیعبدوا اللہ مخلصین لہ الدین۔ ان آیات میں اللہ کے لیے دین میں اخلاص کو بتایا گیا ہے۔ دین کا لفظ قرآن حکیم میں کئی معنے میں استعمال ہوا ہے۔ مذہب و شریعت، قانون، اطاعت اور جزا۔ یہاں اخلاص کے ساتھ لفظ دین اطاعت کے معنے میں آیا ہے۔ دین کو اللہ کے لیے خالص کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی وفاداریاں اللہ کے سوا کسی اور سے وابستہ نہ ہوں، اپنی ساری دلچسپیوں اور محبتوں اور عقیدتوں کو وہ اللہ کے آگے نذر کر دے، کسی چیز کے ساتھ بھی دل کا ایسا لگاؤ باقی نہ رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اسے قربان نہ کیا جا سکتا ہو۔

تراضی : آپس میں ایک دوسرے سے خوش ہونا۔ اسلام میں یہ لین دین اور کاروبار کی آزادی کا بہت بڑا پروانہ ہے۔ اس معاملہ میں قرآن نے اساسی اور بنیادی شرط لین دین کے لیے لین دین کرنے والوں کی باہمی رضامندی کو قرار دیا ہے۔ یعنی دین میں یہ وہ اہم بنیادی شرط ہے کہ کبھی بھی اس سے الگ ہوکر کسی لین دین کے جواز کا تصور نہیں ہو سکتا۔ قرآن نے یہاں معاملات میں جواز کی شرط تراضی قرار دی ہے لیکن تبرعات و صدقات میں حلت کی بنیادی شرط طیب نفس بتائی ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے قاعدۃ العقود نامی کتاب میں تفصیل پیش کی ہے۔ لین دین میں رضامندی جانبین کی جیسے یہ آیت بطور شرط بتادی ہے ایسے ہی تبرعات میں طیب نفس کی شرط پر آیت رہنما ہے فان طبن لکم عن شیء منہ نفسا دیکھئے جلد چہارم معالم القرآن نوٹ نمبر ۲ سورۂ نساء۔

تفضیل بعض علی بعض : اللہ نے کچھ کو کچھ پر برتری عطا فرمائی ہے۔ یہاں یہ بات محذوف ہے کہ برتری کس چیز میں دی ہے۔ قرآن نے نوع انسانی کی اس خصوصیت کا مختلف پیرایوں میں تذکرہ کیا ہے کہیں تفضیل بعض علی بعض کے عنوان سے کہیں رفع بعض

فوق بعض کے الفاظ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یوں تو تمام کائنات کی بنیاد ہی صفات و کمالات کے فرق مراتب پر ہے۔ جمادات میں وہ صفات نہیں جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے۔ نباتات ان صفات سے مفلس ہیں جن سے حیوانات سرفراز ہیں۔ صفات کے تفاوت کا اگر یہ تماشا دنیا میں نہ ہوتا تو ان گنت بے شمار طرح طرح کی بوقلمونیوں سے جو بھرا ہوا نظر آتا ہے نہ ہوتا مقصد یہ ہے کہ افراد انسانی میں صفات و کمالات کا یہ تفاوت کسی دوسرے کا نہیں بلکہ براہ راست اللہ کا کام ہے۔ اور جس طرح یہ قدرت کا کارنامہ ہے اسی طرح تفاوت صفات کی وجہ سے افراد انسانی میں مدارج و مراتب کا جو فرق پیدا ہو گیا ہے یہ بھی کسی دوسرے کا نہیں بلکہ صاف لفظوں میں کہہ دیا فضل اللہ بعضہم علی بعض بہر حال صفاتی و کمالاتی تفاوت کا جو قانون انسانی افراد میں پایا جاتا ہے یہی قرآن کی اصطلاح میں تفضیل بعض علی بعض ہے۔ یہاں صرف یہ بیان کیا ہے کہ بعض افراد کو بعض پر اللہ نے برتری اور فضیلت بخشی ہے لیکن یہ بات کہ کن باتوں میں فضیلت بخشی ہے اسے ابہام و اطلاق ہی کی حالت میں چھوڑ دیا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ وہ اتنے مختلف الجہات وجوہ ہیں کہ ان کی تفصیل میں غیر ضروری طوالت ہو جاتی۔ مگر صفاتی تفاوت کے اس قدرتی قانون کے زیر اثر انسانوں کے بعض افراد کو بعض پر نتیجۃً جو معاشی فضیلت اور برتری حاصل ہو گئی اس کے لیے قرآن میں دوسری جگہ فی الرزق کی جو تصریح کر دی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ معاشی لحاظ سے انسانی افراد میں مدارج کا فرق اسی پر مبنی ہے۔

توفیق ، وفق سے بنا ہے دو چیزوں کے درمیان مطابقت کا نام ہے۔ اتفاق اور موافقت اسی سے بنا ہے۔ جب اسلام نے طاقت پکڑ لی اور یہود کی مدینے میں سیاسی طاقت کمزور ہو گئی تو مسلمانوں کو قرآن نے ہدایت دی کہ اب منافقین کے بارے میں اپنی روش بدلیں یعنی ان لوگوں کے بارے میں جو دم تو بھرتے ہیں اسلام کا لیکن اسلام کے سیاسی نظام کو نہیں مانتے چنانچہ مسلمانوں نے ان کا قدم قدم پر محاسبہ شروع کر دیا۔ منافقین اس صورت حال سے پریشان ہو گئے نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین بھاگ بھاگ کر دربار نبوت میں آتے اور قسمیں کھا کر آپ کو یقین دلاتے کہ وہ یہودیوں سے جو سیاسی ربط و ضبط اور جوڑ توڑ اب تک رکھتے تھے وہ صرف اس لیے تھا کہ اس سے مسلمانوں

اور میودیوں میں کچھ موافقت ہو جائے۔ اس طرح یہاں آیت میں لفظ توفیق، وفاق کے معنے میں ہے۔ صوفیا اور عرفا کی اصطلاح میں توفیق ۱۳ مشاہد میں سے ایک مشہد ہے۔ یعنی یہ کہ اللہ سبحانہ بندہ کو خود بندے کے حال پر نہ چھوڑے بلکہ اس کی نگرانی کرے۔ اس کا متقابل خذلان آتا ہے یعنی بندے کو اس کے حال پر چھوڑ دینا۔ لکھا ہے کہ توفیق اگر آتی ہے تو اللہ کا فضل اور احسان ہے۔ اور اگر خذلان ہو تو یہ اس کی حکمت اور عدل ہے۔ آیتِ قرآنی میں لفظ توفیق ان معنے میں نہیں ہے۔

تزکیہ: اس کے لفظی معنے پاک و صاف کرنا، نکھارنا، میل و کچیل دُور کرنا ہیں۔ قرآن میں اس لفظ کو ان معنے میں استعمال کیا ہے کہ نفسِ انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں اور آلودگیوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے۔ یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دُور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کر دی جائے۔ سورہ والشمس میں ہے قد افلح من زکّٰھا وقد خاب من دسّٰھا بلاشبہ جس نے اپنے آپ کو صاف ستھرا کر لیا وہ کامیاب ہو گیا اور جس نے اسے مٹی میں ملا دیا وہ ناکام رہا۔ دوسری جگہ ہے قد افلح من تزکّٰی بلاشبہ وہ کامیاب ہے جو پاک ہو گیا۔ ان آیتوں سے اندازہ ہو گا کہ قرآن پاک میں اس تزکیہ کا مفہوم کیا ہے جس کو اس نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص خصوصیت قرار دی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت کا سب سے بڑا فرض یہ تھا کہ وہ نفوسِ انسانی کو جلا دیں۔ اُن کو برائیوں اور نجاستوں کی آلودگیوں سے پاک کریں اور ان کے اخلاق و اعمال کو درست اور صاف اور ستھرا بنائیں۔

تحیۃ: حیاۃ تحیۃ کے اصل معنے کسی کو زندگی کی دعا دینے کے ہیں۔ اسی سے دعائیہ کلمات "حیاک اللہ" ہے جس کے معنے ہیں اللہ تمہاری عمر دراز کرے۔ سلام میں چونکہ معنوی اعتبار سے زیادہ ہمہ گیری اور وسعت تھی اس لیے السلام علیکم کو ایک خاص اسلامی شعار کی حیثیت حاصل ہو گئی ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ اس آیتِ قرآنی میں قرآن ہی کی دوسری آیت فسلموا علی انفسکم کی وجہ سے تحیت سے سلام مراد ہے وفیہ الدلالۃ علی انہ قد ارید بہ السلام لفظ سلام شعار ہونے کی وجہ سے گویا مومن و کافر کے درمیان ایک علامت فارقہ بن گیا۔ اور اس کو نبوت نے

اہمیت دی ہے کہ افشائے سلام میں تعارف عدم تعارف کا کوئی لحاظ نہیں رکھا۔ یوں تو اسلام میں بہت سی عمومی چیزیں ہیں لیکن سلام کو رواج دینے کی عرب کے اس ماحول میں زیادہ اہمیت محسوس کی گئی جہاں شب و روز کی قتل و خون ریزی نے انسان کو ایسا خوفزدہ بنا دیا تھا کہ جب کوئی اجنبی شخص کسی سے ملتا تو وہ اس کو موت کا ایک فرشتہ نظر آتا قرآن نے یہ تعلیم دی کہ خوف و ہراس کا دور ختم ہوا اب سلامتی اور امن کا زمانہ آگیا اس کا اعلان کرنے کے لیے لفظ سلام مقرر کیا تاکہ پہلی ملاقات میں یہ بات صاف ہو جائے کہ اب تمہارے لیے صدائے موت نہیں بلکہ پیغام سلامتی ہوں۔ اس لفظ کو چلتے پھرتے اس کثرت سے استعمال کرنے کا حکم دیا کہ خوف دنیا کے پردے سے اٹھ جائے۔

تغییر : اس کے معنے بدل دینے کے ہیں اللہ کی بناوٹ کو بدل دینا دو طرح کا ہے ایک حسی دوسرے معنوی، حسی یہ کہ مردوں کو خصی کر دیا جائے، کانوں کا کاٹنا، آنکھوں سے اندھا کر دینا، ناکوں کا کاٹ دینا اور وہ تمام تعزیریں جو اپنے وقت میں ظالم حکمران اور جبابرہ کرتے تھے۔ عبداللہ ابن عباس اور انس بن مالک فرماتے ہیں کہ آیت قرآنی کا منطوق یہی تغییر حسی ہے اور عبداللہ ابن عباس سے یہ روایت بھی کہ آیت قرآنی کا منطوق تغییر حسی نہیں تغییر معنوی ہے یعنی اس فطرۃ اللہ کو بدلنا ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے تمام خلائق کو پیدا کیا ہے۔ مثلاً توحید دین فطرت ہے لیکن شیطان اور اس کے ایجنٹوں نے اس کو شرک سے مسخ کر دیا۔ قرآن میں دوسرے مقام پر توحید کو دین فطرت اور دین قیم سے تعبیر کیا ہے اور اس کی دلیل یہ دی ہے کہ اللہ نے اسی پر لوگوں کو پیدا کیا ہے فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا۔ پھر فرمایا کہ اللہ کی بنائی ہوئی چیز کو تبدیل کرنا جائز نہیں ہے لا تبدیل لخلق اللہ ہمارے نزدیک آیت قرآنی کا منطوق بھی ہے۔ تغییر حسی یعنی وہ ساری چیزیں جو فطرۃ اللہ کی تبدیلی کے حکم میں اس کا مدلول ہیں۔

جبت : سے مراد اعمال سفلیہ مثلاً سحر، شعبدہ، ٹونے ٹوٹکے، رمل، جفر، فال گیری نجوم اور اس قسم کی دوسری خرافات ہیں۔ ہاتھ کی لکیروں کا علم بھی اسی میں شامل ہے امام راغب لکھتے ہیں۔ جبت اور جبس اس دھوول کو کہتے ہیں جو کسی کام کا نہ ہو اور کہا گیا ہے کہ تا سین ہی کا بدل ہے۔ نیز ہر وہ چیز جس کو خدا کے سوا پوجا جائے

جبت کہلاتی ہے اور جادو اور کاہن کو بھی جبت کہتے ہیں۔ اصل میں جبت کے معنے میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت عمر جبت کے معنے جادو بتاتے ہیں عکرمہ کہتے ہیں کہ جبت حبشی زبان میں شیطان کو کہتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ ابن عباس سے بھی یہی روایت کیا ہے۔ امام طبری نے مجاہد سے جادوا ور سعید بن جبیر سے جادوگر اور قتادہ سے شیطان اور ابن عباس سے بت کے معنے نقل کیے ہیں۔ امام ابن جریر طبری کا فیصلہ اس سلسلہ میں نہایت صاف ہے جس سے ان تمام مختلف اقوال میں توفیق ہو جاتی ہے، فرماتے ہیں،

> جبت اور طاغوت سے وہ جنس مراد ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا کی جائے خواہ وہ بت ہو یا شیطان، آدمی ہو یا جن اس میں جادوگر اور کاہن بھی آجاتے ہیں۔

سنن ابوداؤد میں حضرت قبیصہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ:

> میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ پرندوں کو اڑا کر نیک فال لینا اور فال بد نکالنا اور رمالوں کا خط کھینچنا جبت میں داخل ہے۔

دیت : یہ اصل میں ودی یدی کا مصدر ہے۔ مقتول کے بدلہ میں جو خون بہا ادا کیا جاتا ہے اس کا نام دیت ہے۔ دیت میں سو اونٹ یا ایک ہزار دینار یا دس ہزار درہم دینے پڑتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے اپنے زمانہ میں کرنسی کے لحاظ سے دو ہزار سات سو چالیس روپے تخمینہ بتایا ہے۔

زکوٰۃ : ستھرائی، پاکیزگی، زکوٰۃ، تزکیہ سے اسم ہے۔ علامہ زمخشری تفسیر سورۃ مومنین میں لکھتے ہیں، زکوٰۃ ذات اور معنی دونوں کے درمیان مشترک اسم ہے۔ ذات تو نصاب کی وہ مقدار ہے جس کو زکوٰۃ دینے والا نکال کر دیتا ہے اور معنی زکوٰۃ دینے والے کا فعل ہے جس کا نام تزکیہ ہے۔ اور سورۃ کہف میں زکوٰۃ کے معنے گناہوں سے پاک صاف ہونے کے بتائے ہیں اور علامہ ناصر بن عبدالسید مطرزی المغرب فی ترتیب المعرب میں رقمطراز ہیں۔ " زکوٰۃ کے معنے تزکیہ کے ہیں۔ ارشاد ہے والذین ھم للزکوٰۃ فاعلون (اور جو زکوٰۃ دیا کرتے ہیں) پھر زکوٰۃ مال کی

اس مقدار کا نام پڑ گیا کہ جو فقیروں کے لیے نکالی جاتی ہے اور ترکیب طہارت کو بتلاتی ہے اور کچھ کے خیال میں اس کے معنے زیادتی کے ہیں اور یہی ظاہر ہے اور امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں، اصل میں زکوٰۃ وہ افزونی ہے جو اللہ تعالیٰ کی برکت سے حاصل ہوتی ہے۔ زکوٰۃ کو زکوٰۃ اس لیے کہا گیا کہ اس میں برکت کی اُمید ہوتی ہے، یا اس لیے کہ نفس کا تزکیہ ہوتا ہے، اس سے آپ کو اندازہ ہوگا کہ زکوٰۃ اور تزکیہ یعنی پاکی اور صفائی کی اہمیت اسلام میں کس قدر ہے یہ دل کی پاکی روح کی صفائی اور نفس کی طہارت نبوت کا اصل مقصد ہے، انسانوں کی روحانی و نفسانی بیماریوں کے بڑے حصے کا سبب تو اللہ سے خوف و رجا اور تعلق و محبت کا نہ ہونا ہے اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے لیکن دوسرا سبب ماسوی اللہ کی محبت اور مال و دولت اور دیگر اسباب دُنیا سے دل کا تعلق زکوٰۃ اسی دوسری بیماری کا علاج ہے۔ غزوہ تبوک کے موقع پر جب کچھ صحابہ سے عدم شرکت کا جرم ثابت ہوا اور پھر ان کی صداقت کی بنا پر خدا نے ان کو معاف کر دیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے قرآن نے کہا خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم و تزکیھم بھا ان کے مالوں سے زکوٰۃ لے کر ان کو پاک و صاف بنا دو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ راہِ خدا میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینہ کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبتِ مال ہے دل سے دُور ہو جاتا ہے

سفاح : سفح کے لغوی معنے بہانے کے ہیں اور سفاح کے معنے ہیں عورت کا مرد کے ساتھ بدکاری کی حالت میں رہنا اور صحیح طور پر ان کا عقد نہ ہونا، جس کے معنے عیاشی اور بدکاری کے ہیں اس لیے کہ اس میں بھی عورت اور مرد دونوں محض لذت گیری کو مقصد بنا کر اپنا مادہ منی برباد کرتے ہیں۔ قرآن میں محصنین کی قید غیر مسافحین اور محصنات کی قید غیر مسافحات لگا کر نکاح اور سفاح میں امتیاز قائم کیا ہے۔ یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے۔ صرف حیوانی خواہش کا پورا کرنا نکاح کا مقصد نہیں ہے۔

سکاریٰ : سکر سے جس کے معنے مست ہونے کے ہیں۔ یہ جمع تکسیر ہے یا اسم جمع۔ امام تاج الدین ابو محمد بن مکتوم قیسی حنفی نحوی الدر اللقیط میں لکھتے ہیں۔ سکاریٰ مفہوم کے

بارے میں علماء کو اختلاف ہے کہ آیا یہ جمع تکسیر ہے۔ سیبویہ نے تکسیر صفات کے بیان میں کہا ہے اور کبھی بعض صفات کی فعالیٰ کے وزن پر جمع آتی ہے۔ چنانچہ بعض سُکاریٰ اور عُجالیٰ بولتے ہیں۔ فعالیٰ کے جمع ہونے پر یہ سیبویہ کی صاف تصریح ہے اور استاذ ابوالحسن بن الباذش کو وہم ہو گیا جو انہوں نے سیبویہ کی طرف یہ نسبت کر دی کہ یہ اسم جمع ہے، نیز یہ کہ ابنیہ کے سلسلے میں سیبویہ نے اس کو بیان بھی کیا ہے۔ ابن الباذش کا بیان ہے کہ قیاس بھی یہی ہے کیونکہ یہ ایسے وزن پر آیا ہے جس پر کبھی کوئی جمع آتی ہی نہیں ہے حالانکہ ابنیہ کے سلسلے میں سیبویہ کی اس کے سوا کوئی تصریح نہیں کہ وہ جمع تکسیر ہے چنانچہ انہوں نے یہ کہا ہے کہ فعالیٰ کا وزن اسم میں ہوتا ہے جیسے حباریٰ سمانیٰ کباریٰ اور صفت نہیں ہوتا۔ ہاں صرف اس صورت میں کہ اس کے وزن پر واحد کی تکسیر کر لی جائے جیسے عجالیٰ، سکاریٰ اور کسالیٰ میں اور سیرافی نے اس بارے میں دونوں قول بیان کیے ہیں اور اسی کو ترجیح دی ہے کہ یہ جمع تکسیر ہے اور سیبویہ کا کلام اسی کا مؤید ہے۔ اور امام ابن جنی فرماتے ہیں۔ در سُکاریٰ بالضم۔ ظاہر یہ ہے کہ یہ اسم مفرد غیر مکسر ہے جیسا کہ حباریٰ۔ سمانیٰ اور سُلامیٰ ہیں۔ نیز یہ بھی ممکن ہے کہ مکسر ہو اور ان الفاظ میں سے ہو جو کہ فعالیٰ کے وزن پر آتے ہیں جیسے عراق اور رخال مگر اتنی بات ہے کہ الف مقصورہ لگا کر اسے مؤنث بنا دیا گیا ہے۔

اور امام ابوبکر الجصاص سکاریٰ پر رقمطراز ہیں کہ اس بارے میں اختلاف ہے کہ سکر سے اس آیت میں کیا مراد ہے۔ حضرت ابن عباس، مجاہد، ابراہیم اور قتادہ نے شراب کا نشہ بتایا ہے اور ضحاک کہتے ہیں کہ اس سے خاص طور پر نبیذ کا نشہ مراد ہے۔ صحیح تاویل یہ ہے کہ یہاں شراب کا نشہ مراد ہے اس کی دو وجہیں ہیں ایک یہ کہ سونے والے کو اور جس کی آنکھوں میں نیند بھری ہو اسے سکران نہیں کہا جاتا۔ شراب میں مست کو فی الواقع سکران کہتے ہیں اس لیے لفظ کو حقیقت پر محمول کرنا ضروری ہے اور بغیر قرینہ کے مجازی معنے پر محمول کرنا درست نہیں ہے۔ اور دوسری وجہ وہ سبب نزول ہے جس کے پس منظر میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔

شُحّ : خود غرضی، کنجوسی، بخل، حرص۔ بخل تو یہ ہے کہ آدمی ادائے حقوق میں تنگدلی کا مظاہرہ کرے۔ یہ چیز ہر حال میں بُری ہے لیکن حرص اچھی چیز کی بھی ہو سکتی ہے بُری چیز کی بھی، حد کے اندر بھی ہو سکتی ہے اور حد سے باہر بھی۔ اس وجہ سے اس کا اچھا یا بُرا ہونا ایک امر اضافی ہے۔ اپنے اچھے پہلو کے اعتبار سے یہ انسانی فطرت کے اندر اپنا ایک مقام رکھتی ہے لیکن اکثر طبائع پر اس کا ایسا غلبہ ہوتا ہے کہ یہ ایک بیماری بن کر رہ جاتی ہے۔ اس کے اسی پہلو کی تعبیر ہے۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ شح وہ بخل ہے جس میں حرص ہو اور عادت بن گیا ہو۔ اُردو میں اس کے لیے خود غرضی کا لفظ زیادہ موزوں ہے۔ یہ مصدر ہے اس کا فعل باب عَلِمَ، ضَرَبَ اور نَصَرَ تینوں باب سے آتا ہے۔

شُھَدَاء : شہید کی جمع ہے گواہ، شاہد، نگران، احوال کہنے والا، اقرار کرنے والا، امام راغب نے لکھا ہے کہ شہید، شاہد کو بھی کہا جاتا ہے اور کسی چیز کے مشاہدہ کرنے والے کو بھی علامہ ابوالسعادات مبارک ابن الاثیر جزری النہایہ فی غریب الحدیث والاثر میں رقمطراز ہیں :

حق تعالیٰ کے اسمآ میں شہید وہ ذات ہے جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہ ہو اور شاہد کے معنی حاضر کے ہیں۔ فعیل فاعل کے معنی میں مبالغہ کے اوزان میں سے ہے، جب مطلق علم کا اعتبار ہو تو اللہ علیم ہے اور اُمورِ باطنہ کا خیال کیا جائے تو خبیر ہے اور اُمورِ ظاہرہ کی طرف نسبت ہو تو شہید ہے اور کبھی اس معنی کے ساتھ یہ بھی ملحوظ ہوتا ہے کہ وہ قیامت میں خلق پر گواہ ہوگا۔

اور شرع میں "شہید"، وہ شخص ہے جو اللہ کی راہ میں قتل کیا گیا ہو، شاہ عبدالقادر صاحب دہلوی موضح القرآن سورۂ نسآ میں زیر آیت ومن یطع اللہ والرسول الایہ فرماتے ہیں :

"نبی وہ لوگ جن کو اللہ کی طرف سے وحی آوے یعنی فرشتہ ظاہر میں پیغام کہہ جاوے اور "صدیق"، وہ کہ جو وحی میں آوے ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور "شہید" وہ جن کو پیغمبر کے حکم پر ایسا صدق آیا

کہ اس پر جان دیتے ہیں اور نیک سخت (صالح) وہ جن کی طبیعت نیکی ہی پر پیدا ہوئی ہے۔"

اس معنی میں شہید کا اشتقاق آیا۔ شہادۃ سے ہی یا مشاہدۃ سے یا شہود سے نیز فعیل بمعنی فاعل ہے یا مفعول ہے۔ اسی پر علامہ ابوالقاسم عبدالرحمٰن سہیلی نے الروض الانف میں نفیس بحث لکھی ہے جس کا اقتباس ہدیۂ ناظرین ہے، فرماتے ہیں:

یہ اسم شہادۃ سے ماخوذ ہے یا مشاہدۃ سے اگر شہادۃ سے ہے تو شہید بمعنی مشہود ہے یعنی اس کے حق میں جنت کی شہادت دی گئی ہے اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ شہادۃ ہی سے ماخوذ ہو اور فعیل بمعنی فاعل ہو کیونکہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے و تکونوا شہداء علی الناس یعنی تم لوگوں پر گواہی دو گے اور یہ چیز گو ساری امت محمدیہ علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والتحیۃ کے بارے میں عام ہے پر شہداء کے لیے یہ نام اولیٰ ہے کیونکہ وہ صدیقین وانبیاء کے پیچھے ہی ہیں، اللہ سبحانہ فرماتا ہے فاولئک مع الذین انعم اللہ علیہم من النبیین والصدیقین والشہداء، سو شہید کے معنی میں یہ دو وجہیں تو جب ہیں کہ اس کو شہادۃ سے مشتق قرار دو۔"

اور اگر مشاہدۃ سے ماخوذ ہو تب بھی فعیل بمعنی فاعل ہے کہ شہید ملکوت الٰہی کا مشاہدہ کرتا اور اللہ کے ان فرشتوں کا معائنہ کرتا ہے جنہیں اور کوئی نہیں دیکھتا اور مشاہدۃ سے بمعنی مفعول بھی ہو سکتا ہے۔ یعنی بایں معنی کہ فرشتے اس کے فیض اور اس کی روح کے عروج کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

ان سب وجہوں میں صحت کے اعتبار سے اولیٰ یہی ہے کہ فعیل بمعنی مفعول ہو اور معنی یہ ہوں گے کہ اس کے لیے جنت کی شہادت دی گئی ہے یا نبی علیہ السلام کی اس کے لیے شہادت ہو گی چنانچہ آپ کا ارشاد ہے کہ ھؤلاء الذین اشہد علیہم (یہ وہ لوگ ہیں

جن پر میں گواہی دوں گا) پس یہ وجہ بحیثیت حدیث کے بھی قوی ہے
اور بلحاظ عربیت ایک اور وجہ سے بھی وہ یہ کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے
جب شہداء کا ذکر کیا تو فرمایا والمرأۃ تموت بجمع شھید (اور عورت
کہ زچگی سے مرے شہید ہے) اور شہیدۃ نہیں فرمایا اور دوسری
روایت میں ہے کہ والنفساء شھید یجرھا جنینھا بسررہ الی
الجنۃ (نفاس والی عورت شہید ہے اُسے اس کا بچہ اپنے نال سے
جنت کی طرف کھینچے گا) پھر شہیدۃ نہیں فرمایا اور فعیل جب مؤنث
کی صفت ہو تو ھا اسی وقت میں نہ ہوگی جبکہ وہ بمعنی مفعول ہو جیسے
امرأۃ قتیل اور جریح ہیں اور اگر بمعنی فاعل ہو تو مونث ھا کے ساتھ
آئے گی جیسے امرأۃ علیمۃ اور رحیمۃ وغیرہ ہیں۔ اس سے پتہ چلا کہ شہید
بمعنی مشھود (جس کے لیے گواہی دی گئی ہو) اور مشھود علیہ (جس پر گواہی
دی گئی ہو) اور یہ لغت سے تو استقراء صحیح اور حدیث سے استنباط
بدیع ہے۔

شکر: شکر کرنا، احسان ماننا، قدر پہچاننا۔ شکر یشکر کا مصدر ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ
شکر نعمت کے تصور اور اس کے اظہار کو کہتے ہیں۔ بعض نے کہا ہے کہ یہ کشر کا بدلا ہوا
ہے جس کے معنے کھولنے کے ہیں اور کفر اس کی ضد ہے جس کے معنے نعمت کے بھلا دینے
اور اس کے چھپانے کے ہیں دابۃ شکور وہ جانور ہے جو اپنی فربہی سے اپنے مالک
کی رکھوالی کا پتہ دے رہا ہو اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی اصل عین شکری ہے یعنی وہ
چشمہ جو کہ پر ہو۔ اس اعتبار سے اپنے منعم کے ذکر سے اوقات کے پر ہو جانے کا نام شکر
ہے۔ علامہ لغوی مجدالدین فیروزآبادی کی بصائر ذوی التمییز فی لطائف کتاب اللہ العزیز
ہے۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں ناقل ہیں "شکر پانچ قاعدوں پر مبنی ہے
اوّل شاکر کی مشکور کے لیے فروتنی دوسرے اس سے محبت کرنا، تیسرے اس کی
نعمت کا معترف ہونا، چوتھے اس نعمت کی بنا پر اس کی ثنا کرنا، پانچویں اس نعمت
کو ایسی جگہ استعمال میں نہ لانا جہاں وہ ناپسند کرے۔ یہ پانچ باتیں شکر کی اساس ہیں
اور ان پر اس کی بنیاد ہے۔ اگر ان میں سے ایک بھی نہ ہو تو شکر کے قواعد میں سے

ایک قاعدہ منقلب ہو گیا۔ شکر کے بارے میں جس نے بھی کلام کیا ہے اس کا کلام ان ہی امور کی طرف راجع ہے۔ شکر کا الٹ کفر ہے، اس کے لغوی معنے چھپانے کے ہیں اور محاورہ میں کسی کے کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل سے اس کے اقرار اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں۔ اسی سے ہماری زبان میں کفران نعمت کا لفظ استعمال میں ہے اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کر کے اس کی نافرمانی کا نام ہے تو اس کے مقابلہ میں شکر کی حقیقت یہ ہو گی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرماں برداری کی جائے۔ اس تفصیل سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ شکر ایمان کی جزو دین کی اصل اور اطاعت الٰہی کی بنیاد ہے، یہی وہ جذبہ ہے جس کی بنا پر بندے کے دل میں اللہ تعالیٰ کی قدر و عظمت اور محبت کے قولی و عملی اظہار کا نام شکر ہے۔

شقاق : مخالفت، مقابلہ اپنے دوست کی شق کو چھوڑ کر دوسری شق میں ہونا باب مفاعلت کا مصدر ہے۔ علامہ ابوحیان اندلسی البحر المحیط میں فرماتے ہیں۔ شقاق مصدر ہے شاق کا جیسے ضارب ضرابا خالف خلافا بولتے ہیں اور اس کے معنے عداوت رکھنے اور مخالفت کرنے کے ہیں۔ اس کی اصل شق سے ہے یعنی یہ ایک شق میں ہوا اور ایک شق میں۔ شق طرف کو کہتے ہیں۔ اور بعض کہتے ہیں کہ یہ مشقت سے ماخوذ ہے کیونکہ دونوں میں سے ہر ایک اس چیز کا خواہش مند ہوتا ہے جو دوسرے کو شاق ہو۔ رسول کے مقابلے میں مشاقہ کے معنے ہیں۔ رسول کے مقابل میں اپنی ایک پارٹی کھڑی کرنے کی کوشش کرنا۔

صلوٰۃ : نماز، دعا، رحمت، قرآن مجید میں جہاں بھی لفظ صلوٰۃ بغیر اضافت ہے واو کے ساتھ مرقوم ہے، یہ لفظ کے مفخم ہونے کی بنا پر ہے جیسے کہ لفظ زکوٰۃ ہے۔ صلوٰۃ تصلیہ سے اسم ہے۔ امام راغب اصفہانی رقمطراز ہیں،

بہت سے اہل لغت کا بیان ہے کہ صلاۃ کے معنی دعا کرنے، برکت مانگنے اور بزرگی سے یاد کرنے کے ہیں، بولا جاتا ہے صلیت علیہ یعنی میں نے اس کے لیے دعا کی اور بزرگی سے یاد کیا اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے: اذا دعی احدکم الی طعام فلیجب وان کان صائما فلیصل، جب تم میں سے کسی کو کھانے پر بلایا جائے تو

قبول کرلینا چاہیے اور اگر روزہ دار ہو تو دعا کرنی چاہیے (یعنی دعوت کرنے والے کے حق میں دعا کرے اور وصلّ علیھم ان صلاتك سكن لهم (اور دعا دے ان کو بے شک تیری دعا ان کے لیے آسودگی ہے) یصلون علی النبی یاایھا الذین امنوا صلوا علیہ (وہ رحمت بھیجتے ہیں رسول پر اے ایمان والو رحمت بھیجو اس پر) وصلوٰت الرسول (اور دعائیں لینی رسول کی) اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلمانوں پر صلاۃ کا مطلب حقیقت میں ان کو سراہنا ہے۔ ارشاد ہے: اولٰئك علیھم صلوٰت من ربھم و رحمة (ایسے لوگوں پر ہی شاباشیں ہیں اپنے رب کی اور مہربانی) اور فرشتوں کی طرف سے صلوٰۃ کے وہی معنی ہیں جو آدمیوں کی طرف سے صلاۃ کے ہیں یعنی دعا کرنا اور مغفرت چاہنا، ارشاد ہے ان اللہ و ملٰئکتہ یصلون علی النبی (اللہ اور اس کے فرشتے رحمت بھیجتے ہیں رسول پر)

اور وہ "صلاۃ" کہ جو عبادت مخصوصہ ہے (یعنی بمعنی نماز) اس کی اصل بھی دعا ہی ہے جس طرح کہ کسی شے کو اس کے بعض اجزاء کے نام پر موسوم کر دیتے ہیں اسی طرح یہ عبادت یعنی نماز بھی صلوٰۃ سے موسوم ہوئی (کہ دعا پر مشتمل ہے) نماز ان عبادات میں سے ہے کہ جس سے کوئی شریعت خالی نہیں رہی، گو اس کی صورتیں ہر شریعت کے اعتبار سے یکے بعد دیگرے مختلف رہیں اسی لیے وارد ہے ان الصلوٰۃ کانت علی المؤمنین کتابا موقوتا (بے شک یہ نماز ہی مسلمانوں پر بقید وقت فرض ہے) اور بعض علماء نے کہا ہے کہ صلاۃ کی اصل صلی ہے ان کا بیان ہے کہ صلی الرجل کے معنی یہ ہیں کہ اس شخص نے اس عبادت کے ذریعہ صلی کو کہ جو حق تعالیٰ کی سلگائی ہوئی آگ ہے اپنے اوپر سے دفع کر دیا اور صلّی کی بنا مَرَّضَ کی طرح ہے کہ جو ازالۂ مرض کے لیے استعمال ہوتا ہے نیز عبادت خانہ کو بھی صلاۃ کہا جاتا ہے۔ چنانچہ کنائس یہود (یہودیوں کے عبادت خانے) صلوات سے موسوم ہیں، ارشاد ہے لھدمت صوامع و بیع و صلوٰت و مسٰجد (تو ڈھائے جاتے تکیے اور مدرسے اور عبادت خانے اور مسجدیں) اور ہر وہ مقام کہ جہاں حق تعالیٰ نے "فعل صلوۃ" پر مدح فرمائی ہے یا اس پر رغبت دلائی ہے وہاں لفظ اقامت مذکور ہے جیسے والمقیمین الصلوٰۃ (اور آفرین ہے نماز پر قائم رہنے والوں کو) واقیموا الصلوٰۃ (اور قائم کرو نماز) حالانکہ مصلین منافقین

کے سوا اور کسی کو نہیں کہا، چنانچہ فرمایا فویل للمصلّین الذین ھم عن صلاتھم ساھون
(پھر خرابی ہے ان نمازیوں کی جو نماز سے بے خبر ہیں) ولا یاتون الصلوٰۃ الا وھم
کسالیٰ (اور نہیں آتے نماز کو مگر جی ہارے) لفظ اقامر کو خاص طور پر اس لیے لایا گیا
کہ اس امر پر تنبیہ ہو جائے کہ نماز پڑھنے کا مقصد اس کے حقوق و شرائط کی بجا آوری
ہے نہ کہ مجرد ہیئت کذائی کا ادا کر دینا، اس لیے مروی ہے کہ ان المصلین کثیر والمقیمین
قلیل (نمازی تو بہت ہیں نماز کے حقوق و شرائط ادا کرنے والے تھوڑے ہیں)

صالح :- نیک، اچھا، بھلا، صلاح سے جس کے معنے نیک ہونے کے ہیں، اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر، صلحا، جمع، امام راغب لکھتے ہیں:

"صلاح فساد کی ضد ہے یہ دونوں اکثر استعمال میں افعال کے ساتھ مخصوص ہیں قرآن مجید میں صلاح کہیں تو فساد کے مقابل لایا گیا ہے اور کہیں سیئہ کے، ارشاد ہے خلطوا عملاً صالحاً و اٰخر سیئاً (ملایا انہوں نے ایک کام نیک اور دوسرا بد) اور لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا (مت خرابی ڈالو زمین میں اس کی اصلاح کے بعد) اور الذین اٰمنوا و عملوا الصلحٰت تو بہت مقامات پر ہے۔"

صدیق :- بہت سچا، صدق سے بروزن فعیل، مبالغہ کا صیغہ ہے۔ شاہ عبد القادر فرماتے ہیں کہ صدیق وہ کہ جو وحی آوے اس کا جی خود ہی اس پر گواہی دے۔ امام راغب رقمطراز ہیں:
صدیق وہ ہے جس سے بکثرت صدق ظاہر ہو، اور کہا گیا ہے بلکہ اس کو کہا جاتا ہے جو کبھی جھوٹ نہیں بولتا، اور بعض کہتے ہیں جس سے سچائی کے خوگر ہونے کی وجہ سے جھوٹ بن ہی نہ آتا ہو، اور بعض کا بیان ہے کہ جو قول و اعتقاد میں راستی پر ہو اور اس کا کردار صدق ثابت کرے۔ ارشاد ہے۔ واذکر فی الکتاب ابراھیم انہ کان صدیقا نبیاً۔ صدیق وہ ہے جو فضیلت میں انبیاء سے کچھ ہی کم ہو جیسا کہ میں نے الذریعہ الی مکارم الشریعہ میں بیان کیا ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ صدیق میں صدوق سے زیادہ مبالغہ ہے اور صدوق میں صادق سے زیادہ اس لیے صدق کے مراتب میں سب سے بلند تر مرتبہ صدیقیت ہے اور صدیقیت نام ہے کمال اخلاص کے ساتھ رسالت کے لیے کمال انقیاد کا۔

عُدوان :- ظلم، ستم، زیادتی، یہ عدا یعدو کا مصدر ہے۔ امام ابوبکر عزیزی سجستانی لکھتے ہیں

عدوان کے معنے تعدی اور ظلم کے ہیں۔ آیت فلا عدوان الا علی الظالمین کے معنے یہی ہیں اور امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں "وہ عدوان کہ جس کی ابتدا کرنی ممنوع ہے اس آیت میں مراد ہے ولا تعاونوا علی الاثم والعدوان لیکن جو عدوان کہ بدلہ کے طور پر ہو اور جس کا اس شخص کے ساتھ برتنا ہے جو اس کی پہل کر چکا ہے وہ اس آیت میں مراد ہے فلا عدوان الا علی الظالمین علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں عدوان کے معنے عدالت کو نظر انداز کرنے میں حد سے تجاوز کرنے کے لکھے ہیں۔ فلا عدوان الا علی الظالمین کے معنے ہیں دارو گیر نہیں مگر ظالموں پر اور بعض علماء سے نقل کیا ہے کہ عدوان کے معنے ہیں بری طرح حد سے گزر جانے کے، خواہ یہ بات قوت و استعداد میں ہو یا فعل میں یا حال میں اور اسی معنے میں ارشاد ہے ومن یفعل ذالک عدوانا الخ حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں اس پر مبسوط بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ عدوان یہ ہے کہ جس کی اصل بھی حرام ہے اور زیادتی بھی، عدوان کی دو قسمیں ہیں ایک اللہ کے حق میں عدوان اور دوسرے بندوں کے حقوق میں عدوان اللہ کے حق میں عدوان کی مثال یہ ہے کہ منکوحہ اور مملوکہ کے علاوہ محرمات سے جنسی تعلقات قائم کرنا، ارشاد ہے فمن ابتغی وراء ذالک فاولئک ھم العادون۔ اور ایسے ہی ہر وہ چیز جس کی مقررہ مقدار مباح کی گئی ہو اس میں زیادتی عدوان ہے۔

عقد :- تاج المصادر میں عقد کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں گرہ دبیع بستن وسوگند خوردن و پیمان کردن۔ اور امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں "عقد کے معنے ہیں کسی چیز کے اطراف کو باہم جمع کر دینا اس کا استعمال اجسام کے لیے بھی ہوتا ہے جیسے عقد الحبل اور عقد البناء اور بطور استعارہ معانی کے لیے بھی ہوتا ہے جیسے عقد البیع اور عقد العہد اور تاج العروس میں ہے۔" المرالمتفاق نے جو کچھ اس بارے میں تصریح کی ہے وہ یہ ہے کہ یہ لفظ اصل میں حل کی ضد ہے جس کے معنے کھولنے کے ہیں۔ بعد کو اس کا استعمال لین دین اور دیگر معاملات میں بھی ہونے لگا۔ ازاں بعد اس کو یقین کی پختگی اور اعتقاد جازم کے لیے بھی بولا جانے لگا۔ آیت قرآنی والذین عقدت ایمانکم میں عقد یمین سے مراد عقد موالات ہے۔ عقد موالات یہ ہے کہ ایک شخص اگر کسی مسلمان کے ہاتھ پر مسلمان ہوتا ہے اور دونوں

باہم دوستی کا عہد و پیمان کر لیتے ہیں اور وراثت اور خون بہا کے لیے عہد کر لیتے ہیں۔ اگر اس مسلم کا اور کوئی وارث نہ ہو تو اس معاہدے کی بنا پر اس کی وراثت مسلمان کو ملے گی اور اس کی نسبت بھی مسلمان خاندان کی طرف ہو گی۔ اسی عقد موالات کی بنا پر امام بخاری کو جعفی، امام ابن ماجہ کو ربعی اور امام ابوحنیفہ کو تیمی کہتے ہیں۔

قوام : یہ قام یقوم سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اصل میں قام بالامر کے معنے کسی کام میں محنت کرنے کے ہیں اور اس کی ضد قعد عن الامر آتی ہے یعنی کسی کام میں محنت نہ کرنا۔ اسی سے قائم صفت کا صیغہ اور قوام مبالغہ کا صیغہ ہے۔ قسط کے معنے عدل و انصاف کے ہیں۔ اس آیت میں قوامین بالقسط لا کر بتایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ عدل و انصاف پر جمنے والے اور اس کے قائم کرنے میں خوب محنت کرنے والے ہو جاؤ یعنی یہ کام بہت زیادہ کرو اور ہمیشہ کرو۔ زمخشری نے اس کے معنے لکھے ہیں۔ مجتہدین فی اقامۃ العدل حتی لا تجوروا یعنی انصاف قائم کرنے میں محنت کرنے والے ہو جاؤ تاکہ تم ان پر ظلم نہ کرو۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں مواظبین علی العدل مجتہدین فی اقامتہ۔ یعنی انصاف پر ہمیشہ قائم رہنے والے اور اس کے قائم کرنے میں محنت کرنے والے ہو جاؤ اور علامہ آلوسی صاحب روح المعانی میں فرماتے ہیں اے اہلِ ایمان تم اپنے سارے معاملات میں عدل و انصاف پر جمنے والے اور اس میں بھرپور محنت کرنے والے ہو جاؤ اور محدث محمد بن جریر طبری فرماتے ہیں۔ تمہارا اخلاق اور تمہاری تحریر میں انصاف کو قائم کرنا ہونا چاہیے۔ اور حافظ ابن کثیر رقمطراز ہیں کہ اللہ سبحانہ اہلِ ایمان کو حکم دے رہا ہے کہ وہ انصاف کو قائم کرنے والے بن کر رہیں اور ادھر ادھر نہ ہوں اور نہ انصاف کے بارے میں کسی ملامت گر کی ملامت کا اندیشہ کریں اور نہ ان کو انصاف کے مقام سے کوئی چیز ہٹا سکے بلکہ انصاف میں ایک دوسرے کے مددگار بن کر رہیں مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے نبوت کے علم و عمل کی صورت میں جو حق و عدل تمہیں عطا کیا ہے اب تمہارا ہر قول و فعل، افکار و اعمال اور احوال اسی ترازو میں تلے ہوئے ہونے چاہئیں اور تم اسی پر قائم رہنے والے اور اسی کو دنیا میں قائم کرنے والے ہو

قول بلیغ : اثر کرنے والی بات، بلاغت والی بات بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ بلاغت مصدر ہے، کسی شے کے بلیغ ہونے کے دو معنی ہیں ایک تو یہ کہ وہ شے بذاتہ بلیغ ہو

یعنی زبان اور لغت کے اعتبار سے درست ہو۔ معنے مقصود کے مطابق ہو، اور حقیقت کے اعتبار سے صحیح ہو۔ ان تینوں اوصاف میں سے اگر ایک وصف بھی کم رہا تو بلاغت میں نقصان رہے گا، دوسرے یہ کہ قائل اور مقول لہ یعنی جس سے کہا جائے دونوں کے اعتبار سے بلیغ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ کہنے والا جو کچھ کہنا چاہتا ہے اس کو اس خوبی سے ادا کرے کہ جس سے کہا جا رہا ہے وہ اس کو مان لے۔ آیت قرآنی قل لھم فی انفسھم قولاً بلیغاً میں قول بلیغ کے دونوں معنے ہو سکتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ گفتگو کا وہ مؤثر طرز و انداز اختیار کرنا چاہیے جو دل میں گھر کر جائے۔ یعنی اب ان کو نصیحت کا انداز کان کھولنے والا اور دل میں دھنسنے والا ہونا چاہیے۔ یہ بہرے اور پلید لوگ ہیں۔ اس وجہ سے کریمانہ اندازِ نصیحت ان پر اثر انداز نہیں ہوتا۔ ورنہ قرآن نے آدابِ گفتگو میں قولِ لین، قولِ حسن، قولِ سدید اور قولِ معروف کی ہدایت کی ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی اسی ہدایت کے مطابق کریمانہ انداز میں بات فرماتے لیکن منافقین حضور اقدس کی اس کم النفسی کے نااہل تھے اور نہ قدردان بلکہ وہ اس سے غلط فائدہ اٹھاتے، اس وجہ سے یہاں یہ ہدایت ہوئی کہ اب ان کے ساتھ زیادہ نرمی برتنے کا موقعہ نہیں ہے۔ وقت آگیا ہے کہ ان کو مؤثر انداز میں تنبیہ کی جائے۔

قتلِ خطاء: غلطی اور خطا سے قتل کرنے والوں کی سزا یہاں جو بتائی گئی ہے وہ جرم کے مطابق اور افراط و تفریط سے پاک ہے۔ سزا میں قصاص اس لیے تجویز نہیں کیا گیا کہ اس قاتل نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا ہے بلکہ نادانستگی میں اس سے یہ گناہ سرزد ہوا ہے۔ اس نے گولی چلائی شکار سمجھ کر مگر وہ نکلا آدمی، گولی لگ جانے کے بعد اس کو معلوم ہوا کہ وہ جانور نہیں آدمی ہے یا وہ نشانے پر گولی لگا رہا تھا اور اتفاق سے وہ بہک کر کسی آدمی کے لگ گئی اور وہ مر گیا، اور معاف اس وجہ سے نہیں کیا کہ گو غلطی سے ایسا ہوا مگر انسانی جان اس کے فعل سے ضائع ہوئی جس سے ملک و قوم کا بھی نقصان ہوا اور اس کے ورثہ کا بھی۔ دونوں پہلوؤں کا لحاظ کر کے سزا یہ مقرر کی گئی کہ وہ قاتل خطا غلام یا لونڈی آزاد کرے اور اس کے حامی و مددگار اور وہ خود دونوں مل کر دیت ادا کریں۔ اس سزا میں قاتل کو بھی تنبیہ ہے کہ وہ آئندہ سے خوب دیکھ بھال کر اور پوری احتیاط کے ساتھ اس طرح کے موقعوں پر کوئی قدم اٹھائے اور اس کے

حامیوں کو بھی ہدایت ہو گئی کہ وہ اپنے آدمیوں کی پوری نگرانی کریں۔ یوں تو قانون کی عام کتابوں میں قتل کی پانچ قسمیں بتائی گئی ہیں لیکن صاحب ہدایہ نے نقل کیا ہے کہ امام اعظم قتل کی تین ہی صورتیں بتاتے ہیں، عمداً، شبہ عمداً اور خطاً۔ قتل عمد کا تو مطلب یہ ہے کہ انسان جان بوجھ کر ہتھیار یا ہتھیار جیسی چیز سے اس شخص کو قتل کر ڈالے جس کا قتل شرعاً جائز نہیں ہے۔ خطا کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ غلطی ارادے میں ہو اس طرح کہ ایک چیز کو شکار گمان کر کے نشانہ بنایا لیکن وہ آدمی نکل آیا، دوسرے یہ کہ غلطی فعل میں ہو اور وہ یہ کہ خاص نشانہ پر گولی چلائی اور بہک کر وہ کسی آدمی کو لگ گئی۔ مطلب یہ ہے کہ قتل خطا میں قاتل کے قصد و نیت اور عمل میں کسی کا کوئی دخل نہیں ہوتا ہے۔

قصر ۔ علامہ علی بن محمد خازن بغدادی لکھتے ہیں، لغت میں قصر کے معنے تضییق یعنی تنگی کرنے کے ہیں، کچھ کہتے ہیں کہ قصر کے معنے ہیں کسی چیز کا اس کی اصل سے ملا دینا، ابن الجوزی نے قصر کی تفسیر نقص یعنی کمی کے ساتھ کی ہے اور میں نے اہل تفسیر و لغت میں سے کسی کو اُن کا ہمنوا نہیں پایا اور بعض نے کہا ہے کہ قصر الصلاۃ کے معنے یہ ہیں کہ بموجب رخصت نماز کی بعض رکعتوں یا بعض ارکان کو ترک کر کے نماز کو قصیر (کوتاہ) کر لیا جائے۔ اسی وجہ سے آیت میں جو نماز کا قصر مذکور ہے اس کی تفسیر میں دو قول ذکر کیے ہیں ایک یہ کہ تعداد رکعات میں قصر ہے یعنی چار رکعت کی نماز کو دو رکعت کر لینا، دوسرے یہ کہ قصر سے مراد نماز کی ادائیگی میں تخفیف کرنا ہے بایں طور کہ رکوع و سجود کی جگہ اشارے پر اکتفا کر لی جائے۔ خازن پہلے قول کو اصح بتاتے ہیں اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے دوسرے قول کو اختیار کیا ہے چنانچہ فتح الرحمٰن میں رقمطراز ہیں، "مشہور آنست کہ ایں آیت در صلاۃ مسافر نازل شدہ است و خوف قید اتفاقی است و آنچہ نزد بندہ رجحان یافتہ آنست کہ ایں آیت در صلاۃ خوف نازل شدہ است و سفر قید اتفاقی است و مراد از قصر قصر در کیفیت رکوع و سجود ست کہ بایمائے اولئے تواں کرد نہ در کمیت رکعات واللہ اعلم۔ صحیح مسلم میں حضرت عمرؓ سے روایت ہے کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قصر نماز میں خوف کی قید کے بارے میں دریافت کیا تو آپ نے یہ فرمایا کہ بغیر خوف کے بھی نماز میں قصر ہے اور یہ اللہ کی طرف سے صدقہ ہے اس کو قبول کرنا چاہیے۔ نیز حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم، ابوبکر، عمر، اور صحابہ کرام نے سفر میں بحالت امن بھی

قصر کیا معلوم ہوا کہ قصر کی مشروعیت خوف پر موقوف نہیں ہے۔

لمس: اسی سے ملامسۃ آیا ہے اس کے معنے چھونے کے ہیں، عورتوں کو چھونا جنسی تعلقات کے لیے کنائی زبان ہے۔ قرآن کی عادت یہی ہے کہ اس قسم کی باتوں کے لیے وہ مجاز و استعارے کی زبان اختیار کرتا ہے تاکہ مدعا ظاہر ہو جائے اور شرم کا پردہ بھی پڑا رہے۔ چنانچہ قرآن حکیم میں اس قسم کے واقعات مجاز و استعارہ ہی کے پردے میں بیان کیے گئے ہیں جیسے یہاں اولا مستم النساء یا تم نے عورتوں کو چھویا ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ خدا شرمیلا ہے اسی لیے اس نے جنسی تعلقات کو کنایۃ لمس کے لفظ سے بیان کیا ہے۔ قرآن نے اس کے لیے اور جو الفاظ اختیار کیے ہیں۔ سب کے سب کنائے اور استعارے ہیں مثلاً ھن لباس لکم و انتم لباس، یا نساءکم حرث لکم یا وقد افضی بعضکم الی بعض۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی تعلیمات کے مطابق پاخانہ، پیشاب کے لیے بھی قرآن نے کنایۃ لفظ غائط استعمال کیا ہے جو لغت میں نشیب زمین کو کہتے ہیں او جاء احد منکم من الغائط چونکہ عام طور پر لوگ اس مقصد کے لیے پست زمین کو پسند کرتے ہیں اس لیے استعارۃ اس سے پاخانہ مراد لیا گیا، اس موقع پر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ لفظ پاخانہ بھی اردو زبان میں ایک استعارہ ہے جس کی اصل پائین خانہ ہے۔ چونکہ پاخانے عموماً مکانوں کے کنارے پر بنائے جاتے ہیں اس لیے استعارۃً ان کو پائین خانہ کہا گیا۔ پھر تخفیف کے اصول کے مطابق پاخانہ ہو گیا، اور کثرت استعمال سے اس میں استعارے کی شان باقی نہ رہی۔

لی لسان: لی مصدر ہے لوی یلوی کا جیسا کہ طی مصدر ہے طوی یطوی کا، اس لیے معنے مروڑنے کے ہیں، زبان مروڑنے کے معنے کلام کے الٹ پھیر کرنے اور اس کے معانی میں تحریف کرنے کے ہیں اور یہ معنے بھی اس کے مفہوم میں داخل ہیں کہ کتاب کو پڑھتے ہوئے کسی خاص لفظ یا فقرے کو جو ان کے مفاد یا ان کے خود ساختہ عقائد و نظریات کے خلاف پڑتا ہو زبان کی گردش سے کچھ کا کچھ بنا لیتے ہیں۔ اصل لغت میں لوی یلوی کے ہیں اسی باٹنا اور مروڑنا ہیں، اور لوی لسانہ ایک خاص محاورہ ہے جس کے معنے امام راغب نے جھوٹ بولنے اور بات بنانے کے لکھے ہیں۔

وَالْمُحْصَنٰتُ مِنَ النِّسَآءِ اِلَّا مَا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۚ كِتٰبَ
اللّٰهِ عَلَيْكُمْ ۚ وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ
مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ ۗ فَمَا اسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ
فَاٰتُوْهُنَّ اُجُوْرَهُنَّ فَرِيْضَةً ۗ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيْمَا
تَرٰضَيْتُمْ بِهٖ مِنْۢ بَعْدِ الْفَرِيْضَةِ ۗ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا
حَكِيْمًا ﴿۲۴﴾

اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں ہاں ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو تمہارے قبضے میں آگئی ہوں، یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازمی کر دی گئی ہے۔ ان عورتوں کے علاوہ تمام عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں جن کو مال خرچ کر کے اپنے نکاح میں لاؤ بشرطیکہ نفس پرستی تمہارا مقصد نہ ہو۔ پھر جن عورتوں سے تم نے

ازدواجی زندگی کا فائدہ اٹھایا ہے تو تمہیں ان کے مہر کی رقم بطور فرض کے ادا کر دینی چاہیئے[۲۷]۔ اور مہر مقرر ہو جانے کے بعد اگر باہمی رضامندی سے کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے، بلاشبہ اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے[۲۸]۔

محرمات کی تکمیل اور نکاح کی ترغیب

محرمات کی فہرست کا بقیہ اور ازدواجی زندگی کی ناگزیر شرطیں اس آیت میں بتائی جا رہی ہیں۔ محرمات میں وہ عورتیں بھی شامل ہیں جو شادی شدہ ہوں۔ اب تک جو محرمات بیان کی گئی ہیں یہ ہیں۔

۱۔ تمہارے باپ دادا کی منکوحہ
۲۔ تمہاری مائیں
۳۔ تمہاری بیٹیاں
۴۔ تمہاری بہنیں
۵۔ تمہاری پھوپھیاں
۶۔ تمہاری خالائیں
۷۔ تمہاری بھتیجیاں
۸۔ تمہاری بھانجیاں
۹۔ تمہاری رضاعی مائیں
۱۰۔ تمہاری رضاعی بہنیں

۱۱۔ تمہاری خوشدامنیں
۱۲۔ تمہاری بیویوں کی لڑکیاں.
۱۳۔ تمہارے بیٹوں کی بیویاں
۱۴۔ دو بہنوں کا جمع کرنا
۱۵۔ شادی شدہ عورتیں

یہ پندرہ محرمات ہیں، ان میں سے سات بلحاظ نسب ہیں اور سات دیگر وجوہ سے، جو سات بلحاظ نسب ہیں ان کی بھی دو قسمیں ہیں، اوّل بلحاظ ولادت اس میں دو ہی قسم آتی ہیں مائیں اور بیٹیاں، دوم بلحاظِ اخوت یہ پانچ ہیں اپنی بہن، باپ کی بہن، ماں کی بہن، بھائی کی بیٹی، بہن کی بیٹی، نسب کے علاوہ دیگر وجوہ حرمت یہ ہیں دودھ مائیں، دودھ بہنیں، بیویوں کی مائیں، بیویوں کی پہلی بیٹیاں بشرطیکہ ان بیویوں سے خلوت صحیح ہو چکی ہو۔ بیٹوں کی بیویاں، باپوں کی بیویاں اور دو بہنوں کا ایک نکاح میں جمع کرنا اور شادی شدہ عورتیں۔ ان تعلقات کی حرمت قائم کرکے ان کو صنفی میلان سے اس قدر پاک کر دیا ہے کہ ان رشتوں کے مرد اور عورت یہ تصور بھی نہیں کر سکتے کہ وہ ایک دوسرے کی جانب کوئی صنفی کشش رکھتے ہیں۔ آخر میں یہ پابندی بھی لگا دی ہے کہ ایسی تمام عورتیں بھی حرام ہیں جو بالفعل کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں اور اس سے پہلے آیت ۱۵ میں بے ضابطہ صنفی تعلق کو حرام قرار دیا ہے۔ اس طرح حدود و قیود لگا کر صنفی انتشار کے تمام راستے بند کر دیے گئے مگر انسان کی حیوانی سرشت کے اقتضا اور کارخانۂ قدرت کے مقرر کردہ طریقہ کو جاری رکھنے کے لیے ایک دروازہ کھولنا بھی ضروری تھا۔ یہ دروازہ نکاح کی صورت میں کھولا گیا اور کہہ دیا گیا کہ اس ضرورت کو تم پورا کرو مگر منتشر اور بے ضابطہ تعلقات میں نہیں، چوری چھپے بھی نہیں کھلے بندوں بے حیائی کے طریقہ پر بھی نہیں بلکہ باقاعدہ اعلان و اظہار کے ساتھ تاکہ تمہاری سوسائٹی میں یہ بات معلوم و مسلم ہو جائے کہ فلاں مرد و عورت ایک دوسرے کے ہو چکے ہیں۔

۲۵ ۔ اور وہ عورتیں بھی تم پر حرام ہیں جو کسی دوسرے کے نکاح میں ہوں ہاں ایسی عورتیں اس سے مستثنیٰ ہیں جو تمہارے قبضے میں آگئی ہوں یہ اللہ کا قانون ہے جس کی پابندی تم پر لازمی کر دی گئی ہے۔

محرمات کو ذکر فرما کر آخر میں اب ان عورتوں کی حرمت بیان فرمائی ہے۔ جو کسی کے نکاح میں ہوں یعنی جو عورت کسی کے نکاح میں ہو اس کا نکاح کسی اور سے نہیں ہو سکتا تاوقتیکہ وہ بذریعہ

طلاق یا بعد وفات زوج نکاح سے جُدا نہ ہوجائے۔ اور عدت طلاق یا عدت وفات پوری نہ کرلے اس وقت تک کوئی اس سے نکاح نہیں کرسکتا۔ لیکن اگر کوئی عورت خاوند والی تمہاری ملک میں آجائے تو وہ اس حکم حرمت سے مستثنیٰ ہے اور وہ تم پر حلال ہے گو اس کا خاوند زندہ ہے اور اس نے طلاق بھی نہیں دی اور اس کی صورت یہ ہے کہ کافر مرد اور کافر عورت میں باہم نکاح ہوا اور مسلمان دارالحرب میں زندہ موجود ہے اور اس نے طلاق بھی نہیں دی۔ اب سب محرمات کو بیان فرما کر آخر میں تاکید فرمادی ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اس کی پابندی تم پر لازم ہے[1]

اس آیت میں احصان اور ملک یمین تشریح طلب ہیں

احصان کیا ہے؟

محصنات احصان سے بنا ہے۔ احصان لغت میں مختلف معانی کے لیے آتا ہے۔ حریت، عفت، تزوج، اسلام، قید میں رکھنا، قرآن میں چار معنے میں آیا ہے۔ تزوج یعنی شادی جیسے اس آیت میں عفت جیسے محصنین غیر مسافحین، حریت جیسے من لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنات اور اسلام جیسے فاذا احصن۔

اس آیت میں محصنات کا لفظ ان عورتوں کے لیے بولا گیا ہے جو کسی کی قید نکاح میں ہوں۔ اصل مادہ حصن ہے جس کے معنے قلعہ کے ہیں اور جمع حصون آتی ہے۔ قرآن میں ہے ما نعتھم حصونھم من اللہ اور اسی سے تحصن ہے جس کے معنے قلعہ بند ہونے کے ہیں اور اسی سے تجاوز کرکے ہر قسم کے تحفظ پر یہ لفظ بولا جاتا ہے جیسے درع حصینۃ یعنی زرہ جو بدن کی حفاظت کرتی ہے۔ حصان، وہ گھوڑا جو اپنے سوار کو بچاتا ہے۔ اور حصنت المرأۃ کے معنے پاکدامن اور عفیفہ ہونا ہیں اسی سے عفیف اور پاکدامن عورت کو حصان کہتے ہیں۔ شادی ہوجانے کے بعد عورت شوہر کی حفاظت میں آجاتی ہے اس لیے محصنہ کہلاتی ہے اور نیز شادی شدہ عورت اپنے آپ کو شوہر کے لیے محفوظ کرلیتی ہے اس لیے محصنہ کہلاتی ہے۔ مشہور امام لغت ثعلب کہتے ہیں کہ محصِنہ صاد کے زیر کے ساتھ پاکدامن کو اور صاد کے زبر کے ساتھ شادی شدہ کو کہتے ہیں۔

اس آیت میں جمہور سلف اور خلف (جن میں فقہ کے چاروں امام بھی داخل ہیں) کے نزدیک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

محصنات سے مراد شادی شدہ عورتیں ہیں۔

یہاں یہ سوال بے حد اہم ہے کہ جبکہ المحصنات خود جمع مونث ہے تو اس کے بعد النساء کا اضافہ کیوں کیا گیا۔ وجہ اس کی یہی ہے کہ چونکہ محصنات مشترک المعنے لفظ ہے اس سے پاکدامن عورتیں یا مسلمان عورتیں دونوں مراد ہو سکتی ہیں اس لیے من النساء کا اضافہ کر دیا تاکہ معلوم ہو جائے کہ زوجیت کا علاقہ بالذات قابل احترام ہے خواہ وہ مسلمان عورتیں ہوں یا کافر، آزاد ہوں یا مملوکہ۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ شوہر والی عورتوں سے نکاح ناجائز ہے سوائے ان شادی شدہ عورتوں کے جو لڑائی کے قیدیوں میں سے تمہارے قبضہ میں آگئی ہوں ان کے سابقہ نکاحوں کا اعتبار نہیں ہے۔

گویا اس میں بتا دیا کہ تمام منکوحہ عورتوں سے خواہ وہ کسی مذہب و ملت سے تعلق رکھنے والی ہوں نکاح حرام ہے اور اس طرح دوسرے مذاہب کی عورتوں کے نکاح کو صحیح تسلیم کیا ہے اور حکم دیا ہے کہ کسی مذہب یا قوم کی عورت سے جو نکاح شدہ ہو مسلمان کا نکاح کرنا جائز نہیں ہے سوائے ایک صورت کے کہ کوئی منکوحہ عورت ملک یمین ہو جائے۔

اس آیت میں اشارۃً یہ بات بھی جتادی ہے کہ ایک عورت کا ایک وقت میں دو مردوں سے ازدواجی تعلق نہیں ہو سکتا۔

ملک یمین کیا ہے

ماملکت ایمانکم کے معنے ہیں وہ جن کے تمہارے دائیں ہاتھ مالک ہوئے۔ یہ عربی کا محاورہ ہے اور اس کے معنے قبضہ میں آنا ہیں۔ جو عورتیں جنگ میں گرفتار ہوں وہ اسلامی قانون میں ماملکت ایمانکم کہلاتی ہیں۔ ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے، ان کو کہاں اور کیسے رکھا جائے، یہ بہت معرکہ آرا بحث ہے۔ اس کے متعلق عام طور پر یہ غلط فہمی پھیلی ہوئی ہے کہ اس کا صرف ایک طریقہ ہے یعنی غلام بنالینا حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ اسیران جنگ مرد ہوں یا عورتیں ان کے ساتھ معاملہ کے کئی طریقے مقرر کیے گئے ہیں، منجملہ ان کے ایک غلام بنالینا بھی ہے۔ قرآن نے دوسرے طریقوں کی پوری قوت کے ساتھ کھول کر نشاندہی کی ہے۔

فاما منا بعد واما فداء

پھر ان کو یا تو احسان کر کے رہا کر دو یا فدیہ لے کر چھوڑ دو

یعنی اسیران جنگ کو اگر چھوڑنا چاہو اور ان کے وطن واپس کرنا چاہو تو دو صورتیں ہیں۔ ایک

یہ کہ احسان کر کے بلا معاوضہ رہا کر دو دوسرے یہ کہ فدیہ لے کر چھوڑ دو۔ ان دونوں صورتوں میں جو صورت اسلامی حکومت کے سربراہ کے خیال میں مفید و مناسب ہو اسے اختیار کر لے۔ اگرچہ مشہور یہی ہے کہ امام ابو حنیفہ کے نزدیک بغیر فدیہ کے چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ امام شافعی کے نزدیک جائز ہے لیکن فتح القدیر اور شامی وغیرہ میں ایسی روایات موجود ہیں جن سے اس کی گنجائش نکلتی ہے۔ اس کے علاوہ اسیرانِ جنگ کا تبادلہ بھی ایک طریق ہے۔ اگرچہ ایک روایت کے بموجب امام اعظم کے نزدیک یہ جائز نہیں لیکن امام ابو یوسف، امام محمد، امام مالک، امام شافعی، امام احمد اور ایک روایت میں امام ابو حنیفہ اس پر متفق ہیں کہ اگر دشمن مسلمان اسیروں سے اپنے قیدیوں کا تبادلہ کرنا چاہے تو تبادلہ کر لینا چاہیے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تبادلہ کا ثبوت ملتا ہے۔ مسلم، ابوداؤد اور ترمذی نے یہ روایت نقل کی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو مسلمانوں کے بدلہ میں ایک بار مشرکین کے ایک آدمی کو رہا کیا۔

غلامی بھی اسیرانِ جنگ کو رکھنے کا ایک طریقہ ہے، لیکن اسلام نے اسیرانِ جنگ کو غلام بنانے کی صرف اجازت دی ہے۔ اس اجازت سے فائدہ اٹھانا نہ اٹھانا مسلمانوں کے صوابدید پر موقوف ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ اسی پارہ کے دوسرے رکوع میں آئے گی۔

ان ہی قیدیوں میں بعض اوقات عورتیں بھی ہوتی ہیں ان کے لیے بھی یہی تینوں صورتیں ہیں ان کو غلام بنانے کے لیے ضروری ہے کہ

اولاً وہ دارِ حرب سے دارِ اسلام میں منتقل ہو جائیں۔ مطلق قیدی بنانے سے کسی مسلمان کے لیے یہ عورتیں حلال نہ ہوں گی۔ اگرچہ امام شافعی کے نزدیک مطلق گرفتاری ہی کا اعتبار ہے لیکن امام ابو حنیفہ اختلاف دارین کو ایک ناگزیر شرط قرار دیتے ہیں۔ امام شافعی کے خیال میں مطلق گرفتاری سے عورت کا اپنے شوہر سے نکاح ٹوٹ جائے گا مگر امام ابو حنیفہ کی رائے میں گرفتاری سے نہیں بلکہ اختلافِ دارین سے نکاح ٹوٹے گا۔

ثانیاً ان گرفتار ہو کر آنے والی عورتوں کے شوہر دارِ حرب میں ہوں۔ وہ گرفتار ہو کر دارِ اسلام میں نہ آئے ہوں۔ اگر شوہر اور بیوی دونوں ایک ساتھ گرفتار ہوں تو ان کا نکاح باقی رہے گا۔ امام شافعی اور امام مالک کا مسلک یہ ہے کہ اگرچہ دونوں میاں بیوی گرفتار ہوئے ہوں ان کا نکاح باقی نہ رہے گا۔

ثالثاً، مالِ غنیمت کی تقسیم شرعی ہوئی ہو۔ اگر مالِ غنیمت کی تقسیم شرعی نہ ہوئی ہو جس کی تفصیلات

انشاء اللہ پارہ دہم کے آغاز میں آئیں گی تو پھر کسی کے لیے حلال نہ ہو گی۔ علامہ شامی لکھتے ہیں کہ:

ہمارے زمانے میں جو عورتیں مال غنیمت میں آتی ہیں ان میں تقسیم شرعی نہیں ہوتی ہے۔

اور علامہ شامی ہی نے کچھ شوافع کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے:

ان عورتوں سے زناشوئی کے تعلقات جو روم، ترک اور ہند سے درآمد کی جاتی ہیں حرام ہیں۔

علامہ شامی نے وطی السراری فی زماننا کے عنوان سے تیسری جلد میں بھی اس کی تفصیل دی ہے بہرحال مال غنیمت کی تقسیم شرعی بنیادی اور اہم شرط ہے۔ مال غنیمت کی شرعی تقسیم کے بعد حکومت کی جانب سے باقاعدہ قبضہ ملنا ویسا ہی ایک قانونی فعل ہے جیسا نکاح ایک قانونی فعل ہے۔

رابعاً، جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں میں صرف ان عورتوں سے ملک یمین کے تعلقات جائز ہیں جن سے نکاح جائز ہے۔ اس موضوع پر ہمارے فقہاء کے درمیان کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ یعنی ملک یمین میں آنے والی عورت کے لیے ضروری ہے کہ وہ مشرکہ نہ ہو بلکہ مومنہ ہو یا کتابی ہو کر ان دونوں سے ازدواجی تعلقات جائز ہیں۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں۔

جو عورت کافر دارالحرب سے پکڑی ہوئی آئے اس کے حلال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ ایک حیض گزر جائے اور وہ عورت مشرک بت پرست نہ ہو بلکہ اہل کتاب میں سے ہو[1]

شیخ الاسلام نے جو بات ارشاد فرمائی ہے۔ یعنی یہ کہ جو عورت جنگ سے گرفتار ہو کر آئے اس کے ملک یمین کے ذریعے حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ وہ مشرکہ، مجوسیہ اور بت پرست نہ ہو بلکہ اہل کتاب سے ہو۔ اسلامی قانون کے کسی واقف کار سے پوشیدہ نہیں ہے۔ اور افسوس ہے کہ مولانا مودودی نے اس موضوع کو یہ فرما کر مشکوک بنانے کی کوشش کی ہے کہ جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہل کتاب ہی میں سے ہوں، ان کا مذہب خواہ کوئی ہو۔ بہرحال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصے میں آئیں وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں۔ (تفہیم القرآن ج اص ۳۴۴)

حیرت ہے یہ ایک ایسا مسئلہ ہے جو پورے ۱۴ سو سال سے تمام امت کا متفق علیہ ہے اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہمارا پورا دینی لٹریچر گواہ ہے کہ اس موضوع پر عطاؒ ابن ابی رباح اور عمرو بن دینار کو چھوڑ کر کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ ضروری ہے کہ یہاں اس کے بارے میں کچھ اشارات کر دیے جائیں۔

مشرکہ سے تمتع کی ممانعت قرآن سے

قرآن میں اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے ،

ولا تنکحوا المشرکات حتی یومن ولامۃ مومنۃ خیر من مشرکۃ ولو اعجبتکم ولا تنکحوا المشرکین حتی یومنوا ولعبد مومن خیر من مشرک ولو اعجبکم، اولئک یدعون الی النار واللہ یدعوا الی الجنۃ والمغفرۃ باذنہ و یبین آیاتہ للناس لعلھم یتذکرون۔

اور مشرک عورتوں سے جب تک ایمان نہ لے آئیں نکاح نہ کرو ایک مشرک عورت تمہیں کتنی ہی پسند آئے لیکن مومن عورت اس سے کہیں زیادہ بہتر ہے اور اسی طرح مشرک مرد جب تک ایمان نہ لے آئیں مومن عورتیں ان کے نکاح میں نہ دی جائیں یقیناً ایک مومن بندہ ایک مشرک مرد سے بہتر ہے۔ اگرچہ بظاہر مشرک مرد تمہیں کتنا ہی پسند آئے۔ یہ لوگ یعنی مشرکین تمہیں دوزخ کی دعوت دیتے ہیں اور اللہ تمہیں جنت اور مغفرت کی طرف بلاتا ہے۔ اللہ لوگوں کے لیے اپنی آیات بیان کرتا ہے تاکہ وہ نصیحت یاب ہو جائیں۔

اس آیت کی تشریح میں علامہ قرطبی فرماتے ہیں :

نکاح لغت میں عقد اور وطی دونوں معنے میں آتا ہے تو اللہ سبحانہٗ کے اس ارشاد ولا تنکحوا المشرکات سے نکاح اور وطی دونوں حرام ہوتی ہیں۔

اس آیت کا مفاد یہ ہے کہ چونکہ مشرکہ اور مشرک ہلاکت اور دوزخ کے داعی ہیں اس لیے ان کے ساتھ اہلِ ایمان کو ازدواجی تعلقات نہ پیدا کرنے چاہئیں۔ ظاہر ہے کہ ازدواجی تعلق کا حاصل تمتع اور توالد و تناسل ہے جیساکہ آگے نساءکم حرث لکم سے اس طرف اشارہ کیا جا رہا ہے پھر یہ تمتع اور توالد خواہ ملک نکاح کے ذریعے ہو یا ملک یمین کی راہ سے ہو۔ دونوں کا حکم ایک ہی ہونا چاہیے۔ اور چونکہ خود قرآن نے نکاح کے بارے میں اس حکم سے اہل کتاب کو مستثنیٰ قرار دیا ہے جیساکہ سورہ مائدہ میں ہے والمحصنات من الذین اوتوا الکتاب من قبلکم اس لیے اہل کتاب کی

عورتوں سے نکاح جائز ہے جیسا کہ محققین نے اس آیت کی تشریح میں بتایا ہے۔ تفسیر کی تمام متداول کتابوں میں یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے۔ قرآن کی روح یہی چاہتی ہے کہ جن عورتوں سے ازدواجی تعلق کی اجازت ہے ان ہی سے ملک یمین کے ذریعے بھی تمتع کی اجازت ہو۔ چنانچہ الجصاص نے اسی رُوحِ قرآنی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے ؛

> عقلی طور پر فقہائے کے درمیان اس موضوع پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ ملک یمین کے ذریعے کنا بیہ سے تعلقات استوار ہو سکتے ہیں۔ اور اس میں بھی کوئی اختلاف نہیں کہ جن عورتوں سے ملک یمین کی بنیاد پر تعلق قائم کیا جا سکتا ہے ان سے نکاح کے ذریعے بھی تعلقات استوار ہو سکتے ہیں ۔

مشرکہ سے تمتع کی ممانعت حدیث سے

قرآن کی اس صراحت کے باوجود بیان ہونے کی حاجت نہیں ہے جو بات خود قرآن اس زور سے بتا رہا ہے وہ کسی وضاحت کی محتاج نہیں ہے۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ :

> اگرچہ حضور انور نے یہ بات بیان نہیں فرمائی لیکن قرآن عزیز نے اسے کھول کر اس آیت میں بتا دیا ہے ولا تنکحوا المشرکات حتی یومن

اور حافظ ابن القیم فرماتے ہیں ؛

> قرآن کے بیان کردہ قانون تحریم سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ ہر وہ عورت جس سے نکاح حرام ہے اس سے ملک یمین کے ذریعے تمتع بھی حرام ہے ۔

صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری کے حوالہ سے یہ واقعہ آیا ہے کہ

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حنین والے دن ایک لشکر اوطاس میں روانہ کیا۔ ان کی دشمن سے مڈبھیڑ ہوئی۔ جنگ کا نتیجہ مسلمانوں کے حق میں رہا اور مسلمانوں کو بہت سا مال غنیمت اور قیدی ملے۔ ان قیدیوں میں عورتیں بھی تھیں۔ اہل ایمان کو ان سے تمتع میں اس لیے جھجک رہی کہ یہ شوہروں والیاں تھیں یعنی شادی شدہ تھیں اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی والمحصنات من النساء الا ما ملکت ایمانکم

اس حدیث پر سب نے یہ توضیحی نوٹ لکھا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ گرفتار ہونے کے بعد جب وہ مسلمان ہو جائیں اور مسلمان ہونے کے بعد ان کی استبراء کی مدت ختم ہو جائے تب حلال ہوں گی۔

اس توضیح میں حافظ ابن حزم بھی ائمہ اربعہ اور دوسرے علماء کے ساتھ ہیں چنانچہ المحلی میں رقمطراز ہیں:

اور سارے علماء سے ہمارا اس موضوع پر کوئی اختلاف نہیں ہے کہ بت پرست اور مشرکہ ملک یمین کے ذریعے اس وقت تک حلال نہیں ہو سکتی جب تک مسلمان نہ ہو جائے۔

ہاں اس توضیح سے صرف حافظ ابن القیم اور علامہ شوکانی کو اختلاف ہے۔ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں اپنا موقف پیش کیا ہے لیکن دوسرے علماء نے ان کا تعاقب کیا ہے۔

بات بھی یہی قرین قیاس ہے نکاح ہو یا ملک یمین عورت اور مرد کے درمیان تعلق محض ایک شہوانی تعلق نہیں ہے بلکہ وہ ایک گہرا تمدنی، اخلاقی اور قلبی تعلق ہے۔ مومن اور مشرک کے درمیان اگر یہ تعلق ہو تو جہاں اس کا امکان ہے کہ مومن آقا کے اثر سے مشرک عورت پر اور اس کی اولاد پر اسلام کے عقائد اور طرز زندگی کا نقش ثابت ہو گا وہاں اس کا بھی امکان ہے کہ مشرک مملوکہ کے خیالات اور طور طریقوں سے نہ صرف مومن آقا بلکہ اس کی نسل تک متاثر ہو جائے گی اور اسلام و کفر کی ایسی ملی جلی زندگی وجود میں آئے گی جس کو قرآن کسی طرح پسند نہیں کرتا۔ جو شخص صحیح معنوں میں مومن ہو وہ محض اپنے جذبات شہوانی کی تسکین کے لیے کبھی یہ خطرہ مول نہیں لے سکتا کہ اس کے گھر میں کافرانہ خیالات کی نشر و اشاعت ہو۔

مملوکہ عورت سے تمتع کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی وقتی طور پر جذبات شہوانی کی تسکین کا سامان ہے جو عورت جس کے حصے میں آتی ہے صرف وہی اس کے ساتھ تمتع کر سکتا ہے کسی دوسرے کو اسے ہاتھ لگانے کا حق نہیں ہے۔ اس عورت سے جو اولاد ہو گی وہ اس شخص کی جائز اولاد سمجھی جائے گی جس کی ملک میں وہ عورت ہے۔

ملک یمین سے تمتع اور صحابہ کرام

جو کچھ قرآن کی روح ہے وہی کچھ صحابہ اور تابعین نے سمجھا ہے اور اسی پر انہوں نے عمل کیا ہے۔

عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں بارہ مملوکات ایسی ہیں جن سے تمتع ناجائز ہے ان میں ایک یہ ہے امتك وهي مشركة تمہاری وہ مملوکہ جو مشرکہ ہو۔

موسیٰ ابن ابی عائشہ کہتے ہیں کہ میں نے سعید بن جبیر اور مرۃ الھمدانی سے دریافت کیا کہ مجھے قیدیوں میں سے ایک کنیز ملی ہے ان دونوں کا جواب یہ تھا کہ،

تم اس سے اس وقت تک تمتع نہیں کر سکتے جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے۔

امام محمد بن شہاب الزہری فرماتے ہیں،

اگر مشرکہ عورت کسی کی ملک یمین میں آئے تو اس سے تمتع اس وقت تک جائز نہیں ہے جب تک وہ غسل نہ کرلے، مسلمان نہ ہو جائے اور استبراء نہ ہو جائے۔

امام حسن بصری فرماتے ہیں کہ ہم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کی ہمرکابی میں جہاد میں شریک ہوتے تھے، غنیمت میں سے تقسیم کے بعد جب کسی کے حصہ میں کوئی کنیز آتی تو پہلے اسے غسل کرایا جاتا، پھر اسے اسلام کی تلقین کی جاتی۔ مسلمان ہونے کے بعد اسے نماز کا حکم دیا جاتا بعدازاں تین ماہ استبراء کے لیے گزرتی۔

ائمہ مجتہدین کی رائے

بحث طویل ہو جائے گی اگر ہم پہلی صدی سے لے کر اس چودھویں صدی تک کے مختلف فقہاء کی تحریریں نقل کریں لیکن ہم اتنا کہے بغیر نہیں رہ سکتے کہ یہ مسئلہ کہ ملک یمین کے ذریعے تمتع مشرکہ اور بت پرست سے ناجائز ہے فقہ کے چاروں مذاہب میں متفق علیہ ہے۔

مذہب حنفی کی تصریح علامہ کاشانی نے اپنی کتاب بدائع میں اس طرح کی ہے،

اصل اور ضابطہ یہی ہے کہ کسی کافر عورت سے نکاح اور ملک یمین کے ذریعے تمتع جائز نہیں۔ صرف اہل کتاب کی عورتیں یہود و نصاریٰ اس سے مستثنیٰ ہیں کیونکہ اللہ سبحانہ نے فرمایا ہے ولا تنکحوا المشرکات حتی یومن اور لفظ نکاح عقد اور وطی دونوں معنے میں آتا ہے لہٰذا اس آیت کی رو سے دونوں حرام ہیں۔

درمختار میں ہے،

ستارہ پرست سے نہ نکاح جائز ہے اور نہ ملک یمین کے ذریعے تمتع جائز ہے۔

اور یہ ضابطہ بھی صاحب درمختار نے سپرد قلم کیا ہے،

ہمارے نزدیک ضابطہ یہی ہے کہ ہر تمتع جو ملک یمین کے ذریعے درست ہے وہ نکاح کے ذریعے بھی درست ہے اور جہاں ملک یمین کے ذریعے ناروا ہے وہاں نکاح بھی ناجائز ہے۔

فقہ کی تمام متداول کتابوں فتح القدیر، المبسوط، مجمع الانہر، الاختیار لتعلیل المختار، البحر الرائق وغیرہ

میں یہ بحث موجود ہے اور اس میں فقہائے احناف ایک زبان ہیں۔
امام مالک کے مذہب کی توضیح اقرب المالک الی مذہب مالک اور اس کی شرح الشرح الصغیر میں اس طرح کی ہے؛

کافر عورت سے تمتع نکاح اور ملک یمین کے ذریعے حرام ہے ہاں کتابی عورت سے نکاح کیا جا سکتا ہے اور اس سے ملک یمین کے ذریعے تمتع بھی جائز ہے۔

اسی طرح فقہ مالکیہ کی دوسری کتابوں میں تصریحات موجود ہیں اور ان سب کا خلاصہ اور لب لباب یہی ہے کہ کفر کی حالت میں کافر عورت سے ملک یمین کے ذریعے تمتع ناجائز ہے اس سے صرف کتابی عورت مستثنیٰ ہے۔
مذہب شافعی کے سب سے بڑے ترجمان امام نووی ہیں۔ انہوں نے کھلے اور صریح لفظوں میں پوری قوت کے ساتھ امام موصوف کے مذہب کی جو تشریح کی یہ ہے؛

امام شافعی اور ان کے ہمنواؤں کا مذہب یہی ہے کہ گرفتار ہو کر آنے والی مشرک عورتوں سے ملک یمین کے ذریعے تعلقات تمتع صرف اسی وقت جائز ہیں جب کہ وہ مسلمان ہو جائیں جب تک وہ مسلمان نہ ہوں قطعاً حرام ہیں۔

فقہ شافعیہ کی دوسری کتابوں الروضہ اور متن ابی شجاع میں بھی اسی قسم کی تصریحات ہیں۔
حنابلہ کا مذہب علامہ فقیہ الحنابلہ شیخ منصور بن یونس نے الروض المربع میں اس طرح بیان کیا ہے

جس عورت سے نکاح کے ذریعے تمتع ناجائز ہے اس سے ملک یمین کے ذریعے بھی تمتع حرام ہے کیونکہ جب نکاح ذریعہ تمتع ہونے کی وجہ سے حرام ہے تو تمتع تو بدرجہ اولیٰ حرام ہے۔

علامہ ابن قدامہ نے المغنی شرح مختصر الخرقی میں اسے اور زیادہ کھول کر بیان کیا ہے؛۔

بلاشبہ جن کافر عورتوں سے اہل کتاب کے علاوہ نکاح حرام ہے ان سے ملک یمین کے ذریعے تمتع بھی اکثر اہل علم کے نزدیک حرام ہے ان میں امام مرہ الہمدانی، امام زہری، امام سعید بن جبیر، اوزاعی، ثوری، امام ابوحنیفہ، مالک اور شافعی کی یہی رائے ہے۔ حافظ ابن عبدالبر کہتے ہیں کہ یہی فقہائے امصار اور جمہور علماء کا مسلک ہے اور اس کی مخالفت شاذ کے درجہ میں ہے۔

آخر میں ہم ان اکابر کا بھی مسلک بیان کرنا ضروری سمجھتے ہیں جو ائمہ اجتہاد سے تقلید کا نہیں بلکہ تنقید کا تعلق رکھتے ہیں ان میں سرفہرست حافظ ابن حزم ظاہری کا نام ہے۔ ان کی مشہور کتاب المحلی

ہمارے پیش نظر ہے۔ ان کا موقف اس موضوع پر ائمہ اربعہ سے بھی ایک قدم آگے ہے وہ فرماتے ہیں:

ملک یمین کے ذریعے کسی کافر عورت سے تمتع جائز نہیں ہے اور کتابی عورت کے علاوہ کسی کافر عورت سے ازدواجی تعلق ناجائز ہے۔

گویا ان کی رائے میں کتابی عورت سے نکاح تو ہو سکتا ہے مگر ملک یمین کی بنا پر تمتع نہیں ہو سکتا چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

قرآن وسنت میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے جس سے ثابت ہو کہ کتابی عورت سے ملک یمین کے ذریعے تمتع ہو سکتا ہے۔

اگرچہ یہ بات بہت عجیب ہے کہ نکاح جائز ہو اور ملک یمین کی بنیاد پر تمتع حرام ہو۔ پوری شریعت میں اس کی کوئی مثال نہیں لیکن حافظ ابن حزم نے اس کے عجیب وغریب ہونے کا جس انداز سے دفاع کیا ہے اُسے پڑھیے۔ فرماتے ہیں کہ تمہیں یہ بات عجیب معلوم ہوتی ہے اور یہ بات عجیب نہیں معلوم ہوتی ہے کہ فرض نماز میں نماز مغرب کے علاوہ تین رکعت والی نماز کوئی نہیں ہے۔ بہرحال حافظ ابن حزم اس لحاظ سے ائمہ اربعہ سے ایک قدم آگے ہی ہیں یعنی اہل کتاب سمیت سب کافر عورتوں سے ملک یمین کی بنا پر تمتع کو ناجائز قرار دیتے ہیں۔ کتابی عورت کے بارے میں حافظ ابن حزم کی رائے کو علماء کے یہاں شرف پذیرائی حاصل نہیں ہے۔ امام حسن بصری کو چھوڑ کر پوری اُمت کی علمی طاقت کا اعلان یہی ہے کہ کتابی مملوکہ سے ملک یمین کی بنا پر تمتع جائز ہے اور بقول الجصاص اس موضوع پر فقہاء کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ علیٰ ہذا عطاؒ اور عمرو بن دینار کو چھوڑ کر بقول ابن العربی تمام لوگوں کا، اور بقول ابن قدامہ اکثر اہل علم اور بقول ابن عبدالبر فقہائے امصار اور جمہور علماء کا فیصلہ یہی ہے کہ کتابی عورت کے علاوہ کسی کافر عورت سے ملک یمین کی بنیاد پر تمتع جائز نہیں۔ متاخرین میں سے حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں، علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں، محمد بن اسماعیل یمانی نے سبل السلام میں اور نواب صدیق حسن خاں نے جواز کا موقف یہ کہہ کر اختیار کیا ہے کہ غزوۂ اوطاس میں حضور انور نے استبراء کی شرط بیان فرمائی ہے لیکن کسی جگہ اسلام کی شرط کا ذکر نہیں کیا۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں، حافظ عینی نے عمدۃ القاری میں، علامہ قرطبی نے تفسیر میں اس کے مدلل اور مفصل جوابات دیے ہیں بہرحال سب کا فیصلہ یہی ہے کہ کافر عورتوں سے کتابی کے علاوہ ملک یمین کی بنا پر تمتع جائز نہیں ہے۔

حیرت ہے کہ موضوع کی اس وضاحت کے باوجود مولانا مودودی نے اپنی تفسیر میں یہ بات کیوں کر لکھ دی ہے کہ:

جنگ میں پکڑی ہوئی عورتوں سے تمتع کے معاملہ میں یہ شرط نہیں ہے کہ وہ اہل کتاب میں سے ہوں۔ ان کا مذہب خواہ کوئی ہو بہرحال جب وہ تقسیم کر دی جائیں گی تو جن کے حصہ میں آئیں وہ ان سے تمتع کر سکتے ہیں۔ (تفہیم القرآن ج ۱ ص ۳۴۰)

اگر فی الواقع مولانا کو شوکانی اور حافظ ابن القیم ہی کے موقف کو اپنانا تھا تو یہ بات پہلے مخاطبوں کے سامنے کھل کر آنی چاہیے تھی کہ جمہور کا مسلک یہ ہے تاکہ تفہیم کا قاری کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہو۔ مولانا کا انداز بیان اپنے قاری کو یہ باور کرا رہا ہے کہ مسئلہ یہی ہے اور اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اگر اس قسم کے دوسرے مسائل میں وہ اس قسم کی تعبیر اختیار کرتے ہیں کہ البتہ فقہاء کے درمیان اس امر میں اختلاف ہے۔ اگر اس موقعہ پر بھی اختلاف کو بتا دیا جاتا تو تفہیم کا قاری غلط فہمی کا شکار نہ ہوتا۔

خامساً، ملک یمین کی بنا پر تمتع کے جواز کی یہ بھی شرط ہے کہ استبراء ہو جائے۔ استبراء یہ ہے کہ عورت سے اس وقت تک مباشرت نہ کی جائے جب تک کہ اسے ایک مرتبہ ایام ماہواری نہ آجائیں اور یہ اطمینان نہ ہو جائے کہ وہ حاملہ نہیں ہے اس سے پہلے مباشرت جائز نہیں ہے اگر وہ حاملہ ہو تو وضع حمل سے پہلے مباشرت حرام ہے۔ چونکہ یہ بات صراحۃً قرآن نے نہیں بتائی تھی اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اوطاس کے قیدیوں کے بارے میں خاص طور پر صراحۃً بیان فرمادی کہ

کسی حاملہ عورت سے وضع حمل سے پہلے تمتع نہ کیا جائے اور غیر حاملہ سے بھی اس وقت تک تمتع نہ کیا جائے جب تک حیض نہ آجائے۔

اس موضوع پر علماء میں دو رائیں نہیں ہیں۔ علماء کا اس پر اجماع ہے کہ ملک یمین کی بنا پر تمتع کی شرط یہ ہے کہ استبراء ہو جائے۔ اس موضوع پر ایک سے زیادہ ارشاد نبوت آئے ہیں۔

بہرحال لونڈیوں سے تمتع کے بارے میں یہ پانچ شرطیں ہیں۔ ان شرطوں کے ساتھ لونڈیوں سے تمتع جائز ہے لیکن یاد رہے کہ اسلام غلام بنا کر رکھنے کو صرف جائز قرار دیتا ہے۔ فرض و واجب نہیں بتاتا۔ اس کے ساتھ دو صورتیں اور بھی ہیں کہ فدیہ لے کر رہا کرے یا بلا فدیہ رہا کرے۔ قیدیوں سے تبادلہ بھی فدیہ کے حکم میں ہے۔

صحت نکاح کی شرطیں

۴۶۔ ان عورتوں کے علاوہ تمام عورتیں تمہارے لیے حلال ہیں جن کو مال خرچ کر کے تم اپنے نکاح میں لاؤ بشرطیکہ نفس پرستی تمہارا مقصد نہ ہو۔ یعنی جن عورتوں کی حرمت بیان ہو چکی ان کے سوا سب حلال ہیں

چار شرطوں کے ساتھ اول یہ کہ طلب کرو یعنی زبان سے ایجاب و قبول دونوں طرف سے ہو جاتے، دوسرے یہ کہ مال یعنی مہر دینا قبول کرو، تیسرے یہ کہ ان عورتوں کو قید میں لانا اور اپنے قبضہ میں رکھنا مقصود ہو صرف مستی نکالنا اور شہوت رانی مقصود نہ ہو جیسا کہ زنا میں ہوتا ہے یعنی ہمیشہ کے لیے وہ اس کی بیوی ہو جاتے چھوڑے بغیر کبھی نہ چھوٹے مطلب یہ کہ کوئی مدت مقرر نہ ہو۔ اس سے متعہ کا حرام ہونا معلوم ہو گیا جس پر اہل حق کا اجماع ہے۔ چوتھی شرط جو دوسری آیتوں میں مذکور ہے یہ ہے کہ مخفی طور پر دوستی نہ ہو یعنی کم از کم دو مردوں یا ایک مرد دو عورتیں اس معاملہ کی گواہ ہوں۔ اگر دو گواہوں کے بغیر ایجاب و قبول ہو گا تو وہ نکاح نہ ہو گا زنا سمجھا جائے گا[1]

اس آیت میں صحت نکاح کی تین شرطیں بیان کی گئی ہیں۔

صحت نکاح کی پہلی شرط

نکاح کے صحیح ہونے کی سب سے پہلی شرط یہ ہے کہ زبان سے ایجاب و قبول ہو۔ اس شرط کے لیے قرآن نے ابتغاء کی تعبیر اختیار کی ہے، ابتغاء کے معنے تلاش کرنے کے ہیں۔ اس صیغہ کے مخاطب مرد ہیں۔ گویا نکاح کی مانگ اور طلب مرد کا کام ہے جبکہ عورت کا کام صرف قبول کرنا ہے۔ نر و مادہ کے درمیان فاعلیت اور انفعالیت کا فرق زندگی کے ہر پہلو میں نمایاں ہے۔ یہاں بھی قرآن نے ابتغاء استعمال کر کے اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ دونوں میں ایک فاعل اور دوسرا قابل، ایک طالب دوسرا مطلوب ہو۔ چونکہ ابتغاء کی نسبت مردوں کی طرف ہے اس لیے مرد فاعل ہے اور عورت قابل ہے۔ مرد کا کام ایجاب اور عورت کا کام قبول ہے۔

ایجاب و قبول کے صحیح ہونے کے لیے ضروری ہے کہ

اولاً ایجاب و قبول دونوں یا دونوں میں سے ایک ماضی کے لفظوں میں ہو یعنی ایسا لفظ جس سے یہ سمجھا جائے کہ نکاح ہو چکا۔

ثانیاً، ایجاب و قبول کے لیے لفظی پیمانہ ہونا چاہیے۔ کردار و فعل کے ذریعے نہ ہو۔ کتابت اور تحریر بھی لفظ کے حکم میں ہے بشرطیکہ کاتب مجلس نکاح میں موجود نہ ہو اور اپنی تحریر دو گواہوں کو سنا دے اور اس پر گواہ بنا لے۔ مثلاً کوئی شخص کسی عورت کو لکھ کر بھیجے کہ میں نے تیرے ساتھ اپنا نکاح کر لیا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور عورت دو آدمیوں کو گواہ بنا کر کہے کہ فلاں شخص کی یہ تحریر آئی ہے لہٰذا میں اس سے نکاح کرتی ہوں تو یہ ایجاب و قبول صحیح ہو جائے گا۔

ثالثاً، ایجاب و قبول اس زبان میں ہو جسے میاں بیوی سمجھتے ہوں۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ عربی زبان میں ایجاب و قبول ہو یا اس زبان میں ہو جسے عاقدین اور گواہ سمجھتے ہوں۔ امام شافعی تو فرماتے ہیں کہ جو شخص لفظ نکاح کہنے پر قادر ہو اس کا نکاح اس کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ لیکن امام اعظم اس کے لیے عربی کی شرط نہیں لگاتے۔ اس معنے کے لیے جس زبان میں بھی جو لفظ مستعمل ہو اس سے نکاح ہو جائے گا۔

رابعاً، ایجاب و قبول دونوں ایک مجلس میں ہوں۔ اگر میاں بیوی میں سے کوئی یا ان کا وکیل نہ موجود ہو بلکہ ان میں سے کسی نے اپنی تحریر روانہ کی ہو تو وہ تحریر جس مجلس میں پڑھی جائے اسی مجلس میں قبول کا ہونا ضروری ہے۔ مجلس کے ایک ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایجاب و قبول کے درمیان کوئی ایسا کام نہ ہونے پائے جو ایجاب سے روگردانی کو ظاہر کرتا ہو۔

خامساً، ایجاب و قبول میں باہم مخالفت نہ ہو مثلاً مرد کہے کہ میں تیرے ساتھ ایک سو روپیہ مہر پر نکاح کرتا ہوں اور عورت کہے نکاح تو منظور ہے مگر مہر کی رقم منظور نہیں ہے تو ایسی حالت میں ایجاب و قبول صحیح نہ ہوگا کیونکہ قبول ایجاب کے مخالف ہے۔ ہاں اگر قبول عورت کی جانب سے ہو اور وہ مرد کے مقرر کیے ہوئے مہر سے کم مقدار کو قبول کرے یا قبول مرد کی طرف سے ہو اور وہ عورت کے مقرر کردہ مہر سے زیادہ مقدار کو قبول کرے تو ایسی حالت میں ایجاب و قبول باہم مخالف نہ سمجھے جائیں گے۔

سادساً، ایجاب و قبول کسی وقت پر موقوف یا کسی شرط سے مقید نہ ہوں مثلاً یہ کہے کہ تیرے سے کل کو نکاح منظور ہے یا یہ کہے کہ اگر فلاں کام ہو جائے تو بس میرا تم سے نکاح ہو گیا۔

سابعاً، جس عورت کا نکاح ہو وہ عاقدین کے سامنے متعین ہو۔ عاقدین ان کو کہتے ہیں جو باہم ایجاب و قبول کریں۔ اگر میاں بیوی خود ایجاب و قبول کریں تو وہ ہی عاقدین ہیں۔ اگر میاں بیوی خود ایجاب و قبول نہ کریں بلکہ ان کے وکیل یا ولی ایجاب و قبول کریں تو وکیل اور ولی ہی عاقدین کہلائیں گے عورت کے مقرر کرنے کی ضرورت اس وقت جبکہ عاقدین زوجین نہ ہوں۔

صحتِ نکاح کی دوسری شرط

نکاح کے صحیح ہونے کی دوسری شرط یہ ہے کہ یہ نکاح مال یعنی مہر کے ساتھ ہو۔ مہر میں دو باتیں شرط ہیں۔ ایک یہ کہ وہ مال ہو، دوسرے یہ کہ اس مال کی کم از کم مقدار دس درہم ہو —— پہلی شرط

یعنی مہر کے مال ہونے کی طرف قرآن کی یہ آیت رہنمائی کر رہی ہے اور اسی آیت میں اشارۃً یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ جو مال نہ ہو اس میں مہر بننے کی صلاحیت نہیں ہے اگر کوئی شخص کسی لونڈی سے شادی کرتا ہے اور اس کی آزادی کو مہر قرار دیتا ہے تو یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ آزادی مال نہیں ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ، امام مالک، امام شافعی کا مذہب ہے لیکن امام احمد سے ایک روایت میں کنیز کی آزادی کو اس کا مہر قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی روایت کو حافظ ابن القیم نے زادالمعاد میں راجح قرار دیا ہے ایسے ہی سور اور شراب کو بھی بدل مہر نہیں بنایا جا سکتا کیونکہ یہ دونوں اسلامی قانون میں مال نہیں ہیں۔ ہاں وہ منافع جن کے معاوضہ میں اجرت لینا جائز ہے۔ ان کا شمار مال ہی میں ہوگا اور ان کو مہر قرار دینا صحیح ہوگا۔ لہٰذا اگر کوئی شخص اپنی بیوی کا مہر اپنے گھوڑے کی سواری یا اپنے ملازم کی خدمت یا اپنے گھر کی سکونت کو قرار دے تو صحیح ہے کیونکہ ان چیزوں کے مقابلے میں اجرت لینا جائز ہے۔ ایسے ہی بکریوں کا چرانا یا کاشت کر دینا کو بھی مہر بنانا جائز ہے ایسے ہی اگر شوہر اپنی بیوی کے والد کی خدمت کر دینے کو مہر قرار دے تب بھی درست ہے بشرطیکہ بیوی راضی ہو جائے جیسے حضرت شعیب نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے اپنی بیٹی کا نکاح کرنا چاہا تو یہی مہر مقرر کیا تھا کہ تم میری بکریاں آٹھ برس تک چرا دو۔ اس قصہ کو اللہ سبحانہٗ نے قرآن حکیم میں ذکر فرمایا ہے۔

ایسے ہی اگر کوئی شخص تعلیم کو مہر قرار دے تو جائز نہیں کیونکہ تعلیم قرآن ان منافع میں سے نہیں جس کے مقابلہ میں اجرت لینا جائز ہے لیکن امام شافعی فرماتے ہیں کہ تعلیم قرآن کو مہر قرار دینا جائز ہے۔ وہ صحیح بخاری کی یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کا نکاح کیا اور فرمایا کہ تیرے پاس کچھ ہے اس نے عرض کیا کہ کچھ نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ کوئی لوہے کی انگوٹھی ہی تلاش کر لا اس نے تلاش کی مگر وہ بھی نہ ملی آپ نے فرمایا کہ اچھا جس قدر قرآن تیرے پاس ہے یعنی تجھے یاد ہے اس کے عوض میں میں نے تیرے ساتھ اس عورت کا نکاح کر دیا۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اس ارشاد کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جس قدر قرآن تجھے یاد ہے اس کو مہر بنا کر میں نے نکاح کر دیا بلکہ مطلب یہ ہے کہ چونکہ تجھے قرآن کو یاد کرنے کی سعادت حاصل ہے اس بزرگی کے سبب سے تیرے ساتھ نکاح کر دیا۔ اگرچہ بالفعل تیرے پاس مال نہیں ہے۔ یعنی جب اس کے پاس ہوگا مہر دے دے گا۔ اور امام اعظم اس قسم کی احادیث کی توجیہ اس لیے فرماتے ہیں کہ امام اعظم حدیث کی اصطلاحی صحت کے بعد زندگی میں اسے اپنانے کے لیے ایک شرط یہ بھی بتاتے ہیں کہ وہ حدیث کسی درجہ میں معانی قرآن سے متصادم نہ ہو، اور اس شرط کے عائد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ قرآن اپنے مدلول اور مفہوم میں اگرچہ قطعی نہیں ہے

لیکن وہ اپنے منطوق میں حتمی اور قطعی ہے۔ اور ایک روایت پر اصطلاحی صحت کی خواہ کتنی مہریں ثبت ہو جائیں مگر آپ قطعیت کے ساتھ یہ دعویٰ نہیں کر سکتے کہ راوی جو کچھ بتا رہا ہے یقیناً یہ الفاظ نبوت ہی ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

حدیث میں الفاظ متعدد طرق سے آنے کی وجہ سے مختلف ہوتے ہیں اور الفاظ کا یہ اختلاف ہونے کی وجہ یہ ہے کہ حدیث کی روایت بالمعنی ہوتی ہے۔

امام اعظم کا یہ ضابطہ حافظ ابن عبدالبر نے اس طرح پیش کیا ہے :

امام اعظم اخبار آحاد کو اپنے یہاں جمع کردہ حدیثوں اور معانی قرآن پر پیش فرماتے تھے ان حدیثوں میں سے جو اپنے معنے میں منفرد ہوتی تھیں ان کو ترک کر دیتے اور ان کا نام شاذ رکھتے۔

اس سے معلوم ہوا کہ اخبار آحاد اگر معانی قرآن کے خلاف ہوتی تھیں تو آپ کے یہاں درجہ قبولیت نہ ملتا تھا خواہ وہ معانی قرآن، قرآن کا منطوق ہوں یا مدلول۔ منطوق کی مثال تو یہی مسئلہ ہے ان تبتغوا باموالکم کا منطوق یہی ہے کہ عورتوں کا مہر مال ہونا چاہیے اور بخاری کی حدیث بما معک من القرآن اس سے متصادم ہے اس لیے ابوحنیفہ نے اس کے منہ میں ایسا مطلب ڈال دیا کہ جس سے وہ قرآن سے متصادم نہ ہو یعنی بتایا کہ بما معک میں بار مقابلہ نہیں بلکہ سببیہ ہے جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔

مہر کی مقدار

اس آیت میں دوسری شرط یعنی مال کی مقدار مذکور نہیں ہے اسی لیے اس موضوع پر علماء کے درمیان اختلاف رائے ہے۔ علامہ ابن العربی نے عارضۃ الاحوذی شرح ترمذی میں سات آراء لکھی ہیں۔ اور ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ حضرت علی فرماتے ہیں کہ دس درہم سے کم مہر نہیں ہے۔ یہی امام شعبی ابراہیم نخعی، ابوحنیفہ، ابویوسف، محمد، زفر، الحسن بن زیاد کی رائے ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ دس درہم سے کم بھی مہر ہو سکتا ہے کیونکہ کچھ حدیثوں میں اس سے کم بھی ٹھہرایا ہے۔ چنانچہ صحیح بخاری میں لوہے کی انگوٹھی کا ذکر آیا ہے۔ حنفیہ اس کا جواب دیتے ہیں کہ آپ نے لوہے کی انگوٹھی مہر کا کچھ حصہ ادا کرنے کے لیے تلاش کرائی تھی اس لیے نہیں کہ انگوٹھی ہی کو مہر بنانا مقصود تھا۔ کیونکہ اس زمانہ میں دستور تھا کہ مہر کا کچھ حصہ خلوت سے پہلے ادا کرتے تھے۔ حنفیہ کا استدلال اس حدیث سے ہے جس میں حضور اکرم

نے فرمایا ہے کہ لا مھر اقل من عشرۃ دراھم یعنی مہر دس درہم سے کم درست نہیں ہے۔ اس حدیث کو بیہقی نے بسندِ ضعیف اور ابن ابی حاتم نے بقول حافظ ابن حجر عسقلانی بسندِ حسن روایت کیا ہے۔ یہ مہر کی کم سے کم مقدار ہے۔ زیادہ مہر کی کوئی حد شریعت نے مقرر نہیں کی۔ جس قدر دینے کی جس شخص میں استطاعت ہو اس قدر باندھ سکتا ہے مگر اچھا یہ ہے کہ بنظرِ اتباعِ سنت ازواجِ مطہرات اور بنات کے مہروں میں سے کوئی مہر اختیار کرے۔ ہم یہاں نہایت محقق روایات سے ان کا مہر درج کرتے ہیں۔ دس درہم کا وزن اتولہ و ماشے ، رتی ہے اور رائج الوقت سکہ کے اعتبار سے اس کی قیمت بنتی ہے۔ احناف کے نزدیک اس سے کم مہر نکاح میں باندھنا جائز نہیں ہے۔

نقشہ مہر امہات المومنین

نام	مقدار مہر بوزن شرعی	مقدار وزن رائج	قیمت
۱۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ	۱۲ اوقیہ سونا	۱۹ تولہ ۱ ماشہ ۶ رتی	۵۴۶۰۶/۱۲
۲۔ حضرت سودہ	۴۰۰ درہم چاندی	۱۰۲ تولہ ۱۱ ماشے	۱۰۹۳/۷۵
۳۔ حضرت عائشہ	۴۰۰ "	۱۰۲ تولہ ۱۱ ماشے	۱۰۹۳/۷۵
۴۔ حضرت حفصہ	۴۰۰ "	" "	۱۰۹۳/۷۵
۵۔ حضرت ام سلمہ	۱۰ درہم	اتولہ و ماشے ، رتی	۲۸/۷۵
۶۔ حضرت زینب	۴۰۰ "	۱۰۲ تولے ۱۱ ماشے	۱۰۹۳/۷۵
۷۔ حضرت ام حبیبہ	۴۰۰ دینار	۱۰۴ تولہ ۱ ماشہ سونا	۹۲۴۵۰/۰۰
۸۔ حضرت میمونہ	۴۰۰ درہم	۱۰۲ تولہ ۱۱ ماشہ	۱۰۹۳/۷۵
۹۔ حضرت جویریہ	۴۰۰ "	" "	۱۰۹۳/۷۵

اور آپ کی صاحبزادی حضرت فاطمہ زہرا کا مہر یہ ہے۔

حضرت فاطمہ	۴۰۰ مثقال چاندی	۱۰۴ تولہ ۲ ماشہ	۱۵۶۲/۵۰

صحتِ نکاح کی تیسری شرط

صحتِ نکاح کی تیسری شرط یہ بتائی ہے کہ عورت کو اپنے قبضہ میں رکھنا مقصود ہو۔ وقتی طور پر شہوت رانی کر کے ہیجانِ نفس کو تسکین دینا پیشِ نظر نہ ہو۔ اصل ارشاد میں محصنین غیر مسافحین کے الفاظ آئے ہیں۔

احصان کی شرط اس لیے لگائی ہے کہ نکاح اور سفاح میں حد فاصل قائم ہو جائے۔ نکاح کا اصل مقصد اسی وقت پورا ہوتا ہے جب اس کے ساتھ احصان پایا جائے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ احصان لغت میں روکنے اور محفوظ کرنے کو کہتے ہیں۔ محفوظ شہر کے لیے مدینہ حصینہ اور مضبوط زرہ کے لیے درع حصینہ بولا جاتا ہے حصان عفیف و پاکدامن عورت کو کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ ایک سے زیادہ معنے میں آیا ہے۔ ایک آزادی جیسے آئندہ آیت من لم یستطع منکم طولا ان ینکح المحصنات میں دوسرے عفاف و پاکدامنی جیسے اس آیت میں محصنات غیر مسافحات تیسرے مسلمان ہونے کے معنے میں جیسے آئندہ آیت فاذا احصن میں چوتھے شادی ہونے کے معنے میں جیسے پہلی آیت والمحصنات من النساء میں۔

اس آیت میں لفظ احصان عفاف اور پاکدامنی کے معنے میں ہے یعنی ایک مرد ایک عورت کو سنجیدہ ارادے اور زندگی بھر کی رفاقت کے عزم کے ساتھ اپنی حفاظت وحمایت میں لے اور عورت اسی شعور و ارادے کے ساتھ اس کے حصن حمایت میں داخل ہو۔ اس احصان کے بغیر عورت اور مرد کے تعلق سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جو اللہ سبحانہ اس سے پورا کرنا چاہتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے وقتی اور عارضی تعلق پیدا کرتا ہے تو گو اس کے لیے اس نے نکاح کی رسم بھی پوری کی ہو اور اس کو مال بھی دیا ہو لیکن یہ روح احصان کے خلاف ہے۔ قرآن نے احصان کی شرط لگا کر نکاح کے بنیادی اور اہم مقصد کو واضح کر دیا ہے کہ اسلامی قانون میں نکاح کا مقصد اخلاق کی حفاظت اور عفاف ہے۔ وہ زنا کو حرام قرار دیتا ہے اور نوع انسانی کی دونوں صنفوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے فطری تعلق کو ایک ایسے ضابطہ کا پابند بنا دیں جو اخلاق کو فحش اور بے حیائی سے اور تمدن کو فساد سے محفوظ رکھنے والا ہو۔ اسی لیے یہاں نکاح کو لفظ احصان سے تعبیر کیا ہے جو نکاح کرتا ہے وہ محصن ہے اور جس سے نکاح کیا جاتا ہے وہ محصنہ ہے اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت اس چیز کی ہے کہ مرد و عورت کے تعلق میں احصان یعنی اخلاق اور عفت و عصمت کا پورا پورا تحفظ ہو۔ یہ ایسا مقصد ہے جس کے لیے ہر چیز کو قربان کیا جا سکتا ہے مگر کسی دوسری چیز کے لیے اس کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔

مہر کی ادائیگی اور استمتاع

۷۴۔ پھر جن عورتوں سے تم نے ازدواجی زندگی کا فائدہ اٹھایا ہے تو تمہیں ان کے مہر کی رقم بطور فرض ادا کر دینی چاہیے۔ یعنی جس عورت سے نکاح کیا اور اس کے بعد شوہر نے اس سے کسی مدت معین قلیل یا طویل تک نفع بھی حاصل کر لیا کم سے کم یہ کہ ایک ہی دفعہ وطی یا خلوت صحیحہ کی نوبت آئی ہو تو اب

اس عورت کو پورا مہر دینا لازم ہے۔ بغیر عورت کے معاف کیے کسی طرح چھوٹ نہیں سکتا۔ البتہ جب تک عورت بالکل کام میں نہ آئے اور زوج طلاق دے دے تو مقررہ مہر کا آدھا دینا ہوگا اور اگر عورت نے انتفاع سے پہلے کوئی ایسی بات کی جس سے نکاح ٹوٹ گیا تو شوہر کے ذمہ سے سب مہر اتر جائے گا کچھ دینا نہ پڑیگا۔[1]

پہلی آیت میں نکاح اور شرائطِ نکاح بیان فرمائے تھے اب اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ تم نے جن عورتوں سے نکاح کر کے استمتاع کر لیا ہے تو ان کو پورا مہر دینا تم پر لازم ہو گیا ہے۔ آیت میں اجورھن کے بعد فریضۃ کا لفظ بھی بتانے کے لیے آیا ہے کہ نکاح کے بعد جب خلوت ہو جائے تو پورے مہر کی ادائیگی کرنی پڑے گی۔

اس آیت میں استمتاع سے کچھ لوگوں نے متعہ کا جواز نکالا ہے ضروری ہے کہ یہاں ہم اس موضوع کے مختلف پہلو ناظرینِ معالم القرآن کی ضیافتِ طبع کی خاطر پیش کریں۔ متعہ کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم جانیں۔

اوّلاً متعہ لغت اور اصطلاح میں کیا ہے!

ثانیاً، متعہ کے بارے قرآن کا نقطہ نظر کیا ہے!

ثالثاً، متعہ کے موضوع پر تاریخ عملِ اسلام میں کیا ہے؟

رابعاً، متعہ کے متعلق مجتہدین اور فقہا کیا کہتے ہیں؟

متعہ لغت اور اصطلاح میں

لفظ متعہ متع سے مشتق ہے اسی سے متاع ہے جس کے معنے تھوڑے فائدے کے ہیں اور طلاق والی عورت کو جو کپڑوں کا جوڑا دیا جاتا ہے اس کو بھی متعہ اس لیے کہتے ہیں کہ مہر کے مقابلے میں نفع قلیل ہے اسی سے استمتاع ہے اور اس کے معنے ایسا نفع اٹھانا جو طویل وقت کے لیے ہو، عام محاورے میں بولتے ہیں استمتع الرجل بولدہ آدمی نے اپنے بیٹے سے فائدہ اٹھایا اس لیے استمتاع کے معنے محض فائدہ اٹھانے کے ہیں نہ کہ تعلقات زناشوئی اور متعہ کے معنے اس طرح بتائے گئے ہیں کہ عورت سے فائدہ اٹھانا جسے تم اپنے لیے ہمیشہ رکھنا نہیں چاہتے ہو دیکھو لسان العرب یا جیسا کہ امام راغب نے لکھا ہے کہ ایک مرد ایک عورت سے شرط کر لیتا کہ مقرر مال کی مقدار اسے دے گا اور ایک وقت مقرر

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

تک اس سے فائدہ اٹھائے گا اور جب وہ مقررہ مدت گزر جاتی بغیر طلاق کے اس سے الگ ہوجاتا مطلب یہ ہے کہ لغت کے اعتبار سے کہ استمتاع عام ہے اور متعہ خاص ہے بڑے اور چھوٹے انسانوں کا ایک دوسرے سے فائدہ اٹھانا استمتاع ہے۔ قرآن میں یہ لفظ اسی معنے میں استعمال ہے ربنا استمتع بعضنا ببعض، متعہ میں معاملہ نکاح کے لفظوں سے نہیں بلکہ متعہ ہی کے الفاظ میں ہوتا ہے۔ اس کے برعکس نکاح موقت میں لفظ نکاح ہی استعمال ہوتا ہے لیکن وقت کی قید ہوتی ہے۔ متعہ اور نکاح موقت میں یہ فرق ابن ہمام نے بیان کیا ہے اور صاحب عنایہ کہتے ہیں کہ نکاح موقت گواہوں کی موجودگی میں مدت مقررہ کے لیے ہوتا ہے اور متعہ میں تمتع کے الفاظ بولے جاتے ہیں لیکن شیخ ابن الہمام کہتے ہیں کہ دونوں میں فرق یہ ہے کہ نکاح موقت میں لفظ نکاح اور متعہ میں لفظ تمتع ہوتا ہے۔ موقت میں گواہ ہوتے ہیں اور مدت مقرر ہوتی ہے اور متعہ میں گواہ نہیں ہوتے اور مدت مقرر ہوتی ہے۔

ائمہ اربعہ کے فقہی مدارس پر کام کرنے والوں نے متعہ کی تعریف بھی کی ہے۔ مالکیہ میں سے زرقانی نے نکاح بتعیین مدت کو اور باجی نے نکاح موقت کو متعہ کیا ہے اور اس کو مثال سے اس طرح سمجھایا ہے کہ مسافر شہر میں آئے اور کہے کہ میں واپسی تک تیرے سے شادی کرتا ہوں۔ حنابلہ میں ابن قدامہ کہتے ہیں کہ نکاح متعہ یہ ہے کہ مرد عورت سے وقت مقرر کے لیے شادی کرے مثلاً یوں کہے کہ میں نے اپنی لڑکی کی تیرے سے ایک ماہ کے لیے شادی کر دی۔

اہل تشیع نے متعہ کی حقیقت یہ بتائی ہے۔ تہذیب الاحکام کتاب النکاح باب متعہ میں ہے کہ متعہ میں نہ گواہوں کی ضرورت ہے اور نہ اعلان کی۔ اور اسی کتاب میں یہ بھی واضح کیا ہے کہ متعہ کی شرطوں میں مدت اور مہر کا مقرر ہونا ضروری ہے اور فروع جلد ۲ میں یہ بھی اضافہ ہے کہ ان شرطوں میں یہ بھی کہے کہ میں تجھ سے اتنے دنوں کے لیے اتنی رقم پر تیرے ساتھ متعہ کر رہا ہوں۔ اور تہذیب الاحکام کتاب اور فروع الکافی جلد ۲ شروط المتعہ میں متعہ کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ مرد عورت سے کہے کہ میں تیرے ساتھ متعہ کر رہا ہوں کتاب و سنت پر نکاح ہے زنا نہیں اس شرط پر کہ نہ تو میری موت کے بعد میری وارث ہے اور نہ میں تیرا اتنے دنوں کے لیے اتنی اجرت پر اور عدت تیرے لیے ضروری ہے نیز تہذیب الاحکام میں متعہ میں اجرت کی مقدار یہ بتائی ہے کہ ایک درہم اور اس سے کچھ زیادہ سے درست ہے بلکہ من لایحضرہ الفقیہ میں مٹھی بھر گندم کو بھی کافی قرار دیا گیا ہے۔

یہاں یہ حقیقت پیش نظر رہے کہ متعہ ایک لفظ مشترک ہے جسے بعض اوقات تو نکاح موقت کے معنوں میں بولا جاتا ہے جس میں نکاح کے تمام لوازم ہوتے ہیں جیسے گواہوں کا ہونا، اعلان عام،

مدت نکاح میں میاں بیوی میں سے ایک دوسرے کی وفات پر وراثت پانا وغیرہ ہاں مدت نکاح مقرر ہوتی ہے اور بعض اوقات یہی لفظ متعہ ایسے جنسی رابطہ کے لیے استعمال ہوتا ہے جس میں نہ گواہوں کی ضرورت ہوتی ہے نہ اعلان عام کی نہ سلسلہ وراثت اور نہ چار میں شمار ہونا وغیرہ۔

متعہ کے بارے میں قرآن کا نقطۂ نظر

قرآن حکیم کے منطوق، مدلول اور مفہوم سے یہ بات واضح طور پر ثابت ہو رہی ہے کہ متعہ قطعاً حرام ہے اس موضوع پر ایک آیت نہیں بلکہ کئی آیتیں ہیں۔

سب سے پہلے قرآن کی یہی آیت احل لکم ما وراء ذلکم ان تبتغوا باموالکم محصنین غیر مسافحین صاف اور صریح طور پر منطوقاً بتا رہی ہے کہ قرآن کے نزدیک متعہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ یہ آیت محرمات کے ذکر کے بعد آئی ہے اور اس میں بتایا ہے کہ ان محرمات کے سوا تمہارے لیے عورتیں حلال کی گئی ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ ان محرمات کے سوا عورتوں کے حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ اولاً یہ کہ حصول مال کے ذریعہ یعنی مہر کے ساتھ ہو، ثانیاً، ان عورتوں کو اپنی حمایت و حفاظت میں رکھنا ہو یعنی ایک عورت کا ایک سے زیادہ شوہر نہ ہو، ثالثاً یہ کہ صرف شہوت رانی مقصد نہ ہو بلکہ اولاد اور خانگی زندگی پیش نظر ہو۔ اور معلوم ہے کہ متعہ کا مقصد صرف شہوت رانی ہوتا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے ایک وقتی اور عارضی تعلق پیدا کرتا ہے تو یہ احصان نہیں بلکہ سفاح ہے۔ یہ محض پیشاب کرنے کے لیے ایک پیشاب خانہ کی تلاش ہے جس سے مقصد محض وقتی طور پر مثانہ کا بوجھ ہلکا کرنا ہے۔

قرآن نے اس آیت میں یہ دو شرطیں محصنین اور غیر مسافحین لگا کر متعہ کے اس مکروہ رواج کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا جو عرب جاہلیت میں رائج تھا اور اسی آیت کے بعد والی آیت میں عورتوں کے بارے میں یہ کہہ کر محصنات غیر مسافحات ولا متخذات اخدان۔ یعنی وہ عورتیں محصنہ ہوں اور بدکار نہ ہوں اور چوری چھپے یاری نہ ہو۔ عورتوں کے ساتھ ان چار شرطوں کے ساتھ صحبت حلال ہوتی ہے۔

قرآن کی دوسری آیت اسی سورت کے آغاز میں آئی ہے یعنی یہ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنی وثلاث ورباع وان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ او ما ملکت ایمانکم۔

یہ آیت ببانگ دہل کہہ رہی ہے کہ نکاح چار تک محدود ہے اور معلوم ہے کہ متعہ میں کوئی حد مقرر نہیں ہوتا۔ متعہ والی عورت نہ منکوحہ ہے اور نہ مملوکہ ہے۔ قرآن نے اباحت کو ان دو ہی میں

محدود کیا ہے۔ یعنی قرآن نے عورتوں کے حلال ہونے کی دو ہی صورتیں بتائی ہیں ایک یہ کہ نکاح کے ذریعے حلال ہوں دوسرے یہ کہ ملک یمین کے ذریعے حلال ہوں اور ان دونوں سے مقصود اولاد ہے کیونکہ عورتوں کو حرث کھیتی کہا ہے کھیت سے مطلوب پیداوار ہوتی ہے اور ظاہر ہے کہ اس کھیت کی پیداوار اولاد ہے۔ اور متعہ کا مقصد اولاد نہیں بلکہ وقتی طور پر شہوت رانی ہے۔ اگر شہوت رانی مقصد ہوتا تو اولاد کا ہونا نہ ہونا برابر ہوتا۔ اور اگر شہوت رانی ہی مقصد ہوتی تو عورت حاملہ من الغیر سے صحبت حرام نہ ہوتی۔ بہرحال نکاح ہو یا ملک یمین دونوں سے مقصود اولاد ہے۔ شہوت رانی مقصود نہیں۔ جیسے غذا کھانے سے بدل ما یتحلل مقصود ہوتا ہے اور بھوک محض ایک تقاضے کے درجہ میں ہے ایسے ہی عورتوں سے مقصود اولاد ہے اور شہوت تقاضائے جماع کے لیے ساتھ لگا دی گئی ہے بہرحال متعہ والی عورت نہ مملوکہ ہے اور نہ منکوحہ اور چونکہ دونوں میں سے کوئی نہیں اس لیے قرآن کے بتائے ہوئے ضابطہ حلت سے باہر ہے۔

قرآن میں تیسری آیت اٹھارویں پارے کے آغاز میں ہے :

والذین ھم لفروجھم حافظون الا علی ازواجھم او ما ملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین فمن ابتغی وراء ذالک فاولئک ھم العادون۔

اور وہ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ سوائے اپنی بیویوں کے اور ان عورتوں کے جو ان کی ملک میں ہیں۔ بس وہ ان کے بارے میں قابل ملامت نہیں ہیں البتہ جو اس کے علاوہ کچھ اور چاہتے ہیں وہ ہی زیادتی کرنے والے ہیں۔

اس آیت کے آخری فقرے نے مذکورہ بالا دو صورتوں یعنی منکوحہ اور مملوکہ کے سوا خواہش نفس پوری کرنے کی تمام دوسری صورتوں کو حرام کر دیا ہے خواہ وہ زنا ہو یا عمل قوم لوط یا وطی بہائم یا کچھ اور۔ ممتوعہ عورت نہ تو بیوی کے حکم میں داخل ہے اور نہ لونڈی کے حکم میں۔ لونڈی تو وہ ظاہر ہے کہ نہیں ہے اور بیوی اس لیے نہیں ہے کہ زوجیت کے لیے جتنے قانونی احکام ہیں ان میں سے کسی کا بھی اس پر اطلاق نہیں ہوتا نہ وہ مرد کی وارثہ ہوتی ہے نہ مرد اس کا وارث ہوتا ہے نہ اس کے لیے عدت ہے نہ طلاق نہ نفقہ، نہ ایلاء اور ظہار اور لعان وغیرہ بلکہ چار بیویوں کی مقررہ حد سے بھی مستثنیٰ ہے۔ لہٰذا جب وہ بیوی اور لونڈی دونوں کی تعریف میں نہیں آتی تو لامحالہ وہ ان کے علاوہ کچھ اور میں شمار ہوگی جس کے طالب کو قرآن حد سے گزرنے والا قرار دیتا

ہے۔ ان آیات

قرآن میں نہ صرف یہ کہ متعہ کے جواز کا کوئی اشارہ نہیں ہے بلکہ سچی بات یہ ہے کہ ان کا رخ اس کی حرمت کی طرف ہے۔ باقی رہا زیر تشریح آیت میں لفظ استمتاع سے استدلال تو بہت کمزور استدلال ہے۔ متعہ نہ اس کا منطوق ہے نہ مدلول اور نہ مفہوم۔ استمتاع عام ہے اس کے معنے متعہ کے لینا سنگین غلطی ہے۔ مشہور امام لغت زجاج کا قول لسان العرب میں منقول ہے کہ اس آیت کے معنے میں کچھ لوگوں نے بوجہ لغت سے بے خبری کے بڑی سخت غلطی کھائی ہے۔ الفاظِ قرآنی پر غور کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ قرآن نے قید لگادی ہے کہ تم اپنے مال عورتوں پر اس طرح خرچ کرو کہ ان کو قیدِ نکاح میں لانا مقصود ہو اور قیدِ نکاح جب ایک بار عائد ہو جاتی ہے تو اس سے زوجین کی زندگی میں نکلنے کی صورت سوائے طلاق کے اور کوئی قرآن نے نہیں بتائی ہے فما استمتعتم اسی پر تفریع ہے یعنی بطور نتیجہ آئی ہے کہ جب تم نے مقررہ مہر کے ساتھ ان سے نکاح کر لیا ہے تو اب چونکہ تم اس سے فائدہ اٹھا چکے ہو اس لیے ان کو پورا مہر ادا کرنا تمہارے ذمہ واجب ہے۔ قرآن نے آیت بالا میں تقسیم بتائی ہے کہ مرد و عورت کے تعلقات کی دو قسمیں ایک احصان دوسرے مسافحت محصنین غیر مسافحین احصان یعنی نکاح کے مقابلے میں مسافحت یعنی شہوت رانی ہے۔ متعہ کو ہمیں ان دونوں میں سے ایک میں شمار کرنا ہوگا۔ دونوں میں قدر مشترک مرد و عورت کا تعلق ہے۔ دونوں میں قرآن نے یہاں حد فاصل یہ بتائی ہے احصان میں تعلق ناپیدی ہوتا ہے مسافحت میں وقتی ہوتا ہے۔ احصان میں عورت کے مرد پر کچھ حقوق ہوتے ہیں۔ مسافحت میں نہیں ہوتے۔ احصان میں اولاد کی پرورش کا ذمہ دار باپ ہوتا ہے مسافحت میں نہیں۔ اس بنا پر متعہ صراحۃً مسافحت میں داخل ہے نہ کہ احصان میں۔ بہر حال یہ کہنا کہ یہ آیت قرآنی لفظِ استمتاع کی وجہ سے متعہ کے جواز کو بتا رہی ہے صراحۃً اور علانیہ غلط ہے کیونکہ اس آیت میں منھن کی ضمیر ان عورتوں کی طرف راجع ہے جن سے قرآن نے واحل لکم ما وراء ذالکم میں نکاح کو حلال قرار دیا اور جن کے بارے میں ارشاد ہوا ہے ان تبتغوا باموالکم تم ان کو اپنے مالوں کے بدلے حاصل کرو بشرطیکہ تم احصان کے طالب ہو بدکاری نہ کرنے والے ہو، اگر قرآن غیر مسافحین کی صراحت کر رہا ہے تو پھر متعہ کی گنجائش کہاں ہے۔ نکاح اور سفاح میں یہی فرق ہے کہ نکاح سے مقصود نسل ہوتا ہے اور زنا کا مقصد محض شہوت رانی ہوتا ہے۔ اس لحاظ سے زنا اور متعہ میں کوئی فرق نہیں کیونکہ اولاد نہ زنا سے مقصود ہوتی ہے اور نہ متعہ سے۔ دونوں کا مقصد شہوت رانی ہے۔ اسی بنا پر متعہ کا دوسرا نام عاریۃ الفرج ہے جیسا کہ استبصار میں بتایا ہے:

میں نے ابوعبداللہ سے دریافت کیا کہ مانگی ہوئی شرمگاہ یعنی عاریۃ الفرج کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ انہوں نے بتایا کہ کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ (استبصار ص ۲۵، ۵)

قرآن نے غیر مسافحین کہہ کر دونوں سے منع کر دیا ہے۔ اور پھر اس پر بھی تو غور فرمائیے کہ فما استمتعتم کو گزشتہ آیت سے صرف فا کے ذریعے مربوط کیا گیا ہے یعنی اس میں کوئی نیا حکم نہیں دیا جا رہا ہے بلکہ پہلے ہی حکم کا نتیجہ بتایا جا رہا ہے۔ اگر یہ مستقل حکم ہوتا تو فا کی جگہ واو لاتے۔ اس لیے اس فقرے میں نکاح صحیح کے ذریعے استمتاع اور انتفاع مراد ہے۔ متعہ والے استمتاع اور انتفاع کا یہاں کوئی دور کا بھی اشارا نہیں ہے۔ اگر اس فقرے میں متعہ مراد ہو تو اول کلام اور آخر کلام میں تعارض ہو جائے گا۔ کیونکہ آیت کے پہلے حصے میں تو نکاح اور شرائط نکاح کا ذکر ہو اور آخر میں بلاشرط عورتوں سے نفسانی اور شہوانی انتفاع کی اجازت ہو تعالی کلام اللہ عن ذالک علواً کبیراً۔

متعہ تاریخِ احکام کی روشنی میں

جیسا کہ پہلے بتا آیا ہوں کہ متعہ دو معنے میں بولا جاتا ہے ورنہ تاریخ میں صرف ایک معنے میں بولا گیا ہے اور وہ یہ کہ ایک مدت مقررہ کے لیے گواہوں کی موجودگی میں ولی کی اجازت سے مہر معین کر کے نکاح کیا جائے۔ مقررہ مدت گزرنے پر خود بخود جدائی واقع ہو جائے اور جدائی کے بعد استبراء رحم کے لیے ایک بار ایام ماہواری کا انتظار کرے تاکہ اختلاط نہ ہو۔ یہ صورت شادی اسلام سے پہلے عرب میں رائج تھی اسلام آنے کے بعد ایک عرصہ تک جائز رہی۔ اسی کو متعہ کہتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ابتداء اسلام میں نکاح متعہ کی رخصت تھی بشرطیکہ ضرورت شدیدہ ہو جیسے مردار اور سور کا گوشت کھانے کی جان بچانے کے لیے رخصت ہے۔ اسی طرح اضطرار کی حالت متعہ کی بھی رخصت تھی۔ حضرت ابن ابی عمرہ سے صحیح مسلم میں مروی ہے۔ فرماتے ہیں کہ ابتداء اسلام میں اضطرار کی حالت میں متعہ کی رخصت تھی جیسے مردار، دم اور سور کے گوشت کی رخصت ہے لیکن جب بعد میں اللہ سبحانہ نے دین کو مستحکم کر دیا تو اس سے بھی منع کر دیا اور صحیحین میں حضرت عبداللہ بن مسعود سے مروی ہے کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ کے ساتھ غزوات میں ہوتے تھے اور جوان تھے۔ ہمارے ساتھ عورتیں نہ تھیں۔ ایک دفعہ ہم لوگوں نے رسول اللہ سے کہا کہ اجازت ہو تو ہم لوگ خصی ہو جائیں حضور نے منع فرمایا اور رخصت دی کہ کپڑا دے کر ایک مدت کے لیے نکاح کر لیں۔

مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ اور سلمۃ ابن الاکوع سے بھی رخصت مروی ہے گو اس میں یہ

تشریح نہیں ہے کہ یہ رخصت کس حالت میں تھی مگر ظاہر ہے کہ وہ بھی ضرورت پر محمول ہوگی مگر اس کے بعد یہ رخصت ممنوع ہوگئی۔ اس پر تمام اہل اسلام کا اتفاق ہے سوائے حضرت ابن عباس کہ وہ اضطرار کی حالت میں جواز کا فتویٰ دیتے تھے مگر بعد میں انہوں نے بھی رجوع کرلیا اور سب کی طرح حرام کہنے لگے۔

متعہ کب حرام ہوا؟

اس میں اختلاف ہے کہ متعہ کب حرام ہوا کچھ کہتے ہیں کہ غزوۂ خیبر میں کچھ کی رائے ہے کہ عمرۃ القضاء میں بعض کہتے ہیں کہ فتح مکہ میں اور کچھ کا خیال ہے کہ غزوۂ اوطاس میں اور کچھ کہتے ہیں کہ حجۃ الوداع میں۔ ان میں غزوۂ اوطاس اور فتح مکہ تو ایک ہی زمانہ ہے، حجۃ الوداع اور عمرۃ القضاء میں ممانعت کا مطلب یہ ہے کہ گزشتہ ممانعت کی تاکید اور اعلان ہوا اس لئے اصل اختلاف تو صرف خیبر اور فتح مکہ میں ہے۔ خیبر کے موضوع پر صحیحین میں حضرت علی سے مروی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے نکاح متعہ سے اور اہلی گدھوں کے گوشت سے خیبر میں منع فرمایا۔ یہ حدیث متعدد طریقوں سے مروی ہے لیکن مسلم ہی میں یہ روایت بھی موجود ہے کہ فتح مکہ کے وقت مکہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کی اجازت دی اور تین روز کے بعد منع فرمایا۔ سوال یہ ہے کہ اگر خیبر میں حرام ہوا تھا تو یہ اجازت کیسی تھی؟

خیبر کی ممانعت اور پھر فتح مکہ کے وقت اجازت اور ممانعت اس کی تطبیق میں علماء کی رائے مختلف ہے۔ مازری اور قاضی عیاض کہتے ہیں کہ متعہ خیبر میں حرام ہوا۔ حضرت علی کی روایت ثقات اور مستند لوگوں سے مروی ہے اور عمرۃ القضاء فتح مکہ یا اوطاس میں جو ممانعت آئی ہے وہ خیبر کی ممانعت کی تاکید ہے مگر امام نووی کہتے ہیں کہ یہ رائے ان تمام بیانات کے خلاف ہے جن میں فتح مکہ کے وقت اجازت دینا مذکور ہے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ بعض علماء کہتے ہیں کہ حضرت علی کی روایت میں حرمت متعہ کا وقت نہیں بتایا گیا بلکہ مطلق رکھا گیا ہے اور وقت صرف اہلی گدھوں کی حرمت کا بتایا گیا۔ متعہ فتح مکہ کے وقت حرام ہوا، خیبر میں حرام نہیں ہوا تھا۔ ابن قیم بھی کہتے ہیں کہ یہی صحیح ہے اور اس پر انہوں نے بڑی بسیط تقریر کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضرت علی کی روایت صحیحین میں بھی ہے اور مسند امام احمد میں بھی ہے صحیحین کے الفاظ سے یہ وہم ہوتا ہے کہ متعہ کی حرمت کا زمانہ خیبر ہے مگر مسند کی روایت کے الفاظ صاف ہیں کہ گدھوں کا گوشت خیبر میں منع ہوا۔ اور متعہ کی حرمت کے وقت میں اطلاق ہے اس کا زمانہ نہیں بتایا گیا لہٰذا متعہ خیبر میں نہیں بلکہ پہلے پہلے فتح مکہ کے وقت حرام ہوا مگر اس تاویل میں صحیحین کی روایت کو ترک کرنا یا اس کے مفہوم صریح کو ترک کرنا پڑتا ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ متعہ پہلے مباح تھا خیبر میں حرام ہوا پھر فتح مکہ کے وقت مباح ہو گیا اور تین روز کے بعد پھر حرام ہو گیا یعنی اباحت اور حرمت دونوں مکرر ہوئیں۔

امام نووی کہتے ہیں کہ یہی مختار اور صحیح ہے مگر امام شافعی خود فرماتے ہیں کہ اس کی نظیر شریعت میں نہیں پائی جاتی۔ جو چیز عندالشرع علی الاطلاق مذموم ٹھہر گئی اور حرام ہونا اس کا بیان کر دیا گیا وہ پھر کیونکر مباح ہو سکتی ہے! یا اباحت کسی ضرورت کی وجہ سے ہو گی تو ایسی ضرورت کے وقت، ہمیشہ اس کی اباحت قائم رہنی چاہیے۔ لہٰذا وہ فعل علی الاطلاق حرام نہ ہو گا۔ حالانکہ خود امام شافعی اور دوسرے تمام علماء یہی کہتے ہیں کہ فتح مکہ کے بعد اب کسی ضرورت سے متعہ مباح نہیں ہو سکتا۔ تمام شبہات اس وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں کہ خیبر کے امتناع کو حرمت شرعی پر محمول کیا جا رہا ہے حالانکہ حضرت علی کی روایت میں کوئی لفظ ایسا نہیں ہے جس سے حرمت کا مفہوم متعین ہو۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ حضور نے خیبر میں متعہ سے منع کیا لیکن کسی روایت سے پتہ نہیں ملتا کہ یہ امتناع حرمت کی وجہ سے تھا یا مصلحت کی وجہ سے۔ ابن ابی عمرہ کی روایت صریح ہے کہ ابتداء اسلام میں جب رخصت تھی تو وہ بھی رخصتِ عام نہ تھی بلکہ اضطرار کی حالت میں رخصت تھی لہٰذا بلا اضطرار تو اس وقت بھی منع ہی تھا البتہ حضرت علی نے حضرت ابن عباس کے خلاف استدلالاً فرمایا کہ حضور نے خیبر میں متعہ سے منع فرمایا۔ اس سے یہ بے شک معلوم ہوا کہ حضرت علی فتح مکہ سے قبل اس کو منع سمجھتے تھے مگر منع ہمیشہ حرمت ہی کے لیے نہیں ہوتا۔ حضرت ابن عباس جواز کا فتویٰ دیتے تھے جیسا کہ حضرت عروہ بن زبیر کی روایت سے جو صحیح مسلم میں ہے ثابت ہوتا ہے۔ حضرت علی اس کو منع فرماتے تھے لیکن فتح مکہ کے روز حضور نے صاف طور سے متعہ کا حرام مؤبد ہونا بیان کر دیا چنانچہ مسلم میں وہی سبرہ بن معبد کی روایت ہے کہ حضور نے فرمایا یا ایھا الناس انی قد کنت اذنت لکم فی الاستمتاع من النساء وان اللہ قد حرم ذالک الی یوم القیٰمۃ۔

اے لوگو! میں نے تمہیں عورتوں سے متعہ کرنے کی اجازت دی تھی اور البتہ خدا نے اس کو قیامت تک کے لیے حرام کر دیا ہے۔

اس سے معلوم ہو گیا کہ اس سے پہلے آپ کو خدا کی طرف سے کوئی حکم نہ ملا تھا۔ خیبر کا امتناع بحکمِ خداوندی نہ تھا بلکہ خود حضور نے اس فعل کو مکروہ سمجھ کر منع کیا تھا۔ اور ضرورت کے وقت خود اجازت دی تھی۔ فتح مکہ کے وقت جب خدا کا حکم آ گیا تو آپ نے متعہ کا منجانب اللہ حرام ہونا بیان کر دیا۔ لہٰذا عمرۃ القضاۃ میں جو امتناع مروی ہے وہ پہلی قسم کے امتناع پر محمول ہو گا اور حجۃ الوداع میں جو امتناع مروی ہے وہ حرمت کا اعلان اور تاکید ہے واللہ اعلم۔

درحقیقت ابتدائے اسلام میں حلال وحرام کے بہت سے احکام بتدریج آتے اور خاص کر ان چیزوں کے بارے میں قانون آہستہ آہستہ اترا جو سوسائٹی کے رگ و ریشہ میں اتری ہوئی تھیں جیسے شراب اور سُود کی حرمت کا حکم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے پندرہ بیس سال کے بعد نازل ہوا۔ ٹھیک اسی طرح متعہ کے بارے میں حکم خداوندی کے نازل ہونے سے زمانۂ جاہلیت کے رسم ورواج کے مطابق لوگ متعہ کیا کرتے تھے اور اب تک اس بارے میں صریح اور واضح حکم نازل نہ ہوا تھا۔ سب سے پہلے خیبر کی لڑائی میں جو ہجرت کا ساتواں سال تھا حضور پر نورؐ نے متعہ اور لحوم حمر اہلیہ کی حرمت کا اعلان فرمایا جیسا کہ حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ سے باسانید صحیحہ مروی ہے۔

بعدازیں ۸ھ کے آخر میں جنگ اوطاس کا واقعہ پیش آیا۔ اس میں صرف تین روز کے لیے متعہ کی اجازت ہوئی اور اباحت کے معنے یہ ہیں کہ جن لوگوں نے حسب سابق متعہ ان کو خیبر کی ممانعت کا علم نہ تھا اس بے خبری میں جو متعہ ہوا اس پر کوئی قانونی کارروائی نہیں کی گئی لیکن اس کے بعد جب حضور عمرۃ القضائے کے لیے مکہ معظمہ تشریف لائے تو خانہ کعبہ کے دونوں بازو پکڑ کر فرمایا کہ متعہ قیامت تک کے لیے حرام کیا گیا ہے۔ فتح مکہ کے بعد چونکہ ہزاروں آدمی دائرہ اسلام میں داخل ہوئے۔ ان نومسلموں کو چونکہ متعہ کی حرمت کا علم نہ تھا اس لیے ناواقفیت کی وجہ سے رسم جاہلیت کے مطابق انہوں نے مقام اوطاس میں متعہ کر لیا۔ حضور انور کو علم ہوا تو آپ نے باب کعبہ پر کھڑے ہو کر متعہ کی دائمی حرمت کا اعلان کیا۔

غزوۂ تبوک میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ عورتوں کو مسلمانوں کے خیمہ کے قریب دیکھ کر دریافت فرمایا کہ یہ کون ہیں۔ عرض کیا گیا کہ ان عورتوں سے کچھ لوگوں نے متعہ کیا ہے۔ حضور انور یہ سن کر سخت ناراض ہوئے اور غصہ کی وجہ سے چہرہ مبارک سُرخ ہو گیا اور تقریر کے لیے کھڑے ہو گئے۔ اللہ کی حمد وثنا کی اور اس کے بعد متعہ سے منع فرمایا۔ صحابہ کہتے ہیں کہ ہم نے اس کے بعد کبھی متعہ نہیں کیا اور ہمیشہ کے لیے ہم نے یہ ارادہ کر لیا کہ کبھی متعہ نہ کریں گے[1] آپ کی ناراضگی اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ متعہ پہلے حرام ہو چکا ہے بلکہ اس کی حرمت سے لوگوں کو دو بار مطلع کر چکے ہیں۔ پہلی بار خیبر میں دوسری بار اوطاس میں اور تیسری بار اس کی حرمت کا تاکیدی اعلان کیا۔ اس کے بعد حجۃ الوداع میں چونکہ مجمع صحابہ موجود تھا اعلان عام فرمایا تاکہ حرمت کا اعلان سب تک پہنچ جائے۔

---

[1] الاعتبار للحازمی

شیعی متعہ کا تصور اور اس کا پس منظر

عرب میں اصل رائج شدہ متعہ کی حد تک آپ کے سامنے بات واضح ہو کر سامنے آ چکی ہے آئیے اب اس متعہ پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے جس کے ہمارے دوست اہل تشیع قائل ہیں اور جسے ایران میں صیغہ کہا جاتا ہے۔

ایسا جنسی رابطہ مرد و عورت کے درمیان جس میں نہ گواہ ہوں نہ اعلان عام ہو نہ وراثت ہو اور نہ چار میں اس کا شمار ہو۔ صرف کچھ دے کر کچھ وقت کے لیے یہ کہہ کر کرتو اتنے میں اتنے وقت کے لیے میرے سے شادی کرلے۔ مثلاً یوں کہے کہ میں تیرے سے دو روز کے لیے منتفع ہوں گا اور تجھے اس کی چار روپیہ اجرت دوں گا۔ یہ چار روپیہ بطور مثال ہیں ورنہ کتاب بحضرہ الفقیہ میں امام ابوعبداللہ کے حوالہ سے کہ دو لپ گندم پر بھی متعہ ہو سکتا ہے۔

اس متعہ کا پس منظر یہ ہے کہ یہ ایرانی سوسائٹی کا عمل ہے جس کو عبادت متعہ کہا جاتا ہے اور جس کے فضائل بیان کیے جاتے ہیں اس کی اصل عرب میں نہیں بلکہ اسلام سے پہلے کے ایران کے ساسانی نظام معاشرت سے لی گئی ہے وہاں شادیاں دو قسم کی ہوتی تھیں۔ ایک مستقل اور ایک عارضی۔ مستقل شادی کے لیے میاں بیوی کے لیے پہلوی زبان میں شو اور زن کے الفاظ استعمال ہوتے تھے لیکن عارضی شادی کی صورت میں شوہر اور بیوی کے لیے میرک اور زیانگ کی قانونی اصطلاحات تھیں۔

(قانون ساسانی جلد ا ص ۳۶)

اس عارضی شادی کے لیے نہ گواہوں کا کہیں ثبوت ملتا ہے اور نہ اس میں عورت کے وارثوں کی اطلاع یا رضا ضروری تھی۔ اس میں نہ وراثت چلتی تھی، نہ طلاق ہوتی تھی اور نہ ہی ازدواج کی اولاد اپنے اصل باپ کی طرف منسوب ہوتی تھی۔ (قانون ساسانی ج ا ص ۳۹)

ایرانیوں نے مسلمان ہونے کے بعد اسی غیر انسانی رسم کو متعہ کا نام دے کر اپنی ضرورت پوری کر لی۔ نہ متعہ والی عورت کو ان چار میں شمار کیا۔ جن کی قرآن نے اجازت دی ہے چنانچہ محمد بن یعقوب الکلینی رازی لکھتے ہیں کہ:

بکر بن محمد ازدی نے کہا کہ میں نے ابوالحسن سے متعہ کے بارے میں دریافت کیا کہ متعہ والی عورت ان چار میں شمار ہوگی جو نکاح کے لیے قرآن نے حد بتائی ہے فرمایا کہ بالکل نہیں [1]

---

[1] فروع الکافی کتاب النکاح

بلکہ اس کے ساتھ یوں لکھا ہے کہ:

زرارہ بن اعین نے دریافت کیا کہ متعہ کرنے کے لیے عورتوں کی حد کیا ہے؟ فرمایا جتنی چاہو کر لو۔[1]

بلکہ اس سے بھی آگے ایک قدم اور بڑھا کر لکھا ہے کہ:

ابو عبداللہ نے دریافت کیا کہ کیا متوعہ ان چار میں سے ہے جن سے نکاح کی قرآن نے اجازت دی ہے فرمایا نہیں بلکہ ستر سے بھی نہیں ہے۔[2]

اور نہ متعہ والی عورت کے لیے وراثت کی قید ہے چنانچہ شیخ طوسی فرماتے ہیں کہ:

امام ابو جعفر فرماتے ہیں کہ متعہ والی نہ خود وارث ہوتی ہے اور نہ اس کا کوئی وارث ہوتا ہے وہ تو کرائے پر لی ہوئی ہے۔[3]

اور ابو جعفر الصدوق القمی فرماتے ہیں:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ لوگو اللہ تعالیٰ نے تین طرح کی شرمگاہیں تمہارے لیے حلال کی ہیں، وہ شرمگاہ جو وارث کی حقدار ہو یہ تو نکاح ہے، دوسری وہ شرمگاہ جو وراثت کی حقدار نہ ہو یہ متعہ ہے اور تیسری وہ جو ملک یمین کے ذریعے حاصل ہو۔[4]

اور نہ متعہ والی عورت کے لیے طلاق کی ضرورت ہے محض مقررہ مدت ختم ہونے سے نکاح خود بخود ختم ہو جاتا ہے۔ چنانچہ شیخ ابو جعفر محمد بن الحسن طوسی فرماتے ہیں:

محمد بن اسماعیل کہتے ہیں کہ میں نے ابو الحسن سے دریافت کیا کہ متعہ ایک سال کے لیے ہو یا اس سے کم زیادہ فرمایا اجرت بھی مقرر ہو اور مدت بھی مقرر ہو۔ میں نے دریافت کیا کہ کیا بغیر طلاق کے جدا ہو جائے گی فرمایا ہاں۔[5]

اور نہ متعہ والی عورت کے لیے گواہ اور ولی کی ضرورت ہے۔ چنانچہ محمد بن یعقوب کلینی فرماتے ہیں:

عبدالملک بن جریج کہتے ہیں کہ چار بیویوں والا جس قدر عورتوں سے چاہے متعہ کرے اس کے لیے ولی اور گواہوں کی ضرورت نہیں ہے۔[6]

اور نہ ہی اس کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے بلکہ مجوسی عورت سے بھی یہ تعلق پیدا کیا جا سکتا ہے چنانچہ شیخ الطائفہ ابو جعفر محمد بن الحسن الطوسی فرماتے ہیں:

---

[1]،[2] فروع الکافی کتاب النکاح، [3] الاستبصار [4] من لا یحضرہ الفقیہ [5] الاستبصار ج ۲۔ [6] فروع کافی ج ۲۔

ابو عبداللہ فرماتے ہیں کہ مجوسیہ سے متعہ کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے [1]

بلکہ متعہ کرنے کے لیے یہ تحقیق کرنے کی بھی ضرورت نہیں ہے کہ شادی شدہ ہے یا غیر شادی شدہ، چنانچہ شیخ طوسی فرماتے ہیں،

محمد بن راشد کہتے ہیں کہ میں نے ابو عبداللہ سے کہا کہ میں نے ایک عورت سے متعہ کیا تھا میرے جی میں آیا کہ وہ شاید شادی شدہ ہے تحقیق کی تو معلوم ہوا کہ وہ شادی شدہ ہے ابو عبداللہ نے کہا کہ تو نے تحقیق ہی کیوں کی؟ [2]

ایک دوسری روایت میں ہے کہ

ابو عبداللہ سے کہا گیا کہ فلاں شخص نے ایک عورت سے متعہ کیا اس سے کہا گیا کہ اس کی تو شادی ہو چکی ہے اس نے دریافت کیا، ابو عبداللہ نے کہا اس نے دریافت ہی کیوں کیا ہے۔ [3]

کہیں متعہ والی عورت کو مستاجرہ یعنی کرائے پر لی ہوئی کہا ہے اور کہیں اسے عاریۃ الفرج مانگی ہوئی شرمگاہ بتایا ہے۔ عاریۃ الفرج کی اصل بھی مجوسی نظام معاشرت سے لی گئی ہے۔ ڈنمارک کی کوپن ہاگن یونیورسٹی کے پروفیسر ساسانی نظام معاشرت کے بارے میں لکھتا ہے،

شوہر کو مجاز تھا کہ اپنی بیوی یا بیویوں میں سے ایک کو خواہ وہ بیاہتا بیوی کیوں نہ ہو کسی دوسرے کو جو انقلاب روزگار سے محتاج ہو گیا ہو اس غرض کے لیے دے دے کہ وہ اس سے کسب معاش کے کام میں مدد لے سکے۔ اس عارضی تعلق سے جو اولاد پیدا ہوتی تھی وہ پہلے شوہر ہی کی سمجھی جاتی تھی [4]

اسی مجوسی رسم نے روایات میں وہ صورت اختیار کر لی جسے عاریۃ الفرج کہتے ہیں۔

بہر حال خلاصہ کلام یہ ہے کہ ایرانی سوسائٹی کے جس عمل کو آج متعہ کہا جاتا ہے اور کتب شیعہ میں جس کے فضائل بیان کیے گئے ہیں اس کی اصل اسلام سے پہلے کا مجوسی نظام معاشرت ہے۔ اسلام سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ متعہ کبھی بھی اسلامی تاریخ میں جائز نہیں ہوا اور نہ ہی اسلام کا نظام اخلاق اس جیسے حیا سوز فعل کی ایک لمحہ کے لیے بھی اجازت دے سکتا ہے۔

اسلامی تاریخ میں جس متعہ کا ذکر ہے وہ ایرانی متعہ نہیں جس کی حقیقت سے آپ ابھی ابھی روشناس ہو

---

[1] تہذیب الاحکام ج، [2]، [3] تہذیب الاحکام ج، [4] ایران بعہد ساسانیاں مقدمہ تحقیق متعہ ص ۱۰

چکے ہیں۔ اس متعہ کے جواز کا تصور بھی اسلام کے چہرۂ اخلاق پر ایک بدنما دھبہ ہے۔ اسلامی تاریخ میں جو متعہ جائز تھا اور بعد میں جو حرام ہوگیا ۔ وہ ایرانی نہیں بلکہ وہ متعہ تھا جس میں نکاح کے باقی سب وہی قوانین ہیں جو اصلی نکاح دوامی میں ہوتے ہیں جیسے گواہوں کی موجودگی، اعلانِ عام، مدتِ نکاح میں میاں بیوی کی وفات پر ایک دوسرے کی میراث پانا، ہاں صرف مدتِ نکاح متعین ہوتی ہے اور اسی کو نکاح موقت کہتے ہیں لیکن اسلام کے نظامِ حیاد اخلاق نے اسے بھی گوارا نہیں کیا اور اس کو بھی ہمیشہ کے لیے حرام کر دیا ہے۔

سیدنا علی مرتضیٰ فرماتے ہیں کہ:

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے دن گھریلو گدھوں اور نکاحِ متعہ کو حرام قرار دیا ہے۔

یہ حدیث صرف صحیحین ہی میں نہیں ہے بلکہ صاحب تہذیب الاحکام نے بھی اسے روایت کیا ہے اور اس بیان کو یہ کہہ کر طرح دے گئے کہ ان ھذہ الروایۃ وردت مورد التقیہ یہ بات آنحضرت نے بطور تقیہ کے فرمائی ہے ۔ (تہذیب الاحکام ص ۲۵۱) علامہ طوسی نے یہ توجیہہ کرتے ہوئے اس پر غور نہیں فرمایا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تقیہ کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ یہ تو دلیل ہی تصرف ہے اور مدلول کا یہ کہہ کر منہ بگاڑا ہے کہ حدیث میں جس متعہ کا ذکر ہے اس سے نکاح موقت مراد نہیں بلکہ اس سے ایرانی سوسائٹی کا متعہ مراد ہے حالانکہ جس متعہ کو حدیث میں حرام کیا گیا ہے اس سے یہ متعہ نہیں بلکہ وہ متعہ مراد ہے جو عرب سوسائٹی میں رائج تھا کہ کسی عورت سے مدتِ متعینہ کے لیے نکاح کر لیتے تھے۔ اس مدت کے گزر جانے کے بعد اس کی اجرت دے کر الگ کر دیتے تھے۔ اس میں وہ تمام شرائط موجود ہوتیں جو نکاح حقیقی میں پائی جاتی ہیں۔ اسلام نے اس کو شروع میں جائز رکھا لیکن اسے اسلامی نظامِ معاشرت کے منافی سمجھتے ہوئے صاف صاف لفظوں میں حرام قرار دیا۔ بہرحال شیعہ حضرات نے متعہ کو عبادت قرار دینے کا جو مسلک اختیار کیا اس کے لیے کتاب و سنت میں سرے سے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ صدرِ اول میں صحابہ اور تابعین اور فقہاء میں سے چند بزرگ جس متعہ کے جواز کے قائل ہیں اوّل تو اس سے یہ ایرانی متعہ مراد نہیں بلکہ وہ عربی متعہ مراد ہے جسے نکاح موقت کہتے ہیں دوسرے یہ کہ وہ اس عربی متعہ کو بھی صرف اضطرار اور شدید ضرورت کی حالت میں جائز رکھتے تھے ان میں سے کوئی بھی اسے نکاح کی طرح مباح مطلق اور عام حالات میں معمول بنا لینے کا قائل نہ تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباس کا مسلک

عبداللہ بن عباس جن کا نام قائلین جواز میں سب سے نمایاں کر کے پیش کیا جاتا ہے انہوں نے اپنے مسلک

کی توضیح خود ان الفاظ میں کی کہ ما ھی الا کالمیتۃ لا تحل الا للمضطر (یہ تو مردار کی طرح ہے کہ مضطر کے سوا کسی کے لیے حلال نہیں ہے) نہ یہ کہ شیعہ مصنفین کی تصریح کے مطابق یہ عابدانہ زندگی کا بہت بڑا کارنامہ ہے اور بہت بڑی بزرگی اور فضیلت والا کام ہے۔ اور عبداللہ بن عباس نے اس فتویٰ سے بھی اس وقت رجوع کر لیا جب انہوں نے دیکھا کہ لوگ اباحت کی گنجائش سے ناجائز فائدہ اٹھا کر آزادانہ متعہ کرنے لگے ہیں اور ضرورت تک اسے موقوف نہیں رکھتے۔ دراصل عبداللہ ابن عباس کی پیدائش ہجرت سے ایک یا دو سال پہلے ہوئی۔ اور آٹھ نو برس کی عمر تک اپنے والدین کے ساتھ مکہ میں رہے۔ فتح مکہ کے بعد سنہ ھ میں جب حضرت عباس نے اپنے خاندان کے ساتھ ہجرت کی تو حضرت عبداللہ بن عباس بھی مدینہ منورہ تشریف لائے اور غزوۂ خیبر آپ کی تشریف آوری سے پہلے ہو چکا تھا اس لیے حضرت ابن عباس کو بذات خود متعہ کے متعلق کوئی علم نہیں ہوا۔ صرف دوسرے صحابہ کی زبانی سنا اور اس بنا پر یہ فتویٰ دیا کہ مجبوری کی حالت میں جیسے مردار اور خنزیر حلال ہو جاتا ہے ایسے ہی مجبوری کی حالت میں متعہ بھی جائز ہے لیکن بعد میں جب حضرت علی نے اور دیگر صحابہ نے متعہ کے بارے میں حرمت سے مطلع کیا تو ابن عباس نے اس سے رجوع کر لیا۔

اس سوال کو اگر نظرانداز بھی کر دیا جائے کہ ابن عباس اور ان کے ہم خیال چند گنے چنے اصحاب نے اس مسلک سے رجوع کر لیا تھا یا نہیں تو ان کا مسلک زیادہ سے زیادہ جواز بحالت اضطرار ہو سکتا ہے۔ مطلق اباحت بلاضرورت تمتع حتیٰ کہ منکوحہ بیویوں کی موجودگی میں بھی ممنوعات سے استفادہ کرنا تو ایک ایسی آزادی ہے جسے ذوق سلیم بھی گوارا نہیں کر سکتا کجا کہ اسے شریعت محمدیہ کی طرف منسوب کیا جائے اور ائمہ اہل بیت کو اس سے متہم کیا جائے۔ خود شیعہ حضرات میں بھی کچھ دوستوں نے متعہ کی شناعت سے گھبرا کر متعہ کو زنا سے تعبیر کیا ہے اگرچہ مولوی محمد حسین نے اس کا جواب بھی دیا ہے۔ ہمارے پیش نظر المبلغ سرگودھا ستمبر سنہ ۶۲ء کا شمارہ ہے اس کے باب الاستفسارات میں یہ پوری تفصیل درج ہے۔

متعہ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ

متعہ کی حرمت خود قرآن کے اشارات اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تصریحات سے ثابت ہے لہٰذا یہ کہنا کہ اسے حضرت عمر نے حرام کیا درست نہیں ہے حضرت عمر اس حکم کے موجد نہیں تھے بلکہ صرف اسے نافذ کرنے والے تھے۔ چونکہ یہ حکم حضور نے آخر زمانے میں دیا تھا اور عام لوگوں تک نہ پہنچا تھا اس لیے حضرت عمر نے اس کی اشاعت عام کی اور بذریعہ قانون اسے نافذ کیا۔ حضرت جابر بن عبداللہ

سے صحیح مسلم میں روایت ہے فرماتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور حضرت صدیق کے عہد میں ایک مٹھی کھجور یا ایک مٹھی ستو پر متعہ کیا کرتے تھے حتیٰ کہ عمر بن الخطاب نے عمرو بن الحرث کے واقعہ کے بعد بالکل منع کر دیا۔ ایک اور حدیث بعض لوگوں نے حضرت عمر سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ کے زمانے میں دو متعے تھے۔ ایک متعہ النسا اور دوسرا متعہ الحج ہم دونوں سے منع کرتے ہیں اگر یہ صحیح ہے تو ظاہر ہے کہ حضرت عمر کے امتناع کو تحریم پر محمول نہیں کر سکتے ان میں سے کوئی بھی اس کے منافی نہیں ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فتح مکہ کے وقت فرمایا تھا کہ آج سے اللہ سبحانہ نے متعہ کو قیامت تک کے لیے حرام قرار دے دیا۔ جن لوگوں نے اس کے بعد بھی متعہ کیا بلاشبہ ان کو فتح مکہ کے اس امتناع کا علم نہ ہوا ہوگا ورنہ وہ اس کے بعد ہرگز ایسا نہ کرتے۔ امام نووی لکھتے ہیں کہ حضرت جابر نے یہ اس لیے کہا کہ ان کو حضور کے منع کرنے کا علم نہ ہوا تھا۔ حضور کو حجۃ الوداع میں اسی لیے اعلان کی ضرورت پیش آئی کہ بہتوں کو اس کی خبر نہ ہوتی تھی کہ متعہ حرام ہو گیا ہے۔ حضرت ابوبکر یا حضرت عمر کے وقت میں کچھ لوگ اسی دلیل سے متعہ کرتے تھے کہ ہم لوگوں نے رسول اللہ کے زمانے میں کیا ہے۔ حضرت عمر نے زجرا ایسے لوگوں سے کہا کہ ہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت میں لوگ کرتے تھے مگر ہم منع کرتے ہیں یعنی باوجود کرنے پر منع ہو گیا جس سے ہم واقف ہیں حاشا وکلا حضرت عمر کا یہ مطلب نہیں ہو سکتا کہ جو چیز رسول اللہ کے وقت میں جائز تھی اس کو ہم اپنی رائے سے حرام بناتے ہیں۔ حضرت جابر کا طرز بیان یہ ظاہر کرتا ہے کہ انہوں نے بھی رجوع کر لیا تھا ان کی روایت کے الفاظ لکھ چکا ہوں کہتے ہیں کہ عمرو بن الحرث کے قصہ کے بعد بالکل منع کر دیا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عمر کے منع کو انہوں نے قبول کیا اور مسلم میں ایک روایت ہے کہ ان کے سامنے ابن عباس اور ابن الزبیر کے اس مسئلہ میں اختلاف کا ذکر ہوا تو انہوں نے کہا کہ عمر نے بعد میں منع کر دیا ہے یعنی انہوں نے عبداللہ بن الزبیر کے خیال کی تائید کی۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر نے ان کو سمجھا دیا کہ متعہ کی ممانعت ہو گئی۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہو سکتا کہ عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کو منسوخ کر دیا اور صحابہ نے قبول کر لیا۔

ایک شبہ اور اُس کا جواب

مولانا مودودی تفہیم القرآن میں رقمطراز ہیں کہ:

یہ کہنا زیادہ صحیح ہے کہ متعہ کی حرمت قرآن مجید کے کسی صریح حکم پر نہیں، بلکہ

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت پر مبنی ہے۔ سنت میں اس کی صراحت نہ ہوتی تو محض اس آیت کی بنا پر تحریم کا فیصلہ کر دینا مشکل تھا۔

اس کا دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ مولانا اپنے مخاطبوں کو یہ بتاتے ہیں کہ متعہ کی حرمت سور اور خنزیر کی طرح قطعی نہیں بلکہ ظنی ہے اور اس شبہ کا سرچشمہ یہ ہے کہ مولانا کو سورہ مومنوں اور سورۃ معارج کی آیات سے استدلال میں تردد ہے وہ فرماتے ہیں :

یہ استدلال بہت قوی ہے مگر اس میں کمزوری کا پہلو یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے متعہ کی حرمت کا آخری اور قطعی حکم فتح مکہ کے سال دیا ہے اور اس سے پہلے اجازت کے ثبوت صحیح احادیث میں پائے جاتے ہیں۔ اگر یہ مان لیا جائے کہ حرمت متعہ کا حکم قرآن کی اس آیت میں آچکا تھا جو بالاتفاق مکی ہے اور ہجرت سے کئی سال پہلے نازل ہوئی ہے تو کیسے تصور کیا جا سکتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسے فتح مکہ تک جائز رکھتے۔

حقیقت یہ ہے کہ بعض آیات سے بعض احکام بطور اشارہ معلوم ہوتے ہیں پھر جب اللہ سبحانہ کا ارادہ ہوتا ہے کہ یہ حکم واضح کر دیا جائے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ کی وحی نازل ہو جاتی ہے کہ آپ اس حکم کو لوگوں کے سامنے صاف طور پر بیان کر دیں۔ اس وقت وہ حکم اس آیت سے صراحۃً معلوم ہو جاتا ہے اور عوام و خواص اس کے مکلف بن جاتے ہیں اور جب تک اللہ سبحانہ کو یہ منظور نہیں ہوتا اس وقت تک اس کو واضح اور ظاہر کرنے کی حضور انور پر وحی نہیں آتی۔ اگرچہ خواص اور اذکیا بطور اشارہ اس حکم سمجھ لیں مگر عام طور پر عام لوگ اس کے مکلف نہیں ہوتے جیسے حق سبحانہ نے شراب کے موضوع پر مکی زندگی میں فرمایا و تتخذون منہ سکرا و رزقا حسنا یعنی اور بناتے ہو تم انگور سے نشہ والی چیز اور رزق حسن۔ یہ آیت مکی ہے۔ شراب مکہ میں حرام نہ ہوئی تھی پینے والے اس وقت تک بے تکلف پیتے تھے ہجرت کے بعد حرام ہوئی۔ پھر کسی مسلمان نے ہاتھ نہ لگایا تاہم اس مکی آیت میں بھی سکرا کے بعد رزقا حسنا فرما کر متنبہ فرما دیا کہ جو چیز سکر ہے وہ رزق حسن نہیں۔ اس سے اشارۃً معلوم ہو رہا ہے کہ شراب اچھی چیز نہیں بلکہ حرام ہے۔ ایسے ہی مدنی زندگی میں فرمایا فیھما اثم کبیر و منافع للناس و اثمھما اکبر من نفعھما اس میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ ان میں بڑا گناہ ہے لیکن ان میں لوگوں کے کچھ فوائد بھی ہیں۔ سمجھدار لوگوں نے بڑا گناہ سمجھ کر شراب چھوڑ دی اور کچھ منافع للناس کی وجہ سے پیتے رہے۔ پھر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی لا تقربوا الصلوٰۃ و انتم سکاریٰ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد کچھ نے چھوڑ دی لیکن کچھ نمازوں کے اوقات علاوہ پیتے حضرت عمر نے دعا مانگی کہ اے اللہ شراب

کے بارے میں ہمارے لیے شافی بیان کردے۔ قرآن میں یہ قانون نازل ہوا انما الخمر والمیسر والانصاب والازلام رجس من عمل الشیطان فاجتنبوہ، اس کے بعد شراب کی حرمت قطعی ہوگئی۔

ٹھیک اسی طرح مکہ میں سب سے پہلے سورۃ معارج میں کہا گیا،

والذین ھم لفروجھم حافظون الا علی ازواجھم او ماملکت ایمانھم فانھم غیر ملومین فمن ابتغی وراء ذالک فاولئک ھم العادون۔

اور وہ لوگ جو اپنی شرمگاہوں کی حفاظت کرتے ہیں۔ ہاں مگر اپنی منکوحہ یا اپنی مملوکہ سے اپنی حاجت برآری کرتے ہیں ان پر کوئی ملامت نہیں، جو ان دوراہوں کے علاوہ اپنی حاجت برآری کسی اور راہ سے کرتے ہیں وہ قانون شکن ہیں۔

ظاہر ہے کہ ممتوعہ منکوحہ ہے اور نہ مملوکہ ہے۔ اس میں اشارۃً بتا دیا کہ منکوحہ اور مملوکہ کے علاوہ کسی اور سے جنسی تعلقات قائم کرنا قانون کو توڑنا اور عدوان ہے۔ اس کے بعد سورۃ مومنون کی آیات نازل ہوئیں ان میں بھی یہی انداز اختیار کیا۔ وہاں جن اوصاف پر اہل ایمان کے لیے فلاح کو موقوف کیا گیا ہے ان ہی اوصاف میں سے ایک وصف یہ بھی ہے کہ اپنی منکوحہ اور باندی کے سوا کوئی اور راستہ قضائے شہوت کا اختیار نہیں کرتے۔ بعد ازیں مدینے کی زندگی میں زیر تشریح آیت نے یہ بات کھول کر بتائی کہ محصنین غیر مسافحین اس کے ذریعے قرآن نے صراحۃً متعہ کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا اور یہ شرط مردوں ہی کے لیے نہیں بلکہ عورتوں کے بارے میں بھی بتائی۔ محصنات غیر مسافحات۔ حضرت شاہ عبدالعزیز کی یہ بات بالکل برمحل ہے کہ:

اگر کوئی شخص قرآن کی اس آیت کے سیاق پر پوری طرح غور کرے تو اسے اس میں متعہ کی حرمت صراحۃً معلوم ہوگی۔

پھر اسی بات کو سورۃ مائدہ کے آخر میں جسے دوامی پیغام کہنا چاہیے محصنین غیر مسافحین کا فقرہ دہرا دیا گیا ہے۔ گویا خدا کی وحی نے متعہ کی حرمت پر اب بالکل مہر لگا دی ہے

باہمی رضامندی سے مہر میں کمی یا بیشی

۴۸۔ اور مہر مقرر ہو جانے کے بعد اگر باہمی رضامندی سے کوئی سمجھوتہ ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں۔ بلاشبہ اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ یعنی اگر زوجین مہر مقرر کر لینے کے بعد کسی بات پر راضی ہو جائیں مثلاً عورت اپنی خوشی سے اپنے مہر میں سے کچھ کم کر دے یا مرد اپنی رضامندی سے

مہر مقررہ سے کچھ زیادہ دے تو وہ مختار ہیں اس میں کچھ گناہ نہیں ہے۔ یہ نہیں کہ مقررہ مہر سے کچھ کم دے یا عورت اس سے کچھ زیادہ لے تو ناجائز ہے۔ ہاں رضا کے باہمی ضرور ہونی چاہیے۔ آخر میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری مصلحتوں اور ہر طرح کے نفع ونقصان کو خوب جانتا ہے اور جو حکم فرماتا ہے وہ سراسر حکمت آمیز ہوتا ہے اس کی متابعت میں تمہارے لیے دارین کی خوبی اور بہبودی ہے اور مخالفت میں سراسر نقصان ہے [1]

اس فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ باہم مہر مقرر ہو جانے کے بعد مہر کی مقررہ رقم ایسی کوئی حتمی چیز نہیں کہ اس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی بلکہ شوہر اگر چاہے تو اس میں اضافہ کر سکتا ہے اور بیوی اگر چاہے تو اس میں کمی کر سکتی ہے یا پورا مہر معاف کر سکتی ہے۔ حاصل یہ ہے کہ شوہر کو اختیار ہے کہ نکاح میں جس قدر مہر مقرر ہوا ہے نکاح کے بعد اس کی مقدار بڑھا دے مگر یہ بڑھائی ہوئی رقم اس کے ذمہ اسی وقت واجب الاداء ہو گی جبکہ بیوی اسی مجلس میں اس کو قبول کرے ایسے ہی عورت کو بھی اختیار ہے کہ اپنے مہر کا کوئی جز یا کل معاف کر دے۔ شرط یہ ہے کہ عورت خود معاف کرے، اس کے ولی کا معاف کرنا معتبر نہ ہوگا چاہے ولی اس کا باپ ہو۔ اگر کسی نابالغہ لڑکی کا باپ اس کی طرف سے مہر معاف کر دے گا تو یہ صحیح نہ ہوگا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ازدواجی زندگی کا مقصد ایسی زندگی ہے جس میں مودت و رحمت اور باہم صلح و رضامندی کی ایسی فضا ہو جو دونوں کے احوال میں درستگی کی راہ پیدا کر سکے اور جس کے ذریعے وہ جماعت ترقی کر سکے جس کے یہ دونوں فرد ہیں۔

آیت کا یہ مطلب جمہور کی رائے کے مطابق ہے اور یہی صحیح ہے لیکن سدی نے اس آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ متعہ کی مدت گزر جانے پر اگر تم باہم رضامندی سے نیا معاملہ کر لو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ باہمی رضامندی سے مدت میں بھی اضافہ ہو سکتا ہے اور اجرت میں بھی۔ یہ امامیہ کی رائے ہے جیسا کہ ابو علی طبرسی نے مجمع البیان میں تصریح کی ہے لیکن یہ مطلب درست نہیں ہے کیونکہ یہ آیت کے موضوع کے خلاف ہے۔ اللہ سبحانہ نے اولاً محرمات کو بیان فرمایا اس کے بعد فرمایا ہے واحل لکم ما وراء ذالکم یعنی ان محرمات کے سوا تمہارے لیے اور عورتوں سے ازدواجی تعلق قائم کرنا جائز ہے بشرطیکہ تم ان کے مہر اور نان ونفقہ کی ذمہ داری قبول کر لو۔ اس شرط سے دوسروں کے لیے تحلیل فروج اور عاریت باطل ہو گئی۔ اس کے بعد ارشاد ہے کہ محصنین غیر مسافحین یعنی تمہارا پیش نہاد عورتوں سے تعلق میں ان کو اپنی حفاظت میں لینا ہو وہ تمہاری ہو کر رہے صرف قضائے شہوت پیش نظر نہ ہو۔ اس قید سے بھی ممنوعہ عورت آیت کے مصداق سے

[1] افادات شیخ الاسلام

خارج ہو گئی کیونکہ ایک کی ہو کر نہیں رہتی۔ اس کے بعد ارشاد ہے فما استمتعتم بہ منھن چونکہ تم نے ان منکوحہ عورتوں سے استمتاع کیا ہے اس لیے تم پر ان کا مہر واجب ہو گیا ہے لسے تمہیں ادا کرنا چاہیے۔ اسی مہر کے بارے میں یہ تشریح آئی ہے کہ اگر مہر مقرر ہو جانے کے بعد میاں بیوی رضامندی سے کمی زیادتی کرنی چاہیں تو وہ ایسا کرنے کے مجاز ہیں اور یہ ان کے صوابدید پر موقوف ہے کہ مرد اگر چاہے تو مقررہ رقم میں اضافہ کر دے اور بیوی اگر چاہے تو کم کر دے۔

آیت کے ایک ٹکڑے کا موضوع سے ہٹ کر مطلب بتانا ذوقِ عربیت پر گراں ہے۔ شاہ عبدالعزیز کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے:۔

بات کو آغازِ کلام سے جدا کرنا اور درمیانی فقرے کو متعہ پر محمول کرنا صراحۃً کلام اللہ میں تحریف ہے۔ سیاقِ کلام تو صراحۃً حرمتِ متعہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

اول یہ کہ صاحبِ ہدایہ نے جو امام مالک کی طرف جوازِ متعہ کی نسبت کی ہے اس پر تمام فقہائ نے ان کی سخت گرفت کی ہے۔ ابن دقیق العید کہتے ہیں کہ متعہ کی حرمت کا فیصلہ عام صحابہ و فقہاء کا فیصلہ ہے صاحب المنہل العذب المورود رقمطراز ہیں کہ متعہ حرام ہے کسی حال میں جائز نہیں۔ یہی جمہور صحابہ و تابعین کا مذہب ہے حازمی فرماتے ہیں کہ اس موضوع پر فقہائ کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے۔ سب فقہاء اور ائمہ امت اس پر متفق ہیں۔ ابن عبدالبر کہتے ہیں متعہ کی حرمت پر سب کا اتفاق ہے۔ اہلِ مدینہ اور امام مالک، اہلِ کوفہ اور امام ابوحنیفہ، اہلِ شام اور امام اوزاعی، امام لیث اور امام شافعی اور محدثین یہی کہتے ہیں۔

دوم یہ کہ علامہ شامی نے شیخ ابن الہمام سے جو نقل کیا ہے کہ متعہ کی حرمت حجۃ الوداع میں ہوئی یہ صحیح نہیں ہے۔ جنگِ اوطاس میں اس کی حرمت ہمیشہ کے لیے ہو چکی تھی جیسا کہ احادیث کے تتبع سے ظاہر ہے۔ ابوداؤد کی ایک حدیث میں حجۃ الوداع کا ذکر ہے مگر اس میں صرف اس قدر ہے کہ متعہ کی حرمت حجۃ الوداع میں ہوئی یہ راوی کی غلط فہمی ہے۔ حجۃ الوداع میں تحریم جدید نہیں بلکہ اسی حرمتِ سابقہ جنگِ اوطاس کا اعلان حجۃ الوداع میں کیا گیا تھا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ حجۃ الوداع میں اجتماع بڑا تھا اس لیے حضور انور نے اس بڑے مجمع میں اعلان کیا کہ لوگ عام متعہ کی حرمت سے واقف ہو جائیں۔ راوی کو پہلے سے متعہ کی حرمت کا علم نہ تھا وہ یہ سمجھا کہ اس کی حرمت کا اب اعلان ہوا اور متعہ اب حرام ہوا ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَسْتَطِعْ مِنْكُمْ طَوْلًا اَنْ يَّنْكِحَ الْمُحْصَنٰتِ الْمُؤْمِنٰتِ فَمِنْ
مَّا مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ مِّنْ فَتَيٰتِكُمُ الْمُؤْمِنٰتِ ؕ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِاِيْمَانِكُمْ ؕ
بَعْضُكُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۚ فَانْكِحُوْهُنَّ بِاِذْنِ اَهْلِهِنَّ وَاٰتُوْهُنَّ
اُجُوْرَهُنَّ بِالْمَعْرُوْفِ مُحْصَنٰتٍ غَيْرَ مُسٰفِحٰتٍ وَّلَا مُتَّخِذٰتِ
اَخْدَانٍ ۚ فَاِذَاۤ اُحْصِنَّ فَاِنْ اَتَيْنَ بِفَاحِشَةٍ فَعَلَيْهِنَّ نِصْفُ
مَا عَلَى الْمُحْصَنٰتِ مِنَ الْعَذَابِ ؕ ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ الْعَنَتَ مِنْكُمْ ؕ
وَاَنْ تَصْبِرُوْا خَيْرٌ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ ع

اور جو کوئی تم میں سے اس کی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں
سے نکاح کرے تو ان عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے جو تمہاری ملک
یمین میں ہوں اور ایمان والیاں ہوں[۴۹]۔ اللہ تمہارے ایمانوں کا
حال خوب جانتا ہے تم سب ایک دوسرے کی ہم جنس ہو۔[۵۰]
پس تم ایسی عورتوں کو ان کے سرپرستوں کی اجازت سے اپنے

نکاح میں لے لو اور دستور کے مطابق ان کا مہر ان کے حوالے کردو
بشرطیکہ وہ نکاح کی قید میں رہنے والیاں ہوں بدکار نہ ہوں اور
نہ چوری چھپے آشنا بنانے والی ہوں۔ پھر اگر قید نکاح میں آجانے
کے باوجود بدچلنی کی مرتکب ہوں تو اس کے لیے اس سزا سے آدھی
ہے جو آزاد عورتوں کے لیے مقرر ہے[۵۱]۔ یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے
جنہیں اندیشہ ہے کہ شادی نہ کرنے سے زنا میں مبتلا ہو جائیں گے
اور صبر کر لینا تمہارے لیے بہتر ہے اور اللہ بڑا ہی بخشنہار اور رحم کار ہے[۵۲]۔

اسلام میں غلامی کی اصلاح

دُنیا میں غلامی کی تاریخ حاکمیت و محکومیت اور فاتح و مفتوح کی تاریخ کے ساتھ شروع ہوتی ہے، طاقتور قبائل کمزور قبائل کو یعنی فاتح اور حاکم مفتوح اور محکوم کو غلام بناتے تھے۔ غلامی کے رواج میں سب سے زیادہ لڑائیوں کو دخل ہے ان میں جو شکست خوردہ ہوتے تھے ان کو یا تو قتل کر دیا جاتا تھا یا معاوضہ لے کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ اور جو عمر بھر کے لیے غلام بن جاتے تھے جن سے ہر قسم کے کام لیے جاتے تھے ان میں آخری صورت زیادہ رائج تھی جس نے رفتہ رفتہ لونڈی اور غلاموں کی تجارت کی شکل اختیار کر لی تھی۔ یہ لونڈی، غلام زندگی کی ایسی ناگزیر ضرورت بن گئے تھے کہ کوئی ملک اور قوم بھی غلامی کے رواج سے خالی نہ تھی۔ یونان، مصر، ہندوستان، ہر ملک میں غلامی رائج تھی۔ بعض بعض ملکوں میں تو غلاموں کی تعداد ملک کی اصل آبادی کے برابر تھی۔ خود یورپ میں انیسویں صدی کے وسط تک غلامی رائج تھی۔ یورپین قوموں میں محض جنگی قیدیوں ہی کو نہیں بلکہ

وحشی قوموں کو بھی زبردستی غلام بنا لیتی تھیں۔ غلاموں کی حیثیت جانوروں سے بہتر نہ تھی۔ آقا ان کی جان تک کا مالک ہوتا تھا۔ غلاموں کے قتل کی کوئی سزا نہ تھی۔ ان سے طرح طرح کے پرمشقت کام لیے جاتے تھے۔ اور ادنیٰ لغزش کی بڑی سخت سزا دی جاتی تھی۔ ان کی ساری املاک کا مالک آقا ہوتا۔ الغرض ان کو سوسائٹی میں انسانیت کا مرتبہ حاصل نہ تھا۔

قرآن پہلی کتاب ہے جس نے دوسرے مظلوم طبقوں کے ساتھ غلاموں کے ساتھ بھی انسانیت اور حسن سلوک کا سبق دیا۔ ان کو انسانی حقوق عطا کیے اور ان کو اونچا کرنے کی کوشش کی۔ ان آیات میں قرآن اپنے مخاطبوں کے کورۂ ذہن میں یہ بات اتار دینا چاہتا ہے کہ اسیران جنگ میں سے جو عورتیں تمہارے قبضہ میں آجائیں، انہیں اس لیے حقیر اور ذلیل نہ سمجھو کہ وہ غلام ہیں، دوسری قوم کی عورتیں ہیں اور جنگ میں قید ہو کر آئی ہیں۔ انسان ہونے کے لحاظ سے ہر آدمی دوسرے آدمی کا ہم جنس ہے اور انسانی برادری کا رشتہ سارے رشتوں سے زیادہ قابل لحاظ ہے۔ ان میں سے جو عورتیں مسلمان ہو گئی ہیں تم ان سے نکاح کر سکتے ہو۔ ان سے نکاح کرنے میں کوئی عیب نہیں، انسان ہونے کے لحاظ سے سارے انسان برابر ہیں اور فضیلت کا معیار ایمان و عمل ہے۔ غلامی کے بارے میں قرآن کی اصلاحات میں ایک اہم اصلاح ہے۔ قرآن نے جو اصلاحات کی ہیں اور غلاموں کو جو حقوق دیئے ہیں اور آقا پر جو ذمہ داریاں عائد کی ہیں ان کے نتیجہ میں غلامی کی شکل و صورت بدل گئی اور آقائی زندگی کے پرانے مفہوم کے اعتبار سے غلامی غلامی نہ رہی بلکہ غلام آقا کے خاندان کا ایک فرد بن گیا۔ اس کی آزادی اور ترقی کی راہیں کھل گئیں چنانچہ اسلام کی تاریخ علم و کمال کے ہر میدان میں اصحاب کمال غلاموں سے بھری ہوئی ہے۔

۲۹۔ اور جو کوئی تم میں سے اس کی مقدرت نہ رکھتا ہو کہ خاندانی مسلمان عورتوں سے نکاح کرے تو ان عورتوں سے نکاح کر سکتا ہے جو تمہاری ملک یمین میں ہوں اور ایمان والیاں ہوں۔ یعنی جس کو اس بات کی مقدرت نہ ہو کہ آزاد عورت سے نکاح کر سکے اور اس کے مہر اور نفقہ کا تحمل کر سکے تو بہتر ہے کہ ایسا شخص آپس میں کسی مسلمان لونڈی سے نکاح کرے کہ اس کا مہر کم ہوتا ہے اور نفقہ میں یہ سہولت ہے کہ اگر مالک نے اس کو اپنے یہاں رکھا جیسا کہ اکثر ہوتا ہے تو شوہر اس کے نفقہ سے فارغ البال رہے گا اور اگر شوہر کے حوالہ کر دیا تو بھی بہ نسبت نفقہ حرہ تخفیف ضرور رہے گی۔

اس ارشادِ گرامی کا منشا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی شریف زادی سے نکاح نہیں کر سکتا ہے تو وہ کسی مسلمان کنیز سے نکاح کرے اور اس کی شرط یہ ہے کہ مرد اس قدر فراخی اور وسعت نہ رکھتا ہو کہ آزاد

عورت سے نکاح کر سکے کیونکہ کنیز کا مہر اور نان و نفقہ آزاد عورت سے بہت کم ہوتا تھا۔ اصل ارشاد میں لفظ طول آیا ہے۔ طول کے معنے میں علماء کا اختلاف ہے۔

طول کے معنے

اصل لغت میں لفظ طول تین معنے میں آتا ہے غنا، قدرت، فضل، یہ طول سے لیا گیا ہے جس کے معنے لمبائی کے ہیں اعراض میں ہو یا جواہر میں۔ غنی اور مالداری کو طول اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے ذریعے انسان دُنیا میں برتری اور اقتدار حاصل کرتا ہے، اسی سے تطول مال میں بڑھوتری کے معنے میں ہے اسی سے تطاول مال کے ذریعے لوگوں پر برتری کے معنے میں ہے اسی لیے ارشاد نبوت ہے یتطاولون فی البنیان تعمیرات میں لوگ برتری کا اظہار کریں گے اور اسی سے استطالہ دوسروں کے مقابلہ میں دست درازی کے ذریعے برتری کو کہتے ہیں۔ بزرگی اور برتری کو بھی طول کہتے ہیں شدید العقاب ذی الطول تینوں معنے میں ہم آہنگی ہے۔ آیت میں تینوں معنے کا احتمال ہے۔ اگر آیت میں طول کے معنے غنا کے ہیں جیسا کہ عبداللہ بن عباس، سعید بن جبیر اور قتادہ کی رائے ہے۔ تو اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اگر مال کی اتنی وسعت نہ ہو کہ آزاد عورت سے شادی کر سکو تو پھر تمہیں مومن کنیز سے شادی کر لینی چاہیے۔ اس کے مفہوم میں یہ بات آگئی کہ اگر ایک شخص میں آزاد عورت سے شادی کی وسعت ہے تو اسے کنیز سے شادی نہ کرنی چاہیے دوسری یہ کہ اگر ایک شخص کی کسی آزاد عورت سے شادی ہو چکی ہے تو اسے کنیز سے شادی نہ کرنی چاہیے۔

اس دوسرے مسئلہ کے بارے میں شیخ الاسلام فرماتے ہیں،

> اگر کسی کے نکاح میں آزاد عورت ہو تو اس کو لونڈی سے نکاح کرنا سب کے نزدیک حرام ہے۔

لیکن سب کے نزدیک سے مراد احناف ثوری، اوزاعی اور امام شافعی مراد ہیں ان سب کے خیال میں آزاد عورت اگر نکاح میں ہو تو کنیز سے نکاح ناجائز ہے مگر امام مالک اور امام عثمان بتی فرماتے ہیں کہ اگر دوسری آزاد عورت سے شادی کی وسعت نہ ہو تو کنیز سے کر سکتا ہے جیسا کہ ابن عربی نے احکام میں اور قرطبی نے تفسیر میں تصریح کی ہے۔ اگرچہ قرطبی نے لخمی کے حوالے سے ابو حنیفہ کے مسلک کو ظاہر قرآن قرار دیا ہے چنانچہ مدونہ میں ہے لیست الحرۃ بطول تمنع نکاح الامۃ اس طرح گویا امام اعظم اور ان کے ہمنواؤں کے خیال میں کسی کے نکاح میں آزاد عورت ہونا خود طول ہے جس کی موجودگی

میں کنیز سے نکاح نہیں ہو سکتا لیکن امام مالک طول کو قدرت کے معنے میں لے کر یہ مطلب بتاتے ہیں کہ جو شخص کسی آزاد عورت سے نکاح کی طاقت نہیں رکھتا ہے وہ کنیز سے شادی کرلے اس میں وہ شخص بھی داخل ہے جس کے نکاح میں بالفعل آزاد عورت ہو وہ بھی اگر دوسری شادی کرنا چاہے اور آزاد عورت سے شادی کی قدرت نہ ہو تو کنیز سے شادی کرلے۔ ابوبکر ابن العربی نے احکام القرآن میں اس کی توضیح کی ہے۔

پہلی بات یعنی اگر ایک شخص میں آزاد عورت مسلمان سے شادی کی طاقت نہ ہو تو اسے مومن کنیز سے شادی کر لینے کی اجازت ہے۔

اس موضوع پر علماء میں اختلاف ہے۔

قرآن کی اس آیت میں حکم ہے یا رخصت ہے امام ابوحنیفہ اسے رخصت اور امر ارشادی قرار دیتے ہیں۔ اس لیے امام ابوحنیفہ ان قیود کو جو اس آیت میں آئی ہیں احترازی نہیں کہتے مثلاً کنیز کا مسلمان ہونا۔ اگر اس قید کو نظرانداز کر کے کتابیہ کنیز شادی کر لی تو نکاح ہو جائے گا لیکن ایسا کرنا مکروہ ہے جبکہ امام شافعی اور دوسرے ائمہ کے نزدیک یہ قید احترازی ہے یعنی ان کے خیال میں کنیز کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے اگر غیر مسلم کنیز سے شادی کی تو نکاح ہی نکاح نہ ہوگا خواہ وہ کتابیہ ہو۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

جس کو آزاد عورت سے نکاح کرنے کی مقدرت ہو اس کو لونڈی سے نکاح کرنا امام شافعی کے نزدیک حرام ہے اور امام ابوحنیفہ کے مذہب میں مکروہ ہے ایسے ہی صحت نکاح کے لیے لونڈی کا مسلمان ہونا اکثر علماء کے نزدیک ضروری ہے اور امام ابوحنیفہ کے نزدیک افضل ہے۔

مولانا اشرف علی فرماتے ہیں:

لونڈی کے ساتھ نکاح کرنے میں دو قیدیں لگائیں ایک یہ کہ وہ ایسی عورت سے نکاح نہ کر سکے جس میں دو قیدیں ہوں ایک حریت دوسرے ایمان، دوسری قید یہ کہ وہ مسلمان لونڈی ہو۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک ان قیدوں کی رعایت اولیٰ ہے اور اگر بلا رعایت ان قیود کے لونڈی سے نکاح کیا تو نکاح ہو جائے گا لیکن کراہت ہو گی اور امام شافعی نے ان دو قیدوں کو احترازی فرمایا ہے لیکن قید اول کی صفت ثانیہ کو احترازی کہا بس حرہ غیر مومنہ کے مستطیع کو بھی نکاح کنیز کی اجازت نہیں ہے۔

کنیزوں سے نکاح پر پابندی کیوں؟

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اسلام جب مساوات کا علمبردار ہے بلکہ ایک ہی صف میں

کھڑے ہو گئے محمود و ایاز کا نعرہ لگاتا ہے جیسا کہ یہاں بعضکم من بعض کہہ کر اسی حقیقت کا اظہار کیا ہے کہ انسان ہونے کے لحاظ سے ہر آدمی دوسرے آدمی کا ہم جنس ہے اور انسانی برادری کا رشتہ سارے رشتوں سے زیادہ مقدم ہے۔ غلام اور کنیزیں آزاد مرد اور آزاد عورتیں سب ایک ہی نسلِ انسانی کے افراد ہیں اور ایک ہی ماں باپ کی اولاد ہیں تو کنیزوں سے نکاح پر یہ قدغن کیوں ہے کیا قرآن غلاموں اور لونڈیوں کو ایک ذلیل حالت میں رکھنا چاہتا ہے۔

واقعی اسلام پہلا دین ہے جس نے دوسرے مظلوم طبقوں کے ساتھ غلاموں کے ساتھ بھی انسانیت اور حسن سلوک کا سبق دیا ان کو انسانی حقوق عطا کیے۔

اسلام نے غلاموں کی آزادی اور ان کے ساتھ حسنِ سلوک کو اپنی تحریک کا لازمی حصہ بنا لیا۔ غلاموں کی آزادی کو بڑے اجر و ثواب کا کام قرار دیا۔ سورۃ بلد میں جو مکہ میں نازل ہوئی تھی جن کاموں کو گھاٹی بتایا گیا ہے ان میں ایک "فک رقبۃ" گردن سے غلامی کی رسی ہٹانا بھی ہے۔

اس آیت میں جو بات ارشاد ہوئی ہے کہ کنیزوں میں سے جو مسلمان ہو گئی ہیں ان سے نکاح کر سکتے ہو بشرطیکہ آزاد مسلمان عورت سے کرنے کی تم میں قدرت نہ ہو۔ اس قید لگانے میں جہاں تک میں سمجھا ہوں بنیادی اور اہم ترین حکمت یہ ہے کہ قرآن یہ چاہتا ہے کہ مسلمان ان کو آزاد کر کے اپنی زوجیت میں لیں اور کنیز کو کنیز نہ رہنے دیں۔ اسی لیے احادیث میں لونڈیوں کی تعلیم تادیب اور تربیت کے بعد نکاح کرنے کی ترغیب آئی ہے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ تین شخصوں کو ڈبل اجر ملے گا ایک وہ شخص جو اہلِ کتاب میں سے اپنی نبی پر ایمان لایا اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لایا، دوسرا وہ غلام جو اللہ کا اور اپنے آقا کا حق ادا کرے، تیسرا وہ شخص جس کے پاس ملک یمین والی کنیز ہو جس سے وہ ملک یمین کی بنا پر جنسی تعلقات رکھتا ہے پہلے اس کو خوب سلیقہ شعار بنائے اور خوب تعلیم دے پھر اس کو آزاد کرے پھر اس سے شادی کرے اس کے لیے بھی دوہرا اجر ہے۔ (متفق علیہ)

گویا کنیزوں پر نکاح کی پابندی اس لیے ہے کہ کنیز کو کنیز بنا کر شادی نہ ہو بلکہ مساوات قائم کر کے اس سے شادی کی جائے پابندی کا منشا یہ ہے کہ مسلمان ان کو آزاد کر کے ان سے شادی کریں۔ نبوت کا یہ منشا واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے جب ہم کتب حدیث میں غلاموں اور لونڈیوں کی آزادی کی ترغیب اور ان کی فضیلت دیکھتے ہیں۔ حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی مسلمان غلام کو آزاد کرے گا اللہ تعالیٰ اس کے ہر عضو کے بدلے میں آزاد کرنے والے کے

ہر عضو کو آتش دوزخ سے بچائے گا۔ بعض روایتوں میں مسلم کی جگہ نسمہ یعنی کسی انسان آیا ہے[1]
ایک اعرابی نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ مجھ کو کوئی ایسا کام بتائیے جو مجھے جنت میں پہنچا دے فرمایا اعتق النسمۃ و فک الرقبۃ غلام کو آزاد اور گردن کو چھڑا، اعرابی نے دریافت کیا کہ کیا یہ دونوں ایک نہیں ہیں؟ فرمایا نہیں، عتق نسمہ یہ ہے کہ تم اکیلے غلام آزاد کرو اور فک رقبہ یہ ہے کہ تم بھی ان کی آزادی میں حصہ ڈالو۔[2]

صحابہ کرام اور غلاموں کی آزادی

اس ترغیب کا نتیجہ یہ تھا کہ صحابہ کرام بکثرت غلام آزاد کرتے تھے۔ حضرت عائشہ صدیقہ نے اپنی ایک قسم کے کفارے میں چالیس غلام آزاد کیے[3] آپ کے بھائی عبدالرحمان بن ابی بکر کا دفعۃً سونے کی حالت میں انتقال ہو گیا تھا۔ حضرت عائشہ نے ان کی طرف سے یعنی ان کو ایصال ثواب کے لیے بہت سے غلام آزاد کیے[4]

صحابہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد ہزاروں تک پہنچتی ہے۔ امیر یمانی نے سبل السلام شرح بلوغ المرام میں چند صحابہ کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد نقل کی ہے۔

حضرت عائشہ ۶۷، حضرت عبداللہ بن عباس ۷۰، حضرت حکیم بن حزام ۱۰۰، حضرت عبداللہ بن عمر ۱۰۰۰، حضرت ذوالکلاع الحمیری ۸۰۰۰، حضرت عبدالرحمٰن بن عوف ۳۰۰۰۰۔[5]

حضرت ابوبکر کے آزاد کردہ غلاموں کی تعداد نہیں بتائی ہے مگر یہ لکھا ہے کہ انہوں نے بکثرت غلام آزاد کیے۔

آغاز اسلام میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا تھا ان میں ایک بڑی تعداد غلاموں کی تھی جو اپنے آقاؤں کے پنجہ ستم میں گرفتار تھے۔ ان کے قبول اسلام کے بعد ان کا ظلم اور بڑھ گیا۔ حضرت ابوبکر نے ایسے بہت سے غلاموں کو خرید کر آزاد کیا تھا۔ ان میں سے چند مشہور نام یہ ہیں حضرت بلال، حضرت عامر بن فہیرہ، لونڈیوں میں زنیرہ، نہدیہ، بنت نہدیہ۔

امیر یمانی نے جو فہرست دی ہے وہ صرف ان صحابہ کی ہے جنہوں نے بکثرت غلام آزاد کیے تھے،

---

[1] بخاری کتاب الرہن [2] بیہقی یہ حدیث طویل ہے ہم نے اس کا ٹکڑا نقل کیا ہے۔ [3] بخاری [4] موطا امام مالک
[5] سبل السلام شرح بلوغ المرام

معاشرہ میں مشکل سے کوئی ایسا نکلے گا جس نے کچھ غلام آزاد نہ کیے ہوں۔ حدیث کی کتابوں میں اس کا تذکرہ ہے۔

بہرحال منشا قرآنی یہ ہے کہ کنیزوں سے ان کی غلامی کا داغ مٹا کر ان کو برابری کا درجہ دیا جائے اور پھر ان سے نکاح کیا جائے۔ غلام ہونے کی حالت میں ان سے شادی کرنے سے پرہیز کیا جاتے۔ اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں اور نہ یہ قرآن کا منشا ہے کہ باندیاں بلا نکاح رہیں یا حالت فجور میں رہیں۔ اس سے قرآن نے کھلے لفظوں میں منع کیا ہے۔

ولا تکرھوا فتیاتکم علی البغاء

اپنی کنیزوں کو بدکاری پر مجبور نہ کرو۔

اور ان کو نکاح سے روکنا زنا پر مجبور کرنا ہے۔ پھر صاف الفاظ میں حکم دیا ہے کہ

انکحوا الایامیٰ منکم والصالحین من عبادکم وامائکم

تم میں سے جو لوگ مجرد ہوں اور تمہارے لونڈی اور غلاموں میں سے جو نیک ہوں ان کے نکاح کر دو۔

بہرحال لونڈیوں سے نکاح پر پابندی اس لیے لگائی گئی کہ اس سے ان کی غلامی کو ختم کرنا مقصود ہے ان کی تذلیل کی زندگی کو قرآن دیکھنا نہیں چاہتا اور غلامی کی عمر دراز کرنا نہیں چاہتا۔ قرآن نے اوّل تو غلامی اسیران جنگ میں محدود کی اور وہ بھی اس طرح کر کم سے کم اس کا امکان باقی رکھا۔ سورۂ محمد کی آیت فاما منا بعد واما فداء کے ذریعے اعلان کر دیا کہ اگر مصالح جنگ کے خلاف نہ ہو تو چاہیے کہ اسیران جنگ کو فدیہ لے کر یا احسان کرکے چھوڑ دو، دوسرے غلاموں کے حقوق کی رعایت پر اس قدر زور دیا اور ان کے لیے ایسے احکام و قوانین بنائے کہ غلامی غلامی نہیں رہی بلکہ سوسائٹی کا مساویانہ عنصر بن گئی۔ چنانچہ یہاں بھی کنیز سے نکاح پر پابندی میں بھی راز پوشیدہ ہے۔

قرآن کی نظر میں بندہ و آقا

۵۰ ۔ اللہ تمہارے ایمانوں کا حال خوب جانتا ہے تم سب ایک دوسرے کے ہم جنس ہو۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو تم سب کے ایمان کی اصلی کیفیت معلوم ہے تم کو تو ظاہر پر اکتفا کرنا چاہیے۔ بعض لونڈی کا ایمان اللہ کی نظر میں بعض آزاد عورت کے ایمان سے بہتر اور افضل ہو سکتا ہے تو اب حیثیت ایمانی سے لونڈی کے ساتھ نکاح کر لینے میں کوئی قباحت اور انکار نہ ہونا چاہیے اور آپس میں تم سب ایک ہو، ایک اصل سے پیدا ہوئے ہو، ایک دین میں شریک ہو پھر ان سے نکاح کو کیوں معیوب اور ننگ و عار سمجھتے ہو،

اس کلام سے لونڈیوں کے نکاح کی طرف توجہ دلانا اور ان سے نفرت کو دور کرنا مطلوب ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ عزت و شرف کی اصلی بنیاد ایمان پر ہے ہوسکتا ہے کہ ایک عورت لونڈی ہوتے ہوئے ایمان کے اعتبار سے بڑے بڑے شریف زادوں اور شریف زادیوں پر فوقیت حاصل کرے۔ اس وجہ سے مجرد اس خیال کی بنا پر کہ ایک عورت لونڈی ہے۔ اس کے اندر شرف کے امکان کے اس پہلو کو نظر انداز نہ کرنا چاہیے۔ اور ایمان ایک ایسی چیز ہے جس کے ناپنے اور تولنے کا حقیقی پیمانہ اللہ ہی کے پاس ہے۔ اور دوسرے اس کا صحیح اندازہ نہیں کرسکتے بعضکم من بعض میں اس طرف اشارہ ہے کہ لونڈی اور غلام ہونا تو ایک عارضی اور ہنگامی حالت ہے نسل کے اعتبار سے تو جتنے غلام اور باندیاں ہیں سب ایک ہی آدم کے اولاد ایک ہی حوا کی اولاد ہیں [1]

اس فقرے کے ذریعے قرآن نے یہ بات کھول کر سمجھا دی ہے کہ انسان ہونے میں اور مسلمان ہونے میں سب ایک ہیں۔ مسلمانی اور انسانیت سب کا اشتراکی سرمایہ ہے لیکن دونوں میں فرق ہے ایک نمایاں اور سب کے سامنے ہے یعنی انسانیت اس کے بارے میں فرمایا بعضکم من بعض آزاد بحیثیت آزاد ہرگز اللہ کے یہاں مقرب اور مستحق نجات نہیں اور غلام بحیثیت غلام ہرگز غلام ہونے کی وجہ سے کسی اجر و ثواب سے محروم نہ رہے گا جیسا کہ یورپ میں ہوتا رہا ہے اور ہو رہا ہے کہ کالے کو کالے ہونے کی وجہ سے شہریت کے وہ حقوق نہیں ملتے جو گورے کو ملتے ہیں۔ دوسری چیز پوشیدہ ہے یعنی ایمان، اس کے بارے میں فرمایا واللہ اعلم بایمانکم فقہا نے اس سے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ ایمان اصل میں تصدیق قلبی کا نام ہے اور یہ بھی اسی آیت سے سمجھا ہے کہ ظاہر ایمان کو قبول کر لیا جائے گا۔ مفسرین قرآن نے آیت قرآنی کے منطوق، مدلول اور مفہوم سے جو کچھ سمجھا ہے وہ ایک علمی سرمایہ ہے آئیے آپ بھی لطف اندوز ہو لیجئے۔

امام رازی فرماتے ہیں:

> اس فقرے کے لانے میں یہاں حکمت یہ ہے کہ اہل عرب میں انساب پر فخر کرنے کی بیماری عام تھی۔ یہ کہہ کر بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ کے ہاں انساب کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تین باتیں جاہلیت کی ہیں نسب پر طعن، حسب پر فخر اور نچھتر کے ذریعے بارش۔ اور لوگ مسلمان ہو کر بھی اسے نہ چھوڑیں گے۔ اور اہل جاہلیت

---

[1] افادات شیخ الاسلام [1] تدبر قرآن۔

معمولی آدمی کے بیٹے کو کمین سمجھتے تھے اللہ تعالیٰ نے یہ بات اہلِ ایمان کو اخلاقِ جاہلیت سے بچانے کے لیے فرمائی ہے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں،

مقصد اس فقرے کا یہ ہے کہ اہلِ عرب میں یہ تاثر پیدا کیا جاتا ہے کہ باندی کی اولاد کو جو ذلیل سمجھا جاتا ہے اور اس پر باندی بچہ کی جو پھبتی کسی جاتی ہے جوازِ نکاح کے بعد یہ قطعاً بے معنے ہے۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں،

تم مسلمان ہونے کی حیثیت سے اور اولاد آدم ہونے کی حیثیت میں برابر ہو۔

قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ

یہ دونوں فقرے لوگوں کو باندیوں کے ساتھ شادی سے مانوس کرنے اور نفرت سے روکنے کے لیے لائے گئے ہیں۔

کنیزوں سے نکاح کی اور شرطیں

۵۱۔ پس تم ایسی عورتوں کو ان کے سرپرستوں کی اجازت سے نکاح میں لے لو اور دستور کے مطابق ان کے مہر ان کے حوالے کر دو بشرطیکہ وہ قیدِ نکاح میں رہنے والیاں ہوں، بدکار نہ ہوں اور چوری چھپے آشنا بنانے والی نہ ہوں یعنی تو اب مناسب ہے کہ حسب بیان بالا ان لونڈیوں سے نکاح کر لیا کرو۔ ان کے مالکوں سے اجازت لے کر اور قاعدہ و دستور کے موافق ان کا مہر ملے دیا کرو جبکہ وہ خوشی سے قیدِ نکاح میں آئیں۔ مستی نکالنے والیاں نہ ہوں یعنی زنا نہ ہو کر اس میں مہر لازم نہ ہو سکے گا۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ زنا میں مہر لازم نہیں ہوتا اور نکاح کے لیے گواہوں کا ہونا لازم ہے۔ [1]

اس فقرے میں نکاح کے لیے اور شرطیں بیان کی گئی ہیں۔ اوّل یہ کہ جن کنیزوں سے نکاح کرنا چاہتے ہو۔ ان کے سرپرستوں سے اجازت لے لو۔ دوم یہ کہ ان کے مہر کی ادائیگی کر دو، سوم یہ کہ ان کا مقصد ازدواجی زندگی میں رہنا ہو، چہارم یہ کہ علانیہ ہو اور گواہوں کی موجودگی میں ہو۔ چوری چھپے نہ ہو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سرپرستوں کی اجازت

نکاحِ کنیز کے صحیح ہونے کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ ان کے مالکوں اور سرپرستوں کی اجازت لی جائے خواہ کنیز مکاتبہ ہو مدبرہ ہو یا ام ولد۔ جو حکم کنیز کا ہے وہ ہی غلام کا ہے۔ پہلا امر اباحت کے لیے تھا اور یہ امر وجوب کے لیے ہے یعنی کنیزوں سے نکاح کرنا تو مباح ہے لیکن نکاح میں ان کے سرپرستوں سے اجازت لینا واجب ہے۔ اسی بنا پر الجصاص نے یہ تاثر ظاہر کیا ہے کہ کنیز سے نکاح کرنا اگرچہ واجب نہیں ہے لیکن اس سے نکاح کے جواز کی شرط یہ ہے کہ مالک کی اجازت ہو۔ اور اس سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ جس کنیز سے نکاح کا ارادہ ہو وہ اپنی نہ ہو بلکہ اس سے دوسروں کے مالکانہ تعلقات ہوں۔ یہ دونوں مسئلے امت میں اتفاقی ہیں ایک یہ کہ مالک کی اجازت کے بغیر کسی کی مملوکہ سے نکاح ناجائز ہے جیسا کہ الجصاص نے بتایا ہے۔ دوسرے یہ کہ اپنی مملوکہ سے مملوکہ ہوتے ہوئے نکاح ناجائز ہے۔ اپنی مملوکہ سے نکاح کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کو آزاد کرے۔ اہلِ تشیع میں سے طبری نے بھی مجمع البیان میں اسے اجماعی مسئلہ قرار دیا ہے۔ لیکن یہ یاد رہے کہ کنیز سے نکاح کے لیے اس کے مولیٰ سے اجازت ضروری ہونے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ نفس نکاح میں خود کنیزوں کی رضامندی معتبر نہ ہوگی۔ نکاح میں رضامندی ان کی ہی معتبر ہوگی۔ یہ کنیز کا حکم ہے اگرچہ اس حکم میں غلام بھی کنیز کے ساتھ ہے لیکن تھوڑا سا فرق ہے غلام نے اگر آقا کی اجازت کے بغیر نکاح کر لیا تو نکاح تو ہو جائے گا مگر نکاح موقوف ہوگا۔ موقوف ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر مالک نے اجازت دے دی تو ہو جائے گا ورنہ نہیں۔ یہ امام اعظم، امام مالک، حسن بصری، عطاء ابن ابی رباح، سعید بن المسیب، شریح قاضی اور عامر الشعبی کا مذہب ہے لیکن امام شافعی فرماتے ہیں کہ نکاح ہی منعقد نہ ہوگا۔

مہر دینا واجب ہے

اس آیت میں دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ جن کنیزوں سے تمہارا ازدواجی تعلق قائم ہو ان کو مہر کی ادائیگی واجب ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ یہ مہر کس کو دیا جائے، باندی کو دیا جائے یا اس کے مالک کو دیا جائے امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد کہتے ہیں کہ مالک کو دیا جائے کیونکہ باندی اس کی مملوکہ ہے اور امام مالک فرماتے ہیں کہ کنیز کو دیا جائے۔ ظاہر قرآن امام مالک کا ساتھ دے رہا ہے کیونکہ اٰتوھن اجورھن کی تعبیر کا ظاہری تقاضا یہی ہے۔ جمہور کی جانب سے علامہ تفتازانی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ

یہ انداز تعبیر مہر کا وجوب بتانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے اور یہ سمجھا ہے کہ مہر کنیز کی آبرو کے لیے اجر ہے اور اس لحاظ سے ان کے سپرد ہونا چاہیے لیکن مولیٰ کو ملک یمین کی وجہ سے دیا جاتا ہے اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ باندی قبضہ کے لحاظ سے اسی غلام کی طرح ماذون ہے جیسے مالک تجارت کی اجازت دے دیتا ہے جیسے وہاں تجارت میں رقم پر غلام کا قبضہ ہوتا ہے اور مالک آقا ہوتا ہے ایسے ہی یہاں رقم پر قابض تو باندی ہے لیکن مالک آقا ہی ہے۔ اور الجصاص نے یہ جدت کی ہے کہ یہاں پہلا باذن اهلهن محذوف ہے اور مطلب یہ ہے کہ نکاح بھی ان کے مالکوں کی اجازت کرو اور رقم بھی ان کو ان کے مالکوں کی اجازت سے دو اور آیت میں معروف یہ ہے کہ مہر کے دینے میں ٹال مٹول نہ ہو اور دستور و رواج کے مطابق ہو اور قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ اگر مالکوں کی اجازت سے ان کو دینے کا دستور ہو تو اس کی پیروی کی جائے۔

نکاح کا مقصد عفت ہے

اصل ارشاد میں محصنات آیا ہے۔ شارحین قرآن نے اسے پاکبازی و عفت کے معنے میں لیا ہے۔ اس کا مصدر احصان ہے جو حصن سے بنا ہے جس کے معنے قلعہ یا محفوظ مقام کے ہیں۔ اس سے حصان، احصان، محصن اور محصن الفاظ بنائے گئے۔ حصان قرآن میں نہیں آیا مگر عربوں کے اشعار میں آیا ہے۔ حسان بن ثابت حضرت عائشہ کی شان میں کہتے ہیں،

حَصَانٌ رَزَانٌ مَا تُزَنُّ بِرِيبَةٍ   وَتُصْبِحُ غَرْثَىٰ مِنْ لُحُومِ الْغَوَافِلِ

اس کے معنے پاکدامن عورت کے ہیں۔ دوسرے کے معنے حفاظت میں لینے یا حفاظت میں رکھنے کے ہیں۔ یہ قرآن میں تین موقعوں پر آیا ہے دو بار حضرت مریم کی عصمت و پاکدامنی کے بیان میں ماضی معروف کے صیغے کے ہیں، تیسری جگہ اس کا اسم فاعل محصن: (حفاظت میں لینے والا) اور اسم مفعول محصنۃ (حفاظت میں لی گئی) یہاں آیا ہے۔ محصنات غیر مسافحات یعنی نکاح کی غرض یہ ہے کہ عورت کو عصمت اور حفاظت کی قید میں لایا جائے۔ صرف حیوانی خواہش کا دفع کرنا نکاح کا مقصد نہیں ہے۔ یعنی ایسا نہ ہو کہ صرف لطف اندوزی کا ارادہ ہو اور بس۔ اس فقرے کے ذریعے کھلے لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ شادی سے عورتوں کا مقصد بھی یہی ہے کہ وہ عفت و عصمت کی زندگی گزاریں گی، اخلاق و کردار بلند رکھیں گی۔ اور اپنے داعیات فطرت کو اپنے شوہر کے ذریعے پورا کریں گی۔ اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ شادی کرتے وقت اوّل نظر عورت کی پاکدامنی اور عفت و عصمت پر ہی ہونی ضروری ہے۔ گویا قرآن نے بتا دیا کہ شادی کے ذریعے گوہر عصمت محفوظ رکھا جائے۔ بہرحال نکاح کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عفت و عصمت اور ناموس

آبرو کی انمول دولت جو انسان کو بخشی گئی ہے اس دولت کی حفاظت کا ضامن ازدواج کا بھی آئینی طریقہ ہے جسے ہم نکاح کہتے ہیں۔ اس سے اشارہ ہو گیا کہ متعہ عفت وعصمت کا ضامن نہیں ہے اور جو ممنوعہ ہے وہ عفت وعصمت والی ہرگز نہیں ہے کیونکہ وہ محفوظ نہیں ہے۔

نکاح کے لیے گواہوں کی شرط

نکاح کی ایک بنیادی شرط یہ ہے کہ علانیہ ہو خفیہ اور چوری چھپے نہ ہو۔ اصل ارشاد میں ولا متخذات اخدان آیا ہے۔ اتخاذ کے معنے بنانا ہیں اور اخدان جمع خدن کی ہے، اس کے معنے چھپے یار اور آشنا کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے باقاعدہ نکاح کے ذریعے جنسی تعلقات ہوں، آشنائی اور یاری کی راہ سے نہ ہو۔ اس کے مدلول میں یہ بھی داخل ہو کہ نکاح کا اعلان ہو اور اعلان کا کم سے کم درجہ یہ ہے کہ نکاح دو آدمیوں کو گواہ بنا کر ہو۔ نکاح میں گواہی کی شرط ہونے کی مصلحت ظاہر ہے۔ اگر نکاح میں گواہی شرط نہ ہوتی تو نکاح اور سفاح میں کوئی فرق نہ ہوتا اور جن خرابیوں کی وجہ سے شریعت نے زنا کو حرام کیا ہے وہ بدستور باقی رہتی۔ زنا کی تحریم بے سود ہو جاتی۔ نیز نکاح کی عظمت اور شان ظاہر نہ ہوتی۔

نکاح کی گواہی میں دس باتیں ضروری ہیں،

۱۔ دو گواہ ہوں ایک گواہ کے سامنے اگر ایجاب وقبول ہو گا تو نکاح نہ ہو گا۔

۲۔ دونوں گواہ مرد ہوں یا ایک مرد ہو اور دو عورتیں ہوں،

۳۔ دونوں گواہ آزاد ہوں، غلام کی گواہی کافی نہیں ہے،

۴۔ دونوں گواہ عاقل ہوں مجنون اور بیہوش نہ ہوں،

۵۔ دونوں گواہ بالغ ہوں نابالغ بچوں کی گواہی کافی نہ ہو گی،

۶۔ دونوں گواہ مسلمان ہوں، کافروں کی گواہی کافی نہیں،

۷۔ دونوں گواہ ایسے ہوں کہ ان کو عدالت میں پیش کر سکیں،

۸۔ دونوں گواہ ایک ساتھ طرفین کے ایجاب وقبول سنیں،

۹۔ دونوں گواہ ایجاب وقبول کے الفاظ سن کر یہ سمجھ لیں کہ نکاح ہو رہا ہے،

۱۰۔ دونوں گواہ زوجین سے واقف کر دیے جائیں،

بہرحال آیت کے مدلول سے نکاح کے لیے گواہوں کی شرط معلوم ہو رہی ہے ورنہ آیت کا منطوق تو یہ ہے کہ اگر آزاد مومن عورت سے نکاح کرنے کے لیے تمہارے معاشی احوال وظروف تمہارا ساتھ

نہ دیں تو معاشرے میں کسی کی کنیز سے نکاح کر لو بشرطیکہ وہ مومنہ ہو۔ ان کے مالکوں سے اجازت لے لی جائے۔ ان کے مہر کی ادائیگی کر دی جائے۔ ان کا مقصد قیدِ نکاح میں رہنا ہو، بدکاری کرنا اور چوری چھپے یاری دوستی کرنا مقصد نہ ہو۔ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ اگر قرآن کے نزدیک متعہ کی صورت میں جنسی خواہشات کو پورا کرنے کی صورت جائز ہوتی تو قرآن آزاد عورت سے نکاح نہ کر سکنے کی صورت میں کنیز سے نکاح کرنے کی متبادل صورت ہرگز تجویز نہ کرتا۔ کیونکہ جب متعہ کی اجازت موجود ہے اور اس کا حصول بھی آسان ہے تو پھر کنیز سے نکاح میں کیوں دلچسپی لی جائے۔ علامہ آلوسی کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ اس آیت میں آزاد عورت سے نکاح کی صورت میں باندیوں سے نکاح کی متبادل تجویز اعلان کر رہی ہے کہ اگر از روئے قرآن متعہ کی گنجائش ہوتی تو قرآن یہ اندازِ تعبیر ہرگز اختیار نہ کرتا و من لم یستطع یہ بات بلاغتِ قرآنی کے خلاف ہے کیونکہ متعہ کے جائز ہونے کی صورت میں عدمِ استطاعت کا تحقق ہی نہیں ہوتا۔ شاہ عبدالعزیز نے یہ بات بالکل برموقعہ فرمائی ہے کہ :

اگر متعہ رادر کلام سابق تحلیل مے نمودند پس چرا می گفتند و من لم یستطع

یعنی اگر بقول شیعہ فما استمتعتم سے جوازِ متعہ کا پروانہ مل جاتا تو یہ کیوں فرمایا جاتا کہ و من لم یستطع کیونکہ یہ کھلی بات ہے کہ جنسی تعلقات کے لیے اس کے سامنے متعہ کی راہ کھلی ہوتی ہے۔ کنیزوں سے نکاح پر یہ پابندیاں بتا رہی ہیں کہ اسلام میں متعہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور نہ یہ اسلام کے مذاقِ عفت کے مناسب ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں :

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جب حق لے کر مبعوث ہوئے تو آپ نے جاہلیت کے کل نکاحوں کی بنیاد ڈھا ڈالی سوائے اس نکاح کے جو آج کل رائج ہے۔

(بخاری کتاب النکاح)

غلاموں کے لیے سزا

۵۲ ۔ پھر اگر قیدِ نکاح میں آجانے کے باوجود وہ بدچلنی کے مرتکب ہوں تو ان کے لیے اس سزا سے آدھی ہے جو آزاد عورتوں کے لیے مقرر ہے۔ یعنی جو آزاد مرد یا عورت نکاح سے فائدہ اٹھا چکے یعنی مجامعت کی نوبت آ چکی ہو اور پھر وہ زنا کرے تو وہ سنگسار کیا جائے گا اور اگر نکاح نہیں ہوا بلکہ نکاح سے پہلے ہی زنا کیا تو اس کے لیے سو کوڑوں کا حکم ہے اور لونڈی اور غلام کے لیے قبلِ نکاح اور بعدِ نکاح ہر حالت میں صرف پچاس کوڑے ہیں زیادہ نہیں۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس فقرے میں لفظ فاحشۃ جرم بے حیائی زناکاری کے معنے میں آیا ہے۔ یہ لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے اصلی معنے حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے لازمی معنے برائی کے ہیں کیونکہ جس چیز کی جو حد خالق فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا قبیح یعنی برائی ہے۔ یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جائے فاحشہ ہے۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ سبحانہ نے انسان کی قوت شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حدیں مقرر فرما دی ہیں۔ اب جو ان حدوں سے آگے بڑھ جاتا ہے وہ فاحشہ کا مرتکب ہے اسی لیے قرآن نے زنا کا نام ہی فاحشہ رکھا ہے ولا تقربوا الزنیٰ انہ کان فاحشۃ آیت میں عذاب سے مراد زنا کی سزا ہے اذا احصن میں احصان قید نکاح میں آنے کے معنے میں ہے یعنی لونڈیاں قید نکاح میں آکر اگر بدکاری کا ارتکاب کریں تو ان کی سزا یہ ہے۔ محصنات احصان سے اسم مفعول ہے اور محصنۃ کی جمع ہے اس کے معنے یہاں شریف اور آزاد بیویوں کے ہیں قرطبی، ابن قتیبہ، بغوی، آلوسی اور دوسرے شارحین قرآن نے اس کی مراد الحرائر الابکار یعنی بیاہی شریف عورتیں بتائی ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ باندی زناکاری کا بیاہی ہو کر ارتکاب کرے تو شریف کنواری عورت کی سزا سے آدھی سزا ہے۔ شریف کنواری عورت کی سزا قرآن میں سو درّے بتائے گئے ہیں تو باندی شادی شدہ کی سزا پچاس درّے ہے۔ یعنی آیت میں باندی شادی شدہ کا آزاد کنواری سے مقابلہ ہے آزاد شادی شدہ کی سزا سنگساری ہے اور اس کی تنصیف ممکن نہیں اس لیے باندی کی سزا بھی یہی بتائی ہے یعنی پچاس درّے۔ اس آیت سے چند مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔

اول یہ کہ کنیز شادی شدہ ہو اس کو پچاس درّوں کی سزا دی جائے گی یہ تو آیت خود بتا رہی ہے لیکن یہ آیت اس میں خاموش ہے کہ اگر کنیز غیر شادی شدہ ہو تو اس کو بھی سزا دی جائے گی یا نہیں۔ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے۔ سعید بن جبیر، الحسن اور قتادہ کہتے ہیں کہ غیر شادی شدہ کو سزا نہیں دی جائے گی۔ لیکن دوسرے کبار ائمہ کہتے ہیں کہ غیر شادی شدہ کو بھی یہی سزا ملے گی۔ وہ فرماتے ہیں کہ شادی شدہ کو قرآن سے اور غیر شادی کے لیے سنت سے سزا ثابت ہے۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ شادی شدہ کی سزا قرآن سے اور غیر شادی شدہ کی حدیث سے معلوم ہوتی ہے۔ آلوسی اور قرطبی نے یہی تاثر ظاہر کیا ہے قرطبی فرماتے ہیں باندی کو شادی شدہ ہونے کی صورت میں سزا قرآن سے اور غیر شادی شدہ ہونے کی صورت میں حدیث سے دی جائے گی۔ الآلوسی لکھتے ہیں فالمزوجۃ محدودۃ بالقرآن وغیرھا بالسنۃ، نسائی میں ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کنیز شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ اس کو بدکاری پر سزا دو۔

صحیحین میں بھی زید بن خالد الجہنی کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسی سے

ملتا جلتا ارشاد ہے ۔

دوسرے یہ کہ غلاموں کی بدکاری کی سزا کا اس میں ذکر نہیں ہے مگر اس آیت کے مدلول سے علماء نے یہ سمجھا ہے کہ غلاموں کو بھی سزا دی جائے گی۔ قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ غلام کی سزا مرد ہو یا عورت شادی شدہ ہو یا غیر شادی شدہ صرف پچاس دُرّے ہے ۔ یہ ائمہ اربعہ کا مذہب ہے باندی کی سزا اس آیت کے منطوق سے اور غلام کی سزا اس کے مدلول سے معلوم ہو رہی ہے ۔

تیسرے یہ کہ اس آیت میں لفظ محصنات لونڈی کے بالمقابل خاندانی عورتوں کے معنے میں استعمال ہوا ہے اور لونڈیوں کے لیے لفظ محصنات شادی شدہ عورتوں کے معنے میں آیا ہے اور صاف لفظوں میں فرمایا ہے کہ جب ان کو نکاح کی حفاظت حاصل ہو جائے ۔ گویا احصن میں احصان کے معنے شوہروں کی حفاظت میں آنا ہیں اور محصنات میں احصان کے معنے خاندان کی حفاظت میں آنا ہیں ۔ اس فرق پر غور کرنے سے یہ بات بالکل کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ خاندانی عورت کو دو حفاظتیں حاصل ہوتی ہیں ۔ ایک خاندان کی حفاظت جس کی بنا پر وہ شادی کے بغیر ہی محصنہ ہوتی ہے ۔ دوسری شوہر کی حفاظت جس کی وجہ سے اس کے لیے خاندان کی حفاظت پر ایک اور حفاظت کا اضافہ ہو جاتا ہے ۔ بخلاف اس کے کہ لونڈی جب تک لونڈی ہے محصنہ نہیں ہے کیونکہ اس کو کسی خاندان کی حفاظت حاصل نہیں ہے ۔ البتہ نکاح ہونے پر اس کو شوہر کی حفاظت حاصل ہوتی ہے اور وہ بھی ادھوری، کیونکہ وہ شوہر کی حفاظت میں آنے کے بعد بھی نہ تو ان لوگوں کی بندگی سے آزاد ہوتی ہے جن کی وہ ملک میں ہے اور نہ اسے معاشرے میں وہ مرتبہ حاصل ہے جو خاندانی عورت کو حاصل ہوتا ہے ۔ لہٰذا جو سزا دی جائے گی وہ غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کی سزا سے آدھی ہو گی نہ کہ شادی شدہ خاندانی عورتوں سے ۔ نیز یہاں سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ سورۂ کی دوسری آیت میں جس سزا کا ذکر ہے وہ صرف غیر شادی شدہ خاندانی عورتوں کے لیے ہے جن کے مقابلے میں یہاں شادی شدہ لونڈیوں کی سزا نصف بتائی گئی ہے ۔ رہی شادی شدہ خاندانی عورتیں تو وہ غیر شادی شدہ آزاد عورتوں سے زیادہ سخت سزا کی مستحق ہیں کیونکہ وہ دوسری حفاظت کو توڑتی ہیں ۔ اگرچہ قرآن ان کے لیے رجم کی سزا کی تصریح نہیں کرتا ہے لیکن نہایت لطیف طریقہ سے اس کی طرف اشارہ کرتا ہے جو بلید الزہن لوگوں کے ذہن سے مخفی رہ جائے تو رہ جائے لیکن مبوت کے ذہن سے مخفی نہیں رہ سکتا [1]

[1] تفہیم القرآن ۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ جیسے کہ لونڈیوں کے لیے مہراور احصان کی وہی شرطیں مقرر ہوئیں جو آزاد عورتوں کے لیے تھیں تاکہ سوسائٹی کے اندر ان کا معیار اونچا ہو ایسے ہی ارتکاب زنا کی صورت میں ان کے لیے بھی سزا مقرر ہوئی تاکہ بالتدریج ان کا اخلاقی معیار سوسائٹی کے معیار پر آجائے۔ اور پھر دوسرے مالکوں کی لونڈیوں کے ساتھ مسلمانوں کو نکاح کی اجازت بھی اسی پس منظر میں دی گئی ہے کہ اس سے لونڈیوں کا معاشرتی معیار بلند ہو لے[1]

باندیوں سے نکاح میں محتاط رہو

۵۳۔ یہ حکم ان لوگوں کے لیے ہے جن کو اندیشہ ہے کہ شادی نہ کرنے سے برائی میں مبتلا ہو جائیں گے اور صبر کر لینا تمہارے لیے بہتر ہے اور اللہ بڑا ہی بخشنہار اور رحم کار ہے۔ یعنی لونڈیوں سے نکاح کرنے کا ارشاد اور استحسان اسی کے حق میں ہے جو کوئی شخص تم میں ڈرتا ہو مشقت یعنی زنا میں مبتلا ہونے سے اور اگر صبر کرو اور باندیوں سے نکاح نہ کرو تو بہت اچھا ہے تمہارے حق میں کیونکہ اولاد آزاد ہو گی جس کو صبر و تحمل میں کھٹکا ہو تو اس کو بہتر ہے کہ ایسی حالت میں کسی کی لونڈی سے نکاح کرے اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے صبر کرنے والوں پر[2] علامہ بغوی، علامہ نسفی اور علامہ آلوسی نے ذالک کا مشارالیہ باندی سے نکاح بتایا ہے۔

عنت کی لغوی تحقیق

عنت کے معنے علامہ ابن الاثیر نے حسب ذیل لکھے ہیں مشقت، فساد، ہلاکت، گناہ، غلطی، خطا، زنا اور علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں جور، اذیت کا اور اضافہ کیا ہے۔ یہ عَنِتَ یَعنَتُ کا مصدر ہے۔ امام ابوجعفر بیہقی تاج المصادر میں لکھتے ہیں۔ عنت کے معنے گنہگار ہونا، کسی ایسے کام میں پڑ جانا کہ جس سے نکل نہ سکے، کسی چیز سے ہڈی ٹوٹ جانا ارشاد باری العنت منکم میں عنت سے مراد زنا اور بدکاری ہے اور یہ مادہ مشقت کے معنے پر دلالت کرتا ہے، اور علامہ ابوالسعود ارشاد العقل السلیم الی مزایا الکتاب الکریم میں ارقام فرماتے ہیں۔ عنت اصل میں ہڈی کے جڑ جانے کے بعد ٹوٹ جانے جانے کو کہتے ہیں لیکن بعد میں ہر اس مشقت کو اور ضرر کو بطور استعارہ کہنے لگے جو حالت سنور جانے

---

[1] تدبر قرآن [2] افادات شیخ الاسلام

کے بعد انسان کو لاحق ہو اور علامہ ابوحیان اندلسی البحرالمحیط میں اس لفظ کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔ عنت سے مراد زنا ہے چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس، مجاہد، ضحاک، عطیہ عوفی اور عبدالرحمان بن زید نے بھی بیان کیا ہے۔ عنت کے معنے اصل میں مشقت کے ہیں اور زنا کو بھی عنت اسی مشقت کی بنا پر پڑا ہے کہ جو دُنیا و آخرت میں زانی کو اس فعل کے نتیجہ میں اٹھانی پڑتی ہے۔ مبرد کا بیان ہے کہ اصل میں عنت یہ ہے کہ عشق اور شہوت آدمی کو زنا پر مجبور کرے اور پھر آخرت میں اس کی سزا پاتے اور دُنیا میں اس پر حد لگائی جاتے۔ ابوعبیدہ اور زجاج نے عنت کے معنے ہلاکت کے کیے ہیں اور کچھ لوگوں نے اس کا ترجمہ حد کیا ہے اور کچھ نے ایسا گناہ جو غلبہ شہوت کی بنا پر ہو۔ اور امام ابوبکر عزیزی سجستانی نے نزہتہ القلوب میں بسندِ متصل مبرد سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ اہل عرب کے نزدیک عنت کے معنے طاقت سے زیادہ تکلیف اٹھانے کے ہیں۔ اور امام ابن جریر طبری اس آیت کی تفسیر میں اختلاف اقوال نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں۔ صحیح قول اس بارے میں یہ ہے کہ ارشاد باری ذالک لمن خشی العنت میں عنت سے مراد دینی اور بدنی ضرر ہے کیونکہ عنت کہتے ہیں اس چیز کو جو انسان کو ضرر پہنچانے۔ چنانچہ عنت فلاں کا استعمال ایسے کام کے لیے ہوتا ہے جو دین یا دُنیا میں ضرر رساں ہو۔ اسی معنے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے وددوا ما عنتم۔ بعض نے عنت کے معنے ہلاکت بتائے ہیں۔ بہرحال جو لوگ اس کی تاویل میں زنا کے معنے لیتے ہیں۔ وہ یہ کہتے ہیں کہ زنا ایک دینی ضرر ہے جو عنت میں داخل ہے اور جو لوگ اس کی توجیہ میں گناہ کا ترجمہ کرتے ہیں وہ یہ بیان کرتے ہیں کہ گناہ سب کے سب چونکہ دین کے لیے ضرر ہیں اس لیے عنت ہیں۔ اور جو اس کی تشریح میں عقوبت کے معنے بیان کرتے ہیں یعنی وہ شرعی حد کہ جو بدن کو ضرر پہنچاتی ہے وہ یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ حد محدود کے بدن کے لیے ضرر رساں ہے اس لیے وہ عنت ہے اور اللہ تعالیٰ نے جو لمن خشی العنت منکم فرمایا ہے اس میں عنت سب معانی کو عام ہے اور یہ سب معانی زنا میں موجود ہیں۔ کیونکہ زانی کو دُنیا میں سزا اس کی درجہ سے ایسی شدید ملتی ہے جو اس کے بدن کے لیے سخت ضرر رساں ہے اور پھر دین و دُنیا میں اس کا گناہ اور مضرت علیحدہ۔ نیز تمام مفسرین کا جو تفسیر کے اہل ہیں اس پر اتفاق ہے کہ یہاں عنت کے معنے زنا ہی کے ہیں۔ اس لیے کہ زنا کو ذاتی طور پر لذت اور تقاضائے شہوت ہے لیکن چونکہ وہ عنت کا سبب ہے لہٰذا اس کے ارتکاب کو عنت کی طرف منسوب اور اس سے موصوف قرار دیا گیا ہے[1]

---

[1] لغات القرآن

اکثر شارحین قرآن میں سے شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین، حضرت شیخ الہند نے مشقت اور تکلیف کے معنے کیے ہیں۔ مولانا اشرف علی اور مفتی شفیع نے زنا کے معنے بتائے ہیں۔ مولانا آزاد نے نقصان اور برائی کے اور مولانا مودودی نے بند تقویٰ ٹوٹ جانے کے معنے بتاتے ہیں۔ معنے خواہ کچھ ہوں آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہ باندیوں سے نکاح کی اجازت صرف ان کے لیے ہے جن کو یہ اندیشہ ہو کہ نکاح نہ کرنے کی صورت میں ان سے زنا کا ارتکاب ہو جائے گا۔ اگر خواہش نفس کا اتنا غلبہ نہیں ہے جس سے حرامکاری میں پڑنے کا فوری اندیشہ ہو رہا ہو تو پھر کنیزوں سے نکاح کرنے کے مقابلے میں بہتر یہی ہے کہ خود خواہش نفس پر قابو حاصل کر لیا جائے۔

اسلام میں متعہ کی گنجائش نہیں ہے

یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر قرآن کے نقطہ نظر سے متعہ روا ہوتا اور نبوت نے اس کی اجازت دی ہوتی تو قرآن کو نکاح پر اس قدر پابندیاں عائد کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ جب آپ کے پاس تقضائے شہوت کا یہ آسان ذریعہ موجود ہے تو پھر اندیشہ گناہ کا خطرہ ہی بے معنے ہے۔ دراصل متعہ کا جواز قرآن کی روح سے تصادم ہے۔ بات نامکمل رہ جائے گی اگر ہم اس کے مقاصد کو نظر انداز کر دیں۔

یہ حقیقت ہے کہ ابتدائے آفرینش عالم سے لے کر اب تک سوائے اہل تشیع کے کسی مذہب سماوی میں متعہ کا جواز نہیں ملتا یعنی یہ کہ مرد و عورت کے جنسی روابط ایک سال ایک ماہ ایک ہفتہ ایک دن ایک گھنٹہ کے لیے معاوضہ دے کر قائم کیے جائیں۔ اگر یہ متعہ جائز ہو اور اس کی اجازت ہو جائے تو

اوّلاً نسب مخلط اور مشتبہ ہو کر رہ جائے آدمی یقین کے ساتھ نہ کہہ سکے گا کہ ممتوعہ کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ کس کا ہے؟

ثانیاً، ممتوعہ پر دسترس شرعی قانون میں کسی کو حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ کسی کے ساتھ باضابطہ اس کا نکاح نہیں ہے نتیجہ یہ ہوگا کہ ممتوعہ عورت کے گاہک بہت زیادہ ہوں گے اور اس پر قبضہ کرنے کی ہر شخص کوشش کرے گا اور وجہ ترجیح کسی کو حاصل نہ ہوگی اور پھر اس راہ سے تباہیوں اور بربادیوں کے جو طوفان اٹھتے رہتے ہیں، معاشقہ اور آوارگی کی تاریخوں میں اس کا مطالعہ کیا جا سکتا ہے۔

ثالثاً، متعہ والی عورت کو متعہ کی لت پڑ جاتی ہے طبع سلیم رکھنے والے مرد کو ایسی عورت سے گھن معلوم ہوتی ہے، پھر نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کوئی سلیم الطبع اس سے شادی تک کرنے کو تیار نہیں ہوتا۔ محبت و الفت دُور کی بات ہے۔

رابعاً متعہ کا دروازہ جب کھل جاتا ہے تو کوئی مستقل قاعدہ اور قانون نہیں رہتا تو پھر کسی خاص مرد کو خاص عورت سے لگاؤ نہ رہے گا جس کو جہاں موقعہ مل گیا ناتم اور اُجرت مقرر کرنے کے بعد جو کچھ کرنا ہو گا کر گزریں گے۔ یہی حال زنا کا ہے پھر عفت اور پاکدامنی کا تصور کیا ہوگا۔

خامساً، عورت سے صرف یہی مقصد نہیں کہ اس سے جنسی تقاضا پورا کیا جائے بلکہ مقصد یہ بھی ہے کہ دو جان مل کر ایک دوسرے کے رفیق ہوں۔ گھر کے کاموں میں بھی، کھانے پینے میں بھی، بچوں کی تعلیم و تربیت میں بھی اور زندگی کی دوسری ضروریات میں بھی، پھر غم میں بھی خوشی میں بھی، اور یہ ساری باتیں اس وقت تک ممکن نہیں جب تک عورت کسی ایک کی جائز طریقہ پر ہو کر نہ رہے۔ متعہ میں یہ چیز ناپید ہے وہ ہے ہی مساجرہ یعنی کرایہ پر وقتی طور پر لائی ہوئی۔

يُرِيدُ اللّٰهُ لِيُبَيِّنَ لَكُمْ وَيَهْدِيَكُمْ سُنَنَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ
وَيَتُوْبَ عَلَيْكُمْ ۚ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ اَنْ يَّتُوْبَ
عَلَيْكُمْ ۚ وَيُرِيْدُ الَّذِيْنَ يَتَّبِعُوْنَ الشَّهَوٰتِ اَنْ تَمِيْلُوْا مَيْلًا عَظِيْمًا ۝
يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّخَفِّفَ عَنْكُمْ ۚ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ۝

اللہ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے تمہارے دین کے قوانین واحکام بیان کرے اور۔ چاہتا ہے کہ تمہیں ان لوگوں کے طریقوں پر چلا دے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور۔ اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنی رحمت کے ساتھ توجہ فرمائے اور اللہ تمہاری مصلحتوں کو خوب جاننے والا اور اپنے تمام احکام میں حکمت و دانائی والا ہے[۵۴]۔ اور اللہ کا ارادہ ہے کہ تم پر رحمت کے ساتھ لوٹ آئے اور وہ لوگ جو نفسانی خواہشوں کے پیروکار ہیں چاہتے ہیں کہ تم راہِ حق سے دُور ہٹ جاؤ[۵۵]۔ اور اللہ کا ارادہ ہے کہ تمہارے لیے نرمی و آسانی ہو۔ اور

واقعہ یہ ہے کہ انسان کمزور بنایا گیا ہے۔ ۵۱

نزولِ شرائع کا مقصد

ان آیات میں اسلامی قانون کے اغراض و مقاصد پر روشنی ڈالی گئی ہے گویا یہ آیات مالیاتی اور معاشرتی احکام بیان کرنے کے بعد اٹھے ہوئے سوالات کا جواب ہیں۔ سوال ہوا تھا کہ ان احکام وضوابط کا فائدہ اور ان کی حکمت کیا ہے؟ ہمارے پیشرو بھی اس قسم کے قوانین وضوابط کے ذمہ دار ٹھہرائے گئے تھے اور جو کچھ آج ہم سے کہا جا رہا ہے اس کی ماضی کے مقابلے میں حیثیت کیا ہے؟ یہ تشدید ہے یا تخفیف۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ تمام احکام وقوانین جو تمہارے لیے بیان ہو رہے ہیں تو ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ فلاح و سعادت کی جو راہ تم سے پہلے سب نیک انسانوں پر کھول گئی ہے وہ تم پر کھل جائے اور اس طرح ایک ایسا مستقل نظام فکر و عمل اور ایک ایسا مکمل نظام تہذیب تم کو عطا کر دیا جائے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

ان آیات میں یہ بات کھول کر سمجھائی گئی کہ اسلامی احکام و قوانین کا بنیادی مقصد افراد کی تکمیل ذات اور انسان کی اجتماعی خودی کی نشو ونما ہے۔ فرد کی تکمیل ذات اور اجتماعی سیرت کی تشکیل و تعمیر ایک ایسا مقصد ہے جس سے سیاسی ترقی اور معاشی فارغ البالی کا مقصد خود بخود حل ہو جاتا ہے کیونکہ انسانی شخصیت کا نشو ونما زندگی کی ایک ایسی حالت پر موقوف ہے، جس میں افراد کی حقیقی اور لابدی ضروریات پوری ہوں، اور پھر چونکہ اسلامی قوانین کا مقصد انسان کی تکمیل ذات اور اس کی اجتماعی خودی کا نشو ونما ہے۔ اس لیے وہ مادی زندگی کی ضروریات سے قطع نظر نہیں کر سکتا۔ اس کے فرائض میں سے اہم فرض یہ ہے کہ وہ مملکت کی معاشی تنظیم کرے۔ اسی طرف بعد کی آیت میں اشارہ ہے۔ اس طرح اسلامی قانون خارجی زندگی اور اس کے مختلف شعبوں کی اصلاح کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ وہ انسان کی حیات خارجی ہو یا اس کی باطنی زندگی دونوں کی بیک وقت اصلاح چاہتا ہے۔ کیونکہ خارج و باطن دونوں ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کی اصلاح بغیر اس کے ممکن نہیں کہ دوسرے کی بھی اصلاح کی جائے۔ انسانی زندگی کے کسی شعبہ کو درست نہیں کیا جا سکتا جب تک خود انسان کا نفس بھلائی کی طرف مائل نہ ہو جائے

اور اگر انسان کا نفس خود خواہشوں کا پرستار ہو کر رہ جائے جیسا کہ ویرید الذین یتبعون الشھوات سے اشارا ہو رہا ہے تو تمدن کی تمام اصلاحی کوششیں، معاشرتی زندگی کو درست کرنے کی ترکیبیں اور سیاسی نظام کا تغیر و تبدل بیکار محض ہے۔ جب تک کہ افراد میں بھلائی کی طرف میلان نہ ہو تمدنی زندگی امن و مسرت سے ناآشنا رہے گی۔ قرآن نے لیبین لکم کا مفعول حذف کر کے اس طرف اشارا کیا ہے۔ الجصاص نے ٹھیک لکھا ہے کہ وہ تمام احکام اللہ سبحانہٗ ہمارے لیے بیان کرتا ہے جن کی معرفت کے ہم محتاج ہیں الفاظ یہ ہیں مَا بِنَا الْحَاجَۃُ الی مَعرِفَتِہٖ ،

۵۴۔ اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ تمہارے لیے تمہارے دین کے قوانین و احکام بیان کرے اور چاہتا ہے کہ تمہیں ان لوگوں کے طریقوں پر چلائے جو تم سے پہلے گزر چکے ہیں اور اللہ چاہتا ہے کہ تم پر اپنی رحمت کے ساتھ توجہ فرماتے اور اللہ تمہاری مصلحتوں کو خوب جاننے والا اور اپنے تمام احکام میں حکمت والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو ان احکام کے ارشاد سے مطلوب یہی ہے کہ تم کو حلال اور حرام کا علم ہو جائے اور تم کو پہلے انبیاؑ کا راستہ نصیب ہو جیسے حضرت ابراہیم وغیرہ اور مغفرت کرے تمہاری اور اللہ کو تمہارے مصالح اور تمام حالات کا پورا علم ہے اور اس کے ہر حکم، ہر تدبیر میں حکمت ہے تو اب اگر اس کے حکم کی اطاعت نہ کرو گے تو ہدایت سے محروم رہو گے اور پہلوں کے بھی مخالف اور اللہ کی رحمت و مغفرت سے بھی محروم رہو گے پہلے سے زنا اور لواطت کی حرمت اور ان سے توبہ کرنا اور عورتوں کے متعلق بعضے احکام اور جن عورتوں سے نکاح حرام ہے ان کا ذکر اور نکاح کے متعلق مہر وغیرہ قیود و شرائط کا تذکرہ اور بدکاری سے ممانعت اور اس پر سزا کا ذکر تھا اور بچند وجوہ لوگوں کو ان کی طاعت دشوار تھی۔ اس لیے اس آیت میں اور آئندہ کی دو آیتوں میں ان احکام کی پابندی کو خوب موکد اور مستحکم کر کے مخالفت سے روک دیا[1]

سورت کے آغاز سے یہاں تک جو ہدایات دی گئی ہیں اس سورت کے نزول سے پہلے سورۂ بقرہ میں تمدن و معاشرت کے متعلق جو ہدایات دی جا چکی تھیں ان سب کی طرف بحیثیتِ مجموعی اشارا کرتے ہوئے فرمایا کہ یہ معاشرتِ اخلاق اور تمدن کے وہ قوانین ہیں جو اللہ سبحانہٗ تمہارے سامنے بیان کر رہا ہے اور یہ قوانین بقول الجصاص ہماری ان ضرورتوں سے متعلق ہیں جن کی معرفت کے ہم محتاج ہیں اور یہ بیان دو طرح سے ہے منطوق کی راہ سے اور مدلول کے ذریعے اور یہ وہ قوانین ہیں جن پر قدیم زمانہ سے ہر دور کے انبیاؑ اور ان کے پیرو کار عمل کرتے چلے آتے ہیں اور یہ اللہ کی مہربانی ہے کہ وہ تم کو ہدایت

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کی حالت سے نکال کر صالحین کے طریقۂ زندگی کی طرف تمہاری رہنمائی کر رہا ہے۔[۱]

نجاتِ عالم کے لیے اُمت کا انتخاب

گویا سمجھایا گیا ہے اور ملکہ تمہارے لیے پر زور دے کر بتایا گیا ہے کہ تم دُنیا میں اس لیے روانہ کیے گئے ہو کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے لیے اپنی آیتیں اور اپنے احکام و ہدایات بیان فرمائے اور انبیاء سابقین کے ذریعے ایمان و عمل کی جو راہیں دُنیا کے لیے کھولی گئی تھیں ان کی تمہیں ہدایت بخشے تاکہ تم اس سے وفاداری ظاہر کرو اور اللہ تم پر مہربان ہو۔ اس بات کو قرآن نے اللہ کے ارادے اور فیصلہ سے تعبیر فرمایا ہے اس لیے کہ آخری نبوت کے ذریعے ایک ایسی اُمت کو وجود میں لانا مقصود ہے جو دُنیا میں نبوت کی نیابت کر سکے اور پورے دین کی حامل اور تمام انبیاء کی وارث ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ اللہ سبحانہٗ نے تمام عالم کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا تھا اور اس بنا پر ایک ایسی کامل شریعت عطا کی جو نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کے لیے ابد تک کافی ہے لیکن کوئی شریعت کوئی قانون، کوئی دستور اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو اور جس کی ہر بات ہر ادا، ہر جنبش عملی خطیب بن کر گرد و پیش کو اپنا ہم زبان اور ہم عمل بنائے۔ اس بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاحِ عالم کے لیے تیار کرنا تھا۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر عالمی دعوت کا علمبردار ہو کر آتا ہے وہ علاوہ ان اُصول کے جو دوسرے انبیاء لے کر آئے کچھ نئے اُصول اختیار کرتا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں رقمطراز ہیں :

> وہ ایک قوم کو سنت راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور ان کو دُنیا میں پھیلاتا ہے اور ان کو ذریعہ بنا کر محنت کرتا ہے قرآن کی اس آیت کنتم خیر اُمۃ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

دُنیا کی تمام قوموں میں اس پیغمبرانہ کام کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی۔ ایران تین ہزار سال ناز و نعم میں پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا۔ رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے۔ ہندوؤں کا دل و دماغ صرف وہم پرستی کا کام دینے کے قابل رہ گیا تھا۔ صرف ایک عرب تھا جو بن جوتی زمین کی طرح نشوونما کے مادے سے لبریز تھا اور ایک لوحِ سادہ کی طرح ہر قسم کی نقش آرائیوں کے قابل تھا۔

---

[۱] تفہیم

مشیت ایزدی نے اسی کو تاکا اور یرید اللہ لیبین لکم کا تاج ان کے سر پر رکھا اور فلاح و سعادت کی وہ راہ جس پر انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین چل چکے تھے وہ ان پر کھول دی و یھدیکم سنن الذین من قبلکم اور بالآخر ان کی اس دعا کو شرفِ قبول عطا فرمایا جسے وہ تڑپ تڑپ کر مکی زندگی کی پُرآشوب نمازوں میں اور نماز کی ہر رکعت میں دہراتے تھے اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین اور اس راہ پر تمہیں چلا کر اللہ چاہتا ہے کہ اپنی رحمت تمہارے لیے عام کر دے اور زمانۂ جاہلیت میں تم سے جو معاشرتی، معاشی، سیاسی اور فکری کوتاہیاں تم سے ہو چکیں علم صحیح اور عمل حسن کے ذریعے تمہاری توبہ قبول کرے و یتوب علیکم اور اللہ دنیا کی ساری قوموں کو خوب جاننے والا اور اپنے فیصلوں میں حکمت رکھنے والا ہے۔

ہدایت عالم کے کام کے لیے اللہ کا فیصلہ

۵۵۔ اور اللہ کا ارادہ ہے کہ تم پر رحمت کے ساتھ لوٹ آئے اور وہ لوگ جو نفسانی خواہشوں کے پیرو کار ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہِ حق سے دور ہٹ جاؤ۔ یعنی یہ مختلف قیدیں جو اوپر گزریں اس سے مطلوب تم پر رحمت فرمانا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان قیدوں کی نسبت حکم فرمایا۔ اور جو لوگ اپنی شہوتوں پر فریفتہ ہیں وہ البتہ یہی چاہتے ہیں کہ تم سیدھے راستہ سے دور جا پڑو یعنی انہی کی طرح تم بھی اپنی شہوت کا اتباع کرو اور گمراہ ہو جاؤ تو اب جو کچھ کرو سوچ سمجھ کر کرو۔[1]

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں ایک یہ کہ اللہ سبحانہ تم سے عالم کی ہدایت کا کام لینا چاہتا ہے دوسری یہ کہ اس کام میں سب سے بڑی رکاوٹ وہ طبقات ہیں جو احکام حق کی جگہ نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہیں۔ اللہ سبحانہ کا یہ ارادہ کیسے ظہور میں آیا اور واللہ یرید ان یتوب علیکم نے وجود کا لبادہ کیسے پہنا۔ نبوت کی محکم پیغمبرانہ تعلیم اور قرآن حکیم کے ذریعے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جانِ بلب انسانیت میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی، انسانیت کے وہ ذخائر جو خام اشیاء کی صورت میں پڑے ہوتے تھے جن کی افادیت اور مصرف کی کسی کو خبر نہ تھی اور جن کو جہالت کفر نے برباد کر رکھا تھا۔ آپ نے ان کی زندگی کا رُخ بدل دیا۔ اس میں اللہ کی مدد سے ایمان و عقیدہ پیدا فرمایا۔ زندگی کی نئی روح پھونک دی، دبی ہوئی صلاحیتیں ابھار دیں اور اندرونی استعدادیں اجاگر کر دیں۔ آپ کی تربیت

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نے انہیں کندن بنا دیا تھا کنتم اور علیکم سے جن کو مخاطب کیا جا رہا ہے اور جن کے لیے اللہ نے رحمت کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ انسانیت کی پوری تاریخ میں بہترین انسانی معاشرہ ثابت ہوا جو دلکش، کامل اور تمام انسانی محاسن سے آراستہ تھا۔ اس معاشرے کا تعارف اس آیت کا یہ ایک ٹکڑا کرا رہا ہے۔ واللہ یرید ان یتوب علیکم یہ فقرہ اگرچہ بے حد مختصر مگر بہت زیادہ بلاغت والا، ہمہ گیر، معنے خیز اور وسیع امکانات رکھنے والا ہے۔ جب اس معاشرے کا کسی اور معاشرے سے مقابلہ کیا جائے گا، تو بحیثیت مجموعی اور انفرادی اس کا پلہ بھاری نکلے گا۔ اس فقرے میں اس کے عظیم کام اور اس کے بلند مقام کو بتایا جا رہا ہے۔

راستہ کی مشکلات

دوسرے فقرے میں اس راہ کی مشکلات کو بتایا ہے۔ ارشاد ہے ویرید الذین یتبعون الشھوات ان تمیلوا میلا عظیما، جو لوگ احکام حق کی جگہ اپنی نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ تم راہ اعتدال سے ہٹ کر دُور جا پڑو۔ یہ نفسانی خواہشوں کے پیچھے پڑنے والے کون ہیں اور یہ نفسانی خواہشیں کیا ہیں؟ مولانا اشرف علی فرماتے ہیں "شہوت پرست لوگوں سے بقول ابن زید مراد فساق ہیں اور بقول ابن عباس مراد زانی اور بقول سدی مراد یہود و نصاریٰ ہیں اور بقول بعض صرف یہودی ہیں[1] قرطبی نے عموم کی وجہ سے ابن زید کی رائے کو زیادہ صحیح قرار دیا ہے اور آلوسی نے بھی اسے اپنایا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہدایت عالم کا جو کام اللہ نے تمہارے سپرد کیا ہے اس کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ یہ لوگ ہیں اور ان کی خواہش ہے کہ تم اس کام سے ہٹ جاؤ۔ یہ لوگ یہودی ہوں یا عیسائی، فساق ہوں یا مجوسی ان کی اخلاقی حالت اتنی پست ہو چکی تھی کہ ان میں معاشرتی زندگی میں محرمات کا بھی امتیاز نہ رہا تھا۔ باپ کا بیٹی سے اور بھائی کا بہن سے شادی کر لینا معمولات زندگی میں سے ہو گیا تھا۔ ان میں انسانی مساوات کا کوئی تصور نہ تھا۔ ہر ادنیٰ اپنے سے اعلیٰ کا غلام تھا۔ بادشاہوں اور امیروں کو خدائی کا مرتبہ حاصل تھا۔ رعایا ان کے سامنے سجدے کرتی تھی اور ان کی ثنا و صفت کے گیت گاتی تھی۔

سب سے پہلے مزدک نے انسانی مساوات کا تصور پیش کیا مگر اس شکل میں کہ دولت اور عورت کو تمام

---

[1] بیان القرآن

انسانوں کا اشتراکی سرمایہ قرار دیا اس لیے ہوس رانوں میں یہ مذہب بہت مقبول ہوا، سرکاری سرپرستی بھی اسے حاصل ہوگئی۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پوری قوم ہوس رانی اور سرمستی میں غرق ہوگئی۔ اور اس سے پوری عرب دنیا متاثر ہوئی۔

عورتوں کی حد تک زنا اور فسق و فجور ان میں عام ہوگیا تھا اور یہ واقعات فخریہ اشعار میں بیان کرتے تھے اور یہ اشعار عرب کے بچہ بچہ کی زبان پر ہوتے تھے۔ کوئی شجاع اور بہادر آدمی ہوتا تو اپنی عورت کو اس کے پاس روانہ کر دیتے کہ اس سے ہم بستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی اوصاف آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے۔ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس سے زیادہ نہیں ہوتی تھی کسی عورت کے پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے جب وہ حاملہ ہوتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلوا بھیجتی اور کسی ایک سے کہتی کہ یہ بچہ تمہارا ہے، اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا ___ فاحشہ عورتیں جو سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کا لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس بلوا بھیجتیں۔ وہ صورت شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے۔ عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔ ایک اور رسم جاری تھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مقررہ مدت کے لیے نکاح کرتے مدت گزرنے پر اس کو اجرت دے کر روانہ کر دیتے اس کو متعہ کہتے تھے۔

مالیات کی حد تک عرب کا ذریعہ معاش عموماً قافلوں پر حملہ آوری، سلب اموال اور رہزنی تھا ٹھگی، رہزنی اور سرقہ تمام ملک میں پھیل گیا تھا یہاں تک کہ بڑے بڑے نامور شعراء چور اور رہزن ہوتے تھے۔ اکثر بڑے بڑے جتھے اس لیے قائم ہوتے تھے کہ بجائے جو ملک میں پھر کر غلہ کی تجارت کرتے تھے ان کو لوٹ لیا کریں۔ زندگی میں آبرو اور مال کی حد تک انسان کی یہی بے راہ روی اختیار کرنے والے لوگ الذین یتبعون الشھوات کا مصداق ہیں اور ان کو ہی وہ اصلاحات سخت ناگوار تھیں جو تمدن و معاشرت میں قرآن کرنا چاہتا تھا۔ میراث میں لڑکیوں کا حصہ پانا، سوتیلی ماں سے نکاح حرام ہونا، دو بہنوں کا نکاح میں یکجا ہونا، ملک یمین پر پابندیاں لگنا، عام عورتوں سے نکاح پر قیدیں ہونا، رضاعت قرابت، مصاہرت کی بنا پر عورتوں کا حرام ہونا، منکوحہ عورتوں کی تعداد کا مقرر ہونا، کسی عورت کا دوسرے کی منکوحہ ہونا، عورتوں کے باب میں وہ پابندیاں ہیں جو ان شہوت رانوں کے لیے ناقابل برداشت تھیں۔ اسی بنا پر یہ طبقے ان معاشرتی اصلاحات کی وجہ سے جھاڑ کے کانٹوں کی طرح اہل ایمان کے پیچھے پڑ گئے معاشرتی اصلاحات کو مفاد پرست طبقہ برداشت نہ کرتا تھا۔ اس وجہ سے یہود و نصاریٰ اور آوارگی پسند طبقات میں ان اصلاحات سے ایک آگ لگ گئی، جس طبقہ نے بھی دیکھا کہ ان اصلاحات کی زد ان کی بے لگام

آزادیوں اور بے قید شہوت پرستیوں پر پڑ رہی ہے وہ اس ارادے کے ساتھ اٹھ کھڑے ہو گئے کہ ان تمام اصلاحات کو ناکام کر کے اللہ کے بندوں کو پھر اسی تاریکی میں دھکیل دیں گے جس سے نجات دینے کے لیے اسلام نے یہ روشنی دکھائی تھی۔ قرآن نے ان سب کے جواب میں مسلمانوں کو بتایا کہ تم ان مخالفوں کی ہفوات کی پرواہ نہ کرو۔ انبیاء سابقین اور اسلاف صالحین کی اصلی وراثت یہی ہے جو تمہاری طرف منتقل ہوئی ہے۔ خدا تمہیں اپنی رحمت سے نوازنا چاہتا ہے لیکن یہ اشرار و مفسدین یہ چاہتے ہیں کہ تمہیں اس رحمت سے محروم کر دیں [1]

اُمت کی مخصوص ذمہ داری

پہلی آیت قرآنی نے جہاں یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ اس اُمت کی ذمہ داری یہ ہے کہ پورے عالم کی نجات کا سامان کرے جس کا عملی نمونہ اس کے رسُول نے اس کے سامنے رکھ دیا۔ پہلی آیت میں لیبین لکم کے انداز پر غور کریں تو یہ حقیقت خود بخود الم نشرح ہو کر سامنے آجائے گی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پوری دُنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی تھے لیکن اس عالمگیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی عملی صورت اللہ تعالیٰ نے یہ متعین فرمائی ہے کہ آپ اپنا قائمقام ایک ایسا گروہ تیار کر دیں جو اپنے ایمان میں اتنا پختہ اور اپنے عمل میں اتنا معیاری مسلم ہو کہ آپ کے بعد آپ ہی کی طرح دعوت کا کام کرے ایسے ہی اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اس کام میں بہت بڑی مشکلات اور رکاوٹیں بھی ہیں۔ اور یہ مشکلات ان لوگوں کی جانب سے ہیں جو اس زندگی میں اپنی چاہتوں کو اپنا نصب العین بناتے ہیں۔ یہ ہر دور میں مختلف رہے ہیں۔ قرآن نے یہاں الشہوات جمع لا کر اشارا کر دیا ہے کہ یہ چاہت ایک نہیں مختلف ہیں۔ قرآن نے الشہوات کی تشریح دوسرے موقعہ پر النساء عورتوں البنین اولاد نرینہ، الذهب والفضۃ سونا چاندی کے انبار، الخیل المسومہ نشان زدہ اصل گھوڑے الانعام مویشی، اور الحرث کھیتی سے کی ہے۔ جیسا کہ آپ تیسرے پارے میں پڑھ چکے ہیں۔ یہ الشہوات ہی دین حق کے راستہ میں رکاوٹیں ہیں۔ یہاں ارادے دونوں موجود ہیں۔ ایک ارادہ الٰہی ہے کہ اُمت کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں اور پوری اُمت اپنی اجتماعی حیثیت میں ہدایت ربانی اور پیغام نبوت کی ترجمان ہو انہیں توحید، آخرت، رسالت پر گہرا یقین ہو اور یہ یقین ان کے ایک ایک عمل سے

---

[1] تدبر قرآن

ظاہر ہو۔ ان کے اخلاق وہ ہوں جن کی قرآن نے تلقین کی ہے۔ ان کے معاملات انہی خطوط پر انجام پائیں جو قرآن نے بتا دیئے ہیں ان کی معاشرت، ان کی معیشت اور ان کی سیاست غرض ان کی زندگی کا پورا نظام اور اس نظام کا ایک ایک شعبہ واللہ یرید ان یتوب علیکم کا مصداق ہو اور شہوت کے پرستاروں کی جانب سے اس راہ میں جو بھی رکاوٹ بن کر آئے اور جس نام سے بھی آئے اسے ہٹانے کے لیے سرتوڑ کوشش کی جائے خواہ یہ رکاوٹ ڈارون کے نظریہ ارتقا کا نام لے کر آئے اور خواہ میکڈوگل کا نظریہ جبلت اور چاہے فرائڈ کا نظریہ جنسیت اور ریڈلر کا نظریہ حب تفوق اور پھر چاہے کارل مارکس کا نظریہ اشتراکیت ہو یا کلیاولی کا نظریہ قومیت و وطنیت ہو۔ یہ سب الذین یتبعون الشہوات ہیں۔ یہ سب چاہتے ہیں کہ اہل ایمان راہ حق سے ہٹ جائیں۔ وہاں بھی یہود، مجوس اور نصاریٰ تھے۔ یہاں بھی وہی ہیں فرق ہے تو صرف لبادوں کا ہے۔ اللہ کا ارادہ اپنی پوری جامعیت اور کاملیت کے ساتھ عرب کی سرزمین میں جلوہ فگن ہوا۔ اور ایک جماعت نے اپنا نصب العین عالم مثال اور فکر و نظر کی دنیا ہی میں نہیں اسی عالم آب و گل میں ارادہ الٰہی کو بنایا اور اسے حاصل کر کے ایک مادی حقیقت بنا دیا۔ تاریخ ایسی کسی دوسری مثال سے یکسر خالی ہے کیونکہ دنیا میں نصب العینی حالت کا قائم ہونا مشکل ہے۔ حضور انور اور خلفاء راشدین کے بعد اگرچہ اسلام تصور کی حیثیت سے اتنا ہی مکمل تھا لیکن عمل کی دنیا میں اس کی کامل و مکمل تصویر نہ رہی۔ نتیجہ یہ ہے کہ دنیا کے تمام نظامات سے کُلاً برتر اور بلند بلند ہونے کے باوجود وہ اپنی نصب العینی حالت سے نیچے گر گیا اور اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ الذین یتبعون الشہوات سے تصادم کی وجہ سے اس نظام کے بعض پہلو دب جاتے ہیں یا اس کا کوئی خاص جز عام احساس کے دائرے سے خارج اور اہل فکر کی نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہے اس نوبت پر متبعین شہوات کا طبقہ اپنی فطری بے اعتدالی اور غلو کے ساتھ اس نظام سے ٹکراتا ہے اور اس تصادم سے اسلامی نظام کا وہ پہلو جو عام نظروں سے چھپ گیا تھا برابر آتا ہے لیکن جو پہلو اس طرح ابھرتا ہے وہ ان تمام قیود کے ساتھ ابھرتا ہے جو اسلام نے اس پر عائد کر رکھی ہیں نہ کہ اس غلو اور بے اعتدالی کے ساتھ جو اتباع شہوات کا خاصہ ہے یہاں صرف ایک مثال پر اکتفا کرتا ہوں۔ اسلام نے معاشی امور کو خاصی اہمیت دی ہے اور اس حقیقت کو ملحوظ رکھا ہے کہ معاشی نظام کی ابتری اور اقتصادی پستی خود مذہب و اخلاق کے لیے مہلک ہے۔ نظری حیثیت سے یہ عنصر اسلام میں ہمیشہ سے موجود رہا اور مسلمانوں کی غفلت کے باوجود اس کا غیر شعوری اثر اسلامی زندگی پر پُر اثر مرتب ہوتا رہا لیکن صدیوں سے اسلام کا یہ پہلو مسلمان مفکرین نے بالکل فراموش کر دیا تھا۔ اب گزشتہ دو برس سے جب سے مغرب کے متبعین شہوات نے معاشی امور کو انسان کی زندگی میں غالب اہمیت دینا شروع کیا اور نئی نئی تحریکات پیدا ہوئیں جنہوں

نے معاشی زندگی پر غیر متوازن زور دیا۔ اسلامی نظام کا یہ پہلو جو سطح کے نیچے دبا ہوا تھا پھر نگاہوں کے سامنے آگیا۔
لیکن اس میں الذین یتبعون الشھوات جیسی بے اعتدالی نہیں ہے۔ معاشی زندگی کو مناسب اہمیت دینے کے باوجود کوئی مسلمان یہ یقین نہیں کر سکتا کہ محض اس زندگی کی اصلاح سے دنیا کی تمام خرابیاں دور ہو جائیں گی۔ اسلام نے معاشی امور کو اہمیت ضرور دی ہے لیکن انہیں اخلاقی اصولوں کے تابع رکھا ہے نہ یہ کہ اخلاق و مذہب کو معاشی امور کا تابع بنا دیا ہو۔ بہر حال متبعین شہوات کا وجود اس اعتبار سے اسلام کے لیے ضروری ہے کہ اس کے خلاف کشمکش کرنے سے اسلامی نظام اپنے اندرونی امکانات کو بروئے کار لاتا ہے۔ یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہے گا جب تک اسلام اپنی پوری کاملیت اور ہمہ گیری کے ساتھ ایک بار پھر دنیا پر نہ چھا جائے اور دوبارہ اپنی نصب العینی حالت کو نہ پائے۔

عقلِ انسانی خود اپنے لیے قانون نہیں بنا سکتی

۵۶۔ اور اللہ کا ارادہ ہے کہ تمہارے لیے نرمی اور آسانی ہو۔ اور واقعہ یہ ہے کہ انسان کمزور بنایا گیا ہے یعنی انسان کو اللہ نے ضعیف بنایا ہے اس کو خوب معلوم ہے کہ یہ اپنی شہوات و مرغوبات سے کہاں تک صبر کر سکتا ہے تو اس لیے ہر حکم میں تخفیف کا لحاظ فرمایا گیا ہے۔ یہ نہیں ہوا کہ انسان کے حق میں جو کچھ مفید دیکھا وہ اس کے ذمہ لگا دیا آسان ہو یا سخت مثلاً عورتوں اور شہوت سے صبر کرنا آدمی کو بہت شاق تھا اس لیے اس کی خواہش کو پورا کر لینے کے لیے طریقے جائز اللہ نے بتا دیے کہ اس سے اپنا مطلب حاصل کر سکیں۔ یہ نہیں کہ قضائے شہوت سے بالکل روک دیا ہو۔ حق تعالیٰ نے اپنی شریعت میں تنگی نہیں رکھی کہ کوئی حلال کو چھوڑ کر حرام کی طرف دوڑے۔ خلاصہ ان آیات کا یہ نکلا کہ نفس کو شہوات سے بچانا اور ان تمام قیدوں کا پابند ہونا جو عورتوں کے باب میں مذکور ہوئیں۔ ہرگز دشوار نہیں ہے اور ان کی پابندی نہایت ضروری اور مفید ہے[1]

دراصل اس آیت میں قانون کے بارے میں مہمات معارف پیش کیے گئے، مثلاً قانونِ الٰہی کی ضرورت، قانونِ الٰہی میں تخفیف اور آسانی۔ آیت میں پہلے اس بات کی طرف متوجہ کیا گیا ہے کہ چونکہ انسان کمزور ہے اس لیے اللہ نے قانون سازی اپنے ذمہ لے کر انسان کو اس بوجھ سے ہلکا کر دیا۔ یعنی چونکہ انسان میں اتنی طاقت نہیں ہے کہ وہ خود بخود اپنی حقیقی فلاح کا راستہ بنا سکے کیونکہ ہم جب کائنات اور زندگی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کے مظاہر پر اس نقطہ نظر سے غور کرنا شروع کرتے ہیں کہ ہماری عقلی قوتیں ان کے فہم وادراک میں کہاں تک مدد دے سکتی ہیں تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہماری فکر کے دو مختلف میدان ہیں جو اپنی نوعیت اور فطرت میں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ایک عالم مادی دوسرا عالم انسانی اور یہ دونوں کئی اعتبار سے مختلف ہیں۔عالم مادی بے جان اشیا کے مجموعہ کو کہتے ہیں یہ عالم اپنے معین قوانین رکھتا ہے جن کو تجربے، مشاہدے اور قیاس سے ٹھیک طور پر معلوم کیا جاسکتا ہے۔اس کے برعکس عالم انسانی کے قوانین اس قدر پیچیدہ، مبہم اور غیر معین ہیں کہ تجربے اور مشاہدے کی گرفت میں نہیں آتے ہیں۔اور آتے بھی ہیں تو ان پر وہ وثوق اور اعتماد نہیں کیا جاسکتا جو عالم مادہ کے قوانین کی نسبت عام طور پر کیا جاتا ہے۔اسی وجہ سے مادی دنیا کے مظاہر کی صحیح توجیہہ ممکن ہے لیکن انسانی اُمور، معاملات اور تمدنی مظاہر کی توجیہہ صحت کے ساتھ دشوار بلکہ غیر ممکن ہے پھر چونکہ مادی اشیا کے خواص و افعال یکساں اور غیر متغیر ہیں اس لیے زمانے اور وقت کی تبدیلیاں بھی ان پر مؤثر نہیں ہو سکتی ہیں۔کسی مادی چیز کے بارے میں ہم بآسانی یہ حکم لگا سکتے ہیں کہ فلاں فلاں حالات و شرائط کی موجودگی میں اس سے یہ خاصیت ظاہر ہو گی۔لیکن عالم انسانی میں اس قطعیت اور صحت کے ساتھ اسباب و نتائج کا تعین بہت دشوار ہے۔یہاں ہمیں انسان کی آزاد فطرت سے سابقہ پڑتا ہے بے جان مادے سے نہیں اور انسان اپنے اعمال و افعال میں مادے کی طرح اضطراری طور سے کسی معین قانون کا محکوم نہیں ہے۔اس کا آزاد ارادہ ہر قانون کو توڑ سکتا ہے اور ہر نظریے کو باطل کر سکتا ہے۔علت و معلول کا تعلق اس قدر پیچیدہ ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ بس فلاں فلاں علت ہی کا رہین منت ہے انسانی اُمور، معاملات اور تمدنی زندگی میں واقعات و مظاہر کی توجیہہ ایک دشوار عمل ہے جس میں قدم قدم پر اختلاف رائے ہو سکتا ہے اور ایسی کوئی تدبیر نہیں جس سے اختلاف کا سدِ باب کیا جاسکے۔

عالم مادی اور انسانی اُمور کی دنیا میں ایک اہم فرق یہ بھی ہے کہ اوّل الذکر ہمارا فکر استقرائی طریق پر کام کرتا ہے اور آخر الذکر ہمارا فکری عمل استخراجی طریق پر ہوتا ہے اور دونوں میں یہ بھی نمایاں فرق ہے کہ عالم مادی میں انسان شاہد کی حیثیت رکھتا ہے اور اشیا کی حیثیت مشہود کی ہوتی ہے برعکس اس کے عالم انسانی میں انسان خود ہی شاہد ہے اور خود ہی مشہود ہے اس فرق کی وجہ سے عالم طبعی یا مادی دنیا کے مشاہدات، تجربات اور نظریات کے قائم کرنے میں خالص معروضی نقطہ نظر اختیار کیا جاسکتا ہے اور نتائج کے استنباط میں عقل اپنی غیر جانبداری قائم رکھ سکتی ہے لیکن انسانی امور و معاملات اور تمدنی مسائل میں یہ معروضیت ناممکن ہے۔جہاں انسان خود اپنی زندگی اور تمدن کے مسائل پر غور کرنا شروع کرتا ہے وہیں

اس کی عقل شخصی یا جماعتی جذبات و میلانات سے متاثر ہو جاتی ہے۔
عالم انسانی اور عالم مادی کا فرق معلوم کر لینے کے بعد کوئی دیانتدار شخص اس بات کا انکار نہیں کرے گا کہ عالم مادی میں صحت اور صداقت کی تلاش اور اتفاق رائے کا حصول جتنا آسان ہے عالم انسانی اور تمدنی معاملات میں اتنا ہی دشوار ہے۔ تمدنی زندگی کے بنیادی مسائل محض عقل کی وساطت سے حل نہیں ہو سکتے کیونکہ اس میدان میں عقلی استدلال نتائج کی صحت تک رہنمائی نہیں کر سکتا۔ تمدنی اور معاشرتی زندگی کی اساس و بنیاد کو عقلی موشگافیوں اور فکری قوتوں کے سپرد کر دینے کا نتیجہ ہمیشہ یہی ہوا ہے اور ہوتا رہے گا کہ وقتی جذبات اور عارضی میلانات و شہوات فکر پر غالب رہیں گے اور جو نظریہ بھی بالآخر قائم ہو گا وہ محض ان شہوات اور جذبات کا عکس ہو گا۔ حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ وہ دائرہ ہی نہیں ہے جس میں عقل و استدلال کے پائے چوبیں پر بھروسہ کیا جائے کیونکہ بقول مولانا روم

پائے استدلالیاں چوبیں بود ‌ پائے چوبیں سخت بے تمکیں بود

انسانی عقل کی انہی کمزوریوں کی طرف قرآن نے خلق الانسان ضعیفا کہہ کر اشارہ کیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ انسان کے ہر تمدنی، معاشرتی، معاشی اور سیاسی مسئلہ کی تہ میں یہ سوال پوشیدہ ہوتا ہے کہ انسانی تعلقات کی بنیاد کیا ہونی چاہیے اور انسانی تمدن کن بنیادوں پر تعمیر ہونا چاہیے۔
اس ضروری اور فیصلہ کن سوال کا جواب کس طرح دیا جائے۔ انسانی عقل کی رہنمائی پر انسانی امور و معاملات اور تمدنی زندگی کے مسائل میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا، لامحالہ اگر ہم اس بنیادی مسئلہ کا قابل اعتماد فیصلہ چاہتے ہیں تو ہمیں کسی دوسرے ماخذ کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ اس کا ماخذ الہامی ہدایات ہیں اللہ نے انسانی عقل سے اس بوجھ کو ہلکا کر دیا ہے۔ جو لوگ الہامی ہدایات پر ایمان لاتے ہیں انہیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جن اصول و عقائد کی طرف انہیں دعوت دی گئی ہے وہ کسی انسان کے ساختہ و پرداختہ نہیں بلکہ ان کا صدور ایک ایسی ذات سے ہوا ہے جو ہمہ تن حق ہے جس کی عقل کائنات کے ہر گوشہ پر حاوی اور جس کی ہمہ بین آنکھ زمین و آسمان کی ہر شئے کو محیط ہے جب تک یہ یقین نہ پیدا ہو جائے کوئی شخص دعوت ایمان کو صداقت کے ساتھ قبول نہیں کر سکتا اور نہ الہامی قوانین کے سامنے سر تسلیم خم کر سکتا ہے اس طرح جن اصولوں اور صداقتوں کو وہ قبول کرتا ہے وہ اس کی آزاد مرضی اور غیر پابند قوت فیصلہ پر مبنی اور جبر و تشدد سے پاک ہوتے ہیں۔ پھر چونکہ ان مقاصد اور اصولوں پر وہ یہ سمجھ کر ایمان لاتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں اس لیے اس کا کوئی امکان ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ کبھی ان سے اختلاف کرے۔
بہر حال انسان کا علم اور انسان کی حکمت چونکہ بہت کمزور ہے اس لیے اللہ کی امداد کی ضرورت ہے کہ

اس کا علم اس کی حکمت ہر پہلو سے کامل تر اور کامل ترین ہے جیسا کہ واللہ علیم حکیم سے اس طرف اشارہ فرمایا ہے خلق الانسان ضعیفا کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انسان قانون پر عمل نہیں کر سکتا بلکہ جیسا کہ آیت کا سیاق بتا رہا ہے مطلب یہ ہے کہ وہ قانون کو اپنے لیے خود نہیں بنا سکتا۔ یہی وہ بوجھ ہے جسے اللہ تعالیٰ نے انسان سے ہلکا کر دیا ہے اس کو راستہ بتا کر اس پر چلنے کی ہدایت فرما دی۔

قوانین میں نرمی و آسانی

اس آیت کا یہ مطلب بھی بتایا گیا ہے کہ انسان چونکہ جسم کے لحاظ سے، ارادہ کے لحاظ سے کمزور ہے اس لیے اللہ سبحانہ نے شریعت کے احکام میں سہولت کا لحاظ فرمایا ہے اس مطلب کی رو سے ضعف سے ضعفِ جسمانی اور آزادی مراد ہے۔ حضرت شیخ الاسلام کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے اسلام کے قوانین و ضوابط میں یسر، آسانی اور سہولت کا لحاظ فرمایا ہے۔ مسندِ احمد میں حضرت عبد اللہ بن عباس کے حوالے سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی کہ دین بہت آسان ہے اسی کی طرف رہنمائی کر رہا ہے۔

یہ نرمی اور سہولت ملتِ ابراہیمی کی بنیاد اور اساس ہے۔ اور اسی بنیاد پر اسلامی قانون کی عمارت اٹھائی گئی ہے۔ اگر اس پر تفصیلی بحث کی جائے تو تمام قانون اسلامی پر ایک اجمالی نظر ڈالنی پڑے گی۔ اور اس اجمال میں بھی اتنی تفصیل ہو جائے گی جس کی یہاں گنجائش نہیں ہے اس لیے ہم یہاں صرف وہ اصول پیش کرتے ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ نے خاص اس موضوع پر ارشاد فرمائے ہیں ان کی روشنی میں آپ سارے اسلامی قوانین کا جائزہ لے کر بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ اسلامی قانون میں دوسرے سماوی ادیان کے مقابلے میں کس قدر آسانی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یسر و سہولت کے لیے اسلامی قانون میں حسب ذیل امور کا لحاظ رکھا گیا ہے۔

۱۔ کسی عبادت کے لیے ایسی چیز کو رکن و شرط کی حیثیت نہ دی گئی جس کی ادائیگی میں دشواری ہو، شریعت محمدی میں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنا اسی لیے لازم قرار نہیں دیا گیا۔ حضور انور کے اس ارشاد

> اگر مجھے اپنی امت کے مشقت میں پڑ جانے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں ہر نماز کے ساتھ انہیں مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

۲۔ کچھ طاعات کو فخر و مباہات اور مسرت کے اظہار کے لیے اجتماعی رسم کا درجہ دے دیا ہے۔ چنانچہ جمعہ اور عیدین کے اجتماع میں یہی روح کام کر رہی ہے۔ حضور کے اس ارشاد گرامی کہ یہودیوں کو پتہ لگ

جائے کہ ہمارے دین میں تنگی نہیں کشائش ہے، اسی طرف اشارہ ہے۔ کیونکہ بڑے اجتماع میں بننا اور شان وشوکت کو نمایاں کرنے میں آگے ہونا انسان کی طبیعت ہے۔

۳۔ طاعات میں ایسے کردار کو قانون اپنایا ہے جس کی طرف انسان طبعاً مائل ہوتا ہے اور خود عقل بھی اس کو چاہتی ہے۔ عقلی اور طبعی رغبتوں کے اسی اجتماع کو قائم رکھنے کی خاطر مساجد میں خوشبو، ان کی صفائی اور جمعہ کے روز غسل اور خوشبو کی تلقین کی ہے اور قرآن و آذان میں تحسین صوت کو پسند کیا ہے۔

۴۔ اجتماعی طبیعت کے تقاضے کو باقی رکھنے پر زور دیا ہے اور بتایا ہے کہ ملک میں سربراہ کی امامت اور گھر میں صاحب البیت کی امامت کو باقی رکھا جائے۔

۵۔ رائے عامہ کا اصل شریعت سے رابطہ قائم رکھنے کے لیے شریعت کی تعلیم، وعظ وارشاد، امر بالمعروف نہی عن المنکر پر زور دیا ہے تاکہ بے علمی اور بے خبری پیدا ہو کر اُمت کا قانون سے عملی رابطہ نہ ٹوٹے۔

۶۔ جیسے اوامر کی حد تک خود نمونہ بن کر دکھایا ہے ایسے ہی رخصتوں پر عمل کیا ہے تاکہ لوگوں کے لیے عمل کی کاپی کرنے میں آسانی ہو۔

۷۔ اللہ سے معاشرے کے مہذب ہونے اور قانون پر عمل ہونے کے لیے دُعا کی ہدایت کی ہے۔

۸۔ نبوت کی وساطت سے پیرو کاروں پر اللہ کی جانب سے سکینت کا نزول ہوا اور اس طرح ان میں طاعت کی سرشاریاں پیدا ہوئیں۔

۹۔ جو شخص دوسروں کے حقوق تلف کرتا ہے اس کے حقوق بھی قانون میں تلف کر دیے۔ اسی قاعدے کے تحت نہ قاتل کو وراثت ملتی ہے اور نہ مکرہ کی طلاق نافذ ہوتی ہے۔

۱۰۔ اگر کسی دُشوار کام کو کرنے کا کہا جائے تو اس میں تدریج کو پیش نظر رکھا جائے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں قرآن میں اوّل جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں جنت و دوزخ کا ذکر تھا۔ جب طبیعتوں میں اس سے گداز پیدا ہو گیا تو حلال وحرام کے قوانین نازل ہوئے۔ اگر روز اوّل شراب کے حرام ہونے یا زنا کی بندش کا حکم آجاتا تو لوگ نہ چھوڑتے۔

۱۱۔ عوام کے جذبات کی خاص طور پر رعایت کی گئی ہے، جذبات ہی کی رعایت سے حضور انور نے کچھ کام پسندیدہ ہونے کے باوجود نہیں کیے مثلاً خانہ کعبہ میں آمد ورفت کے لیے دو دروازے قائم کرنے کا ارادہ اس لیے فسخ فرما دیا تھا کہ اس میں قریش کے جذبات کو ٹھیس لگنے کا اندیشہ تھا۔ یہاں اسی مفسدہ کی خاطر اس مصلحت کو ترک کر دیا لیکن اس کے حدود کیا ہیں یہ ایک طویل قانونی بحث ہے۔

۱۲۔ قانونِ اسلامی اپنی وضع اپنے اسلوب، اپنے اندازِ بیان، اپنے طریقِ خطاب، اپنے طریقِ استدلال

میں وضعی اور صناعی طریقوں کو نہیں اپنا آوٗہ اپنی ہر بات میں اپنا بے میل فطری طریقہ رکھتا ہے اور یہی وہ بنیادی امتیاز ہے جو قرآن کے طریقِ ہدایت کو علم وحکمت کے وضعی طریقوں سے ممتاز کر دیتا ہے ۔

۳۔ اسلامی قانون میں عابدانہ زندگی میں قانونی اوامر کا بوجھ عقلِ انسانی پر نہیں ڈالا اس کی ذمہ داری خود اٹھالی ارکان شرائط اور آداب بتائے لیکن اس کو اصطلاحات کا گورکھ دھندا بلکہ مخاطبوں کی عقل وفہم کے مطابق اس کی تحدید وتعیین فرمائی ۔

اگر ادیان کا ان اصولوں کی روشنی میں تقابلی مطالعہ کیا جائے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی جتنی رعایت اسلامی قانون میں ہے اس قدر اور کہیں نہیں ہے لیکن یہ بحث کہ سہولت کا مفہوم اور اس کا معیار کیا ہے ایک طویل بحث ہے ۔ علامہ شاطبی نے الموافقات میں اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے انشاء اللہ ہم پارہ ۱۱ کے آخر میں ہدیۂ ناظرین کریں گے ۔

سابقہ اُمتوں کے احکام میں تخفیف

آیت کا یہ مطلب بھی ہو سکتا ہے کہ پہلی امتوں پر جو احکام مقرر کیے گئے تھے ۔ اس میں تمہاری حالت کا لحاظ کرتے ہوئے تخفیف منظور ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ تم پر سے یہ بوجھ ہلکا کر دیں کیونکہ اول تو انسان ضعیف الخلقت ہے ۔ پھر آخری اُمت اپنے قویٰ اور ہمت کے اعتبار سے اور بھی زیادہ کمزور ہے اور جس قدر زمانہ قیامت قریب آتا جائے گا یہ ضعف اور کمزوری زیادہ ہی ہوگی اس وجہ سے اللہ تعالیٰ کو تم پر تخفیف منظور ہے اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ پہلی اُمتوں سے اس اُمت میں احکام کی آسانی زیادہ ہے[1]

مقصد یہ ہے کہ جو بوجھ انسانیت کے سروں پر پڑ گیا تھا اور جن پھندوں میں لوگ گرفتار ہو گئے تھے اللہ کو یہ منظور ہے کہ قرآن کے ذریعے اس کو ہلکا کرے اور انسانیت کو اس سے نجات دلائے یہ بوجھ کیا تھا اور یہ پھندے کیا تھے جن سے قرآن نے نجات دلائی ۔ قرآن نے دوسرے مقامات پر اسے واضح کر دیا ہے مذہبی احکام کی ناروا سختیاں ، مذہبی زندگی کی ناقابلِ عمل سختیاں ، ناقابلِ عقیدوں کا بوجھ ، وہم پرستیوں کا بوجھ ، احبار و رہبان کی طاعت کی بیڑیاں ، اربابِ اقتدار کی تعبد کی زنجیریاں ، یہ بوجھل رکاوٹیں تھیں جنہوں نے انسانیت کے دل ودماغ کو مقید کر دیا تھا ۔ قرآن نے ان سب کو ہلکا کر دیا اور زندگی کے لیے ہدایت کی ایسی سہل وآسان راہ دکھا دی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ نہیں ہے عمل کے لیے کوئی سختی نہیں ، حدیث

---

[1] کشف الرحمان

میں ہے، حنیفۃ السمحۃ لیلھا کنھارھا اللہ تعالیٰ کے نزدیک سب سے زیادہ پسندیدہ دین آسان دین حنیف ہے۔

اسی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام کو لوگوں کی سہولت کا لحاظ رکھنے کی ہدایت فرماتے تھے۔ ارشاد ہے:

> تم آسانی پیدا کرنے کے لیے روانہ کیے گئے ہو نہ کہ دشواری۔ لوگوں کے لیے آسانی پیدا کرو، دشواری پیدا نہ کرو، سکون فراہم کرو نہ کہ وحشت۔

انسانی فطرت کی بنیادی خصوصیت

۵۶- آخر میں ارشاد ہوا ہے وخلق الانسان ضعیفا، ویسے تو انسانی فطرت قدرت کے رازہائے گراں مایہ کا خزانہ ہے اور قرآن نے مختلف مقامات پر مختلف الفاظ میں ان کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن اس آیت میں قرآن نے انسانی فطرت کی جس اہم خصوصیت کا ذکر کیا ہے وہ بتانا چاہتا ہوں۔ آیت کا مفاد یہ ہے کہ آدمی ہو یا آدمی کے سوا دوسری جاندار مخلوق، زندگی کی مدت جن کی جتنی بھی ہو اس مدت کو گزارنے کے لیے جن ضرورتوں کے وہ محتاج ہوتے ہیں ان کا حصول عموماً جسمانی توانائیوں کے ساتھ وابستہ ہے۔ مشاہدہ یہی ہے کہ آدمی بے سروسامانی کی جس حالت میں اس دنیا میں آتا ہے مشکل ہی سے کسی دوسرے جاندار میں اس کی نظیر مل سکتی ہے۔ جو جاندار اُون، بال، کھر، پر، بازو، سینگ، چنگل اور ایسے ہی بیسیوں قدرتی سامان کے ساتھ دنیا میں آتے ہیں ان کے مقابلہ میں آدمی جو ایک زندہ لوتھڑے کے سوا ابتداً کچھ نہیں ہوتا، ننگا اور ہر قسم کے سامان سے خالی جسم لے کر آتا ہے وہ بھی اتنا نازک و ناتواں حساس و اثر پذیر ہوتا ہے کہ اپنے طبعی مسکن کے موسموں کی معمولی سختی کا مقابلہ بھی بآسانی نہیں کر سکتا۔ گرمی ہو یا سردی ان موسمی تبدیلیوں کی ہلکی سی شدت آدمی کو لو کھلا کر رکھ دیتی ہے حالانکہ زمین کے کرے میں انسان کے ساتھ اور بھی جاندار ہیں۔ ان کی رہائش گاہ بھی زمین ہے لیکن موسمی تکلیفوں سے بچنے کے لیے ان کو ان دردسریوں میں مبتلا ہونے کی قطعاً ضرورت نہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ جتنے بھی جاندار ہیں پیدا ہونے کے ساتھ ان میں بھی ساری قوتیں اچانک ظہور میں نہیں آتی ہیں بلکہ ہر ایک کو کچھ نہ کچھ دن اس کے لیے گزارنے پڑتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی جب آپ آدمی کا مقابلہ دوسرے جانداروں سے کریں گے تو زمین و آسمان کا فرق محسوس کریں گے۔ مرغی کے بچے پیدا ہونے کے ساتھ ہی دانہ چگنے لگتے ہیں۔ آدمی کے سوا جتنے بھی ہیں جتنی کم مدت میں ان کا پیدائشی ضعف قوت کے انتہائی مدارج کو پہنچتا ہے اس مدت کو اس طویل زمانہ سے

کیا نسبت ہے جو آدمی کے بچوں کو اسی قوت کے حاصل کرنے میں صرف کرنا پڑتی ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ جن مراحل کو دوسرے دنوں میں طے کرتے ہیں آدمی کے بچے مہینوں میں ہی نہیں بلکہ سالوں میں طے کرتے ہیں۔ ماں باپ کی اعانت سے آزاد ہو کر خود اپنی معاش کا کفیل ہونے کے لیے آدمی کو عام حالات میں کم از کم پندرہ سولہ سال کی مدت چاہتی ہے۔ پھر جب اس پر غور کیا جائے کہ پیدائشی ضعف کے ازالہ کے بعد دوسروں میں معاشی ضرورتوں کے حصول کی جو قوتیں بروئے کار آتی ہیں عموماً آخر عمر تک ان کا ساتھ دیتی ہیں۔ ماں باپ کی نگرانی سے الگ ہونے کے بعد زندگی گزارنے کے لیے ان میں سے کسی کو دوسرے کی قطعاً ضرورت نہیں ہوتی۔ ہر ایک اپنی جگہ خود زندگی گزارتا ہے۔ اپنی قوت بازو سے آخر وقت تک خود کما کما کر اپنی ضروریات پوری کرتا ہے لیکن آدمی کا کیا حال ہے۔ اوّل تو اس کے ضعف کا ازالہ ہی برسوں میں ہوتا ہے اس کے بعد حصول معاش کی جو قوتیں انسان کے دست و بازو میں نمایاں ہوتی ہیں۔ زیادہ زمانہ گزرنے نہیں پاتا کہ بتدریج پھر وہ ہی پیدائشی کمزوری مختلف راستوں سے واپس آ جاتی ہے اور بالآخر اس نقطہ پر پہنچ جاتا ہے جس پر وہ پیدائش کے وقت تھا۔ جیسے شروع میں نگرانوں کا ماں باپ کی صورت میں محتاج تھا آخر میں اولاد کا محتاج ہو جاتا ہے جیسے پیدائشی ضعف کی طرف قرآن نے خلق الانسان ضعیفا کہہ کر اشارہ کیا ہے ایسے ہی ظہور قوت کے بعد دوسرے ضعف کو خلقکم من ضعف ثم من بعد ضعف قوۃ ثم من بعد قوۃ ضعفا و شیبۃ، یہاں فرمایا ہے۔

اسی ضعف کا نتیجہ ہے کہ شخصی حیثیت سے انسانوں کے کم ہی کام ایسے ہوتے ہیں جسے وہ اپنے سلسلے مکمل کر کے دنیا سے جاتا ہو۔ عام حال اس سلسلے میں اجتماعی حیثیت سے زمین کے اس کرے پر آدم کی اولاد جن جن شعبوں کے متعلق سہولتوں کو پیدا کرنے کی دھن میں مشغول ہے۔ جس رفتار سے انسان کی اجتماعی کوششیں اس راہ میں آگے بڑھ رہی ہیں۔ اس کا اندازہ صرف اسی سے ہو سکتا ہے کہ ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہونے کے لیے تاریخ کے نامعلوم زمانے سے آدمی جدوجہد میں مصروف ہے۔ سمجھنے والے یہی سمجھ رہے ہیں کہ آدمی نے راہ ترقی کا بہت بڑا فاصلہ طے کر لیا ہے۔ بالخصوص ہوائی جہاز کی ایجاد نے اس یقین میں بڑی قوت پیدا کر دی ہے لیکن بات مقابلہ سے سمجھ میں آتی ہے۔ مقابلہ کیجئے تو آپ اس نتیجہ پر ضرور پہنچیں گے کہ یہ سب کچھ ہو جانے کے باوجود انسان چڑیوں، طوطوں کے برابر بھی نہیں ترقی کر سکا ہے۔ وہ نقل مکانی کے مسئلہ میں نہ لوہے کے محتاج ہیں نہ لکڑی کے اور نہ پٹرول کے اور نہ ان دوسری گیسوں کے جن کے بل بوتے پر انسان نے ہوائی راستوں پر اقتدار حاصل کیا ہے خلق الانسان ضعیفا کی یہ کیسی کھلی تفسیر ہے۔ مچھروں اور مکھیوں کے مقابلے میں بھی جو معذور ہوا اور ان تعلیوں اور ترقیوں

کے دعووں کے بعد بھی منعدور اس کی ناتوانیوں اور بدحالیوں کا کیا ٹھکانہ ہے اور اس پر بھی حال یہ ہے کہ جو کچھ اس سے بن آیا وہ اکیلا نہیں بلکہ ایک ایک کام کے لیے ہزاروں اور لاکھوں ہاتھوں کی ضرورت ہوتی ہے بقول شخصے آدمی کے منہ میں کھانے کا ایک لقمہ بھی بیسیوں ہاتھوں سے گزرنے کے بعد جاتا ہے، گیہوں کے بونے والے، جوتنے والے، پانی دینے والے کاٹنے والے، بھوسہ صاف کرنے والے، تولنے والے، بیچنے والے، بازار میں لانے والے، دکان میں رکھنے والے، خریدنے والے، پیسنے والے آٹے کو لاد کر لانے والے، پکنے کے بعد برتن کو بنانے والے ایندھن کی لکڑیوں کو لانے والے، دستر خوان پر چننے والے جب سب اپنے کاموں سے فارغ ہو جاتے ہیں تو لقمہ توڑ کر توڑنے والا اس لقمہ کو منہ تک پہنچاتا ہے۔

یہ آدمی کا حال ہے اس کے مقابلے میں اور جانداروں کو دیکھئے ان میں ہاتھی بھی ہے اژدھا بھی ہے جو بھی ہے اپنی ساری ضرورتوں کو اپنی قوت بازو سے مہیا کرتا ہے۔ کسی کی منت پذیری سے ہر ایک کی گردن آزاد ہے۔ ان میں سے ہر ایک کی زندگی خود مکتفی ہے۔ وہ ہی خود مکتفی زندگی جس کے انسان درپے ہے اور ہزاروں برس سے درپے ہے۔ جاندار ان کے ہر ہر فرد کو خود اکتفائیت کا جو مقام حاصل ہے۔ اگر وہاں تک رسائی ممکن نہ ہو تو آدمی کی ٹولیوں کو تو خود مکتفی ہونے میں کامیاب بنالیا جائے۔ لیکن جس مقصد میں اجتماعی قوت و طاقت سے کام لینے کے باوجود آدمی کو کامیابی حاصل نہیں ہو رہی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ اسی مقصد میں دوسرے جاندار کامیاب ہیں اور کیوں کامیاب نہ ہوں۔ انسان میں حیوانی کی وہ طاقت جو کمزوریوں کے آغوش میں ہوتی ہے اول تو یہ طاقت بھی نہ ہونے کے برابر ہے۔ دو ہستیوں کے درمیان والی ہستی بھی ایک قسم کی نیستی ہوتی ہے۔ عربی کا مشہور مقولہ ہے الموجود بین العدمین عدم

لیکن اسے اگر صوفیانہ غلو بھی قرار دے دیا جائے پھر بھی ہم دیکھتے ہیں کہ قوت و طاقت اور زور کے اس زمانے میں بھی آدمی میں قوت کے جو آثار نمایاں ہوتے ہیں، خم ٹھونکنے والے اپنے متعلق جتنی تعلیوں سے بھی کام لے لیں مگر اس کا راز بھی ہلکے سے مقابلے سے کھل جاتا ہے۔ کچھ نہیں تو چیونٹی ہی کو دیکھ لیجئے اور اندازہ لگانے والوں سے پوچھ لیجئے کہ چیونٹی اپنے وزن سے تیرہ سو گنا وزن اٹھا لیتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ چیونٹی میں اللہ سبحانہ جتنی قوت بھر دی ہے اگر آدمی میں بھی قوت کا یہی پیمانہ ہوتا تو لکھتے ہیں کہ اس قوت سے ۱۰۰ من وزنی چیز آدمی اٹھا سکتا تھا۔ یعنی اگر کچھ نہیں صرف ایک چیونٹی کو جو طاقت ملی ہے اگر آدمی کو مل جاتی تو آدمی سو ایکڑ پیداوار کو ایک ہی ولہر میں کھیت سے گھر پہنچا سکتا تھا۔ بہرحال کتابوں میں پڑھیے زندہ چیزوں کی ایک بڑی تعداد قوت کا وہی معیار آپ کو نظر آئے گا اب قرآن کی آیت و خلق الانسان ضعیفا پڑھیے۔ یہ انسان کی وہ خصوصیت ہے جس کا قرآن نے اس آیت میں ذکر کیا ہے۔ اسلام نے جس معاشی نظام کو پیش کیا ہے اس میں منجملہ دوسری چیزوں کے فطرت انسانی کی اس خصوصیت کو بہت بڑا دخل ہے[1]

---

[1] اسلامی معاشیات۔

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَاْكُلُوْۤا اَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ اِلَّاۤ
اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ ۗ وَلَا تَقْتُلُوْۤا اَنْفُسَكُمْ ۗ
اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُمْ رَحِيْمًا ۝ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ عُدْوَانًا وَّظُلْمًا
فَسَوْفَ نُصْلِيْهِ نَارًا ۗ وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ۝ اِنْ
تَجْتَنِبُوْا كَبَآئِرَ مَا تُنْهَوْنَ عَنْهُ نُكَفِّرْ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ
وَنُدْخِلْكُمْ مُّدْخَلًا كَرِيْمًا ۝

اے اہل ایمان تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ
مگر ہاں وہ مال جو آپس کی رضامندی سے کاروبار کے ذریعے تمہیں ملا
ہو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور دیکھو اپنی جانوں کو ہلاک نہ
کرو اللہ تمہارے لیے رحمت رکھنے والا ہے۲۹۔ اور یاد رکھو جو کوئی ظلم و
سرکشی سے ایسا کرے گا تو ہم عنقریب اسے دوزخ میں ڈالیں گے
اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے۳۰۔ اگر تم ان گناہوں سے بچتے رہو گے

جو بڑے بڑے ہیں تو ہم تمہاری لغزشوں کو تم سے محو کر دیں گے اور تمہیں عزت و تکریم کے مقام میں داخل کریں گے ۔"

حرمت مال و جان اور معاشرتی زندگی

پہلی آیات میں اسلامی قانون کا اجمالاً تصوری خاکہ اور معاشرتی زندگی سے اس کا گہرا ربط بیان کیا۔ اور ساتھ ہی اُمت کی ذمہ داریاں بتائیں اب ان آیات میں یہ حقیقت پیش کی جا رہی ہے کہ معاشرتی زندگی کی سعادت اور اُمت کی اجتماعیت اس وقت تک حاصل نہیں ہو سکتی ہے۔ جب تک خاندان کے تمام افراد اور اُمت کے سارے طبقات میں دیانتداری، راستبازی اور ایک دوسرے کی جان و مال کی حفاظت کا جذبہ نہ ہو۔ یہاں ناجائز طریقہ سے ایک دوسرے کے مال کھانے اور قتل نفس کی حرمتوں کو یکجا کر دیا ہے۔ ان کو یکجا کرنے کی حکمت یہ ہے کہ ان دونوں میں بڑا گہرا رشتہ ہے۔ مال کی حرص اس کے حصول کے لیے جائز ناجائز کی تمیز اٹھا دیتی ہے اور پھر یہ بیماری لوگوں کو اس طرح اندھا بہرا کر دیتی ہے کہ اس کے لیے قتل و خونریزی تک کی نوبت آجاتی ہے۔ سماجی فسادات اور خونریزیوں کے اسباب کا سراغ لگایا جائے تو معلوم ہوگا کہ حرص مال کو ان میں سب سے زیادہ دخل ہے جو سمجھنے لگتے ہیں کہ ساری شرافتوں اور بلندیوں کا دار و مدار مال ہی پر ہے۔ وہی با عزت ہے جو روپیہ والا ہے اور بے عزت وہی ہے جو روپے سے خالی ہے۔ مشہور فارسی شعر

خوک باش و خرس باش و یا سگ مردار باش ۔۔۔ ہر چہ باشی باش لیکن اندکے زردار باش

کی ذہنیت جب کسی فرد یا قوم پر سوار ہو جاتی ہے تو اندکے زردار باش، کے مشورے کی تعمیل کا جن کو موقعہ نہیں ملتا وہ ہر قسم کے جرائم کا ارتکاب کرنے میں بے باک ہوتے ہیں جب مال کا عشق ان پر مسلط ہوتا ہے تو اپنے عشق مطالبات کی پا بجائی میں بے روک ٹوک مشغول ہو جاتے ہیں بے آئینی کی اس زندگی میں زمین پر جس قسم کا فساد بھی پھوٹ پڑے اس کا کون اندازہ کر سکتا ہے۔ قرآن نے یہاں قتل اور ایک دوسرے کے مال کھانے کی حرمت یکساں رکھی ہے۔ حضور انور نے بھی دونوں میں چولی دامن کا ساتھ بتایا ہے ارشاد ہے حرمة ماله كحرمة دمه، مومن کے مال کی حرمت ایسی ہے جیسے اس کی جان کی۔

۵۸۔ اے اہل ایمان تم ایک دوسرے کا مال آپس میں ناجائز طور پر نہ کھاؤ مگر ہاں وہ مال جو آپس کی

رضامندی سے کاروبار کے ذریعے تمہیں ملا ہو اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور دیکھو اپنی جانوں کو ہلاک نہ کرو اللہ تمہارے لیے رحمت رکھنے والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کسی کو کسی کا مال ناحق کھا لینا مثلاً جھوٹ بول کر یا دغابازی سے یا چوری سے ہرگز درست نہیں ہے۔ ہاں اگر سوداگری یعنی بیع وشراء سے ہو یا باہم رضامندی سے تو اس میں کوئی حرج نہیں۔ اس مال کو کھالو جس کا خلاصہ یہی نکلا کہ جائز طریقہ سے لینے کی ممانعت نہیں جو مال کو ترک کرنا تم پر دشوار ہو۔ اور دوسرے فقرہ کا مطلب یہ ہے کہ آپس میں ایک دوسرے کو قتل بھی مت کرو بے شک اللہ تعالیٰ تم پر مہربان ہے کہ بلا وجہ کسی کے مال یا جان میں تصرف کرنے کو منع فرمادیا اور تم پر ایسے احکام بھیجے جس میں سراسر تمہارے لیے بہبودی اور خیریت ہے۔ [1]

یہاں سب سے اہم سوال یہ بھی ہے کہ مال ناجائز طور پر کھانے اور قتل نفس میں باہم ربط کیا ہے اور ان دونوں کی باہم پیوندکاری کیوں کی گئی ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر جہاں تک میں سمجھا ہوں جیسا کہ الجصاص نے نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ لا تقتلوا کی نہی دونوں باتوں سے روک رہی ہے باہم قتل و خون ریزی سے بھی اور خودکشی سے بھی قد اقتضی النھی عن قتل غیرہ و قتل نفسہ نادار رکھنے والوں میں مال سے عاشقانہ تعلق رکھنے والے وہ ہی ہوتے ہیں جو کرنا تو سب کچھ چاہتے ہیں لیکن کچھ کر نہیں سکتے۔ قرآن میں ہے کہ عرب زمانۂ جاہلیت میں محض معاشی دشواریوں پر غالب آنے کے لیے اپنی اولاد کو قتل کر دیتے تھے لا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق اور آج یورپ، امریکہ اور ایشیا میں پیدا ہونے کے بعد تو نہیں، پیدا ہونے سے پہلے برتھ کنٹرول کے ذریعے جو اولادکشی کی مہم جاری ہے اس کا سبب اس کے سوا کیا ہے کہ جو اپنے اندر دوسروں سے چھیننے کی طاقت نہیں رکھتے وہ معیشت میں جن سے پریشانی آنے کا احتمال ہے ان بچوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی زندگی کے حقوق سے محروم کر دیتے ہیں۔

اور صرف یہی نہیں بلکہ اس سے بھی آگے ترقی کا یہ قدم بھی اٹھا لیتے ہیں کہ معاشی پریشانیوں سے بچنے کی خاطر اولادکشی ہی نہیں بلکہ خودکشی بھی ان کا ایک محبوب اور پسندیدہ کام بن جاتا ہے۔ مولانا گیلانی نے اپنے زمانے کے احوال کی کیسی اچھی تصویر پیش کی ہے۔

" ان ہی دنوں کے اخباروں کی یہ خبریں کس سے پوشیدہ ہیں کہ کچھ علاقوں میں خودکشی کو آسان بنانے کے لیے باقاعدہ انجمنیں قائم ہیں، رسالے نکلتے ہیں جن میں لوگوں کو بہ سہولت خودکشی کا طریقہ بتایا جاتا ہے پولینڈ اور آسٹریا کا نام اس سلسلے میں سب سے آگے ہے۔ ۱۹۲۰ء ۲ مارچ کی اشاعت میں سنڈے ایکسپریس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اخبار میں بریگیڈیر ہیری گارڈن کا ایک بیان خودکشی کے واردات کے بارے میں شائع ہوا تھا جس میں بتایا تھا کہ ان کی رائے میں خودکشی کا سب سے بڑا سبب خانگی اور مالی دشواریاں ہیں۔

(سچ ۱۱ اپریل ۳۷ء)

چونکہ ہیری گارڈن کا خاص مضمون اسی موضوع خودکشی سے متعلق ہے اس لیے ان کے بیان کو خاص اہمیت دی گئی۔ اسی بیان میں انہوں نے یہ بھی بتایا تھا :

ہر ہفتہ اوسطاً آدمی زبانی یا تحریراً مجھے ارادہ خودکشی سے مطلع کرتے رہتے ہیں۔ وہ مگر جو خودکشی پر آمادہ رہتے ہیں مگر زبان سے اقرار نہیں کرتے ان کی تعداد انگلستان میں ہر حال پانچ ہزار تک پہنچتی ہے۔ (سچ)

دیکھا آپ نے اکل اموال الناس بالباطل کا بحران بالآخر لوگوں کو کس چیز پر راضی ہونے کے لیے مجبور کر دیتا ہے۔ انہوں نے جب حلال خوری سے رشتہ توڑا تو اس رشتہ کے جو لازمی نتائج ہیں ان سے اپنے آپ کو کیسے بچا سکتے ہیں۔

اس موقعہ پر ایک اور شخصی واقعہ کا ذکر شاید اس قرآنی اشارے کو سمجھنے میں مدد دے۔ مولانا عبدالماجد دریا بادی نے ایک مغربی خاتون جس کا نام مسز کیلسن تھا اسی کے متعلق یہ لکھنے کے بعد کہ :

یہ ایک حسین عورت تھی ۲۹ سال کی جوان عمر، شوہر موجود تھا، اولاد بھی ہو چکی تھی موجود تھی، شادی پر صرف ۵ سال گزرے تھے۔

مولانا کے بیان سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ نوجوانی کے زمانے میں فلم اسٹار بننے کا موقعہ بھی مل چکا تھا لیکن آخر چند سے ہٹ کر ایک کے ہو رہنے کا اس نے فیصلہ کیا۔ روزی کا پیمانہ اس کے لیے ناپا تلا تھا سینما کی زندگی کی رنگ رلیوں کے بعد اس نپی تلی معیشت کا یہ حال اس کے لیے ناقابل برداشت بن گیا جس تمدن و تہذیب میں وہ پیدا ہوئی تھی وہ خدا اور اس کی رحمتوں سے مایوس تہذیب و تمدن تھے۔ ایسی حالت میں جو تحریری فیصلہ اس نے کیا اس کا اپنا بیان کردہ یہ ہے :

میں مالی مشکلات سے جن کا کوئی حل نہیں ہے مجبور ہو کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر رہی ہوں۔ میری آمدنی اتنی رہی جس سے خود میری اور میری بچی کی گزر ہو سکے۔ شوہر سے میری جدائی ہو چکی ہے۔ میری ایک اولاد کی وہ پرورش کر رہا ہے، میرے دوست و احباب ایسے موجود ہیں جو مجھے مالی امداد دے سکتے ہیں لیکن اس کے بعد ان کے دلوں میں میری محبت اور قدر باقی نہ رہے گی۔

اور پھر اس پر ہی بس نہیں کی بلکہ یہ بھی لکھا ہے کہ ،

میں اپنی بچی کو بھی اپنے ساتھ ختم کیے دیتی ہوں اس لیے بھی ختم کرتی ہوں کہ وہ اگر حسین نہ نکلی اور میرے خیال میں وہ حسین نہیں ہے تو کوئی اسے پوچھے گا بھی نہیں۔ میں ہی اس بچی کو وجود میں لائی اور میں ہی اس کو ختم بھی کرتی ہوں۔

بہرحال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ سرمایہ اور مال سے ناجائز تعلق خودکشی اور دشمن کشی کا سبب ہوتا ہے قرآن اس آیت میں یہی بتا رہا ہے کہ مال سے ایسے روابط قائم نہ کرو جو خودکشی، اولادکشی اور غیرکشی کا ذریعہ بن جائے اموالکم بینکم بالباطل کی تعبیر کس قدر بلیغ ہے۔ یہ ایک طرف اسلام کے قاعدۂ اشتراک اجتماعی کو بنا رہی ہے اور دوسری طرف فرد کی انفرادی ملکیت کا احترام کر رہی ہے یعنی ایک طرف تو بتایا جا رہا ہے کہ ایک کا مال سب کا مال ہے اور دوسری طرف کہا جا رہا ہے کہ ہر ایک کا مال اس کی ملکیت ہے۔

اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریاں

اس میں قرآن نے قاعدۂ اشتراک پیش کر کے اسلامی ریاست کی معاشی ذمہ داریوں کی طرف رہنمائی کی ہے۔ معاشی ذمہ داریوں میں کفالت عامہ معاشی ترقی کا اہتمام اور تقسیم دولت میں پائے جانے والے تفاوت کو کم کرنا شامل ہے۔ ہم یہاں صرف کفالت کی حد تک معالم العرفان کے قارئین کی ضیافت طبع کے لیے کچھ ضروری اشارات کرتے ہیں۔ معاشی ذمہ داری کے اسی شعبے کفالت عامہ کی خاطر لوگ اشتراکیت کو معاشی نظام سمجھ کر اس کی طرف دیوانہ وار جا رہے ہیں سید رشید رضا نے درست لکھا ہے کہ ان کو اس معاملہ میں راہ اعتدال نہیں ملی ہے۔ اگر وہ تلاش کرتے تو اسلام کی آغوش میں ان کو سب کچھ مل جاتا۔ یہ اسلام ہے کہ معاشی ملکیت کے اقرار اور احترام کے ساتھ سب کے اموال کو اُمت کا مال بناتا ہے اور ہر ایک کی جان کو سب کی جان کہتا ہے۔

کفالت عامہ سے مراد یہ ہے کہ اسلامی مملکت کے حدود میں ہر انسان کی بنیادی زندگی کی ضروریات کی کفالت کی جائے۔ یہ کفالت اس درجہ تک ہونی چاہیے کہ کوئی فرد ضروریات سے محروم نہ رہے۔ ان بنیادی ضروریات میں غذا، لباس، مکان اور علاج لازماً شامل ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر کسی وجہ سے کوئی فرد انتظام کے باوجود اس حال میں پایا جائے کہ وہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل سے قاصر ہو تو اسلامی ریاست اس بات کی ذمہ دار ہے کہ وہ شخص ان

وسائل حیات سے محروم نہ رہے جو ضروریات زندگی کی تکمیل کے لیے درکار ہیں۔ ریاست کو ایسا نظم قائم کرنا پڑے گا کہ محروم افراد اپنی محرومی کا ثبوت فراہم کر کے بآسانی اور بلا تاخیر اجتماعی خزانے سے بقدر ضرورت مدد حاصل کر سکیں اور اسلامی مملکت کا کوئی شہری بھوکا پیاسا، ننگا بے ٹھکانہ اور بیماری میں علاج سے محروم نہ رہے۔
نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کی اسی آیت کی روشنی میں یہ اصول واضح فرما دیا ہے کہ اصحاب امر محروم افراد کی ضروریات کی تکمیل کے ذمّہ دار ہیں۔ ابوداؤد میں بحوالہ سلیمان بن عبدالرحمان ہے کہ:

ابومریم ازدی کہتے ہیں کہ میں حضرت معاویہ کے پاس گیا انہوں نے کہا ابو فلاں کیسے تشریف لائے ہو؟ میں نے کہا، آپ کو ایک ارشاد نبوّت سنانے آیا ہوں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جس کو اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کا سربراہ بنایا ہے اگر وہ ان کی ضروریات اور فقر سے بے پروا ہو کر بیٹھ گیا اللہ تعالیٰ بھی اس کی ضروریات اور فقر سے بے نیاز ہو جائے گا۔ حضرت معاویہ نے یہ سُن کر ایک آدمی کو عوام کی ضروریات پوری کرنے پر مقرر فرما دیا۔

ترمذی کتاب الاحکام میں ہے:

عمرو بن مرہ نے معاویہ سے کہا کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ فرماتے سُنا ہے کہ جو سربراہ مملکت ضرورت مندوں فقیروں اور مسکینوں پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے اللہ سبحانہ اس کی ضروریات، فقر اور مسکینی پر اپنے دروازے بند کر لیتا ہے۔ یہ سُن کر معاویہ نے ایک آدمی کو عوامی ضروریات پوری کرنے پر مقرر کر دیا۔

اسلامی ریاست کی اس ذمّہ داری کی اہمیت کا اندازہ خلافت کی اس تعریف سے بھی ہو سکتا ہے کہ جو حضرت سلمان فارسی نے کی ہے۔ ابوعبید کتاب الاموال میں رقمطراز ہیں:

خلیفہ وہ ہے جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرے اور شہریوں پر اس طرح مہربان ہو جس طرح آدمی اپنے اہل و عیال پر ہوتا ہے۔

شہریوں کی ضروریات زندگی کی تکمیل کا اہتمام دراصل اس خیر خواہی کا حصہ ہے جو سرکار پر لازم قرار دی گئی ہے جو حکومت شہریوں کے ساتھ پوری خیر خواہی نہ برتے اس کا انجام بُرا ہو گا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد بخاری کتاب الاحکام باب من استرعی رعیۃ فلم ینصح میں ہے:

جس شخص کو اللہ سبحانہ نے حکمران بنایا اور اس نے شہریوں کے پوری خیر خواہی نہ برتی وہ جنت کی خوشبو بھی نہ پا سکے گا۔

ایک اور ارشاد مسند ابی عوانہ میں ہے :

جو شخص مسلمانوں کا سربراہ ہے اور پھر ان کی بھلائی کے لیے محنت نہیں کرتا ہے اور ان کے لیے خیر خواہ نہیں ہے وہ ان کے ساتھ جنت میں نہ داخل ہوگا ۔

ظاہر ہے کہ کسی کے ساتھ خیر خواہی کا اولین تقاضا یہ ہے کہ جن ضروریات کی عدم تکمیل سے اس کی جان ضائع ہو جانے کا اندیشہ ہو ان کو پورا کرنے کا اہتمام کیا جائے ۔

قرآن نے حکومت کو اپنے تمام شہریوں کا ولی اور سرپرست بنایا ہے اس کی سرپرستی کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ان افراد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کرے ۔ ترمذی نے ابواب الفرائض میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے :

جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کا سرپرست اللہ و رسول ہے ۔

اور امام ترمذی ہی نے کتاب النکاح کے باب ما جاء لا نکاح الا بولی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی نقل کیا ہے :

جس کا کوئی سرپرست نہ ہو اس کی سرپرست حکومت ہے ۔

یہ بات کہ یہ سرپرستی صرف نکاح اور شادی کے معاملہ تک نہیں ہے بلکہ یہ ایک عمومی سرپرستی ہے جس میں رعایا کی ضروریات کی تکمیل بدرجہ اولیٰ شامل ہے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس خط سے صاف ظاہر ہے جو آپ نے ایک نومسلم قبیلہ کے سردار کے نام لکھا تھا ۔ آپ سردار کے توسط سے اس کے قبیلہ حمیر کے لوگوں کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :

اہل حمیر میں تم کو اچھے روش اختیار کرنے کی تلقین کرتا ہوں : خیانت کرنا اور نہ مخالفانہ روش اختیار کرنا ، اللہ کا رسول تمہارے مالدار اور غریب تمام لوگوں کا سرپرست ہے ۔ صدقہ کا مال محمد رسول اللہ علیہ وسلم یا ان کے گھر والوں کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ یہ زکوٰۃ ہے جسے تم اپنا پاکیزگی کی خاطر غریب مسلمانوں کے لیے نکالتے ہو ۔

اس خط میں اہل حمیر کو یہ بتایا گیا ہے کہ ان سے ان کے مال کا جو حصہ بطور زکوٰۃ وصول کیا جاتا ہے وہ صدر مملکت کے ذاتی مصرف میں نہ آئے گا بلکہ ضرورت مند مسلمانوں کو دیا جائے گا ۔ ان کو اطاعت کر کے سرکشی کی روش اختیار کرنے یا امانت ترک کر کے ادائے عشر و زکوٰۃ میں خیانت کرنے سے منع کیا گیا ہے اور یہ اطمینان دلایا گیا ہے کہ جو فرد بھی مصیبت یا ضرورت سے پریشان ہوگا خواہ وہ مالدار ہو یا مفلس اللہ کا رسول اس کو سہارا دینے کے لیے موجود ہے ۔ ظاہر ہے کہ یہاں حضور انور

صلی اللہ علیہ وسلم سے آپ کی وہ حیثیت مراد ہے جو حکومت کے سربراہ کی حیثیت سے آپ کو حاصل تھی۔ یہ بات حضرت عمر کے ایک اثر سے بالکل واضح ہو جاتی ہے۔ آپ نے حضرت ابو عبیدہ ابن الجراح کو ایک خط لکھا تھا جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد اللہ ورسولہ مولیٰ من لا مولیٰ لہ کا حوالہ دے کر حکومت کی ذمہ داری بتائی تھی۔

حکومت کی اس سرپرستی میں بنیادی ضروریات کے علاوہ بشرطِ گنجائش افراد کی دوسری ضروریات کی تکمیل بھی داخل ہو جاتی ہے۔ فتوحات کے بعد جب بیت المال میں کافی مال آنے لگا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ اعلان فرمایا کہ جو لوگ مقروض ہوں اور وفات پا جائیں۔ ان کے قرضے اسلامی حکومت کے خزانے سے ادا کیے جائیں گے۔ ابو عبید نے کتاب الاموال میں آپ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

مجھ سے مسلمانوں کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ لگاؤ ہے لہٰذا جو قرض والا مر جائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہے۔

امام بخاری نے کتاب النفقات میں اس موضوع پر خاص عنوان "من ترک کلا او ضیاعا فالی" قائم کر کے لکھا ہے کہ

پھر جب اللہ نے آپ پر فتوحات کا دروازہ کھول دیا تو آپ نے فرمایا مجھ سے مسلمانوں کو اپنی جانوں سے بھی زیادہ لگاؤ ہے لہٰذا جو مسلمان قرض چھوڑ کر وفات پائے اس کے قرض کی ادائیگی میرے ذمہ ہوگی اور جو مال چھوڑ جائے، وہ اس کے وارثوں کا ہوگا۔

ایک دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے قرض کے علاوہ مرنے والے کی چھوڑی ہوئی دوسری ذمہ داریوں مثلاً بے سہارا اولاد اور اہلیہ کی کفالت کے سلسلے میں بھی یہی اعلان فرمایا۔ امام ترمذی نے ابواب الفرائض میں "من ترک مالاً فلورثتہ" کے تحت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جو مال چھوڑ جائے تو وہ مال اس کے گھر والوں کے لیے ہے اور جو بے سہارا چھوڑ جائے اس کی ذمہ داری مجھ پر ہے۔ امام ترمذی کہتے ہیں کہ یہ حدیث حسن صحیح ہے اور ترک ضیاعاً کے معنے یہ ہیں کہ اس حال میں چھوڑ جائے کہ اس کے پاس کچھ بھی نہ ہو اور فالی کے معنے یہ ہیں کہ میں اس کی کفالت کروں گا۔

اسی مفہوم کی ایک حدیث ابوعبید نے کتاب الاموال میں حضرت مقدام بن معدی کرب کے حوالے سے نقل کی ہے:

جو متوفی مال چھوڑ جائے وہ اس کے وارثوں کے لیے ہے اور جو ذمہ داریاں چھوڑ کر مرے وہ اللہ کے ذمہ ہیں اور کبھی فرمایا وہ اللہ اور اس کے رسول کے ذمہ ہیں۔

اصل ارشاد میں من ترک کلا آیا ہے۔ ابوعبید کہتے ہیں کہ ہمارے خیال میں کل میں وہ تمام افراد داخل ہیں جن کی کفالت مرنے والے کے ذمہ ہو اور بچے بھی اس میں شامل ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد جو افراد اسلامی حکومت کی صدارت کے منصب پر فائز ہوتے ان کو اپنی ان وسیع ذمہ داریوں کا پورا شعور تھا۔ اس حقیقت پر خلافت راشدہ کی پوری تاریخ گواہ ہے مشہور شافعی فقیہ عزالدین بن عبدالسلام نے قواعد الاحکام میں یہ انکشاف کیا ہے کہ حضرت عمر نے اپنی ذمہ داریاں گناتے ہوئے ایک عام تقریر میں فرمایا تھا:

لوگو! اللہ نے مجھ پر یہ ذمہ داری ڈالی ہے کہ میں اس کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روک دوں۔

اس ارشاد کی تشریح خود عزالدین بن عبدالسلام نے اس طرح کی ہے:

اللہ کے حضور کی جانے والی دعاؤں کو روکنے کا مطلب یہ ہے کہ امام ظالموں کے مقابلے میں مظلوموں کے ساتھ انصاف کرے اور ان کو اس بات کی ضرورت نہ پڑنے دے کہ وہ اللہ سے انصاف کے طالب ہوں۔ اسی طرح وہ لوگوں کی ضروریات اور حاجتیں پوری کرے تاکہ ان کو اس کی ضرورت باقی نہ رہے کہ اللہ سبحانہ سے اس کی تکمیل کی دعا کریں۔ حکمرانوں پر شہریوں کے حقوق کے موضوع پر یہ جملہ کتنا جامع اور واضح ہے۔

اس اصول کا اعلان حضرت عمر نے اس وقت بھی فرمایا تھا جب آپ سعد بن مالک کو عراق کا امیر بنا کر روانہ کر رہے تھے۔ (البدایہ والنہایہ)

عوام کی معاشی ضروریات کی تکمیل کا حضرت عمر کو کتنا خیال تھا اس کا اندازہ اس خطبہ سے بھی کیا جا سکتا ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے قادسیہ کی فتح کی خوشخبری سنانے کے بعد عوام کے سامنے دیا تھا۔ اس میں آپ نے فرمایا:

مجھے اس بات کی بڑی فکر رہتی ہے کہ جہاں بھی کوئی ضرورت دیکھوں اسے پوری کر دوں۔ جب تک ہم سب مل کر اسے پورا کرنے کی گنجائش رکھتے ہوں۔ جب ہمارے اندر

اتنی گنجائش نہ رہے تو ہم باہمی امداد کے ذریعے گزر اوقات کریں گے۔ یہاں تک کہ سب کا معیارِ زندگی ایک جیسا ہو جائے۔ کاش تمہیں پتہ ہوتا کہ میرے دل میں تمہارا کتنا خیال ہے۔ میں تو یہ بات تمہیں صرف اپنے عمل ہی سے سکھا سکتا ہوں۔ بخدا میں بادشاہ نہیں ہوں کہ تمہیں اپنا غلام بنا کر رکھوں بلکہ خدا کا بندہ ہوں۔ حکومت کی یہ امانت میرے سپرد کی گئی ہے۔ اب اگر میں اس کو ذاتی ملکیت نہ سمجھ کر تمہیں واپس کر دوں اور تمہارے پیچھے پیچھے چلوں یہاں تک کہ تم اپنے گھروں میں سیر ہو کر کھا پی سکو تو میں تمہارے ذریعے فلاح پاؤں گا اور اگر میں اسے اپنا بنا لوں اور تمہیں اپنے پیچھے پیچھے چلنے اور اپنے گھر آنے پر مجبور کر دوں تو میرا انجام خراب ہوگا کچھ عرصہ میں خوشی منالوں گا مگر آخرت میں ہمیشہ خراب و غمگین رہوں گا۔ میرا حال یہ ہوگا کہ نہ کوئی کچھ کہنے والا ہوگا نہ کوئی میری بات کا جواب دے گا کہ عذر پیش کر کے معافی حاصل کر سکوں۔

اسلامی تاریخ بتاتی ہے کہ حضرت عمرؓ جب شام تشریف لے گئے تو حضرت بلالؓ نے بڑی ہی موثر انداز میں آپ کو یہ بتایا کہ عوام بھوک سے پریشان ہیں۔ آپ نے فوراً مقامی حکام کو حکم دیا کہ ہر مسلمان کے لیے بقدرِ کفایت غذائی اجناس فراہم کریں۔ ابو عبید نے کتاب الاموال میں یہ واقعہ لکھا ہے۔ اور ابن جوزی نے سیرۃ عمر بن الخطاب میں بحوالہ کلبی یہ بھی بتایا ہے کہ،

ایک بار حضرت عمرؓ اپنی چادر میں کنکریاں بھر کر اسے سر کے نیچے رکھے ہوئے مسجد میں سو رہے تھے کہ ایک پکارنے والے نے یا عمر یا عمر کہہ کر پکارنا شروع کیا۔ آپ چونک کر اٹھے اور آواز کی سمت دوڑے۔ دیکھا کہ ایک اعرابی اونٹ کی نکیل تھامے کھڑا ہے اور اس کے گرد لوگ جمع ہیں۔ جب اس نے حضرت عمرؓ کو دیکھا۔ لوگوں نے اسے بتایا کہ یہی امیرالمومنین ہیں۔ حضرت عمرؓ نے پوچھا کہ تجھے کس نے ستایا ہے۔ وہ اٹھ کر اپنا حال بیان کرنے لگا۔ چند اشعار پیش کیے جن میں قحط کی شکایت تھی۔ حضرت عمرؓ اپنا ہاتھ سر پر رکھ کر چیخے ہائے عمر ہائے عمر۔ لوگو! تم سمجھے کہ یہ کیا کہہ رہا ہے۔ یہ قحط اور خشک سالی کا ذکر کر رہا ہے۔ عمر سیر ہو کر کھاتا پیتا ہے اور مسلمان قحط کی مصیبت میں مبتلا ہیں۔ کون ہے جو ان لوگوں کو رسد اور کھجوریں اور ان کی ضرورت کی چیزیں پہنچائے چنانچہ آپ نے دو انصاری افراد کو بہت سے اونٹوں کے ساتھ جن پر اجناس اور کھجوریں لدی ہوئی تھیں روانہ کیا وہ یمن گئے اور اپنے ساتھ جو کچھ لے گئے اسے وہاں تقسیم کر دیا۔

کفالتِ عامہ کی ذمہ داری کے بارے میں حضرت عمرؓ کا تصور اتنا بلند، اس قدر وسیع اور ہمہ گیر تھا کہ ابنِ سعد نے طبقات میں اور ابن جریر طبری نے تاریخ میں لکھا ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ اگر اسلامی مملکت میں کوئی جانور بھی بھوکا مر گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اللہ کے حضور مجھے اس کے لیے جواب دہ ہونا پڑے گا ارشاد ہے :

لـو مات جمل ضياعاً على شط الفرات لخشيت ان يسألني الله[1]

اگر فرات کے کنارے ایک اونٹ بھی بے سہارا مر گیا تو مجھے اندیشہ ہے کہ اس کے بارے میں اللہ سبحانہٗ مجھ سے پوچھیں گے۔

کفالتِ عامہ اور قیامِ عدل کی ذمہ داریوں کو تمام و کمال ادا کرنے کے لیے آپ نے یہ پروگرام بنایا تھا ایک سال تک پوری اسلامی مملکت کا دورہ کر کے حالات کا جائزہ لیں۔ چنانچہ آپ نے فرمایا تھا کہ :

اگر میں زندہ رہا انشاء اللہ ایک سال تک اپنی رعایا کے درمیان دورہ کروں گا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ عوام کی بعض ضروریات ایسی ہیں جن کی خبر مجھ تک نہیں پہنچ پاتی ان کے مقامی حاکم مجھے ان کی ضروریات سے باخبر نہیں رکھتے اور خود وہ لوگ مجھ تک نہیں پہنچ پاتے۔ میں پہلے شام جاؤں گا اور دو ماہ وہاں ٹھہروں گا۔ پھر الجزیرہ جاؤں گا اور وہاں دو مہینہ قیام کروں گا، پھر مصر جاؤں گا اور وہاں بھی دو مہینہ تک رہوں گا پھر بحرین جاؤں گا اور دو مہینہ وہاں رہوں گا۔ پھر کوفہ جاؤں گا اور وہاں دو مہینہ قیام کروں گا، پھر بصرہ جاؤں گا اور دو ماہ وہاں ٹھہروں گا۔ خدا کی قسم! یہ سال کتنا اچھا ہوگا۔[1]

مگر شہادت نے آپ کو اس پروگرام کے مطابق عمل کرنے کا موقع نہ دیا۔ خود مدینہ میں آپ اہلِ حاجت کا پتہ لگانے اور ان کی حاجت روائی کا اہتمام کرنے کے لیے راتوں میں گشت لگاتے تھے۔ کئی بار ایسا ہوا کہ آپ کو کسی کی کسی ضرورت کا پتہ اسی گشت کے دوران لگا اور آپ نے فوراً وہ ضرورت پوری کی۔ آپ اپنے ماتحت حکام کو بھی اس ذمہ داری کی طرف متوجہ کرتے رہتے تھے۔ بصرہ کے والی حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہٗ جب ایک وفد کے ساتھ آپ سے ملاقات کے لیے آئے تو آپ نے ان لوگوں کو ہدایت فرمائی کہ :

سنو! لوگوں کے گھروں میں ان کے لیے فراخی کا سامان فراہم کرو اور ان کے متعلقین

---

[1] تاریخ طبری

کو کھلانے کا سامان کرو۔

کفالت عامہ کی ذمہ داری صرف مسلمان شہریوں تک محدود نہیں سمجھی جاتی تھی بلکہ غیر مسلم رعایا کو بھی اس سلسلہ میں وہی حیثیت حاصل تھی جو مسلمانوں کو تھی۔ حضرت عمرؓ نے بیت المال کے نگران کو ہدایت کی تھی کہ ضرورتمند اہل ذمہ کا پتہ لگا کر ان کی ضروریات کی تکمیل کا اہتمام کیا جائے۔

عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کا گزر کسی کے دروازے پر ہوا جہاں ایک سائل بھیک مانگ رہا تھا۔ ایک بوڑھا آدمی جس کی بصارت زائل ہو چکی تھی۔ آپ نے پیچھے سے اس کے بازو کو ٹٹولا اور پوچھا تم کس مذہب کے ہو اہل کتاب ہو؟ اس نے جواب دیا کہ یہودی ہوں۔ آپ نے پوچھا تمہیں کس چیز نے ایسا کرنے پر مجبور کر دیا ہے؟ اس نے جواب دیا کہ میں بڑھاپے، ضرورت مندی اور جزیہ کی وجہ سے بھیک مانگ رہا ہوں۔ (راوی) کہتا ہے کہ حضرت عمرؓ اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے گھر لے گئے اور گھر میں سے لا کر اسے کچھ دیا پھر آپ نے بیت المال کے خزانچی کو بلوایا اور ان سے کہا اس کا اور اس جیسے دوسرے افراد کا خیال رکھو۔ کیونکہ خدا کی قسم یہ بات انصاف سے بعید ہے کہ ہم ان کی جوانی میں ان سے جزیہ وصول کر کے کھائیں اور بڑھاپے میں انہیں بے سہارا چھوڑ دیں۔[1]

شام کے سفر میں آپ کو راستہ میں کچھ عیسائی ملے جو جذام میں مبتلا تھے۔ آپ نے ان کی معذوری کے پیش نظر ان کے لیے روزینہ جاری کرنے کا حکم دے دیا۔[2] غیر مسلم رعایا کی ضروریات کی تکمیل کا یہ اہتمام صرف حضرت عمرؓ کی شفقت کا نتیجہ نہ تھا بلکہ ابتداء ہی سے یہ اسلامی ریاست کی معاشی پالیسی کا ایک اہم اصول تھا۔ یہ بات نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اوپر نقل کیے ہوئے اس خط سے ظاہر ہے جو آپ نے قبیلہ حمیر کو مخاطب کرتے ہوئے لکھا تھا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے دور خلافت میں جب حضرت خالد بن ولید نے اہل حیرہ کے ساتھ جو عیسائی تھے معاہدہ کیا، تو اس میں ایک دفعہ یہ شرط بھی رکھی کہ:

میں نے ان کا یہ حق قرار دیا ہے کہ ایسا بوڑھا آدمی جو محنت کرنے سے معذور ہو جائے یا جس پر کوئی مرض یا مصیبت آ پڑے، یا جو آدمی پہلے مالدار رہا ہو اور اب ایسا غریب ہو جائے کہ اس کے ہم مذہب اسے خیرات دینے لگیں اس کا جزیہ ساقط کر دیا جائے گا اور جب تک وہ دار الہجرت اور دار الاسلام میں مقیم رہے گا اس کے اور اس کے اہل و عیال کی کفالت

---

[1]، [2] تاریخ طبری۔

مسلمانوں کے بیت المال سے کی جائے گی۔
اوپر جو احادیث و آثار نقل کیے گئے ہیں ان کا تعلق بہت بنیادی ضروریات سے ہے اگرچہ بعض احادیث میں ادائے قرض کا بھی ذکر آیا ہے اور سرپرستی (ولایت) کی احادیث کا تعلق ہر طرح کی بنیادی ضروریات سے ہے۔ بعض دوسرے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ غذا، لباس، مکان اور علاج جیسی بنیادی ضرورتوں کے علاوہ دوسری ضروریات کی تکمیل کا بھی اہتمام کیا گیا تھا۔
بعض آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر شادی شدہ افراد کو شادی کرنے کے لیے بیت المال سے مالی امداد دی جاتی تھی۔ حضرت عمر بن عبدالعزیزؒ نے کوفہ کے والی زید بن عبدالرحمٰن بن عمر بن الخطاب کو لکھا تھا جیسا کہ کتاب الاموال میں ابو عبید نے لکھا ہے کہ بیت المال کے فاضل مال میں سے ایسے لوگوں کی مدد کی جائے جنہوں نے شادی کی ہو اور ان کے پاس نقد مال نہ ہو۔
ان آثار کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہے کہ اسلامی حکومت کی ذمہ داری ہے کہ محروم اہل حاجت کی حاجت روائی کا اہتمام کرے۔ بعض بنیادی ضروریات کی تکمیل لازمی ہے مگر حتی الامکان دوسری اہم ضروریات کی طرف بھی توجہ کرے۔ مسلمان حکمرانوں کے فرائض پر اظہار خیال کرنے والے متعدد مفکرین نے اس فرض کی صراحت کی ہے۔ جن مفکرین نے اسے فرائض امیر میں داخل نہیں کیا ہے مثلاً ماوردی اور ابو یعلی، ان کے پیش نظر غالباً یہ مفروضہ ہے کہ زکوٰۃ و صدقات واجبہ کی تحصیل و تقسیم سے یہ مقصد بتمام و کمال حاصل ہو جائے گا۔ اس سلسلے میں بنیادی اصول کو حافظ ابن حزم نے واضح کیا ہے۔ المحلی میں رقمطراز ہیں :-

> ہر ملک کے مالدار لوگوں پر فرض ہے کہ اپنے غریب لوگوں کی کفالت کریں۔ اگر زکوٰۃ کی آمدنی اور سارے مسلمانوں کی فئے اس کے لیے کافی نہ ہو تو سلطان ان کو ایسا کرنے پر مجبور کرے گا۔ ان اہل حاجت کے لیے اتنے مال کا انتظام کیا جائے گا جس سے کہ وہ بقدر ضرورت غذا حاصل کر سکیں۔ اور اسی طرح جاڑے اور گرمی کا لباس اور ایک ایسا مکان جو انہیں بارش، گرمی، دھوپ اور راہ گیروں کی نظروں سے محفوظ رکھ سکے۔

امام غزالی التبر المسبوک میں لکھتے ہیں :

> سلطان پر واجب ہے کہ جب اس کی رعایا تنگی میں مبتلا ہو اور فاقہ اور مصیبت سے دوچار ہو تو ان کی مدد کرے۔ بالخصوص قحط اور گرانی کے زمانہ میں، کیونکہ ایسے حالات میں لوگ کسب معاش میں ناکام رہتے ہیں اور گزر اوقات کرنا دشوار ہو جاتا ہے ایسے حالات

میں سلطان کو چاہیے کہ ان کو کھانا فراہم کرے اور سرکاری خزانے سے انہیں مال دے کر ان کی حالت بہتر بنائے۔

الجصاص نے احکام القرآن میں سورۂ یوسف کی تفسیر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ،

اللہ تعالیٰ نے ہمیں حضرت یوسف علیہ السلام کا جو قصہ سنایا ہے اور ان کے بارے میں قحط کے زمانے میں غذائی اشیاء کو محفوظ کر کے انسانوں میں بقدر ضرورت تقسیم کرنے کا جو واقعہ نقل کیا ہے وہ اس بات پر دلیل ہے کہ ہر زمانے میں حکمرانوں پر یہ واجب ہے کہ جب ان کو اندیشہ ہو کہ قحط کے سبب عوام ہلاک ہو جائیں گے تو ایسا ہی طریقہ اختیار کریں۔

اس مسئلہ میں اصولی بات یہ ہے کہ ہر فرد کی بنیادی ضروریات کی تکمیل پورے اسلامی معاشرے پر فرض کفایہ ہے اور فرض کفایہ کی بقدر کفایت تکمیل بالاخیر ریاست کی ذمہ داری ہے۔ یہ مقصد کہ ہر فرد کی بنیادی ضروریات زندگی کی تکمیل۔ جس حد تک افراد کے اپنے وسائل اور محنت اور پھر معاشرے کے رضاکارانہ تعاون سے حاصل نہ ہو سکے اس حد تک ریاست کو اپنے زیر اہتمام حاصل کرنا ہوگا تاکہ شریعت کا منشا پورا ہو سکے۔ بعض فقہا نے اس اصول کی صراحت بھی کر دی ہے۔ چنانچہ امام نووی نے منہاج الطالبین میں لکھا ہے،

فرض کفایہ میں شامل ہے.... مسلمانوں کی تکلیف دور کرنا مثلاً ننگے کو کپڑے پہنانا، اور بھوکے کو کھانا کھلانا جبکہ یہ ضروریات زکوٰۃ اور بیت المال کے ذریعے پوری نہ ہو رہی ہوں۔

منہاج الطالبین کے شارح شہاب الدین احمد البرلسی اس بیان پر یہ سوال اٹھاتے ہیں کہ:

کیا تکلیف دور کرنے سے مراد اس مقدار کی فراہمی ہے جس سے سد رمق ہو جائے یا بقدر کفایت فراہمی مراد ہے۔

اور اس سوال کا یہ جواب دیتے ہیں،

اس بارے میں دو رائیں ہیں جن میں صحیح رائے دوسری ہے چنانچہ ایسا لباس فراہم کرنا ضروری ہے جس سے پورا بدن ڈھک جائے اور جو جاڑے اور گرمی کے حالات کے لیے موزوں ہو نیز کھانے کپڑے کے ساتھ وہ چیزیں شامل ہیں جو اتنی ہی ضروری ہوں، مثلاً طبیب کا معاوضہ، دوا کی قیمت اور معذور کے لیے ملازم جیسا کہ ظاہر ہے۔

اس موضوع پر یہاں اسوا لکسم بینکسم بالبا طل پر لکھنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ

سمجھنے والے سمجھ رہے ہیں کہ اشتراکیت کوئی معاشی نظام ہے۔ حقیقت میں یہ معاشی نظام نہیں بلکہ قدرت کا انتقام ہے۔ سید رشید رضا نے صحیح لکھا ہے،

جن ممالک میں اسلامی ہدایات کو اپنایا جائے گا ان میں کسی کو تن پوشی اور بھوک کی شکایت نہ ہوگی۔ مسلمان اور غیر مسلم دونوں یکساں ہوں گے۔ کیونکہ اسلام کے نظامِ معیشت نے اہل اسلام پر یہ فرض کیا ہے کہ ہر حاجت مند اور ضرورت مند کی ضرورت کو پورا کیا جائے۔ اور اس کی فرضیت ایسی ہی ہے جیسے فقیروں کے لیے، مسکینوں کے لیے سرمایہ داروں کے مال میں حق فرض ہے۔ ان ممالک میں بسنے والا یہ یقین کرتا ہے کہ اُمت کا مال خود اس کا مال ہے۔ حالتِ اضطرار میں اس کے لیے ذخیرہ ہے۔ اسلام نے سرمایہ داروں کے اموال میں مال کی ایک مقررہ مقدار سرکار کے قبضہ میں دی ہے اور دوسرے واجبات و وقت شہریوں کے اختیارِ تمیزی اور صوابدید پہ چھوڑ کر خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے تاکہ ان میں جذبۂ سخاوت پیدا ہو۔ ہاں کسی ضرورت مند کو اس کی ہرگز اجازت نہیں دی کہ مالکوں کی رضامندی اور اجازت کے بغیر ان کے اموال میں دست درازی کرے۔ کیونکہ اس میں دو گونہ خرابیاں ہیں۔ ایک اخلاقی فضائل کی راہیں ختم ہو جاتی ہیں اور دوسرے بیکار نکموں اور کاہلوں کا ایک پیشہ ور طبقہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ان دو خرابیوں کے علاوہ اجتماعی زندگی کی ابتری اور انسانیت کا انحطاط اس کے نتیجے میں رونما ہوگا وہ اس سے الگ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ چونکہ اشتراکی نظام کا مقصد ایسی سوسائٹی کی تعمیر ہے جس میں کوئی فرد دوسرے فرد کی معاشی امداد کا محتاج نہ ہو اور نہ کوئی شخص دوسروں کی امداد کو اپنا اخلاقی فرض خیال کرے۔ اس لیے اس نظام میں انسان کی بعض اعلیٰ خصوصیات اور شریف جذبات مثلاً غریبوں کی اعانت حاجت مندوں کی حاجت روائی اور بیماروں کی عیادت و خبرگیری اور اسی نوع کے دیگر انسانی فضائل یکسر ناپید ہو جائیں گے۔ اس کے برعکس اسلام معاشی زندگی کے بعض اہم اور ضروری شعبوں کو ضابطہ اور قانون کی طاقت کے حوالہ کر کے باقی تمام شعبوں میں انسان کے اخلاقی احساسات کو ان کے عمل میں آزاد چھوڑ دیتا ہے اور اس کے تصورات کی اصلاح، اس کی سیرت و ذہنیت کی تشکیل اور ایک مناسب ماحول کی تخلیق کے ذریعہ سے بالواسطہ اس امر کی کوشش کرتا ہے کہ اخلاقی احساسات کا یہ آزاد عمل غلط سمت بہہ نہ جائے۔ اس طرح اسلام نے دیگر تمام امور کی طرح معاشی امور میں بھی انسان کے آزاد اور باختیار ارادے کے لیے ایک ایسا میدان چھوڑ دیا ہے جہاں اس پر اخلاقی

احساسات کے سوا قانون یا حکومت کا کوئی دباؤ نہیں تاکہ اس میدان میں اس کی اخلاقی آزمائش ہو سکے۔

اکل بالباطل کا مطلب

اکل بولا ہے مگر مراد صرف کھانا نہیں بلکہ تمام تصرفات ہیں اور باطل کے معنے ناحق اور ناجائز کے ہیں کہ کسی کے مال کو باہم ناجائز طور پر نہ لو۔ چونکہ اموال کا مدبولا ہے اس لیے الجصاص نے اس سے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ جیسے کسی کے مال کو ناجائز اور ناحق استعمال کرنا از روئے آیت قرآنی حرام ہے ایسے ہی اپنے مال کو بھی ناحق اور ناجائز استعمال کرنا حرام ہے۔ اپنے مال کا ناجائز استعمال یہ ہے کہ ان کاموں میں خرچ کرے جن کے کرنے سے اللہ نے منع فرمایا ہے۔ مثلاً سودی کاروبار کرے شراب کی دکان کرے، قمار پر مال لگائے اور باطل عبداللہ ابن مسعود کی تشریح کے مطابق ان تمام صورتوں کو اپنے اندر لپٹے ہوئے ہے جو شرعاً حرام ہیں۔ قرآن نے ایک لفظ بالباطل فرما کر تمام ناجائز طریقوں سے حاصل کیے ہوئے مال کو حرام قرار دے دیا۔ پھر ان ناجائز طریقوں کی تفصیلات جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالے فرمادی۔ آپ نے ہر ناجائز معاملہ کی تفصیل بیان فرمادی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو تفصیلات ناجائز خرید و فروخت یا ناجائز اجارہ داری وغیرہ کی رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث میں مذکور ہیں۔ وہ درحقیقت اس قرآنی حکم کی تشریح ہیں اس لیے وہ سب احکام ایک حیثیت سے قرآن ہی کے احکام ہیں۔ احادیث رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم میں جتنے احکام شرعیہ مذکور ہوتے ہیں۔ سب کا عام طور پر یہی حال ہے کہ وہ کسی نہ کسی طرح قرآنی اشارہ کی تشریح ہوتی ہے خواہ ہمیں معلوم ہو یا نہ ہو کہ یہ فلاں آیت کی تشریح ہے۔[1]

باطل طریقے سے مراد لین دین، کاروبار اور تجارت کے وہ طریقے ہیں جن میں معاملہ کے دونوں فریقوں کی حقیقی رضامندی یکساں طور پر نہیں پائی جاتی بلکہ اس میں ایک کا مفاد محفوظ ہوتا ہے۔ دوسرا ضرر یا غرر کا ہدف بنتا ہے۔ قرآن نے اس مفہوم کی طرف خود اشارہ فرمادیا ہے چنانچہ باطل طریقے سے ایک دوسرے کا مال کھانے کی نہی کے بعد یہ جو فرمایا ہے کہ الا ان تکون تجارۃ عن تراض منکم یہ مثبت پہلو سے اسی اجمال کی وضاحت ہے جو پہلے ٹکڑے میں پایا جاتا ہے اس ٹکڑے نے واضح کر دیا کہ معاملہ اور لین دین کی بنیاد جب حقیقی باہمی رضامندی پر ہے تب ہی اس سے جو منافع ہوتا ہے

[1] معارف قرآن مفتی۔

وہ جائز ہوتا ہے اور اگر اس میں کوئی دھوکا پایا جاتا ہے یا اس میں ایک فریق کی بے بسی اور مجبوری کو دخل ہے تو اگرچہ وہ بظاہر اس پر راضی بھی ہو لیکن یہ اکل اموال الناس بالباطل کے حکم میں داخل ہے۔ اسی لیے معاملے اور تجارت کی وہ صورتیں اسلام میں ناجائز ہیں جن میں ضرر یا غرر کا شائبہ ہو۔ سود اس کاروبار کی بدترین شکل ہے[1]

معاشی وسائل میں تجارت

اگرچہ معاشی وسائل ایک سے زیادہ ہیں مثلاً صنعت، زراعت، ملازمت وغیرہ مگر یہاں صرف تجارت کا ذکر کیا ہے اس کی وجہ یا تو یہ ہے کہ یہ معاشی وسائل میں سب سے زیادہ ہے اور اس راہ سے حاصل شدہ منافع سب سے زیادہ پاکیزہ ہیں اور یا اس کی وجہ یہ ہے کہ معاشی وسائل ہیں معیشت کی بنیاد بھی باقی ہے دوسرے وسائل بھی اگرچہ وسائل ہیں مگر حاصل ان کا بھی تجارت ہی ہے۔

یہاں قرآن تجارت کا لفظ بول کر ہر مالک کی ملکیت کا حق مان کر اسے یہ حق بھی دے رہا ہے کہ وہ اپنی املاک کو مزید نفع کمانے اور اس طرح انہیں اپنی ملکیت میں اضافہ کرنے کے لیے استعمال کرنے کا مجاز ہے۔ اس مقصد کے تحت اپنی ملکیت کے ذریعے خود کوئی پیداوار کاروبار کر سکتا ہے اور کسی دوسرے کاروباری واسطہ سے بھی اپنا منشا پورا کر سکتا ہے۔ اس آیت میں قرآن نے اس حق کو نہ صرف تسلیم کیا ہے بلکہ دوسرے مواقع پر اس کی ترغیب بھی دی ہے۔

ملکیت کے ذریعے نفع کمانے کا حق سخت ترین اعتراضات کا ہدف بنایا گیا ہے۔ انفرادی ملکیت کو ختم کر کے اجتماعی ملکیت کا نظام قائم کرنے کی تجویز بھی اس مخصوص حق کو تسلیم کرنے کے لیے پیش کی گئی ہے۔

نفع کمانے کا ذریعہ زیادہ تر مالک کا نقد سرمایہ ہوتا ہے۔ تاجر تیار شدہ مال کو ایک جگہ سے خرید کر دوسری جگہ یا ایک وقت خرید کر دوسرے وقت فروخت کرتا ہے اسے مال خریدتے وقت مستقبل میں خواہ یہ مستقبل کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو، حالات طلب کا اندازہ لگانا ہے۔ مال خرید کر بازار میں لانے کے وقت تک قیمت تبدیل ہو سکتی ہے جس کا تمام تر اثر اس کی آمدنی پر پڑتا ہے۔ یہاں لاگت قیمت خرید متعین ہوتی ہے اور قیمتِ فروخت غیر متعین اور غیر متیقن ہوتی ہے۔ تاجر کو بھی اپنا کاروبار عدم تیقن

---

[1] تدبر قرآن

کی فضا میں انجام دیتا ہے خواہ اکثر اوقات یہ عدم تیقن درجہ میں اس عدمِ تیقن سے کم ہو جو بڑے صنعتی کاروبار میں ہوتا ہے۔ تاجر کے لیے بھی صنعت کار کی طرح منافع و نقصان دونوں ہی کا امکان رہتا ہے صنعتی کاروبار کرنے کی طرح تاجر بھی چند مفید سماجی اعمال انجام دیتا ہے۔ اسی طرح زراعت میں بھی پیداواری عمل کے آغاز اور فصل کی تیاری کے درمیان زمانی فصل پایا جاتا ہے کسان کو یہ نہیں معلوم ہوتا کہ اس کی پیداوار کے بازار میں پہنچنے تک حالات طلب میں کیا تبدیلی ہو گی اور پیداوار کس نرخ پر فروخت کی جاسکے گی۔ وہ بھی اپنے کاروباری فیصلوں میں مستقبل کے بارے میں اپنے اندازوں کو ہی رہنما بناتا ہے۔ زراعت میں بھی لاگت متعین، مقرر اور آمدنی غیر مقرر اور غیر متیقن ہوتی ہے۔ الغرض صنعت، زراعت اور تجارت سب میں ایک روح کام کرتی ہے۔

تجارت کی دوسری شکل شرکت

سرمایہ کے نفع آور کاروبار کی تجارت میں دوسری شکل یہ ہے کہ ایک فرد اپنے سرمایہ کے ساتھ دوسرے فرد یا افراد سے مل کر کاروبار کرے۔ کاروبار میں ہر شریک سرمایہ اور کاروباری جدّوجہد دونوں کے ساتھ آتا ہے اس شکل میں نفع اور نقصان میں ہر شریک پہلے سے طے شدہ نسبت کے مطابق حصّہ دار ہوگا۔ یہ شرکت کی سادہ ترین صورت ہے۔

اس شکل میں اور ذاتی تجارت کی صورت میں ہونے والے نفع کے اندر اصولاً کوئی فرق نہیں پایا جاتا۔ اس لیے اس شکل میں نفع کے وقوع اور اس کے استحقاق پر علیحدہ گفتگو کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔

شرکت سے متعلق تفصیلی قانونی بحثوں کا مطالعہ اسلامی فقہ کی کتابوں کی مدد سے کیا جاسکتا ہے۔ تفصیلات میں مختلف فقہائے کے درمیان جو اختلاف ہے اس کی نشاندہی یا اس پر بحث کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔

یہاں ہم صرف اہم باتوں کی طرف اشارہ کرتے ہیں۔ اگر دو فریق برابر برابر سرمایہ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوں تو امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک ضروری ہے کہ وہ دونوں نفع و نقصان میں برابر کے شریک ہوں لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ غیر مساوی نسبتیں بھی طے کر سکتے ہیں کیونکہ اگرچہ سرمایہ ان کا برابر ہے لیکن کاروباری صلاحیتوں اور عملی جدّوجہد کے اعتبار سے دونوں افراد کے درمیان فرق ممکن ہے۔ شرکت کی اس عام شکل کو فقہی اصطلاح میں شرکت العنان کہتے ہیں۔ اس شکل میں شرکا کی ذمّہ داری سرمایہ میں ان کے حصّوں کی نسبت سے متعین ہوتی ہے۔

شرکت کی ایک اختلافی شکل شرکت المفاوضہ ہے۔ شرکا اپنے تمام سرمایہ کے ساتھ کاروبار میں شریک ہوتے ہیں لیکن ان سرمایوں کا باہم مساوی ہونا ضروری ہے۔ خسارے کی شکل میں شرکا۔ کی ذمہ داری غیر محدود ہوتی ہے۔ نفع کی صورت میں ہر شریک کو برابر برابر حصے ملتے رہیں۔ شرکت کی اس صورت میں صرف فقہ حنفی میں صحیح قرار دیا گیا ہے۔

تجارت کی تیسری شکل مضاربت

سرمایہ کو تجارت میں لگانے کی تیسری شکل یہ ہے کہ مالک اپنا سرمایہ کسی کاروباری کے سپرد کر دے۔ سرمایہ والا صرف سرمایہ فراہم کرے اور کاروباری فریق اسی سرمائے کے ذریعے کاروبار چلائے۔ یہ مضاربت کی سادہ ترین صورت ہے جس میں ایک شریک صرف سرمایہ فراہم کرتا ہے اور دوسرا شریک صرف کاروباری جدوجہد کرتا ہے سرمایہ نہیں لگاتا۔

کاروبار میں نفع ہوگا تو دونوں فریق اس نفع میں طے شدہ نسبتوں کے ساتھ حصہ دار ہوں گے۔ کاروبار میں نقصان ہوگا تو اس کو سرمایہ لگانے والا برداشت کرے گا۔ کاروباری فریق کو صرف یہ نقصان ہوگا کہ اسے اپنی سعی و جہد کا کوئی صلہ نہ ملے گا۔ کسی فریق کے حق میں بہرصورت کسی متعین رقم کی ادائیگی کا معاہدہ نہیں کیا جا سکتا۔ سرمایہ فراہم کرنے والا یہ شرط نہیں پیش کر سکتا کہ نفع ہو یا نقصان اسے ایک مقررہ رقم ضرور ملنی چاہیے۔ البتہ نفع کی تقسیم کے لیے دونوں فریق باہمی رضامندی سے جو تناسب بھی چاہیں طے کر سکتے ہیں۔

فقہا نے بھی اس بات کی صراحت کر دی ہے کہ سرمایہ فراہم کرنے والا فریق نقصان کی ذمہ داری کاروباری فریق کے سر نہیں ڈال سکتا وہ یہ طے نہیں کر سکتا کہ نقصان کی صورت میں بھی اسے اپنا سرمایہ واپس ملنا چاہیے کاروبار میں خسارے کے باعث اگر پورا سرمایہ بھی ڈوب جائے تو اس کی یا اس کے کسی حصہ کی ادائیگی کاروباری فریق کے ذمہ نہ ہوگی۔ بہرحال ذاتی کاروبار ہو یا شرکت اور یا پھر مضاربت یہاں قرآن نے اس کے جواز کی بنیادی شرط یہ بتائی ہے کہ عن تراض منکم ہو۔

کاروبار کے جواز کی بنیادی شرط

اور اس بنیادی شرط عن تراض منکم کا مطلب یہ ہے کہ لین دین نہ تو کسی ناجائز دباؤ سے ہو اور نہ فریب اور دغا سے۔ رشوت اور سود میں بظاہر رضامندی ہوتی ہے مگر فی الواقع وہ مجبوری کی رضامندی ہوتی ہے اور دباؤ کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جوئے میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے مگر فی الواقع جوئے میں حصہ لینے والا

ہر شخص اس غلط امید پر رضامند ہوتا ہے کہ جیت اس کی ہوگی ہارنے کے ارادے سے کوئی بھی رضامند نہیں ہوتا۔ جعل اور فریب کے کاروبار میں بھی بظاہر رضامندی ہوتی ہے مگر اس غلط فہمی کی بنا پر ہوتی ہے کہ اندر جعل و فریب نہیں ہے۔ اگر فریق ثانی کو معلوم ہو جائے کہ کوئی اس سے جعل و فریب کر رہا ہے تو وہ ہرگز اس پر راضی نہ ہو۔[1]

بہر کیف باہمی لین دین کو قرآن نے عن تراض منکم پر مبنی کیا ہے یعنی کوئی کسی کے مال کو اس کی رضامندی کے بغیر اپنی ملک نہیں بنا سکتا۔ اسی اصول کو پیش نظر رکھ کر فقہاء اسلام نے تمام معاشی ابواب کے قوانین کو مرتب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ظاہر ہے کہ لین دین میں باہمی رضامندی کی شرط تقریباً تمام متمدن اقوام کے قوانین میں مسلم ہے۔ چوری، ڈاکہ، دھوکہ، فریب، غصب وغیرہ کو اسی لیے جرم قرار دیا گیا ہے کہ ان تمام صورتوں میں مالک کی مرضی کے بغیر اس کے مال پر قبضہ کیا جاتا ہے لیکن قرآن نے اس عام قانون کے علاوہ مالی معاملات اور مال کے لین دین کے متعلق چند اور قوانین کا بھی اضافہ کیا ہے جن میں پہلی دفعہ تو ابھی آپ پڑھ آئے ہیں اور دوسرے پارے میں بھی بحث گزر چکی ہے یعنی لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل اور دوسری آپ تیسرے پارے میں سُود کے موضوع پر پڑھ چکے ہیں کہ لا تظلمون و لا تظلمون۔ اسلامی معاشیات کے لیے یہ تینوں دفعات میرے خیال میں سنگ میل کا حکم رکھتی ہیں۔ سُود قمار کا ان تینوں دفعات کی روشنی میں مطالعہ کرنا چاہیے۔

ذاتی کاروبار، شرکت اور مضاربت میں سرمایہ کاروبار میں نقصان کے خطرہ کے ساتھ داخل ہوتا ہے لیکن سُود و قمار میں سرمایہ اپنی بحفاظت واپسی کی شرط کے ساتھ نقصان کے خطرے سے بری الذمہ ہو کر داخل ہوتا ہے۔ یہی فرق سُود و قمار میں نفع کے استحقاق کو ختم کر دیتا ہے۔ اس اصول کی معقولیت پر مزید اطمینان کے لیے اس نفسیاتی کیفیت کا مطالعہ کر لینا بھی مفید ہوگا۔ جو سرمائے کے کاروبار میں شرکت کی ان دو مختلف صورتوں میں کاروباری کی ہوتی ہے۔ اسی نفسیاتی کیفیت کی طرف قرآن نے عن تراض منکم سے اشارہ کیا۔ عن تراض منکم کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ جن چیزوں کو اللہ اور اس کے رسُول نے حرام قرار دے دیا ہے وہ باہمی رضامندی سے تجارت کے ذریعے حلال ہو جائیں گی بلکہ مطلب یہ ہے کہ جو کچھ بھی اللہ نے حلال کیا ہے اگر وہ تمہاری ملک نہیں کسی اور کی ملک ہے اس کے حلال ہونے کی شرط یہ ہے کہ تجارت کے ذریعے ہو اور باہم رضامندی سے ہو اس میں جھوٹ، فریب،

---

[1] تفہیم القرآن۔

دھوکا نہ ہو۔

لفظ تراضی سے امام ابوحنیفہ اور امام مالک نے یہ نتیجہ بھی نکالا ہے کہ کاروبار اور لین دین میں لینے اور دینے والے کے لیے مجلس میں ایجاب و قبول ہو جانے کے بعد کوئی اختیار باقی نہیں رہتا ہے کیونکہ آیت تجارت کی راہ سے بشرط تراضی استعمال و تصرف کا پروانہ دے رہی ہے اور ظاہر ہے کہ پروانہ دینا بیع کے مکمل ہونے کی علامت ہے اور بیع کی تکمیل دلیل ہے لینے والے اور دینے والے میں سے کسی کے لیے اختیار نہ ہونے کی۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ مجلس کے برخاست ہونے تک دونوں کو نہ لینے اور نہ دینے کا اختیار ہے ان کا مستند وہ ارشادِ نبوت ہے جو بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے آیا ہے کہ،

لینے والے اور دینے والے کو اختیار ہے جب تک دونوں متفرق نہ ہوں۔

امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ ارشادِ نبوت صحیح ہے لیکن تفرق سے تفرقِ ابدان نہیں بلکہ تفرقِ اقوال مراد ہے یعنی مجلس کا برخاست ہونا مراد نہیں بلکہ بات چیت کا ختم ہونا مراد ہے۔ شیخ ابن الہمام فرماتے ہیں کہ تفرق سے بات چیت کا ختم ہونا عرف اور شریعت میں بکثرت آیا ہے۔ لیکن قاضی ثناءاللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ آیتِ قرآنی استعمال کے جواز کی تو دلیل ہے مگر لینے والے اور دینے والے سے حق فسخ کو سلب کرنے کی دلیل نہیں ہے اور تفرق سے بات چیت کا ختم ہونا مجازی معنے ہیں حقیقی معنے نہیں ہیں۔

خودکشی اور باہم خونریزی کی ممانعت

پہلے ارشاد ہوا تھا کہ اپنے مال باہم ناجائز طور پر نہ کھاؤ اور اب فرمایا جا رہا ہے کہ اپنے آپ کو قتل نہ کرو۔ اس کے معنے میں شارحینِ قرآن نے موقعہ اور مقام کی مناسبت سے کچھ اختلاف کیا ہے۔ علامہ آلوسی نے اس کے معنے یہ بتائے کہ ایک دوسرے کو قتل نہ کرو۔ یعنی باہم خونریزی نہ کرو اور یہ اندازِ بیان اس عمل کی قباحت کو اثر انگیز طور پر ظاہر کرنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ ارشادِ نبوت ہے المسلمون کالنفس الواحدۃ سارے مسلمان ایک جان کی طرح ہیں۔ امام حسن بصری نے یہی معنے بتائے ہیں مطلب اس تعبیر کا یہ ہے کہ جو شخص معاشرے میں کسی کے قتل کا ارتکاب کرتا ہے وہ اپنوں ہی کے قتل کا مرتکب ہوتا ہے کیونکہ معاشرے کے تمام افراد سب بھائی بھائی ہیں اور ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے۔ اسی لیے قرآن نے ایک کے قاتل کو سب کا قاتل قرار دیا۔

الجصاص نے یہ معنے بتائے ہیں کہ خودکشی نہ کرو کیونکہ بہت سے نادان جب ان پر غم، خوف یا

کوئی سخت معاشی بدحالی آتی ہے تو خودکشی کر لیتے ہیں ۔ قرآن نے خودکشی کو سنگین جرم قرار دیا ہے کیونکہ خودکشی کرنے والا فی الواقع تکلیف کے سامنے ہمت ہار دیتا ہے اور جو تکلیف سے گھبرا کر ہمت ہار دیتا ہے اس کا اللہ پر ایمان نہیں ہے ۔ اسی لیے ارشادِ نبوت میں خودکشی کرنے والے کی سزا جہنم بتائی گئی ہے اور آیت میں اسی معنے کو لے کر عمرو بن العاص مشہور صحابی نے شدید سردی میں غسل سے رخصت پر استدلال کیا ہے ۔

کچھ لوگوں نے اس فقرے کو پہلے فقرہ کا تتمہ بتایا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ دوسروں کا مال ناجائز طور پر کھانا خود اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا ہے ۔ دُنیا میں اس سے نظامِ تمدن خراب ہوتا ہے اور اس کے بُرے نتائج سے حرام خور آدمی خود بھی نہیں بچ سکتا ۔ اور آخرت میں اس کی بدولت سخت سزا کا مستوجب بن جاتا ہے ۔[1]

جن دو چیزوں کا یہاں قرآن نے ذکر کیا ہے یعنی لوگوں کے اموال کی حرمت اور انسانی جان کی حرمت ۔ اسلام میں ان دونوں کے تحفظ کی ضمانت دی گئی ہے ۔ قرآن میں فرد اور اجتماع کے باہمی تعلق کو جس انداز میں پیش کیا گیا ہے اس کی روشنی میں یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ ان دونوں کے درمیان اسلامی مقاصد زندگی کے حصول کے لیے فعال تعاون اسلام کا ایک اہم تقاضا ہے ۔ اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں وہ مقاصد تمام و کمال حاصل ہوں جو اسلام کو مطلوب ہیں ۔ انہی مقاصد کے لیے فرد کو اپنے دائرۂ کار میں اپنے ذرائع اور وسائل سے کام لیتے ہوئے اپنے دائرۂ عمل میں کوشش کرنی ہے ۔ اسلامی طرزِ زندگی میں ان دونوں کے درمیان مفادات کے ٹکراؤ کی اصولی طور پر کوئی گنجائش نہیں ہے ۔ عملی زندگی میں مفادات کا ٹکراؤ اور اس بنا پر افراد کے درمیان اور فرد و اجتماع کے مابین کشمکش اور نزاع کی شکل اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب دونوں میں سے ایک کو خطرہ لاحق ہو جائے مال کو یا جان کو ۔ اسلامی زندگی کی کامیابی کا مدار ان دونوں کا تحفظ ہے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متعدد ارشادات کے ذریعہ اس حقیقت کو اور زیادہ واضح کیا ہے ۔

كل المسلم على المسلم حرام دمه وماله وعرضه

ایک مسلمان کی ہر چیز دوسرے مسلمان کے لیے قابلِ احترام ہے اور اس پر دست درازی ممنوع ہے اس کی جان اس کا مال اس کی آبرو ۔

---

[1] تفہیم القرآن

اب تک قرآن نے معاشرتی زندگی میں سعادت حاصل کرنے کے لیے آبرو کے تحفظ کی ہدایات کی تلقین کی ہے اور زیر نظر آیت میں جان اور مال کے تحفظ کی ہدایت کی ہے ۔ آخر میں فرمایا ہے کہ ان اللہ کان بکم رحیما یعنی تمہیں باہم ایک دوسرے کے مال ناجائز طور پر کھانے اور باہم قتل وخونریزی کی ممانعت اس لیے کی گئی ہے کہ اللہ کی ذات تم پر مہربان ہے اور یہ احکام اسی مہربانی وشفقت کا نتیجہ ہیں ۔ اس طرح تمہارے اموال اور تمہاری جانیں محفوظ ہوں گی ۔

ظلم وسرکشی کی سنگین سزا

۵۹ ۔ اور یاد رکھو جو کوئی ظلم وسرکشی سے ایسا کرے گا تو ہم عنقریب اسے دوزخ میں ڈالیں گے اور یہ اللہ پر بہت آسان ہے ۔ یعنی جو کوئی ظلم اور زیادتی سے باز نہ آتے بلکہ ناحق اوروں کا مال کھاتے یا ظلماً کسی کو قتل کر ڈالے تو اس کا ٹھکانا دوزخ ہے ۔ اور ایسے ظالموں کو آگ میں ڈال دینا اللہ تعالیٰ کو دشوار نہیں ہے بالکل سہل اور آسان ہے تو اب کوئی یہ سمجھ نہ بیٹھے کہ ہم تو مسلمان ہیں ، دوزخ میں کیسے جا سکتے ہیں اللہ تعالیٰ مالک ومختار ہے اس کو عدل وانصاف سے کون روک سکتا ہے [1]

اصل ارشاد میں ذالک آیا ہے ۔ اس کے مشار الیہ کے مقرر کرنے میں مختلف خیالات ہیں ۔ کچھ کی رائے میں اس کا مشار الیہ قتل نفس ہے ، کچھ کہتے ہیں کہ قتل نفس اور لوگوں کا مال ناجائز طور پر کھانا ہے اور کچھ کا خیال ہے کہ شروع سورت سے یہاں تک جس قدر محرمات گزرے ہیں سب کی طرف اشارہ ہے ۔ علامہ بغوی نے آخری رائے کو راجح قرار دیا ہے ۔ عدوان اور ظلم دونوں الگ الگ ہیں ۔ عدوان یہ ہے کہ تم زور وزبردستی سے کسی کا مال چھین لو یا دوسرے کی جان کے لیوا ہو جاؤ اور ظلم یہ ہے کہ دھاندلی سے کسی کا حق واجب ادا نہ کرو بلکہ اس کو دبا بیٹھو ۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص کسی کی جان کا زور اور زبردستی سے لیوا ہو جائے گا یا کسی کے مال کو طاقت کے زور سے چھینے گا ۔ یا جو شخص کسی کے حق واجب کو دھاندلی سے ادا نہ کرے گا اس کے لیے اللہ کے یہاں سنگین سزا ہے ۔ حضرت مولانا اشرف علی نے بیان القرآن میں اپنے افادات میں بڑی لطیف نکتہ آفرینی فرمائی ہے فرماتے ہیں کہ عدوان کا حاصل یہ ہے کہ وہ شخص واقع میں قتل کا مستحق نہ ہو اس کو قتل کر دیا جائے اور ظلم کی تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ غیر مستحق کا قتل ہو جانا تین طرح ہو سکتا ہے ایک یہ کہ فعلاً خطا ہوئی مثلاً گولی شکار پر چلائی اور وہ کسی آدمی کے لگ گئی ، دوسرے یہ کہ قاضی وحکم سے اجتہاداً

---

[1] افادات شیخ الاسلام

غلطی ہوئی مثلاً تنقیح مقدمہ روئداد سے ثبوت ہو گیا اور گواہوں کو اپنے نزدیک معتبر سمجھا اور واقع میں وہ معتبر نہ تھے
تیسرے یہ کہ حقیقت حال یعنی اس کا غیر مستحق ہونا معلوم ہے پھر بھی اس کو عمداً قتل کر ڈالا ظلم کا لفظ کی وجہ
سے پہلی دو صورتیں آیت کا مصداق نہ رہیں۔ اور عدوان کی قید سے معلوم ہو گیا کہ جو شخص واقع میں مستحق قتل
ہو مثلاً اس پر قصاص واجب ہے اس کا قتل کرنا ممنوع نہیں ہے بلکہ ولی کی درخواست پر واجب ہے
اور ولی کو جائز ہے۔

پوشیدہ حقیقت کی طرف اشارہ

وکان ذالک علی اللہ یسیرا۔ یہ اللہ کے لیے بہت آسان ہے۔ یہ انداز بیان ایک پوشیدہ حقیقت
کی طرف اشارہ کر رہا ہے وہ یہ کہ جو لوگ خدا کو مانتے ہیں لیکن اللہ کی صفات عدل ورحمت کا صحیح تصور نہیں
رکھتے۔ وہ اپنے آپ کو رعائتیں دینے میں بڑے فیاض ہوتے ہیں اور بڑے بڑے جرائم کرتے چلے جاتے
ہیں لیکن یہود کی طرح توقع بھی رکھتے ہیں کہ اللہ ان پر بہت مہربان ہے اس لیے سب کو بخش دے گا۔
قرآن نے جو یہود کا قول سیغفر لنا نقل کیا ہے وہ اسی ذہنیت کی غمازی کر رہا ہے۔ درحقیقت اس قماش
کے لوگ شہ تو حاصل کرتے ہیں اس مہلت سے جو ایسے لوگوں کو اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے لیکن ان کی حیلہ گر
جو طبیعت آڑ تلاش کرتی ہے خدا کی رحمت کی۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی ہی ذہنیت رکھنے والوں کو خطاب کرکے
فرمایا کہ جو لوگ ظلم وعدوان کی زندگی گزار رہے ہیں۔ ان کو جہنم میں ڈالنا خدا کے لیے دشوار نہیں ہے۔

کبائر سے اجتناب کا نتیجہ

۳۱۔ اگر تم ان گناہوں سے بچتے رہو گے جو بڑے بڑے ہیں تو ہم تمہاری لغزشوں کو تم سے محو کر دیں
گے اور تمہیں عزت وتکریم کے مقام میں داخل کریں گے۔ پہلی آیت میں مذکور تھا کہ کوئی ظلماً کسی کے مال یا جان
کو نقصان پہنچائے گا تو اس کی سزا دوزخ ہے جس سے معلوم ہو گیا تھا کہ حق تعالیٰ کی نافرمانی بندہ کے لیے
موجب عذاب ہے۔ اب اس آیت میں گناہوں سے بچنے کی ترغیب اور گناہوں سے اجتناب کرنے پر وعدہ
مغفرت اور جنت کی توقع اور طمع دلائی جاتی ہے تاکہ اس کو معلوم کرکے ہر ایک آدمی گناہوں سے بچنے کی
کوشش کرے اور معلوم ہو جائے کہ جو کبیرہ گناہ مثلاً کسی کا مال غصب یا سرقہ کرنے یا کسی کو ظلماً قتل
کرنے سے بچ گیا جن کا ذکر ابھی گزرا تو اس کے وہ تمام صغیرہ گناہ بخشے جائیں گے جن کا مرتکب بغرض تحصیل
سرقہ اور قتل ہوا تھا۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس موضوع پر چند باتیں تفصیل طلب ہیں۔ اوّل یہ کہ کبیرہ اور صغیرہ کی حقیقت کیا ہے، دوسرے یہ کہ تکفیرِ سیّئات کا مطلب کیا ہے اور پھر یہ کہ اس موضوع پر اہل السنت اور معتزلہ کے مابین فکری اختلاف کیا ہے۔

گناہ کبیرہ کسے کہتے ہیں ؟

گناہ کبیرہ وہ گناہ ہے جس پر کوئی وعید ہو یا حد ہو یا اس پر لعنت آئی ہو یا اس میں مفسدہ کسی ایسے گناہ کا مفسدہ جیسا ہو جس پر وعید، حد یا لعنت آئی ہو یا وہ براہ تہاون فی الدین صادر ہوا ہو۔ احادیث میں کبائر کی جو تعداد آئی ہے وہاں حصر مقصود نہیں ہے بلکہ احوال وظروف کے مطابق وقت کے تقاضوں کا جواب ہے۔[۱]

قرآن وحدیث کی رُو سے اور اقوالِ سلف کی تشریحات کے مطابق گناہ کبیرہ یہ ہے کہ اس پر قرآن میں کوئی حدِ شرعی یعنی دُنیا میں سزا مقرر کی گئی ہو یا اس پر لعنت کے الفاظ آئے ہوں یا اس پر جہنم کی دھمکی ہو۔ ایسے تمام گناہ کبیرہ ہیں اسی طرح ہر وہ گناہ بھی کبیرہ میں داخل ہوگا جس کے مفاسد اور نتائج کسی گناہ کبیرہ کے برابر ہوں۔ اسی طرح جو گناہ صغیرہ جرأت و بیباکی کے ساتھ کیا جائے یا جس پر مداومت کی جاتے وہ بھی کبیرہ میں داخل ہو جاتا ہے۔[۲]

سب سے زیادہ صحیح قول یہ ہے کہ گناہ کبیرہ وہ ہے کہ جس پر اللہ اور اس کے رسُول نے دُنیا میں غصہ یا کوئی حد مقرر کی ہو اور آخرت میں اس پر عذابِ عظیم مرتب کیا ہو یا اس کے مرتکب پر لعنت کی ہو یا اس کو کفر کے ساتھ موسوم کیا ہو اور صغیرہ وہ ہے کہ جس سے منع تو فرمایا مگر اس پر غضب و لعنت وغیرہ اُمور کو نہیں فرمایا۔[۳]

گناہ کا چھوٹا بڑا ہونا اگرچہ حالات اور نسبتوں کے بدلنے سے تبدیل بھی ہوتا رہتا ہے اس وجہ سے ان کی منطقی حد بندی ذرا مشکل ہے تاہم یہ ایسی چیز نہیں جس کا سمجھنا مشکل ہو جس طرح ہجرت اور جہاد بھی نیکی ہے اور راستہ سے تکلیف دہ چیز ہٹانا بھی نیکی ہے لیکن نیکی ہونے کے لحاظ سے دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اسی طرح کسی کا گھر لوٹ لینا بھی گناہ ہے اور راستہ میں گندی چیز کا پھینکنا بھی برائی ہے لیکن دونوں برائیوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ درحقیقت نیکی اور بدی دونوں کی چھوٹائی اور بڑائی کے ناپنے کے لیے پیمانہ ان کے اثرات ونتائج ہیں۔ اگر ہماری نگاہ دُور رس ہو اور ہم خواہشاتِ نفس کی جانبداری سے بالاتر ہو کر حقائق پر غور کریں تو اس کے سمجھنے میں کوئی التباس پیش نہیں آسکتا۔[۴]

---

[۱] بیان القرآن [۲] معارف م ش [۳] معارف م ا [۴] تدبر قرآن

تین چیزیں ہیں جو کسی فعل کو بڑا گناہ بناتی ہیں ۔

۱۔ کسی کی حق تلفی خواہ وہ خدا ہو جس کی حق تلفی کی گئی ہے یا والدین ہوں یا دوسرے انسان یا خود اپنا نفس، پھر جس کا حق جتنا زیادہ ہے اسی قدر اس کے حق کو تلف کرنا زیادہ بڑا گناہ ہے ۔ اسی بنا پر گناہ کو ظلم بھی کہا جاتا ہے اور اسی بنا پر قرآن میں شرک کو ظلم عظیم کہا گیا ہے ۔

۲۔ اللہ سے بے خوفی اور اس کے مقابلے میں استکبار، جس کی بنا پر آدمی اللہ کے امر و نہی کی پروا نہ کرے اور نافرمانی کے ارادے سے وہ کام کرے جس سے اللہ نے منع کیا ہے اور عمداً ان کاموں کو نہ کرے جن کا اس نے حکم دیا ہے ۔ یہ نافرمانی جس قدر زیادہ ڈھٹائی اور جسارت اور ناخدا ترسی کی کیفیت اپنے اندر لیے ہوتے ہو گی اسی قدر گناہ بھی شدید ہو گا ۔ اسی معنے کے لحاظ سے گناہ کے لیے فسق اور معصیت کے الفاظ استعمال ہوئے ہیں ۔

۳۔ ان روابط کو توڑنا اور ان تعلقات کو بگاڑنا جن کے وصل و استحکام اور درستی پر انسانی زندگی منحصر ہے خواہ یہ روابط بندے اور خدا کے درمیان ہوں یا بندے اور بندے کے درمیان، پھر جو رابطہ جتنا زیادہ اہم ہے اور جس کے کٹنے سے امن کو جتنا زیادہ نقصان پہنچتا ہے اور جس کے معاملے میں مامونیت کی جتنی زیادہ توقع کی جاتی ہے، اسی قدر اس کے توڑنے، خراب کرنے کا گناہ زیادہ ہے[1]

حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے اور موضوع کے کسی پہلو کو تشنہ نہیں چھوڑا ہے ۔ اگرچہ دوسرے علماء نے بھی اس موضوع پر داد تحقیق دی ہے لیکن جو سلجھی ہوئی اور لطیف بحث حافظ ابن القیم نے کی ہے وہ ان کا ہی حصہ ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ کبائر کے موضوع پر سلف میں اختلاف حقیقت کا اختلاف نہیں ہے بلکہ محض تعبیری ہے ۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں سورۃ نساء میں زیر تشریح آیت تک اللہ سبحانہ نے جن جن باتوں سے منع کیا ہے وہ سب کبائر ہیں ۔ اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ کبائر میں سب سے اکبر گناہ شرک کرنا، خدا کی تدبیر سے نڈر ہونا، اللہ کی رحمت سے بے امید ہونا اور رحمت الٰہی سے مایوس ہونا ہے ۔ عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ خدا کی ہر نافرمانی کبیرہ ہے ۔ علی ابن طلحہ کہتے ہیں ۔ ایسا ہر گناہ کبیرہ ہے جس پر دوزخ کی غضب کی لعنت کی اور عذاب کی دھمکی ہو ۔ ضحاک کہتے ہیں جس گناہ پر دنیا میں سزا اور آخرت میں عذاب ہو کبیرہ ہے ۔ الحسین بن الفضل کہتے ہیں جس گناہ کو قرآن نے کبیر یا عظیم کہہ کر پکارا ہے وہ کبیرہ ہے ۔ سفیان ثوری کہتے ہیں کبیرہ وہ

---

[1] تفہیم القرآن

گناہ ہیں جن کا تعلق حقوق العباد سے ہے اور جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہے وہ صغیرہ ہیں۔ مالک بن مغول کہتے ہیں۔ اہل بدعت کے گناہ کبائر ہیں اور اہل السنت کے صغائر ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ بدعت خود کبائر میں سے ہے اس کی اساس پر کیے ہوئے اہل السنت کے مقابلے میں کبائر ہیں۔ کچھ کی رائے میں ارادہ او قصد سے کیے گئے سارے گناہ کبائر ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ وہ سب گناہ کبیرہ ہیں جو جائز سمجھ کر کیے جائیں۔ اور سدی کہتے ہیں کبائر وہ گناہ ہیں جن سے اللہ نے منع کیا ہے اور سیئات ان کبائر تک پہنچنے کے ذرائع، مقدمات، توابع اور وسائل ہیں۔ سدی کا مطلب یہ ہے کہ جن باتوں سے اللہ نے منع کیا ہے ان کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ تو وہ ہیں جو بالذات منع ہیں اور کچھ ایسے ہیں کہ بالذات تو ممنوع نہیں بلکہ ان کے مقدمات اور مبادی ہیں اس طرح صغائر نام ہوا مقدمات کا اور کبائر نام ہے مقاصد و غایات کا۔ مولانا شبیر احمد عثمانی کا میلان اسی طرف معلوم ہوتا ہے وہ فرماتے ہیں۔

> مثلاً کسی کا مال غصب یا سرقہ کرنے یا کسی کو ظلماً قتل کرنے سے بچ گیا تو اس کے وہ تمام صغیرہ گناہ بخشے جائیں گے جن کا مرتکب بغرض تحصیل و تکمیل سرقہ اور قتل ہوا تھا

تکفیر سیئات کا مطلب

تکفیر کے معنے ڈھانپ دینے اور مٹا دینے کے ہیں اور سیئات کے یہاں معنے چھوٹے گناہوں کے ہیں۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا نامۂ اعمال بڑے بڑے جرائم سے خالی ہو گا تو چھوٹی خطاؤں کو نظر انداز کر دیا جائے گا۔ یعنی اگر تم نے بڑے گناہوں سے دامن بچا کر رکھا تو اس بڑے گناہ کی راہ میں جتنے تم نے مقدمات، توابع اور وسائل اختیار کیے ان کو ملیا میٹ کر دیا جائے گا اور تم پر فرد جرم نہ لگائی جائے گی البتہ اگر کبائر کا ارتکاب کر کے آؤ گے تو ان کی راہ میں جو تم نے وسائل اختیار کیے ہیں اور جن ذرائع سے ان کا ارتکاب کیا ہے اور اس سلسلے میں جو مقدمات اور توابع بھی تم نے اختیار کیے ہیں ان مقدمات و توابع اور وسائل و ذرائع کو جرائم کی فہرست میں لکھ لیا جائے گا اور پھر جو مقدمہ تم پر قائم کیا جائے گا اس میں یہ مقدمات و توابع بھی گرفت میں آجائیں گے۔

قرآن نے یہاں نکفر عنکم سیئاتکم کی تعبیر اختیار کی ہے نغفر لکم ذنوبکم نہیں فرمایا۔ دونوں تکفیر سیئات اور مغفرت ذنوب میں جوہری فرق ہے یہاں چار چیزیں ہیں مغفرت، تکفیر، ذنوب اور سیئات، ذنوب سے مراد کبائر، سیئات سے صغائر ہیں۔ سیئات وہ ہیں جن میں کفارہ کام دے سکے اسی بنا پر سیئات کے لیے تکفیر آیا ہے۔ مغفرت کبائر کے لیے ہے اور تکفیر صغائر کے لیے۔ یہی وجہ

ہے کہ مصائب، ہموم اور غموم سے لیے تکفیر کا لفظ آیا ہے۔ مصائب ذنوب کی مغفرت کا نہیں بلکہ تکفیر کا سامان ہیں ذنوب کی بخشش و مغفرت مصائب سے نہیں بلکہ توبہ سے ہوتی ہے۔

حضرت شیخ الاسلام کی لطیف تحقیق

حضرت شیخ الاسلام نے اس آیت کی جو تشریح کی ہے اور تکفیر سیئات کا جو مطلب بتایا ہے اور اس سلسلے میں معتزلہ اور اہل السنت کے مذہب کی جس لطیف انداز میں تنقیح فرمائی ہے وہ بہت عجیب و غریب ہے۔ فرماتے ہیں:

اس آیت میں چند باتیں بحث طلب ہیں مگر اصل سب کی ایک ہی ہے کہ اس آیت کا عمدہ اور اصلی مطلب واضح ہو کر سامنے آجائے جس سے تمام امور کا جان لینا آسان ہو جائے۔

معتزلہ اور ان کے ہمنواؤں نے سرسری طور پر اس آیت کا یہ مطلب لیا ہے کہ اگر کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو گے یعنی پوری عمر میں ایک کبیرہ گناہ بھی نہ کرو گے تو پھر صغیرہ گناہ ضرور معاف ہو جائیں گے خواہ ان کی مقدار کچھ ہو اور اگر صغائر کے ساتھ ایک یا دو بھی کبیرہ گناہ شامل ہو گئے تو معافی ممکن نہیں ہے بلکہ سب کی سزا ضرور بھگتنی ہوگی۔

اہل السنت فرماتے ہیں کہ ان دونوں صورتوں میں اللہ تعالیٰ کو معافی اور گرفت کا اختیار بدستور قائم ہے۔ پہلی صورت یعنی اگر کبیرہ گناہوں سے بچتے رہو گے اور ایک بھی کبھی کبیرہ گناہ نہ کرو گے تو پھر صغیرہ خواہ کتنے ہوں ضرور معاف ہوں گے۔ اس صورت میں معافی کا لازم ہونا اور دوسری صورت یعنی اگر صغائر کے ساتھ کبیرہ ایک بھی ہو تو مواخذہ کا ضرور ہونا معتزلہ کی کم فہمی اور بدفہمی کا نتیجہ ہے اور اس آیت کے ظاہری الفاظ سے جو معتزلہ کا مذہب راجح نظر آتا ہے اس کا جواب کچھ نے تو یہ دیا ہے کہ انتفاء شرط سے انتفاء مشروط ہونا لازم اور ضروری نہیں ہے۔ اور کسی نے یہ بتایا کہ آیت زیر تشریح میں کبائر سے اکبر کبائر یعنی شرک مراد ہے اور کبائر کو جمع شرک کی قسموں کے متعدد ہونے کی وجہ سے لایا گیا ہے۔ اور اسی کے ذیل میں اور باتیں بھی زیر بحث آگئی ہیں لیکن ہم ان سب باتوں کو نظرانداز کر کے آیت زیر تفسیر کے ایسے محقق اور عمدہ معنے پیش کرتے ہیں جو نصوص اور عقل کے مطابق قواعد اور تحقیقات محققین کے موافق ہوں۔

یہ تو ظاہر ہے کہ اس آیت ان تجتنبوا کبائر ما تنهون عنه نكفر عنكم سيئاتكم اور دوسری آیت جو سورۂ نجم میں ہے۔

الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم دونوں کا مدعا اور مقصد ایک ہے۔

صرف لفظوں میں تھوڑا سا فرق ہے تو اب جو مطلب ایک آیت کا ہوگا وہی دوسری آیت کا ہوگا۔ لہٰذا سورۂ نجم کی آیت کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس کا ارشاد صحیح بخاری وغیرہ کتب حدیث میں صاف موجود ہے۔

عن ابن عباس قال ما رأیت شیئا اشبہ باللمم مما قال ابو ھریرۃ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ کتب علی ابن آدم حظہ من الزنا ادرک ذلک لا محالۃ فزنی العین النظر وزنی اللسان المنطق والنفس تمنی وتشتھی والفرج یصدق ذالک ویکذبہ۔

بشرط فہم اس حدیث سے دونوں آیتوں کے واقعی اور تحقیقی مطلب کا پورا سراغ ملتا ہے۔ اس مطلب کے مقابلے میں کوئی دوسری تقریر آیت کے مطلب کے لیے کیونکر قابل ترجیح ہو سکتی ہے۔ بالخصوص معتزلہ کی ہرزہ سرائی کیسے قابل التفات اور لائق جواب سمجھی جاسکتی ہے اور واقعی حدیث مذکور کا مطلب اور حضرت ابن عباس نے جو اس سے بات نکالی ایسی عجیب اور قابل قبول تحقیق ہے کہ جس سے دونوں آیتوں کا مطلب واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے اور معتزلہ کی خرافات کی گنجائش اور اہل حق کو اس کی تردید کی بھی ضرورت نہ رہی۔ اور ذیلی اور ضمنی اقوال واختلاف بھی بہت خوبی سے طے ہو گئے۔ چنانچہ اہل فہم معمولی غور و فکر کے بعد سمجھ سکتے ہیں۔ محض وضاحت کی خاطر ہم حدیث مذکور کا خلاصہ ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں:

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ سورۂ نجم کی آیت میں جو لمم آیا ہے اور جس کی معافی کا ذکر ہے اس کی تعیین اور تحقیق کے متعلق ابوہریرہ کی حدیث سے بہتر ہم کو کوئی چیز معلوم نہیں ہوئی جس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے ابن آدم کے ذمہ پر جو زنا کا حصہ مقرر فرما دیا ہے وہ ضرور اس کو مل کر رہے گا پس زنا میں آنکھ کا حصہ تو دیکھنا ہے اور زبان کا حصہ یہ ہے کہ اس سے وہ باتیں کی جائیں جو زنا کے لیے مقدمات اور اسباب ہوں اور نفس کا حصہ یہ ہے کہ زنا کی تمنا اور اس کی خواہش کرے لیکن فعل زنا کا تحقق اور اس کا بطلان دراصل شرمگاہ پر موقوف ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر شرمگاہ سے زنا کا صدور ہو گیا تو آنکھ زبان دل سب کا زانی ہونا متحقق ہو گیا۔ اور اگر باوجود تحصیل جملہ اسباب و ذرائع کے شرمگاہ کا فعل نہ ہوا بلکہ زنا سے توبہ اور اجتناب نصیب ہو گیا۔ تو اب تمام وسائل زنا جو فی نفسہ مباح تھے صرف زنا کی تبعیت کی وجہ سے گناہ قرار دیے گئے تھے وہ سب کے سب لائق مغفرت ہو گئے یعنی ان کا زنا ہونا باطل ہو گیا اور گویا ان کا قلب ماہیت ہو کر بجائے زنا عبادت بن گئے کیونکہ فی نفسہ نہ معصیت تھے نہ عبادت بلکہ مباح تھے۔ صرف اس لیے کہ وہ زنا کے لیے

وسیلہ تھے معصیت کے ذیل میں داخل ہو گئے تھے جب زنا کے لیے وسیلہ نہ رہے تو اب ان وسائل کا زنا میں شمار ہونا اور ان کو معصیت قرار دینا انصاف نہیں ہے مثلاً ایک شخص مسجد میں چوری کے ارادے سے گیا مگر وہاں جا کر عین موقعہ پر متنبہ ہو گیا اور چوری سے توبہ کی اور رات بھر نماز پڑھتا رہا تو ظاہر ہے کہ جو رفتار چوری کا ذریعہ تھی اب وہ توبہ اور نماز کا ذریعہ ہو گئی۔ بنا علیہ عبداللہ ابن عباس اس حدیث ابوہریرہ کو سُن کر سمجھ گئے کہ لمم وہ باتیں ہیں جو دراصل گناہ نہیں مگر گناہ کا ذریعہ ہو کر گناہ ہو جاتی ہیں۔ اس روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوا کہ وہ لوگ بڑے گناہ اور کھلے گناہ سے تو بچتے ہیں ہاں صدور لمم ان سے ہو جاتا ہے لیکن بڑے گناہ کے کرنے سے پہلے ہی وہ اس سے تائب ہو جاتے ہیں تو ابن عباس نے جیسے حدیث ابی ہریرہ سے آیت سورۂ نجم کا مطلب سمجھ لیا ہم کو چاہیے کہ وہی معنے حسب ارشاد ابن عباس اس آیت کے بھی معلوم کر لیں جس کے بعد بحمداللہ نہ ہم کو اس کی ضرورت ہو گی کہ اس آیت کی توضیح میں گناہ صغیرہ اور کبیرہ کی مختلف تفسیریں نقل کریں اور نہ معتزلہ کے استدلال کے لیے جواب کی فکر ہو گی اور تکفیر سیئات کی وجہ اور دخول جنت کا سبب بھی بسہولت قواعد کے مطابق معلوم ہو جائے گا اور اجتناب کے معنے بھی ظاہر ہو جائیں گے۔ خلاصہ ہر دو آیت کا حسب ارشاد حدیث و بیان ابن عباس یہ ہوا کہ جو لوگ ان گناہوں سے رکیں گے اور ان کے ارتکاب سے اپنے کو بچاتے رہیں گے تو اس اجتناب کی وجہ سے ان کے وہ بُرے کام جو انہوں نے کسی گناہ کبیرہ کے سلسلے میں کیے ہیں معاف کر دیے جائیں گے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ زنا کے صغائر شراب نہ پینے سے معاف ہو جائیں گے۔ شراب پینے کی وجہ سے زنا کے صغائر کا مواخذہ لازم اور واجب ہو جائے گا واللہ اعلم۔ اس موضوع کے تفصیلی مباحث انشاء اللہ سورۃ مائدہ میں آرہے ہیں۔

وَلَا تَتَمَنَّوْا مَا فَضَّلَ اللّٰهُ بِهٖ بَعْضَكُمْ عَلٰى بَعْضٍ ۭ لِلرِّجَالِ
نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبُوْا ۭ وَلِلنِّسَاۗءِ نَصِيْبٌ مِّمَّا اكْتَسَبْنَ ۭ وَسْـَٔلُوا اللّٰهَ
مِنْ فَضْلِهٖ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمًا ۝ وَلِكُلٍّ جَعَلْنَا
مَوَالِيَ مِمَّا تَرَكَ الْوَالِدٰنِ وَالْاَقْرَبُوْنَ ۭ وَالَّذِيْنَ عَقَدَتْ اَيْمَانُكُمْ
فَاٰتُوْھُمْ نَصِيْبَھُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدًا ۝ ع ۲

اور اللہ نے تم میں سے کچھ کو کچھ پر جو برتری دے رکھی ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ جو کچھ مردوں نے کمائی کی ہے اس میں سے ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس میں سے ان کا حصہ ہے اور اللہ سے اس کے فضل کو مانگتے رہو بلاشبہ وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ اور ہم نے والدین اور رشتہ داروں کے چھوڑے ہوئے سرمایہ کے حقدار مقرر کر دیے ہیں اور جن لوگوں سے تمہارے عہد و پیمان ہو چکے ہیں ان کو ان کا حصہ دے دو بلاشبہ اللہ

ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔ [63]

معاشرتی زندگی کی سعادت

اجتماعی زندگی کے اچھے ہونے کے لیے معاشرتی زندگی کی سعادت ناگزیر ہے اور معاشرتی زندگی میں سعادت اس وقت تک نہیں آ سکتی جب تک ظاہر کے ساتھ باطن بھی صاف اور پاک نہ ہو۔ علامہ بقاعی فرماتے ہیں کہ قتل اور اکل بالباطل کی ممانعت کے بعد تمنی سے ممانعت فرمائی ہے۔ اوّل الذکر ظاہراعمال سے اور ثانی الذکر کا اعمال باطن سے تعلق ہے۔ اوّل کے ذریعے ظاہری گناہوں سے اور آخرالذکر کے ذریعے باطنی گناہوں سے طہارت ہوتی ہے۔ تمنی چونکہ حسد کا ذریعہ ہے اس لیے اس پر قدغن قائم کر دی۔ یہ تمنی ہی اکل بالباطل کا اور اکل بالباطل قتل کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

قفال مروزی کہتے ہیں کہ اکل بالباطل اور قتل کو حرام کرنے کے بعد اس آیت میں ان راہوں پر بھی اللہ سبحانہٗ نے پہرہ لگا دیا جو اکل بالباطل اور قتل کی طرف جانے والے ہیں۔ اس طرح اس آیت میں ایک بڑی اہم اخلاقی ہدایت دی گئی ہے جسے اگر ملحوظ رکھا جائے تو معاشرتی زندگی کی سعادت سے انسان بہت آسانی سے ہم آغوش ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انسانوں کو یکساں نہیں بنایا ہے بلکہ ان کے درمیان بے شمار حیثیتوں سے چند در چند امتیازات رکھے ہیں کوئی خوبصورت ہے کوئی بدصورت، کوئی خوش آواز ہے اور کوئی بدآواز، کوئی طاقتور ہے اور کوئی کمزور، کوئی سلیم الاعضا ہے اور کوئی پیدائشی طور پر جسمانی نقص لے کر آیا ہے۔ کسی کو جسمانی اور ذہنی قوتوں میں سے کوئی قوت زیادہ دی ہے اور کسی کو کوئی دوسری قوت، کسی کو بہتر حالات میں پیدا کیا ہے اور کسی کو بدتر حالات میں پیدا کیا ہے، کسی کو زیادہ ذرائع دیے ہیں اور کسی کو کم۔ اسی فرق و امتیاز پر انسانی تمدن کی ساری گوناں گونی قائم ہے اور یہ عین مقتضائے حکمت ہے۔

جہاں اس فرق کو اس کی فطری حدود سے بڑھا کر انسان اپنے مصنوعی امتیازات کا اس پر اضافہ کرتا ہے وہاں ایک قسم کا فساد رونما ہوتا ہے اور جہاں سرے سے اس فرق کو مٹانے کے لیے فطرت سے جنگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے وہاں دوسری قسم کا فساد برپا ہو جاتا ہے۔ آدمی کی یہ ذہنیت کہ جسے کسی حیثیت سے اپنے مقابلہ میں بڑھا ہوا دیکھے بے چین ہو جائے یہی اجتماعی زندگی میں رشک، حسد، رقابت، عداوت، مزاحمت اور کشاکش کی جڑ ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو فضل اسے جائز طریقہ

حاصل نہیں ہوتا اسے پھر وہ ناجائز طریقوں سے حاصل کرنے پر اتر آتا ہے۔ اللہ سبحانہ اس آیت میں اسی ذہنیت سے بچنے کی ہدایت فرمارہا ہے۔ اس ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ جو فضل اس نے دوسروں کو دیا ہے اس کی تمنا نہ کرو۔

۱۶۔ اور اللہ نے تم میں سے کچھ کو کچھ پر جو برتری دے رکھی ہے اس کی تمنا نہ کرو۔ یعنی حق تعالیٰ نے جو کسی کو کسی پر کسی امر میں فضیلت و شرافت اور اختصاص و امتیاز عنایت فرمائے تو تم اس کی ہوس اور حرص نہ کرو کیونکہ یہ بھی گویا ایسا ہی ہے کہ کسی کے خاص مال اور جان میں بلاوجہ دست اندازی کی جائے جس کی حرمت ابھی گزر چکی ہے۔ نیز اس سے باہم تحاسد و تباغض پیدا ہوتا ہے اور حکمتِ الٰہی کی مخالفت بھی لازم آتی ہے۔ بعض عورتوں نے آپ کی خدمت میں عرض کیا کہ کیا سبب ہے؟ کیا وجہ ہے کہ ہر جگہ حق تعالیٰ مردوں کو خطاب کرتا ہے اور ان کو حکم دیتا ہے عورتوں کا ذکر نہیں کیا جاتا اور میراث میں مردوں کو دہرا حصہ دیا جاتا ہے عورت سے اس آیت میں ان سب کا جواب ہو گیا[1]

یہ آیت بھی قرآن کے مہمات معارف میں سے ہے اس میں دو باتیں بحث طلب ہیں ایک تمنا اور دوسری وہ چیز جس میں تمنا کی جاتی ہے یعنی ما فضل اللہ بہ ہمیں تمنا سے پہلے اس چیز کو جاننا چاہیے جس سے تمنا کی جاتی ہے۔

انسانوں کا صفاتی تفاوت

ما فضل اللہ بہ انسان کی وہ خصوصیت ہے جس کا قرآن نے مختلف پیرایوں میں ذکر کیا ہے کہیں فرمایا ہے : انظر کیف فضلنا بعضھم علی بعض اور کہیں ارشاد ہوا ہے۔ ورفع بعضکم فوق بعض درجات اور کہیں بتایا ہے رفعنا بعضکم فوق بعض درجات۔

مطلب یہ ہے کہ یوں تو تماشاگاہ عالم کی بنیاد ہی صفات و کمالات کے تفاوت پر مبنی ہے، جمادات میں وہ صفات نہیں پائے جاتے جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے اور نباتات ان صفات سے مفلس ہیں جن سے حیوانات سرفراز ہیں۔ حیوانوں کو ان کمالات سے حصہ نہیں ملا ہے جن پر انسان کی انسانیت کی بنیاد ہے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ صفات کے تفاوت کی اگر یہ نیرنگیاں یہاں نہ ہوتیں تو ان گنت بے شمار بوقلموں ہستیوں سے آج عالم جو بھرا ہوا ہے صرف ایک شخصیت بن کر رہ جاتا۔ ایک کو دوسرے سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ممتاز کرنے کی صورت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی تھی کہ صفات و کمالات میں باہم ایک کو دوسرے سے جدا کیا جائے۔

باوجود ان تمام اختلافات و امتیازات کے یہ بھی امر واقعہ ہے کہ موجودات کی مختلف قسموں میں صف بندی کی گئی ہے۔ ان میں اختلاف کے باوجود ائتلاف و مجانست اور مشابہت بھی یقیناً موجود ہے اور اتنی زیادہ کہ اسی کی بنیاد پر ہم ان کو کسی نہ کسی نوع یا صنف میں داخل کرتے ہیں۔ ایک ایک جنس یا ایک ایک نوع کے افراد میں باوجود صفاتی امتیازات کے وحدت کی مشترک باتیں اس قدر کثرت سے پائی جاتی ہیں کہ ان کی نوعی یا جنسی صف بندی ہو جاتی ہے۔ اسی بنیاد پر ہم گھوڑوں، گدھوں، بیلوں کے افراد کو اگرچہ نوعیت کے اعتبار سے ایک ہی سمجھتے ہیں اور اسی نقطۂ نظر سے ان تمام انواع میں ایک نوع کے نیچے افراد انسانی بھی مندرج ہیں۔ مگر یہ عجیب بات ہے کہ انسان کے سوا حیوانات کی جتنی قسمیں ہیں۔ اگرچہ ان کے افراد میں بھی صفات و کمالات کا تفاوت ہے لیکن ان میں سے اگر ہر نوع کے تمام افراد میں نہیں تو ایک نوع کی جو مختلف اصناف ہیں ان میں سے ایک صنف میں باوجود صفاتی تفاوت کے اتنی یکجہتی پائی جاتی ہے کہ جو کمالات ایک فرد میں پائے جاتے ہیں وہی کمالات اسی صنف کے دوسرے افراد میں بھی موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں آدمی پر غور کیجئے۔ اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور مختلف نسلوں میں بٹا ہوا ہے لیکن حال یہ ہے کہ دو نسلوں کو تو درکنار ایک ہی ماں باپ کے دو بچے ہوتے ہیں لیکن دونوں میں پیدائشی صفات و کمالات کے اعتبار سے تفاوت اور اتنا تفاوت بھی ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک کو اگر انسان کہا جائے تو دوسرے پر لفظ حیوان کا اطلاق بھی مشکل سے ہوتا ہے۔ بظاہر دونوں ہی آدمی ہیں، دونوں انسانی چہرے رکھتے ہیں لیکن ذہنی، دماغی، جسمانی، اندرونی، بیرونی، ظاہری و باطنی کمالات و صفات کے لحاظ سے ایک بھائی اگر آسمان پر ہے تو دوسرا ٹھیک اس کے بالمقابل تحت الثریٰ یا پاتال میں ہے، ایک خوبصورت ہے اتنا خوبصورت کہ دیکھنے والے تکتے رہتے ہیں دوسرا اتنا زشت رو کریہ المنظر بھدی شکل کا کہ دیکھ کر جی متلائے۔ ایک غبی ہے دوسرا ذہین، ایک چست و چالاک ہے دوسرا کاہل و سست، ایک فرشتہ خصلت ہے دوسرا شیطان سیرت، کسی کو شاعری سے لگاؤ ہے تو دوسرے کو ریاضی سے، کسی کا جی بیوپار اور کاروبار کو چاہتا ہے تو دوسرا کتابوں کا کیڑا نظر آتا ہے۔

جیسے حیوانی اصناف میں صفاتی تفاوت کی کمی نے ہر صنف اور ہر قسم کے افراد میں ان کی زندگی کی سطح کو مساوی اور ہموار رکھا ایسے ہی انسانی افراد میں اندرونی و بیرونی اعتبار سے کمالات و صفات کے تفاوت نے زندگی کے ہر شعبہ میں ان کے اندر مدارج کا ایسا اختلاف پیدا کر دیا کہ انسان کے سوا مدارج و مراتب کے اس اختلاف کی نظیر ملنی مشکل ہے۔

مدارج و مراتب کا یہ تفاوت افرادِ انسانی میں کمالات و صفات کے تفاوت کا نتیجہ ہے اور یہ تفاوت

اکتسابی نہیں بلکہ عموماً اکثر و بیشتر پیدائشی ہوتی ہے کیونکہ کسب و اکتساب سے بھی کمالات و صفات کی کمی و بیشی ان ہی رجحانات و میلانات کے تابع ہوتی ہے جنہیں ہر شخص ماں کے پیٹ سے لے کر آتا ہے۔ شاعری کی صلاحیتوں کو ہر شخص محنت و ترقی دے سکتا ہے لیکن کیا یہ ممکن ہے کہ جسے شاعری سے قدرتاً مناسبت نہ ہو قوت و طاقت سے کوئی اسے شاعر بنا سکتا ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کیا ہے کہ اکتسابی نشوونما کی توقع ان ہی صفات کے متعلق کی جاسکتی ہے جنہیں شکم مادر سے بچہ اپنے ساتھ لایا ہو۔ بہرحال صفات و کمالات کے اسی تفاوت سے مدارج و مراتب کا اختلاف رونما ہوا ہے۔

زیر تشریح آیت میں ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہی انسان کی وہ خصوصیت ہے جس سے انسانی زندگی کے سارے نظام متاثر ہوتے ہیں۔ معاشی زندگی کی وہ مساوات جو گدھوں، کتوں، بلیوں وغیرہ حیوانات میں پائی جاتی ہے۔ انسانی زندگی کا معاشی نظام اس سے بالکل مختلف ہے اور اس اختلاف یعنی فطری کمالات کی کمی و بیشی کی وجہ سے معاشی زندگی میں جو نشیب و فراز پیدا ہوگیا ہے۔ اس کو ختم کرنے کی صرف یہی تدبیر ہوسکتی ہے کہ پیدا ہونے والے بچوں کے اندر اسی وقت تبدیلی پیدا کی جائے جب رحم مادر میں مختلف جذبات و رجحانات کی صلاحیتوں اور مناسبتوں کو قدرت فراہم کرتی ہے۔ اور وں کا پتہ نہیں لیکن قرآن میں کائناتی حوادث کے کلیات میں جن چیزوں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں یعلم ما فی الارحام بھی ہے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ وہ ہی جانتا ہے جو نطفہ میں انسانی کمالات بھرتا ہے کہ ماؤں نے کن صلاحیتوں کے بچوں کو اپنے ارحام میں محفوظ کیا ہے۔ اسی لیے قرآن نے فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض کے ذریعے اعلان کیا ہے کہ افراد انسانی میں صفات و کمالات کا یہ تفاوت کسی دوسرے کا نہیں بلکہ براہ راست اللہ کا کام ہے اور جس طرح یہ اللہ کا کام ہے ٹھیک ایسے ہی تفاوت صفات کی وجہ سے افراد انسانی میں مدارج و مراتب کا فرق بھی کسی دوسرے کا نہیں بلکہ اللہ کا ہی کارنامہ ہے۔ ورفعنا بعضھم فوق بعض یعنی کسی کو ایسی صفت دی گئی جو نتیجے کے لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی اور کسی کو ایسا کمال عطا کیا جو اپنے ثمرات و نتائج کے لحاظ سے انمول اور قیمتی ہے اور اسی لیے دونوں کو اپنی اپنی صفات کی قیمت برابر نہیں ملتی۔ ایک کا درجہ دوسرے سے اسی تفاوت کی وجہ سے اگر بلند ہوتا ہے تو یہ بھی اللہ سبحانہ کی دین کا نتیجہ ہے۔

یہاں قرآن نے صفات و کمالات کے تفاوت کے اسی نتیجہ کو صرف ما فضل اللہ بعضکم علی بعض کے اطلاقی پیرائے میں پیش کیا ہے یعنی صرف یہ بیان کیا ہے کہ کچھ کو کچھ پر ہم نے ہی برتری اور فضیلت دی ہے لیکن یہ بات کہ کن باتوں میں فضیلت دی ہے اسے چھوڑ دیا ہے اور وجہ اس کی

یہ ہے کہ وہ اس قدر مختلف الجہات وجوہ ہیں کہ ان کی تفصیل میں غیر ضروری طوالت ہو جاتی۔ تفاوت صفات کے قانون پر تنبیہہ کرنے کے لیے ما فضل اللہ بہ بعضکم علی بعض کی تعبیر کافی ہے۔ ہر شخص اس کی تفصیلات کو تجربے اور مشاہدے کی روشنی میں خود ہی سمجھ سکتا ہے مگر صفاتی وکمالاتی تفاوت کے اس قانون کے تحت بعض افراد کو بعض پر جو معاشی فضیلت اور برتری حاصل ہو جاتی ہے ایک موقعہ پر اس کی تصریح بھی کر دی گئی ہے۔

واللہ فضل بعضکم علی بعض فی الرزق

اور خدا ہی نے برتری دی تم میں سے کچھ کو کچھ پر روزی میں۔

اس آیت میں فی الرزق کی تصریح سے معلوم ہو رہا ہے کہ نوعِ انسانی میں صفاتی وکمالاتی تفاوت کا قانون اللہ نے اس لیے نافذ کیا ہے کہ انسانوں میں رزقی فرق مراتب پیدا ہو ورنہ انسانی افراد کی معاشی سطح کو ہرگز برابر رکھنے کا ارادہ ہوتا تو جس قدرت نے ہزاروں جانداروں کی معاشی سطح کو تفاوت کے اس قانون سے الگ کر کے برابر کر دیا ہے۔ وہی قدرت صرف نوعِ انسانی کے افراد میں اس مساوات کے پیدا کرنے میں کب مجبور تھی[1]

مدارج کے اختلاف پر غم وغصّے کی لہریں

اس آیت میں جہاں یہ بات بتائی گئی ہے کہ بعض کی بعض پر برتری خود خدا کی بنائی ہوئی ہے وہیں لا تتمنوا کہہ کر برتری اور ترجیحی سلوک کے ان قصوں میں آرزو آفرینیوں سے حق تعالیٰ نے منع فرما دیا ہے مقصد یہ ہے کہ پیدائشی مغالطوں سے پیدا ہونے والے خواہ مخواہ کی اس غیر ضروری کوفت سے اہل ایمان کو نجات دلائی جاتی۔ اس کا حاصل یہی ہے کہ اپنی اپنی واقعی ضرورتوں اور حاجتوں کی حد تک سوچنا اور اسی کے مطابق جدوجہد کرنا یہ اور بات ہے اور لیتے لگا کر اپنے آپ کو دوسروں سے ناپ ناپ کر بیٹھے بٹھائے لوگ غم کے ہاتھوں میں خود اپنے ہی ہاتھوں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ قطعاً دوسری چیز ہے سعی وعمل کے تو ہم مکلف ہیں لیکن ناپا ناپی کے ان خرخشوں میں پڑ کر لوگ جو پریشان ہو رہے ہیں اور اسی کا نام معاشی تراد رکھ لیا ہے کسبِ معاش کی ہوس اور مادی ضرورتوں سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

معاشرے میں بے شمار برائیاں اس لیے پیدا ہوتی ہیں کہ انسان سبک دماغی کی وجہ سے آرزوؤں اور

---

[1] اسلامی معاشیات

تمناؤں کا شکار ہو جاتا ہے نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غلط ارمان اور خود ساختہ غم لوگوں کو ایسے میدان میں ڈال دیتا ہے جس میں آدمی کی ساری جدوجہد اور اس کی تمام قابلیت وصلاحیت ایک لاحاصل تصادم ایک بے فائدہ تنازع کی نذر ہو جاتی ہے۔ آیت کا مدعا یہ ہے کہ ہر شخص کو معاشی جدوجہد میں اپنی حقیقی ضرورتوں پر نظر رکھنی چاہیے۔ دوسروں کے ساتھ ناپ ناپ کر اپنے اندر کمتری اور کم مائیگی کا خواہ مخواہ احساس پیدا کر کے اپنے ہاتھوں خود اپنے آپ کو ذہنی کلفتوں میں مبتلا نہ کرنا چاہیے۔ اس قرآنی آیت میں بھی توجہ دلائی گئی ہے کہ زندگی کی حقیقی ضرورتوں کے پوری ہونے کے باوجود جو دوسروں کے ساتھ اپنی زندگی کے معیار کو ناپ ناپ کر کڑھتے رہتے ہیں وہ دنیا میں اگر تنہا ہوتے اور ان کے ساتھ ان کا ہم جنس کوئی دوسرا نہ ہوتا تو دوسروں سے ناپنے کا موقعہ ہی ان کو نہ ملتا۔ پھر اس وقت جیسے اپنی زندگی سے آدمی فرحاں ہوتا آج بھی دوسروں سے قطع نظر کر کے اپنی زندگی ہم گزاریں، تجربہ بتلائے گا کہ جن کلفتوں اور الجھنوں کو آدمی قلت معیشت کی طرف منسوب کرتا ہے۔ ان کا اکثر و بیشتر حصہ اس عمل کے بعد ثابت ہوگا کہ قطعاً وہمی اور خود تراشیدہ تھا۔

تلاش معاش کا ذریعہ اکتساب ہے

۶۲ - جو کچھ مردوں نے کمائی کی ہے اس میں ان کا حصہ ہے اور جو کچھ عورتوں نے کمایا ہے اس میں ان کا حصہ ہے اور اللہ سے اس کا فضل مانگتے رہو بلاشبہ وہ ہر چیز کو خوب جاننے والا ہے۔ یعنی مردوں اور عورتوں کے لیے حصہ مقرر ہے جیسا کچھ وہ کام کرتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہوا کہ ہر ایک کو اس کے عمل کا پورا بدلہ ملتا ہے اس میں ہرگز کمی نہیں کی جاتی۔ جو کسی کو شکایت کا موقعہ ملے۔ ہاں یہ بات دوسری ہے کہ وہ اپنی حکمت اور رحمت کے مطابق کسی کو خاص بڑائی اور فضیلت عنایت کرے اس کی حرص اور شکایت کرنی بے جا ہوس ہے۔ البتہ اپنے عمل کے معاوضہ سے اور زیادہ ثواب وانعام مانگو تو بہتر اور مناسب ہے۔ اس میں کچھ خرابی نہیں تو اب جو فضل کا طالب ہو اس کو لازم ہے کہ عمل کے ذریعے سے طلب کرے۔ حسد اور تمنی سے فضل کا طالب نہ ہو اور اللہ تعالیٰ کو ہر چیز کا علم ہے ہر ایک کے درجے اور استحقاق کو خوب جانتا ہے اور ہر ایک کے مناسب شان اس سے معاملہ کرتا ہے تو اب جس کو فضیلت عطا کرتا ہے سراسر علم وحکمت کے مطابق ہے کوئی اپنی لاعلمی کی وجہ سے کیوں اس میں خلجان کرے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ مبحات معارف میں سے ہے اس پر سرسری نظر ڈال کر آگے نہ بڑھنا چاہیے۔ پچھلے فقرے میں تمناؤں، آرزوؤں، ولولوں، خواہشوں اور ارمانوں سے منع کیا تھا اور بتایا تھا کہ دُنیا میں صفات و کمالات کے تفاوت سے جو نتائج فضل الٰہی کی صورت میں رونما ہوتے ہیں ان کو دیکھ کر صرف آرزوؤں اور تمناؤں کی مخلوق بن کر نہ رہو بلکہ اس کے لیے دو کام کرو ایک یہ کہ اللہ کے سامنے اس فضل کی خاطر طلب کے ہاتھ پھیلاؤ اور دوسرے یہ کہ اکتساب کرو۔ قرآن نے جسے یہاں اکتساب کہا ہے اسے دوسرے موقعہ پر ابتغاءِ فضل کہا ہے کہیں فرمایا تبتغوا من فضله کہیں وابتغوا من فضل الله اور وابتغاء کم من فضله فرمایا ہے۔ اکتساب اور ابتغاءِ فضل دونوں قرآن کی معاشی اصطلاحات ہیں۔ آخر صحاح کی حدیث مشہور حدیث ہے کہ بندے قیامت کے روز اس وقت تک کھڑے رہیں گے جب تک کہ چار باتوں کے جواب سے فارغ نہ ہو لیں گے۔ ان ہی چار سوالوں میں سے ایک بڑا سوال یہ بھی ہو گا عن ماله من این اکتسبه و فیه انفقه یعنی اس سے مالیات کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ اس کے اکتسابی ذرائع کیا تھے؟ اور اخراجات کیا تھے؟ سچ پوچھئے تو قرآن کی معاشیات کا تعلق اکتساب ہی سے ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ ولولوں اور آرزوؤں کی مخلوق نہیں بلکہ اکتساب اور ابتغاءِ فضل اللہ یعنی تلاش معاش کے لیے کردار کی طاقت پیدا کرو اور ہمت کرو، محنت کرو اور اس کے ساتھ اللہ کی جناب میں سوال کے لیے ہاتھ اٹھاؤ اور اس دُعا و اکتساب میں مرد و عورت کی کوئی تخصیص نہیں۔ جیسا کہ لوگوں کا خیال تھا کہ اکتساب و محنت صرف مرد کا کام ہے۔ عورت کا معیشی اور مالیاتی استقلال سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں اس سے صاف انکار کر دیا کہ یہ اکتساب صرف مردوں کے حصے میں آیا ہے اس نے قطعی لفظوں میں اعلان کر دیا کہ مرد کی کمائی مرد کے لیے ہو گی، عورت کی کمائی عورت کے لیے ہو گی۔ عورت بیٹی ہو کر باپ سے الگ، بہن ہو کر بھائی سے الگ، بیوی ہو کر شوہر سے الگ مستقلاً اپنی کمائی کا انتظام کر سکتی ہے اور اس کی مالک ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے نوعِ انسانی کو مرد و عورت کی دو جنسوں میں تقسیم کر دیا ہے اور دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی ہستی اپنے اپنے فرائض اور اپنے اپنے اعمال رکھتی ہیں کارخانۂ معیشت کے محنت و اکتساب میں دونوں پڑ رہے ہیں۔

اکتساب یا ابتغاءِ فضل کا قرآن میں کیا مقام ہے؟ اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ تلاش معاش کی خاطر سورۂ مزمل میں تہجد کی نماز کی فرضیت عام مسلمانوں سے ہٹا دی گئی۔ قرآن میں ہے:

علم ان سیکون منکم مرضیٰ و اخرون یضربون فی الارض یبتغون من فضل الله۔

اللہ جان چکا ہے کہ تم میں کچھ لوگ بیمار ہوں گے اور کچھ تلاشِ معاش کی خاطر زمین پر چلتے پھرتے رہیں گے۔

آیتِ قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ اگر تہجد کی نماز سب پر فرض کر دی جائے گی تو فضل اللہ کے ابتغا یعنی تلاشِ معاش کے فریضے سے کچھ لوگ محروم ہو جائیں گے۔ قرآن نے نماز کے فریضہ کو اٹھا لینا گوارا کیا لیکن تلاشِ معاش کے فریضہ سے لوگوں کو روکنا گوارا نہ کیا۔

معاشی کاروبار پر اسلام کا زور

یہ آیت بتا رہی ہے کہ اکتساب یعنی تلاشِ معاش کو قرآن کس نقطۂ نظر سے دیکھتا ہے۔ اولاً وہ اس معاملہ میں مرد و عورت کے درمیان کوئی حد فاصل قائم کرنا نہیں چاہتا اور پھر ہر ایک کے اکتساب کو اکتساب ہی کہتا ہے۔ یہ نہیں کہ مرد کا اکتساب تو اکتساب ہے اور عورت کا اکتساب ہی نہیں ہے۔

ثانیاً اس آیت نے یہ بھی بتا دیا کہ ہر شخص کی آمدنی کا اہم اور بنیادی ذریعہ اکتساب ہے خواہ یہ اکتساب تجارت کے ذریعے ہو یا زراعت کے، صنعت کے ذریعے یا اجارہ کے یہ اکتساب ہی مالکانہ حقوق کا منشأ ہوتا ہے اور مالکانہ حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اسے استعمال و تصرف کا حق ہے، مزید نفع کمانے کے لیے کاروبار میں لگانے کا حق ہے۔ انتقالِ ملکیت کا حق ہے اور اس کے تحفظ کا حق ہے۔ مقابلہ اور سابق کا میدان قرآن کے نزدیک اکتساب ہی کا ہے اور اکتساب رزق حاصل کرنے کا ذریعہ ہے۔ مردوں کے لیے بھی اور عورتوں کے لیے بھی۔ قیامت بھی قائم ہو رہی ہو تو اکتساب کو ترک نہ کرنا چاہیے۔ حضرت عائشہ صدیقہ کی مشہور حدیث ہے کہ:

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر قیامت بھی قائم ہو جائے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کوئی پودا ہو اگر اس کے بس میں ہو کہ کھڑا نہ ہو جب تک کہ اس کو بو لے تو چاہیے کہ پودے کو بو دے۔

اکتساب ہی کے موضوع پر اگر ابوبکر الجصاص کا یہ استدلال صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ آیتِ قرآنی سے مستنبط ہے۔ قرآن کی آیت

انشاکم من الارض واستعمرکم فیها

اٹھا کر کھڑا کیا تم کو زمین سے اور آبادکاری کرائی تم سے اس میں

کے تحت لکھتے ہیں:

یہ آیت بتاتی ہے کہ زمین کی کل آبادکاری کھیتی، باغبانی اور تعمیرات کے ذریعے واجب ہے
مذہب اور دین کے متعلق آج جو غلط نظریات پائے جاتے ہیں ان کی موجودگی میں کون یقین کر سکتا ہے
کہ قرآن اس آیت میں مما اکتسبوا اور مما اکتسبن کہہ کر اکتساب کو کیا مقام دے رہا ہے۔ کہاں یہ نقطہ نظر کہ
جو جس حد تک دنیوی کاروبار سے الگ ہو کر زندگی بسر کرے گا اسی حد تک خدا کے حضور میں بلندی حاصل
کرے گا اور کہاں یہ عقیدہ کہ دنیا کے شغلوں میں انہماک، اکتساب اور ان کے ساتھ اشتغال ہی کو خدا کی
خوشنودی اور نزدیکی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ مذہب کے ان غلط رجحانات کے استیصال میں قرآن نے کیا
کام کیا ہے ضرورت ہے کہ اس پر مستقل کام کیا جائے۔

صوفیاء کو نادانوں نے بدنام کر دیا ہے کہ ان کا دنیوی کاروبار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طبقہ کی
کوئی شخصیت نہیں بلکہ وہ کہ جن کا اساطین صوفیہ میں شمار ہوتا ہے میری مراد مشہور بزرگ حضرت شیخ
ابوالمکارم علاء الدولہ سمنانی ہیں۔ مولانا جامی نے نفحات الانس میں ان کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

حق تعالیٰ نے زمین اور کھیتوں کو حکمت سے پیدا کیا ہے اور خدا چاہتا ہے کہ یہ زمین
اور کھیت آباد رہیں اور ان سے مخلوق کو نفع پہنچے۔ اگر خلق اللہ کو یہ معلوم ہو جائے کہ
دنیا کی آبادکاری جس سے فائدہ اور آمدنی مقصود ہو یعنی فضول خرچی مقصد نہ ہو تو ہرگز آبادکاری
کو نہ چھوڑیں۔

آگے اور بڑھ کر فرماتے ہیں:

اسی طرح اگر لوگوں کو پتہ ہوتا کہ آبادکاری کے کام کے چھوڑنے اور زمین کو بے کار پڑا
رہنے میں کتنا گناہ ہے تو ہرگز وہ یہ نہ کرتے کہ آبادی کے جو اسباب ہیں ان کو برباد ہونے
کے لیے چھوڑ دیں۔

آگے تمثیل سے اس اسلامی نظریہ کی تشریح کرتے ہیں:

جو کوئی زمین کا کوئی ایسا قطعہ رکھتا ہے کہ اس سے ہزار من غلہ سالانہ حاصل ہو سکتا ہے
اگر اس کی کوتاہی و سستی سے نو سو من غلہ اس زمین سے حاصل ہوا اور اس کی وجہ سے سو من
غلہ مخلوق کے حلق میں نہ پہنچ سکا تو اس سے روزِ قیامت سو من غلہ کی بازپرس ہو گی۔
اور اس کے برابر اس سے واپس مانگا جائے گا۔ (نفحات الانس)

آخر میں اس اعلان پر مولانا جامی نے ان کے بیان کو ختم کیا ہے کہ:

جو اپنی کاہلی سے زمین کی آبادکاری کو چھوڑ بیٹھا ہو اور اس کا نام اس نے ترکِ دنیا

رکھا ہو تو یہ شیطان کی پیروی کے سوا کچھ نہیں ہے ۔

معاشی جدّ و جہد اور اکتساب بھی جہاد ہے

ممکن ہے کہ اربابِ تنقید کو طبرانی کی اس حدیث پر سنداً کوئی اعتراض ہو جس میں ہے کہ ایک صحابی نے حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلّم سے عرض کیا کہ میرا پیشہ اور گزر بسر کا ذریعہ شکار ہے۔ جنگلوں اور بیابانوں میں رہنے کی وجہ سے عموماً نماز باجماعت کی سعادت سے محروم رہ جاتا ہوں میرے متعلق کیا حکم ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ،

بہت اچھا مشغلہ ہے مجھ سے پہلے جتنے پیغمبر گزرے سب شکار کرتے تھے اور شکار کی تلاش میں نکلتے تھے باقی جماعت کی نماز کے لیے تمہارے واسطے بس یہ کافی ہے کہ روزی کی تلاش میں جب تم کو جماعت سے غیر حاضر ہونا پڑے تو جماعت کی محبت، جماعت والوں کی محبت، اللہ کے ذکر کی محبت، ذکر اللہ میں مشغول ہونے والوں کی محبت اور اپنے اہل و عیال کے لیے حلال روزی کی تلاش کی خواہش الغرض یہ سب چیزیں جماعت کی غیر حاضری کی قائم مقام ہیں تمہیں چاہیے کہ اپنے اہل و عیال کے لیے طلبِ حلال میں کوشش کرو۔ اللہ کی راہ میں جہاد ہے ۔

صاحب مجمع الزوائد کا جو طبرانی جیسے محدثین کی حدیثوں میں سنداً اگر کوئی سقم پاتے ہیں تو اس پر تنبیہ کیے بغیر نہیں رہتے۔ اس حدیث کے متعلق سکوت اختیار کرنا اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ ان کے نزدیک یہ صحیح ہے اور پھر جب قرآن گواہ ہے کہ ابتغاءِ رزق میں اکتساب ہونا چاہیے اور اس میں حرج نہ ہونا چاہیے اسی لیے تہجد کی نماز کی فرضیت عام مسلمانوں سے ساقط ہوئی ۔

بہر حال آیت کا مطلب یہ ہے کہ زندگی ولولوں، آرزوؤں اور ارمانوں میں نہ گزارو بلکہ اکتساب کرو، محنت کرو، کوشش کرو اور ما فضل الله به بعضكم على بعض کو حاصل کرو۔ خواہ یہ فضیلت مردوں میں باہم ہو یا عورتوں میں باہم ہو یا عورتوں اور مردوں میں۔ جو فضائل غیر اختیاری ہیں ان کے پیچھے نہ پڑو کہ وہ سعی و عمل سے حاصل نہیں ہوتے۔ ان فضائل کی بہم رسانی کے لیے تگ و دو کرو جو اختیاری ہیں مثلاً مالدار ہونا، مقتدر ہونا، نیک ہونا، عالم ہونا، یہ فضائل تمناؤں سے نہیں اکتساب سے حاصل ہوتے اور اکتساب کا دروازہ سب کے لیے کھلا ہوا ہے ۔

تلاشِ معاش کا ذریعہ دُعا ہے

آخر میں فرمایا واسئلوا اللہ من فضلہ یعنی تلاشِ معاش کی ایک تدبیر اگر اکتساب ہے تو اس کے ساتھ ہی تلاشِ معاش کی دوسری تدبیر اللہ سبحانہ سے مانگنا اور سوال کرنا ہے۔ جیسے وہ حصولِ معاش کی حکیمانہ تدبیر ہے ایسے ہی یہ بھی حصولِ معاش کا حکیمانہ طریق ہے۔ کیونکہ اپنی معاشی ضرورتوں کی خاطر ہم جن چیزوں کے محتاج ہیں۔ جن راہوں سے وہ پیدا ہو کر آ رہی ہیں۔ ان کے بارے میں صحیح معلومات بہم پہنچا کر عمل کا صحیح طریقہ اختیار کرنا اگر حصولِ معاش کا حکیمانہ طریق ہے تو پھر ان ہی چیزوں سے افادہ و استفادہ کے معاملہ میں اس طریق عمل کو اختیار کرنا ہمارے لیے کس درجہ ناگزیر ہے جو علم و یقین کی اس روشنی کا تقاضا ہے جو خود ان چیزوں کے خالق اور پیدا کرنے والے کے متعلق ہم اندر رکھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جو کچھ ہم سے باہر ہوا ہو رہا ہے اور جو قوتیں اور طاقتیں ہمارے اندر پیدا ہو رہی ہیں۔ سب جانتے ہیں کہ قرآن کا دعویٰ ان کے بارے میں یہ ہے کہ ان سب کی تخلیق اور ان کے عمل پیدائش کا تعلق اللہ کی یگانہ ذات اور اس کے ارادے سے ہے جب سب کچھ اس کے قبضے میں ہے تو اس سے مانگنا بھی ویسا ہی طریق ہے جیسا کہ حصولِ معاش کے لیے محنت و اکتساب کی تدبیر کرنا۔ میرے خیال میں معاشی جدوجہد کے سلسلے میں عمل کا پہلا طریقہ اگر کوئی عقلی تدبیر ہے تو دوسرا طریقہ اس سے بھی زیادہ عقلی تدبیر کہلانے کا مستحق ہے یہی واسئلوا اللہ من فضلہ کا منطوق ہے۔

دُعائی تدبیر کی کامیابی و ناکامی

ناکامیوں کے ہزارہا تجربات کے بعد بھی جب اکتساب کا چھوڑ دینا بدعقلی کی دلیل ہے تو صرف اس لیے کہ دعائیں بھی کبھی قبول نہیں ہوتی ہیں۔ تدبیر کے اس طریقہ سے محض اس لیے بے تعلق ہو جانا نادانی نہیں تو اور کیا ہے۔

اللہ اکبر! اپنے اختیار پر بھی جنہیں اختیار نہیں ہے اور اپنا اقتدار بھی جن کے اقتدار میں نہیں ہے ان کو اختیار و اقتدار کا اگر حصہ مل جاتا ہے ان کی بارگاہوں میں لگاتار نامنظوریوں کے باوجود درخواستوں کا تانتا نہیں ٹوٹتا۔ ہزار دفعہ جس کی درخواست مسترد ہو چکی ہے وہ ایک ہزار ایک کے بعد بھی منظوری کی توقع کرتے ہوتے، درخواست دینے سے نہیں گھبراتا۔ پھر پتہ نہیں کہ حکام

نہیں حاکم ہے تابع نہیں متبوع ہے جاہل نہیں عالم ہے کھلے لفظوں میں جو بندہ نہیں خدا ہے۔ اگر کسی بندے کی کسی درخواست کو کسی وقت قبول نہیں کرتا یا جاہل کے جہل کا اپنے علم کو تابع نہیں بناتا تو کیسے مان لیا جائے کہ جس کے اختیار میں سارے جہان کے اختیارات ہیں اور جس کے اقتدار کے ساتھ سارے جہان کے اقتدارات اٹکے ہوئے ہیں۔ بندے کے کسی مطلبے کو پورا کرنا اس کے اختیار سے خارج بدیہی باہر ہے۔
اللہ اکبر جو اپنی رحمت سے مایوس ہونے والوں کو کافر کہتا ہے آپ نے اس سے پہلے آپ کو ہمیشہ کے لیے مایوس بنا لیا۔ قرآن ہی میں ہے۔

انہ لا ییئس من روح اللہ الا القوم الکافرون

اس کا سیدھے سطروں میں مطلب یہی ہے کہ کافر ہوئے بغیر کوئی اللہ سبحانہٗ کی رحمت سے مایوس نہیں ہو سکتا۔ ایمان و اسلام کے دعویٰ کے باوجود اللہ کی رحمتوں سے مایوس ہو کر دعا و استغفار معاشی مشکلات کی راہ میں چھوٹی عقل تسلی سمجھنا بہت بڑی جسارت ہے۔

دعائی تدبیر اور عقلی تدبیر میں ہم آہنگی

قرآن کی بتائی ہوئی اور نبوت کی برتی ہوئی راہ یہی ہے کہ دونوں میں ہم آہنگی ہو عقلی تدبیر بھی ہو اور دعا میں انہماک بھی ہو۔ غزوۂ بدر ان دونوں کی ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے ایک طرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے جنگ کے ضوابط رائیں اختیار کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ہے۔ میدان جنگ میں بہترین موقعہ کا انتخاب، فوج کی صف بندی، صفوں میں ترتیب، اسلحہ کے استعمال میں ترتیب، تیر کب چلائے جائیں۔ تلوار کب نکالی جائے، پتھروں اور ڈھیلوں سے غیر پر کس وقت حملہ کیا جائے، ہر ایک کا ایک خاص فاصلہ مقرر کیا، دشمنوں کی ہر حرکت و سکون کی نگرانی، مادی ذرائع سے ممکنہ حد تک ان کو منقطع کرنے کی تدبیریں وغیرہ وغیرہ ان میں سے ہر بات کی تعلیم اور ان پر اپنی خاص توجہ، براہ راست حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قائم کیے ہوتے تھے یہاں تک کہ دست مبارک میں خود تیر لے کر صفوں کو ترتیب دے رہے تھے۔
دوسری طرف دعا میں اتنا انہماک تھا یعنی کامیابی کا حقیقی اختیار جس کے ہاتھ میں ہے اس سے مانگنے میں اور واسئلوا اللہ من فضلہ پر عمل میں آتنا زور صرف ہو رہا تھا کہ حضرت علی بیان فرماتے ہیں کہ،

میں بدر کے روز ایک لڑائی لڑا، پھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گرے ہوئے یا حی یا قیوم فرما رہے ہیں۔ میں واپس میدان جنگ میں آیا اور لڑا پھر گیا تو میں نے حضور کو سجدے میں ہی پایا۔ (فتح الباری)

سجدے سے سر اٹھایا، آسمان کی طرف ہاتھ اٹھے ہوتے ہیں، تن بدن کا ہوش نہیں ہے، شانہ مبارک سے چادر شریف ڈھلک کر گر گئی ہے، پورے انہماک و استغراق، دل کی ساری قوت و توجہ، اصرار الحاح کے ساتھ زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں،

یا اللہ آپ کو یاد دلاتا ہوں، آپ کا عہد اور آپ کا وعدہ اے اللہ اگر آپ چاہیں تو آپ کی عبادت نہ ہو، اے اللہ اگر یہ مٹھی بھر جماعت مسلمانوں کی تباہ ہو گئی تو زمین میں آپ کی عبادت کا نظام نہ رہے گا۔ (صحیح بخاری)

وعدہ کے باوجود رب اور رب کی مدد کو جس بیقرار اور اضطراب کو ڈھونڈا جا رہا ہے کہ بقول معلم الامت حضرت عبداللہ ابن مسعود کے

ہم نے نہیں سنا کہ اپنی گم شدہ چیز کو کوئی ڈھونڈھ رہا ہو اس طرح جس طرح محمد صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کو ڈھونڈھ رہے تھے۔

اللہ کی بارگاہ اس بیقراری کو دیکھ کر دوسروں سے نہیں رہا جاتا اور جیسا کہ بخاری میں ہے:

تب حضرت ابوبکر نے آپ کے دست مبارک کو پکڑ لیا اور کہا کہ بس کیجئے یا رسول اللہ۔

اسی کی تفصیل مسلم میں ہے کہ

ابوبکر آئے اور آپ کی چادر کو پکڑ کر آپ کے شانہ مبارک پر ڈالا پھر آپ سے لپٹ گئے اور بولے اے اللہ کے نبی اللہ آپ سے کیا گیا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔

وہ اکتساب تھا اور یہ فضل خداوندی کی بھیک ہے وہ عقلی تدبیر تھی اور یہ دعائی تدبیر ہے۔

دونوں تدبیروں میں فرق

تدبیر عقلی یا تدبیر دعائی ہیں، دونوں تلاش معاش، ابتغاء فضل کی تدبیریں لیکن دونوں میں فرق ہے معاش پیدا کرنے والا ایک ہے اور جن راہوں سے معاش آ رہی ہے وہ بے شمار ہیں۔ اور اتنی بے شمار کہ بے حد و حساب ہیں، ایک ایک قطرے کو موتی بننے کے لیے بقول غالب

دام ہر موج میں ہے حلقۂ صد کامِ نہنگ

کے طرح طرح کے پیچیدہ اور نازک قوانین سے سابقہ پڑتا ہے اس لیے تدبیر عقلی بہ نسبت تدبیر دعائی کے زیادہ آسان ہے۔

ایک سے تعلق رکھنا اور وہ بھی بھیک مانگنے، سوال کرنے کا تعلق رکھنا ایسا مرحلہ ہے کہ جس سے

کچھ نہیں ہوتا ہے وہ بھی بہرحال اس کام کو کر ہی لیتا ہے اسی لیے اس کا جذبہ اللہ سبحانہ نے ہر ایک میں ودیعت کیا ہے لیکن تدبیر کے عقلی پہلو کی پابجائی میں ملکۂ پیدائش کے ان پیچیدہ مراحل سے گزرنا پڑتا ہے کہ ہاتھ سے منہ کو منہ تک پہنچانے کے لیے آدمی کو ہزاروں مرحلوں کا اندیشہ گزرتا ہے یا جیسے غالب نے کہا ہے کہ ایک قطرہ کو موتی کی حالت تک پہنچنے کے لیے دریا کے ہر حلقۂ موج میں نہنگوں کے سینکڑوں کھلے ہوئے دھانوں کو بند کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے تدبیر کے اس مرحلہ کی پابجائی کا حق ادا کرنا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اس میں جان کو جوکھوں میں ڈالنا پڑتا ہے اس پر وہی قابو پاسکتا ہے جو پیدائش کے سارے قوانین پر گہری نظر رکھتا ہو اور عمل کی قوتوں سے بھی سرفراز ہو۔ یہی وجہ ہے کہ تدبیرِ عقلی کا ہر شخص اپنی اپنی عقل اور قوتِ عمل ہی کے حساب سے مکلف ہوتا ہے۔ اسے یہاں قرآن نے اکتساب کی مردوں اور عورتوں کی طرف نسبت کر دی ہے اور حکم نہیں دیا ہے تاکہ اس کی پابجائی ہر شخص اپنی عقل اور قوتِ عمل کے مطابق کر سکے برخلاف دعائی تدبیر کے کہ وہ کلی تدبیر ہے۔ یعنی پیدائش کی راہوں سے نہیں بلکہ خود پیدا کرنے والے سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو مانگنا ہے۔ یہ ایک ایسا کام ہے کہ دنیا میں جو کچھ بھی نہیں کر سکتا مانگنے پر تو اسے بھی قدرت ہوتی ہے اور مانگ ہی اس کی آخری پناہ ہوتی ہے۔ اسی لیے اس پر عمل نہ کرنے والے کے لیے سنگین وعید آئی ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد امام ترمذی نے نقل کیا ہے کہ،

جو اللہ سے نہیں مانگتا ہے اللہ اس پر غصہ فرماتا ہے۔

تدبیر کی یہ وہ راہ ہے کہ جب بھی کامیابی سے نہ ملے پھر بھی کامیابی ہے۔ آپ ہی بتائیے کہ ہماری ساری تدبیروں میں حصولِ معاش کے لیے اس عجیب و غریب اور بے خطا تدبیر کا مقابلہ کون کر سکتا ہے واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے واسئلوا اللہ من فضلہ فرما کر مسلمانوں کے لیے روحانی اور مادی ترقیوں کے لیے ایک راہ کھول دی ہے۔ خبر نہیں کہ معاشی ضرورتوں کے لیے اس تدبیر کو لوگوں نے کیوں چھوڑ دیا ہے۔ اللہ اکبر جس تدبیر کے بارے میں نبوت نے ضمانت دی تھی کہ،

جس کے لیے دعا کی راہ کھول دی گئی اس کے لیے رحمت کا دروازہ کھول دیا گیا ہے۔

اس کے تاثیری نتائج کے متعلق لوگوں کے دلوں میں انکار پیدا ہو گیا ہے وانا اللہ فالی اللہ المشتکی۔

حصولِ معاش کے دیگر ذرائع

۳۳۔ اور ہم نے والدین اور رشتہ داروں کے چھوڑے ہوئے سرمایہ کے حقدار مقرر کر دیے ہیں۔

اور جن لوگوں سے تمہارے عہد و پیمان ہو چکے ہیں ان کو ان کا حصہ دے دو۔ بلاشبہ اللہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔
یعنی مرد ہو یا عورت ہر ایک کے لیے تم میں سے اے مسلمانو! ہم نے وارث مقرر کر دیئے اس مال کے جس کو چھوڑ کر مریں اور قرابت والے کسی کو اس سے محروم نہیں رکھا اور جن لوگوں سے تمہارا معاہدہ ہوا ہے ان کو ان کا حصہ ضرور پہنچاؤ۔ اللہ تعالیٰ تمام امور سے باخبر ہے کہ وارثوں کو کیا حصہ ملنا چاہیے اور جن سے معاہدہ ہوا ہے ان کو کیا ملنا چاہیے اور ہمارے ان احکام کو کون بجا لاتا ہے اور کون نافرمانی کرتا ہے[1]

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اکتساب ہی حصولِ معاش کا ذریعہ نہیں ہے اکتساب کے علاوہ بھی حصولِ معاش کے ذرائع ہیں۔ مثلاً وراثت اور معاہدہ۔ ان ذرائع سے بھی انتقالِ ملکیت ہو کر معاشی مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔

وراثت انتقالِ ملکیت کی ایک شکل خونی رشتہ کی بنا پر ملکیت کا ایک فرد سے دوسرے فرد کی طرف منتقل ہونا ہے۔ انتقالِ ملکیت کی اس شکل کو اکتساب سے جدا کر کے اس لیے بیان کیا ہے کہ اس میں مالک کی رضامندی شرط نہیں ہے۔ یہ انتقال مالک کی مرضی سے قطع نظر بلکہ بعض اوقات اس کے علی الرغم قرآن کے حکم کے تحت ہوتا ہے۔ قرآن نے ان رشتوں کو تفصیل سے بیان کر دیا ہے جن کے پائے جانے پر مرنے والے کی ملکیت کے مقررہ حصے متعین افراد کو منتقل ہوں گے۔ وراثت کا قانون پہلے بیان ہو چکا ہے اور اس کی مزید تشریح سنت نے کر دی ہے۔ ضابطہ میراث کے مطابق ایک فرد کو اس کے ماں باپ اور دوسرے قریبی اعزہ کے انتقال پر ان کی ملکیت کا ایک حصہ مل جاتا ہے۔ مرنے والے کے املاک کی اس ضابطہ کے مطابق تقسیم لازمی ہے۔ اس میں خواہ میراث پانے والے کے اکتساب کو کوئی دخل نہیں ہے۔

حصولِ ملکیت کا دوسرا ذریعہ معاہدہ ہے یعنی کسی مملوکہ چیز کا شرعاً درست معاہدے کے ذریعے ایک مالک سے دوسرے مالک کی طرف منتقل ہونا ہے۔ اس میں سارے عقود آ گئے۔ عورت کو جو مہر اور نان و نفقہ عقدِ نکاح کے ذریعے شوہر سے حاصل ہوتا ہے دین، اجارہ، مزارعت، مصالحت کے سارے معاملات، سیاسی، ملکی، بین الاقوامی عہود، اس میں آ گئے۔ عقدِ بیع، عقدِ موالات اور وصیت سب اس میں داخل ہیں۔ وصیت کے علاوہ ایسے تمام معاہدوں میں طرفین کی رضامندی شرط ہے۔

اصل ارشاد میں موالی آیا ہے۔ یہ عربی زبان میں وسیع معنے میں آتا ہے۔ ولی سے بنا ہے اور ولا معنے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرب بھی استعمال ہوا ہے خواہ وہ قرب کسی لحاظ سے ہو اس لیے لفظ وارث یعنی عصبہ، ابن العم، حلیف، آزاد شدہ غلام، غلام کو آزاد کرنے والا۔ اس آیت میں مولی بمعنے وارث آیا ہے یعنی وہ لوگ جن کو ترکہ پہ ولایت حاصل ہے یا وہ لوگ جن کو میت سے قرب حاصل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن مردوں کا اپنی کمائی اور جن عورتوں کا اپنی کمائی میں حصہ ہے ان کے ورثہ بھی ہیں جن کا ان مردوں اور عورتوں کے ترکہ میں حصہ ہے اور یہ ورثہ کون ہیں، یہ والدین اور اقربا ہیں اور وہ سب لوگ ہیں جن سے تمہارا عہد و پیمان ہو چکا ہے۔ عہد و پیمان والے کون ہیں؟ اصل مطلب تو عرض کیا جا چکا ہے کہ اس میں وصیت، عقد موالات اور دین وغیرہ سب داخل ہیں۔

مولی الموالات اور عقد موالات

لیکن شارحین قرآن نے اس آیت کے مدلول میں مولی الموالات کو بھی داخل کیا ہے۔ مولی الموالات وہ دو شخص کہلاتے ہیں جو باہم قول و قرار کر کے ایک دوسرے کے اس طرح دوست بن گئے ہوں کہ اگر ایک پر دیت لازم آئے تو دوسرا اسے ادا کرے اور ایک کی وفات پر دوسرا اس کی میراث پائے اسی کو عقد موالات کہتے ہیں۔ عرب میں یہ رسم اور دستور تھا جو لوگ اس رسم کو قرآن کی اس آیت کا منطوق بتاتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے ذریعے قرآن نے اس دستور کو قائم رکھا اور مولی الموالات کو میراث میں حقدار قرار دیا۔ انصار و مہاجرین میں مواخات کی بنا پر میراث کا جو سلسلہ باہم جاری ہوا اس کا سرچشمہ بھی یہی آیت ہے۔ شیخ الاسلام رقمطراز ہیں:

> اکثر لوگ حضرت کے ساتھ اکیلے اکیلے مسلمان ہو گئے تھے ان کا سب کنبہ اور تمام اقربا کافر چلے آتے تھے تو اس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دو دو مسلمانوں کو آپس میں بھائی بھائی کر دیا تھا۔ وہی دونوں آپس میں ایک دوسرے کے وارث ہوتے تھے جب ان کے اقربا بھی مسلمان ہو گئے تب یہ آیت اتری کہ میراث تو اقربا کا حق ہے اب رہ گئے وہ منہ بولے بھائی تو ان کے لیے میراث نہیں۔ ہاں زندگی میں ان کے ساتھ سلوک ہے اور مرتے وقت کچھ وصیت کر دے تو مناسب ہے مگر میراث میں کوئی حصہ نہ ملے گا۔[1]

مولانا کے ارشاد میں دوسرے شارحین قرآن کے مقابلے میں کچھ معنویت ہے۔ مولانا الذین عقدت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایمانکم کا مصداق وصیت وغیرہ کو قرار دیتے ہیں جبکہ دوسرے شارحین قرآن نے اس آیت کو مواخات کی بنا پر وراثت کا پروانہ قرار دے کر سورۃ انفال کی آیت واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض سے اسے منسوخ قرار دیا اور کچھ نے سورہ احزاب کی آیت واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض سے اسے منسوخ فرمایا۔ چنانچہ مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں :

ابتدائے اسلام میں جب تک کہ اکثر مسلمانوں کے رشتہ دار مسلمان نہ ہوتے تھے اور اس وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے باہم انصار و مہاجرین عقد مواخات جس کا اثر اسی موالات جیسا تھا منعقد فرمایا۔ اس وقت اسی رسم قدیم کے موافق حکم رہا کہ انصار و مہاجرین میں باہم میراث جاری رہی۔ پھر جب لوگ کثرت سے مسلمان ہو گئے تو اس میں اول ترمیم وہ ہوئی جو اس آیت میں مذکور ہے یعنی چھٹا حصہ مولی الموالات کو اور باقی دوسرے ورثہ کو دلایا جاتا تھا۔ پھر بعد چندے سورۃ احزاب کی آیت واولوا الارحام بعضھم اولی ببعض سے بالکل ہی اس مولی الموالات کا حصہ منسوخ ہو گیا [1]

اور صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے مروی ہے کہ اس آیت میں موالی سے وارث مراد ہیں اور والذین عقدت ایمانکم کے بارے میں یہ ہے کہ جب مہاجر مدینے آئے تو مہاجر انصاری کی وراثت پاتا تھا۔ اس مواخات کی وجہ سے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کے درمیان قائم کی تھی پھر جب یہ آیت نازل ہوئی ولکل جعلنا موالی تو میراث منسوخ ہو گئی اور دوسرے فقرہ میں والذین عقدت ایمانکم میں ان کے لیے نصرت، مہربانی ہے میراث باقی نہیں رہی ہاں اس کے حق میں وصیت ہو سکتی ہے۔

جن لوگوں نے آیت کو منسوخ کہا ہے انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مواخات والے جو وراثت پاتے تھے وہ قرآن کی اس آیت کی وجہ سے پاتے تھے حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ وہ اس موالات کی بنا پر وراثت پاتے تھے جو عرب میں رائج تھی۔ اور جسے قرآن نے بعضھم اولیاء بعض کہہ کر قائم رکھا تھا۔ اس آیت نے اسی رواج کو منسوخ کیا ہے۔

اب دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مواخات والوں کو اس آیت کی بنا پر میراث دی جائے اور پھر اس آیت کو آیت احزاب سے منسوخ قرار دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ مواخات والوں کو موالات کی بنا پر وراثت

---

[1] بیان القرآن

دی جاتے اور اس آیت کے ذریعے موالات کے عرب رواج کو منسوخ کیا جاتے۔ ہمارے خیال میں دوسری رائے قابل ترجیح ہے۔ مولانا عثمانی کا میلان بھی اسی طرف ہے۔

کیا موالات کی ہر نوع ختم ہو گئی

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اگر اس آیت نے موالات کی بنا پر وراثت کو منسوخ کیا ہے تو کیا موالات کی ساری انواع کو ختم کیا ہے یا اب بھی اس کی کچھ انواع باقی ہیں۔ مولی صرف وارث کے معنے میں بھی آتا ہے۔ امام نووی نے تہذیب الاسماء واللغات میں تصریح کی ہے کہ اگرچہ لفظ مولی زیادہ تر حلیف اور مولی للموالات کے معنے میں ہے تاہم مولی غلام کو بھی کہتے ہیں۔ عرب کا دور جاہلیت ختم ہو جانے کے بعد زمانۂ اسلام میں مولی الموالات کے بہت آثار نظر آتے ہیں۔ دوسری صدی تک کا یہ اسلامی دستور باقی تھا کہ جب کوئی نو مسلم مشرف باسلام ہوتا تو وہ جس قبیلہ کے کسی شخص سے عقد موالات کرتا یعنی دوستی کا عہد و پیمان کرتا اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہو جاتا اور اس کا حلیف اور مولی کہلاتا تھا۔ اسی نسبت سے امام ابن ماجہ کو ربعی، امام بخاری جعفی اور امام ابوحنیفہ کو تیمی کہتے ہیں۔ یہ نسبت غلامی کی نہیں بلکہ دوستی کے عہد و پیمان کی نسبت ہے۔ امام ابوحنیفہ کے بارے میں امام طحاوی نے مشکل الآثار میں عقد موالات پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> عبداللہ بن یزید کہتے ہیں کہ میں امام ابوحنیفہ کے پاس گیا انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو میں نے عرض کیا کہ ایسا شخص جس پر اللہ نے اسلام کے ذریعے احسان کیا۔ یعنی نو مسلم ہوں۔ امام صاحب نے فرمایا یوں نہ کہو بلکہ ان قبائل میں سے کسی سے تعلق پیدا کر لو پھر تمہاری نسبت بھی ان کی طرف ہو گی میں خود بھی ایسا ہی تھا۔

یہ عبداللہ بن یزید امام اعظم کے شاگرد ہیں چنانچہ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ یہ ابوحنیفہ اور ابن عون کے شاگرد ہیں۔ فن حدیث میں ان کا شمار امام بخاری کے اساتذہ میں ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بنا یہ رہا تھا کہ امام اعظم کو تیمی غلامی کی وجہ سے نہیں بلکہ ولاء اور مولی الموالات کے دستور کی وجہ سے کہتے ہیں بالتصریح تو یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ عقد موالات کس نے کیا تھا۔ امام صاحب کے والد کے بارے میں ملا علی قاری فرماتے ہیں۔ ان کے والد ثابت مسلمان پیدا ہوئے اس لیے قیاس یہی کہتا ہے کہ زوطی نے مسلمان ہونے کے بعد یہ تعلق قائم کیا ہوگا۔ بہرحال مولی الموالات کا یہ دستور زمانۂ اسلام میں موجود رہا۔ یہاں تک تو سارے ائمہ فقاہت متفق ہیں کہ وارث کے ہوتے ہوئے مولی الموالات کو کچھ میراث نہیں

ملتی ہے خواہ وہ وارث ذوی الفرض نسبی ہوں یا عصبہ یا ذوی الارحام۔ لیکن جب کوئی نہ ہو تو اس میں فقہا کا اختلاف ہے جیسا کہ الجصاص نے تفصیل لکھی ہے خلاصہ یہ ہے کہ اگر اقربا میں سے کوئی وارث نہ ہو تو امام ابوحنیفہ امام ابو یوسف، امام محمد اور امام زفر فرماتے ہیں جو شخص جس مسلمان کے ہاتھ پر مسلمان ہوا ہو اور اس نے اس مسلمان سے عقدِ موالات کر لیا ہو اور وہ جس سے عقدِ موالات قائم ہے بغیر وارث کے مر گیا تو یہ نومسلم اس کا وارث ہوگا۔ اور اس نسبت کی وجہ سے وارث ہوگا۔ امام مالک، ابن شبرمہ، امام ثوری، امام اوزاعی اور امام شافعی فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کا مال سارے مسلمانوں کا اشتراکی سرمایہ ہے اور اسے خزانہ سرکار میں داخل کیا جائے گا۔ الجصاص نے اس آیت سے اپنے موقف پر اس طرح استدلال کیا ہے :

زیرِ تشریح آیتِ قرآنی یعنی والذین عقدت ایمانکم الخ ان لوگوں کے حق میں میراث کا اعلان کر رہی ہے جن سے عقدِ موالات ہو چکا ہے جبکہ ان کا کوئی نسبی اور رحمی وارث موجود نہ ہو۔ آغازِ کار میں قرآن نے موالات کے اس دستور عربی کو مہاجرین و انصار کے درمیان بعضھم اولیاء بعض کہہ کر قائم رکھا تھا بعدازیں و اولوا الارحام بعضھم اولی ببعض کہہ کر اس میں یہ ترمیم کی تھی کہ ذوی الارحام کی موجودگی میں یہ موالات میراث میں موثر نہ ہوگی۔ یعنی عقدِ موالات کرنے والوں کو ذوی الارحام کی موجودگی میں کوئی میراث نہ ملے گی۔ آیتِ قرآنی کا مدلول ظاہری یہ ہے کہ اگر نسبی، عصبہ اور ذوی الارحام موجود نہ ہوں تو میراث عقدِ موالات کرنے والوں کی طرف منتقل ہو جائے گی۔ عقدِ موالات والوں کی میراث سے محروم ہونے کی شرط اور قید اولوا الارحام موجود ہی نہ ہوں تو پھر سارے قرآن اور ساری سنت میں ایسی کوئی قانونی دفعہ نہیں جس سے ذوی الارحام اور ورثاء کی عدم موجودگی میں عقدِ موالات کرنے والوں کو میراث سے محروم کیا جا سکے۔ بلکہ اس کے برعکس سنت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایسے ارشادات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عقدِ موالات کرنے والوں کے لیے وراثت ہے۔ ابوداؤد میں تمیم داری کے حوالہ سے ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ اس شخص کے بارے میں طریقِ کار کیا ہے جو کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے۔ آپ نے فرمایا کہ جس کے ہاتھ پر کوئی نومسلم اسلام لاتا ہے وہ اس نومسلم کی زندگی اور موت میں اس کا سب سے زیادہ قریبی ہے۔ موت میں اس کا سب سے زیادہ قریبی ہونے کا اس کے سوا اور کیا مطلب ہو سکتا ہے کہ وہ اس کی میراث کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ یہی رائے ہے حضرت عمر، حضرت عبداللہ ابن مسعود، حسن بصری،

ابراہیم نخعی کی، بلکہ امام زہری سے دریافت کیا گیا کہ نومسلم اگر عقدِ موالات کرے تو اس کا کیا حکم ہے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ سعید بن المسیب کا فتویٰ یہ ہے کہ اگر کوئی نومسلم کسی قوم کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہو تو ان کے لیے اس کی میراث جائز ہے۔ ربیعۃ ابن عبدالرحمٰن کا فیصلہ یہ ہے کہ دارِ حرب ہو یا دارِ اسلام اگر کوئی نومسلم کسی کے ہاتھ پر مسلمان ہو تو اس کی میراث اس کو ملے گی جس کے ہاتھ پر مسلمان ہوا ہے۔ (احکام القرآن)

حافظ منذریؒ نے تمیم داری کی حدیث پر نوٹ لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ کا اور ان کے اصحاب کا یہی مذہب ہے مگر ان کی شرط یہ ہے کہ دونوں کے درمیان عقدِ موالات ہوا ہو اور محدثین میں سے یہی مذہب اسحاق بن راہویہ کا ہے بلکہ حافظ ابن القیم نے تہذیب السنن میں تصریح کی ہے کہ اسحاق بن راہویہ کے ساتھ تمیم کی روایت پر عمل کرنے والوں میں امام احمد، طاؤس، ربیعہ اور لیث بن سعد بھی ہیں اور یہی حضرت عمر بن الخطاب اور عمر بن عبدالعزیز کا فیصلہ ہے۔

ایک شبہ کا جواب

یہاں شاید کچھ لوگوں کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ اسلام نے ہر قسم کے زمانہ جاہلیت کے حلفوں کو ملیا میٹ کر دیا ہے۔ ان میں عقدِ موالات بھی داخل ہے۔ چنانچہ اس موضوع پر ابوداؤد میں حدیث آئی ہے،
جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ
اسلام میں کوئی حلف نہیں ہے جاہلیت کی حلف میں اسلام توانائی نہیں پیدا کر سکتا ہے۔
یہ روایت مسلم میں بھی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام میں اس قسم کے کسی حلف کی گنجائش نہیں ہے۔ الجصاص نے احکام القرآن میں اس سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ یہ اس حلف کے بارے میں ہے جو لوگ زمانہ جاہلیت میں باہم اٹھاتے تھے زمانہ جاہلیت کا عقدِ موالات یہ ہوتا تھا کہ دو شخص باہم یہ عہد کرتے تھے کہ میرا خون تیرا خون ہے، میری معافی تیری معافی ہے اور میں تیرا وارث ہوں گا اور تو میرا وارث ہوگا یہ عقدِ موالات چونکہ ایسی بہت سی منکرات پر مشتمل ہوتا تھا جن سے اسلام نے روکا ہے مثلاً یہ کہ ہم ایک دوسرے کے مددگار رہیں گے چاہے حق پر ہوں یا باطل پر۔ بلاشبہ اسلام نے اس قسم کے عقدِ موالات کو نہ صرف ختم کیا ہے بلکہ کالعدم قرار دیا ہے اور ظالم کے مقابلے میں مظلوم کی مدد کو واجب قرار دیا ہے۔ نیز جاہلیت کے عقدِ موالات میں حلیف اقرباء کی موجودگی میں وارث ہوتا تھا۔ اسلام نے اقرباء کے وراثت میں حقوق مقرر کر کے اس پر بھی قدغن قائم کر دی ”لا حلف فی الاسلام“ کے یہی معنے ہیں کہ اسلام اس قسم

عہد کو گوارا نہیں کرتا ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ اسلام نے جس عقدِ موالات کو کالعدم قرار دیا ہے۔ وہ قبائل کا عقدِ موالات ہے یعنی قبائل باہم ایک دوسرے کی مدد کا، صلح کا، جنگ کا عہد کرتے تھے۔ اسلام میں قبائلی تعاون کی گنجائش نہیں ہے۔ اور یہ بھی لکھا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس عقدِ موالات کو غلط قرار دیا ہے۔ وہ عہدِ مواخات نہیں ہے جیسے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے مابین کیا ہے۔

بہرحال عقدِ مواخات ہو یا عقدِ موالات علی الاطلاق اسلام میں منع نہیں ہے بلکہ وہ خاص عقدِ موالات منع ہے جو بہت سی منکرات پر مشتمل ہوتا تھا۔

اَلرِّجَالُ قَوّٰمُوْنَ عَلَی النِّسَآءِ بِمَا فَضَّلَ اللّٰهُ بَعْضَهُمْ عَلٰی
بَعْضٍ وَّبِمَآ اَنْفَقُوْا مِنْ اَمْوَالِهِمْ ؕ فَالصّٰلِحٰتُ قٰنِتٰتٌ
حٰفِظٰتٌ لِّلْغَيْبِ بِمَا حَفِظَ اللّٰهُ ؕ وَالّٰتِیْ تَخَافُوْنَ نُشُوْزَهُنَّ
فَعِظُوْهُنَّ وَاهْجُرُوْهُنَّ فِی الْمَضَاجِعِ وَاضْرِبُوْهُنَّ ۚ
فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ
عَلِيًّا كَبِيْرًا ﴿۳۴﴾ وَاِنْ خِفْتُمْ شِقَاقَ بَيْنِهِمَا فَابْعَثُوْا
حَكَمًا مِّنْ اَهْلِهٖ وَحَكَمًا مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ يُّرِيْدَآ اِصْلَاحًا
يُّوَفِّقِ اللّٰهُ بَيْنَهُمَا ؕ اِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَلِيْمًا خَبِيْرًا ﴿۳۵﴾

مردوں کو عورتوں پر اس بنا پر درجہ قوامیت حاصل ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں خاص باتوں میں فضیلت عطا فرمائی ہے[۶۴]۔ اور اس لیے کہ عورتوں کی زندگی کا بندوبست کرنے کے لیے مرد اپنے اموال خرچ کرتے ہیں[۶۵]۔ لہٰذا نیک اور

صالح عورتیں وہ ہیں جن میں طاعت شعاری ہوتی ہے اور جو اللہ کی دی ہوئی حفاظت سے کام لے کر مردوں کی غیب میں بھی شوہروں کے حقوق و مفادات کی نگران بن کر رہتی ہیں[66]۔ اور دیکھو جن بیویوں سے تمہیں غلط روی کا اندیشہ ہو تو تم ان کو نصیحت کرو اور ان سے خوابگاہوں میں علیحدگی اختیار کر لو اور ان کی پٹائی کرو[67]۔ بعد ازیں اگر وہ تمہارے کہے پر چلیں تو ان کے خلاف کوئی راہ تلاش نہ کرو یقین مانو کہ اللہ سب کے اوپر ہے اور سب سے زیادہ بڑائی رکھنے والا ہے[68]۔ اور اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان پھوٹ کا اندیشہ ہو تو ایک پنچ مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے قرابت داروں میں سے مقرر کرو[69]۔ اگر وہ دونوں اصلاح کے خواہاں ہوں گے تو اللہ دونوں کے مابین موافقت کا سامان کر دے گا اللہ سب کچھ جاننے والا اور خبردار ہے ۞

شوہر کی صدارت اور بیوی کے فرائض

یہاں تک معاشرتی زندگی کی سعادت کے اصول بتائے گئے ہیں معاشرت سعادت سے ہم روش نہیں جب تک خانگی زندگی سعادت والی نہ ہو۔ خانگی سعادت عبارت ہے میاں بیوی سے۔ اس سورت میں قرآن نے اب تک عورت کے حقوق اور شوہر کے فرائض بتائے ہیں۔ اب مردوں کے حقوق اور عورت کے فرائض بتائے جارہے ہیں۔ یہاں تک قرآن نے عورتوں کے جو حقوق اور مردوں کے جو فرائض اس سورت میں بتائے ہیں ان کو ذہن میں ایک بار پھر تازہ کر لیجئے۔

۱۔ سب سے پہلے بتایا کہ مرد عورت کی نوعیت اگرچہ مختلف ہے مگر جنس کے اعتبار سے دونوں انسان ہیں۔ اور انسان ہونے کے لحاظ سے دونوں میں سے کسی کو دوسرے پر برتری نہیں ہے۔

۲۔ پھر بتایا کہ تخلیق کے اعتبار سے عورت مرد کا ایک حصہ ہے

۳۔ شادی اپنی پسند کی عورتوں سے کرنی چاہیے تاکہ زندگی محبت پر استوار ہو سکے۔

۴۔ شادی چار سے زیادہ کرنے کی اجازت نہیں ہے اور چار کے لیے عدل کی ناگزیر شرط ہے۔

۵۔ اگر شرط عدل پوری نہ کر سکو تو ایک سے زیادہ عورت سے شادی کرنے کی اجازت نہیں ہے۔

۶۔ عورتوں کا مہر خوش دلی سے ادا کرو۔

۷۔ مال وجائداد میں عورت ہر حیثیت سے وارث ہے بیوی ہو کہ بیٹی، ماں ہو یا بہن۔

۸۔ عورت مال ومتاع نہیں ہے کہ دوسروں کو وراثت میں مل جائے۔

۹۔ عورتوں کو مال ومتاع لینے کے لیے شوہر مجبور نہیں کر سکتے۔

۱۰۔ عورتوں کے ساتھ معاشرت، نیکی اور انصاف پر مبنی ہونی چاہیے۔

۱۱۔ بیوی شوہر کو ناپسند ہو تو صبر وبرداشت سے کام لے۔

۱۲۔ نکاح کے بعد نباہ نہ ہو سکے اور شوہر عورت کو چھوڑنا چاہے تو اگر بیوی کو سونے اور چاندی کا ڈھیر بھی مہر میں دے دیا ہو اس سے واپس نہ لیا جائے۔

۱۳۔ عورت اگر باپ کی منکوحہ ہو، ماں ہو، بیٹی ہو، بہن ہو، چچی یا پھوپی ہو، خالہ ہو یا بھتیجی، بھانجی ہو یا رضاعی ماں، رضاعی بہن ہو یا خوشدامن، یا کوئی شادی شدہ ہو اس سے شادی روا نہیں ہے۔

۱۴۔ شادی کا مقصد عفت وعصمت کا تحفظ ہے۔

عورتوں کے یہ حقوق یا مردوں کے یہ فرائض بتانے کے بعد اب مردوں کے حقوق کے سلسلے میں

عورتوں کو جو زریں ہدایات دی گئی ہیں اس کی داستان بھی قرآن کی زبان سے سن لیجئے تاکہ دونوں کے فرائض و اختیارات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کیا جاسکے کہ قرآن نے عصمت و عفت کے تحفظ کی کتنی زبردست جدوجہد کی ہے۔ اور دونوں کے باہمی رشتۂ محبت کو کس قدر پائدار اور جاندار قرار دیا ہے۔ کوئی ایسا قانون کہ جو صرف ایک فریق پر ذمہ داری عائد کرے اور دوسرے کو ہر ذمہ داری سے بری قرار دے خواہ وہ کتنا ہی خوشنما اور جاذب نظر ہو وہ اُدھورا اور ناقص ہی ہوگا۔ آئین اور ضابطہ مکمل وہ ہی ہو سکتا ہے جو ہر ایک پر دوسرے کی ذمہ داری کو ضروری قرار دے گو اس کی شکل مختلف ہی کیوں نہ ہو۔ بلاشبہ عورت اپنی خلقت میں کمزور، اپنے فطری جذبات میں اعتدال سے دور اور اپنی جسمانی ساخت میں مرد کے مقابلے میں بڑی حد تک ضعیف ہے اور اسی وجہ سے یہ قابلِ لطف و کرم، لائق اُنس و محبت ہے اور باعثِ درگزر ہے۔ نزولِ قرآن سے پہلے دُنیا کا عالمگیر اعتقاد یہ تھا کہ وجودِ انسانی کا کامل ظہور صرف مردوں ہی کی جنس میں ہوا ہے۔ عورتوں کی ہستی کوئی مستقل ہستی نہیں رکھتی وہ صرف اس لیے بنائی گئی ہے کہ مردوں کی کام جوئیوں کا ذریعہ ہوں اور ان کی چاکری اور پرستاری کریں۔

قرآن تاریخِ عالم کی سب سے زیادہ پرانی آواز ہے جو اس اعتقاد کے خلاف بلند ہوئی۔ اللہ نے نوعِ انسانی کو مرد و عورت کی دو جنسوں میں تقسیم کر دیا ہے اور دونوں یکساں طور پر اپنی اپنی ہستی اپنے اپنے فرائض رکھتے ہیں۔ قرآن نے دونوں کے فرائض اور دونوں کے حقوق کا نقشہ پیش کر دیا ہے۔ اللہ نے دُنیا میں ہر گروہ کو دوسرے گروہ پر خاص باتوں میں فوقیت دی ہے۔ ایسی ہی فوقیت مردوں کو بھی عورتوں پر ہے۔ مرد عورتوں کی ضروریاتِ معیشت کے قیام کا ذریعہ ہیں اس لیے قوامیت و کارفرمائی کا مقام قدرتی طور پر ان ہی کے حصے میں آیا ہے۔

۴۶ - مردوں کو عورتوں پر اس بنا پر درجہ قوامیت حاصل ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے مردوں کو عورتوں کے مقابلے میں خاص باتوں میں فضیلت عطا فرمائی ہے۔ پہلی آیتوں میں ذکر تھا کہ مرد اور عورت کے حقوق کی پوری رعایت رکھی گئی ہے۔ اگر رعایتِ حقوق میں فرق ہوتا تو عورتوں کے لیے وجہ شکایت ہوتی۔ اب اس آیت میں مرد اور عورت کا درجہ بتلاتے ہیں کہ مرد کا درجہ بڑھا ہوا ہے۔ عورت کے درجہ سے اس لیے فرقِ مدارج کے باعث جو احکام میں فرق ہوگا وہ سراسر حکمت اور قابلِ رعایت ہوگا۔ اس میں عورت اور مرد بقاعدہ حکمت ہرگز برابر نہیں ہو سکتے۔ عورتوں کو اس کی خواہش کرنی بالکل عبث ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ مردوں کو عورتوں پر اللہ تعالیٰ نے حاکم اور نگران بنایا ہے۔ دو وجہ سے اوّل بڑی اور وہبی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اصل سے بعضوں کو بعضوں پر یعنی مردوں کو عورتوں پر علم و عمل میں کہ جن دونوں پر

تمام کمالات کا مدار ہے فضیلت اور بڑائی عطا فرمائی جس کی تشریح احادیث میں موجود ہے اور دوسری وجہ جو کسبی ہے یہ ہے کہ مرد عورتوں پر اپنا سرمایہ خرچ کرتے ہیں اور مہر، خوراک، پوشاک جملہ ضروریات کے کفیل ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عورتوں کو مردوں کی حکم برداری چاہیے [1]

کوئی عقل مند اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ مرد اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے بہت سے معاملات میں عورت سے برتر ہے۔ غریب عورت پر زندگی میں کچھ زمانہ ایسا گزرتا ہے جس میں وہ بڑی حد تک بے کار ہوتی ہے اور دوسرے کی امداد و اعانت کی محتاج ہوتی ہے۔ میری مراد حمل، رضاعت، بچوں کی تربیت اور حیض و نفاس کے زمانے سے ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ مرد کی صدارت کے موضوع پر تحریر فرماتے ہیں،

ضروری ہے کہ مرد کو اس کی بیوی کا قوام بنایا جائے اور فطرت کا تقاضا ہے کہ عورت پر مرد کو غلبہ حاصل ہو اس لیے کہ مرد عقل میں کامل سیاست میں ماہر، حمایت میں مضبوط اور ننگ و عار کو دُور کرنے کی صلاحیت کا مالک ہے اور اس حیثیت سے بھی مرد کو عورت پر برتری حاصل ہے کہ مرد عورت کو کپڑا روٹی اور گھر مہیا کرتا ہے [2]

جدید تحقیق میں مرد کی حیثیت

جدید تحقیق نے بھی اس کی تائید کر دی ہے کہ مرد کا دماغ عورت سے بڑا ہے اس میں فہم و ذکا کا مادہ نسبتاً زیادہ اور اس کی عقل میں پختگی ہوتی ہے۔ ساتھ ہی مرد کا جسم اور عضلات مضبوط ہوتے ہیں اس سلسلے میں کچھ لوگوں کی تحقیق ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش خدمت ہے۔

مشہور نیشلسٹ فلاسفر علامہ پرودھوں اپنی کتاب ابتکار النظام میں رقمطراز ہیں:۔

عورت کا وجدان بمقابلہ مرد کے اسی قدر کمزور ہے جس قدر اس کی عقلی قوت مرد کی عقلی قوت کے مقابلہ میں ضعیف نظر آتی ہے اس کی اخلاقی قوت بھی مرد کے اخلاق سے بالکل مختلف ہے اور ایک دوسری قسم کی طبیعت رکھتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جس چیز کے حسن و قبح کے متعلق وہ رائے قائم کرتی ہے، وہ مردوں کی رائے کے مطابق نہیں ہوتی۔ پس مرد اور عورت میں یہ فرق کوئی عارضی امر نہیں ہے بلکہ عورت کی طبعی خاصیت پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] حجۃ اللہ البالغہ

مبنی ہے[1]

اس قول کو نقل کر کے علامہ فرید وجدی لکھتے ہیں ،

حواس خمسہ جس پر انسان کی عقل اور دماغی نشو ونما کا دار ومدار ہے اس میں سخت اختلاف پایا جاتا ہے۔ علامہ ٹیکولس اور علامہ بیلی نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے حواس خمسہ مرد کے حواس خمسہ سے ضعیف ہیں[2]

پھر کچھ آگے چل کر علامہ موصوف لکھتے ہیں :

سائیکلوجیا نے ثابت کر دیا ہے کہ عورت کے مغز اور مرد کے مغز میں مادۃً اور شکلاً سخت اختلاف ہے۔ مرد کے مغز کے وزن کا اوسط عورت کے مغز سے سو گرام زیادہ ہے[3]

عورت کا دماغ

جدید تحقیقات نے یہ بھی ثابت کر دیا ہے کہ عورت کا دماغ مرد کے دماغ سے بہت چھوٹا ہے جس کا اثر عقل وشعور پر پڑتا ہے۔ تولنے کے بعد معلوم ہوا ہے کہ احمق کا دماغ عقلمند کے دماغ سے کافی چھوٹا ہوتا ہے۔ اسی سلسلہ میں علامہ فرید وجدی رقمطراز ہیں ،

یہی وہ قوائے عقلیہ کا سرچشمہ ہے جس میں مرد کا پلہ عورت سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے۔ مرد کے دماغ کے وزن کا اوسط عام طور پر ½ ۴۹ اوقیہ ہے اور عورت کے دماغ کا وزن صرف ۴۴ اوقیہ، دو سو اٹھہتر مردوں کے دماغ وزن کیے گئے تو سب سے بڑے دماغ کا وزن ۶۵ اوقیہ اور سب سے چھوٹے دماغ کا وزن ۳۴ اوقیہ ثابت ہوا۔ لیکن جب ۱۹۱ عورتوں کے دماغ کا وزن کیا گیا تو سب سے وزنی ۵۴ اوقیہ کا اور سب سے کم وزنی دماغ ۳۱ اوقیہ کا نکلا۔ کیا یہ اس امر کا ثبوت نہیں ہے کہ عورتوں کے عقلی قوی مرد کے قوی سے بدرجہا ضعیف ہوتے ہیں[4]

اور دماغوں کا یہ اختلاف کسی خاص جگہ سے تعلق نہیں رکھتا بلکہ ہر جگہ ہوتا ہے اس میں متمدن اور غیر متمدن کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ انسائیکلوپیڈیا کا مصنف پروفیسر ودخارینی لکھتا ہے :

جس طرح مرد اور عورت کے جسمانی اور دماغی قوی کا باہمی اختلاف تم کو پیرس جیسے متمدن شہر کے شائستہ باشندوں میں نظر آتا ہے اسی طرح امریکہ کے وحشی ترین اقوام میں

---

[1] مسلمان عورت ۔ [2]، [3]، [4] مسلمان عورت

بھی پایا جاتا ہے۔[1]

خلاصہ یہ ہے کہ جدید تحقیقات نے بھی یہ ثابت کر دیا ہے کہ مردوں میں عورت کی بہ نسبت زیادہ صلاحیت پائی جاتی ہے اور مرد صلاحیت میں عورتوں سے ہر اعتبار سے بڑھے ہوئے ہیں۔

شوہر کے قوام ہونے کا مطلب

قوام قیام سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ قیم اور قیام بھی اسی کے ہم معنے ہیں عربی زبان میں قام جب علیٰ کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنے نگرانی، حفاظت، ولایت، کفالت کے آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شوہر عورتوں کے نگران، محافظ، والی اور کفیل ہوتے ہیں گویا قوامون علی النساء میں بالادستی اور ولایت کا مفہوم بھی ہے اور کفالت و تولیت کا بھی اور یہ دونوں باتیں کچھ لازم ملزوم سی ہیں۔

گھر کی چھوٹی سی وحدت بھی ایک چھوٹی سی ریاست ہے۔ حدیث میں ہے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ تم میں سے ہر ایک حاکم ہے ہر ایک سے اس کی رعیت کے بارے باز پرس ہوگی۔ اور اس کی تفصیل میں یہ بھی فرمایا ہے کہ مرد بھی گھر کی ریاست میں حاکم ہے اور اس کے گھر کے لوگ بمنزلہ ایک رعیت کے ہیں۔ ہر ریاست کو اپنے قیام و بقا کے لیے ایک سربراہ کی ضرورت ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اس ریاست میں سربراہی کا مقام مرد کو ملے یا عورت کو قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ مقام مرد کو حاصل ہے۔

عقلی احتمالات صرف تین ہیں مرد حاکم ہو، عورت حاکم ہو، دونوں برابر ہوں نہ کوئی حاکم ہو نہ محکوم۔ ان تین کے علاوہ کوئی احتمال نہیں۔

قرآن نے مرد کے حاکم ہونے کا اعلان کیا۔ قرآن ایک جامع قانون ہے وہ جس موضوع کو لیتا ہے ایک کامل حکم کے انداز پر اس کے سارے پہلوؤں سے بحث کرتا ہے۔ مرد و عورت کے باہمی حقوق اور فرائض بتانے کے بعد یہ ضرورت تھی کہ گھر کی چھوٹی سی ریاست میں ایک نظم کا ڈھانچہ بتایا جائے۔ کیوں اس کے بغیر انتظام نہیں ہو سکتا۔ اگرچہ گھر کی حکومت کو صراحۃً حکومت نہیں کہا مگر مرد کی سربراہی کا صاف لفظوں میں اعلان کیا ہے۔ حضرت مفتی صاحب نے کیا اچھی بات ارشاد فرمائی ہے کہ حاکم (سربراہ) ہونے سے مراد یہ ہے کہ اجتماعی نظام کے لیے عقلاً اور عرفاً یہ ضروری ہوتا ہے کہ اس کا کوئی سربراہ ہو کہ اختلاف

---

[1] مسلمان عورت

کے وقت اس کے فیصلے سے کام چل سکے جس طرح ملک وسلطنت اور ریاست کے لیے اس کی ضرورت سب کے نزدیک مسلم ہے۔ اسی طرح قبائلی نظام میں بھی اس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی اور کسی ایک شخص کو قبیلہ کا سردار اور حاکم مانا گیا ہے اسی طرح اس عائلی نظام میں جس کو خانہ داری کہتے ہیں۔ ایک امیر اور سربراہ کی ضرورت ہے۔ عورتوں اور بچوں کے مقابلے میں اس کام کے لیے حق تعالیٰ نے مردوں کو منتخب فرمایا کہ ان کی علمی اور عملی قوتیں بہ نسبت عورتوں اور بچوں کے زیادہ ہیں۔ یہ ایسا بدیہی معاملہ ہے کہ کوئی سمجھدار اس کا انکار نہیں کر سکتا۔[1]

شوہر کے قوام ہونے کی وجہ

قرآن نے عورت کے مقابلہ میں گھر کی ریاست میں مرد کے سربراہ ہونے کی دو وجہیں بتائی ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو عورت پر فضیلت دی ہے۔

یہاں فضیلت بمعنے شرف، کرامت اور عزت نہیں ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے مرد کو شریف، نیک اور معزز بنایا ہے اور عورت کو کمین، بد اور ذلیل بنایا ہے۔ کیونکہ یہ ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ روحانی دنیا یعنی قرب حق اور حسن عمل میں مرد و عورت کی حیثیت بالکل مساوی ہے۔ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج اور ساری عبادتیں جس طرح اور جس پیمانے پر مرد کی قبول ہو سکتی ہیں وہی ساری راہیں عورت کے لیے بھی کھلی ہیں بلکہ یہاں فضل اللہ بعضھم علی بعض یہ بتا رہا ہے کہ ان میں سے ایک صنف یعنی مرد کو اللہ نے طبعاً ایسی خصوصیت بھی عطا فرمائی ہے جو عورت کو نہیں دی ہے یا اس سے کم دی ہے۔ باپ بیٹے دونوں بحیثیت بندۂ خدا بالکل ایک ہیں۔ عنداللہ اعمال کی مقبولیت کی حیثیت سے دونوں میں کوئی فرق نہیں لیکن دنیا میں قرآن ہی نے بتایا ہے کہ باپ بالادست ہو اور اولاد زیردست باپ حکم دے بیٹا حکم مانے ٹھیک اسی طرح معاشرت کی انتظامی مشین میں مرد کو عورت پر تفوق حاصل ہے جس کی بنا پر وہی سزاوار ہے کہ قوامیت کی ذمہ داری اس پر ڈالی جائے مثلاً محافظت و مدافعت کی جو قوت اور صلاحیت یا کمانے اور محنت کرنے کی جو استعداد و ہمت مرد میں موجود ہے وہ عورت میں نہیں ہے۔

یہاں سید رشید رضا نے اپنے استاد مفتی محمد عبدہٗ مصری سے بڑے پتے کی بات نقل کی ہے۔ وہ بھی گوش گزار فرمالیجئے:

---

[1] معارف قرآن م ش

مرد کو عورت پر جن راہوں سے فضیلت ملی ہے وہ دو طرح کی ہیں فطری اور کسبی۔ فطری یہ کہ مرد اپنے مزاج کے لحاظ سے عورت کے مقابلہ میں زیادہ طاقتور، زیادہ کامل، زیادہ بھرپور اور زیادہ حسن و جمال رکھتا ہے بلکہ تمہیں میری یہ بات سن کر شاید حیرت ہی ہو کہ مرد عورت کے مقابلے میں زیادہ خوبصورت ہوتا ہے کیونکہ خوبصورتی نام ہے بناوٹ کی تکمیل اور تمامیت کا۔ انسان بھی اپنی حیاتِ جسمانی میں حیوانات کی ایک نوع ہے۔ سارے حیوانات میں نظامِ تخلیق ایک ہے۔ تمام جانداروں میں نر مادہ کے مقابلے میں کامل تر اور حسین تر ہوتا ہے۔ مرغ اور مرغی، بکرا، بکری، شیر شیرنی، گائے اور بیل میں آپ مشاہدہ کر سکتے ہیں۔ مرد میں تخلیقی کمال کا شاہکار داڑھی اور مونچھوں کا ہوتا ہے۔ اسی بنا پر پیدائشی طور پر جس کے داڑھی نہ آئے وہ عیب شمار ہوتا ہے اور ایسا شخص بال اگانے کے لیے تدبیر کے درپے ہوتا ہے اور مزاج کے طاقتور ہونے اور کمالِ خلقت کی وجہ سے مرد میں عورت کے مقابلہ میں انجام بینی اور عقل کا بلوغ زیادہ ہے۔ اطبا کا فیصلہ ہے کہ عقلِ سلیم ہمیشہ جسمِ سلیم میں ہوتی ہے۔ اور کسبی یہ کہ عورت کے مقابلے میں مرد تمام کاموں میں محنت، ایجاد اور فن کاری میں پیش پیش ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ گھر کی زندگی میں عورت کے مقابلے میں مرد کی صدارت کی۔

شوہر کے قوام ہونے کی دوسری وجہ

۶۵ - اور اس لیے کہ عورتوں کی زندگی کا بندوبست کرنے کے لیے مرد اپنے اموال خرچ کرتے ہیں۔

دوسری وجہ قرآن نے عورت کے مقابلہ میں گھر کی ریاست میں مرد کے سربراہ ہونے کی یہ بتائی ہے کہ مرد عورتوں کے اخراجات کے کفیل اور ذمہ دار ہوتے ہیں۔ یعنی بیوی کی معاشی اور کفالتی کی ذمہ داری کا بوجھ شوہر پر ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ ذمہ داری شوہر نے اتفاقاً نہیں اٹھائی ہے بلکہ اس لیے اٹھائی ہے کہ یہ ذمہ داری اسی کے اٹھانے کی ہے۔ اسی میں اس کی صلاحیتیں ہیں اور وہی اس کی پابجائی کر سکتا ہے۔

تمام مکاتبِ قانونِ اسلامی اس بات پر متفق ہیں کہ شوہر پر اپنی بیوی کا نفقہ واجب ہے اور بیوی کو ان تمام ضروریات سے بے نیاز کرے جو خوراک پوشاک اور رہائش سے متعلق ہیں۔ جو بات یہاں خبری پیرائے میں کہی گئی ہے وہ ہی بات دوسرے موقعہ پر انشائی پیمانے میں بتائی گئی ہے۔ ارشادِ نبوت میں بتایا گیا ہے کہ عورتوں کو صرف رہائش، خوراک اور پوشاک ہی نہیں دیتا ہے بلکہ شوہر کا فرض ہے کہ ان میں حسن کاری کرے۔ چنانچہ ترمذی میں ارشاد ہے:

تم بیویوں کو کپڑا اور کھانا دینے میں حسن کاری کا مظاہرہ کرو۔

مقدار نفقہ

نفقہ کی تفصیلات کی تعیین عورت کی ضروریات اس کے سابقہ معیار زندگی، عرف عام اور شوہر کی مالی حالت کو دیکھ کر کی جائے گی۔ اگر شوہر نادار ہو تو بھی اس کے ذمہ بیوی کا نفقہ واجب ہوگا البتہ اس سے ناداری کی حالت میں اس کا مطالبہ نہ کیا جائے گا بلکہ وہ رقم اس کے ذمہ قرض ہوگی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت ابوسفیان کی بیوی ہندہ بنت عتبہ نے سرکار میں استغاثہ کیا کہ میرے شوہر کنجوس آدمی ہیں بخوشی اتنا بھی دینے کو تیار نہیں ہیں جو میرے بچوں کو کافی ہو۔ یہ روداد سنا کر اسی عورت نے دریافت کیا کہ

میں ان کے مال میں سے بچوں کو کھلا دوں تو کیا اس میں حرج ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

ہاں اتنا لے جو تیرے اور تیرے بچوں کے کافی ہو جایا کرے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھی یہی دستور تھا کہ ازواج مطہرات کے نفقہ کے لیے انتظام فرماتے تھے بلکہ ایک باغ ہی اس کام کے لیے خاص کر رکھا تھا جسے فروخت کر کے سال بھر کا نفقہ ایک ہی بار جمع کرا دیتے تھے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں حبس نفقۃ الرجل قوت سنۃ لاہلہ کا عنوان قائم کر کے لکھا ہے:

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نخل بنی نضیر کو فروخت فرما دیا کرتے تھے اور اس کی قیمت سے اپنے اہل و عیال کے لیے سال بھر کے کھانے کا انتظام فرمایا کرتے تھے۔

بلکہ فقہائے کرام نے تفصیل بتائی ہے کہ مرد کے فرائض میں سے ایک فریضہ یہ بھی ہے کہ بیوی کے لیے طہارت و نفاست کا سامان فراہم کرے۔ چنانچہ صاحب رد محتار میں علامہ شامی لکھتے ہیں:

شوہر پر واجب ہے کہ بیوی کے لیے ایسی چیزوں کا سامان کرے جس سے وہ اپنے آپ کو صاف ستھری رکھ سکے اور میل کچیل سے پاک رہے جیسے کنگھی، تیل، صابون وغیرہ جیسا وہاں کا رواج ہو اور اتنی خوشبو کا فراہم کرنا بھی ضروری ہے جس سے وہ بدبو دور ہو جائے اور اتنا پانی بھی ہونا ضروری ہے جس سے کپڑے اور بدن دھو سکے۔

یہ بات کہ نفقہ کا معیار کیا ہو؟ اس کے بارے میں تین رائیں ہیں۔ ایک یہ کہ نفقہ کی مقدار کی تعیین میں صرف شوہر کی حالت کا لحاظ رکھا جائے گا۔ سرخسی کاسانی اور شامی نے اسی رائے کو ترجیح دی ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ میاں اور بیوی دونوں کی مالی حالت کو معیار بنایا جائے۔ یہ رائے امام مالک کی ہے اور فقہاءِ حنفیہ سے خصاف کی ہے۔ صاحب ہدایہ نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ احناف کا اسی پر عمل ہے تیسری رائے یہ ہے کہ صرف عورت کی مالی حالت کا لحاظ کیا جائے۔ یہ رائے شاذ ہے۔ ؎1

بہرحال ان دو وجوہ سے اللہ نے مردوں کو قوام بنایا ہے یعنی گھر کی چھوٹی سی ریاست میں اللہ نے مرد کو صدارت کا منصب دیا ہے۔ صدارت دینے کے باوجود بعضھم کہہ کر یہ لطیف اشارہ بھی کر دیا کہ، اوّلاً کہ مرد کو عورت سے اور عورت کو مرد سے وہی تعلق ہے جو جسم کے اعضاء کا باہم ایک دوسرے سے ہوتا ہے۔ جسم کے اعضاء میں جو نسبت سر کو دوسرے اعضاء سے ہے وہی نسبت مرد کو عورت سے ہے گویا مرد سر ہے تو عورت بدن ہے یعنی نہ مرد کو اپنی برتری کے گھمنڈ میں عورت پر زیادتی کرنی چاہیے اور نہ عورت کو مرد کی برتری کے سامنے احساس کمتری کا شکار ہونا چاہیے کیونکہ اعضاءِ بدن میں کسی عضو کی برتری نظام بدن کی صلاح اور فلاح کی وجہ سے ہے ورنہ نفس عضو ہونے میں سب برابر ہیں۔

ثانیاً یہ بھی بتا دیا کہ اگر کسی چیز میں مردوں کی برتری ثابت بھی ہو جائے تو اس کی حیثیت اس سے زیادہ ہرگز نہیں کہ گھر کے انتظام میں مرد کی سربراہی ہے انتظامی حیثیت میں اگر مرد عورت سے بالا ہے تو عورت اس حیثیت میں بالا ہے کہ مرد کو اس کی خدمت پر لگا دیا ہے۔ وہ مخدوم بھی بیٹھی ہے کھانا مردلا رہا ہے کپڑے سرمائی و گرمائی وہ مہیا کر رہا ہے۔ رہائش کا انتظام وہ کر رہا ہے۔ بہرحال ایک پہلو میں اگر مرد کو برتری حاصل ہے تو دوسرے پہلو میں عورت کو بھی برتری حاصل ہے۔ یہاں زیر بحث کلی فضیلت نہیں ہے بلکہ ایک جزئی بالکل ایسی جزئی جیسی سربراہِ مملکت کو عام شہریوں کے مقابلے میں ہوتی ہے۔

عورت صالحہ اور اس کا فریضہ

۶۲۔ لہٰذا نیک اور صالح عورتیں وہ ہیں جن میں طاعت شعاری ہوتی ہے اور جو اللہ کی دی ہوئی حفاظت سے کام لے کر مردوں کی غیب میں بھی ان کے حقوق و مفادات کی نگراں بن کر رہتی ہیں یعنی جو عورتیں نیک ہیں وہ مردوں کی تابعداری کرتی ہیں اور اللہ کے حکم کے موافق خاوند کے پیچھے اس کی رضا کے موافق اپنے نفس اور خاوند کے مال کی حفاظت کرتی ہیں اپنے نفس اور مال زوج میں کسی قسم کی خیانت نہیں کرتی ہیں۔ ؎2

؎1 نظام النفقات ؎2 افادات شیخ الاسلام

قانتات قنوت سے بنا ہے اس کے معنے خضوع و خشوع کے ساتھ فرمانبرداری کے ہیں۔ سارے قرآن میں یہ لفظ کہیں بھی اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی فرمانبرداری کے لیے نہیں آیا ہے۔ یہاں بھی اسی معنے میں آیا ہے۔ اسی سے وتر میں قنوت آتی ہے۔ شوہروں کی معروف میں طاعت بھی اس میں داخل ہے لیکن یہ اس کا منطوق نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کی صالح عورتیں وہ ہیں جن میں یہ اوصاف ہوں، اولاً جس میں اللہ سبحانہٗ کی فرمانبرداری کے ساتھ شوہر کی طاعت کا جذبہ بھی ہو۔

شوہر کی طاعت و فرمانبرداری

عورت شوہر کی محبت اور اس کی خوشنودی اپنے ایثار اور فرمانبرداری ہی سے خرید سکتی ہے یعنی عورت جب شوہر کی معروف میں طاعت کرے گی، شوہر اس پر اپنی جان چھڑکتا رہے گا اور بیوی کے لیے وہ سارے جتن کرے گا جو ایک شریف مرد کر سکتا ہے۔ اسی لیے عورت کی خوبیوں میں شوہر کی معروف میں اطاعت کو بھی شمار کیا گیا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> عورت جب پنج وقتی نماز پڑھے رمضان کے مہینے میں روزے رکھے، اپنی آبرو کی حفاظت کرے اور اپنے شوہر کے کہے کو مانے تو وہ جنت کے دروازوں میں سے جس دروازے سے چاہے داخل ہو جائے۔

نماز، روزہ اور عفت و عصمت کے تحفظ کے ساتھ شوہر کی فرمانبرداری بھی ضروری بتائی گئی اور اس میں اشارہ ہے کہ عورت پر جہاں حقوق اللہ کی بجاآوری ضروری ہے شوہر کے حقوق کا پاس بھی ضروری ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک بار پوچھا گیا کہ بہترین عورت کونسی ہے آپ نے جواب میں فرمایا:

> شوہر جب اس کو دیکھے تو وہ اس کو خوش کر دے اور جب کسی کام کا حکم دے بجالائے اور شوہر کی اپنی جان و مال میں ایسی مخالفت نہ کرے جو اسے ناپسند ہو۔

شوہر کے حقوق کی بجاآوری کی تاکید کا اس سے دلچسپ اور بلیغ انداز اور کیا ہو سکتا ہے۔ گویا جو عورت محسوس کرے کہ اس میں یہ خوبیاں نہیں ہیں وہ یقین کرے کہ وہ سرکار دو عالم کے نزدیک بہترین ہے سب کچھ ہے مگر جو خاتم النبیین کی نگاہ میں بہتر نہیں اور محروم ہے۔

شوہر کی ناجائز بات میں اطاعت نہیں

یہ حقیقت ہے کہ شوہر کی طاعت عورت پر معروف میں واجب ہے یعنی عورت اپنے شوہر کی

ان باتوں پر عمل نہ کرے گی جو رب العزت کے احکام کے خلاف ہوں اور قانتات میں اس طرف لطیف اشارہ ہے کیونکہ قنوت کی اصل روح اللہ سبحانہ کی طاعت میں دوام کے ہیں۔ اب شوہر کی اطاعت اسی حد تک ہے جہاں پر اللہ کی طاعت کا دامن ہاتھ سے نہ چھوٹے۔ اگر شوہر کی طاعت میں اللہ کی طاعت سے محرومی ہوتی ہے تو وہ قانتات میں سے ہرگز نہیں ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں اس موضوع پر لا تطیع المرأۃ زوجھا فی معصیۃ اللہ کا عنوان قائم کرکے بتایا ہے کہ شوہر کی اطاعت کی حدود کیا ہیں حدیث میں ایک واقعہ کا ذکر کیا گیا ہے کہ ایک انصاری خاتون ایک بار خدمت اقدس میں تشریف لائیں اور بتایا کہ میں نے اپنی لڑکی کی شادی کردی ہے۔ اتفاق سے میری لڑکی کے بال گر گئے ہیں۔ اب میرے داماد کا تقاضا ہے کہ دوسرے بال علیحدہ سے لے کر اس کے بالوں میں شامل کردیے جائیں کہ بدصورتی جاتی رہے۔ آپ کا اس سلسلے میں کیا ارشاد ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسی عورت پر لعنت کی گئی ہے جو الگ سے بال لے کر اپنے بالوں میں جوڑے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عورت پر شوہر کی معصیت میں طاعت ناجائز ہے کیونکہ عورت پر اپنے شوہر کی طاعت سے اہم اور اقدم اپنے خالق کی طاعت ہے۔ لہٰذا اگر کوئی خدا کی معصیت کا حکم دے یا خدا کے عائد کیے ہوئے کسی فرض سے باز رکھنے کی کوشش کرے تو اس کی اطاعت سے انکار کردینا عورت کا فرض ہے۔ اس صورت میں اگر وہ اطاعت کرے گی تو گنہگار ہوگی۔

شوہر کی خوشنودی

ان امور میں بلاشبہ عورت شوہر کا حکم بجالائے گی جن میں اللہ کی نافرمانی نہیں ہوتی۔ فرمانبردار بیوی حدیث میں بڑی گراں قدر نعمت قرار دی گئی ہے۔ اس حدیث کو پڑھیے اور اندازہ کیجیے کہ فرمانبردار بیوی کا اسلام میں کیا مقام ہے۔

> تقویٰ کے بعد مسلمانوں کے لیے بہترین چیز جو اس کے لیے قابل استفادہ ہے وہ نیک عورت ہے کہ اگر شوہر اس کو حکم دے بجالائے۔ شوہر اس کو دیکھے تو خوش کردے۔ اس کو قسم دے تو پوری کردے اور اگر شوہر موجود نہ ہو تو اپنی ذات اور شوہر کے مال میں خیرخواہ بن کر رہے۔ (ابن ماجہ افضل النساء)

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ کی نافرمانی سے بچنے کے بعد بہترین دولت نیک اور فرمانبردار بیوی ہے۔ اسلام نے میاں بیوی کے رشتہ کو زیادہ سے زیادہ مضبوط کرنا چاہا ہے اور اس سلسلے میں دونوں کی

نفسیات کو پیش نظر رکھ کر ہر ایک کو اس کے لائق حقوق عطا کیے ہیں۔ بیوی پر شوہر کے جو حقوق ہیں۔ وہ سب اس لائق ہیں کہ عورت بدل و جان بجا لاتے۔ پہلے گزر چکا ہے کہ شوہر پورے گھر میں صدر کی حیثیت رکھتا ہے اور گھر کی ریاست کا نگران ہے اس میں بیوی بھی داخل ہے۔ پھر نگران کے جائز حکم سے سرتابی کیونکر جائز ہو سکتی ہے اور پھر عورت اپنے شوہر کی رفیقہ حیات اور شریک زندگی ہے اور ایک دوست کا فریضہ ہے کہ دوسرے دوست کے لیے ایثار و قربانی کرے۔ عورت جو کچھ کرے رفیقہ حیات ہی کی حیثیت سے اسے کرنا چاہیے اپنے کو غلام اور محکوم نہ تصور کرنا چاہیے۔

حافظات للغیب کے معنے

نیک عورتوں کی دوسری خوبی یہ بتائی گئی ہے کہ وہ شوہر کی غیب میں عزت و ناموس کی نگران ہوتی ہیں۔ قتادہ اور ثوری کہتے ہیں کہ شوہروں کی عدم موجودگی میں اپنی جان اور شوہر کے مال کی حفاظت کرتی ہیں۔ اس صورت میں غیب کے معنے میں ہے یعنی پیٹھ پیچھے۔ اور پیٹھ پیچھے کی قید اس لیے لگائی ہے کہ معلوم ہو جائے کہ جب ان کا اپنے شوہروں کی غیب میں یہ حال ہے تو حضور میں ان کا کیا پوچھنا۔ اس حفاظت میں سب سے بڑی چیز شوہر کا حق زوجیت یعنی اپنے ناموس کی حفاظت، گویا عورت کی عفت اس کا سب سے بڑا جوہر ہے۔ ایک معنے تو یہی ہیں کہ شوہر کی غیر موجودگی میں اس کے ناموس اور اس کے مال کی حفاظت کرتی ہیں۔ دوسرے معنے یہ بھی ہیں کہ ازدواجی سے متعلق میاں بیوی کے درمیان جس قدر راز ہوتے ہیں یعنی لوگوں سے الگ ہو کر خلوت میں میاں بیوی میں جس قدر باتیں ہوتی ہیں سب کی محافظ ہوتی ہیں۔ پیار و محبت کے ساتھ اگر کبھی ناراضگی بھی ہو جاتی ہے اور شوہر ڈانٹ ڈپٹ بھی دیتا ہے تو کانوں کان کسی کو خبر نہیں ہونے دیتی ہیں۔ اس صورت میں لفظ غیب اپنے معنے میں ہے غیب کے معنے میں نہیں ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ جب وہ خلوت کی باتوں تک کی محافظ ہیں تو آبرو کی حفاظت میں ان کے مقام کا اسی سے اندازہ کر لو۔ رشید رضا کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے۔

نزاہت اور پاکدامنی کے لیے جو کنائی زبان بولی جا سکتی ہے۔ یہ انداز بیان میری رائے میں بلیغ ترین ہے۔ سب پڑھتے ہیں حتیٰ کہ نوجوان لڑکیاں تک پڑھتی ہیں اور خوب سمجھتی ہیں لیکن شرمندگی محسوس کرنے کا وسوسہ بھی نہیں ہوتا۔

حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

بہترین بیوی وہ ہے کہ جب تم اسے دیکھو تو تمہارا جی خوش ہو جائے جب تم اسے

کسی بات کا حکم دو تو وہ تمہاری اطاعت کرے اور جب تم گھر میں نہ ہو تو وہ تمہارے پیچھے تمہارے مال کی اور اپنے نفس کی حفاظت کرے۔

یہ حدیث پہلے معنے کی تائید کرتی ہے جو سفیان ثوری اور قتادہ نے بتاتے ہیں بما حفظ اللہ میں باء سببیہ ہے یعنی عورتوں کا اپنے ناموس کو محفوظ رکھنا توفیق کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عمل کے ظہور میں آنے کے لیے صرف بندہ کا ارادہ کافی نہیں ہوتا بلکہ اس کے ساتھ اللہ کی توفیق بھی شرط ہے اگر بندے کی جانب سے ارادہ ہو اور اللہ کی جانب سے توفیق تو عمل موجود ہوتا ہے۔ مفتی محمد شفیع صاحب کا یہ کہنا بالکل بجا ہے " چونکہ عورتوں کی یہ ذمہ داریاں یعنی اپنی عصمت اور شوہر کے مال کی حفاظت میں اللہ تعالیٰ عورت کی مدد فرماتے ہیں۔ انہی کی امداد اور توفیق سے وہ اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہوتی ہیں ورنہ نفس و شیطان کے مکائد ہر وقت مرد و عورت کا گھیرا ڈالے رکھتے ہیں اور عورتیں خصوصاً اپنی علمی اور عملی قوتوں میں بہ نسبت مرد کے کمزور بھی ہیں۔ اس کے باوجود وہ ان ذمہ داریوں میں مردوں سے زیادہ مضبوط ہیں یہ سب اللہ کی توفیق اور امداد ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بے حیائی کے کاموں میں بہ نسبت مردوں کے عورتیں بہت کم مبتلا ہوتی ہیں۔"

عورت کی غلط کاری اور علاج

۷۴۔ اور دیکھو جن بیویوں سے تمہیں غلط روی کا اندیشہ ہو تو تم ان کو نصیحت کرو، ان سے خوابگاہوں میں علیحدگی اختیار کر لو اور ان کی پٹائی کرو۔ یعنی اگر عورت خاوند سے بدخوئی کرے تو پہلا درجہ تو یہ ہے کہ مرد اس کو زبانی فہمائش کرے اور سمجھائے اگر نہ مانے تو دوسرا درجہ یہ ہے کہ جدا سوئے لیکن اسی گھر میں، اس پر بھی نہ ملے تو تیسرا درجہ یہ ہے کہ اس کو مارے بھی لیکن نہ ایسا کہ جس کا نشان باقی رہے یا ہڈی ٹوٹ جائے ہر تقصیر کا ایک درجہ ہے اس کے موافق تادیب اور تنبیہ کی اجازت ہے جس کے تین درجے ترتیب وار آیت میں مذکور ہیں اور مارنا پیٹنا آخر کا درجہ ہے۔ سرسری قصور پر نہ مارے ہاں قصور زیادہ ہو پھر مارنے میں حرج نہیں۔ جس قدر مناسب ہو مارے پیٹے مگر اس کا خیال رکھے کہ ہڈی نہ ٹوٹے اور نہ ایسا زخم پہنچائے کہ جس کا نشان باقی رہ جائے۔[1]

پہلی آیت میں صالحات کو بیان کیا تھا اس آیت میں ناشزات یعنی غلط کار عورتوں کا چہرہ پیش

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کیا جارہا ہے اور تقسیم کے پیرائے میں یہ بات اشارۃً معلوم ہو گئی کہ نیکوکار اور صالحات پر مردوں کو کوئی تادیبی اقدام کرنے کا حق نہیں ہے۔

یہ بات یاد رہے کہ نشوز عورت ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ عورت کی مردوں میں بھی نشوز ہوتا ہے۔ یہاں عورت کا نشوز بیان کیا ہے اور اسی پارے کے آخر میں مردوں کا نشوز بیان کیا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے :

وان امراۃ خافت من بعلھا نشوزا

اگر عورت کو اپنے شوہر کی غلط کاری کا اندیشہ ہو۔

جیسے خبث و طیب دونوں میں ہوتے ہیں ایسے ہی نشوز بھی دونوں میں ہو سکتا ہے۔ نشوز اگر عورت کی جانب سے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ مرد کی قوامیت کو چیلنج کرتی ہے اور مرد کی طرف سے ہو تو اس کے معنے یہ ہیں کہ بیوی کے حقوق کو تسلیم کرنے سے انکار کردے اور اس سے پیچھا چھڑانے پر آمادہ ہو جائے۔ نشوز نشز سے ہے اس کے لغت میں معنے اٹھنا ہیں جیسے واذا قیل انشزوا فانشزوا (المجادلہ ۲۸) اسی سے نشوز بین الزوجین ہے یعنی کا شوہر کے خلاف اٹھ جانا اور شوہر کا بیوی کے خلاف ہو جانا یعنی ان میں باہم موافقت نہ ہونا۔ اس لیے لغت میں نشوز بین الزوجین کے معنے ہیں کراھیۃ کل منھما صاحبہ و سوء عشرتہ یعنی ہر ایک کا اپنے ساتھی سے کراہت رکھنا اور اس سے بدسلوکی کرنا لیکن بلحاظ حالات کے الگ الگ معنے ہیں۔ عورت کا نشوز مرد کے خلاف یہ ہے کہ بیوی اس کے خلاف اٹھ کھڑی ہو۔ اس کی نافرمان ہو جائے اس سے بغض رکھے، اس کی طاعت سے باہر ہو جائے اور شوہر کا نشوز عورت کے خلاف یہ ہے کہ وہ عورت کو بلا وجہ مارے اور اس پر ظلم کرے۔

یہاں انداز تعبیر یہ اختیار کیا ہے کہ جن عورتوں سے تمہیں نشوز کا خوف ہو یعنی جن کے ناشزہ ہونے کی تمہیں توقع ہو یا جن کا ناشزہ ہونا تمہیں معلوم ہو۔ یہ نہیں فرمایا کہ جو عورتیں ناشزہ ہوں۔ یعنی صاف طور پر ان کی طرف نشوز کی نسبت نہیں کی گئی اور نہ نشوز کو ان کا فعل قرار دیا ہے۔ جہاں تک میں سمجھا ہوں اس انداز بیان سے قرآن نے یہ سمجھایا ہے کہ عورت کا شوہر کے خلاف اٹھنا عورت کی فطرت نہیں ہے۔ اگر کبھی کبھار ایسا ہو جائے اور کسی وجہ سے وہ اپنی فطرت کے خلاف ایسا کر بیٹھے تو ایسے موقعہ پہ مرد کو کیا کرنا چاہیے۔

اس میں اشارہ ہے کہ برائی عورت کی فطرت نہیں ہے۔ تورات میں ہے کہ شجرہ ممنوعہ کے پھل کھانے کی ترغیب آدم کو حوا نے دی تھی اس لیے نافرمانی کا پہلا قدم جو انسان نے اٹھایا وہ عورت کا تھا۔ اسی بنا پر یہودیوں اور عیسائیوں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا کہ عورت کی فطرت میں برائی ہے اور وہی مرد کو سیدھی

راہ سے بھٹکاتی ہے۔ لیکن قرآن نے اس قصہ کی کہیں بھی تصدیق نہیں کی، کسی جگہ تعبیر کا انداز بھی ایسا اختیار نہیں کیا ہے جس سے عورت کا فطرت ہی سے بُرا ہونا معلوم ہو۔ اس مقام کی نزاکت کو نظر میں رکھ کر بلاغت قرآنی کا مطالعہ فرمایئے کہ وہ نشوز کو فعل بنا کر فعل کی نسبت بھی عورتوں کی طرف کرنا گوارا نہیں کرتا۔

تادیب کا پہلا درجہ رفق و ملاطفت

اگر عورتوں میں نشوز رونما ہو تو شوہروں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اوّلین طور پر ان کو نصیحت کریں۔ اصل ارشاد میں فعظوھن آیا ہے۔ وعظ کے معنے زبانی نصیحت کرنے کے آتے ہیں اور وعظ کی روح یہ ہے کہ نرمی، خوش اسلوبی اور مصلحت کے ساتھ کی جائے۔ یہ بات کہ وعظ کا اصل مقصد عورت کی اصلاح اور اس کی اخلاقی حفاظت ہے اس سے واضح ہوتی ہے کہ زندگی میں یہ کوئی حیرت انگیز بات نہیں کہ میاں بیوی میں کشیدگی پیدا ہو جائے اور یہ بھی ہوتا ہے کہ اس سلسلے میں شیطان کو بہکانے اور ابھارنے کا موقع مل جاتا ہے۔ پھر اس وقت اور بھی جبکہ عورتیں نازک طبع، تندخو اور تلوّن مزاج ہوتی ہیں۔ اس لیے قرآن نے ان حقائق و واقعات سے چشم پوشی نہیں کی ہے۔ عورتوں کی فطری کمزوریوں کو پیش نظر رکھ کر مردوں کو اس سلسلے میں مفید ہدایتیں دی ہیں تاکہ زندگی میں بناؤ سنوار پیدا ہو جائے۔ قرآن نے ذاتی معائب کی غیبت کرنے اور بدگمانیاں کرنے کی ممانعت کی ہے۔ اس کا سبب یہی ہے کہ اس طریقہ اصلاح سے فتنہ و فساد کا دروازہ کھل جائے گا اور خانگی زندگی کا امن و سلام اٹھ جائے گا۔ نیز اس طرح وعظ کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہو سکتا اور نہ اس کی کوئی اصلاح ہو سکتی ہے جس کی غیبت کی جائے۔ نیز اس سے غیبت کرنے والے شخص کی اخلاقی کمزوری ظاہر ہوتی ہے۔ جو کچھ کہا جائے سامنے کہا جائے اور رفق و ملاطفت سے کہا جائے۔

اس کی وجہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم نے بتائی ہے کہ جذبات کی فراوانی اور حسیات کی نزاکت اور انتہا پسندی کی جانب میل و انعطاف عورت کی فطرت میں ہے اسی فطرت پر اللہ نے اس کو پیدا کیا ہے، یہ عورت ہونے کے لیے عیب نہیں اس کا حسن ہے۔ تم اس سے جو کچھ بھی فائدہ اٹھا سکتے ہو اس فطرت پر قائم رکھ کر ہی اٹھا سکتے ہو۔ اگر اس کو مردوں کی طرح سیدھا اور سخت بنانے کی کوشش کرو گے تو اسے توڑ دو گے۔ ارشاد ہے:

> عورتوں سے اچھا برتاؤ کرو کیونکہ وہ پسلی کی مخلوق ہیں اور پسلی میں سب سے ٹیڑھا حصہ اس کا بالائی ہوتا ہے۔ لہٰذا اگر تم سیدھا کرنا چاہو گے تو اسے توڑ دو گے اور اگر چھوڑ دو گے تو وہ ٹیڑھی رہے گی۔

خلاصہ یہ ہے کہ انہیں نرمی اور آشتی سے سمجھاؤ۔ اس میں شوہر کو بھی تنبیہ ہے کہ غصہ میں اگر فوراً

کارروائی کی اجازت نہیں ہے اور بات کا ایسا انداز اختیار کرے جو موثر ہو۔ مختلف عورتوں کے لحاظ سے وعظ بھی مختلف ہوگا کچھ کو صرف اللہ سے ڈرا دینا کافی ہو جائے گا اور کچھ کے لیے دنیوی انجام کی تہدید و تخویف اور معاشرہ میں رسوائی موثر ہوگی۔ اور کچھ میں مرغوبات سے محرومی کی دھمکی کافی ہوگی۔

تادیب کا دوسرا درجہ مقاطعہ

اگر عورت مزاج کی اکھڑ ہو اور وعظ و نصیحت اور تنبیہہ و ملامت کسی درجہ میں مفید نہ ہو تو قرآن نے دوسرا علاج یہ بتایا ہے کہ ان کو خوابگاہوں میں چھوڑ دو۔ اصل ارشاد ہیں واھجروھن فی المضاجع آیا ہے یعنی ان سے بے تکلفانہ قسم کا خلاملا چھوڑ دے۔ اس کے بھی دو درجے ہیں ایک یہ کہ صرف بات چیت چھوڑ دے دوسرے یہ کہ ان سے خصوصی تعلقات چھوڑ دے۔ مطلب یہ ہے کہ جب زبانی نصیحت اور فہمائش دونوں بے اثر ہو کر رہ جائیں اور نافرمانی و سرکشی بدستور قائم رہے تو ان سے بات چیت چھوڑ دی جاتے اور اس پر بھی باز نہ آئے تو پھر ہم بستری کے تعلقات منقطع کر دو۔ لیکن یہ قدم محض بدگمانی کی بنا پر نہیں بلکہ تحقیق و تجربہ کے بعد اٹھایا جاتے۔ فقہانے تصریح کی ہے کہ محض بدگمانی کی بنا پر یہ قدم اٹھانا جائز نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے بات چیت چھوڑنے کے معنے بھی بتائے ہیں جیسا کہ الجصاص نے تصریح کی ہے۔

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ کجی عورت کی سرشت میں داخل ہے اس سے جدا نہیں ہو سکتی۔ اس کی اصلاح رفق و ملاطفت ہی سے ہو سکتی ہے۔ اگر رفق و ملاطفت کی ساری صورتیں بیکار ہو جائیں تو یہ دوسرا قدم اٹھایا جائے کہ بات چیت چھوڑ دے مگر یاد رہے کہ ارشاد نبوت میں تین دن سے زیادہ مسلمان سے بات چیت چھوڑنا جائز نہیں ہے۔ اگر یہ قدم بھی بیکار ہو جائے تو بے تکلفی والے تعلقات چھوڑ دے لیکن از روئے قرآن اس کی مدت بھی چار ماہ ہے۔ بہرحال جو قدم بھی اٹھائے سوچ سمجھ کر اٹھائے۔ جوش غضب اور جذبات میں کچھ نہ کرے اور اس سے غافل نہ ہو کہ میاں بیوی کے درمیان جو تعلقات ہیں بہت گہرے ہیں۔ گھر کا سارا نظام دونوں کی مصالحت اور اتحاد عمل میں مضمر ہے۔ عورت زندگی کی ساتھی ہے اس سے ایک منٹ کے لیے بھی آپ بے نیاز نہیں ہو سکتے۔ اگر باہر کا سارا نظام مرد درست رکھتا ہے تو گھر کا سارا اندرونی نظام عورت کے ہاتھ میں ہے، گھر میں کھانے پینے کا نظم، بچوں کی پرورش اور ان کی تربیت اور اس طرح کی دوسری تمام چیزیں عورت سے تعلق رکھتی ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ میاں بیوی میں موافقت نہ ہو اور زندگی کی گاڑی تیز رفتاری سے رواں دواں ہو۔ جس نے کہا سچ کہا ہے کہ مرد و عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں۔ ان دونوں کی دوستی اور اتحاد و عمل کے بغیر یہ

گاڑی چل نہیں سکتی ۔

حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ امام بخاری باب قوا انفسکم و اھلیکم نارا اس لیے لائے ہیں کہ اپنے مخاطبوں کو یہ بتائیں کہ عورتوں کو ان کی حالت پر نہ چھوڑنا چاہیے بلکہ نرمی سے بتدریج ان کی اصلاح کی کوشش کرنی چاہیے کہ مرد پر اس قدر اصلاح کی ذمہ داری ہے ۔ نیز اس میں یہ بتایا گیا ہے کہ عورتوں کے ساتھ مدارات اور ملاطفت کا برتاؤ ناگزیر ہے جو دلوں میں محبت و الفت کے رسوخ کا باعث ہو ۔ پھر ساتھ ہی یہ تدبیر بھی ہے کہ عورتوں کی بہت سی باتوں سے درگذر کی جائے اور ان کی کج مزاجی پر صبر و تحمل سے کام لیا جائے ۔

تادیب کا تیسرا درجہ تعزیر ہے

اگر عورت وعظ و نصیحت اور تہدید و ملامت اور اس کے مقاطعہ سے بھی راستی پر نہ آئے تو پھر اسے مارنے کی بھی اجازت ہے ۔ اصل ارشاد میں فاضربوھن آیا ہے ۔ اس ضرب کی صورت کیا ہو ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی حدبندی کرتے ہوئے فرمایا ہے کہ :

واضربوھن ضربا غیر مبرح

ان کو اس طرح مارو کہ جلد نہ کھل جائے ۔

حجۃ الوداع کا مشہور تاریخی خطبہ جہاں دوسرے اہم حقائق کا حامل ہے ان ہی میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا ۔

> سنو ! عورتوں کے متعلق بھلائی کا تاکیدی حکم قبول کرو کیونکہ وہ تمہارے پاس بطور قیدی ہیں ۔ اس کے سوا تم ان کی کسی چیز کے مالک نہیں ہو ۔ اگر وہ کھلی ہوئی بدکاری کا ارتکاب کر جائیں تو تم ان کو بستر پر تنہا چھوڑ دو اور معمولی تنبیہہ کرو ، اطاعت کرلیں تو پھر زیادتی کی اجازت نہیں ہے ۔ سنو تمہاری عورتوں پر تمہارے حقوق ہیں ۔ اور اسی طرح تمہاری عورتوں کے تم پر حقوق ہیں ۔ تمہارے حقوق یہ ہیں کہ وہ ان کو تمہارے بسترے پر نہ بیٹھنے دیں جن کو تم پسند نہیں کرتے اور تمہارے گھروں میں ان کو نہ بلائیں جن کا آنا تمہیں ناپسند ہو اور ان کا تم پر حق یہ ہے کہ تم ان کو کپڑے اور کھانا دینے میں حسن کار بن کر رہو ۔ (ترمذی)

یہ ارشاد نبوت قرآن کی اس آیت میں بہترین تشریح ہے ۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ قرآن نے

جس ضرب کی اجازت دی ہے وہ اس وقت ہے جب عورت فاحشہ کی مرتکب ہو جائے ۔
غور فرمائیے اس حدیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کے بارے میں جو ہدایتیں دی ہیں ۔ پہلی بات تو یہی ہے کہ خانگی زندگی کے نظام میں مرکزیت پیدا کرنے کے لیے مردوں کو عورتوں پر برتری دی گئی ہے ۔ دونوں کی حیثیت اگر برابر ہوگی تو اقتداری مساوات کا نتیجہ اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ عائلی زندگی کا شیرازہ منتشر ہو کر رہ جائے ۔ دو بادشاہ ایک اقلیم میں نہیں رہ سکتے ۔ اس کے بعد آپ نے بتایا کہ فاحشہ مبینہ یعنی کھلی بے حیائی کی صورت میں شوہر کو فہمائش ، مقاطعہ اور گوشمالی کی اجازت دی گئی ہے ۔ کھلی بے حیائی سے جدھر اشارہ ہے وہ چھپا نہیں ہے لیکن بعض نے اس میں بھی بلا وجہ توسیع کی ہے ۔ الغرض آخری درجہ پر عورت کی تنبیہ کی یہ اجازت خاص حالات میں ہے اور زبانِ نبوت نے تصریح کی ہے کہ یہ ضرب غیر مبرح ہو یعنی ایسی مار ہو کہ جس سے عورت کے کسی عضو کو نقصان نہ پہنچے بلکہ یہاں تک تصریح کی ہے کہ اس سے مراد مسواک سے مارنا ہے ۔ جیسا کہ ابو حیان اندلسی نے حضرت عبد اللہ بن عباس سے نقل کیا ہے ۔ بہرحال اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ مار بالکل ہلکی ہو ۔ ایسی نہ ہو جس سے چوٹ لگ جائے یا جس سے رفیق زندگی کی توہین ہو جائے ۔
قرآن حکیم کے مخاطب خاص طبقہ کے لوگ خاص قوم کے افراد نہیں اس کے مخاطب عرب و عجم ، چینی ، حبشی ، انگریز ، جاپانی ، رومی اور ہندی اعلیٰ و ادنیٰ ، شریف و رذیل ، عالم و عامی ، سمجھدار و بیوقوف ، چمار ، چوڑھے ، نائی دھوبی ، شہری دیہاتی ، نیک بخت بد بخت ہر طبقہ ہر سطح پر ذہنیت کے لوگ پہلی صدی سے لے کر قیامت تک ہر دور اور ہر زمانے والے ہیں ۔ اور اس کے احکام و مسائل میں ہر انسانی ضرورت اور ماحول کا لحاظ رکھا گیا ہے ۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ ایسے بہت سے معاشرے موجود ہیں جہاں عورتوں کے لیے جسمانی سزائیں عام ہیں قرآن کی یہ اجازت ایسے ہی لوگوں کے لیے ہے ورنہ قرآن کا سیاق نرمی ہی کی طرف متوجہ کر رہا ہے ۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ عام طریق سے غرض حاصل نہ ہو تو بس اسی پر اکتفا کرنا چاہیے سنگین اور تشدد طریق کو اختیار نہ کرنا چاہیے ۔

عورتوں کو مارنا اور نبوت کا منشا

عورتوں کو مارنا عام طور پر اسلامی تہذیب کے خلاف ہے ۔ یہ زمانہ جاہلیت کا دستور تھا جس کی اسلام نے اصلاح کی ہے ۔ ایاس بن عبد اللہ کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک بار حکم دیا کہ خدا کی بندیوں کو نہ مارا کرو تو حضرت عمر نے آکر عرض کی یا رسول اللہ بیویاں اپنے شوہروں پر دلیر ہو گئیں تو آپ نے

مارنے کی رخصت دی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بہت سی عورتیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر اپنے شوہروں کی شکایتیں لے کر آئیں۔ یہ دیکھ کر آپ نے فرمایا کہ آلِ محمد کے گرد بہت سی عورتیں چکر کاٹتی رہی ہیں جو اپنے اپنے شوہروں کی شکائتیں لے کر آتی تھیں۔ یہ اپنی بیویوں سے ایسی بدسلوکی کرنے والے تم میں سے اچھے لوگ نہیں لے مختلف عنوانوں اور مختلف پیرایوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عورتوں کو مارنے سے روکا ہے۔

زندگی کے آخری حصے میں مدینہ منورہ پہنچنے کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس امہات المومنین کا اجتماع دوسرے مصالح کے ساتھ مردوں کے باہمی تعلقات کا عملی درس ہے۔ یہ بھی اس کی بڑی غرض تھی، خود فرماتے تھے۔

تم میں بہتر وہ ہے جو اپنے بیوی اور بچوں کے لیے بہتر ہے اور خود میں اپنے بیوی بچوں کے لیے بہتر ہوں۔ (مشکوٰۃ)

اس میں بھی اسی راز کا انکشاف ہے کہ وقتی طور پر اپنے آپ کو نیک بنا کر پیش کرنا یہ کوئی بات نہیں ہے۔ نیکی اور بھلائی تو وہ ہی ہے جو بیوی اور اولاد سے تعلقات میں نمایاں ہو عمل کر کے بھی دکھایا جاتا اور زبان مبارک سے بھی فرمایا جاتا۔

سب سے زیادہ کامل مومن وہ ہے جو اخلاق میں اچھا ہو اور اپنے گھر والوں کے لیے نرم ہو۔ (ترمذی)

یہاں یہ بات خاص طور پر یاد رکھنی چاہیے کہ ان تینوں علاجوں میں ترتیب ہے اور ترتیب کے لیے تدریج بھی ہے ترتیب یہ ہے کہ اوّل وعظ پھر مقاطعہ اور پھر ضرب، اور تدریج یہ ہے کہ یہ سارے کام ہنگامی نہ ہوں بلکہ آہستہ آہستہ ہوں۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ تینوں باتیں بالترتیب ہیں اور بالتدریج ہیں۔ آلوسی نے بھی النص ہو الدال علی الترتیب کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نشوز کی حالت میں ان تینوں تدبیروں کی اجازت ہے۔ اب رہا ان پر عملدرآمد تو بہرحال اس میں قصور اور سزا کے درمیان تناسب ہونا چاہیے اور جہاں ہلکی تدبیر سے اصلاح ہو سکتی ہے وہاں سخت تدبیر سے کام نہ لینا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیویوں کے مارنے کی جب کبھی اجازت دی ہے باولِ نخواستہ دی ہے اور پھر بھی اسے ناپسند ہی کیا ہے تاہم بعض عورتیں ایسی ہوتی ہیں جو پٹے بغیر درست ہی نہیں ہوتی ہیں ایسی حالت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ منہ پر نہ مارا جائے بے رحمی سے نہ مارا جائے اور ایسی چیز سے

لے ابوداؤد، ابن ماجہ، دارمی

نہ مارا جائے جو جسم پر نشان چھوڑ جائے [1]

اصلاحِ حال کے بعد زیادتی

۶۸۔ بعد ازیں اگر وہ تمہارے کہے پر چلیں تو ان کے خلاف کوئی راہ تلاش نہ کرو۔ یقین مانو کہ اللہ سب کے اوپر ہے اور سب سے زیادہ بڑائی رکھنے والا ہے۔ یعنی وہ عورتیں تمہاری نصیحت یا علیٰحدگی یا ضرب و تادیب کے بعد اگر بدخوئی اور نافرمانی سے باز آجائیں اور بظاہر مطیع ہو جائیں تو تم بھی بس کر جاؤ اور ان کے قصوروں کی کھود کرید مت کرو اور خواہ مخواہ ان کے ملزم بنانے سے خدا سے ڈرو بے شک اللہ تم سب پر غالب اور حاکم ہے نہ عورتوں کے معاملے میں خواہ مخواہ کی بدگمانی سے کام لو اور نہ تھوڑے قصور پر اخیر کی سزا دینے لگو بلکہ ہر قصور کی ایک حد ہے اور مار اخیر کا درجہ ہے [2] ایک مطلب یہ ہے کہ اگر ان تینوں تادیبی میں سے کسی ایک کے ذریعے بھی وہ اصلاحِ حال کر لیں تو تم خواہ مخواہ دوسری تادیبی صورتیں بے محل ان کے خلاف استعمال نہ کرو۔ آغاز وعظ و نصیحت سے کرو۔ اگر یہ تدبیر سود مند نہ ہو تو بات چھوڑ دو۔ اگر اس میں بھی تمہیں کامیابی کی صورت نظر نہ آئے تو زناشوئی کے تعلقات چھوڑ دو اور اس میں ناکامی ہو تو پھر ضرب کے ذریعے اس کی صحت، ماحول اور اپنے عرف کے مطابق کارروائی کرو۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اگر وہ تمہارا کہا مان لیں اور نشوز چھوڑ دیں تو ان پر گفتار و کردار کے ذریعے زیادتی نہ کرو۔ گویا قوام ہونے کی حیثیت سے شوہر کو بیوی پر ظلم و زیادتی سے منع کیا جا رہا ہے اور علامہ آلوسی رقمطراز ہیں، اگر بیوی بغاوت کی جگہ طاعت کی راہ پر آجائے تو ان سے انتقام لینے کے بہانے نہ تلاش کرنے چاہئیں اور پچھلی کدورتوں کو بالکل بھول جانا چاہیے۔ لفظ تبغی دونوں معنے میں ہو سکتا ہے بمعنے طلب اور تلاش بھی اور بمعنے ظلم و تعدی بھی۔ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ اگر بیویاں آغاز ہی میں اور یا نشوز کے بعد تمہاری مطیع ہو جائیں اور توبہ کر لیں تو تم کو ان کے خلاف تکلیف دینے کے لیے راہیں تلاش کرنے کی اجازت نہیں ہے یعنی توبہ کے بعد ان کا نشوز نہ ہونے کے برابر ہے کیونکہ گناہ سے توبہ کرنے والا ایسا ہے جیسے اس نے گناہ ہی نہیں کیا۔

اس سے اشارۃً یہ بھی سمجھ میں آ رہا ہے کہ اگر بیویاں ناشزات نہ ہوں بلکہ قانتات ہوں تو ان کو وعظ و نصیحت کی بھی گنجائش نہیں ہے چہ جائیکہ مقاطعہ اور ضرب و تعزیر۔

---

[1] تفہیم القرآن

زوجین کے نزاع میں قانون تحکیم

۶۹ - اگر تمہیں میاں بیوی کے درمیان پھوٹ کا اندیشہ ہو تو ایک پنچ مرد کے رشتہ داروں میں سے اور ایک عورت کے قرابت داروں میں سے مقرر کرو۔ یعنی اے مسلمانو! اگر تم کو اندیشہ ہو کہ خاوند اور بیوی میں مخالفت اور ضد ہے اور وہ اپنے باہمی نزاع کو خود سمجھا نہ سکیں گے تو تم کو چاہیے کہ ایک منصف مرد کے اقارب میں سے اور ایک منصف عورت کے اقارب میں سے مقرر کر کے بغرض فیصلہ زوجین کے پاس بھیجو۔ کیونکہ اقارب کو ان کے حالات بھی زیادہ معلوم ہوں گے اور ان سے خیر خواہی کی بھی زیادہ توقع ہے۔ یہ دونوں منصف احوال کی تحقیق کریں گے اور جس کا جتنا زیادہ قصور دیکھیں گے اس کو سمجھا کر باہم موافقت کرا دیں گے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اگر میاں وہ ساری تدبیریں اختیار کرے جو اوپر والی آیت میں ذکر کی گئی ہیں اور کسی صورت میں کوئی تدبیر کامیاب نہ ہو تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ معاملہ طول پکڑ گیا ہے اور قابو سے باہر ہو گیا ہے لیکن یہاں پہنچنے کے بعد بھی قرآن نے یہ اجازت نہیں دی ہے کہ شوہر کو چاہیے کہ بیوی کو طلاق دے دے۔ قرآن میاں بیوی کے رشتے کو معاشرے کے استحکام کی بنیاد قرار دیتا ہے۔ اس کے ٹوٹنے کو صرف اس وقت ہی گوارا کرتا ہے۔ جب اصلاح کی ساری تدابیر اختیار کرنے کے بعد یہ ثابت ہو جائے کہ اب دونوں میں جمعیت اور اجتماعیت ممکن نہیں ہے۔ چنانچہ اس آیت میں شوہر کی ساری تدابیر کے ناکام ہونے کے بعد اصلاحِ احوال کے لیے ایک اور تدبیر بتاتی ہے۔ اس تدبیر کے مخاطب کون ہیں؟ میاں بیوی کے رشتہ دار، خود میاں بیوی ... یا مسلمانوں کی رائے عامہ، تینوں رائیں ہیں جمہور کی رائے ہیں حکام کچھ کے خیال میں عام مسلمان، کچھ کہتے ہیں کہ میاں بیوی اور کچھ کہتے ہیں کہ ان کے رشتہ دار، ہمارے خیال میں یہ ہدایت مسلمانوں کی رائے عامہ کو دی گئی ہے اور اس کے مدلول میں حکمران اور میاں بیوی کے رشتہ دار بھی داخل ہیں۔

ابوبکر الجصاص کی رائے میں اصل مخاطب حکام ہیں اور قرطبی نے جمہور کا یہی خیال نقل کیا ہے۔ ابوبکر کہتے ہیں کہ معاملہ چونکہ میاں بیوی کے قابو سے نزاع کے طویل ہونے کی وجہ سے باہر ہو کر عدالت میں پہنچ گیا ہے اس لیے مخاطب حکام ہیں۔ دراصل آیتِ قرآن میں یہ بات کھولی نہیں گئی ہے۔ اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ اگر زوجین خود چاہیں تو اپنے اپنے رشتہ داروں میں سے خود ہی ایک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک آدمی کو اپنے اختلاف کا فیصلہ کرنے کے لیے منتخب کرلیں ورنہ دونوں خاندانوں کے بڑے بوڑھے مداخلت کرکے پنچ مقرر کردیں اور اگر معاملہ عدالت میں پہنچ جائے تو عدالت خود کوئی کارروائی کرنے سے پہلے خاندانی پنچ مقرر کرکے اصلاح کی کوشش کرے۔

تدبیر یہ بتائی گئی ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور اپنے اثر و رسوخ کو کام میں لائیں اور بگڑی ہوئی صورت حال کو درست کریں اور اس کی عملی صورت یہ تجویز فرمائی ہے کہ ایک پنچ میاں کے رشتہ داروں میں سے لیا جائے اور دوسرا بیوی کے اقارب میں سے۔ یہ دونوں اصلاح کی کوشش کریں۔ قرآن نے ان کے لیے لفظ حکم بول کر اشارہ کردیا کہ اس کام کے لیے کہ ہر کو نہ لیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ ان کو منتخب کیا جائے جن میں فیصلہ کرنے کی صلاحیت ہو اور ظاہر ہے کہ فیصلہ کی صلاحیت کے لیے ان کا علم والا ہونا، دیانتدار اور عادل ہونا اور معاشرے میں ذی وجاہت ہونا ضروری ہے۔ بہرحال اگر میاں بیوی کے درمیان شقاق ایسی کشمکش پیدا ہوجائے جسے وہ باہم سلجھا نہ سکیں۔ اُمت اور افرادِ اُمت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ افراد کے باہمی اور خانگی مناقشوں سے معاشرہ اسلامی کا دامن بالکل الگ اور بے تعلق نہیں ہوتا کیونکہ افراد ہی کی صلاحیت پر اُمت کی صالحیت کا مدار ہے۔ اس آیت میں اس کی تعلیم ہے کہ افراد کے خانگی نزاعوں کو اُمت اپنا ہی معاملہ سمجھے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر زوجین کے مابین تمہیں باہمی کشمکش کا علم ہوجائے تو تمہیں دو حکم مقرر کرنے چاہئیں ایک مرد کے خاندان میں سے ہو دوسرا بیوی کے رشتہ داروں میں سے ہو۔

حاکمین کے فرائض و اختیارات

ف۷ ۔ اگر وہ دونوں اصلاح کے خواہاں ہوں گے تو اللہ دونوں کے مابین موافقت کا سامان کردے گا اللہ سب کچھ جاننے والا اور خبردار ہے یعنی اگر دونوں منصف اصلاح بین الزوجین کا قصد کریں گے تو اللہ تعالیٰ ان کے حسن نیت اور حسن سعی سے زوجین میں موافقت کرادے گا بے شک اللہ تعالیٰ کو تمام چیزوں کا علم اور اطلاع ہے۔ رفع نزاع اور حصول اتفاق کے اسباب اور کیفیات اس کو خوب معلوم ہیں اس لیے نزاع زوجین کے رفع ہونے میں کوئی دشواری نہ ہوگی۔[۱]

اس امر میں اختلاف ہے کہ ثالثوں کے اختیارات کیا ہیں۔ فقہا میں ایک گروہ کہتا ہے کہ یہ ثالث فیصلہ کرنے کا اختیار نہیں رکھتے البتہ تصفیہ کی جو صورت ان کے نزدیک مناسب ہو اس کے لیے سفارش

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کر سکتے ہیں ماننا یا نہ ماننا زوجین کے اختیار میں ہے۔ ہاں اگر زوجین نے ان کو طلاق یا خلع یا کسی امر کا فیصلہ کر دینے کے لیے اپنا وکیل بنایا ہو تو البتہ ان کا فیصلہ تسلیم کرنا زوجین کے لیے واجب ہوگا۔ یہ حنفی اور شافعی علماء کا مسلک ہے۔ دوسرے گروہ کے نزدیک دونوں پنچوں کو موافقت کا فیصلہ کرنے کا اختیار ہے مگر علیٰحدگی کا وہ فیصلہ نہیں کر سکتے۔ یہ حسن بصری، قتادہ اور بعض دوسرے فقہا کا قول ہے۔ ایک اور گروہ اس بات کا قائل ہے کہ ان پنچوں کو ملانے اور جدا کر دینے کے پورے اختیارات ہیں۔ ابن عباس، سعید بن جبیر، ابراہیم نخعی، شعبی، محمد بن سیرین اور بعض دوسرے حضرات نے یہی رائے قائم کی ہے۔

حضرت علی اور حضرت عثمان کے فیصلوں کی جو نظیریں ہم تک پہنچی ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ دونوں حضرات پنچ مقرر کرتے ہوئے ان کو عدالت کی جانب سے حاکمانہ اختیارات بھی دے دیتے تھے۔ چنانچہ حضرت عقیل بن ابی طالب اور ان کی بیوی فاطمہ بنت عتبہ بن ربیعہ کا مقدمہ جب حضرت عثمان کی عدالت میں پیش ہوا تو انہوں نے شوہر کے خاندان میں سے حضرت ابن عباس کو اور بیوی کے خاندان میں سے حضرت معاویہ ابن ابی سفیان کو سرپنچ مقرر کر دیا اور ان سے کہا کہ اگر آپ دونوں کی رائے میں ان کے درمیان تفریق کر دینا ہی مناسب ہو تو تفریق کر دیں۔ اسی طرح ایک مقدمہ میں حضرت علی نے حکم مقرر کیے اور ان کو اختیار دیا کہ چاہیں ملا دیں اور چاہیں جدا کر دیں[1]

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ابن بطال کے حوالہ سے اس موضوع پر علماء کے مابین اتفاق و اختلاف کی یہ تفصیل پیش کی ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں خطاب مسلمان حکمران طبقہ سے ہے اور اس پر بھی علماء کا اتفاق ہے ان ارادا اصلاحاً سے حکمین مراد ہیں۔ اور اس پر بھی علماء متفق ہیں کہ حکمین میں سے ایک شوہر کے اقارب میں سے ہو اور دوسرا بیوی کے رشتہ داروں میں سے ہو اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ حکمین کا کوئی فیصلہ بصورتِ اختلاف نافذ نہ ہوگا۔ اور اگر دونوں متفقہ طور پر دونوں میں ملاپ کرا دیں تو یہ فیصلہ بالاتفاق نافذ ہے لیکن اگر دونوں بالاتفاق بجائے ملاپ کے میاں بیوی کے درمیان جدائی کا فیصلہ کریں تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام مالک، امام اوزاعی اور امام اسحاق فرماتے ہیں کہ حکمین کا یہ فیصلہ نافذ ہو جائے گا اور اہل کوفہ امام شافعی اور امام احمد کہتے ہیں کہ حکمین کا یہ فیصلہ بغیر اجازتِ زوجین نافذ نہ ہوگا۔ اور ان بزرگوں کا یہ اختلاف دراصل حکمین کی حیثیت میں اختلاف کی وجہ سے ہوا ہے۔ امام مالک اور ان کے ہمنواؤں کا خیال یہ ہے کہ حکمین کی حیثیت حاکم کی ہے اور امام ابوحنیفہ اور

---

[1] تفہیم القرآن

دوسرے اہل کوفہ۔ امام احمد اور شافعی کی رائے میں حکمین کی حیثیت حاکم کی نہیں بلکہ وکیل کی ہے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اگر حکمین نے جدائی کا فیصلہ کر دیا تو حاکم ہونے کی وجہ سے بغیر اجازت زوجین فیصلہ نافذ ہو جائے گا اور وکیل ہونے کی وجہ سے زوجین کی اجازت کے بغیر نافذ نہ ہوگا۔

زیر تشریح آیت کے اس فقرے میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ میاں اور بیوی کے درمیان شقاق رونما ہو جائے۔ اس میں حکمین کا کام یہ ہے کہ میاں بیوی میں صلح کرائیں۔ اس سے زیادہ کوئی کام حکمین کے روانہ کرنے کی غرض نہیں ہے۔ یہ دوسری بات ہے کہ خود فریقین اپنی رضامندی سے ان دونوں حکموں کو اپنا وکیل، مختار یا ثالث بنا دیں اور ان سے یہ کہہ دیں کہ تم دونوں مل کر جو فیصلہ بھی ہمارے حق میں دو گے ہمیں منظور ہوگا۔ اس صورت میں یہ دونوں حکم پورے طور پر پیش پا افتادہ معاملہ کو نمٹانے میں مختار ہوں گے۔ اگر دونوں طلاق پر متفق ہو جائیں تو طلاق ہو جائے گی۔ دونوں مل کر خلع وغیرہ کی صورت تجویز کر دیں تو وہ بھی نافذ ہو جائے گی۔ یہ امام ابوحنیفہ اور حسن بصری کا مذہب ہے۔

باہمی نزاع ختم کرنے کا طریق

قرآن حکیم کی اس تعلیم سے لوگوں کے باہمی جھگڑے اور مقدمات کا فیصلہ کرنے کے متعلق ایک نئے باب کا نہایت مفید اضافہ ہوا۔ گویا عدالت میں جانے کے بجائے بہت سے مقدمات کا فیصلہ برادریوں کی پنچائت کے ذریعے کیا جا سکتا ہے۔ فقہا نے تصریح کی ہے کہ باہم صلح کرانے کے لیے تحکیم کی تجویز صرف ازدواجی زندگی تک محدود نہیں بلکہ دوسرے نزاعات میں بھی اس سے کام لیا جا سکتا ہے۔ بالخصوص جبکہ جھگڑا اقربا میں ہو۔ کیونکہ عدالتی فیصلہ سے وقتی طور پر جھگڑا تو ختم ہو جاتا ہے مگر دلوں میں عداوت اور کدورت کے جراثیم پیدا ہو جاتے ہیں۔ فاروق اعظم نے ملک کی مختلف عدالتوں کے نام لکھا تھا کہ:

> رشتہ داروں کے مقدمات انہی میں واپس کر دو تاکہ وہ خود برادری کی امداد سے آپس میں صلح کی صورت نکال سکیں کیونکہ عدالتی فیصلہ دلوں میں کینہ اور عداوت کے نشو و نما پانے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

فقہاء احناف میں سے قاضی قدس علاؤ الدین طرابلسی نے اپنی کتاب معین الحکام میں اور ابن شحنہ نے لسان الحکام میں اس فرمانِ فاروقی کو ایسے پنچایتی فیصلوں کی خاص بنیاد قرار دیا ہے جن کے ذریعے فریقین کی رضامندی سے صلح کی کوئی صورت نکالی جائے اور ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ فاروقی فرمان میں یہ حکم رشتہ داروں کے باہمی جھگڑوں سے متعلق ہے مگر اس کی جو علت و حکمت اس فرمان

میں مذکور ہے کہ عدالتی فیصلے دلوں میں کدورت پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ حکمت رشتہ دار اور غیر رشتہ دار میں عام ہے کیونکہ باہمی عداوت سے سب ہی مسلمانوں کو بچانا ضروری ہے۔[1]

---

[1] معارف قرآن م سش

وَاعْبُدُوا اللّٰهَ وَلَا تُشْرِكُوْا بِهٖ شَيْـًٔا وَّبِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا

وَّبِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْجَارِ ذِي الْقُرْبٰى

وَالْجَارِ الْجُنُبِ وَالصَّاحِبِ بِالْجَنْۢبِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۙ وَمَا

مَلَكَتْ اَيْمَانُكُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ مَنْ كَانَ مُخْتَالًا

فَخُوْرَا ۝ الَّذِيْنَ يَبْخَلُوْنَ وَيَاْمُرُوْنَ النَّاسَ بِالْبُخْلِ

وَيَكْتُمُوْنَ مَآ اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ ۭ وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ

عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝ وَالَّذِيْنَ يُنْفِقُوْنَ اَمْوَالَهُمْ رِئَاۗءَ

النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ۭ وَمَنْ

يَّكُنِ الشَّيْطٰنُ لَهٗ قَرِيْنًا فَسَاۗءَ قَرِيْنًا ۝ وَمَاذَا عَلَيْهِمْ

لَوْ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَنْفَقُوْا مِمَّا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ ۭ

وَكَانَ اللّٰهُ بِهِمْ عَلِيْمًا ۝

"اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ بالکل شریک نہ بناؤ۔"

اور والدین کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں کے ساتھ، غریبوں کے ساتھ اور پڑوسیوں کے ساتھ خواہ اہل قرابت ہوں یا اجنبی، نیز پاس بیٹھنے والوں کے ساتھ، مسافروں اور غلاموں کے ساتھ سلوک میں حسن کار بن کر رہو۔ اللہ ان لوگوں سے محبت نہیں کرتا ہے جو اکڑفوں اور گھمنڈی ہوں۔ جو بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کا حکم دیتے ہوں اور خدا کے دیے ہوئے فضل کو چھپاتے ہوں اور ہم نے کافروں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے اور اللہ سبحانہ ان لوگوں کو بھی دوست نہیں رکھتا جو صرف لوگوں کے دکھاوے کی خاطر مال خرچ کرتے ہیں اور اللہ پر آخرت والے دن پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ اور جس شخص کو شیطان کی رفاقت مل جاتی ہے تو یہ بہت بری رفاقت ہے۔ ان لوگوں کا کیا نقصان ہو جاتا اگر وہ اللہ اور آخرت والے دن پر ایمان لے آتے اور اللہ کی دی ہوئی نعمت کو خرچ کرتے اور اللہ ان کی حالت کی پوری خبر رکھتا ہے۔

حقوق وفرائض

اگر یہ بات ٹھیک ہے کہ اس وقت رات نہیں ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس وقت لازماً دن ہے اس لیے جب عائلی زندگی اور معاشی زندگی پر تبصرے سے یہ بات ثابت ہو گئی کہ اسلام نہ تو رہبانیت کو صحیح سمجھتا ہے نہ اس کا دائرہ انفرادی زندگی تک محدود ہے تو اس کی نوعیت آپ سے آپ مقرر ہو گئی یعنی یہ کہ انسانیت کا کوئی مسئلہ نہیں جو اسلام کے دائرے سے باہر ہو وہ ایک ایسا دین ہے جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور جو قدم بھی اٹھاتا ہے اس کی ہدایت کو سامنے موجود پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح اپنے اندر سمیٹے ہوئے روحانی نظام، اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام، قانونی نظام، غرض اسلام زندگی کا ایک ایسا مکمل نظام ہے جس کے سارے اجزاء اپنی اپنی جگہ اہمیت رکھتے ہیں یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ وہ ایک ہی کوزے میں سارے اجزاء کو پیش کرتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ابھی عائلی نظام کا تعارف ہو رہا تھا کہ فوراً رخ معاشی نظام کی طرح ہو گیا۔ اور معاشی نظام پر گفتگو نے رخ ایک دم معاشرتی نظام کی طرف کر لیا۔ درمیان میں اعبدوا اللہ فرما کر اخلاقی نظام کی طرف متوجہ کر دیا کہ ماں باپ کے ساتھ اچھا سلوک کرو۔ قرابت داروں کے حقوق سے غافل نہ ہو۔ یتیموں، مسکینوں، مسافروں اور پڑوسیوں کی خبر گیری کرتے رہو۔ پڑوسی خواہ قرابت دار ہو یا اجنبی ہر حال میں اچھے سلوک کا مستحق ہے۔ جو لوگ تمہارے پاس اٹھنے بیٹھنے والے ہیں لونڈی غلام جو تمہارے قبضے میں ہیں ان سب کے تمہارے ذمہ حقوق ہیں۔ ضروری ہے کہ سب کے ساتھ محبت وسلوک کرو، بخل نہ کرو خدا نے جو کچھ دیا ہے اس کے بندوں کی خدمت میں لگاؤ۔ خرچ میں ریا ونمائش سے دامن بچا کر رکھو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان میں کچھ اخلاقی فضائل ہیں اور کچھ رذائل فضائل بھی کچھ حقوق ہیں اور کچھ آداب۔

قرآن کی پہلی تعلیم یہ ہے کہ ہر انسان پر مخلوق ہونے کی حیثیت سے اپنے خالق کے کچھ حقوق وفرائض اور کچھ دوسرے انسانوں بلکہ حیوانوں اور بے جان چیزوں کے کچھ حقوق عائد ہیں اور یہ ان کے حقوق ہیں جنہیں ہر انسان کو امکان بھر ادا کرنا ضروری ہے یہ حقوق وفرائض قرآنی اخلاق کی پہلی قسم ہیں۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے اسلامی اخلاق کا چہرہ پیش کیا ہے۔

عبادت اللہ کا حق اور بندے کا فرض ہے

اے - اور اللہ کی بندگی کرو اور اس کے ساتھ بالکل شریک نہ بناؤ۔ یعنی عبادت اور نیک عمل خدا پر یقین کرکے اور ثواب آخرت کی توقع سے کرو۔ نمود وریائے مال دینا بھی شرک ہے گو کم درجہ کا ہے لے

یہاں حقوق و فرائض کے بیان میں سب سے پہلے اللہ کا حق پیش کیا ہے۔ صحیحین کی ایک حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اللہ کا حق بتایا ہے۔ ارشاد ہے ،

اے معاذ! جانتے ہو کہ اللہ کا حق بندوں پر کیا ہے اور بندوں کا حق اللہ پر کیا ہے؟ میں نے عرض کیا کہ اللہ اور اس کے رسول کو زیادہ علم ہے فرمایا کہ اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ صرف اسی کی عبادت کریں اور شرک نہ کریں ۔

اور مسند احمد میں حضرت ابو ہریرہ کے حوالے سے یہی ارشاد ان ہی الفاظ میں نقل ہوا ہے۔ اس ارشاد میں صاف بتایا ہے کہ اللہ کا بندے پر حق یہ ہے کہ اس کی عبادت کریں اور اس کی عبادت میں کسی کو ساتھی یا ساجھی نہ بنائیں اور قرآن نے اسی عبادت کو انسان کی تخلیق کا بنیادی اور اہم مقصد قرار دیا ہے۔ چونکہ خالق کا حق طبعاً مقدم ہے اس لیے یہاں وضعاً بھی تمام حقوق و فرائض سے پہلے اس کا ذکر کیا گیا ہے۔ یہ عبادت جس کا قرآن حکم دے رہا ہے اور جسے مقصدِ تخلیق بنایا گیا ہے کیا چیز ہے اور اس کا ٹھیک ٹھیک مفہوم و مدعا کیا ہے جب تک یہ واضح نہ ہو جائے قرآن کا یہ مطالبہ مجمل رہے گا کہ اللہ کی عبادت کرو۔

عبادت کی معنوی توضیح

اہل لغت اور علمائے شریعت نے عبادت کے معنے اس طرح بیان کیے ہیں۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ عبادت انتہائی تذلل کا نام ہے۔ صاحبِ لسان العرب نے مشہور امام لغت زجاج سے نقل کیا ہے کہ عبادت وہ طاعت ہے جس میں خضوع ہو۔ امام نووی نے بھی عبادت کے معنے جذبہ خضوع رکھنے والی طاعت کے بتاتے ہیں۔ اور حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ عبادت دو بنیادی اور اہم چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے ایک انتہائی محبت دوسرے نہایت عجز و تذلل، اہل عرب روندے ہوئے پامال راستہ کو طریقِ معبد کہتے ہیں اور تعبد بھی یعنے تذلل آتا ہے۔ محبت ہو تذلل نہ ہو یا تذلل ہو محبت نہ ہو عبادت

لے افاداتِ شیخ الاسلام

نہیں۔ عبادت دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

ان بیانوں اور لغوی تشریحات میں بظاہر کچھ اختلاف ہے مگر فی الواقع یہ اختلاف نہیں بلکہ ایک جامع حقیقت کے مختلف اہم پہلوؤں کی وضاحت ہے۔

اہل لغت کے بیانات اور قرآن کے استعمالات سے جو بات حقیقت بن کر نمودار ہوتی ہے کہ عبادت اللہ کے حضور باطناً ہر حیثیت سے پوری طرح جھک جانے کا نام ہے کیونکہ قرآن نے دونوں ہی قسم کے جھکاؤ کو عبادت سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ایک ناقابل انکار حقیقت ہے کہ باطن کے جھکاؤ کی حیثیت فعل عبادت میں رُوح کی ہے جبکہ ظاہر کے جھکاؤ کی حیثیت محض قالب کی ہے لیکن اسی کے ساتھ یہ بات بھی ناقابل انکار ہے کہ رُوح اور قالب کی یہ تفریق قطعاً ایک فکری اور نظری تفریق ہے۔ اس دوئی کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ ازروئے واقعہ بھی ان دونوں چیزوں کو الگ کیا جا سکتا ہے ٹھیک اسی طرح جیسے انسان کے جسم اور اس کی روح کے درمیان تفریق صرف جسم یا صرف روح کو انسان نہیں کہا جا سکتا اس لیے باطن کے جھکاؤ کی تمام تر اہمیتوں کے باوجود صرف اسی کو قرآن کی مطلوبہ عبادت قرار دینا سخت ناقہمی ہے۔ عبادت تو ظاہر کے جھکاؤ اور باطن کے جھکاؤ دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔

اس مسئلے پر ایک اور پہلو سے غور کیجئے۔ عبادت کے قالب کے مقابلے میں اس کی رُوح کی اہمیت جتنی زیادہ مسلم ہے اسی قدر یہ بات بھی مسلم ہے کہ رُوح ایک پوشیدہ چیز ہے۔ اس کے برعکس عبادت کا قالب سب کے سامنے موجود ہے بلکہ یہ قالب ہی اپنی رُوح کے وجود کا ثبوت بھی ہے اور اسی کو دیکھ کر اس کا جھکاؤ کا حال معلوم کیا جا سکتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں عبادت کا قالب اس کا صرف قالب ہی نہیں ہے بلکہ اس کی رُوح کا لازمی مظہر ہی ہے۔ انسان کا ظاہر اگر خدا اور اس کے احکام کے سامنے جھکا ہوا ہے تو بھی اس بات کی شہادت ہے کہ اس کا باطن بھی اپنے آپ کے حضور سجدہ ریز ہے اس لیے کہنا چاہیے کہ ظاہر کا جھکاؤ اگر صحیح معنوں میں موجود ہے تو گویا سب کچھ موجود ہے۔ چنانچہ آپ سُن چکے ہیں کہ بعض عُلماء نے عبادت کے معنے صرف طاعت کے کیے ہیں۔ جو ظاہری جھکاؤ ہی کی ایک واقعاتی تعبیر ہے۔ اس سے کم ازکم اتنا تو واضح ہو رہا ہے کہ ان علماء کے نزدیک احکام الٰہی کی طاعت اور ظاہر کے جھکاؤ کے بغیر عبادت ایک لفظ بے معنے سے زیادہ نہیں۔ اسی طرح جن ارباب علم نے عبادت کے معنے صرف اطاعت نہیں بلکہ طاعت مع الخضوع بتائے ہیں۔ ان کے خیال کے مطابق بھی طاعت یعنی ظاہر کا جھکاؤ عبادت کے مفہوم کا جزو لازم ہے۔ اس طرح جس تعبیر کو بھی لیجئے عبادت کے مفہوم سے ظاہر کا جھکاؤ علیحدہ نہیں ہے۔

قرآن کی مطلوبہ عبادت

بہرحال اللہ تعالیٰ نے اپنی جس عبادت کو انسان کا مقصدِ وجود قرار دیا ہے اور جس کی تلقین و ہدایت کے لیے اس کے رسول آتے رہے ہیں وہ صرف باطن کے جھکاؤ یا چند رسُوم کی ادائیگی کا نام نہیں ہے۔ یہی عقلِ صریح کا تقاضا ہے اور یہی قرآن کا ناطق فیصلہ۔ عقل کا تقاضا اس لیے ہے کہ جو خدا انسان کا خالق اور مالک، رازق اور محسن، حاکم اور معبود سبھی کچھ ہے، اسے سبھی طرح کی عبادتوں کا حقدار بھی ہونا چاہیے۔ قرآنی فیصلہ اس لیے ہے کہ قرآن کی آیتیں اپنے پیروؤں سے اللہ سبحانہٗ کی پرستش اور بندگی دونوں کا یکساں طور پر مطالبہ کر رہی ہیں۔ وہ جہاں یہ کہتی ہیں کہ اللہ ہی کو سجدہ کرو۔ اسی کے نام کی پاکی بیان کرو، اسی سے دعائیں مانگو، اسی کی بڑائی کا اعلان کرو، اسی کو مدد کے لیے پکارو۔ اور اسی کے حضور اعترافِ نعمت کرو۔ وہیں یہ بھی کہتی ہیں اور بار بار کہتی ہیں کہ اللہ ہی کو بلا قید و شرط اطاعت کا مستحق اور حقیقی فرماں روا مانو، اسی کو مستقل بالذات قانون ساز تسلیم کرو۔ اسی کے احکام کی اطاعت کرو، اسی کے قوانین کے مطابق فیصلے کرو، اسی کے ضابطوں کو زندگی کے ضابطے بناؤ، اور اسی کے حلال کو حلال اور اسی کے حرام کو حرام سمجھو۔ اس لیے اس عبادت کا مفہوم جسے انسان کی پیدائش کا مدعا و مقصد قرار دیا گیا ہے جو ہر نبی کی دعوت کا سرعنوان تھی اور جس کا قرآن نے ہمیں حکم دیا ہے لازماً وہ ہی جامع اور کامل مفہوم ہوگا جس میں پرستش اور بندگی دونوں شامل ہیں، پرستش اس کے محبوبِ مطلق ہونے اور بندگی اس کے حاکمِ مطلق ہونے کی وجہ سے کی جاتی ہے۔ اس طرح ان دونوں تعبیروں سے یہ حقیقت زیادہ روشن ہو جاتی ہے کہ اسلام میں عبادت، محبت اور تذلل دونوں کی جامع ہے۔ حافظ ابن القیم کے استاد حافظ ابن تیمیہ سے جب دریافت کیا گیا کہ اعبدوا اللہ میں جس عبادت کا حکم دیا گیا اس کا مدعا کیا ہے تو آپ نے اس مسئلہ پر ایک مفصل تقریر فرماتے ہوئے کہا ہے:۔

> عبادت ایک جامع لفظ ہے اس کے اندر وہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال اور اقوال داخل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور جو اس کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں، مثلاً نماز، روزہ، زکوٰۃ حج، راست گوئی، امانتداری، صلہ رحمی۔ دیانت، اطاعتِ والدین، وفائے عہد، امر بالمعروف نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ، پڑوسیوں، یتیموں، مسکینوں اور مملوکوں کے ساتھ اچھا سلوک، دعا، ذکرِ الٰہی، تلاوتِ قرآن اور اسی قسم کے تمام اعمالِ صالحہ عبادت کے اجزاء ہیں۔ اسی طرح اللہ کی اور اس کے رسُول کی محبت، رحمتِ خداوندی کی اُمید اور عذابِ الٰہی کا خوف خشیت، انابت، اخلاص، صبر و شکر، توکل اور تسلیم و رضا وغیرہ ساری اچھی صفات عبادت کے اندر شامل

ہیں۔ (العبودیۃ ص ۲)

آگے چل کر ایک جگہ پھر فرماتے ہیں،

ان نصوص سے جہاں ایک طرف یہ حقیقت روشنی میں آتی ہے کہ عبدیت کسی مخلوق کے شرف و مجد اور اس کی سعادت معراج کمال ہے وہاں دوسری طرف یہ امر بھی بے نقاب ہو جاتا ہے کہ دین اپنے تمام اجزا کے ساتھ عبادت میں داخل ہے سارے انبیاء اللہ کا دین سکھانے آئے تھے جیسا کہ قرآن میں کئی جگہ اس کی صراحت موجود ہے اور پھر ہر نبی نے اپنے مخاطب لوگوں کو فاعبدوہ کی ہدایت کی، اس سے معلوم ہوا کہ دین اور عبادت ایک ہی مدعا کی دو تعبیریں ہیں۔

یہ ساری تفصیلات اس بارے میں کوئی شبہ باقی نہیں رہنے دیتی ہیں کہ عبادت اللہ کا بنیادی حق اور بندے کا اولین فرض ہے۔

حق خدا کے بعد حقوق کی ترتیب

۲۔ اور والدین کے ساتھ، رشتہ داروں کے ساتھ، یتیموں کے ساتھ اور غریبوں کے ساتھ، پڑوسیوں کے ساتھ خواہ اہل قرابت ہوں یا اجنبی نیز پاس بیٹھنے والوں کے ساتھ، مسافروں اور غلاموں کے ساتھ سلوک میں حسن کاربن کر رہو۔ یتامیٰ، نساء اور ورثاء اور زوجین کے حقوق اور ان کے ساتھ حسن معاملہ کو بیان فرما کر اب یہ ارشاد ہے کہ ہر ایک کا حق درجہ بدرجہ تعلق کے موافق اور حاجت مندی کے مناسب ادا کرو سب سے مقدم اللہ تعالیٰ کا حق ہے پھر ماں باپ کا پھر درجہ بدرجہ سب واسطہ داروں اور حاجت مندوں کا اور ہمسایہ قرب اور غیر قرب سے مراد قرب و بُعد نسبی ہے یا قرب و بُعد مکانی۔ صورت اولیٰ میں یہ مطلب ہوگا کہ ہمسایہ قرابتی کا حق ہمسایہ اجنبی سے زیادہ ہوگا اور صورت ثانیہ کا مدعا یہ ہوگا کہ پاس کے ہمسایہ کا ہمسایہ بعید یعنی جو کہ فاصلہ سے رہتا ہے اس سے زیادہ ہے اور پاس بیٹھنے والے میں رفیق سفر اور پیشہ کے اور کام کے شریک اور ایک آقا کے دو نوکر اور ایک استاد کے دو شاگرد اور دوست و شاگرد اور مرید وغیرہ سب داخل ہیں۔ اور مسافر میں مہمان غیر مہمان دونوں آگئے اور مال مملوک لونڈی غلام کے علاوہ دیگر حیوانات کو بھی شامل ہے۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے سب سے پہلے اپنا حق ادا کرنے کا حکم دیا ہے اس کے بعد مخلوق کے حقوق کو بیان کیا ہے اور ان میں ایک خاص ترتیب کو ملحوظ رکھا ہے۔ اور اس ترتیب کے ضمن میں انسانی تعلقات کی تدریجی ترتیب کی بحث آجاتی ہے جسے قرآن نے ہمیشہ پیش نظر رکھا ہے اور ان فرائض کو ہر انسان کے تعلقات کی کمی بیشی اور دُوری و نزدیکی کی تدریج اور ترتیب کے ساتھ متعین اور ہر ایک کا درجہ اور مرتبہ الگ الگ مقرر کر دیا ہے۔ مثلاً ایک حیوان کے مقابلے میں ایک انسان کی مدد، ایک اجنبی شخص کے مقابلے میں ایک دوست کی غیروں اور بیگانوں کے مقابلے میں ایک عزیز کی اور ان عزیزوں میں بھی قرابت کی دُوری و نزدیکی کی ترتیب اسی طرح رکھی گئی ہے مگر یہ ترتیبی امداد حق کے ساتھ ہے۔ اگر کوئی عزیز سے عزیز بھی باطل پر ہو تو اس کے مقابلہ میں اس غیر و بیگانہ کی امداد جو حق پر ہے۔ فرض ہے کہ جو مدد محض قرابت اور عزیزداری کی بنا پر باطل پر کی جاتی ہے اس کا نام قرآن کی اصطلاحی زبان میں حمیۃ الجاھلیۃ جس سے بچنے کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی ہے۔

قرآن کے سوا کہیں انسانی حقوق کی درجہ وار کوئی تفصیل نہیں ہے۔ انسان اور حیوان کے درمیان بھی خط فاصل نہیں ہے۔

اس ترتیب کا فلسفہ یہ ہے کہ ترتیب میں جس کا درجہ بڑھ کر ہے اس کے ساتھ تعلقات کی وابستگی دوہری تہری ہوتی ہے۔ مثلاً ایک شخص جو ایک وقت میں ایک ہی کی مدد کر سکتا ہے اس کی ایک غریب ماں بیمار ہے۔ ایک غریب اور بیمار باپ ہے ایک غریب اور بیمار بھائی ہے۔ ایک اسی طرح کا اس کا پڑوسی ہے۔ پھر اسی حالت میں اس کا ایک ہم محلہ بھی ہے اور اسی حالت میں اس کا کوئی ہم وطن بھی ہے تو اس کو کس کی امداد کرنی چاہیئے یہی وہ موقع ہے جس میں تدریجی تعلقات کی ترتیب کا سوال پیش آجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ تعلقات کے دوہرے تہرے پہلے ماں کے ہیں پھر باپ کے ہیں، پھر بھائی کے ہیں پھر پڑوسی کے ہیں، پھر ہم وطن کے ہیں اور اسی ترتیب سے ان کا ادا کرنا بھی ضروری ہے یہ نیکی نہ ہو گی کہ اپنی غریب اور بیمار ماں کو چھوڑ کر کوئی اپنے غریب اور بیمار پڑوسی کی خدمت کے لیے آمادہ ہو جائے یہ ایثار نہیں بلکہ ظلم ہے۔ یا یہ ہو سکتا ہے کہ اپنے اوپر مزید زحمت گوارا کر کے دونوں کے حقوق سے عہدہ برآ ہو؛ اگر ایسا وہ کر سکے تو اخلاقاً اسے معذور سمجھا جائے گا۔ قرآن نے اسی فطری ترتیب کو ان آیتوں میں پیش کیا ہے۔

والدین کا حق

والدین یعنی ماں باپ کی عزت، خدمت اور اطاعت کو قرآن نے اللہ سبحانہ کے بعد انسانی رشتوں میں

سب سے بڑا بتایا ہے اور خدا کی طاعت کے ساتھ ان کے ساتھ نیکی کرنے، ان کی طاعت کرنے کی تاکید کی گئی ہے۔ نبوت نے اپنے ارشادات میں سب سے پہلے ماں اور باپ کی مشترکہ حیثیت کی بھی تفصیل کی اور بتایا کہ ماں اور باپ میں بھی سب سے بڑا درجہ ماں کا ہے، عورت کی فطری کمزوری، بیماری اور حمل وضع حمل اور تربیت اولاد کی تکلیفوں کو ہنسی خوشی برداشت کرنا، ماں کی بڑائی، اس کی سب سے پہلے دلداری کرنے اور اس کی فرماں برداری کرنے کی سب سے بڑی وجہ ہے۔

ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی بچہ کی تولید و تکوین میں شریک ہے وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں اس لیے جب بچہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی اس ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوتوں کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے چنانچہ قرآن نے ان کی خدمت ان کی اطاعت، ان کی امداد اور ان کی دلداری ہر چیز فرض قرار دی ہے بلکہ یہاں تک تاکید کی ہے کہ ان کی کسی بات پر اُف تک نہ کرو، ان کے سامنے ادب سے جھکے رہو۔ ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو انہی کی خدمت سب سے بڑا جہاد ہے بلکہ ان کی ہی خوشنودی سے خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآن پاک میں والدین کے ساتھ حسن سلوک نیکی اور خدمت کی ۱۲ مختلف آیتوں میں تاکید آئی ہے اور اکثر موقعوں پر یہ تعلیم توحید و عبادت کی تعلیم کے بعد آتی ہے کیونکہ اللہ کی ذات تخلیق انسانی کے لیے اگر علت فاعلی ہے تو ماں اور باپ اسی تخلیق کے لیے علت مادی ہیں۔

رشتہ داروں کے حقوق

قرآن میں والدین کے بعد ذی القربیٰ کے الفاظ ارشاد ہوئے ہیں۔ قرآن کے دوسرے مقامات سے یہاں اندازِ تعبیر ذرا مختلف ہے اور کسی جگہ والدین اور اقربا کے حقوق کے بیان میں یہ انداز نہیں اختیار کیا گیا یعنی ہر جگہ فللوالدین والاقربین آیا ہے لیکن یہاں بجائے یہ کہنے کے و بالوالدین احساناً و بذی القربیٰ فرمایا ہے۔ شارحین قرآن نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ قرآن اس معاملہ میں اُمت محمدیہ کو یہ حکم بنی اسرائیل کے مقابلے میں زیادہ مؤکد کر کے دے رہا ہے۔ حرف باکا تکرار تاکید کے لیے ہے لیکن سید رشید رضا نے یہاں اس سے زیادہ لطیف بات لکھی ہے وہ فرماتے ہیں کہ با کا تکرار تاکید کے لیے نہیں بلکہ تنویع ظاہر کرنے کے لیے ہے یعنی یہ بتانے کے لیے ہے کہ والدین کے ساتھ احسان کی نوعیت اور ہے اور اقربا کے ساتھ احسان کی نوعیت کچھ اور ہے جو ادب و احترام اور خدمت والدین کی کی جائے گی وہ

اقرباکی زندگی۔

پہلے بیوی، بچوں کے حقوق کا ذکر ہوچکا ہے اب یہاں والدین کے حقوق کے بعد اہلِ قرابت کے حقوق کا ذکر کیا جارہا ہے۔ اہلِ عرب کی زبان میں اس کا نام صلہ رحمی ہے۔ قرآن کی اخلاقی تعلیمات میں صلہ رحمی اور حقوقِ قرابت کی اہمیت دُنیا کے تمام مذاہب سے زیادہ ہے۔ قرآن کی کم ازکم بارہ آیات میں اس کی صریح تاکید ہے اور اس کو انسان کا احسان نہیں بلکہ اس کا فرض اور حق ہوتا ہے۔

حقِ قرابت کو اسلام میں وہ اہمیت حاصل ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی ان تمام محنتوں، زحمتوں، تکلیفوں اور مصیبتوں کا جو تبلیغ اور دعوت کی راہ میں آپ کو پیش آئیں اور اپنے اس احسان و کرم کا جو ہدایت تعلیم اور اصلاح کے ذریعے ہم پر فرمایا بدل و معاوضہ اور مزدوری اپنی اُمت سے یہ طلب فرماتے ہیں کہ رشتہ داروں کا حق ادا کرو اور ان سے لطف و محبت سے پیش آؤ۔

کسی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوق محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے۔ یہ اشتراک کہیں ہم عمری کہیں ہم درسی کہیں ہم سائگی، کہیں ہم مذاقی، کہیں ہم پیشگی، کہیں ہم وطنی، کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس اشتراک کے عقدِ محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائیگی واجب ہے۔ لیکن ان تمام اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن رحمِ مادر ہے۔ یہ ہم رحمی خالقِ فطرت کی باندھی ہوئی گرہ ہے جو متفرق انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دستِ قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسانوں پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔

یتیموں کے حقوق

یتیموں کے بارے میں ضروری باتیں بتائی جاچکی ہیں۔ یتیم وہ کمسن بچہ ہے جو باپ کے سایۂ محبت سے محروم ہوجائے۔ اُمتِ مسلمہ کے ہر رکن کا فرض ہے کہ اس کو اپنی آغوشِ محبت میں لے، اس کو پیار کرے، اس کی ہر طرح خدمت کرے۔ اس کی تعلیم و تربیت کی فکر کرے۔ عقل و شعور تک پہنچنے کے بعد ان کے باپ کی متروکہ جائداد واپس کردے۔

اگر یتیم مفلس و غریب ہوں تو ان کی مناسب پرورش اور امداد عام مسلمانوں کا فرض ہے۔ قرآن پاک نے صرف یہاں نہیں بقرہ، انفال اور حشر میں بار بار ان کی پرورش کی تاکید اور ان کے ساتھ نیک سلوک کرنے کی ہدایت کی ہے۔ بیت المال میں قرآن نے دوسرے ابوابِ خیر کے ساتھ یتیموں کی امداد کے لیے بھی ایک مد

رکھی۔ اسلامی حکومتوں نے مستقل یتیم خانے قائم کیے جن میں یتیموں کی پرورش کے ساتھ ان کی تعلیم و تربیت کا بھی پورا انتظام تھا۔ سب سے پہلے باقاعدہ یتیم خانہ ولید بن عبدالملک نے قائم کیا۔ اس کے بعد اس کا سلسلہ قائم رہا ہر اسلامی حکومت میں یتیم خانہ ضرور ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ ثروت اصحاب خیر اپنے ذاتی یتیم خانے بھی قائم کرتے تھے جن پر بڑی بڑی جائدادیں وقف کرتے تھے جن کا ذکر تاریخوں میں موجود ہے۔ اس طرح یتیم خانوں کی بنیاد درحقیقت مسلمانوں نے رکھی جس کی تقلید دوسری قوموں اور حکومتوں نے کی۔ مسلمانوں سے پہلے اس کی مثال نہیں ملتی۔

اس کے علاوہ قرآن نے عدالت کے فرائض میں لاوارث یتیم کی سرپرستی اور ان کی جائداد کی حفاظت اور نگرانی رکھی جس کی روشنی میں فقہاء نے باقاعدہ قوانین وضوابط بنائے۔

ناداروں اور حاجت مندوں کے حقوق

اصل ارشاد میں مساکین آیا ہے۔ یہ مسکین کی جمع ہے۔ یہ سکون سے بنا ہے۔ مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی جس کی معاشی حالت انتہائی سکون کی حالت میں ہو۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں:

المسکین کا لفظ سکون سے بنا ہے گویا یوں سمجھنا چاہیے کہ عجز و بے چارگی نے اسے بے حس و حرکت کر دیا ہے۔

حصول معاش کی قوتیں اور ذرائع بالکل ساکن یا مفقود نہ ہوں لیکن اتفاقی حالات کے شکار ہو کر معاشی ذرائع سے وہ محروم ہو گئے ہوں مثلاً ناگہانی طور پر کسی بیماری کا حملہ ہوا ہو اور علاج معالجہ میں سارا سرمایہ ختم ہو گیا ہو یا کاروبار میں نقصان ہو کر کنگال ہو گیا یا اسی قسم کے دوسرے حوادث کا شکار ہو گئے ہوں۔ جیسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں مہاجرین کا حال تھا کہ ان کو حالات نے گھر بار اور جائداد چھوڑنے پر مجبور کر دیا تھا اور انہوں نے مدینے آکر پناہ لی تھی۔ حوادث روزگار میں ان ہی مبتلا ہونے ناداروں کو الفقراء کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن میں مہاجرین کی صفت الفقراء آتی ہے۔ ان دونوں یعنی مسکین اور فقیر میں فرق پر انشاء اللہ تفصیلی تبصرہ دسویں پارے میں آئے گا۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر ملک، ہر سوسائٹی میں کچھ لوگ ایسے چکر دں میں آجاتے ہیں کہ باوجود عدم معذوری کے کچھ کرنا بھی چاہیں تو کرنے کی ساری راہیں اپنے اوپر مسدود پاتے ہیں۔ ہم کہہ سکتے ہیں کہ موجودہ زمانے میں بیروزگار تعلیم یافتہ طبقہ کی نوعیت بھی شاید اسی کے قریب قریب ہے۔ دوسروں کو حیرت ہوتی ہے کہ ہٹے کٹے ہوتے ہوئے یہ لکھے پڑھوں کا گروہ معاشی پریشانیوں میں آخر مبتلا کیوں ہے کہ جاہلوں سے

زیادہ روٹی کا مسئلہ ان کے لیے پیچیدہ بنا ہوا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ بظاہر حالات کسی کے کتنے ہی اچھے کیوں نہ ہوں لیکن اس کے واقعی حالات کا صحیح معیار نہیں ہو سکتے۔ اکبر کا شعر اس موقعہ پر یاد آتا ہے ؎

یہ دنیا رنج وراحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے کسی پر کیا گزرتی ہے

پڑوسیوں کے حقوق اور ذمہ داریاں

اصل ارشاد میں والجار ذی القربیٰ والجار الجنب کے الفاظ آتے ہیں یعنی ہمسایہ قریب اور ہمسایہ بیگانہ۔ ان کی مراد میں شارحین قرآن کا اختلاف کیا ہے۔ ایک قریب کے معنے رشتہ دار و عزیز اور بیگانہ کے معنے غیر اور اجنبی کے ہیں۔ دوسری رائے یہ ہے کہ نزدیک کے معنے ہم مذہب کے ہیں اور دور سے مراد دوسرے مذہب والے ہیں جیسے یہودی، عیسائی، مشرک، لیکن فی الواقع یہ حقیقت بے معنے ہے۔ قرآنی تعلیم کا منشا یہ ہے کہ پڑوسیوں اور ہمسایوں میں ان کو ترجیح دی جائے گی جن کے ساتھ اس پڑوس اور ہمسائیگی کے علاوہ محبت اور رابطہ کا کوئی دوسرا تعلق بھی موجود ہو وہ خواہ قرابت یا عزیزداری کا ہو یا ہم مذہبی یا اور کسی قسم کی رفاقت کا ہو۔ بہر حال حق کے ساتھ دوہرے تعلقات کو اکہرے تعلق پر ترجیح ہے۔

اس حکم الٰہی کی تفسیر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف طریقوں سے فرمائی ہے۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ آپ نے اس کو ایمان کا براہ راست اثر اور نتیجہ فرمایا۔ ایک روز آپ مجمع صحابہ میں تشریف فرما تھے کہ ایک خاص و لقشیں انداز میں فرمایا خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، خدا کی قسم وہ مومن نہ ہوگا، جاں نثاروں نے پوچھا کون یا رسول اللہ فرمایا وہ جس کا پڑوسی اس کی شرارتوں سے محفوظ نہیں ہے [1]

ایک اور موقع پر آپ نے فرمایا جو خدا اور روزِ جزا پر ایمان رکھتا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے پڑوسی کی عزت کرے۔ ایک اور حدیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جو شخص خدا اور روز جزا پر ایمان رکھتا ہے وہ اپنے پڑوسی کو تکلیف نہ دے [2]

پڑوسیوں میں محبت کی ترقی اور تعلیمات کی استواری کا بہترین ذریعہ باہم ہدیوں اور تحفوں کا تبادلہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی بیویوں کو اس کی تاکید فرماتے تھے۔ اسی بنا پر ایک بار حضرت عائشہ نے پوچھا یا رسول اللہ میرے دو پڑوسی ہیں تو میں ان میں سے ہدیہ کس کے پاس بھیجوں۔ فرمایا

---

[1] [2] صحیح بخاری کتاب الادب

جس کے گھر کا دروازہ تمہارے گھر سے زیادہ قریب ہو[1]

اس ہدیہ اور تحفہ کے لیے کسی بیش قیمت چیز کی ضرورت نہیں بلکہ کھانے پینے کی معمولی چیزیں بھی اس کے لیے کافی ہیں، کچھ نہ ہو سکے تو گوشت کا شوربہ ہی ہو۔ آپ نے ایک توکل پیشہ صحابی ابوذر کو نصیحت فرمائی کہ اے ابوذر جب شوربہ پکاؤ تو پانی بڑھا دو اور اس سے اپنے ہمسایوں کی خبرگیری کرتے رہو[2]

دوست اور ہم نشین کے حقوق

اصل ارشاد میں اس کے لیے الصاحب بالجنب کے الفاظ آئے ہیں، ہم سفر، ہم مجلس، ہم سبق، ہم تجارت، ہم صنعت، ہم مسجد سب مراد ہیں۔ اسے عام طور سے پڑوسی نہیں کہتے گروہ ہمسایہ کی طرح اکثر ساتھ ہوتا ہے جیسے ایک سفر کے دو رفیق، ایک مدرسہ کے دو طالب علم، ایک کارخانہ کے دو ملازم، ایک استاد کے دو شاگرد، ایک دکان کے دو شریک کہ یہ بھی درحقیقت ایک طرح کی ہم سائیگی ہے اور اس کا دوسرا نام رفاقت اور صحبت ہے اور ایسا شخص بھی اس سے مراد ہے جس سے کہیں کسی وقت آدمی کا ساتھ ہو جائے۔ مثلاً آپ بازار میں جا رہے ہوں اور کوئی شخص آپ کے ساتھ راستہ چل رہا ہو یا کسی دکان پر آپ سودا خرید رہے ہوں اور کوئی دوسرا خریدار بھی آپ کے پاس بیٹھا ہو یا سفر کے دوران کوئی شخص آپ کا ہم سفر ہو۔ یہ عارضی ہمسائیگی بھی ہر مہذب اور شریف آدمی پر ایک حق عائد کرتی ہے جس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ حتی الامکان اس کے ساتھ نیک برتاؤ کرے اور اسے تکلیف دینے سے مجتنب رہے[3]

شریعتِ اسلام نے جس طرح دور نزدیک کے دائمی پڑوسیوں کے حقوق واجب فرمائے۔ اسی طرح اس شخص کا بھی حق صحبت لازم کر دیا جو تھوڑی دیر کے لیے کسی مجلس میں یا سفر میں آپ کے برابر بیٹھا ہو، جس میں مسلم و غیر مسلم اور رشتہ دار و غیر رشتہ دار سب برابر ہیں۔ اس کے ساتھ بھی حسن سلوک کی ہدایت فرمائی جس کا ادنیٰ درجہ یہ ہے کہ آپ کے کسی قول و فعل سے اس کو ایذا نہ پہنچے۔ کوئی گفتگو ایسی نہ کریں جس سے اس کی دل آزاری ہو۔ کوئی کام ایسا نہ کریں جس سے اس کو تکلیف ہو مثلاً سگریٹ پی کر اس کا دھواں اس کے منہ کی طرف نہ چھوڑیں، پان کھا کر پیک اس کی طرف نہ ڈالیں۔ اس طرح نہ بیٹھیں جس سے اس کی جگہ تنگ ہو جائے۔

قرآن کریم کی اس ہدایت پر لوگ عمل کرنے لگیں تو ریلوے مسافروں کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں

---

[1] صحیح بخاری کتاب [2] ترمذی [3] تفہیم القرآن۔

ہر شخص اس پر غور کرے کہ مجھے صرف ایک آدمی کی جگہ کا حق ہے اس سے زائد جگہ گھیرنے کا حق نہیں۔ دوسرا کوئی اگر قریب بیٹھا ہے تو اس ریل میں اس کا بھی اتنا ہی حق ہے جتنا میرا ہے [1]

مسافروں اور مہمانوں کے حقوق

اصل ارشاد میں وابن السبیل آیا ہے اس کے مفہوم میں مسافر اور مہمان داخل ہیں۔ مروجہ نظام تمدن میں گو مہمانی کی زحمت ہوٹلوں اور ریستورانوں نے اپنے سر لے لی ہے مگر گزشتہ نظام تمدن میں اس کی جگہ نہایت اہم تھی۔ اور اب بھی مہمان نوازی مشرقی تمدن کے ضمیر میں داخل ہے اور مغربی تمدن نے بھی اس رسمی حیثیت کو باقی رکھا ہے۔ ہر انسان کسی نہ کسی کا مہمان ہوتا ہے اور جو مہمان ہوتا ہے وہ چل کر آتا ہے اور جو چل کر آتا ہے وہ مسافر بھی ہوتا ہے گویا ہر مسافر مہمان ہوتا ہے اس لیے یہ کہنا چاہیے کہ سوسائٹی کے نظام میں اس کی حیثیت مبادلہ اخلاق کی ہے۔ آج ہم چل کر آنے والے مہمان کے ساتھ نیک سلوک اور عزت کا برتاؤ کریں گے تو کل جب ہم چل کر جائیں گے وہ ہمارے ساتھ کرے گا۔ دوسرے مذاہب میں مہمان نوازی کی تعلیم کا ذکر خصوصیت کے ساتھ نہیں لیکن اہل عرب میں مہمان کا بہت بڑا حق سمجھا جاتا تھا۔ مہمان کی خدمت اور حفاظت میزبان اپنا فرض سمجھتا تھا۔ اسلام آیا تو اس نے اس فرض کی اہمیت کو اور بڑھایا۔

یہاں قرآن نے ابن السبیل کا لفظ لاکر دو باتوں کی طرف اشارہ کیا ہے ایک تو یہی کہ مسافر اور مہمان ہماری حسن کاری کا مستحق ہے خواہ مسلم ہو یا غیر مسلم، ملکی ہو یا غیر ملکی اور دوسری طرف ہمیں سیاحت اور مسافرت کی طرف بھی اس میں ترغیب ہے۔

یہ تو قرآن حکیم کی صراحت ہے کہ مسافر کے ساتھ حسن سلوک اور نیکی کا برتاؤ کرو اور قرآن ہی میں انبیاء کے واقعات میں مہمان نوازی پر ضمنی اشارات بھی آئے ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکارم اخلاق میں مہمان نوازی کو بہ تصریح اس قدر اہمیت دی ہے کہ اس کو ایمان کامل کا ایک حصہ قرار دیا ہے اور فرمایا ہے کہ:

> جو شخص اللہ اور آخرت پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے اپنے پڑوسی کی عزت کرے اور جو شخص خدا اور آخرت پر ایمان لایا ہے اس کو چاہیے کہ اپنے مہمان کا جائزہ عزت

---

[1] تفہیم القرآن۔

کے ساتھ دریافت کیا گیا کہ مہمان کا جائزہ کیا ہے؟ فرمایا کہ ایک دن اور ایک رات اور مہمانی تین دن کی ہے۔ اس کے آگے مہمان پر صدقہ ہوگا[1]

ابوداؤد کی کتاب الاطعمہ باب الضیافت میں ہے کہ

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مہمان کی ایک رات ضیافت کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے جس کے صحن میں مسلمان صبح کرے اس پر یہ حق فرض ہے مہمان چاہے تو اس کا تقاضا کرے اور چاہے تو چھوڑ دے۔

بخاری کتاب الادب اور مسلم میں ہے؛

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جو شخص بھی خدا اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے اس کا حق ایک دن ایک رات ہے۔ مہمانی کی مدت تین دن ہے اس کے بعد جو کچھ کیا جائے صدقہ ہے اور مہمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ میزبان کے یہاں اتنا طویل عرصہ ٹھہرے کہ اسے تنگی میں ڈال دے۔

یہ ارشادات بتاتے ہیں کہ ایک شب و روز کا قیام و طعام ہر صاحب استطاعت مسلمان مقیم پر مسافر مہمان کا حق ہے۔ مسافر مہمان کے لیے تین دن تک اس سہولت سے فائدہ اٹھانے کی گنجائش ہے اور میزبان کو چاہیے کہ خوش دلی کے ساتھ اس کی ضیافت کرے۔ تین دن کے بعد اگر میزبان کچھ کرتا ہے تو اس کی حیثیت صدقہ کی ہے اور مہمان کو حتی الامکان تین روز سے زیادہ قیام سے پرہیز کرنا چاہیے۔ رہی ایک شب و روز کی ضیافت وہ میزبان پر مہمان کا واجب الادا حق ہے۔

ماملکت ایمانکم کے حقوق

قرآن کی اصطلاح میں ماملکت ایمانکم سے مراد وہ غلام اور کنیزیں ہیں جو جنگ میں گرفتار ہو کر آئیں لیکن مولانا عثمانی فرماتے ہیں:

"مال مملوک غلام اور لونڈی کے علاوہ دیگر حیوانات کو بھی شامل ہے۔"

اس کا مطلب یہ ہے کہ اس لفظ کے ذریعے غلاموں اور ان تمام جانداروں کے حقوق بیان ہوئے ہیں جو آپ کی ملک میں داخل ہیں، بلکہ اگر اس کے مفہوم میں ان کو بھی داخل کر لیا جائے۔ اجرت کے

[1] بخاری کتاب الادب

ذریعے جن کے اوقات کے ہم مالک ہو جاتے ہیں نوکر، ملازم، مزدور جو خود تو مملوک نہیں ہوتے لیکن ان اوقات کا آقا، مالک کی ملکیت ہوتے ہیں تو یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے اس طرح قرآن نے یہاں ملکت ایمانکم بول کر غلاموں، کنیزوں، نوکروں، مزدوروں اور حیوانوں کے حقوق بیان کر دیئے ہیں۔ ملک یمین کی بحث میں ہم اس پر اظہارِ خیال کر چکے ہیں لیکن یہاں قرآن نے یہ لفظ حقوق کے ضمن میں بولا ہے اس لیے اسلام میں غلاموں کے ساتھ حسنِ معاشرت کی بھی آیت اساس ہے۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے غلاموں کے ساتھ نیک، اور شریفانہ برتاؤ کرنے کی پُرزور تلقین کی ہے۔

احادیث میں غلاموں اور کنیزوں کے ساتھ حسنِ سلوک کی تاکید آئی ہے، صحیح بخاری میں معرور بن سوید سے روایت ہے کہ انہوں نے حضرت ابوذر غفاری کو یہ کہتے ہوئے سُنا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> تمہارے ہاتھ کے نیچے کام کرنے والے تمہارے بھائی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو تمہارے ہاتھ کے نیچے ڈال دیا ہے۔ یاد رکھو جس کا بھائی اس کے ہاتھ کے نیچے ہو تو چاہیے کہ جو کچھ خود کھائے اسے کھلائے اور جو خود پہنتا ہو اسے پہنائے اور ان پر اتنا کام نہ لادو جو ان کو دبا دے اور اگر ان پر بار ڈالو تو ان کی مدد کرو۔

یہ ارشادِ نبوت قرآن کی اس آیت کی بہترین تفسیر ہے۔ اس ارشاد میں صرف غلاموں ہی سے حسنِ سلوک کی نہیں بلکہ نوکروں، ملازموں اور مزدوروں سے بھی حسنِ سلوک کی ہدایت کی گئی ہے۔

اس ارشادِ نبوت سے معاشی زندگی کے چند اہم گوشوں پر روشنی پڑتی ہے۔

اولاً یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا منشا ہے کہ جو لوگ مزدوری پر کام کرتے ہیں لوگ ان کو اپنا بھائی خیال کریں۔ اور دونوں میں تعلقات کی نوعیت ایسی ہو جیسے بھائی بھائی میں ہوتی ہے۔

ثانیاً کم از کم کھانے پینے، پہننے بہننے کی حد تک دونوں کی معاشی سطح ایک ہو، جو خود کھائے وہ مزدور کو کھلائے اور جو خود پہنے وہ مزدور کو پہنائے۔ اس سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اجرت کے معاملہ میں نبوت کا نقطۂ نظر کیا ہے یعنی کم از کم اتنی اُجرت مزدور کو ضرور ملنی چاہیے کہ کھانے اور پہننے کی حد تک وہ اپنے مالک کے برابر ہو جائے۔

ثالثاً وقت اور کام دونوں کے لحاظ سے نوکروں، غلاموں اور مزدوروں پر اتنا بوجھ نہ ڈالا جائے جو ان کو مغلوب کر کے تھکا دے۔

رابعاً اگر کوئی کام ایسا پیش آ جائے جس کی انجام دہی میں غلام و نوکر اور مزدور کو دشواری پیش آ رہی ہو

اس کا مطلب نہ یہ ہے کہ اس سے یہ کام نہ کرایا جائے اور نہ یہ کہ خواہ حالات کچھ ہوں پھر بھی اسی سے کام لیا جائے بلکہ اصل حل یہ ہے کہ کارکن کی مدد مزید قوت سے کی جائے۔

محنت اور سرمایہ کا جھگڑا

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں یہی سمجھتا ہوں کہ محنت اور سرمایہ کے نام پر جس قدر آویزشیں اس زمانہ میں رونما ہو رہی ہیں۔ اس ارشادِ نبوت کی روشنی میں اس کا حل تلاش کیا جا سکتا ہے۔ یہ صرف نظریہ نہیں ہے بلکہ اس کی پشت پر عملی واقعات کی طویل فہرست بھی ہے۔ اسی حدیث کے راوی حضرت ابوذر غفاری کا یہ معمول تھا اور حضرت عمر کا سفر بیت المقدس میں آدھے راستہ خود سوار ہونا اور آدھے راستہ میں غلام کو سوار کرانا مشہور ہے۔

صحیح بخاری میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک اور ارشاد آیا ہے،

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ روزِ قیامت میں تین آدمیوں کا فریق مخالف ہوں گا۔ ایک شخص وہ جس نے میرے نام سے کچھ دیا اور پھر عہد شکنی کی، دوسرا وہ جو کسی آزاد آدمی کو بیچ کر اس کی قیمت کھائے، تیسرا وہ جس نے کسی کو مزدور رکھا اور اس سے پورا کام لیا لیکن اس کی پوری مزدوری ادا نہ کی۔

ایک اور ارشاد مسند ابی یعلیٰ میں ابوہریرہ کے حوالہ سے آیا ہے،

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ مزدور کو اس کی مزدوری ادا کر دو قبل اس کے کہ پسینہ خشک ہو۔

ایک اور ارشاد مسند احمد میں آیا ہے:

مزدور کو اس کے کام میں سے بھی حصہ دو کیونکہ اللہ کا عامل و مزدور نامراد نہیں کیا جا سکتا۔

اس ارشادِ نبوت کا کیا مطلب ہے؟ کیا علاوہ مزدوری کے منافع میں بھی مزدور کا حصہ ہے۔ افسوس ہے کہ فقہاءِ اسلام کی کتابوں میں مجھے اس موضوع پر کوئی بات نہیں ملی ہے لیکن ایک اور حدیث ہے جس سے اس کی ایک گونہ تشریح ہوتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

تمہارا خادم اگر تمہارا کھانا تیار کرے اور لے کر تمہارے پاس آئے اور گرمی دھوئیں کو اس نے برداشت کیا تھا تو چاہیے کہ اپنے ساتھ بٹھا لو اور کھانے پر زیادہ آدمی ہوں تو پھر

خادم کے ہاتھ میں کھانے میں سے کچھ چیز اٹھا کر ایک لقمہ یا دو لقمے دے دو۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اس کام سے بھی جو خادم نے کیا خادم کو کچھ نہ کچھ حصہ ملنا چاہیے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو قرآن کے مطالبہ حسنِ سلوک ہی کا اس کو اثر سمجھتا ہوں۔ کیا مزدور کو بھی اس پر قیاس کیا جا سکتا ہے؟ غلاموں، ملازموں اور مزدوروں سے مالکوں کو کیا معاملہ کرنا چاہیے اور حسنِ سلوک کی حد کیا ہے؟ ارشادِ نبوت سے یہ بات تو پہلے گوش گزار ہو چکی ہے کہ بھائی بھائی کا معاملہ کیا جائے۔ اسی حسنِ سلوک کے سلسلے کی ایک وہ حدیث ہے جس میں آیا ہے کہ ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور دریافت کیا، میں اپنے نوکر کو کتنی بار معاف کروں؟ راوی کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ اس نے پھر اسی سوال کو دہرایا۔ آپ نے اس کے جواب میں فرمایا روزانہ ستر بار معاف کرو۔ اسی بنا پر فقہاءِ اسلام نے یہ طے کر دیا ہے کہ نوکر جو تنخواہ پر رکھا جاتے اس پر چیزوں کے نقصان کرنے کا تاوان نہ ہوگا جب تک وہ قصداً نقصان نہ کرے۔ علامہ مقدسی نے اس جزئیہ کو نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ یہی امام مالک اور ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔

اسی سلسلے میں وہ حدیثیں بھی ہیں جن کا تعلق اگرچہ غلاموں سے ہے مگر میرے نزدیک یہ احکام ہر شخص کے لیے عام ہیں جو کسی کی ماتحتی میں کام کرتا ہو۔

ابو مسعود بدری صحابی کا مشہور واقعہ ہے کہ وہ کوڑے سے اپنے غلام کو مار رہے تھے پیچھے سے حضور انور نے آواز دی خبردار ابو مسعود، ابو مسعود کہتے ہیں غصہ میں مجھے کچھ پتہ نہ چلا کہ کون آواز دے رہا ہے کہ اتنے میں دیکھتا ہوں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں ابو مسعود خبردار اللہ تعالیٰ تم پر تمہارے غلام سے زیادہ قادر ہے۔

اور یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

> کوئی آقا اپنے غلام کو میرا عبد نہ کہے بلکہ فتای میرا جوان کہے۔ اسی طرح غلاموں کو ممانعت کی کہ وہ اپنے آقاؤں کو رب نہ کہیں بلکہ مولیٰ کہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں:

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انتقال کے وقت آخری بات جو فرمائی وہ یہ تھی کہ نماز کا خیال رکھو اور جو تمہارے غلام ہیں ان کے بارے میں اللہ سے ڈرتے رہو۔

حسنِ سلوک کے بارے میں ان تعلیمات پر صحابہ نے اس طرح عمل کیا کہ ان کے غلاموں اور آقاؤں کے درمیان تمیز مشکل ہو گئی۔ ان بے خانماں افراد کو ان کے آقاؤں کے گھروں کا غلام بنا کر نہیں بلکہ

ایک طرح سے ارکان اور ممبر بنا رکھا کہ جس غلام کو جو آزاد کرے گا وہ اسی کے موالی میں شمار ہوگا۔ حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں اپنے فوجی افسروں کو حکم دیا تھا کہ رومی اور عجمی غلام جو مسلمان ہو گئے ہوں ان کو ان کے قدیم خاندانوں میں شمار کرو جو ان کا حق ہو وہ ان کا ہو۔ اور اگر یہ غلام چاہیں تو اپنا ایک الگ مستقل قبیلہ بنالیں [1]

ان تعلیمات نے ان غلاموں کو غلام نہیں بلکہ اسلام کا سردار، ملکتوں کا بادشاہ اور روحانی قیادت کا عظیم منصب عطا کر دیا۔ اسلام کی تاریخ ان واقعات سے لبریز ہے ۔

اخلاقی رذائل میں فخر و غرور کا مقام

۴۷ ۔ اللہ سبحانہٗ ان لوگوں سے محبت نہیں کرتا ہے جو اکڑ فوں اور گھمنڈی ہوں۔ یعنی جس کے مزاج میں تکبر اور خود پسندی ہوتی ہے کہ کسی کو اپنے برابر نہ سمجھے اپنے مال پر مغرور اور عیش میں مشغول ہو وہ ان حقوق کو ادا نہیں کرتا سو اس سے احتراز رکھو اور جدا رہو [2] اصل ارشاد میں مختال و فخور کے الفاظ آئے ہیں۔ مختال کا مادہ خیل ہے ۔ اسی سے خیلاً بنا ہے جس کے معنے تکبر کے ہیں۔ اسی سے حدیث میں آتا ہے من جر ثوبہ خیلاء لم ینظر اللہ الیہ جو اپنا کپڑا تکبر سے نیچا کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کی طرف نہ دیکھے گا اور مختال وہ مالدار ہے جو بڑا بنتا ہے ۔

فخور فخر سے بنا ہے جس کے معنے گھمنڈ کے ہیں یعنی ان چیزوں میں اپنی بڑائی ظاہر کرنا جو انسان سے باہر ہیں مثلاً سرمایہ اور جاہ۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ مختال وہ ہے جو اپنی ذات کی بڑائی چاہتا ہے اور عزیز دل قریبیوں اور پڑوسیوں سے ملنے میں کسرِ شان سمجھتا ہے اور فخور وہ ہے جو دوسروں کے سامنے اپنی بڑائی زبان سے کرتا ہے۔ یا یوں کہو کہ مختال اپنے آپ کو فضیلت دینے والا ہے اور فخور مال و مرتبہ سے بڑائی ظاہر کرنے والا ہے یا مختصر لفظوں میں یوں کہہ دو کہ مختال اپنے کردار سے بنتا ہے اور فخور اپنی گفتار سے ہوتا ہے ۔

اس فقرے کے ذریعے یہ بات بتائی گئی ہے کہ عبادت میں اللہ کا حق ادا کرنے، اور مخلوق سے برتاؤ میں حسن کاری سے وہ لوگ گریز کرتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں کو خود اپنی قوت و قابلیت اور اپنی تدبیر و حکمت کا کرشمہ سمجھتے ہیں۔ ان کے اندر تواضع اور شکر گزاری کے جذبے کی جگہ غرور اور فخر پیدا ہو جاتا ہے وہ لوگوں سے اچھا برتاؤ کرنے کی بجائے ان پر اپنی دھونس اور رعب جمانے کی فکر کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ ایسے ناشکروں اور ناقدروں کو پسند نہیں فرماتا ہے ۔

---

[1] کتاب الاموال لابی عبید [2] افادات شیخ الاسلام

دراصل انسان میں جب کوئی وصف باکمال پایا جاتا ہے تو قدرتی طور پر اس کے دل میں اس کا خیال پیدا ہوتا ہے اور یہ کوئی اخلاقی عیب نہیں ہے لیکن جب یہ خیال اس قدر ترقی کر جاتا ہے کہ وہ لوگوں کو جن میں یہ وصف نہیں پایا جاتا حقیر سمجھنے لگتا ہے تو اس کو کبر اور اس کے اظہار کو تکبر کہتے ہیں۔

فخر و غرور ایک اضافی چیز ہے جس کے لیے محض اپنی عظمت کا تخیل کافی نہیں بلکہ اس تصور کے ساتھ دوسرے لوگوں کی تحقیر بھی ضروری ہے چنانچہ حدیث میں ہے کہ ثابت بن قیس کہتے ہیں کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضر تھا۔ آپ نے قرآن کی یہی آیت ان اللہ لا یحب کل مختال فخور تلاوت فرمائی اور تکبر کی برائی کا تذکرہ کیا مجھے رونا آگیا۔ حضور نے مجھ سے دریافت کیا کہ ثابت کیوں روتے ہو۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں ایک ایسا آدمی ہوں کہ خوبصورتی مجھے بھاتی ہے یہاں تک کہ میرا جی چاہتا ہے کہ میرے چپل کے تسمے بھی خوبصورت ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ پھر تو تم اہل جنت میں سے ہو تم اپنی سواری اور پالان کو اگر خوبصورت بناتے ہو تو یہ کبر نہیں بلکہ کبر یہ ہے کہ حق کو ہلکا سمجھو اور لوگوں کو حقیر مانو۔ ابو داؤد نے کتاب اللباس میں ابو ہریرہ کی یہ حدیث لکھی ہے کہ ایک خوش جمال شخص نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں ایک حسین شخص ہوں اور حسن مجھے نہایت محبوب ہے۔ میں یہ پسند نہیں کرتا کہ کسی کو مجھ پر تفوق حاصل ہو تو کیا یہ تکبر ہے فرمایا یہ تکبر نہیں ہے۔ تکبر یہ ہے کہ حق کو قبول نہ کیا جائے اور لوگوں کو حقیر سمجھا جائے۔

تکبر کی اسی اضافی حیثیت نے اس کو مذہبی، اخلاقی، معاشرتی بداخلاقیوں کا سرچشمہ بنادیا تکبر ہی جب انسانی طبیعت کا تقاضا اور ملکہ بن جاتے اور عادات و کردار میں اس کا ظہور ہو اس کا نام اختیال ہے اور جب بھی زبان پر نمایاں ہو تو اس کا نام فخر ہے۔

دُنیا کی زندگی میں اللہ سے لگاؤ اور مخلوق سے برتاؤ تمام بداخلاقیوں کا سرچشمہ اختیال و فخر ہے۔

فخر و غرور کی خصوصیات

۳۷۔ جو بخیلی کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کرنے کا حکم دیتے ہوں اور خدا کے دیے ہوئے فضل کو چھپاتے ہوں اور ہم نے کافروں کے لیے رُسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے یعنی اللہ تعالیٰ دوست نہیں رکھتا خود پسند اور تکبر کرنے والوں کو جو کہ بخل کرتے ہیں اور اپنے مال اور علم خداداد کو لوگوں سے چھپاتے ہیں۔ کسی کو نفع نہیں پہنچاتے اور قولاً و عملاً دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں اور ان کافروں کے لیے ہم نے ذلت کا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یہ آیت یہودیوں کے بارے میں نازل ہوئی جو فی سبیل اللہ مال خرچ کرنے میں خود بخل کرتے تھے اور مسلمانوں کو بھی روکتے تھے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف جو توریت میں مذکور تھے اور اسلام کی حقانیت پر مبنی جو آیات موجود تھیں ان کو چھپاتے سو مسلمانوں کو اس سے بچنا چاہیے۔[1]

پہلی آیت میں اکڑنے اور فخر کرنے والوں کا تذکرہ تھا اس آیت میں ان کا خصوصی چہرہ پیش کیا گیا ہے۔

اول یہ کہ یہ خود بھی بخیل ہیں اور دوسروں کو بخل کا مشورہ دیتے ہیں۔ بخیل اس شخص کو کہتے ہیں جو دوسروں کے حقوق کی پاسبانی میں تنگ دل ہو۔ بخالت کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے کہ آدمی اپنے مال و اسباب کو بجائے خدا کے دین سمجھنے کے خود اپنی تدبیر و قابلیت کا کرشمہ سمجھنے لگتا ہے۔ اس وجہ سے اس کے اندر تواضع و خاکساری اور تشکر گزاری کا جذبہ سرد پڑجاتا ہے جو فیاضی وجود کا اصلی محرک ہوتا ہے۔ بخیل آدمی دوسروں کو بھی بخل کا مشورہ دیتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کی فیاضی سے خود اس کا راز فاش ہوجاتا ہے۔ اپنے اس عیب پر پردہ ڈالنے کے لیے اس کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ جس طرح وہ دوسروں کے حقوق دبائے بیٹھا ہے اسی طرح دوسرے بھی دبائے رہیں۔ قاعدہ ہے کہ جو آدمی بزدل ہوتا ہے وہ دوسروں کو بھی بزدلی ہی کا درس دیتا ہے تاکہ اس کی بزدلی کا راز نہ نکلے۔

دوسری یہ کہ یہ اللہ کے اس فضل کو چھپاتے ہیں جو اللہ نے ان کو دیا ہوا ہے۔ یہ بخیل مالداروں کی ایک پوشیدہ نفسیاتی کمزوری کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ بخیل مالداروں کی ایک طرف تو یہ خواہش ہوتی ہے کہ ہر شخص پر ان کی بالادستی قائم رہے دوسری طرف وہ یہ کوشش بھی کرتے ہیں کہ کوئی شخص لوازِ حقوق کے معاملے میں ان پر تنقید نہ کرے۔ ہر شخص کے سامنے اپنے وسیع اخراجات، کاروباری نقصانات کا ذکر کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگ اس غلط فہمی کا شکار رہیں کہ ہیں تو یہ دریا دل لیکن مجبور ہیں۔[2]

اللہ کے فضل کو چھپانا یہ ہے کہ آدمی اس طرح رہے گویا اللہ نے اس پر فضل نہیں کیا ہے مثلاً کسی کو اللہ نے دولت دی ہو اور وہ اپنی حیثیت سے گر کر رہے۔ نہ اپنی ذات اور نہ اپنے اہل وعیال پر خرچ کرے نہ بندگانِ خدا کی مدد کرے، نہ نیک کاموں میں حصہ لے، لوگ دیکھیں تو سمجھیں کہ بیچارہ بڑا ہی خستہ حال ہے۔ یہ دراصل اللہ تعالیٰ کی سخت ناشکری ہے۔ حدیث میں آیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ان اللہ اذا انعم نعمۃ علی عبد احب ان یظھر اثرھا علیہ اللہ جب کسی بندے

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

کو نعمت دیتا ہے تو وہ پسند کرتا ہے کہ اس نعمت کا اثر بندے پر ظاہر ہو یعنی اس نعمت کا اثر کھانے پینے پہننے سینے لباس اور اس کی داد و دہش ہر چیز سے اللہ کی دی ہوئی اس نعمت کا اظہار ہوتا ہے۔[1]

بہرحال اللہ کے دیے ہوئے فضل سے مراد دولتِ مال ہے اور اس کے ساتھ دولتِ علم بھی ہو سکتی ہے جیسا کہ عبداللہ بن عباس سے منقول ہے۔ آیت بتا رہی ہے کہ نعمت کا اظہار بطورِ تحدیثِ نعمت کرنا جائز ہے۔

نمائشی خرچ کاروباری خرچ ہے

۷۵۔ اللہ سبحانہٗ ان لوگوں کو بھی دوست نہیں رکھتا جو صرف لوگوں کے دکھاوے کی خاطر مال خرچ کرتے ہیں اور اللہ پر اور آخرت والے دن پر ایمان نہیں رکھتے ہیں اور خود پسند متکبر وہ لوگ ہیں کہ اپنا مال لوگوں کو دکھاوے کی خاطر خرچ کرتے ہیں یعنی اللہ کے لیے خرچ کرنے میں تو بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بھی بخل کی ترغیب دیتے ہیں لیکن لوگوں کے دکھانے کو اپنا مال خرچ کرتے رہتے ہیں اور ان کا نہ اللہ پر ایمان ہے نہ قیامت کے دن پر کہ حصولِ رضائے حق تعالیٰ اور تحصیلِ ثوابِ اخروی ان کو مقصود ہو اور اللہ کے یہاں مقبول اور پسندیدہ یہ ہے کہ ان حقداروں کو دیا جائے جن کا اوّل ذکر ہو چکا ہے اور دینے میں اللہ کی خوشنودی اور آخرت کے ثواب کی توقع ہو۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کی راہ میں جیسے بخل کرنا برا ہے ویسا ہی لوگوں کے دکھانے کو خرچ کرنا برا ہے۔

اب تک جو کچھ بتایا گیا ہے اس کا تعلق ان سے تھا جو مال کے ساتھ بخل کا تعلق رکھتے ہیں۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ ان ہی سرمایہ داروں میں کچھ ایسے بھی ہیں کہ اچانک بخیل ہونے کے باوجود کبھی کبھی کچھ دن کے لیے ایسی صورت اختیار کر لیتے ہیں کہ یہ ظاہر محسوس ہوتا ہے کہ بہت بڑے "دیالو" ہیں مثلاً کسی تقریب کے موقعہ پر وہی شخص جس نے ساری عمر ایسی گزاری کہ کسی غریب کے لیے بھی دشوار ہو لیکن یہی بخیل اور غریب ہوتے غریب تر زندگی رکھنے والا اچانک شہر کے کسی موڑ یا چوراہے پر کسی پڑاؤ یا اسٹیشن کے سامنے کسی بلند و بالا عمارت کے بنانے میں اس لیے مصروف ہے کہ تھکے ماندوں کو اس میں آرام ملے مسافر اس میں ٹھہرائے جائیں گے یا از یں قبل خیراتی کاموں میں چندہ کا اعلان اس احساس سے دب کر کرتا ہے کہ یہ پریشان حال لوگوں کے لیے پریشان ہے۔ کبھی ہسپتال بناتا ہے، کبھی ختم دلاتا ہے اور

---

[1] تفہیم القرآن [2] افاداتِ شیخ الاسلام

کبھی کسی مجلس میں غریبوں میں غلہ کی تقسیم کا اعلان کرتا ہے۔ یہ سب کچھ کیا وہ اس لیے کرتا ہے کہ خدا کو خوش کرتا ہے۔ کیا واقعی غریبوں کی غربت پر اس کا دل دکھا ہے انسانی برادری کے متعلق اس کے دل میں کیا واقعی رحم کا کوئی جذبہ متلاطم ہوا ہے جن کی مالی فراہمی سراسر غریبوں کا خون چوسنے سے ہوئی ہے کیا اس کا دل غریبوں کی غربت پر تڑپ سکتا ہے؟ یقیناً ان بخلاء کے بارے میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ ایسا کیوں کرتے ہیں۔ قرآن نے اس آیت میں اسی اٹھتے ہوئے سوال کا جواب دیا ہے کہ خرچ کرنے والے اس لیے خرچ نہیں کرتے کہ خدا کو خوش کرنا چاہتے ہیں یا خدا کی مخلوق کو کوئی فائدہ پہنچانا چاہتے ہیں بلکہ رئاء الناس یعنی لوگوں کو دکھانا ان کے اخراجات کا پس منظر ہے۔ یعنی جن کو غریب بنا کر وہ اپنے کو امیر بنا رہا ہے ان ہی غریبوں کی آنکھ میں اپنی مسجدوں اپنے ہسپتالوں سے خاک جھونک رہا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ بخل و کنجوسی سے پیدا ہونے والی لعنت کو اس طرح وہ لوگوں کی ستائشوں اور مدح سرائیوں سے بدل دے۔ ان کا مقصد صرف یہ ہوتا ہے کہ دوسروں پر ان کی دولت مندی کا رعب قائم ہو، ان کی برائیوں کا دنیا میں چرچا ہو، محفلوں اور مجلسوں میں اس کا تذکرہ کیا جائے۔

اس ارشاد گرامی نے یہ بات کھول دی ہے کہ جیسے بخل کرنا قرآن کی نظر میں برائی ہے ایسے ہی لوگوں کو دکھانے کے لیے خرچ کرنا بھی برائی ہے۔ ارشادِ نبوت میں دکھاوے کو بھی شرک فرمایا ہے۔

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے کہ شرک سے بالکل میں بے نیاز ہوں۔ جو شخص کوئی نیک عمل کرتا ہے اور اس میں میرے ساتھ کسی دوسرے کو بھی شریک ٹھہراتا ہے تو میں اس عمل کو شریک ہی کے لیے چھوڑ دیتا ہوں اور اس عمل کرنے والے کو بھی چھوڑ دیتا ہوں۔

شیطان کی رفاقت

۷۸۔ اور جس شخص کو شیطان کی رفاقت مل جاتی ہے تو یہ بہت بُری رفاقت ہے۔ یعنی بخل کرنے اور دکھاوے کے لیے خرچ کرنے کا کام وہی لوگ کرتے ہیں جن کا شیطان رفیق ہو جو ان کو ایسے کام کرنے پر آمادہ کرتا ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ ان متکبرین کو بخل اور رئاء الناس کے اعمال پر ابھارنے والا شیطان ہے۔ تیسرے پارے میں پڑھ چکے ہو، الشیطان یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شیطان کا کام ہی یہ ہے کہ جس چیز میں غنا بخشی کی قوت نہیں ہے وہ باور کراتا ہے کہ یہی آدمی کو غنی بناتی ہے۔ خلود بخشی کی قوت سے جو محروم ہے وہ دھوکہ دیتا ہے کہ یہی خلود بخش ہے اور جن اعمال و افعال کا آخرت میں کوئی نتیجہ نہیں ہے وہ یقین دلاتا ہے کہ یہی نتیجہ خیز ہیں۔ جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا وہ سکھاتا رہتا ہے سب کچھ اسی میں ملتا ہے۔ الغرض شیطانی رفاقت کے بعد جو ہے وہ نہیں نظر آتا ہے اور جو نہیں ہے آدمی کو وہ ہے نظر آتا ہے۔ مفتی محمد عبدہ کا یہ استنباط لطیف ہے کہ ارشاد میں خبردار کیا گیا ہے کہ صحبت بد مؤثر ہوتی ہے اس سے بچ کر رہنا چاہیے۔ رفاقت کے لیے ہمیشہ نیک رفیق تلاش کرنا چاہیے۔

یہاں بخیلوں اور ریاکاروں کو شیطان کا رفیق ایسا ہی کہا ہے جیسا کہ دوسرے موقع پر فضول خرچی کرنے والوں کو قرآن نے اخوان الشیاطین کہا ہے۔

ذرا ٹھہر جائیے، شیطانی رفاقت کی حقیقت سمجھ لیجیے، حواس اور عقل کی راہوں سے جن چیزوں تک آدمی کی رسائی ممکن نہیں ان ہی چیزوں کو بتانے اور ان ہی کا علم دینے کے لیے خدا نے نبوت اور وحی کی رہنمائی عطا فرمائی لیکن اگر عقل والوں کا اصرار یہی ہو کہ ہم وہی اور صرف وہی مانیں گے جسے ہم جانتے ہیں تو آپ ہی بتائیے کہ ایسے ذہنی اختلاط کے مریضوں کے لیے انبیاء کی نبوت کی ضرورت ہی کیا ہے۔

قرآن میں ان ہی ذہنی اختلاط کے لیے ایک مخفی سزا کا ذکر ہے۔

ومن یعش عن ذکر الرحمان نقیض له شیطانا فهو له قرین

اور جو آنکھیں چراتا ہے رحمان کی یاد سے تو ہم پیچھے لگا دیتے ہیں اس کے شیطان، پھر وہی اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔

جو نہیں جانتے کہ خود میں کیا ہوں؟ وہ ہی کہتے ہیں کہ شیطان کیا ہے کچھ بھی نہیں صرف قدرت کا ایک انتقامی تازیانہ ہے۔ اللہ سبحانہ نے انسان کو جس مقصد کی تکمیل کے لیے زمین کے اس کرے پر بسایا ہے جو جس حد تک اس نصب العین سے ہٹتا ہے نہ رکنے والے کوڑے کی صورت میں وہ ان پر برستا ہے جیسے بلی چوہے کو دبوچ لیتی ہے۔ اپنے نصب العین سے ہٹنے والوں کو الشیطان بھی اسی طرح دبوچ لیتا ہے اس کو اسی لیے بنایا گیا ہے یہی اس کا کام ہے ایک جگہ نہیں قرآن میں کئی بار ان عبادی لیس لک علیهم سلطان[1] کے اعلان کے ساتھ اس کی ڈیوٹی پر لگائی گئی ہے۔

اجلب علیهم بخیلک ورجلک وشارکهم فی الاموال والاولاد

---

[1] میرے بندوں پر تجھے قابو حاصل نہیں ہے۔

وعدھم وما یعدھم الشیطان الا غرورا

چڑھ جا ان پر اپنے سواروں اور پیادوں کے ساتھ اور ساجھی بن جا ان کے اموال اور اولاد میں اور ان کو وعدوں کے سبز باغ دکھا۔ شیطان کا وعدہ سرتاسر دھوکا اور فریب ہے۔
اولاد کے ساتھ الاموال میں جب وہ ساجھی بن جاتا ہے تو یقین مانیے کہ اور خرچ کی تمام راہوں پر وہ قبضہ جما لیتا ہے اور فردا کی فکر میں ڈال کر امروز کی لذت کو بے مزہ کر دیتا ہے۔ اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔
اس پر تفصیلی بحث انشاءاللہ پارہ پندرہ میں آئے گی۔

ایمان صحیح ہونے پر افسوس

ف۔ ان لوگوں کا کیا نقصان ہو جاتا اگر وہ اللہ اور آخرت پر ایمان لے آتے اور اللہ کی دی ہوئی نعمت کو خرچ کرتے اور اللہ ان کی حالت سے خوب باخبر ہے۔ یعنی ان کافروں کا کچھ نقصان نہ ہوتا اگر وہ بجائے کفر کے اللہ اور آخرت والے دن پر ایمان لے آتے اور بجائے ریاکاری کے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرتے بلکہ ان کا سراسر نفع تھا۔ ضرر تو اس میں ہے جس کو وہ اختیار کر رہے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے کہ وہ کیا اور کس نیت سے کر رہے ہیں۔ اسی کا عوض ان کو ملے گا۔ پہلی آیت میں ینفقون اموالھم فرمایا تھا یعنی مال کو ان کی طرف منسوب کیا تھا اب اس آیت میں وانفقوا مما رزقھم اللہ فرمایا یعنی مال کی اپنی طرف نسبت کی۔ اس میں اشارہ ہے کہ وہ لوگ اپنا مال سمجھ کر خرچ کرتے ہیں ان کو چاہیے تھا کہ اللہ کا مال سمجھ کر اس کے حکم کے موافق خرچ کرتے رہے[1]۔

یہ ان تنگ دلوں، بخیلوں اور ریاکاروں کی بدقسمتی پر اظہارِ افسوس ہے کہ یہ اللہ اور آخرت پر ایمان لانے اور اللہ کی بخشی ہوئی دولت کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بڑا خسارہ سمجھتے ہیں حالانکہ یہ خسارے کا سودا نہیں ہے بلکہ سرتاسر نفع ہی نفع ہے اللہ تعالیٰ کسی کے عمل سے بے خبر نہیں[2]۔

یہ آیت کن لوگوں کے حالات کی عکاسی کر رہی ہے، مشرکین کی، یہود و نصاریٰ کی۔ قرآن کے یہی تین مخاطب ہیں۔ سید رشید رضا کہتے ہیں کہ روئے سخن سب کی طرف ہے۔ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود خدا کو مانتے تھے، اس کی خالقیت، مالکیت اور ربوبیت کے قائل تھے۔ الٰہیت کو

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

بھی مانتے تھے مگر اس میں خدا کے ساتھ اور کو بھی شریک کرتے یہودی اور عیسائی ایمان باللہ والیوم الآخر کے مدعی تھے لیکن شرک کے دھبوں سے ان کا دامن ایمان بھی محفوظ نہ تھا اس لیے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ سب ایمان صحیح کو اپنا لیں۔ اور اگر خود مسلمانوں کا ذکر ہے تو مطلب یہ ہے کہ اگر یہ ایمان کامل کو اپنا لیں۔ دونوں صورتوں میں حیرت و تعجب اپنی جگہ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا کردار لوگوں کے لیے کس قدر حیرت ناک ہے کیونکہ اگر یہ لوگ ایمان میں اخلاص کو اپنا لیتے تو دنیا کے فوائد سے تو بہرہ ور ہوتے ہی آخرت کی کامرانیاں بھی ہاتھ سے نہ جاتیں۔

اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ ۚ وَاِنْ تَكُ حَسَنَةً يُّضٰعِفْهَا وَيُؤْتِ مِنْ لَّدُنْهُ اَجْرًا عَظِيْمًا ۞ فَكَيْفَ اِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ وَّجِئْنَا بِكَ عَلٰى هٰٓؤُلَآءِ شَهِيْدًا ۞ يَوْمَئِذٍ يَّوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَعَصَوُا الرَّسُوْلَ لَوْ تُسَوّٰى بِهِمُ الْاَرْضُ ۭ وَلَا يَكْتُمُوْنَ اللّٰهَ حَدِيْثًا ۞

رکوع

بلاشبہ اللہ سبحانہ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے، اگر ایک ذرہ بھی نیکی ہوگی تو وہ اُسے دُگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا بدلہ بھی مرحمت فرمائے گا۔" اے پیغمبر پھر کیسی گزرے گی جب ہر اُمت میں سے ہم ایک گواہ طلب کریں گے اور ہم تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے بلائیں گے۔" اس روز کفر کی راہ پر چلنے والے اور رسول کے نافرمان تمنا کریں گے کہ کاش زمین کو ان پر برابر کر دیا جاتے اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔"

جزا و سزا اعمال کے نتائج ہیں

اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لیے ایک نظام قائم کیا ہے جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار چلتا ہے۔ انسان غلطی سے یہ سمجھتا ہے کہ یہ اصول فطرت صرف مادیات تک محدود ہیں حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات، ذہنیات ہوں یا عملیات ہر ایک میں یہ یکساں جاری و ساری ہیں جس طرح عالم مادہ میں یہ قانونِ خداوندی ہے کہ زہر کھانے سے آدمی کا جسم مرجاتا ہے اسی طرح یہ اللہ سبحانہ' کا قانون ہے کہ گناہ سے اس کی روح مر جاتی ہے اور جس طرح اصول حفظان صحت کی عدم پیروی سے انسان بیمار ہو جاتا ہے اسی طرح اصول تزکیۂ قلب کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے۔ پھر جس طرح دوا اور اصول حفظان صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے ایسا ہی روحانی تدابیر علاج کے ذریعے بھی وہ شفایاب ہوتا ہے۔ غرض جس طرح دُنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے آثار بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ غرور اور خاکساری بخل اور فیاضی، تقویٰ اور فسق ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے میت، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جُدا نہیں ہو سکتی۔ اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادی اور طبیعی اشیاء میں ہے انسان خود اپنے اوپر ظلم کرتا ہے لیکن جناب الٰہی اس سے اپنے قانون مجازات میں پاک ہے وہ جو کچھ ہے وہ سرتاسر عدل ہے۔

۴۸۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ' کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے اگر ذرہ برابر بھی نیکی ہو گی تو وہ اسے دُگنا کر دے گا اور اپنے پاس سے بہت بڑا بدلہ بھی مرحمت فرمائے گا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کسی کا حق ایک ذرہ کے برابر بھی ضائع نہیں کرتا لہٰذا ان کافروں پر جو عذاب ہو گا وہ عین انصاف اور ان کی بداعمالی کا بدلہ ہے اور اگر ذرہ برابر بھی کسی کی نیکی ہو گی تو اضعاف مضاعف اس کو اجر دے گا اور اپنی طرف سے ثواب عظیم بطور انعام اس کو عنایت کرے گا۔[1]

اس آیت کے ذریعے دو اہم باتیں سمجھائی گئی ہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک یہ کہ اللہ سبحانہٗ کسی پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ۔
دوسری یہ کہ ذرہ برابر کی ہوئی نیکی بھی اللہ کے یہاں بے حد قیمتی ہوجائے گی
ظلم نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ یہ مادی علت ومعلول اور عمل اور عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے ۔ قرآن نے ان ہی دو اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے ۔ عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے جس کے معنے پیچھے کے ہیں اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے جو کسی فعل کے بعد لازم آجاتا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے نکلا ہے جس کے معنے لوٹنے کے ہیں اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزا کے معنے میں بولا گیا ہے ۔
قرآن میں یہ بات کھول کر سمجھائی گئی ہے کہ جزا وسزا ہمارے ہی اعمال کے ردِ عمل کا نام ہے ۔ ارشاد ہے لتجزیٰ کل نفس بما تسعیٰ یعنی جزا وسزا ہمارے دنیا میں کیے ہوئے اعمال کے آثار ولوازم ہیں ۔ غرض جزا وسزا انہی اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد میں اس اصول کی اس طرح تشریح فرمائی ہے کہ روزِ قیامت اللہ سبحانہٗ فرمائے گا اے میرے بندو! یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تم کو لوٹا کر دے رہا ہوں جو کوئی اچھا بدلہ پائے وہ خدا کا شکر کرے اور جو برائی دیکھے وہ خود کو ہی ملامت کرے ۔ ظلم نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ ہر عمل کا عامل کی ذات پر جیسا اثر ہوتا ہے ۔ اسی کے مطابق اس میں بلندی اور پستی ہوگی ۔ اللہ تعالیٰ کسی کے عمل کی جزا میں کوئی کمی نہ کرے گا خواہ وہ عمل ذرے کی مقدار میں ہو اور کسی کو بغیر جرم کے قطعاً سزا نہ دے گا ۔

نیکیوں میں تضعیف کا قانون

یہاں ارشاد ہوا ہے کہ اگر نیکی ہو تو اس کو بڑھاتا ہے اور اپنے پاس سے اور بڑا ثواب دیتا ہے ۔ حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ ایک نیکی پر اس کا دس گنا ملنا تو اس امت کے حق میں عام ضابطہ ہے ۔ ارشادِ نبوت ہے کہ ،

جب تم میں کوئی اپنے اسلام میں حسن کار ہوجائے تو پھر جو نیکی کرتا ہے اس کے نامۂ اعمال میں دس گنا سے سات سو گنا تک لکھی جاتی ہے اور جو برائی کرتا ہے وہ صرف اتنی ہی لکھی جاتی ہے ۔ (بخاری ومسلم)

یہ گویا زبانِ نبوت سے تضاعف کی تشریح ہوئی ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ دس گنا تو ایک ضابطہ عام ہے

اور اس کے لیے ہے جو ایمان و اسلام میں حسن کاری پیدا کرے لیکن اللہ کی رحمت کا دروازہ اس حد پر پہنچ کر بھی بند نہیں کرتی بلکہ سات سو اور اس سے بھی زیادہ دینے کے لیے کھلا رکھتی ہے جیسے جیسے مومن کی حسن کاری اور اللہ سبحانہ کی رویت کا جتنا تصور غالب ہوتا جائے گا اتنا ہی ایک نیکی کا ثواب بڑھتا جائے گا۔ اسی طرح بعض وقت خود عمل کی برتری و فضیلت اور کبھی ضرورت کا بروقت احساس بھی ایک نیکی کو بے شمار نیکیاں بنا دیتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود سے دریافت کیا گیا کہ من جاء بالحسنۃ فلہ عشر امثالھا تو عام مسلمانوں کے بارے میں ضابطہ ہے بتلائیے مہاجرین کے لیے کیا قانون ہے۔ انہوں نے جواباً فرمایا کہ اس سے بھی زیادہ ہے اور یہ آیت تلاوت فرمائی وان تک حسنۃ یضاعفھا ویؤت من لدنہ اجراً عظیماً۔ حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ اللہ سبحانہ ایک نیکی پر بیس لاکھ نیکیاں بھی لکھ دیتا ہے جیسا کہ اس آیت میں ہے کہ اللہ اپنے پاس سے بڑا ثواب اور دیتا ہے اللہ اکبر اس کا اندازہ کون کر سکتا ہے۔

بہرحال نیکیوں کی تضعیف اور زیادتی کا ضابطہ سات سو گنا ہی پر جا کر ختم نہیں ہوتا۔ اس سے بھی کہیں اوپر پہنچتا ہے بے شک جس کی رحمت غیر متناہی ہو اس کے انعامات کو بھی لامتناہی ہونا چاہیئے لیکن اللہ کی یہ داد و دہش اسلام کے اس اعلیٰ مرتبہ سے شروع ہوتی ہے جس کا نام احسان ہے۔ اسلام، ایمان اور احسان کے برسرارتقائی مراتب کی تفصیلات انشاءاللہ اسی پارے کے پانچویں رکوع میں آرہی ہیں۔

روز قیامت انبیاء کی شہادت

۹۷۔ اے پیغمبر پھر کیسے گزرے گی جب ہم ہر امت میں سے ایک گواہ طلب کریں گے اور ہم تمہیں بھی ان لوگوں پر گواہی دینے کے لیے بلائیں گے۔ یعنی ان کافروں کا کیا برا حال ہوگا جس وقت بلائیں گے ہم ہر امت اور ہر قوم میں سے گواہ ان کے حالات بیان کرنے والا اور ان کے واقعی معاملات ظاہر کرنے والا۔ اس سے مراد ہر امت کا نبی اور دور کے صالح اور معتبر لوگ ہیں کہ وہ قیامت کو نافرمانوں کی نافرمانی اور فرمانبرداروں کی فرمانبرداری بیان کریں گے اور سب کے حالات کی گواہی دیں گے اور تم کو اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان پر یعنی تمہاری امت پر مثل دیگر انبیاء علیہم السلام کے احوال بتانے والا اور گواہ بنا کر لاویں گے اور یہ بھی احتمال ہے کہ ھٰؤلاء کا اشارہ انبیاء سابقین یا کفار مذکورہ بالا کی طرف ہو اول صورت میں انبیاء مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انبیاء سابقین کی صداقت پر گواہی دیں گے جبکہ ان کی امتیں ان کی تکذیب کریں گے اور دوسرے احتمال سے کفار مراد ہوں

مطلب یہ ہے کہ انبیاء سابقین جیسا اپنی اپنی اُمت کے کفار فساق کے کفر و فسق کی گواہی دیں گے تم بھی اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان سب کی بداعمالی پر گواہ ہو گے جس سے ان کی خرابی اور برائی خوب محقق ہو گی۔[1]

اس سے پہلی آیت میں وعید اور وعدہ تھا اب یہاں حرف فا کے ذریعہ فقرہ لاکر کہا جا رہا ہے کہ جب اللہ سبحانہٗ کسی عامل کے عمل کو ذرہ برابر بھی ضائع نہ ہونے دے گا تو پھر اس روز جب پوری انسانیت اللہ کے حضور پیش ہوگی اور انبیاء شہادت کے لیے آئیں گے ان پر کیا بیتے گی۔ یعنی ان لوگوں کا کیا حال ہوگا جب میدان حشر میں ہر اُمت کا نبی اپنی اُمت کے نیک و بداعمال پر بطور گواہ پیش ہوں گے حضور انور بھی اپنی اُمت پر گواہ بن کر حاضر ہوں گے جیسے ہر دور کا پیغمبر اپنے دور کے لوگوں پر اللہ کی عدالت میں گواہی دے گا کہ زندگی کا وہ سیدھا راستہ اور فکر و عمل کا وہ صحیح طریق جس کی تعلیم آپ نے مجھے دی تھی اسے میں نے ان لوگوں تک پہنچا دیا تھا پھر بھی شہادت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دور کے لوگوں پر دیں گے اور قرآن سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا دور آپ کی بعثت کے وقت سے قیامت تک ہے۔[2]

مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اتمام حجت کا تعلق ہے اللہ نے اپنے رسُول کے ذریعے سے ان کو اپنے دین سے آگاہ کر دیا اور ان پر حجت تمام کر دی۔ اب دین و شریعت سے آگاہ کرنے کے معاملے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی۔ اس اتمام حجت کے بعد اگر یہ لوگ اللہ و رسول سے منحرف ہی رہے تو آج تو اپنے کفر و نفاق کو چھپا سکتے ہیں لیکن کل کو کیا کریں گے جب میدان حشر میں اللہ تعالیٰ تمام امتوں اور ان کے پیغمبروں کو جمع کر کے پیغمبروں سے گواہی دلوائے گا کہ انہوں نے لوگوں کو دین پہنچا دیا تھا اور اسی طرح کی گواہی آپ بھی اس امت کے لوگوں پر دینے کے لیے کھڑے کیے جائیں گے۔

گواہی دینے کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ انبیاء کہیں گے کہ ہم نے ان لوگوں کو دین پہنچایا تھا لیکن اس صورت میں انبیاء کی شہادت اپنے معاصر مخاطبین تک محدود رہے گی اس لیے کچھ علماء نے شہادت کا یہ مطلب بتایا ہے کہ ہر اُمت کے اعمال و افکار کو نبوت کے پیش کیے ہوئے علم و عمل سے مقابلہ کر کے دیکھا جائے گا۔ اس مقابلہ میں جو صحیح ہوں گے وہ کامیاب ہوں گے اور جو صحیح نہ ہوں گے وہ ناکام ہوں گے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

اگرچہ آیت میں ھاؤلاء کا اشارہ انبیاء سابقین کی طرف بتایا ہے لیکن قرآن کی دوسری آیت اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کردار سے ہم آہنگ بھی ہے کہ ھاؤلاء کا اشارالیہ آپ کی اُمت ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس طرح دوسری اُمتوں کے رسول اپنی اُمتوں پر گواہ ہوں گے اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی اپنی امت پر گواہ ہوں گے۔ قرآن میں دوسری جگہ صراحۃً آیا ہے لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیدا۔ اور صحیح بخاری میں حدیث ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے فرمایا کہ مجھ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عبداللہ مجھے قرآن سناؤ تو میں نے کہا کہ یارسول اللہ میں آپ کو قرآن سناؤں۔ قرآن تو آپ پر ہی نازل ہوا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں مجھے یہ پسند ہے کہ میں قرآن دوسرے سے سنوں۔ حضرت عبداللہ نے سورۃ نسآء کی تلاوت شروع کی جب اس زیر تشریح آیت پر پہنچے تو آپ نے فرمایا کہ بس کرو اور آپ کی آنکھوں سے آنسو جاری تھے۔ اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ابن ابی حاتم کے حوالہ سے یہی روایت دوسرے صحابی محمد بن فضالہ کے حوالہ سے اس طرح لکھی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بنی ظفر قبیلہ میں تشریف لائے اور آپ کی ہمرکابی میں عبداللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ تھے۔ آپ نے قرآن پڑھنے کا حکم دیا۔ آپ سن رہے تھے جب قاری اس آیت پر پہنچا فکیف اذا جئنا تو آپ رو پڑے اور شدت تاثر میں آپ نے فرمایا کہ:

یارب ھذا علی من انا بین ظھرانیہ فکیف بمن لم ارہ۔

یا اللہ ان پر تو میں گواہی دوں گا جن میں موجود ہوں مگر ان پر گواہی کیسے دوں گا جن کو میں نے دیکھا نہیں ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اس آیت میں ھاؤلاء سے مراد آپ کی اُمت ہے۔ سوچئے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہ آیت سن کر شدت تاثر سے کیوں آبدیدہ ہوئے؟ قسطلانی نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ آپ کو اس آیت سے آخرت کا منظر مستحضر ہو گیا۔ ابن بطال کہتے ہیں کہ رونے کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو قیامت کی ہولناکیاں یاد آئیں۔ پھر وہاں اُمت کے لیے اپنی شہادت اور شفاعت کے لیے جناب الٰہی میں درخواست کے مناظر یاد آ گئے۔ لیکن حافظ عسقلانی فرماتے ہیں کہ آپ کا رونا اپنی اُمت پر رحمت و شفقت کے تقاضے سے تھا۔ آپ کو یہ احساس ہوا کہ اُمت کے اعمال و افکار پر آپ کو گواہی دینی ہوگی اور اُمت کے افکار و اعمال جادۂ اعتدال پر نہ ہوں گے۔ اور اس کے نتیجہ میں اُمت کو سزا ملے گی۔

گویا آیت میں اشارہ کر دیا کہ اُمت کی تباہی و بربادی یہاں ہو یا وہاں ہمیشہ رسول کے لائے ہوئے علم و عمل سے انحراف کا نتیجہ ہوتی ہے۔

مفتی صاحب نے یہ بات برمحل فرمائی ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ گزشتہ اُمتوں کے انبیاء اپنی اپنی اُمتوں پر بطور گواہ پیش ہوں گے اور آپ بھی اپنی اُمت کے اعمال کی گواہی دیں گے۔ قرآن کریم کے اس اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کے بعد کوئی نبی آنے والا نہیں ہے جو اپنی کسی اُمت کے متعلق گواہی دے۔

قیامت کی ہولناکیاں

۸۰۔ اس روز کفر کی راہ پر چلنے والے اور رسول کے نافرمان تمنا کریں گے کہ کاش زمین کو ان پر برابر کر دیا جائے اور وہ اللہ سے کوئی بات نہ چھپا سکیں گے۔ یعنی جس دن ہر اُمت میں ان کے حالات بیان کرنے والا بلایا جائے گا اس دن کافر اور نافرمان لوگ اس بات کی تمنا کریں گے کہ کاش ہم زمین میں ملا دیے جاتے اور مٹی میں مل کر نیست و نابود ہو جاتے، آج پیدا نہ ہوتے اور ہم سے حساب و کتاب نہ ہوتا۔ اور وہ لوگ اللہ تعالیٰ سے کسی بات کو چھپا نہ سکیں گے اور ذرہ ذرہ کا حساب ہوگا۔[1]

اس آیت میں صرف کافر کا نہیں بلکہ اس کے ساتھ عاصی کا بھی ذکر فرمایا ہے اور بتایا ہے کہ اس دن وہ سارے لوگ جنہوں نے کفر اور نافرمانی رسول کا ارتکاب کیا ہوگا یہ آرزو کریں گے کہ کاش وہ زمین میں دھنس جائیں اور زمین ان کے سمیت برابر کر دی جائے اس دن کوئی شخص خدا سے کوئی بات نہ چھپا سکے گا۔

اس فقرہ کا استیناف اور انداز بتا رہا ہے کہ پہلی آیت میں آتے ہوئے سوالیہ نشان کیف کا جواب ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ روز جب ہم ہر اُمت کے لیے اس کے رسول کو گواہ بنا کر لائیں گے اس روز لوگوں کا کیا حال ہوگا؟ جواب میں ارشاد ہوا ہے کہ لوگوں کا حال یہ ہوگا کہ کفر کرنے والے اور رسالت کے نافرمان اس روز کی ہولناکیوں کو دیکھ کر مٹی ہو کر زمین میں مل جانے کی آرزوئیں کریں گے جیسا کہ سورۂ نبا میں ہے ویقول الکافر یا لیتنی کنت ترابا۔ کچھ کی رائے میں مطلب یہ ہے کہ دفن ہونے کی آرزو کریں گے اور کچھ کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ تمنا کریں گے کہ ساری روئے زمین کے مالک ہوں اور اسے فدیہ میں دے کر چھٹکارا پا لیں۔

اور آخر میں فرمایا کہ و لا یکتمون اللہ حدیثا۔ یعنی وہ دن ایسا ہوگا کہ جو کچھ کیا ہے سب ظاہر ہو جائے گا اور جس طرح دُنیا میں چھپ چھپا کر گزارہ کر لیتے تھے وہاں اخفا کا پردہ کوئی نہ ہوگا اور کوئی بات اللہ سے نہ چھپا ئیں گے۔ نہ چھپانے میں ایک لطیف تعریض بھی ہے دُنیا میں یہ لوگ اللہ کی دی ہوئی دولت اور

[1] افادات شیخ الاسلام

نعمت کو چھپاتے رہے ہیں جیسا کہ پہلے پڑھ چکے ہو ویکتمون ما اتاھم اللہ من فضلہ لیکن اس روز الٹے کچھ بھی چھپا نہ سکیں گے ہر چیز کھل کر بے نقاب اور ظاہر ہو جائے گی ۔

بہرحال اس آیت میں قیامت کے دن کی ہولناکی پیش کی گئی ہے جس سے اس عظیم الشان دن میں انسان کی بے کسی، عاجزی اور ہر چیز کے کام آنے سے سوائے ایمان وعمل کے قطعی مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔ قرآن کے دوسرے مواقع پر بھی مختلف عنوانوں اور مختلف پیرایوں میں اس دن کی ہولناکی کا نقشہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر فرمایا ہے کہ لوگ اس روز پریشان پروانوں کی طرح اور پہاڑ روئی کے گالوں کی طرح ہو جائیں گے (القارعہ) ایک اور جگہ ہے کہ وہ دن ایسا ہولناک ہوگا کہ اس کی ہولناکی بچوں کو بوڑھا بنا دے گی۔ (مزمل) اس کی تفصیلی مباحث انشاء اللہ اپنے اپنے موقعہ پر آئیں گے۔ یہاں قرآن کفر پیشہ طبیعت اور عصیان کیش مزاج رکھنے والوں کو خبردار کر رہا ہے کہ زندگی کے افکار و اعمال پر اگر نبوت کے فکر وعمل کی شہادت نہ ہوگی تو اس کے حالات جو کچھ، جتنے کچھ اور جیسے کچھ سنگین سے سنگین تر ہوں ان کا اندازہ کرنے کے لیے یہی بات ہوش مند کے لیے کافی ہے کہ ہر شخص پیوند زمین ہو کر حشر کی رسوائی سے بچنے کی آرزو کرے گا۔ اور کیوں نہ کرے جبکہ وہ دن اللہ کی عدالت میں پیش ہونے کا دن ہوگا یوم یقوم الناس لرب العالمین جس روز ہر شخص اپنے بھائی، ماں، باپ، بیوی اور بیٹے سے بھاگے گا یوم یفر المرء من اخیہ جس روز کوئی کسی کے کام نہ آئے گا یوم لا تجزی نفس عن نفس جس روز خود انسانوں کی زبانیں ان کے خلاف گواہی دیں گی یوم تشھد علیھم السنتھم جس روز کوئی دوست کسی دوست کے کام نہ آئے گا یوم لا یغنی مولی عن مولی جس روز ظلم پیشہ لوگ ندامت سے اپنے ہاتھ کاٹیں گے یوم یعض الظالم جس روز عدالت الٰہی میں گواہ آموجود ہوں گے یوم یقوم الاشھاد۔ الغرض یہ دن بے حد ہولناک ہوگا یہ اپنی ہولناکی کی وجہ سے الطامۃ الکبریٰ (بڑی مصیبت) ہے یوم عسیر، یوم عظیم، یوم عصیب، یوم الحسرۃ ہے اور اپنی ہولناکیوں کی وجہ سے اسے القارعہ، الغاشیہ کہا گیا ہے ۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ
تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ وَلَا جُنُبًا إِلَّا عَابِرِي سَبِيلٍ حَتَّىٰ
تَغْتَسِلُوا ۚ وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ
مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا مَاءً فَتَيَمَّمُوا
صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ
عَفُوًّا غَفُورًا ﴿۴۳﴾

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تا آنکہ تم ایسی حالت میں ہو جاؤ کہ جو کچھ کہہ رہے ہو اس کا تمہیں پتہ ہو، اور ایسے ہی جب تم نہانے کی حاجت والے ہو تو اس حالت میں بغیر غسل کے نماز نہ پڑھو مگر یہ کہ تم مسافر ہو۔ اور اگر تم بیمار ہو یا حالتِ سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کر کے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو چھویا ہو اور تمہیں غسل کے لیے پانی

دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر لو اور مسح کر لو چہروں کا اور ہاتھوں کا[۸۲]۔ بلاشبہ اللہ درگزر کرنے اور بخشنے والا ہے[۸۳]۔

نماز کے ذریعے اخلاقی مشکلات پر قابو

شروع سورت سے مسلمانوں کو رشتہ داروں اور ازدواجی زندگی کے حقوق کی ادائیگی کی تاکید اور کسی کی حق تلفی کرنے اور جانی مالی نقصان پہنچانے کی ممانعت اور معاصی کی خرابی پر مطلع کر کے اس کے بعد واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئاً فرما کر اقارب اور یتامٰی اور مساکین اور ہمسایوں وغیرہ کے ساتھ احسان و سلوک کرنے کا ارشاد کر کے اسی کے ذیل میں تکبر اور خود پسندی اور بخل و ریا سے ڈرایا تھا جو ایسے عیب ہیں کہ دوسروں کے حق ادا کرنے اور کسی کے ساتھ سلوک کرنے سے روکتے ہیں۔ اور روپیہ پیسہ دینے والوں اور لوگوں کے ساتھ سلوک کرنے والوں کی طبیعت میں خواہ مخواہ آ نے بھی لگتے ہیں۔ اب تمام حکموں کے آخر میں پھر مسلمانوں کو صریح خطاب فرما کر خاص نماز کی بابت جو سب عبادتوں میں اعلیٰ و افضل ہے اور شریعت میں جس قدر اس کا اہتمام کیا ہے اور اس کے ارکان و شرائط و آداب وغیرہ کو مفصل بتلایا ہے۔ کسی عبادت کا اس قدر اہتمام نہیں کیا۔ دو باتوں کی تاکید فرمائی جو امور متعلقہ صلوٰۃ میں سب سے اہم اور نفس پر شاق ہیں اور ارکانِ صلوٰۃ کی صحت اور خوبی کے جسم اور جان ہیں۔ اوّل یہ کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تاوقتیکہ جو مُنہ سے نکلے اس کو سمجھ بھی لو اور جنابت میں بھی نماز سے دُور رہو یہاں تک کہ غسل کر کے تمام بدن کو خوب پاک کر لو کیونکہ نماز میں دو امر نہتم بالشان ہیں ایک حضور اور خشوع دوسرے طہارت اور نظافت اور جملہ امور متعلقہ صلوٰۃ میں بھی دو امر نفس پر شاق ہیں اور نشہ خشوع و حضور کے منافی ہے تو جنابت طہارت اور نظافت کے مخالف ہے بلکہ نشہ چونکہ مثل نوم اور غشی ناقض وضو ہے تو اس لیے طہارت کے بھی مخالف ہے تو حاصل یہ ہوا کہ نماز کو پورے اہتمام سے ادا کرو اور جملہ امور ظاہری و باطنی کا لحاظ رکھو گو نفس پر شاق ہو۔ باقی اس خاص موقعہ پر اس تاکید اور تقید سے دو فائدے معلوم ہوتے ہیں۔ اول یہ کہ احکام کثیرہ مذکورہ بالا جن میں حقوق و معاملات باہمی اور عبادتِ جانی و مالی کا ذکر تھا۔ ان سب کو بجالانے کے ساتھ بخل اور ریا اور خود پسندی اور بڑائی سے بھی مجتنب رہنا چونکہ نفس پر شاق ہے اور سننے

والوں کو غلبان کا موقع ہے تو اس دشواری اور غلبان کا علاج بتانا مقصود ہے۔ یعنی نماز کو اس کی شرائط و آداب ظاہری و باطنی کے ساتھ ادا کرو گے تو جملہ اوامر و نواہی مذکورہ بالا کی تعمیل تم پر آسان ہو جائے گی کیونکہ نماز کی وجہ سے جملہ اوامر و عبادات میں سہولت اور رغبت اور تمام منہیات اور معاصی سے نفرت پیدا ہو جاتی ہے جیسا کہ دیگر آیات و احادیث میں مذکور ہے اور علمائِ محققین نے تصریح کی ہے۔ دوسرے یہ کہ احکام کثیرہ سابقہ کو سن کر بعید نہیں جو کاہلی اکم ہمت اپنے آپ کو مجبور خیال کرکے ہمت ہار دیں اور اس کاہلی کا اثر نماز میں بھی ظاہر ہونے لگے جس کے شرائط و آداب بہت کچھ ہیں اور جو ہر وقت موجود ہے اس لیے نماز کا اہتمام مناسب ہوا۔ الحاصل جو کوئی اقامتِ صلوٰۃ کا اہتمام اور التزام رکھے گا اس کو دیگر احکام جانی و مالی میں بھی آسانی و سہولت ہو گی اور جو کوئی دیگر احکام میں کاہلی اور بے پروائی کرتا ہے اس سے اقامتِ صلوٰۃ میں کوتاہی کرنا بعید نہیں واللہ اعلم [1]

مطلب یہ ہے کہ معاشرتی زندگی کے جو حقوق و فرائض بیان کیے گئے ہیں اگر تم چاہتے ہو کہ ان کی اخلاقی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہو تو چاہیے کہ خدا کے ذکر و عبادت سے اپنی ایمانی قوت مضبوط کرتے رہو جو جماعت نماز کی حقیقت سے محروم ہو گی یعنی عبادت کے خشوع و خضوع کا اس میں ذوق نہ ہو گا وہ کبھی عملی زندگی کی اخلاقی مشکلوں پر قابو نہیں پا سکتی۔

۱۸۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی تم نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تا آنکہ تم ایسی حالت میں ہو جاؤ کہ جو کچھ کہہ رہے ہو اس کا تمہیں پتہ ہو اور ایسے ہی جب تم نہانے کی حاجت میں ہو تو اس حالت میں بغیر غسل کے نماز نہ پڑھو مگر یہ کہ تم سفر کر رہے ہو۔ پہلی آیات میں مسلمانوں کو خطاب تھا واعبدوا اللہ ولا تشرکوا بہ شیئا الی آخر الآیات، اور اسی کے ذیل میں کفار کی مذمت بیان فرمائی تھی جو کہ امورِ مذکورہ سابقہ کی مخالفت کرتے تھے۔ اب اس کے بعد پھر مسلمانوں کو نماز کے موضوع پر خاص ہدایات دی جا رہی ہیں۔ ان ہدایات کو پہلی آیات کے ساتھ یہ مناسبت ہے کہ اس سے پہلے کفر کی دو خرابیوں کا خاص طور پر ذکر کیا تھا۔ ایک اللہ پر ایمان نہ لانا دوسرے اپنا مال اللہ کے لیے خرچ نہ کرنا بلکہ لوگوں کے دکھانے کو اور اپنی عزت بڑھانے کو مال خرچ کرنا اور ظاہر ہے کہ پہلی خرابی کا منشا تو علم کا نقصان اور جہل کا غلبہ ہے اور دوسری خرابی کی وجہ ہوائے نفس اور اپنی خواہش ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ گمراہی کے دو بنیادی سبب ہیں اول جہالت جس میں حق و باطل کی تمیز نہیں ہوتی، دوسرے ہوائے نفس جس سے باوجود تمیز حق و باطل کے حق کے مطابق عمل نہیں ہوتا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کیونکہ شہوت سے قوت ملکی کمزور اور قوت بہیمی طاقتور ہوجاتی ہے اس کے نتیجہ میں ملائکہ سے بُعد اور شیاطین سے قرب ہوجاتا ہے۔ یہ بہت سی خرابیوں کی جڑ ہے اس لیے اسی مناسبت سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو اولاً نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے منع فرمایا کیونکہ یہ نادانی کی حالت ہے۔ اس کے بعد جنابت کی حالت میں نماز پڑھنے سے روکا۔ یہ حالت ملائکہ سے بعد اور شیاطین سے قرب کی حالت ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ جہاں جُنبی ہوتا ہے وہاں ملائکہ نہیں آتے واللہ اعلم۔ اب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اے ایمان والو جب تم کو کفر اور ریا کی خرابی معلوم ہو چکی اور ان کے اضداد کی خوبی واضح ہو چکی ہے تو اس سے نشہ اور جنابت کی حالت میں نماز پڑھنے کی خرابی کو بھی خوب سمجھ لو کہ ان کا منشا بھی وہی ہے جو کفر وریا کا منشا تھا اس لیے نشہ میں نماز کے نزدیک نہ جانا چاہیے تاوقتیکہ تم کو اس قدر ہوش نہ آجائے کہ جو منہ سے کہو اس کو سمجھ بھی سکو۔ اور حالت جنابت میں نماز کے نزدیک نہ جانا چاہیے تاوقتیکہ غسل نہ کرلو مگر حالتِ سفر میں کہ اس کا حکم آگے آرہا ہے۔

نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھنے کا حکم اس وقت تھا کہ نشہ اس وقت تک حرام نہ ہوا تھا لیکن نشہ کی حالت میں نماز پڑھنے سے روک دیا گیا تھا۔ روایات میں منقول ہے کہ صحابہ کی ایک جماعت دعوت میں جمع تھی چونکہ شراب اس وقت تک حرام نہ ہوئی تھی اس لیے انہوں نے شراب پی تھی، مغرب کا وقت آگیا تو سب اسی حالت میں نماز کو کھڑے ہو گئے۔ امام نے سورہ الکافرون پڑھی اس میں لا اعبد ما تعبدون کی جگہ اعبد ما تعبدون بیہوشی میں پڑھ دیا جس سے معنے بالکل خلاف اور غلط ہو گئے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اب اگر نیند کے غلبہ یا بیماری کی وجہ سے کسی کا ایسا حال ہو جائے کہ اس کی خبر نہ رہے کہ میں نے کیا کہا تو ایسی حالت کی نماز بھی درست نہ ہوگی جب ہوش آئے تو اس کی قضا ضرور کرے۔[1]

یہ آیت قرآنی بھی من جملہ ان آیات سے ہے جس میں مسائل کی بہتات ہے اور گو سورہ مائدہ میں بھی یہی مسائل آرہے ہیں لیکن ضروری ہے کہ یہاں وضاحت کر دی جائے تاکہ آئندہ جہاں یہ مسائل متفرق طور پر بطور مثلات آئیں ذہن فہم و تدبر کے لیے تیار رہے۔

شراب کی حرمت تاریخ میں

الف: سب سے پہلے یہ بات کہی گئی ہے کہ نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ اس میں دو باتیں سمجھنے کی ہیں ایک یہ کہ نشہ کی حالت سے کیا مراد ہے دوسرے یہ کہ نماز سے نماز مراد ہے یا جائے نماز یعنی مساجد۔

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن کا نزول ہوا تو عرب کے لوگ صدیوں سے شراب کے عادی تھے مشکل تھا کہ بیک بار باز آ جاتے،
اس لیے بتدریج ممانعت کے احکام نازل ہوئے۔
سب سے پہلے مکہ میں اس موضوع پر یہ آیت نازل ہوئی۔

و من ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منہ سکرا و رزقا حسنا

اور تم کھجور اور انگور کے پھلوں سے نشہ آور عرق اور اچھی غذا بناتے ہو۔

اس آیت میں نشہ آور سکر کو رزق حسن سے الگ کر کے اشارہ کر دیا تھا کہ نشہ آور چیز رزق حسن نہیں ہے یہ آیت مکی ہے اور شراب حرام ہونے سے بہت پہلے نازل ہوئی۔

بعد ازیں شراب کے موضوع پر وہ آیت نازل ہوئی جو سورۃ البقرہ میں ہے کہ

یسئلونک عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما۔

پوچھتے ہیں کہ شراب اور جوئے کا کیا حکم ہے کہہ دو کہ ان دونوں میں بہت بڑی خرابی ہے اگرچہ ان میں لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے زیادہ ہے۔

غالبا ۳ھ کے آخر میں یہ دوسرا حکم آیا ہے کیونکہ حضرت حمزہ کی شہادت تک شراب حرام نہیں ہوئی تھی۔ صحیح بخاری میں ایک روایت ہے؛

غزوۂ بدر میں حضرت علی کو مال غنیمت میں سے ایک اونٹنی ملی تھی۔ خمس میں سے ایک اور اونٹنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عطا فرمائی تھی۔ حضرت علی کا نکاح حضرت فاطمہ سے ہو چکا تھا اور وہ دعوت ولیمہ کی تیاری کر رہے تھے۔ ارادہ تھا کہ جنگل میں جا کر اذخر (ایک جنگلی گھانس) لائیں اور سناروں کے ہاتھ بیچیں۔ اس ارادے سے باہر نکلے تو دیکھا کہ ان کی اونٹنیوں کے کوہان کسی نے کاٹ لیے ہیں اور پیٹ چاک کر کے کلیجہ نکال لیا ہے۔ لوگوں سے پوچھا کہ یہ کس نے کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ پاس ہی ایک گھر میں حضرت حمزہ چند انصاریوں کے ساتھ شراب پی رہے تھے ایک مغنیہ نے گاتے گاتے یہ مصرع پڑھا،

الا یا حمز للشرف النواء

اے حمزہ موٹی اونٹنیوں کے لیے۔

حضرت حمزہ تلوار لے کر اٹھے اور اونٹنیوں کے پیٹ چاک کر کے ان کے کلیجے نکال لیے۔ حضرت علی نے جا کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر کی اور واقعہ سنایا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے چادر اوڑھی اور حضرت علی اور زید کو لے کر حضرت حمزہ کے پاس گئے۔ حضرت حمزہ مخمور تھے۔ حضور انور کی طرف نظر اٹھا کر

دیکھا اور کہا تم سب میرے باپ کے غلام ہو۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہ حالت دیکھ کر تشریف لے آئے حضرت حمزہ نے ۱۵ھ شوال ۳ھ میں شہادت پائی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ سورہ بقرہ کی یہ آیت ۳ھ میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں صرف یہ ظاہر کر کے چھوڑ دیا گیا تھا کہ شراب بُری چیز ہے اللہ کو پسند نہیں چنانچہ مسلمانوں میں سے ایک گروہ اس کے بعد ہی شراب سے پرہیز کرنے لگا تھا مگر بہت سے لوگ بدستور پیتے رہے حتیٰ کہ بسا اوقات نشے کی حالت میں نماز پڑھنے کھڑے ہو جاتے اور کچھ کا کچھ پڑھ جاتے۔ واقعہ کی طرف شیخ الاسلام نے اپنے فوائد میں اشارہ کیا ہے۔ یہ واقعہ حدیث کی مختلف کتابوں میں مختلف طریقے سے آیا ہے۔

نشہ میں امامت والی روایت

اس موضوع پر کچھ روایات آئی ہیں۔ یہ بات کہ یہ کون صحابی تھے جنہوں نے نشہ کی حالت میں امامت کرائی۔ روایات سے صاف طور پر ظاہر نہیں ہوتا۔ ایک روایت میں حضرت علی کا نام ہے اور دوسری میں عبدالرحمان بن عوف کا نام ہے، تیسری میں کوئی مہاجر مذکور ہے۔ ترمذی نے کتاب التفسیر میں اور ابوداؤد نے کتاب الاشربہ میں امام حضرت علی کو قرار دیا ہے اور حاکم نے مستدرک کی دو روایتوں میں حضرت عبدالرحمان بن عوف کا نام بتایا ہے اور حاکم ہی نے مستدرک میں امام ایک اور شخص کو بتایا ہے۔ ان روایتوں میں مختلف قسم کے اختلافات ہیں۔ مثلاً

۱۔ ترمذی اور مستدرک حاکم کی روایت میں ہے کہ دعوت کرنے والے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تھے جبکہ مستدرک کی دو روایتوں میں ہے کہ داعی کوئی انصاری تھے۔ اور مستدرک حاکم کی کتاب الاشربہ میں دعوت کے بغیر مجلس شراب کا ذکر ہے۔

۲۔ ترمذی اور ابوداؤد کی روایت میں ہے کہ حضرت علی امام تھے جنہوں نے نشہ کی حالت میں کچھ کا کچھ پڑھ دیا اور مستدرک حاکم کتاب الاشربہ کی تین روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ امام حضرت عبدالرحمٰن بن عوف تھے اور مستدرک ہی کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی مہاجر امام تھا۔

۳۔ روایتوں میں ہے کہ اس دعوت کی مجلس میں شراب تھی لیکن مستدرک حاکم کی تفسیر سورہ نساء والی روایت میں شراب کا ذکر نہیں ہے بلکہ وہ جو امام بنا تھا وہ کہیں سے پی کر آیا تھا۔

مولانا شبلی نعمانی نے سیرۃ النبی میں ترمذی اور ابوداؤد کی روایت کی وجہ سے امامت کے سلسلے میں حضرت علی کا نام لکھا ہے لیکن سید سلیمان کے نزدیک امامت کی نسبت حضرت علی کی طرف مشکوک ہے

ان کا کہنا یہ ہے کہ ،

حضرت علی کا شراب پینا جو بچپن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت و تربیت میں پل کر جوان ہوئے قیاس کے خلاف ہے ۔

اور مولانا فرماتے ہیں ؛

سب سے پہلا راوی ان روایتوں میں ابوعبدالرحمٰن السلمی ہے جس کا نام عبداللہ ابن حبیب ہے، وہ پہلے حضرت علی کا طرفدار تھا بعد کو عثمانی بنی امیہ کا طرفدار ہوگیا ۔ پھر اس کا یہ دعویٰ کہ اس نے حضرت علی سے سُنا ہے مسلّم نہیں ہے بخاری نے اس کو مانا ہے لیکن ابن ابی حاتم نے اس سے انکار کیا ہے،

اور نتیجہ یہ نکالا ہے کہ ،

ابوعبدالرحمٰن السلمی عثمانی نے فرقہ داری کے جذبہ میں یا عطا نے ذراسی بھول میں واقعہ کی نسبت ادھر سے ادھر کر دی ۔

اور آخر میں حاکم محدث کا فیصلہ یہ لکھا ہے کہ

خارجیوں نے اس نشہ اور غلط قرأت کو امیر المومنین علی ابن ابی طالب کی طرف منسوب کیا ہے اللہ نے ان کو اس الزام سے بری کر دیا ۔

اور مولانا نے یہ فیصلہ دیا ہے :

درحقیقت حضرت علی واقعہ کے راوی تھے لیکن عثمانی اور خارجی راوی نے حضرت علی کو صاحبِ واقعہ بنا دیا ۔

افسوس کہ ہمیں سید صاحب کی اس تحقیق سے اتفاق نہیں ہے ، بات وہی صحیح ہے جو مولانا شبلی نے فرمائی ہے ۔ شراب حرام ہونے سے پہلے شراب کا پینا کوئی گناہ نہیں ہے ۔ اس سے دامان تقویٰ اور تقدس پر کوئی داغ نہیں آتا ۔ جب یہ گناہ نہیں ، جرم شرعی نہیں تو کوئی کرے اس میں سارے صحابہ برابر ہیں ۔ آپ ابھی ابھی سید الشہداء حمزہ کے بارے میں پڑھ چکے ہیں کہ انہوں نے شراب اس وقت پی تھی جب کہ شراب حرام نہ تھی ۔

باقی سید صاحب کی ابوعبدالرحمٰن السلمی کی جامہ تلاشی کرنا اور ان کو عثمانی قرار دے کر ان کی طرف غلط گوئی اور اور غلط بیانی کی نسبت کرنا بہت بڑی زیادتی ہے ۔ امام ابن ابی حاتم کے یہ کہنے سے کہ ان کی روایت حضرت علی سے ثابت نہیں ہے یہ نتیجہ نکالنا کہ ان کی روایت صحیح نہیں عجیب ہے ۔ تاریخ میں آج تک ان کی ثقاہت اور دیانت پر کوئی حرف گیری نہیں کی گئی ہے ۔ حافظ ابن عبدالبر نے ڈنکے کی چوٹ

کہا ہے ھو عند جمیعھم ثقۃ ابوعبدالرحمٰن سب کے یہاں ثقہ ہیں۔ بلاشبہ ان کے سماع میں اختلاف ہے امام شعبہ فرماتے ہیں کہ ابوعبدالرحمٰن نے عبداللہ بن مسعود سے اور حضرت عثمانؓ سے نہیں بلکہ حضرت علی سے سنا ہے اور یحییٰ ابن معین کہتے ہیں کہ ابوعبدالرحمٰن کو حضرت عمر سے شرفِ سماع حاصل نہیں ہے۔ اور امام بخاری فرماتے ہیں کہ ابوعبدالرحمٰن نے حضرت علی، حضرت عثمان اور حضرت عبداللہ بن مسعود سے سنا ہے اور واقدی کہتے ہیں کہ صفین کی جنگ میں حضرت علی کے ساتھ موجود تھے۔ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں۔

> ابوعبدالرحمٰن السلمی اور دیگر علمائے کوفہ جیسے علقمہ، اسود، حارث، لیثی، زر بن حبیش کہ جن کے پاس عاصم بن ابی النجود نے قرآن پاک کی قرأت کی ہے۔ ان سب لوگوں نے حضرت عبداللہ بن مسعود سے قرآن پاک سیکھا ہے۔ نیز یہ لوگ مدینہ جاکر حضرت عمر، حضرت عائشہ سے علم کی تحصیل کرتے تھے۔ بلکہ ان حضرات نے حضرت عمر، حضرت عائشہ سے جتنا علم حاصل کیا اتنا علم حضرت علی سے نہیں کیا اور کوفہ کے قاضی شریح نے فقہ کی تعلیم حضرت معاذ بن جبل سے یمن میں حاصل کی تھی۔[1]

لہٰذا یہ کہنا کہ ابوعبدالرحمٰن السلمی نے عثمانی ہونے کی وجہ سے معاذاللہ حضرت علی کا نام یوں ہی کہہ دیا خلافِ واقعہ ہے۔ ابوعبدالرحمٰن نے تو بلاریب عثمانی ہونے کی وجہ سے ایسا نہیں کیا لیکن حاکم نے غالی شیعہ ہونے کی وجہ سے یہ ہاتھ کی صفائی ضرور دکھائی ہے کہ حضرت علی کا نام ہٹا کر عبدالرحمٰن بن عوف اور کسی مہاجر کا نام لے دیا۔ امام حاکم کی وفات ۴۰۵ھ میں ہو رہی ہے جبکہ ترمذی ان سے پہلے ۲۷۹ھ میں اور ابو داؤد ۲۷۵ھ میں فوت ہو چکے ہیں۔ ابوداؤد کی سنن میں اور ترمذی کی جامع میں حضرت علی کا نام ہونا اور پورے ایک سو چھبیس سال کے بعد امام حاکم کی مستدرک میں عبدالرحمٰن کا نام ہونا پورے کیس کو مشکوک بنا دیتا ہے۔ ہمارے خیال میں ابوداؤدؒ اور ترمذی کے مقابلہ میں حاکم کے بیان کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ اللہ اکبر حاکم ایک صدی کے بعد ان اربابِ سنن کو خارجی بتا رہا ہے فالی اللہ والی اللہ المشتکیٰ۔

بہرحال نشہ کی حالت میں نماز پڑھی گئی اور نماز میں قل یاایہا الکافرون کو کچھ کا کچھ پڑھ دیا۔ اس پر غالباً ۴ھ کی ابتداء میں یہ نیا حکم آیا اور نشے میں نماز پڑھنے کی ممانعت کر دی گئی۔ اس کے بعد جب نماز کا وقت آتا تو منادی اعلان کرتا کہ کوئی مخمور نماز میں شامل نہ ہونے پائے۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ لوگوں نے نماز کے اوقات میں شراب پینی چھوڑ دی اور آپ نے شراب پینے کے اوقات تبدیل کر دیے۔ اصل

---

[1] منہاج السنۃ ج ۴ ص ۱۴۲

ارشاد میں سکاریٰ کے الفاظ آئے ہیں یہ سکران کی جمع ہے۔ سکران نشہ والے کو کہتے ہیں، نشہ خواہ کسی چیز سے ہو۔ جیسا کہ شیخ الاسلام نے اشارہ کیا ہے۔

صلوٰۃ مراد نماز یا مسجد

ب، ۲ لا تقربوا الصلوٰۃ میں صلوٰۃ سے کچھ علماء نے نماز مراد لی ہے اور کچھ نے جائے نماز یعنی مسجد مراد لی ہے۔ جن لوگوں نے صلوٰۃ سے نماز نہیں بلکہ نماز کی جگہ مراد لی ہے ان کا موقف یہ ہے کہ جس طرح کبھی ظرف بولتے ہیں اور مظروف اس کے مفہوم میں آپ سے آپ داخل ہو جاتا ہے اسی طرح کبھی مظروف بولتے ہیں ظرف مراد ہوتا ہے بشرطیکہ قرائن موجود ہوں۔ یہاں دو قرینے موجود ہیں جو اس کی دلیل ہیں کہ آیت میں صلوٰۃ کا لفظ موضع صلوٰۃ کے لیے آیا ہے ایک یہ کہ فرمایا ہے کہ نشہ اور جنابت کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ ظاہر ہے کہ اگر صلوٰۃ سے نماز مراد ہو تو اس کے لیے نماز کے قریب نہ پھٹکو کی تعبیر نہیں بلکہ نماز نہ پڑھو کی تعبیر ہوتی، دوسرے یہ کہ اس آیت الا عابری سبیل کا استثنا موجود ہے۔ عبور کے معنے گزر جانا ہیں۔ یہ گزر جانا نماز کے ساتھ نہیں بلکہ جائے نماز کے ساتھ مناسبت رکھتا ہے، ہماری رائے میں صلوٰۃ سے مراد نماز ہے کیونکہ یہی اس کے حقیقی معنے ہیں حقیقی معنے کو چھوڑ کر بلا ضرورت مجازی معنے مراد لینا ٹھیک نہیں ہے۔ جو دو قرینے بتائے گئے ہیں وہ معنے حقیقی سے ہٹنے کے لیے کافی نہیں ہیں لا تقربوا قریب نہ پھٹکو کو اس کا قرینہ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ بلیغ انداز بات کو مؤکد بنانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے جیسے لا تقربوا مال الیتیم میں ہے۔ یہاں کوئی نہیں کہہ سکتا ہے کہ مال یتیم سے وہ صندوق یا گھر مراد ہے جہاں مال یتیم رکھا ہوا ہے اور ایسے ہی عابری السبیل میں بھی اس کا قرینہ بننے کی صلاحیت نہیں ہے کیونکہ یہاں عابر سبیل مسافر کے معنے میں ہے۔ خود ایک ارشادِ نبوت میں یہ لفظ مسافر اور راہ گیر کے معنے میں آیا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ دنیا میں ایسے رہ جیسے کہ تو پردیسی ہے یا راستہ چلتا مسافر، اصل الفاظ یہ ہیں او عابری السبیل یعنی جس طرح کوئی مسافر پردیس کو اپنا اصلی وطن نہیں سمجھتا اسی لیے تمہیں بھی چاہیے کہ اس دنیا کو اپنا اصلی وطن نہ سمجھو اس لیے سفر کے لیے اس تعبیر کو اجنبی کہنا زیادتی ہے۔ اس کے برعکس خود اس آیت میں اس حکم یعنی لا تقربوا الصلوٰۃ کی غایت حتی تعلموا ما تقولون بانگ دہل اعلان کر رہی ہے کہ اس ارشاد میں صلوٰۃ سے مراد نماز ہے نہ کہ جائے نماز یعنی مسجد۔ ظاہر ہے کہ مسجد میں پڑھا یا کہا نماز میں جا رہا ہے نہ کہ مسجد میں۔ یعنی نشہ کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ تاکہ تم جان لو

جو کچھ تم کہہ رہے ہو جیسے حتیٰ تغتسلوا حالتِ جنابت میں جوازِ صلوٰۃ کی غایت ہے ایسے ہی حتیٰ تعلموا ما تقولون حالتِ نشہ میں جوازِ صلاۃ کی غایت ہے دونوں کا وزن یکساں ہے۔

نماز میں جاننے کا مفہوم

ج ۱۔ آیت کا موضوع نماز کی ممانعت نہیں بلکہ نماز کے اوقات میں شراب کی ممانعت ہے حتیٰ تعلموا ما تقولون کو غایت بنا کر پیش کرنا اس کی دلیل ہے یعنی اگر اس حالت میں ہو کر منہ سے جو کچھ کہہ رہے ہو اسے جانتے ہو تو نماز پڑھنی چاہیے۔ اور یہ فقرہ خود اس بات کی بھی غمازی کر رہا ہے کہ نماز میں قراءت فرض ہے چونکہ نشہ کی حالت میں نمازی اس فرض کی بجا آوری سے محروم ہو جاتا ہے اس لیے نماز کے اوقات میں شراب پینے سے روک دیا گیا ہے۔ اگر قرأت نماز میں رکن نہ ہوتی تو یہ ممانعت ہی نہ ہوتی۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہاں یہ بات بڑی لطیف لکھی ہے کہ اس ارشاد میں تنبیہہ ہے کہ نماز نمازی اپنے حضور قلب کے ساتھ ادا کرے کہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے جانے اور یہ بھی اس آیت کا مطالبہ ہے کہ نمازی قرآن کے معانی سیکھے، اس پر غور و فکر کرے اور ایسی تمام چیزوں سے بچ کر رہے جو حضور قلب میں رکاوٹ بن کر رہیں۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ حضرت امام شافعی نے الرسالہ میں لکھا ہے:

> ہر مسلمان کی ذمہ داری میں یہ بات داخل ہے کہ اتنی عربی زبان ضرور سیکھے کہ اللہ کی توحید اور محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی شہادت دے سکے اور کتاب اللہ کی تلاوت کر سکے اور جو اذکار اللہ نے فرض کیے ہیں یعنی تکبیر و تسبیح، تشہد وغیرہ ان کو بول سکے، اور اس سے زیادہ زبان نبوت کا علم اس کے لیے فضیلت ہے۔ (الرسالہ ص ۹)

آیت بتا رہی ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہے اسے اس کا علم ہونا چاہیے سید رشید رضا کا یہ کہنا اسی معنے کے لحاظ سے ہے کہ:

> آیت دلیل ہے اس بات کی کہ ہر مسلمان پر اتنی عربی زبان کا سیکھنا واجب ہے کہ وہ نماز میں جو کچھ کہتا ہے اسے جان سکے۔

مطلب یہ ہے کہ نماز کو نمازی قلب و دماغ حاضر کر کے ادا کرے۔ حضور کے دو درجے ہیں ایک یہ کہ جانے کیا کر رہا ہوں، دوسرے یہ کہ جانے کیا کہہ رہا ہوں۔ قرآن نے اس آیت میں دوسری بات کا مطالبہ کیا ہے یعنی یہ جانے کہ کیا کہہ رہا ہوں۔

یعنی نماز میں جو کچھ پڑھا جاتا ہے اس کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اگر بے پروائی کی وجہ سے

معنوں کی طرف دل متوجہ نہ ہوا تو اس سے دل پر کچھ اثر نہ ہوگا۔ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ نماز میں جو کچھ پڑھا جائے اس کے سمجھنے کی ضرورت ہے۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے نیند کے غلبہ کی حالت میں نماز پڑھنے کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس میں بھی انسان فہم و تدبر سے عاری ہو جاتا ہے۔ چنانچہ حدیث میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ:

نماز میں جب تم پر نیند غالب آجائے تو سو جاؤ کیونکہ اگر نیند کی حالت میں نماز پڑھو گے تو ممکن ہے کہ دعا کی بجائے اپنے آپ کو برا بھلا کہنے لگو۔

دوسری روایت میں ہے کہ فرمایا:

نمازی کو جب نیند آجائے تو سو جانا چاہیے تاکہ وہ جو کہتا ہے وہ سمجھے۔

مستدرک حاکم میں ہے کہ آپ نے فرمایا:

جو شخص اچھی طرح وضو کرے پھر اس طرح نماز پڑھے کہ وہ جو کچھ کہتا ہے اس کو سمجھتا بھی ہے یہاں تک کہ نماز ختم کرے تو وہ ایسا ہو جاتا ہے کہ گویا اسی دن وہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوا ہے۔

یہ نماز کا وہ باطنی ادب ہے جس کے بغیر نماز کامل نہیں ہوتی۔ جس طرح نماز کے ظاہری شرائط سے غفلت برتنا نماز سے غفلت ہے۔ اسی طرح نماز کے باطنی آداب کا لحاظ نہ کرنا بھی غفلت ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جو شخص نماز کی عربی عبارت کا مطلب نہیں سمجھتا اس کی نماز نہیں ہوتی ہے کیونکہ یہ نماز کے شرائط ظاہری میں سے نہیں ہے۔ شرط تو نماز میں قرآن کی قرأت ہے تلاوت نہیں ہے۔ تلاوت نام ہے معانی پر غور کے ساتھ پڑھنے کا اور قرأت کہتے ہیں مطلق پڑھنے کو۔

د: ولا جنباً یعنی جنابت کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ۔ جنابت کے اصل معنے دوری اور بے گانگی کے ہیں۔ اسی سے لفظ اجنبی نکلا ہے۔ شریعت کی اصطلاح میں جنابت سے مراد وہ ناپاکی ہے جو قضائے شہوت سے یا خواب میں مادہ منویہ خارج ہونے سے لاحق ہوتی ہے۔ کیونکہ اس کی وجہ سے آدمی طہارت سے بیگانہ اور دور ہو جاتا ہے[1] مطلب یہ ہے کہ حالت جنابت میں نماز پڑھنا تمہارے لیے ایسا ہی ممنوع ہے جیسا کہ نشہ کی حالت میں۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہوش میں ہونا اور جنابت سے پاک ہونا شرائط نماز میں ہیں۔ اور یہ بھی پتہ لگ گیا کہ نشہ اور جنابت کی دونوں حالتیں نجاست کی حالتیں ہیں

---

[1] تفہیم القرآن

نشہ عقل کی نجاست ہے اور جنابت جسم کی۔ اسی لیے قرآن نے شراب کو رجس بھی کہا ہے۔

جنابت کے اسباب

جنابت کو اصطلاح میں حدث اکبر بھی کہتے ہیں۔ جنابت کے پیدا ہونے کے دو اسباب ہیں۔
۱۔ منی کا نکلنا۔ یعنی منی کا اپنی جگہ سے بشہوت جدا ہو کر جسم سے باہر آنا، سونے میں یا جاگنے میں، بیہوشی میں یا ہوش میں، جماع سے یا بغیر جماع کے کسی خیال و تصور سے یا ملامست سے۔
۲۔ ایلاج یعنی کسی شہوت والے مرد کے خاص حصہ کا کسی زندہ عورت کے خاص حصہ میں یا کسی دوسرے زندہ آدمی کے مشترک حصہ میں داخل ہونا منی نکلے یا نہ نکلے۔
جب یہ دو سبب موجود ہوں گے تو جنابت پیدا ہو جائے گی۔ اور یہ شخص جنب کہلائے گا۔

جنابت میں قرآن کی تلاوت

جنابت کا یہ حکم تو قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ جنابت والے کو نماز پڑھنا منع ہے۔ اسی سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسرے مسائل بھی استنباط فرماتے ہیں کیونکہ حالت جنابت میں نماز کی ممانعت کی علت جنابت کا نماز کے مزاج سے نسبت اور لگاؤ نہ رکھنا ہے۔ چونکہ نماز کا مزاج مناجات الٰہی ہے اور مناجات الٰہی کے لیے طہارت ناگزیر ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی مزاجی مناسبت کی رعایت سے ان کاموں پر بھی جنابت والے پر قدغن قائم کر دی جن میں اسی نوع کا تقدس پایا جاتا ہے۔ مثلاً سنن ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل ہو کر آیا ہے۔
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنابت والا شخص اور حیض والی عورت قرآن کی تلاوت نہ کریں۔
اگرچہ روایتی حیثیت سے اس حدیث پر حافظ عسقلانی نے التلخیص الحبیر میں کلام کیا ہے اور بتایا ہے کہ اس کا راوی اسماعیل بن عیاش ہے۔ اور امام بیہقی اور مشہور محدث ابن ابی حاتم اور ابن عدی نے اسے ضعیف قرار دیا ہے لیکن حافظ ابو حاتم نے اسے موقوف کی حیثیت سے اس کی صحت کو سراہا ہے۔ امام بیہقی نے خلافیات میں حضرت عمر کا فیصلہ اس موضوع پر کراہت قرار دیا ہے۔ اسی بنا پر جمہور ائمہ ابو حنیفہ، شافعی، احمد بن حنبل اکثر علماء نے جنبی کے لیے قرآن پڑھنے پر قدغن قائم کی ہے۔ صرف امام مالک نے تعوذ کی خاطر چھوٹی آیات کو جائز سمجھا ہے۔ علامہ مقدسی نے حضرت علی، حضرت عمر، تابعین میں حسن بصری

ابراہیم نخعی، زہری، قتادہ اور ائمہ میں ابوحنیفہ، شافعی کا بھی مذہب بتایا ہے اور ابوداؤد، نسائی اور ترمذی کے حوالے سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی لکھا ہے کہ

حضرت علی فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن کی تلاوت سے سوائے جنابت کے کوئی چیز نہ روکتی تھی۔

جنابت میں قرآن کو ہاتھ لگانا

جس ممنوعیت کی بنا پر حالت جنابت میں قرآن کی تلاوت ناجائز ہے۔ اسی ممنوعیت کی بنا پر حالت جنابت میں قرآن کو ہاتھ لگانا بھی ناجائز ہے۔ امام حاکم نے مستدرک میں، طبرانی، دارقطنی اور بیہقی نے اپنی سنن میں حکیم بن حزام کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ،

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے یمن کا والی بنا کر روانہ کیا تو فرمایا تھا کہ طہارت کے بغیر قرآن کو کوئی ہاتھ نہ لگائے۔

اسی بنا پر ائمہ میں امام ابوحنیفہ، امام شافعی، امام احمد اور اکثر فقہاً کا مذہب یہ ہے کہ جنبی کے لیے حالت جنابت میں قرآن کو ہاتھ لگانا منع ہے۔

حالت جنابت میں مسجد میں جانا

اسی ممنوعیت کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے حالت جنابت میں مسجد میں جانے سے منع فرمایا ہے ابوداؤد نے سنن میں حضرت عائشہ صدیقہ کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کے دروازے مسجد میں کھلے دیکھے تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ ان گھروں کے دروازوں کو مسجد سے ہٹا لو۔ لوگوں نے اس خیال سے تعمیل نہیں کی کہ شاید کوئی رخصت مل جاتے۔ آپ نے پھر فرمایا کہ گھروں کے دروازے مسجد سے ہٹا لو۔ میں مسجد کو کسی حیض والی عورت اور جنابت والے مرد کے لیے روا نہیں کرتا ہوں۔

یہ حدیث بتا رہی ہے کہ حالت جنابت میں جنبی کے لیے مسجد میں داخل ہونا اور مسجد میں ٹھہرنا جائز نہیں ہے۔ یہی امام ابوحنیفہ اور امام سفیان ثوری کا مذہب ہے۔ امام احمد وضو کرنے کے بعد جنبی کو مسجد میں ٹھہرنے کی اجازت دیتے ہیں۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں جنبی کے لیے مسجد میں داخل ہونے: تلاوت قرآن اور

نماز کی ممانعت کی جو لطیف حکمت بیان فرمائی ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجئے۔ فرماتے ہیں ،
چونکہ اللہ کے شعائر کی تعظیم دین کے واجبات میں سے ہے اس لیے بغیر طہارت کے ان کے قریب جانے پر قدغن قائم کر دی گئی ہے اللہ کے شعائر میں سے نماز، کعبہ اور قرآن ہیں، عظیم ترادب یہی ہے کہ کوئی شخص بغیر پاکی اور طہارت ان کے پاس نہ جائے اس لیے حالتِ جنابت میں قرآن کا پڑھنا، مسجد میں داخل ہونا جائز نہیں ہے۔ مسجد دفتر کعبہ ہونے میں دین کے شعائر میں سے ہے۔
بہرحال جنابت کی حالت میں نہ مسجد میں جانا جائز ہے نہ تلاوتِ قرآن جائز ہے اور نہ قرآن کو ہاتھ لگانا روا ہے۔

۵۔ الاعابری سبیل ، اس کے معنے لغت میں راستہ سے گزرنے والے کے ہیں۔ فقہا اور مفسرین کا اس کی تشریح میں اختلاف ہے کچھ کہتے ہیں کہ اس سے مراد مسافر ہیں یعنی اگر آدمی حالتِ سفر میں ہو اور اسے غسل کی حاجت ہو جائے تو تیمم کیا جا سکتا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ جنابت کی حالت میں مسجد میں نہ جانا چاہیے لیکن کسی کام کے لیے مسجد میں سے گزرنا جائز ہے۔ پہلی رائے حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت سعید بن جبیر اور بعض دوسرے حضرات نے اختیار کی ہے اور دوسرے رائے کو حضرت عبداللہ ابن مسعود، حضرت انس بن مالک، حسن بصری اور ابراہیم نخعی وغیرہ حضرات نے اختیار کی ہے اگرچہ اس امر میں قریب قریب سب کا اتفاق ہے کہ اگر آدمی حالتِ سفر میں ہو اور جنابت لاحق ہو جائے اور نہانا ممکن نہ ہو تو تیمم کر کے نماز ادا کر سکتا ہے لیکن جو لوگ عابری سبیل کی تشریح مسافر سے کرتے ہیں وہ اس مسئلہ کو قرآن کی اس آیت سے ثابت کرتے ہیں اور جو عابری سبیل کے معنے مسجد سے گزرنے والے کے بتاتے ہیں وہ اس کو حدیث سے لیتے ہیں۔

رہا مسجد میں سے حالتِ جنابت میں گزرنے کا مسئلہ تو اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف، امام محمد کہتے ہیں کہ مسجد میں بیٹھنے کا ارادہ ہو یا مسجد سے گزرنے کا مسجد میں بغیر طہارت کے داخل ہونا جائز نہیں۔ امام مالک اور امام شافعی کے نزدیک حالتِ جنابت میں مسجد سے گزرنے کا جواز اسی آیت سے لیتے ہیں ان کی رائے میں عابری سبیل کے معنے راستہ عبور کرنے والے کے ہیں اور آیتِ قرآنی میں صلوٰۃ سے مراد نماز نہیں بلکہ مقامِ نماز ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے اہلِ ایمان نشہ کی اور جنابت کی حالت میں مسجد کے قریب نہ جاؤ ہاں گزرنے کی اجازت ہے لیکن امام ابوحنیفہ اور دوسرے اکابر کی رائے میں عابری سبیل سے مسافر مراد ہے اور صلوٰۃ انہی معنے میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ حالتِ نشہ اور حالتِ جنابت میں نماز کے قریب نہ جاؤ لیکن اگر مسافر ہو اور جنابت کی حالت ہو جائے اور پانی نہ ہونے کی وجہ

سے غسل نہ کرسکو تو یہ مستثنیٰ ہے اسے کیا کرنا چاہیے اس کا حکم آگے آرہا ہے کہ تیمم کرے۔ مسجد سے گزرنے کا مسئلہ قرآن کی اس آیت میں زیر بحث نہیں ہے۔ اس کا حکم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان کیا ہے جیسا کہ آپ پہلے سن چکے ہیں۔

غسل جنابت کی فرضیت

حتی تغتسلوا یہ غایت ہے یعنی حالتِ جنابت میں نماز کے مباح ہونے کی شرط یہ ہے کہ غسل کر لو بغیر غسل کے نماز کے قریب جانا جائز نہیں ہے۔ کیونکہ جنابت کا کسل اور انقباض اس انشراح اور حضورِ قلب کے منافی ہے جو نماز کے لیے مطلوب ہے جنابت کے لیے طہارت غسل ہے۔

آیت میں غسل کا حکم ہے لیکن غسل کے طریقہ سے بحث نہیں کی گئی ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے قرآن کا مبین بنایا ہے اس لیے حضور اقدس نے غسل کا طریقہ بتایا ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات کے ذریعے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے غسل کا جو طریقہ نقل ہو کر ہم تک آتا ہے یہ ہے صحیح بخاری میں ہے :

> حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب غسل جنابت کرتے پہلے ہاتھ دھوتے پھر وضو فرماتے پھر تین دو ہتڑ پانی سر پر ڈالتے پھر اپنے بدن مبارک کو دھوتے۔

اس کی مزید توضیح بخاری میں یہ آتی ہے :

> حضرت میمونہ کہتی ہیں میں نے آپ کے غسل کے لیے پانی رکھا۔ آپ نے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھوئے پھر استنجا کیا، پھر زمین پر ہاتھ مارا اور مٹی سے ہاتھ صاف کر کے ان کو دھویا پھر غرارے کیے پھر ناک میں پانی دیا، چہرہ دھویا، سر پر پانی بہایا، پھر آپ نے پیر دھوئے۔

ابوداؤد میں حضرت علی کے حوالہ سے ہے :

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو غسل جنابت میں ایک بال کے برابر بھی جگہ چھوڑتا ہے وہ غسل نہیں کرتا ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غسل جنابت میں خوب صفائی کرنا ضروری ہے اور ایک ارشاد ہے کہ ہر بال کے نیچے جنابت ہے لہٰذا بالوں کو دھوؤ اور بدن کو صاف کرو۔ اس کا مقصد بھی تطہیر میں مبالغہ ہے اسی بناپر فقہائے نے غسل جنابت میں مضمضہ اور استنشاق کو واجب کہا ہے۔ امام احمد، امام اسحاق،

امام ابن ابی لیلیٰ اور عبداللہ بن المبارک کہتے ہیں کہ یہ دونوں وضو اور غسل میں واجب ہیں۔ امام ابوحنیفہ اور سفیان ثوری کہتے ہیں کہ وضو میں سنت اور غسل میں واجب ہیں اور امام مالک اور شافعی دونوں سنت کہتے ہیں۔ اس پر مزید تفصیل انشاءاللہ سورۃ مائدہ میں آرہی ہے۔

تیمم کی اجازت اور اس کے مواقع

۴۸۔ اور اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی شخص قضائے حاجت کر کے آیا ہو یا تم نے عورتوں کو چھوا ہو اور غسل کے لیے پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر لو اور مسح کرو اپنے چہروں کا اور اپنے ہاتھوں کا۔ یعنی حالت جنابت میں نماز کا نہ پڑھنا تاوقتیکہ غسل نہ کرلے۔ یہ حکم جب ہے کہ کوئی عذر نہ ہو اور اگر کوئی ایسا عذر پیش آجائے کہ پانی کے استعمال سے معذوری ہو اور طہارت کا حاصل کرنا ضروری ہو تو ایسے وقت میں زمین سے تیمم کر لینا کافی ہے۔

پانی کے استعمال سے معذوری کی تین صورتیں ہیں۔ ایک بیماری کہ اس میں پانی نقصان دیتا ہے۔ دوسرے سفر کہ پانی اتنا موجود ہے کہ غسل کرے تو پیاس سے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہے دور تک پانی نہ ملے گا۔ تیسرے یہ کہ پانی موجود ہی نہیں ہے۔ پانی کے موجود نہ ہونے کی صورت کے ساتھ طہارت کے ضروری ہونے کی دو صورتیں بتاتی ہیں ایک یہ کہ کوئی قضائے حاجت کر کے آیا ہے اس کو وضو کی ضرورت ہے دوسرے یہ کہ بیوی سے صحبت کی ہو اسے غسل کی حاجت ہے۔

تیمم کی صورت یہ ہے کہ پاک زمین پر دونوں ہاتھ مارے، پھر سارے منہ پر اچھی طرح مل لیوے پھر دونوں ہاتھ زمین پر مار کر دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک مل لے۔ مٹی طاہر ہے اور بعض چیزوں کے لیے پانی کی طرح مطہر بھی ہے جیسے موزہ چمڑے کا، شیشہ، تلوار وغیرہ، جو نجاست زمین پر گر کر خاک ہو جاتی ہے وہ بھی پاک ہے۔ نیز ہاتھ اور چہرے پر مٹی ملنے میں تذلل اور عاجزی بھی ہے جو گناہوں سے معافی مانگنے کی اعلیٰ صورت ہے لہٰذا چونکہ مٹی ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی نجاست کو زائل کرتی ہے اس لیے بوقت معذوری پانی کی جانشین بنادی گئی۔ اس کے سوا مقتضائے آسانی و سہولت جس پر حکم تیمم مبنی ہے یہ ہے کہ پانی کی نیابت کا کام ایسی چیز سے لیا جاتے جو پانی سے زیادہ سہل الحصول ہو سو زمین کا ایسا ہونا ظاہر ہے کیونکہ وہ سب جگہ موجود ہے۔ لہٰذا خاک انسان کی اصل ہے اور اپنی اصل کی طرف رجوع کرنے میں گناہوں اور خرابیوں سے بچاؤ ہے۔ کافر بھی آرزو کریں گے کہ خاک میں مل جائیں[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں بعض مہمات مباحث ہیں جن پر تبصرہ سورۃ مائدہ کی تشریحات میں ملے گا لیکن یہاں کچھ باتوں کی طرف اشارہ کر دینا ضروری ہے۔

تیمم کے یہاں تین مواقع بیان ہوتے، مرض، سفر اور پانی کی نایابی۔ اس سے یہ باتیں خود بخود نکلتی ہیں تیمم کی حقیقت، تیمم کے واجب ہونے کی شرطیں اس کے صحیح ہونے کی شرطیں، پانی کے استعمال سے معذور ہونے کی صورتیں، جن چیزوں سے تیمم جائز ہے اور جن سے ناجائز، تیمم کے فرائض و واجبات، تیمم کے نواقض

نجاست کی یہاں دو حالتیں مذکور ہوئی ہیں ایک یہ کہ او جاء احد منکم من الغائط یا تم میں سے کوئی قضائے حاجت سے آتے۔ لفظ غائط اصلاً نشیبی زمین کے لیے آتا ہے یہاں یہ قضائے حاجت پیشاب اور پاخانہ سے کنایہ ہے۔ دوسری او لمستم النساء یا تم نے عورتوں سے ملاقات کی ہو۔ لمست کے معنے چھونے کے ہیں لیکن یہاں یہ کنایہ ہے مباشرت سے۔

نجاست کی ان دونوں حالتوں کے ذکر سے مقصود یہ ہے کہ یہ دونوں حالتیں طہارت کے لیے ناقض ہیں اور ان کے رونما ہونے سے طہارت واجب ہو جاتی ہے اور یہ بتانا بھی ہے کہ تیمم دونوں حالتوں میں طہارت کے لیے کفایت کر جاتی ہے بشرطیکہ مرض، سفر اور یا پانی کی نایابی ہو۔

نجاست کی پہلی حالت کی توضیح

نجاست کی پہلی حالت کے بیان سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ ان دونوں راہوں سے معتاد طریق پر جو کچھ بھی نکلتا ہے اس سے طہارت ختم ہو جاتی ہے اور یہ بات بھی سمجھ میں آ رہی ہے کہ پیشاب ہو یا پاخانہ دونوں نجاست ہیں۔ اور ان دونوں راہوں سے جو کچھ غیر معتاد طریق پر باہر آتے وہ بھی نجاست ہے جیسے مذی، ودی وغیرہ، اور اس سے بھی جمہور کے نزدیک طہارت ختم ہو جاتی ہے۔ البتہ اس امر میں اختلاف ہے کہ انسانی بدن سے جو چیزیں ان راہوں کے علاوہ دوسری جگہ سے نکلتی ہیں مثلاً بدن سے خون نکل آیا، ناک سے نکسیر آ گئی اور منہ سے قے آ گئی یہ بھی طہارت کو ختم کرتی ہے یا نہیں۔ قرآن کی یہ آیت اس موضوع پر خاموش ہے۔ امام شافعی قے اور خون کو ناقض طہارت نہیں بتاتے، امام احمد تھوڑی قے اور خون کو ناقض نہیں بتاتے اور امام ابوحنیفہ خون کو ناقض کہتے ہیں بشرطیکہ بہتا ہو اور خون کے نجس ہونے کا معیار بہنا ہے اگر بہتا نہیں تو نجس نہیں، ایسے ہی اگر قے معمولی ہو تو اس کو ناقض نہیں بتاتے ہاں اگر غیر معمولی یعنی منہ بھر کر ہو تو وہ ناقض ہے۔ امام ابوحنیفہ خون، قے وغیرہ کو ان دونوں راہوں سے نکلی ہوئی نجاست پر قیاس کرتے ہیں کیونکہ وہاں طہارت کرنے کی علت صرف نجاست کا نکلنا ہے۔

شاید آپ یہ علت محسوس کریں کہ قرآن نے دو راہوں سے خروج نجاست پر خاص طہارت کا یعنی وضو کا جو حکم دیا ہے وہ محض تعبدی ہے۔ عقلیت تو یہ ہے کہ نجاست جہاں سے نکلی ہے اس جگہ کو صاف کیا جاتے نہ کہ ہاتھ منہ اور پاؤں دھوئیں جائیں لہٰذا اس پر قیاس درست نہیں ہے۔ صاحب ہدایہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ طہارت نہ ہونے کے موضوع پر نجاست کا ہونا ایک ٹھیٹھ عقلی مسئلہ ہے یعنی اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں کہ زوال طہارت میں نجاست بالذات اثر انداز ہے ہاں اس کے نتیجہ میں وضو کا حکم الہیہ ایک امر تعبدی ہے لیکن جب نجاست کا ہونا ثابت ہو گیا تو دوسرا حکم یعنی وضو اس کے نتیجہ میں خود بخود ظاہر ہو گیا خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اقوال و افعال سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے اگرچہ اس پر آپ کے ارشادات اور اعمال ہماری تحقیق میں روایتی حیثیت سے اس قدر پایہ صحت کو نہیں پہنچے ہیں جیسے کہ اس موضوع کی اہمیت کے پیش نظر ان میں صحت ہونی چاہیے۔ اس پر تفصیلی بحث کی یہاں گنجائش نہیں اور اختصار مفید مدعا نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں، علامہ عینی نے عمدۃ القاری میں اور مولانا شبیر احمد عثمانی نے فتح الملہم میں، مولانا محمد زکریا نے اوجز المسالک میں، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری نے تحفۃ الاحوذی میں، علامہ نووی نے شرح المہذب میں اور مولانا ظفر احمد عثمانی نے اعلاء السنن میں سیر حاصل بحث کی ہے۔

نجاست کی دوسری حالت کی توضیح

اس آیت میں نجاست کی دوسری حالت یعنی اولمستم النساء میں ملامست کے معنے چھونے اور ہاتھ لگانے کے ہیں، اور کنائی زبان میں یہ مباشرت کے لیے استعارہ ہے۔ اس امر میں اختلاف ہے کہ یہاں کنائی معنے مراد ہیں یا لغوی، قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ حضرت علی مرتضیٰ، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ کنائی معنے مراد ہیں یعنی مباشرت اور اسی کو امام ابوحنیفہ، امام سفیان ثوری نے اپنایا ہے بخلاف اس کے حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمر فاروق، حضرت عبداللہ بن عمر کی رائے ہے کہ آیت میں ملامست اپنے لغوی معنے میں ہے۔ اسی رائے کو امام شعبی اور امام شافعی نے اپنایا ہے۔

اس تفسیری اختلاف کی وجہ سے یہ بات خود بخود نکل آئی کہ عورت کو ہاتھ لگانے سے امام شافعی کے نزدیک وضو ٹوٹ جائے گا لیکن امام ابوحنیفہ کے نزدیک نہیں ٹوٹے گا کیونکہ ان کے خیال میں آیت میں لغوی معنے نہیں بلکہ کنائی معنے مراد ہیں۔ اور امام مالک فرماتے ہیں کہ اگر مرد و عورت ایک دوسرے کو شہوانی جذبات کے ساتھ ہاتھ لگائیں گے تو ان کا وضو ٹوٹ جائے گا، لیکن اگر جذبات شہوانی کے ساتھ ہاتھ نہیں لگایا تو اس سے وضو نہ ٹوٹے گا۔

امام شافعی کی ہمنوائی میں امام احمد، امام زہری، امام اوزاعی بھی ہیں۔ امام نووی نے خود امام شافعی کا اس موضوع پر جو مسلک وضاحت سے بیان کیا ہے یہ ہے:۔

وضو توڑنے والی تیسری چیز کسی جوان عورت کے بدن کو چھونا ہے، اگر بال، دانت، ناخن کو چھویا، یا نابالغ بچی کے بدن کو ہاتھ لگایا تو وضو نہ ٹوٹے گا۔[1]

علامہ ابن قدامہ نے امام احمد کا مذہب اس طرح پیش کیا ہے:۔

امام احمد کا مشہور مذہب یہی ہے کہ عورت کو چھونا اگر شہوت سے ہو تو وضو توڑ دیتا ہے اور اگر بغیر شہوت کے ہو ناقض وضو نہیں ہے۔[2]

علامہ ابوالبرکات احمد بن محمد مالکی نے اپنی مشہور کتاب الشرح الصغیر میں امام مالک کے مذہب کی اس طرح توضیح کی ہے:

بالغ مرد کا کسی ایسے شخص کو چھونا جس کو عادۃً لذت کی خاطر چھویا جاتا ہو چاہے ناخن بال ہی کو چھوئے اور چاہے کپڑے کے ساتھ ہو ناقض وضو ہے۔

واقعاتی زندگی میں مسائل کا یہ اختلاف اس فکری اختلاف کی وجہ سے ہوا جو قرآن کی اس آیت کی تشریح میں صحابہ میں ہوا۔ یعنی کچھ بزرگوں نے ملامست کو لغوی معنے میں لیا اور کچھ نے اسے کنائی معنے میں سمجھا۔

ہماری رائے میں زیر تشریح آیت میں ذوقِ تشریع سے قریب تر وہ تفسیر ہے جس میں ملامست کے کنائی معنے بتائے گئے ہیں۔ اس معنے کے اعتبار سے آیت کی یہ تفسیر ہوگی کہ اگر تم جنابت کی حالت میں ہو یعنی شہوت انزال کے ذریعے پوری کر رہے ہو، بیمار ہو یا مسافر ہو یا تمہارا وضو حدث اصغر یعنی پیشاب یا پاخانہ کی وجہ سے نہ رہا ہو اور یا تم نے عورتوں سے زناشوئی کی ہو چاہے اس میں انزال نہ ہوا ہو تو تم ان سب صورتوں میں تیمم کر سکتے ہو اور امام شافعی کی رائے کے مطابق اگر ملامست لغوی معنے میں ہو تو آیت کی تفسیر یہ ہوگی کہ اگر حالت جنابت میں ہو یعنی تم نے عورتوں سے زناشوئی کی ہو، بیمار ہو یا مسافر ہو، یا پیشاب پاخانہ کے باعث یا عورتوں کو ہاتھ لگانے کی وجہ سے وضو نہ رہا ہو تو تم تیمم کر لو۔

امام شافعی کی تشریح کی بنا پر آیت سے حالت جنابت میں جوازِ تیمم کی گنجائش نہیں ملتی ہے اس لیے کہ ایک ہی وقت میں ملامست دو معنے نہیں دے سکتا ہے حقیقی اور مجازی، عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اللہ کی ذات بڑی حیا والی ہے کہ زناشوئی کے لیے کنائی زبان میں بات ارشاد فرمائی ہے۔ نیز ملامست

---

[1] روضۃ الطالبین [2] المغنی ابن قدامہ

مفاعلت ہے اور یہ دو کے اشتراک کو چاہتا ہے۔ اور پھر اگر آیت کی لغوی معنے لے کر تشریح کی جائے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات اور اعمال سے متصادم ہو جاتی ہے مثلاً

امام نسائی نے سنن میں حضرت عائشہ کا یہ بیان نقل کیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے تلخیص الجبیر میں اس کی سند کو صحیح مانا ہے اور حافظ ذیلعی نے اسے علی شرط مسلم فرمایا ہے بیان عائشہ یہ ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھتے تھے، میں آپ کے سامنے اس طرح لیٹی ہوتی تھی جیسے جنازہ ہوتا ہے جب آپ رکعت کرنا چاہتے تو اپنے پاؤں سے مجھے چھوتے۔

ایک دوسرا بیان ابوداؤد نے سنن میں حضرت عائشہ ہی کا ابراہیم تیمی کے حوالہ سے پیش کیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے لکھا ہے کہ عائشہ کا یہ بیان دس طریق سے آیا ہے۔ ابن عبدالبر نے اسے صحیح کہا ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ازواج مطہرات کی تقبیل فرما لیتے تھے نماز پڑھتے تھے اور وضو نہ کرتے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے:

حضرت عائشہ حضور انور کے سر مبارک میں اعتکاف کی حالت میں شانہ کرتی تھیں۔

الغرض حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان گنت اعمال کی کوئی توجیہہ نہیں ہوسکتی۔ اگر آیت میں یہ مطلب ڈالا جائے کہ عورت کو چھونے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے۔

پانی کی نایابی کا مطلب

اصل ارشاد فلم تجدوا ماء ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ تم پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو خواہ اس وجہ سے کہ پانی نایاب ہے یا اس لیے کہ ایک میل دور ہے یا اس لیے کہ استعمال سے بیمار ہو جائے گا یا پیاس کا اندیشہ لاحق ہو۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں مسافر کے لیے جواز تیمم کی یہ شرط ہے کہ وہ پانی تلاش کرے ساتھیوں سے مانگے۔ اگر بیابان میں ہو تو دور تک نظر دوڑائے اگر درمیان میں ٹیلہ یا دیوار کی رکاوٹ ہو اس کے پار جائے کیونکہ قرآن نے فلم تجدوا ملم فرمایا، نہ پانے کا مصداق وہی ہوسکتا ہے جو طلب اور جستجو کرے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ہر وہ شخص جس کی ملک میں پانی نہیں وہ لم تجدوا ماء

کا مصداق ہے اگر پانی پاس موجود نہیں ہے کسی سے مانگنا شرط نہیں ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورہ مائدہ میں آرہی ہے۔ یہاں اتنی بات ضرور سمجھ لینی چاہیے کہ قرآن نے بیمار اور مسافر کو تیمم کی رخصت دی ہے بیمار کو اس لیے کہ پانی تو موجود ہے مگر نقصان دیتا ہے اور مسافر کو اس لیے کہ پانی کا حاصل کرنا دشوار ہے اور اس تندرست کو بھی رخصت دی ہے جسے پانی دستیاب ہی نہ ہو خواہ اسے وضو کی حاجت ہو یا غسل کی۔ ان سب صورتوں میں تیمم جائز ہے۔ ظاہر قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیمار ہونا، مسافر ہونا اور حدث اصغر یا اکبر کے بعد پانی کا نہ ملنا جواز تیمم کے حالات ہیں۔ بیمار کے پاس اور مسافر کے پاس پانی ہونا تیمم میں مانع نہیں ہے کیونکہ بیمار کو پانی نقصان دیتا ہے اور مسافر کو سفر میں پانی کی ضرورت ہے تو اصل لم تجدوا ماء بیمار اور مسافر کی قید نہیں بلکہ صحت ور آدمی جو حدث اصغر یا اکبر میں مبتلا ہو اس کی قید ہے یعنی اگر تندرست انسان بے وضو ہو یا جنبی ہو اور اسے پانی دستیاب نہ ہو تو اسے تیمم کی اجازت ہے۔

تیمم کے لغوی اور شرعی معنے

اصل ارشاد میں تیمموا آیا ہے۔ لغت میں تیمم کے معنے قصد و ارادے کے آتے ہیں۔ اس کا مادہ امّ آتا ہے امّ یوم امًا سے امام اور ماموم بنا ہے اور اسی سے تیمم ہے اسے تیمم اور تائم دونوں طرح بولا گیا ہے۔ صاحب بنا یہ نے تائم اور تیمم اور ام کے معنے ارادہ کرنے کے لکھے ہیں۔ اسی سے حدیث ہے کانوا یتاممون شرار ثمارھم فی الصدقۃ وہ صدقہ میں بدترین پیداوار کا ارادہ کرتے تھے یتممون بھی آتا ہے۔ لغوی معنے کے اعتبار سے اعشیٰ کا یہ شعر ہے۔

تیممت قیسًا وکم دونہ من الارض من مھمہ ذی شزن

لغوی معنے سے ترقی کر کے اصطلاحی معنے پیدا ہو گئے یعنی تیمم نام ہے۔ مٹی کے ذریعے چہرے اور ہاتھوں کے مسح کرنے کا اور تیمم بالتراب اسی معنے میں بولا جاتا ہے۔ ایک شعر میں شاعر نے بڑی جدت پیدا کی ہے کہ دونوں معنے میں استعمال کیا ہے۔

تیممتکم لما فقدت اولی النھی

ومن لم یجد ماءً تیمم بالتراب

لغوی معنے کی رعایت سے امام ابوحنیفہ نے تیمم میں نیت کو شرط قرار دیا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ لغوی معنے ہی میں استعمال ہوا ہے۔

صعید کی لغوی تحقیق

تیمم کس سے کیا جاتا ہے؟ یعنی طہارت میں پانی کی جگہ کیا استعمال کیا جاتا ہے۔ قرآن نے اس سوال کا جواب یہ دیا ہے کہ تیمم صعید سے کیا جائے۔

صعید کے بارے میں اہل لغت کی تحقیق یہ ہے۔ مجدالدین فیروز آبادی قاموس میں لکھتے ہیں کہ صعید مٹی یا سطح زمین کو کہتے ہیں۔ ثعالبی نے فقہ اللغۃ میں لکھا ہے کہ صعید سطح زمین کی مٹی کو کہتے ہیں۔ صاحب مصباح لکھتے ہیں صعید عربی زبان میں مٹی، سطح زمین اور راستہ کو کہتے ہیں۔ اصل میں صعود سے بنا ہے جس کے معنے بلند ہونے کے ہیں۔ صعید فعیل کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ صعید روئے زمین کو کہتے ہیں اور بعض کی رائے میں صعید اس غبار کو کہتے ہیں جو اوپر کو چڑھتا ہے۔ امام شافعی کا یہی مسلک ہے۔ علامہ علی بن محمد خازن بغدادی تفسیر لباب التاویل فی معانی التنزیل میں لکھتے ہیں؛

> ربیع نے امام شافعی سے صعید کی تفسیر میں نقل کیا ہے کہ اسم صعید غبار والی مٹی کے علاوہ اور کسی معنے کے لیے نہیں آتا چنانچہ سنگریزہ پر بھی خواہ موٹا ہو یا باریک صعید کا لفظ نہیں بولا جاتا اور اگر مٹی سنگریزہ کے ساتھ اس طرح مل جائے کہ اس پر غبار آجائے تو صعید وہ ہے جو اس کے ساتھ ملا ہے۔

صعید کی فقہی تشریح ہے لغوی نہیں جو امام شافعی نے اپنے مسلک کے مطابق کر دی ہے چنانچہ قاضی ابوبکر بن العربی صاحب عارضۃ الاحوذی امام شافعی کا قول نقل کر کے فرماتے ہیں۔

> یہ ان کی اپنے مذہب کے مطابق تفسیر فقہی ہے اور ہم نے جو معنے بیان کیے ہیں وہ زیادہ صحیح اور لغت کے زیادہ مطابق ہیں۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے فتصبح صعیداً زلقاً پھر ہو جائے گی وہ زمین صاف اپٹواں۔

اور زجاج نے جو لغت عربیت کے امام ہیں تصریح کی ہے۔

> میں اس موضوع پر اہل لغت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں جانتا کہ صعید کے معنے روئے زمین کے ہیں خواہ اس پر مٹی ہو یا نہ ہو۔ اسی سے قرآن میں صعیداً جرزاً اور صعیداً زلقاً آیا ہے۔ صعید نام اس لیے ہوا کہ وہ زمین کی سطح بالائی کی انتہا ہے[1]

[1] فتح الباری

امام بخاری نے اپنی صحیح میں سورہ نسا کی تفسیر میں صعید کے معنے وجہ الارض کے لکھے ہیں اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں ابوعبید کا بھی یہی قول نقل کیا ہے۔ اسی بنا پر ائمہ احناف کا مسلک یہ ہے کہ زمین کی جنس میں سے جس چیز سے بھی تیمم کر لیا بشرطیکہ وہ پاک کرنے والی ہو تو جائز ہے۔ اگرچہ اس پر گرد و غبار نہ ہو۔ زمین کی جنس سے وہ چیز مراد ہے جو نہ آگ سے پگھلے اور نہ جل کر راکھ ہو جاتے۔ چنانچہ پتھر اور گچ، چونہ، سرمہ، گیرو، ہڑتال، گندھک اور یاقوت اور زبرجد، فیروزہ اور عقیق سب زمین کی جنس ہیں۔

خود ارشادِ نبوت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے، صحیح بخاری میں ہے :

حضرت جابر کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میرے لیے تمام روئے زمین مسجد اور طہور بنادی گئی ہے۔

تیمم کا طریقہ مسنون

تیمم کے طریقہ میں اختلاف ہے شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ تیمم کا طریقہ بھی ان مسائل میں ایک ہے جن میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہی لوگوں نے مختلف نقل کیا ہے۔ محدثین کے ظہور میں آنے سے پہلے اکثر فقہا تابعین نے جس مسنون طریقہ کی نشاندہی فرمائی یہ ہے کہ تیمم دو دفعہ زمین پر ہاتھ مارنے کا نام ہے۔ ایک بار چہرے کے لیے اور دوسری بار ہاتھوں کے لیے ہے۔ امام ابوحنیفہ، امام مالک اور امام شافعی دو ضرب کے قائل ہیں۔ امام احمد، امام اسحاق اور امام اوزاعی ایک ضرب بتلاتے ہیں امام الحسن بن حی اور امام ابن ابی لیلی تین ضربات کہتے ہیں۔ احادیث سب کی تائید کرتی ہیں :
دار قطنی، حاکم اور بیہقی نے بحوالہ عبداللہ بن عمر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے

تیمم دو ضربیں ہیں ایک ضرب چہرے کے لیے دوسری ضرب ہاتھوں کے لیے کہنیوں تک۔

اس کی سند میں علی ابن ظبیان ہے۔ اس کے علاوہ اور بھی روایات ہیں مگر ان میں کوئی بھی روایتی سقم سے خالی نہیں ہے۔ صحیح بخاری میں عمار بن یاسر کی روایت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بتائی ہوئی یہ ترکیب ہوتی ہے۔

اے عمار تجھے کافی ہے یہ بات کہ اپنے ہاتھ کو زمین پر مار پھر اس میں پھونک مار پھر مسح کر اپنے چہرے اور ہاتھوں کا۔

اگرچہ امام نووی نے اس کا جواب دیا ہے کہ یہ ضرب کا طریق بتایا جارہا ہے تیمم کرنے کا طریق

نہیں سکھایا جارہا ہے لیکن ہمیں اس موقعہ پر شاہ ولی اللہ کی بات پسند ہے کہ عمار کی روایت میں درجہ کفایت بتایا گیا ہے اور ابن عمر کی روایت میں طریق مسنون بتایا گیا ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم عمار کو یہ بتا رہے ہوں کہ زمین میں لوٹ مارنے کا نام تیمم نہیں بلکہ ہاتھوں کو لگی ہوئی مٹی سے مسح کافی ہے۔ قدر ممسوح اور تعداد ضربات بتانی مقصود نہیں ہیں

تیمم میں مسح کے اعضاء

قرآن میں محل مسح وجہ چہرہ و یدین دونوں بتائے گئے ہیں لیکن ید کا اطلاق عربی زبان میں مختلف ہے۔ ید پنجے تک کی جگہ کو بھی کہتے ہیں یعنی اس جوڑ تک جو کلائی کو ہاتھ سے پیوند کرتا ہے۔ چوری میں چور کا ہاتھ یہاں تک کاٹا جاتا ہے۔ اور ید انگلیوں سے کہنیوں تک کے حصہ کو بھی کہتے ہیں اور ید مونڈھے تک کو بھی کہتے ہیں۔ اس لیے اس میں فقہا کے درمیان اختلاف ہے۔ امام احمد، امام اسحاق، امام اوزاعی اور ظاہریہ یہ کہتے ہیں کہ صرف پہنچوں تک ہاتھوں کا مسح کیا جائے اور اس کے مقابلہ میں جمہور اور ائمہ ثلاثہ کہتے ہیں کہ کہنیوں تک ہاتھوں کا مسح کیا جائے اور امام زہری کہتے ہیں کہ مونڈھوں تک مسح کیا جائے۔ ہمیں یہاں قاضی ثناء اللہ کی بات مبنی بر انصاف معلوم ہوتی ہے۔

امام زہری سے منقول ہے کہ تیمم میں مونڈھوں تک مسح واجب ہے ایسے ہی صحابہ کے بارے میں بھی ہے کہ انہوں نے اس آیت کے نازل ہونے کے بعد بغلوں اور مونڈھوں تک مسح کیا لیکن یہ سب کچھ حضور انور کی تعلیم سے پہلے کی کہانی ہے۔ جب اپنے اللہ کی مراد بتا دی تو سب کو علم ہو گیا۔ عمار بن یاسر کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جگہ فوجی پڑاؤ کیا۔ حضرت عائشہ آپ کے ہمراہ تھیں۔ پڑاؤ میں حضرت عائشہ کا ظفاری موتیوں کا ہار گر گیا ہار کی تلاش میں سب کو رکنا پڑا، صبح ہو گئی، پانی موجود نہ تھا۔ اللہ نے طہارت کی رخصت والی آیت نازل فرمائی۔ لوگ اٹھے زمین پر ہاتھوں کو مارا پھر ہاتھ اٹھاتے اور بغیر جھاڑے ہاتھوں کو خوب اپنے چہروں پر ملا اور ہاتھوں کا مونڈھوں تک مسح کیا۔ یہ ابن الجوزی نے امام احمد کے حوالے سے روایت پیش کی ہے اور ابن ماجہ میں ہے کہ ہم نے شانوں تک مسح کیا۔ ایک اور روایت میں ہے کہ ہم نے حضور انور کے ساتھ شانوں تک تیمم کی لیکن حضور انور کی تعلیم اور اجماع سے معلوم ہوا ہے کہ پورا ہاتھ مراد نہیں ہے۔ ہاتھ آیت میں مقدار کی حد تک مجمل ہے۔ حضور نے آیت کے چہرۂ اجمال سے نقاب اٹھائی اور بتایا تیمم میں ہاتھ کی

مقدار وہی ہے جو وضو میں ہے یعنی کہنیوں تک۔ عمار بن یاسر کہتے ہیں کہ جس وقت آیت تیمم نازل ہوئی میں موجود تھا۔ حضور انور نے ہمیں حکم دیا۔ ہم نے ایک ضرب چہرے کے لیے اور دوسری کہنیوں تک ہاتھوں کے لیے لگائی تھی۔ یہ روایت مسند بزار میں موجود ہے اور حافظ عسقلانی نے التلخیص الحبیر میں بلا تنقید اسے نقل کیا ہے اور ابوداؤد حدیث عمار میں کہنیوں تک کے الفاظ لائے ہیں لیکن اس کی سند میں قتادہ کہتے ہیں کہ میرے سے ایک محدث نے بیان کیا یہ محدث اگرچہ مبہم ہے لیکن نفس خود اس کی ثقاہت کی نشاندہی کے لیے کافی ہے۔ سلسلہ حدیث عمار اس آیت قرآنی کے لیے بیان بن کر آئی ہے [1]

تیمم، غسل اور وضو کی جگہ

اس پر اب تو پوری امت کا اجماع ہے کہ تیمم جنابت کی حالت میں اور وضو کی ضرورت میں کام دے سکتی ہے یعنی آپ کو نہانے کی حاجت ہو یا وضو کرنا ہو تو دونوں کی جگہ تیمم کر سکتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ محدث نے لکھا ہے کہ امت میں حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود حالت جنابت میں تیمم کے جواز کو نہیں مانتے تھے۔ وہ قرآن کی اس آیت میں ملامست کو جماع سے کنایہ نہیں بلکہ چھونے کے معنے میں سمجھتے تھے اس لیے بحالت جنابت غسل کے قائل نہ تھے لیکن عمران بن حصین کی حدیث اس شخص کے بارے میں جو جنابت اور پانی نہ ہونے کی وجہ سے نماز با جماعت سے رہ گیا تھا اور اس کو حضور انور نے فرمایا علیک بالصعید فانہ یکفیک مٹی سے تیمم کر لینا کافی ہے۔ یہ صحیحین میں موجود ہے۔ اور عمار بن یاسر کی حدیث پہلے پڑھ چکے ہو۔ اگرچہ حضرت عمر اور عبداللہ بن مسعود کے بارے میں یہ بھی پایا گیا ہے کہ انہوں نے اس رائے سے رجوع کر لیا تھا بہرحال تیمم جنابت کے غسل اور وضو دونوں کی نیابت کرتی ہے اور اس کی حیثیت عامہ علماء قانون کی نظر میں ناپاکی کو ہٹانے کی نہیں بلکہ چھپانے کی ہے۔ امت میں صرف داؤد ظاہری کے خیال میں اس کی حیثیت رافع کی ہے ورنہ سب یہی کہتے ہیں کہ تیمم ساتر ہے اور حقیقت یہی ہے کہ اگر تیمم رافع حدث ہوتی تو پانی ملنے پر اس کے ختم ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا اور پانی کا ملنا مٹی کے طاہر ہونے کی غایت نہ ہوتا یہ تیمم کی قانونی حیثیت ہے۔

---

[1] تفسیر مظہری

پانی ملنے پر اداشدہ نماز کا اعادہ

اس قانونی نقطہ کا مطلب یہ ہرگز نہیں ہے کہ جو نماز بن تیمم سے ادا کی جا چکی ہیں وہ عذر زائل ہونے پر یا پانی دستیاب ہونے پر لوٹائی جائیں گی کیونکہ قرآن نے پانی نہ ملنے کی صورت یا عذر موجود ہونے کی صورت میں پانی سے طہارت کی قید ہٹادی ہے اس لیے اگر وقت اول میں بھی نماز تیمم سے پڑھ لی اور وقت کے اندر عذر دور ہوگیا یا پانی دستیاب ہوگیا تو نماز کا اعادہ نہیں کیا جائے گا۔ ایسا واقعہ خود زمانۂ نبوت میں پیش آیا حضور ﷺ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا کہ نماز کو لوٹانا نہیں، چنانچہ ابوداؤد میں ہے :

حضرت ابوسعید خدری کہتے ہیں کہ دو آدمی سفر پر گئے نماز کا وقت آگیا، پانی موجود نہ تھا۔ دونوں نے تیمم کیا اور نماز پڑھ لی، پھر وقت کے اندر پانی دستیاب ہوگیا۔ ایک ساتھی نے وضو کر کے نماز کا اعادہ کرلیا اور دوسرے نے نہیں کیا۔ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوکر واقعہ بیان کیا آپ نے اسے مخاطب کر کے جس نے نماز کا اعادہ نہیں کیا تھا فرمایا اصبت السنۃ تم نے سنت کے مطابق کیا اور تمہارے لیے وہی نماز کافی ہے اور وضو کر کے نماز لوٹانے والے سے کہا کہ تمہیں ڈبل اجر مل گیا۔

تیمم کے بارے میں اور بھی ضروری مباحث ہیں جو ان شاء اللہ سورہ مائدہ میں آپ پڑھیں گے۔

عفو و مغفرت کا درجہ قانونی تیسیر ہے

۴۳۔ بلاشبہ اللہ درگزر کرنے والا اور بخشنے والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے ضرورت کے وقت تیمم کی اجازت دے دی اور مٹی کو پانی کے قائمقام کردیا اس لیے کہ وہ سہولت اور معافی دینے والا ہے اور بندوں کی خطائیں بخشنے والا ہے اپنے بندوں کے نفع اور آسائش کو پسند کرتا ہے جس سے یہ بھی معلوم ہوگیا کہ نماز میں نشہ کی حالت میں جو کچھ کا کچھ پڑھا گیا تھا وہ بھی معاف کردیا گیا اور جس سے یہ خطاب بھی نہ رہا کہ آئندہ تو ایسی حالت میں نماز نہ پڑھیں گے شاید پہلی غلطی کا مواخذہ ہوگا[1] اور اس سے یہ بھی اشارہ ہوگیا ہے کہ اصل اور قانونی مطالبہ تو طہارت کاملہ کا ہے اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ عفو و کرم کے درجہ کی بات ہے اور یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عزیمت کا قانون ہو یا رخصت کی بات ہو دونوں اللہ کی جانب سے ہیں عزیمت اگر اس کی عزت و حکمت کا تقاضا ہے تو رخصت میں اس کی عفو و مغفرت کا مظاہرہ ہے۔ ❖

---

[1] افادات شیخ الاسلام

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتٰبِ يَشْتَرُونَ الضَّلٰلَةَ
وَيُرِيدُونَ أَن تَضِلُّوا السَّبِيلَ ﴿٤٤﴾ وَاللّٰهُ أَعْلَمُ بِأَعْدَائِكُمْ ۚ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ وَلِيًّا ۙ وَّكَفٰى بِاللّٰهِ نَصِيرًا ﴿٤٥﴾ مِّنَ الَّذِينَ هَادُوا
يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ عَن مَّوَاضِعِهٖ وَيَقُولُونَ سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا
وَاسْمَعْ غَيْرَ مُسْمَعٍ وَّرَاعِنَا لَيًّا بِأَلْسِنَتِهِمْ وَطَعْنًا فِي الدِّينِ ۚ وَ
لَوْ أَنَّهُمْ قَالُوا سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاسْمَعْ وَانظُرْنَا لَكَانَ خَيْرًا لَّهُمْ
وَأَقْوَمَ ۙ وَلٰكِن لَّعَنَهُمُ اللّٰهُ بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُونَ إِلَّا قَلِيلًا ﴿٤٦﴾

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے وہ ضلالت کے خریدار بنے ہوتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راستہ سے بھٹک جاؤ اور اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہے اور اللہ ہی کارساز ہونے کے لحاظ سے کافی ہے اور اللہ ہی کی مددگاری کفایت کرتی ہے[۴۵]۔ یعنی وہ لوگ جو یہودی ہیں وہ

باتوں کو ان کی اصلی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں اور کہتے ہیں سمعنا وعصینا
اور اسمع غیر مسمع اور راعنا اپنی زبانوں کو مروڑ کر اور دین میں
طعنہ اندازی کی خاطر - اور اگر یہ لوگ سمعنا واطعنا اور اسمع اور انظرنا
کہتے تو یہ ان کے حق میں بہتر اور زیادہ درست ہوتا لیکن ان پر
ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے پھٹکار ڈال دی اس لیے تھوڑی
سی تعداد کے سوا سب ایمان سے محروم ہیں۔

اسلام کا نظامِ حیات اور اس کی اپوزیشن

دُنیا میں نزولِ قرآن کے وقت دین کے دو تصوّر کارفرما تھے ایک یہ کہ دُنیا انسان کے لیے قید خانہ ہے اس کا جسم اس کی روح کے حق میں ایک پنجرے کی حیثیت رکھتا ہے - انسان نجات اسی وقت پا سکتا ہے جب وہ اس قید خانے کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالے اور اس پنجرے سے اپنے آپ کو آزاد کرائے یعنی وہ دُنیا کو چھوڑ دے بستیوں سے دُور نکل جائے اور کسی گوشے میں اپنے خدا سے لو لگا کر بیٹھ جائے' اپنی خواہشوں کو دبا کر کچل دے صرف اسی صورت میں اس کی روح کی آنکھ پر سے وہ پردہ ہٹ سکتا ہے جو اسے خدا کے جلوؤں کے دیکھ پانے اور اس کی جناب تک رسائی حاصل کر لینے سے روکے ہوئے ہے اس لیے انسان کا فرض ہے کہ وہ ریاضتیں کر کے ریا کے اس جال سے باہر نکل جائے دین کا یہی نظریہ ہے جس کا نام رہبانیت ہے اور نزولِ قرآن کے وقت عیسائیت اس کی علمبردار تھی -

دوسرا تصوّر یہ ہے کہ انسان کو دُنیا سے منہ موڑ لینے کی ضرورت نہیں بلکہ اسی دُنیا کو برتتے ہوئے اور اپنی جبلی خواہشوں کو معقول طور پر پوری کرتے ہوئے خدا کی عبادت کرنی چاہیے۔

رہے دنیوی معاملات اور مسائل تو صرف انفرادی زندگی کی حد تک دین اسے معاشرتی اور اخلاقی ہدایات دیتا ہے جن کی پوری پوری پابندی کرنی چاہیے۔ باقی زندگی کی تمام شاخوں میں وہ آزاد ہے کیونکہ عبادت فرد کا کام ہے جماعت کا کام نہیں اس لیے دین بھی انسان اور خدا کے درمیان ایک نجی معاملہ ہے جو دنیا کے عام اجتماعی مسائل اور معاملات سے کوئی تعرض نہیں کرتا۔ ان مسائل میں انسان کو اختیار ہے جو راستہ چاہے اختیار کرے اور زندگی کا جو نظام چاہے اپنائے۔ یہ یہودیوں کا نظریۂ دین ہے نزولِ قرآن کے وقت یہ بھی موجود تھے۔

ان دونوں نظریوں کے مقابلے اسلامی نظریہ یہ ہے کہ جیسے دنیا کو چھوڑ دینا اور نفس کو مار ڈالنا غلط ہے ایسے ہی بندگی کو صرف فرد کا کام اور دین کو صرف انسان کی نجی زندگی کا معاملہ سمجھنا بھی غلط ہے۔ صحیح بات یہ ہے کہ عبادت گاہ ہو یا گھر، کھیت ہوں یا بازار، معاشی ادارے ہوں یا سیاسی ادارے یہ سارے شعبے دین کے فرائض اور بندگی کی ذمہ داریاں ادا کرنے کے مقامات ہیں۔ ان میں سے کسی ایک جگہ سے نہ تو انسان بھاگ سکتا ہے اور نہ ان میں اپنی من مانی کرنے کا مجاز ہے، صحیح خدا پرستی یہ ہے کہ انسان اپنی پوری زندگی انفرادی سے کر اجتماعی تک احکام الٰہی کے تحت گزارے۔ وہ عبادت گاہ میں اگر رب العالمین کی عبادت کرتا ہے تو اس سے باہر بھی وہ ہی کچھ کرے جسے کرنے کا اسے حکم ملا ہے اور اس طرح اس کی دنیوی زندگی کا نظام پورا پورا وہ ہے جو اس کے مالک کو پسند ہے۔

اس سورت میں اب تک عائلی نظام، معاشرتی نظام اور اخلاقی نظام سے بحث کی گئی ہے اور اب قرآن سیاسی نظام اور قانونی نظام سے متعارف کرانا چاہتا ہے اور بتانا چاہتا ہے کہ اسلام کا سیاسی اور قانونی نظام کیا ہے چنانچہ آیت ۵۸ ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات سے شروع ہو کر پورے پارہ میں ان دونوں نظاموں کا کامل ترین چہرہ پیش کیا گیا ہے۔

نزولِ قرآن کے وقت دو قومیں موجود تھیں ایک عیسائی، دوسرے یہودی اور یہ دونوں اسلام کے نظامِ حیات کے لیے اپوزیشن تھیں، اس لیے قرآن نے یہاں یہودی اپوزیشن کا چہرہ پیش کر کے ان کی خدا پرستی، دینداری پر ضرب کاری لگائی ہے اور سورت کے آخر میں عیسائیوں کا ذکر کیا ہے۔ اسلام کی راہِ اعتدال کا صحیح تصور پیش ہی نہیں ہو سکتا جب تک افراط و تفریط کے دونوں رُخ سامنے نہ آجائیں اب یہاں یہودیوں کے ایک فرقہ کی حیثیت سے نہیں بلکہ نبوت اور اسلامی نظامِ حیات کی اپوزیشن کی حیثیت سے مطالعہ کریں۔ اگر یہ نکتہ آپ پیشِ نظر رکھیں تو آپ پورے کلام میں وہ بے ربطی محسوس نہ کریں گے جو عام شارحین محسوس کر رہے ہیں۔

۴۴ ۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے وہ ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں اور چاہتے ہیں کہ تم بھی راستہ سے بھٹک جاؤ اور اللہ تمہارے دشمنوں سے خوب واقف ہے اور اللہ ہی کارساز ہونے کے لحاظ سے کافی ہے اور اللہ ہی کی مددگاری کفایت کرتی ہے۔ ان آیات میں یہود کے بعض قبائح اور ان کے مکر و فریب کا بیان ہے اور ان کی ضلالت اور کفر پر خود ان کو نیز دوسروں کو مطلع کرنا ہے تاکہ ان سے علیحدہ رہیں چنانچہ ان اللہ لا یحب من کان مختال فخورا" سے لے کر یایھا الذین امنوا لا تقربوا تک، یہود کے قبائح بیان ہو چکے ہیں، بیچ میں ایک خاص مناسبت سے نشہ اور جنابت میں نماز سے ممانعت فرما کر پھر یہود کے قبائح کا بیان ہے۔ یہود کو کتاب کا کچھ حصہ ملا یعنی الفاظ پڑھنے کو ملے اور عمل کرنا جو مقصود تھا نہیں ملا اور گمراہی خرید کرتے ہیں یعنی پیغمبر آخر الزمان کے حالات و اوصاف کو دُنیا کی عزت اور رشوت کے واسطے چھپاتے ہیں اور جان بوجھ کر انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ مسلمان گمراہ ہو جائیں اور اللہ تعالیٰ اے مسلمانو! تمہارے دشمنوں کو خوب جانتا ہے تم ہرگز ایسا نہیں جانتے سو اللہ کے فرمانے پر اطمینان کرو اور ان سے بچو اور اللہ تعالیٰ تم کو نفع پہنچانے اور نقصان سے بچانے کے لیے کافی ہے اس لیے دشمنوں سے اس قسم کا اندیشہ نہ کرو اور دین پر قائم رہو[1]

جیسا کہ آیت کی تمہید میں اشارہ ہو چکا ہے کہ اس سورت میں آگے آیت میں اسلام کے سیاسی اور قانونی نظام سے بحث آرہی ہے اور پہلے اسلام کے عائلی، معاشرتی اور اخلاقی نظام سے بحث ہو چکی ہے۔ یہاں یہودیوں کے مخصوص چہرے کو سیاسی نظام کو پیش کرنے کے لیے بطور تمہید پیش کیا گیا ہے تاکہ مسلمان اسلام کے سیاسی نظام کے قائم کرنے میں ان سے بچ کر رہیں اور پھونک پھونک کر قدم اٹھائیں۔ اسی لیے بات کا آغاز استفہام کے ذریعہ کیا گیا ہے اور ہر شخص کو مخاطب بنا کر کہا گیا ہے کہ کیا تم کو ان کے حالات کا پتہ نہیں ہے۔ یعنی چونکہ یہ تمہاری سب سے بڑی اپوزیشن ہے تمہیں ان کے حالات سے باخبر رہنا چاہیے تاکہ زندگی کے کسی گوشہ میں تم ان کی کاپی نہ کر سکو۔

قرآن نے یہود کا چہرہ بتاتے ہوئے اس آیت میں ان کے اجتماعی زندگی کو چار طرح سے بے نقاب کیا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہود کو کتاب کا کچھ حصہ دیا گیا ہے

اولاً یہ کہ یہود کو کتاب الٰہی کا ایک حصہ دیا گیا ہے اصل ارشاد اوتوا نصیبا من الکتاب ہے۔ اس فقرے کی یا یہودیوں کے اس کردار کی تشریح میں شارحین قرآن مختلف ہیں۔ ایک رائے تو آپ شیخ الاسلام کی زبانی سن چکے ہیں کہ الفاظ پڑھنے کو ملے اور عمل سے محروم رہے۔ قاضی ثناءاللہ نے بھی اسی کو اپنایا ہے قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ ان کو علم تورات کا تھوڑا سا حصہ ملا ہے۔ یہی زمخشری نے اختیار کیا ہے۔ سید رشید رضا نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی کی ہے کہ قرآن کی یہ تعبیر کہ ان کو کچھ کتاب کا حصہ دیا گیا ہے نصیبا من الکتاب بتا رہی ہے کہ ان کو ساری کتاب یاد نہ تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے زمانہ نزول میں تورات کو اس طرح یاد نہیں کیا تھا جیسے مسلمانوں نے قرآن کو یاد کر لیا تھا اور عصر اول میں کتاب کے متعدد نسخے تیار نہیں ہوئے تھے جیسے قرآن کے متعدد نسخے تھے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہودیوں کے پاس صرف ایک ہی تورات کا نسخہ تھا جسے حضرت موسیٰ نے لکھا تھا۔ اس پر ہم اجمالی بحث تیسری جلد میں کر چکے ہیں لیکن ہمیں اوتوا نصیبا من الکتاب کی تشریح میں مفتی محمد عبدہ کی یہ تشریح زیادہ پسند ہے کہ کتاب کا ایک حصہ دیے جانے کا مطلب یہ ہے کہ یہود نے اپنی زندگی میں ساری کتاب کو دستور حیات کے طور پر نہیں اپنایا بلکہ زندگی کی مختلف احوال میں کتاب الٰہی کے بیشتر احکام کو چھوڑ دیا اور ان کو عملی پذیرائی نہیں دی مثلاً مالیاتی مسائل میں انہوں نے تورات کے حکم سود کی ممانعت کو عملاً قبول نہیں کیا مطلب یہ ہے کہ وہ تورات کے کچھ احکام پر عمل کرتے تھے اور اکثر احکام سے عملی زندگی میں روگرداں تھے۔ یہی معنے ہیں اس آیت کے افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض، یہاں کفر انکار کے معنے میں نہیں بلکہ کافرانہ زندگی اختیار کرنے کے معنے میں ہے اور ایمان ببعض الکتاب مومنانہ زندگی اپنانے کے معنے میں ہے۔ گویا کتاب کے جس حصے پر وہ عمل کرتے تھے اس کو قرآن ایمان ببعض الکتاب اور اوتوا نصیبا من الکتاب کہتا ہے اور جس حصے پر وہ عمل نہیں کرتے قرآن کفر ببعض الکتاب اور نسوا حظا مما ذکروا بہ کہتا ہے۔

قرآن نے یہ بات اتنی قوت اور وضاحت کے ساتھ کہی ہے کہ اس میں دو رائیں نہیں ہو سکتی ہیں لیکن افسوس ہمارے شارحین قرآن دوسری راہوں میں چلے گئے۔ اول تو اس مقام پر خاموشی سے گزر جاتے ہیں اور جو لب کشائی کرتے ہیں ان کا حال یہ کہ وہ مختلف وادیوں میں گم ہو کر رہ گئے ہیں اور اس کے نتیجہ میں ان کو قرآن کی یہ آیات یہاں بے ربط آنے لگی ہیں۔

یہود خود ضلالت کے خریدار ہیں

ثانیاً یہ کہ یہود ضلالت کے خریدار بنے ہوئے ہیں یعنی کس طرح وہ ہدایت دے کر ضلالت خریدتے ہیں یعنی یہود کا کتاب الٰہی کے بیشتر حصہ سے عمل کی زندگی میں کٹ جانا اور تھوڑے حصہ سے وابستہ رہنا اس لیے ہوا کہ ان میں اصول و صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح آجل کے مقابلہ میں عاجل کو ترجیح دینے کی بیماری پیدا ہو گئی تھی۔ ان کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں بلکہ صرف مصالح اور منافع اور اغراض و مفادات رہ گئے تھے۔ ان کی پوری دینی زندگی محض کاروبار بن کر رہ گئی تھی۔ وہ کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو چھپا کر مادی فوائد حاصل کرتے ہیں۔ اسی کو قرآن میں یکتمون ما انزل اللہ ویشترون بہ ثمنا قلیلا کہا ہے۔ یہی ہدایت کے بدلے میں ضلالت کا خریدار بننا ہے اور یہی مغفرت کے بدلے میں عذاب کا سودا کرنا ہے اور اسی کو آخرت کی زندگی کے مقابلے میں دنیا کی زندگی کو خریدنا کہا گیا ہے۔ گویا سیاسی مفادات، قومی منافع اور ملکی مصلحتوں کی خاطر اللہ کے احکام کو پس پشت ڈال دینا قرآن کی زبان میں ضلالت کی خریداری ہے۔ اور یہ برائی اس وقت رونما ہوتی ہے جب کوئی قوم ایک بااصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت، جماعت کے بلند مقام سے گر کر ابن الوقتی، مصلحت پرستی کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا لیتی ہے۔ اور پوری زندگی میں چند رسوم کی ادائیگی کو دینداری کا نام دے کر باقی زندگی کو وہ دین کی پابندی سے آزاد کر لیتی ہے۔ دنیا کے عام اجتماعی مسائل اور معاملات سے دین کا رابطہ توڑ بیٹھتی ہے۔ قرآن نے ان کی قومی زندگی سے متعدد مثالیں بھی دی ہیں۔

اہل ایمان کے بارے میں یہودی خواہش

ثالثاً یہ کہ وہ چاہتے ہیں کہ تم بھی صراط مستقیم سے بھٹک جاؤ۔ یعنی وہ خود ہی گمراہ نہیں ہیں بلکہ ان کی خواہش یہ ہے کہ مسلمان بھی گمراہ ہو جائیں اور زندگی میں صراط مستقیم سے ہٹ جائیں۔ اور اسلام کو صرف انفرادی زندگی تک محدود کر کے اجتماعی، معاشی، سیاسی اور اخلاقی زندگی کا رابطہ اسلام سے توڑ لیں۔ قرآن نے اہل ایمان کے لیے اس یہودی خواہش کا قرآن میں مختلف عنوانوں سے ذکر کیا ہے کہیں ارشاد ہوا ہے؛

ودّ کثیر من اھل الکتاب لو یردونکم من بعد ایمانکم کفاراً

اہل کتاب میں سے اکثر کی خواہش یہ ہے کہ تمہیں ایمان کے بعد پھر کافروں میں واپس لوٹا دیں۔

اس موضوع پر ہم پہلی جلد میں یہودی خواہش کا پورا چہرہ بے نقاب کر چکے ہیں ۔
اور کہیں بتایا ہے :

ودت طائفۃ من اھل الکتاب لو یضلونکم

اہل کتاب کا ایک طبقہ یہ بات دل سے پسند کرتا ہے کہ تم کو گمراہ کر دیں ۔

اور کسی جگہ صاف صاف بتایا ہے :

یا ایھا الذین آمنوا ان تطیعوا فریقا من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین ۔

اے اہل ایمان اگر تم اہل کتاب میں سے کسی ایک گروہ کی بھی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے ۔

گمراہ کرنا ، کافر بنانا اور اہل ایمان کے گمراہ ہونے کی خواہش ہونا سب کا حاصل ایک ہے ۔ اختلاف حقیقت کا نہیں صرف انداز بیان کا ہے ۔ ان کی یہ خواہش اگر دیکھنا چاہتے ہو تو ان کی طرف سے جو کھلا ہوا زبردست اور منظم اور مخفی پروپیگنڈا زمانۂ نبوت سے لے کر آج تک عقائد اسلام کے خلاف سیاسی ، معاشرتی ، تاریخی ، جغرافیائی تحریروں کے ذریعہ سے اسلامی آبادیوں کے درمیان جاری رہتا ہے وہ دیکھ لو بلاشبہ وہ سب اسی خواہش کے مظاہر ہیں ۔ ان ساری سرگرمیوں اور کوششوں کی غرض یہ ہوتی ہے کہ مسلمان اسلام کے جادۂ اعتدال سے ہٹ جائیں ۔ اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے وہ کہیں علمیت کا لبادہ اوڑھ کر آتے ہیں پورے خلوص اور پورے زور قلم کے ساتھ اسلام کے محقق اور شارح بن کر مسلمانوں کے ذہنوں میں اسلام کے خلاف بغاوت کے جراثیم پیدا کرتے ہیں ۔ دین و سیاست کی تفریق ، اسلام کی نظام حکومت سے یکسر بے تعلقی اور اس کا محض ایک اعتقادی ، اخلاقی اور عبادتی نظام ہونا وغیرہ وغیرہ ان کی اسی خواہش کے غیر شعوری مظاہر ہیں ۔

ما بعا یہ کہ یہودی اہل ایمان کے دشمن اور اس دنیا میں نبوت کی سب کی بڑی اپوزیشن ہیں ۔ اصل ارشاد یہ ہے واللہ اعلم باعدائکم مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تم سے زیادہ تمہارے دشمنوں کو جانتا ہے ۔

یہ کہہ کر گویا اہل ایمان کو خبردار کیا جارہا ہے کہ یہ تمہاری اپوزیشن ہیں ان کے افکار و اعمال کی کاپی کبھی نہ کرنا ، ایسا نہ ہو کہ تم بھی عمل کے لیے کتاب الٰہی کے ایک حصہ کو لے کر باقی کو چھوڑ بیٹھو اور اس طرح تم بھی ایمان و کفر کی یک جائی کا جرم کر لو ۔

خامساً یہ کہ ولایت و نصرت کے تعلقات ان سے نہیں تمہارے اللہ سے ہیں ولی ہونے کی حیثیت

سے وہ زندگی کے ہر موڑ پر تمہارا رہنما ہے اور نصیر ہونے کی حیثیت میں وہ ہر مشکل میں تمہارا مددگار ہے۔ کسی کے تعلقات سے دھوکہ نہ کھاؤ اور کسی کی مدد پر بھروسہ نہ کرو۔ اللہ کا ولی ہونا یہ ہے کہ وہ اہل ایمان کی مصلحتوں کی رعایت کرتا ہے اور اس کا مددگار ہونا یہ ہے کہ وہ ان کو دشمنوں کی ایذا رسانی سے بچاتا ہے۔

ولایت و نصرت کے لیے کفایت کی قید لگا کر اشارہ کر دیا کہ اجتماعی زندگی میں اللہ کی ولایت و نصرت سے ہٹ کر کسی سے یہ تعلقات و روابط نہ قائم کرنے چاہئیں۔ اس معاملے میں انفرادی مراسم اور انفرادی مصالح کو کوئی وزن نہ دینا چاہیے۔ یہودی اسلام اور مسلمانوں کو اپنے لیے ایک مشترک خطرہ سمجھتے ہیں اور اس خطرے ہی کے پیش نظر وہ تمہارے کھلے دشمن اور تم کو اسلام کی صراط مستقیم سے ہٹانا چاہتے ہیں اس لیے مسلمانوں کا رویہ ان کے ساتھ مد مقابل اور اپوزیشن کی حیثیت سے تمام مفادات سے بالا ہو کر ہونا چاہیے۔

تحریف یہودیوں کا شیوہ ہے

۸۵۔ یعنی وہ لوگ جو یہودی ہیں وہ باتوں کو اپنی اصلی جگہ سے ہٹا دیتے ہیں۔ یعنی یہود میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو تورات میں نازل فرمایا اس کو اپنے ٹھکانے سے بدلتے اور پھیرتے ہیں یعنی معنوی اور لفظی تحریف کرتے ہیں۔[1]

اس کے تین مطلب ہیں ایک یہ کہ کتاب اللہ کے الفاظ میں ردّ و بدل کرتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اپنی تاویلات سے آیات کتاب کے معنے کچھ سے کچھ کر دیتے ہیں، تیسرے یہ کہ یہ لوگ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے پیروؤں کی صحبت میں آ کر ان کی باتیں سنتے ہیں اور واپس جا کر لوگوں کے سامنے غلط طریقے سے پیش کرتے ہیں۔ بات کچھ کہی جاتی ہے اور وہ اپنی شرارت سے کچھ کا کچھ بنا کر لوگوں میں مشہور کرتے ہیں تاکہ انہیں بدنام کیا جائے اور ان کے متعلق غلط فہمیاں پھیلا کر لوگوں کو اسلامی جماعت کی طرف آنے سے روکا جائے۔[2]

عام شارحین قرآن نے تحریف کے دو ہی محمل بتائے ہیں ایک یہ کہ توریت میں تحریف کرتے تھے دوسرے یہ کہ حضور انور کی باتوں میں تحریف کرتے تھے۔ موقع اور مقام کا تقاضا یہی ہے کہ دوسرے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

یعنے مراد ہوں کیونکہ ویقولون کا عطف اسی کی نشاندہی کر رہا ہے۔ اگر حضور انور کی باتوں میں تحریف مراد ہو تو پھر تحریف کا مطلب یہ ہے کہ آپ کی بات کو غلط معنے پہنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اور اگر تورات میں تحریف مراد ہے اور یہ ان کے علماء کے جرائم میں مستقل پیشہ ورانہ جرم کو بتایا جا رہا ہے تو پھر تحریف کا مطلب یہ ہے کہ بات کو اصل معنے اور مفہوم سے پھیر کر اپنی خواہش کے مطابق دوسرے معنے پہنا دیئے جائیں جو قائل کے منشا کے خلاف ہوں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ

اکثر انواعہ وجوداً ان یقلب اللفظ من ظاہر مرادہ الی ھواہ

تحریف کی عام قسموں میں سے سب سے زیادہ رائج یہ ہے کہ اپنی خواہش کے مطابق مراد مقرر کی جائے۔

تورات میں دونوں قسم کی تحریفات ہوئی لفظی بھی اور معنوی بھی، مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اظہار الحق میں تورات سے ۱۰۰ شہادتیں ایسی پیش فرمائی ہیں حق میں تحریف ہوئی ہے۔

شانِ نبوت میں یہود کی شرارت

۸۶۔ اور کہتے ہیں سمعنا وعصینا اور اسمع غیر مسمع اور راعنا اپنی زبانوں کو مروڑ کر اور دین میں طعنہ اندازی کی خاطر۔ یعنی جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کو کوئی حکم سناتے ہیں تو یہود جواب میں کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا مطلب یہ ہے کہ قبول کر لیا لیکن آہستہ سے کہتے ہیں کہ نہ مانا یعنی ہم نے صرف کان سے سنا دل سے نہیں مانا اور جب یہود آپ سے مخاطب ہوتے تو کہتے ہیں سن نہ سنایا جائے تو، یعنی ایسی بات کرتے ہیں جس کے دو معنے ہوں ایک معنی کے اعتبار سے دعا دوسرے معنے کے لحاظ سے بد دعا، چنانچہ یہ بات بظاہر دعا ہے۔ مطلب یہ کہ تو ہمیشہ غالب اور معزز رہے کوئی تجھ کو بُری اور خلاف بات نہ سنا سکے اور دل میں یہ نیت رکھے بہرا ہو جائیو۔ ایسے ہی جب خدمت اقدس میں یہودی ہوتے تو کہتے راعنا، اس کے بھی دو معنے ہیں ایک اچھے ایک بُرے جن کا بیان سورۂ بقرہ میں گزر چکا ہے۔ اچھے معنے تو یہ کہ ہماری رعایت کرو اور شفقت کی نظر کرو کہ آپ کا مطلب سمجھ لیں اور جو پوچھنا ہو پوچھ سکیں اور بُرے معنے یہ کہ یہود کی زبان میں یہ کلمہ تحقیر کا ہے یا زبان کو دبا کر راعینا کہتے یعنی تو ہمارا چرواہا ہے اور یہ ان کی محض شرارت تھی کیونکہ وہ خوب جانتے تھے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اور دیگر پیغمبروں نے بھی بکریاں چرائی ہیں۔ یہود ان کلمات کو اپنے کلام میں رلا ملا کر اس طرح کہتے کہ سننے والے اچھے ہی معنے پر محمول کرتے اور بُرے معنے کی طرف دھیان بھی نہ جاتا۔ اور دل میں

بُرے معنے مراد لیتے اور پھر دین میں یہ عیب لگاتے کہ اگر یہ شخص نبی ہوتا تو ہمارا فریب ضرور معلوم کر لیتا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے فریب کو خوب کھول دیا[1]

سمعنا واطعنا، اسمع غیر مسمع، راعنا وغیرہ الفاظ عرب کی مجلسی زندگی کے الفاظ میں سے ہیں جو متکلم کی قدر افزائی و تحسین، سننے والے کے اظہار، ذوق و شوق کے موقع پر استعمال ہوتے تھے جیسے ہم بولتے ہیں بجا ارشاد ہے، سر تسلیم خم ہے، خوب بات فرمائی ہے، کیا نکتہ ارشاد ہوا، مکرر ارشاد ہو، پھر فرمائیے، اسی طرح عرب میں بھی مذکورہ الفاظ، کلمات رائج تھے۔ یہ الفاظ اصلاً تو اظہارِ تحسین، اعتراف و قبول کے لیے ہیں لیکن اگر کوئی گروہ شرارت اور بدتمیزی کرنا چاہے تو زبان کو ذرا توڑ مروڑ کر تلفظ کو بگاڑ کر یا لب و لہجہ میں ذرا مصنوعی انداز پیدا کر کے بڑی آسانی سے تحسین کو تقبیح اور اعتراف و اقرار کو طنز و استہزاء بنا سکتا ہے۔ اس سے متکلم کے وقار کو کوئی نقصان پہنچے یا نہ پہنچے۔ لیکن شرارت پسند اشخاص اس طرح اپنے دل کی بھڑاس نکالنے کی کوشش کر کے خوش ہو جاتے ہیں۔ اب ان الفاظ کو کسی قدر وضاحت کے ساتھ سمجھ لیجئے۔

سمعنا واطعنا کے لفظی معنے ہیں ہم نے سنا اور اطاعت کی۔ اہل عرب یہ اس موقعہ پر بولتے ہیں جب اپنے کسی بڑے، کسی سردار کسی بادشاہ کے حکم وارشاد پر اپنی طرف سے امتثال امر کے لیے آمادگی اور مستعدی کا اظہار کرنا چاہتے۔ عربی میں اس کے لیے طاعت کا لفظ بھی ہے جو قرآن میں بھی استعمال ہوا ہے۔ یہودی اشرار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس میں جاتے تو اپنی سعادت مندی اور وفاداری کی نمائش کے لیے سمعنا واطعنا تو بات بات پر کہتے لیکن لب و لہجہ کے تصرف سے اس کو ادا اس طرح کرتے کہ اطعنا کو عصینا بنا لیتے۔ چونکہ دونوں کے حروف ہم آہنگ اور قریب المخرج ہیں۔ اس تحریف میں ان کو کامیابی ہو جاتی۔ اس طرح وہ تسلیم و طاعت کے جملہ کو نافرمانی و سرکشی کے قالب میں ڈھال دیتے اور سمجھنے والے ان کی اس شرارت پر کوئی گرفت بھی نہ کر سکتے۔ اس لیے وہ بڑی آسانی سے یہ بہانہ بنا سکتے کہ ہم نے سمعنا واطعنا کہا ہے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں شریف اور خوددار آدمی بات کو سن کر بھی خاموشی سے ٹال دینے ہی کو بہتر خیال کرتا ہے۔

اسمع غیر مسمع کے لفظی معنی ہیں سنو وہ بات جو پہلے سنائی نہیں گئی اس فقرے کا اچھا محل یہ ہے کہ مجلس میں متکلم یا خطیب کی کوئی حکیمانہ بات سن کر ایک سامع دوسرے سامع کو متوجہ کرے کہ یہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

دانشمندانہ اور حکیمانہ بات سنیئے۔ یہ بات پہلی بار ہمارے کانوں نے سنی ہے۔ اس سے پہلے کبھی ہم نے نہیں سنی۔ ظاہر ہے کہ یہ بات نہ صرف متکلم اور خطیب کی قدردانی کی دلیل ہے بلکہ دوسروں کو اس کی قدردانی کے لیے تشویق و ترغیب بھی ہے لیکن کوئی شخص ٹھونگ کے انداز میں بانداز تمسخر بھی بات کہے تو اس کا یہ مفہوم بھی ہو سکتا ہے کہ ذرا اس کی ناشنید لی سنو۔ یہ کبھی بے پر کی اڑا رہا ہے ایسی بات کہہ رہا ہے کہ کسی نے سنی ہو گی۔ ظاہر ہے کہ محض انداز اور لب لہجہ کی تبدیلی نے اس نہایت اعلیٰ فقرے کو طعن و طنز کا ایک زہر آلود نشتر بنا دیا لیکن اس پر بھی کوئی گرفت نہیں ہو سکتی اس لیے کہ گرفت ہو تو کہنے والا صفائی پیش کر سکتا ہے کہ میں نے طنز کے طور پر نہیں بلکہ تحسین کے طور پر کہا ہے۔ چونکہ اس فقرے میں طنز کا پہلو غیر مسمع کے الفاظ سے پیدا ہوتا تھا اس لیے قرآن نے اس کی یہ لوک توڑ دی اور ہدایت کی کہ صرف اسمع کہا جائے۔

راعنا کے لفظی معنے ہیں ذرا ہماری رعایت فرمائیے۔ اس لفظ کا اچھا محل استعمال یہ ہے کہ اگر مخاطب نے متکلم کی بات اچھی طرح سنی یا سمجھی نہ ہو یا بات ایسی لطیف ہو کہ خود متکلم کی زبان سے اس کو مکرر سننا چاہیے تو اس کو دوبارہ متوجہ کرنے کے لیے جس طرح ہم کہتے ہیں پھر ارشاد ہو، پھر فرمائیے اسی طرح عربی میں راعنا کہتے ہیں۔ یہ انداز سامع کے ذوق و شوق اور اس کی رغبت علم کی دلیل ہے لیکن یہودی زبان کو توڑ مروڑ کر اس کو بھی طنز کے قالب میں ڈھال دیتے تھے۔ اس کی شکل یہ ہوتی کہ راعنا میں عین کے زیر کو ذرا دبا دیتے تو یہ لفظ راعینا بن جاتا اس کے معنے ہیں اے ہمارے چرواہے۔ قرآن نے یہود کی اس شرارت کی وجہ سے اس لفظ کو اہل ایمان کے مجلسی الفاظ ہی سے خارج کر دیا۔[1]

نبی کی شان میں گستاخی دین میں طعن ہے

۴۶۔ اور اگر یہ لوگ سمعنا واطعنا اور اسمع اور انظرنا کہتے تو یہ ان کے حق میں بہتر اور زیادہ درست ہوتا لیکن ان پر ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے پھٹکار ڈال دی اس لیے ان میں تھوڑی تعداد کے علاوہ سب ایمان سے محروم ہیں۔ حق تعالیٰ نے یہود کے تین قول مذموم بیان فرما کر اب بطور ملامت و ہدایت ارشاد فرماتے ہیں کہ اگر یہود عصینا کی جگہ اطعنا کہتے اور بجائے اسمع غیر مسمع کے اسمع کہتے اور راعنا کی جگہ انظرنا کہتے تو ان کے حق میں بہتر ہوتا اور یہ بات درست اور سیدھی ہوتی اور اس یہود کی اور شرارت

---

[1] تدبر قرآن

کی گنجائش نہ ہوتی جو کلمات سابقہ سے یہود بُرے معنے اپنے دل میں مراد لیا کرتے تھے لیکن چونکہ ان کو ان کے کفر کے باعث اپنی رحمت و ہدایت سے محروم کردیا ہے اس لیے وہ مفید اور سیدھی باتوں کو نہیں سمجھتے اور ایمان نہیں لاتے مگر تھوڑے سے آدمی کہ وہ ان خباثتوں اور شرارتوں سے مجتنب ہیں اور اس وجہ سے اللہ کی لعنت سے محفوظ ہیں جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی لہ

مطلب یہ ہے کہ یہ جسارت اور گستاخی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اس لیے کرتے ہیں کہ اللہ نے ان کو اپنی رحمت سے دور کردیا ہے یعنی ان پر لعنت ڈال دی ہے اور ان پر یہ لعنت ان کے کافرانہ طرزِ عمل کی وجہ سے ہوئی ہے۔ اس میں اشارہ ہوگیا ہے کہ گناہ سے گناہ پیدا ہوتا ہے اگر یہ کفر اختیار نہ کرتے تو شانِ نبوت میں گستاخی جیسے سنگین جرم کو نہ اپناتے اور طعناً فی الدین کہہ کر یہ بھی بتادیا کہ نبی پر طعن خود دین پر طعن ہے کیونکہ نبی فی الواقع مجسمہ دین اور مظہر شریعت ہوتا ہے۔

تھوڑا ایمان یا تھوڑے ایماندار

آخر میں فرمایا فلا یومنون الا قلیلاً اس کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ قلیل ایمان کی صفت ہے اور عبارت یوں ہے فلا یومنون الا ایماناً قلیلاً یعنی وہ تھوڑا سا ایمان لاتے ہیں جو ایمان صلاحیت اور پاکیزگی نفس کے لیے ضروری ہے اس میں عقائد کے ساتھ معاملات، اخلاق اور اجتماعی اور انفرادی زندگی کے متعدد اجزا ہیں۔ بنی اسرائیل دینی زندگی کے سارے اجزائیں سے صرف چند اجزاء پر نام ونمود کے لیے ایمان رکھتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ایسا ایمان کسی کو نیک بنا تا نہ اس سے تزکیہ ہوتا ہے اور نہ عقلِ انسانی کی ترقی کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر ان کے پاس ایمان کامل ہوتا تو وہ بلاشبہ آگے بڑھ کر اس کتاب اور اس نبوت کا استقبال کرتے جو ان کی کتاب کی مصدق بن کر آئی ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہودیوں کی تھوڑی تعداد ایمان لاتی ہے اور عبارت یوں ہے فلا یومنون الا عدداً قلیلاً یعنی ان کی تھوڑی سی تعداد ایمان لاتی ہے۔ اس مطلب کی تائید صحیح بخاری کی ابوہریرہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جس کے الفاظ یہ ہیں :

اگر مجھ پر دس یہودی ایمان لے آتے تو تمام یہودی ایمان لے آتے۔

ان الفاظ پر یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ بہت سے یہودی آپ پر ایمان لا چکے تھے مگر اس کے باوجود

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

تمام یہود ایمان نہیں لائے۔ مسند احمد کی اس روایت سے جو ابوہریرہ کے حوالہ سے آئی ہے کہ،

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہود کے دس بڑے علماء مجھ پر ایمان لے آتے تو تمام یہود ایمان لے آتے۔

معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی مراد مطلق یہود نہ تھی بلکہ خاص ان کے علماء مراد تھے اگر ان کے دس علماء ایمان لے آتے تو ان کی اتباع میں یقیناً بقیہ یہود بھی ایمان لے آتے جیسا کہ قبائل عرب بھی اس کے منتظر تھے کہ قریش ایمان لے آئیں تو ان کی اتباع میں ہم بھی ایمان لے آئیں گے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری کے وقت رؤسائے یہود سے مشاہیر کے نام بھی لکھے ہیں۔

یہاں کعب احبار نے دس کی بجائے بارہ کا عدد بتایا ہے۔ دونوں روایتوں میں یہ اختلاف ہے کہ حضور نے دس کا عدد بیان فرمایا ہے یا بارہ کا، کعب کہتے ہیں کہ بارہ اور ابوہریرہ کہتے ہیں دس۔ یحییٰ ابن سلام فرماتے ہیں کہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ہو سکتا ہے کہ کعب احبار نے پورا عدد ذکر کیا ہو اور ابوہریرہ نے ان کی تعداد بتائی ہو جو مشرف باسلام نہ ہوئے تھے۔ عبداللہ بن سلام اور مخیریق اسلام قبول کر چکے تھے۔ بہرحال خلاصۂ حدیث یہ ہے کہ اگر کہیں اس وقت یہ دس بارہ احبار کلمۂ اسلام قبول کر لیتے تو جو یہود ان کو ارباب اور سادہ سمجھتے تھے تمام کے تمام اسلام میں داخل ہو جاتے مگر چونکہ اس قوم کے حق میں من حیث القوم اسلام مقدر نہ تھا اس لیے ان کے علماء کو بہت کم توفیق ہوئی۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ آمِنُوا بِمَا نَزَّلْنَا مُصَدِّقًا لِمَا مَعَكُمْ
مِنْ قَبْلِ أَنْ نَطْمِسَ وُجُوهًا فَنَرُدَّهَا عَلَى أَدْبَارِهَا أَوْ نَلْعَنَهُمْ
كَمَا لَعَنَّا أَصْحَابَ السَّبْتِ ۚ وَكَانَ أَمْرُ اللَّهِ مَفْعُولًا ۝ إِنَّ اللَّهَ لَا
يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ
يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدِ افْتَرَىٰ إِثْمًا عَظِيمًا ۝ أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ
يُزَكُّونَ أَنْفُسَهُمْ ۚ بَلِ اللَّهُ يُزَكِّي مَنْ يَشَاءُ وَلَا يُظْلَمُونَ فَتِيلًا ۝
انْظُرْ كَيْفَ يَفْتَرُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ ۖ وَكَفَىٰ بِهِ إِثْمًا مُبِينًا ۝ ع

اے اہل کتاب! اس کتاب پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے اور جو اس کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے اور اس وقت سے پہلے ایمان لاؤ کہ ہم چہرے مسخ کر ڈالیں اور پھر پیٹھ پیچھے لوٹا دیں، یا ان کو ایسا ہی پھٹکار والا بنا دیں جیسے سبت والوں کو بنا دیا اور اللہ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے۔ یہ بات اللہ کبھی نہیں معاف

کرے گا کہ اس کے ساتھ شریک کیا جائے اور اس کے علاوہ دوسرے گناہ جس کو چاہے گا معاف کر دے گا اور جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بناتا ہے وہ بڑا گناہ کرتا ہوا خدا پر بہتان اٹھاتا ہے۔ کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جو اپنی پاکیزگی کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں بلکہ پاکیزگی اللہ ہی جسے چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور رائی برابر کسی پر ظلم نہیں کیا جاتا۔ دیکھو یہ اللہ پر کیسے بہتان اٹھاتے ہیں ان کی کھلی گنہ گاری کے لیے یہی بات کافی ہے۔"

اہلِ کتاب کو اسلام کی دعوت

یہودیوں کا مذہبی تصور یہ تھا کہ دنیا کو برتتے ہوئے اور اپنی جبلی خواہشوں کو معقول حدود کے اندر پوری کرتے ہوئے خدا کی عبادت کرنی چاہیے، رہے دنیوی معاملات اور مسائل تو صرف انفرادی زندگی کی حد تک دین اسے متعینہ ہدایتیں دیتا ہے جن کی پوری پوری پابندی کرنی چاہیے باقی زندگی میں وہ آزاد ہے دنیا کے عام اجتماعی مسائل اور معاملات کو انسانوں کی علمی و فکری رہنمائی میں حل کیا جائے۔ یہی ان کی تمام فکری و عملی گمراہیوں کا سرچشمہ تھی۔ اس کے برعکس اسلام کی آواز عبادت گاہوں اور زندگی کے انفرادی دائروں تک محدود نہیں بلکہ وہ بازاروں کاروباری اداروں، معاشی میدانوں، تمدن کے دائروں، سیاست اور حکومت کے ایوانوں غرض زندگی کے ایک ایک شعبے میں ہدایتیں دیتا ہے، کچھ باتوں سے روکتا اور کچھ باتوں کا امر کرتا ہے اور ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو وہ دین نہ کہتا ہو۔

قرآن نے اس آیت میں اسی اسلام کی دعوت دی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کی عبادت کے یہ دو لازمی تقاضے ہیں ایک یہ کہ ہم اللہ کی عبادت کریں اور دوسرے یہ کہ اللہ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلقات قائم نہ کریں۔ دوسروں سے عابدانہ تعلقات ہی کو قرآن "ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً من دون اللہ" کہتا ہے اسی کو اتخاذِ ارباباً من دون اللہ کہا ہے اسی کو عبادتِ طاغوت کہتا ہے۔ اسلام کی دعوت یہ ہے کہ جیسے کسی کے ساتھ پرستش کے تعلقات قائم کرنا اس کی عبادت ہے ایسے ہی کسی کو مطاع مطلق مان کر اپنے اور مرضی سے اس سے بندگی کے تعلقات قائم کرنا اس کی عبادت ہے۔ یہودی بندگی کی حد تک شرک کا جرم عظیم اختیار کیے ہوئے تھے۔ محض پرستش کی حدود میں اللہ سے عابدانہ تعلقات قائم کر کے اپنی پاکیزگی نفس کے مدعی تھے۔ قرآن ان آیات میں ان کے اسی طرزِ عمل کو افتراء علی اللہ کذباً اور اثم مبین کہتا ہے۔

۴۷۔ اے اہل کتاب اس کتاب پر ایمان لاؤ جو ہم نے اتاری ہے اور اس کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہے اور اس وقت سے پہلے ایمان لاؤ کہ ہم چہرے مسخ کر ڈالیں اور پیٹھ پیچھے ان کو لوٹا دیں یا ان کو ایسا ہی پھٹکار والا بنا دیں جیسے سبت والوں کو بنا دیا تھا اور اللہ کا فیصلہ نافذ ہو کر رہتا ہے۔ آیات سابقہ میں یہود کی ضلالت اور مختلف قبائح کا ذکر فرما کر اب ان کو بطورِ خطاب ایمان اور تصدیق قرآن کا حکم دیا جاتا ہے اور اس کی مخالفت سے ڈرایا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے اہل کتاب ایمان لاؤ قرآن پر جس کے احکام مصدق اور مطابق ہیں توریت کے ایمان لاؤ اس سے پہلے کہ مٹا ڈالیں ہم تمہارے چہروں کے نشانات یعنی آنکھ ناک وغیرہ، مطلب یہ کہ تمہاری صورتیں بدل دی جائیں پھر الٹ دیں تمہارے چہروں کو پیٹھ کی طرف یعنی چہرے کو مطموس اور ہموار کر کے پیچھے کی طرف اور گدی کو آگے کی طرف کر دیں یا ہفتہ کے دن والوں کی طرح تم کو مسخ کر کے جانور بنا دیں اصحاب سبت کا قصہ سورۃ اعراف میں مذکور ہے۔[1]

اس آیت میں اہل کتاب خصوصاً یہود کو ایمان کی دعوت دی گئی ہے اور دعوت کے دونوں انداز ترغیب اور ترہیب اختیار کیے گئے ہیں۔ ترغیب یہ ہے کہ تمہاری کتاب کی مصدق ہے اور ترہیب میں دو باتوں کی طرف ان کی توجہ مبذول کرائی گئی ہے۔ ایک طمس وجوہ دوسرے لعنت،

قرآن کے مصدق ہونے کا مطلب

یہ قرآن اس چیز کی تصدیق کرتا ہے جو تمہارے پاس ہے یعنی قرآن حکیم اس پیشین گوئی کو سچی ثابت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کر رہا ہے جو تورات میں آخری نبی کی بعثت اور اس بعثت کی خصوصیات سے متعلق آئی ہے۔ مقصود یہ ہے کہ اگر سمجھ سے کام لو تو قرآن عزیز اور یہ پیغمبر تمہارے لیے سامان رحمت ہیں کیونکہ ان کے ظہور سے سب سے زیادہ تمہارا ہی سر اونچا ہوا ہے۔ تمہارے صحیفوں میں ان کی پیشین گوئیاں موجود تھیں اور یہ پیشین گوئیاں اب تک اپنے حقیقی مصداق کے ظہور کی منتظر تھیں۔ اب اس کتاب اور اس پیغمبر کے ظہور نے ان کا مصداق دنیا کے سامنے پیش کر کے تمہاری کتاب کو سند تصدیق عطا کر دی لہٰذا تمہیں اس پر ایمان لانے کے لیے آگے بڑھنا چاہیے اور ایمان لانے سے مقصود ان تمام صداقتوں اور حکموں کو بجان و دل قبول کرنا ہے جو اس کتاب میں مذکور ہیں۔ یہ گویا پوری اسلامی زندگی کو اپنانے کا مختصر ترین انداز تعبیر ہے اور اس لیے ایمانیات کی بہت سی باتیں جن کی تفصیل ہر موقعہ پر پیش نہیں کی جاتی آمنوا کے تحت آجاتی ہیں۔

قرآن پر ایمان لانے کے معنے یہ ہیں کہ جو کچھ قرآن میں علمی و عملی عقائد و عبادات و احکام مذکور ہیں۔ ان سب کو بے کم و کاست تسلیم کر لیا جاتے۔ اگر کوئی تسلیم ہی نہیں کرتا تو ان کی تعمیل و پیروی کا مطالبہ اس سے کیوں کر کیا جا سکتا ہے اس بنا پر اسے ما نزلنا سے تعبیر کیا گیا ہے اور اسے ہی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ماجئت بہ فرمایا ہے یعنی جو کچھ میں لے کر آیا ہوں اس کو مانو۔

چہروں کا بگاڑ اور ان کا الٹاؤ

ایمان کی دعوت میں ترہیب کے انداز میں پہلے علماء یہود سے جو بات کہی گئی ہے کہ اس وقت سے پہلے ایمان لے آؤ کہ ہم چہرے مسخ کر کے پیٹھ پیچھے الٹا دیں۔ اصل ارشاد یہ ہے نطمس وجوھا فنردھا علی ادبارھا اس فقرے کی تشریح میں شارحین قرآن مختلف ہیں۔ کچھ کی رائے ہیں اس کا مدلول لغوی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے چہروں کے نقش و نگار اور آنکھ ناک وغیرہ اعضا کو مٹا دیا جائے گا اور اس کے نتیجے میں ان لوگوں کے چہروں کو گدیوں کی طرح صاف چٹ کر دیں گے جو لوگ یہ مطلب بتاتے ہیں ان میں پھر اختلاف ہے کہ عذاب کب ہوگا۔ کچھ کہتے ہیں دنیا میں ہوگا اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ ڈراوے سب عذاب اخروی کے ڈراوے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ دنیا میں ہوگا ان کے سامنے جب یہ سوال آیا کہ کب ہوگا تو انہوں نے جواب دیا کہ قیامت سے پہلے ہوگا لیکن مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ:

> میرے نزدیک سرے سے یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ قرآن میں کوئی لفظ ایسا نہیں جس سے معلوم ہو کہ اگر ایمان نہ لاؤ گے تو طمس و مسخ کا عذاب ضرور واقع ہوگا بلکہ احتمال ہے یعنی اگر ان کے جرم کو دیکھا جائے تو وہ اس سزا کے مستحق ہیں اور اگر عذاب نہ دیں تو یہ ان کی

رحمت ہے ہے [1]

اور کچھ کی رائے میں مدلول لغوی مراد نہیں بلکہ استعارے کی زبان میں ان کو بتایا گیا ہے کہ اس سے پہلے ایمان لے آؤ کہ ہم تمہارے سرداروں کو ذلیل وخوار کر دیں۔ زمخشری نے کشاف میں، راغب نے مفردات میں وجوہ کے معنے اعیان ورؤساء کے لکھے ہیں۔ اس صورت میں طمس مٹا دینے کے معنے میں نہیں بلکہ ہٹا دینے کے معنے میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ پہلے اس کے کہ ہم ان کے ذی وجاہت لوگوں کے حالات کو زیروزبر کر ڈالیں اور ان سے عزت واقبال چھین کر ذلت وادبار ان پر ڈالیں۔ بیضاوی اور رازی نے بھی یہ معنے لکھے ہیں اور اسی استعارے کی رعایت سے سید رشید رضا نے یہ معنے بتائے ہیں۔

> اس کتاب پر ایمان لاؤ جو ان باتوں کی تصدیق کرتی ہے جو تمہارے پاس ہیں پہلے اس کے کہ ہم تمہارے ان مقاصد کے چہروں کو ملیامیٹ کریں جو تم اسلام کی بیخ کنی کے لیے اختیار کیے ہوئے ہو اور اسلام کو غلبہ دے کر تمہیں پیچھے ہٹائیں اور تمہارے دین وعلم کا چولہے میں بھانڈا پھوڑیں۔

دراصل اس آیت کے سمجھنے کے لیے یہ بات پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اہل عرب بالکل ناخواندہ تھے اور ان کے مقابلے میں یہودیوں کے اندر ویسے بھی تعلیم کا چرچا تھا اور انفرادی طور پر ان میں ایسے جلیل القدر عالم پائے جاتے تھے جن کی شہرت عرب کے باہر تک پہنچی ہوئی تھی۔ حافظ ابن حجر نے مدینے کے ان علماء یہود کے نام بھی فتح الباری میں لکھے ہیں جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود تھے۔ عبداللہ بن سلام، ابو یاسر بن اخطب، حی بن اخطب، کعب بن الاشرف، رافع بن ابی الحقیق، عبداللہ بن حنیف، فنحاص رفاعہ ابن زید، زبیر بن باطیا، کعب بن اسد، شمویل بن زید، ان میں صرف عبداللہ بن سلام کا اسلام ثابت ہے۔ ان علماء نے اپنے مذہبی درباروں کی ظاہری شان سے اپنا رعب اور زیادہ گہرا اور وسیع کر رکھا تھا۔ اہل مدینہ ان سے بے حد مرعوب تھے۔ ان حالات میں جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے آپ کو نبی کی حیثیت سے پیش کیا اور لوگوں کو اسلام کی دعوت دینی شروع کی تو قدرتی بات تھی کہ ادھر ادھر لوگ ان لوگوں سے جاکر پوچھتے مگر ان علماء نے کبھی لوگوں کو صحیح بات نہ بتائی۔ ان کے لیے یہ کہنا تو مشکل تھا کہ وہ توحید جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پیش کر رہے ہیں غلط ہے یا انبیاء اور کتب آسمانی اور ملائکہ اور آخرت کا جو مطالعہ آپ بتا رہے ہیں اس میں کوئی غلطی ہے یا وہ اخلاقی اصول جن کی آپ تعلیم دے

[1] معارف قرآن م ش

رہے ہیں ان میں سے کوئی چیز غلط ہے لیکن وہ کھلے بندوں اس حقیقت کا اعتراف کرنے کے لیے تیار نہ تھے کہ جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں صحیح ہے وہ نہ سچائی کی کھلے بندوں تردید کر سکتے ہیں نہ سیدھی طرح اس کو سچائی مان لینے پر آمادہ تھے۔ ان دونوں راستوں کے درمیان انہوں نے طریقہ یہ اختیار کیا کہ ہر شخص کے دل میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف اہل ایمان کے خلاف اور آپ کے مشن کے خلاف کوئی نہ کوئی وسوسہ ڈال دیتے۔ کوئی الزام آپ پر چسپاں کر دیتے۔ کوئی ایسا شوشہ چھوڑ دیتے جس سے لوگ شکوک و شبہات میں پڑ جائیں اور طرح طرح کے الجھن میں ڈالنے والے سوالات چھیڑ دیتے تاکہ لوگ ان میں خود بھی الجھیں اور حضور الزراور اہل ایمان کو بھی الجھانے کی کوشش کریں۔ یہی علمار مجلس میں آتے تو اپنے سلام اور کلام میں ہر ممکن طریقے سے دل کا بخار نکالنے کی کوشش کرتے، ذو معنے الفاظ بولتے، زور سے کچھ کہتے اور زیر لب کچھ کہتے ان کا یہی رویہ تھا جس کی بنا پر ان سے فرمایا جا رہا ہے کہ ایمان لے آؤ اور انکار حق کے شیوہ سے باز آجاؤ۔ اس وقت سے پہلے ایمان لے آؤ جب ایسا ہو کہ ہم لوگوں کے چہرے مسخ کر کے پیٹھ پیچھے الٹا دیں یعنی انہیں ذلیل و خوار کر دیں یعنی وہ وقت دور نہیں ہے کہ دعوت حق کی فتح مندی ان کی ذلت و خواری کا آخری فیصلہ کر دے گی۔ دنیا نے دیکھ لیا کہ قرآن کا یہ اعلان حرف بحرف پورا ہوا۔

سبت والوں کی طرح کی پھٹکار

دعوت ایمان کے لیے ترہیب کے انداز میں علمار یہود سے دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ اس سے پہلے ایمان لے آؤ کہ ہم تمہارے ساتھ لعنت کا اصحاب سبت جیسا معاملہ کریں۔ سبت والوں سے مقصود یہودیوں کی وہ جماعت ہے جنہیں سبت کے دن احترام کا حکم دیا گیا تھا اور اس دن شکار کھیلنے سے روک دیے گئے تھے لیکن انہوں نے حیلے بہانے نکال کر اس حکم کی نافرمانی کی اور غضب الٰہی کے سزاوار ہوئے۔ سورہ بقرہ کے نوٹ ۱۸۰، ۱۸۱، ۱۸۲، ۱۸۳ میں اس پر اجمالی تبصرہ گزر چکا ہے اور تفصیل انشاء اللہ پارہ نہم میں آئے گی۔

یہاں بتانا یہ ہے کہ اب تمہارے لیے آخری موقعہ ہے کہ تم سنبھلنا چاہو تو سنبھل جاؤ۔ یہ موقع نکل گیا تو پھر کبھی میسر نہ آئے گا۔ بہتر ہے کہ اس کتاب پر ایمان لے آؤ جو تمہاری اپنی پیش گوئیوں کی تصدیق کرتی ہوئی اتری ہے ورنہ یاد رکھو کہ اب تمہارے لیے وہ وقت آ پہنچا ہے کہ تمہارے اوپر بھی اسی طرح کی لعنت کر دی جائے جس طرح کی لعنت سبت والوں پر کر دی گئی ہے کہ وہ ذلیل بندر ہو کر رہ گئے تھے۔

رحمت کی طرح لعنت کے بھی مختلف مدارج ہوتے ہیں۔ یہاں ان کو جس درجے کی لعنت کی دھمکی دی

گئی ہے یہ وہ لعنت ہے جس کے فی الواقع وہ اپنی شرارتوں کی وجہ سے مستحق بن چکے تھے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے اس سے کم درجے کی ان پر کی تو یہ ان کو گویا تھوڑی سی مہلت دی گئی اور ہر مہلت جو کسی قوم کو ملتی ہے اگر وہ اس کی قدر نہیں کرتے تو یہ ان کے اخروی عذاب میں زیادتی کا باعث ہوتی ہے۔

شرک فی الطاعۃ ناقابلِ عفو جرم ہے

۹۸۔ یہ بات اللہ کبھی معاف نہ کرے گا کہ اس کے ساتھ شریک کیا جائے اور اس کے علاوہ دوسرے گناہ جس کو چاہے گا اللہ معاف کر دے گا اور جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بناتا ہے وہ بڑا گناہ کرتا ہوا خدا پر بہتان اٹھاتا ہے۔ یعنی مشرک کبھی نہیں بخشا جاتا بلکہ اس کی سزا دائمی ہے۔ البتہ شرک سے نیچے جو گناہ ہیں صغیرہ ہوں یا کبیرہ وہ سب قابلِ مغفرت ہیں۔ اللہ تعالیٰ جس کی مغفرت چاہیں اس کے صغیرہ و کبیرہ بخش دیتے ہیں، کچھ عذاب دے کر یا بلا عذاب دیے۔ اشارہ اس طرف ہے کہ یہود چونکہ کفر و شرک میں مبتلا ہیں وہ مغفرت کی توقع نہ رکھیں۔[1]

شرک کے معنے ساجھے پن کے ہیں اور دین کی اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساتھی یا ساجھی ٹھہرایا جائے، گویا شرک کی تین قسمیں ہیں۔

ایک وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہوتا ہے۔

دوسرے وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی صفات سے ہوتا ہے۔

تیسرے وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی صفتوں کے لوازم اور تقاضوں سے ہوتا ہے۔

پہلی قسم کے شرک کی عملی صورتیں یہ ہیں، کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہم جنس قرار دیا جائے، اسے اس کا باپ یا اولاد سمجھ لیا جائے۔ یہ مان لیا جائے کہ وہ کسی اور ہستی کے ساتھ مل کر ایک قالب ہو گیا ہے۔ یہ تصور کر لیا جائے کہ وہ کسی مخلوق کی صورت اختیار کر کے نمودار ہوا کرتا ہے یعنی کوئی اس کا اوتار ہو سکتی ہے۔

دوسری قسم کے شرک کی عملی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن صفتوں سے متصف ہے ان میں سے کوئی صفت کسی اور کے اندر بھی موجود مان لی جائے اور اسی معنے و مفہوم میں مان لی جائے جس معنے و مفہوم میں وہ اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہے مثلاً علم اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھلی اور چھپی ہر بات کو خود بخود جانتا ہے اس کے لیے غائب بھی حاضر ہے اور گزرا ہوا یا آنے والا زمانہ بھی حال کا زمانہ ہے۔ اسی

[1] افادات شیخ الاسلام

طرح نفع ونقصان پہنچانا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے مسرت اور راحت کا سامان عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم کرتا ہے۔

تیسری قسم کے شرک کی صورت یہ ہے کہ صفات الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں انہیں اور ان سب کو اللہ ہی کے لیے خاص نہ سمجھا جائے بلکہ انہیں یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے لیے خاص نہ سمجھا جائے بلکہ انہیں یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے لیے ثابت اور موجود مان لیا جائے مثلاً صفات الٰہی کا ایک تقاضا یہ ہے کہ حقیقی طاعت اور محبت صرف اللہ کا حق ہے۔ اب کوئی شخص کسی اور سے بھی ایسی ہی محبت اور عقیدت رکھے یا اسی طرح کی طاعت کا اسے مستحق قرار دے لے تو یہ صفات الٰہی کے تقاضوں میں غیر اللہ کو شریک ٹھہرانا ہے۔ اسی طرح ان صفات کا ایک اور تقاضا یہ بھی ہے کہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے اور حکم دینے، قانون بنانے کا حق اصلاً اسی کو پہنچتا ہے اس لیے اگر کسی اور کو بھی یہ حیثیت دے دی جائے خواہ وہ ایک فرد ہو یا بہت سے افراد کا مجموعہ ہو تو یہ شرک ہوگا۔

شاہ عبدالقادر نے پہلی دو قسموں کو آیت ولا تنکحوا المشرکات کے تحت ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

شرک یہ کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے یا وہ جو چاہے کر سکتا ہے یا ہمارا بھلا یا برا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے۔ مثلاً کسی چیز کو سجدہ کرے اور اس سے حاجت مانگے اس کو مختار جان کر۔

اور تیسری قسم کا تعارف آیت وان اطعتموھم انکم لمشرکون کے تحت اس طرح کرایا ہے۔

شرک فقط یہی نہیں ہے کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔

اور آپ چاہیں تو پہلی دو قسموں کو شرک فی الالوہیت اور تیسری قسم کو شرک فی الربوبیت کہہ سکتے ہیں اور آپ چاہیں تو پہلی دو قسموں کو شرک فی العبادۃ اور تیسری قسم کو شرک فی الطاعۃ بھی کہہ سکتے ہیں۔ شاہ عبدالعزیز نے اسے شرک فی الطاعۃ ہی فرمایا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ،

شرک کی ایک قسم شرک فی الطاعۃ بھی ہے اس کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی مخلوق کی ایسی طاعت کی جائے کہ اگر اس کا حکم خدا کے حکم کے خلاف بھی ہو جب بھی اسی کی اطاعت کی جائے۔

قرآن نے یہود و نصاریٰ کو اسی کا مجرم گردانا ہے۔ اسی کو قرآن نے یہودیوں اور عیسائیوں کے سامنے رفع نزاع کے لیے عبادت خداوندی کے ساتھ بطور مطالبہ پیش کیا ہے ولا یتخذ بعضنا بعضاً ارباباً

من دون اللہ یہود و نصاریٰ کی تمام فکری گمراہیوں کا سرچشمہ یہی شرک تھا۔ یعنی شرک فی الطاعۃ یعنی انہوں نے اپنے علماء و مشائخ کو ارباب بنالیا تھا۔ ارباب بنانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ ان کو رب السماوات والارض مانتے تھے کیونکہ اس طرح تو کبھی کسی نے کسی کو رب نہیں بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے احبار کو اور عیسائیوں نے اپنے رہبان کو زندگی کے متعلق قانون سازی کے بارے میں حلال و حرام کا حق دے رکھا تھا۔ قرآن نے ان پر کھلے بندوں یہ الزام عائد کیا ہے اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ یعنی ان کو ایسا صاحب اختیار مان رکھا ہے کہ جو چاہیں یہ جائز کریں جو چاہیں وہ حرام قرار دیں۔ سارے اختیارات شریعت اور قانون سازی کے ان کو ہی حاصل تھے۔ امام رازی نے لکھا ہے

مفسرین قرآن کی اکثریت کی رائے میں ارباب بنانے سے مراد ان کو معبود بنالینا نہیں بلکہ اوامر و نواہی میں ان کی طاعت کرنا ہے۔

خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کا یہی مطلب بتایا ہے۔ عدی بن حاتم طائی جو پہلے عیسائی تھے کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب براۃ کی یہ آیت اتخذوا احبارھم ورھبانھم پڑھی تو میں نے عرض کیا کہ ہم انہیں پوجتے تو نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا ایسا نہیں ہے کہ جس بات کو وہ حرام ٹھہراتے ہیں تم حرام سمجھ لیتے ہو، جس بات کو حلال کر دیتے ہیں تم حلال مان لیتے ہو عرض کیا ہاں، فرمایا یہی ان کو رب بنالینا ہے۔ (ترمذی)

اس سے معلوم ہوا کہ اپنے پیشواؤں، سربراہوں کو اس بات کا حق دے دینا کہ جو کچھ اپنی خواہش اور رائے سے حلال و حرام ٹھہرا دیں اس کو بلا چون و چرا مان لینا اور ان کی طاعت کرنا قرآن کے نزدیک ان کو رب بنالینا ہے کیونکہ اس بات کا حق اللہ کے سوا بالذات کسی کو نہیں ہے۔ اس مضمون سے حضرت شاہ عبدالعزیز نے یہ استنباط فرمایا ہے کہ قرآنی نظر میں اس درجہ کی اطاعت بھی شرک ہے اور شاہ عبدالقادر نے بھی یہی بات سمجھی ہے۔

قرآن کی اس آیت میں اسی شرک کا ذکر ہے جس کا یہود ارتکاب کر رہے ہیں ورنہ دنیا جانتی ہے اور قرآن گواہ ہے کہ یہودیوں نے شرک کی پہلی دو قسموں کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہودیوں میں ایک انسان بھی ایسا نہیں جس نے اپنے ربی کو خدا سمجھا ہو لیکن ان کے عمل کا یہی حال رہا۔ گویا حق و باطل، حلال و حرام، عذاب و ثواب اور جنت و دوزخ کی ساری تقسیم کا اختیار انہی کے قبضے میں ہے۔ جو حلال کر دیں حلال ہے جو حرام کر دیں حرام ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ شرک تو اللہ کی حکومت سے صریح بغاوت ہے۔ اسے چھوڑ کر باقی ہر معصیت مغفرت کی گنجائش رکھتی ہے اور جس کسی کے حق میں مشیت الٰہی ہوگی اسے معافی مل جائے گی۔

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ آدمی بس شرک نہ کرے باقی دوسرے گناہ دل کھول کر کرتا رہے بلکہ دراصل اس سے یہ بات ذہن نشین کرانی مقصود ہے کہ شرک جس کو ان لوگوں نے بہت معمولی چیز سمجھ رکھا تھا تمام گناہوں سے بڑا گناہ ہے حتیٰ کہ اور گناہوں کی معافی تو ممکن ہے مگر یہ ایسا گناہ ہے کہ معاف نہیں کیا جا سکتا۔

یہودیوں کے ذکر میں اس آیت کے لانے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ تمہیں نبیوں کی اولاد ہونا، نبیوں سے نسبت اور نسب کا تعلق دھوکے میں نہ ڈال دے۔ تم نے مشرکانہ زندگی سے دین کی بنیاد ہی منہدم کردی ہے۔ اس جرم کو اللہ ہرگز معاف نہ کرے گا۔

یہود کا پاکیزگی نفس کا دعویٰ

۹۰۔ کیا تم نے ان لوگوں کے حال پر غور نہیں کیا جو اپنی پاکیزگی کا دعویٰ کرتے ہیں حالانکہ ایسا نہیں بلکہ اللہ جسے چاہتا ہے پاکیزگی عطا کرتا ہے اور (اللہ) رائی برابر کسی پر ظلم نہیں کرتا۔ یعنی یہود باوجود اس قدر خراب ہوں کے پھر بھی اپنے آپ کو پاک صاف اور مقدس کہتے ہیں حتیٰ کہ اپنے آپ کو ابناء اللہ اور احباء اللہ بتلاتے ہیں جو بالکل لغویات ہے بلکہ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے اس کو پاکیزہ اور مقدس کرتا ہے۔ یہود کے کہنے سے کچھ نہیں ہوتا اور ان جھوٹی شیخی کرنے والوں پر ادنیٰ سا ظلم بھی نہ ہوگا یعنی یہ لوگ اپنے عذاب بے نہایت میں گرفتار ہوں گے ان پر ناحق عذاب ہرگز نہ ہوگا [1]

تزکیہ کے لفظی معنے پاک وصاف کرنا میل کچیل دور کرنا ہیں۔ قرآن نے اس لفظ کو اس معنے میں استعمال کیا ہے کہ نفس انسانی کو ہر قسم کی نجاستوں سے نکھار کر صاف ستھرا کیا جائے یعنی اس آئینہ کے زنگ کو دور کر کے اس میں صیقل اور جلا پیدا کیا جائے۔ قرآن میں ہے قد افلح من زکٰھا بلاشبہ جس نے نفس کو صاف ستھرا بنا لیا وہ کامیاب ہو گیا۔

یہودی اپنے آپ کو ایک برتر اور برگزیدہ گروہ سمجھتے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ وہ اللہ کے محبوبوں کی اولاد ہیں اور خود خدا کے محبوب اور چہیتے ہیں اس لیے ان کے لیے خدا کے یہاں کوئی باز پرس اور حساب نہ ہو گی۔ ان کے اعمال و اخلاق خواہ کچھ ہوں۔ تزکیہ نفس کے اس غرور نے ان کو عمل اور طاعت کی ذمہ داریوں سے بالکل فارغ کر دیا تھا اور انہوں نے اپنے آپ کو بندگی کے دائرے سے نکال لیا تھا حالانکہ کہیں بھی اللہ نے ان کو برگزیدگی کی یہ سند عطا نہیں کی تھی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا یہ استنباط بڑا لطیف ہے کہ جیسے کسی کے لیے اپنی پاکی کا دعویٰ کرنا، اپنی ستائش کرنا یا اپنی بے گناہی کا اعلان کرنا ہرگز روا نہیں ہے ٹھیک اسی طرح کسی کے پاک و بے گناہ ہونے کا حتمی فیصلہ کرنا بھی درست نہیں ہے ہاں بطورِ حسنِ ظن کے کسی کے بارے میں آپ یہ خیال کر سکتے ہیں کیونکہ بلا علم کسی فیصلہ کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ فی الواقع اللہ کے یہاں کس کا کیا مقام ہے اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔
آخر میں فرمایا ہے بل اللّٰہ یزکی من یشاء یعنی بزرگی تو اللہ کا عطیہ ہے وہ جسے چاہتا ہے بزرگی دیتا ہے اور اللہ نے بزرگی کا مدار ایمان و عمل اور نیکی و تقویٰ کو بنایا ہے نہ کہ نسبت اور نسب کو۔
اس آیت میں تزکیہ کی نسبت اللہ کی طرف کی گئی ہے اور کبھی تزکیہ کی نسبت نبوت کی طرف ہوتی ہے یتلوا علیکم آیتنا و یزکیکم اور کبھی بندے کی طرف ہوتی ہے جیسے قد افلح من زکٰھا اللہ کی طرف اس لیے کہ حقیقت میں وہی اس کا فاعل ہے اور نبی کی طرف اس لیے کہ وہ لوگوں تک تزکیہ کے پہنچنے میں واسطہ ہوتا ہے اور تزکیہ کی نسبت بندے کی طرف اس لیے کہ وہ اکتساب کرتا ہے۔

اللہ پر بہتان طرازی

۵۰۔ دیکھو یہ اللہ پر کیسے بہتان اٹھاتے ہیں، ان کی کھلی گنہ گاری کے لیے یہی بات کافی ہے۔ یعنی کیسے تعجب کی بات ہے کہ اللہ پر کیسی جھوٹی تہمت لگاتے ہیں اور باوجود ارتکابِ کفر اور شرک کے اپنے آپ کو اللہ کا دوست کہتے ہیں اور اللہ کے نزدیک مقبول ہونے کے مدعی ہیں اور ایسی سخت تہمت صریح گنہ گار ہونے کے لیے بالکل کافی ہے[1]
شرک بھی اللہ پر تہمت ہے اور تزکیہ نفس بھی اللہ پر افترا ہے ظاہر ہے کہ اگر شرک کرنے والے اپنے تمام مشرکانہ اعمال کو دین کی سند دینے کے لیے یہ دعویٰ کرتے ہیں کہ ان باتوں کا حکم ان کو اللہ تعالیٰ نے دیا ہے تو یہ اللہ پر صریح تہمت ہے۔ اور ایسے ہی اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں اللہ کا مقبول، پارسا، زاہد یا خدا کا ولی ہوں اور اللہ نے یہ اعلان نہیں کیا ہے تو وہ بھی اللہ پر جھوٹ کا بہتان اٹھا رہا ہے اور ان کا یہ افترا صاف طور پر باطل ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ أُوتُوا نَصِيبًا مِّنَ الْكِتَابِ يُؤْمِنُونَ بِالْجِبْتِ
وَالطَّاغُوتِ وَيَقُولُونَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا هَٰؤُلَاءِ أَهْدَىٰ
مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَعَنَهُمُ اللَّهُ ۖ
وَمَن يَلْعَنِ اللَّهُ فَلَن تَجِدَ لَهُ نَصِيرًا ۝ أَمْ لَهُمْ نَصِيبٌ
مِّنَ الْمُلْكِ فَإِذًا لَّا يُؤْتُونَ النَّاسَ نَقِيرًا ۝ أَمْ يَحْسُدُونَ
النَّاسَ عَلَىٰ مَا آتَاهُمُ اللَّهُ مِن فَضْلِهِ ۖ فَقَدْ آتَيْنَا آلَ
إِبْرَاهِيمَ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَآتَيْنَاهُم مُّلْكًا عَظِيمًا ۝
فَمِنْهُم مَّنْ آمَنَ بِهِ وَمِنْهُم مَّن صَدَّ عَنْهُ ۚ وَكَفَىٰ
بِجَهَنَّمَ سَعِيرًا ۝

کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے
اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں
کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ لوگ اہل ایمان سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔ [۹۲]

یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ کی لعنت ہو جاتی ہے تو تم کو اس کا کوئی مددگار نہ ملے گا[۹۳]۔ کیا یہ بات ہے کہ ان کا حکومت میں کوئی حصہ ہے بس اس لیے وہ لوگوں کو رائی برابر بھی کچھ دینے کے روادار نہیں ہیں[۹۴]۔ یا پھر اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ لوگوں کو دے رکھا ہے اس پر چڑ رہے ہیں اگر یہی بات ہے تو ہم نے ہی تو ابراہیم کی اولاد کو کتاب اور حکمت عطا کی تھی اور ہم نے ان کو عظیم حکومت دی تھی[۹۵]۔ پھر ان میں سے کچھ نے مانا اور کچھ ہٹ گئے اور ہٹ جانے والوں کے لیے دوزخ کی دھکتی آگ کافی ہے[۹۶]۔

فکری، عملی اور اخلاقی گراوٹ

دین کے متعلق جب تصور ہو کہ وہ انفرادی اعمال کی اصلاح اور شخصی نجات کے حصول کا ذریعہ ہے معاملات تمدن سے اس کا اگر تعلق ہے تو بس اتنا کہ انسان اپنی ذات کے لیے کوئی ایسا عمل نہ کرے جس سے اپنا کوئی نقصان ہو اور جہاں تک ممکن ہو فرقہ وارانہ برائی سے بچے۔ دین سے ان کو جو کچھ محبت تھی وہ صرف اپنے دھڑے کے بچانے تک محدود تھی۔ اس کے نتیجہ میں ان میں اتباعِ حق کی جگہ جتھا بندی اور گروہ پرستی کی روح پیدا ہو کر حق و باطل کا امتیاز باقی نہیں رہا تھا۔ گروہی تعصب چاہتا ہے کہ جس طرح بھی بنے اپنی بات بنالی جائے اور مخالف گروہ کو زک پہنچا دی جائے۔ اگر ایسا کرنے میں اسے خود اپنے اصولوں اور عقیدں

کے خلاف بھی جانا پڑے تو ملا تامل چلا جاتے۔ یہی حال مدینے کے یہودیوں کا تھا وہ ہمیشہ بت پرستی کے مخالف رہے اور بت پرستوں کی تحقیر و تذلیل کرتے رہے لیکن اب اہلِ ایمان کی ضد میں آکر بت پرستوں کی تعریف کرتے اور کہتے کہ ان مسلمانوں سے تو مشرکوں ہی کا طور طریقہ زیادہ قرینِ صواب ہے۔

پہلی آیت میں ان کی یہ گمراہی بتائی تھی کہ ان میں مذہبی گروہ بندی کا کمنلیکس پیدا ہو کر وہ ایمان و عمل کی رکعت سے محروم ہو گئے تھے لیکن پھر بھی اپنے اہلِ کتاب اور بنی اسرائیل ہونے پر نازاں ہیں۔ اور ان آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ افکار کی حد تک وہ اوہام کی مخلوق بن کر رہ گئے تھے اور اعمال کی حد تک وہ طاغوت سے تعلق رکھتے تھے اور اس کے نتیجہ میں ان میں حق اور باطل میں امتیاز نہیں رہا تھا اور ایک بے اصول، ناقابلِ اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر آ گئے تھے جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہوتا بلکہ صرف مصالح اور منافع ہی اغراض و مقاصد ہو جاتے ہیں۔ یہ صورتِ حال اس وقت پیدا ہوتی تھی جب ان میں جبت اور طاغوت کو پذیرائی حاصل ہوتی۔

۹۲۔ کیا تم نے ان لوگوں کو نہیں دیکھا جنہیں کتاب کا ایک حصہ دیا گیا ہے اور ان کا حال یہ ہے کہ جبت اور طاغوت کو مانتے ہیں اور کافروں کے متعلق کہتے ہیں کہ یہ لوگ اہلِ ایمان سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔ اس آیت میں بھی یہود کی شرارت اور خباثت کا اظہار ہے۔ قصہ یہ ہے کہ یہودیوں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے عداوت بڑھی تو مشرکینِ مکہ سے ملے اور ان سے متفق ہوئے اور ان کی خاطرداری کی وجہ سے بتوں کی تعظیم کی اور کہا کہ تمہارا دین مسلمانوں کے دین سے بہتر ہے اور اس کی وجہ صرف حسد تھا۔ اس پر کہ نبوت اور دین کی ریاست ہمارے سوا دوسروں کو کیوں مل گئی؟ اس پر اللہ تعالیٰ ان کو الزام دیتا ہے۔ ان آیات میں اسی کا مذکور ہے۔[1]

اس سے پہلی آیات میں یہود کی قومی زندگی میں یہ برائیاں بتانے کے لیے کہ ان میں دین سے راہِ حق سے کیسے انحراف پیدا ہو گیا تھا کہ وہ ہدایت کے بدلے ضلالت کے خریدار اور دوسروں کو راہِ حق سے ہٹانے کے خواہاں، اور جنابِ نبوت میں گستاخ و بے ادب ہونے کے ساتھ مشرکانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ اس گمراہی کا نتیجہ یہ تھا کہ ہدایت کا سر رشتہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے اسوہ کی جگہ انسانوں کے ہاتھ میں آ گیا تھا۔ وہ لوگوں کو اندھا بہرا بنا کر جس طرح چاہتے تھے اپنی نفسانی اغراض کے لیے استعمال کرتے تھے اور انسان کی زندگی میں عقلی ترقی اور روشنی کی تمام راہیں بند ہو گئی تھیں۔ ان برائیوں کی طرف توجہ دلانے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اور ان کی زندگی سے عبرت دلانے کے لیے انداز بیان یہ اختیار کیا تھا الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب یعنی ان کے اس انحراف کا اصلی باعث یہ تھا کہ یہود نے اپنی زندگی میں ساری کتاب کو دستور حیات کے طور پر نہیں اپنایا تھا بلکہ زندگی کے مختلف احوال میں کتاب الٰہی کے بیشتر احکام کو چھوڑ دیا تھا۔ بس ان کا یہ طرز عمل ہی ان برائیوں کا باعث بنا۔ اور چونکہ آئندہ بیان ہونے والی برائیوں کے ہونے کا بھی اصلی باعث یہی ہے اس لیے الم تر الی الذین اوتوا نصیبا من الکتاب کو پھر دہرایا ہے۔ یعنی ان برائیوں کا سبب بھی یہی ہے۔ اگرچہ کچھ بزرگوں نے اس کے یہ معنے بھی بتائے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو تورات کے الفاظ پڑھنے کو ملے اور عمل سے محروم رہے۔ اور یہ بھی مطلب اس فقرے کے مُنہ میں ڈالا گیا ہے کہ اوتوا نصیبا من الکتاب کے معنے یہ ہیں کہ ان کو ساری کتاب فی الواقع یاد نہ تھی۔ یعنی ان کے پاس پوری کتاب جو حضرت موسیٰ لے کر آئے تھے محفوظ ہی نہ تھی۔ یہ اپنی جگہ تاریخی طور پر ثابت شدہ ایک علمی حقیقت ہے جس کا اقرار خود ان امتوں اور فرقوں نے کیا ہے جن کے پاس یہ صحیفے آئے تھے۔ اس پر تفصیلی تبصرہ انشاءاللہ چھٹے پارے میں آئے گا۔

اس آیت میں جن برائیوں کو ان کی طرف منسوب کیا گیا ہے یہ ہیں کہ:

الف: وہ جبت کو مانتے ہیں

ب: وہ طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں۔

ج: وہ اہل ایمان کے مقابلے میں اہل کفر کو سیدھے راستہ پر بتاتے ہیں۔ ان میں پہلی برائی کے لیے قرآن میں یؤمنون بالجبت کی تعبیر آئی ہے۔

یہود کا جبت پر ایمان

امام راغب فرماتے ہیں کہ جبت اور جبس دونوں ایک ہیں، ایسی ردی چیز جو کسی کام کی نہ ہو، نیز ہر وہ چیز جس کی خدا کے سوا پوجا کی جائے جبت کہلاتی ہے اور جادو اور کاہن کو بھی جبت کہتے ہیں: اصل میں جبت کے معنے میں اختلاف ہے۔ حضرت عمرؓ اس کے معنے جادو کے بتاتے ہیں۔ عکرمہ کا خیال ہے کہ جبت حبشی زبان میں شیطان کو کہتے ہیں۔ ابن ابی حاتم نے حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی یہی روایت کیا ہے۔ طبری نے مجاہد سے جادو کے اور سعید بن جبیر اور ابوالعالیہ سے جادوگر اور قتادہ سے شیطان کے معنے نقل کیے ہیں۔ بغوی نے معالم میں، ابن سیرین اور مکحول دمشقی کا قول نقل کیا ہے کہ جبت کاہن کو کہتے ہیں۔ ابوعبیدہ کا بیان ہے کہ ہر وہ معبود جس کی اللہ کے سوا عبادت

کی جائے جبت ہے۔ امام ابن جریر کا فیصلہ اس سلسلے میں نہایت صاف ہے کہ :

جبت اور طاغوت سے مراد وہ جنس مراد ہے جس کی اللہ تعالیٰ کے سوا پوجا کی جاتی خواہ وہ بت ہو یا شیطان، آدمی ہو یا جن بس اس میں جادوگر اور کاہن بھی آجاتے ہیں۔

سنن ابوداؤد میں حضرت قبیصہ کے حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی آیا ہے کہ :

پرندوں کو اڑا کر شگون لینا یعنی عیافہ یا رمل کا عمل کرنا یعنی طرق اور بدفالی لینا یعنی طیرہ یہ سب جبت سے تعلق رکھتے ہیں۔

بہرحال اسلام کی زبان میں جادو، کہانت، فال گیری، ٹونے ٹوٹکے، شگون اور دوسرے تمام اعمال سفلیہ کو جبت سے تعبیر کیا گیا ہے۔

یہود اپنے دور زوال میں کتاب الٰہی کو پس پشت ڈال کر بس انہی چیزوں کے ہو کر رہ گئے تھے۔ ان کے انبیاء نے نہایت درد انگیز الفاظ میں ان کی اس حالت پر ماتم کیا ہے۔ امتوں پر جب اخلاقی و مادی انحطاط آتا ہے اور غلامی جہالت، نکبت و افلاس اور ذلت و پستی ان کے اندر کوئی بلند حوصلگی نہیں رہنے دیتے۔ تو ان کی توجہات جادو ٹونے اور طلسمات یرسنجات عملیات اور قسم قسم کے وہمی اور خیالی باتوں کی طرف مبذول ہو جاتی ہے اور بجائے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے اسوۂ حسنہ کے فکر و نظر اور ان کے مطالعہ و جستجو کا مرکز یہ چیزیں بن جاتی ہیں۔ وہ ایسی تدبیریں تلاش کرتے ہیں جن سے کسی مشقت کے بغیر محض ٹونوں، ٹوٹکوں، پھونکوں اور منتروں کے زور سے سارے کام بن جائیں۔ قرآن نے یہاں معاشرے کی اس فکری و عملی گراوٹ کو ایمان بالجبت سے تعبیر کیا ہے۔ یہاں خاص طور پر اس بات کے جتانے کی وجہ یہ ہے کہ حامل کتاب اللہ ہونے، نبوت اور توحید کے ماننے کے باوجود یہ اس سوسائٹی کا بالکل چربہ بن گئے تھے جو مشرک بن کر توحید و نبوت سے بیگانہ ہو کر توہمات کا شکار تھی۔

نبوت سے بیگانہ سوسائٹی اور توہمات

مشرکین عرب میں قسم قسم کے توہمات پھیلے ہوئے تھے۔ مثلاً جن اور شیاطین، بھوت پلیت کے بارے میں ان کے عجیب عجیب اعتقاد تھے وہ جن و شیطان اور بھوت پلیت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے مگر اختلاف صورت اور اشکال کی وجہ سے ان کے نام الگ الگ تھے۔ جو جن میدانوں اور جنگلوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو اپنی صورتیں اور لباس بدل کر دھوکا دیتے تھے ان کا نام غول تھا یہ مذکر

بھی ہوتے تھے، اور مونث بھی، مونث کو سلاۃ کہتے تھے۔ ان کا عقیدہ تھا کہ بیماری اڑ کر لگتی ہے جیسا کہ اکثر ہنود کا عقیدہ ہے۔ ان کا خیال تھا کہ جس مقتول کا قصاص نہیں لیا جاتا ہے۔ اس کی روح اُلّو کی صورت میں پکارتی پھرتی ہے کہ میرا قصاص لیا جائے میں پیاسی ہوں، اسے ہامہ کہتے تھے۔ ایک خیالی جانور کے معتقد تھے جس کے کاٹنے سے بھوک لگتی ہے اسے صفر کہتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ذہنیت کی اصلاح کے لیے فرمایا:

بیماری کا لگ جانا، الو، پھر صفر یہ سب وہم پرستی کی باتیں ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ (مسلم عن ابی ہریرہ)

ایک اور ارشاد ہے:

مرض کا لگ جانا، صفر اور غول بیابانی سب خیالات ہیں ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ (مسلم عن جابر)

کہانت ایک سخت بلا تھی جو سارے ملک میں پھیلی ہوئی تھی۔ ہر جگہ ایک یا کئی کاہن ہوتے تھے۔ جو آئندہ واقعات کی پیشین گوئی کرتے۔ اسلام نے اہل ایمان کو اس سے بھی روکا۔ ارشاد ہے:

جو شخص کاہن کے پاس جائے اور اس کی باتوں کی تصدیق کرے گا اور جو حیض کے زمانے میں بیوی کے پاس جائے اور جو بیوی سے اغلام کرے گا تو وہ اس دستور حیات سے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا علیحدہ ہو گیا۔ (احمد، ابو داؤد)

سانپ کو قتل نہیں کرتے تھے۔ یہ اعتقاد تھا کہ سانپ مار جائے تو اس کا جوڑا آکر بدلہ لیتا ہے۔ جو کام کرنا چاہتے تھے پہلے شگون لیتے تھے مثلاً اس وقت کوئی پرندہ دائیں جانب سے اٹھے تو مبارک سمجھتے تھے اور بائیں جانب سے اڑا تو اُس وقت اس کام سے باز رہتے تھے اس قسم کے سینکڑوں اوہام پھیلے ہوئے تھے جن کا شمار نہیں ہو سکتا۔

امام ابن قتیبہ عکرمہ سے نقل کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ ہم ابن عباس کی خدمت میں بیٹھے ہوئے تھے، اس طرف سے کہیں ایک پرندہ چیختا ہوا نکلا۔ حاضرین میں سے ایک شخص نے کہا کہ خیر ہے خیر ہے۔ عبداللہ ابن عباس نے فرمایا کہ نہ خیر ہے نہ شر۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے تو صرف یہ ثابت ہے کہ اچھا نام اور نیک فال پسند کرتے تھے۔

عروہ ابن عامر کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے بدفالی کا ذکر آگیا۔ آپ نے فرمایا کہ اس حد تک درست ہے کہ کسی کا نام اچھا سننا اور اس سے خوش ہو جانا، لیکن فال کسی مسلمان کو کام

روکتی نہیں ہے لہٰذا تم میں سے اگر کوئی ایسی بات دیکھے جس کی وجہ سے اس کے دل میں بدفالی پیدا ہو تو اسے چاہیے کہ یوں کہہ دیا کرے اللھم لا یاتی بالحسنات الا انت ولا یدفع السیئات الا انت ولا حول ولا قوۃ الا باللہ۔ (ابوداؤد)

اس دعا میں جو بات بتائی گئی ہے کہ اللہ ہی بھلائی پہنچاتا ہے اور اللہ ہی بلاؤں کو ٹالتا ہے اور بھلائی کو حاصل کرنے اور برائی سے بچنے کی طاقت بھی اللہ ہی دیتا ہے۔ اسلامی توحید کا وہ بلند تصور ہے کہ جس کے دل میں یہ تصور قائم ہو گیا پھر اس کے دل میں غیر اللہ کا کوئی خوف باقی نہیں رہتا اور اس کا قبلہ توجہ اللہ کی ذات رہ جاتی ہے۔

ابوداؤد میں ہے کہ،

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نشرہ کے متعلق دریافت کیا گیا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ ایک شیطانی کام ہے۔

ابن الاثیر نہایہ میں رقمطراز ہیں کہ جس شخص کو یہ وہم ہو جاتا کہ اس پر جن کا اثر ہو گیا ہے تو وہ اس منتر سے اپنا علاج کرا لیتا۔ عرب کا گمان تھا کہ اس منتر کی جنات کے اثرات کے ازالہ میں بالذات تاثیر ہے۔

ابوداؤد میں ہے:

عیسیٰ ابن حمزہ فرماتے ہیں کہ میں عبداللہ بن حکیم کے پاس گیا انہیں سرخ بادہ کی تکلیف تھی میں نے کہا کہ اس کے لیے آپ گلے میں منکے کیوں نہیں ڈال لیتے۔ انہوں نے فرمایا کہ میں ان باتوں سے اللہ کی پناہ لیتا ہوں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے جو اپنے گلے میں اس قسم کی چیز لٹکائے اس کی جان کی حفاظت خود اسی کے حوالے کر دی جاتی ہے۔

ابن الاثیر رقمطراز ہیں کہ عرب چند منکے لے کر بچوں کے گلوں میں نظر گزر کے خیال سے ڈال دیتے تھے۔ ان کا گمان تھا کہ اس عمل سے نظر نہیں لگتی ہے۔ اسلام چونکہ اوہام پرستی کی جڑ اکھاڑنے آیا تھا اس لیے اس نے اس وہم کی بھی تردید کر دی اور بتا دیا کہ ایک مخلوق کو دوسری مخلوق میں بالذات کوئی تاثیر نہیں ہے۔ تمام کائنات میں حقیقی موثر صرف اللہ سبحانہ کا ارادہ ہے۔ چند منکے گلے میں ڈال کر یہ عقیدہ قائم کر لینا کہ یہ خوبصورت پتھر کوئی فائدہ پہنچا سکتا ہے صرف ایک جاہلانہ وہم پرستی ہے۔ یہ سب اسی ایمان بالجبت کے مظاہر اور قوالب ہیں جس کا قرآن یہاں یہودیوں کو طعنہ دے رہا ہے کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود وہ ایسے واہیات اور خرافات کو مانتے ہیں۔

یہودیوں کا طاغوت پر ایمان

دوسری برائی جس پر یہاں یہودیوں کو ملامت کی گئی یہ ہے کہ وہ طاغوت پر ایمان رکھتے ہیں تیسری جلد میں ہم طاغوت کے معنے طاغوت کے کفر طاغوت کی ولایت اور طاغوتی تہذیب پر سیر حاصل تبصرہ کر چکے ہیں۔ یہاں اعادے میں طوالت ہوگی۔ یہاں اتنی بات اور سمجھ لیجیے کہ حضرت عمرؓ نے طاغوت کے معنے شیطان کے اور عکرمہ نے کاہن کے بتاتے ہیں۔ اور امام مجاہدؒ کہتے ہیں کہ طاغوت انسان کی صورت میں شیطان ہے اس سے حضرت عمرؓ کے ارشاد کی توضیح ہوگئی۔ اور جابر بن عبداللہؓ نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا کہ طاغوت ایک نہیں متعدد تھے اور مختلف قبیلوں کے اعتبار سے ان کی تقسیم تھی۔ قبیلہ جہینہ کا ایک طاغوت اسلم کا ایک غرضیکہ ہر قبیلہ کا ایک طاغوت ہوتا تھا جس سے وہ فیصلے کراتے تھے۔ بعض روایات میں اس دور کے طواغیت کے نام بھی بتائے گئے ہیں مثلاً علی ابن طلحہ نے عبداللہ بن عباسؓ کے حوالے سے بتایا ہے کہ کعب بن اشرف طاغوت تھا یہ مدینہ منورہ کا ابتدائی اسلامی دور میں بہت بڑا فتنہ تھا جو شر و فساد پھیلانے میں تنہا ایک بڑے گروہ اور کثیر الافراد قبیلے سے کم نہ تھا۔ اس کا باپ قبیلہ طے سے تھا۔ دولت مند تھا۔ زندگی کے سارے اسباب کی سازگاری کے ساتھ بہت بداخلاق، خود پسند، متکبر اور اسلام کا دشمن تھا۔ یہودی علماء کے لیے اس نے وظیفے مقرر کر رکھے تھے اور معاشرتی اور مالیاتی مسائل میں ان کے فیصلے کرتا تھا۔

اس روشنی میں ایمان بالطاغوت کے معنے یہ ہوں گے کہ یہ لوگ اس کو مانتے ہیں اور یہی ان کا حاکم ہے یعنی جو شخص بندگی کی حدود سے نکل کر خود آقائی کا مدعی ہے اور خدا کے بندوں سے اپنی بندگی کراتا ہے۔ یہ حاملین کتاب ہو کر اسے مانتے ہیں اور یہ آپ البقرہ آیت نمبر ۲۵۶ میں پڑھ چکے ہیں کہ کوئی شخص صحیح معنوں میں مومن نہیں ہو سکتا جب تک وہ اس طاغوت کا منکر نہ ہو۔

یہودیوں پر ایک اور فردِ جرم

ایمان بالجبت اور ایمان بالطاغوت کے ساتھ یہودیوں پر قرآن نے تیسری فردِ جرم یہ لگائی ہے کہ ان کا اہل کفر کے بارے میں فیصلہ یہ ہے کہ یہ اہل ایمان سے زیادہ صحیح راستہ پر ہیں۔ یہ گراوٹ اور پستِ اخلاق کی انتہا ہے۔ یہ انقلاب انگیز تبدیلی جو یہودیوں کی ذہنیت و نفسیات میں ہوئی تھی۔ یعنی ایمان بالجبت اور ایمان بالطاغوت کے ساتھ اور نتیجہ کے طور پر یا مستقلاً جیسا کہ دیقولون کے انداز کا

تقاضا ہے ان میں اصول اور صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح آجل کے مقابلے عاجل کو اور ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا تھا۔ ان کا ایک ہی عملی مذہب تھا اور وہ مادہ پرستی اور مفاد کیشی کا مذہب تھا۔ دنیوی فوائد اور مادی ترقی منتہائے نظر بن کر رہ گئی۔ اصول و اخلاقی معیار منافع و فوائد کے مقابلے میں اپنی اہمیت بالکل کھو چکے تھے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی نظر میں اصول و اخلاق کی اہمیت اتنی گھٹ گئی کہ ایمان کے مقابلے میں کفر صریح کو ترجیح دینے لگے۔ اور جو لوگ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے تھے ان کو وہ مشرکین عرب کی بہ نسبت زیادہ گمراہ قرار دیتے تھے اور کہتے تھے کہ ان سے تو مشرکین ہی زیادہ ہدایت یافتہ ہیں حالانکہ وہ صریح طور پر دیکھ رہے تھے کہ ایک طرف خالص توحید ہے اور دوسری طرف کھلی بت پرستی ہے جس کی برائی سے تورات اٹی پڑی ہے۔ بہر حال اسلام کے خلاف عداوت کے جنون نے انہیں انتہائی پستی میں گرادیا تھا یہاں تک کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود مشرکین کے مسلک کو پیروان اسلام کے طور طریقے سے بہتر اور قابل ترجیح بتاتے تھے۔ گویا ان کا تصور حق و صداقت ہی تبدیل ہو گیا تھا اور اہل کتاب ہونے کا دعویٰ بھی محض برائے نام رہ گیا تھا جس کی حقیقی حیثیت کوئی نہ تھی۔

اس سے یہ بات الم نشرح ہو کر سامنے آگئی کہ توہمات سے فکری اور طاغوت عملی وابستگی ایسی سنگین برائی ہے کہ دعویٰ ایمان اور نبی کی امت ہونے کے باوجود آدمی دین و ایمان کو وقتی مفادات پر قربان کر دیتا ہے اور مادی و سیاسی اغراض و مقاصد کی بجاآوری کے لیے دین و ایمان کا سودا کر بیٹھتا ہے۔ لادینی عقائد و نظریات کو حق کا لباس پہنانے کے لیے کوشاں ہو جاتا ہے اور اس میں کسی قسم کا عیب نظر نہیں آتا بلکہ اس پر بحث کی گنجائش بھی محسوس نہیں کرتا۔ اس کی مثالیں ہمیں ہر جگہ ملتی ہیں۔ اگر ہم بھی اس روشنی میں اپنی ایمانی اور اسلامی زندگی کا جائزہ لیں تو لے سکتے ہیں۔ اس آئینے میں ہم اپنا چہرہ بھی دیکھ سکتے ہیں۔

دنیا و آخرت میں اللہ کی لعنت

۵۲ ۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے اور جس پر اللہ کی لعنت ہو جاتی ہے تو تم کو اس کا کوئی مددگار نہ ملے گا۔ یعنی یہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب ہو کر اغراض نفسانی کی وجہ سے بتوں کی تعظیم کی اور طریقہ کفر کو طریقہ اسلام سے افضل بتایا ان پر اللہ کی لعنت ہے۔ اور جس پر اللہ لعنت کرے اس کا دنیا و آخرت میں کوئی مددگار اور حامی نہیں ہو سکتا سوا اب انہوں نے اپنی

اعانت کی طمع میں جو مشرکین مکہ سے موافقت کی بالکل لغو ہے چنانچہ دُنیا میں یہود نے ازحد ذلتیں اٹھائی ہیں اور آخرت میں بھی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ جن کا چہرہ پہلے پیش کیا گیا ہے اللہ نے ان کو اپنے قانون کے مطابق اپنی رحمت سے دُور کر دیا ہے۔ رحمتِ الٰہی تو ان کی طرف متوجہ ہوتی ہے جو ایمان باللہ رکھتے ہیں اور جبت و طاغوت سے پرہیز کرتے ہیں اور جو اپنے افکار کی عمارت اوہام پر اٹھاتے ہیں اور اپنے عابدانہ اعمال میں طاغوت کے ہو کر رہ جاتے ہیں۔ ان کا استقبال اللہ کی رحمت نہیں بلکہ لعنت کرتی ہے۔

غور طلب یہ بات ہے کہ یہاں اس آیت میں اور اس سے پہلی آیت میں یہود کے کس کردار کی بنا پر ان کو مستحق لعنت قرار دیا گیا ہے اور لعنت بھی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی، آپ غور کریں گے تو یہ حقیقت آپ کے سامنے الم نشرح ہو کر آجائے گی کہ اجتماعی لعنت ان پر اس لیے آئی ہے کہ :

اولاً، انہوں نے اپنی زندگی کا رشتہ اللہ کی کتاب سے منقطع کر لیا تھا۔

ثانیاً، انہوں نے دین کو روحانی رشتہ کی جگہ کاروباری نظام کی حیثیت دے دی تھی۔

ثالثاً، وہ حق کی عداوت میں چھوٹ اور بے لگام ہو کر رہنمائے ضلالت ہو کر رہ گئے تھے۔

رابعاً، وہ نبوت کے گستاخ اور بے ادب ہو گئے تھے۔

خامساً، انہوں نے مشرکانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ وہ اس طرح کے مشرک نہ تھے جس طرح عام مشرکین ہوتے ہیں۔ قرآن کی کسی آیت سے اس کا ثبوت نہیں ملتا۔ وہ شرک جس میں وہ مبتلا تھے یہ تھا کہ انہوں نے اپنی زندگی میں خدا کو مانتے ہوئے، نبوت موسیٰ کا اقرار کرتے ہوئے ہدایت کا سر رشتہ کتاب الٰہی کی جگہ انسانوں کے ہاتھ میں دے دیا تھا۔ وہ لوگوں کو اندھا بہرا بنا کر جس طرح چاہتے تھے اپنی نفسانی غرضوں کے لیے استعمال کرتے تھے۔ قرآن نے اس گمراہی کو شرک قرار دیا ہے۔ وہ یہودیوں سے کہتا ہے کہ سارے گناہ بخشے جاسکتے ہیں مگر شرک کے لیے کوئی بخشش نہیں ہے۔

سادساً، ان کو اپنے پارسا ہونے، نجات یافتہ ہونے کا گھمنڈ تھا۔ ایمان و عمل سے دُوری کے باوجود وہ بنی اسرائیل ہونے پر نازاں تھے، وہ کہتے تھے کہ ہم خدا کے چہیتے ہیں اور آخرت کی نجات ہمارے لیے لکھ دی گئی ہے۔ علم و عمل سے محرومی کے باوجود اس غرور باطل میں مبتلا تھے۔

سابعاً، انہوں نے اوہام کا نام عقائد رکھ چھوڑا تھا اور اعمال و اخلاق کی حدود میں وہ عصیان و

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

علاوہ ان کے بیمار تھے اور طاغوت کے ہاتھ میں ان کی قیادت تھی اور اسی کو وہ مانتے تھے۔
ثامناً، ان کے قلوب میں حق کا نہیں بلکہ باطل کا مقام تھا اور اہل ایمان کے مقابلے میں اہل کفر کو ترجیح دیتے تھے۔
ان اسباب کی بنا پر وہ اجتماعی طور پر خدا کی بارگاہ میں ملعون قرار پاتے۔ آخر میں فرمایا کہ جس پر اللہ کی لعنت ہو جائے خدا کے ہاں سے اس کی خیر کٹ جاتی ہے یعنی اللہ ان کی ہرگز مدد نہیں کرتا ہے۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ ملعون ہونے کے اسباب جہاں موجود ہوتے ہیں اللہ کی امداد و نصرت کے دروازے وہاں بند ہو جاتے ہیں۔ یہود کی لعنت کی پوری تاریخی داستان انشاء اللہ جلد ششم میں آئے گی۔

یہودیوں کا اعتراف حق میں بخل

۹۴۔ کیا یہ بات ہے کہ ان کا حکومت میں کچھ حصہ ہے پس اس لیے وہ لوگوں کو رائی برابر بھی کچھ دینے کے روادار نہیں ہیں۔ یہود اپنے خیال میں جانتے تھے کہ پیغمبری اور دین کی سرداری ہماری میراث ہے اور ہمیں کو لائق ہے اس لیے عرب کے پیغمبر کی متابعت سے عار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ آخر کار حکومت اور بادشاہت ہمیں کو پہنچ کر رہے گی۔ برائے چندے اوروں کو بھی مل جائے تو کچھ مضائقہ نہیں ہے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مطلب آیت کا یہ ہے کہ کیا یہود کا کچھ حصہ ہے سلطنت میں، یعنی ہرگز نہیں، اگر یہ حاکم ہو جائیں تو لوگوں کو تل کے برابر بھی نہ دیں یعنی ایسے بخیل ہیں کہ بادشاہت میں فقیر کو تل برابر بھی نہ دیں۔[1]

آیت میں استفہام انکاری ہے۔ مطلب یہ ہے جیسا کہ ان کے پاس کتاب کا ایک حصہ موجود نہیں ہے ایسا ہی اقتدار میں بالفعل ان کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ ظلم و طغیان کی پاداش میں ان سے یہ چھین لیا گیا ہے۔ یہ تو حال کا نقشہ ہے اور مستقبل کی تصویر یہ ہے کہ اگر ان کو اقتدار مل جائے تو وہ اس میں سے کسی کو بادشاہ ہو کر بھی رائی برابر دینے کو تیار نہ ہوں گے۔ نقیر کے لفظی معنے اس باریک سے نشان کے ہیں جو کھجور کی گٹھلی کے کنارے پر ہوتا ہے جیسے فتیل اس باریک دھاگے کو کہتے ہیں جو کھجور کی گٹھلی میں ہوتا ہے محاورے میں دونوں سے مراد حقیر سے حقیر تر چیز ہوتی ہے جیسے اردو میں رائی بھر، رتی بھر وغیرہ بولتے ہیں۔ تل برابر شاہ عبدالقادر کا ترجمہ ہے۔ فاذاً لا یؤتون الناس نقیرا۔ یہ شرط محذوف

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی جزا ہے۔ زمخشری نے شرطیہ بتائی ہے لو کان لھم نصیب یعنی اگر بالفرض ان کو حکومت مل جائے لیکن یہ شرط صحیح نہیں ہے کیونکہ لو کے جواب میں فا نہیں آتی ہے اس لیے صحیح یہ ہے ان کان لھم نصیب یعنی بالفعل تو نہیں اگر مستقبل میں ان کو کبھی اقتدار میں سے حصہ مل جائے گا تو یہ اس قدر بخیل ہیں کہ کسی کو رائی برابر بھی کچھ نہ دیں گے۔

آیت کی یہ تشریح بھی کی گئی ہے۔

کیا خدا کے اقتدار میں ان کی بھی کچھ حصہ داری ہے کہ اس کے فضل و انعام میں سے یہ جس کو چاہیں حصہ دیں جس کو چاہیں محروم کر دیں۔ چنانچہ اپنے اسی اختیار کی بنا پر مسلمانوں کو خدا کے فضل و کرم سے محروم رکھنا چاہتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں ہے اور ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے تو پھر تمام اس بوالفضولی سے کیا حاصل؟ تقدیر الٰہی سے پنجہ آزمائی کر کے کون جیتا ہے[1]

کیا خدا کی حکومت کا کوئی حصہ ان کے قبضہ میں ہے کہ یہ فیصلہ کرتے چلے ہیں کہ کون ہدایت پر ہے اور کون نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو ان کے ہاتھوں دوسروں کو ایک پھوٹی کوڑی بھی نصیب نہ ہوتی کیونکہ ان کے دل تو اتنے چھوٹے ہیں کہ ان سے حق کا اعتراف تک نہیں ہو سکتا۔ دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کیا ان کے پاس کسی ملک کی حکومت ہے کہ اس میں دوسرے لوگ حصہ بٹانا چاہتے ہیں اور یہ انہیں اس میں سے کچھ حصہ نہیں دینا چاہتے۔ یہاں تو محض اعترافِ حق کا سوال ہے اور اس میں بھی یہ بخل سے کام لے رہے ہیں[2]

مطلب خواہ کوئی ہو خلاصہ یہ ہے کہ یہود سرمایہ دار ہو کر انتہائی بخیل ہیں ان سے کسی شخص کو فائدہ نہیں ہو سکتا۔ اگر ان کو اقتدار بھی مل جائے تو کسی انسان کو کوئی حقیر سے حقیر تر فائدہ پہنچانا بھی ان کو شاق ہو گا۔ جب صورتِ حال یہ ہے تو ان کو یہ کیونکر گوارا ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عربی ہو کر پیغمبر ہوں اور آپ کے صحابہ کو اقتدار ملے۔

یہود کو حکومت ملنے کے جس امکان پر یہاں اشارہ ہو رہا ہے اس کی تفصیل انشاء اللہ پندرھویں پارے میں ملے گی۔

یہود کا بنی اسماعیل سے حسد

۹۵۔ یا پھر اللہ نے اپنے فضل سے جو کچھ ان لوگوں کو دے رکھا ہے اس پر جل رہے ہیں۔ اگر یہ

---

[1] تدبر قرآن۔ [2] تفہیم القرآن

بات ہے تو ہم نے ابراہیم کی اولاد کو کتاب و حکمت عطا کی تھی اور ہم نے ان کو عظیم حکومت دی تھی۔ یعنی کیا یہود حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے اصحاب پر اللہ کا فضل و انعام دیکھ کر حسد میں مرے جاتے ہیں سو یہ تو ان کی بالکل بیہودگی ہے کیونکہ ہم نے حضرت کے گھرانے میں کتاب و علم اور سلطنت عظیم عنایت کی ہے پھر یہود آپ کی نبوت اور عزت پر کیسے حسد اور انکار کرتے ہیں اب بھی تو ابراہیم کے گھرانے میں ہے بلہ

مسلمانوں کے ساتھ یہود اس لیے حسد کرتے تھے کہ اسلام سے پہلے ان کو علمی اور مذہبی حیثیت سے اہل عرب پر تفوق حاصل تھا لیکن اسلام کی وجہ سے ان کی برتری کا آفتاب غروب ہو رہا تھا۔ یہودی حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بڑے بڑے مضبوط قلعے تھے، فن جنگ سے واقف تھے۔ سامان و اسلحہ وافر رکھتے تھے، دولت کی بہتات تھی، باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا۔ عرب کے تمام مادی ذرائع کے وہ تنہا اجارہ دار تھے۔ اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت از بام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا اس لیے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گی چنانچہ قریظہ، بنی نظیر، بنی قینقاع اور یثرب، خیبر، فدک، تیما، وادی القریٰ وغیرہ کے یہودی، زمیندار، سوداگر، مہاجن، علماء اور قلعہ نشین سرمایہ دار دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور اس کی بیخ کنی کر دیں۔ منافقین میں عبداللہ بن ابی کو اپنا بادشاہ بنانا چاہتے تھے لیکن اسلام نے اس کی شاہانہ ریاست کا خاتمہ کر دیا۔ اس لیے جب ریاست کی دیوانگی نے ان کو اسلام کے خلاف دیوانہ بنا دیا۔ ان کی یہ عداوت قسم قسم کے روپ بدل کر آتی تھی۔ ان میں ایک روپ وہ ہے جسے قرآن نے یہاں حسد سے تعبیر کیا ہے۔ الناس کے معنے لوگوں کے ہیں مگر یہاں مراد بنی اسماعیل ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بنی اسماعیل سے تعلق رکھتے تھے اور آپ کو اللہ نے رسالت کا منصب جلیل عطا فرمایا تھا اس لیے ان کو جلن یہ تھی کہ انبیاء تو ہمیشہ بنی اسرائیل میں ہوئے ہیں اب نبوت ایک عرب کو کیسے مل گئی۔

اگر ایک شخص پر اللہ تعالیٰ اپنا کوئی احسان کرے مثلاً اس کو علم و فضل، مال و دولت، عزت و شہرت یا اور کوئی دینی و دنیوی نعمت سے سرفراز کرے تو ان چیزوں کو دیکھ کر دوسرے شخص کے

لہ افادات شیخ الاسلام

دل میں ان کے حاصل کرنے کی خواہش ہو تو اس کو رشک اور منافست کہتے ہیں لیکن اگر وہاں چیز دل کو دوسرے کے لیے پسند نہ کرے اور اس کی یہ خواہش ہو کہ خدا کی یہ نعمتیں اس سے چھین لی جائیں تو اس کا نام حسد ہے اور قرآن حکیم کی اس آیت سے یہی تعریف مستنبط ہوتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے بنی اسماعیل کو نبوت دے کر اپنا خاص احسان فرمایا تھا جس کو دیکھ کر یہودی حسد کرتے تھے ان کی خواہش تھی کہ یہ دولت بنی اسماعیل سے چھن جائے یہاں آیت میں فضل سے نبوت ہی مراد ہے۔

قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اس میں جلنے اور جڑنے کی کون سی بات ہے۔ ہم نے آل ابراہیم سے وعدہ کیا تھا کہ ان کو کتاب و حکمت اور ملک عظیم دیں گے۔ آل ابراہیم میں نسل ابراہیمی کی دونوں شاخیں داخل ہیں بنی اسحاق اور بنی اسماعیل۔ کتاب و حکمت روحانی نعمتیں ہیں اور ملک عظیم مادی نعمت ہے۔

اس فقرے کے دو مطلب بتائے گئے ہیں ایک یہ کہ آل ابراہیم سے بنی اسحاق مراد ہوں اور مطلب یہ ہو کہ ہم نے ہی بنی اسحاق پر یہ انعامات کیے تھے اور اب ہم ہی بنی اسماعیل پر انعام کر رہے ہیں۔ دوسرے یہ کہ آل ابراہیم سے بنی اسماعیل مراد ہوں۔ شیخ الاسلام کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ تورات میں ہے کہ ابراہیم کی اولاد اسحاق کے نام سے پکاری جائے گی۔ اس کے برعکس اہل عرب ہمیشہ اپنے آپ کو حضرت ابراہیم کی طرف منسوب کرتے تھے اس لیے کہ حضرت ابراہیم نے وہیں قیام کیا وہیں بیت اللہ کی تعمیر کی اور وہیں مناسک حج ادا کیے گویا اس طرح اس آیت میں اللہ سبحانہ نے اس وعدہ کی طرف اشارہ کیا جو حضرت ابراہیم سے حضرت اسماعیل کے بارے میں فرمایا تھا تورات میں یہ وعدہ مذکور ہے:-

> اور خداوند کے فرشتہ نے آسمان سے دوبارہ ابرہام کو پکارا اور کہا کہ خداوند فرماتا ہے کہ چونکہ تو نے یہ کام کیا کہ اپنے بیٹے کو بھی جو تیرا اکلوتا ہے دریغ نہ رکھا اس لیے میں نے بھی اپنی ذات کی قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل کو بڑھاتے بڑھاتے آسمان کے تاروں اور سمندر کے کنارے کی ریت کے مانند کر دوں گا اور تیری اولاد دشمنوں کے پھاٹک کی مالک ہو گی اور تیری نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گی کہ تو نے میری بات مانی۔ (کتاب پیدائش باب ۲۲-)

تورات کے اس بیان سے صاف واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ وعدہ برکت حضرت ابراہیم سے اس وقت فرمایا ہے جب انہوں نے اپنے اکلوتے بیٹے حضرت اسماعیل کی قربانی کے امتحان میں کامیابی

حاصل کی ہے اس لیے لازماً یہ وعدہ حضرت اسماعیل اور ان کی اولاد سے متعلق ہو سکتا ہے۔

اس وعدے میں تین باتوں کا ذکر ہے۔

ایک یہ کہ اللہ ان کو ایک عظیم اُمت بنائے گا۔

دوسری یہ کہ ان کو عظیم فتوحات حاصل ہوں گی۔

تیسری یہ کہ اس نسل کے وسیلہ سے زمین کی سب قومیں برکت پائیں گے۔

یہ تینوں وعدے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پورے ہوئے۔ آپ کی بعثت سے ایک عظیم اُمت ظہور میں آئی یہ اُمت دُشمنوں کے پھاٹکوں کی مالک بنی اور آپ کی دعوت سے تمام عالم انسانی کو دین کی برکت مل گئی[1]

حاصل یہ ہے کہ اگر بنی اسماعیل پر حسد کی وجہ سے یہ لوگ اس نبی کی مخالفت کر رہے ہیں تو جتنا حسد کرنا ہے کر لیں ہم نے تو آلِ ابراہیم کو کتاب و حکمت اور عظیم حکومت دے دی ہے۔

اس آیت میں یہ لطیف نکتہ بھی قابلِ توجہ ہے کہ کتاب و حکمت کے ساتھ جب عظیم سلطنت بھی دینے کا اعلان ہوا ہے تو دونوں کو جداگانہ فعل لاکر بیان کیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ سلطنت و حکومت کتاب و حکمت کا لازمہ نہیں ہے بلکہ اس پر عمل پیرا ہونے کا ثمرہ اور نتیجہ ہے یہ ممکن ہے کہ کتاب و حکمت ہو۔ لیکن سلطنت نہ ہو۔ یہاں خاص طور پر سلطنت کو مستقل فعل لاکر اس لیے بیان کیا ہے کہ یہود کا سارا حسد اسی وجہ سے تھا۔ وہ جانتے تھے کہ جن کو کتاب و حکمت یعنی نبوّت کے علم و عمل کی نعمت مل رہی ہے وہ اپنے حسنِ قبول کی وجہ سے اس کے ثمرات سے ہمدوش ہوگی۔ ان کے اسی حسد پر اٰتینٰھم ملکاً عظیماً سے ضرب کاری لگائی ہے فرمایا کہ ہم نے ان کو صرف کتاب و حکمت ہی نہیں دی ہے بلکہ اس کے ساتھ ایک عظیم سلطنت بھی دی ہے۔

نبوت پر ایمان اور اس سے روگردانی

۹۶۔ پھر ان میں سے کچھ نے مانا اور کچھ ہٹ گئے اور ہٹ جانے والوں کے لیے دوزخ کی دہکتی آگ کافی ہے یعنی حضرت ابراہیم کے گھرانے میں اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ سے بزرگی دی ہے اور اب بھی اسی گھرانے میں ہے لہٰذا جو کوئی بلا وجہ محض حسد سے اس کو نہ مانے اس کے عذاب کے لیے دوزخ کی بھڑکتی

[1] تدبر قرآن

آگ کافی ہے۔

یہ اجمال ہے آئندہ دو آیتوں میں اسی اجمال کی تفصیل ہے۔ اس آیت میں تعریض ہے پہلی بات کی یعنی جب یہ بات تم کو معلوم ہو چکی کہ اللہ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو آل ابراہیم ہونے کی وجہ سے کتاب و حکمت اور عظیم سلطنت سے نوازا ہے تو اب سن لو کہ کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے لائے ہوئے علم و عمل کو مان چکے ہیں اور کچھ نے نہیں مانا ہے۔ امام مجاہد سے بھی یہی تفسیر منقول ہے گویا بنی اسماعیل میں سے ایک گروہ تو اس کتاب و حکمت کو قبول کر کے ایمان سے مشرف ہو چکا ہے لیکن ایک گروہ اس سے ابھی روگرداں ہے۔ یاد رہے کہ یہ آیت پہلی آیت کا نتیجہ ہے کوئی مستقل اور علیحدہ بات نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو کچھ نے مانا ہے اور کچھ نے نہیں مانا اور بس۔ آئندہ آیات میں ان ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کی جزا اور سزا کی تفصیل ہے۔ حضور انور کے آل ابراہیم سے ہونے کا صرف یہ مطلب نہیں ہے کہ آپ نسل ابراہیم سے تھے بلکہ یہاں کتاب و حکمت کے اضافہ سے یہ اشارہ کیا ہے کہ ابراہیم اس خدا پرست تہذیب کے بانی و امام تھے جس کی بنیادیں خدا کی توحید ، اس پر ایمان اور اس کے ذکر، فطرت مستقیم اور قلب سلیم اللہ تعالیٰ کے لحاظ و تقویٰ نوع انسانی پر رحم اور ذوق سلیم پر رکھی گئی ہیں۔

ابراہیمی اخلاق و طرز حیات اس تہذیب کے رگ و ریشہ میں سرایت کیے ہوئے ہیں۔ اگر حضرت ابراہیم ایک طرف اس تہذیب کے بانی و موسس تھے تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو ان کے نسلی وارث بھی تھے۔ اس تہذیب کے مجدد اور مکمل تھے جنہوں نے اس تہذیب میں از سر نو جان ڈالی ہے۔ اور اس میں بقائے دوام کا رنگ بھرا اور اس کے اصول و ارکان اس طرح مضبوط کیے کہ اسے ایک دائمی اور عالمگیر تہذیب کی شکل دے دی۔ اس لیے یہاں یہ سوچنا بے معنے ہے کہ امن بہ کا مرجع کیا ہے۔ آل ابراہیم ہو یا ابراہیم کتاب و حکمت ہو یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سب کا حاصل ایک ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بِآيَاتِنَا سَوْفَ نُصْلِيهِمْ نَارًا ۖ كُلَّمَا نَضِجَتْ
جُلُودُهُم بَدَّلْنَاهُمْ جُلُودًا غَيْرَهَا لِيَذُوقُوا الْعَذَابَ ۗ إِنَّ اللَّهَ
كَانَ عَزِيزًا حَكِيمًا ﴿٥٦﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
سَنُدْخِلُهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِن تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا
أَبَدًا ۖ لَّهُمْ فِيهَا أَزْوَاجٌ مُّطَهَّرَةٌ ۖ وَنُدْخِلُهُمْ ظِلًّا ظَلِيلًا ﴿٥٧﴾

(یاد رکھو) جن لوگوں نے ہماری آیات کے ساتھ کافرانہ رویہ اختیار کیا تو عنقریب ہم ان کو آگ میں جھونک دیں گے، جب بھی ان کی کھالیں پک گل جائیں گی تو ان کو دوسری کھالوں میں بدل ڈالیں گے تاکہ عذاب کا مزہ خوب چکھ لیں، بلاشبہ اللہ سب پر غالب ہے اور اپنے ہر کام میں حکمت والا ہے۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کو مان لیا اور انہوں نے اعمال صالحہ کیے ان کو ہم ضرور ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں

ہمیشہ رہیں گے، ان کو ان باغات میں پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور ہم ان کو بڑے گنجان سائے میں رکھیں گے۔۹۶

نبوت پر ایمان و کفر کے لازمی نتائج

جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ غرور و خاکساری، بخل و فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فجور، ایمان و کفر، اخلاص اور نفاق ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں جو ان سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت، شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی۔ اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادی اور طبیعیاتی اشیا میں ہے۔

الغرض یہ مادی اور جسمانی دنیا علت و معلول اور عمل ردِ عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل ہے یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام قرآن میں عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے۔

ان آیات میں ایمان و عمل صالح اور کفر کے عالم آخرت میں نتائج بتائے گئے ہیں اور ان کی تفصیل پیش کی گئی ہے۔ یہی اس آیت کی روح ہے۔ یہ بات کہ اس کی کیفیت اور نوعیت کیا ہو گی؟ تو اصل یہ ہے کہ ہم ان ہی باتوں کو سمجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظیریں اس عالم مادی میں ہماری نگاہوں سے گزرتی ہیں وہ عالم جو نگاہوں سے مستور بلکہ تصور سے بھی دور ہے اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال سے ہم بے نیاز ہو جائیں، تقریباً ناممکن ہے ان کے بارے میں جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دنیا کے قیاس پر آخرت کا ہر خاکہ اور نقشہ بتایا اور سمجھایا جاتے اور یہی قرآن کا کام ہے۔

۹۷۔ یاد رکھو جن لوگوں نے ہماری آیات کے ساتھ کافرانہ رویہ اختیار کیا تو عنقریب ہم ان کو آگ میں جھونک دیں گے جب بھی ان کی کھالیں پک کر جل جائیں گی تو ان کو دوسری کھالوں سے بدل دیں گے

تاکہ عذاب کا مزہ چکھ لیں بلاشبہ اللہ سب پر غالب اور اپنے ہر کام میں حکمت والا ہے۔ پہلی آیت میں مومن و کافر کا ذکر تھا اب مطلق مومن و کافر کی جزاء و سزا بطور قاعدہ کلیہ کے ذکر فرماتے ہیں تاکہ ایمان کی طرف پوری ترغیب ہو اور کفر سے پوری ترہیب ہو جائے۔ کافروں کے عذاب میں کمی اور نقصان نہ آنے کی وجہ سے ان کی کھال جل جانے کے وقت دوسری کھال بدل دی جائے گی۔ مطلب یہ ہوا کہ کافر ہمیشہ عذاب میں یکساں مبتلا رہیں گے۔ اللہ غالب ہے یعنی کافروں کو ایسی سزا دینے میں اس کو کوئی دقت و دشواری نہیں اور حکمت والا ہے یعنی کافروں کو یہ سزا دینی عین حکمت ہے۔[1]

یہ آیات گرامی مہمات معارف پر مشتمل ہے۔ یہاں سب تو نہیں مگر کچھ کا ذکر کر دینا ضروری ہے۔ اولاً جیسے اس سے پہلے پڑھ آئے ہو کہ شرک کے لیے بخشش نہیں ہے یہ آیت بتا رہی ہے کہ کفر کے لیے بھی بخشش نہیں ہے۔ امام ربانی مجدد الف ثانی فرماتے ہیں کہ،

کفر و شرک کا عذاب دائمی ہے جیسا کہ نصوص قطعیہ اس کی رہنما ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ کفر کے ساتھ اللہ سبحانہ کی عداوت ذاتی ہے اس لیے اللہ کی رحمت و رافت میں سے جو اللہ کی صفات جمال سے تعلق رکھتی ہیں کافر کو کوئی حصہ نہیں ملے گا اور اللہ کی صفت رحمت اللہ کی عداوت ذاتی کو دور نہ کرے گی۔ کیونکہ جو چیز ذات سے تعلق رکھتی ہے وہ بہ نسبت اس چیز کے جو صفات سے تعلق رکھتی ہے زیادہ طاقتور اور زیادہ بلند ہوتی ہے لہٰذا صفت کا تقاضا ذات کے تقاضے کو نہیں بدل سکتا۔ اور حدیث قدسی سبقت رحمتی غضبی میں غضب سے غضب ذاتی نہیں بلکہ غضب صفاتی مراد ہے۔ غضب صفاتی کا گنہ گاروں سے تعلق ہے جبکہ غضب ذاتی کا کفر سے تعلق ہے اور ارشاد باری رحمتی وسعت کل شیئ میں رحمت کی وسعت کا مومنوں اور کافروں سے تعلق دنیا تک ہے۔ آخرت میں کفر رحمت کی بو بھی نہ پا سکے گا۔

(مکتوبات امام ربانی)

یہ آیت قرآنی بتا رہی ہے کہ کفر وہ بیماری ہے جس کے نتائج سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہے اس لیے اس کے نتائج بد بھگتے بغیر نجات کا تصور بھی اللہ کے قانون ابدی کے خلاف ہے۔ دراصل کفر ایمان کی ضد ہے۔ ان دونوں کا تعلق دل سے ہے۔ دل میں ایمان کی ایک کرن بھی ہو تو اس کی روشنی کی امید کی جا سکتی ہے مگر جس کا شانہ دل میں اس نور ایمان کا ایک ذرہ بھی نہ ہو اس کی روشنی سے ہمیشہ کے لیے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ناامیدی ہے۔ اسی لیے ایمان کے بغیر اعمال بھی کالعدم ہو جاتے ہیں اور جہاں ایمان کچھ بھی ہے اعمال خیر کا کچھ نہ کچھ وجود ضروری ہے البتہ اعمال بد بھی ساتھ اگر ہوں تو ان کی تلافی دنیا میں توبہ سے اعمال صالحہ سے مصائب و محن سے اور آخرت میں عذاب دوزخ یا خدا کی رحمت سے ہو سکتی ہے اور نجات مل سکتی ہے۔

الغرض ایمان کے مجرم جس کا دوسرا نام کفر ہے اپنے ناقابلِ تلافی نتیجہ بھگتے بغیر عذابِ دوزخ سے رہائی کا تصور بھی نہیں کر سکتا کہ اس کی دنیوی زندگی کا ایمانی فقدان رحمتِ الٰہی کو اپنے طرف جذب کرنے کی قدرت ہی نہیں رکھتا ہے۔

ثانیاً، یہاں یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کیا شرک و کفر کے مجرمین کے لیے شرک و کفر کے دورۂ عذاب کے طے کر لینے کے بعد بھی رہائی کا تصور کیا جا سکتا ہے؟ اس کا جواب اس پر موقوف ہے کہ کیا دوزخ ہمیشہ آباد رہے گا؟ اس پر تو سب کا قطعیت کے ساتھ اتفاق ہے کہ جنت کا وجود دائمی ہے لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے۔ جمہور اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم اور جنت دونوں کا وجود دائمی ہے۔ گنہ گار مومن اپنے گناہ کے بقدر عذاب اٹھا کر یا خدا کی رحمت سے معاف ہو کر بالآخر جنت میں جائیں گے لیکن مشرک و کافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہوں گے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ فقہاء و محدثین کا ایک گروہ اس بات کا قائل ہے جو مومن ہو گا اور گنہ گار بھی ہو گا وہ دوزخ میں نہ جائے گا بلکہ معافی سے سرفراز کیا جائے گا اور شروع ہی سے جنت میں داخل ہو گا۔ یہ مرجیہ ہیں۔ اس کے برعکس خوارج اور معتزلہ کا عقیدہ یہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہ کبیرہ کا ارتکاب کرے گا وہ بھی کافروں کی طرح ہمیشہ جہنم میں رہے گا۔

اہل السنت والجماعت کے ایک مختصر گروہ کا جس میں کچھ صحابہ کرام اور تابعین کے نام بھی ہیں اور متاخرین میں جس کے پرجوش حامی حافظ ابن القیم جوزی ہیں یہ خیال ہے کہ جب گنہ گار اپنے اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پا چکیں گے تو دوزخ فنا کر دی جائے گی۔ حافظ ابن القیم نے اپنی دو کتابوں شفاء العلیل اور حادی الارواح میں قرآن حدیث آثار صحابہ اور بیسیوں عقلی دلائل سے اپنے موقف کو ثابت کیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل سنت کے ایک فریق کا خیال تسلیم کیا ہے۔ ایک زیدی عالم شیخ مقبلی نے بھی اپنی مشہور کتاب العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الاباء والمشائخ میں اس کو قبول کیا ہے۔ صوفیائے کرام میں شیخ محی الدین بن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک جن پر خلودِ نار کا حکم ہے وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ ان کو اسی دوزخ میں راحت و لذت محسوس ہونے لگے گی جیسے بعض کیڑے غلاظت کو پسند کرتے ہیں اور ان میں ہی تکلف اٹھاتے ہیں۔ ہمارے معاصرین میں سید سلیمان ندوی سیرۃ النبی میں اور سید مناظر حسن گیلانی الدین القیم میں اسی نظریہ کے حامی ہیں۔ جو کچھ کہا گیا ہے یہ ان لوگوں کا خیال ہے

جو اللہ تعالیٰ کی رحمت عمومی کی معتقد تھے۔ جمہور کا مسلک اس سے کچھ مختلف ہے۔ ان کے نزدیک جنت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ رہے گا اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہوں گے کبھی دوزخ سے نجات نہ ملے گی۔ شارحین قرآن نے اس آیت میں کھالوں کے پک جانے کے بعد بدل جانے سے یہی سمجھا ہے کہ عذاب منقطع نہ ہوگا اور احساس عذاب ہمیشہ تازہ ہوتا رہے گا۔ یہ امام رازی کی رائے ہے۔ ابوحیان اندلسی نے بھی اسے نقل کیا ہے اگرچہ پسند نہیں کیا ہے۔

ایمان وعمل صالح کی جزا

۵۸ - اور جن لوگوں نے ہماری بات کو مان لیا اور انہوں نے اعمال صالح کیے ان کو ہم ضرور ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے، ان کو ان باغات میں پاکیزہ بیویاں ملیں گی اور ہم ان کو بڑے گنجان سائے میں رکھیں گے۔ یعنی مومن ہمیشہ جنت میں رہیں گے اور ان کو بیویاں ایسی ملیں گی جو حیض اور دیگر الائشوں سے پاک ہوں گی اور ان کو گھری اور گنجان چھاؤں میں داخل کریں گے جو آفتاب کی دھوپ سے بالکل محفوظ ہوں گی۔[1]

پہلی آیت میں آخرت کی زندگی میں ان لوگوں کے حالات کی عکاسی کی گئی تھی جو اس زندگی میں نبوت کے لائے ہوئے علم وعمل سے باغی ہو کر زندگی گزارتے ہیں اور بتایا کہ اس باغیانہ زندگی کے آخرت میں نتائج کس قدر ہولناک ہوں گے۔ اب اس آیت میں ان لوگوں کے حالات کی تصویر پیش کی گئی ہے جو نبوت کے علم وعمل کو مانتے ہوئے اس سے طاعت و فرمانبرداری کے تعلقات رکھتے ہیں۔ ایمان و عمل صالح کو عطف کے ذریعے جوڑ کر اشارہ کیا ہے کہ وجود کے اعتبار سے اگرچہ دونوں مغائر ہیں ایک سرتاسر فکر ہے اور دوسرا سرتاسر کردار ہے لیکن ظہور کے اعتبار سے دونوں کی ہم آہنگی کامیابی حاصل کرنے کے لیے ناگزیر ہے۔ وعدے کے وقت سں لاکر بتا دیا کہ یہ ناگزیر نتائج ہیں۔ افکار، اعمال اور اخلاق اگر نبوت کے علم وعمل سے وابستہ ہوں گے تو عالم آخرت میں ان کے نتائج پر بہار باغات، دوام راحت اور بے میل سکون کی صورت میں ظاہر ہوں گے۔

یہاں جنت کی خاص طور پر دو خصوصیتیں بتائی گئی ہیں۔

ایک یہ کہ جنتی جنت میں ہمیشہ رہیں گے یعنی جنت بقائے دوام کی جگہ ہے۔ علامہ آلوسی نے بالکل سچا لکھا ہے کہ خلود یہاں دوام کے معنے میں ہے اور اس پر اجماع ہے یعنی یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مکان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے ، جہاں کی راحتیں دائمی اور جہاں کی سلامتی ابدی ، جہاں کی لذت بے انتہا ، جہاں کی زندگی غیر منقطع ، جہاں کی خوشی ناپیدا کنار اور جہاں کا عیش جاوداں ہے ۔ قرآن نے اس کی تصریح سولہ مقامات پر کی ہے ۔ یہاں ذرا تاکید پر تاکید اور پرزور طریقہ تعبیر پر نظر ڈالیے کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں کیا بلکہ ساتھ ہی ابداً فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا اور قرآن میں دوسرے موقعہ پر وعد اللہ حقاً ، کا اضافہ کیا پھر اسی جگہ مزید تاکید کا اضافہ کیا ومن اصدق من اللہ قیلا اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلود جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے ۔

دوسری خصوصیت یہ بتائی گئی ہے کہ وہاں ازواج مطہرہ ہوں گی ۔ ازواج کے ساتھ تطہیر کی قید بڑی گہری معنویت رکھتی ہے ۔ وہاں کی جو لذتیں بھی ہوں گی ان کی تعبیر الوان نعمت ، شربت و شراب ، ازدواجی زندگی اور دوسرے مادی لذائذ سے ہو سکتی ہے مگر وہ حظ و مسرت اور اطمینان و سکینت کے علاوہ کسی معنے میں بھی مادی خصوصیات سے آلودہ نہ ہوں گی ۔ یہاں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول و براز ، پسینہ اور سوء ہضم کی علت لگی ہوتی ہے اور بغیر اس کے یہاں انسان زندہ نہیں رہ سکتا مگر وہاں یہ کچھ نہ ہوگا ۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کھائیں گے اور پیئیں گے لیکن نہ تھوکیں گے نہ وہاں بول و براز کی حاجت ہوگی ، نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی ، نہ بلغم اور کھنگار جیسی گھنونی چیزیں ہوں گی ۔ کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا ، وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی ، بیویاں پاک صاف جسم کی روح کی ہر ممکن گندگی اور آلودگی سے ستھری ، پاکیزہ ، عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں گندگی اور تکلیف سے صاف ، بُرے اخلاق کے داغ سے پاک ، جو جنت میں داخل ہوگا اس کو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی ، نہ ان کے کپڑے میلے ہوں گے اور نہ ان کی جوانی زائل ہوگی ۔ وہاں منادی ہوگی یہ وہ زندگی ہے کہ پھر موت نہ آئے گی وہ جوانی ہے کہ پھر بوڑھے نہ ہوں گے ، وہ آرام ہے کہ پھر تکلیف نہ پاؤ گے ، لوگوں کے چہرے اپنے اپنے اعمال کے مطابق چمکیں گے کوئی ستارہ کی طرح اور کوئی چودھویں رات کی طرح ۔

غور کرو کہ وہ جسمانی زندگی ہماری موجودہ جسمانی زندگی سے کتنی مختلف ہوگی اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے انسان کبھی شکم مادر میں بچہ کی صورت میں زندہ تھا مگر وہاں اس کی زندگی ، اس کی غذا ، اس کی سانس ، اور اس کے لوازم حیات ، بیرون شکم کے اصول حیات و قوانین زندگی سے بالکل مختلف تھے اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا اس کی بیرونی زندگی کے حالات کو تعجب کے ساتھ سن کر آمادہ انکار ہونا دانشمندی نہیں ہے ۔ ایسے ہی اس مادی زندگی کے خوگر اور اس عالم آب و گل کے باشندے کا اس دوسری زندگی کے اصول حیات ، طرز غذا اور دوسرے لوازم حیات کو سن کر آمادہ انکار ہونا تو ان کا بہ فعل بھی دانشمندی کے خلاف ہوگا ۔ ○○○

إِنَّ اللَّهَ يَأْمُرُكُمْ أَن تُؤَدُّوا الْأَمَانَاتِ إِلَىٰ أَهْلِهَا وَإِذَا
حَكَمْتُم بَيْنَ النَّاسِ أَن تَحْكُمُوا بِالْعَدْلِ ۚ إِنَّ اللَّهَ نِعِمَّا
يَعِظُكُم بِهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ كَانَ سَمِيعًا بَصِيرًا ۝ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ
آمَنُوا أَطِيعُوا اللَّهَ وَأَطِيعُوا الرَّسُولَ وَأُولِي الْأَمْرِ مِنكُمْ ۖ
فَإِن تَنَازَعْتُمْ فِي شَيْءٍ فَرُدُّوهُ إِلَى اللَّهِ وَالرَّسُولِ إِن
كُنتُمْ تُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ ذَٰلِكَ خَيْرٌ وَأَحْسَنُ
تَأْوِيلًا ۝ ع

بلاشبہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کے حوالے کردو[۹۹]، اور جب لوگوں کے مابین فیصلہ کرو تو عدل و انصاف سے کرو، بلاشبہ اللہ تم کو نہایت عمدہ نصیحت کرتا ہے یقیناً اللہ سب کچھ سُن رہا ہے دیکھ رہا ہے۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسُول کی اطاعت کرو اور تم میں جو

صاحبِ امر ہوں ان کی اطاعت کرو[۱۰۱]۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں نزاع ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف اسے لوٹا دو، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو[۱۰۲]۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اور اسی میں انجام کار کی خوبی ہے[۱۰۳]۔

سیاسی نظام اور مصادرِ قانون

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ قرآن عائلی نظام، معاشی نظام، معاشرتی نظام اور اخلاقی نظام بیان کرنے کے بعد چونکہ اسلام سیاسی نظام اور قانونی نظام سے روشناس کرانا چاہتا ہے اس لیے خاص طور پر اوتوا نصیبا من الکتاب کہہ کر یہود کا چہرہ پیش کر کے دین و سیاست کی تفریق کے باطل نظریہ پر پہلے ضرب لگا دی۔ تاکہ مسلمان اپنے اصل مقصد کو نہ بھول جائیں اور یہودیوں کی طرح دینداری کے معنے یہ نہ سمجھ لیں کہ عبادات اور معاشرت میں چند شرعی اطوار و اقدار کو اپنانا ہی اسلام ہے خواہ مقاصدِ زندگی وہی ہوں جو دنیا پرستوں کے ہوتے ہیں خواہ نظام اجتماع کی زمام کار صالحین کے ہاتھ میں ہو یا فجار و فساق کے ہاتھ میں، اور خواہ اجتماعی امامت اپنے اصول و نصب العین کے اعتبار سے اسلامی ہو یا کافرانہ اس جرم کے مرتکب یہودی تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو اس جرم کی سزا اس طرح دی کہ ان کی آبادیاں کفار کے تابع فرمان ہو گئیں۔ لیکن انہوں نے اور ان کے علماء نے اسے سزا سمجھنے اور اس اصل قصور کی جس کی پاداش میں ان کو یہ سزا ملی تھی تلافی کرنے کے بجائے الٹا یہ فیصلہ کر دیا کہ نظام کفر ہی نظام ایمان سے زیادہ صحیح ہے۔ یہودیوں کی داستان میں دین و سیاست کی تفریق کے باطل نظریہ پر متنبہ فرمانے کے بعد اب ان آیات میں اسلام کا نظامِ سیاسی اور نظامِ قانون پیش کیا جا رہا ہے اور اولین طور پر یہ بات ذہن نشین کی ہے کہ اس نظام کے تمام اجزاء جس مرکز سے حرکت اور زندگی حاصل کرتے ہیں وہ اللہ سبحانہٗ کی ذات و صفات کا تصور ہے۔ اسلامی معاشرے کے جملہ اعتقادات اور سارے اعمال و افکار

اسی تصور کی بنیادوں پر استوار ہیں۔ اسلام نے صفات الٰہی کی تصریح و توضیح میں جس جامعیت سے کام لیا ہے وہ دُنیا کے دوسرے مذاہب میں مفقود ہے اس کے تمام خارجی ادارے اور تمام نظامات اسی ایک مصدر سے مشتق ہیں۔ اسلامی مملکت کا تصور، اسلام کا قانونی نظام رسُول کی شخصیت اور اس کا منصب اسلامی معاشرہ کا اخلاقی ضابطہ، اعمال و فرائض کی تمام شاخیں غرض کہ اسلامی نظام کا ہر معمولی سے معمولی جزو بھی بالواسطہ یا بلا واسطہ اسی مرکزی تخیل سے وابستہ ہے۔

۹۹۔ بلاشبہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانتیں امانت والوں کے حوالے کر دو۔ یہود میں عادت تھی کہ امانت میں خیانت کرتے اور فصل خصومات میں رشوت وغیرہ کی وجہ سے کسی کی خاطر اور رعایت کر کے خلاف حق حکم دیتے اس لیے مسلمانوں کو ان دونوں سے اس آیت میں روکا گیا۔ منقول ہے کہ فتح مکہ کے دن آپ نے خانہ کعبہ کے اندر داخل ہونا چاہا تو عثمان بن طلحہ کلید بردار خانہ کعبہ نے کنجی دینے سے انکار کیا تو حضرت علی نے اس سے چھین کر دروازہ کھول دیا۔ آپ فارغ ہو کر جب باہر تشریف لائے تو حضرت عباس نے آپ سے درخواست کی کہ یہ کنجی مجھ کو مل جاتے اس پر آیت نازل ہوئی اور کنجی عثمان بن طلحہ کے سپرد کی گئی۔[1]

دو باتیں ارشاد ہوتی ہیں کہ یہود کی خیانت پر تنبیہ ہے دوسری بات کا تعلق آیت کی شان نزول سے ہے جہاں تک یہود کے امانت میں خیانت کا تعلق ہے واقعی یہود کی بنیادی غلطیوں میں سے ایک یہ تھی کہ انہوں نے اپنے دور انحطاط میں امانتیں یعنی ذمہ داری کے مناصب اور مذہبی پیشوائی اور قومی سربراہی کے مرتبے ایسے لوگوں کو دینے شروع کر دیے جو نااہل، کم ظرف، بداخلاق، بددیانت اور بدکار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بُرے لوگوں کی قیادت میں ساری قوم خراب ہوتی چلی گئی۔ مسلمانوں کو ہدایت ہو رہی ہے کہ تم ایسا نہ کرنا، بلکہ امانتیں ان لوگوں کے سپرد کرنا جو ان کے اہل ہوں۔ یعنی جن میں بار امانت اٹھانے کی صلاحیت ہو — اس آیت کے پس منظر میں عام شارحین قرآن نے "شان نزول" کے نام سے وہی بات پیش کی ہے جو حضرت شیخ الاسلام نے لکھی ہے۔

یہ واقعہ السیوطی نے لباب النقول میں ابن مردویہ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ اور ابن مردویہ نے اس کا تاریخی نسب یہ بتایا ہے کہ کلبی کہتے ہیں کہ مجھے ابوصالح کے ذریعہ سے معلوم ہوا ہے اور ابوصالح کا بیان ہے کہ مجھے ابن عباس کے ذریعے پتہ لگا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جب مکہ فتح ہو گیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عثمان بن طلحہ کو بلایا، ان سے کہا کہ چابی مجھے دکھاؤ۔ جب عثمان حضور انور کو چابی دینے لگے تو حضرت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

عباس بول پڑے کہ سقایہ میرے پاس ہے چابی بھی مجھے عنایت فرمائیے۔ عثمان نے چابی دیتے دیتے ہاتھ روک لیا۔ آپ نے فرمایا کہ عثمان چابی لاؤ۔ یہ اللہ کی امانت ہے دروازہ کھولا اندر تشریف لے گئے، باہر تشریف لاتے طواف کیا۔ جبریل نے حضور کو حکم دیا کہ چابی عثمان کو دی جاتے۔ آپ نے عثمان کو بلایا چابی اسے دی اور یہ آیت تلاوت کی ان اللہ یامرکم... الخ لیکن روایتی طور پر عبداللہ بن عباس کا یہ بیان ثابت نہیں ہے کیونکہ جس راہ سے عبداللہ بن عباس کا یہ بیان نقل ہوکر آیا ہے وہ محدثین کے نزدیک سب سے زیادہ کمزور طریق ہے۔

آیت اپنے معنے میں کسی پس منظر کی محتاج نہیں ہے اور علماء کا فیصلہ ہے کہ العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب آیات قرآنی کے مطالب میں خاص واقعات کا نہیں بلکہ عام الفاظ ہی کا اعتبار کیا جاتا ہے۔

اس آیت کی عظمت شان کو علماء نے بہت سراہا ہے۔ علامہ قرطبی رقمطراز ہیں۔ یہ آیت گرامی امہات معارف میں سے ہے۔ دین وقانون کی ساری دفعات کا یہ آیت گہوارہ ہے۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں کہ یہ آیت قرآنی قانون کے بنیادی مسائل پر مشتمل ہے اور علامہ سید رشید رضا کہتے ہیں کہ یہ دونوں آیتیں اسلام کے سارے سیاسی نظام کے لیے اساس اور بنیاد کی حیثیت رکھتی ہیں۔ اگر پورے قرآن میں ان کے سوا کوئی آیت اس موضوع پر نہ ہوتی تو اُمت کو اسلام کے نظام سیاسی کے لیے یہ ہی کافی ہوتیں۔

الامانات امانت کی جمع ہے۔ لفظ امانت یہاں خاص معنے میں نہیں بلکہ عام معنے میں آیا ہے۔ اس میں تمام حقوق و فرائض انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے، اپنوں سے تعلق رکھتے ہوں یا بیگانوں سے، مالی معاملات ہوں یا سیاسی معاہدات، سب لفظ امانت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے زیر آیت انا عرضنا الامانۃ، امانت کی یہ تعریف کی ہے۔ امانت کیا ہے؟ پرائی چیز رکھنا اپنی خواہش کو روک کر، اس معنے میں علم بھی امانت ہے، رائے بھی امانت ہے، عہدے اور مناصب بھی امانت ہے حکومت اور اقتدار بھی امانت ہے۔

اسلام میں حکومت کی حیثیت

قرآن کے نقطہ نظر سے حکومت اور سیاسی اقتدار کی حیثیت سرتاسر امانت کی ہے۔ یعنی مسلمان اس کے مالک نہیں ہیں بلکہ امین ہیں۔ جیسے مالک کی مرضی کے خلاف کبھی بھی امانت میں تصرف خیانت ہے ایسے ہی اقتدار وحکومت میں اللہ کی مرضی کے خلاف تصرف امانت میں خیانت ہے یعنی اقتدار و حکومت

میں اللہ کی مرضی کے خلاف تصرف امانت میں خیانت ہے یعنی اقتدار و حکومت میں سے جو کچھ بھی کسی کی ملک میں ہے وہ اللہ تعالیٰ کی امانت ہے۔ اس کا استعمال ان مقاصد کی خاطر ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ہونا چاہیئے جو مالک نے مقرر کر دیے ہیں۔ ریاست اور ریاستی اموال املاک کی حیثیت بھی یہی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو اسلامی ریاست قائم کی تھی اس کی حیثیت آپ نے یہی بتائی تھی آپ بحیثیت صدر اس ریاست کے امین تھے۔ چنانچہ سنن ابو داؤد میں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میں نہ خود سے تمہیں دیتا نہ کسی چیز کو تم سے روکتا ہوں میں تو صرف ایک خازن ہوں وہاں خرچ کرتا ہوں جہاں مجھے حکم دیا گیا ہے۔

آپ نے اہل ایمان پر یہ واضح کر دیا تھا کہ مملکت میں جو کچھ جیسا کچھ اور جتنا کچھ بھی ہے وہ امانت ہے۔ صدر مملکت اس کا امین محافظ اور نگران ہے ایسے ہی جیسے یتیم کے سرمایہ میں اس کا نگران اور متولی ہوتا ہے۔ اسی حقیقت کو حضرت عمر نے ان الفاظ میں واضح کیا ہے۔

میری حیثیت تمہاری دولت میں وہی ہے جو کسی یتیم کے سرپرست کی ہوتی ہے۔

طبقات ابن سعد میں ہے؛

میری نظر میں سرکاری اموال کی وہی حیثیت ہے جو کسی یتیم کے مال کی ہوتی ہے۔

ایک دوسرے موقعہ پر حضرت عمر نے مسلمان حکمران کی حیثیت اس غلام کی بتائی ہے جس پر ادائے امانت اسی طرح فرض ہے جس طرح غلام پر اپنے آقا کے لیے۔ فرمایا کہ:

جو شخص مسلمانوں کے امور کا نگران بنا وہ ان کا غلام ہے۔ ان کی خیر خواہی اور امانتوں کا پاس اس پر اسی طرح فرض ہے جس طرح غلام پر اپنے آقا کے بارے میں۔

قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں حضرت عمر کی مجلس مشاورت میں ایک تقریر نقل کی ہے جس سے حکومت کے امانت ہونے کے تصور پر اچھی روشنی پڑتی ہے۔

میں نے آپ لوگوں کو جس غرض کے لیے تکلیف دی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مجھ پر آپ کے معاملات کی امانت کا جو بار ڈالا گیا ہے اسے اٹھانے میں آپ میرے ساتھ شریک ہوں۔ میں آپ ہی کے افراد میں سے ایک فرد ہوں اور آج آپ ہی وہ لوگ ہیں جو حق کا اقرار کرنے والے ہیں۔ آپ میں سے جس کا جی چاہے مجھ سے اختلاف کرے اور جس کا جی چاہے میرے ساتھ اتفاق کرے۔ میں یہ نہیں چاہتا ہوں کہ آپ میری خواہش کی پیروی کریں۔

قرآن نے یہاں حکومت کے لیے لفظ امانت بول کر یہ رہنمائی کی ہے کہ خدا کا تعلق صرف انسان کی انفرادی زندگی کے لیے ہی ضروری نہیں ہے بلکہ مملکت کے اعلیٰ ترین مقاصد کا حصول بھی اللہ سبحانہٗ کے صحیح تعلق سے ہی وابستہ ہے۔ یہ بات آپ جانتے ہیں کہ مملکت ایسا ادارہ ہے جو افراد کی تکمیل ذات اور ارتقائے شخصیت کے وسائل مہیا کرتا ہے اور شخصیت کی تکمیل نام ہے قابو یافتہ ارادہ کا۔ ایسا ارادہ جس میں بے قیدی اور بے آئینی معدوم ہو اور اعلیٰ درجہ کا ضبط پایا جاتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا ارادہ وہ ہی ہو سکتا ہے جو خارجی موثرات کی مدد سے بالکل بے نیاز ہو۔ اس بنا پر افراد مملکت کی تکمیل ذات ممکن نہیں ہے۔ جب تک خدا کا تصور اس کی ذات صفات کا تصور اور اس کے قانون مکافات کا تصور انسانی ذہن و عمل پر مکمل نہ ہو۔ اس طرح مملکت میں خدائی امانت کا اعتقاد مملکت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا مملکت کے وجود کے لیے فوج اور پولیس کا ہونا ضروری ہے۔

بہرحال اس آیت کی روشنی میں حکومت اور اس کی ذمہ داریاں اہل حکومت کے ہاتھ میں امانت کی حیثیت رکھتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ احادیث میں حکومت اس کے مناصب، اس کے عہدے اور اس کی ذمہ داریوں کے تذکرے میں لفظ امانت ہی استعمال ہوا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر کو حکومت کی ذمہ داریوں کے بارے میں جو وصیت فرمائی تھی اس میں ہے:

انہا امانۃ و انہا یوم القیامۃ خزی و ندامۃ

حکومت کے امانت ہونے کا تقاضا

جب یہ بات از روئے قرآن و سنت الم نشرح ہو کر سامنے آگئی کہ حکومت اور اس کی ذمہ داریوں کی حیثیت امانت کی ہے تو آپ قرآن کا یہ حکم جو اس آیت میں ہو رہا ہے کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت امانت والوں کے سپرد کر دو۔ یعنی تمہاری اولین ذمہ داری یہ ہے کہ امانت امانت والوں کو دو۔ یعنی جن میں اس امانت کو لینے کی اہلیت، صلاحیت اور قابلیت ہو، اس کے امانت ہونے کا اولین تقاضا یہ ہے کہ یہ اس کو دی جائے جس میں اس کی اہلیت ہو۔ اس موقعہ پر قرابت داری کا خیال، خاندان و نسل کا پاس و لحاظ اور رشتہ اخوت و مودت ہرگز دھوکا نہ دے۔ اسی طرح حرص و ہوس، بے جا خوشامد و چاپلوسی اور غلط اخلاقی دباؤ کا شکار نہ ہو۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی روح کو کھول کر سمجھایا ہے، ارشاد ہے:
جو بھی لائق تر فرد کو چھوڑ کر کسی دوسرے کو کام سپرد کرتا ہے وہ اللہ اور اس کے رسول

سے خیانت کرتا ہے۔ (السیاستہ الشرعیہ)

حکومت اور اس کی ذمہ داریاں اگر امانت نہ ہوں تو خیانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ ایک دوسری حدیث ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم نے ارشاد فرمایا ہے؛

ایک بہتر شخص کی موجودگی میں اس کو چھوڑ کر جس کسی نے کسی اور کو محض دھڑے کی وجہ سے کام کی ذمہ داری دے دی اس نے اللہ اور اس کے رسُول اور سارے اہل ایمان سے خیانت کی ہے۔

(السیاستہ الشرعیہ)

عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ راوی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے؛

جس شخص نے نیک ترین اور پسندیدہ شخص کو چھوڑ کر اُمت کا کام دوسرے کو سپرد کر دیا اس نے اللہ، اس کے رسُول اور مسلمانوں سے خیانت کی۔ (مجموعۃ الحدیث النجدیہ)

حافظ ابن تیمیہ نے اس ساری بحث کو پیارے انداز میں پیش کیا ہے فرماتے ہیں:

اگر کسی نے قرابت داری، رشتہ داری، دوستی، ہم شہری، ہم مذہبی اور ہم جنسی کی وجہ سے اصلح اور احق کو چھوڑ کر دوسرے کو ذمہ داری سونپ دی یا کسی مالی منفعت کی اُمید پر اس نے بے انصافی سے کام لیا یا اس وجہ سے حقدار اور باصلاحیت افراد کو نظر انداز کر دیا کہ اس سے اس کی عداوت تھی ان تمام صورتوں میں اس نے اللہ، اس کے رسُول اور مسلمانوں سے خیانت کی۔ (السیاستہ الشرعیہ)

حاکمیت اللہ کی ہے

اس آیت میں اقتدار اور حکومت کی ذمہ داریوں کو امانت قرار دینے کے ساتھ یہ کہہ کر کہ ان اللہ یامرکم یہ بھی جتا دیا ہے کہ اسلامی ریاست میں حاکمیت صرف اللہ کی ہوتی ہے۔

علم سیاست کی اصطلاح میں حاکمیت کا لفظ اقتدار اعلیٰ اور اقتدار مطلق کے معنے میں بولا جاتا ہے۔ ریاست صدر وزیر اعظم اور قومی اسمبلی کے حاکم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسے افراد ریاست پر حکم چلانے کے غیر محدود اختیارات حاصل ہیں۔ افراد اس کی غیر مشروط اطاعت پر مجبور ہیں خواہ بطوع و رغبت یا بجبر۔ اس کے اختیارات حکمرانی کو اس کے اپنے ارادے کے سوا کوئی خارجی چیز محدود کرنے والی نہیں ہے۔ افراد کو اس کے مقابلے میں کوئی حق حاصل نہیں جس کے جو کچھ بھی حقوق ہیں اسی کے دیئے ہوئے ہیں وہ جس حق کو بھی سلب کر دے وہ آپ سے آپ معدوم ہو جاتا ہے۔ قانون صاحب حاکمیت کے ارادے سے وجود

میں آتی ہے اور افراد کو اطاعت کا پابند بناتا ہے مگر خود صاحب حاکیت کو پابند نہیں کرتا۔ وہ اپنی ذات قادر مطلق ہے اس کے احکام کے بارے میں خیر و شر صحیح اور غلط کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا جو کچھ وہ کرے وہ ہی خیر ہے جو کچھ کہے وہ صحیح ہے اس لیے ناگزیر ہے کہ وہ سبوح قدوس اور منزہ عن الخطا ہو، علم سیاست کے ماہرین حاکیت کا یہ واضح تصور ہے کہ انسانی سوسائٹی میں جب اس کا مصداق تلاش کرتے ہیں تو ناکامی کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ قرآن بتاتا ہے کہ آمر اور حاکم فی الواقع اللہ سبحانہ' ہے وہ ہی مختار مطلق ہے فعال لما یرید وہی غیر مسئول ہے لا یسئل عما یفعل وہی تمام اقتدار کا مالک ہے بیدہ ملکوت کل شیئ وہی ایک ہستی ہے جس پر قانون کی حکومت نہیں بلکہ قانون پر اس کی حکومت ہے واللہ غالب علی امرہ اور وہ ہی ذات ہے جس کے اختیارات کو محدود کرنے والا کوئی نہیں وھو یجیر ولا یجار علیہ اور اسی کی ذات منزہ عن الخطا ہے۔ الملک القدوس السلام بہرحال اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ آمر اللہ کی ذات ہے ۔ اسی بنا پر ہمارے اصولیین نے یہ پالیسی طے کی ہوئی ہے اور اس موضوع پر کبھی ان میں دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ حافظ ابن الہمام اپنی مشہور اور دقیق کتاب "التحریر" میں لکھتے ہیں :

الحاکم لاخلاف فی انہ اللہ رب العالمین

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حاکیت صرف اللہ رب العالمین کی ہے ۔

اور مشہور اصولی علامہ محب اللہ اپنی کتاب مسلم الثبوت میں لکھتے ہیں

حاکم کی حیثیت صرف اللہ سبحانہ' کی ہے ۔

الغرض اسلام کے سیاسی نظام کے سارے اجزاء جس مرکز سے حرکت اور زندگی حاصل کر رہے ہیں۔ وہ قرآن کی اس آیت کی رو سے اللہ کی حاکیت ہے ۔ اسلامی معاشرے کے جملہ اعتقادات اور سارے اعمال و افکار اللہ سبحانہ' کے بارے میں تصور آمریت پر استوار ہیں، اُمت کے تمام خارجی ادارے اور تمام نظامات اسی ایک مصدر سے مشتق ہیں۔ اسلامی مملکت کا تصور، اسلام کا قانونی نظام، اسلامی معاشرے کا اخلاقی ضابطہ، اعمال و فرائض کی ساری شاخیں غرض کہ اسلامی زندگی کا ہر معمولی سے معمولی جزو بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ اسی مرکزی تخیل سے وابستہ ہے اور یہ بالکل ٹھیٹھ عقلی بات ہے کہ جو خالق ہے وہی آمر ہے الا لہ الخالق والامر یہ بیان واقعہ بھی ہے اور اظہار حق بھی۔ یعنی جس نے یہ کائنات بنائی ہے اس کے ہر گوشہ میں اسی کا امر ہے ۔

امانت کے دائرے کی پہنائیاں

امانت کا لفظ اپنے معنے کے لحاظ سے امانت کے ہر جزئیہ پر یکساں بولا جائے گا۔ اسی لیے اہل تفسیر کی تصریحات کے مطابق اس کی پنہائیوں میں وہ امانت الہٰی بھی داخل ہے جسے اصولیین کی زبان میں "تکلیفِ شرعی" کہتے ہیں اور وہ امانت بھی داخل ہے جس کا نام عدل وانصاف ہے اور جو حاکموں کو اپنی رعایا کے حقوق ادا کرنے پر مجبور کرتا ہے اور وہ تمام امانتیں بھی اس میں داخل ہیں جن کو ان کے مالکوں کے سپرد کرنا ضروری ہے۔

اس تفصیل سے ظاہر ہوگا کہ امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائداد اور مالی اشیا تک محدود نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔ اگر کسی کی کوئی چیز آپ کے پاس رکھی ہے تو اس کے مانگنے پر یا یوں بھی اس کو جوں کا توں دے دینا امانت ہے۔ اگر کسی کا کوئی حق آپ پر باقی ہے تو ادا کرنا بھی امانت ہے، کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا بھی امانت ہے۔ کسی مجلس میں آپ ہوں، اور کچھ باتیں وہاں دوسروں کے متعلق سنیں تو ان کو اسی مجلس تک رکھنا اور دوسروں تک پہنچا کر فتنہ اور ہنگامہ کا باعث نہ بننا بھی امانت ہے۔ کسی نے آپ سے اپنے نجی کام میں مشورہ طلب کیا تو اس کو سن کر اپنے ہی تک محدود رکھنا اور اس کو اپنے علم کے مطابق صحیح مشورہ دینا بھی امانت ہے۔ اگر آپ کسی جگہ ملازم ہیں تو آپ کو نوکری کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو محسوس کرکے انجام دینا بھی امانت ہے۔ اگر آپ کسی کے آٹھ گھنٹے کے ملازم ہیں اور آپ اس کی اجازت کے بغیر کچھ وقت چرا لیتے ہیں یا بے سبب سستی کرتے ہیں تو یہ بھی امانت کے خلاف ہے۔

نبوت کی راہ سے جو علم وعمل آیا ہے وہ بھی امانت ہے اس علم وعمل کو ان کے ضرورت مندوں تک پہنچانا ایسا ہی ادائے امانت ہے جیسے کسی کے پیسے اس کو پہنچانا اور جیسے یہ واجب ہے یہاں سید رشید رضا نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ نبوت کے علم وعمل کی امانت کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے ضروری ہے کہ وقت کے احوال وظروف کے مطابق اس امانت کو لوگوں تک پہنچانے کا طریقہ بھی سیکھے۔ ابھی یہ موضوع تشنۂ تحقیق ہے انشاء اللہ اس پر تفصیلی مباحث نویں پارے سورۂ انفال میں اور بائیسویں پارے سورۂ احزاب کے آخر میں ہدیہ ناظرین ہوں گے۔

عدل وانصاف کا حکم

۱۰۰۔ اور جب لوگوں کے مابین فیصلہ کرو تو عدل وانصاف سے کرو بلاشبہ اللہ سبحانہ تم کو عمدہ نصیحت

کرتا ہے یقیناً اللہ سب کچھ سن رہا ہے دیکھ رہا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز نے اس پوری آیت کی اس طرح تشریح کی ہے۔

اے اہلِ حکومت خواہ تھوڑوں پر حکومت ہو خواہ بہتوں پر بے شک اللہ تعالیٰ تم کو اس بات کا حکم دیتا ہے کہ اہلِ حقوق کو ان کے حقوق جو تمہارے ذمہ ہیں پہنچا دیا کرو اور تم کو یہ بھی حکم دیتے ہیں کہ جب محکوم لوگوں کا تصفیہ کیا کرو ایسے حقوق میں جو ان میں باہم ایک دوسرے کے ذمہ ہیں تو عدل و انصاف سے تصفیہ کیا کرو بے شک اللہ تعالیٰ جس بات کی تم کو نصیحت کرتے ہیں وہ بات بہت اچھی ہے۔ دُنیا کے اعتبار سے بھی اس میں بقا ہے اور آخرت کے اعتبار سے بھی کہ موجبِ قرب و ثواب ہے۔ بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے اقوال کو جو دربارہ امانت و تصفیہ کے تم سے صادر ہوتے ہیں، خوب سنتے ہیں اور تمہارے افعال کو جو اس باب میں تم سے واقع ہو رہے ہیں خوب دیکھتے ہیں تو اگر کمی و کوتاہی کرو گے تو مطلع ہو کر تم کو سزا دیں گے[1]

حافظ ابن تیمیہ نے السیاسۃ الشرعیہ میں لکھا ہے کہ:

اس آیت میں اہلِ حقوق کو ان کے حقوق پہنچا دینا اور لوگوں کے درمیان انصاف کرنا واجب قرار دیا گیا ہے۔ یہی دونوں چیزیں بہترین انتظامیہ اور عمدہ ترین عدلیہ کی ضمانت ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں اسلامی نظامِ حکومت کا جو خلاصہ بیان کیا گیا ہے وہ اربابِ فکر و دانش کے لیے دستور کی بنیاد کی حیثیت رکھتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس روح کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو حکومت کو بقا عطا کرتی ہے اور جس سے عوام و خواص کو اطمینان و سکون کی دولت ملتی ہے۔

عدل کی لغوی تحقیق

کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح بانٹ دیا جائے کہ ان دو میں سے کسی میں ذرا بھی کمی یا بیشی نہ ہو تو اس کو عربی میں عدل کہتے ہیں۔ اور اس سے وہ معنے پیدا ہوتے ہیں جن میں ہم اس لفظ کو اپنی زبان میں بولتے ہیں یعنی جو بات ہم کہیں یا جو کام کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے۔ اور علامہ قبول مصباح میں

---

[1] بیان القرآن

فرماتے ہیں:

عدل کے معنے ہیں معاملات میں میانہ روی سے کام لینے کے یہ جور کے خلاف ہے عدل فی امرہ عدلاً اور عدل علی القوم عدلاً باب ضرب سے آتا ہے۔

علامہ ابن الاثیر نے نہایہ میں عدل بالفتح عدل بالکسر کو مثل کے اور عدیل کو مثیل کے معنے میں لکھا ہے

امانت کے ذکر کے بعد معاملات میں عدل کا حکم ہے کہ امانت کے سب سے اہم پہلو کی طرف اور اقتدار کے ساتھ جو ذمہ داری وابستہ ہے اس کی طرف متوجہ کیا ہے۔ جن کو اللہ سبحانہٗ زمین کا اقتدار بخشتا ہے ان پر اوّلین ذمہ داری جو عائد ہوتی ہے وہ یہی ہے کہ وہ لوگوں کے مابین پیدا ہونے والے معاملات کو عدل و انصاف کے ساتھ چکائیں۔ یہاں عدل کا مطلب یہ ہے کہ قانون کی نگاہ میں امیر و غریب، شریف و وضیع کالے اور گورے کا کوئی فرق نہ ہو۔ انصاف خرید نی و فروختنی چیز نہ بننے پائے۔ اس میں کسی جنبہ داری، کسی عصبیت، کسی سہل انگاری کو راہ نہ مل سکے، کسی دباؤ، کسی زور و اثر اور کسی خوف و طمع کو اس پر اثر انداز ہونے کا موقعہ نہ ملے۔

سیاسی نظام کی دو بنیادیں انتظامیہ اور عدلیہ

اس آیت میں بتا دیا ہے کہ سیاسی نظام کی دو اہم اور ناگزیر ضرورتیں ہیں ایک صالح انتظامیہ اور دوسرے اچھی عدلیہ۔ کوئی نظام سیاسی ان دو کے بغیر نہ مکمل ہوتا ہے اور نہ قائم ہوتا ہے۔ قرآن نے یہاں ان دونوں کا ذکر کر کے ان کی بنیادی اہمیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

انتظامیہ کا مقصد زندگی کے بنیادی مفادات کا تحفظ کرتی ہے اور ناگزیر اجتماعی ذمہ داریوں مثلاً دفاع، امن و امان اور افراد معاشرہ کے فلاح و بہبود کے فرائض انجام دیتی ہے۔ انتظامیہ نظم، اقتدار قوت اور مرکزیت کی امتیازی صفات کی حامل ہوتی ہے۔ اسلامی شعور اور زندگی کا اسلامی مزاج انتظامیہ کی ضرورت اور اہمیت کو اور زیادہ مستحکم کر دیتا ہے۔ انتظامیہ مسلمانوں کے مشترکہ مقاصد کی ضامن اور ان کے جذبۂ اخوت و تعاون کی اعلیٰ ترین مظہر بن کر ابھرتی ہے۔ قرآن نے انتظامیہ کو قیام دین، دعوت الخیر، شہادت علی الناس اور امر بالمعروف و نہی عن المنکر کی جو ذمہ داریاں سونپی ہیں انتظامیہ ان کی اولین ذمہ دار قرار پاتی ہے۔ افراد کا اسلامی شعور انتظامیہ سے اپنے مقصد زندگی کے حصول میں ہر ممکن مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ انتظامیہ فرد کی جان و مال، عزت و آبرو، عقل و فہم اور دین و اخلاق کی محافظ بن کر رہتی ہے۔ افراد کے تزکیہ اور زندگی کی مادی تعمیر کی خاطر مختلف خدمات انجام دے کر

انتظامیہ افراد کو ان کے مقصدِ زندگی کے حصول میں مدد دیتی ہے۔

عدلیہ کا مقصد یہ ہے کہ قانون کی بنا پر حدودِ مملکت میں رہنے والے افراد کو جو حقوق حاصل ہیں ان کی حفاظت کی جائے اور انہیں ظلم و جور سے محفوظ رکھا جائے۔ اسی سے ظاہر ہوتا ہے کہ عدلیہ کا تعلق انتظامی امور سے نہیں ہوتا بلکہ شخصی حقوق سے ہوتا ہے اور ان دونوں کا یہ امتیاز بتانے کے لیے دونوں کو دو فقروں میں علیحدہ بیان کیا ہے۔ انتظامیہ کے لیے ان تؤدوا الامانات الی اھلھا کی تعبیر اور عدلیہ کے لیے اذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ عدلیہ اپنے فرائض عدل و قضا میں انتظامیہ کے اثر سے آزاد ہے۔ انتظامیہ یا اس کے کسی افسر اور عہدہ دار چاہے وہ وزیر اعظم اور صدر مملکت ہی کیوں نہ ہو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ عدلیہ کو کسی خاص فیصلے پر مجبور کرے۔ یہی نہیں بلکہ سربراہِ مملکت عدلیہ کو کسی مقدمہ کی دوبارہ سماعت پر بھی مجبور نہیں کر سکتا۔ فتاویٰ ہندیہ کے باب آداب القاضی میں ہے؛

> عدالت جب کسی معاملہ میں کوئی فیصلہ کر دے اس کے بعد سربراہِ مملکت اسے حکم دے کہ وہ اس مقدمہ کی دوبارہ سماعت علماء کے سامنے کرے تو عدالت پر اس حکم کا ماننا واجب نہیں ہے۔

فرائض عدل و انصاف کی حد تک عدلیہ کے لیے بجز اسلامی قوانین کی پیروی کے اور کوئی پابندی نہیں ہے اور آیت میں بین الناس کی عمومی تعبیر بتا رہی ہے کہ قرآن کے نزدیک صدر مملکت، گورنر، وزیر اعظم، وزراء، اعلیٰ حکام اور عامۃ الناس سب کے لیے ایک ہی قانون اور ایک ہی نظام عدالت ہے۔ کسی کے لیے کوئی قانونی امتیاز نہیں ہے۔ کسی کے لیے خاص عدالتیں نہیں ہیں اور کوئی عدالت کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔

عدل کی عظمت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ قرآن نے نبوت کی بعثت کا مقصد عدل و انصاف کے قیام کو بتایا ہے۔ خود قرآن کے نزول کا مقصد بھی عدل و انصاف کو قائم کرنا ہے۔ اسی پر معاشرہ بلکہ دنیا کا سارا کارخانہ قائم ہے۔ اگر عدل و انصاف ختم ہو جائے تو دنیا کا سارا نظام درہم برہم ہو جائے۔ قرآن نے جس تفصیل سے عدل کے تمام پہلوؤں کو واضح کیا ہے اس کی مثال دوسری جگہ نہیں ملتی ہے۔ اس موضوع پر متعدد مباحث تفصیل طلب ہیں معاشرتی عدل، اجتماعی عدل، عدالت کے فرائض، عدالت کے ججوں کے اوصاف، عدالت کا دائرہ کار وغیرہ وغیرہ پر ان شاء اللہ تبصرہ سورہ مائدہ میں آئے گا۔

اسلام کے استنادی مصادرِ قانون

۱۰۱- اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اللہ کی اطاعت کرو اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرو اور تم میں سے جو صاحبِ امر

ہیں ان کی اطاعت کرو۔ پہلی آیت میں حکام کو عدل کا حکم فرما کر اب اوروں کو حکام کی متابعت کا حکم دیا جا رہا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ حکام کی متابعت جب ہی واجب ہوتی ہے جب وہ حق کی اطاعت کریں گے حاکم اسلام بادشاہ یا اس کا صوبہ دار یا قاضی یا سردار لشکر اور جو کوئی کسی کام پر مقرر ہو ان کے حکم کا ماننا ضروری ہے جب تک وہ خدا اور اس کے رسول کے حکم کے خلاف حکم نہ دیں۔ اگر خدا و رسول کے حکم کے صریح خلاف کرے تو اس حکم کو ہرگز نہ مانے[1]

اس سے پہلے اسلام کے نظامِ سیاسی کے موضوع پر قرآن کی سابقہ آیت میں انتظامیہ اور عدلیہ کا ذکر پیش ہو چکا ہے لیکن کوئی انتظامیہ اور کوئی عدلیہ اپنے وجود کے لحاظ سے بیکار محض ہے اگر اس کی پشت پر اس کی رہنمائی کے لیے دستور نہ ہو۔ اسلامی ریاست کی انتظامیہ اور عدلیہ کا دستور کیا ہے یا دستوری قانون کے ماخذ کیا ہیں جن پر چل کر دنیا میں عدل اور حق قائم کیا جا سکے۔ قرآن نے یہاں اسی اٹھتے ہوئے سوال کا بطور استیناف بیانی جواب دیا ہے۔

اس آیت میں بالترتیب تین طاعتوں کا حکم دیا گیا ہے، اللہ کی، رسول کی اور مسلمانوں میں اولوالامر کی۔ اس سے پہلی بات تو یہ معلوم ہوئی کہ رسول اولی الامر میں شامل نہیں بلکہ ان سے الگ اور بالاتر ہے اور اس کا درجہ طاعت میں اللہ سبحانہ کے بعد دوسرے نمبر پر ہے۔ اللہ کی طاعت کتاب اللہ کی طاعت ہے۔ رسول کی طاعت سے مقصود آپ کی سنت اور اسوۂ حسنہ کی طاعت ہے۔ یہی دونوں قانون کے اصلی سرچشمے ہیں۔ ان کے اندر جس قدر قوانین واضح شکل میں موجود ہیں وہ قطعی اور اٹل ہیں اور ہمیشہ کے لیے واجب التسلیم اور واجب الاطاعت ہیں۔ ان میں کبھی معمولی ردّ و بدل بھی نہیں ہو سکتا۔ نہ کوئی انتظامیہ اور نہ کوئی عدلیہ نہ کوئی مقننہ اور نہ کوئی کابینہ۔ انتظامِ مملکت کے چلانے میں ان سے بال برابر انحراف کر سکتی ہے نہ کسی جج کے لیے جائز ہے کہ معاملات کا فیصلہ ان سے ہٹ کر کرے، ایسا کرنا اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھنے کے مترادف ہے ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون۔

قانون کے ان دونوں ماخذوں کی طرف متوجہ کرنے کے لیے یا ایھا الذین اٰمنوا سے فقرے کا آغاز یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ جو لوگ الہامی ہدایات پر ایمان رکھتے ہیں انہیں اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جن قانونی ماخذوں کی طرف انہیں دعوت دی گئی ہے وہ کسی انسان کے ساختہ پرداختہ نہیں ہیں بلکہ ان کا صدور ایک ایسی ذات سے ہوا ہے جو ہمہ تن حق و صداقت ہے جس کی عقل کائنات کے ہر گوشہ پر حاوی اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جس کی ہمہ تن اتھم زمین وآسمان کی ہر شے کو محیط ہے۔ پھر چونکہ ان ماخذوں پر وہ یہ سمجھ کر ایمان لاتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں خواہ یہ کتاب اللہ ہو یا رسول اللہ اس لیے اس کا کوئی امکان نہیں پیدا ہو سکتا کہ وہ کبھی ان سے اختلاف کرے کیونکہ ان سے اختلاف کرنے کے معنے یہ ہیں کہ وہ الہامی ہدایات سے منکر ہے اور اس کے ساتھ ہی وہ اس سوسائٹی سے خارج ہو جاتا ہے جس کا وہ اس بنا پر رکن ہوا تھا کہ اس نے اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کو بلا رد و قدح تسلیم کر لیا تھا جن پر اسلامی معاشرہ کی تعمیر ہوئی ہے اور جن کے متعلق تمام مسلمانوں کا اعتقاد ہے کہ وہ اللہ کی طرف سے انسانوں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے روانہ کیے گئے ہیں اس لیے انسانی اختلافات اور تمدن و معاشرت کی نزاعوں میں اہل ایمان قرآن اور اسوۂ حسنہ کو حکم اور ہیچ تسلیم کرتے ہیں۔ خدا کی ذات و صفات کائنات اور انسان سے اس کے تعلق کی نوعیت سیاسی اقتدار کی حقیقت اور اس کا اصلی مستقر حکمرانوں کی ذمہ داریاں، ان کے اقتدار کے حدود، افراد کے حقوق و فرائض اور ان کی ذمہ داریاں ان سب کے بارے میں قرآن و سنت کا فیصلہ صریح اور محکم ہے۔

قرآن و سنت کی موجودگی میں عقلی مداخلت

اسلامی نظام میں قانون کا ماخذ عام لائے یا کسی خاص طبقہ اور جماعت کے اغراض و مفادات نہیں ہیں اس لیے اس نظام میں قوانین کی بابت مختلف اغراض رکھنے والے طبقوں یا مختلف تصورات و خیالات رکھنے والی جماعتوں کے مابین کشمکش پیدا نہیں ہو سکتی کیونکہ قانون کا ماخذ یہاں تمام تر قرآن و سنت ہیں جن کے احکام و ہدایات اور جن کے مقرر کردہ اصول کار اور مقاصد جملہ افراد معاشرہ کو یکساں تسلیم ہیں خواہ وہ کسی اور گروہ سے تعلق رکھتے ہوں۔ اسلامی نظام میں قانون کا پہلا ماخذ قرآن ہے۔ جن امور کی بابت قرآن نے صاف اور صریح احکام دیے ہیں ان کی نسبت اور کوئی قانون سازی نہیں ہو سکتی۔ الآیہ کہ کسی ایسے حکم کے تحت ضمنی قوانین و ضوابط مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئے۔ ایسی صورت میں احادیث و سنت کی طرف رجوع کرنا ہوگا اور اس کی روشنی میں یہ قوانین و ضوابط مرتب کیے جائیں گے۔ اسی طرح جہاں کسی معاملہ کے متعلق قرآن ساکت ہو اس سے کوئی ہدایت نہ ملتی ہو وہاں سنت سے مدد لی جاتی ہے۔ ان حدود کے اندر اسلام نے عقل کی مداخلت کو بالکل رد کر دیا ہے اور کسی انسان کو یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اس دائرے میں اپنی عقلی موشگافیوں سے فکر و عمل کا انتشار پیدا کرے۔ جب قرآن و سنت سے کسی معاملہ میں صاف و صریح ہدایت موجود ہو تو یہ قطعاً ناجائز ہے کہ اس کو چھوڑ کر افراد اپنی عقل و فہم کی رہنمائی قبول کریں۔

اسلامی نظام میں عقل کا مقام

اس آیت میں مذکورہ بالا دونوں اطاعتوں کے بعد تیسری اطاعت پر زور دیا گیا ہے یعنی اولی الامر کی اطاعت، اس اطاعت کا مطلب یہ ہے کہ جب ایک بات قرآن و سنت میں موجود نہ ہو تو پھر اولوالامر کو موقع دیا ہے کہ وہ قرآن و سنت کی حدود سے باہر اپنی عقل و فہم کو کام میں لائیں۔ جہاں کسی صورت حال کی نسبت قرآن و سنت دونوں خاموش ہوں وہاں اسلامی معاشرے کے ان افراد کو عقل و استدلال کا حق عطا کیا گیا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم و فضل کی وسعتوں کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں لیکن اولی الامر کو فکر و اجتہاد کی یہ آزادی غیر مشروط اور بے قید نہیں ہے بلکہ کچھ قیود اور تحدیدات رکھتی ہیں چنانچہ اس آیت میں یہ قید لگا دی گئی ہے کہ یہ کام صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے علم و اطلاع اور فکری صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کے اہل ہوں یہ قید اولی الامر سے سمجھی جارہی ہے ظاہر ہے کہ اُمت ان تؤدوا الامانات الی اھلھا پر عمل کرتے ہوئے ان کو ہی امارت کا منصب جلیل دے گی جن میں اس کی صلاحیت ہو گی۔ دوسری شرط یہ ہے کہ ان کا قرآن و سنت پر جو قانون نافذ ہیں ایمان راسخ اور یقین کامل ہو۔ یہ شرط اُمت میں لفظ منکم سے معلوم ہو رہی ہے اور تیسری شرط یہ ہے کہ وہ متبع اور مطیع کتاب و سنت ہوں۔ یہ شرط اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول کے بعد بلا فصل لانے سے معلوم ہو رہی ہے۔ ان شرطوں کے عائد کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر استنادی اصول طے کرنے کے اجتہادی اصول میں انسانی عقل کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا تو اندیشہ یہ تھا کہ ضمنی قوانین اور تفصیلی ضوابط کا رشتہ اس اساس و بنیاد سے منقطع ہو جاتا جس پر یہ قوانین و ضوابط مبنی ہیں اور ایسی صورت میں اسلامی احکام و قوانین ایک بے ربط مجموعہ کی صورت اختیار کر لیتے جن کی اصل و اساس اور فروع و تفصیلات کے درمیان کوئی موافقت نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ضمنی قوانین اور تفصیلی ضوابط کی ترتیب اور اصولوں کے عملی انطباق میں بھی اجتہاد اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس عمل میں اصل کی اسپرٹ ہاتھ سے نہ جانے پائے یعنی ایسا اجتہاد جو اسلام کی رُوح اور قرآن و سنت کے بنیادی اصول سے متعرض ہو جائز نہیں ہے۔

اولوالامر کون ہیں

اس موضوع پر بہت کچھ کہا گیا ہے مگر ہمارے خیال میں یہاں اولی الامر سے مسلمانوں کے وہ حکمران

مراد ہیں جو قرآن وسنت کے احکام نافذ کرنے والے نظام اُمت قائم رکھنے والے اور تمام امورِ اجتہادی میں حکم وامر کی طاقت رکھنے والے ہوں۔

کیونکہ

اوّلاً اس لیے کہ اولوالامر کا لفظ اسی سورت میں دوبارہ آرہا ہے۔

واذا جاءھم امر من الامن اوالخوف اذاعوا بہ ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم۔

ظاہر ہے کہ اس آیت میں ذکر امن اور خوف کے حالات کا ہے یعنی صلح وجنگ اور فتح وشکست کا۔ ان حالات کا تعلق صرف حکام وامراء ملک ہی سے ہو سکتا ہے۔ معاملہ ملک کے نظم اور قیام امن کا ہے۔ استنباطِ مسائل اور حلال وحرام کا معاملہ نہیں ہے اس لیے ماننا پڑے گا کہ اولی الامر سے مقصود وہی لوگ ہیں جن کے سپرد ملک کا انتظام ہے اور جو ان خبروں کی تحقیق کر سکتے ہیں جن کا اثر ملک کے امن وخوف پر پڑ سکتا ہے۔

ثانیاً، کتاب وسنت اور صدرِ اول کے آثارِ عربیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لفظ امر جب ایسی ترکیب کے ساتھ بولا جاتے تو یہ عموماً حکومت وسلطنت ہی معنوں میں آتا ہے۔ احادیث میں یہ استعمال اس کثرت سے ہے کہ ایک صاحبِ نظر کے لیے کسی مزید دلیل کی ضرورت نہیں ہے۔ نیز لغت کی بنا پر ظاہر ہے کہ امر کے معنے حکم کے ہیں اور اولی الامر کے معنے حضرت امام بخاری نے ذوی الامر کے کیے ہیں یعنی حکم والا اور معلوم ہے کہ حکم والا حکومت والا ہی ہو سکتا ہے۔

ثالثاً، احادیثِ صحیح سے ثابت ہے کہ خود یہ آیت جس پس منظر میں آئی ہے وہ امیرِ جماعت کی اطاعت ہی کا معاملہ تھا۔ بخاری اور مسلم میں عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ،

یہ آیت عبداللہ بن حذافہ کے بارے میں نازل ہوئی جب آپ نے ایک دستہ میں ان کو روانہ کیا تھا۔

امام محمد بن جریر طبری نے تفسیر میں ایک روایت کی ہے کہ عمار بن یاسر اور خالد بن الولید کی باہمی نزاع کے بارے میں اتری۔ خالد امیر تھے اور عمار نے ان کے حکم کے بغیر ایک شخص کو مزدوری پر رکھ لیا۔ دونوں روایتوں سے ثابت ہوتا ہے کہ معاملہ امیر کی اطاعت وعدم اطاعت کا تھا نہ کہ احکام ومسائل کے حکم واستفتاء۔

رابعاً اکثر اقوال مرویہ صحابہ وتابعین سے بھی یہی تفسیر ثابت ہوتی ہے بلکہ دورِ اول میں صرف یہی تفسیر معلوم ومشہور تھی۔ بہت سی موشگافیاں بعد کی پیداوار ہیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ابن عیینہ کا قول

نقل کیا ہے کہ :

میں نے مدینہ میں محمد بن کعب کے بعد زید بن اسلم سے بڑھ کر قرآن کا کوئی مفسر نہیں دیکھا میں نے ان سے اس بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا کہ اس آیت سے پہلی آیت پڑھو ان اللہ یامرکم ان تؤدوا الامانات الی اھلھا واذا حکمتم بین الناس ان تحکموا بالعدل۔ معلوم ہوا کہ اولوالامر سے مراد حکام ہیں۔

یعنی چونکہ پہلے سے ذکر حکومت کا ہو رہا ہے اس لیے اولوالامر سے مراد ارباب اقتدار ہیں۔ طبری نے بسند صحیح حضرت ابوہریرہؓ اور میمون بن مہران سے نقل کیا ہے کہ ھم الامراء مراد حکام ہیں۔ اور حافظ ابن حزم نے ان تمام صحابہ و تابعین کو شمار کیا ہے جن سے یہ تفسیر منقول ہے یہ ۱۳ سے زیادہ ہیں۔ باقی کچھ صحابہ و تابعین کا یہ کہنا کہ اولوالامر سے مراد اہل علم ہیں مثلاً حضرت جابر کا ارشاد کہ ھم اھل العلم اور مجاہد، عطاء اور ابوالعالیہ کا فرمان کہ ھم العلماء تو ان کا مشہور تفسیر سے کوئی تعارض نہیں ہے اور نہ کوئی اختلاف ہے۔ دراصل اسلام کے نظام حکومت کی ترکیبی ہیئت یہ تھی کہ حکومت و ولایت کا منصب تمام شرعی اور علمی قوتوں سے مرکب ہو۔ جو شخص حاکم ہوتا وہ عالم اور فقیہ بھی ہوتا تھا۔ لہٰذا ان بزرگوں نے اولوالامر کی تفسیر علماء سے کی وہ احوال وظروف کے مطابق تھی۔ گویا انہوں نے یہ بتا دیا کہ اُمت اسلامیہ کی سربراہی اور فرماں روائی ایسے ہی افراد میں ہونی چاہیئے جو اہل علم ہوں۔

خامساً، حدیث و سیرت کے سب سے بڑے امام یعنی امیر المومنین فی الحدیث امام بخاری کا بھی یہی مذہب ہے۔ کتاب الاحکام میں عنوان ہے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ اور اس میں حضرت ابوہریرہ کی روایت درج کی ہے من اطاع امیری فقد اطاعنی۔ اس سے معلوم ہوا کہ امام بخاری کے نزدیک اولوالامر سے امراء مراد ہیں۔ فتح الباری میں حافظ ابن حجر نے امام بخاری کے انداز سے یہی بات سمجھی ہے فرماتے ہیں :

یہ امام بخاری اشارہ کر رہے ہیں کہ میرے نزدیک یہ آیت امراء کی طاعت کے بارے میں نازل ہوئی ہے نہ کہ علماء کی۔

سادساً، سب سے زیادہ قدیم اور مکمل تفسیر جو اس وقت ہمارے پاس موجود ہے وہ امام ابن جریر طبری کی ہے اور صحابہ و تابعین کی تفاسیر پر ان کا احاطہ اور استیعاب معلوم ہے انہوں نے بھی تمام اقوال نقل کرنے کے بعد ترجیح اسی کو دی ہے کہ اولوالامر سے حکام مراد ہیں۔

اسلام کے اجتہادی مصادرِ قانون

۱۰۲ ۔ پھر اگر تمہارے درمیان کسی چیز میں نزاع ہو جائے تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف اسے لوٹا دو، اگر تم اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہو۔ یعنی تمہارے اور اولی الامر میں باہم اختلاف ہو جائے کہ حاکم کا یہ حکم اللہ اور اس کے رسول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف تو اس کو کتاب اللہ اور سنت رسول کی طرف رجوع کر کے طے کر لیا کرو کہ وہ حکم فی الحقیقت اللہ و رسول کے حکم کے موافق ہے یا مخالف اور جو بات محقق ہو جائے اسی کو بالاتفاق مسلم اور معمول بہ سمجھنا چاہیے اور اختلاف کو دور کر دینا چاہیے۔ اگر تم کو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان ہے کیونکہ جس کو اللہ اور قیامت پر ایمان ہوگا وہ ضرور اختلاف کی صورت میں اللہ اور رسول کے حکم کی طرف رجوع کرے گا اور ان کے حکم کی مخالفت سے بے حد ڈرے گا جس سے معلوم ہو گیا کہ جو اللہ و رسول کے حکم سے بھاگے گا، وہ مسلمان نہیں۔ اس لیے اگر دو مسلمان آپس میں جھگڑیں۔ ایک نے کہا چلو شرع کی طرف رجوع کریں، دوسرے نے کہا کہ میں شرع کو نہیں سمجھتا یا مجھ کو شرع سے کام نہیں ہے تو اس کو بے شک کافر کہیں گے۔ [1]

اس آیت سے اولاً یہ بات معلوم ہوتی کہ جن مسائل اور معاملات کے بارے میں واضح ہدایات قرآن و سنت میں موجود نہ ہوں۔ ان کے لیے حالاتِ زمانہ اور ضروریاتِ وقت کے مطابق قوانین وضع کیے جائیں گے۔ یہ قوانین اولوالامر وضع کریں گے۔ یہ قانون سازی جس طرح عام نہ ہو گی بلکہ صرف ان ہی امور میں ہو گی جن کے بارے میں قرآن و سنت کے واضح احکام موجود نہیں۔ اسی طرح یہ قانون سازی آزاد بھی نہ ہو گی بلکہ دین کے مزاج اور قانون کے متعینہ مقاصد کے تحت ہی ہو گی اور کتاب و سنت کے واضح احکام کو سامنے رکھ کر انہی کی بنیاد پر کی جائے گی۔

اس قانون سازی میں اگر اولوالامر میں کہیں اختلاف ہو جائے تو اولی الامر کا فرض ہے کہ ان مسائل کا حل اکثریت سے نہیں بلکہ اس طرح تلاش کریں کہ ان کو ان لوگوں کے سپرد کر دیں جو اصول و استناد یعنی قرآن و سنت سے واقف ہوں۔ وہ اصول استناد کے قواعد اور عمومی احکام کے تحت اس کا حل تلاش کریں۔ ہماری رائے میں ان تنازعتم فی شیء کے مخاطب اولی الامر ہیں۔ یہ اولی الامر کے صوابدید پر موقوف ہے کہ اصول استناد سے واقف کاروں کی جماعت خود اپنے میں سے بنائیں یا عام شہریوں میں سے ان لوگوں کو بنائیں جو اپنے علم و تقویٰ

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اپنی دینی بصیرت، اپنی قانونی مہارت اور مقتضیات زمانہ سے اپنی گہری واقفیت کی بنا پر اس کے اہل ہوں۔ اس بات کی دلیل کہ اس کے مخاطب اولوالامر ہیں خود قرآن کی آیت استنباط ہے ولو ردوہ الی الرسول والی اولی الامر منھم لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم اور اولوالامر کو ردوہ الی اللہ والرسول کی ہدایت کر کے یہ اشارہ بھی کر دیا کہ اسلام کے سیاسی نظام میں اولوالامر کا درجہ مسیحیت کے پوپ سے مختلف ہے۔ مسیحیت میں پوپ زمین کا فرماں روا نہیں آسمانی و دینی فرماں روا ہے جو مذہب کی آخری طاقت اپنے قبضہ میں رکھتا ہے لیکن اسلام کے سیاسی نظام کی اصلی بنا زمین کی فرماں روائی ہے۔ وہ صرف اصول استناد قرآن و سنت کی حفاظت کرنے والا اور ان کو نافذ کرنے والا ہے۔ یعنی محض ایک قوت نافذہ اس کی ذات کو اصل قانون میں کوئی دخل نہیں ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو فردوہ الی اللہ والرسول نہ فرمایا جاتا۔ یعنی اگر قانون سازی میں ایسی صورت پیش آ جائے جس میں تم میں باہم نزاع و اختلاف ہو تو پھر اس کے آخری فیصلے کی قوت نہ تو سربراہ مملکت کا حکم ہے اور نہ نمائندوں کی اکثریت ہے بلکہ اس کا مرکز پھر بھی اصول استناد یعنی قرآن و سنت ہیں اگر اصول استناد میں منطوقاً اور صراحتہً اس کا حل موجود نہ ہو تو اس کو ان لوگوں کے فکر و مطالعہ کے حوالہ کر دینا چاہیے جو اپنی بصیرت اور علم و تقویٰ کی وجہ سے اس کی اہلیت رکھتے ہوں وہ قرآن و سنت کے مدلول او مفہوم سے قواعد عامہ اور اصول معلومہ کی روشنی میں اس کا حل تلاش کریں۔
اس طرح تمام مسائل زندگی میں اصول استناد کتاب و سنت کو سند، مرجع اور حرف آخر تسلیم کرنا اسلام کے سیاسی نظام کی وہ خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظام زندگی سے ممتاز کرتی ہے جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جاتی وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام ہے۔

سنتِ رسُول کا مطلب

دونوں فقروں اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول اور ردوہ الی اللہ والرسول میں اصول استناد کا بتکرار کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ نزاعات میں منطوقاً مدلولاً اور مفہوماً فیصلے کے لیے یہی مرجع ہیں۔ اللہ کی طرف رجوع کرنے سے مراد کتاب اللہ کی طرف لوٹنا ہے اور رسُول کی طرف لوٹنے سے مقصود سنتِ رسُول کی طرف لوٹنا ہے۔ سنت سے مقصود یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے دیے ہوئے مقامات کی پابجائی کرتے ہوئے آپ نے جو کچھ کہا ہے اور سامنے ہوتا دیکھ کر جس پر خاموشی اختیار فرمائی ہے اور پھر اسے صحابہ نے اپنی انفرادی، اجتماعی زندگی میں برتا ہے سب سنت ہے۔ قرآن نے آپ کو صاف صریح اور غیر مشتبہ الفاظ کے ساتھ خدا کا رسُول ہونے کی حیثیت میں معلم، مربی، مزکی، ہادی، حاکم،

قاضی، آمر، ناہی، مبین قرآن، تالی قرآن، امام رشد، واعظ، بشیر، منذر، مقامات دیے ہیں۔ یعنی آپ مسلمانوں کے لیے محض ایک پیرو مرشد اور واعظ نہیں تھے بلکہ عملاً ان کی جماعت کے قائد، حاکم، قاضی، شارح، مربی، معلم سب کچھ تھے۔ اور عقائد و تصورات سے لے کر عملی زندگی کے تمام گوشوں تک مسلم معاشرے کی پوری تشکیل آپ ہی کے بتاتے سکھاتے اور مقرر کیے ہوئے طریقوں پر ہوئی تھی۔ اس لیے کبھی یہ نہیں ہوا کہ آپ نے نماز روزے اور مناسکِ حج کی جو تعلیم دی ہو بس وہی مسلمانوں میں رائج ہوئی ہو اور باقی باتیں محض وعظ و ارشاد میں مسلمان سن کر رہ جاتے ہوں بلکہ فی الواقع جو کچھ ہوا وہ یہ تھا کہ جس طرح آپ کی سکھائی ہوئی نماز فوراً مسجدوں میں رائج ہو گئی اور اسی وقت جماعتیں اس پر قائم ہونے لگیں۔ اسی طرح شادی بیاہ اور طلاق و وراثت کے متعلق جو قوانین آپ نے مقرر فرمائے انہی پر مسلم خاندانوں میں عمل شروع ہو گیا۔ لین دین کے جو ضابطے آپ نے مقرر کیے انہی کا بازاروں میں چلن ہونے لگا۔ مقدمات کے جو فیصلے آپ نے کیے وہی ملک کا قانون قرار پائے۔ لڑائیوں میں جو معاملات آپ نے دشمنوں کے ساتھ اور فتح پا کر مفتوح علاقوں کی آبادی کے ساتھ کیے وہی اسلامی مملکت کے ضابطے بن گئے اور آپ کے بعد خلافتِ راشدہ اور اس کا نظام اپنے تمام پہلوؤں کے ساتھ انہی سنتوں پر قائم ہوا۔ اس لیے آپ کی محسوس مرئی زندگی اور خلافتِ راشدہ کا تعامل سنتِ راشدہ ہوئی بلکہ دینی احکام و ہدایات کی جو تعبیریں صحابہ کرام نے بالاتفاق کی ہیں اور دستوری و قانونی مسائل کے جو فیصلے خلفاءِ راشدین لے چکے ہیں ان کی حیثیت سنت ہی کی ہے یعنی ان کو جوں کا توں تسلیم کرنا پڑے گا۔ اور مجتہدین امت کے وہ فیصلے جو انہوں نے مختلف دستوری مسائل پیش آنے پر کیے ہیں یہ اگرچہ سنت نہیں ہیں مگر سنت کی روح سمجھنے میں ہماری بہترین رہنمائی کرتے ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے ایک موقعہ پر امت کے مناقشوں اور تفریقات کے ذکر میں پیمانہ نجات بتاتے ہوئے لکھا ہے۔

> نجات پانے والی جماعت وہ ہے جو عقیدہ و عمل میں اس چیز کو اپنائے جو اصول استناد کتاب و سنت سے ظاہر ہو اور جس پر جمہور صحابہ اور تابعین کا عمل ہو۔

قانون سازی میں فکری اجتہاد کے تین بڑے اصول

فان تنازعتم فی شیئٍ اولی الامر کو مخاطب کر کے جن معاملات کے بارے میں قرآن و سنت میں واضح ہدایات موجود نہ ہوں اجتہاد کرنے کی آزادی دی ہے فکر و اجتہاد کی اس آزادی نے بالعموم تین صورتیں اختیار کی ہے جنہیں بالترتیب اجماع، قیاس اور استحسان سے یاد کیا جاتا ہے۔ یہ درحقیقت فکری اجتہاد کے تین بڑے

اصول ہیں جنہیں اسلامی فکر نے زمانہ کے تغیر پذیر مطالبات کو پورا کرنے کے لیے ترتیب دیا ہے۔

فکری اجتہاد کا پہلا اصول اجماع

اجماع سے مراد یہ ہے کہ جب کوئی ایسا مسئلہ درپیش ہو جس کے متعلق قرآن وسنت میں کوئی تصریح نہ ہو۔ یا قرآن وسنت کا کوئی اصول زیر بحث مسئلہ پر منطبق تو ہوتا ہو لیکن اس کی تعبیر میں اختلاف ہو تو ایسی صورت میں مسلمان علماء مجتہدین جس رائے اور فیصلہ پر پہنچیں۔ اسلامی معاشرے کے جملہ افراد اس فیصلہ کو قبول کر لیتے ہیں اس طرح ایک متنازعہ فیہ مسئلہ متفق علیہ ہو جاتا ہے۔ آئندہ اگر حالات اس امر کے متقضی ہوں تو اس پر نظر ثانی کی جاتی اور مسئلہ زیر بحث کا از سر نو تصفیہ کیا جائے تو ایسا کرنے میں کوئی امر مانع نہیں ہے۔ لفظ اجماع سے یہ مراد نہیں ہے کہ معاشرے کے افراد کی اکثریت جس رائے، فیصلہ یا قانون پر چاہے عمل شروع کر دے یا اپنی زندگی کے لیے جو ضابطہ عمل مفید سمجھے اسے اختیار کرے اجماع کے معنے یہ بھی نہیں ہیں کہ انتخابات ہوں اور منتخبہ نمائندے کسی مجلس قانون ساز یا پارلیمنٹ میں جمع ہوں اور رائے شماری کی بنا پر اکثریت جو قانون چاہے وضع کرے اجماع کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اسے قانون کی اصول استناد قرآن وسنت پر مبنی ہونا چاہیے۔ دوم اجماع میں صرف ان لوگوں کی رائے کا وزن ہوتا ہے جو باعتبار علم وفضل اور صلاحیت فکر اس کے اہل ہوں۔ ہر تعلیم یافتہ خواہ وہ یونیورسٹی کا فاضل ہو یا کسی مدرسہ عربی کا فارغ التحصیل اور علامہ ہو یہ حق نہیں رکھتا ہے کہ وہ اجماع میں اپنا وزن کسی طرف ڈال سکے۔ تعلیم یافتہ طبقوں کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ مجتہدین اور اہل فکر کی رائے پر اعتماد کریں۔ البتہ اگر وہ شکوک وشبہات میں مبتلا ہوں تو وہ مطالبہ کر سکتے ہیں کہ علماء ان کے شکوک دور کریں اور مضبوط دلائل سے ان کی تشفی کریں۔ یہ یاد رکھنا چاہیے کہ اس تحدید سے آزادی رائے کا اصول باطل نہیں ہوتا۔ کیونکہ علماء کا گروہ کوئی پنڈتوں اور برہمنوں کا پیدائشی گروہ نہیں ہے بلکہ ہر وہ شخص جو کتاب وسنت کا علم اور دین میں بصیرت رکھتا ہو علماء کے زمرے میں شامل ہو سکتا ہے۔ اجتہاد کے لیے صرف صلاحیت فکر اور وسعت علم اور دین کی حقیقی روح سے واقفیت ضروری ہے اور یہ آخری جزو سب سے زیادہ اہم ہے کیونکہ اس کے بغیر علم کی وسعت اور فکری صلاحیت بھی بے سود ہے۔

فکری اجتہاد کا دوسرا اصول قیاس

قیاس سے مراد یہ ہے کہ شریعت کے کسی حکم کو جو کسی خاص امر سے متعلق ہے کسی دوسرے امر پر منطبق

کیا جائے بشرطیکہ ان دونوں امور کے مابین کوئی علت میں مشترک ہو۔ اس طرح جب دو امور میں کوئی مشابہت پائی جائے اور ان میں کسی ایک کی نسبت شریعت کا کوئی حکم موجود ہو تو دوسرے کے متعلق بھی یہ مان لیا جاتا ہے کہ اس کا بھی یہی حکم ہے کیونکہ دونوں کی علت مشترک ہے۔ ابتداء قیاس کے باقاعدہ مدون نہ تھے مگر قیاس سے کام ضرور لیا جاتا تھا کیونکہ بہت سے معاملات ایسے پیش آتے تھے جن کی نسبت قرآن کا کوئی حکم موجود نہ تھا۔ ایسی صورت میں چارہ کار یہی تھا کہ معاملہ زیر بحث اور کسی حکم شریعت کے مابین کوئی وجہ اشتراک ہوتی تو اس حکم کو معاملہ مذکورہ پر بھی چسپاں کر دیا جاتا۔ اس طرح آزادی رائے اور اجتہاد کے اس طریقہ سے برابر کام لیا جا رہا تھا لیکن قیاس کے نام سے اس کے اصول نہ تو منضبط تھے اور نہ مسلم، پھر جب اسلامی حکومت کی توسیع کے ساتھ مسلمان قاضیوں کو عراق، فلسطین اور شام وغیرہ میں جہاں کے حالات مختلف تھے نئے نئے مسائل سے دوچار ہونا پڑا جن کے متعلق قرآن و سنت میں صریح احکام نہ تھے تو ان کو قیاس کے اصول مقرر کر کے ان کے مطابق اجتہاد و آزادی فکر سے کام لینا پڑا۔ مکہ اور مدینہ کے فقہاء نے ابتداء میں اس کی پرزور مخالفت کی اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ ان حالات سے ناواقف تھے جن سے عراق اور شام کے فقہاء دوچار تھے۔ اس طرح اہل روایت اور اہل درایت کے مابین یہ بات وجہ نزاع رہی۔ یہاں تک کہ امام اعظم ابوحنیفہ نے اپنے زبردست دلائل سے اس طریقہ کو ایسا مضبوط و مبرہن کر دیا کہ امت کی اکثریت کو اسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہ رہا۔ حقیقت میں نگاہ سے دیکھا جائے تو اس کی مخالفت کر کے خود اہل روایت اپنے مقصد کو مجروح کر رہے تھے کیونکہ جب فقہی استنباط فقہی قیاس کا قاعدہ تسلیم نہیں کیا گیا تھا اور اس کے اصول و شرائط متعین نہ ہوئے تھے۔ اس وقت بھی شخصی رائے کا استعمال بہرحال ناگزیر تھا بے شمار مسائل ایسے پیدا ہوتے تھے جن کے متعلق قرآن و سنت خاموش تھے۔ ایسی صورت میں اس کے سوا کوئی چارہ نہ تھا کہ شخصی رائے کو کام میں لا کر معاملات کا تصفیہ کیا جائے مگر اس وقت ہر فقیہ کے لیے آزادی تھی کہ جس طرح چاہے قیاس سے کام لے لیکن حضرت امام ابوحنیفہ نے قیاس کے اصول و قواعد مقرر کر کے اس آزادی کو محدود کر دیا۔ ان اصول کی تفصیلات کا یہاں محل نہیں ہے۔

اصول استناد اور اصول اجتہاد

اس آیت قرآنی نے یہ بات کھول کر بتا دی ہے کہ اسلامی ریاست قانون سازی کی بنیاد دو ہیں ایک اصول استناد دوسرے اصول اجتہاد۔ جیسا کہ شارحین قرآن نے اس آیت سے سمجھا ہے علامہ

آلوسی فرماتے ہیں ھی متضمنۃ لجمیع الادلۃ الشرعیۃ یہ قرآنی آیت تمام مصادر قانون کو اپنے اندر سمیٹے ہوتے یعنی کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اصول دین اور ادلہ شرعیہ کی طرف اشارہ ہے جیسا کہ علماء اصول نے لکھا ہے کہ ادلہ شرعیہ چار ہیں۔ ان تصریحات سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن نے قانون سازی میں اصول استناد کے ساتھ اصول اجتہاد کو بھی قائم رکھا ہے اور معاشرے کے لیے اس امر کی گنجائش رکھی ہے کہ وہ قانون سازی میں احوال وظروف کی تبدیلیوں سے مطابقت پیدا کر سکے۔ ہاں جس بات کو اسلام گوارا نہیں کرتا ہے وہ یہ ہے کہ اس نصب العین، اس معیار خیر وشر اور زندگی کی بابت اس نقطہ نظر میں کوئی تبدیلی پیدا کی جائے جو اسے اپنے پیرو دین نے عطا کیا ہے یا ان اصول ومقاصد کو بدلا جائے جنہیں اس آخری اور قطعی طور سے شعبہ حیات میں متعین کر دیا ہے جہاں تک تبدیل پذیر حالات کے ساتھ مطابقت پیدا کرنے کا سوال ہے اجماع سے بھی حل ہو سکتا ہے اور قیاس واستحسان سے بھی۔ کیونکہ ایک اجماع دوسرے اجماع کو منسوخ کر سکتا ہے۔ اسی طرح قیاس واستحسان کے اصولوں کے صحیح استعمال سے اسلامی معاشرہ زمانہ اور وقت کی تبدیلیوں کا مقابلہ کر سکتا ہے مگر یہ یاد رہے کہ شریعت کے مقاصد کی تکمیل سب سے اہم چیز ہے۔ اگر زمانہ کی تبدیلی یا حالات کے باعث کوئی اصول اس مقصد کو نہ پورا کر رہا ہو جس کے لیے اس کا قیام ہوا تھا تو یہ اس بات کی دلیل ہوگی کہ مذکورہ اصل حالات پر صحیح منطبق نہیں کیا گیا ہے۔ اور پھر اسے اس طرح حالات پر منطبق کرنا ہوگا کہ اسلام کا مقصد حاصل ہو جائے۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی نظام کے دونوں اصولوں یعنی اصول استناد اور اصول اجتہاد پر یکساں زور دیں۔ کیونکہ اس زمانے میں ایک طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو یورپ کی تقلید میں اصول اجتہاد اور آزادی فکر پر غیر متوازن زور دے کر مذہب کی اساس و بنیاد کو خطرہ میں ڈال رہا ہے۔ اس طبقہ کے افراد انفرادی و اجتماعی زندگی کے معاملات و مسائل میں سرے سے قرآن وحدیث کی ہدایت ہی سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ حالانکہ قرآن حکیم نے صراحت کر دی ہے کہ جو شخص خدا اور رسول کے فیصلوں کو اپنی زندگی کے معاملات اور تمدنی مسائل میں آخری فیصلہ نہیں مانتا۔ اس کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں۔ زندگی کے مسائل میں قرآن وسنت کی ہدایت سے انحراف اس اساس و بنیاد ہی کو منہدم کر دیتا ہے جس پر اسلامی معاشرہ قائم ہے اور اس اساس کے بغیر کوئی معاشرہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔ اسلامی زندگی کی حقیقت کو باقی رکھنا ہے تو قرآن وسنت کے کے مرکز سے وابستہ رہنا ہوگا اور اصول اجتہاد کے ساتھ اصول استناد کو ترتیب دینا ہوگا۔ کیونکہ

اسلامی نظام کے قالب میں بیداری اور حرکت کی رُوح اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب استناد کے ساتھ اجتہاد کا عمل جاری رہے۔ ابھی اس آیت کی روشنی میں ہمیں کچھ اور کہنا ہے مثلاً حکومت کی تشکیل کیسے ہو؟ صدرِ مملکت کا انتخاب، مجلس شوریٰ کی تشکیل، اولی الامر کے اوصاف، مجالس قانون ساز کے حدود، انتظامیہ کے حدودِ عمل، عدلیہ کے حدودِ عمل، اصُولِ مشاورت، اصُولِ انتخاب اولی الامر اور اصولی اطاعت وغیرہ وغیرہ، ان سب موضوعات پر اجمالی تبصرہ انشاء اللہ اسی پارے میں آ رہا ہے لیکن انتخاب کے بارے میں تفصیلی بحث انشاء اللہ ۲۵ پارے میں آئے گی۔

اسلام کے سیاسی نظام کی خوبی

۱۰۴ ۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے اور اسی میں انجام کار کی خوبی ہے۔ یعنی اپنے تنازعات اور اختلافات میں اللہ و رسُول کی طرف رجوع کرنا اور اللہ و رسُول کی فرمانبرداری کرنی مفید ہے آپس میں جھگڑنے یا اپنی رائے کے مطابق فیصلہ کر لے سے اس رجوع کا انجام بہتر ہے ¹

اس میں تنبیہ ذالک اسم اشارہ ہے اس کا مشارالیہ کچھ کے خیال میں ردوہ الی اللہ والرسول کا مضمون جملہ۔ یعنی اللہ و رسُول کی طرف رجوع کرنا شیخ الاسلام کا میلان بھی یہی ہے لیکن کچھ کی رائے یہ ہے کہ ان آیات میں جو کچھ بتایا گیا ہے۔ یہ سب کچھ اس کا مشارالیہ ہے۔ علامہ آلوسی نے اسی کے حسن کا اقرار کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ یعنی تمہارے سیاسی نظام کا خاکہ ہم نے پیش کیا ہے۔ اپنی ذات کے لحاظ سے دوسرے تمام نظاموں کے مقابلے میں تمہارے لیے بہترین ہے۔ اس سے تمہیں دُنیا میں استحکام ملے گا اور اس میں تمہاری منفعتوں اور مصلحتوں کی پوری پوری ضمانت موجود ہے اور ذاتی طور پر بہتر ہونے کے ساتھ یہ انجام کے لحاظ سے بھی اپنے اندر حسن کا بیش بہا خزانہ رکھتا ہے۔ اس کے ذریعے تمہارے اختلافات ختم ہوں گے اور فتن و مفاسد کا ہمیشہ کے لیے دروازہ بند ہو جائے گا۔

زیرِ تشریح فقرے سے پہلے اس نظام کی کامیابی کے لیے یہ بنیادی اور اہم شرط بتائی ہے کہ اس نظام کی کامیابی کا مدار اس پر ہے کہ تمہارے اندر اللہ اور آخرت پر ایمان و یقین کی رُوح موجود ہو۔ اصل ارشاد یہ ہے ان کنتم تومنون باللہ والیوم الاخر شارحین قرآن نے تو اس فقرے کو ایک دھمکی سمجھا ہے لیکن اس موقعہ پر اس بات کو جتانے کا صرف دھمکی ہی مقصد نہیں ہے بلکہ اس میں یہ بتانا ہے کہ

---

¹ افادات شیخ الاسلام

یہ نظام جس کا خاکہ اس آیت میں پیش کیا گیا ہے ایمان باللہ والیوم آخر پر مبنی ہے۔ اسلام کا نظام سیاسی صرف قومی تقاضا نہیں بلکہ مسلمانوں کے ایمان باللہ والیوم الآخر کے بعد وجود میں آیا ہے۔ ایمان یعنی وہ عہد و میثاق جو ذات الٰہی اور مسلمانوں کے درمیان منعقد ہوا ہے یہ ایمان اس اقرار سے عبارت تھا کہ مسلمان انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے اس مقصدِ حیات کو اپنی زندگی اور اپنے افکار و اعمال کے لیے قبول کرتے ہیں جیسے اللہ سبحانہٗ نے ان کے لیے متعین کر دیا ہے۔ نیز اس مقصدِ حیات کی تکمیل جو دستورِ زندگی اور ضابطہ عمل رسُول کے ذریعے ان تک پہنچایا گیا ہے اس کی رہنمائی اور ہدایت بھی ان کو تسلیم ہے۔ یہ اقرار تھا اس بات کا کہ آئندہ سے مسلمان کسی اور مقصد پر اپنی عملی اور فکری قوتیں صرف نہیں کریں گے بجز اس ایک مقصد کے جو ان کے فرماں روائے حقیقی نے ان کے لیے متعین کر دیا ہے اور اسی طرح اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے جملہ مسائل میں وہ کسی قانون و ضابطہ یا کسی دوسرے آئین و دستور کی رہنمائی قبول نہیں کریں گے صرف اس دستورِ زندگی اور آئینِ عمل میں اپنے لیے ہدایت تلاش کریں گے جو انہیں رسُول کی وساطت سے قرآن و سنت کی صورت میں عطا ہوا ہے۔ اس قانونی نظام اور اخلاقی ضابطہ نے جس کی اطاعت کا عہد مسلمانوں نے ایمان کے ذریعے سے کیا تھا ان کی زندگی کے مقاصد، ان کے اصُول کا نیز ان کی معیشت و سیاست اور حیاتِ عائلی کا پورا خاکہ تیار کر دیا۔ لہٰذا اس ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ان تمام قانونی، سیاسی، عائلی اور دیگر مسائل میں جو اس قانونی نظام اور اخلاقی ضابطہ کے حدود میں آتے ہیں مسلمانوں کی صرف ایک ہی رائے ہونی چاہیے اور وہ اسے اپنانے اور قبول کرنے اور عملاً قائم کرنے کی راہ ہے اور بس۔

یہاں یہ بات بھی بڑی برمحل ہے کہ قرآن مجید چونکہ محض کتاب آئین ہی نہیں ہے بلکہ کتاب تعلیم و تلقین اور صحیفہ وعظ و ارشاد بھی ہے اس لیے پہلی دو آیتوں میں جو قانونی اصُول بیان کیے گئے ہیں اب اس فقرے میں ان کی حکمت و مصلحت سمجھائی جا رہی ہے۔ اس فقرے میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں ایک یہ کہ مذکورہ بالا چاروں اصُولوں کی پیروی کرنا ایمان کا لازمی تقاضا ہے۔ دوسرے یہ کہ ان اصولوں پر اپنے نظامِ زندگی کو تعمیر کرنے ہی میں مسلمانوں کی بہتری ہے۔ صرف یہی ایک چیز ان کو دُنیا میں صراطِ مستقیم پر قائم رکھ سکتی ہے اور اسی سے ان کی عاقبت بھی دُرست ہو سکتی ہے[1]

[1] تفہیم القرآن

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ يَزْعُمُونَ أَنَّهُمْ آمَنُوا بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ وَمَا
أُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ يُرِيدُونَ أَنْ يَتَحَاكَمُوا إِلَى الطَّاغُوتِ وَقَدْ
أُمِرُوا أَنْ يَكْفُرُوا بِهِ ۖ وَيُرِيدُ الشَّيْطَانُ أَنْ يُضِلَّهُمْ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿٦٠﴾
وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ تَعَالَوْا إِلَىٰ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ وَإِلَى الرَّسُولِ رَأَيْتَ
الْمُنَافِقِينَ يَصُدُّونَ عَنْكَ صُدُودًا ﴿٦١﴾ فَكَيْفَ إِذَا أَصَابَتْهُمْ
مُصِيبَةٌ بِمَا قَدَّمَتْ أَيْدِيهِمْ ثُمَّ جَاءُوكَ يَحْلِفُونَ ۖ بِاللَّهِ
إِنْ أَرَدْنَا إِلَّا إِحْسَانًا وَتَوْفِيقًا ﴿٦٢﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ يَعْلَمُ اللَّهُ مَا
فِي قُلُوبِهِمْ فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَعِظْهُمْ وَقُلْ لَهُمْ فِي أَنْفُسِهِمْ
قَوْلًا بَلِيغًا ﴿٦٣﴾

کیا تو نے ان لوگوں کے حالات پر غور نہیں کیا جو اپنے تئیں دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل ہوئی ہے اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری گئی ہے لیکن چاہتے یہ ہیں

کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں حالانکہ ان کو طاغوت
کے نہ ماننے کا حکم ہو چکا ہے اور شیطان کی خواہش ہے کہ ان کو
صراطِ مستقیم سے بھٹکا کر دُور لے جائے [۱۰۴]۔ اور جب ان سے کہا جاتا
ہے کہ آؤ تم اللہ کی طرف اور اللہ کے رسُول کی طرف تو تم ان منافقین
کو اپنے سے کتراتے دیکھو گے [۱۰۵]۔ اس وقت ان پر کیا گزرے گی جب
ان کے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آپڑے گی ۔ پھر
آپ کے پاس یہ کہہ کر اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ
بخدا ہم تو صرف بھلائی کے خواہاں اور میل ملاپ چاہتے تھے [۱۰۶]۔
یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کے حال کو اللہ خوب جانتا ہے
تم ان سے بے رخی برتو ان کو نصیحت کرو اور ان سے اس انداز
سے بات کرو کہ بات ان کے جی میں اتر جائے [۱۰۷]۔

سیاسی زندگی میں اسلام کی پوزیشن

یہ بات تو پہلے صاف ہو چکی ہے کہ اسلام زندگی کا ایک ایسا مکمل نظام ہے جس کا سیاسی نظام بھی

ایک حصہ ہے لیکن یہ بات ابھی واضح ہو کر سامنے نہیں آئی کہ نظامِ سیاسی کی اسلام میں کیا حیثیت ہے اور کیوں ہے۔ ان آیات میں اسی بات کی پوری قوت سے وضاحت کی گئی ہے۔ خاص طور پر اس بات کی وضاحت اس لیے کی گئی ہے کہ سیاست خود زبانِ حال سے کہتی رہتی ہے کہ میرا دین سے کوئی رشتہ نہ ہونا چاہیے۔ دین تو انتہائی بلند اور مقدس چیز ہے اس لیے یہ اس کے تقدس اور اس کی عظمت کی توہین ہے کہ اسے سیاسی جھگڑوں میں داخل کر دیا جائے۔ یہودی ذہن ایسا ہی تھا اس لیے قرآن نے روزِ اول ہی اس بات کو بڑی قوت سے سمجھا دیا ہے کہ اللہ سبحانہٗ انسانوں کا صرف رب اور الٰہ ہی نہیں ہے بلکہ ملک، آمر اور حاکم بھی ہے یعنی وہ ایسا رب اور الٰہ ہے جس کی ربوبیت اور الوہیت میں بادشاہت اور حاکمیت بھی شامل ہے۔ اس کا کھلا مطلب یہ ہے کہ انسان کا حقیقی فرماں روا اور قانون ساز صرف اللہ تعالیٰ ہے۔ جب یہ حقیقت ہے کہ انسان کا حاکم حقیقی اور مقتدرِ اعلیٰ اور قانون ساز اللہ تعالیٰ ہے۔ تو یہ اس کی تلقین ہے کہ انسان کی سیاسی زندگی کی تعمیر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت پر ہونی چاہیے نہ کہ کسی اور حاکمیت پر۔ جو لوگ اپنے تئیں ایمان کے مدعی تھے ان میں سے کچھ کا خیال یہودیوں کی صحبت سے یہ ہو گیا تھا کہ اسلام سے سیاست اور حکومت کا رشتہ زیادہ سے زیادہ ثانوی درجہ کا ہے۔ دین میں اسے کوئی بنیادی اہمیت کا مرتبہ حاصل نہیں ہے۔ نہ حکومت اس کے لیے ناگزیر ہے ناگزیر ہونا تو درکنار وہ اس کے لیے مطلوب بھی نہیں ہے۔ اس میں کوئی گناہ نہیں ہے کہ ایک شخص ایمان خدا کی کتاب پر رکھے اور رسومِ عبادت نبوت کی ہدایت کے مطابق ادا کرے لیکن زندگی کے مسائل اور تمدن کے معاملات میں حاکم کسی اور کو مان کر اپنے معاملات کا فیصلہ اس سے کرائے۔ ان آیات قرآن نے اسی ذہنیت پر ضرب کاری لگائی ہے اور بتایا ہے کہ سیاست اور حکومت کو اگر اسلام سے الگ کر دیا جائے تو پھر اسلام وہ اسلام نہ ہو گا جو اللہ کا بھیجا ہوا، قرآن کا بتایا ہوا، محمد رسول اللہ کا لایا ہوا اور صحابہ کرام کا اپنایا ہوا اسلام ہے۔ اسلام اپنی صحیح شکل میں اسی وقت دیکھا جا سکتا ہے جب اسے کامل اقتدار کے تخت پر بٹھایا جائے۔

۱۰۴۔ کیا تو نے ان لوگوں کے حالات پر غور نہیں کیا جو اپنے تئیں دعویٰ تو یہ کرتے ہیں کہ وہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہیں جو آپ پر نازل ہوئی ہے اور اس پر بھی جو آپ سے پہلے اتاری گئی ہے لیکن چاہتے یہ ہیں کہ اپنے معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرائیں حالانکہ ان کو طاغوت کے نہ ماننے کا حکم ہو چکا ہے اور شیطان کی خواہش ہے کہ صراطِ مستقیم سے ہٹا کر دور لے جائے۔ یہود فصلِ خصومات میں رعایت و رشوت کے عادی تھے اس لیے جو لوگ جھوٹے اور خائن ہوتے وہ اپنا معاملہ یہودیوں کے پاس لے جانا پسند کرتے کہ وہ خاطر کریں گے اور آپ کے پاس ایسے لوگ اپنا معاملہ لانا پسند نہ کرتے کہ آپ حق کی رعایت کریں گے

اور کسی کی اصلاً رعایت نہ کریں گے، سو مدینے میں ایک یہودی اور ایک منافق کہ ظاہر میں مسلمان تھا کسی امر میں دونوں جھگڑ پڑے یہودی جو سچا تھا اس نے کہا چل محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اور منافق جو جھوٹا تھا اس نے کہا کہ چل کعب بن اشرف کے پاس جو یہودیوں میں عالم اور سردار تھا۔ آخر وہ دونوں آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے تو آپ نے یہودی کا حق ثابت فرمایا، منافق جو باہر نکلا تو کہنے لگا کہ اچھا حضرت عمر کے پاس چلو جو وہ فیصلہ کریں وہی منظور اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے پر راضی نہ ہوا۔ غالباً یہ سمجھا ہو گا کہ میں مدعی اسلام ہوں اس لیے یہودی کے مقابلے میں میری رعایت کریں گے اور حضرت عمر آپ کے حکم سے مدینہ میں فیصلے کرتے تھے۔ چنانچہ وہ دونوں حضرت عمر کے پاس آئے۔ جب حضرت عمر نے یہ جھگڑا سنا اور یہودی کے یہاں سے ان کو یہ بھی معلوم ہو گیا کہ یہ معاملہ حضور انور کی خدمت میں پیش ہو چکا ہے اور آپ اس معاملہ میں یہودی کو سچا اور غالب کر چکے ہیں۔ تو حضرت عمر نے اس منافق کو قتل کر دیا اور فرمایا کہ جو کوئی ایسے قاضی کے فیصلے کو نہ مانے اس کا فیصلہ یہی ہے۔ اس کے وارث حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے اور حضرت عمر پر قتل کا دعویٰ کیا اور قسمیں کھانے لگے کہ حضرت عمر کے پاس تو صرف اس وجہ سے گئے تھے کہ شاید وہ اس معاملہ میں صلح کرا دیں۔ یہ وجہ نہ تھی کہ حضرت کے فیصلے سے انکار تھا اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ ان آیات میں اصل حقیقت ظاہر فرما دی اور حضرت عمر کا لقب فاروق ہوا۔[1]

اس آیت کا یہ پس منظر ابن کثیر کو چھوڑ کر دوسرے تمام شارحین قرآن نے ذکر کیا ہے۔ اردو تفاسیر میں صاحب معارف القرآن، مفتی محمد شفیع اور مولانا محمد ادریس بھی اس معاملہ میں شیخ الاسلام کے ہم زبان ہیں۔ اصل واقعہ امام بغوی کی معالم میں کلبی کے حوالے سے آیا ہے۔ کلبی کہتے ہیں کہ مجھے ابو صالح سے معلوم ہوا ہے اور ابو صالح کا بیان ہے کہ مجھے ابن عباس سے معلوم ہوا ہے۔

مفسر قرآن کلبی کا حسب نسب

کلبی کا پورا نام ابو النضر محمد بن السائب بن بشیر بن عمرو بن عبدالحارث بن عبدالعزی کلبی ہے۔ ۱۴۶ھ ان کی وفات کا سال ہے۔ یہ قبیلہ بنو کلب سے تعلق کی وجہ سے کلبی کہلاتے ہیں۔ کوفہ کے باشندے تھے تاریخ وانساب اور تفسیر میں مشہور ہیں۔ علماء ان کے ضعیف اور ناقابل اعتبار ہونے پر متفق ہیں۔ ان پر سب سے زیادہ سنگین الزام جھوٹی روایتیں بیان کرنے کا ہے۔ سلیمان کہتے ہیں کہ کوفہ میں دو کذاب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تھے ان میں ایک کلبی ہیں۔ تفسیر میں ان کی بیشتر روایات ابوصالح سے مروی ہیں۔ ابوجناب کلبی کا بیان ہے کہ ان کے استاذ تفسیر ابوصالح نے قسم کھاکر بتایا ہے کہ میں نے کلبی کو کوئی بات تفسیر کے متعلق نہیں سنائی۔ امام سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ کلبی نے ایک مرتبہ خود اعتراف کیا کہ میں نے ابوصالح سے ابن عباس کی جو روایتیں بیان کی ہیں وہ جھوٹ ہیں تم انہیں روایت نہ کرو۔ ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ انتہائی غالی شیعہ تھے، حضرت ابوجزہ کہتے ہیں کہ میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آ رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام سے اٹھ کر چلے گئے۔ حضرت علی وہاں بیٹھے تھے تو جبریل علیہ السلام نے وہ وحی حضرت علی پر نازل کر دی۔ ابوجزہ کا یہ قول مشہور محدث یزید بن زریع کے سامنے نقل کیا گیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے کلبی سے یہ بات تو نہیں سنی لیکن یہ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ سینہ پیٹ پیٹ کر کہہ رہا تھا کہ میں سبائی ہوں میں سبائی ہوں۔ اور حافظ ابن حبان فرماتے ہیں کلبی سبائی تھا اور ان لوگوں میں سے تھا جو کہتے ہیں کہ حضرت علی کی وفات نہیں ہوئی دوبارہ واپس آئیں گے۔ حافظ ذہبی اس کا طویل تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں لا یحل ذکرہ فی الکتب فکیف الاحتجاج بہ کتابوں میں اس کا ذکر بھی نہ آنا چاہیے چہ جائیکہ ان کو استدلالی شخصیت کہا جاتے۔

یہ ہے اُس روایت کا حال جو اس آیت کے پس منظر میں ہمارے شارحینِ قرآن نے لکھ دیا ہے اور جس کا ہمیں احساس بھی نہیں ہے کہ ہم کیا لکھ رہے ہیں۔

آئیے قرآن کو اس منظر سے الگ ہو کر پڑھیے۔

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ ایمان کو جب انقیاد میسر نہیں آتا ہے وہ اسلام کے سیاسی نظام کی موجودگی میں دوسرے نظاموں پر متوجہ رہتا ہے۔ لیکن جب مقام انقیاد حاصل ہو جاتا ہے تو پھر قلب ہر طرف سے ہٹ کر اسلام ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے۔ قرآن پر بھی ایمان ہو، رسُول کی بھی تصدیق ہو پھر اپنے معاملات میں، اپنے تمدنی مسائل میں کسی اور کی طرف نظر بھی ہو کیا یہ بیک دو متضاد باتیں نہیں اور کیا یہ یہود کی طرح ایمان وکفر کا اجتماع نہیں ہے۔ کیا وثوق واعتماد اسی کا نام ہے کہ قرآن جو راہ بتاتے اور اللہ کا رسول جو کچھ پیش کرے اسے قبول نہ کیا جاتے۔ قرآن کا فتویٰ ہے۔

ویقولون آمنا باللہ وبالرسول واطعنا ثم یتولی فریق منھم من بعد ذالک وما اولئک بالمومنین واذا دعوا الی اللہ ورسولہ لیحکم بینھم اذا فریق منھم معرضون وان یکن لھم الحق

يأتوا اليه مذعنين أفي قلوبهم مرض ام ارتابوا ام يخافون ان يحيف الله عليهم و رسوله بل اولئك هم الظالمون انما كان قول المومنين اذا دعوا الى الله و رسوله ليحكم بينهم ان يقولوا سمعنا و اطعنا و اولئك هم المفلحون ۔

اور لوگ کہتے ہیں کہ ہم نے اللہ اور اس کے رسُول کو مان لیا اور ہم ان کے فرمانبردار ہو گئے اس کے بعد پھر ان میں سے ایک جماعت پھر جاتی ہے اور یہ لوگ ماننے والے نہیں ہیں ۔ اور جب ان کو بلایا جاتا ہے اللہ و رسُول کی طرف تاکہ ان میں فیصلہ کرے تب ایک فریق ان میں منہ موڑ لیتا ہے اور اگر ان کا کچھ بنتا ہو تو یہ اس کی طرف مطیع ہو کر آئیں ۔ کیا ان کے دلوں میں کوئی روگ ہے یا شک میں پڑ گئے ہیں اور یا پھر ڈرتے ہیں کہ ان پر اللہ و رسُول زیادتی کرے گا کچھ بھی نہیں بلکہ یہی لوگ ظلم کار ہیں ۔ اہل ایمان کا بول تو یہی ہوتا ہے جب بھی ان کو اللہ و رسُول کی طرف بلایا جائے تاکہ ان کا فیصلہ کر دے تو ان کا کہنا یہی ہوتا ہے کہ ہم نے سنا اور ہم نے کہا مان لیا اور یہی لوگ کامیاب ہیں ۔

قرآن کی ان آیات کو پڑھیے اور بار بار پڑھیے اور پھر سوچیے کہ قرآن کے نزدیک اس ایمان کی کیا قیمت ہے جس میں اسلام کے سیاسی نظام کے لیے انقیاد نہ ہو ۔ یہاں قرآن بتا رہا ہے کہ ظاہر و باطن ایسے دو جداگانہ عالم نہیں کہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں بلکہ دونوں کا باہم ایسا گہرا ربط ہے کہ ہمیشہ ایک کا دوسرے پر انعکاس ہوتا رہتا ہے ۔ اگر اعتقادِ باطن اعمال ظاہرہ کا مقتضی ہے تو اعمال ظاہرہ اعتقادِ باطن کے ممد و معاون ہیں ۔ دیکھیے اگر ایک شخص اعتقاد رکھتا ہے ان الحکم الا لله امر ان لا تعبدوا الا ایاہ تو اس کے عقیدہ کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اپنے معاملات اور تمدنی مسائل میں اللہ کی بندگی کا نمونہ بن جائے جب وہ اس اعتقاد و یقین کے مطابق عمل کرتا ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اندر ایک نئی رُوح داخل ہو رہی ہے اور جتنا اس کا یہ عمل ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر اس کے باطن میں طاعت و بندگی کا جوش اور جذبہ پیدا ہوتا ہے ۔ اس کو مثال سے سمجھیے کہ ایک شخص تواضع کو نیک خصلت سمجھتا ہے تو اس کا مخلوق سے تواضع کا معاملہ یقیناً اس کے اعتقاد میں اور پختگی کا باعث ہوتا ہے ۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ صفاتِ قلبیہ جس قدر بھی ہیں ان میں ایمان بما انزل اللہ بھی داخل ہے سب کا حال یہی ہے ۔ پہلے وہ انسان کو جنبشِ عمل کے لیے مضطر کرتی ہیں اور جب جوارح مصروفِ عمل ہو جاتے ہیں تو ان کے آثار لوٹ کر پھر ان صفات کو اور روشن کر دیتے ہیں ۔ ایمان ایک عقیدہ ہے اور اس کا تقاضا یہ ہے کہ اعمال کا رُخ اس کے

مطابق ہو اور جب اعمال اس تقاضا کو پورا کرنا شروع کر دیں تو یہ عقیدہ ترو تازہ اور راسخ ہونے لگتا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ حسن بصری سے نقل کرتے ہیں۔

ایمان صرف ظاہر داری کا نام نہیں ہے اور صرف آرزوؤں کو بھی ایمان نہیں کہتے بلکہ ایمان اسے کہتے ہیں جو دل میں سرایت کر جاتے اور اعمال بھی اس کی تصدیق کریں۔

مقصد یہ ہے کہ اعمال انسان کی کیفیاتِ قلبیہ کا آئینہ ہیں۔ اب اگر بندہ نیک عمل کرتا ہے تو یہ اس کے قلبی تصدیق کی دلیل ہوگی ورنہ اس کی بدعملی خود اس کی بے ایمانی کی شاہد ہوگی۔

اسی طرح یہاں سمجھئے کہ ایک شخص اسلام کے سیاسی نظام کو مانتا ہے۔ یہ ایمان بما انزل اللہ ہے۔ اس کے ساتھ اگر وہ معاملات زندگی اور تمدنی مسائل میں قرآن و سنت کو بھی تسلیم کر کے اپنے مسائل کا فیصلہ اس سے کراتا ہے تو یہ نیک عملی ہے اور تحاکم الی اللہ والرسول ہے اور اگر ایمان بما انزل اللہ کا مدعی ہو کر اپنے معاملات طاغوت کے پاس لے جاتا ہے تو یہ بدعملی ہے اور تحاکم الی الطاغوت ہے۔

یہاں صریح طور پر طاغوت سے مراد وہ حاکم ہے جو قانون الٰہی کے سوا کسی دوسرے قانون کے مطابق فیصلے کرتا ہو اور وہ نظامِ عدالت ہے جو نہ تو اللہ کے اقتدارِ اعلیٰ کا مطیع ہو اور نہ اللہ کی کتاب کو آخری سند مانتا ہو لہٰذا یہ آیت اس معنے میں بالکل صاف ہے کہ جو عدالت طاغوت کی حیثیت رکھتی ہو اس کے پاس اپنے معاملات فیصلہ کے لیے لے جانا ایمان کے منافی ہے اور خدا اور اس کی کتاب پر ایمان لانے کا لازمی اقتضاء یہ ہے کہ آدمی ایسی عدالت کو جائز عدالت تسلیم کرنے سے انکار کر دے۔ قرآن کی رُو سے اللہ پر ایمان اور طاغوت سے کفر دونوں لازم و ملزوم ہیں اور خدا اور طاغوت دونوں کے آگے بیک وقت جھکنا عین منافقت ہے[1]

دراصل یہاں قرآن نے اس تقسیم کی تعبیر اختیار کر کے اپنے مخاطبوں کو یہ بتا دیا ہے کہ اسلام کے سیاسی نظام کی ایک پوزیشن وہ تھی جس کا چہرہ تمہارے سامنے یومنون بالجبت والطاغوت میں پیش ہو چکا ہے یہ کفر خالص ہے اور ایک پوزیشن یہ ہے جو خدا کو، قرآن کو خدا کے رسول کو مان کر بھی یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت یعنی اپنے معاملات کا فیصلہ کرانے کے لیے طاغوت کی طرف جانا چاہتے ہیں۔ یہ پوزیشن منافقوں کی ہے یعنی ہر ایسا شخص جو ایمان کا مدعی ہو کر اللہ اور اس کے رسول کے مقابلہ میں ان کی ضد متقابل قوتوں کو حاکم مانتا ہو منافق ہے۔ احادیثِ صحیحہ سے اس کی توضیح ہوتی ہے۔ اس موضوع پر اس کثرت سے

---

[1] تفہیم القرآن

حدیثیں موجود ہیں اور عہدِ صحابہ سے لے کر عہدِ تدوینِ کتب تک مختلف طبقات رواۃ و حفاظ میں اس قدر ان کی شہرت رہ چکی ہے کہ اسلام کے عقیدۂ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی اور چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہو گی۔

مسندِ امام احمد کی ایک روایت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے پورے سیاسی نظام کے لیے اسلام کا نظامِ عمل یہ بیان فرمایا ہے:

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لوگو! میں تم کو ان پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے اتار دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔ لوگوں نے عرض کیا۔ کیا ایسا شخص جہنمی ہو گا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو۔ فرمایا ہاں اگرچہ روزہ رکھتا ہو نماز پڑھتا ہو۔ اور اپنے زعم میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔

اس ارشادِ نبوت میں جس بات پر بنیادی طور پر زور دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ شخص جو اپنے تئیں ایمان و سلام کا مدعی ہو کر اسلام کے سیاسی نظام سے منسلک نہیں ہے تو وہ مسلمان نہیں ہے۔ یہ بات بالکل قرآن ل اس آیت کی روح کے مطابق ہے یہاں یہ کہا گیا ہے کہ جو اپنے ایمان کا زعم رکھتا ہے اور اپنے معاملات اور تمدنی مسائل کو اسلام کے سیاسی نظام سے وابستہ کرنے کی جگہ طاغوتی نظام سے وابستہ کرتا ہے وہ یمان کا جھوٹا مدعی ہے اور ارشادِ نبوت میں بھی یہی بات ایمان کی جگہ اسلام سے متعلق کہی گئی ہے۔ ایمان کا لق عالمِ غیب سے ہے اور اسلام کا عالمِ شہادت سے۔ اللہ کی ذات دانائے غیب ہے اس نے عالمِ غیب ے بارے میں بات فرمائی اور نبی کی ذات کے سامنے عالمِ شہادت ہے اس لیے آپ نے اسی عالم کی بات مائی ہے۔

آخر میں فرمایا وقد امروا ان یکفروا بہ مطلب یہ ہے کہ حالانکہ ان لوگوں کو اللہ نے طاغوت کا نکر بن کر رہنے کا حکم دیا تھا یعنی ان سے کہا گیا تھا کہ اسلام کے سیاسی نظام کے مقابلے میں تمہیں اپنی زندگی ں ان کاروں میں اعمال و اخلاق میں طاغوت کا باغی بن کر رہنا ہو گا اور پوری زندگی طاغوت سے کافرانہ تعلقات اساس پر قائم کرے گا۔ تمام نبیوں کی بعثت کا مقصد ہی یہ بتایا گیا تھا۔

ولقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔

بلاشبہ ہم نے ہر امت میں پیغمبر روانہ کیا تا کہ لوگوں کو بتائے کہ اللہ کی بندگی کرو اور طاغوت سے بچو۔

مطلب یہ ہے کہ یہ مدعیانِ ایمان، زبانی دعوے کی حد تک تو ایمان کے مدعی ہیں مگر ان کے اعمال گواہی دے رہے ہیں کہ اللہ سے ان کے کافرانہ اور طاغوت سے ان کے مومنانہ تعلقات ہیں۔

آخری فقرے میں اس ایمان بالطاغوت کی وجہ یہ بتائی ہے کہ ان کو اس معاملہ میں شیطان کی قیادت حاصل ہے اور شیطان کی خواہش یہی ہے کہ وہ ان کو ہدایت سے ہٹا کر ضلالت میں ایسے فاصلے پر لے جائے جہاں سے پیچھے ہٹنے اور ہدایت پر آنے کا امکان نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان کو تو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قیادت حاصل ہے اور انہوں نے اسی قیادت کی برکت میں اسلام کا سیاسی نظام حاصل کیا ہے اور ان کے مقابلے میں ان مدعیانِ ایمان کو پیش کیا ہے جن کو شیطان کی قیادت حاصل ہے اور اسی قیادت کے نتیجہ میں ان کی نگاہوں نے طاغوت کا سیاسی نظام پسند کیا ہے۔ اور اپنے معاملات میں اللہ و رسول کی طرف رجوع کرنے کے بجائے یہود کے سرداروں اور ان کی عدالتوں کی طرف رجوع کرتے ہیں۔ احادیث سے معلوم ہوا ہے کہ ما انزل الیک یعنی جو کچھ محمد رسول اللہ لے کر تشریف لاتے ہیں کے مقابلے میں انسانوں کا بنایا ہوا نظامِ حیات تو درکنار اگر خود ما انزل من قبلک بھی پیش کیا جائے یعنی حضرت موسیٰ کا نظامِ حیات بھی لایا جائے یہ بھی ضلالت ہے ارشاد ہے:

والذی نفس محمد بیدہ لو بدا لکم موسیٰ فاتبعتموہ وترکتمونی لضللتم عن سواء السبیل (رواہ الدارمی)

اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں میری جان ہے اگر آج موسیٰ کا بھی ظہور ہو جاتے اور تم مجھے چھوڑ کر ان کے پیچھے چل پڑو تو سیدھی راہ سے گمراہ ہو جاؤ گے۔

اسلام کے مصادرِ قانون سے روگردانی

١٠٥۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ تم اللہ کی طرف اور رسول کی طرف تو تم ان منافقین کو اپنے سے کتراتے دیکھو گے۔ یعنی جب کسی جھگڑے میں منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو حکم نازل کیا ہے اس کی طرف آؤ اور اس کے رسول کے روبرو اپنے جھگڑے لاؤ تو ظاہر میں چونکہ اسلام کے مدعی ہیں اس لیے صاف طور پر تو انکار نہیں کر سکتے مگر آپ کے پاس آنے سے اور حکمِ الٰہی پر چلنے سے بچ جاتے اور رکتے ہیں کہ کسی ترکیب سے جان بچ جائے۔ اور رسول کو چھوڑ کر جہاں ہمارا جی چاہے اپنا جھگڑا لے جائیں۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ منافقین کی عام روش تھی کہ جس مقدمہ میں انہیں توقع ہوتی تھی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہوگا اس کو تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں لے آتے تھے مگر جس مقدمہ میں اندیشہ ہوتا تھا کہ فیصلہ ان کے خلاف ہوگا اس کو آپ کے پاس لانے سے انکار کر دیتے تھے۔ یہی حال اب بھی بہت سے منافقوں کا ہے کہ اگر شریعت کا فیصلہ ان کے حق میں ہو تو سر آنکھوں پر ورنہ ہر اس قانون، ہر اس رسم ورواج اور ہر اس عدالت کے دامن میں جا پناہ لیں گے جس سے انہیں اپنے منشا کے مطابق فیصلہ حاصل ہونے کی توقع ہو۔[1]

سنّت کے مآخذ قانون ہونے کی اہمیت

یہ بات اسی جگہ تیسری بار دہرائی گئی ہے پہلے فرمایا اطیعوا اللّٰہ واطیعوا الرسول دوسری بار فرمایا ردوہ الی اللّٰہ والرسول اب تیسری بار ارشاد ہو رہا ہے تعالوا الیٰ ما انزل اللّٰہ والی الرسول۔ ظاہر ہے کہ ما انزل اللّٰہ سے اگر قرآن مراد ہے تو الرسول سے سنت مراد ہے۔ یہاں الی ما انزل اللّٰہ والرسول کی تعبیر کو چھوڑ کر والی الرسول کی تعبیر یہ بتانے کے لیے اختیار کی گئی ہے کہ رسول کی سنت اسلام کے سیاسی نظام میں قانون کا دوسرا مأخذ ہے اور بڑا ہی اہم مأخذ ہے افسوس ہے کہ ایک عرصہ سے ایک گروہ اس کی اہمیت کم کرنے اور اس کے قانونی حجت ہونے کے پہلو کا انکار کرکے لوگوں کے ذہنوں میں انتشار برپا کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب ان لوگوں سے جو ایمان کے مدعی ہو کر طاغوتی نظام کو عملاً اپناتے ہیں کہا جاتا ہے کہ آؤ اسلام کے اس سیاسی نظام کو اپناؤ جس کے قانونی مأخذ اللّٰہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت ہیں تو یہ منافقین طرح دے جاتے ہیں۔

اس آیت نے یہ بات کھول کر بتا دی ہے کہ جو ایمان کا دعویٰ کرکے اسلام کے بارے میں یہ تصور رکھتا ہے کہ وہ انفرادی اعمال کی اصلاح اور شخصی نجات کے حصول کا ذریعہ ہے۔ معاملات تمدن، اور زندگی کے مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں تو وہ قرآن کی نظر میں منافق ہے۔ اس آیت میں ایک لطیف اشارہ اس طرف کیا گیا ہے کہ ایمان باللّٰہ کی حقیقی کسوٹی اسلام کا سیاسی نظام ہے۔ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ ایک مسلمان طاغوت کے مقابلے میں خدا کا بول بالا کرنے کے لیے بے تاب ہو اور

---

[1] تفہیم القرآن

اس کی راہ میں ہر قربانی کے لیے آمادہ ہو جائے۔

اسلام کے سیاسی نظام کی کامیابی

۱۰۶ا۔ اس وقت ان پر کیا گزرے گی جب ان کے ہاتھوں کی لائی ہوئی مصیبت ان پر آ پڑے گی۔ پھر آپ کے پاس یہ کہہ کر اللہ کی قسمیں کھاتے ہوئے آئیں گے کہ بخدا ہم تو صرف بھلائی کے خواہاں اور میل ملاپ چاہتے تھے یعنی یہ تو سب کچھ ہوا مگر یہ منافق لوگ اس وقت کیا کریں گے جس وقت پہنچنے لگے ان کو ان کے کرتوت کا یعنی فصل خصومات میں آپ کے پاس جو آنے سے رکتے اور بچتے ہیں جب اس کا عذاب ان پر آنے لگے تو پھر یہ منافق اس وقت کیا کر سکتے ہیں اس کے سوا کہ آئیں رسُول کی خدمت میں قسمیں کھاتے ہوئے کہ ہم حضرت عمرؓ کی خدمت میں صرف اس لیے گئے تھے کہ شاید وہ باہم صلح اور ملاپ کرادیں۔ رسُول کے ارشاد سے اعراض کرنا اور جان بچانا ہرگز ہم کو منظور نہ تھا۔[1]

ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ ہمارے خیال میں اس تصویر میں حضرت عمرؓ کو داخل کرنے کی خوبصورت کہانی کلبی کے دماغ کی اختراع ہے جسے ہمارے مفسرین نے شرف پذیرائی عطا کر رکھا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ آج قرآن سے کہا جاتا ہے کہ اپنے معاملات میں طاغوت کی طرف نہ جاؤ۔ اللہ اور اس کے رسُول کی طرف آؤ یعنی اسلام کا سیاسی نظام اپناؤ، ایمان کا تقاضا یہی ہے مگر وہ کترا جاتے ہیں لیکن اس وقت وہ کیا کریں گے جب ان کی شرارتوں کی پاداش میں ان پر ایسا وقت آئے گا کہ یہ لوگ آپ کے پاس آئیں گے اور قسمیں کھا کھا کر یقین دلائیں گے کہ جو کچھ یہ کرتے رہے ہیں کسی بری نیت سے نہیں بلکہ بھلائی اور باہمی سازگاری کی خاطر کرتے رہے ہیں۔

جس عذاب کے آنے کی یہاں ان کو خبر دی گئی ہے۔ اس کا تعلق بعد میں آنے والے اس زمانہ سے ہے جب کہ اسلام کا سیاسی نظام غالب ہو جائے گا اور طاغوت کی سیاسی طاقت بالکل کمزور ہو جائے گی اور اہل ایمان سے کہہ دیا جائے گا کہ منافقین کے بارے میں چشم پوشی اور اغماض کی روش بدل دو چنانچہ کچھ عرصہ کے بعد اسلام کا سیاسی نظام طاقتور ہو گیا اور مسلمانوں نے اپنی روش بدل لی اور قدم قدم پر منافقین کی جامہ تلاشی ہونے لگی۔ منافقین اس صورت حال سے پریشان ہوتے نہ طاغوتی نظام میں جو یہودیوں کا قائم کردہ تھا، نادم ختم باقی رہا تھا کہ ان کی سرپرستی کر سکے اور نہ مسلمان ان کی

[1] افادات شیخ الاسلام

جہالتوں میں آنے کے لیے تیار تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین بھاگ بھاگ کر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں آتے اور قسمیں کھا کھا کر آپ کو یقین دلاتے کہ وہ یہود کے طاغوتی نظام سے اب تک جو ربط و ضبط رکھتے تھے اور گاہ گاہ اپنے معاملات میں ان کی بالاتری تسلیم کرتے رہے ہیں۔ اس میں کسی فساد نیت کو دخل نہیں ہے بلکہ ان کی خواہش صرف یہی رہی ہے کہ اس سے مسلمانوں کو فائدہ پہنچے گا اور مسلمانوں اور یہود کے مابین اختلاف کی جو خلیج حائل ہو گئی ہے وہ زیادہ وسیع نہ ہونے پائے گی۔ اس طرح وہ اپنی منافقت کو مصالحت کے پردے میں چھپانے کی کوشش کرتے اور اس کو احسان و توفیق کے خوبصورت الفاظ سے تعبیر کرتے لیکن واقعات کے طشت ازبام ہو جانے کے بعد اس سخن سازی کا موقعہ بالکل نکل چکا تھا۔

منافقین کو نصیحت کرنے کی ہدایت

۱۰۷۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کے حال کو اللہ خوب جانتا ہے تم ان سے بے رُخی برتو۔ ان کو نصیحت کرو اور ان سے اس انداز سے بات کرو کہ بات ان کے جی میں اتر جائے۔ اس آیت میں حق تعالیٰ نے ان کی قسم اور ان کی معذرت سابقہ کی تکذیب فرمائی کہ منافقین جو کچھ زبانی باتیں بنائیں بتائیں اللہ تعالیٰ کو ان کے دل کی باتیں خوب معلوم ہیں۔ یعنی ان کے نفاق اور ان کے جھوٹ کو خوب جانتا ہے لہٰذا آپ بھی علم خداوندی پر بس کر کے منافقوں کی بات سے تغافل کیجئے اور ان کی بات کی پرواز کیجئے۔ مگر ان کو نصیحت کرنے اور کام کی باتیں بتلانے میں ہرگز کوتاہی نہ فرمائیے۔ اور ان کی ہدایت سے مایوس نہ ہو جیئے [1]

اس آیت میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ان کا نفاق اور ان کے دلوں کے روگ کا معاملہ تو آپ اللہ پر چھوڑ دیجئے۔ وہ خوب جانتا ہے کہ جو کچھ کہہ رہے ہیں احسان و توفیق سے یا منافقت اور طاغوت پرستی کا جذبہ ہے۔ اس معاملہ کو تو اللہ پر چھوڑ دیں کہ اس کا تعلق مافی قلوبہم سے ہے آپ تو ان سے وہ معاملہ فرمائیے جو قانون کا تقاضا ہے۔

اوّل یہ کہ آپ ان کی اس حرکت سے بے رُخ ہو جائیں اور ان پر اس کا کوئی ردّ عمل ظاہر نہ کریں اور اس پر ان کی کوئی گرفت نہ کریں۔ ابن کثیر نے فاعرض عنہم کی تفسیر یہ فرمائی ہے کہ لا تعنفہم

[1] افادات شیخ الاسلام

علی ما فی قلوبھم بلکہ بعض شارحین قرآن نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ اپنے علم کے مطابق آپ ان کے سامنے ان کے منافق ہونے کو بھی نہ جتائیں اور کچھ کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اب تک جس کریمانہ اخلاق کا آپ ان کے لیے اظہار فرما رہے تھے۔ اب ذرا وہ اکرام و بشاشت نہ اختیار کیجئے مگر زبان سے ان کو کچھ نہ فرمائیے۔

دوم یہ کہ ان کو نصیحت و وعظ فرمائیے۔ یعنی ان کو نصیحت اور فہمائش خوش اسلوبی، نرمی اور مصلحت کے ساتھ کیجئے اور ان کی ایمان فروشیوں پر پند و نصیحت، کی ایسی باتیں کہیئے کہ ان کے دلوں میں اتر جائیں۔ یہ اعراض، یہ وعظ اور یہ قول بلیغ کی احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے ہیں کہ ان لوگوں میں ضد اور کد نہ ہونے پائے اور نیکی کے بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا لِيُطَاعَ بِاِذْنِ اللّٰهِ ۭ وَلَوْ اَنَّھُمْ اِذْ
ظَّلَمُوْٓا اَنْفُسَھُمْ جَاۗءُوْكَ فَاسْتَغْفَرُوا اللّٰهَ وَاسْتَغْفَرَ لَھُمُ الرَّسُوْلُ
لَوَجَدُوا اللّٰهَ تَوَّابًا رَّحِيْمًا ۝ فَلَا وَرَبِّكَ لَا يُؤْمِنُوْنَ حَتّٰي
يُحَكِّمُوْكَ فِيْمَا شَجَرَ بَيْنَھُمْ ثُمَّ لَا يَجِدُوْا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا
قَضَيْتَ وَيُسَلِّمُوْا تَسْلِيْمًا ۝ وَلَوْ اَنَّا كَتَبْنَا عَلَيْهِمْ اَنِ اقْتُلُوْٓا
اَنْفُسَكُمْ اَوِ اخْرُجُوْا مِنْ دِيَارِكُمْ مَّا فَعَلُوْهُ اِلَّا قَلِيْلٌ مِّنْھُمْ ۭ وَلَوْ
اَنَّھُمْ فَعَلُوْا مَا يُوْعَظُوْنَ بِهٖ لَكَانَ خَيْرًا لَّھُمْ وَاَشَدَّ تَثْبِيْتًا ۝
وَّاِذًا لَّاٰتَيْنٰھُمْ مِّنْ لَّدُنَّآ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝ وَّلَهَدَيْنٰھُمْ صِرَاطًا
مُّسْتَقِيْمًا ۝ وَمَنْ يُّطِعِ اللّٰهَ وَالرَّسُوْلَ فَاُولٰۗىِٕكَ مَعَ الَّذِيْنَ اَنْعَمَ اللّٰهُ
عَلَيْهِمْ مِّنَ النَّبِيّٖنَ وَالصِّدِّيْقِيْنَ وَالشُّهَدَاۗءِ وَالصّٰلِحِيْنَ ۚ وَحَسُنَ
اُولٰۗىِٕكَ رَفِيْقًا ۝ ذٰلِكَ الْفَضْلُ مِنَ اللّٰهِ ۭ وَكَفٰى بِاللّٰهِ عَلِيْمًا ۝ ع

اور جو رسول بھی ہم نے روانہ کیا ہے وہ اسی لیے روانہ کیا ہے کہ

اس کی بحکمِ خدا اطاعت کی جاتے اور اگر ایسا ہوتا کہ جس وقت انہوں
نے اپنا نقصان کیا تھا تو اسی وقت اگر آپ کے پاس آجاتے اور
اللہ سے معافی مانگتے اور رسولِ خدا بھی ان کے لیے معافی کی درخواست
کرتے تو وہ بلاشبہ اللہ کو اپنے گناہوں کے لیے بخشنہار اور رحمت کرنے
والا پاتے[۱۰۸]۔ لہٰذا قسم ہے آپ کے رب کی کوئی بھی مومن نہیں ہو
سکتا جب تک کہ وہ اپنے تمام جھگڑوں اور قضیوں میں آپ کو
اپنا حاکم اور فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں۔ پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو
اس پر اپنے دلوں میں بھی کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح
سراپا تسلیم ہو جائیں[۱۰۹]۔ اگر ہم ان کو حکم دے دیتے کہ اپنے کو قتل کر
ڈالو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے کم ہی آدمی اس پر
عمل پیرا ہوتے۔ اور اگر جس بات کی ان کو نصیحت کی جاتی اس کو
اپناتے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتری ہوتی اور یہ ان کی زیادہ

ثابت قدمی کا باعث ہوتا اور جب یہ لوگ ایسا کرتے تو ہم ان کو اپنی جانب سے اجرِ عظیم عطا کرتے اور ان کو سیدھی راہ دکھا دیتے"[111] اور جو شخص بھی اللہ اور رسُول کی طاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے، یعنی انبیاءؑ، صدیقین، شہداء اور صالحین اور ان لوگوں کی رفاقت کیسی اچھی ہے"[111]۔ یہی وہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملتا ہے اور اللہ ہی بندوں کا حال جاننے کے لیے کا علم کافی ہے"[112]۔

نبی کی طاعت شرطِ ایمان ہے

اسلامی مملکت کی فطرت و ماہیت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس کا مقصد اصلی افراد کی تکمیلِ ذات اور انسانی کی اجتماعی خودی کی نشوونما ہے اس لیے اس مملکت پر معاشی اغراض اور مادی آسائشوں کا تصور غالب نہیں ہو سکتا۔ لیکن یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انفرادی شخصیت اور اجتماعی سیرت کا کوئی مکمل نمونہ پہلے ہی سے افرادِ مملکت کے سامنے موجود ہو کیونکہ اس کے بغیر شخصیت کا حقیقی مفہوم اور اجتماعی سیرۃ کا معیار متعین کرنا دشوار ہو جاتے گا۔ نیز یہ سوال کہ شخصیت کے لوازم و صفات اور اجتماعی سیرۃ کے نقش و نگار کیا ہوں اور کس طرح کی شخصیت کا ارتقا مطلوب ہے۔ بحث و نظر اور اختلاف و نزاع کا ایک ایسا دروازہ کھول دے گا جس کی وجہ سے مملکت اور افراد کے اخلاق نصب العین کی بابت لوگ کسی ایک رائے پر متفق نہ ہوں گے۔ یورپ کی اجتماعی زندگی کو جس

چیز نے سب سے زیادہ نقصان پہنچایا ہے اور جس کی وجہ سے مغربی یورپ کی جمہوریتوں میں انتشار آفرین عناصر تقویت حاصل کرتے گئے وہ اس اتفاق رائے کا فقدان ہے۔ اول تو ابتداء ہی سے مذہب و اخلاق کو ملکی اور اجتماعی زندگی سے بالکل بے دخل کر دیا گیا۔ پھر جن دائروں میں شخصیت کی نشوونما کے لیے مذہبی اصولوں اور اخلاقی مقاصد کو تسلیم کیا گیا ان میں بھی آج تک یہ فیصلہ نہ ہو سکا کہ کس قسم کی شخصیت کا ارتقا مطلوب ہے اور کس طرح سیرت کو معیار قرار دیا جائے۔ اسلامی مملکت میں اس قسم کے نزاع کا کوئی امکان نہیں ہے کیونکہ اس مملکت کے افراد پہلے ہی اس امر پر متفق ہیں کہ سیرت کا معیار اور شخصیت کے لوازم و صفات کیا ہونے چاہئیں۔ قرآن نے مسلمانوں کے سامنے رسُول کی شخصیت و سیرت کو ایک نمونہ بنایا ہے اور بتایا ہے کہ شخصیت کا نشوونما ارتقا اسی نمونہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ رسُول کی مکمل اطاعت اور پیروی ضروری ہے اور شرطِ نجات ہے۔ ان آیات میں قرآن نے رسُول کی اسی حیثیت کو پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ نبوت آتی ہی اس لیے ہے کہ بحکمِ خدا اس کی اطاعت کی جائے اور پھر بتایا ہے کہ یہ اطاعت بھی صرف ظاہر کی حد تک نہ ہونی چاہیے بلکہ دل کی پوری رضا سے ہونی چاہیے۔ اس کے بعد واضح کیا ہے کہ ایسا ہونا کیوں ضروری ہے۔

۱۰۸۔ اور جو بھی رسُول ہم نے روانہ کیا ہے وہ صرف اسی لیے روانہ کیا ہے کہ اس کی بحکمِ خداوندی اطاعت کی جائے۔ اگر ایسا ہوتا کہ جس وقت انہوں نے اپنا نقصان کیا تھا تو اسی وقت اگر آپ کے پاس آجاتے اور اللہ سے معافی مانگ لیتے اور رسُولِ خدا ان کے لیے معافی کی درخواست کر لیتے تو وہ بلاشبہ اللہ کو اپنے گناہوں کے لیے بخشنہار اور رحمت کرنے والا پاتے۔ یعنی اللہ تعالیٰ جس رسُول کو اپنے بندوں کی طرف بھیجتا ہے سو اسی غرض سے بھیجتا ہے کہ اللہ کے حکم کے موافق بندے ان کے کہنے کو مانیں تو اب ضرور تھا کہ یہ لوگ رسُول کے ارشاد کو بلا تامل پہلے ہی سے دل و جان سے تسلیم کرتے اور اگر گناہ اور بُرا کرنے کے بعد بھی متنبہ ہو جاتے اور اللہ سے معافی چاہتے اور رسُول بھی ان کی معافی کی دُعا کرتا تو پھر بھی حق تعالیٰ ان کی توبہ قبول فرما لیتا مگر انہوں نے یہ غضب کیا کہ اول تو رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم سے جو بعینہٖ اللہ تعالیٰ کا حکم تھا ہٹے اور بچے پھر جب اس کا وبال ان پر پڑا تو اب بھی متنبہ اور تائب نہ ہوتے بلکہ لگے جھوٹی قسمیں کھانے اور تاویلیں گھڑنے پھر ایسوں کی مغفرت ہو تو کیوں کر ہو[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

آیت کی یہ تشریح اس ذہنی تحفظ کی بنا پر ہے جو اس آیت کے پس منظر کے متعلق کلبی کی روایت نے پیدا کیا ہے ورنہ اگر آپ آیت قرآنی کا اس پس منظر سے علیحدہ ہو کر مطالعہ فرمائیں گے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ اس آیت میں کسی انفرادی اور شخصی واقعہ پر تبصرہ نہیں ہے بلکہ یہ ایک گروہ کے متعلق بات ہو رہی ہے گروہ بھی وہ جو ایمان کا مدعی ہے یعنی مسلمان ہونے کا دعویٰ کرتا ہے۔ خدا کو بھی مانتا ہے خدا کے رسول کو بھی مانتا ہے اور قرآن کو بھی خدا کی کتاب مانتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک اسلام کو بطور دین اختیار کرنے کا تعلق ہے کوئی بات ایسی نہیں جو بظاہر ان کے مسلمان ہونے کے خلاف ہو۔ لیکن ان کا گناہ قرآن کی نظر میں یہ اور صرف یہ تھا کہ یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت یعنی اپنے معاملات کو فیصلہ کے لیے اسلام کی عدالت میں نہیں بلکہ طاغوت کی عدالت میں لے جاتے تھے اور وہ ایسا شیطان کے اغوا سے کر رہے تھے۔ ان کی عام روش یہ تھی کہ جس مقدمہ میں انہیں توقع ہوتی تھی کہ فیصلہ ان کے حق میں ہو گا اس کو نبوت کی سرکار میں لے آتے اور جس مقدمہ میں ان کو اندیشہ ہوتا کہ فیصلہ ان کے خلاف ہو گا اس کو نبوت کی سرکار میں لانے سے کتراتے۔ حاصل یہ کہ ان کے دامن میں قرآن کے بیان کے مطابق تحاکم الی الطاغوت کا سنگین گناہ تھا۔ قرآن نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ منافق ہیں کیونکہ ایمان کے مدعی ہو کر وہ ایمان کے سیاسی نظام کو قبول نہیں کرتے۔ ایمان کے لیے ان میں اخلاص وصداقت نہیں ہے۔ قرآن کے جو احکام ان کے شخصی اغراض کے خلاف نہ ہوتے ان پر خوشی خوشی عمل کرتے جو خلاف ہوتے ان سے نکل بھاگتے جب کبھی خوشحالیوں کا موقعہ ہوتا وہ سب سے پہلے مومن تھے۔ جب قربانیوں کا وقت آجاتا تو سب آخری صفوں میں بھی نظر نہ آتے۔ طاغوتی نظام سیاست سے سازگاریاں رکھنے میں ان کو کوئی تامل نہ ہوتا وہ سمجھتے تھے کہ دونوں طرف ملے رہنے میں ہی مصلحت ہے اور گرفت ہونے پر وہ اپنی اس مصلحت کوشی کو اس طرح پیش کرتے ان اردنا الا احسانا و توفیقا۔ یہ وہ نفاق ہے جو ایمان بمعنے اخلاص کے مقابلہ میں آتا ہے۔ یہ وہ نفاق نہیں ہے جو ایمان بمعنے تصدیق کا مدمقابل ہے۔ یہ کفر خالص ہے اسی بنا پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کے بارے میں حکم ہوا ہے کہ

۱۔ آپ ان سے اعراض کر لیں یعنی ان کو سزا دینے کے بارے میں کوئی قدم نہ اٹھائیں

۲۔ ان کی ایمان فروشیوں پر ان کو نصیحت کریں اور نصیحت بھی ایسی کہ ان کے جی میں اتر جائے

اب اس آیت میں ان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ نبی تو روانہ ہی اس لیے کیا جاتا ہے کہ اس کی بلا قید اور بلا شرط اطاعت کی جائے اور زندگی کے ہر گوشہ میں کی جائے۔ یہ الفاظ اپنے اندر کیسا بلیغانہ

عموم رکھتے ہیں ما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ یعنی تم لوگوں کو جو پیغمبر کی اطاعت کا حکم دیا گیا ہے تو یہ کوئی نئی بات نہیں ہے جو انہی کے ساتھ ہوتی ہے بلکہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جس کسی کو بھی ہم نے منصب رسالت دے کر روانہ کیا ہے تو اسی لیے کیا ہے کہ ہمارے حکم سے اس کی اطاعت کی جائے۔ یعنی ہر نبی اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہی لوگوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے فاتقوا اللہ واطیعون اور ایسا ہونا ضروری ہے۔ عقل اس کے سوا ایک نبی کے لیے کسی اور حیثیت کا تصور ہی نہیں کر سکتی۔ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اگر اس کی عبادت کا طریقہ معلوم کرنے اور اس کے احکام جاننے کا واحد ذریعہ صرف نبی ہی ہے تو نبی کی کامل اطاعت اور بغیر اللہ کی عبادت کی کوئی شکل ممکن ہی نہیں ہے۔ اگر راستہ چلے بغیر آپ منزل پر نہیں پہنچ سکتے اور آلات پرواز استعمال کیے بغیر فضائی سفر نہیں کر سکتے تو نبی کی ساری باتوں کے مانے بغیر اللہ کی عبادت بھی نہیں کر سکتے۔

رسول کی عصمت

پھر آیت میں بلا قید اور بلا شرط رسول کی طاعت کا اعلان بتا رہا ہے کہ رسول معصوم ہوتا ہے۔ اس سے نہ فکر و اجتہاد کی غلطیاں سرزد ہوتی ہیں نہ اعمال و اخلاق کی لغزشیں، نفس و شیطان کی دراندازیوں سے اس کے جذبات، اخلاق و افکار اور اعمال سبھی پاک ہوتے ہیں۔ نبی معصوم اس لیے نہیں ہوتا کہ اس میں غلط سوچنے اور غلط کام کرنے کی استعداد ہی نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس حقیقت واقعی یہ ہے کہ ہر شخص کی طرح نبوت میں بھی یہ استعداد طبعی طور پر لازماً موجود ہوتی ہے لیکن ہوتا یہ ہے کہ اس صلاحیت کو اپنی کارکردگی دکھانے میں کامیابی نہیں ہوتی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ نبی کی فکر و بصیرت حد درجہ کامل ہوتی ہے اور اس کی اخلاقی قوت بھی۔ ایک طرف تو وہ احکام الٰہی کا منشا سمجھنے اور ان سے اپنے اجتہاد کے ذریعے مزید احکام نکال لینے کی بہترین صلاحیتیں رکھتا ہے دوسری طرف اسے اپنے نفس پر پورا پورا کنٹرول حاصل ہوتا ہے اور اس کی اخلاقی حس اس کا خوف خدا اور اس کا اندیشۂ آخرت اتنا بڑھا ہوا ہوتا ہے کہ گناہ کے محرکات سر ہی نہیں اٹھا پاتے۔ لیکن پھر بھی یہ واقعہ ہے کہ نبی کے معصوم ہونے کی صرف یہی وجہ نہیں ہے بلکہ یہاں ایک اور چیز بھی ہے جو انہیں اس مقام عصمت تک پہنچاتی ہے اور وہ ہے اللہ سبحانہ کی خصوصی نگرانی یہی نگرانی ہے جو انہیں فکر و اجتہاد کی غلطیوں سے بھی بچائے رکھتی ہے اور اخلاق و عمل کی کوتاہیوں سے بھی۔

غور کرو تو خود محسوس ہوگا کہ نبوت کی عصمت اس مقصد کے لیے بالکل ناگزیر تھی جس کی خاطر رسالت کا سلسلہ قائم کیا گیا ہے ایسا شخص لوگوں کے لیے اسوۂ حسنہ کیوں کر بن سکتا ہے جو خود معصوم نہیں ہے جس کا اپنا دامن دھبوں سے پاک نہ ہو وہ دوسروں کو کیا دکھا کر تلقین کر سکتا ہے کہ تمہیں اپنے دامنوں کو اس طرح پاک رکھنا چاہیے۔ حالانکہ نبوت کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ ہی نہیں سکتا جب تک نبی اپنے پیروؤں کے سامنے اسلام کا اور احکام الٰہی کی کامل طاعت کا عملی نمونہ پیش نہ کرتا ہے۔

بہر حال نبی کے مطاع ہونے اور زندگی کے ہر گوشہ میں واجب الطاعت ہونے کا تقاضا اور لازمہ یہ ہے کہ نبی معصوم ہو۔

یہ سمجھانے کے بعد کہ رسالت پر ایمان لانے کا یہ ایک کھلا ہوا اور بڑا بنیادی تقاضا ہے کہ رسول کی کامل اطاعت کی جائے۔ ایسی طاعت جس میں کوئی قید و شرط نہ ہو ان کو ان کی اس بے راہ روی پر جس کا مظاہرہ وہ تحاکم الی الطاغوت کی صورت میں کر کے نبی کی طاعت سے روگرداں ہوتے ہیں بڑے بلیغ اور موثر انداز میں سمجھایا ہے کہ اگر وہ اپنی اس بدعنوانی پر غلط تاویلوں کا پردہ ڈالنے کی جگہ سیدھے طور پر کھلے بندوں اپنے جرم کا اقرار کرتے اور بارگاہ نبوت میں حاضر ہو کر اللہ سے اپنے اس سنگین جرم کی معافی مانگتے اور اللہ کا رسول بھی ان کے لیے مغفرت مانگتا تو پھر ان کے اس گناہ کی بخشش ہو جاتی اور آئندہ کے لیے اللہ ان کو نیکیاں کرنے کی توفیق عطا کر دیتا۔ دیکھئے وعظ و نصیحت کے لیے کیسا قول بلیغ اختیار کیا گیا ہے ایسا اسلوب، ایسا طریق خطاب، ایسا لب و لہجہ اس طرح کے الفاظ اختیار کیے گئے ہیں جو مخاطب کے دل کو دکھ پہنچانے والے نہیں ہیں۔ اس قول بلیغ کے ذریعے ان لوگوں کو نصیحت کی گئی ہے کہ آؤ توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے اعذار لنگ چھوڑو۔ گزشتہ گناہوں کی معافی مانگ لو۔ گنہ گاری گنہ گارانہ زندگی کو ظاہر کرنے کے لیے ظلموا انفسھم کیسا لطیف اور محبت سے لبریز انداز ہے۔

ظاہر ہے کہ جب رسول خدا کی حاکمیت قانونی کا مظہر ہے تو اس امر کی گنجائش کسی صاحب ایمان کے لیے نہیں رہ جاتی کہ وہ رسول کی عدالت کو چھوڑ کر اپنے کسی معاملہ کو فیصلہ کے لیے طاغوت کی عدالت میں لے جائے۔ جو شخص ایسا کرتا ہے وہ اپنی جان پر بہت بڑا ظلم کرتا ہے اس لیے کہ فی الحقیقت یہ چیز خدا کی حاکمیت کا انکار اور بالواسطہ شرک اور کفر کا ارتکاب ہے۔ چنانچہ ان منافقین سے جو اپنے معاملات یہود کی عدالتوں میں لے جاتے تھے فرمایا کہ جن لوگوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ان کے لیے اس کی اصلاح اور اس کے عواقب سے نجات حاصل کرنے کی

واحد صورت یہ تھی کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر اپنی غلطی کا اعتراف کرتے، خدا سے مغفرت کے طالب ہوتے اور حضور اقدس بھی ان کے لیے دعائے مغفرت کے ذریعے ان کی سفارش کرتے تو اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول کر لیتا۔ اس کے سوا اس سنگین گناہ کی تلافی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

معافی کے لیے استغفارِ رسول کی شرط

اس جگہ قبول توبہ کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے اور پھر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دعائے مغفرت کرنے کی شرط غالباً اس لیے ہے کہ ان لوگوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے منصب نبوت پر حملہ کیا تھا اور آپ کے فیصلہ کو نظر انداز کر کے آپ کو ایذا پہنچائی اس لیے ان کے جرم کی توبہ کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضری اور حضور انور کے استغفار کو شرط کر دیا گیا۔[1]

اس کے دو پہلو ہیں ایک یہ کہ رسول کا یہ استغفار ان کے لیے اس دنیا میں بمنزلہ شفاعت ہے جس سے ان کے اس گناہ عظیم کے بخشے جانے کی توقع ہے دوسرا یہ کہ رسول کی عدالت کے ہوتے ہوئے ان کا تحاکم الی الطاغوت رسول کی صریح توہین ہے۔ اس وجہ سے یہ ضروری ہوا کہ وہ رسول کی رضا اور ان کی دعا بھی حاصل کریں۔[2]

اسلام کے سیاسی نظام کو ماننا شرطِ ایمان ہے

۱۰۹۔ لہٰذا قسم ہے آپ کے رب کی کوئی بھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ وہ اپنے تمام جھگڑوں میں آپ کو اپنا حاکم اور فیصلہ کرنے والا نہ مان لیں، پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور پوری طرح سر پا تسلیم و رضا ہو جائیں۔ یعنی منافق لوگ کس بیہودہ خیال میں ہیں اور کیسے بیہودہ حیلوں سے کام نکالنا چاہتے ہیں۔ ان کو خوب سمجھ لینا چاہیے ہم قسم کھا کر کہتے ہیں کہ جب تک یہ لوگ تم کو اے رسول اپنے تمام چھوٹے بڑے مالی جانی نزاعات میں منصف اور حاکم نہ جان لیں گے کہ تمہارے فیصلے اور حکم سے ان کے جی میں کچھ تنگی اور ناخوشی نہ آنے پائے اور

---

[1] معارف م ش [2] تدبر قرآن۔

تمہارے ہر حکم کو خوشی کے ساتھ دل سے نہ قبول کریں گے اس وقت تک ان کو ہرگز ایمان نصیب نہ ہوگا اب جو کچھ کرنا ہے سوچ سمجھ کر کر لیں [1]

اس آیتِ گرامی میں نبوت کو حاکم اور قاضی کی حیثیت سے پیش کر کے یہ مطالبہ کیا گیا کہ مسلمان اس وقت تک مسلمان نہیں ہو سکتا جب تک رسُول کو حاکم اور قاضی نہ مان لے اور صرف مان لینا ہی مسلمان ہونے کے لیے کافی نہیں ہے بلکہ مان لینے کے بعد عملی زندگی میں اس کے فیصلہ پر اپنے اندر کوئی تنگی محسوس نہ کریں اور اپنے آپ کو اس کے لیے سراپا تسلیم ہو جائیں۔ اصل یہ ہے کہ جب تک افراد کے باہمی تنازعات اور مملکت اور افراد کے اختلافات کا تصفیہ کرنے کے لیے کوئی حاکم نہ موجود ہو اس وقت تک معاشرہ یا مملکت میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا۔ لیکن اس حکم کے لیے ضروری ہے کہ وہ افراد مملکت اور مملکت یا خود افراد کی مختلف جماعتیں اور پارٹیاں اس کے عدل وانصاف اس کی غیر جانبداری پر مطمئن ہوں۔ نیز اس کی اصابت رائے اور صحت فکر ان سب کے نزدیک اتنی مسلم ہو کہ وہ اس کے فیصلوں میں غلطی یا خطا کے امکان کا تصور بھی نہ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس شرط کی تکمیل کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت سے نہیں ہو سکتی کیونکہ کوئی شخص خواہ وہ کتنا ہی صاحب الرائے کیوں نہ ہو غلطی سے بری نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جبکہ تمدنی اور معاشرتی امور میں انسان کے شخصی امیال وعواطف اس کا انفرادی نقطہ نظر جو خود اسی کے ذاتی تجربات پر مبنی ہوتا ہے اور اس کی ذہنی خصوصیات اس کی رائے یا فیصلہ کی تشکیل میں دخیل ہوتے ہیں۔ جماعت کے فیصلوں پر بھی یہی بات صادق آتی ہے۔ ان حالات میں ان شرائط کی تکمیل صرف وہی ذات کر سکتی ہے جو معصوم ہو کیونکہ انسانی جذبات وخواہشات اور انسانی تعصبات اور جنبہ داریوں سے صرف ایسی ہی ذات پاک ہو سکتی ہے جو نبوت کے زیور سے آراستہ ہو۔ یہیں سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ جس مملکت کی اساس نبوی ہدایات اور وحی پر مبنی قوانین وضوابط نہ ہو وہ انسانیت کی فلاح معاشرے کے استحکام اور تمدنی امن وعافیت کا ذریعہ نہیں ہو سکتی۔ نبوت کی ذات ہی وہ حکم ہے جسے ایک مرتبہ تسلیم کر لینے کے بعد انسان اپنے اختلافات اور نزاعوں میں اس سے رجوع کر سکتا ہے کیونکہ رسالت کا ماخذ ایک ما فوق الانسان ہستی کا ارادہ ہے اور اس کی نسبت ایک ایسی ذات کی طرف ہوتی ہے جو خطا اور لغزش سے پاک ہے۔ جس مملکت کے افراد اپنی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

سیاسی زندگی کی بنیاد نبوت کی راہ سے آئے ہوئے قوانین پر رکھتے ہیں اس کے اندر اختلافات کبھی اس حد تک نہیں پڑھ سکتے کہ وہ پورے معاشرتی اور سیاسی نظام کو خطرہ میں ڈال دیں کیونکہ ایسی سوسائٹی میں افراد کی مختلف جماعتوں یا افراد اور مملکت میں کوئی نزاع واقع ہوجائے تو نبوت ان میں تصفیہ کرنے کے لیے موجود ہے۔

اس آیت میں نبوت کی جس حاکمانہ حیثیت کو بتایا ہے اس کا حکم صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ قیامت تک کے لیے ہے جو کچھ اللہ کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم لائے ہیں اور جس طریقہ پر اللہ کی ہدایت ورہنمائی کے تحت آپ نے عمل کیا ہے وہ ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کے درمیان فیصلہ کن سند ہے اور اس سند کو ماننے یا نہ ماننے ہی پر آدمی کے مومن ہونے اور نہ ہونے کا فیصلہ ہے۔ حدیث میں اس بات کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے لا یومن احدکم حتی یکون ھواہ تبعاً لما جئت به تم میں سے کوئی شخص مومن نہیں ہوسکتا جب تک کہ اس کی خواہش نفس اس طریقہ کی تابع نہ ہوجائے جسے میں لے کر آیا ہوں [1]

اس آیت میں بتایا ہے کہ ایمان کی شرط یہ ہے کہ ہر معاملہ میں اپنا فیصلہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرانا چاہیئے اور جو فیصلہ وہ فرمائیں اس کو حق جان کر دل وجان سے اس کو مان لے اور دل سے اس پر راضی ہو اور دل میں اس سے کوئی تنگی اور ناگواری نہ پائے جب تک دل وجان سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلوں پر راضی نہ ہو اس وقت تک ایمان صحیح نہیں محض ظاہری اطاعت ایمان کے لیے کافی نہیں بلاشبہ نفاق ہے [2]

اس آیت میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت اور علو مرتبت کے اظہار کے ساتھ آپ کی اطاعت جو بے شمار آیات قرآنیہ سے ثابت ہے اس کی واضح تشریح فرمائی ہے۔ اس آیت میں قسم کھا کر حق تعالیٰ شانہ نے فرمایا کہ کوئی آدمی اس وقت تک مومن یا مسلمان نہیں ہوسکتا جب تک وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو ٹھنڈے دل سے پوری طرح تسلیم نہ کرے کہ اس کے دل میں بھی اس فیصلہ سے کوئی تنگی نہ پائی جائے [3]

اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کی قسم کھا کر فرمایا کہ یہ لوگ اس وقت تک مومن نہیں ہوسکتے،

---

[1] تفہیم القرآن [2] معارف م ا [3] معارف م ش

جب تک یہ اپنے درمیان پیدا ہونے والے تمام نزاعات میں تمہی کو حکم نہ مانیں۔ پھر ساتھ ہی ان کے اندر یہ ذہنی تبدیلی نہ واقع ہو جائے کہ وہ تمہارے فیصلے کو بلا چون وچرا پورے اطمینان قلب کے ساتھ مانیں اور اپنے آپ کو بلا کسی استثناء و تحفظ کے تمہارے حوالہ کر دیں۔ رسول کی اطاعت خود خدا کی اطاعت کے ہم معنے ہے اس وجہ سے اس کا حق صرف طاعت سے ادا نہیں ہوتا بلکہ اس کے لیے دل کی اطاعت بھی شرط ہے [1]

چونکہ اسلامی نظام ایک الہامی نظام ہے اور اس کے مقابلے میں طاغوتی نظام انسانوں کا بنایا ہوا نظام ہے خواہ وہ جمہوری ہو یا اشتراکی یا آمریت پر مبنی۔ اسلامی نظام کی بنیاد قرآن حکیم اور اسوۂ رسول پر ہے۔ قرآن اگر انسانی فکر کی نہیں بلکہ خدا کی کتاب ہے تو پیغمبر بھی انسانوں کا فرستادہ نہیں بلکہ اللہ کا رسول ہے جس کے بارے میں تمام مسلمانوں کا عقیدہ ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے انسانوں کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے اس لیے اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانوں کو چاہیئے کہ رسول کو خدا کا رسول ماننے کے بعد انسانی اختلافات تمدن و معاشرت کی تمام نزاعوں اور زندگی کے سارے مسائل میں طاغوتی نظام سے ہٹ کر اللہ کے رسول کو حکم اور جج تسلیم کریں اور اس کا جو بھی فیصلہ ہو اس کو بخوشی قبول کریں۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ اسلامی معاشرہ میں کوئی شخص داخل نہیں ہو سکتا جب تک وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے اختلافات اور مسائل زندگی کے جج اور فیصل تسلیم نہ کرے۔

اسلام کے سیاسی نظام میں اس پابندی کا نتیجہ یہ ہے کہ سیاسی اقتدار کی حقیقت اور اس کا اصلی مستقر، حکمرانوں کی ذمہ داریاں، ان کے اقتدار کے حدود و افراد کے حقوق و فرائض اور ان کی ذمہ داریاں ان سب کے بارے میں رسالت کا فیصلہ ہی اصل فیصلہ ہے۔ اس کی موجودگی میں اب مسلمانوں کا کسی اور طرف دیکھنا ایمان بالرسالت کے منافی ہی نہیں بلکہ شرک فی الرسالت کے مرادف ہے۔

آخر میں ثُمَّ لَا یَجِدُوْا فِیْٓ اَنْفُسِهِمْ حَرَجًا مِّمَّا قَضَیْتَ وَیُسَلِّمُوْا تَسْلِیْمًا کہہ کر اشارہ کر دیا کہ اس طاعت گزاری اور نبوت کے لیے فرمانبردار ہونے اور اس کو حاکم ماننے کی بنا جبر، طاقت، استبداد نہیں بلکہ محبت، شفقت، رحمت ہونی چاہیے۔ یعنی یہ طاعت جو ایک مسلمان نبوت کی کرے وہ خالص محبت کے تقاضے سے کرے نہ کہ کسی جبر سے اور حالات کی سازگاری سے۔

---

[1] تدبر قرآن

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت

چنانچہ ایک حدیث میں اسی بات کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیت کے انداز پر ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے۔ امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت انس بن مالک کے حوالہ سے یہ ارشاد نقل کیا ہے:

لا یومن احدکم حتی اکون احب الیہ من ولدہ ووالدہ والناس اجمعین

تم میں کوئی مومن نہیں ہے جب تک کہ میں اسے اپنے بیٹے، اپنے باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ پیارا نہ ہو جاؤں۔

حافظ بدرالدین عینی لکھتے ہیں کہ محبت کے تین اسباب ہیں کمال، جمال اور جود و سخا، یہ تینوں اوصاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے زیادہ کسی کی ذات میں موجود نہیں۔ آپ کا کمال اسلام کے نظام حیات سے ظاہر ہے۔ آپ کا جمال احادیث شمائل میں موجود ہے، آپ کی روحانی و جسمانی جود و سخا کا تو اندازہ ہی کون لگا سکتا ہے۔ پھر آپ کی محبت تمام مخلوقات سے زیادہ کیوں نہ ضروری ہو، ماں باپ بیٹے کی محبت طبعی ہے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت عقلی ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ کمال ایمان یہ ہے کہ تقاضائے عقل تقاضائے طبیعت پر غالب آئے ایمان صرف عقائد عملی کا نام نہیں بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جن سے شدہ مومن کا قلب مزین و رنگین ہوتا ہے۔ شفا میں سیرۃ محمد بن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ جنگ اُحد میں ایک انصاری عورت کا باپ بھائی، شوہر تینوں شہید ہو گئے، جب اسے خبر ملی تو اس نے دریافت کیا کہ آنحضرت تو بخیر ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں بخیر ہیں اس نے کہا چلو مجھے دکھاؤ۔ جب اس نے آپ کو دیکھ لیا تو بولی کل مصیبۃ بعدک جلل جب آپ زندہ ہیں تو آپ کے بعد ہر مصیبت آسان ہے۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہمیں اپنے مال، اولاد اور والدین اور پیاس میں سرد پانی سے زیادہ پیاری تھی۔ اہل مکہ جب زید بن دثنہ کو قتل کے لیے حرم سے باہر لے چلے تو ابو سفیان بولا کہو زید قسم کھا کر بتلاؤ کیا اس وقت تمہیں یہ پسند ہے کہ حضور انور تمہاری جگہ ہوتے اور تم اپنے گھر ہوتے۔ زید نے قسم کھا کر کہا مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں ہے کہ میں اپنے گھر میں ہوں اور یہاں آپ کے جسم میں ایک کانٹا بھی چبھے۔ ابو سفیان کہنے لگا میں نے کسی کو اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھی اس سے محبت کرتے ہیں اور اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے

صحابہ کرام کو ایسی ہی محبت تھی جیسا کہ حدیث میں موجود ہے۔ بدقسمتی سے اگر کسی کو محبت کا یہ مقام حاصل نہیں ہے تو وہ ان کی محبت میں تاویل نہ کرے جن کو یہ مقام حاصل ہے۔ یہ نبوت کی محبت ہی ہے کہ وہ نبوت کی طرف سے آئی ہوئی بات کو بخوشی قبول کرتے ہیں۔ اگر وہ ذرا بھی دل میں تنگی محسوس کریں تو ان کو اپنے ایمان پر نظر ثانی کرنی چاہیے۔

اسلامی نظام سے تعلق کا اصلی تقاضا

۱۱۰۔ اگر ہم ان کو حکم دے دیتے کہ اپنے کو قتل کر ڈالو یا اپنے گھروں سے نکل جاؤ تو ان میں سے کم ہی آدمی اس پر عمل پیرا ہوتے۔ اگر وہ اس بات کو اپناتے جس کی ان کو نصیحت کی جا رہی ہے تو یہ ان کے لیے زیادہ بہتری ہوتی اور یہ ان کی مزید ثابت قدمی کا باعث ہوتی اور جب یہ لوگ ایسا کرتے تو ہم ان کو اپنی جانب سے اجر عظیم عطا کرتے اور ان کو سیدھی راہ دکھاتے۔ یعنی سب جانوں کا مالک چونکہ اللہ تعالیٰ ہے اس لیے اس کے حکم میں کسی کو جان سے بھی دریغ نہ کرنا چاہیے سو اگر اللہ تعالیٰ لوگوں کو کہیں کہ اپنی جانوں کو ہلاک کر ڈالو اور جلا وطن ہونے کا حکم فرما دیتا جیسے کہ بنی اسرائیل پر حکم کر دیا تھا تو بجا نہ لاتے مگر گنے چنے صرف سچے اور پکے ایمان والے۔ یہ منافق ایسے حکم پر کیسے عمل کر سکتے تھے۔ اب ان کو سمجھنا چاہیے کہ ان کو ہم نے جو حکم دے رکھے ہیں وہ محض ان کی نصیحت اور خیر خواہی کے ہیں نہ جان کی ہلاکت کا حکم دیا گیا نہ جلا وطن ہونے کا۔ اگر ان ہی سہل اور آسان حکموں پر چلیں تو نفاق بالکل جاتا رہے اور خالص مسلمان ہو جائیں مگر افسوس سمجھتے نہیں ہیں اور موجودہ حالت کو غنیمت نہیں سمجھتے ہیں کہ ذرا سی بات میں دین و دنیا دونوں درست ہو جاتے ہیں۔[1]

یہ خیال رہے کہ جن منافقین کا یہاں چہرہ پیش ہو رہا ہے یہ مہاجرین میں سے نہیں بلکہ زیادہ نو مسلم یہود اور مدینہ کے اطراف میں یہود کے زیر اثر قبائل سے تعلق رکھتے تھے۔ یہ اسلام کی بڑھتی ہوئی سیاسی طاقت کو دیکھ کر حالات کے تحت مسلمان ہو گئے تھے لیکن یہ لوگ اپنے تعلقات شہری زندگی اور تمدنی احوال میں یہود اور قبائلی سرداروں سے بھی، معاملات اور مقدمات کے ذریعے ان سے رکھنا چاہتے تھے۔ قرآن نے ان کی اسی کمزوری سے پردہ اٹھایا ہے کہ ان کو اپنے کو قتل کرنے اور اپنے گھر بار چھوڑنے کا حکم دیا جائے تو اس کے لیے ان میں سے بہت تھوڑے آمادہ ہوں گے ان اقتلوا انفسکم او

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اخرجوا من دیارکم ایک معنے میں تو دونوں حکم اب بھی موجود ہیں یعنی جہاد و قتال اور ترک وطن یا ہجرت اپنے اپنے موقع پر اور شرائط کے تحقق پر اب بھی واجب ہیں۔ یہاں مراد یہ ہے کہ اگر یہ احکام خود بھی مقصود ہوتے اور قتال و ہجرت ہر حال میں فرض ہوتے۔ جہاد اوّل تو خود ہی ایک سخت آزمائش ہے لیکن جب یہ تلوار ان کے خلاف اٹھانی پڑے جن سے عزیز و قرابت کے رشتے ہوں اور ان کی حمیت و حمایت کا جذبہ رگ و ریشہ میں سمایا ہوا ہو تو یہ آزمائش سخت تر ہو جاتی ہے اس لیے کہ تلوار اس صورت میں اپنی ہی گردنوں پر چلانی پڑتی ہے۔ چنانچہ بدر کے موقع پر مہاجرین اس آزمائش میں پورے اترے۔ ایسے ہی مہاجرین کو اسلام کی خاطر گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ اسی حقیقت کی طرف ان منافقین کو متوجہ کیا جا رہا ہے کہ اگر مہاجرین کی طرح ان پر بھی اپنوں کے خلاف تلوار اٹھانا اور گھروں کو چھوڑنا فرض کر دیا جاتا تو اس میدان میں ان میں سے تھوڑے ہی مردانگی کا مظاہرہ کرتے۔ اس صورت میں کتبنا علیہم کی ضمیر کا مرجع منافقین ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کو تو ان حالات سے دوچار ہونا نہیں پڑا جن سے مہاجرین کا سابقہ پڑا ہے ان سے صرف رسول کی طاعت، آپ کے حکموں کی بجا آوری کا مطالبہ ہو رہا ہے۔ یہ اسی سے پہلو تہی کر رہے ہیں، مگر اکثر شارحین قرآن نے کتبنا علیہم میں ضمیر کا مرجع الناس قرار دے کر مطلب یہ بتایا ہے کہ اگر ہم لوگوں پر اپنے کو مار ڈالنا اور گھروں سے نکلنا فرض کر دیتے تو چند ہی ہمارے اس مطالبہ کو پورا کرتے اور مطالب بھی بتائے گئے ہیں۔ اس کے بعد ان کو سمجھایا ہے کہ لو انہم فعلوا یعنی اگر شک و تذبذب اور تزلزل کی راہ چھوڑ کر اطاعت رسول میں یکسوئی کے ساتھ لگ جائیں تو انہیں ایمان میں ثبات و استقلال اور اس کی برکتیں خود بخود ہونے لگیں۔ ذکر انہی منافقین اور کمزور ایمان والوں کا ہو رہا ہے فعلوا ما یوعظون یعنی اللہ و رسول کی اپنی زندگی کے سارے مسائل میں طاعت اگر کر لی ہوتی اور طاغوت کی طاعت اختیار نہ کرتے تو لکان خیرا لہم دنیوی، اخروی، انفرادی و اجتماعی ہر اعتبار سے وہ کامیاب ہوتے اور تثبیتاً ان احکام پر عمل کر کے خود ایمانی قوت ضعیف سے، قوی اور قوی تر ہو جاتی حضرت تھانوی فرماتے ہیں کہ تجربہ سے ثابت ہے کہ دین کا کام کرتے رہنے سے اعتقاد و یقین کی باطنی کیفیت میں بھی ترقی ہوتی رہتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عمل عامل میں قوت یقین کے اضافہ کا سبب ہوتا ہے اعمال ہی کے ذریعے اجمالی علم واضح اور تفصیلی بنتا ہے اور اسی کی راہ سے انسان میں اخلاق و ملکات کی نشو و نما ہوتی ہے۔ اذا لآتینٰہم کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ طاعت رسول کرتے اور بجائے طاغوت کے اسلام کا سیاسی نظام اپناتے تو پھر ہم اپنے خاص فضل سے ان کو اتنا بڑا اجر

عطا کرتے جس کے اوّل و آخر کا اللہ کے سوا کسی کو علم نہیں۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ یہ ایک اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہوا کہ جماؤ کے بعد کیا ہوگا جواب میں فرمایا تب اللہ کے خزانہ سے اجر عظیم ملے گا اور صراط مستقیم کو کھول دیا جائے گا جو الذین انعمت علیھم کی راہ ہے۔

صراط مستقیم کیا ہے؟ صراط کے معنے راستہ کے ہیں اور مستقیم استقامت سے بنا ہے۔ اس کے معنے ٹھیک اور سیدھا ہونا ہیں۔ صراط مستقیم ایسا راستہ جو ٹھیک ہو، سیدھا ہو، جس میں اعتدال ہو، افراط و تفریط نہ ہو، زندگی کے تمام گوشوں میں کام آنے والا ہو۔ فرد اور جماعت دونوں کے حق میں اصلاح اور فلاح کی ضمانت دیتا ہو۔ اس میں کجی نہ ہو اور کوئی اونچ نیچ نہ ہو۔ زندگی کے ہر موقعہ پر اور ہر گوشہ کے لیے رہنما ہو، منزل تک پہنچانے والا ہو کشادہ ہو مقصد تک جانے کے لیے اس کے علاوہ کوئی راستہ نہ ہو۔ صراط مستقیم کی یہ حقیقت حافظ ابن القیم نے بتائی ہے۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ نبوت کی راہ کا سیدھا ہونا اور طاغوت کی بنائی ہوئی راہوں کا ٹیڑھا ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر شخص بلا تکلف معلوم کر سکتا ہے۔ نبوت اگر انسان کی ہدایت کے لیے ضروری ہے تو یہ بھی ضروری ہے کہ اس کی ہدایات بھی صاف اور واضح ہوں۔ اس میں گنجلک نہ ہو نا قابل حل معمہ نہ ہو، اعتقاد میں سہل اور عمل میں آسان ہو۔

انعام یافتہ لوگ اور ان کی رفاقت

۱۱۱۔ اور جو شخص اللہ و رسول کی طاعت کرے گا وہ ان لوگوں کے ساتھ ہو گا جن پر اللہ نے انعام فرمایا یعنی انبیاء، صدیقین، شہداء، اور صالحین اور ان لوگوں کی رفاقت کیسی اچھی ہے۔ نبی وہ ہیں جن پر اللہ کی طرف سے وحی آئے۔ یعنی فرشتہ ظاہر میں آ کر پیغام کہہ جائے اور صدیق وہ کہ جو پیغام اور احکام خدا تعالیٰ کی طرف سے پیغمبروں کو آئے ان کا جی آپ ہی اس پر گواہی دے اور بلا دلیل اس کی تصدیق کرے اور شہید وہ ہے کہ پیغمبروں کے حکم پر جان دینے کو حاضر ہوں اور صالح وہ ہیں جن کی طبیعت نیکی پر پیدا ہوتی ہے اور بُری باتوں سے اپنے نفس اور بدن کی اصلاح اور صفائی کر چکے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ چار قسمیں مذکورہ جو امت کے باقی افراد سے افضل ہیں ان کے ماسوا جو مسلمان ہیں اور درجہ میں ان کے برابر نہیں لیکن اللہ و رسول کی فرمانبرداری میں مشغول ہیں وہ لوگ بھی انہی کی شمار اور ذیل میں سمجے جائیں گے۔ اور ان حضرات کی رفاقت بہت ہی خوبی اور فضیلت کی بات ہے اس کو کوئی حقیر نہ سمجھے۔ اس آیت میں اشارہ ہو گیا کہ

منافقین جن کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے وہ اس رفاقت اور معیت سے محروم ہیں لہ

سورہ فاتحہ میں پڑھ آئے ہو کہ صراط مستقیم انعام یافتہ لوگوں کی راہ ہے۔ اب بات کو زیادہ مؤثر اور زیادہ بلیغ انداز میں کہا گیا ہے کہ جو بھی اللہ اور رسول کی اطاعت کرے گا یعنی نبوت کے لائے ہوئے نظام کو زندگی کے مسائل میں اپنائے گا اور طاغوتی نظام سے ہٹ کر رہے گا تو اس کو انعام یافتہ لوگوں کی رفاقت حاصل ہوگی۔ یعنی یہ کوئی تباہی اور بربادی کا راستہ نہیں ہے بلکہ اس پر چلنے والے تو انعام یافتہ ہیں اور جو اس راہ پر چلتا ہے اس کو ان انعام یافتہ لوگوں کی رفاقت ملتی ہے دُنیا کا کوئی نظامِ حیات اپنے ماننے والوں کو مستقبل میں فلاح کی اتنی بڑی ضمانت دے نہیں سکتا جتنی بڑی یہاں قرآن دے رہا ہے۔

اس آیت میں انبیاؑ، صدیقین، شہداء اور صالحین کو انعام یافتہ قرار دیا ہے۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان پر اللہ سبحانہ نے کیا انعام فرمایا ہے؟ ظاہر ہے کہ یہاں انعام سے وہ عارضی اور نمائشی انعامات مراد نہیں ہیں جو دُنیا میں فرعونوں، نمرودوں اور قارونوں پر ہوتے رہتے ہیں اور اب بھی ہمارے سامنے بڑے بڑے ظالموں اور بدکاروں اور گمراہوں کو مل رہے ہیں نعمت دراصل اس حالت کو کہتے ہیں جس میں دل خوشی محسوس کرے۔ ان کو اللہ نے دو قسم کی نعمتوں سے نوازا ہے۔ ایک علم اور دوسرا عمل۔ اسی لیے یہاں چار طبقوں کا ذکر کیا ہے دو طبقے یعنی انبیاء اور صدیقین علم کا اور شہداء وصالحین عمل کا کمالی نمونہ ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں۔ دونوں میں ایک باریک سا فرق ہے۔ جیسے انبیاء کی حیثیت علم میں فاعل اور منبع کی ہے صدیقین کا مقام مفعول اور مجمع کا ہے ایسے شہداء کی حیثیت عمل میں فاعل کی اور صالحین کا درجہ مفعول اور منبع کا ہے۔

بہرحال انبیاء اور صدیقین علم کا اور شہداء وصالحین عمل کا نمونہ ہیں۔ قرآن نے علم وعمل کے اسی مجموعہ کو انعام قرار دیا ہے اور سورہ فاتحہ میں اس کے حامل بزرگوں کی راہ کو صراط مستقیم بتایا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن تمام انبیاؑ کی ہدایات کا مجموعہ بنا کر دیا گیا ہے اس لیے آپ جس نظامِ حیات کو لے کر تشریف لائے ہیں وہ کمالِ علم اور کمالِ عمل کا نمونہ ہے اور اسی کا نام صراط مستقیم ہے۔ اس موضوع کے سارے پہلوؤں پر ہم سورۂ فاتحہ میں بحث

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

کر چکے ہیں۔ اس بحث سے یہ نتیجہ خود بخود سامنے آجاتا ہے کہ اسلام علم و عمل کے مجموعہ کا نام ہے۔ وہ صرف ایک کائناتی نظریہ نہیں جو واقعات کی توجیہ و تشریح پر اکتفا کرتا ہو بلکہ وہ انسان کی حیات انفرادی اور حیات اجتماعی کی تعمیر و تاسیس کا ایک عملی پروگرام ہے۔ دین اور فلسفہ میں یہی فرق ہے۔ فلسفہ کا سارا دارومدار نظریہ پر ہے مگر دین کا سارا محور نظریہ کی بنیاد پر اٹھتی ہوئی عمل کی عمارت پر ہے۔ عملی زندگی کو اگر اس کے دائرے سے خارج کر دیا جائے تو پھر دین کوئی معنویت نہیں رہتی۔ یوں تو ہر مذہب انسانی زندگی کو ایک خاص اخلاقی سانچہ میں ڈھالتا ہے اور افراد سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنا اخلاقی رویہ تبدیل کریں لیکن اسلام اس بارے میں ایک خاص امتیازی شان رکھتا ہے۔ اس نے کردار و عمل کی تبدیلی کو انسان کی خانگی، عائلی اور معاشرتی زندگی کے محدود دائرے سے وسیع کر کے ساری انسانی زندگی پر محیط کر دیا۔ نیز اس نے اخلاق اور نیک عملی کے اصولوں کو انسان کی حیات اجتماعی پر بھی پھیلا دیا جس میں اس کی سیاسی اور معاشی زندگی بھی شامل ہے۔ علم کی حد تک اسلام اپنے پیروؤں سے صرف خدا کی ذات و صفات، رسالت، قیامت، جنت و دوزخ، جزائے عمل کے زبانی اقرار اور قلبی تصدیق ہی کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ عمل کی حد تک انہیں عالم انسانیت کی اجتماعی فلاح و صلاح کا ذمہ دار بھی قرار دیتا ہے اور ان سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہیئت اجتماعی میں وہ بنیادی تبدیلیاں لائیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے اقرار میں سچے ہیں۔ یہاں علم و عمل کے نمونہ پیش کر کے ان کی رفاقت کی خوشخبری اسی حوصلہ افزائی کی خاطر ہے اور منافقین میں یہاں کی بھی وہ کمزوری تھی جسے قرآن نے یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت سے بیان کیا۔ جو نہیں لوگ اپنے آپ کو رعایتیں دینے میں اتنے کیوں سخی ہیں! خوب سمجھ لو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دُنیا کو جو کچھ دیا ہے وہ سچے علمی حقائق اور اچھے عملی نظام کے سوا کچھ نہیں ہے۔

علم و عمل کی نعمت فضلِ خداوندی ہے

۱۱۲۔ یہی وہ حقیقی فضل ہے جو اللہ کی طرف سے ملا ہے اور اللہ ہی بندوں کا حال جاننے کے لیے کافی ہے یعنی اللہ اور رسول کا حکم ماننے والوں کو انبیاء، صدیقین اور شہداء و صالحین کی معیت و رفاقت میسر آئی یہ اللہ کا بڑا انعام اور اس کا محض فضل ہے۔ ان کی طاعت کا معاوضہ نہیں جس سے منافقین بالکل محروم ہیں اور اللہ کافی ہے جاننے اور خبر والا، وہ ہر ایک مخلص و منافق اور ہر مطیع کی طاعت، اور اس کے استحقاق اصلی اور مقدار فضل کو بالتفصیل جانتا ہے۔ اب کسی کو ان امور

کی تفاصیل کی وجہ سے وعدہ الہٰی کے پورا ہونے میں خلجان نہ ہو[1]
یہاں ذالک کا مشارالیہ کیا ہے؟ کچھ کہتے ہیں کہ مومنین کو جو کاملین کی معیت حاصل ہو گی۔ یہ محض فضل خداوندی ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ انعام بزرگوں کی بزرگی اللہ کا فضل ہے۔ کچھ کی رائے میں اطاعت گزاروں کی جزا فضل ہے۔ دراصل انبیاء وصدیقین، شہداء وصالحین کے عنوان سے جس علم وعمل کو اللہ نے اس آیت میں اپنا انعام قرار دیا ہے۔ اسی کی طرف اشارہ کیا ہے کہ اس میں انسانی محنت وکاوش کو کوئی دخل نہیں ہے یہ محض فضل خداوندی ہے۔ ان کی راہ صرف علم وعمل کو مان لینا اور اپنی ذات کی حد تک اپنا لینا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ ان کا بنیادی کام علم وعمل کی اس نعمت کو لوگوں تک پہنچانا اور دنیا کو اس کی دعوت دینا ہے اس کو تمام نبیوں کی بعثت کا مقصد اور مشن قرار دیا ہے۔ اس میں وہ کامیابی اور ناکامی کے نتائج سے بے پروا ہو کر زندگی بھر لگے رہنے پر مامور تھے اس کام کو تمام نبیوں نے قاطبۃ امیروں، غریبوں میں، دکانداروں اور دستکاروں میں، کاشتکاروں، زمینداروں میں، مزدوروں کارخانوں میں، نوکروں آقاؤں میں، شوہروں، بیویوں میں، اولاد اور والدین میں، شاگردوں اور اساتذہ میں گھر باہر ہر جگہ کیا ہے۔ اس میں جان کھپائی ہے عزت کو تج کیا ہے مال لٹایا ہے، رشتہ داروں کو چھوڑا اور وطن کو خیرباد کہا ہے۔ یہی وہ اصل عظیم ہے جو قرآنی دعوت کی اولین بنیاد ہے اسی کو قرآن نے اہل ایمان کو خوشیاں منانے کا حکم دیا ہے۔

قل بفضل اللہ وبرحمتہ فبذالک فلیفرحوا

اس آیت میں نبوت محمدی کی یہ امتیازی شان بتائی ہے کہ آپ نبیوں صدیقین کا علم اور شہداء وصالحین کا عمل لے کر تشریف لائے، اور بلا قید آپ کی نبوت کا سب سے مطالبہ یہ ہے کہ اس کی اطاعت کی جائے اور بلا قید زمان و مکان کی جائے۔ دوسری رسالتوں کے مقابلے میں رسالت محمدی کے اس امتیازی حیثیت کو نگاہ میں رکھتے اور پھر اس پر غور کیجئے کہ اس حیثیت کے لازمی تقاضے کیا ہو سکتے ہیں کیا یہ کہ اس امتیازی شان کے باوجود اس نبوت کا بھی مقام ومرتبہ ہر پہلو سے وہی ہو گا جو دوسرے نبیوں کا ہے۔ اس سوال کے جواب میں عقل وانصاف اور قرآن وسنت ہر ایک کا فیصلہ صاف نفی میں ہے۔ بلاشبہ ان حقائق کے فطری تقاضے لازماً بالکل دوسرے ہوں گے۔ اس امتیازی حیثیت کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ گزشتہ انبیاء کے تمام ادیان، تمام شریعتیں اور تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں اور اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف محمد رسول اللہ کا لایا ہوا ہے اور دوسرا اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ صداقت، شہادت اور صالحیت کا محمد رسول اللہ سے علیحدہ ہو کر کوئی وجود نہیں ہے اور تیسرا اس کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آخرت کی نجات صرف آپ کی پیروی پر موقوف ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا خُذُوْا حِذْرَكُمْ فَانْفِرُوْا ثُبَاتٍ اَوِ انْفِرُوْا
جَمِيْعًا ﴿٧١﴾ وَاِنَّ مِنْكُمْ لَمَنْ لَّيُبَطِّئَنَّ ۚ فَاِنْ اَصَابَتْكُمْ مُّصِيْبَةٌ
قَالَ قَدْ اَنْعَمَ اللّٰهُ عَلَيَّ اِذْ لَمْ اَكُنْ مَّعَهُمْ شَهِيْدًا ﴿٧٢﴾ وَلَئِنْ
اَصَابَكُمْ فَضْلٌ مِّنَ اللّٰهِ لَيَقُوْلَنَّ كَاَنْ لَّمْ تَكُنْۢ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهٗ مَوَدَّةٌ
يّٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ مَعَهُمْ فَاَفُوْزَ فَوْزًا عَظِيْمًا ﴿٧٣﴾ فَلْيُقَاتِلْ فِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ الَّذِيْنَ يَشْرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بِالْاٰخِرَةِ ۭ وَمَنْ يُّقَاتِلْ فِيْ
سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيُقْتَلْ اَوْ يَغْلِبْ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿٧٤﴾ وَمَا لَكُمْ
لَا تُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَالْمُسْتَضْعَفِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ وَ
النِّسَاۗءِ وَالْوِلْدَانِ الَّذِيْنَ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اَخْرِجْنَا مِنْ هٰذِهِ
الْقَرْيَةِ الظَّالِمِ اَهْلُهَا ۚ وَاجْعَلْ لَّنَا مِنْ لَّدُنْكَ وَلِيًّا ۚ وَّاجْعَلْ لَّنَا
مِنْ لَّدُنْكَ نَصِيْرًا ﴿٧٥﴾ اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۚ
وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ الطَّاغُوْتِ فَقَاتِلُوْٓا اَوْلِيَاۗءَ
الشَّيْطٰنِ ۚ اِنَّ كَيْدَ الشَّيْطٰنِ كَانَ ضَعِيْفًا ﴿٧٦﴾

اے پیروانِ دعوتِ ایمانی! اپنی حفاظت اور تیاری میں لگے رہو۔ پھر
نکلو تم مقابلہ کے لیے الگ الگ دستوں کی صورت میں یا اکٹھے ہو کر[۱۱۳]
ہاں تم میں کوئی کوئی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے ضرور جی چرائے گا۔
بس اگر تم پر کوئی افتاد آجائے تو وہ کہے گا کہ خدا نے مجھ پر احسان
کیا ہے کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر
کوئی مہربانی ہو جائے تو وہ ضرور کہے گا اور اس انداز سے کہے گا گویا
تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی علاقہ ہی نہیں کہ اے کاش
مجھے بھی ان کی رفاقت نصیب ہوتی تو میرا بھی کام بن جاتا[۱۱۴]۔ لہٰذا ان
لوگوں کو جو اللہ سے آخرت کے بدلے میں دُنیا کا سودا کر چکے ہیں اللہ
کی راہ میں لڑنا چاہیے اور دیکھو جو بھی اللہ کی راہ میں قتال کرتا ہے
اور اس کے نتیجہ میں مرتا ہے یا مارتا ہے ہم ضرور اسے اجرِ عظیم سے
نوازیں[۱۱۵] گے۔ اور تمہیں کیا ہو گیا کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس

مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جنگ نہیں کرتے ہو جو کہتے ہیں
اے ہمارے پروردگار ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندے ظالم
ہیں نکال اور اپنی طرف سے ہمارے لیے کسی کو ہمارا حامی بنا اور
اپنی طرف سے کسی کو ہماری مدد کے لیے تیار کر[۷۶]۔ جو لوگ ایمان
رکھتے ہیں ان کا لڑنا اللہ کی راہ میں ہوتا ہے اور جن لوگوں نے
کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کا لڑنا طاغوت کی راہ میں ہوتا ہے۔
مسلمانو! تم شیطان کے ساتھیوں اور مددگاروں سے لڑو یقین
کرو کہ شیطان کی چال کمزور ہوتی ہے[۷۷]۔

اسلامی نظام ہر نظام کا مدمقابل اور حریف ہے

اسلامی نظام کا اولین مقصدِ حیات یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جن سے کفر کا وجود عبارت ہے خواہ یہ کسی رنگ میں کسی بھیس میں ہو اور کہیں ہو۔ دنیا کے ہر دوسرے وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کی بقا کا آرزومند و کشمکشِ حیات میں مبتلا ہے اور اس میدان میں اسلام اس کا تنہا مدمقابل اور حریف ہے۔ یہ کفر خواہ کسی صورت میں ہو کیونکہ اپنی فطرت کے اعتبار سے اسلام کی ضد ہے اسلام اور کفر کے درمیان مصالحت ناممکن اور ان کی لڑائی بلا فصل قائم ہے۔ یہ لڑائی دنیا کی دوسری تمام لڑائیوں پر حاوی اور ان سے مافوق ہے بلکہ اور جتنی نزاعیں اور لڑائیاں ہیں ان کا سلسلہ

کہیں نہ کہیں جاکر اس لڑائی سے ضرور واسطہ پڑتا ہے کفر کی طاقتیں اسلام کے سفر ارتقاء میں مزاحم ہوتی ہیں لیکن ان کی یہ مزاحمت حق وصداقت کی سعی کمال کا ذریعہ بن جاتی ہے جس طرح انسان کو اپنے خارجی ماحول کی مخالف قوتوں سے کشمکش کرنا پڑتی ہے اور یہی کشمکش اس کی قوتوں کو صیقل کرتی ہے جس سے بالآخر وہ اپنے ماحول پر غلبہ حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام بھی کفر سے جنگ آزما ہو کر اپنے قوٰی کو مضبوط اور اپنی داخلی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ کفر و اسلام کا یہ تصادم اور ان دونوں کی ازلی پیکار، اسلام کی قوت حیات کی افزونی اور کفر کے ضعف و انحطاط پر منتہی ہوتی ہے۔ اور اس پیکار کی وجہ سے اسلام آگے بڑھتا ہے کفر و اسلام کا یہ تصادم جیسے اسلام کے اندرونی ارتقا کا سبب ہوتا ہے ایسے ہی وہ اپنے پیروکاروں کے لیے بہت آزمائش ہوتا ہے کیونکہ اسلام صرف ایک طرز فکر کا نام نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک طریق عمل ہے جس کے مطابق انسان اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی ماحول کو بدلتا ہے۔ اسی انقلاب اور تبدیلی کی کوشش کو قرآن کی زبان میں جہاد کہتے ہیں اور جہاد اسلامی زندگی کا اصل الاصول اور ایمان وعمل کا حقیقی جوہر ہے۔ اگر فریضہ جہاد کو اسلامی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو پھر اسلام بھی کائنات کا ایک بے جان فلسفہ رہ جاتا ہے۔

پہلی آیات میں منافقین کی ان نافرمانیوں کا ذکر تھا جو اسلام کو زندگی کے تمام مسائل کے لیے بطور دستور، آئین اور قانون ماننے کی راہ میں ان سے ہوئی ہیں۔ اور ان آیات میں منافقین کی ان نافرمانیوں کا ذکر ہے جو کفر و اسلام کے مابین تصادم ہونے کی صورت میں ان سے ظاہر ہوئی ہیں۔

۷۱۔ اے پیروان دعوت ایمانی! اپنی حفاظت اور تیاری میں لگے رہو لہٰذا نکلو تم مقابلے کے لیے الگ الگ دستوں کی صورت میں یا اکٹھے ہو کر۔ یہاں سے جہاد کا ذکر ہے اس سے پہلی آیت میں یہ ذکر تھا کہ جو اللہ اور رسول کی فرمانبرداری کرے گا اس کو انبیاء، صدیقین اور شہداء، اور صالحین کی رفاقت انعام میں ملے گی اور احکام خداوندی میں حکم جہاد چونکہ شاق اور دشوار ہے خصوصاً منافقین پر جن کا ذکر اوپر سے آرہا ہے اس لیے جہاد کا حکم فرمایا کہ ہر کوئی حضرات انبیاء، صدیقین، شہداء، صالحین کی رفاقت اور معیت کی امید نہ کرنے لگے۔ منقول ہے کہ شروع میں بہت سے ضعیف الاسلام بھی دعوت اسلام قبول کر چکے تھے۔ پھر جب جہاد فرض ہوا تو بعض متزلزل ہو گئے اور بعض کفار کے میزبان ہو کر آپ کی مخالفت کرنے لگے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! منافقوں کی کیفیت تو تمہیں پہلے معلوم ہو چکی ہے۔ اب خیر اسی میں ہے کہ تم ہر طرح سے اپنا بچاؤ کرو اور اپنی خبرداری اور احتیاط کر لو۔ ہتھیاروں سے ہو یا تدبیر سے، عقل سے ہو یا سامان سے اور

دشمن کے مقابلے اور مقاتلے کے لیے گھر سے باہر نکلو متفرق طور پر یا سب اکٹھے ہو کر جیسا موقع ہو۔[1]

وہی اوپر والا مضمون آگے چل رہا ہے پہلے داخلی امن کے سلسلے میں اسلامی حکومت کا سیاسی نظام، حکومت کی حیثیت قانون سازی میں حکومت کے قانونی مصادر نیز ان کی جامہ تلاشی لی جو ایمان کا دعویٰ کر کے اسلام کے سیاسی نظام کو قبول نہیں کرتے اب خارجی امن کی خاطر دفاع کا حکم بیان ہو رہا ہے اور اس سلسلے میں بھی ان لوگوں کی جامہ تلاشی ہو رہی ہے جو ایمان کے مدعی ہو کر اسلام کی خاطر قربانیوں سے گریز کرتے ہیں۔ اور جن کا اسلام کے بارے میں تصور یہ ہے کہ وہ انفرادی اعمال کی اصلاح اور شخصی نجات کے حصول کا ذریعہ ہے اور بس۔ جن میں اسلام کا تصور یہ ہو ان کے متعلق یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کہ وہ اپنے دینی اور اخلاقی تصورات کی قوت سے مستقبل کی تعمیر نو میں کوئی حصہ لیں گے۔ جن حالات میں اہل ایمان سے یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ کا مطالبہ کیا گیا تھا وہ اور تھے جبکہ یہودی مدینہ میں آباد تھے اور سیاسی طاقت پر قابض تھے۔ مسلمانوں کو سمجھایا گیا کہ سیاسی نظام کی حیثیت سے تمہیں سب رشتہ توڑ کر اسلام سے جوڑنا ہو گا۔ اب حالات اور ہیں احد کی شکست کی وجہ سے اطراف و نواح میں قبائل کی ہمتیں بڑھ گئی تھیں اور مسلمان ہر طرف سے خطرات میں گھر گئے تھے۔ آئے دن خبریں آرہی تھیں کہ فلاں قبیلے کے تیور بگڑ رہے ہیں، فلاں قبیلہ دشمنی پر آمادہ ہے، فلاں مقام پر حملہ کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔ اہل ایمان کے ساتھ پے درپے غداریاں کی جا رہی تھیں۔ مدینہ کے حدود سے باہر ان کے لیے جان و مال کی سلامتی باقی نہ رہی تھی ان حالات میں مسلمانوں کی جانب سے زبردست محنت و کوشش کی ضرورت تھی تاکہ ان خطرات سے اسلام کی دعوت مٹ نہ جائے۔

حذر کے اصلی معنے کسی خطرہ اور آفت سے بچنے کے ہیں اس کا خاص استعمال تو دفاعی آلات کے لیے ہوتا ہے لیکن اپنے عام استعمال میں یہ ان ہتھیاروں پر بھی بولا جاتا ہے۔ جو حملے کے کام میں آتے ہیں یہاں یہ لفظ اپنے عام مفہوم میں استعمال ہوا ہے مطلب یہ ہے کہ دشمن کے مقابلے میں ہر طرح کے کیل کانٹے سے لیس ہو کر تیار ہو جاؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ دفاعی اسباب کی فراہمی ایمان کا تقاضا ہے اور توکل کے منافی نہیں ہے۔ اگر مسلمانوں نے اس آیت کی روح کو سمجھا ہوتا تو اس اپاہج پنے میں مبتلا نہ ہوتے جسے انہوں نے توکل کے نام سے اختیار کر رکھا ہے۔ اس آیت میں جس تیاری کا حکم دیا گیا ہے اس میں حملہ کی صورت میں مقابلے کے سارے وسائل کو معلوم کرنا اور ان وسائل پر عمل کرنا اور دشمن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی اجتماعی طاقت کا اندازہ، دشمن ملک کے جغرافیائی احوال سے واقفیت اور ان ہتھیاروں سے واقفیت اور ان کے استعمال سے باخبر ہونا سب اس میں داخل ہیں، جنگ کی تیاری زمان اور مکان کی تبدیلی سے تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ اس دور میں تیاری کے لیے جیسے تلواریں، گھوڑے، کمانیں اور تیر ضروری تھے اور تیاری کے مفہوم میں یہ وقت کا تقاضا تھے اور ان کی پابجائی خذوا حذرکم کا مطالبہ کرنے کے لیے ضروری تھی ایسے ہی آج کے زمانے میں تیاری کے مفہوم میں بندوقیں، توپیں، مشین گنیں اور تمام وہ آلات جو میدان جنگ میں استعمال ہوتے ہیں۔ حمل ونقل کے وسائل ہوائی جہاز اور دخانی جہاز، ٹرک، بس کار اور تمام دوسری چیزیں جن کی فراہمی پر میدان جنگ کی کامیابی موقوف ہے اور ان آلات کو بنانے چلانے کا علم الغرض تمام جنگی علوم وفنون سے واقفیت مسلمان کے دینی واجبات اور ایمان کے تقاضے میں داخل ہے۔

سامان جنگ کی تیاری کے ساتھ قرآن نے اسی آیت میں جنگ کے لیے اقدام اور اس کی تنظیم کی طرف فانفروا ثبات او انفروا جمیعاً کہہ کر حکم دیا ہے۔ ثبات ثبۃ کی جمع ہے۔ ثبۃ کے معنے سواروں کی جماعت، ٹکڑی اور دستہ کے ہیں۔

عرب میں جنگ کے دو طریقے رائج تھے ایک منظم فوج کی صورت میں لشکر آرائی، دوسرا ٹکڑیوں اور دستوں کی صورت میں دشمن پر چھاپہ مارنا، یہاں ثبات کے لفظ سے اسی طریقے کی طرف اشارہ کیا ہے مسلمانوں نے یہ دونوں طریقے استعمال کیے۔

عزم وہمت سے تہی دامن لوگ

۱۴۴۔ ہاں تم میں سے کوئی کوئی ایسا بھی ہے جو لڑائی سے ضرور ہی پیچھے رہے گا بس اگر تم پر کوئی افتاد آجائے گی تو وہ کہے گا کہ خدا نے مجھ پر احسان کیا ہے کہ میں ان کے ساتھ موجود نہ تھا۔ اور اگر اللہ کی طرف سے تم پر کوئی مہربانی ہو جائے تو وہ ضرور کہے گا اور اس انداز سے کہے گا کہ گویا تمہارے اور اس کے درمیان محبت کا کوئی علاقہ ہی نہ تھا کہ اے کاش مجھے بھی ان کی رفاقت نصیب ہو جاتی تو میرا کام بھی بن جاتا۔ اور بڑی کامیابی حاصل کر لیتا۔ یعنی اے مسلمانو! تمہاری جماعت میں بعضے ایسے بھی گھسے ہوتے ہیں کہ جہاد کو جانے میں دیر لگاتے ہیں اور دیر کرتے ہیں اور حکم خداوندی کی تعمیل نہیں کرتے بلکہ نفع دنیوی کو تکتے رہتے ہیں اور اس سے مراد منافق ہیں جیسے عبداللہ بن ابی اور اس کے ساتھی کہ یہ لوگ گو ظاہر میں اسلام قبول کر چکے تھے مگر ان کو سب باتوں سے مقصود صرف

دنیا کا نفع تھا۔ حق تعالیٰ کی فرمانبرداری سے ان کو کوئی غرض نہ تھی، یہ لوگ جہاد میں جانے والوں کی حالت تکتے رہتے ہیں جانے کے بعد اگر جہاد میں مسلمانوں کو کوئی صدمہ پہنچتا ہے مثلاً مقتول ہوگئے یا شکست ہوگئی تو بہت خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کا بڑا ہی فضل ہوا کہ ہم لڑائی میں ان کے ساتھ نہ تھے ورنہ ہماری خیر نہ تھی الحمدللہ خوب بچے۔ اور اگر مسلمانوں پر اللہ کا فضل ہو گیا مثلاً فتح ہو گئی یا مال غنیمت بہت سا ہاتھ آگیا تو بہت پچھتاتے ہیں اور دشمنوں کی طرح غلبۂ حسد سے کہتے ہیں ہائے افسوس میں جہاد میں مسلمانوں کے ساتھ ہوتا تو مجھ کو بھی بڑی کامیابی ہوتی، یعنی مال غنیمت ملتا۔ یعنی ان کو صرف اپنی محرومی پر افسوس نہیں ہوتا بلکہ اپنی محرومی سے زیادہ مسلمانوں کی کامیابی پر حسد اور قلق ہوتا ہے۔[1]

اس آیت میں منافقوں کی ان نافرمانیوں کا ذکر ہو رہا ہے جو جنگ کے معاملہ سے تعلق رکھتی ہیں۔ دراصل ہر جماعت میں کچھ لوگ ایمان و یقین سے محروم اور عزم و ہمت سے تہی دست ہوتے ہیں۔ وہ جب دیکھتے ہیں کہ عزم و ہمت کا کوئی قدم اٹھایا جا رہا ہے تو اپنی کمزوری سے خود بھی باز رہتے ہیں اور دوسرں کو بھی باز رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ پھر جب جماعت قدم اٹھا دیتی ہے تو الگ تھلگ رہ کر غیروں کی طرح تماشہ دیکھتے ہیں۔ اگر کوئی حادثہ پیش آگیا تو خوش ہوتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اچھا ہوا ہم ان لوگوں کے ساتھ نہ تھے۔ اگر کامیابی ہوتی ہے تو رشک و حسد سے جل مرتے ہیں اور کہنے لگتے ہیں کہ کاش ہم نے بھی ساتھ دیا ہوتا تو آج کامیابی میں ہمارا بھی حصہ ہوتا۔ گویا ان کی شخصیت جماعت کی ہستی سے بالکل الگ ہے نہ تو اس کا نقصان ان کا نقصان ہے نہ اس کی کامیابی ان کی کامیابی۔ اسلام کے ابتدائی عہد میں بھی ایسے لوگ موجود تھے۔ قرآن نے ان کے اعمال کو پیش کیا ہے اور ان کو مخلص مومن کی جگہ منافق قرار دیا ہے۔ یاد رہے کہ یہ وہ نفاق نہیں جو ایمان بمعنے تصدیق کا مدمقابل ہوتا ہے۔ بلکہ وہ نفاق ہے جو ایمان بمعنے اخلاص کے مقابلے پر آتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو جنگ سے خود بھی جی چراتے ہیں اور دوسروں کو بھی پست ہمت کرتے ہیں۔ ان کا حال یہ ہے کہ اگر تمہیں کسی مہم میں کوئی گزند پہنچ جائے تو خوش ہوتے ہیں کہ اللہ نے ہمیں خوب بچایا کہ ہم اس مہم میں ان کے ساتھ شریک نہیں ہوتے اور اگر تمہیں کامیابی حاصل ہوتی ہے تو حاسدانہ کہتے ہیں کاش ہم بھی اس میں شامل ہوتے۔ اس بات کے ساتھ كان لم تكن بينكم و بينه مودة

[1] افادات شیخ الاسلام۔

کے الفاظ سے ان کے باطن کی عکاسی کی گئی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر یہ اپنی شامتِ اعمال سے کسی مہم میں شامل نہیں ہوتے ہیں تو ایمانی و اسلامی اخوت کا تقاضا یہ ہے کہ مسلمانوں کی کامیابی پر خوش ہوں کہ اللہ نے ان کے دینی بھائیوں کو سرخرو کیا لیکن انہیں اس بات کی کوئی خوشی نہیں ہوتی ہے بلکہ جس طرح حریف کی کسی کامیابی پر آدمی کا دل جلتا ہے کہ وہ اس میں حصہ دار نہیں ہو سکا اسی طرح یہ لوگ اس کو اپنی کامیابی نہیں بلکہ حریف کی کامیابی سمجھتے ہیں اور اپنی محرومی پر سر پیٹتے ہیں۔ گویا اسلام اور مسلمانوں سے ان کا کوئی رشتہ نہیں ہے [1]

غور کرو یہاں منافقین کی کیا خصوصیت بیان ہوئی ہے۔

یہ کہ لڑائی سے خود بھی جی چراتے ہیں اور دوسروں کو پست ہمت بناتے ہیں۔ قرآن نے اسے نفاق کی خصوصیت قرار دیا ہے۔ اسلام کی سربلندی اور دین حق کے غلبہ کی کوششوں میں قدموں کا سست پڑجانا اور اس کے لیے ادنیٰ ترین قربانی دینے پر بھی تیار نہ ہونا یہاں تک کہ دلوں کا اس تمنا اور آرزو سے بھی خالی ہوجانا کہ خدائی زمین پر اس کا کلمہ بلند ہو اور اس کے عطا کیے ہوئے قانونِ سعادت اور ضابطہ حیات کا بول بالا ہو کیا آج اسلامی زندگی عملاً اسی طرح کفر کے غلبہ سے گری ہوئی نہیں جس طرح وہ مدنی زندگی میں کفر کی طاقتوں سے محصور تھی۔ اور کیا آج دینِ حق کے قیام اور اسلامی طرزِ زندگی کو ایک عملی حقیقت بنانے میں جانفروشی اور ایثار و قربانی کی کچھ کم ضرورت ہے۔ اگر ہے تو پھر اس بے رخی، اعراض اور پست ہمتی کا کیا نام رکھیں گے۔ کیا ایمان بمعنے التصدیق کی علمبرداری ہمیں اس دھمکی سے بچا سکتی ہے۔

اللہ کی راہ میں جہاد ایمان کی کسوٹی ہے

۱۱۵۔ لہٰذا ان لوگوں کو جو اللہ سے آخرت کے بدلے میں دنیا کا سودا کر چکے ہیں اللہ کی راہ میں لڑنا چاہتے اور دیکھو جو بھی اللہ کی راہ میں قتال کرتا ہے اور اس کے نتیجہ میں مرتا ہے یا مارتا ہے ہم ضرور اسے اجرِ عظیم سے نوازیں گے۔ یعنی اگر منافق لوگ جہاد سے رکیں اور اپنے نشیب و فراز دنیوی کو تکتے رہیں تو تکتے رہیں مگر جو لوگ آخرت کے مقابلے میں دُنیا پر لات مار چکے ہیں ان کو چاہیے کہ اللہ کی راہ میں بے تامل لڑیں اور دُنیا کی زندگی اور اس کے مال و دولت پر نظر نہ رکھیں اور سمجھ لیں کہ اللہ

---

[1] تدبر قرآن

تعالیٰ کی اطاعت اور حکم برداری میں ہر طرح نفع ہے غالب ہوں یا مغلوب، ملے یا نہ ملے[1]
مطلب یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں لڑنا دنیا طلب لوگوں کا کام ہے ہی نہیں۔ یہ تو ایسے لوگوں کا کام ہے جن کے پیش نظر صرف اللہ کی خوشنودی ہو جو اللہ اور آخرت پر ایمان کامل رکھتے ہوں اور دنیا میں اپنی کامیابی اور خوش حالی کے سارے امکانات اور اپنے ہر قسم کے دنیوی مفادات اس امید پر قربان کرنے کے لیے تیار ہو جائیں کہ ان کا رب ان سے راضی ہوگا اور اس دنیا میں نہیں تو آخرت میں بہرحال ان کی قربانیاں ضائع نہ ہوں گی۔ رہے وہ لوگ جن کی نگاہ میں اصل اہمیت اپنے دنیوی مفاد ہی کی ہو تو درحقیقت یہ راستہ ان کے لیے نہیں ہے۔[2]
پہلی آیت میں منافقین کا ذکر تھا۔ اس کے مقابلے میں اس آیت میں ان مخلصین کاملین فی الایمان کا ذکر ہے جو اپنی جان و مال اور دنیا کو اللہ کے دین اور اسلام کے نظام کو برتر کرنے کے لیے خرچ کرتے ہیں اور اللہ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لیے اپنا سب تج کر دیتے ہیں۔ ان کا بیان دو پہلوؤں سے ہے ایک یہ کہ ان منافقین کو غیرت آئے جن کا ذکر اوپر کی آیت میں ہوا ہے کہ سب تمہارے جیسے مفاد پرست اور ابن الوقت نہیں ہیں بلکہ تمہاری ہی آنکھوں کے سامنے وہ اللہ کے بندے بھی ہیں جو اپنا تن من دھن سب کچھ اللہ کی راہ میں قربان کرنے کا عہد کر چکے ہیں اور اپنی زندگی کا مقصد اللہ کی رضا کے سوا کچھ نہیں سمجھتے، دوسرا یہ کہ اس ذکر سے ان اہل ایمان کی حوصلہ افزائی ہو جو ان منافقین کے برعکس اللہ ہی کے لیے جینے اور مرنے والے تھے۔ گویا ان دو نمونوں کو پیش کر کے بتایا گیا ہے کہ اللہ کو زندگی کا کون سا نمونہ پسند ہے۔
اس آیت میں ایک لطیف اشارہ اس حقیقت کی طرف کیا ہے کہ ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی جہاد فی سبیل اللہ ہے۔ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ انسان معبودان باطل کے مقابلے میں خدا کا بول بالا کرنے کے لیے بے تاب ہو اور اس راہ میں جان لڑانے پر آمادہ ہو جائے۔ دنیا کی اور نیکیوں میں ذاتی منفعت کی توقع اور خواہش نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے لیکن خدا کی راہ میں جاں نثاری صرف محبت کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ والدین کی خبرگیری میں رضائے الٰہی سے زیادہ والدین کی محبت کا جذبہ بھی کارفرما ہو سکتا ہے۔ غریب رشتہ داروں اور فقراء و مساکین کی امداد بنی نوع انسان کی عام ہمدردی پر مبنی ہو سکتی ہے لیکن خدا کے دین کے لیے سر دے دینا صرف رضائے الٰہی کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ [2] تفہیم القرآن

طلب کا نتیجہ ہو سکتا ہے جس میں کسی اور جذبہ کی آمیزش ممکن نہیں ہے۔

اسلام میں جہاد کے بنیادی مقاصد

۱۱۶۔ اور تمہیں کیا ہو گیا کہ اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچوں کی خاطر جنگ نہیں کرتے ہو جو کہتے ہیں اے ہمارے پروردگار ہمیں اس بستی سے جہاں کے باشندے ظالم ہیں۔ نکال اور اپنی طرف سے ہمارے لیے کسی کو ہمارا حامی بنا اور اپنی طرف سے کسی کو ہماری مدد کے لیے تیار کر یعنی دو وجہ سے تم کو کافروں سے لڑنا ضروری ہے ایک تو اللہ کے دین کو بلند اور غالب کرنے کے لیے دوسرے جو لوگ مظلوم مسلمان کافروں کے ہاتھ میں بے بس پڑے ہیں ان کو چھڑانے اور خلاصی دینے کی وجہ سے مکہ میں بہت لوگ تھے کہ حضرت کے ساتھ ہجرت نہ کر سکے۔ اور ان کے اقرباء ان کو ستانے لگے کہ پھر کافر ہو جائیں۔ سو خدا تعالیٰ نے مسلمانوں کو فرمایا کہ تم کو دو وجہ سے کافروں سے لڑنا ضروری ہے تاکہ اللہ کا دین بلند ہو اور مسلمان جو کہ مظلوم اور کمزور ہیں کفارِ مکہ کے ظلم سے نجات پائیں۔[1]

مطلب یہ ہے کہ تم ان مردوں، عورتوں اور بچوں کو کفار کے ظلم و ستم سے نجات دلانے کے لیے کیوں نہیں اٹھتے جو کفار کے اندر بے بسی کی حالت میں گھرے ہوئے اور ان سے چھوٹ کر مسلمانوں سے آملنے کی کوئی راہ نہیں پا رہے ہیں۔ جن کا حال یہ ہے کہ رات دن بے قراری کے ساتھ یہ دعا کر رہے ہیں کہ اے اللہ ہمیں ان ظالم باشندوں کی بستی سے نکال۔[2]

اس میں ان مظلوم بچوں، عورتوں، مردوں کی طرف اشارہ ہے جو مکہ میں اور عرب کے دوسرے قبائل میں اسلام قبول کر چکے تھے مگر نہ ہجرت پر قادر تھے اور نہ اپنے آپ کو ظلم سے بچا سکتے تھے یہ غریب طرح طرح سے تختۂ مشق ستم بنائے جا رہے تھے اور دعائیں مانگتے تھے کہ کوئی انہیں اس ظلم سے بچائے۔[3]

اسلام زندگی کا جامع دستور ہے

آیت میں مالکم استفہام سے مقصود ترغیب و تحریص ہے اور خطاب اہل ایمان، مخلصین اور صادقین سے ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ دین کا اسلامی تصور اس راہبانہ طرزِ فکر کے بالکل مغایر ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن [3] تفہیم القرآن

جس میں محض عبادات، ریاضات اور کشف و مراقبہ سے انسان اپنی شخصی نجات حاصل کرنا چاہتا ہے۔ کیونکہ شخصی نجات کے حصول کا یہ طریقہ انسان کو کائنات خارجی میں تبدیلی کرنے کی جدوجہد سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ حالانکہ اسلام انفس و آفاق دونوں کو مرضی الٰہی کے مطابق بدلنا چاہتا ہے کیونکہ ظاہر و باطن کائنات خارجی اور نفس انسانی دونوں ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور جب کبھی انہیں ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے نتیجہ ہمیشہ مہلک ہوتا ہے۔ انسان کے اخلاقی امراض اس کے نفس اور خارجی ماحول کے تعامل سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ ان میں سے کسی ایک سے۔ اس لیے صرف ایک کو چھیڑنے اور دوسرے سے تغافل برتنے سے اسباب مرض کبھی دفع نہیں ہو سکتے۔ جب کبھی انسان عبادات و ریاضات میں مشغول ہو کر خارجی ماحول میں تبدیلی کی ضرورت سے بے خبر ہو جاتا ہے۔ اس کی سوسائٹی میں بداخلاقی اور بدعملی کی وبا پھوٹ پڑتی ہے۔ جس سے بالآخر وہ خود اپنا دامن محفوظ نہیں کر سکتا ہے خواہ وہ راہبانہ اتقا اور زاہدانہ پارسائی کے لحاظ سے وہ کتنا ہی بلند ہو۔ اسی طرح جب وہ بیرونی دنیا پر نظر جما کر محض خارجی ماحول کی تبدیلیوں میں معاشرتی امراض کی دوا ڈھونڈھتا ہے اور اپنی باطنی اخلاقی زندگی سے غفلت برتتا ہے۔ بدی کی قوتیں بالکل غیر محسوس طور پر اس کے نفس میں پرورش پاتی ہیں اور بالآخر اپنے پورے زور و طاقت کے ساتھ خارج پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی معاشرت' اس کی سیاست اور اس کی معیشت کا گوشہ گوشہ ان کے اثرات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف عبادات و ریاضات پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اصلاح نفوس اور تزکیہ قلوب کے ساتھ ساتھ حضور نے کل نظام زندگی میں انقلاب برپا کرنے کی کوشش کی۔ اور جب کفار و مشرکین کی جانب سے آپ کی منظم مخالفت کی گئی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے محض پند و وعظ سے کام لینے کے بجائے اپنی اجتماعی قوت سے ان کا مقابلہ کیا اور اس طرح اپنے عمل سے ثابت کر دیا کہ اسلام صرف ایک نظری عقیدہ یا فلسفہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک عظیم الشان انقلابی قوت ہے جو اگر ایک طرف باطن میں نفس انسانی کی شرارتوں اور انسانی خواہشات کی بے قیدیوں کا مقابلہ کرتی ہے تو دوسری طرف ظاہر میں اپنے خارجی ماحول اور اپنی معاشرتی، سیاسی اور عمرانی زندگی کے امراض و مفسدات سے آمادہ پیکار رہتی ہے۔

قتال کے دو مقصد

آیت میں والمستضعفین کا عطف لفظ اللہ پر ہے یعنی فی سبیل اللہ والمستضعفین۔ زجاج اور

زہری سے امام قرطبی سے بھی ترکیب منقول ہے۔

اس میں قتال کے دو بنیادی مقاصد کی طرف رہنمائی کی گئی ۔

ایک یہ کہ خدا کی زمین حق پرستوں کے لیے ہے۔ کفر و ضلالت کے پرستاروں کے لیے نہیں قتال کا مقصد یہ ہے کہ دُنیا میں حق غالب ہو اللہ کے نام کا بول بالا ہو۔ دُنیا میں اسی قوم کو باقی رہنا چاہیے جو حق و ہدایت کے اعتبار سے اصلح ہو۔ غیر اصلح عقائد و اعمال کو مٹ جانا چاہیے اور قانون الٰہی کا ہاتھ بن کر بزورِ شمشیر مٹا دینا چاہیے۔ حق کا یہ حق ہے کہ باطل پر غالب آتے۔ حق کی راہ روکنے والوں سے مسلح ہو کر جنگ کی جاتے اور اس وقت تک کی جاتے جب تک کہ وہ اس راہ کو کھلا چھوڑ کر ہٹ نہ جاتے ۔

دوسرے یہ کہ دنیا سے ظلم و فساد کا خاتمہ ہو۔ جبر و تشدد اور انسانیت سوز ستم گاریوں کا سدباب ہو۔ اسلام کے قانون دان طبقہ نے قتال کے بھی دو مقصد بتاتے ہیں ایک یہ کہ اللہ کے نام کا بول بالا ہو۔ اللہ کی حکومت قائم ہو، دوسرے یہ کہ دُنیا ظلم و فساد سے خالی ہو کر امن وسلام کا گہوارہ ہو۔ قانون کی زبان میں پہلے مقصد کا نام اعلاء کلمۃ اللہ اور دوسرے مقصد کا نام دفع الشر عن العباد ہے ۔ صاحب ہدایہ علامہ برہان الدین مرغینانی نے کتاب السیر میں ان دونوں کی قانونی تشریح ان الفاظ میں کی ہے :

انما فرض لاعزاز دین اللہ و دفع الشر عن العباد

قرآن کی یہ آیت گرامی اسلام میں جنگ کے ان دوگونہ مقاصد کی توضیح کر رہی ہے۔ یہاں اعزاز دین اللہ کو فی سبیل اللہ سے اور دفع الشر عن العباد کو والمستضعفین من الرجال والنساء والولدان سے تعبیر کیا ہے۔ دوسرے موقع پر پہلے کو یکون الدین للہ اور دوسرے کو لا تکون فتنہ سے تعبیر کیا ہے مقصد یہ بتانا ہے کہ قتال کے یہ دو بنیادی مقاصد ہیں کہ اللہ کی طرف سے آئی ہوئی ہدایات اور ہدایات پر مشتمل نظام طاعت قائم ہو اور پوری زندگی میں ظلم و فساد سے خاتمہ ہو ۔

قومیت اور وطنیت اور قرآن

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ قرآن کی نظر میں زبان، قوم اور وطن کی ایمان و اسلام کے مقابلے میں کوئی قیمت نہیں ہے ہم نسب اور ہم زبان، ہم جنس اور ہم وطن لوگوں نے مل کر ایمان والوں کو جبر و تشدد اور ظلم و فساد کا نشانہ بنایا تو قرآن نے قوم سے جنگ کرنے کا اور وطن کو چھوڑ دینے کا حکم

دے دیا۔ وطن اسی وقت تک اہل ایمان کے لیے وطن کی حیثیت رکھتا ہے اور قوم اسی وقت قوم ہے جب اس کے اندر ان کے دین و ایمان کے لیے امن ہو۔ اگر دین و ایمان کو اس میں امن حاصل نہ ہو تو وہ وطن اہل ایمان کا وطن نہیں۔ اور اگر ہم نسب اور ہم زبان ایمان کی اپوزیشن بن کر سامنے آجائیں تو ہم نسب ہونے کے باوجود اہل ایمان سے ان کا کوئی ربط نہیں ہے۔

اللہ کا راستہ اور طاغوت کا راستہ

۷۶۔ جو لوگ ایمان رکھتے ہیں ان کا لڑنا اللہ کی راہ میں ہوتا ہے اور جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کا لڑنا طاغوت کی راہ میں ہوتا ہے۔ مسلمانو! تم شیطان کے ساتھیوں سے لڑو یقین کرو کہ شیطان کی چال کمزور ہوتی ہے۔ یعنی جب یہ بات ظاہر ہے کہ مسلمان اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور کافر شیطان کی راہ میں سو پھر تو مسلمانوں کو شیطان کے دوستوں یعنی کافروں کے ساتھ لڑنا بلا تامل ضروری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کا مددگار ہے کسی قسم کا تردد نہ کرنا چاہیے اور سمجھ لو کہ شیطان کا حیلہ اور فریب کمزور ہے مسلمانوں پر نہ چل سکے گا۔ اس سے مقصود مسلمانوں کو جہاد پر ترغیب دلانا اور ہمت بندھانا ہے جس کا ذکر آئندہ آیات میں بالتصریح آرہا ہے۔[1]

یہ اللہ کا دو ٹوک فیصلہ ہے۔ اللہ کی راہ میں اس غرض کے لیے لڑنا کہ زمین پر اللہ کا دین قائم ہو یہ اہل ایمان کا کام ہے اور جو واقعی مومن ہے وہ اس کام سے کبھی باز نہ آئے گا اور طاغوت کی راہ میں اس غرض کے لیے لڑنا کہ خدا کی زمین پر خدا کے باغیوں کا راج ہو۔ یہ کافروں کا کام ہے اور کوئی ایمان رکھنے والا آدمی یہ کام نہیں کر سکتا۔[2]

اس سے صاف ظاہر ہے کہ مومن کی جدّ و جہد کا مقصد یہی ہوتا ہے کہ دُنیا میں خدا کا قانون رائج ہو اور اللہ تعالیٰ کا حکم بلند ہو۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ تمام مخلوق کا مالک ہے اور اس کا قانون خالص انصاف پر مبنی ہے اور جب انصاف کی حکومت قائم ہوگی تو امن قائم رہے گا۔ دُنیا کے امن کے لیے یہ ضروری ہے کہ دُنیا میں وہ قانون رائج ہو جو خدا کا قانون ہے لہٰذا کامل مومن جب جنگ کرتا ہے تو اس کے پیش نظر یہی مقصد ہوتا ہے۔

لیکن اس کے مقابلے میں کفار کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ کفر کی ترویج ہو اور کفر کا غلبہ ہو اور طاغوتی

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

قوتیں برسرِ اقتدار آئیں تاکہ دنیا میں کفر و شرک خوب پھیلے اور چونکہ کفر و شرک شیطان کی راہیں ہیں اس لیے کافر شیطان کے کام میں اس کی مدد کرتے ہیں[1]

فی سبیل اللہ اور فی سبیل الطاغوت کہہ کر جہاد اور فساد میں ایک امتیازی لکیر کھینچ دی ہے اور بتا دیا ہے کہ سچا مسلمان جب ہتھیار اٹھاتے تو توسیع ملک کے لیے، قومی برتری کے لیے نہیں۔ تجارتی منڈیاں قائم کرنے کے نہیں، دوسروں کو نیچا دکھانے کے لیے نہیں، دوسروں پر اپنی برتری ثابت کرنے کے لیے نہیں، رشک و ہوس، جاہ پرستی کے جذبات سے متاثر ہو کر نہیں بلکہ دنیا کے بلند ترین مقصد انسانیت کے بہترین نصب العین اللہ کے نام کی برتری اور بلندی کے لیے۔ رنگ، نسل، زر بوم اور قوم، وطن، زبان اور قبیلہ کی عزت و حمیت کی خاطر نہیں بلکہ اس لیے کہ اللہ کی زمین پر اللہ کا کلمہ سر بلند کرنے اور اسلام کو غالب کرنے کے لیے۔ کائنات عالم میں خدائے واحد کی بندگی ہو، اسی کا قانون بالاتر ہو، اسی کی مرضی کی حکمرانی ہو۔ یہ ہے فی سبیل اللہ۔

اگر دنیا معبودان باطل میں لگی ہو، غیر الٰہی نظامات غالب ہوں اور اسلامی قدریں مٹ رہی ہوں پٹواری سے لے کر سربراہِ مملکت تک کی ساری مشینری اور قلم سے لے کر الاذاعۃ المرتبہ تک ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلی بغاوت کر رہے ہوں اور آپ کی محنتیں، آپ کے مال اور آپ کی جانیں اسے جما رہی ہوں اسے بچا رہی ہوں خواہ یہ آزادی کے نام پر ہو، وطن کے نام پر ہو، قوم کے نام پر ہو، یہ سب طاغوت کی راہ ہے اور اس میں جان کھپانا، وقت لگانا طاغوت کی راہ میں جان کھپانا ہے۔

---

[1] معارف قرآن م ش

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ قِيلَ لَهُمْ كُفُّوا أَيْدِيَكُمْ وَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ وَ
اٰتُوا الزَّكٰوةَ ۚ فَلَمَّا كُتِبَ عَلَيْهِمُ الْقِتَالُ إِذَا فَرِيقٌ مِّنْهُمْ
يَخْشَوْنَ النَّاسَ كَخَشْيَةِ اللّٰهِ أَوْ أَشَدَّ خَشْيَةً ۚ وَقَالُوا رَبَّنَا
لِمَ كَتَبْتَ عَلَيْنَا الْقِتَالَ ۚ لَوْلَآ أَخَّرْتَنَآ إِلٰٓى أَجَلٍ قَرِيبٍ ۗ
قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ ۚ وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّمَنِ اتَّقٰى ۟ وَلَا
تُظْلَمُونَ فَتِيلًا ﴿٧٧﴾ أَيْنَ مَا تَكُونُوا يُدْرِكْكُّمُ الْمَوْتُ وَلَوْ كُنْتُمْ
فِي بُرُوجٍ مُّشَيَّدَةٍ ۗ وَإِنْ تُصِبْهُمْ حَسَنَةٌ يَقُولُوا هٰذِهٖ
مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۚ وَإِنْ تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَقُولُوا هٰذِهٖ مِنْ عِنْدِكَ ۚ
قُلْ كُلٌّ مِّنْ عِنْدِ اللّٰهِ ۖ فَمَالِ هٰٓؤُلَآءِ الْقَوْمِ لَا يَكَادُونَ يَفْقَهُونَ
حَدِيثًا ﴿٧٨﴾ مَآ أَصَابَكَ مِنْ حَسَنَةٍ فَمِنَ اللّٰهِ ۖ وَمَآ أَصَابَكَ مِنْ
سَيِّئَةٍ فَمِنْ نَّفْسِكَ ۚ وَأَرْسَلْنٰكَ لِلنَّاسِ رَسُولًا ۗ وَكَفٰى بِاللّٰهِ
شَهِيدًا ﴿٧٩﴾

اے پیغمبر کیا آپ نے ان لوگوں کے حالات پر غور نہیں کیا جنہیں کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں کو روک لو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔" پھر جب ان پر قتال فرض کیا گیا تو اچانک ان میں سے ایک جماعت انسانوں سے اس طرح ڈرنے لگی جیسے خدا سے ڈرنا چاہیے بلکہ اس سے بھی زیادہ، اور کہتی ہے اے ہمارے مولیٰ! تو نے ہم پر جنگ فرض کیوں کر دی ہے، کیوں نہ ہمیں کچھ اور روز کی مہلت دے دی"[119]۔ اے پیغمبر کہہ دو لوگو! دُنیا کا سرمایہ تو بہت تھوڑا ہے اور آخرت خدا ترس کے لیے بہترین سرمایہ ہے، وہاں تم پر ذرہ برابر ظلم نہ کیا جائے گا[120]۔ تم کہیں بھی ہو موت تمہیں پا کر رہے گی چاہے تم اونچے اور مضبوط برجوں میں ہو[121]۔ اور اے پیغمبر جب ان کو کوئی خوشی کی حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی جانب سے ہے اور ان کو اگر بدحالی لپٹتی ہے تو کہتے ہیں

کہ یہ تمہاری طرف سے ہے[۱۲۲]۔ تم کہہ دو کہ جو کچھ بھی ہوتا ہے سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات کو سمجھنے میں سوجھ بوجھ کے قریب نہیں پھٹکتے[۱۲۳]۔ یاد رکھو بھلائی خواہ کچھ ہو جو تمہیں پیش آتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ نقصان اٹھاتے ہو وہ خود تمہاری جانب سے ہے[۱۲۴]۔ اور ہم نے لوگوں کے لیے تم کو پیغمبر بنا کر روانہ کیا ہے اور تمہارے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے[۱۲۵]۔

گفتار کے نہیں کردار کے غازی بنو

پہلی آیت میں اہلِ ایمان کی حوصلہ افزائی فرمائی تھی اور بتایا تھا کہ اہلِ ایمان کی جنگ خدا کی راہ میں ہوتی ہے اور اللہ ان کے سر پر ہوتا ہے برعکس اس کے اہلِ کفر کی جنگ شیطان کی راہ میں ہوتی ہے اور شیطان ان کے سر پر ہوتا ہے گویا اصل میں مقابلہ رحمان اور شیطان کے درمیان ہوتا ہے۔ اگر اہلِ ایمان اللہ کی وفاداری میں کوئی کمزوری نہ دکھائی تو کامیابی ان کے لیے ہے۔ اب ان کمزوریوں کی ان آیات میں نشاندہی ہو رہی ہے جن سے اہلِ ایمان کی وفاداری مشکوک ہو کر رہ جاتی ہے۔

اس دور میں کفار کے علاقوں میں مسلمانوں کی مظلومیت اور بے بسی کا جو حال تھا اس کا ذکر پہلی آیات میں آ چکا ہے۔ ان حالات سے مدینہ کے مسلمانوں میں جنگ کا احساس پیدا ہونا ناگزیر تھا۔ مسلمان اپنے اس احساس کا ذکر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کرتے تو منافقین بھی پورے

جوش وخروش سے جذبہ جنگ کا اظہار کرتے بلکہ اپنی کمزوریوں پر پردہ ڈالنے کے لیے مخلصین اہل ایمان
سے زیادہ جوش وخروش کا اظہار کرتے ۔ اور قاعدہ کی بات ہے کہ جس کا عمل کمزور ہو وہ ایک قسم کے
احساس کمتری میں مبتلا ہو جاتا ہے اور اس لیے وہ لاف زنی کیا کرتا ہے۔ چنانچہ منافقین بھی زبان
سے بڑے ولولے کا اظہار کرتے لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انہیں روکتے اور فرماتے کہ ابھی انتظار
کرو۔ نماز کے اہتمام اور زکوٰۃ کی ادائیگی سے اپنے تعلق باللہ اپنی تنظیم اور اپنے جذبہ انفاق کو ترقی دو
لیکن جب اس کا وقت آگیا اور جنگ کا حکم دیا گیا تو زبان کے ان غازیوں کا سارا جوش سرد پڑ گیا ان کی
اسی قسم کی کمزوریوں کو بے نقاب کیا گیا ہے تاکہ اہل ایمان ان کے فتنوں سے آگاہ ہو جائیں اور ان کی دو رُخہ
اندازیوں سے مسلمانوں کے اندر جو غلط اور منافیٔ توحید و اسلام رجحانات ابھر سکتے ہیں۔ ان کا اچھی طرح
ازالہ ہو جائے۔ اور اہل ایمان کو پتہ لگ جائے کہ ان کا مقصدِ حیات اگر اللہ کی بندگی ہے اور اُمتِ
مسلمہ اگر صرف اسی لیے وجود میں لائی گئی ہے کہ وہ دُنیا کے سامنے حق کی پوری شہادت دے تو اس
کی بندگی اس سے بڑی کیا ہو گی اور اس کی شہادت سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے جو اپنی جان دے
کر انجام دی گئی ہو۔ کوئی شک نہیں کہ اللہ کی یہ سب سے بڑی بندگی اور حق کی یہ سب سے اونچی شہادت
ہے۔ دوسرے لفظوں میں کہ مسلمان کے وجود کا جو مقصد ہے قتال اس مقصد کی انجام دہی کی سب سے
بڑی معیاری کوشش ہے ۔

۱۱۸۔ اے پیغمبر کیا آپ نے ان لوگوں کے حالات پر غور نہیں کیا جنہیں کہا گیا تھا کہ اپنے ہاتھوں
کو روک لو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ ادا کرو۔ مکہ میں ہجرت کرنے سے پہلے کافر مسلمانوں کو بہت ستاتے
تھے اور ان پر ظلم کرتے تھے۔ مسلمان آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر شکایت کرتے اور رخصت مانگتے
کہ ہم کفار سے مقاتلہ کریں اور ان سے ظلم کا بدلہ لیں۔ آپ مسلمانوں کو لڑائی سے روکتے کہ مجھ کو
مقاتلہ کا حکم نہیں ہوا بلکہ صبر اور درگزر کرنے کا حکم ہے اور فرماتے کہ نماز اور زکوٰۃ کا جو حکم تم
کو ہو چکا ہے اس کو برابر کیے جاؤ کیونکہ جب تک آدمی طاعت خداوندی میں اپنے نفس پر جہاد
کرنے کا اور تکالیف جسمانی کا خوگر نہ ہو اور اپنے مال خرچ کرنے کا عادی نہ ہو تو اس کو جہاد کرنا
اور اپنی جان کا دینا بہت دشوار ہے اس بات کو مسلمانوں نے قبول کر لیا تھا۔[1]
اس آیت میں کن لوگوں کا ذکر ہے یہ سوال بہت بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ قرآن کا سیاق وسباق

[1] افادات شیخ الاسلام

تو یہی کہتا ہے کہ ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے جو ایمان و یقین سے محروم اور عزم و ہمت سے تہی دست ہوتے ہیں وہ جب دیکھتے ہیں کہ عزم و ہمت کا کوئی قدم اٹھایا جا رہا ہے تو اپنی کمزوری سے خود بھی باز رہتے ہیں ان کا یہی ذکر ہو رہا ہے اور یہاں ان کی یہی کمزوری بیان ہو رہی ہے کہ پہلے یہ لوگ قتل و خون ریزی کے عادی تھے۔ اسلام نے اس سے روکا اور اعمال حسنہ کی تلقین کی۔ جب حق و صداقت کی راہ میں جنگ کا حکم دیا گیا تو منافق اور ایمان کے کچے لوگ کہتے ہیں۔ اور کچھ کی رائے ہیں یہ کہنے والے مخلصین ہیں بلکہ بعض روایات میں تو اجلہ صحابہ جیسے حضرت عبدالرحمن بن عوف کا نام بھی لے دیا۔ چنانچہ حاکم اور نسائی نے اپنی روایات میں بھی نام لیا ہے۔

اسی بنا پر کفوا ایدیکم کے مفہوم میں اختلاف ہوا ہے۔

ایک مفہوم یہ ہے کہ پہلے تو لوٹ کھسوٹ اور نفسانی لڑائیوں کے لیے ان کی تلوار ہر وقت بے نیام رہتی تھی اور رات دن کا مشغلہ ہی جنگ و پیکار تھا۔ اس وقت انہیں خون ریزی سے ہاتھ روکنے اور نماز اور زکوٰۃ سے نفس کی اصلاح کا حکم دیا گیا تھا۔ اب جو اللہ کی خاطر تلوار اٹھانے کا حکم دیا گیا تو وہ لوگ جو نفس کی خاطر لڑنے میں شیر دل تھے خدا کی خاطر لڑنے میں بزدل بنے جاتے تھے وہ دست شمشیر زن جو نفس و شیطان کی راہ میں بڑی تیزی دکھاتا تھا اب خدا کی راہ میں شل ہوا جاتا ہے۔

دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو مکہ میں قریش کے مظالم سہتے سہتے ایک زمانہ ہو گیا تھا اور قدرتاً انتقام کی خواہش ان کے دلوں میں پیدا ہو گئی تھی۔ یہ لوگ بھی آخر اسی خون اور گوشت کے بنے ہوتے تھے اور جوش میں آکر بار بار جنگ کی اجازت مانگ رہے تھے۔ ادھر وحی الٰہی بار بار ابھی عفو و حلم مصلحت اور درگزر کا سبق دے رہی تھی یہاں تک کہ ہجرت کا حکم آگیا اور مسلمان مدینے کی پر امن فضا میں منتقل ہو گئے۔ ۱۳، ۱۴ سال کی صحبت رسول کی زبردست ٹریننگ کے بعد جب علم الٰہی میں مسلمانوں کے اخلاق فاضلہ پختہ ہو گئے اور تحمل اور بے نفسی ان کے کردار کے جزو بن گئے تو حکم جہاد و قتال نازل ہوا۔ لیکن اُدھر مدینہ کی پُرامن فضا میں رہتے ہوتے مسلمانوں کے جذبات انتقام دھیمے پڑ گئے اور وہ جوش و ولولہ قتال باقی نہیں رہا تھا اب طبعی تقاضا سے میدان جنگ میں جانے سے حیلہ حوالہ ڈھونڈنے جانے لگے۔ یہاں ذکر انہی عافیت کوش مسلمانوں کا ہے کہ پہلے یہ لوگ خود جنگ کے لیے بے تاب تھے بار بار کہتے کہ ہم پر ظلم کیا جا رہا ہے۔ آخر ہم کب تک صبر کریں ہمیں مقابلہ کی اجازت دی جائے اس وقت ان سے کہا جاتا تھا کہ صبر کرو، نماز پڑھو، زکوٰۃ دو تو صبر کا یہ حکم ان پر شاق گزرتا تھا مگر اب جو لڑائی کا حکم ہوا ہے تو انہی تقاضا کرنے والوں میں سے ایک گروہ دشمنوں کا ہجوم اور

جنگ کے خطرات دیکھ کر سہما جارہا ہے۔

ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پہلے مفہوم کے اعتبار سے مخاطب منافقین ہیں اور دوسرے مفہوم کے اعتبار سے مخاطب مخلص اہلِ ایمان ہیں۔ حاکم نے مستدرک میں ان مخلصین میں سے عبدالرحمان بن عوف اور ان کے ساتھیوں کا نام بھی لے دیا ہے۔

ہماری رائے میں پہلا مفہوم صحیح ہے کیونکہ

اولاً، زرقانی کے بیان کے مطابق قتال کی اجازت ۱۲ صفر المظفر ۲ھ مطابق ۱۵ اگست ۶۲۳ء کو ہوئی ہے۔ ہجرت کی تاریخ ۱۶ ستمبر ۶۲۲ء ہے اور ربیع الاول کی ۴ تاریخ ہے۔ گویا ہجرت سے پورے ایک سال کے بعد قتال کی اجازت ہوگئی اور اس اجازت کے بعد اگست ہی کے مہینے میں غزوۂ ابوا یعنی صفر ۲ھ میں ہوا۔ ماہ ربیع الثانی مطابق ماہ اکتوبر ۶۲۳ء کو حضرت عبیدہ کی مہم پیش آئی۔ اسی ماہ میں غزوۂ بواط ہوا۔ پھر جمادی الاولیٰ مطابق نومبر ۶۲۳ء غزوۂ عشیرہ ہوا۔ غزوۂ عشیرہ سے واپسی پر دس روز کے بعد غزوۂ بدر اولیٰ ہوا۔ اس کو غزوۂ سفوان بھی کہتے ہیں۔ اسی سال رجب میں عبداللہ بن جحش کی مہم پیش آئی اور اسی سال رمضان مبارک کی ۸ تاریخ کو حضور انور غزوۂ بدر کبریٰ کے لیے مدینہ سے روانہ ہوئے۔ ۱۷ رمضان ۲ھ کو جنگ ہوئی، یہ ۲۲ فروری ۶۲۴ء کے مطابق ہے اس کے بعد ۱۵ شوال ۳ھ میں یعنی بدر سے ایک سال کے بعد اُحد کی مہم پیش آگئی۔ اس کے تین روز کے بعد ۱۷ شوال کو غزوۂ حمراء الاسد پیش آیا۔ ابھی ذی قعدہ اور ذی الحجہ ۳ھ کے مہینے اطمینان سے گزرے پھر اطلاع ملی کہ بنو اسد کے رئیس طلیحہ اور سلمہ اپنی قوم کو حضور کے خلاف جنگ کی دعوت دے رہے ہیں۔ حضور نے اس فتنہ کو دبانے کے لیے ابو سلمہ عبداللہ بن الاسد کو ڈیڑھ سو صحابہ کے ساتھ یکم محرم الحرام ۴ھ جون ۶۲۵ء میں روانہ کیا۔ صفر ۴ھ میں رجیع کا واقعہ پیش آیا۔

ثانیاً یہ سورت یعنی سورۂ نساء جس میں یہ آیت موجود ہے ۳ھ کے اواخر سے لے کر ۴ھ کے اواخر یا ۵ ہجری کے اوائل تک مختلف اوقات میں نازل ہوئی ہے۔ اگرچہ یہ تعین کرنا مشکل ہے کہ کس مقام سے کس مقام تک کی آیات ایک سلسلہ تقریر میں نازل ہوئی ہیں اور ان کا ٹھیک زمانہ نزول کیا ہے۔ لیکن بعض احکام اور واقعات کی طرف بعض اشارے ایسے ہیں جن کے نزول کی تاریخیں ہمیں روایات سے معلوم ہوتی ہیں اس لیے ان کی مدد سے ہم ان مختلف آیات کی ایک سرسری سی حد بندی کر سکتے ہیں جن میں یہ احکام اور اشارے واقع ہوتے ہیں۔ مثلاً مدینہ سے بنی نضیر کا اخراج ربیع الاول ۴ھ میں ہوا اس لیے غالب گمان یہ ہے کہ جن آیات میں

یہودیوں کو آخری تنبیہہ کی گئی۔ امنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم من قبل ان نطمس۔ اس سے پہلے قریبی زمانے میں نازل ہوئی ہوں گی اور اس کے بعد جو آیات منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہیں وہ بھی اسی زمانے میں نازل ہوئی ہیں کیونکہ منافقین بھی اہل کتاب میں سے مسلمان ہو کر آئے ہوئے لوگ تھے۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ ہجرت کے شروع سے لے کر ۸ھ تک اہل ایمان کو پُرامن فضا میں وقت گزارنے کا کب موقعہ ملا کہ ان کے اس فضا میں جذبات سرد پڑ گئے اور وہ جوش و ولولہ باقی نہ رہا۔ کم از کم تاریخ کے طالب علم کی حیثیت سے ۱ھ سے ۸ھ تک کا کوئی سال کوئی ماہ کوئی ہفتہ اور کوئی دن ہمارے علم میں ایسا نہیں جسے ہم ان کے حق میں پُرامن فضا کہہ دیں جس میں رہ کر معاذ اللہ وہ میدان جنگ سے بچنے کے لیے حیلے حوالے ڈھونڈھنے لگے۔ اوروں کا پتہ نہیں لیکن میرا ذوقِ ایمان تو صحابہ کرام کے بارے میں یہ بات قبول کرنے کو تیار نہیں۔ یہ تو تاریخی حقائق کی تکذیب ہے۔ عکرمہ کی روایت خواہ سند کے اعتبار سے کتنی صحیح ہو مگر قابل قبول نہیں ہے۔ یہ ایک طرف صحابہ کے کردار پر حرف لاتی ہے دوسری طرف تاریخ کی تکذیب کرتی ہے۔ حاکم کا محدثین کی بارگاہ میں خواہ کوئی مقام ہے لیکن صحابہ کے معاملہ میں اس کی تشیع والی حس ضرور پھڑ پھڑاتی ہے۔ اس لیے ہماری رائے میں اس کے مخاطب بھی کمزور قسم کے لوگ ہیں۔

جنگ گریز رجحانات کی نمائش

۱۱۹۔ پھر جب ان پر قتال فرض کیا گیا تو اچانک ان میں سے ایک جماعت انسانوں سے اس طرح ڈرنے لگی جیسے خدا سے ڈرنا چاہیے بلکہ اس سے بھی زیادہ اور کہتی ہے کہ اے ہمارے پروردگار تو نے ہم پر جنگ کیوں فرض کر دی۔ کیوں نہ ہمیں کچھ اور روز کی مہلت دے دی۔ یعنی ہجرت کرنے کے بعد جب مسلمانوں کو کافروں سے لڑنے کا حکم ہوا تو ان کو تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ ہماری درخواست قبول ہوئی اور مراد ملی مگر بعضے کچے مسلمان کافروں کے مقابلہ سے ایسے ڈرنے لگے جیسا کہ اللہ کے عذاب سے ڈرنا چاہیے یا اس سے زیادہ آرزو کرنے لگے کہ تھوڑی مدت میں اور بھی قتال کا حکم نہ آتا اور ہم زندہ رہتے تو خوب ہوتا[1]

جن شارحین قرآن نے اسے مخلصین کے حق میں بتایا ہے ان کو یہاں تشریح و تفسیر میں قدم قدم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پر مشکلات سے دوچار ہونا پڑا۔ کسی نے کہا کہ یہ خوف طبعی تھا اس لیے اس پر کوئی گناہ نہیں ہے اور کسی نے قالوا کی یہ تاویل کی کہ مسلمانوں کی زبان سے یہ قول بطورِ تمنا کے کہا بطورِ اعتراض نہ تھا اور کوئی بولا کہ یہ قول اگر زبان سے تھا جب بھی چونکہ درجہ تمنا میں تھا اعتراض و انکار اس سے مقصود نہ تھا اس لیے قابل مواخذہ جب بھی نہ تھا لیکن خود لفظ قالوا سے یہ لازم نہیں آتا کہ زبان سے بھی ادا کیا گیا ہو۔ قول عربی جس طرح کلامِ لسانی کے لیے آتا ہے اسی طرح حدیث نفس کے لیے بھی اور علمِ الٰہی میں یہ دونوں برابر ہیں اور حدیثِ نفس یا وسوسہ کا معصیت نہ ہونا بالکل ظاہر ہے اس لیے شارحین قرآن نے یہاں حدیثِ نفس مراد لی ہے۔ لیکن ہم پہلے بتا چکے ہیں کہ آیت میں فریق سے مراد وہی منافقین ہیں۔ یہ ان صحابہ کے احوال کی عکاسی نہیں ہے جن کے جنتی ہونے کی دنیا میں اللہ کی وحی نے گواہی دے دی ہے۔

اسلامی جنگ کا نماز سے تعلق

اس پوری آیت سے کہ پہلے اہل ایمان کو نماز اور روزے کا حکم دیا گیا تھا بعد ازیں قتال کی فرضیت آئی یہ بات نکلتی ہے کہ اسلامی جنگ کی روح اور نماز اور زکوٰۃ میں نہایت گہری مناسبت ہے۔ جو لوگ خدا کی راہ میں لڑنے کے لیے تیار ہو رہے ہوں ان کے لیے اسلحہ کی ٹریننگ سے زیادہ ضروری اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہے۔ جہاد میں جو للہیت، اخلاص اور نظم و طاعت کی جو پابندی مطلوب ہے اس کی بہترین تربیت نماز سے ہوتی ہے اور اس کے لیے انفاق فی سبیل اللہ کا جو جذبہ درکار ہے وہ ایتائے زکوٰۃ کی پختہ عادت سے نشوونما پاتا ہے۔ ان صفات کے بغیر اگر کوئی گروہ جہاد کے لیے اٹھ کھڑا ہو تو اس جنگ سے کوئی اصلاح وجود میں نہیں آسکتی ہے۔ اس سے صرف فساد فی الارض میں اضافہ ہو سکتا ہے اسی وجہ سے اسلامی جنگ کے سخت سے سخت حالات میں بھی نماز کے اہتمام و التزام کی تاکید ہوتی ہے۔

دنیا و آخرت کا تقابلی مطالعہ

۱۲۰۔ اے پیغمبر کہہ دو لوگو! دنیا کا سرمایہ بہت تھوڑا ہے اور آخرت خدا ترس لوگوں کے لیے بہترین سرمایہ ہے، وہاں تم پر ذرہ برابر ظلم نہ ہوگا۔ یعنی چونکہ حیات اور منافع دنیوی کی رغبت کے باعث ان لوگوں کو حکمِ جہاد بھاری معلوم ہوا تو اس لیے حق تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان سے کہہ دو کہ دنیا کے تمام منافع حقیر اور سریع الزوال ہیں اور ثواب آخرت کا بہترین ہے ان کے لیے جو اللہ کی

نافرمانی سے پرہیز کرتے ہیں لہٰذا تمہیں چاہیے کہ منافع دنیوی کا لحاظ نہ کرو اور اللہ تعالیٰ کی فرمانبرداری میں کوتاہی نہ کرو اور جہاد کرنے سے نہ ڈرو اور اطمینان رکھو کہ تمہاری محنت وجانفشانی کا ثواب ادنیٰ سا بھی ضائع نہ ہوگا لہٰذا تم کو ہمت اور شوق سے جہاد میں مصروف ہونا چاہیے [1]

یہاں دو باتوں کا سمجھ لینا ضروری ہے۔

آخرت لامحدود اور دنیا محدود ہے

ایک یہ کہ آخرت کے مقابلے دنیا کو قلیل کہا گیا ہے۔ وجہ یہ ہے کہ انسان ماں کے پیٹ سے لامحدود خواہشیں لے کر آیا ہے۔ اتنی لامحدود خواہشیں ہیں کہ ان کی پابجائی دنیا کا موجودہ سرمایہ نہیں کرسکتا کیونکہ وہ محدود ہے۔ انسانی فطرت کے لامحدود تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے لامحدود سامان کی ضرورت ہے۔ آخرت کے بارے میں قرآن نے بتایا ہے:

لکم فیھا ما تشتھی انفسکم و لکم فیھا ما تدعون

تمہارے لیے وہ سب کچھ ہے جو تم چاہو اور وہ سب کچھ ہے جو تم مانگو گے

موجودہ زندگی میں انسان کے اندر لامحدود تمنائیں رکھی گئی ہیں اور محدود شکل میں یہاں کچھ آرزوئیں پوری کردی گئی ہیں۔ اس طرح انسان میں آخرت کی لامحدود طلب کا جذبہ ابھار دیا ہے۔ گویا پیاس بھی ہے اور پیاسے کو چند گھونٹ پلا بھی دیے گئے ہیں۔ پینے کی اس لذت سے مانوس ہونے بلکہ پیاس کے بھڑک جانے کے بعد نہ ختم ہونے والی لامحدود تمناؤں اور آرزوؤں کے متعلق ایک طرف یہ اعلان کردیا کہ متاع الدنیا قلیل اس لیے اس سے اس کی تسکین ناممکن ہے۔ دوسری طرف بتادیا کہ آدمی کو اس کی خاطر اس قوت وقدرت کے لازوال چشمہ کی تلاش میں نکلنا چاہیے۔ جس کی لامحدودیت کی شہادت کائناتی حقائق کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے۔ جہاں لامحدود کمالات رکھنے والی اپنے لامحدود کمالات کا مظاہرہ کرے گی۔ انسانی احساسات اپنے اردگرد پس وپیش اندر باہر ہر لمحہ ہر لحظہ ایسے نت نئے تجلیات کو مسلسل بغیر کسی انقطاع کے پاتے جائیں گے جن کی نہ کوئی حد ہوگی نہ انتہا۔ اور اس طرح لامحدود مطالبات والی فطرت کو لامحدود مطلوبات سے متمتع ہونے اور لذت یاب ہونے کا موقعہ ابدالاباد تک ملتا جائے گا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آخرت کا حقیقی نظریہ کیا ہے

دوسری یہ کہ آخرت کا تصور جس پر اسلام کا کل عملی اور فکری نظام قائم ہے اپنے نتائج کے لحاظ سے انسانی زندگی کے لیے سودمند ہے۔ جب کبھی تاریخ کے کسی دور میں انسان نے اس تصور کو اس کے صحیح مفہوم کے ساتھ مخلصانہ طور پر قبول کیا اور اس کے مقتضیات کو پورا کرنے کی کوشش کی اس کی زندگی میں ایک عظیم الشان انقلاب رونما ہو گیا۔ آخرت کا صحیح تصور یہ نہیں ہے کہ یہ دنیا بے حقیقت ہے لہٰذا میاں جیسی بھی گزرتی ہے گزر جانے دو بلکہ آخرت کا حقیقی نظریہ یہ ہے کہ کائنات عالم کو اللہ سبحانہٗ کی مرضی کے مطابق چلانے میں مخالف قوتوں کے خلاف جو جدوجہد کرنی پڑے گی اور اس میں جو جو تکالیف اور آزمائشیں آئیں گی ان سے زیادہ متاثر نہ ہونا چاہیے کیونکہ یہ تمام تکالیف و مصائب یہ تمام جانکاہیاں اور مایوسیاں آخرت کے اس اجر و انعام کے مقابلہ میں کوئی وزن نہیں رکھتی ہیں جو اللہ سبحانہٗ نے ان انسانوں کے لیے مختص کر دیا ہے جو کائنات عالم میں اس کے منشا کو پورا کرنے کے لیے اپنے جان و مال کی بازی لگاتے ہیں۔ قرآن نے یہ کبھی نہیں کہا کہ یہ دُنیا بے حقیقت ہے لیکن اس نے اس بات پر یقیناً زور دیا کہ آخرت کے مقابلے میں یہ دنیا ہیچ ہے قل متاع الدنیا قلیل والاخرۃ خیر لمن اتقیٰ یعنی جس طرح ایک اعلیٰ حقیقت کے سامنے ادنیٰ تر حقیقت کوئی وقعت نہیں رکھتی ہے اسی طرح آخرت کے مقابلے میں یہ دنیا بے قیمت ہے لیکن اس کے یہ معنے ہرگز نہیں ہیں کہ دنیا مطلقاً بے حقیقت ہے کیونکہ انسان ادنیٰ تر حقیقت سے گزر کر اعلیٰ تر حقیقت تک پہنچ سکتا ہے اسی طرح آخرت اگرچہ اس دنیا سے بہتر اور زیادہ حقیقی ہے مگر اسی دُنیا کی زندگی میں حصہ لے کر انسان اپنی آخرت سنوار سکتا ہے نہ کہ اس دُنیا سے بے تعلق اور الگ ہو کر۔ آخرت کے اس تصور کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان دُنیا کو اپنی دینی زندگی کے لیے قابل اجتناب نہ سمجھے، مادے کو اپنی رُوح کے قفس نہ گمان کرے۔ اپنی ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کو خدا پرستی کی راہ کی آفت نہ خیال کرے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسائل زندگی سے کنارہ کش ہو کر رہنے دنیا چھوڑ دینے اور اللہ کو پا لینے کے لیے گوشہ نشینی کی روش اختیار نہ کرے جسے رہبانیت کہتے ہیں بلکہ اسے چاہیے کہ مسائل حیات سے پوری طرح متعلق رہے۔ متاہل اور متمدن زندگی گزارے آبادی سے جنگلوں کی طرف نہیں بلکہ جنگلوں سے آبادی کی طرف رہے اور یہ سب کچھ اس عزم و یقین کے ساتھ کرے کہ آخرت میں مجھ سے اس کی بازپرس ہوگی۔

فرائض کی ادائیگی میں موت سے نہ ڈرو

۱۲۱۔ تم کہیں بھی ہو موت تمہیں پا کر رہے گی چاہے تم اونچے اور مضبوط برجوں میں ہو۔ یعنی کیسے ہی مضبوط اور محفوظ و مامون مکان میں رہو مگر موت تم کو کسی طرح نہ چھوڑے گی کیونکہ موت ہر ایک کے واسطے مقدر اور مقرر ہو چکی ہے، اپنے وقت پر ضرور آئے گی کہیں ہو لہٰذا اگر جہاد میں نہ جاؤ گے تو بھی موت سے ہرگز نہیں بچ سکتے تو اب جہاد سے گھبرانا اور موت سے ڈرنا اور کافروں کے مقابلہ سے خوف کرنا بالکل نادانی اور اسلام میں کچے ہونے کی علامت ہے۔ لہ

اس سے یہ بات ذہن نشین کرنا مقصود ہے کہ موت کے خوف سے جنگ میں نہ جانا فضول ہے کوئی شخص نہ تو اللہ کے مقرر کیے ہوتے وقت سے پہلے مر سکتا ہے اور نہ اس کے بعد جی سکتا ہے اور نہ مضبوط تر حفاظت کا سامان موت سے کسی کو بچا سکتا ہے لہٰذا تم کو فکرِ موت سے بچنے کی نہیں بلکہ اس بات کی ہونی چاہیے کہ زندگی کی جو مہلت تمہیں ملی ہے اس میں فریضہ کی ادائیگی ہو جاتے۔ اگر جنگ میں مرنے سے بچ بھی جاؤ تو بالآخر موت سے تو نہیں بچ سکتے خواہ زندگی کے لیے کتنا ہی حفاظت کا سامان کر لو۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ زندگی کی حفاظت نہ کرنی چاہیے۔ زندگی اللہ کی دی ہوتی ایک نعمت ہے اس کی قدر کرنی چاہیئے۔ دیکھنا یہ چاہیئے کہ جس مقصد کی خاطر دینے والے نے زندگی عطا فرمائی ہے اس کی پابجائی کہاں تک ہو رہی ہے۔

علامہ قرطبی نے آیت کے مدلول سے جو نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ جان و مال کی حفاظت کی خاطر شہروں کی تعمیرات اور ان کی بناوٹ قرآن کے نقطہ نظر سے توکل کے منافی نہیں ہے۔ قرطبی نے تو اس آیت کے مدلول سے یہ معلوم کیا ہے کہ شہروں کی آبادکاری توکل کے منافی نہیں ہے۔ دوسرے علماء نے تو زمین کی آبادکاری کو ان فرائض میں داخل کر دیا ہے جن کی بجاآوری پر جنت کی آبادی کے وعدے ہیں۔ آخرت کو آباد کرنے کے لیے دُنیا کو آباد کرو کے نظریہ کی قرآن کے سوا کسی نے دعوت نہیں دی ہے۔ صوفیانہ نقطہ نظر سے حضرت علاء الدولہ سمنانی نے اسلامی نظریات کی شرح کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ،

اگر کوئی اپنی کاہلی سے زمین کی آبادکاری چھوڑ بیٹھا ہو اور اس کا نام اس نے توکل

لہ افادات شیخ الاسلام

اور زہد رکھ لیا ہو تو یہ شیطان کی پیروی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ (نفحات الانس)

رسالت خدا کی رہنمائی میں کام کرتی ہے

۱۲۲۔ اور اے پیغمبر جب ان کو کوئی خوشی کی حالت پیش آتی ہے تو کہتے ہیں یہ اللہ کی جانب سے ہے اور ان کو اگر بدحالی پہنچتی ہے تو کہتے ہیں کہ یہ تمہاری طرف سے ہے۔ یعنی ان منافقین کا اور عجیب حال سنو۔ اگر تدبیر لڑائی کی درست آئی اور فتح ہوئی اور غنیمت کا مال ہاتھ آگیا تو کہتے ہیں کہ یہ خدا کی طرف سے ہے یعنی اتفاقی بات ہو گئی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر کے قائل نہ ہوتے۔ اور اگر تدبیر بگڑ جاتی اور ہزیمت و نقصان پیش آجاتا تو الزام رکھتے تھے آپ کی تدبیر پر۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ ان کا حال یہ تھا کہ جب تک بات بنی رہتی یہ لوگ برابر اہل ایمان کے ساتھ رہتے اور کہتے کہ یہ تو عین فضل خداوندی ہے جس میں ہم تم سب شریک ہیں اور جب بات بگڑ جاتی تو فوراً الزام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر رکھ دیتے کہ یہ جو کچھ بھی پیش آیا ہے، سب آپ ہی کی بے تدبیریوں کا نتیجہ ہے۔ گویا جب فتح وظفر اور کامیابی و سرخروئی نصیب ہوتی ہے تو اسے اللہ کا فضل قرار دیتے اور بھول جاتے ہیں کہ ان پر یہ فضل نبی ہی کے ذریعہ سے ہوا ہے مگر جب خود اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کے سبب سے کہیں شکست ہوتی ہے اور بڑھتے ہوئے قدم پیچھے ہٹنے لگتے ہیں تو سارا الزام نبی کے سر تھوپ دیتے ہیں اور خود بری الذمہ ہو جاتے ہیں۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ یہ لوگ نہ تو یہ مانتے تھے کہ کائنات میں صرف خدا ہی کی مشیت کارفرما ہے اور نہ یہ مانتے تھے کہ رسول کا ہر کام خدا کے حکم کے تحت ہوتا ہے بظاہر تو آپ کی رسالت کا اقرار کرتے تھے لیکن باطن میں ان کے یہی خیال چھپا رہتا تھا کہ آپ سارے کام اپنی رائے اور تدبیر سے کرتے ہیں۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جو شخص جماعت کی پیشوائی و ریاست کا منصب رکھتا ہے اسے کیسے کیسے دشواریوں میں سے گزرنا پڑتا ہے وہ جب عزم و عمل کی دعوت دیتا ہے تو ایک گروہ ایسے لوگوں کا پیدا ہو جاتا ہے جو یقین کا کچا اور ہمت کا کمزور ہوتا ہے وہ اطاعت کی جگہ مخالفت کی روش اختیار کرتا ہے۔ پھر جب اس صورت حال کی وجہ سے کوئی ناکامی پیش آتی ہے تو بجائے اس کے کہ اپنی بدعملیوں پر نادم ہوں سارا الزام رئیس جماعت کے سر ڈال دیتے ہیں اور مخالفت کا ان کو ایک نیا بہانہ ہاتھ آجاتا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اللہ کے قوانین سے ناواقفیت

۱۲۳- تم کہہ دو کہ جو کچھ ہوتا ہے سب اللہ کی طرف سے ہوتا ہے، پھر ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ بات کو سمجھنے میں سوجھ بوجھ کے قریب نہیں پھٹکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ان کو جواب دے دو کہ بھلائی اور برائی سب اللہ کی طرف سے ہے سب باتوں کا موجد اور خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اس میں کسی دوسرے کو دخل نہیں اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کی تدبیر بھی اللہ ہی کی طرف سے ہے اور اللہ ہی کا الہام ہے تمہارا الزام رکھنا نبی پر سراسر غلط اور کم فہمی ہے اور بگڑی کو بگڑی نہ سمجھو یہ اللہ کی حکمت ہے وہ تم کو سدھاتا ہے اور آزماتا ہے، تمہارے قصوروں پر۔ یہ جواب اجمالی ہوا منافقین کے الزام کا آئندہ آیت میں اس کی تفصیل آرہی ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ یہاں جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ اسباب کے تحت ہو رہا ہے سب کچھ اللہ کر رہا ہے، حسنہ ہو یا سیئہ ہو کامیابی ہو یا ناکامی سب کا تعلق اللہ کی ذات سے ہے۔ اسباب اور مسببات کی یہ لڑی اللہ نے اپنے قوانین کے تحت قائم کر رکھی ہے۔ خبر نہیں کہ ان کی عقلوں کو کیا ہو گیا کہ بات کی تہ کو نہیں پہنچتے، ہر بات کو محض سطحی مطالعہ کرنے میں اس کی گہرائی میں نہیں پہنچتے ہیں۔ ان میں مادی مزاج اپنا رنگ دکھا رہا ہے۔ یہ مزاج ہمیشہ ساری خوشحالیوں اور خوش بختیوں کو اپنے علم و لیاقت اور اپنی ذہانت و محنت کی طرف منسوب کرتا ہے لیکن ایمانی طرزِ فکر یہ ہے کہ اس کائنات میں تصرف کرنے والا صرف اللہ کا ارادہ ہے وہی اسباب کا خالق ہے اور جب چاہے حالات کو پلٹ سکتا ہے کیونکہ اسباب کی اس پر حکومت نہیں بلکہ اسباب پر وہ حکمران ہے۔ دیکھنے کی چیز ظاہری اسباب نہیں بلکہ وہ خالق و مالک ہے جس کے ہاتھ میں ان سارے اسباب و وسائل کی ڈور ہے۔

لا یکادون یفقہون حدیثا میں اشارہ ہے کہ ہوشیار اور عقل مند آدمی بات کی تہ تک پہنچتا ہے ظاہر کے حرفی ڈھانچہ تک نہیں رہتا ہے۔

فقاہت اور روایت

یہیں سے فقاہت اور تحدیث میں فرق سمجھ میں آجاتا ہے روایت نام ہے الفاظ کو محفوظ کر لینے کا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور فقاہت کہتے ہیں مدلول ظاہری سے گزر کر بات کی گہرائی اور متکلم کی مراد کو پالینے کو۔ اس لیے قدرتی طور پر علماء کی بھی دو قسمیں ہیں ایک عالم جزئیات اور دوسرا عالم کلیات۔ یعنی ایک وہ جو نص کے ملفوظ ظاہری کا نگران ہو اور جس کی مدلول ظاہری تک محدود ہوں اور دوسرا وہ جس کی عمیق نگاہ اس کی ظاہری سطح تک پہنچ کر اس کلیہ کا بھی پتہ لگاتے جس کے وسیع سلسلے میں یہ جزئیہ بطور ایک فرد کے موجود ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

آپ کی اُمتوں میں عُلماء دو قسموں میں منحصر ہیں ایک حفاظِ حدیث دوسرے فقہا جو احکام کے استنباط کا کام کرتے ہیں۔ حلال و حرام کے قواعد منضبط کرتے ہیں۔ ان لوگوں کی مثال اہلِ زمین کے لیے آسمان کے ستاروں کی ہے۔ لوگوں کو ان فقہائ کی کھانے اور پینے سے زیادہ ضرورت ہے اور لوگوں پر ان کی اطاعت والدین کی اطاعت سے زیادہ فرض ہے۔

اس کا راز اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ فقہائ کلام الٰہی اور کلام نبوی کی اس جامعیت اور معجزانہ بلاغت کو کھولتے ہیں۔ گویا ایک فقیہ کے ذریعے کلام الٰہی کی وجوہ اعجاز نمایاں ہوتی ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ علم ادنیٰ حفظ و روایت ہے اور علم حقیقی فقہ و درایت ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ کے آغاز میں اسے نہایت شاندار انداز میں سمجھایا ہے۔ ارشاد ہے:

اس علم کے کچھ طبقے ہیں اور اس کے جاننے والوں میں باہم کچھ درجات ہیں۔ اس علم میں کچھ چھلکے اور کچھ مغز یا کچھ سیپی اور کچھ موتی کے درجے کے ہیں۔

آگے اپنے نقطہ نظر کو کھول کر سمجھاتے ہیں:

چھلکوں میں ظاہر کے بہت نزدیک احادیث کے بارے میں یہ علم کہ صحیح ہے یا ضعیف، مشہور ہے یا غریب اس کے علم بردار بڑے بڑے محدثین اور حفاظِ حدیث ہوئے ہیں اس کے بعد ایک اور بھی علم ہے جس کے ذریعے حدیث کے معانی تک دسترس ہوتی ہے۔ احکام استنباط کیے جاتے ہیں۔ منطوق، مدلول اور مفہوم کلام سے منصوص حکم پر قیاس کیا جاتا ہے۔ منسوخ اور محکم راجح اور مرجوح کا علم ہوتا ہے۔ اس علم کی حیثیت عام علماء کے نزدیک مغز اور موتی کی ہے۔ فقہائ محققین کا یہی کام ہے۔

اچھائی فضل الٰہی اور بُرائی انسان کا عمل ہے

۱۲۴۔ یاد رکھو کہ بھلائی خواہ کچھ ہو جو تمہیں پیش آتی ہے وہ اللہ کی طرف سے ہے اور جو کچھ نقصان

اٹھاتے ہو وہ خود تمہاری جانب سے ہے یعنی اصل بات یہ ہے کہ بھلائی اور بُرائی کا موجد ہر چند اللہ تعالیٰ ہے مگر بندے کو چاہیے کہ نیکی اور بھلائی کو حق تعالیٰ کا فضل اور احسان سمجھے۔ اور سختی اور بُرائی کو اپنے اعمال کی شامت سمجھے۔ اس کا الزام پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم پر نہ رکھے۔ پیغمبر ان امور کے لیے نہ موجد ہے نہ سبب بلکہ موجد تو اللہ تعالیٰ ہے اور سبب تمہارے عمل ہیں[1] یہاں عام ذہنوں میں یہ خلش پیدا ہوتی ہے کہ ـــــ اس سے پہلی آیت میں یہ بتایا گیا تھا کل من عند اللہ بھلائی ہو یا بُرائی اللہ کی جانب سے ہے اور اس آیت میں ارشاد ہوا ہے کہ بھلائی اللہ کی جانب سے ہے اور بُرائی بندے کی جانب سے ہے۔ اس خلش کو دُور کرنے کے لیے شارحین قرآن نے متعدد جوابات دیے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ پہلی آیت میں من عند اللہ ہے اور یہاں من اللہ ہے۔ زبان وادب کے ماہرین نے دونوں میں فرق یہ کیا ہے کہ من عند اللہ بُرے بھلے سارے افعال تکوینی کے لیے عام ہے بخلاف اس کے من اللہ کا استعمال صرف محل رضا میں ہوتا ہے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ یہاں حسنہ سے مراد نعمت اور خوشحالی ہے اور سیئہ سے مصیبت اور بدحالی ہے۔ گویا یہ آیت خاص ہے اور پہلی عام ہے۔ اور کچھ کی رائے ہے کہ اصل تو یہی ہے کہ خیر و شر ہر چیز کا ظہور خدا ہی کی مشیت سے ہوتا ہے اس کے حکم واذن کے بغیر کوئی چیز بھی ظہور میں نہیں آتی لیکن خیر و شر میں یہ فرق ہے کہ خیر خدا کی رحمت کا اقتضا ہوتا ہے اور شر انسان کے اپنے اعمال پر مترتب ہوتا ہے۔ اس پہلو سے شر کا تعلق انسان کے اپنے نفس سے ہے اور کچھ نے بتایا ہے کہ اگر عالم اسباب سے قطع نظر کرکے فاعل حقیقی اور مسبب الاسباب کی طرف خیال کرو تو ہر بھلائی اور بُرائی کا خالق اور موجد صرف وہی ہے۔ اس اعتبار سے تمہارا بھلائی اور بُرائی میں تفرقہ کرنا کہ یہ بھلائی تو اللہ کی طرف سے ہے اور یہ بُرائی رسُول کی طرف سے ہے سراسر حماقت ہے۔ اور اگر عالم اسباب پر نظر کرتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ عالم اسباب میں تم کو جو خیر اور بھلائی پہنچتی ہے وہ محض اللہ کا فضل و احسان ہے اور اگر تم کو کوئی بُرائی اور تکلیف پہنچتی ہے تو سمجھ لو کہ وہ تمہارے اعمال بد کا نتیجہ ہے۔

دراصل یہ آیت یہاں جس موقعہ پر آئی ہے اس میں دو باتوں کو بیان کرنا مقصود ہے ایک یہ کہ یہاں شگون اور شوم کی تردید مقصود ہے اور بتانا یہ ہے کہ برائیاں جس قدر ہیں ان کا شوم اور شگون سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ ایسا سمجھنا جہالت اور نادانی ہے۔ دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ جس شخص پر جو افتاد آتے اسے چاہیے کہ اس کا سبب اپنے اندر تلاش کرے اپنے سے باہر دوسروں

[1] افادات شیخ الاسلام

کے جیب دامن میں نہ تلاش کرے۔

رسالت پوری انسانیت کے لیے بھلائی ہے

۱۲۵۔ اور ہم نے آپ کو لوگوں کے لیے پیغمبر بنا کر روانہ کیا ہے اور تمہارے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے۔ حق تعالیٰ رسول سے منافقوں کے الزام کو دور فرما کر ارشاد کرتا ہے کہ ہم نے تم کو تمام لوگوں کے لیے رسول کر کے روانہ کیا ہے اور ہم کو سب کچھ معلوم ہے ہم سب کے اعمال کا بدلہ دیں گے تم کسی کے بیہودہ انکار والزام کی پروا نہ کرو اپنی رسالت کا کام کیے جاؤ۔[1]

پہلے ارشاد ہوا تھا کہ حسنہ اور خوشحالی اللہ کی جانب سے ہے۔ یہاں فرمایا ہے کہ ہم نے لوگوں کی بھلائی کی خاطر آپ کو روانہ کیا ہے۔ یعنی اللہ نے آپ کو روانہ فرما کر لوگوں کے ساتھ بھلائی کا ارادہ فرمایا ہے۔ آپ کا وجود گرامی پوری انسانیت کے لیے اللہ کی بہت بڑی بھلائی ہے۔ اسی بات کو ظاہر کرنے کے لیے ارسلنٰک الی الناس کی تعبیر چھوڑ کر خاص اندازِ بیان اختیار کیا ہے یعنی ارسلنٰک للناس لام منفعت کے لیے آتا ہے۔

اور للناس فرمایا للعرب نہیں فرمایا۔ بتانا یہ ہے کہ آپ کی رسالت پوری انسانیت کے لیے ہے اور آپ کا پیغام کسی قوم، کسی ملک کے لیے خاص نہیں بلکہ معیاری قوموں اور سارے ملکوں کے لیے عام ہے۔ گویا آپ کی ذات کو روانہ فرما کر اللہ سبحانہٗ نے پوری کائنات کے لیے ارادۂ رحمت فرمایا ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مَنْ يُطِعِ الرَّسُولَ فَقَدْ أَطَاعَ اللَّهَ ۖ وَمَنْ تَوَلَّىٰ فَمَا أَرْسَلْنَاكَ عَلَيْهِمْ
حَفِيظًا ﴿٨٠﴾ وَيَقُولُونَ طَاعَةٌ فَإِذَا بَرَزُوا مِنْ عِنْدِكَ بَيَّتَ
طَائِفَةٌ مِنْهُمْ غَيْرَ الَّذِي تَقُولُ ۖ وَاللَّهُ يَكْتُبُ مَا يُبَيِّتُونَ ۖ
فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ وَتَوَكَّلْ عَلَى اللَّهِ ۚ وَكَفَىٰ بِاللَّهِ وَكِيلًا ﴿٨١﴾
أَفَلَا يَتَدَبَّرُونَ الْقُرْآنَ ۚ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللَّهِ لَوَجَدُوا
فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا ﴿٨٢﴾

جس نے بھی رسول کی اطاعت کی اس نے فی الواقع اللہ کی اطاعت
کی ہے اور جس کسی نے روگردانی کی تو اے پیغمبر ہم نے تم کو ان پر
نگران بنا کر روانہ نہیں کیا[۱۲۶]۔ یہ لوگ آپ کے سامنے تو طاعت
کا دم بھرتے ہیں لیکن جب آپ کے پاس سے ہٹ کر باہر جاتے
ہیں تو ان میں سے کچھ لوگ راتوں کو اپنی مجلسی زندگی میں آپ کے
ارشادات کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور اللہ ان کی سرگوشیاں

لکھ رہا ہے، آپ ان سے بے رُخ ہو جائیے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے
اللہ کی کارسازی کافی ہے[۱۲۷]۔ کیا یہ لوگ قرآن کے معانی پر غور نہیں
کرتے ہیں۔ اگر اللہ کے علاوہ کسی دوسرے کی طرف سے ہوتا تو
بلاشبہ اس میں بہت اختلاف پاتے۔[۱۲۸]

اسلام کے نظامِ حیات کی اصلی اساس

تاریخی حیثیت سے بھی اور قرآن کے نقطۂ نظر سے اسلامی نظامِ حیات کا قیام اور اسلام کے سیاسی نظام کی تکوین ایک عہد و پیمان کے ذریعے عمل میں آئی تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ظہور و بعثت کے بعد جو لوگ مکہ میں اسلام لاتے وہ اس نظام کے اوّلین ارکان تھے جس نے مکہ کی ابتدائی اور منتشر صورت سے نکل کر مدینہ میں منظم اور مربوط صورت اختیار کر لی اور جس سے بطور نتیجہ اسلام کا سیاسی نظام وجود میں آیا۔ یہ لوگ جو مکہ میں اسلام لاتے تھے۔ اسلام لانے سے قبل ایک ایسے معاشرے کے افراد تھے جسے قرآن کی زبان میں جاہلیت کہتے ہیں۔ عرب میں نہ اس وقت کوئی سلطنت تھی اور نہ کوئی قانونی ضابطہ تھا۔ اسلام لاتے ہی انہوں نے خدائی قانون اور خدائی حکومت کی اطاعت کا عہد کیا۔ اور اپنے نفس و ارادہ کو بالکلیہ احکامِ الٰہی کے تابع کر دیا۔ نتیجۃً وہ ان جملہ حقوق سے دستبردار ہو گئے جو ان کو زمانۂ جاہلیت میں میں حاصل تھے اس طرح وہ معاملہ ہوا جسے قرآن نے ایمان کے نام سے تعبیر کیا ہے۔ یہ ایک عام دستور ہے کہ ہر نظام کی ابتداء اس کے ساتھ حلف وفاداری اٹھانے سے ہوتی ہے۔ اسلامی نظام بھی اپنے ہمنواؤں سے سب سے پہلے اپنے لیے حلف وفاداری اٹھانے کا مطالبہ کرتا ہے۔ اسی کا نام ایمان ہے، اور اسی عہد کو زیادہ مستحکم کرنے کے لیے بیعت لی جاتی ہے۔ ایمان اگرچہ بظاہر توحید و رسالت کے اقرار کا نام ہے مگر فی الواقع وہ پورے اسلامی نظامِ حیات کے وفاداری کا ایک مضبوط میثاق ہے مکہ میں یہ اسلامی معاشرہ بہت منتشر صورت میں تھا لیکن مدینہ پہنچ کر اس کے خال و خد نمودار ہو گئے جیسا

جیسا زمانہ گزرتا گیا اس کے لیے ایک قانونی اور اخلاقی ضابطہ عمل مدون ہو گیا اور اس قانونی و اخلاقی ضابطہ کو نافذ کرنے کے لیے ایک سیاسی نظام وجود پذیر ہوا جس کی حکمرانی خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس ہاتھوں میں تھی۔ ایمان کی حدود میں یہ معاہدہ چونکہ خدا اور بندوں کے درمیان ہوا تھا اور حضور انور کی حیثیت اللہ سبحانہ کی جانب سے ایک نمائندہ کی تھی اس لیے اصل طاعت اللہ سبحانہ کی تھی۔ حضور انور کی اطاعت ایک انسان کی حیثیت سے نہیں بلکہ رسول خدا کی حیثیت سے تھی۔ ان آیات میں قرآن نے یہ بات سمجھائی ہے کہ رسول کی حیثیت میں آپ کی اطاعت براہِ راست خدا کی اطاعت ہے۔ اسلام کے سیاسی نظام میں ملکی قوانین وضوابط اور اخلاقی اصول جن کو نبوت پیش کر رہی ہے براہِ راست ارادۂ الٰہی سے ماخوذ ہیں۔ اس قانون اور اخلاقی نظام سے وابستگی ہی اسلام کے نظام سے وابستگی اور اس سے روگردانی اسلام سے روگردانی ہے۔ اسلامی نظام کی دو بنیادیں ہیں ایک رسول اللہ دوسرے کتاب اللہ۔ عمل کی حد تک رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور علم کی حد تک کتاب اللہ ہے۔ ان آیات اللہ میں رسول اللہ کے بارے میں بتایا ہے کہ مخاطبوں میں ایسی جماعت موجود ہے جو زبان کی حد تک طاعت کا دم بھرتی ہے اور کتاب اللہ کے متعلق کہا ہے کہ وہ اللہ کی کتاب پر غور و فکر سے مطالعہ نہیں کرتے۔

۱۲۶۔ جس نے بھی رسول کی اطاعت کی اس نے فی الواقع اللہ کی طاعت کی اور جس کسی نے روگردانی کی تو اے پیغمبر ہم نے تم کو ان پر نگران بنا کر روانہ نہیں کیا ہے۔ آپ کی رسالت کو محقق فرما کر اب خدا تعالیٰ آپ کے متعلق یہ حکم سناتا ہے کہ جو ہمارے رسول کی فرمانبرداری کرے گا وہ بے شک ہمارا تابعدار ہے اور جو اس سے روگردانی کرے گا تو ہم نے تجھ کو اے رسول ان لوگوں پر نگہبان بنا کر روانہ نہیں کیا کہ ان کو گناہ نہ کرنے دے۔ ہم ان کو دیکھ لیں گے۔ تیرا کام صرف پیغام پہنچانا ہے آگے ثواب اور عقاب یہ ہمارا کام ہے۔[1]

دراصل اسلامی نظام کی فطرت اور ماہیت پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کا اصل مقصد افراد کی تکمیل ذات اور انسان کی اجتماعی خودی کی نشوونما ہے۔ یہ مقصد اسی وقت حاصل ہوتا ہے جب انفرادی شخصیت اور اجتماعی سیرت کا کوئی ایسا نمونہ مکمل افراد کے سامنے موجود ہو کیونکہ اس کے بغیر شخصیت کا حقیقی مفہوم اور اجتماعی سیرت کا معیار متعین کرنا دشوار ہو جائے گا۔ قرآن کا فیصلہ ہے کہ رسول کی شخصیت و سیرت ایک نمونہ ہے اور ایسا نمونہ ہے کہ قرآن رسول کی اطاعت کو

[1] افادات شیخ الاسلام

براہِ راست خدا کی طاعت بتا رہا ہے۔ اس کا کھلے لفظوں میں مطلب یہ ہے جیسا کہ امام رازی نے سمجھا ہے کہ رسول سے ذرا غلطی اور خطا کا امکان نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کی طاعت عین طاعتِ الٰہی کیسے ہوتی۔ رسول کی طاعت کا طاعتِ الٰہی ہونا رسول کے معصوم ہونے کی واضح دلیل ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں:

> لوگوں کے لیے ایک معصوم اور متفق علیہ کی ضرورت ہے۔ اور نبی کا خطا سے معصوم ہونا اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے ضروری علم و یقین کی وجہ سے ہوتا ہے جس کے سبب نبی سمجھتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے جو چیز پا رہا ہے اور سمجھ رہا ہے وہ حقیقت کے عین مطابق ہے اور اسے ایسا یقین ہوتا ہے گویا حقائق کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اور دیکھتے وقت اپنی آنکھوں کو غلط بین نہیں سمجھ رہا ہے ۔۔۔ اکثر حقائق کے بارے میں نبی کو ایک فطری ملکہ حاصل ہوتا ہے جس کے ذریعے ہمیشہ صحیح طریقے سے علم وجدانی حاصل ہوتا ہے اور اسے اپنے وجدانی تجربہ کی صداقت کا مشاہدہ اکثر ہوتا رہتا ہے۔

اس طرح نبی کی ذات موردِ عنایاتِ الٰہی اور مرکزِ الطاف و توجہات ہوتی ہے اس کے اخلاق و عادات اور اس کی زندگی کے طور طریقے سب خدا کی نظر میں محبوب زندگی کے تمام طریقوں میں سے اس کا طریقۂ حیات، لوگوں کے اخلاق میں اس کا اخلاق اور لوگوں کی گوناگوں عادتوں میں اس کی عادتیں اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہو جاتی ہیں۔ اس کی تمام پسندیدہ چیزوں اور شعائر اور اس سے نسبت رکھنے والی چیزوں سے اللہ کی محبت و پسندیدگی متعلق ہو جاتی ہے اور نبوت کی اتباع واطاعت اور اس کے شعائر اور خصوصیات کو اپنانا اور اس جیسا اخلاق پیدا کرنا اللہ کی محبت کو پالے کا مضبوط طریقہ اور قرب و آسان راستہ ہو جاتا ہے۔ اور جو ان کی اتباع کرتا اور ان کی کاپی بنتا ہے وہ خدا کی محبتوں کا ہی نہیں بلکہ محبوبوں میں ہو جاتا ہے۔ ان ہیغمبرانہ اطوار کا نام شریعت کی زبان میں سنن الہدیٰ ہے بہرحال شخصیت کا نشو و ارتقاء اسی نمونہ کے مطابق قرآن کا مطالبہ ہے اور جو جماعت اس نمونہ کو اپنالیتی ہے وہی اجتماعی سیرت کی تشکیل میں انسانوں کے لیے بطور ایک معیار ہوتی ہے۔ شخصی اور اجتماعی سیرت کے ان دونوں نمونوں کو قرآن نے انسانیت کے سامنے پیش کیا ہے۔

تعامل صحابہ اور اسلام کا سیاسی نظام

شخصی ارتقاء میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ اور کسی شخص کا عمل حجت و دلیل نہیں ہے

لیکن اجتماعی سیرت کی تشکیل میں صحابہ کرام کے اعمال و اقوال کو اسلامی قوانین کا ماخذ قرار دیا گیا ہے۔ اور اجتماعی و سیاسی زندگی میں اسلامی قوانین کا بہت بڑا حصہ اسی ماخذ سے ماخوذ ہے۔ تعامل صحابہ اس حیثیت سے کوئی درجہ نہیں رکھتا کہ وہ صحابہ کا تعامل ہے نہ اس حیثیت سے اسے دلیل و حجت قرار دیا جا سکتا ہے۔ بلکہ صحابہ کا تعامل قانون اسلامی کا اس حیثیت سے ماخذ ہے کہ وہ اجتماعی سیرت کی تشکیل میں سنت نبوی کی ایک علامت اور دلیل ہے۔ صحابہ کرام چونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دیکھنے والے آپ کے فیضان صحبت سے مستفیض ہونے والے اور آپ کی کامل اتباع کرنے والے تھے اس لیے ان کا کوئی عمل ایسا ہو ہی نہیں سکتا تھا جو براہ راست سراج رسالت منیر سے ماخوذ نہ ہوا۔ اسی لیے ان کے ارشادات و اعمال کو قانون اسلامی کا ماخذ اور مسائل کے لیے دلیل و حجت کہا گیا ہے کیونکہ ان کے اقوال و افعال خود نبوت کے اقوال و افعال کا عکس ہیں وہ رسول کی تزکیہ و تعلیم کی سرگرمیوں کا نمونہ ہیں۔

بہرحال آیت میں بتایا گیا ہے کہ اسلام کے نظام حیات میں رسول کی طاعت اللہ کی طاعت ہے یہ گویا قرآن نے طاعت رسول کے لیے فلاح ، نجاح کی بہت بڑی ضمانت دی ہے۔ اس عظیم ضمانت کے باوجود اگر کوئی فرد اپنے شخصی ارتقاء اور کوئی جماعت اپنی اجتماعی سیرت کی تشکیل میں رسول سے روگرداں ہوتی ہے تو ہو جائے۔ رسول پر اس کی ذمہ داری نہیں ہے۔ ہٹنے والے اور دامان رسول چھوڑنے والے اپنے عمل کے خود ذمہ دار ہیں ، ان کے اعمال کے بارے میں رسول سے نہ پوچھا جائے گا۔ رسول کے سپرد جو کام کیا گیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ اللہ کے احکام اور ہدایات ان تک پہنچائے جائیں اور بس۔ مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنے شخصی ارتقاء اور اجتماعی سیرت کی تشکیل میں آپ کی طاعت نہیں کرتے ہیں تو نہ کریں آپ اس کی پرواہ کیجئے کیونکہ آپ کو مبلغ بنا کر روانہ کیا ہے ان کا حفیظ اور نگران بنا کر روانہ نہیں کیا ہے۔ ان کے اعمال کی نگرانی آپ کا نہیں ہمارا کام ہے ان الینا ایابھم ثم ان علینا حسابھم۔

یہاں امام رازی نے مقاتل کے حوالہ سے اس آیت کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ ایک بار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میرے سے محبت کرتا ہے وہ اللہ سے محبت کرتا ہے اور جو میری طاعت کرتا ہے وہ اللہ کی طاعت کرتا ہے۔ اس پر منافقین بولے کہ یہ شخص تو ہمیں آہستہ آہستہ شرک کے قریب لے جا رہا ہے۔ ایک طرف خود ہی ہمیں غیر اللہ کی عبادت سے روکتا ہے اور دوسری طرف ہم سے اپنے کو رب بنانے کا مطالبہ کرتا ہے جیسا کہ عیسائی حضرت عیسیٰ کو بنا چکے ہیں۔ اس پر یہ

آیت نازل ہوئی۔ اگرچہ تاریخی حیثیت سے اس کی کوئی قیمت نہیں ہے کیونکہ جس راہ سے یہ روایت آئی ہے یعنی مقاتل وہ محدثین کے یہاں قابل اعتبار شخصیت نہیں ہے۔ ان کا چہرہ ارباب جرح و تعدیل نے یہ بتایا ہے۔ امام جوزجانی کہتے ہیں کہ بڑا لپاڑی قسم کا جھوٹا ہے، یحییٰ ابن معین کہتے ہیں کہ قابل اعتبار نہیں ہے، فلاس کہتے ہیں کہ متروک الحدیث ہے۔ ابن سعد کہتے ہیں کہ محدثین اس کی حدیث سے بچتے ہیں۔ عبدالرحمٰن بن حکم اس کو قصہ گو بتاتے ہیں، نسائی نے کذاب قرار دیا ہے۔ دارقطنی کہتے ہیں کہ جھوٹ بولتے ہیں۔ اس کے باوجود بھی اگر شارحین قرآن کے نزدیک یہی پس منظر ہے تو مقاتل کی بات کا مطلب یہ ہے کہ مومن صرف ایک اللہ کی عبادت کرتا ہے۔ اللہ کے سوا اس کے عابدانہ تعلقات کسی سے نہیں ہوتے۔ شرک دو قسم کا ہے ایک الوہیت میں دوسرے ربوبیت میں، الوہیت میں شرک یہ ہے کہ پرستش اور پوجا میں اللہ کے ساتھ کسی سے عابدانہ تعلقات ہوں، ربوبیت میں شرک یہ ہے کہ بندگی و طاعت میں اللہ کے ساتھ شریک کر لیا جائے یعنی اللہ کے ساتھ کسی مخلوق کو حلال و حرام اور قانون سازی کا حق دے دیا جائے۔ منافقین یہ کہنا چاہتے تھے کہ یہ ہم سے شرک فی الربوبیت کرانا چاہتے ہیں۔ قرآن نے اس آیت میں منافقین کے اسی شبہ اور مغالطہ کا جواب دیا ہے کہ رسول کی طاعت رسول ہونے کی حیثیت میں ایک انسان کی طاعت نہیں بلکہ اللہ کی طاعت ہے۔

دو غلی اسلامی زندگی

۱۲۷۔ یہ لوگ آپ کے سامنے تو طاعت کا دم بھرتے ہیں لیکن جب آپ کے پاس سے ہٹ کر باہر جاتے ہیں تو ان میں سے کچھ لوگ راتوں کو اپنی مجلسی زندگی میں آپ کے ارشادات کے خلاف باتیں کرتے ہیں اور اللہ ان کی سرگوشیاں لکھ رہا ہے۔ آپ ان سے بے رخ ہو جائیے اور اللہ پر بھروسہ کیجئے۔ اللہ آپ کو کارساز ہونے کے اعتبار سے کافی ہے۔ ان منافقین کی اور مکاری سنو۔ آپ کے روبرو تو آکر کہہ جاتے ہیں ہم نے قبول کیا حکم تیرا اور باہر جا کر مشورہ کرتے ہیں اس کے خلاف یعنی تیری نافرمانی اور مخالفت کا مشورہ کرتے ہیں۔ اور اللہ کے یہاں ان کے سب مشورے لکھے جاتے ہیں، ان کو سزا دینے کے لیے۔ لہٰذا اے نبی ان سے منہ پھیر لے اور کسی بات کی پرواہ مت کر اور اپنے سب کام اللہ کے حوالے کر دے وہ تیرے لیے کافی ہے۔ [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

طاعت یہاں مبتدائے محذوف کی خبر ہے پورا جملہ امرک طاعۃ یعنی آپ کی بات اور آپ کا حکم سر آنکھوں پر، یا جملہ امرنا طاعۃ ہے یعنی ہمارا کام ہی آپ کی طاعت ہے۔ پہلی رائے حافظ ابن جریر کی ہے مطلب یہ ہے کہ وہ بارگاہ رسالت میں ہوتے ہیں تو طاعت و فرمانبرداری کے پرجوش نعرے لگاتے ہیں اور آپ کی مجلس میں ہر بات پر سر تسلیم خم کر دیتے ہیں لیکن جب آپ کی مجلس سے ہٹتے ہیں تو اپنی مجلسوں میں ان آیات و احکام کے خلاف سرگوشیاں کرتے ہیں جن کو اپنی خواہشات اور اپنے ذاتی مفاد کے خلاف پاتے ہیں۔ قرآن نے ان کے اس رویے پر ان کو یہ دھمکی دی ہے واللہ یکتب ما یبیتون اللہ ان کی ساری سرگوشیوں کو لکھ رہا ہے وہ یہ خیال نہ کریں کہ اگر وہ یہ سرگوشیاں آپ سے چھپا کر کریں گے تو آپ سے ان کی یہ سرگوشیاں چھپی رہیں گی ایک وقت آئے گا اللہ آپ کو بتا دے گا اور اس طرح ان کی چالاکیاں سب کے سامنے بے نقاب ہو جائیں گی اور یا مطلب یہ ہے کہ وہ یہ نہ سمجھیں کہ ان کی یہ سرگوشیاں خدا سے چھپی ہوئی ہیں۔ ایک روز ان کا یہ سارا دفتر لکھا ہوا ان کے سامنے آجائے گا۔ پہلے مطلب کی صورت میں ان کو دھمکی ہے اور دوسرے مطلب میں ان کو ڈرایا جا رہا ہے۔

آیت میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے جو اسلام کی حد تک دورخی زندگی اختیار کر لیتے ہیں، زبان سے کچھ کہتے ہیں اور دل میں کچھ ہوتا ہے۔ ایمان کا تقاضا یہی ہے کہ قلب و زبان میں ہم آہنگی ہو، یہ سامنے ہو کر فرمانبرداری کی لافیں مارنا اور علیحدہ ہو کر نافرمانی کے لیے ترکیبیں سوچنا نفاق ہے۔ قرآن نے یہاں اسے نفاق ہی قرار دیا ہے۔

اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہے فاعرض عنھم آپ ان سے اعراض فرمایئے یعنی آپ ان کی سرگوشیوں کی قطعاً پروا نہ کیجئے۔ ان کی سازشوں اور سرگوشیوں پر کوئی ایکشن نہ لیجئے۔ بلکہ و توکل علی اللہ ان کے معاملے میں اللہ پر بھروسہ کیجئے یعنی ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کیجئے اور اللہ کا بھروسہ ہی آپ کو کافی ہے۔ یہ بدبخت اپنی سرگوشیوں سے اسلام کا اور آپ کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے جو کچھ بگاڑیں گے اپنا ہی بگاڑیں گے۔

اس جگہ مفتی صاحب کی یہ لکتہ آفرینی خوب ہے کہ اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص لوگوں کا پیشوا اور رہنما ہو اسے طرح طرح کی دشواریوں سے گزرنا پڑتا ہے لوگ طرح طرح کے الزامات اس کے سر ڈالیں گے۔ دوستی کے روپ میں دشمن بھی ہوں گے۔ ان سب باتوں کے باوجود رہنما کو عزم و استقلال کے ساتھ اللہ کے بھروسہ پر اپنے کام سے لگن ہونی چاہیئے۔

اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایسے مواقع پر ایسے لوگوں کی کوئی پروا نہ کرنی چاہیئے اور ان سے انتقام نہ لینا چاہیے۔ اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کفار و منافقین سے عفو و درگزر کی نصیحت ہے عام شارحین قرآن کا خیال یہ ہے کہ وہ جہاد سے پہلے کی بات ہے چنانچہ اس آیت کو کچھ شارحین نے جاھد الکفار والمنافقین سے منسوخ کہہ دیا ہے لیکن شارحین قرآن میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفو و درگزر کی نصیحت میں کوئی منافات نہیں سمجھتے۔ چنانچہ یہاں بھی امام رازی نے تصریح کی ہے کہ دونوں میں کوئی منافات نہیں ہے۔

قرآن میں تدبر کی دعوت

۱۲۸ - کیا یہ لوگ قرآن کے معانی پر غور نہیں کرتے ہیں۔ اگر اللہ کے علاوہ یہ قرآن کسی اور کی طرف سے ہوتا تو بلا شبہ اس میں بہت اختلاف پاتے۔ پہلی آیات سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا رسول ہونا اور آپ کی اطاعت کا بعینہٖ خدا کی اطاعت ہونا اور آپ کے نافرمانوں پر خدا کا عذاب ہونا تو خوب ظاہر ہو گیا۔ مگر منافق اور آپ کے مخالف کہہ سکتے ہیں کہ خدا کی گواہی اور اس کے ارشادات کی تسلیم و تصدیق میں تو ہرگز تامل نہیں لیکن یہ کیسے معلوم ہو کہ یہ خدا ہی کا کلام ہے بشر کا بنایا ہوا نہیں تو حق تعالیٰ اس کا جواب دیتے ہیں کہ یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے جس سے صاف معلوم ہو جائے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے دیکھو اگر یہ قرآن اللہ کا کلام نہ ہوتا جیسا کہ تم گمان کرتے ہو تو ضرور قرآن میں بہت سے مواقع میں طرح طرح کا اختلاف ملتا۔ دیکھو آدمی ہر حالت میں اسی حالت کے موافق کلام کرتا ہے جو حالت پیش ہوتی ہے دوسری حالت کا دھیان نہیں ہوتا۔ غصہ میں مہربانی والوں کا دھیان نہیں رہتا اور مہربانی میں غصہ والوں کا۔ دنیا کے بیان میں آخرت کا لحاظ نہ رہے اور آخرت کے بیان میں دنیا کا۔ بے پروائی میں عنایت کا ذکر نہیں اور عنایت میں بے پروائی کا۔ بالجملہ ایک حال کا کلام دوسرے حال سے مختلف نظر آئے گا لیکن قرآن شریف چونکہ خالق کا کلام ہے۔ یہاں ہر چیز کے بیان میں دوسری جانب بھی نظر رہتی ہے غور و فہم سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن میں ہر چیز کا بیان ہر مقام میں ایک انداز پر ہے۔ دیکھئے یہاں منافقوں کا حال مذکور تھا جو سخت عتاب کا محل تھا سو یہاں بھی ان کی باتوں پر اسی قدر الزام ہے جتنا چاہیے اور جو الزام ان کی ایک خاص جماعت پر تھا وہ خاص ان پر ہی لگایا اور فرمایا کہ بعض ایسا کرتے ہیں یہ نہیں کہ غصہ وغیرہ کی حالت میں کلام اپنی حد سے نکل جاتے اور دوسری حالت کے کلام سے

مختلف نظر آئے۔

نیز یہ مطلب بھی ہے کہ ہم برابر دیکھتے ہیں کہ جب آدمی کوئی کلام طویل کرتا ہے تو وہ یکساں نہیں ہوتا بلکہ کوئی جملہ فصیح کوئی غیر فصیح کوئی صحیح کوئی غلط کوئی سچا کوئی کاذب کوئی موافق کوئی باہم متناقض ضرور معلوم ہوتا ہے اور قرآن اتنی بڑی کتاب ہونے کے باوجود ان جملہ اختلافات سے پاک ہے جو طاقت البشر سے پاک ہے۔

اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو فہم اور تدبر سے کام نہ لے وہ قرآن میں شبہات اور اختلافات کا وہم چلا سکتا ہے مگر فہیم ایسا نہیں کر سکتا۔ دیکھو جو اسی جگہ تدبر نہ کرے وہ کہہ سکتا ہے کہ اول تو فرمایا قل کل من عند اللہ پھر فرمادیا وما اصابك من سيئة فمن نفسك سو یہ تناقض اور تناقض ہو گیا۔[1]

مقصد یہ ہے کہ منافق اور ضعیف لوگوں کی جس روش پر اوپر کی آیتوں میں تنبیہ کی گئی ہے۔ اس کی بڑی اور اصلی وجہ یہ تھی کہ انہیں قرآن کے منجانب اللہ ہونے میں شک تھا۔ انہیں یقین نہ آتا تھا کہ رسول پر واقعی وحی اترتی ہے اور یہ جو کچھ ہدایات آرہی ہیں براہ راست خدا ہی کے پاس سے آرہی ہیں اسی لیے ان کی منافقانہ روش پر ملامت کرنے کے بعد اب فرمایا جارہا ہے کہ یہ لوگ قرآن پر غور نہیں کرتے ورنہ یہ کلام تو خود شہادت دے رہا ہے کہ یہ خدا کے سوا کسی دوسرے کا کلام نہیں ہو سکتا۔ کوئی انسان اس بات پر قادر نہیں ہے کہ سالہا سال تک وہ مختلف حالات میں مختلف مواقع پر مختلف مضامین پر تقریریں کرتا رہے اور اول سے آخر تک اس کی ساری تقریریں ایسا ہموار، یک رنگ، متناسب مجموعہ بن جائیں جس کا کوئی جز دوسرے جز سے متصادم نہ ہو۔ جس میں تبدیلی رائے کا کہیں نشان تک نہ ملے۔ جس میں متکلم کے نفس کی مختلف کیفیات اپنے مختلف رنگ نہ دکھائیں اور جس پر کبھی نظر ثانی تک کی ضرورت پیش نہ آئے۔[2]

دراصل اس آیت میں منافقین کو ان کے اس فکری تضاد پر متوجہ کیا ہے کہ ایک طرف قرآن پر ایمان اور پیغمبر کی باتوں پر طاعت کا نعرہ لگاتے ہو اور پھر اسی قرآن اور اسی پیغمبر کی باتوں پر تنقید بھی کرتے ہیں۔ اپنے وہ اس مختلف طرز عمل کے لیے قرآن میں ان کو بیک وقت دو مختلف باتیں نظر آرہی ہیں۔ کیا ان کو قرآن میں بیک وقت دو ارادوں کی کارفرمائی دکھائی دے رہی ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

اس کی کچھ باتیں قابل پذیرائی ہیں اور کچھ ناقابل پذیرائی، کچھ باتیں اچھی ہیں اور کچھ اچھی نہیں ہیں۔ کیا وہ قرآن پر غور نہیں کرتے؟ اگر وہ قرآن کا بغور مطالعہ کرتے تو ان کو معلوم ہو جاتا کہ قرآن کی ہر بات اپنے اصول اور کلیات میں مستحکم اور مربوط ہے۔ وہ جن عقائد کی تعلیم دیتا ہے وہ ایک دوسرے سے پوری طرح وابستہ ہیں۔ وہ جن عبادات وطاعات کا حکم دیتا ہے ان کا براہِ راست عقائد سے تعلق ہے۔ وہ جن اعمال اور اخلاق کی تلقین کرتا ہے وہ اپنے اصول سے براہِ راست نشوونما پاتے ہیں۔ اس کی مجموعی تعلیم سے زندگی کا جو نظام بنتا ہے وہ ایک وحدت کی صورت میں ہے۔ جس طرح کائنات کے اجزائے مختلفہ کا باہمی توافق اور ان کی سازگاری اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اس کے اندر ایک ہی ارادہ کار فرما ہے کوئی اس میں شریک نہیں ہے ٹھیک ایسے ہی اس کتاب عزیز کے مختلف اجزا کی باہمی سازگاری اور پھر اس کتاب کے علم کے ساتھ نبوت کے عمل کی ہم آہنگی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ دونوں علم وعمل کی صورت میں ایک ہی خدائے واحد کے ارادے کا پرتو ہیں۔ اگر قرآن خدا کی کتاب نہ ہوتی اور حضور انور کی ساختہ و پرداختہ ہوتی تو علم وعمل میں کبھی موافقت نہ ہوتی، سرتاسر اختلاف ہوتا۔ بلکہ خود کتاب تناقضات اور اختلافات کا ایک منتشر دفتر بن کر رہ جاتی۔

قرآن پر تدبر ہر مسلمان کا فرض ہے

اس آیت کا یہ مدلول بھی بالکل بے غبار ہے کہ قرآن کو پڑھنا، اس کے معنے جاننا اور اس پر غور وفکر کرنا ہر مسلمان کی اسلامی ذمہ داریوں اور ایمانی تقاضوں میں داخل ہے۔ قرآن کا ہر شخص سے مطالبہ ہے کہ وہ اسے پڑھے سمجھے اور اس پر غور وفکر کرے۔ اور اس کے جاننے کے لیے جن وسائل کی ضرورت ہے ان کی تکمیل کرے۔ مثلاً قرآن کا پڑھنا اور سمجھنا عربی جاننے پر موقوف ہے تو عربی کا جاننا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ آج ہی نہیں روزِ اول ہی سے عجمیوں نے عربی سیکھی اور دین کا بیشتر ذخیرہ عجمیوں ہی کی وساطت سے ہم تک پہنچا ہے۔ محدثین، قرا، فقہا کی تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ان میں بیشتر غیر عربی تھے۔ دین کے تقاضے سے وہ کہ انہوں نے عربی پر عبور حاصل کیا۔ قرآن پڑھا، سمجھا اور فکر وغور سے کام لے کر اس سے زندگی کے مختلف مسائل معلوم کیے۔

قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ قرآن کا مخلصانہ اور گہرا مطالعہ کیا جائے جو خارجی اثرات اور غیروں کے تصورات سے بالکل آزاد ہو۔ اس طرح اس پر ہمارے ذاتی رجحانات اور خواہشات سایہ فگن نہ ہوں۔ ممکن ہے کہ ہماری خواہشات معیوب نہ ہوں بلکہ مستحسن ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وہ فطری اور طبعی ہوں لیکن یہ قطعاً

ضروری نہیں کہ قرآن سے ہر مستحسن چیز کے لیے دلیل و سند کا کام لیا جائے۔ قرآن کے مطالعہ اور تفہیم کو زمانہ کے محدود پیمانوں کا پابند نہیں بنانا چاہیے کیونکہ زمانے آتے جاتے رہتے ہیں۔ غور و فکر کے انداز بھی بدلتے رہتے ہیں۔ اشیاء کی قدر و قیمت کو بھی کبھی قرار نہیں یہ چڑھتی اترتی رہتی ہیں۔ قرآن ایک آسمانی کتاب ہے، مستقل ہے اپنی منفرد شخصیت رکھتی ہے۔ علوم انسانی کا پورا خزانہ اور اس کے سارے نظریات ریت کے پھسلتے ہوئے ٹیلے کی طرح ہیں۔

یہ صحیح ہے کہ قرآن میں تدبر کرنا اور اس کا مطالعہ کرنا صرف اماموں اور مجتہدین کا کام نہیں ہے لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ ایک عامی کا مطالعہ اور مجتہدین کا تدبر قرآنی یکساں ہے۔ دونوں کے تدبر و تفکر کے درجات علم و فہم کے درجات کی طرح مختلف ہیں۔ اگر مجتہدین کا تفکر ایک ایک آیت سے ہزاروں مسائل نکالے گا جبکہ عام علماء کا تفکر ان مسائل کو صرف سمجھے گا۔

یہ بالکل درست ہے کہ یہ آیت ہر شخص کا یہ حق مان رہی ہے کہ وہ قرآن میں تدبر و تفکر کرے لیکن مجتہدانہ تدبر کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس کے مبادی و مقدمات سے گزر کر یہ کام کرے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تدبر قرآنی کے مقبول ہونے کا انحصار جس طرح اس بات پر ہے کہ تدبر کرنے والوں میں اس کی اہلیت ہو۔ اسی طرح اس امر پر بھی ہے کہ یہ تدبر صحیح طریقے سے کیا جائے۔ قرآن پر تدبر کے لیے ضروری ہے کہ ایک آیت کے وہ معنے لیے جائیں جن کے لیے عربی زبان کی لغت، قواعد اور معروف استعمالات میں گنجائش ہو جو قرآن کی عبارت کے سیاق و سباق سے لگتے ہوئے ہیں۔ جو اسی موضوع کے متعلق قرآن کے دوسرے بیانات سے متناقض نہ ہوں اور جن کی تائید قولی اور عملی تشریحات سے ملتی ہو کم از کم سنت ان معنوں کے خلاف نہ ہو۔

تدبر قرآن کی راہ میں مشکلات

جہاں تک قرآن کا تعلق ہے وہ تحریری شکل میں مطبوعہ لوگوں کے ہاتھوں میں موجود ہے لیکن اس کے باوجود اس کے تدبر میں چند رکاوٹیں ہیں۔

سب سے پہلی دقت اصطلاحات کی ہے۔ قرآن صرف عربی میں نہیں بلکہ عربی مبین میں ہے۔ قرآن میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جن کی ہم روزانہ تلاوت کرتے ہیں مگر یہ نہیں جانتے کہ یہ قانونی زبان کی اصطلاحات ہیں مثلاً سلطان ملک حکم، امر ولایت۔ ان الفاظ کے قانونی مفہوم کو عربی میں بھی لوگ کم سمجھتے ہیں کیونکہ ایک مدت دراز سے ہمارے ہاں اسلام کا سیاسی نظام معطل ہو چکا ہے۔ ہمارے

متقدمین ان اصطلاحات کو بخوبی سمجھتے تھے۔ امام محمد کی السیر الکبیر اور الجامع الکبیر اور قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج اس کی گواہ ہے۔

دوسری شکل ایک اور ہے جواب بڑھتے بڑھتے ایک لطیفے اور مذاق کی شکل اختیار کر گئی۔ ایک مجلس میں مجھ سے خود ایک سیاسی مذاق رکھنے والے دوست نے طنزیہ انداز میں کہا کہ صاحب قرآن پر ہر شخص تدبر کر سکتا ہے یہ کوئی چینی اور گھی کا ڈپو نہیں ہے کہ ڈپو ہولڈر ہی اس کو کرنے کا قانوناً مجاز ہے۔ قرآن پر مولوی کی اجارہ داری نہیں ہے کہ وہی تدبر کرنے کا مجاز ہے۔ جس طرح مولوی کو تدبر کرنے کا حق ہے اسی طرح ہم بھی یہ حق رکھتے ہیں۔ یہ باتیں وہ لوگ کہتے ہیں کہ جو نہ قرآن کی زبان سے واقف ہیں نہ اسلام کی تاریخ پر ان کی نگاہ ہے۔ وہ اس بات پر مصر ہیں کہ انہیں علم کے بغیر قرآن پر تدبر کرنے کا نہیں بلکہ قرآن کی صورت بگاڑنے کا پروانہ مل جانا چاہیے۔ بلاشبہ قرآن پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہے اور مولوی کسی خاندان یا نسل کا نام نہیں ہے۔ جس طرح ہر شخص قانون پڑھ کر وکیل اور جج بن سکتا ہے اور ہر شخص انجینئرنگ پڑھ کر انجینئر اور طب پڑھ کر حکیم بن سکتا ہے اسی طرح ہر شخص قرآن کے علم پر وقت اور محنت صرف کر کے قرآن میں تدبر کر سکتا ہے۔ قرآن کوئی بازیچہ اطفال نہیں ہے کہ جس کا جی چاہے تدبر کرنے بیٹھ جائے اور اس کے احکام کے بارے میں جاہلانہ فیصلے کرنے لگے۔

تدبر ہی کے نتیجے میں وہ پیش پا افتادہ احوال و ظروف کے لیے اس سے احکام نکال سکے گا، اسی کی طرف علامہ قرطبی نے اشارہ کیا ہے اور تدبر کی دعوت سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی ہے کہ قرآن کی تشریح کسی امام کا حق نہیں ہے۔

وَإِذَا جَآءَهُمْ أَمْرٌ مِّنَ الْأَمْنِ أَوِ الْخَوْفِ أَذَاعُوا بِهِ ۖ وَلَوْ رَدُّوهُ
إِلَى الرَّسُولِ وَإِلَىٰ أُولِي الْأَمْرِ مِنْهُمْ لَعَلِمَهُ الَّذِينَ يَسْتَنبِطُونَهُ مِنْهُمْ ۗ
وَلَوْلَا فَضْلُ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَرَحْمَتُهُ لَاتَّبَعْتُمُ الشَّيْطَانَ إِلَّا قَلِيلًا ۝

اور جب ان کو امن یا ڈر کی کوئی خبر معلوم ہوتی ہے تو اس کی تشہیر کرتے ہیں[۱۲۹]۔ اور اگر یہ لوگ اس خبر کو اللہ کے رسول کی بارگاہ تک یا ان لوگوں تک پہنچاتے جو ان میں سے ارباب اختیار ہیں تو ان میں سے فکر و نظر رکھنے والے اس کی تہ تک پہنچ جاتے[۱۳۰]۔ اور دیکھو اگر اللہ کا تم پر فضل اور رحمت نہ ہوتا تو تھوڑوں کو چھوڑ کر سب کے سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔[۱۳۱]

انسانی زندگی اور نبوت کا علم و عمل

اس سے پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ عدلیہ اور انتظامیہ کی حد تک سارے معاملات سارے مسائل کے لیے مرکزی طاقت اللہ اور اس کا رسول ہے۔ اور یہ بھی اسی سورت میں پوری قوت سے بات سمجھائی جا چکی ہے کہ روحانی نظام، اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام اور معاشی نظام کا سررشتہ

اللہ اور رسول کے ہاتھ میں ہے اب بتایا جا رہا ہے کہ ہر قسم کے دفاعی اور سیاسی مسائل کا تعلق بھی اللہ کے رسول سے ہے یا پھر ان لوگوں سے جو اہلِ ایمان میں سے ان کے ارباب بست وکشاد ہوں۔ یہاں بتایا جا رہا ہے کہ یہ توحیدِ ربوبیت، توحیدِ عبادت، توحیدِ قانون، توحیدِ نظام، توحیدِ معاشرت، توحیدِ اخلاق، توحیدِ سیاست، توحیدِ اطاعت جیسی نعمتیں اس وقت تمہیں صرف اس لیے ملی ہیں کہ اللہ نے تمہیں نبوت کے علم وعمل کی صورت میں اپنے فضل و رحمت سے نوازا ہے۔ اگر یہ دونوں نہ ہوتے تو تم بھی استبداد کے شکنجے میں کسے ہوتے اور مختلف راہوں میں ہٹ کر شیطان کے پیروکار ہوتے۔ یہ اللہ کا بہت بڑا فضل اور اس کی بہت بڑی رحمت ہے کہ اس نے نبوت کے علم وعمل کے ذریعے تمہیں شیطان کی پیروی سے بچا لیا۔ اور انسانوں کی بندگی سے چھڑا کر خدا کی بندگی پر لگا دیا اور دنیا کی تنگی سے نکال کر کشادگی کی طرف لے آیا اور مذاہب کی کج روی اور بے اعتدالی سے نکال کر نبوت کے علم وعمل کے صدقہ اسلام کی صراطِ مستقیم پر لگا دیا۔ اور نبوت کے اسی علم وعمل نے ان کی ایمان کے ذریعے تربیت کی، رُوح کی بلندی قلب کی صفائی اخلاق کی خوبی، مادی گرفت سے آزادی اور خواہشات سے دستبرداری کا سبق دیا۔ یہ زبردست انقلاب انسانی تاریخ کا انوکھا واقعہ ہے۔ اس کی ہر چیز نرالی اور انوکھی تھی۔ اس کی سرعت اس کا عمق اس کی وسعت و ہمہ گیری حیرت انگیز تھی۔ اس کا باعث اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ نے نبوت کے علم وعمل کی صورت میں اپنا فضل و رحمت فرمایا ہے۔

۱۲۹ ۔ اور جب ان کو امن یا ڈر کی خبر معلوم ہوتی ہے تو اس کی تشہیر کرتے ہیں۔ یعنی ان منافقوں اور کم سمجھ مسلمانوں کی ایک خرابی یہ ہے کہ جب کوئی امن کی بات پیش آتی ہے مثلاً رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کسی سے صلح کا قصد فرمانا یا لشکر اسلام کی فتح کی خبر سننا یا کوئی خبر خوفناک سن لیتے ہیں جیسے دشمنوں کا کہیں جمع ہونا یا مسلمانوں کی شکست کی خبر آنا تو ان کو بلا تحقیق کیے مشہور کرنے لگتے ہیں اور اس میں اکثر فساد ونقصان مسلمانوں کو پیش آجاتا ہے۔ منافق ضرر رسانی کی غرض سے اور کم سمجھ کم فہمی کی وجہ سے ایسا کرتے تھے[1]

کچھ شارحین قرآن کہتے ہیں کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے جو ہر طرف افواہیں اڑاتے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ کمزور مسلمانوں کے متعلق ہیں جو مبالغہ آمیز اطلاعیں آنے پر پریشان ہو جاتے اور ان کو نشر کر دیتے ان خبروں سے یکایک مدینہ اور اس کے اطراف میں پریشانی پھیل جاتی۔ حافظ ابن جریر نے تصریح کی ہے کہ یہ آیات اسی گروہ کے بارے میں ہیں جو حضور انور کے سامنے طاعت و فرمانبرداری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے جھوٹے دعوے کرتا اور اپنی نجی مجلسوں میں آپ کے ارشادات کے خلاف سرگوشیاں کرتا تھا۔

دراصل اس آیت میں عام زندگی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ جب حالات ہنگامی ہوتے ہیں، اور افواہیں ہر طرف اڑتی ہیں، کبھی خطرے کی بے بنیاد خبریں آتی ہیں، کبھی دشمن کسی خطرے کو راز بنانے کی خاطر اطمینان کی خبریں بھیج دیتا ہے۔ ان افواہوں میں رائے عامہ بڑی دلچسپی لیتی ہے۔ نیتیں مختلف ہوتی ہیں منافق لوگ جو محض ہنگامہ پسند تھے جن کے لیے اسلام اور کفر کا یہ مقابلہ کوئی سنجیدہ معاملہ نہ تھا۔ اور کچھ وہ لوگ جنہیں کچھ خبر نہ تھی کہ اس قسم کی غیر ذمہ دارانہ خبریں پھیلانے کے نتائج کیا ہوتے ہیں اور کچھ وہ لوگ جن میں محض خبریں معلوم کرنے کا اشتیاق ہوتا ہے ان میں پھنس جاتے ہیں۔ انہی لوگوں کو اس آیت میں تنبیہہ کی گئی ہے اور سختی سے روکا گیا ہے۔ رائے عامہ جب بھی سیاسی اور دفاعی معاملات میں دراندازہوتی ہے اس سے اجتماعی نقصان زیادہ ہوتا ہے۔ ان کو پتہ نہیں ہوتا کہ کیا چیز راز ہے اور کیا چیز راز نہیں ہے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جب ان کو خبر ملتی ہے کہ فلاں فوجی دستہ کامیابی سے ہمدوش ہو گیا ہے اور دشمنوں کے نرغے سے بچ گیا یا ان کو پتہ لگتا ہے کہ فلاں فوجی مہم میں دشمن کا دباؤ بڑھ گیا تو ان خبروں کو وہ لوگوں میں خوب پھیلاتے ہیں۔ اصل ارشاد میں اذاعوا بہ کے الفاظ آتے ہیں اذاعت کے معنے مشہور کرنے اور شائع کرنے کے ہیں اسی سے ریڈیو کو مذیاع اور ریڈیو اسٹیشن کو دارالاذاعت کہتے ہیں۔ یعنی امن اور خطرے کی جو بات بھی ہوتی آن کی آن میں جنگل کی آگ کی طرح ان کے ذریعے سے لوگوں میں پھیل جاتی۔

جماعتی زندگی میں افواہیں عام حالات میں بھی بڑے خطرناک نتائج پیدا کر سکتی ہیں۔ اور جب حالات جنگ کے ہوں پھر تو ان کی خطرناکی دو چند ہو جاتی ہے۔

حوادث و واقعات میں اجتہاد و استنباط

۱۳۰ - اور اگر یہ لوگ اس خبر کو اللہ کے رسول کی بارگاہ تک یا ان لوگوں تک پہنچاتے جو ان میں سے ارباب اختیار ہیں تو ان میں سے فکر و نظر والے اس کی تہ کو پہنچ جاتے ۔ یعنی کہیں سے کوئی خبر آتے تو چاہیے کہ اول پہنچائیں سردار تک اور اس کے نائبوں تک جب وہ اس خبر کو تحقیق اور تسلیم کر لیں تو ان کے کہنے کے مطابق اس کو کہیں نقل کریں اور اس پر عمل کریں[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ اللہ و رسول اور ملت کے خیرخواہ ہیں تو ان کے لیے ایسے مواقع پر صحیح طریق کار یہ ہے کہ اس طرح کی جو باتیں ان کے علم میں آئیں ان کو عوام میں سنسنی پیدا کرنے کا ذریعہ بنانے کے بجائے ان کو رسول خدا اور امت کے ارباب حل و عقد کے سامنے پیش کریں تاکہ ان کے اندر جو لوگ معاملات کی گہری سوجھ بوجھ رکھتے ہیں۔ ان کے موقع و محل کا تعین کر سکیں، اور ان کے بارے میں صحیح پالیسی اختیار کر سکیں۔

استنباط کا اصل مفہوم کنواں کھود کر اس سے پانی نکالنا اور کسی پوشیدہ خبر کو ظاہر کرنا ہے اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے کسی بات کی تہ کو پہنچنے اور اس کی حقیقت کو پانے کے معنے میں یہ استعمال ہوا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں جس نظام حیات کو لے کر آئے وہ آخری اور ابدی ہے اور ایسے آخری ابدی نظام کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ زیادہ تر زور قانون کے کلی اور ابدی اصول و مبادی پر دے۔ چنانچہ اس آخری وحی نے قرآن کو صرف اصول و کلیات تک محدود رکھا۔ اور جزئیات کے لیے اپنی آیتوں میں ایسے اشارے رکھے ہیں جن کے سہارے وہ لوگ جو علم و معرفت سے پرنور اور حکم و حکمت سے معمور اور شرح صدر اور تائید ربانی سے فیض یاب ہوں وہ عملی قدم اور جزئیات کو صحیح طور سے جان لیں۔ یہ مرتبہ سب سے پہلے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا اور چونکہ آپ خطا سے معصوم ہیں اس لیے آپ کے اس منصب کے نتائج بھی خطا سے معصوم ہیں پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وسیلہ سے یہ منصب امت کو ملا ہے۔ اسی کا اصطلاحی نام استنباط اور اجتہاد ہے جس کو ہر زمانے میں فیض یاب علوم نبوت اور حاملین اسرار شریعت خدا کی دی ہوئی بصیرت کے مطابق اس کی وحی کی روشنی میں ہمیشہ انجام دیتے رہے ہیں اور دیتے رہیں گے۔ آپ پیچھے اسلام کے مصادر قانون میں پڑھ آئے ہیں کہ اسلامی نظام میں قانون کا ماخذ عام رائے یا کسی خاص طبقہ اور جماعت کے اغراض و مفادات نہیں بلکہ یہاں قانون کا پہلا ماخذ قرآن حکیم ہے جہاں قرآن ساکت ہو وہاں سنت رسول یا صحابہ کا تعامل دوسرا ماخذ ہے۔ ان حدود کے اندر اسلام نے عقل کی مداخلت کو گوارا نہیں کیا۔ لیکن جہاں صورت حال کی نسبت قرآن و سنت دونوں ساکت ہوں وہاں اسلامی معاشرہ کے ان افراد کو عقل و استدلال کا حق عطا کیا گیا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم و فضل کی وسعت کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر سکتے ہوں یعنی جن میں استنباط کی قابلیت ہو۔

قانون سازی کے طریقوں میں وسعت

اصول اگرچہ اسلامی نظام میں اصولِ استناد کی حد تک قانون کا ماخذ قرآن و سنت اور بعصول اجتہاد کی حد تک اجماع و قیاس ہیں۔ لیکن ان کے علاوہ بھی قوانین کی دریافت کے کچھ اور طریقے ہیں۔ جس مسئلہ میں منطقی استدلال اور براہِ راست اجتہاد کے ذریعے قانون معلوم کرنا ممکن نہ ہو یا جہاں قیاس کے قیاس اخذ کردہ حکم مصالح کے منافی ہو یا تقاضائے ضرورت کے خلاف نظر آئے وہاں اسلامی قانون وہ ہوگا جو قرآن و سنت کے دیئے ہوئے مزاج کے مطابق ہو اور انہی مقاصد کے تحت وضع کیا جائے جو قرآن و سنت میں معتبر ہیں۔ قانون سازی کے اس آخری طریقہ کو کچھ فقہا نے استحسان اور کچھ نے استصلاح سے تعبیر کیا ہے اصطلاحی طور پر استحسان اور استصلاح کی مختلف تعریفیں کی گئی ہیں۔ اور ان دونوں کے درمیان فرق بھی کیا گیا ہے اور ان میں سے بعض اپنی نوعیت کے اعتبار سے بعض سے مختلف ہیں۔ ہم ان فنی مباحث کو نظر انداز کرتے ہوئے اس حقیقت پر زور دینا چاہتے ہیں کہ استنباطِ احکام کے یہ دونوں طریقے اپنے مزاج اور نتیجہ کے اعتبار سے یکساں واقع ہوئے ہیں۔ ان کی اصل توجہ شریعت کی روح، اس کے مقاصد اور لوگوں کی ضروریات اور مصالح کی طرف ہوتی ہے۔ استصلاح انہی عمومی مصالح پر مبنی قانون سازی کا نام ہے۔ استحسان کسی مسئلہ کو اس کے حکم کے باب میں اس کے نظائر سے کاٹ دینے کا نام ہے۔ یہ طریقہ زیادہ تر فقہائے احناف نے اختیار کیا ہے۔ اس موضوع کی تفصیلات مصطفیٰ احمد الزرقا کی المدخل الفقہی العام، الآمدی کی الاحکام فی اصول الاحکام اور الشاطبی کی الموافقات میں موجود ہیں۔ بہرحال استحسان ہو یا استصلاح قانون کے دائرے میں وہ احکام بھی داخل ہیں جو کسی زمانے میں حالات و ضروریات کی مناسبت سے اس زمانہ کی اسلامی ریاست مرتب کرتی ہے۔ چونکہ دونوں طرح کے قوانین کا مقصد شریعت کے مقاصد کا حصول ہے لہٰذا ان کے درمیان عملاً کوئی تفریق نہیں کی جا سکتی۔ اسلام میں عادلانہ سیاست پر مبنی قانون سازی بھی اسلام کا ایک باب ہے۔

اس موقعہ پر حافظ ابن القیم الجوزی اعلام الموقعین میں بڑی مفید بات لکھ گئے:

انبیاء کی تشریف آوری اور کتابوں کے نازل ہونے کا یہ منشا تھا کہ لوگ اپنی زندگی میں جادۂ عدل سے نہ ہٹیں۔ کیونکہ عدل ہی کے سہارے زمین و آسمان قائم ہیں۔ لہٰذا جب حق کے نشان نمایاں ہو جائیں، عقلی دلائل سامنے آ جائیں اور کسی طریق سے بھی حق واضح ہو جائے تو وہی اسلام اور دین الٰہی ہے اور وہی اللہ کا فرمان ہے اور اسی میں

اس کی رضا مضمر ہے۔ عدل تک پہنچنے کے طریقوں یا اس کے دلائل اور علامات کو اللہ نے کسی ایک قسم کے احکام میں محصور کر کے دوسرے قوی تر زیادہ واضح اور مدلل طریقوں کو باطل قرار نہیں دیا ہے بلکہ اس نے جو طریقے بھی مشروع فرمائے ہیں ان کے ذریعے یہ واضح کر دیا ہے کہ اصل مقصد حق اور عدل کا قیام اور انسانی زندگی کی متوازن اور منصفانہ تنظیم ہے۔ لہٰذا حق تک جس طریقے سے بھی پہنچا جا سکے اور عدل کو جس طرح بھی پہچانا جا سکے اس کے مطابق قانون سازی ضروری ہے۔ اسباب و وسائل اور طریقے مقصود نہیں ہیں بلکہ اصل وہ مقاصد ہیں جن کی خاطر انہیں وضع کیا گیا ہے۔ البتہ مشروع طریقوں کو سامنے لا کر اللہ تعالیٰ نے مناسب مثالوں اور معقول اسباب کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ حق کے ثابت شدہ طریقوں میں سے ہر طریقہ آپ کو انہی مقاصد کی طرف لے جانے والا ملے گا۔ دینِ کامل سے اس کے علاوہ اور کسی چیز کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی۔ ہمارے نزدیک سیاستِ عادلہ شریعتِ کاملہ کی مخالف نہیں بلکہ اسی کا ایک حصہ اور اس کے مختلف ابواب میں سے ایک باب ہے اس کو سیاست کہنا محض ایک اصطلاحی بات ہے ورنہ اگر وہ عدل پر مبنی ہو تو شریعت ہیں داخل ہے۔

جدید اسلامی قانون سازی کی اصولی حیثیت کو سمجھنے کے لیے اس نکتہ کا فہم بہت ضروری ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ دورِ جدید کی ایک اسلامی ریاست قانون سازی کی اسلامی شرائط کی پابندی کرتے ہوتے جو قوانین مرتب کرے گی وہ شرعی اور دینی حیثیت کے حامل ہوں گے۔ البتہ ان اجتہادی قوانین کو وہ حیثیت حاصل نہ ہوگی جو قرآن و سنت کے منصوص احکام کو حاصل ہے۔ اجتہادی قوانین اختلافی ہوتے ہیں۔ تفصیلی امور میں اسلامی مفکرین کی ان رایوں کو کوئی آخری اور قطعی بات نہ سمجھنا چاہیے جو کسی نصِ صریح پر مبنی نہ ہوں۔

قانون سازی کی سب سے بڑی مشکل

ملکی زندگی میں قانون سازی کے لیے جو وقت پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اصولِ استناد اور اصولِ اجتہاد میں مصالحت کس طرح پیدا کی جائے۔ جمہوریت صرف اصولِ اجتہاد پر زور دیتی ہے۔ اس کے مقابلہ میں آمریت صرف اصولِ استناد کو صحیح تسلیم کرتی ہے حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں اصول اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور کسی ایک پہلو میں غلو برتنے سے دوسرا مجروح ہو جاتا ہے۔ اگر انسانی فکر کو غیر محدود

آزادی عطا کردی جاتی ہے تو تمدنی زندگی کی بنیاد اور اس کے مقصد و نصب العین پر کبھی اتفاق رائے نہیں ہو سکتا اور افراد متضاد نظریات رکھنے والے گروہوں میں بٹ جاتے ہیں جس میں سے ہر گروہ سیاسی میدان میں دوسرے گروہ کا رقیب اور دشمن بن جاتا ہے۔ اس طرح سے اعمال و عقائد کی وہ یکسانیت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو قانون کے موثر وجود کی شرط ہے۔ اس قسم کی بے قید آزادی سے تمدنی امور اور انسانی معاملات میں محض عقلی بنیادوں پر کوئی صحیح فیصلہ نہیں ہو سکتا کیونکہ عقل جذبات کی تابع خواہشات کی مغلوب، تعصبات کی اسیر اور انفرادی تجربات سے محصور ہوتی ہے۔ دوسری طرف اگر صرف اصول استناد پر زور دیا جائے اور اصول اجتہاد کو نظر انداز کر دیا جائے تو انسان کی فکری ارتقا کی راہیں بالکل مسدود ہو جاتی ہیں اور اس کی حیثیت صرف ایک مشین کے پرزے کی رہ جاتی ہے۔ اصول استناد میں غلو برتنا انسان کی ذہنی موت ہے جو مغربی تمدن ان دونوں میں کبھی مصالحت پیدا نہ کر سکا اور ہمیشہ کسی نہ کسی میں غلو کرتے رہے۔ انسانیت کی سعادت دوسرے تمام شعبوں کی طرح یہاں بھی عدل و توازن کے دامن سے بندھی ہوتی ہے اور جب تک کوئی ایسا نظام اختیار نہ کیا جائے جس میں اصول استناد کے ساتھ اصول اجتہاد کی بھی رعایت رکھی گئی ہو اور افکار و اعمال کی بے قیدی کا سد باب کرنے کے ساتھ جائز حدود میں فکر و عمل کی آزادی بھی دی گئی ہو اس وقت تک انسانی زندگی کا قافلہ اسی طرح بھٹکتا رہے گا۔ زمانۂ خلافت راشدہ میں ان دونوں میں ہم آہنگی قائم رہی۔ خلافت راشدہ کے بعد اس میں اعتدال باقی نہ رہا۔ اصول استناد پر زیادہ زور دینے والے ایک طرف اور اصول اجتہاد پر زور دینے والے الگ اہل حدیث اور اہل الرائے کے نام سے معاشرے میں پیدا ہو گئے۔ خلافت راشدہ کے زمانے میں مسلمانوں کی سیادت و امامت جن لوگوں کے ہاتھ میں تھی وہ نئے پیش آنے والے مسائل زندگی میں انفراداً یا اجتماعاً صحیح فیصلہ کرنے کی استعداد رکھتے تھے اور روح اسلام اور اسلامی قانون سازی کے اصول سے اتنی واقفیت اور مسائل کے استنباط کی قوت رکھتے تھے جس سے وہ اُمت کی مشکلات کو حل کرنے اور اشتباہ و تحیر کے موقعہ پر ان کی رہنمائی کرنے پر وہ اتنی ذکاوت و مستعدی و علم رکھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات میں جو طبعی قوتیں پیدا کی ہیں اور زمین میں دولت و قوت کے جو خزانے اور چشمے رکھ دیے ہیں ان سے کام لیتے ہیں اور ان کو اسلام کے مقاصد کے لیے مفید بناتے لیکن دنیا کی بدقسمتی تھی کہ خلفائے راشدین کے بعد دنیا کی رہنمائی کے منصب جلیل پر وہ لوگ حاوی ہو گئے جنہوں نے اس کے لیے کوئی حقیقی تیاری نہ کی تھی۔ خلفائے راشدین کی طرح اور خود اپنے زمانے کے بہت سے مسلمانوں کی طرح انہوں نے اعلیٰ دینی اور اخلاقی تربیت نہیں پائی تھی ان کا دینی،

روحانی اور اخلاقی معیار اتنا بلند نہ تھا جو ملتِ اسلامیہ کے رہنماؤں کے شایانِ شان ہے۔ ان کے ذہن اور طبیعتیں عرب کی قدیم تربیت اور ماحول کے اثرات سے بالکلیہ آزاد نہ تھیں۔ ان میں نہ رُوحِ جہاد تھی اور نہ قوتِ اجتہاد جو دنیا کی پیشوائی اور عالمگیر قیادت کے لیے ضروری ہے۔ خلیفہ راشد عمر بن عبدالعزیز کی ذات کو مستثنیٰ کر کے عام خلفائے بنی اُمیہ اور بنی عباس کا حال یہی تھا۔

بہرحال استنباط کے معنے لغت میں زمین کھود کر اس کی تہ سے پانی نکالنے کے ہیں اور اصطلاح میں اصول و استناد کی تہ میں جو حقائق اور معارف مستور ہیں ان کو خداداد فہم و فراست سے نکالنے کا نام استنباط اور اجتہاد ہے۔ امام رازی نے اس موقعہ پر یہ بات برمحل کہی ہے کہ یہ آیت مدلولاً بتارہی ہے کہ :

۱۔ یہ کہ نئے نئے مسائل جو پیش آئیں گے ان کی بابت اگر احکام نص میں نہیں تو استنباط کیے جائیں گے۔

۲۔ یہ کہ استنباط بھی ایک حجت شرعی ہے۔

۳۔ یہ کہ عوام پر اہل علم کی تقلید واجب ہے۔

۴۔ یہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس پر مامور تھے کہ احکام کا استنباط کرتے رہے ہیں۔

اور الجصاص کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ اگر کسی امام معصوم کا وجود اُمت میں ضروری ہوتا تو قرآن میں استنباط احکام کی ہدایت نہ ہوتی۔ امام خود ہی ابتداءً ان احکام سے واقف ہوتا ہے۔

ہدایت کے دو چراغ

۱۳۱۔ اور دیکھو اگر اللہ کا تم پر فضل اور رحمت نہ ہوتی تو تھوڑوں کو چھوڑ کر سب کے سب شیطان کے پیچھے لگ جاتے یعنی اگر اللہ اپنے فضل سے تمہاری اصلاح و تربیت کے لیے احکام نہ بھیجتا اور تم کو وقتاً فوقتاً حسبِ ضرورت ہدایت اور تنبیہہ نہ کرتا جیسا کہ اس موقعہ پر رسُول اور سرداروں کی طرف رجوع کرنے کو فرمایا تو تم گمراہ ہو جاتے مگر چند خواص جو کامل العقل اور کامل الایمان ہیں ان تنبیہات کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھو اور شکر کرو اور پوری تعمیل کرو۔ [1]

اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو امام، ہادی، معلم فرمایا ہے۔ یعنی نبوت سے سرفراز

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہونے کے بعد آپ کی ذات گرامی مجسّم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہو گئی ہے آپ کی تشریف آوری اسی لیے ہوئی ہے کہ آپ لوگوں کی رہنمائی فرمائیں۔ آپ نے اُمّت کے سامنے ہدایت کے دو چراغ روشن کیے ہیں۔ ان دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو جنہیں یہود اپنی شرارت سے گمراہ کرنا چاہتے تھے فرمایا،

کیف تکفرون و انتم تتلی علیکم آیات اللہ و فیکم رسولہ

تم کفر کیسے کرتے ہو حالانکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیات تلاوت ہوتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول ہے۔

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں اہل ایمان کو ملی ہیں ایک تو آیات الٰہی جو ان کو سنائی جاتی ہیں۔ دوسرے خود رسول کا مستقل وجود جو اپنی تعلیم و تربیت، فیض صحبت، نمونۂ تقلید، کتاب کی شرح و تفسیر، قانون سازی، فرماں روائی سے ان کو بھٹکنے نہیں دیتا اور گمراہی سے مانع ہوتا ہے اگر صرف کتاب الٰہی اس کام کو انجام دے سکتی تو رسول کی حاجت نہ ہوتی۔ اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتاب صامت قرآن ہے اور رسول کتاب ناطق ہے اور دونوں مل کر حبل اللہ ہیں اسی لیے اعتصام بحبل اللہ کا حکم ہے۔ غالباً اس حدیث کے بھی یہی معنے ہیں جس کا اعلان آپ نے حجۃ الوداع میں کیا۔

انی تارك فیکم الثقلین کتاب اللہ و سنتی

میں تم میں دو چیزیں چھوڑ رہا ہوں ایک کتاب اللہ دوسرے اپنی سنت

یہ بات میں پہلی جلد میں بتا چکا ہوں کہ نبوت کے کمال علم کو رحمت اور کمال عمل کو فضل سے تعبیر کرنا قرآن کی اصطلاح ہے۔ فضل ان خوبیوں کو کہتے ہیں جو انسان کی ذات میں ایسا جلا پیدا کریں جس سے دوسرے متاثر ہو سکیں اور رحمت نام ہے اس شرف کا جو آدمی کو بغیر محنت کے حاصل ہو۔ نبوت کا علم کتاب اللہ یعنی قرآن ہے یہ سر تا سر رحمت ہے کیونکہ وہبی ہے اور نبوت کا عمل اللہ کا فضل ہے کیونکہ محنت و مشقت کے ذریعے عطا ہوا ہے۔ اسی لیے رزق کو بھی قرآن نے بے شمار مقامات پر اللہ کا فضل کہا ہے۔ خاص نبوت کے موضوع پر قرآن میں ہے،

الا رحمۃ من ربك و کان فضلہ علیك کبیرا

اس میں بتایا ہے کہ علم وحی اور کتاب کا آنا اگر اللہ سبحانہٗ کی رحمت ہے تو اس کے نتیجے میں آپ کی محنتوں، مشقتوں کے ذریعے آپ کے دامن میں عمل کا ظہور اللہ کا فضل ہے۔ علم اگر پڑھنے کی چیز

ہے یعنی قرآن تو عمل برتنے کی چیز ہے یعنی سنت۔ قرآن میں آگے آپ پڑھیں گے کہ نبوت کے علم و عمل یعنی اللہ کی رحمت و فضل ہی پر خوشیاں منانے، اترانے اور اقوام دُنیا کے سامنے اکڑنے کا حکم ہے۔

قل بفضل اللہ و برحمتہ فبذالك فليفرحوا

کہہ دو کہ اللہ کے فضل اور اللہ کی رحمت ہی پر اہلِ ایمان کو خوشی منانی چاہیے

اسلام میں دو عیدیں قرآن کے اسی مطالبے کو پورا کرنے کا عملی شاہکار ہیں۔ایک نبوت کے کمالِ علم اور دوسرے نبوت ہی کے کمالِ عمل کی یادگار میں منائی جاتی ہے۔

قرآن کے شارحین نے یہاں فضل و رحمت کی قرآن اور حضور کی تشریف آوری سے تفسیر کی ہے صرف ابومسلم اصفہانی نے فضل و رحمت سے مراد مدد اور کامیابی بتاتی ہے۔

یہاں چونکہ اس آیت میں استنباط کا ذکر ہوا ہے اس لیے موقعہ کی مناسبت چاہتی ہے کہ فضل و رحمت سے قرآن و سنت مراد ہو۔ یعنی اصول اجتہاد کی ضمنی تصریح کے بعد ضروری تھا کہ اصول استناد کا صراحتہً ذکر آئے۔ اس طرح مصادرِ قانون کا پورا تذکرہ آ گیا ہے۔ فرق صرف یہ کہ اسلام کے سیاسی نظام میں مصادرِ قانون والی آیت یا ایہا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم میں اصول استناد کو پہلے اور اصولِ اجتہاد کو بعد میں پیش کیا تھا اور یہاں اصول اجتہاد کو پہلے اور اصول استناد کا بعد میں ذکر کیا ہے۔ یاد رکھیئے کہ اسلام میں قرآن و سنت اصولِ استناد ہیں۔

اصولِ استناد میں باہم رشتہ

اگرچہ قرآن و سنت دونوں الگ الگ ہیں لیکن دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔ اسی اعتبار سے ان کے مجموعہ کو حبل اللہ کہا گیا ہے۔ دونوں میں الگ الگ ہونے کے باوجود قرآن کا بنایا ہوا رشتہ یہ ہے کہ کتاب اللہ اگر ما انزل اللہ علیك اللہ کا اتارا ہوا علم ہے تو سنتِ رسول اسی علم کا پرتو اور نقش ما اراك اللہ اللہ کا دکھایا ہوا ہے اس لیے روشنی ہونے کی حیثیت میں اور خدا کی جانب سے ہدایت ہونے میں ان دونوں کو ایک دوسرے سے جُدا نہیں کیا جا سکتا ان میں وجود کے اعتبار سے باہم اگر کچھ فرق ہے تو صرف نامہ اور پیام کا ہے۔ علمِ نبوت یعنی قرآن اگر نامۂ خداوندی ہے تو عمل نبوت یعنی سنت پیامِ خدا ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ حضور انور

صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے جو سرمایہ علم وعمل لے کر تشریف لائے ہیں وہ سب اللہ کی جانب سے ہے اور دونوں اُمت کو بطریق تواتر ملے ہیں۔ علم نبوت قرآن کا تواتر علمی ہے اور عمل نبوت سنت کا تواتر عملی ہے۔ اسلام میں جیسے علم نبوت کے لیے قراء سبعہ کی روایات ہیں ایسے ہی عمل نبوت کے لیے محدثین کی روایات ہیں۔ نہ تو قرآن کا قرآن ہونا قراء سبعہ کی روایات پر موقوف ہے اور نہ سنت کا سنت ہونا محدثین پر منحصر ہے۔ وہ تاریخ علم نبوت ہے یہ تاریخ عمل نبوت ہے۔ مزید تفصیل کے لیے جلد اوّل میں سورۃ فاتحہ میں "برہانِ علم اور برہانِ عمل" کا بحث مطالعہ فرمائیے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اصول استناد یعنی نبوت کا لایا ہوا علم وعمل نہ ہوتا تو تم شیطان کے پیچھے لگ جاتے۔ شراب نوشی، بداخلاقی، جنون سود خواری، لوٹ کھسوٹ اور مال کی محبت، سنگدلی اور بے رحمی کی تصویر ہوتے۔ تمہارے اموال بادشاہوں کے ہاتھ کا میل ہوتے اور تم ان کے خانہ زاد غلام ہوتے۔ صرف چند نفوس ہی ایسے ہوتے جن کے دامن ان برائیوں سے داغدار نہ ہوتے۔ اتباع شیطان توہمات اور جاہلانہ رسوم کے تحت زندگی بسر کرنے کا نام ہے۔ قرآن میں ایک سے زیادہ بار آیا ہے لا تتبعوا خطوات الشیطان یہاں شیطان سے مراد وہی ہے جس کا ذکر آپ پہلے پڑھ چکے ہیں و یرید الشیطان ان یضلھم ضلالا بعیداً ۔

فَقَاتِلْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا تُكَلَّفُ إِلَّا نَفْسَكَ ۚ وَحَرِّضِ الْمُؤْمِنِينَ ۖ
عَسَى اللَّهُ أَنْ يَكُفَّ بَأْسَ الَّذِينَ كَفَرُوا ۚ وَاللَّهُ أَشَدُّ بَأْسًا وَ
أَشَدُّ تَنْكِيلًا ﴿٨٤﴾ مَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً حَسَنَةً يَكُنْ لَهُ نَصِيبٌ
مِنْهَا ۖ وَمَنْ يَشْفَعْ شَفَاعَةً سَيِّئَةً يَكُنْ لَهُ كِفْلٌ مِنْهَا ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلَىٰ
كُلِّ شَيْءٍ مُقِيتًا ﴿٨٥﴾

بس آپ راہِ خدا میں قتال کریں آپ پر اپنی ذات کے سوا کسی کی
ذمہ داری نہیں ڈالی جاتی ہے اور آپ اہل ایمان کو بھی جہاد کی
ترغیب دیں کیا بعید ہے کہ اللہ سبحانہ اہلِ کُفر کی لڑائی کو روک
دے[۱۳۲] اور اللہ کی ذات گرفت اور عذاب دینے میں بہت سخت
ہے[۱۳۳]۔ جو شخص دوسرے شخص کے ساتھ نیکی کے کام میں ملتا اور
لگتا ہے تو اسے اس کام میں سے ضرور حصہ ملے گا اور جو کوئی
بُرائی میں دوسرے کے ساتھ ملتا اور لگتا ہے تو اس کے لیے

اس برائی میں حصہ ہوگا[134]، اور اللہ ہر چیز کی نگرانی کرنے والا ہے[135]۔

ہر حال میں حق کا بول بالا کرو

اگر اس علم صادق اور عمل حسن کے لیے کوئی ایسی پشت پناہ طاقت نہ ہو جو آپ کا ہاتھ بٹا سکے تو نبی ہونے کی حیثیت میں آپ کو تن تنہا ہی یہ کام انجام دینا ہوگا۔ یہ آپ کی ذاتی ذمہ داری ہے۔ نبوت کا لایا ہوا علم و عمل صرف ایک طرز فکر نہیں ہے جو انسان کی اجتماعی فلاح اور اس کے نظام اجتماعی کی صلاح و فساد سے بالکل بے تعلق ہو بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک طریق عمل ہے جس کے مطابق نبوت اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی ماحول کو بدلتی ہے یہ نبوت کی زندگی کا اصل اصول اور علم و عمل کا حقیقی جوہر ہے۔ اگر اس ذریعہ کو اسلامی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو پھر اسلام بھی کائنات کا ایک بے جان فلسفہ رہ جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے یہاں نبوت کو مخاطب کر کے کہا کہ وہ تنہا حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے کیونکہ نبوت کے علم و عمل کی رو سے خدا کا صحیح تصور یہ نہیں ہے کہ دنیا میں جو کچھ ہو رہا ہے وہی اس کی عین مرضی ہے اس لیے رائج الوقت تصورات اور نظامات کے خلاف آواز نہیں اٹھانی چاہیے بلکہ اس کے برعکس خدا کا تصور نبوت سے اور نبوت کو ماننے والوں سے یہ مطالبہ کرتا ہے کہ دنیا کی ان قوتوں کے خلاف صف آرا ہو جاؤ جو کائنات کے مادی اور انسانی وسائل کو اس کے بنانے والے کی مرضی اور منشا کے خلاف استعمال کر رہی ہیں۔

جو دعوت انسانیت کی سعادت و نجات کا مدار ہے اس کی عند اللہ یہ قیمت ہے کہ اس کے لیے نوامیس فطرت اور قوانین بھی توڑ دیے جاتے ہیں اور اس کے لیے وہ کچھ کیا جاتا ہے جو وہم و گمان میں بھی نہیں ہوتا۔ بلاشبہ یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ اسلامی نقطہ نظر سے فرد کی شخصیت کا ارتقا اور اس کی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے۔ دین کا مخاطب فرد ہے، خدا کی عبادت اور طاعت کی طرف فرد کو دعوت دی گئی ہے۔ حقوق و فرائض فرد پر عائد کیے گئے ہیں۔ امر و نہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں۔ طاعت و جزا کی امید فرد کو دلائی گئی ہے۔ اس نظام علم و عمل میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کو ابتدا میں عامل کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے مگر اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ جماعت اور اجتماعی نظام نبوت کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے۔ اس آیت میں ان

کی اہمیت کو بتا رہا ہے کہ اگر کوئی بھی اس معاملہ میں آپ کا ساتھ نہ دے پھر بھی آپ تن تنہا اس کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ فرد کی شخصیت کا ارتقا اور اس کی ذات تکمیل جماعت ہی کی اصلاح اور اجتماعی نظام کی بہتری پر موقوف ہے۔ انسان پیدا ہی فرد کی صورت میں ہوتا ہے مگر رہتا ایسا نہیں ہے گوناگوں اجتماعی تعلقات بھی فرد کی نشوونما کے ضامن ہوتے ہیں۔

۱۳۲۔ بس آپ راہ خدا میں قتال کریں۔ آپ پر اپنی ذات کے سوا کسی کی ذمہ داری نہیں ہے اور آپ اہل ایمان کو بھی جہاد کی ترغیب دیں کیا بعید ہے کہ اللہ سبحانہٗ اہل کفر کی لڑائی کو روک دیں۔ یعنی اگر اللہ اپنے فضل سے تمہاری اصلاح اور تربیت کے لیے احکام نہ پہنچاتا اور تم کو وقتاً فوقتاً حسب ضرورت ہدایت اور تنبیہہ نہ فرماتا رہتا جیسا کہ اس موقع پر رسول اور سرداروں کی طرف رجوع کرنے کو فرمایا تو تم گمراہ ہو جاتے مگر چند خواص جو کامل العقل اور کامل الایمان ہیں ان تنبیہات کو اللہ تعالیٰ کا انعام سمجھو اور شکر کرو اور پوری تعمیل کرو[1]

مقصد یہ ہے کہ آپ خود جہاد پر آمادہ ہو جایئے خواہ کوئی دوسرا ساتھ دے یا نہ دے۔ آپ پر کسی دوسرے کے عمل کی ذمہ داری نہیں ہے۔ تاریخ کا بیان ہے کہ جب غزوۂ حمراء الاسد یا اُحد شوال میں ہو چکا تو اس کے معاً بعد ذی قعدہ میں آپ مشرکین کے وعدہ کا خیال کر کے بدر کی طرف پھر چلنے پر آمادہ ہو گئے۔ اس وقت لوگ ساتھ دینے میں پس و پیش کرنے لگے۔ کچھ تو اس لیے کہ ابھی اُحد کے زخم بالکل تازہ تھے اور کچھ اس لیے بھی کہ افواہی خبروں پر یقین کرتے تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہ رنگ دیکھ کر تن تنہا چل کھڑے ہونے پر آمادہ ہو گئے۔ قرآن کا یہ انداز بیان مادی اسباب کی ذاتی تاثیر کے خلاف سب سے بڑا چیلنج ہے۔ ان اسباب اور ان کے ماننے والوں کی قوت کا مذاق اڑانے والا اور ان کی کمزوری اور غیر مفید ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مادیت اور اس کے حاملین کے استخفاف و استہزاء پر مامور ہو کر آئے تھے جو اس کی تقدیس کرتے، اس کا کلمہ پڑھتے اور اس پر ہر طرح بھروسہ کرتے تھے، ان کو حقیر سمجھنے اور خدا کی مدد سے ان پر فتح پانے اور ان کی تذلیل میں خاص لذت، قلبی تسکین اور روحانی غذا حاصل تھی اور گویا وہ اپنے ایمان و توحید کے طویل اور بابرکت سفر میں ہر قدم پر مادیت کو اپنے قدموں سے روندنے، اپنے عزم سے مسخر کرنے کا التزام کر کے شک پر ایمان کی، مادے پر روح کی، نظام شرک پر توحید کی نئی فتح کا سروسامان

[1] افادات شیخ الاسلام

کر رہے تھے۔ نبوت نے اپنی زندگی میں اپنے ماحول کی قوت و بادشاہت مادہ اور معدہ کی عبادت، باطل خداؤں اور دھمکانے والی طاقتوں کے خلاف ہمیشہ علم بغاوت بلند رکھا۔ اس کا راز یہ تھا کہ لوگوں کی توجہ مادی اسباب سے ہٹا کر اللہ کی طرف لگے۔

اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ حرض المومنین علی القتال یعنی درجہ ترغیب میں آپ کے فرائض میں تبلیغ داخل ہے۔ تحریض کے معنے کسی چیز کی خوبیاں بکثرت بیان کر کے اس کی جانب شوق و رغبت دلانا۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا کام ان کو ترغیب دینا ہے۔ ترغیب کے بعد بھی وہ تیار نہ ہوں تو آپ اپنا فرض ادا کر چکے ان کے کردار کے بارے میں آپ سے دریافت نہ کیا جائے گا۔

چونکہ تن تنہا میدان جنگ میں کود پڑنے سے خطروں کے استقبال کا یقینی اندیشہ تھا اس لیے فرمایا عسی اللہ ان یکف یعنی اس کی امید ہے کہ اللہ تعالیٰ کافروں کی جنگ روک دے اور ان کو مرعوب اور مغلوب کر دے۔

اس تحریض کے نتیجہ میں آپ کی ہمرکابی میں ۷۰ صحابہ کرام نکلے۔ ابو سفیان دو ہزار کا لشکر لے کر نکلا۔ گھوڑے ساتھ تھے لیکن مرالظہران پہنچ کر اس کی ہمت نے جواب دے دیا اس نے کہا کہ قریش کے لیے شادابی اور سرسبزی کا سال مناسب ہے کیونکہ اونٹ سبزہ اور درختوں کے پتے کھائیں گے لوگ ان کا دودھ پی کر گزارہ کر لیں گے اب خشک سالی ہے، یہ وقت لڑائی کے لیے مناسب نہیں ہے چنانچہ وہ سب واپس چلے گئے اور عسی اللہ ان یکف کی عملی تفسیر ہو گئی۔

اللہ کا عذاب سخت ہوتا ہے

۱۲۳۔ اور اللہ کی ذات گرفت اور عذاب دینے میں سخت ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی لڑائی اور اس کا عذاب کافروں کے ساتھ لڑنے سے بہت سخت ہے لہٰذا جو لوگ کافروں کے ساتھ لڑنے اور ان کو مارنے اور ان کے ہاتھ سے مارے جانے سے ڈرتے ہیں وہ اللہ تعالیٰ کے غصہ اور اس کے عذاب کا کیوں کر تحمل کر سکتے ہیں۔

نبوت کی جانب سے اللہ کی گرفت اور عذاب کی دھمکی صرف اخلاقی یا اصلاحی ضرورت کے تحت نہیں ہوتی ہے۔ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے، نبوت کے طریقہ میں یہ ایمان وجدان، قلبی جذبہ و احساس ایسا عقیدہ ہے کہ جو انسان کے احساسات، خیالات و افکار اور اعمال پر پورے طرح قابو حاصل کر لیتا ہے اور دوسرے طریقہ میں صرف اعتراف، اقرار اور ضابطہ کی حیثیت رکھتا

ہے۔ اوّل الذکر کے یہاں عذابِ خداوندی کا ذکر ہوتا ہے تو تڑپ وارفتگی اور خوف کے ساتھ اور اس کو بیان کرتے ہیں تو جوش و قوت کے ساتھ، اور دوسرے اس کے بارے میں گفتگو کہتے ہیں تو محض اخلاقی یا معاشرتی ضرورت کی حد تک اور اصلاح یا اخلاقی تنظیم کے جذبہ سے اور دونوں میں مشرق و مغرب کے فاصلہ سے زیادہ فرق ہے۔

آیت کی تشریح ختم ہوگئی ہے لیکن ایک ضروری بات کہنی باقی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں اکیلے جنگ کرنے کا حکم بتا رہا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بھروسہ تعداد نہ تھا بلکہ نصرتِ الٰہی پر تھا۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ "جب یہ آیت نازل ہوئی تو آپ نے فرمایا کہ میں ضرور جہاد کے لیے جاتا ہوں اگرچہ ایک بھی میرے ساتھ نہ ہو اور کل سترہ سو ہمراہیوں کے ساتھ بدرِ صغریٰ کو بغرضِ جہاد تشریف لے گئے جس کا وعدہ ابوسفیان سے غزوۂ اُحد کے بعد ہوا تھا۔ حق تعالیٰ نے ابوسفیان اور کفارِ قریش کے دل میں رُعب اور خوف ڈال دیا۔ کوئی مقابلہ میں نہ آیا اور وعدے سے جھوٹے ہوتے اور حق سبحانہٗ نے اپنے ارشاد کے موافق کافروں کی لڑائی روک دی اور آپ ہمراہیوں سمیت خیر و سلامتی کے ساتھ واپس تشریف لے آتے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شجاعت

یہ آیتِ قرآنی جیسے طبعی اسباب قانون اور علت و معلول کے عام قانون کی کارفرمائی کے خلاف ایک تاریخی شہادت ہے ایسے ہی یہ آیت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بے مثال اور بے نظیر شجاعت کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے۔ شجاعت کا وصف انسانیت کا اعلیٰ جوہر اور اخلاق کا سنگِ بنیاد ہے۔ عزم، استقلال، حق گوئی، راست گفتاری، بزدلی یہ تمام باتیں شجاعت ہی سے پیدا ہوتی ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سینکڑوں مصائب و خطرات اور بیسیوں معرکے اور غزوات پیش آتے، لیکن پامردی اور ثبات کے قدم نے لغزش نہیں کھائی۔ غزوہ بدر کی گھمسان کی لڑائی میں ۳۰۰ نہتے مسلمانوں کے قدم جب ایک ہزار مسلح فوج کے حملوں سے ڈگمگا جاتے تھے تو دوڑ کر مرکزِ نبوت ہی کے دامن میں آکر پناہ لیتے تھے۔ حضرت علی جن کے دست و بازو نے بڑے بڑے معرکے سر کیے، کہتے ہیں کہ جب بدر میں زور کا رن پڑا تو ہم لوگوں نے آپ ہی کی آڑ میں آکر پناہ لی۔ آپ سب سے زیادہ شجاع تھے۔ مشرکین کی صف سے اس دن آپ سے زیادہ کوئی قریب نہ تھا[1]

[1] مسند امام احمد

حضرت انس بن مالک کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سب سے زیادہ شجاع تھے۔ ایک بار مدینہ میں شور ہوا کہ دشمن آگئے، لوگ مقابلہ کے لیے تیار ہوگئے لیکن سب سے پہلے ہوآگے بڑھ کر نکلا وہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جلدی میں آپ نے اس کا بھی انتظار نہ کیا کہ گھوڑے پر زین کس لی جائے۔ گھوڑے کی برہنہ پشت پر سوار ہوکر آپ تمام خطروں کے مقامات میں گشت لگا آتے اور واپس آکر لوگوں کو تسکین دی کہ کوئی خطرے کی بات نہیں[1]

اللہ کی راہ میں تعاون کی قدر و قیمت

۱۲۴۔ جو شخص دوسرے شخص کے ساتھ نیکی کے کام میں ملتا اور لگتا ہے تو اسے اس کام میں حصہ ملے گا اور جو کوئی برائی میں دوسرے سے ملتا اور لگتا ہے تو اس کے لیے اس برائی میں حصہ ہوگا یعنی اگر کوئی نیک کام میں سفارش کرے جیسے نبی کریم کا مسلمانوں کو جہاد کی تاکید کرنا یا کوئی بری بات میں سعی کرے جیسا منافق اور سست مسلمانوں کا جہاد سے ڈر کر دوسروں کو بھی ڈرانا تو اول صورت میں ثواب کا اور دوسری صورت میں گناہ کا حصہ ملے گا۔ ایسے ہی اگر کوئی محتاج کی سفارش کرکے دولتمند سے کچھ دلوادے تو یہ بھی خیرات کے ثواب میں شریک ہوگا اور جو کوئی کافر مفسد یا سارق کو سفارش کرکے چھڑوادے پھر وہ فساد اور چوری کرے تو یہ بھی شریک ہوگا فساد اور چوری میں[2]

یہ مطلب بھی بتایا گیا ہے کہ یہ اپنی اپنی پسند اور اپنا اپنا نصیب ہے کہ کوئی خدا کی راہ میں کوشش کرنے اور حق کو سربلند کرنے میں لوگوں کو ابھارے اور اس کا اجر پائے اور کوئی خدا کے بندوں کو غلط فہمیوں میں ڈالنے اور ان کی ہمتیں پست کرنے اور ان کو اعلاء کلمۃ اللہ کی سعی و جہد سے باز رکھنے میں اپنی قوت صرف کرے اور اس کی سزا کا مستحق ہو[3]

اس صورت میں آیت حرض المومنین علی القتال سے متعلق ہے۔ لیکن یہاں یہ لفظ جس انداز میں استعمال ہوا ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ شفاعت عرفی معنے میں نہیں بلکہ لغوی معنے میں ہو۔ عربی میں شفع الشئی کے معنے ہیں اس کے ساتھ اسی طرح کی دوسری چیز کو ملا کر اس کو جوڑا کر دیا۔ اب وہ چیز یگانہ اور طاق نہیں رہا بلکہ جفت اور شفع ہو گیا۔ آیت بالا میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا کہ آپ تن تنہا میدان جنگ میں اعلاء کلمۃ اللہ کے لیے جائیے۔ آپ پر اپنی ذمہ داری ہے کسی اور کی

---

[1] صحیح بخاری [2] افادات شیخ الاسلام [3] تفہیم القرآن

ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ نبی ہونے کی حیثیت میں آپ کا کام اہل ایمان کو کام کی دعوت دینا، تلقین کرنا اور ترغیب دینا ہے اور بس، یہ فرمانے کے بعد قرآن نے اہل ایمان کو مخاطب کیا ہے کہ ایک طرف نبوت خدا کی زمین میں خدا کا کلمہ بلند کر رہی ہے۔ اس کے عطا کیے ہوتے قانون سعادت اور ضابطہ حیات کا بول بالا کر رہی ہے اور دوسری طرف نبوت کی راہ میں روڑے اٹکانے والا روڑے اٹکا رہا ہے۔ اب جو شخص نبوت کے ساتھ لگ کر نبوت کے ہاتھ بٹائے گا اور اسلام و کفر کی کشمکش میں اسلام کا بول بالا کرے گا اس کو ضرور اس کا حصہ ملے گا اور اس کے مقابلہ میں جو شخص نبوت کے مخالف کیمپ میں جا کر کام کرے تو اس کی پاداش میں ضرور اس کا حصہ ہوگا۔ اس آیت نے کھول دیا کہ ایمان باللہ کا حقیقی امتحان جہاد فی سبیل اللہ میں ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے اس لیے مسلمانوں کو اپنی ذاتی نیکیوں پر قانع ہو کر نہ بیٹھنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے کہ ہماری نیکیاں خالص اور بے آمیز نہ ہوں بلکہ ان میں ذاتی یا قومی مفاد کی خواہش بھی ہو اپنے ایمان کا امتحان کرنا چاہتے ہو تو دیکھو کہ خدا کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی خواہش تم میں کتنی ہے کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے من مات ولم یغزو ولم یحدث بہ نفسہ مات علی شعبۃ من النفاق، جس شخص کو اس طرح موت آئے کہ نہ تو اس نے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور نہ اپنے دل میں جہاد کی خواہش کی تو وہ ایک طرح سے نفاق کی حالت میں مرا۔

اس صورت میں اس آیت کا سارا زور فقاتل فی سبیل اللہ پر ہے۔ آیت میں شفاعت حسنہ اور شفاعت سیئہ کا ذکر ہے۔ شفاعت حسنہ تو بلاشبہ یہ ہے کہ نبوت کو تن تنہا یہ کام کرنے کا حکم ملا ہے اب جو بھی نبوت کے ساتھ ملے گا لگے گا نبوت کی تائید و تقویت کے لیے قدم اٹھائے گا سرفروشی اور جاں نثاری کا مظاہرہ کرے گا۔ کافرانہ نظام تمدن سے غیر مطمئن ہو کر اسے اللہ کے حکم کے مطابق بدلنے کی کوشش کرے گا اس کو نبوت کے ساتھ ملنے کا ضرور اجر ملے گا۔ یہ شفاعت حسنہ ہے اس کے برعکس شفاعت سیئہ یہ ہے کہ اس کی ہمنوائی اور تائید و تقویت کا سامان کرے اور ذریعہ بن جائے اس کے ساتھ لگ جاتے یا مل جائے جو خدا کی زمین میں طاغوت کا نظام قائم کر رہا ہے۔ اللہ کے بندوں کو اللہ کی بندگی سے نکال کر ارباباً من دون اللہ کی بندگی میں داخل کر رہا ہے۔ غیر اسلامی ماحول اور کافرانہ نظام تمدن کے لیے کوشش کر رہا ہے۔ اسلامی تہذیب سے بیزار ہو کر اس کی جگہ کافرانہ تہذیب پر محنت کر رہا ہے جو اس کام کرنے والے کے ساتھ لگے گا اس کو اس کام کی پاداش میں سزا ضرور مل کر رہے گی۔

اس آیت کا منشا یہ ہے کہ جو لوگ دینِ حق کے قیام اور اسلامی طرزِ زندگی کو ایک عملی بنانے میں جانفروشی اور ایثار و قربانی کریں گے اور ان کا ساتھ دیں گے جو اسلام کو برتر کرنے کے لیے کوشاں ہیں وہ من یشفع شفاعۃ حسنۃ کے مصداق ہیں۔ اور جو لوگ حق کے قیام کی خاطر ان لوگوں کے ساتھ ہو کر جان و مال کی قربانی نہیں دیتے اور صداقت کی تبلیغ و اشاعت کے لیے مصیبتیں برداشت نہیں کرتے جو اسلام کا بول بالا کرنے کی کوششیں کر رہے ہیں بلکہ اس کے برعکس ان کی تمام کوششیں ان نظاموں کی حفاظت و بقا میں مصروف ہیں جن کو اللہ نے مٹانے کا حکم دیا تھا غیر اسلامی تہذیب و تمدن کی جگہ اسلامی تہذیب و تمدن کے قیام کی نہ ان میں آرزو ہے اور نہ وہ اس کے لیے کسی قسم کی جدوجہد کرنے پر آمادہ ہیں تو ایسے لوگ شفاعتِ سیئہ کے مصداق ہیں۔

اللہ کی حفاظت و نگرانی

۱۳۵ - اور اللہ ہر چیز کی نگرانی کرنے والا ہے۔ یعنی خدا تعالیٰ تمام چیزوں پر قادر ہے اور ہر چیز کا حصہ بانٹنے والا ہے تو نیکی اور بدی کا حصہ دینے میں اسے کوئی دشواری نہیں ہے [1] اصل ارشاد میں لفظ مقیت آیا ہے۔ یہ قوت سے بنا ہے جو انسان کے بقا کا سامان ہے اس کی جمع اقوات آتی ہے اسی سے اقات یقیت ہے۔ مقیت وہ ہے جو ہر چیز کو قوت دیتا اور اس کی نگرانی کرتا ہے۔ اور اس کے لزومی معنے قدرت والے کے ہیں۔ ابن جریر نے قدرت کے معنے کو راجح کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو ذات تمہارے جسم کی پرورش گاری کر رہی ہے وہ اس پر بھی قادر ہے کہ نیکی میں ہاتھ بٹانے پر اور برائی میں حصہ لینے پر جزا اور سزا دے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

وَإِذَا حُيِّيتُم بِتَحِيَّةٍ فَحَيُّوا بِأَحْسَنَ مِنْهَا أَوْ رُدُّوهَا إِنَّ اللَّهَ
كَانَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ حَسِيبًا ۝ اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ لَيَجْمَعَنَّكُمْ
إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ لَا رَيْبَ فِيهِ وَمَنْ أَصْدَقُ مِنَ اللَّهِ
حَدِيثًا ۝ ع

اور جب تمہیں سلامتی کی دُعا دی جائے تو تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دُعا دو یا اسی کو لوٹا دو ۔ اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے[۱۳۶] ۔ اللہ ہی معبود ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں وہ تم سب کو روزِ قیامت ضرور جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور اللہ سے زیادہ سچی بات کون کہنے والا ہے[۱۳۷] ۔

حُسنِ معاشرت اور حُسنِ اخلاق

بیاسی ، دفاعی مسائل کے تذکرے میں بیلا ایک حسنِ معاشرت اور حسنِ اخلاق کا ذکر یہ بتانے کے

لیے ہے کہ اس عالم کی تکمیل اور نظم و نسق کے لیے ایک ہی قوت انسانوں کی نہیں بلکہ سینکڑوں مختلف قوتوں والے انسانوں کی ضرورت ہے۔ دوسرے مدارس پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہاں صرف ایک فن کی تعلیم ہوتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تربیت گاہ میں فوجی تعلیم کے سوا کوئی اور فن نمایاں نہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مکتب میں عفو و درگزر کے سوا کوئی سبق نہیں۔ بدھ کی خانقاہ میں دربدر بھیک مانگنے والے مرتاض فقیروں کے سوا کوئی اور موجود نہیں لیکن قرآن کو دیکھو اور قرآن لانے والے کی درس گاہ کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ ایک عمومی جامعہ ہے جس میں انسانی ترقی کی ہر قوت نشوونما پا رہی ہے۔ یہاں خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک پوری پوری یونیورسٹی ہے جس کے اندر علم و فن کا ہر شعبہ اپنی جگہ پر قائم ہے۔ ہر جنس اور ہر مذاق کے طالب علم آتے ہیں اور اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی استعداد کے مطابق کسب کمال کرتے ہیں۔

یہ حقیقت ہے کہ دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف قائم کرنے اور فتنہ و فساد کو ختم کرنے کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں ایک قانون دوسرے اخلاق، اگرچہ دونوں کا منشا ایک ہے مگر منزل مقصود تک پہنچنے کے لیے ان کے راستے مختلف ہیں۔ قانون برائیوں کو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا اور اخلاق کے ذریعے ہر شخص کو مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ قرآن نے ایسا جامع ضابطہ پیش کیا ہے جو عدل و احسان اور قانون و اخلاق دونوں کا جامع ہے۔ عین سیاسی مسائل کے ضمن میں حسن اخلاق اور حسن معاشرت کی تعلیم دی ہے اور اس میں سے حسن اخلاق و معاشرت کی اس اصل پر زور دیا ہے کہ جب کبھی کوئی شخص تمہیں سلام کرے تو چاہیے کہ اس نے جو کچھ کہا ہے اس سے زیادہ بہتر جواب دو۔ اور اگر بہتر طور پر نہ دو تو کم از کم اسی جیسا۔ یہ حکم یہاں اس مناسبت سے آیا ہے کہ جنگ کی حالت ہو یا امن کی، منافق ہو یا ایماندار لیکن جو کوئی بھی تمہیں سلام کرے تمہیں بھی اس کا جواب ویسا ہی دینا چاہیے اس کے دل کا حال خدا جانتا ہے تم نہیں جانتے ہو۔

۱۳۶۔ اور جب تمہیں سلامتی کی دعا دی جائے تو تم بھی سلامتی کی اس سے بہتر دعا دو یا اسی کو لوٹا دو۔ اللہ ہر چیز کا حساب لینے والا ہے۔ یعنی کسی مسلمان کو سلام کرنا یا دعا دینا درحقیقت اللہ سے اس کی شفاعت کرنا ہے تو حق تعالیٰ شفاعت حسنہ کی ایک خاص صورت کو جو مسلمانوں میں شائع و ذائع ہے صراحت کے ساتھ بیان فرماتا ہے کہ جب کوئی تم کو اے مسلمانو! دعا دے یا سلام کرے تو تم کو بھی اس کا جواب دینا چاہیے یا تو وہی کلمہ اس کو کہہ دو یا اس سے بہتر مثلاً

کسی نے کہا السلام علیکم تو واجب ہے تم پر کہ اس کے جواب میں وعلیکم السلام کہو اور زیادہ ثواب چاہو تو ورحمۃ اللہ بھی بڑھادو اور اگر اس نے ورحمۃ اللہ بڑھا کر کہا ہو تو تم وبرکاتہ بڑھادو۔ اللہ کے یہاں ہر ہر چیز کا حساب ہوگا اور اس کی جزا ملے گی۔ سلام اور اس کا جواب بھی اس میں آگیا۔ اس سے شفاعت حسنہ کی پوری ترغیب ہوگئی اور شفاعت سیئہ کی خرابی اور مضرت معلوم ہوگئی کیونکہ جو شفاعت حسنہ کرے گا اللہ اس کو ثواب دے گا اور جس کی شفاعت کی ہے اس پر اس کے ساتھ حسن سلوک اور مکافات کا حکم فرمادیا برخلاف شفاعت سیئہ کے کہ بجز معصیت اور محرومی کے کچھ نہ ملے گا۔[1]

اسلامی معاشرے میں سلام کی اہمیت

ہر معاشرے میں کچھ ایسے دعائیہ کلمات مروج ہوتے ہیں جو معاشرے کے افراد آپس میں ملتے جلتے وقت ابتدائی تعارف، اظہار محبت و اعتماد، نشان اخوت و مروت اور علامت وحدت فکر و عقیدہ کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ معاشرتی اتصال و ارتباط کے نقطہ نظر سے ان کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ معاشرے کے افراد، خواہ ان کے اندر کتنی ہی دوری و بے گانگی ہو، آمنے سامنے ہوتے ہی ان کے واسطہ سے اس طرح باہم ایک دوسرے سے جڑ جاتے ہیں گویا ان کے اندر کوئی اجنبیت و بیگانگی تھی ہی نہیں۔ عربوں میں اس مقصد کے لیے بہت سے الفاظ اور فقرے معروف تھے مثلاً حیاك اللہ اهلاً و سهلاً، صباح الخیر، مرحباً، سلام کا لفظ بھی معروف تھا۔ جب اسلامی معاشرہ ظہور میں آیا تو بجز ان کلمات کے جن میں شرک کی کوئی آمیزش تھی باقی تمام کلمات باقی رہے۔ البتہ السلام علیکم کو ایک خاص اسلامی شعار کی حیثیت حاصل ہوگئی۔ یہ کلمہ گویا مومن و کافر کے درمیان ایک معاشرتی علامت فارقہ بن گیا۔ جب ایک شخص نے دوسرے کو السلام علیکم کہہ دیا اور اس نے وعلیکم السلام سے اس کا جواب دے دیا تو گویا باہم کی اجنبیت اٹھ گئی اور دونوں دو قالب و یک جان ہو گئے اور جواب نہ دیا تو اس کے معنے صرف یہی نہ تھے کہ اس نے سلام قبول نہیں کیا بلکہ اس کے معنے یہ بھی ہوتے تھے کہ اس نے اس کا اسلام بھی تسلیم نہیں کیا۔

کلمہ تحیت کی اس اہمیت کی وجہ سے اس موقعہ پر جب کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین سے اعراض کا حکم فاعرض عنھم کے ذریعے ہوا۔ مسلمانوں کو یہ تنبیہ بھی کردی گئی کہ جب کوئی شخص

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تمہیں سلام و تحیت سے مخاطب کرے تو اس کا معاشرتی حق یہ ہے کہ اس کے سلام و تحیت کا اس کو بہتر طریقہ پر جواب دو اگر یہ نہیں تو کم از کم اسی کے الفاظ اس کی طرف لوٹا دو۔

اس تنبیہہ کی ضرورت اس لیے ہوئی کہ زیادہ پرجوش لوگوں کی طرف سے اس مرحلے میں منافقین کے ساتھ معاشرتی بائیکاٹ کی نوبت نہ آنے پائے۔ [1]

اس وقت مسلمانوں اور غیر مسلموں کے تعلقات نہایت کشیدہ ہو رہے تھے اور جیسا کہ تعلقات کی کشیدگی میں ہوا کرتا ہے۔ اس بات کا اندیشہ تھا کہ کہیں مسلمان دوسرے لوگوں کے ساتھ کج خلقی سے نہ پیش آنے لگیں اس لیے انہیں ہدایت کی گئی کہ جو تمہارے ساتھ احترام کا برتاؤ کرے اس کے ساتھ تم بھی ویسے ہی کرو بلکہ اس سے زیادہ احترام سے پیش آؤ۔ شائستگی کا جواب شائستگی ہی ہے بلکہ تمہارا منصب یہ ہے کہ دوسروں سے بڑھ کر شائستہ بنو۔ ایک داعی و مبلغ گروہ کے لیے جو دنیا کو راہ راست پر لانے اور مسلک حق کی طرف ترغیب دینے کے لیے اٹھا ہو، درشت مزاجی، ترش روئی اور تلخ کلامی مناسب نہیں ہے اس سے نفس کی تسکین تو ہو جاتی ہے مگر اس مقصد کو الٹا نقصان پہنچتا ہے جس کے لیے وہ اٹھا ہے۔ [2]

اصل ارشاد میں حییتم بتحیۃ آیا ہے۔ لغت میں اس کے معنے زندہ رکھنے کے اور حیاک اللہ کہنے کے ہیں۔ پھر یہ لفظ ملاقات کے وقت میں دعائی پیمانے کے لیے استعمال ہونے لگا خواہ کچھ ہو۔ عرب میں اس کے لیے ایک سے زیادہ پیمانے رائج تھے لیکن اسلام نے ان سب پیمانوں سے ہٹ کر تحیت کے لیے سلام کا پیمانہ یہ بتانے کے لیے ایجاد کیا کہ اسلام سلامتی اور امن کا پیغام ہے اور اہل ایمان سلامتی پسند ہیں۔

ملاقاتی پیمانہ اور اس کی مصالح

نیز اس میں اور بھی حکمتیں ہیں مثلاً یہ کہ یہ تمام انبیاء علیہم السلام کا متفقہ طریقہ ہے جیسا کہ قرآن سے معلوم ہوتا ہے و سلام علی المرسلین قرآن نے اسے ملاقات کے لیے دعائی پیمانہ بتایا ہے تحیتھم یوم یلقونہ سلام قرآن نے اسی کو اپنانے کا حکم دیا ہے سلموا علی انفسکم تحیۃ من عند اللہ مبارکۃ طیبۃ اس کی صورت ذکر و دعا کی ہے اور انسانی پیمانہ ہے یہ

---

[1] تدبر قرآن [2] تفہیم القرآن

اصل میں سلمت سلاما علیک کی بگڑی ہوئی شکل ہے۔ دوام اور ثبوت کے معنے پیدا کرنے کے لیے جملہ اسمیہ بنایا گیا ہے لیکن یہ طریقہ قانونی نہیں بلکہ سماعی ہے یعنی صرف ان پیمانوں تک محدود ہے جو اہل عرب سے سنے گئے ہیں جیسے الحمدللہ، سبحان اللہ، السلام علیکم۔ ہر لفظ کو آپ ایسا بنا لینے کے مجاز نہیں ہیں۔ اگر آپ حیاہ کو الحیاۃ لکم کہیں گے تو یہ معنے پیدا نہ ہوں گے یا آپ الصلوٰۃ علیکم کہیں گے تو اس میں السلام علیکم والے دعائی معنے نہ ہوں گے۔ یہ دعائی پیمانہ خاص ہے اس میں سلامتی سے مقصود وہ سلامتی ہے جو اللہ سبحانہ کی جانب سے بندوں پر نازل ہوتی ہے اور دنیا میں کسی انسان کو جو بہتر سے بہتر دعا دی جا سکتی ہے وہ سلامتی کی ہے اور عرب کی اس دنیا میں جہاں جان مال آبرو کی سلامتی کو ہر وقت خطرہ لاحق تھا۔ یہ دعائی پیمانہ بالکل برمحل تھا جب دو آدمی آپس میں ملتے تھے تو ایک دوسرے سے بیگانگی کی وجہ سے چوکنے ہوتے تھے اور ڈرتے تھے کہ کہیں غفلت پا کر دشمنی نہ کرے اب جب اسلام کے قاعدے کے مطابق دونوں یہ لفظ بولتے ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ دونوں ایک دوسرے کو اپنی طرف سے اطمینان دلاتے ہیں اور دونوں ایک دوسرے کی سلامتی کی دعا کرتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینے تشریف لائے تو آپ نے اہل مدینہ کو جو سب سے پہلی تعلیم دی وہ یہ تھی۔

لوگو! باہم سلام کو پھیلاؤ، کھانا کھلاؤ اور جب تمام لوگ سو رہے ہوں نماز پڑھو، یہ کرو گے تو سلامتی کے ساتھ جنت میں داخل ہو جاؤ گے۔

(ترمذی باب الزہد)

ایک دوسری حدیث میں سلام کی غرض و غایت بھی بیان فرمادی اور فرمایا ہے کہ

تم لوگ اس وقت تک جنت میں داخل نہ ہو گے جب تک ایمان نہ لے آؤ اور اس وقت تک ایمان نہ لاؤ گے جب تک آپس میں محبت نہ کرو، میں تم کو ایسی بات بتاتا ہوں کہ جب تم اس پر عمل کرو گے تو باہم محبت کرنے لگو گے اور وہ یہ ہے کہ باہم سلام پھیلاؤ۔ (ترمذی باب افشاء السلام)

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس آیت کریمہ کا منطوق کیا ہے۔ کیا سلام کا یہی پیمانہ اس کا منطوق ہے۔ عام شارحین قرآن کا میلان یہی ہے کہ سلام کا یہی پیمانہ اس آیت کریمہ کا منطوق ہے لیکن سوال یہ ہے کہ اگر سلام کا یہی پیمانہ آیت کا منطوق ہے تو پھر انداز تعبیر

یہ کیوں ہے کہ مسلمانو! جب تم کو کسی طرح پر دعا دی جائے تو تم اس سے بہتر دعا دو یا اس جیسی یہ انداز تعبیر بتا رہا ہے کہ قرآن اہل ایمان کو سمجھا رہا ہے کہ سارے اختلافات کے باوجود تمہارے اخلاق بلند سے بلند تر ہونے چاہئیں۔ منافقین خواہ کیسی اسلام کے خلاف ریشہ دوانیاں کریں اور علم و عمل میں خواہ ان کی زندگی میں کیسا تضاد رونما ہو جائے لیکن تمہارا فرض یہ ہے کہ تمہیں جب بھی کوئی دعا دے خواہ دعائیہ پیمانہ کچھ ہو اور کسی طرح کا ہو تمہارا اخلاقی فرض ہے کہ اولاً اس کا جواب بہترین دو، اور اگر بہترین نہ ہو تو کم از کم اس جیسا تو ضرور دو۔

سلام کے آداب واحکام اور اس کے قانونی مباحث پر انشاء اللہ تبصرہ سورۃ نور ۱۸ پارہ میں آرہا ہے وہاں یہ بحث وصلاً آرہی ہے یہاں سلام کا ذکر ایک ضمنی موضوع کی حیثیت سے آرہا ہے۔

آوازِ قرآنی کی انقلابی تاثیر

۱۲۷۔ اللہ ہی معبود ہے اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہ تم سب کو روز قیامت ضرور جمع کرے گا جس کے آنے میں کوئی شبہ نہیں ہے اور اللہ سے زیادہ سچی بات کہنے والا کون ہے۔ یعنی قیامت کا آنا اور ثواب وعقاب کے وعدوں کا پورا ہونا سب سچ ہے اس میں تخلف نہ ہو گا ان باتوں کو سرسری خیال نہ کرو۔[1]

شارحین قرآن یہاں اول تو خاموش ہیں اور جنہوں نے کچھ لب کشائی کی وہ دور دراز کار گوشوں میں نکل گئے، آلوسی، ابوحیان اندلسی، قرطبی، ابن کثیر، شوکانی، بیضاوی اور زمخشری وغیرہ خاموش ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اس فقرے کا پہلے فقرے سے پیوند دو طرح سے ہے۔ اول یہ کہ پہلی آیت میں سلام کے موضوع پر ہدایت کا مقصد یہ تھا کہ کسی مسلمان کے ہاتھ سے کسی مسلمان کا خون نہ ہو جائے۔ اس پر پہلی وعید یہ ہے کہ ان اللہ کان علی کل شیئٍ حسیباً اسی وعید میں اس آیت کے ذریعے تاکید میں مبالغہ فرمایا ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ ارشاد فرما رہے ہیں کہ تمہیں ہر شخص کے سلام وتحیت کا استقبال کرنا چاہیے اور اس سے معاملہ ظاہر کے مطابق کرنا چاہیے کیونکہ اس کے باطن کو اللہ سبحانہٗ کے سوا جاننے والا کوئی نہیں ہے جو اپنی معبودیت میں یگانہ اور جو ساری مخلوقات کا ایک روز حساب لینے والا ہے۔ علامہ مراغی فرماتے ہیں کہ

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلے آیات میں اللہ سبحانہ نے نبوت کو جہاد کا اور اس کی ترغیب دینے کا حکم دیا اور مسلمانوں سے کہا تھا کہ ملاقات کے وقت مروت و حیت کا مظاہرہ کریں۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ ان اعمال کی روز قیامت جزا ملے گی۔ مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ اوپر بہت سے احکام مذکور ہوئے ہیں آگے ان کی تاکید واہتمام کے لیے اپنی عظمت اور قیامت کا ذکر فرماتے ہیں تاکہ حاکم کی عظمت سے اور دربار کی حاضری وحساب سے عمل کے لیے اہتمام زیادہ ہو جاتے۔ مولانا محمد ادریس فرماتے ہیں گزشتہ آیت میں یعنی ان اللہ کان علی کل شیئ حسیبا، میں وعید اور تہدید تھی۔ اب اس آیت میں اسی کی تاکید کے لیے توحید اور عظمت اور قیامت کا ذکر فرماتے ہیں۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں کافر، مشرک، ملحد اور دہریے جو کچھ کرتے ہیں اس سے خدا کی خدائی کا کچھ نہیں بگڑتا۔ اس کا خداتے واحد اور خدائے مطلق ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جو کسی کے بدلے بدلی نہیں جا سکتی پھر وہ ایک روز سب انسانوں کو جمع کر کے ہر ایک کو اس کے عمل کا نتیجہ دکھائے گا۔ اس کی قدرت کے احاطہ سے بچ کر کوئی بھاگ بھی نہیں سکتا لہٰذا خدا ہرگز اس بات کا حاجت مند نہیں ہے کہ اس کی طرف سے کوئی اس کے باغیوں پر جلے دل کا بخار نکالے اور کج خلقی و ترش کلامی کو زخم دل کا مرہم بنائے۔ یہ تو اس آیت کا تعلق اوپر کی آیت سے ہے لیکن یہی آیت اس پورے سلسلہ کلام کا خاتمہ بھی ہے جو پچھلے دو تین رکوعوں سے چلا آ رہا ہے۔ اس حیثیت سے اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کی زندگی میں جو شخص جس طریقے پر چاہے چلے اور جس راہ پر اپنی کوششیں اور محنتیں صرف کرنا چاہتا ہے کیے جائے۔ آخر کار سب کو ایک دن اس خدا کے سامنے حاضر ہونا ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے پھر ہر ایک اپنی سعی و عمل کے نتائج دیکھ لے گا۔

ان سب بزرگوں کی بات سر آنکھوں پر لیکن میرا قرآنی ذوق اس معاملہ میں کچھ ان بزرگوں سے الگ ہے، اللہ سبحانہ کی الاہیت اور ایمان بالآخرہ دین ابنیا کے اساسی ارکان ہیں۔ قتال کے ذکر میں اور تحیات کے موضوع پر ان کی اہمیت بالکل واضح اور صاف ہے ماقبل میں دو ہی چیزیں مذکور ہیں ایک قاتل فی سبیل اللہ وحرض المومنین اس کے بعد اللہ لا الہ الا ھو الخ لاکر قرآن نے اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتاری ہے کہ تمہاری اس ساری تگ ودو، محنت و ریاضت مشقت و ابتلا، جہاد اور قتال کا پس منظر اور صرف یہ ہے کہ دنیا میں اللہ کی حاکمیت کا ڈنکا پٹ جائے اور انسانوں کی بندگی سے چھڑا کر اللہ کی بندگی پر آمادہ کیا جائے اور یہ کام اس احساس سے کیا جائے کہ تم اس کام کے لیے دنیا میں روانہ کیے گئے ہو اور تم سے اللہ سبحانہ روز قیامت فرائض کی ادائیگی کے بارے میں دریافت کرے گا۔

اور دوسری آیت واذا حییتم بتحیۃ سے اس کا ربط یہ ہے کہ لفظ تحیت ایک مشترک لفظ ہے انسان اور اللہ دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ انسان کے لیے یہ زندگی کی دعا اور تہنیت کے معنے میں آتا ہے اور اللہ کے لیے ملک حکومت زبانی تعریف کے معنے میں آتا ہے اسی سے التحیات للہ ہے جمع لانے کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ زمین میں سربراہان مملکت کی مختلف اور متفرق تعریفیں ہوتی تھیں۔ اس لیے اہل ایمان سے کہا گیا ہے کہ التحیات للہ یعنی تحیت کی ساری انواع اور ایسے تمام الفاظ جس سے شاہانہ جلال کی مدحت سرائی ہو سکتی ہے وہ سب اللہ کے لیے ہیں۔ اس جگہ خاص طور پر اللہ کی الوہیت کو اس لیے یاد دلایا گیا ہے کہ لفظ تحیت سے کسی ذہن میں یہ غلطی نہ ہو جائے کہ اللہ جیسی عظمت کسی انسان کو بھی حاصل ہو سکتی ہے فرمایا یہ باہم ملاقات میں عظمت نہیں بلکہ دعا ہے۔ عظمت تو صرف اس ذات کے لیے ہے جس کی الوہیت میں کوئی شریک نہیں ہے۔ ساری عظمتیں اور بڑائیاں اسی کے لیے ہیں۔

عقیدۂ آخرت کا اہتمام

قیامت کا ذکر اس موقعہ پر خاص طور پر اس لیے ہوا ہے کہ نبوت کے خدوخال نمایاں کرنے والی صفات اور اس کی علامتوں اور خصوصیات کی دوسری اہم چیز آخرت ہے۔ عقیدۂ آخرت کا اہتمام، اس سے دلچسپی اور شیفتگی کا اظہار اس کی تبلیغ و تشہیر اور اس کی اہمیت پر اتنا زور کہ یہی قرآنی دعوت کا بنیادی نقطہ معلوم ہوتا ہے۔ جو لوگ قرآن کے مطالعہ میں وقت گزارتے ہیں اور قرآن فہمی کا صحیح ذوق رکھتے ہیں وہ قرآن پڑھتے ہوئے صاف محسوس کرتے ہیں کہ جیسے آخرت ان کی نظروں کے سامنے ہے اور اس کی تصویر، نعمت و مصیبت اور سعادت و شقاوت کی تمام تفصیلات کے ساتھ ان کی آنکھوں میں رہتی ہے وہ ہر وقت جنت کے شدید اشتیاق اور جہنم سے شدید خوف کے عالم میں رہتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ قرآن کے ماننے والوں پڑھنے والوں کے لیے یہ بات بالکل اور واقعہ کی حیثیت رکھتی تھی جو ان کے شعور و احساس اعصاب اور قوت فکریہ پر غالب آجاتا ہے۔ اللہ اکبر یہاں لا ریب فیہ کے ساتھ ومن اصدق من اللہ حدیثاً کی بلاغت کتنی موثر ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اللہ کے چھوٹے بڑے سارے ہی ارشادات سے متعلق دل میں یقین محکم اور اذعان کامل ہونا چاہیے۔ اگر ریب اور تذبذب ذرا بھی باقی رہ گیا تو عمل بلکہ عزم عمل میں بھی کوتاہی نہ جائے گی مطلب یہ ہے کہ اس بیان کی صداقت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔

آپ مانیں یا نہ مانیں اللہ کی حاکمیت و الوہیت کا عقیدہ اور آخرت میں جزا و سزا کے یقین

نے عہدِ اول کے مسلمانوں کی کایا پلٹ دی تھی ان میں ایک نئی روح اور نیا ولولہ پیدا ہوگیا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح بے نظم نہ تھے بلکہ ایک جاندار قوت کے مالک تھے ان کو از سر نو زندگی ملی۔ ان کی اجتماعی تربیت بالکل نئے طریقے پر ہوئی، ان کے ذہنوں میں انقلاب آگیا۔ دنیا ان کے لیے اور وہ دنیا کے لیے بالکل بدل گئے۔ یہ توحید اور ایمان بالآخرہ کی فسوں کاری تھی کہ دنیا ان کی نظروں میں حقیر ہوگئی۔ انہوں نے دیکھا کہ دنیا میں ہر طرف ظلم و فساد کا دور دورہ ہے۔ فسق و فجور کی گرم بازاری ہے، تاریکی کا غلبہ ہے انہوں نے قرآن کی یہ آواز سنی زہرۃ الحیاۃ الدنیا انہیں احساس ہوا کہ اللہ نے ان کو اس لیے روانہ کیا ہے کہ وہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔ ان کو یقین تھا کہ اللہ ان کا ضامن ہے اس نے ان سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا اور خدا کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ حالات کی ساری ناخوشگواریوں میں اللہ کے بھروسہ پر وہ کام کرتے اور پورے یقین سے کہتے و من اصدق من اللہ حدیثاً۔

فَمَا لَكُمْ فِي الْمُنٰفِقِيْنَ فِئَتَيْنِ وَاللّٰهُ اَرْكَسَهُمْ بِمَا كَسَبُوْا ؕ
اَتُرِيْدُوْنَ اَنْ تَهْدُوْا مَنْ اَضَلَّ اللّٰهُ ؕ وَمَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَنْ
تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۝ وَدُّوْا لَوْ تَكْفُرُوْنَ كَمَا كَفَرُوْا فَتَكُوْنُوْنَ سَوَآءً
فَلَا تَتَّخِذُوْا مِنْهُمْ اَوْلِيَآءَ حَتّٰى يُهَاجِرُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ فَاِنْ
تَوَلَّوْا فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ وَجَدْتُّمُوْهُمْ ۠ وَلَا تَتَّخِذُوْا
مِنْهُمْ وَلِيًّا وَّلَا نَصِيْرًا ۝ اِلَّا الَّذِيْنَ يَصِلُوْنَ اِلٰى قَوْمٍۭ بَيْنَكُمْ
وَبَيْنَهُمْ مِّيْثَاقٌ اَوْ جَآءُوْكُمْ حَصِرَتْ صُدُوْرُهُمْ اَنْ
يُّقَاتِلُوْكُمْ اَوْ يُقَاتِلُوْا قَوْمَهُمْ ؕ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَسَلَّطَهُمْ عَلَيْكُمْ
فَلَقٰتَلُوْكُمْ ۚ فَاِنِ اعْتَزَلُوْكُمْ فَلَمْ يُقَاتِلُوْكُمْ وَاَلْقَوْا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ ۙ
فَمَا جَعَلَ اللّٰهُ لَكُمْ عَلَيْهِمْ سَبِيْلًا ۝ سَتَجِدُوْنَ اٰخَرِيْنَ يُرِيْدُوْنَ
اَنْ يَّاْمَنُوْكُمْ وَيَاْمَنُوْا قَوْمَهُمْ ؕ كُلَّمَا رُدُّوْۤا اِلَى الْفِتْنَةِ اُرْكِسُوْا
فِيْهَا ۚ فَاِنْ لَّمْ يَعْتَزِلُوْكُمْ وَيُلْقُوْۤا اِلَيْكُمُ السَّلَمَ وَيَكُفُّوْۤا اَيْدِيَهُمْ

فَخُذُوْهُمْ وَاقْتُلُوْهُمْ حَيْثُ ثَقِفْتُمُوْهُمْ ۚ وَاُولٰٓئِكُمْ جَعَلْنَا لَكُمْ عَلَيْهِمْ

سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ ع ۱۱

پھر تمہیں کیا ہو گیا کہ تم منافقوں کے بارے میں دو فریق ہو گئے ہو حالانکہ اللہ نے ان کو ان کی بداعمالی کی وجہ سے پلٹا دیا ہے کیا تم چاہتے ہو کہ ایسے لوگوں کو راہ دکھاؤ جن کو اللہ نے بے راہ کر دیا ہے اور یاد رکھو جس کسی پر اللہ راہ گم کر دیتا ہے تو تم اس کے لیے کوئی راہ نہیں نکال سکتے۔ ۸۸ ان کی دلی تمنا یہ ہے کہ ان کی طرح تم بھی راہ کفر اختیار کر لو اور تم ایک جیسے ہو جاؤ دیکھو جب تک یہ لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کر آئیں تم ان میں سے ہرگز کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ پھر اگر یہ ہجرت کرنا قبول نہ کریں تو ان کو جہاں پاؤ گرفتار کر لو، قتل کر دو۔ اور تمہیں ان کو اپنا دوست اور مددگار بنانے کی اجازت نہیں ہے ۸۹

مگر ہاں جو لوگ کسی ایسی قوم سے جا ملیں کہ تم میں اور اس میں عہد و پیمان ہو چکا ہے یا ایسے لوگ جو لڑائی سے تنگ آکر تمہارے پاس چلے آئیں نہ تم سے لڑیں نہ اپنی قوم سے لڑیں، اگر اللہ چاہتا تو ان لوگوں کو بھی تم پر مسلط کر دیتا کہ تم سے لڑے بغیر نہ رہتے۔ بس اگر وہ تم سے ایک طرف ہو جائیں اور نہ لڑائی کریں اور صلح کا پیغام روانہ کریں تو پھر اللہ نے تمہارے لیے ان کے خلاف جنگ کرنے کی کوئی راہ نہیں رکھی ہے[۹۰]۔ ضرور ملیں گے تمہیں کچھ لوگ ایسے جو تمہاری جانب سے خود بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم کی طرف سے بھی، ہاں جب کبھی فتنہ وفساد کی طرف لوٹا دیتے ہیں تو اوندھے منہ اس میں گر جاتے ہیں لہٰذا اگر ایسے لوگ کنارہ کش نہ ہو جائیں اور تمہاری طرف پیغام صلح نہ روانہ کریں اور لڑائی سے ہاتھ نہ روکیں تو انہیں بھی جہاں پاؤ گرفتار کر لو اور

قتل کردو اور یہی لوگ وہ لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمہیں کھلی حجت دے دی ہے۔[۱۴۱]

زمانہ نبوت میں ایمان کی کسوٹی ہجرت تھی

پہلی آیات میں جن منافقوں کا ذکر تھا وہ مدینہ میں مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہتے تھے اور اب ان آیات میں جن منافقوں کا ذکر ہے وہ مکہ میں اور عرب کے دوسرے حصوں میں رہتے تھے وہ اسلام تو قبول کر چکے تھے لیکن ہجرت کر کے دارالاسلام کی طرف آنے کی بجائے اپنی کافر قوم ہی کے ساتھ رہتے سہتے تھے اور ان تمام کارروائیوں میں حصہ لیتے تھے جو ان کی قوم اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کرتی تھی ان کے بارے میں یہ بہت بڑی الجھن تھی کہ ان کے ساتھ مسلمانوں کا طرز عمل کیا ہونا چاہیے۔ کچھ کی رائے میں یہ مسلمان تھے اور کچھ اس کے خلاف رائے رکھتے تھے۔ ان آیات میں اسی اختلاف کا اللہ کی وحی نے فیصلہ کیا ہے کہ یہ قطعاً منافق ہیں، ان کی نسبت بحث اور اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر وہ مکہ سے ہجرت کر جائیں اور دشمنوں کے حلقہ میں نہ رہیں تو مسلمان ہیں لیکن اگر اس سے انکار کریں تو پھر ظاہر ہے کہ جو کوئی دشمنوں کے ساتھ ہوگا اس کا شمار دشمنوں ہی میں ہوگا اور جس طرح جنگ میں دشمنوں سے لڑنا ہے ان سے بھی لڑنا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں ہجرت کا عمل ہی ایمان کی کسوٹی بن گیا تھا۔ ہجرت سے مقصود یہ ہے کہ اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینا اور حصول مقاصد کی راہ میں جو چیزیں حائل ہوں ان سب کو چھوڑ دینا خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشیں ہوں حتیٰ کہ قوم ہو، ملک ہو وطن ہو، اہل و عیال ہوں سب کو چھوڑ دینا، علم و عمل کا کون سا گوشہ ہے جس میں ہجرت کے جذبے کے بغیر کامیابی ہو سکتی ہے۔ ہماری معلومات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی ہجرت سے گزرے بغیر نہیں ملتی۔ ساری دنیا کی علمی، تمدنی ترقیاں حیرت انگیز انکشافات انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری نئی نئی آبادیوں کا قیام طرح طرح کے وسائل معیشت کا ظہور، پھر ملکوں کا عروج، قوموں کی بالادستی، تمدن کی وسعت فی الواقع انسان کے دنیا میں عمل ہجرت کے نتائج ہیں۔

فرق صرف اتنا ہے کہ یہی کام جب نبوت کی رہنمائی میں اللہ کی رضا کی خاطر کیا جاتا ہے تو اس کو قرآن کی زبان میں ہجرت کہا جاتا ہے۔

یہاں یہ بات ضرور ذہن میں رکھیے کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کی تو عام حکم دے دیا گیا کہ جہاں جہاں جس جس علاقے میں اور جس جس قبیلے میں اہل ایمان موجود ہیں وہاں سے وہ ہجرت کریں اور مدینہ آجائیں اس وقت جو لوگ ہجرت کر سکتے تھے مگر صرف اس لیے نہ کرتے کہ انہیں اپنے گھر بار، اعزہ و اقربا اور اپنے مفادات اسلام کے مقابلے میں عزیز تھے وہ سب منافق قرار دیے گئے اور جو لوگ فی الواقع کمزور تھے ان کو المستضعفین میں شمار کیا گیا۔

۱۳۸۔ پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ تم منافقوں کے بارے میں دو فریق ہو گئے ہو حالانکہ اللہ نے ان کو ان کے اعمال کی وجہ سے پلٹا دیا ہے کیا تم چاہتے ہو کہ ایسے لوگوں کو راہ دکھاؤ جن کو اللہ نے گمراہ کر دیا ہے اور یاد رکھو جس کسی پر اللہ راہ گم کر دیتا ہے۔ تو تم اس کے لیے کوئی راہ نہیں نکال سکتے۔ ان منافقوں میں وہ لوگ داخل ہیں جو ظاہر میں بھی ایمان نہ لاتے تھے بلکہ ظاہر و باطن میں کفر پر قائم تھے لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے میل جول اور ظاہر میں محبت کا معاملہ کرتے تھے اور غرض ان کی یہ تھی کہ مسلمانوں کی فوج ہماری قوم پر چڑھائی کرے تو ہمارے جان و مال اس حیلے سے محفوظ رہیں۔ جب مسلمانوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کا آنا جانا اس غرض سے ہے دل کی محبت سے نہیں تو بعض مسلمانوں نے کہا کہ ان شریروں سے ملنا ترک کر دینا چاہیے تاکہ ہم سے جدا ہو جائیں اور بعضوں نے کہا کہ ان سے ملے جاتیے شاید ایمان لے آئیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی کہ ہدایت و گمراہی اللہ کے قبضے میں ہے تم اس کی ہرگز فکر نہ کرو اور ان سے بالاتفاق وہ معاملہ کرو جو آئندہ مذکور ہے دو فریق مت بنو[1]

یہ آیت فا کے ذریعے پہلے بیان شدہ مضمون سے بالکل مربوط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب اللہ تم کو اپنی راہ میں قتال کرنے کا حکم دے چکا ہے اور اس معاملہ میں ڈھیلے پڑنے والوں کو اور ان لوگوں کو جو جہاد کے فرض ہونے کی تاخیر کی تمنائیں کرتے تھے ڈانٹ بھی پڑ چکی تھی اور جب تم پر یہ حقیقت واضح ہو چکی ہے کہ اللہ کے سوا ایسا کوئی حاکم نہیں ہے جس کی خاطر اللہ کے ادامر کو چھوڑا جا سکے اور جس کی وجہ سے اللہ کی طاعت کو خیرباد کہا جا سکے تو پھر تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ منافقین کے بارے میں متردد ہو اور باہم دھڑے بن گئے ہو۔ وہ لوگ

[1] افادات شیخ الاسلام

محض اپنے رشتوں اور قرابتوں یا جائداد و املاک کی محبت میں ہجرت سے گریزاں اور اب تک بدستور دارالحرب میں پڑے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ مکہ میں تھے بظاہر مصلحۃً اسلام کا دم بھرتے تھے لیکن دل میں قطعاً مخالف تھے یہ جنگ چھڑی تو مسلمانوں میں ان کے متعلق دو رائیں ہو گئیں، کچھ لوگ کہتے کہ مسلمان ہیں اور کچھ کہتے دشمنوں میں سے ہیں۔ قرآن نے یہاں ان لوگوں کو تنبیہہ کی ہے جو ان کو مسلمان کہہ رہے تھے اور بتا دیا کہ جو لوگ ایسا سوچ رہے ہیں یہ ان کی غلط سوچ ہے۔ ان کی نسبت بحث و اختلاف کی کوئی گنجائش نہیں ہے اب یہ اسلام کی طرف بڑھنے والے نہیں ہیں۔ انہوں نے اسلام کی طرف جو قدم بڑھایا تھا دُنیا کی محبت میں انہوں نے اپنے اٹھائے ہوئے قدم کو پھر پیچھے ہٹا لیا جس کی سزا میں اللہ نے اپنے قانون کے مطابق ان کو پھر اسی کفر میں دھکیل دیا جس میں وہ پہلے تھے۔ جو لوگ خدا کے قانون کی زد میں آ چکے ہیں اب وہ راہ راست پر نہیں آ سکتے کوئی لاکھ چاہے ان کو راہ ملنی مشکل ہے۔

آیت کا تاریخی پس منظر

یہاں صحیحین میں امام بخاری اور مسلم نے زید بن ثابتؓ کے حوالہ سے اس آیت کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ،

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اُحد میں تشریف لے گئے تو کچھ لوگ میدان جنگ سے واپس آ گئے یہ آیت ان کے بارے میں نازل ہوئی۔

اگرچہ یہ صحیحین کی روایت ہے اور حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ ھذا ھو الصحیح فی سبب نزولھا مگر شارحین قرآن نے اسے شرف پذیرائی نہیں دیا کیونکہ ان آیات میں جو احکام اور ہدایات منافقین کے بارے میں آئی ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُحد میں ان پر قطعاً عمل نہیں کیا ہے۔ اسی وجہ سے ابن جریر نے ابن عباس کی اس روایت کو قبول کیا ہے جس میں آیا ہے کہ مکہ کے منافق تھے اور پھر زید بن ثابت کی یہ روایت قرآن کی بیان کردہ اس غایت کے خلاف ہے حتیٰ یہاجروا اُحد کے منافقین تو مدینے میں ہی تھے ان کی ہجرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

اس کے علاوہ مسند احمد میں عبدالرحمان بن عوف کے حوالہ سے ایک اور روایت آتی ہے کہ،

> مشرکین عرب میں سے کچھ لوگ مدینے آئے اور یہ ظاہر کیا کہ ہم مسلمان اور مہاجر ہو کر آئے ہیں۔ کچھ دن مدینے میں مقیم رہے پھر مدینے کی آب و ہوا کے موافق نہ آنے کی وجہ سے مدینہ سے باہر چلے گئے۔ صحابہ کرام نے ان سے دریافت کیا کہ مدینے سے

باہر کیوں آتے کہنے لگے کہ وبا کی وجہ سے آگئے صحابہ نے فرمایا کیا تمہارے لیے حضور انور کا نمونہ نہیں ہے۔ ان کے بارے میں صحابہ میں اختلاف ہوا کچھ نے کہا کہ منافق ہو گئے اور کچھ بولے منافق نہیں ہوئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ روایت منقطع ہے اور اس کی سند میں تدلیس سے کام لیا گیا ہے اس لیے مدلس ہے یہ اور اسی قسم کی دوسری روایات کی مدد سے شارحین قرآن نے اس آیت کے منہ میں مطالب ڈالے ہیں لیکن آیتِ قرآنی اپنے معنے میں بالکل واضح اور صاف ہے اور تشریح کے لیے کسی روایت کی محتاج نہیں ہے۔ بہرحال یہ آیتِ قرآنی مدینہ کے منافقین کے بارے میں نہیں بلکہ مکہ کے منافقین کے بارے میں ہے اور اپنے مطالب میں بالکل صاف ہے۔

منافقین کی گرفتاری اور قتل کا حکم

۱۳۹۔ ان کی دلی تمنا یہ ہے کہ ان کی طرح تم بھی راہ کفر اختیار کر لو اور تم ایک جیسے ہو جاؤ دیکھو جب تک یہ لوگ اللہ کی راہ میں ہجرت نہ کرآئیں تم ان میں سے ہرگز کسی کو اپنا دوست اور مددگار نہ بناؤ، پھر اگر یہ ہجرت کرنا قبول نہ کریں تو ان کو جہاں پاؤ گرفتار کر لو اور قتل کر دو اور تمہیں ان کو اپنا دوست اور مددگار بنانے کی اجازت نہیں ہے۔ یعنی منافق تو کفر پر ایسے جمے ہوتے ہیں کہ خود تو اسلام کیا قبول کریں گے وہ تو یہ چاہتے ہیں کہ تم بھی ان کی مثل کافر ہو کر ان کے برابر ہو جاؤ لہٰذا اب تم کو چاہیے کہ وہ جب تک ایمان قبول کر کے اپنا وطن چھوڑ کر تمہارے پاس نہ آجائیں اس وقت تک ان کو دوست نہ بناؤ نہ اپنے کسی کام میں ان کو دخل دو اور نہ ان کی حمایت واعانت کرو اور اگر وہ لوگ ایمان اور ہجرت کو قبول نہ کریں تو ان کو قید کرو اور قتل کرو جہاں قابو پاؤ اور اجتناب کلی رکھو اور ان سے کوئی تعلق نہ رکھو[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین جن سے مدد کی تمہیں آس ہے اور جن کی ہدایت کی توقع رکھتے ہو ان کا حال یہ ہے کہ وہ تمہیں بھی اسی کفر میں واپس لے جانے کی آرزو رکھتے ہیں جس میں وہ خود ہیں اس طرح وہ اسلام پر ہی شب خون مارنے کے ارادے رکھتے ہیں۔ اس لیے جب تک وہ ہجرت نہ کریں اس وقت تک ان سے کوئی تعلق نہ رکھو یہ ہجرت ہی ان کے ایمان و اسلام کی کسوٹی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہے۔ اگر وہ اس سے گریز کرتے ہیں تو تم ان کو دشمن اور دشمنوں کا ساتھی سمجھو اور ان کو جہاں پاؤ گرفتار اور قتل کرو۔ یعنی جنگ میں جیسے تمام دشمنوں سے لڑنا ہے ان سے بھی تمہیں لڑنا ہے۔ گویا جس دورنگی اور مصلحت پرستی اور ترجیح دینا بر آخرت کو انہوں نے اپنایا ہے اس کی وجہ سے اللہ سبحانہ نے انہیں اسی طرف پھیر دیا ہے جس طرف سے یہ آئے تھے۔ انہوں نے کفر سے نکل کر اسلام کی طرف پیش قدمی ضرور کی تھی لیکن اس کے لیے جس کسوٹی کی ضرورت تھی اس سے وہ تہی دامن تھے اسلام کی خاطر اپنے مفادات کو قربان کرنے کے لیے تیار نہ تھے اس لیے جدھر سے آئے تھے ادھر ہی واپس ہو گئے۔ اب ان کا معاملہ صاف ہے کہ ایمان لائیں اور ہجرت کریں تو مسلمان ہیں اور اگر ایسا نہیں کرتے تو ان سے بھی وہی معاملہ کیا جائے جو میدان جنگ میں دشمن سے کیا جاتا ہے۔

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ ان لوگوں نے علانیہ کفر اختیار کر لیا تھا۔ قرآن نے ان کے بارے میں جو انکشاف کیا ہے یہ ہے کہ:

۱۔ وہ راہِ حق سے ہٹ چکے ہیں — واللہ ارکسھم بما کسبوا

۲۔ وہ گم کردہ راہ ہیں — من اضل اللہ

۳۔ ان کے راہ پر آنے کی کوئی صورت نہیں — من یضلل اللہ فلن تجد لہ سبیلاً

۴۔ یہ خود ہی کافر نہیں بلکہ تمہیں بھی کافر بنانا چاہتے ہیں — لو تکفرون کما کفروا

ان اوصاف کی موجودگی میں اب یہ منافق نہیں بلکہ دائرۂ اسلام سے باہر ہیں۔ یعنی مردم شماری کے رجسٹر میں بھی مسلمان نہیں ہیں۔ علامہ نسفی نے مدارک میں اور آلوسی نے روح المعانی میں یہ بات بالکل برمحل لکھی ہے کہ یہ لوگ اسلام کو چھوڑ کر مشرکین سے جا ملے تھے۔ اسی بنا پر محققین نے حتیٰ یہاجروا سے پہلے یومنوا مقدر مانا ہے یعنی چونکہ دائرۂ اسلام سے خارج ہو چکے ہیں اس لیے جب تک ایمان نہ لائیں اور ہجرت نہ کریں تمہیں ان سے تعلقات و ولایت و نصرت قائم کرنے جائز نہیں ہیں۔

منافقین کے معاملہ میں سنگینی کی وجہ

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قرآن نے منافقین کے بارے میں یہ سنگینی کیوں اختیار کی ہے۔ دراصل بات یہ ہے کہ کوئی نظام اپنے افراد کو عمل کی غیر محدود آزادی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ غیر محدود آزادی روح نظام کی نفی ہے۔ اسی طرح نظام اپنے افراد کے ان مقاصد و عزائم کو بھی

گوارا نہیں کرتا جو اس کے مقاصد وجود سے متصادم ہوتے ہیں مثلاً ایک قومی حکومت جو خالص دنیوی اصولوں پر قائم ہو کسی ایسی جماعت کا وجود برداشت نہیں کر سکتی جس کا مقصد یہ ہو کہ قومی حکومت کی جگہ خاندانی حکومت قائم کی جائے۔ کوئی مملکت یہ نہیں دیکھ سکتی کہ اس کے افراد کسی ایسی وفاداری سے وابستہ ہو جائیں جو ان کے لیے مملکت کی وفاداری سے بالاتر اور اہم ہو۔ اسلامی نظام میں افراد کے مقاصد اور نظام کے مقاصد اسلام میں داخل ہونے کے بعد ایک ہو جاتے ہیں۔ مقاصد کی یہ ہم آہنگی اور یک جہتی اسلام میں اس طرح پیدا کی گئی ہے کہ افراد کے اغراض و مقاصد کو اسلام کے نظام سیاسی میں ضم کر دیا گیا ہے۔ یعنی فرد کا مقصد زندگی صرف اسلام کی اغراض کا حصول اور اس کی ہدایات کی بھرپور اطاعت ہے۔ یہاں مسلمان ہونے کی حیثیت میں ذاتی حقوق یکسر ناپید ہیں اسے صرف ان فرائض کا ذمہ دار قرار دیا گیا ہے جو اسلام کی جانب سے اس پر عائد کیے گئے ہیں۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ اسلام ایک ایسا نظام ہے جس کے اغراض و مقاصد افراد کی زندگی اور ان کی اغراض و ضروریات کے مجموعہ سے ماورا حقیقت رکھتے ہیں۔ افراد کی یہ آزادیاں اس کل سے ماخوذ ہیں جس کا نام اسلام ہے۔ اس سے الگ ہو کر فرد کی آزادی بالکل بے معنی ہے اس لیے فرد کی آزادی، اس کے مفادات کو اسلام کی آزادی اور اس کے مفادات میں گم ہو جانا چاہیے منافقین نے اپنی آزادی اور اپنے مفادات کو اسلام کی آزادی اور اس کے مفادات کے مقابلے میں ترجیح دی ہے اس لیے قرآن نے ان کے بارے میں یہاں یہ سنگین پالیسی اختیار کی ہے اور حکم دیا ہے خذوا ھم واقتلوا ھم حیث وجدتموھم اس دور میں فرد کی اسلام سے وفاداریاں جانچنے کا معیار ہجرت تھا۔ فرمایا کہ اگر ہجرت نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دشمن کے کیمپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کے ساتھ میدان جنگ میں وہی معاملہ کرو جو دشمن کے ساتھ ہوتا ہے۔ یہ حکم ان منافق مسلمانوں کا ہے جو برسر جنگ کافر قوم سے تعلق رکھتے ہوں اور اسلامی حکومت کے خلاف معاندانہ کارروائیوں میں حصہ لیں ۔

دو قسم کے لوگ اس حکم سے مستثنیٰ ہیں

۱۴۰۔ مگر ہاں جو لوگ کسی ایسی قوم سے جا ملیں کہ تم میں اور ان میں عہد و پیمان ہو چکا ہے یا ایسے لوگ جو لڑائی سے تنگ آکر تمہارے پاس چلے آئیں نہ تم سے لڑیں اور نہ اپنی قوم سے لڑیں۔ اگر اللہ چاہتا تو ان لوگوں کو بھی تم پر مسلط کر دیتا کہ تم سے لڑے بغیر نہ رہتے۔ پس اگر وہ تم سے ایک طرف ہو جائیں اور لڑائی نہ کریں اور صلح کا پیغام روانہ کریں تو پھر اللہ نے تمہارے لیے ان کے خلاف کرنے کی کوئی راہ نہیں رکھی ہے۔ یعنی اس ظاہری ملنے جلنے سے ان کو قید اور قتل سے نہ بچاؤ مگر کل دو طرح سے

ایک تو یہ کہ جن لوگوں سے تمہاری صلح ہے ان سے ان کا بھی معاہدہ اور مصالحت ہو تو وہ بھی صلح میں داخل ہو گئے ۔ دوسری طرح یہ کہ جو لوگ لڑائی سے عاجز ہو کر تم سے صلح کریں اور اس بات کا عہد کریں کہ نہ اپنی قوم کے طرفدار ہو کر تم سے لڑیں گے اور نہ تمہارے ساتھ ہو کر اپنی قوم سے لڑیں گے اور اس عہد پر قائم بھی رہیں تو ایسے لوگوں سے بھی نہ لڑو اور ان کی مصالحت کو منظور کر لو اور اللہ کا احسان مانو کہ تمہاری لڑائی سے باز آ گئے اللہ چاہتا تو ان کو تم پر جری اور غالب تر کر دیتا ۔[1]

اس آیت میں جو لفظ الا آیا ہے وہ استثنا کے معنے دے رہا ہے یہ استثنا نہ تو حتیٰ یہاجروا سے ہے جیسا کہ ابومسلم اصفہانی کا خیال ہے اور نہ لا تتخذوا منھم اولیاء سے ہے جیسا کہ کچھ لوگوں کی رائے ہے بلکہ فخذوا ھم واقتلوھم کی خبر سے ہے مطلب یہ ہے کہ اگر یہ واجب القتل منافق کسی ایسی کافر قوم کے ملک سے تعلق رکھتے ہوں جس کے ساتھ اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو تو اس علاقے میں جنگ میں ان کا تعاقب نہ کیا جائے حصر کے معنے تنگ ہونے ، بے ہمت ہونے کے ہیں اور سلم کے معنے طاعت اور فرمانبرداری کے ہیں۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ میدان جنگ میں دو قسم کے لوگوں کی پکڑ دھکڑ اور قتل کی تمہیں اجازت نہیں ۔

ایک وہ لوگ جو کسی ایسی قوم اور قبیلہ سے تعلق رکھتے ہوں جن کے ساتھ مسلمانوں کے مصالحانہ تعلقات ہوں، ایسے لوگوں کی جان بخشی صرف معاہدے کے احترام کی وجہ سے کی گئی ہے کیونکہ معاہدے کے قیام تک ان کے کسی شہری کو گرفتار یا گرفتار کرنا عہد شکنی ہے خواہ وہ شہری کافر ہو یا منافق معاہدے کی رُوح یہی ہے کہ جو شخص تمہارے معاہدہ کی پناہ میں ہو وہ حکماً تمہاری پناہ میں بھی ہے حلیف کا حلیف بھی ایک درجہ میں حلیف ہی ہوتا ہے ان کو قتل کرنا ایک قسم کی عہد شکنی ہے ۔

دوسرے وہ لوگ جو جنگ میں غیر جانبدار ہوں ۔ اپنی کمزوری اور پست ہمتی کی وجہ سے مسلمانوں سے درخواست کریں کہ وہ نہ اپنی قوم سے مل کر مسلمانوں سے لڑیں گے اور نہ مسلمانوں میں شامل ہو کر اپنی قوم سے مقابلہ کریں گے بلکہ حقیقتہً غیر جانبدار رہیں تو ان لوگوں کو بھی جنگ کے زمانہ میں قتل کرنا جائز نہیں کیونکہ جب ان سے نقصان کا اندیشہ نہیں ہے تو پھر ان کے قتل کی اجازت نہیں ہے خود قرآن نے اس حکم کی یہ مصلحت واضح فرمائی ہے کہ ایسے کمزور لوگوں کی جانب سے غیر جانبداری کا رویہ بھی غنیمت ہے یہ بھی تو ممکن تھا کہ اللہ سبحانہٗ ان کو جنگ کرنے کا حوصلہ دے دیتا اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ لوگ کھلم کھلا دشمن بن کر سامنے آجاتے۔ یہ اللہ کا انعام ہے کہ باوجود قوت و قدرت کے ان کا دل تمہارے ساتھ جنگ کرنے سے ہٹا دیا اور ان کے دلوں میں ہیبت ڈال دی۔

آخر میں ارشاد فرمایا ہے فان اعتزلوکم یعنی اگر وہ تم سے کنارہ کش رہیں اور جنگ نہ کریں بلکہ تمہاری طرف صلح کا ہاتھ دراز کریں تو پھر تمہیں ان کے خلاف ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے یعنی اصل یہ ہے کہ جو کوئی تمہارے خلاف جنگ و جدال پر آمادہ نہ ہو اور صلح و مصالحت کا ہاتھ بڑھاتے تو تمہارے لیے کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے کہ اس پر ہتھیار اٹھاؤ۔ تمہیں جنگ کا حکم اس لیے نہیں دیا گیا ہے کہ تمہیں جنگ کا خواہش مند ہونا چاہیے بلکہ اس لیے کہ تمہارے برخلاف لوگوں نے جنگ کا اعلان کر دیا ہے۔ اس سے یہ بات بالکل واضح ہو جاتی ہے کہ جو لوگ مسلمانوں سے نہ لڑیں اور ان کے ساتھ صلح و سازگاری سے رہنا چاہیں اگرچہ وہ کافروں کے مقابلے میں مسلمانوں کا بھی ساتھ نہ دیں ان سے جنگ و قتال جائز نہیں ہے۔ کیونکہ اصل امن و صلح ہے نہ کہ جنگ و قتل۔

نفاق ولا مرکھنے والا طبقہ

۱۴۱۔ مزید ملیں گے تمہیں کچھ لوگ ایسے جو تمہارے جانب سے خود بھی امن میں رہنا چاہتے ہیں اور اپنی قوم کی طرف سے بھی، ہاں جب کسی فتنہ و فساد کی طرف لوٹا دیے جائیں تو اوندھے منہ اس میں گر جاتے لہٰذا ایسے لوگ اگر کنارہ کش ہوں اور تمہاری طرف پیغام مصالحت نہ روانہ کریں اور لڑائی سے ہاتھ نہ روکیں تو ان کو بھی گرفتار کر و اور قتل کرو اور یہی لوگ ہیں جن کے خلاف ہم نے تمہیں کھلی حجت دے دی ہے۔ یعنی کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ تم سے عہد کر جاتے ہیں کہ نہ تم سے لڑیں گے نہ اپنی قوم سے لڑیں گے تاکہ تم سے اور اپنی قوم دونوں سے امن میں رہیں لیکن اس عہد پر قائم نہیں رہتے بلکہ جب اپنی قوم کا غلبہ دیکھتے ہیں تو ان کے مددگار ہو جاتے ہیں تو ایسے لوگوں سے تم بھی درگزر مت کرو تمہارے ہاتھ تو صریح حجت آگئی کہ انہوں نے اپنا عہد توڑ ڈالا ہے [1]

یہاں آخرین کی تعبیر بتا رہی ہے کہ یہ منافقین والے ہیں یعنی وہ لوگ جنہوں نے مسلمانوں سے حلیفانہ تعلقات قائم کر رکھے تھے لیکن وہ اپنے ان تعلقات میں مخلص نہ تھے یہ گویا ان جھوٹے

[1] افادات شیخ الاسلام

حلفاء کی طرف اشارہ ہے جو ولا کا دعویٰ کر کے مسلمانوں کے خطرے سے اپنے آپ کو محفوظ رکھنا چاہتے تھے اور اپنی قوم کے اندر شامل رہ کر اس سے بھی مامون رہنا چاہتے تھے۔ یہ لوگ بظاہر تو ولا کے مدعی تھے لیکن ان کی ولایت محض نمائشی تھی۔ جب ان پر قومی دباؤ پڑتا یہ ان شرارتوں میں شامل ہو جاتے جو وہ اسلام اور اہل ایمان کے خلاف کرتے۔ آیت میں فتنہ سے مراد کفر، شرک، معاشرتی بے راہ روی، اخلاقی فساد سب کچھ ہو سکتا ہے کہ سیاق قرآنی بتا رہا ہے کہ یہاں اس سے مراد کفار کے وہ جارحانہ اقدامات ہیں جو وہ اسلام کے خلاف کر رہے تھے۔

قرآن نے یہاں ان لوگوں کے بارے میں اہل ایمان کو یہ ہدایت دی ہے کہ یہ لوگ اس رعایت کے مستحق نہیں ہیں جو پہلے دو طبقوں کو دی گئی ہے۔ یہ کھلے دشمن ہیں اگر یہ تمہاری مخالفت سے باز نہ آئیں۔ تمہارے ساتھ صلح جویانہ رویہ اختیار نہ کریں اور اپنے ہاتھ نہ روکیں تو تم جہاں کہیں پاؤ ان کو گرفتار اور قتل کرو۔ ان کو گرفتار کرنے اور ان کو قتل کرنے کا اللہ نے تمہیں کھلا اختیار دیا ہے۔

اسلام میں جنگ کا مقصد

ان لوگوں کے بارے میں جنگ کی یہ اجازت بتا رہی ہے کہ جہاد کی مشروعیت مظلوموں کی حمایت جلاوطنوں کو حق دلانے، حج کا راستہ کھولنے، عقیدے کی آزادی حاصل کرنے، دُنیا سے ظلم و فساد مٹا کر اللہ کے بندوں سے بندوں کی بندگی ہٹانے اور اللہ کی بندگی قائم کرنے کے لیے ہوئی تھی اسلام نے میدان جنگ میں بھی یہ قانون بتایا ہے کہ عین میدانِ جنگ میں پہنچ کر صلح و آشتی کا خیال رکھا جائے اگر کسی قوم سے لڑائی آ پڑے تو تلوار کے فیصلے سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کر دی جائیں۔ اوّل یہ کہ تم اسلام قبول کر لو اور لڑائی سے ہاتھ ہٹا کر ہمارے بھائی بن جاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو تم دین، حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو گے۔ اگر یہ منظور نہ ہو تو اسلام کا سیاسی نظام قبول کر لو۔ اس حالت میں تمہاری حفاظت کی جائے گی۔ اگر وہ ان دونوں میں سے کوئی بات قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں ہے۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے مناظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا محض اسلامی نظام کو قبول کر لیا اور جنگ رک گئی اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گیا۔ یہ قانون سرتاسر اسلام کی امن پسندی، سلامت طلبی اور خون ریزی سے بچنے کی آخری کوشش پر مبنی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا

دستور تھا کہ جب کسی فوج کو مقرر فرماتے تو جرنیل کو ہدایت کرتے کہ :

جب تم مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابل ہو تو اس کو تین باتوں میں سے کسی ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت دے ان میں سے جو بات بھی وہ مان لے اس کو قبول کر لو اور ان پر حملہ نہ کرو۔ ان کو اسلام کی دعوت دو اگر مان لیں تو اس سے جنگ نہ کرو اور ان سے درخواست کرو کہ وہ مسلمان ریاست میں آکر آباد ہو جاتے تو اس کے وہ ہی حقوق ہوں گے جو مسلمانوں کے ہیں۔ اگر اسلام قبول نہ کریں تو اسلامی نظام کو پیش کرو اگر وہ یہ بھی مان لے تو جنگ نہ کرو اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر اللہ سے مدد مانگو اور لڑائی شروع کر دو۔

یہ وہ اصول جنگ ہے جس سے خون ریزی کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی کو مسلمان ہونے کے لیے مجبور کرنا تھا۔

وَمَا كَانَ لِمُؤْمِنٍ أَنْ يَقْتُلَ مُؤْمِنًا إِلَّا خَطَأً ۚ وَمَنْ قَتَلَ مُؤْمِنًا
خَطَأً فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ وَدِيَةٌ مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ إِلَّا أَنْ
يَصَّدَّقُوا ۚ فَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ عَدُوٍّ لَكُمْ وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ
مُؤْمِنَةٍ ۖ وَإِنْ كَانَ مِنْ قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُمْ مِيثَاقٌ فَدِيَةٌ
مُسَلَّمَةٌ إِلَىٰ أَهْلِهِ وَتَحْرِيرُ رَقَبَةٍ مُؤْمِنَةٍ ۖ فَمَنْ لَمْ يَجِدْ فَصِيَامُ
شَهْرَيْنِ مُتَتَابِعَيْنِ تَوْبَةً مِنَ اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿٩٢﴾
وَمَنْ يَقْتُلْ مُؤْمِنًا مُتَعَمِّدًا فَجَزَاؤُهُ جَهَنَّمُ خَالِدًا فِيهَا وَ
غَضِبَ اللَّهُ عَلَيْهِ وَلَعَنَهُ وَأَعَدَّ لَهُ عَذَابًا عَظِيمًا ﴿٩٣﴾

اورکسی مسلمان کو زیب نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو قتل کرے مگر یہ کہ اس سے غلطی سے ایسا ہو جائے[۱۴۲] - اور جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے مار ڈالے تو اس کا کفارہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا دینا ہے۔ ہاں

مقتول کے وارثوں کو معاف کر دینے کا حق ہے[۱۴۳]۔ اور اگر وہ مسلمان مقتول
کسی ایسی قوم سے ہو جس سے تمہاری دشمنی ہے تو اس کا کفارہ ایک
مومن غلام کو آزاد کرنا ہے[۱۴۴]۔ اور اگر وہ مقتول کسی ایسی قوم کا فرد ہو
جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جائے گا
اور ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہوگا اور جسے آزاد کرنے کے لیے غلام
میسر نہ ہو تو وہ پے درپے دو ماہ کے روزے رکھے اللہ سے توبہ
کرنے کی خاطر اور اللہ جاننے والا حکیم ہے[۱۴۵]۔ اور جو کسی مسلمان کو
جان بوجھ کر قتل کر ڈالے تو اس کی سزا دوزخ ہے اسی میں پڑا رہے
گا اور اس پر اللہ کا غضب اور اس کی پھٹکار ہے اور اللہ نے
اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے[۱۴۶]۔

غلطی سے قتل کی سزا

مسلمانوں میں باہم اصل اخوت رافت، رحمت اور بھائی چارہ ہے۔ ایمان کا رشتہ خون کے رشتہ سے بڑھ کر ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے تو ایمان کا رشتہ لے کر تشریف لائے۔ اس کے ذریعے

مدت کے بچھڑے ہوئے باہم مل گئے، دشمن بھائی بھائی بن گئے اور خاندانی، لسانی، ملکی یگانگت سے بڑھ کر ایمانی یگانگت ان میں پیدا ہو گئی جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا اور باہمی دشمنیوں کو دل سے ایسا بھلا دیا کہ وہ بھائی بھائی ہو گئے۔ اہل ایمان کی اس باہمی اخوت و محبت اور مہربانی کی تشریح اور تاکید حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان فیض ترجمان سے یوں فرمائی ہے کہ،

مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے، محبت کرنے اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو تو بدن کے سارے اعضا بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ [1]

صحیح مسلم کی ایک روایت میں ہے کہ فرمایا،

سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کے مثل ہیں اگر اس کی آنکھ بھی دُکھے تو سارا بدن دُکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو پورا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔

مقصد یہ ہے کہ اُمت مسلمہ ایک جسم ہے اور اس کے سارے افراد اس کے اعضا ہیں۔ بدن کے ایک عضو میں بھی اگر تکلیف ہو تو سارے اعضا اس تکلیف کو محسوس کرتے ہیں اور اس میں شریک ہوتے ہیں۔ یہی حال مسلمانوں کا ہونا چاہیے کہ ان میں سے ایک کو بھی تکلیف ہو تو سارے مسلمانوں کو تکلیف محسوس ہونی چاہیے۔

جریر بن عبداللہ البجلی جو ایک مشہور صحابی ہیں کہتے ہیں کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے تین باتوں پر بیعت کی، نماز کو قائم رکھنا، زکوٰۃ دینا اور ہر مسلمان کی خیر خواہی کرنا [2] کئی روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا مسلمان کو گالی دینا خدا کی نافرمانی ہے اور اس سے لڑنا کفر ہے [3] یہ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں میں باہم برادری اور صلح و آشتی کا حکم دیا ہے اور جو اس کے خلاف کرتا ہے وہ خدا کے حکم کو نہیں مانتا ہے اور یہ ایک معنے میں کفر ہے اسی لیے قرآن پاک میں مسلمان کے ناحق اور بالارادہ قتل کی سزا وہی رکھی ہے جو میدان جنگ میں کافروں کے لیے ہے فرمایا کہ کسی مسلمان کو سزاوار نہیں ہے کہ وہ کسی بھی مسلمان کو قتل کرے الا یہ کہ غلطی سے ایسا ہو جائے اور مومن خواہ کہیں کا رہنے والا ہو ان آیات میں مومن کے غلطی سے قتل ہو جانے کا حکم بیان ہو رہا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر مسلمان مقتول اسلامی مملکت کا شہری ہو تو قاتل کو غلام آزاد کرنے کے ساتھ

---

[1] صحیح بخاری [2] صحیح بخاری کتاب الایمان [3] صحیح بخاری

مقتول کے وارثوں کو خون بہا بھی دینا ہوگا۔ اگر مسلمان مقتول اسلامی مملکت کا شہری نہیں بلکہ کسی ایسے ملک کا شہری ہے جو دار حرب ہے تو خون بہا نہیں صرف غلام آزاد کرنا ہوگا اور اگر مقتول اسلامی مملکت کا نہیں بلکہ کسی ایسے ملک کا شہری ہے جس سے اسلامی مملکت کے عہد و پیمان کے تعلقات ہیں تو قاتل کو خون بہا بھی دینا ہوگا اور غلام بھی آزاد کرنا پڑے گا۔ یہ مسئلہ یہاں اس لیے بیان کیا گیا ہے کہ پہلی آیات میں ان نام نہاد مسلمانوں کے بارے میں قتل کا حکم دیا گیا تھا جنہوں نے مسلمانوں اور اسلامی مملکت کے خلاف جنگ میں حصہ لیا تھا اور مسلمانوں کے لیے بھی ضروری ہو گیا تھا کہ مقابلہ کریں ورنہ اگر جنگ کی حالت نہ ہو تو قتل نفس ایک بہت بڑا گناہ ہے اور ایک مسلمان کے لیے کسی حال میں جائز نہیں کہ کسی مسلمان کو دیدہ و دانستہ قتل کر ڈالے۔ اس کے بعد بتلایا ہے کہ اگر کوئی شخص غلطی سے اور شبہ میں کسی مسلمان کو قتل کر دے تو اس کا کیا حکم ہے یاد رہے کہ قرآن نے دو حالتوں کے سوا اور کسی حالت میں قتل کو جائز نہیں رکھا ہے یا تو لڑائی کی حالت ہو یا قانون کی رُو سے کسی مجرم کو سزا دی جائے اور بس۔

۹۲ا۔ اور کسی مسلمان کو زیب نہیں ہے کہ کسی مسلمان کو قتل کرے مگر یہ کہ اس سے غلطی سے ایسا ہو جائے۔ قتل خطاً یعنی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دینے کی کئی صورتیں ہیں۔ مثلاً غلطی سے مسلمان کو شکار سمجھ کر مار ڈالا یا تیر اور گولی شکار پر چلائی چوک کر کسی مسلمان کو جا لگی۔ ایک صورت قتل خطاً کی یہ بھی ہے کہ ایک مسلمان کافروں میں ہو اور اس کو کوئی مسلمان کافر سمجھ کر بوجہ لاعلمی قتل کر ڈالے اور یہاں اسی صورت کو بیان کرنا مقصود ہے۔ مجاہدین کو یہ بات اکثر پیش آجاتی ہے اور آیاتِ سابقہ کے بھی مناسب ہے۔ گو قتلِ خطاً کی اور صورتوں کا حکم بھی یہی ہے وہ صورتیں بھی اس میں آگئیں۔ [1]

انداز بیان اور پیرایۂ تعبیر خود بول رہا ہے کہ گناہوں میں سنگین گناہ قتل مومن ہے۔ اتنے بڑے گناہ کی جسارت کوئی مسلمان ہوش و حواس کے ہوتے ہوئے نہیں کر سکتا۔ اس میں غلطی تو ہو سکتی ہے لیکن بالارادہ اور جان بوجھ کر یہ کام ایک مسلمان کے ہرگز شایانِ شان نہیں ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ایک مسلمان کے لیے شرک کے بعد اس سے بڑھ کر کوئی گناہ نہیں ہو سکتا کہ اپنے مسلمان بھائی کے خون سے ہاتھ رنگین کرے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

قرآن نے مسلمانوں کی جمعیت و جماعت کی بنیاد باہمی مواخات پر رکھی ہے یعنی ہر مسلمان کا شرعی رشتہ دوسرے مسلمان سے بھائی کا ہے فاصبحتم بنعمتہ اخواناً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری حج کے موقعہ پر جو یادگار عالم خطبہ دیا تھا اور جو حجۃ الوداع کے نام سے مشہور ہے۔ اس میں ہمیشہ کے لیے تمام مسلمانوں کو وصیت فرمائی تھی لا ترجعوا بعدی کفاراً یضرب بعضکم رقاب بعض میرے بعد کافر نہ ہو جانا کہ تم ایک دوسرے کو مارنے لگو۔ اس کی سنگینی کے پیش نظر حضور انور نے ان راہوں پر قدغن قائم کر دی جو قتل مومن کی طرف لے جانے والی تھیں۔ مثلاً بخاری میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا ہے۔

> کبھی اپنے بھائی مسلمان کی طرف ہتھیار سے اشارہ نہ کیا کرو ممکن ہے کہ ہتھیار لگ جائے اور تم دوزخ کے گڑھے میں گر پڑو۔

اور ابن ابی شیبہ نے ابوہریرہ سے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ،

> جب کبھی کوئی مسلمان دوسرے مسلمان کی طرف تلوار سے اشارہ کرتا ہے تو فرشتے اس پر لعنت بھیجتے ہیں۔

فتح الباری میں ابن العربی کا یہ تشریحی نوٹ نقل کیا گیا ہے کہ،

> جب صرف ہتھیار اٹھا کر اشارہ کرنے کے بارے میں ایسی شدید وعید آئی ہے کہ فرشتے لعنت بھیجتے ہیں تو اس بدبخت کا کیا حال ہو گا جو صرف اشارہ ہی نہ کرے بلکہ سچ مچ اپنے ہتھیار سے ایک مسلمان کو قتل کر ڈالے اور یہ جو فرمایا کہ اشارہ کرنے والا مستحق لعنت ہے تو اس سے مراد وہی شخص ہے جو ڈرانے کے لیے ایسا کرے خواہ غصہ سے یا ہنسی ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر ہنسی دل لگی میں بھی کوئی شخص ہتھیار اٹھا کر کسی مسلمان کو ڈرائے گا تو وہ لعنت کا مستحق ہو گا۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے امام ترمذی اور امام نسائی نے مرفوعاً روایت کیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ،

> اللہ کی نظروں میں تمام دنیا کے مٹ جانے سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ ایک مسلمان کا قتل ہونا ہے۔

اور اسی بنا پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے۔

> قیامت کے روز سب سے پہلے جس معاملہ کا فیصلہ چکایا جائے گا وہ انسان کا

خون ہے۔ (بخاری عن عبداللہ بن مسعود)
حضرت عبداللہ بن عمر کے سامنے جب ایک قاتل لایا گیا تو آپ نے فرمایا بن پڑے تو ٹھنڈے پانی کا کچھ توشہ لے لے کیونکہ تو جنت میں ہرگز نہ جائے گا۔
بہرحال آیت میں انداز بیان کہہ رہا ہے کہ قتل مومن اللہ کے نزدیک سنگین گناہ ہے۔

اسلامی مملکت میں مسلمان شہری کا قتل خطأ

۱۴۳۔ اور جو شخص کسی مسلمان کو غلطی سے مار ڈالے تو اس کا کفارہ ایک مسلمان غلام کو آزاد کرنا اور مقتول کے وارثوں کو اس کا خون بہا دینا ہے ہاں مقتول کے وارثوں کو معاف کرنے کا حق ہے۔ یعنی اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کو غلطی سے قتل کر دے۔ فقہاء نے قتل خطا کی دو بڑی قسمیں بتائی ہیں ایک یہ کہ غلطی قصد وظن میں ہوتی، مثلاً دور سے آدمی کو شکار سمجھ لیا یا آدمی تو سمجھا مگر مسلمان پر کافر حربی کا دھوکا ہوا۔ دوسرے یہ کہ غلطی خود عمل میں ہو گئی مثلاً نشانہ لگایا جانور پر مگر گولی جا لگی مسلمان کو۔ اس صورت میں مسلمان کے غلطی سے قتل کرنے کے گناہ کی تو بہ یہ ہے کہ۔ اولاً، تحریر رقبۃ مومنۃ مسلمان غلام کو آزاد کرے چونکہ ایک مسلمان کی اس کے ہاتھ سے جان تلف ہوئی ہے اس لیے اس کا کفارہ یہی ہے کہ ایک مسلمان کی جان کی تخلیق کرے، آزاد کرنا بھی تخلیق ہے جیسے غلامی کی حقیقت عدم ہے غلام کے لیے رقبۃ کی تعبیر بھی بڑی بلیغ ہے۔ رقبہ کے معنے گردن کے ہیں چونکہ غلام ہمہ وقت طاعت و فرمانبرداری کے لیے آقا کے سامنے گردن جھکائے رہتا ہے یا بیل کی طرح اس کی گردن پر خدمت کا جوا رکھا ہوتا ہے اس لیے اس کو رقبہ کہا گیا ہے۔ اسی لیے جمہور علماء کی رائے میں مفلوج، مشغول غلام کی آزادی معتبر نہیں ہے ایسے ہی اندھا اور مجنون غلام بھی قتل خطأ میں آزادی کے لائق نہیں ہے۔
غلام مسلمان ہونا چاہیے لیکن مسلمان کی تعیین میں اختلاف ہے۔ عبداللہ بن عباس، الحسن، شعبی اور نخعی کہتے ہیں کہ چاہیے کہ نماز پڑھتا ہو اور ایمان سمجھتا ہو۔ امام ابوحنیفہ، ابویوسف، امام محمد، زفر اور الحسن بن زیاد، الاوزاعی اور الشافعی فرماتے ہیں کہ بچہ بھی آزاد کیا جا سکتا ہے۔
ثانیاً غلام آزاد کرنے کے ساتھ دیت بھی ادا کرنی پڑے گی جو مقتول کے ورثاء کو ملے گی۔ غلام کا آزاد کرنا کفارہ ہے یہ حق اللہ ہے اور خون بہا مقتول کے ورثاء کو دینا مقتول کے ورثاء کا حق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقتول کے عزیز و اقارب کا حق ہے کہ ان کو خون بہا ملے۔ قرآن کی نظر فطرت بشری کی گہرائیوں پر ہے اس نے اصول قانون میں یہ بات رکھی کہ قتل اگر غلطی سے ہو گیا تو جان کی تلافی

غلام کی آزادی سے کی جائے لیکن مقتول کے وارثوں کی اشک شوئی خون بہا سے کی جائے۔

دیت کیا ہے؟

دیت کا لفظ عربی زبان میں عِدۃ کے وزن پر مصدر ہے۔ قانون میں اس کی تعریف یہ کی گئی ہے کہ وہ مالی معاوضہ جو کسی آزاد شہری کے خلاف اقدام سے واجب ہوا ہو۔ آج بھی بین الاقوامی قانون میں یہ بالکل جائز ہے کہ جب ایک ملک کی رعایا کا خون دوسرے ملک کے باشندوں کے ہاتھوں ہو جائے اور غیر ملک میں فوجداری کا مقدمہ چلانا دشوار ہو تو بجائے فوجداری استغاثہ کے صرف ہرجانہ کی رقم پر کفایت کر لی جائے۔ یہ ہرجانہ اسی دیت کے لیے ایک خوشنما اور جدید اصطلاح ہے۔

قرآن میں یہاں لفظ دیت کو بے قید بطور نکرہ لایا گیا ہے لیکن نبوت کی عملی زندگی نے اس کی تحدید کی ہے اور اس تحدید میں عرب کے عرف کو قانون کی حیثیت سے دی تھی۔ اس بنا پر فقہا کا اس پر اجماع ہے کہ دیت سو اونٹ ہے۔ اگر دوسری صورت میں کوئی خون بہا دینا چاہے تو اس کی مقدار سو اونٹوں کی بازاری قیمت کے لحاظ سے مقرر کی جائے گی۔ حضور انور کے زمانہ میں نقد دینے والوں کے لیے ۸ سو دینار یا آٹھ ہزار درہم تھے۔ جب حضرت عمرؓ کا زمانہ آیا تو انہوں نے فرمایا کہ اب اونٹوں کی قیمت زیادہ ہو گئی لہٰذا اب سونے کے سکہ میں ایک ہزار دینار یا چاندی کے سکے میں ۱۰ ہزار درہم خون بہا دلوایا جائے، یہی امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے۔

قتلِ خطا میں دیت کی ذمہ داری

قتلِ خطا میں غلام آزاد کرنے کی ذمہ داری اگر قاتل پر ہے تو دیت دینے کی ذمہ داری قاتل پر نہیں بلکہ قاتل کے قبیلہ پر ہوتی ہے یعنی اس کی قوم، جماعت یا شہر والوں پر ہوتی ہے جہاں قاتل رہتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کی قوم، برادری، خاندان اور شہر والوں کا فرض ہے کہ وہ اس کے چال چلن پر نظر رکھیں۔ اگر عقیلہ یعنی قاتل کی قوم غفلت اور بے پرواہی نہ کرتی تو مجرم اس جرم کا مرتکب نہ ہوتا۔ لیکن یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس معاملہ میں قانون نے قاتل اور مقتول دونوں سے ہمدردی کا پہلو اختیار کیا ہے۔ مقتول کے وارثوں کے ساتھ یہ ہمدردی کی ہے کہ ان کی دیت اور مال دے کر اشک شوئی کی ہے اور قاتل کے ساتھ غلطی سے قتل ہونے کی وجہ سے یہ ہمدردی کی ہے کہ قاتل کے رشتہ داروں کو اس معاملہ میں قاتل کی مدد کرنے کی تلقین کی ہے۔ اس موضوع پر

فقہائے امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ اتفق الفقہاء علیہ مگر واضح رہے کہ رشتہ داروں پر ذمہ داری کا یہ بوجھ قتل عمد کی صورت میں نہیں بلکہ قتل خطا کی صورت میں ہے اور اس مسئلہ میں بھی علمائے امت کے درمیان کوئی اختلاف نہیں ہے کہ خون بہا کی رقم یکبارگی وصول نہ کی جائے گی بلکہ تین سالوں میں لی جائے گی۔ الجصاص نے استفاض ذالک عن عمر یہ بات حضرت عمر سے شہرت کے درجہ میں نقل ہو کر آئی ہے اور صدر اول میں کسی نے اس سے اختلاف نہیں کیا اور تمام فقہاء نے اسے ہی اپنایا ہے۔

اگر مقتول مسلمان نہ ہو بلکہ یہودی، عیسائی، مجوسی، معاہد یا ذمی ہو تو پھر دیت کے موضوع پر ائمہ کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔ امام ابوحنیفہ، ابو یوسف، محمد، زفر، عثمان اللیثی، سفیان ثوری اور الحسن بن صالح کہتے ہیں کہ دیت کے موضوع پر مسلم اور غیر مسلم میں مساوات ہے۔ امام مالک کی رائے میں یہودیوں اور عیسائیوں کا خون بہا نصف ہے اور مجوسی کی دیت صرف آٹھ سو درہم ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں یہودی اور عیسائی کی دیت مسلمان کے مقابلے میں ایک تہائی ہے اور مجوسی کی دیت آٹھ سو درہم ہے۔

دیت کو معاف کر دینے کا حق

آخر میں فرمایا ہاں مقتول کے وارثوں کو معاف کر دینے کا حق ہے۔ اصل ارشاد ہیں الا ان یصدقوا آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقتول کے وارثوں کو دیت کا دینا واجب ہے۔ ہاں اگر وہ معاف کر دیں تو پھر واجب نہیں ہے۔ معافی کو تصدق کے ساتھ تعبیر کرنے میں ایسا کرنے کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ عفو و درگزر کی اس اخلاقی تعلیم میں اگر قوت اور قدرت کا جز شامل نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری اور دوفائت پسندی کے مرادف ہو کر رہ جائے۔ اسی لیے یہاں قرآن نے پہلے مقتول کے ورثا کے حق کا اقرار کیا اور اس اعتراف کے بعد ان کو معاف کرنے کی ترغیب دی۔ قرآن نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے اور موجودہ تعلیم کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر طمانچہ مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کر دے جرأت اور طبعی پستی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ قرآن نے عفو و درگزر کی ایسی تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی برقرار رہتی ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ برائی کا بدلہ برائی اجتماعی تقاضا ہے لیکن عفو و درگزر افراد کا اخلاقی کمال ہے۔ جماعتی قانون کی قوت موجود ہوتے

ہوتے افراد کا آپس میں عفو و درگزر سے کام لینا ایک بلند اخلاق کی مثال ہے جس کی مزدوری کی ذمہ داری اللہ سبحانہ نے اپنے ذمہ لی ہے اور بتا دیا ہے کہ ظلم کرنے والے خواہ وہ ہوں جو بے سبب ظلم کر بیٹھیں یا وہ جو انتقام کے جوش میں آگے بڑھ جائیں خدا کی محبت سے محروم ہیں۔ اس حق کے حاصل ہو جانے کے بعد عفو و درگزر خودداری کے منافی نہیں ہوتا بلکہ بڑی ہمت کا کام ہے کہ قدرت کے باوجود اور اشتعال ہونے پر بھی اپنے نفس کو قابو میں رکھ کر عفو و درگزر کرتے ہیں اسی لیے ارشاد ہے ولمن صبر وغفر ان ذالك لمن عزم الامور۔

مسلمان مقتول اگر دار حرب کا شہری ہو

۱۴۴۔ اور اگر وہ مسلمان مقتول کسی ایسی قوم سے ہو جس سے تمہاری دشمنی ہے تو اس کا کفارہ ایک مومن غلام کو آزاد کرنا ہے۔ یعنی اگر مقتول مسلمان ہو اور ایسی ملک کا شہری ہو جن سے اسلامی مملکت کے تعلقات حلیفانہ نہیں بلکہ حریفانہ ہیں تو اس صورت میں قاتل کو صرف غلام آزاد کرنا ہوگا دیت اور خون بہا نہ ہوگا۔ کفار کے علاقوں میں بہت سے مسلمان بھی تھے جو خود تو ہجرت کے دل سے خواہاں تھے لیکن مجبوریوں نے ان کی راہ روک رکھی تھی۔ جنگ پیش آجانے کی صورت میں اندیشہ تھا کہ مبادا ان کو خود مسلمانوں کے ہاتھوں کوئی گزند پہنچ جائے اس لیے قرآن نے قتل مومن کی سنگینی بھی واضح کر دی اور یہ بھی وضاحت کر دی کہ اگر مقتول مسلمان دشمن قوم یا قبیلہ کا فرد ہو تو ایک مسلمان غلام کا آزاد کرنا کافی ہے اور خون بہا کی ادائیگی ضروری نہیں ہے۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ قیاس و عقل کا تقاضا بھی یہی ہے کہ اس صورت میں صرف کفارہ واجب ہو اور دیت واجب نہ ہو کیونکہ اگر دار الحرب کے شہری مسلمان کے قتل میں دیت واجب ہو تو جو دار الحرب میں جہاد کی خاطر جانے والے مجاہدین کی ذمہ داری میں یہ بات داخل ہو جاتی ہے کہ جہاد کے لیے قدم اٹھانے سے پہلے اس امر کی تحقیق کریں کہ کون مسلمان ہے اور کون کافر اور یہ ایک ایسی الجھن ہوتی جس کا حل ممکن نہ تھا اس لیے اللہ سبحانہ نے دار الحرب کے مسلمان شہریوں کے قتل میں خون بہا واجب نہیں کیا۔ اگر ایسا ہوتا تو لوگ جہاد ہی میں محتاط ہو جاتے۔ کفارہ ضرور واجب کر دیا کہ یہ حق اللہ ہے۔[1]

---

[1] معارف القرآن ص ۱۔

مقتول اگر معاہد قوم کا فرد ہو

۱۴۵۔ اور اگر وہ مقتول کسی ایسی قوم کا فرد ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہو تو اس کے وارثوں کو خون بہا دیا جائے اور ایک مومن غلام کو آزاد کیا جائے گا اور جسے آزاد کرنے کے لیے غلام میسر نہ ہو تو وہ پے درپے روزے دو ماہ کے رکھے اللہ سے توبہ کرنے کی خاطر اور اللہ جاننے والا حکیم ہے۔ اس آیت میں قتل خطا کے دو حکم بتائے ہیں ایک تو آزاد کرنا غلام مسلمان کا اور اس کا مقدور نہ ہو تو دو ماہ کے متصل روزے رکھنا یہ کفارہ ہے خدا تعالیٰ کی جناب میں اپنی خطا کا، دوسرے اس مقتول کے وارثوں کا خون بہا دینا یہ ان کا حق ہے۔ ان کے معاف کرنے سے معاف بھی ہو سکتا ہے اور کفارہ کسی کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہو سکتا۔ اس کے متعلق تین صورتیں ہو سکتی ہیں کیونکہ جس مسلمان کو غلطی سے قتل کیا اس کے وارث مسلمان ہوں گے یا کافر۔ اگر کافر ہیں تو ان سے معاہدت ہے یا دشمنی اول دونوں صورتوں میں مقتول کے وارثوں کو خون بہا دینا پڑے گا تیسری صورت میں خون بہا لازم نہ ہوگا اور کفارہ سب صورتوں میں ادا کرنا ہوگا۔[1]

اس آیت میں اور پہلی آیت میں ذرا سا فرق ہے اوّل یہ کہ پہلی آیت میں وھو مومن کی قید موجود ہے جبکہ اس آیت میں نہیں ہے دوسرے یہ کہ اس آیت میں فدیۃ مسلمۃ کا ذکر پہلے ہے اور غلام آزاد کرنا بعد میں ہے جبکہ پہلے اس کا عکس ہے تیسرے یہ کہ اس میں الا ان یصدقوا نہیں ہے جبکہ پہلی آیت میں صراحۃً موجود ہے۔

اس بنا پر شارحین قرآن کا اس آیت کی تفسیر میں تھوڑا سا اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس فقرے وان کان من قوم بینکم الخ میں ضمیر کا مرجع مقتول مومن ہے اس لیے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر وہ مقتول مومن ہو لیکن وہ غیر ملکی ہو اور ملک ایسا ہو جو تمہارا معاہد ہو تو تم پر اس مقتول کی دیت اور کفارہ دونوں واجب ہیں۔ تابعین میں سے حسن بصری، جابر بن زید اور ابراہیم نخعی کی رائے یہی ہے اور شارحین قرآن میں سے امام رازی، علامہ آلوسی اور ابو السعود نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ ہمارے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی کا میلان بھی یہی ہے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ ضمیر کا مرجع صرف مقتول ہے مقتول مومن نہیں۔ اگر مقتول مومن ہوتا تو پہلی آیت کی طرح وھو مومن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی قید ہوتی ۔ یہ قید نہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ مقتول مومن نہیں اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر مقتول ایسے ملک کا شہری ہو جس سے اسلامی حکومت کا معاہدہ ہو اور اس میں وہ غیر مسلم بھی داخل ہیں جو اسلامی مملکت کے شہری ہیں کیونکہ ان سے بھی اسلامی حکومت تحفظ جان و مال کا عہد کرتی ہے تو اس صورت میں تمہیں غلام بھی آزاد کرنا ہوگا اور خون بہا بھی دینا ہوگا۔ عبداللہ ابن عباس، امام شعبی، امام نخعی اور امام شافعی سے یہی تشریح منقول ہے اور حافظ ابن جریر نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے کیونکہ گزشتہ آیت کی طرح اس آیت میں و ھو مومن کی قید نہیں ۔ اردو مفسرین میں سے مولانا اشرف علی اور مولانا آزاد نے بھی اسی کو پسند کیا ہے لیکن جن لوگوں نے روایات کی بنا پر یہ طے کر لیا ہے کہ غیر مسلم کی دیت مسلمان کی دیت سے آدھی ہوتی ہے ۔ ان کو اس تشریح سے اختلاف ہے لیکن روایات کے برعکس قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ کفارہ اور دیت کے لحاظ سے ذمی، مستامن اور معاہد کافر کا بھی ایک مسلمان کے برابر حق ہے ۔

غلامی کا رواج اگر نہ ہو

آخر میں فرمایا کہ فمن لم یجد اگر کسی کو آزاد کرنے کے لیے غلام نہ دستیاب ہو ۔ اس کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ غلام دستیاب نہ ہو، یعنی بردہ فروشی اور غلامی کا رواج نہ رہے جیسا کہ آزادی کی ہدایات سے قرآن کا مقصد ہے یا یہ کہ غلام خریدنے کے لیے سرمایہ ہی نہ ہو ۔ یہاں پہلی بات زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ قرآن نے غلامی کا رواج کم کرنے کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے ہیں جس کی تفصیل کا یہاں محل نہیں ہے لیکن اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ غلاموں کی تعداد گھٹانے کے لیے قرآن نے مکاتبت کا طریقہ رائج کیا یعنی غلام کو حق دیا گیا ہے کہ اگر وہ غلام رہنا نہیں چاہتا تو اپنے کتابت کا معاملہ کرے ۔ کتابت یہ ہے کہ اپنے آقا سے کہے کہ اگر وہ اتنی رقم کما کر آقا کو دے دے تو وہ آزاد ہے غلام کے اس عمل میں دوسرے مسلمانوں کی شرکت کو بہت بڑے ثواب کا کام بتایا ہے قرآن کے مصارف میں ایک مصرف یہ بھی بتایا ہے ۔ پھر مول کتابت ادا کرنے کے بعد اس کی ضرورت نہیں کہ آقا اپنی زبان سے آزادی کے کلمات کہے بلکہ رقم کی ادائیگی کے ساتھ ہی وہ آزاد ہو جاتا ہے ۔ اس کے علاوہ قرآن نے غلاموں کو آزاد کرنے کے مختلف قانونی طریقے بتائے ہیں ان میں سے ایک وہ ہے جو آپ ان آیات میں پڑھ چکے ہیں ۔ اسلامی مملکت کا مسلمان شہری، مستامن، ذمی، معاہد غیر اسلامی مملکت کا غیر مسلم شہری، غیر معاہد غیر اسلامی مملکت کا مسلمان شہری غلطی سے مسلمان کے ہاتھ سے مارا جائے تو مسلمان غلام کو آزاد کرنا

واجب ہے۔ کفارہ ظہار میں غلام آزاد کرنا ضروری ہے اور امام ابوحنیفہ کے خیال میں اس کے لیے مسلمان ہونا بھی ضروری نہیں۔ کفارہ یمین میں غلام آزاد کرنے کی ترغیب ہے اسی طرح اگر کوئی شخص عمداً رمضان کا روزہ توڑ دے تو اسے بھی غلام آزاد کرنے کی ہدایت ہے۔ ان ہدایات سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کا منشا غلامی کے رواج کو کم کرنا ہے اس لیے یہاں فرمایا ہے فمن لم یجد جسے غلام آزاد کرنے کے لیے دستیاب نہ ہو تو پے در پے دو ماہ کے روزے رکھے۔ یہ دو ماہ قمری ہونے چاہئیں۔ اگر چاند کی پہلی سے نہیں درمیان سے روزے شروع کرے گا تو پورے ۶۰ روزے رکھنے ہوں گے۔ اگر درمیان میں ایک بھی چھوڑے گا تو پھر از سرِ نو رکھنے ہوں گے توبۃ من اللہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ جرمانہ نہیں بلکہ توبہ اور کفارہ ہے۔ جرمانے میں ندامت و شرمساری اور اصلاح نفس کی کوئی رُوح نہیں ہوتی بلکہ عموماً وہ سخت ناگواری کے ساتھ مجبوراً دیا جاتا ہے اور بیزاری و تلخی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے برعکس اس کے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس بندے سے خطا ہوئی ہے وہ عبادت اور کارِ خیر ادا کرنے حقوق کے ذریعے سے اس کا اثر اپنی رُوح پر دھوئے اور شرمساری و ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرے تاکہ نہ صرف یہ کہ گناہ معاف ہو بلکہ آئندہ کے لیے اس کا نفس ایسی غلطیوں کے اعادے سے بھی محفوظ رہے۔ کفارے کے لغوی معنے ہیں چھپانے والی چیز کسی کارِ خیر کو گناہ کا کفارہ قرار دینے کا مطلب یہ ہے کہ نیکی اس گناہ پر چھا جاتی ہے اور اسے ڈھانک لیتی ہے جیسے کسی دیوار پر داغ لگ گیا ہے اور اس پر سفیدی پھیر کر داغ کا اثر مٹا دیا جائے۔ [1]

مومن کو عمداً قتل کی اخروی سزا

۹۳۔ اور جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر ڈالے تو اس کی سزا دوزخ ہے۔ اسی میں پڑا رہے گا اور اس پر اللہ کا غضب اور پھٹکار ہے اور اللہ نے اس کے لیے بڑا عذاب تیار کر رکھا ہے۔

یعنی اگر مسلمان دوسرے مسلمان کو غلطی سے نہیں بلکہ قصداً اور مسلمان معلوم کرنے کے بعد قتل کرے گا تو اس کے لیے آخرت میں جہنم اور لعنت اور عذابِ عظیم ہے۔ کفارے سے اس کی رہائی نہ ہوگی باقی رہی دنیوی سزا وہ سورۂ بقرہ میں گزر چکی۔ جمہور علماء کے نزدیک خلود اس کے لیے ہے جو مسلمان کے قتل کو حلال سمجھے کیونکہ اس کے کفر میں شبہ نہیں ہے یا خلود سے مراد یہ ہے کہ

---

[1] تفہیم القرآن۔

مدت دراز تک جہنم میں رہے گا یا وہ شخص مستحق تو اسی سزا کا ہے آگے اللہ مالک ہے جو چاہے کرے واللہ اعلم۔[1]
یہ آیت اس موضوع پر نص قطعی ہے کہ جو مسلمان دانستہ بلا کسی حق شرعی کے دوسرے مسلمان کو قتل کر دے وہ دوزخ میں ڈالا جائے گا۔ اللہ کے غضب ولعنت کی آماجگاہ ہوگا اور عذاب الیم کا مستحق۔ اس سزا کی سنگینی سمجھنے کے لیے یہ بات ملحوظ رکھنی چاہیے کہ ایک مسلمان کے لیے شرک کے بعد اس سے بڑھ کر اور کوئی کفر نہیں ہو سکتا کہ اپنے مسلمان بھائی کے خون سے ہاتھ رنگین کرے۔ احادیث میں اس حقیقت کی جو بے شمار تشریحات وتمثیلات ملتی ہیں وہ مشہور ہیں اور مہاجرین وانصار اور عموم صحابہ کرام نے ان کی عملی تصویر بن کر بتلا دیا ہے کہ اخوت دینی کے کیا معنے ہیں۔ ہر مسلمان پر اس کی نماز اور روزے سے بھی بڑھ کر جو چیز فرض کر دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ مسلمان سے محبت کرے، جہاں تک بن پڑے ان کی بھلائی چاہے اور کوئی بات ایسی نہ کرے جس سے مسلمانوں کو نقصان پہنچے۔ اگر یہ چیز نہیں ہے تو ایمان واسلام بھی نہیں ہے۔ پہاڑوں جتنا بھی زہد وعبادت ہو سمندر جتنی بھی دولت خرچ کر ڈالی جائے لیکن اگر یہ چیز نہیں تو بالکل بے کار وعبث ہے۔

فرمایا کہ:

کوئی شخص مومن نہیں ہو سکتا جب تک اس میں یہ بات پیدا نہ ہو جائے کہ جو بات اپنے لیے پسند کرے وہی اپنے بھائی کے لیے بھی پسند کرے۔

(رواہ الشیخان)

اور فرمایا کہ:

تم کبھی جنت میں نہیں جا سکتے جب تک ایمان نہ لاؤ اور کبھی مومن نہیں ہو سکتے جب تک باہم محبت وپیار نہ کرو۔ (رواہ الشیخان)

اور فرمایا کہ:

ایک دوسرے کی ٹوہ میں نہ رہو باہم کینہ وعناد نہ رکھو۔ بدگوئی نہ کرو۔ اور آپس میں بھائی بھائی ہو جاؤ (رواہ الشیخان)

حضرت انس رضی اللہ عنہ کو وصیت کی کہ:

تجھ پر صبح کا سورج چمکے تو اس حالت میں چمکے کہ اس کی کرنوں کی طرح

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تیرا دل بھی سب کے لیے صاف ہو اور شام آئے تو اس طرح آئے کہ کسی کی طرف سے تیرے دل میں کھوٹ نہ ہو۔ (مسلم)

اور فرمایا کہ:

مسلمان وہ ہے کہ اس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمانوں کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ (بخاری)

اور فرمایا کہ:

کسی مسلمان کے لیے روا نہیں ہے کہ تین دن سے زیادہ کسی مسلمان سے روٹھا رہے۔ (رواہ الشیخان)

اور فرمایا کہ:

اللہ کی اس پر پھٹکار جس نے کسی مسلمان کو نقصان پہنچایا یا اس کو دھوکا دیا۔ (ترمذی)

ایک حدیث میں یہاں تک زور دیا کہ جو شخص اللہ اور قیامت پر ایمان رکھتا ہے اس کو نہ چاہیے کہ اپنے بھائی مسلمان کی طرف تیز نظروں سے گھورے یعنی جب مسلمان بھائی کو دیکھے محبت اور پیار سے دیکھے۔ (رواہ الحاکم وصححہ)

جب اللہ و رسول نے مسلمانوں کی قومیت کی بنیاد ہی باہمی محبت و برادری پر رکھی اسی کو ایمان کی جڑ قرار دیا اسی پر اسلام کی تکمیل موقوف ٹھہری تو ظاہر ہے کہ جو مسلمان خدا کے اس جوڑے ہوئے رشتہ کو توڑ دے اور اپنے انہی ہاتھوں سے جو مسلمانوں کی دستگیری و مددگاری کے لیے بنائے گئے تھے مسلمانوں کی گردنیں کاٹے اس سے بڑھ کر خدا کی زمین پر اس کے قانون کا کون مجرم ہو سکتا ہے اور اگر انسان کی برائیاں اور بدعملیاں اللہ کی لعنت کا مستحق ہو سکتی ہیں تو اس سے بڑھ کر اور کون سا کام ہے جو اللہ کے عرش جلال و غیرت کو ہلا دے اور اس کی لعنتیں بارش کی بوندوں کی طرح آسمان سے زمین پر برسنے لگیں؟

اللہ اکبر جس مومن کا وجود اللہ کو اس قدر محبوب و محترم ہو کہ تمام دنیا کا زوال اس کی ہلاکت کے مقابلے میں ہیچ ہو اسی کا خون خود ایک مسلمان کے ہاتھ سے ہو اس سے زیادہ اللہ کی شریعت اور اس کے قانون کی اور کیا توہین ہو سکتی ہے اور ان سارے گناہوں میں سے جو انسان کے ہاتھ پاؤں کر سکتے ہیں اور کون سا گناہ ہے جو اس سے زیادہ ملعون اور مردود ہو سکتا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس فعل کے لیے وہ وعید فرمائی جو کسی معصیت کے لیے نہیں فرمائی

یعنی فجزاؤہ جھنم خالدًا فیھا و غضب اللہ علیہ و لعنہ اس میں خلود فی النار غضب لعنت تین چیزوں کا ذکر کیا ہے اور تمام قرآن و سنت میں یہ تینوں کلمات وعید کفار کے لیے مخصوص ہیں۔ اہل ایمان کے بارے میں کہیں نہیں بولے گئے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ قتل مومن کا گناہ تمام معاصی فسوق سے بڑھ کر ہے۔ معصیت و فسق کا لفظ اس کی ناپاکی ظاہر کرنے کے لیے کافی نہ تھا جب مسلمان کو صرف گالی دینا فسق ہے تو پھر اس کو قتل کر دینا فسق کیوں کر ہو سکتا ہے۔ سن آئے ہو کہ مسلمان کو گالی دینا فسق ہے اور اس سے قتال کفر ہے ۔

ایمان کی طرح کفر کے بھی درجات ہیں

جس طرح ایمان کی ستر سے اوپر کچھ شاخیں ہیں اور ان میں سے ہر شاخ ایمان و اسلام ہے اسی طرح کفر کی بھی شاخیں ہیں اور اعلیٰ و ادنیٰ مراتب ہیں۔ اسی لیے صحابہ و سلف سے کفر دون کفر اور ظلم دون ظلم مروی ہے۔ امام بخاری نے کتاب الایمان میں عنوان قائم کیا ہے کفران العشیر و کفر دون کفر لیکن دراصل یہ خود صحابہ کرام کے آثار سے ماخوذ ہے جیسا کہ امام احمد نے کتاب الایمان میں عطا ابن ابی رباح کے طریق سے روایت کیا ہے۔ امام ابوالحسن الاشعری نے المقالات الاسلامیہ میں تصریح کی ہے کہ یہ متعدد صحابہ سے منقول ہے اور صدر اول میں عام طور پر زبان زد تھا۔ حافظ ابن تیمیہ کی کتاب الایمان میں یہ سارا ذخیرہ موجود ہے ۔

اور جس طرح ایمان و اسلام اعتقادی اور عملی یعنی اعتقادات میں بھی اعمال میں بھی، فکر میں بھی فعل میں بھی ہے اسی طرح کفر اور نفاق کی بھی دو قسمیں ہیں اعتقادی اور عملی شرک کفر اعتقادی ہے اور عمدًا ترک صلوٰۃ کفر عملی ہے۔ لہٰذا قرآن و احادیث میں لفظ کفر دیکھ کر اور اس آیت میں جزاؤہ جھنم خالدًا فیھا و غضب اللہ و لعنہ کوئی تاویل نہ کرنی چاہیے۔ قرآن و سنت میں جس فعل کو کفر کہا ہے وہ کفر کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا اور جب تک دنیا باقی ہے وہ کفر ہی ہے اور کفر ہی رہے گا۔ ہاں یہ کفر کفر عملی ہے ۔ وہ کفر اعتقادی نہیں ہے جو مخرج عن الملۃ ہوتا ہے۔ اس کا کرنے والا دیسا ہی فعل کفر کا مرتکب ہوگا جیسا تارک صلوٰۃ مسلمان جس کے کفر پر صحابہ کرام کا اتفاق تھا۔ امام ترمذی نے صحابہ کا اتفاق نقل کیا ہے الفاظ یہ ہیں :

کان اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لا یرون شیئاً من الاعمال ترکہ کفرا غیر الصلوٰۃ ۔

یہاں من الاعمال کی قید کہہ رہی ہے کہ عمل کی باتوں میں جو بات کفر ہو سکتی ہے وہ ترک صلوٰۃ سمجھی جاتی تھی لیکن بلاشبہ یہ وہ کفر نہیں ہے جو ایک مسلمان کو ملت سے نکال دیتا ہے جب تک ایک شخص اعتقاد کے اس دروازے سے پلٹ نہ جائے جس سے وہ اسلام میں داخل ہوا تھا اس وقت تک وہ اس معنے میں کافر نہیں ہو سکتا۔

اس سے یہ بات الم نشرح ہو گئی کہ مسلمان کو قتل کرنا قرآن کے نزدیک ان انتہائی معاصی میں سے ہے جو عملی کفریات کا حکم رکھتی ہیں اس لیے اس کفر کے بعد جو مسلمان کو قطعاً کافر و مرتد کر دیتا ہے اس کفر سے بڑھ کر اللہ کے نزدیک کوئی برائی نہیں ہے۔ قرآن کی اس وعید کو پڑھ کر جس دل میں رائی برابر بھی اللہ اور یوم الآخر پر ایمان ہے لرز اٹھتا ہے اگر ایک مسلمان کا ایمان بالکل مردہ ہو چکا ہے تو سارے گناہ جو زمین پر کیے جاتے ہیں اس سے سرزد ہو سکتے ہیں لیکن اس کفر کے ارتکاب کا کبھی وہ دھیان بھی نہیں کر سکتا۔

مسلمان پر ہتھیار اٹھانے کی حدیث

وہ ارشادِ نبوت جسے امام بخاری اور امام مسلم نے مختلف طریقوں سے روایت کیا ہے۔

من حمل علینا السلاح فلیس منا، یعنی جس نے مسلمانوں کے مقابلے پر ہتھیار اٹھایا وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے، قرآن کی اسی آیت سے مستنبط ہے یہ حدیث نہایت اہم ہے اور اسلام کے قواعد میں سے ایک قاعدہ ہے۔ لیس منا کے معنے ہیں 'ہم میں سے نہیں ہے'، یعنی ہم مسلمانوں میں سے نہیں ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے انداز بیان اور طرز خطاب پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ لیس منا وعید کا ایسا فقرہ ہے جو آپ ان مواقع میں بولتے تھے جہاں صریح کفر کی جگہ کفر سے بہت ہی قریب اور اسلامی زندگی سے بہت دور حالت کو ظاہر کرنا مقصود ہوتا تھا۔ عام گناہوں سے یہ حالت زیادہ سخت مگر کفر قطعی سے کم ہوتی تھی۔ جن جن احادیث میں یہ لفظ آیا ہے ان سب پر غور کیا جائے اور ایمان و کفر کے عملی مراتب کو بھی پیش نظر رکھا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجائے گی۔ نبوت نے جن کاموں کے لیے جو احکام دیے ہیں اور جو الفاظ استعمال کیے ہیں ہمیں حق نہیں ہے کہ تاویل و توجیہ کر کے ان کے لغوی مفہوم کا اصلی زور کم کرنے کی کوشش کریں۔ یہی وجہ ہے کہ ائمہ سلف نے ہمیشہ ارشادات میں ایسی تاویلوں کا انکار کیا ہے اسی حدیث کی نسبت امام نووی اور حافظ عسقلانی لکھتے ہیں کہ:

سفیان بن عینیہ اس بات کو پسند نہ کرتے تھے کہ لیس منا کی تفسیر یوں بیان کی جائے
کہ لیس علی ھدینا۔ اور اس تفسیر کے بارے میں کہتے تھے کہ کیا ہی برا قول ہے۔
مقصد یہ ہے کہ ان کی تاویل نہ کی جاتے۔ شیخ عبدالوہاب الشعرانی نے میزان الکبریٰ میں امام سفیان
ثوری کی طرف منسوب کرکے لکھا ہے کہ :

بارگاہ نبوت میں ادب یہ ہے کہ جن ارشادات کا منشا لوگوں کو ڈانٹ ڈپٹ ہے ان کو بغیر تاویل کے پیش کیا جائے۔ اگر تاویل کرو گے تو شارع کا منشا پامال ہو کر رہ جائے گا۔ جیسے یہ ارشاد من غشنا فلیس منا جو مسلمانوں سے فریب کرے گا وہ ہم سے نہیں ہے۔ اگر اس کی یہ تاویل کی جائے گی کہ اس خصلت اور اس کام میں وہ ہم سے نہیں ہے تو بدکار لوگوں کے لیے ایک قسم کی جسارت کا سامان ہو گا۔

قتل مسلم کی پہلی صورت

بہر حال قتل مسلم قرآن کی نظر میں ایک سنگین جرم ہے اس کی متعدد صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ ایک مسلمان مسلمان کو قتل کرے لیکن اس فعل کو جائز نہ سمجھے، اس کی حرمت کو مانتا ہو اور اس کے ارتکاب پر شرمندہ ہو تو اس کا حکم یہی ہے کہ یہ کفر عملی ہے مگر اس کا کرنے والا ملت سے خارج نہ ہو گا۔ دنیا میں اسلامی احکام و معاملات اس پر جاری ہوں گے۔ آخرت کا معاملہ اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

یہاں اس آیت میں قاتل مومن کی جو سزا بیان ہوئی ہے کہ اس پر اللہ کا غضب ہے، اللہ کی لعنت ہے، اس کی سزا جہنم ہے، جہنم میں اس کا ڈیرا ہے اس کے لیے اللہ کے یہاں عذاب عظیم ہے اس کی روشنی میں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قاتل مومن کی توبہ قبول ہو سکتی ہے یا نہیں؟ اس موضوع پر خود صحابہ و سلف سے اختلاف منقول ہے۔

ایک جماعت کی رائے ہے کہ سورۂ فرقان کی

والذین لا یدعون مع اللہ الٰھا اخر ولا یقتلون النفس التی حرم اللہ
الا بالحق ولا یزنون ومن یفعل ذالک یلق اثاما یضاعف لہ العذاب
یوم القیامہ و یخلد فیہ مھانا الا من تاب و آمن و عمل عملاً صالحا"
فاولئک یبدل اللہ سیاتھم حسنات۔

اور جو اللہ کے ساتھ کسی اور الٰہ کو نہیں پکارتے، اللہ کی حرام کی ہوئی کسی جان کو ناحق ہلاک نہیں کرتے اور نہ زنا کے مرتکب ہوتے ہیں۔ یہ کام جو بھی کرے گا وہ اپنے گناہ کا بدلہ پائے گا، قیامت کے روز اس کو مکرر عذاب دیا جائے گا، ہاں جو توبہ کرے، ایمان لے آئے اور اچھے کام کرے۔ یہی ہیں جن کی برائیوں کو اللہ بھلائیوں سے تبدیل کر دے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ سارے گناہوں کی طرح قتل نفس کے مرتکب کی توبہ بھی مقبول ہو سکتی ہے لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس سے بخاری و مسلم میں مروی ہے کہ جو مسلمان مسلمان کو قتل کرے اس کی توبہ مقبول نہیں ہے وہ فجزاءہ جہنم خالداً کے معنے یہی کرتے ہیں کہ لا توبہ لہ اس کی توبہ نہیں ہے۔ اور صحیح بخاری کتاب التفسیر میں سعید بن جبیر سے مروی ہے کہ ابن عباس سے الا من تاب کے بارے میں دریافت کیا گیا تو فرمایا کہ یہ آیت مکی ہے، سورۂ نساء مدنی ہے۔ اس کی آیت من یقتل مومناً نے اسے منسوخ کر دیا لہٰذا قاتل مسلم کی قبولیت توبہ کا اس سے استدلال نہیں ہو سکتا۔
صحیح مسلم کی روایت میں زیادہ تفصیل آئی ہے کہ جب سورۂ فرقان کی آیت اتری تو مشرکین مکہ نے کہا کہ ہم تو یہ سب کام کر چکے ہیں اب مسلمان ہوئے بھی تو نجات کیوں کر ملے گی؟ اس پر یہ آیت اتری الا من تاب و آمن یعنی ہاں لیکن جس نے توبہ کی اور ایمان لے آیا، اللہ اس کی برائیاں مٹا دے گا لیکن من یقتل والی آیت مشرکین کے لیے نہیں ہے مسلمانوں کے لیے اتری ہے یعنی جو شخص مسلمان ہونے کے باوجود مسلمان کو قتل کرے اس کی سزا جہنم ہے اور اس کے لیے توبہ نہیں ہے
اس میں شک نہیں کہ عبداللہ بن عباس کا مذہب کئی پہلوؤں سے طاقتور نظر آتا ہے۔
اولاً اس لیے کہ زیر تفسیر آیت کا منطوق عدم قبولیت کے لیے ظاہر و نص ہے۔ خالداً فیھا و غضب اللہ و لعنہ کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا اور منطوق مفہوم پر مقدم ہے جب تک اس کے خلاف کوئی سبب قوی موجود نہ ہو۔
ثانیاً یہ کہنا کہ سورۂ فرقان کی آیت نے اسے منسوخ کر دیا صحیح نہیں ہو سکتا کیونکہ سورۂ فرقان مکی ہے اور یہ سورت نساء مدنی ہے۔ خود ابن عباس بتاتے ہیں کہ یہ سورت نزلت فی آخر ما نزل نزول کے اعتبار سے آخری ہے اور ظاہر ہے کہ ناسخ کے لیے زمانی تقدم ضروری ہے۔
ثالثاً دونوں آیتوں میں حکم مشترک نہیں ہے۔ دونوں کا منشا الگ الگ ہے۔ نسخ اگر ہو سکتا ہے تو سلف کی اصطلاح میں ہو سکتا ہے جیسا کہ ابن عباس نے کہا یعنی عام اور خاص کا

نسخ سورۃ فرقان کی آیت میں ذکر کفار کا ہے اور حکم بھی جو دیا گیا ہے وہ انہی کفار کی نسبت ہے جو کفر سے توبہ کریں اور ایمان لے آئیں اور چونکہ الایمان یھدم ما قبلہ یعنی اسلام تمام پچھلی برائیوں کو نابود کر دیتا ہے اس لیے جب شرک سے توبہ ہو سکتی ہے تو قتل نفس سے کیوں نہیں ہو سکتی۔ قریش میں جو لوگ فتح مکہ کے بعد ایمان لائے، ان میں کون تھا جس نے خود مسلمانوں سے قتال نہیں کیا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ الا من تاب کے بعد آمن کا لفظ بھی موجود ہے۔ یعنی توبہ کی اور ایمان لایا۔ جس سے واضح ہو گیا کہ یہ توبہ اسلام لانے والے کافر کی توبہ ہے نہ کہ مومن کی توبہ معصیت بعد از اسلام۔

غرض کہ اس مذہب کی قوت میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن عام طور پر علماء نے دوسرے مذہب کو اختیار کیا یعنی قبولیت توبہ کو۔ وہ فرماتے ہیں کہ قاتل مومن کا معاملہ بڑا ہی سخت ہے لیکن توبہ قبول ہو سکتی ہے اللہ کے ہاتھ میں ہے چاہے بخش دے چاہے نہ بخشے۔ اس میں شک نہیں کہ احتیاط تو اُمید ہی میں ہے نہ کہ یاس و قنوط کے پیام میں یا عبادی الذین اسرفوا علی انفسھم لا تقنطوا من رحمۃ اللہ کے حکم کا عموم بڑا ہی اُمید افزا ہے اور اگر اس پر نظر ڈالی جائے تو کوئی شک نہیں کہ جمہور کا مذہب ہی محتاط معلوم ہوتا ہے۔ موضوع کے تمام پہلوؤں پر یہاں بحث کی گنجائش نہیں ہے۔

قتل مومن کی دوسری صورت

قتل مومن کی دوسری صورت یہ ہے کہ اس فعل کو حلال سمجھے اور اس پر نادم و متاسف نہ ہو۔ مثلاً کوئی مسلمان فوج ہو، وہ یہ سمجھے کہ لڑائی لڑنا تو ہمارا کام ہے مسلمان سامنے ہوں گے تو انہی سے لڑیں گے یعنی مسلمانوں پر تلوار اٹھانا کوئی گناہ کی بات نہیں ہے۔ یا یوں سمجھیں کہ ہمارے مالکوں کا حکم یہی ہے ہم نے ان کا نمک کھایا ہے اس لیے ہمیں ایسا ہی کرنا چاہیے یعنی اگر کوئی نمک کھلا کر حکم دے کہ مسلمانوں کو قتل کر دو تو قتل کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے تو اس صورت میں تمام اُمت کا اجماعی فیصلہ یہ ہے کہ وہ شخص قطعاً اور حتماً کافر ہے یعنی اس کفر کا مرتکب ہوا ہے جو ملت سے خارج کر دیتا ہے۔ اس کا حکم شرعاً وہی ہوگا جو تمام کفار و مشرکین کا ہوتا ہے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں کہ اس کو مسلمان سمجھے اور اس سلوک کا حقدار کہے جو مسلمانوں کو مسلمانوں کے ساتھ کرنا چاہیے یہ حکم خاص مسئلہ پر ہی موقوف نہیں ہے بلکہ ہر محلل حرام غیر ماول کے لیے یہی حکم ہے۔

قتلِ مومن کی تیسری صورت

قتل مومن کی تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی مسلمان کافروں کے ساتھ ہو کر ان کی فتح و نصرت کے لیے مسلمانوں سے لڑے یا لڑائی میں ان کی اعانت کرے اور جب مسلمانوں اور غیر مسلموں میں جنگ ہو رہی ہو تو وہ غیر مسلموں کا ساتھ دے یہ صورت اس جرم کے کفر و عدوان کی انتہائی صورت ہے اور ایمان کی موت اور اسلام کے نابود ہو جانے کی ایک ایسی اشد حالت ہے جس سے زیادہ کفر و کافری کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔ دُنیا کے وہ سارے گناہ، ساری معصیتیں، ساری ناپاکیاں، ہر طرح اور ہر قسم کی نافرمانیاں جو مسلمان جسم دُنیا میں کر سکتا ہے یا ان کا وقوع دھیان میں آ سکتا ہے سب اس کے آگے ہیچ ہیں جو مسلمان اس کا مرتکب ہو وہ قطعاً کافر ہے اور بدترین قسم کا کافر، اس کی حالت کو قتل مسلم کی پہلی صورت پر قیاس کرنا درست نہ ہوگا۔ اس نے صرف قتل مسلم ہی نہیں کیا ہے بلکہ اسلام کے برخلاف دشمنانِ اسلام کی اعانت و نصرت کی ہے اور بالاجماع اور بالاتفاق کفر صریح اور مخرج عن الملت ہے۔ جب قرآن ایسی صورت میں غیر مسلموں کے ساتھ کسی طرح کا علاقہ محبت رکھنا بھی جائز نہیں رکھتا تو پھر صریح اعانت فی الحرب اور اہل ایمان کے خلاف تلوار اٹھانے کے بعد کیوں کر ایمان و اسلام باقی رہ سکتا ہے [1]

---

[1] مسئلہ خلافت

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ إِذَا ضَرَبۡتُمۡ فِي سَبِيلِ ٱللَّهِ فَتَبَيَّنُواْ وَلَا تَقُولُواْ
لِمَنۡ أَلۡقَىٰٓ إِلَيۡكُمُ ٱلسَّلَٰمَ لَسۡتَ مُؤۡمِنٗا تَبۡتَغُونَ عَرَضَ ٱلۡحَيَوٰةِ
ٱلدُّنۡيَا فَعِندَ ٱللَّهِ مَغَانِمُ كَثِيرَةٞۚ كَذَٰلِكَ كُنتُم مِّن قَبۡلُ فَمَنَّ
ٱللَّهُ عَلَيۡكُمۡ فَتَبَيَّنُوٓاْۚ إِنَّ ٱللَّهَ كَانَ بِمَا تَعۡمَلُونَ خَبِيرٗا ﴿٩٤﴾

مسلمانو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کرو تو تمہیں اچھی طرح چھان بین کر لینی چاہیے جو کوئی تمہیں سلام کرے تو یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو کیا تم دنیا کے سروسامان زندگی کے طلب گار بنتے ہو، اگر ایسا ہے تو اللہ کے پاس بہت غنیمتیں موجود ہیں[۱۴۷] ۔ تمہاری حالت بھی تو پہلے ایسی ہی تھی پھر اللہ نے تم پر احسان کیا لہٰذا تم لوگوں کے حال کی تحقیق کر لیا کرو[۱۴۸] ، تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔[۱۴۹]

غیر ملکی مسلمانوں کے تحفظ کی تلقین

ابتدائے اسلام میں اسلام علیکم کا لفظ اسلامی زندگی کے لیے شعار اور علامت کی حیثیت رکھتا تھا اور ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو دیکھ کر یہ لفظ اس معنے میں استعمال کرتا تھا کہ میں تمہارے ہی گروہ کا آدمی ہوں، دوست اور خیر خواہ ہوں۔ میرے پاس تمہارے لیے سلامتی و عافیت کے سوا کچھ نہیں ہے۔ لہٰذا تم نہ مجھ سے دشمنی کرو اور نہ میری طرف سے عداوت اور ضرر کا اندیشہ رکھو جس طرح فوج میں ایک لفظ شعار کے طور پر مقرر کیا جاتا ہے اور رات کے وقت ایک فوج کے آدمی ایک دوسرے کے پاس سے گزرتے ہوئے اسے اس غرض کے لیے استعمال کرتے ہیں کہ مخالف فوج کے آدمیوں سے ممتاز ہوں۔ اسی طرح اسلام کا لفظ بھی مسلمانوں میں شعار کے طور پر مقرر کیا گیا تھا خصوصیت کے ساتھ اس زمانہ میں اس شعار کی اہمیت اس وجہ سے اور بھی زیادہ تھی کہ اس وقت عرب کے نو مسلموں اور کافروں کے درمیان لباس زبان اور کسی دوسری چیز میں کوئی نمایاں امتیاز نہ تھا جس کی وجہ سے ایک مسلمان سرسری نظر میں دوسرے مسلمان کو پہچان سکتا ہو لیکن لڑائیوں کے موقع پر ایک پیچیدگی یہ پیش آتی تھی کہ مسلمان جب کسی دشمن گروہ پر حملہ کرتے اور وہاں کوئی مسلمان اس لپیٹ میں آجاتا تو وہ حملہ آور مسلمانوں کو یہ بتانے کے لیے کہ وہ بھی ان کا دینی بھائی ہے اسلام علیکم یا لاالہ الا اللہ کہتا مگر مسلمانوں کو اس پر شبہ ہوتا کہ یہ کوئی کافر ہے جو محض جان بچانے کے لیے حیلہ کر رہا ہے اس لیے بسا اوقات وہ اسے قتل کر ڈالتے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہر موقع پر نہایت سختی کے ساتھ سرزنش فرمائی مگر اس قسم کے واقعات برابر پیش آتے رہے۔ آخر کار اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں اس پیچیدگی کو حل کیا۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان کہے اس کے متعلق تمہیں سرسری طور پر یہ فیصلہ کر دینے کا حق نہیں ہے کہ وہ محض جان بچانے کے لیے جھوٹ بول رہا ہے ہو سکتا ہے کہ وہ سچا ہو اور ہو سکتا ہے کہ وہ جھوٹا ہو۔ حقیقت تو تحقیق ہی سے معلوم ہو سکتی ہے۔ تحقیق کے بغیر چھوڑ دینے میں اگر یہ امکان ہے کہ ایک کافر جھوٹ بول کر جان بچا لے جائے تو قتل کر دینے میں اس کا بھی امکان ہے کہ ایک مومن بے گناہ تمہارے ہاتھ سے مارا جائے۔ بہرحال تمہارا ایک کافر کو چھوڑ دینے میں غلطی کرنا اس سے بدرجہا بہتر ہے کہ تم ایک مومن کو قتل کرنے میں غلطی کرو۔

۱۴۷۔ مسلمانو! جب تم اللہ کی راہ میں سفر کرو تو تمہیں اچھی طرح چھان بین کر لینی چاہیے اور جو کوئی تمہیں سلام کرے یہ نہ کہو کہ تم مومن نہیں ہو۔ تم دنیا کے سرو سامان زندگی کے طلب گار

بنتے ہو اگر ایسا ہے تو اللہ کے پاس بہت غنیمتیں موجود ہیں حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک فوج کو ایک قوم پر جہاد کے لیے روانہ کیا۔ اس قوم میں ایک شخص مسلمان تھا جو اپنا مال واسباب اور مواشی ان میں سے نکال کر الگ کھڑا ہو گیا۔ اس نے مسلمانوں کو دیکھ کر السلام علیکم کہا۔ مسلمانوں نے یہ سمجھا کہ یہ بھی کافر ہے اپنی جان اور مال بچانے کے لیے اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتا ہے اس لیے اس کو مار ڈالا اور اس کے مواشی اور اسباب سب لے لیا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو تنبیہہ اور تاکید کی گئی کہ جب تم جہاد کے لیے سفر کرو تو تحقیق سے کام لو بے سوچے سمجھے کام مت کرو، جو تمہارے سامنے اسلام ظاہر کرے اس کے مسلمان ہونے کا ہرگز انکار نہ کرو، اللہ کے پاس بہت کچھ غنیمتیں ہیں ایسے حقیر سامان پر نظر نہ کرنی چاہیے [1]

شیخ الاسلام نے جو واقعہ پس منظر کے طور پر پیش فرمایا ہے وہ سنن ترمذی میں ہے۔ صرف یہی نہیں اور بھی بہت سے واقعات ہیں جن کو شارحین قرآن نے اس آیت کے تحت پس منظر کے طور پر پیش کیا ہے۔ ایک واقعہ بخاری نے مختصراً اور بزار نے بھی مفصلاً نقل کیا ہے۔ پس منظر خواہ کچھ ہو آیت میں مسلمانوں کو یہ قانونی ہدایت ہو رہی ہے کہ جب تم وطن سے باہر جہاد میں ہوں تو چھان بین کیے بغیر محض شک وشبہ کی بنا پر قتل میں جلد بازی نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ کافر کے خیال میں کسی مسلمان کو قتل کر دو۔ امام رازی نے یہ بات بر محل لکھی ہے کہ آیت کا منشا یہ ہے کہ مومن کے قتل سے قطعاً بچ کر رہو۔ تحقیق واحتیاط ہر حال میں واجب ہے۔ سفر جہاد کی قید صرف اس لیے ہے کہ آیت قرآنی کے نازل ہونے سے پہلے سفرِ جہاد میں ایسے واقعات پیش آچکے تھے۔ چنانچہ صحیح بخاری اور مسلم میں حضرت اسامہ کی روایت ہے کہ ان کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بنو الحرقہ کی طرف ایک فوجی مہم کے لیے روانہ کیا۔ لڑائی میں اسامہ نے ایک آدمی پر حملہ کیا ساتھ ہی ایک انصاری حملہ آور ہوا۔ اسامہ کہتے ہیں کہ جب میری تلوار اس کی گردن پر چمکی تو وہ پکار اٹھا لا الٰہ الا اللہ میں نے کچھ پروا نہ کی اور قتل کر ڈالا لیکن کلمہ کی صدا سن کر انصاری نے تلوار روک لی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب یہ حال معلوم ہوا تو نہایت ناراض وغمگین ہوئے اور فرمایا اقتلته، بعد ما قال لا اله الا الله تو نے اسے قتل کر دیا باوجودیکہ وہ لا الٰہ الا اللہ کہہ چکا تھا، میں نے عرض کیا انما كان متعوذا وہ تو محض اس نے میری تلوار سے بچنے کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لیے کہا تھا، فی الواقع مسلمان نہ ہوا تھا لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم برابر یہی جملہ دہراتے رہے کہ تو نے باوجود لاالہٰ الااللہ کہنے کے قتل کر ڈالا، یہاں تک کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا حزن و ملال اور اس واقعہ کا تاثر دیکھ کر مجھے اس قدر ندامت ہوئی کہ میرے دل نے کہا کاش آج کے دن سے پہلے میں مسلمان نہ ہوا ہوتا۔ ایک روایت میں ہے کہ حضور انور نے اسامہ سے کہا کہ تو نے اس کا دل چیر کر کیوں نہ دیکھ لیا کہ واقعی دل سے اقرار کیا ہے یا نہیں یعنی جب زبان سے یہ کلمہ نکلا تو اس کا احترام واجب ہو گیا خواہ تلوار کے ڈر سے کہا ہو یا سچ مچ دل سے اقرار کیا ہو۔ دل کا حال صرف اللہ کو معلوم ہے۔ یہی واقعہ صحیح مسلم میں جندب بن عبداللہ کی روایت سے بھی مروی ہے اور اس میں کچھ اضافہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسامہ سے کہا قیامت کے دن جب یہ شخص لاالہٰ الا اللہ کے ساتھ تیرے سامنے آئے گا تو اس وقت تو کیا کرے گا؟ یعنی اللہ سبحانہٗ کو کیا جواب دے گا، اسامہ نے عرض کیا یا رسول اللہ آپ میرے لیے دعا کیجئے لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہی کہتے رہے کہ قیامت کے دن جب لاالہٰ الا اللہ کا دعویٰ ہو گا تو تم کیا جواب دو گے؟ اور اس جملے کے سوا کوئی بات نہ فرمائی۔

صحیح بخاری میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے حضرت مقداد بن عمرو الکندی نے دریافت کیا کہ اگر ایسا ہو کہ ایک کافر سے مقابلہ ہو اور وہ تلوار میرے ہاتھ پر اس طرح مارے کہ ہاتھ کٹ جائے پھر الگ ہو کر کہے کہ میں اللہ پر ایمان لے آیا تو یہ کہنے کے بعد اسے قتل کر دوں یا نہ کروں فرمایا لا تقتلہٗ مت قتل کرو۔ حضرت مقداد نے کہا اس نے تو میرا ہاتھ کاٹ ڈالا ہے اور اس کے بعد اسلام لانے کا اقرار کیا پھر کیوں نہ اس سے بدلہ لے لوں۔ فرمایا جو کچھ بھی ہوا ہو لیکن جب کلمہ توحید کا اقرار کر لیا تو پھر قتل نہ کرو۔ اقرار کرنے سے پہلے وہ کافر تھا اور تو مسلمان۔ لیکن اگر تو نے اقرار کے بعد اسے قتل کر دیا تو وہ تیری جگہ ہو جائے گا اور تو اس کی جگہ۔ یہ واقعات تشریح و تفسیر ہیں لا تقولوا لمن القی الیکم السلام لست مومنا کی۔ اصل یہ ہے کہ اسلامی جنگ کا مقصود فتوحات حاصل کرنا اور مال غنیمت جمع کرنا نہ تھا بلکہ اصل مقصد جیسا کہ واضح طور پر پہلے بیان ہو چکا ہے اللہ کا کلمہ بلند کرنا اور مظلوم مسلمانوں کو کفار کے پنجۂ استبداد سے چھڑانا تھا۔ جب اصل مقصد یہ تھا تو اس کے لیے ہر خطرہ گوارا کیا جا سکتا تھا لیکن یہ بات کیسی گوارا کی جا سکتی تھی کہ کسی مسلمان کی جان خطرے میں پڑے۔ غور کرو جب قرآن میدان جنگ میں ایک مشرک دشمن کا کلمہ پڑھ کر جنگ کی حالت میں قتل ہو جانا گوارا نہیں کرتا تو پھر ان مسلمانوں کو

قتل کرنے کی کب اجازت دے سکتا ہے جن کی ساری زندگیاں اسلام و ایمان میں بسر ہوتی ہیں۔ اللہ اکبر یہ حقیقت کتنی بلند ہے جس کا اظہار قرآن کر رہا ہے۔ قرآن کہہ رہا ہے کہ حملہ آور لڑائی کے گھمسان میں اگر جان بچانے کے لیے بھی کلمہ پڑھ لے تو اسے قتل نہ کرو۔

ایمان میں زبانی اقرار کی حیثیت

دنیا میں ایک بڑے سے بڑا انسان خواہ اخلاق کے کتنے ہی بلند مقام پر ہو کبھی اپنے حریف پر اعتماد نہیں کر سکتا اور پھر میدان جنگ میں تو ایسا ممکن ہی نہیں۔ یہ قرآن ہے جو دعوت دے رہا ہے کہ تم اپنے مدِمقابل اور حریف کی زبان پر بھی اعتماد کر لو اور اس تشویش میں نہ پڑو کہ ان کے دلوں میں کیا ہے۔ قرآن اخلاق عالیہ کا اولین معلم ہے وہ کسی کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ اپنے جیسے ایک شخص کو بلاوجہ جھوٹا قرار دے یا اس کے متعلق کسی اندرونی کمزوری کی بنا پر اپنے ضمیر کے خلاف بولنے کا تصور لائے وہ اگر جھوٹ کہہ رہا ہے لاالٰہ الا اللہ۔ تو تم یہ مت کہو کہ تو مسلمان نہیں ہے یہاں حافظ ابن تیمیہ کتاب الایمان میں یہ بات خوب لکھ گئے کہ:

> اسلام کے ثبوت کا دارومدار کسی ایسی ہی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم سب کو یکساں طور پر ہو سکے۔ اگر خدا کے رسول کے علم پر اس کا فیصلہ چھوڑ دیا جاتا تو یقیناً منافقین کا گروہ کفار میں شمار ہوتا اب اگر ان کو قتل کیا جاتا تو ان کو ناحق یہ بدنام کرنے کا موقعہ مل جاتا کہ آپ اپنے ہمنواؤں کو بھی قتل کر دیتے ہیں۔ اس لیے کلمہ توحید کا زبانی اقرار ہی اسلام کے قبول کرنے کا معیار قرار دے دیا گیا اور اسی ایک کلمہ پر جنگ کے آغاز و خاتمہ کا دارومدار رکھ دیا گیا۔ (کتاب الایمان)

فقہاء کی اصطلاح میں اسی کو اقرار باللسان کہتے ہیں۔ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے کہ اسلام میں اقرار کی حیثیت کیا ہے؟ ایک جماعت رکن کہتی ہے دوسری جماعت شرط کہتی ہے۔ رکن ہو یا شرط یہ تو فالتو سی موشگافیاں ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ فقہاء نے ایمان کی تعریف میں اقرار کا اضافہ اس لیے کیا ہے کہ جو تصدیق قلبی، زبانی انکار کے ساتھ ہو وہ ایمان کی تعریف میں داخل نہ ہے اور یہ سمجھا ہے کہ جب زبان کے لیے اقرار کرنا لازم ہو جائے گا تو اب انکار کی کوئی گنجائش ہی نہیں ہو گی۔ حافظ ابن تیمیہ نے اس بات کو اس طرح سمجھایا ہے کہ جب تک اقرار نہ ہو ہمارے پاس اس کا ثبوت کیا ہے کہ اس کے قلب میں حقیقتہً تصدیق موجود ہے لہٰذا اگر ایک شخص مطالبہ کے

باوجود بھی اقرار نہیں کرتا تو ہم اسی پر محمول کریں گے کہ اسے تصدیق قلبی حاصل نہیں ہے اس لیے نہایت ضروری ہے کہ اقرار باللسان کو ایمان کا جزء قرار دیا جائے۔

بہر حال اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ جس طرح اسلام پر جبر و اکراہ کرنا صحیح نہیں ہے اسی طرح کسی کے اسلام میں بلا وجہ شک و شبہ پیدا کرنا بھی صحیح نہیں ہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ تم مسلمان ہونے پر کسی کو مجبور نہ کرو لیکن اگر کوئی شخص از خود مسلمان ہوتا ہے تو بے وجہ اس کے اسلام کو شک کی نظر سے بھی نہ دیکھو گویا اسلام کے معاملہ میں کسی پہلو سے بھی قرآن نے تشدد پسند نہیں کیا۔ کوئی اسلام لاتا ہے تو بسر و چشم اسے قبول کر لو اور نہیں لاتا تو اس کی مرضی پر چھوڑ دو۔ کیا اس سے بڑھ کر آزادیٔ رائے کا کوئی مفہوم ہو سکتا ہے۔

مالِ غنیمت کا حصول مقصدِ جہاد نہیں

آیت میں تبتغون عرض الحیاۃ الدنیا میں اشارہ کر دیا کہ تمہاری محنتوں اور کوششوں کا پیشِ نہاد سرمایہ کی فراہمی نہیں ہے۔ تمہیں سامان دنیا کے طالب کی حیثیت سے میدان جہاد میں نہ آنا چاہیے بلکہ طالب رضائے خداوندی بن کر اس میدان میں جانا چاہیے۔ تمہاری تقدیریں نبوت کے علم و عمل کے اپنانے، اس کے جھنڈے تلے جمع ہونے، ان کی سیرت کی کاپی کرنے سے وابستہ ہیں۔ سرمایہ و دولت تمہاری مشکلات کا حل نہیں ہے۔ عرب جاہلیت میں دستور تھا کہ لڑائی میں جو مال جس کے ہاتھ آئے وہ اسی کا ہے۔ رومیوں میں بھی ایسا ہی دستور تھا۔ اور آج کل بھی یورپ کی تمام قوموں میں ایسا ہی قانون رائج ہے۔ جس شہر یا قلعہ کو فوج حملہ کر کے فتح کر لیتی ہے ایک خاص وقت تک لوٹنے کا اسے حق ہوتا ہے چنانچہ ہندوستان میں انگریزی فوج نے سرنگاپٹم، بھرت پور اور حیدرآباد (سندھ) کو بے دریغ لوٹا اور ۱۸۵۷ء میں جب دہلی فتح ہوئی تو سات دن تک فوجیوں کو لوٹ مار کی اجازت دے دی گئی تھی لیکن قرآن نے یہ حکم دے کر کہ مال غنیمت جو کچھ بھی ہاتھ آئے سرکار کا ہے نہ کہ لوٹنے والوں کا، سپاہیوں کی ذاتی طمع و حرص کے ابھرنے کی راہ روک دی۔ اس آیت میں بھی اس پر متنبہ کیا ہے کہ مال غنیمت تمہارا سطح نظر نہیں، تمہیں تو خدا کے پاس اجر و ثواب کے غنائم پر نظر رکھنی چاہیے جس کے اللہ کے پاس بڑے ذخیرے ہیں۔

صحابہ کرام کی ایمانی تربیت

۹۴ ا۔ تمہاری حالت بھی تو پہلے ایسی ہی تھی پھر اللہ نے تم پر احسان کیا لہٰذا تم لوگوں کے حال کی تحقیق کر لیا کرو۔ تم ایسے ہی تھے اس سے پہلے دنیا کی غرض سے ناحق خون کیا کرتے تھے لیکن اب مسلمان ہو کر ہرگز ایسا نہ کرنا چاہیے بلکہ جس پر مسلمان ہونے کا احتمال بھی ہو تو اس سے بچو یا یہ مطلب ہے کہ اس سے پہلے شروع اسلام میں تم بھی کافروں کے شہر میں رہتے تھے۔ تمہاری مستقل حکومت اور مستقل بود و باش نہ تھی تو جیسا اس حالت میں تمہارا اسلام معتبر سمجھا گیا اور تمہارے جان و مال کی حفاظت کی گئی ایسا ہی اب تم کو بھی اس طرح کے مسلمانوں کی حفاظت لازم ہے، بلا تحقیق ان کو قتل نہ کرو۔ احتیاط و غور سے کام کرنا چاہیے[1] مطلب یہ ہے کہ ایک وقت تم پر بھی ایسا گزر چکا ہے کہ انفرادی طور پر مختلف کافر قبیلوں میں منتشر تھے اپنے اسلام کو ظلم و ستم کے خوف سے چھپانے پر مجبور تھے اور تمہارے پاس ایمان کے زبانی اقرار کے سوا اپنے ایمان کا کوئی ثبوت نہ تھا اب یہ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے تم کو اجتماعی زندگی عطا کی اور تم اس قابل ہوئے کہ کفار کے مقابلے میں اسلام کا جھنڈا بلند کرنے اٹھے ہو۔ اس احسان کا یہ کوئی شکریہ نہیں ہے کہ جو مسلمان ابھی پہلی حالت میں ہیں ان کے ساتھ تم نرمی اور رعایت سے کام نہ لو[2]

بتایا یہ جا رہا ہے کہ تم روزِ اوّل سے ایسے نہ تھے ایک وقت تھا جب قریش کی طاقت مقابلہ پر تھی اور تمام ملک میں تمہارے خلاف آگ لگا دی تھی اور اسلام کا راستہ روک کر کھڑے ہو گئے تھے اس وقت اسلام کو اپنانا اور نبوت پر ایمان لانا اسی کا کام تھا جو موت سے نہ ڈرتا ہو جو اپنے عقیدے اور یقین کے لیے آگ میں کودنے اور انگاروں میں لوٹنے کے لیے تیار ہو، جو دنیا کی تمام ترغیبات سے منہ موڑ چکا ہو، یہ اللہ کا احسان تھا کہ اس نے تمہیں ایمان کے میدان میں قدم بڑھانے کی توفیق دی اور تم نے لا الٰہ الا اللہ کا آوازہ قبول کیا۔ قرآن کی غذا تم کو ملی ایمان کے ذریعے تمہاری تربیت ہوئی دوسروں کو بھی اپنے اوپر قیاس کر لو اور کسی پر ہاتھ ڈالنے سے پہلے خوب حقیقت حال معلوم کر لو۔ گویا یہ کہہ کر قرآن نے مومن کی جان کے احترام کی آخری حد بتا دی کہ عین میدان جنگ میں بھی اگر کوئی اظہارِ اسلام کرے تو مسلمان کے لیے جائز نہیں ہے کہ اس کے خلاف تلوار اٹھائے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

صحابہ کرام کے ایمان و عمل کی نگرانی

۱۴۹۔ سو تم جو کچھ کرتے ہو اللہ اس سے باخبر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ تمہارے ظاہر اعمال اور دلی اغراض سب پر مطلع ہے تو اب جس کو قتل کرو محض اللہ کے حکم کے موافق قتل کرو اپنی کسی غرض کا اصلاً دخل نہ ہو اور یہ بھی مقصد ہے کہ اگر کوئی کافر فقط اپنی جان و مال کے خوف سے تمہارے روبرو اسلام ظاہر کرے اور دھوکا دے کر اپنی جان بچالے تو اللہ تعالیٰ کو سب کچھ معلوم ہے اس کے عذاب سے نہیں بچ سکتا مگر تم اس کو کچھ مت کہو یہ تمہارے کرنے کی بات نہیں ہے ہم دیکھ لیں گے۔ [1]

یہ دراصل اولین مسلمانوں کی ایمانی تربیت کی منزلیں تھیں۔ ان ہی منزلوں سے گزر کر ان کے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ نادان سمجھتے ہیں کہ یہ ان کو غنیمت کے موضوع پر ڈانٹ ڈپٹ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں صحابہ کرام کی ایمانی تربیت و تکمیل کا سلسلہ جاری رہا۔ قرآن برابر ان کے قلوب کو طاقت اور گرمی بخشتا رہا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس سے ان کو استحکام، خواہشات نفس پر قابو، رضائے الٰہی کی سچی طلب اور اس کی راہ میں اپنے کو مٹانے کی عادت، جنت سے عشق، علم کی حرص، دین کی سمجھ اور احتساب نفس کی ساری کروٹوں کی اللہ سبحانہٗ نگرانی فرمارہے تھے۔ اس نگرانی کا نتیجہ ہے کہ ان لوگوں کی نفسیات عجیب طرح تبدیل ہو گئیں جب بھی کوئی شخص لا الٰہ الا اللہ پر ایمان لاتا اس کی زندگی میں عظیم الشان انقلاب رونما ہوتا۔ ایمان اس میں پیوست ہو جاتا، یقین رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتا اور اس کے جسم میں خون و روح کی طرح دوڑ جاتا۔ جاہلیت کے جراثیم کو ختم کر دیتا اور اس کی جڑوں کو کھاڑ دیتا، دل و دماغ اس کے فیضان سے معمور ہو جاتے۔ یہ ایمان ایک کامیاب نگرانی اور نفسیاتی تربیت تھی جو طالب علم کو اعلیٰ درجہ کی قوت ارادی، محاسبۂ نفس اور خود اپنے ساتھ انصاف کی قوت عطا کرتی۔ تاریخ میں کسی دوسری طاقت کا سراغ نہیں ملتا۔ جو نفس کی ترغیبات اور اخلاقی لغزشوں پر اس کامیابی کے ساتھ فتح حاصل کر لیتی ہو۔

اگر کسی وقت کوئی چوک ہو جاتی اور کوئی غلطی سرزد ہو جاتی اور یہ چاہے میدان جنگ ہی ہوتا تو بھی ایمان سراپا سوال بن کر دربار نبوت میں ہوتا کہ حضرت اسامہ کے واقعہ میں پڑھ چکے ہو۔ دل کی پیاس چین نہ لیتی، پریشان کن خیالات کا سیلاب امنڈ کر آجاتا۔ ہمارے سامنے مورخین نے

[1] افادات شیخ الاسلام

اسلامی تاریخ کے ایسے عجیب و غریب واقعات پیش کیے ہیں جن کی نظیر اسلامی تاریخ کے علاوہ کہیں نہیں ملتی۔ یہ سب کچھ اس الٰہی نگرانی کا نتیجہ تھا جس کا قرآن نے ان اللہ کان بما تعملون خبیراً سے اعلان کیا ہے۔

لَا یَسْتَوِی الْقٰعِدُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِیْنَ غَیْرُ اُولِی الضَّرَرِ
وَالْمُجٰهِدُوْنَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ فَضَّلَ اللّٰهُ
الْمُجٰهِدِیْنَ بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ عَلَى الْقٰعِدِیْنَ دَرَجَةً ؕ
وَكُلًّا وَّعَدَ اللّٰهُ الْحُسْنٰی ؕ وَفَضَّلَ اللّٰهُ الْمُجٰهِدِیْنَ عَلَى الْقٰعِدِیْنَ
اَجْرًا عَظِیْمًا ۝ دَرَجٰتٍ مِّنْهُ وَمَغْفِرَةً وَّرَحْمَةً ؕ وَكَانَ اللّٰهُ
غَفُوْرًا رَّحِیْمًا ۝　ع ۱۳

اہل ایمان میں سے وہ لوگ جو کسی عذر کے بغیر جہاد کی سرگرمیوں
میں حصہ نہیں لیتے، اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال کی
بازی لگاتے ہیں یکساں اور برابر نہیں ہیں۔[150] اللہ نے بیٹھنے
والوں کے مقابلے میں جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا
درجہ بڑھایا ہے اور وعدہ اللہ نے سب سے بھلائی کا کیا ہے۔[151]
لیکن اللہ نے مجاہدین کو بیٹھنے والوں کے مقابلے میں اجرِ عظیم

میں بزرگی دی ہے یعنی ان کے لیے اللہ کی جانب سے بڑے درجے ہیں اور رحمت ہے اور اللہ بڑا معاف کرنے والا مہربان ہے۔[152]

فریضۂ جہاد اسلامی زندگی کی جان ہے

یوں تو ہر مذہب انسانی زندگی کو ایک مخصوص اخلاقی سانچہ میں ڈھالتا ہے اور افرادِ انسانی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنا اخلاقی رویہ تبدیل کریں لیکن قرآن اس بارے میں دیگر ادیان پر نمایاں فوقیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے کردار و عمل کی اس تبدیلی کا دائرہ جس کا مطالبہ ہر دین میں موجود ہے انسان کی خانگی، عائلی اور معاشرتی زندگی کے محدود دائرے سے وسیع کر کے ساری انسانی زندگی پر محیط کر دیا۔ نیز اس نے اخلاق اور نیک عملی کے اصولوں اور مذہبی اقدار و غایات کو انسان کی حیاتِ اجتماعی پر بھی پھیلا دیا جس میں اس کی سیاسی اور معاشی زندگی بھی شامل ہے۔ حالانکہ دوسرے مذاہب نے نیکی اور حسنِ عمل کا صرف انفرادی اور معاشرتی تصور پیش کیا ہے اور اخلاقی اصولوں کو زیادہ سے زیادہ سماجی اور عائلی زندگی تک وسعت حاصل کرنے کا موقع دیا۔ اس کے برعکس اسلام اپنے پیروؤں سے صرف خدا کی ذات و صفات کے اقرار کا مطالبہ نہیں کرتا ہے بلکہ انہیں عالم انسانیت کی اجتماعی فلاح و صلاح کا ذمہ دار بھی قرار دیتا ہے اور ان سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنی اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے ہیئتِ اجتماعی میں وہ بنیادی تبدیلیاں عمل میں لائیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے اقرار میں صادق ہیں، جس حد تک انسان اپنی انفرادی، عائلی اور اجتماعی زندگی میں یہ تبدیلیاں پیدا کرنے سے قاصر رہتا ہے اسی حد تک اس کا ایمان ناقص رہتا ہے۔ غرض کہ اسلام صرف ایک طرزِ فکر نہیں ہے جو انسان کی اجتماعی فلاح اور اس کے نظامِ اجتماعی کے صلاح و فساد سے بالکل بے تعلق ہو بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک محسوس طریقِ عمل ہے جس کے مطابق انسان اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی ماحول کو بدلتا ہے۔ اس انقلاب و تبدیلی کی کوشش کو قرآن

کی زبان میں جہاد سے تعبیر کیا جاتا ہے اور جہاد اسلامی زندگی کا اصل اصول اور ایمان کا حقیقی جوہر ہے۔ اگر فریضۂ جہاد کو اسلامی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو پھر اسلام بھی کائنات کا ایک بے جان فلسفہ رہ جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم ایمان والوں کی ایک ضروری یہ صفت قرار دیتا ہے کہ وہ راہِ خدا میں جان و مال سے جہاد کرتے ہیں۔ اسلام میں نجات کا استحقاق گوشہ گیری، رہبانیت، مراقبہ، رہبان، اور الٰہیات کے فلسفیانہ خیال آرائی پر موقوف نہیں بلکہ خدا کی توحید، رسولوں اور کتابوں اور فرشتوں کی سچائی اور جزا و سزا کے اعتقاد کے ساتھ ان کے مطابق عمل خیر اور نیک کرداری کی جدوجہد پر مبنی ہے۔ اسی لیے اس آیت میں جہاد کا مقابل لفظ قعود استعمال کیا گیا ہے جس سے مقصود سستی تغافل اور ترکِ فرض ہے۔

۱۵۰۔ اہلِ ایمان میں سے وہ لوگ جو کسی عذر کے بغیر جہاد کی سرگرمیوں میں حصہ نہیں لیتے اور وہ جو اللہ کی راہ میں جان و مال کی بازی لگاتے ہیں برابر اور یکساں نہیں ہیں۔ اس آیت میں غیر اولی الضرر کے لفظی معنے ہیں وہ جو تکلیف والے نہ ہوں یعنی معذور نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ بغیر عذر جہاد میں شریک نہ ہونے والے مسلمان اجر و ثواب میں ان مسلمانوں کے ہم پلہ اور برابر نہیں ہو سکتے جو جہاد میں شریک ہیں۔ اس آیت میں تمام غیر معذور اہلِ ایمان کو جہاد کی ترغیب دی جا رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جن مسلمانوں کے پاس کوئی عذر نہیں ہے پھر بھی اگر وہ جہاد کے لیے نہیں اٹھ رہے ہیں تو انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ وہ خدا کے یہاں اجر کے لحاظ سے ان کے برابر نہ ہوں گے جو آج خدا کی راہ میں جان و مال دونوں سے جہاد کر رہے ہیں۔ سمجھایا جا رہا ہے کہ جس دعوت کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آتے ہیں اور جس پر زندگی استوار کرنے کا کام سے مطالبہ ہو رہا ہے وہ ایک جاندار انقلاب انگیز اور متحرک نظامِ فکر و عمل ہے جس کا خمیر عشق کی ولولہ انگیزیوں اور جنون نوازیوں سے تیار ہوا ہے جس میں ایثار و قربانی اور سرفروشیوں کی ضرورت ہے اور جس میں محض افراد کی شخصی نجات کا نہیں بلکہ عالمِ انسانیت کا تصور کارفرما ہے۔ تم ایک نظامِ تمدن اور عالمگیر مقصد کے داعی ہو ایک عالمگیر نصب العین کے نمائندے ہو اور ایک جہانی اور عالمگیر مقصد کے علمبردار ہو۔ جہاد فی سبیل اللہ تمہارے اخلاص و اتقا کا پیمانہ ہے اور خدا کے اجر کی تقسیم اسی پیمانہ سے ہو گی۔ اگرچہ آیت میں جہاد سے مراد سیاق قرآنی کے قرینہ کی وجہ سے یہاں قتال ہی ہے لیکن جہاد کا مقابلہ قعود سے کر کے اشارہ کر دیا کہ جہاد اور قتال دونوں الگ الگ ہیں ان دونوں کے ایک معنے نہیں ہیں بلکہ ان دونوں میں عام اور خاص کی نسبت ہے۔ یعنی ہر

جہاد قتال نہیں ہے بلکہ جہاد کی قسموں میں سے ایک قسم قتال فی سبیل اللہ ہے۔ اس آیت میں جہاد کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ جہاد بالنفس اور جہاد بالمال۔ یعنی اپنی جان کے ذریعے جہاد کرنا اور اپنے مال کے ذریعے جہاد کرنا، جان کے ذریعے جہاد کرنا یہ ہے کہ اسلام کی حمایت کے لیے ہر قسم کی جانی تکلیف بے خطر اٹھائی جائے یہاں تک کہ اپنی جان تک جوکھوں میں ڈال دینے، آگ میں جلائی جانے، سولی پر لٹکائی جانے، نیزے سے چھد جانے اور تلوار سے کٹ جانے کے لیے ہر وقت آمادہ رہے۔ مال سے جہاد کرنا یہ ہے کہ اسلام کو کامیاب اور سربلند کرنے کے لیے اپنی ہر ملکیت کو قربان، اپنی ہر دولت کو نثار اور اپنے ہر سرمایہ کو وقف کرنے کو تیار رہے۔ اسی جان اور مال کی غلط محبت شخص اور قوم دونوں کی ترقی و سعادت میں رکاوٹ ہے۔ اگر یہ دونوں بت ہمارے سامنے سے ہٹ جائیں تو ہم کامل موحد ہو جائیں اور پھر ہماری ترقی کو دنیا کی کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ جسمانی و روحانی ہر قسم کی ترقی کا راز یہی ہے۔

اس آیت میں صرف یہ بتایا ہے کہ جو لوگ معذور تو نہیں ہیں لیکن دین کے دوسرے مشاغل میں لگنے کی وجہ سے جہاد میں نہ جا سکے وہ بلا شبہ ان لوگوں کے برابر نہیں ہیں جو میدان جنگ میں کام کر رہے ہیں۔

معذور قاعدین کا مجاہدین سے مقابلہ

۱۵۱۔ اللہ نے بیٹھنے والوں کے مقابلے میں جان و مال سے جہاد کرنے والوں کا درجہ بڑھایا ہے اور وعدہ اللہ نے سب سے بھلائی کا کیا ہے۔ پہلی آیت میں ان بیٹھنے والوں کا ذکر تھا جو بلا عذر جہاد میں شریک نہ ہو سکے۔ یعنی ان کو عذر تو کوئی نہ تھا مگر دین کے دوسرے مشاغل میں لگنے کی وجہ سے جہاد میں نہ جا سکے۔ اب اس آیت میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو ذاتی عذر کی وجہ سے میدان جنگ کی شرکت سے محروم رہے ہیں جیسے عبداللہ ابن ام مکتوم نابینا ہونے کی وجہ سے نہ جا سکے اور جیسے حضرت عثمان غنیؓ اپنی اہلیہ کی بیماری کی وجہ سے حضور انورؐ کے کہنے پر جنگ بدر میں نہ جا سکے ان کے مقابلہ میں مجاہدین کا درجہ اونچا ہے یعنی درجہ عمل در نہ بھلائی کا وعدہ اللہ کی جانب سے سب کے لیے ہے یعنی مجاہدین اور قاعدین دونوں کے لیے۔ کیونکہ جہاد کی نیت سب کی تھی مگر مجاہدین کو قاعدین پر ایک درجہ فضیلت ہے، اس لیے کہ یہاں نیت جہاد کے ساتھ عمل جہاد بھی ہے۔ یہ معذور قاعدین وہ ہیں جو کسی عذر کی وجہ سے شریک جنگ نہ ہو سکے۔

یہاں ان اعذار کی تفصیل بیان نہیں ہوئی ہے جن کی وجہ سے جہاد کی شرکت سے وہ مستثنیٰ ہوتے یہ تفصیل سورہ نور میں آئی ہے۔ وہاں بتایا ہے کہ اگر دفاع کے لیے نفیر عام ہو تو کن کن لوگوں کو معذور تصور کیا جا سکتا ہے فرمایا ناتواں آدمی یعنی جو لوگ جسمانی طور پر مجبور ہوں، مثلاً بہت بوڑھے، اندھے، اپاہج دوسرے بیمار یا تیسرے ایسے لوگ جو سفر کے لازمی اخراجات کے انتظام کی مقدرت نہ رکھتے ہوں۔ اس آیت میں ان ہی معذورین کا ذکر ہے ان ہی کے بارے میں فرمایا ہے کہ ان سے اور مجاہدین سے اللہ نے الحسنیٰ کا یعنی اچھی جزا کا وعدہ فرمایا ہے۔ یہاں مجاہدین کو ان کے مقابلہ میں صرف درجہ عمل میں برتری ہے۔ قرآن کا یہی اشارہ پاکر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام سے فرمایا تھا جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت انس سے مروی ہے کہ،

مدینہ میں کچھ لوگ ہیں، وہاں ہونے کے باوجود تمہارے ساتھ ہیں جتنا تم چل رہے ہو اور جتنی وادیاں تم قطع کر رہے ہو سب میں تمہارے ساتھ ہیں، صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ وہ تو یہاں نہیں مدینے میں ہیں فرمایا ہاں مدینہ میں ہیں مگر وہ خود نہیں رہے ان کو عذر نے نہیں آنے دیا۔

اس طرح کلا وعد اللّٰہ الحسنیٰ سب کے بارے میں ہے خواہ پیچھے رہ جانے والے بغیر عذر کے کام سے لیے ہوں خواہ عذر کی بنا پر رہے ہوں اور خواہ آنے والے میدان جنگ میں آتے ہوں سب ہی سے اللہ نے جنت کا، ثواب جزیل کا وعدہ فرمایا ہے۔ اسلامی نصب العین کی ترقی اور اسلامی نظام تمدن اور طرز تفکر کی تبلیغ ان سب کی زندگی کا اتنا بڑا سرمایہ ہے کہ اگر کبھی ان سے اس کام میں کوتاہی ہو جاتی تو ساری عبادتیں اور ساری ریاضتیں ان کی نگاہ میں ہیچ ہو جائیں۔ اگرچہ اس اعتبار سے سارے اللہ کے ہاں اجر کے مستحق ہیں کہ سب اسلام کے مخلص ہیں ان میں سے منافق اور اسلام کا بدخواہ کوئی نہیں ہے تاہم مجاہدین کا درجہ اللہ کے یہاں بہت بلند ہے۔

حافظ ابن کثیر اور دوسرے شارحین قرآن نے کلا وعد اللّٰہ الحسنیٰ سے یہ نکتہ خوب معلوم کیا ہے کہ جہاد فرض عین نہیں بلکہ فرض کفایہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس آیت میں ان بیٹھنے والوں کا ذکر ہے جو جہاد کے فرض کفایہ ہونے کی صورت میں میدان جنگ کی طرف جانے کے بجائے دوسرے کاموں میں لگے رہیں، اگر فرض عین ہوتا تو بغیر عذر غیر اولی الضرر پر یقیناً عتاب ہوتا۔

فرض کفایہ، فرض عین اور جہاد

بعض ہدایات کے متعلق اسلام نے صراحتہً یہ پالیسی اختیار کی ہے کہ اگرچہ افراد کے لیے ان کی حیثیت اخلاقی ہدایات کی ہے لیکن پورے اجتماع کے لیے وہ فرض کی حیثیت رکھتے ہیں۔ جو افراد ان ہدایات کی تکمیل کے لیے ضروری وسائل اور استعداد رکھتے ہوں، ان کو چاہیے کہ وہ آگے بڑھ کر ان کو بجا لائیں تاکہ متعلقہ اجتماعی مصلحت کا تحفظ ہو سکے۔ اصطلاحی الفاظ میں یہ حکم فرض کفایہ کہلاتا ہے اس کے تحت عموماً ایسے احکام آتے ہیں جن کا تعلق پورے اجتماع کے مفاد و مصالح سے ہے۔ ان مفادات و مصالح کا تحفظ ضروری ہے لہٰذا ان احکام کی تعمیل اور متعلقہ اُمور کا انجام پانا لازمی ہے۔ جہاد کی قسموں میں سے ایک قسم قتال ہے اور قتال کی دو صورتیں ہیں ہجوم اور دفاع دراصل ہجوم کی بنیاد بھی دفاع ہی ہے یعنی جب تک دنیا میں عالمگیر صلح و امن اور عام اخوت قائم نہ ہو جائے ضروری ہے کہ حریف و مفسد قوتوں سے ہمیشہ مقابلہ جاری رکھا جائے۔ اگر ایسا نہ کیا جائے گا تو دشمن مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے اور اسلام کی اشاعت اور اس کے مشن کی تبلیغ و تکمیل میں ہمیشہ مانع رہیں گے۔ فقہا کی اصطلاح میں اسی کے لیے فرض کفایہ اور فرض عین کی اصطلاحیں ہیں۔ یہی اعمالِ انسانی کی قدرتی تقسیم ہے جس کو جماعتی فرائض اور شخصی فرائض کہا جاتا ہے۔ فرض کفایہ سے مقصود وہ احکام ہیں جو بحیثیت جماعت و اجتماع قوم پر فرض ہیں نہ کہ بحیثیت فرد و انفرادیعنی ایسے فرائض جو مسلمان جماعتوں اور آبادیوں کے ذمے عائد کر دیے گئے کہ ان کا انتظام کریں۔ انتظام ہونا چاہیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر فرد بطورِ خاص اس میں حصہ بھی لے۔ اگر ایک گروہ نے ایک وقت میں انجام دے دیا تو باقی مسلمانوں پر سے اس وقت ساقط ہو گیا جیسے تجہیز و تکفین میت اور نمازِ جنازہ۔ البتہ عزیمت اسی میں ہے کہ ادائے فرض میں حصہ لیا جائے۔ فرائض کفایہ میں قرآن کا خطاب افراد سے نہیں بلکہ جماعت سے ہے۔

دوسری قسم اعیان کی ہے یعنی وہ فرائض جن کی فرضیت جماعت پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان کی ذمہ داری ہے اور ایک کے کرنے سے دوسرا بری الذمہ نہیں ہو سکتا جیسے پانچ وقت نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔

شرعاً قتال کی پہلی صورت یعنی ہجوم اور مقابلہ کا دائمی سلسلہ فرض کفایہ ہے۔ ضروری نہیں کہ ہر مسلمان اس میں حصہ لے، ہر عہد ہر ملک میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے

جو یہ فرض انجام دیتی ہے صاحب ہدایہ لکھتے ہیں کہ :

جہاد فرض کفایہ ہے جب مسلمانوں کی ایک جماعت اس کے لیے کھڑی ہو گئی تو باقی مسلمان ذمہ داری سے بری ہو گئے اور کوئی بھی اگر نہ اٹھا تو پھر تمام مسلمان جہاد ترک کر دینے کی وجہ سے گنہ گار ہوں گے کیونکہ فرض سب پر ہے ۔

اور فتح الباری میں ہے کہ جہاد جیسا کہ مشہور ہے فرض کفایہ ہے اس کے بعد یہ بھی لکھا ہے :

جہاد کی یہ قسم یعنی قتال فرض کفایہ ہے لیکن نفس جہاد ہر مسلمان پر فرض عین ہے کسی کے لیے ہاتھ سے کسی کے لیے مال سے کسی کے لیے زبان سے اور کسی کے لیے دل سے ۔

یعنی جس وقت ایک گروہ ہاتھ اور تلوار سے مصروف جہاد ہو گا تو باقی مسلمانوں پر زبان، مال اور دل سے ان کے لیے کوشش اور محنت فرض ہو گی ۔ مال و دولت والوں کا فرض ہو گا کہ مال سے مدد کریں ۔ ایسے ہی اقناع ، روضۃ الطالبین ، المغنی ، المحلی میں تصریحات ہیں ۔ یہ صورت تو اس قتال کی ہے جس کی صورت حملہ و ہجوم کی ہو گی ۔ دوسری قسم دفاع ہے ۔ یعنی جب کوئی غیر مسلم جماعت مسلمانوں کی آبادیوں پر حملہ کا ارادہ کرے تو اس حملہ و تسلط کو ہر طرح کا مقابلہ کر کے روکنا یہ فرض کفایہ نہیں بلکہ بالاتفاق فرض عین ہے ایک گروہ کے دفاع کرنے سے باقی مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے ۔ ہدایہ میں ہے :

لیکن نفیر عام کی صورت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے

نفیر ، نفر سے بنا ہے نفر کے معنے ایک جگہ سے دوسری جگہ تیزی سے دور جانے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر حفظ و دفاع کی ضرورت سے عام اجتماع اور قیام کا وقت آ گیا تو پھر جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض ہو جاتا ہے ۔ شیخ ابن الہمام لکھتے ہیں :

فرض کفایہ ہونے کی صورت اس وقت تک ہے کہ نفیر کی حالت نہ ہو اگر مسلمانوں کے شہروں میں سے کسی شہر پر غیر مسلموں نے حملہ کر دیا تو اس وقت جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض عین ہو جاتا ہے خواہ جنگ کے لیے دعوت دینے والا عادل ہو یا فاسق ۔

اس موضوع پر تفصیلی بحث انشاءاللہ پارہ گیارہ میں آ رہی ہے

مجاہدین کا اختصاصی مقام

۱۵۲ ۔ لیکن اللہ نے مجاہدین کو بیٹھنے والوں کے مقابلے میں اجر عظیم میں بزرگی دی یعنی ان کے

لیے اللہ کی جانب سے بڑے درجے مغفرت اور رحمت ہے اور اللہ بڑا ہی معاف کرنے والا مہربان ہے اس سے پہلے مسلمان کو نادانستگی اور چوک سے قتل کر دینے پر عتاب اور تنبیہہ فرمائی تھی اس لیے یہ احتمال تھا کہ کوئی جہاد کرنے سے رک جاتے کیونکہ مجاہدین کو ایسی صورت پیش آہی جاتی ہے اس لیے مجاہدین کی فضیلت بیان فرما کر جہاد کی رغبت دلائی گئی۔ خلاصہ ان آیتوں کا یہ ہے کہ لنگڑے، لنجے، اندھے، بیمار، معذور لوگوں کو تو جہاد کرنے کا حکم نہیں باقی سب مسلمانوں میں جہاد کرنے والوں کے بڑے درجے ہیں حق تعالیٰ بڑے غفور رحیم ہیں جہاد کرنے والوں کے بارے میں اجر و مغفرت و رحمت کے جو وعدے فرماتے ہیں وہ ضرور پورے فرمائے گا یا یہ کہ مجاہد کے ہاتھ سے نادانستگی میں اگر کوئی مسلمان قتل ہو گیا تو حق تعالیٰ معاف فرمائے گا، اس اندیشہ سے جہاد سے مت رکو۔ [1]

اصل میں جس مقصد کے لیے اہل ایمان کی جدّ و جہد مطلوب ہے وہ اللہ کے اس قانون کا نفاذ ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم علم و عمل کی صورت میں لے کر آئے اور جس کے غلبہ میں مسلمان مامور ہیں۔ جس کی مخالف طاقتیں اور دعوتیں دنیا میں ہمیشہ رہیں گی یہ جہاد قیامت تک جاری رہے گا اس کی بکثرت قسمیں ہیں جن میں سے ایک جنگ بھی ہے۔ یہ اس کی بعض اوقات سب سے اعلیٰ قسم ہو جاتی ہے۔ اس کی غایت یہ ہے کہ اسلام کے مقابلے میں کوئی برابر کی حریف طاقت باقی نہ رہے جو خواہشات اور طبیعتوں کو مخالف سمت کی طرف کھینچے اور بہت سے انسانوں کے لیے کفر و اسلام کے درمیان کشمکش پیش آتے۔

اس جہاد کا ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان اس اسلام سے بخوبی واقف ہو جس کی خاطر وہ جہاد کر رہا ہے اور کفر و جاہلیت کے بارے میں جس کے خلاف وہ جہاد کر رہا ہے اس کو گہری واقفیت ہو تاکہ جس لباس اور جس رنگ میں بھی کفر ظاہر ہو اس کو پہچان سکے۔ یقیناً ہر مسلمان کے لیے ضروری نہیں کہ وہ کفر و جاہلیت سے گہری واقفیت رکھے اور اس کے مظاہر، صورتوں اور رنگوں کو پہچانتا ہو لیکن بلاشبہ اسلام کی رہنمائی اور کفر و جاہلیت کے خلاف اسلامی لشکر کی قیادت کے لیے یہ ضروری ہے کہ وہ عام اور متوسط مسلمانوں سے زیادہ کفر کو پہچانتا ہو۔

آیت میں مجاہدین کی برتری، ان کے مقام کی بزرگی بتانے کے لیے درجات کی تعبیر کے ساتھ مغفرت اور رحمت کے الفاظ آئے ہیں۔ آخرت کے درجات کا نقشہ بخاری و مسلم میں حضر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ابو سعید خدری کے حوالے سے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیش کیا ہے۔

اللہ سبحانہ نے مجاہدین کے لیے سو درجے تیار کیے ہیں، ہر دو درجہ کے درمیان اتنا ہی فاصلہ ہے جتنا آسمان و زمین کے درمیان۔

جیسا کہ ابن جریر نے بتایا ہے کہ یہاں درجات سے بھی درجات آخرت مراد ہیں کیونکہ یہ اجر عظیم کی تفسیر بن کر آئی ہے۔ ان درجات کا مصدر ان مجاہدین کی وہ قوت ایمان اور اپنی راحت و عیش کے مقابلے میں رضائے الٰہی کی طلب، ذاتی چاہتوں پر عمومی مصالح کی ترجیح ہے۔ ان کے اخلاقی اروحانی، دینی و علمی وسائل صالح تمدن کے وجود میں لانے میں مددگار تھے۔ ان کے اعلیٰ اخلاقی نمونے معیار کا کام دیتے تھے اور ان کی اخلاقی تعلیمات زندگی اور نظام حیات کے لیے میزان کا درجہ رکھتے تھے چنانچہ اسلامی حکومت کی غیر معمولی وسعت آبادی کی انتہائی افزونی عیش و عشرت کے وسائل کے باوجود جرائم و بداخلاقیوں کے واقعات بہت کم پیش آتے تھے۔ یہ مغفرت و رحمت ہی کا اثر تھا کہ اس کے نتیجہ میں ایک ایسا معیاری معاشرہ معیاری تمدن، معیاری تہذیب، معیاری نظام سیاست، معیاری نظام معیشت اور معیاری دور وجود میں آیا جس سے زیادہ ترقی یافتہ دور کا انسان خواب میں نہیں دیکھ سکا اور اس سے زیادہ مبارک اور پر بہار زمانہ فرض نہیں کیا جا سکتا۔

إِنَّ الَّذِينَ تَوَفَّاهُمُ الْمَلَائِكَةُ ظَالِمِي أَنفُسِهِمْ قَالُوا فِيمَ كُنتُمْ ۖ
قَالُوا كُنَّا مُسْتَضْعَفِينَ فِي الْأَرْضِ ۚ قَالُوا أَلَمْ تَكُنْ أَرْضُ اللَّهِ
وَاسِعَةً فَتُهَاجِرُوا فِيهَا ۚ فَأُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ ۖ وَسَاءَتْ مَصِيرًا ﴿٩٧﴾
إِلَّا الْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الرِّجَالِ وَالنِّسَاءِ وَالْوِلْدَانِ لَا
يَسْتَطِيعُونَ حِيلَةً وَلَا يَهْتَدُونَ سَبِيلًا ﴿٩٨﴾ فَأُولَٰئِكَ عَسَى
اللَّهُ أَن يَعْفُوَ عَنْهُمْ ۚ وَكَانَ اللَّهُ عَفُوًّا غَفُورًا ﴿٩٩﴾ وَمَن يُهَاجِرْ فِي
سَبِيلِ اللَّهِ يَجِدْ فِي الْأَرْضِ مُرَاغَمًا كَثِيرًا وَسَعَةً ۚ وَمَن يَخْرُجْ
مِن بَيْتِهِ مُهَاجِرًا إِلَى اللَّهِ وَرَسُولِهِ ثُمَّ يُدْرِكْهُ الْمَوْتُ فَقَدْ
۱۴ ع ۱۱ وَقَعَ أَجْرُهُ عَلَى اللَّهِ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٠﴾

جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں جب ان کی روح فرشتے قبض کرتے ہیں تو ان سے دریافت کرتے ہیں کہ تم کس حال میں[۱۵۳] تھے وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں بے بس تھے، فرشتے کہتے ہیں

کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کرتے پس ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بُری جگہ ہے[۱۵۴]۔ ہاں وہ جو مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے واقعی بے بس ہیں نہ تو کوئی تدبیر کر سکتے ہیں نہ کوئی اور راستہ نکال پاتے ہیں تو عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو معاف کر دے اور اللہ بڑا بخشش کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے[۱۵۵]۔ اور جو بھی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت آرام و آسائش کی جگہ اور فراخی پائے گا اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ و رسول کی خاطر ہجرت کے ارادے سے نکلے پھر اس کو موت آجائے تو اس کا اجر اللہ کے یہاں مقرر ہو گیا ہے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے[۱۵۶]۔

ہجرت ایمان کا بنیادی تقاضا ہے

گزشتہ رکوع میں مجاہدین کا ذکر تھا اب اس رکوع میں مہاجرین کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ دونوں میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جب دشمنانِ حق کے ظلم و ستم سے تنگ آکر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

نے مدینہ کی طرف ہجرت کی تو قدرتی طور پر ملک عرب دو حصوں میں بٹ گیا۔ دارالہجرت اور دارالحرب۔ دارالہجرت مدینہ تھا جہاں مسلمان ہجرت کر کے جمع ہو گئے تھے اور دارالحرب ملک کا وہ حصہ تھا جو دشمنوں کے قبضے میں تھا۔ دارالحرب میں جو مسلمان باقی رہ گئے تھے وہ اعتقاد و عمل کی آزادی سے محروم تھے، انہیں ہمیشہ دشمنوں کا ظلم وستم سہنا پڑتا تھا۔ اسی لیے انہیں حکم دیا گیا کہ مکہ سے ہجرت کر جائیں۔ اگر باوجود استطاعت کے نہیں کریں گے تو اپنی کوتاہی عمل کے لیے جواب دہ ہوں گے۔

اگر غور سے دیکھو تو اسلام کے ظہور کی تاریخ دراصل دو بڑے اور اصولی عہدوں میں منقسم ہے۔ ایک عہد مکہ کی زندگی اور اعمال کا ہے۔ دوسرا مدینہ کے قیام اور اعمال کا پہلا عہد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے اس کی ابتدا غار حرا کے اعتکاف سے شروع ہوتی ہے اور غار ثور کے دہانہ پر اس کی تکمیل ہے۔ دوسرا ہجرت سے شروع ہوتا ہے اور حجۃ الوداع پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتداء مدینہ کی فتح سے ہوئی اور تکمیل مکہ کی فتح پر۔ دنیا کی نظروں میں اسلام کے ظہور کا دور دوسرا دور تھا کیونکہ اسی دور میں اسلام کی پہلی غربت ختم ہوئی۔ اور ظاہری طاقت وحشمت کا سر و سامان شروع ہوا۔ بدر کی جنگ فتح ہتھیاروں کی پہلی فتح تھی۔ مکہ کی فتح عرب کی فتح کا اعلان عام تھی لیکن قرآن کی نظر میں اسلام کی زندگی کا اصلی دور دوسرا دور نہیں پہلا دور تھا وہ دیکھتا تھا کہ اس کی ساری قوتوں کی بنیادیں ہجرت سے استوار ہوئی ہیں۔ بلاشبہ بدر کے ہتھیاروں نے غیر مسخر طاقت کا دنیا میں اعلان کر دیا لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کے قبضوں پر جمے تھے ان کی طاقتیں کس میدان میں تیار ہوئی تھیں۔ بلاشبہ مکہ کی فتح عرب کی فتح تھی لیکن اگر ہجرت کے ذریعے مدینہ کی فتح ظہور میں نہ آتی تو مکہ کے فتح کے لیے راہ کیوں کر نکلتی۔ یہ صحیح ہے کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہجرت اور اس کے اعمال سے فتح ہوا تھا۔ ہجرت تخم ہے اور اس کے بعد اسی کا برگ و بار ہے۔ ہجرت بنیاد ہے اس کے بعد ستون و محراب ہے، ہجرت نشو و نما ہے اس کے بعد ظہور انفجار ہے۔ ہجرت اگر معنے اور حقیقت ہے تو اس کے بعد صورت و اظہار ہے، ہجرت روح ہے تو جہاد کی سرگرمیاں جسم ہیں، ہجرت کے بعد خواہ کچھ ہو لیکن اولین بنیاد و استعداد کی عظمت ہجرت کو حاصل ہے اس لیے ان آیات میں قرآن نے ان لوگوں کو مخاطب کیا ہے جو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ابھی تک بلا کسی مجبوری کے اپنی کافر قوم ہی کے درمیان مقیم تھے اور نیم مسلمانہ اور نیم کافرانہ زندگی بسر کر رہے تھے۔ حالانکہ ایک دارالاسلام

وجود میں آچکا تھا۔ فرمایا ہجرت نہ کرنے والے اپنے آپ پر ظلم کر رہے ہیں۔

۱۵۳۔ جو لوگ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں جب ان کی روحیں فرشتے قبض کرتے ہیں تو ان سے دریافت کرتے ہیں کہ تم کس حال میں تھے؟ مراد وہ لوگ ہیں جو اسلام قبول کرنے کے بعد بھی ابھی تک بلا کسی مجبوری و معذوری کے اپنی کافر قوم ہی کے درمیان بستے تھے اور نیم مسلمانہ اور نیم کافرانہ زندگی بسر کرنے پر راضی تھے۔ درآنحالیکہ ایک دارالاسلام مہیا ہو چکا تھا جس کی طرف ہجرت کر کے اپنے دین و اعتقاد کے مطابق پوری اسلامی زندگی بسر کرنا ان کے لیے ممکن ہو گیا تھا۔ یہی ان کا اپنے نفس پر ظلم تھا کیونکہ ان کو پوری اسلامی زندگی کے مقابلہ میں اس نیم کفر و نیم اسلامی زندگی پر جس چیز نے قانع و مطمئن کر رکھا تھا وہ کوئی واقعی مجبوری نہ تھی بلکہ محض اپنے نفس کے عیش، اپنے خاندان، اپنی جائداد و املاک اور اپنے دنیوی مفادات سے محبت تھی جسے انہوں نے اپنے دین پر ترجیح دی۔ ان سے فرشتے قبض روح کے بعد دریافت کریں گے کہ دارالحرب میں رہ کر کن مشاغل میں لگے ہوئے تھے کہ ہجرت نہ کر سکے۔

عصمت موثمہ اور عصمت مقومہ

اسلام قبول کرنے کی پہلی برکت یہ ہے کہ اس کی حلقہ بگوشی کے بعد ہی جان و مال کی عصمت فوراً حاصل ہو جاتی ہے۔ فقہا کے نزدیک اس عصمت کی دو قسمیں ہیں عصمت موثمہ اور عصمت مقومہ جس کے ازالہ سے صرف گناہ ہو وہ موثمہ کہلاتی ہے اور جس کے ازالہ سے گناہ کے ساتھ دیت بھی لازم ہو وہ مقومہ کہلاتی ہے۔ پہلی عصمت اسلام حاصل کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور دوسری دارالاسلام میں سکونت سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> میں ہر مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین کی جماعت میں بسے لوگوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ کیوں فرمایا کہ دونوں کو اتنے فاصلے پر رہنا چاہیے کہ ایک کو دوسرے کی آگ کی روشنی نظر نہ آسکے۔ (ابوداؤد)

اس لحاظ سے ایک مسلمان اگر دارالحرب میں رہتا ہے تو اس کو عصمت موثمہ تو حاصل ہے مگر عصمت مقومہ حاصل نہیں ہے اسی لیے جیسا کہ پڑھ چکے ہو اگر ایک مسلمان دارالحرب میں رہتا ہے اور وہاں قتل کر دیا جائے تو اس کے قاتل کو صرف گناہ ہوگا مگر اس پر خون بہا نہ آئے گا۔ عصمت مقومہ اسی وقت حاصل ہوگی جبکہ اسلام لانے کے ساتھ سکونت دارالاسلام کی اختیار کرے یعنی دارالحرب سے ہجرت کرے۔

دار حرب سے ہجرت کا حکم

۱۵۴ - وہ کہتے ہیں کہ ہم ملک میں بے بس تھے فرشتے کہتے ہیں کہ کیا اللہ کی زمین کشادہ نہ تھی کہ تم اس میں ہجرت کر جاتے بس ایسے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے اور وہ بہت بری جگہ ہے۔ فرشتوں کا یہ کہنا کہ کیا اللہ کی زمین میں وسعت سمٹ چکی تھی کہ تم اس لیے ہجرت نہ کرتے تھے۔ اس بات کا اشارہ ہے کہ دار الحرب کی سکونت مسلمان کے لیے موزوں نہیں ہے۔ یعنی سمجھایا یہ گیا ہے کہ جب ایک جگہ خدا کے باغیوں کا غلبہ تھا اور خدا کے قانون پر عمل کرنا ممکن نہ تھا تو وہاں رہنا کیا ضرور تھا کیوں نہ اس جگہ کو چھوڑ کر کسی ایسی سرزمین میں منتقل ہو گئے جہاں قانون الٰہی کی پیروی ممکن تھی۔ فقہا نے لکھا ہے کہ جب ایک ملک میں رہ کر اسلامی زندگی پر چلنا ممکن نہ ہو اور یہ معلوم ہو کہ کوئی دوسرا ملک ہے جہاں پوری اسلامی زندگی پر عمل ہو سکتا ہے تو اس دوسرے ملک کی طرف ہجرت کر جانا واجب ہے الجصاص نے لکھا ہے کہ یہ آیت اس کی دلیل ہے کہ زمین کفر سے اسلامی ملک کی طرف ہجرت واجب ہے۔

ہجرت ہجر سے ہے جس کے معنے ترک کر دینے اور چھوڑ دینے کے ہیں۔ اسلام کی اصطلاح میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت و صداقت کے کسی اعلیٰ مقصد کی خاطر اپنی دنیوی محبوبات و مالوفات کو ترک کر دے مثلاً دولت کو آرام و راحت کو اعزہ و اقربا کے قرب کو وطن و مکان کو اس کا نام ہجرت الی اللہ اور ذہاب الی اللہ ہے۔ خدا کے ہر رسول اور ان کے پیروؤں کو قیام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑی انی مھاجر الی ربی اور انی ذاھب الی ربی۔ چونکہ وطن و مکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے ترک کرنے میں اہل و عیال، مال و متاع، دوست و احباب ہر طرح کے علاقوں کو ترک کر دینا پڑتا ہے اور اس کی محبت و الفت کی زنجیر اور ساری زنجیروں سے بھاری ہے اس لیے ترک وطن کی ہجرت اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہے اور زیادہ تر ہجرت کا اطلاق تارکین وطن ہی پر کیا گیا ہے۔ صحیح بخاری کی سب سے پہلی حدیث ہے:

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ہر شخص کے لیے وہ ہے جس کی اس نے نیت کی، جس نے اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہجرت کی تو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے اور جس نے اس لیے ہجرت کی کہ دنیا کمائے یا شادی رچائے تو اس کی ہجرت اسی کام کے لیے ہے۔

لیکن یہ بات واضح رہے کہ دار الاسلام کی طرف ہجرت کا سوال اسی وقت پیدا ہوتا ہے جب کسی

خطہ پر دارالاسلام کا وجود بھی ہو اور اس کی طرف ہجرت کرنا ممکن بھی ہو۔ لیکن اگر بدنصیبی سے صفحۂ ہستی پر دارالاسلام کا وجود ہی نہ رہے یا مسلمانوں کی مسلسل غفلت کی وجہ سے دارالحرب میں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہو جائے کہ دارالاسلام میں ان کی کھپت کا امکان ہی نہ ہو تو پھر ہجرت کا وجوب نہیں بلکہ ایسے حالات میں مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ وہ اپنے ہی ماحول میں اسلامی فضا پیدا کرنے کی کوشش کریں جس میں آئینِ اسلامی اور دستورِ نبوت پر عمل کرنے کی پوری آزادی ہو جائے اور جب تک اسلامی نظامِ حیات پر عمل پیرا ہونے میں کوئی ادنیٰ رکاوٹ بھی باقی رہے اس وقت تک لگاتار اور مسلسل کوشش جاری رکھیں۔ مسلمانوں کی تعداد کا اضافہ اس ذمہ داری کو اور زیادہ وزنی بنائے گا۔ منتشر افراد اور اشخاص آج کے زمانے میں مستضعفین فی الارض ہونے کا عذر کر سکتے ہیں لیکن مقتدر اور بڑی جماعتوں کے لیے یہ عذر کرنا بھی غلط ہے اس لیے ان کا ایک ہی نصب العین ہونا چاہیے کہ وہ ایک کافرانہ زندگی سے نکل کر ایسی زندگی کے لیے کوشش کریں جس میں اسلامی دستور پر عمل پیرا ہونے کی انہیں پوری پوری آزادی حاصل ہو جائے۔ یہ مقصد اگر دفعتہً حاصل نہ ہو سکے تو بتدریج حاصل کریں لیکن اس کے بغیر کسی ناتمام اور ادھوری آزادی پر قناعت کر کے بیٹھ رہنا ناقابلِ عفو جرم ہے۔

ہجرت سے معذور مسلمان

۱۵۵۔ ہاں وہ جو مردوں، عورتوں اور بچوں میں سے واقعی بے بس اور مجبور ہیں نہ تو کوئی تدبیر کر سکتے ہیں نہ کوئی اور راستہ نکال پاتے ہیں تو عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو معاف کر دے اور اللہ بڑا بخشش کرنے والا اور معاف کرنے والا ہے۔ یعنی جو لوگ ضعیف ہیں اور عورتیں اور بچے کہ وہ نہ ہجرت کی تدبیر کر سکتے ہیں نہ ان کو ہجرت کا راستہ معلوم ہے، وہ قابلِ معافی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان جس ملک میں کھلا نہ رہ سکیں وہاں سے ہجرت فرض ہے اور سوائے ان لوگوں کے جو بالکل معذور ہیں اور کسی کو وہاں پڑا رہنے کی اجازت نہیں ہے۔ ؎

مطلب یہ ہے کہ ہجرت کے معاملہ میں معذور صرف وہ لوگ ہیں جن کے ترکش میں ہجرت کے لیے تدبیر کا کوئی تیر نہیں ہے بے کسی اور بے بسی کے عالم میں ہیں کہ حالات کے غلط دھارے نے ان پر ساری راہیں بند کر دی ہیں خواہ یہ محتاجی اور مفلسی کی وجہ سے ہو یا راہ سے بے خبر ہونے

؎ افاداتِ شیخ الاسلام

کی وجہ سے ہو یا جسمانی کمزوری اور بیماری اس کا سبب ہو۔ عورتوں اور بچوں کا ذکر تبعاً کیا گیا ہے تو ایسے لوگ فی الواقع معذور ہیں۔ امید ہے کہ اللہ سبحانہٗ ان کو معاف کر دے۔ غور طلب بات ہے کہ معذور قرار دینے کے باوجود یہ نہیں فرمایا کہ ایسی حالت میں ان پر کوئی گناہ نہیں ہے بلکہ یہ فرمایا ہے کہ عجب نہیں اللہ ان لوگوں کو معاف کر دے اس میں اشارہ ہے کہ ہجرت کا معاملہ اتنا عظیم ہے کہ اس کا معذور بھی مجرم ہی ہے لسے چاہیے کہ اس تگ و دو میں رہے کہ جب موقعہ ملے اس فرض کو ادا کرے۔

یہاں ہجرت کے عمل پر یہ زور دیا جارہا ہے کہ اسلام کا سارا نظام اعلاء کلمۃ اللہ اور دین حق کے قیام کی سعی و طلب پر استوار ہے۔ روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ، عبادات و فرائض اور اوامر و نواہی سب کے سب بالآخر اسی غایت اصلی کے تابع ہیں کہ اللہ کی زمین پر بس اسی کی بندگی کی جائے۔ اور معبودان باطل کو ہر جگہ سے نکال پھینکا جائے۔ صدر اول کے مسلمانوں میں عمل ہجرت کی برکت سے اعلاء کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دے کر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی طلب و آرزو تھی۔ ان میں اسلام کے اخلاقی اقدار اور قرآن و سنت کے معیار خیر و شر کو سارے عالم پر حکمران بنا کر اللہ کو راضی کرنے کی خواہش تھی۔ ان کی نمازوں میں روح تھی عبادات میں جان تھی اور اسلام کے سارے اجزا اس سے اپنی زندگی اور پرورش کا سامان حاصل کر رہے تھے۔ اس کے لیے وہ سارے مفادات، سارے منافع، سارے مصالح، برادری، خاندان، قوم اور ملک تک کو چھوڑ دیتے تھے جب سے یہ مقصد نظروں سے اوجھل ہو گیا اسلامی زندگی کی ساری شاخیں مرجھا گئیں۔ غور کیجئے یہ بات کن لوگوں کے بارے میں کہی جارہی ہے فاولئک عسی اللہ ان یعفو عنھم۔ صاحب روح نے مروزی میں عیاش بن ربیعہ، سلمۃ بن ہشام اور ولید بن الولید اور عورتوں میں ام فضل لبابہ بنت الحارث، ام عبداللہ بن عباس کے نام لیے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کی نمازیں اور عبادتیں یکسر خلوص و للّٰہیت سے معمور تھیں ان کو کہا جارہا ہے کہ معذور ہونے کے باوجود تم مجرم ہو، ہو سکتا ہے کہ اللہ معاف کر دے۔

اسلامی زندگی کی خاطر ہجرت کی ترغیب

۱۵۶۔ اور جو بھی اللہ کی راہ میں ہجرت کرے گا وہ زمین میں بہت آسائش اور آرام کی جگہ اور فراخی پائے گا۔ اور جو شخص اپنے گھر سے اللہ و رسول کی خاطر ہجرت کے ارادے سے نکلے گا پھر اس کو

موت آجائے تو اس کا عمل ہجرت اللہ کے یہاں مقرر ہو گیا اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ اس آیت میں ہجرت کی ترغیب اور مہاجرین کو تسلی دی جاتی ہے کہ جو شخص اللہ کے واسطے ہجرت کرے گا اور اپنا وطن چھوڑے گا تو اس کو رہنے کے لیے بہت جگہ ملے گی اور اس کی روزی و معیشت میں فراخی ہو گی۔ تو ہجرت کرنے میں اس سے نہ ڈرو کہ کہاں رہیں گے اور کیا کھائیں گے اور یہ بھی خطرہ نہ کرو کہ شاید راستہ میں موت آجائے تو ادھر کے ہوں نہ ادھر کے، کیونکہ اس صورت میں بھی ہجرت کا پورا ثواب ملے گا اور موت تو اپنے وقت پر آتی ہے۔ وقت مقرر سے پہلے نہیں آسکتی [1]

اس آیت میں ہجرت کی راہ میں نکلنے والوں کی حوصلہ افزائی کی گئی ہے کہ جو اللہ کی راہ میں ہجرت کے لیے اٹھ کھڑا ہو گا وہ خدا کی زمین میں بہت ٹھکانے اور بڑی وسعت پائے گا۔ یعنی رہنے کی بہت جگہیں ملیں گی اور معیشت کی فراخی اس کا استقبال کرے گی۔ گویا بتا دیا کہ وطن چھوڑنے سے یہ خیال نہ کریں کہ گھر سے بے گھر ہو جائیں گے اور پردیس میں تکلیف ہو گی۔ نہیں بلکہ ان کو گھر سے زیادہ آرام ملے گا کشادہ جگہ اور فراخ روزی ملے گی۔

یہ امر واقعہ ہے کہ کفار سے دور رہنے کا حکم صرف اس لیے دیا گیا ہے کہ اسلامی معاشرت کفر کے اثر سے متاثر نہ ہو۔ یہ خطرہ اسی مقام پر پیدا ہو سکتا ہے جہاں اسلام کو اقتدار اور طاقت حاصل نہ ہو۔ باقی جہاں اسلام کو شوکت حاصل ہو وہاں عقلی اور نفسیاتی لحاظ سے تاثر کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے من یہاجر فی سبیل اللہ کا منطوق بھی ہے کہ جو شخص اللہ کے دین پر ایمان لایا ہو اور وہ مغلوبی اور مقہوری کی زندگی بسر کر رہا ہو۔ اس کے لیے نظام کفر کے تحت زندگی بسر کرنا صرف دو ہی صورتوں میں جائز ہو سکتا ہے ایک یہ کہ وہ اسلام کو اس زمین میں غالب کرنے اور نظام کفر کو نظام اسلام میں تبدیل کرنے کی جدوجہد کرتا رہے جس طرح انبیا علیہم السلام اور ان کے ابتدائی پیرو کرتے رہے ہیں، دوسرے یہ کہ وہ درحقیقت وہاں سے نکلنے کی کوئی راہ نہ پاتا ہو اور سخت نفرت و بیزاری کے ساتھ وہاں مجبورانہ قیام رکھتا ہو۔ ان دو صورتوں کے علاوہ ہر صورت میں دارالکفر کا قیام گناہ ہے۔ بلاشبہ ایسے ماحول میں اسلامی سپرٹ کو فنا کر دینے کے مترادف ہے اس لیے اگر علیحدہ ہونے کی طاقت نہ ہو تو کم از کم اس زندگی کی کراہت سے کسی وقت دل خالی نہ ہو اور صرف کراہت ہی نہیں بلکہ اس سے نجات پانے کا راستہ تلاش کرنا بھی زندگی کا نصب العین بنا لینا چاہیے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آخر میں یہ اطمینان بھی دلادیا کہ ہجرت کے اجر عظیم کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ آدمی دارالہجرت میں پہنچ ہی جائے بلکہ صرف یہ کافی ہے کہ اللہ و رسول کی طرف آدمی ہجرت کے ارادے سے گھر سے نکل جائے خواہ راستہ میں اسے موت نے آ پکڑا ہو اللہ پر اس کا اجر لازم ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص صحیح مقصد سے ترک وطن کرے گا اور اللہ و رسول کی خوشنودی کی خاطر اپنے گھر سے نکل کھڑا ہو گا تو اگرچہ وہ منزل تک نہ پہنچ سکے اور راستہ ہی میں اس کو موت آ پکڑے پھر بھی اللہ کے ذمہ اس کا اجر ثابت ہو گیا۔ اگرچہ ابھی ہجرت کی تکمیل نہیں ہوئی لیکن اس کی نیت ہونے کی وجہ سے اس سے یہ وعدہ ہے کہ اس کو پورا صلہ عطا ہو گا۔ اس آیت میں ان لوگوں کے لیے بڑی بشارت ہے جو کسی نیک کام کو نیک نیت سے شروع کر دیں اور اس کام کے پورا ہونے سے پہلے موت آجائے یا اچانک قتل ہو جائے مثلاً سانپ کاٹ لے یا کوئی دشمن اس کو قتل کر دے یا سواری سے گر پڑے کسی بھی حادثہ کا شکار ہو کر اللہ کو پیارا ہو جائے تو اللہ تعالیٰ اس کو پورا اجر عطا فرمائے گا۔

اگرچہ یہاں دارالحرب سے اپنے دین کی حفاظت کے لیے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنے کا ذکر ہے لیکن کچھ اہل علم نے ہر وہ ہجرت جو طالب علم کے لیے یا حج کے لیے ہو یا جہاد کے لیے ہو یا ایک ایسے شہر کی طرف ہو جس میں زہد و تقویٰ کے حصول کی اُمید ہو یا پاکیزہ حلال روزی تلاش کرنے کی غرض سے ہو اسے ہجرت کے حکم میں داخل کیا ہے اور اگر راستہ میں موت آجائے گی تو اجر اللہ تعالیٰ کے ذمہ ہو گا۔

ایک شبہ کا ازالہ

عام طور پر ایک حدیث کا غلط مفہوم لے کر یہ سمجھ لیا گیا کہ ہجرت آغازِ اسلام میں تھی اب یہ حکم منسوخ ہو گیا ہے۔ ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کسی دارالحرب سے دارالاسلام کی طرف ہجرت کرنے کا حکم اب بھی موجود ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں:

> صحیح یہ ہے کہ دارِ کفر سے ہجرت کرنا اس شخص پر ایک مضبوط فریضہ ہے جو اس پر قادر ہے، یہ منسوخ نہیں ہے اور یہ آیت اس کی کھلی دلیل ہے کہ ہجرت ایسے مقام سے واجب ہے جہاں مسلمان کو اسلامی زندگی میسر نہ ہو۔

قرطبی رقمطراز ہیں:

> یہ ہجرت یعنی دارِ حرب سے دارِ اسلام کی طرف ہجرت باقی ہے اور قیامت تک فرض ہے۔

کچھ لوگوں کو اس سلسلے میں ابوداؤد اور مسند احمد کی اس حدیث سے جو مجاشع بن مسعود کے حوالہ سے آئی ہے۔ میری مراد یہ ارشادِ نبوت ہے لا ھجرۃ بعد فتح مکہ فتح مکہ کے بعد کوئی ہجرت نہیں ہے۔ یہ غلط فہمی ہوئی ہے کہ اب اسلام میں کوئی ہجرت نہیں ہے حالانکہ اس ارشاد میں اس وقت کے احوال و ظروف کی عکاسی کی گئی ہے کہ مکہ فتح ہو جانے کے بعد چونکہ پورے کا پورا ملک دارالاسلام بن چکا تھا۔ حضور انور نے بتایا تھا کہ اب یہاں فتح مکہ کے بعد ہجرت کی حاجت نہیں ہے۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ پوری دنیا کے مسلمانوں کے لیے حالات کچھ ہوں قیامت تک کے لیے ہجرت منسوخ ہو گئی ہے اور قاضی ثناءاللہ نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ مکہ فتح ہو جانے کے بعد چونکہ مکہ دارالاسلام بن چکا ہے اس لیے اب فتح کے بعد مکہ سے ہجرت واجب نہیں رہی۔ فتح مکہ کے بعد مکہ سے کوئی ہجرت کرے گا تو اسے ہجرت کا ثواب نہیں ملے گا۔

وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوْا مِنَ
الصَّلٰوةِ ۖ إِنْ خِفْتُمْ أَنْ يَّفْتِنَكُمُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ إِنَّ الْكٰفِرِيْنَ كَانُوْا
لَكُمْ عَدُوًّا مُّبِيْنًا ۝ وَإِذَا كُنْتَ فِيْهِمْ فَأَقَمْتَ لَهُمُ الصَّلٰوةَ فَلْتَقُمْ
طَآئِفَةٌ مِّنْهُمْ مَّعَكَ وَلْيَأْخُذُوْٓا أَسْلِحَتَهُمْ ۣ فَإِذَا سَجَدُوْا فَلْيَكُوْنُوْا
مِنْ وَّرَآئِكُمْ ۠ وَلْتَأْتِ طَآئِفَةٌ أُخْرٰى لَمْ يُصَلُّوْا فَلْيُصَلُّوْا مَعَكَ
وَلْيَأْخُذُوْا حِذْرَهُمْ وَأَسْلِحَتَهُمْ ۚ وَدَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَوْ تَغْفُلُوْنَ
عَنْ أَسْلِحَتِكُمْ وَأَمْتِعَتِكُمْ فَيَمِيْلُوْنَ عَلَيْكُمْ مَّيْلَةً وَّاحِدَةً ۭ
وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ كَانَ بِكُمْ أَذًى مِّنْ مَّطَرٍ أَوْ كُنْتُمْ
مَّرْضٰٓى أَنْ تَضَعُوْٓا أَسْلِحَتَكُمْ ۚ وَخُذُوْا حِذْرَكُمْ ۭ إِنَّ اللّٰهَ أَعَدَّ
لِلْكٰفِرِيْنَ عَذَابًا مُّهِيْنًا ۝

اور جب تم سفر میں نکلو اور تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں کسی
مصیبت میں ڈال دیں گے تو تم پر کچھ گناہ نہیں ہے اگر

نمازیں قصر کرلو، بلاشبہ کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔[157] اور اے
پیغمبر جب تم مسلمانوں میں موجود ہو اور تم ان کے لیے نماز قائم
کرو تو چاہیے کہ فوج کا ایک حصہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے
اور اپنے ہتھیار لیے رہے، پھر جب وہ سجدہ کر چکے تو پیچھے
ہٹ جاتے اور دوسرا حصہ جو نماز میں شریک نہ تھا تمہارے
ساتھ شریک ہو جائے اور چاہیے کہ پوری طرح چوکنا رہے
اور اپنے ہتھیار لیے رہے، جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار
کی ہے ان کی دلی تمنا ہے کہ تم اپنے ہتھیار اور سامان جنگ
سے ذرا بھی غفلت کرو تو ایک بارگی تم پر ٹوٹ پڑیں۔[158] اور
اگر تمہیں بارش کی وجہ سے کچھ تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو پھر تم
پر کوئی گناہ نہیں اگر ہتھیار اتار کر رکھ دو لیکن اپنے بچاؤ
کی طرف سے غافل نہ ہونا چاہیے، بلاشبہ اللہ نے کفر پیشہ
لوگوں کے لیے رسوا کن عذاب تیار کر رکھا ہے۔[159]

جنگ اور نماز، سفر اور نماز

نماز اسلام میں ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہی نہیں بلکہ وہ ایمان کا لازمی مظہر بھی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ دل میں ایمان تو ہو مگر سر میں رکوع اور سجدہ کی تڑپ نہ ہو، ایمان دل کی ایک کیفیت کا نام ہے یہی کیفیت خارج میں نماز کی شکل اختیار کر لیتی ہے اسی لیے جہاں ہو وہاں نماز ضرور ہو گی۔ ٹھیک اسی طرح کہ جہاں سورج نکلا ہوا ہو وہاں روشنی اور گرمی ضرور ہوتی ہے۔ یہ بات کہ نماز ایمان کا لازم ہے قرآن و سنت کا فیصلہ ہے کوئی قیاس نہیں ہے۔ قرآن میں ہے اقیموا الصلاۃ ولا تکونوا من المشرکین نماز قائم کرو مشرکین میں سے نہ ہو۔ اس آیت پاک سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم چیز نماز ثابت ہوتی ہے دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترکِ نماز سے کفر و شرک میں گرفتار ہونے کا اندیشہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی آیتِ قرآنی کی روح اس طرح سمجھائی ہے:

ان بین الرجل و بین الشرک والکفر ترک الصلاۃ

بلاشبہ انسان اور کفر و شرک کے درمیان علیحدگی کرنے والی چیز نماز ہے۔

دراصل نماز پوری اسلامی زندگی کے جذبۂ اتباع کا سرچشمہ ہے اور اس کی محافظ بھی، وہ اگر ادا ہو گی تو شریعت کے باقی احکام بھی ادا ہو سکیں گے۔ اور اگر اس کا حق ادا نہ ہوا تو شریعت کے باقی احکام بھی ادا نہ ہو سکیں گے۔ اور اگر اس کا حق ادا نہ ہوا تو شریعت کے باقی احکام بھی ادا نہ ہو سکیں گے۔ اور اگر اس کا حق ادا نہ ہوا تو باقی شریعت بھی غفلت کی نذر ہو جانے سے نہ بچ سکے گی۔ یوں سمجھئے کہ پورے اسلامی نظام میں نماز کی حیثیت وہی ہے جو انسانی جسم میں دل کی ہوتی ہے۔ دل میں اگر حرکت اور گرمی اور زندگی موجود ہو تو جسم کے دوسرے تمام حصوں تک بھی خون کی روانی قائم ہوتی ہے اور وہ زندہ رہتے ہیں۔ لیکن جس وقت یہ دل اپنی حرکت اور زندگی کھو دیتا ہے۔ اس وقت دوسرے اعضا بھی سرد اور بے جان ہو کر رہ جاتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے اپنے عمالِ حکومت کو نماز کی بھی حیثیت اس طرح سمجھائی تھی۔

بلاشبہ میرے نزدیک تمہارے سارے مسائل میں سب سے زیادہ اہمیت والی چیز نماز ہے، جس نے اپنی نماز کی حفاظت کی اور اس کا پورا پورا حق ادا کیا اس نے اپنے پورے دین کو محفوظ کر لیا اور جس نے اپنی نماز کو ضائع کر دیا وہ باقی چیزوں کو اور زیادہ ضائع

کر کے رہے گا۔

یہ نماز کی اہمیت ہے کہ بیماری، سفر اور جنگ کی حالت میں بھی قرآن نے اسے بجالانے کی تلقین کی اور اس کی ادائیگی کی ترکیب بتائی۔ یہاں ہجرت اور جہاد کے ذکر میں نماز کے قصر کرنے کی رعایت عطا فرما کر اور صلوٰۃ خوف کی ترکیب بتا کر اشارہ کر دیا کہ نماز جو روح کی غذا اور مقصد حیات ہے اس سے کسی حال میں غفلت نہ ہو کیونکہ یہی دل کی روشنی ہے، یہی نبوت کی آنکھ کی ٹھنڈک ہے اور یہی مومن کو دیدار الٰہی کے لیے تیار کرتی ہے۔

۱۵۷۔ اور جب تم سفر میں نکلو اور تمہیں اندیشہ ہو کہ کافر تمہیں کسی مصیبت میں ڈال دیں گے تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اگر نماز میں قصر کر لو بلا شبہ کافر تمہارے کھلے دشمن ہیں۔ یعنی جب تم جہاد وغیرہ کے لیے سفر کرو اور کافروں سے جو تمہارے صریح دشمن ہیں اس کا خوف ہو کہ وہ موقع پاکر تمہیں ستائیں گے تو نماز کو مختصر رکھو یعنی جو نماز حضر میں چار رکعت کی ہو اس کو دو رکعت پڑھو۔ ہمارے یہاں سفر میں منزل کا ہونا ضروری ہے اس سے کم ہوگا تو قصر نہ ہوگا۔ اور کافروں کے ستانے کا ڈر اس وقت موجود تھا جب یہ حکم نازل ہوا جب یہ ڈر جاتا رہا تو اس کے بعد بھی آپ سفر میں دو رکعت پڑھتے رہے۔ اور صحابہ کو بھی اس کی تاکید فرمائی اب ہمیشہ سفر میں قصر کرنے کا حکم ہے خوف مذکور ہو یا نہ ہو اور یہ اللہ کا فضل ہے شکریہ کے ساتھ قبول کرنا لازم ہے جیسا کہ حدیث میں ارشاد ہے۔[1]
اس سلسلے میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

مسافت کیا ہے؟

اصل ارشاد میں اذا ضربتم فی الارض ہے جس کے لفظی معنے ہیں جب تم زمین میں مارو۔ مراد یہ ہے کہ جب تم کہیں کا سفر کرو کیونکہ مسافر زمین پر پاؤں، لاٹھی اور اپنے سواریوں کے پاؤں زمین پر مارتا ہے جیسے زمین پر گزرنے کے لیے طرق الارض اس مناسبت سے بولتے ہیں کہ گویا رہرو زمین پر ہتھوڑا مارنا چاہتا ہے۔

اس موقع پر ضربتم فی الارض فرمایا ہے جبکہ اس سے پہلے آیت میں ضربتم فی سبیل اللہ فرمایا تھا کیونکہ جو حکم یہاں بیان ہو رہا ہے وہ ہر مسافر کے لیے ہے خواہ اس کا سفر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

راہ خدا میں ہو یا نہ ہو مثلاً تجارت اور سیاحت کی خاطر ہو اس سے ان لوگوں کے استدلال کی کمزوری معلوم ہوتی ہے کہ آیت میں جو حکم دیا جا رہا ہے ان کے لیے ہے جن کا سفر فی سبیل اللہ ہو جیسے جہاد، حج، عمرہ، طلب علم وغیرہ، صحابہ میں عبداللہ ابن عمر، عبداللہ بن مسعود، تابعین میں عطا ابن ابی رباح کا یہی خیال ہے اور ائمہ میں سے امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں کہ ناجائز غرض کے لیے جو سفر کیا جائے اس میں قصر کی اجازت نہیں ہے اور فقہ جعفری کے ترجمان ابوجعفر الصدوق ابن بابویہ القمی کہتے ہیں کہ جس کا سفر معصیت کا ہو اسے نماز کو قصر کرنے کی اجازت نہیں ہے دیکھو من لا یحضرہ الفقیہ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ قصر ہر سفر میں کیا جا سکتا ہے کیونکہ قرآن میں ضربتم فی الارض آیا ہے ضربتم فی سبیل اللہ نہیں ہے باقی رہی سفر کی نوعیت وہ اپنی جگہ اچھی اور بری ہو سکتی ہے مگر سفر کے اچھے اور برے ہونے کا نماز پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا۔

اگرچہ ضرب فی الارض کی تعبیر مطلق سفر کے لیے ہے اور قرآن نے اس کی کوئی تحدید نہیں کی ہے بلکہ جیسا کہ قرطبی نے لکھا ہے کہ

سفر کی تحدید نہ قرآن میں مذکور ہے اور نہ سنت میں اس کا ذکر آیا ہے لیکن علما نے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک ارشاد سے یہ معلوم کیا ہے کہ سفر کی مدت اتنی مسافت ہے جو متوسط چال سے تین دن میں طے ہو متوسط چال سے مراد آدمی یا اونٹ کی متوسط رفتار ہے۔ تین دن کی مسافت سے یہ مراد ہے کہ صبح سے دوپہر تک چلے - ارشاد نبوت یہ ہے :

یمسح المقیم یوما و لیلۃ والمسافر ثلاثۃ ایام ولیالیھا

مقیم ایک دن رات مسح کرے اور مسافر تین دن رات مسح کرے۔

اس سے استدلال اس طرح کیا گیا ہے کہ اس ارشاد میں مسافر کے لیے مسح کی مدت تین دن رات بتائی گئی ہے یہی مدت سفر ہے یعنی اتنی مسافت پر جانے والے کو مسافر کہتے ہیں۔ امام مالک نے مدت سفر ایک دن رات بتائی ہے ان کا استدلال اس ارشاد نبوت سے ہے جس میں آپ نے عورت کو ایک دن سے نامحرم کے ساتھ سفر سے منع فرمایا ہے ارشاد یہ ہے۔

لا یحل لامرأۃ تؤمن باللہ والیوم الاخر ان تسافر مسیرۃ یوم الا مع ذی محرم منھا

کسی عورت کے لیے بغیر محرم کے ایک روز کی مسافت پر سفر کرنا جائز نہیں۔

ان کے خیال میں پورے دن کا چلنا مراد ہے۔ امام حسن اور امام محمد بن شہاب زہری کہتے ہیں کہ مسافت اتنی ہو کہ دو دن میں قطع ہو جائے۔ انہوں نے یہی ارشادِ نبوت سے استدلال کیا ہے۔ امام مالک کی ہمنوائی میں امام احمد، امام شافعی، لیث، اوزاعی اور اسحاق بن راہویہ نے کہا ہے۔ احناف سے جن بزرگوں نے فرسنگ کا اعتبار کیا ہے ان کے نزدیک قصر کے لیے کم از کم ۴۵ میل کا سفر ضروری ہے۔ مولانا عبدالشکور[1] نے ۳۶ میل لکھا ہے۔ مولانا مودودی نے ۴۵ میل بتایا ہے۔ اصل مذہب حنفیہ کا یہ ہے کہ تین دن کا سفر ہو۔ قرطبی نے امام مالک کی ترجمانی کرتے ہوئے فرسنگ کے اعتبار سے ۱۶ فرسنگ بتائے ہیں یہی چار برید ہیں اور میلوں کے اعتبار سے ۴۶، ۴۵، اور ۳۶ میل تک کا حساب درج کیا ہے۔ اس لحاظ سے قصر کی مسافت سے ائمہ اربعہ اور فقہاءِ محدثین کے درمیان اس موضوع پر فی الواقع اختلاف رائے نہیں ہاں البتہ ان اہلِ ظاہر سے اختلاف ہے جو کہتے ہیں کہ قریب بعید ہر سفر میں قصر جائز ہے۔ شوکانی نے اس معاملہ میں بڑی فراخ دلی سے ایک میل کم از کم بتایا ہے اور ایک میل کی پابندی بھی اس لیے لگائی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بقیع قبرستان میں جاتے تھے تو قضائے حاجت کے لیے دور نکل جاتے مگر ان حالات میں آپ سے قصر ثابت نہیں ہے۔

سفر میں قصر کی نوعیت کیا ہے؟

قصر کے معنے لغت میں تضییق یعنی تنگ کرنے کے ہیں۔ کچھ کی رائے میں قصر کے معنے کسی چیز کا اس کی اصل سے ملانا ہیں۔ ابن الجوزی نے قصر کی تفسیر نقص یعنی کمی کرنے سے کی ہے۔ لیکن اہلِ تفسیر ولغت میں سے کسی نے ان کی ہمنوائی نہیں کی ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ قصرِ صلاۃ کے معنے یہ ہیں کہ بموجب رخصت نماز کی بعض رکعتوں یا بعض ارکان کو ترک کر کے نماز کو قصیر کوتاہ کر لیا جاتا ہے اسی لیے آیت میں قصر کی تفسیر دو طرح کی گئی ہے ایک یہ کہ تعدادِ رکعات میں قصر ہے یعنی چار رکعت کی نماز کو دو رکعت کر لینا، دوسرے یہ کہ قصر سے مراد نماز کی ادائیگی میں تخفیف کرنا ہے بایں طور کہ رکوع وسجود کی جگہ ایماء واشارہ پر اکتفا کیا جائے۔ عام شارحین قرآن کا کہنا ہے کہ قصر سے مقصود چار رکعت کی نماز کو دو رکعت پڑھنا ہے لیکن حضرت شاہ ولی اللہ نے دوسری رائے کو اختیار کیا ہے۔ چنانچہ فتح الباری میں فرماتے ہیں:

---

[1] علم الفقہ

مشہور آنست کہ ایں آیت در صلاۃ مسافر است و خوف قید اتفاقی است و
آنچہ نزد ایں بندہ رجحان یافتہ است آنست کہ ایں آیت در صلاۃ خوف
نازل شدہ است و سفر قید اتفاقی است و مراد از قصر قصر در کیفیت رکوع
و سجود است کہ بایما ادا تواں کرد نہ در کمیت رکعات ۔ واللہ اعلم ۔

بہرحال جمہور یہی کہتے ہیں کہ قصر سے مراد تعداد رکعات کو کم کرنا ہے اور آیت میں سفر کی نماز مراد ہے ۔ پھر ان میں اس موضوع پر اختلاف ہے کہ جس قصر کا مسافر سے اس آیت میں مطالبہ کیا گیا ہے اس کی نوعیت کیا ہے ؟ کچھ کہتے ہیں کہ قصر کرنا ضروری نہیں ہے محض اجازت ہے ۔ آدمی چاہے پوری پڑھے اور چاہے قصر کرلے ۔ یہ امام شافعی کی رائے ہے اگرچہ وہ قصر کرنے کو افضل اور قصر نہ کرنے کو خلاف اولیٰ کہتے ہیں ۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک قصر کرنا فرض ہے اور اشہب کی روایت میں یہی امام مالک کا مذہب ہے ۔ حدیث سے ثابت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیشہ سفر میں قصر کیا ہے چنانچہ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں :

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حالتِ سفر میں مدینہ کی واپسی تک چار رکعت والی نماز قصر کرتے تھے اور آپ سے کبھی سفر میں پوری نماز ثابت نہیں ہے ۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ابوبکر اور عمر اور عثمان کے سفروں میں رہا ہوں اور کبھی نہیں دیکھا کہ آپ نے قصر نہ کی ہو ، اسی کی تائید میں ابن عباس اور دوسرے متعدد صحابہ سے بھی روایات منقول ہیں ۔

اس موضوع پر سارے دفترِ حدیث میں صرف دو صحابی کا عمل اس کے خلاف ہے ایک حضرت عائشہ دوسرے حضرت عثمان ۔ حضرت عائشہ کے بارے میں تو حافظ ابن تیمیہ نے اعلان کر دیا کہ

یہ سب غلط ہے ام المومنین حضور انور اور جمیع صحابہ کے خلاف ہرگز نہیں کر سکتی ہیں ۔ حضرت عائشہ سے جب یہ بیان صحیح طور پر ثابت ہے کہ آپ فرماتی ہیں کہ نماز دو دو رکعت فرض ہوئی تھی ۔ جب حضور نے مدینہ میں ہجرت فرمائی تو حضر کی نماز میں اضافہ ہو گیا ۔ سفر میں اصل ہی باقی رکھی گئی اس کے باوجود حضرت عائشہ کے بارے میں یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور سارے مسلمانوں کے خلاف نماز پڑھی ہو گی ۔ (زاد المعاد)

ہاں حضرت عثمان کے بارے میں یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ انہوں نے حج کے

بدایۃ المجتہد میں ابن رشد نے بتایا ہے اور خوارج کا بھی یہی مسلک ہے جیسا کہ قاضی ثناء اللہ نے تصریح کی ہے لیکن پوری اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ قصر کے لیے خوف شرط نہیں ہے۔ قرآن میں یہ شرط صرف پیش پا افتادہ احوال و ظروف کے تحت آئی ہے کیونکہ زمانۂ نزول میں حضور انور اور صحابہ کے سفر خوف کے اندیشوں سے بھرپور تھے۔ اس لیے شرط یہاں مؤثر نہیں ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کا تعامل گواہ ہے کہ آپ حالت سفر میں بھی قصر فرماتے تھے اور نماز قصر کرتے تھے اور پھر یہ بات تاریخ و روایت میں صاف ہو چکی ہے جیسا کہ صحیح مسلم میں ہے کہ یعلی ابن امیہ کہتے ہیں کہ :

میں نے حضرت عمر سے دریافت کیا کہ قرآن کی اس آیت میں قصر کے لیے خوف کی شرط ہے۔ اب تو امن و امان ہو چکا ہے۔ حضرت عمر نے فرمایا کہ مجھے بھی اس پر حیرت تھی اور اپنی اس حیرت کا اظہار بارگاہ نبوت میں کیا تھا، آپ نے فرمایا تھا کہ عمر! یہ اللہ کی جانب سے صدقہ ہے اللہ نے خیرات کی ہے، اللہ کی خیرات کو قبول کر لینا چاہیے۔

قرآن میں ایسی بہت مثالیں ہیں کہ شرط احوال و وقائع کے تحت آتی ہیں۔ احوال و وقائع کے بدلنے سے شرط بے جان ہو کر رہ گئی لیکن اصل حکم اپنی جگہ باقی رہا۔ ان خفتم کی شرط صرف آیت کے موقع نزول کے اعتبار سے اس علت کو ظاہر کر رہی ہے جس کی بنا پر قصر کی مشروعیت آئی ہے۔ اس سے یہ بات نہیں نکلتی کہ یہ خوف ہی کے ساتھ مخصوص ہے۔ عبداللہ ابن عمر نے اُمیہ ابن خالد کو جو جواب دیا تھا وہ اس باب میں قول فیصل ہے:۔

امیہ ابن خالد نے عبداللہ بن عمر سے دریافت کیا کہ قرآن میں حضر کی نماز بھی ہے نماز خوف بھی ہے لیکن سفر کی نماز قرآن میں نہیں ہے۔ عبداللہ بن عمر نے فرمایا بھائی اللہ نے حضور انور کو مبعوث فرمایا اور ہم علم سے بے بہرہ تھے ہم تو وہی کچھ کرتے ہیں جو ہم نے حضور کو کرتے دیکھا ہے۔

نماز میں قصر کی تاریخ کا مسئلہ

حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ

اللہ سبحانہٗ نے نماز دو دو رکعت فرض کی تھیں۔ پھر جب حضور نے مدینہ ہجرت فرمائی تو

موقعہ پر منٰی میں چار رکعت نماز پڑھائیں ہیں۔ یہ حضرت عثمان کا منفرد عمل ہے۔ ابن القیم نے زادالمعاد میں حضرت عثمان کے اس عمل کی چھ تاویلیں پیش کی ہیں۔ ان میں سب سے اچھی توجیہ ان کے خیال کے مطابق اور خود حنفیہ اور مالکیہ کی رائے کے مطابق یہ ہے کہ جب صحابہ نے اعتراض کیا تو حضرت عثمان نے ان کو یہ کہہ کر خاموش کرنے کی کوشش کی ہے چونکہ مکہ میں شادی کرلی ہے اور چونکہ میں نے حضور سے سنا ہے جو شخص کسی شہر میں متأہل ہوا ہو وہ گویا اس شہر کا باشندہ ہے اسے نماز پوری کرنی چاہیے اس لیے میں نے یہاں قصر نہیں کیا۔

مسئلہ فقہی یہی ہے اور تاریخی بھی، تفصیلات تو فقہ و روایت کی کتابوں میں ہیں مگر اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ جیسا کہ ابوداؤد وغیرہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جس سال پہلی بار حضرت عثمان نے بجائے قصر کے پوری نماز پڑھانے کا ارادہ کیا، بیان کیا جاتا ہے کہ اس سال دور دور کے دیہاتی مسلمانوں کا مجمع غیر معمولی طور پر اکٹھا ہوگیا تھا حضرت عثمان کو بعض ذرائع سے غالباً یہ چیزیں پہنچائی گئیں کہ عرفات و مزدلفہ کی قصر کی نمازوں کو کچھ دیہاتیوں نے اپنے علاقوں میں یہ پھیلا دیا ہے کہ نمازیں دو دو رکعت ہی ہیں، دلیل میں یہ بات پیش کرتے ہیں کہ ہم نے خود خلیفہ کے پیچھے ظہر کی دو عصر کی دو اور عشا کی بھی دو رکعت پڑھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ اگر ناواقف دیہاتیوں کو اس سے مغالطہ ہوا ہو تو کوئی تعجب کی بات نہیں ہے مقصود اسی غلط فہمی کا ازالہ تھا۔ بہرحال وجہ کچھ ہو حضرت عثمان کے عمل کے سوا سفر میں نماز پوری کرنے کا کوئی عمل نہیں ہے۔

بعض ائمہ نے فلیس علیکم جناح کوئی مضائقہ نہیں کا مفہوم یہ سمجھا ہے کہ سفر میں قصر کرنا ضروری نہیں ہے لیکن ان کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے۔ ایسی ہی تعبیر آپ البقرہ میں مناسک حج کے موضوع پر پڑھ چکے ہیں۔ سعی بین الصفا والمروہ کے بارے میں آیا ہے فلاجناح علیہ ان یطوف بھما صفا و مروہ کی سعی میں کوئی مضائقہ نہیں حالانکہ یہ سعی مناسک حج میں ہے اور واجب ہے۔ دراصل دونوں جگہ لوگوں کے اس اندیشہ کو دور کرنا مقصود ہے کہ ایسا کرنے سے کہیں کوئی گناہ تو نہ ہوگا۔

آیت میں خوف کی قید کی توضیح

اس پر علما کا اتفاق ہے کہ نماز کے قصر میں سفر بالذات مؤثر ہے۔ اس کے لیے کسی شرط کی ضرورت نہیں، صرف حضرت عائشہ کی رائے ہے کہ سفر میں قصر کی شرط خوف ہے۔ جیسا کہ

اقامت کی نماز میں اضافہ ہوا اور نمازِ سفر پہلی ہی رکھی گئی ۔

اور صحیح بخاری میں ہے :

نماز دو رکعت فرض ہوئی تھی پھر ہجرت کے بعد چار رکعت فرض ہوئی۔

علامہ دولابی نے حضرت کے اس بیان کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ نماز کی چار رکعتیں منگل کے دن ۱۲ ربیع الثانی سنہ ۲ھ کو فرض ہوئیں ۔ تاریخ خمیس اور سیرۃ مغلطائی میں بھی ایسا ہی ہے الروض الانف میں علامہ ابوالقاسم السہیلی نے بھی یہی لکھا ہے ۔ اصل یہ ہے کہ معراج کی رات میں سوائے مغرب کے ساری نمازیں دو رکعت فرض ہوئیں پھر ہجرت کے بعد ظہر، عشا اور عصر میں اضافہ ہوا۔ مغرب اور فجر اپنے حال پر رہیں۔ حافظ عسقلانی رقمطراز ہیں کہ ابن الاثیر کا دعویٰ ہے کہ سفر میں نماز کا قصر سنہ ۴ھ میں ہوا۔ دولابی سنہ ۲ھ بتاتے ہیں۔ لیکن سابقہ حدیث عائشہ پر یہاں شاید ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ یہ حدیث عائشہ کہتی ہے کہ سفر کی نماز دو ہی فرض ہوئی ہے جبکہ قرآن یہاں کہہ رہا ہے کہ نماز قصر کرو۔ اس کے جواب میں پسندیدہ بات وہی ہے جو حافظ عسقلانی نے لکھی ہے کہ نمازیں تو دو رکعت کی صورت میں معراج ہی میں فرض ہوئی تھیں۔ پھر فجر و مغرب کے علاوہ ہجرت کے بعد اضافہ ہوا۔ اس کے بعد سنہ ۴ھ میں نماز میں قصر کا حکم آیا۔ دوسری احادیث بھی اس کی مؤید ہیں۔ مثلاً صحیح مسلم میں عبداللہ بن عباس کا یہ بیان کہ اللہ سبحانہٗ نے تمہارے نبی کی زبان پر سفر میں دو رکعتیں فرض کی ہیں جیسا کہ حضر میں چار رکعتیں فرض کیں اور نسائی میں بسندِ صحیح حضرت عمر رضی اللہ عنہٗ کا بیان ہے، نمازِ سفر تمہارے نبی کی زبان پر دو رکعت ہیں پوری کی پوری — ان بیانات کا منشا یہ واضح کرتا ہے کہ سفر میں نماز کا قصر رخصت نہیں بلکہ اصل فرض ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قول و عمل نے قرآن کے چہرۂ اجمال سے نقاب اٹھائی ہے ۔

جنگ میں نمازِ خوف کی ترکیب

۱۵۸- اور اے پیغمبر جب تم مسلمانوں میں موجود ہو اور تم ان کے لیے نماز قائم کرو تو چاہیے کہ فوج کا ایک حصہ تمہارے ساتھ کھڑا ہو جائے اور اپنے ہتھیار لیے رہے پھر جب وہ سجدہ کر چکے تو پیچھے ہٹ جائے اور دوسرا حصہ جو نماز میں شریک نہ تھا وہ تمہارے ساتھ نماز میں شریک رہے اور پوری طرح چوکنا رہے اور اپنے ہتھیار لیے رہے، جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان کی دلی تمنا ہے کہ تم اپنے ہتھیار اور سامانِ جنگ سے ذرا بھی غفلت کرو تو ایک بارگی

تم پر ٹوٹ پڑیں۔ پہلے نمازِ سفر کا بیان تھا یہ نمازِ خوف کا بیان ہے یعنی کافروں کی فوج مقابلہ میں ہو تو مسلمانوں کی فوج دو حصے ہو جائے ایک حصہ امام کے ساتھ آدھی نماز پڑھ کر دشمن کے مقابلے میں جا کر کھڑا ہو جائے' دوسرا حصہ آ کر امام کے ساتھ نصف باقی پڑھ لے۔ امام کے سلام کے بعد دونوں جماعتیں اپنی باقی نماز جُدا جُدا پڑھ لیں۔ اگر مغرب کی نماز ہو تو اوّل جماعت دو رکعت اور دوسری جماعت ایک رکعت امام کے ساتھ پڑھے اور اس حالت میں نماز کے اندر آمد و رفت معاف ہے اور تلوار زرہ سپر کے اپنے ساتھ رکھنے کی بھی ہدایت فرمائی" تاکہ کفار موقع پا کر یک بارگی حملہ نہ کر دیں۔ [1]

صلوٰۃ خوف چونکہ دراز دامن موضوع ہے اس لیے ہم ناظرینِ معالم القرآن کی سہولت کے لیے سمیٹنے کی کوشش کریں گے۔ ہمیں اس سلسلے میں ان سوالات کا جواب دینا ہے۔

۱۔ نمازِ خوف کی ابتداء روایتی اور تاریخی حیثیت سے کب ہوئی اور اس کا حکم۔

۲۔ نمازِ خوف کی مشروعیت وقتی تھی یا دائمی ہے۔

۳۔ نمازِ خوف کے لیے سفر شرط ہے یا عام حالات میں بھی جائز ہے۔

۴۔ کیا نمازِ خوف میں خوف رکعات کی تعداد پر اثر انداز ہوتا ہے۔

۵۔ نمازِ خوف کی کہانی تاریخ کی زبانی اور اس کی صورتیں۔

۶۔ نمازِ خوف کی ادائیگی کے لیے شرائط کیا ہیں۔

نمازِ خوف کی تاریخ اور اس کا حکم

جمہور علماء اس پر متفق ہیں کہ نمازِ خوف سب سے پہلے غزوۂ ذات الرقاع میں پڑھی گئی۔ یہ غزوہ کب ہوا اس میں اربابِ سیرۃ کا اختلاف ہے۔ ابن اسحاق اور دوسرے اصحابِ سیر و مغازی اس غزوہ کو غزوۂ خندق سے پہلے کہتے ہیں مگر حافظ ابن القیم لکھتے ہیں کہ یہ صحیح نہیں ہے اس لیے کہ امام احمد اور اربابِ سنن ابو عیاش الزرقی سے اور ترمذی میں حضرت ابو ہریرہ سے روایت کرتے ہیں کہ صلوٰۃ خوف پہلے پہلے غزوۂ عسفان میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھی ہے۔ ان دونوں روایتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ضجنان اور عسفان کے درمیان اترے تھے اور کفار کے لشکر کی قیادت خالد بن الولید کر رہے تھے۔ مسلمان ظہر کی نماز سے فارغ ہوئے تو کفار نے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

افسوس کیا کہ ہم نے ایک موقع کھو دیا۔ پھر خالد نے کفار سے مشورہ کیا کہ عصر کی نماز مسلمانوں کو اپنے مال و اولاد سے بھی زیادہ عزیز ہے۔ جب یہ لوگ عصر کی نماز شروع کریں تو متفقہ حملہ کر دیا جائے حضرت جبرئیل نے حضور کو اس مشورے کی خبر دی اور صحابہ کو جمع کر کے صلاۃ خوف پڑھنے کا حکم دیا اور پھر صحیحین میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت ہے کہ وہ غزوۂ ذات الرقاع میں شریک تھے اور مسند امام احمد اور سنن میں روایت ہے کہ مروان بن الحکم کے سامنے حضرت ابوہریرہ نے بیان کیا کہ ہم نے صلاۃ خوف غزوہ نجد میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ پڑھی ہے اور حضرت ابوہریرہ غزوۂ خیبر کے قریب مسلمان ہوئے اور ابوموسیٰ اشعری غزوۂ خیبر کے بعد مدینہ آئے تو اگر ذات الرقاع خندق سے بھی پہلے تھا تو یہ لوگ کیوں کر شریک ہوتے اس لیے غزوہ ذات الرقاع بلاریب غزوہ عسفان اور غزوۂ خیبر کے بعد ہوا۔ امام بخاری کا صحیح میں میلان اسی طرف ہے اور حافظ عسقلانی کی رائے بھی یہی ہے اور یہ مسئلہ بھی اتفاقی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ خندق میں نماز خوف نہیں پڑھی۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں یہ بات جزم و یقین کے ساتھ کہی جا سکتی ہے کہ غزوہ ذات الرقاع بنو قریظہ سے جنگ کے بعد ہوا کیونکہ یہ بات ثابت ہے کہ غزوہ خندق میں نماز خوف کی مشروعیت نہ ہوئی تھی۔ صاحب ہدایہ نے غزوۂ خندق کے واقعہ سے اپنے اس موقف پر استدلال کیا تھا کہ دوران نماز میں قتال ناجائز ہے اس پر حافظ زیلعی نے ان کا تعاقب کیا اور کہا کہ صاحب ہدایہ کا یہ استدلال محل نظر ہے کیونکہ نماز خوف تو مشروع ہی غزوۂ خندق کے بعد ہوئی ہے۔ قاضی عیاض شفا میں رقمطراز ہیں۔ صحیح اور پایہ دار بات یہی ہے کہ خندق کا واقعہ نماز خوف مشروع ہونے سے پہلے ہوا ہے شیخ ابن الہمام نے بھی تصریح کی ہے کہ صحیح یہی ہے کہ نماز خوف غزوۂ خندق کے بعد مشروع ہوئی ہے،

نماز خوف کا حکم اس صورت کے لیے جبکہ دشمن کے حملہ کا خطرہ تو ہو مگر عملاً معرکہ قتال گرم نہ ہو جنگ ہونے کی حالت میں حنفیہ کے نزدیک نماز مؤخر کی جائے گی۔ امام مالک اور امام ثوری کے نزدیک اگر رکوع و سجود ممکن نہ ہو تو اشاروں سے پڑھ لی جائے گی۔ امام شافعی کے نزدیک نماز ہی کی حالت میں تھوڑی مار دھاڑ بھی کی جا سکتی ہے اور کھایا پیا بھی جا سکتا ہے۔

نمازِ خوف کی مشروعیت وقتی تھی یا دائمی ہے

جمہور ائمہ کا خیال یہی ہے کہ نمازِ خوف کی مشروعیت دائمی ہے کیونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد صحابہ کے تعامل سے نمازِ خوف کا مختلف جنگوں میں پڑھنا ثابت ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ

نے نمازِ خوف پڑھی ہے۔ ابوموسیٰ اشعری نے اصفیان میں نمازِ خوف پڑھی۔ سعید بن العاص طبرستان میں مجوسیوں سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ آپ کی ہمرکابی میں جماعتِ صحابہ حضرت حسن، حضرت حسین، حضرت حذیفہ، حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عبداللہ بن عباس، حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت عبداللہ بن الزبیر موجود ہیں، سعید نے دریافت کیا کہ آپ میں کون ہے جس نے حضور کے ساتھ نمازِ خوف پڑھی ہے؟ حضرت حذیفہ نے اپنے کو پیش کیا، حضرت حذیفہ ہی نے نماز پڑھائی۔ کاشانی رقمطراز ہیں کہ اس طرح حضور کے بعد نمازِ خوف کے جواز پر صحابہ کا اجماع ہو چکا ہے لیکن امام ابو یوسف، حسن بن زیاد اور شافعیہ میں امام مزنی اور ابراہیم بن علیہ کا خیال ہے کہ نمازِ خوف صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ کے لیے مخصوص تھی۔ ان بزرگوں کے اس خیال کی بنیاد قرآن میں اذا کنت فیھم فاقمت کے خطاب پر ہے۔ یعنی چونکہ قرآن نے نمازِ خوف کے جواز کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہونے کی شرط لگائی ہے اس لیے آپ کے بعد شرط معدوم ہونے کی وجہ سے نمازِ خوف کی کوئی گنجائش نہیں لیکن قرآن میں بکثرت مثالیں موجود ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ایک حکم دیا گیا ہے اور وہی حکم آپ کے بعد آپ کے جانشینوں کے لیے ہے اس لیے نمازِ خوف کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ خاص کر دینے کی کوئی وجہ نہیں۔ ابن العربی کہتے ہیں آپ کے ہونے کی شرط یہاں حکم کے لیے ہے نہ کہ وجودِ صلاۃ کے لیے۔ بدایۃ المجتہد میں ابن رشد نے اور نصب الرایہ میں حافظ زیلعی نے اس پر پسندیدہ اور دلچسپ بحث کی ہے۔ بہرحال نمازِ خوف کی مشروعیت اُمت کے لیے آپ کے بعد بھی موجود ہے اور جب تک تصریح نہ ہو محض احتمالات سے خصوصیات کو ثابت نہیں کیا جا سکتا ہے اور معلوم ہے کہ یہاں کوئی ایسی تصریح نہیں ہے۔

کیا نمازِ خوف کے لیے سفر شرط ہے؟

جمہور کے نزدیک نمازِ خوف کے لیے سفر شرط نہیں۔ حالتِ اقامت میں شہر میں بھی خوف کے حالات پیدا ہو جائیں تو نمازِ خوف پڑھی جا سکتی ہے۔ صرف ابن الماجشون نے اس پر قدغن قائم کی ہے۔ الزرقانی نے ان کے موقف کی ترجمانی کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ اذا ضربتم فی الارض کے مفہوم کے سہارے ایسا کہتے ہیں، ورنہ امام شافعی، امام احمد اور امام ابوحنیفہ اور ان کے تلامذہ کی متفقہ رائے یہی ہے کہ نمازِ خوف کے لیے سفر کی شرط نہیں ہے۔ امام مالک کے بارے میں

اگرچہ عام شہرت یہی ہے کہ وہ نمازِ خوف کے جواز کے لیے سفر کو شرط قرار دیتے ہیں لیکن امام مالک کی طرف یہ نسبت صحیح نہیں ہے۔ امام نودی نے خبر نہیں یہ بات کہاں سے نکالی ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میرا اپنا خیال یہ ہے کہ شاید سمجھنے والوں نے المدونہ سے ایسا سمجھ لیا ہے۔ المدونہ میں ہے،

امام مالک فرماتے ہیں نمازِ خوف دو رکعت نہ پڑھے مگر وہ شخص جو سفر میں ہو حضر میں نہ پڑھے۔

اس سے مراد یہ نہیں ہے کہ نمازِ خوف حضر میں نہ پڑھی جائے بلکہ مقصد یہ ہے کہ نمازِ خوف حضر میں دو رکعت نہ پڑھی جائے۔ پابندی حضر میں قصرِ صلاۃ پر لگائی جا رہی ہے نہ کہ نمازِ خوف پر۔ المدونہ ہی میں اس کے بعد ان کا یہ ارشاد،

اگر حضر میں خوف کی حالت ہو تو چار رکعت نمازِ خوف کے مطابق پڑھیں قصر نہ کریں۔

صراحۃً کہہ رہا ہے کہ ان کا مقصد حضر میں نمازِ خوف پر قدغن لگانا نہیں ہے۔ ابن العربی نے احکام القرآن میں، قرطبی نے تفسیر میں، دردیر نے شرح کبیر اور دسوقی نے امام ملک کے اس موقف کی تشریح کی ہے۔

نمازِ خوف میں خوف کا تعدادِ رکعات پر اثر

قاضی ابوبکر بن العربی لکھتے ہیں کہ نمازِ خوف میں خوف رکعتوں کی تعداد پر قطعًا اثر انداز نہیں ہوتا ہے۔ عبداللہ بن عمر، ائمہ میں ابراہیم نخعی، ثوری، مالک، شافعی، ابوحنیفہ اور تمام اہلِ علم کی رائے یہی ہے۔ حنابلہ کے مسلک کی ترجمان الانوار الساطعہ میں ہے،

رکعات کی تعداد میں خوف قطعًا اثر انداز نہیں ہوتا بلکہ خوف صرف وصف و شرط پر اثر کرتا ہے۔

حنفی مسلک کی ترجمانی صاحبِ بدائع نے اس طرح کی ہے،

ہمارے نزدیک خوف کی وجہ سے رکعات کی تعداد کم نہ ہو گی۔ یہی عام صحابہ کرام کی رائے ہے۔

الشعرانی نے المیزان الکبریٰ میں لکھا ہے:

اس پر پوری امت کا اتفاق ہے کہ نمازِ خوف حضر میں چار رکعت اور سفر میں

دو رکعت ہے۔

صحابہ میں عبداللہ بن عباس کی یہ رائے ہے کہ نمازِ خوف ایک رکعت ہے اور ان کی ہمنوائی الحسن البصری، طاؤس یمانی، عطا بن ابی رباح اور مجاہد نے کی ہے۔ ابن قدامہ نے صحابہ میں سے زید بن ثابت، ابوہریرہ اور جابر بن عبداللہ کا بھی نام لیا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ جو لوگ نمازِ خوف میں ایک رکعت کہتے ہیں وہ صرف قتال کی حالت میں ایک رکعت مانتے ہیں علی الاطلاق نہیں۔ اور بعد والوں میں کچھ ایسے بھی ہیں جو ایک سجدہ ایک تکبیر ہی کو کافی بتلاتے ہیں چنانچہ ابن ابی شیبہ نے سعید بن جبیر وغیرہ کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ ان کا کہنا ہے کہ،

جب میدانِ جنگ میں گھمسان کا رن پڑ جاتے اور باہم مڈبھیڑ ہو جائے اور نماز کا وقت آجائے تو صرف سبحان اللہ، الحمدللہ، لاالہٰ الا اللہ اللہ اکبر ہی کہہ لینا کافی ہے۔

اور حافظ عسقلانی نے بتایا ہے کہ بس یہی ان کی نماز ہے اعادہ کی ضرورت نہیں ہے۔ ابن عباس نے غالباً قرآن کی بیان کردہ قیام جماعت کی تدبیر سے سمجھی ہے۔ قرآن نے یہاں یہ تدبیر بتائی ہے کہ ایک گروہ اسلحہ کے ساتھ امام کے پیچھے نماز کے لیے کھڑا ہو، دوسرا گروہ حفاظت کا فرض انجام دے۔ جب پہلا گروہ سجدہ کر چکے تو پیچھے ہٹ کر وہ حفاظت و نگرانی کا کام سنبھالے، اور دوسرا گروہ جس نے نماز نہیں پڑھی ہے امام کے پیچھے اسی مسلح حالت میں نماز کے لیے کھڑا ہو۔ اس صورت میں مقتدیوں اور امام کی نماز کی رکعتوں کی تعداد کیا ہو گی؟ ظاہر ہے کہ امام اگر مسافر ہے تو دو رکعت ہوئیں اور مقتدیوں کی ایک ایک رکعت ہوئی۔ ابن عباس نے مقتدی کی ایک رکعت کو پوری نماز سمجھ لیا ہے۔

نمازِ خوف کی کہانی تاریخ کی زبانی

ابن العربی نے لکھا ہے کہ حضور نے نمازِ خوف ۲۴ بار پڑھی ہے اور قاضی عیاض نے ان مقامات کی تفصیل بیان کی ہے۔ ابن القصار مالکی کہتے ہیں کہ حضور انور نے دس جگہ نمازِ خوف پڑھی ہے حافظ زیلعی فرماتے ہیں کہ کچھ فقہا نے بتایا ہے کہ حضور انور نے دس جگہ نمازِ خوف پڑھی ہے لیکن سیر و مغازی کے فنکاروں کے نزدیک ثابت صرف چار جگہ ہے، ذات الرقاع، بطن نخل، عسفان اور ذی قرد ذات الرقاع میں نمازِ خوف پڑھنے کا ذکر صحیح بخاری میں بحوالہ سہل بن ابی حثمہ میں ہے بطن نخلہ کی حدیث سنن نسائی میں بحوالہ جابر بن عبداللہ ہے۔ عسفان میں نمازِ خوف پڑھنے

کی حدیث ابوداؤد اور نسائی میں بحوالہ ابی عیاش الزرقی آئی ہے اور ذی قرد میں نماز پڑھنے کی حدیث بحوالہ عبداللہ بن عباس نسائی میں موجود ہے۔ ان ہی مقامات کی پڑھی گئی نماز خوف کی مختلف صورتیں حدیث کی کتابوں میں آئی ہیں، ابن القیم نے زادالمعاد میں لکھا ہے کہ اگرچہ نماز خوف کی صورتیں لوگوں نے ۱۰، ۱۴، ۱۶، ۲۴ تک بتائی ہیں لیکن اصول ۶ ہیں، باقی سب راویوں کا اختلاف ہے۔

نماز خوف کی کیفیت اور ترکیب کا دارو مدار بہت حد تک ان حالات پر ہے جن کے تحت یہ نماز پڑھی گئی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف حالات میں متعدد طریقوں سے نماز پڑھائی ہے۔ حدیث کی کتابوں میں صرف ابوداؤد کی سنن ایک ایسی کتاب ہے جس میں اس موضوع پر تفصیلی بحث کی گئی ہے۔ ابوداؤد نے گیارہ صورتیں نماز خوف کی لکھی ہیں۔ جواز کی حد تک سب فقہائے کے یہاں مقبول ہیں۔ اختلاف جو کچھ ہے وہ صرف اولایت میں ہے جواز میں نہیں ہے اس لیے امام وقت مجاز ہے کہ ان طریقوں میں سے جس طریقہ کی جنگی صورت حال اجازت دے اسے اختیار کرلے۔ لکھنے والوں نے لکھا ہے انما ھی صلاۃ ضرورۃ فتفعل بحال الضرورۃ حسب الامکان۔ یہ ضرورت کی نماز ہے اس کو ضرورت کے مطابق جیسے ممکن ہوگا کیا جائے گا۔ یہاں نماز خوف کی سب صورتیں تو نہیں ہم صرف چار صورتیں پیش کرتے ہیں۔ اوّل یہ کہ فوج کا ایک حصہ امام کے ساتھ نماز پڑھے اور دوسرا حصہ دشمن کے مقابلہ پر رہے۔ پھر جب ایک رکعت پوری ہوجائے تو پہلا حصہ چلا جائے اور دوسرا حصہ آکر دوسری رکعت امام کے ساتھ پڑھے اس کے بعد امام سلام پھیر دے اس طرح امام کی دو رکعتیں ہوتی ہیں اور فوج کی ایک ایک رکعت۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھ کر چلا جائے پھر دوسرا حصہ فوج کا آکر امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے پھر دونوں حصے باری باری سے آکر اپنی چھوٹی ہوئی نماز کی ایک ایک رکعت بطور خود ادا کرلیں۔ اس طرح دونوں حصوں کی ایک ایک رکعت امام کے پیچھے ہوگی اور ایک رکعت انفرادی طور پر۔ تیسرا طریقہ یہ ہے کہ امام کے پیچھے فوج کا ایک حصہ دو رکعتیں ادا کرے اور تشہد کے بعد سلام پھیر دے، پھر دوسرا حصہ تیسری رکعت میں آکر شامل ہو اور امام کے ساتھ دو رکعت پڑھے اور امام کے ساتھ سلام پھیر دے اس طرح امام کی چار اور فوج کی دو دو ہوں گی۔ چوتھا طریقہ یہ ہے کہ فوج کا ایک حصہ امام کے ساتھ ایک رکعت پڑھے اور جب امام دوسری رکعت کے لیے کھڑا ہو تو مقتدی بطور خود ایک رکعت مع تشہد پڑھ کر سلام پھیر دیں، پھر دوسرا حصہ آکر اس حال میں امام کے پیچھے کھڑا ہو کہ وہی امام دوسری رکعت میں ہو اور یہ لوگ بقیہ نماز امام کے ساتھ ادا

کرنے کے بعد ایک رکعت خود اٹھ کر پڑھ لیں۔
پہلی صورت کو ابن عباس اور جابر بن عبداللہ نے روایت کیا ہے۔ دوسرے طریقہ کو عبداللہ بن مسعود نے روایت کیا ہے اور احناف اسی کو ترجیح دیتے ہیں۔ تیسرے طریقے کو حسن بصری نے ابوبکرہ سے روایت کیا ہے اور چوتھے طریقے کو امام مالک اور امام شافعی نے تھوڑے سے اختلاف کے ساتھ ترجیح دی ہے اس کا ماخذ سہل بن حثمہ کی روایت ہے۔

نمازِ خوف کی ادائیگی کی شرطیں

نمازِ خوف کی ادائیگی کے لیے کچھ اہم اور بنیادی شرطیں ہیں۔ ان کے بغیر نمازِ خوف ادا کرنا جائز نہیں ہے مثلاً
اوّل یہ کہ جنگ جو کی جا رہی ہے وہ فی حدِ ذاتہٖ جائز ہو، اگر کچھ مسلمانوں نے اسلامی مملکت کی بغاوت کر دی تو ان مسلمان باغیوں کے لیے نمازِ خوف جائز نہیں ہے۔ یہ ائمہ کے درمیان اتفاقی ہے برخلاف نمازِ قصر کے کہ وہ جائز ہے خواہ سفر کیسا ہو کیونکہ اس میں مبنیٰ مشقت ہے اور بس۔
دوسرے یہ کہ دشمن موجود ہو، اگر دُور سے غبار دیکھ کر اندازہ کر لیا کہ دشمن آ رہا ہے اور نماز پڑھ لی، بعد کو معلوم ہوا کہ دشمن نہیں آ رہا ہے نماز نہیں ہوئی دوبارہ پڑھنی پڑے گی۔
تیسرے یہ کہ نمازِ خوف کی یہ صورت اس وقت ہے جب پوری فوج ایک ہی امام کی امامت میں نماز ادا کرنی چاہے۔ ہر سپاہی کی یہ آرزو ہو کہ ایک امام کے پیچھے پڑھے جیسے زمانۂ نبوت ہر شخص کی یہ آرزو تھی کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی امامت میں پڑھے۔ یہ آرزو ایک فطری آرزو تھی جس کا لحاظ ضروری تھا۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی ایک ہی امام کی اقتداء کی خواہش نہ تو اتنی شدید ہو سکتی ہے اور نہ اس کی اہمیت ہی ہے اس لیے دفاع کے تقاضوں کے مطابق اگر اہلِ لشکر الگ الگ اماموں کی اقتداء میں نماز پڑھیں تو پھر نماز اپنے طریقے پر پڑھی جاتے گی اور نمازِ خوف نہ پڑھی جائے گی حضور انور کے زمانے میں صحابہ کرام کی والہانہ عقیدت اور عقیدت کے ساتھ محبت کا جوش اس صورت کے اختیار کرنے کا باعث تھا۔ اس زمانے میں اوّل تو جنگ کی صورت ہی بالکل تبدیل ہو چکی ہے دوسرے یہاں حضورِ انور کی امامت نہیں اس لیے حالات کے تقاضے کے تحت قیامِ جماعت کی جو شکل اختیار کی جائے وہ اختیار کی جا سکتی ہے۔ افضل یہی ہے کہ ہر فوج کا حصہ مستقل امامت میں اگر مسافر ہے تو دو رکعت اور اگر مسافر نہیں تو پوری نماز پڑھے۔

دشمن کے مقابلے میں چوکنے رہنے کا حکم

۱۵۹۔ اور اگر تمہیں بارش کی وجہ سے کوئی تکلیف ہو یا تم بیمار ہو تو پھر تم پر گناہ نہیں ہے اگر ہتھیار اتار دو، لیکن اپنے بچاؤ کی طرف سے تمہیں غافل نہ ہونا چاہیے۔ بلاشبہ اللہ نے کفر پیشہ لوگوں کے لیے رسواکن عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یعنی اگر بارش، بیماری یا ضعف کی وجہ سے ہتھیار کا اٹھانا مشکل ہے تو ایسی حالت میں ہتھیار اتار کر رکھ دینے کی اجازت ہے لیکن اپنا بچاؤ کر لینا چاہیئے۔ مثلاً زرہ سپر خود ساتھ لے لو، اگر دشمنوں کے خوف سے اتنی بھی مہلت نہ ملے کہ نمازِ خوف بصورت مذکورہ ادا کر سکیں تو جماعت موقوف کر کے تنہا تنہا نماز پڑھ لیں۔ پیادہ ہو کر اور سواری سے اترنے کا بھی موقعہ نہ ملے تو سواری پر اشارے سے نماز پڑھ لیں اگر اس کی بھی مہلت نہ ملے تو پھر نماز کو قضا کر لیں[1]

پہلی آیت میں ہتھیار اور سامانِ حفاظت کو ہمراہ رکھنے کا حکم ہوا تھا یہاں فرمایا کہ دشواری کے وقت میں ہتھیار اتار دینے کی اجازت ہے لیکن بچاؤ سے کسی حال میں بے پروا نہ ہونا چاہیے۔

حذر کے اصل معنے کسی خطرے اور آفت سے بچنے کے ہیں لیکن اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ ان چیزوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو جنگ میں دشمن کے حملوں سے بچنے کے لیے استعمال ہوتی ہیں مثلاً زرہ بکتر، سپر خود وغیرہ، اس کا خاص استعمال تو دفاعی آلات ہی کے لیے ہے لیکن اپنے عام استعمال میں ان اسلحہ پر بھی بولا جاتا ہے جو حملے کے کام آتے ہیں مثلاً تیر تفنگ تلوار وغیرہ، یہاں پر بھی یہ لفظ اپنے عام مفہوم میں معلوم ہوتا ہے لیکن یہ لفظ جب اسلحہ کے ساتھ استعمال ہو جیسا کہ اس آیت میں ہے تو اس سے مراد صرف وہ چیزیں ہوتی ہیں جن کو ایک سپاہی اپنے دشمن سے بچاؤ کے لیے استعمال کرتا ہے۔ اس آیت سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ اسلام میں احتیاط کے تقاضوں سے بے پروا ہونے کی کسی حال میں بھی اجازت نہیں ہے۔ یہاں تک کہ بیماری اور بارش وغیرہ کی وجہ سے اگر اسلحہ اتارنے کے لیے مجبور ہی ہونا پڑے تو صرف اسلحہ اتار سکتا ہے۔ حذر یعنی حفاظتی نوعیت کی چیزوں سے پھر بھی بے پروا ہونے کی اجازت نہیں ہے۔

دراصل قرآن کی اس آیت میں ہمیں دفاعی سیاست کا ایک عظیم گر بتایا ہے۔ غور کیجئے کیا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام اسلحہ اور سامانِ جنگ کے اعتبار سے دشمنوں کے مقابلے

[1] افادات شیخ الاسلام

میں کبھی عشرِ عشیر ہی تھے۔ دفاعی سیاست کا منشا یہ ہے کہ اسلامی نصب العین کو ہم نے اپنایا ہے اور اس کے مطابق ہم جو زندگی کا خاکہ قائم کرنا چاہتے ہیں اس کے مفاد کے لیے دشمن سے جنگ کریں یعنی دفاعی سیاست کے تحت جنگ کا مقصد اپنے ملی مفاد کو دشمن سے منوانا ہے۔ یہ دفاعی سیاست جنگ کے نتائج حاصل کرنے میں بہت زیادہ موثر ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ تیاری ایسی ہو کہ جہاں تک ممکن ہو کم سے کم لڑائی لڑے بغیر دشمن کی فوج کا حوصلہ پست ہو جائے۔

اس آیت میں جہاد کی تلقین کر کے قرآن نے مسلمانوں کو سمجھایا ہے کہ اگر تم یہ چاہو کہ سیاسی اقتدار اور فرمانروائی کی باگ ڈور دوسروں کے ہاتھ میں چھوڑ کر گوشہ عافیت میں بیٹھ جاؤ۔ پھر بھی تمہارے اصول و اقدار جن کو تم نے قبول کیا ہے دنیا میں خود بخود غالب رہیں تو یہ کم فہمی اور کوتاہ نظری ہے ہاں تمہارا مقصد اصلی اخلاق کی اصلاح ہونا چاہیئے نہ کہ سیاسی طاقت کا حصول لیکن بہرحال اس طاقت کا حاصل کرنا ضروری ہے آخر میں فرمایا ان اللہ اعد للکافرین عذاباً مھینا۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تدبیر اور احتیاط اور اہتمام کے ساتھ کام کرو اور اللہ کے فضل سے امید رکھو وہ کافروں کو تمہارے ہاتھ سے ذلیل و خوار کرا دے گا۔ کافروں سے خوف مت کرو[1]

اس میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ ان کفار کی سرکوبی کے لیے جہاں تک تمہارا تعلق ہے، تم پوری طرح مستعد رہو ویسے اللہ نے تو ان کو ذلیل کرنے والا عذاب تیار کر ہی رکھا ہے[2]

یعنی یہ احتیاط جس کا تمہیں حکم دیا گیا ہے محض دنیوی تدابیر کے لحاظ سے ہے ورنہ در اصل فتح و شکست کا مدار تمہاری تدابیر پر نہیں بلکہ اللہ کے فیصلے پر ہے۔[3]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن [3] تفہیم القرآن

فَإِذَا قَضَيْتُمُ الصَّلٰوةَ فَاذْكُرُوا اللّٰهَ قِيٰمًا وَّقُعُودًا وَّعَلٰى جُنُوبِكُمْ ۚ
فَإِذَا اطْمَأْنَنْتُمْ فَأَقِيمُوا الصَّلٰوةَ ۚ إِنَّ الصَّلٰوةَ كَانَتْ عَلَى
الْمُؤْمِنِينَ كِتٰبًا مَّوْقُوتًا ﴿١٠٣﴾ وَلَا تَهِنُوا فِي ابْتِغَاءِ الْقَوْمِ ۖ
إِنْ تَكُونُوا تَأْلَمُونَ فَإِنَّهُمْ يَأْلَمُونَ كَمَا تَأْلَمُونَ ۚ وَتَرْجُونَ
مِنَ اللّٰهِ مَا لَا يَرْجُونَ ۗ وَكَانَ اللّٰهُ عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٠٤﴾ ع ۱۵ / ۱۲

پھر جب تم ایک رکعت نماز باجماعت ادا کر چکو تو اللہ کو کھڑے، بیٹھے، لیٹے یاد کرتے رہو[۱۶۰]۔ پھر جب مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو قائم کرو[۱۶۱]۔ بلاشبہ نماز اہلِ ایمان پر بقیدِ وقت فرض کی گئی ہے[۱۶۲] اور کمزوری و سستی نہ دکھاؤ اگر تم تکلیف سے دوچار ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھا رہے ہیں اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں، اللہ سب کچھ جانتا ہے اور وہ حکیم و دانا ہے[۱۶۳]۔

نماز اجتماعی زندگی کی اساس ہے

باطل کی شکست اور حق کی سربلندی کی خاطر لڑنا مسلمان کا فرض ہے اس فرض کو انجام دینے کے لیے ہر وقت تیار رہنا چاہیے۔ اس کی ایک تیاری وہ ہے جو آیت خذوا حذرکم کی ہدایت کی صورت میں بتائی گئی ہے اور ایک تیاری وہ ہے جس کا نقشہ ہماری روزانہ کی نمازیں پیش کرتی ہیں۔ چنانچہ ابوداؤد میں ہے:

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کا لشکر جب پہاڑی پر چڑھتا تو تکبیر اور جب نیچے اترتا تو تسبیح کہتا۔ نماز اسی طریقے پر قائم کی گئی۔

صف بندی، ایک افسر کی اطاعت، تمام سپاہیوں کی باہم محبت اور دستگیری اور ایک تکبیر کی آواز پر پوری صفوف کی حرکت اور نشست و برخاست نماز میں مسلمانوں کو صف بندی جنگ کے اوصاف سکھاتی ہے اور ان کے قوائے عمل کو بیدار کرتی ہے۔ سردیوں میں پانچ وقت وضو کرنا، ظہر کے وقت دھوپ کی شدت میں گھر سے نکل کر مسجد کو آنا، عصر کے وقت لہو و لعب کی دلچسپیوں سے وقت نکال کر خدا کو یاد کرنا، رات کو سونے سے پہلے دُعا و زاری کر لینا، صبح کو خوابِ سحر کی لذت کو چھوڑ کر حمد باری میں مصروف ہونا اس کے بغیر ممکن نہیں کہ ہم فرضی راحت و تکلیف سے بے پروا ہو کر عمل کی طاقت اپنے اندر پیدا کریں اور کام کے وقت احساس فرض کے تقاضے کو بجا لانا ضروری سمجھیں اور اس کے لیے عارضی تکلیفوں کی برداشت کا اپنے کو خوگر بنائیں۔ ہفتہ میں ایک دن نماز جمعہ کے لیے شہر کے سب مسلمانوں کا ایک جگہ جمع ہونا، دن رات کے پروگراموں میں آرام کے وقت ممکن نہ تھا مگر اس کے لیے بھی دوپہر کا وقت مقرر کیا گیا تاکہ اس اجتماع اور مظاہرے میں بھی مسلمان سپاہیانہ خصائص کے خوگر رہیں۔ نماز اسلام کی اجتماعی زندگی کی بنیادی اینٹ ہے۔ زمانۂ نبوت اور خلافت میں یہ قاعدہ تھا کہ جب کوئی اہم واقعہ پیش آتا یا کوئی سیاسی یا اجتماعی مشکل پیدا ہوتی تو مسلمانوں میں منادی کرائی جاتی تھی کہ الصلاۃ جامعۃ سب لوگ وقت پر جمع ہو جاتے اور اس اہتمام سے اطلاع پاتے یہ گویا مسلمانوں کے اجتماعی، سیاسی مسائل کے مخلصانہ حل کا ذریعہ تھا جس کے لیے نماز کے تعلق سے ہر مسلمان کا جمع ہونا ضروری تھا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نمازِ اسلام کا اولین شعائر اور اس کے اجتماعی و تمدنی و سیاسی و اخلاقی مقاصد کی آئینہ دار ہے اسی کی شیرازہ بندی سے مسلمانوں کا شیرازہ بندھا تھا اور اسی کی گرہ کھل جانے سے اس کی نظم و جماعت کی ہر گرہ کھل گئی تھی۔ کسی

قوم کی زندگی اس کے نظم جماعت کے بغیر قائم نہیں رہ سکتی یہی گرہ جب کھل جاتی ہے تو قوم کا شیرازہ منتشر اور پارہ پارہ ہو جاتا ہے۔ اسلام میں نماز باجماعت مسلمانوں کی زندگی کی عملی مثال ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی عملی مثال کو عربوں کے سامنے پیش کرکے ان کی زندگی کا خاکہ کھینچا اور بتایا کہ مسلمانوں کا صف بصف کھڑا ہونا ایک دوسرے کے شانہ سے شانہ ملانا اور یکساں حرکت و جنبش کرنا ان کی قومی زندگی کی مستحکم و مضبوط دیوار کا مسالہ ہے۔

۱۶۰۔ پھر جب تم نماز ایک رکعت باجماعت ادا کر چکو تو اللہ کو کھڑے، بیٹھے اور لیٹے یاد کرتے رہو۔ یعنی خوف کے وقت بوجہ تنگی اور بے اطمینانی اگر نماز میں کسی طرح کی کوتاہی ہوگئی تو نماز خوف سے فراغت کے بعد ہر وقت ہر حالت میں کھڑے ہو یا بیٹھے یا لیٹے اللہ کو یاد کرو حتیٰ کہ عین ہجوم اور مقاتلہ کے وقت بھی کیونکہ وقت کی تعیین اور دیگر قیود کی پابندی تو بحالت نماز تھی جن کی وجہ سے تنگی اور بے اطمینانی پیش آنے کا موقع ہے اس کے سوا ہر حالت میں بلا قید اللہ کو یاد کرسکتے ہو، کسی حالت میں اس کی یاد سے غافل نہ رہو۔ عبداللہ ابن عباس نے اس آیت کے ذیل میں فرمایا کہ صرف وہ شخص جس کے عقل و حواس کسی وجہ سے مغلوب ہو جائیں البتہ معذور ہے ورنہ کوئی شخص اللہ کی یاد کرنے میں معذور نہیں۔[1]

عام شارحین قرآن نے آیت کی یہی تشریح کی ہے۔ آلوسی لکھتے ہیں جب تم نماز خوف کو بیان کردہ طریقہ کے مطابق ادا کرکے فراغت حاصل کر لو تو اللہ کے ذکر پر مداومت کرو۔ قرطبی فرماتے ہیں جب تم نماز خوف سے فراغت پالو تو اللہ کو زبان اور دل سے یاد کرو اور اس پر مداومت کرو۔ ابن کثیر فرماتے ہیں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نماز خوف کے بعد زیادہ ذکر کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔ امام رازی نے بھی اولیت اسی کو دی ہے، فرماتے ہیں کہ جب نماز خوف ادا کر چکو تو سارے احوال میں اللہ کے ذکر پر مداومت کرو۔ ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں جب نماز خوف سے فارغ ہو جاؤ تو اللہ کو یاد کرو۔ علامہ شوکانی فرماتے ہیں جب تم نماز خوف سے فارغ ہو جاؤ تو ان حالات میں اللہ کو یاد کرو۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ تم جب نماز خوف ادا کر چکو تو سارے حالات میں اللہ کے ذکر پر ہمیشگی کرو، اور نواب صدیق حسن خاں رقمطراز ہیں کہ جب تمہیں نماز خوف سے فراغت ہو جائے تو اللہ کو خوب یاد کرو۔ اردو کے شارحین قرآن میں سے بلا استثنا سبھی نے لفظ بلفظ یہی لکھی ہے۔ شارحین میں سے صرف زمخشری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نے اس آیت قرآنی کی دوسرے انداز میں تشریح کی ہے۔ پہلی آیات میں نمازِ خوف کی جو ترکیب بتائی گئی ہے اسی پر فا کے ذریعے تفریع کی ہے کہ اس طرح جنگ کی حالت میں نماز میں ایک رکعت امام کے ساتھ باقاعدہ ادا کرنے کے بعد دوسری رکعت اس طرح ادا کرو۔ اس طرح آیت کا ترجمہ یوں ہوگا کہ امام کے ساتھ ایک رکعت باجماعت ادا کرنے کے بعد باقی نماز کھڑے بیٹھے اور لیٹے پڑھ لو۔ اس صورت میں قضا کے معنے ادا کرنے اور ذکر کے معنے نماز کے ہیں۔ قیاماً یعنی کھڑے ہو کر تلوار چلاتے ہوئے، قعوداً بیٹھ کر یعنی گھٹنوں کے بل کمان تیر چلاتے وعلیٰ جنوبھم اپنے پہلوؤں پر یعنی زخموں سے چور ہو کر خون بہاتے ہوئے اس طرح اس آیت میں ایک رکعت جو باقاعدہ ادا ہوتی اس کو الصلوٰۃ کہا گیا اور دوسری رکعت جو خدا کا نام اللہ اکبر، بیٹھ کر جھک کر لیٹے اور لڑائی حملہ اور مدافعت کی حالت میں ہوئی اس کو ذکر اللہ کہا گیا ہے۔ اس طرح یہ آیت البقرہ کی آیت کے مطابق ہو گئی جس میں بتایا گیا ہے کہ اگر جنگ دشمن خوف سے موقعہ نہ ملے تو پھر جس طرح ممکن ہو کھڑے ہی کھڑے ادا کر لو۔ رکوع اور سجدہ کا موقعہ نہ ہو تو اشارہ ہی سے ادا کر لو قبلہ کی جہت نہ ہو تو کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ یہی حال سوار کا ہے۔ میری مراد یہ آیت ہے

فان خفتم فرجالاً او رکباناً

پہلے مطلب کی صورت میں جو عام شارحین قرآن نے اختیار کیا ہے لفظ قضا فراغت کے معنے میں ہے اور ذکر اپنے معنے میں ہے۔

پرسکون حالات میں نماز کی اقامت

۱۶۱ – پھر جب مطمئن ہو جاؤ تو نماز کو قائم کرو۔ یعنی جب خوف مذکور جاتا رہے اور خاطر جمع ہو جائے پھر جو نماز پڑھو اطمینان اور تعدیل ارکان اور رعایت شروط اور محافظت آداب کے ساتھ پڑھو جیسا کہ امن کی حالت میں پڑھنی چاہیے اور جن حرکات زائدہ کی اجازت دی گئی ہے وہ حالت خوف کے ساتھ مخصوص ہے[1] یہاں یہ بات غور طلب ہے کہ جنگ کی عارضی اور مخفف نماز کو اقامت صلوٰۃ نہیں کہا گیا۔ حالانکہ ذکر الٰہی تسبیح وتہلیل اور کچھ ارکان بھی اس میں موجود تھے بلکہ یہ فرمایا گیا کہ جب اطمینان ہو جائے تو اقامت صلاۃ کرو۔ معلوم ہوا کہ جنگ کی حالت میں نماز پڑھی گئی ہے قائم نہیں کی گئی ہے۔ اقامت صلاۃ کے معنے مطلق ذکرِ الٰہی، تسبیح وتہلیل،

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

حمد و ثنا اور تلاوت قرآن سے جداگانہ ہیں یعنی اقامت صلاۃ کے ضمن میں ذکر و فکر تسبیح و تہلیل، حمد و ثنا اور قرآت کے علاوہ کچھ اور ارکان بھی داخل ہیں جو جنگ کی حالت میں کم یا موقوف ہو گئے تھے اور اب اس عارضی معنے کے دور ہو جانے کے بعد پھر بدستور نماز میں ان کی بجا آوری کا مطالبہ کیا جا رہا ہے۔ یہی وہ ارکان تھے جن کے بارے میں سورہ بقرہ میں کہا گیا فاذا امنتم فاذکروا اللہ کما علمکم ما لم تکونوا تعلمون جب خوف جاتا رہا تو پھر خدا کو اس طرح یاد کرو جس طرح اس نے بتایا ہے۔ اقامت صلاۃ کے معنے صرف نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو اس کے ارکان واجبات سنن اور آداب کے ساتھ ادا کرنے کے ہیں یہاں فاذا اطماننتم فاقیموا الصلوٰۃ کی تعبیر بتا رہی ہے کہ نماز کو قائم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ نماز کو اس کے تمام آداب و ارکان اور شرائط کے ساتھ بجا لایا جائے۔ نماز کے ارکان اگرچہ قیام، قرآت، رکوع، سجود اور قعود ہیں۔ یعنی یہ نماز کے اجزائے ترکیبی ہیں۔ اسی طرح جیسے نماز کے ۱۴ واجبات ۲۴ سنتیں اور ۶ مستحبات ہیں ٹھیک اسی طرح نماز کے کچھ باطنی آداب ہیں۔ مثلاً قنوت، خشوع، تبتل، تضرع، اخلاص اور فہم و تدبر، نماز کے بارے میں ان سب کے بارے میں قرآن میں اشارات، اور سنت میں تصریحات ہیں۔ اگرچہ ان میں اسلام کے قانون دانوں نے فرق مراتب کو خوب قوت کے ساتھ واضح کیا ہے لیکن رسائل الارکان میں مولانا بحر العلوم نے اس موضوع پر جس انداز سے داد تحقیق دی ہے وہ ان کا ہی حصہ ہے۔ آئیے آپ بھی لطف اندوزی فرما لیجئے۔ مولانا کے ارشادات کا خلاصہ یہ ہے کہ کسی ماہیت کے اجزاء اہمیت اور غیر اہمیت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتے۔ ایک درخت میں جڑ، شاخیں، پتیاں، ٹہنیاں سب اس کے اجزا کہلاتے ہیں، مگر ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے یہ تمام اجزاء ایک حیثیت نہیں رکھتے۔ اسی طرح ایک انسان میں ہاتھ پیر، دل و دماغ وغیرہ سب اس کے اجزاء شمار ہوتے ہیں مگر ان اجزاء میں اس عظیم فرق مراتب ہے کچھ کے کٹ جانے سے درخت باقی رہتا ہے اور بعض کے کٹ جانے سے درخت کی صرف زینت میں فرق پڑتا ہے۔ اور بعض کے کٹ جانے سے اس کے نمو میں کمی آتی ہے اور کچھ کے کٹ جانے سے درخت کی حقیقت ہی ختم ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسان کے اگر ہاتھ پیر قطع کر دیئے جائیں تو پھر بھی اسے انسان ہی کہا جاتا ہے لیکن اگر اس کی گردن کاٹ دی جائے تو پھر وہ انسان نہیں رہتا بلکہ اس کا ڈھانچہ رہ جاتا ہے جس کو اب انسان کہنا صرف اس لحاظ سے ہوتا ہے کہ پہلے اس ڈھانچہ پر انسان بولا جاتا تھا لہٰذا جس طرح خارج میں کسی ماہیت کے اجزاء میں حکم کا اتنا تفاوت ہوتا ہے اسی طرح فقہائے نے شرعی ماہیات کے اجزاء میں بھی فرق سمجھ لیا ہے۔

نماز کے بعض اجزاء وہ ہیں جن کے نہ ہونے سے نماز کی آرائش میں فرق آتا ہے اور بعض سے اس کی حقیقت اثر پذیر ہوتی ہے اور کچھ سے اس پر نماز کا اطلاق ہی درست نہیں رہتا۔ پہلی قسم سنتہائے دوسری واجبات، تیسری فرائض وارکان کہلاتی ہے۔

شاید یہاں آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ ان مراتب کا اندازہ کیسے معلوم کیا گیا؟ اس کا اندازہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان اور کردار سے ہوا۔ نماز کے بعض اجزاء کے چھوڑ دینے پر آپ نے نماز کو ناقص قابلِ اعادہ بتایا اور بعض کے ترک سے ناقص تو فرمایا مگر اعادہ کا حکم نہیں دیا بعض کی وجہ سے نماز کا ہونا نہ ہونا برابر بتایا۔ آپ کے ارشادات کے اسی نشیب و فراز سے فقہاء نے معلوم کر لیا کہ نماز میں وہ کون سے اجزاء ہیں جن کی ادائیگی سے اقیموا الصلاۃ کا مطالبہ ادا پورا ادا ہوتا ہے اور وہ کون سے اجزاء ہیں جن کے چھوڑ دینے سے یہ مطالبہ نقصان کے ساتھ پورا ہوتا ہے اور وہ کون سے اجزاء ہیں جن کے نہ ہونے سے نماز کی صرف زینت میں فرق آتا ہے بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اقامتِ صلاۃ کے معنے یہ ہیں کہ نماز کو اس کے تمام ارکان، واجبات، سنن اور آداب کے ساتھ بجالایا جائے۔ اس بنا پر نماز میں اطمینان، ارکان کا اعتدال، باطنی خضوع و خشوع ملحوظ رہنا چاہیے جس کے بغیر نماز ناقص ہوتی ہے۔ نمازِ خوف میں چونکہ سکون کی دولت ختم ہو جاتی ہے۔ واجبات و سنن کی رعایت نہیں ہوتی اس لیے اسے نماز کہا گیا، اور اب جبکہ اضطراب کے بعد سکون کی حالت واپس آگئی تو نماز قائم کرنے کا حکم دیا۔

نماز بتقیدِ وقت فرض ہے

۱۶۲۔ بلاشبہ نماز مسلمانوں پر بتقیدِ وقت فرض ہوئی ہے یعنی بے شک نماز فرض ہے۔ وقت معین میں سفر حضر، اطمینان و خوف ہر حالت میں اسی وقت میں ادا کرنا ضروری ہے۔ یہ نہیں کہ جب چاہو پڑھ لو یا یہ مطلب ہے کہ نماز کے متعلق حق تعالیٰ نے پورا ضبط اور تعین فرما دیا ہے کہ حضر میں کیا ہونا چاہیے اور سفر میں کیا کرنا چاہیے اور خوف میں کیا ہو ہر حالت میں اس کی پابندی چاہیے۔[1]

الجصاص نے لکھا ہے کہ اس آیت میں نمازوں کی فرضیت اور ان کی توقیت بیان کی گئی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے۔ اگرچہ یہاں اوقات کا اجمالی تصور ہے لیکن آغاز و انجام کی تحدید کے بغیر دوسری آیات میں اوقات کا تذکرہ کیا ہے، قرآن میں ہے،

اقم الصلوٰۃ لدلوک الشمس الیٰ غسق اللیل وقرآن الفجر

آفتاب کے جھکاؤ کے وقت رات کی تاریکی تک نماز قائم کر اور فجر کی قرأت کر۔

یہ آیت کریمہ اوقات پنجگانہ کی تعیین اور اس کے سبب کو پوری طرح اپنے اندر سمیٹے ہوتے ہے۔ الجصاص لکھتا ہے تنتظم الآیۃ الصلوٰت الخمس اس جگہ سب سے اہم تشریح کے قابل لفظ دلوک ہے۔ دلوک کے اصلی معنے جھکنے کے ہیں۔ عربی میں اس کا اطلاق ۳ اوقات یا آفتاب کی تین حالتوں پر ہوتا ہے۔ زوال پر مقابل نقطہ نگاہ سے آفتاب کے ہٹ جانے پر اور غروب پر اور جب آیت مذکورہ میں یہ کہا گیا کہ آفتاب کے دلوک پر نماز پڑھو تو ان تینوں دلوکات یعنی آفتاب کے تینوں جھکاؤ پر ایک ایک نماز لازم ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ آفتاب کے اوج کمال پر پہنچنے کے بعد جب آفتاب ڈھلنا شروع ہوتا ہے تو اس کے تین جھکاؤ ہوتے ہیں ایک نقطہ سمت الراس سے، دوسرا نقطہ تقابل سے اور تیسرا دائرہ افق سے۔ پہلا ظہر کا وقت ہے دوسرا عصر کا اور تیسرا مغرب کا یہ تین نمازوں کے اوقات ہوئے۔ چوتھی نماز کا وقت غسق اللیل ہے، یہ عشا کی نماز ہے۔ اور پانچویں نماز کا وقت قرآن الفجر ہے۔ اس طرح یہ آیت گرامی اپنے اندر پانچوں نمازوں کے اوقات کو سمیٹے ہوتے ہے۔

نماز کے لیے اوقات کی ضرورت

ممکن ہے یہاں آپ کے ذہنوں میں یہ سوال ابھر آئے کہ کیا نماز کے لیے خاص خاص اوقات کی تعیین ضروری تھی؟ واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے انسانیت کو جس دین کامل کی دعوت دی ہے۔ اس کی اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ نظام عملی ہے محض نظری نہیں۔ اس نے نماز کی تعلیم دی تو محض اصول اور نظریات کے لحاظ سے نہیں بلکہ اس لیے کہ انسان روزانہ مختلف اوقات میں اس فرض کو ادا بھی کرے۔ انسان کی نفسیاتی خصوصیت یہ ہے کہ جو کام اس کو مداومت کے ساتھ کرنا ہوتا ہے جب تک وہ اس کے اوقات مقرر نہ کرے کبھی وہ اس کو مستعدی کے ساتھ بلاناغہ انجام نہیں دے سکتا، اس لیے ہر منظم باقاعدہ اور دائمی عمل کے لیے اوقات کی تعیین ضروری ہے اور یہی طریقہ تمام دنیا نے اپنے باقاعدہ اور منظم کاموں کے لیے اختیار کیا ہے۔ اس میں اصلی راز یہ ہے کہ جب انسان

کو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کو کسی کام کے کرنے کے لیے ۲۴ گھنٹوں کی مہلت ہے تو ہمیشہ سستی اور کاہلی سے اس کام کو ایک وقت سے دوسرے وقت پر ٹالتا جاتا ہے یہاں تک کہ دن تمام ہو جاتا ہے اور آخری گھڑی بھی گزر جاتی ہے اور وہ اس کام کو انجام نہیں دیتا لیکن جب کاموں کے لیے اوقات متعین ہو جاتے ہیں تو ہر مقررہ وقت کی آمد انسان کو اس وقت کا کام یاد دلاتی ہے اور وہ وقت گزرنے نہیں پاتا کہ دوسرے کام کا وقت آ جاتا ہے اس طرح وقت کا فرشتہ ہر وقت انسان کے فرائض کو یاد دلاتا رہتا ہے اور تمام کام پابندی کے ساتھ بلا ناغہ انجام پاتے جاتے ہیں۔ اوقات نماز کے تقرر میں اصول وحدت بھی مدنظر ہے۔ مسلمان مختلف شہروں اور ملکوں اور اقلیموں میں ہزاروں، لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں آباد ہیں مگر یہ کثرت ایک خاص وقت اور ایک خاص حالت میں وحدت کا مرقع بن جاتی ہے۔ کرۂ ہوا میں لگی ہوئی دُور بین سے اگر زمین کی طرف دیکھو تو ایک خاص وقت میں لاکھوں کروڑوں انسانوں کو ایک ہی وضع ایک ہی شکل میں خالق عالم کے سامنے سرنگوں پاؤ گے۔ اور جہاں تک مطلع و مغرب میں نمایاں فرق نہ ہوگا یہی منظر یگانگت کا آنکھوں کے سامنے ہوگا۔ مختلف ملکوں میں طلوع و غروب کا اختلاف اگر اس وحدت کے رنگ کو کامل نہیں ہونے دیتا تو کم از کم اتنی وحدت تو یقینی ہے کہ جس وقت جس حالت میں ایک جگہ آفتاب ہوتا ہے جب دوسری جگہ بھی اسی حالت میں ہوتا ہے تو نماز کا فرض اُس وقت وہاں ادا ہوتا ہے یہ وحدت ظاہر ہے کہ اوقات کے تقرر کے بغیر ممکن نہ تھی اور اگر ایسا نہ ہوتا تو صفحۂ ہستی تو کجا ایک محلہ اور ایک گھر کے مسلمان بھی ایک جگہ اور ایک حالت میں نمازی نظر نہیں آ سکتے تھے۔

نماز کے لیے مناسب اوقات

اصل یہ ہے جیسا کہ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے لکھا ہے حق تو یہ تھا کہ انسان بھی فرشتوں کی طرح شب و روز صرف دُعا و نماز میں مصروف رہتا مگر انسان کی فطری و نوعی ضرورتوں کے سبب ایسا ہونا ممکن اور مناسب نہ تھا۔ اس لیے قرآن نے اس کی تلافی اس طرح کی کہ اس کے لیے چند مناسب اوقات مقرر کر دیے۔ ہر انسان ہر روز مختلف قسم کے کاموں میں اپنی عمر کے یہ ۲۴ گھنٹے بسر کرتا ہے صبح کو یہ بیدار ہوتا ہے دوپہر تک کام کر کے تھوڑی دیر سستاتا ہے۔ پھر سہ پہر تک وہ اپنا بقیہ کام انجام دیتا ہے اور اس کو تمام کر کے سیر و تفریح اور دلچسپ مشاغل میں، دل بہلاتا ہے شام ہوتی ہے تو گھر آ کر خانگی زندگی کا آغاز کرتا ہے اور کھا پی کر تھوڑی دیر کے بعد طویل آرام

اور غفلت کی نیند کے لیے تیار ہوتا ہے۔ اسلامی نمازوں کے اوقات پر ایک غائر نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے روزانہ کے ان مختلف انسانی مشاغل کے ہر آغاز پر ایک وقت کی نماز رکھی ہے تاکہ پورے اوقات خدا کی یاد ہی میں محسوب ہوں اور ظہور کے وقت جب صبح کی نسیم سحری حی علی الصلاۃ کا نغمہ جان فزا سناتی ہے اور ہر شے کی زبان سے صانع عالم کی تسبیح و تحمید کا ترانہ بلند ہوتا ہوتا ہے تو یہ وقت غافل انسانوں کے سر جھکانے کے لیے بھی نہایت موزوں ہے کہ کتاب زندگی میں حیات امروزہ کا ایک نیا ورق اس وقت کھلتا ہے اس لیے مناسب ہے کہ اس دن کے کارناموں کی لوح پر سب سے پہلے سجدہ نیاز کا طغرا نقش ہو۔ اس کے بعد انسان اپنی محنت و مشقت کا آغاز کرتا ہے اور دوپہر تک اس میں مصروف رہتا ہے۔ دوپہر کو روزانہ کاروبار کا نصف حصہ ختم کرتا ہے۔ اس موقعہ پر بھی اس کو خدا کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ دن کا آدھا کام بخیر و خوبی ختم ہو گیا۔ پھر دوپہر کے بعد جب آرام سے فارغ ہو کر کام کے لیے تازہ دم ہوتا ہے تو یہ وقت بھی ایک دفعہ خدا کا نام لینے کا ہے۔ اس کے بعد شام ہوتی ہے جو دنیا کے انقلاب کا دوسرا منظر پیش کرتی ہے۔ دن بھر کے کاموں کے بعد اب آرام و سکون کا دور شروع ہوتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کا سر نامہ بھی عبودیت کا سجدہ ہو پھر سوتے وقت جب انسان اپنی احساس زندگی کے لیے کچھ دیر کے لیے بے خبر ہونے لگتا ہے تو مناسب ہے کہ وہ خدا کا نام لے کر اس دنیا سے بے خبر ہو کیونکہ اسے کیا معلوم کہ اس وقت کی بند ہونے والی آنکھوں کو پھر کبھی کھلنا بھی نصیب ہوگا۔ اسی طرح آخر عمر تک روزانہ کام کے یہ پہیے اپنی جگہ پر گھومتے رہتے ہیں۔ صبح سے دوپہر تک انسان کی مصروفیت کے اصلی گھنٹے ہیں اس لیے صبح سے زوال تک کوئی فرض نماز نہیں رکھی گئی اسی لیے عشا سے لے کر صبح تک کوئی فرض نماز نہیں ہے کہ یہ وقت صرف خواب راحت کے لیے موزوں ہے۔ ان خاص اوقات کو چھوڑ کر بقیہ اوقات تمام تر انسان کے کام کے ہیں ان ہی کام کے اوقات کے شروع میں نماز پنجگانہ مقرر ہوئی ہے[1]

جہاد فی سبیل اللہ کی اہمیت اور فضیلت

۱۶۳ - اور کمزوری و سستی نہ دکھاؤ اگر تم تکلیف سے دوچار ہو تو تمہاری طرح وہ بھی تکلیف اٹھاتے ہیں اور تم اللہ سے اس چیز کے امیدوار ہو جس کے وہ امیدوار نہیں ہیں اللہ سب کچھ جاننا

[1] سیرت النبیؐ

ہے اور وہ حکیم و دانا ہے۔ یعنی کفار کی جستجو اور ان کے تعاقب میں ہمت سے کام لو اور کوتاہی نہ کرو۔ اگر تم کو ان کی لڑائی سے زخم اور درد پہنچا ہے تو اس تکلیف میں وہ بھی شریک ہیں اور آئندہ تم کو حق تعالیٰ سے وہ امیدیں ہیں جو ان کو نہیں۔ یعنی دنیا میں کفار پر غلبہ اور آخرت میں ثواب عظیم اور اللہ تعالیٰ تمہارے مصالح اور تمہارے اعمال کو خوب جانتا ہے اس کا جو حکم ہے اس میں تمہارے لیے بڑے منافع ہیں۔ دین اور دنیا دونوں کے لیے سو اس کے امتثال کو غنیمت اور بڑی نعمت سمجھو۔ لہ

مطلب یہ ہے کہ کفر کی طاقتیں جو اس وقت دعوت اسلامی اور اسلامی نظام کے راستہ میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئی ہیں تمہیں اس رکاوٹ کے ہٹانے میں کمزوری اور سستی نہ دکھانی چاہیے۔ اصل ارشاد میں لا تھنوا آیا ہے یہ وہن سے بنا ہے۔ عمل ارادے، کردار، رائے کی کمزوری کو کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے اندر عزیمت، بلند ہمتی پیدا کرو، جنگ اور اس کے لوازم میں کمزوری کا مظاہرہ نہ کرو۔ گویا یوں کہا جا رہا ہے کہ نماز سے فارغ ہو جانے کے بعد ان لوگوں پر بھرپور حملہ کر دو اور ان راہوں سے بچ کر رہو جو تم میں کسی وجہ سے کمزوری کا باعث ہو سکتی ہیں اور وہ کردار اختیار کرو جو تم میں اس کام کے لیے جوش پیدا کریں۔ اس راہ میں تکلیفوں سے دل برداشتہ ہو کر پست ہمت نہیں ہونا چاہیے۔ کفر بھی تکلیفوں سے دردمند ہے اور تم بھی، مگر دونوں میں فرق ہے تم حق کی خاطر تکلیف برداشت کر رہے ہو جب کہ کفر باطل کو فروغ دینے کے لیے تکلیفیں برداشت کر رہا ہے اور پھر کفر کے پیش نظر صرف دنیا کے ناپائدار فائدے ہیں جبکہ تمہارے پیش نظر رب السماوات والارض کی خوشنودی و تقرب اور اس کے ابدی انعامات ہیں۔ یہاں جہاد کے موضوع پر ترجون من اللہ ما لا یرجو ن فرما کر جہاد کی فضیلت کی طرف اور لا تھنوا فرما کر جہاد کی اہمیت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اہمیت اور فضیلت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جو چیز جتنی زیادہ اہم ہے اتنی ہی افضل ہے۔ حضور انور نے جہاد کی اہمیت اور فضیلت کو جس انداز سے بیان کیا ہے اس کا سرسری اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اسلامی احکام میں جہاد کو جو اہمیت ہے وہ عقائد ضروریہ کے بعد کسی فرض کسی حکم، کسی رکن، کسی عبادت کو حاصل نہیں۔ قرآن و سنت میں یہ بات بار بار دہرائی گئی ہے کہ اسلامی زندگی اسی عمل کے بقا پر موقوف ہے جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ باقی رہے گا اور اس کی راہ میں ہر فرد اپنی زندگی اور اپنا مال

لہ افادات شیخ الاسلام

قربان کر دینے کے لیے تیار رہے گا اس وقت تک نظامِ کفران پر غالب نہ آسکے گا۔ جس روز یہ جذبہ مردہ ہو جائے گا اسی دن اسلامی زندگی کی موت شروع ہو جائے گی۔ قرآن نے مثال میں یہودیوں کی تاریخ پیش کی ہے۔ جب یہودیوں میں اعتقاداً و عملاً یہ جذبہ باقی نہ رہا۔ حکومت و عزت ان ہی کے لیے تھی جب چند گھڑیوں کے عیش و راحت کا عشق قومی زندگی و عزت کے دائمی عیش کی طلب پر غالب آگیا اور اس چیز کو چھوڑ بیٹھے تو ذلت و محکومی کا داغ ہر یہودی کی پیشانی پر لگ گیا اور ہمیشہ کے لیے خوار و ذلیل ہو کر رہ گئے ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ

چونکہ شریعت و ملت کے قیام کی اصلی بنیاد یہی تھی اس لیے ہر حیثیت اور ہر اعتبار سے اس پر زور دیا گیا اور سارے عملوں اور نیکیوں سے جو ایک مسلمان دنیا میں کر سکتا ہے اس عمل کا مرتبہ اجر افضل و اعلیٰ ٹھہرایا۔ جس عمل میں جس قدر زیادہ ایثار و قربانی ہوگی اتنا ہی زیادہ اس کا اجر و ثواب بھی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل سے بڑھ کر اور کس عمل میں مال و جان کا ایثار ہو سکتا ہے۔ کوئی خاص وقت اور عہد اس کے لیے مخصوص نہیں ہر حال ہر زمانے میں ایک اسلامی زندگی کے ایمان اور صداقت کی بنیاد یہی چیز اور اسی کا سچا عشق و ولولہ ہے یہی سنام دین ہے یہی اساس شریعت یہی ملاک اسلام ہے۔ یہی ایمان و نفاق کی اصلی کسوٹی ہے۔ یہی مومن کو منافق سے الگ کر دینے کے لیے اصلی پہچان ہے۔ نماز اسی سے ہے روزہ اسی سے ہے، حج اسی سے ہے زکوٰۃ کا مصرف یہی ہے۔ سب اس کی خاطر ملتوی کیے جا سکتے ہیں اس کو کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ نماز دین کا ستون ہے اور روزہ برائیوں سے بچنے کی ڈھال ہے لیکن یہ دین کی بنیاد ہے اور برائیوں کو معدوم کرنے والی تلوار۔ پس اس کی فضیلت کو نہ نماز پہنچ سکتی ہے نہ روزہ نہ اس سے بڑھ کر کوئی دوسرا عمل ہے جو اللہ کی نظروں میں محبوب ہو اور کرنے والے کو اس کی دائمی محبوبیت سے سرفراز کر دے۔ ہزاروں نمازیں ہزاروں روزے بھی اس ایک قطرۂ خون کی فضیلت نہیں پا سکتے جو اس راہ میں بہایا گیا۔ اور عمر بھر کی خیرات صدقات بھی اس ایک درہم کے اجر کا مقابلہ نہیں کر سکتے جو اس راہ میں خرچ کیا گیا۔ یہی عمل اسلام و ایمان کی اصلی پہچان ہے جس مسلمان کے دل میں اس کا ولولہ نہ ہو وہ ایمان و اسلام کی روشنی سے محروم ہے۔ نفاق کی ظلمت اس پر چھا گئی۔ صحیح مسلم میں ہے:

جو مسلمان دنیا سے اس حالت میں گیا کہ نہ تو کبھی اللہ کی راہ میں لڑائی لڑی۔ اور نہ اس کے دل میں اس بات کی طلب رہی اس کی موت ایسی حالت میں ہوئی جو

نفاق کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔

قرطبی نے اس کی شرح میں لکھا ہے فیہ دلیل علی وجوب العزم اس حدیث سے ثابت ہوا کہ جہاد کا عزم وارادہ ہر مسلمان پر واجب ہے۔ اس کے عزم اور طلب سے بھی اگر دل خالی ہو گیا تو وہ مومن نہیں ہے منافق ہے۔

ترمذی میں ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کی ایک جماعت میں اس بات کا چرچا ہوا کہ ای الاعمال احب الی اللہ ساری نیکیوں اور عبادتوں میں سب سے زیادہ کون سا عمل اللہ کے نزدیک محبوب و مقبول ہے اس پر سورۃ صف کی یہ آیت نازل ہوئی۔

ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا کانھم بنیان مرصوص

اللہ تعالیٰ اپنی راہ میں ان جہاد کرنے والوں کو پسند کرتا ہے جو اس طرح صف باندھ کر لڑتے ہیں کہ گویا ایک دیوار ہے سیسہ پگھلائی ہوئی۔

بخاری و مسلم میں حضرت ابوہریرہ سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا ای العمل افضل؟ کون سا عمل سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ فرمایا ایمان باللہ ورسولہ اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لانا۔ پوچھا اس کے بعد کون سا عمل؟ فرمایا الجہاد فی سبیل اللہ اللہ کی راہ میں جہاد۔

بخاری میں ابو سعید خدری سے روایت ہے کہ حضور سے پوچھا گیا کہ سب سے افضل آدمی کون ہے؟ آپ نے فرمایا من یجاھد فی سبیل اللہ بنفسہ ومالہ وہ مومن جو اللہ کی راہ میں اپنی جان ومال سے جہاد کرتا ہے۔ اور فرمایا جہاد فی سبیل اللہ کی ایک صبح و شام تمام دنیا اور اس کی نعمتوں سے بہتر ہے اور ان ساری چیزوں سے افضل ہے جن پر سورج نکلتا ہے اور ڈوبتا ہے۔

حد ہو گئی کہ جن لوگوں نے جنگ بدر میں جان نثاریاں کی تھیں اگر کبھی ان سے کوئی لغزش ہوئی تو آپ نے یہ کہہ کر ان کو کچھ بھی کہنے سے انکار کر دیا "یہ وہ جان نثار ہیں جنہوں نے جنگ بدر میں شرکت کی ہے۔ عجب نہیں کہ اس عمل کی برکت سے ان کی ساری اگلی اور پچھلی خطائیں بخش دی ہوں اللہ کہہ دیا ہو کہ جو چاہے کرو۔

طبرانی نے عمران بن حصین سے روایت کی ہے کہ جب شام کے رومیوں کی تیاریوں کی خبر پہنچی تو مدینے میں مسلمانوں کی حالت نہایت نازک اور کمزور تھی۔ کسی طرح کا سازوسامان نہ تھا۔ حضرت عثمان نے یہ حال دیکھا تو اپنا تجارتی قافلہ پورا کا پورا جناب نبوت میں پیش کر دیا جو شام جانے کے

لیے تیار ہوا تھا۔ اس میں دو سو اونٹ مال و اسباب سے لدے ہوئے تھے اور دو سو اوقیہ سونا تھا جس کا وزن ہمارے حساب سے تقریباً پندرہ سو انیس تولہ چار ماشہ دو رتی ہوتا ہے۔ یعنی آج کے حساب سے نولاکھ گیارہ ہزار چھ سو بارہ روپے بنتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج کے دن کے بعد سے عثمان خواہ کچھ ہی کرے لیکن کوئی عمل اسے نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ سبحان اللہ عمل جہاد کی برکت یہ ہے کہ جہاد کے لیے اپنا مال و متاع قربان کرنا خدا اور رسول کی نظروں میں ایسا محبوب و محترم کام ہے جس کے بعد کوئی برائی بھی صاحب عمل کو نقصان نہیں پہنچا سکتی۔

ایک شخص نے دریافت کیا یا رسول اللہ کوئی ایسا عمل بتلا دیجیے کہ مجاہدین کا ثواب حاصل ہو فرمایا کیا تم اس کی طاقت رکھتے ہو کہ نماز ہی پڑھتے رہو، روزہ ہی رکھتے رہو۔ اس نے کہا کہ یا رسول اللہ یہ تو میری طاقت سے باہر ہے فرمایا پھر بخدا اگر تم ایسا کرنے کی طاقت بھی رکھتے جب بھی ان لوگوں کی فضیلت کو نہیں پا سکتے جو اللہ کی راہ میں جہاد کرتے ہیں کیا تم نہیں جانتے ہو کہ مجاہد کا گھوڑا لگام میں اچھلتا ہے تو اس کے لیے بھی اس کے نامۂ اعمال میں نیکیاں درج ہوتی رہتی ہیں (رواہ احمد)

بخاری و مسلم میں ہے کہ تین بار آپ سے دریافت کیا گیا مایعدل الجھاد جہاد کے برابر کون سا کام فضیلت رکھتا ہے تین مرتبہ جواب میں فرمایا کہ تم اس کی طاقت نہیں رکھتے ہو۔ یعنی کوئی عمل اس کے برابر نہیں پھر فرمایا مجاہد کی مثال تو اس روزہ دار کی ہے جو اللہ کی جناب میں کھڑا رہتا ہو اور کبھی بھی نماز روزے سے الگ نہ ہو۔ اور فرمایا جس کے پاؤں اللہ کی راہ میں ایک گھنٹہ کے لیے بھی گرد آلود ہوتے دوزخ کی آگ ان پر حرام ہے۔ بخاری میں بھی روایت تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ آئی ہے۔ حافظ عسقلانی اس کی شرح میں لکھتے ہیں: اس حدیث سے جہاد فی سبیل اللہ کی عظمت و فضیلت کا اندازہ ہوتا ہے جب صرف غبار راہ سے قدموں کا آلودہ ہونا اتنا بڑا اجر رکھتا ہے کہ جہنم کی آگ اس پر حرام ہو جاتی ہے تو جو خوش نصیب جہاد میں کمال سعی و تدبیر کرے اور اپنی جان و مال کو اس کے لیے وقف کر دے اس کے اجر و ثواب کا کیا حال ہوگا اور کون ہے جو اس کا اندازہ لگا سکتا ہے واللہ یضاعف لمن یشاء۔

ارباب سنن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ کوئی ایسی موت نہیں جس کے ساتھ اعمال کا سلسلہ بھی ختم نہ ہو جاتا ہو مگر وہ شخص جو جہاد میں دشمن کے حملے کی انتظار میں مرا ہو اس کا عمل ایسا ہے جو مرنے کے بعد بھی قیامت تک بڑھتا رہے گا۔ یعنی عمل جہاد بھی حسنات جاریہ میں سے ہے۔

جو لوگ خود اپنی ذات سے جہاد میں حصہ نہ لے سکیں مگر مجاہدین کو اپنے مال و متاع سے مدد پہنچائیں یا اور کسی طرح کی خدمت انجام دیں تو اگرچہ وہ مجاہدین کا اجر و ثواب نہیں پا سکتے لیکن ان کے لیے بھی اجر ہے اور ساری عبادتوں، طاعتوں سے بڑھ کر اجر ہے۔ ابن ماجہ میں ہے،

جو مسلمان ایسے وقت میں گھر سے نہ نکلا صرف اپنے روپے سے جہاد میں مدد کی تو اس کو ہر روپیہ کے بدلے سات سو روپیہ کا اجر ملے گا اور جس نے روپیہ بھی لگایا اور خود بھی شریک ہوا تو اس کے لیے سات لاکھ کا اجر ہے پھر آپ نے یہ آیت پڑھی واللہ یضاعف لمن یشاء۔

اور امام بخاری نے باب باندھا ہے فضل من جھز غازیا اس میں زید بن خالد کی حدیث لائے ہیں کہ جس نے مجاہد اور غازی کے سامان کا انتظام کیا تو گویا اس نے خود جہاد کیا اور جس نے اس کے پیچھے اس کے کاموں کی دیکھ بھال کی تو اس کے لیے بھی ایسا ہی اجر ہے۔

اسلام نے حقوق العباد پر جس قدر زور دیا ہے وہ سب جانتے ہیں بالخصوص والدین اور اقربا کے حقوق کہ ساری نیکیوں سے مقدم بتائے ہیں لیکن جہاد ہی وہ عظیم عمل ہے جس میں یہ حقوق بھی رکاوٹ نہیں ہو سکتے کیونکہ اسلام اور اہل اسلام کی حفاظت ہی پر تمام افراد کی حفاظت موقوف ہے۔ ان پر تفصیلی تبصرہ دسویں پارے میں آ رہا ہے۔ بہرحال میں نے یہاں جہاد کی اہمیت اور فضیلت کو اس لیے پیش کیا ہے تاکہ قرآن کی بات ترجون من اللہ مالا یرجون واضح ہو کر کوزہ ذہن میں آ جائے کہ ایمان کا نقطہ نظر کیا ہوتا ہے۔ مقاصد کی راہ میں تکلیفیں مومن کو بھی پیش آتی ہیں اور کافر کو بھی لیکن مومن کے لیے جھیلنا سہل ہوتا ہے کیونکہ وہ اپنے سامنے ایسی امیدیں رکھتا ہے جو کافر کو میسر نہیں وہ یقین رکھتا ہے کہ میں جو تکلیف اٹھا رہا ہوں اللہ کی راہ میں ہے اور میرے لیے دنیا میں بھی کامیابی ہے اور آخرت میں بھی۔ پھر افسوس اس مومن پر جو مقاصد حق کی راہ میں اتنا بھی نہ کر سکے جتنا ایک کافر باطل کی راہ میں کرتا ہے۔

إِنَّا أَنزَلْنَا إِلَيْكَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِتَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ بِمَا أَرَاكَ
اللَّهُ ۚ وَلَا تَكُن لِّلْخَائِنِينَ خَصِيمًا ﴿١٠٥﴾ وَاسْتَغْفِرِ اللَّهَ ۖ إِنَّ اللَّهَ كَانَ
غَفُورًا رَّحِيمًا ﴿١٠٦﴾ وَلَا تُجَادِلْ عَنِ الَّذِينَ يَخْتَانُونَ أَنفُسَهُمْ ۚ إِنَّ
اللَّهَ لَا يُحِبُّ مَن كَانَ خَوَّانًا أَثِيمًا ﴿١٠٧﴾ يَسْتَخْفُونَ مِنَ النَّاسِ وَلَا
يَسْتَخْفُونَ مِنَ اللَّهِ وَهُوَ مَعَهُمْ إِذْ يُبَيِّتُونَ مَا لَا يَرْضَىٰ مِنَ الْقَوْلِ ۚ
وَكَانَ اللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ مُحِيطًا ﴿١٠٨﴾ هَا أَنتُمْ هَٰؤُلَاءِ جَادَلْتُمْ عَنْهُمْ
فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فَمَن يُجَادِلُ اللَّهَ عَنْهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ أَم مَّن
يَكُونُ عَلَيْهِمْ وَكِيلًا ﴿١٠٩﴾

اے پیغمبر ہم نے تم پر سچائی کے ساتھ الکتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو جیسا کچھ خدا نے تم کو سمجھایا ہے اور خیانت کرنے والوں کی طرفداری میں نہ جھگڑو۔[۱۶۴] اور اللہ سے مغفرت مانگو بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔[۱۶۵] اور جو لوگ

اپنے اندر خیانت رکھتے ہیں تم ان کی طرف سے نہ جھگڑو خدا ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا جو خیانت اور گنہ گاری میں ڈوبے ہوئے ہوں، اسی طرح کے لوگ انسانوں سے شرماتے ہیں اللہ سے نہیں شرماتے حالانکہ اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو اپنی مجلس میں ایسی ایسی باتوں کا مشورہ کرتے ہیں جو خدا کو پسند نہیں ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے قابو میں ہے"[166] دیکھو تم ہی وہ لوگ ہو کہ جنہوں نے ان مجرموں کی جانب سے دُنیا کی زندگی میں جھگڑا کیا ہے بتاؤ روز قیامت ان کی جانب سے اللہ کی عدالت میں کون جھگڑا کرے گا یا ان کا اس روز کون وکیل ہوگا۔"[167]

عدلیہ کے فرائض و واجبات

یہاں پر اصل موضوع کی طرف سلسلہ کلام لوٹ گیا ہے۔ اسلام کا معاشرتی، معاشی اور اخلاقی نظام بیان کرنے کے بعد اصل موضوع اسلام کا سیاسی نظام تھا۔ آغاز میں اسلام کا سیاسی نظام

بیان کرتے ہوئے عدلیہ اور انتظامیہ کی طرف اشارہ کرکے اسلام کے سیاسی نظام میں مصادرِ قانون بیان کیے تھے اور بتایا تھا کہ اسلامی نظام میں خدا کا حکم اور رسول کا طریقہ بنیادی قانون اور آخری سند کی حیثیت رکھتا ہے۔ مسلمانوں کے درمیان جس مسئلہ میں بھی نزاع واقع ہوگی اس میں فیصلہ کے لیے قرآن وسنت کی طرف رجوع کیا جائے گا کیونکہ یہی دونوں اسنادی اصُول کی حیثیت رکھتے ہیں جو فیصلہ وہاں سے حاصل ہوگا اس کے سامنے سب سرِ تسلیم خم کریں گے۔ اس طرح تمام مسائلِ زندگی میں ان اصول استناد کو سند اور مرجع اور حرفِ آخر تسلیم کرنا اسلامی نظام کی وہ خصوصیت ہے جو اسے کافرانہ نظام سے ممتاز کرتا ہے جس نظام میں یہ چیز نہ پائی جائے وہ بالیقین ایک غیر اسلامی نظام ہے۔ ان دونوں اصولِ استناد کو پوری وضاحت کے ساتھ بیان کرنے کے بعد بات کا رُخ اس طرف ہوگیا کہ ان اصُولِ استناد پر مبنی اسلامی نظام کو دُنیا میں رائج اور قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی رکاوٹوں کو دُور کرنے کے لیے تیار ہوجانا چاہیے۔ رکاوٹیں دو طرح کی ہیں داخلی اور خارجی، ان ہی رکاوٹوں کو دُور کرنے کے لیے جہاد کا حکم ہوا اور اسی کی خاطر ہجرت کی تلقین کی گئی۔ اسی سلسلے میں جہاد کی اہمیت اور فضیلت بتائی گئی۔ میدانِ جنگ میں نماز کی ادائیگی کی ترکیب بتائی گئی ہے۔ اب ان آیات میں ایک واقعہ کی روشنی میں عدلیہ اور انتظامیہ کو خاص ہدایتیں دی گئی ہیں مثلاً۔

۱۔ عدالت کو چاہیے ہر حال میں حق وانصاف کے ساتھ فیصلہ کرے اس معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم کی تمیز نہ ہونی چاہیے۔

۲۔ عدالت میں فیصلہ کرنے والا ہمیشہ اللہ سے مدد کا طالب رہے کیونکہ عدالت کی ذمہ داری نہایت نازک ہے ایسا نہ ہو کہ کسی قسم کے میلان سے کوئی لغزش ہوجائے۔

۳۔ عدالت کو ایسی کوئی بات نہ کرنی چاہیے جس سے کسی فریق کی وکالت کی بُو آئے۔

۴۔ مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی وجہ سے کسی مجرم کی ہرگز حمایت نہ کرنی چاہیے۔

۵۔ تمام مسائلِ زندگی میں نبوت کے فیصلوں کی حیثیت اللہ کی ارات کی ہے یعنی اصولِ استناد میں قرآن اگر ما انزل اللہ ہے تو نبی کا طریقہ، فیصلہ اور حکم ما اراہ اللہ ہے۔

۶۔ اسلام کے نظام کو جو چیز نظامِ کفر سے ممتاز کرتی ہے وہ یہ ہے کہ نظامِ کفر مطلق آزادی کا مدعی ہے اور نظامِ اسلام صرف اس دائرے میں آزادی سے متمتع ہوتا ہے جو اللہ نے دی ہے، کفر اپنے سارے معاملات کا فیصلہ خود اپنے بنائے ہوئے اصول اور قوانین سے کرتا ہے اس کے

برعکس اسلام اپنے ہر معاملہ میں اصول استناد ما انزل اللہ اور ما انزلہ اللہ یعنی خدا کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اگر ان میں کوئی روشنی نہ ملے تو وہ آزادی عمل برتتا ہے۔ ان رکوع کی اصلی روح یہ بتاتا ہے کہ مصادر قانون میں الرسول کی حیثیت کیا ہے اور بعد والے رکوع میں اسی کی اہمیت اور عظمت کو ظاہر کیا ہے۔

۱۶۴۔ اے پیغمبر ہم نے تم پر سچائی کے ساتھ کتاب نازل کی ہے تاکہ تم لوگوں کے درمیان فیصلہ کرو جیسا کچھ خدا نے تم کو سمجھا دیا ہے اور خیانت کرنے والوں کی طرف داری میں نہ جھگڑو۔ منافق اور ضعیف الایمان لوگوں میں جب کوئی کسی گناہ اور خرابی کا مرتکب ہوتا تو سزا اور بدنامی سے بچنے کے لیے حیلے گھڑتے اور آپ کی خدمت میں اس کا اظہار کرتے کہ آپ ان کو بری سمجھ جائیں بلکہ کسی بری الذمہ کے ذمہ تہمت لگا کر اس کے مجرم بنانے میں سعی کرتے اور باہم مشورہ کرتے چنانچہ ایک دفعہ ایسا ہوا کہ ایک ایسے ہی مسلمان نے دوسرے مسلمان کے گھر میں نقب لگائی ایک تھیلا آٹے کا اور اس کے ساتھ کچھ ہتھیار چوری کرکے لے گیا۔ اس تھیلے میں اتفاقاً سوراخ تھا چور کے گھر تک راستہ میں آٹا گرتا گیا۔ چور نے یہ تدبیر کی کہ مال اپنے گھر میں نہ رکھا بلکہ رات ہی کو لے جاکر وہ مال ایک یہودی کے پاس بطور امانت رکھ آیا جو اس کا واقف تھا۔ صبح کو مالک نے اسی سوراخ پر چور کو جا پکڑا مگر تلاشی پر اس کے گھر سے کچھ نہ نکلا، اُدھر چور نے قسم کھالی کہ مجھے کچھ خبر نہیں۔ آٹے کا سراغ آگے چلتا نظر آیا تو مالک نے اسی سراغ پر یہودی کو جا پکڑا اس نے مال کا اقرار کر لیا کہ میرے گھر میں موجود ہے مگر میرے پاس تو رات کو فلاں شخص امانت رکھ گیا ہے۔ میں چور نہیں ہوں۔ مالک نے یہ معاملہ حضور فخر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔ چور کی قوم اور اس کی جماعت نے ایکا کر لیا کہ جس طرح ہو سکے چور پر چوری ثابت نہ ہونے پائے چور یہودی بنے۔ چنانچہ یہودی سے جھگڑے اور آپ کی خدمت میں چور کی برأت پر قسمیں کھائیں، گواہی دی، قریب تھا کہ یہودی کو چور سمجھ لیا جائے اور مجرم بنا دیا جائے کہ حق سبحانہ نے اس پر متعدد آیات نازل فرمائیں اور حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کو اور سب کو متنبہ فرما دیا کہ چور یہی مسلمان ہے یہودی اس میں سچا اور بے قصور ہے اور ہمیشہ کے لیے ایسے لوگوں کی قلعی کھول کر سب کو متنبہ کر دیا۔
آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے رسول ہم نے اپنی سچی کتاب تجھ پر اس لیے اتاری ہے کہ ہمارے سمجھانے اور بتلانے کے موافق تمام لوگوں میں نیک ہوں یا بد، مومن ہوں یا کافر حکم اور انصاف کریں اور جو دغاباز ہیں ان کی بات کا اعتبار اور ان کی طرفداری ہرگز مت کرو اور ان کی قسم اور

ان کی گواہی پر کسی بے قصور کو مجرم مت بناؤ یعنی ان دغابازوں کی طرف سے ہو کر یہودی سے مت جھگڑو۔ لے
یہ واقعہ جو شیخ الاسلام نے بیان کیا ہے علامہ قرطبی نے اسی طرح بلا سند پیش کیا ہے اور علامہ
بغوی نے اسے کلبی کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ کلبی کا حال تاریخ و روایت میں کیا ہے۔ اس پر ہم
پہلے تبصرہ کر چکے ہیں اور یہی واقعہ امام ترمذی نے اپنے جامع میں اور حاکم نے مستدرک میں ابن سعد
نے طبقات میں اس سے مختلف پیش کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایک مسلمان جو منافق تھا اور جس کا
نام طعمہ یا بشیر تھا ایک انصاری کی زرہ چرالی۔ اور چوری کر کے مال مسروقہ یہودی کے یہاں رکھ دیا۔
زرہ کے مالک نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں استغاثہ کیا اور طعمہ پر اپنا شبہ ظاہر کیا
مگر طعمہ اور اس کے بھائی بندوں نے اتفاق کر کے الزام یہودی کے سر رکھ دیا۔ یہودی سے دریافت
کیا گیا تو اس نے اپنی براءت کی لیکن طعمہ کے ساتھی طعمہ کی حمایت میں زور شور سے وکالت کرتے
رہے۔ قریب تھا کہ مقدمہ کی ظاہری رُوداد کی بنا پر یہودی کے خلاف فیصلہ ہو جاتا کہ وحی آئی اور
معاملہ کی ساری حقیقت کھول دی۔ یہ ہم نے خلاصہ پیش کیا ہے ورنہ کتابوں میں قصہ بڑا طویل ہے۔
اگرچہ روایتی طور پر اس کی تاریخی حیثیت پائدار نہیں ہے مگر سیاق قرآنی بتا رہا ہے کہ اس قسم کا
واقعہ کچھ ضرور ہوا ہے۔ واقعہ کی تفصیلات اور اس کی جزئیات سے نظر ہٹا کر ہمیں غور کرنا چاہیے
کہ خود سیاق قرآنی کیا ہے اوروں نے جو کچھ سمجھا ہے اور جو کچھ لکھا ہے وہ اپنی جگہ درست
ہے لیکن میں نے جو کچھ سمجھا ہے چاہتا ہوں کہ وہ سمجھا دوں۔ جیسا کہ پہلے تمہید میں اشارہ ہو چکا ہے
کہ اصل موضوع اسلامی نظام میں مصادرِ قانون ہے۔ اس سلسلہ میں قرآن نے اصول استناد پیش کرتے
ہوئے اللہ اور اس کے رسول کا ذکر کیا ہے فردوہ الی اللہ والرسول اللہ کی حد تک تو یہ بات
صاف ہو چکی ہے کہ اللہ کی اطاعت یا اللہ کی طرف لوٹانے کا مطلب ما انزل اللہ کی اطاعت ہے
اور ما انزل اللہ کتاب اللہ اور قرآن ہے لیکن الرسول کی حد تک یہ بات وضاحت طلب ہے۔ رسول
کے معنے پیغمبر اور قاصد کے ہیں یعنی قرآن کے الفاظ کو بعینہٖ انسانوں تک پہنچانا اس کا کام ہے
پھر ما انزل اللہ سے الگ ہو کر رسول کی طاعت کا مفہوم کیا ہے۔ قرآن یہاں اسی بات کو سمجھانا اور
اپنے مخاطبوں کے ذہنوں میں اتارنا چاہتا ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ انسانی الفاظ میں یہ قدرت
نہیں کہ ان کے ذریعہ سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جا سکے جو ایک طرف اختلافِ فہم سے

لے افاداتِ شیخ الاسلام

محفوظ ہے اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کے جزئیات کی کوئی حد نہیں پوری طرح حاوی ہو سکے لیکن فہم انسانی کے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں گو ان کو تمامتر دُور نہیں کیا جا سکتا تاہم ان کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اسلام نے اپنے قانونِ الٰہی سے جو بہرحال انسانی بول چال کے الفاظ میں ہے اس اختلاف فہم کے نقص کو کم کرنے کے لیے یہ کیا کہ اپنے رسُول کی معرفت زبانی اور عملی طور سے اس کی تشریح و تبیین کردی گو انسانی ذرائع حفظ و درایت کی فطری کمزوریوں کے سبب سے اس کی تشریح و تبیین میں بھی اختلافِ فہم پیدا ہو گیا مگر یہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ اگر یہ تشریح و تبیین نہ ہوتی تو اختلاف کی خلیج اس سے بھی زیادہ عمیق اور وسیع ہوتی۔

روزمرہ کے پیش آنے رہنے والے جزئیات کے فیصلے کی یہ صورت رکھی گئی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں روزانہ اس قسم کے واقعات اور مقدمات پیش ہونے رہتے اور آپ ما انزل اللہ کے اصول و کلیات کے تحت اپنے نورِ بصیرت اور فہم حکمت سے ان کے فیصلے فرماتے رہتے۔ اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا اور فیصلوں کی حیثیت حضور انور کی اپنی رائے کی نہیں بلکہ اللہ کی امانت کی ہے۔ اس ما انزل اللہ کے نزول کی غرض اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ اے پیغمبر اس کے احکام اور قوانین کو لے کر اس فہم کے ذریعے جو کچھ اللہ تعالیٰ تجھ کو سمجھائے اور دکھائے لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنے پیغمبر کو بھی سمجھانا اور دکھانا جو کچھ تھا وہ آپ کے عمل اور قضایا اور فیصلوں کی صورت میں محفوظ ہے اور اسلام کے قانون کا دوسرا مصدر ہے۔

یہ بات بھی قرآن میں بتائی گئی ہے کہ رسُول کے تمام فیصلے منصفانہ ہوتے تھے اور رسُول کے فیصلوں کی اطاعت خود خدا کے حکم کی اطاعت ہے بلکہ ایمان کی دلیل اور نشانی ہے۔

اس موضوع پر اب تک جو کچھ کہا گیا ہے اس کو ملا کر دیکھئے سب سے پہلے کہا گیا ہے کہ مسائل زندگی میں اللہ و رسُول کی طرف رجوع کرو فردوہ الی اللہ والرسول، پھر کہا گیا کہ رسُول آتا ہی اس لیے ہے کہ بحکم خدا اس کی اطاعت کی جائے الا لیطاع باذن اللہ اور پھر ہر قسم کی پوری قوت اور اُرزو سے یہ اعلان کیا گیا کہ کوئی شخص کبھی مومن نہیں ہو سکتا جب تک اپنے تمام جھگڑوں قضیوں میں رسُول کو حاکم نہ بنائے۔ فلا و ربك لا یؤمنون اور اب بتایا جا رہا ہے کہ آپ پر یہ کتاب اس لیے نازل کی ہے تاکہ تم جیسا خدا تم کو سمجھائے اس کے ذریعے فیصلے کرو۔

یہ اطاعت اور مطلقاً سرافگندگی اور تمام فیصلوں کے قطعی حق اور منصفانہ فیصلہ ہونے کی ربانی

ذمہ داری ہر حاکم وقت اور سلطان زمانہ کے لیے نہیں، یہ نبوت کے لیے خاص ہے۔ دو شخصوں کے باہمی جزئی و شخصی مقدمات کا فیصلہ ظاہر ہے کہ خود اللہ تعالیٰ قرآن کے ذریعہ نہیں کرتا تھا بلکہ رسول کے فہم نبوت، نور نبوت، فیض حکمت، شرح صدر تبیین حقیقت اور ارائت کے ذریعے فرماتا تھا۔ لیکن کلیات کی حیثیت سے وہ یقیناً ما انزل اللہ کے مطابق ہوتا تھا اور ان کلیات کے مطابق ان جزئیات کا فیصلہ خود اللہ تعالیٰ آپ کو سمجھاتا تھا۔ آپ کے ان قضایا اور فیصلوں کی رضامندانہ اطاعت ہر مسلمان پر قیامت تک ضروری ہے بلکہ ایمان کی نشانی ہے۔ آپ کی زندگی کے بعد ان فیصلوں کی اطاعت یہ ہے کہ اس قسم کے مقدمات میں ہم وہی فیصلہ جاری کریں جو آپ نے اپنی زندگی میں ان کے متعلق کیے کیونکہ آپ کے فیصلے بحکم خداوندی غلطی سے پاک، ظلم سے بری اور بے انصافی سے منزہ تھے اور دنیا میں رسول کے سوا کسی انسان کو اس بے گناہی کا درجہ حاصل نہیں ہے۔

ایک غلط استدلال

اس آیت سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ مقدمات کے فیصلوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ارائت الہٰی ہوتی تھی۔ یعنی خدا کی طرف سے آپ کو رائے سمجھائی جاتی تھی اور یہ ارائت الہٰی علم کا وہ کوثر ہے جس کی دھاریں انسانی دماغ سے نہیں بلکہ قلب نبوت کے سرچشمہ سے بہتی ہیں۔ انسانی خیال اور تجربہ سے نہیں بلکہ الہام الہٰی اور القائے ربانی، حکمت یزدانی، فہم رسالت بلکہ نبوت سے ماخوذ ہے اور جس کی نسبت محرم اسرار قرآن وسنت فاروق اعظم برسرمنبر فرماتے ہیں:

> لوگو! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے غلطی سے پاک تھی کیونکہ اللہ تعالیٰ آپ کو وہ رائے دکھاتا تھا اور ہماری رائے تو صرف ہمارا گمان اور سراسر تکلف ہے۔
>
> (ابوداؤد)

اور ظاہر ہے کہ ارائت الہٰی جو بمنزلہ وحی ہے غلط نہیں ہو سکتی لیکن ابوداؤد میں ایک حدیث ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اہل مقدمہ سے فرمایا:

> میں ایک آدمی ہوں تم لوگ میرے پاس اپنے جھگڑے لے کر آتے ہو اور شاید تم میں سے بعض زیادہ زبان آور ہوں جو اپنی دلیل کو خوبی سے بیان کر سکتے ہوں تو میں جیسا سنتا ہوں ویسا فیصلہ کر دیتا ہوں تو اگر میں کسی کو حق دلا دوں جو اس کا نہیں بلکہ اس کے بھائی کا ہے تو وہ نہ لے کہ میں اس کو آگ کاٹ کر دے رہا ہوں۔

اس سے ایک غلط رو شخص یہ استدلال کر سکتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے فیصلے ہمیشہ ارادت الٰہی کے تحت نہ ہوتے تھے اس لیے امت اسلام کے سیاسی نظام میں آپ کے قضایا اور فیصلوں کی پیروی پر مجبور نہیں لیکن ایسا سوچنا سراسر غلط فہمی ہے۔ اصل یہ ہے کہ مقدمات میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک واقعہ کی اصلی روداد دوسری اس روداد پر صحیح اور عادلانہ فیصلہ۔ یہ بات کہ واقعہ کی اصلی روداد کیا ہے اور مدعی، مدعا علیہ میں سے کون صحیح کہہ رہا ہے۔ علم غیب سے تعلق رکھتا ہے جس کا دعویٰ کسی نبی کو نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض ہو بھی تو یہ دعویٰ بجائے خود مسلم ہے کہ قاضی کا ذاتی علم دو انسانوں کے درمیان فیصلہ کا مبنیٰ نہیں قرار پا سکتا۔ اس کے لیے فریقین کے بیانات شہادتیں اور دلائل ہی کارآمد اور مفید ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ امر اول کے متعلق عموماً آپ کو غیب کا علم عطا نہیں ہوا۔ لیکن یہ کہنا کہ دوسری چیز یعنی جس روداد کو اپنے صحیح باور کیا اس کے مطابق آپ کا فیصلہ عادلانہ نہ ہوتا تھا۔ نبوت کی شان کی توہین اور تحقیر ہے اور اس ارادت کے خلاف ہے جس کا شرف مقدمات کے فیصلے میں قرآن کی اس آیت نے آپ کو بخشا ہے۔ اسی لیے جو غلطی فیصلوں میں آپ سے ہو سکتی تھی وہ فریقین میں سے کسی ایک کی شہادت و دلیل کو سن کر اس کے مطابق واقعہ یا خلافِ واقعہ ہونے تک محدود تھی لیکن جس کو آپ نے صحیح باور کر لیا اس کے مطابق مناسب اور صحیح حکم و فیصلہ میں آپ سے کبھی غلطی نہیں ہوئی اور نہ ہو سکتی تھی۔ اور امت آپ کی پیروی آپ کے ان قضایا اور فیصلوں میں کرتی ہے نہ کہ نزاع مذکورہ کے گزشتہ واقعات اور گزشتہ مقدمات کے صحیح یا غلط باور کرنے میں خوب سمجھ لیجئے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم روداد مقدمہ کو سامنے رکھ کر جو فیصلے فرماتے تھے وہ تمام تر حق منصفانہ اور صحیح ہوتے تھے اور ان کی اطاعت سے انحراف کفر و نفاق تھا ارشاد ہے:

وما کان لمومن ولا مومنۃ اذا قضی اللہ ورسولہ امراً ان یکون لھم الخیرۃ من امرھم ومن یعص اللہ ورسولہ فقد ضل ضلالاً مبیناً۔

اور کسی ایماندار مرد اور کسی ایماندار عورت کا یہ کام نہیں کہ جب اللہ اور اس کا رسول کسی بات کا فیصلہ کر دے تو اس کو اپنے کام کا کوئی اختیار رہے اور جو خدا اور اس کے رسول کی نافرمانی کرے گا وہ صریح گمراہ ہے۔

قانون سازی کا طریق کار

آپ کے بعد بھی امت کو قرآن میں تدبر اور تفکر کی دعوت دی گئی ہے لیکن آپ میں اور امت میں جوہری فرق ہے۔ آپ کا ہر فیصلہ قرآن سے اللہ کی ارائت ہوتا تھا جبکہ آپ کے بعد ہر شخص کا قرآن سے فیصلہ لاتے ہے اور دونوں میں آسمان و زمین کا فرق ہے۔ ایک شخص نے فاروق اعظم سے کہا فاحکم بما اراک اللہ آپ اللہ کی ارائت کے مطابق فیصلہ کیجئے۔ تو حضرت عمر نے اس کو ڈانٹا کہ یہ خصوصیت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے ہمارے پاس جو کچھ ہے وہ ارائت نہیں بلکہ رائے ہے اسی لیے خلفائے راشدین نے اپنے اپنے زمانہ میں ان نو بنو تازہ بتازہ واقعات کے فیصلوں کے لیے ماانزل اللہ کو اور اس کے بعد ما اراہ اللہ کو یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان قضایا اور فیصلوں کو جو فہم نبوت نور بصیرت اور ارائت الٰہی کے ذریعے فیصل ہوئے تھے۔ قانون سازی کے لیے مصدر قرار دیا اور ان دونوں یعنی ما انزل اللہ اور ما اراہ اللہ کو ہمیشہ کے لیے اسلامی زندگی میں قانون سازی کے لیے اصول استناد کی حیثیت حاصل ہوگئی اور اسی طریق کار کو بعد کے فقہائے نے اختیار کیا۔ اور ہر نئے واقعہ کو کتاب اللہ اور فیصلہ نبوی کے معصوم اور مسلم معیار پر جانچ کر ان میں سے کسی نہ کسی مماثل اور مشابہ فیصلہ پر قیاس کر کے اپنے فیصلے لیے اور جو چیزیں ان میں نہ ملیں ان کو معمولی عدل و انصاف، رسم و رواج، عقل و فکر استحسان وغیرہ کے اصول پر سمجھ کر ان کا فیصلہ کیا بلکہ حافظ ابن القیم تو یہاں تک فرما گئے ہیں کہ اسلام میں عادلانہ سیاست پر مبنی قانون سازی بھی اسلام ہی کا ایک باب ہے۔

کیونکہ انبیاء کی بعثت اور کتابیں نازل کرنے سے اللہ سبحانہٗ کا منشا یہ تھا کہ لوگ عدل و انصاف پر قائم رہیں۔ یہی وہ عدل ہے جس کے سہارے آسمان و زمین قائم ہیں۔ لہٰذا جب حق کی علامات نمایاں ہو جائیں، عقلی دلائل سامنے آجائیں اور کسی طریقہ سے بھی حق واضح ہو جائے تو وہی شریعت الٰہی اور دین الٰہی ہے، وہی اللہ کا فرماں ہے اور اسی میں اللہ کی رضا مضمر ہے۔ عدل تک پہنچنے کے طریقوں یا اس کے دلائل اور علامات کو اللہ نے کسی ایک قسم کے احکام میں محصور کر کے دوسرے قوی تر، زیادہ واضح اور مدلل طریقوں کو باطل نہیں قرار دیا ہے بلکہ اس نے جو طریقے بھی شروع فرمائے ہیں ان کے ذریعے یہ واضح کر دیا ہے کہ اصل مقصد حق اور عدل کا قیام اور انسانی

زندگی کی متوازن اور منصفانہ تنظیم ہے۔ بس حق تک جس طریقہ سے بھی پہنچا جا سکے اور عدل کو جس طرح بھی پہچانا جا سکے اس کے مطابق قانون سازی ضروری ہے۔ اسباب و وسائل اور طریقے مقصود بالذات نہیں ہوتے بلکہ اصل مقصود وہ مقاصد ہیں جن کی خاطر انہیں وضع کیا گیا ہو، البتہ مشروع طریقوں کو سامنے لا کر اللہ تعالیٰ نے مناسب مثالوں اور معقول اسباب کی طرف رہنمائی کر دی ہے۔ حق کے ثابت شدہ طریقوں میں سے ہر طریقہ آپ کو انہی مقاصد کی طرف لے جانے والا ملے گا۔ شریعت کاملہ سے اس کے سوا اور کسی چیز کی توقع بھی نہیں کی جا سکتی تھی، ہمارے نزدیک سیاست عادلہ شریعت کاملہ کی مخالف نہیں ہے بلکہ اسی کا ایک حصہ اور اس کے مختلف ابواب میں سے ایک باب ہے اس کو سیاست کہنا محض ایک اصطلاحی امر ہے ورنہ اگر وہ عدل پر مبنی ہو تو شریعت میں داخل ہے (اعلام الموقعین ج ۲)

جدید اسلامی قانون سازی کی اصولی حیثیت کو سمجھنے کے لیے اس نکتہ کو سمجھنا بے حد ضروری ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ دورِ جدید کی ایک اسلامی ریاست قانون سازی کی اسلامی شرائط کی پابندی کرتے ہوتے جو قوانین مرتب کرے گی وہ شرعی اور دینی حیثیت کے حامل ہوں گے۔ البتہ ان اجتہادی قوانین کو وہ حیثیت حاصل نہ ہو گی جو قرآن و سنت کے منصوص احکام کو حاصل ہے۔ اجتہادی قوانین اختلافی ہوتے ہیں۔ تفصیل امور میں اسلامی مفکرین کی ان رایوں کو حرفِ آخر سمجھنا چاہیے جو کسی نص صریح پر مبنی نہ ہوں۔

بہرحال آیت قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت میں صرف قرآن کو لوگوں تک پہنچانا ہی آپ کا کام نہیں ہے بلکہ جیسے اس کے معانی کی تشریح اور مطالب کی توضیح آپ کے فرائض میں داخل ہے ایسے ہی اللہ کی آرائ کے مطابق اس کتاب کے ذریعے لوگوں کے تمدنی، معاشی، ثقافتی، معاشرتی، دیوانی اور سیاسی معاملات و مسائل میں فیصلہ کرنا بھی آپ کا کام ہے۔ اب یہی حق و باطل کی کسوٹی ہے۔ آپ اسی کسوٹی پر رکھ کر لوگوں سے معاملہ کریں جو اس پر یعنی قرآن پر اور قرآن سے اللہ کی آرائ کے مطابق آپ کے فیصلے پر پورا اترتا ہے وہ مومن اور مخلص ہے اور جو اس میں کھوٹا ہے وہ غدار اور بے وفا ہے۔ آپ اس کی طرفداری نہ کریں۔ خواہ کوئی ہو۔

عدالت میں قضا کی نزاکت

۱۶۵۔ اور اللہ سے مغفرت مانگو بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی قبل تحقیق صرف حال کو دیکھ کر چور کو بری اور یہودی مذکورہ کو چور خیال کر لینا تمہاری عصمت اور عظمتِ شان کے مناسب نہیں اس سے استغفار چاہیے۔ اس میں ان مخلصین صحابہ کو کامل تنبیہ ہو گئی جو بوجہ اسلامی تعلق یا قومی وغیرہ، چور پر حسن ظن کر کے یہودی کے چورا بنانے میں کوشاں تھے۔[1] علماء اور شارحین قرآن نے یہ مطلب بھی بتایا ہے کہ جن لوگوں نے چور ہونے کے باوجود طعمہ کی حمایت کی اور یہودی کو چور بتایا ان کے لیے اللہ سے مغفرت مانگیے۔ مطلب خواہ کچھ ہو اور استغفار کا تعلق خواہ کسی سے ہو آیت بتا رہی ہے کہ قضا کا معاملہ جج کے لیے بڑی نزاکت کا معاملہ ہے۔ طبیعت کے میلان سے ہر وقت لغزش کا اندیشہ ہے۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

ہو سکتا ہے کہ تم ایک مقدمہ میرے پاس لاؤ اور تم میں ایک فریق دوسرے کی نسبت زیادہ چرب زبان ہو اور اس کے دلائل سُن کر میں اس کے حق میں فیصلہ کر دوں مگر یہ سمجھ لو کہ اگر اس طرح اپنے کسی بھائی کے حق میں سے کوئی چیز تم نے میرے فیصلے کے ذریعے سے حاصل کی تو دراصل تم دوزخ کا ایک ٹکڑا حاصل کرو گے۔

اگرچہ ایک قاضی کی حیثیت سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا روداد کے مطابق فیصلہ کر دینا بجائے خود آپ کے مقام عصمت کے منافی نہ تھا لیکن اس وقت جب کہ کفر و اسلام کے درمیان زبردست کشمکش برپا تھی اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رودادِ مقدمہ کے مطابق فیصلہ کر دیتے تو اسلام کے مخالفوں کو آپ کے خلاف اور اسلام کے خلاف ایک زبردست اخلاقی حربہ مل جاتا۔ اس لیے قرآن نے خاص طور پر آپ کو مخاطب کیا ہے کہ آپ کو طبیعت کے ایسے میلان سے جو کسی فریق کی چرب زبانی یا مسلمان کی حمایت کے جوش میں پیدا ہو سکتا ہے اللہ کی جناب میں استغفار کرنی چاہیے عمداً عدل و انصاف کو بالفعل ہاتھ سے نہ دیا ہو اور کسی فریق کی طرف میلان بھی نہ ہوا ہو۔ کیونکہ آپ طہارتِ قلب کے جس مقامِ رفیع پر ہیں اس کا تقاضا یہی ہے۔ ولا تکن للخائنین خصیماً مت ہو تو خیانت کرنے والوں کے لیے جھگڑا کرنے والا، اسے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

آپ نے کوئی فی الواقع طرفداری کی ہوگی۔ قرآن میں جو حکم آپ کو دیا جاتا ہے اس کا لازماً یہ منشا ہرگز نہیں ہوتا کہ آپ ایسا کر چکے ہیں اس لیے ممانعت آئی ہے بلکہ اس اندازِ بیان سے اُمت کی تعلیم مقصود ہوتی ہے اور آپ کو مخاطب کر کے اس کی سنگینی کی طرف اشارہ ہوتا ہے۔ اقم الصلاۃ کا حکم بار بار اس لیے نہیں آیا کہ آپ نے نماز چھوڑ دی تھی، آپ نے طعمہ کے واقعہ میں اس کی جانب سے جھگڑا نہیں کیا تھا بلکہ اس کے خلاف فیصلہ کیا تھا۔ اس اندازِ بیان سے دوسرے مخاطبوں کی جھوٹی امیدوں کو ختم کرنا تھا۔ ورنہ فیصلہ کے معاملہ میں حضور انور کی امانت و دیانت تو قبل از نبوت بھی مسلم تھی۔ اگر آپ میں اس قسم کی طرفداری کا ذرہ بھی ہوتا تو عرب جیسی اکھڑ قوم آپ کو الامین کا لقب کیوں کر دیتی۔ لہٰذا اگر قبل از نبوت آپ کی دیانت و امانت پر کبھی حرف گیری نہیں ہوئی ہے تو بعد از نبوت اس کا امکان بھی سوچنا حقائق و واقعات کا منہ چڑانا ہے۔ ہاں آپ کی زندگی میں ایسے واقعات ضرور پیش آئے ہیں کہ ان کے اندر اچھوں اچھوں کے پائے استقامت میں لغزش آجاتی لیکن آپ وہاں بھی فوق العادت، امانت و دیانت کے پیکر رہے۔ ایسے مواقع پر اللہ کی وحی نے آپ کی دستگیری فرمائی چنانچہ اس واقعہ میں بھی فیصلہ کرنے سے اللہ سبحانہٗ نے آپ کی دستگیری فرمائی ایک طرف یہودیوں سے سیاسی تعلقات انتہائی کشیدہ ہیں دوسری طرف حالات مقدمہ یہ ہیں کہ گواہی دینے والے گواہی دے رہے ہیں کہ طعمہ بے قصور ہے۔ ان حالات میں حضور انور کو نہ یہودیوں کے سیاسی تعلقات کی پرواہ ہے اور نہ آپ کو اس کی پرواہ ہے کہ کچھ مسلمان اس کے ساتھ ہیں۔ آپ حق و انصاف کا بول بالا کرنے ہیں اور یہودی کو دشمن ہونے کے باوجود بری اور طعمہ کو مسلمان ہونے کے باوجود مجرم گردان رہے ہیں۔ ایسے عدل و انصاف کی دنیا میں نظیر نہیں مل سکتی ہے۔

شاید یہاں آپ کے ذہن میں خلش ہو کہ صورتِ حال اگر یہ ہے تو پھر قرآن آپ کو استغفار کی کیوں تلقین کر رہا ہے استغفار کے معنی میں حفاظت چاہنے کے ہیں جیسا کہ ابن القیم نے مدارج السالکین میں لکھا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مشکلات میں حالات پر قابو پانے کے لیے اللہ کی حفاظت چاہو۔ منشا یہ ہے کہ قضا کا معاملہ ضروری ہونے کے ساتھ اپنے اندر اس قدر نزاکتیں رکھتا ہے کہ کوئی جج ایک آن کے لیے بھی اپنے آپ کو خدا کی حفاظت سے بے پرواہ نہ سمجھے۔ آپ کو مخاطب کر کے اسلام کی عدلیہ کو سمجھایا جا رہا ہے اور قرآن تعلیم دے رہا ہے کہ عدل و انصاف کے معاملہ میں کسی شخص، پارٹی، برادری، قرابت کی نہیں بلکہ عدل و انصاف کی حمایت کرنی چاہیے۔ گویا کھلے لفظوں میں بتا دیا کہ اسلام کے نقطۂ نظر سے قانون کے سامنے سب برابر ہیں۔ عدالت کے فرائض میں یہ بات

داخل ہے کہ عدالت میں بیٹھ کر جج اپنا ذاتی طبعی اور اعتقادی رجحان کا کسی درجہ میں مظاہرہ نہ کرے۔ اور جس کے بارے میں عدالت کو ذاتی طور پر برحق ہونا معلوم ہو اس کی کوئی مدد نہ کرے بلکہ عدالت کا کام یہ ہے کہ فریقین میں ہر طرح برابری کا مظاہرہ کرے اگر عدالت ایسا کرے گی تو وہ غصیم ہو جائے گی۔

خیانت کار لوگوں کی سفارش

۱۶۶- اور جو لوگ اپنے اندر خیانت رکھتے ہیں تم ان کی طرف سے نہ جھگڑ و خدا ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتا ہے جو خیانت اور گنہ گاری میں ڈوبے ہوئے ہوں۔ اس طرح کے لوگ انسانوں سے شرماتے ہیں اللہ سے نہیں شرماتے حالانکہ اللہ ان کے ساتھ ہوتا ہے جب وہ راتوں کو اپنی مجلس میں ایسی باتوں کا مشورہ کرتے ہیں جو خدا کو نا پسند ہیں وہ جو کچھ کرتے ہیں اللہ کے قابو میں ہے۔ پہلی آیت میں جب ان لوگوں کی دغا اور برائی صاف بتلادی گئی تو شاید رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بوجہ غلبہ شفقت جو آپ کو تمام انسانیت سے خصوصاً اپنی امت پر تھا حق تعالیٰ سے ان خطا واروں کی معافی چاہی اس پر ارشاد ہوا کہ ان دغابازوں کی طرف ہو کر اللہ سے کیوں جھگڑتے ہو ایسے لوگ اللہ کو نہیں بھاتے یہ تو لوگوں سے چھپ چھپ کر راتوں کو ناجائز مشورہ کرتے ہیں اور اللہ سے نہیں شرماتے جو ہر وقت ان کے ساتھ ہے اور ان کے تمام امور پر حاوی ہے اور اگر آپ نے ان کی معافی نہ بھی مانگی ہو تو آپ کی معافی مانگنے کا احتمال تو بالیقین موجود تھا دیکھئے دوسری جگہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بابت یجادلنا فی قوم لوط ان ابراھیم لحلیم اواہ منیب ارشاد صریح موجود ہے اس کی پیش بندی کے لیے حق تعالیٰ نے یہ ارشاد فرماکر ان لوگوں کی سفارش سے آپ کو روک دیا۔[1]

لا تجادل میں خطاب عام ہے جیسا کہ اگلی آیت بتارہی ہے اور انداز کلام حضور انور کے لیے خطابی انداز اس لیے اختیار کیا گیا ہے تاکہ عدلیہ کے حاکموں پر اس جرم کی قباحت اور شناعت زیادہ واضح ہو جائے۔ مسلمان حکمرانوں کو سبق دیا جارہا ہے کہ انصاف کے معاملہ میں کسی تعصب کا دخل نہ ہونا چاہیے۔ یہ ہرگز دیانت نہیں کہ خیانت کار لوگوں کی حمایت کی جائے۔ خیانت کار لوگ اللہ کو پسند نہیں ہیں الذین یختانون انفسھم سے وہی لوگ مراد ہیں جن کا ذکر پہلے خائنین میں ہو چکا ہے۔ خیانت یہاں بے وفائی اور غداری کے معنے میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اطاعت و

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وفاداری کا عہد تو انہوں نے ایمان کے ذریعے اللہ سے کیا ہے لیکن یہاں دوسروں کے لیے اظہار ہمدردی کر رہے ہیں۔ ان کی اس خیانت کے بارے میں ارشاد ہوا ہے کہ یہ خود اپنے آپ سے خیانت کر رہے ہیں اور جو شخص دوسرے سے خیانت کرتا ہے وہ درحقیقت سب سے پہلے اپنے آپ سے خیانت کرتا ہے کیونکہ دل اور دماغ کی جو قوتیں اس کے پاس بطور امانت ہیں ان میں بے جا تصرف کر کے وہ انہیں مجبور کرتا ہے کہ خیانت میں اس کا ساتھ دیں اور اپنے ضمیر کو جسے اللہ نے اس کے اخلاق کا محافظ بنایا تھا اس حد تک دبا دیتا ہے کہ وہ اس خیانت کاری میں سدِ راہ بننے کے قابل نہیں رہتا جب انسان اپنے اندر اس ظالمانہ دست برد کو پایۂ تکمیل تک پہنچا لیتا ہے تب کہیں باہر اس سے خیانت و معصیت کے افعال صادر ہونے ہیں۔[1] مطلب یہ ہے کہ اس خیانت سے اسلامی نظام کا کچھ نہیں بگڑتا بلکہ خود ان کا ہی خانہ خراب ہوتا ہے۔ خدا ایسے بدعہدوں اور ضمیر فروشوں کو پسند نہیں کرتا۔

فرمایا یستخفون من الناس ولا یستخفون من اللہ یہ لوگ انسانوں سے تو چھپتے ہیں لیکن اللہ سے نہیں چھپتے، یعنی ان کو لوگوں سے تو شرم آتی ہے مگر اللہ سے شرم نہیں آتی ہے۔ ان کو خیانت کا ارتکاب کرکے لوگوں کا ڈر تو مارا جا رہا ہے لیکن ایمان کے تقاضے کے خلاف اقدام کرکے اللہ سے نہیں ڈرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان میں فسادِ نیت موجود ہے اور دیانت و خیانت کی تمام تر بنیاد ارادہ و نیت پر ہے۔ اس فقرے کے یہ معنے بھی کیے گئے ہیں کہ یہ لوگ اپنی حرکات کو انسانوں سے تو چھپا سکتے ہیں لیکن اللہ سے نہیں چھپا سکتے ہیں کیونکہ اللہ تو ان کے ساتھ اس وقت بھی ہوتا ہے جب یہ راتوں کی تنہائیوں میں باہم اس کی مرضی کے خلاف مشورے کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دیانت امانت اور اس جیسے دوسرے اخلاق کے لیے یہ اعتقاد ضروری ہے کہ کوئی ہستی ہے جو ہمارے دل کے ہر گوشہ کو ہر طرف سے جھانک رہی ہے۔ ہم مجمع میں ہوں یا تنہائی میں، اندھیرے میں ہوں یا روشنی میں کوئی ہے جو دل کی تہ کو ہزاروں پردوں میں دیکھ رہا ہے۔ دنیا کی تمام قوتیں صرف جسم پر حکمران ہیں مگر ایک قدرت والا ہے جو دل پر حکمران ہے اور ہمہ آن ہر لحظہ ہمارے ساتھ ہے۔ یہی ایمان صحیح ہے جس سے حسن نیت پیدا ہوتا ہے۔ آبِ حیات کا وہ سرچشمہ ہے جو نہ ہو تو ہمارے اعمال سراب سے زیادہ بے وقعت ہیں اور یہی وہ مشعل ہے جو ہماری تیرہ و تار زندگی کی روشنی ہے جب تک کسی واقفِ اسرار، عالم الغیب، دانائے راز اور دل کی ہر جنبش

[1] تفہیم القرآن

اور ہر حرکت سے باخبر ہستی کا اور اس کے سامنے عمل کے مواخذہ، باز پرس اور جوابدہی کا یقین نہ ہوگا دل میں اخلاص اور نفس میں دُنیاوی اغراض سے پاکی پیدا نہیں ہو سکتی اور نہ بے غرضانہ بلند پایہ اخلاق کا وجود ہو سکتا ہے۔

غلط کار کی حمایت مسلمان نہیں کرتا

۱۶۷۔ دیکھو تم ہی وہ لوگ ہو کہ جنہوں نے ان مجرموں کی جانب سے دُنیا کی زندگی میں جھگڑا کیا ہے۔ بتلاؤ! روزِ قیامت ان کی جانب سے اللہ کی عدالت میں کون جھگڑا کرے گا یا اس روز ان کا کون کارساز ہوگا۔ اس میں خطاب ہے چور کی قوم اور ان لوگوں کو جو چور کے طرفدار ہوتے تھے۔ یعنی اللہ کو سب کچھ معلوم ہے اس بے جا حمایت سے چور کو قیامت میں کوئی نفع نہیں ہو سکتا۔ لہ

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ یہودی کے مقابلہ میں چور کی مدد کرنے والی مسلمانوں کی ایک جماعت تھی اور اصل مخاطب یہی لوگ ہیں۔ اور حضورِ انور کو اوپر کی آیات میں مخاطب کر کے ان کو بھی تنبیہہ کی گئی ہے۔ یعنی اوپر کی آیات میں حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی شخصاً مخاطب نہیں ہے بلکہ مسلمانوں میں سے وہ لوگ مخاطب ہیں جو وقتاً فوقتاً اپنے ذاتی تعلقات کی بنا پر منافقین کی حمایت کرتے تھے اور ان کی صریح غلطیوں کے باوجود ان کی بریت کے لیے کوئی نہ کوئی عذر تلاش کرتے چنانچہ یہاں روئے سخن ان کی طرف کر کے فرمایا کہ کان کھول کر سن لو! خبردار ہو جاؤ کہ آج تو تم ان کی حمایت میں مجادلہ کر رہے ہو لیکن کل جب خدا کی عدالت میں یہ پیش ہوں گے تو اللہ سبحانہٗ سے ان کی جانب سے مدافعت کون کرے گا یا ان کی جانب سے وکالت کا فرض کون انجام دے گا۔ اس طرح مسلمانوں کو آگاہ کر دیا کہ مسلمانوں کو ہم مذہب ہونے کی وجہ سے یا اپنے خاندان اور قبیلہ کا فرد ہونے کی وجہ سے کسی مجرم کی ہرگز حمایت نہ کرنی چاہیے اور سازش کر کے جتھہ بندی نہ کرنی چاہیے۔

یہ آیاتِ قرآنی بتا رہی ہیں کہ قرآن نے عدل و انصاف کا جو حکم دیا ہے وہ اخلاق معاشرت اور سیاست کے ہر گوشہ کو محیط ہے یعنی زندگی کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جس پر قرآن کی یہ تعلیم حاوی نہ ہو۔ یہ صرف قانون ہی کا تقاضا نہیں ہے بلکہ اخلاق کا بھی یہی مطالبہ ہے۔ یہاں

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

قانون و اخلاق میں ہم آہنگی ہے۔ یعنی ان آیات کی رُو سے اخلاقی طور پر اگرچہ ہر مسلمان کو عادل ہونا چاہیے لیکن حاکمِ وقت کے لیے عادل ہونا اور بھی زیادہ ضروری ہے۔ اسی لیے احادیث میں عادل حاکم کی بڑی فضیلت آئی ہے اور رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے روز جب خدا کے سائے کے علاوہ کوئی سایہ نہ ہوگا۔ سات شخصوں کو اللہ سبحانہٗ اپنے عرش کے سایہ میں جگہ دے گا جن میں ایک شخص امام عادل ہوگا۔

وَمَنْ يَعْمَلْ سُوٓءًا اَوْ يَظْلِمْ نَفْسَهٗ ثُمَّ يَسْتَغْفِرِ اللّٰهَ يَجِدِ اللّٰهَ غَفُوْرًا
رَّحِيْمًا ﴿۱۱۰﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ اِثْمًا فَاِنَّمَا يَكْسِبُهٗ عَلٰى نَفْسِهٖ ؕ وَكَانَ
اللّٰهُ عَلِيْمًا حَكِيْمًا ﴿۱۱۱﴾ وَمَنْ يَّكْسِبْ خَطِيْٓئَةً اَوْ اِثْمًا ثُمَّ يَرْمِ
بِهٖ بَرِيْٓـئًا فَقَدِ احْتَمَلَ بُهْتَانًا وَّاِثْمًا مُّبِيْنًا ﴿۱۱۲﴾ ع ۱۶/۱۳

اور جو شخص کوئی برائی کی بات کر بیٹھتا ہے یا اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر لیتا ہے اور پھر اس کی اللہ سے معافی مانگ لیتا ہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا اور مہربان پائے گا[168]، اور جو کوئی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا ارتکاب وہ اپنے ہی خلاف کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے[169]، اور جو کوئی کسی قصور کا ارتکاب کرتا ہے اور پھر اس کو کسی بے گناہ کے سر ڈال دیتا ہے تو بلاشبہ اس نے بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیا ہے۔[170]

قانون جرم پر لاگو ہے نہ الزام پر

شہریوں کا اولین حق اسلام میں یہ ہے کہ ان کے جان و مال اور آبرو کی حفاظت کی جائے اور قانونی جواز کے بغیر ان پر ہاتھ نہ ڈالا جائے جو خلاف قانون کرتا ہے خواہ کوئی ہو قانون اس کی گرفت کرے گا۔ اس کے جرم کی پاداش میں دوسرے کو نہ پکڑا جائے گا، ہم جماعت ہونا، ہم قرابت ہونا قانون کے سامنے بے حقیقت ہے۔ برائی کرنے والا ہی برائی کا ذمہ دار ہے۔ قرآن کے نزدیک اجتماع ایک بامقصد ہیئت ہے، اس کے مقاصد اور مزاج کا مطالعہ یہ بتاتا ہے کہ فرد و اجتماع کے مابین کسی تکرار کی گنجائش نہیں۔ قرآنی اجتماعیت افراد ہی کے مقاصد تکمیل کا ذریعہ ہے۔ یہ اجتماعیت انسان کے فطری رجحانات اور دواعی کے تحت ابھرتی ہے۔ اجتماع میں قانون افراد کے جذبہ طاعت اور فرمانبرداری کا عملی مظہر ہے۔ افراد اس کے ذریعے سے اپنے مشترکہ مقاصد حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ قانون فرد کے لیے ایک رحمت ہے کہ یہ ہر فرد کے تمام مادی اور روحانی مفادات کا نگران و محافظ اور ان کی ترقی و تزکیہ کا ذریعہ ہے۔ قانون ہی کے ذریعے حکومت اور دوسرے اجتماعی ادارے جنم لیتے ہیں جو انسانی زندگی کے مختلف پہلوؤں کی تعمیر و تزکیہ کے لیے مفید ثابت ہوتے ہیں، اسی طرح افراد ہی قانون کا اصل سرمایہ ہیں۔ ان ہی کے مدار پر قانون کی کامیابی کا انحصار ہے۔ انہی کی ترقی قانون کی ترقی ہے اور ان ہی کی کامیابی قانون کا مقصود ہے۔ قانون کا کام یہ ہے کہ وہ ہر فرد کی نگرانی کرے اور ان کو برائیوں سے روکے۔ ان کے باہمی تعلقات کو منظم کرے اور ان کو اسلامی طرز زندگی پر کاربند رہنے اور ہر طرح کی کج روی سے دور رہنے میں مدد دے۔ ان آیات میں بتایا ہے کہ جو برائی کرتا ہے اس کی برائی اس پر ہے یہ خیال نہ کرو کہ یہ شخص ہمارا ہم مذہب یا رشتہ دار ہے، اس کا جرم ثابت ہونے سے کسی دوسرے پر دھبہ آئے گا۔ اور بتایا کہ خود برائی کرنا اور اسے دوسرے کے سر تھوپ دینا ایک قانون شکنی دوسری قانون کی خلاف ورزی کا ارتکاب ہے۔ اس طرح دنیا کی عدالت کو دھوکا دینا ممکن ہے لیکن خدا کی عدالت کو ہرگز دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ عمل سوء، ظلم نفس، کسب اثم، کسب خطیئہ اور الزام گناہ میں نوع انسانی کے تمام افراد کی حیثیت یکساں ہے۔ کسی کا حسب نسب یا سیاسی حیثیت یا اس کی مالی حالت اس کی بنیادی قانونی حیثیت کو ذرا بھی متاثر نہیں کرتی۔

۱۶۸ - اور جو شخص کوئی بُرائی کی بات کر بیٹھتا ہے یا اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کر لیتا ہے اور پھر اس کی اللہ سے معافی مانگتا ہے تو وہ اللہ کو بخشنے والا مہربان پائے گا۔ سوء اور ظلم سے مراد بڑے اور چھوٹے گناہ ہیں یا سوء سے وہ گناہ مراد ہے جس سے دوسرے کو تکلیف ہو جیسے کسی پر تہمت لگانی اور ظلم وہ ہے کہ اس کی خرابی اپنے ہی نفس تک رہے یعنی گناہ کیسا ہی ہو۔ اس کا علاج توبہ و استغفار ہے۔ توبہ کے بعد اللہ تعالیٰ البتہ معاف کر دیتا ہے۔ اگر آدمیوں نے جان بوجھ کر فریب سے کسی مجرم کی برأت ثابت کر دی یا غلطی سے مجرم کو بے قصور سمجھ گئے تو اس سے ان کے جرم میں تخفیف نہیں ہو سکتی البتہ توبہ سے بالکل معاف ہو سکتا ہے۔ اس میں اس چور کو اس کے سب طرفداروں کو جو دیدہ دانستہ طرفدار بنے ہوں یا غلطی سے سب ہی کو توبہ اور استغفار کا اشارہ ہو گیا اور اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اب بھی اگر کوئی اپنی بات پر ڈٹا رہے گا اور توبہ نہ کرے گا تو اللہ کی بخشش اور اس کی رحمت سے محروم ہوگا۔[1]

اس میں ایک طرف تو حق و انصاف سے دشمنی رکھنے والوں کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ یہ جرم اتنا سنگین ہے کہ جب تک اللہ کی جناب میں معافی کی درخواست نہ کرے صرف قانونی سزا سے اس جرم کی سنگینی کا مداوا نہیں ہو سکتا۔ اور دوسری طرف مجرمین کو تسلی دی ہے کہ جو کچھ ہوا ہے وہ تقاضائے ایمان کے خلاف ہے۔ اب خدا کی گرفت سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی برائی ہو گئی یا اگر کسی نے اپنی جان پر ظلم کر لیا تو وہ اللہ کی طرف رجوع کرے اور اس سے مغفرت مانگے۔ جو شخص خلوص کے ساتھ استغفار کرے گا اللہ اس کے لیے غفور و رحیم ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ خواہ متعدی ہو یا لازمی یعنی حقوق العباد سے متعلق ہو یا حقوق اللہ سے ہر قسم کا گناہ توبہ اور استغفار سے معاف ہو سکتا ہے۔ ہاں توبہ کی حقیقت کا جاننا ضروری ہے محض زبان سے استغفر اللہ کہنے کا نام توبہ نہیں ہے۔[2]

انسان کے تمام کاروبار میں اصل چیز دل ہے۔ اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے وہ ناپاک ہوتا ہے۔ انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگزاشتوں کی اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیے خدا سے نکوکاری کا مستحکم وعدہ کرے تو اس کا نام توبہ ہے۔ یہ توبہ و

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف م ش

استغفار گنہ گار سے گنہ گار انسان کو بھی خدا کی آغوشِ محبت میں لاکر ڈال دیتی ہے۔ آدم علیہ السلام کا قصور اور پھر ان کی توبہ اور رحمتِ الٰہی کا رجوع واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت یہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی آغوشِ رحمت کس طرح گنہ گار کو واپس لینے کے لیے ہمیشہ رہتی ہے۔ رحمتِ الٰہی کے اس پرجوش نظارہ کی جو کیفیت یہاں قرآن نے یجد اللہ غفورا رحیما میں پیش کی ہے اس سے ہندوستان کا ہر مت اور دھرم قطعاً محروم، تورات خاموش، زبور کی سریلی آواز مدھم اور انجیل کی خوشخبری مبہم ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے اس پیامِ ربانی میں اس کی کیفیت اور اصول و شرائط کو جس انداز میں پیش کیا ہے وہ گویا رب العالمین کی طرف سے رحمۃ للعالمین کا خاص حصہ ہے۔ اس آیت کو غور سے پڑھیے اور بار بار پڑھیے۔ چور اور ڈاکو بھی اگر توبہ کریں تو اس میں ان کے لیے بھی بشارت ہے۔ یہ آیت چوتھے پارے میں پڑھ چکے ہیں کہ توبہ کے لیے ضروری ہے کہ توبہ کے بعد بندے کے دل میں آئندہ تلافی اور تدارک کا بھی احساس موجود ہو۔ توبہ کے لیے تین چیزوں کا ہونا ضروری ہے ایک گزشتہ گناہوں پر ندامت دوسرے جس گناہ میں مبتلا ہے اسے چھوڑ دینا تیسرے آئندہ کے لیے نہ کرنے کا عہد کرنا اور اگر گناہ حقوق العباد سے متعلق ہے تو صاحبِ حق سے معاف کرانا بھی توبہ کی شرط ہے۔

گناہ کی تمام تر ذمہ داری گنہ گار پر ہے

۱۶۹۔ اور جو کوئی کسی گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو اس کا ارتکاب وہ خود اپنے ہی خلاف کرتا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ یعنی جو اپنے قصد سے گناہ کرے گا اس کا وبال تو اسی پر پڑے گا اور اس کی سزا خاص اسی کو دی جائے گی۔ کسی دوسرے کو سزا نہیں ہو سکتی کیونکہ ایسا تو وہ کر سکتا ہے جس کو واقعی بات کی خبر نہ ہو یا حکمت سے بے بہرہ ہو مگر حق سبحانہٗ تو علاما مبالغہ بصیغہ مبالغہ علیم و حکیم ہے وہاں اس کی گنجائش کہاں تو اب خود چوری کر کے یہودی کے سر لگانے سے کیا نفع ہو سکتا ہے۔[1]

اس آیت میں قانونِ سزا بتایا گیا ہے کہ ہر شخص اسی قصور میں پکڑا جائے گا جس کا وہ خود مرتکب ہوا ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ قصور کوئی کرے اور پکڑا کوئی جائے۔ چوری کرے ایک

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مسلمان اور پکڑا جائے یہودی۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی کو ضرر اور نقصان جو کچھ بھی پہنچے گا۔ اس کو اپنے کسب ہی سے پہنچے گا وہ جو کچھ بوئے گا وہی کاٹے گا اور جو کچھ کرے گا وہی بھرے گا۔ نہ دوسرے کے نیک اعمال کا کریڈٹ اس کو ملنے والا ہے اور نہ دوسرے کی برائیاں اس کے کھاتے میں پڑنے والی ہیں اور نہ کوئی دوسرا اس کا بوجھ اٹھانے والا ہے۔ ہر شخص کی کامیابی اور ناکامی اس کے کسب سے بندھی ہوئی ہے یہی بات البقرہ لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت کے عنوان سے سمجھائی ہے۔ آیت کا منشاء یہ ہے کہ جو شخص ارادے کی پوری قوت سے گناہ کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ یہ اس کی کارگزاری ہے اور اس سے فائدہ اٹھاتا ہے تو اس کی یہ کارگزاری خود اس کی ذات کے لیے وبال ہے اور اس کے نتائج بد سے اس کو ہی دوچار ہونا ہے۔ دُنیا میں اس کا انجام لوگوں میں رسوائی اور عدالت میں رُسوائی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے یہاں یہ بات خوب لکھی ہے کہ کوئی شخص کسی کے کام نہ آئے گا ہر شخص کو اپنے اعمال کے نتائج بھگتنے ہوں گے اور حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

> جو شخص جان کر گناہ کرتا ہے تو اس گناہ کی پاداش، نقصان، رسوائی، بدنامی سب اسی کے لیے ہے نہ کسی اور کے لیے اس لیے تم اس اندیشہ سے کہ مجرم ہماری برادری، ہماری پارٹی کا آدمی ہے اس سے ہماری بدنامی ہے اس مجرم کی حمایت نہ کرو۔

بے گناہ کو گنہ گار اور گنہ گار کو بے گناہ بنانا

۱۱۰۔ اور جو شخص کسی قصور کا ارتکاب کرتا ہے اور اس کو کسی بے گناہ کے سر مقوپ دیتا ہے تو بلاشبہ اس نے بہتان اور کھلے گناہ کا بوجھ اپنے سر پر اٹھا لیا ہے۔ یعنی جس نے چھوٹا یا بڑا گناہ کر کے کسی بے گناہ کے ذمہ لگایا تو اس پر دو گناہ لازم ہو گئے۔ ایک جھوٹی تہمت اور دوسرا وہ اصلی گناہ۔ تو ظاہر ہو گیا کہ خود چوری کر کے یہودی پر تہمت دھرنے سے اور وبال بڑھ گیا، نفع خاک بھی نہ ہوا اور معلوم ہو گیا کہ گناہ چھوٹا ہو یا بڑا توبہ خالص کے سوا اس کا کوئی علاج نہیں ہے۔[1] بہتان یہ ہے کہ جان بوجھ کر کسی بے گناہ کو مجرم ٹھہرایا جائے یا اس کی طرف کوئی ناکردہ گناہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یا برائی منسوب کی جاتے یہ بھی ایک طرح کا جھوٹ ہے بلکہ اسی رکوع میں قرآن نے اس کو خیانت بھی کہا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ گنہ گار کو بے گناہ اور بے گناہ کو گنہ گار ٹھہرانے کی مذمت ہے۔ اور بتایا ہے کہ ایسے لوگ بھی ہوتے ہیں جو اعتراف جرم کی جگہ جھوٹ اور بہتان کی راہ اختیار کرتے ہیں اور اس کا بوجھ کسی بے گناہ پر لادنے کی کوشش کرتے ہیں۔ فرمایا کہ گناہ سے بریت کا یہ راستہ غلط ہے۔ اس بہتان اور جھوٹ سے دُنیا کی عدالت کو دھوکا دیا جا سکتا ہے اللہ سبحانہٗ کو دھوکا نہیں دیا جا سکتا۔ اللہ کی بارگاہ میں ایسے مجرم نہ صرف اپنے گناہ کا بوجھ اٹھائیں گے بلکہ اپنے اصل جُرم پر بہتان اور جھوٹ کا بھی اضافہ کریں گے۔

قرآن چونکہ محض کتاب آئین نہیں بلکہ کتاب تعلیم و تلقین اور صحیفۂ وعظ و ارشاد بھی ہے۔ اس لیے قانون و اخلاق دونوں میں ہم آہنگی رکھتا ہے۔ دُنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف قائم کرنے کے لیے دو چیزیں ہیں قانون اور اخلاق۔ اگرچہ دونوں کا منشا ایک ہے مگر منزل تک پہنچنے کے راستے مختلف ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے جس کی تلافی ایک دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا اس لیے اس کے ذریعے عدل و انصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیۃً نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں یہ دونوں چیزیں ملی جلی ہیں۔ سنت میں بھی یہ دونوں ملی ہوئی ہیں۔ خلافتِ راشدہ کے دور میں معاشرہ اسی قانون و اخلاق کا ملا جلا نمونہ ہے۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ بعد کو دونوں میں ہم آہنگی نہ رہ سکی، فقہ کے نام پر قانون اور تصوّف کے نام پر اخلاق الگ الگ ہو گئے۔ فقہ پر کام کرنے والے فقہاء اور تصوّف پر کام کرنے والے صوفیاء کہلانے لگے۔ اس کے نتیجہ میں اسلامی زندگی کن المناک نتائج کا شکار ہوئی یہ داستان طویل ہے تفصیل کا محل نہیں اور اختصار مفید مدعا نہیں ہے۔

وَلَوْلَا فَضْلُ اللّٰهِ عَلَيْكَ وَرَحْمَتُهٗ لَهَمَّتْ طَّآئِفَةٌ مِّنْهُمْ اَنْ يُّضِلُّوْكَ ؕ
وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّآ اَنْفُسَهُمْ وَمَا يَضُرُّوْنَكَ مِنْ شَيْءٍ ؕ وَاَنْزَلَ اللّٰهُ
عَلَيْكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَعَلَّمَكَ مَا لَمْ تَكُنْ تَعْلَمُ ؕ وَكَانَ فَضْلُ
اللّٰهِ عَلَيْكَ عَظِيْمًا ﴿۱۱۳﴾ لَا خَيْرَ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنْ نَّجْوٰىهُمْ اِلَّا مَنْ اَمَرَ
بِصَدَقَةٍ اَوْ مَعْرُوْفٍ اَوْ اِصْلَاحٍ بَيْنَ النَّاسِ ؕ وَمَنْ يَّفْعَلْ ذٰلِكَ
ابْتِغَآءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ فَسَوْفَ نُؤْتِيْهِ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۱۱۴﴾ وَمَنْ يُّشَاقِقِ
الرَّسُوْلَ مِنْ بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُ الْهُدٰى وَيَتَّبِعْ غَيْرَ سَبِيْلِ الْمُؤْمِنِيْنَ
نُوَلِّهٖ مَا تَوَلّٰى وَنُصْلِهٖ جَهَنَّمَ ؕ وَسَآءَتْ مَصِيْرًا ﴿۱۱۵﴾

اور اے پیغمبر اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں ایک جماعت نے تمہیں صراطِ مستقیم سے بہکانے کا پورا ارادہ کر لیا تھا فی الواقع یہ اپنے آپ ہی کو بہکا رہے ہیں، اور تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے، اور اللہ نے تم پر کتاب

اور حکمت اتاری ہے اور تمہیں وہ باتیں سکھلا دی ہیں جو تمہیں
معلوم نہ تھیں اور تم پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے[۱۱۲]۔ ان لوگوں کی
خفیہ سرگوشیوں میں اکثر مشورے بھلائی کے لیے نہیں ہوتے
ہیں ہاں جو کوئی خیرات کے لیے یا کسی نیک کام کے لیے حکم
کرے یا لوگوں میں صلح وصفائی کرا دے تو یہ بے شک بھلائی کی
بات ہے اور جو کوئی یہ کام اللہ کی رضا کا متلاشی ہو کر کرتا ہے
تو ہم اسے اجرِ عظیم دیں گے[۱۱۳]۔ اور جو بھی اللہ کے رسول کی مخالفت
پر راہ ہدایت واضح ہو جانے کے باوجود کمربستہ ہو جاتا ہے
اور اہلِ ایمان کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ پر چلتا ہے تو ہم اسے
اسی طرف کو لے جائیں گے جس طرف وہ خود پھر گیا اور ہم
اسے دوزخ میں داخل کریں گے دوزخ بدترین جگہ ہے[۱۱۴]۔

برہانِ فضل اور برہانِ رحمت

قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال علم اور کمال عمل کو رحمت اور فضل سے تعبیر کیا ہے جس

چیز کو پہلی آیات میں ما انزل اللہ اور ما اراہ اللہ کہا ہے اسی کا پھر ان آیات میں فضل و رحمت کے عنوان سے پیش کیا ہے فضل کہتے ہیں ان خوبیوں کو جو انسان کی ذات میں ایسا جلا پیدا کریں جس سے دوسرے متاثر ہوں اور رحمت نام ہے اس شرف کا جو آدمی کو بغیر محنت حاصل ہو جاتے نبوت کا علم سرتاسر رحمت ہے کیونکہ وہی ہے جو ما انزل اللہ ہے اور نبوت کا عمل اللہ کا فضل ہے کیونکہ محنت اور مشقت کے ذریعے عطا ہوا ہے۔ قرآن میں ہے :

الا رحمة من ربك ان فضله كان عليك كبيراً

مگر مہربانی تیرے رب کی جانب سے اور اس کی بخشش تجھ پر بڑی ہے ۔

اس آیت میں یہ بتایا ہے کہ علم وحی اور کتاب کا آنا اگر اللہ سبحانہٗ کی رحمت ہے تو اسی کے نتیجے میں آپ کی محنتوں، مشقتوں کے ذریعے آپ کے دامن میں عمل کا ظہور صرف اللہ کا فضل نہیں فضل کبیر ہے آپ کے علم میں اگر شان اعجاز ہے تو آپ کے عمل میں شان تعبد ہے۔ علم اگر پڑھنے کی چیز قرآن ہے تو عمل برتنے کی چیز سنت ہے۔ گویا اسلام نے دُنیا کو جو کچھ دیا ہے وہ سچے علمی حقائق اور اچھے عملی نظام کے سوا کچھ نہیں ہے اور کیوں نہ ہو ؟ جب کہ یہ امر واقعہ ہے کہ نبوت نام ہے اللہ کی نمائندگی کا، اللہ کی ذات اگر جامع الکمالات ہے تو ضروری ہے کہ جو جامع الکمالات کی نمائندگی کر رہا ہے وہ بھی مجمع الکمالات ہو۔ کمال علمی کی حد تک اگر قرآن ایک جامع کتاب ہے تو قرآن کے نقش کو مجمع ہونا چاہیے تاکہ نمونہ کو کامل نمونہ اور عمل کو نقش قرآن کہا جا سکے۔ حضرت نوح کی زندگی کفر کے خلاف غیظ و غضب کا ولولہ پیش کرتی ہے۔ حضرت ابراہیم کی حیات بت شکنیوں کا منظر دکھاتی ہے، حضرت موسیٰ کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد شان نظم و نسق اور اجتماعی دستور و قوانین کی مثال پیش کرتی ہے۔ حضرت عیسیٰ کی لائف صرف خاکساری، تواضع، عفو و درگزر اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے، حضرت سلیمان کی زندگی شاہانہ اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ حضرت ایوب کی حیات صبر و شکر کا نمونہ ہے، حضرت یونس کی سیرت ندامت و انابت اور اعتراف کی مثال ہے۔ حضرت یوسف کی زندگی قید و بند میں بھی دعوت حق اور جوش تبلیغ کا سبق ہے۔ حضرت داؤد کی سیرت گریہ و بکا، حمد و ستائش اور دُعا و زاری کا صحیفہ ہے۔ حضرت یعقوب کی زندگی اُمید، خدا پر توکل اور اعتماد کی مثال ہے لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرۃ مقدسہ نوح و ابراہیم، موسیٰ و عیسیٰ، سلیمان و داؤد، ایوب و یونس اور یوسف و یعقوب سب کی زندگیاں اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے یہی معنے ہیں ان فضله كان كبيرا، اور وكان فضل الله عليك عظيماً کے۔

اس رکوع میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے کمال علم اور کمال عمل کو پیش کر کے آپ کے پیش کیے ہوئے اسلامی نظام کا دوسرے نظاموں سے مقابلہ کیا ہے۔ یہ پہلے سُن آئے ہو کہ منافقین اہل کتاب میں سے تھے جو دعویٰ تو یہ کرتے تھے کہ وہ قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور پچھلی کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں لیکن اپنے تمدنی و مالیاتی مسائل میں اسلام کے سیاسی نظام کو جس کی اساس اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول ہے نہیں مانتے تھے یہاں ان کو یہی سمجھایا جا رہا ہے کہ محمد رسول اللہ جو نظام اسلامی نبوت کے علم و عمل کی صورت میں لے کر آئے تمام نظاموں میں افضل، اولیٰ اور فائق ہے اور اس میں ہر قسم کی زد سے حفاظت کی ضمانت ہے۔

۱۱۳۔ اور اے پیغمبر اگر تم پر اللہ کا فضل اور اس کی رحمت نہ ہوتی تو ان میں سے ایک جماعت نے تمہیں صراط مستقیم سے بہکانے کا پورا ارادہ کر لیا تھا فی الواقع یہ اپنے آپ ہی کو بہکا رہے ہیں اور تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔ اگرچہ عام شارحین قرآن نے ان آیات کو اسی پس منظر سے مربوط کرنے کی کوشش کی ہے جس کی طرف پہلے اشارہ ہو چکا ہے لیکن ہمارے خیال میں یہ مستقل بات ہے اور اس میں یہ اہم اعلان کیا گیا کہ :

الف : آپ اسلامی نظام جو نبوت کے علم و عمل کی صورت میں لے کر آتے ہیں یہ اللہ کی رحمت اور اس کا فضل ہے

ب : اگر فضل و رحمت یعنی علم و عمل کا یہ نظام نہ ہوتا تو یہ لوگ آپ کو اپنے نظاموں پر چلا لیتے اور اس طرح آپ کو اپنی جگہ سے ہٹا دیتے۔

ج : اس کی مخالفت نفاق کی صورت میں جو بھی کر رہا ہے اس سے آپ کا نقصان نہیں بلکہ مخالفت کرنے والوں کا اپنا نقصان ہے۔

د : اس نظام کو مان کر اس سے منحرف ہونے والے لوگ خود اپنے کو گمراہ کرتے ہیں۔ آپ کو راہِ حق سے ہٹانے میں وہ کامیاب نہ ہوں گے

یہ چاروں باتیں پہلے الم نشرح ہو چکی ہیں۔

نبوت کا علم و عمل اللہ کی رحمت اور فضل ہے

پہلے اس بات پر غور کرو کہ نبوت اور اس کے مخالفوں میں یہاں بنائے نزاع کیا ہے اور پھر یہ سوچو کہ یہاں مخالف کون ہے۔ یہود و نصاریٰ تھے جن کے پاس کتاب تھی جو نبوت کو مانتے

اور آخرت پر ایمان کے مدعی تھے۔

بنا بر نزاع کیا بات تھی کیا یہ تھی کہ وہ خدا کو مانتے نہیں تھے اور خدا کی مقدس کتابوں کا انکار کرتے تھے؟ کیا یہ تھی کہ انہوں نے حضور انور کو نہیں مانا تھا، کیا یہ تھی کہ انہوں نے قرآن کے خدا کی کتاب ہونے کا انکار کر دیا تھا۔ قرآن گواہ ہے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات نہ تھی۔ خدا اور آخرت پر ایمان کے وہ مدعی تھے امنا باللہ وبالیوم الاخر۔ مقدس کتابوں اور قرآن کو خدا کی کتاب مانتے تھے یزعمون انھم آمنوا بما انزل الیک وما انزل من قبلک۔

اصل یہ ہے کہ ان کی مخالفت صرف اس لیے تھی کہ وہ قرآن کو مانتے ہوئے صرف انفرادی زندگی تک محدود رکھنا چاہتے تھے وہ اسے ایسا نظام نہیں سمجھتے تھے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی اور عملی پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہو۔ وہ نمازیں پڑھتے ہوتے مقدمات و معاملات کا فیصلہ طاغوت سے کرا لیتے یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت۔ وہ اسلام کے تحفظ کے لیے کوئی قربانی کرنا گوارا نہ کرتے تھے لما کتب علیھم القتال، اور کبھی میدان مقابلہ میں جاتے ہیں اور اپنی غلطیوں اور کمزوریوں کی وجہ سے کہیں ناکامی ہوتی ہے تو ذات نبوت کو اپنی تنقید کا نشانہ بنا لیتے ہیں۔ یقولون ھذا من عندک اہل ایمان میں بزدلی پیدا کرنے کے لیے قسم قسم کی افواہیں اڑاتے اذا جاء ھم امر من الامن او الخوف اذاعوا بہ اسلام کی خاطر ان کو اپنے مفادات کو چھوڑنا گوارا نہ تھا۔ اور ہجرت کے لیے تیار نہ تھے۔ یہ لوگ یہودیوں میں سے تھے، اور انہوں نے مسلمانی کا لبادہ پہن لیا تھا۔

ان کو پیش نظر رکھ کر قرآن کہتا ہے کہ اگر آپ اسلام کے اس نظام کے علمبردار نہ ہوتے جو آپ کے کمال علم اور کمال عمل کی صورت میں آپ کے پاس موجود ہے تو آپ ان منافقین کے شر سے محفوظ نہ رہتے لیکن چونکہ اللہ نے آپ کو اپنے فضل و رحمت کا نظام دے کر روانہ کیا ہے اس لیے اس کے مقابلے میں وہ نظام نہیں ٹھہر سکتے جن کے وہ علمبردار ہیں اس لیے ان کی ہمتیں پست ہیں اختلاف تعبیر سے حقیقت مختلف نہیں ہوتی۔ قرآن کبھی نبوت کے علم و عمل کو فضل و رحمت کہتا ہے کبھی حبل اللہ، کبھی کتاب و حکمت کہتا ہے مصداق سب کا ایک ہے۔ فقہاء کی زبان میں اسی کا نام شریعت ہے اور اسی کو قرآن نے انعام خداوندی قرار دیا ہے اور نبوت کے اسی کمال علم اور کمال عمل کا نام صراط مستقیم ہے۔ یہاں فضل اور رحمت کے الفاظ کمال علم اور کمال عمل کے لیے لا کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان اور عصمت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور

بتایا ہے کہ اس عالم امکان میں کمالات علمی ہوں۔ یا کمالات عمل دونوں میں آپ کی ذات گرامی اصل اور مصدر کی حیثیت رکھتی ہے۔ انبیاء سابقین کے لیے اور قیامت تک ہونے والی اُمت کے لیے بھی۔ شاید آپ حیران ہوں کہ یہ کیوں کر ہو سکتا ہے۔ پہلی بات کہ آپ انبیاء سابقین کے لیے علم و عمل میں اصل ہیں۔ مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اور دوسری بات کہ آپ اُمت کے لیے علم و عمل میں مصدر ہیں، شاہ عبدالعزیز نے پیش فرمائی ہے۔ اس پر تفصیلی بحث کی تو یہاں گنجائش نہیں ہے، کچھ ارشادات پیش خدمت ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

کمال علم کے لیے لازم ہے کہ اعلیٰ درجہ کی معلومات تک ذہن پہنچے لہٰذا جو شخص کمال علم میں تمام انسانوں میں ممتاز ہوگا بلا شبہ عمدہ سے عمدہ معلومات تک اس کی رسائی ہوگی اور کمال عمل کے لیے ضروری ہے کہ علم سے متاثر ہو اور اعمال علمی ہدایات کے مطابق صادر ہوں۔ اس بنا پر یہ کہنا بالکل ہدایت عقل کا تقاضا ہے کہ علم کے لیے عمل لازم ہے بشرطیکہ طبیعت عمل میں صحت ہو۔ اگر طبیعت میں کوئی کمی ہوگی تو ظہور عمل نہ ہوگا۔ علم ہو اور عمل نہ ہو۔ اس کا تعلق قابل سے ہے فاعل سے ہرگز نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مصدر کے حق میں وصف صادر خانہ زاد ہوتا ہے لہٰذا جو شخص کمال علمی کے لیے مصدر ہو اور پھر چونکہ کمال علمی کمال عمل کے لیے اصل اور منشا ہے اس لیے لازماً وہ کمال عمل کے لیے بھی مصدر ہوگا تو چونکہ اصل اور مصدر وصف اپنے وصف میں اکمل اور افضل ہوتا ہے اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کمال علم اور کمال عمل میں کامل ہونا بلکہ اکمل اور افضل ہونا اور اعلیٰ و اشرف ہونا ضروری ہے۔ الحاصل حضور انور میں دونوں کمال بدرجہ کمال موجود ہیں وجہ اس کی یہی ہے کہ آپ کی ذات گرامی دونوں کمالوں کے لیے مصدر ہے اس لیے کمال علمی کے تقاضے کے تحت ضروری ہے کہ آپ کو خدا کے جلال و جمال سے بدرجہ کمال واقفیت ہو، اتنی واقفیت کہ آپ کے مقابلہ میں کوئی ہم سنگ تو کیا پاسنگ بھی نہ ہو سکے۔ اور پھر بمقتضائے کمال عملی علم جلال و جمال سے بدرجہ کمال متاثر ہو۔ اس کے بعد بمقتضائے کمال علمی اسرار احکام خداوندی سے آگاہ ہو اور پھر بمقتضائے کمال عمل اس کے موافق بجالائے۔ کمال علمی پر تو اعجاز قرآنی کافی ہے۔ کمال علمی کے لیے یہ ضروری ہے کہ معلومات کاملہ تک بوجہ احسن

پہنچے قرآن اس موضوع پر اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اگر کوئی زمانے تو اس سے بہتر یا اس جیسی کتاب لے کر آتے۔ قرآن علم حقائق، علم وقائع میں اپنی مثال آپ ہے۔

نبوت کے علم وعمل کی درسگاہ

شاہ عبدالعزیز نے اپنی تفسیر میں نبوت کے کمال علم وعمل کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔ بات شاہ صاحب کی ہے اور الفاظ میرے نہیں سید سلیمان کے ہیں۔ شاہ صاحب نے نبوت کے کمال علم وعمل کو ۱۲ انشیمنوں کی تمثیل سے سمجھایا ہے اور سید صاحب موصوف نے اسی کی اس طرح توضیح کی ہے آؤ ذرا اس عرب کے معلم کی درسگاہ کا مطالعہ کریں اور لسوف فضل اللہ علیک و رحمتہ کی تفسیر آنکھوں سے دیکھیں۔ یہ طالب علم کون ہیں؟ ابو بکر، عمر، عثمان، علی، طلحہ و زبیر مکہ کے قریشی طلبہ ہیں۔ یہ کون ہیں ابوذر، انس ہیں یہ مکہ سے باہر تہامہ کے قبیلہ غفاری کے فرزند ہیں۔ یہ ابو ہریرہ اور طفیل بن عمرو ہیں، یمن سے آئے ہیں اور قبیلہ دوس سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ ابو موسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل ہیں، یہ بھی یمن سے آئے ہیں اور دوسرے قبیلوں کے ہیں۔ یہ کون ہیں یہ ضماد بن ثعلبہ ہیں قبیلہ ازد کے ہیں یہ کون ہیں خباب بن الارت قبیلہ تمیم سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ منقذ بن حبان اور منذر بن عائذ ہیں، عبدالقیس کے قبیلہ کے ہیں اور بحرین سے آئے ہیں، یہ عبید و جعفر عمان کے رئیس ہیں۔ یہ فروہ معان کے رہنے والے ہیں۔ یہ بلال حبش سے آئے ہیں، یہ صہیب رومی کہلاتے ہیں۔ یہ ایران کے سلمان فارسی ہیں۔ یہ درسگاہ نبوت کے طالب علم ہیں۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس میں داخلہ کے لیے رنگ و روپ، وطن، قوم، ملک اور زبان و لہجہ کی کوئی قید نہیں ہے بلکہ داخلہ دنیا کے تمام خاندانوں، تمام قوموں، تمام ملکوں اور تمام زبانوں کے لیے عام ہے۔

صلائے عام ہے یاران نکتہ داں کے لیے۔

نبوت کے علم وعمل کے کمال کا پورا پورا اندازہ کرنا چاہتے ہو تو درسگاہ نبوت کی حیثیت بھی معلوم کر لو کیا یہ وہ کالج ہے جہاں صرف ایک فن کی تعلیم ہوتی ہے یا اس کی حیثیت ایک جامعہ کی ہے جہاں ذوق مناسبت طبع واستعداد کے مطابق ہر ملک کے لوگوں کو اور ہر قوم کے افراد کو الگ تعلیم دی جاتی ہے۔ ایک طرف عقلائے روزگار، اسرار فطرت کے محرم، دنیا کے جہانبان اور ملکوں کے فرمانروا اس درسگاہ سے تعلیم پا کر نکلے ہیں۔ صدیق اکبر، فاروق اعظم، عثمان غنی، علی مرتضیٰ، اور معاویہ ابن ابی سفیان اسی درسگاہ کے فضلاء ہیں جنہوں نے مشرق سے مغرب تک، افریقہ سے

پاکستان تک فرماں روائی کی ہے جو دنیا کے بڑے سے بڑے شہنشاہ اور حکمران کی سیاست و تدبیر اور نظم و نسق کے کارناموں کو منسوخ کر دیتی ہے۔ ان کے عدل و انصاف کے فیصلے ایرانی دستور اور رومی قانون کو بے اثر کر دیتے ہیں اور دنیا کی سیاسی و انتظامی تاریخ میں وہ درجہ حاصل کر لیتے ہیں جن کی مثال نہیں ملتی ہے۔

دوسری طرف خالد بن ولید، سعد بن ابی وقاص، ابو عبیدہ ابن الجراح، عمرو بن العاص ہیں جو دنیا کے وہ فاتح اعظم اور سپہ سالار اکبر ہیں جن کے فاتحانہ کارناموں کی دھاک آج بھی دنیا میں بیٹھی ہوئی ہے۔ سعد بن ابی وقاص نے ایران کا تاج شاہی اتار کر اسلام کے قدموں پر ڈال دیا۔ ابو عبیدہ نے رومیوں کو شام سے نکال کر ابراہیم کی موعودہ زمین کی امانت مسلمانوں کے سپرد کر دی۔ عمرو بن العاص نے فرعون کی سرزمین وادیٔ نیل رومن شہنشاہی کے ہاتھوں سے زبردستی چھین لی۔ عبداللہ بن زبیر اور ابن ابی سرح نے افریقہ کا میدان دشمنوں سے جیت لیا۔ یہ وہ مشہور فاتح اور سپہ سالار ہیں جن کی قابلیتوں کو زمانے نے تسلیم کیا ہے اور تاریخ نے ان کی بزرگی کی شہادت دی ہے۔

تیسری طرف باذان بن ساسان یمن، خالد بن سعید صنعا، مہاجر بن امیہ کندہ، زیاد بن لبید حضرموت، عمرو بن حزم نجران، یزید بن ابی سفیان تیما، علاء بن حضرمی بحرین، وغیرہ بیسیوں وہ صحابہ ہیں جو صوبوں میں گورنر کی حیثیت سے کام کر رہے تھے۔

چوتھی طرف فقہاء و مجتہدین کی صف ہے ان میں عمر بن الخطاب، علی ابن ابی طالب، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو ابن العاص، حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ، ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت ابن زبیر وغیرہ ہیں۔ جنہوں نے اسلام کے فقہ و قانون کی بنیاد ڈالی۔

پانچویں طرف قراء اور ارباب تجوید کی صف ہے مثلاً ابی بن کعب، عثمان بن عفان، عبداللہ بن مسعود، علی ابن ابی طالب، زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری، ابو الدرداء، ابو ہریرہ، عبداللہ بن عباس، سالم مولیٰ حذیفہ، عقبہ بن عامر، عبداللہ بن عمر، ابو زید، معاذ بن جبل، عبداللہ بن السائب۔

چھٹی طرف عام روایت و تاریخ کی جماعت ہے۔ مثلاً حضرت ابو ہریرہ، حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت انس بن مالک، حضرت ابو سعید خدری، حضرت عبادہ ابن الصامت، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت براء بن عازب وغیرہ سینکڑوں صحابہ ہیں جو احکام و وقائع کے ناقل اور راوی ہیں۔

ساتویں طرف ان اصحاب صفہ کی جماعت ہے جن کے پاس سر رکھنے کے لیے مسجد نبوی کے

چبوترے کے سوا کوئی جگہ نہ تھی۔ بدن پر کپڑوں کے سوا دنیا میں ان کی کوئی ملکیت نہ تھی۔ یہ رات کو عبادت کرتے اور دن میں اسلام کی رضا کارانہ خدمات انجام دیتے۔

آٹھویں طرف ان پاکباز زاہدوں کی جماعت ہے جن کے مانند آسمان کے نیچے ان سے زیادہ حق گو پیدا نہیں ہوا۔ ان کے نزدیک آج کا کھانا کل کے لیے اٹھا کر رکھنا بھی شانِ توکل کے خلاف تھا۔ ان کو دربارِ رسالت سے مسیح الاسلام کا خطاب عنایت کیا تھا۔ عثمان بن مظعون ہیں جو اسلام کے پہلے صوفی کہلاتے ہیں، ابو الدرداء ہیں جن کی راتیں نمازوں میں اور دن روزوں میں گزرتے تھے۔

نویں طرف مدبرین کی جماعت ہے اس میں طلحہ ہیں زبیر ہیں، مغیرہ ہیں مقداد ہیں، سعد بن معاذ ہیں، سعد بن عبادہ ہیں، اسید بن حضیر اور اسعد بن زرارہ ہیں۔

گیارہویں طرف معاشیات کے ماہرین کی جماعت ہے ان میں عبدالرحمان بن عوف اور سعد بن زبیر ہیں۔

بارہویں طرف حق کے شہیدوں کی وہ جماعت ہے جنہوں نے خدا کی راہ میں جان قربان کی ہے مگر حق کا ساتھ چھوڑنے پر راضی نہ ہوئے۔

سوچنے کی بات ہے یہ وہی وحشی عرب وہی بت پرست عرب بااخلاق عرب ہیں۔ یہ انقلاب کیوں کر آیا؟ ایک اُمی کی تعلیم جاہل عربوں کو عاقل، روشن دل روشن دماغ اور متقن کر کر بناگئی۔ اس سوال کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ یہ سب کچھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالِ علم اور کمالِ عمل کا کارنامہ ہے۔ آپ کی ذات ان دو کمالوں کا مجموعہ تھی اور یہ سب ان ہی کی نیرنگیاں اور جلوہ آرائیاں ہیں جو کبھی صدیق و فاروق ہو کر چمکتی تھیں۔ کبھی ذی النورین اور مرتضیٰ ہو کر نمایاں ہوتی تھیں، کبھی خالد اور ابو عبیدہ، اور کبھی سعد و جعفر طیار ہو کر سامنے آتی تھیں۔ کبھی ابن عمر اور ابوذر اور سلمان اور ابوالدرداء ہو کر مسجد و محراب میں نظر آتی تھیں، اور کبھی ابن عباس، ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود کی صورت میں علم و فن کی درس گاہ اور عقل و حکمت کا دبستان بن جاتی تھیں اور کبھی بلال و صہیب اور عمار و خبیب کی امتحان گاہوں میں تسلی کی رُوح اور تسکین کا پیام بن جاتی تھیں۔ گویا یہ نبوت کے کمالِ علم اور کمالِ عمل کا آفتاب عالمتاب تھا جس سے اونچے پہاڑ، ریتلے میدان، بہتی نہریں، سرسبز کھیت اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق تابش اور نور حاصل کر رہے تھے یا فضل و رحمت کا ابرِ باراں تھا جو پہاڑ،

جنگل، میدان، کھیت و باغ ہر جگہ برستا تھا اور ہر ٹکڑا اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا تھا اور قسم قسم کے درخت اور رنگا رنگ پھول اور پتے جم رہے تھے اور اُگ رہے تھے۔

اہل ایمان کو گمراہ کرنے کی سازش

ارشاد ہوا ہے کہ اگر اے پیغمبر تمہارے ساتھ نبوت کا علم و عمل خدا کے فضل و رحمت کی صورت میں نہ ہوتا تو ان میں ایک جماعت نے تمہیں صراطِ مستقیم سے بھٹکانے کا پورا ارادہ کر لیا تھا۔ یہ بات قرآن نے یہودیوں کے بارے میں ایک بار نہیں متعدد بار کہی ہے۔ یہ بات یہاں ذہن میں رکھیے کہ منافقین کا تعلق یہودیوں سے تھا۔ پہلے پارے میں آپ پڑھ چکے ہیں۔

ودّ کثیر من اھل الکتاب لو یردونکم من بعد ایمانکم کفاراً

اہل کتاب میں سے اکثر کی خواہش یہ ہے کہ تمہیں ایمان کے بعد پھر کافروں میں واپس لوٹا دیں۔

تیسرے پارے میں ہے:

ودت طائفۃ من اھل الکتاب لو یضلونکم

اہل کتاب میں سے ایک جماعت کی خواہش ہے کہ تم کو گمراہ کر دیں۔

اور چوتھے پارے میں ہے،

یا ایھا الذین آمنوا ان تطیعوا فریقاً من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین۔

اے اہل ایمان اگر تم اہل کتاب میں سے کسی ایک گروہ کی اطاعت کرو تو وہ تمہیں ایمان کے بعد کافر بنا دیں گے۔

ان سب آیتوں میں وہی بات کہی گئی ہے جو زیرِ تشریح آیت میں بتائی گئی ہے یعنی یہ کہ ان کی سازش یہ ہے کہ اے پیغمبر تمہیں جادۂ حق سے ہٹا دیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ اللہ کے فضل و رحمت سے ہمدوش نہ ہوتے تو یہ لوگ اپنے مقصد میں کامیاب ہو جاتے لیکن چونکہ آپ اللہ کی جانب سے کمال علم اور کمال عمل لے کر آئے ہیں اس لیے آپ ان کے مقابلے میں کامیاب ہیں اور ان کا کوئی چال گمراہی کا آپ کے مقابلہ میں کامیاب نہ ہوگا۔ یہاں جو بات کہی گئی ہے کہ اللہ کی رحمت اور فضل کی موجودگی ان گمراہ کرنے والے لوگوں کے راستے میں

اڑا ہے۔ اگر یہ نہ ہوتے تو ان کی سازشیں کامیاب ہو جاتیں۔ یہی بات اہل ایمان کو مخاطب کر کے چوتھے پارے کے آغاز میں دوسرے انداز میں کہی ہے پہلے یہ بتایا کہ اگر تم اہل کتاب کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں ایمان کے بعد راہ کفر کی طرف لے جائیں گے اور پھر فرمایا کہ:

وکیف تکفرون و انتم تتلی علیکم آیات اللہ و فیکم رسوله

تمہارے لیے کفر کی طرف جانے کا اب کیا موقع ہے جب کہ تم کو اللہ کی آیات سنائی جارہی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

یہاں اسی چیز کو آیات اللہ اور رسول اللہ سے تعبیر کیا ہے جیسے زیر تشریح آیت میں فضل اللہ اور رحمت اللہ کہا ہے اور بتایا ہے کہ نبوت کے کمال علم اور کمال عمل پر مشتمل نظام اسلامی کے ہوتے ہوتے تم راہ کفر کیوں کر اختیار کر سکتے ہو۔ اس آیت میں بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی کہا گیا ہے کہ نبوت کے کمال علم رحمت الٰہی اور کمال عمل فضل الٰہی پر مبنی اسلامی نظام کی موجودگی میں آپ کو راہ سے ہٹانا ممکن نہیں۔ ان کی سازشوں کا آپ پر کوئی اثر نہ ہوگا بلکہ یہ خود ہی ان سازشوں کے جال میں پھنس کر رہ جائیں گے۔ وما یضلون الا انفسهم کا یہی مطلب ہے۔ اور اگر آیت قرآنی کے پس منظر میں رکھ کر آپ مطلب سمجھنا چاہتے ہیں تو آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر وہ غلط روداد پیش کر کے تمہیں غلط فہمی میں مبتلا کرنے میں کامیاب ہو بھی جاتے اور اپنے حق میں انصاف کے خلاف فیصلہ حاصل کر لیتے تو نقصان انہی کا تھا آپ کا کچھ بھی نہ بگڑتا کیونکہ خدا کے نزدیک مجرم وہ ہوتے نہ کہ تم۔ جو شخص حاکم کو دھوکہ دے کر اپنے حق میں غلط فیصلہ حاصل کرتا ہے وہ دراصل خود اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کرتا ہے کہ ان تدبیروں سے حق اس کے ساتھ ہو گیا حالانکہ فی الواقع اللہ کے نزدیک حق جس کا ہے اسی کا رہتا ہے اور حاکم کے غلط فیصلے سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔[1]

نبوت کے علم کی وسعت اور عمل کی عظمت

۱۱۲۔ اور اللہ نے تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے اور تمہیں وہ کچھ سکھلا دیا جو تمہیں معلوم نہ تھیں اور تم پر اللہ کا بڑا ہی فضل ہے۔ اس میں خطاب ہے رسول علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کی

[1] تفہیم القرآن۔

طرف اور اظہار ہے ان خوبیوں کے قریب کا اور بیان ہے آپ کی عظمت و شان عصمت کا اور اس کا کہ آپ کمال علمی میں جو تمام کمالات سے افضل اور اوّل ہے سب سے فائق ہیں اور اللہ کا فضل آپ پر بے نہایت ہے جو ہمارے بیان اور ہماری سمجھ میں نہیں آسکتا۔ ؎

پوری آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ منافقین کا ایک گروہ آپ کو غلط رائے دے کر بہکانا چاہتا تھا مگر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ ان کی یہ چال کارگر نہ ہوئی اور آپ کو بہکا نہ سکے اس کی وجہ یہ تھی کہ اللہ کا آپ پر فضل اور رحمت ہے اور وہ رحمت و فضل یہ ہے کہ اس نے آپ پر کتاب اور حکمت اتاری اور آپ کو وہ علم عطا کیا جو پہلے نہ تھا۔ اس سے ظاہر ہوا کہ گمراہی سے آپ کی یہ حفاظت خطا سے یہ عصمت اور علم کی یہ بخشش آپ کو کمالِ علم اور کمالِ عمل ملنے کی وجہ سے حاصل ہوئی ہے۔

یہاں کتاب سے مراد علم نبوت یعنی قرآن اور حکمت سے مراد عمل یعنی سنت ہے۔ اصل حکمت وہ نورِ نبوّت اور الہامی معرفت ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب وسینہ میں ودیعت کیا تھا اور چونکہ آپ کے سنن و اقوال آپ کی اسی ودیعت شدہ حکمت نبوی کی پیداوار اور آثار و نتائج ہیں اس لیے ان پر بھی حکمت کا اطلاق ہوا ہے۔

علم کے لغوی معنے جاننے کے ہیں اور تعلیم اسی سے متعدی ہے سکھانے کو کہتے ہیں مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہو گی۔ نبوّت کے تعلق سے جب اس کا استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً خدا کی توحید ذات و صفات، دین و شریعت کے احکام اور اخلاقی تعلیمات مراد ہوں گے۔ حضرت ابراہیم توحید پر استدلال کرتے ہوئے اپنے باپ سے فرماتے ہیں:

یا ابت انی قد جاءنی من العلم ما لم یاتک

اے میرے باپ میرے پاس علم کا وہ حصہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں آیا۔

حضرت خضر کے بارے میں ہے:

وعلّمناه من لدنا علماً

ہم نے اپنے پاس سے اسے علم سکھایا۔

؎ افادات شیخ الاسلام

خدا کے پاس سے تو ہر چیز ہے پھر اپنے پاس سے علم سکھانے کا مفہوم کیا ہے۔ ہر وہ شی جو انسان کی ذاتی محنت، کوشش اور جدوجہد وغیرہ معمولی ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی ہے تو وہ من جانب اللہ کہی جاتی ہے۔ اسی طرح خدا کے پاس سے علم عطا ہونے کے معنے اس علم کے ملنے کے ہیں جو انسان کے طبعی ذرائع علم و استدلال اور تلاش و تحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو یہی علم خداداد ہے۔ حضرت داؤد و سلیمان کے بارے میں ہے ولقد اٰتینا داؤد و سلیمان علماً اور حضرت یوسف کے آغاز نبوت کے موقع پر ہے،

وکذالک یجتبیک ربک ویعلمک من تاویل الاحادیث
اور ایسے ہی تیرا پروردگار تجھے نوازے گا اور تجھ کو باتوں کی حقیقت سکھائے گا

ان آیتوں میں اس علم کا ذکر نہیں جس کا منشا وحی موقت ہے کیونکہ ان میں سیاق کلام سے علم کے یکبارگی دیے جانے کا ذکر ہے جو وحی موقت کی شان نہیں۔ ایسے ہی وعلمک مالم تکن تعلم میں جس حقیقت کا ذکر کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ وحی موقت کے علاوہ خود آپ کے اندر یہ علمی قوت ہمیشہ کے لیے ودیعت کر دی گئی تھی اور مولانا محمد قاسم نانوتوی فرماتے ہیں وعلمک مالم تکن تعلم سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ علم میں کوئی آپ کا ہم پایہ نہیں ہے۔ اوّل تو مالم تکن تعلم اس طرف اشارہ ہے کہ جو علوم حضور انور کو عطا ہوئے وہ کوشش و محنت کی سرحد سے پرے تھے اور یہ بھی یہ آیت بتا رہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کتاب و حکمت کے علاوہ علم خداوندی سے بے واسطہ مستفید ہوتے ہیں اور یہ سب جانتے ہیں کہ علم پر صفات حاکمہ ختم ہو جاتی ہیں کیونکہ ارادہ قدرت کا وجود علم کا محتاج ہے لیکن علم اپنے وجود کے لیے کسی صفت کا محتاج نہیں ہے لہٰذا جو شخص بذات خود اللہ سبحانہٗ کی صفت علمی سے مستفید ہو رہا ہے اس کے سامنے سب کی حیثیت ایسی ہو گی جیسے آفتاب کے سامنے ذرات کی۔ جیسے ذرات نور کا آفتاب سے استفادہ کرتے ہیں ایسے ہی اور سب علم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے استفادہ کرتے ہیں۔

شاید ذہن میں آپ یہ خلش محسوس کریں کہ اگر نبوت ایسا ہی کمال علم لے کر آئی ہے تو علم معقولات جو دنیا میں پھیلے ہوئے ہے ان میں انبیاء کو تاریخ و روایت کی حد تک کوئی تعلق اور دخل ثابت نہیں ہے۔ مولانا محمد قاسم نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ گفتگو نبوت کے علم میں ہے معلومات میں نہیں، تھے دخل کا ہونا نہ ہونا معلومات کا ہونا نہ ہونا ہے علم کا ہونا نہ ہونا ہے۔ اگر کوئی تیز نگاہ رکھتا ہو اور گھر میں بیٹھا رہتا ہو اور دوسرا کمزور بصارت والا ہو اور سیاحت کرتا ہو اور سیاحت میں اسے عجائب و غرائب

دیکھنے کا زیادہ اتفاق ہوتا ہو تو گویا اس معلومات کی زیادتی سے اس کی بصارت قوی ہو جائے گی۔ اور کمالِ بصارت میں اس شخص سے بڑھ جائے گا جو قوی البصر ہے۔ اس لیے اگر کسی کی بوجہ محنت و طلب کسی فن میں معلومات وسیع ہوں تو معلومات کی زیادتی سے علم و فہم میں اضافہ نہ ہو گا۔ سوئی دیکھو یا پھالی دونوں صورتوں میں ایک ہیں، فرق ہے تو صرف اتنا کہ سوئی باریک ہے اور پھالی موٹی، ایسے ہی ذات و صفات خداوندی اور اسرار احکام خداوندی کا علم ہو یا اس کے مقابلے میں زمین آسمان، دواؤں خواص اجسام، قضایا اور نظریات کا علم ہو۔ علم کی حد تک قوت علمیہ ایک سے ہے لیکن دونوں میں فرق ہے کہ اوّل میں معلومات دقیقہ میں اور دوسرے میں معلومات واضح ہیں اس لیے جیسے سوئی اور انتیسویں کے چاند دیکھنے کے مقابلہ میں پھالی اور موٹی چیزوں کا دیکھنا کوئی کمال نہیں ایسے ہی بمقابلہ علم ذات و صفات اور اسرار احکام خداوندی زمین و آسمان، ادویہ خواص اجسام کا علم کوئی کمال نہیں ہے۔ اسی بنا پر علم اور خشیتِ خداوندی کو ایک حدیث میں حضور انور نے ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ کوئی ایسا عمل کیا جس میں رخصت کا پہلو اختیار کیا۔ بعض لوگوں نے اس عمل کے اختیار کرنے سے پرہیز کیا۔ یہ بات آپ تک پہنچ گئی اسی وقت آپ نے خدا کی حمد و ثنا کے بعد فرمایا، لوگوں کو کیا ہو گیا اس عمل سے احتراز کرتے ہیں جسے میں کرتا ہوں، خدا کی قسم میں ان سب میں زیادہ خدا کا علم رکھنے والا اور سب سے زیادہ اللہ سے ڈرنے والا ہوں۔ (صحیح بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ نبیِ وقت کے سب سے زیادہ عالم ہونے کا مطلب یہی ہے کہ خدا کی ذات و صفات کا سب سے زیادہ علم اس کو ہوتا ہے اور اس لیے سب میں زیادہ خدا سے ڈرنے والا بھی وہی ہوتا ہے جس مقصد کے لیے نبی کو بھیجا جاتا ہے وہ مخلوق کی ہدایت ہے اسی لیے تمام علوم ہدایت اس کو مرحمت ہوتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مقدسہ سب سے زیادہ کامل ہے اس لیے آپ کو علوم بھی کاملترین ملے ہیں۔ وعلمك مالم تكن تعلم فرمانے کے بعد آخر میں وکان فضل اللہ علیك عظیماً ارشاد ہوا ہے اس میں اشارہ ہے کہ جیسے آپ کے علم میں وسعت ہے۔ آپ کے عمل میں بہت بڑی عظمت ہے اس عظمت کا ایک اجمالی نقشہ پہلے پیش ہو چکا ہے۔

بڑے مقاصد کی خاطر سرگوشی

۱۷۳ - ان لوگوں کی خفیہ سرگوشیوں میں اکثر مشورے بھلائی کے لیے نہیں ہوتے ہیں ہاں جو

کوئی خیرات کے لیے یا کسی نیک کام کے لیے حکم کرے یا لوگوں میں صلح وصفائی کرا دے تو یہ بے شک بھلائی کی بات ہے اور جو کوئی یہ کام اللہ کی رضا کا متلاشی ہو کر کرتا ہے تو ہم اسے اجر عظیم دیں گے۔ منافق اور حیلہ گر آپ سے کان میں بات کرتے تاکہ لوگوں میں اپنا اعتبار بڑھائیں اور مجلس میں آکر بیٹھ کر آپس میں بیہودہ سرگوشیاں کرتے، کسی کی عیب جوئی، کسی کی غیبت، کسی کی شکایت کرتے۔ اس پر ارشاد ہوا کہ جو لوگ باہم کانوں میں مشورہ کرتے ہیں۔ اکثر مشورے خیر سے خالی ہوتے ہیں۔ صاف اور سچی بات کو چھپانے کی حاجت نہیں۔ اس میں کوئی فریب ہوتا ہے۔ البتہ چھپا دے تو صدقہ اور خیرات کی بات کو چھپا دے تاکہ لینے والا شرمندہ نہ ہو یا کسی ناواقف کو غلطی سے بچائے اور اس کو اچھی بات اور صحیح مسئلہ بتائے تاکہ اس کو ندامت نہ ہو یا دو میں لڑائی ہو اور غصہ والا جوش میں صلح نہیں کرتا تو اول کوئی تدبیر بنا کر اس کو سمجھائے حتیٰ کہ توریہ کی بھی اجازت ہے۔ آخر میں فرمایا کہ جو کوئی امور مذکورہ کو اللہ تعالیٰ کی رضامندی کے لیے کرے گا اس کو بڑا عظیم الشان ثواب عنایت ہوگا۔ یعنی ریاکاری یا کسی اور غرض دنیاوی کے لیے نہ ہونا چاہیے [1]

نجویٰ کے معنے سرگوشی اور رازداری کے انداز میں کسی سے بات کرنے کے ہیں۔ اس میں بجائے خود کوئی برائی نہیں ہے اس لیے ایسے مواقع بہت ہو سکتے ہیں جہاں رازداری اور سرگوشی کا طریقہ ہی قرین مصلحت ہو۔ ہر جگہ ہر موقع پر اعلان ہی ضروری نہیں ہے۔ اس میں برائی یا بھلائی بات کی نوعیت سے پیدا ہوتی ہے۔ اگر بات نیکی اور تقویٰ کی ہے تو وہ نجوائے خیر ہے اور اگر بات شرارت اور فتنے کی ہے تو وہ نجوائے شیطانی ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کی وضاحت سورۂ مجادلہ میں فرما دی ہے:

یا ایھا الذین آمنوا اذا تناجیتم فلا تتناجوا بالاثم والعدوان ومعصیۃ الرسول وتناجوا بالبر والتقویٰ۔

اے ایمان والو! جب تم آپس میں رازداری کے ساتھ بات کرو تو گناہ اور ظلم کے مشورے نہ کرو بلکہ نیکی اور تقویٰ کی بات کرو۔

مگر یہاں قرآن نے یہ فیصلہ دیا ہے کہ بہت سرگوشیوں میں خیر نہیں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں زیادہ تر ان ہی باتوں کو راز بنایا جاتا ہے جن کو آدمی طبعاً لوگوں کے سامنے کرنا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں چاہتا اور اس میں برائی کا پہلو ہوتا ہے ورنہ اچھی باتوں اور اچھے کاموں کے لیے عام دستور یہ ہے کہ اسے ظاہر کیا جاتا ہے ۔ یہ منافقین اپنی خفیہ مجالس میں نبوت اور اسلام کے خلاف سازشوں کے مشورے کرتے تھے اور لوگوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے روکتے ، منکرات کو رواج دیتے اور مسلمانوں کو باہم لڑانے کے لیے اسکیمیں تیار کرتے تھے ۔ قرآن ان کی ان ہی سازشوں کو یہ کہہ کر بے نقاب کر رہا ہے کہ لا خیر فی کثیر من نجواھم یعنی ان کے زیادہ تر مشورے ان ہی موضوعات پر ہوتے ہیں اس لیے ان میں کوئی خیر نہیں ہے ۔ ہاں اگر ان کے یہی مشورے اللہ کی راہ میں خیرات کرنے ، معروف کو رواج دینے اور مسلمانوں میں باہم صلح و صفائی کے لیے ہوتے تو ان میں ضرور خیر ہوتی بلکہ یہ تو وہ کام ہیں کہ ان کاموں کو جو اللہ کی رضا جوئی کے لیے کرے گا اللہ اس کو اجرِ عظیم دے گا ۔

اس آیت پر تدبر کی نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن نہایت بلیغ انداز میں ان منافقین کے مقاصد بے نقاب کر رہا ہے جو اہلِ ایمان میں لڑائی کرانے ، ان کو خدا کی راہ میں خرچ کرنے سے باز رکھنے اور معاشرے میں برائیاں عام کرنے میں پیش پیش ہیں اور اس کے لیے سرگوشیاں ، خفیہ مجالس منعقد کرتے ہیں اور عام لوگوں میں اپنی ان مفسدانہ کارگزاریوں پر مصلحانہ مساعی کا چربہ چڑھا کر پیش کرتے ہیں اور منکرات کو معروف کہہ کر پکارتے ہیں ۔

نبوت کی اپوزیشن اور اس کا انجام

۱۱۴ ۔ اور جو بھی اللہ کے رسول کی مخالفت پر راہِ ہدایت واضح ہو جانے کے باوجود کمربستہ ہو جاتا ہے اور اہلِ ایمان کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ پر چلتا ہے تو ہم اسے اسی طرف لے جائیں گے ، جس طرف وہ خود پھر گیا اور ہم اسے دوزخ میں داخل کریں گے دوزخ بدترین جگہ ہے ۔ یعنی جب کسی کو حق بات واضح ہو چکے پھر اس کے بعد بھی رسول کے حکم کی مخالفت کرے اور سب مسلمانوں کو چھوڑ کر اپنی جدا راہ اختیار کرے تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے جیسا کہ اس چور نے کیا جس کا ذکر ہو چکا ہے ، بجائے اس کے کہ قصور کا اعتراف کر کے ، توبہ کرتا یہ کیا کہ ہاتھ کٹنے کے خوف سے مکہ بھاگ گیا اور مشرکین میں مل گیا ۔ [1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ واقعہ مندرجہ صدر میں جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودی کو بری کر دیا اور طعمہ کے خلاف فیصلہ فرمایا تو وہ مسلمانوں سے الگ ہو کر مشرکین مکہ سے جا ملا۔
(ترمذی، حاکم، ابن سعد)

جس شخص پر الہدیٰ، یعنی دین حقیقی کی راہ واضح ہو جائے اور پھر وہ دیدہ دانستہ اس سے پھر جائے تو اس نے خود اپنی پسند سے سعادت کی راہ چھوڑ کر شقاوت کی راہ پسند کر لی اور جیسی کچھ راہ اس نے پسند کی ضروری ہے کہ ویسا ہی نتیجہ اسے پیش آئے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ یہ اچھی طرح سمجھ چکنے کے بعد کہ رسول جس طریق ہدایت کے داعی ہیں یہ اللہ کی اتاری ہوئی ہدایت ہے۔ رسول کی مخالفت کرتے ہیں اور اہل ایمان کا طریقہ چھوڑ کر کوئی اور طریقہ اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ اللہ ان کو ان کی اختیار کی ہوئی راہ پر جانے کے لیے چھوڑ دے گا اور یہ اس راہ سے سیدھے جہنم میں پہنچ جائیں گے۔[2]

گویا جب مذکورہ بالا مقدمہ میں وحی الٰہی کی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس خائن مسلمان کے خلاف اور اس بے گناہ یہودی کے حق میں فیصلہ صادر فرما دیا تو اس منافق پر جاہلیت کا اس قدر سخت دورہ پڑا کہ وہ مدینہ سے نکل کر اسلام اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمنوں کے پاس مکہ چلا گیا اور کھلم کھلا مخالفت پر اتر آیا۔ اس آیت میں اس کی اسی حرکت کی طرف اشارہ ہے۔[3]

یہ آیت مہمات معارف میں سے ہے۔ اگرچہ شارحین قرآن نے آیت کے مطالب کو پس منظر سے وابستہ کیا ہے لیکن جیسا کہ علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ العبرۃ بعموم اللفظ قرآن کی جلالت شان کا تقاضا ہے کہ اسے عام ہی رکھا جائے۔ شارحین قرآن نے اس پر جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے، مشہور مفسر قرآن امام ابن جریر فرماتے ہیں کہ

جو بھی بربنائے عداوت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت کرے گا اور آپ سے یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ آپ اللہ کے رسول ہیں علیحدگی اختیار کرے گا اور راہ حق چھوڑ کر اہل ایمان کی راہ کے علاوہ کسی اور راہ پر چلے گا یعنی راہ کفر پر چلے گا ہم اس کا مدد گار اسی چیز کو بنا دیں گے جس سے اس نے مدد لی ہے۔

اور حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

---

[1] ترجمان القرآن [2] تدبر قرآن، [3] تفہیم القرآن

جو شخص محمد رسول اللہ کے لائے ہوئے نظام کو چھوڑ کر کسی اور نظام کو اپنا کر حضور کے نظام کا مدمقابل ہو جائے گا اور وہ ایسا حق ظاہر ہو جانے کے بعد جان کر کرے گا اور اہل ایمان کی راہ کے علاوہ راہ چلے گا ہم اسے اسی طرف لے جائیں گے جس کی طرف وہ جاتے گا۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں،

جو شخص اللہ کے رسول کی دلیل قطعی کے ذریعہ ہدایت ثابت ہو جانے اور یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اللہ کے رسول کا حکم یہ ہے مخالفت کرے گا اور اہل ایمان کی متفقہ راہ چھوڑ کر کسی اور راہ پر چلے گا ہم دنیا میں اسے اس چیز پر اقتدار دے دیں گے جس کو وہ اختیار کر رہا ہے اور ہم اس کے اور اس کی اختیار کردہ راہ میں رکاوٹ نہ بنیں گے۔

یہاں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ آیت میں روئے سخن کس کی طرف ہے اہل ایمان کی طرف یا اُن لوگوں کی طرف جو نبوت کے منکر ہیں۔ عام شارحین قرآن روئے سخن اہل کفر کی طرف بتاتے ہیں اور مطلب یہ قرار دیتے ہیں کہ جن کافروں پر حضور انور کی نبوت کی صداقت ظاہر ہو چکی ہے اگر وہ اس کے بعد بھی حضور کو نبی نہیں مانتے بلکہ آپ کے مخالف ہی رہیں گے اور ماننے والوں کی راہ پر نہ چلیں گے تو اللہ تعالیٰ ان کو دو قسم کی سزا دیں گے ایک نولہ ما تولی اس کے معنے یہ بتائے ہیں کہ دنیا میں جو طریقہ اس نے اختیار کیا ہے اسی پر اس کو چھوڑ دیں۔ امام مجاہد کہتے ہیں کہ ہم اسے بتوں کے حوالے کر دیں گے۔ لیکن ہماری رائے میں آیت میں روئے سخن کافروں کی طرف نہیں بلکہ اہل ایمان کی طرف ہے اور آیت کا منشا یہ بتانا نہیں کہ جو حضور کی نبوت کو نہیں مانے گا بلکہ یہ بتانا ہے کہ جو حضور کو نبی ماننے کے بعد آپ کے احکام کو نہیں مانے گا۔ حضور کے احکام پر چلنا ہی اہل ایمان کی راہ ہے۔ اسی لیے آیت میں لفظ اتباع ہے۔ حیرت ہے کہ ایک طرف آیت قرآنی سے اجماع ثابت کیا جاتا ہے اور دوسری طرف آیت کا روئے سخن اہل ایمان سے ہٹا کر اہل کفر کو قرار دیا جاتا ہے۔ آیت کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ جو شخص بھی مسلمانی کا دعویٰ کر کے نبوت کی اپوزیشن بن کر کھڑا ہو گا اور یہ کام بے خبری میں نہیں بلکہ پورے علم و شعور اور دل کی پوری رضامندی سے کرے گا وہ یقیناً ان سزاؤں کا مستحق ہو گا جن کا ذکر اس آیت میں ہو رہا ہے۔ اس کی راہ اہل ایمان کی راہ نہیں۔ اہل ایمان کی راہ تو نبوت

کی اتباع ہے۔ جو بھی اتباعِ نبوت سے جان بوجھ کر گریزاں ہے وہ اہلِ ایمان کی راہ نہیں چل رہا ہے۔
اس آیت نے یہ بات کھول دی کہ کسی انسان کا وضع کردہ کوئی قانون اگر نبوت سے متصادم ہو جائے تو اسے ٹھکرا کر نبوت کے قانون پر عمل پیرا ہونا فرض ہے کیونکہ ــــ نبوت جو کچھ لے کر آئی ہے وہ الہدیٰ ہے اور انسانوں کا وضع کردہ قانون الہویٰ ہے۔ اہلِ ایمان کی راہ اتباعِ ہدیٰ ہے اتباعِ ہویٰ نہیں ہے۔ قرآن کے نقطہ نظر سے متصادم ہونے والی چیز باطل ہے اور اس پر عمل کرنا ممنوع ہے۔ قرآن مسلمان کو یہ اجازت نہیں دیتا کہ وہ نبوت کے علم و عمل کے سوا کسی دوسرے قانون کو اپنا دستور العمل بنائے۔ اس نے ہر اس چیز کو حرام قرار دیا ہے جس میں نبوت کے علم و عمل اس کی مبادیات اور قانون سازی کے مقررہ طریق کار کے ساتھ ذرہ برابر بھی تصادم پایا جائے۔ قرآن نے اس صورتِ حال کی صرف دو صورتیں بتائی ہیں۔ الہدیٰ کی طاعت یا الہویٰ خواہش کی پیروی۔ الہدیٰ نام ہے نبوت کے علم اور اس علم کے مطابق پیمانۂ عمل کا، اور الہویٰ نام ہے نبوت کے پیمانۂ عمل کے خلاف ہر کام کے خواہشِ نفس کی پیروی کرنے کا۔ اللہ کا ارشاد ہے:

فان لم یستجیبوا لك فاعلم انما یتبعون اھواءھم و
من اضل ممن اتبع ھواہ بغیر ھدی من اللہ

اگر وہ تمہارا یہ مطالبہ پورا نہیں کرتے تو سمجھ لو کہ دراصل یہ اپنی خواہشات
کے پیرو ہیں اور اس شخص سے بڑھ کر کون گمراہ ہو گا جو خدائی ہدایت کے
بغیر بس اپنی خواہشات کی پیروی کرے۔

فقہاء اس پر متفق ہیں کہ اگر کوئی مسلمان قرآن اور سنت سے ہٹ کر کچھ اپنے قوانین گھڑ لیتا ہے اور اللہ کی نازل کردہ بعض یا پورے کے پورے احکام کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوتا ہے تو اس کی حالت کے مطابق ان فیصلوں میں سے ایک فیصلہ اس پر منطبق ہوتا ہے۔ ایک شخص اگر چوری، تہمت، بدکاری یا زنا کے بارے میں قرآنی حکم کو نہیں مانتا تو وہ کافر ہے اور اگر وہ ان احکام کو ماننے سے انکار تو نہیں کرتا لیکن کسی دوسری وجہ سے ان کے مطابق فیصلہ بھی نہیں کرتا تو وہ ظالم ہے اور اگر وہ فیصلہ دیتے ہوئے انصاف اور تقاضوں کو ملحوظ نہیں رکھتا تو وہ فاسق ہے۔
اس آیتِ قرآنی سے کچھ علماء نے اصولِ اجتہاد میں سے اجماع کے حجت ہونے پر استدلال کیا ہے چنانچہ شیخ الاسلام فرماتے ہیں ــــ اکابر علماء نے اس آیت سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ اجماعِ امت کا مخالف اور منکر بھی جہنمی ہے یعنی اجماعِ امت کو ماننا فرض ہے۔ حدیث میں وارد ہے کہ اللہ کا

باقی مسلمانوں کی جماعت پر ہے جس نے ہدی راہ اختیار کی وہ دوزخ میں جائے گا۔[1] لیکن کچھ علما کو اجماع کے حجت ہونے میں تو نہیں مگر اس آیت سے اجماع کی حجیت پر استدلال میں اختلاف ہے۔ یہ ایک طویل الذیل بحث ہے۔ تفصیل آلوسی نے روح المعانی میں لکھ دی ہے۔ حافظ ابن کثیر یہاں اس آیت کی تفسیر میں بڑی عجیب بات فرما گئے کہ،

اس اُمت کے لیے ایک طرف اس بات کی ضمانت دی گئی ہے کہ وہ کسی غلط بات پر جمع ہونے سے محفوظ کردی گئی اور دوسری طرف اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کی ضمانت دی گئی ہے۔

اس موضوع پر بہت سی صحیح حدیثیں آئی ہیں۔

جلیل القدر محدثین نے اس کی تصریح کی ہے کہ اگرچہ مشہور روایت لا تجتمع امتی علی ضلالۃ لفظاً و سنداً ثابت نہیں ہے لیکن وہ اپنے مفہوم کے اعتبار سے صحیح ہے۔ مشہور اندلسی محدث و ناقد علامہ ابو محمد علی بن حزم اپنی کتاب الاحکام فی اصول الاحکام میں لکھتے ہیں:

محدثین کہتے ہیں کہ یہ بات بالکل درست ہے کہ اُمت محمدی صلی اللہ علیہ وسلم کبھی بھی غیر حق پر متفق نہیں ہو سکتی اس لیے کہ آپ نے اس کی خبر دی ہے کہ ہر دور میں حق کے علمبردار رہیں گے بیان کیا گیا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ لا تجتمع امتی علی ضلالۃ۔ اگرچہ اس کے الفاظ و سند درجۂ صحت کو نہیں پہنچے لیکن اس کا مفہوم اور نتیجہ ان احادیث کی بنا پر جن میں ہر دور میں حق پر قائم رہنے والوں کی خبر دی گئی ہے صحیح اور ثابت ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

إِنَّ اللَّهَ لَا يَغْفِرُ أَنْ يُشْرَكَ بِهِ وَيَغْفِرُ مَا دُونَ ذَٰلِكَ لِمَنْ يَشَاءُ ۚ
وَمَنْ يُشْرِكْ بِاللَّهِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١١٦﴾ إِنْ يَدْعُونَ
مِنْ دُونِهِ إِلَّا إِنَاثًا ۖ وَإِنْ يَدْعُونَ إِلَّا شَيْطَانًا مَرِيدًا ﴿١١٧﴾ لَعَنَهُ
اللَّهُ ۘ وَقَالَ لَأَتَّخِذَنَّ مِنْ عِبَادِكَ نَصِيبًا مَفْرُوضًا ﴿١١٨﴾ وَلَأُضِلَّنَّهُمْ
وَلَأُمَنِّيَنَّهُمْ وَلَآمُرَنَّهُمْ فَلَيُبَتِّكُنَّ آذَانَ الْأَنْعَامِ وَلَآمُرَنَّهُمْ
فَلَيُغَيِّرُنَّ خَلْقَ اللَّهِ ۚ وَمَنْ يَتَّخِذِ الشَّيْطَانَ وَلِيًّا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَقَدْ
خَسِرَ خُسْرَانًا مُبِينًا ﴿١١٩﴾ يَعِدُهُمْ وَيُمَنِّيهِمْ ۖ وَمَا يَعِدُهُمُ الشَّيْطَانُ
إِلَّا غُرُورًا ﴿١٢٠﴾ أُولَٰئِكَ مَأْوَاهُمْ جَهَنَّمُ وَلَا يَجِدُونَ عَنْهَا مَحِيصًا

اللہ یہ بات نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے اس کے سوا جتنے گناہ ہیں وہ جسے چاہے بخش دے[۱۴۵] اور جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بناتا ہے وہ سیدھی راہ سے دور جا پڑتا ہے[۱۴۶]۔ یہ لوگ اللہ سے ورے صرف دیویوں ہی کو پکارتے ہیں اور یہ لوگ

نہیں پکارتے ہیں مگر شیطان مردود کو جس پر اللہ نے لعنت کی ہے۔[۱۱۷]
اور اسی کا دعویٰ ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقررہ حصہ
ضرور لے کر رہوں گا[۱۱۸]، میں ان کو ضرور بہکاؤں گا، میں ان کو ضرور
آرزوؤں میں لگائے رکھوں گا، میں ان کو ضرور حکم دوں گا، وہ
ضرور میرے حکم کی بجا آوری میں جانوروں کے کان چیریں گے
اور میں ان کو ضرور حکم دوں گا وہ میری اطاعت میں ضرور خدا کی
بناوٹ میں تبدیلی کریں گے[۱۱۹]۔ اور دیکھو! جو شخص بھی اس شیطان
کو اللہ سے ورے اپنا رفیق و مددگار بنائے گا وہ سراسر نقصان
اور خسارے میں رہے گا اور خسارہ بھی کھلا خسارہ[۱۲۰]۔ یہ شیطان ان
سے وعدے کرتا ہے اور ان کو آرزوؤں میں الجھائے رکھتا ہے
لیکن شیطان کا ہر وعدہ سراسر دھوکا اور فریب ہوتا ہے،
یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے جس سے ان کو خلاصی کی
کوئی صورت نہ ملے گی۔[۱۲۱]

اسلامی نظام کا غیر اسلامی نظام سے مقابلہ

نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کی سب سے اہم رکن توحید کی دعوت ہے ۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں عقیدہ اور عبد و معبود کے باہمی تعلق کی تصحیح اور صرف ایک کی بندگی کی دعوت ہر زمانہ اور ہر ماحول میں انبیائے کرام علیہم الصلاۃ والسلام کی پہلی دعوت اور ان کا سب سے بڑا اور اہم مقصد رہا ہے ۔ ہمیشہ ان کی تعلیم یہی رہی ہے کہ اللہ ہی نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے اور صرف وہی عبادت، دعا، توجہ اور قربانی کا مستحق ہے ۔ اور صرف وہی تمام مسائل زندگی میں طاعت کا حقدار ہے ۔ ان کے بھرپور حملہ کا رخ اپنے زمانے میں جاری و ساری " وثنیت " کی طرف متوجہ رہا ہے جو مورتیوں اور مقدس و صالح زندہ و مردہ شخصیتوں کی پرستش کی صورت میں جلوہ گر تھی ۔ ان ہستیوں کے بارے میں اہل جاہلیت کا اعتقاد تھا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو عزت و عظمت اور معبودیت کی خلعت سے سرفراز فرمایا ہے ۔ ان کو خاص امور میں تصرف کا اختیار بھی دے رکھا ہے اور انسانوں کے بارے میں ان کی سفارشوں کو علی الاطلاق قبول کرتا ہے جیسے شہنشاہ اعظم ہر علاقہ کے لیے ایک حاکم بھیج دیتا ہے اور بعض اہم امور کے علاوہ علاقہ کے انتظام کی ساری ذمہ داری انہی کے سر ڈال دیتا ہے ۔ جس شخص کو نبوت کے علم و عمل سے کچھ بھی تعلق ہے اس کو یقینی اور بدیہی طور پر یہ معلوم ہوگا کہ اس نے یہ مطالبہ کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی غیر مشروط عبادت اور طاعت کی جائے اور انسان احکام الٰہی کے سامنے اپنے اختیارات سے کلیتہً دستبردار ہو جائے ۔ اپنی عقل، اپنی رائے، اپنے افکار اور اپنے اعمال، اپنے احساسات اور اپنے جذبات، اپنے رجحان طبع اور اپنے ذوق سب کی گردنوں میں اللہ کی بے قید غلامی کا قلاوہ ڈال دے کیونکہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کے تحت وہ اللہ کا عبد ہے اور اسے صرف اس کی مرضیات پوری کرنے کا فرض انجام دینا ہے ۔ یہاں شرک کا ذکر ان منافقین کے تعلق سے ہوا ہے جو احکام الٰہی کے مقابلے میں اپنے ہوا و ہوس، اپنے میلان طبع کی پیروی کر رہے تھے اور اتباع ہدیٰ کی جگہ اتباع ہویٰ کی راہ اختیار کیے ہوئے تھے ۔ نبوت کا علم و عمل ہوتے ہوئے کسی اور کے قانون کی اطاعت کرتے ہیں ۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طاعت جو حق خداوندی ہے اس میں دوسرے کو شریک کر دیا گیا ۔ یہ پرستش میں شرک نہیں بلکہ اللہ کی بندگی میں شرک ہے ۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ :

اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہوا اور جدی راہ چلے ۔ یہ آیت

نازل فرمائی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو "شرک" فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے بس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔

اور مولانا شیخ الاسلام عثمانی فرماتے ہیں ؛

اس سے معلوم ہوا کہ شرک یہی نہیں کہ اللہ کے سوا کسی کی پرستش کرے بلکہ اللہ کے حکم کے مقابلے میں کسی کے حکم کو پسند کرنا بھی شرک ہے ۔

گویا بتا دیا ہے کہ اسلامی نظام کی موجودگی میں کسی دوسرے نظام کو برضا و رغبت شرف پذیرائی دینا ایک مسلمان کے لیے مشرکانہ عمل ہے اور انسانیت کی خیر و برکت اور تمدن کی ساری ترقیاں اسلامی نظام سے وابستہ رکھنی چاہییں ۔

۱۷۵- اللہ یہ بات نہ بخشے گا کہ اس کے ساتھ کسی کو شریک کیا جائے ۔اس کے سوا جتنے گناہ ہیں وہ جسے چاہے بخش دے گا۔ یعنی شرک سے نیچے کے گناہ جس کے چاہے بخش دے گا مگر شرک کو ہرگز نہ بخشے گا۔ مشرک کے لیے عذاب ہی مقرر ہو چکا تو چوری کرنا اور تہمت جھوٹی لگانا اگرچہ کبیرہ گناہ تھے مگر یہ بھی احتمال تھا کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس چور کو بخش دیتا مگر جب وہ چور رسول کے حکم سے بھاگا اور مشرکوں میں جا ملا تو اس کی مغفرت کا احتمال بھی باقی نہ رہا[1]

جیسا کہ تمہید میں اشارہ ہو چکا ہے اور شاہ عبد القادر کے حوالہ سے بتایا جا چکا ہے کہ اس آیت میں پرستش میں شرک کا نہیں بلکہ بندگی میں شرک کا ذکر ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ شرک فی الالوہیت کا نہیں بلکہ شرک فی الربوبیت کا ذکر ہے - اس آیت میں شرک فی الذات اور شرک فی الخلق کا ذکر نہیں ۔حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں ؛

ان میں مشرکین عرب کا اور یہود و نصاریٰ کا نبوت سے کوئی اختلاف نہ تھا بلکہ قرآن کہتا ہے کہ یہ ان کی مانی ہوئی باتوں میں سے ہے ۔

یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا نبوت سے اختلاف صرف توحید عبادت میں تھا۔ اللہ تعالیٰ نے جس مطلوبہ عبادت کو انسان کا مقصد وجود قرار دیا ہے اور جس کی تلقین و ہدایت کے لیے اس کے رسول آتے رہے ہیں وہ کوئی ادھوری یا آدھی تہائی قسم کی عبادت نہیں، نہ وہ صرف پرستش

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تک محدود ہے اور نہ صرف اطاعت و بندگی تک یہی عقل کا صریح تقاضا ہے اور یہی قرآن کا واضح فیصلہ
عقل کا صریح تقاضا یہ اس لیے ہے کہ جو خدا انسان کا خالق اور مالک ، رازق اور محسن ، حاکم اور معبود سبھی کچھ
ہے اسے سبھی طرح کی عبادتوں کا حقدار بھی ہونا چاہیے ۔ قرآنی فیصلہ یہ اس طرح ہے کہ اس کی آیتیں
اپنے پیروؤں سے اللہ جل مجدہ کی پرستش اور اس کی اطاعت و بندگی دونوں ہی چیزوں کا یکساں طور
پر مطالبہ کرتی دیکھی جا رہی ہیں ۔ وہ جہاں یہ کہتا ہے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرو اسی کے نام کی پاکی بیان
کرو ، اسی سے دعائیں مانگو ، اسی کی بڑائی کا اعلان کرو ، اسی کو مدد کے لیے پکارو اور اسی کے حضور
اعترافِ نعمت کرو ، وہیں یہ بھی کہتی ہیں اور بار بار کہتی ہیں کہ اللہ ہی کو بے قید و شرط اطاعت کا مستحق
اور حقیقی فرماں روا مانو ۔ اسی کو مستقل بالذات قانون ساز تسلیم کرو ، اسی کے احکام کی اطاعت کرو ، اسی
کے قوانین کے مطابق فیصلے کرو ، اسی کے ضابطوں کو زندگی کے ضابطے بناؤ ۔ اور اسی کے حرام کو
حرام سمجھو ، اسی لیے اس عبادت کا مفہوم جسے انسان کی پیدائش کا مقصد و مدعا فرمایا گیا ہے ۔ جو ہر
نبی کی دعوت کا سر عنوان تھی اور جس کا قرآن نے ہمیں حکم دیا ہے ۔ لازماً وہ ہی جامع اور کامل مفہوم ہوگا
جس میں پرستش اور اطاعت دونوں چیزیں شامل ہوں ۔

اس آیت میں جس چیز کو شرک قرار دیا گیا ہے وہ شرک فی الطاعت ہے اور سابقہ آیت من
یشاقق الرسول کے بھی مناسب ہے ۔ شرک کے معنے ساجھے پن کے ہیں اور اصطلاح میں شرک
نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا
ساجھی بنایا جائے گویا شرک کی تین قسمیں ہیں ۔ ایک وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہو دوسرے
وہ شرک جس کا تعلق اللہ تعالیٰ کی صفات سے ہو تیسرے وہ شرک جس کا تعلق اس کی صفتوں کے لوازم
سے ہو ۔ اس کی صورت یہ ہے کہ صفاتِ الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں انہیں اور ان سب کو اللہ ہی
کے لیے خاص نہ سمجھا جائے بلکہ انہیں یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے لیے بھی ثابت
مانا جائے مثلاً صفاتِ الٰہی کا ایک تقاضا یہ ہے کہ حقیقی اطاعت صرف اللہ کا حق ہے ۔ اسی طرح ان
صفات کا ایک تقاضا یہ ہے کہ اقتدارِ اعلیٰ صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہے اور حکم دینے اور قانون بنانے
کا حق اصلاً اسی کو پہنچتا ہے ۔ اس لیے اگر کسی اور کو بغیر حکم الٰہی یہ حیثیت دے دی جائے خواہ وہ
ایک فرد ہو یا بہت سے افراد کا مجموعہ ہو تو یہ شرک ہوگا ۔ اسی کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے وان
اطعتموھم انکم لمشرکون اس آیت کی تشریح میں شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں :

شرک فقط یہی نہیں ہے کہ کسی کو خدا کے سوا پوجیے بلکہ شرک کے حکم میں ہے

کہ اور کا مطیع ہو جائے۔

اطاعت میں نبی کا مقام

اطاعت کے موضوع پر خود قرآن نے نبی کی اطاعت کو شرط ایمان قرار دیا ہے۔ دین و شریعت کے دائرے میں نبی جو کچھ کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چون و چرا نہ کرے۔ اور خواہ اس کی مصلحت سمجھ میں آتے یا نہ آتے۔ بہرصورت یہ یقین رکھے کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور سراپا حق ہی ہے۔ نبی کی یہ حیثیت خود قرآن میں اللہ سبحانہ کی مقرر کی ہوئی ہے جیسا کہ پڑھ آتے ہو وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ پھر یہ اطاعت بھی صرف ظاہر کی حد تک نہ ہو بلکہ دل کی رضا کے ساتھ ہونی چاہیے جیسا کہ ہم آیت قرآنی فلا وربک لا یومنون حتیٰ یحکموک کی تشریح میں بتا آئے ہیں۔ اور ایسا ہونا بہرحال ضروری بھی تھا۔ عقل اس کے سوا ایک نبی کے لیے کسی اور حیثیت کا تصور ہی نہیں کر سکتی۔ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اگر اس بندگی کا طریقہ معلوم کرنے اور اس کے احکام جاننے کا واحد ذریعہ صرف نبی ہی ہے تو نبی کی کامل اطاعت کے بغیر اللہ تعالیٰ کی اطاعت اور بندگی کی کوئی صورت ممکن ہی نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن میں ہم دیکھتے ہیں کہ ہر نبی اپنی نبوت کا اعلان کرتے ہی لوگوں سے مطالبہ کرتا ہے۔ فاتقوا اللہ واطیعون خدا کا تقویٰ اختیار کرو اور میری اطاعت کرو۔ یہ دراصل اس حقیقت کا اظہار ہے کہ تقویٰ اور بندگی کی راہ تمہیں صرف نبی کی اطاعت کے ذریعہ مل سکتی ہے۔ نبی ہی بتا سکتا ہے کہ اللہ سبحانہ کے احکام کیا ہیں اور ان پر عمل کس طرح کیا جانا چاہیے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنی ہی اطاعت کا حکم دینے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اطیعوا اللہ کے ساتھ اطیعوا الرسول کا حکم بھی دیا ہے بلکہ جیسا کہ اسی پارے میں پڑھ آتے ہو نبی کی اطاعت کو خدا کی اطاعت فرمایا من یطع الرسول فقد اطاع اللہ اس لحاظ سے رسول کی طاعت ذات اور شخص کی نہیں بلکہ رسالت کی ہے۔ یعنی یہ اطاعت رب العزت کے حکم کے تحت ہوتی ہے۔ اسی بنا پر رسول سے مشاقہ قرآن میں سنگین جرم بتایا گیا ہے۔ یہاں اسی اطاعت کے مقابلے میں گمراہ سادہ مسرفین کی طاعت کو شرک قرار دیا گیا ہے۔ قرآن میں قوم ثمود کے ذکر میں جہاں حضرت صالح یہ فرماتے ہیں۔ فاتقوا اللہ واطیعون وہاں یہ بھی فرماتے ہیں:

ولا تطیعوا امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون

اور ان بے لگام لوگوں کے حکم کی اطاعت نہ کرو جو ملک میں فساد کرتے ہیں اور اصلاح
کا کوئی کام نہیں کرتے۔
سورۃ احزاب میں صاف تصریح ہے :
یوم تقلب وجوھھم فی النار یقولون یالیتنا اطعنا اللہ واطعنا الرسولا و
قالوا ربنا انا اطعنا سادتنا وکبراءنا فاضلونا السبیلا۔
جس روز ان کے چہرے آگ پر اُلٹ دیے جائیں گے اس وقت وہ کہیں گے کہ کاش ہم
نے اللہ اور رسُول کی طاعت کی ہوتی اور کہیں گے اے رب ہمارے ہم نے اپنے سرداروں
اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی اور انہوں نے ہمیں سیدھے راستہ سے بھٹکا دیا۔
یہ منافقین جن کا یہاں ذکر ہو رہا ہے خدا کی کتاب اور اس کے قانون کے ہوتے ہوتے مسرفین کے قانون
کی پیروی کرتے تھے اور اپنے معاملاتِ زندگی، تمدنی مسائل میں بجائے اس کے کہ اسلام کے سیاسی
نظام کو مان کر اللہ کے رسُول کی اطاعت کرتے وہ تحاکم الی الطاغوت کو اپنا رہے تھے۔ قرآن ان کے
اسی طرزِ عمل کو یہاں شرک بتا رہا ہے۔

غیر اسلامی نظام سر تا سر ضلالت ہے

۱۷۶۔ اور جو بھی اللہ کے ساتھ شریک بناتا ہے وہ سیدھی راہ سے دُور جا پڑتا ہے[1] اس لیے کہ وہ
شخص اللہ ہی سے صریح منحرف ہو گیا اور اللہ کے مقابلے میں دوسرا معبود بنا کر شیطان کا پورا مطیع ہو
گیا۔ اللہ کی اطاعت اور اس کی رحمت سے مستغنی ہو بیٹھا اور جو اتنی دُور جا بیٹھا تو اللہ کی رحمت
اور اس کی مغفرت کا کیسے مستحق ہو سکتا ہے بلکہ ایسے شخص کی مغفرت تو خلافِ حکمت ہونی چاہیے۔ یہی وجہ
ہے کہ ایسے لوگوں کو مغفرت سے صاف مایوس فرما دیا گیا۔ اور مسلمان کتنا ہی گنہ گار ہو چونکہ اس کی
خرابی صرف اعمال تک ہے۔ اس کا عقیدہ اور تعلق اور توقع سب جوں کا توں موجود ہیں اس
کی مغفرت ضرور ہوگی جلدی یا بدیر اللہ جب چاہے گا بخش دے گا۔ جس طرح توحید اصل اصُول
ہے تمام ممکن بھلائیوں اور نیکیوں کی، اسی طرح شرک اصلی بنیاد ہے ساری بُرائیوں کی، اس
لیے اور کسی گناہ پر شرک کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ مشرک قبولِ رحمت کی ساری استعدادوں کو

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

محو کر دیتا ہے۔ اس آیت میں لفظ ضلالت سے بھی اس بات کی تائید ہوتی ہے کہ یہاں ان مشرکوں کا ذکر ہو رہا ہے جو شرک فی الطاعت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اگر احکام و قوانین کی جگہ نیاز مندانہ اعمال کا شرک مراد ہوتا تو ضلالت نہ آتا بلکہ افترا آتا اور پھر یہاں سابقہ آیت میں الهدی آیا ہے اسی کے ضلالت ہی مناسب ہے۔

اس آیت نے فیصلہ کر دیا ہے کہ اسلامی نظام کے مقابلے میں ہر نظام سراسر ضلالت اور گمراہی ہے جبکہ اسلامی نظام سراسر ہدایت ہے۔ مدلیا کون ہے؟ اس پر تفصیلی بحث تو دوسرے موقعہ پر آئے گی مگر یہاں اتنا بتا دینا ضروری ہے کہ غیر اسلامی نظام کے نظام ہونے کا تمام تر انحصار اس بات پر ہے کہ اس کو پارلیمنٹ کی یا بادشاہ کی منظوری حاصل ہے یا کسی عدالت نے اس پر عمل کیا ہے یا کسی حکومت نے اس کو تسلیم کیا ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی چیز بھی نہ ہو تو پھر اس نظام کی قانونی حیثیت ختم ہو جاتی ہے، اس کے برعکس اسلامی نظام کی قانونی حیثیت ان چیزوں میں سے کسی چیز کی محتاج نہیں ہے۔ وہ بہرحال قانون ہے کوئی عدالت اس کو مانے یا نہ مانے اور کوئی حکومت اس کو تسلیم کرے یا نہ کرے وہ اس کائنات کے حقیقی مالک اور حکمران کا قانون ہے۔ اگر کوئی عدالت یا حکومت اس کو تسلیم نہیں کرتی تو اس کے تسلیم نہ کرنے سے اس کی قانونی حیثیت متاثر نہیں ہوتی بلکہ خود وہ عدالت یا حکومت نافرمانی اور بغاوت کی مجرم ٹھہرتی ہے۔ قرآن کا اعلان ہے۔

ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئك هم الفاسقون۔

اس حقیقت کا اظہار ان ناموں سے بھی ہوتا ہے جو اسلام نے اپنے نظام کے لیے اختیار کیے ہیں۔ اسلامی قانون میں جو الفاظ استعمال ہوتے ان میں ما انزل اللہ ہے جس کے معنے ہیں اللہ کا اپنے رسول پر اتارا ہوا نظام، اسی کو قرآن، کتاب ذکر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ دوسرا لفظ ما اراہ اللہ جس کے معنے ہیں اللہ کی اپنے رسول کو سمجھائی ہوئی بات، اسی کو سنت اور حدیث کہتے ہیں۔ اور دونوں کو قرآن و سنت یا نبوت کا علم و عمل کہتے ہیں۔ اس کے خدا کی طرف سے آنے اور خدا کی آیات ہونے میں اسلامی نظام کے لیے ہدایت ہونے کی پوری پوری ضمانت موجود ہے۔ اور اسی بنا پر اس کو نہایت مقدس و محترم مانا جاتا ہے۔ وہ ہر مسلمان کے ایمان کی بنیاد ہوتا ہے جس کو مانے بغیر اس کا ایمان ہی درست نہیں ہوتا۔ اس کے دینے والے کے متعلق ہر مسلمان کا یہ عقیدہ ہوتا ہے کہ وہ دلوں کے بھیدوں اور خلوت خانوں کے رازوں سے بھی واقف ہے۔

اس کی کھلی ہوئی خلاف ورزی تو درکنار اگر دل کے کسی گوشہ میں اس سے انحراف کا وسوسہ بھی موجود ہو تو وہ اس سے بھی باخبر ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں اس کے متعلق ہر مسلمان کا یہ بھی عقیدہ ہوتا ہے کہ خدا کی رضا اس کے مانے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس کے اندر دنیا کی صلاح بھی ہے اور آخرت کی فلاح بھی۔ اس بنا پر قانون اسلامی سرتاسر ہدایت ہے اور غیر اسلامی قانون سرتاسر ضلالت ہے۔

اسلامی نظام سے انحراف کا سبب

۱۷۷ ۔ یہ لوگ اللہ سے ورے صرف دیبیوں ہی کو پکارتے ہیں اور یہ لوگ نہیں پکارتے ہیں مگر اس شیطان مردود کو جس پر اللہ نے لعنت کی ہے اور اسی کا دعویٰ ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ایک مقررہ حصہ ضرور لوں گا، یعنی انہوں نے اللہ کے سوا جو اپنا معبود بنایا ہے تو ان بتوں کو جن کو عورتوں کے نام سے نامزد کر رکھا ہے جیسے عزّیٰ، منات، اور نائلہ وغیرہ اور حقیقۃ الامر دیکھئے تو یہ مشرکین شیطان سرکش ملعون الٰہی کی عبادت کرتے ہیں۔ اسی نے بہکایا ایسا کرایا اور بت پرستی کرنے میں اس کی اطاعت اور اس کی عین خوشی ہے۔ اس سے مشرکین کی پرلے سرے کی ضلالت اور جہالت ظاہر فرمانی مقصود ہے۔ دیکھئے اوّل تو اللہ کے سوا کسی کو معبود بنانا اس سے بڑھ کر ضلالت کیا ہو سکتی ہے۔ پھر بنایا تو کس کو پتھروں کو جن میں کسی قسم کی حس و حرکت بھی نہیں اور عورتوں کے نام سے موسوم ہیں۔ اور کس کے بتلانے سے شیطان مردود و ملعون خداوندی کے بہکانے سے کیا اس ضلالت اور جہالت کی نظیر مل سکتی ہے اور کوئی احمق سے احمق بھی اس کو قبول کر سکتا ہے۔[1]

دراصل یہ استیناف بیانی ہے۔ اس میں جواب دیا گیا ہے کہ بندگی کی حدود میں مشرکانہ طرز عمل کیوں اختیار کیا گیا ہے۔ اوروں کی نظر نے تو یہ نہیں تاڑا لیکن علامہ آلوسی نے یہ بات سمجھی ہے چنانچہ فرماتے ہیں والجملۃ مبینۃ لوجہ ما قبلھا یعنی من یشرک باللہ میں جو دعویٰ کیا گیا ہے۔ اس آیت میں اس کی وجہ بیان کی جا رہی ہے جیسے قرآن کی عادت ہے کہ توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال کرتا ہے ایسے یہاں شرک فی العبادت کو شرک فی الطاعت کی وجہ قرار دیا ہے یعنی چونکہ ان میں شرک فی العبادت سے بستگی تھی اس لیے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان میں شرک فی الطاعت پروان چڑھا۔

اناث انثی کی جمع ہے۔ لغت میں نرم و نازک کمزور کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس آیت میں معبودان باطل کو اناث یا تو باعتبار لفظ کہا ہے کیونکہ اپنے بتوں کو انواع و اقسام کے زیورات سے آراستہ کرتے اور عورتوں کے نام سے پکارتے جیسے لات، منات، عزیٰ، نائلہ کہ یہ سب مونث نام ہیں۔ سعید بن منصور، ابن جریر اور ابن المنذر نے حضرت حسن بصری کی تصریح نقل کی ہے۔ کہ عرب کے قبیلہ قبیلہ کا بت تھا جو اسی قبیلہ کی نسبت انثی بنی فلاں کہلاتا تھا۔ یا معنے کے اعتبار سے اناث کہا گیا چنانچہ مغربی نے اناث کے معنے کمزور اور عاجز کے بتائے ہیں جن کو کام کرنے کی قدرت نہ ہو۔ اسی مناسبت سے عربی میں کھٹل تلوار کو سیف انیث کہتے ہیں اَنِثَ فی امرہ کے معنے ڈھیلا پڑجانے کے ہیں۔ مخنث اور کمزور آدمی کو انیث کہا جاتا ہے۔ امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں کہ موجودات کی ایک دوسرے کے اعتبار سے تین قسمیں ہیں ۱۔ فاعل غیر منفعل یہ صفت صرف ذات باری کی ہے اس کا کوئی دوسرا شریک نہیں۔ ۲۔ منفعل غیر فاعل یہ صفت جمادات کی ہے۔ ۳۔ ایک اعتبار سے فاعل دوسرے اعتبار سے منفعل جیسے جن وانس اور ملائکہ کہ یہ اللہ سبحانہ کے اعتبار سے منفعل ہیں اور اپنی مصنوعات کے اعتبار سے فاعل ہیں۔ چونکہ عرب کے معبود من جملہ جمادات تھے جو سراسر منفعل اور غیر فاعل ہیں یعنی ان میں محض اثر پذیرائی کی صلاحیت ہے مگر موثر ہونے کی قوت بالکل نہیں ہے۔ لہٰذا قرآن عزیز نے اناث کہہ کر مشرکین کو تنبیہہ کی ہے کہ تم نے جن کو معبود بنا رکھا ہے ان میں نہ عقل ہے نہ سمجھ، نہ سن سکتے ہیں نہ دیکھ سکتے اور صرف یہی نہیں بلکہ کسی حیثیت سے بھی تو کوئی کام سرانجام نہیں دے سکتے۔ اسی لیے حضرت ابن عباس، حسن بصری اور قتادہ نے اناثا کے معنے مُردے اور بے جان کے بتاتے ہیں۔ ابن جریر اور ابن ابی حاتم حضرت حسن بصری سے ناقل ہیں کہ ہر بے جان چیز جس میں رُوح نہ پائی جائے اناث میں داخل ہے۔ خشک لکڑی ہو یا خشک پتھر، مشہور مفسر ضحاک تابعی کا بیان ہے کہ مشرکین فرشتوں کو معاذاللہ خدا کی بیٹیاں کہتے تھے اور مدعی تھے کہ ہم ان کو اس لیے پوجتے ہیں کہ یہ بارگاہ ایزدی میں ہمارے قرب کا ذریعہ ہیں۔ قرآن مجید نے ان کے اسی خیال کے اعتبار سے اناث کہا ہے۔ ضحاک کی یہ تفسیر خود قرآنی آیات کے بھی مناسب ہے۔ سورۃ زخرف میں تصریح ہے۔

وجعلوا الملائکۃ الذین ھم عباد الرحمٰن اناثا۔

بہرحال اناث کا لفظ فرشتوں کے لیے ہو یا بتوں کے لیے، فرشتوں کے بھی انہوں نے بت رکھے تھے۔ یہ دونوں کا ایک ہے۔ لیکن یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ ناموں کی یہ تانیث تماثیل اور صورتوں کے اعتبار سے ہے ورنہ ذات کے لحاظ سے نہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے بت پرستی کا جو پس منظر بتایا ہے اس کی تائید ہوتی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں:

مشرکین کا خیال یہ ہے کہ کچھ نیکوکار بندگان خدا پہلے گزرے ہیں جنہوں نے اللہ کی عبادت اور تقرب الٰہی میں خوب نام پیدا کیا۔ اللہ نے ان کو الوہیت کی پوشاک سے نوازا، اس کے نتیجہ میں وہ تمام مخلوقات میں استحقاق عبادت کے شرف سے مالا مال ہوگئے۔ جیسے شہنشاہ اعظم ہر علاقہ کے لیے حاکم روانہ کر دیتا ہے۔ اور علاقہ کے انتظام کی ساری ذمہ داری اس کے سر ڈال دیتا ہے۔ اسی طرح اللہ نے ان کو عزت و عظمت اور معبودیت کی خلعت سے سرفراز فرمایا ہے۔ اب یہی لوگوں کی درخواستیں سنتے اور لوگوں کی عبادات کے بھی مستحق ہیں بلکہ اللہ کی کوئی عبادت ان کی عبادت کی آمیزش کے بغیر قبول ہی نہیں ہوتی ہے۔ اللہ کی ذات بالاتر ہے، اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے ان کی عبادت ناگزیر ہے۔ یہی سنتے ہیں، یہی دیکھتے ہیں، یہی سفارش کرتے ہیں، یہی کام بناتے ہیں اور لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔ لوگوں نے اسی تصور کے تحت ان کے ناموں کی تصویریں بنائی ہیں اور ان کو اولاً قبلہ توجہ بنایا۔ بعدازیں امتداد وقت کے ساتھ شخص اور شخصیت کا فرق نکاہوں سے اوجھل ہوگیا اور لوگوں نے اشخاص یعنی بتوں کو معبود بنالیا۔ اسی بنا پر اللہ سبحانہ، تردید کے لیے دو قسم کے انداز اختیار کیے کبھی شخصیتوں کا یہ کہہ کر رد کیا کہ حکم ملک صرف اللہ کا ہے اور کبھی اشخاص کا رد کیا، یہ کہہ کر کہ یہ جمادات ہیں۔

اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مذہب کی ابتدائی تاریخ کا مظہر یعنی اعاظم پرستی عرب میں موجود تھی۔ صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ عرب کے مشہور بت لات، ود، یغوث وغیرہ پہلے زمانہ کے بزرگوں کے نام ہیں۔ اہل عرب ان کی مورتیں بنا کر پوجتے تھے۔

ان تصریحات کی روشنی میں اناث کی تفسیر میں جو تین باتیں کہی گئی ہیں اوّل اصنام دوم اموات سوم ملائکہ سب صحیح ہیں۔ اصنام اشخاص ہیں ان کی شخصیتیں خواہ فرشتے ہوں یا اموات ہوں، خواہ کوئی قرآن کہتا ہے ان سے دعاؤں، فریادوں، استغاثوں، استعانتوں اور دہائیوں میں تعلقات

قائم رکھنا ہی ان سے عابدانہ معاملہ کرنا ہے اور یہی پرستش بندگی کا باعث ہے۔

شرک کی قیادت شیطان کرتا ہے

اس آیت میں دوسری بات یہ ارشاد ہوئی کہ یہ لوگ نہیں پکارتے مگر شیطان مردود کو، اصل ارشاد وان یدعون الا شیطانًا مریدًا ۔ شیطان سرکش شریر کو کہتے ہیں۔ امام محمد بن جریر فرماتے ہیں کہ ہر چیز کو جو سرکش ہو شیطان سے اس لیے موسوم کیا گیا کہ اس کے اخلاق و افعال اپنے تمام ہم جنسوں کے اخلاق و افعال سے جدا ہوتے ہیں اور وہ خیر سے جدا ہوتا ہے اس معنی کے اعتبار سے شیطان شیطن سے بروزن فیعال ہے اور سیبویہ نے کبھی اس کے نون کو زائد لکھا ہے اور کبھی اصلی، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس کے اشتقاق میں اختلاف ہے۔ بصریوں کے نزدیک اس کا وزن فیعال ہے لہٰذا اس کا نون اصلی ہے اور شطن سے مشتق ہے جس کے معنے دور ہونے کے ہیں اور اسم فاعل شاطن ہے اور کوفیوں کے نزدیک اس کا وزن فعلان ہے اور نون زائد ہے اور شاط یشیط سے مشتق ہے جس کے معنے ہلاک ہونے کے ہیں اس کا مونث شیطانہ ہے اور شیطان کی جمع شیاطین ہے۔

مرید مرد سے ہے شجر امرد اس درخت کو کہتے ہیں جس پر پتے نہ ہوں اور امرد مردوں میں بے ریش لڑکے کو کہتے ہیں۔ اس لیے مرید وہ ہے جو ہر قسم کی بھلائی سے خالی ہو۔ یہاں شیطان کے پکارنے کا ذکر اس کی شرک میں قیادت ظاہر کرنے کے ہے کیونکہ تمام برائیوں کا شجرہ نسب اسی سے ملتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو وہ معبود بنا کر اپنی دعاؤں، فریادوں، استغاثوں اور استعانتوں میں پکارتے ہیں ان کو تو اس کا کوئی پتہ بھی نہیں نہ انہوں نے ان پکارنے والوں کو اس کی تلقین کی ہے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ اس معاملہ میں شیطان کی طاعت کر رہے ہیں اور اس کے بہکانے سے ایسا کر رہے ہیں ورنہ شیطان کو اس معنے میں تو کوئی معبود نہیں بناتا کہ اس کے آگے مراسم عبادت ادا کرتا ہو اور اس کو الوہیت کا درجہ دیتا ہو۔ اسے معبود بنانے کی صورت یہ ہے کہ آدمی اپنے نفس کی باگیں شیطان کے ہاتھ میں دیتا ہے اور جدھر وہ چلاتا ہے ادھر چلتا ہے گویا کہ یہ اس کا بندہ ہے اور وہ اس کا خدا۔ اس سے معلوم ہوا کہ کسی کے احکام کی بے چون و چرا اطاعت اور اندھی پیروی کرنے کا نام بھی عبادت ہے اور جو شخص اس طرح کی طاعت کرتا ہے وہ دراصل اس کی عبادت بجا لاتا ہے [1]

[1] تفہیم القرآن

پھر ایک جملہ خبریہ کے ذریعہ شیطان کی صفت لعنہ اللہ یہ بتانے کے لیے لاتے ہیں کہ ان کی طاغوتوں کا مرکز ذاتی لعنت کا موصوف ہے۔ یہ گویا ان کی جہالت اور حماقت پر ایک اور ضرب کاری لگائی ہے اور اُلوسی نے تصریح کی ہے کہ ابوالبقاء نے اسے جملہ معترضہ بھی بتایا ہے۔

انسانی زندگی میں شیطان کا حصّہ

۱۱۸- اور اس کا دعویٰ ہے کہ میں تیرے بندوں میں سے ضرور ایک مقررہ حصّہ لے کر رہوں گا۔ یعنی جب شیطان سجدہ نہ کرنے پر ملعون ہوا تو اس نے اسی وقت کہا تھا کہ میں تو غارت ہو ہی چکا مگر میں بھی تیرے بندوں اور اولادِ آدم میں سے اپنے لیے ایک مقدار معلوم اور بڑا حصہ لوں گا یعنی ان کو گمراہ کر کے اپنے ساتھ جہنم میں لے جاؤں گا جیسا کہ سورہ حجر اور بنی اسرائیل وغیرہ میں مذکور ہے مطلب یہ ہے کہ متمرد اور ملعون ہونے کے علاوہ شیطان تو جملہ بنی آدم کا اوّل روز سے سخت دشمن ہے اور اس دشمنی کو صاف ظاہر ہو چکا ہے تو اب یہ احتمال ہٹ رہا کہ گو شیطان ہر طرح سے خبیث و گمراہ ہے مگر شاید کسی کو خیر خواہانہ کوئی نفع کی بات بتلادے بلکہ یہ معلوم ہو گیا کہ وہ دشمن ازلی تو بنی آدم کو جو کچھ بتلائے گا ان کی گمراہی اور بربادی ہی کی بات بتلائے گا۔ پھر ایسے گمراہ اور بدخواہ کی اطاعت کرنی کس قدر حماقت اور جہالت ہے حصّہ مقررہ لینے کے ایک معنے یہ بھی ہیں کہ تیرے بندے اپنے مال میں سے میرا حصہ ٹھہرائیں گے جیسا کہ لوگ بت یا جن وغیرہ غیر اللہ کی نذر و نیاز ادا کرتے ہیں[1]

جیسا کہ حضرت شیخ الاسلام نے بتایا ہے کہ اس آیتِ قرآنی کی تشریح دو طرح سے کی گئی ہے ایک یہ کہ اے پروردگار تیرے کچھ بندے تجھے چھوڑ کر میرے ہوں گے تو اس طرح تیرے بندوں میں میرا حصہ ضرور ہو گا۔ اس تفسیر کا حاصل یہ ہے کہ شیطان کہہ رہا ہے کہ تیرے بندوں میں ایک مقررہ حصہ میرا ہو گا۔ اگرچہ لفظ نصیب قلت اور کثرت کو نہیں بتاتا لیکن یہاں متبادر اس سے قلت ہی ہوتی ہے اور نصیب من عبادک سے بلاغت کی رو سے سمجھا بدیہی جاتا ہے کہ سب میں کچھ میرے ہمنوا ہوں، لیکن قرآن میں اسی بات کو دوسرے مقامات پر بھی بیان کیا گیا ہے۔ مثلاً سورہ اعراف میں ہے لا تجد اکثرھم شاکرین اور سورہ نحل میں ہے لاغوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین اور سورہ بنی اسرائیل میں لاحتنکن ذریتہ الا قلیلا۔

[1] افادات شیخ الاسلام

ان سب آیات کا منطوق یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت شیطان کی ہمنوا ہوگی اس طرح جیسا کہ ابوحیان اندلسی نے لکھا ہے کہ یہ آیت قرآنی قرآن کی آیات سے متعارض ہوگی اس لیے ہماری رائے میں آیت کا مطلب دوسرا ہے یعنی یہ کہ میں تیرے بندوں سے ان کے مال میں ایک مقررہ حصہ لوں گا۔ جیسا کہ شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ میں تیرے بندوں کو ایسا گمراہ کردوں گا کہ وہ شرک کرنے لگیں گے اور اپنے مالوں سے مقررہ حصے غیراللہ کی نیازوں کے نکالیں گے۔ اب یہ آیت اس تشریح کی روشنی میں قرآن کی دوسری آیت شارکھم فی الاموال والاولاد کے مطابق ہے۔

اب سادہ لفظوں میں اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے اوقات میں ان کی محنتوں اور کوششوں میں ان کی قوتوں اور قابلیتوں میں ان کے مال اور اولاد میں اپنا حصہ لگاؤں گا اور ان کو ایسا فریب دے کر پرچاؤں گا کہ وہ ان ساری چیزوں کا ایک معتد بہ حصہ میری راہ میں صرف کریں گے۔

انسانی زندگی پر شیطان کے چھاپے

۱۱۹ ۔ میں ان کو ضرور بہکاؤں گا میں ان کو ضرور آرزوؤں میں لگاتے رکھوں گا، میں ان کو ضرور حکم دوں گا۔ وہ ضرور میرے حکم کی پابجائی میں جانوروں کے کان چیریں گے اور میں ان کو ضرور حکم دوں گا کہ وہ میری طاعت میں ضرور خدا کی بناوٹ میں تبدیلی کریں گے۔ یعنی جو لوگ میرے حصہ میں آئیں گے ان کو طریق حق سے گمراہ کردوں گا اور ان کو حیات دنیوی اور خواہشات دنیوی کے حصول کی اور قیامت اور حساب وکتاب اخروی کے نہ ہونے کی آرزو دلاؤں گا اور اس بات کی تعلیم دوں گا کہ جانوروں کے کان چیر کر بتوں کے نام پر ان کو چھوڑ دیں گے اور اللہ کی پیدا کی ہوئی صورتوں کو اور اس کی مقرر کی ہوئی باتوں کو بدل ڈالیں گے۔ کافروں کا دستور تھا گائے بکری اونٹ کا بچہ بت کے نام کر دیتے اور اس کا کان چیر کر یا اس کے کان میں نشانی ڈال کر چھوڑ دیتے اور صورت بدلنا جیسے خوجہ کرنا یا بدن کو سوئی سے کھود کر تل بنانا یا نیلا داغ دینا یا بچوں کے سر پر چوٹیاں رکھنی کسی کے نام کی۔ مسلمانوں کو ان کاموں سے بچنا ضروری ہے، داڑھی منڈانا بھی اسی تغیر میں داخل ہے اور اللہ کے جتنے احکام ہیں کسی میں تغیر کرنا بہت سخت بات ہے جو چیز اس نے حلال کردی اس کو حرام کرنا یا حرام کو حلال کرنا اسلام سے نکال دیتا ہے تو جو کوئی ان باتوں میں مبتلا ہو اس کو یقین کر لینا چاہیے کہ میں شیطان کے مقررہ حصے میں داخل ہوں جس کا ذکر گزرا۔ [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

شیطان کے اس چیلنج سے اس کے جوش و خروش کا پورا پورا اندازہ ہوتا ہے جو وہ بنی آدم کو گمراہ کرنے کے لیے اپنے اندر رکھتا ہے اور یہ بات بھی ظاہر ہو رہی ہے کہ اس کی تمام مساعی ضلالت کا خاص ہدف توحید کا عقیدہ ہے چنانچہ یہاں اس نے کہا لا ضلنھم میں ان کو ضرور گمراہ کروں گا اور سورہ نمل میں اس کی بجائے لاغوینھم آیا ہے۔ ضلالت اور غوایت دونوں کا چیلنج دیا ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔

ضلالت نام ہے علمی اور فکری گمراہی کا اور غوایت نام ہے کردار و عمل میں غلط روی کا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن میں دونوں کی نفی کی گئی ہے۔ ارشاد ہے ما ضل صاحبکم و ما غوی۔ اس آیت میں شیطان نے کہا ہے کہ ہر قسم کی فکری، نظری، اور عقلی گمراہیوں میں ڈالوں گا یعنی ان کے عقائد اور نظریات کو راہ حق سے ہٹاؤں گا۔ علامہ بغوی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ اضلال سے مقصود تزیین ہے یعنی شیطان کا کام یہ ہے کہ ہر کام کو لوگوں کے سامنے مزین کر کے اور سجا کر پیش کرتا ہے چنانچہ قرآن ہی میں ہے لازینن لھم یعنی تیری نافرمانی کو اچھی کر کے دکھاؤں گا۔ باطل پر حق کی، شرک پر توحید کی اور بدعت پر سنت کی اور اعمال سیئہ پر حسنہ کی ملمع کاری کروں گا۔

رازدں اور دلولوں کا جال

اس آیت میں دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ میں ان کو ضرور آرزوؤں میں لگائے رکھوں گا۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ جس چیز میں درحقیقت غنا بخشی کی قوت نہیں ہے وہ باور کراتا ہے کہ یہی آدمی کو غنی بناتی ہے اور جو چیز خلود بخشی کی خاصیت سے محروم ہے اس کے بارے میں خلود بخش ہونے کا سبز باغ دکھاتا ہے۔ جن اعمال و افعال کا کوئی نتیجہ نہیں ہے باور کراتا ہے کہ وہی نتیجہ خیز ہیں۔ جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا سکھاتا ہے کہ سب کچھ اسی راہ میں ملتا ہے۔ الغرض شیطان کی امانی اور آرزوؤں کا جال اتنا وسیع اور اتنا مستحکم ہوتا ہے کہ موجود اس کے بعد معدوم نظر آتا ہے اور معدوم موجود ہو جاتا ہے۔ حیرت ہے کہ آدمی دیکھتا ہے اور یقین کر لیتا ہے۔ خود قرآن نے انہی آرزوؤں کے جال کی ایک عملی مثال بھی پیش کی ہے کہ شیطان نے حضرت آدم کو بہکاتے ہوئے کہا کہ ھل ادلک علی شجرۃ الخلد کیا میں تجھے دوام اور ہمیشگی کا درخت بتا دوں؟ اور دوسری جگہ اسی کی شرح کرتے ہوئے شیطان کی زبان سے

آرزوؤں کا یہ سبز باغ دکھایا گیا ہے کہ اس نے حضرت آدم اور حوا کو یہ سمجھایا تھا کہ اس درخت کے استعمال کے بعد تم دونوں کو یہاں بقائے دوام حاصل ہو جائے گا۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ انسان گناہوں اور فواحش کی طرف میلان ہوتا ہے اور اس کی نظر سے اس کی مضرتیں غائب ہو جاتی ہیں۔ لوگوں کے وہ عقائد و نظریات جن کا قرآن و سنت میں کوئی نام و نشان نہیں اسی شیطانی تمنی کا شاخسانہ ہیں مثلاً یہ عقیدہ کہ وہ جن کے ناموں کی نذریں اور نیازیں دیتے ہیں وہ خدا سے ان کے لیے سفارش کرتے ہیں۔ انہی کی سفارش سے ان کو دنیا کی نعمتیں مل رہی ہیں اور آخرت میں بھی ایمان و عمل سے تہی دامن ہونے کے باوجود ان کی سفارش سے ان کو جنت ملے گی اسی سے یہود اس وہم میں مبتلا ہو گئے تھے کہ وہ ابراہیم خلیل اللہ اور خدا کے برگزیدہ بندوں کی اولاد ہیں۔ اس وجہ سے وہ خدا کے بیٹوں اور محبوبوں کی حیثیت رکھتے ہیں اور جنت کے پشتینی حقدار ہیں۔ ان کے اعمال کچھ ہوں دوزخ کی آگ اول تو ان کو چھوئے گی نہیں اور اگر چھوئے گی تو محض عارضی طور پر، ایسے ہی نصاریٰ کا یہ عقیدہ کہ خدا نے اپنے بیٹے کو ان کے تمام گناہوں کا کفارہ بنا دیا ہے اب وہ عمل و اطاعت کی تمام ذمہ داریوں سے سبکدوش ہیں۔

مشرکانہ نذریں

تیسری بات شیطان کی طرف منسوب کر کے یہ بتائی ہے کہ شیطان نے کہا کہ میں ان کو ضرور کان چیرنے کا حکم دوں گا پس وہ چوپایوں کے کان چیریں گے۔ اصل الفاظ میں فلیبتکن آذان الانعام آیا ہے۔ بتک کے معنے کاٹنے اور چیرنے کے ہیں۔ اہل عرب کے توہمات میں سے ایک کی طرف اشارہ ہے۔ ان کے ہاں قاعدہ تھا کہ جب اونٹنی پانچ بچے جن لیتی تو اس کے کان پھاڑ کر اسے اپنے دیوتا کے نام پر چھوڑ دیتے اور اس سے کام لینا حرام سمجھتے تھے۔ اسی طرح جس اونٹ کے نطفہ سے دس بچے ہو جاتے اسے بھی دیوتا کے نام پر پُن کر دیا جاتا تھا اور کان چیرنا اس بات کی دلیل تھا کہ یہ پن کیا ہوا جانور ہے۔[1] حضرت قتادہ فرماتے ہیں کہ کان چیرنے کی یہ رسم بحائر اور سوائب کے لیے تھی۔ بحائر جمع بحیرہ کی ہے اس بچہ کو کہتے ہیں جس کا کان چیر کر بتوں کی نذر کرتے تھے اور سائبہ اس جانور کو کہتے ہیں جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتا حضرت

---

[1] تفہیم القرآن۔

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں جانوروں کے کان چیرنا یہ کافروں کا دستور تھا کہ گاتے کا یا بکری کا بچہ بت کے نام کر دیتے اور اس کے کان میں نشان ڈال دیتے۔ مسلمانوں کو ان کاموں سے بچنا ضروری ہے اپنے بزرگوں سے یہ معاملہ نہ کریں کافر بھی جن سے کرتے تھے بزرگ ہی جان کر کرتے تھے۔ کان چیرنے کا پس منظر یہ تھا کہ دوسرے ان کو نذر کا جانور سمجھ کر ان سے تعرض نہ کریں اور ان کا احترام کریں۔

تغییرِ خلق اللہ کا مطلب

آخری بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ میں ان کو ضرور حکم دوں گا وہ ضرور خدا کی بناوٹ میں تبدیلی کریں گے۔ اصل ارشاد یہ ہے فلیغیرن خلق اللہ وہ ضرور اللہ کی بناوٹ کو بدل ڈالیں گے۔ اللہ کی بناوٹ کو بدل ڈالنے کے دو مطلب ہیں اور آیتِ قرآنی میں دونوں کی گنجائش ہے۔ ایک یہ کہ خلق اللہ کو بدلنے سے اس فطرت کو بدلنا مراد ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو پیدا کیا ہے جیسے توحید دینِ فطرت ہے اسے شرک سے تبدیل کر دیا، جیسا کہ اس آیت کا یہی مطلب مجاہد، عکرمہ، ابراہیم نخعی، الحسن، قتادہ، اور عطا خراسانی نے بتایا ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ اس ایک قادرِ مطلق خالقِ عالم اور صانعِ ہستی کا اعتراف انسان کی فطرت میں داخل ہے۔ متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں بھی اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے۔ جماعت انسانی کا کوئی حصہ زمین کا کوئی گوشہ، زمانہ کا کوئی عہد اس توحید کے تصور سے خالی نہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ایک خدا کا اعتراف انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے۔ قرآن نے اسی کو فطرۃ اللہ کہا ہے:

فاقم وجھک للدین حنیفا فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا

اپنا چہرہ سب طرف سے پھیر کر خدا کے دین کی طرف کر لو یہی خدا کی وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

کل مولود یولد علی الفطرۃ

ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔

انسان کے اسی جذبۂ فطرت یعنی توحید کو شیطان اور اس کے ایجنٹوں نے تبدیل کر ڈالا ہے

اور حضرت عبداللہ بن عباس نے تغییرِ دین اللہ کی خود یہ تفسیر بھی فرمائی ہے کہ حرام کو حلال اور حلال کو حرام کر دینا اللہ کے دین کو بدلنا ہے۔

دوسرے علمائے صحابہ جیسے عبداللہ ابن عمر، انس بن مالک، سعید بن المسیب، عکرمہ اور سفیان ثوری نے اس آیت کی یہ تفسیر پیش کی ہے کہ آیت میں خلق تکوینی میں تبدیلی مقصود ہے۔ انہوں نے اس کی مثال میں جسم گدانے، داڑھی منڈانے کو پیش کیا ہے لیکن صرف اتنا نہیں بلکہ اس کا دائرہ اس سے کہیں زیادہ وسیع ہے۔ خدائی ساخت میں ردّوبدل کرنے کا مطلب اشیاء کی پیدائشی بناوٹ میں ردّوبدل کرنا نہیں ہے۔ اگر اس کا مطلب یہ لیا جائے تب تو پوری انسانی تہذیب ہی شیطان کے اغوا کا نتیجہ قرار پائے گی۔ اس لیے تہذیب تو نام ہی ان تصرفات کا ہے جو انسان خدا کی بنائی ہوئی چیزوں میں کرتا ہے دراصل اس جگہ جس ردّوبدل کو شیطانی فعل قرار دیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ انسان کسی چیز سے وہ کام لے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا نہیں کیا اور کسی چیز سے وہ کام نہ لے جس کے لیے خدا نے اسے پیدا کیا ہے۔ بالفاظِ دیگر وہ تمام افعال جو انسان اپنی اور اشیاء کی فطرت کے خلاف کرتا ہے اور وہ تمام صورتیں جو وہ منشائے فطرت سے گریز کے لیے اختیار کرتا ہے اس آیت کی رُو سے شیطان کی گمراہ کن تحریکات کا نتیجہ ہیں مثلاً عمل قومِ لوط، ضبطِ ولادت، رہبانیت، برہمچریہ، مردوں اور عورتوں کو بانجھ بنانا، مردوں کو خواجہ سرا بنانا، عورتوں کو ان کی ان خدمات سے منحرف کرنا جو فطرت نے ان کے سپرد کی ہیں اور انہیں تمدن کے ان شعبوں میں گھسیٹ لانا جن کے لیے مرد پیدا کیا گیا ہے۔ یہ اور اس طرح کے بے شمار افعال جو شیطان کے شاگرد دُنیا میں کر رہے ہیں۔ دراصل یہ معنے رکھتے ہیں کہ یہ لوگ خالق کائنات کے ٹھہرائے ہوئے قوانین کو غلط سمجھتے ہیں۔

آیت میں تغییرِ خلق اللہ کی دونوں تشریحیں آپ کے سامنے ہیں اور دونوں کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک خلق تکوینی میں تغییر اور دوسرا خلق تشریعی میں تغییر ہے۔ خلق تشریعی میں تغییر کے معنے دین اور احکامِ دین میں تحریف کر دینے کے ہیں۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ آفتاب پرستی، آتش پرستی شجر پرستی، حیوان پرستی وغیرہ سب اس تغییرِ خلق کی صورتیں ہیں کہ مشرک ان سے وہ کام لے رہا ہے جس کے لیے ان کی خلقت ہوئی ہی نہ تھی۔

اس پوری آیت پر حضرت مولانا اسماعیل شہید نے جو تبصرہ کیا ہے وہ بھی قابلِ دید ہے۔ اس میں مولانا نے حال کے چہرہ کی جس انداز سے عکاسی کی ہے خوب ہے۔ چنانچہ فرماتے ہیں۔

ان آیات کا مطلب یہ ہے کہ جو غیر اللہ کو پکارتے ہیں وہ اپنے خیال میں عورتوں کے پجاری ہیں کوئی ضرت بی بی کو، کوئی بی بی آسیہ کو، کوئی بی بی آتا ولی کو، کوئی لال پری کو، کوئی سیاہ پری کو، کوئی ستیلا کوئی مسانی کو، اور کوئی کالی کو پوجتا ہے۔ یہ محض خیالات ہیں ورنہ ان کی حقیقت بھی کچھ نہیں ئی عورت ہے نہ کوئی مرد محض خام خیالی اور شیطانی وسوسہ ہے جس کو معبود بنالیا ہے اور یہ جو لتا ہے اور کبھی کوئی تماشا بھی دکھا دیتا ہے شیطان ہے۔ ان مشرکوں کی تمام عبادتیں شیطان یے ہو رہی ہیں۔ یہ اپنے خیال میں نذر و نیاز عورتوں کو دیتے ہیں مگر درحقیقت شیطان لے لیتا ہے ہیں ان باتوں سے نہ دینی فائدہ ہے نہ دنیوی، کیونکہ شیطان راندۂ درگاہ ہے۔ اس سے دینی مدہ تو ہونے سے رہا کیونکہ یہ انسان کا دشمن ہے، بھلا کیسے اس کا بھلا چاہے گا یہ تو خدا کے امنے کہہ چکا ہے کہ میں تیرے بہت سے بندوں کو اپنا بندہ بنالوں گا۔ ان کی عقلیں ایسی ماروں کہ اپنے خیالات ہی کو ماننے لگیں گے، میرے نام کے جانور مقرر کریں گے جن پر میری نیاز کا نشان دگا۔ مثلاً اس کا کان چیر ڈالیں گے یا کاٹ ڈالیں گے یا اس کے گلے میں کر بند ڈالیں گے، ماتھے پر ہندی لگادیں گے، منہ پر سہرا باندھ دیں گے، منہ کے اندر پیسہ رکھ دیں گے۔ بہرحال ہر وہ علامت و یہ بتائے کہ یہ جانور فلاں کی نیاز کا ہے اسی میں داخل ہے۔ شیطان یہ بھی کہہ آیا ہے کہ میرے اثر ے لوگ اللہ کی پیدائش کو بگاڑیں گے، کوئی کسی کے نام کی چوٹی رکھے گا کوئی کسی کے نام پر ناک یا ان چھدوائے گا، کوئی داڑھی منڈوائے گا کوئی چار ابرو صاف کر کے فقیری کا اظہار کرے گا یہ سب شیطانی باتیں ہیں اور اسلام کے خلاف ہیں۔ پھر جس نے اللہ جیسے کریم کو چھوڑ کر شیطان جیسے دشمن کی راہ اختیار کی اس نے صریح دھوکہ کھایا کیونکہ اول تو شیطان دشمن ہے، دوسرے اس میں بجز وسوسہ ڈالنے کے اور کوئی قدرت نہیں ہے۔ جھوٹے سچے وعدوں سے انسان کا وقتی طور پر دل بہلاتا ہے کہ فلاں کو مانو گے تو یہ ہوگا اور لمبی لمبی آرزوئیں دلاتا ہے کہ اگر اتنے پیسے ہوں تو ایسا ایسا باغ تیار ہو جائے گا اور خوبصورت محل بن جائے گا۔ چونکہ یہ امیدیں پوری نہیں ہوتی ہیں اس لیے انسان گھبرا کر خدا کو بھول کر غیروں کی طرف دوڑنے لگتا ہے اور ہوتا وہی ہے جو مقدر ہوتا ہے کسی کے ماننے نہ ماننے سے کچھ نہیں ہوتا۔ یہ تو محض ایک شیطانی وسوسہ ہے اور اس کا مکر و فریب ہے۔ ان باتوں کا انجام یہ ہوتا ہے کہ انسان شرک میں مبتلا ہو کر جہنمی ہو جاتا ہے اور شیطان کے جال میں بری طرح پھنس جاتا ہے کہ لاکھ ہاتھ پاؤں مارے مگر رہائی نصیب نہیں ہوتی[1]

---

[1] تقویۃ الایمان

عالمگیر اور اصولی حریف

۱۸۰۔ اور جو شخص بھی اس شیطان کو اللہ سے وَرے اپنا رفیق و مددگار بناتا ہے وہ سرتاسر نقصان اور گھاٹے میں رہے گا اور خسارہ بھی کھلا خسارہ ۔ یعنی شیطان کا تمرد اور اللہ کی رحمت سے دُوری میں یہ حال اور اس کے اغوا اور افکار و اعمال میں آرائش کی یہ داستان سننے کے باوجود جو شخص اس سے لگاؤ اور تعلقات رکھے گا اور اس کی وسوسہ اندازیوں میں اس کی پیروی کرے گا وہ اپنی معاش اور معاد میں سرتاسر نقصان اور گھاٹے میں رہے گا اور ہمیشہ اوہام کا شکار رہے گا، فکری اور عملی زندگی میں بغیر ہدایت کے ٹاک ٹوئیاں مارتا رہے گا ۔ اس کے نتیجہ میں وہ اللہ کی ان نعمتوں سے محروم رہے گا جو اس نے انسان کو دی ہیں مثلاً عقل کی ہدایت، وحی کی ہدایت وغیرہ وغیرہ شیطان کا دوست بنانا یہی ہے کہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کو چھوڑ کر خود ساختہ طریقوں کو اپنی انفرادی زندگی میں اور شیطان کے زور آور اور طاقتور ایجنٹوں کے بناتے ہوئے قانون کو اپنی اجتماعی زندگی میں اختیار کیا جاتے ۔ اس آیت نے یہ بنیادی اور اہم نکتہ واضح کیا ہے کہ یہاں دو ولایتیں ہیں ایک ہواتے نفس اور انسان کی مکمل آزادی کی دعوت یہی شیطان کی ولایت ہے دوسرے انسان کی عبدیت اس کے خدا کے سامنے ذمہ داری، جواب دہی کی دعوت یہ نبوت اور تعلیمات وحی کی دعوت ہے ۔ پہلی دعوت کا نام جاہلیت ہے اور دوسری دعوت کو اسلام کہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ جو شخص اپنی زندگی میں نبوت کی ولایت کو چھوڑ کر شیطان کی ولایت کو اپنائے گا وہ کھلے ہوئے نقصان میں رہے گا ۔

شیطان کا کاروبار

۱۸۱۔ یہ شیطان ان سے وعدے کرتا ہے اور ان کو آرزوؤں میں الجھاتے رکھتا ہے ۔ لیکن شیطان کا ہر وعدہ سرتاسر دھوکا اور فریب ہوتا ہے ۔ یہی لوگ ہیں جن کا ٹھکانا دوزخ ہے جس سے ان کو خلاصی کی کوئی صورت نہ ملے گی ۔ یعنی جب شیطان کی خیانت و شرارت اور اس کی عداوت کی کیفیت خوب معلوم ہو چکی تو اب اس میں کچھ شک نہیں رہا کہ اپنے سچے معبود سے منحرف ہو کر جو کوئی بھی اس کی موافقت کرے گا سخت نقصان میں پڑے گا ۔ اس کے تمام وعدے اور امیدیں محض فریب ہیں ۔ نتیجہ یہ ہوگا کہ ان سب کا ٹھکانا جہنم ہے ۔ اس سے نکلنے کی کوئی صورت

نہ ہوگی۔[1]

مطلب یہ ہے کہ شیطان کی سب سے بڑی وسوسہ اندازی یہ ہے کہ طرح طرح کے وعدوں میں رکھتا اور آرزوؤں اور امیدوں میں ڈالتا ہے۔ وعدوں میں رکھنے اور آرزوؤں میں ڈالنے سے مقصود یہ ہے کہ انسان حقیقت و عمل کی جگہ محض باطل آرزوؤں اور جھوٹی امیدوں کا بندہ ہو جاتا ہے۔ وہ نجات و سعادت کے لیے سعی و عمل کی راہ اختیار نہیں کرتا بلکہ اپنی جھوٹی امیدوں اور مغرورانہ آرزوؤں ہی میں مگن رہتا ہے۔ شیطان کا سارا کاروبار ہی وعدوں اور امیدوں پر چلتا ہے وہ انسان کو انفرادی طور پر جب کسی غلط راستے پر ڈالتا ہے تو اس کے آگے امیدوں کا سبز باغ پیش کر دیتا ہے۔ کسی کو انفرادی لطف و لذت اور کامیابیوں کی امید، کسی کی قومی سربلندیوں کی توقع کسی کو نوعِ انسانی کی فلاح و بہبود کا یقین، کسی کو صداقت تک پہنچ جانے کا اطمینان کسی کو یہ بھروسہ کہ نہ خدا ہے نہ آخرت بس مر کر مٹی ہو جانا ہے کسی کو یہ تسلی کہ آخرت ہے بھی تو وہاں کی گرفت سے فلاں کے طفیل اور فلاں کے صدقے میں بچ جائیں گے۔ غرض جو جس وعدے اور جس توقع سے فریب کھا سکتا ہے اس کے سامنے وہی پیش کرتا ہے اور پھانس لیتا ہے اور وہ بتاتا ہے کہ دنیا میں مادے کے سوا کچھ نہیں ہے حتیٰ کہ انسان بھی صرف برقیہ اور سالمیہ ہی کی کرشمہ سازی ہے اسے اس دنیا میں اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ صرف مادی احتیاجات کی تسکین ہے۔ اس نے مصنفین اور اہلِ قلم کے روپ میں اپنی جادو بیانی، سحر طرازی اور زورِ خطابت کے ذریعے نبوت کے علم و عمل کے خلاف ایک عام بغاوت پیدا کر دی۔ اس نے دنیا پرستی کو نہایت دلفریب اور دلکش بنا کر پیش کیا جو چیز اس کی ر[illegible] آگی ہوتی اس کے خلاف غیظ و غضب کو بھڑکایا اور اس طرح شیطان نے اپنی فریب کاری سے طبیعتوں کو ہر قسم کی قید و بند سے آزاد کر دیا۔ انسان کو زندگی سے بھرپور تمتع، مطالباتِ نفس کی بے عنان تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی۔ جس کا حرص ہوا کہ اس زندگی کی اہمیت جتائی۔ نقد لذت اور ظاہری محسوس مادی شے کے سوا ہر چیز کو غلط کیا، جو کچھ ہے یہی مادی دنیا ہے، آخرت کا حساب و کتاب کچھ نہیں، عقل ہی سب سے بڑا معیار اور آخری معیار ہے۔ وحیِ الٰہی محض وہم ہے۔ مادہ کی قوتیں اور قوانین ہی سب کچھ ہیں۔ ان کے اوپر کوئی مشیتِ اعلیٰ حاکم نہیں ہے اس پر تفصیلی بحث انشاءاللہ پندرھویں پارے میں آئے گی۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَنُدْخِلُهُمْ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ۭ وَعْدَ اللّٰهِ حَقًّا ۭ وَمَنْ اَصْدَقُ
مِنَ اللّٰهِ قِيْلًا ۝ لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَآ اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتٰبِ ۭ
مَنْ يَّعْمَلْ سُوْۗءًا يُّجْزَ بِهٖ ۙ وَلَا يَجِدْ لَهٗ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلِيًّا
وَّلَا نَصِيْرًا ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِنَ الصّٰلِحٰتِ مِنْ ذَكَرٍ اَوْ
اُنْثٰى وَهُوَ مُؤْمِنٌ فَاُولٰۗىِٕكَ يَدْخُلُوْنَ الْجَنَّةَ وَلَا يُظْلَمُوْنَ
نَقِيْرًا ۝ وَمَنْ اَحْسَنُ دِيْنًا مِّمَّنْ اَسْلَمَ وَجْهَهٗ لِلّٰهِ وَهُوَ
مُحْسِنٌ وَّاتَّبَعَ مِلَّةَ اِبْرٰهِيْمَ حَنِيْفًا ۭ وَاتَّخَذَ اللّٰهُ اِبْرٰهِيْمَ
خَلِيْلًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَ
كَانَ اللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيْطًا ۝ ع ١٨ ١١ ١٥

اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے کام کیے
ہم ان کو ضرور ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے

نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ نے یہ پکا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ سے زیادہ بات میں سچا کون ہے[۱۸۲]۔ دیکھو! نہ تو مدارِ نجات تمہاری آرزوئیں ہیں اور اہلِ کتاب کی آرزوئیں، جو بھی کوئی برائی کرے گا اسے اس کی جزا ملے گی اور اسے اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ملے گا[۱۸۳]۔ اور جو بھی نیک عمل اختیار کرینگے بشرطیکہ وہ مومن ہوں خواہ مرد ہوں یا عورت ان کو جنت میں داخلہ ملے گا اور ذرہ برابر بھی ان پر ظلم نہ ہوگا[۱۸۴]۔ اس شخص سے بہتر نظامِ حیات کس کا ہو سکتا ہے جس نے حسن کار ہو کر اللہ کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا اور سب سے ہٹ کر ابراہیم کے طریقہ کو اپنا لیا وہ ابراہیم جسے اللہ نے اپنا دوست بنا لیا تھا[۱۸۵]۔ اور یاد رکھو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے[۱۸۶]۔

قانونِ نجات کا اعلانِ عام

اسلام سے مقصود ایمان و عمل صالح ہے۔ یہ کسی حلقہ بندی کا نام نہیں۔ کوئی انسان ہو، کسی نسل و قوم سے ہو، کسی نام سے پکارا جاتا ہو۔ لیکن اگر نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کی رہنمائی میں ایمان و عمل صالح رکھتا ہے تو اسلام پر چلنے والا ہے۔ یہودیوں اور عیسائیوں نے نجات کے لیے ایمان و عمل سے ہٹ کر ایک خاص طرح کی نسلی اور جماعتی فرقہ واریت کا قانون بنا لیا تھا۔ یہودیوں نے گروہ بندی کا ایک دائرہ کھینچا اور اس کا نام یہودیت رکھا، جو اس دائرے کے اندر ہے وہ سچائی پر ہے اس کے لیے نجات ہے جو اس سے باہر ہے وہ باطل پر ہے اور اس کے لیے نجات نہیں ہے۔ اسی طرح عیسائیوں نے بھی ایک دائرہ کھینچ لیا اور اس کا نام مسیحیت رکھا، جو اس میں داخل ہے صرف وہ ہی سچائی ہے اور صرف اسی کے لیے نجات ہے جو اس سے باہر ہے اس کا سچائی میں کوئی حصہ نہیں ہے اور نجات سے قطعاً محروم۔ باقی رہا نبوت کے علم و عمل کی رہنمائی میں ایمان و عمل صالح تو اس کا قانون یک قلم ختم کر دیا گیا۔ نبوت کے علم کی جگہ اوہام و خرافات نے لے لی، اور عمل کی جگہ خواہشوں، ہوا جس نفس اور میلانِ طبع نے لے لی۔ قرآن نے ان کے اسی اعتقاد کو ان لفظوں میں پیش کیا ہے۔ کونوا ھودا و نصاریٰ

یعنی نجات کی راہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کی روشنی میں اور ایمان و عمل صالح میں نہیں بلکہ یہودیت اور مسیحیت کی گروہ بندی میں ہے۔ قرآن نے ان کا رد کرتے ہوئے بتایا ہے کہ تلک امانیھم یہ ان کی خوش آئند آرزوئیں اور ان کے پرجوش ولولے ہیں ورنہ حقیقت سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے اور پھر بتایا کہ نجات کا قانون تو بس اور صرف یہ ہے کہ

بلی من اسلم وجھہ للہ و ھو محسن فلہ اجرہ عند ربہ

یعنی جو نبوت کے علم و عمل کی روشنی میں اللہ سے فکر و علم میں مخلصانہ لگاؤ اور کردار و عمل میں محسنانہ طور اختیار کرے گا اور اس طرح اسلام و احسان کی تصویر بن کر رہے گا اس کے لیے نجات ہے آیت میں اسلام و احسان کی قید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آخرت کی نجات اسلام ہی پر موقوف ہے اور کوئی دین اللہ کے حضور اسلام کے سوا منظور شدہ اور قابلِ قبول نہیں ہے۔ اس آیت میں نہ صرف یہودیوں اور عیسائیوں کو بلکہ سب کو مخاطب کر کے صاف صاف اعلان کر دیا ہے۔ ایسا اعلان جس کے بعد کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔

۱۲۲- اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے ہم ان کو ضرور ایسے باغات میں داخل کریں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی، وہ ان میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے، اللہ نے یہ پکا وعدہ فرمایا ہے اور اللہ سے زیادہ بات میں سچا کون ہے۔ یعنی اور وہ لوگ جو شیطان کی خرابی سے محفوظ ہیں اور ارشادِ خداوندی کے موافق ایمان لائے اور اچھے عمل کیے وہ ہمیشہ کے لیے باغ و بہار میں رہیں گے اور یہ اللہ کا وعدہ ہے جس سے کسی کی بات نہیں ہو سکتی۔ پھر ایسے سچے وعدے کو چھوڑ کر شیطان کی جھوٹی باتوں میں آنا کس قدر گمراہی اور کتنی بڑی مضرت کو سر پر لینا ہے[1] اس آیت میں سمجھایا گیا ہے کہ آرزوئیں، ولولے، نعرے اور دعوے مدارِ نجات نہیں بلکہ مدارِ نجات ایمان و عمل صالح ہے جو لوگ اس کو اختیار کریں گے وہ جنت میں جائیں گے۔ اس کے بعد قرآن نے جنت کا چہرہ پیش کیا ہے، اس چہرے میں سب سے اہم اور بنیادی بات جو کہی گئی ہے وہ جنت کا دوام اور ہمیشگی ہے۔ اس موجودہ زندگی میں بھی اگرچہ لذتیں اور مسرتیں ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ بقائے دوام ہے۔ یہاں کی ہر لذت عارضی پر مسرت آتی ہے۔ یہاں خوشی کا کوئی ترانہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو۔ یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹا، ہر روشنی کے ساتھ تاریکی، ہر موجود کے ساتھ فنا، ہر سیری کے بعد بھوک، ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے۔ انسان ہزاروں مشکلیں اٹھانے کے بعد ایک خوشی کا پیغام سنتا ہے مگر ابھی اس سے سیر ہونے کی نوبت بھی نہیں آتی کہ اس کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ غرض اس موجودہ عالم فانی کی ہر چیز آنی جانی ہے اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے۔

لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں جہاں حیات ہے موت نہیں، راحت ہے تکلیف نہیں، لذت ہے الم نہیں، مسرت ہے غم نہیں، سکون ہے اضطراب نہیں۔ شادمانی ہے حزن و اندوہ نہیں۔ یہ ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ابدی، جہاں کی لذت بے انتہا جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور لازوال اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ قرآن نے یہ چیز اس آیت میں جس انداز سے پیش کی ہے اس کے لیے آیت میں تاکید پر تاکید اور

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

پُرزور طریقہ تعبیر پر نظر ڈالیے کہ صرف خالدین پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ساتھ ہی ابدًا فرماکر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا۔ اس پر بھی بس نہیں کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ وعد اللہ حقاً یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے۔ پھر مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ ومن اصدق من اللہ قیلاً اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہوسکتی ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلودِ جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے؟

مدارِ نجات ولولے نہیں ایمان و عمل ہے

۱۸۳۔ نہ تو مدارِ نجات تمہاری آرزوئیں ہیں اور نہ اہلِ کتاب کی آرزوئیں جو بھی کوئی برائی کرے گا اسے اس کی جزا ملے گی اور اسے اللہ کے سوا اپنا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ملے گا۔ امانی بروزن افاعیل امنیۃ کی جمع ہے جس کے معنے کسی ٹھہرائی ہوئی تمنا اور اندازہ کی ہوئی چیز کے ہیں۔ کتاب والوں یعنی یہودیوں اور نصرانیوں کو خیال تھا کہ ہم خاص بندے ہیں۔ جن گناہوں میں لوگ پکڑے جائیں گے ہم نہ پکڑے جائیں گے۔ ہمارے پیغمبر حمایت کرکے ہمیں بچالیں گے اور ناداں اہلِ اسلام بھی اپنے حق میں بھی خیال کرتے ہیں سو فرمادیا کہ نجات اور ثواب کسی کے امید اور خیال پر موقوف نہیں، جو بُرا کرے گا پکڑا جائے گا کوئی ہو۔ اللہ کے عذاب کے وقت کسی کی حمایت کام نہیں آسکتی اللہ جس کو پکڑے وہی چھوڑے تو چھوٹے دنیا کی مصیبت اور بیماری کو دھیان کرلو[1]

دراصل پچھلی آیات میں انسانی گمراہی کی یہ حالت بتلائی تھی کہ ایمان و عمل کی جگہ باطل آرزوؤں اور جھوٹی امیدوں میں مگن ہوجاتا ہے۔ یہاں بتلایا ہے کہ اسی گمراہی میں یہودی اور عیسائی مبتلا ہو گئے تھے، ایمان و عمل کی جگہ صرف آرزوئیں اور امیدیں ہی ان کا سرمایۂ دین ہیں۔ یہودی کہتے ہیں کہ ہم خدا کی خاص امت ہیں، ہم پر آتشِ دوزخ حرام ہے۔ عیسائی کہتے ہیں کہ ہم کفارۂ مسیح پر ایمان رکھتے ہیں اس لیے ہمارے لیے نجات ہی نجات ہے۔ قرآن مسلمانوں کو متنبہ کرتا ہے کہ کہیں تم بھی اسی گمراہی میں مبتلا نہ ہوجانا۔ وہ کہتا ہے نہ تو تمہاری آرزوئیں سے کچھ بننے والا ہے نہ اہلِ کتاب کی۔ خدا کا قانون تو یہ ہے کہ جس کسی کا عمل بُرا ہوگا وہ اس کی سزا ضرور پائے گا خواہ تم ہو خواہ یہودی ہوں خواہ عیسائی ہوں، خواہ کوئی ہو۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک مرتبہ مسلمانوں اور اہل کتاب میں بحث چھڑ گئی۔ یہودیوں نے کہا ہمارا دین سب سے بہتر ہے کہ نجات صرف ہمارے لیے ہی ہے۔ مسلمانوں نے کہا ہمارا دین سب سے بہتر ہے کیونکہ سب کے بعد آیا اور سب کی نجات اس پر موقوف ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ (ابن جریر) اس سے معلوم ہوا کہ محض اپنی بڑائی کرنے اور ڈینگیں مارنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ اصل چیز ایمان و عمل ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ نجات سے متعلق جھوٹی آرزوئیں خواہ مسلمانوں کی ہوں یا اہل کتاب کی، ان میں سے کوئی بھی پوری ہونے والی نہیں ہے جو بھی بُرائی کرے گا وہ اپنے کیے کی سزا پائے گا۔

یہاں مسلمانوں اور اہل کتاب دونوں کی آرزوؤں کا ایک ساتھ ذکر کرکے قرآن نے یہ واضح کردیا کہ شرک اور خاندانی بزرگی کے بل بوتے پر جنت کے خواب دیکھنے والے سب ایک ہی دامِ فریب کے گرفتار ہیں اور ان سب کی نامرادی ایک ہی طرح کی ہے۔

اچھی زندگی ایمان کے بغیر اچھی نہیں

۱۲۴۔ اور جو بھی نیک عملی کی زندگی اختیار کریں گے بشرطیکہ وہ مومن ہوں خواہ مرد ہوں یا عورتیں ان کو جنت میں داخلہ ملے گا اور ذرہ برابر ان پر ظلم نہ ہوگا۔ یعنی جو کوئی نیک عمل کرے گا بشرطیکہ ایمان رکھتا ہو ایسے لوگ جنت میں جائیں گے اور اپنی نیکیوں کا پورا ثواب پائیں گے۔ خلاصہ یہ کہ ثواب و عقاب کا تعلق اعمال سے ہے کسی کی اُمید اور آرزو سے کچھ نہیں ہوتا۔ لہٰذا اُمیدوں پر لات مارو اور نیک کاموں کی ہمت کرو۔[1]

مطلب یہ ہے کہ آخرت میں کامیابی ان لوگوں کو ہوگی جو ایمان اور عمل صالح کی راہ اختیار کیے ہوئے ہیں، جس کے پاس یہ دولت ہوگی وہ فائز المرام ہے خواہ وہ مرد ہو یا عورت، اسرائیلی ہو یا اسماعیلی، عربی ہو یا عجمی، اس کی کسی نسبت کی وجہ سے اس کے ساتھ کوئی کمی نہ ہوگی۔ علامہ آلوسی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ آخرت میں کامیابی کے لیے عمل صالح کے ساتھ ایمان کی قید بتانے کے لیے ہے کہ عمل کا ایمان کے بغیر کوئی اعتبار نہیں ہے۔

یہاں ایک خاص نکتہ ہے کہ یہودیوں نے سب سے زیادہ اہمیت عملی رسم و رواج کو دی ہے اور عیسائیوں نے اس کے برخلاف صرف ایمان پر نجات و فلاح کا دارومدار رکھا۔ چنانچہ حواریوں کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

خطوط و ملفوظات میں اس تعلیم کو بہت کچھ نمایاں کیا ہے اور بتایا ہے کہ عمل نہیں بلکہ صرف ایمان نجات کا ذریعہ ہے۔ قرآن نے جو راہ اختیار کی ہے وہ یہ ہے کہ وہ دونوں کی اصلاح کر کے ان دونوں کو جمع کرتا ہے اور کہتا ہے کہ نجات نہ تنہا ایمان پر اور نہ تنہا عمل پر بلکہ ایمان اور عمل صالح کی ایسی جامعیت پر موقوف ہے جن میں درخت اور پھل کی نسبت ہو، دوسری بات یہ ہے کہ وھو مومن کو جملہ حالیہ کی صورت میں لا کر اشارہ کر دیا کہ وہ ایمان کو محض ایمان کی بنا پر اہمیت نہیں دیتا بلکہ اس لیے اہمیت دیتا ہے کہ وہ عمل صالح کی علت اور سبب ہے یعنی عمل صالح کے لیے راستہ بناتا اور تخم ریزی کے لیے زمین درست کرتا ہے۔ اگر حال ذوالحال کی قید ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیا جب کہ خود بلاغت کے علماء تصریح کرتے ہیں تو یہ کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لیے نخل ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے۔ اب اگر ایسا کوئی شخص نظر آتا ہے کہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس کے ایمان کے مطابق کوئی تغیر نظر نہیں آتا تو یہی سمجھنا چاہیے کہ ایمان اس کی زبان سے اتر کر اس کے دل کی گہرائیوں میں برگ و بار پیدا نہیں کیا ہے یہی سبب ہے کہ قرآن پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم بتاتا ہے۔ ہر اہم موقع پر اس نے مسلمانوں کو یا ایہا الذین آمنوا کی ندا سے خطاب کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں، کہیں بھی کہہ ہے ان کنتم مومنین صحابہ تو صحابہ علماء تابعین تک ایمان کے بارے میں جو تاثر رکھتے ہیں اس کا اندازہ امام حسن بصری کے اس بیان سے ہوتا ہے جو ابن ابی شیبہ کے حوالہ سے آلوسی نے نقل کیا ہے،

> ایمان آرزوؤں اور تمناؤں کا نام نہیں ہے۔ ایمان وہ ہے جو دل میں بیٹھ جائے اور عمل اس کی تصدیق کرے۔ بہت سے لوگوں کو مغفرت کی امیدوں اور تمناؤں نے تب تک غافل بنائے رکھا وہ دنیا سے نیکی کے بغیر یہی کہتے گئے کہ ہم تو اللہ سے حسن ظن رکھتے ہیں، یہ لوگ جھوٹے تھے۔ اگر ان کو اللہ سے حسن ظن ہوتا تو ضرور حسن عمل کی مایہ لے جاتے۔

قرآن نے محبت الٰہی، اللہ و رسول کی طاعت اور فرمانبرداری کو ایمان کا لازمی تقاضا بتایا ہے والذین امنوا اشد حبا للہ اور انما کان قول المؤمنین جیسی آیات کا بغور مطالعہ کیجئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انقیاد باطن، التزام طاعت، عہد وفاداری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا ایک مرتبہ رہتا ہے۔ اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہد وفاداری

نہیں کرتا وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔

سید رشید رضا نے یہاں یہ بات بڑی دردانگیز لکھی ہے کہ :

ان دونوں آیتوں میں ان مسلمانوں کے لیے بہت بڑی عبرت ہے جو اسلام کو ایک سیاسی قومیت بناتے بیٹھے ہیں اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ اللہ سبحانہ کا معاملہ مسلمان قوم سے محض مسلمان ہونے کی بنا پر ہوگا فیصلہ کا مدار علم وعمل نہیں بلکہ قومی تشخص ہوگا۔ خبر نہیں یہ لوگ کتاب الٰہی کی رہنمائی کب حاصل کریں گے ؟ تا حال تو محض دعووں ، نعروں اور تمناؤں میں پل رہے ہیں۔ اگر مسلمانوں کی تمناؤں کی پوری تفصیل دیکھنا چاہتے ہو تو امام غزالی کی کتاب احیاء علوم الدین میں کتاب الغرور کا مطالعہ کرو۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے اسی لیے وہ مذہب کا اصل الاصول ہے وہ نہ ہو تو ساری نیکیوں کی عمارت بے بنیاد ہے اور اگر ایمان ہو تو عمل موجود نہ ہو تو بنیاد بغیر عمارت کے ہے۔ قرآن نے اس آیت میں اپنے بلیغ انداز من یعمل من الصلحت وھو مؤمن سے یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ نجات کا مدار ایمان اور عمل صالح دونوں پر ہے اسی لیے امنوا کے ساتھ وعملوا الصلحت پر اس نے ہمیشہ زور دیا ہے۔ منشا یہ ہے کہ ان دونوں میں ایمان اصل اور عمل اس کی فرع ہے ، ایمان ملزوم اور اعمال اس کے لوازم ہیں اس لیے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں ہو سکتا ، اسی طرح عمل کے بغیر ایمان ایک بے برگ وبار درخت ہے۔ جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم وجود برابر ہے

اسلامی نظامِ حیات کا تاریخی چہرہ

۱۸۵۔ اور اس شخص سے بہتر نظامِ حیات کس کا ہو سکتا ہے جس نے حسن کار ہو کر اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دیا اور سب سے ہٹ کر ابراہیم کے طریقہ کو اپنایا وہ ابراہیم جسے اللہ نے دوست بنا لیا تھا۔ پہلے معلوم ہو چکا کہ اللہ کے نزدیک اعمال کا اعتبار ہے یہود اور دعا کرنی نتیجہ نہیں اہل کتاب وغیرہ سب کے لیے یہی قاعدہ مقرر ہے جس میں اشارہ تھا اہل اسلام یعنی حضرات صحابہ کی تعریف اور فضیلت کی طرف اور اہل کتاب کی مذمت اور برائی کی طرف اشارہ کر کے اب فرماتے ہیں کہ دینداری میں ایسے شخص کا مقابلہ کون کر سکتا ہے کہ جو شخص اللہ کے حکم پر سر رکھے ہوتے ہو اور نیک کاموں میں دل سے لگا ہوا ہو اور حضرت ابراہیم کے دین کی بھی پیروی کرتا ہو

جوسب کو چھوڑ کر اللہ کا ہو گیا تھا اور اس کو اللہ نے اپنا دوست بنا لیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ تینوں خوبیاں حضرات صحابہ میں علی وجہ الکمال متعین نہ کہ اہل کتاب میں۔ اب اس سے اہل کتاب کی وہ آرزو جو پہلے گزری لغو محض اور باطل ہو گئی۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ اسلام کے نظام حیات سے بڑھ کر کون سا نظام ہو سکتا ہے جس میں یک قلم اپنے آپ کو اللہ کی سپردگی اور ہر حکم کی تعمیل میں پوری پوری حسن کاری ہے۔ اسلام کے معنے اپنے کو کسی دوسرے کے سپرد کر دینا اور اطاعت و بندگی کے لیے جھکا دینا ہیں اور احسان کے معنے حسن کاری کے ہیں یعنی ہر حکم کی تعمیل اس طرح کرنا جس طرح اس کے کرنے کا حق ہے اور یہی وہ ملت ہے جو حضرت ابراہیم لے کر آئے تھے۔ تورات و قرآن سے ثابت ہے کہ ملت ابراہیم کی اصلی بنیاد قربانی اور راہ خدا میں سرفروشی ہے۔ اور یہی حضرت ابراہیم کی پیغمبرانہ اور روحانی کمال کی اصلی خصوصیت تھی۔ یہ قربانی کیا تھی یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی۔ یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی۔ یہ اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے سامنے پیش کر دینے کی نذر تھی۔ یہ خدا کی اطاعت، عبودیت اور کامل بندگی کا بے مثال منظر تھا۔ یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ امتحان تھا جس کو پورا کیے بغیر دنیا کی پیشوائی اور آخرت کی نیکی نہیں مل سکتی۔ یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا نہ تھا بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمناؤں، اور آرزوؤں کی قربانی تھی اور خدا کے حکم کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا۔ یہی ملت ابراہیمی ہے جس کی پیروی کا مطالبہ ہے اور اسی سے اسلامی نظام حیات کا تاریخی چہرہ وابستہ ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو پھر اسلامی نظام حیات کی مخالفت اور اس سے انحراف کے کیا معنے؟ یہی ھدی اللہ ہے۔

ان دو لفظوں اسلام، احسان سے ملت ابراہیمی کا حقیقی چہرہ پیش کر دیا ہے۔ اب ملت کا چہرہ بیان کرنے کے بعد حضرت ابراہیم کا ان الفاظ میں تعارف کرایا ہے کہ واتخذ اللہ ابراہیم خلیلا اللہ نے حضرت ابراہیم کو اپنا پیارا بنا لیا۔

حضرت ابراہیم کا مقام خلت

خلیل وہ دوست جس کی محبت دل کی گہرائیوں میں جاگزین ہو۔ خلال سے جس کے معنے کسی سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوستی کرنے کے ہیں صفت مشبہ کا صیغہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :

خلیل بروزن فعیل بمعنی فاعل ہے ، خلۃ بالضم سے ماخوذ ہے جس کے معنے اس دوستی اور محبت کے ہیں جو دل کے اندر گھس کر اس کے وسط میں پہنچ جائے ۔ حضرت ابراہیم کے دل میں اللہ تعالیٰ کی محبت کا جو اثر تھا اس کے اعتبار سے یہ بالکل صحیح ہے اور کچھ کی رائے میں خلت بمعنے اصطفا ہے یعنی برگزیدگی ۔ حضرت ابراہیم خلیل کے لقب سے اس لیے ملقب ہوئے کہ آپ کی دوستی اور دشمنی اللہ کے لیے تھی ۔ اور ان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی خلت کا مطلب ان کی مدد کرنا اور ان کو پیشوا بنانا تھا اور کچھ کا خیال ہے کہ خلیل خلۃ بفتح خاء سے مشتق ہے جس کے معنے حاجت کے ہیں اور ان کا نام خلیل اس لیے ہوا کہ وہ اپنے رب کے ہی ہو گئے تھے اور ساری حاجتیں اسی کے سپرد کر دی تھیں ۔

خازن بغدادی لکھتے ہیں :

اللہ کا بندے کو خلیل بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اسے اپنی فرمانبرداری اور طاعت پر قابو دے دے ، عصمت سے سرفراز فرمائے توفیق عنایت کرے ، اس کے خلل کو چھپائے اور اس کی مدد کرے ۔

حافظ ابن القیم نے دس مراتب محبت بیان کیے ہیں ان کی فہرست خود ان کے بیان کے مطابق یہ ہے ۔ علاقہ ، ارادہ ، غرام ، وداد ، شغاف ، عشق ، تیتم ، تعبد اور خلت ۔ فرماتے ہیں :

مرتبہ خلت کی حامل صرف دو ہستیاں ہیں ابراہیم اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم ، جیسا کہ صحیح حدیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ان اللہ اتخذ نی خلیلا کما اتخذ ابراھیم خلیلا ۔ اللہ نے مجھے ایسے ہی خلیل بنا لیا ہے جیسے حضرت ابراہیم کو خلیل بنایا تھا اور ایک دوسری حدیث میں ہے اگر میں روئے زمین کے باشندوں میں سے کسی کو خلیل بناتا تو ابوبکر کو بناتا لیکن تمہارا ساتھی خلیل الرحمان ہے ۔ دونوں ارشاد صحیح ہیں اور یہ ارشاد نبوت اس خیال کو بالکل غلط قرار دیتے ہیں کہ خلت حضرت ابراہیم کے لیے ہے اور محبت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے لہٰذا حضرت ابراہیم خلیل اور حضور انور حبیب ہیں ۔ خلت دراصل وہ محبت ہے جو عاشق کی روح اور اس کے دل میں اس طرح جاگزیں ہوتی ہے کہ اس میں غیر محبوب

کے لیے کوئی جگہ نہیں رہتی ہے ۔

اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ حضرت ابراہیم کا خلیل اللہ ہونا تمام نبیوں میں اور اُمتوں میں مانا ہوا ہے یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ حضرت ابراہیم کے خلیل اللہ ہونے کا ذکر تورات میں بھی بار بار ہوا ہے۔ یہاں لفظ حنیف پہلے لاکر اشارہ کر دیا کہ ان کے خلیل اللہ ہونے کی وجہ، ان کا ہر طرف سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنے رب کے بالکلیہ حوالہ کر دینا تھا۔ چنانچہ ارشاد ہے ،

اذ قال لہ ربہ اسلم قال اسلمت لرب العالمین

ان کی ملت اسلام، احسان اور حنیفیت یعنی توحید ہے اور وہ اس کے اولین قائد ہیں۔ محمد رسول اللہ جو نظام لے کر آئے ہیں اس کی حقیقت بھی یہی تین چیزیں ہیں اور بس اس لیے محمد رسول اللہ کے لائے ہوئے نظام حیات سے بہتر کوئی نظام نہیں ہے اور اسلامی نظام حیات کے سوا کوئی نظام اللہ کے یہاں مقبول نہیں ہے ۔

اس فقرے کا انداز استفہام انکاری ہے اور مقصد یہ بتانا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیش کردہ نظام حیات سے بہتر کوئی نظام حیات نہیں ہے۔ اس استفہام انکاری کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ دوسرے تمام دین منسوخ ہو چکے ہیں اور اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف اسلام ہے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے کیونکہ جب اس دین سے بہتر کوئی دین نہیں ہے تو اب کسی اور دین کا وجود نہیں ہے۔ آپ کے دین کے مقابلہ میں کسی دین کا اچھا نہ ہونا اس بات کا کھلا تقاضا کرتا ہے کہ ہر انسان اور ہر زمانے کا انسان آپ پر ایمان لائے اور آپ کے لائے ہوئے دین کو اپنا دین مان کر لازماً اسی کی پیروی کرے۔ اگر کوئی آپ کو نہیں مانتا اور آپ کے لائے ہوئے دین کا حلقہ اپنی گردن میں نہیں ڈالتا تو یہ آپ کے نہیں بلکہ اس فرمانروائے کائنات کے خلاف بغاوت ہے جس نے آپ کو پوری کائنات کا ہادی بنا کر روانہ کیا ہے ۔

اسلام کو اپنانے کی علت

۱۲۶- اور یاد رکھو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب کچھ اللہ کا ہے اور اللہ ہر چیز کا احاطہ کیے ہوئے ہے۔ یعنی زمین و آسمان میں جو کچھ ہے سب اس کے بندے اور اس کی

مخلوق و مملوک ہیں اور اس کے قبضے میں ہیں اپنی رحمت اور حکمت سے جس کے ساتھ جیسا چاہے معاملہ کرے اس کو کسی کی حاجت نہیں خلیل بنانے سے کوئی دھوکا نہ کھاتے اور اہل عالم کے جملہ اعمال خیر و شر کی جزا اور سزا میں مردود نہ کرے [1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سامنے سر تسلیم خم کر دینا اور خود سری و خود مختاری کو چھوڑ کر اسلامی نظام حیات کو اپنانا اس لیے بہترین ہے کہ یہ حقیقت کے عین مطابق ہے جب اللہ زمین و آسمان کا اور ان ساری چیزوں کا مالک ہے جو زمین و آسمان میں ہیں تو انسان کے لیے صحیح رویہ یہی ہے کہ اللہ کی بندگی و طاعت پر راضی ہو جائے اور خود سری و خود مختاری چھوڑ کر اسلامی نظام حیات کو قبول کرے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَيَسْتَفْتُونَكَ فِي النِّسَآءِ ۖ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِيهِنَّ ۙ وَمَا يُتْلٰى
عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ فِي يَتٰمَى النِّسَآءِ الّٰتِي لَا تُؤْتُونَهُنَّ مَا كُتِبَ لَهُنَّ
وَتَرْغَبُونَ أَنْ تَنْكِحُوهُنَّ وَالْمُسْتَضْعَفِينَ مِنَ الْوِلْدَانِ ۙ
وَأَنْ تَقُومُوا لِلْيَتٰمٰى بِالْقِسْطِ ۗ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ
بِهٖ عَلِيمًا ۝ وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا
فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَآ أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ۚ وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ۗ
وَأُحْضِرَتِ الْأَنْفُسُ الشُّحَّ ۚ وَإِنْ تُحْسِنُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ
بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ۝ وَلَنْ تَسْتَطِيعُوٓا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ
النِّسَآءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا
كَالْمُعَلَّقَةِ ۚ وَإِنْ تُصْلِحُوا وَتَتَّقُوا فَإِنَّ اللّٰهَ كَانَ غَفُورًا رَّحِيمًا ۝
وَإِنْ يَتَفَرَّقَا يُغْنِ اللّٰهُ كُلًّا مِّنْ سَعَتِهٖ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ وَاسِعًا حَكِيمًا ۝

اور اے پیغمبر لوگ تم سے عورتوں کے بارے میں دریافت کرتے

ہیں۱۸۸، تم کہہ دو کہ اللہ تم کو ان کے بارے میں حکم دیتا ہے، نیز وہ
آیات تم کو حکم دیتی ہیں جو تمہیں قرآن میں سنائی جاتی ہیں۱۸۹،
جن کو تم ان کا وہ حق نہیں دیتے جو ان کے لیے ٹھہرا دیا گیا ہے
اور چاہتے ہو کہ ان سے نکاح کر لو، نیز جو کچھ بے بس یتیم لڑکوں
کے بارے میں قرآن میں سنایا جا رہا ہے اس بارے میں خدا تم
کو حکم دیتا ہے۱۸۹، اور وہ حکم دیتا ہے کہ یتیموں کے معاملہ میں
حق و انصاف کا دامن تھام کر رکھو۱۹۰۔ اور بھلائی کے کام تم جو کچھ
کرتے ہو اللہ اس کو خوب جانتا ہے۱۹۱۔ اور اگر کسی عورت کو اپنے
شوہر سے سرکشی یا کنارہ کشی کا اندیشہ ہو تو باہم صلح کرنے میں
دونوں پر کوئی گناہ نہیں اور صلح ہی بہتر ہے۱۹۲۔ اور انسان
کی طبیعت میں لالچ موجود ہے۱۹۳۔ اور اگر تم حسن کار بن کر رہو اور
محتاط رہو تو تم جو کچھ کرتے ہو اللہ کو اس کی پوری خبر ہے۱۹۴، اور

تم اپنی جانب سے خواہ کتنی خواہش کرو کہ عورتوں میں عدل کرو لیکن پورا عدل کرنا تمہارے بس سے باہر ہے، بس ایسا نہ ہو کہ کسی ایک کی طرف تمہارا میلان ہو اور دوسری کو چھوڑ دو گویا معلقہ ہے[۱۹۵]۔ اور اگر اصلاح کر لو اور متقیانہ سیرت اختیار کر لو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے[۱۹۶]، اور اگر میاں بیوی جدا ہو جاویں تو اللہ ہر ایک کو اپنی کشائش سے بے پروا کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا اور حکمت والا ہے[۱۹۷]۔

عائلی ضوابط اور حقوقِ قرابت

سلسلہ بیان پھر قرابت داروں کی طرف پھر گیا ہے جس سے سورت کی ابتدا ہوئی تھی۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ سورت کے آغاز میں یتیموں اور عورتوں کے بارے میں جو احکام نازل ہوئے تھے ان کی نسبت بعض لوگوں نے مزید سوالات کیے اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ (ابن جریر)

عرب والے عورتوں، بچوں، یتیموں کو بعض حقوق میں محروم رکھتے تھے۔ میراث نہ دیتے تھے اور کہتے تھے کہ میراث ان کا حق ہے جو دشمنوں سے لڑائی کریں۔ یتیم لڑکیوں سے ان کے اولیاٗ نکاح کر کے نفقہ اور مہر میں کمی اور ان کے مال میں بے جا تصرف کرتے تھے۔ چنانچہ اس سورت کے اول میں ان باتوں کی تاکیدات گزر چکی ہیں۔ اب اس موقعہ پر چند رکوع پہلے سے جو ارشاد چلا آرہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ واجب الاتباع حکمِ الٰہی ہے، کسی کی عقل، کسی کا دستور، کسی کا حکم، کسی کی آرزو

اور قیاس قابلِ اتباع نہیں ہو سکتا۔ اللہ سبحانہٗ کے حکم کے سامنے کسی کی بات سننا اور اللہ کے حکم کو چھوڑ کر کسی کے حکم پر عمل کرنا صریح کفر اور گمراہی ہے۔ اس مضمون کو طرح طرح کی تاکیدات صیغہ کے ساتھ ظاہر کر کے دکھلایا ہے۔ اب اس کے بعد آیات سابقہ کا حوالہ دے کر بعض اور مسائل عورتوں اور یتیم لڑکیوں کے نکاح کے متعلق بتلائے جاتے ہیں تاکہ ان تاکیدات کے بعد کسی کو عورتوں کے حقوق دینے میں کوئی بات باقی نہ رہے۔ روایت ہے کہ جب عورتوں کے متعلق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے میراث کا حکم ظاہر فرمایا تو بعض عرب کے سردار آپ کی خدمت میں آئے۔ اور تعجب سے کہا کہ ہم نے سنا ہے کہ آپ بہن اور بیٹی کو میراث دلواتے ہیں۔ حالانکہ میراث تو ان کا حق ہے جو دشمنوں سے لڑیں اور غنیمت کا مال لائیں۔ آپ نے فرمایا کہ بے شک حق تعالیٰ کا بھی حکم ہے کہ ان کو میراث دی جائے۔

نیز اشارہ ہے اس طرف کہ ارشاد و من احسن دیناً ممن اسلم وجھہ للہ وھو محسن کے مصداق حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم ہیں کہ نکاح مہر نفقہ، معاملات میں اپنے زیردستوں کی ادنیٰ حق تلفی روا نہیں رکھتے اور حکمِ خداوندی کے مقابلہ میں اپنے منافع اور اغراض ذاتی اور اپنی قوم کے رسم و رواج کی اصلاً پروا نہیں کرتے۔ یہ لوگ حکمِ الٰہی کی مخالفت کے احتمال سے بھی پرہیز کرتے ہیں[1]

۱۸۷۔ اور اے پیغمبر تم سے لوگ عورتوں کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ کیا پوچھتے ہیں؟ یہاں اس کو کھول کر نہیں بتایا گیا ہے مگر آگے جو جواب دیا گیا ہے اس سے سوال کی نوعیت خود بخود واضح ہو گئی۔ جب جواب سے سوال کی نوعیت خود بخود واضح ہو جاتے تو سوال کو نظر انداز کر دینا قرین بلاغت ہے۔ پوچھنے والے صحابہ کرام تھے۔

پہلے یہاں سوال کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے تاکہ جواب کے سمجھنے میں آگے الجھن نہ ہو۔ سورۂ نسآ کے آغاز میں دو قسم کی پابندیاں عائد کی گئی تھیں۔ ایک یہ کہ بیویوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کر دی گئی، دوسرے یہ کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لیے عدل کو شرط قرار دیا گیا۔ میری مراد قرآن کی یہ آیت ہے فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ، اس کی تشریح کے لیے سورۂ نسآ میں نوٹ نمبر ۹

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

جلد ۴ میں پڑھو۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ ایک شخص کی بیوی مریضہ ہے اور وہ دوسری شادی کرتا ہے تو کیا وہ مجبور ہے کہ دونوں سے ایک جیسی رغبت رکھے یکساں محبت رکھے اگر وہ ایسا نہ کرے تو کیا عدل کا تقاضا یہ ہے کہ دوسری شادی سے پہلے پہلی بیوی کو چھوڑ دے اور اگر پہلی بیوی جدا ہونا نہ چاہے تو کیا میاں بیوی میں ایسا معاملہ ہو سکتا ہے کہ غیر مرغوب بیوی اپنے کچھ حقوق سے دستبردار ہو کر شوہر کو طلاق نہ دینے پر راضی کرلے۔ یہ سوالات ہیں جو اس وقت کیے گئے تھے اور ان آیات میں ان ہی سوالات کے جوابات ہیں۔

یتیموں کے حقوق کی اہمیت

۱۸۸۔ تم کہہ دو کہ اللہ تم کو حکم دیتا ہے ان عورتوں کے بارے میں نیز وہ آیات حکم دیتی ہیں جو تمہیں قرآن میں سنائی جا رہی ہیں۔ یہ سوال کا جواب نہیں ہے بلکہ جواب سے پہلے ان احکام کی تعمیل کی طرف متوجہ کیا گیا ہے جو اسی سورت میں یتیم لڑکیوں کے متعلق بالخصوص اور یتیم بچوں کے بارے میں بالعموم بتائے گئے ہیں۔ اس آیت میں ما یتلی علیکم سے مراد وہ آیات ہیں جو اسی سورت کے شروع میں آئی ہیں مثلاً وان خفتم ان لا تقسطوا فی الیتامیٰ فانکحوا ما طاب لکم من النساء مثنیٰ وثلاث ورباع فان خفتم ان لا تعدلوا فواحدۃ

یہاں ما یتلی کے ترکیبی جوڑ میں علماء کا اختلاف ہے۔ کچھ کی رائے میں ما یتلی واؤ کے ذریعے یفتی کی ضمیر سے مربوط ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تم کو فتویٰ دیتا ہے اور قرآن کی وہ آیات جن کی تلاوت تمہارے سامنے کی جا رہی ہے تمہیں حکم دیتی ہیں اور کچھ کے خیال میں ما یتلی کا عطف فیہن کی ضمیر پر ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہیں عورتوں کے بارے میں حکم دیتا ہے اور ان احکام کی تعمیل کے بارے میں بھی تمہیں حکم دیتا ہے جو تمہیں قرآن میں پہلے سے سنائے جا رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ کی نگاہ میں یتیموں کے حقوق کی اہمیت کتنی زیادہ ہے۔ سورت کے ابتدائی دو رکوعوں میں ان کے حقوق کے تحفظ کی تاکید بڑی شدت کے ساتھ کی جا چکی ہے مگر اس پر ہی بس نہیں کی گئی بلکہ یہاں سوالات کا جواب دینے سے پہلے یتامیٰ کے حقوق کا ذکر بطور خود فرما دیا۔

یتیم لڑکیوں کی حق تلفی کی ممانعت

۱۸۹۔ ان یتیم عورتوں کے بارے میں جن کو تم ان کا وہ حق نہیں دیتے جو ان کے لیے ٹھہرا دیا گیا ہے

اور چاہتے ہو کہ ان سے نکاح کر لو۔ اشارہ ہے اس آیت کی طرف جس میں بتایا گیا ہے کہ وان خفتم ان لا تقسطوا فی الیتامیٰ اگر تمہیں یتیموں کے بارے میں بے انصافی کا اندیشہ ہو تو جو عورتیں پسند ہوں ان سے نکاح کر لو۔

آیت میں فی یتامی النساء کی مراد میں شارحین قرآن کا اختلاف ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی کہ یتیم لڑکیاں مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کی سرپرستی میں ایسی یتیم لڑکیاں ہوتی تھیں جن کے پاس والدین کی چھوڑی ہوئی کچھ دولت ہوتی تھی وہ ان لڑکیوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ظلم کرتے تھے۔ اگر لڑکی مالدار ہونے کے ساتھ خوبصورت بھی ہوتی تو یہ لوگ چاہتے تھے کہ خود اس سے نکاح کر لیں اور مہر و نفقہ ادا کیے بغیر اس کے مال اور جمال دونوں سے فائدہ اٹھائیں اور اگر وہ بدصورت ہوتی تو یہ لوگ نہ اس سے خود نکاح کرتے اور نہ کسی دوسرے سے اس کا نکاح کرتے تاکہ اس کا کوئی ایسا حمایتی نہ پیدا ہو جائے جو کل اس کے حق کا مطالبہ کرنے والا ہو۔ اس تشریح کی روشنی میں آیت میں ترغبون ان تنکحوھن کے دونوں مطلب ہو سکتے ہیں تم ان سے نکاح کی رغبت رکھتے ہو اور تم ان سے نکاح کرنا نہیں چاہتے ہو یعنی خوبصورت ہونے کی صورت میں پہلے اور بدصورت ہونے کی حالت میں دوسرے معنے ہوں گے۔

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یتامی النساء سے یتیم بچیاں مراد نہیں بلکہ یتیم بچوں کی مائیں مراد ہیں کیونکہ ان کے خیال میں یہ آیت ام کحہ نامی عورت کے بارے میں نازل ہوئی جس کے یتیم بچے تھے اور مطلب یہ ہے کہ عورتوں کے یتیم بچوں کے بارے میں انصاف نہ کر سکو تو ان عورتوں سے نکاح کر لو جو ان کی مائیں ہیں لیکن حضرت ابن عباس سے یہ روایت جس تاریخی حیثیت سے آئی ہے وہ ہمارے نزدیک صحیح نہیں ہے کیونکہ روایت کا سرچشمہ کلبی عن ابی صالح ہے اور اس کے بارے میں ہم بتا چکے ہیں کہ یہ سلسلہ سند محدثین کے یہاں قابل پذیرائی نہیں۔ اسی بنا پر شارحین قرآن کی اکثریت نے حضرت عائشہ کے تفسیری بیان کو اپنایا ہے۔

یتیموں کے حقوق کی نگرانی ضروری ہے

۱۹۰۔ اور وہ حکم دیتا ہے کہ یتیموں کے معاملہ میں حق و انصاف کا دامن تھام کر رکھو۔ اس سورت کے اول میں تاکید فرمائی تھی یتیموں کے حق ادا کرنے کی۔ اور فرمایا تھا کہ یتیم لڑکی جس کا ولی مثلاً چچا کا بیٹا ہو اگر جانے کہ میں اس کا پورا حق ادا کر سکوں گا تو خود اس لڑکی سے نکاح نہ کرے بلکہ کسی

اور سے نکاح کر لے اور اور آپ اس کا حمایتی بنا رہے۔ اس پر مسلمانوں نے ایسی عورتوں سے نکاح کرنا موقوف کر دیا تھا مگر تجربہ سے معلوم ہوا کہ بعض جگہ لڑکی کے حق میں یہی بہتر ہے کہ اس کا ولی ہی نکاح میں لائے جیسی رعایت وہ کرے گا غیر نہ کرے گا۔ تب مسلمانوں نے حضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے اجازت مانگی اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور رخصت مل گئی اور فرمایا کہ وہ پہلے ممانعت جو سنائی گئی تھی وہ خاص اس صورت میں تھی کہ ان کا حق پورا ادا نہ کرو، اور یتیموں کے حق ادا کرنے کی تاکید کی گئی تھی اور جو یتیموں کے ساتھ بھلائی اور سلوک کرنے کے ارادے سے ایسا کرے تو اجازت ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ سورت کے آغاز میں عورتوں اور یتیموں کے بارے میں جو احکام نازل ہو چکے تھے وہ اب بھی بدستور سابق واجب العمل ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ تم کو یتیم عورتوں اور بچوں کے بارے میں وہی فتویٰ اور حکم دیتا ہے جو اس سورت کے شروع میں بتایا جا چکا ہے اور اب پھر تم کو اجمالاً سنایا جا رہا ہے کہ جو احکام عورتوں اور یتیموں کے بارے میں پہلے نازل ہو چکے ہیں، ان پر عمل کرو اور جو کوئی ان کے بارے میں تم سے کچھ دریافت کرے تو یہ کہہ دو کہ اس کا جواب اور حکم وہی ہے جو پہلے سورۃ نساء کے آغاز میں بیان ہو چکا ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے ان تقوموا للیتامٰی بالقسط یعنی یتیموں کے معاملہ میں حق و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو خواہ یہ یتیم عورتیں ہوں یا یتیم بچے ہوں، ان کے بارے میں عدل و انصاف کی طرف پوری طرح متوجہ رہو اور پھر پورا انصاف کرو۔

عمل کے نیک ہونے کا قانون

۱۹۱۔ اور بھلائی کے کام تم جو کچھ کرتے ہو اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تمہاری ذرہ ذرہ بھلائی معلوم ہے لہٰذا یتیموں اور عورتوں کے حق میں جو بھلائی کرو گے اس کا ثواب ضرور پاؤ گے[2] یعنی انسان جو نیکی بھی کرتا ہے اس کا ایک ایک ذرہ اللہ کے علم میں ہے نہ کوئی اس کے علم سے باہر ہے اور نہ کرنے والے کی نیت اور ارادہ اس سے پوشیدہ ہے۔ گویا اس فقرے میں عمل کے نیک ہونے کا قانون بیان فرما دیا ہے کہ عمل کے نیک ہونے کا مدار اس پر ہے کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے اس عمل کے بارے میں کیا جانتے ہیں یعنی اگر تم نے اپنی بیویوں پر خرچ کیا ہے

[1] [2] افادات شیخ الاسلام

اور اس لیے خرچ کیا ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے تو تمہارا یہ خرچ قطعاً خیر ہے ایسے ہی اگر تم نے یتیموں پر خرچ کیا ہے اور اس لیے کیا ہے کہ یہ اللہ کا حکم ہے تو یہ بھی قطعاً خیر ہے۔ اور اگر خرچ میں اللہ کی مرضی کا اتباع مقصود نہیں ہے تو یہ بظاہر کتنا ہی بڑا دینی کام سمجھا جاتے لیکن پھر بھی وہ دنیوی کام ہے گویا اصول یہ بتا دیا گیا کہ جسے عام طور پر دنیوی خرچ کہا جاتا ہے جیسے بیوی، بچوں اور والدین پر، اپنے عزیزوں پر صرف نیت اور نقطۂ نظر کی تبدیلی سے وہ بھی خیرات بن جاتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اپنی بیوی پر آدمی جو اللہ کو سامنے رکھ کر خرچ کرتا ہے وہ صدقہ ہے صرف یہی نہیں کہ وہ صدقہ بن جاتا ہے بلکہ تمام صدقات میں اس صدقہ کو برتری حاصل ہو جاتی ہے۔ ارشاد ہے:

> وہ اشرفی جسے اللہ کی راہ میں تم نے خرچ کیا اور وہ اشرفی جو غلام آزاد کرانے میں صرف کی، اور وہ اشرفی جو کسی مسکین پر تم نے خرچ کی اور وہ اشرفی جو تم نے اپنی بیوی پر لگائی۔ ان تمام اشرفیوں میں ثواب اور اجر کے اعتبار سے سب سے بڑی وہ ہے جسے تم نے اپنی بیوی پر خرچ کیا۔ (صحیح مسلم)

بیوی اور بچے تو ایک حد تک غیر بھی ہو سکتے ہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی زیادہ ارشاد فرمایا ہے کہ آدمی جو خود اپنی ذات پر خرچ کرتا ہے وہ بھی صدقہ ہے۔ مسند احمد میں ارشاد ہے:

> تم نے خود اپنے کو جو کچھ کھلایا وہ بھی صدقہ ہے جو کچھ اپنی اولاد پر صرف کیا وہ بھی صدقہ ہے۔ اپنی بیوی کو جو کچھ دیا یہ بھی صدقہ ہے اپنے نوکر پر جو کچھ لگایا یہ بھی صدقہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ فان اللہ کان بہ علیما یعنی اللہ سبحانہ کی مرضی کو دھیان میں رکھ کر اسراف و تبذیر کے سوا دولت کے تمام مصارف صدقہ بن جاتے ہیں۔ سید قطب نے یہاں یہ بات خوب فرمائی ہے کہ یہ اللہ سبحانہ کا بنایا ہوا نظام تربیت ہے جس کے ذریعے اسلام انسان کو انسان کی حیثیت میں لے کر چلتا ہے اور اسے ان بلند آفاق اور اعلیٰ مراتب تک لے جاتا ہے جہاں تک انسانیت کبھی نہیں پہنچ سکتی اور آئندہ بھی اس وقت تک نہیں پہنچ سکتی، جب تک اسلامی منہاج تربیت کو نہ اپنائے گی۔ اور اسلام کے ضابطہ حیات کو اپنی زندگی میں برپا اور اسلامی قانون زندگی اپنی سماجی اور شہری زندگی میں نافذ نہ کرے گی۔

سید رشید رضا فرماتے ہیں کہ آیت کی رہنمائی یہ ہے کہ یتیموں کے ساتھ تمہارے کسی معاملہ کا کوئی رُخ اللہ کے علم سے باہر نہیں ہے اور اس کی جزا سے اللہ سبحانہ بے خبر نہیں ہے۔ یہ انداز بیان یتیموں کے ساتھ حسن معاملگی کے لیے ایک ترغیب ہے۔ یتیموں کے ساتھ معاملہ کرنے کے تین درجے ہیں، ایک یہ کہ ان کے حقوق ہڑپ کر دیے جائیں یہ درجہ سب سے نچلا ہے اور حرام ہے دوسرے یہ کہ ان سے عادلانہ برتاؤ کیا جاتے اور ان پر کسی قسم کی زیادتی نہ کی جائے یہ قانونی درجہ واجبہ ہے تیسرے یہ کہ ان کے ساتھ اکرام کا معاملہ کیا جاتے ان کے اگر دو روپیہ واجب الادا ہیں تو ان کو تین روپے دیے جائیں یہ اخلاقی درجہ استحباب ہے۔

رشتہ نکاح کی خاطر ایثار

۱۹۲۔ اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے سرکشی یا کنارہ کشی کا اندیشہ ہو تو باہم صلح کرنے میں دونوں پر کوئی گناہ نہیں ہے اور صلح ہی بہتر ہے۔ یعنی اگر کوئی عورت خاوند کا دل اپنے سے پھرا دیکھے اور اس کو خوش اور متوجہ کرنے کے لیے اپنے مہر اور نفقہ وغیرہ میں سے کچھ چھوڑ کر اس کو راضی کرلے تو اس مصالحت میں کسی کے ذمہ کچھ گناہ نہیں ہے۔ زوجین میں مصالحت اور موافقت بہت ہی اچھی بات ہے البتہ بے وجہ عورت کو تنگ کرنا اور بلا رضا اس کے مال میں تصرف کرنا گناہ ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ مہر اور عدل تو ہر عورت کا ایک حق شرعی ہے لیکن کسی عورت کو اپنے شوہر کی طرف سے اگر یہ اندیشہ ہو کہ ان پابندیوں کا بوجھ اگر اس پر اس نے لادے رکھا تو وہ اسے چھوڑ دے گا یا اس سے بے پروائی برتنے گا تو اس میں کوئی حرج نہیں کہ دونوں مل کر باہم کوئی سمجھوتہ کرلیں، یعنی عورت اپنے حق مہر عدل اور نان و نفقہ کے معاملے میں ایسی رعایتیں شوہر کو دے دے کہ قطع تعلق کا اندیشہ رفع ہو جائے فرمایا کہ صلح ہی بہتر ہے اس لیے کہ میاں بیوی کا رشتہ ایک بار جڑ جانے کے بعد فریقین کا فائدہ اسی میں ہے کہ یہ قائم رہے خواہ اس کے لیے کتنا ہی ایثار کرنا پڑے [2]

دراصل یہاں سے اصل استفتا کا جواب شروع ہوتا ہے اس جواب کو سمجھنے کے لیے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن۔

ضروری ہے کہ پہلے سوال کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیا جائے۔ زمانۂ جاہلیت میں ایک شخص غیر محدود تعداد تک بیویاں کرنے کے لیے آزاد تھا۔ اور ان کثیر التعداد بیویوں کے لیے کچھ بھی حقوق مقرر نہ تھے۔ سورۂ نسآ کی ابتدائی آیات جب نازل ہوئیں تو اس آزادی پر دو قسم کی پابندیاں عائد ہو گئیں۔ ایک یہ کہ بیویوں کی تعداد زیادہ سے زیادہ چار تک محدود کر دی گئی۔ دوسرے یہ کہ ایک سے زیادہ بیویاں رکھنے کے لیے عدل کو شرط قرار دیا گیا۔ اب یہ سوال پیدا ہوا کہ اگر کسی شخص کی بیوی بانجھ ہے یادائم المرض ہے یا تعلق زن و شو کے قابل نہیں ہے اور شوہر دوسری بیوی بیاہ لاتا ہے تو کیا وہ مجبور ہے کہ دونوں کے ساتھ یکساں رغبت رکھے، یکساں محبت رکھے، جسمانی تعلق میں بھی یکساں برتے۔ اور اگر وہ ایسا نہ کرے تو کیا عدل کی شرط کا تقاضا یہ ہے کہ وہ دوسری شادی کرنے کے لیے پہلی بیوی کو چھوڑ دے۔ نیز یہ کہ اگر پہلی بیوی خود جدا نہ ہونا چاہے تو کیا زوجین میں اس قسم کا معاملہ ہو سکتا ہے کہ جو بیوی غیر مرغوب ہو چکی ہے وہ اپنے بعض حقوق سے خود دستبردار ہو کر شوہر کو طلاق سے باز رہنے پر راضی کرے۔ کیا ایسا کرنا عدل کی شرط کے خلاف تو نہ ہوگا۔ یہ سوالات ہیں جن کا جواب ان آیات میں دیا گیا ہے۔[1]

اخلاقی رذائل میں حرص و بخل کا مقام

۱۹۳ ۔ اور انسان کی طبیعت میں لالچ موجود ہے۔ یعنی اپنے نفع اور مال کی حرص اور بخیلی ہر ایک کے جی میں گھسی ہوئی ہے۔ سو نظر بر مصلحت اگر عورت مرد کو کچھ نفع پہنچائے گی تو مرد خوش ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ حرص و بخل انسان کی طبیعت ہے مرد اور عورت میں سے کوئی بھی اپنے حق اور نفع سے دستبردار نہیں ہونا چاہتا۔ ہر ایک اپنی اپنی جگہ لالچی اور کنجوس ہے کچھ نہ دینا اور سب کچھ لینا چاہتا ہے لیکن ہر شخص کو چاہیے کہ ان دونوں پر قابو رکھے اور دوسرے کے ساتھ اچھا سلوک کرے۔

عربی میں شح خود غرضی، کنجوسی، بخل، حرص اور تنگ دلی کے معنے میں آتا ہے۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ شح وہ بخل ہے جس میں حرص ہو اور عادت بن گیا ہو۔ اردو میں اس کے لیے خود غرضی کا لفظ موزوں ہے۔ یہ مصدر ہے اس کا فعل سمع۔ ضرب، نصر تینوں ابواب

[1] تفہیم القرآن۔

سے آتا ہے۔ قرآن نے اس اخلاق رذیلہ کی برائی کئی جگہ بیان کی ہے۔ خانگی زندگی کی ناگواری زیادہ تر اسی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ شوہر زیادہ دینا نہیں چاہتا اور بیوی زیادہ لینا چاہتی ہے۔ شوہروں کو اپنے مال سے محبت ہوتی ہے اس لیے زیادہ خرچ نہیں دیتے اور بیویاں لالچ سے زیادہ کی طلبگار ہوتی ہیں یا ایک شخص کے ایک سے زیادہ بیویاں ہوں تو ہر بیوی کو حرص ہوتی ہے کہ شوہر پر میرا زیادہ حق ہے اور شوہر کو اس بیوی کی حرص ہوتی ہے جس کو وہ چاہتا ہے۔ اس سے گھریلو زندگی میں کشمکش پیدا ہوتی ہے اور سارا گھر روحانی تکلیف میں رہتا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ باہم ایثار و احسان کا سلوک ہو اور ہر ایک دوسرے کے آرام کو اپنا آرام اور اس کی تکلیف کو اپنی تکلیف سمجھے۔ خود غرضی اور تنگدلی کو دونوں ارادے کی پوری قوت سے ختم کر دیں۔ عورت کی جانب سے خود غرضی یہ ہے کہ وہ اندر شوہر کے لیے بے رغبتی کے اسباب کو خود محسوس کرتی ہو اور پھر بھی وہ سلوک چاہے جو ایک مرغوب بیوی کے ساتھ ہی برتا جا سکتا ہے۔ مرد کی طرف سے خود غرضی یہ ہے کہ جو عورت دل سے اتر جانے پر بھی اس کے ساتھ ہی رہنا چاہتی ہو اس کو وہ حد سے زیادہ دبانے کی کوشش کرے اور اس کے حقوق ناقابل برداشت حد تک گھٹا دینا چاہے۔ اگر دونوں خود غرضی کو چھوڑ کر ایثار و احسان کا نمونہ بن جائیں تو پھر وہ گھر جو پہلے غم کدہ تھا عشرت کدہ بن جاتے۔ میاں بیوی کے ان ہی خانگی اختلافات کے سلسلے میں قرآن نے اس آیت میں رہنمائی کی ہے اور بتایا ہے کہ میاں بیوی دونوں شح چھوڑ دیں۔

احسان و تقویٰ اختیار کرو

۱۹۴۔ اور اگر تم حسن کار بن کر رہو اور محتاط ہو کر زندگی گزارو گے تو پھر تم جو کچھ کرتے ہو اللہ کو اس کی پوری پوری خبر ہے۔ یعنی اگر عورتوں کے ساتھ نیک سلوک کرو گے اور بدسلوکی اور لڑائی سے بچ کر رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہاری سب باتوں سے باخبر ہے۔ اس نیکی کا ثواب ضرور عنایت کرے گا۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں نہ اعراض اور ناخوشی کی نوبت آئے گی اور نہ راضی کرنے اور اپنے کسی حق کو چھوڑنے کی ضرورت ہو گی[1] اس فقرے میں پھر اللہ سبحانہٗ نے مردہی کے جذبہ فیاضی سے اپیل کی ہے جس طرح بالعموم ایسے معاملات میں اس کا قاعدہ ہے

[1] افادات شیخ الاسلام۔

اس نے مرد کو ترغیب دی ہے کہ وہ بے رغبتی کے باوجود اس عورت کے ساتھ احسان سے پیش آئے جو برسوں اس کی رفیق زندگی رہی ہے اور اس خدا سے ڈرے جو اگر کسی انسان کی خامیوں کے سبب سے اپنی نظر التفات اس سے پھیرے اور اس کے نصیب میں کمی کرنے پر اتر آئے تو پھر دنیا میں اس کا کوئی ٹھکانا نہیں۔[1] گویا ان الفاظ سے مرد کو ابھارا ہے کہ ایثار و قربانی اور احسان و تقویٰ کا مقام اعلیٰ مرد ہی کے شایان شان ہے وہ اپنی فتوت اور مردانگی کی لاج رکھے اور عورت کے سامنے ہاتھ پھیلانے والا بننے کے بجائے اس کو دینے والا بنے۔ اور مفتی احمد یار خاں صاحب کے الفاظ میں اس فقرے کا لب لباب یہ ہے کہ:

اے خاوندو! اگر تم اس کے باوجود کہ تم کو اپنی موجودہ بیوی ناپسند ہو، پھر بھی اس سے اچھی طرح نبھا دو اور یہ سمجھو کہ عورت تمہارے پاس اللہ کی امانت ہے تو ہم بھی تم پر فضل و کرم فرمائیں گے۔[2]

عام شارحین قرآن نے اس آیت کا روئے سخن شوہروں کی طرف بتایا ہے لیکن قاضی ثناءاللہ پانی پتی اور سید رشید رضا کا میلان اس طرف ہے کہ آیت میں مردوں اور عورتوں دونوں سے خطاب ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر میاں بیوی دونوں احسان و تقویٰ کی راہ اختیار کریں تو اللہ تعالیٰ ان کو اجر عطا فرمائے گا۔

بیویوں کے درمیان عدل کا معیار

۱۹۵- اور تم اپنی جانب سے خواہ کتنی خواہش کرو کہ عورتوں میں عدل کرو لیکن پورا عدل کرنا تمہارے بس سے باہر ہے۔ بس ایسا نہ ہو کہ کسی ایک کی طرف تمہارا میلان ہو اور دوسری کو چھوڑ دو گویا معلقہ ہے۔ یعنی اگر کئی عورتیں نکاح میں ہوں تو یہ تو تم سے نہ ہو سکے گا کہ محبت قلبی اور ہر ہر امر میں بالکل مساوات اور برابری ہو مگر ایسا ظلم بھی نہ کرو کہ ایک طرف تو بالکل جھک جاؤ، اور دوسری کو درمیان میں لٹکتی رکھو، نہ خود ہی آرام سے رکھو نہ بالکل علیحدہ ہی کرو جو دوسرے سے نکاح کر سکے۔[3] اس آیت میں عدل کا مفہوم بتایا ہے اور سمجھایا ہے کہ ایک سے زیادہ بیوی کرنے کی صورت میں تم سے جو عدل کا مطالبہ کیا گیا ہے تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمہاری

---

[1] تفہیم القرآن [2] نور العرفان [3] افادات شیخ الاسلام

طبیعت کا قدرتی میلان بھی سب کے ساتھ یکساں رہے، کیونکہ ایسا کرنا تمہاری طاقت سے باہر ہے مقصود یہ ہے کہ جتنی باتیں تمہارے اختیار میں ہیں ان میں سب کے ساتھ یکساں سلوک کرو اور کسی ایک ہی طرف جھک نہ پڑو۔ مثلاً سب کو ایک طرح کا مکان دو، ایک طرح کا لباس پہناؤ، ایک ہی طرح کھانے پینے کا انتظام کرو، ایک ہی طرح باری رہو سہرا اور شب باش ہو۔ مطلب یہ ہے کہ آدمی تمام حالات میں تمام حیثیتوں سے دو یا زائد بیویوں کے درمیان مساوات نہیں برت سکتا، ایک خوبصورت ہے دوسری بدصورت، ایک جوان ہے دوسری بوڑھی، ایک دائم المرض ہے اور دوسری صحت مند، ایک بدمزاج ہے اور دوسری خوش مزاج اور اسی طرح دوسرے تفاوت بھی ممکن ہیں جن کی وجہ سے ایک بیوی کی طرف طبعاً میلان کم اور دوسری کی طرف زیادہ ہو سکتا ہے ایسے حالات میں قانون یہ مطالبہ نہیں کرتا ہے کہ محبت و رغبت اور جسمانی تعلقات میں ضروری دونوں کے درمیان مساوات رکھی جائے بلکہ صرف یہ مطالبہ کرتا ہے کہ جب تم بے رغبتی کے باوجود ایک عورت کو طلاق نہیں دیتے اور اس کو اپنی خواہش یا خود اس کی خواہش کی بنا پر بیوی بنائے رکھتے ہو تو اس سے کم از کم اس حد تک تعلق ضرور رکھو کہ وہ عملاً بے شوہر ہو کر نہ رہ جائے ایسے حالات میں ایک بیوی کی بہ نسبت دوسری کی طرف میلان زیادہ ہونا تو فطری بات ہے لیکن ایسا بھی نہ ہونا چاہیے کہ دوسری یوں معلق ہو جائے گویا کہ اس کا کوئی شوہر نہیں ہے۔

اس آیت سے بعض لوگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قرآن ایک طرف عدل کی شرط کے ساتھ تعدد ازدواج کی اجازت دیتا ہے اور دوسری طرف عدل کو ناممکن قرار دے کر اس اجازت کو منسوخ کر دیتا ہے لیکن درحقیقت ایسا نتیجہ نکالنے کے لیے اس آیت میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر صرف اتنا ہی کہنے پر اکتفا کیا گیا ہوتا کہ "تم عورتوں کے درمیان عدل نہیں کر سکتے" تو یہ نتیجہ نکالا جا سکتا تھا، مگر اس کے بعد ہی جو یہ فرمایا گیا ہے کہ لہٰذا ایک بیوی کی طرف بالکل نہ جھک پڑو۔ اس فقرے نے کوئی موقع اس مطلب کے لیے باقی نہیں چھوڑا جو مسیحی یورپ کی تقلید کرنے والے حضرات اس سے نکالنا چاہتے ہیں۔

ازدواجی زندگی میں اصلاح و تقویٰ

۱۲۹ - اور اگر اصلاح کر لو اور متقیانہ سیرت اختیار کر لو تو اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی اگر اصلاح اور مصالحت کا معاملہ کرو گے اور تعدی و حق تلفی سے تا بقدر بچتے رہو گے تو اس کے بعد

اللہ معاف فرمانے والا ہے۔[1]

ارشاد میں دو لفظ آتے ہیں اصلاح اور اتقاء۔ اصلاح کا تعلق ماضی سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ اگر اپنی پچھلی بدعنوانیوں کی اصلاح ضابطہ الٰہی کے مطابق کر لوگے اور اتقاء کا تعلق حال اور مستقبل سے ہے یعنی اگر اب اور آئندہ محتاط ہو کر رہو گے تو خانگی زندگی میں اللہ کی شان مغفرت اور شان رحمت کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کر لوگے۔ سید رشید رضا نے یہاں یہ بات بہت اچھی لکھی ہے کہ اگر تم اپنی بیویوں سے معاملہ کرنے میں اصلاحی پہلو اپناؤ گے اور اختیاری معاملات میں ان پر ظلم و زیادتی سے بچ کر رہو گے تو اللہ تعالیٰ غیر اختیاری معاملات میں تمہاری کوتاہیوں سے درگزر فرمادے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر حتی الامکان تم قصداً ظلم نہ کرو اور انصاف ہی سے کام لینے کی کوشش کرتے رہو تو فطری مجبوریوں کی بنا پر جو تھوڑی بہت کوتاہیاں تم سے انصاف کے معاملہ میں صادر ہوں گی اللہ انہیں معاف فرمادے گا۔

ناگزیر حالات میں جدائی

۱۹۷۔ اور اگر میاں بیوی جدا ہو جاویں تو اللہ ہر ایک کو اپنی کشائش سے بے پروا کر دے گا اور اللہ بڑی وسعت والا اور حکمت والا ہے۔ یعنی اگر زوجین جدائی ہی کو پسند کریں اور طلاق کی نوبت آجائے تو کچھ حرج نہیں ہے اللہ تعالیٰ ہر ایک کا کارساز ہے اور سب کی حاجات پوری کرنے والا ہے۔ اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ بیوی کو راحت سے رکھے اور ایذا نہ دے اور اس پر قادر نہ ہو تو پھر طلاق دے دینا مناسب ہے۔[2]

قانون میں مطالبہ تو یہی ہے کہ ازدواجی رشتہ ٹوٹنے نہ پائے لیکن حالات اگر مجبور کر دیتے ہیں اور دونوں میں علیحدگی ہو ہی جاتی ہے تو بہر حال اصل رازق اور کارساز اللہ سبحانہ ہے وہ ہر ایک کو اپنے فضل سے مستغنی کر دے گا۔ مطلب یہ ہے کہ اس رشتہ کو قائم رکھنے کے لیے میاں بیوی دونوں سے ایثار اور کوشش تو مطلوب ہے لیکن یہ غیرت اور خودداری کی حفاظت کے ساتھ مطلوب ہے میاں بیوی میں سے جس طرح کسی کے لیے اکڑنا جائز نہیں ہے اسی طرح ایک حد خاص سے زیادہ دبنا جائز نہیں ہے۔ اگرچہ الفاظ میں عمومیت ہے لیکن سیاق کلام دلیل ہے کہ اس میں عورتوں کی

---

[1][2] افادات شیخ الاسلام

خاص طور پر حوصلہ افزائی ہے۔ کہ وہ حتی الامکان نباہنے کی کوشش کریں اور مصالحت کے لیے ایثار بھی کریں لیکن یہ حوصلہ رکھیں کہ اگر کوشش کے باوجود نباہ کی صورت پیدا نہ ہوئی ہو تو رازق اللہ تعالیٰ ہے وہ اپنے خزانہ جود سے ان کو مستغنی کر دے گا۔[1]

گویا اس ارشاد کے ذریعے میاں بیوی کو تسلی دی ہے کہ اگر اصلاحی کوششیں ناکام ہو جائیں اور بالآخر جدا ہونا ہی پڑے تو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ ہر ایک کو دوسرے سے مستغنی کر دے گا۔ عورت کے لیے کوئی دوسرا ٹھکانا اور کفالت کا دوسرا ذریعہ اور مرد کے لیے دوسری بیوی مل جائے گی۔ اللہ کی قدرت بے حد وسیع ہے۔ اس سے مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے ان میں سے ہر ایک نکاح سے پہلی زندگی پر ایک نگاہ ڈالے کہ باہم ایک دوسرے سے واقفیت نہ تھی۔ اللہ نے دونوں میں تعلق پیدا کر دیا تھا۔ اب بھی وہ اس پر قادر ہے کہ پھر ایسی صورت پیدا کر دے۔[2]

مفتی احمد یار خاں نے اس آیت سے یہ لطیف استنباط فرمایا ہے کہ ،

> اس سے معلوم ہوا کہ کبھی عورت کو طلاق دے دینا کشائش رزق کا سبب بن جاتا ہے۔ مرد و عورت دونوں کے لیے۔ جیسے کبھی نکاح وسعت رزق کا ذریعہ ہے۔ یہ بھی معلوم ہوا کہ نہ عورت بالکل مرد کی محتاج ہے اور نہ مرد بالکل عورت کا حاجتمند سب رب کے حاجت مند ہیں ، ایک کا دوسرے کے بغیر کام چل سکتا ہے۔[3]

گویا سمجھا دیا گیا ہے کہ تم اس بھلاوے میں کبھی نہ رہنا کہ کسی کی قسمت کا بنانا اور بگاڑنا تمہارے ہاتھ میں ہے۔ اگر تم اس سے دست کش ہو جاؤ گے تو اس کا کوئی ٹھکانا نہ رہے گا، نہیں تو تمہاری اور اس کی سب کی قسمتوں کا مالک اللہ ہے اور اللہ کے پاس اپنے کسی بندے یا بندی کی مدد کا تم ایک ہی ذریعہ نہیں ، اس مالک آسمان و زمین کے ذرائع بے حد وسیع ہیں اور وہ اپنے ذرائع سے کام لینے کی حکمت بھی رکھتا ہے۔[4]

---

[1] تدبر قرآن [2] معارف م ش [3] کنز الایمان [4] تفہیم القرآن

وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَلَقَدْ وَصَّيْنَا الَّذِيْنَ
اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَاِيَّاكُمْ اَنِ اتَّقُوا اللّٰهَ ۭ وَاِنْ تَكْفُرُوْا
فَاِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ غَنِيًّا
حَمِيْدًا ۝ وَلِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ وَكَفٰى
بِاللّٰهِ وَكِيْلًا ۝ اِنْ يَّشَاْ يُذْهِبْكُمْ اَيُّهَا النَّاسُ وَيَاْتِ
بِاٰخَرِيْنَ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَلٰي ذٰلِكَ قَدِيْرًا ۝ مَنْ كَانَ يُرِيْدُ
ثَوَابَ الدُّنْيَا فَعِنْدَ اللّٰهِ ثَوَابُ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ۭ وَ
كَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًۢا بَصِيْرًا ۝ ع ١٩ ١٦

اور مسلمانو! یاد رکھو آسمانوں میں اور زمین میں جو کچھ ہے سب
اللہ ہی کے لیے ہے۔ ہم نے یقیناً ان لوگوں کو جن کو تم
سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور خود تم کو بھی یہ حکم دیا کہ اللہ کی
نافرمانی کے نتائج سے ڈرو اور اگر نہ مانو گے تو پھر یقین کرو

کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے وہ بے نیاز ہے اور ستودہ صفات ہے[199]۔ اور بے شک اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے اور کارسازی کے لیے اللہ ہی کافی ہے[200]۔ لوگو! اگر وہ چاہے تو تمہیں ہٹا دے اور تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے وہ بلاشبہ ایسا کرنے پر قادر ہے[201]۔ جو شخص دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے پاس دنیا و آخرت کا دونوں کا ثواب ہے[202]۔ اور اللہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے[203]۔

احکامِ حق کی تعمیل اور استقامت و اخلاص

بیان احکام کے بعد ان آیات میں تذکیر و موعظت کے پہلو پر زور دیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اصل چیز حق کی پا بجائی اور استقامت و اخلاص ہے۔ بالعموم قانونی احکام بیان کر دینے کے بعد اور بالخصوص تمدن و معاشرت کے ان پہلوؤں کی اصلاح پر زور دینے کے بعد جن میں انسان اکثر ظلم کا ارتکاب کرتا رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس قسم کے پر اثر جملوں میں ایک مختصر وعظ ضرور

فرمایا کرتا ہے اور اس سے مقصود یہ ہوتا ہے کہ نفوس کو ان احکام کی پابندی پر آمادہ کیا جائے۔ اس سے پہلے چونکہ عورتوں اور یتیم بچوں کے ساتھ انصاف اور حسن سلوک کی ہدایت کی گئی ہے لہٰذا اس کے بعد ضروری سمجھا گیا کہ اہل ایمان کی حس ایمانی کو قانون کی پاسداری کے لیے بیدار کیا جائے۔ اور بتایا جائے کہ جب تک ضمیر میں بیداری نہ ہو گی اور قانون کے لیے مخلصانہ طاعت کا جذبہ نہ ہو گا محض قانون کا ڈھانچہ اصلاح حال کا ضامن نہیں ہے اور اسی سلسلے میں اس اجتماعی قانون کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اصل چیز تقویٰ ہے۔ اور اس میں مسلمان اور پہلی امتیں اللہ کی یکساں مخاطب ہیں۔ جس قدر حق کی مخلصانہ طاعت کا جذبہ اور قانون کی نافرمانی سے بچنے کا جوش ہو گا اس قدر کامیابی سے ہم دوش ہو گا۔

۱۹۸ - اور مسلمانو! یاد رکھو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ قوانین بیان فرمانے کے بعد قرآن نے یہاں مملکت اور اس کی اساس و بنیاد کے متعلق قرآنی نظریہ پیش کیا ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو مملکتی زندگی ہو یا تمدنی زندگی ہر شعبہ حیات میں بنیادی نظریات اور اساسی اصولوں کا ماخذ انسان کے وہ تصورات ہیں جو وہ خود اپنی ذات اپنے آغاز و انجام اور کائنات خلقت سے اپنے تعلق کی نسبت قائم کرتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر بالآخر دیگر نظریات و تصورات قائم ہوتے ہیں۔ کیونکہ انسان اپنی تقدیر اپنے مرتبہ اور کائنات سے اپنے تعلق کی بابت جو تصور تعمیر کرے گا وہی اس کے جملہ اعمال و افکار کی تشکیل پر موثر ہو گا۔ بالفاظ دیگر خدا کا تصور ہی وہ مرکزی نقطہ ہے جس سے اعمال و افکار کی تمام شاخیں پھوٹتی ہیں کسی جماعت کے سیاسی اور عمرانی نظریات و عقائد کی حقیقت معلوم کرنی ہو تو سب سے پہلے اس بات پر غور کرنا چاہیے کہ اس کے افراد اپنی تقدیر اپنی ابتداء و انتہا اور کائنات سے اپنے تعلق کی نسبت بالفاظ دیگر ذات ایزدی کے متعلق کیا تصور رکھتے ہیں کیونکہ خدا کے تصور میں یہ جملہ تصورات شامل ہیں۔ خدا کا تصور بیک وقت انسان کے آغاز و انجام اور اس کی تقدیر کا تصور بھی ہے اور یہی تصور اس کے مرتبہ اور حیثیت اور کائنات سے اس کے تعلق کو بھی معین کرتا ہے۔

اس اعتبار سے قرآن کی اس آیت پر غور کیجئے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ قرآن کے نقطہ نظر سے سارا ملک اور اقتدار اللہ کے لیے ہے۔ انسان کی حیثیت یہاں مالک کی نہیں مملوک کی ہے۔ یہ بات ان آیات میں تین بار دہرائی گئی ہے اس طرح یہ یاد دہانی کی گئی ہے کہ انسان یہاں آزاد خود مختار کی حیثیت لے کر نہیں آیا بلکہ اس لیے آیا ہے کہ مملوک ہونے کی حیثیت میں مالک کی مرضی کو خود اپنی

زندگی اور اس کے معاملات میں نافذ کرے اور دوسروں کو بھی مالک کی مرضی پر چلانے کی کوشش کرے

سب کے لیے حکم میں یکسانی

۱۹۹۔ ہم نے یقیناً ان لوگوں کو جن کو تم سے پہلے کتاب دی گئی تھی اور خود تم کو یہ حکم دیا ہے کہ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور اگر نہ مانو گے تو پھر یقین کرو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے وہ بے نیاز ستودہ صفات ہے۔ اوپر سے ترغیب و ترہیب کا ذکر چلا آرہا تھا یعنی حکم خداوندی کی اطاعت کرنا اور اس کی مخالفت سے بچنا سب کے لیے ضروری ہے۔ اس کے ہوتے ہوئے کسی کی بات کی طرف دھیان رکھنا ہرگز جائز نہیں ہے۔ ان دونوں آیتوں کا خلاصہ یہ ہے کہ تم کو اور تم سے پہلوں کو سب کو یہ حکم سنایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو اور اس کی نافرمانی نہ کرو تو ثواب اگر کوئی رب کے حکم کو نہ مانے گا تو اسے پروا نہیں وہ سب چیزوں کا مالک ہے۔ اپنا ہی کچھ بگاڑے گا اس کا کچھ نقصان نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہیں اور تمہاری طرح پچھلی تمام امتوں کو ہمیشہ یہی ہدایت کی جاتی رہی ہے کہ خدا ترسی کے کام کرو۔ اس کی ہدایت کی پیروی میں تمہاری اپنی فلاح ہے۔ خدا کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ اگر تم اس کی خلاف ورزی کرو گے تو پچھلی تمام امتوں نے اس کی نافرمانیاں کر کے خدا کا کیا بگاڑا ہے جو تم بگاڑ سکو گے۔ اس فرمانروائے کائنات کو نہ پہلے کسی کی پروا تھی نہ اب تمہاری پرواہ ہے۔ وہ چونکہ پوری کائنات کا مالک ہے۔ اس وجہ سے اس نے تم سے پہلے اہل کتاب کو بھی اپنے احکام و حدود سے آگاہ کر دیا اور اب تمہیں بھی اس سے آگاہ کر دیا۔ اہل کتاب نے نافرمانی کی تو انہوں نے خود اپنی شامت بلائی، خدا کا کچھ نہیں بگاڑا اسی طرح اگر تم بھی کفر کرو گے تو یاد رکھو کہ خدا تمہارا محتاج نہیں ہے بلکہ بے نیاز ستودہ صفات ہے وہ تمہارے لیے کسی چیز کو پسند کرتا ہے تو اس لیے نہیں کہ اس کو اس کی احتیاج ہے بلکہ اس لیے کہ وہ حمید ہے۔ اس کی اس صفت کا تقاضا ہے کہ بے نیاز ہونے کے باوجود ساری مخلوق کو اپنے جود و کرم سے نوازے۔ وہ بالذات محمود ہے اسے اپنی ذات کی تکمیل کی خاطر نہ تمہارے شکر کی ضرورت ہے اور نہ اپنے محمود ہونے کے لیے تمہاری حمد کا محتاج ہے۔ ابوذر کی طویل حدیث میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ سبحانہ کے حوالہ سے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے:

تم سب محتاج ہو مگر وہ جسے میں بے نیاز کر دوں تم مجھ سے مانگو میں تمہیں

بے نیاز کر دوں گا اگر تمہارے اگلے پچھلے، انسان، جن، چھوٹے بڑے مرد و عورت، زندہ مردہ، تر اور خشک سب مل کر میرے بندوں میں سب سے زیادہ شقی القلب بندہ کی طرح ہو جائیں تو میری سلطنت میں مچھر کے پر کے برابر بھی کوئی کمی نہیں آسکتی اور اگر سب کا دل متقی ہے متقی انسان کی طرح ہو جائے تو میری سلطنت میں ایک مچھر کے پر کی برابر زیادتی نہیں ہو سکتی۔
یہ ایک طویل حدیث کا ٹکڑا ہے جو صحیح مسلم، مسند احمد اور سنن ترمذی میں آتی ہے۔

اللہ کی ذات کمالات کا مرکز ہے

۲۰۰۔ اور اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے اور کارسازی اللہ ہی کے لیے ہے یعنی اگر اللہ کی فرمانبرداری کرو گے تو سمجھ لو کہ وہ تمام چیزوں کا مالک ہے۔ تمہارے سارے کام بنا سکتا ہے۔ "تین دفعہ فرمایا کہ اللہ کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے۔ اوّل سے کشائش اور وسعت مقصود ہے کہ اس کے یہاں کسی چیز کی کمی نہیں ہے، دوسری سے بے پروائی اور بے نیازی کا بیان مقصود ہے کہ اس کو کسی کی پروا نہیں ہے اگر نافرمان ہو جاؤ، تیسری دفعہ میں رحمت اور کارسازی کا اظہار ہے بشرطیکہ تقویٰ اختیار کرو۔ [1]

دراصل ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی اس معنے کر کے سب سے زیادہ مکمل ہے کہ وہ کائنات کا مالک ہے اور اس پر پورا اختیار رکھتا ہے اور کائنات پوری کی پوری اس کی محکوم ہے اور اس کے باوجود اس میں غنائے مطلق ہے اس فرمانروائے کائنات کو نہ پہلے کسی کی پروا ہے اور نہ اب کسی کی، وہ سرتاسر محمود ہے جلال و جمال اور حسن و کمال کا کوئی گوشہ نہیں جو موجود نہ ہو۔ اور پھر ان بے پروائیوں اور کمالوں کے ساتھ سب کا کارساز ہے۔

جس طرح قرآن نے جابجا خلقت اور ربوبیت سے استدلال کیا ہے۔ یعنی دنیا میں ہر چیز خدا کی مخلوق اور مربوب ہے اس لیے ضروری ہے کہ کوئی خالق بھی ہو رب بھی ہو، اسی سے وہ ملوکیت سے بھی استدلال کرتا ہے یعنی اس کائنات میں اس حسن و جمال کے ساتھ جو کچھ موجود ہے وہ سب مملوک ہے اس لیے ضروری ہے کہ کوئی مالک بھی ہو اور کائنات میں اللہ کی ملکیت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کامل اور بے داغ ہے اس لیے ضروری ہے کہ مالک میں اس درجہ حسن و کمال ہو کہ کائنات کی ہر چیز اس کی ستائش کے ترانے گائے۔

قانونِ استبدال اقوام

۱۰۲۔ لوگو! اگر اللہ چاہے تو تمہیں ہٹا دے اور تمہاری جگہ دوسروں کو لے آئے وہ بلاشبہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ اس پر قادر ہے کہ تم سب کو فنا کر دے اور دنیا سے اٹھا لے اور دوسرے لوگ مطیع و فرمانبردار پیدا کر دے۔ اس سے بھی حق تعالیٰ کا استغنا اور بے نیازی ظاہر ہو گئی اور نافرمانوں کو پوری تہدید و تخویف ہو گئی۔ [1] مطلب یہ ہے کہ اگر اس کے حکم سے تم انحراف کرو گے تو وہ تم کو ہٹا کر کسی دوسری قوم کو سر بلند کر دے گا۔ اور تمہارے ہٹ جانے سے اس کی سلطنت کی رونق میں کوئی فرق نہ آئے گا۔ فرمایا کیا تم اللہ کی شانِ مالکیت اور استغنا پر غور نہیں کرتے ہو، یعنی اس بات پر غور نہیں کہ کائنات کی ہر چیز اللہ کی ملک ہے اور ہر چیز اپنے وجود و بقا میں اللہ کی محتاج ہے اور ہر چیز اپنی خلقت میں کسی خاص مقصد و مصلحت کے لیے بنائی گئی ہے۔ ایسا نہیں ہے کہ بغیر کسی سوچے ہوئے مقصد کے اور ٹھہرائی ہوئی مصلحت کے ویسے ہی ظہور میں آ گئی ہو۔ پھر اگر تم دیکھ رہے ہو کہ آسمان و زمین کی ہر چیز اس کی ملک ہے اور اپنی ملکیت میں مالک ہی کی کارسازی کا کام کر رہی ہے تو کیوں کر ممکن ہے کہ تمہارے وجود میں کوئی خاص مصلحت پوشیدہ نہ ہو اور اللہ نے تمہیں ویسے ہی تمام مخلوقات میں سے چن لیا ہو۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں چھانٹ دے اور ایک نئی قوم کی تخلیق کا سامان کر دے۔ کیونکہ اس کا ٹھہرایا ہوا قانون یہی ہے کہ جو جماعت غیر نافع ہو جائے اسے مٹ جانا چاہیے اور اس کی جگہ نافع و صالح جماعت کو ظہور میں آنا چاہیے وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

تاریخ کا مطالعہ کرو تو اس اذہاب اور اتیان بآخرین کے مناظر تمہارے سامنے آ جائیں گے اور قرآن پر تدبر کرو تو اس کے سنن و نوامیس واضح ہو جائیں گے۔ حکمتِ الٰہی نے افراد کی طرح قوموں کی زندگی کے لیے بھی ایک خاص نظام مقرر کیا ہے اور اسی کے مطابق ایک قوم کی جگہ دوسری قوم سے اور ایک جماعت کی زندگی دوسری جماعت کی زندگی سے ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ قرآن نے اس

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ارشاد ہیں بتایا ہے کہ افراد کے نظامِ حیات کی طرح جماعتوں اور قوموں کا نظامِ حیات بھی جدوجہد سعی و طلب اور فکر و عمل کی صلاحیت کا نظام ہے اور یہاں بھی بقاء انفع کا قانون کام کر رہا ہے یعنی وہ قوم کشمکش حیات میں باقی رہتی ہے جو دُنیا کے لیے انفع ہو، جو انفع نہیں چھانٹ دی جاتی ہے لہٰذا جو قوم اس قانون فطرت کے مطابق اپنے زندگی و بقاء کا اہل ثابت نہیں کرے گی، ضروری ہے کہ اس کی جگہ کسی دوسری جماعت کو مل جاتے یہی آتیان لقوم آخرین ہے ۔

دُنیا و آخرت کی فلاح کی ضمانت

۲۰۲ ۔ جو شخص دنیا کا ثواب چاہتا ہے تو اسے معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کے پاس دُنیا و آخرت دونوں کا ثواب ہے ۔ یعنی اگر اس کی تابعداری کرو تو تم کو دُنیا بھی دے اور آخرت بھی، پھر صرف دُنیا کے پیچھے لڑنا اور اس کی نافرمانی کر کے آخرت سے محروم رہنا بڑی نادانی ہے لے مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ، کے پاس دُنیا کے فائدے بھی ہیں اور آخرت کے فائدے بھی، پائدار اور دائمی فائدے عارضی اور وقتی فائدے بھی، اب یہ تمہارے اپنے ظرف اور حوصلے اور ہمت کی بات ہے کہ تم اس سے کس قسم کے فائدے چاہتے ہو، اگر تم محض دُنیا کے چند روزہ فائدے ہی چاہتے ہو اور ان کی خاطر ابدی زندگی کے فائدوں کو قربان کر دینے کے لیے تیار ہو تو خدا بھی کچھ تم کو یہیں اور ابھی دے دے گا مگر پھر آخرت کے ابدی فائدوں میں تمہارا کوئی حصّہ نہیں رہے گا۔ دریا تو تمہاری کھیتی کو ابد تک سیراب کرنے کے لیے تیار ہے مگر یہ تمہارے اپنے ظرف کی تنگی اور حوصلہ کی پستی ہے کہ صرف ایک فصل کی سیرابی کو ابدی خشک سالی کی قیمت پر خریدتے ہو، کچھ ظرف میں وسعت ہو تو اطاعت و بندگی کا وہ راستہ اختیار کرو جس سے دنیا اور آخرت دونوں کے فائدے تمہارے حصّہ میں آئیں ۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ قرآن دُنیا کو انسان کی دینی زندگی کے لیے قابلِ اجتناب نہیں سمجھتا بالفاظِ دیگر قرآن نے اپنے ماننے والوں کو یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ مسائلِ زندگی سے کنارہ کش ہو کر اس دنیا کو چھوڑ دیں اور اللہ کو پا لینے کے لیے گوشۂ تنہائی میں بیٹھ جائے کی وہ روش اختیار کر لیں جسے رہبانیت کہا گیا۔ اس کے برعکس قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان مسائلِ حیات سے پوری طرح متعلق

لے افاداتِ شیخ الاسلام

رہے متاہل اور متمدن زندگی گزارے - اپنی ایک ایک فطری قوت کو زندہ و کارفرما رکھے، اپنے جبلی مطالبات کو مناسب حدود کے اندر پورا کرتا رہے۔ غرض آبادی سے جنگلوں کی طرف نہیں بلکہ جنگلوں سے آبادی کی طرف آئے اور یہ سب کچھ دینداری کا کام اور دین کا مطالبہ سمجھ کر کرے۔ قرآن نے اسی کے لیے یہ دعا بتائی ہے ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاخرۃ حسنۃ اور اسی کا قرآن نے وعدہ کیا ہے فَاٰتٰهُمُ اللّٰهُ ثواب الدنیا وحسن ثواب الاخرۃ -

اللہ کی ذات باخبر ہے

۲۰۳ - اور اللہ سب کچھ سننے والا اور دیکھنے والا ہے - یعنی اللہ تمہارے سب کام دیکھ رہا ہے اور سب باتیں سنتا ہے جس کے طالب ہوگے وہی کچھ ملے گا[1] مطلب یہ ہے کہ انسان زندگی کے سارے اعمال اور ساری گفتار کے وقت یہ بات دھیان میں رکھے کہ اللہ سبحانہ سن رہا ہے اور دیکھ رہا ہے۔ یہ بات نہیں کہ اس سے چھپ کر ہم کچھ کریں یا کہیں اور اسے کچھ خبر نہ ہو۔ یہ دھیان ہی انسان کی زندگی میں تزکیہ کا سامان ہے اور اسے عدل و فضل سے ہمدوش کرتا ہے اس سے ایک طرف انسان کی دنیوی زندگی میں استقامت آتی ہے اور دوسری طرف انسان میں آخرت کی زندگی کے لیے صلاحیت پیدا ہوتی ہے۔ مقصد یہ ہے کہ نافرمانی اور بدعملی سے بچو اور راہ حق میں استقامت و اخلاص کو اپناؤ کیونکہ اللہ کی ذات سمیع و بصیر ہے وہ پوری باخبری کے ساتھ اس کائنات پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ ہر ایک کی ظرف اور حوصلے پر اس کی نگاہ ہے -

---

[1] افادات شیخ الاسلام

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلَّهِ وَلَوْ
عَلَىٰ أَنفُسِكُمْ أَوِ الْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ ۚ إِن يَكُنْ غَنِيًّا أَوْ فَقِيرًا
فَاللَّهُ أَوْلَىٰ بِهِمَا ۖ فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوَىٰ أَن تَعْدِلُوا ۚ وَإِن تَلْوُوا
أَوْ تُعْرِضُوا فَإِنَّ اللَّهَ كَانَ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرًا ﴿١٣٥﴾

اے اہل ایمان! تم انصاف پر خوب قائم ہونے والے اللہ کی خاطر گواہی دیتے ہوئے ہو جاؤ خواہ تمہیں یہ گواہی خود اپنے خلاف، اپنے والدین کے خلاف، اپنے رشتہ داروں کے خلاف دینی پڑے۔[٢٠٤] اگر کوئی مالدار یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش کے پیچھے پڑ کر عدل و انصاف کو ہاتھ سے نہ دو۔[٢٠٥] اور اگر بات کو لپیٹ کر کہو گے یا صاف گوئی سے روگردانی کرو گے تو یاد رکھو اللہ تمہارے کردار سے خوب باخبر ہے۔[٢٠٦]

انسان اور راست بازی

اس سے پہلے معاشرتی زندگی کے سلسلہ میں خانگی زندگی میں افراد کو انصاف برتنے کی ہدایت کی تھی اب اس آیت میں اجتماعی زندگی میں انصاف برتنے اور راستی بازی اختیار کرنے کی تلقین کی گئی ہے۔ قسط کا مفہوم وہی ہے جو ہم عام بول چال میں حق، عدل، انصاف، راست بازی وغیرہ الفاظ سے ادا کرتے ہیں۔

انسان کے لیے ایک اہم مرحلہ یہ ہے کہ وہ ہر حال میں سچ پر قائم و استوار رہے، انصاف قائم کرنے اور سچی گواہی دینے میں ذرا بھی پس و پیش نہ کرے۔ اگرچہ سچ بولنے سے خود اسے، اس کے والدین اور قرابت داروں کو نقصان پہنچے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مالدار کے مال کا لالچ یا اثر و رسوخ کا خوف سچ کہنے سے نہیں باز رکھے یا کوئی مفلس ہو جس کی مفلسی پر ترس کھا کر تھوڑی سی غلط بیانی گوارا کر لی جائے۔ ارشاد ہو رہا ہے کہ کوئی مالدار ہو یا غریب، اللہ تعالیٰ کی مہربانی ان کے لیے گواہی دینے سے کہیں زیادہ سود مند اور نفع بخش ہو گی۔ غرض انصاف کے معاملے میں ہوائے نفس کی پیروی ہرگز نہ کرنی چاہیے۔ یہ بھی نہیں کہ بیان میں ہیرا پھیری کا طریقہ اختیار کیا جائے یا گواہی نہ دینے سے گریز کو پناہ گاہ بنا لیا جائے۔ اس طرح انسانوں کو چکما دیا جا سکتا ہے لیکن اللہ تعالیٰ تو دلوں اور نیتوں کے بھید بھی جانتا ہے۔

جو لوگ اپنے خلاف یا اپنے انتہائی رشتہ داروں کے خلاف بھی سچ کہتے ہوئے نہ جھجکیں وہ مخلوق کی بھلائی اور بہبود کے لیے جو گراں بہا کام انجام دے سکتے ہیں۔ ان کی توقع ایسے لوگوں سے کیوں کر رکھی جا سکتی ہے جو ایک لفظ زبان سے نکالتے وقت دس مرتبہ سوچتے ہیں کہ اس سے ہماری موافقتوں پر تو زد نہ پڑے گی اور ہمارے مخالف تو فائدہ نہ اٹھا لیں گے۔ اس کا نام ان کے ہاں سیاست دانی اور تدبر ہے۔ امنِ عالم کے ضامن وہ ہی ہو سکتے ہیں جو حق و انصاف کے معاملے میں راستبازی کے اس انتہائی بلند مرتبے پر فائز ہوں۔ یہ قرآن عزیز کا ایک انقلاب انگیز اصول ہے اور سچ یہ ہے کہ انصاف کے معاملہ میں سب سے بڑی کٹھن منزل یہی ہے کہ اپنے نفس کے مقابلہ میں انقلاب کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ قرآن عزیز نے اس کٹھن منزل کی رہنمائی اس آیت میں کی ہے۔

۴۰۲۔ اے اہلِ ایمان! تم انصاف پر خوب قائم ہونے والے اللہ کی خاطر گواہی دینے والے ہو

جاؤ۔ خواہ یہ گواہی اپنے خلاف، اپنے والدین کے خلاف، اپنے رشتہ داروں کے خلاف دینی پڑے۔ یعنی گواہی سچی اور اللہ کے حکم کے مطابق دینی چاہیے اگرچہ اس میں تمہارا، تمہارے کسی عزیز کا نقصان ہوتا ہو جو حق وانصاف ہو اس کو صاف ظاہر کر دینا چاہیے۔ دُنیوی نفع کے لیے آخرت کا نقصان مول نہ لو۔[1]

اصل ارشاد میں کونوا قوامین بالقسط شھداء للہ کی تعبیر آئی ہے۔ ہماری رائے میں شھداء للہ قوامین کی ضمیر سے حال ہے۔ قوام مبالغہ کا صیغہ ہے۔ دوسری تعبیرات کو چھوڑ کر یہ انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات آجائے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اور جس بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ صرف یہ نہیں کہ قسط کو قائم کرو بلکہ یہ جس عدل وانصاف کو نبوت علم وعمل کی صورت میں لے کر آئی ہے اس کو بہت زیادہ قائم کرنے والے ہو جاؤ اور یہ کام وقتی طور پر نہیں بلکہ دائمی طور پر کرو۔ اور نبوت کے اس علم وعمل پر صرف قائم ہونا ہی تمہاری ذمہ داری نہیں بلکہ تم دُنیا کے سامنے تاقیام قیامت اس کے علمبردار اور اس کے داعی بن کر رہو۔ اسی بلیغ معنویت کی خاطر یہ نہیں فرمایا کہ قوموا بالقسط انصاف کو قائم کرو نہ یہ فرمایا کہ کونوا قائمین بالقسط یعنی زندگی کی ساری شاخوں میں عدل وانصاف کے علمبردار ہو جاؤ اور اس میں خوب محنت کرو اور جانیں کھپا دو اور یہ کام اس طرح انجام دو کہ یہ تمہارا قومی نشان بن جائے گویا قسط کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے مومن ہونے کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ وہ سہارا تم بنو۔

اس ارشاد کا مدلول یہ بھی ہے کہ اس میں حاکموں، گواہوں، عالموں اور درویشوں اور بادشاہوں سب سے خطاب ہے۔ ہر شخص اپنی حیثیت کے مطابق انصاف کرے۔ قوامین مبالغہ فرما کر یہ بتایا گیا ہے کہ مسلمان کی ہر بات، ہر عمل زندگی کا ہر شعبہ انصاف پر مبنی ہو۔ اپنے گناہوں کا اقرار، نیکیوں میں قصور کا اعتراف، غرض کہ ہزارہا چیزیں انصاف میں داخل ہیں۔[2]

اور یہ بھی آیت کا منشا ہے کہ یہ فرمانے پر اکتفا نہیں کیا کہ انصاف کی روش پر چلو بلکہ یہ فرمایا کہ انصاف کے علمبردار بن جاؤ تمہارا کام صرف انصاف کرنا ہی نہیں ہے بلکہ دُنیا میں انصاف کا جھنڈا لے کر اُٹھنا ہے۔ تمہیں اس بات پر کمر بستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور اس کی جگہ عدل و راستی قائم ہو۔[3]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] نور العرفان [3] تفہیم القرآن

دراصل اس ارشاد میں انصاف وراستی کے خلاف ایک ایک ریشہ کو جڑ سے نکال پھینک دیا گیا ہے کہا گیا ہے کہ معاملات میں عدل وانصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو۔ جو کچھ کہو یا کرو خدا لگتی کہو اور خدا واسطے کہو۔ عدل وانصاف کے فیصلہ اور گواہی میں نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ میں آئے نہ عزیزوں، قرابت داروں کا۔ پھر اس فیصلہ اور گواہی میں کوئی بات لگی لپٹی نہ رکھی جائے، نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچا لیا جائے۔ مطلب یہ ہوا کہ فیصلہ اور گواہی میں قرابت نہ دیکھو جو حق ہو وہ کر دیا کہو اور بس۔

امیر اور غریب کے لیے قانونی مساوات

۲۰۵۔ اگر کوئی مالدار یا محتاج ہے تو اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے لہٰذا اپنی خواہش کے پیچھے پڑ کر عدل وانصاف کو ہاتھ سے نہ جانے دو۔ یعنی سچی گواہی دینے میں اپنی کسی نفسانی خواہش کی پیروی نہ کرو کہ مالدار کی رعایت کر کے یا محتاج پر ترس کھا کر سچ کو چھوڑ دو جو حق ہو سو کہو۔ اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ اور ان کے مصالح سے واقف ہے اور اس کے یہاں کس چیز کی کمی ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ جائز نہیں ہے کہ فیصلہ اور گواہی میں دولت مند کی رعایت کی جائے یا غریب پر ترس کھا کر فیصلہ میں رد و بدل کیا جائے۔ غریب پر مہربان ہو کر فیصلہ یا گواہی میں رد و بدل کرنا بظاہر نیکی کا کام دکھائی دیتا ہے مگر درحقیقت یہ ایک مقدس فریب ہے۔ ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی کی خاطر داری میں یا کسی کی بزرگی کو مان کر یا کسی کی بڑائی سے مرعوب ہو کر بے ایمانی کرنا ہے۔ منشا یہ ہے کہ عدل وانصاف کی راہ میں کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لیے ٹھوکر کا ذریعہ نہ بنے۔

اس آیت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ جو گواہ کسی فریق کو نفع پہنچانے کی غرض سے طرفدارانہ گواہی دیتا ہے وہ غلطی میں مبتلا ہے۔ اللہ تعالیٰ سے بڑھ کر کوئی اس کا نگران نہیں ہو سکتا۔ اس لیے گواہوں کو اس لیے طرفداری کرنی چاہیے اور نہ خود کسی فریق کو گواہ کی طرفداری کے ذریعہ اپنی نفع اندوزی کا خیال دل میں لانا چاہیے بلکہ دونوں کو اپنا معاملہ اللہ سبحانہ کے سپرد کر دینا چاہیے کہ وہی ان کا سب سے بہتر اور سب سے بڑھ کر ولی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لگ عدل و انصاف کے فیصلے یا گواہی میں اسی لیے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی وہ طرفداری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے تو ارشاد ہوا کہ فاللّٰہ اولیٰ بہما اللہ تعالیٰ امیر اور غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ تمہاری کم بین نظر تو اس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے اور اللہ تعالیٰ کی نظر میں سب کچھ ہے۔ وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندوں کے ساتھ وہ کچھ کرتا ہے جس میں اُن کی بھلائی ہو۔ غور کیجئے کہ ان لفظوں میں عدل و انصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے۔ کم حوصلہ انسان اپنے فیصلہ اور گواہی میں کسی خاص انسان کی بھلائی کے لیے جھوٹ بولتا یا غلط فیصلہ دیتا ہے اور سمجھتا ہے کہ اس سے اس کو فائدہ پہنچے گا۔ حالانکہ عالم الغیب کے سوا یہ کس کو معلوم ہو سکتا ہے کہ آگے چل کر اس کے لیے مفید ٹھہرے گی۔ پھر ایک اور حیثیت سے دیکھئے کہ اگر بالفرض ایک خاص آدمی کو اپنی طرفداری سے فائدہ پہنچا بھی دو تو کیا یہ صحیح نہیں ہے کہ اس نے اس طرح حقیقت میں سچائی کا خون کر کے نظمِ عالم کو ابتر کرنے کی کوشش کی اور ظلم کی بنیاد رکھی جس سے عالم کے امن و امان کے درہم برہم ہو جانے کا خطرہ ہے۔ غلط گو انسان کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع و نقصان کا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ کے عدل و انصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہے جس کا ایک فرد وہ خاص انسان بھی ہے۔

عدل و انصاف میں مساوات کی عملی تشریح

عدل و انصاف کے قانون میں مساوات کی عملی تشریح حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی ہے۔ اور اسی طرح صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی زندگی۔ ان کی زندگی کے ہر پہلو میں آپ کو عدل و انصاف کی حکمرانی نظر آئے گی۔ اس عدل و انصاف میں چھوٹے بڑے، امیر و فقیر، مسلم و غیر مسلم اور سلطان و گدا کی کوئی تمیز نہیں ہے۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ یعنی یہ جائز نہیں ہے کہ امیر کے لیے الگ قانون ہو اور کمزور و بے اثر کے لیے الگ فتویٰ ہو بلکہ سب کو اللہ کے ایک ہی قانونِ عدل کے تحت ہونا چاہیے کیونکہ اللہ کا حق سب پر یکساں قائم ہے اور یہ حق دوسرے تمام حقوق سے بڑا ہے۔ اگر کوئی شخص امیر اور با اثر ہے تو اس وجہ سے وہ خدا کے حق سے بری الذمہ نہیں ہو سکتا۔ یہ بات اچھی طرح سمجھنے کے لیے حضور کے اس ارشاد کو سامنے رکھیے جو حضرت عائشہ سے مروی ہے وہ فرماتی ہیں :

جب ایک معزز عورت نے چوری کی تو اس کے معاملے کی قریش کو بڑی فکر ہوئی ، لوگوں نے یہ سوچنا شروع کر دیا کہ کون شخص ایسا ہو سکتا ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کی سفارش کرے بالآخر یہ طے پایا کہ اس کی جرأت صرف اسامہ ابن زید کر سکتے ہیں ۔ وہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑے چہیتے ہیں ۔ لوگوں کے کہنے پر اسامہ نے حضور سے اس کی سفارش کی ۔ حضور نے فرمایا ۔ اسامہ تم اللہ کی مقرر کی ہوئی حدود میں سے ایک حد کے معاملہ میں سفارش کرنے آئے ہو پھر آپ خطبہ کے لیے کھڑے ہوئے اور فرمایا لوگو ! تم سے پہلے قوموں کو اسی چیز نے تباہ کیا کہ ان کا حال یہ ہو گیا تھا کہ اگر ان میں کوئی معزز آدمی چوری کرتا تو اس کو چھوڑ دیتے اور اگر کوئی معمولی آدمی چوری کرتا تو اس پر حد جاری کر دیتے ۔ خدا کی قسم میں ایسا نہیں کروں گا اگر فاطمہ بنت محمد بھی چوری کرتی تو اس کا ہاتھ بھی کاٹ دیتا ۔

عدل و انصاف اور شہادت کا مسئلہ صرف اخلاق سے ہی تعلق نہیں رکھتا بلکہ اخلاق کے ساتھ سیاست سے بھی گہرا تعلق رکھتا ہے ۔ یعنی جو شخص عدل و انصاف کرتا ہے اس کے لیے کن کن اوصاف سے متصف ہونا ضروری ہے ۔ اس آیت میں اگرچہ اس کی تصریح نہیں ہے تاہم اشارات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص فیصلہ کرتا ہے اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ آزاد ہو اپنے فیصلہ کے نفاذ کی قدرت رکھتا ہو ۔ قوت نطق سے محروم نہ ہو صاحب علم ہو چنانچہ ارشاد ربانی ہے :

وضرب الله مثلاً رجلين احدهما ابكم لا يقدر على شيئ و هو كل على مولاه اينما يوجهه لا يات بخير هل يستوى هو ومن يأمر بالعدل و هو على صراط مستقيم

اور اللہ نے ایک مثال بیان کی ہے دو آدمی ہیں ایک گونگا ہے کسی بات کے کرنے کی قدرت نہیں رکھتا ۔ اپنے آقا پر بوجھ ہے جہاں بھی روانہ کرے کوئی خوبی کی بات اس سے بن نہ آئے ، دوسرا ایسا ہے کہ لوگوں کو عدل و انصاف کی باتوں کا حکم دیتا ہے اور خود بھی عدل و انصاف کے سیدھے راستہ پر ہے کیا پہلا آدمی اور یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں ۔

امام رازی نے اس آیت کی تشریح میں یہ لکھا ہے کہ جو شخص عدل کا حکم دیتا ہے اس کو صفت نطق سے متصف ہونا چاہیے ورنہ وہ حکم نہ دے سکے گا اور قادر ہونا چاہیے کیونکہ حکم سے بعد حق کا اظہار ہوتا ہے اور جب تک وہ قادر نہ ہو اظہار حق حاصل نہیں ہو سکتی اور عالم ہونا چاہیے تاکہ عدل و ظلم میں تمیز کر سکے۔ اس سے معلوم ہوا کہ عادل ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ قادر بھی ہو اور عالم بھی ہو۔ پہلا اگر گونگا ہے تو دوسرے کو گویا ہونا چاہیے۔ پہلا شخص کسی قسم کی قدرت نہیں رکھتا تو دوسرے کو صاحب قدرت ہونا چاہیے۔ پہلے شخص سے کوئی کام ٹھیک نہیں بنتا اس لیے دوسرے شخص کو عالم ہونا چاہیے تاکہ وہ کام سلیقہ سے کر سکے۔

آخر میں فرمایا ہے کہ لا تتبعوا الھوی ان تعدلوا اس کے معنے دو طرح سے کیے گئے ہیں ایک یہ کہ انصاف کرنے میں اتباع ہوئی نہ کرو۔ اس صورت میں تعدلوا عدل سے بنا ہے اس کے معنے انصاف کرنے کے ہیں۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ تم الھوی کی پیروی نہ کرو کہ حق سے ہٹ جاؤ۔ اس صورت میں تعدلوا عدول سے بنا ہے اس کے معنے ہٹ جانے کے ہیں۔ قاضی بیضاوی نے یہی معنے لیے ہیں۔ ھوی ہمارے خیال میں یہاں الھدی کی ضد ہے۔ یعنی تم نے اللہ کی ہدایت چھوڑ کر اگر اپنی خواہشوں کی پیروی کی تو تم اس قسط سے ہٹ جاؤ گے جس پر قائم رہنے کا اللہ نے تم کو حکم دیا ہے اور جس کی دعوت اور شہادت پر تم مامور ہو کر آئے ہو۔

نظام حق کو بگاڑنے کی دو صورتیں

۲۰۶۔ اور اگر بات کو لپیٹ کر کہو گے یا صاف گوئی سے روگردانی کرو گے تو یاد رکھو اللہ تمہارے کرتوں سے باخبر ہے۔ بات کو لپیٹ کر کہنا یہ کہ سچی بات تو کہو مگر زبان داب کر ادا کرو پیچ سے کہ سننے والے کو شبہ پڑ جائے یعنی صاف صاف سچ نہ بولا اور روگردانی یہ کہ پوری بات نہ کہی بلکہ کچھ کام کی رکھ لی سو ان دونوں صورتوں میں گو جھوٹ تو نہ بولا مگر بوجہ عدم اظہار حق گنہگار ہوگا گواہی سچی اور صاف اور پوری دینی چاہیے۔[1]

شیخ الاسلام نے جو تشریح فرمائی ہے یہ عام شارحین قرآن کی ترجمانی ہے۔ ہمارے خیال میں یہ اس آیت کا مدلول ہے موقعہ و محل کے اعتبار سے آیت قرآنی کا منطوق یہ ہے کہ اس میں نظام حق

---

[1] تفسیر شیخ الاسلام

کو بگاڑنے کی دو شکلوں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے ایک یہ کہ نبوت جو علم و عمل پر مبنی نظام حق لے کر آئی ہے اس کو کج کرنے، بگاڑنے اور مسخ کرنے کی کوشش کی جائے جیسا کہ یہود نے کیا اور جس کا ذکر آل عمران کی آیت یلوون السنتھم بالکتاب میں ہوا ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اسے بگاڑنے کی کوشش ترک کی جائے اس کی شکل باقی رہے لیکن زندگی کے معاملات میں اسے کوئی اہمیت نہ دی جائے۔ مدلول کی حد تک تشریح وہی ہے جو شیخ الاسلام نے پیش فرمائی ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی نے اس آیت کی جو تفسیر فرمائی ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجئے۔

اے ایمان والو! تمام معاملات میں ادا کے وقت بھی اور فیصلہ کے وقت بھی انصاف پر خوب قائم رہنے والے، اور اقرار بالشہادت کی نوبت آئے تو اللہ کی خوشنودی کے لیے سچی گواہی اور اظہار دینے والے رہو۔ اگرچہ وہ گواہی اور اظہار اپنی ہی ذات پر ہو جس کو اقرار کہتے ہیں یا کہ والدین اور دوسرے رشتہ داروں کے مقابلہ میں ہو اور گواہی کے وقت یہ خیال نہ کرو کہ جس کے مقابلہ میں ہم گواہی دے رہے ہیں یہ امیر ہے اس کو نفع پہنچانا چاہیے تاکہ اس سے بے مروتی نہ ہو، یا یہ کہ غریب ہے، اس کا کیسے نقصان کر دیں، تم کسی کی امیری یا غریبی کو نہ دیکھو کیونکہ وہ شخص جس کے خلاف گواہی دینی پڑے گی۔ اگر امیر ہے تو، اور غریب ہے تو، دونوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کو زیادہ تعلق ہے۔ اتنا تعلق تم کو نہیں کیونکہ تمہارا تعلق جس قدر ہے وہ بھی انہیں کا دیا ہوا ہے اور اللہ تعالیٰ کو جو تعلق ہے وہ تمہارا دیا ہوا نہیں۔ پھر جب باوجود تعلق قوی کے اللہ تعالیٰ نے ان کی مصلحت اسی میں رکھی کہ اظہار حق کیا جائے تو تم تعلق ضعیف پر ان کی ایک عارضی مصلحت کا کیوں خیال کرتے ہو سو تم اس شہادت میں خواہش نفس کا اتباع مت کرنا کہ کبھی تم حق سے ہٹ جاؤ اگر تم کج بیانی کرو گے یعنی غلط اظہار دو گے، پہلو تہی کرو گے، یعنی شہادت کو ٹالو گے تو یاد رکھنا کہ بلاشبہ اللہ تعالیٰ تمہارے سب اعمال کی پوری خبر رکھتے ہیں۔ [1]

مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ مسلمانوں کو چاہیے قوامون بالقسط ہوں یعنی حق و انصاف پر مضبوطی سے قائم رہنے والے کہ کوئی بات بھی انہیں ان کی جگہ سے نہ ہلا سکے اور چاہیے کہ اللہ کے لیے گواہی دینے والے ہوں دنیا کی کوئی چیز انہیں سچ کہنے سے نہ روک سکے۔ اگر کسی معاملے میں سچائی خود ان کی ذات کے خلاف ہو یا ان کے ماں باپ اور عزیز و اقربا کے خلاف ہو جب بھی

---

[1] بیان القرآن

انہیں یہ کہ یہ بات کہنی چاہیے نہ صرف بھائی بہن کے لیے دل و زبان لکھتے ہیں۔
سچی گواہی دینے میں نہ تو کسی کی دولت کا پاس کرو نہ کسی کی محتاجی کا۔ اگر کسی معاملہ میں گواہی دینے سے بچ سکتے ہو تو اس سے پہلو تہی نہ کرو اور جب گواہی دو تو صاف صاف بات کہو گھما پھرا کر نہ کہو کہ حقیقت ہی مشتبہ ہو جائے۔[1]

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں کہ یہ آیت بتاتی ہے کہ انصاف قائم کرنا اور اس پر قائم رہنا صرف حکومت اور عدالت کا فریضہ نہیں بلکہ ہر انسان اس کا مکلف ہے کہ وہ خود انصاف پر قائم رہے اور دوسروں کو انصاف پر قائم رکھنے کے لیے کوشش کرے۔ انصاف کا صرف ایک درجہ حکومت کا فریضہ ہے وہ یہ کہ سرکش انسان جب انصاف کی شاہراہ سے ہٹ جائیں تو جابرانہ تعزیر کے ذریعہ ان کو انصاف پر قائم رکھے۔[2]

اس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ سورہ مائدہ میں آ رہی ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن۔ [2] معارف م ش

يَآيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْ نَزَّلَ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَالْكِتٰبِ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ مِنْ قَبْلُ ۭ وَمَنْ يَّكْفُرْ بِاللّٰهِ وَمَلٰۗىِٕكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ فَقَدْ ضَلَّ ضَلٰلًۢا بَعِيْدًا ۝۱۳۶ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ اٰمَنُوْا ثُمَّ كَفَرُوْا ثُمَّ ازْدَادُوْا كُفْرًا لَّمْ يَكُنِ اللّٰهُ لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ سَبِيْلًا ۝۱۳۷

اے اہل ایمان! ایمان لاؤ اللہ پر، اللہ کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اس نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے اتاری ہے اور دیکھو جو اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روزِ آخرت کے بارے میں راہِ کفر اختیار کرے گا تو وہ بھٹک کر سیدھے راستہ سے دور جا پڑے گا۔ بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کفر

میں پڑ گئے پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ ان کو بخشنے والا نہیں ہے اور نہ اللہ ان کو کامیابی کی راہ دکھائے گا۔"

مسلمانوں کو ایمان میں اخلاص کی دعوت

اعمال وخصائل اور احکام و قوانین بیان کرنے کے بعد اہل ایمان سے ایمان میں اخلاص پیدا کرنے کا مطالبہ۔ سب جانتے ہیں کہ ایمان علم ہے اور باقی ساری چیزیں عمل ہیں اور علم ہمیشہ عمل پر مقدم ہوتا ہے۔ عمل کی حیثیت ایک درخت کی سی اور علم کی حیثیت بیج کی سی، جس طرح بیج کے بغیر درخت کا وجود ممکن نہیں ٹھیک اسی طرح ایمان کے بغیر عمل بھی وجود میں نہیں آسکتا اس لیے جب تک ایمان وجود میں نہ آئے عمل کے وجود میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایمان جس قدر صحیح ہوگا اچھا ہوگا۔ عمل میں اسی قدر پذیرائی کی قوت ہوگی۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ایمان کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک سیاسی ایمان۔ دوسرے واقعی ایمان۔ سیاسی ایمان یہ کہ مردم شماری کے رجسٹر میں اس کا نام مسلمان ہو، اس سے اس کو جان و مال اور آبرو کا تحفظ حاصل ہو جاتا ہے گا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں اسی ایمان کے چہرہ سے نقاب کشائی فرمائی ہے۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یشھدوا ان لا الہ الا اللہ وان محمدا رسول اللہ و یقیموا الصلاۃ و یوتوا الزکوۃ فاذا فعلوا ذالک عصموا منی دماءھم و اموالھم الا بحق الاسلام وحسابھم علی اللہ۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے جنگ کرتا رہوں یہاں تک کہ وہ اللہ ہی کے معبود ہونے اور محمد کے رسول خدا ہونے کی گواہی دے دیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں، جب وہ ایسا کریں گے تو اسی وقت مجھ سے

اپنی جانوں اور اپنے مالوں کو محفوظ پا سکیں گے اور اس کے بعد ان کا حساب لینا اللہ کا کام ہے ۔ (صحیح مسلم کتاب الایمان)

دوسرا ایمان واقعی وہ ہے جس پر نجات آخرت موقوف ہے ۔ پہلے ایمان کا متابل کفر ہے اور اس دوسرے ایمان کا متابل نفاق ہے ۔ اس آیت میں پہلے آمنوا سے ایمان کے پہلے معنے اور دوسرے آمنوا سے ایمان کے دوسرے معنے مراد ہیں اور مطلب یہ ہے کہ اے مسلمانو! اپنے ایمان میں اخلاص پیدا کرو ۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایمان والے فرمایا ہے ان کو جو ظاہر میں مسلمان ہیں سوان کو تقید ہے کہ جب تک دل سے یقین نہ لاویں گے ان سب چیزوں کا تو خدا کے ہاں مسلمان نہیں ۔

۲۰۷ ۔ اے اہل ایمان، ایمان لاؤ اللہ پر، اللہ کے رسول پر اور اس کتاب پر جو اللہ نے اپنے رسول پر نازل کی ہے اور اس کتاب پر جو اس نے پہلے اُتاری، اور دیکھو جو شخص اللہ، اس کے فرشتوں، اس کی کتابوں، اس کے رسولوں اور روزِ آخرت کے بارے میں راہ کفر اختیار کرے گا وہ بھٹک کر سیدھی راہ سے دُور جا پڑے گا ۔

یعنی جو اسلام قبول کرے اس کے لیے ضروری ہے کہ اللہ تعالیٰ کے تمام حکموں پر دل سے یقین لائے اس کے ارشادات میں سے اگر کسی ایک ارشاد پر بھی یقین نہ لائے گا تو وہ مسلمان نہیں ۔ صرف ظاہری اور زبانی بات کا اعتبار نہیں ہے[1] شیخ الاسلام بھی یہی سمجھانا چاہتے ہیں کہ اس آیت میں ایمان والوں سے جو یہ کہا گیا ہے کہ ایمان لاؤ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے حکموں پر دل سے یقین لاؤ ۔ یعنی یہاں لفظ ایمان دو الگ معنوں میں استعمال ہوا ہے ۔ الذین آمنوا میں ایمان ماننے کے معنے میں ہے اور آمنوا میں لفظ ایمان یقین کرنے سچے دل سے ماننے پوری سنجیدگی اور خلوص سے ماننے ۔ اپنے فکر کو اپنے مذاق کو اپنی پسند کو اپنے رقیے اور چلن کو، اپنی دوستی اور دشمنی کو اس یقین کے مطابق بنا لینے کے معنے میں ہے جس پر وہ ایمان لایا ہے ۔

اللہ پر ایمان لانے کا مطلب

اللہ پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ اس کی ہستی پر یقین کے ساتھ اس کے اختیارات کو اسی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کے لیے مخصوص سمجھا جائے جو اس کی صفات کے لازمی تقاضے ہیں اور ان حقوق کو بھی اسی کے لیے مخصوص سمجھا جائے جو اس کی صفات سے فطری طور پر وابستہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی صفات میں سب سے اہم اور بنیادی الوہیت ہے۔ قرآن وسنت بتاتے ہیں کہ الوہیت کے اہم اور بنیادی تقاضے یہ ہیں۔ صرف اللہ ہی وہ ہے جس کی رضا جوئی کی انسان کو فکر ہونی چاہیے۔ یہی اس کے سارے کاموں کا اصل محرک ہونا چاہیے اور سارے اعمال و حرکات صرف اللہ کے لیے مخصوص رکھنے چاہئیں جو اپنی حقیقت یا اپنی صورت کے اعتبار سے پرستش کی قسم کے ہوں۔ وہ جذبات و احساسات بھی اللہ ہی کے لیے خاص کر دینے چاہئیں جن کے اندر بندگی کی روح پائی جاتی ہو۔ توکل صرف اسی پر کیا جائے۔ امیدیں صرف اسی سے وابستہ کی جائیں، تقویٰ صرف اسی کا اختیار کیا جائے۔ خوف اسی کا رکھا جائے۔ حقیقی محبت صرف اسی سے کی جائے اور یہ بھی اللہ کی الوہیت کا تقاضا ہے کہ اس پوری کائنات کا جس کا ہماری یہ دنیا بھی ایک چھوٹا سا حصہ ہے۔ مقتدر اعلیٰ اللہ ہی ہے۔ حکم دینے، منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرنے کا اصل مستحق صرف وہی ہے، حقیقی شارع اور قانون ساز بھی وہی ہے۔ کسی مخلوق کی زندگی کا ضابطہ متعین کرنے اس کے معاملے کا فیصلہ کرنے اسے معاف کرنے، سزا دینے کا اختیار بھی پورے کا پورا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ الوہیت کے یہ بنیادی تقاضے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا انکار بھی ایمان باللہ کے دعوے کو بے معنی کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ساری باتیں ایمان باللہ کے اصل مفہوم میں شامل ہیں اور کوئی شخص صحیح معنوں میں مسلمان ہو ہی نہیں سکتا جب تک کہ یہ عقیدہ اپنے پورے مفہوم کے ساتھ اس کے دل میں نہ اتر چکا ہو۔

رسول پر ایمان لانے کا مطلب

رسالت کے لفظی معنے سفارت اور پیغامبری کے ہیں۔ شریعت کی اصطلاح میں رسالت اس سفارت کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے تشریعی احکام پہنچانے اور انھیں اپنی مرضی کی راہ بتلانے کے لیے قائم کیا ہے۔ اس کا دوسرا نام نبوت ہے۔ رسالت پر ایمان لانے کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ نبی کی مکمل طاعت اور پیروی کی جائے اور ایسا سمجھنا شرطِ ایمان ہے دین و شریعت کے دائرے میں نبی جو کچھ بھی کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چوں نہ کرے اور خواہ اس کی مصلحت سمجھ میں آسکے یا نہ آئے۔ بہرصورت یہ یقین رکھے کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور سراپا حق ہی ہے اور پھر یہ اطاعت بھی صرف ظاہر کی حد تک نہ ہونی چاہیے بلکہ

دل کی رضا کے ساتھ ہونی چاہیے اور ایسا ہونا ضروری بھی ہے عقل ایک نبی کے لیے کسی اور حیثیت کا تصور ہی نہیں کر سکتی۔ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اگر اس بندگی کرنے کا طریقہ معلوم کرنے اور ان احکام کے جاننے کا واحد ذریعہ صرف نبی ہے تو نبی کی کامل اطاعت اور پیروی کے بغیر اللہ کی اطاعت اور بندگی کی کوئی شکل ممکن ہی نہیں رہ جاتی۔ اگر راستہ چلے بغیر آپ منزل تک نہیں پہنچ سکتے تو نبی کی ساری باتوں کو مانے بغیر اور اس کے پیچھے چلے بغیر اللہ کی بندگی بھی نہیں کر سکتے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر نبی اپنی نبوت کا اعلان کرتے وقت لوگوں سے مطالبہ کرتا ہے فاتقوا اللہ واطیعون۔ قرآن حکیم جگہ جگہ انبیاءؑ کی طاعت، ان کی اتباع، ان کی سیرت کو اپنانے پر زور دیتا ہے اور وہ مسلمانوں کو ہدایت کرتا ہے کہ یہ دعا برابر مانگتے رہیں۔

اھدنا الصراط المستقیم صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین۔

ایمان بالرسالت کے تقاضے میں قرآن نبوت کے لیے اس اعزاز و احترام اور توقیر و اکرام کا مطالبہ کرتا ہے جو قلب کی گہرائیوں کی پیداوار ہو اور ان سے جذباتی لگاؤ اور محبت پیدا کرنا چاہتا ہے اور صرف ان کی اس طاعت پر راضی نہیں ہے جو جذبات محبت اور تعظیم سے خالی ہو جیسے کہ رعایا کا بادشاہ کے ساتھ اور دوسرے فوجی و سیاسی لیڈروں کے ساتھ عوام کا ایک رسمی تعلق ہوتا ہے۔ قرآن مومن سے زکوٰۃ و صدقات کے محض فرائض کی ادائیگی اور احکام کی ضابطہ کی تعمیل کو کافی نہیں سمجھتا بلکہ اس کا مطالبہ یہ بھی ہے و تعزروہ و توقروہ اس کی مدد کرو اس کی عزت و تکریم کرو، رسول کی مخلصانہ طاعت۔ نبوی اخلاق کو اپنانا، شریعت کو خواہشات نفس اور رسم و رواج و عادات پر ترجیح دینا اور دعوت نبوت کی راہ میں جانی مالی فداکاری بغیر اس دلی محبت کے جو دل کی گہرائیوں میں موجود ہو اور انسان کے عقل و دماغ پر محیط و مستولی ہو ممکن نہیں ہے۔

اللہ کی کتاب پر ایمان لانے کا مطلب

اللہ کی کتاب پر ایمان لانے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کو اللہ کی کتاب مان کر انسان احکام الٰہی کے حق میں اپنے اختیارات سے کلیتہً دستبردار ہو جائے، اپنی عقل اپنی رائے، اپنے افکار، اپنے اعمال، اپنے احساسات اور اپنے جذبات، اپنے رجحان طبع اور اپنے ذوق سب کی گردنوں پر اس کی

ہے قید غلامی کا حلقہ ڈھیلا ہے۔ تمام آسمانی کتابوں میں قرآن کا امتیاز یہ ہے کہ وہ جوں کا توں محفوظ ہے اور قیامت تک محفوظ رہے گا۔ اس میں ایک لفظ کیا ایک نقطہ کی بھی کمی بیشی نہیں ہوئی ہے اور نہ ہو سکے گی۔ یہ عقیدت نہیں، تاریخ گواہ ہے کہ قرآن اب تک محفوظ چلا آرہا ہے اور مخلوط ملاوٹ بلا نہیں تمدنی حالات بھی کہتے ہیں کہ اب مستقبل کے آخری لمحے تک اس کی اس صفت میں داغ لگنے کا کوئی امکان نہیں۔

پھر یہ کتاب ایک ایسی زبان میں ہے جو ایک زندہ زبان ہے کروڑوں آدمی اسے بولتے ہیں اور دنیا کے گوشے گوشے میں اس کے جاننے، سمجھنے اور پڑھنے پڑھانے والے بے شمار انسان موجود ہیں۔ اس کے مقابلے میں کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں ہے جو ان صفتوں کی مالک ہو اور جو ٹھیک ٹھیک انہی الفاظ و عبارات میں موجود ہو جن میں وہ اپنے لانے والے رسول پر اتری تھی اور جس کی زبان آج دنیا کی کوئی زندہ زبان ہو۔

آخر میں یہ جو فرمایا کہ جو اللہ کے فرشتوں، کتابوں، رسولوں اور آخرت کے بارے میں راہ کفر اختیار کرے گا تو وہ بھٹک کر سیدھی راہ سے دور جا پڑے گا تو اس میں کفر دونوں معنے کا احتمال رکھتا ہے۔ اگر کفر ایمان بمعنے تصدیق کا مقابل ہے تو یہ واقعی اور حقیقی کفر ہے اور اگر کفر ایمان بمعنے اخلاص کا مقابل ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ زبان سے دعوے نرے اقرار کی حد تک سب کچھ مانتا ہے لیکن اپنے رویے سے ثابت کرتا ہے کہ وہ جس چیز کو ماننے کا دعویٰ کر رہا ہے فی الواقع اسے نہیں مانتا۔ صحابہ کی زبان میں یہ نفاق عمل ہے اور فقہا کی اصطلاح میں اس کا نام فسق ہے اور قرآن و سنت میں اس پر بھی لفظ کفر بولا جاتا ہے۔ بہرحال اسلام کے ان بنیادی عقائد میں سے جس عقیدے کے ساتھ کفر کی ان دونوں قسموں میں سے جس قسم کو اپنائے گا نتیجہ بہرحال یہی ہوگا کہ حق سے دوری ہوگی اور صراط مستقیم سے اتنی دوری ہو جائے گی کہ پھر اس کے لیے اس کا پانا مشکل ہو جائے گا۔

ایمان و کفر کا تقابلی مطالعہ

۲۰۸ - بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان لائے پھر کفر میں پڑ گئے، پھر ایمان لائے، پھر کفر کیا پھر اپنے کفر میں بڑھتے چلے گئے اللہ ان کو بخشنے والا نہیں۔ اور نہ اللہ ان کو کامیابی کی راہ دکھائے گا۔ یعنی ظاہر میں تو مسلمان ہوئے اور دل میں مذبذب رہے اور آخر کو بے یقین ہو گئے

ان کو نجات کا راستہ نہیں ملے گا۔ وہ کافر ہیں ظاہری مسلمانی کچھ کام نہ آئے گی۔ اس سے مراد منافقین ہیں اور بعض فرماتے ہیں کہ یہ آیت یہودیوں کی شان میں ہے کہ اوّل ایمان لائے پھر گوسالہ کی عبادت کر کے کافر ہو گئے۔ پھر توبہ کر کے مومن ہوئے پھر عیسیٰ علیہ السلام سے منکر ہو کر کافر ہوئے اس کے بعد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کا انکار کر کے کفر میں ترقی کر گئے۔[1]

اہل ایمان کا صحیح موقف واضح کرنے کے بعد یہاں سے روئے سخن منافقین کی طرف متوجہ ہوا ہے۔ اور بتایا کہ جو لوگ ایمان لاتے پھر کفر کیا پھر ایمان لائے پھر کفر کیا پھر اپنے کفر میں ترقی کرتے گئے۔ یہ ان کے تذبذب کے لیے ایک بیان واقعہ ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ منافقین زیادہ تر اہل کتاب بالخصوص یہود میں سے اور انہی کے زیر اثر بھی تھے۔ اس پہلو سے دیکھئے تو ان کے ایمان و کفر کا ایک کھیل تو وہ ہے جو وہ تورات کے ساتھ پہلے کھیل چکے ہیں۔ اور دوسرا کھیل یہ ہے جو اسلام کے ساتھ کھیل رہے ہیں کہ پہلے آگے بڑھ کر اس کے ماننے کا اقرار کیا اور اب رات دن اس کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں۔ اور یہ جو فرمایا کہ پھر اپنے کفر میں بڑھتے گئے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص محض کافر بن جانے پر اکتفا نہ کرے بلکہ اس کے بعد لوگوں کو بھی اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرے، اسلام کے خلاف خفیہ سازشیں اور علانیہ تدبیریں شروع کر دے۔ اور اپنی قوت اس سعی و جہد میں صرف کرنے لگے کہ کفر کا بول بالا ہو اور اس کے مقابلہ میں اللہ کے دین کا جھنڈا سرنگوں ہو جائے یہ کفر میں مزید ترقی اور ایک جرم میں پے در پے جرائم کا اضافہ ہے جس کا وبال بھی مجرد کفر سے لازماً زیادہ ہونا چاہیے۔ خود سیاق قرآنی بھی یہی چاہتا ہے کہ ذکر منافقین کا ہو رہا ہے اگرچہ انہوں نے بظاہر ایمان کی راہ اختیار کر لی تھی مگر فی الحقیقت ایمان سے محروم تھے۔ چنانچہ بار بار آتے اور بار بار الٹے پاؤں پھر گئے۔ سو ایسا ایمان، ایمان نہیں ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے نہ خدا کی مغفرت ہو گی اور نہ ایسوں پر سعادت و کامیابی کی راہ کھلے گی۔

بلاشبہ ایسے لوگ جو دین کو کھیل اور تماشا بنا لیتے ہیں عادۃً ان کا دل مسخ ہو جاتا ہے پھر ان کو ایمان کی توفیق نہیں ہوتی ہے کہ اس پر مغفرت مرتب ہو سکے۔ آیت کا یہ مطلب نہیں کہ اگر یہ لوگ اخلاص کے ساتھ ایمان لے آتے تو ان کا ایمان اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان کی توبہ قبول نہ ہوتی ۔ ہزار بار کفر کے بعد بھی اگر صدق دل سے صحیح توبہ کرے تو وہ قبول ہے سید رشید رضا رقمطراز ہیں ،

آیت یہ نہیں بتا رہی ہے کہ ایمان صحیح کے باوجود بھی مغفرت نہ ہو گی بلکہ آیت سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے دین کو کھیل و تماشہ بنا لیا ہے ایسے لوگ اللہ کی مغفرت اور ہدایت سے محروم کر دیے گئے ۔

بَشِّرِ الْمُنٰفِقِيْنَ بِاَنَّ لَهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ الَّذِيْنَ يَتَّخِذُوْنَ
الْكٰفِرِيْنَ اَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ اَيَبْتَغُوْنَ عِنْدَهُمُ
الْعِزَّةَ فَاِنَّ الْعِزَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا ۝ وَقَدْ نَزَّلَ عَلَيْكُمْ فِي الْكِتٰبِ
اَنْ اِذَا سَمِعْتُمْ اٰيٰتِ اللّٰهِ يُكْفَرُ بِهَا وَيُسْتَهْزَاُ بِهَا فَلَا تَقْعُدُوْا
مَعَهُمْ حَتّٰى يَخُوْضُوْا فِيْ حَدِيْثٍ غَيْرِهٖٓ ڮ اِنَّكُمْ اِذًا مِّثْلُهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ
جَامِعُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْكٰفِرِيْنَ فِيْ جَهَنَّمَ جَمِيْعًا ۝ الَّذِيْنَ
يَتَرَبَّصُوْنَ بِكُمْ ۚ فَاِنْ كَانَ لَكُمْ فَتْحٌ مِّنَ اللّٰهِ قَالُوْٓا اَلَمْ نَكُنْ مَّعَكُمْ ڮ
وَاِنْ كَانَ لِلْكٰفِرِيْنَ نَصِيْبٌ ۙ قَالُوْٓا اَلَمْ نَسْتَحْوِذْ عَلَيْكُمْ وَ
نَمْنَعْكُمْ مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۭ فَاللّٰهُ يَحْكُمُ بَيْنَكُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ
وَلَنْ يَّجْعَلَ اللّٰهُ لِلْكٰفِرِيْنَ عَلَى الْمُؤْمِنِيْنَ سَبِيْلًا ۝ ع

ان منافقوں کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دو جو اہل ایمان
کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور مددگار بناتے ہیں۔ کیا

یہ لوگ ان کافروں کے پاس عزت کے متلاشی ہیں۔ اگر ایسا
ہی ہے تو یاد رکھو کہ عزت تو ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے
ہے[209]۔ اور اللہ اپنی کتاب میں یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم
سنو کہ اللہ کی آیات کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا
مذاق اڑایا جا رہا ہے وہاں نہ بیٹھو، جب تک کہ لوگ کسی دوسری
بات میں نہ لگ جائیں، اگر بیٹھا کرو گے تو تم بھی ان ہی جیسے
ہو جاؤ گے، یقین مانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں
ایک جگہ جمع کرنے والا ہے[210]۔ یہ منافقین تمہارے معاملے
میں انتظار کر رہے ہیں اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی
تو آکر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے، اگر کافروں کا
پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے
پر قادر نہ تھے اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے نہیں بچایا[211]

بس اللہ ہی تمہارے درمیان روزِ قیامت فیصلہ کرے گا، اور اللہ کافروں کے لیے اہلِ ایمان پر غالب آنے کی کوئی راہ نہیں بنائے گا۔"[۲۱۲]

ایمان و نفاق کا تقابلی مطالعہ

پہلے ایمان بمعنے اخلاص کی دعوت دی تھی۔ اب یہاں اسی ایمان کے مقابل نفاق کے کچھ خدا خال بیان ہو رہے ہیں۔ قرآن نے کفر کی طرح نفاق کا بھی جا بجا ذکر کیا ہے اور منافقوں کے اعمال و خصائل پر البقرہ کے آغاز میں، پھر آل عمران کے درمیان میں اور اب نساء کے مختلف ابواب میں ان کا چہرہ پیش کیا ہے۔ ایمان و کفر کی طرح نفاق کی تمام حالتیں یکساں نہیں ہوتیں اور نہیں تھیں۔ چونکہ اصل کے اعتبار سے یہ حالت بھی انکار ہی کی ایک اقرار نما صورت ہے اس لیے جب بڑھتی ہے تو انکار قطعی ہی کی طرف بڑھتی ہے اور اسی کے خصائص رونما ہونے لگتے ہیں کسی میں کم، کسی میں زیادہ جیسا کہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ کسی سے نفاق کا رخ زیادہ اس طرف تھا کہ ہجرت ہی سے جی چراتے تھے۔ کسی پر انفاق مال دشوار تھا، کوئی جہاد سے جان چراتا تھا، کسی پر نماز کا قیام سخت گزرتا تھا، کوئی ایسا بھی تھا کہ احکامِ الٰہی اور آیاتِ قرآنی کی ہنسی اڑاتا تھا۔ اور اس تاک میں تھا کہ اگر مسلمانوں پر کوئی آفت پڑے تو کھلم کھلا دشمنوں کے ساتھ ہو جائے۔ تاہم یہ قطعی ہے کہ ان سب نے اسلام بطور اپنے دین و طریقہ کے قبول کر لیا تھا اور مسلمانوں ہی میں سمجھے جاتے تھے۔ یہ بات نہ تھی کہ محض ایک سازشی گروہ بھیس بدل کر مسلمانوں میں آملا ہو اور مسلمانوں میں سے نہ ہو۔ یہاں منافقوں کے یہ اعمال و خصائص بتلائے گئے ہیں کہ چونکہ ان کے دلوں میں ایمان نہیں ہے اس لیے مسلمانوں کی کامیابی پر بھروسہ نہیں رکھتے۔ وہ مسلمانوں کو چھوڑ کر ان کے دشمنوں کو اپنا دوست بناتے ہیں تاکہ جب مسلمانوں کے دشمن فتح مند ہوں تو وہ عزت و کامرانی حاصل کریں۔ وہ الگ تھلگ رہ کر واقعات کی رفتار

دیکھتے رہتے ہیں۔ اگر مسلمانوں کو فتح ہوتی ہے تو فتح کے فائدوں میں حصے دار بن جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم بھی تمہارے ساتھ تھے۔ اگر دشمنوں کا پلہ بھاری رہتا ہے تو ان سے جا ملتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اگر لڑائی میں ہم تمہارے ساتھ نہ ہوتے اور تمہیں نہ بچاتے تو مسلمانوں نے تمہارا خاتمہ ہی کر دیا ہوتا۔ اللہ کی آیات سنتے ہیں تو ان کا مذاق اڑاتے ہیں وغیرہ وغیرہ۔

۲۰۹۔ ان منافقوں کو دردناک عذاب کا مژدہ سناؤ جو اہل ایمان کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق اور مددگار بناتے ہیں، کیا یہ لوگ ان کافروں کے پاس عزت کے متلاشی ہیں اگر ایسا ہی ہے تو یاد رکھو کہ عزت ساری کی ساری اللہ ہی کے لیے ہے۔ یعنی منافق لوگ جو مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں کو دوست بناتے ہیں ان کے لیے سخت عذاب ہے اور ان کا یہ خیال کہ کافروں کے پاس بیٹھ کر ہم کو دنیا میں عزت ملے گی، بالکل غلط ہے سب عزت اللہ کے واسطے ہے جو اس کی اطاعت کرے گا اس کو عزت ملے گی خلاصہ یہ ہوا کہ ایسے لوگ دنیا و آخرت دونوں میں ذلیل ہوں گے۔

اس آیت میں منافقین کی یہ صفت بتائی گئی ہے کہ یہ مسلمانوں کے بالمقابل کفار یعنی یہود کو اپنا دوست اور کارساز بناتے ہوتے ہیں۔ ان کی نگاہوں میں عزت و سرخروئی حاصل کرنے کے اندیشہ ہیں حالانکہ عزت و ذلت سب خدا کے ہاتھ میں ہے۔ وہ جس کو چاہتا ہے عزت دیتا ہے جس کو چاہتا ہے ذلیل کر دیتا ہے۔ عزت کا مفہوم عربی زبان میں اردو کی بہ نسبت زیادہ وسیع ہے۔ اردو میں عزت محض احترام اور قدر و منزلت کے معنے میں آتا ہے مگر عربی میں عزت کا مفہوم یہ ہے کہ کسی شخص کو ایسی بلند اور محفوظ حیثیت حاصل ہو جائے کہ کوئی اس کا کچھ نہ بگاڑ سکے۔ دوسرے الفاظ میں لفظ عزت ناقابلِ ہتک حرمت کا ہم معنی ہے۔[1]

فان العزۃ للہ جمیعا یعنی اعزاز تو تمام تر اللہ کی ملک اور اس کے قبضے میں ہے وہ جسے چاہے معزز بنا دے۔ جیسے دنیا میں اربابِ اقتدار اور اساطینِ حکومت سے تعلق اور ان کی وفاداری اور اطاعت شعاری سے عزت حاصل ہوتی ہے اور سربراہِ مملکت کی نافرمانی اور باغیانِ حکومت سے دوستی ذلیل و خوار بناتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح رب العالمین سے وفاداری اور اس کے وزراء اور سفراء یعنی انبیاء کی اطاعت شعاری بقدر وفاداری و اطاعت شعاری بارگاہ خداوندی میں معزز بناتی ہے اور خداوند قدوس کی بغاوت اور اس کے رسولوں

[1] افادات شیخ الاسلام، تفہیم القرآن

انکار و نافرمانی بارگاہ خدا میں انسان کو ذلیل وخوار کرتی ہے۔ دراصل عزت نام ہے کسی کی محبت اور عظمت کی بنا پر محض اس کے حکم پر جان و مال اور آبرو قربان کر دینے کا۔ یہ شرف انبیاء و مرسلین اور ان کے متبعین کے سوا کسی کو نصیب نہیں ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ ایسا کرنے والوں کو اللہ نے ثواب الدنیا وحسن ثواب الاخرۃ عطا فرمایا ہے۔

دُنیا کی زندگی کے بارے میں قرآنی نقطۂ نظر

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ دُنیا اور دُنیا کی زندگی کے بارے میں قرآنی نقطۂ نظر کیا ہے قرآن کی روشنی میں نبوت نے ایسا معاشرہ تیار کیا تھا کہ اس کے سائے اور اس کی حکومت میں نوع انسانی کو پوری کامیابی وسعادت ہو اور اس کی قیادت میں اس کا جو قدم پڑے وہ صحیح پڑے اور صحیح منزل کی طرف اُٹھے۔ دُنیا کو ہر قسم کا اطمینان اور فارغ البالی ہر طرح کی سرسبزی و شادابی اور خیر و برکت حاصل ہو، انسانوں کی مصلحتوں کا ان سے زیادہ جاننے والا اور ان سے زیادہ ان کا خیال رکھنے والا، دُنیا کے لیے ان سے بہتر نگران و محافظ اور انسانوں کا ان سے بڑھ کر خیر خواہ کوئی نہیں ہو سکتا تھا۔ وہ بعض اہل مذاہب کی طرح دُنیا کی زندگی کو لعنت کا طوق نہیں سمجھتے تھے اسی کے ساتھ وہ اس کو عیش و عشرت کی آخری فرصت و مہلت بھی نہیں سمجھتے تھے کہ اس کا ایک ایک منٹ قیمتی سمجھتے، اور اس کے لذائذ اور نعم کو کسی طرح دن کے لیے نہ اُٹھا رکھتے اسی طرح سے وہ اس زندگی کو کسی سابق قدیم گناہ کی سزا بھی نہیں سمجھتے تھے جو ان کے لیے مقدر ہو چکی ہے۔ نیز مادہ پرست اقوام کی طرح وہ دُنیا کو خوان یغما بھی نہیں سمجھتے تھے جس پر وہ بھوکوں کی طرح گریں اور زمین کی دولتوں اور خزانوں کا پڑا ہوا لاوارثی مال نہیں سمجھتے تھے جس کے لوٹنے کے لیے وہ لوٹ پڑیں وہ کمزور قوموں کو شکار نہیں سمجھتے تھے جس کے شکار کرنے کے لیے وہ ایک دوسرے سے مقابلہ کریں۔ ان کا اعتقاد تھا کہ یہ زندگی اللہ کی ایک نعمت ہے جس میں اللہ سے قرب حاصل کرنے اور اپنے کمال انسانی تک پہنچنے کا ان کو موقعہ دیا گیا ہے اور عمل اور جدوجہد کی ایک مہلت ہے۔ جس کے بعد اس کے لیے کوئی مہلت نہیں۔

ان کو دُنیا کی قوموں اور انسانی گروہوں پر نگران اور امین مقرر کیا ہے اور وہ ان پر مامور ہیں کہ وہ رفتار سیرت و اخلاق اور رجحانات کا جائزہ لیتے رہیں جو راہ راست سے منحرف ہو جائے اس کو صراط مستقیم پر لائیں، جو اعتدال سے بڑھ جائے اس میں اعتدال پیدا کریں، کجی کو دور کرتے

رہیں، دشمنوں کو بھوتے یہاں کہ ذرکر طاقت سے اس کا حق دلائیں، مظلوم کو ظالم سے انصاف کرائیں اور خدا کی زمین میں انصاف و امن قائم رکھیں۔

كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ

تم سب امتوں سے بہتر ہو جو بھیجی گئی عالم میں، اچھے کاموں کا حکم کرتے ہو اور بُرے کاموں سے منع کرتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

(آل عمران - ۱۱۰)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ بِالْقِسْطِ شُهَدَاءَ لِلّٰهِ

اے ایمان والو! انصاف پر قائم رہو۔ اللہ کی طرف سے گواہ بنو۔

(النساء ۱۳۵)

ایک یورپین نو مسلم عالم نے مسلمانوں کے اس امتیاز کو اور دنیا کی زندگی کے بارے میں اس معتدل نقطۂ نظر اور طرز عمل کو بڑی خوبی سے بیان کیا اس کا اقتباس نامناسب نہ ہوگا۔

اسلام عیسائیت کی طرح دنیا کے متعلق بُری رائے نہیں رکھتا اس کی تعلیم ہے کہ ہم دنیاوی زندگی کی قدر و قیمت میں موجودہ مغربی تہذیب کی طرح مبالغہ نہ کریں۔ عیسائیت دنیاوی زندگی کی مذمت کرتی ہے اور اس سے نفرت رکھتی ہے۔ موجودہ یورپ روح عیسائیت کے خلاف زندگی پر ایسا گرتا ہے جیسے بوالہوس کھانے پر، وہ اس کو نگلتا تو ہے لیکن اس کی عزت کرنا نہیں جانتا۔ اسلام ان دونوں کے برعکس زندگی کو سکون و احترام کی نگاہ سے دیکھتا ہے وہ زندگی کی پرستش نہیں کرتا، بلکہ ایک بلند تر زندگی کے سفر کی ایک ضروری منزل سمجھتا ہے جس سے گزرنا ہے اس بنا پر انسان کو اس کی تحقیر اور اپنی اس دنیاوی زندگی کی بے وقعتی نہیں کرنی چاہیے، زندگی کے سفر میں ہمارا اس دنیا سے گزرنا ضروری اور اللہ کے یہاں مقدر ہو چکا ہے۔ پس انسان کی زندگی اپنی پوری قیمت رکھتی ہے، لیکن ہم کو یہ نہیں بھولنا چاہیے کہ وہ محض آیات و اسعا وہ ار ہے اور اس کی قیمت اس سے زائد نہیں جو واسطوں اور آلات کی ہوتی ہے، اسلام اس مادہ پرستانہ نظریہ کا روادار نہیں جس کا قول ہے کہ میری سلطنت یہی دنیا ہے اور نہ وہ عیسائیت سے متفق ہے جو زندگی کی تحقیر کرتی ہے اور کہتی ہے کہ یہ دنیا میری سلطنت نہیں اسلام کی راہ ان دونوں کے درمیان ہے۔ قرآن ہم کو اس جامع دعا کی تعلیم دیتا ہے ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الاٰخرۃ حسنۃ

(اے اللہ ہم کو دنیا میں بھی بھلائی عطا فرما اور آخرت میں بھی) اس دُنیا اور اس کی چیزوں کی قدر شناسی ہماری روحانی جدوجہد کے راستہ میں سنگ گراں نہیں مادی ترقی اور خوشحالی نہ مقصود بالذات ہے اور نہ پسندیدہ شے، ہماری ساری کوششوں اور جدوجہد کا مقصد یہ ہونا چاہیے کہ ایسے انفرادی و اجتماعی حالات و اسباب پیدا ہو جائیں اور ایسا ماحول قائم ہو جائے، اور اگر موجود ہے تو ہم اس کو باقی رکھیں جو انسان کی اخلاقی طاقت کی ترقی میں مددگار ہو، اس اصول کے مطابق اسلام مسلمان میں ہر چھوٹے بڑے کام کے موقع پر اخلاقی ذمہ داری کا احساس پیدا کرنا چاہتا ہے، اسلام کا مذہبی نظام انجیل کی اس تقسیم کو ہرگز پسند نہیں کرتا کہ قیصر کا حق قیصر کو دے دو اور اللہ کا حق اللہ کو دو۔ اس لیے کہ اسلام ہماری زندگی کی ضروریات کو اخلاقی اور عملی قسموں میں تقسیم کرنے کا روادار نہیں، اس کے نزدیک انتخاب کا ایک ہی حق ہے اور وہ یہ کہ انسان یا تو حق کو اختیار کرے یا باطل کو، اس کے نزدیک کوئی درمیانی چیز نہیں اس لیے وہ عمل پر زور دیتا ہے کہ وہ اخلاق کا ایک لازمی جزو ہے، اسلامی تعلیمات کی رُو سے ہر فردِ مسلم کو اپنے آپ کو ماحول اور اس کے گردوپیش کے واقعات کا شخصی طور پر جوابدہ سمجھنا چاہیے اور اپنے تئیں دینی جدوجہد کے لیے مامور اور ہر وقت اور ہر سمت میں حق کے قیام اور باطل کے زوال کا ذمہ دار تصور کرنا چاہیے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

کنتم خیر اُمۃ اُخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر و تومنون باللّٰہ۔

تم بہترین اُمت ہو جو لوگوں کے لیے پیدا کی گئی، نیکی کا حکم دیتے ہو اور بُرائی سے روکتے ہو اور اللہ پر ایمان لاتے ہو۔

یہی بات اسلام کی جارحانہ کارروائی، ابتدائی اسلامی فتوحات اور اسلامی ملوکیت کو اخلاقی طور پر حق بجانب ثابت کرتی ہے، پس اسلام استعماری (IMPERIALIST) ہے۔ اگر یہ مفہوم انہی الفاظ سے ادا ہو سکتا لیکن استعمار (IMPERIALIST) کی اس قسم کی محرک حکومت اور غلبہ کی محبت بالکل نہیں اور نہ اقتصادی اور خود غرضی کو اس میں کچھ دخل ہے۔ مجاہدین اولین کو جو چیز میدانِ جنگ میں بڑے ذوق و شوق کے ساتھ لے جاتی ہے وہ دوسروں کی دولت و محنت کے ذریعہ عیش و عشرت کی زندگی بسر کرنے کی لالچ نہ تھی، اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ایک ایسا دُنیاوی ڈھانچہ بنا دیا جائے جس میں انسان کے لیے بہتر سے بہتر روحانی ترقی ممکن ہو اسلامی تعلیمات کی رُو سے اخلاق و فضیلت کا علم انسان سے اخلاقی ذمہ داری کا

معاملہ کرتا ہے، بڑی بے غیرتی کی بات ہے کہ انسان نظری طور پر حق و باطل میں امتیاز کرے پھر حق کی ترقی اور باطل کے زوال کے لیے جدوجہد نہ کرے۔ اسلام کی رو سے اگر انسان حق اور نیکی کے غلبہ اور حکومت کے لیے سعی و جانفشانی کرتا ہے تو وہ زندہ رہتی ہے اور پھیلتی پھولتی ہے اور اگر اس کی مدد اور تقویت میں دریغ کرتا ہے اور اس کی حمایت و نصرت سے دست کشی کرتا ہے تو اس کو زوال ہو جاتا ہے اور وہ بالکل مغلوب ہو جاتی ہے گی۔ [1]

مستدرک حاکم میں فاروق اعظم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

شام کے گورنر کو آپ نے مخاطب کر کے فرمایا لوگوں میں تم اقلیت میں تھے اللہ نے تمہیں اسلام کے ذریعے بہتات عطا فرمائی، اور تم لوگوں میں ذلیل ترین تھے اللہ نے اسلام کے ذریعے عزیز بنایا جب بھی تم عزت اسلام کے سوا کسی دوسری راہ سے تلاش کرو گے اللہ تم کو ذلیل کر دے گا۔

ابوبکر الجصاص نے لکھا ہے کہ آیت کی مراد یہ ہے کہ کفر و الحاد کی راہ سے عزت تلاش نہ کرو بلکہ ایمان و اسلام کی راہ سے عزت تلاش کرو۔ رشید رضا فرماتے ہیں کہ:

مسلمانوں نے جب سے اس راہ کو چھوڑا ہے جس سے ان کے اسلاف نے دنیا میں عزت و رفعت حاصل کی تھی، وہ دنیا میں ذلیل ہو گئے اور ان میں ایسے منافق رونما ہو گئے جو کفر و فجور سے موالات کے ذریعے عزت کے متلاشی ہیں۔ اللہ کرے کہ مسلمان پھر اسی ہدایت کی طرف پلٹ آئیں اور و للہ العزۃ جمیعا کی آغوش میں آجائیں۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمانوں میں آج ایسے مسلمان بھی ہیں جن کی جدوجہد اور کوشش ملازمتیں اور عہدے حاصل کرنا ہے۔ یہ لوگ ہر ظالم حکومت اور ہر باطل نظام سے تعاون کرتے ہیں۔ ہر حکومت کے سائے میں اہم عہدے حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسلام کے خلاف قوانین وضع کرتے ہیں اور حکومت کے زور سے انہیں نافذ کرتے ہیں۔ غیر اسلامی حکومتوں کی جابرانہ اور ظالمانہ کارروائیوں میں شریک ہوتے ہیں بلکہ ان میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی کوشش کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو ان کی فوج میں رضاکارانہ طور پر شریک ہونے کی دعوت دیتے ہیں ملک کے

---

[1] مسلمانوں کا عروج و زوال

علم کے نیچے جنگ کرنے کا مشورہ دیتے ہیں خواہ انہیں کتنے ہی وزنی دلائل سے سمجھا دیا جائے کہ یہ کھلا تعاون علی الاثم اور موالات کفر ہے ۔

اس روش کی وجہ سے دُنیا کے نزدیک مسلمانوں کی ساکھ اُٹھ گئی ۔ انہوں نے اپنا امتیاز و شرف کھو دیا ۔ ان کی شہرت پر بٹہ لگ گیا ۔ صاحب رسالت اور صاحب دین قوم کی حیثیت سے ان کی کوئی وقعت نہ رہی وہ لوگوں کی نظروں میں ذلیل ہو گئے ۔ وہ مسلمان جن کو عدل و انصاف قائم کرنے کا شریف ترین منصب سپرد کیا گیا تھا جن کو ظالموں اور بے انصافوں سے جنگ کرنے کا حکم دیا گیا تھا ، جن کو یہ تعلیم دی گئی تھی کہ ظالم بادشاہ کے سامنے حق بات کہنا سب سے بڑا جہاد ہے ۔ وہی مسلمان اب ظالم حکومتوں سے تعاون کرنے لگے ، ظلم و بے انصافی میں ان کا ہاتھ بٹانے لگے اور اسے اسلام اور مسلمانوں کی خدمت سمجھنے لگے ۔ انہیں فخر ہے کہ انہوں نے مسلمانوں کے حقوق کی حفاظت کی انہیں سرکاری ملازمتیں اور عہدے دلوائے وہ اپنی اس کامیابی کو اسلام کے لیے شرف و عزت کا سامان سمجھتے ہیں ۔ مفتی احمد یار خاں نے یہ بات بالکل سچ فرمائی ہے کہ " اس آیت سے معلوم ہوا کہ دینی قومی غدار نہ اپنی قوم میں عزت پائے نہ دوسری قوموں میں عزت دین پر قائم رہنے میں ہے [1]

قرآن کو تنقید کا نشانہ بنانے والوں سے بچو

۱۴۰ ۔ اور اللہ اپنی کتاب میں یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم سنو کہ اللہ کی کتاب کے خلاف کفر بکا جا رہا ہے اور ان کا مذاق اڑایا جا رہا ہے ، وہاں نہ بیٹھو جب تک کہ لوگ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں اگر بیٹھو گے تو تم بھی ان ہی جیسے ہو جاؤ گے ، یقین جانو کہ اللہ منافقوں اور کافروں کو جہنم میں ایک جگہ جمع کرنے والا ہے ۔ یعنی اے مسلمانو! خدا تعالیٰ پہلے قرآن شریف میں تم پر حکم روانہ کر چکا ہے کہ جس مجلس میں احکام خداوندی کا انکار و تمسخر کیا جاتا ہو ، وہاں ہرگز نہ بیٹھو ورنہ تم بھی ویسے ہی سمجھے جاؤ گے ، البتہ جس وقت دوسری باتوں میں مشغول ہوں تو اس وقت ان کے پاس بیٹھنے کی ممانعت نہیں ۔ منافقوں کی مجالس میں آیات و احکام الٰہی پر انکار و استہزاء ہوتا تھا اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور یہ جو فرمایا کہ حکم نازل ہو چکا ہے

[1] نور العرفان

تم ہی نے اشارہ ہے آیت و اذا رأیت الذین یخوضون فاعرض عنھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ کی طرف جو پہلے نازل ہو چکی تھی، اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص مجلس میں اپنے دین پر طعنہ اور عیب سنے اور پھر انہی میں بیٹھا رہے اگرچہ آپ کچھ نہ کہے وہ منافق ہے۔[1] مطلب یہ ہے کہ اگر ایک شخص اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود کافروں کی ان صحبتوں میں شریک ہوتا ہے جہاں آیاتِ الٰہی کے خلاف کفر بکا جاتا ہے اور ٹھنڈے دل سے ان لوگوں کو خدا اور رسول کا مذاق اڑاتے ہوئے سنتا ہے تو اس میں اور ان کافروں میں کوئی فرق باقی نہیں رہتا۔[2]

جو بات اس آیت میں بتائی گئی ہے یہ ہے کہ ان لوگوں کے پاس بھی نہ بیٹھو جو اللہ کی آیات کو ہدف تنقید بناتے ہیں۔ یہ بات پہلے سورۂ انعام میں کہی گئی تھی اب یہاں مکرر فرمائی گئی ہے حکم کا یہ تکرار کہ ایک بار مکہ میں نزول دوبارہ مدینہ میں حکم کی اہمیت ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ یہ کفر اور تمسخر کرنے والے کون لوگ تھے؟ مکہ میں مشرکین تھے اور مدینہ میں یہود و منافقین تفصیل تو انشاء اللہ ساتویں پارے میں آئے گی۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ بے دینی کا ہر مشغلہ کفر و انکار کا ہر مظاہرہ اس آیت کا مصداق ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے بروایت ضحاک منقول ہے کہ اس آیت کے مفہوم میں وہ سب لوگ داخل ہیں جو قرآن کی تفسیر غلط کرتے ہوں۔ قرآن میں تحریف کرتے ہوں اور دین میں نت نئی باتیں نکالتے ہوں۔ دارمی کی ایک طویل حدیث میں ابو الدرداء سے روایت ہے کہ جو چیزیں اسلام کو فنا کرنے والی ہیں ان میں ایک بات منافق کا قرآن میں جھگڑا ڈالنا بھی ہے۔ امام احمد، ابو داؤد، اور حاکم حضرت ابوہریرہ سے روایت کرتے ہیں المراء فی القرآن کفر۔ قرآن میں جھگڑنا کفر ہے۔ اس آیت سے فقہاء نے یہ بات خوب سمجھی ہے کہ کفر و فسق، معصیت کی مجالس میں شرکت ممنوع ہے۔ ہاں کافروں، فاسقوں اور گنہگاروں سے اس وقت ملنے میں کوئی حرج نہیں جب وہ کفر و فسق میں مشغول نہ ہوں انکم اذا مثلھم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ شریک مجلس ہو کر تم بھی کافر ہو گئے بلکہ مثلیت اور یکسانی نفس معصیت میں ہو گی۔ منکرین کا استہزاء کفر اعتقادی سے پیدا ہوتا ہے اور ان کی مجلسوں میں مسلمانوں کی شرکت فسق کا نتیجہ ہے۔ علامہ آلوسی رقمطراز ہیں کہ مطلق شرکت سے تو گناہ میں مماثلت ہو گی لیکن شرکت کے بعد ان کے کردار پر راضی ہوا تو پھر کفر میں مماثلت ہو گی۔

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

کسی کے کفر پر پسندیدگی کا اظہار بھی کفر ہے ۔ جیسا کہ صاحب ذخیرہ نے اما اعظم سے نقل کیا ہے۔ اگرچہ اس میں اختلاف بھی ہے لیکن پائدار اور مضبوط قانونی موقف یہی ہے کہ کفر پر پسندیدگی کا اظہار بھی کفر ہے ۔

ابن الوقتی بھی منافقت ہے

۱۴۱ ۔ یہ منافق تمہارے معاملے میں انتظار کررہے ہیں ۔ اگر اللہ کی طرف سے فتح تمہاری ہوئی تو آکر کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہ تھے ۔ اگر کافروں کا پلہ بھاری رہا تو ان سے کہیں گے، کیا ہم تمہارے خلاف لڑنے پر قادر نہ تھے اور کیا ہم نے تم کو مسلمانوں سے نہیں بچایا ہے ۔ یعنی یہ منافق وہ ہیں جو برابر تمہاری تاک اور انتظار میں لگے رہتے ہیں، پھر اگر تمہاری فتح ہو تو تم سے کہتے ہیں کہ کیا ہم تمہارے ساتھی نہیں ، مال غنیمت میں ہم کو بھی شریک کرو ۔ اور اگر کافروں کو لڑائی میں کچھ حصہ مل گیا ۔ یعنی وہ غالب ہوئے تو ان سے کہتے ہیں ۔ کہ کیا ہم نے تم کو گھیر نہیں لیا تھا تم کو اور تمہاری حفاظت نہیں کی اور ہم نے کیا تم کو مسلمانوں کے ضرر سے نہیں بچایا لوٹ میں ہم کو بھی حصہ دو ۔ اس سے معلوم ہوا کہ دین حق پر ہو کر گمراہوں سے بھی بنا کے رکھنا یہ بھی نفاق کی بات ہے [1]

یہ انہی منافقین کے کردار کی مزید تفصیل ہے کہ یہ اسلام اور مسلمانوں کے نہایت بدخواہ ہیں ۔ یہ ہمیشہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ تمہیں کوئی افتاد پیش آتے ۔ کوئی ٹھوکر لگے، تم شکست کھاؤ تمہیں فتح حاصل ہو تو کہیں گے کیا ہم تمہارے ساتھ نہیں تھے اور اگر کہیں دشمن کا پلہ بھاری ہو جائے تو ان کے پاس پہنچیں گے اور ان کو یقین دلائیں گے کہ یہ تو ہماری تدبیر تھی کہ تم مسلمانوں سے محفوظ رہے، ہم اس طرح تمہیں بچاتے رہے کہ مسلمان تم پر کھل کر حملہ نہ کر سکے اور ان کا پورا دباؤ تم پر نہ پڑ سکا [2]

ہر زمانے کے منافقین کی یہی خصوصیت ہے ۔ مسلمان ہونے کی حیثیت سے جو فائدے حاصل کیے جا سکتے ہیں ان کو یہ اپنے زبانی اقرار اور دائرہ اسلام میں برائے نام شمولیت کے ذریعے سے حاصل کرتے ہیں اور جو فائدے کافر ہونے کی حیثیت میں حاصل ہونے ممکن ہیں ان کی خاطر

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن

یہ کفار سے جا کر ملتے ہیں اور ہر طریقے سے ان کو یقین دلاتے ہیں کہ ہم کوئی متعصب مسلمان نہیں ہیں۔ نام کا تعلق مسلمانوں سے ضرور ہے مگر ہماری دلچسپیاں اور وفاداریاں تمہارے ساتھ ہیں۔ فکر و تہذیب اور مذاق کے لحاظ سے ہر طرح کی موافقت تمہارے ساتھ ہے اور کفر و اسلام کی کشمکش میں ہمارا وزن جب پڑے گا تمہارے ہی پلڑے میں پڑے گا۔ لہ

اصول واخلاق پر منافع اور مصالح کی ترجیح

یہ آیت قرآنی ایمان واخلاص کے مقابلے میں نفاق کی عکاسی کر رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ نفاق کے نتیجے کے طور پر ان میں اصول و صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح تا جل کے مقابلے میں عاجل کو ترجیح دینے کا مرض رونما ہو جاتا ہے۔ جب یہ بیماری عام ہو جاتی ہے تو اجتماعی زندگی ایک با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے گر کر ایک بے اصول، ناقابل اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر آ جاتی ہے جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں بلکہ صرف منافع و مصالح اور اغراض و مقاصد ہوتے ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ آج تمام اسلامی ممالک میں مسلمانوں کو مغربی تہذیب، مغربی فلسفہ اخلاق اور مغربی معیاروں کو قبول کرنے کی دعوت دی جا رہی ہے۔ یہ بات ہر شخص جانتا ہے کہ مغرب کا سارا نظام زندگی تمام تر مادہ پرستی اور مصلحت بینی پر مبنی ہے۔ افادیت اور مصلحت بینی اس نظام زندگی کے ریشہ ریشہ میں سرایت کر چکی ہے۔ اس نظام سے تعاون کا نتیجہ ہے کہ مسلمانوں کی نظر آخرت کی اہمیت کم ہوتے ہوتے بعض حلقوں میں معدوم ہو گئی ہے۔ دنیوی ترقی، مادی فوائد اور منافع منتہائے نظر بن گئے۔ اصولی و اخلاقی معیار فوائد اور منافع کے مقابلے میں اپنی اہمیت بالکل کھو چکے ہیں۔ مسلمانوں میں اس دعوت کے علمبرداروں نے ترقی پر اتنا زور دیا اور اس شد و مد اور بلند آہنگی سے مادی ترقی کی دعوت دی کہ بالارادہ یا بلا ارادہ اسلام، قرآن اور رسالت کی اہمیت کم ہو گئی بلکہ بعض نے اسلامی نظام حیات کی تضحیک کی جس میں دنیا کے مقابلے میں آخرت کی اہمیت زیادہ تسلیم کی گئی۔ ان جملوں ان تقریروں کا مذاق اڑایا گیا جن میں دنیا کو متاع قلیل اور متاع غرور کہا گیا تھا۔ دنیا پرست، مادہ پرست اور منکر آخرت قوموں، ملکوں کو مسلمان نوجوانوں کے سامنے ایک بلند نمونہ اور معیار کامل کے طور پر پیش کیا گیا جو ہر تنقید

لہ تفہیم القرآن

سے بالا تھا، پھر جو نظام تعلیم قائم کیا گیا اس میں انکارِ آخرت کی رُوح بسی ہوئی تھی۔ اس کی اساس اخلاق کے مقابلے میں ظاہری منافع کی ترجیح پر رکھی گئی ہے، اس میں شرافت اور اخلاق کے مقابلہ میں خواہش نفس اور لذت کا عنصر غالب ہے وہ تمام ایسی قوم اور ایسی تہذیب کے ذہن کی پیداوار ہے جو سرتاپا مُنکرِ آخرت ہے۔ دراصل یہ کسی مجرد نظام کی دعوت نہیں اور نہ ایسا ممکن ہے بلکہ یہ ایک پوری تہذیب، تمدن و معاشرت اور اخلاق و فلسفہ اجتماع کی دعوت ہے۔ پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ انہوں نے مسلمانوں کو صاف صاف ہوا کے رُخ پر چلنے اور دریا کے بہتے ہوئے دھارے پر کشتی چھوڑ دینے کی دعوت دی اور صاف صاف کہا،

چلو تم ادھر کو ہوا ہو جدھر کی

اہل کفر اہل ایمان پر غالب نہ ہوں گے

۲۱۲ ۔ بس اللہ ہی تمہارے درمیان روزِ قیامت فیصلہ کرے گا اور اللہ ہرگز کافروں کے لیے اہل ایمان پر غالب آنے کی کوئی سبیل نہیں بنائے گا۔ یعنی اللہ تم میں اور ان میں حکم فیصل فرما دے گا کہ تم کو جنت دے گا اور ان کو جہنم میں ڈالے گا۔ دُنیا میں جو کچھ ان سے ہو سکے کر دیکھیں مگر اہل ایمان کی بیخ کنی ہرگز نہ کر سکیں گے جو ان کی دلی تمنا ہے [1]

اس آیت کی تشریح میں شارحینِ قرآن مختلف ہیں۔ علامہ قرطبی نے پانچ خیال نقل کیے ہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ، کافروں کو ایسا غلبہ ہرگز نہ دے گا کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کا خاتمہ ہی کر دیں۔ ان کے الفاظ یہ ہیں کہ ؛

نہ شود کہ اسلام را مستاصل کردانند۔ واللہ اعلم

اور یہ مطلب بھی بتایا گیا ہے کہ مسلمان جب تک اسلام پر قائم رہیں گے اس وقت تک ان پر کافر غلبہ نہیں پا سکتے۔ گویا یہ آیت قرآن کی دوسری آیت کے ہم معنی ہے ۔

ولا تهنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان كنتم مومنين

ابن العربی نے اس کو سراہا ہے اور سید رشید رضا فرماتے ہیں کہ کافروں کو اہل ایمان پر اس وقت تک غلبہ نہ ہو گا جب تک اہلِ ایمان، ایمان کے حقوق ادا کرتے رہیں گے اور راہِ ایمان پر گامزن رہیں گے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ایک اہم حقیقت کا انکشاف

یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ جنگ اور سیاست میں مسلمانوں کے مقابلے میں کفر کے غلبہ کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو آپ کو پتہ لگ جائے گا کہ مسلمانوں کی مغلوبیت کا باعث یہ اور صرف یہ ہے کہ مسلمانوں کی ایمانی زندگی میں انقلاب آ گیا اور وہ اس مقصد کو بھول گئے جس کے لیے اللہ نے بے شمار قوموں کی موجودگی میں ان کو منتخب کیا تھا یعنی امر بالمعروف، نہی عن المنکر۔ وہ جو مقصد لے کر چلے تھے کہ انسانوں کو انسانوں کی خدائی سے نکال کر خدائے واحد کا پرستار بنائیں اسے فراموش کر دیا۔ لوگوں پر الٰہی قوانین کی جگہ اپنے وضع کردہ قوانین نافذ کرنے لگے۔ قید و بند سے آزاد ایک باغی زندگی گزارنے لگے۔ گویا نہ وہ نبی کی اُمت میں اور نہ ان کا وحی و رسالت پر ایمان ہے، نہ حساب کا ڈر ہے اور نہ آخرت کا خوف۔ وہ ان جاہلی قوموں سے پورے طور پر مشابہ ہو گئے جن سے وہ کل تک جنگ کرتے رہے تھے۔ اب وہ تمدن و اجتماع، سیاست، اخلاق، اور معاشرت میں ان ہی مغضوبین و ضالین کی تقلید کرنے لگے جن کی وجہ سے اللہ ان سے ناراض ہوا تھا اور اپنا غضب نازل کیا تھا۔

مسلمانوں کے پیشِ نظر کوئی صحیح اور اعلیٰ مقصد نہ رہا اور ان کی تگ و دو اور جد و جہد کھانے پینے اور عیش و عشرت تک محدود ہو گئی۔ دُنیا کی قوموں میں ان کا کوئی امتیاز اور خصوصیت باقی نہ رہی بلکہ ان کے بعض بادشاہ، صدرِ مملکت اور وزیرِ اعظم دوسری قوموں کے جابرہ اور فراعنہ سے بھی بازی لے گئے ان کے دولت مندوں میں تکبر پیدا ہو گیا۔ ان کے سردار اور اکابر قوم فسق و فجور میں مبتلا ہو گئے، یہاں تک کہ جب اس اُمت کے فساق و فجار، بغض و حسد، جاہ طلبی، دُنیا پرستی، عیش پسندی، آخرت سے غفلت، خون ریزی، بے حیائی، حق تلفی، بد عہدی، بے وفائی، حدود اللہ سے تجاوز، ظلم و بے انصافی، اسراف و تبذیر اور فواحش و منکرات وغیرہ مختلف جرائم میں دوسری قوموں سے بھی سبقت لے گئے باوجود اس کے کہ ان کے ملک میں کچھ دینی شعائر کا رواج تھا اور ان کے نام اسلامی قسم کے تھے وہ خدا کی نظروں میں حقیر ہو گئے اور باوجود اپنی وسیع سلطنت، تعدد افواج، بے شمار خزائن اور اپنی شاندار تہذیب کے وہ لوگوں کی نگاہ میں بے وقعت ہو گئے۔ لوگوں کے دلوں سے ان کی ہیبت اور عظمت جاتی رہی اور وہ ان پر جری ہو گئے اور دُنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایمان کا کفر سے نہیں بلکہ کفرِ عملی کا کفرِ حقیقی سے مقابلہ ہوا اور نتیجۃً وہ غالب رہا جس کے پاس طاقت تھی۔ قرآن نے یہاں جس غلبہ کے نہ ہونے کا اعلان کیا ہے وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کا غلبہ ہے۔

کفر کے مقابلہ کفر کے غلبہ نہ ہونے کا ثبت اعلان نہیں کر رہی ہے۔

آیتِ قرآنی کا مطلب صاف ہے کہ قیامت کے روز اللہ سبحانہ تمہارا فیصلہ فرمائے گا فاللہ یحکم بینکم یوم القیامۃ یہ آخرت کے بارے میں ہے اور آیت ولن یجعل اللہ للکافرین علی المومنین سبیلا میں دُنیا کے متعلق حکم مذکور ہے کہ دُنیا میں کافروں کو یہ قدرت نہ ہو گی کہ اہلِ ایمان کا قلع قمع کر دیں اور صفحۂ ہستی سے ان کا نام ونشان مٹا دیں۔ شیخ جلال الدین السیوطی نے تفسیر جلالین میں اسی کو اپنایا ہے اور شاہ ولی اللہ نے بھی یہی مطلب بتایا ہے اور جو مطلب میں نے بتایا ہے اسے ابن العربی نے اپنایا ہے۔ باقی کچھ اکابر کا یہ کہنا کہ مطلب یہ ہے کہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ تمہارا فیصلہ کریں گے اور اس فیصلہ میں کافروں کو مسلمانوں کے مقابلہ میں غلبہ نہیں دیں گے اسے محققین نے قبول نہیں کیا ہے۔ مفتی احمد یار نے آیت سے یہ نتیجہ خوب نکالا ہے کہ:

> اس سے معلوم ہوا کہ دُنیا کے تمام کافر و منافق متفق ہو کر اسلام اور مسلمانوں کو نہیں مٹا سکتے۔ مسلمان جہاں کہیں نقصان اٹھاتے ہیں اپنی غداری اور شامتِ اعمال کی وجہ سے اٹھاتے ہیں۔

مولانا کا یہ نتیجہ بالکل درست ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ ہماری ہر شکست خود ہمارے اعمالِ بد کا نتیجہ ہے۔

إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ يُخٰدِعُوْنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمْ ۚ وَإِذَا قَامُوْٓا
إِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوْا كُسَالٰى ۙ يُرَآءُوْنَ النَّاسَ وَلَا
يَذْكُرُوْنَ اللّٰهَ إِلَّا قَلِيْلًا ۞ مُذَبْذَبِيْنَ بَيْنَ
ذٰلِكَ ۖ لَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ وَلَآ إِلٰى هٰٓؤُلَآءِ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلِ
اللّٰهُ فَلَنْ تَجِدَ لَهٗ سَبِيْلًا ۞ يٰٓأَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا
لَا تَتَّخِذُوا الْكٰفِرِيْنَ أَوْلِيَآءَ مِنْ دُوْنِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۚ
أَتُرِيْدُوْنَ أَنْ تَجْعَلُوْا لِلّٰهِ عَلَيْكُمْ سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۞
إِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ فِي الدَّرْكِ الْأَسْفَلِ مِنَ النَّارِ ۚ
وَلَنْ تَجِدَ لَهُمْ نَصِيْرًا ۞ إِلَّا الَّذِيْنَ تَابُوْا وَأَصْلَحُوْا
وَاعْتَصَمُوْا بِاللّٰهِ وَأَخْلَصُوْا دِيْنَهُمْ لِلّٰهِ فَأُولٰٓئِكَ مَعَ
الْمُؤْمِنِيْنَ ۖ وَسَوْفَ يُؤْتِ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ أَجْرًا
عَظِيْمًا ۞ مَا يَفْعَلُ اللّٰهُ بِعَذَابِكُمْ إِنْ
شَكَرْتُمْ وَاٰمَنْتُمْ ۚ وَكَانَ اللّٰهُ شَاكِرًا عَلِيْمًا ۞

یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ بازی کر رہے ہیں، حالانکہ در حقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے[۲۱۳]۔ جب یہ نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے اور خدا کو کم ہی یاد کرتے ہیں[۲۱۴]۔ کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں، نہ پورے اس طرف ہیں نہ پورے اُس طرف، جسے اللہ بھٹکا دیتا ہو اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے[۲۱۵]۔ اے اہلِ ایمان! مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق و مددگار نہ بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کا صریح الزام اپنے اوپر لے لو، بلاشبہ منافق جہنم کے سب سے نیچے طبقہ میں ہوں گے اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے[۲۱۶]۔ البتہ جو ان میں سے تائب ہو جائیں اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کر دیں، ایسے

لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو ضرور اجرِ عظیم عطا فرمائے گا۔ آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزاری کرتے رہو اور ایمان کی راہ پر گامزن رہو اللہ بڑا قدر شناس اور علم والا ہے۔"[۴۸]

نفاق کے اور خصائص

ان آیات میں منافقین کے اعمال و خصائل کی مزید تفصیل پیش کی گئی ہے۔ انسانی عقائد و اعمال کی یہ تین حالتیں ایمان کفر اور نفاق کی کوئی نئی حالتیں نہیں ہیں۔ دنیا کے تمام گوشوں میں بھی تین حالتیں ہیں تکوین کی حالت، افساد کی حالت یا پھر ان دونوں کی درمیانی حالت، خود ہمارے وجود کا بھی یہی حال ہے، زندگی ہے یا موت اور یا بیماری۔ بیماری کو نہ تو زندگی کی صحیح حالت کہہ سکتے ہیں اور نہ ہی موت قرار دے سکتے ہیں، دونوں کے بین بین ہے۔ اسی طرح علم معنے میں ایمان زندگی ہے کفر موت ہے اور نفاق بیماری ہے اسی لیے قرآن نے اسے مرض سے تعبیر کیا ہے بظاہر کے اعتبار سے خوشنما لیکن باطن کے اعتبار سے گندگی کا سنڈاس ان کے چہرے نہایت شاندار ان کا لباس نہایت دیدہ زیب، ان کی زبان نہایت شیریں، ان کے ذہن نہایت روشن لیکن ان کی روح نہایت تاریک ان کے دل نہایت کھوکھلے، یقین سے قطعی خالی، ان کے افکار مذبذب، صبر و برداشت سے بالکل ناآشنا۔ اخلاق و ارادے کے نہایت کمزور، دین کو دنیا کے بدلے فروخت کرنے والے، آخرت پر دنیا کو ترجیح دینے والے، قوم اور ملک کو شخصی اغراض اور منافع اور نام نہاد عزت وجاہ کے عوض میں فروخت کر دینے والے، اپنی ذات اور قوم سے بدگمان رہنے والے، دوسروں پر بھروسہ کرنے والے۔ یہی لوگ آج کل نمائندے ہیں، ان ہی کے ہاتھ میں قوم کی باگ ڈور ہے، انہیں کو اسلامی ممالک کی بہار اور رونق کہنا چاہیے۔ یہ لوگ ہمیشہ اپنے

مخاطبوں کو روباہی فلسفہ کی تعلیم دیتے ہیں، ان میں بزدلی اور کم ہمتی کا پرچار کرتے ہیں، یہ طبقہ ہی جسم قوم کا وہ ناسور ہے جو ہمیشہ نت نئی صورتوں میں رونما ہوتا رہتا ہے۔ وطنیت، قومیت، لادینیت، عقلیت اور اشتراکیت اسی کے پستانوں سے دودھ پی کر پلتے اور جوان ہوتے ہیں۔

۱۴۳ - یہ منافق اللہ کے ساتھ دھوکہ کر رہے ہیں حالانکہ درحقیقت اللہ ہی نے انہیں دھوکہ میں ڈال رکھا ہے۔ یعنی دل سے کافر ہیں اور ظاہر میں مسلمان ہیں تاکہ دونوں طرف کی مضرت اور ایذا سے محفوظ رہیں اور دونوں سے فائدہ اٹھاتے رہیں۔ حق تعالیٰ نے ان کی اس دغابازی کی یہ سزا دی کہ ان کی تمام شرارتوں اور مخفی خباثتوں کو اپنے نبی پر ظاہر کر دیا، ایسا ذلیل کیا کہ کسی قابل نہ رہے اور سب دغابازی مسلمانوں پر کھل گئی اور آخرت میں جو اس کی سزا ملے گی وہ بھی ظاہر کر دی چنانچہ آئندہ آیتوں میں ذکر آ رہا ہے۔ خلاصہ یہ کہ ان کی دھوکہ بازی سے تو کچھ نہ ہوا اور اللہ نے ان کو ایسا دھوکہ میں ڈال دیا کہ دُنیا و آخرت دونوں میں غارت ہو گئے۔[1]

خدع کی نسبت جب اللہ کی طرف ہوتی ہے تو اس سے خداع کی مجازات مراد ہوتی ہے۔ قرطبی، الجصاص، رازی، اور ابن کثیر نے یہی معنے بتاتے ہیں۔ خادعھم کے معنے یہ ہوں گے کہ خدا نے ان کو دھوکہ میں ڈال رکھا ہے یعنی ان کو دھوکہ دینے میں ہرا رہا ہے اور مغلوب کر رہا ہے۔ خدا سے ہرانے اور مغلوب کرنے کا مطلب یہ ہے کہ خدا نے دُنیا میں اچھوں کی طرح بُروں کو بھی مہلتِ عمل دے رکھی ہے مگر یہ مہلت اس لیے نہیں ہے کہ خدا کا قانون ان کی طرف سے غافل ہے بلکہ اس لیے ہے کہ ہر عمل کا نتیجہ اپنے مقررہ وقت ہی پر ظاہر ہوا کرتا ہے لیکن شریر آدمی اس مہلت سے نڈر ہو جاتا ہے، وہ سمجھتا ہے کہ میں جو کچھ بھی کیے جاؤں میرے لیے کچھ ہونے والا نہیں ہے، حالانکہ اس کے لیے سب کچھ ہونے والا ہے مگر اپنے مقررہ وقت پر۔[1]

اور خدا کو دھوکہ دینے کا مطلب یہ ہے کہ اپنی اسلامی زندگی کے بارے میں خدا کے رسُول اور مسلمانوں کو دھوکہ میں رکھنا چاہتے ہیں۔ البقرہ کے آغاز میں یہ اضافہ بھی گزرا ہے و ما یخدعون الا انفسھم و ما یشعرون یعنی وہ اپنے آپ کو اس غلط فہمی میں مبتلا کر رہے ہیں کہ ان کی یہ منافقانہ روش ان کے لیے مفید ہو گی حالانکہ دراصل یہ ان کو دُنیا میں بھی نقصان پہنچائے گی اور آخرت میں بھی۔ دُنیا میں ایک منافق چند روز کے لیے تو دھوکا دے سکتا ہے مگر ہمیشہ اس کا دھوکا نہیں

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [1] ترجمان القرآن۔

چل سکتا۔ آخر کار اس کی منافقت کا راز فاش ہو کر رہتا ہے اور پھر معاشرے میں اس کی کوئی ساکھ باقی نہیں رہتی۔

اس سے معلوم ہوا کہ دھوکہ اور فریب بھی منافق کی ایک علامت ہوتی ہے اس کی فریب کاری کی داستان اسلامی تاریخ میں ایک المناک کہانی ہے یہاں اس کی تفصیل کا موقع نہیں ہے۔

دھوکہ بازی کی ایک مثال

۱۴۲۔ جب یہ نماز کو اٹھتے ہیں تو کسمساتے ہوئے محض لوگوں کو دکھانے کی خاطر اٹھتے ہیں اور اللہ کو کم ہی یاد کرتے ہیں۔ یعنی نماز جو نہایت ضروری اور خالص عبادت ہے اور اس کے ادا کرنے میں جانی، مالی کسی مضرت کا بھی اندیشہ نہیں ہے۔ منافق اس سے بھی جان چراتے ہیں۔ مجبوری لوگوں کے دکھانے اور دھوکہ دینے کو پڑھ لیتے ہیں کہ ان کے کفر کی کسی کو اطلاع نہ ہو اور مسلمان سمجھے جاویں پھر ایسوں سے اور کسی بات کی کیا توقع ہو سکتی ہے اور وہ کیسے مسلمان ہو سکتے ہیں[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین کی دھوکہ بازی کی ایک مثال ہے یعنی نماز کے لیے اٹھتے ہیں تو طبیعت پر جبر کر کے، الکساتے ہوئے، مارے باندھے محض اس ڈر سے کہ اگر نماز میں نہ گئے تو مسلمانوں کی مردم شماری کے رجسٹر سے نام ہی خارج ہو جائے گا۔ یہ محض دکھاوے کی نماز ہوتی ہے کہ مسلمان ان کو اپنے اندر شامل رکھیں اس وجہ سے اس میں اللہ کا ذکر اتنا ہی ہوتا ہے جتنا مجبوری اور دکھاوے کی نماز میں ہو سکتا ہے ظاہر ہے کہ یہ اللہ کے ساتھ صریح دھوکہ بازی ہے۔

اس آیت قرآنی سے یہ بات صاف واضح ہوتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں کوئی شخص مسلمانوں کی جماعت میں شمار ہی نہ ہو سکتا تھا جب تک کہ وہ نماز کا پابند نہ ہو، جس طرح تمام دنیوی جماعتیں اور مجلسیں اپنے اجتماعات میں کسی ممبر کے بلا عذر شرکت نہ ہونے کو اس کی عدم دلچسپی پر محمول کرتی ہیں۔ اور مسلسل چند اجتماعات سے غیر حاضر ہونے پر اسے ممبری سے خارج کر دیتی ہیں۔ اسی طرح اسلامی جماعت کے کسی رکن کا نماز باجماعت سے غیر حاضر رہنا اس زمانے میں اس بات کی صریح دلیل سمجھا جاتا تھا کہ وہ شخص اسلام سے کوئی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دلچسپی نہیں رکھتا۔ اور اگر وہ مسلسل چند مرتبہ جماعت سے غیر حاضر رہتا تو یہ سمجھ لیا جاتا تھا کہ وہ مسلمان نہیں ہے۔ اس بنا پر سخت سے سخت منافقوں کو بھی اس زمانے میں پانچوں وقت مسجد کی حاضری ضرور دینی پڑتی تھی کیونکہ اس کے بغیر وہ مسلمانوں کی جماعت میں شمار نہیں ہو سکتے تھے۔ البتہ جو چیز ان کو سچے اہل ایمان سے ممیز کرتی تھی وہ یہ تھی کہ سچے مومن ذوق و شوق سے آتے تھے۔ وقت سے پہلے مسجد میں پہنچ جاتے تھے۔ نماز سے فارغ ہو کر بھی مسجدوں میں ٹھہرتے تھے اور ان کی ایک ایک حرکت سے ظاہر ہوتا تھا کہ نماز سے ان کو حقیقی دلچسپی ہے، بخلاف اس کے اذان کی آواز سنتے ہی منافق کی جان پر بن جاتی تھی، دل پر جبر کر کے اٹھتا تھا، اس کے آنے کا انداز صاف غمازی کرتا تھا کہ آنہیں رہا بلکہ اپنے آپ کو کھینچ کر لا رہا ہے۔ جماعت ختم ہوتے ہی اس طرح بھاگتا تھا گویا کسی قیدی کو رہائی ملی ہے اور اس کی تمام حرکات و سکنات سے ظاہر ہوتا تھا کہ یہ شخص خدا کے ذکر سے کوئی رغبت نہیں رکھتا۔[1]

نفاق کی علامات

یہاں سے یہ بھی واضح ہو جاتا ہے کہ جن احادیث میں نفاق کی علامات بتائی گئی ہیں ان کا کیا مطلب ہے اور وہ قرآن ہی سے لی گئی ہیں۔ مثلاً ابن کثیر نے مسند احمد کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے کہ:

> منافقوں کی چند علامتیں ہیں جن کے ذریعے ان کی شناخت ہو سکتی ہے۔ اوّل سلام کی بجائے ان کی زبانوں پر لعنت ہوتی ہے، دوم لوٹ مار کا مال ان کی خوراک ہوتا ہے، سوم خیانت کا مال ان کا مال غنیمت ہوتا ہے، سوم مسجدوں کے قریب نہیں آتے بجز بحوالہ کرتے ہوتے، چہارم نمازوں میں شریک نہیں ہوتے مگر سب سے آخر میں اتراتے ہوئے، پنجم خود کسی سے محبت نہیں کرتے، ششم ان سے کوئی محبت نہیں کرتا، ہفتم رات کو شہتیر کی طرح بستروں پر دراز رہتے ہیں اور دن کو شور مچاتے پھرتے ہیں۔

صحیحین میں عبداللہ بن عمرو کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے:

> جس شخص میں چار باتیں ہوں گی وہ کورا منافق ہے اور جس میں ان چاروں میں

[1] تفہیم القرآن

ایک ہوگی اس میں نفاق کی ایک خصلت ہوگی۔ امانت میں خیانت، وعدہ خلافی، جھوٹ بولنا، غصہ میں آپے سے باہر ہو جانا، عہد کرکے توڑ ڈالنا۔

صحیح مسلم میں یہ اضافہ بھی ہے:

اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو، روزہ رکھتا ہو اور اس خیال میں مگن ہو کہ وہ مسلمان ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ نفاق کوئی ایسی حالت نہ تھی جو صرف حضور اقدس کے زمانہ ہی میں ظہور پذیر ہوئی ہے۔ اور نہ منافقوں کا گروہ کوئی ایسا گروہ تھا جو محض چھپے کافروں کا ایک سازشی گروہ ہو۔ یہ ایمان و عمل کی کمزوری کی ایک زیادہ سخت حالت ہے جس طرح اس زمانے میں تھی اسی طرح ہر زمانے میں ہو سکتی ہے اور ہوتی رہتی ہے۔

ان ارشادات میں جن اعمال کو نفاق کی علامات بتایا گیا ہے ان کا خلاصہ بداخلاقی، مطلب پرستی، خیانت اور دین سے بیزاری ہے۔ جب انسانی اخلاق بگڑ جاتا ہے تو اس کی زبان گندی اور اس کی حرکات خفیف ہو جاتی ہیں۔ جب اس میں مادۂ امانت نہیں رہتا تو لوٹ کا مال اس کو مال طیب نظر آنے لگتا ہے اور خیانت اس کی نظر میں مالِ غنیمت کی طرح محبوب بن جاتی ہے۔ جب اس میں مطلب پرستی اور شقاوت کوشی سرایت کر جاتی ہے تو اس کے پیشِ نظر بجز اپنے مطلب اور غرض کے کچھ نہیں ہوتا۔ اس کے دل میں کسی سے اُلفت نہیں رہتی اس لیے لوگوں کے دل بھی اس کی محبت سے خالی ہو جاتے ہیں۔ خود غرض انسانوں کا ہمیشہ یہی حشر ہوتا ہے اور جب قلب میں دین بیزاری آتی ہے تو نماز میں چستی باقی نہیں رہتی ہے۔ یہ منافقین کی معاشی اور معاشرتی زندگی کا اتنا سچا نقشہ ہے کہ اگر کوئی شخص ان کا اس سے زیادہ نقشہ کھینچنا چاہے تو کھینچ نہیں سکتا۔ ان میں سے ایک ایک عمل تقاضائے ایمان کے منافی ہے۔

اگر آج مسلمانوں کی اکثریت اپنے ایمان و عمل کا احتساب کرے تو اسے معلوم ہو جائے کہ نفاق کی حقیقت معلوم کرنے کے لیے اور کسی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں وہ اپنے ہی وجود میں اسے دیکھ لے سکتی ہے۔

منافق کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہوتا ہے

۲۱۵ - کفر و ایمان کے درمیان ڈانواڈول ہیں نہ پورے اس طرف ہیں نہ پورے اس طرف، جسے اللہ نے بھٹکا دیا ہو اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے۔ یعنی منافقین تو بالکل حیرت اور تردد

یں گرفتار ہیں، نہ ان کو اسلام پر اطمینان ہے نہ کفر پر، سخت پریشانی میں مبتلا ہیں، کبھی ایک طرف جھکتے ہیں کبھی دوسری طرف۔ اور اللہ جس کو بھٹکانا اور گمراہ کرنا چاہے اس کو نجات کا راستہ کہاں مل سکتا ہے[1]

اسلامی قوت کا اصلی منبع ایمان ہے۔ اسلامی زندگی میں معجزات اور خوارق ایمان ہی کا کارنامہ ہیں ایمان کی طاقت کا دشمن صرف شک و تذبذب ہے۔ شک اور تذبذب سے زیادہ ایمان کو پامال کرنے والی کوئی چیز نہیں۔ ایمان نام ہے ماورا محسوسات عالم غیب کی باتوں پر نبوت کی زبان سے سن کر مان لینے کا۔ وہ لوگ ہمیشہ تذبذب کا شکار رہتے ہیں جو عالم غیب کے حقائق کا صرف اپنی فکر کی نارسائیوں کی بنیاد پر انکار کرتے ہیں۔ وہ ہمیشہ کفر و ایمان کے دوراہے پر کھڑے رہتے ہیں۔ اس سلسلے میں تاریخ اسلام کی عظیم شخصیت بلکہ فلسفہ و تاریخ اور علوم عمرانیات کے امام علامہ ابن خلدون کی بات آب زر سے لکھنے کے قابل ہے۔

تم فکر کی اس خام خیالی پر ہرگز اعتماد نہ کرو کہ وہ کائنات اور اس کے اسباب و عوامل کا احاطہ کر سکتی ہے اور اس کے وجود کی ساری تفصیلات سے واقف ہو سکتی ہے۔ اس معاملہ میں فکر کی خود رائی حماقت پر مبنی سمجھو اور یہ سمجھ لو کہ ہر صاحب ادراک انسان ابتداء میں یہی سمجھتا ہے کہ سارے موجودات اس کے علم و ادراک کے احاطہ میں آگئے ہیں، کوئی چیز اس سے باہر نہیں رہی لیکن حقیقت اس کے خلاف ہے، تم بہرے کو دیکھتے ہو کہ اس کے نزدیک موجودات صرف چار محسوسات میں منحصر ہیں، مسموعات کی قسم بہرے سے اس کے دائرہ سے خارج ہے، اسی طرح اندھا، اس کی شمار سے مرئیات کی قسم بالکل خارج ہو جاتی ہے اور غیر محسوس اشیاء میں اگر ان کے اباؤ اجداد اور ان کے زمانہ کے بزرگوں اور دوسرے تمام لوگوں کا تقلیدی علم نہ ہو تو ان کے تسلیم کرنے سے بھی انکار کر دیں، لیکن وہ ان غیر محسوس اصناف کی اثبات میں عام لوگوں کی اتباع کرتے ہیں۔ اور ان کو اپنی فطرت اور طبیعت اور اکیہ کی مدد سے قبول نہیں کرتے، اگر بے زبان بولنے لگے اور ان سے پوچھا جائے تو ہم ان کو معقولات کا منکر ہی پائیں گے اور ان کے نزدیک معقولات کا پورا خزانہ ساقط الاعتبار ہوگا اور جب یہ بات واضح ہو گئی تو بہت ممکن ہے ایسے مدرکات بھی عالم میں موجود ہوں جو ہمارے ادراک سے باہر ہوں، کیونکہ

[1] افادات شیخ الاسلام

جانتے اور اکات مخلوق اور حادث ہیں اور اللہ کی مخلوقات انسان کی معلومات سے کہیں زیادہ ہیں اور موجودات کا حصر ممکن ہی نہیں اور ان کا دائرہ بہت وسیع ہے اللہ ہی ان کا احاطہ کر سکتا ہے لہذا موجودات کے معاملے کے بارے میں اپنے ادراک اور اپنی مدرکات کی تردید کر دو اور رسول اللہ علیہ السلام کے بتائے ہوئے عقیدہ اور عمل پر قائم ہو کیونکہ وہ تمہاری بھلائی کے حریص ہیں اور تمہارے لیے نفع بخش چیزوں کو وہ تم سے زیادہ جانتے ہیں انسان کے ادراکات تمہارے ادراکات سے بلند ہیں۔ اور ان کی عقل کا دائرہ تمہاری عقل کے دائرہ سے وسیع ہے اور یہ عقل اور اس کے ادراکات کے لیے کوئی عیب کی بات نہیں کیونکہ عقل ایک صحیح ترازو کی طرح ہے اور اس کے احکام قطعی اور یقینی ہیں ان میں غلطی یا جھوٹ کا شائبہ نہیں، لیکن تم کو یہ امید نہیں کرنا چاہیے کہ اسی ترازو سے امور توحید و آخرت اور صفات الہیہ کی حقیقت بھی تول سکو گے، کیونکہ یہ امید محال ہے اور اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص سونا تولنے والا کانٹا دیکھے تو یہ امید وابستہ کرے کہ اسی سے پہاڑ بھی تول سکتا ہے لیکن اس سے یہ بات تو ثابت نہیں ہوتی کہ کانٹا اپنے تول میں سچا نہیں، اسی طرح عقل کے بھی حدود ہیں جہاں اس کو ٹھہرنا پڑتا ہے۔ اس سے وہ آگے نہیں بڑھ سکتی کہ وہ اللہ کی ذات و صفات کو بھی اپنی ادراکات کے دائرہ میں داخل کرے بلکہ وہ اس کے پیدا کیے ہوئے بے شمار ذرات میں سے ایک حقیر ذرہ ہے۔

اضلال و ہدایت کا قانون

اور یہ جو فرمایا ہے کہ جسے اللہ بھٹکا دیتا ہے اس کے لیے تم کوئی راستہ نہیں پا سکتے تو اللہ کا یہ فعل اضلال اس کی سنت تکوینی کے تحت ہے جس کے مطابق وہ ہر عزم عمل پر عمل کا ترتب فرماتا ہے ہدایت اور ضلالت اللہ سبحانہ کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا برے کام کے جواب میں اللہ کی طرف سے ہوتا ہے۔ ہدایت کی طرح اللہ تعالیٰ کی جانب سے گمراہی بھی اترتی ہے مگر کس کے لیے بتصریح فرمایا وما یضل به الا الفاسقین اس سے معلوم ہوا کہ انسان کی بدعملی پہلے ہوتی ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جزا میں گمراہ کرنا اضلال فرمانا مؤخر ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسان کی بدعملی پہلے ہوتی ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں اضلال بعد میں ہوتا ہے اور یہی طبعی اصول ہے انسان

جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے تب آنسو کے قطرے نکلتے ہیں۔

اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس نے خدا کے کلام اور اس کے رسول کی سیرت سے ہدایت نہ پائی ہو، جس کو سچائی سے منحرف اور باطل کی طرف راغب دیکھ کر خدا نے بھی اسی طرف پھیر دیا ہو جس طرف وہ خود پھرنا چاہتا تھا اور جس کی ضلالت طلبی کی وجہ سے خدا نے اس پر ہدایت کے دروازے بند اور صرف ضلالت کے راستے کھول دیے ہوں۔ ایسے شخص کو راہِ راست دکھانا درحقیقت کسی انسان کے بس کا کام نہیں ہے۔ اس معاملہ کو رزق کی مثال سے سمجھئے، یہ ایک حقیقت ہے کہ رزق کے تمام خزانے اللہ کے قبضۂ قدرت میں ہیں۔ جس انسان کو جو کچھ بھی ملتا ہے اللہ ہی کے ہاں سے ملتا ہے مگر اللہ ہر شخص کو رزق اس راستہ سے دیتا ہے جس راہ سے وہ خود مانگتا ہو۔ اگر کوئی شخص اپنا رزق حلال راستہ سے تلاش کرے اور اسی کے لیے کوشش بھی کرے تو اللہ اس کے لیے حلال راستہ کھول دیتا ہے، اور جتنی اس کی نیت صادق ہوتی ہے اسی نسبت سے حرام کے راستے اس کے لیے بند کر دیتا ہے بخلاف اس کے جو شخص حرام خوری پر تلا ہوا ہے اور اسی کے لیے سعی کرتا ہے، اس کو خدا کے اذن سے حرام ہی کی روٹی ملتی ہے۔ اور پھر یہ کسی کے بس کی بات نہیں کہ اس کے نصیب میں رزقِ حلال لکھ دے، بالکل اسی طرح یہ حقیقت بھی ہے کہ دنیا میں فکر و عمل کی تمام راہیں اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہیں۔ کوئی شخص کسی راہ پر بھی اللہ کے اذن اور اس کی توفیق کے بغیر چل نہیں سکتا، رہی یہ بات کہ کس شخص کو کون سے راستے پر چلنے کا اذن ملتا ہے اور کس راہ کی راہ روی کے اسباب اس کے لیے ہموار کیے جاتے ہیں تو اس کا دارومدار آدمی کی اپنی طلب اور سعی پر ہے اگر وہ خدا سے لگاؤ رکھتا ہے سچائی کا طالب ہے اور خالص نیت سے خدا کے راستہ پر چلنے کی سعی کرتا ہے تو اللہ تعالیٰ اس کی توفیق ارزانی فرما دیتا ہے اور اسی راہ پر چلنے کے اسباب اس کے لیے ہموار کر دیتا ہے بخلاف اس شخص کے جو خود گمراہی کو پسند کرتا ہے اور غلط راہوں پر چلنے کی سعی کرتا ہے اللہ سبحانہٗ کی طرف سے اس کے لیے ہدایت کے دروازے بند ہو جاتے ہیں اور وہی راہیں اس کے لیے کھول دی جاتی ہیں جن کو اس نے آپ اپنے لیے منتخب کیا ہے۔ ایسے شخص کو غلط سوچنے، غلط کام کرنے اور غلط راہوں پر اپنی قوتیں صرف کرنے سے بچا لینا کسی کے اختیار میں نہیں ہے۔ اپنے نصیب کی راہِ راست جس نے خود کھو دی اور جس سے اللہ نے اسے محروم کر دیا اس کے لیے یہ گم شدہ نعمت کسی کے ڈھونڈنے سے نہیں مل سکتی ہے۔ [1]

---

[1] تفہیم القرآن

کفر سے عدم موالات

۲۱۶ ۔ اے اہل ایمان: مومنوں کو چھوڑ کر کافروں کو اپنا رفیق و مددگار بناؤ کیا تم چاہتے ہو کہ خدا کا صریح الزام اپنے اوپر لے لو، بلاشبہ منافق جہنم کے سب سے نچلے طبقہ میں اور تم کسی کو ان کا مددگار نہ پاؤ گے۔ یعنی مسلمانوں کو چھوڑ کر کافروں سے دوستی کرنا دلیل ہے نفاق کی۔ جیسا کہ منافقین کرتے ہیں لہٰذا اے مسلمانو! تم ایسا ہرگز نہ کرنا ورنہ اللہ تعالیٰ کا صریح الزام اور پوری حجت تم پر قائم ہو جائے گی کہ تم بھی منافق ہو اور منافقوں کے لیے دوزخ کا سب سے نیچا طبقہ ہے اور کوئی ان کا مددگار نہیں ہو سکتا کہ اس طبقہ سے ان کو نکالے یا عذاب میں کچھ تخفیف کرادے، مسلمانوں کو ایسی بات سے دور رہنا چاہیے۔[1]

کافرین سے مراد یہاں اہل کتاب خاص طور پر یہود ہیں جن سے منافقین کی سازباز تھی جیسا کہ آیت ۶۰، ۶۱ میں گزر چکا ہے۔ اولیاء جمع ولی کی ہے اس کے معنے کارساز، حمایتی، ساتھی، دوست اور مددگار کے ہیں جس کی طرف ضرورت کے وقت رجوع کیا جائے اور جس کا محبت و حمایت کے جذبہ سے ساتھ دیا جائے۔ فرمایا کہ مسلمانوں کے لیے جائز نہیں کہ وہ کافروں کو اپنا ولی بنائیں لیکن اس کے ساتھ من دون المومنین کی قید ہے یعنی کافروں کے ساتھ صرف اس قسم کی موالات ناجائز ہے جو مسلمانوں کے بالمقابل یا ان کے مفاد و مصالح کے خلاف ہو، اسلام کا حق اور مفاد دوسرے تمام حقوق و مفادات پر مقدم ہے اس لیے مسلمانوں کی کسی جماعت کے لیے یہ بات جائز نہیں ہے کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے مفاد و مصالح کے برخلاف کفار کی کسی جماعت کے ساتھ موالات کا تعلق قائم کرے۔ اس قید نے یہ بات واضح کر دی کہ غیر حربی کفار کے ساتھ اس نیکی، عدل اور احسان کی ممانعت نہیں ہے جس کی اسلام نے تمام بنی نوع انسان کے معاملے میں ہدایت فرمائی ہے۔ مسلمان غیر مسلم قوموں اور حکومتوں کے ساتھ دوستانہ سیاسی و اقتصادی معاہدے بھی کر سکتے ہیں۔

ترک موالات کا مطلب یہ ہے کہ جو غیر مسلم مسلمانوں کے حریف و دشمن اور حملہ آور فریق کا حکم رکھتے ہوں۔ ان سے تمام ایسے تعلقات ترک کر دینا جو محبت، خدمت اور اعانت پر مبنی ہوں۔ اگر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کوئی مسلمان ایسے تعلقات رکھے گا تو اس کا شمار بھی شریعت کے نزدیک انہی غیر مسلموں میں ہوگا مسلمانوں میں نہ ہوگا۔

قرآن حکیم نے اس بارے میں ایک اصولی تقسیم کردی ہے، تمام غیر مسلم اقوام و افراد کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے ایک قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو نہ تو مسلمانوں سے لڑتے ہیں اور نہ ان پر حملہ آور ہیں نہ ان کی آبادیوں پر قابض ہونا چاہتے ہیں، دوسری قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو یہ ساری باتیں کر رہے ہیں یعنی لڑتے ہیں، حملہ آور ہیں، اسلامی ممالک پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں یا کر چکے ہیں۔

اسلام کا حکم یہ ہے کہ پہلی قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمانوں کو نیکی و محبت اور ہر طرح کے احسان و خیر خواہی اور حسن معاملات کا سلوک کرنا چاہیے۔ اسلام اس سے ہرگز مانع نہیں ہے۔ عالمگیر محبت اس کی دعوت حق کا اصل الاصول ہے۔ البتہ دوسری قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ وہ اجازت نہیں دیتا کہ اس طرح کا کوئی علاقہ بھی مسلمان رکھیں، اگر رکھیں گے تو ان کا شمار بھی اللہ اور اس کی شریعت کے دشمنوں میں ہوگا۔ ایک مسلمان کے سارے گناہوں سے قرآن چشم پوشی کر سکتا ہے لیکن اگر دوسری قسم کے غیر مسلموں سے محبت کرتا ہے یا کسی طرح کا واسطہ رکھتا ہے تو یہ صرف گناہ نہیں بلکہ نفاق ہے۔ مسلمانوں کو اس سے اپنا دامن بچا کر رکھنا چاہیے۔ یہ جرم کوئی معمولی جرم نہیں ہے اس جرم کا ارتکاب کر کے مسلمان اپنے خلاف اللہ کو ایسی حجت قاطعہ فراہم کر دیتا ہے کہ پھر کسی عذر کی گنجائش نہیں ہوسکتی۔ اس کی سزا دوزخ ہونا بالکل مبرہن ہو جائے گا اور دوزخ میں سزا بھی ایسی سنگین ہے کہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقہ میں ہوں گے یعنی ان کا درجہ کٹر اور معاند کفار سے بھی نیچے ہے جس کا عذاب جہنم کے تمام طبقوں سے بڑا ہوا ہے۔ دوزخ کے سات طبقے ہیں سب سے نیچے طبقہ میں سب سے زیادہ سخت عذاب ہوگا۔

منافقین کے لیے توبہ کا دروازہ کھلا ہے

۱۴۶۔ البتہ ان میں سے جو تائب ہو جائیں اور اپنے طرز عمل کی اصلاح کرلیں اور اللہ کا دامن تھام لیں اور اپنے دین کو اللہ کے لیے خالص کرلیں ایسے لوگ مومنوں کے ساتھ ہیں اور اللہ مومنوں کو اجر عظیم مرحمت فرمائے گا۔ یعنی جو منافق اپنے نفاق سے توبہ کرے اور اپنے اعمال کی درستی کرے اور اللہ کے پسندیدہ دین کو خوب مضبوط پکڑے اور اللہ پر توکل کرے اور ریا وغیرہ خرابیوں سے دین کو پاک و صاف رکھے تو وہ خالص مسلمان ہے۔ دین و دنیا میں ایمان والوں کے ساتھ ہوگا اور ایمان والوں کو بڑا ثواب ملنے والا ہے ان کے ساتھ ان کو بھی ملے گا جتنا

نے نفاق سے سچی توبہ کی۔[1]

یہاں منافق کی توبہ کے صحیح ہونے کے لیے تین شرطیں بتائی ہیں، اصلاح، اعتصام باللہ اور اخلاص للہ۔

اصلاح یہ ہے کہ فکر و عمل میں درستگی آجائے، کہیں بھی بگاڑ نہ ہو، اور پورے طرزِ عمل کی بنا اچھائی اور راستی پر ہو۔

اعتصام یہ ہے کہ اپنے فکر و عمل میں نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے وابستہ ہو جائیں۔

اخلاص یہ ہے کہ اپنی وفاداریاں نبوت کے نظامِ حیات کے علاوہ کسی اور سے وابستہ نہ ہوں۔ اپنی ساری دلچسپیوں، محبتوں اور عقیدتوں کو وہ اللہ کے آگے نذر کر دے۔ کسی چیز کے ساتھ بھی دل کا لگاؤ ایسا باقی نہ رہے کہ اللہ کی رضا کے لیے اسے قربان نہ کیا جا سکتا ہو، فقہا نے آیت سے یہ مسئلہ خوب نکالا ہے کہ اعمال تقرب و عبادت ہر قسم کے شائبہ ریا سے اور ہر قسم کے دنیوی معاوضہ سے پاک ہونا چاہیے اور یہ بھی بتایا ہے کہ آذان و حج وغیرہ پر معاوضہ قبول کرنا جائز نہیں ہے۔ اگرچہ متاخرین نے ضرورت کی بنا پر بعد کو جواز کا فتویٰ دیا ہے۔ پوری آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ منافقین جو اس قدر شدید وعیدوں کے مستحق ہیں۔ وہ بھی اللہ کی رحمت اور مغفرت سے مایوس نہ ہوں۔ توبہ اور اصلاح حال تو ان کی اپنی اختیاری چیز ہے۔ جب اور جس وقت چاہیں کر سکتے ہیں اور سیدھی راہ اختیار کر کے مومنین کی معیت حاصل کر سکتے ہیں۔

ایمان و شکر عذاب سے مانع ہے

۱۴۸۔ آخر اللہ کو کیا پڑی ہے کہ تمہیں خواہ مخواہ سزا دے اگر تم شکر گزاری کرتے رہو، اور ایمان کی راہ پر گامزن رہو اللہ بڑا قدر شناس اور علم والا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نیک کاموں کا قدر دان ہے اور بندوں کی سب باتوں کو خوب جانتا ہے لہٰذا جو شخص اس کے حکم کو ممنونیت اور شکر گزاری کے ساتھ تسلیم کرتا ہے اور اس پر یقین رکھتا ہے تو اللہ عادل رحیم کو ایسے شخص پر عذاب کرنے سے کوئی تعلق نہیں یعنی ایسے شخص کو ہرگز عذاب نہ دے گا وہ تو سرکش اور نافرمانوں کو عذاب دیتا ہے۔[2]

---

[1] [2] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں منافقین کو مخاطب کر کے باندازِ التفات فرمایا کہ خدا کو تمہیں عذاب دینے سے کوئی فائدہ ہے اگر تم شکر گزار بن جاؤ اور ایمان اختیار کر لو تو اللہ بڑا قدر دان اور ہر ایک کے ایمان و عمل سے اچھی طرح باخبر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ کے ساتھ احسان فراموشی کا رویہ اختیار نہ کرو بلکہ صحیح طور پر احسان مند بن کر رہو تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ خواہ مخواہ تمہیں سزا دے۔ اپنے محسن کے مقابلہ میں صحیح احسان مندانہ رویہ یہی ہو سکتا ہے کہ آدمی دل سے اس کے احسان کا اعتراف کرے زبان سے اس کا اقرار کرے اور عمل سے احسان مندی کا ثبوت دے، ان کے مجموعہ کا نام شکر ہے اور اس شکر کا تقاضا یہ ہے کہ اولاً احسان کی اس کی طرف نسبت کرے، ثانیاً محسن کے لیے محبت اور وفاداری کے جذبات سے آدمی کا دل سرشار ہو، ثالثاً، اپنے محسن کا مطیع و فرمانبردار ہو، اور بس۔

الحمد للہ معالم القرآن کی پانچویں جلد آج مورخہ ۳۰، جمادی الاول ۱۳۹۰ھ، ۱۹ر مئی ۱۹۷۰ء، جمعرات کے دن بوقت ۱۱ بج کر ۵ منٹ پر اللہ کی توفیق سے مکمل ہوئی۔

ربّ تقبل منی انک انت السمیع العلیم

معالم القرآن

جلد ششم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

علم و کتاب واٹس ایپ گروپ

نام — — — — — معالم القرآن
موضوع — — — — تشریح وتفسیر
ملکیت — — — — ادارہ تعلیمات قرآن، سیالکوٹ
تالیف — — — — حضرت مولانا الحاج محمد علی صاحب الصدیقی الکاندھلوی
عناوین — — — — ۳۸۸
آیات — — — — ۱۱۱
طابع — — — — محمد اسلم قریشی
تزئین وآرائش — — — — سید محمد انور حسین نفیس رقم، لاہور
کتابت — — — — محمد احمد صوفی، گوجرانوالہ
ناشر — — — — قاری عبدالرحمان، ایم۔اے
صفحات — — — — ۴۳۶
تاریخ اشاعت — — — — شوال المکرم ۱۳۹۰ھ مطابق اکتوبر ۱۹۷۰ء
مطبع — — — —

قیمت ۔ ۱۵۰ روپے

ملنے کا پتہ ۔ دارالعلوم الشہابیہ، رنگ پورہ روڈ، سیالکوٹ، پاکستان

دریا بحباب اندر

سورۃ کا نام

انتساب

میں تفسیر معالم العرفان کی چھٹی جلد کو جس میں اُمت کو دین کی تکمیل کی خوشخبری سُنا کر رہتی دُنیا تک قوامیت اور شہادت علی الناس کے منصب جلیل پر فائز کیا گیا ہے قابلِ صد احترام حافظ عبدالرشید خاقان صاحب کے نام منسوب کرتا ہوں جن کی قرآن کی اشاعت میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ دریادلی سے یہ جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس جذبۂ خیر کو تا دیر قائم رکھے اور ان کے لیے دُنیا اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین۔

قاری عبدالرحمٰن ایم۔اے
ناظم ادارہ تعلیمات قرآن سیالکوٹ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

حرفِ آغاز

الحمد للہ وحدہ والسلام علیٰ من لا نبی بعدہ ، اللہ سبحانہ کا بہت بڑا انعام ہے کہ معالم القرآن کی جلد ششم کی تکمیل کا سامان فرمایا۔ معالم القرآن کی پانچویں جلد شوال [illegible]ھ مطابق اکتوبر [illegible]ء میں شائع ہوئی۔ اب پورے چھ ماہ بعد اس کی جلد ششم آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔ اس کی تالیف زیادہ تر سفر میں ہوئی ہے۔ گوجرانوالہ کے الحاج عبدالغنی صاحب مالک الیوم الوطن شوزیٔ کویت کی دعوت پر کویت جانا پڑا۔ حاجی صاحب موصوف ہی کی فیکٹری میں صبح ۸ بجے سے ۱۲ بجے دوپہر تک تفسیر کا کام روزانہ معمول بن گیا۔ نومبر کے آغاز میں حاجی صاحب کے دوشِ ہمت پر سوار ہو کر اس جگہ پہنچنے کا ارادہ ہو گیا جہاں کی سرزمین پر نہ تو سبزہ کا فرش ہے اور نہ اس کی آغوش میں نہروں اور ندیوں کی ریل پیل ہے، اس کے چاروں طرف جلے ہوتے پہاڑ کھڑے پہرہ دیتے ہیں۔ لیکن بقول حفیظ ؎

نہ اس میں گھاس اگتی ہے نہ اس میں پھول کھلتے ہیں
مگر اس سرزمیں سے آسماں بھی جھک کے ملتے ہیں

ارادے کو عمل کا جامہ پہنانے کی ساری کوشش حاجی عبدالغنی کی مخلصانہ ہمدردی کی رہین منت ہے۔ خبر نہیں کہ لوگوں کو اس سلسلہ میں کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں مگر میں الحمد للہ ان سب جھمیلوں سے بے نیاز رہا۔ حاجی صاحب موصوف کی ہمت اور ریاض صاحب کی محنت سے تاریخ مقررہ پر دوستوں کے جلو میں جہاز پر سوار ہوا اور احباب کے پرخلوص نرغے میں جدہ پہنچ گیا۔ عزیز طارق کی معیت میں حرم پاک میں پہنچا۔ پہلے بھی چار مرتبہ مجھے یہاں آنے کی سعادت نصیب ہوئی مگر اس بار میرا قلب عجیب کیفیات سے دوچار تھا۔ عمرہ کیا اور کچھ روز کے بعد حج کی سعادتوں سے ہمدوش

ہونے کا بھی موقعہ مل گیا۔ عرفات میں جب اس بار دعا کے لیے کھڑا ہوا تو یوں محسوس ہو رہا تھا کہ دراجابت وا ہو چکا ہے اور رحمت گنہگار بندوں کو پیار کر رہی ہے۔ اسی وقت میرے دل میں خیال آیا کہ اس ساری کائناتِ انسانی میں اللہ کی عبادت کرنے والی مسلمانوں کے سوا کوئی قوم نہیں۔ اللہ اکبر کیا نسبت ہے دنیا کی قوموں کی رسوم عبادات کو اس عبادت سے جسے ہم حج کہتے ہیں کفن بردوش ننگے سر ننگے بدن بال بڑھے، چہرہ خاک آلود، لاکھوں انسان بلبلا رہے ہیں، آہیں بھر رہے ہیں۔ اس آہ و فغاں کے شور میں جب فضا میں یہ ترانے گونجتے ہیں لبیک اللھم لبیک لا شریک لک لبیک اور لا الہ الا اللہ وحدہ لا شریک لہ الخ تو روح پر وجد کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اگر حج نہ ہوتا تو انسانیت کا اپنے مولیٰ سے عاشقانہ تعلقات کا ظہور نہ ہوتا۔ اور پوری انسانیت سوز و گداز، ذوق و شوق والی عبادت سے بیگانہ ہوتی۔ عرفات سے چل کر مزدلفہ پہنچے۔ رات گزاری، مزدلفہ سے منیٰ کی طرف پیدل مارچ کر دیا۔ منیٰ پہنچ کر مجھے بخار آگیا۔ قربانی کا کام الحاج نذیر احمد اور قاری عبدالرحمٰن نے اپنے ذمہ لے لیا۔ طواف کے لیے قاری صدیق مجھے حرم لے گئے۔ طواف اور سعی سے فراغت ہوئی، احرام کے کپڑے اتارے نہیں بلکہ جنوں کی وادیوں سے نکل کر فرزانگی میں آتے، کپڑے پہن کر پھر منیٰ روانہ ہو گئے۔ بخار زوروں پر تھا۔ مجھے تو علم نہیں مگر بتانے والے بتاتے ہیں کہ ۱۰۳ بخار ہے۔ الحمدللہ حج کے سارے ارکان بغیر دخرابی پایۂ تکمیل کو پہنچے اور خوشی کی بات یہ ہے کہ بخار اور کمزوری کے باوجود کوئی نماز بھی بغیر جماعت کے نہیں پڑھی۔ ۱۳ کو مکہ میں واپسی ہوئی لیکن بخار اسی طرح رہا، وہاں سے یہ خیال کر کے جدہ آگیا کہ تبدیل ہوا سے شاید بخار ہٹ جائے لیکن یہاں چند روز قیام میں طبیعت اور بگڑ گئی۔ یہاں احباب کی موجودگی سے اگرچہ دل باغ و بہار رہا لیکن کمزوری میں اضافہ ہو گیا۔ یہاں جن دوستوں کی اخلاص کیشی سے میں متاثر ہوا اور جو مجھے پوری زندگی نہ بھولے گی ان میں قاری عبدالرحمٰن ایم اے، حاجی نذیر صاحب، حکیم محمد عبدالواحد مولانا سعید احمد، حاجی محمد بشیر، حاجی محمد نفیس اور پروفیسر عصمت اللہ اور محمد طارق صاحب خاص طور پر قابلِ ذکر ہیں۔ بالآخر ۲۰ نومبر کو کویت روانہ ہو گیا۔ عزیز عبدالرشید خاقان کے پاس فروانیہ میں قیام کیا۔ الحمدللہ جاتے ہی دو روز کے بعد طبیعت سنبھل گئی اور بخار ختم ہو گیا۔ مکہ کے زمانہ قیام میں تفسیر کا کام بالکل بند رہا۔ کویت پہنچ کر پھر تفسیر کا کام شروع کیا۔ پورا دسمبر اور جنوری کی پندرہ تاریخ تک کام کیا۔ حج سے واپسی تو ہو گئی مگر نشاط کی کیفیت سے محرومی پر دل کڑھتا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ بخار کی مزاحمتوں کے ہاتھوں مجبور ہو کر جو کام چھوڑ آیا ہوں پورا کر دوں اور شوق کے پروں پر

اُڑتا ہوا مدینہ منورہ کی طرف چلوں محبت اور وفا کی کشش مجھے مدینہ منورہ کھینچ رہی تھی۔ پھر جناب حاجی عبدالغنی کی دریادلی نے میری ہمت کے لیے مہمیز کا کام کیا۔ انہوں نے اپنی کار اور اپنے چھوٹے بھائی عبدالرحمن سلمہٗ کو اس کے لیے تیار کر دیا۔ بالآخر ۱۲ صفر المظفر مطابق ۱۷ جنوری شنبہ صبح ۸ بجے مدینہ منورہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ بعد نماز مغرب الخبر پہنچا۔ یہاں ملک عباس حسین اور عزیزان قاری محمد صدیق، ماسٹر انور، رشید اور بابر مصطفیٰ بٹ پہلے سے چشم براہ تھے۔ رات کو قیام کیا اور صبح ۸ بجے وہاں سے روانہ ہو کر رات کو ۹ بجے الریاض پہنچا، یہاں محمد رفیق صاحب کو انتظار تھا۔ رات کو یہاں قیام کر کے صبح ۶ بجے مدینہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ ظہر کی نماز بریدہ میں پڑھی۔ نماز سے فارغ ہو کر شوق مدینہ نے سفر کو جاری رکھنے پر مجبور کر دیا۔ جب میں مدینہ منورہ زاد ہا اللہ شرفا پہنچا رات کے دس بج چکے تھے۔ حرم نبویؐ بند ہو چکا تھا۔ فندق الزہراء میں قیام کیا۔ صبح ۳ بجے بیدار ہو کر اپنی حاجات ضروریہ وضو اور چائے سے فارغ ہی ہوا تھا کہ حرم سے اذان تہجد کی آواز بلند ہوئی فوراً حرم پہنچا۔ سب سے پہلے مسجد نبوی میں دو رکعت نماز ادا کی اور سعادت کے نصیب ہونے پر اللہ کا شکر ادا کیا۔ پھر بارگاہِ نبوت میں حاضر ہوا۔ آپ پر درود و سلام پیش کیا اور گواہی دی کہ بے شک آپ نے اللہ کا پیغام کما حقہٗ پہنچا دیا۔ درود و سلام سے فارغ ہو کر ریاض الجنۃ میں آیا۔ یہ زمین کا حصہ حضور انور کی خواب گاہ اور منبر کے درمیان چھوٹا سا قطعہ ہے۔ جہاں انوار و رحمت برستے ہیں اور جہاں سے اسلام کے جاں نثاروں کی یادیں وابستہ ہیں۔ نماز تہجد ادا کی۔ صبح کی نماز سے فارغ ہو کر قبا گیا۔ قبا کی مسجد میں دو رکعت نماز پڑھی۔ عصر کی نماز کے بعد جنت البقیع کی طرف گیا۔ یہاں سے فارغ ہو کر اُحد گیا۔ یہی میدان ہے جہاں ایمان و یقین اپنی اصلی صورت میں نظر آیا۔ نماز عشاء کے بعد حضرت شیخ الحدیث جناب مولانا محمد زکریا صاحب کی زیارت کی۔ حضرت شیخ نے کھانے کی دعوت دی، دوسرے روز ان کے یہاں کھانے میں شریک ہوا۔ جمعرات کے روز صبح قیام گاہ میں غسل کر کے احرام کے لباس میں ملبوس ہو کر مکہ کے لیے تیار ہو گیا۔ ۸ بجے مدینہ سے مکہ کی طرف روانگی ہو گئی۔ راستہ میں شہداء بدر کی زیارت کی اور بالآخر بعد نماز عصر مکہ میں پہنچا۔ عمرہ ادا کیا یعنی بیت اللہ کا طواف کیا۔ سعی بین الصفا والمروہ کی۔ عمرہ ادا کرنے کے بعد جناب فضل حق صاحب کے یہاں قیام کیا۔ یہ باغ و بہار شخصیت ہیں۔ ہر بار پر تپاک خیر مقدم پر اصرار ان کی طبیعت کا تقاضا بن گئی تھی۔ اس سفر میں الحمدللہ تفسیر کا کام جاری رہا۔ جہاں بھی قیام کیا۔ کچھ نہ کچھ کام ضرور کیا۔ اس بار مکہ کے قیام میں جن احباب کے صدق و صفا اور مہر و وفا سے سابقہ پڑا ہے ان میں جناب الحاج

فضل حق صاحب مالک فضل میڈیکل سٹور کے علاوہ جناب پروفیسر عصمت اللہ صاحب، جناب الحاج عزت اللہ صاحب، جناب الحاج محمد طارق صاحب، جناب الحاج مولانا محمد سعید صاحب، جناب الحاج محمد بشیر صاحب، جناب الحاج محمد نفیس صاحب، خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ۱۳ جنوری کو مکہ سے واپس ہو کر طائف، زلفی، الریاض ہوتا ہوا الخبر پہنچا۔ الخبر میں دو روز قیام کے دوران ملک عباس حسین صاحب کے اصرار سے دو تبلیغی اجتماعات سے خطابات کا موقعہ ملا۔ جمعہ کے روز نماز کے بعد ملک صاحب موصوف قاری محمد صدیق، بابر مصطفیٰ بٹ اور ماسٹر محمد انور سے رخصت ہو کر رات کے ۹ بجے کویت پہنچ گیا۔ کویت میں آکر مرقاب میں جناب الحاج محمد الیاس صاحب کے مکان پر قیام کیا اور وہیں تفسیر کا کام کیا۔ میں مولانا احمد القاسم خطیب مسجد کارپوریشن کویت کا بے حد مشکور ہوں کہ انہوں نے تفسیر کے کام میں مجھ سے کتابی تعاون کیا اور تفسیر کی ۲۰ کتابیں مجھے عاریۃً دیں فجزاہم اللہ عنی خیر الجزاء۔

الحمد للہ یہ طویل سفر تفسیر کے کام پر اثر انداز نہیں ہوا۔ ۲۸ فروری کو کویت سے چل کر سیالکوٹ پہنچا اور باقی کام پورا کیا۔

اس جلد میں مجھے جن علمی گہواروں سے مزید استفادہ کرنے کا موقعہ ملا ہے ان کے نام یہ ہیں:

۱۔ محاسن التاویل	علامہ الشام محمد جمال الدین القاسمی۔
۲۔ تثبیت دلائل النبوۃ	قاضی عبد الجبار بن احمد الہمدانی ۴۱۵ھ
۳۔ المجموع شرح المہذب	للامام النووی
۴۔ الجواب الصحیح	للامام الحافظ ابن تیمیہ
۵۔ ہدایۃ الحیاری	للامام الحافظ ابن القیم
۶۔ اعلاء السنن	للشیخ المحدث ظفر احمد العثمانی
۷۔ ازالۃ الخفاء	للشیخ الامام شاہ ولی اللہ محدث دہلوی
۸۔ شہادۃ القرآن	حضرت مولانا محمد ابراہیم صاحب سیالکوٹی
۹۔ کلمۃ اللہ فی حیاۃ روح اللہ	حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی
۱۰۔ ازالۃ الشکوک	مولانا رحمت اللہ مہاجر مکی۔
۱۱۔ اظہار الحق	〃 〃
۱۲۔ عقیدۃ الاسلام	مولانا السید انور شاہ کشمیری

مقدمہ

الحمد للہ سبحانہٗ والسلام علیٰ من بعث الی الناس کافۃ"، معالم العرفان کی جلد ششم پیشِ خدمت ہے قرآن کے معجزانہ امتیازات کی کوئی حد نہیں ہے اور ان میں سے ایک یہ ہے جس طرح یہ ماضی میں دُنیا کی بڑی طاقتوں کے لیے ایک چیلنج بن کر آیا تھا جیسا کہ علامہ عبدالجبار ہمدانی نے بتایا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہود و نصاریٰ کو اس قرآن کے ذریعے تن تنہا ہوتے ہوئے غلط فکر، غلط کردار، غلط اخلاق، غلط معیشت، غلط سیاست پر ہونے کا چیلنج کیا اور اعلان کیا کہ جو نظام میں لے کر آیا ہوں یہی حق ہے اور یہی غالب ہو کر رہے گا۔ اس کے مقابلے میں سارے نظام پاش پاش ہو جائیں گے۔

ٹھیک اسی طرح جیسا کہ حضرت علی مرتضیٰ نے بتایا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مستقبل کو سامنے رکھ کر قرآن کا یہ چہرہ پیش کیا ہے کہ:

> آگاہ ہو جاؤ ایک بڑا فتنہ آنے والا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اس فتنے سے بچنے اور نجات پانے کا ذریعہ کیا ہے۔ فرمایا کتاب اللہ، اس میں تم سے پہلی اُمتوں کے واقعات ہیں اور تمہارے بعد کی اس میں اطلاعات ہیں اور تمہارے درمیان جو مسائل پیدا ہوں قرآن میں ان کا حکم اور فیصلہ ہے۔ وہ قول فیصل ہے، وہ فضول باتیں اور یاوہ گوئی نہیں ہے۔ جو کوئی جابر و سرکش اسے چھوڑے گا اللہ تعالیٰ اسے توڑ کر رکھ دے گا اور جو کوئی ہدایت کو اس کے بغیر تلاش کرے گا اس کے حصہ میں اللہ کی طرف سے گمراہی آئے گی۔ قرآن ہی حبل اللہ المتین اور مضبوط نصیحت نامہ ہے اور یہی صراط مستقیم ہے۔ وہی وہ حق مبین ہے جس کے اتباع سے خیالات کبھی

محفوظ رہتے ہیں اور زبانیں اس میں گڑبڑ نہیں کر سکتی ہیں۔ اور علم والے کبھی اس کے علم سے سیر نہیں ہوں گے اور وہ کثرت مزاولت سے کبھی پرانا نہ ہوگا اور اس کے عجائب کبھی ختم نہ ہوں گے اور قرآن وہ ہے جسے سن کر تو جنوں کو ایمان لانا پڑا، جس نے قرآن کے موافق بات کہی اس نے سچی بات کہی اور جس نے قرآن پر عمل کیا وہ مستحق اجر و ثواب ہوا اور جس نے قرآن کے موافق فیصلہ کیا اس نے عدل و انصاف کیا اور جس نے قرآن کی دعوت دی اس کو صراط مستقیم کی ہدایت نصیب ہو گئی۔

(جامع ترمذی، مسند دارمی)

اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ قرآن کی تعلیمات عملاً صاف واضح اور متعین ہیں۔ اور زمانہ مابعد میں انسانی تحریفات کی آمیزش اور تصرفات سے پاک ہیں اور اس کا اس طرح ہونا اس لیے ضروری تھا کہ اس پر نوع انسانی کی الہامی تعلیم کے درس کا خاتمہ ہوا ہے۔ اسی لیے قرآن خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا علمی معجزہ ہے۔ سارے اختلافات کے باوجود اس پر اُمت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں کہ قرآن نے اہل عرب کی عام شاہراہ سے ہٹ کر اپنا انداز بیان الگ اختیار کیا یہ طرز بدیع اور اسلوب عجیب عرب میں موجود نہ تھا۔ ان کے کلام کا تمام تر نمونہ شعر اور نثر تھا۔ شعراء شعر کے ذریعے اپنے تاثرات ظاہر کرتے جبکہ خطباء نثر کو اظہار جذبات کا ذریعہ بناتے۔ قرآن نے دونوں راہوں سے ہٹ کر نظم و نثر کے درمیان ایک ایسا پسندیدہ اسلوب اختیار کیا جو بلغائے عرب کے تخیل میں بھی نہ تھا۔ قرآن کے مطالع مقاطع اور فواصل حد اعجاز کا شاہکار ہیں۔

یہیں سے یہ نکتہ بھی حل ہو جاتا ہے کہ قرآن حکیم اپنی تعلیمات اور معانی کے ساتھ اپنے الفاظ، کلمات اور تعبیر میں بھی معجزہ ہے۔ اور اس کی فصاحت و بلاغت کے معجزانہ کمال کی دوسری آسمانی کتابیں حریف نہیں ہیں کیونکہ دوسری آسمانی کتابیں اگر وحی ہیں تو اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے معنے کے لحاظ سے وحی ہیں۔　　نہ تو خود ان کتابوں کو اور نہ ان کے ماننے والوں کو اس کا دعویٰ ہے اور نہ کبھی انہوں نے اپنی کتابوں کو کلام و عبارت کے لحاظ سے معجزہ کہا ہے چنانچہ اسی لیے وہ اصل الفاظ اور زبان جس کے قالب میں وحی موسوی تورات اور وحی عیسوی انجیل نے ظہور کیا مدت ہوئی کہ دنیا ان سے محروم ہو گئی۔ تورات کی زبان عبرانی کو جو حضرت موسیٰ کی زبان سے نکلی تھی بخت نصر کی آگ کھا گئی اور ارامی و سریانی زبان کا قالب اختیار کر لیا اور آخر صدہا سال بعد حضرت عزیر نے پھر اس کو عبرانی زبان میں منتقل کیا۔ اور انجیل کے متعلق ابھی تک یہ طے نہیں ہوا کہ اس

کی اصل زبان کیا تھی اور انجیل پہلے پہل کس زبان میں لکھی گئی تھی۔ انجیل کی سب سے قدیم زبان یونانی ہے مگر ظاہر ہے کہ یہ وہ زبان نہیں ہے جو حضرت عیسیٰ فلسطین میں بولتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کتابوں کی فصاحت و بلاغت کے اعجاز اور ان کے الفاظ کے خدائی الفاظ ہونے کا دعویٰ کیوں کر ہو سکتا ہے بر خلاف اس کے دنیا میں وحی محمدی یعنی قرآن سب سے پہلی اور آخری وحی ہے جس نے اس حیثیت سے اعجاز کا دعویٰ کیا چنانچہ قرآن حکیم کا حرف حرف اور لفظ لفظ وحی ہے اور وہی ہے جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا اور وہ ہر قسم کی تغیر و تحریفات سے پاک ہے اس لیے اس کا شائل، اس کی تعبیر، اس کے کلمات، اس کے الفاظ تک معجزہ ہیں اور اس وصف میں دنیا کی کوئی کتاب آسمانی اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی ہے۔ تمام صرف یہ چاہتا ہوں کہ یہ خود دائمی ہے اس کے افکار و نظریات دائمی ہیں۔ اور جس مدلول کی اس عالم میں یہ دلیل بن کر آیا وہ دائمی ہے یعنی رسالت محمدیہ علی صاحبہا السلام لینے لیے تو یہی کافی ہے اور یہ بھی اللہ کا خاص انعام ہے کہ اس کی کچھ خدمت کر کے اپنے سیاہ اعمال نامہ کو دھونے کے لیے آب رحمت کے چند قطرے فراہم ہو جائیں۔

پارہ ششم ایک نظر میں

صفاتِ الٰہی

توحید الوہیت و ربوبیت

رسالت و نبوت

دستوری قواعد

صحابہ کا چہرہ

اسلامی شعائر

اجتماعی قوانین

اخلاقی قوانین

معاشی قوانین

سیاسی قوانین

عدلیہ کے ضوابط

دفاعی قوانین

ایمان کے تقاضے

نفاق کا چہرہ

فوجداری قوانین

معاشرتی قوانین

آخرت کی زندگی

قرآن کا تعارف

قرآنی اصطلاحات

آیات اللہ

قرآن حکیم نے انبیاء کے معجزات کو عموماً آیت کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ آیت کے معنے نشانی اور علامت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو علم و احساس کے جو ذرائع عطا فرمائے ہیں وہ درحقیقت صرف آیات و علامات کی شناخت اور یادداشت ہے۔ دُنیا میں جس قدر چیزیں ہم جانتے اور پہچانتے ہیں صرف آیات و علامات سے جانتے ہیں۔ کلیات سے لے کر جزئیات تک ہمارا پھیلا ہوا علم وہ محض آیات کا رہینِ منت ہے بلکہ ہمارے تمام تجربے اور مشاہدے، طبیعیات، کیمیائیات، نباتات، حیوانات، ارضیات، ہندسیات، ریاضیات وغیرہ جو کچھ علوم ہیں وہ صرف علامات شناسی کا مجموعہ ہیں۔ قرآن میں آیت کا لفظ اس معنے میں بڑی بہتات سے آیا ہے۔ جس طرح یہ آیات الٰہی عام بندے اور خدا اور خالق و مخلوق کے تعلق اور رابطہ کو نمایاں کرتی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے سے اپنے تعلق و رابطہ کو اپنے مخصوص علامات و آیات کے ذریعہ سے نمایاں کرتا ہے۔ یہی وہ علامات ہیں جو اللہ سبحانہٗ اور پیغمبر کے درمیان رابطہ خاص اور علاقہ مخصوص کو نمایاں کرتی ہیں اور سابق سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرستادہ الٰہی ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے یہ حقیقت واضح ہوتی ہے کہ اس کی نظر میں اصل چیز معجزات نہیں بلکہ اصل چیز نبوت ہے اس لیے وہ لوگوں کو قدم قدم پر اصل روح نبوت کی طرف متوجہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں قرآن نے نہایت وضاحت صفائی اور تصریح کے ساتھ ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا ہے۔

سب سے پہلے اس نے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور معجزات میں کوئی تلازم نہیں اور یہ معجزات اصل نبوت سے خارج ہیں۔ نبوت کے اصلی لوازم وحی، مخاطبہ الٰہی، تزکیہ، انذار، تبشیر، تعلیم اور

ہدایت ہیں۔ عام لوگوں میں انبیا کے معجزات کو دیکھ کر یہ غلط عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ براہ راست کائنات میں تصرف پر قادر ہیں۔ چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسٰی کے معجزات کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسٰی کے قبضہ و قدرت میں تھی اور وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کرتے تھے۔ یہی وہ بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے دین حق کی دیوار کج کھڑی کی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن نے نہایت شدت سے اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادے سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ قل انما الآیات عند اللہ اور وما کان لرسول ان یاتی بایۃ الا باذن اللہ۔

اتباع ظن

امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں ظن اس خیال کو کہتے ہیں جو علامات دیکھ کر دماغ میں پیدا ہوتا ہے۔ اب اگر قوی ہو گیا تو علم ہو جاتا ہے اور اگر بہت کمزور رہا تو وہم کے مرتبہ میں رہ جاتا ہے اور یہ سب سے کمزور درجہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ظن لغت کے لحاظ سے یقین اور شک کے خلاف کسی حالت کا نام نہیں بلکہ انسان کے اپنے ہی ایک تخمینہ کا نام ہے، اس کے بعد وہ واقعات کے لحاظ سے یقین اور وہم دونوں کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ صحابہ کے کلام سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظن کو ٹھیک ان موقعوں پر استعمال کرتے تھے جہاں ہم اردو میں اٹکل بولتے ہیں۔ واقعی بات کو علم اور تخمینی بات کو ظن کہتے ہیں۔ یہی کہ قرآن کی اصطلاح میں ظن کہتے ہیں مالھم بہ من علم الا اتباع الظن اس قسم کی آیات میں ظن ان ہی خیالات کو کہا گیا ہے جو خود اپنے دماغ سے تراش لیے جائیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآنی محاورے میں بیشتر ظن کا اطلاق بے تحقیق بات پر ہوتا ہے۔ یہاں عیسائیوں کے بارے میں ایک ہی فقرے میں دو باتیں فرمائی ہیں، ایک یہ کہ وہ بے خبر ہیں اور دوسرے یہ کہ وہ اٹکل اور اندازے کے تیر چلا رہے ہیں، اسی لیے ان میں مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر کوئی ایک متفق علیہ بات نہیں ہے بلکہ بیسیوں اقوال ہیں جن کی کثرت خود اس بات کی دلیل ہے کہ وہ بے علم ہیں اور اس معاملہ میں وہ اٹکل کے تیر چلا رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ

مسیح نہ تھا بلکہ مسیح کی شکل میں کوئی اور تھا جسے یہودی اور رومی سپاہی ذلت کے ساتھ صلیب دے رہے تھے اور مسیح وہیں کسی جگہ کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر مسیح ہی چڑھایا گیا تھا مگر ان کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی تھی بلکہ اتارے جانے کے بعد ان میں جان تھی۔ کوئی کہتا ہے کہ انہوں نے صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ اپنے حواریوں سے ملے۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب کی موت مسیح کے جسم انسانی پر ہوئی اور وہ دفن ہوا مگر الوہیت کی روح جو اس میں تھی وہ اٹھا لی گئی۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم سمیت زندہ ہوئے اور جسم سمیت اٹھائے گئے، ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں۔

بہرحال ظن کے معنے اٹکل اور اندازے کے ہیں۔ حضرت عمرؓ نے ایک روز خطبہ میں فرمایا: لوگو! دین کے بارے میں رائے تو صرف حضور کی صواب تھی ہم تو صرف اٹکل کے تیر لگاتے اور تکلف کر کے خیال جماتے ہیں انما ہو منا الظن والتکلف۔ ان مختصر الفاظ میں حضرت عمرؓ نے قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

لتحکم بین الناس بما اراک اللہ

لہٰذا جو رائے خدا کی اراءۃ کے ساتھ ہو اس کا نام رائے ہے اور جو محض اپنی اٹکل ہو اس کا نام ظن اور تکلف ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا معمول یہ تھا کہ جب کسی معاملہ کے متعلق انہیں کتاب و سنت میں کوئی فیصلہ نہ ملتا فرماتے کہ اگر تم چاہو تو میں تمہیں اپنے ظن اور گمان سے بتلادوں اسی ظن کو رائے بھی کہا جاتا ہے اور اسی معنے میں قرآن نے رائے زنی سے منع کیا ہے۔ یعنی محض اپنی عقل سے کسی شرعی بنیاد کے بغیر کوئی بات کہہ دینا۔ حضرت ابوبکرؓ فرماتے ہیں کہ میں کس زمین کے اوپر اور کس آسمان کے نیچے رہ سکتا ہوں۔ اگر قرآن کی کسی آیت میں صرف اپنی رائے سے کوئی ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں ہے۔

اتباعِ ھویٰ

جیسے ساری فکری گمراہیوں اور کج رویوں کا شجرۂ نسب بالواسطہ اور بلاواسطہ اتباع ظن سے جا ملتا ہے ٹھیک اسی طرح عمل کی ساری گمراہیوں کا سرچشمہ اتباعِ ہویٰ ہے۔ وہاں ظن کے

مقابلہ میں اگر یقین ہے تو یہاں ہوی کا مدمقابل ہدیٰ ہے۔ قرآن عزیز اتباعِ ہویٰ اور اتباعِ ہدیٰ کو دو متضاد چیزیں قرار دیتا ہے یعنی جو متبع ہوی ہے وہ متبع ہدیٰ نہیں ہو سکتا اور جو متبع ہدیٰ ہے وہ متبع ہوی نہیں ہو سکتا۔ اتباعِ ہدیٰ کے لیے اتباعِ ہوی کا چھوڑنا ناگزیر ہے۔ ہدیٰ اور ہوی اپنی اپنی جگہ دو کھلے ہوئے راستے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے دونوں انسان کے سامنے رکھ دیئے اور ان دونوں میں سے ایک پر چلنے کا اور دوسرے سے بچنے کا حکم ہے۔ ہدیٰ نبوت کا دیا ہوا علم و عمل ہے۔ اس کی اتباع میں محکومیت کا داغ لگتا ہے اور ہوی اپنے ہی نفس کے جذبات ہیں اس کے مان لینے میں حاکمیت کا مزا آتا ہے۔ کچھ سادہ لوح کوشش کرتے ہیں کہ ہدیٰ اور ہوی کے درمیان اتفاق و سازگاری ہو جائے یعنی۔

باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

لیکن یہ کوشش بیکار بھی ہے اور مذموم بھی۔ قرآن نے پہلے ہی اعلان کر دیا ہے کہ یہ دو راہیں الگ الگ ہیں۔ ایک کا سرا زمامِ ہدایت محمد رسول اللہ کے ہاتھ میں اور دوسری کا زمام ضلالت شیطان کے ہاتھ میں ہے ایک کا منتہی جنت ہے اور دوسرے کا دوزخ۔

ہوی کا محرک چونکہ خود نفسِ انسانی ہے اس لیے وہ جسمِ انسانی میں جان کی طرح رگ رگ اور ریشہ ریشہ میں سرایت کی ہوئی ہے اس کا خلاف اتنا ہی مشکل ہوتا ہے جتنا کہ جسم کو جان کا۔ ان میں اسی طرح فطری جاذبیت ہوتی ہے جیسا کہ لوہے اور مقناطیس میں۔ اور جب اس پر قرآن کا لیبل لگا دیا جاتا ہے تو اب وہی ہوی ٹھیک ہدیٰ کی صورت میں نظر آنے لگتی ہے اور دونوں کی اس مصالحت و ہم آہنگی سے جو خوشی میسر آتی ہے وہ گنگا و جمنا کے سنگم جیسا لطف دینے لگتا ہے۔ اس حد پر پہنچ کر انسان اتنا سکون محسوس کرتا ہے کہ تلاشِ حق کا لفظ بھی سننا اسے گوارا نہیں ہوتا۔ اسی لیے سورہ جاثیہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے بطور امتنان فرمایا ہے کہ دیکھئے اتباعِ ہوی کی اس گرم بازاری میں ہم نے آپ کو ہدیٰ پر قائم کیا ہے یہ کتنا بڑا احسان ہے تو اب آپ ان بے خبروں کی اہواء کا ساتھ نہ دیں۔ ہوی کے اسی غیر معمولی اثر اور برقی تاثیر کی اس ارشادِ نبوت میں نشاندہی کی گئی ہے۔

آئندہ میری امت میں کچھ لوگ ہوں گے کہ جن میں یہ اہواء اس طرح رچی ہوں گی جیسے کتے کاٹے کے جسم میں ہڑک رچ جاتی ہے کہ جسم کی کوئی رگ اور کوئی جوڑ ایسا نہیں رہتا جس میں یہ بیماری گھسی ہوئی نہ ہو۔

واقعی ہوئی جب انسان کے رگ و پے میں سرایت کرجاتی ہے تو پھر ہوئی ہی اس کو صدی معلوم ہونے لگتی ہے اس لیے اس کو توبہ کی توفیق بھی نہیں ہوتی ہے کیونکہ توبہ کی توفیق اس وقت ہوتی ہے جبکہ قلب کا کوئی گوشہ ہوئی سے خالی ہو لیکن جب رگ رگ میں ہوئی سرایت کر جاتے تو پھر توبہ کی توفیق کہاں سے آتے۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ،

> جو شخص تم میں سے اپنے دین کی قدر کرنا چاہیے اسے شیطانی افعال اور اصحاب اہواء سے علیحدہ رہنا چاہیے۔ کیونکہ ان کے پاس بیٹھنے سے ان کی بیماری خارش سے زیادہ اثر کر لگتی ہے۔

امام اوزاعی فرماتے ہیں کہ

> اصحاب اہواء سے بات چیت نہ کرو نہ ان سے جھگڑا کرو کہ وہ تمہارے دل میں فتنہ کا بیج ڈال دیں گے۔

یہ ہوئی ہے جو فرقہ بندی کو جنم دیتی ہے اور ہدایت کی صراط مستقیم سے ہٹ کر سینکڑوں راہیں نکالتی ہے اور یہ سب راہیں ٹیڑھی ہوتی ہیں۔ ان بہت سے غلط راستوں کے درمیان ایک ایسی راہ جو بالکل وسط میں ہو اور سیدھی ہو جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ اس کے تمام جذبات کے ساتھ اس کی روح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ اور اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہو جس کے اندر کوئی ٹیڑھ کوئی کجی کسی پہلو کی بے رعایت اور کسی پہلو کے ساتھ ظلم نہ ہو اور بے انصافی نہ ہو یہی وہ الہدیٰ ہے یہی انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء اور اس کی کامیابی بامرادی کے لیے سخت ضروری ہے۔ انسان کی عین فطرت اس کی طالب ہے۔ اسی کی نبوت رہنما بن کر آئی ہے۔ اسی کو قرآن سواء السبیل اور الصراط المستقیم کہتا ہے۔ یہ شاہراہ دنیا کی اس زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک سیدھی جاتی ہے جو اس پر چلا وہ یہاں الذین انعمت علیہم میں داخل ہے اور آخرت میں کامیاب و بامراد ہے۔

الارض المقدسۃ

ارض مقدس سے مراد کنعان اور فلسطین کا علاقہ ہے اس کو مقدس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی علاقہ ہے جہاں حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب نے آوازہ حق بلند کیا۔ چونکہ توحید اور خدا پرستی کی آواز سب سے پہلے اسی علاقہ میں گونجی تھی۔ اس وجہ سے اس کو ارض مقدس

کہا ہے اور اسی لیے ان تمام جگہوں کو جہاں اہل حق نے حق کا بول بالا کرنے کے لیے محنتیں کی ہیں ان کو مقدسہ کہتے ہیں۔ مثلاً مکہ مقدسہ، مدینہ مقدسہ وغیرہ اور شاید یہیں سے مسجد اقصیٰ کو البیت المقدس کہنا شروع کر دیا ہے۔ بعض بزرگوں نے ارض مقدسہ سے مراد شام لکھا ہے وہ بھی درست ہے کیونکہ پہلے کنعان اور فلسطین شام ہی کے علاقے شمار ہوتے تھے۔ تورات میں ارض مقدس کے بارے میں وعدوں کی صراحتیں موجود ہیں۔ مثلاً

"دیکھو میں نے یہ زمین جو تمہارے آگے ہے تمہیں عنایت کی، داخل ہو اور اس زمین کو جس کی بابت خداوند نے تمہارے باپ دادوں ابراہام اور اسحاق اور یعقوب سے قسم کی کہ تم کو اور تمہارے بعد تمہاری نسل کو دوں گا میراث میں لو۔" (استثناء ۱-۸)

"تو اس سرزمین میں جس کی بابت خداوند نے تیرے باپ دادوں ابراہام اور اسحاق اور یعقوب سے قسم کھا کر کہا کہ لے میں تمہیں دوں گا سکونت کرے۔" (استثناء ۳۰-۲)

"مضبوط ہو جاؤ اور دلاور ہو جاؤ خوف نہ کھاؤ اور ان سے نہ ڈرو کیونکہ خداوند تیرا خدا وہی ہے جو تیرے ساتھ جاتا ہے وہ تجھ سے غافل نہ ہوگا اور تجھ کو نہ چھوڑے گا۔" (۳۱-۶)

استقسام بالازلام

استقسام کے معنے ہیں حصہ، قسمت یا تقدیر معلوم کرنا۔ ازلام زلم کی جمع ہے جوئے یا فال کے تیروں کو کہتے ہیں۔ عرب میں فال کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے وہ غیب کے فیصلے معلوم کرتے تھے اور جوئے کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے وہ گوشت یا کسی چیز کے حصے حاصل کرتے۔

اللباب میں ہے کہ قسمت معلوم کرنے والے تیر سات ہوتے تھے ان میں ایک پر لکھا تھا کہ امرنی ربی میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے۔ ایک پر لکھا تھا نہانی ربی میرے رب نے مجھے روک دیا ہے۔ ایک پر لکھا تھا منکم تم میں سے ہے۔ ایک پر لکھا تھا من غیرکم اجنبی حلیف ہے ایک پر لکھا تھا ملصق ملا گیا ہے۔ ایک پر لکھا تھا العقل دیت ہے اور ایک پر لکھا تھا غفل کچھ نہیں ہے۔ زمانہ جاہلیت میں جب کوئی سفر کا، تجارت کا، شادی کا ارادہ کرتا یا نسب میں اختلاف ہوتا یا کسی مقتول کے بارے میں اختلاف ہوتا یا دیت کا مسئلہ معلوم کرنا ہوتا تو لوگ مکہ کے سب سے بڑے بت ہبل کے پاس تین سو درہم مقررہ فیس دے کر آتے

اور اس شخص کو دیتے جس کی تحویل میں یہ تیر ہوتے وہ ان تیروں کے ذریعے ان کو پیش ہ اندہ مسئلہ کا جواب دیتا۔

تیروں کے ذریعے جوا کھیلنے کی یہ صورت تھی کہ اونٹ کو ذبح کرکے اس کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کر دیتے اور ان ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے ان پانسوں کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر لیے تھے جن کے نام یہ ہیں:

فذ، توام، رقیب، حلس، مسبل، معلی، منافس، منیح، نعیم وغد

ان میں سے ہر تیر کے مختلف حصے مقرر کر دیے تھے اور جب جوا کھیلتے تھے تو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصب دار شخص کے ہاتھ میں دیتے تھے اور وہ ان کو گڈمڈ کرکے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا تھا جن کے نام پر وہ تیر نکلتے تھے جن جن کے حصے مقرر تھے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جن کے نام پر نکلتے وہ ناکام تصور ہوتے تھے۔ اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہو جاتے تھے ان کو فقیروں پر تقسیم کر دیتے تھے چونکہ یہ سخاوت کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لیے جوئے کی ان مجالس میں شریک ہونا ایک قومی عار تھا۔

قرآن نے یہاں استقسام بالازلام کو حرام کرکے ان دونوں پر قدغن قائم کی ہے یعنی مشرکانہ فال گیری جس میں قسمت کا فیصلہ معلوم کیا جاتا ہے یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے۔ جوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام جن میں اشیاء کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی امر پر رکھا جائے!

انجیل

حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہ العزیز اظہار الحق میں رقمطراز ہیں کہ امام قرطبی نے الاعلام بما فی دین النصاریٰ من الفساد والاوہام کے باب سوم میں لکھا ہے کہ جو کتاب عیسائیوں کے ہاتھوں میں انجیل کے نام سے ہے یہ وہ ہرگز انجیل نہیں جس کا تذکرہ اللہ سبحانہ نے حضور کی زبانی قرآن میں کیا ہے۔

کشف الظنون کے مصنف نے انجیل کے بارے میں لکھا ہے کہ

وہ ایک کتاب تھی جس کو اللہ نے عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام پر نازل کیا تھا۔

پھر ایک طویل عبارت میں ان اناجیل اربعہ کے اصلی انجیل ہونے کی تردید کی ہے اھ

کہا ہے کہ "حضرت عیسیٰ جو انجیل لے کر آئے تھے وہ ایک ہی انجیل تھی جس میں اختلاف اور تناقض کوئی نہ تھا ان عیسائیوں نے اللہ پر اور اس پیغمبر حضرت عیسیٰ پر جھوٹی تہمت رکھ دی۔

کتاب تخجیل من حرف الانجیل کا مصنف اپنی کتاب کے باب دوم میں ان مشہور اناجیل کی نسبت لکھتا ہے۔

یہ انجیلیں وہ سچی انجیل نہیں ہیں جن کو دے کر سچا رسول بھیجا گیا تھا اور جو خدا کی جانب سے اتاری گئی تھی۔ اور سچی انجیل تو صرف وہی ہے جو مسیح کی زبان سے نکلی ہے۔ پھر باب ۹ میں عیسائیوں کی قباحتوں کے سلسلے میں رقمطراز ہے۔

اس پولس نے ان کو اپنی لطیف فریب کاری سے دین سے قطعاً محروم کر دیا کیونکہ اس نے ان کی عقلوں کو ایسا بودا پایا کہ جیسے چاہے ان کو بہکایا جا سکتا ہے اس لیے اس خبیث نے توراۃ کے نشانوں تک کو مٹا دیا۔

ان موجودہ اناجیل اربعہ کے زمانہ تصنیف کے متعلق واہی تباہی بلا سند کہانیاں ہیں۔ ہورن اپنی تفسیر مطبوعہ ۱۸۲۲ء جلد چہارم قسم ۲ کے باب دوم میں کہتا ہے:

ہم کو مورخین کنیسہ کی معرفت اناجیل کی تالیف کے زمانے کے جو حالات پہنچے ہیں وہ ناقص اور غیر معین ہیں جن سے کسی مقرر چیز تک رسائی نہیں ہوتی اور مشائخ متقدمین نے واہی روایات کی تصدیق کی اور ان کو قلم بند کر ڈالا۔ بعد کے آنے والے لوگوں نے ان کی لکھی ہوئی چیزوں کو ان کی تعظیم کی وجہ سے قبول کر لیا اور یہ سچی جھوٹی روایتیں ایک کاتب سے دوسرے کاتب تک پہنچتی رہی ہیں۔ مدت مدید گزر جانے کی وجہ سے اب ان کی تنقید اور کھرا کھوٹا معلوم کرنا بھی دشوار ہو گیا۔

پھر اسی جلد میں لکھتا ہے،

پہلی انجیل سنہ ۳۷ یا سنہ ۳۸ یا سنہ ۴۳ یا سنہ ۴۸ یا سنہ ۶۲ یا سنہ ۶۳ یا سنہ ۶۴ میں تالیف کی گئی۔ دوسری انجیل سنہ ۵۶ اور اس کے سنہ ۶۵ تک کسی وقت میں اور غالب یہ ہے کہ سنہ ۶۰ یا سنہ ۶۳ میں تالیف ہوئی، تیسری انجیل سنہ ۵۳ یا سنہ ۶۳ یا سنہ ۶۴ میں تالیف ہوئی۔ چوتھی انجیل سنہ ۶۸ یا سنہ ۶۹ یا سنہ ۷۰ یا سنہ ۹۸ میں تالیف ہوئی۔

اھلال لغیر اللہ

اھلال کے معنے عربی زبان میں نامزد کرنے اور شہرت دینے کے ہیں۔ مشہور لغوی علامہ ابو الفتح

ناصر بن عبدالسید المطرزی نے مغرب میں اھلال کے معنے یہ بتاتے ہیں۔

چاند دیکھنے کے وقت جو آواز بلند کی جاتی ہے اس کو اھلال کہتے ہیں اور اسی طرح بچہ جب پیدائش کے وقت آواز بلند کرے تو اسے استھلال کہتے ہیں۔

اور امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ

چاند دیکھتے وقت جو آواز بلند کی جاتی ہے اسے اہلال کہتے ہیں اور یہ مطلقاً ہر آواز کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور اسی سے پیدائش کے وقت بچہ کے رونے کی آواز کو بھی اہلال کہتے ہیں اور ما اھل بہ لغیر اللہ کے معنے یہ ہیں کہ جس جانور پر غیر اللہ کا نام ذکر کیا گیا ہو اور وہ اصنام کی خاطر ذبح کیا جائے۔

اور لغت کی کتاب صراح میں علامہ ابوالفضل محمد بن عمر قرشی لکھتے ہیں

ما اھل بہ لغیر اللہ کے معنے یہ ہیں کہ غیر اللہ کا نام اس پر لیا جائے اور اہلال کے اصل معنے آواز بلند کرنے کے ہیں۔

مشہور محدث امام ابن جریر طبری فرماتے ہیں:

ما اھل بہ اس کو اس لیے کہا گیا ہے کہ اہل جاہلیت جب اپنے ساحت رواؤں کے تقرب کے لیے جانوروں کو ذبح کرنے کا ارادہ کرتے تو ان جانوروں پر اپنے معبودوں کا نام لیتے اور بلند آواز سے اس کی تشہیر کرتے۔

اور شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں کہ اھل کو ذبح پر محمول کرنا خلاف لغت و عرف ہے۔ اہلال عربی محاورہ اور لغت میں بمعنی ذبح نہیں آیا ہے بلکہ اھلال کے معنے لغت عربی میں آواز بلند کرنے اور شہرت دینے کے ہیں۔ جیسے آواز طفل نو، اور شہرت چاند وغیرہ۔ اھللت للہ اگر کوئی بولے گا تو اس سے کبھی یہ نہ سمجھا جائے گا کہ میں نے اللہ کے نام پر ذبح کیا۔ بنا نا یہ چاہتا ہوں کہ اہلال کے معنے ذبح کے ہرگز نہیں ہیں بلکہ شہرت دینے اور تقرب کے طور پر نامزد کرنے کے ہیں۔ اگر اہلال کے معنے بھی ذبح کے ہوں تو پھر ما ذبح علی النصب جس کے معنے ہی یہ ہیں وہ جانور جو بتوں کے نام پر ذبح کیے جائیں میں کوئی معنویت نہیں رہتی۔ اگر ما اھل بہ لغیر اللہ کا مطلب بھی یہی ہو تو واو عطف کے ساتھ ما ذبح علی النصب بے معنے ہو کر رہ جائے گا۔ چنانچہ امام قرطبی الکلیل فرماتے ہیں،

صنم اور بت کی قید مشرکین کی تردید کے لیے ہے ورنہ مراد مطلقاً غیر اللہ

ہے خواہ وہ صنم ہو یا کوئی اور۔
علامہ ابوحیان الاندلسی نے مختلف اقوال نقل کر کے لکھا ہے :

بوچیز اس آیت کریمہ سے ظاہر ہو رہی ہے وہ یہ ہے کہ جو جانور بھی غیر اللہ کے لیے ذبح کیا جائے وہ حرام ہے۔ لفظ غیر اللہ میں بت اور حضرت مسیح سب ہی شامل ہیں اور اس کو اہلال اسی لیے کہا گیا ہے کہ وہ لوگ ذبح کے وقت اس شخص کا نام بلند کرتے تھے جس کے لیے جانور ذبح کرتے تھے پھر اس میں یہ وسعت اور کثرت آگئی کہ ہر ذبیحہ پر اس کا اطلاق ہونے لگا جیسے تلبیہ کہنے کو اہلال کہتے ہیں اور یہ ہر احرام والے کی علامت ہے۔

اہل کتاب

قرآن کے سوا جن آسمانی کتابوں کے نام قرآن میں آئے ہیں ان کے پیروؤں کو اہل کتاب الذین اوتوا الکتاب کہا جاتا ہے یا یوں کہو کہ جو قرآن کو گو آسمانی کتاب نہیں مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں آیا ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہوں خواہ وہ یہودی ہوں یا نصرانی۔ یہ بات کہ یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب کہنے کے لیے کیا یہ شرط ہے کہ وہ صحیح اور پر اصلی تورات و انجیل پر ایمان رکھتے ہوں یا صرف تورات اور انجیل کو ماننے والے بھی اہل کتاب ہی شمار کیے جائیں۔ قرآن کی آیات بتاتی ہیں کہ اہل کتاب ہونے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کو مانتے ہوں اور اس کی پیروی کا دعویٰ کرتے ہوں۔

قرآن حکیم نے جن کو اہل کتاب کہا ہے ان کے ہی بارے میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ وہ آسمانی کتاب میں تحریف کرتے تھے اور یہ بھی بتایا ہے کہ وہ عزیر کو خدا کا بیٹا اور مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔ ان اوصاف کے باوجود قرآن نے ان کو اہل کتاب کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہودی اور عیسائی ساری برائیوں کے باوجود قرآن کے نزدیک اہل کتاب ہیں۔
خبر نہیں لوگوں نے یہ بات کہاں سے معلوم کر لی ہے کہ :

آیت میں مسیحی یا عیسائی سرے سے مراد ہی نہیں بلکہ نصاریٰ سے مراد نصاریٰ ہی ہیں جو کہ حضرت عیسیٰ کو نبی ماننے والا نہ کہ آپ کو ابن اللہ قرار دینے والا ایک قدیم فرقہ ہوا ہے۔

حالانکہ خود قرآن ہی میں نصاریٰ کے بارے میں یہ انکشاف موجود ہے وقالت النصاری المسیح ابن اللہ۔ الجصاص نے احکام القرآن میں لکھا ہے کہ حضرت فاروق اعظم کے دور خلافت میں آپ کے کسی عامل یا گورنر نے ایک خط لکھ کر آپ سے دریافت کیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تورات پڑھتے ہیں اور یوم السبت کی تعظیم کرتے ہیں مگر قیامت پر ان کا ایمان نہیں۔ ایسے لوگوں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے۔ فاروق اعظم نے بتایا کہ وہ اہل کتاب ہی کا فرقہ ہیں۔ بہرحال قرآن کی اصطلاح میں اہل کتاب وہ ہیں جو قرآن کے سوا تورات، انجیل اور زبور کو مانتے ہوں۔ یہ لوگ جزیہ دے کر اسلامی حکومت کے وفادار شہری ہو سکتے ہیں اور ایک شہری ہونے کی حیثیت سے ان کو وہ تمام بنیادی حقوق حاصل ہوں گے جو مملکت کے دوسرے شہریوں کو حاصل ہیں۔ ان کے معابد اور مذہبی عمارات محفوظ ہوں گے۔ ان کو مذہب لانے پر مجبور نہ کیا جائے۔ ان کی جان ومال اور عزت وآبرو کی مسلمان حکومت حفاظت کرے گی ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں۔ ان کا جائز کھانا مسلمان کھا سکتے ہیں اور مسلمان اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

یہیں سے ایسے لوگوں کے لیے جو قرآن، تورات، زبور اور انجیل کو تو خدائی کتاب نہیں مانتے مگر وہ اپنی جگہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں اسلامی قانون شہریت میں شبہ اہل کتاب کی اصطلاح رونما ہوگئی۔

جاہلیت

احادیث میں اکثر جاہلیت کو اسلام کا مدمقابل بنا کر استعمال کیا ہے۔ قرآن میں ما انزل اللہ کے مقابلے پر لفظ جاہلیت آیا ہے اور کہیں احادیث میں اسلامی نظام جماعت کے مقابلہ پر یہ لفظ بولا گیا۔ اسلام کے مقابلہ پر یہ لفظ اس لیے آیا ہے کہ اسلام سرتاسر علم ہے کیونکہ اس کی صرف خدا نے رہنمائی کی ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے اور اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے جاہلیت کا طریقہ ہے۔

عرب کے زمانہ قبل اسلام کو جاہلیت کا دور اسی معنے میں کہا گیا ہے کہ اس زمانہ میں علم کے بغیر محض وہم وقیاس اور گمان یا خواہشات کی بنا پر انسانوں نے اپنے لیے زندگی کے طریقے مقرر کیے تھے۔ گویا جاہلیت ہر وہ دور ہے جس میں افکار وعقائد، اتباع ظن اور اعمال و

اخلاق کا سانچہ اتباع ہوا پر استوار ہو۔ یہ طرزِ عمل جہاں اور جس وقت بھی ہو اسے جاہلیت ہی کہا جائے گا۔ مدرسوں اور یونیورسٹیوں میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ محض ایک اتباعِ ظن ہے اور کسی معنی میں علم نہیں ہے لہٰذا خدا کے دیے ہوئے علم سے بے نیاز ہو کر جو فکر اس اتباعِ ظن پر قائم ہو گا اور جو نظامِ زندگی اتباعِ ہویٰ کی آمیزش کر کے بنایا جائے گا وہ بھی اسی طرح کی جاہلیت قرار دیا جائے گا جو اسلام سے پہلے تھا۔ اسی بنا پر سورۂ مائدہ میں جاہلیہ کا لفظ ما انزل اللہ کے مقابلہ پر آیا ہے۔ اس وجہ سے ہر وہ قانون جو خدا کے اتارے ہوئے قانون کے خلاف ہے وہ جاہلیت کا قانون ہے۔

مسند امام احمد میں حارث اشعری کی حدیث میں اسلام کا نظامِ عمل بیان کیا ہے اس کے مقابل نظامِ عمل کو جاہلیت سے تعبیر کیا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا اللہ نے مجھے حکم دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا اس کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ کیا ایسا شخص دوزخی ہو گا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو، فرمایا ہاں اگرچہ روزہ رکھتا ہو نماز پڑھتا ہو اور اپنے خیال میں اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔

جہر بالسوء

بدگوئی پر زبان کھولنا خدا کو پسند نہیں ہے لیکن مظلوم کو اس کی اجازت ملی ہے کہ وہ ظالم کی ظالمانہ کارروائیوں کو علانیہ بیان کرے۔ یہ صرف اجازت ہے پھر بھی افضل یہی ہے کہ بدگوئی پر زبان نہ کھولے۔ ہر حال میں برائی سے بچ کر رہے کیونکہ مومن ہونے کی حیثیت میں بندے کو اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔ یہ مسلمانوں کو ایک نہایت بلند درجہ کی اخلاقی تعلیم ہے۔ اور بتایا جا رہا ہے کہ غیبت و بدگوئی اور قانون کی زبان میں ہتک عزت بالکل ناجائز ہے اور فرد و جماعت اور شخص و ملت دونوں کو صلاح و فلاح کی یہ ایک راہ بتائی ہے۔ جہر بالسوء میں پس پشت بھی کسی کے عیب کی تشہیر اور اس کے روبرو تلخ کلامی دونوں داخل ہیں۔ بلاعذر اور بلا مصلحت شرعی کسی کی بدگوئی کسی حال میں جائز نہیں، نہ سامنے نہ پیچھے۔ لیکن مظلوم کو

اس کی اجازت ہے کہ وہ ظالم کی کارروائی کو علانیہ بیان کرے۔ اس کے دو فائدے ہیں ایک تو اس سے اپنی بدنامی کے ڈر سے ظلم کرنے میں کچھ ہچکچائیں گے دوسرا یہ کہ اس طرح لوگوں کو مظلوم کے ساتھ ہمدردی پیدا ہوگی۔ فقہائے نے تصریح کی ہے کہ جھوٹی بات کی تشہیر کی مظلوم کو بھی اجازت نہیں ہے۔

غلو فی الدین

غلو کے معنے بڑھنے، زیادہ ہونے، حد سے زیادہ ہونے کے ہیں۔ اسی سے قیمتوں کے گراں ہونے کے لیے غلا السعر بولا جاتا ہے۔ حضرت عیسٰی کے بارے میں یہود و نصاریٰ دونوں نے غلو کیا ہے۔ ایک نے تفریط میں دوسرے نے افراط میں۔ افراط و تفریط دونوں مذموم ہیں۔ مطرف بن عبداللہ نے اچھی بات فرمائی ہے،

ولا تغل فی شیئ من الامر واقتصد
کلا طرفی قصد الامور ذمیم

غلو عقیدہ میں ہو یا عمل میں دونوں میں دین کے تعلق سے مذموم ہے۔ دین میں جس چیز کا جو درجہ و مرتبہ یا جو وزن و مقام ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے جو چیز پاؤ سیر ہے وہ من بھر کر دی جائے جو حکم صرف استحباب و استحسان کا درجہ رکھتی ہے اس کو فرض و واجب کا درجہ دے دیا جائے۔ جو شخص ایک فقیہ یا مجتہد ہے اسے امام معصوم بنا دیا جائے جس کو اللہ نے نبی یا رسول بنایا ہے اس کو شریک خدا یا خدا بنا ڈالا جائے۔ جس کی صرف تعظیم و تکریم کا حکم ہے اس کی عبادت شروع کر دی جائے۔ یہ اور اس قسم کی ساری باتیں غلو میں داخل ہیں۔ اور جس طرح دین میں تفریط بہت بڑا جرم ہے اسی طرح افراط بھی بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے مذہب کا وہ مزاج جو سرتاسر اعتدال ہے بالکل درہم برہم ہو جاتا ہے اور اس کی وہ خدائی ترکیب جو اس کے اجزاء کو حسن و جمال کا ایک دلآویز پیکر بناتی ہے بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ یوں تو اس غلو میں ساری امتیں مبتلا ہوئی ہیں۔ ہم مسلمان بھی افکار، اعمال، اخلاق اور احوال میں اس سے نہ بچ سکے لیکن نصاریٰ کو اس میدان میں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی اصل بیماری یہی ہے کہ انہوں نے اپنے اس غلو کے سبب سے پورے دین کا حلیہ بگاڑ دیا۔

فترۃ من الرسل

فترت کے لفظی معنے انقطاع عمل یا سکون کے ہیں۔ اصطلاح میں دو نبوتوں کے درمیانی

زمانے کو کہتے ہیں۔ حضرت عیسٰی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان وقفہ کم و بیش چھ سو سال کا ہا ہے حضور انور کا سال ولادت ۵۷۰ھ اور سال رسالت ۶۱۰ھ ہے۔ حضور اور حضرت عیسٰی کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں ابو ہریرہ کے حوالہ سے جو حدیث لکھی ہے اس سے اس کی تائید ہوتی ہے فرمایا کہ میں ابن مریم کے سب سے زیادہ قریب ہوں۔ میرے اور اس کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔ یہ ارشاد نبوت ان لوگوں کے موقف کو طاقتور بنا تا ہے جو کہتے ہیں کہ حضور کے اور حضرت عیسٰی کے درمیان کوئی نبی نہیں ہے۔ لیکن بعض روایات میں یہ مذکور آتا ہے کہ جرجیس اور خالد بن سنان نبی تھے جو حضرت عیسٰی کے بعد ہوئے۔ مگر ابو ہریرہ کی صحیح روایت کے مقابلہ میں ان کی تاریخی حیثیت کوئی نہیں ہے۔ علامہ جمال الدین قاسمی نے اس موضوع پر ایضاح الفطرہ فی اہل الفترہ کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت کا منشا زمانہ بعثت کی دنیا کا نقشہ پیش کرنا ہے۔ مفتی محمد عبدہ مصری نے اپنے رسالہ توحید میں اس دور کی بلیغ انداز میں عکاسی کی ہے۔ ایک انگریز سیرت نگار آر وی سی بوڈلے نے اپنی کتاب پیغمبر میں زمانہ فترت کی دنیا کا عمومی جائزہ لیتے ہوئے اس وقت کے قابل ذکر ممالک واقوام کا تذکرہ کیا ہے۔

> قدیم روایات کے باوجود چھٹی صدی عیسوی کی اس دنیا میں عربوں کو کوئی اہمیت حاصل نہ تھی۔ حقیقت میں تو کسی کی بھی کوئی اہمیت نہ تھی۔ یہ ایک نزاع کا دور تھا جب کہ مشرقی یورپ اور مغربی ایشیا کی عظیم سلطنتیں اول ہی تباہ ہو چکی تھیں یا اپنے شاہی دور کے اختتام پر تھیں، یہ ایک ایسی دنیا تھی جو اب بھی یونان کی فصاحت ایران کی عظمت اور روما کی شوکت و جلال سے متحیر تھی اور کوئی ایسی ایک شے یا کوئی ایسا ایک مذہب بھی نہ تھا جو ان میں سے کسی کی جگہ لیتا۔

غرضیکہ ساتویں صدی مسیحی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی تھی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جا سکے اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق کی قدروں کی حامل ہو نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل و انصاف اور رحم پر ہو اور نہ ایسی قیادت تھی جو علم و حکمت اپنے ساتھ رکھتی ہو اور نہ ایسا کوئی دین تھا جو انبیاء کرام کی طرف صحیح نسبت رکھتا ہو اور ان کی تعلیمات و خصوصیات کا حامل ہو۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں محمد رسول اللہ بشیر و نذیر بن کر تشریف لائے۔ اس عالمگیر تاریکی کا نقشہ قرآن نے علی فترت من الرسل کے مختصر

جملہ کے ذریعہ پیش کیا ہے۔

قربان

قربان یہاں قربانی یعنی ذبیحہ کے معنے میں نہیں ہے بلکہ لفظی معنے اور وسیع مفہوم میں جیسے نذر و نیاز کے مفہوم میں ہے۔ راغب اصفہانی نے مفردات میں اور الجصاص نے احکام القرآن میں یہی معنے بتاتے ہیں۔ سب نے ہی یک زبان ہو کر لکھا ہے ما یتقرب الی اللّٰہ یعنی قربان وہ چیز ہے جس کے ذریعہ اللہ کا قرب تلاش کیا جائے۔ اسلام و کفر میں حد فاصل صرف یہ ہے کہ مسلمان اپنے صدقہ، نذر و نیاز اور قربانی کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرتا ہے جبکہ کافر یہی غیر اللہ کے لیے کرتا ہے۔ یہ غیر اللہ مشرکین مکہ کے بت ہوں یا عیسائیوں کے حضرت عیسیٰ اور ان کی والدہ ہوں یا یہودیوں کے حضرت عزیر ہوں اور یا مسلمانوں کے شیخ جیلانی ہوں۔ اشخاص و افراد کی تبدیلی مسئلہ پر اثر انداز نہیں ہوتی ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے :

> کھانے پینے کی چیزیں اور اسی طرح دوسرے اموال کو غیر اللہ کے تقرب کی نیت سے دینا حرام اور شرک ہے۔ (فتاویٰ عزیزی)

کلالہ

کلالہ جس کا نہ والد ہو نہ اولاد ہو۔ یہ تکلل النسب سے بنا ہے جس کے معنے ہیں نسب نے اس کو گھیر لیا۔ کچھ کہتے ہیں کہ کلالہ اس وارث کو کہتے ہیں جو نہ میت کا والد ہو اور نہ اس کی اولاد ہو۔ بعض کا خیال یہ ہے کہ باپ بیٹا آدمی کے دو کنارے ہیں تو جب مرتے وقت نہ باپ چھوڑے نہ بیٹا تو گویا دونوں کنارے اس کے مٹ گئے اس لیے اس کو کلالہ کہتے ہیں اور کچھ کی رائے ہے کہ جو چیز گھیرے اس کو اکلیل کہتے ہیں اور میت کو کلالہ اس لیے کہا ہے کہ دوسرے وارث اس کو گھیر لیتے ہیں۔ قانون کی اصطلاحی زبان میں کلالہ اس میت کو کہتے ہیں جس کی نہ اولاد ہو اور نہ والد ہو۔ یعنی نہ بالائی رشتہ ہو نہ زیریں۔ صدیق اکبر نے کلالہ کی یہی تعریف کی ہے اور ابن کثیر فرماتے ہیں یہی حضرت عمر، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عبداللہ ابن عباس اور حضرت زید بن ثابت کا ارشاد ہے۔ تابعین میں امام شعبی، ابراہیم نخعی، حسن بصری، قتادہ، جابر بن زید اور الحکم کی یہی رائے ہے۔ اہل مدینہ، اہل کوفہ اور اہل بصرہ کا یہی فیصلہ ہے۔ فقہاء سبعہ اور

ائمہ اربعہ کا یہی موقف ہے بلکہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ اسی پر اجماع ہے۔ اس کے برعکس اہل لغت کہتے ہیں کہ کلالہ اس وارث کو کہتے ہیں کہ جو میت کا نہ باپ ہو اور نہ اولاد ہو۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ بظاہر اصطلاح شریعت اور اہل لغت کے مابین تضاد ہے لیکن دونوں درست ہیں کیونکہ جس میت کے بلاواسطہ وارث نہ ہوں بلکہ دوسرے ہوں تو میت کا رشتہ دوسروں سے کمزور ہوگا کیونکہ بالواسطہ ہوگا۔ اسی لیے ان وارثوں کا رشتہ میت سے کمزور ہوگا جو میت کی اولاد میں سے نہ ہوں اور باپ بھی نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ کلال کے معنے ضعف کے ہیں اور بالواسطہ رشتہ بلاواسطہ کے مقابلے میں ایک کمزور رشتہ ہے اس لیے دونوں پر اطلاق صحیح ہے۔

دراصل کلالہ کی اصل کلال ہے اور کلال کے معنے کمزوری کے ہیں۔ اعشیٰ کہتا ہے :

فالیت لا ارثی لها من کلالة
ولا من حفا حتی تلاقی محمداً

میں نے قسم کھائی ہے کہ اونٹنی پر اس کی تھکاوٹ اور فرسودہ پائی کی وجہ سے اس وقت تک رحم نہ کروں گا جب تک وہ مجھے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ تک نہ پہنچا دے گی اسی سے وہ زبان جس میں گویائی نہ ہے اور وہ آنکھ جس میں بینائی نہ ہے وہ تلوار جو کند ہو گئی ہو اور وہ شخص جو بوجھ نہ اٹھا سکے۔ کلیل اور کل کہلاتے ہیں۔

خدیجۃ الکبریٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا انک لتحمل الکل آپ تو ان کو اٹھاتے ہیں جو گرے پڑے ہیں اور کمزوری کی وجہ سے اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے اور یہی معنے ہیں اس ارشاد کے کہ من ترک مالا فلورثتہ و من ترک کلا فالی وعلی جو شخص مال و اسباب چھوڑ جاتے وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جو بوجھ چھوڑ کر جاتے وہ میرے ذمہ ہے۔ توسیع استعمال کے بعد عرف میں کلالہ سے وہ لوگ مراد ہوتے ہیں۔ جو منقطع الطرفین ہوں نہ ان کے والدین ہوں اور نہ اولاد ہو۔ اور جو شخص آباؤ اجداد کی خصوصیات سے محروم ہو جاتے اس کو بھی کلالہ کہتے ہیں۔ چنانچہ ایک شاعر کہتا ہے :

ورثتم قناة الملک غیر کلالة
عن ابنی عبد مناف عبد شمس وهاشم

عبدمناف کے دونوں بیٹوں عبدشمس اور ہاشم سے حکومت کا نیزہ تمہیں ایسا وراثت

میں ملا ہے جو کنذ نہیں ہے لیکن تم خود ان خصوصیات سے بے بہرہ ہو۔ قریب کے رشتہ کو چھوڑ کر دُور کے رشتہ کو بھی کلالہ کہتے ہیں۔ الجصاص رقمطراز ہیں کہ احادیث میں کلالہ مورث اور وارث دونوں معنے میں آتا ہے۔

یہ لفظ دو مرتبہ آیا ہے ایک بار سورۃ نساء کے آغاز میں پارہ ۴ میں اور دوسری بار سورۃ نساء کے آخر میں پارہ ششم کے آغاز میں۔ بھائی بہن تین طرح کے ہیں، سگے جن کو عینی کہتے ہیں سوتیلے جو صرف باپ میں شریک ہوں جن کو علاتی کہتے ہیں اور وہ سوتیلے جو صرف ماں میں شریک ہوں جن کو اخیافی کہتے ہیں۔ سورۃ نساء کے آغاز میں اخیافی بہن بھائی کی میراث کا ذکر ہے اور اس پر اجماع ہے اور سورت کے آخر میں علاتی اور عینی بہن بھائیوں کی میراث کا ذکر ہے۔

لَا يُحِبُّ اللّٰهُ الْجَهْرَ بِالسُّوْٓءِ مِنَ الْقَوْلِ اِلَّا مَنْ ظُلِمَ
وَكَانَ اللّٰهُ سَمِيْعًا عَلِيْمًا ۝ اِنْ تُبْدُوْا خَيْرًا اَوْ تُخْفُوْهُ
اَوْ تَعْفُوْا عَنْ سُوْٓءٍ فَاِنَّ اللّٰهَ كَانَ عَفُوًّا قَدِيْرًا ۝

اللہ سبحانہٗ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی کسی کو علانیہ بُرا کہے مگر وہ جو مظلوم ہو، اور اللہ سبحانہٗ سب کچھ جانتا اور سنتا ہے۔[۲۱۹] اگر تم لوگ بھلائی کھلم کھلا کروگے یا چُھپا کر کروگے یا بُرائی سے درگزر کروگے تو بلاشبہ اللہ ہی معاف کرنے والا صاحب قدرت ہے۔[۲۲۰]

قانون ازالہ حیثیت عرفی

کسی کو بُرا کہنے کی کئی قسمیں ہیں۔ ایک قسم تو قوت شہوانیہ سے تعلق رکھتی ہے اور اس کے مرتکب زیادہ تر رند، بے باک، نوجوان اور بے تکلف دوست واحباب ہوتے ہیں۔ مثلاً جب اس قسم کی بے تکلفانہ اور رندانہ صحبتیں قائم ہوتی ہیں تو عورتوں کے حسن وجمال کا ذکر ہوتا ہے اور اس سلسلے میں اس قسم کے حالات وواقعات بیان کیے جاتے ہیں جو بعض اوقات شرمناک حد تک پہنچ جاتے ہیں۔

کسی کو بُرا کہنے کی دوسری قسم کا تعلق قوتِ غضبیہ سے ہے جس کا نام سب وشتم یا گالی گلوچ ہے اور یہ صورت عموماً جنگ و جدل کے موقع پر پیش آتی ہے۔ گالی گلوچ کی مختلف قسمیں ہیں۔ بعض اوقات انسان ایک شخص کے ماں باپ کو بُرا بھلا کہتا ہے۔ اس کے نسب میں عیب نکالتا ہے۔ کبھی خود اس شخص کے عیوب ظاہر کرتا ہے یہاں تک اگر وہ کسی نفرت انگیز بیماری مثلاً برص جذام میں مبتلا ہو تو اس پر بھی طنز کرتا ہے۔ بعض حالتوں میں اگر اس نے کوئی بُرا کام کیا ہے یا اس کے ساتھ کوئی بُرا برتاؤ کیا گیا ہے تو اس کا اظہار کرتا ہے۔ قرآن نے اس آیت میں اجمالی طور پر ان تمام صورتوں کی ممانعت کی ہے۔ گویا یہ آیت قرآنی قانون ازالہ حیثیت عرفی کی بنیاد ہے۔ پہلے کئی رکوعوں میں منافقوں کے حالات کو کھول کر بیان کیا ہے۔ اب یہاں اہل ایمان کو ایک نہایت بلند درجہ کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ منافق بُت پرست اور یہودی سب کے سب اس وقت ہر ممکن طریق سے اسلام کی راہ میں روڑے اٹکانے اور اس کی پیروی قبول کرنے والوں کو ستانے اور پریشان کرنے پر تُلے ہوتے تھے۔ کوئی بدتر سے بدتر تدبیر ایسی نہ تھی جو وہ اس نو زائیدہ جماعت کے خلاف استعمال نہ کر رہے ہوں۔ اس پر مسلمانوں میں نفرت اور غصہ کے جذبات کا پیدا ہونا ایک فطری بات تھی۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں میں اس قسم کا طوفان اٹھتے دیکھ کر فرمایا کہ بدگوئی پر زبان کھولنا اللہ کے نزدیک کوئی پسندیدہ کام نہیں ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ تم مظلوم ہو۔ اور اگر مظلوم ظالم کے خلاف بدگوئی پر زبان کھولے تو اسے حق پہنچتا ہے لیکن پھر بھی افضل یہی ہے کہ علانیہ ہو یا خفیہ ہر حال میں بھلائی کے لیے کام کیے جاؤ اور بُرائیوں سے درگزر کرو کیونکہ تم کو اپنے اخلاق میں خدا کے اخلاق سے قریب تر ہونا چاہیے۔ جس خدا کا قرب تم چاہتے ہو اس کی شان یہ ہے کہ نہایت حلیم و بُردبار ہے۔ سخت سے سخت مجرموں تک کو رزق دیتا ہے اور بڑے سے بڑے قصوروں پر بھی درگزر کیے چلا جاتا ہے۔ لہٰذا اس سے قریب تر ہونے کے لیے تم بھی عالی اور وسیع الظرف بنو۔

۲۱۹ - اللہ سبحانہٗ اس بات کو پسند نہیں کرتا کہ کوئی کسی کو علانیہ بُرا کہے مگر وہ جو مظلوم ہو اور اللہ سب کچھ جانتا اور سنتا ہے۔ یعنی اگر کسی میں دین و دنیا کا عیب معلوم ہو تو اس کو مشہور نہ کرنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ سب کی بات سنتا اور سب کے کام جانتا ہے، ہر ایک کو اس کے موافق جزا دے گا۔ اسی کو غیبت کہتے ہیں، البتہ مظلوم کو رخصت ہے کہ ظالم کا ظلم لوگوں سے بیان کرے، ایسے ہی بعض اور صورتوں میں بھی غیبت روا ہے اور یہ جو میاں شاہ اس لیے فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ کسی منافق کا نام مشہور نہ کریں۔ اس میں وہ مگر کر شاید پاک ہو جاتے بلکہ مبہم نصیحت کریں۔ اس طرح

منافق آپ سمجھ لے گا یا تنہائی میں نصیحت کریں کہ شاید ہدایت قبول کرے چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی ایسا ہی کرتے تھے کسی کا نام لے کر مشہور نہ کرتے تھے۔ [1]

اصل ارشاد میں الجھر بالسوء من القول آیا ہے۔ جہر کسی چیز کے ظہور کو کہا جاتا ہے۔ بینائی کی افراط سے ہو یا شنوائی کی مگر یہاں مراد صرف اعلان ہے خواہ زبان دہن سے ہو یا زبان قلم سے۔ سوء برائی، آفت، گناہ، برا کام، عیب سوءٌ سے اسم ہے۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے کہ سوء آفات اور امراض کا ایک جامع نام ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں۔ سوء ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں ڈال دے چاہے دنیوی امور سے ہو یا اخروی۔ احوال نفسیہ میں سے ہو یا احوال بدنیہ سے یا ان حالات میں سے ہو جو کہ جاہ و مال کے چھوٹ جانے اور دوست کے بچھڑ جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن حکیم میں اس کا استعمال جن معانی میں ہوا ہے۔ حافظ سیوطی نے ان کو تفصیل کے ساتھ الاتقان فی علوم القرآن میں قلم بند کیا ہے فرماتے ہیں:

سوء کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ شدت اور سختی کے لیے یسومونکم سوء العذاب کونچیں کاٹنے کے لیے لا تمسوھا بسوء زنا کے لیے من اراد باھلک سوء برص کے لیے بیضاء من غیر سوء عذاب کے لیے ان الخزی الیوم والسوء علی الکافرین شرک کے لیے ماکنا نعمل من سوء گالی گلوچ کے لیے لا یحب اللّٰہ الجھر بالسوء گناہ کے لیے یعملون السوء بجہالۃ برے کے معنے میں لھم سوء الدار نقصان اور ضرر کے معنے میں ویکشف السوء شکست اور ہزیمت کے معنے میں لم یمسسھم سوء۔

اس آیت میں بھی اسی طرح کی ایک تنبیہ ہے جیسے آپ پیچھے پانچویں پارے میں لا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مومناً میں پڑھ آئے ہیں۔ جس طرح وہاں منافقین سے جب اعراض کا برتاؤ کرنے کا حکم ہوا تو ساتھ ہی مسلمانوں کو یہ ہدایت کر دی گئی کہ جو تمہیں سلام کرے تم اس کے سلام کا جواب دو اور مقصود اس سے یہ تھا کہ مبادا پرجوش مسلمان ان لوگوں سے سلام کلام ہی بند کر دیں جن پر ان کو منافقت کا شبہ ہو جاتے۔ اسی طرح یہاں بھی منافقین کے لیے ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں جس سے اس بات کا اندیشہ تھا کہ مسلمان علانیہ سخت الفاظ میں منافقین کی برائیوں کا اعلان شروع کر دیں گے۔ اس بنا پر یہ ہدایت کی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ

[1] افادات شیخ الاسلام

برائی کا اظہار صرف مظلوم کے لیے جائز ہے دوسروں کے لیے اللہ اس کو پسند نہیں فرماتا۔

جماعتی زندگی کا ایک اہم مسئلہ

یہ بات چونکہ جماعتی زندگی کے اہم مسائل میں سے ہے اس لیے اس کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے۔ جماعتی زندگی میں کسی گروہ کے اندر اگر کوئی ایسی برائی جڑ پکڑ رہی ہو یا پکڑ چکی ہو جو پوری جماعت کے لیے خطرہ بن سکتی ہو تو اس کا تدارک ضروری ہوتا ہے۔ اور اس تدارک کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ اس برائی کی قباحت اس کے بد نتائج اور اس کے مرتکبین کے انجام کو اچھی طرح واضح کر دیا جائے تاکہ جماعت کے افراد اس کے شر سے محفوظ ہو جائیں لیکن ساتھ ہی اس امر کو ملحوظ رکھنا بھی ضروری ہے کہ جماعت کے عام افراد، عام عنوان سے کہی ہوئی بات کو صرف اپنے اندازے، قیاس اور گمان کی بنا پر خاص اشخاص پر منطبق کرنا شروع کر دیں۔ اس سے نہ صرف اس بات کا اندیشہ ہے کہ بہت سے بے گناہ افراد تہمتوں کا نشانہ بن جائیں گے بلکہ جماعت میں انتشار و فساد پیدا ہونے کا بھی خطرہ ہے۔ یہاں منافقین سے متعلق جو باتیں بیان ہوئی ہیں دیکھ لیجئے بالکل عام انداز میں بیان ہوئی ہیں اور مقصد یہ ہے کہ جو لوگ یہ حرکتیں کر رہے ہیں وہ اگر اپنی اصلاح کرنا چاہیں تو اصلاح کر لیں اور اگر وہ اصلاح نہ کریں تو کم از کم مسلمان اپنے آپ کو ان فتنوں سے محفوظ رکھیں۔ اس حد تک یہ چیز نہ صرف یہ کہ ٹھیک ہے بلکہ جماعتی بقا کے لیے ناگزیر ہے، لیکن اگر یہی چیز یہ شکل اختیار کر لے کہ اس کو دلیل بنا کر عام افراد تعین کے ساتھ ایک دوسرے کو طعنوں کا نشانہ بنانا شروع کر دیں کہ تو منافق ہے، تو کافر ہو گیا اور فلاں فی الدرك الاسفل من النار کا سزاوار ہے تو پوری جماعت میں ایک طوفان بپا ہو جائے گا۔ اسی فتنہ کے سدباب کے لیے یہ ہدایت فرما دی گئی کہ تعین اشخاص کے ساتھ برائی کا اظہار و اعلان صرف اس شخص کے لیے جائز ہے جس پر شخصاً ظلم ہوا ہو۔ اس صورت میں ظلم، ظالم اور مظلوم تینوں متعین ہوں گے اور قانون اس کا مداوا کر سکے گا جب یہ شکل نہ ہو بات کا انداز عمومی ہونا چاہیے جیسے قرآن نے منافقین کے ذکر میں اختیار کیا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے علم میں بھی جب اس طرح کی کوئی بات آتی تو آپ ہمیشہ عام انداز اختیار فرماتے مثلاً مابال قوم یفعلون کذا لوگوں کو کیا ہو گیا ہے جو اس طرح کے کام کرتے ہیں، البتہ جب کوئی متعین شخص کسی متعین جرم کے ساتھ سامنے آتا تو آپ اس پر قانون کے مطابق گرفت فرماتے۔

اللہ کو پسند نہیں کا مطلب

آیت نے اخلاق کی اصطلاح میں بدگوئی اور قانون کی زبان میں ہتک عزت کو بالکل ناجائز قرار دیا۔ اور فرد و جماعت، شخص و ملت دونوں کے ہاتھ میں فلاح و اصلاح کی ایک بڑی اصل دی۔ الجہر بالسوء من القول کے تحت میں پس پشت بھی کسی کے عیب کی تشہیر آگئی اور اس کے روبرو تلخ کلامی بھی۔ اللہ پسند نہیں کرتا کا مطلب یہ ہے کہ زبان کو بُرے الفاظ لعنت، ملامت، گالی گلوچ، ہجو مذمت اور اسی طرح کی جملہ بدگوئیوں سے آلودہ کرنا ممنوع اور خدا کی ناراضگی کا باعث ہے جن سے ایک طرف تو انسان کی بے قدری ہو اور دوسری طرف اس کی بے شرمی، بد طینتی اور بد تہذیبی کا اعلان اور اس کی اس بے ضمیری کا اظہار ہو کر وہ اپنے نفس کو جاہلانہ جذبات اور شیطانی وسوسے مثلاً عجب و غرور، تضحیک و تحقیر اور ہزل گوئی و بدکلامی وغیرہ اخلاقی رذائل سے اپنی زبان کو روکنے پر قابو نہیں رکھتا۔ بدگوئی کی شناعت اور اکراہی کا اندازہ آیت قرآنی کے اس بلیغ اور مؤثر انداز بیان سے کیجئے جو اس کی ممانعت کے لیے اس نے اختیار کیا ہے۔ اس ممانعت کا عام اور معمولی طریقہ یہاں تو یہ تھا کریوں کہہ دیتا لا تجھروا بالسوء من القول ایسی بات نہ کہو، لیکن اس کے بجائے لا یحب اللہ الجہر بالسوء من القول کا اسلوب اختیار کر کے دراصل حکیمانہ طور پر اس امر کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ یہ چیز ناراضیٔ خدا کا باعث ہے۔ اس لیے خواہ کچھ ہو اس کا ارتکاب نہ ہونے پائے۔

بدگوئی کا یہ حکم عام نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس میں ایک استثنا بھی رکھا ہے اور مظلوم کو ظالم کے خلاف زبان ملامت کھولنے کی اجازت دی ہے۔ یہ بات بہت سے مصالح پر مبنی ہے مظلوم اگر ظالم کے ظلم وستم سے تنگ آکر بددعائیں دے، نالہ و فریاد کرے اور اس کی برائیوں اور مظالم کو بیان کرے تو اللہ تعالیٰ کو مظلوم کی یہ بدگوئی ناپسند نہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ لوگ اس کی مظلومیت اور بے بسی پر ترس کھائیں اور ظالم کو اس کے ظلم سے روکیں یا ایسا ہو کہ بدنامی اور رسوائی کے خوف سے ظالم خود ہی باز آجائے۔ اس کے علاوہ تقاضائے فطرت ہے کہ زخم خوردہ اور مظلوم انسان اگر کچھ نہیں کر سکتا تو کم از کم ظالم پر لعنت بھیج کر اور ظالم کو برا بھلا کہہ کر ہی اپنے غم و غصہ کی آگ بجھا لیتا ہے اور اس استثنا کی دوسری اہم وجہ اور مصلحت جس پر باونیٰ تامل نگاہ پہنچ سکتی ہے یہ ہے کہ ظلم بدترین گناہ اور ظالم ایک حیوان صفت انسان ہے جو اللہ کے نزدیک سخت مغضوب، ذلیل اور اس کی عنایتوں سے محروم ہے حتیٰ کہ اس کی ملامت اور بدگوئی کرنا بھی اللہ کو پسند نہیں ہے۔

بدزبانی سے بچنے کے مصالح

قرآن وحدیث میں جابجا بدزبانی سے بچنے کے حکم ومصالح نہایت تفصیل سے بیان کیے گئے ہیں مثلاً اول یہ کہ بدزبانی میں لوگ عموماً زیادتی کرتے ہیں۔ یعنی اگر ایک شخص ایک بار کسی کے بارے میں بدزبانی کرتا ہے تو دوسرا دو بار کرتا ہے۔ اگر ایک شخص کسی کے باپ کے بارے میں بدزبانی کرتا ہے تو دوسرا اس کے باپ اور ماں دونوں کو اس میں شامل کر لیتا ہے۔ اس لیے دوسرے کی تعدی سے محفوظ رہنے کا طریق یہ ہے کہ کسی کے بارے میں بدزبانی نہ کی جائے۔ اللہ سبحانہ نے قرآن مجید کی اس آیت میں یہی نکتہ بیان کیا ہے۔

ولا تسبوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم۔

مسلمانو! ان لوگوں کو برا نہ کہو جو خدا کے سوا دوسرے معبودوں کو پکارتے ہیں کہ یہ لوگ بھی نادانی سے بڑھ کر خدا کو برا کہہ بیٹھیں گے۔

اسی نکتہ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے ماں باپ پر لعنت بھیجے کہا گیا یا رسول اللہ! کوئی اپنے ماں باپ پر کیوں کر لعنت بھیج سکتا ہے فرمایا اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو برا بھلا کہے گا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو برا بھلا کہے گا۔ (بخاری کتاب الادب)

دوسرے یہ کہ بدزبان آدمی اجتماعی اور معاشرتی زندگی کے فوائد سے محروم ہو جاتا ہے اور لوگ اس سے ملنا جلنا چھوڑ دیتے ہیں۔ حدیث میں ہے کہ ایک شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملنے آیا۔ آپ نے اس کو دیکھا تو فرمایا کہ اپنے قبیلہ میں یہ نہایت برا آدمی ہے لیکن جب وہ آپ کے پاس بیٹھا تو آپ اس سے نہایت خندہ پیشانی سے ملے۔ جب وہ چلا گیا تو حضرت عائشہؓ نے کہا کہ جب آپ نے اس کو دیکھا تو برا کہا۔ پھر اس سے نہایت لطف ومحبت سے ملے۔ فرمایا۔ عائشہ تم نے مجھے بدزبان کب پایا۔ خدا کے نزدیک قیامت کے روز ان سب سے برا شخص وہ ہوگا جس کی بدزبانی کے خوف سے لوگ اسے چھوڑ دیں۔ (بخاری کتاب الادب)

تیسرے یہ کہ بدزبانی دور وحشت وجہالت کی یادگار اور تہذیب وشائستگی کے خلاف ہے ایک بار حضرت ابوذرؓ نے ایک غلام کو ماں کی گالی دی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی اطلاع

ہوتی تو فرمایا تم میں جاہلیت کا اثر باقی ہے۔ (صحیح بخاری)

امام بخاری نے ادب المفرد میں اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ غلاموں اور نوکروں سے بدزبانی کرنا جائز نہیں ہے۔

چوتھے یہ کہ رفق و ملاطفت اور شرم و حیا شریفانہ اخلاق ہیں اور اسلام نے خاص طور پر ان کی تعلیم دی ہے لیکن بدزبانی ان کے بالکل خلاف ہے۔ ایک بار کچھ یہود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے اور سلام کی بجائے السام علیکم (تم کو موت آئے) کہا۔ حضرت عائشہ نے جواب میں کہا علیکم ولعنکم اللہ وغضب اللہ علیکم۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے سنا تو فرمایا کہ اے عائشہ نرمی اختیار کرو اور سختی و بدزبانی سے بچو۔ (بخاری کتاب الادب)

پانچویں یہ کہ بدزبانی سے روکنے کا ایک دقیق نکتہ یہ ہے کہ اس میں عموماً بے شرمی اور بے حیائی کی باتوں کو الفاظ کی صورت میں منہ سے نکالا جاتا ہے اور سنایا جاتا ہے۔ اس سے سوسائٹی میں ان مکروہ باتوں کو سننے اور سنانے کی جرأت پیدا ہوتی ہے اور بے حیائی کے الفاظ بڑھ کر اعمال کی صورت اختیار کر لیتے ہیں یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بدزبانی کو حیا کے بالمقابل ذکر فرمایا۔ ارشاد ہے کہ بدزبانی جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے اور حیا جس چیز میں شامل ہوتی ہے اس کو زینت دے دیتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی حیا کے خلاف ہے۔

چھٹے یہ کہ بدزبانی سے لوگوں کو اذیت پہنچتی ہے۔ حالانکہ مسلمانوں کو ایذا رسانی سے احتراز کرنا چاہیے اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے کہ جس کے ہاتھ اور زبان سے مسلمان محفوظ رہیں۔ (مسلم کتاب الایمان) مُردوں کو برا بھلا کہنے کی ممانعت اسی لیے کی گئی ہے کہ اس سے زندوں یعنی مُردوں کے عزیز و اقارب کو تکلیف ہوتی ہے۔ (ترمذی)

ساتویں یہ کہ بدزبانی باہم لڑائی کا پیش خیمہ ہے اور مسلمانوں کے ساتھ لڑنا کفر ہے اس لیے جو چیز اس کا ذریعہ بنتی ہے وہ اگر کفر نہیں تو کم از کم فسق ضرور ہے۔ اسی بنا پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، "مسلمان کو برا بھلا کہنا فسق ہے اور اس کے ساتھ لڑنا کفر ہے۔ (بخاری کتاب الادب)

ان تمام مراتب کے پیش نظر رکھنے کے بعد یہ بات واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ بدزبانی قرآنی تعلیمات اور اسلامی خصوصیات کے منافی ہے اس لیے جو شخص صحیح اسلامی زندگی اللہ کی پسند کے مطابق بسر کرنا چاہتا ہے وہ اس بداخلاقی میں مبتلا رہنا کبھی گوارا نہیں کرے گا۔

اخلاق اور محبتِ الٰہی

ذرا ٹھہر جایئے اور یہاں اس پہلو پر بھی غور فرمایئے کہ دین و دُنیا کی سب سے بڑی نعمت اللہ سبحانہٗ کی محبت ہے یعنی وہ پیار جو اللہ سبحانہٗ کو اپنے بندے سے ہو۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن راہوں سے حاصل ہوتی ہے ان میں دیگر ضروریات دین کے علاوہ سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسن اخلاق ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی محبت پر زور تو تورات اور انجیل میں بھی ہے۔ مگر اصل یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے؟ اور یہ دولت انسان کو کیوں کر حاصل ہو سکتی ہے اس کا جواب صرف قرآن نے دیا ہے۔ مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز میں صاحب خلق عظیم داعی خیر کی پیروی محبت الٰہی کا ذریعہ ہے اس لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات' ارشادات' احکام' اخلاق اور اعمال کی پیروی محبت الٰہی کا سب سے بڑا ذریعہ ہیں لیکن قرآن نے اس مختصر جواب پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے نام بنام بتایا ہے کہ خدا کی محبت کے مستحق اور سزا وار کون کون ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں۔ اس سے اسلامی اصول اخلاق کا یہ مسئلہ سمجھ میں آتا ہے کہ ان کاموں میں سے جو خدا کی محبت کا ذریعہ ہیں۔ حسن خلق یہی ہے اور ان امور میں سے جن سے یہ نعمت چھن جاتی ہے۔ بد اخلاقی بھی ہے

قرآن نے منفی اور مثبت دونوں پہلو پیش کیے ہیں منفی پہلو کی حد تک اس کی پکار اگر یہ ہے کہ کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے آگے بڑھ جانے، فخر و غرور (شیخی)، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف ظلم اور گناہ وہ بداخلاقیاں ہیں جو انسان کو محبتِ الٰہی کے سایہ سے دُور کرتی ہیں۔ تو مثبت پہلو کی حد تک اس کا اعلان یہ ہے کہ ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی اور جہاد وہ اخلاق حسنہ ہیں جو محبتِ الٰہی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں۔

بدزبانی علانیہ اور پوشیدہ دونوں حرام ہیں

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ علانیہ بُرا کہنے کو ناپسند کہنے کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ کو خفیہ بدزبانی پسند ہے۔ علانیہ اور جہر بالسوء کی قید احترازی نہیں بلکہ اتفاقی ہے اور منافقین کے یہاں مفاسد کی مناسبت سے ہے ورنہ جیسے جہر بالسوء اللہ کو پسند نہیں ہے ایسے اسرار بالسوء بھی اللہ کو پسند نہیں ہے قرآن میں سنجوٰی بالاثم والعدوان کی ممانعت آئی ہے اور پھر قرآن نے صراحۃً متعدد آیتوں میں کسی کے بارے میں بدزبانی کے مخفی طریقوں کی بُرائی بیان کی ہے۔

ویل لکل ھمزۃ لمزۃ — ہر شخص جو لوگوں کی عیب چینی کرتا اور ان پر آوازے کستا ہے اس کی بڑی تباہی ہے ۔

اس آیت میں بدزبانی کے جن معنی اور دل خراش طریقوں کی مذمت کی گئی ہے ان کی توضیح ترجمہ سے نہیں ہو سکتی بلکہ اس کے لیے اہل لغت کی تصریحات پیش نظر رکھنی چاہئیں جو حسب ذیل ہیں ۔

۱۔ ھمز سامنے اور لمز پیٹھ پیچھے بُرائی کرنا ۔
۲۔ ھمز خاص طور پر لوگوں کے نسب کی بُرائی بیان کرنا ۔
۳۔ ھمز ہاتھ کے اشارے سے اور لمز زبان سے بُرائی کرنا ۔
۴۔ ھمز زبان سے اور لمز آنکھ کے اشارے بُرائی کرنا ۔
۵۔ ھمز بُرے الفاظ سے ہم نشینوں کی دل آزاری کرنا ۔
۶۔ لمز آنکھ ، ہاتھ ، سر ابرو کے اشاروں سے ہم نشینوں کی بُرائی کرنا ۔

اس سے معلوم ہوا کہ بدزبانی کا دائرہ کہاں تک وسیع ہے ۔

آخر میں ارشاد ہے وکان اللہ سمیعاً علیماً ، اس میں تنبیہ فرما دی ۔

اولاً یہ کہ مظلوم کے علاوہ اگر کوئی شخص بدزبانی سے احتیاط نہ کرے گا تو اس کو یہ سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ سبحانہٗ اس سے بے خبر اور ناواقف نہیں ہے بلکہ اس کی شان یہ ہے کہ وہ تمہاری بدزبانی کو سنتا اور جانتا ہے اس لیے اگر تم اس عادت کو نہ چھوڑو گے تو اس کی پاداش بہرحال تمہیں بھگتنی ہوگی ۔

ثانیاً ، سمیع میں ایک طرف تو ظالم کو تنبیہ ہے کہ مظلوم کہیں فریاد کرے کرجاتے نہ جانے اللہ تو بہرصورت اُس کی سُن ہی رہا ہے اور دوسری طرف مظلوم کو بھی ترغیب ہے کہ مخلوق کے سامنے خواہ مخواہ زیادہ واویلا نہ کرے یقین رکھے کہ اللہ تو سُن رہا ہے اور علیماً کی صفت لا کر بھی ظالم و مظلوم دونوں کو یاد دلایا ہے کہ کوئی زبان سے بولے یا نہ بولے اللہ پر ہر ظلم کی نوعیت و حقیقت عیاں ہے ۔

ثالثاً ، اس میں اشارہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس ہدایت کے خلاف روش اختیار کرے گا تو وہ یاد رکھے کہ اللہ سبحانہٗ سننے والا اور جاننے والا ہے یعنی اس پر وہ گرفت کرے گا ۔

فضائل اخلاق کی ترغیب

۲۲۰ - اگر تم لوگ بھلائی کھلم کھلا کرو گے یا چھپا کر کرو گے یا بُرائی سے درگزر کرو گے تو بلاشبہ اللہ سبحانہٗ معاف کرنے والا صاحب قدرت ہے ۔ اس آیت میں مظلوم کو معافی کی رغبت دلائی

منظور ہے کہ حق تعالیٰ زبردست اور قدرت والا ہو کر خطا والوں کی خطا بخشتا ہے۔ بندۂ زیر دست عاجز کو بطریق اولیٰ دوسروں کی خطاؤں کو معاف کر دینا چاہیے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ مظلوم کو ظالم سے بدلہ لینا جائز ہے مگر افضل یہ ہے کہ صبر کرے اور بخش دے۔ آیت میں اشارہ ہے اس طرف کہ منافقوں کی اصلاح کرنا چاہتے ہو تو ان کی ایذا اور شرارت پر صبر کرو اور نرمی اور پردہ سے ان کو سمجھاؤ، ظاہر کی لعن وطعن سے بچو اور کھلا مخالف نہ بناؤ۔[1]

اس آیت میں اہلِ ایمان کو اخلاقِ حسنہ کی تعلیم دی گئی۔ یہاں تین درجے بیان کیے ہیں۔ پہلا درجہ یہ ہے کہ انسان نیکی کرتا ہے اور ساتھ ہی وہ اس کا اظہار بھی کر دیتا ہے۔ یہ ایک درجہ ہے لیکن بالکل ابتدائی اور سطحی قسم کا درجہ ہے ان تبدوا خیرا کا مفہوم یہی ہے۔ خیر سے مراد ہر قسم کی نیکی ہے نماز کی کرنا کی صدقہ وخیرات کی۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ نیکی کرے اور اس کا اظہار نہ کرے بلکہ اپنے عمل کا تمام تر مقصد رضائے الٰہی رکھے یہ اونچا مرتبہ ہے اور ارشاد میں او تخفوہ سے اسی طرف اشارہ مقصود ہے۔ نیکی میں اصل اور ضابطہ کی بات یہی ہے کہ اس کی پابجائی ہو۔ یہ بات کہ نیکی کا چھپانا افضل ہے یا ظاہر کرنا۔ نیکی کرنے والوں کے احوال کے اختلاف سے تعلق رکھتی ہے۔ زندگی میں ایسے مواقع ضرور پیش آتے ہیں جہاں نیکی کا اعلان واظہار بھی ضروری ہے۔ ایک شخص بھوک پیاس سے نڈھال ہے یا بیماری میں مبتلا سڑک پر پڑا تڑپ رہا ہے۔ آپ قریب سے گزر رہے ہیں اور آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ اسے کھانا کھلا کر یا دوا پلا کر از سر نو زندہ کر دیں لیکن اس اندیشہ سے کہ کہیں آپ کی اس خدمت کا شمار ریاکاری میں نہ ہو جائے، اس کے پاس سے کتراتے گزر جاتے ہیں۔ یہ تقویٰ نہیں عین معصیت اور وہم پرستی ہے۔ یہاں ضرورت فی الفور مدد رسانی کی ہے خواہ اس کا اعلان ہی کرنا پڑے۔ جن لوگوں نے نیکی کے اہتمام یا اخفا کی تاکید حد سے زیادہ کی ہے اور خدمتِ خلق کو مخفی رکھنے کے ساتھ محدود و مقید کر دیا ہے ان کی تعلیم یقیناً ناقص، نامکمل یک طرفہ ہے اور انہوں نے زندگی میں پیش آنے والے بکثرت واقعات کو نظر انداز کر دیا ہے۔ ضابطہ یہی ہے کہ عمل خیر کے اعلان واخفا میں اختیار ہے اور ساتھ ہی فضیلت اخفا کی ہے جب اظہار واعلان میں خاص مصلحت نہ ہو۔

تیسرا مرتبہ یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کو ناگواریاں پیش آئیں اور وہ ان کو نظر انداز کر جائے اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

برائی کرنے والے سے بدلہ لیا جائے یہ نفس کے لیے بہت شاق ہے اور اس کا درجہ سلوک و اخلاق کے منتہی کو ملتا ہے اور آخر میں عفواً قدیراً کا اضافہ کرکے بتادیا کہ جب گنہگاروں اور بدکاروں کو معاف کرنا خدا کی صفت ہے تو بندوں میں بھی خدا کی اس صفت کا جلوہ پیدا ہونا چاہیے اور یہاں یہ بلیغ نکتہ قابل توجہ ہے کہ قرآن کہتا ہے کہ تمہارا خدا تو ہر قسم کی قدرت علی الاطلاق رکھنے کے باوجود اپنے بندوں کو معاف کرتا ہے تو انسان جس کی قدرت محدود ہے اور جس کا اختیار مشروط ہے اور جس کی عاجزی و درماندگی ظاہر ہے اس کو تو بہر حال معاف ہی کرنا چاہیے۔ امام رازی نے یہاں یہ بات خوب ارشاد فرمائی ہے کہ آیت کے ان دو مختصر جملوں میں اخلاق و سلوک کا سارا خلاصہ آگیا ہے۔

قانون اور اخلاق کی مجموعی تعلیم

زیر نظر آیت کی تشریح تشنہ رہ جائے گی۔ اگر ہم اس پر مجموعی حیثیت سے ایک نظر نہ ڈالیں پہلی آیت میں مظلوم کو دادرسی کی خاطر بدلہ لینے کی اجازت دی ہے۔ اور اس آیت میں مظلوم کو معاف کرنے کی ترغیب دی ہے۔ اس حیثیت سے یہ آیت بتا رہی ہے کہ اسلام قانون و اخلاق کا مجموعہ ہے، قانوناً اس نے ہر مظلوم اور صاحبِ حق کو یہ اختیار دیا ہے کہ وہ چاہے تو تورات کے حکم کے مطابق اس کا بدلہ لے لیکن اس سے بلند تر بات یہ ہے کہ وہ انجیل کے مطابق اس ظالم کو معاف کر دے بلکہ برائی کی جگہ اس کے ساتھ بھلائی کرے۔ اس مجموعی تعلیم نے حکومت کے قانون انتقام و عدل اور شخص کی اخلاقی روحانیت کی تکمیل دونوں کو اپنی اپنی جگہ قائم رکھا ہے اور اس لیے وہ نسل انسانی کی حفاظت، ترقی اور نشوونما کا پوری طرح متکفل ہے۔ وہ عدل و انصاف کے بزور قائم کرنے کی بھی صلاحیت رکھتی ہے اور ذاتی اخلاق کے ذریعے سے لوگوں کی روحانی تکمیل میں کسی طرح حارج نہیں؛ وہ نہ یہودیوں کی شریعت کی طرح صرف مردہ جسم ہے اور نہ عیسائیوں کی تعلیم کی طرح غیر محسوس روح ہے بلکہ وہ جسم و جان کا مجموعہ اور زندہ اور محسوس پیکر ہے۔

موسوی، عیسوی اور محمدی اخلاقی تعلیمات میں باہم جو باریک فرق ہے۔ اس کا مبنی یہی ہے کہ موسویت اور عیسائیت میں قانون اور اخلاق الگ ہیں اور اسلام ان دونوں کی ترکیب کا نام ہے۔ اسلامی قوانین کو پیش نظر رکھ کر مخالفین نے اکثر کہا ہے کہ اسلام کی تعلیم میں اخلاقی روح نہیں ہے لیکن اگر وہ قانونِ محمدی کے ساتھ اخلاقِ محمدی کو سامنے رکھتے تو ان کو یہ شبہ پیش نہ آتا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسلام کے نام پر جو تعلیم پیش کی ہے وہ عفو اور عادلانہ انتقام یعنی اخلاق

اور قانون دونوں کا مجموعہ ہے۔ اس حیثیت سے آپ پورے اسلامی نظام پر نظر ڈالیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ سیاسی نظام، معاشی نظام، معاشرتی نظام، مالیاتی نظام اور عائلی نظام میں ہر جگہ کس خوبصورتی سے قانون و اخلاق میں مناہمت کی گئی ہے۔

الغرض قانون و اخلاق یعنی انتقام و عفو میں سے کسی ایک ہی کو اختیار کرنا دنیا کے جسمانی یا روحانی نظام کا نقص ہے۔ اگر انتقام اور سزا کا اصول نہ ہو تو جماعت کا نظام قائم نہیں رہ سکتا اور نہ ملک میں امن و امان رہ سکتا ہے۔ اور نہ افراد کے بڑے حصے کو برائیوں سے باز رہنے پر مجبور کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر عفو کا اصول نہ ہو تو روح کی بلندی اور اخلاق کی پاکیزگی کی کوئی چیز نہ رہے حالانکہ وہ ہی ایک اچھے اور صحیح نظام حیات کا مطلب ہے۔ اس لیے ان میں سے کسی ایک کو لینا اور دوسرے کو چھوڑ دینا نظام ہستی کو آدھا رکھنا اور آدھا مٹا دینا ہے۔

اس لیے قرآن نے ایک ایسی تعلیم پیش کی ہے جس کی نظر انسانی ہستی کے پورے نظام پر ہے اس نے یہ کیا کہ سزا اور انتقام کو تو جماعت اور حکومت کے ہاتھ میں دے دیا اور اس حکم کے ساتھ دیا کہ اس کے اجراء میں کوئی رحم نہ کیا جائے اور نہ اس میں بڑے، چھوٹے، امیر و غریب اور اپنے اور غیر میں کوئی فرق نہ کیا جائے تاکہ جماعت اور ملک کا نظام قائم رہے۔ دوسری طرف عفو کو شخصیت کے مدارج کمال کا ذریعہ بتایا۔ تاکہ اشخاص کی روحانی پاکی اور اخلاقی بلندی برابر ترقی کرتی جائے بہرحال انتقام و عفو دونوں کا اپنی اپنی جگہ مقام ہے۔ قانون کی حد تک انتقام ہے لیکن عفو کا درجہ اخلاق و احسان کا ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی قانون موجودہ ترقی پذیر ملکوں کے قوانین سے زیادہ نرم زیادہ منصفانہ اور عقل کے زیادہ مطابق ہے لیکن عفو کی عام تعلیم کا دائرہ اسلام میں اس سے زیادہ وسیع ہے۔ اخلاق کی سب سے بڑی بھاری اور دشوار تعلیم جو اکثر نفوس پر شاق گزرتی ہے وہ عفو و درگزر، ضبطِ نفس، تحمل اور بردباشت کی ہے لیکن اسلام نے اس سنگلاخ کو بھی نہایت آسانی سے طے کر دیا ہے اور قرآن نے ایک سے زیادہ آیات میں صبر و برداشت، تحمل اور عفو و درگزر کو بڑی ہمت اور اخلاقی بہادری کا کام بلکہ خدا کی محبوبی کا سبب بتایا ہے۔ اہل ایمان کو اس پر عمل کرنے کی دعوت دی ہے بلکہ بیگانے تو بیگانے قرآن نے تو ایمان والوں کو حکم دیا ہے کہ وہ بیگانوں اور اپنے دشمنوں کو بھی معاف کر دیں۔

قل للذین آمنوا یغفروا للذین لا یرجون ایام اللہ

اے پیغمبر اہل ایمان سے کہہ دو کہ وہ ان کو معاف کر دیں جو ایام اللہ کی امید نہیں۔

(ایام اللہ، خدا کی گرفت کے دن) کی جو امید نہیں رکھتے ظاہر ہے کہ وہی ہیں جو کافر ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ کفر کے خلاف اسلام کے جذبات کس قدر شدید ہیں۔ اس کے باوجود مسلمانوں کو تاکید کی جاتی ہے کہ وہ ان کو معاف کر دیں اور ان کی خطاؤں سے درگزر کریں۔ کیا اس سے زیادہ اسلام سے کسی نرمی کا مطالبہ ہے؟ زیر تشریح آیت میں اللہ تعالیٰ مسلمانوں کی ترغیب کی خاطر اس عفو و درگزر اور معافی کو اپنا خاص وصف بنا کر اہل ایمان کو اپنی پیروی کی تلقین فرماتا ہے کہ تمہارے لیے بہتر اور اچھی اور پسندیدہ روش یہی ہے کہ اچھے جذبات دل میں پرورش کرو اور دوسروں کی برائیوں سے درگزر کرو۔ کیونکہ ؎

در عفو لذتیست کہ در انتقام نیست

إِنَّ الَّذِينَ يَكْفُرُونَ بِاللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيُرِيدُونَ أَنْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ
اللَّهِ وَرُسُلِهِ وَيَقُولُونَ نُؤْمِنُ بِبَعْضٍ وَنَكْفُرُ بِبَعْضٍ وَيُرِيدُونَ
أَنْ يَتَّخِذُوا بَيْنَ ذَٰلِكَ سَبِيلًا ۝ أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَافِرُونَ حَقًّا
وَأَعْتَدْنَا لِلْكَافِرِينَ عَذَابًا مُهِينًا ۝ وَالَّذِينَ آمَنُوا بِاللَّهِ
وَرُسُلِهِ وَلَمْ يُفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ أُولَٰئِكَ سَوْفَ
يُؤْتِيهِمْ أُجُورَهُمْ ۗ وَكَانَ اللَّهُ غَفُورًا رَحِيمًا ۝

جو لوگ خدا سے اور اس کے پیغمبروں سے کفر کرتے ہیں اور خدا اور اس کے پیغمبروں کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے[۲۲۱]، اور ایمان و کفر کے درمیان ایک راہ نکالنا چاہتے ہیں۔ وہ بلاشبہ پکے کافر ہیں[۲۲۲]۔ اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت والا عذاب تیار کر رکھا ہے[۲۲۳]۔ اور جو لوگ اللہ اور اس کے

پیغمبروں پر ایمان لائے اور ان میں سے کسی کے درمیان کسی میں فرق نہیں کیا ایسے لوگوں کو وہ عنقریب ان کے اجر عطا کرے گا اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔ ۱۵۲

ایک نبی کا انکار بھی کفر ہے

اہل کتاب اور منافقوں میں یہ چیز قدر مشترک تھی کہ وہ خدا اور رسول کی باتوں کو علم کی حد تک مانتے تھے مگر عمل کی حدود میں انکار کرتے تھے۔ اور اہل کتاب میں یہودیوں میں یہ چیز زائد تھی کہ وہ کچھ رسول کو مانتے تھے اور کچھ کو نہیں مانتے تھے اسی مناسبت سے منافقین کے ذکر کے خاتمہ پر ربط مضمون کے لیے یہود اور عیسائیوں کا تذکرہ کیا ہے اور پھر منافقین کے نفاق کا سارا دارومدار اہل کتاب سے تعلقات تھے۔ ان سے سیاسی تعلقات، مقدمات میں ان کی عدالتوں سے بستگی، منافقین یہ روابط اہل کتاب سے کاٹنے کے لیے تیار نہ تھے بلکہ وہ اپنے اس رویہ کو جائز ثابت کرنے کے لیے یہ حیلہ تراشتے تھے کہ اہل کتاب بہرحال اہل کتاب ہیں۔ ان میں دینی لحاظ سے کچھ خرابیاں ہیں لیکن ان خرابیوں کی وجہ سے ان کو بالکل کافروں کی صف میں کھڑا کر دینا اور ان کے ساتھ کافروں کا معاملہ کرنا درست نہیں ہے۔ قرآن نے یہاں نہایت صراحت کے ساتھ بتایا ہے کہ پکے کافر یہی ہیں کیونکہ یہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان تفریق کرتے ہیں۔ اللہ نے جن کو رسول بنا کر بھیجا ہے ان میں سے جس کو چاہتے ہیں مانتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں نہیں مانتے۔ قرآن کی زبان میں اسی کا نام تفریق بین الرسل ہے۔ یعنی خدا کے رسولوں میں باعتبار تصدیق تفرقہ و امتیاز کرنا یعنی یہ سمجھنا کہ ان میں سے فلاں سچا تھا فلاں سچا نہ تھا، یا کسی ایک کی تصدیق کرنی باقی سب سے انکار کر دینا۔ سب کی تصدیق کرلی کسی ایک کا انکار کر دینا۔ قرآن کہتا ہے ہر راست باز انسان کا جو خدا کے سچے دین پر چلنا چاہتا ہے فرض ہے کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں، تمام کتابوں، تمام دعوتوں پر ایمان لاتے اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرے۔ راہیں صرف دو ہیں ایمان کی اور انکار کی۔ ایمان کی یہ ہے کہ سب کو مانو، انکار کی یہ ہے کہ

سب کا یا کسی کا انکار کر دو۔ کسی ایک کا انکار بھی وہی حکم رکھتا ہے جو سب کے انکار کا ہے۔ قرآن کے الفاظ پر غور کیجئے یہ صاف اعلان کرتے ہیں کہ کسی ایک رسول کا انکار بھی آخری درجہ کا کفر ہے اور اس ایک انکار کی موجودگی میں باقی سارے انبیاء کا اقرار بھی کوئی قدر و قیمت نہیں رکھتا۔

۱۲۱ - جو لوگ خدا سے اور اس کے پیغمبروں سے کفر کرتے ہیں اور خدا اور اس کے پیغمبروں کے درمیان فرق کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے۔ یہاں سے ذکر ہے یہود کا، چونکہ یہود میں نفاق کا مضمون بہت تھا اور آپ کے زمانے میں جو منافق تھے وہ یہود تھے یا یہود دیوں سے ربط اور محبت رکھنے والے اور ان کے مشورے پر چلنے والے تھے اس لیے قرآن شریف نے دونوں کا ذکر اکٹھا فرمایا ہے۔ آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں سے منکر ہیں اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کرنا چاہتے ہیں یعنی اللہ پر ایمان لاتے ہیں اور رسولوں پر ایمان نہیں لاتے اور بعض رسولوں کو تو مانتے ہیں اور بعض کو نہیں مانتے۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ یہ خدا پر ایمان اپنی شرائط پر لانا چاہتے ہیں نہ کہ خدا کی شرائط پر۔ حالانکہ ایمان وہی معتبر ہے جو اللہ سبحانہ کی شرائط پر ہو۔ اگر ایمان کی شرطیں بھی مقرر کریں گے اور رسولوں کا انتخاب یہ اپنے ہی صوابدید اور اختیار تمیزی سے کریں گے تو پھر خدا کی خدائی کہاں رہی پھر تو خدائی کا منصب انہوں نے خود ہی سنبھال لیا۔

دراصل اس آیت میں ان پر جو فردِ جرم عائد کی گئی ہے وہ یہ ہے۔

اولاً یہ کہ اللہ اور اس کے رسولوں کا کفر کرتے ہیں۔

ثانیاً یہ کہ وہ اللہ اور اس کے رسولوں کے درمیان فرق کرنا چاہتے ہیں۔

ثالثاً یہ کہ وہ کچھ پر ایمان لاتے ہیں اور کچھ کا انکار کرتے ہیں۔

اللہ و رسول سے کفر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ نہ خدا کو مانتے ہیں اور نہ خدا کے رسولوں کو مانتے ہیں۔ صاحب رُوح نے یہاں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ زبان سے صراحۃً خدا اور رسول کا انکار کرتے ہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ خدا اور رسول کے بارے میں ان کے افکار و اعمال کا تقاضا ہی ان کا انکار ہے یعنی ان کے فکر و عمل کا لازم یہ ہے کہ وہ خدا اور رسول کو نہیں مانتے ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اللہ اور اس کے رسُولوں میں فرق کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ لوگ خدا کو مانتے ہیں مگر خدا کے رسُولوں کو نہیں مانتے۔ یا یہ کہ خدا کے رسُولوں میں سے کچھ کو نہیں مانتے اور کچھ کو مانتے ہیں۔ اور یہ بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے کہ اللہ کی بات مانتے ہیں اور اللہ کے رسُول کی بات نہیں مانتے۔

احکامِ دین، تفریق کی حُرمت

اور یہ بھی اس کا مدلول ہے کہ زندگی کی مختلف شاخوں میں سے کچھ شاخوں میں اللہ اور اس کے رسُول کو مانتے ہیں اور کچھ میں نہیں مانتے۔ حالانکہ خدا اور رسُول کو ماننے کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ احکام میں پیروی کی حد تک ہرگز کوئی تفریق نہ کی جائے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے کہ احکام تو اطاعت کے لیے ہی لیے جاتے ہیں اور اس لحاظ سے حکم سب برابر ہیں۔ آج تک کہیں بھی محکوم اور غلام کا یہ حق تسلیم نہیں کیا گیا ہے کہ وہ آقا کے احکام کی بجاآوری میں من مانی کر سکتا ہے۔ چاہے تو ان احکام کو حسبِ خواہش دو حصّوں میں بانٹ دے۔ ایک حصے کو واجب الاطاعت سمجھ کر اس کی اطاعت کرے اور دوسرے کو غیر ضروری اور زائد قرار دے کر پسِ پشت ڈال دے۔ پھر فرمانروائے مطلق آقائے حقیقی کے محکوموں اور غلاموں کو کب یہ حق پہنچتا ہے کہ اس کے کچھ احکام کی تو وہ تعمیل کریں اور کچھ کو نظر انداز کر دیں۔ یہ طرزِ عمل اللہ کی اطاعت نہیں ہے اس کی نافرمانی ہے۔ منافقین اور یہود کی یہ مشترک بیماری تھی۔

اس مسئلہ کے اس پہلو پر بھی غور فرمائیے۔ یہ بات دلائل کی پوری قوت سے ثابت ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی عبادت کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ جب صورتِ واقعہ یہ ہے تو عقل اس کے سوا کچھ مان ہی نہیں سکتی کہ انسان کو اپنے مالک اور معبود کی جانب سے جو احکام ملے ہیں خواہ وہ چھوٹے ہوں یا بڑے، معروف ہوں یا غیر معروف۔ مذاقِ عام والی مذہبیت کا رنگ ان پر نمایاں ہو یا نہ ہو۔ انسان کے ظاہر سے متعلق ہوں یا باطن سے، ذکر یا پرستش کی نوعیت کے ہوں یا تمدنی و اجتماعی نوعیت کے۔ سب کے سب عبادت کا یہ پیدائشی وظیفہ انجام دینے کی خاطر ملے ہیں ان میں سے کوئی ایک حکم بھی ایسا نہیں ہو سکتا جو اس فریضہ کی ادائیگی کے معاملے سے بالکل غیر متعلق ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے اس لیے حقیقت واقعہ یہی ہے کہ انسان کی اپنے فرائضِ حیات سے سبکدوشی ان سارے ہی احکام کی تعمیل پر موقوف ہے جو اسے عطا ہوتے ہیں، اور صرف کسی خاص حصے کی بجاآوری کے نتیجے میں اسے اپنے اس فرض سے سبکدوش نہیں قرار دیا جا سکتا کیونکہ اس مجموعہ احکام کا ایک

ایک جزو اس کی پیدائشی غرض وغایت سے متعلق ہے اور کسی نہ کسی پہلو سے اس کی تفصیل وتکمیل لازماً مطلوب ہے۔ کسی اور تصورِ دین کے تحت احکام دین میں تفریق کی گنجائش ہو تو ہو لیکن قرآنی تصورِ دین کے تحت اس کے ایک ایک حکم کی تعمیل دینداری ہے، اللہ کی اطاعت ہے تقویٰ ہے، عبادت ہے۔ اسے نظرانداز کرکے کمالِ بندگی کا مقام پالینا محال ہے اور تکمیلِ بندگی کے لیے اسے غیر ضروری اور غیر موثر سمجھنا کفر ہے۔

قرآن نے احکام دین میں تفریق کی ممانعت کو بڑے موثر اور بلیغ انداز میں پیش کیا ہے مثلاً۔

یا ایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ

اے ایمان والو اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

اس آیت میں اطاعت کرنے کے لیے اطاعت میں داخل ہونے کی بلیغ تعبیر اختیار کی ہے۔ کسی چیز میں داخل ہونے کے معنے یہ ہیں کہ داخل ہونے والے کا پورا وجود اس کے اندر سما چکا ہے ہر طرف سے اس نے اسے ڈھک لیا ہے، اور اب اس کا کوئی جزو بھی اس سے باہر نہیں ہے اس لیے اسلام میں یا اللہ و رسول کی طاعت میں داخل ہو رہنے کا مطالبہ بداہتہً اس بات کا مطالبہ ہے کہ اہلِ ایمان کتاب وسنت کے ایک ایک حکم کی بجاآوری کے لیے اپنے آپ کو وقف رکھیں۔ اور چھوٹی بڑی کوئی ہدایت بھی فراموش نہ ہونے پائے۔

ایک اور جگہ تنبیہہ کے انداز میں ارشاد ہوتا ہے۔

واحذرھم ان یفتنوك عن بعض ما انزل اللہ الیك

اس بات سے ہوشیار رہو کہ کہیں یہ خدا فراموش لوگ تمہیں فتنے میں ڈال کر اس ہدایت کے کسی جزو کی پیروی سے نہ روک دیں جسے اللہ نے تم پر نازل کیا ہے۔

بہر حال تفریق بین اللہ ورسلہ کے منطوق، مدلول اور مفہوم میں یہ ساری باتیں داخل ہیں، یہ بھی کہ اللہ کو مانتے ہیں اور اللہ کے رسولوں کو نہیں مانتے۔ یہ بھی کہ اللہ کے رسولوں میں سے کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے اور یہ بھی کہ اللہ کی بات مانتے ہیں اللہ کے رسول کی بات نہیں مانتے اور یہ بھی کہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام میں کچھ کو مانتے اور کچھ کو نہیں مانتے۔ اور ارشاد یقولون نؤمن ببعض ونکفر ببعض اور کہتے ہیں کہ ہم کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے کے زیادہ مناسب تفریق بین الرسل اور بین الاحکام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ توحید کے قائل ہیں مگر رسالت کو نہیں مانتے۔ اور جو لوگ رسالت کو مانتے ہیں مگر کسی رسول کو نہیں مانتے اور جو لوگ اللہ کی بات مانتے

ہیں مگر رسول کی بات نہیں مانتے اور بالآخر جو لوگ اپنی زندگی کی کچھ شاخوں میں اللہ اور اس کے رسول کی بات نہیں مانتے وہ سب یفرقون بین اللہ و رسلہ کا مصداق ہیں کوئی صراحۃً کوئی دلالۃً اور کوئی اشارۃً ، اگرچہ نؤمن ببعض ونکفر ببعض کا قرینہ بتاتا ہے کہ مراد دو ہی قسم کے لوگ ہیں ۔ ایک وہ جو کچھ رسولوں کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے اور دوسرے وہ جو احکام کی حد تک تفریق روا رکھتے ہیں ۔

قرآن نے اس غلط کار طبقہ کا چہرہ پیش کیا ہے جس نے احکام الٰہی میں تفریق کی روش اپنا رکھی تھی اور اسے ان لفظوں میں سرزنش کی ہے ۔

افتؤمنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض فما جزاء من یفعل ذالک منکم الاخزی فی الحیاۃ الدنیا ویوم القیامۃ یردون الی اشد العذاب ۔

تو کیا تم کتاب الٰہی کے ایک حصہ پر ایمان رکھتے ہو اور دوسرے حصہ کا انکار کرتے ہو لہٰذا تم میں سے جو لوگ بھی ایسا کریں گے ان کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ دنیوی زندگی میں ان کے لیے ذلت وخواری ہو ۔ اور قیامت کے دن سخت ترین عذاب کی طرف پھیر دیے جائیں ۔

کوئی شک نہیں کہ ان آتشین الفاظ کی حیثیت ہوش مند پیروانِ قرآن کے لیے ایک مستقل اور معنے خیز تنبیہہ کی سی ہے جو ہر آن انہیں چوکنا رکھنا چاہتی ہے کہ خبردار اس مہلک غلط فکری غلط کاری کے قریب ہرگز نہ جانا کیونکہ یہ کوئی معمولی بات نہیں بلکہ بڑا خوفناک جرم ہے جس کا ارتکاب بڑے سنگین نتائج پیدا کرتا ہے اس کے معنے کتاب الٰہی کے ایک حصہ سے کفر کے ہیں ، دوسرے لفظوں میں فریضہ عبادت کی ذمہ داریوں سے انکار کے بھی ہو سکتے ہیں اور اس کی پاداش آخرت میں سخت ترین عذاب اور دنیا میں دردناک ذلت وخواری کے سوا اور کچھ نہیں ہو سکتی ۔

غرض جس طرح انسان کو یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ اپنی رائے اور خواہش سے جس نبی کا چاہے انکار کر دے اسی طرح اس کو یہ حق بھی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے دیے ہوئے احکام دین کی پیروی میں اپنے ذوق یا خواہش کے تحت کسی طرح امتیاز سے کام لے ۔ جن احکام کو چاہے عمل کے لیے منتخب کرے اور باقی سے بے پروا ہو ، ہے اس طرح کی کوئی بھی تفریق ایمان کے قطعی خلاف ہے ۔

سنگین فیصلہ اور اس کی وجہ

۲۲۲۔ اور ایمان و کفر کے درمیان راہ نکالنا چاہتے ہیں یہی لوگ بلاشبہ پکے کافر ہیں مطلب یہ ہے کہ اسلام اور کفر کے درمیان ایک نیا مذہب اپنے لیے نکالتے ہیں۔ ایسے ہی لوگ اصلی اور ٹھیٹ کافر ہیں ان کے لیے خواری اور ذلت کا عذاب تیار ہے۔ اللہ کا ماننا جب ہی معتبر ہے کہ اپنے زمانہ کے پیغمبر کی تصدیق کرے اور اس کا حکم مانے۔ بدون تصدیق نبی کے اللہ کا ماننا غلط ہے اس کا اعتبار نہیں بلکہ ایک نبی کی تکذیب اللہ کی اور تمام رسولوں کی تکذیب سمجھی جاتی ہے۔ یہود نے جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کی تو حق تعالیٰ کی اور تمام انبیاءؑ کی تکذیب کرنے والے قرار دیے گئے اور کٹے کافر سمجھے گئے ہیں[1]

بظاہر یہ ایک سخت فیصلہ معلوم ہوتا ہے مگر حقیقت کا تقاضا یہی تھا کہ فیصلہ اس کے سوا کچھ اور نہ ہو اور ایک نبی کے انکار کو بھی اس سے کم تر درجے کا جرم نہ قرار دیا جائے۔ جب یہ معلوم ہے کہ خواہ کوئی بھی رسول ہو وہ اللہ سبحانہٗ ہی کی طرف سے آتا ہے اور اسی کے احکام لوگوں کو سناتا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ وہ کائنات کے حقیقی فرمانروا ہی کی طرف سے مقرر کیا ہوا حاکم مجاز ہوتا ہے تو اس کا انکار دراصل اس کا انکار نہیں ہے بلکہ فرمانروائے کائنات کے حق فرماں روائی کا انکار ہے۔ اس کے خلاف بغاوت کا اعلان ہے اور اس انکار و اعلان بغاوت کی موجودگی میں دوسرے انبیاءؑ کا اقرار بالکل ایسا ہی ہے جیسے کسی حکومت کے مقرر کیے ہوئے دوسرے افسروں کو تو اس کا نمائندہ اور حاکم مجاز تسلیم کر لیا جائے اور پھر اسی حکومت کے کسی ایک افسر کو اس کا نمائندہ اور حاکم مجاز ماننے سے انکار کر دیا جائے۔ یہ حکومت کی اطاعت تو نہ ہوئی اپنی رائے اور خواہش کی اطاعت ہوئی۔ اس کے تو معنے یہ ہیں کہ جن افسروں کو حکومت کا نمائندہ اور حاکم مجاز تسلیم کیا گیا ہے۔ ان کا یہ تسلیم کیا جانا بھی دراصل حکومت کے حق اطاعت کی بنا پر نہیں ہے بلکہ اپنے جی کی خواہش کی وجہ سے ہے اس لیے اس تسلیم و اقرار کی بھی فی الواقع کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو جو کسی ایک رسول کا انکار کرتے ہیں سارے رسولوں کا منکر قرار دیا ہے مثلاً قوم نوح کے بارے میں اس نے فرمایا ہے کہ جب انہوں نے ہمارے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رسُولوں کو جھٹلایا تو ہم نے بھی انہیں غرق کر دیا۔ وقوم نوح لما کذبوا الرسل اغرقناھم حالانکہ ازروئے واقعہ انہوں نے صرف ایک رسُول حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کی تھی، باقی رسُولوں کا تو ان کے سامنے کوئی مسئلہ ہی نہ تھا۔ آپ پانچویں پارے میں یہ پڑھ آئے ہیں کہ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ جو رسُول بھی آتا ہے اسی لیے آتا ہے کہ اس کی طاعت کی جائے اذنِ خداوندی کے مطابق اور یہ بھی سن آئے ہو من یطع الرسول فقد اطاع اللہ کہ جو اللہ کے رسُول کی طاعت کرتا ہے دراصل اللہ کی اطاعت کرتا ہے۔ جب واقعہ اور حقیقت یہ ہے تو کیا اس کا کھلا اور واضح مطلب یہ نہیں ہے کہ کسی رسُول کو نہ ماننا فی الواقع اذنِ خداوندی کو ٹھکرانا اور اللہ کی اطاعت کا انکار ہے۔ ایسی حالت میں ایک رسُول کا انکار بھی کفر و بغاوت کا آخری درجہ کیوں نہ ہوگا۔ اور اللہ کے ایک ایک رسُول کو رسُول برحق ماننے بغیر ایمان کی سند کا ملنا اصُول اور انصاف کی بات کیسے ہوگی؟

کافروں کے لیے اخروی سزا

۲۲۳۔ اور ہم نے کافروں کے لیے ذلت والا عذاب تیار کر رکھا ہے۔ یہاں دو باتیں غور طلب ہیں، ایک یہ کہ کافرین پر الف لام لا کر ان تمام کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا ذکر پہلے ہو چکا ہے یعنی خدا کو نہ ماننے والے اور رسالت کو تسلیم نہ کرنے والے۔ یا خدا کو ماننے والے اور رسُول کو نہ ماننے والے۔ یا خدا کی بات کو ماننے والے خدا کے رسُول کی بات نہ ماننے والے یا خدا کے رسولوں میں سے کچھ کو ماننے والے اور کچھ کو نہ ماننے والے یا پھر اپنی زندگی کے کچھ گوشوں میں نبوت کے علم و عمل کو ماننے والے اور کچھ میں نہ ماننے والے، سب کے لیے عذاب مہین تیار کیا ہوا ہے۔ دوسری یہ کہ ان کے لیے عذاب تیار کرنے کی علت ان کا کفر ہے۔ اگر ان کے دامنوں میں کفر نہ ہوتا تو اللہ ان کے لیے عذاب تیار نہ کرتا۔ ذلت آمیز عذاب تیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے خیالات و نظریات کی تہ میں اصل روگ اپنی بڑائی کا ہوتا ہے شعوری یا غیر شعوری طور پر۔ بہرحال یہ لوگ سمجھتے یہی ہیں کہ ان کی عقل وحی الٰہی کے مقابلے میں زیادہ وزن دار ہے اور انبیاء سے معاذ اللہ جو کوتاہیاں رہ گئی ہیں ان کی تلافی یہ اپنی عقل آرائیوں سے کر دیں گے، اسی کبر و خود بینی کی سزا انہیں آخرت میں یہ ملے گی کہ علاوہ جسمانی تعذیب کے یہ مخلوق کی نظروں میں ذلیل و رسوا ہوا کریں گے۔

قانون پر معتبر ایمان

۱۵۲ - اور جو لوگ اللہ اور اس کے پیغمبروں پر ایمان لاتے اور ان میں سے کسی کے درمیان کوئی فرق نہیں کرتے۔ ایسے لوگوں کو وہ عنقریب ان کے اجر دے گا اور اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے یعنی اور جن لوگوں نے کسی نبی کو جدا نہیں کیا بلکہ ایمان لاتے اللہ پر اور اس کے سب رسولوں پر اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ان کو بڑے ثواب عطا فرمائے گا۔ اس سے مراد مسلمان ہیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور سب نبیوں پر ایمان لاتے لے

یہ آیت پہلی آیت کے مقابلے میں ہے مگر اس آیت میں اولٰئك هم المومنون حقاً نہیں فرمایا، صرف اجر اور ثواب کا ذکر فرمایا، وجہ یہ ہے کہ اس آیت میں فقط ایمان کا ذکر ہے اور اعمال صالحہ کا ذکر نہیں ہے اور بغیر اعمال صالحہ کے مومن کامل نہیں ہو سکتا۔ دوسری جگہ ارشاد ہے،

انما المومنون الذين اذا ذكر الله وجلت قلوبهم واذا تليت عليهم ءايٰته زادتهم ايماناً وعلى ربهم يتوكلون الذين يقيمون الصلاة ومما رزقنٰهم ينفقون ۝ اولٰئك هم المومنون حقاً لهم درجات عند ربهم ومغفرة ورزق كريم۔

مومنوں کی شان تو یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اس کی آیتیں پڑھ کر سنائی جاتی ہیں تو ان کے ایمان کو اور زیادہ کر دیتی ہیں، اور وہ ہر حال میں اپنے پروردگار پر بھروسہ رکھتے ہیں، جو نماز قائم کرتے ہیں اور ہم نے جو کچھ دیا ہے اس میں سے ایک حصہ ہماری راہ میں بھی خرچ کرتے ہیں، بلاشبہ یہی لوگ پکے اور سچے مومن ہیں، ان کے لیے ان کے پروردگار کے یہاں مرتبے ہیں، اور بخشائش، اور بڑی خوبی و عزت کی روزی۔

لے افادات شیخ الاسلام

اس سے معلوم ہوا کہ یہاں جس ایمان کے موضوع پر کفر کے مقابل میں گفتگو ہو رہی ہے وہ قانونی ایمان ہے جس پر نجات موقوف ہے اور مذکورہ بالا آیات میں جن لوگوں کو ھم المومنون حقاً کہا ہے وہ صفات فاضلہ والے اہل کمال ہیں۔ تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے یعنی ایمان کا کفر سے مقابلہ کرتے ہوئے آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کو اپنا واحد معبود اور مالک تسلیم کر لیں اور اس کے بھیجے ہوئے تمام رسولوں کی نبوت کو مان لیں، صرف وہی اپنے اعمال پر اجر کے مستحق ہیں وہ جس درجہ کا عمل صالح کریں گے اسی درجہ کا اجر پائیں گے، رہے وہ لوگ جنہوں نے خدا کی لاشریک الوہیت و ربوبیت ہی کو تسلیم نہیں کیا، یا جنہوں نے خدا کے نمائندوں میں سے بعض کو ماننے اور بعض کو نہ ماننے کا طرز عمل اختیار کیا تو ان کے لیے کسی عمل پر کسی اجر کا سوال سرے سے پیدا ہی نہیں ہوتا۔ کیونکہ ایسے لوگوں کا کوئی عمل خدا کی نگاہ میں قانونی عمل نہیں ہے [1]

قرآن کی اس آیت سے جس سے ایمان کا یہ قانونی موقف معلوم ہوا ہے کہ تمام انبیاؑ کی یکساں طور پر تصدیق کی جائے یعنی یقین کیا جائے کہ سب حق پر تھے، سب خدا کی سچائی کے پیامبر تھے، سب نے ایک ہی قانون واصل کی تعلیم دی ہے۔ پہلی آیت میں اہل کتاب کو ان کے جس طرز عمل کی بنا پر الکافرون حقاً کہا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ وہ جہاں دوسرے کو اللہ کے رسول مانتے تھے، حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی طرح ماننے کے لیے تیار نہ ہوتے تھے حالانکہ جس طرح اللہ کے رسول وہ حضرات تھے اسی طرح آپ بھی تھے۔ پھر یہی چیز ہے جس کو ایمان و کفر کے درمیان کی راہ بتایا ہے کیونکہ دوسرے انبیاؑ کو مان کر اگر وہ ایمان باللہ کے تقاضے پورے کرتے نظر آ رہے تھے تو رسالت محمدی کا انکار کر کے اللہ کی معبودیت اور حاکمیت کو وہ ٹھکرا بھی رہے تھے۔ پھر اسی رویہ کو اللہ و رسول کا کفر کرنا بھی کہا گیا، کیونکہ خدا کے کسی رسول کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا دراصل نہ خدا کو ماننا ہے نہ کسی رسول کو ماننا ہے بلکہ محض اپنی خواہش نفس کو ماننا ہے ٹھیک ایسے ہی اس آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ وحدت ادیان کا نظریہ لغو اور مہمل ہے۔ اس نظریہ کا فلسفہ یہ ہے کہ جب ہمارے پاس بھی خدا ہی کا بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اس کی پیروی کرنا کافی نہیں ہے۔ کسی اور چیز کو اپنانا کیوں ضروری ہو۔ وہ اپنی جگہ حق یہ اپنی جگہ حق۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے اس فلسفہ کو اللہ تعالیٰ یفرقون بین اللہ و رسلہ فرما کر نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں کہا بلکہ

---

[1] تفہیم القرآن

اسے صاف طور سے کفر کا فلسفہ قرار دیتا ہے اور انہیں یہ بھی حق وہ بھی حق کہنے کے باوجود اصل حق کا منکر ٹھہراتا ہے۔

بہرحال اس موضوع پر جہاں تک قرآن کے فیصلے کا تعلق ہے وہ بالکل دو ٹوک انداز میں وحدتِ ادیان کے نظریہ کو باطل قرار دے کر نبوتِ محمدیہ کی پیروی کو سارے انسانوں کے لیے ضروری اور شرطِ نجات قرار دیتا ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جسے آپ کا پیغام ہی نہ پہنچا ہو۔ یہ بات خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ گرامی سے معلوم ہوتی ہے۔ ارشاد ہے:

والذی نفس محمد بیدہ لا یسمع بی احد من ھذہ الامۃ یھودی

لا نصرانی ثم یموت ولم یؤمن بالذی ارسلت بہ الا کان

من اصحاب النار۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس اُمت میں سے جس کسی شخص تک مثلاً یہودی یا نصرانی میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا وہ دوزخی ہو گا۔

(مشکوٰۃ بحوالہ مسلم)

اس میں لا یسمع بی کی قید لگا کر آپ نے یہ بات واضح فرما دی کہ جس شخص تک آپ کا پیغام نہیں پہنچا ہے وہ مستثنیٰ ہے کیونکہ اس صورت میں وہ معذور ہو گا اور جب تک ایک شخص فی الواقع معذور ہو اور اس کے پاس امرِ حق پہنچا ہی نہ ہو اس وقت تک اس پر اس کی پیروی کی ذمہ داری ڈالنا اور اسے اس بارے میں جواب دہ قرار دینا یقیناً بے انصافی ہے۔ لیکن جو لوگ اسلام سے واقف ہو جانے کے بعد بھی اسے نہ مانیں ان کا پکڑا جانا کسی طرح بے انصافی نہیں ہے بے انصافی اگر ہے تو یہ کہ انہیں نہ پکڑا جائے کیونکہ ان کا نہ ماننا کسی چھوٹی بات اور کسی معمولی حق کا نہ ماننا نہیں ہے بلکہ دُنیا کی سب سے بڑی بات اور سب سے بڑے حق کا نہ ماننا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کے حق فرماں روائی کا نہ ماننا ہے۔ اس لیے یہ کھلی ہوئی دھاندلی ہو گی کہ ایسے لوگوں کے پکڑے جانے کو انصاف اور معقولیت کے خلاف سمجھا جائے۔ دُنیا کسی ایسے حکمران کا تصور تک نہیں کر سکتی جس نے اپنی رعایا کو اس بات کی کھلی چھوٹ دی ہو کہ وہ اس کے فرمانوں کے ساتھ اپنی مرضی کے مطابق سلوک کرے چاہے تو اس کے موجودہ گورنروں اور رائج الوقت قانونوں کو تسلیم کرے اور چاہے تو رد کرے اور ان کے بجائے اس کے ریٹائر ہونے والے گورنروں اور منسوخ شدہ

تو امین کرما نتی ہے۔ پھر کیا یہ کوئی معقول با ۔ ہوئی کہ ایسے لوتصور کو اس حکمران کی طرف نسوب کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کیا جائے جو سارے حکمرانوں کا حکمران اور پوری کائنات کا حقیقی فرماں روا ہے ! آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ اس نے اپنے جن پیغمبروں کا دور ختم کر دیا اور اپنی جن شریعتوں کو منسوخ کر دیا ہے۔ ان ہی کی اطاعت اور پیروی پر اصرار کرنے والوں کو وہ اپنا وفادار اور فرمانبردار بندہ تسلیم کرتا ہے اور اپنے اس پیغمبر کی اطاعت اور اپنی اس شریعت کی پیروی سے انکار کے باوجود انہیں بغاوت کی سزا نہ دے جسے وہ اس دور کے لیے اپنا جہانی اور ابدی پیغمبر اور اپنی عالمگیر شریعت قرار دے چکا ہے۔ یہ عجیب بندگی اور فرمانبرداری ہے کہ اللہ تعالیٰ تو اپنی پرستش اور اطاعت و رضا طلبی کے لیے فریدکو اپنا ہادی بنانے کا حکم دے مگر آپ کہیں نہیں ہم تو اس غرض کے لیے وحید کا دامن پکڑے رہیں گے اس کی یہ روش کسی طرح حق بجانب قرار نہیں دی جاسکتی ہے۔

بہرحال اس آیت سے چند باتیں معلوم ہوتی ہیں ۔

ایک یہ کہ قبول عمل کے لیے ایمان شرط ہے ، دوسری یہ کہ ایمان و عمل کے لیے نبوت کی تصدیق ضروری ہے تیسرے یہ کہ تمام نبیوں اور رسولوں کی واحد اور مشترک دین کا اصل الاصول ایمان باللہ اور ایمان بالرسالت ہے یعنی خدا پر اور تمام رسولوں پر ایمان لانا اللہ کا دین ہے اور اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا۔ قرآن ہی میں یہود و نصاریٰ کے بارے میں کہا گیا ہے فان اسلموا فقد اهتدوا اگر انہوں نے اسلام قبول کرلیا تو انہوں نے سیدھی راہ پالی ۔ اور البقرہ میں ہے فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اهتدوا اگر وہ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لے آئے تو انہوں نے سیدھی راہ پالی ۔اس سے معلوم ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہدایت کا مطلع ہیں۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ جن آیتوں میں ایمان و عمل صالح پر خوف و غم نہ ہونے کی خوشخبری دی گئی ہے ان میں ایمان سے مقصود توحید کامل ہے اور اس کا یہ منشا نہیں ہے کہ یہود و نصاریٰ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں ۔ یہود و نصاریٰ کیا خود مسلمان اس اسلام کامل کے بغیر نجات کے مستحق نہیں جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عمل صالح اس تعلیم کے مطابق نہ ہو جو محمد رسول اللہ کے ذریعے سے دنیا میں آئی ہے یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے خواہ وہ مسلمان ہو یا یہودی و عیسائی ہو یا صابی ، غرض کسی نبی کا پیروی کا مدعی ہو لم یفرقوا بین احد منهم کا یہی مقصود ہے ۔

وحدت ادیان کا غلط تصور

قرآن کی اس آیت میں لم یفرقوا بین اللہ و رسلہ کا صریح اعلان جیسے دین کی وحدت کو تبادلہ

ہے ایسے ہی یہ وحدت ادیان کی بھی کھلی تردید کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے کہ اب صرف محمد رسول اللہ کی پیروی کو برحق اور شرط نجات تسلیم کیا جائے۔ دوسرے آسمانی مذاہب بھی حق اور عنداللہ مقبول اور ذریعہ نجات تھے مگر اس وقت ان میں سے کوئی ایک بھی ایسا نہیں ہے جو باطل کی آمیزشوں سے یکسر پاک ہو۔ اور اللہ کے حضور اب بھی قابل قبول اور ذریعہ نجات ہو۔ اس کے باوجود کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ سارے مذاہب آج بھی یکساں حق ہیں کیونکہ سب خدا ہی کی پرستش کی تلقین کرنے والے اور اس کی بارگاہ تک پہنچانے والے ہیں۔ اسی طرح بنیادی اصول اور سچائیاں سب مشترک ہیں، فرق جو کچھ ہے وہ الفاظ و اصطلاحات کا ہے یا زیادہ سے زیادہ رسوم و ظواہر کا اور یہ چیزیں ہرگز مدار حقانیت نہیں ہیں (معاذ اللہ)

اس نظریے کے علمبردار ہمارے دنیادار اور دیندار دونوں ہی قسم کے لوگ ہیں۔ دنیادار تو یہ نظریہ اپنے آخری مفہوم تک اپنا چکے ہیں۔ لیکن اس کی تاریخ بہت پرانی نہیں ہے، دہلی کے ایک مغل بادشاہ اکبر نے کفر و اسلام کو ملا کر ایک دین الٰہی ایجاد کیا تھا اور پھر تین پشتوں کے بعد ایک اور شہزادہ داراشکوہ نے بھی کچھ اسی قسم کی کوشش شروع کی تھی اور بعض محمد طبع ۱۹۴۷ء کے بعد آزاد ہندوستان میں بھی شرک و توحید اور اسلام و کفر کو مخلوط کر کے قسم قسم کے خوشنما ناموں کے ساتھ ایک نئے دین کی اختراع کی فکر میں لگے ہوئے ہیں۔ ذرا غور سے دیکھئے تو اس کے اسیر اور قتیل ہر جگہ موجود ہیں۔ مسلمانوں کا تعلیم یافتہ طبقہ خصوصاً اس کا سیاسی عنصر تیزی سے اس نظریہ کو قبول کر رہا ہے۔ ان کے صحافی، ان کے لیڈر کبھی اشاروں کنایوں میں اور کبھی کھلم کھلا اس کا درس دینے لگے ہیں۔ گیتا اور گرنتھ کا تو پتہ نہیں مگر قرآن کا یہ نظریہ ہرگز نہیں ہے۔ قرآن وحدت دین کا تو یقیناً قائل ہے مگر وہ وحدت ادیان کو قطعاً تسلیم نہیں کرتا۔ وہ صرف اپنے ہی کو حق اور واجب الاتباع قرار دیتا ہے۔ یہ تو اس موضوع پر دنیا داروں کا حال ہے باقی رہے دیندار لوگ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ وحدت ادیان کے بارے میں ان کا تصور کیا رہا ہے لیکن ان حضرات کے کلام سے جو کچھ مترشح ہوتا ہے اس کو دیکھ کر یہ کہنا بہت مشکل ہے کہ یہ حضرات اس نظریے کے اثر سے بالکل محفوظ رہے ہیں۔ آخر ہماری دینی ادبیات میں جو اس قسم کے اشعار بھرے پڑے ہیں انہیں کس ذہنیت کا نتیجہ فکر کہا جائے گا۔

کفر و اسلام در رہت پویاں
وحدہ لاشریک لہ گویاں

یا

ہر کس طالب یار اند چہ ہشیار چہ مست
ہر جا خانۂ عشق است چہ مسجد چہ کنشت

یا

بازیچہ کفر و دین بطفلاں بسیار
بگذر ز مقامے کہ خدا ہم حرفیست

یا

در حیرتم کہ دشمنی کفر و دین چرا ست
از یک چراغ کعبہ و بت خانہ روشن است

یا

اگر کافر ز بت آگاہ گشتے
یکے از سالکان راہ گشتے

یا

مسلمان گر بدانستے کہ بت چیست
یقین کردے کہ دین در بت پرستیست

ان جیسے اشعار کو محض ہفوات نہ سمجھئے کیونکہ یہ اچھے خاصے بزرگوں کے فرمائے ہوئے ہیں جو ایک خاص دینی فلسفہ کے ترجمان ہیں۔ اچھا مان لیجئے کہ یہ شاعرانہ مبالغے ہیں جو شعر و شاعری کے باب میں نظر انداز کر دینے کے لائق ہیں مگر اس طرح کے سنجیدہ ارشادات کے کیا معنے ہوں گے اور انہیں کیا کہہ کر نظر انداز کیا جائے گا۔

حق یہ ہے کہ ایک ہی حقیقت کی آواز ساری دُنیا میں گونج رہی ہے ۔

گیتا ہندوستان کا قرآن ہے اور قرآن عرب کی گیتا ،

یہ قول غوث اللہ شاہ قلندر قادری کی طرف منسوب ہے اور اسے وحدتِ ادیان کے ایک ممتاز مبلغ پنڈت سندر لال نے اپنی کتاب گیتا اور قرآن کے سرورق لکھا ہے۔ اور اس طرح گویا انہوں نے اپنے نظریہ کے برحق ہونے پر ایک مسلمان بزرگ کا یہ قول دلیل اوّل کی حیثیت سے پیش کیا ہے ۔

بہرحال قرآنی تصورِ دین کی رُو سے وحدتِ ادیان کا نظریہ سرتاسر باطل ہے اور اس آیتِ قرآنی کے قطعاً خلاف ہے ۔

يَسْـَٔلُكَ اَهْلُ الْكِتٰبِ اَنْ تُنَزِّلَ عَلَيْهِمْ كِتٰبًا مِّنَ السَّمَآءِ
فَقَدْ سَاَلُوْا مُوْسٰٓى اَكْبَرَ مِنْ ذٰلِكَ فَقَالُوْٓا اَرِنَا اللّٰهَ جَهْرَةً
فَاَخَذَتْهُمُ الصّٰعِقَةُ بِظُلْمِهِمْ ۚ ثُمَّ اتَّخَذُوا الْعِجْلَ مِنْۢ
بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنٰتُ فَعَفَوْنَا عَنْ ذٰلِكَ ۚ وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى
سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ۝ وَرَفَعْنَا فَوْقَهُمُ الطُّوْرَ بِمِيْثَاقِهِمْ
وَقُلْنَا لَهُمُ ادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا وَّقُلْنَا لَهُمْ لَا تَعْدُوْا فِى
السَّبْتِ وَاَخَذْنَا مِنْهُمْ مِّيْثَاقًا غَلِيْظًا ۝ فَبِمَا نَقْضِهِمْ
مِّيْثَاقَهُمْ وَكُفْرِهِمْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَقَتْلِهِمُ الْاَنْۢبِيَآءَ
بِغَيْرِ حَقٍّ وَّقَوْلِهِمْ قُلُوْبُنَا غُلْفٌ ۭ بَلْ طَبَعَ اللّٰهُ عَلَيْهَا
بِكُفْرِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْنَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝ وَّبِكُفْرِهِمْ وَقَوْلِهِمْ
عَلٰى مَرْيَمَ بُهْتَانًا عَظِيْمًا ۝ وَّقَوْلِهِمْ اِنَّا قَتَلْنَا الْمَسِيْحَ
عِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ وَمَا صَلَبُوْهُ
وَلٰكِنْ شُبِّهَ لَهُمْ ۭ وَاِنَّ الَّذِيْنَ اخْتَلَفُوْا فِيْهِ لَفِيْ شَكٍّ

مِنْهُ ۭ مَا لَهُمْ بِهٖ مِنْ عِلْمٍ اِلَّا اتِّبَاعَ الظَّنِّ ۚ وَمَا قَتَلُوْهُ
يَقِيْنًۢا ۝ بَلْ رَّفَعَهُ اللّٰهُ اِلَيْهِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ۝
وَاِنْ مِّنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ اِلَّا لَيُؤْمِنَنَّ بِهٖ قَبْلَ مَوْتِهٖ ۚ وَ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكُوْنُ عَلَيْهِمْ شَهِيْدًا ۝

اے پیغمبر! اہل کتاب آپ سے درخواست کرتے ہیں کر آسمان سے کوئی کتاب ان پر نازل کرا دو[۲۲۵]۔ بلاشبہ وہ اس سے بڑی فرمائش حضرت موسیٰ سے کر چکے ہیں، انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو کھلم کھلا دکھلا دو تو ان کی شرارت کی وجہ سے بجلی کی کڑک نے ان کو آپکڑا[۲۲۶]۔ پھر واضح دلائل آنے کے باوجود انہوں نے گوسالہ پرستی کو اختیار کر لیا، ہم نے اس سے درگزر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو واضح اقتدار دیا تھا[۲۲۷]۔ اور ہم نے ان پر کوہ طور بلند کر کے ان سے عہد لیا تھا[۲۲۸]۔ اور ہم

نے ان کو حکم دیا تھا کہ شہر کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو[۲۲۹]۔ اور یہ بھی ہم نے ان سے کہا تھا کہ سبت کے دن کے بارے میں قانون کی حد بندی نہ توڑو اور ہم نے ان سے پکا عہد لیا تھا[۲۳۰]۔ پھر ان کی عہد شکنیوں کی وجہ سے اور اللہ کی آیات کا کفر کرنے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے تھے، نیز اس بنا پر کہ انہوں نے کہا تھا کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ معدودے چند آدمیوں کے سوا سب ایمان سے محروم ہیں[۲۳۱] نیز ان کے کافرانہ طرز عمل اور حضرت مریم پر بہتان طرازی کی وجہ سے اور اس بنا پر کہ انہوں نے کہا ہے کہ ہم نے مسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ کو قتل کر دیا ہے[۲۳۲]۔ حالانکہ انہوں نے نہ حضرت مسیح کو قتل کیا ہے اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا

بلکہ امرِ واقعہ یہ ہے کہ حقیقتِ حال ان پر مشتبہ ہوگئی[۲۳۳] - اور
بلاشبہ جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے وہ
شک و شبہ میں پڑے ہوتے ہیں، ظن و گمان کے سوا
ان کے پاس کوئی علم و بصیرت نہیں ہے[۲۳۴] - اور یقیناً
انہوں نے حضرت مسیح کو قتل نہیں کیا ہے بلکہ اللہ نے
ان کو اپنی طرف اٹھا لیا ہے، اللہ سب پر غالب اور اپنے
کاموں میں حکمت والا ہے[۲۳۵] - اور اہل کتاب میں سے کوئی
نہیں ہے جو اپنی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے
اور قیامت کے روز وہ ان پر شہادت دینے والا ہوگا[۲۳۶]۔

یہودیوں پر فردِ قراردادِ جرائم

یہاں سے بیان کا رُخ یہودیوں کی طرف پھر رہا ہے کیونکہ مدینہ کے منافقوں میں زیادہ تر یہودی تھے۔ یہودی کہتے تھے کہ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سچے ہیں تو ان پر آسمان سے ایک کتاب اس طرح کیوں نازل نہیں ہوتی کہ ہم اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں - اس پر ان کو تنبیہہ ہے اور تنبیہہ بھی اتنی سخت ہے کہ لفظ لفظ جوشِ غضب میں ڈوبا ہوا ہے - پوری تقریر از اول تا آخر فردِ قراردادِ

جرائم پر مشتمل ہے۔

اس پورے رکوع میں بلاغت کا یہ اسلوب قابلِ توجہ ہے کہ بنی اسرائیل کے جرائم کی ایک طویل فہرست تو سنادی گئی ہے لیکن الفاظ میں یہ بات واضح نہیں کی گئی ہے کہ اس فہرست کے سنانے سے مدعا کیا ہے۔ جرائم کی فہرست میں ایک جملہ معترضہ آگیا ہے اور اس کے ختم ہوتے ہی پھر ان کے جرائم کی داستان شروع ہوگئی ہے۔ اس کے بعد اقتضائے کلام سے ایک اور طویل جملہ معترضہ آگیا ہے۔ اور اس کے خاتمہ پر فہرست جرائم شروع ہوگئی۔ یہ اندازِ بیان متکلم کے زورِ بیان، سامع کی ذہانت، دعوے کی قوت اور فیصلہ کے دلیل سے بے نیاز ہونے کو ظاہر کرتا ہے۔ عرب خطبات میں اس کی شاندار مثالیں موجود ہیں۔ اس انداز کے پرزور کلام کو ایک صاحبِ ذوق سامع تو سمجھ سکتا ہے لیکن اس کے زور اور اس کی بلاغت کو کسی دوسری زبان میں منتقل کرنا ممکن نہیں ہے۔

مقصود یہ ہے کہ یہود آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ تم ان پر آسمان سے کتاب اتار دو کہ وہ اس کا اترتے ہوئے مشاہدہ کریں۔ ان کا یہ مطالبہ ان کی تاریخ کے طالب علم کے لیے تعجب خیز نہیں ہے۔ یہ جن اسلاف کے خلف ہیں وہ اپنے پیغمبر سے اس سے بھی کہیں بڑھ چڑھ کر مطالبہ کر چکے ہیں۔ جن کی تاریخ یہ ہے، جن کا قولی مزاج یہ ہے ان سے کس خیر کی امید کی جا سکتی ہے ان کے ان مسلسل جرائم کی وجہ سے جن کا سلسلہ اسلاف سے لے کر اخلاف تک کہیں ٹوٹا ہوا نہیں ہے۔ خدا نے ان پر لعنت کر دی ہے اب کوئی معجزہ بھی ان کو دکھا دو، ایمان کی سعادت ان کو نصیب نہ ہوگی۔ یہ ہمیشہ ایسا ہی کرتے رہے ہیں اور ایسا ہی کرتے رہیں گے۔ جو طالبِ حق ہوتا ہے وہ کبھی ایسی فرمائشیں نہیں کرتا بلکہ یہ بات دیکھتا ہے کہ جو تعلیم دی جا رہی ہے وہ کیسی ہے اور جو تعلیم دینے والا ہے اس کا حال کیسا ہے؟

۲۲۵۔ اے پیغمبر! اہلِ کتاب آپ سے درخواست کرتے ہیں کہ آسمان سے کوئی کتاب ان پر نازل کرا دو۔ یہودیوں کے چند سردار آپ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اگر تم سچے پیغمبر ہو تو ایک کتاب لکھی لکھائی یکبارگی آسمان سے لا دو۔ جیسے حضرت موسیٰ توریت لائے تھے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی[1] مطلب یہ ہے کہ مدینے کے یہودی جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عجیب و غریب مطالبے کرتے تھے ان میں سے ایک یہ بھی تھا کہ ہم آپ کی رسالت

[1] افادات شیخ الاسلام

اُس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو یا ہم میں سے ایک ایک شخص اوپر سے اس مضمون کی تحریر نہ آجائے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہمارے رسول ہیں ان پر ایمان لاؤ۔[1]

حافظ ابن جریر نے سدی، محمد بن کعب القرظی، اور قتادہ کے حوالہ سے ان فرمائش کرنے والوں کے بارے میں جو کچھ بتایا ہے یہ ہے کہ سدی کہتے ہیں کہ یہود نے یہ درخواست پیش کی کہ اگر آپ سچے رسول ہیں تو حضرت موسیٰ کی طرح لکھی ہوئی کتاب آسمان سے لائیے۔ محمد بن کعب القرظی کہتے ہیں کہ یہودیوں کا مطالبہ تھا کہ جیسے حضرت موسیٰ اللہ کی جانب سے تختیاں لے کر آئے تھے آپ بھی اللہ کی جانب سے تختیاں لائیے۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ان کی طلب یہ تھی کہ خصوصی کتاب آسمان سے اتاری جائے۔ اور ابن جریج کہتے ہیں، ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم آپ کی دعوت کو اس وقت تک قبول نہ کریں گے جب تک آپ فلاں فلاں کے نام اللہ کی جانب سے یہ خط لے کر نہ آئیں کہ آپ اللہ کے رسول ہیں۔ بات خواہ کچھ ہو اتنی بات صاف ہے کہ یہودیوں نے سوال کیا تھا اور یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ یہ سوال کرنے والے عوام نہیں بلکہ ان کے علماء ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے لو آمن بی عشرۃ من الیھود لآمن بی الیھود یعنی اگر مجھ پر دس یہودی ایمان لے آتے تو تمام یہود ایمان لے آتے۔ وہ خود ایمان نہ لاتے تھے اور اس قسم کے سوالات کر کے عام مسلمانوں میں بے چینی پیدا کرتے تھے۔ مسند احمد کی روایت میں اس کی توضیح آئی ہے کہ دس یہود سے مراد یہودی علماء ہیں۔ چنانچہ الفاظ یہ ہیں۔ لو آمن عشرۃ من احبار الیھود اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ کی مراد مطلق یہود نہ تھی بلکہ خاص ان کے علماء تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینہ میں تشریف آوری سے رؤسا یہود میں سے مشاہیر کے حسب ذیل نام لکھے ہیں۔

عبداللہ ابن سلام، ابو یاسر بن اخطب، حی بن اخطب، کعب بن الاشرف، رافع بن ابی الحقیق، عبداللہ بن حنیف، فنحاص، رفاعہ بن زید، زبیر بن باطیا، کعب بن اسد، شمویل بن زید۔

اس سلسلے میں کعب اور ابوہریرہ کی روایت میں یہ اختلاف ہے کہ حضور انور صلی اللہ

---

[1] تفہیم القرآن

علیہ وسلم نے علمار یہود میں دس کا عدد بیان فرمایا ہے یا بارہ کا ۔کعب کا رجحان بارہ کی جانب ہے جب کہ ابوہریرہ دس بتاتے ہیں ۔یحییٰ بن سلام فرماتے ہیں کہ دونوں باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں ہوسکتا ہے کہ کعب نے پورا عدد ذکر کیا ہو اور ابوہریرہ نے صرف ان کا ذکر کیا ہو جو حلقۂ اسلام میں داخل نہ ہوتے تھے ۔عبداللہ بن سلام اور مریق اسلام قبول کر چکے تھے ۔بہرحال خلاصہ حدیث یہ ہے کہ اگر کہیں اس وقت یہ دس بارہ احبار کلمۂ اسلام قبول کر لیتے تو جو یہود ان کو ارباب کہتے تھے تمام کے تمام اسلام میں داخل ہو جاتے مگر چونکہ اس قوم کے حق میں من حیث القوم اسلام مقدر نہ تھا اس لیے ان کے علمار کو بھی بہت کم اسلام کی توفیق ہوئی ۔اسی فطری شقاوت کی وجہ سے انہوں نے مختلف زمانوں میں اپنے پیغمبروں کو جھٹلایا ، ان کو تکلیفیں دیں ۔حضرت موسیٰ اور ان کے بعد کوئی پیغمبر ان میں ایسا نہ آیا جس نے ان کی سنگدلی کا ماتم نہ کیا ہو اور ان کی سرکشی پر ان کے حق میں بد دعا نہ کی ہو ۔

بہرحال یہود نے ازراہ تعنت حضور انور سے یہ سوال کیا ۔ان کا مقصد طلب حقیقت نہیں بلکہ وہ ازراہ شرارت ایسا کر رہے تھے ۔

بے باکی و سرکشی کی سنگین سزا

۲۲۶ - بلاشبہ وہ اس سے بڑی فرمائش حضرت موسیٰ سے کر چکے ہیں ۔انہوں نے کہا تھا کہ ہمیں خدا کو کھلم کھلا دکھا دے تو ان کی شرارت کی وجہ سے بجلی کی کڑک نے ان کو آ پکڑا ۔اس تمام رکوع میں الزامات کو ان کے جواب میں ذکر فرمایا ہے ۔اس کے بعد تحقیقی جواب دیا ہے ۔مطلب یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہودی جو تم سے عناداً ایسی کتاب طلب کرتے ہیں ان کی یہ بے باکی اور سرکشی تعجب کی بات نہیں ہے ان کے بزرگوں نے اس سے بھی بڑی اور سخت بات اپنے نبی موسیٰ علیہ السلام سے طلب کی تھی کہ خداوند تعالیٰ کو آشکارا ہم کو دکھا دو ورنہ ہم تمہارا یقین نہ کریں گے جیسا کہ سورہ بقرہ میں گزرا ۔اس پر یہ ہوا کہ ان کہنے والوں پر بجلی آن پڑی اور سب مر گئے ۔پھر حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کی دعا سے ان کو زندہ کر دیا ۔[1]

یہاں واقعہ کی تفصیل پیش کرنا مقصود نہیں بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست کی طرف

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اشارہ مقصود ہے اس لیے ان کی قومی تاریخ کے چند نمایاں واقعات کی طرف اشارات کیے جا رہے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہودیوں نے آپ سے صرف یہ مطالبہ کیا ہے کہ ہم آپ کی رسالت اس وقت تک تسلیم نہ کریں گے جب تک ہماری آنکھوں کے سامنے ایک لکھی لکھائی کتاب آسمان سے نازل نہ ہو اور انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا کہ ہم تمہارا اس وقت تک یقین نہ کریں گے جب تک خدا کو اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں۔ دراصل بنی اسرائیل شک کے لیے بیمار تھے کہ انہیں کسی طرح یہ یقین ہی نہ آتا تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے کلام بھی کرتا ہے۔ اس وجہ سے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام ان سے کہتے کہ اللہ سبحانہ تعالیٰ یہ حکم دیتا ہے تو وہ کہتے کہ جب تم سے خدا کلام کرتا ہے تو وہ ہم سے بھی کلام کرے اور ہم بھی اسے آنکھوں سے دیکھیں۔ اس کے بغیر ہم تمہاری بات کی صحت کیسے مان لیں۔

یہود کے مطالبہ اور حضرت موسیٰ کے شوق میں فرق

یہود نے دیدار الٰہی کا مطالبہ کیا اور حضرت موسیٰ نے دیدار الٰہی کا شوق ظاہر کیا۔ لیکن دونوں میں بڑا فرق ہے۔ اس بات میں کہ یہ خواہش شرح صدر اور اطمینان قلب حاصل کرنے کے لیے ہو اور اس بات میں کہ اس کو انکار و تکذیب کا بہانہ بنایا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ خواہش اسی طرح تھی جس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام نے یہ دیکھنا چاہا کہ اللہ تعالیٰ مُردوں کو کیسے زندہ کرتا ہے تاکہ دعوت کے بارے میں ان کو پورا پورا شرح صدر اور اطمینان حاصل ہو جائے۔ اسی لیے اللہ سبحانہ نے رَبِّ اَرِنِی کی درخواست پر حضرت موسیٰ کو ملامت نہیں کی بلکہ فرمایا کہ تم ان ناسوتی آنکھوں سے میرے جمال کا نظارہ نہیں کر سکتے صرف میری صفات ہی کو دیکھ سکتے ہو۔

اس کے برعکس یہود کا مطالبہ دید محض ان کی بے یقینی اور شک پرستانہ ذہنیت کا ایک مظاہرہ تھا اور یہ مظاہرہ وہ قدم قدم پر اللہ تعالیٰ کی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود کرتے تھے۔ اس وجہ سے ان پر عتاب ہوا۔

یہودیوں کی جانب سے سوال حضور انور سے کتاب کا ہو یا حضرت موسیٰ سے اللہ کی دید کا ہو دونوں کا منشا جہالت اور عناد ہے۔ کیوں؟

اس لیے کہ حضور انور سے آسمانی کتاب کے لیے نزول کی درخواست یا تو اس لیے ہے کہ وہ نبوت و رسالت کی حقیقت سے ناآشنا ہیں اور ان کو انبیاء کے معجزات اور دوسرے عجیب و غریب امور کے درمیان فرق تمیز ہی معلوم نہیں ہے۔ یہ خلاف واقعہ ہے ان کو نبوت و رسالت کی حقیقت بھی معلوم

ہے اور ان کی کتابوں میں یہ بات ان کے سامنے وضاحت سے پیش کر دی ہے اس لیے ظاہر ہے کہ ان کا یہ سوال جہالت پر مبنی ہے۔

یا ان کے پیش نظر عناد کی وجہ سے صرف نبوت کو عاجز کرنا اور لاجواب کرنا ہے۔ وہ خواہ کچھ ہو ان کے سوال میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ سے دیدار الٰہی کے مطالبہ کی پاداش میں ان پر عتاب ہوا عتاب کا ذکر البقرہ میں گزر چکا ہے اور یہاں بھی فاخذتھم الصاعقۃ بظلمھم کہہ کر اسے بیان کیا گیا ہے اس کی تفصیل الاعراف میں آ رہی ہے۔

گوسالہ پرستی کا جرم

۲۲۷۔ پھر واضح دلائل آنے کے باوجود انہوں نے گوسالہ پرستی کو اختیار کر لیا ہم نے اس سے بھی درگزر کیا اور موسیٰ علیہ السلام کو واضح غلبہ دیا تھا۔ یعنی ایسی عظیم الشان نشانیاں دیکھ کر پھر یہ کیا کہ بچھڑے کو پوجنے لگے۔ بالآخر حق تعالیٰ نے اس سے بھی درگزر فرمائی۔ واقعہ سورہ بقرہ میں کسی قدر تفصیل سے گزر چکا ہے[1]

واضح دلائل سے مراد وہ نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ کے رسول مقرر ہونے کے بعد سے لے کر فرعون کے غرق ہونے اور بنی اسرائیل کے مصر سے نکلنے تک پے در پے ان لوگوں کے مشاہدے میں آچکی تھیں ظاہر ہے کہ سلطنت مصر کی عظیم الشان طاقت کے پنجوں سے جس نے بنی اسرائیل کو چھڑایا تھا وہ کوئی گائے کا بچہ نہ تھا بلکہ اللہ رب العالمین تھا مگر یہ اس قوم کی باطل پرستی کا کمال تھا کہ خدا کی قدرت اور اس کے فضل کی روشن ترین نشانیوں کا تجربہ اور مشاہدہ کر چکنے کے بعد بھی جب جھکی تو اپنے محسن خدا کے آگے نہیں بلکہ ایک بچھڑے کی مصنوعی مورت ہی کے آگے جھکی بلکہ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے باوجود اس قدر انعامات کے منعم سے تعلق توڑ کر بچھڑے کی مورتی سے عابدانہ تعلقات پیدا کر لیے تھے۔ کتاب خروج باب ۳۲ میں اس واقعہ کی تفصیلات موجود ہیں لیکن یہود نے اپنی عادت کے مطابق اس میں حضرت ہارون کو بھی ملوث کر لیا ہے جس کی قرآن نے دوسرے موقعہ پر تردید کی ہے۔

اور جب لوگوں نے دیکھا کہ موسیٰ نے پہاڑ سے اترنے میں دیر کی تو وہ ہارون

---

[1] افادات شیخ الاسلام تفہیم القرآن

کے پاس جمع ہوکر اس سے کہنے لگے کہ اٹھ ہمارے لیے دیوتا جو ہمارے آگے آگے چلے کیونکہ
ہم نہیں جانتے کہ اس مرد موسیٰ جو ہم کو ملک مصر سے نکال کر لایا ہے کیا ہوگیا ....
تب خداوند نے موسیٰ کو کہا نیچے جا کیونکہ تیرے لوگ جن کو تو مصر سے نکال لایا بگڑ
گئے ہیں۔ وہ اس راہ سے جس کا میں نے حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے۔ انہوں نے
اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لیے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے
اسرائیل یہ تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا ہے اور خداوند نے موسیٰ
سے کہا کہ میں اس قوم کو گردن کش دیکھتا ہوں اس لیے تو مجھے چھوڑ دے کہ میرا غضب
ان پر بھڑکے اور میں ان کو بھسم کر دوں۔

(باب ۳۲ آیات ۱-۷)

ارتداد کی سزا

اس کے بعد ارشاد ہے فعفونا عن ذالك ہم نے اسے معاف کر دیا۔ اس معافی اور درگزر کی
تفصیل البقرہ میں گزر چکی ہے وہاں بتایا جا چکا ہے کہ جن لوگوں نے گوسالہ پرستی کا جرم کیا تھا ان کے بارے
میں حکم ہوا تھا کہ فاقتلوا انفسکم اس کے معنے یہ نہیں کہ اپنی تلواریں اپنی گردنوں پر چلا دو بلکہ اس
کا مطلب یہ ہے کہ ہر قبیلہ میں سے جو لوگ اس فتنہ شرک اور گوسالہ پرستی سے الگ رہے ہیں۔ اپنے قبیلہ
میں سے ان لوگوں کی گردنیں مار دیں جنہوں نے قوم کے لیے اس فتنہ ارتداد کی راہ کھول ہے۔ یہ حکم دینے میں
چند مصلحتیں تھیں۔

اوّل یہ کہ اس طرح اس توبہ نے ایک اجتماعی توبہ کی شکل اختیار کر لی۔ گویا بنی اسرائیل کے اجتماعی
ضمیر نے ان لوگوں کو اپنے اندر سے کاٹ دیا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد توحید کی اہانت کی تھی۔

دوم یہ کہ اس سے توحید کی حقیقی عظمت اور شرک کی حقیقی کراہت پورے طور پر واضح ہوگئی
گویا شرک ایک ایسی برائی ہے کہ اگر آدمی کا بایاں ہاتھ اس کا ارتکاب کرے تو اس کے دایاں ہاتھ کا فرض
ہے کہ اپنے بائیں ہاتھ کو کاٹ دے۔

سوم یہ کہ ہر قبیلہ اور ہر خاندان کے اچھے لوگ اگر اپنے اپنے قبیلوں کے برے افراد پر تلوار اٹھائیں
گے تو اس سے خاندانی عصبیت ختم ہو جائے گی۔

تورات کے مطالعہ سے بھی قریب قریب یہی بات نکلتی ہے چنانچہ تورات کی کتاب خروج میں ہے

جب حضرت موسیٰ نے دیکھا کہ لوگ بے قابو ہو گئے کیونکہ ہارون نے ان کو بے لگام چھوڑ کر ان کو ان کے دشمنوں کے درمیان ذلیل کر دیا تو موسیٰ نے لشکرگاہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا کہ جو خداوند کی طرف ہے وہ میرے پاس آ جائے تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہو گئے اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لٹکا کر پھاٹک پھاٹک گھوم کر سارے لشکرگاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو۔ بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق عمل کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں تین ہزار مرد کھپ آئے اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف ہو تاکہ وہ تم کو آج ہی برکت دے۔ (باب ۳۲)

اگرچہ تورات کے اس بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے مرتدوں کے قتل کے کام پر بنی لاوی کو مقرر کیا تھا لیکن عبارت کا آخری حصہ ہمارے موقف کی تائید کر رہا ہے کہ ہر قبیلہ کے موحدین یہ کام کریں تاکہ یہ اہل ایمان کے مزید ایمان کی ایک شہادت ہو اور لوگ سبق حاصل کریں کہ شرک اتنا بڑا گناہ ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی شریعت میں ارتداد فوجداری کا ایک سنگین جرم تھا مستوجب قتل، جیسا کہ ارتداد کی سزا شریعت اسلامیہ میں بھی قتل ہے۔

آخر میں فرمایا وَاٰتَيْنَا مُوْسٰى سُلْطٰنًا مُّبِيْنًا ہم نے موسیٰ کو واضح اقتدار دیا تھا حضرت شیخ الہند فرماتے ہیں اور دیا ہم نے موسیٰ کو غلبہ صریح۔

یہ اقتدار و غلبہ کیا ہے؟ شیخ الاسلام فرماتے ہیں، غلبہ یہ کہ حضرت موسیٰ نے اس بچھڑے کو توڑ کر کے آگ میں جلا دیا اور اس کی راکھ ہوا میں دریا پر اڑا دی اور ستر ہزار آدمی بچھڑے کو سجدہ کرنے والے قتل کیے گئے۔ [1]

بچھڑے کے موضوع پر تفصیلی مباحث سولہویں پارے میں آ رہے ہیں باقی مقتولین کی تعداد تو مفسرین قرآن نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالے سے اور حضرت علی کے حوالے سے یہ انکشاف کیا ہے۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موضوع پر دفتر حدیث میں ایک حرف منقول

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں ہے۔ تورات نے تصریح کی ہے کہ مقتولین کی تعداد تین ہزار تھی۔ تین ہزار سترقرآن جو واقعہ پیش کر رہا ہے اس کی عبرت تعداد پر نہیں بلکہ فعل پر ہے۔ اور مولانا آزاد فرماتے ہیں اور موسیٰ کو قیام حق و شریعت میں ظاہر و واضح اقتدار دیا۔ ہماری رائے میں سلطان مبین سے یہاں وبدبہ اغلبہ اور اقتدار مراد ہے۔ اور اس فقرے کے ذریعے قرآن اپنے مخاطبوں کے ذہن میں آتارنا چاہتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے گوسالہ پرستی کے سنگین جرم پر ایکشن لیا اور ان کو سزا دی۔ علامہ آلوسی نے اسی کو اولیت کا درجہ دیا ہے۔ اگرچہ حافظ ابن جریر نے یہاں سلطان مبین سے معجزات مراد لیے ہیں۔

کوہ طور کے سایے میں عہد

۲۲۸۔ اور ہم نے کوہ طور کو بلند کر کے ان سے عہد لیا تھا یعنی جب یہود نے کہا تھا کہ تورات کے حکم سخت ہیں ہم نہیں مانتے تو اس وقت کوہ طور کو زمین سے اٹھا کر ان کے سروں پر معلق قائم کر دیا تھا کہ ان حکموں کو قبول کرو اور مضبوطی سے پکڑو ورنہ پہاڑ ڈالا جاتا ہے[1] موثق اور میثاق کے معنے عہد و پیمان کے ہیں۔ اس لفظ کی روح وثوق اور استحکام ہے۔ اس وجہ سے یہ خاص طور پر اس عہد و پیمان کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کسی اہم معاملہ کے لیے پورے شعور اور پورے احساس ذمہ داری کے ساتھ باندھا گیا ہو اور جس کی وفاداری کا تاکید کے ساتھ اظہار و اقرار کیا گیا ہو۔ یہاں اس سے مراد وہ عہد ہے جو بنی اسرائیل سے تورات کی پابندی کا لیا گیا۔ اللہ کی شریعت خود خدا اور بندوں کے درمیان ایک معاہدہ ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اس کو میثاق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔

اس معاہدے کا قرآن حکیم اور تورات دونوں میں ذکر ہے کہ بنی اسرائیل کے سرداروں سے کوہ طور کے نیچے عہد لیا گیا اور اس وقت اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایک سخت زلزلہ نے پہاڑ کو ہلا دیا۔ اگر زلزلے کے وقت آدمی کسی اونچی دیوار کے زیر سایہ یا پہاڑ کے دامن میں ہو تو ایسا معلوم ہوگا کہ پہاڑ یا دیوار سائبان کی طرح سر پر لٹک رہے ہیں اور اوپر گرا چاہتے ہیں اس حالت کو قرآن نے پہاڑ کو ان کے سروں پر اٹھا لینے سے تعبیر کیا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فاتحانہ سرشاریاں اور ان کا علاج

۲۲۹۔ اور ہم نے ان کو حکم دیا تھا کہ شہر کے دروازے میں سجدہ کرتے ہوئے داخل ہو۔ یہود کو حکم ہوا تھا کہ شہر میں داخل ہو سجدہ کر کے اور سر جھکائے ہوئے۔ انہوں نے سجدے کے بدلے سرین پر سرکنا اور پھسلنا شروع کیا۔ جب شہر میں پہنچے تو ان پر طاعون پڑا، دوپہر میں قریب ستر ہزار مر گئے۔ ؎

یہاں کسی واقعہ کی تفصیل بیان کرنا مقصود نہیں ہے بلکہ یہودیوں کے جرائم کی ایک مختصر فہرست پیش کرنی مقصود ہے اس لیے ان کی قومی تاریخ کے چند نمایاں واقعات کی طرف سرسری اشارات کیے گئے ہیں۔ اس فقرے میں جس واقعہ کا ذکر ہے اس پر تفصیلی تبصرہ پہلی جلد میں ہو چکا ہے وہاں مطالعہ کیا جائے۔

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ باب سے مراد شہر کا پھاٹک ہے۔ قدیم شہروں کے اردگرد ایک بلند چہار دیواری شہر پناہ کے نام سے موسوم ہوتی تھی۔ شہر میں داخل ہوتے وقت اسی شہر پناہ سے گزرنا ہوتا تھا۔ سجدا یہاں اپنے لغوی معنے میں ہے یعنی عاجزی سے فروتنی کے ساتھ۔ سجدہ نماز کی ہیئت مخصوص مراد نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شہر کے دروازے میں فاتحانہ تمکنت کے ساتھ داخل نہ ہوں بلکہ عاجزانہ اور سرافگندہ ہو کر داخل ہوں۔ مقصد یہ بتانا ہے کہ ان کو یہ حکم دیا گیا تھا کہ اس شہر میں داخل ہوں، اس کی زرخیزی و شادابی سے پوری آزادی کے ساتھ فائدہ اٹھائیں لیکن شہر میں داخل ہونے کے وقت خدا کا شکر کریں اور اپنے گناہوں کی معافی مانگتے رہیں۔ لیکن جس طرح انہوں نے ہر نعمت کی ناقدری اور ہر ہدایت کی خلاف ورزی کی، اسی طرح اس نعمت اور اس ہدایت کی بھی ناقدری کی جیسے ان کو سجداً کے ذریعے کردار کا پیمانہ بتایا تھا ایسا ہی حطۃ کے ذریعے گفتار کا پیمانہ بھی ان کے لیے مقرر کیا تھا۔ حطۃ کا لفظ ایک پورا جملہ ہے اس کا مبتدا محذوف ہے۔ زمخشری نے اس کی وضاحت یوں کی ہے مسئلتنا حطۃ ہماری مانگ حطہ ہے حطہ حط سے ہے اس کے معنے جھاڑ دینے کے ہیں یہاں اس سے مراد گناہوں کا جھاڑ دینا ہے۔ عربی اور عبری دونوں کے قریب الماخذ ہونے کی وجہ سے کچھ بزرگوں نے یہ گمان کر

؎ افادت شیخ الاسلام

لیا ہے کہ یہ مادہ جھاڑ دینے اور بخش دینے کے مفہوم میں عبری میں بھی استعمال ہوا ہے اور یہ ان کے ہاں استغفار اور توبہ کے کلمات میں سے تھا۔ وہیں سے یہ عربی میں منتقل ہوا ہے۔

قرآن نے بتایا ہے کہ دعا کے لیے گفتار کا جو پیمانہ ان کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ اس کو انہوں نے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل دیا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں الفاظ کی تبدیلی مراد نہیں ہے بلکہ رویہ کی تبدیلی ہے۔ ابو مسلم اصفہانی کا یہی خیال ہے لیکن قرآن کے الفاظ سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی ہے۔ ہمارے نزدیک یہاں صرف رویہ اور عمل کی تبدیلی کی طرف اشارا نہیں ہے بلکہ یہ بتانا ہے کہ بنی اسرائیل کے بدبختوں نے حطہ کے لفظ کو اس سے بالکل مختلف مفہوم والے لفظ سے بدل لیا تھا۔

نقضِ عہد کی ایک مثال

۲۳۰۔ اور یہ بھی ہم نے ان سے کہا تھا کہ سبت کے دن کے بارے میں قانون کی حد بندی نہ توڑنا اور ہم نے ان سے پکا عہد لیا تھا۔ یہودیوں کو حکم تھا کہ ہفتہ کے دن مچھلی کا شکار نہ کریں اور سب دنوں سے زیادہ ہفتہ ہی کے دن مچھلیاں دریا میں بکثرت نظر آتیں۔ یہودیوں نے یہ حیلہ کیا کہ دریا کے پاس حوض بناتے۔ ہفتہ کے دن جب مچھلیاں دریا سے حوضوں میں آتیں تو ان کو بند کر دیتے پھر دوسرے روز حوضوں میں سے شکار کرتے۔ اس فریب اور عہد شکنی پر اللہ تعالیٰ نے ان کو بندر بنا دیا جو جانوروں میں بہت خسیس اور مکار ہے۔[1]

اصحاب سبت کا ذکر پہلی جلد میں گزر چکا ہے اور مفصل ذیل جلد سورہ اعراف میں آئے گا۔ سبت کی حرمت کے متعلق موسوی قانون میں بنی اسرائیل کو یہ ہدایات تھیں۔

پھر خداوند نے موسیٰ سے ہمکلام ہو کر کہا کہ تو بنی اسرائیل کو فرما اور ان کو کہہ کہ تم میرے سبتوں کو مانو اس لیے کہ یہ میرے اور تمہارے قرنوں میں نشانی ہے تاکہ تم جانو کہ میں خداوند تمہارا پاک کرنے والا ہوں، پس تم سبت کو مانو اس لیے کہ وہ تمہارے لیے مقدس ہے جو کوئی اس کو پاک نہ جانے وہ ضرور مار ڈالا جائے جو اس میں کچھ کام کرے وہ اپنی قوم سے کٹ جائے۔ چھ دن کام کرنا لیکن

[1] افادات شیخ الاسلام

ساتواں دن آرام کے لیے ہے وہ خداوند کے لیے مقدس ہے پس بنی اسرائیل سبت
کو مانیں اور اسے اپنی پشت در پشت عہد ابدی جان کر اس میں آرام کریں ۔
میرے اور بنی اسرائیل کے درمیان یہ علامت ابدی ہے ۔
(خروج باب ۱۳ آیات ۱۲-۱۷)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عہد مبارک سے عرصہ دراز کے بعد بنی اسرائیل کی ایک جماعت بحر قلزم کے کنارے آباد ہو گئی ۔ چونکہ یہ لوگ ساحل کے باشندے تھے اس لیے مچھلی ان کا قدرتی شکار تھا ۔ اور اس کو بہت مرغوب مشغلہ سمجھتے تھے اور اس کی خرید و فروخت کا کاروبار کرتے تھے یہ ہفتہ کے چھ دن مچھلی کا شکار کھیلتے اور سبت کا روز عبادتِ الٰہی میں صرف کرتے ۔ قدرتی طور پر مچھلیاں چند روز جان بچانے کی خاطر پانی کی تہ میں پوشیدہ رہتیں اور سبت کے روز پانی کی سطح پر تیرتی نظر آتی تھیں ۔ ساتھ ہی اللہ سبحانہٗ نے اس طریقہ سے ان کو آزمایا اور ان کی قوتِ ایمانی کا امتحان لیا ۔ حتیٰ کہ سبت کے علاوہ ہفتہ کے باقی دنوں میں مچھلیوں کا حاصل ہونا مشکل تر ہو گیا ۔ اور چھٹے دن یہ کیفیت رہنے لگی کہ گویا قلزم میں مچھلی کا نام و نشان باقی نہیں رہا مگر سبت کے روز وہ اس کثرت سے آتیں کہ جال اور کانٹے کے بغیر ہاتھوں ہی سے باسانی گرفت میں آجاتیں۔

کچھ عرصہ تک تو یہودی اس حالت کو صبر آزما طریقہ پر دیکھتے رہے ، آخر نہ رہ سکے اور ان میں سے بعض بعض نے خفیہ طریقوں سے ایسے حیلے ایجاد کیے کہ جس سے یہ ظاہر ہی نہ ہو سکے کہ وہ سبت کے احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں ۔

کچھ تو یہ کرتے کہ جمعہ کی شام کو قلزم کے قریب گڑھے کھود لیتے اور دریا سے ان گڑھوں تک نہر کی طرح ایک گول نکال لیتے اور جب سبت کے روز سطح آب پر مچھلیاں تیرنے لگتیں تو وہ دریا کے پانی کو کھول دیتے تاکہ پانی گڑھوں میں چلا جائے اور اس طرح مچھلیاں بھی پانی کے بہاؤ سے ان میں آجائیں اور جب سبت کا دن گزر جاتا تو اتوار کی صبح کو ان مچھلیوں کو گڑھوں میں سے نکال لیتے ۔

اور کچھ یہ کرتے کہ جمعہ کے روز دریا میں جال اور کانٹے ڈال دیتے تاکہ سبت کے روز ان میں مچھلیاں پھنس جائیں اور اتوار کی صبح کو ان جالوں اور کانٹوں میں گرفتار مچھلیوں کو پکڑ لاتے اور یہ سب اپنی ان ترکیبوں پر بے حد مسرور نظر آتے تھے ۔ چنانچہ جب ان کے علمائے حق اور مخلصینِ اُمت نے ان کو ان کی اس حرکت سے روکا تو انہوں نے معترضین کو یہ جواب دیا کہ خدا کا حکم یہ ہے کہ سبت کے روز شکار نہ کرو ، لہٰذا ہم اس کی تعمیل میں سبت کے دن شکار نہیں کرتے بلکہ

تواریخ روز کرتے ہیں۔ اگرچہ ان کا دل اور ضمیر ملامت کرتا تھا مگر کچھ ردی جواب دے کر ان کو مطمئن کر دیتے کہ ہماری یہ ترکیب خدا کے یہاں منظور چل جائے گی۔

اصل بات یہ ہے کہ وہ دین کے احکام پر صداقت کے ساتھ عمل کرنا نہیں چاہتے تھے۔ قرآن نے ان کے اسی کردار کو یہاں عدوان فی السبت کہا ہے۔

یہودیوں سے میثاق کی کہانی

آخر میں ارشاد ہوا ہے واخذنا منھم میثاقا غلیظا ہم نے ان سے مضبوط عہد لیا تھا۔ یعنی اس بات کا عہد لیا تھا کہ تورات کو اپنانا ہے اس پر عمل کرنا۔ اس میں بیان کردہ حدود الٰہی کو قائم کرنا ہے۔ تاریخ میں اگرچہ ایک سے زیادہ مواثیق کا ذکر ہے۔ لیکن یہاں موقعہ و محل کی مناسبت سے میثاق سے مراد تورات پر عمل کا عہد ہے اور تورات کے مشتملات کو ماننے اور قبول کرنے کا میثاق ہے۔ اسی میں حضرت عیسیٰ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری بھی داخل ہے آج جو تورات موجود ہے اس میں حضرت موسیٰ کی پانچویں کتاب جو استثنا کے نام سے موسوم ہے اس کی فصل ۲۹-۳۰-۳۱ ۳۱ اور ۳۲ میں ہمیں اس عہد و میثاق کے آثار ملتے ہیں۔

۲۹ فصل کا آغاز اس فقرے سے ہوتا ہے۔

> یہ اس عہد کی باتیں ہیں جو خداوند نے موسیٰ کو حکم دیا کہ موآب کی سرزمین میں بنی اسرائیل سے باندھے۔ اس عہد کے سوا جو اس نے ان کے ساتھ حورب میں باندھا تھا۔ (استثنا باب ۲۹ آیت ۱)

اس کے بعد آیت نمبر ۱۴ میں ہے:

> اور میں فقط تمہارے ساتھ ہی یہ عہد اور قسم نہیں کرتا بلکہ اس کے ساتھ جو آج کے دن خداوند ہمارے خدا کے آگے یہاں موجود ہے۔

اس کے بعد باب ۳۱ کے آخر میں ہے:

> اور ایسا ہوا کہ جب موسیٰ اس شریعت کی باتوں کو کتاب میں لکھ چکا اور وہ تمام ہوئیں تو موسیٰ نے لاویوں کو جو خداوند کے عہد کے صندوق کو اٹھاتے تھے فرمایا کہ اس شریعت کو لے کے خداوند اپنے خدا کے عہد کے صندوق کی ایک بغل میں رکھو تاکہ وہ تمہارے برخلاف گواہ رہے۔ کیونکہ میں تیری بغاوت اور تیری گردن کشی

> کو جانتا ہوں۔ دیکھو ہنوز کہ میں جیتا اور آج کے دن تک تمہارے ساتھ ہوں تم نے خداوند سے بغاوت کی ہے تو میرے مرنے کے بعد کتنا زیادہ کرو گے۔ اپنے فرقوں کے سارے بزرگوں اور منصب داروں کو مجھ پاس جمع کرو تاکہ میں یہ باتیں ان کے کانوں تک پہنچاؤں اور آسمان اور زمین کو درمیان لا کے ان پر گواہ کروں۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ میرے مرنے کے بعد تم اپنی تئیں خراب کرو گے اور اس راہ سے جس کی بابت میں نے تم کو حکم دیا تھا۔ پھر جاؤ گے اور کہ آخری دنوں میں تم پر بدی پڑے گی اس لیے کہ تم خداوند کے حضور بدی کرو گے کہ اپنے ہاتھ کے کاموں سے اُسے غصہ دلاؤ گے۔ سو موسیٰ نے اس گیت کی باتیں اسرائیل کی ساری جماعت کو کہہ سنائیں یہاں تک کہ وہ تمام ہوئیں۔ (استثنا، باب ۳۱ آیات ۲۸تا ۳۰)

حضرت موسیٰ نے اپنی زندگی کی آخری وصیت جس پر ان کی تورات اور ان کے صحیفہ حیات دونوں کا خاتمہ ہو جاتا ہے، بنی اسرائیل کو یہ فرمائی۔

> یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مردِ خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور شعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کی چوٹیوں پر وہ جلوہ گر ہوا، دس ہزار مقدسوں کے ساتھ آیا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ان کے لیے تھی۔ ہاں وہ اپنے لوگوں سے بڑی محبت رکھتا ہے اس کے سارے مقدس تیرے ہاتھ میں ہیں اور وہ تیرے قدموں کے پاس بیٹھے ہیں اور تیری باتوں کو مانیں گے۔ (استثنا ۳۳-۱-۲-۳)

نقضِ عہد کی پاداش

۱۳۱۲۔ پھر ان کی عہد شکنیوں کی وجہ سے اور اللہ کی آیات کا کفر کرنے کی وجہ سے اور اس وجہ سے کہ وہ انبیاء کو ناحق قتل کرتے ہیں، نیز اس بنا پر کہ انہوں نے کہا کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں بلکہ ان کے کفر کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے اسی کا نتیجہ ہے کہ معدودے چند آدمیوں کے سوا سب ایمان سے محروم ہیں۔ یعنی یہود نے اس عہد کو توڑ دیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اس عہد شکنی پر اور آیاتِ الٰہی سے منکر ہونے پر اور انبیاء علیہم السلام کے ناحق قتل کرنے پر اور ان کے اس کہنے پر کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں ان پر سخت سے سخت عذاب مسلط کیے

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہودیوں کو ہدایت کی تو کہنے لگے کہ ہمارے دل پردے میں ہیں۔ تمہاری بات وہاں تک پہنچ نہیں سکتی تو اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ یہ بات نہیں بلکہ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے جس کی وجہ سے وہ نعمت ایمان سے محروم ہیں مگر تھوڑے لوگ اس سے مستثنیٰ ہیں جیسے حضرت عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی[1]

یعنی یہودیوں کی عہد شکنی کی وجہ سے اور آیات الٰہیہ کے کھلم کھلا انکار کی وجہ سے اور انبیاءؑ علیہم السلام کے ناحق خون بہانے کی وجہ سے اور ان کے اس کہنے کی وجہ سے کہ ہمارے دل غلافوں میں ہیں اللہ نے ان کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جس کے وہ ان سنگین جرائم کی پاداش میں مستحق تھے۔ اللہ کی لعنت، اللہ کا غضب، ذلت و مسکنت، آزادی اور حکومت کا زوال وغیرہ وغیرہ۔ کیونکہ ان گناہوں نے ان کی قومی وحدت کو پارہ پارہ کر دیا اور ان کی اجتماعی زندگی کو تار تار کر دیا تھا۔ ان کی قوت و شوکت پامال ہو گئی اور ان کی زندگی اخلاقی گراوٹوں کا گہوارہ بن کر رہ گئی تھی۔ یہ سب کچھ عہد شکنی کفر اور عصیان کے ناگزیر نتائج تھے۔

فبما نقضھم فعل محذوف کے متعلق ہے چاہے متعلق عام نکال لیجئے جیسا کہ علامہ آلوسی کا خیال ہے اور چاہے خاص یعنی لعنت۔ بلاغت کا یہ اسلوب عربی زبان میں زیادہ ہے۔

اظہارِ تکبّر یا اظہارِ معذرت

قلوبنا غلف کے معنے ہیں ہمارے دل غلافوں میں ہیں شارحین قرآن نے اس کی دو صورتیں بتائی ہیں۔ ایک یہ کہ اغلف کی جمع ہے دوسرے یہ کہ غلاف کی جمع ہے۔ غلاف کی جمع ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل تو علم و حکمت یعنی نقلی اور عقلی علوم و فنون کا گہوارہ ہیں۔ پتہ نہیں کہ آپ کی دعوت کیا ہے ہمیں تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گنجینۂ علوم ہونے کی وجہ سے آپ کی دعوت ہماری جماعتی زندگی کی ضرورت نہیں ہے اور پہلی صورت میں یعنی جب غلف اغلف کی جمع ہو۔ معنے یہ ہیں کہ آپ کی دعوت ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ ابو عبید کہتے ہیں کہ غلاف میں محفوظ چیز کو اغلف کہتے ہیں جیسے میان میں محفوظ تلوار کے لیے سیف اغلف بولا جاتا ہے ابن عباس، قتادہ اور مجاہد نے دلوں کے غلافوں میں ہونے کا یہی مطلب بتایا ہے کہ آپ کی دعوت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

دونوں صورتوں میں جوہری فرق ہے۔ پہلی صورت میں یہود کا یہ کہنا اظہارِ تکبر ہے اور دوسری طرف اظہارِ معذرت ہے۔ اظہارِ تکبر کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ ہمارے دل و دماغ اس قسم کی لایعنی باتوں کے لیے نہیں بنے ہیں اس لیے آپ کی دعوت کسی صورت میں ہمارے دلوں میں نہیں اترتی ہے۔ اگر آپ کی دعوت میں ذرا بھی معقولیت ہوتی تو ہم ضرور مان لیتے اور اظہارِ معذرت کی صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ باتیں جو نبوت پیش کر رہی ہے ہمارے دل میں تو کسی طرح نہیں اترتی اگر یہ خدا کی طرف سے ہیں تو خدا کے اختیار میں سب کچھ ہے۔ آخر وہ ہمارے دلوں کو ان باتوں کے لیے کیوں نہیں کھول دیتا۔

اگرچہ ہمارے شارحینِ قرآن نے غلف کو اغلف کی جمع قرار دے کر اسی معنے کو ترجیح دی ہے کہ تمہاری دعوت ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔ یعنی اظہارِ معذرت کو اپنایا ہے اور ہم نے بھی جلد اوّل میں اسی کی ہمنوائی کی ہے لیکن آیت کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ہم یہاں دوسرے مفہوم میں یعنی اظہارِ تکبر کو ترجیح دیتے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہود کے اس قول قلوبنا غلف کے بعد اللہ تعالیٰ نے یہاں بل طبع اللہ اور پہلے پارے میں بل لعنہم اللہ جو فرمایا ہے اس سے واضح تائید اسی کی ہوتی ہے یعنی وہ تو اپنے گھمنڈ اور غرور کے سبب یہ سمجھتے ہیں کہ نبوت کی باتیں ایسی ہیں جو کسی معقول آدمی کے دل میں نہیں اترتی ہیں حالانکہ حقیقت اس کے بالکل خلاف ہے۔ یہ باتیں تو نہایت معقول اور نہایت دلنشین ہیں۔ لیکن ان لوگوں کے کفر اور ان کی ضد اور ہٹ دھرمی کے سبب سے ان کے دلوں پر اللہ تعالیٰ نے مہر کر دی ہے اس وجہ سے اب ان کے اندر ان معقول باتوں کے قبول کرنے کے لیے کوئی صلاحیت باقی نہیں رہ گئی ہے یہ مہر ابتداءً کبھی نہیں لگتی جزائً ہی لگتی ہے اور یہاں تو اس کی تصریح بھی موجود ہے بکفرھم

آخر میں فرمایا ہے فلا یومنون الا قلیلاً اس کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ وہ لوگ سارے ایمان سے محروم ہیں صرف تھوڑا سا ایمان رکھتے ہیں، دوسرا یہ کہ ان لوگوں میں اہلِ ایمان کی تعداد بہت تھوڑی ہے۔ پہلی صورت میں قلیل کا موصوف ایمان محذوف ہوگا اور دوسری صورت میں قلیل کا موصوف عدد محذوف ہوگا۔ ایمان کی صفت ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ جو ایمان نجات کے لیے ضروری ہے اس میں عقائد کے ساتھ معاملات، اخلاق اور اجتماعی و انفرادی زندگی کے متعدد اجزا ہیں۔ یہود دینی زندگی کے سارے اجزا میں سے صرف چند اجزا تک

کتاب الٰہی کو مانتے تھے اور یہ کتاب الٰہی کے سارے مطالبات ہیں سے چند کو مانتے تھے۔ کتاب الٰہی کے وہ مطالبات جن کا تعلق حضرت عیسٰی اور حضرت محمد رسول اللہ کی نبوت سے تھا۔ ان کو ذرہ برابر اہمیت نہ سمجھتے، اور عدد کی صفت ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ ان کی بڑی تعداد ایمان سے محروم تھی صرف چند آدمی ایمان رکھتے تھے جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ۔

یہود کے دیگر سنگین جرائم

۲۲۲ - نیز ان کے کافرانہ طرز عمل اور حضرت مریم پر بہتان عظیم کی وجہ سے اور اس بنا پر کہ انہوں نے کہا کہ ہم نے حضرت مسیح ابن مریم کو قتل کر دیا ہے۔ یعنی اور نیز اس وجہ سے کہ حضرت مسیح ابن مریم سے ہوکر دوسرا کفر کیا اور حضرت مریم پر طوفان عظیم باندھا اور ان کے اس قول کی وجہ سے کہتے تھے کہ ہم نے حضرت عیسٰی کو مار ڈالا ان تمام وجوہ سے یہود پر عذاب اور مصیبتیں آئیں لے

اس فقرے میں یہودیوں کے تین سنگین جرائم بتلائے گئے ہیں

اوّل کفر

دوم، حضرت مریم پر بہتان

سوم، حضرت عیسٰی ابن مریم کو قتل کا دعویٰ

کفر سے یہاں حضرت عیسٰی علیہ السلام کا کفر مراد ہے۔ آلوسی لکھتے ہیں الکفر بعیسٰی، قرطبی فرماتے ہیں بکفرہم المسیح، قاضی بیضاوی رقمطراز ہیں ای بعیسٰی ابن مریم۔ صاحب المنار السید رشید رضا فرماتے ہیں والمراد بالکفر --- الکفر بعیسٰی۔ قرآن یہاں یہودیوں کے سنگین جرائم میں ایک جرم یہ بتا رہا ہے کہ انہوں نے حضرت مسیح ابن مریم کے کفر کا جرم کیا تھا اور نبوت کا انکار قرآن کے نزدیک سنگین جرم ہے جیساکہ پیچھے پڑھ آئے ہو۔ یہود کا دوسرا جرم جسے قرآن نے یہاں بیان کیا ہے وہ حضرت مریم پر بہتان ہے۔

حضرت عیسٰی کی پیدائش کا مسئلہ یہودیوں میں ذرا برابر مشتبہ نہ تھا بلکہ جس روز وہ پیدا ہوتے تھے۔ اسی روز اللہ تعالیٰ نے پوری قوم کو اس بات پر گواہ بنالیا تھا کہ یہ ایک غیر معمولی شخصیت

لے افادات شیخ الاسلام

کا بچہ ہے جس کی ولادت معجزہ کا نتیجہ ہے نہ کہ کسی اخلاقی جرم کا۔ جب بنی اسرائیل کے ایک شریف ترین اور مشہور و نامور مذہبی گھرانے کی بن بیاہی لڑکی گود میں بچہ لیے ہوئے آئی اور بڑے چھوٹے سینکڑوں ہزاروں کی تعداد میں اس کے گھر پر ہجوم کرکے آگئے تو اس لڑکی نے ان کے سوالات کا جواب دینے کے بجائے خاموشی کے ساتھ اس نوزائیدہ بچہ کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ تمہیں جواب دے گا۔ مجمع نے حیرت سے دیکھا اور کہا کہ اس بچہ سے ہم کیا پوچھیں جو گہوارے میں لیٹا ہوا ہے۔ مگر یکایک وہ بچہ گویا ہو گیا اور اس نے نہایت صاف اور فصیح زبان میں مجمع کو خطاب کرکے کہا انی عبد اللہ

اٰتنی الکتاب وجعلنی نبیاً میں اللہ کا بندہ ہوں۔ اللہ نے مجھے کتاب دی ہے اور نبی بنایا ہے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے اس شبہ کی جڑ کاٹ دی تھی جو ولادت مسیح کے بارے میں پیدا ہو سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سن شباب کو پہنچنے تک کبھی کسی نے

نہ حضرت مریم پر زنا کا الزام لگایا نہ حضرت عیسیٰ کو ناجائز ولادت کا طعنہ دیا۔ لیکن جب تیس برس کی عمر کو پہنچ کر آپ نے نبوت کے کام کی ابتدا فرمائی اور جب آپ نے یہودیوں کو ان کی بداعمالیوں پر ملامت کرنی شروع کی، ان کے علماء و فقہاء کو ان کی ریاکاری پر ٹوکا، ان کے عوام اور خواص سب کو اس اخلاقی زوال پر متنبہ کیا جس میں وہ مبتلا ہو گئے تھے۔ اور اس پر خطر راستے کی طرف اپنی قوم کو دعوت دی جس میں خدا کے دین کو عملاً قائم کرنے کے لیے ہر قسم کی قربانیاں برداشت کرنی پڑتی تھیں۔ اور ہر محاذ پر شیطانی قوتوں سے لڑائی کا سامنا تھا۔ تو یہ بے باک مجرم صداقت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ناپاک سے ناپاک ہتھیار استعمال کرنے پر اتر آئے۔ اس وقت انہوں نے وہ بات کہی جو تیس سال تک نہ کہی تھی کہ مریم علیہا السلام معاذ اللہ زانیہ تھیں اور عیسیٰ علیہ السلام ولدالزنا۔ حالانکہ یہ ظالم بالیقین جانتے تھے کہ یہ دونوں ماں بیٹے اس گندگی سے بالکل پاک ہیں۔ پس درحقیقت ان کا یہ بہتان کسی شبہ کی بنا پر نہ تھا جو واقعی ان کے دلوں میں موجود ہوتا بلکہ خالص بہتان تھا جو انہوں نے جان بوجھ کر حق کی مخالفت کے لیے گھڑا تھا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے اسے کفر قرار دیا ہے۔ کیونکہ اس الزام سے ان کا اصل مقصد خدا کے دین کا راستہ روکنا تھا نہ کہ ایک بے گناہ عورت پر الزام لگانا۔[1]

قرآن نے حضرت مریم پر یہودیوں کے اس الزام کو بہتان عظیم قرار دے کر حضرت مریم کی

---

[1] تفہیم القرآن

پاکدامنی کا اعلان کیا ہے۔

یہود کا تیسرا جرم یہ بتایا گیا ہے کہ انا قتلنا المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ ہم نے مسیح ابن مریم اللہ کے رسول کو قتل کر دیا۔ یہاں لفظ رسول اللہ کے بارے میں شارحین قرآن کے خیالات مختلف ہیں۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہودیوں نے لفظ رسول اللہ استہزاً کہا ہے مطلب یہ ہے کہ یہود حضرت عیسیٰ کو رسول خدا تو نہیں مانتے تھے یہاں وہ حضرت عیسیٰ کو رسول اللہ بطور تمسخر کہہ رہے ہیں۔ جیسے فرعون نے کہا تھا ان رسولکم الذی ارسل الیکم لمجنون۔ اسی طرح یہود بطور فخر طنزاً کہتے تھے کہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو جو خدا کا رسول ہونے کا دعویٰ کرتے تھے قتل کر دیا۔ اور کچھ کی رائے یہ ہے کہ رسول اللہ کا لفظ یہود کے قول کا جزو نہیں بلکہ ان کے جرم کی سنگینی واضح تر کرنے کے لیے اللہ تعالیٰ نے کہا لیکن زیادہ اچھا یہ ہے کہ یہ یہود ہی کا قول ہے اور ان کی جرأت مجرمانہ اس قدر ترقی کر گئی تھی کہ رسول کو رسول جانتے ہوئے قتل کے اقدام کا اعلان کر رہے ہیں اور فخریہ کہہ رہے ہیں کہ ہم نے اللہ کے رسول کو قتل کیا ہے اور گھوڑے کے واقعہ کا جو ذکر کیا ہے اس پر غور کرنے سے یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ یہودیوں کے لیے مسیح علیہ السلام کی نبوت میں شک کرنے کی کوئی گنجائش باقی نہ تھی۔ پھر جو روشن نشانیاں انہوں نے حضرت عیسیٰ میں مشاہدہ کیں ان کے بعد تو یہ معاملہ بالکل ہی غیر مشتبہ تھا کہ وہ کسی غلط فہمی کی بنا پر نہ تھا بلکہ وہ خوب جانتے تھے کہ ہم اس جرم کا ارتکاب اس شخص کے ساتھ کر رہے ہیں جو اللہ کی طرف سے رسول بن کر آیا ہے۔

آگے بڑھنے سے پہلے یہاں یہ لطیف بات سمجھنے کی اور توجہ کی مستحق ہے کہ اس پوری آیت میں کچھ کاموں اور کچھ باتوں کو یہودیوں پر لعنت کا سبب بتایا ہے۔ کام یہ ہیں نقض میثاق، کفر بآیات اللہ، قتل انبیاء اور باتیں یہ ہیں۔ ان کا کہنا کہ ہمارے دل غلاف میں ہیں۔ ان کا حضرت مریم پر تہمت لگانا اور ان کا یہ کہنا کہ ہم حضرت مسیح عیسیٰ رسول اللہ کو قتل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قتل مسیح ان کے افعال میں سے نہیں بلکہ اقوال میں سے ہے۔ اگر یہود نے فی الواقع حضرت مسیح کو قتل کیا ہوتا تو ان کا یہ فعل قابل لعنت ہوتا اور تعبیر یوں ہوتی و قتلھم المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ تعبیر یہ نہیں ہے بلکہ یہ ہے و قولھم انا قتلنا المسیح یہاں صرف قول کو موجب لعنت قرار دینا اور افعال کی فہرست میں اس کا ذکر نہ کرنا اس بات کی واضح دلیل ہے کہ یہ یہودیوں کا محض افتراء

بہتان ہے۔ ان کا یہ قول ہی ان کی ملزمیت کا سبب ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر فعل قتل صورت فعلیہ میں وہاں فی الواقع موجود ہوتا تو اللہ تعالیٰ فعل کو سبب لعنت قرار دیتا، نہ کہ صرف قول کو۔ اور یہاں یہود کی صرف اس لاف زنی کو سبب لعنت بتا کر اظہار کر دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو حضرت مسیح کی نسبت یہ بات بہت ناپسند ہے کیونکہ یہود کا یہ دعویٰ عیسیٰ ابن مریم کے بارے میں اللہ سبحانہ کے اس کردار کی جو آگے آرہا ہے سو فعہ اللہ اللہ نے اسے اپنی طرف اٹھالیا تکذیب کرتا ہے۔

حضرت مسیح نہ مقتول ہیں نہ مصلوب

۲۲۳۔ حالانکہ انہوں نے نہ حضرت مسیح کو قتل کیا ہے اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ حقیقت حال ان پر مشتبہ ہو گئی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ زبان سے کہتے ہیں کہ ہم نے حضرت مسیح کو قتل کیا حالانکہ انہوں نے نہ ان کو قتل کیا اور نہ سولی پر چڑھایا بلکہ ان کو اشتباہ والتباس ہو گیا۔ اس جگہ اللہ تعالیٰ نے دو لفظ استعمال فرمائے ایک ما قتلوہ جس میں قتل کی نفی فرمائی۔ دوسرے ما صلبوہ جس میں صلیب پر چڑھائے جانے کی نفی فرمائی۔ کیونکہ اگر صرف ما قتلوا کہتے تو یہ احتمال باقی رہ جاتا کہ ممکن ہے قتل نہ کیے گئے ہوں بلکہ صلیب پر چڑھائے گئے ہوں۔ اور ایسے ہی اگر صرف ما صلبوہ فرماتے تو یہ احتمال رہتا کہ ممکن ہے صلیب پر نہ چڑھائے گئے ہوں بلکہ قتل کر دیے گئے ہوں علاوہ ازیں بعض مرتبہ یہود یہ بھی کرتے تھے کہ اول قتل کر دیتے اور پھر صلیب پر چڑھا دیتے اس لیے قتل اور صلب دونوں کو علیحدہ علیحدہ ذکر فرمایا اور پھر ایک حرف نفی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ حرف نفی یعنی لفظ ما کو قتل اور صلب ہر ایک کے ساتھ علیحدہ علیحدہ ذکر فرمایا تاکہ دونوں کی الگ الگ نفی اور ہر ایک کی مستقل تردید ہو جائے اور خوب واضح ہو جائے کہ ہلاکت کی کوئی بھی صورت پیش نہیں آئی نہ مقتول ہوئے نہ مصلوب ہوئے اور نہ مقتول ہو کر صلیب پر چڑھائے گئے۔

ما قتلوہ کہنے کے بعد ما صلبوہ کے اضافہ سے بتانا یہ چاہتے ہیں کہ حضرت کو قتل کر دینا تو الگ رہا یہود تو واقعتہً اتنا بھی نہ کر سکے کہ اس زمانے میں اس ملک میں جو طریقہ سزائے موت کا رائج تھا اسی تک آپ کو پہنچا دیتے۔ یعنی وہ آپ کو سولی پر چڑھا تک نہ سکے۔ صلب کے اصلی معنی جیسا کہ اہل لغت نے تصریح کی ہے سُولی پر چڑھانے کے ہیں۔ اُردو میں یہ مفہوم سُولی دینے سے نہیں سُولی پر چڑھانے سے حاصل ہوتا ہے۔ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالقادر، شاہ

رفیع الدین نے اپنے تراجم میں اس کی خاص رعایت کی ہے۔ شاہ ولی اللہ نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے۔

و نکشتند اورا و بردار نکردند اورا

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں۔

اور اس کو مارا ہے اور نہ سولی پر چڑھایا

اور شاہ رفیع الدین لکھتے ہیں۔

نہیں مارا اس کو اور نہ سولی دی اس کو

مولانا شیخ الہند لکھتے ہیں:

نہیں مارا اس کو اور نہ سولی پر چڑھایا۔

ان تمام ہی قرآن کے تراجم کرنے والے حضرات نے صلیب کے معنے سولی پر چڑھانے کے ہیں موت اس کے لیے لازم نہیں ہے ظاہر یہ ہے کہ قرآن اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھا رہا ہے کہ یہودیوں نے حضرت مسیح کو نہ قتل کیا ہے اور نہ سولی پر چڑھایا ہے۔ ان کا یہ کہنا کہ انا قتلنا المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ محض ان کا زبانی دعویٰ اور قول ہی قول ہے۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ یہود محض اس کہنے کی وجہ سے اللہ کے غضب اور لعنت کا گہوارہ بنے ہیں اگر فی الواقع وہ قتل کر دیتے تو نہ معلوم کس قدر غضب اور لعنت کے مستحق ہو جاتے اور یہ بھی اس آیت سے معلوم ہوا کہ آج بھی جو شخص کہے مسیح عیسیٰ ابن مریم مقتول اور مصلوب ہو چکے ہیں وہ بلاشبہ ملعون اور مغضوب ہے۔

قتل وصلب کی غلط توجیہ

کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس آیت میں مطلق قتل اور صلب کی نفی مراد نہیں بلکہ ذلت اور لعنت کی موت کی نفی مراد ہے لیکن ایسا سوچنا درست نہیں ہے کیونکہ آیت قرآنی میں مطلق قتل اور صلب کی نفی بلا قید کی گئی ہے۔ قید کا اضافہ اپنی جانب سے ہے نہ قرآن حکیم میں اس قید کا نام ونشان ہے اور نہ کسی صحیح اور ضعیف حدیث میں اور نہ کسی صحابی اور تابعی کے اثر اور قول میں اس کا کوئی نشان ہے محض وہم وگمان سے قرآن کے اطلاق کو کیسے مقید کیا جا سکتا ہے۔ اور اگر یہ سوچا جائے کہ یہود اس کے قائل ہیں تو جواب یہ ہے کہ یہود تو ہزار ہا اباطیل کے قائل ہیں تو کیا قرآن حکیم کی

تفسیر کرنا ان کے مزعومات فاسدہ اور خیالات باطلہ کے تابع کیا جاسکتا ہے۔ اور اگر یہ مان بھی لیا جائے تو پھر بھی اس آیت میں یہود کا بھرپور رد ہے اس لیے کہ یہود کا گمان یہ تھا کہ جھوٹا نبی ضرور قتل ہوتا ہے اس کے جواب میں قرآن کہتا ہے کہ حضرت مسیح قتل ہی نہیں کیے گئے اور نہ صلیب پر چڑھائے گئے کیونکہ وہ خدا کے سچے نبی تھے۔

علاوہ ازیں اگر یہود کے اس مزعوم کی رعایت کی جائے تو قتلھم الانبیاء اور یقتلون النبیین کے یہ معنے کیے جائیں گے کہ معاذ اللہ وہ انبیاء ذلت اور لعنت کی موت مرے۔

وہم کا ازالہ

پہلے فقرے کے معنے یہ ہوئے کہ یہود نے مسیح علیہ السلام کو قتل نہیں کیا اور نہ ان کو سولی پر چڑھایا۔ اس انداز بیان کا منطوق یہ اور صرف یہ ہے کہ مقتول اور مصلوب حضرت مسیح نہیں ہیں۔ یعنی قتل کی نفی منقول پر مقصود ہے۔ یہ بتانا مقصود نہیں کہ وہاں قتل کا کوئی واقعہ نہیں ہوا بلکہ یہ بتانا مقصود ہے کہ قتل و صلب کا واقعہ ہوا ہے لیکن مقتول و مصلوب حضرت مسیح علیہ السلام نہیں ہیں۔ یہاں ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر حضرت مسیح مقتول و مصلوب نہیں ہیں تو پھر کون ہے کیونکہ قتل و صلب دونوں حسی امر ہیں ذہنی اور خیالی نہیں ہیں اس لیے کوئی نہ کوئی تو ضرور مقتول و مصلوب ہے۔ اسی ذہنی وہم کا ازالہ کرنے کے لیے ارشاد ہوا ہے ولکن شبہ لھم یعنی مقتول و مصلوب حضرت مسیح نہیں بلکہ کوئی اور تھا۔

شاید یہاں آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ اگر یہی مطلب ہے تو پھر فعل شبہ میں اسناد کس طرف ہے اور اس فعل کا مسندالیہ کون ہے کیونکہ اگر اس کا مسندالیہ حضرت مسیح کو قرار دیا جائے تو مسیح اس صورت میں مشبہ بہ ہوں گے اور یہاں ذکر مشبہ کا ہے۔ اور اگر یہاں کسی اور مقتول و مصلوب کو مسندالیہ بنایا جائے تو اس کا ذکر یہاں نہیں ہے۔

اس کا جواب بالاتفاق جمہور مفسرین وہ ہے جو امام رازی نے مفاتیح الغیب میں دیا ہے کہ شبہ کا مسندالیہ ضمیر ہے اور ضمیر کا مرجع وہ مقتول ہے جو ما قتلوہ کا مدلول ہے اس اعتبار سے مقتول مذکور رہے اور فعل مجہول کی ضمیر کا مرجع ہے۔

اس کے علاوہ انا قتلنا المسیح میں بھی اس مقتول کا ذکر ہے جیسا کہ قاضی بیضاوی کی رائے ہے چنانچہ قاضی صاحب رقمطراز ہیں۔

اس فعل کا مسند الیہ ضمیر ہے اس کا مرجع وہ مقتول ہے جو انا قتلنا کا مدلول ہے ۔
یا یوں کہہ دیجئے جیسا کہ خود قاضی صاحب نے لکھا ہے کہ
شبہ کا مسند الیہ جار مجرور ہے گویا یوں کہا گیا ہے کہ ان کو حضرت عیسٰی اور مقتول
میں مشابہت نظر آئی ۔

پہلی صورت میں معنے یوں ہوں گے کہ مقتول کو حضرت عیسٰی جیسا بنا دیا گیا اور دوسری صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ یہودیوں کے لیے اصل معاملہ مشتبہ بنا دیا گیا۔ پہلے معنی کی رعایت سے حضرت شاہ عبدالقادر اس طرح ترجمہ فرماتے ہیں لیکن وہی صورت بن گئی ان کے آگے ۔ حضرت عبداللہ ابن عباس سے باسناد صحیح منقول ہے کہ جب یہودیوں نے حضرت مسیح کے قتل کا ارادہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے حضرت مسیح علیہ السلام کو مکان کے کسی دریچے سے آسمان پر اٹھا لیا اور انہی میں سے ایک شخص کو حضرت عیسٰی کے مشابہ بنا دیا ۔ یہودیوں نے اُسے حضرت عیسٰی سمجھ کر قتل کر دیا ۔ (ابن کثیر) یہ روایت حدیث کی متعدد کتابوں میں موجود ہے اور اس کے راوی علی شرط البخاری ہیں ۔ جس طرح فرشتوں کا بشکل بشر متمثل ہونا اور موسیٰ علیہ السلام کے عصا کا اژدھا بن جانا قرآن عزیز میں مذکور ہے تو پھر ایک شخص کے عیسٰی علیہ السلام کے مشابہ ہو جانے میں کیا استبعاد ہے ۔ احیاء موتیٰ کا اعجازی کارنامہ القاء شبہ کے معجزہ سے بہت زیادہ بلند ہے ۔ عیسٰی علیہ السلام کے احیاء موتیٰ کے معجزہ کو ماننا اور القاء شبہ کے معجزہ کا انکار بڑا ہی عجیب ہے ۔ اور دوسرے معنے کی رعایت سے مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ صورت حال ان کے لیے مشتبہ ہو گئی ۔ یہ ان یہودیوں کے بارے میں ہے جو اپنے آباؤ اجداد کی تقلید میں کہتے چلے آ رہے تھے کہ حضرت مسیح کو سُولی دے دی گئی ۔ یہ شبہ بعض ذی الشان الیٰ زمانہ مسیح میں یہودیوں کے علماء کو رہے تھے ۔ جب حضرت عیسٰی علیہ السلام ان کے ہاتھوں سے نکل گئے تو انہوں نے کسی غلام کو پکڑ کر پھانسی دے دی اور کسی کو اُسے دیکھنے نہ دیا اور پھر دفن کر دیا اور لوگوں میں یہ مشہور کر دیا کہ حضرت عیسٰی کو پھانسی دے دی گئی اس سے صورت حال مشتبہ ہو گئی ۔ سید انور شاہ کشمیری نے عقیدۃ الاسلام میں حافظ ابن حزم کی الملل والنحل سے یہی بات نقل کی ہے ۔ بہرحال مفسرین کا اس پر اتفاق ہے کہ یہود کو دھوکہ ہوا اور وہ حضرت عیسٰی کے دھوکہ میں کسی اور کو سُولی پہ چڑھا گئے لیکن یہ شخص کون تھا اور دھوکہ کی صورت کیا ہوئی ۔ اس کا تصریحی جواب نہ قرآن عزیز میں ہے اور نہ کسی صحیح حدیث میں ۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ تاریخ کی روشنی میں واقعہ کی جزئیات کو دیکھا جائے ۔

تاریخ کی روشنی میں اشتباہ کی نوعیت

اس موضوع پر مولانا دریا بادی نے مبسوط بحث کی ہے۔ ہم یہاں ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے ان کا بیان پیش کرتے ہیں۔

پہلی بات اس سلسلے میں یاد رکھنے کے قابل یہ ہے کہ حضرت عیسٰی یروشلم کے لوگوں سے بہت کم ملتے جلتے تھے۔ نتیجہ یہ تھا کہ عوام تو عوام خواص بھی آپ کو پوری طرح نہ پہچانتے تھے۔ چنانچہ جب آپ کی گرفتاری کا وقت آیا تو اس کے لیے اکابر یہود اور متعدد سپاہیوں کا ایک پورا گروہ اس ضرورت کے لیے کافی ثابت نہ ہوا۔ بلکہ آپ کی شناخت کے لیے آپ ہی کی مختصر سی پارٹی کے ایک منافق و غدار کو ساتھ لینا پڑا۔ یہ ایک خالص تاریخی حقیقت ہے لیکن امام المفسرین امام رازی اس راز سے بھی واقف ہیں۔ فرماتے ہیں دان الناس ما کانوا یعرفون المسیح الا بالاسم ما کان قلیل المخالطۃ للناس (کبیر) متی اور مرقس دونوں انجیلوں میں ہے کہ گرفتاری کرنے والی پارٹی میں سردار، کاہنوں اور قوم کے بزرگوں کی طرف سے ایک " بھیڑ تلواریں اور لاٹھیاں لیے ہوئے" سپاہیوں کی شامل تھی۔ اس پر بھی گرفتاری اور شناخت کے لیے انہیں یہودا منافق کا سہارا ڈھونڈنا پڑا اور انجیل یوحنا میں ہے کہ جب یہ پلٹن اور پیادے وہاں پہنچے تو " یسوع نے اُن سے پھر پوچھا کہ تم کسے ڈھونڈتے ہو، وہ بولے یسوع ناصری کو۔ یسوع نے جواب دیا، میں تم سے تو کہہ چکا ہوں"۔ (۱۸ : ۳-۸) "حضرت مسیح" کا تعظیمی تخیل تو بہت بعد کی پیداوار ہے۔ معاصر مخالفین و معاندین کی نظر میں تو آپ کی حیثیت صرف یسوع ناصری نامی ایک بدنام و غیر معروف مجرم کی تھی۔ وہ سامنے موجود تھا۔ اور پھر بھی کوئی پہچان نہیں رہا تھا۔ حالانکہ سب آئے تھے۔ اُس کی تلاش میں! دوسری بات یہ خیال رکھنے کی ہے کہ حضرت عیسٰی کو آیا بلحاظ یہود یسوع ناصری کو تبدیل ہیئت میں خاص ملکہ تھا۔ انجیلوں میں حضرت کی اسی قدرت کو بطور معجزہ کے بیان کیا گیا ہے " چھ دن کے بعد یسوع نے پطرس اور یعقوب اور اس کے بھائی یوحنا کو ہمراہ لیا اور انہیں ایک اونچے پہاڑ پر الگ لے گیا اور اُن کے سامنے اُس کی صورت بدل گئی۔ اور اس کا چہرہ سورج کی مانند چمکا" (متی ۱۷ : ۱، ۲) جب وہ دعا مانگ رہا تھا تو ایسا ہوا کہ اُس کے چہرہ کی صورت بدل گئی اور اس کی پوشاک سفید براق ہو گئی۔" (لوقا ۹ : ۲۹) نیز مرقس ۹ : ۲۰) یہ معجزہ تھا یا نہ تھا، یہ ایک الگ بحث ہے۔ بہرحال آپ کو نفس قدرت اس پر حاصل تھی

تیسرے، اس تاریخی حقیقت کا استحضار ذہن میں کر لیا جائے کہ ملک (شام و فلسطین) کی آبادی اُس وقت اسرائیلیوں، یہود کی تھی اور اس برادری کے ایک فرد آپ بھی تھے لیکن ملک پر حکومت رومیوں کی تھی اور اعلیٰ عہدہ دار اور پولیس اور فوج رومیوں پر مشتمل تھی اور یہ رومی نہ صرف مشرک یعنی دین و عقیدہ میں اسرائیلیوں سے علیحدہ تھے۔ بلکہ صورت شکل، وضع و لباس، زبان و معاشرت وغیرہ میں اُن سے ویسے ہی الگ تھے جیسے آج انگریز ہندوستانیوں سے مختلف و ممتاز ہیں اور جس طرح آج ہندوستانیوں کو سب فوجی گورے یکساں اور گوروں کو سارے "کالے" ایک سے معلوم ہیں، بدیسی رومی سپاہیوں اور فوجیوں کی نظر میں سب یہود یہود۔ اور اسرائیلی اسرائیلی بھی ایک ہی تھے۔ چوتھی کڑی اس سلسلہ کی یہ ملائیے کہ جس مقام پر رومی عدالت تھی وہاں سے سرکاری سولی گھر فاصلہ پر تھا۔ اور سُولی یا صلیب جس کی شکل انگریزی چھاپہ کے بڑے حرف (ٹی) T کے مشابہ یا ملتی جلتی ہوتی تھی۔ وہ سولی گھر میں پوری گڑھی ہوئی نہیں ہوتی تھی صرف اس کا سیدھا اور کھڑا ستون زمین میں گڑھا ہوا رہتا تھا۔ باقی جو لکڑی اس کے اوپر آڑی آڑی پڑتی تھی۔ اس کے لیے قاعدہ یہ تھا کہ وہ مجرم کو عدالت سے اپنے اوپر لاد کر سُولی گھر تک لانی پڑتی تھی یہاں تک جو کچھ عرض ہوا اس پر ایک نظر دوبارہ کر کے امور ذیل کو بھی نظر کے سامنے لے آئیے۔ ۱۔ حکم جب سنایا گیا ہے جمعہ کا دن تھا اور دن آخر ہو رہا تھا اور یہود کو جلدی تھی کہ ہر طرح فراغت پا کر شام تک گھر واپس آ جائیں۔ جمعہ کی شام ہی سے اُن کی یوم السبت شروع ہو جاتا تھا اور یوم السبت کے حدود کے اندر مجرم کی سزا دہی وغیرہ ممنوع تھی اور پھر یہود کا اہم تہوار، عید فسح (   ) بھی شروع ہو رہی تھی۔ غرض یہود کو اس کی بہت ہی عجلت تھی کہ کسی طرح اُن کا یہ مجرم سُولی پا کر شام سے قبل ہی دفن ہو جائے۔ ۲۔ لاغر و ناتواں مجرم (یعنی خود حضرت مسیح) کے لیے ممکن نہ تھا کہ اتنی وزنی لکڑی لاد کر اتنا فاصلہ یہود کی خاطر خواہ تیزی سے طے کر سکیں۔ خصوصاً جب کہ یہودی بچے اور شریر قسم کے یہود خود ہی قدم قدم پر انہیں چھیڑتے جاتے (   ) کا ماستہ کھوٹا کرتے جاتے۔ اب ساری صورتِ حال کو اس تفصیل کے ساتھ پیش نظر رکھ کر فرمائیے کہ رومی سپاہی، جو مجرم، بلکہ مجرموں کو (آپ کے ساتھ سُولی کے لیے دو مجرم اور بھی تھے) حراست میں لیے ہوئے تھے اور یہ بھی معلوم ہو چکا ہے کہ وہ رعایا میں سے نہیں بلکہ حاکم قوم کے افراد تھے۔ ایسے موقع پر کیا کرتے؟ خود تو اپنے اوپر وہ سُولی والی لکڑی کا بوجھ لادنے سے رہے۔ انہوں نے وہی کیا جو اُن کی جگہ پر کوئی بھی اُن جیسا انسان کرتا۔ انہوں نے مجمع ہی میں سے کسی بد تمیز

یہودی کو پکڑ لیا اور صلیب کی لکڑی اُس پر لاد دی۔ انگریز گارد ایسے موقع پر یعنی کسی ہندوستانی مجرم کو حراست میں لیے جاتا ہوتا تو کیا کرتا! یہی کرتا کہ بھیڑ میں کسی ہندوستانی ہی کو پکڑ لیتا۔ اور اُس پر لاد دیتا۔ یہ محض قیاس و قرینہ نہیں۔ انجیلوں میں اتنے جزو کی تصریح موجود ہے۔ "انہیں شمعون نام ایک کرینی آدمی ملا۔ اُسے بیگار پکڑا کہ اُس کی صلیب اٹھائے" (متی ۲۷: ۳۲) اور "شمعون نام ایک کرینی آدمی اسکندر روفس کا باپ دیہات سے آتے ہوئے ادھر سے گزرا۔ انہوں نے اُسے بیگار سے پکڑا کہ اُس کی صلیب اٹھائے" (مرقس ۱۵: ۲۱) "اور جب اُس کو لیے جاتے تھے تو انہوں نے ایک شمعون نام کرینی کو پکڑا جو دیہات سے آتا تھا پکڑ کر صلیب اُس پر رکھ دی کہ یسوع کے پیچھے پیچھے چلے" (لوقا ۲۳: ۲۶) جب یہ مجمع (جو یقیناً کوئی باقاعدہ و منظم مجمع نہیں، بلکہ عوام کی ایک بھیڑ تھا۔ اس افراتفری کے ساتھ ایک دوسرے کو ریلتا پیلتا، مجرم سے چھیڑ چھاڑ کرتا، اُس سے تمسخر کرتا ہوا، سُولی گھر کے پھاٹک پر پہنچا تو رومی پولیس گارد جو ساتھ تھا اب اُس کی ڈیوٹی ختم ہوگئی۔ اب یہاں سے جیل کے سنتریوں کا عمل دخل شروع ہوتا ہے۔ وہ کیا جانیں کہ یسوع ناصری کس کا نام ہے۔ وہ اپنے حسب دستور مجرم اُسی کو سمجھے جس کے اوپر صلیب لادی ہوئی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اس حقیقت کو مستحضر کر لیجیے کہ جیل کے رومی سپاہیوں کے لیے سب یہودی اجنبی ہی تھے اور اس لیے باہم دگر ہمشکل اور یکساں۔ انہیں ایک اسرائیلی (یسوع ناصری) اور دوسرے اسرائیلی (شمعون کرینی) کے درمیان اشتباہ نہایت آسان تھا۔ انہیں دونوں کے درمیان کوئی نمایاں فرق ہی نظر آسکتا تھا۔ شمعون نے یقیناً واویلا مچایا ہوگا۔ لیکن ادھر مجمع کا شور و ہنگامہ، ادھر جیل کے سپاہیوں کی اسرائیلیوں کی زبان سے ناواقفیت، اور پھر سُولی پر لٹکا دینے کی جلدی، اسی افراتفری کے عالم میں اُسی شمعون کو پکڑ کر سُولی پر چڑھا دیا گیا اور وہ چیختا چلاتا رہا۔ حضرت مسیح قدرتاً اس ہڑبونگ میں دشمنوں کے ہاتھ سے رہا ہوگئے اور دشمن دھوکے میں پڑے ہوئے ہاتھ ملتے رہ گئے وَلٰکِن شُبِّہَ لَہُم یہ عقیدہ نو ایجاد نہیں خود مسیحیوں ہی کا ایک قدیم ترین فرقہ باسلیدیہ کے نام سے گزرا ہے (بانی فرقہ کا سال وفات [illegible]) وہ اسی عقیدہ کا قائل تھا اور کھلم کھلا کہتا کہ مصلوب حضرت مسیح نہیں ہوئے بلکہ شمعون کرینی ہوا ہے۔ قرآن مجید نے اسی عقیدہ کی تصویب کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔

چند شبہات اور ان کا ازالہ

قرآن نے حضرت مسیح کے مصلوب ہونے اور مقتول ہونے کی جس زور سے تردید کی ہے، وہ

کچھ لوگوں کے لیے حیران کن ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ

دنیا کی دو کثیر التعداد قومیں یہود و نصاریٰ تواتر قومی کے طور پر اس پر متفق ہیں کہ حضرت مسیح مصلوب ہوئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت مسیح کی مصلوبیت کا مسئلہ متواتر ہونے کی وجہ سے قطعی ہے۔ یہ غلط ہے کہ اس مسئلہ کی پشت پر تواتر کی طاقت ہے اور یہ بھی بدیہی طور پر واقعہ کے خلاف ہے کہ یہ مسئلہ نصاریٰ میں اتفاقی ہے۔

دراصل یہ بات کہ حضرت مسیح کی مصلوبیت تواتر سے ثابت ہے صرف وہی لوگ کہتے ہیں جن کو تواتر کی حقیقت کا علم نہیں ہے۔ بے سروپا خبروں اور افواہوں کا نام تواتر نہیں ہے۔ بلاشبہ جو کام یا بات بہر حالت تواتر کے ساتھ ہم تک پہنچے وہ یقینی ہے اور عقل بھی یہ فیصلہ کرتی ہے کہ اسے ثابت شدہ حقیقت تسلیم کرنا چاہیے کیونکہ تواتر کا مفید یقین ہونا مسلمات میں سے ہے لیکن یہ بات کہ تواتر کسے کہتے ہیں ذرا سمجھنے کی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں۔

خبر کے متواتر ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں چار شرطیں ہوں، اول یہ کہ بیان کرنے والوں کی اتنی بڑی تعداد ہو کہ عادۃً جن کا جھوٹ پر ایکا محال ہو۔ دوم یہ کہ از ابتدا تا انتہا سلسلہ روایت میں ہم آہنگی اور یکسانی ہو۔ سوم یہ کہ آخر میں علمی سہارا کوئی علم و فکر اور منظریہ نہ ہو بلکہ محسوس و مرئی اور مشاہدہ ہو، چہارم یہ کہ سننے والوں کو یہ خبر علمی قاطعیت رہی ہو۔

اور علامہ سخاوی فتح المغیث میں رقمطراز ہیں :

یہ سب باتیں اس وقت قابلِ پذیرائی ہیں جب خبر کا آخری مرکز محسوس ہو۔ اگر مشاہدہ سے متعلق ہے تو مشاہدہ ہو اور اگر سماع سے متعلق ہے تو سماع ہو۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ تواتر کے لیے ضروری ہے کہ بیان کرنے والوں کی اتنی تعداد ہو کہ جن کا جھوٹ پر اتفاق ناممکن ہو۔ اور پھر جو کچھ کہہ رہے ہیں اس کا اپنے حواس سے ادراک کر رہے ہوں اور ان میں باہم کہیں اختلاف نہ ہو۔ اب آپ ہی خدا لگتی فرمائیے کہ صلب مسیح کے موضوع پر اس قسم کا تواتر کہاں موجود ہے۔ اس موضوع پر ہماری تاریخی معلومات کا سب سے بڑا سہارا اناجیل ہیں یا پھر کچھ رسائل ہیں۔ نہ اناجیل کے مولفین میں عدد تواتر ہے اور نہ اناجیل کی روایتیں کسی مشاہدہ کرنے والے کا کوئی بیان ہے۔ واقعہ صلب کی روایت کا اناجیل میں مرکز چند عورتیں ہیں۔ راویوں میں عدد تواتر مفقود ہے اور جو بھی بیان کرنے والے ہیں ان میں واقعہ کا چشم دید

گواہ کوئی نہیں ہے اور تواتر کہتے ہیں یا افواہ ہے اس کی قانونی حیثیت کچھ بھی نہیں۔
باقی یہ رہا یہ مسئلہ کہ یہ نصاریٰ میں متفق علیہ ہے۔ یہ بھی تحقیق کی روشنی میں غلط ہے چنانچہ جارج سیل صاحب قرآن عزیز کے ترجمہ انگریزی میں بذیل آیت و مکروا و مکر اللہ لکھتے ہیں:

> یہود کے خلاف اللہ کا مکر یہ تھا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر اٹھالیا اور آپ کی شباہت ایک اور شخص پر ڈال دی جو آپ کی جگہ گرفتار ہو کر سولی دیا گیا۔ یہ مسلمانوں کا متواتر مسئلہ ہے۔ بعض عیسائی یہ گمان کرتے ہیں کہ یہ قصہ القاء شباہت کا معاذ اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی اختراع ہے مگر وہ لوگ یقیناً غلطی پر ہیں کیونکہ پیغمبر کے زمانے سے بہت مدت پہلے عیسائیوں کے بہت سے فرقوں کا یہی اعتقاد تھا۔ چنانچہ فرقہ بے سی لی ڈین جو عیسائیت کے نہایت شروع میں تھا۔ مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے سے انکار کرتا تھا اور ان کا اعتقاد یہ تھا کہ سائیمن آپ کی جگہ سولی پر لٹکایا گیا، ایسے ہی فرقہ سرنتھس جو ان سے بھی پیشتر تھا اور کارپاکرشن جو مسیح علیہ السلام کو صرف انسان ہی مانتے ہیں، ان کا بھی یہی اعتقاد تھا کہ مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے بلکہ آپ کے حواریوں میں سے ایک شخص کو جو آپ کا ہم شکل تھا صلیب دیا گیا۔ مصنف فوٹین کہتا ہے کہ میں نے ایک کتاب بنام رسولوں کے سفرنامے، پڑھی جس میں پطرس، یوحنا، اندریاس، طاس اور پولوس کے اعمال مندرج تھے اور من جملہ دیگر امور کے ایک امر یہ بھی تھا کہ مسیح علیہ السلام مصلوب نہیں ہوئے بلکہ آپ کی جگہ کوئی اور شخص صلیب دیا گیا تھا۔

ایک اور خلش

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ ممکن ہے کچھ عیسائی فرقے حضرت عیسیٰ کے مصلوب نہ ہونے کا عقیدہ رکھتے ہوں لیکن اناجیل اور عہد جدید کے رسائل کی تصریحات تو مسئلہ صلب مسیح کی مؤید اور مثبت ہیں جب ان کتابوں میں مسئلہ کی تصریح اور پھر ان میں غلطی نہ ہونا دونوں مسلم ہیں تو پھر صلب مسیح کے عقیدے کو ماننا ضروری ہے۔
جواب یہ ہے کہ اولاً ان کتابوں کے غلطی سے محفوظ ہونے اور ان کے مصنفین کی عصمت کی کوئی دلیل

نہیں ہے۔ ثانیاً یہ کتاب جن مصنفین کی طرف منسوب ہیں ان کی طرف ان کی نسبت بھی تواتر سے ثابت نہیں ہے۔ ثالثاً ان اناجیل کی تصریحات دوسری اناجیل سے معارض ہیں جیسے انجیل برناباس اور وجہ ترجیح کوئی موجود نہیں ہے۔ رابعاً یہ اناجیل خود اس مسئلہ میں باہم متعارض ہیں۔ خامساً ان اناجیل کی تصریحات قرآن سے معارض ہیں اور قرآن کی تاریخی حیثیت تواتر سے ثابت ہے۔

بلاشبہ حضرت مسیح کو سُولی دینے کا قصہ موجودہ چاروں انجیلوں میں موجود ہے لیکن قرآن کریم نے اس کی بڑی سختی سے تردید کی ہے کہ درحقیقت یہ غلط فہمی ہے۔ ورنہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ آسمان پر اٹھا لیے گئے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ انسانی معلومات کی ترقی کے ساتھ قرآن حکیم کی صداقت خود بخود واضح ہوتی جارہی ہے۔ چند سو سال پہلے انجیل برناباس کا نسخہ دریافت ہوا تھا۔ اس میں نہایت صراحت اور وضاحت کے ساتھ یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ حضرت عیسیٰ کو سُولی نہیں دی گئی تھی بلکہ ان کی جگہ یہوداہ اسکریوتی مصلوب ہوا تھا۔ لیجئے آپ بھی پڑھ لیجئے:

۲۱۴۔ گھر سے نکل کر یسوع نماز پڑھنے باغ میں گیا اپنے نماز پڑھنے کے معمول کے موافق، سو بار گھٹنے جھکاتے اور سجدے میں گرا۔ چنانچہ یہوداہ وہ مقام جہاں یسوع اپنے شاگردوں کے ساتھ تھا۔ جانتا تھا۔ سو وہ سردار کاہن کے پاس گیا اور بولا اگر تم مجھے دو جس کا وعدہ تھا تو آج رات میں یسوع کو، جس کی تلاش میں تم ہو تمہارے ہاتھ میں دے دوں گا کیونکہ وہ گیارہ ساتھیوں کے ساتھ اکیلا ہے۔ سردار کاہن نے کہا کہ تو کیا مانگتا ہے۔ یہوداہ نے کہا تیس سکے سونے کے تب سردار نے فی الفور اسے رقم گن دی۔ اور ایک فریسی حاکم کے پاس اور ہیرودیس کے پاس سپاہی لانے بھیجا اور انہوں نے ایک دستہ ساتھ کر دیا۔ کیونکہ وہ لوگوں سے ڈرتے تھے، سو انہوں نے اپنے ہتھیار لیے اور ڈنڈوں پر مشعلیں اور قندیلیں لیے یروشلم سے نکلے۔

۲۱۵۔ جب یہوداہ کے ساتھ سپاہی اس مقام کے قریب پہنچے جہاں یسوع تھا تو یسوع نے بہت سے لوگوں کی آمد سنی سو وہ خوف سے گھر کے اندر چلا گیا اور وہ گیارہ سو رہے تھے تب خدا نے اپنے خادم کا خطرہ دیکھ کر اپنے کارگزاروں جبریل، میکائیل، رفائیل اور اوریائیل کو حکم دیا کہ یسوع کو دُنیا سے نکال لائے۔ مقدس فرشتے آئے اور اس کھڑکی میں سے جو دکھن کی طرف کھلتی ہے یسوع کو نکال لے گئے۔ انہوں نے اسے تیسرے آسمان پر لا بٹھایا۔ ان فرشتوں کی صحبت میں جو ابد تک خدا کی حمد بیان کرتے ہیں۔

۲۱۹ یہوداہ جھپٹ کر سپاہیوں سے پہلے اس حجرے میں داخل ہوا جہاں سے یسوع
اٹھا لیا گیا تھا۔ اور شاگرد سو رہے تھے اس پر حیرت انگیز خدا نے حیرت انگیز کام کیا۔
وہ یہ کہ یہوداہ بدل کر بول چال اور چہرے میں ایسا یسوع کی مانند ہو گیا کہ ہم نے یسوع
ہی سمجھا اور وہ ہمیں جگا کر دریافت کرنے لگا کہ استاد کہاں ہے اس پر ہم نے تعجب
کیا اور جواب دیا کہ آقا تو ہی تو ہمارا اُستاد ہے کیا تو اب ہمیں بھول گیا اور وہ مسکرا
کر بولا ، بھلا تم احمق ہو کہ مجھے یہوداہ اسکریوتی نہیں سمجھتے اور وہ یہ کہہ ہی رہا تھا
کہ سپاہ داخل ہوئی اور یہوداہ پر ہاتھ ڈال دیا کیونکہ وہ ہر طرح یسوع جیسا تھا۔ ہم
یہوداہ کی باتیں سن کر اور سپاہیوں کا انبوہ دیکھ کر گویا دیوانہ ہو کر بھاگ کھڑے ہوئے۔
اور یوحنا جو ایک مہین چادر لپیٹے ہوئے تھا جاگ کر بھاگا۔ اور جب ایک سپاہی
نے اسے چادر سے پکڑا تو وہ چادر چھوڑ کر ننگا بھاگ کھڑا ہوا۔ کیونکہ خدا نے یسوع کی
دعا سن لی اور گیارہوں کو آفت سے بچا لیا۔

یہ انجیل برناباس کا اقتباس ہے۔ اس انجیل کی روایتی اور تاریخی حیثیت پر تو ہم آئندہ بحث کریں گے لیکن حال ہی میں انجیل کا ایک اور نسخہ دریافت ہوا ہے جو پطرس حواری کی طرف منسوب ہے اس میں بالکل صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ حضرت مسیح کو سُولی دینے سے کچھ پہلے آسمان پر اُٹھا لیا گیا تھا۔ انجیل پطرس کا یہ جملہ علیم اسٹرسیر نے اپنی مشہور کتاب اناجیل اربعہ صلا میں نقل کیا ہے۔

قرآن میں صلیب مسیح کی اہمیت

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قرآن عزیز نے صلیب مسیح کو اس قدر اہمیت کیوں دی ہے وجہ اس کی یہ ہے کہ عیسائی دُنیا نے اسے اپنے دین کی اساس اور عقائد میں اصل کی حیثیت سے پیش کیا ہے ان کے خیال میں اس کو مان کر آدمی نجات پا سکتا ہے اور اس کا انکار کر کے ہلاک ہو جاتا ہے۔

اس عقیدے کے لیے افسانہ یہ بنایا گیا ہے کہ حضرت مسیح کو یہودیوں نے پیلاطس حاکم کے دربار میں پیش کر کے عرض کیا ، عالی جاہ ، یہ شخص نہ صرف ہمارے لیے بلکہ حکومت کے لیے خطرہ بنتا جا رہا ہے مگر فوراً اس کا استیصال نہ کیا گیا تو ہمارا دین ہی صحیح حالت میں نہ رہ سکے گا بلکہ اندیشہ ہے کہ کہیں آپ کے ہاتھ سے حکومت کا اقتدار بھی نہ چلا جائے اس لیے اس شخص نے بڑے عجیب و غریب شعبدے دکھا کر لوگوں کو اپنا گرویدہ بنا لیا ہے اور ہر وقت اس گھات میں ہے کہ عوامی طاقت سے قیصر اور آپ کو

شکست دے کر خود بنی اسرائیل کا بادشاہ بن جائے۔ اس شخص نے لوگوں کو صرف دنیوی راہ سے ہی گمراہ نہیں کیا بلکہ اس نے ہمارے دین تک کو بھی بدل ڈالا اور لوگوں کو بددین بنانے میں لگا ہے لہٰذا اس فتنہ کی سرکوبی ضروری ہے۔ غرض کافی گفت و شنید کے بعد پیلاطس نے ان کو اجازت دے دی کہ وہ حضرت مسیح علیہ السلام کو گرفتار کر لیں اور شاہی دربار میں مجرم کی حیثیت سے پیش کریں۔ بنی اسرائیل کے سردار، فقیہ اور کاہن یہ فرمان حاصل کر کے بیحد مسرور ہوتے اور فخر و مباہات کے ساتھ ایک دوسرے کو مبارکباد دینے لگے کہ آخر ہماری سازش کارگر ہوئی اور کہنے لگے کہ اب ضرورت اس امر کی ہے کہ خاص موقعہ کا انتظار کریں اور کسی خلوت اور تنہائی کے موقعہ پر اس طرح اس کو گرفتار کیا جائے کہ عوام میں ہیجان نہ ہونے پاتے۔

انجیل یوحنا میں اس واقعہ سے متعلق کہا گیا ہے کہ

> بس سردار کاہنوں اور فریسیوں نے صدر عدالت کے لوگوں کو جمع کر کے کہا ہم کرتے کیا ہیں؟ یہ آدمی تو بہت معجزے دکھاتا ہے، اگر ہم اسے یوں ہی چھوڑ دیں تو سب اس پر ایمان لے آئیں گے اور رومی آ کر ہماری جگہ اور قوم دونوں پر قبضہ کر لیں گے اور ان میں سے کائفا نام ایک شخص نے جو اس سال سردار کاہن تھا۔ ان سے کہا تم نہیں جانتے اور نہ سوچتے ہو کہ تمہارے لیے یہی بہتر ہے کہ ایک آدمی اُمت کے واسطے نہ کہ ساری قوم ہلاک ہو۔
>
> (انجیل یوحنا باب ۱۱ آیت ۴۷ تا ۵۱)

یہ اس منصوبے کا تذکرہ ہے جو بادشاہ کے پاس جانے سے پہلے آپس میں ہوا اور یہ خطرہ ظاہر کیا گیا کہ اگر اس ہستی کو یونہی چھوڑ دیا گیا تو بادشاہ وقت قیصر کہیں سلطنت کے لیے خطرہ سمجھ کر رہی سہی برائے نام حکومتِ یہود کا بھی خاتمہ نہ کر دے۔

حضرت عیسیٰ اور ان کی دعوت کے بارے میں جو حالات قرآن نے پیش کیے ہیں ان میں اور انجیل میں بیان کردہ دعوتی حالات میں اصولاً کوئی اختلاف نہیں ہے لیکن اس کے بعد کے پورے حالات کے بیان میں قرآن اور انجیل دونوں کی راہیں متضاد سمتوں میں اور الگ الگ ہیں اور اس درجہ تضاد ہے کہ کسی طرح بھی مفاہمت ممکن نہیں ہے۔ ہاں یہود و نصاریٰ میں یہ نقطہ اشتراکی ہے کہ حضرت مسیح کو سُولی دی گئی۔ فرق صرف یہ ہے کہ یہود اس کو اپنا کارنامہ سمجھتے ہیں اور عیسائی اس کو یہود کا ایک قابل نفریں عمل سمجھتے ہیں۔ یہود کا دعویٰ یہ تھا کہ ہم نے حضرت مسیح کو قتل کیا ہے نصاریٰ نے یہود کے اس دعویٰ کو مان لیا ہے۔ دونوں کا بیان یہ ہے کہ یہود کے سرداروں اور کاہنوں کو یہ اطلاع

کہ اس وقت عیسیٰ علیہ السلام لوگوں کی بھیڑ سے الگ اپنے شاگردوں کے ساتھ ایک بند مکان میں موجود ہیں۔ یہ بہترین موقعہ ہے اس کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ فوراً ہی یہ لوگ موقعہ پر پہنچ گئے اور چاروں طرف سے مکان کا محاصرہ کر لیا۔ یسوع علیہ السلام کو گرفتار کر لیا اور توہین و تذلیل کرتے ہوئے پیلاطس کے دربار میں لے گئے تاکہ وہ ان کو سولی پر لٹکائے۔ اگرچہ پیلاطس نے عیسیٰ علیہ السلام کو بے قصور سمجھ کر چھوڑ دینا چاہا مگر بنی اسرائیل کے اشتعال پر مجبوراً سپاہیوں کے حوالے کر دیا۔ سپاہیوں نے ان کو کانٹوں کا تاج پہنایا، منہ پر تھوکا، کوڑے لگائے اور ہر طرح کی توہین و تذلیل کرنے کے بعد مجرموں کی طرح سولی پر لٹکا دیا۔ اور دونوں ہاتھوں میں میخیں ٹھونک دیں، سینہ کو برچھی کی انی سے چھید دیا۔ اور اس کس مپرسی کی حالت میں انہوں نے یہ کہتے ہوئے جان دے دی۔ ایلی ایلی لما سبقتنی ؟ انجیل متی میں اس واقعہ کی تفصیلات کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

> سردار کاہن نے اس سے کہا میں تجھے زندہ خدا کی قسم دیتا ہوں کہ اگر تو خدا کا بیٹا مسیح ہے تو ہم سے کہہ دے یسوع نے اس سے کہا۔ تو نے خود کہہ دیا بلکہ میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو قادر مطلق کی داہنی طرف بیٹھے اور آسمان کے بادلوں پر آتا دیکھو گے۔ اس پر سردار کاہن نے یہ کہہ کر اپنے کپڑے پھاڑے کہ اس نے کفر کیا ہے۔ اب ہمیں گواہوں کی کیا حاجت رہی۔ دیکھو تم نے ابھی یہ کفر سنا ہے تمہاری کیا رائے ہے۔ انہوں نے جواب میں کہا کہ وہ قتل کے لائق ہے اس پر انہوں نے اس کے منہ پر تھوکا اور اس کے مکے مارے اور بعض نے طمانچے مار کے کہا اے مسیح ہمیں نبوت سے بتا کہ کس نے تجھے مارا۔۔۔ جب صبح ہوئی تو سب سردار کاہنوں اور قوم کے بزرگوں نے یسوع کے خلاف مشورہ کیا کہ اسے مار ڈالیں اور اسے باندھ کر لے گئے اور پیلاطس حاکم کے سپرد کیا ۔۔۔ اور حاکم کا دستور تھا کہ عید پر لوگوں کی خاطر ایک قیدی جسے وہ چاہتے تھے چھوڑ دیتا تھا اس وقت برابا نام ان کا ایک مشہور قیدی تھا پس جب وہ اکٹھے ہوئے تو پیلاطس نے ان سے کہا تم کسے چاہتے ہو کہ میں تمہاری خاطر چھوڑ دوں برابا کو یا یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے۔۔۔۔ وہ بولے برابا کو پیلاطس نے ان سے کہا پھر یسوع کو جو مسیح کہلاتا ہے کیا کروں؟ سب نے کہا کہ اس کو صلیب دی جائے اس نے کہا کہ کیوں؟ اس نے کیا برائی کی ہے مگر وہ اور بھی چلا چلا کر بولے کہ اس کو صلیب دی جائے۔ جب پیلاطس نے دیکھا کہ کچھ بن نہیں پڑتا الٹا بلوہ

ہوتا جاتا ہے تو پانی لے کر لوگوں کے روبرو اپنے ہاتھ دھوئے اور کہا میں اس راستباز کے خون سے بری ہوں۔ تم جانو۔ سب لوگوں نے جواب دے کر کہا کہ اس کا خون ہماری اور ہماری اولاد کی گردن پر۔ اس پر اس نے برابا کو ان کی خاطر چھوڑ دیا اور یسوع کو کوڑے لگوا کر حوالے کیا تاکہ صلیب دی جائے۔ اس پر حاکم کے سپاہیوں نے یسوع کو قلعہ میں لے جا کر ساری پلٹن اس کے گرد جمع کی اور اس کے کپڑے اتار کر اسے قرمزی چوغہ پہنایا اور کانٹوں کا تاج بنا کر اس کے سر پر رکھا اور ایک سرکنڈا اس کے دہنے ہاتھ میں دیا اور اس کے آگے گھٹنے ٹیک کر اسے ٹھٹھوں میں اڑانے لگے کہ اے یہودیوں کے بادشاہ آداب اور اس پر تھوکا۔ اور وہی سرکنڈا لے کر اس کے سر پر مارنے لگے اور جب اس کا ٹھٹھا کر چکے تو چوغے کو اس پر سے اتار کر پھر اسی کے کپڑے اسے پہنائے اور صلیب دینے کو لے گئے۔ اس وقت اس کے ساتھ دو ڈاکو صلیب پر چڑھائے گئے۔ ایک دہنے اور ایک بائیں اور راہ چلنے والے سر ہلا ہلا کر اس کو لعن طعن کرتے اور کہتے تھے۔ اے مقدس کے ڈھانے والے اور تین دن میں بنانے والے اپنے تئیں بچا اگر تو خدا کا بیٹا ہے تو صلیب پر سے اتر آ۔ اسی طرح سردار کاہن بھی فقیہوں اور بزرگوں کے ساتھ مل کر ٹھٹھے کے ساتھ کہتے تھے۔ اس نے اوروں کو بچایا لیکن اپنے تئیں بچا نہیں سکتا۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور دوپہر سے لے کر تیسرے پہر تک تمام ملک میں اندھیرا چھا گیا اور تیسرے پہر کے قریب یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا ایلی ایلی لما سبقتنی اے میرے خدا اے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا، جو وہاں کھڑے تھے ان میں سے بعض نے سن کر کہا کہ یہ ایلیا کو پکارتا ہے۔ یسوع پھر بڑی آواز سے چلّایا اور جان دے دی۔ (انجیل متی باب ۲۶)

تفصیلات میں کم و بیش فرق کے ساتھ یہی مفروضہ داستان باقی تینوں انجیلوں میں بھی مذکور ہے۔ چاروں انجیلوں کی اس متفقہ مگر مفروضہ داستان کے مطالعہ کرنے کے بعد ہر شخص یہ سوچنے پر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام کی موت انتہائی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں دردناک طریقہ سے ہوئی۔ واقعہ کا یہی انداز اس کے مفروضہ اور گھڑے ہوئے ہونے کی دلیل ہے۔ اور پھر واقعہ کا یہ پہلو بھی کم حیرت انگیز نہیں ہے کہ بقول انجیل کے یسوع مسیح نے اس حادثہ سے قبل تین مرتبہ خدا تعالیٰ سے یہ درخواست کی، اے میرے باپ اگر ہو سکے تو یہ موت کا پیالہ مجھ سے ٹل جائے اور جب یہ درخواست کسی طرح قبول نہیں ہوئی تو آخر مایوس ہو کر یہ کہنا پڑا اگر یہ میرے پیئے بغیر ٹل نہیں سکتا تو تیری مرضی

پوری ہو۔

حیرت اس بات پر ہے کہ جب عقیدہ کفارہ کے مطابق حضرت مسیح کا یہ معاملہ خدا اور اس کے بیٹے کے درمیان طے شدہ تھا تو پھر اس درخواست کے کیا معنے۔ اور اگر لوازم بشریت کی بنا پر تھا تو خدا کی مرضی معلوم ہو جانے اور اس پر قناعت کر لینے کے بعد پھر یہ بے خبر اور مایوس انسانوں کی طرح جان دینے کا کیا سبب؟

یہود کی گھڑی ہوئی اس داستان کو چونکہ نصاریٰ نے قبول کر لیا تو یہود ازراہ فخر و غرور اس پر شاداں تھے اور کہتے تھے کہ مسیح ناصری اگر مسیح موعود ہوتا تو خدا تعالیٰ اس بے بسی اور بے کسی کے ساتھ اس کو ہمارے ہاتھ میں نہ دیتا کہ وہ مرتے وقت تک خدا سے شکوہ کرتا رہا اور اس کو بچانے مگر خدا نے اس کی کوئی مدد نہ کی۔

واقعہ یہ ہے کہ عیسائیوں کے پاس اس الزام کا کوئی جواب نہیں ہے اور واقعہ کی تفصیلات کو مان لینے کے بعد عقیدہ کفارہ کی کوئی قیمت نہیں رہ جاتی ہے اس لیے عیسائیوں نے واقعہ کی ان تفصیلات کے بعد یہ اضافہ اور کیا۔ یوحنا کی انجیل میں ہے:

> لیکن جب انہوں نے یسوع کے پاس آکر دیکھا کہ وہ مر چکا ہے تو اس کی ٹانگیں نہ توڑیں مگر ان میں سے ایک سپاہی نے بھالے سے اس کی پسلی چھیدی اور فی الفور اس سے خون اور پانی بہ نکلا ۔ ۔ ۔ ان باتوں کے بعد ارمتیہ کے رہنے والے یوسف نے جو یسوع کا شاگرد تھا یہودیوں کے خوف سے خفیہ طور پر پیلاطس سے اجازت چاہی کہ یسوع کی لاش لے جائے۔ پیلاطس نے اجازت دے دی۔ پس وہ آکر اس کی لاش لے گیا اور نیکدیمس بھی آیا جو پہلے یسوع کے پاس رات کو گیا تھا اور پچاس سیر کے قریب مر اور عود ملا ہوا لایا پس انہوں نے یسوع کی لاش لے کر اسے سوتی کپڑے میں خوشبودار چیزوں کے ساتھ کفنایا جس طرح کہ یہودیوں میں دفن کرنے کا دستور ہے اور جس جگہ اسے صلیب دی گئی وہاں ایک باغ تھا اور اس باغ میں ایک نئی قبر تھی جس میں کبھی کوئی نہ رکھا گیا تھا۔ پس انہوں نے یہودیوں کی تیاری کے دن کے باعث یسوع کو وہیں رکھا۔ ہفتہ کے پہلے دن مریم مگدلینی ایسے تڑکے کہ ابھی اندھیرا ہی تھا قبر پر آئی اور پتھر کو قبر سے ہٹا ہوا دیکھا۔ بس وہ شمعون پطرس اور اس کے دوسرے شاگرد کے پاس جسے یسوع عزیز رکھتا تھا دوڑی ہوئی گئی اور ان سے کہا کہ خداوند

کو قبر سے نکال لے گئے اور ہمیں معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھ دیا ... لیکن مریم باہر قبر کے پاس کھڑی روتی رہی۔ اور جب روتے روتے قبر کی طرف جھک کر اندر نظر کی تو دو فرشتوں کو سپید پوشاک پہنے ہوئے ایک کو سرہانے اور دوسرے کو پائنتی بیٹھے دیکھا۔ جہاں یسوع کی لاش پڑی تھی۔ انہوں نے اس سے کہا اے عورت تو کیوں روتی ہے؟ اس نے ان سے کہا اس لیے کہ میرے خداوند کو اٹھا کر لے گئے اور معلوم نہیں کہ اسے کہاں رکھا یہ کہہ کر وہ پیچھے مڑی اور یسوع کو کھڑے دیکھا اور نہ پہچانا کہ یہ یسوع ہے۔ یسوع نے اس سے کہا۔ مجھے نہ چھو کیونکہ میں اب تک باپ کے پاس اوپر نہیں گیا لیکن میرے بھائیوں کے پاس ان سے جا کر کہو کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ کے اور اپنے خدا اور تمہارے کے پاس اوپر جاتا ہوں۔ مریم مگدلینی نے آکر شاگردوں کو خبر دی کہ میں نے خداوند کو دیکھا اور اس نے مجھ سے یہ باتیں کہیں۔ (انجیل یوحنا)

ہر ایک شخص معمولی غور و فکر کے بعد آسانی سے یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ یہ پارۂ بیان پہلے حصۂ بیان کے ساتھ غیر مربوط اور قطعاً بے جوڑ ہے بلکہ سچ یہ ہے کہ یہ اندازہ لگانا ہی مشکل ہے کہ یہ دونوں تفصیلات ایک ہی شخصیت سے وابستہ ہیں کیونکہ پہلا پارۂ بیان ایک ایسی شخصیت کا مرقع ہے جو بے کس اور بے بس اور مایوس خدا سے شاکی نظر آتی ہے اور دوسرا حصۂ بیان ایسی ہستی کا چہرہ پیش کرتا ہے جو خدائی صفات سے موصوف، ذات باری کی مقرب اور پیش آمدہ واقعات سے مطمئن اور خوش ہے بلکہ ان کے وقوع کی متمنی اور ان کو اپنے ادائے فرض کا اہم جز سمجھتی ہے۔

بہر حال چونکہ حقیقت دوسری تھی اور ایک عرصہ دراز کے بعد عقیدۂ کفارہ کی بدعت نے عیسائیوں کو حقیقت کے خلاف اس افسانہ کے گھڑنے پر مجبور کر دیا اس لیے قرآن حکیم نے یہاں حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے متعلق دوسرے گوشوں کی طرح اس گوشہ سے بھی جہالت و تاریکی کا پردہ ہٹا کر حقیقتِ حال کے رُخِ روشن کو جلوہ آرا کرنا ضروری سمجھا اور اس نے اپنا وہ فرض انجام دیا جس کو مذاہب عالم کی تاریخ میں قرآن کی دعوت تجدید و اصلاح کہا جاتا ہے۔

حضرت مسیح کے بارے میں اختلاف

۲۳۴ اور بلاشبہ جن لوگوں نے اس بارے میں اختلاف کیا ہے وہ شک و شبہ میں پڑے ہوئے ہیں۔ ظن و گمان کے سوا ان کے پاس علم و بصیرت نہیں ہے۔ اختلاف کرنے والے کون ہیں یہودی

اور عیسائی یا صرف عیسائی۔ یہ تو آیت قرآنی میں فیہ کی تعبیر بتا رہی ہے کہ اختلاف کا موضوع حضرت عیسیٰ کی ذات گرامی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں جس اختلاف کا ذکر ہے اس کا تعلق حضرت عیسیٰ کی تشریف آوری سے ہے یا روانگی سے ہے۔ اگر اختلاف کا تعلق حضرت عیسیٰ کی تشریف آوری سے ہے تو بلاشبہ اس موضوع پر یہودیوں اور عیسائیوں کا اختلاف ایک واضح اور کھلی بات ہے۔ آپ کی پیدائش کا معاملہ یہودیوں اور عیسائیوں میں بالکل متضاد سمتوں کا انتہائی گوشہ بن گیا تھا۔ یہودی ان کی پیدائش کو ناجائز تعلق کا نتیجہ قرار دیتے تھے برخلاف اس کے عیسائی نہ صرف جائز بلکہ ایک ربانی معجزہ تصور کرتے تھے۔ قرآن نے ثالث کی حیثیت سے دونوں میں فیصلہ کر دیا اس نے حضرت مریم کی پاکی کا اعلان کیا۔ یہودیوں کے الزام کو بہتان عظیم قرار دیا اور پیدائش مسیح کی سرگزشت ٹھیک اسی طرح بیان کر دی جس طرح انجیل میں موجود ہے۔ ظاہر ہے کہ یہاں اختلاف سے یہ اختلاف مراد نہیں ہے یہ اختلاف یہودیوں اور عیسائیوں کے مابین ہے اور اگر اختلاف کا تعلق حضرت مسیح کی روانگی سے ہے تو اس میں یہودیوں اور عیسائیوں میں بھی اختلاف ہے اور خود عیسائیوں میں بھی اس موضوع پر شدید اختلاف ہے۔ ہماری رائے میں یہاں اختلاف کرنے والوں سے عیسائی مراد ہیں۔ ان میں مسیح علیہ السلام کے مصلوب ہونے پر کوئی متفق علیہ ایک قول نہیں ہے بلکہ اس موضوع پر بیسیوں اقوال ہیں جن کی کثرت خود اس بات کی دلیل ہے کہ اصل حقیقت ان کے لیے بھی مشتبہ رہی۔ ان میں سے کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر جو شخص چڑھایا گیا وہ مسیح نہ تھا بلکہ مسیح کی شکل میں کوئی اور تھا جسے یہودی اور رومی سپاہی ذلت کے ساتھ صلیب دے رہے تھے اور مسیح وہیں کھڑا ان کی حماقت پر ہنس رہا تھا۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب پر چڑھایا تو مسیح ہی کو گیا تھا مگر ان کی وفات صلیب پر نہیں ہوئی تھی بلکہ اتارے جانے کے بعد ان میں جان تھی کوئی کہتا ہے کہ انہوں نے صلیب پر وفات پائی اور پھر وہ جی اٹھے اور کم و بیش دس مرتبہ آپ حواریوں سے ملے اور باتیں کیں۔ کوئی کہتا ہے کہ صلیب کی موت مسیح کے جسم انسانی پر واقع ہوئی اور وہ دفن ہوا، مگر الوہیت کی روح جو اس میں تھی وہ اٹھالی گئی۔ اور کوئی کہتا ہے کہ مرنے کے بعد مسیح علیہ السلام جسم سمیت زندہ ہوئے اور جسم سمیت اٹھائے گئے۔ ظاہر ہے کہ اگر ان لوگوں کے پاس حقیقت کا علم ہوتا تو اتنی مختلف باتیں ان میں مشہور نہ ہوتیں۔

بہرحال عیسائیوں میں نفس واقعہ صلیب سے متعلق بھی جیسا کہ ہم نے اوپر اشارہ کیا ہے بڑا اختلاف ہے اور اس پر جو افسانہ انہوں نے تصنیف کیا ہے اس میں بڑے اختلافات ہیں۔

حیات عیسیٰ علیہ السلام کی پہلی دلیل

۲۳۵۔ اور یقیناً انھوں نے حضرت مسیح کو قتل نہیں کیا ہے بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھالیا ہے اور اللہ سب پر غالب اور اپنے کاموں میں حکمت والا ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کے قول کی تکذیب کرتا ہے کہ یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل کیا بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھالیا۔ اللہ تعالیٰ سب چیزوں پر قادر ہے اور اس کے ہر کام میں حکمت ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں یہود کو جواب دینا مقصود ہے ان کا دعویٰ یہ تھا کہ انا قتلنا المسیح عیسیٰ ابن مریم رسول اللہ ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو قتل کر دیا۔ اس کے جواب میں اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں کہ یہود نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ ان کو اللہ نے اپنی طرف اٹھالیا ہے۔ ظاہر ہے کہ اس آیت میں قتلوہ کی ضمیر منصوب کا مرجع عیسیٰ السلام ہیں اور عیسیٰ علیہ السلام سے یہاں صرف ان کی رُوح مراد نہیں ہو سکتی کیونکہ قتل اور سُولی پر چڑھانا وہ اعمال ہیں جن کا مورد صرف جسم ہی ہو سکتا ہے رُوح کا قتل کرنا اور رُوح کا سُولی پر چڑھانا قطعاً محال ہے۔ لہٰذا بل رفعہ اللہ کی ضمیر بھی اسی جسم کی طرف راجع ہے جس جسم کی طرف ماقتلوہ کی ضمیر راجع ہے۔ یہود رُوح عیسیٰ السلام کے قتل کے مدعی نہ تھے بلکہ جسم عیسیٰ کے قتل کے دعویدار تھے اس لیے ان کی تردید میں بل رفعہ اللہ فرمایا گیا ہے۔

عربی زبان میں لفظ بل اضراب اور اعراض کے لیے آتا ہے لہٰذا ما قبل اور ما بعد میں منافات ہونی ضروری ہے۔ ظاہر ہے کہ رفع جسمانی ہی قتل کے منافی ہے۔ رفع روحانی اور رفعت شان قتل کے منافی نہیں اس لیے بل رفعہ اللہ میں رفع جسمانی مراد ہے ورنہ یہاں کلمہ بل کا لانا بالکل بے موقع اور بے محل ہو جائے گا۔

رفع سے عزت کی موت مراد نہیں

کچھ گمراہ لوگوں نے یہاں رفع سے مراد عزت کی موت بتائی ہے جیسا کہ مرزا قادیانی نے ازالہ اوہام میں لکھا ہے، ایسا سمجھنا قطعاً غلط ہے۔ لغت کی کسی کتاب میں رفع کے معنے عزت کی موت نہیں لکھے ہیں۔ یہ کہہ کر لوگوں کو دھوکا دینا کہ رفع کا صلہ جب الیٰ آئے تو اس کے معنے اعزاز و اکرام کے ہوتے ہیں جیسے رفعتہ الی الحاکم، لغت اور زبان میں دھاندلی کے مترادف ہے کیونکہ

اوّلاً رفعتہ الی الحاکم کے معنے عزت کی موت کسی نے نہیں بتاتے ہیں۔ اگر اس کے یہ معنے نہیں

تو اسے دلیل کے طور پر پیش کرنا عبث ہے۔

ثانیاً رفعتہ الی الحاکم جہاں اہلِ لغت نے لکھا ہے وہاں معنے یہ بتاتے ہیں۔ نزدیک گردانیدن کسے رابکسے ملتہ بالی و من ذالک قولہم رفعتہ الی السلطان یہاں نزدیک گردانیدن کسے را بکسے موجود ہے اس کا مدلول مرتبہ کی بلندی نہیں بلکہ جسمانی قرب ہے اس لیے رفعتہ الی السلطان کے معنے یہ نہیں کہ اس شخص کو گھر بیٹھے بغیر جسمانی حرکت عزت دلادی بلکہ معنے یہ ہیں کہ میں اس کو بادشاہ کے حضور میں لے گیا وہاں جاکر اگر وہ منظور نظر ہے تو معزز ہے اور اگر کوئی مجرم ہے تو ذلیل ورسوا ہے کیونکہ بادشاہ اور حاکم کی حضوری میں عزت و ذلت اپنے مقام اور حیثیت سے ہوتی ہے نہ کہ قرب مکان کی وجہ سے۔ چنانچہ فتح الباری شرح صحیح بخاری میں محاورہ رفعہ الی الحاکم کے معنے احضرہ للشکوی یعنی شکایت کے لیے حاکم کے حضور میں جانا لکھے ہیں۔

بہرحال رفع کا صلہ اگر الی آئے تو اس کے معنے عزت کی موت دینا نہیں۔ ایک سے زیادہ مثالیں لغت اور حدیث میں موجود ہیں۔

پہلی مثال لغت کی مشہور کتاب المصباح المنیر میں علامہ فیومی رقمطراز ہیں رفعت الزرع الی البیدر اور اس کے معنے صاحب صراح نے فارسی میں اس طرح کیے۔ برداشتم غلہ درودہ و بخرمن گاہ آوردم۔ یعنی میں کھیت کو کاٹ کر اور غلہ اٹھا کر خرمن گاہ میں لے آیا۔ صاحب قاموس رفعوا الزرع کے معنے یہ بتاتے ہیں کہ کسان کھیت کاٹ کر خرمن گاہ میں اٹھا کر لائے۔ علامہ زمخشری نے اساس البلاغہ میں یہی معنے بتائے کیا کوئی عقل مند آدمی یہاں یہ معنے کر سکتا ہے کہ غلہ کو عزت دی اور اس کا اکرام کیا۔

دوسری مثال صحیح بخاری میں ابوہریرہ کی حدیث میں ہے کہ ابوہریرہ مال زکوٰۃ کی نگرانی پر مقرر تھے، چور نے چوری کی، ابوہریرہ نے اس کو پکڑ لیا اور اس سے کہا کہ لارفعنک الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ حافظ عسقلانی نے اس کے معنے بتائے ہیں لاذھبن بک اشکوک یعنی میں تجھے حضور کے پاس لے جاکر تیری شکایت کروں گا۔ حافظ لکھتے ہیں کہ رفعہ الی الحاکم کے معنے حاکم کے حضور میں شکایت کرنے کے ہیں۔ کیا معاذ اللہ حضرت ابوہریرہ چور کو دربار نبوت میں لے جاکر معزز بنانا چاہتے تھے۔

تیسری مثال مشکوٰۃ شریف میں ہے کہ حضرت اسید بن حضیر قرآن حکیم کی تلاوت فرما رہے تھے۔ اثنائے تلاوت میں آپ نے سر اٹھایا چنانچہ الفاظ یہ ہیں فرفع راسہ الی السماء

آپ نے سر آسمان کی طرف اٹھایا، دونوں جگہ رفع کے ساتھ الیٰ آیا ہے اور دونوں جگہ رفع جسمانی مراد ہے اعزاز و اکرام کے معنے نہیں ہیں۔

چوتھی مثال زمانہ نبوت میں ایک بچہ کا انتقال ہو گیا اور وہ بچہ آپ کے پاس اٹھا کر لایا گیا۔ چنانچہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ الفاظ ہیں کہ فرفع الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یعنی وہ بچہ آپ کے پاس اٹھا کر لایا گیا۔ ظاہر ہے کہ بچہ اسی جسد عنصری کے ساتھ اٹھا کر لایا گیا تھا کسی کے نزدیک یہاں عزت کی موت مراد نہیں ہے۔

پانچویں مثال لغت حدیث کی مشہور کتاب مجمع البحار میں ہے مرفعہ الی یدہ لیرے مرفعہ الی غایۃ طول یدہ لیراہ الناس یعنی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیالہ اپنے دست مبارک کی لمبائی کی مقدار میں اوپر اٹھایا تاکہ لوگ دیکھ لیں۔ یہاں کوئی نہیں کہتا کہ یہ پیالہ کا رفع روحانی تھا۔

چھٹی مثال حدیث میں ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم شب کو بیدار ہوتے، اٹھ کر بیٹھ جاتے اور اپنا سر مبارک آسمان کی طرف اٹھا کر تین بار فرماتے سبحان الملک القدوس الفاظ یہ ہیں فرفع رأسه الی السماء یہاں کوئی نہیں کہتا کہ یہ سر کا رفع روحانی تھا۔

ساتویں مثال، حافظ ابن کثیر نے اپنی تفسیر میں عبداللہ ابن عباس کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب بیت المقدس کی طرف رخ کر کے نماز پڑھتے تو سلام پھیرنے کے بعد سر مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے۔ اللہ نے یہ آیت نازل فرمائی فلنولینک قبلۃ ترضاھا۔

ان مثالوں سے صاف ظاہر ہے کہ رفع کا صلہ جب الیٰ آتا ہے تو اس کے معنے اٹھانے کے ہوتے ہیں۔ اس میں اعزاز و اکرام کے معنے قطعاً نہیں ہوتے۔ خلاصہ یہ ہے کہ لغت میں رفع کے حقیقی اور وضعی معنے اوپر کو اٹھانا ہیں اور اس کی ضد وضع اور حقیقی ہے کہ ان کے معنے نیچے رکھنا ہیں۔ لہٰذا رفع کا مفعول جب کوئی جسمانی چیز ہوگی وہاں اس سے مراد جسم کو نیچے سے اوپر اٹھانا ہوگا۔ علامہ فیومی المصباح المنیر میں رقمطراز ہیں:

الرفع فی الاجسام حقیقۃ فی الحرکۃ والانتقال وفی المعانی علی ما یقتضیہ المقام۔

رفع اجسام میں معنے حقیقی کے لحاظ سے حرکت اور انتقال کا نام ہے، اور معانی میں موقع و مقام کی مناسبت سے ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ عیسیٰ علیہ السلام بجسدہ العنصری آسمان پر اٹھائے گئے کیونکہ رفعہ اللہ الیہ میں ضمیر منصوب کا مرجع عیسیٰ علیہ السلام ہیں اور عیسیٰ نام ہے جسم مع الروح کا نہ کہ صرف روح کا۔
اگر مان بھی لیا جائے کہ رفع کے معنے اعزاز اور اکرام کے ہیں تو اس کی دو ہی صورتیں ہیں ایک یہ کہ یہ معنے کنائی ہیں، دوسرے یہ کہ مجازی ہیں۔

کنائی اور مجازی معنے میں فرق

دونوں میں باریک فرق ہے کنائی معنے حقیقی معنے کے ساتھ جمع ہو سکتے ہیں لیکن حقیقی اور مجازی معنے کبھی جمع نہیں ہو سکتے۔ کنایہ اور مجاز میں بھی فرق ہے جیسا کہ علامہ تفتازانی نے مطول میں لکھا ہے کہ

> کنایہ ایک ایسا لفظ ہے جس سے اس کے لازمی معنی مراد ہوتے ہیں اور لازمی معنے کے ساتھ اس لفظ کے اصلی معنی کا مراد لینا بھی جائز ہے مثلاً لفظ طویل النجاد کہ اس کے کنائی معنے دراز قامت ہیں اور اس کے حقیقی معنے شریف النسب ہیں۔ دونوں جمع ہو سکتے ہیں۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ کنایہ اور مجاز میں یہی فرق ہے کہ کنایہ میں حقیقی اور کنائی معنے دونوں جمع ہو سکتے ہیں برخلاف مجاز کے کہ اس کے ساتھ حقیقی معنے جمع نہیں ہو سکتے۔

اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں رفعہ اللہ الیہ کے حقیقی معنی یعنی جسمانی رفع اور کنائی فرضی معنے یعنی رفع منزلت دونوں جمع ہو سکتے ہیں کیونکہ جسمانی رفع حضرت عیسیٰ کی بزرگی کی وجہ سے خود اعزاز و اکرام کو لازم ہے جیسا کہ آیت ورفع ابویہ علی العرش میں دونوں جمع ہیں۔ بہرحال رفع کا مفعول جب کوئی جسمانی چیز ہوگی تو اس وقت جسمانی رفع مراد ہوگا۔ اسی لیے قرآن حکیم میں جہاں کہیں رفع سے روحانی رفع عزت ہوتا ہے وہاں بلاشبہ کوئی قرینہ موجود ہوتا ہے جس سے پتہ لگتا ہے کہ رفع جسمانی مراد نہیں ہے مثلاً ان آیات قرآنیہ کو بغور پڑھیے ورفع بعضھم درجات، نرفع درجات من نشاء، ورفع بعضکم فوق بعض درجات اور ورفعنا لک ذکرک۔ ان آیات میں ذکر اور درجہ کی قید بتا رہی ہے کہ ان میں رفع جسمانی مراد نہیں۔
بتانا یہ چاہتا ہوں کہ رفعہ اللہ الیہ کے ذریعے اللہ نے معاملہ کی اصل حقیقت بتا دی ہے اس میں جزم اور صراحت کے ساتھ جو کچھ بتایا گیا ہے۔ وہ صرف یہ ہے کہ حضرت مسیح کو قتل کرنے میں یہودی کامیاب نہیں ہوئے اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا۔ یہ سوال کہ اس اٹھا لینے

کی کیفیت کیا تھی؟ تو اسے واقعاتی دنیا میں سمجھنے کے لیے یہ باتیں ذہن میں رکھیے کہ

اولاً عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کے جسم و روح سمیت اٹھائے جانے کا عقیدہ پہلے سے موجود تھا اور ان اسباب میں سے تھا جن کی بنا پر ایک بہت بڑا گروہ حضرت مسیح کی الوہیت کا قائل ہوا ہے لیکن اس کے باوجود قرآن نے نہ صرف یہ کہ اس کی صاف تردید نہیں کی بلکہ بعینہٖ رفع کا لفظ استعمال کیا جو عیسائی اس واقعہ کے لیے استعمال کرتے ہیں۔ قرآن عزیز کی شان سے یہ بعید ہے کہ وہ کسی نظریہ کی تردید کرنا چاہتا ہو اور پھر ایسی زبان استعمال کرے جو اس خیال کی تائید و تقویت کا سامان ہو۔

ثانیاً یہ کہ اگر حضرت مسیح کو اٹھایا جانا ویسا ہی اٹھایا جانا ہوتا جیسا کہ ہر مرنے والا دنیا سے اٹھایا جاتا ہے یا اگر اس رفع سے مراد محض درجات و مراتب کی بلندی ہوتی تو اس مضمون کو بیان کرنے کا انداز یہ نہ ہوتا جو ہم یہاں دیکھ رہے ہیں۔ اس کو بیان کرنے کے لیے اور زیادہ مناسب الفاظ یہ ہوتے کہ یقیناً انہوں نے مسیح کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو زندہ بچا لیا اور پھر طبعی موت دی۔ یہودیوں نے ان کو ذلیل کرنا چاہا، اللہ نے ان کو بلند درجہ عطا کیا۔

ثالثاً یہ کہ اگر یہ رفع ویسا ہی معمولی قسم کا رفع ہوتا جیسے ہم محاورے میں کسی مرنے والے کو کہتے ہیں کہ اللہ نے اسے اٹھا لیا تو یہ ذکر کرنے کے بعد یہ فقرہ بالکل غیر موزوں تھا وکان اللّٰہ عزیزاً حکیماً اللہ زبردست طاقت رکھنے والا الحکیم ہے بلکہ یہاں موزوں فقرہ وکان اللّٰہ غفوراً رحیماً ہوتا۔ یہ قوت و حکمت کا حوالہ تو صرف کسی ایسے واقعہ کے بعد ہی موزوں ہو سکتا ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی قوت قاہرہ اور اس کی حکمت کا غیر معمولی ظہور ہوا ہو۔

ہمیں افسوس ہے کہ معالم القرآن کے صفحات اس سے زیادہ تفصیل کے متحمل نہیں ہیں۔ اگر آپ اس موضوع سے تفصیلی مباحث دیکھنا چاہتے ہیں تو حضرت الشیخ السید انور شاہ کشمیری کی عقیدۃ الاسلام، مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی کلمۃ اللہ فی حیات عیسیٰ روح اللہ اور مولانا محمد ابراہیم سیالکوٹی کی شہادۃ القرآن پڑھیے۔ عقیدۃ الاسلام علماء کے لیے ایک عجیب علمی سوغات ہے۔

حیات عیسیٰ علیہ السلام کی دوسری دلیل

۲۳۶۔ اور اہل کتاب میں سے کوئی نہیں جو اس کی موت سے پہلے اس پر ایمان نہ لے آئے گا اور قیامت کے روز وہ ان پر شہادت دینے والا ہوگا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام زندہ موجود ہیں آسمان پر۔ جب دجال پیدا ہوگا تب اس جہان میں تشریف لاکر اسے قتل کریں گے اور یہود و نصاریٰ ان پر ایمان

لائیں گے کہ بے شک عیسٰی زندہ ہیں مرے نہ تھے اور قیامت کے دن حضرت عیسٰی علیہ السلام ان کے حالات اور اعمال کو ظاہر کریں گے کہ یہودنے میری تکذیب اور مخالفت کی اور نصاریٰ نے مجھے خدا کا بیٹا بتایا۔ [1]

دراصل اس فقرے کے دو معنے بیان کیے گئے ہیں اور الفاظ میں دونوں کا احتمال ہے۔ایک معنے وہ جو ہم نے ترجمہ میں اختیار کیے ہیں۔ دوسرے یہ کہ اہل کتاب میں سے کوئی ایسا نہیں جو اپنی موت سے پہلے مسیح پر ایمان نہ لے آئے۔ اہل کتاب سے مراد یہودی ہیں اور ہو سکتا ہے کہ عیسائی بھی ہوں پہلے معنے کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ مسیح کی طبعی موت جب واقع ہو گی۔ اس وقت جتنے اہل کتاب ہوں گے وہ سب ان پر ایمان لا چکے ہوں گے، دوسرے معنے کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ تمام اہل کتاب پر مرنے سے پہلے رسالت مسیح کی حقیقت منکشف ہو جاتی ہے اور وہ مسیح پر ایمان لے آتے ہیں مگر یہ اس وقت ہوتا ہے جب کہ ایمان لانا مفید نہیں ہو سکتا۔ دونوں معنے متعدد صحابہ، تابعین اور اکابر مفسرین سے منقول ہیں اور صحیح مراد صرف اللہ کے علم میں ہے [2]

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس آیت کا ترجمہ حضرت شاہ ولی اللہ قدس اللہ سرہٗ العزیز اس طرح فرماتے ہیں :

نباشد ہیچ کس از اہل کتاب الا البتہ ایمان آرد بعیسٰی پیش از مردن عیسٰی، و روز قیامت باشد عیسٰی گواہ بر ایشاں۔

نہیں رہے گا کوئی شخص بھی اہل کتاب میں سے مگر ضرور ایمان لائے گا عیسٰی علیہ السلام پر عیسٰی علیہ السلام کی موت سے پہلے اور حضرت عیسٰی قیامت کے روز ان پر گواہ ہوں گے۔

حضرت شاہ ولی اللہ کے ترجمہ سے صاف ظاہر ہے کہ آیت قرآنی میں بہ اور موتہ کی دونوں ضمیریں حضرت مسیح کی طرف راجع ہیں۔ قرآن حکیم کا ظاہر سیاق بھی یہی چاہتا ہے کہ ضمیروں کا مرجع حضرت عیسٰی ہوں کیونکہ جیسے ما قتلوہ، ما صلبوہ اور ما قتلوہ یقیناً اور بل رفعہ اللہ کی تمام ضمیریں حضرت عیسٰی کی طرف راجع ہیں۔ اور پھر آئندہ آیت و یوم القیامۃ یکون علیھم شھیدا میں بھی یکون کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسٰی ہیں ایسے ہی ضروری ہے کہ بہ اور موتہ کی ضمیروں کا مرجع بھی حضرت عیسٰی ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ترجمان القرآن حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی باسناد صحیح یہی منقول ہے کہ بہ اور موتہ کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ علیہ السلام ہیں۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں فرماتے ہیں ؛

اسی پر عبداللہ بن عباس نے جزم ویقین کیا۔ جیسا کہ ابن جریر نے باسناد صحیح بحوالہ سعید بن جبیر بیان کیا ہے اور ابی رجاء کے حوالہ سے امام الحسن البصری سے اس آیت کی تفسیر قبل موت عیسیٰ منقول ہے۔ حسن بصری فرماتے ہیں واللہ حضرت عیسیٰ اس وقت بھی زندہ ہیں، جب تشریف لاویں گے اس وقت ان پر سب ایمان لاویں گے اور یہی اکثر اہل علم سے منقول ہے اور اسی کو ابن جریر وغیرہ نے راجح قرار دیا ہے۔ (فتح الباری ص ۳۵ ج ۶)

یہی بات علامہ قسطلانی نے ارشاد الساری میں اس طرح پیش فرمائی ہے ؛

اہل کتاب میں سے کوئی نہ ہوگا مگر حضرت عیسیٰ پر حضرت عیسیٰ کی موت سے پہلے ایمان لے آئے گا ___ اسی پر ابن عباس نے یقین کیا ہے جیسا کہ ابن جریر نے سعید بن جبیر کے حوالہ سے بتایا ہے۔ (ارشاد الساری علی صحیح البخاری)

اور حضرت قتادہ اور ابو مالک سے بھی یہی منقول ہے کہ قبل موتہ کی ضمیر حضرت مسیح کی طرف راجع ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی ایک روایت ہے جس کو امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ بہ اور موتہ کی ضمیریں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرف راجع ہیں۔ چنانچہ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ ؛

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے۔ بے شک عنقریب تم میں عیسیٰ ابن مریم نازل ہوں گے فیصلہ کرنے اور انصاف کرنے والے ہوں گے صلیب کو توڑیں گے اور خنزیر کو قتل کریں گے، لڑائی کو ختم کر دیں گے، اور مال کی اتنی بہتات کر دیں گے کہ کوئی لینے والا نہ ہوگا۔ اور ایک سجدہ دنیا ومافیہا سے زیادہ قیمتی ہوگا۔ پھر ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ اگر چاہو تو اس کی تصدیق کے لیے یہ آیت پڑھو وان من اھل الکتاب الا لیومنن بہ قبل موتہ۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں ؛

حضرت ابو ہریرہ کا آیت قرآنی کو اس طرح پڑھنا اس بات کی دلیل ہے کہ بہ اور
موتہٖ کی ضمیریں حضرت عیسٰی علیہ السلام کی طرف راجع ہیں۔ یعنی ہر شخص زمانۂ آئندہ میں
حضرت عیسٰی کی موت سے پہلے حضرت عیسٰی پر ایمان ضرور لائے گا۔

مطلب یہ ہے کہ آیت قرآنی میں لیؤمنن لام تاکید اور نون تاکید یہ چاہتا ہے کہ مراد الٰہی یہ ہو کہ آئندہ ایک ایسا زمانہ آنے والا ہے جس میں سب اہل کتاب ایمان لے آئیں گے۔ اور آپ ان پر قیامت کے دن شاہد ہوں گے۔ اس آیت کے صحیح معنے یہی ہیں چونکہ ابھی تک تمام اہل کتاب کا حضرت مسیح پر ایمان متحقق نہیں ہوا، اس لیے آپ ابھی تک بقید حیات ہیں۔

ایک خلش کا ازالہ

شاید کچھ لوگ یہاں یہ خلش محسوس کریں کہ اس حدیث میں اقرؤا ان شئتم حضور انور کا ارشاد نہیں ہے بلکہ خود حضرت ابو ہریرہ کا استنباط ہے جو حجت نہیں مطلب یہ کہ یہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ صحابی کا اثر ہے۔

جواب یہ ہے کہ حدیث کتاب اللہ کی شرح ہے۔ قرآن عزیز میں جو بات بالاجمال بتائی گئی ہے۔ حدیث اس کی تفصیل ہے۔ اسی بنا پر فقہاء صحابہ اس تتبع اور تلاش میں رہتے تھے کہ ارشادات نبوت اور کلمات طیبہ کا ماخذ کتاب اللہ سے معلوم کریں۔ چنانچہ حافظ ابن القیم زاد المعاد میں رقمطراز ہیں۔

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اس کے بہت حریص تھے کہ ارشادات کو قرآن سے مستنبط کریں۔

کتاب اللہ اور حدیث رسول اللہ میں تطبیق اور توفیق دینا اور حدیث کی تصدیق اور مزید توثیق کے لیے کتاب اللہ کی کسی آیت سے استشہاد کرنا یہ ہر شخص کا کام نہیں ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ نے تفقہ اور استنباط کی نعمت اور دولت سے سرفراز فرمایا ہے وہی کر سکتا ہے۔ ابن القیم فرماتے ہیں،

> یہ علم کے مراتب میں سے بزرگ ترین مرتبہ ہے جس کو مل جائے وہ خدا کا شکر کرے اور جسے نہ ملے وہ اپنے سوا کسی کو ملامت نہ کرے۔

خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات کوئی مسئلہ بیان فرما کر اس کے مطابق قرآن کی آیت

تلاوت فرماتے۔ اسی طرح صحابہ کرام کی بھی عادت تھی کہ ارشاد نبوت کو آیت قرآنی کے حوالہ سے بیان کرتے حضرت ابوہریرہ کی بھی یہی عادت تھی کہ اکثر حدیث کی روایت کر کے استشہاداً کوئی آیت قرآنی تلاوت فرماتے۔ اور وہ اکثر اپنی رائے نہ ہوتی بلکہ حضور اقدس ہی سے منقول ہوتی۔ کبھی تصریح فرما دیتے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اور اختصاراً صرف آیت کی تلاوت پر ہی اکتفا فرما دیتے لیکن تتبع اور استقراء کیا جاتا ہے تو دوسری سند سے اس کے مرفوع ہونے کی تصریح مل جاتی ہے۔ یہ آیت بھی اسی قبیل سے ہے۔ احادیث میں ایک سے زیادہ اس کی نظیریں موجود ہیں۔ چنانچہ اس حدیث کے متعلق بھی بعض راویوں کو اس کے مرفوع ہونے کا گمان ہے جیسا کہ مسند امام احمد ص ۲۹۰ ج ۲ میں اس روایت سے معلوم ہوتا ہے۔

حدثنا عبد اللہ قال حدثنی ابی نا یزید انا سفیان عن الزھری
عن حنظلۃ عن ابی ھریرۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم
ینزل عیسی ابن مریم فیقتل الخنزیر ویکسر الصلیب (الی ان قال)
ثم تلا ابو ھریرۃ وان من اھل الکتاب الا لیؤمنن بہ قبل موتہ
ویوم القیامۃ یکون علیھم شھیداً۔ فزعم حنظلۃ ان
ابا ھریرۃ قال یؤمن بہ قبل موتہ عیسی فلا ادری ھذا کلہ
حدیث النبی صلی اللہ علیہ وسلم او شیٔ قالہ ابو ھریرۃ۔

یہ روایت حافظ ابن کثیر نے بھی اپنی تفسیر میں نقل کی ہے دیکھو ابن کثیر ص ۳۳۵ ج ۳ اور حافظ ابوجعفر طحاوی نے شرح معانی الآثار میں حضرت ابن سیرین رحمہ اللہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت ابوہریرہ کی سب روایتیں مرفوع ہیں۔ گو بظاہر موقوف ہوں۔ (شرح معانی الآثار ص ۱ ج ۱) اور حافظ جلال الدین السیوطی نے تفسیر درمنثور ص ۲۴۲ ج ۲ میں اس روایت کو مرفوعاً بھی نقل کیا ہے۔

اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ یہ ابوہریرہ کا قول ہے پھر بھی حجت ہے کیونکہ ایک صحابی کا مجمع صحابہ میں کسی بات کو علی الاعلان کہنا اور صحابہ کا اس پر سکوت فرمانا اجماع سکوتی کہلاتا ہے۔ بالخصوص ایسی بات جو بار بار اور مجمع صحابہ میں کہی گئی ہو اور صحابہ میں سے اس پر کسی نے کوئی گرفت نہ کی ہو اس کی قطعی دلیل ہے کہ یہ امر صحابہ کے نزدیک بالکل مسلم ہے۔ اگر قابل انکار ہوتا تو صحابہ کرام اس پر ضرور نکیر فرماتے۔ صحابہ کرام سے یہ ناممکن ہے کہ ان کے سامنے کوئی بات قابل

گرفت کی جائے یا کوئی کلام قابلِ اعتراض کیا جائے اور وہ خاموش رہیں۔ حضرت ابی ہریرہ کا قبل موتہ کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسٰی کو قرار دینا اور صحابہ کے مختلف مجامع میں اس کو بار بار بیان فرمانا اور کسی صحابی کا اس پر انکار نہ کرنا اس امر کی قطعی اور صریح دلیل ہے کہ یہ امر تمام صحابہ کے نزدیک مسلم تھا۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں رقمطراز ہیں :

> بہ اور موتہ دونوں ضمیروں کا مرجع حضرت عیسٰی ہونا۔ حافظ ابن جریر کا مختار ہے اور سلف کی ایک جماعت نے اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ اور قرآن کا ظاہر سیاق اسی کا مقتضی ہے کیونکہ گزشتہ کلام میں حضرت عیسٰی ہی کا ذکر ہے ۔ اور تابعین تبع تابعین کثرت سے اسی طرف ہیں کہ آیت کی مراد یہ ہے کہ عیسٰی علیہ السلام کی موت سے پہلے ہر کتابی حضرت عیسٰی پر ضرور ایمان لائے گا جیسا کہ ابن عباس سے مروی ہے۔

ہاں کچھ مفسرین کی رائے یہ ضرور ہے کہ موتہ کی ضمیر کتابی کی طرف راجع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہر کتابی اپنے مرنے سے پہلے حضرت عیسٰی کے رسول برحق ہونے اور اللہ کا بندہ ہونے پر ایمان لے آتا ہے مگر یہ رائے کمزور ہے کیونکہ ـــــ اولاً اس صورت میں ایمان سے وہ ایمان مراد ہوگا جو یہودی غرغرہ کی حالت میں لاتا ہے ایسی صورت میں بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ تعبیر قبل موتہ کی جگہ عند موتہ یا حین موتہ ہو۔

ثانیاً اگر موتہ کی ضمیر کتابی کی طرف ... ہو گی تو مضارع مؤکد بنون تاکید خالص استقبال کے لیے نہ ہے گا۔ کیونکہ اس صورت میں آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ ہر کتابی اپنے مرنے سے پہلے حضرت عیسٰی پر ضرور ایمان لے آتا ہے اور یہ بات زمانہ مستقبل کے ساتھ خاص نہیں ہے۔ اہل کتاب اس آیت کے نازل ہونے کے وقت بھی اور اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے بھی مرتے تھے لہٰذا اہل کتاب کا اپنے مرنے کے وقت ایمان لانا زمانہ مستقبل کے ساتھ خاص نہ رہا۔ حالانکہ تمام ائمہ نحو کے یہاں یہ مسلّم ہے کہ مضارع مؤکد بنون تاکید خالص استقبال معنے کے لیے آتا ہے چنانچہ امام ابن ہشام نحوی مغنی میں رقمطراز ہیں۔

> اگر مضارع حال کے معنے میں ہو تو نون ثقیلہ اور خفیفہ سے اس کی تاکید ممنوع ہے اور اگر مضارع مستقبل کے معنے میں ہو تو اس کی تاکید نون ثقیلہ و خفیفہ سے واجب

ہے جیسے تاللہ لاکیدن اصنامکم ۔ (مغنی جلد ثانی ص ۴۲)

ایسے ہی علامہ رضی شرح کافیہ میں لکھتے ہیں :

اس مستقبل میں جو محض خبری معنے لئے رہا ہو نون تاکید نہیں آتا، ہاں جب شروع میں تاکیدی علامت موجود ہو جیسے لام قسم تو پھر نون تاکید و امر ورہے ۔

ثالثاً یہ کہ اس صورت میں بہ کی ضمیر کا مرجع حضرت عیسیٰ کو اور قبل موتہ کی ضمیر کا مرجع کتابی کو قرار دیا جائے ۔ یہ انتشار ضمائر ہے، بلیغ کلام میں اس طرح کا انتشار نہیں ہوتا ۔

بہرحال اس آیت سے پہلے آیات میں یہ بتایا گیا ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کو نہ سُولی پر چڑھایا گیا اور نہ قتل کیا گیا بلکہ ان کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف اٹھالیا ۔ یہ یہود و نصاریٰ دونوں کے اس نظریہ کی تردید ہے جو انہوں نے اپنے زعم باطل سے قائم کرلیا تھا ۔ ان سے ہی کہا جارہا ہے کہ حضرت مسیح کے متعلق صلیب پر چڑھائے جانے اور قتل کیے جانے کا دعویٰ علمی طور پر سرتا سر غلط اور بیہودہ ہے اس کے بعد اس آیت میں ان کو ہی اس بات کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ اگر وہ آج اس غلط اور علم و حقیقت سے دور عقیدہ پر فخر کرتے ہیں تو وہ وقت بھی آنے والا ہے جب عیسیٰ علیہ السلام خدائے برتر کی حکمت و مصلحت پورا کرنے کے لیے کائنات ارضی پر واپس تشریف لائیں گے اور ان عینی مشاہدے کے وقت یہود و نصاریٰ میں سے ہر ایک موجود ہستی کو قرآن کے فیصلہ کے مطابق عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آنے کے سوا کوئی چارہ کار باقی نہ رہے گا ۔ اور پھر جب وہ اپنی مدت حیات ختم کرنے کے بعد موت سے دوچار ہوں گے تو روز قیامت اپنی اُمت پر اسی طرح گواہ ہوں گے جیسے سارے انبیاء اپنی اُمتوں پر شاہد بنیں گے ۔

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اگرچہ یہود و نصاریٰ دونوں واقعہ صلیب پر متفق ہیں لیکن اس سلسلے میں دونوں کے زاویۂ نظر مختلف ہیں ۔ یہود حضرت مسیح علیہ السلام کو مفتری اور کاذب کہتے ہیں اور اس لیے فخر کرتے ہیں کہ انہوں نے حضرت عیسیٰ کو سُولی پر چڑھا دیا اور اس حالت میں مار ڈالا ۔ اس کے برعکس نصاریٰ کا خیال یہ ہے کہ دُنیا کا پہلا انسان آدم علیہ السلام گنہ گار تھا اور ساری دُنیا گنہ گار تھی اس لیے خدا کی صفت رحمت نے ارادہ کیا کہ دُنیا کو گناہوں سے نجات دلائے اس لیے اس کی صفت رحمت نے بیٹا ہونے یعنی ابنیت کی صورت اختیار کی اور اس کو دُنیا میں روانہ کیا تاکہ وہ یہود کے ہاتھوں سُولی پر چڑھے اور مارا جائے اور اس طرح ساری کائنات ماضی و مستقبل کے گناہوں کا کفارہ بن کر دُنیا کی نجات کا باعث بنے ۔ یہاں ان

آیات میں قرآن عزیز نے صاف صاف بتادیا کہ حضرت مسیح کے قتل کے دعویٰ کی بنیاد کسی بھی عقیدے پر مبنی ہر گمراہی اور علم وحقیقت کے خلاف اندازے کا تیر ہے اور اس سلسلے میں صحیح اور مبنی بر حقیقت فیصلہ وہی ہے جو قرآن نے کیا ہے اور جس کی بنیاد علم ویقین اور وحی الٰہی پر قائم ہے۔ للذا آج جب کہ تمہارے سامنے اس اختلاف کے فیصلہ کے لیے جو شک وگمان کی شکستہ بنیادوں پر قائم تھا، علم ویقین کی روشنی آچکی ہے پھر بھی تم اپنے ظنون کاسدہ اور اوہام فاسدہ پر اصرار کر رہے ہو۔ اور حضرت مسیح سے متعلق باطل عقیدے کو چھوڑنے کے لیے تیار نہ ہو تو قرآن کا دوسرا فیصلہ اور وحی الٰہی کا یہ اعلان بھی سن لو کہ تمہاری نسلوں پر وہ وقت بھی آنے والا ہے جب قرآن کے اس صحیح فیصلہ اور اعلانِ برحق کے مطابق حضرت مسیح ملاءِ اعلیٰ سے کائناتِ ارضی کو واپس ہوں گے اور ان کی یہ آمد ایسی مشاہد ہوگی کہ یہود و نصاریٰ میں سے ایک فرد بھی ایسا نہ رہے گا جو بادل نخواستہ یا بادل خواستہ اس ذات گرامی پر ایمان نہ لے آئے کہ بلاشبہ وہ خدا کے سچے رسول ہیں، خدا کے بیٹے نہیں، برگزیدہ انسان ہیں، مصلوب ومقتول نہیں ہوئے تھے بقیدِ حیات ہمارے آنکھوں کے سامنے ہیں۔

اہلِ زیغ کے لیے تازیانہ

یہاں یہ بات خاص طور پر توجہ کے قابل ہے کہ سورۂ آلِ عمران کی طرح اس جگہ حضرت عیسٰی علیہ السلام کے لیے لفظ توفی نہیں بولا بلکہ بصراحت لفظ موت استعمال کیا گیا۔ سوچیں کہ ایسا کیوں کیا گیا ہے؟ صرف اس لیے کہ آلِ عمران میں جس حقیقت کا اظہار مقصود ہے اس کے لیے توفی ہی مناسب ہے جیسا کہ سورۂ آلِ عمران کے تشریحی نوٹوں میں آپ پڑھ چکے ہیں۔ اس جگہ براہِ راست موت ہی کا تذکرہ مطلوب ہے اور اس حالت کا ذکر ہے جس کے بعد حضرت مسیح بھی کل نفس ذائقۃ الموت، کا مصداق بننے والے ہیں اس لیے یہاں موت کو بصراحت لانا ہی مقام کا تقاضا ہے۔ اور یہ مزید تائید ہے اس بات کی کہ آلِ عمران میں لفظ موت کی جگہ توفی کا استعمال ایک خاص مقصد کی خاطر ہوا ہے ورنہ جیسے آلِ عمران میں ... حال ہوا تھا اسی طرح یہاں بھی کہا جاتا یا جیسے یہاں لفظ موت لایا گیا ہے آلِ عمران میں بھی لفظ موت ہی استعمال ہوتا۔ لیکن قرآن عزیز کے ان دقیق اسالیب بیان کو پالینا حق کے طالبوں ہی کا حصہ ہے نہ اصحابِ زیغ اور اربابِ ضلالت کا جو اپنی ذاتی اغراض کے پیش نظر پہلے ایک نظریہ ایجاد کرتے ہیں اور بعد ازاں اس سلسلے کی تمام آیاتِ قرآنی کو اسی سانچے میں ڈھال کر اس کا نام تفسیرِ قرآن رکھتے ہیں۔

بہرحال جمہور کے نزدیک آیت زیر تشریح کی تفسیر یہی ہے جو سپرد قلم کی جاچکی ہے۔ مشہور محدث جلیل القدر مفسر اور اسلامی مورخ حافظ عماد الدین ابن کثیر اس تفسیر کو عبداللہ ابن عباس اور حسن بصری سے بسند صحیح نقل کرنے کے بعد لکھتے ہیں؛

قتادہ، عبدالرحمن اور بہت سے مفسروں کا یہی قول ہے اور یہی حق ہے جیسا کہ ہم عنقریب دلیل قاطع سے بیان کریں گے۔

اور جیسا کہ پہلے بتا آیا ہوں کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں اسی کو سراہا ہے۔

ہاں اس صحیح تفسیر کے علاوہ کتب تفسیر میں احتمال عقلی کے طور پر دو قول اور بھی منقول ہیں۔ مگر وہ دونوں بلحاظ سند ضعیف اور ناقابل اعتماد اور اور بلحاظ سیاق وسباق غلط اور ناقابل التفات ہیں۔

ایک یہ ہے کہ موتہ میں ضمیر کا مرجع کتابی کو قرار دیا جاتے اور ترجمہ یوں کیا جاتے اور اہل کتاب میں سے کوئی فرد ایسا نہیں ہے جو اپنی موت سے حضرت عیسٰی پر ایمان نہ لاتا ہو۔

دوسرا یہ ہے کہ ہ کی ضمیر کا مرجع بجائے حضرت عیسٰی کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہوں اور ترجمہ یوں کیا جائے کہ اہل کتاب کا ہر فرد اپنی موت سے پہلے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آتا ہے۔

اس بات سے قطع نظر کہ یہ دونوں تفسیریں نقل روایت کے لحاظ سے ناقابل اعتبار اور غیر صحیح اور سیاق وسباق قرآنی کے خلاف ہیں۔ عقلی نقطہ نظر سے بھی غلط ہیں اس لیے کہ اگر اس آیت کے یہ معنے ہیں تو پھر یہ آیت معاذ اللہ اپنے مقصد بیان کے خلاف بے معنے اور بے نتیجہ ہے کیونکہ قرآن کا یہ صاف اعلان ہے کہ انسان جب عالم دنیا سے کٹ کر عالم غیب سے وابستہ ہو جاتا ہے اور نزعی کیفیات اس پر طاری ہو جاتی ہیں تو اس وقت اس کے اعمال کا صحیفہ لپیٹ دیا جاتا ہے اور اس وقت تبدیلی عقائد اور اعتراف حق کا کوئی نتیجہ اور ثمرہ نہیں ملتا یعنی اس وقت کا نہ اقرار و اعتراف معتبر اور نہ انکار مستند، تو ایسی صورت میں حضرت عیسٰی یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصیت کا تذکرہ کیا معنے رکھتا ہے؟ انسان جب اس حالت میں ہوتا ہے تو اس کے سامنے سے غیب کے سارے پردے ہٹ جاتے ہیں اور دین حق کی بتائی ہوئی غیب کی ساری حقیقتیں اس پر منکشف ہو جاتی ہیں۔ اس وقت کے ایمان کا اعتبار ہی نہیں ہے۔ اور جب اس قسم کا ایمان قابل قبول ہی نہیں ہے تو اس کا ذکر اس انداز سے ہونا چاہیے تھا جو انداز غرق فرعون کے وقت

فرعون کے ایمانی اعتراف کے لیے اختیار کیا گیا اور جس میں اس وقت کے ایمان کا بے قیمت ہونا ظاہر کیا گیا، ذکر ایسے اسلوب اور انداز میں کر گیا مستقبل میں ہونے والے کسی عظیم الشان واقعہ کی خبر دی جا رہی ہے۔ جو قرآن کے مخاطبوں یہود و نصاریٰ کے عقائد و عزائم کے خلاف حضرت عیسیٰ السلام سے متعلق قرآن کی تصدیق اور اس کے اٹل فیصلہ کی زندہ شہادت بن کر پیش آنے والا ہے۔ ایک عیسائی اور یہودی پنجۂ موت میں آجانے کے وقت جان عزیز سپرد کر دینے سے پہلے حضرت عیسیٰ پر ایمان لاتے یا نہ لاتے۔ اس کی اس وقت کی تصدیق کا ثبات انسانی کے علم و ادراک سے الگ صرف اس کے خدا کے درمیان ہے۔ اس کا کوئی قانونی مقام نہیں ہے۔ لیسے موقعہ پر ایسی بات کا تذکرہ قطعاً بے محل ہے جہاں ایک قوم کو ایک خاص جرم پر ملزم اور مجرم کی حیثیت سے پیش کیا جا رہا ہے اور فیصلہ حق کی تائید کے لیے ماضی اور مستقبل میں کا ثبات ماضی میں پیش آنے والے واقعات کو پیش کیا جا رہا ہے جیسا کہ اس آیت کے سیاق و سباق سے ظاہر ہو رہا ہے اور اس پر غور فرمائیے کہ غرغرے کی حالت میں حضور انور اور حضور کی رسالت پر ایمان ہر اس کتابی سے تعلق رکھتا ہے جو اس آیت کے نزول سے پہلے گزر چکا ہے۔ اگر اس آیت میں یہی بات بتانی پیش نظر ہوتی تو اس کے لیے موکد مستقبل کی یہ تعبیر لیؤ منن بہ بلاغت کلام کے بالکل مناسب نہیں ہے اس کے لیے تو ایسی تعبیر ہونی چاہیے جو ماضی، حال اور استقبال تینوں پر یکساں حاوی ہو تاکہ بات اپنے توسع کے لحاظ سے پوری طرح ادا ہو۔ اور آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان والی بات تو اس لیے بھی قطعی غلط ہے کہ اس آیت سے پہلے اور بعد کی آیات میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی ذکر ہی نہیں ہے کیونکہ شروع آیات میں صرف حضرت مسیح علیہ السلام کا ذکر ہو رہا ہے اور آیت کے آخر میں یہ ارشاد ہے ویوم القیامۃ یکون علیھم شھیدا، اور یہ بالکل واضح ہے کہ اس جگہ شاہد سے حضرت عیسیٰ اور علیہم کی ضمیر سے ان کی اُمت مراد ہے تو پھر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیے بغیر درمیان کی کسی ضمیر کا مرجع حضور انور کو قرار دینا نہ صرف یہ کہ فصاحت و بلاغت کے منافی ہے بلکہ قاعدہ عربیت کے قطعاً خلاف اور انتشار ضمائر کا موجب ہے۔

غرض بے غل و غش صحیح معنے وہی ہیں جو جمہور نے اختیار کیے ہیں اور یہ دونوں خود ساختہ احتمالات آیت کی تفسیر تو کیا صحیح احتمال بھی کہلانے کے بھی مستحق نہیں ہیں۔

فَبِظُلْمٍ مِّنَ الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ طَيِّبٰتٍ اُحِلَّتْ
لَهُمْ وَبِصَدِّهِمْ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ كَثِيْرًا ۝ وَّاَخْذِهِمُ
الرِّبٰوا وَقَدْ نُهُوْا عَنْهُ وَاَكْلِهِمْ اَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ ۚ
وَاَعْتَدْنَا لِلْكٰفِرِيْنَ مِنْهُمْ عَذَابًا اَلِيْمًا ۝ لٰكِنِ الرّٰسِخُوْنَ
فِى الْعِلْمِ مِنْهُمْ وَالْمُؤْمِنُوْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ
وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلِكَ وَالْمُقِيْمِيْنَ الصَّلٰوةَ وَالْمُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَالْمُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ ؕ اُولٰٓئِكَ
سَنُؤْتِيْهِمْ اَجْرًا عَظِيْمًا ۝

بس یہودیوں کی ظلم کاری کی وجہ سے ہم نے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں
جو ان پر حلال تھیں حرام کر دیں [۲۳۸] اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں
کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے [۲۳۸] - اور اس وجہ سے کہ وہ باوجود
منع کیے جانے کے سود لیتے تھے [۲۳۹] - اور اس وجہ سے بھی کہ وہ

لوگوں کے اموال ناجائز طور پر کھاتے تھے [۲۳۰] ۔ اور ان میں کافروں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے [۲۳۱] ۔ مگر ہاں جو لوگ ان میں سے علم میں پکے ہیں اور جو ایمان والے اس کتاب پر جو تم پر نازل ہوتی ہے اور ان پر جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہیں ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور خدا اور آخرت کو مانتے ہیں ان کو ہم ضرور اجر عظیم دیں گے [۲۳۲] ۔

فضائل ورذائل کا تقابلی مطالعہ

ان آیات میں رذائل کا فضائل سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ پہلے رذائل پیش کیے گئے ہیں، بعدازیں ان کے مقابلے پر فضائل بتائے گئے ہیں اور دونوں کے نتائج الگ الگ عذاب الیم اور اجر عظیم بول کر بتاتے گئے ہیں یعنی رذائل کا نتیجہ عذاب الیم اور فضائل کا اجر عظیم قرار دیا گیا ہے۔ ظلم کاری، راہ خدا یعنی نیکی کے کاموں میں رکاوٹیں کھڑی کرنا، سُود ستانی اور لوگوں کا مال غلط طور پر کھانے کو رذائل میں شمار کیا گیا ہے۔ گویا یہ ام الرذائل ہیں۔ باقی دوسرے رذائل کا بلاواسطہ اور بالواسطہ غیرہ سب ان ہی سے ملتا ہے۔

یہودیوں کے تذکرے میں ان رذائل کا اضافہ یہ بتانے کے لیے کہ یہودیوں کی جن اجتماعی برائیوں کا پہلے ذکر ہو چکا ہے ان کے ساتھ یہ برائیاں بھی ان کی قومی زندگی کا حصہ بن چکی تھیں۔ ان برائیوں میں ملوث ہونے کی وجہ سے وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے قبول کرنے سے گریز کر رہے ہیں اور اسی بنا پر وہ پہلے انبیاؑ کے گستاخ اور بے ادب اور قاتل بنے رہے۔ اس سے معلوم

ہوا کہ برائیوں سے برائیاں جنم لیتی ہیں اور نیکیوں کی قدریں گر جاتی ہیں۔ اہل ایمان کو اشاروں میں بتایا جا رہا ہے کہ تم ان برائیوں سے بچ کر رہنا ورنہ تمہارا انجام بھی یہی ہوگا جو یہودیوں کا تمہارے سامنے ہے۔

رذائل کے مقابلہ پر رسوخ علمی، ایمان، اقامت صلوٰۃ، ایتاء زکوٰۃ کو بطور فضائل پیش کیا ہے اور اشارہ کیا ہے کہ یہ اس قدر طاقتور ہیں کہ اگر ان پر قابو پالیا جائے تو باقی خوبیوں پر قابو پالینا بہت آسان ہے۔ اسلام کے پیش نظر اخلاق کی علمی و نظری حیثیت نہیں بلکہ عملی ہے کیونکہ اس کا منشا انسان کو صرف اخلاق کا علم بخشنا نہیں بلکہ انسان کو فضائل اخلاق کا عامل بنانا اور رذائل اخلاق سے عملاً بچانا ہے اس لیے وہ یہ بحث نہیں کرتا کہ فلاں خلق کی اصلیت کیا ہے اور اس سے دوسرے اخلاق کس طرح پیدا ہوتے ہیں بلکہ اس سے بحث کرتا ہے کہ انسان کو کس طرح اچھے اخلاق کا پابند بنایا جائے اور کس طرح برے اخلاق سے بچایا جائے، اسی لیے اس نے اپنی تعلیم میں فلسفہ کا رنگ اختیار نہیں کیا۔

قرآن اخلاق کو دو ہی قسموں میں تقسیم کرتا ہے وہ اخلاق جن کو اللہ سبحانہ پسند کرتا ہے یہ فضائل کہلاتے ہیں اور وہ کام جن کو اللہ ناپسند کرتا ہے یہ رذائل کہلاتے ہیں۔ اس آیت میں قرآن نے دونوں کا اجمالی اور بنیادی نقشہ پیش کیا ہے۔

۲۳۷۔ پس ہم نے یہودیوں کی ظلم کاری کی وجہ سے ان پر وہ پاکیزہ چیزیں جو ان کے لیے حلال تھیں حرام کر دیں۔

یہاں سمجھنے کی یہ باتیں ہیں۔ اولاً یہ کہ یہاں جسے ظلم کہا گیا ہے سورۃ انعام کی آیت ۱۴۶ میں اسے بغی فرمایا ہے ذالك جزيناهم ببغيهم یہ ہم نے ان کو ان کی سرکشی کی سزا دی تھی۔ بغی کے معنے زیادتی اور دست درازی کے آتے ہیں۔ اور اس لحاظ سے یہ ظلم کے مرادف ہے۔ دونوں میں ایک جوہری فرق ہے۔ ظلم کے معنے بے موقعہ، بے محل اور بے جا استعمال کے ہیں اور یہ اپنی ذات کی حد تک بھی ہو سکتا ہے برخلاف بغی کے کہ یہ اپنی ذات کی حد تک زیادتی کے لیے نہیں بلکہ دوسروں کے حقوق کو ہڑپ کرنا، دوسروں پر دست درازی کرنے پر بولا جاتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ یہودی دونوں قسم کی برائیوں میں مبتلا تھے، انفرادی و ذاتی بھی اور اجتماعی اور قومی بھی۔ انفرادی حیثیت میں وہ جھوٹے تھے، زبان کے جھوٹ تھے اور جماعتی حیثیت میں وہ بدعہد اور بے ایمان تھے۔ قرآن نے یہاں ان دونوں قسم کے گناہوں کا ذکر نہیں کیا بلکہ صرف قومی اور اجتماعی قسم کے گناہوں کی نشاندہی کی ہے۔ یعنی آیت میں رذائل کو تین لفظوں میں پیش کیا ہے۔ ایک لوگوں کو اللہ کے راستہ

سے روکنا۔ دوسرے سُود لینا تیسرے لوگوں کے اموال پر ناجائز قبضہ۔ ان قومی رذائل کی جن کو ہر مذہب اور ہر انسانی معاشرت نے بُرا کہا ہے۔ اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت خدا کے ناپسندیدہ کام ہیں، اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ ہیں۔ اگر ان کو جائز ٹھہرایا جائے تو شہریوں کے باہمی حقوق سے امان اٹھ جائے اور کسی کی جان و مال و آبرو محفوظ نہ رہے۔

ان تینوں کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جاسکتی ہے ایک ان میں سے کسی بُرائی کا اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ ناپسندیدگی اور عدم رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے۔ پہلی ترتیب کے ساتھ اجتماعی، معاشی رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ سب سے پہلے صدعن سبیل اللہ پھر اخذ ربا پھر اکل اموال الناس بالباطل، صدعن سبیل اللہ میں جس بُرائی کی طرف اشارہ ہے وہ اساساً ہمہ گیر ہے، ایمان، اعمال اور اخلاق کی ساری خوبیوں اور اچھائیوں کے خلاف قدغن قائم کرنا اس سے جماعت کی پوری دینی، اخلاقی اور معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے۔ سُود ستانی سے انسانی معاشرت تباہی اور بربادی کے دھانے پر کھڑی جاتی ہے، اور اکل اموال الناس کی بُرائی وہ بُرائی ہے کہ جماعت سے آگے بڑھ کر پورے ملک و ملت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے۔ یہ تو ایک نظریہ کے مطابق ان رذائل کی ترتیب ہے، دوسرے نظریہ کی رُو سے پہلے وہ ذمیم کردار ہے جس سے خدا کی رضا چھن جاتی ہے۔ پھر وہ بُرائی ہے جس سے خدا کی محبت سے محروم ہوجاتا ہے اور پھر وہ ہے جس سے خدا کی رحمت سے خالی ہوجاتا ہے۔

ثانیاً یہ مضمون قرآن عزیز میں تین جگہ بیان ہوا ہے۔ سورۃ آل عمران میں گزر چکا ہے کل الطعام کان حلا لبنی اسرائیل الا ما حرم اسرائیل علی نفسہ من قبل ان تنزل التوراۃ۔ کھانے کی ساری چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں، البتہ جو چیزیں ایسی تھیں جن کو تورات نازل ہونے سے پہلے حضرت یعقوب نے اپنے اوپر حرام کر لیا تھا۔ پھر اس آیت میں فرمایا کہ فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم ہم نے بہت سی پاکیزہ چیزیں بنی اسرائیل کے ظلم کی وجہ سے ان پر حرام کر دیں جو پہلے ان کے لیے حلال تھیں۔ اس کے بعد آٹھویں پارے میں اس اجمال کی تفصیل آ رہی ہے جس میں بتایا ہے کہ ان سرکشیوں کی وجہ سے ہم نے ان پر تمام ناخن والے جانور حرام کیے، بکری اور گائے کی چربی بھی ان کے لیے حرام ٹھہرا دی۔ ان تینوں آیتوں کے جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت اسلامی اور یہودی فقہ کے درمیان حیوانی غذاؤں کی حلت و حرمت کے معاملہ میں جو فرق پایا جاتا ہے وہ دو وجوہ پر مبنی ہے۔

ایک یہ کہ نزولِ تورات سے صدیوں پہلے حضرت یعقوب نے کچھ چیزوں کا استعمال چھوڑ دیا تھا اور ان کے بعد ان کی اولاد نے بھی ان چیزوں کو چھوڑے رکھا تھا تا آنکہ یہودی علمار نے ان پر قانونی حرمت قائم کر دی۔ اور ان کی حرمت تورات میں لکھ لی۔ ان اشیا میں اونٹ، خرگوش اور سافان شامل ہیں۔ آج بائبل میں تورات کے جو اجزار موجود ہیں، ان میں ان تینوں چیزوں کی حرمت کا ذکر ہے چنانچہ احبار کے باب ۱۱ میں ہے:

گمراں میں سے جو جگالی کرتے ہیں یا کھاں کے چرے ہوئے ہوتے ہیں ان کو نہ کھاؤ جیسے اونٹ وہ جگالی تو کرتا ہے پھر کھر اس کا چرا ہوا نہیں ہوتا، سو وہ تمہارے لیے ناپاک ہے۔ اور صافن کو وہ جگالی کرتا ہے اور کھر اس کا چرا ہوا نہیں تو وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے۔ اور خرگوش کہ وہ جگالی تو کرتا ہے پھر اس کا کھر چرا ہوا نہیں ہے وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے اور سور کہ کھر اس کا دو حصہ ہوتا ہے اور اس کا پاؤں چرا ہے، پھر وہ جگالی نہیں کرتا وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے۔ تم ان کے گوشت میں سے کچھ نہ کھائیو، اور ان کی لاشوں کو نہ چھوئیو کہ یہ تمہارے لیے ناپاک ہیں۔ (۴۔۵۔۶۔۷)

اور استثنا کے باب ۱۴ میں ہے:

لیکن ان میں سے کہ جگالی کرتے ہیں یا ان کے کھر چرے ہوتے ہیں۔ تم ان کو نہ کھاؤ جیسے اونٹ، خرگوش اور بربوع اس لیے کہ یہ جگالی کرتے ہیں، لیکن ان کے کھر چرے ہوئے نہیں ہیں سو یہ تمہارے لیے ناپاک ہیں۔ اور سور کہ اس کے کھر چرے ہوتے ہیں پر جگالی نہیں کرتا وہ تمہارے لیے ناپاک ہے تم ان کا گوشت نہ کھائیو اور نہ ان کی لاش کو ہاتھ لگائیو۔ (۶۔۷۔۸)

لیکن آلِ عمران میں یہودیوں کو جو یہ چیلنج دیا گیا تھا کہ

فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا ان کنتم صادقین

اور دکھاؤ تورات اور پڑھو اس کو تم اپنے دعوے میں سچے ہو۔

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تورات میں ان احکام کا اضافہ بعد میں کیا گیا ہے کیونکہ اگر اس وقت تورات میں یہ احکام ہوتے تو یہودی فوراً لاکر پیش کر دیتے۔

دوسرے یہ کہ اللہ کی شریعت سے جب یہودیوں نے بغاوت کی اور خود ہی شارع بن بیٹھے

تو انہوں نے بہت سی پاک چیزوں کو اپنی موشگافیوں سے خود حرام کر لیا۔ اور اللہ تعالیٰ نے سزا کے طور پر اسے قائم رہنے دیا۔ ان اشیاء میں ایک تو ناخن والے جانور شامل ہیں جیسے شتر مرغ، قاز، بطخ، وغیرہ دوسرے گائے اور بکری کی چربی۔ بائیبل میں ان دونوں قسم کی حرمتوں کو احکام تورات میں داخل کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ تورات میں کتاب احبار کے گیارہویں باب میں ہے۔

> اور پرندوں سے جن سے تم گھن کرو اور جن کو نہ کھاؤ اس لیے کہ وہ مکروہ ہیں۔ سو یہ ہیں۔ نسر، عقاب اور گدھ، اور چیل اور شاہین اور سب اس کی قسمیں اور کوے اور اس کی اقسام، اور شتر مرغ اور اُلو اور کوکل اور، باز اور سب اس کی قسمیں اور بوم اور ہڑگیلا اور رخم اور راج ہنس اور حواصل اور چوہے مار، اور لق لق اور بگلا اور سب اس کی قسمیں اور ہُدہد اور چمگادڑ اور سب پرندے جو چار پاؤں پر چلتے ہیں وہ تمہارے لیے مکروہ ہیں (۱۳ سے ۲۰ تک)

اور تورات کے کتاب احبار کے باب ہفتم میں ہے:

> پھر خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ بنی اسرائیل کو حکم کر کہ بیل اور بھیڑ اور بکری کی چربی نہ کھائیو۔ اور اس حیوان کی چربی بھی جو خود بخود مر گیا یا جس کو درندوں نے پھاڑا ہو تو اسے اور کاموں میں لا سکتے ہو پھر اس کو ہرگز نہ کھائیو۔

لیکن قرآن کی اس آیت کا اشارہ بتاتا ہے کہ یہ چیزیں تورات میں حرام نہ تھیں بلکہ حضرت عیسیٰ کے بعد حرام ہوتی ہیں۔ اور تاریخ بھی شہادت دیتی ہے کہ موجودہ یہودی شریعت کی تدوین دوسری صدی عیسوی کے آخر میں ربی یہوداہ کے ہاتھوں مکمل ہوتی مگر پہلے کچھ زیادہ وزنی نہیں ہے اصل یہی ہے اور یہی عامہ مفسرین کی رائے ہے کہ نزول انبیاء بنی اسرائیل کے زمانے میں یہ سب چیزیں یہودیوں پر اللہ سبحانہ کی جانب سے بطور سزا حرام ہوتی ہیں۔ یہ صورت اپنی جگہ معنویت بھی رکھتی ہے اور اس کے لیے تاویل کے کسی کمزور سہارے کی بھی ضرورت نہیں ہے

پہلی صورت میں یعنی یہ کہ یہ چیزیں حضرت عیسیٰ کے بعد خود یہودی علماء نے اپنے لیے حرام کی تھیں یہ سوال ابھرتا ہے کہ اگر ایسا ہی ہے تو قرآن نے یہاں حرمنا طیبات احلت لھم کی تعبیر کیوں اختیار کی ہے۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ خدائی تحریم کی صرف یہی ایک صورت نہیں ہے کہ وہ کسی پیغمبر یا کتاب کے ذریعے سے کسی چیز کو حرام کرے بلکہ اس کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ وہ اپنے باغی بندوں پر خانہ ساز شارعوں اور جعلی قانون سازوں کو مسلط کر دے اور

وہ ان پر طیبات کو حرام کردیں ، ایک یہ معنے تاویل ہے ، اصل یہی ہے کہ یہ تحریم نبوت ہی کے ذریعے اللہ سبحانہ کی جانب سے ہوتی ہے اور بطور سزا ہوتی - مولانا آزاد کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ

جب کسی جماعت میں راست بازی اور پرہیزگاری باقی نہیں رہتی تو مباح اور جائز باتوں کا بھی استعمال اس طرح کرنے لگتی ہے کہ طرح طرح کی برائیوں کا ذریعہ بن جاتی ہیں اور اس وقت مصلح کے لیے ضروری ہو جاتا ہے سداللذریعہ ان جائز باتوں کو بھی عارضی طور پر روک دے - چنانچہ یہودیوں کی بے لگام طبیعت کا بھی حال تھا - نتیجہ یہ نکلا کہ کتنی ہی حلال چیزیں جن کے لیے پہلے کوئی روک ٹوک نہ تھی مصلحتاً روک دی گئیں - یہاں اسی معاملہ کی طرف اشارہ ہے -

اللہ کی راہ سے رُکنا اور روکنا

۲۳۸ - اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے تھے - صد کے عربی میں رکنے اور رکنے کے معنے آتے ہیں یعنی لازم بھی آتا ہے اور متعدی بھی - عامہ شارحین قرآن نے یہاں متعدی معنے لیے ہیں - اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ وہ غلط قیادت کے ذریعے لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں یا یہ کہ لوگوں کو منکرات کا حکم دیتے ہیں اور معروف سے روکتے ہیں یعنی صرف اسی پر اکتفا نہیں کرتے کہ خود اللہ کے راستے سے منحرف ہیں بلکہ اس قدر بے باک ہو چکے ہیں کہ مجرمین کی قیادت کرکے اکابر مجرمین کا منصب اختیار کر لیتے ہیں اور دُنیا میں خدا کے بندوں کو گمراہ کرنے کے لیے جو بھی آوازہ بلند ہوتا ہے اس کی قیادت بھی یہودی کرتے ہیں ، اور اللہ کی طرف بلانے کے لیے جو آواز اٹھتی ہے اس کے مقابلہ میں سب سے بڑی روک بن کر کھڑے ہو جاتے ہیں حالانکہ یہ اللہ کی کتاب ، اللہ کے رسُولوں کو ماننے والے ہیں - دُنیا میں تمام بری تحریکوں کا شجرہ نسب بالواسطہ اور بلا واسطہ یہود سے ملتا ہے - دُنیا کی تاریخ میں پہلی مرتبہ جو نظام زندگی اور نظام حکومت خدا کے انکار اور اس کی کھلم کھلا بغاوت پر قائم ہوا ، اس کا سہرا ان ہی کے سر پر ہے چاہے وہ فرائڈ کا نظریہ جنسیت ہو یا کارل مارکس کا نظریہ اشتراکیت ، مذہب کے لباس میں نہیں بلکہ فلسفہ کے لباس میں نمودار ہو کر پوری انسانیت کو اللہ کے راستے سے روک رہا ہے - اس کی اسلام کے خلاف جارحانہ کارروائیاں مذاہب باطلہ کی جارحانہ کارروائیوں سے بالکل مختلف ہیں - مذاہب باطلہ براہ راست اور بلا واسطہ اسلام کے مقابلہ پر آتے تھے یہ باطل فلسفہ یعنی اشتراکیت اور جنسیت براہ راست اسلام کے مقابلہ پر نہیں آتا بلکہ علم اور عقل کے نام سے مقابلہ کرتا ہے - وہ

جب اسلام کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرتا ہے تو اسلام کا نام نہیں لیتا بلکہ اسلام سے اس طرح قطع نظر کرتا ہے کہ گویا اسے معلوم ہی نہیں کہ اسلام بھی اس کے حریف کی حیثیت سے دُنیا میں موجود ہے بلکہ وہ علمی تحقیق اور عقلی استدلال کے بل بوتے پر انسان اور کائنات کی ایسی تشریح کرتا ہے، خدا، رسُول، کتاب اور آخرت کی کوئی گنجائش باقی نہیں رہتی کیونکہ اسلام بھی انسان اور کائنات ہی کا ایک نظریہ ہے۔ وہ عقیدہ اور سند کو قابلِ اعتنا نہیں سمجھتا بلکہ وہ ان کو علم اور عقل کے معیار پر پرکھتا ہے اور صرف اور اس کے ناقابلِ تغیر و تردید قوانین کے نام لا مذہبیت اور دہریت کی طرف دعوت دیتا ہے۔

اسلامی غیرت کا زوال

یہی یہودی جب مذہب کے نام پر اسلام کی راہ روکتا تھا تو ہماری اسلامی حمیت جوش میں آجاتی تھی اور ہمارے دل میں اس کی مخالفت اور اس کے مقابلے میں اسلام کی مدافعت اور محافظت کا جذبہ ابھرتا تھا۔ ہمیں ذرہ بھر شبہ نہ ہوتا کہ اس کا ماننا اسلام کا انکار ہے اور اس کا اثبات اسلام کی نفی ہے لیکن یہی یہودی جب سے اشتراکیت اور جنسیت کے نظریات کے نام پر اسلام کی راہ میں رکاوٹ بن کر آیا ہے تو ہماری اسلامی غیرت کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا اور اس کے مقابلہ میں اسلام کی مدافعت اور حمایت کا جذبہ کمزور ہو گیا۔ جب اس کے دام ہمرنگ زمین میں پھنستے ہیں تو بے علمی اور جہالت قبول کرتے ہیں اور اسے علم کا نام دیتے ہیں اور بے عقلی و نادانی اختیار کرتے ہیں اور اسے عقل اور زیرکی سمجھتے ہیں۔ ہم اشتراکیت اور جنسیت کے نام پر ان کے نظریات کو مانتے ہیں اور ہمارے دل میں یہ بات کھٹکتی نہیں ہے کہ ان کے اثبات سے اسلام کی نفی ہوتی ہے اور ہمیں احساس تک نہیں ہوتا کہ یہ صد عن سبیل اللہ ہے۔ ہم ان کو حریف نہیں حلیف سمجھ رہے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہماری بربادی کی جن کوششوں میں یہودی مصروف ہیں وہ ہمارے ہی ہاتھوں سے زیادہ موثر اور زیادہ کامیاب ہو رہی ہیں۔

یہودی رکاوٹ دام ہمرنگ زمین ہے

غلط مذہب کے اثر سے جب کوئی مسلمان اسلام کو خیرباد کہتا تھا تو وہ مجبور ہوتا تھا کہ کسی گرجا یا مندر میں جاکر شدھی یا بپتسمہ کی ایک خاص رسمی کارروائی میں سے گزرے اس کے بعد وہ مسلمانوں کی

جماعت سے الگ ہو جاتا تھا اور ان سے ہر قسم کی سماجی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات منقطع کر لیتا تھا۔ اس کی عبادات کی رسمیں اور بود و باش کے طریقے بدل جاتے تھے اور وہ شادی بیاہ اور دوستی اور رشتہ داری اور میل و ملاقات کے لیے ایک دوسری قوم سے راہ و ربط پیدا کرتا تھا۔ اس طرح اس کا کفر کھل کر سامنے آجاتا۔ اسلام سے اس کی دشمنی اور نفرت آشکارا ہو جاتی تھی اور مسلمان اس کی طرف سے ہوشیار ہو جاتے لیکن یہودی باطل فلسفہ کے اثر سے اب جب کوئی مسلمان اشتراکیت کو اختیار کرتا ہے تو وہ مجبور نہیں ہوتا کہ عیسائی یا ہندو کی طرح کسی رسمی کارروائی میں سے گزرے یا مسلمانوں کی جماعت سے الگ ہو جائے یا ان سے اپنے سماجی، اقتصادی اور سیاسی تعلقات منقطع کرے یا اپنی بود و باش کے طریقوں کو بدلے کیونکہ یہودیت کے صد عن سبیل اللہ کے اس نئے روپ نے اپنے ہمنواؤں کو اجازت دے رکھی ہے کہ تم مذہب سے بیزار ہو کر اور خدا اور رسول کے دشمن بن کر بیتے ہوئے اسلام کے دائرے میں اگر رہو تو کوئی حرج نہیں ہے۔ چنانچہ اس دشمن دین و ایمان سے آج مسلمان ایسے ہیں جو یا تو خدا کے منکر یا وحی و رسالت کے یا حیات بعد الموت کے یا جزا و سزا کے اور یا ان سب کے۔ ان میں کچھ ایسے ہیں جو کہتے ہیں کہ اسلامی نظام اس زمانے میں ناقابل عمل ہے۔ اور بعض کا خیال ہے کہ مذہب ایک ڈھکوسلا ہے۔ جو یا تو اقتصادی حالت کا نتیجہ ہوتا ہے یا دبی ہوئی جنسی خواہشات کا رد عمل۔ پھر ان میں سے کوئی اسلام کے معاشی نظام کو فرسودہ اور بیکار سمجھتا ہے۔ کوئی اسلامی حکومت کی تجویز کا مذاق اڑاتا ہے کوئی جنسی تعلقات پر اسلام کی لگائی ہوئی پابندیوں کو ایک فطری عمل کی ناجائز مضر صحت اور بے وقت رکاوٹ سمجھ کر ان کا استخفاف کرتا ہے کوئی اسلام کے عبادت کے طریقوں کو بے معنے سمجھتا ہے۔ کوئی زکوٰۃ کو موقوف کرنا چاہتا ہے کوئی حج کو، کوئی نماز کو اور کوئی روزے کو۔ ان میں سے اکثر ایسے ہیں جو اسلام ہی کے نام پر اسلام کی بنیادی باتوں کا انکار کرتے ہیں اور اس کے اساسی اصولوں کا مذاق اڑاتے ہیں۔ وہ اپنے غیر اسلامی تصورات پر اسلام کا لیبل لگاتے ہیں۔ ان ساری کارگزاریوں کے باوجود یہ لوگ مسلمان بنے بیٹھے ہیں اور مسلمانوں سے شادی بیاہ، دوستی اور رشتہ داری، میل و ملاقات اور کھانے پینے کے تعلقات رکھے ہوئے ہیں۔ الا اللہ فالی اللہ المشتکی۔

ہمارے شارحین قرآن نے اس آیت میں اللہ کے راستے سے روکنے سے مراد یہ بتا کر یہودی لوگوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لانے سے روکتے تھے۔ آیت کی معنویت میں بہت بڑی الجھن پیدا کر دی۔ کیونکہ اگر آیت سے مراد یہ ہے تو یہودیوں کا لوگوں کو نبوت محمدیہ کے ماننے سے روکنا طیبات کے حرام ہونے کی کیسے علت بن سکتا ہے، حالانکہ گفتگو یہود کی قومی زندگی کے

شنائع پر ہو رہی ہے۔

آیت میں کثیراً کے اضافہ سے فقرے میں بہت بڑی معنوی وسعت آگئی ہے۔ کثیراً کے ایک معنے تو یہی ہیں کہ وہ بہت لوگوں کو راہِ حق سے روکتے تھے۔ دوسرے معنے یہ بھی ہو سکتے ہیں کہ ان میں لوگوں کو راہِ حق سے ہٹانے اور روکنے کی عادت بہت زیادہ تھی۔ تیسرے معنے یہ بھی بتائے گئے ہیں کہ نسلاً کثیراً وہ عرصہ دراز تک یہ کام کرتے رہے ہیں۔ بہرحال کثرت کا کمیت اور کیفیت اور زمانہ تینوں سے تعلق ہو سکتا ہے۔

یہود کو سود کی ممانعت

۱۳۹۔ اور اس وجہ سے بھی کہ وہ باوجود منع کیے جانے کے وہ سود لیتے تھے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن بتا رہا ہے کہ یہودیوں کے لیے بلا قید سود حرام تھا لیکن یہود کے احبار اور فقہاء نے اس میں بھی قیدیں لگا رکھی تھیں۔ چنانچہ تورات کی کتاب خروج کے باب ۲۲ میں ہے:

> اگر تو میرے لوگوں میں سے کسی محتاج کو جو تیرے پاس رہتا ہو قرض دے تو اس سے قرض خواہ کی طرح سلوک نہ کرنا اور نہ اس سے سود لینا۔ اگر تو کسی وقت اپنے ہمسایہ کے کپڑے گرو رکھ بھی لے تو سورج کے ڈوبنے اس کو واپس کر دینا۔ کیونکہ فقط وہی ایک اس کا اوڑھنا ہے اس کے جسم کا وہی لباس ہے۔ پھر کیا وہ اوڑھ کر سوئے گا۔ پس جب وہ فریاد کرے گا تو میں اس کی سنوں گا کیونکہ میں مہربان ہوں۔
>
> (آیت ۲۵، ۲۶، ۲۷)

اور تورات کتاب احبار کے باب ۲۵ میں ہے:

> اور اگر تمہارا بھائی تمہارے بیچ میں محتاج اور تہی دست ہو جائے تو تم اس کی دستگیری کرو خواہ وہ اجنبی ہو خواہ مسافر تاکہ وہ تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے تو اس سے سود اور نفع مت لے، پھر اپنے خدا سے ڈر و تاکہ تیرا بھائی تیرے ساتھ زندگانی بسر کرے تو اسے سود پر روپیہ قرض دے نہ اسے نفع کے لیے کھانا کھلا۔ میں خداوند تمہارا خدا ہوں جو تم کو زمین مصر نکال لایا تاکہ تمہیں کنعان کی زمین دوں اور تمہارا خدا ہوں۔ (۳۵، ۳۶، ۳۷، ۳۸)

اور تورات کی کتاب تثنیۃ الاستثناء میں ہے:

تو اپنے بھائی کو سُود پر قرض نہ دینا نہ نقد کے سُود پر نہ غلّہ جات کے سُود پر، نہ کسی چیز کے جس کی عادت پر سُود پر کی جاتی۔ تو اجنبی کو سُودی قرض دے سکتا ہے پر اپنے بھائی کو سُودی قرض نہ دینا تاکہ خداوند تیرا اس سرزمین جس کا تو وارث ہونے جاتا ہے۔ ان سب کاموں میں جن میں تو ہاتھ لگائے تجھے برکت دے۔ (۱۹، ۲۰)

بلا ریب یہ اجنبی اور بھائی، یگانے اور بیگانے کی سُود کے موضوع پر تفریق اُس تورات کی ہرگز آواز نہیں ہے جو حضرت موسیٰ پر نازل ہوئی ہے۔ یہ یہودی احبار کا تحریفی کارنامہ ہے یا پھر اصل تورات کی گمشدگی کے بعد روایت بالمعنے ہے۔ انبیاء بنی اسرائیل کی تصریحات بتا رہی ہیں کہ سُود یہودیوں پر بلا قید حرام تھا اس میں یگانے اور بیگانے کی کوئی تقسیم نہ تھی۔

حضرت داؤد علیہ السلام اپنے ۱۵ زبور میں فرماتے ہیں،

اے خداوند تیرے خیمے میں کون رہے گا۔ تیرے کوہ مقدس پر کون سکونت کرے گا۔ وہ جو سیدھی چال چلتا ہے اور صداقت کے کام کرتا ہے اور اپنے دل سے سچ بولتا ہے وہ جو اپنی زبان سے چغلی نہیں کھاتا اور اپنے ہمسایہ سے بدی نہیں کرتا اور اپنے پڑوسی پر عیب نہیں لگاتا ہے۔ وہ جس کی نظر میں نکما آدمی خوار ہے پر وہ انہیں جو خداوند سے ڈرتے ہیں عزت دیتا ہے۔ وہ جو اپنے ضرر پر قسمیں کھاتا ہے اور بدلتا نہیں۔ وہ جو سُود کے لیے قرض نہیں دیتا، اور بے گناہوں کو ستانے کے لیے رشوت نہیں لیتا وہ جو یہ کرتا ہے کبھی نہ ٹلے گا۔

حضرت سلیمان نے جہاں امثال میں بُرے لوگوں کا چہرہ پیش فرمایا ہے وہاں یہ بھی ایک نشانی بتائی ہے۔

جو سُود خواری اور ظلم سے اپنی دولت بڑھاتا ہے وہ اس کے لیے جو مسکینوں پر رحم کرنے بٹورتا ہے۔ (۸ : ۹)

حضرت حزقی ایل اپنی ربانی وحی میں اچھوں اور بروں کے اعمال کی عکاسی کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

اور کسی پر ستم نہیں کیا، اور قرض دار کا گرو پھیر دیا۔ اور ظلم سے کچھ چھین نہیں لیا ہے۔ بھوکوں کو اپنی روٹی کھلاتی ہے اور ننگے کو کپڑے پہنائے ہیں۔ سُود پر نہیں دیا لیا اور بدی سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا ہے۔ (۸ ، ۷)

ظاہر ہے کہ ان انبیاء کی شریعت و قانون کا نام تورات ہے اس لیے اصل تورات میں سُود

علی الاطلاق حرام تھا لیکن بعد میں یہودی فقہاء اور ان کے احبار کی ہاتھ کی صفائی نے اس میں قیدیں لگا دیں۔ اور سود ہی پر کیا موقوف ہے لین دین میں دیانتداری کے جس قدر بھی دینی احکام میں یہود میں وہ صرف اس لیے ہیں کہ اپنے آدمیوں کے ساتھ بدمعاملگی نہ کی جائے لیکن اگر آدمی دوسرے مذہب اور گروہ کا ہوگا تو اس کے ساتھ سچائی اور دیانت داری سے پیش آنا کچھ ضروری نہیں۔ جس طرح بھی غیروں کا مال کھا لیا جائے جائز ہے۔ گویا انہوں نے دین و صداقت کو اپنی نسل اور گروہ کا حق سمجھ لیا تھا۔ یہ قرآن نے آکر بتایا کہ دیانت تو ہر حال میں دیانت ہے اور خیانت ہر حال میں خیانت ہے۔

لوگوں کے اموال کو ناجائز طور پر کھانا

۲۴۰۔ اور اس وجہ سے بھی کہ وہ لوگوں کا مال ناجائز طور کھاتے تھے۔ اس فقرے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ حاکموں کو رشوت دے کر ناجائز فائدے اٹھاتے تھے، اور دوسرا مفہوم یہ ہے کہ لوگوں کی امانتوں میں خیانت کرکے لوگوں کا مال کھاتے۔ الفاظ میں اس قدر عموم ہے کہ اس کی آغوش میں سارے وسائل آجاتے ہیں۔ اس فقرے میں قرآن نے یہود کے جرائم کی فہرست میں بتایا ہے کہ وہ ناجائز طریقہ پر لوگوں کا مال کھاتے تھے۔ اس فقرے میں ان تمام طریقوں کی جو لین دین میں ایمانداری کے خلاف ہیں داستان بیان کر دی ہے اور جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں ہے، یعنی وہ کسی کی چیز دھوکا اور فریب سے لیتے یا زور و ظلم سے لیتے، غصب کرتے، چوری کرتے اس میں خیانت کرتے، رشوت لیتے غرض ہر ناجائز طریقہ سے دوسرے کا مال لیتے۔

اُخروی سزا

۲۴۱ اور ان میں سے کافروں کے لیے ہم نے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے۔ دنیوی سزا بیان کرنے کے بعد اس فقرے میں ان کی آخرت والی سزا بیان ہو رہی ہے۔ مطلب یہ ہے یہود کی اگلی پچھلی سخت سخت شرارتیں ذکر فرما کر جس سے ان کی سرکشی اور ان کا گناہوں پر دلیر ہونا ظاہر ہوگیا اب فرماتے ہیں کہ اسی واسطے ہم نے ان پر شریعت بھی سخت رکھی کہ ان کی سرکشی ٹوٹے تو اب یہ شبہ نہ رہا کہ تحریم طیبات تو ان پر تورات میں کی گئی تھی، اور حضرت عیسٰی کی مخالفت کرنا اور حضرت مریم پر تہمت لگانا نزول توریت کے بعد میں ہوا تو سزا جرم سے کیسے مقدم ہوگی۔ اس تمام رکوع کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ سے اہل کتاب برابر ایک ایک نادر شرارت، نافرمانی اور

عہد شکنی اور حضرات انبیاء کو ایذارسانی کرتے چلے آتے ہیں۔ اب اگر اے محمد رسول اللہ تم سے علاوہ تورات جیسی کتاب دفعۃً واحدۃً طلب کریں اور قرآن جو سب کتابوں سے افضل ہے۔ اس پر کفایت نہ کریں تو ان متعصب نالائقوں سے کیا بعید ہے ان کی اس قسم کی ناشائستہ حرکات پر تعجب نہ کرو اور متحیر نہ ہو ان کی تمام حرکات چھوٹی بڑی اگلی پچھلی ہم کو خوب معلوم ہیں۔ ہم نے بھی سخت شریعت ان کے لیے دُنیا میں رکھی اور آخرت میں عذاب عظیم ان کے لیے تیار کر رکھا ہے[1]

مقصد یہ ہے کہ قرآن اور پیغمبر پر ایمان لانے میں جو چیزیں ان کے لیے مانع ہیں وہ دراصل ان کے یہ جرائم ہیں۔ یہ ہمیشہ سے گردن کش اور نافرمان ہیں۔ انہوں نے اپنی سرکشی سے اپنے اوپر حلال چیزیں حرام کرائی ہیں اور اپنی سرکشی ہی کے سبب سے حق کی راہ میں روڑے بنے ہیں اور یہی چیز ہے جس نے ان کے لیے حرام خوری کے سارے دروازے کھول دیے جن کا کردار یہ ہو ان سے کس طرح توقع کرتے ہو کہ وہ کوئی بڑے سے بڑا معجزہ دیکھ کر قرآن پر ایمان لائیں گے فرمایا ان میں سے جتنے بھی کفر پر جم گئے ہیں ہم نے ان کے لیے دردناک عذاب تیار کر رکھا ہے[2]

مقصد یہ ہے کہ اس قوم کے جو لوگ ایمان و طاعت سے محروم ہو چکے ہیں اور بغاوت و سرکشی کی روش پر قائم ہیں ان کے لیے خدا کی طرف سے دردناک سزا تیار ہے۔ دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دُنیا میں جو عبرتناک سزا ان کو مل رہی ہے وہ کبھی کسی دوسری قوم کو نہیں ملی ہے دو ہزار برس ہو چکے ہیں کہ زمین پر کہیں ان کو عزت کا ٹھکانا میسر نہیں۔ دُنیا میں تتر بتر کر دیے گئے ہیں۔ اور ہر جگہ غریب الوطن ہیں۔ کوئی دور ایسا نہیں گزرتا جس میں وہ دنیا کے کسی نہ کسی خطے میں ذلت کے ساتھ پامال نہ کیے جاتے ہیں۔ اور اپنی دولت مندی کے باوجود کوئی جگہ ایسی نہیں جہاں انہیں احترام کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہو اور پھر غضب یہ ہے کہ قومیں پیدا ہوتی ہیں اور مٹتی ہیں مگر اس قوم کو موت بھی نہیں آتی۔ اس کو دُنیا میں لا یموت فیھا ولا یحییٰ کی سزا دی گئی ہے تاکہ قیامت تک دنیا کی قوموں کے لیے ایک زندہ نمونہ عبرت بنی رہے اور اپنی سرگزشت سے یہ سبق دیتی رہے کہ خدا کی کتاب بغل میں رکھ کر خدا کے مقابلے میں باغیانہ جسارتیں کرنے کا یہ انجام ہوتا ہے رہی آخرت تو انشاء اللہ وہاں کا عذاب اس سے بھی زیادہ دردناک ہوگا۔[3]

اس آیت کے الفاظ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سزائیں تو عموماً اجتماعی ہوتی ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن [3] تفہیم القرآن

چنانچہ فلاں نعمتوں سے ساری قوم محروم کر دی گئی لیکن آخرت میں سزائیں تمامتر انفرادی اور شخصی حیثیت سے ملتی ہیں۔ ہر ہر فرد اپنے اپنے اعمال کی سزا بھگتے گا۔ جہنم کا عذاب الیم صرف ان ہی افراد کو ہوگا جو کافر ہوں گے۔ لے

اہل کتاب کے علماء حقانی

۲۴۲ - مگر ہاں ان میں جو لوگ علم میں پکے ہیں، اور جو ایمان والے اس کتاب پر جو تم پر نازل ہوئی ہے اور اس پر جو تم سے پہلے نازل ہو چکی ہے۔ ایمان رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور خدا اور آخرت کو مانتے ہیں۔ ان کو ہم ضرور اجر عظیم دیں گے۔ یعنی بنی اسرائیل میں جن کا علم مضبوط ہے جیسے عبداللہ بن سلام اور ان کے ساتھی اور جو لوگ صاحب ایمان ہیں، وہ مانتے ہیں قرآن، توریت اور انجیل سب کو اور نماز کو قائم کرنے والوں کا تو کیا کہنا ہے اور دینے والے زکوٰۃ کے اور ایمان رکھنے والے اللہ پر اور قیامت پر اور ایسے لوگوں کو ہم اجر عظیم بخلاف اوّل فریق کے کہ ان کے لیے سخت عذاب ہے۔ لے

راسخین فی العلم سے مراد وہ علماء ہیں جن کے قدم علم شریعت میں خوب جمے ہوئے تھے۔ علم میں طول و عرض اور عمق تینوں ہوتے ہیں، علم کا عمق ہی رسوخ کہلاتا ہے۔ صحیح علم طول و عرض کا نام نہیں ہے بلکہ اس کے رسوخ اور عمق کا نام ہے۔ اکتسابی اور رسمی فنون چونکہ محض انسانی دماغ کی تخلیقات ہیں اس لیے قطعی نہیں بلکہ ظنی ہیں اور ظنیات میں چونکہ یقین حاصل نہیں ہوتا اس لیے تحصیل یقین کی سعی میں دلائل اور تحقیقات کا طول خواہ مخواہ پیدا ہو جاتا ہے لیکن وحی کا علم قطعی ہے وہ جتنا منقول ہے سب مغز ہی مغز ہے۔ اس میں طول و عرض نہیں ہوتا۔ اس کی گہرائی بے اندازہ ہوتی ہے اس سے پہلے یہودیوں کے بارے میں یہ انکشاف کیا تھا مالھم بہ من علم الا اتباع الظن اب یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ان یہودیوں میں کچھ ایسے ہیں جن کا علم ظنیات کا نہیں بلکہ علم میں رسوخ حاصل ہے۔ یعنی ان کو علم سطحی نہیں بلکہ عمیق علم حاصل ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے علمی چہرہ ان الفاظ میں پیش فرمایا اولئٰک ابرھم قلوباً و اعمقھم علماً یہ لوگ دل کے بے حد نیک اور علم میں بڑے گہرے ہیں۔ علامہ شاطبی غرناطی نے الموافقات

لے تفسیر ماجدی لے افادات شیخ الاسلام

نے شرح میں تیرہ مقدمات لکھے ہیں ان میں ہر مقدمہ اہم اور ضروری ہے لیکن بارہواں مقدمہ سب سے زیادہ اہم آپ فرماتے ہیں کہ علم ہمیشہ محقق اور راسخ فی العلم سے حاصل کرنا چاہیے۔ راسخ فی العلم کی نشانی یہ ہے کہ اس کے علم کا نسب نامہ صحیح ہو یعنی اس نے علم شیوخ کی زیر نگرانی حاصل کیا ہو صحبت اور ملازمت شیخ کو رسوخ علم میں بڑا دخل ہے۔ صحابہ کا علم اسی طریق پر تھا۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ میں ایک قل ھو اللہ احد پڑھنے والا مسئلہ توحید کو جس خوبی اور پختگی کے ساتھ سمجھا ہوا تھا۔ آج ہمارا تیس پاروں کا حافظ عالم بھی اس کا عشر عشیر نہیں سمجھتا ہے۔ یہود میں علماء کم نہ تھے بے شمار تھے لیکن شریعت ان کے لیے ایک نمائشی جامے کی حیثیت رکھتی تھی جس کو وہ پہن کر بازاروں اور عوام میں نکلا کرتے تھے۔ ان کے فکر و نظر اور قلب و روح سے علم کو کوئی تعلق نہ تھا۔ ہاں البتہ ان میں جو نفوس قدسی دین کی حقیقت سے آشنا تھے ان کے قدم علم شریعت میں راسخ تھے۔ یہاں ان ہی نفوس قدسی کو جو عام علماء یہود سے ممتاز کرنے کے لیے علماء سے نہیں بلکہ راسخون فی العلم سے پیش کیا ہے یعنی یہ آدمی کے خس و خاشاک کی طرح ہوا کے رخ پر اڑنے والے نہیں ہیں بلکہ چٹانوں کی طرح اپنے موقف حق پر جمنے والے ہیں۔

آیت میں المؤمنون سے مراد وہ سلیم الفطرت لوگ ہیں جو اگرچہ راسخین فی العلم کا درجہ تو نہیں رکھتے لیکن اپنی فطرت کی سلامتی، دل کی صلاحیت اور کردار کی پاکیزگی کے اعتبار سے تمام سوسائٹی میں ممتاز تھے اور یہود کے عام بگاڑ کے باوجود وہ خدا کی ہدایت و شریعت پر قائم تھے اور جب اسلام کی دعوت ان کے کانوں میں پڑی تو وہ اسے قبول کرنے کے لیے بھی اٹھ بڑھے۔ گویا ان کا علم راسخ اور ایمان ہی ان کی قیادت کر رہا تھا کہ دین کامل کو مانا جائے۔

تمام نبیوں کے واحد اور مشترک دین کا اصل الاصول دو باتیں ہیں توحید کامل اور رسالت محمدی، یعنی اللہ تعالیٰ کو توحید کی تمام صفتوں میں کامل اور بلا شریک ماننا اور اس کے تمام پیغمبروں کو یکساں صادق اور واجب تسلیم کرنا اور بس۔ اسی کا نام اسلام ہے جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا وہ آخرت میں گھاٹے میں رہے گا۔ ان یہودیوں کے رسوخ علمی اور ایمان نے ان کو اس ہدایت امر کے قبول کرنے پر آمادہ کر دیا جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے۔

اگرچہ شارحین قرآن نے ایسے یہودی علماء کے دور نبوت میں نام بھی بتائے ہیں لیکن الفاظ قرآنی عام ہیں اور قیامت تک کے لیے ہیں۔ اور یہود و نصاریٰ کی فلاح و نجات اسی کے ماننے پر منحصر ہے اسی لیے فرمایا یومنون بما انزل الیک و ما انزل من قبلک یہ مبتدا کی خبر ہے۔ یعنی یہ راسخین

فی العلم اور سلیم الفطرت لوگ اس قرآن پر بھی ایمان رکھتے ہیں اور اس سے پہلی کتابوں کا بھی ایمان رکھتے ہیں۔ اہل کتاب کا بھی گروہ ہے جس کی قرآن نے جگہ جگہ تعریف کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے کہ،

> اب جو ایمان لاتے اور جو یہودی ہوتے اور نصرانی اور صابئی، جو بھی خدا اور یوم آخرت پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیا اس کو خوف وغم نہ ہوگا۔

ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود ایمان کامل ہے اور اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ یہود و نصاریٰ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں۔ قرآن نے ایمان کامل کا چہرہ، پیش کیا ہے،

> قل آمنا باللہ وما انزل علینا وما انزل علی ابراھیم واسماعیل واسحاق و یعقوب والاسباط وما اوتی موسیٰ وعیسیٰ والنبیون من ربھم، لا نفرق بین احد منھم ونحن لہ مسلمون۔

قرآن نے اس آیت میں ایمان کامل یہ بتایا ہے کہ خدا اور اس کے تمام رسولوں کو مانا جائے کسی ایک کی تصدیق کرنی باقی سب کا انکار کر دینا یا سب کی تصدیق کرنی اور کسی ایک کا انکار کر دینا ایمان کامل نہیں ہے۔ اس کے بعد ان اہل ایمان اور راسخین فی العلم کی عملی زندگی پر تبصرہ کیا ہے۔ اور اعمال میں اولیت نماز کو دی ہے اور نماز کی اہمیت کی وجہ سے عام انداز بیان چھوڑ کر اختصاصی اور مدحی انداز اختیار کی ہے چنانچہ فرمایا والمقیمین الصلوٰۃ اور نماز قائم کرنے والے۔ عام تعبیر تو والمقیمون الصلوٰۃ ہونا چاہیے کیونکہ اس کا عطف والمومنون پر ہے لیکن نماز کی اہمیت اور زندگی میں اس کے اختصاصی مقام کو اجاگر کرنے کے لیے یہ انداز اختیار کیا ہے۔ عربی زبان کا یہ قاعدہ ہے کہ جب کسی کی خصوصیت اور ستائش جتانی مقصود ہوتی ہے تو اسے منصوب کر کے لاتے ہیں۔ شعرائے عرب کے کلام میں اس کی بے شمار مثالیں ہیں۔ تعبیر کی اس تبدیلی کا قاعدہ یہ ہوتا ہے کہ عام انداز کو چھوڑ کر یہ خاص انداز سننے والے کے لیے ایک طرف دلکش ہوتا ہے اور دوسری طرف بغیر کسی اضافے کے محض تبدیلی سے اس میں اختصاص کی روح پیدا ہو جاتی ہے۔ یہ گویا ان کی جن کے اوصاف بیان ہوئے ہیں غیر معمولی تعریف ہوگئی۔ خاص شارحین قرآن نے اپنے ترجمہ میں بھی اس کی رعایت کی ہے مثلاً شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ مدح می کنم برپا دارندگان نماز را، اور شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں اور آفرین نماز قائم کرنے والوں کو۔ نماز اور زکوٰۃ میں چولی دامن کا ساتھ ہے اس لیے ان کی عملی زندگی کے تذکرے میں نماز کے ساتھ زکوٰۃ کا ذکر کیا۔ آخر میں والمومنون باللہ والیوم الآخر کا مقام وہی ہے جو سورۃ البقرہ کے شروع میں

وبالآخرۃ ھم یوقنون کا ہے۔ جس طرح وہاں یومنون بالغیب اور دوسری صفات کے ذکر کے بعد یقین آخرت کو بیان کیا، کیونکہ آخرت پر یقین اس زندگی میں تمام خیر اور تقویٰ کا اصل محرک ہے اسی طرح یہاں بھی آخرت کی تذکیر کے لیے اس کا اعادہ فرما دیا۔ کیونکہ تمام دینی زندگی کی اصل بنیاد ایمان بالآخرت ہے۔

اِنَّآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ كَمَآ اَوْحَيْنَآ اِلٰى نُوْحٍ وَّالنَّبِيّٖنَ مِنْۢ
بَعْدِهٖ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰٓى اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَ
يَعْقُوْبَ وَالْاَسْبَاطِ وَعِيْسٰى وَ اَيُّوْبَ وَيُوْنُسَ وَ
هٰرُوْنَ وَسُلَيْمٰنَ ۚ وَاٰتَيْنَا دَاوٗدَ زَبُوْرًا ﴿۱۶۳﴾ وَرُسُلًا
قَدْ قَصَصْنٰهُمْ عَلَيْكَ مِنْ قَبْلُ وَ رُسُلًا لَّمْ نَقْصُصْهُمْ
عَلَيْكَ ۭ وَكَلَّمَ اللّٰهُ مُوْسٰى تَكْلِيْمًا ﴿۱۶۴﴾ رُسُلًا مُّبَشِّرِيْنَ وَ
مُنْذِرِيْنَ لِئَلَّا يَكُوْنَ لِلنَّاسِ عَلَى اللّٰهِ حُجَّةٌۢ بَعْدَ
الرُّسُلِ ۭ وَكَانَ اللّٰهُ عَزِيْزًا حَكِيْمًا ﴿۱۶۵﴾ لٰكِنِ اللّٰهُ يَشْهَدُ
بِمَآ اَنْزَلَ اِلَيْكَ اَنْزَلَهٗ بِعِلْمِهٖ ۚ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ يَشْهَدُوْنَ ۭ
وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا ﴿۱۶۶﴾

اے پیغمبر[۲۴۳] ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی بھیجی ہے، جس طرح
نوح اور اس کے بعد کے پیغمبروں کو روانہ کی تھی اور ہم نے ہی

ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب، عیسیٰ، ایوب یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی روانہ کی تھی، اور ہم نے ہی داؤد کو زبور دی[۲۴۳]۔ اور خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم قرآن میں پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے تمہیں نہیں سنایا اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی طور پر کلام ہوتا ہے[۲۴۵]۔ یہ تمام رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر بھیجے گئے تھے تاکہ ان کو روانہ کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے اور اللہ بہر حال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے[۲۴۶]۔ (لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں) مگر اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور اس پر فرشتے بھی گواہ ہیں، اور اللہ کی گواہی بس کرتی ہے[۲۴۷]۔

انبیاء میں حضور انور کا مقام

یہودیوں کے اس گمراہانہ اعتراض کا کہ آسمان سے ایک لکھی لکھائی کتاب نہیں اتری پہلے الزامی

جواب دیا تھا اب اس آیت میں اس کا تحقیقی جواب دیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ سوال طرح طرح سے ہے کیونکہ نبی اُسے کہتے ہیں جس پر اللہ کی وحی آئے اُسے نہیں کہتے جو آسمان سے کتاب لے کر آتے ۔ یہ بے شمار نبی جو تورات کی مشہور شخصیتیں ہیں۔ ان میں سے کسی پر بھی ایسی کتاب نازل نہیں ہوئی کیونکہ ایسا ہونا سنّتِ الٰہی کے خلاف ہے۔ جس طرح خدا نے ہمیشہ نبیوں کو اپنی وحی سے مخاطب کیا ہے اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم وحی الٰہی سے مخاطب ہوتے ہیں۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں یہ عنوان قائم کر کے باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام آیاتِ قرآنیہ میں سے اس آیت کا انتخاب یہی سمجھانے کے لیے کیا ہے کہ نبی وہ گرامی قدر شخصیت ہوتی ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آئے اور صرف اتنی بات نہیں بلکہ آیت کے انتخاب سے یہ بھی بتانا چاہتے ہیں کہ انبیاء دو طرح کے ہوتے ہیں۔ انبیاء مرسلین اور انبیاء مجددین۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تعلق قسم اوّل سے ہے۔ اور اس آیت کے ذریعے یہ بھی سمجھایا ہے کہ اللہ کا دین ہمیشہ اپنے اصول اور اپنی بنیادی تعلیمات میں ایک ہی رہا ہے۔ اس دین کے جو مختلف ایڈیشن الگ الگ شریعتوں کی شکل میں انسانیت کے آغاز سے لے کر نزولِ قرآن تک آتے رہے ہیں ان کی ظاہری صورتوں اور ان کی تفصیلات میں تو جغرافیائی، تمدنی، نسلی اور قومی حالات اور زمانے کے تقاضوں کے اختلاف کی بنا پر فرق ضرور ہو سکتا تھا۔ لیکن ان کی رُوح اور ان کے اصول و مبادی میں کسی فرق کا سوال خارج از بحث ہے۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشبہ اور انبیاء کو مشبہ بہ قرار دے کر یہ بھی سمجھایا ہے کہ جو کمالات فرداً فرداً سب میں تھے ان کا مجموعہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ان سب کے وہ کمالات جو ان انبیاء میں انفرادی طور پر موجود تھے انھوں نے کر جمع ہیں ان میں ایک طرف انبیاء مرسلین میں حضرت نوح اور ابراہیم کا تو دوسری طرف انبیاء مجددین میں حضرت اسماعیل و اسحاق، یعقوب، حضرت عیسیٰ، حضرت ایوب، حضرت یونس، حضرت ہارون، حضرت سلیمان، حضرت داؤد اور حضرت موسیٰ کا ذکر کر کے بتا دیا ہے کہ وہ کمالات روحانی، مادی جو ان میں الگ موجود تھے وہ سب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی میں موجود تھے۔

۳۴۲۔ اے پیغمبر ہم نے تمہاری طرف اسی طرح وحی روانہ کی ہے۔ اہل کتاب اور مشرکین مکہ جملہ کفار قرآن مجید کی حقانیت اور صداقت میں طرح طرح سے بیہودہ شبہ پیدا کرتے تھے۔ اس موقعہ پر بھی کہہ دیا کہ جیسے توریت سب کی سب ایک دفعہ اتری تھی ایسے ہی تم بھی ایک کتاب آسمان سے لاؤ تو ہم تم کو سچا جانیں۔ بقول شخصے خوئے بد را بہانہ بسیار، سو حق تعالیٰ نے اس جگہ چند آیتیں نازل فرما کر اس کی حقیقت واضح کر دی۔ اور وحی کی عظمت اور کفار کے سب خیالات اور شبہات

بیہودہ کر رد کردیا اور وحی الٰہی کی متابعت کو عامۃً اور قرآن مجید کی اطاعت کو خصوصاً بیان فرماکر بتلا دیا کہ علم الٰہی کا ماننا سب پر فرض ہے۔ کسی کا کوئی عذر اس میں نہیں چل سکتا جو اس کو تسلیم کرنے میں تردد یا تامل کرے یا انکار کرے وہ گمراہ اور بے دین ہے۔ اب یہاں سے تحقیقی جواب دیا جاتا ہے۔[1]

وحی اور اس کی عظمت

ایحاء کا لفظ بول کر یہ بتانا مقصود ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کوئی انوکھی اور عجیب چیز لے کر نہیں آئے جو پہلے کبھی ذاتی ہو۔ آپ کا پیغام نہیں ہے کہ میں دنیا میں اکیلا پیغمبر بن کر آیا ہوں، بلکہ دراصل وہ بھی اسی منبع علم سے فیض یاب ہوئے ہیں جن سے آپ سے پہلے انبیاء فیض یاب ہوتے رہے ہیں اور وہ اللہ کی وحی ہے۔ وحی کے لغوی معنے کسی کا اپنے دلی منشاء کو لبوں کو جنبش دیئے بغیر اخفاء اور آہستگی سے دوسرے پر ظاہر کر دینا ہیں اور اصطلاحاً اس کے معنے خدا کا اپنے دلی منشاء سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں۔ یہ علم واطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے۔

جس طرح علم کی تین مادی قسمیں وجدانیات، حسیات اور بدیہیات عام انسانوں کے لیے یقینی ہیں۔ اسی طرح روحانی ذرائع کے یہ تین درجے کشف، الہام اور وحی انبیاء علیہم السلام کے لیے یقینی ہیں۔ اور جس طرح علم کے مادی ذرائع میں سے یقین کا سب سے پہلا ذریعہ وہ ہے جو تمام تر مادی ہے یعنی وجدان پھر حس ظاہر اور پھر بدیہیات۔ اسی طرح علم کے روحانی واسطوں میں سب سے زیادہ یقینی وہ ہے جو تمام تر روحانی ہے یعنی وحی پھر الہام پھر کشف۔ ہم نے علم کے ذرائع کی جو تین قسمیں کی ہیں یعنی وحی، الہام اور کشف۔ یہ قرآن پاک کی اصطلاحیں نہیں ہیں۔ قرآن کی اصطلاح میں روحانی ذریعہ علم کا نام مکالمہ الٰہی ہے اور اس کی تین قسمیں ہیں۔

۱۔ وحی (اشارہ) بات کرنا یعنی دل میں کسی معنے کا بغیر آواز اور الفاظ کے آجانا۔

۲۔ خدا کا پردے کے پیچھے سے بات کرنا۔

۳۔ خدا کا فرشتے کے ذریعہ سے بات کرنا۔ یعنی فرشتہ خدا کا پیغام لے کر آتا ہے۔ وہ نبی پر وحی کرتا ہے جس کو نبی سن کر محفوظ کرلیتا ہے۔ اسی کو عام طور سے وحی کہتے ہیں کیونکہ قرآن پاک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کا نزول اسی آخری طریقہ سے ہوا ہے لیکن اس شہرت عام کے معنے یہ نہیں ہیں کہ وہ اور دوسرے طریقے وحی کی قسمیں نہیں ہیں۔ مکالمہ الٰہی کے یہ تینوں طریقے وحی کی یہ تین مختلف قسمیں بھی ہیں اور پھر ان تینوں کا مشترک نام بھی وحی ہے یعنی یہ مقسم بھی ہے اور اپنی تین قسموں میں سے بھی ایک پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔

وحی کی آواز

حدیث عائشہ میں ہے کہ کبھی تو یہ صورت ہوتی ہے کہ وحی آتی ہے تو مجھے ایک گھنٹی کی سی آواز آتی ہے اور یہ قسم مجھ پر شدید ہوتی ہے۔ اور حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔ کہ جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی آتی تھی تو آپ کے روئے انور کے پاس ایک ایسی آواز محسوس ہوتی تھی جیسے شہد کی مکھیوں کے بھن بھنانے کی ہوتی ہے۔ ان دونوں پر اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہوگا کہ اصل غرض سب جگہ ایک ہی ہے مکھیوں کے بھن بھنانے کی آواز بھی گھنٹہ کی آواز کی طرح ایک گونج رکھتی ہے۔ اس میں بھی سننے والے کو کسی خاص جہت کا ادراک نہیں ہوتا اور یہاں بھی انسانی کلام کے برخلاف مبداء اور مقطع یعنی آغاز و انجام الگ الگ نمایاں محسوس نہیں ہوتے بلکہ ایک بسیط اور مسلسل آواز محسوس ہوتی ہے اور یہ عجیب بات ہے کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آواز کو تشبیہ دی تو گھنٹے کی آواز سے تشبیہ دی اور جب حضرت عمرؓ نے اس کو تشبیہ دی تو شہد کی مکھیوں کی بھن بھناہٹ سے دی۔ علماء نے لکھا ہے کہ گھنٹہ کی آواز اگرچہ ایک ناخوشگوار آواز ہے مگر وحی کو اس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ وہ بھی ایک بسیط آواز ہے اور بے جہت سنی جاتی ہے مکھیوں کی لگاتار بھن بھناہٹ سے بھی اسی قسم کی آواز پیدا ہوتی ہے۔ ان دونوں تشبیہوں پر غور فرمایئے۔ آپ کو معلوم ہوگا کہ دونوں ایک ہی حقیقت کی ترجمانی کر رہی ہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ صاحب وحی کو وہ آواز کچھ تیز محسوس ہوتی ہے اور سامعین میں سے جس کو اس غیبی آواز کے سننے کی سعادت نصیب ہوتی ہے۔ ان کو خفیف اور ہلکی محسوس ہوتی ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وحی کی حقیقت خواب و خیال سے بالکل بالاتر ہے خواب کا سارا تماشہ صرف سونے والے تک محدود ہوتا ہے اور یہاں آثار وحی سننے والوں پر بھی درجہ بدرجہ نمودار ہوتے تھے حتیٰ کہ بعض اوقات وحی کی بے کیف آواز کا ادراک بھی ہوتا تھا۔ چنانچہ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ نزول وحی کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی متاثر نہ ہوتے تھے بلکہ وحی کی آمد کے وقت اگر آپ کا جسم اقدس کسی دوسرے کے جسم کے ساتھ ذرا متصل ہو جاتا تو وہ بھی وحی کی غلظت سے پس پس جاتا تھا۔ بخاری میں ہے:

سہل بن سعد ساعدی کہتے ہیں کہ میں نے مروان کو مسجد میں بیٹھا دیکھا تو میں ان

کی طرف متوجہ ہوا۔ انہوں نے بتایا کہ زید بن ثابت نے ان سے بیان کیا ہے کہ حضور اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب آیت قرآنی لا یستوی القاعدون من المومنین والمجاھدون فی سبیل اللہ مجھے املا کرائی تھی تو عبداللہ ابن ام مکتوم آگئے۔ انہوں نے کہا کہ یا رسول اللہ بخدا اگر میں جہاد کر سکتا تو ضرور جہاد کرتا۔ عبداللہ ابن ام مکتوم نابینا تھے ان کی اس معذرت پیش کرنے پر اللہ نے آیت کا یہ حصہ اپنے رسول پر نازل فرمایا، غیر اولی الضرر، اس وقت آپ کی ران میری ران سے ملی ہوئی تھی۔ میری ران پر اتنا وزن پڑا کہ یوں محسوس ہوا کہ اب چورا ہوتی۔

ذرا سوچئے کہ جب وحی میں آتے ہوئے ایک کلمہ کا وزن زید بن ثابت کو اتنا محسوس ہو رہا تھا تو جن پر یہ کلمہ نازل ہوا تھا ان کو اس کا وزن کتنا محسوس ہوتا ہوگا اور پھر اندازہ کرنا چاہیے کہ جن پر پورا قرآن نازل ہوا ہے ان کو عام انسانوں سے کتنا امتیاز ہوگا۔

علمی ذرائع میں وحی کا مقام

وحی علم کا ایک ایسا ذریعہ ہے جو اللہ کی جانب سے انبیاء کو عطا کیا جاتا ہے یہ تخلیقی ہے اور نہ کسبی۔ عام انسانوں میں حواس اور مشاعر علم کا ذریعہ ہوتے ہیں لیکن انبیاء میں حواس اور مشاعر سے بالاوحی علم کا ذریعہ ہوتا ہے۔

یوں سمجھو کہ مخلوقات میں جیسے علمی ذرائع کا ایک ارتقائی سلسلہ قائم ہے۔ جمادات بے حس ہیں لیکن نباتات میں قوت احساس موجود ہے۔ حیوانات میں احساسات کے ساتھ کچھ مشاعر بھی کارفرما ہیں۔ انسان احساس اور شعور کے کمالات کا نمونہ ہے، ایسے ہی انسانوں میں انبیاء کو حواس و مشاعر سے بالا ایک ایسی قوت دی جاتی ہے جو عام انسانوں کو نہیں ملتی۔ حواس صرف مادیات کی دریافت کا ذریعہ نہیں مشاعر مادیات سے آگے ذہنیات اور عقلیات کا ادراک کرتے ہیں اور وحی ذہنیات وعقلیات سے بالا حقائق طبعیہ معلوم کرنے کا راستہ ہے۔

اس ذریعہ میں غور و بحث، منطقیانہ فکر و نظر اور ترتیب مقدمات کی ضرورت نہیں پڑتی، بلکہ حقائق اس طرح سامنے آتے ہیں جیسے وجدانیات، فطریات، بدیہیات اور محسوسات۔

چونکہ اللہ سبحانہ انبیاء کو ایک نئے ذریعہ سے علم عطا کرتا ہے اس لیے اس کا نام بھی عام ذرائع سے الگ وحی رکھا ہے۔ عربی میں وحی کے معنی ایماء اور اشارے کے ہیں گویا اللہ سبحانہ کا وہ اشارہ ہے

جو نبوت پر حقائق غیبیہ کے ادراک کی راہ کھول دیتا ہے۔ اسی کو امام رازی کی زبان میں ملکہ نبوت مجدد الف ثانی کی زبان میں نور نبوت اور علامہ اقبال کی اصطلاح میں شعور نبوت کہتے ہیں۔

مجدد الف ثانی فرماتے ہیں،

> جیسے عقل کا مقام حواس سے بالا ہے کہ جن چیزوں تک ہم حواس کے ذریعے رسائی حاصل نہیں کر سکتے۔ عقل کے ذریعے کر سکتے ہیں ایسے ہی نبوت کا مقام عقل سے بالا ہے، جہاں عقل کی رسائی نہیں ہے نور نبوت کے ذریعے اس کا ادراک ہو جاتا ہے۔

اور ساتھ ہی مجدد صاحبؒ نے یہ لطیف انکشاف بھی فرمایا ہے کہ جو شخص عقل و حواس ہی کو علمی ذریعہ مانتا ہے اور اس کے سوا کسی علمی ذریعہ کو نہیں مانتا در حقیقت وہ نور نبوت کا منکر ہے۔ علامہ اقبال نے اپنے مخصوص انداز میں یوں پیش کیا ہے جسے ہم نے شعور نبوت سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ اس شعور کی موجودگی میں نہ تو افراد کو خود کسی چیز پر حکم لگانا پڑے گا، نہ ان کے سامنے یہ سوال ہوگا کہ ان کی پسند کیا ہو اور ناپسند کیا ہو۔ ان کو یہ بھی سوچنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ وہ اپنے لیے کیا راہ عمل اختیار کریں۔ یہ سب باتیں گویا پہلے ہی طے شدہ ہوں گی، یہ نہیں کہ ان کو اس بات میں خود اپنے فکر اور انتخاب سے تعبیر کرنا چاہیے۔ کیونکہ وحی فی الواقع عقلیت سے بالا ایک ایسے ذریعہ کا نام ہے جس میں وجدان نہیں سرتاسر عرفان ہوتا ہے خواہ یہ بالواسطہ ہو یا بلاواسطہ، آواز کے ساتھ ہو یا بغیر آواز کے حصول علم کی حد تک نبوت کے عرفان کی دنیا ایسی ہی حقیقی اور واقعی ہوتی ہے جیسے ہمارے مشاہدات کی۔ اسے صرف اس لیے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا کہ اس کی ابتداء ادراک یا حس سے نہیں ہوتی۔ یہ کوئی غیر شعوری قسم کا وجدان نہیں بلکہ حقیقی اور واقعی عرفان کا نام ہے۔

امام غزالی فرماتے ہیں آدمی کے اطوار میں جیسے عقل معقولات کے ادراک کا ایک ذریعہ ہے۔ ایسے ہی نبوت بھی ایک طور ہے جس کے نور سے صاحب نبوت حقائق غیبیہ اور عقل سے بالا امور کا ادراک کر لیتا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ کی ژرف نگاہی اس قسم کے مواقع پر بہت بڑی رہنمائی کرتی ہے وہ فرماتے ہیں۔ انسان کامل بھی اعتدال صورت نوعیہ کے لحاظ سے معارف الٰہیہ کے بغیر پایہ کمال کو نہیں پہنچ سکتا ہے۔ اس لیے حکمت الٰہی نے کچھ شخصیتوں کی عقلیت کو ایسا صاف پاکیزہ اور بلند تر بنایا ہے کہ جن میں حقائق غیبیہ کے ادراک کی پوری پوری قابلیت رکھی ہے۔ یہ عظیم المرتبت شخصیت بارگاہ الٰہی سے علوم کا فیضان لے کرتی ہے اور انسانوں تک پہنچاتی ہے۔ اور انسانی زندگی اس کی بے چون و چرا اطاعت کرتی ہے۔ اس کی حیثیت انسانوں میں ٹھیک ٹھیک وہی ہے جو شہد کی

کمیوں میں بیصرب کی ہوتی ہے اگر سلسلہ وحی نہ ہوتا تو نوعِ انسانی اس درجہ کمال کو نہ پا سکتی جو تقدیرِ الٰہی نے اس کے لیے مقرر کیا ہے گویا انسانوں میں وحی و نبوت نوعِ انسانی کے ارتقار کی آخری کڑی ہے۔

یہی بات مولانا آزاد نے اپنے مخصوص خطیبانہ انداز میں اس طرح سمجھائی ہے جہاں تک انسانوں کی عملی زندگی کا تعلق ہے عقل کی ہدایت نہ تو ہر حال میں کافی ہے اور نہ ہر حال میں مؤثر، نفسِ انسانی طرح طرح کی خواہشوں اور جذبوں میں کچھ اس طرح مضروب ہے کہ جب کبھی عقل اور جذبات میں کشمکش ہوتی ہے تو اکثر حالتوں میں فتح جذبات کی ہوتی ہے۔ بسا اوقات عقل ہمیں یقین دلاتی ہے کہ فلاں کام نقصان رساں اور تباہ کن ہے لیکن جذبات ہمیں ترغیب دیتے ہیں اور ہم اس کے ارتکاب سے باز نہیں آتے۔ وجدان کے ساتھ اگر حواس کی ہدایت ضروری ہے اور اگر حواس کے ساتھ عقل کی ہدایت ناگزیر تھی۔ کیونکہ اس کی ہدایت ایک خاص حد سے آگے نہ بڑھ سکتی تھی تو کیا یہ ضروری نہ تھا کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی ہو کیونکہ عقل کی ہدایت بھی ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھ سکتی تھی اور اعمال کی وارستگی و انضباط کے لیے کافی نہیں ہے مگر اس نے وجدان کے ساتھ حواس دیئے تاکہ وجدان کی لغزشوں میں نگرانی کا کام کریں۔ اور اگر حواس کے ساتھ عقل بھی دی تاکہ حواس کی غلطیوں میں جج اور قاضی و حاکم کا کام کرے تو کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ عقل کے ساتھ کچھ اور بھی دیتا تاکہ عقل کی درماندگیوں میں رہنما اور فیصلہ کن ہو۔ قرآن بتاتا ہے کہ ضروری تھا اور اسی لیے اللہ نے انسان کے لیے ایک چوتھے مرتبہ ہدایت کا بھی سامان کر دیا۔ اسی مرتبہ ہدایت کا نام وحی ہے۔

الغرض وحی و نبوت کا مقام عقل و فکر سے بالا ہے اور جیسے وحی کا مقام عقل سے بالا ہے ایسے ہی نبوت کا مقام ولایت سے بالا ہے۔ ولایت میں صرف وجدان ہوتا ہے اور اس میں غلطی کا احتمال ہے۔ اسی لیے ولی کے الہام میں دلیل و حجت بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس نبوت مقامِ عرفان پر گامزن ہوتی ہے جس میں غلطی کا کوئی احتمال نہیں ہوتا۔

وحی اور فکرِ جدید

وحی سے متعلق فکرِ جدید نے مادیت اور فلسفہ کے دباؤ سے پہلے پہلے انکار کی راہ اختیار کی اور اس پر کبھی قدامت کی خرافات اور کبھی عصبی بیماری کی پھبتی کسی، لیکن یورپ کے محققین جیسا کہ فرید وجدی نے دائرۃ المعارف الاسلامیہ میں بتایا ہے۔ وحی کے بارے میں اس نتیجے پر پہنچے ہیں کہ وحی خود روحِ انسانی کی تجلیات میں سے ایک تجلی ہے جو انسان پر ظاہر ہو کر انسان کو معلومات فراہم کرتی ہے۔

ان کا موقف یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی قید مکان سے منزہ ہے اور ملائکہ میں اللہ سے ہمکلامی اور اس سے کچھ سننے کے لیے اللہ کے لیے قید مکان کا اقرار ہے۔

دراصل انسان کی فکری گمراہیوں کا سرچشمہ یہ ہے کہ وہ یا تو عقل و بینش سے کورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بغیر بیان لیتا ہے یا پھر فرزانگی اور عقلیت کا اس طرح غلط استعمال کرتا ہے کہ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالا ہوئی۔ اس نے فوراً جھٹلا دی گویا حقیقت کے اثبات و وجود کا سارا دار و مدار صرف اس پر ہے کہ ایک شخص کی سمجھ اس کا ادراک کر سکتی ہے یا نہیں۔ دونوں علم و بصیرت کے خلاف اور دونوں کا نتیجہ عقل و بینش سے محرومی اور عقلی ترقی کا نقصان ہے۔ اگر فرشتوں پر وحی آنے کی اور خود حضور پر وحی آنے کی وہ تمثیل سامنے ہوتی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی ہے تو ان پر اللہ سبحانہ کی تنزیہہ منکشف ہو جاتی۔

فی الواقع وحی کا معاملہ ان حقائق غیبیہ سے تعلق رکھتا ہے جس کے لیے ہماری تعبیرات کام نہیں دے سکتی ہیں۔ ہماری ہر تعبیر کسی ایسی حالت کا تصور پیدا کرے گی جو عام طور پر ہمیں پیش آتی رہتی ہیں۔ وحی ہمارے محسوسات و مفہومات کے دائرے سے باہر ہے اور انسان کی ساری درماندگی یہی ہے کہ وہ حقائق غیبیہ کو اپنے معیار خیال سے تولنا چاہتا ہے، اور اس کے لیے مقدمات بناتا رہتا ہے حالانکہ حقائق غیبیہ اس کے ترتیب دیے ہوئے سارے مقدمات میں اس کے لیے ٹھوکروں پر ٹھوکریں ہیں کیونکہ وہ جتنے مقدمات بناتا ہے اپنے احساس و ادراک کے اندر رہ کر بناتا ہے اور غیبی حقائق اس دائرے کی رسائی سے بالا ہیں۔ نبوت کی دعوت حقائق غیبیہ کو ماننے کی ہے جاننے کی نہیں۔

وحی کی آمد کی کیفیت

اسی بنا پر حضرت امام بخاری اپنی صحیح کے آغاز میں وحی کی آمد کی کیفیت سے متعلق یہ حدیث عائشہ لائے ہیں۔

> حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حارث بن ہشام نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ آپ پر وحی کیسے آتی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا گاہ گاہ وحی آتی ہے مجھ پر گھنٹے کی جھنکار کی طرح اور یہ مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے۔ پھر جب یہ پوری ہو جاتی ہے تو مجھے وہ سب محفوظ ہوتا ہے جو اس نے کہا ہوتا ہے اور کبھی کبھار فرشتہ آدمی کی صورت میں آتا ہے اور مجھ

ہمکلام ہوتا ہے۔ میں اس کی ساری بات کو یاد کرتا ہوں۔

امام بخاریؒ نے اس حدیث کے ذریعے اپنے مخاطبوں کو یہ بات بتائی ہے کہ وحی ایک غیبی معلوماتی ذریعہ ہے اور یہ معلوماتی ذریعہ ہمارے ادراک کی دسترس سے باہر ہے۔ ہم جو کچھ جان سکتے ہیں وہ وحی نہیں بلکہ وحی کی آمد کی کیفیت ہے اور وہ بھی صرف تمثیل کے درجے میں۔ اصل یہ ہے کہ جس حالت و کیفیت سے انسان دوچار نہیں ہوتا، اس کی حقیقت کا بھی ادراک نہیں کر سکتا۔ وحی بھی ان حالات میں سے ایک حالت ہے جو صرف خاصۂ نبوت ہے۔ اس کا ادراک وہی کر سکتا ہے جو اس سے دوچار ہو۔ اس لیے وحی کو عملی طور پر سمجھنے کے لیے صرف تمثیل کے دائرے میں گفتگو ہو سکتی ہے اور معلوم ہے کہ تشبیہ و تمثیل سے کسی چیز کی حقیقت معلوم نہیں ہوتی۔

یہاں وحی کو بتلانے کے لیے صلصلۃ الجرس گھنٹی کی جھنکار کی تعبیر آئی ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ صلصلۃ الجرس کی تعبیر اس حالت کو مثالاً ظاہر کرنے کے لیے ہے جو وحی کی آمد کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آتی تھی یعنی وحی چونکہ عالم غیب سے تعلق رکھنے والا ذریعہ علم کا نام ہے۔ اس عالم سے جس قوت کا تعلق پیدا کرنا مقصود ہوتا ہے تو اس قوت کو دنیا کی تمام چیزوں سے بے تعلق کر دیا جاتا ہے۔ وحی چونکہ عالم غیب سے آتی ہے، اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی قوت سامعہ کو ایک خاص جھنکار کے ذریعے تمام دنیوی علائق سے بیگانہ کر کے حفظ وحی کے لیے تیار کر دیا جاتا ہے اس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کے ذریعے علوم الٰہیہ کا نزول ہوتا تھا۔

وحی کی شدت اور گرانی

وحی کی اس قسم کا جسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے گھنٹی کی آواز سے تشبیہ دی ہے، خود حضور نے اشدہ علی سے تعارف کرایا ہے یعنی وحی کی یہ قسم مجھ پر سب سے زیادہ بھاری ہوتی ہے۔ گرانی اور سنگینی کی وجہ یہ نہیں ہے کہ معانی کے سمجھنے میں دقت ہوتی ہے بلکہ اصلی وجہ یہ ہے کہ عالم غیب کی جو چیز بھی عالم شہادت میں واسطوں کے ساتھ آتی ہے۔ اس میں خفت اور آسانی ہوتی ہے اور عالم غیب کی جو چیز براہ راست یا واسطوں کی کمی کے ساتھ آتی ہے اس میں زیادہ شدت اور گرانی ہوتی ہے سورج کی گرمی بہت سے پردوں اور بہت بڑی مسافت کے بعد اس قابل ہوتی ہے کہ ہم اس سے فائدہ اٹھا سکیں۔ الغرض عالم غیب کی ہر چیز عالم شہادت میں واسطوں کے ساتھ پہنچتی ہے لیکن صلصلۃ الجرس کی صورت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر جو وحی آتی ہے اس میں چونکہ حضور انور

صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچنے میں کوئی واسطہ نہیں ہوتا اس لیے اس میں زیادہ سنگینی ہوتی ہے۔ علامہ ابن خلدون نے اس صورت کے ثقیل ہونے کی وجہ یہ لکھی ہے کہ اس میں نبی کی بشریت مغلوب اور فرشتہ کی ملکیت غالب ہو جاتی ہے یعنی وحی کے اس صورت میں شدید ہونے کی وجہ یہ ہے کہ پیغمبر کی جسمانیت ایک بشری جسمانیت ہے اور جبرئیل کی جسمانیت ایک ملکی جسمانیت ہے۔ نبی کی بشری جسمانیت پر فرشتہ کی ملکی جسمانیت کا غلبہ ہو جاتا ہے۔

دراصل اللہ سبحانہٗ کی وحی ایک عظیم الشان ذمہ داری اور انسانی کمال کا آخری درجہ ہے۔ اس کا بوجھ برداشت کرنا بے حد دشوار ہے۔ یہ اللہ سبحانہٗ کی دی ہوئی قوت برداشت اور اس کی بخشی ہوئی توفیق ہی ہے جس کے صدقے وحی کی امانت نبوت کے سینے میں محفوظ ہوتی ہے۔

حضور انور کی شان جامعیت

۴۴۲۔ جس طرح نوح اور اس کے بعد پیغمبروں کی طرف وحی کی اور جیسے ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب اور اولاد یعقوب، عیسیٰ، ایوب، یونس، ہارون اور سلیمان کی طرف وحی بھائی گئی تھی اور ہم نے داؤد کو زبور دی۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ وحی خاص اللہ کا حکم اور اس کا پیام ہے جو انبیاء پر بھیجا جاتا ہے۔ اور انبیاء سابقین پر جیسے اللہ کی وحی نازل ہوئی ویسے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر اللہ تعالیٰ نے اپنی وحی بھیجی۔ لہٰذا جس نے اس کو مانا اس کو بھی ضرور ماننا چاہیے اور جس نے اس کا انکار کیا گویا ان سب کا منکر ہو گیا۔ حضرت نوح اور ان سے پچھلوں کے ساتھ مشابہت کی شاید یہ وجہ ہو کہ حضرت آدم کے وقت سے جو وحی شروع ہوئی تو اس وقت بالکل ابتدائی حالت تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام پر اس کی تکمیل ہوگئی گویا اول حالت تعلیمی حالت تھی، حضرت نوح کے زمانے میں وہ حالت پوری ہو کر اس قابل ہوگئی کہ ان کا امتحان لیا جائے اور فرمانبرداروں کو انعام اور نافرمانوں کو سزا دی جاتے۔ چنانچہ انبیاء اولوالعزم کا سلسلہ بھی حضرت نوح علیہ السلام سے ہی شروع ہوا اور وحی الٰہی سے سرتابی کرنے پر بھی اول عذاب حضرت نوح کے وقت سے شروع ہوا۔ خلاصہ یہ کہ پہلے حکم الٰہی اور انبیاء کی مخالفت پر عذاب الٰہی نازل نہیں ہوتا تھا بلکہ ان کو معذور سمجھ کر ان کو ڈھیل دی جاتی تھی اور سمجھانے ہی کی کوشش کی جاتی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے میں جب مذہبی تعلیم خوب ظاہر ہو چکی اور لوگوں کو حکم خداوندی کی متابعت کرنے میں کوئی خفا باقی نہ رہا تو اب نافرمانوں پر عذاب نازل ہوا۔ اول حضرت نوح کے زمانے میں طوفان آیا۔ اس کے بعد حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب وغیرہ کے زمانے میں کافروں پر

قسم قسم کے عذاب آئے تو آپ کی وحی کو حضرت نوح اور ان سے پچھلوں کی وحی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہیں۔ اہل کتاب اور مشرکین مکہ کو پوری طرح تنبیہ کر دی گئی کہ جو آپ کی وحی یعنی قرآن کو نہ مانے گا وہ عذاب عظیم کا مستحق ہوگا۔[1]

مطلب یہ ہے کہ جیسے ہم نے حضرت نوح اور حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل وغیرہ کو وحی کی نعمت سے سرفراز کر کے نبوت عطا کی ایسے ہی آپ کو بھی وحی سے مشرف فرما کر نبی بنایا۔ نبی ہونے میں آپ میں اور ان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ وحی ان کے پاس بھی آتی تھی آپ کے پاس بھی آتی ہے۔ نبی اسی کو کہتے ہیں جس کے پاس اللہ کی وحی آئے۔ لکھی ہوئی کتاب کا ملنا نبوت کے لیے کوئی شرط نہیں۔ یہ جتنے انبیاء ہیں ان میں سے ہر ایک پر وحی آتی ہے اور یہ یہودیوں کے نزدیک نبی ہیں۔ ان پر اگر یکبارگی کتاب کا نازل نہ ہونا ان کی نبوت پر حرف نہیں لاتا تو پھر آپ پر یکبارگی کتاب کا نہ اترنا آپ کی نبوت میں کیسے خلل انداز ہو سکتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ یہ انبیاء ہیں جن کے نام اور کام تورات کے صحیفوں میں بھی بیان ہوئے ہیں۔ ان کو اللہ نے اپنی وحی سے نوازا ہے۔ جب نبیوں کا یہ سلسلہ موجود ہے اور ان پر جن شکلوں میں اور جن باتوں کی وحی آئی اس کے دستاویزی ثبوت موجود ہیں تو ان یہودیوں کی طرف سے آپ کی صداقت کے ثبوت کے لیے ایسے بے سروپا مطالبات کے کیا معنے جو ان تمام رسولوں اور نبیوں کو مانتے ہیں جن کا ذکر ہوا ہے اور یہ بھی مانتے ہیں کہ ان پر وحی نازل ہوتی ہے۔

اس آیت میں قرآن نے انبیاء کے حوالہ سے ان تمام قوموں کی تاریخ کا خلاصہ پیش کر دیا ہے جن کا قرآن تذکرہ کرتا ہے۔ حضرت نوح اور حضرت نوح کے بعد انبیاء اور حضرت ابراہیم اور ان کے بعد آنے والے پیغمبر۔

اس میں وہ تمام پیغمبر آگئے جن کی تاریخ سے قرآن استشہاد کرتا ہے۔ حضرت نوح اور حضرت نوح کے بعد حضرت ہود اور حضرت صالح یہ دونوں پیغمبر قوم عاد اور قوم ثمود میں آئے۔ حضرت ہود کے تذکرے میں قرآن نے بتایا ہے واذکروا اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوح۔ عرب میں قوم نوح کے بعد قوم عاد کو عروج ہوا ان کی آبادیاں عمان سے لے کر حضرموت اور یمن تک پھیلی ہوئی تھیں۔ قوم ثمود عرب کے اس حصے میں آباد تھی جو حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ تک چلا گیا ہے۔ ایسے ہی حضرت ابراہیم کے ساتھ حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت عیسیٰ، حضرت ایوب،

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حضرت یونس، حضرت ہارون، حضرت سلیمان اور حضرت داؤد۔ اس میں اشارہ کر دیا کہ نبوت کے دو عظیم سلسلے ہیں۔ ایک نوحی دوسرے ابراہیمی، اور اللہ نے ان دو پیغمبروں اور ان کے خاندانوں کو نبوت و وحی کے لیے چن لیا ہے وجعلنا فی ذریتھما النبوۃ والکتاب۔ حضرت یعقوب کے ساتھ اسباط کا اضافہ یہ سمجھانے کے لیے کیا ہے کہ اولاد یعقوب میں انبیاء پر وحی آئی ہے مگر وہ صاحب کتاب نہیں ہیں جیسے حضرت یوسف، اسباط جمع سبط کی ہے جیسے عرب میں قبیلہ کا اطلاق خاندان پر ہوتا ہے ایسے ہی بنی اسرائیل میں لفظ اسباط استعمال ہوتا ہے۔ اسباط بنی اسرائیل بارہ خاندانوں پر مشتمل ہے اور یہ بارہ خاندان خود حضرت یعقوب کے دس بیٹوں اور حضرت یوسف کے دو بیٹوں سے مل کر بنتے ہیں۔ حضرت یعقوب کے دس بیٹوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ روبین، ۲۔ شمعون، ۳۔ یہودا، ۴۔ یشکار، ۵۔ زبولون، ۶۔ بنیامین، ۷۔ دان، ۸۔ نفتالی، ۹۔ جاد، ۱۰۔ اشیر، حضرت یوسف کے دو بیٹوں کے نام، ۱۔ افرائیم، ۲۔ منسی۔

آخر میں خاص طور پر زبور کا تذکرہ کیا ہے لیکن یاد رہے کہ موجودہ بائیبل میں زبور کے نام سے جو کتاب پائی جاتی ہے وہ ساری کی ساری زبور داؤد نہیں ہے۔ اس میں بکثرت مزامیر دوسرے لوگوں کے بھی بھر دیے گئے ہیں اور وہ اپنے مصنفین کی طرف منسوب ہیں۔ البتہ جن مزامیر پر تصریح ہے کہ وہ حضرت داؤد کے ہیں ان کے اندر فی الواقع کلام حق کی روشنی معلوم ہوتی ہے۔ اسی طرح بائیبل میں امثال سلیمان کے نام سے جو کتاب ہے اس میں بھی اچھی خاصی آمیزش پائی جاتی ہے اور اس کے آخری دو باب تو صریحاً الحاقی ہیں مگر اس کے باوجود ان امثال کا بڑا حصہ صحیح و برحق معلوم ہوتا ہے۔ ان دو کتابوں کے ساتھ ایک اور کتاب حضرت ایوب کے نام سے بھی بائیبل میں درج ہے لیکن حکمت کے بہت سے جواہر اس میں رکھنے کے باوجود اسے پڑھتے ہوئے یہ یقین نہیں آتا کہ واقعی حضرت ایوب کی طرف اس کتاب کی نسبت صحیح ہے اس لیے کہ قرآن میں اور خود اس کتاب میں حضرت ایوب کے جس صبر عظیم کی تعریف کی گئی اس کے بالکل برعکس وہ ساری کتاب ہمیں یہ بتاتی ہے کہ حضرت ایوب اپنی مصیبت کے زمانے میں اللہ کے خلاف سراپا شکایت بنے رہے۔ حتیٰ کہ ان کے ہم نشین ان کو اس امر پر مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے کہ خدا ظالم نہیں ہے مگر وہ کسی طرح مان کر نہ دیتے تھے۔

ان صحیفوں کے علاوہ بائیبل میں انبیاء بنی اسرائیل کے ۱۷ صحائف اور بھی درج ہیں جن کا بیشتر حصہ صحیح معلوم ہوتا ہے خصوصاً یسعیاہ، یرمیاہ، حزقی ایل، عاموس، اور بعض دوسرے صحیفوں میں تو بکثرت مقامات ایسے آتے ہیں جنہیں پڑھ کر آدمی کی روح وجد کرنے لگتی ہے۔ ان میں الہامی کلام کی شان

صریح طور پر محسوس ہوتی ہے۔ ان کی اخلاقی تعلیم ان کا شرک کے خلاف جہاد، ان کا توحید کے حق میں زور استدلال۔ اور ان کی بنی اسرائیل کے اخلاقی زوال پر سخت تنقید پڑھتے وقت آدمی یہ محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اناجیل میں حضرت مسیح کی تقریریں اور قرآن مجید اور یہ صحیفے ایک ہی سرچشمے سے نکلے ہوئے ہیں لہ

مطلب یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے بعد جو انبیاء ہوتے ان سب کا بالاجمال ذکر فرما کر جو ان میں اولوالعزم پیغمبر ہیں، اور جو مشہور اور جلیل القدر ہیں ان کو تخصیص اور تفصیل کے ساتھ ذکر فرمایا جس سے خوب معلوم ہو گیا کہ آپ کے اوپر جو وحی آتی اس کا حق ہونا اور اس کا ماننا ایسا ہی ضروری ہے جیسا تمام اولوالعزم اور مشاہیر پیغمبروں کی وحی کو۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ انبیاء پر جو وحی آتی ہے کبھی فرشتہ پیغام لے کر آتا ہے۔ کبھی لکھی ہوئی کتاب مل جاتی ہے۔ کبھی بغیر پیغام اور بدون واسطہ کے خود اللہ تعالیٰ اپنے رسول سے بات کرتا ہے ان سب صورتوں میں چونکہ وہ اللہ تعالیٰ ہی کا حکم ہے کسی دوسرے کا حکم نہیں تو بندوں پر اس کی اطاعت یکساں فرض ہے۔ بندوں تک پہنچنے کا طریقہ تحریر ہو یا تقریر اور خواہ پیغام ہو تو اب یہود کا یہ کہنا کہ توریت کی طرح پوری کتاب ایک دفعہ ہی آسمان سے لاؤ گے تو ہم تم کو سچا جانیں گے ورنہ نہیں کتنی بے ایمانی اور حماقت ہے۔ جب وحی الٰہی حکم الٰہی ہے اور اس کے نازل ہونے کی صورتیں البتہ متعدد ہیں تو پھر کسی صورت میں اس کے ماننے میں تردد یا انکار کرنا یا یہ کہنا کہ فلاں خاص طریقہ سے تو مانو گا ورنہ نہیں صریح کفر ہے اور کھلی حماقت ہے ٢ہ

دراصل اس آیت میں تین باتوں کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔

ایک یہ کہ اللہ کا دین ایک ہے اور جس طرح آپ سے پہلے بے شمار پیغمبروں پر خدا کی سچائی نازل ہوتی ہے اسی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی نازل ہوتی ہے۔

دوسرے یہ کہ یہودیوں کے اس گمراہانہ اعتراض کا جواب دے دیا کہ آسمان سے ایک لکھی لکھائی کتاب کیوں نہیں آتر آتی۔ فرمایا کہ یہ بے شمار پیغمبر جو تورات کی مشہور شخصیتیں ہیں ان میں سے کسی پر ایسی کتاب حضرت موسیٰ کے سوا نازل نہیں ہوئی۔ جس طرح خدا نے ہمیشہ نبیوں کو اپنی وحی سے مخاطب کیا ہے اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی وحی الٰہی سے مشرف ہوئے ہیں۔

تیسرے یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مشبہ اور جملہ انبیاء کو مشبہ بہ قرار دے کر اشارہ کر دیا کہ

لہ تفہیم القرآن ٢ہ افادات شیخ الاسلام

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تمام انبیاؑ کے کمالات کے جامع ہیں۔ حضرت نوح کی زندگی کفر کے خلاف غیظ و غضب کا ولولہ پیش کرتی ہے، حضرت ہود علیہ السلام سرکش و ظالم حکمرانوں کے خلاف برسرپیکار ہیں حضرت صالح علیہ السلام مترفین اور مفسدین کی پیشوائی کے خلاف اعلان کرتے ہیں۔ حضرت ابراہیم کی زندگی بت شکنیوں کا سلسلہ پیش کرتی ہے۔ حضرت عیسٰی کی حیات صرف خاکساری، تواضع، عفو و درگزر اور قناعت کی تعلیم دیتی ہے۔ حضرت سلیمان کی زندگی شاہانہ اولوالعزمیوں کی جلوہ گاہ ہے، حضرت ایوب کی حیات صبر و شکر کا نمونہ ہے، حضرت یونس کی سیرت ندامت و انابت اور اعتراف کی مثال ہے، حضرت یوسف کی زندگی قید و بند میں بھی جوش تبلیغ اور دعوت کا سبق ہے۔ حضرت داؤد کی سیرت گریہ و بکا، محمد و ستائش اور دعا و زاری کا صحیفہ ہے، حضرت یعقوب کی زندگی امید خدا پر توکل اور اعتماد کی مثال ہے۔ حضرت اسماعیل کی زندگی جذب و شوق اور قربانی کا نمونہ ہے۔ حضرت اسحاق کی زندگی پارسائی اور زہد و تقویٰ کا نمونہ ہے، اور حضرت موسیٰ کی زندگی کفار سے جنگ و جہاد شاہانہ نظم و نسق اور اجتماعی دستور و قوانین کی مثال پیش کرتی ہے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات مقدسہ کو دیکھو کہ اس میں نوح اور ابراہیم موسیٰ اور عیسٰی، سلیمان اور داؤد، ایوب اور یونس، یوسف اور یعقوب سب کی زندگیاں اور سیرتیں سمٹ کر سما گئی ہیں۔

محدث خطیب بغدادی کی ایک ضعیف روایت میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیدائش کے وقت ندا آئی کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو ملکوں ملکوں پھراؤ۔ اور سمندروں کی تہ میں لے جاؤ۔ کہ تمام دنیا ان کے نام و نشان کو پہچان لے، جن و انس، چرند و پرند بلکہ ہر جاندار کے سامنے ان کو لے جاؤ۔ ان کو آدم کا اخلاق، شعیب کی معرفت، نوح کی شجاعت، ابراہیم کی دوستی، اسماعیل کی زبان، اسحاق کی رضا، صالح کی فصاحت، ہود کی حکمت، موسیٰ کی سختی، ایوب کا صبر، یونس کی طاعت، یوشع کا جہاد، داؤد کی آواز، دانیال کی محبت، یوسف کا حسن، الیاس کا وقار، یحییٰ کی پاکدامنی اور عیسٰی کا زہد عطا کرو اور تمام انبیاؑ کے اوصاف و اخلاق میں ان کو غوطہ دو۔

جن علماء نے اس روایت کو اپنی کتابوں میں جگہ دی ہے ان کا منشاء درحقیقت یہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اس صفت جامعیت کو نمایاں کریں جس کی نشاندہی قرآن حکیم کی یہ آیت گرامی کر رہی ہے کہ جو کچھ اور انبیاء کو متفرق طور پر عطا ہوا تھا وہ سب مجموعی طور پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ملا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کی زندگی کے مختلف پہلوؤں میں دیکھو۔ یہ جامعیت کی صفت کاملہ پورے طور پر نمایاں ہو جاتی ہے گی۔ مکہ کے پیغمبر کو جب مکہ سے یثرب جاتے دیکھو تو کیا

تم کو وہ پیغمبر یاد آنے لگا جو مصر سے مدین جاتا نظر آتا ہے۔ کہ حرا کے غار نشین اور کوہ سینا کے تماشائی ایک حیثیت سے کیسی یکسانی نظر آتی ہے مگر جو فرق ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی آنکھیں تحمل تجلی اور حضور انور کی بند۔ حضرت موسیٰ باہر دیکھ رہے تھے اور حضور اندر اندر۔ کوہ زیتون پر وعظ کہنے والے مسیحا پر حضرت عیسیٰ اور صفا پر چڑھ کر یا معشر قریش! کہہ کر پکارنے والے میں کس قدر مشابہت ہے۔ بدر و حنین اور احزاب و تبوک کے سپہ سالار اور موآبیوں اور عمونیوں اور اموریوں سے نبرد آزما موسیٰ میں کس قدر مماثلت ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ کے سات سرداروں کے حق میں بددعا کی تو آپ کی زندگی حضرت موسیٰ کے مثل تھی جب انہوں نے ان فرعونیوں پر بددعا کی۔ جو معجزات پر معجزات دیکھنے کے باوجود ایمان نہ لائے۔ اور جب آپ نے احد میں اپنے قاتلوں کے حق میں دعائے خیر کی تو اس وقت گویا آپ حضرت عیسیٰ کے قالب میں تھے جنہوں نے کبھی اپنے دشمنوں کا بھی برا نہیں چاہا۔ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تم مسجد نبوی کی عدالت گاہ اور ہنگاموں اور غزوات میں دیکھو تو حضرت موسیٰ کی سیرت کا نقشہ سامنے آ جاتا ہے لیکن جب آپ کو مکان کے حجروں میں، پہاڑوں کے غاروں میں، رات کی تنہائیوں اور تاریکیوں میں دیکھو تو حضرت عیسیٰ کا جلوہ نظر آتا ہے۔ شب و روز کے ۲۴ گھنٹوں میں آپ کی زبان مبارک کی دعاؤں اور مناجاتوں کو سنو تو زبور والے داؤد کو دھوکا ہوگا۔ فتح مکہ کے خدم و حشم اور بیرق و علم کے سائے میں آپ کو دیکھو تو تزک و احتشام اور فوجوں والے سلیمان کا مغالطہ ہوگا۔ اگر شعب ابی طالب میں آپ کو تین برس اس طرح محصور دیکھو کہ کھانے کا سامان تک نہیں ہے تو مصری قید خانے کے پیغمبر یوسف کا جلوہ دکھائی دے گا، غرض

حسن یوسف دم عیسیٰ ید بیضا داری
آنچہ خوباں ہمہ دارند تو تنہا داری!

حضرت موسیٰ سیاست اور قانون لے کر آئے تھے، حضرت داؤد دعا و مناجات لے کر آئے، عیسیٰ زہد و اخلاق لے کر آئے تھے۔ لیکن محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قانون و سیاست بھی لائے اور دعا و مناجات بھی اور زہد و اخلاق بھی۔ ان سب کا مجموعہ الفاظ و معانی محمد رسول اللہ ہیں۔

قرآن میں سب نبیوں کا ذکر نہیں ہے

۲۴۵ ۔ اور خدا کے وہ رسول جن کا حال ہم قرآن میں پہلے سنا چکے ہیں اور وہ جن کا حال ہم نے نہیں سنایا اور اللہ نے موسیٰ سے کلام کیا جیسا کہ واقعی کلام ہوتا ہے۔ اس میں یہودیوں کو تنبیہ ہے کہ

وہ اس دھوکہ میں نہ رہیں کہ نبوت ان کی خاندانی میراث ہے اور یہ غور نہ کریں کہ اللہ نے بنی اسرائیل ہی میں سے انبیاء بنائے ہیں بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ ان من امۃ الا خلا فیھا نذیر کوئی قوم اور اُمت ایسی نہیں جس میں کوئی نہ کوئی خدا کی جانب سے آگاہ کرنے والا نہ آیا ہو۔ قرآن کی مکی سورتوں میں کچھ نبیوں کا ذکر کیا ہے مثلاً سورہ انعام، سورہ ہود، سورہ الشعراء میں ان کا تذکرہ ہے۔ لیکن کچھ ایسے ہی بھی ہیں جن کا قرآن میں ذکر نہیں ہے۔ اس آیت میں انسانوں کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے اصناف انسانی میں سے ایک خاص طبقہ کا قرآن نے اجمالی تذکرہ کر کے بتایا ہے کہ جن کے نام لیے گئے ہیں یہ سب نہیں بلکہ سب میں سے کچھ ہیں اور کچھ وہ ہیں جن کا ہم نے ذکر نہیں کیا اور ذکر نہ کرنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ انبیاء اور قومیں قرآن کے مخاطبوں کے لیے جانے پہچانے نہیں۔ ان کی تاریخ، ان کے حالات سے قرآن کے مخاطب واقف نہیں، اور نہ معلوم قوموں اور پیغمبروں کے حالات میں ان قوموں کے لیے کوئی سامان عبرت نہیں ہے اور واقعات و احوال کے بیان کرنے کا بنیادی قاعدہ عبرت پذیری ہے، وہ ذکر کہہ سکتا ہے کہ چین و جاپان اور ہندوستان میں یا امریکہ اور یورپ کے شمالی ممالک میں ہدایت کی روشنی نہیں پہنچی ہے، یقیناً پہنچی ہے لیکن چونکہ قرآن کے مخاطب ان سے واقف نہیں ہیں اس لیے قرآن ان کا تذکرہ نہیں کرتا۔ یہودیوں کی یہ ذہنیت کہ نبوت پر پوری دنیا میں ان کی اجارہ داری ہے قطعاً غلط ہے یہ مقتضائے حکمت ہے اور نہ اللہ کی وسعت رحمت کے شایان شان ہے۔ قرآن نے اس علمی حقیقت کا انکشاف کیا ہے ورنہ قرآن سے پہلے اہل کتاب اس سے قطعاً بے خبر تھے۔

یہ بات کہ کس قدر انبیاء ہوئے ہیں اس کا شمار اور یہ بات فلاں مقام پر کون نبی ہوا ہے۔ ہماری قدرت اور علمی دسترس سے باہر ہے جب تک خود قرآن اور زبان نبوت اس کا انکشاف نہ کرے۔ اس موضوع پر قرآن نے اجمالی ایمان کی ہدایت کی ہے۔ آغاز قرآن ہی میں ما انزل من قبلک فرما کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔

آخر میں خصوصیت سے حضرت موسیٰ کے بارے میں فرمایا ہے کہ و کلم اللہ موسیٰ تکلیماً،

ویسے تو ہر وحی کلام الٰہی ہے اور ہر کلام الٰہی اللہ کی وحی ہے جیسا کہ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے۔

و ما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیاً او من وراء حجاب او یرسل رسولا فیوحی باذنہ ما یشاء انہ علی حکیم۔

کسی انسان میں اللہ سے بات کرنے کا یارا نہیں ہے ہاں یہ کہ اللہ وحی کرے یا پردے کے پیچھے سے بات کرے یا پیغام رساں روانہ کرے اور وہ وحی کرے اللہ کے حکم

سے جو اللہ چاہے اللہ کی ذات برتر ہے اور حکمت والی ہے۔

ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کو پس پردہ کلام الٰہی کا خاص امتیازی شرف حاصل ہوا۔ اگر امتیاز نہ ہوتا تو انداز بیان یہاں سب سے الگ نہ ہوتا۔ بعض شارحین قرآن کی لائنے میں تکلیماً کا زور بتا رہا ہے کہ تمام نبیوں پر فرشتہ کے ذریعے وحی آئی مگر حضرت موسیٰ کو اللہ تعالیٰ نے یہ خصوصیت عطا کی کہ ان سے پس پردہ کلام کیا اور فرشتہ کا درمیانی واسطہ نہ تھا۔ یہ حضرت موسیٰ پر اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ جہاں یہ خصوصیت نہ ہو وہ وحی نہیں ہے اور صاحب وحی نبی نہیں ہے۔ ایسے ہی لکھی ہوئی کتاب ملنا موسیٰ علیہ السلام کی خاص خصوصیت تھی نبوت کی شرط نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سنت ہے کہ ہر نبی کو کسی خاص فضیلت اور کسی خاص معجزے سے سرفراز فرماتے ہیں۔ کسی میں کوئی فضیلت رکھی اور کسی میں کوئی۔ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے اپنا کلام سنایا مگر دیدار سے محروم رکھا۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو شب معراج میں اپنے کلام اور دیدار دونوں سے مشرف فرمایا۔

بتانا یہ ہے کہ نبی ہونے کے لیے صاحب وحی ہونا ضروری ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ وحی کی خاص نوع ہو، اور نہ یہ ضروری ہے کہ لکھی ہوئی کتاب اس کے پاس ہو۔ دیکھنا یہ چاہیے کہ نبوت کا مشن کیا ہے!

نبوت کا مشن

۲۴۶۔ یہ تمام رسول خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے بنا کر روانہ کیے گئے ہیں تاکہ ان کو روانہ کر دینے کے بعد لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے ہو۔ اور اللہ ہر حال غالب رہنے والا اور حکیم و دانا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو برابر بھیجا کہ مومنوں کو خوشخبری سنائیں اور کافروں کو ڈرائیں تاکہ لوگوں کو قیامت کے دن اس عذر کی جگہ نہ رہے کہ ہم کو تیری مرضی اور غیر مرضی معلوم نہ تھی۔ معلوم ہوتی تو ہم ضرور اس پر چلتے سو جب اللہ تعالیٰ نے پیغمبروں کو معجزے دے کر روانہ کیا اور پیغمبروں نے راہ حق بتائی تو اب دین حق کے قبول نہ کرنے میں کسی کا کوئی عذر نہیں سنا جا سکتا۔ وحی الٰہی ایسی قطعی حجت ہے کہ اس کے روبرو کوئی حجت چل نہیں سکتی بلکہ سب حجتیں قطع ہو جاتی ہیں اور یہ اللہ کی حکمت و تدبیر اور زبردستی کرے تو کون روک سکتا ہے مگر اس کو پسند نہیں [1]

---

[1] فوائد شیخ الاسلام

یعنی ان سب کا ایک کام تھا اور وہ یہ کہ لوگوں کو اعمال نیک کے نتائج کی خوشخبری سنائیں اور اعمال بد کے نتائج سے آگاہ کریں۔ گویا سارے انبیاء کا مشترک مشن لوگوں کو بشارت دینا اور خطرے سے آگاہ کرنا ہے بشارت اس بات کی کہ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی زندگی بسر کریں گے۔ ان کے لیے ابدی زندگی کی خوشیاں اور کامرانیاں ہیں۔ آگاہی اس بات کی کہ جو لوگ کفر اور بدعملی کی راہ اختیار کریں گے ان کے لیے دائمی عذاب نار ہے۔ ان کی پیروی و طاعت انسان کی روحانی بیماریوں کا علاج اور اخلاقی کمزوریوں کا درمان ہے۔ یہ وہ مقدس گروہ ہے جو خدا کی بساط ہوتی تمام آبادیوں میں پھیلا اور مختلف زمانوں میں اپنی تعلیم و ہدایت کا چراغ روشن کرتا رہا۔ انسان کے سرمایہ میں فلاح و سعادت، اخلاق، نیک اعمال اور بہترین تمدن کی پر جو کچھ اثرات ہیں وہ ان ہی انبیاء کرام کے بشیری اور نذیری فیوض و برکات ہیں۔ وہ ہر جگہ تبشیر و انذار کے نشانات چھوڑ گئے ہیں۔

نوح کا جوش تبلیغ، ابراہیم کا ولولہ توحید، اسحاق کی وراثت پدری، اسماعیل کا ایثار، موسیٰ کی سعی و کوشش، ہارون کی رفاقت حق، یعقوب کی تسلیم، داؤد کا غربت حق پر ماتم۔ سلیمان کا سرود و حکمت، زکریا کی عبادت، یحییٰ کی عفت، عیسیٰ کا زہد، یونس کا اعتراف تقصیر، ہود کی جانفشانی، ایوب کا صبر، یہی تبشیر و انذار کے وہ حقیقی نقش و نگار ہیں جن سے انسانیت کی روحانی اور اخلاقی زندگی کا ایوان آراستہ ہے اور جہاں کہیں صفات عالیہ کا وجود ہے وہ نبوت کی بشیری شان ہے اور جس جگہ برائیوں اور رذائل سے اجتناب ہے وہ نبوت کی نذیری شان ہے۔

انسانوں کی عمدہ معاشرت، صحیح تمدن اور اعلیٰ مسرت کی تکمیل اور کائنات کے اندر اس کو اشرف المخلوقات کا مرتبہ حاصل کرانے میں یقیناً تمام کارکن طبقات انسانی کا ہاتھ ہے۔ ہیئت دانوں نے ستاروں کی چالیں بتائیں۔ حکماء نے چیزوں کے خواص بتاتے، اطباء نے بیماریوں کے نسخے ترتیب دیئے۔ مہندسوں نے عمارتوں کا فن نکالا۔ صناعوں نے ہنر اور فن پیدا کیے۔ ان سب کی کوششوں سے مل کر یہ دنیا تکمیل کو پہنچی۔ ہم ان سب کے ممنون ہیں مگر سب سے زیادہ ہم ان بزرگوں کے ممنون ہیں جن کی بشیری اور انذاری شان نے ہماری اندرونی دنیا کو آباد کیا جنہوں نے ہماری حرص و ہوس کی اندرونی چالیں درست کیں۔ انسانی بیماریوں کے نسخے ترتیب دیئے، جذبات، احساسات اور ارادوں کے نقشے بنائے۔ نفوس و قلوب کے عروج و تنزل کا فن ترتیب دیا جس سے دنیا کے صحیح تمدن اور صحیح معاشرت کی تکمیل ہوئی۔ اخلاق و سیرت انسانیت کا جوہر قرار پایا۔ نیکی اور بھلائی ایوان عمل کے نقش و نگار بنے۔ خدا اور بندہ کا باہم رشتہ استوار کیا۔ اگر انبیاء علیہم السلام اور

نذیر نہ ہوتے تو کیا یہ دُنیا کبھی تکمیل کو پہنچ سکتی ہے۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

نبوت کی غرض وغایت

نبوت کا مشن بتانے کے بعد نبوت کی ضرورت کی طرف یہ کہہ کر اشارہ فرمایا ہے تاکہ لوگوں کے پاس اللہ کے مقابلے میں کوئی حجت نہ رہے۔ یعنی انبیاء کے آجانے کے بعد کسی کو یہ کہنے کا موقع نہ رہے کہ ہماری عقل مسائل وحقائق کے سمجھنے سے قاصر رہی۔ متکلمین نے یہیں سے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ بندوں پر حجت الٰہی انبیاء کے روانہ کرنے کے بعد ہی قائم ہوتی ہے نہ کہ مجرد عقل کی وجہ سے۔ مطلب یہ ہے کہ ان تمام پیغمبروں کو روانہ کرنے کی ایک ہی غرض تھی اور وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی پر اتمام حجت کرنا چاہتا تھا تاکہ آخری عدالت کے موقعہ پر کوئی گمراہ مجرم اس کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے اور آپ نے ہمیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا تھا۔ اس غرض کے لیے خدا نے دُنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر بھیجے اور کتابیں نازل کیں۔ ان پیغمبروں نے کثیر التعداد انسانوں تک حقیقت کا علم پہنچا دیا اور اپنے پیچھے کتابیں چھوڑ گئے ہیں جن میں سے کوئی نہ کوئی کتاب انسانوں کی رہنمائی کے لیے ہر زمانہ میں موجود رہی ہے۔ اب اگر کوئی شخص گمراہ ہوتا ہے تو اس کا الزام خدا پر اور اس کے پیغمبروں پر عائد نہیں ہوتا بلکہ یا تو خود اس شخص پر عائد ہوتا ہے کہ اس تک پیغام پہنچا اور اس نے قبول نہیں کیا یا ان لوگوں پر عائد ہوتا ہے جن کو راہِ راست معلوم تھی، اور انہوں نے خدا کے بندوں کو گمراہی میں مبتلا دیکھا تو انہیں آگاہ نہیں کیا[1] بالفاظِ دیگر بتایا گیا ہے کہ انبیاء دنیا میں اس لیے تشریف لاتے ہیں کہ لوگوں کو یہ کہنے کا موقعہ نہ رہے کہ ان کے پاس خطرے سے آگاہ کرنے والا کوئی نہیں آیا۔ ورنہ وہ ہرگز کفر و بدعملی کی راہ اختیار نہ کرتے۔ اگرچہ اللہ کی ذات عزیز ہے اس پر انبیاء کا روانہ کرنا واجب نہیں ہے اور اگر وہ مخلوق اور مملوک کو انبیاء کو روانہ کیے بغیر ہی سزا دے تو اس سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہے لیکن وہ حکیم بھی ہے۔ اس کی حکمت کا تقاضا یہ ہے کہ وہ کسی کو سزا دے تو اتمام حجت کے بعد ہی دے۔ رسولوں کی تشریف آوری ہی اللہ کی یہ حجت ہے۔

انبیاء کی آمد کی غرض وغایت کے بارے میں شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوش میں بہت کچھ بتایا جا سکتا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ قرآن کی بتائی ہوئی غرض کی نشاندہی کی جائے۔ یہاں قرآن صرف یہی بتاتا ہے کہ نبوت

---

[1] تفہیم القرآن

کی غرض یہ ہے کہ اس کا وجود بنی آدم پر اتمام حجت رہے، ممکن ہے کہ آدم کے فرزند یہ عذر کریں کہ ہمارے پاس کوئی یاد دلانے والا نہیں آیا اور ہمیں باطل کی تاریکی سے نکال کر حق کی روشنی میں لانے والا نہیں آیا۔ لوگ جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے شعور اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر فطری بصیرت اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں۔ انبیاء ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں۔ ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق اور ظلمت کی جگہ نور عطا کرتے ہیں۔

دراصل اس دُنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے۔ افراط و تفریط پیدا ہوگی اس کے تئیں زمین پر فساد رونما ہوگا۔ انسانی زندگی میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی، کبھی دونوں پلے برابر نہ ہوں گے۔ عقائد ہوں یا عبادات، اخلاق ہوں کہ معاملات ان میں اسی توازن کا نام حق و عدل ہے۔ آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے۔ یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دُنیا کے ذرّے ذرّے اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالق فطرت کے اندازے اور تقدیر سے قائم ہے۔ یہی توازن اور برابر کی تول رسُولوں کے ذریعے آئی ہوئی میزان شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں میں ہونا چاہیے۔ بے ارادہ دُنیا کی میزان کا نام قانون فطرت ہے اور با ارادہ دُنیا کی میزان کا نام قانون شریعت ہے۔ یہی اللہ کی حجت ہے جو انبیاء لے کر آئے ہیں۔ انسانی دُنیا کی سکینت، طمانیت اور امن و امان کا نظام اسی اللہ کی حجت کے ذریعے قائم ہو سکتا ہے، اگر یہ نہ ہو تو سارا نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔

قرآنی وحی خاص علوم میں ممتاز ہے

۲۴۷۔ لوگ نہیں مانتے تو نہ مانیں لیکن اللہ گواہی دیتا ہے کہ جو کچھ اس نے تم پر نازل کیا ہے اپنے علم سے نازل کیا ہے اور اس پر فرشتے بھی گواہ ہیں اور اللہ کی گواہی بس کرتی ہے۔ یعنی وحی ہر پیغمبر کو آتی رہی ہے۔ یہ کچھ نئی بات نہیں، سب کو معلوم ہے لیکن اس قرآن میں اللہ نے اپنا خاص علم اتارا اور اللہ اس حق کو ظاہر کر دے گا۔ چنانچہ جاننے والے جانتے ہیں کہ جو علوم اور حقائق قرآن مجید سے حاصل ہوئے ہیں اور برابر حاصل ہوتے رہیں گے وہ کسی کتاب سے نہیں ہوئے اور جس قدر ہدایت لوگوں کو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے ہوئی اور کسی سے نہیں ہوئی۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اصل ارشاد میں لکنِ استعمال ہوا ہے اور عربی زبان میں لکن استدراک کے لیے آتا ہے۔ استدراک کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ پہلی بات میں پیدا شدہ شبہ کو دور کیا جائے۔ سوال یہ ہے کہ یہاں کیا شبہ پیدا ہوا تھا؟ مفسرین قرآن کہتے ہیں کہ شبہ یہ پیدا ہوا کہ جب ان بیانات کی روشنی میں یہ حقیقت کھل کر سامنے آچکی ہے کہ آپ بھی ویسے ہی اللہ کے رسول ہیں جیسے دوسرے انبیاء تو پھر ان یہودیوں کی جانب سے یہ مطالبہ کیوں ہو رہا ہے کہ کتاب آسمانی سے کر آؤ۔ اللہ سبحانہ نے بتایا ہے کہ ان کا یہ معاملہ آپ سے الگ نہیں دوسرے انبیاء کے ساتھ بھی ان کا یہی معاملہ رہا ہے جن کو وہ نبی مانتے تھے۔ معاملہ کے واضح اور صاف ہونے کے باوجود اگر یہود آپ کو اللہ کا رسول نہیں مانتے ہیں اور آپ پر آنے والی وحی کی شہادت نہیں دیتے ہیں تو نہ دیں ان کی شہادت پر آپ کا رسول ہونا موقوف نہیں بلکہ اللہ کی شہادت پر آپ کا رسول ہونا موقوف ہے۔ آپ کی رسالت پر اللہ اور اس کے فرشتوں کی شہادت ہے۔ آپ پر جو وحی اللہ نے نازل کی ہے اس کا سررشتہ علم الٰہی سے ملا ہوا ہے۔ یہ آپ کا وجدان نہیں بلکہ وہ عرفان ہے جس کی صداقت پر کسی شبہ کی گنجائش نہیں ہے اس طرح آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی ہو گئی ہے۔

إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَصَدُّوا عَن سَبِيلِ اللَّهِ قَدْ ضَلُّوا
ضَلَالًا بَعِيدًا ﴿١٦٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَظَلَمُوا لَمْ يَكُنِ اللَّهُ
لِيَغْفِرَ لَهُمْ وَلَا لِيَهْدِيَهُمْ طَرِيقًا ﴿١٦٨﴾ إِلَّا طَرِيقَ جَهَنَّمَ خَالِدِينَ
فِيهَا أَبَدًا ۚ وَكَانَ ذَٰلِكَ عَلَى اللَّهِ يَسِيرًا ﴿١٦٩﴾ يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ
جَاءَكُمُ الرَّسُولُ بِالْحَقِّ مِن رَّبِّكُمْ فَآمِنُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ وَإِن
تَكْفُرُوا فَإِنَّ لِلَّهِ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۚ وَكَانَ اللَّهُ
عَلِيمًا حَكِيمًا ﴿١٧٠﴾

بلاشبہ جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی اور اللہ کی راہ سے انہوں نے
لوگوں کو روکا تو بلاشبہ وہ دور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں۔ بلاشبہ
جن لوگوں نے کفر اختیار کیا اور ظلم کیا تو اللہ انہیں بخشنے والا نہیں ہے،
اور نہ اللہ انہیں کوئی راستہ دوزخ کے راستہ کے علاوہ دکھائے گا
وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے۔ ایسا کرنا اللہ کے لیے بالکل معمولی

بات ہے۔ اے انسانو! رسول تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے حق لے کر آچکا ہے لہٰذا ایمان لے آؤ تمہارے لیے یہی بہتر ہوگا، اور اگر راہِ کفر اختیار کروگے تو یاد رکھو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا اور اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔[249][250]

ہدایت کا معیار

ان سے پہلی آیات میں دلائل کی پوری قوت سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور آپ ہی کی ذات گرامی معیارِ حق ہے۔ آپ کی صداقت یہودیوں کے ماننے نہ ماننے پر موقوف نہیں ہے۔ آپ کی صداقت کے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے اور اللہ کی گواہی یہ ہے کہ آپ نے علوم الٰہیہ، ادبیہ، سیاسی، دیوانی، فوجداری، اجتماعی اور اخلاقی علوم پر مشتمل اعجازی کتاب کو آپ کی نبوت کے لیے دلیل بنایا ہے اور فرشتوں کی گواہی یہ ہے کہ فرشتوں کے جھرمٹ میں روح الامین کتاب الٰہی لے کر نازل ہوتے۔ اب اس کے باوجود اگر کوئی آپ کی وحی کو نہ مانے گا اس کو ہدایت نہ ملے گی۔ آپ عالم میں خدا کی تعلیم و ہدایت کے شاہد ہیں۔ نیکوکاروں کو فلاح و سعادت کی بشارت سنانے والے مبشر ہیں۔ ان کو جو ابھی تک بے خبر ہیں ہوشیار اور بیدار کرنے والے نذیر ہیں بھٹکنے والے مسافروں کو پکارنے والے داعی ہیں اور خود سراپا نور اور چراغ ہیں۔ یعنی آپ کی ذات اور آپ کی زندگی راستہ کی روشنی ہے۔ یوں تو ہر پیغمبر خدا کا شاہد، داعی، مبشر اور نذیر وغیرہ بن کر اس دنیا میں آیا ہے مگر یہ ساری صفتیں عملاً نمایاں ہو کر ظاہر نہیں ہوئیں۔ بہت سے انبیاء تھے جو خصوصیت کے ساتھ شاہد ہوتے جیسے حضرت یعقوب، حضرت اسحاق، حضرت اسماعیل وغیرہ

بہت سے تھے جو نمایاں طور پر مبشر تھے جیسے حضرت ابراہیم حضرت عیسیٰ، بہت سے تھے جن کا خاص وصف نذیر تھا جیسے حضرت نوح، حضرت موسیٰ، حضرت ہود، حضرت شعیب بہت سے تھے جو امتیازی حیثیت سے داعی حق تھے جیسے حضرت یوسف، حضرت یونس لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سب کچھ بیک وقت تھے اور آپ کے مرقع حیات میں یہ سارے نقش و نگار نمایاں تھے اور یہ اس لیے کہ آپ سب کے جامع تھے آپ ایسی وحی لے کر آئے جو کامل ہے۔ آپ کی تعلیم دائمی ہے اس لیے آپ کی ذات مجموعہ کمالات ہے۔

آپ کا انکار اور آپ سے سرکشی ضلال بعید ہے اور آپ سے کا فرانہ تعلقات کا نتیجہ دوزخ کی ہولناکی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس سے بچنے کا راستہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ پوری انسانیت آپ کو اللہ کا رسول مانے۔ قرآن نے اس آیت میں بلاتمیز سب کو مخاطب کیا ہے۔

۱۴۸- بلاشبہ جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی اور اللہ کی راہ سے انہوں نے لوگوں کو روکا تو بلاشبہ وہ دُور کی گمراہی میں جا پڑے ہیں۔ یعنی حق کے واضح ہونے کے باوجود جو لوگ آپ کی وحی کو نہیں مانتے اور آپ کے رسول ہونے کا انکار کر رہے ہیں۔ اور خود ہی نہیں مانتے بلکہ اوروں کے لیے رکاوٹ بنے ہوتے ہیں اور دوسروں کو اپنی غلط رہنمائی اور قسم قسم کے شبہات پیدا کر کر راہ حق سے روک رہے ہیں۔ وہ راہ حق سے بہت دُور ہو چکے ہیں اور اتنی دُور ہو چکے ہیں کہ ان کا پلٹ کر آنا ممکن نہیں ہے۔ اس آیت میں قرآن نے ایک اصولی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ جب کفر کے ساتھ کفر کی پیشوائی اور قیادت کسی طبقہ کے پاس ہو تو حق کی پذیرائی کی اس طبقہ میں حق کی پوری وضاحت کے باوجود کوئی صلاحیت نہیں ہوتی۔ بالخصوص جب حق سے روگردانی کا پس منظر منافع ہوتے ہیں تو انسان منفعت کوشی میں اس قدر اندھا ہو جاتا ہے کہ اس کی زندگی کا ہر قدم حق کشی میں صرف ہونے لگتا ہے مطلب یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وحی اور نبوت کا انکار کرنے کے بعد ان کا ہدایت کی نعمت سے سرفراز ہونا ناممکن ہے۔ اس کا صاف اور کھلا تقاضا یہ ہے کہ آخرت کی نجات حضور اقدس کے لائے ہوئے اسلام پر موقوف ہے کیونکہ جب آپ کی نبوت کا انکار ضلال بعید ہے تو اس کے معنے یہ بھی ہیں کہ اسلام ہی شرطِ نجات ہے۔ یہ صرف اس آیت کا مدلول ہی نہیں بلکہ دوسرے موقعہ پر صراحۃً بھی قرآن نے یہ بات کہی ہے۔

و من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ و ھو فی الاخرۃ من الخاسرین

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلہ خداوندی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس اُمت میں سے جس کسی بھی شخص تک مثلاً یہودی یا نصرانی تک میری نبوت کا پیغام پہنچا اور اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا وہ دوزخی ہوگا۔ (مسلم)

اس حدیث میں نام اگرچہ یہود و نصاریٰ کے لیے گئے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نام صرف مثال کے طور پر لیے گئے ہیں، ورنہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل عام ہے جیسا کہ زیر تشریح آیت میں ان الذین کفروا بالکل عام ہے اور ایک کلیہ اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ دُنیا کا کوئی گروہ کوئی قوم اور کوئی ملت ایسی نہیں ہے جس پر اس کا اطلاق نہ ہوتا ہو۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جو آیت سے کھینچ تان کر نکالی جا رہی ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس آیت کے لفظ کفروا کا صریح مفہوم ہے۔ ظاہر ہے کہ آپ پر وحی آنے کو دلائل سے ثابت کرنے کے بعد کفر کا لفظ صاف طور پر بتا رہا ہے کہ آپ کی نبوت کا انکار کھلے طور پر گمراہی ہے اور اگر یہ گمراہی ہے تو آپ کی نبوت کو مان لینا یقیناً ہدایت ہے۔ اسی لیے یہود و نصاریٰ کو خاص طور پر آپ کی نبوت قبول کر لینے پر قرآن نے ہدایت ملنے کی بشارت دی ہے۔ فان اسلموا فقد اھتدوا۔

قانونِ مجازات اور مکافاتِ عمل

۲۴۹- بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی اور ظلم کیا تو اللہ انہیں بخشنے والا نہیں ہے اور نہ اللہ ان کو دوزخ کے راستہ کے علاوہ کوئی راستہ دکھائے گا، وہ دوزخ میں ہمیشہ رہیں گے، ایسا کرنا اللہ کے لیے معمولی بات ہے۔ قرآن مجید اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تصدیق اور توثیق کے بعد فرماتے ہیں کہ اب جو لوگ آپ کے منکر ہوتے اور تورات میں جو آپ کے اوصاف موجود تھے ان کو چھپا لیا اور لوگوں پر کچھ کا کچھ ظاہر کرکے ان کو بھی دینِ حق سے باز رکھا سو ایسوں کو نہ مغفرت نصیب ہو نہ ہدایت جس سے خوب واضح ہوگیا کہ ہدایت آپ کی متابعت میں منحصر ہے اور گمراہی آپ کی مخالفت کا نام ہے جس سے یہودی کو پوری سرزنش ہوگئی اور ان کے خیالات کی تغلیط واضح ہوگئی ہے[1] اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ قانونِ مجازات اور مکافاتِ عمل کیا ہے۔ کفر و ظلم کے نتائج ایمان و عدل کے نتائج سے بالکل مختلف ہوتے ہیں۔ اعمال اور ان کے نتائج میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ اچھے اعمال کے اچھے نتائج اور

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

برے اعمال کے برے نتائج کا ہونا ناگزیر ہے۔ کفر و ظلم کے نتائج یقیناً خوشگوار نہ ہوں گے۔ کفر سے مراد خدا کی وحی کا انکار، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا انکار اور ظلم سے مراد تورات میں بتائی ہوئی ان آیتوں کا چھپالینا جو حضور انور کی نبوت سے تعلق رکھتی ہیں یا پھر غلط قیادت کے ذریعے لوگوں کو دھوکہ دینا ہے۔ گویا انہوں نے اپنے کفر اور اپنے ظلم سے اپنے آپ کو اس قابل ہی نہیں چھوڑا ہے کہ خدا ان کی مغفرت فرمائے یا جہنم کے راستہ کے سوا ان کو کوئی راستہ دکھائے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی شان اور اللہ کا قانون یہ نہیں ہے کہ اس کفر کو معاف کر دیا جاتے اور یوم حساب میں اس ظلم سے درگزر کیا جائے کیونکہ کفر و ظلم دونوں نفس انسانی پر اثر انداز ہو کر تاریکی اور فطری فساد کی ایسی کیفیت پیدا کر دیتے ہیں جو کبھی انسان سے جدا نہیں ہو سکتے اور ہمیشہ انسان کے افکار و اعمال پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ اس لیے کفر و ظلم کی مغفرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اور یہ بھی اللہ کا قانون نہیں ہے کہ ظلم و کفر کے لیے فلاح و سنجاح کی کوئی راہ نکالے بلکہ ظلم و کفر بالذات ایسی برائیاں ہیں کہ ان کو اپنانے والا جہنم کی طرف جانے والے راستہ ہی پر گامزن ہوتا ہے۔ پوری عمر کفر و ظلم میں کھپا کر جہنم کی امید اللہ کے قانون عدل کو برباد کرتے اور پورے نظام عدل کو تباہ کرنے کے مترادف ہے۔

اس آیت پر غور کرو کہ کفر و ظلم مقدم ہے اور لـم یکن اللہ لیغفر لھـم الخ مؤخر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی جانب سے مغفرت نہ ہونا اور جہنم کا راستہ دکھانا علت اور انسانوں کا کفر و ظلم معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسانوں کا کفر و ظلم پہلے ہوتا ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں عدم مغفرت بعد میں ہوتی ہے اور یہی طبعی اصول بھی ہے۔ انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اگر کوئی اسے الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی نادانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی یہ عادت نہیں ہے کہ بندہ کے کفر و ظلم میں ملوث ہونے کے باوجود بندے کے لیے مغفرت اور جنت کی راہ کھول دے۔ آیت کا جبر سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

عالمگیر اور دائمی نبوت

۱۷۰۔ اے انسانو! الرسول تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی جانب سے حق لے کر آچکا ہے لہٰذا ایمان لے آؤ تمہارے لیے بہتر ہو گا اور اگر راہ کفر اختیار کرو گے تو یاد رکھو کہ آسمان و زمین میں جو کچھ ہے سب اللہ کا ہے اور اللہ سب کچھ جاننے والا ہے اور اپنے تمام کاموں میں حکمت رکھنے والا ہے۔ آپ کی اور آپ کی کتاب کی تصدیق اور آپ کے مخالفین یعنی اہل کتاب کی تغلیط اور تفصیل بیان

فرمایا کہ اب عام سب لوگوں کو منادی کی جاتی ہے کر لے لوگو ہمارا رسول سچی کتاب اور سچا دین لے کر تمہارے پاس پہنچ چکا ہے۔ اب تمہاری خیریت اسی میں ہے کہ اس کی بات مانو اور اگر نہ مانو گے تو خوب سمجھ لو کہ اللہ تعالیٰ کا ہے جو کچھ آسمان اور زمین میں ہے اور تمہارے تمام احوال اور افعال سے خبردار ہے۔ تمہارے اعمال کا پورا حساب کتاب ہو کر اس کا بدلہ ملے گا۔ اس ارشاد سے بھی صاف معلوم ہو گیا کہ وحی جو پیغمبروں پر نازل ہو اس کا ماننا فرض اور اس کا انکار کفر ہے لہ

اس آیت میں یہودیوں کے مخاطبہ اور عیسائیوں کے مخاطبہ کے درمیان میں تمام انسانوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے۔ لفظ رسول پر الف لام تعریف لگا کر فرمایا ہے کہ وہ رسول تمہارے پاس آ چکا ہے۔ اس سلسلے میں سمجھنے کی یہ بات ہے کہ عیسائی اور یہودی دونوں اہل کتاب ہیں ان کے تذکرے میں پوری انسانیت کو مخاطب بنانے کی وجہ یہ ہے کہ جب اہل کتاب ہو کر ان پر ایمان لانا واجب ہے تو جو اہل کتاب نہیں ان کو تو بدرجہ اولیٰ ایمان لانا ضروری ہے اور آنے　　اور وہ رسول کی تعبیر اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی اپنی کتابوں کی تصریحات کی بنا پر رسول کے آنے کے منتظر تھے۔ ان سے کہا جا رہا ہے کہ جس کا تمہیں انتظار تھا وہ رسول آ چکا ہے۔

تورات میں ایک بشارت ہے:

> خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا۔ فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔　　(استثنا ۳۳-۲)

اس بشارت کا ایک ٹکڑا حضرت حبقوق نبی کے صحیفہ میں پھر دہرایا گیا ہے۔

> خدا تیمان سے اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے۔ اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا اور اس کی حمد سے زمین معمور ہو گئی۔　　۳-۳

حضرت یحییٰ جب ظاہر ہوتے ہیں تو لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ تمہیں آنے والے پیغمبروں میں تم کون ہو؟

> یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو بھیجا کہ اس سے پوچھیں کہ تو کون ہے؟ اور اس نے اقرار کیا انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں۔ تب انہوں نے اس سے پوچھا کہ تو اور کون ہے؟ کیا تو الیاس ہے اس نے کہا میں نہیں ہوں،

لہ افادات شیخ الاسلام

پس آیا تو وہ "نبی" ہے، اس نے جواب دیا نہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ تورات کی پیشین گوئی کے مطابق یہود کو تین پیغمبروں کا انتظار تھا جن میں سے دو کے نام الیاس اور مسیح تھے لیکن تیسرے کا نام صرف وہ نبی لیا گیا ہے۔ یہ تیسرا نبی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا کون ہے۔ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہی ذات ہے جو نبی اور رسول کے مطلق نام سے دُنیا میں مشہور ہے۔ مسلمان آپ کو آنحضرت کہتے ہیں اور مسیحیوں میں آپ کا نام وہی پرافٹ مشہور ہو گیا ہے۔ عرب روم اور یہودی و نصاریٰ سب کو تورات اور انجیل کی بشارتوں کے مطابق ایک آنے والے کا انتظار تھا۔ صحیح بخاری میں حضرت ابوسفیان کی زبانی مروی ہے کہ جب قاصد نبوی دعوت نامہ اسلام لے کر قیصر کے دربار میں پہنچا۔ اور قیصر نے ابوسفیان کو بلا کر جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق چند استفسارات کیے اور ابوسفیان نے ان کے جو جوابات دیے ہیں، ان کو سن کر اس نے بھرے دربار میں کہا تم نے جو کچھ کہا اگر وہ سچ ہے تو ایک دن یہ میرے پاؤں کے نیچے کی مٹی اس کے قبضہ میں ہوگی مجھ کو یہ ضرور خیال تھا کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن یہ خیال نہ تھا کہ وہ عرب میں پیدا ہوگا۔ اگر ممکن ہوتا تو میں خود جا کر اس کی زیارت کرتا اور اگر وہاں ہوتا تو خود اس کے پاؤں میں دھوتا۔

قیصر کے محرم راز اور شام کے بشپ ابن ناطور کا بیان ہے کہ قیصر کا خیال تھا کہ غنقریب نئے رسول کی پیدائش کا زمانہ قریب ہے اور رومیہ کے ایک مسیحی عارف نے بھی خط لکھ کر قیصر کے خیال کی تائید کی۔ مقوقس شاہ مصر کے دربار میں جو قاصد حضور انور کا خط لے کر گیا تھا وہ بھی یہ جواب لے کر آیا کہ ہاں ہم کو بھی یقین ہے کہ ایک پیغمبر آنے والا ہے لیکن خیال تھا کہ وہ شام میں پیدا ہوگا۔ حبش کے عیسائی بادشاہ نے لکھا تھا کہ ہم گواہی دیتے ہیں کہ آپ سچے پیغمبر ہیں۔ یمن کے شہر نجران سے ایک عیسائی وفد آیا اور فیصلہ حق کے لیے یہ طے پایا تھا کہ دونوں فریق مباہلہ کریں جس کی تفصیل آپ جلد سوم میں پڑھ چکے ہیں۔ لیکن وفد کے سمجھدار عیسائیوں نے وفد کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلہ میں مباہلہ سے منع کیا اور کہا کہ خدا کی قسم اگر یہ سچے پیغمبر ہیں تو ہم ہمیشہ کے لیے تباہ ہو جائیں گے۔ اس سے بھی پتہ چلتا ہے کہ ان کو بھی پیغمبر کا انتظار تھا۔ ورقہ بن نوفل کا واقعہ صحیح بخاری میں آتا ہے کہ وہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے۔ بعثت کے پہلے ہی روز جب حضرت خدیجہ آپ کو ورقہ کے پاس لے کر گئی ہیں تو ورقہ نے آپ کی نبوت کی تصدیق کی اور آرزو ظاہر کی کہ کاش میں آپ کی ہجرت تک زندہ رہتا تو آپ کی مدد کرتا۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عیسائیوں کو آنے والے پیغمبر کا

اس وقت انتظار تھا۔

قرآن اسی پس منظر میں یہاں مخاطب کرکے کہہ رہا ہے کہ لوگو! وہ رسُول جس کی بشارت موسیٰ نے توراۃ میں دی اور جس کی آمد کی خبر حضرت عیسیٰ نے انجیل میں دی ہے آچکا ہے اور ان کے ہمیشہ رہنے والی سچائی تمہارے پروردگار کی جانب سے لے کر آچکا ہے۔

اور اگر آیت کو اس منظر سے الگ کیا جائے تو الرسول میں الف لام تعریف یہ بتانے کے لیے ہے کہ رسُولوں میں وہ رسُول کامل آچکا ہے جس کی رسالت میں عموم بھی ہے اور جو نبوّت و رسالت کا خاتم ہے یعنی جس پر نبوّت و رسالت کے سارے کمالات ختم ہو گئے ہیں کیونکہ قرآن کے سوا کسی اور صحیفہ نے یہ دعویٰ نہیں کیا کہ وہ مکمل ہے اور اس کے ذریعے سے اللہ کا دین اپنے تمام اصول و فروع کے لحاظ سے تکمیل کو پہنچ گیا ہے بلکہ گزشتہ انبیاء میں سے ہر ایک نے اپنے وقت میں یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور نبوّت آئے گی جو اس کے کام کی تکمیل کرے گی۔ اللہ سبحانہٗ نے حضرت موسیٰ سے فرمایا۔

> میں ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔ (استثنا - ۱۸)

اسی طرح حضرت عیسیٰ نے بھی کہا:

> لیکن وہ فارقلیط پاکیزگی کی رُوح ہے جسے باپ خدا میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا (یوحنا ۱۴، ۲۶)

اور لکھا ہے کہ

> لیکن جب وہ یعنی سچائی کی روح آئے گی تو وہ تمہیں ساری سچائی کی راہ بتائے گی۔

حضرت عیسیٰ نے بھی ایک آئندہ آنے والے کا پتہ دیا جو اس کی تکمیل کرے گا۔ بالآخر وہ آیا اور دعویٰ کیا کہ میں موسیٰ کی مانند بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے آیا ہوں اور یہ دعویٰ کیا کہ میں ہی سچائی کی وہ رُوح ہوں جو مسیح کی اصلی بڑائی ظاہر کرنے، سچائی کی راہ بتانے اور مسیح کی ادھوری بات کو مکمل کرنے کے لیے آیا ہوں۔ اسی لیے حضورِ انور نے کسی اپنے بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کیونکہ تکمیل کے بعد کسی نئے آنے والے کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقع کہاں! اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ما انزل من قبلک پر ایمان لانے کی تاکید کی لیکن وما انزل من بعدک کے قبول کرنے کا اشارہ تک نہیں

کیا۔ دوسری رسالتوں کے مقابلے میں رسالت محمدی کی اس امتیازی حیثیت کو نگاہ میں رکھیے اور پھر اس بات پر غور کیجیے کہ اس حیثیت کے لازمی تقاضے کیا ہو سکتے ہیں یہی کہ دنیا کی ہدایت اور آخرت کی سعادت آپ کی نبوت پر ایمان لانے پر موقوف ہے۔ آپ پر ایمان ہی دنیا اور آخرت میں ہر قسم کی خیر کا ذریعہ ہے۔ لیکن اس کے برعکس اگر کوئی نہیں مانتا تو اللہ کو کسی کی پرواہ نہیں ہے وہ کافروں کو کفر کی سزا ضرور دے گا۔

يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ وَلَا تَقُولُوا عَلَى اللّٰهِ إِلَّا
الْحَقَّ ۚ إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللّٰهِ وَ
كَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ ۖ فَآمِنُوا بِاللّٰهِ وَرُسُلِهِ ۖ
وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ انتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ إِنَّمَا اللّٰهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ
سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ ۘ لَّهُ مَا فِي السَّمَاوَاتِ وَمَا فِي
الْأَرْضِ ۗ وَكَفَىٰ بِاللّٰهِ وَكِيلًا ۝ لَّن يَسْتَنكِفَ الْمَسِيحُ
أَن يَكُونَ عَبْدًا لِّلّٰهِ وَلَا الْمَلَائِكَةُ الْمُقَرَّبُونَ ۚ وَمَن
يَسْتَنكِفْ عَنْ عِبَادَتِهِ وَيَسْتَكْبِرْ فَسَيَحْشُرُهُمْ إِلَيْهِ
جَمِيعًا ۝ فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ
فَيُوَفِّيهِمْ أُجُورَهُمْ وَيَزِيدُهُم مِّن فَضْلِهِ ۖ وَأَمَّا الَّذِينَ
اسْتَنكَفُوا وَاسْتَكْبَرُوا فَيُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَلَا
يَجِدُونَ لَهُم مِّن دُونِ اللّٰهِ وَلِيًّا وَلَا نَصِيرًا ۝

اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو[251] اور اللہ کے بارے میں حق کے
سوا کچھ نہ کہو[252] مریم کا بیٹا عیسیٰ ابن مریم مسیح بس اللہ کا رسول ہے[253]
اور اس کا کلمہ ہے جسے اللہ نے مریم پر القا کیا تھا[254] اور ایک روح
ہے جو اللہ کی جانب سے ہے[255]۔ لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسولوں پر
ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ تین ہیں[256]، اس سے باز آجاؤ اس میں تمہارے
لیے خیر ہے[257]۔ واقعہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی ذات یگانہ معبود
ہے[258]۔ اس کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو،
آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور کارساز ہونے کے لیے
اللہ کافی ہے[259]۔ مسیح کو ہرگز اس بات سے عار نہیں کہ وہ خدا کا
بندہ سمجھا جائے اور نہ خدا کے مقرب فرشتوں کو اس سے ننگ و عار
ہے[260]۔ جو کوئی خدا کی بندگی میں ننگ و عار سمجھے اور گھمنڈ کرے
اللہ ضرور سب کو اپنے حضور جمع کرے گا، پھر وہ لوگ جو

ایمان اور عملِ صالح کی متاع رکھتے ہوں گے ان کو پوری پوری اجر تیں دے گا اور اپنے فضل سے مزید دے گا، اور وہ لوگ جو خدا کی بندگی کو ننگ و عار سمجھتے ہیں اور گھمنڈ میں ہیں ان کو دردناک عذاب دے گا اور اس روز ان کو خدا کے سوا کوئی رفیق و مددگار نہ ملے گا۔

اہلِ کتاب یعنی عیسائیوں کا غلو

اہل کتاب کی ایک بہت بڑی گمراہی دین میں غلو ہے یعنی حقیقت و اعتدال سے ہٹ کر بہت دور تک چلے جانا، مورخین کا بیان ہے کہ تیسری صدی سے لے کر ساتویں صدی تک مسیحیت کی جو حالت رہی ہے اس سے قرآن کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔ مشرکانہ رسوم نے مذہب کی جگہ لے لی تھی۔ اصل رومی بت پرستانہ عقیدوں نے مسیحی مذہب کا روپ بھر لیا تھا۔ حضرت مسیح کے ناسوتی اور لاہوتی دو عنصروں میں تحلیل مصر کو قائم رکھنے کے لیے کی گئی جس سے حضرت مسیح کی وہی ایک ہے کی تعلیم ان کے مذہب سے مٹ گئی۔ ضعیف الاعتقادی اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ قبر پرستی عام ہو گئی تھی۔ اور ہر بڑے پادری سے دعا مانگی جاتی تھی۔ ملک شام میں جو بڑے بڑے پادری اور بطریق تھے ان کے معتقد ان کو سجدے کرتے تھے۔ مسیح و مریم، روح القدس اور حواریین اور مسیحیت کے دیگر اسالین کے مجسمے بنا کر ان کی پرستش اس کثرت سے کرتے تھے کہ اس کی نظیر زمانہ مابعد کے رومن کیتھولک فرقہ کی بت پرستی میں بھی نہیں ملتی۔

سیل صاحب ترجمہ قرآن کے دیباچہ میں لکھتے ہیں:

گرجا کے پادریوں نے مذہب کے ٹکڑے کر ڈالے تھے اور امن، محبت اور نیکی کو مفقود کر دیا تھا، اصل مذہب کو بھول گئے تھے اور اس کے متعلق اپنی خیال آرائیوں پر جھگڑتے تھے۔ اسی تاریک زمانہ میں اکثر وہ توہمات جو رومن چرچ کے لیے باعث ننگ ہیں مذہبی صورت میں قائم کیے گئے، خصوصاً ولیوں اور مجسموں کی پرستش نہایت بے شرمی

سے ہونے لگی۔

مسٹر مارس اپنی کتاب تاریخ ہندوستان میں ضمناً ایک موقعہ پر تحریر کرتے ہیں :

اس نازک موقعہ پر یعنی ظہورِ اسلام کے وقت ان سیلہ باکانہ بدعات کے درمیان جو چرچ کو ناپاک کر رہی تھیں اور اختلافات کے اس غیر منقطع سلسلہ کے درمیان جو چرچ میں ایک ہلچل ڈالے ہوتے تھے، اگرچہ مشرق میں اصل مسیحیت کی شعاع نظر آتی تھی لیکن بہت مدھم۔

الغرض حضرت عیسیٰ علیہ السلام دُنیا کو امن و سلام کا پیام سنا کر رخصت ہوتے ان کے رفع وصعود کے بعد ہی ان کے شاگردوں میں فرقہ آرائیاں شروع ہوگئیں۔ اور بالآخر پال نے جو ایک تو عیسائی یہودی تھا اس طرح غلبہ پایا کہ اس کی بدعات کی خاک میں اصل عیسویت ہمیشہ کے لیے دفن ہوگئی اور باپ بیٹے رُوح القدس کا مشرکانہ عقیدہ اس میں داخل ہوگیا، اور تورات جس کا کوئی نقطہ خود حضرت عیسیٰ بھی مٹا نہیں سکتے تھے وہ ان کی روحانی شاگردی کے مدعی پال کے ہاتھوں ہمیشہ کے لیے لعنت قرار پائی۔

۲۵۱ اے اہل کتاب اپنے دین میں غلو نہ کرو۔ اہل کتاب اپنے انبیاء کی تعریف میں غلو سے کام لیتے تھے اور حد سے نکل جاتے تھے۔ خدا اور خدا کا بیٹا کہنے لگے سو خدا تعالیٰ فرماتا ہے کہ دین کی بات میں مبالغہ نہ کرو۔ اور جس سے اعتقاد ہو اس کی تعریف میں حد سے نہ بڑھنا چاہیے، جتنی بات تحقیق ہو اس سے زیادہ نہ کہے اور حق تعالیٰ کی شان مقدس میں بھی وہی بات کہو جو سچی اور محقق ہو اپنی طرف سے کچھ مت کہو۔ تم نے یہ کیا غضب کیا کہ حضرت عیسیٰ کو جو اللہ کے رسول ہیں اور اللہ کے حکم سے پیدا ہوتے ہیں ان کی وحی کے خلاف خدا کا بیٹا کہنے لگے اور تین خدا کے معتقد ہوگئے، ایک خدا، دوسرے حضرت عیسیٰ، تیسرے حضرت مریم، ان باتوں سے باز آجاؤ، اللہ تعالیٰ واحد یکتا ہے کوئی اس کا شریک نہیں اور نہ کوئی اس کا بیٹا ہو سکے اس کی ذات پاک اس سے منزہ ہے۔ یہ تمام خرابی اس کی ہے کہ تم نے وحی کی اطاعت اور پابندی نہ کی۔ وحی کی متابعت کرتے تو خدا کے لیے بیٹا نہ مانتے اور تین خدا کے قائل ہو کر صریح مشرک نہ ہوتے اور محمد رسول اللہ سید الرسل اور قرآن مجید افضل الکتب کی تکذیب کر کے آج ڈبل کافر نہ ہوتے۔ اہل کتاب کے ایک فریق نے تو حضرت عیسیٰ کو رسول بھی نہ مانا اور قتل کرنا پسند کیا جن کا ذکر پہلے گزرا۔ اور دوسرے فریق نے ان کو خدا کا بیٹا کہا، دونوں کافر ہوگئے۔ دونوں فریق کی گمراہی کا سبب یہی ہوا کہ وحی کے خلاف کیا اس سے ظاہر ہوگیا کہ نجات وحی کی متابعت میں ہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلی آیات میں حضرت عیسٰی کے بارے میں یہودیوں کی تفریط کا ذکر تھا۔ اب اس کے مقابلے پر حضرت عیسٰی ہی کے بارے میں عیسائیوں کے افراط کا تذکرہ ہے یا بقول حضرت تھانوی اسی بات کو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہودیوں کا غلو احکام ظاہری میں تعمق اور مسائل باطنی کی طرف روگردانی کی صورت میں تھا اور عیسائیوں کا غلو مسائل باطنی میں تعمق اور احکام ظاہر سے بے التفاتی کی صورت میں تھا۔ حالانکہ اعتدال ظاہر و باطن کی ہم آہنگی میں ہے۔

لا تغلوا غلو سے بنا ہے۔ غلو کے معنے بڑھنے، زیادہ ہونے، حد سے بڑھ جانے کے ہیں۔ ہانڈی کو اُبال آجاتے تو بولتے ہیں غلت القدر، یہاں فی دینکم کے اضافہ سے بتا دیا کہ دین میں غلو ممنوع ہے دین میں غلو یہ ہے کہ اللہ کے دین میں اللہ کی کتاب اور اللہ کے پیغمبر نے جس کام، جس فکر، جس حالت کا جو درجہ اور مرتبہ بتایا ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے۔ مثلاً جو حکم صرف استحباب کا درجہ رکھتا ہے اس کو فرض اور واجب کا درجہ دے دیا جائے، جس عمل کی جو صورت بتائی ہے اسے بگاڑ دیا جائے۔ جو شخص ایک فقیہ۔ مجتہد یا صحابی ہے اس کو معصوم بنا دیا جائے۔ جس کو اللہ نے نبی و رسول بنایا ہے اس کو خدا کا شریک یا خدا بنا ڈالا جائے۔ جس کی صرف تعظیم و تکریم مطلوب ہے اس کی عبادت شروع کر دی جائے۔ یہ اور اسی قبیل کی ساری باتیں غلو میں داخل ہیں۔ اور جس طرح دین میں تفریط بہت بڑا جُرم ہے۔ اسی طرح یہ افراط بھی بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے اللہ کے دین کا وہ مزاج جو سراسر اعتدال ہے درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ یوں تو اس غلو میں سب ہی مبتلا ہوئے ہیں۔ یہودیوں کا جُرم اگر یہ تھا کہ وہ حضرتِ مسیح کے انکار و مخالفت میں حد سے بڑھ گئے تو عیسائیوں کا جُرم یہ ہے کہ وہ حضرت مسیح کی عقیدت و محبت میں حد سے بڑھ گئے بلکہ انہوں نے اپنے غلو کے سبب سے پورے دین کا حلیہ بگاڑ دیا۔ حضرت عیسٰی خدا کے بندے اور رسُول تھے۔ ان کو انہوں نے خدا کا بیٹا بنا یا اور پھر ان کو خدائی کے عرش پر بٹھا دیا حضرت مریم حضرت عیسٰی کی والدہ تھیں۔ ان کو نعوذ باللہ خدا کی ماں بنایا۔ حضرت جبریل خدا کے بندے اور فرشتے تھے۔ ان کو بھی ایک اقنوم کی حیثیت دے کر تثلیث کے کٹہرے میں کھڑا کر دیا۔ حضرت مسیح نے دُنیا اور اس کے زخارف سے بچتے رہنے کی تاکید فرمائی تو انہوں نے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ غرض اس غلو کے چکر میں کوئی چیز بھی اپنی اصلی حالت پر برقرار نہیں رہی افکار، اعمال، اخلاق اور احوال سب کا چہرہ بگڑ کر رہ گیا۔ الغرض اہل کتاب کی بہت بڑی گمراہی دین میں غلو ہے۔ یعنی حقیقت و اعتدال سے متجاوز ہو کر بہت دُور تک چلے جانا۔ اگر کسی کی محبت و تعظیم کی تو اتنی تعظیم کی کہ اسے خدا کے درجہ تک پہنچا دیا۔ مخالفت پر آئے تو اتنی مخالفت کی کہ اس کی صداقت ہی سے انکار کر دیا۔ اگر زہد و عبادت کی راہ اختیار کی تو اتنی

وہ اتنا آگے چلے گئے کہ رہبانیت تک پہنچ گئے۔ اگر دنیا کے پیچھے پڑے تو اتنے چھوٹ اور بے لگام ہوئے کہ نیک و بد کی تمیز ہی اٹھا دی۔ یہود و نصاریٰ اسی گمراہی کا شکار ہوئے۔ یہاں خطاب عیسائیوں سے ہے کہ انہوں نے عیسیٰ علیہ السلام کی محبت میں اس قدر غلو کیا کہ انہیں خدا کا بیٹا بنا دیا۔ اور ایک خدا کی جگہ تین خدا یعنی باپ بیٹا اور روح القدس کا اعتقاد پیدا کر لیا۔

اللہ کے دین میں فساد کا دروازہ

۲۵۲۔ اور اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہو۔ یعنی دین کے موضوع پر کوئی عقیدہ، کوئی عمل، عمل کی کوئی صورت میں اپنی رائے نہ گھسیڑو اور توحید میں شرک کا کوئی شائبہ بھی نہ آنے دو۔ دراصل دین میں غلو کا فتنہ جس راہ سے پیدا ہوتا ہے اور پھر اس کی تائید و تقویت کا سامان جہاں سے فراہم ہوتا ہے۔ یہ اس کا سدِ باب ہے۔ ظاہر ہے کہ اگر اللہ کی طرف وہی بات منسوب کی جائے جو اس نے فرمائی ہے تو اس سے کسی فتنہ کا دروازہ نہیں کھل سکتا۔ فتنہ کا دروازہ اس وقت کھلتا ہے جب اس کی طرف وہ بات منسوب کی جاتی ہے جو اس نے نہیں فرمائی ہے۔ یہی چیز بدعت ہے اور یہیں سے شیطان کو دین میں گھسنے کا اور اس میں فساد برپا کرنے کی راہ کھلتی ہے۔ نصاریٰ جہاں سے ہلاک ہوئے وہ یہی دروازہ ہے انہوں نے گمراہ قوموں سے غلط عقیدے اور باطل طریقے اخذ کیے۔ خصوصاً فلاسفہ یونان کی طرف جن کے تخیلات سے متاثر ہو کر عیسائی اس صراطِ مستقیم سے ہٹ گئے جس کی طرف ابتداءً ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ حضرت مسیح کے ابتدائی پیروکار جو عقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انہوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم حضرت مسیح نے ان کو دی تھی مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف حضرت عیسیٰ کی عقیدت اور تعظیم میں غلو کر کے اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اوہام اور فلسفیوں سے متاثر ہو کر اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیرات شروع کر دیں اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کی مسیح کی تعلیمات سے کوئی نسبت نہ تھی۔

اس موضوع پر خود ایک مسیحی عالم ریورینڈ چارج ولیم کا بیان قابل ملاحظہ ہے،
عقیدہ تثلیث کا فکری سانچہ یونانی ہے اور یہودی تعلیمات اس میں ڈھالی گئی ہیں۔ اس لحاظ سے یہ ہمارے لیے ایک عجیب قسم کا مرکب ہے۔ مذہبی خیالات بائیبل کے اور ڈھلے ہوئے ایک اجنبی فلسفہ کی صورتوں میں۔ باپ، بیٹا، روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں آخری اصطلاح اگرچہ خود یسوع نے شاذ و نادر ہی کبھی استعمال کی تھی، اور پال نے بھی جو اس کو استعمال

کیا۔ اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا۔ تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا پس اس عقیدے کا مولد یہودی ہے۔ اگرچہ اس مرکب میں شامل ہونے سے وہ بھی یونانی اثرات سے مغلوب ہو چکا تھا اور مسئلہ خالص یونانی۔ اصل سوا جس پر یہ عقیدہ بنا وہ ذکری اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا۔ یعنی یہ کہ ان تینوں اقانیم باپ بیٹا، روح القدس کے درمیان تعلق کی حیثیت کیا ہے؟ کلیسا نے اس کا جواب جو دیا ہے وہ اس عقیدے میں یقیناً کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے۔

ایک اور مسیحی عالم کا بیان انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا میں یسوع مسیح کے عنوان کے تحت لکھا گیا ہے۔ عید پنتکست کے موقع پر پطرس کے یہ الفاظ کہ ایک انسان جو خدا کی طرف سے تھا،" یسوع کو اس حیثیت میں پیش کرتے ہیں جس میں اس کے ہم عصر اس کو جانتے اور سمجھتے تھے۔ انجیلوں سے ہم کو معلوم ہوتا ہے کہ یسوع بچپن سے جوانی تک بالکل فطری طور پر جسمانی و ذہنی نشوونما کے مدارج سے گزرا۔ اس کو بھوک پیاس لگتی تھی، وہ تھکتا اور سوتا تھا۔ وہ حیرت میں مبتلا ہو سکتا تھا اور دریافت حال کا محتاج تھا۔ اس نے دکھ اٹھایا، اس نے صرف یہی نہیں کہ سمیع و بصیر ہونے کا دعویٰ نہیں کیا بلکہ صریحاً اس سے انکار کیا ہے درحقیقت اس کے حاضر و ناظر ہونے کا اگر دعویٰ کیا جائے تو یہ اس پورے تصور کے بالکل خلاف ہو گا جو ہمیں انجیلوں سے حاصل ہوتا ہے بلکہ اس دعویٰ کے ساتھ آزمائش کے واقعہ کو اور گتسمنی اور کھوپڑی کے مقام پر جو واردات گزریں ان میں سے کسی کو بھی مطابقت نہیں دی جا سکتی تاوقتیکہ ان واقعات کو بالکل غیر حقیقی نہ قرار دے دیا جائے۔ یہ ماننا پڑے گا کہ مسیح جب ان سارے حالات سے گزرا تو وہ انسانی علم کی عام محدودیت اپنے ساتھ لیے ہوتے تھا۔ اس محدودیت میں اگر کوئی استثنا تھا تو وہ صرف اسی حد تک جس حد تک پیغمبرانہ بصیرت اور خدا کے یقینی شعور کی بنا پر ہو سکتا ہے۔ پھر مسیح کو قادر مطلق، سمجھنے کی گنجائش تو انجیلوں میں بہت کم ہے۔ کہیں اس بات کا اشارہ تک نہیں ملتا کہ وہ خدا سے بے نیاز ہو کر خود مختارانہ کام کرتا تھا اس کے برعکس وہ بار بار دعا مانگنے کی عادت سے اور اس قسم کے الفاظ سے کہ" یہ چیز دعا کے سوا کسی اور ذریعے سے نہیں مل سکتی۔ اس بات کا صاف اقرار کرتا ہے کہ اس کی ذات بالکل خدا پر منحصر ہے۔

بہر حال حضرت مسیح کی ابنیت، ان میں خدا کے حلول کا عقیدہ، تثلیث کا فکری سانچہ اور حضرت مسیح کے بارے میں دانائے غیب، قادر مطلق، مختار کل، اور حاضر و ناظر ہونے کے تصورات کی حیثیت قول علی اللہ بغیر الحق کے سوا کچھ نہیں ہے اور قرآن کے نزدیک یہ سنگین جرم ہے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ

دین میں غلو خواہ عقائد میں ہو یا اعمال میں اور چاہے اخلاق میں ہو یا احوال میں فی الواقع اللہ پر خلاف واقعہ بات تھوپنے کے مترادف ہے۔ یعنی اگر ایک کام ایک بات، ایک حال دین کے بتائے ہوئے علم و عمل میں نہیں ہے اور آپ کہتے ہیں کہ یہ دین ہے تو آپ یہ کہہ کر کہ اللہ کا حکم ہے اللہ پر تہمت لگاتے ہیں اور بغیر علم غلط طور پر کسی چیز کو دین کہنا اور موجب ثواب و عقاب بتانا، اللہ پر جھوٹ بولنے کے مترادف ہے۔ قرآن میں ہے

ومن اظلم ممن افترٰی علی اللہ کذباً

اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ پر جھوٹ بولے۔

ایسے ہی حضرت عیسٰی کے بارے میں یہ تصورات رکھنا اور ان کی اشاعت خدا پر جھوٹ بولنا ہے۔

مریم کے بیٹے اور خدا کے رسول ہیں

۲۵۳ - مریم کا بیٹا عیسٰی بس اللہ کا رسول ہے۔ یعنی وہ معبود و الٰہ نہیں، خدا نہیں اور مظہر خدا نہیں بلکہ وہ صرف اللہ کے رسول ہیں۔ رسول، رسالت سے بنا ہے۔ رسالت کے لفظی معنے سفارت کے ہیں قرآن کی اصطلاح میں رسالت اس سفارت کو کہتے ہیں جسے اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے قانونی احکام پہنچانے اور انہیں اپنی مرضی کی راہ بتانے کے لیے قائم کیا ہے اس کا دوسرا نام نبوت ہے۔

اللہ تعالیٰ نے انسانوں تک اپنے احکام پہنچانے کے لیے ہمیشہ انسانوں کو ذریعہ بنایا ہے یعنی اللہ کے یہ رسول نہ فرشتوں میں سے ہوتے تھے نہ جنوں میں سے نہ کسی اور مخلوق میں سے اور نہ ایسا ہے کہ اپنے احکام بتانے کے لیے اللہ تعالیٰ خود ہی کسی انسانی یا غیر انسانی شکل میں یہاں اتارا ہو۔ اس کے برعکس واقعہ یہ ہے کہ جب بھی رسول بھیجا گیا نوعِ انسانی ہی میں سے بھیجا گیا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

وما ارسلنا من قبلک الا رجالا نوحی الیھم

ہم نے تم سے پہلے مردوں ہی کو پیغمبر بنا کر روانہ کیا ہے جن کی طرف ہم وحی کرتے ہیں۔

اس لیے یہ بدیہی بات ہے کہ رسالت کے لیے ہمیشہ انسانوں ہی کا تقرر ہوا ہے ٹھیک ویسے ہی انسانوں کا جیسے کہ ہم اور آپ ہیں۔ ہماری ہی طرح وہ بھی جسم و جان رکھتے تھے، قوتیں اور خواہشیں رکھتے، بیوی بچے رکھتے۔ قوانین طبعی کے تحت پیدا ہوتے، نشوونما پاتے، کھاتے اور پیتے اور سوتے اور جاگتے، خوشی اور غم کا احساس کرتے، ہنستے اور روتے، تندرست رہتے، بیمار پڑتے اور وفات پاتے۔ غرض وہ ہر پہلو سے انسان ہوتے اور انسانیت کی ایک ایک چیز ان کے اندر موجود ہوتی۔ قرآن نے متعدد آیات میں حقیقتِ حال کی یہ تفصیل بتائی ہے مثلاً۔

انهم ليأكلون الطعام ويمشون فى الاسواق
بلاشبہ اللہ کے رسول کھانا کھاتے اور بازاروں میں چلتے تھے۔

اور

وجعلنا لهم ازواجاً وذرية
ہم نے ان کے بیوی بچے بنائے تھے۔

جس مصلحت کی بنا پر رسالت کے لیے انسانوں ہی کا تقرر ہوا اس کی بھی قرآن حکیم نے نشاندہی کر دی ہے۔ جب لوگوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے خلاف یہ دلیل دی کہ اگر اللہ کو ہمارے پاس اپنا کوئی رسول بھیجنا ہوتا تو کسی فرشتے کو بھیجتا، نہ کہ ہمارے ہی جیسے ایک انسان کو تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

قل لوكان فى الارض ملائكة يمشون مطمئنين لنزلنا عليهم من السماء ملكا رسولا۔
اے رسول ان سے کہہ دو کہ اگر زمین میں فرشتے آباد ہوتے تو ہم ضرور ان پر آسمان سے کسی فرشتہ ہی کو رسول بنا کر روانہ کرتے۔

یہ آیت رسالت کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ بتا رہی ہے کہ رسول کو اسی جنس اور اسی مخلوق میں سے ہونا چاہیے جس کے پاس جاکر اسے رسالت کا فرض انجام دینا ہے۔ بظاہر اگرچہ صرف ایک بات ہے لیکن فی الواقع یہ ایک ایسا کلمہ حکمت ہے جو عقل سلیم کو پوری بات سمجھا دیتا ہے۔ اس سے یہ حقیقت آپ سے آپ کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ انسانوں تک اللہ کے احکام پہنچانے والے رسولوں کا انسان ہی ہونا ضروری تھا۔ ورنہ رسالت کا منشا پورا ہی نہیں ہو سکتا تھا۔ قرآن نے اس آیت میں ابن مریم کہہ کر یہی بات سمجھائی ہے کہ انسان ہیں اور انسان ہو کر اللہ کے رسول ہیں۔

حضرت عیسیٰ کی اعجازی ولادت

۲۵۲۔ اور حضرت مسیح اللہ کا کلمہ ہیں جسے اللہ نے مریم پر القا کیا تھا۔ یعنی حضرت عیسیٰ مریم کے بیٹے ہیں اور حضرت مریم سے ان کی ولادت عام تخلیقی ضابطے سے نہیں بلکہ اللہ کے کلمہ کن سے ہوئی۔ مطلب یہ ہے کہ صرف کلمہ کن سے بلا توسط اسباب پیدا ہوئے۔ اگرچہ تمام لوگوں کی پیدائش اللہ ہی کے کلمہ سے ہوتی ہے مگر چونکہ بظاہر اور لوگوں میں کچھ اسباب ظاہری کا بھی لگاؤ ہوتا ہے۔ حضرت مسیح کی

ولادت میں رہبی نہ تھا اس لیے ان پر کلمۃ اللہ کا اطلاق ہوا۔ یہاں مریم کی طرف کلمہ بھیجنے کا مطلب یہ ہے کہ مریم کے رحم پر اللہ نے یہ فرمان نازل کیا کہ کسی مرد سے تعلق کے بغیر حمل کا استقرار قبول کرے۔ عیسائیوں کو ابتداءً مسیح کی پیدائش بے پدر کا یہی راز بتایا گیا تھا۔ مگر انہوں نے یونانی فلسفہ سے گمراہ ہو کر پہلے لفظ کلمہ کو کلام کا ہم معنے سمجھ لیا۔ پھر اس کلام سے اللہ کی ذاتی صفت کلام مراد لے لی۔ پھر یہ قیاس قائم کیا کہ اللہ کی اس صفت ذاتی نے مریم کے بطن میں داخل ہو کر وہ جسمانی صورت اختیار کر لی جو مسیح کی شکل میں رونما ہوئی۔ اس طرح عیسائیوں میں مسیح علیہ السلام کے خدا ہونے کا غلط عقیدہ پیدا ہوا اور اس غلط تصور نے جڑ پکڑ لی کہ خدا نے خود اپنے آپ کو یا اپنی ازلی صفات میں سے صفت کلام کو مسیح کی شکل میں ظاہر کیا ہے۔ اس طرح عیسائیوں نے لفظ کلمہ کو بمعنے ذات خدا یا اقنوم علم سمجھ لیا ہے اور اپنے ان اختراعی معنی کو لے کر ہی ان کو قرآن کی اس آیت کے سمجھنے میں یہ شبہ ہو گیا کہ قرآن نے حضرت مسیح کو خدا کا کلمہ کہہ کر حضرت مسیح کی الوہیت کی طرف اشارہ کیا ہے لیکن ان کا ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے لکھنے والوں نے تو عیسائیوں کے اس رکیک شبہ پر بہت کچھ لکھا ہے لیکن حضرت مولانا کیرانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے ازالۃ الشکوک میں اس کا جو جواب دیا ہے وہ بے نظیر اور عجیب ہے۔ ہم معالم القرآن کے پڑھنے والوں کی ضیافت طبع کے لیے یہاں اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

لفظ کلمہ لغت عرب میں کہیں بمعنے ذات خدا یا اقنوم علم استعمال نہیں ہوا ہے قرآن میں جہاں بھی کلمہ یا اس کی جمع کلمات خدا کی طرف مضاف ہو کر آیا ہے جیسے کلمۃ اللہ، کلمہ ربک، کلمات ربنا، کلمتنا، اور کلماتنا۔ وہاں بمعنے کلام خدا یا حکم خدا آتا ہے مثلاً سورۃ توبہ میں وکلمۃ اللہ ھی العلیا (اللہ کی بات ہمیشہ اوپر ہے۔ اور سورۃ انعام میں ہے وتمت کلمت ربک صدقا وعدلا یعنی صداقت اور عدالت کی رُو سے تیرے رب کی بات پوری ہو گئی۔ اور سورہ صافات میں ہے ولقد سبقت کلمتنا لعبادنا المرسلین ہمارا حکم اپنے بندوں کے حق میں جو رسول ہیں پہلے ہو چکا ہے۔ بہرحال قرآن میں ہر جگہ لفظ کلمہ یا کلمات خدا کی بات اور خدا کے حکم کے معنے میں آیا ہے اور کہیں بھی بمعنے ذات یا اقنوم علم نہیں آیا ہے۔

حضرت مسیح کلمۃ اللہ ہیں

حضرت مسیح چونکہ بغیر باپ کے پیدا ہوتے یعنی عادت الٰہی کے خلاف ان کی ولادت اللہ تعالیٰ کے امر یعنی کن سے ہوئی اور اس طرح ان کو ولادت میں ایک قسم کا اختصاص ملا ہے اور یہودی ان کی

اس اختصاصی شان کو نہیں مانتے تھے اس لیے قرآن میں اللہ سبحانہ نے حضرت مسیح کو کلمۃ اللہ فرمایا۔ ورنہ ساری کی ساری مخلوق ہی اللہ کے حکم سے پیدا ہوتی۔ اور اختصاصی شان کو ظاہر کرنے کیلئے کلمہ کا اطلاق عربی زبان میں عام طور پر ہوتا تھا۔ مخلوق پر لفظ خلق مقدور پر لفظ قدرت مرجو پر لفظ رجا اور مشتہی پر شہوت بولا جاتا ہے اسی طرح کلمہ کن کے ذریعے جس کی ولادت ہوتی ہے اس کو کلمہ کہہ دینا لغت اور محاورے کے مطابق ہے۔

خود عہد جدید اور قدیم کی کتابوں میں یہ لفظ یعنے کلام خدا اور حکم خدا آتا ہے۔ مثلاً زبور عربی میں ہے

بکلمۃ الرب تثبت السماوات و بروح فیہ جمیع جنودھا۔

اس کا فارسی ترجمہ یوں کیا گیا ہے:

آسمانہا بکلام خداوند وتمامی عساکر انہا بنفس دہانش ساختہ اند۔

اور ۱۸۴۴ء کے ہندی ترجمہ میں ہے:

خداوند کے کلام سے آسمان بنے اور ان کے سارے لشکر اس کے منہ کے دم سے۔

اور اخبار الایام کی پہلی کتاب کے ستر ہویں باب میں ہے۔

اور اسی رات ایسا ہوا کہ خدا کا کلام ناتان نبی کو پہنچا۔

اور انجیل لوقا کے تیسرے باب میں ہے:

خدا کا کلام بیابان میں زکریا کے بیٹے یحییٰ کو پہنچا

اور اعمال کے چوتھے باب میں ہے:

خدا کی بات دلیری سے کہنے لگے

اور اعمال ہی کے چھٹے باب میں ہے:

تب ان بارہ رسولوں نے سب مریدوں کو بلا کے کہا کہ مناسب نہیں کہ ہم خدا کی بات کو چھوڑ کے میزوں کی خدمت کریں اور خدا کی بات پھیل گئی۔

اور اعمال کے بارہویں باب میں ہے:

لیکن خدا کا کلام پھیل کر بڑھ گیا۔

اور اعمال کے تیرہویں باب میں ہے:

اور سلامی شہر میں پہنچ کے یہودیوں کی عبادت گاہوں میں خدا کے کلام کا وعظ کرنے لگے۔ چاہا کہ خدا کا کلام سنے، ۴۴۔ دوسرے سبت کے دن کو قریب سارے شہر کی ہم آئی تاکہ خدا کی بات سنیں۔ ۴۶۔ تب پادل اور برنباہ نے دلیری کرکے

کہا ضرور تھا کہ خدا کا کلام پہلے تم سے کیا۔
نامہ اوّل یوحنا کے باب دوم میں ہے :
اے جوانو! میں نے تمہیں لکھا ہے کہ تم دلیر ہو اور خدا کی بات تم میں رہتی ہے۔
ان سب مقامات میں لفظ کلمہ حکم اور بات کے معنیٰ میں آیا ہے [1]

بہرحال حضرت عیسٰی کے بارے میں کلمۃ اللہ ان کی تشریف و خصوصیت بتانے کے لیے آیا ہے نہ کہ ان کی الوہیت۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی خارق عادت ولادت کوئی ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنا پر ان کو خدائی کا درجہ دے دیا جائے۔ ان کی ولادت اسی طرح کلمہ کن سے ہوئی ہے جس طرح آدم کی ولادت کلمہ کن سے ہوئی ہے۔ اسباب تو ظاہر کا پردہ ہیں وجود اور زندگی تو جسے بھی ملتی ہے خدا ہی کے حکم سے ملتی ہے اور بس۔

حضرت عیسٰی رُوح من اللہ ہیں

۲۵۵- اور ایک رُوح ہے جو اللہ کی جانب سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے زندہ کیے ہوتے اور اللہ کی بنائی ہوئی رُوح ہیں جو بلا اسباب عادی ظاہری مریم کے بطن میں مجسم ہو گئے۔ یعنی حضرت عیسٰی خدا تعالیٰ کی طرف سے ایک پاکیزہ رُوح ہیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بغیر باپ کے محض نفخہ جبریل سے پیدا کیا جیسے جبریل امین کو رُوح القدس کہا جاتا ہے اس لیے کہ وہ خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ پاک رُوح ہیں۔ گویا حضرت عیسٰی کو اللہ نے وہ پاکیزہ رُوح عطا کی تھی جو بدی سے ناآشنا تھی، سراسر حقانیت اور راست بازی تھی اور از سرتا پا فضیلت اخلاق تھی۔ حضرت عیسٰی کی یہ تعریف عیسائیوں کو بھی بتائی گئی تھی مگر انہوں نے اس میں غلو کیا۔ روح من اللہ کو عین رُوح اللہ قرار دے لیا اور مطلب یہ لیا کہ وہ اللہ تعالیٰ کی اپنی رُوح تھی جو مسیح کے اندر حلول کر گئی۔ یہ عیسائیوں کا دوسرا زبردست غلو تھا جس کی وجہ سے وہ گمراہی میں مبتلا ہو گئے۔ اور تو اور کچھ دلیر عیسائیوں نے قرآن کی اس تعبیر کا بھی منہ بگاڑ کر رکھ دیا اور برملا کہہ دیا۔ اس آیت کے موافق حضرت عیسٰی رُوح اللہ ہیں تو البتہ الوہیت کے مرتبہ میں ہیں۔ اس لیے کہ خدا کی رُوح کچھ خدا سے کمتر نہیں ہے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اس شبہ کا ازالۃ الشکوک میں جو جواب دیا ہے وہ صرف لطیف نہیں بلکہ محققانہ ہے۔ اور بتایا ہے کہ قرآن میں حضرت عیسٰی کو روح منہ کیوں کہا گیا ہے۔ فرماتے ہیں۔ اس آیت میں رُوح کی نسبت خدا کی طرف اگر حضرت مسیح کے حق میں ہے تو دوسری آیات میں اوروں کے حق میں لکھا ہے مثلاً

[1] ازالۃ الشکوک۔

حضرت آدم کے بارے میں ہے فسوّاہ و نفخ فیہ من روحہ کہیں فرمایا و نفخت فیہ من روحی ان آیات میں حضرت آدم کے نفس ناطقہ کو اللہ نے اپنی رُوح فرمایا ہے اور روحہ و روحی اس پر بولا ہے ایک دوسرے موقعہ پر قرآن میں حضرت جبرئیل کو اپنی رُوح فرمایا فارسلنا الیھا روحنا لہٰذا اس آیت میں روح منہ کا مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسٰی کا نفس ناطقہ اور جان اللہ کی جانب سے ہے ۔

شاید آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ اگر صرف اتنی سی بات ہے تو اس میں حضرت عیسٰی کی خصوصیت کیا ہے جان تو سب کی اللہ کی دی ہوئی ہے۔ حضرت عیسٰی کے بارے میں خاص طور پر یہ بات کیوں فرمائی گئی ہے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اس کی دس وجوہ بتائی ہیں لیجئے آپ بھی پڑھ لیجئے ۔

اولاً یہ کہ اللہ سبحانہٗ اپنی مخلوقات میں سے کسی مخلوق کو اپنی طرف اس لیے نسبت اور اضافت کرتے ہیں تاکہ لوگوں میں اس کی عظمت کی نمائش ہو جائے ۔ یہ اضافت تشریفی ہوتی ہے ۔ قرآن میں اس قسم کی اضافتیں متعدد ہیں ۔ بیتی میرا گھر، جنتی میری جنت ، اس قسم کی اضافت صرف قرآن ہی میں نہیں ہے بلکہ عہد عتیق اور جدید کی کتابوں میں بکثرت موجود ہے مثلاً ،

انجیل متی میں حضرت عیسٰی کا ارشاد ہے کہ

میرا گھر بیت المقدس عبادت کا پہلا گھر کہلائے گا ۔

کتاب پیدائش کے باب ۲۸ میں ہے

اور یہ پتھر جو میں نے کھڑا کیا خدا کا گھر ہو گا

سموئیل کی کتاب دوم باب ششم میں ہے :

اور داؤد اپنے سارے لوگوں کو لے کر باعل یہوداہ سے چلا تاکہ خدا کی صندوق کو کہ جس کے پاس لشکروں کو یہواہ کا نام لیا جاتا ہے جو دو کروبوں کے بیچ میں دھرا تھا وہاں سے چڑھا لاوے ۳ ۔ سو انہوں نے خدا کی صندوق کو نئی گاڑی میں رکھا ۔

ان میں خدا کا گھر، خدا کا صندوق میں اضافت تشریف کے لیے ہے ۔

ثانیاً یہ کہ کچھ چیزوں کی تخلیق عام عادت الٰہیہ کے خلاف اور عجیب طور پر ہوتی ہے ۔ اللہ سبحانہٗ کو جب اس تخلیقی اعجاز کو بتانا مقصود ہوتا ہے تو اس کی اضافت اپنی طرف کرتے ہیں جیسے اونٹنی کو ناقۃ اللہ فرمایا گیا ہے وہ یہی ہے کہ اس کی تخلیق خلاف عادت الٰہیہ اللہ کی قدرت سے ہوئی ہے پتھر سے نکلی تھی باقاعدہ کوئی ولادت نہ ہوئی تھی ۔

ثالثاً یہ کہ روح کے معنے پھونک کے آتے ہیں چونکہ حضرت عیسٰی مریم کے بطن میں حضرت جبرئیل کی

پھونک سے حمل میں آئے تھے اور جبریل کی پھونک محض اللہ کے حکم سے تھی اس لیے حضرت عیسٰی کو روح اللہ کہہ دیا گیا۔

رابعاً یہ کہ روح کے معنے نعمت کے بھی آتے ہیں۔ حضرت عیسٰی کی ذات گرامی بھی چونکہ اللہ کی رحمت تھی اس لیے ان کو روح اللہ کہہ دیا گیا۔

خامساً عربی زبان میں روح پاکیزہ چیز کو بھی بولتے ہیں اور چونکہ حضرت عیسٰی کی ولادت بغیر باپ کے نطفہ سے ہوئی تھی اس لیے ان پر عرب محاورے کے مطابق لفظ روح بولا گیا ہے۔

سادساً یہ کہ ہر ایسی چیز کو جو دینی امور میں مخلوق خدا کی بھلائی کا ذریعہ ہو عربی میں روح کہا جاتا ہے اسی اعتبار سے قرآن کو روح کہا گیا ہے ارشاد ہے ،

وکذالک اوحینا الیک روحاً من امرنا

السیوطی نے روح کی تفسیر قرآن سے کی ہے اور بیضاوی نے اسی کو قول مختار کہا ہے۔ حضرت عیسٰی بھی چونکہ ہدایت و تزکیہ میں مخلوق کی بھلائی کا سبب ہیں اس لیے ان کو روح اللہ کہا گیا ہے۔

سابعاً یہ کہ اناجیل کی زبان میں ہر سچے کو روح اللہ اور روح الحق کہا گیا ہے۔ فی الواقع حضرت عیسٰی ایک سچے واعظ تھے اسی اعتبار سے قرآن نے ان کو روح کہا ہے۔ یوحنا کے پہلے نامہ کے چوتھے باب میں ہے،

اے پیارو تم ہر واعظ روح پر اعتقاد نہ رکھو بلکہ روحوں (واعظوں) کو آزماؤ کہ وے خدا کی طرف سے ہیں کہ نہیں۔ کون روح (واعظ) خدا سے ہے تم اس سے جانو ہر ایک روح (واعظ) جو اقرار کرتا ہے کہ یسوع مسیح جسم میں ظاہر ہوا خدا سے ہے۔ ہم خدا کے ہیں جو خدا کو پہچانتا ہے۔ ہماری سنتا ہے اور جو خدا کا نہیں ہماری نہیں سنتا ہے ہم اسی سے روح الحق سچے واعظ اور روح الضلالہ گمراہی کے واعظ کو پہچانتے ہیں۔

اس میں روح اللہ روح الحق سچے واعظ پر بولا گیا ہے۔

ثامناً یہ کہ انجیل اور عہد عتیق میں روح اللہ بمعنے قدرت خداوندی مستعمل ہے۔ چنانچہ انجیل متی کے باب ۱۲ میں ہے:

لیکن اگر میں خدا کی روح سے دیووں کو دور کرتا ہوں تو خدا کی بادشاہت تم تک پہنچتی ہے۔

اور لوقا کی انجیل میں یہی بات اس طرح کہی گئی ہے کہ

اگر میں خدا کی قدرت سے دیووں کو نکالتا ہوں تو البتہ خدا کی بادشاہت تم

تکمہ ئی۔

متی نے خدا کی رُوح سے بولا اور لوقا نے خدا کی قدرت سے اسی کی تفسیر کر دی۔ حضرت مسیح بھی چونکہ بغیر باپ کے خدا کی قدرت سے پیدا ہوئے تھے اس لیے ان پر روح اللہ اور روح من اللہ کا اطلاق صحیح ہے تاسعاً یہ کہ کتب عہد قدیم میں رُوح اللہ میں نفس ناطقہ کو بھی کہا گیا ہے جسے ادراک کامل ہو اور مصدر حسنات ہو۔ چنانچہ کتاب پیدائش کے باب ۴۱ میں بادشاہ مصر کا حضرت یوسف کے بارے میں قول آیا ہے۔

اور فرعون نے اپنے نوکروں کو کہا کہ تم ایسا جیسا یہ مرد ہے جس میں خدا کی روح ہے پا سکتے ہیں۔

اور کتاب دانیال کے باب چہارم میں ہے کہ رُوح خدایان مقدس در تست اور اس کے مقابلہ میں لفظ روح زنا وغیرہ آتی ہے۔ یوشع کی کتاب کے باب چہارم میں ہے حرامکاری کی روح نے انہیں گمراہ کیا ہے۔

چونکہ حضرت مسیح کا نفس ناطقہ ادراک کامل سے مالا مال، حسنات اور عجائب و غرائب کا مصدر تھا، اس لیے ان کو رُوح اللہ کہا گیا ہے۔ اس صورت میں اور پہلی اور دوسری میں وروح منہ، کا مضاف محذوف ہوگا اصل عبارت یوں ہے ذو روح منہ السیوطی نے جلالین اور قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اس طرف اشارہ کیا ہے۔

عاشراً یہ کہ چونکہ مطلق روح کو تجرد اور اصل خلقت کے اعتبار سے اللہ کی ذات کے ساتھ ایک طرح کی مناسبت ہے۔ اس لحاظ سے مطلق رُوح کی اضافت بھی خدا کی طرف صحیح ہے۔ چنانچہ خرقی ایل کی کتاب میں اللہ سبحانہ نے ان سب لوگوں کو مخاطب کر کے جن کو حضرت خرقیل کے معجزہ سے زندہ کیا تھا فرمایا۔ اور جب میں اپنی رُوح تم میں رکھوں گا۔ عربی میں تعبیر یوں ہے فاعطی فیکمہ روحی۔ اس میں اللہ سبحانہ نے ان لوگوں کی جان کو اپنی رُوح فرمایا ہے۔[1]

بہرحال ان وجوہ کی بنا پر قرآن کی اس آیت میں اللہ سبحانہ نے حضرت مسیح کو رُوح فرمایا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ کلمۃ اللہ، رُوح اللہ قسم کے اطلاقات سے حضرت مسیح کی الوہیت کو ثابت کرنا پرلے درجہ کی حماقت ہے۔ ہاں اس سے دوسری مخلوقات کے مقابلہ میں ایک طرح کی فضیلت ضرور ثابت ہوتی ہے۔

۲۵۶۔ لہٰذا تم اللہ اور اس کے رسُولوں پر ایمان لاؤ اور یہ نہ کہو کہ تین ہیں۔ یعنی ان صحیح حقائق

---

[1] ازالۃ الشکوک ملخصاً

کہہ لینے کے بعد اب واجب ہے کہ اپنے خود تراشیدہ عقائد و خیالات کو چھوڑ کر اللہ اور اس کے رسولوں کی ہدایات پر ایمان لاؤ۔ اللہ کو الٰہ واحد مانو اور تمام رسولوں کی رسالت تسلیم کرو جن میں سے ایک رسول مسیح بھی ہیں۔ یہی مسیح علیہ السلام کی اصل تعلیم تھی اور یہی امر حق ہے جسے ایک سچے حضرت مسیح کے پیرو کو ماننا چاہیے۔ اور نہ کہو کہ تین ہیں۔ یعنی تین خداؤں کے عقیدے کو چھوڑ دو خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ وہ تین اقنوم ہوں یا تین مستقل بالذات ہستیاں ہوں۔ پہلے اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لاؤ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ جب خدا کے تمام رسولوں کی تعلیم تورات و انجیل میں موجود ہے اور اس تعلیم میں مسیح سے لے کر آدم تک کہیں سراغ نہیں ملتا تو آخر یہ عقیدہ تم نے کہاں سے گھڑ لیا ہے۔ پس صحیح راستہ یہ ہے کہ الگ پگڈنڈی بنانے کے بجائے تم بھی اس صراط مستقیم پر چلو جس پر تمام نبی اور رسول چلے آخر یہ کیسے ممکن ہے کہ مسیح کی تعلیم اللہ اور اس کے رسولوں کے خلاف ہو۔

عیسائی مذہب میں خدا کا تصور

جہاں تک خدا کے وجود کا تعلق ہے عیسائی مذہب اس معاملہ میں دوسرے مذاہب سے مختلف نہیں ہے۔ وہ بھی خدا کو تقریباً انہی صفات کے ساتھ تسلیم کرتا ہے جو دوسرے مذاہب میں اس کے لیے بیان کی جاتی ہیں۔ مارس ملمن لکھتا ہے :

> عیسائیت کا خدا کے بارے میں تصور یہ ہے کہ وہ ایک زندہ جاوید وجود ہے جو تمام امکانی صفات کمال کے ساتھ متصف ہے۔ اسے محسوس تو کیا جا سکتا ہے لیکن پوری طرح سمجھا جا نہیں سکتا اس لیے اس کی حقیقت کا ٹھیک ٹھیک تجزیہ ہمارے ذہن کی قوت سے ماوراء ہے وہ کیا ہے؟ ہمیں معلوم نہیں صرف اتنی بات معلوم ہے جو خود اس نے بنی نوع انسان کو وحی کے ذریعے بتلائی ہے۔

عقیدہ تثلیث

یہاں تک تو بات واضح اور صاف ہے لیکن آگے چل کر اس مذہب نے خدا کے تصور کی جو تفصیلات بیان کی ہیں وہ بڑی الجھی ہوئی ہیں اور ان کا سمجھنا آسان نہیں ہے۔ یہ بات تو ہر کس و ناکس کو معلوم ہے کہ عیسائی مذہب میں خدا تین اقانیم سے مرکب ہے۔ باپ، بیٹا، روح القدس۔ اسی کو عقیدۂ تثلیث کہتے ہیں لیکن بجائے خود اس عقیدے کی تشریح و تعبیر میں عیسائی علماء کے بیانات اس

قدر مختلف ہیں کہ یقینی طور پر کوئی ایک بات کہنا بہت مشکل ہے۔ وہ تین اقانیم کون ہیں؟ جن کا مجموعہ ان کے نزدیک خدا ہے۔ خود ان کی تعیین میں بھی اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا باپ بیٹے اور روح القدس کے مجموعہ کا نام ہے اور بعض کا کہنا ہے کہ باپ بیٹا اور کنواری وہ تین اقنوم ہیں جن کا مجموعہ خدا ہے۔ پھر ان تین اقانیم میں سے ہر ایک کی انفرادی حیثیت کیا ہے اور خدا کے مجموعے سے جسے ثالوث کہتے ہیں اس کا کیا رشتہ ہے؟ اس سوال کے جواب میں بھی ایک زبردست اختلاف ہے۔ ایک گروہ کا کہنا ہے کہ ان تین میں سے ہر ایک بذات خود بھی ویسا ہی خدا ہے جیسا مجموعہ خدا، ایک دوسرے گروہ کا کہنا ہے کہ ان تینوں میں سے ہر ایک الگ الگ خدا تو ہیں مگر مجموعہ خدا سے کمتر ہیں اور ان پر لفظ خدا کا اطلاق ذرا وسیع معنے میں کر دیا گیا ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ یہ تین خدا ہی نہیں خدا تو صرف ان کا مجموعہ ہے۔

خواب پریشاں

غرض اس قسم کے بے شمار اختلافات ہیں جن کی وجہ سے تثلیث کا عقیدہ ایک خواب پریشاں بن کر رہ گیا ہے۔ ہم اس جگہ عقیدے کی وہ تشریح پیش کرتے ہیں جو عیسائیوں کے یہاں سب سے زیادہ متبرک عام معلوم ہوتی ہے یہ تعبیر انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا کے الفاظ میں مندرجہ ذیل ہے :

> تثلیث کے عیسائی نظریے کو ان الفاظ میں اچھی طرح تعبیر کیا جا سکتا ہے کہ باپ خدا ہے، بیٹا خدا ہے اور روح القدس خدا ہے۔ لیکن یہ مل کر تین خدا نہیں ہیں بلکہ ایک ہی خدا ہیں اس لیے کہ عیسائی نظریے کے مطابق ہم جس طرح تینوں میں سے ہر ایک اقنوم کو خدا اور آقا سمجھنے پر مجبور ہیں۔ اسی طرح ہمیں کیتھولک مذہب نے اس بات کی ممانعت کر دی ہے کہ ہم ان کو تین خدا یا تین آقا سمجھنے لگیں۔

اسی بات کو قدرے تفصیل سے بیان کرتے ہوئے تیسری صدی عیسوی کے مشہور عیسائی عالم اور فلسفی سینٹ اگسٹائن اپنی مشہور کتاب علی الثالوث میں لکھتے ہیں :

> عہد قدیم اور جدید کے وہ تمام کیتھولک علماء جنہیں پڑھنے کا مجھے اتفاق ہوا ہے اور جنہوں نے مجھ سے پہلے تثلیث کے موضوع پر لکھا ہے وہ مقدس صحیفوں کی روشنی میں اس نظریے کی تعلیم دینا چاہتے ہیں کہ باپ بیٹا اور روح القدس مل کر ایک خدائی وحدت تیار کرتے ہیں، جو اپنی ماہیت اور حقیقت کے اعتبار سے ایک اور ناقابل تقسیم ہے۔

اس وجہ سے وہ تین خدا نہیں ہیں بلکہ ایک خدا ہے اگرچہ باپ نے بیٹے کو پیدا کیا۔ لہٰذا جو باپ ہے وہ بیٹا نہیں ہے۔ اسی طرح بیٹا باپ سے پیدا ہوا ہے۔ اسی لیے جو بیٹا ہے وہ باپ نہیں ہے اور روح القدس بھی نہ باپ ہے نہ بیٹا بلکہ باپ اور بیٹے کی رُوح ہے، جو دونوں کے ساتھ مساوی اور تثلیثی وحدت میں ان کی حصہ دار ہے لیکن یہ نہ سمجھا جائے کہ یہ تثلیثی وحدت ہی کنواری مریم کے پیٹ سے پیدا ہوئی ہے، اسے پنطس، پیلاطس نے پھانسی دی اسے دفن کیا گیا اور پھر یہ تیسرے روز زندہ ہو کر جنت میں چلی گئی کیونکہ یہ واقعات تثلیثی وحدت کے ساتھ نہیں، صرف بیٹے کے ساتھ پیش آتے تھے۔ اسی طرح یہ بھی نہ سمجھنا چاہیے کہ یہی تثلیثی وحدت یسوع مسیح پر کبوتر کی شکل میں اس وقت نازل ہوئی تھی جب اسے بپتسمہ دیا جا رہا تھا بلکہ یہ واقعہ صرف روح القدس کو تھا۔ علیٰ ہذا القیاس یہ سمجھنا بھی درست نہیں ہے کہ جب یسوع مسیح کو بپتسمہ دیا جا رہا تھا یا جب وہ اپنے تین شاگردوں کے ساتھ پہاڑ پر کھڑا تھا۔ اس وقت تثلیثی وحدت نے اس سے پکار کر کہا تھا کہ تو میرا بیٹا ہے ۔۔۔۔ بلکہ یہ الفاظ صرف باپ کے تھے جو بیٹے کے لیے بولے گئے تھے۔ اگرچہ جس طرح باپ بیٹے اور رُوح القدس ناقابل تقسیم ہیں۔ اسی طرح ناقابل تقسیم طریقے پر وہ کام بھی کرتے ہیں، یہی میرا عقیدہ ہے اس لیے کہ یہ کیتھولک عقیدہ ہے۔

تین کو ایک اور ایک کو تین قرار دینے کی عیسائیوں کے پاس وجہ جواز کیا ہے۔ اس سوال کا جواب سننے سے پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ عیسائی مذہب میں باپ بیٹے اور روح القدس سے کیا مراد ہے۔

عیسائیوں کے نزدیک باپ سے مراد خدا کی تنہا ذات ہے جس میں اس کی صفت کلام اور صفت حیات سے قطع نظر کر لی گئی ہے۔ یہ ذات بیٹے کے وجود کے لیے اصل کا درجہ رکھتی ہے۔ مشہور عیسائی فلاسفر سینٹ تھامس اکوئیناس کی تشریح کے مطابق باپ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس نے کسی کو جنا ہے اور کوئی ایسا وقت گزرا ہے جس میں باپ تھا اور بیٹا نہیں تھا بلکہ یہ ایک خدائی اصطلاح ہے جس کا مقصد صرف یہ ہے کہ باپ بیٹے کے لیے اصل ہے جس طرح ذات صفت کے لیے اصل ہوتی ہے ورنہ جب سے باپ موجود ہے اسی وقت سے بیٹا موجود ہے اور ان میں سے کسی کو کسی پر کوئی زمانی اولیت حاصل نہیں ہے۔

خدا کی ذات کو باپ کیوں کہا جاتا ہے۔ اس سوال کا جواب دیتے ہوئے النفر ڈائی گارو نے لکھا ہے کہ

اس سے کئی حقائق کی طرف توجہ دلانا مقصود ہے۔ ایک تو اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ تمام مخلوقات اپنے وجود میں خدا کی محتاج ہیں۔ جس طرح بیٹا باپ کا محتاج ہوتا ہے، دوسری طرف یہ بھی ظاہر کرنا ہے کہ خدا اپنے بندوں پر اس طرح شفیق اور مہربان ہے جس طرح باپ اپنے بیٹے پر مہربان ہوتا ہے۔

(انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجن اینڈ ایتھکس ۵ ج ۳ ص ۸۵)

بیٹے سے مراد عیسائیوں کے نزدیک خدا کی صفت کلام ہے۔ لیکن یہ انسانوں کی صفت کلام کی طرح نہیں ہے۔ انسانوں کی صفت کلام اور خدا کی صفت کلام کے درمیان فرق بیان کرتے ہوئے اکوئیناس لکھتا ہے۔

انسانی فطرت میں صفت کلام کوئی جوہری وجود نہیں ہے اسی وجہ سے اس کو انسان کا بیٹا یا مولود نہیں کہہ سکتے لیکن خدا کی صفت کلام ایک جوہری ہے جو خدا کی ماہیت میں اپنا ایک وجود رکھتا ہے اسی لیے اس کو حقیقتہً نہ مجازاً بیٹا کہا جاتا ہے اور اس کی اصل کا نام باپ ہے۔

عیسائی عقیدے کے مطابق خدا کو جس قدر معلومات حاصل ہوتی ہیں وہ اسی صفت کے ذریعے ہوتی ہیں۔ اور اسی صفت کے ذریعے تمام اشیاء پیدا ہوتی ہیں۔ یہ صفت باپ کی طرح قدیم اور جاودانی ہے۔ خدا کی یہی صفت یسوع مسیح بن مریم کی انسانی شخصیت میں حلول کر گئی تھی جس کی وجہ سے یسوع مسیح کو خدا کا بیٹا کہا جاتا ہے۔ حلول کا یہ عقیدہ ایک مستقل حیثیت رکھتا ہے۔

رُوح القدس سے مراد باپ اور بیٹے کی صفت حیات اور محبت ہے۔ یعنی اس صفت کے ذریعے خدا کی ذات (باپ) اپنی صفت علم (بیٹے) سے محبت کرتی ہے اور بیٹا باپ سے محبت کرتا ہے۔ یہ صفت بھی صفت کلام کی طرح ایک جوہری وجود رکھتی ہے اور باپ بیٹے کی طرح قدیم اور جاودانی ہے۔ اسی وجہ سے اسے ایک مستقل اقنوم کی حیثیت حاصل ہے۔ عیسائیوں کا عقیدہ یہ ہے کہ جب حضرت مسیح کو بپتسمہ دیا جا رہا تھا تو یہی صفت ایک کبوتر کے جسم میں حلول کر کے حضرت مسیح علیہ السلام پر نازل ہوئی تھی۔ اس کے بعد جب حضرت مسیح کو آسمان پر اٹھا لیا گیا تھا تو عید پینٹی کوسٹ کے روز بھی رُوح القدس آتشیں زبانوں کی شکل میں حضرت مسیح کے حواریوں پر نازل ہوا۔

اب عقیدہ توحید فی التثلیث کا خلاصہ یہ ہوا کہ خدا تین اقانیم یا شخصوں پر مشتمل ہے۔ خدا کی ذات جسے باپ کہتے ہیں خدا کی صفت کلام جسے بیٹا کہتے ہیں اور خدا کی صفت حیات جسے روح القدس کہا جاتا ہے۔ ان تین میں سے ہر ایک خدا ہے۔ لیکن یہ تینوں مل کر تین خدا نہیں ہیں بلکہ

ایک ہی خدا ہیں۔ [1]

مولانا عبدالماجد دریا بادی نے اپنی تفسیر میں مسیحی تثلیث کا عقیدہ خود مسیحیوں کے الفاظ میں یہ بتایا ہے کہ " باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے۔ جلال برابر عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح قدس ہے۔ باپ غیر مخلوق، بیٹا غیر مخلوق اور روح قدس غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود، بیٹا غیر محدود اور روح قدس غیر محدود، باپ ازلی بیٹا ازلی اور روح قدس ازلی تاہم تین ازلی نہیں بلکہ ایک ازلی، اسی طرح تین غیر محدود نہیں اور نہ تین غیر مخلوق بلکہ ایک غیر مخلوق اور ایک غیر محدود، یونہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق اور روح قدس قادر مطلق۔ تو بھی تین قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق ہے۔ ویسا باپ خدا بیٹا خدا روح القدس خدا بس یہ بھی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا تین میں ایک اور ایک میں تین کے اسی گورکھ دھندے کو عیسائیوں کے لیے ایک ناقابل حل چیستان بنا دیا۔ تقریباً ۱۸ سو برس سے مسیحی علماء اسی خود پیدا کردہ مشکل کو حل کرنے پر سرکھپا رہے ہیں۔ بیسیوں فرقے اسی کی مختلف تعبیرات پر بنے ہیں، اسی پر ایک گروہ نے دوسرے کی تکفیر کی ہے۔ اسی کے جھگڑوں میں کلیسا پر کلیسا الگ ہوگئے۔ اسی پر ان کے سارے علم کلام کا زور ہے۔ حالانکہ یہ مشکل نہ خدا نے پیدا کی تھی اور نہ حضرت مسیح نے، اور نہ اس چیستان کا کوئی حل ممکن ہے۔ یہ الجھن خود ان کے غلو کی تخلیق ہے۔ اس کا بس یہی ایک حل ہے کہ وہ غلو سے باز آجائیں اور تین کہنا چھوڑ دیں، اور بس۔

حلول و تجسم کے عقیدہ کا بطلان

۲۵۷۔ اس سے باز آجاؤ اس میں تمہارے لیے خیر ہے۔ یعنی تین خدا کہنے سے اور تین میں ایک اور ایک میں تین کے چکر سے باز آجاؤ۔ یہ بات دھمکی کے انداز میں ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کہنے سے باز آجاؤ کہ خدا کی صفت کلام انسانوں کی فلاح کے لیے حضرت مسیح کے انسانی وجود میں حلول کر گئی۔ حضرت مولانا اشرف علی نے یہ بات برموقعہ فرمائی ہے کہ یہ آیت گرامی حلول و اتحاد کے بطلان صریح پر دال ہے۔ حضرت مسیح کے بارے میں حلول و تجسم کا عقیدہ سب سے پہلے انجیل یوحنا میں ملتا ہے اس انجیل کا مصنف حضرت مسیح کی سوانح کی ابتداء ان الفاظ سے کرتا ہے۔

ابتداء میں کلام تھا اور کلام خدا کے ساتھ تھا اور کلام خدا تھا یہی ابتداء میں

---

[1] عیسائیت کیا ہے از مولانا محمد تقی عثمانی

خدا کے ساتھ تھا۔ (یوحنا ۱: ۱-۲)

اور آگے چل کر لکھتا ہے:

اور کلام مجسم ہوا اور فضل اور سچائی سے معمور ہو کر ہمارے درمیان رہا اور ہم نے اس کا ایسا جلال دیکھا جیسا باپ کے اکلوتے کا جلال۔ (یوحنا ۱: ۱۴)

چونکہ عیسائی مذہب میں کلام خدا کے اقنوم ابن سے عبارت ہے جو خود مستقل خدا ہے اس لیے یوحنا کی عبارت کا مطلب یہ ہوا کہ خدا کی صفت کلام یعنی بیٹے کا اقنوم مجسم ہو کر حضرت مسیح علیہ السلام کے روپ میں آگیا تھا۔ مارس ریلٹن اس عقیدے کی تشریح کرتے ہوتے لکھتا ہے کہ

کیتھولک عقیدے کا یہ کہنا ہے کہ وہ ذات جو خدا تھی خدائی کی صفات کو چھوڑے بغیر انسان بن گئی یعنی اس نے ہمارے جیسے وجود کی کیفیات اختیار کرلیں جو زمان و مکان کی قید میں مقید ہے اور ایک عرصہ تک ہمارے درمیان مقیم رہی۔

بیٹے کے اقنوم کو یسوع مسیح علیہ السلام کے انسانی وجود کے ساتھ متحد کرنے والی طاقت عیسائیوں کے نزدیک رُوح القدس تھی۔ روح القدس سے مراد عیسائیوں میں خدا کی صفت محبت ہے۔ اس لیے اس عقیدے کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ خدا کو اپنی بندوں سے محبت تھی اس لیے اس نے اپنی صفت محبت کے ذریعے اقنوم ابن کو دُنیا میں بھیج دیا تاکہ وہ لوگوں کے اصلی گناہ کا کفارہ بن سکے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کرلینی چاہیے کہ عیسائیوں کے نزدیک بیٹے کے حضرت مسیح میں حلول کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ بیٹا خدائی چھوڑ کر انسان بن گیا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ پہلے صرف خدا تھا اب انسان بھی ہوگیا لہٰذا اس عقیدے کے مطابق حضرت مسیح بیک وقت خدا بھی تھے اور انسان بھی۔ الفریڈای گاروے اسی بات کو ان الفاظ میں ظاہر کرتا ہے:

وہ حضرت مسیح حقیقۃً خدا بھی تھے اور انسان بھی۔ ان کی ان دونوں حیثیتوں میں سے کسی ایک کے انکار یا ان کے وجود میں دونوں کے متحد ہونے کے انکار ہی سے مختلف بدعتی نظریات پیدا ہوتے۔ اتھناسیئس نے آریوس کے مقابلہ میں اس نظریہ کی پُرزور حمایت کی تھی لہٰذا منظور شدہ فارمولا یہ ہے کہ حضرت مسیح کی ایک شخصیت میں دو ماہیتیں جمع ہوگئی تھیں۔

انسانی حیثیت سے حضرت مسیح خدا سے کم مرتبہ تھے اسی لیے انہوں نے یہ کہا تھا کہ "باپ مجھ سے بڑا ہے۔"

اور اسی حیثیت سے ان میں تمام انسانی کیفیات پائی جاتی تھیں لیکن خدائی حیثیت سے وہ باپ کے ہم مرتبہ ہیں اس لیے انجیل یوحنا میں آپ کا یہ قول مذکور ہے ۔

میں اور باپ ایک ہیں ۔

اگسٹائن لکھتے ہیں ،

علی ہذا القیاس خدائی حیثیت سے انہوں نے انسان کو پیدا کیا اور انسانی حیثیت سے وہ خود پیدا کیے گئے ۔

بلکہ اگسٹائن تو یہاں تک لکھ گئے ہیں کہ ،

چونکہ خدا نے بندے کا روپ اس طرح نہیں اپنایا تھا کہ وہ اپنی اس خدائی حیثیت کو ختم کر دے جس میں وہ باپ کے برابر ہے لہٰذا ہر شخص اس بات کو محسوس کر سکتا ہے کہ یسوع مسیح اپنی خدائی شکل میں خود اپنے آپ سے افضل ہے ، اور اسی طرح اپنی انسانی حیثیت میں خود اپنے آپ سے کمتر بھی ہے ۔[1]

بہرحال کچھ ہو قرآن کا مطالبہ ہے کہ ان سب غالیانہ عقائد سے باز آجاؤ اور آخر میں فرمایا ہے کہ اسی میں تمہاری بہتری ہے ۔ یعنی اگر تم توحید کو مانو گے تو یہ تمہارے حق میں اچھا ہوگا اس دنیا میں بھی بہتر ہے اور آخرت میں بھی بہتر ہے ۔ دنیا کی بہتری یہ ہے کہ نوع انسانی جس مقصد کی خاطر دنیا میں آئی ہے اور اللہ سبحانہٗ نے جو کمالات اس کے لیے مقدر فرمائے ان کمالات تک پہنچنا ممکن ہو جائے گا اور آخرت کی بہتری یہ ہے کہ عالم غیب میں ان کمالات کے جو نتائج اللہ سبحانہٗ نے متعین فرمائے ان سے ہمدوش ہوگا ابدی زندگی ، راحت و انعام دالے گا ۔ اور اگر توحید کی جگہ تثلیث کو اپنایا تو مشرکانہ زندگی ہوگی اور شرک اس دنیا میں انسان کو اپنے نوعی کمال تک پہنچنے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے ۔ اور آخرت میں مشرک کے لیے سرتاسر خسارہ ہی خسارہ ہے ۔

توحید الوہیت کا اعلان

۲۵۸ ۔ امر واقعہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی ذات ہی یگانہ معبود ہے ، وہ ہر اعتبار سے اور ہر معنے میں واحد ہے ۔ تثلیث اور حلول و اتحاد کی وہاں گنجائش نہیں ۔ کسی بھی پیغمبر نے از مسیح تا

[1] عیسائیت ۔

اُدم تثلیث کی تعلیم نہیں دی ہے سب توحید کے منادی بنکر آئے ہیں۔ عہد قدیم اور عہد جدید میں سب نبیوں نے اس کی دعوت دی ہے یہی سارے نبیوں کا اشتراکی سرمایہ ہے۔ قرآن کے بیان توحید کی تائید صرف عہد عتیق اور جدید کی کتابیں بھی کرتی ہیں مثلاً

تورات سفر استثنا باب ۴ آیت ۳۵، ۳۶

یہ سب تجھ کو دکھایا گیا تاکہ تو جانے کہ خداوند وہی خدا ہے اور اس کے سوا کوئی نہیں۔

تورات سفر استثنا باب ۶ آیت ۴

سُن اے اسرائیل خداوند ہمارا اکیلا خدا ہے۔

تورات سفر استثنا باب ۳۲ آیت ۳۹

اب دیکھو کوئی معبود میرے ساتھ نہیں اور میں ہی مارتا ہوں اور میں جلاتا ہوں اور میں ہی زخمی کرتا ہوں اور میں ہی چنگا کرتا ہوں، اور ایسا کوئی نہیں جو میرے ہاتھ سے چھڑا دے۔

زبور حصہ ۳ باب ۸۶ آیت ۹

تو بزرگ اور عجائب کام کرتا ہے تو ہی اکیلا خدا ہے۔

زبور باب ۷۷ آیت ۱۳۔

اے خدا تیری راہ مقدس ہے، کون معبود خدا کے مانند بڑا ہے۔

اول کتاب السلاطین باب ۸ آیت ۶۰۔

تاکہ زمین کے سارے گروہ معلوم کریں کہ خداوند وہی خدا ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں۔

کتاب اشعیا باب ۴۳ آیت ۱۱

اور میرے سوا کوئی بچانے والا نہیں ہے۔

کتاب اشعیا باب ۴۵ آیت ۱۴

اور تیرے آگے سجدہ کریں گے اور تیرے آگے منت کریں گے اور کہیں گے کہ یقیناً تجھ میں ہے اور کوئی دوسرا نہیں اور اس کے سوا کوئی خدا نہیں یقیناً تو ہی ایک خدا ہے۔

کتاب اشعیا باب ۴۶ آیت ۹

میں خدا ہوں اور کوئی دوسرا نہیں، میں خدا ہوں اور مجھ سا کوئی نہیں ہے۔

کتاب خروج باب ۱۵ آیت ۱۱

معبودوں میں خداوند تجھ سا کون ہے، پاکیزگی میں کون ہے تیرا سا جلال والا۔

کتاب دوم سموئیل باب ۷ آیت ۲۲

اے خداوند کوئی تیری مانند نہیں اور تیرے سوا جہاں تک ہم نے اپنے کانوں سے سنا ہے کوئی خدا نہیں ہے۔

اول کتاب السلاطین باب ۸ آیت ۲۳

اور سلیمان نے اسرائیل کی ساری جماعت کی روبرو کھڑے ہو کر اپنے ہاتھ آسمان کی طرف پھیلائے اور کہا اے خداوند اسرائیل کے خدا تجھ سا کوئی خدا نہ اوپر آسمان میں ہے نہ نیچے۔

کتاب اشعیا باب ۴۰ آیت ۲۸۔

کیا تو نے نہیں جانا کیا تو نے نہیں سنا خداوند ابدی خدا ہے۔ زمین کے کناروں کا پیدا کرنے والا وہ تھک نہیں جاتا اور ماندہ نہیں ہوتا اس کے فہم کی تہاہ نہیں ہے۔

کتاب یرمیاہ باب ۱۰ آیت ۱۰ تا ۱۲

لیکن خداوند سچا خدا ہے وہ زندہ خدا اور ابدی بادشاہ ہے۔ زمین اس کے قہر سے تھرتھراتی ہے اور قومیں اس کے جھلاہٹ کی برداشت نہیں کر سکتی ہیں تم ان سے اس طرح کہو کہ جن معبودوں نے آسمان و زمین کو نہیں بنایا زمین پر سے اور آسمان کے نیچے سے نیست ہوں گے۔ اسی نے اپنی قدرت سے دنیا کو بنایا ہے۔ اسی نے اپنی حکمت سے جہان کو قائم کیا ہے۔ عہد عتیق کی طرح عہد جدید کی کتابوں میں بھی جگہ جگہ توحید کی تعلیم موجود ہے۔ مثلاً

یسوع نے کہا کہ میں اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں۔

یوحنا باب ۲۰ آیت ۱۷

ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جس کو تو نے بھیجا ہے جانیں۔ (یوحنا باب ۱۷ آیت ۳)

اس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کون سا ہے ۲۹۔ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے ۳۰ اے اسرائیل سن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔

مرقس باب ۱۲ آیت ۲۸

اے استاذ کیا خوب تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے

مرقس ۱۳ - ۳۲

تو مجھ سے نیکی کی بات کیوں پوچھتا ہے نیک تو ایک ہی ہے ۔

متی ۱۹ - ۱۷

یسوع نے بڑی آواز سے چلا کر کہا ایلی ایلی لما سبقتنی لے میرے خدا لے میرے خدا تو نے مجھے کیوں چھوڑ دیا ہے ۔

متی ۲۷ - ۴۶ ۔

جو کلام تم سنتے ہو وہ میرا نہیں بلکہ باپ کا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے ۔ (یوحنا ۱۴-۲۴)

زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ رکھو کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے ۔

متی ۹ - ۲۳ ۔

یسوع نے شاگردوں سے کہا یہیں بیٹھے رہنا جب تک دعا مانگوں ۔ متی ۲۶ - ۳۶ ۔

یسوع نے کہا لکھا ہے کہ تو اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر ۔

لوقا ۴ آیت ۸ ۔

ان تصریحات کے باوجود عیسائی تثلیث کے گورکھ دھندے سے چمٹے ہوئے ہیں لیکن ان میں ایک گروہ ایسا بھی ہے جس نے اس گورکھ دھندے سے پریشان ہو کر صاف صاف کہہ دیا کہ حضرت مسیح کو خدا ماننا ہی غلط ہے وہ صرف انسان تھے ۔ مسٹر جیمس میک کمن نے اپنی فاضلانہ کتاب میں ان منکرین کا تذکرہ تفصیل سے کیا ہے ۔ ان کے بیان کے مطابق اس نظریہ کے ابتدائی لیڈر پال آف سموسٹا جن کا نام حافظ ابن حزم نے الملل والنحل پولس الشمشاطی بتایا ہے اور لوسین ہے ۔ مسٹر میک کمن لکھتے ہیں ۔

> دونوں کا نظریہ یہ تھا کہ یسوع مسیح ایک مخلوق تھے، البتہ دونوں کے نظریات میں یہ فرق ہے کہ پال کے نزدیک وہ محض ایک انسان تھے جن میں خدا کی غیر شخصی عقل نے اپنا مظاہرہ کیا تھا ۔ اور لوسین اور اس کے مکتب فکر کے نزدیک وہ ایک آسمانی وجود تھے جس کو خدا عدم سے وجود میں لایا تھا اور جن میں خدائی عقل اپنی شخصی کیفیت میں آگئی تھی ۔ لہٰذا وہ حلول کے وقت ایک انسانی جسم کا مظاہرہ کرتے تھے مگر ان کی روح انسانی نہیں تھی ۔ ان کا مشن یہ تھا کہ وہ باپ کا پیغام پہنچائیں لیکن نہ تو وہ علی الاطلاق خدا تھے اور نہ قدیم و جاودانی ۔

گویا پال نے تو سرے سے حلول کے عقیدے ہی کا انکار کر دیا اور یہ کہا کہ حضرت مسیح کے وجود میں خدا کے حلول کرنے کا مطلب صرف یہ ہے کہ ان کو خدا کی طرف سے ایک خاص عقل عطا ہوئی تھی

اور لوسین نے حلول کے عقیدے کا تو انکار نہیں کیا۔ اس نے یہ تسلیم کیا کہ خدا کی صنت علم ان میں حلول کر گئی تھی لیکن یہ حلول ایسا نہ تھا کہ حضرت مسیح کو خدا، خالق، قدیم اور جاودانی بنادے بلکہ اس حلول کے باوجود خدا بدستور خالق رہا اور حضرت مسیح بدستور مخلوق۔

پال اور لوسین ہی کے نظریات سے متاثر ہوکر چوتھی صدی عیسوی میں مشہور متکلم آریوس نے اپنے وقت کے کلیسا کے خلاف بڑی زبردست جنگ لڑی اور پوری عیسائی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا۔ اس کے نظریات کا خلاصہ ریک کن کے الفاظ میں یہ تھا۔

> آریوس میں اس بات پر زور دیتا تھا کہ صرف خدا ہی قدیم اور جاودانی ہے اور اس کا کوئی ساجھی نہیں۔ اسی نے بیٹے کو پیدا کیا جب کہ وہ پہلے معدوم تھا۔ لہٰذا نہ بیٹا جاودانی ہے اور نہ خدا ہمیشہ سے باپ ہے کیونکہ ایک ایسا وقت تھا جس میں بیٹا موجود نہیں تھا۔ بیٹا باپ سے بالکل الگ ایک حقیقت رکھتا ہے اور اس پر تغیرات واقع ہو سکتے ہیں۔ وہ صحیح معنے میں خدا نہیں ہے۔ البتہ اس میں مکمل ہونے کی صلاحیت موجود ہے اور وہ ایک مکمل مخلوق ہے۔ ایک عقل مجسم جو ایک حقیقی انسانی جسم میں پائی جاتی ہے اس طرح اس کے نزدیک مسیح ایک ثانوی خدائی کا حامل ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ نیم دیوتا جو خدائی اور انسانیت دونوں کی صفات سے کسی قدر حصہ رکھتا ہے لیکن بلند ترین معنے میں خدا نہیں ہے۔
>
> گویا اس کی نظر میں حضرت مسیح کی حیثیت
>
> بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر
>
> کی تھی۔ اور بس۔

عقیدۂ ابنیت پر ضرب کاری

۲۵۹۔ اس کی ذات اس سے پاک ہے کہ اس کا کوئی بیٹا ہو۔ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اسی کا ہے اور کارساز ہونے کے لیے اللہ کافی ہے۔ یعنی آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے سب اس کی مخلوق اور اس کی مملوک اور اس کے بندے ہیں، پھر کیسے کوئی اس کا شریک یا اس کا بیٹا کون اور کیوں کر ہو سکتا ہے۔ اور اللہ سب کام بنانے والا اور سب کی کارسازی کے لیے وہی کافی ہے، کسی دوسرے کی حاجت نہیں پھر بتلایئے اس کو شریک یا بیٹے کی حاجت کیسے ہو

ہو سکتی ہے۔ خلاصہ یہ ہوا کہ نہ کسی مخلوق میں اس کے شریک بننے کی قابلیت اور لیاقت اور نہ اس کی ذات پاک میں اس کی گنجائش اور نہ اس کو اس کی حاجت، جس سے معلوم ہو گیا کہ مخلوقات میں سے کسی کو خدا تعالیٰ کا شریک یا بیٹا کہنا اس کا کام ہے جو ایمان اور عقل دونوں سے محروم ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص حق تعالیٰ کے لیے بیٹا یا کسی کو اس کا شریک مانتا ہے وہ حقیقت میں جملہ موجودات کو مخلوق باری اور باری تعالیٰ کو خالق جملہ موجودات نہیں مانتا اور نیز اللہ تعالیٰ کو سب کی حاجت برآری اور کارسازی کے لیے کافی نہیں جانتا۔ گویا خدا کو خدائی سے نکال کر مخلوقات اور ممکنات میں داخل کر دیا، تو اب ارشاد سبحانہ ان یکون لہ ولد میں جس ناپاکی کی طرف اشارہ مخفی تھا اس کا پتہ چل گیا۔ اور فرزند حقیقی اور فرزند مجازی اور ظاہری دونوں میں وہ ناپاکی چونکہ برابر موجود ہے تو خوب سمجھ میں آگیا کہ اس کی ذات مقدس جیسے اس سے پاک ہے کہ اس کے بیٹا پیدا ہو اس سے بھی پاک اور برتر ہے کہ اپنی مخلوق میں سے کسی کو بیٹا بنائے۔[1]

یہ عیسائیوں کے چوتھے غلو کی تردید ہے۔ ولدیت کا عقیدہ غلط ہی نہیں بلکہ اصلاً مہمل اور تنزیہ الوہیت کے لیے باعث توہین اور شان الوہیت کے بالکل منافی ہے۔ خالق کا صحیح رشتہ مخلوق کے ساتھ صرف مالکیت کا ہے۔ مالک و مملوک میں مباینت لازمی ہے برخلاف والد و مولود کے کہ ان میں ہم جنسی اور ہم قومی شرط ہے۔ جب ہر مخلوق اللہ کی مملوک ہے تو کوئی مخلوق اللہ کی اولاد نہیں ہو سکتی۔ بائبل کے عہد جدید کی روایات مثلاً،

آسمان سے یہ آواز کہ یہ یعنی حضرت مسیح، میرا پیارا بیٹا ہے جس سے میں خوش ہوں

(متی باب ۳ آیت ۱۱)

توان سے زیادہ سے زیادہ بس یہی ثابت ہوتا ہے کہ مسیح علیہ السلام نے خدا اور بندوں کے تعلق کو باپ اور اولاد کے تعلقات سے تشبیہہ دی ہے اور باپ کا لفظ وہ خدا کے لیے محض مجازاً اور استعارے کے طور پر استعمال کرتے تھے، یہ تنہا مسیح کی خصوصیت نہیں ہے۔ قدیم ترین زمانہ سے بنی اسرائیل خدا کے لیے باپ کا لفظ بولتے چلے آرہے تھے اور اس کی بکثرت مثالیں بائبل کے پرانے عہد نامے میں موجود ہیں۔ حضرت مسیح نے یہ لفظ اپنی قوم کے محاورے کے مطابق ہی استعمال کیا ہے وہ خدا کو صرف اپنا باپ ہی نہیں بلکہ سب انسانوں کا باپ کہتے تھے لیکن عیسائی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نے غلو سے کام لیا اور مسیح کو خدا کا اکلوتا بیٹا قرار دیا۔ ان کا عجیب و غریب نظریہ اس باب میں یہ ہے کہ چونکہ مسیح خدا کا مظہر ہے اور اس کے کلمے اور اس کی رُوح کا جسدی ظہور ہے۔ اس لیے وہ خدا کا اکلوتا بیٹا ہے اور خدا نے اپنے اکلوتے بیٹے کو زمین پر اس لیے بھیجا ہے کہ انسانوں کے گناہوں کو اپنے سر لے کر صلیب پر چڑھ جائے اور اپنے خون سے انسانوں کے گناہوں کا کفارہ ادا کرے حالانکہ اس کا کوئی ثبوت خود حضرت مسیح کے کسی قول سے وہ نہیں دے سکتے۔ یہ عقیدہ ان کے اپنے تخیلات کا آفریدہ ہے اور اس غلو کا نتیجہ ہے جس میں وہ اپنے پیغمبر کی عظیم الشان شخصیت سے متاثر ہو کر مبتلا ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں کفارے کی تردید نہیں کی ہے کیونکہ عیسائیوں کے یہاں یہ کوئی مستقل عقیدہ نہیں ہے بلکہ مسیح کو خدا کا بیٹا قرار دینے کا شاخسانہ اور اس کی ایک صوفیانہ و فلسفیانہ توجیہ ہے۔ لہٰذا اس عقیدے کی تردید آپ سے آپ ہو جاتی ہے۔ اگر مسیح کے ابن اللہ ہونے کی تردید کر دی جائے اور اس غلط فہمی کو دُور کر دیا جائے کہ مسیح علیہ السلام صلیب پر چڑھائے گئے تھے[1]

اللہ کا بندہ ہونا شرف ہے

۱۷۲۔ مسیح کو ہرگز اس بات سے عار نہیں ہے کہ وہ خدا کا بندہ سمجھا جائے اور نہ خدا کے مقرب فرشتوں کو اس سے ننگ و عار ہے۔ یعنی اللہ کا بندہ ہونا اور اس کی عبادت کرنا اور اس کے حکموں کو بجالانا تو اعلیٰ درجہ کی شرافت اور عزت ہے۔ حضرت مسیح علیہ السلام اور ملائکہ مقربین سے اس نعمت کی قدر اور ضرورت پوچھئے ان کو اس سے کیسے ننگ و عار آ سکتا ہے، البتہ ذلت اور غیرت تو اللہ کے سوا کسی دوسرے کی بندگی میں ہے جیسے نصاریٰ نے حضرت مسیح کو ابن اللہ اور معبود مان لیا اور مشرکین فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں مان کر ان کی اور بتوں کی عبادت کرنے لگے سو ان کے لیے ہمیشہ کو عذاب اور ذلت ہے[2]

نجران کے عیسائیوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ ہمارے خداوند یسوع کا رتبہ کم کرتے ہیں کہ آپ ان کو خدا کا بندہ کہتے ہیں، اس میں ان کی توہین ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام کو خود اللہ کا بندہ بننے سے عار نہیں ہے۔ اور یہ آیت نازل ہوئی۔ دراصل یہ بھی غلو کی ایک صورت ہے کہ جب کسی شخص کو مانتے ہیں تو یہ کوشش ہوتی ہے کہ جس سے عقیدت

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

رکھتے ہیں اس کو بڑھا کر دکھائیں۔ عیسائیوں نے حضرت مسیح کو مانا تو صرف اس پر قانع نہ رہے کہ ان کو اللہ کا بندہ اور رسول کہیں بلکہ ان کو حاضر و ناظر، مختار کل، دانائے غیب ابن اللہ تین میں سے تیسرا بنا دیا یہاں قرآن نے عیسائیوں کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر فرمایا ہے کہ تم عبداللہ کہتے ہوئے جھجکتے ہو اور اسے مسیح کی شان میں گستاخی اور بے ادبی سمجھتے ہو لیکن خود حضرت مسیح تو عبداللہ ہونے کو ہرگز عار نہیں سمجھتے، مسیح تو کیا عار سمجھیں گے وہ بھی عار نہیں سمجھتے جو نوری مخلوق ہیں اور جنہیں اللہ سے قرب ہے، خدا کا بندہ ہونا تو اتنا بڑا شرف ہے کہ اس سے اوپر کسی شرف کا تصور بھی نہیں ہے۔

یہاں شارحین قرآن نے تفضیل ملائکہ علی الانبیاء اور تفضیل انبیاء علی الملائکہ کی بحث چھیڑی ہے۔ معتزلہ کا مذہب چونکہ ملائکہ کی افضلیت کا ہے اس لیے اس آیت میں ملائکہ کے مسیح پر عطف کو دیکھ کر علامہ زمخشری نے اپنے مسلک کی ترجمانی کا فرض ادا کرنا ضروری سمجھا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ اس قسم کے مسائل تعبیری نوع سے حل نہیں ہوتے۔ یہاں ایسے کوئی تصریح نہیں ہے کہ فرشتے انبیاء سے افضل ہوتے ہیں، صرف عطف کی تعبیر کے سہارے استدلال کیا جا رہا ہے۔ لیکن ہمارے نزدیک یہ کوئی کلیہ نہیں ہے کہ عطف میں معطوف ضرور اعلیٰ ہو۔ بہرحال اس موضوع کی تفصیل مباحث کا یہ محل نہیں ہے۔

خدا کی بندگی سے ننگ و عار

۲۶۱ - اور جو کوئی اللہ کی بندگی سے عار کرے گا اور گھمنڈی بنے گا اللہ ضرور سب کو اپنے حضور جمع کرے گا۔ پھر وہ لوگ جو ایمان اور عمل صالح کی متاع رکھتے ہوں ان کو پوری پوری اجرتیں دے گا اور اپنے فضل سے مزید دے گا اور وہ لوگ جو خدا کی بندگی کو ننگ و عار سمجھتے ہوں اور گھمنڈی ہیں ان کو دردناک عذاب دے گا اور اس روز ان کا خدا کے سوا کوئی رفیق و مددگار نہ ہوگا یعنی جو شخص اللہ کی بندگی سے ناک چڑھاتے گا اور سرکشی کرے گا تو وہ یونہی نہ چھوڑ دیا جائے گا بلکہ ایک روز سب کو اللہ کے سامنے جمع ہونا اور حساب دینا ہے۔ لہٰذا جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک کام کیے یعنی اللہ کی بندگی پوری بجا لاتے ان کو ان کے کاموں کا پورا پورا ثواب ملے گا بلکہ اللہ کے فضل سے بڑی بڑی نعمتیں ان کو ثواب سے زیادہ بھی ان کو عنایت ہوں گی اور جنہوں نے اللہ کی بندگی سے ناک چڑھائی اور سرکشی کی وہ عذاب عظیم میں گرفتار ہوں گے اور کوئی ان کا خیر خواہ و مددگار نہ ہوگا۔

جن کو اللہ کی بندگی میں شریک کیا ہے عدالت کے کٹہرے میں وہ بھی کام نہ آئیں گے۔ اب نصاریٰ کو خوب سمجھ لینا چاہیے کہ ان دونوں صورتوں میں سے ان کے مناسب حال کیا ہے اور حضرت مسیح کے موافق شان کیا ہے لے

استنکاف کے معنے ہیں کسی چیز سے غیرت، حمیت اور خودداری کی بنا پر روگردانی کرنا اور شکبار کہتے ہیں حقیر سمجھ کر سامنے تن جانا اور اکڑنا یعنی خود جو کچھ ہے اس سے زیادہ اپنے کو سمجھنا اور دوسروں کو کمتر سمجھنا، حضرت مسیح سے استنکاف کی نفی کے بعد اس آیت میں یہ عام قانون بیان کر دیا ہے کہ جو بھی اللہ کی بندگی میں عار اور اپنے کو بڑا بنا کر رکھے اس کی اللہ کی بارگاہ میں پیشی ضرور ہو گی۔ اس قانون کا اطلاق کا دائرہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ جن بزرگوں کو آپ مانتے ہیں ان کو خدا کا بندہ کہتے ہوئے یہ سوچ کر آپ ہچکچائیں کہ اس میں ان کی توہین ہے بلکہ اس کی پہنائیاں اس سے کہیں زیادہ ہیں۔ غیر مسلموں کے درمیان اگر آپ اپنے کو مسلمان کہتے ہوئے ہچکچاتے ہیں۔ غیر اسلامی نظاموں کے مقابلے میں اگر آپ اسلامی نظام کا ذکر کرتے ہوتے یا اسلامی نظام سے اپنی وابستگی ظاہر کرتے ہوئے شرماتے ہیں تو یہ استنکاف ہے۔ خدا کی بندگی اسلام سے وابستگی شرمانے کی نہیں بلکہ فخر کرنے کی چیز ہے۔ نیشنلزم کے مقابلہ میں اسلامیت سوشلزم کے مقابلے میں اسلامی نظام کو اگر آپ اس لیے نہیں لاتے کہ آپ اسلام کو ان کے مقابلے میں حقیر سمجھتے ہیں اور اسلام سے اپنے انتساب کو اپنی بے عزتی تصور کرتے ہیں تو بلا شبہ یہ استنکاف بھی ہے اور استکبار بھی۔ قرآن نے اللہ کی عبادت سے استنکاف سے اس آیت میں سختی سے روکا ہے۔ عبادت خداوندی سے استنکاف کے ممنوع ہونے کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ کے سوا اوروں کی عبادت سے استنکاف ہونا چاہیے اور دوسرا تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کے سارے نظام جو اب تک آئے تھے، وہ سب منسوخ ہو چکے ہیں اور اب اللہ کے نزدیک عابدانہ نظام صرف اسلام ہے ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے کیونکہ اللہ کی عبادت کا یہ نظام ساری دنیا کا نظام ہے اور اس کا لانے والا پیغمبر پوری نوع انسانی کا پیغمبر ہے۔

اسی لیے آئندہ دو آیتوں میں یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے کہ خواہ کوئی کتنی بڑی روحانی طاقت رکھتا ہو اور کیسی مادی طاقتوں سے سرشار ہو، قانون اور ضابطہ سب کے لیے ایک ہے

لے افادات شیخ الاسلام

اس میں نبی غیر نبی، ولی غیر ولی، بادشاہ اور عام شہری سب یکساں ہیں سب سے مطالبہ ہے کہ نبوت کے لاتے ہوئے خدا کی عبادت کے نظام کو جو اپنائے گا اور ایمان وعمل کی دولت سے مالامال ہوگا وہ کامیاب ہوگا۔ اللہ کے یہاں اس کو ایمان وعمل کی مزدوری ضرور ملے گی یعنی جتنا اجر مقرر ہے وہ تو ملے ہی گا اس کے علاوہ اللہ ان کو اپنے فضل سے بھی ضرور نوازے گا اور وہ لوگ جنہوں نے اللہ سے عابدانہ تعلقات میں عار محسوس کی اور اکڑ کا مظاہرہ کیا تو اللہ ان کو دردناک عذاب دے گا اور ان کا کوئی کارساز و مددگار نہ ہوگا۔

يَا أَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَاءَكُمْ بُرْهَانٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَأَنْزَلْنَا إِلَيْكُمْ
نُوْرًا مُّبِيْنًا ﴿۱۷۴﴾ فَأَمَّا الَّذِيْنَ آمَنُوْا بِاللّٰهِ وَاعْتَصَمُوْا بِهٖ
فَسَيُدْخِلُهُمْ فِيْ رَحْمَةٍ مِّنْهُ وَفَضْلٍ وَّيَهْدِيْهِمْ إِلَيْهِ
صِرَاطًا مُّسْتَقِيْمًا ﴿۱۷۵﴾

اے لوگو! تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے پاس بُرہان یعنی دلیل و حجت آچکی ہے[۲۶۲]، اور ہم نے تمہاری طرف ایک نورِ مبین اتار دیا ہے[۲۶۳]، لہٰذا جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے اور اس کا سہارا مضبوط پکڑا تو وہ انہیں ضرور اپنی رحمت کے سائے میں داخل کرے گا اور ان پر اپنا فضل کرے گا اور انہیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھاتے گا ایسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے[۲۶۴]۔

حضورِ انور کی جامعیت اور کاملیت

سابقہ آیات میں عیسائیوں پر حجت تمام کردی۔ اس سے پہلے یہودیوں کے تمام شبہات کا قلع قمع

کر دیا تھا۔ یہ دونوں طبقے نبوت اور قانونِ الٰہی سے واقف تھے اور یہی اہلِ کتاب ہیں۔ اس سے پہلے اسی سورت میں منافقین کو مخاطب کرکے ان کی حامر تلاشی لی اور ساتھ ہی مشرکین کے خیالات و افکار کا بودا پن بھی عیاں کیا۔ اس کے نتیجہ میں جب حضور انور کی نبوت ہر پہلو سے بے نقاب ہوکر سامنے آگئی۔ یہود، نصاریٰ منافقین اور مشرکین کے سارے شبہات جب تار تار ہو گئے تو اللہ سبحانہٗ نے پوری انسانیت کو اس آیت میں للکارا ہے اور بتایا ہے کہ برہان اور نورِ مبین دو چیزیں ہیں جن سے وابستگی پر انسانی زندگی کی فلاح اور نجات موقوف ہے۔ نورِ مبین سے مقصود قرآن حکیم ہے اور برہان جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی۔ برہان آپ کو اس لیے کہا گیا ہے کہ آپ کی ذاتِ گرامی مختلف طبقاتِ انسانی کے لیے عملی نمونے اور مثالیں رکھتی ہے، یعنی انسانوں کے ہر طبقہ اور صنف کے لیے آپ کی ذات میں نصیحت پذیری اور عمل کے لیے برہان ہے یعنی سراسر دلیل و حجت ہے۔ اس دُنیا کی بنیاد ہی اختلافِ عمل پر ہے۔ باہمی تعاون اور مختلف پیشوں اور کاموں ہی کے ذریعے سے یہ دُنیا چل رہی ہے۔ اس میں بادشاہ یا رئیسِ جمہوریہ اور حکام بھی ضروری ہیں، اور محکوم و مطیع اور فرمانبردار رعایا بھی۔ امن و امان کے قیام کے لیے قاضیوں اور ججوں کا ہونا بھی ضروری ہے اور فوجوں کے سپہ سالاروں اور افسروں کا بھی، غریب بھی ہیں اور دولتمند بھی، شب بیدار، عابد و زاہد بھی اور دن کے سپاہی اور مجاہد بھی، اہل و عیال بھی ہیں اور دوست و احباب بھی۔ تاجر اور سوداگر بھی ہیں اور امام و پیشوا بھی، غرض اس دُنیا کا نظم و نسق ان مختلف اصناف کے وجود اور قیام ہی پر موقوف ہے اور ان تمام اصناف کو اپنی اپنی زندگی کے لیے عملی مجسمہ اور نمونہ کی ضرورت ہے۔ قرآن تمام انسانوں کے لیے حضور انور کی ذاتِ گرامی کو برہان بنا کر پیش کرتا ہے، اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ آپ کی ذاتِ گرامی سب کے لیے حجت و دلیل ہے۔ ایک حاکم کیلئے محکوم کی زندگی۔ ایک محکوم کے لیے حاکم کی زندگی۔ ایک دولت مند کے لیے غریب کی زندگی اور ایک غریب کے لیے دولت مند کی زندگی، حجت اور دلیل نہیں بن سکتی۔ ان تمام مختلف طبقات کے لیے ضرورت تھی کہ ایسی کامل و جامع زندگی ہو جو اپنی زندگی میں ہر نوع، ہر قسم، ہر گروہ اور ہر صنفِ انسانی کے لیے ہدایت کی مثالیں اور نظیریں رکھتی ہو۔ وہ ہی اس لائق ہے جو اس اصناف و انواع سے بھری ہوئی دُنیا کی عالمگیر اور دائمی رہنمائی کے لیے برہان کا کام انجام دے اور بس۔

۲۶۲ - لے لوگو: تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہارے پاس برہان یعنی دلیل و حجت آچکی ہے یعنی تمہارے پروردگار کی جانب سے تمہاری تربیت اور تزکیہ نفس کی خاطر ایک عظیم برہان یا ایک کھلی اور واضح دلیل آچکی ہے۔ یہ تمہارے سامنے ایمان صحیح کی حقیقت کھول کر بیان کرتی ہے اور وہ تمام

باتیں نہیں بتاتی ہے جن کی تمہیں زندگی کے مختلف گوشوں میں ضرورت ہے۔ یہ برہان خود حضور انور کی ذات گرامی ہے۔ یعنی آپ اپنی نبوت کی خود دلیل ہیں۔ کیونکہ ایک ایسی ہستی جس نے علمی طلبگاری میں زندگی کا ایک لمحہ بھی صرف نہیں کیا اور جس نے کسی کے سامنے کبھی زانوے ادب تہ نہیں کیا۔ اس میں یکایک علم کی تکمیل ہوتی ہے اور وہ امیوں، علم کے طلب گاروں کو علوم الٰہیہ اور صفات ربوبیت کا معلم بن جاتا ہے اور اپنے تعلیم کا دائرہ صرف عالم غیب سے متعلق افکار تک محدود نہیں رکھتا بلکہ اللہ سبحانہ کے حاکمانہ حقوق، نفس انسانی کے تزکیہ اور حیاتِ اجتماعی کی صلاح و فلاح کے اصول و ضوابط تک پھیلا دیتا ہے۔

آپ کی ذات قانون کی علمی تشریح کے لیے برہان ہے ایسے ہی آپ کی عملی سیرت بھی پوری انسانی زندگی کے لیے برہان ہے۔ یہ محض شاعرانہ انشاپردازی نہیں بلکہ تاریخی واقعات ہیں۔ آپ غیظ و غضب اور رحم و کرم، جود و سخا، اور فقر و فاقہ، شجاعت و بہادری اور رحمدلی و رقیق القلبی، خانہ داری اور خدادانی دنیا و دین دونوں کے لیے زندگی کے نمونوں سے مالا مال تھے۔ آپ دنیا کی بادشاہی کے ساتھ آسمان کی بادشاہی اور آسمان کی بادشاہی کے ساتھ دنیا کی بادشاہی کی بشارت دیتے تھے اور دونوں بادشاہوں کے قوانین و قواعد اور دستور العمل کو اپنی زندگی میں اپنے برت کر دکھایا۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ دنیا میں صرف عفو و درگزر، معافی و نرمی انسانیت کی تکمیل کے سب سے بڑے ذریعے ہیں بلکہ فقط یہی ذریعے ہیں اس لیے جس ہستی میں صرف یہی ایک پہلو ہو وہی انسانیت کی سب سے بڑی برہان ہے لیکن بتایا جائے کہ انسان کے اخلاق میں کیا صرف یہی قوتیں ہیں یا اس کے مقابل کی قوتیں بھی ہیں۔ ایک انسان میں دیکھو تو غصہ و کرم، محبت و عداوت، خواہش و قناعت انتقام اور ہر قسم کے فطری جذبات موجود ہیں اس لیے برہان کامل وہی ہو سکتا ہے جو انسانیت کے ان تمام قوی اور جذبات میں اعتدال پیدا کر کے ان کے صحیح مصرف کو مقرر کر دے۔ جن لوگوں کو یہ دعویٰ ہے کہ ان کے پیغمبروں کی سیرتیں صرف رحم و کرم اور عفو و درگزر پر مبنی ہیں وہ براہ کرم بتائیں کہ اپنی اجتماعی زندگی میں وہ کتنے روز ان کی سیرتوں کے مطابق کر سکے ہیں۔ قسطنطین پہلے عیسائی بادشاہ سے لے کر آج تک عیسائی مذہب میں کتنے صاحب تاج و تخت گزرے اور کتنی بادشاہیاں قائم ہوئیں مگر ان میں سے کسی نے اپنی سلطنت کا قانون اپنے پیغمبر کی سیرت کو قرار دیا۔ پھر ایسی سیرت جو عملی زندگی میں ہر حیثیت سے اپنے پیروؤں کے لیے نمونہ نہ ہو وہ کیوں کر برہان کہی جا سکتی ہے۔ اگرچہ شارحین قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے برہان ہونے پر جو تشریحی نوٹ لکھا ہے وہ تو صرف یہی ہے جیسا کہ ابن جریر نے لکھا ہے کہ اللہ نے آپ کو حجت قاطعہ بنایا ہے۔ اور آپ کو رسول بنا کر اپنی حجت تمام کر دی ہے یا اللہ نے آپ کو برہان اس لیے کہا ہے کہ آپ معجزات

ے کر آتے ہیں جیسا کر قرطبی نے لکھا ہے اور یہ ایسا پیغمبر ہے جس کی شان اعجاز مخالفتوں اور منکروں کو حیران کر دیتی ہے جیسا کہ النسفی رقمطراز ہیں یا آپ کی تشریف آوری ہے چونکہ حجت دنیا والوں پر پوری ہو گئی اس لیے آپ کو برہان کہا ہے جیسا کہ القاسمی نے تصریح کی ہے لیکن بات صرف اتنی ہی نہیں ہے۔ آیئے آپ کے برہان ہونے کا یہ پہلو بھی دیکھ لیجئے۔ بُرہان میں تنوین تعظیم کے لیے ہے یعنی آپ کی ذات ایسی عظیم بُرہان ہے جس کی آغوش میں تمہاری ضرورتوں کی کفالت، ساری بیماریوں کا علاج، ساری پریشانیوں کا مداوا اور سارے سوالوں کا جواب ہے۔ دُنیا میں دو قسم کی تعلیم گاہیں ہیں ایک وہ جہاں صرف ایک فن سکھایا جاتا ہے جیسے کوئی میڈیکل کالج ہے کوئی انجنیئرنگ کالج۔ ایک آرٹ سکول ہے، ایک تجارت کا مدرسہ ہے ایک زرعی کالج ہے، ایک قانون کا مدرسہ ہے، ایک فوجی تعلیم کا مدرسہ حربیہ ہے۔ ان میں سے ہر مدرسہ صرف ایک ہی قسم کے طلبہ کی تعلیم کا انتظام کر سکتا ہے۔ میڈیکل کالج سے صرف ڈاکٹر نکلیں گے۔ زراعت کے کالج سے صرف زراعت کے ماہر پیدا ہوں گے، قانون کے مدرسہ سے صرف قانون دان تیار ہوں گے، تجارت کی تعلیم گاہ سے صرف تجارت کے واقف کار پیدا ہوں گے ملٹری کالج سے صرف سپاہی پیدا ہوں گے۔ آؤ اب ذرا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان بُرہان دیکھو اور پتہ لگاؤ کیا مدرسۂ نبوت کی حیثیت اس سکول اور کالج کی ہے جہاں ایک ہی فن کی تعلیم ہوتی ہو یا اس کی حیثیت ایک جامع اور عمومی درسگاہ اور عظیم الشان یونیورسٹی کی ہے۔ جہاں ذوق مناسبت طبع اور استعداد کے مطابق ہر ملک کے لوگوں کو اور ہر قوم کے افراد کو الگ الگ تعلیم ملتی ہے۔ ہر فن کی کتابیں الگ ہوتی ہیں۔ ہر فن کے اساتذہ الگ الگ ہوتے ہیں۔ آؤ دیکھو یہاں کتاب بھی ایک ہے استاذ بھی ایک ہے اور درسگاہ بھی ایک ہے۔ اس کے باوجود ایک کتاب اور ایک استاذ سے پڑھ کر نکلنے والے طالب علموں کا حال یہ ہے کہ

ایک طرف عقلائے روزگار اسرار فطرت کے محرم دُنیا کے جہانبان اور ملکوں کے فرمانروا اس درسگاہ سے تعلیم پا کر نکلے ہیں۔ ابوبکر صدیق ہیں، عمر فاروق ہیں، عثمان غنی ہیں، علی مرتضیٰ، معاویہ ابن ابی سفیان ہیں جنہوں نے مشرق سے مغرب تک، افریقہ سے ہندوستان تک فرمانروائی کی جو دُنیا کے بڑے سے بڑے شہنشاہ اور حکمرانوں کی سیاست و تدبیر اور نظم و نسق کے کارناموں کو منسوخ کر دیتی ہے۔ ان کے عدل و انصاف کے فیصلے ایرانی دستور اور رومی قانون کو بے اثر کر دیتے ہیں اور دُنیا کی سیاسی و انتظامی تاریخ میں وہ درجہ حاصل کر لیتے ہیں جن کی مثال نہیں پیش کی جا سکتی۔
دوسری طرف خالد بن الولید، سعد بن ابی وقاص اللیثی، ابوعبیدہ بن جراح، عمرو بن العاص

پیدا ہوتے ہیں جو مشرق و مغرب میں وہ عالم گیر کار اور انسانیت کے لیے لعنت سلطنتوں کا چند سال میں مرقع الٹ دیتے ہیں اور دُنیا کے وہ فاتح اعظم اور سپہ سالار ثابت ہوتے ہیں جن کے فاتحانہ کارناموں کی دھاک آج بھی دُنیا میں بیٹھی ہوئی ہے۔ سعد بن ابی وقاص نے ایران کا تاج شہنشاہی اتار کر اسلام کے قدموں میں لا ڈالا۔ خالد اور ابو عبیدہ نے رومیوں کو شام سے نکال کر ابراہیم کی موعود زمین کی امانت مسلمانوں کے سپرد کر دی۔ عمرو بن العاص نے فرعون کی سرزمین وادی نیل رومن شہنشاہی کے ہاتھوں سے زبردستی چھین لی۔ عبداللہ بن الزبیر اور ابن ابی سرح نے افریقہ کا میدان دشمنوں سے جیت لیا۔ یہ وہ مشہور فاتح اور سپہ سالار ہیں جن کی قابلیتوں کو زمانے نے تسلیم کیا ہے اور تاریخ نے ان کی بزرگی کی شہادت دی ہے۔

تیسری طرف باذان بن ساسان، ابن یمن خالد بن سعید صنعا میں مہاجر بن امیہ کندہ، زیاد بن لبید حضرموت میں عمرو بن حزم نجران میں یزید بن ابی سفیان تیما میں علاء ابن حضرمی بحرین وغیرہ بیسیوں وہ صحابہ ہیں جنہوں نے صوبوں اور شہروں کی کامیاب حکومت کی اور خلق خدا کو آرام پہنچایا۔

چوتھی طرف علماء و فقہاء کی صف ہے۔ عمر بن الخطاب، علی ابن ابی طالب، عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص، حضرت عائشہ، حضرت ام سلمہ ابی بن کعب، معاذ بن جبل، زید بن ثابت، عبداللہ ابن زبیر وغیرہ ہیں جنہوں نے اسلام کے قانون فقہ کی بنیاد ڈالی، اور دُنیا کے مقننین میں انھوں نے خاص درجہ پایا۔

پانچویں صف عام ارباب روایت و تاریخ کی ہے مثلاً ابو ہریرہ، ابو موسیٰ اشعری، انس بن مالک، ابو سعید خدری، عبادہ ابن الصامت، جابر بن عبداللہ، براء بن عازب وغیرہ سینکڑوں صحابہ ہیں، جو احکام و وقائع کے ناقل اور راوی ہیں۔

چھٹی جماعت ان ستر صحابہ اہل صفہ کی ہے جن کے پاس سر رکھنے کے لیے مسجد نبوی کے چبوترے کے علاوہ کوئی جگہ نہ تھی، بدن پر کپڑوں کے سوا دُنیا میں ان کی کوئی ملکیت نہ تھی، وہ دن کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور ان کو بیچ کر خود کھاتے، کچھ خدا کی راہ میں دیتے اور رات کو عبادت میں گزارتے۔

ساتویں کلاس زہاد کی ہے جن میں ابوذر غفاری ہیں جن کے مانند آسمان کے نیچے ان سے زیادہ حق گو پیدا نہیں ہوا۔ ان کے نزدیک آج کا کھانا کل کے لیے اٹھا رکھنا بھی شان توکل کے خلاف تھا ان کو دربار نبوت نے مسیح الاسلام کا خطاب عنایت کیا تھا۔ سلمان فارسی ہیں جو زہد و تقویٰ کی تصویر ہیں۔ عبداللہ بن عمرو ہیں جنہوں نے پورے تیس سال عبادت میں گزارے مصعب بن عمیر ہیں

جو اسلام سے پہلے ریشم کے کپڑے پہنتے تھے اور ناز و نعمت میں پلے تھے اور جب اسلام لائے تو ٹاٹ اوڑھتے اور پیوند لگے کپڑے پہنتے۔ عثمان بن مظعون ہیں، محمود بن سلمہ ہیں اور ابوالدرداء ہیں جن کی راتیں نماز میں اور دن روزوں میں گزرتے تھے۔

آٹھویں طرف بہادر کارپردازوں اور عرب کے مدبرین کی جماعت ہے، اس میں طلحہ ہیں، زبیر ہیں، مغیرہ ہیں، مقداد ہیں، سعد بن معاذ ہیں، سعد بن عبادہ ہیں، اسید بن حضیر ہیں، اسد بن زرارہ اور عبدالرحمان بن عوف ہیں۔

نویں طرف تاجر، بیوپاری اور کاشت کاروں کی جماعت ہے ان میں عبدالرحمان بن عوف اور سعد بن زبیر جیسے سرمایہ دار اور دولت مند بھی ہیں۔

دسویں طرف حق کے شہیدوں کی جماعت ہے جنہوں نے خدا کی راہ میں اپنی عزیز جانیں قربان کر دیں۔ یہ ان گنت ہیں۔ ان کی داستانوں سے سیرت و تاریخ کا کتابیں بھری پڑی ہیں۔ دُنیا کے ایک مشہور مذہب کو صرف ایک سُولی پر ناز ہے لیکن یہاں کتنی سولیاں ہیں کتنے مذبح ہیں اور کتنے مقتل ہیں؟

غور کا مقام ہے۔ یہ وہی وحشی عرب، وہی بُت پرست عرب، وہی بداخلاق عرب ہیں۔ یہ کیا انقلاب ہو گیا تھا۔ ایک اُمّی کی تعلیم جاہل عربوں کو عاقل، روشن دل، روشن دماغ اور معلم کیوں کر بنا گئی۔ ایک یتیم پیغمبر کا ولولۂ تبلیغ کس بے بس عربوں کو سپہ سالار اور بہادر بنا کرتے زور اور قوت کا خزانہ کیسے عطا کر گیا۔ جو خدا کے نام سے بھی ناآشنا تھے وہ ایسے شب زندہ دار عابد و متقی اور طاعت گزار کیوں کر ہو گئے۔ آپ نے درسگاہ محمدی یا مدینہ یونیورسٹی کی پوری سیر کر لی۔ ہر رنگ اور ہر مذاق کے طالب علم دیکھے، عالم بھی دیکھے، معلم بھی دیکھے، فوجی بھی دیکھے، جج اور مجسٹریٹ بھی دیکھے۔ حکام اور والی بھی دیکھے، غریب و مسکین بھی دیکھے، شاہ و امیر بھی دیکھے، غلام بھی دیکھے آقا بھی دیکھے، لڑنے والے بھی دیکھے مرنے والے بھی دیکھے، راہِ حق کے شہیدوں اور جان نثاروں کو بھی دیکھا۔ آپ نے کیا فیصلہ کیا ہے؟ اس کے سوا فیصلہ کیا ہو سکتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خود اپنی ذات میں اپنے کمالات اور اپنی صفات کے لیے اپنے پروردگار کی جانب سے بُرہان ہیں اور یہ سب آپ کے بُرہان ہونے کی جلوہ آرائیاں ہیں جو کبھی صدیق اکبر اور فاروق اعظم ہو کر چمکتی تھیں، کبھی ذی النورین اور مرتضیٰ ہو کر نمایاں ہوتی تھی۔ کبھی خالد بن الولید اور ابو عبیدہ اور کبھی سعد و جعفر طیار ہو کر سامنے آتی تھیں۔ کبھی ابن عمر اور ابوذر اور سلمان اور ابو درداء ہو کر مسجد

محراب میں نظر آتی تھیں۔ کبھی ابن عباس اور ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود کی صورت میں علم و فن کی درسگاہ اور عقل و حکمت کا دبستان بن جاتی تھیں۔ گویا محمد رسول اللہ کی بُرہان آفتاب عالم تاب تھی جس سے اونچے پہاڑ ریتلے میدان، بہتی نہریں، سرسبز کھیت اپنی اپنی صلاحیت اور استعداد کے مطابق تابش اور نور حاصل کر رہے تھے، یا یہ بُرہان ایک ابرِ باراں تھا جو پہاڑ، جنگل، میدان اور کھیت، ریگستان اور باغ ہر جگہ برستا تھا اور ہر ٹکڑا اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو رہا تھا اور قسم قسم کے درخت اور رنگارنگ کے پھول اور پتے جم رہے تھے اور اُگ رہے تھے سید رشید رضا نے بالکل بجا فرمایا ہے کہ

وھو برھان بسیرتہ العلیۃ کما انہ برھان فی سیرتہ العلیۃ

قرآن نورِ مبین ہے

۲۶۳۔ اور ہم نے تمہاری طرف ایک نُور مبین اتارا ہے۔ نُور مبین سے مراد قرآن حکیم ہے جس میں بڑے چھوٹے انفرادی اور اجتماعی مسائل کا حل موجود ہے۔ قرآن کو نُورِ مبین اس لیے کہا ہے کہ اس سے احکام و قوانین نمایاں ہو جاتے ہیں، جیسے روشنی سے چیزیں نظر آتی ہیں۔ سید رشید فرماتے ہیں کہ اس کی بلاغت اور اس کے اندازِ بیان سے حقائق اس طرح کھل کر سامنے آجاتے ہیں کہ کسی غور و فکر والے شخص کے لیے کوئی اشتباہ نہیں رہتا ہے۔ اس کی واضح ترین مثال توحید ہے۔ پہلے مذاہب میں جو حقیقت میں توحید ہی کا پیام لے کر آئے تھے تین اسباب سے غلط فہمیاں اور گمراہیاں پیدا ہوئیں، ایک جسمانی تشبیہ و تمثیل دوسرے صفات کو ذات سے الگ اور مستقل ماننا اور تیسرے افعال کی نیرنگی سے دھوکہ کھانا۔ قرآن نے ان گرہوں کو کھولا، ان غلط فہمیوں کو دُور کیا اور ان حقیقتوں کو واضح کیا۔

ذات میں توحید

خدا کو، خدا کی صفتوں کو اور خدا اور بندہ کے تعلق کو واضح کرنے کے لیے خیالی یا مادی تشبیہیں اور تمثیلیں دوسرے مذاہب کے معتقدوں نے ایجاد کیں۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اصل خدا گم ہوتا رہا اور اس کی جگہ تشبیہیں اور تمثیلیں خدا بن گئیں۔ ان ہی تشبیہوں اور تمثیلوں نے مجسم ہو کر بتوں کی شکل اختیار کرلی اور بُت پرستی شروع ہوگئی۔ قرآن کی کھلی روشنی نے ان تمام تشبیہی اور تمثیلی صورتوں، طریقوں اور محاوروں کو یک قلم موقوف کر دیا اور ان کا استعمال شرک قرار دیا۔

صفات میں توحید

قدیم مذاہب کے عقیدہ توحید میں غلط فہمیوں کا دوسرا سبب صفات کا مسئلہ ہے یعنی صفات کو ذاتِ الٰہی سے الگ مستقل وجود کے طور پر تسلیم کرنا، ہندوؤں کے عام مذہب میں جو لاتعداد خداؤں کا لشکر نظر آتا ہے وہ فی الواقع اسی غلطی کا نتیجہ ہے کہ ہر ایک صفت کو انہوں نے ایک علیحدہ اور مستقل وجود مان لیا اور اس طرح ایک خدا کے ۳۳ کروڑ خدا بن گئے۔ ہندو مذہب پر غور کرو تو معلوم ہوگا کہ وہ اسی مسئلہ صفات کے تجسم اور مستقل وجود کے تخیل سے مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کی تین بڑی صفتیں ہیں خالقیت، قیومیت اور ممیتیت ہند و فرقوں نے ان تین صفتوں کو تین مستقل شخصیتیں تسلیم کر لیا۔ اور برہما، وشنو اور شیو یعنی خالق، قیوم اور ممیت تین مستقل ہستیاں بن گئیں۔ عیسائیوں نے خدا کی تین بڑی صفتوں یعنی حیات علم اور ارادے کو تین مستقل شخصیتیں تسلیم کر لیا۔ حیات باپ ہے علم روح القدس ہے اور ارادہ بیٹا ہے۔ اسی قسم کی چیزیں رومی، یونانی اور مصری تخیل میں بھی ملتی ہیں لیکن قرآن عزیز کی واضح روشنی نے اس غلطی کا پردہ چاک کیا اور صفات کی نیرنگی سے دھوکا کھا کر ایک کو چند سمجھنا انسان کی جہالت اور نادانی قرار دیا اور بتایا کہ تینوں ایک کی صفات ہیں۔ صفات کے تعدد اور اختلاف سے موصوف میں تعدد اور اختلاف نہیں ہوتا۔ یہ بات صرف قرآن کی روشنی میں نمایاں ہو کر سامنے آئی ہے، ورنہ اوروں نے تو ذات سے صفات کو الگ کر کے ایک خدا کے متعدد خدا بنا ڈالے سبحان اللہ عما یشرکون۔

افعال میں توحید

لوگوں نے افعال الٰہی کی نیرنگی کو دیکھ کر یہ سمجھا کہ ان مختلف افعال کی کرنے والی مختلف ہستیاں ہیں کوئی مارتی ہے، کوئی جلاتی ہے۔ کوئی لڑواتی ہے، کوئی صلح کراتی ہے، کسی کا کام محبت ہے، کسی کا کام عداوت ہے، کوئی علم کا دیوتا ہے، کوئی دولت کی دیوی ہے، غرض ہر کام کے لیے الگ الگ سینکڑوں خدا ہیں۔ قرآن نے ان نادانوں کو بتایا ہے کہ یہ سب ایک ہی خدا کے کام ہیں۔ خدا نے یہ کائنات بنائی ہے، آسمان و زمین بنائے، مادے کو خلق کیا، اشیا میں خاصیتیں رکھی ہیں اور ان کو مختلف قوتیں بخشیں، پھر انسان کو بنایا، اس کو دل و دماغ بخشا، عقل و حکمت دی۔ اب دیکھو ایک انسان اس کائنات میں اشیا کی ترتیب اور ان کی خاصیتوں کو دیکھ کر ایک خالق و قادر کی

صنعت کاری اور صورت گری پر تعجب کرتا ہوا فتبارک اللہ احسن الخالقین پڑھ کر حضرت ابراہیم کی طرح یہ پکار اٹھتا ہے ۔

انی وجھت وجھی للذی فطر السماوات والارض حنیفا وما انا من المشرکین

اور دوسری طرف اسی مادہ اور اس کی قوتوں کی ظاہر داریوں میں پھنس کر انسان کے دل و دماغ کی عقل و حکمت خدا کا انکار کر بیٹھتی ہے اور مادے ہی کو اصل کائنات اور علۃ العلل سمجھنے لگتی ہے اور یہ کہتی ہے ۔

ما ھی الا حیاتنا الدنیا نموت و نحیا وما یھلکنا الا الدھر

کائنات ایک ہے ، پیغام ایک ہے ، البتہ دل دو ہیں اور یہ دونوں دل اور دونوں دماغ ایک ہی خالق کی مخلوق ہیں دو خالق نہیں ہیں۔ نتیجہ کیا نکلا ، یہی نا کہ افعال کی دوئی فاعل کی دوئی کی دلیل نہیں ہے ۔ یہ تمام نیرنگیاں ایک ہی قدرت کے تماشے ہیں ۔

اللہ کی عبادت

اللہ سبحانہٗ کی عبادت ہر مذہب میں حق اور ہے لیکن ایک عام غلط فہمی پھیل گئی تھی کہ عبادت کا مقصود جسم کو تکلیف دینا ہے یا دوسرے لفظوں میں کہو کہ یہ خیال پیدا ہو گیا تھا کہ جس قدر اس ظاہری جسم کو تکلیف دی جائے گی ، اسی قدر روحانی ترقی ہو گی اور دل کی اندرونی صفائی اور پاکی بڑھے گی ۔ اسی کے نتیجہ میں ہندوؤں میں عام طور پر جوگ اور عیسائیوں میں رہبانیت پیدا ہوئی اور بڑی بڑی ریاضتوں کا وجود ہوا اور ان کو روحانی ترقی کا ذریعہ سمجھا گیا ۔ کوئی عمر بھر نہانے سے پرہیز کرتا ۔ کوئی عمر بھی ٹاٹ یا کمل اوڑھے رہتا ۔ کوئی ہر موسم میں یہاں تک شدید جاڑوں میں بھی ننگا رہتا ، کوئی عمر بھر کھڑا رہتا ، کوئی پوری عمر غار میں گزار دیتا ، کوئی ساری عمر دھوپ میں کھڑا رہتا ، کوئی عمر بھر کے لیے کسی چٹان پر بیٹھ جاتا ۔ کوئی عہد کر لیتا تھا کہ پوری زندگی صرف درختوں کی پتیاں کھا کر گزارہ کرے گا ، کوئی عمر بھر تجرد میں گزارتا تھا اور قطع نسل کو عبادت سمجھتا تھا ، کوئی ایک ہاتھ ہوا میں رکھ کر سکھا دیتا ، کوئی حبس دم یعنی سانس روکنے کو عبادت سمجھتا ، کوئی درخت پر الٹا لٹک جاتا ، یہ تھا قرآن کے آنے سے پہلے خدا پرستی کا اعلیٰ درجہ اور روحانیت کی سب سے بڑی ترقی یافتہ شکل ۔ قرآن نے آکر انسانوں کو ان مصیبتوں سے نجات دلادی اور بتایا کہ یہ روحانیت نہیں جسمانی تماشے ہیں ۔ ہمارے خدا کو جسم کی شکل نہیں بلکہ دل کا رنگ مرغوب ہے طاقت سے زیادہ تکلیف اس کی شریعت میں نہیں ۔

بہرحال آیت گرامی میں کہ اللہ تعالیٰ نے انسانیت کو دو چیزیں مرحمت فرمائیں۔ ایک برہان اور دوسرے نورِ مبین۔ برہان سے حضور انور کی ذات گرامی مراد ہے اور نورِ مبین سے قرآن حکیم۔ اسے دوسرے لفظوں میں آپ عمل اور علم بھی کہہ سکتے ہیں۔ برہان کو یہاں مقدم کرکے اس کی مقصودیت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی علم سے مقصود عمل ہے اور من ربکم کے اضافہ سے یہ بات جتا دی ہے جیسا کہ علامہ ابوالسعود نے لکھی ہے کہ اس سے مقصود انسانوں کی تربیت اور ان کا تزکیہ ہے۔

علم و عمل کی شاہراہ

۲۶۴ - لہٰذا جو لوگ اللہ پر ایمان لاتے اور اس کا سہارا مضبوط پکڑا تو وہ انہیں ضرور داخل کرے گا اپنی رحمت کے سائے میں اور ان پر اپنا فضل کرے گا اور انہیں اپنے تک پہنچنے کی راہ دکھائے گا۔ ایسی راہ جو بالکل سیدھی راہ ہے۔ پہلے سے وحی الٰہی اور بالخصوص قرآن حکیم کی عظمت اور اس کی حقانیت کا بیان اور اس کی متابعت اور اتباع کی تاکیدات کا ذکر تھا۔ اسی کے ذیل میں حضرت مسیح علیہ السلام کی الوہیت اور ان کے ابن اللہ ہونے کا ذکر کیا تھا جس کے قائل نصاریٰ تھے۔ اس کی تردید و ابطال کے بعد اب آخر میں پھر اسی اصل اور ضروری بات کی سب کو تاکید فرمائی جاتی ہے کہ اے لوگو! تمہارے پاس رب العالمین کی جانب سے حجت کامل اور نورِ روشن پہنچ چکا ہے جو ہدایت کے لیے کافی و وافی ہے یعنی قرآن مجید اب کسی تامل اور تردد کی گنجائش نہیں سو جو کوئی اللہ پہ ایمان لائے گا اور اس مقدس کتاب کو مضبوط پکڑے گا وہ اللہ کی رحمت اور فضل میں داخل ہوگا اور براہِ راست اس تک پہنچے گا اور جو اس کے خلاف کرے گا اس کی گمراہی اور خرابی اسی سے سمجھ لیجئے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی جانب آئی ہوئی برہان اور خدا کی نازل کردہ کتاب کی روشنی میں اللہ سے بندگی کا تعلق رکھیں گے اور اس تعلق کے ساتھ اللہ سے اعتصام پیدا کریں گے یعنی اللہ کی بھیجی ہوئی برہان اور اللہ کی نازل کردہ کتاب کو اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں تھام کر رکھیں گے اور زندگی کے اطوار، اقدار اور احوال میں ان دونوں کے ہو کر رہیں گے۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب اللہ سے ربط اور قرآن و سنت سے وابستگی کا نام اعتصام ہے۔ قرآن نے اس سورت میں اعتصام کا تیسری بار ذکر کیا ہے سب سے پہلے آیت نمبر ۱۰۳ میں پھر آیت نمبر ۲۶ میں، دونوں پر تفصیلی تبصرہ جلد چہارم اور پنجم میں ہو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چکا ہے۔ اب یہاں اسی اعتصام کا تیسری بار ذکر ہو رہا ہے۔ اعتصام یہ ہے کہ فکر و عمل میں اللہ کے رہنما ذرائع علم و عمل سے وابستہ ہو جائیں۔ اعتصام ہی اس دنیا میں اولاً اہل ایمان کی انفرادی صلاح اور اجتماعی فلاح کا ضامن ہے اور یہی صراط مستقیم کا رہنما ہے۔ خدا کے بھیجے ہوئے برہان اور خدا کی نازل کردہ کتاب کے علاوہ ہر اعتصام خواہ یہودیت کا ہو یا عیسائیت اور چاہے وہ وطنیت کا ہو یا قومیت کا، مادیت کا ہو یا معاشی سامراج کا، صراط مستقیم کا رہنما نہیں بلکہ سُبل متفرقہ کا رہنما ہے۔ آیت ۱۰۳ میں بتایا جا چکا ہے کہ صرف انفرادی زندگی میں نہیں بلکہ تہذیبی، قانونی، اخلاقی، سیاسی اور عائلی زندگی کے تمام گوشوں میں اجتماعی طور پر اعتصام والا بن کر رہنا چاہیے۔ اور اس سے زندگی کا کوئی گوشہ جدا نہ ہونا چاہیے۔ مختلف کارکن قوتیں اسی تمام اسی مرکز اسی سلسلہ، اسی وجود اسی طاقت میں اپنی قدرتی اور مناسب ترکیب و ترتیب کے ساتھ یک جا ہونی چاہئیں۔ اور تمام اعمال اور قوتوں پر ایک ایسی اجتماعی کیفیت طاری ہو، ہر قوت کھنچی ہوئی، ہر عمل باہم ملا ہوا، ہر شخص زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو۔ کوئی چیز کوئی گوشہ کوئی عمل اس سے علیحدہ نہ ہو۔ اسی کا نتیجہ صراط مستقیم ہے۔ یہاں ایمان کے ساتھ اعتصام کا ذکر کر کے اور پانچویں پارے میں اخلاص کے ساتھ اعتصام کا ذکر کر کے اور چوتھے پارے میں تقویٰ کا حکم دینے کے بعد اعتصام کا ذکر کر کے اشارہ کیا ہے کہ ایمان، اخلاص اور تقویٰ کی حقیقی کسوٹی اعتصام بکتاب اللہ و سنت رسول اللہ ہے۔ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ مسلمان نظام ہائے باطل کے مقابلے میں نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کا بول بالا کریں اور زندگی کے ہر گوشہ میں اس سے وابستہ ہو کسی حال میں اس سے جدائی گوارا نہ کر سکیں۔

اس آیت میں اس ایمان کے جس میں اعتصام موجود ہو دو ناگزیر نتیجے بتائے ہیں اور سین تاکید کا لگا کر بتائے ہیں فسيدخلهم في رحمة منه وفضل یعنی اللہ سبحانہ ان لوگوں کو جن کے ایمان میں نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے اعتصام ہوگا اپنی خاص رحمت میں اور اپنے خاص فضل میں ضرور داخل کرے گا۔ رحمت سے مراد عام شارحین قرآن نے جنت اور فضل سے مراد اہل جنت کو مزید اکرام و عنایت بتایا ہے لیکن ہمارے شاہ صاحب فرماتے ہیں یہاں رحمت سے مراد انفرادی صلاح اور فضل سے مراد دوسروں کی اصلاح کی ہے۔ اسی لیے نبوت کو فضل قرار دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ قرآن و سنت سے وابستگی کے نتیجہ میں تمہیں انفرادی طور پر اچھا بنائے گا اور دوسروں کو اچھا بنانے کا مقام عطا کرے گا، تمہارا وجود انسانیت کے لیے رحمت ہوگا۔ پوری انسانیت تمہارے افکار، تمہارے علوم، تمہارے فضائل سے استفادہ کرے گی اور اس انفرادی صلاح اور اجتماعی فلاح کے بعد اللہ ایسی

شاہراہ تمہارے لیے کھول دے گا جس پر چل کر تم منزل مقصود کو پہنچ جاؤ گے۔ دنیا میں سیادت، قیادت اور امامت کا مقام دے گا اور آخرت میں جنت اور رضوان عطا کرے گا۔ یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس پر قائم رہنے کی ہر نمازی نماز کی ہر رکعت میں اللہ کی جناب میں درخواست کرتا ہے۔

آیت کا زبردست احتجاج

قرآن کی یہ آیت مسلمانانِ عالم کے رہنماؤں اور ان کے حکمرانوں کے خلاف زبردست احتجاج ہے۔ موجودہ عالم اسلام اللہ کی ہدایات اور اس کے نازل کردہ نورِ مبین کے اعتصام سے ہٹ کر یورپ کے لائے ہوئے مختلف نظاموں سے جس طرح اعتصام کر رہا ہے اس کے مطالعہ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جیسے ان رہنماؤں، لیڈروں اور حکمرانوں نے یورپ کے فکری فلسفہ کو اپنے ساری اقتصادی سیاسی اور ثقافتی پہلوؤں کے ساتھ نیز ان کی مادہ پرستانہ قومیت کو اپنانے کا عزم کر لیا ہے وہ اس اسلامی مزاج کے ساتھ جس کی جڑیں اور شاخیں ہر طرف پھیلی ہوئی ہیں اور اس کے علمی، اجتماعی ڈھانچہ کے ساتھ مستقل طور پر برسرپیکار اور معنوی اور روحانی قوتوں کے ساتھ برسرِ جنگ ہیں۔ وہ اپنے طرزِ عمل، نظامِ تعلیم و تربیت اور اعلانات کے ذریعے قوم کی اس قوت ایمانی اور جذبۂ دینی کو غیر شعوری طور پر داؤ پر لگائے ہیں اور یورپ کی اطاعت کو ترقی کا ذریعہ سمجھ کر دھوکے میں پڑے ہوتے ہیں۔ بے شک یہ رہنما وقتاً فوقتاً اسلام سے اپنی وابستگی اور دلچسپی کا ایمان کی حد تک اظہار کرتے رہتے ہیں کیونکہ وہ جانتے ہیں کہ ان کے اور عوام کے درمیان اسلام سب سے بڑا اور طاقتور رابطہ ہے اور اس کا نام لیے بغیر وہ لاکھوں عوام کے دلوں پر حکومت نہیں کر سکتے۔ لیکن اعتصام سے وہ تہی دامن ہوتے ہیں۔ ان کے یہاں اسلام ایمان و اعتصام کا نام نہیں ہے بلکہ ان کے نزدیک اسلام اس ایمان کا ہے جس میں اعتصام نبوت کے علم و عمل سے نہیں بلکہ مغربی فکر، مغربی تمدن کے ساتھ ہو، صرف عقائد و اخلاقیات میں محدود رہ کر ساری زندگی میں بے قید ہونے کو ہی وہ اسلام سمجھتے ہیں۔ ڈاکٹر سالم کی یہ رائے بالکل درست ہے کہ

> اس مقصد کی خاطر قومیت نے اسلام سے پوری ہم آہنگی کی ہے لیکن جس اسلام کو قومیت نے اپنایا ہے وہ قدیم اسلام نہیں بلکہ تبدیل شدہ جدید اسلام ہے۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کا نام تو لیتے ہیں لیکن صرف اس لیے کہ ہر اس چیز کے لیے سندِ جواز مل جائے جسے قوم پرور اختیار کرنا چاہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ان کے یہاں اسلام ایمان و اعتصام کا نہیں بلکہ چند عقائد، چند رسوم کا نام ہے اور رسوم کے لیے بھی حقیقی ہونا شرط نہیں بلکہ وہ تمام رواجی رسمیں جو مسلمانوں میں رائج ہوں اسلام ہیں۔

يَسْتَفْتُونَكَ قُلِ اللّٰهُ يُفْتِيكُمْ فِي الْكَلٰلَةِ ۚ اِنِ امْرُؤٌا هَلَكَ
لَيْسَ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَهٗٓ اُخْتٌ فَلَهَا نِصْفُ مَا تَرَكَ ۚ وَهُوَ يَرِثُهَآ اِنْ
لَّمْ يَكُنْ لَّهَا وَلَدٌ ۚ فَاِنْ كَانَتَا اثْنَتَيْنِ فَلَهُمَا الثُّلُثٰنِ مِمَّا تَرَكَ ۚ
وَاِنْ كَانُوْٓا اِخْوَةً رِّجَالًا وَّنِسَآءً فَلِلذَّكَرِ مِثْلُ حَظِّ الْاُنْثَيَيْنِ ۗ
يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اَنْ تَضِلُّوْا ۗ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝

ع

اے پیغمبر لوگ آپ سے کلالہ کے بارے میں فتویٰ دریافت کرتے ہیں
فرما دیجئے کہ اللہ تم کو کلالہ کے بارے میں حکم دیتا ہے[265] کہ اگر کوئی
ایسا شخص مر جائے جس کی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن موجود
ہو تو جو کچھ مرنے والا چھوڑ جائے اس کا آدھا بہن کا ہے[266]۔ اور بہن
مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو تو اس کا وارث بھائی ہوگا[268]، پھر
اگر دو بہنیں ہوں تو انہیں ترکے میں سے دو تہائی ملے گا[269]، اور
اگر بھائی بہن ہوں کچھ مرد اور عورتیں تو پھر مرد کے لیے دو عورتوں کے مثل

کے برابر حصہ[۲۶۹]۔ اللہ تمہارے لیے اپنے احکام واضح کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو اور اللہ تمام باتوں کا علم رکھنے والا ہے[۲۷۰]۔

میراث کا ایک ذیلی مسئلہ

سورت کے آغاز میں قرابت داروں کے حقوق و احکام بیان ہوئے تھے درمیان میں بھی ان مسائل کا تذکرہ ہوا، اب سورت کا انجام بھی اسی پر ہوا ہے۔ یہ آیت گرامی پوری سورت نساء کے نازل ہونے کے بہت عرصہ بعد نازل ہوئی بلکہ کچھ روایات سے تو پتہ چلتا ہے کہ یہ نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری آیت ہے۔ بہرحال یہ آیت میراث کے مسائل میں ایک ضمیمہ کی حیثیت رکھتی ہے جو ابتدائے سورت کے بیان کردہ احکام وراثت کے ایک خاص مسئلہ کی وضاحت کے لیے بعد میں نازل ہوئی ہے۔ القاسمی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ سورت کا آغاز بھی مالیاتی مسائل سے ہوا تھا، خاتمہ بھی مالیاتی مسائل کی ایک خاص دفعہ پر مشاکلت کے لیے کیا گیا۔ اور شاید کلالہ کا مسئلہ آخر میں ذکر فرما کر اس طرف اشارہ ہو کہ جس طرح کلالہ کا وارث اس کے بھائی ہوتے ہیں اسی طرح بنی اسرائیل کے وارث اب بنی اسماعیل ہیں۔ بنی اسرائیل حضرت مسیح کے بعد ایک کلالہ کی حیثیت رکھتے ہیں کیونکہ حضرت مسیح اسرائیلی سلسلہ نبوت کے آخری فرزند ہیں اس لیے اب نبوت بنی اسماعیل میں منتقل ہوتی ہے جو بنی اسرائیل کے بھائی ہیں۔ اور دونوں خاندانوں کو بابرکت کرنے کا وعدہ بھی حضرت ابراہیم سے تھا۔ حضرت شیخ الاسلام اپنے افادات میں یہاں ایک خاص نوٹ تحریر فرما گئے ہیں۔ لکھتے ہیں۔ اس جگہ کلالہ کے حکم کو بیان فرمانے سے چند باتیں معلوم ہوئیں۔

اولاً یہ کہ جیسا پہلے وان تکفروا فان للہ ما فی السماوات وما فی الارض فرما کر اس کے بعد بطریق تمثیل اہل کتاب کا ذکر فرمایا تھا ایسے ہی آیت فاما الذین آمنوا باللہ واعتصموا کے بعد اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ بھی بطور تمثیل ذکر کر دیا ہے تاکہ وحی سے انحراف کرنے والوں کی گمراہی اور برائی اور وحی کا اتباع کرنے والوں کی حقانیت خوب سمجھ میں آجائے۔

ثانیاً اس طرف بھی اشارہ کر دیا کہ اہل کتاب کا حال تو یہ کہ انہوں نے ذات قدس سبحانہ کے لیے

شریک اور اولاد جیسے شنیع کام کو اپنا ایمان بنا لیا اور وحی الٰہی کا ڈٹ کر مقابلہ کیا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کا حال یہ ہے کہ اصول ایمان اور رسوم عبادات تو درکنار معاملات جزئیہ اور معمولی مسائل متعلقہ میراث نکاح وغیرہ میں بھی وحی کے متلاشی اور اس کی انتظار میں رہتے اور زندگی کے ہر معاملہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ اقدس کو دیکھتے کہ کیا ارشاد ہوتا ہے اپنی عقل اور خواہش کو قطعاً حاکم نہ سمجھتے ۔ اگر ایک بار تسلی نہ ہوتی تو مکرر حاضرِ خدمت ہو کر دریافت کرتے ۔ ببیں تفاوت راہ از کجاست تا بکجا ۔

ثالثاً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بلا حکم وحی اپنی طرف سے حکم نہ فرماتے تھے ۔ اگر کسی معاملہ میں حکم وحی موجود نہ ہوتا تو حکم فرمانے میں نزول وحی کا انتظار فرماتے ، جب نزول وحی ہوتا تو حکم فرماتے ۔ اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ اللہ سبحانہٗ کے سوا حاکم کوئی نہیں چنانچہ آیات متعددہ میں ان الحکم ا ۷ للہ وغیرہ صاف مذکور ہے ، باقی جو ہیں سب واسطہ ہیں ۔ ان کے ذریعے سے اوروں کو حکم الٰہی پہنچایا جاتا ہے خواہ واسطہ قریب ہو یا بعید جیسا حکم سلطانی پہنچانے کے لیے وزیر اعظم اور دیگر مقربین شاہی اور حکام اعلیٰ اور ادنیٰ درجہ بدرجہ واسطہ ہوتے ہیں پھر اس سے زیادہ گمراہی کیا ہو گی کہ کسی معاملہ میں وحی الٰہی کے مقابلے میں کوئی گمراہ کسی کی بات سنے اور عمل کرے ۔

آنانکہ زردے تو بجاتے نگر آنند

گر تو منظر آنند چہ کر تو منظر آنند

رابعاً اس میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ ایک دفعہ تمام کتاب کے نازل ہونے میں جیسا کہ اہل کتاب درخواست کرتے ہیں وہ خوبی نہیں ہے جو حسب ضرورت اور حسب موقع متفرق نازل ہونے میں ہے کیونکہ ہر شخص اپنی ضرورت کے مطابق سوال کر سکتا ہے اور بذریعہ وحی اس کو جواب مل سکتا ہے جیسا کہ یہاں اور قرآن کے دوسرے مواقع میں موجود ہے ۔ اور یہ صورت مفید تر ہونے کے علاوہ بوجہ شرافت ذکر خداوندی و عزت خطاب حق عز و جل ایسے فخر عظیم پر مشتمل ہے جو کسی امت کو نصیب نہیں ہے جس صحابی کی بھلائی میں یا اس کے سوال میں کوئی آیت نازل ہوئی وہ اس کے مناقب میں شمار ہوتی ہے اور اختلاف کے موقع میں جس رائے یا جس کے قول کے موافق وحی الٰہی اتری تا قیامت ان کے نام کا بول بالا ہوا ۔ لہٰذا کلالہ کے متعلق سوال و جواب کا ذکر فرما کر اس طرح کے بالعموم سوالات اور جوابات کی طرف اشارہ کر دیا ، اور غالباً اسی اشارے کی خاطر سوال کو مطلق رکھا ۔ مسئول عنہ کا سوال کے ساتھ ذکر نہیں کیا بلکہ جواب میں اس کی تصریح فرمائی جس کی قرآن میں کہیں مثال نہیں ہے ۔ اور پھر جواب کی اللہ سبحانہٗ کی طرف نسبت فرمائی ۔ الیٰ صلی جملہ احکام کے لیے

وحی الٰہی منشا اور اصل ہے۔ اور ہدایت اسی کی متابعت پر موقوف ہے اور کفر و ضلالت اسی کی مخالفت میں منحصر ہے اور چونکہ زمانہ نبوت میں یہود و نصاریٰ اور جملہ مشرکین اور تمام اہل ضلالت کی گمراہی کی جڑ یہی مخالفت تھی اس لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے کلام میں بہت جگہ وحی کی متابعت کی خوبی اور اس کی مخالفت کی خرابی پر تنبیہ فرمایا، بالخصوص اس جگہ تو دو رکوع کا موضوع ہی یہ مہتم بالشان مضمون ہے۔ شاید حضرت امام بخاریؒ نے اسی وجہ سے اپنی کتاب میں

باب کیف کان بدء الوحی الی رسول اللہ

منعقد فرما کر آیت انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح والنبیین من بعدہ کو ترجمۃ الباب میں داخل کیا اور ان دونوں رکوعوں کی طرف اشارہ کر گئے گویا مطلب یہ ہے کہ یہاں سے مضمون وحی کے ختم تک تلاوت کر لو۔

۲۶۵۔ لے پیغمبرؐ آپ سے کلالہ کے بارے میں فتویٰ دریافت کرتے ہیں! فرما دیجئے کہ اللہ تم کو کلالہ کے بارے میں حکم دیتا ہے۔ شروع سورت میں آیت میراث میں کلالہ کی میراث کا ذکر گزر چکا ہے۔ اس کے بعد جو بعض صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس کے متعلق زیادہ تفصیل پوچھنی چاہی تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ کلالہ کے معنے کمزور اور ضعیف یہاں وہ شخص مراد ہے جس کے وارثوں میں باپ اور اولاد میں سے کوئی نہ ہو جیسا کہ پہلے بیان ہوا کیونکہ اصلی وارث والد اور ولد ہی ہیں، جس کے یہ نہ ہوں تو اس کے حقیقی بھائی بہین کو بیٹا بیٹی کا حکم ہے۔ اور اگر حقیقی نہ ہوں تو یہی حکم سوتیلوں کا ہے جو کہ باپ میں شریک ہوں۔ ایک بہن ہو تو آدھا اور دو بہنیں ہوں تو دو تہائی۔ اور اگر بھائی بہن دونوں ہیں تو مرد کو دہرا حصہ اور عورت کو اکہرا حصہ ملے گا۔ اور اگر صرف بھائی ہوں، بہن کوئی نہ ہو تو وہ بہن کے مال کے وارث ہوں گے یعنی ان کا کوئی حصہ مقرر نہیں بلکہ وہ عصبہ ہیں جیسا کہ آیت میں یہ سب صورتیں مذکور ہیں۔ اب باقی رہ گئے ہیں وہ بھائی بہن جو صرف ماں میں شریک ہوں جن کو اخیافی کہتے ہیں تو ان کا حکم آغاز سورت میں بیان ہو چکا ہے کہ ان کا حصہ مقرر ہے۔[1]

کلالہ کی معنوی تحقیق پر ہم چوتھی جلد میں سورۃ نساء کی آیت ۱۲ میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ یہاں ہم محض تقریب سخن کی خاطر اس پر اجمالی تبصرہ کرتے ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کلالہ کی لغوی اور اصطلاحی تحقیق

علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے کلالہ کے لغوی معنے کے متعلق اہل لغت کے سات اقوال نقل کیے ہیں۔ علامہ منظور افریقی نے لسان العرب میں ابن بری کی جانب نسبت کر کے لکھا ہے کہ کلالہ اصل میں مصدر ہے۔ کل یکل کلالۃ بولا جاتا ہے۔ کل اس شخص کو کہتے ہیں جو اپنے پیچھے نہ بیٹا چھوڑے اور نہ باپ۔ لفظ کلالہ وارث اور مورث دونوں پر بولا جاتا ہے۔ اگر مورث کے معنے ہیں تو مصدر بمعنے اسم مفعول ہے جیسے خلق بمعنے مخلوق اور اگر کلالہ وارث کے معنے میں ہو تو مصدر بمعنے اسم فاعل ہے جیسے عدل بمعنے عادل، رجل عدل ہیں اور ماء غور ہیں بمعنی غائر، لفظ کلالہ مورث کے معنے بصریین کا مختار ہے اور لفظ کلالہ بمعنے وارث کو کوفیین کا مختار ہے۔ ابن الاثیر فرماتے ہیں کہ باپ اور بیٹا آدمی کی دو طرفین ہیں، اگر دونوں طرفین نہ رہیں تو آدمی کلالہ کہلاتا ہے۔ زمخشری نے اساس البلاغۃ میں آدمی کے باپ اور بیٹا نہ ہونے کو بمعنی وارث کلالہ کو مجاز قرار دیا ہے فرماتے ہیں ومن المجاز کل فلان اذا لم یکن ولد اور والد، اصل لغت میں کلالہ کے معنے کمزور ہونے کے ہیں۔ اسی سے وہ تلوار جو کند ہو گئی ہو کلیل اور اسی طرح وہ زبان جس میں قوت گویائی نہ ہو اور وہ آنکھ جس کی بینائی کمزور ہو جائے کلیل کہلاتی ہے۔ اسی سے قرآن میں اس غلام کو جس کا بوجھ مالی کمزوری کی وجہ سے اس کا آقا اٹھائے کل اور اسی سے حدیث میں خدیجۃ الکبریٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں بتایا ہے انک لتحمل الکل آپ ان کا بوجھ اٹھاتے ہیں جو خود کمزوری کی وجہ سے اپنی مدد آپ نہیں کر سکتے۔ اور یہی معنے اس ارشاد گرامی کے

من ترک مالا فلورثتہ ومن ترک کلا فالی وعلی

جو شخص مال چھوڑ کر مر جائے تو وہ اس کے وارثوں کا ہے اور جو بوجھ چھوڑ جائے

یعنی بے کس اور بے بس اولاد چھوڑ جائے یا قرض چھوڑ جائے تو اس کا ذمہ دار میں ہوں

استعمال میں وسعت کے بعد کلالہ سے مراد وہ ہوتے ہیں جو منقطع الطرفین ہوں نہ ان کے والدین ہوں اور نہ اولاد ہو۔ اور جو شخص آباؤ اجداد کی خصوصیات سے محروم ہو اس کو بھی کلالہ کہتے ہیں۔ ایک شاعر کہتا ہے

ورثتم قناۃ الملک غیر کلالۃ

عن ابنی مناف عبد شمس وھاشم

یعنی عبد مناف کے دونوں بیٹوں عبد شمس اور ہاشم سے تم کو حکومت کا نیزہ میراث میں تو ملا ہے مگر تم خود ان کی خصوصیات سے بے بہرہ ہو۔ قرب کے رشتہ دار کو چھوڑ دور کے رشتہ دار کو بھی کلالہ

کہتے ہیں۔ الخصاص رقمطراز ہیں کہ احادیث میں مورث اور وارث دونوں کو کہتے ہیں۔ بہرحال اس پر علماء کا اجماع ہے کہ سورہ نساء کی پہلی آیت وان کان رجل یورث کلالۃ میں کلالہ سے وہ مورث مراد ہے جس کے والد اور اولاد نہ ہونے کی صورت میں اخیافی بھائی بہن ہوں یعنی جو میت کے ساتھ صرف ماں کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں اور باپ ان کا دوسرا ہو۔ اور سورۂ نساء کی اس آیت میں اخیافی نہیں عینی اور علاتی بھائی بہن مراد ہیں یعنی جو میت کے ساتھ باپ اور ماں یا صرف باپ کی طرف سے رشتہ رکھتے ہوں گویا تین صورتیں ہیں، ایک یہ کہ کلالہ کے وارث اخیافی بھائی بہن ہوں، دوسرے یہ کہ کلالہ کے وارث عینی بھائی بہن ہوں تیسرے یہ کہ کلالہ کے وارث علاتی بھائی بہن ہوں۔ اس آیت میں آخری دو صورتوں کا ذکر ہے جبکہ پہلی آیت کلالہ میں پہلی صورت کا ذکر تھا۔

عینی یہ کہ باپ اور ماں ایک ہی ہوں۔ علاتی یہ کہ باپ ایک اور مائیں مختلف ہوں اور اخیافی یہ کہ ماں ایک ہو اور باپ مختلف ہوں۔

پہلی آیت میں چونکہ پہلی صورت بتائی گئی اس لیے سوال پیدا ہو کہ باقی دوسری صورتوں کا کیا حکم ہے۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ نے کلالہ کے موضوع پر دو آیتیں نازل فرمائی، ایک سورہ نساء کے شروع میں اور دوسری سورۂ نساء کے خاتمہ پر، پہلی آیت میں بات اجمالی بتائی گئی تھی، دوسری آیت میں بات کو کھول دیا گیا ہے۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ پہلی آیت میں اس کلالہ کا ذکر تھا جو اپنے وارثوں میں اخیافی بہن بھائی چھوڑ کر مرتا ہے، اس آیت میں اس کلالہ کا ذکر ہے جو اپنے وارثوں میں عینی اور علاتی بھائی بہن چھوڑ کر مرتا ہے۔ یہ بات کہ اس آیت میں اس کلالہ کا ذکر ہے جو اپنے وارثوں میں عینی یا علاتی بھائی بہن چھوڑ کر مرا ہو۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے ایک بار خطبہ میں ارشاد فرمایا اور صحابہ میں سے کسی نے اس سے اختلاف نہ کیا اس لیے یہ بات اتفاقی اور اجماعی ہے اور اسی سلسلے میں حضرت جابرؓ کا وہ واقعہ بھی ہے جسے عام شارحین قرآن نے اس آیت کے پس منظر میں پیش کیا ہے۔

> حضرت جابرؓ کہتے ہیں کہ میں بیمار تھا اور بیہوش تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، وضو فرمایا اور وضو کے باقی پانی سے مجھ کو چھینٹا دیا۔ مجھے ہوش آیا تو میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہؐ میں کلالہ ہوں، میرا کوئی وارث نہیں، میری میراث کا کیا بنے گا، اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔

یہ روایت صحیحین میں اور سنن اربعہ میں موجود ہے اور حافظ ابن جریر کا یہ بھی انکشاف ہے کہ

حضرت جابر کی ۹ بہنیں تھیں۔ قرآن کے سیاق اور حضرت جابر کے واقعہ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ کلالہ کے معنے قطعاً بے غبار ہیں۔ قرآن نے موضوع میراث پر سب سے پہلے اولاد کی پھر اولاد کی موجودگی میں اور عدم موجودگی میں اور بھائیوں کی موجودگی اور عدم موجودگی میں والدین کی میراث کا ذکر کیا ہے پھر اولاد کی موجودگی اور عدم موجودگی میں میاں بیوی کی میراث کا ذکر کیا ہے۔ ان کا میت سے بلا واسطہ تعلق ہے اب ظاہر ہے جن کا تعلق میت سے بالواسطہ ہوگا وہ کلالہ ہے اسی لیے اس کے بعد کلالہ کی میراث کا ذکر ہے اور گزشتہ ضابطہ میراث بول رہا ہے کہ کلالہ وہ ہے جس کا باپ نہ ہو اور بیٹا نہ ہو کیونکہ ان کی میراث بیان ہو چکی ہے۔ اگر لغت سے کلالہ کے معنے معلوم نہ بھی ہوں تو قرآن کا سیاق خود معنے بتانے کے لیے کافی ہے اور شاید اسی بنا پر امام اعظم ابوحنیفہ نے کلالہ کے معنے میں دادی اور پوتی کی نفی کا بھی اضافہ کیا ہے، بہرحال اس آیت نے اور نساء کی پہلی آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ ایسا شخص جس کا اصحاب فرض میں سے کوئی وارث نہ ہو اور اپنے پیچھے عینی یا علاتی بھائی بہن چھوڑ کر مرا ہے تو ان کی وراثت کا ضابطہ یہ ہے۔

وارثوں میں اکیلی بہن

۲۶۶۔ اگر کوئی ایسا شخص مرا ہو جس کی اولاد نہ ہو اور اس کی ایک بہن موجود ہو تو جو کچھ مرنے کے بعد اس نے چھوڑا ہے اس میں آدھا اس کی بہن کا ہے۔ یعنی اگر کوئی مرد مر گیا اور اس نے ایک بہن چھوڑی نہ بیٹا چھوڑا نہ باپ تو اس کی میراث میں اسے نصف مال ملے گا[1]

اصل ارشاد میں لفظ هلك آیا ہے اس کے معنے مر جانے کے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ اس کا استعمال تحقیر کے موضوع پر ہوتا ہے لیکن محققین کی رائے میں یہ عرف حادث ہے ورنہ اصل میں اس کے معنے میں ایسی کوئی بات نہیں۔ اس معنے میں یہ لفظ خود قرآن و سنت میں آیا ہے اور تحقیر کا کوئی پہلو وہاں نہیں ہے۔ حضرت یوسف کے بارے میں ہے حتی اذا هلك اور حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک ہوا تو مدینہ میں آہ و فغاں سے ایک ہنگامہ بپا تھا۔ باہر سے آنے والے نے دریافت کیا یہ کیا ہو گیا۔ لوگوں نے جواب دیا کہ هلك رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضور کا وصال ہو گیا ہے لیکن بعد عرف میں یہ لفظ حقارت والی موت پر بولا جانے لگا۔ اسی بنا پر علامہ خفاجی نے

[1] افادات شیخ الاسلام

شرح شفا میں تصریح کی ہے ۔

انبیاء کے حق میں اس لفظ کا استعمال ذکرنا چاہیے اور لغت قدیم معنے کا خیال کیا جائے

قواعد شرعیہ سے تھوڑا سا لگاؤ رکھنے والا شخص بھی یہ بات بخوبی جانتا ہے ۔

علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں بھی یہ بات نقل کی ہے ۔

یہ بات کہ اگر کلالہ وہ ہے جس کے باپ نہ ہو اور بیٹا نہ ہو تو قرآن نے صرف بیٹے کی نفی کیوں کی ہے اور یہ کیوں فرمایا ہے کہ لیس لہ ولد ، اس کا جواب یہ ہے کہ قرآن نے یہاں بیٹے نہ ہونے کی تصریح اس لیے کی ہے کہ

اولاً بیٹا نہ ہونا کلالہ کے لغوی مفہوم میں موجود ہے

ثانیاً عموماً آدمی کی وفات والدین کے وفات کے بعد ہوتی ہے اس کا سرمایہ یا اپنی کمائی سے ہوتا ہے یا وراثت میں ظاہر ہوتا ہے ۔

ثالثاً ، بھائیوں اور بہنوں کا والد کے ساتھ وارث نہ ہونا فرائض کی آیات سے پہلے معلوم ہو چکا ہے اس لیے یہاں باپ نہ ہونے کی شرط لگانے کا کوئی فائدہ نہ تھا۔ یہ بات خود قرآن سے ، میراث کے قواعد سے پہلے ہی معلوم تھی اس لیے اختصاراً اسے حذف کر دیا ۔

آیت میں ولد سے کیا مراد ہے ؟ ولد سے مراد یہاں بیٹا ہے کیونکہ بیٹے کی موجودگی میں بہن بالاجماع وارث نہیں ہو سکتی اور بیٹی کی موجودگی میں بہن کو وراثت میں حق ملتا ہے لیکن کچھ صحابہ کی رائے میں یہاں ولد بیٹا اور بیٹی دونوں کے لیے ہے ۔ زید بن ثابت سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کا انتقال ہو گیا ہے اس نے اپنے پسماندگان میں ایک بیٹی بہن چھوڑی ہے اور ایک بیوی چھوڑی ہے میراث کا حکم کیا ہے فرمایا کہ بیوی کو آدھی اور بہن کو آدھی جائداد دے دی جائے اور فرمایا کہ میں بارگاہ نبوت میں حاضر تھا ، آپ نے یہی فیصلہ فرمایا تھا۔ یہ حدیث مسند امام احمد میں ہے۔ حافظ ابن جریر نے عبداللہ بن عباس اور عبداللہ ابن الزبیر کا فیصلہ اس شخص کے بارے میں جو ایک بیٹی اور بہن چھوڑ کر انتقال کر جاتے یہ نقل کیا ہے کہ بہن کو کچھ نہ ملے گا لیکن جمہور نے اس معاملہ میں عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن الزبیر سے اختلاف کیا ہے ، ان کی رائے میں بیٹی کو نصف فرض کی بنا پر اور بہن کو نصف عصبہ ہونے کی وجہ سے دیا جاتے گا۔ بہن کو عصبہ بنا کر دینا اس واقعہ کی وجہ سے ہے جو صحیح بخاری میں بحوالہ سلیمان از ابراہیم الاسود آیا ہے کہ

حضرت معاذ نے زمانہ نبوت میں ایسے ہی واقعہ لڑکی کے لیے اور بہن کے لیے نصف کا فیصلہ فرمایا تھا ۔

اور صحیح بخاری میں ہذیل بن شرجیل کے حوالے سے ہے کہ

حضرت ابو موسیٰ اشعری سے دریافت کیا گیا کہ ایک شخص کا انتقال ہو گیا۔ اس نے پسماندگان میں ایک بیٹی، ایک پوتی اور ایک بہن چھوڑی ہے۔ آپ نے فرمایا کہ بیٹی کو نصف اور بہن کو نصف ملے گا یہ بتا کر فرمایا کہ عبداللہ بن مسعود سے بھی پوچھ لو۔ سائل نے عبداللہ ابن مسعود سے دریافت کیا اور ساتھ ہی ابو موسیٰ کا فتویٰ بھی بتا دیا۔ عبداللہ بن مسعود نے کہا پھر تو میں بے راہ ہو جاؤں گا اور مجھے راہ نہ ملے گی۔ میں تو وہی فیصلہ کروں گا جو حضور نے فیصلہ کیا ہے۔ آدھا بیٹی کو ملے گا اور چھٹا پوتی کو ملے گا اور باقی بہن کو۔ سائل کہتا ہے کہ میں ابو موسیٰ کے پاس آیا اور ان کو عبداللہ بن مسعود کے فتویٰ سے آگاہ کیا، بولے جب تک یہ عالم تم میں موجود ہے مجھ سے مسائل نہ پوچھا کرو۔

بھائی بہن کے سارے مال کا وارث

۲۶۷ ۔ اور بہن مر جائے اور اس کی اولاد نہ ہو تو اس کا وارث بھائی ہوگا۔ یعنی اور اگر اس کے برعکس ہو یعنی کوئی عورت لاولد مر گئی اور اس نے بھائی عیانی یا علاتی چھوڑا تو وہ بہن کے مال کا وارث ہوگا کیونکہ وہ عصبہ ہے اور اگر اس نے لڑکا چھوڑا تو بھائی کو کچھ نہ ملے گا اور اگر لڑکی چھوڑی تو لڑکی سے جو کچھ بچے گا وہ اس بھائی کو ملے گا اور اگر بھائی بہن اخیافی ہوں تو اس کے لیے چھٹا حصہ مقرر ہے جیسا کہ ابتدائے سورت میں گزر چکا ہے[1] مطلب یہ ہے کہ بھائی اس کے سارے مال کا وارث ہوگا اگر اور کوئی صاحب فریضہ نہ ہو۔ اگر کوئی صاحب فریضہ موجود ہو مثلاً شوہر ہو تو اس کا حصہ ادا کرنے کے بعد باقی تمام ترکہ بھائی کو ملے گا۔[2]

منشا یہ ہے کہ بھائی بہن کے مال کا وارث ہوگا جب کہ اس کے بیٹا نہ ہو، والعز ہو جیسا کہ کلالہ کی معنوی روح کا تقاضا ہے اور جیسا کہ فرائض اور میراث کے قواعد و ضوابط کی روح ہے۔

کلالہ برادر کی اگر دو بہنیں ہوں

۲۶۸ ۔ پھر اگر دو بہنیں ہوں تو ان کو ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا۔ یعنی اگر دو سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

زیادہ بہنیں ہوں تو ان کو دو تہائی ملے گا[1] مطلب یہ ہے کہ اگر مرنے والا کلالہ اپنے پسماندگان میں دو بہنیں چھوڑ کر مرے تو ان کو بھائی کے ترکہ میں سے دو تہائی ملے گا اور اگر دو سے بھی زیادہ ہوں جیسا کہ حضرت جابر کی نو بہنیں تھیں تو ان کو بھی دو تہائی ہی ملے گا اور باقی عصبہ کو ملے گا بشرطیکہ اصحاب فرض میں سے کوئی نہ ہو۔ اداء قرض اور اجرائے وصیت ہر حال میں مقدم ہوگا۔ اس آیت میں کلالہ کی دو بہنوں کا خاص طور پر حکم بتایا اور حکم بھی ایسے بلیغ انداز میں بتایا کہ دو بہنوں کے لیے صرف تثنیہ کی ضمیر پر اکتفا نہیں فرمایا۔ بلکہ اثنتین کا عدد دے کر آئے، صرف اس لیے تاکہ کسی کو یہ شبہ نہ ہو کہ جب ایک بہن کو آدھا ہے تو دو بہنوں کا تو لازماً سارا ہوگا فرمایا یہ بات نہیں بلکہ بہنیں دو ہوں گی تو صرف دو تہائی ملے گا پورا نہیں ملے گا اور دو سے زائد کے بارے میں بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ فان کن نساء فوق اثنتین فلھن ثلثا ما ترک اس لیے یہاں اس کا ذکر نہیں کیا۔

مرد کو عورت سے دگنا

۲۶۹ - اگر بہن بھائی ہوں، کچھ مرد کچھ عورتیں تو پھر مرد کے لیے دو عورتوں کے برابر حصہ ہے یعنی اگر میت کلالہ ہو اس کے نہ باپ ہو نہ بیٹا اور اس کے وارثوں میں بھائی اور بہنیں ہوں تو میت کا ترکہ ان بھائی بہنوں میں دو اور ایک کی نسبت سے تقسیم ہوگا، اس کے لیے یہ بلیغ تعبیر اختیار کی للذکر مثل حظ الانثیین یعنی لڑکے کو دو لڑکیوں جیسا ہے، یہ نہیں فرمایا للانثیین مثل حظ الذکر دو لڑکیوں کو ایک لڑکے جیسا ملے گا یا للانثی مثل حظ الذکر کہ لڑکی کو لڑکے سے آدھا ملے گا اس میں اس مزاجی ذہن کی تردید ہے جو عورتوں کو وراثت سے محروم کرتا تھا۔

یہ بات کہ مرد کو عورت کے مقابلہ میں ڈبل کیوں دیا گیا ہے؟ یہ سوال بہتوں کے ذہنوں میں ابھرا ہے۔ اور شارحین قرآن نے اس پر مختلف انداز میں داد تحقیق دی ہے۔

آئیے ذرا اس موضوع پر ایک اور پہلو سے غور فرمایئے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن نے صرف عورتوں کے حقوق کا اعتقاد ہی پیدا نہیں کیا بلکہ صاف صاف اعلان کر دیا کہ حقوق کے اعتبار سے مرد و عورت دونوں برابر ہیں۔

ولھن مثل الذی علیھن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور یہ بھی درست ہے کہ جہاں تک معیشی اور مالیاتی استقلال کا تعلق ہے قرآن نے مرد و عورت دونوں کے استقلال کا اعلان کیا ہے۔

للرجال نصیب مما اکتسبوا و للنساء نصیب مما اکتسبن

اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ وراثت میں قرآن نے حقداری کی حد تک مرد و عورت دونوں کی برابری کا اعلان کیا ہے۔

للرجال نصیب مما ترک الوالدان والاقربون وللنساء نصیب مما ترک الوالدان مما قل منہ او کثر

اس کے باوجود ترتیب اور تقسیم حقوق میں عورت کو مرد سے نصف دیا ہے، اور وں کا پتہ نہیں مگر اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ نہیں ہے کہ عورت کمزور ہے جیسا کہ علامہ آلوسی کی رائے ہے اگر بنیاد یہی ہو تو پھر عورت کو ڈبل ملنا چاہیے اور طاقتور کو سنگل ملنا چاہیے۔ اور اس بات میں کوئی خاص وزن نہیں ہے کہ مرد کو خاندانی زندگی میں قوام بنایا گیا ہے اور یہ بھی کوئی وجہ نہیں ہے کہ عورت کی فطری ساخت، جسمانی ترکیب اور عضویاتی ساخت نے اسے اس قابل ہی نہیں رکھا ہے کہ تربیت اولاد کے ساتھ اور کوئی کام کرے۔ واقعی وجہ اس کی یہ ہے کہ عورت کو میراث میں لڑکے کے مقابلہ میں آدھا اس لیے دیا گیا ہے کہ عورت کو مہر کی صورت میں شوہر کی جانب سے جو رقم ملنے والی ہے وہ اس کمی کو پورا کر دیتی ہے۔ نیز عورت پر شادی ہو جانے کے بعد اپنی رہائش، خوراک کی کوئی ذمہ داری نہیں ہوتی ہے شوہر اس کی ہر قسم کی کفالت کرتا ہے۔ اسے مثال سے یوں سمجھئے کہ رشید کا انتقال ہوا ہے۔ اس نے دو بالغ بچے حمید اور فریدہ چھوڑے ہیں اور اس کا ترکہ تین ہزار روپیہ ہے۔ ظاہر ہے کہ دو ہزار حمید کو ملیں گے اور ایک ہزار فریدہ کو۔ اب دونوں کی شادی ہوتی ہے، حمید کو اپنی بیوی کو ایک ہزار روپیہ مہر دینا ہے اور فریدہ کو لینے شوہر سے ایک ہزار روپیہ مہر لینا ہے۔ حمید پر اپنی اور اپنی اہلیہ کے نان و نفقہ کی ذمہ داری ہے جب کہ فریدہ اپنے نان و نفقہ سے بے فکر ہے۔ مہر کے بارے میں پڑھ چکے ہو واتوا النساء صدقاتھن نحلۃ، اور وآتیتم احداھن قنطارا۔

ان حالات میں آپ ہی ذرا انصاف فرمائیے کہ زیادہ کس کو ملا ہے، لڑکی کو یا لڑکے کو۔ لڑکے کے پاس صرف ایک ہزار ہے اور اس میں اس پر خانگی ذمہ داریاں ہیں۔ لڑکے پر مہر کی ذمہ داری ہے اس لیے اس کو ڈبل دیا گیا ہے۔ لڑکی کو مہر لینا ہے اس لیے اس کو میراث میں حصہ سنگل دیا گیا ہے اور یہی وجہ ہے کہ شوہر کے مرجانے پر بیوی کو چوتھائی اور آٹھواں دیا ہے اور بیوی کے مرجانے پر شوہر کو

ڈبل اور چوتھائی دیا ہے کیونکہ بیوی کے مرجانے پر شوہر کو دوسری شادی کرنی ہے بیوی کو مہر دینا ہے اور شوہر کے مرجانے پر بیوی کو دوسری شادی کرنی ہے اس کو مہر لینا ہے۔

نزولِ قوانین کا مقصد

۲۷۰۔ اللہ تمہارے لیے اپنے احکام واضح کرتا ہے تاکہ تم گمراہ نہ ہو اور اللہ تمام باتوں کا علم رکھنے والا ہے۔ یعنی اللہ رحیم و کریم محض اپنے بندوں کی ہدایت کے لیے اور ان کو گمراہی سے بچانے کے لیے اپنے احکام حقہ صادقہ بیان فرماتا ہے جیسا یہاں میراث کلالہ کو بیان فرمادیا۔ اس کی اس میں کوئی غرض نہیں ہے وہ سب سے غنی اور بے نیاز ہے تو اب جو اس مہربانی کی قدر نہ کرے بلکہ اس کے حکم سے انحراف کرے اس کی شقاوت کا کیا ٹھکانا۔ اس سے معلوم ہوگیا کہ بندہ کو جملہ احکام کی تابعداری لازم ہے اگر معمولی اور جزوی امر میں خلاف کرے گا تو گمراہی ہے پھر جو لوگ اس کی ذات پاک اور اس کی صفات کمال میں اس کے حکم کے خلاف کرتے ہیں اور اپنی عقل اور اپنی خواہش کو اس کے مقابلہ میں اپنا مقتدا بناتے ہیں۔ ان کی ضلالت اور خباثت کو اسی سے سمجھ لیجئے کہ کس درجہ کی ہوگی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ اپنے بندوں کی ہدایت پسند کرتا ہے آخر میں ارشاد ہے کہ اس کو سب کچھ معلوم ہے۔ تو مطلب یہ نکلا کہ مسائل وغیرہ میں جو ضرورت پیش آتے اس کو پوچھ لو۔ یہاں صحابہ نے جو کلالہ کے مسئلہ میں استفسار فرمایا تھا اس کی تحسین کی طرف اور آئندہ ایسے سوالات کی ترغیب کی طرف اشارہ کر دیا اور یہ بھی بتادیا کہ اللہ سب کچھ جانتا ہے یعنی تم نہیں جانتے تم تو یہ بھی نہیں بتلا سکتے کہ کلالہ اور اس کے سوا دیگر صورتوں میں جو حصہ مقرر کیا گیا ہے فی الواقع اس کی وجہ کیا ہے؟ پھر آدمی کی عقل اس قابل کب ہو سکتی ہے کہ اس کے بھروسے حق سبحانہ کی ذات و صفات میں وحی کے خلاف پر جرأت کرے جو اپنے تعلقات اور اپنے اقارب کے فرق اور امتیاز سے عاجز ہو وہ بے چون و چگوں اور اس کی صفات کو بدون اس کے بتلائے کیا سمجھ سکتا ہے[1] ان تضلوا اصل میں علت بیان کرنے کے لیے ہے۔ اصل میں لئلا تضلوا ہے یعنی تاکہ تم بے راہ نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اسلامی احکام و قوانین کا بنیادی مقصد افراد کی تکمیل ذات اور انسان کی اجتماعی زندگی کی نشوونما ہے۔ فرد کی تکمیل ذات اور اجتماعی سیرت کی تشکیل و تعمیر ایک ایسا مقصد ہے جس سے سیاسی ترقی اور معاشی فارغ البالی کا مقصد

[1] افادات شیخ الاسلام

خود بخود حل ہو جاتا ہے کیونکہ انسانی شخصیت کا نشوونما زندگی کی ایک ایسی حالت پر موقوف ہے جس میں افراد کی حقیقی اور مادی ضروریات پوری ہوں۔ چونکہ اسلامی قوانین کا مقصد انسان کی تکمیلِ ذات اور اس کی اجتماعی خودی کی نشوونما ہے اس لیے وہ مادی زندگی کے مالیاتی شعبہ سے قطع نظر نہیں کر سکتا۔ اس کے فرائض میں اہم فرض یہ ہے کہ وہ معاشرے کی مالیاتی، معاشی اور سیاسی تنظیم کرے۔ اسی طرح اسلامی قانون باطنی زندگی اور اس کے مختلف شعبوں کی اصلاح کو کافی نہیں سمجھتا۔ وہ انسان کی حیات خارجی ہو یا اس کی باطنی زندگی دونوں کی بیک وقت اصلاح چاہتا ہے کیونکہ خارج و باطن دونوں ایک دوسرے سے اثر پذیر ہوتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک کی اصلاح بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ دوسرے کی بھی اصلاح کی جائے۔ انسانی زندگی کے کسی شعبہ کو درست نہیں کیا جا سکتا جب تک خود انسان کا نفس بھلائی کی طرف مائل نہ ہو جائے اور اگر نفس انسانی زندگی کی ہر شاخ میں خواہشوں کا پرستار ہو کر رہ جائے تو تمدن کی تمام اصلاحی کوششیں، معاشرتی زندگی کو درست کرنے کی ترکیبیں اور سیاسی نظام کا تغیر و تبدل بیکار ہے۔ جب تک افراد میں بھلائی کی طرف میلان نہ ہو تمدنی زندگی امن و مسرت سے ناآشنا رہے گی۔ قرآن نے یبین اللہ لکم کا مفعول حذف کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ الجصاص نے بالکل درست لکھا ہے کہ وہ تمام احکام اللہ سبحانہٗ ہمارے لیے بیان کرتا ہے جن کی ہمیں ضرورت ہے اور دوسرے شارحین قرآن نے اسی کو احکام و شرائع سے تعبیر کیا ہے یعنی اللہ تمہارے لیے دین کے قوانین و احکام بیان کرتا ہے۔ سورت کے آغاز سے یہاں تک جو معاشرتی، عائلی، اخلاقی، روحانی، معاشی، قانونی اور سیاسی اور مالیاتی احکام بیان ہوتے ہیں۔ ان سب کی طرف بحیثیتِ مجموعی اشارہ کرتے ہوئے فرمایا کہ معاشرت اخلاق، سیاست اور مالیات کے وہ قانون ہیں جو اللہ تمہاری خاطر بیان کر رہا ہے اور اس لیے بیان کر رہا ہے تاکہ تم زندگی میں کسی مقام پر بے راہ اور گم کردہ راہ نہ ہو جاؤ۔

اور یہاں لکم پر زور دے کر اشارہ کیا ہے کہ تم دنیا میں اس لیے روانہ کیے گئے ہو کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے لیے اپنے احکام و ہدایات بیان فرمائے۔ نبوت کے بجائے خود امت کو مخاطب اس لیے کیا گیا ہے کہ آخری نبوت کے ذریعے ایک ایسی امت کو وجود میں لانا مقصود ہے جو دنیا میں نبوت کی نیابت کر سکے اور پورے دین کی حامل اور تمام انبیا کی وارث ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اگرچہ اللہ سبحانہٗ نے تمام عالم کی اصلاح کے لیے مبعوث فرمایا تھا اور اس بنا پر ایسی کامل شریعت عطا کی جو نہ صرف عرب بلکہ تمام عالم کے لیے ابد تک کافی ہے لیکن کوئی شریعت، کوئی قانون، کوئی دستور اس وقت تک مفید اور کارآمد نہیں ہو سکتا جب تک اس کے ساتھ ایسا گروہ موجود نہ ہو جو اس شریعت کی عملی تصویر ہو۔ اس بنا پر

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کا ایک اہم مقصد ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاحِ عالم کے لیے تیار کرنا تھا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی لکھتے ہیں کہ جو پیغمبر عالمی دعوت کا علمبردار ہو کر آتا ہے وہ علاوہ ان اصول کے جو دوسرے انبیاء کرکچھ نئے اصول اختیار کرتا ہے۔ حجۃ اللہ البالغہ میں ہے:

وہ ایک قوم کو سلتِ راشدہ کی طرف دعوت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے۔ پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے اور ان کو دنیا میں پھیلاتا ہے اور ان کو ذریعہ بنا کر محنت کرتا ہے۔ قرآن کی اس آیت کنتم خیر امۃ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

دنیا کی تمام قوموں میں اس پیغمبرانہ کام کی صلاحیت مفقود ہو چکی تھی صرف عرب کی سرزمین بن جوتی زمین کی طرح نشوونما کے مادے سے لبریز تھی۔ اللہ سبحانہ نے اسی کا انتخاب فرمایا اور یہیں تکمہ تاج ان کے سر پر رکھا اور فلاح وسعادت کی وہ راہ جس پر انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین چل چکے تھے ان پر کھول دی اور بالآخر ان کی اس دعا کو شرفِ قبول عطا کیا اھدنا الصراط المستقیم یہاں ان تضلوا میں اسی طرف اشارہ ہے کہ وہ احکام و قوانین اس لیے تمہارے سامنے کھول کر بیان کر رہا ہے کہ صراطِ مستقیم سے نہ ہٹ جاؤ۔ ایسا نہ ہو کہ تم یہودیوں کی طرح روحانیت کو چھوڑ کر مادیت کے ہو جاؤ اور ایسا نہ ہو کہ تم مادیت کو نظر انداز کر کے روحانیت کے پیچھے پڑ جاؤ۔

سورۃ نساء کی یہ آخری سطریں جو اس خطاکار کے قلم سے آج مورخہ ۲۵ ذیقعدہ ۱۳۹۷ھ مطابق ۸ نومبر ۱۹۷۷ء بروز دوشنبہ بوقت ۱۱ بجے دن بمقام شویخ الکویت فیکٹری منیرم الوطن از جناب الحاج عبد الغنی صاحب حوالۂ قرطاس ہوتی ہیں، اللہ سبحانہ لغزشوں کو معاف فرمائے، اور خاص اپنے فضل وکرم سے معالم القرآن کو پوری کرنے کی توفیق عطا فرماتے۔ آمین۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم

سُورت کا نام

یہ قرآن کی پانچویں سُورت ہے۔ اس میں ۱۲۰ آیتیں ہیں۔ اس کا نام مائدہ ہے۔ اس میں مائدہ کا واقعہ ہے اور واقعہ اپنے اندر ایک سے زیادہ عجائبات رکھتا ہے کیونکہ اس کے جلو میں ایک سے زیادہ قدرت کی نشانیاں ہونے کے ساتھ اس دور کے اہل ایمان پر عظیم مہربانی اور منکرین کے لیے سنگین دھمکی ہے۔ اس لیے بندہ ہونے کی حیثیت میں یہ واقعہ بندوں کو ان ذمہ داریوں کے اپنانے کا بہت بڑا محرک ہے جو اللہ کی جانب سے اس پر ڈالی گئی ہیں جس کے ذریعے اللہ اور بندوں کے درمیان رابطہ ایمانی استوار ہوتا ہے اس لیے پوری سُورت کو مائدہ کے نام سے موسوم کر دیا گیا ہے۔

زمانہ نزول سورۃ مائدہ

یہ سورت مدنی اس معنے میں ہے کہ اس کے نزول کا زمانہ رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام مدینہ بلکہ آخر عمر شریف کا زمانہ ہے، ورنہ واقعتہً اس کے بیشتر حصہ کا نزول مکہ مکرمہ میں حجۃ الوداع ۹ ذی الحجہ سنہ ۱۰ھ میں ہوا ہے۔ اور کچھ صلح حدیبیہ سے واپسی کے وقت نازل ہوئی ہے۔ روایات سے اس کی تصدیق ہوتی ہے کہ یہ صلح حدیبیہ کے بعد سنہ ۶ھ ہجری کے اواخر یا سنہ ۷ھ کے اوائل میں نازل ہوئی ہے۔ ذی قعدہ سنہ ۶ھ کا واقعہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چودہ سو مسلمانوں کے ساتھ عمرہ ادا کرنے کے لیے مکہ تشریف لے گئے مگر کفار مکہ نے عداوت کے جوش میں عرب کی قدیم ترین مذہبی روایات کے خلاف آپ کو عمرہ نہ کرنے دیا، اور بڑی رد و کد کے بعد یہ بات قبول کی کہ آئندہ سال آپ زیارت کے لیے آ سکتے ہیں۔ اس موقعہ پر ضرورت پیش آئی کہ مسلمانوں کو ایک طرف تو زیارت کعبہ کے لیے سفر کے آداب بتلائے جائیں تاکہ آئندہ سال عمرہ کا سفر پوری اسلامی شان کے ساتھ ہو سکے اور دوسری طرف انہیں تاکید کی جائے کہ دشمن کافروں نے ان کو عمرے سے روک کر جو زیادتی کی ہے اس کے جواب میں وہ خود کوئی ناروا زیادتی نہ کریں۔ اور کچھ فتح مکہ کے سال سنہ ۸ھ میں۔

روایتوں میں آیا ہے کہ جس وقت اس سُورت کا نزول ہوا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اونٹنی

پر سوار تھے نزولِ وحی کے ثقل کو جانور تک نے محسوس کیا اور وہ بیٹھ گئی۔

بیان کے انداز سے گمان یہی ہوتا ہے کہ یہ پوری سورت ایک ہی خطبہ پر مشتمل ہے جو بیک وقت نازل ہوا ہوگا۔ ہو سکتا ہے کہ متفرق طور پر اس کی بعض آیتیں بعد میں نازل ہوئی ہوں اور مضمون کی مناسبت سے ان کو اس سورت میں مختلف مقامات پر پیوست کر دیا گیا ہو، لیکن سلسلہ بیان میں کہیں کوئی خفیف سا خلا بھی محسوس نہیں ہوتا جس سے یہ قیاس کیا جا سکے کہ یہ سورت دو یا تین خطبوں کا مجموعہ ہے۔

سورہ مائدہ کا موضوع

سورہ نساء کے نزول سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ اسلام صرف ایک عقیدہ و مسلک نہیں ہے جس کی حکمرانی صرف دلوں اور دماغوں تک محدود ہو بلکہ وہ روحانی اور اخلاقی نظام کے ساتھ ایک سیاسی نظام بھی ہے جس کی حکمرانی عملاً اپنے حدود میں بسنے والے تمام لوگوں کی زندگی پر محیط ہوتی ہے۔ اب مسلمان اس طاقت کے مالک بن چکے تھے کہ جس سیاسی نظام پر وہ ایمان لائے تھے اس کے مطابق ریاست بنا کر زندگی بسر کر سکیں اور اس کے علاوہ کسی دوسرے سیاسی نظام یا قانون کو اپنے دائرہ حیات میں دخل انداز نہ ہونے دیں۔ اس سورت میں اللہ تعالیٰ نے اُمتِ مسلمہ سے آخری اُمت کی حیثیت سے اپنی آخری اور کامل شریعت پر پوری پابندی کے ساتھ قائم رہنے اور اس کو پوری دُنیا میں قائم کرنے کا عہد و پیمان لیا ہے۔

گویا دوسرے لفظوں میں سورت کا موضوع ایفائے عہد ہے یعنی احکام الٰہی کی اطاعت کا جو عہد کر چکے ہو اسے سچائی کے ساتھ پورا کرو۔ پورا کرنا یہ ہے کہ جن باتوں کے کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ کرو اور جن سے روکا گیا ہے ان سے رک جاؤ۔ چنانچہ آغاز ہی میں اوفوا بالعقود کے بعد اوامر و نواہی کا بیان شروع ہو گیا ہے۔ سورت کے موضوع کے تقاضے سے اس میں جو مطالب بیان ہوئے ہیں ان میں چند نمایاں باتیں یہ ہیں۔

اوّلاً یہ کہ اس میں جو احکام و قوانین بیان ہوئے ہیں وہ دعوتِ اسلامی کے اس دور سے تعلق رکھتے ہیں جب کہ تکمیلِ دین اور اتمامِ نعمت کا مرحلہ سامنے آ چکا ہے۔ ظاہر ہے کہ عہد و پیمان لینے کے لیے سب سے زیادہ موزوں احکام بھی ہو سکتے ہیں۔

ثانیاً یہ کہ ان احکام میں امتحان کا پہلو زیادہ نمایاں ہے۔ پچھلی اُمتوں کو اس طرح کے جو احکام دیے گئے تھے ان میں انہوں نے ٹھوکریں کھائیں جس کے نتیجے میں وہ معتوب ہوئیں۔ اس اُمت پر اللہ کا خاص یہ فضل ہوا کہ عہد و پیمان لیتے وقت ایسے احکام خاص طور پر دیے گئے۔ یہ اُمت پاؤں پھسلنے

کے مقامات سے اچھی طرح واقف ہو جاتے ۔
ثالثاً یہ کہ اس سورت میں تفصیل کے ساتھ یہود و نصاریٰ کے نقضِ عہد کی تاریخ بھی بیان ہوتی ہے اور اس کے اسباب پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔
رابعاً یہ کہ اس سورت میں انفرادی اور اجتماعی زندگی کے ان پوشیدہ گوشوں کو خاص طور پر نشانزد کیا گیا ہے جہاں سے کفر اور اس کے ایجنٹوں کو گھس آنے کا موقعہ ملتا ہے اور پھر وہ فتنے سر اٹھاتے ہیں جو روکے نہ جائیں تو پورا انتظام شریعت درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے ۔
خامساً یہ کہ اس سورت میں وہ اصول و ضوابط خاص طور پر پوری طرح واضح کر دیئے گئے ہیں جن کا اہتمام عدل پر قائم و استوار رہنے کے لیے ضروری ہے ۔
یہ پانچ باتیں اس وقت کہی گئیں جب کہ اسلامی اصول اور نقطہء نظر کے مطابق مسلمانوں کی اپنی ایک مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اخلاق معاشرت تمدن ہر چیز میں اب مسلمان غیر مسلموں سے ممتاز ہو چکے تھے۔ تمام اسلامی علاقے میں مساجد اور نماز باجماعت کا نظم قائم ہو گیا تھا۔ ہر بستی اور ہر قبیلے میں امام مقرر تھے۔ اسلامی قوانین سیاسی، فوجداری اور دیوانی بڑی حد تک بن چکے تھے اور ریاست کی تشکیل سیاسی قوانین کی روشنی میں ہو چکی تھی اور عدالتوں کے ذریعے دیوانی اور فوجداری قوانین نافذ کیے جا رہے تھے۔ لین دین خرید و فروخت کے پرانے معاملات بند اور نئے اصلاح شدہ طریقے رائج ہو چکے تھے۔ وراثت کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا۔ نکاح طلاق کے قوانین، پردہ شرعی اور استیذان کے احکام اور زنا و قذف کی سزائیں جاری ہونے سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی ایک خاص سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ مسلمانوں کی نشست و برخاست بول چال، کھانے پینے، وضع قطع اور رہنے سہنے کے طریقے تک اپنی ایک مستقل شکل اختیار کر چکے تھے اسلامی زندگی کی ایسی مکمل صورت گری ہو جانے کے بعد غیر مسلم دنیا اس طرف سے قطعی مایوس ہو چکی تھی کہ یہ لوگ جن کا اپنا ایک الگ تمدن بن چکا ہے پھر کبھی ان میں آملیں گے ۔
اسی لیے اس سورت کو آخری سورت کہا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آخری مراحل میں نازل ہوتی ہے البحر المحیط میں ابن حیان اندلسی کی یہ بات زیادہ وزنی ہے کہ سورہ مائدہ کے کچھ حصے سفر حدیبیہ میں اور کچھ فتح مکہ کے سفر میں اور کچھ حجۃ الوداع کے سفر میں نازل ہوتے ہیں۔ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں بحوالہ حضرت حمزہ ابن حبیب اور عطیہ ابن قیس یہ ارشادِ نبوت نقل کیا ہے کہ سورہ مائدہ نزول کے اعتبار سے قرآن کی آخری سورت ہے۔ اس کے حلال و حلال اور اس کے حرام کو حرام سمجھو۔ اسی قسم کی

ایک روایت حافظ ابن کثیر نے بحوالہ جبیر بن نفیر نقل کی ہے کہ وہ حج کے بعد حضرت عائشہ صدیقہ کے پاس حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا جبیر تم سورہ مائدہ پڑھتے ہو، انہوں نے عرض کیا ہاں پڑھتا ہوں، حضرت عائشہ نے فرمایا کہ یہ قرآن کی آخری سورت ہے جو احکام دیے ہیں وہ محکم ہیں ان میں نسخ کا احتمال نہیں ہے۔ ان کا خاص اہتمام کرو۔

(۵) سورۃ المائدۃ مدنیۃ (۱۱۲)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَوْفُوْا بِالْعُقُوْدِ ڛ اُحِلَّتْ لَكُمْ بَهِيْمَةُ الْاَنْعَامِ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ غَيْرَ مُحِلِّي الصَّيْدِ وَاَنْتُمْ حُرُمٌ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يَحْكُمُ مَا يُرِيْدُ ۝۱

اے مسلمانو! معاہدے پورے کرو[1]، تمہارے لیے مویشی جانور حلال کر دیے گئے[2] ہیں، ہاں مگر وہ جن کا ذکر آگے کیا جائے گا[3]۔ لیکن جب تم حالت احرام میں ہو تو تمہارے لیے شکار حلال نہیں ہے[4]۔ بلاشبہ اللہ جیسے چاہتا ہے حکم دیتا ہے[5]۔

معاشرتی زندگی اور تمدنی زندگی

سورہ نساء میں اسلامی معاشرت کو کھول کر بیان کیا تھا۔ اس سورت میں اسلامی تمدن کا ذکر ہو رہا ہے۔ دونوں باتوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے سورت کی ابتداء اوفوا بالعقود سے کی ہے کیونکہ اگر ایک طرف تمدن کی بنیاد معاہدات پر ہے تو دوسری طرف شریعت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے چند عقود ہی کو کہتے ہیں اور عیسائیت نے چونکہ نہ صرف شریعت کا استخفاف کر کے اسے بالکل غیر ضروری

قرار دیا حالانکہ اپنی آسمانی کتاب کا نام نیا عہد نامہ ہی رکھا ہے بلکہ اسے معاذاللہ ایک لعنت قرار دیا ہے۔ اسی لیے عیسائیت کے ذکر کی ابتداء اس حکم سے موزوں تھی۔ اور دونوں باتوں کو اکٹھا کرکے اس طرف توجہ دلائی ہے کہ جب نظام عالم مادی بغیر قوانین وعہود ایک دن بھی قائم نہیں رہ سکتا تو روحانی نظام بدون اتباع قوانین اور بدون ایفائے عہود الٰہی کیوں کر قائم رہ سکتا ہے۔ اور اس حکم سے ابتداء کرنے کے بعد کھانے پینے اور نکاح کے کچھ احکام بتائے کہ خواہشات حیوانی کی تعدیل کے لیے یہ احکام نہایت ضروری ہیں۔ اس رکوع میں تکمیل دین کا بھی اعلان ہے یہ گویا اشارہ ہے کہ دین کی تکمیل شریعت کی تکمیل کے بغیر ممکن نہیں ہے دوسرے رکوع میں پھر ضرورت شریعت کو بتاتے ہوئے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور صفات ملکوتی کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اوّل الذکر کے لیے نماز کا ذکر کیا اور اس کی ایک چھوٹی سی فرع طہارت جسمانی کی طرف توجہ دلائی ہے اور اگر ایک طرف اللہ تعالیٰ کے سچے تعلق کو بتایا تو دوسری طرف انسانوں کے تعلقات میں اعلیٰ درجہ کے اصول انصاف کی طرف توجہ دلائی ہے یہاں تک کہ نہ صرف غیر قوموں بلکہ دشمنوں سے بھی عدل وانصاف پر قائم رہنے کا حکم دیا۔ تیسرے رکوع میں یہودیوں اور عیسائیوں کی عہد شکنیوں چوتھے رکوع میں بنی اسرائیل کی نافرمانی کا، پانچویں رکوع میں ان اہل کتاب کے جو عہد شکنیوں کی وجہ سے راہ حق سے دُور ہو گئے تھے منصوبوں کا ذکر ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف وہ کرتے تھے اور جان و مال کی حفاظت کو واضح کیا ہے جس کے بغیر تمدن قائم نہیں رہ سکتا، چھٹے میں بتایا ہے کہ اہل کتاب کے باہمی مقدمات انہی کی شریعت کے مطابق فیصلے کرو، اور ساتویں میں دنیوی جھگڑوں کے فیصلے اور دینی جھگڑوں کے فیصلوں کی طرف متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ دینی اختلافات میں فیصلے قرآن حکیم ہی سے کرنا ہے۔ آٹھویں رکوع میں یہود و نصاریٰ سے تعلقات کا اور نویں میں ان کی حالت کا ذکر ہے۔ دسویں میں عیسائیت کے حق میں انحراف اور غلو کو واضح کیا ہے، گیارہویں میں بتایا کہ اس کے باوجود عیسائی مسلمانوں سے زیادہ قریب ہیں اور ان میں حق پذیری کی زیادہ صلاحیت موجود ہے۔ بارہویں رکوع میں عیسائیوں کی غلطی پر مسلمانوں کو متنبہ کیا جنہوں نے ایک طرف تو یہاں تک غلو کیا کہ عبادت کی خاطر اللہ تعالیٰ کی حلال کردہ چیزوں کو بھی حرام قرار دیا اور دوسری طرف دُنیا میں اس قدر منہمک ہوئے کہ حرام چیزوں جیسے شراب کو بھی شیرِ مادر بنا لیا۔ تیرہویں رکوع میں خانہ کعبہ کی حرمت کا ذکر کیا کیونکہ اگر ایک دفعہ پہلے عیسائیوں نے اس گھر کو ڈھانے کا ارادہ کیا تھا تو علم الٰہی میں وہ دوسرا وقت بھی آنے والا تھا جب اس پاک گھر کے باسے میں عیسائی اقوام کے بد ارادے ہوں گے۔ چودہویں میں بتایا کہ شریعت گو ضروری ہے مگر افراط و تفریط پسند نہیں ہے۔ اسی بنا پر چھوٹے چھوٹے غیر ضروری سوالات کرنے سے روک دیا۔

پندرہویں رکوع میں حواریوں کے مائدہ طلب کرنے کے ذکر میں عیسائیوں کے لذاتِ دنیوی میں انہماک کی طرف توجہ دلائی اور بتایا کہ ان کی توجہ روحانی امور سے ہٹ کر کھانے پینے اور خواہشاتِ نفس کی طرف رہ جائے گی اور آخری رکوع میں بتایا کہ حضرت مسیح کی الوہیت اور تثلیث کا مسئلہ خود حضرت مسیح کی تعلیم ہرگز نہیں ہے۔

۱۔ اے مسلمانو! اپنے معاہدے پورے کرو۔ ایمان شرعی دو چیزوں کا نام ہے، صحیح معرفت اور تسلیم و انقیاد۔ یعنی خدا اور رسول کے جملہ ارشادات کو صحیح مان کر تسلیم و قبول کے لیے اخلاص سے گردن جھکا دینا۔ اس تسلیمی پہلو کے لحاظ سے ایمان فی الواقع تمام قوانین و احکام الٰہیہ کے ماننے اور جملہ حقوق ادا کرنے کا ایک مضبوط عہد و اقرار ہے۔ گویا حق تعالیٰ کی ربوبیت کاملہ کا وہ اقرار جو عہد الست کے سلسلے میں لیا گیا تھا، جس کا نمایاں اثر انسان کی فطرت اور سرشت میں آج تک موجود ہے۔ اسی کی تجدید و تشریح ایمان شرعی سے ہوتی ہے۔ پھر ایمان شرعی میں جو کچھ اجمال عہد و پیمان تھا اسی کی تفصیل پورے قرآن و سنت میں دکھلائی گئی ہے۔ اس صورت میں دعویٰ ایمان کا مطلب یہ ہوا کہ بندہ تمام احکام الٰہیہ میں خواہ ان کا تعلق براہِ راست خدا سے ہو یا بندوں کی جسمانی تربیت سے یا روحانی اصلاح سے دنیوی مفاد سے ہو یا اخروی فلاح سے، شخصی زندگی سے ہو یا حیاتِ اجتماعی سے صلح سے ہو یا جنگ سے، اس کا عہد کرتا ہے کہ ہر منہج سے اپنے مالک کا وفادار بن کر رہے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو عہد و پیمان اسلام جہاد، سمع و طاعت یا دوسرے عمدہ خصال اور امور خیر کے متعلق صحابہ کرام سے بشکل بیعت لیتے تھے وہ اسی عہد ایمانی کی ایک محسوس صورت تھی، اور چونکہ ایمان کے ضمن میں بندے کو حق تعالیٰ کے جلال و جبروت کی صحیح معرفت اور اس کی شانِ انصاف و انتقام اور وعدوں کی سچائی کا پورا یقین ہوتا ہے۔ اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ بدعہدی اور غداری کے مہلک عواقب سے ڈر کر اپنے تمام عہدوں کو جو خدا سے یا بندوں سے یا خود اپنے نفس سے کیے ہوں۔ اس طرح پورا کرے کہ مالک حقیقی کی وفاداری میں فرق نہ آنے پائے۔ اس تقریر کے موافق عقود کی تفسیر میں جو مختلف تشریحات سلف سے منقول ہیں ان سب میں تطبیق ہو جاتی ہے اور آیت میں ایمان والو کے لفظ سے خطاب فرمانے کا مزید لطف حاصل ہوتا ہے۔ [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اہل ایمان کو اپنے عہد پورا کرنے کا حکم اس لیے دیا گیا ہے کہ ایمان دراصل ایک معاہدہ التزام ہے کہ میں دل و جان سے ان احکام کی تعمیل کروں گا۔ یہ عہد التزام ہی ایمان کی حقیقت ہے جس میں تمام احکام داخل ہیں اس طرح گویا ایمان تمام حقوق کی بجا آوری کا عہد و قرار ہے اس لیے حکم ہوا ہے کہ اے ایمان والو تم نے ایمان لا کر التزام احکام کا اجمالی طور پر جو عہد و پیمان کیا ہے اس کو پورا کرو۔ لہٰذا ایمان درحقیقت التزام طاعت کا ایک اجمالی معاہدہ ہے۔ جیسے آج کی زبان میں حلف وفاداری کہتے ہیں۔ یہ اجمالی معاہدہ ایک امر بسیط ہے اور تمام احکام شرعیہ اس معاہدے کی دفعات ہیں مطلب یہ ہے کہ ایمان دراصل التزام طاعت خداوندی کے معاہدہ کا نام ہے اور یہ ایک امر بسیط ہے۔ اس میں فی حد ذاتہ تجزی اور تبعض نہیں جیسے عقد نکاح کہ حقوق زوجیت کے التزام کا ایک اجمالی معاہدہ ہے اور ایک امر بسیط ہے جس میں کمی بیشی نہیں ہو سکتی صرف ایجاب و قبول سے پورا ہو جاتا ہے لیکن نان و نفقہ اور رہائش وغیرہ یہ تمام امور عقد نکاح کے اجزاء ترکیبی نہیں بلکہ اس کے لوازم ہیں۔ اسی طرح اعمال صالحہ عقد ایمان کے لوازم ہیں جن کی بجا آوری لازم ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ :

> جب آدمی مسلمان ہوا تو سب حکم اللہ کے قبول کرنے ٹھہرا چکا، اب فرماتے ہیں کہ ان کو قبول کرو۔

مطلب یہ ہے حسب عہد ان احکام کی بجا آوری کرو جن کے التزام کا تم نے عہد کیا ہے، خلاف عہد کوئی کام نہ کرو بے وفائی بہت بُری چیز ہے۔

عقود کا مفہوم عموم

عقد کا لفظ عہد و میثاق کے مقابلہ میں عام ہے۔ اس میں قول و قرار اور کسی معاملے میں گواہی کی ذمہ داری سمیت کہ اس عہد و میثاق تک جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ یعنی ہر عہد شرعی کو شامل خواہ اس کا تعلق خالق سے ہو خواہ مخلوق سے جیسا کہ حضرت عبداللہ ابن عباس کی رائے ہے۔ ابو حیان اندلسی نے بھی عام عقود مراد لیے ہیں۔ امام حسن فرماتے ہیں کہ ہر قسم کا عہد عقود میں مراد ہے خواہ کاروباری، لین دین، کرایہ نکاح طلاق ، مزارعت، مصالحت، تملیک، تخییر اور عتق وغیرہ۔ مطلب یہ ہے کہ عبادات کے علاوہ بھی جتنے عہد سیاسیات، تجارت، معاشرت وغیرہ معاملات و اخلاقیات سے متعلق ہو سکتے ہیں سب اس میں آگئے۔ ابوبکر الجصاص فرماتے

ہیں کہ عقد کیا جاتے یا عہد اس کا اطلاق ایسے معاملہ پر ہوتا ہے جس میں دو فریق نے آئندہ زمانے میں کوئی کام کرنے یا چھوڑنے کی پابندی ایک دوسرے پر ڈالی ہو اور دونوں متفق ہو کر اس کے پابند ہو گئے ہوں۔ امام راغب اصفہانی نے یہ بات بڑی لطیف لکھی ہے کہ معاہدات کی جتنی قسمیں ہیں سب اس کے حکم میں داخل ہیں اور پھر لکھا ہے کہ عقد کی ابتدائی تین قسمیں ہیں۔ ایک معاہدہ وہ ہے جو انسانوں کا اپنے رب سے ہے مثلاً ایمان، طاعت کا عہد یا حلال و حرام کی پابندی کا عہد، دوسرے وہ معاہدہ جو ایک کا خود اپنے نفس کے ساتھ ہے جیسے کسی چیز کی نذر یا حلف۔ تیسرے وہ جو ایک انسان کا دوسرے انسان کے ساتھ۔ اس میں وہ تمام معاہدات داخل ہیں جو دو شخصوں یا دو جماعتوں یا دو حکومتوں کے درمیان ہوتے ہیں۔ حکومتوں کے باہمی معاہدات یا بین الاقوامی معاملات، جماعتوں کے عہد و میثاق اور دو انسانوں کے درمیان ہر طرح کے معاملات اس میں داخل ہیں اور اس آیت کی رُو سے ان کا ایفا واجب ہے چنانچہ اس سورت میں میثاق شریعت کی پوری تاریخ بھی اس کے تمام نتائج و عواقب کے ساتھ بیان ہوتی ہے۔ قسم اور شہادت کی ذمہ داریاں بھی واضح کی گئی ہیں۔

چارپایوں کی حلت

۲۔ تمہارے لیے مویشی جانور حلال کر دیے گئے ہیں۔ سورۃ نساء میں گزر چکا ہے کہ یہود کو ظلم و بدعہدی کی پاداش حلال و طیب چیزوں سے محروم کر دیا گیا۔ فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات (نساء رکوع ۲۲) جن کی تفصیل سورۃ انعام میں ہے۔ اس اُمت مرحومہ کو ایفائے عہد کی ہدایت کے ساتھ ان چیزوں سے بھی منتفع ہونے کی اجازت دے دی گئی۔ یعنی اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری اور اسی جنس کے تمام اہلی اور وحشی (پالتو اور جنگلی) چوپائے مثلاً ہرن، نیل گائے وغیرہ تمہارے لیے ہر حال میں حلال کیے گئے بجز ان حیوانات یا حالات کے جن کے متعلق حق تعالیٰ نے قرآن کریم میں یا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبانی تمہارے جسمانی یا روحانی یا اخلاقی مصلحت کے لیے ممانعت فرما دی ہے[1]

اصل ارشاد میں بھیمۃ الانعام ہے۔ اس میں اضافت تشبیہ کے لیے ہے یعنی مویشیوں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سے ملتے چلتے ہوتے چوپائے جو نہ درندے ہوں نہ شکاری مراد ہیں۔ ہرن، نیل گائے وغیرہ ایسے چوپائے جو شکاری اور درندے نہ ہونے میں مویشیوں سے مشابہ ہوں۔ اضافت سے یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ اونٹ، گائے، بکری اور اس قبیل کے سارے ہی چوپائے خواہ گھریلو ہوں یا وحشی تمہارے لیے جائز ٹھہرا دیے گئے۔ احلت لکم حلال کر دیے گئے سے مراد یہ ہے کہ جو پابندیاں تم نے اپنے اوہام سے عائد کی ہیں وہ بھی ختم اور جو پچھلے صحیفوں کی روایات کی بنا پر تھیں وہ بھی کالعدم۔ دراصل انعام (مویشی) کا لفظ عربی زبان میں اونٹ، گائے، بھیڑ، بکری پر بولا جاتا ہے اور بہیمہ کا اطلاق ہر چرنے والے چوپائے پر ہوتا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے یہ فرمایا ہوتا کہ انعام تمہارے لیے حلال کیے گئے تو اس سے صرف وہی جانور حلال ہوتے جنہیں عربی میں انعام کہتے ہیں لیکن حکم ان الفاظ میں دیا گیا ہے کہ مویشی کی قسم کے چرندے چوپائے تم پر حلال کیے گئے۔ اس سے حکم وسیع ہو جاتا ہے اور وہ سب چرندے جانور اس دائرے میں آ جاتے ہیں جو مویشی کی نوعیت کے ہوں یعنی جو کچلیاں نہ رکھتے ہوں، حیوانی غذا کے بجائے نباتی غذا کھاتے ہوں، اور دوسری حیوانی خصوصیات میں انعام عرب سے مماثلت رکھتے ہوں۔ نیز اس سے اشارہ یہ بھی مترشح ہوتا ہے کہ وہ چوپائے جو مویشیوں کے برعکس کچلیاں رکھتے ہوں اور دوسرے جانوروں کو مار کر کھاتے ہوں، حلال نہیں ہیں۔ اسی اشارے کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح کر کے حدیث میں صاف حکم دے دیا کہ درندے حرام ہیں۔ اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان پرندوں کو بھی حرام قرار دیا جن کے پنجے ہوتے ہیں جو دوسرے جانوروں کو شکار کر کے کھاتے ہیں یا مردار خوار ہوتے ہیں۔ ابن عباس کی روایت ہے کہ

نھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم عن کل ذی مخلب من الطیر۔

حضور نے پنجوں والے پرندوں سے منع فرمایا ہے۔

دوسرے متعدد صحابہ سے بھی اس کی تائید میں روایات منقول ہیں۔[1]

تحلیل سے ایک استثناء

۳۔ ہاں مگر وہ جن کا ذکر آگے کیا جائے گا۔ غالباً اس سے مراد وہ چیزیں ہیں جو اسی رکوع کی تیسری آیت میں بیان کی گئی ہیں یعنی حرمت علیکم المیتۃ سے ذالکم فسق تک[2]

[1] تفہیم القرآن افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ بجز ان جانوروں کے جن کی حرمت قرآن میں آگے بیان ہو رہی ہے۔ اصل یہ ہے کہ اشیاء میں عام قانون تحلیل ہے جیسا کہ پڑھ چکے ہو هو الذی خلق لکم ما فی الارض میں قرآن نے اشیاء کی حلت کا اعلان کیا ہے حرام صرف وہ چیزیں ہیں جن کی حرمت کا قرآن و سنت میں ذکر ہے۔ یہاں صرف اشارہ کیا ہے۔ تفصیل آگے آ رہی ہے۔ تفصیل سے موقع پر قرآن نے گیارہ چیزوں کا ذکر کیا ہے اوّل مردار جانور، دوسرے خون، تیسرے سور کا گوشت، چوتھے وہ جانور جو بقصد تقرب غیر اللہ کے لیے نامزد کر دیا گیا ہو، پانچویں وہ جانور جو گلا گھٹ کر مر جاتے، چھٹے وہ جانور جو چوٹ کھا کر مر جاتے، ساتویں وہ جو اوپر سے نیچے گر کر مرا ہو، آٹھویں وہ جانور جو دوسرے جانور کے سینگ مارنے سے مرا ہو۔ نویں وہ جانور جس کو درندے نے پھاڑ کھایا، دسویں وہ جانور جو کسی استھان پر ذبح کیا جائے۔

اس آیت میں لطیف بلیغ نکتہ یہ ہے کہ ایفاء عہد کے حکم کے بعد تحلیل عام بیان کی اور پھر تحلیل عام کے بعد استثناء کر کے اپنے علم و قدرت اور رمز مصلحت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

حالتِ احرام میں شکار حرام ہے

۴۔ لیکن جب تم حالت احرام میں ہو تو تمہارے لیے شکار حلال نہیں ہے۔ محرم کو صرف خشکی کے جانور کا شکار جائز نہیں دریائی شکار کی اجازت ہے۔ اور جب حالت احرام کی رعایت اس قدر ہے کہ اس میں شکار کرنا ممنوع ہے تو خود حرم شریف کی حرمت کا لحاظ اس سے کہیں زیادہ ہونا چاہیے یعنی حرم کے جانور کا شکار محرم یا غیر محرم سب کے لیے حرام ہوگا جیسا کہ لا تحلوا شعائر اللہ کے عموم سے مترشح ہوتا ہے[1] مطلب یہ ہے کہ حالت احرام میں حلال جانوروں کا شکار بھی ناجائز ہے۔ شکار سے یہاں صرف ان جانوروں کا شکار مراد ہے جن کا کھانا جائز ہے جیسا کہ امام راغب نے تصریح کی ہے۔ باقی سانپ بچھو وغیرہ موذی جانوروں کا اس ممانعت سے کوئی تعلق نہیں ہے اور ان کے مارنے پر شکار کا اطلاق ہوتا ہے۔ لفظ صید سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ان جانوروں کا شکار مراد ہے جو وحشی ہوتے ہیں اور جن کے پکڑنے میں کسی تدبیر و حیلہ کی ضرورت پڑتی ہے۔ عام گھریلو جانور بھیڑ بکری گائے اونٹ وغیرہ جو عادتاً شکار کر کے نہیں لائے جاتے اور روزانہ محض ذبح کر کے کھائے جاتے ہیں ان کو ذبح کرنے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی کوئی ممانعت نہیں۔ و انتم حرام سے صرف حالت احرام ہی میں شکار کی حرمت ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی معلوم ہوا کہ حرم کے علاقہ میں بھی شکار حرام ہے خواہ شکار کرنے والا احرام میں د ہو۔ ممانعت کا اصل مدار شکار کا حدود حرم میں ہونا ہے۔

یہ گویا ان حرمتوں میں سب سے پہلی حرمت کا ذکر ہے۔ یعنی تمہارے لیے انعام کے قسم کے تمام چوپائے خواہ پالتو ہوں یا وحشی جائز ہیں ایں پابندی کہ حالت احرام میں شکار کو جائز کرنے والے نہ بن جانا۔ اس کے سب سے پہلے ذکر کرنے سے اس کی اہمیت ظاہر ہوتی ہے۔

یہاں یہ بات ضرور سمجھ لینی چاہیے کہ احرام اس فقیرانہ لباس کو کہتے ہیں جو زیارت کعبہ کے لیے پہنا جاتا ہے۔ کعبہ کے گرد کئی کئی منزل کے فاصلے پر ایک حد مقرر کر دی گئی ہے جس سے آگے بڑھنے کی کسی زائر کو اجازت نہیں جب تک وہ اپنا معمولی لباس اتار کر احرام کا لباس نہ پہن لے۔ اس لباس میں صرف ایک تہمد اور ایک چادر ہوتی ہے جو اوپر سے اوڑھی جاتی ہے اسے احرام اس لیے کہتے ہیں کہ اسے پہن لینے کے بعد آدمی پر بہت سی وہ چیزیں حرام ہو جاتی ہیں جو عام حالات میں جائز ہیں مثلاً حجامت، خوشبو کا استعمال۔ ہر قسم کی زینت و آرائش اور قضائے شہوت وغیرہ ان ہی پابندیوں میں سے ایک یہ بھی کہ کسی جاندار کو ہلاک نہ کیا جائے نہ شکار کیا جائے اور نہ کسی کو شکار کا پتہ بتایا جائے[1]

دراصل اس سورت میں جو احکام بیان ہوتے وہ تکمیلی اور اتمامی نوعیت کے ہیں۔ اپنے اسی پہلو کے پیش نظر وہ اس سورت میں بیان ہوتے ہیں۔ ان پر عہد لینے کے معنے یہ ہیں کہ پوری شریعت کی پابندی اور اس سے وفاداری کا عہد لیا گیا۔ کھانے پینے کے باب میں یہاں جو حرمتیں اور حلتیں بیان ہوئی ہیں وہ بالکل آخری نوعیت کی ہیں۔ اس سے پہلے اس موضوع کے بہت سے احکام سورہ بقرہ میں گزر چکے ہیں اور بقرہ سے زیادہ تفصیل کے ساتھ سورۂ انعام میں بیان ہوتے ہیں جو ایک مکی سورت ہے صرف کچھ جزئیات باقی رہ گئی تھیں جو یہاں بیان کی گئی ہیں اور ان کے بعد یہ باب بالکل مکمل ہو گیا۔

اللہ حاکم مطلق ہے

۵ ـ بلاشبہ اللہ جیسے چاہتا ہے حکم دیتا ہے جس خدا نے تمام مخلوقات کو پیدا کیا پھر

---

[1] تفہیم القرآن۔

کمال حکمت سے ان میں باہم فرق مراتب رکھا۔ ہر نوع میں اس کی استعداد کے موافق جدا جدا فطری خواص و قوی ودیعت کیے زندگی اور موت کی مختلف صورتیں تجویز کیں۔ بلاشبہ اسی خدا کو اپنی مخلوقات میں یہ حق حاصل ہے کہ اپنے اختیار کامل علم محیط اور حکمت بالغہ کے اقتضا سے جس چیز کو جس کسی کے لیے جن حالات میں حلال یا حرام کر دے لا یسئل عما یفعل وھم یسئلون [1] یعنی ارادہ الٰہی سے بالاتر کوئی ارادہ نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے۔ کسی کو حق نہیں۔ اس کے ماننے میں چون وچرا کرنے کا کوئی حق نہیں ہے اگرچہ اس کے تمام احکام حکمت و مصلحت پر مبنی ہیں لیکن بندہ مسلم اس کے حکم کی اطاعت اس حیثیت سے نہیں کرتا کہ وہ اسے مناسب پاتا ہے یا مبنی بر مصلحت سمجھتا ہے بلکہ صرف اس بنا پر کرتا ہے کہ یہ مالک کا حکم ہے۔ جو چیز اس نے حرام کر دی وہ صرف اس لیے حرام ہے کہ اس نے حرام کی ہے اور اسی طرح جو اس نے حلال کر دی ہے وہ بھی کسی دوسری بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اس بنیاد پر حلال ہے کہ جو خدا ان ساری چیزوں کا مالک ہے وہ اپنے غلاموں کو اس چیز کے استعمال کی اجازت دیتا ہے۔ لہٰذا قرآن پورے زور کے ساتھ یہ اصول قائم کرتا ہے کہ اشیاء کی حلت و حرمت کے لیے مالک کی اجازت و عدم اجازت کے سوا کسی اور بنیاد کی ضرورت نہیں اور اسی طرح بندے کے لیے کسی کام کے جائز ہونے یا نہ ہونے کا مدار بھی اس کے سوا کچھ نہیں کہ خدا جس چیز کو جائز رکھے وہ جائز ہے اور ناجائز قرار دے وہ ناجائز ہے۔[2]

اس میں شاید اس حکمت کی طرف اشارہ بھی ہے کہ انسان کے لیے بعض جانوروں کو کھانے کی اجازت دینا کوئی ظلم نہیں۔ جس مالک نے سب جانیں بنائی ہیں اسی نے پوری بصیرت و حکمت کے ساتھ یہ قانون بھی بنایا ہے کہ ادنیٰ کو اعلیٰ کے لیے غذا بنایا ہے زمین کی مٹی درختوں کی غذا ہے اور درخت جانوروں کی غذا اور جانور انسانوں کی غذا۔ انسان سے اعلیٰ کوئی مخلوق نہیں ہے اس لیے انسان کسی کی غذا نہیں بن سکتا۔[3] آئیے اس فقرے پر ابتلاء امتحان کے زاویہ سے نگاہ ڈالیے تو آپ محسوس کریں گے حالت احرام میں شکار کی ممانعت کا معاملہ بالکل اس حکم سے مشابہ ہے جو یہود کو سبت کے دن سے متعلق دیا گیا تھا۔ ان کو سبت کے دن شکار کی ممانعت تھی لیکن وہ اس عہد کو نباہ نہ سکے۔ مطلب یہ ہے کہ ان اللہ یحکم ما یرید کا اضافہ فرما کر اس حکم کے امتحانی پہلو کی طرف اشارہ کر دیا کہ یہ حکم تمہاری وفاداری کی جانچ کے لیے ہے۔ اس میں چون وچرا نہ کرنا اور

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن [3] معارف القرآن دمشقی

اس سے گریز کی راہیں نہ تلاش کرنا، خدا جو چاہتا ہے حکم دیتا ہے اور اس کے احکام کی بے چون وچرا اطاعت ہی میں بندوں کے لیے خیر و برکت ہے۔

یہ بات پیش نظر رہے کہ جو احکام محض تعبدی ہوتے ہیں ان میں بندوں کی مصلحت کا پہلو مخفی ہوتا ہے اس لیے جب تک یہ عقیدہ دل میں مضبوط نہ ہو کہ خدا کو حکم دینے کا اختیار مطلق حاصل ہے اور اس کا ہر حکم بندوں ہی کی مصلحت کے لیے ہوتا ہے اس وقت تک پھی وفاداری کے ساتھ ان کی تعمیل نہیں ہو سکتی۔[1]

حضرت مولانا اشرف علیؒ نے یہاں یہ نکتہ آفرینی خوب فرمائی ہے کہ آیت میں اسرار احکام کی تفتیش کی ممانعت کی طرف اشارہ ہے۔[2]

---

[1] تدبر قرآن [2] تفسیر ماجدی۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحِلُّوْا شَعَآئِرَ اللّٰهِ وَلَا الشَّهْرَ الْحَرَامَ
وَلَا الْهَدْيَ وَلَا الْقَلَآئِدَ   وَلَآ آٰمِّيْنَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ
يَبْتَغُوْنَ فَضْلًا مِّنْ رَّبِّهِمْ وَ   رِضْوَانًا ؕ وَاِذَا حَلَلْتُمْ
فَاصْطَادُوْا ؕ وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَاٰنُ   قَوْمٍ اَنْ صَدُّوْكُمْ عَنِ
الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اَنْ تَعْتَدُوْا ۘ وَتَعَاوَنُوْا   عَلَى الْبِرِّ وَالتَّقْوٰى ۪ و
وَلَا تَعَاوَنُوْا عَلَى الْاِثْمِ وَالْعُدْوَانِ ۪   وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ
اِنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ۝ ا

اے اہل ایمان اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو، اور نہ ان مہینوں کی بے حرمتی کرو جو حرمت کے مہینے ہیں۔ نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو اور نہ ان جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردن میں نذر خدا کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوتے ہیں۔ اور نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے

فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش میں مکان محترم کی طرف جا رہے ہوں[9]۔ ہاں جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو تم کو شکار کی اجازت ہے[10]۔ اور یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ اس گروہ کی دشمنی جس نے تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ روکا تھا اس بات پر نہ ابھارے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو[11]۔ تمہارا دستور یہ ہونا ہونا چاہیے کہ نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں ایک دوسرے کی مدد کرو، گناہ اور ظلم کی بات میں کسی سے تعاون نہ کرو[12]۔ اللہ سے ڈرو، اللہ سنگین سزا دینے والا ہے[13]۔

اسلامی شعائر

جیسے مشاعر ان امکنہ کو کہا جاتا ہے جہاں اللہ کو یاد کیا جاتا ہے، حج کے مشاعر اپنے گوناگوں تاثرات کی بنا پر دوسرے فوائد و برکات کے علاوہ صدق توبہ اور ذکر الٰہی کی نورانیت کے لیے بہتر سے بہتر موقع پیدا کرتے ہیں۔ مشاعر کا جو تقدس اور عظمت ایک مسلمان کے قلب میں ہے، اس کا نفسیاتی اثر بہت گہرا ہوتا ہے۔ وہ مقامات جہاں انبیاء علیہم السلام پر برکتوں اور رحمتوں کا نزول اور انوار الٰہی کی بارش ہوئی وہ ماحول اور فضا قدم قدم پر نبوی مناظر اور ربانی مشاہد جہاں حضرت ابراہیم کو مناسک حج کی معرفت حاصل ہوئی مشاعر کہلاتے ہیں، ایسے ہی شعائر شعیرہ کی جمع ہے، اس سے دین کی

تمام نشانیاں مراد ہیں۔ شارحین قرآن نے اس سے مراد وہ تمام امور لیے ہیں جو حدود و فرائض اوامر اور نواہی کی صورت میں اللہ کی جانب سے ہیں۔ اسی لیے امام حسن کا کہنا ہے کہ شعائر اللہ سے مراد اللہ کا دین ہے مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو کسی مسلک یا عقیدے یا طرز فکر و عمل یا کسی نظام کی نمائندگی کرتی ہو وہ اس کا شعیرہ اور شعار کہلائے گی کیونکہ وہ اس کے لیے علامت اور نشانی کا کام دیتی ہے۔ سرکاری جھنڈے فوج اور پولیس وغیرہ کی یونیفارم، سکے، نوٹ اور اسٹامپ حکومتوں کے شعائر ہیں اور وہ اپنے محکوموں سے بلکہ جن جن پر ان کا زور چلے سب سے ان کے احترام کا مطالبہ کرتی ہیں۔ گرجا اور قربان گاہ اور صلیب مسیحیت کے شعائر ہیں۔ چوٹی، زنار اور مندر برہمنیت کے شعائر ہیں، کیس، کڑا، کرپان وغیرہ سکھ مذہب کے شعائر ہیں۔ ہتھوڑا اور درانتی اشتراکیت کا شعار ہے۔ یہ سب مسلک اپنے اپنے پیروؤں سے اپنے ان شعائر کے احترام کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اگر کوئی شخص کسی نظام کے شعائر میں سے کسی شعار کی توہین کرتا ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ وہ اس نظام کے خلاف دشمنی رکھتا ہے اور اگر وہ توہین کرنے والا خود اس نظام سے تعلق رکھتا ہو تو اس کا یہ فعل اپنے نظام سے بغاوت کا ہم معنے ہے۔

۲ ـ اے اہل ایمان اللہ کی نشانیوں کی بے حرمتی نہ کرو۔ یعنی جو چیزیں حق تعالیٰ کی عظمت و معبودیت کے لیے علامات و نشانات خاص قرار دی گئی ہیں ان کی بے حرمتی نہ کرو۔ ان میں حرم محترم، بیت اللہ شریف، جمرات صفا و مروہ، ہدی احرام، مساجد، کتب سماویہ وغیرہ تمام حدود و فرائض اور احکام دینیہ شامل ہیں آگے ان شعائر میں سے بعض مخصوص چیزوں کا جو مناسک سے متعلق ہیں ذکر فرماتے ہیں جیسا کہ اس سے پہلے آیت میں بھی محرم کے بعض احکام ذکر کیے گئے تھے[لـه]

اصل ارشاد میں شعائر اللہ آیا ہے اللہ کی نشانیاں یعنی وہ چیزیں جن کو اللہ تعالیٰ نے بندوں کے لیے نشان بندگی قرار دیا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں۔ شعائر شعیرہ کی جمع ہے اور ابن فارس نے اس کا واحد شعار بتایا ہے۔ ہر وہ شے جو کسی کے لیے نشان مقرر ہو یا جو کسی علامت کو بتائے اسے شعیرہ کہتے ہیں اور امام ابوبکر الجصاص رقمطراز ہیں کہ اہل لغت کا بیان ہے کہ شعائر شعیرہ کی جمع ہے۔ شعیرہ نشانی ہے جو اس چیز کو بتاتی ہے جس کے لیے وہ مقرر کی گئی ہے اشعار بدن کے معنے یہ ہیں کہ جانور پر ایسی نشانی لگا دی جائے جس سے معلوم ہو جائے کہ یہ قربانی کا جانور ہے

لـه افادات شیخ الاسلام

یہاں شعائر سے اللہ کے دین کے تمام نشانات مراد ہیں یعنی دین کے وہ فرائض جن کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ہمیں بتایا ہے کہ ان کے حدود سے تجاوز نہ کریں اور ان کے حقوق میں کوتاہی نہ کریں اور ان کو ضائع نہ ہونے دیں۔ یہ معنے ان تمام معانی کو جامع ہیں جو سلف سے اس کی تشریح میں منقول ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں تعظیم شعائر ایک مستقل عنوان قائم کر کے شعائر اللہ کی تشریح کی ہے فرماتے ہیں کہ شعائر اللہ وہ محسوس اور مرئی امور ہیں جن کے ذریعے اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اور اللہ کے ساتھ مخصوص ہیں ان کی تعظیم اللہ کی تعظیم ہے۔ اور ان کی بے حرمتی و بے ادبی جناب الٰہی میں بے ادبی ہے۔ اسلام میں بزرگ تر شعائر چار ہیں۔ قرآن، خانہ کعبہ، ذات پیغمبر اور نماز اس کے بعد ہر ایک کے بارے میں ضمیرہ ہونے کی حیثیت بتائی ہے۔ شاہ عبدالعزیز نے شعائر کے معنے میں ذرا وسعت کر دی ہے۔ فرماتے ہیں کہ دین کے عرف میں شعائر، مکانات اوقات اور علامات عبادت کو کہتے ہیں۔ کعبہ، عرفات، مزدلفہ، رمی جمار صفا، مروہ، منیٰ اور مساجد، رمضان، حرمت کے مہینے، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ، جمعہ، ایام تشریق، اذان، تکبیر، ختنہ، نماز باجماعت، نماز جمعہ و عیدین سب اللہ کے شعائر ہیں۔

بعض بزرگوں نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ احکام شرعیہ کی دو قسمیں ہیں۔ کچھ احکام وہ ہیں جو امت کے لیے بطور تعبد مقرر کیے گئے ہیں مثلاً نماز بطریق مخصوص، اور نماز میں خانہ کعبہ کی طرف رُخ کرنا، مناسک حج وغیرہ، یہ ایسے احکام ہیں جن کی شرعیت کی مصلحت ہمارے ادراک سے بالا ہے۔ ان میں کمی بیشی کے ہم مجاز نہیں ہیں۔ ان میں کسی کی رائے حجت نہیں ہے ان میں کمی و بیشی کے ذریعے دین میں بدعت کو گھس آنے کا موقع ملتا ہے۔ ان کو شعائر کہتے ہیں۔ یہ گویا ایک مسلمان کی اسلامی زندگی کی محسوس نشانیاں ہیں۔

کچھ احکام وہ ہیں جن کی شرعیت انسانی مصالح کی خاطر ہوتی ہے ان کے اسباب و علل تک ہماری رسائی ممکن ہے مثلاً احکام معاملات، سیاست، معاشرت، عدالت ان کو شعائر نہیں کہتے، ان دونوں قسم کے مجموعہ احکام کا نام اسلام ہے۔

دراصل شعائر انسان کے اندر بندگی کا احساس ابھارنے اور اسے مکمل کرنے میں بڑا حصہ لیتا ہے اور یہ مومن کو ایک ذہن عطا کرتے ہیں جو اسلام کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہوتا ہے، ایک ایسا دل عطا کرتے ہیں جو دین کے حکموں پر برابر کان لگائے رکھتا ہے۔ ایک ایسی رُوح عطا کرتے ہیں جو رضائے الٰہی کی طلب سے سرشار ہوتی ہے اور اس طرح وہ اللہ کی

طاعت گزاری کے لیے ایسا مستعد ہو جاتا ہے کہ اس کی جناب سے جو حکم بھی ملے اس کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑے ۔ اس کے دل کی زمین جنت کراور کھادیانی پاکر اس طرح شعائر کے ذریعے تیار ہو جاتی ہے کہ دینی ہدایات کا جو تخم بھی اس میں ڈالا جائے اُسے فوراً قبول کرلے ۔ اور نشوونما لینے کے لیے اپنا عمل شروع کرے ۔ یہی وجہ ہے کہ ان کو شعائر کہا گیا ہے یعنی دین کے باقی اجزائے لیے نشانِ راہ قرار دیا گیا ہے ۔ یقیناً یہ ایک بہترین تعبیر تھی جو قرآن نے اختیار کی ہے ۔

حرمت والے مہینوں کی بے حرمتی

۷ - اور نہ ان مہینوں کی بے حرمتی کرو جو حرمت کے مہینے ہیں ۔ ارب ولے مہینے چار ہیں منہا اربعۃ حرم سورۃ توبہ رکوع ۵ ۔ یعنی ذوالقعدہ ، ذوالحجہ ، محرم ، رجب ۔ ان کی تعظیم اور احترام یہ ہے کہ دوسرے مہینوں سے بڑھ کر ان میں نیکی و تقویٰ کو اختیار کرو اور شر و فساد سے بچنے کا اہتمام کرو بالخصوص حجاج کو ستاکر اور دق کرکے حج بیت اللہ سے نہ روکا جائے ۔ اگرچہ یہ تمام سال کے بارہ مہینوں میں واجب العمل ہیں ۔ لیکن ان محترم مہینوں میں بالخصوص بہت زیادہ موکد قرار دیے گئے ۔ باقی دشمنانِ دین کے مقابلہ میں ہجومی پیش قدمی تو جمہور کا مذہب یہ ہی ہے بلکہ ابن جریر نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ اس کی ان مہینوں میں ممانعت نہیں ہے اس کا بیان انشاء اللہ سورۃ توبہ میں آئے گا۔ عام شارحین قرآن کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے کیونکہ اس میں مشرکین سے حرمت والے مہینوں میں جنگ کی ممانعت ہے اور البقرہ کی آیت فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم کو ناسخ بتاتے ہیں مگر محققین کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ نہیں ہے کیونکہ اول آیت میں مشرکین کی بابت کوئی حکم نہیں ہے بلکہ مسلمانوں کو ہدی اور ان کے مراسم حج میں خلل اندازی سے ممانعت ہے ۔ وہ بدستور اب بھی باقی ہے لیکن یہ سوچ درست نہیں ہے کیونکہ آیت میں یہ فقرہ ولا یجرمنکم شنان قوم اس توجیہ کا ساتھ نہیں دیتا ہے اصل بات یہ ہے کہ شعائر اللہ کے عام احترام کا حکم دینے کے بعد اب یہاں چند خاص شعائر کا نام لے کر ان کے احترام کا خاص طور پر حکم دیا گیا ہے کیونکہ اس وقت جنگی حالات کی وجہ سے یہ اندیشہ پیدا ہو گیا تھا کہ جنگ کے جوش میں کہیں مسلمانوں کے ہاتھوں ان کی توہین نہ ہو جائے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان چند شعائر کو نام بنام بیان کرنے سے یہ مقصود نہیں ہے کہ صرف یہی احترام کے مستحق ہیں۔ اور پھر ان کے احترام کا یہ حکم اس زمانے میں دیا گیا تھا جب کہ مسلمانوں اور مشرکین عرب کے درمیان جنگ برپا تھی، مکہ پر مشرکین قابض تھے۔ عرب کے ہر حصے سے مشرک قبائل کے لوگ حج و زیارت کے لیے کعبہ کی طرف جاتے تھے اور بہت سے قبیلوں کے راستے مسلمانوں کی زد میں تھے۔ اس وقت یہ حکم دیا گیا کہ یہ لوگ مشرک سہی۔ تمہارے اور ان کے درمیان جنگ سہی مگر جب یہ خدا کے گھر کی طرف جارہے ہیں تو حج کے مہینوں میں ان پر حملہ نہ کرو۔ یہ مہینے قابلِ احترام ہیں تمہیں ان کا احترام کرنا چاہیے۔

کعبہ کی نیاز اور قربانی

۸ ۔ نہ قربانی کے جانوروں پر دست درازی کرو اور نہ ان جانوروں پر ہاتھ ڈالو جن کی گردنوں میں نذرِ خدا کی علامت کے طور پر پٹے پڑے ہوتے ہوں۔ ہدی قربانی کے جانوروں کو کہتے ہیں جو بطور نذرِ خدا کے حضور پیش کرنے کے لیے بیت اللہ لے جاتے جاتے ہیں۔ قلائد قلادہ کی جمع ہے جس سے مراد وہ ہار یا پٹہ ہے جو ہدی کے جانور کے گلے میں نشان کے طور پر ڈالتے تھے تاکہ قربانی کا جانور سمجھ کر اس سے تعرض نہ کریں اور دیکھنے والوں کو اسی جیسا عمل کرنے کی ترغیب بھی ہو۔ قرآن عظیم نے ان چیزوں کی تعظیم و حرمت کو باقی رکھا اور ہدی یا اس کی علامات سے تعرض کرنے کو ممنوع قرار دیا[1] ہدی کے بعد قلائد کا ذکر عام کے بعد خاص کے ذکر کی نوعیت رکھتا ہے۔ اور مقصود اس سے تعرض کی سنگینی کو واضح کرنا ہے کہ جن جانوروں کے گلے میں خدا کی تخصیص کے پٹے بندھ گئے ہوں ان پر حملہ خاص خدا کے گلے پر حملہ کرنا ہے۔ ان جانوروں کی بے حرمتی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ ان کو حرم تک پہنچنے سے روکا جائے یا چھین لیا جائے، دوسری صورت یہ ہے کہ ان سے قربانی کے علاوہ کوئی دوسرا کام سواری یا دودھ حاصل کرنے کا لیا جائے اس آیت نے ان سب صورتوں کو ناجائز قرار دیا ہے۔

طالب رضائے حق قابلِ احترام ہے

۹ ۔ اور نہ ان لوگوں کو چھیڑو جو اپنے رب کے فضل اور اس کی خوشنودی کی تلاش

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں مکان محترم کی طرف جا رہے ہوں۔ بظاہر یہ شان صرف مسلمانوں کی ہے یعنی جو مخلص مسلمان حج و عمرہ کے لیے جائیں ان کی تعظیم و احترام کرو اور ان کی راہ میں روڑے مت اٹکاؤ۔ اور جو مشرکین حج بیت اللہ کے لیے آتے تھے۔ اگر وہ بھی اس آیت کے عموم میں داخل ہوں۔ کیونکہ وہ بھی اپنے زعم اور عقیدے کے موافق خدا کے فضل و قرب اور خوشنودی کے طالب ہوتے تھے تو کہنا پڑے گا کہ یہ حکم اس وقت سے پہلے کا ہے جب کہ انما المشرکون نجس فلا تقربوا المسجد الحرام بعد عامھم ھذا۔ کی منادی کرادی گئی۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ خانہ کعبہ کا ادب یہ ہے کہ جو اس کی زیارت کو جا رہا ہے اس سے کوئی تعرض نہ کرو، اس لیے کہ جب خانہ کعبہ کے ادب اور احترام میں قربانی کے جانور سے تعرض جائز نہیں تو انسان سے تعرض کرنا کیسے روا ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین جس کام میں اللہ کی تعظیم کریں اس کام میں کافروں کی مزاحمت نہ کرو۔ البتہ بت وغیرہ کی تعظیم میں ان کی مزاحمت اور اہانت کرو۔ مشرکین عرب اپنے آپ کو ملتِ ابراہیم کا پیرو کہتے تھے۔ اسی بنا پر وہ حج اور عمرہ کی نیت سے سفر کرتے اور اپنے گمان میں وہ اللہ کی خوشنودی کا قصد کرتے۔ ان کے بارے میں اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں کہ جو لوگ خانہ کعبہ کی نیت سے آتے ہیں ان سے تعرض نہ کرو۔ مقصد یہ ہے کہ مسلمان شعائر اللہ کے احترام پر مامور ہے بشرطیکہ ان کا نفسیاتی پس منظر خالص خدا پرستانہ ہو۔ کسی مشرکانہ یا کافرانہ تخیل کی آلودگی سے انہیں ناپاک نہ کر دیا گیا ہو۔ کوئی شخص خواہ غیر مسلم ہی کیوں نہ ہو اگر اپنے عقیدہ و عمل میں خدائے واحد کی عبادت اور بندگی کا کوئی جز رکھتا ہے تو اس جزو کی حد تک مسلمان اس سے موافقت کریں گے اور ان شعائر کا بھی احترام کریں گے جو اس مذہب میں خالص خدا پرستی کی علامت ہوں۔ اس چیز میں ہمارے اور ان کے درمیان نزاع نہیں ہے بلکہ موافقت ہے نزاع اس میں نہیں ہے کہ وہ خدا کی بندگی کیوں کرتا ہے بلکہ اس امر میں ہے کہ وہ خدا کی بندگی کے ساتھ دوسری بندگیوں کی آمیزش کیوں کرتا ہے؟

یاد رکھنا چاہیے کہ شعائر اللہ کے احترام کا یہ حکم اس وقت دیا گیا تھا جب کہ مسلمانوں اور مشرکینِ عرب کے درمیان جنگ برپا تھی، مکہ پر مشرکین قابض تھے۔

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

احرام کھولنے کے بعد شکار کی اجازت

۱۰ ۔ اور جب احرام کی حالت ختم ہو جائے تو تمہیں شکار کی اجازت ہے یعنی حالتِ احرام میں شکار کی جو ممانعت کی گئی وہ احرام کھولنے کے بعد باقی نہیں رہتی۔ احرام بھی من جملہ شعائر اللہ ہے اور اس کی پابندیوں میں سے کسی پابندی کو توڑنا اس کی بے حرمتی کرنا ہے اس لیے شعائر اللہ کے سلسلے میں اس کا ذکر کر دیا گیا کہ جب تک تم احرام بند ہو شکار کرنا خدا پرستی کے شعائر میں سے ایک شعائر کی توہین کرنا ہے ۔ البتہ جب شرعی قاعدے کے مطابق احرام کی حد ختم ہو جائے تو شکار کرنے کی اجازت ہے۔[1]

یاد رہے کہ فاصطادوا میں صیغہ امر وجوب کے معنے میں نہیں بلکہ صرف اجازت کے مفہوم میں ہے ۔ الجصاص اور آلوسی نے اس کی تصریح کی ہے۔ نسفی اور ابن کثیر کا بھی اسی طرف میلان ہے۔ مولانا اشرف علیؒ نے یہ عجیب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ محض ایک امر مباح کے لیے صیغہ امر کا لانا یہ بتانے کے لیے ہے کہ جس مباح کے ترک سے اس کے ممنوع ہونے کا قانون میں شبہ ہونے لگے اس مباح کا کرنا ہی مطلوب ہوتا ہے ۔ یہاں سے ان متشددین کی غلطی بھی واضح ہو جاتی ہے جو مباحات کے چھوڑنے میں احرام ہی کی طرح تشدد اور غلو رکھتے ہیں ۔

دشمنی میں بھی انصاف کا دامن نہ چھوڑو

۱۱ ۔ اور یاد رکھو ایسا نہ ہو کہ کسی گروہ کی دشمنی جس نے تمہارے لیے مسجد حرام کا راستہ روکا تھا اس بات پر تمہیں نہ ابھارے کہ تم ان پر زیادتی کرنے لگو۔ پچھلی آیت میں جن شعائر کو حق تعالیٰ نے معظم و محترم قرار دیا تھا ۶ھ میں مشرکین مکہ نے ان سب کی اہانت کی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور تقریباً ڈیڑھ ہزار صحابہ ماہ ذیقعدہ محض عمرہ ادا کرنے کے لیے مدینہ طیبہ سے روانہ ہوئے۔ حدیبیہ کے مقام پر پہنچ کر مشرکین نے اس مذہبی فریضہ کی بجا آوری سے روک دیا ۔ نہ حالتِ احرام کا خیال کیا نہ کعبہ کی حرمت کا ، محترم مہینہ کا نہ ہدی و قلائد کا۔ مسلمان شعائر اللہ کی اس توہین اور مذہبی فریضہ سے روک دیے جانے پر ایسی وحشی و ظالم قوم کے مقابلہ میں جس قدر بھی غیظ و غضب

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

اور بغض و عداوت کا اظہار کرتے وہ حق بجانب تھے اور جوش انتقام سے برافروختہ ہو کر جو کارروائی کرتے وہ ممکن تھی لیکن اسلام کی محبت و عداوت دونوں نپی تلی ہیں۔ قرآن کریم نے ایسے جابر و ظالم دشمن کے مقابلہ میں بھی اپنے جذبات کو قابو میں رکھنے کا حکم دیا۔ عموماً آدمی زیادہ محبت یا زیادہ عداوت کے جوش میں حد سے گزر جاتا ہے اس لیے فرمایا کہ سخت سے سخت دشمنی تمہارے لیے اس کا باعث نہ ہو کہ تم زیادتی کر بیٹھو اور عدل و انصاف کو ہاتھ سے چھوڑ دو۔[1]

چونکہ کفار نے اس وقت مسلمانوں کو زیارت کعبہ سے روک دیا تھا اور عرب کے قدیم دستور کے خلاف حج تک سے مسلمان محروم کر دیئے گئے تھے اس لیے مسلمانوں میں یہ خیال پیدا ہوا کہ جن کافر قبیلوں کے راستے اسلامی مقبوضات کے قریب سے گزرتے ہیں، ان کو ہم بھی حج سے روک دیں اور زمانہ حج میں ان کے قافلوں پر چھاپے ماریں مگر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرما کر روک دیا۔[2]

آیت کا منشا یہ ہے کہ جس قوم نے تم کو واقعہ حدیبیہ کے وقت مکہ میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے روک دیا تھا۔ اور تم سخت غم و غصہ کے ساتھ ناکام واپس ہو گئے تھے۔ اب جبکہ تم کو قوت اور قدرت حاصل ہے تو ایسا نہ ہونا چاہیے کہ گزشتہ واقعہ کے غم و غصہ اور بغض کا انتقام اس طرح لیا جائے کہ تم ان کو بیت اللہ اور مسجد حرام میں داخل ہونے اور حج کرنے سے روکنے لگو۔ کیونکہ یہ ظلم ہے اور اسلام ظلم کی اجازت نہیں دیتا۔ ظلم کے بدلہ میں انصاف کرنا اور انصاف پر قائم رہنا اسلام کا شاہکار ہے۔ اگر انہوں نے اپنے زمانہ اقتدار میں اقتدار کے نشہ میں مسلمانوں کو مسجد حرام میں داخل ہونے اور عمرہ کرنے سے جبراً روک دیا تو یہ ظلم تھا، اس کا جواب ہرگز یہ نہ ہونا چاہیے کہ اب مسلمان بھی اپنے زمانہ اقتدار میں اسی ظلم کی کاپی کریں۔

اس آیت قرآنی کا مطالبہ یہ ہے کہ عدل و انصاف میں دوست دشمن سب یکساں ہیں، تمہارا دشمن خواہ کیسا ہی سخت ہو اور اس نے تمہیں کیسی ایذا پہنچائی ہو، اس سے بھی عدل و انصاف کا برتاؤ تمہارا فرض ہے۔

یہ کیسے زرّیں اصول کی تعلیم ہے کہ یگانے تو یگانے ان حق پوش بیگانوں سے بھی انصاف کا معاملہ کرو جن کی دشمنی کھل کر سامنے آچکی ہو اور تم ان سے اور وہ تم سے میدان جنگ میں آمنے سامنے آچکے ہوں۔ اس طرح سمجھا دیا کہ جو دشمن نہ ہوں یا جن سے تعلقات ہوں ان کے حقوق کی نگہداشت

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

کس قدر ضروری ہے۔ پھر دشمن کے لفظ کو عام نہیں رکھا۔ کیونکہ بعض وقت محض اجنبی ہونے کی وجہ سے ایک قوم کو دشمن سمجھ لیا جاتا ہے بلکہ ان صدوکم عن المسجد الحرام بول کر بتا دیا کہ وہ دشمن جو تمہیں انتہا درجہ کے دکھ پہنچا چکے ہوں، تمہیں گھر سے بے گھر کر چکے ہوں اور تمہارے مذہبی فریضہ کی ادائیگی میں حائل ہو چکے ہوں ان سے بھی عدل و انصاف کرو۔

نیکی میں سب کے شریک رہو

۱۲۔ تمہارا دستور یہ ہونا چاہیے کہ نیکی اور پرہیزگاری کی ہر بات میں ایک دوسرے کی مدد کرو، گناہ اور ظلم کی بات میں کسی سے تعاون نہ کرو۔ اگر کوئی شخص بالفرض جوشِ انتقام میں زیادتی کر بیٹھے تو اس کے روکنے کی تدبیر یہ ہے کہ جماعت اسلام اس کے ظلم و عدوان کی اعانت نہ کرے بلکہ سب مل کر نیکی اور پرہیزگاری کا مظاہرہ کریں اور اشخاص کی زیادتیوں اور بے اعتدالیوں کو روکیں۔[1]

اس آیت میں جو قاعدہ بتایا گیا ہے وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے سارے کاموں کے لیے ایک عام دستور العمل ہے۔ جو کوئی نیک کام کرے اس کی مدد کرو۔ اگرچہ مسلمان نہ ہو اور اگرچہ مخالف ہو اور جو کوئی برائی کرے اس کی مدد نہ کرو۔ اگرچہ مسلمان ہو، اگرچہ تمہارا ساتھی ہو مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کا شیوہ اختیار نہ کرو کہ اپنی قوم پرست پر مقدم اور اپنی پارٹی بہر حال اپنی پارٹی۔ اس سے پہلے قاعدہ اور اصول غیروں سے معاملات کے بتائے تھے۔ اب اس آیت میں اُمت کی حیثیت بتائی جا رہی ہے کہ تمہاری حیثیت عام امتوں کی نہیں ہے تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ دنیا میں تم برّ و تقویٰ کے مددگار اور اثم و عدوان کے مخالف بن کر آئے ہو اور یہ ایک ایسی اصولی حقیقت ہے جو اس اُمت کے پورے نظامِ اجتماع کی روح ہے اور جس پر مسلمان کی ہر صلاح و فلاح بلکہ خود اس کی زندگی اور بقا موقوف ہے۔ ہر دانش مند جانتا ہے کہ دنیا کا پورا نظام باہمی تعاون پر قائم ہے۔ قرآن نے اس آیت میں صرف تعاون کی تعلیم نہیں دی بلکہ تعاونوا علی البرّ والتقویٰ کی ہدایت کی ہے اور تعاون علی الاثم والعدوان سے منع کیا ہے۔ جس کا صاف مطلب یہ ہے کہ مسلمان بھائی بھی اگر حق کے خلاف چل رہا ہو تو ناحق اور ظلم پر اس کی بھی مدد

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مدد کرو بلکہ اس کی کوشش کرو کہ ناحق اور ظلم سے اس کا ہاتھ روکو، کیونکہ درحقیقت یہی اس کی صحیح امداد ہے تاکہ ظلم وجور سے اس کی دُنیا و آخرت تباہ نہ ہو۔

صحیح بخاری میں حضرت انس سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا انصر اخاک ظالما او مظلوما یعنی اپنے بھائی کی مدد کرو خواہ وہ ظالم ہو یا مظلوم صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ بھائی کی امداد تو ہم سمجھ گئے مگر ظالم کی امداد کا کیا مطلب ہے آپ نے فرمایا کہ اس کو ظلم سے روکو، یہی اس کی مدد ہے۔

دراصل یہ آیت اوپر والی بات ہی کی ایک دوسرے پہلو سے تاکید ہے یعنی جس گروہ کو اللہ نے دُنیا میں نیکی اور تقویٰ قائم کرنے کے لیے پیدا کیا ہے۔ اس کے لیے پسندیدہ روش یہ نہیں ہے کہ وہ دوسروں کی زیادتی سے مشتعل ہو کر خود اس طرح کی زیادتیاں کرنے لگے، وہ ایسا کرے تو اس کے معنے یہ ہوتے کہ اس نے گناہ اور زیادتی کے کام میں تعاون کیا اور شریر لوگوں نے برائی کی جو نیو جمائی اس پر اس نے بھی چند روڑے رکھ دیے حالانکہ اس کا کام نیکی اور تقویٰ میں تعاون کرنا تھا۔

اللہ کی نافرمانی سے بچو

۱۳۔ اللہ سے ڈرو، اللہ سنگین گرفت والا ہے۔ یعنی حق پرستی، انصاف پسندی اور تمام عمدہ اخلاق کی جڑ خدا کا خوف ہے۔ اور اگر خدا سے ڈر کر نیکی سے تعاون نہ کیا گیا تو عام عذاب کا اندیشہ ہے[1]

لہٰذا تم کو چاہیے کہ نیکی اور پرہیزگاری میں ایک دوسرے کی مدد کرو تاکہ تم کو اللہ کے فضل اور رضوان سے حصہ ملے اور سخت عذاب سے محفوظ رہو۔ بِر یعنی نیکی سے لوگ خوش ہوتے ہیں اور تقویٰ سے اللہ خوش ہوتا ہے۔ جس نے دونوں باتوں کو اپنے اندر جمع کر لیا اس نے سعادت مکمل کر لی۔ بِر نیکی فعل خیرات کا نام ہے اور تقویٰ و پرہیزگاری ترک منکرات کا نام ہے۔ جس میں یہ دونوں باتیں جمع ہو جائیں اس کی خوش نصیبی کے کیا کہنے،

آئیے ایک بار پوری آیت پر مجموعی نظر ڈال لیجئے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اوپر والی آیت میں حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت فرمائی تھی کہ یہ چیز احرام کے تقدس اور اس کے درویشانہ مزاج کے خلاف نیز شعائر الٰہی میں سے ایک شعیرہ کی توہین ہے۔ اب اسی تعلق سے تمام شعائرِ الٰہی کے احترام کو پہلے بحیثیتِ مجموعی تاکید فرمائی۔ پھر چند مخصوص شعائر کا حوالہ دیا۔ پھر شعائر کی ممانعت سے متعلق یہ واضح فرمایا کہ اس کا تعلق صرف حالتِ احرام سے ہے احرام سے باہر ہو جانے کے بعد یہ ممانعت اٹھ جائے گی۔

پھر اس اشتعال انگیز سبب کا ذکر فرمایا جو اس وقت تازہ بتازہ موجود تھا۔ اندیشہ تھا کہ مسلمان اس سے مغلوب ہو کر کوئی ایسی بات کر گزریں جو احترامِ شعائر کے منافی ہو۔ قریش نے ان کو بیت اللہ کی زیارت و طواف سے محروم رکھا تھا۔ یہ معاملہ نہایت صبر آزما تھا اور اب جبکہ مسلمانوں کے پاس سیاسی طاقت موجود تھی اس بات کا قوی اندیشہ تھا کہ اس عہد کے احترام میں ان سے کوئی بے اعتدالی صادر ہو جاتے۔ اسی صورت کا تقاضا تھا کہ مسلمانوں کو خاص طور پر متنبہ کیا جائے کہ دوسروں کی زیادتیاں بھی ان کے لیے کسی زیادتی کا جواز فراہم نہیں کر سکتیں۔ وہ دنیا میں شعائرِ الٰہی کا احترام کرنے اور نیکی و تقویٰ کے علمبردار بن کر اٹھے ہیں۔ اس وجہ سے جب تک اپنے بچاؤ کی ضرورت مجبور نہ کرے ان کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی قدم نیکی اور تقویٰ کے خلاف اٹھائیں۔ اس کے بعد نکتہ کی بات یہ ارشاد فرمائی کہ دوسروں کے غلط رویہ سے متاثر ہو کر انہی کی سی روش اختیار کر لینا درحقیقت ان کی برائی کی برائی بدی میں ان کے ساتھ تعاون کرنا ہے اور یہ چیز اہلِ ایمان کے شایانِ شان نہیں ہے۔ اہلِ ایمان کے شایانِ شان بات یہ ہے کہ وہ نیکی اور تقویٰ کے کام میں تعاون کریں۔ دشمن کے ہاتھوں بھی کوئی نیک کام ہو رہا ہو تو اس میں مزاحم ہونے کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کریں۔ آخر میں شدید العقاب کا حوالہ دینے سے مقصود مسلمانوں کو سخت الفاظ میں تنبیہ ہے کہ عہدِ الٰہی کی حرمت سخت سے سخت حالات میں بھی قائم رکھنی ہے، اور یہ یاد رکھو جس خدا نے تم کو اپنے عہد و میثاق سے دنیا کی امامت کی سرفرازی بخشی ہے۔ اس کے ہاں نقضِ میثاق کی پاداش بھی بڑی سخت ہے۔

اس آیت سے حضرت مولانا اشرف علی کی یہ نکتہ آفرینی قابلِ داد ہے کہ حسن و قبح میں مقدمات کو مقاصد کا حکم دیا جاتا ہے اور مشائخ اہلِ تربیت کے یہاں اسی قاعدے پر عمل ہے یہیں سے ان مجلسوں، انجمنوں اور اجتماعی زندگی کے شعبوں میں شرکت کا وجوب بھی مفہوم

رہا ہے جن کا مقصد اشاعت دین اور نصرت دین ہو اور جو انسانی حقوق کی حفاظت کو اپنا نصب العین بنا چکی ہوں اور ان اجتماعی کاموں اور اداروں میں شرکت کی حرمت بھی یہیں سے معلوم ہو رہی ہے جن سے بے دینی، بدعملی اور انسانی حقوق کی پامالی کی تائید ہوتی ہو۔

برّ و تقویٰ اور اثم و عدوان

جیسے لفظ تقویٰ فرائض کی ادائیگی کے لیے آتا ہے ایسے لفظ برّ حقوق کی پاسبانی کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی لیے برّ کی ضد اثم اور عقوق آتا ہے۔ برّ اور بار اسی سے صفت کے صیغے آتے ہیں۔ برّ الوالدین اس سعادت مند بیٹے کو کہتے ہیں جو اپنے والدین کا فرمانبردار ہو اور ان کے پورے پورے حقوق ادا کرنے والا ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ اس کے معنے میں صرف حقوق ہی داخل ہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ یہ لفظ زیادہ حقوق میں استعمال ہوتا ہے اور فرائض میں کم۔ فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے بچاؤ کے معنے میں ہو تو اس کی ضد فجور آتی ہے۔

انسان کا دنیا اور دنیا کی تمام چیزوں اور رکھیلوں سے ایک گونہ لگاؤ ہے اس لگاؤ کا یہ تقاضا ہے کہ اس کی ترقی و حفاظت میں کوشش کی جائے اور اس کی تباہی سے اس کی حفاظت کی جائے۔ برّ و تقویٰ کو بنیاد بنا کر تعمیر کی جائے اور اثم و عدوان پر مبنی تخریب سے بچا جائے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ تم اس وقت تک اپنی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ نہ ہو گے جب تک دنیا میں برّ و تقویٰ کے معاون اور اثم و عدوان کے مخالف بن کر کھڑے نہ ہو گے۔ یہ آیت قرآنی مکارم اخلاق کے لیے رہنما اصول فراہم کرتی ہے۔ اسی لیے ایک ارشاد نبوت میں برّ حسن اخلاق کو بتایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے:

> نواس بن سمعان کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، یہ کہ برّ صرف اچھے اخلاق کا نام ہے جب کہ اثم وہ ہے جس کی تمہارے دل میں کھٹک ہو اور تمہیں یہ پسند نہ ہو کہ لوگ اس پر مطلع ہوں۔

مسند احمد اور مسند دارمی میں حضرت وابصہ کے حوالہ سے جو ارشاد نبوت آیا ہے اس میں برّ اور اثم کی حقیقت کو اور زیادہ وضاحت سے پیش کیا ہے،

> وابصہ کہتے ہیں کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور نے فرمایا کہ وابصہ تو برّ اور اثم کے بارے میں پوچھنے آیا ہے، عرض کی جی ہاں۔

فرمایا کہ تو اپنے دل سے پوچھ۔ بر وہ ہے جس پر تیرا جی مطمئن ہو اور تیرا دل لگ جائے
اور اثم وہ ہے کہ جس کی کھٹک تیرے جی میں لہے اگرچہ لوگ تجھے کتنے ہی
فتویٰ دیں۔

یہ دونوں ارشادات نبوت واشگاف طور پر کہہ رہے ہیں کہ بر کا سرتاسر تعلق لوگوں کے حقوق سے ہے، انسانی حقوق جیسے اخلاق سے تعلق رکھتے ہیں ایسے ہی معاملات میں دیانت وامانت سے تعلق رکھتے ہیں۔ اسی بنا پر ایک ارشاد نبوت میں راست گفتار اور سچے کو بار فرمایا ہے۔ چنانچہ مسند احمد میں حضرت عبداللہ بن عمرو کے حوالے سے یہ واقعہ آیا ہے کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ جنت کا عمل کیا ہے؟ فرمایا سچ بولنا جب بندہ سچ بولتا ہے تو بار یعنی نیکوکار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے حوالے سے یہ ارشاد نبوت اس کی توضیح کرتا ہے کہ:

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لوگو! راست گوئی کی عادت اختیار کرو کیونکہ راست گوئی بر نیکوکاری کی رہنما ہے اور نیکوکاری انسان کو جنت میں پہنچاتی ہے۔

ان ارشادات کی روشنی میں یہ بات صاف ہو جاتی ہے کہ انسانی حقوق یعنی اخلاق ومعاملات میں حسن کاری کا نام بر ہے۔ اگر اخلاق میں ہو تو اس کا متقابل فجور ہے اور معاملات میں ہو تو اس کا متقابل اثم ہے اور اگر اقارب میں ہو تو اس کا متقابل عقوق ہے۔ بہرحال جیسے خداوندی حقوق کی پاسبانی کا نام تقویٰ ہے ایسے ہی انسانی حقوق کی ادائیگی کا نام بر ہے۔ اسی بنا پر سفر کی دعا میں دونوں کو مانگا ہے:

اللھم انا نسألك فی سفرنا ھذا البر والتقویٰ۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةُ وَالدَّمُ وَلَحْمُ الْخِنْزِيرِ وَمَآ أُهِلَّ لِغَيْرِ
اللّٰهِ بِهٖ وَالْمُنْخَنِقَةُ وَالْمَوْقُوذَةُ وَالْمُتَرَدِّيَةُ وَالنَّطِيحَةُ
وَمَآ أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُبِحَ عَلَى النُّصُبِ وَ
أَنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْأَزْلَامِ ذٰلِكُمْ فِسْقٌ اَلْيَوْمَ يَئِسَ
الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ دِينِكُمْ فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِ
اَلْيَوْمَ أَكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ وَأَتْمَمْتُ عَلَيْكُمْ نِعْمَتِي وَ
رَضِيتُ لَكُمُ الْإِسْلَامَ دِينًا فَمَنِ اضْطُرَّ فِي مَخْمَصَةٍ
غَيْرَ مُتَجَانِفٍ لِإِثْمٍ فَإِنَّ اللّٰهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ۝

مسلمانو! تم پر یہ چیزیں حرام کر دی گئی ہیں۔ مُردار جانور، خون
سُور کا گوشت، وہ جانور جو غیر خدا کے نام پر پکارا جائے، گلا گھونٹ
کر مرا ہو، وہ جو بلندی سے گر کر مر جائے، وہ جو کسی جانور کے
[۱۲] سینگ مارنے سے مر جائے، وہ جسے درندہ پھاڑ کھا جائے۔

مگر ہاں وہ حرام نہیں جسے تم اس کے مرنے سے پہلے ذبح کر لو،[15]
وہ جانور جو کسی تھان پر چڑھا کر ذبح کیا جاتے۔[16] اور یہ بات بھی
حرام ہے کہ تیروں کے پاسوں سے آپس میں تقسیم کرو، یہ گناہ
کی بات[17] ہے۔ مسلمانو، جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی وہ آج
تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو چکے[18] ہیں۔ لہٰذا ان سے
نہ ڈرو، مجھ سے ڈرو۔[19] آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا
دین کامل کر دیا اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے
لیے میں نے دینِ اسلام پسند کر لیا۔[20] پس دیکھو جو کوئی بھوک
سے بے بس ہو جاتے یہ نہ ہو کہ دانستہ گناہ کرنا چاہے تو اللہ
بخشنے والا رحمت رکھنے والا[21] ہے۔

محرمات کی تفصیل

اس آیت میں ان حرمتوں کی تفصیل بیان ہو رہی ہے جن کا پہلی آیت میں الا ما یتلی علیکم کے الفاظ میں اجمالاً ذکر ہوا تھا۔ اس میں پہلے ان چیزوں کا ذکر ہوا جن کی حرمت پہلے ہی بیان ہو چکی

ہے۔ مزید تاکید اور تکمیل بحث کے طور پر ان کا یہاں بھی اعادہ کر دیا گیا۔ اس مقام پر یہ بات خوب ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں حلال و حرام کی جو قیود شریعت کی طرف سے عائد کی گئی ہیں، ان کی اصل بنیاد ان اشیا کے طبی فوائد یا نقصانات نہیں بلکہ ان کے اخلاقی فوائد و نقصانات ہیں جہاں تک مادی اور طبی امور کا تعلق ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو انسان کی اپنی سعی و جستجو اور کاوش و تحقیق پر چھوڑ دیا ہے۔ یہ دریافت کرنا انسان کا اپنا کام ہے کہ مادی اشیا میں کیا چیزیں اس کے جسم کو غذائے صالح بہم پہنچاتی ہیں اور کیا چیزیں تغذیہ کے لیے غیر مفید یا نقصان دہ ہیں۔ شریعت ان امور میں اس کی رہنمائی کی ذمہ داری اپنے سر نہیں لیتی۔ اگر یہ کام اس نے اپنے ذمہ لیا ہوتا تو سب سے پہلے سنکھیا کو حرام کیا ہوتا لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن و سنت میں اس کا یا ان دوسرے مفردات و مرکبات کا جو انسان کے لیے مہلک ہیں سرے سے کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ شریعت غذا کے معاملہ میں جس چیز پر روشنی ڈالتی ہے دراصل اس کا یہ پہلو ہے کہ کس غذا کا انسان کے اخلاق پر کیا اثر ہوتا ہے اور کون سی غذائیں طہارتِ نفس کے لحاظ سے کیسی ہیں اور غذا حاصل کرنے کے طریقوں میں سے کون سے طریقے اعتقادی و نظری حیثیت سے صحیح یا غلط ہیں۔ چونکہ اس کی تحقیق کرنا انسان کے بس میں نہیں ہے اور اسے دریافت کرنے کے ذرائع انسان کو میسر ہی نہیں ہیں اور اسی بنا پر انسان نے اکثر امور میں غلطیاں کی ہیں، اس لیے شریعت صرف انھی امور میں اس کی رہنمائی کرتی ہے۔ جن چیزوں کو اس نے حرام حرام کیا ہے۔ انہیں اس وجہ سے حرام کیا ہے کہ یا تو اخلاق پر ان کا برا اثر پڑتا ہے یا وہ طہارت کے خلاف ہیں۔ یا ان کا تعلق کسی فاسد عقیدے سے ہے برعکس اس کے جن چیزوں کو اس نے حلال کیا ہے ان کی علت کی وجہ یہ ہے کہ وہ ان برائیوں میں سے کوئی برائی اپنے اندر نہیں رکھتیں۔

سوال کیا جا سکتا ہے کہ خدا نے ہم کو ان اشیا کی حرمت کی وجوہ کیوں نہ سمجھاتے تاکہ ہمیں بصیرت حاصل ہو جاتی۔ اس کا جواب یہ ہے کہ ان وجوہ کو سمجھنا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے مثلاً یہ کہ خون یا سؤر کے گوشت یا مردار کے کھانے سے ہماری اخلاقی صفات میں کیا خرابیاں رونما ہوتی ہیں کس طرح اور کس قدر ہوتی ہیں۔ اس کی تحقیق ہم کسی طرح نہیں کر سکتے کیونکہ اخلاق کو ناپنے اور تولنے کے ذرائع ہمیں حاصل نہیں ہیں۔ اگر بالفرض ان کے برے اثرات کو بیان بھی کر دیا جائے تو شبہ کرنے والا تقریباً اسی مقام پر ہوتا جس مقام پر وہ اب ہے، کیونکہ وہ اس بیان کو صحت اور عدم صحت کو آخر کس چیز سے ناپتا۔ اس لیے اللہ سبحانہ نے حلال و حرام کی حدود کا انحصار ایمان پر رکھ دیا ہے جو شخص اس بات پر مطمئن ہو جائے کہ کتاب اللہ کی کتاب ہے اور رسول اللہ کا رسول ہے

اور اللہ علیم و خبیر ہے وہ اس کے مقرر کیے ہوئے حدود کی پابندی کرے گا خواہ ان کی مصلحت اس کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے اور جو شخص اس بنیادی عقیدے پر ہی مطمئن نہ ہو، اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ جن چیزوں کی خرابیاں انسانی علم کے احاطہ میں آگئی ہیں صرف انہی سے پرہیز کرے اور جن کی خرابیوں کا علمی احاطہ نہیں ہوا ہے ان کے نقصانات کا تختۂ مشق بنا رہے۔

۱۴ ۔ مسلمانو! تم پر یہ چیزیں حرام کر دی گئی ہیں، مردار جانور، اس آیت سے جن چیزوں کا کھانا حرام ہوا، ان میں اول میتہ مردار جانور ہے، جو واجب الذبح جانور ذبح کیے بغیر خود اپنی موت سے مر جاتے، اس کا خون اور حرارت غریزیہ گوشت ہی میں محتقن اور جذب ہو کر رہ جاتی ہے جس کی سمیت اور گندگی سے کئی قسم کے بدنی اور دینی نقصانات لگ جاتے ہیں (ابن کثیر) شاید اسی تعلیل پر متنبہ فرمانے کے لیے میتہ کے بعد دم خون کی حرمت مذکور ہوئی۔ اس کے بعد حیوانات کی ایک خاص نوع یعنی خنزیر کا ذکر کیا جس کی بے انتہا نجاست خوری اور بے حیائی مشہور عام ہے شاید اسی لیے شریعت حقہ نے دم خون کی طرح اس کو نجس العین قرار دیا۔ ان تین چیزوں کے ذکر کے بعد جن کی ذات ہی مادی گندگی اور خباثت پائی جاتی تھی۔ محرمات کی ایک اور قسم کا ذکر کیا یعنی وہ جو جانور اپنی ذات کے اعتبار سے حلال و طیب ہے مگر مالک حقیقی کے سوا کسی اور کی نیاز کے طور پر نامزد کر دیا گیا ہو۔ اس کا کھانا بھی میت کی خباثت اور عقیدے کی گندگی کی بنا پر حرام ہے کسی جاندار کی جان صرف اسی مالک حقیقی و خالق کے حکم اور نام پر لے جا سکتی ہے جس کے حکم اور ارادے سے اس پر موت و حیات طاری ہو سکتی ہے۔ باقی منخنقہ وغیرہ غیر مذبوح جانور سب میتہ کے حکم میں داخل ہیں جیسا کہ ما ذبح علی النصب، ما اھل لغیر اللّٰہ کے ساتھ ملحق ہے جاہلیت میں ان سب چیزوں کے کھانے کی عادت تھی۔ اسی لیے اس قدر تفصیل سے ان کا ذکر کیا لے

میتہ، دم، لحم خنزیر اور ما اھل بہ لغیر اللّٰہ کا ذکر دوسری جلد میں ہو چکا ہے۔ منخنقہ اس جانور کو کہتے ہیں جو گلا گھونٹ کر مر جائے۔ موقوذہ جو چوٹ سے مر جائے، مثلاً کسی ٹرک کے نیچے آ کر مر گیا۔ متردیہ جو اوپر سے نیچے گر کر مر جائے۔ نطیحہ جو کسی جانور کے سینگ سے مر جائے ما اکل السبع جس کو کسی درندے نے پھاڑ کھایا ہو۔

مذکورہ بالا پانچوں چیزوں کا ذکر درحقیقت میتہ کی تفصیل کے طور پر ہوا ہے اور اس تفصیل

لے ملفوظات شیخ الاسلام

سے گویا اس حکم کی تکمیل فرمائی ہے جو بقرہ اور اس سے پہلے انعام میں بیان ہو چکا ہے۔ اس تفصیل کی ضرورت اس لیے تھی کہ بعض ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہو سکتا تھا کہ ایک مردار میں جو طبعی موت سے مرا ہو اور اس جانور میں جو کسی چوٹ یا حادثہ کا شکار ہو کر مر گیا ہو کچھ فرق ہونا چاہیے۔ چنانچہ یہ شبہ اس زمانے میں بھی کچھ کی زبانوں پر آتا ہے بلکہ بہت سے لوگ اسی کو بہانہ بنا کر گردن مروڑی ہوئی مرغی بھی جائز بتاتے ہیں۔ قرآن کی اس تفصیل نے اس شبہ کو صاف کر دیا۔

موقوذہ کے بارے میں یہ بات ضرور پیش نظر رہے کہ موقوذہ وہ جانور ہے جو ضرب شدید کے ذریعے ہلاک ہوا ہو جیسے لاٹھی یا پتھر وغیرہ اور جو تیر کسی شکار کو اس طرح قتل کرے کہ دھار کی طرف سے نہ لگے ویسے ہی ضرب سے مر جائے وہ بھی موقوذہ میں ہی داخل ہے۔ حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ نے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں بعض اوقات معراض تیر سے شکار کرتا ہوں اگر شکار اس سے مر جائے تو کیا کھا سکتا ہوں۔ آپ نے فرمایا کہ اگر وہ جانور تیر کے عرض کی چوٹ سے مرا ہے تو وہ موقوذہ کے حکم میں داخل ہے، اس کو مت کھا اور اگر دھار کی طرف سے لگا ہے اور اس نے زخم کر دیا ہے تو کھا سکتے ہو۔ یہ روایت الجصاص نے احکام القرآن میں نقل کی ہے اس میں شرط یہ ہے کہ تیر پھینکتے وقت بسم اللہ کہہ کر پھینکا ہو۔

جو شکار بندوق کی گولی سے ہلاک ہو گیا ہو اس کو بھی فقہائے نے موقوذہ میں داخل کیا ہے ابوبکر الجصاص نے حضرت عبداللہ بن عمر سے نقل کیا ہے فرماتے ہیں المقتولۃ بالبندقۃ تلک الموقوذۃ یعنی بندوق کے ذریعے جو جانور قتل کیا گیا ہو وہی موقوذہ ہے اس لیے حرام ہے امام اعظم، امام شافعی اور امام مالک وغیرہ سب اس پر متفق ہیں۔ (قرطبی)

ذبح اور ذکاۃ کی اسلامی اصطلاح

۱۵۔ مگر ہاں وہ حرام نہیں ہے جسے تم اس کے مرنے سے پہلے ذبح کر لو۔ اصل ارشاد میں ذکیتم آیا ہے۔ ذکاۃ سے ہے جو اصل میں آگ کے جلنے پر بولا جاتا ہے۔ ذکیت الشاۃ کے معنے ہیں میں نے بکری کو ذبح کیا۔ گویا حرارت غریزی کے اخراج کا نام تذکیہ ہے یعنی خون کے نکل جانے کا اس لیے شریعت میں جانور کو ذبح کر کے مارنے پر بولا گیا ہے۔ لفظ تذکیہ لاکر بتا دیا کہ اصل ذبح خون نکالنا ہے اس لیے بجائے ذبح کے تذکیہ کا لفظ اختیار کیا کیونکہ خون میں بہت قسم کی زہریں ہوتی ہیں۔ اور تذکیہ اسی جانور کا ہو سکتا ہے جس میں زندگی باقی ہو۔

یعنی کچھ حرارت غریزی موجود ہو اس لیے یہی لفظ زیادہ موزوں تھا۔
مطلب یہ ہے کہ جو جانور مذکورہ بالا حوادث میں سے کسی حادثہ کا شکار ہو جانے کے باوجود مرا نہ ہو بلکہ کچھ آثار زندگی اس میں پائے جاتے ہوں اس کو اگر ذبح کر لیا جائے تو کھایا جا سکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حلال جانور کا گوشت صرف ذبح کرنے سے حلال ہوتا ہے، کوئی دوسرا طریقہ اس کو ہلاک کرنے کا صحیح نہیں ہے۔ یہ ذبح اور ذکاۃ اسلام کے اصطلاحی الفاظ ہیں۔ ان سے مراد حلق کا اتنا حصہ کاٹ دینا ہے جس سے جسم کا خون اچھی طرح خارج ہو جائے۔ جھٹکا کرنے یا گلا گھونٹنے یا کسی اور تدبیر سے جانور کو ہلاک کرنے کا نقصان یہ ہوتا ہے کہ خون کا بیشتر حصہ جسم کے اندر ہی رک جاتا ہے اور وہ جگہ جگہ جم کر گوشت کے ساتھ چمٹ جاتا ہے، برعکس اس کے ذبح کرنے کی صورت میں دماغ کے ساتھ جسم کا تعلق دیر تک قائم رہتا ہے جس کی وجہ سے رگ رگ کا خون کھینچ کر باہر آ جاتا ہے اور اس طرح پورے جسم کا گوشت خون سے صاف ہو جاتا ہے۔ خون کے متعلق ابھی یہ بات گزر چکی ہے کہ وہ حرام ہے لہٰذا گوشت کے پاک اور حلال ہونے کے لیے ضروری ہے کہ خون اس سے جدا ہو جائے[1] ذبح کا یہ استثنا شروع کی چار قسموں سے متعلق نہیں ہے اس پر سلف صالحین کا اتفاق ہے۔ یہ استثنا منخنقہ اور اس کے مابعد سے متعلق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان تمام صورتوں میں اگر جانور زندہ پایا گیا۔ زندگی کی علامتیں محسوس کی گئیں اور اسی حالت میں اس کو اللہ کے نام پر ذبح کر دیا گیا تو وہ حلال ہے۔

تھانوں پر بھینٹ

۱۶ - اور وہ جانور جو کسی تھان پر چڑھا کر ذبح کیا جائے، تھوڑا سا پہلے ہدی کے ادب و احترام کا ذکر تھا یعنی وہ جانور جو تقرب الی اللہ کی غرض سے خدائے واحد کی سب سے پہلی عبادت گاہ کی نیاز کے طور پر ذبح کیا جاتا ہے۔ اس کے بالمقابل اس جانور کا بیان فرمایا جسے خدا کے سوا کسی دوسرے کے نام پر یا خانہ خدا کے سوا کسی دوسرے مکان کی تعظیم کے لیے ذبح کیا جائے۔
(موضح القرآن) اس دوسری صورت میں بھی فی الحقیقت نیت نذر غیر اللہ ہی کی ہوتی ہے گو ذبح کے وقت زبان سے بسم اللہ اللہ اکبر کہا جائے۔ اس تقریر کے موافق ما اهل به

---

[1] تفہیم القرآن

لغیر اللہ اور ما ذبح علی النصب کا فرق واضح ہوگیا۔ (ابن کثیر)[1]

امام راغب فرماتے ہیں کہ نصب ان پتھروں کو کہتے ہیں جن کو مشرکین عرب غیر اللہ کی عبادت کے لیے نصب کرتے تھے اور جانوروں کو وہاں جاکر وہاں ذبح کرتے تھے الی نصب یوفضون قرآن میں آیا ہے۔

نصب اور صنم میں فرق یہ ہے کہ نصب ان پتھروں کو کہتے ہیں جو کسی دیوتا یا دیوی کے نام پر لگایا گیا ہو خواہ تصویر ہو یا نہ ہو اور صنم وہ تصویری پتھر ہے جس پر کسی دیوتا یا دیوی کی تصویر ہو خانہ کعبہ کے گرد تین سو ساٹھ پتھر کھڑے کیے ہوتے تھے جن کو مشرکین اپنے دیوتاؤں کا استھان سمجھ کر ان کے پاس آکر قربانیاں کیا کرتے تھے اور کچھ خون بھی ان پر چھڑک دیتے تھے اور ان پتھروں کو بدلتے ہی رہتے تھے۔ ایک پتھر کے بجائے دوسرا اچھا پتھر رکھ دیتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو بھی نجس اور حرام قرار دیا اور ان قربانیوں کے کھانے کی ممانعت کی جو ان استھانوں پر لے جاکر کی جائیں کیونکہ یہ صورت بھی فی الواقع نذر غیر اللہ کی ایک خاص صورت ہے اگرچہ ذبح کے وقت زبان سے بسم اللہ اللہ اکبر کہہ دیا جائے۔ کیونکہ اصل مقصود اس ذبح سے غیر اللہ کی تعظیم اور تقرب ہے جو شرک ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے بھی حرام قرار دیا کیونکہ حرمت کا دارومدار مشرکانہ اعتقاد پر ہے جس کا ظہور کبھی گفتار سے ہوتا ہے اور کبھی کردار سے۔ یعنی ایسے مقام پر ذبح کرنے سے جو غیر اللہ کے نام پر بنے ہوئے ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے ذبیحہ کا کھانا حرام قرار دیا۔[2]

دراصل نصب تھان اور استھان کو کہتے ہیں۔ عرب میں ایسے استھان بے شمار تھے جہاں دیویوں، دیوتاؤں، بھوتوں اور جنوں کی خوشنودی کے لیے قربانیاں کی جاتی تھیں۔ قرآن نے اس قسم کے ذبیحے حرام قرار دیے۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ ان کے اندر حرمت محض بارادہ تقرب و خوشنودی استھانوں پر ذبح کیے جانے ہی سے پیدا ہو جاتی ہے اس سے بحث نہیں کہ ان پر نام اللہ کا لیا گیا ہے یا کسی غیر اللہ کا، اگر غیر اللہ کا نام لینے کے سبب سے ان کو حرمت لاحق ہوتی تو ان کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اوپر ما اھل لغیر اللہ کا ذکر ہو چکا ہے وہ کافی تھا۔ ہمارے نزدیک اسی حکم میں وہ قربانیاں بھی داخل ہیں جو مزاروں اور قبروں پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں بھی صاحب مزار اور صاحب قبر کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف ص ا

خوشنودی مدنظر ہوتی ہے۔ ذبح کے وقت نام چاہے اللہ کا لیا جائے یا صاحب قبر و مزار کا۔ ان کی حرمت میں نام کو نہیں بلکہ مقام کو دخل ہے لے

فی الواقع نصب سے مراد وہ سب مقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو۔ خواہ وہاں کوئی پتھر یا لکڑی کی مورت ہو یا نہ ہو۔ ہماری زبان میں اس کا ہم معنے لفظ آستانہ یا استھان ہے جو کسی بزرگ یا دیوتا سے یا کسی خاص مشرکانہ اعتقاد سے وابستہ ہو۔ لے

استقسام بالازلام

۱۷۔ اور یہ بات بھی حرام ہے کہ تیروں کے پاسوں سے آپس میں تقسیم کرو، یہ گناہ کی بات ہے۔ بعض مفسرین نے ازلام سے تقسیم کے تیر مراد لیے جو زمانہ جاہلیت میں لحم ذبیحہ وغیرہ کے بانٹنے میں استعمال ہوتے تھے اور وہ ایک صورت قمار اور جوے کی تھی جیسے آج کل چھٹی ڈالنے کی رسم ہے لیکن حافظ ابن کثیر وغیرہ محققین کے نزدیک راجح یہی ہے کہ ازلام سے مراد وہ تیر ہیں جن سے مشرکین مکہ کسی اشکال و تردد کے وقت اپنی مرادوں اور کاموں کا فیصلہ کرتے تھے۔ یہ تیر خانہ کعبہ میں قریش کے سب سے بڑے بت ہبل کے پاس رکھے تھے۔ ان میں سے کسی پر امرنی ربی لکھا تھا، میرے پروردگار نے حکم دیا، کسی پر نہانی ربی تحریر تھا میرے پروردگار نے منع کر دیا۔ اس طرح ہر تیر پر یوں ہی اٹکل پچو باتیں لکھ چھوڑی تھیں۔ جب کسی کام میں تذبذب ہوا تو تیر نکال دیکھ لیتے۔ اگر امرنی ربی والا تیر نکل آیا تو کام شروع کر دیا اور اگر اس کے خلاف نکلا تو ترک کر دیتے۔ علی ہذا القیاس گویا بتوں سے یہ ایک قسم کا مشورہ اور استعانت تھی۔ چونکہ اس رسم کا مبنی خالص جہل، شرک اوہام پرستی اور افترا علی اللہ تھا اس لیے قرآن حکیم نے متعدد مواقع میں نہایت تغلیظ و تشدید کے ساتھ اس کی حرمت کو ظاہر فرما دیا۔ اس تقریر کے موافق ازلام کا ذکر نصب کی مناسبت سے ہوا، اور مردار، خنزیر وغیرہ نہایت خبیث اور گندی چیزوں کی تحریم کے سلسلے میں منسلک کرکے بتلا دیا کہ اس کی معنوی اور اعتقادی نجاست و خباثت ان چیزوں سے کم نہیں ہے جیسا کہ دوسری آیت میں رجس

لے تدبر قرآن لے تفہیم القرآن

کے اطلاق سے ظاہر ہوتا ہے [1]

اصل میں استقسام کے معنے صرف قسمت یا تقدیر معلوم کرنے کے ہیں۔ ازلام جوئے یا فال کے تیروں کو کہتے ہیں۔ عرب میں فال کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے سے وہ اپنے خیال کے مطابق غیب کے فیصلے معلوم کرتے تھے، اور جوئے کے تیروں کا بھی رواج تھا جن کے ذریعے سے گوشت یا کسی چیز کے حصے حاصل کرتے تھے۔ علماء نے یہاں پہلی صورت کو ترجیح دی ہے یعنی تیروں کے ذریعے فال وغیرہ نکالتے اور جو حکم نکل آیا اس پر عمل کرتے۔ خود صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں ایک روایت اسی مضمون کی آئی ہے کہ:

> استقسام یہ ہے کہ تیروں سے فال گیری کی جاتی۔ اگر ممانعت نکل آتے تو رک جاتے اور اگر حکم ہوتا تو عمل کرتے اور تیروں پر نشانیاں لگا رکھی تھیں ان سے ہی قسمت معلوم کر لیتے۔

صحابہ، تابعین اور اکثر مفسرین سے یہی منقول ہے۔ عبداللہ بن عباس سے حافظ ابن جریر نے نقل کیا کہ مقصد قسمت معلوم کرنے والے تیر ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے امام مجاہد، ابراہیم نخعی، الحسن البصری اور مقاتل بن حیان سے بھی یہی معنے نقل کیے ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں:

> تیروں کے ذریعے قسمت معلوم کرنا یہ ہے کہ تیروں کے ذریعے خیر و شر کا فیصلہ کیا جاتے۔ یہی جمہور کا مختار ہے۔

امام مجاہد نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ قرعہ اندازی، فال گیری اور وہم پرستی کی یہ شکل اہل عرب ہی میں رائج نہ تھی بلکہ ایران اور روم کی بڑی مہذب قومیں بھی اس میں مبتلا تھیں۔

دراصل استقسام بالازلام کے ذریعے جس چیز کو حرام قرار دیا گیا اس کی تین بڑی قسمیں دنیا میں پائی جاتی ہیں، اور آیت کا حکم ان تینوں پر حاوی ہے۔

۱۔ مشرکانہ فال گیری جس میں کسی دیوی یا دیوتا سے قسمت کا فیصلہ پوچھا جاتا ہے یا غیب کی خبر دریافت کی جاتی ہے یا باہمی نزاعات کا تصفیہ کرایا جاتا ہے۔ مشرکین مکہ نے اس غرض کے لیے کعبہ کے اندر ہبل دیوتا کے بت کو مخصوص کر رکھا تھا۔ اس کے استھان میں سات تیر رکھے ہوتے تھے۔ جن پر مختلف الفاظ اور فقرے کندہ تھے۔ کسی کام کرنے نہ کرنے کا سوال ہو یا گم شدہ چیز کا

[1] افادات شیخ الاسلام

پتہ پوچھنا ہو یا خون کے مقدمہ کا فیصلہ مطلوب ہو، غرض کوئی کام بھی ہو اس کے لیے ہبل کے پانسہ دار کے پاس پہنچ جاتے۔ اس کا نذرانہ پیش کرتے اور ہبل سے دعا مانگتے کہ ہمارے اس معاملہ کا فیصلہ کردے۔ پھر پانسہ داران تیروں کے ذریعے سے فال نکالتا اور جو تیر بھی فال میں نکل آتا اس پر لکھے ہوئے لفظ کو ہبل کا فیصلہ سمجھا جاتا تھا۔

۲۔ توہم پرستانہ فال گیری، جس میں زندگی کے معاملات کا فیصلہ عقل و فکر سے کرنے کے بجائے کسی وہمی خیالی چیز یا کسی اتفاقی شئے کے ذریعے سے کیا جاتا ہے یا قسمت کا حال ایسے ذرائع سے معلوم کیا جاتا ہے جن کا وسیلہ علم غیب ہونا کسی علمی طریق سے ثابت نہیں ہے۔ رمل، نجوم، جعفر مختلف قسم کے شگون اور نچھتر اور فال گیری کے بے شمار طریقے اس قسم میں داخل ہیں۔

۳۔ جوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام جن میں اشیا کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی اتفاقی امر پر رکھ دیا جائے۔ مثلاً یہ کہ لاٹری میں اتفاقاً فلاں شخص کا نام نکل آیا ہے۔ لہٰذا ہزار ہا آدمیوں کی جیب سے نکلا ہوا روپیہ اس ایک شخص کی جیب میں چلا جائے۔ یا یہ کہ علمی حیثیت سے تو ایک معمہ کے بہت سے حل صحیح ہیں مگر انعام وہ شخص پائے گا جس کا حل کسی معقول کوشش کی بنا پر نہیں بلکہ محض اتفاق سے اس حل کے مطابق نکل آیا ہو جو صاحب معمہ کے صندوق میں بند ہے۔

ان تینوں قسموں کو حرام قرار دینے کے بعد قرعہ اندازی کی صرف وہ سادہ صورت اسلام میں جائز رکھی گئی ہے جس میں برابر کے دو کاموں یا دو برابر کے حقوق کے درمیان فیصلہ کرنا ہو۔ مثلاً ایک چیز پر دو آدمیوں کا حق ہر حیثیت سے بالکل برابر ہے اور فیصلہ کرنے والے کے لیے ان میں سے کسی کو ترجیح دینے کی کوئی معقول وجہ موجود نہیں ہے اور خود ان دونوں میں سے بھی کوئی اپنا حق خود چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہے۔ اس صورت میں ان کی رضامندی سے قرعہ اندازی پر فیصلہ کا مدار کیا جا سکتا ہے یا مثلاً دو کام یکساں درست ہیں اور عقلی حیثیت سے آدمی ان دو کے درمیان مذبذب ہو گیا ہے کہ ان میں سے کس کو اختیار کرے۔ اس صورت میں ضرورت ہو تو قرعہ اندازی کی جا سکتی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بالعموم ایسے مواقع پر یہ طریقہ اختیار کرتے تھے جبکہ دو برابر کے حقداروں کے درمیان ایک کو ترجیح دینے کی ضرورت پیش آتی اور آپ کو اندیشہ ہوتا تھا کہ اگر آپ خود ایک کو ترجیح دیں گے تو دوسرے کو ملال ہوگا۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن

آخر میں فرمایا ہے ذالکم فسق یعنی یہ سب اللہ کے مقرر کیے ہوتے دین و آئین کی خلاف ورزی ہے۔ ذالکم کا اشارہ ممکن ہے استقسام بالازلام تک محدود ہو لیکن زیادہ قابل پذیرائی یہی ہے کہ ان سب چیزوں کی طرف ہے جن کی ممانعت اوپر آ چکی ہے۔ رازی اور قرطبی نے اسی کو راجح بتایا ہے۔ اور ذالک اشارہ بعید یہاں ان کاموں کے بعد منزلت کو ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے۔ یعنی یہ کام برائی میں بہت اونچا مقام رکھتے ہیں۔ فسق کا لفظ یہاں عام قانونی معنے میں نہیں ہے بلکہ قرآنی مفہوم میں ہے۔ قرآن میں یہ لفظ مکمل بڑی نافرمانی، سرکشی، کفر و شرک سب کی تعبیر کے لیے آیا ہے۔ ابلیس کے بارے میں ہے ففسق عن امر ربہ۔ دراصل یہ لفظ یہاں تقویٰ کے مقابلے پر آیا ہے۔ پچھلی آیت کو واتقوا اللہ پر ختم فرمایا تھا اور اس کو ذالکم فسق پر ختم کیا۔ جس طرح حقیقی تقویٰ یہ ہے کہ نفس کی خواہشوں کی طرح ذوق و ذائقے کی آزادیوں پر بھی احکام الٰہی کا پورا پورا کنٹرول ہو ایسے ہی حقیقی فسق یہ ہے کہ احکام الٰہی کی پابندیوں سے الگ ہو کر انسان میں فکری اور اخلاقی آوارگی نہ آ جائے۔ تقویٰ اور فسق کا یہ تصور عام ذہنوں کو بڑا عجیب معلوم ہوگا مگر یہی بجوہر دراصل دین حق کا وہ خاص وصف ہے جو اسے دوسرے مذاہب سے ممتاز کرتا ہے۔ جانوروں کے حلال و حرام ہونے کے احکام میں فسق کی تعبیر اس لیے اختیار کی گئی کہ اسلام سے پہلے کھانے پینے میں مذہبی عقائد نہایت درجہ سخت اور تنگ تھے۔ یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے بیجا قیدیں ہٹا دیں اور وہم پرستی کے عنصر سے دین کو پاک کر دیا۔

کفر سے معاشرتی انقطاع

۱۸۔ مسلمانو! جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ہے وہ آج تمہارے دین کی طرف سے مایوس ہو چکے ہیں۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جبکہ زندگی کے ہر شعبہ میں اور علوم ہدایت کے ہر باب کے متعلق اصول و قواعد اس طرح ہموار ہو چکے تھے اور فروع و جزئیات کا بیان بھی اتنی کافی تفصیل اور جامعیت سے کیا جا چکا تھا کہ پیروان اسلام کے لیے قیامت تک قانون الٰہی کے سوا کوئی قانون قابل التفات نہیں رہا تھا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے ہزاروں سے متجاوز خدا پرست، جانباز اور سرفروش فدائیوں اور معلموں کی اسی عظیم الشان جماعت تیار ہو چکی تھی جس کو قرآنی تعلیم کا مجسم نمونہ کہا جا سکتا تھا، مکہ فتح ہو چکا تھا صحابہ کرام کامل وفاداری کے ساتھ خدا سے عہد و پیمان پورے کر رہے تھے۔ نہایت گندی غذائیں اور

مردار کھانے والی قوم مادی اور روحانی طیبات سے ذائقہ سے لذت اندوز ہو رہی تھی۔ شعائر اللہ کا ادب اور احترام قلوب میں راسخ ہو چکا تھا۔ ظنون واوہام اور انصاب وازلام کا تارپود بکھر چکا تھا۔ شیطان جزیرۃ العرب کی جانب سے ہمیشہ کے لیے مایوس کر دیا گیا تھا کہ دوبارہ وہاں اس کی پرستش ہو سکے۔ ان حالات میں ارشاد ہوا الیوم یئس الذین کفروا من دینکم یعنی آج کفار اس بات سے مایوس ہو گئے کہ تم کو تمہارے دین سے ہٹا کر پھر انصاب وازلام وغیرہ کی طرف لے جائیں یا دین اسلام کو مغلوب کرنے کی توقعات باندھیں یا احکام وغیرہ میں کسی قسم کی تحریف و تبدیلی کی اُمید قائم کر سکیں لے

کافروں کو تمہارے دین کی طرف سے مایوسی ہو چکی ہے یعنی تمہارا دین ایک مستقل نظام بن چکا ہے اور خود اپنی حاکمانہ طاقت کے ساتھ نافذ و قائم ہے۔ کفار جو اب تک اس کے قیام میں مانع رہے ہیں اب اس طرف سے مایوس ہو چکے ہیں کہ وہ اسے مٹا سکیں گے اور تمہیں پھر پچھلی جاہلیت کی طرف واپس لے جا سکیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک تو وہ اس طمع خام میں مبتلا رہے ہیں کہ وہ دین اسلام کو یا مغلوب کر لیں گے یا کچھ لو اور کچھ دو کے اصول پر کوئی ایسا سمجھوتہ کر لیں گے کہ دونوں کا نباہ ہو سکے لیکن اب ان کی اس طمع خام کا خاتمہ ہو گیا ہے۔ اب انہوں نے کھلی آنکھوں دیکھ لیا ہے کہ دونوں راہیں ایک دوسرے سے اس طرح الگ الگ ہو گئی ہیں کہ اب ان کا کسی نقطہ اتصال پر جمع ہونا بالکل ناممکن ہے۔ یہ بات دھیان میں رہے کہ کھانے پینے کی چیزوں کے اشتراک کو معاشرتی ارتباط میں بڑا دخل ہوتا ہے۔ اگر صورت حال یہ پیدا ہو جائے کہ ایک سے یہاں جو چیزیں حلال وطیب ہوں دوسرے کے یہاں وہ حرام اور خبیث قرار دے دی جائیں تو اس کے معنے یہ ہوئے کہ دونوں میں مکمل معاشرتی انقطاع کا اعلان ہو گیا۔ اب ان دونوں کے مل بیٹھنے کی کوئی صورت باقی نہیں رہی ہے۔ قدرتی طور پر اس چیز نے ان کو اسلام اور مسلمانوں سے آخری درجہ میں مایوس کر دیا۔ آخری مایوسی سے بعض مرتبہ آخری جھلاہٹ بھی پیدا ہوتی ہے۔ لیکن یہ مریض کا آخری سنبھالا ہوتی ہے جس کے بعد آخری ہچکی کے سوا کوئی اور چیز باقی نہیں رہ جاتی۔

میرے سوا کسی سے نہ ڈرو

۱۹۔ لہٰذا ان سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو۔ یعنی آج تمہیں کامل و مکمل دین مل چکا ہے جس

لے افادات شیخ الاسلام

میں کسی ترمیم کا آئندہ امکان نہیں ہے۔ خدا کا انعام تم پر پورا ہو چکا ہے جس کے بعد تمہاری جانب سے اس کے ضائع کر لینے کا کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ خدا نے ابدی طور پر اسی دینِ اسلام کو تمہارے لیے پسند کیا ہے اس لیے اب کسی ناسخ کے آنے کا بھی احتمال نہیں ہے ایسے حالات میں تم کو کفار سے خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے وہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکتے ہیں۔ البتہ اس محسن جلیل اور منعم حقیقی کی ناراضگی سے ہمیشہ ڈرتے رہو جس کے ہاتھ میں تمہاری ساری سنجاح و فلاح اور کل سُود و زیاں ہے۔ گویا فلا تخشوھم واخشونی میں اس پر متنبہ فرما دیا کہ آئندہ مسلم قوم کو کفار سے اس وقت تک کوئی اندیشہ نہیں جب تک ان میں خشیتِ الٰہی اور تقویٰ کی شان موجود ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اس دین کے احکام اور اس کی ہدایات پر عمل کرنے میں اب کسی کافر طاقت کے غلبہ و قہر اور دراندازی و مزاحمت کا خطرہ تمہارے لیے باقی نہیں رہا ہے۔ انسانوں کے خوف کی اب کوئی وجہ نہیں رہی ہے۔ اب تمہیں خدا سے ڈرنا چاہیے کہ اس کے احکام کی تعمیل میں اگر کوئی کوتاہی تم نے کی تو تمہارے پاس ایسا کوئی عذر نہ ہوگا جس کی بنا پر تمہارے ساتھ کچھ بھی نرمی کی جائے اب شریعت کی خلاف ورزی کے معنے یہ نہیں ہیں کہ تم دوسروں کے اثر سے مجبور ہو بلکہ اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ تم خدا کی اطاعت کرنا چاہتے ہو۔[2] یہ گویا وعدہ الٰہی ہے کہ اب تشویش کی چیز کفار کا غلبہ نہیں بلکہ احکامِ شریعت سے تجاوز اور ان سے روگردانی ہے۔ یہی چیز اہل ایمان کو نقصان پہنچا سکتی ہے اور ان کے ملی وجود کے لیے خطرہ کا باعث بن سکتی ہے۔ خشیتِ الٰہی ہی ایک ایسی چیز ہے جس کی کمی اہل ایمان میں ضعف پیدا کر سکتی ہے نہ کہ اہلِ کفر کی کوئی خارجی قوت۔

ان سے مت ڈرو اور مجھ سے ڈرو، کا مطلب یہ ہے کہ اب ان کے دوبارہ غلبہ کا اندیشہ مت کرو۔ ہاں احکام الٰہی کی خلاف ورزی اور حدود اللہ کے توڑنے سے بچو اور اس سے ڈرو یعنی اگر تم کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اس وجہ سے پہنچے گا کہ تم اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرو گے اور اگر تم اپنے عہد پر مضبوط ہو تو کفر کا خوف مت کرو۔ اس میں دین اسلام کے کمال غلبہ اور اسلامی حکومت کے دنیا میں پھیل جانے کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی دنیا میں تمہارا اس قدر غلبہ ہوگا کہ دنیا کی کوئی طاقت تم کو برباد نہ کر سکے گی، لیکن اگر تم احکام الٰہی کی پیروی نہ کرو گے تو یہ تمہارا تغافل تمہیں اس مقام رفیع سے گرا دے گا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ کا ذکر جس کا قرآن بار بار ذکر کرتا ہے۔ امام راغب نے اس خشیت کے معنے یہ بتاتے ہیں کہ اللہ کے خوف سے مراد وہ خوف ہے جس میں تعظیم کی آمیزش ہو یعنی اس کی عزت اور محبت دل میں ہو، ظاہر ہے کہ محبوب چیز کا خوف یہ نہیں ہوتا کہ انسان اس سے بھاگتا ہے بلکہ خوف واقعی یہ ہے کہ کوئی بات نہ پیدا ہو جائے کہ انسان اپنے محبوب سے دور ہو جائے یا کوئی امر اس کی ناراضگی کا انسان سے سرزد ہو جائے۔ لہٰذا خشیت اللہ کے معنے یہی ہیں کہ حدود اللہ کو توڑنے کا خوف ہو۔ اسی لیے قرآن میں خشیت اللہ کی نسبت علماء کی طرف کی ہے کیونکہ وہ حدود الٰہی کا علم رکھتے ہیں اور صفات الٰہی سے واقف ہوتے ہیں اور حدود اللہ کو توڑنے کی جرأت نہیں کرتے اور اپنے عہد و میثاق پر قائم رہتے ہیں۔

تکمیلِ دین کا اعلان

۲۰ - آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمت تم پر پوری کر دی اور تمہارے لیے میں نے دین اسلام پسند کر لیا۔ یعنی اس کے اخبار و قصص میں پوری سچائی، بیان میں پوری تاثیر اور قوانین و احکام میں پورا توسط و اعتدال موجود ہے جو حقائق کتب سابقہ اور دوسرے ادیان سماویہ میں محدود و ناتمام تھیں۔ ان کی تکمیل و تتمیم اس دین قیم سے کر دی گئی ہے۔ قرآن و سنّت نے حلت و حرمت وغیرہ کے متعلق تنصیصاً یا تعلیلاً جو احکام دیے ان کا اظہار و ایضاح تو ہمیشہ ہوتا رہے گا لیکن اضافہ و ترمیم کی گنجائش نہیں چھوڑی۔

سب سے بڑا احسان تو یہ ہے کہ اسلام جیسا مکمل اور ابدی قانون اور خاتم الانبیاء جیسا نبی تم کو مرحمت فرمایا۔ مزید برآں اطاعت و استقامت کی توفیق بخشی۔ روحانی غذاؤں اور دنیوی نعمتوں کا دسترخوان تمہارے لیے بچھا دیا۔ حفاظت قرآن، غلبہ اسلام اور اصلاح عالم کے سامان مہیا کر دیے لہٰذا اس کامل عالمگیر اور مکمل دین کے بعد اب کسی اور دین کا انتظار کرنا سفاہت ہے اسلام جو تفویض و تسلیم کا مرادف ہے اس کے سوا مقبولیت اور نجات کا کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔

اس آیت الیوم اکملت لکم دینکم کا نازل فرمانا بھی من جملہ نعمائے عظیم ایک نعمت ہے۔ اسی لیے بعض یہود نے حضرت عمرؓ سے عرض کیا کہ امیرالمومنین اگر یہ آیت ہم پر نازل ہوتی تو ہم اس کے یوم نزول کو عید منایا کرتے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا کہ مجھے معلوم نہیں ہے کہ جس روز

یہ ہم پر نازل کی گئی مسلمانوں کی دو عیدیں جمع ہو گئی تھیں۔ یہ آیت ۱۰ھ میں حجۃ الوداع کے موقعہ پر عرفہ کے روز جمعہ کے دن عصر کے وقت نازل ہوئی جبکہ میدان عرفات میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اونٹنی کے گرد چالیس ہزار سے زائد اتقیاء و ابرار کا مجمع کثیر تھا۔ اس کے بعد صرف ۸۱ روز حضور اس دنیا میں جلوہ افروز رہے[1]

اس آیت میں تکمیل دین کا اعلان ہے۔ سورۂ بقرہ کی آیت ۱۲۸ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا نقل کی گئی تھی کہ ان کی نسل میں اُمتِ مسلمہ پیدا ہو جائے، پھر آیت ۱۵۰ دوسری جلد میں فرمایا تھا کہ خدا چاہتا ہے کہ تم پر اپنی نعمت پوری کرے لاتم نعمتی علیکم یہاں فرمایا کہ آج کے دن خدا نے تمہارا دین کامل کر دیا اور خدا نے تم پر اپنی نعمت پوری کر دی اور اُمتِ مسلمہ اپنے تمام مقاصد و خصائص کے ساتھ ظہور میں آگئی اور اللہ نے تمہارے لیے اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لیا۔ یہاں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔

اول یہ کہ تمہارا دین کامل کر دیا

دوسرے یہ کہ اپنی نعمت تم پر پوری کر دی

تیسرے یہ کہ اسلام کو بطور دین اللہ نے تمہارے لیے پسند کر لیا۔

دین کو کامل کر دینے سے مراد اس کو ایک مستقل نظامِ فکر و عمل اور ایک ایسا مکمل نظام تہذیب و تمدن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ایک ایسا دین ہے جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور جو قدم بھی اٹھانا چاہتا ہے اس کی ہدایت سامنے موجود پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوتے ہے۔ کچھ اسی طرح جس طرح ہوا کا کرہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لیے ہوتے ہے۔

ہم یہاں اس نظام کے اہم اجزا کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتے ہیں تاکہ ایک طرف تو اس دعوے کا مکمل ثبوت بھی سامنے آجائے، دوسری طرف یہ بھی معلوم ہو جائے کہ دین ہے کیا! لیکن قبل اس کے کہ کمال دین کا تعارف کرایا جائے دو تین اصولی باتوں کو اچھی طرح ذہن نشین

[1] افادات شیخ الاسلام

کر لینا چاہیے۔

اوّل یہ کہ اس دین کا ہر جزو ایک ہی مرکز سے وابستہ ہے ایک ہی رُوح ہے جو ان سب کے اندر دوڑ رہی ہے یہ مرکز اور یہ رُوح وہی افکار و عقائد ہیں جن کو قرآن ایمانیات کہتا ہے اور ان میں سے بھی خصوصیت کے ساتھ یہ عقیدہ کہ اللہ تعالیٰ ہی ہمارا تنہا معبود و اصل حاکم اور حقیقی قانون ساز ہے دراصل یہی بنیادی وہ جڑ ہے جس سے بالکل فطری انداز میں اس دُنیا کا پورا نظام پایۂ تکمیل کو پہنچا ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس دین کی کارفرمائی ایک ایسے معاشرے کے وجود پر موقوف ہے جو مسلم ہو جسے اللہ اور اس کی صفات پر گہرا یقین ہو جو آخرت پر سچا یقین رکھتا ہو اور جو محمد رسول اللہ کو دل سے اللہ کا نبی اور آخری نبی تسلیم کرتا ہو اس لیے اس دین کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اسے ایک ایسے ہی معاشرے کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھا جائے۔ لکم سے اسی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔

تیسری بات یہ کہ اس نظام کے مختلف حصے آپس میں مضبوطی کے ساتھ جڑے ہوئے ہیں جس طرح مشین کے مختلف پرزے باہم جڑے ہوتے ہیں اس لیے نظری طور پر سمجھنے کے لیے تو انہیں الگ الگ قانون میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مگر عملی طور پر ان کا علیحدہ علیحدہ وجود قریب قریب ناممکن ہے۔ اپنی کارکردگی کے اعتبار سے یہ سارے اجزاء دراصل ایک وحدت میں ان میں کا کوئی جزو اپنا عمل جوہر اسی وقت دکھا سکتا ہے جب یہ پورا دین کل کا کل حرکت میں ہو جیسا کہ دینکم کی اضافت اسی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔

ان اصولی باتوں کو ذہن نشین کر لینے کے بعد آئیے اب کامل دین کا اجمالی مطالعہ کریں، اسلام صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں یعنی یہ اس طرح کا دین نہیں کہ بندے اور خدا کے درمیان کا بس ایک نجی معاملہ ہو، اگر ایسا ہوتا تو اس کی تعلیمات لازماً انفرادی زندگی کے مسائل تک محدود ہوتیں۔ وہ صرف مسجد کی باتیں کرتا۔ نماز روزے کا حکم دیتا۔ چند اخلاقیات کی تلقین کر دیتا کچھ معاشرتی ہدایتیں دے دیتا اور پھر خاموش ہو رہتا۔ مگر قرآن و سنت کا صفحہ صفحہ گواہی دے رہا ہے کہ صورت واقعہ یہ نہیں ہے اسلام کی مسند ارشاد عبادت گاہوں اور زندگی کے انفرادی دائروں میں ہی بچھی ہوئی نہیں ہے بلکہ وہ بازاروں، کاروباری اداروں، معاشی میدانوں، تمدن کے دائروں میں، سیاست اور حکومت کے ایوانوں غرض زندگی کے ایک ایک شعبے میں ہدایتیں دیتا۔ کچھ باتوں سے روکتا اور کچھ باتوں کا امر کرتا نظر آتا ہے۔ ان میں سے کوئی بات بھی

ایسی نہیں جس کو وہ دین نہ کہتا ہو۔ مثلاً قرآن حکم دیتا ہے کہ زانی کو سو کوڑے مارو، اس کا یہ حکم صریح طور پر ایک ایسا حکم ہے جس کا تعلق پولیس اور عدالت سے ہے۔ اور اس لیے وہ پہلی اجتماعی زندگی کا معاملہ ہے لیکن اس تمام حیثیت وہ خود دین اللہ کی قرار دیتا ہے۔ ولا تاخذکم بھما رافۃ فی دین اللہ۔

اسی طرح قرآن کہتا ہے کہ سال کے چار مہینے حرمت والے ہیں، ان میں جنگ کرنا جائز نہیں ہے۔ قرآن کی یہ ہدایت واضح طور پر جنگی قوانین سے تعلق رکھتی ہے۔ اور ہر شخص جانتا ہے کہ جنگ اجتماعی زندگی کے بالکل آخری مسائل میں سے ہے لیکن قرآن اسے بھی دین قیم قرار دیتا ہے ذالک الدین القیم۔

یہ چند مثالیں اس حقیقت کو کھول دینے کے لیے بالکل کافی ہیں کہ اللہ کا ہر فرمان اور اس کے رسول کا ہر ارشاد اسلام کا حصہ اور دین کا جزو ہے۔

دین کے کامل کر دینے کا یہاں یہ مطلب نہیں ہے کہ دوسرے تمام دینوں کو جو آدم تا عیسیٰ علیہم السلام چلے آ رہے تھے ان کو ناقص کہا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ وہ جن لوگوں کی ہدایت کے لیے آئے تھے ان کی ہدایت کا ان کے اندر پورا سامان نہیں تھا۔ ایسا سمجھنا بالکل غلط ہوگا اس کے برخلاف حقیقت واقعہ یہ ہے کہ ان ادیان میں سے جو دین بھی آیا وہ اس قوم، اس زمانے اور اس علاقے کی اصلاح کے لیے بالکل کافی تھا جس کے لیے اسے نازل کرنے والے نے نازل کیا تھا۔ لیکن چونکہ ان میں کا ہر دین صرف ایک قوم کے لیے تھا۔ تمام انسانوں کے لیے نہ تھا۔ صرف ایک محدود علاقے کے لیے تھا پوری دنیا کے لیے نہ تھا صرف ایک خاص زمانے اور محدود مدت کے لیے تھا۔ ہمیشہ کے لیے نہ تھا اس لیے قدرتی طور پر اس میں نہ عالمی معاملات و مسائل کے بارے میں ہدایتیں ہوتی تھیں۔ نہ اس کی ساری تعلیمات کا مزاج بین الانسانی ہوتا تھا نہ وہ دور مستقبل کے مسائل کو سامنے رکھ کر گفتگو کرتا تھا۔ غرض جس طرح اس کی مخاطبت کا دائرہ محدود تھا۔ اسی طرح اس کی تعلیمات کا مجموعہ بھی مختصر اور محدود تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ کی مشیت اور حکمت کا فیصلہ یہ ہوا کہ اب ایسا دین روانہ کیا جائے جو سب کے لیے ہو اور ہمیشہ کے لیے ہو تو اس فیصلے کا فطری تقاضا تھا کہ اس نبی پر نازل ہونے والے دین کا مزاج بین الاقوامی ہو اور اس کی تعلیمات ہر زمانے ہر ملک اور ہر طرح سے انسانی مسائل پر حاوی ہوں۔ قرآن حکیم کی یہ گرامی قدر آیت اسی فطری تقاضے کی تکمیل کا اعلان کر رہی ہے۔ اس کا منشا یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ

کی جو ہدایت آدم علیہ السلام کے زمانے سے اترنی شروع ہوئی تھی اور جو نوع انسانی کے ذہنی اور تمدنی ارتقاء کے ساتھ تفصیل اور وسعت کا رنگ اختیار کرتی چلی آرہی تھی۔ وہ آج ہر پہلو سے کمال کے درجے کو پہنچ گئی ہے اور اب ایک مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے تمام پہلوؤں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اس میں روحانی نظام، اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام اور قانونی نظام کامل اور مکمل ہے۔

اکمال دین کے فطری تقاضے

دوسرے دینوں کے مقابلے میں اسلام کی اس امتیازی حیثیت کو نگاہ میں رکھیے اور پھر اس بات پر غور کیجیے کہ اکمال دین کے لازمی تقاضے کیا ہوسکتے ہیں۔ کیا یہ کہ اس امتیاز کے باوجود اس نبوت کا بھی مرتبہ و مقام ہر پہلو سے ٹھیک وہی ہوگا جو دوسری نبوتوں کا ہے اور کیا اسلام کا حق بھی ویسا ہوگا جیسا کہ دوسرے دینوں کا ہے۔ اس سوال کے جواب میں عقل و انصاف اور قرآن و حدیث ہر ایک کا فیصلہ صاف نفی میں ہے۔ ان کے نزدیک اکمال دین کے فطری تقاضے لازماً بالکل دوسرے ہوں گے۔

۱۔ اکمال دین کا پہلا فطری اور لازمی تقاضا تو یہ ہے کہ دوسرے تمام ادیان منسوخ ہوچکے ہیں اور اب اللہ تعالیٰ کے نزدیک منظور شدہ دین صرف اسلام ہے۔ ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانے کا انسان اسی کی پیروی کرے کیونکہ جب دین ساری دنیا کا دین اور اس کا لانے والا پیغمبر پوری نوع انسانی کا پیغمبر قرار دیا گیا ہے تو اب کسی اور دین اور پیغمبر کا زمانہ باقی نہیں رہ سکتا۔ رسول تو آتا ہی اس لیے ہے کہ جن لوگوں کی طرف بھیجا گیا ہے وہ اسے اللہ کا رسول تسلیم کریں اور اس کی غیر مشروط پیروی کریں۔ یہ ایک مسلمہ اصولی حقیقت ہے کہ

ما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے معاملے میں یہ مسلمہ اصولی حقیقت محض بے معنی الفاظ نہ رہ جائے گی۔ کوئی وجہ نہیں کہ یہاں بھی اس اصول کا اسی طرح اطلاق نہ ہو جس طرح کہ دوسرے تمام انبیاء کے سلسلے میں ہوتا ہے۔ اس لیے آپ کا سارے انسانوں کی طرف مبعوث ہونا اور پھر آخری رسول ہونا اور دین کامل کے کر آنا اس بات کا کھلا تقاضا کرتا ہے کہ ہر انسان اور ہر زمانے کا انسان آپ پر ایمان لائے اور آپ کے لائے ہوئے کامل دین کو اپنا دین مان کر لازماً اسی کی پیروی کا

سے اگر کوئی شخص آپ کی نبوت کو نہیں مانتا اور آپ کے لائے ہوئے دین کا حلقہ اپنی گردن میں نہیں ڈالتا تو یہ آپ کے نہیں بلکہ اس فرمانروائے کائنات کے خلاف بغاوت ہے جس نے آپ کو پوری دنیا کا ہادی اور آخری نبی بنا کر بھیجا ہے۔

اس کے علاوہ جب قرآن کے سوا اب دوسری کوئی ایک کتاب بھی ایسی نہیں رہ گئی ہے جو پوری طرح محفوظ ہو اور جس کی اصل زبان دنیا کی مردہ زبانوں میں شامل نہ ہو چکی ہو تو دوسری کتابوں اور شریعتوں کی ٹھیک ٹھیک پیروی ممکن بھی کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ صورتِ حال تو گویا خود ان کتابوں اور شریعتوں کا اقراری بیان ہے کہ اب عملاً زمانہ ختم ہو گیا ہے۔

کمال دین کا دوسرا فطری اور لازمی تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی ذات اگر جامع الکمالات ہے تو ضروری ہے کہ جو جامع الکمالات کا نمائندہ ہو وہ بھی مجمع الکمالات ہو۔ کمال علمی کی حد تک قرآن حکیم ایک جامع کتاب ہے تو قرآن کے نقش کو بھی مجمع ہونا چاہیے۔ تاکہ نمونہ کو مکمل نمونہ اور عمل کو نقش قرآن کہا جا سکے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اگر دین کامل ہے تو جو ذات کامل دین لے کر آئی ہے ضروری ہے کہ وہ بھی تکملہ حضور کا نمونہ ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان کاملیت کا جلوہ دیکھنا ہو اور کمال علم بسیاہ گمال عمل کی مائش گاہ اگر آپ مطالعہ کرنا چاہیں تو مختصراً یوں سمجھئے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خواہ خلوت میں ہوں یا جلوت میں، مسجد میں ہوں یا میدان جہاد میں، نماز شبانہ میں مصروف ہوں یا فوجوں کی درستی میں، منبر پر ہوں یا گوشہ تنہائی میں۔ ہر وقت اور ہر شخص کو حکم تھا کہ جو کچھ میری حالت اور کیفیت ہو وہ سب منظرِ عام پر لائی جائے۔ ازواجِ مطہرات آپ کے خلوت خانوں کے حالات سنانے اور بتانے میں مصروف رہیں۔ مسجد نبوی میں ایک چبوترہ ان عقیدت مندوں کے لیے تھا جن کے رہنے کو گھر نہ تھے۔ وہ باری باری دن کو جنگل سے لکڑیاں کاٹ کر لاتے اور اس سے روزی حاصل کرتے اور سارا وقت آپ کے ارشادات سنتے آپ کے حالات دیکھتے اور آپ کی معیت میں گزارنے کے لیے صرف کرتے تھے۔ ان کی تعداد ستر کے قریب تھی، ان ہی میں حضرت ابوہریرہ ہیں جن سے زیادہ کسی صحابی کی روایات نہیں ہیں۔ یہ ستر ہستیاں معتقد جاسوسوں کی طرح شب و روز ذوق و شوق کے ساتھ آپ کے حالات دیکھتے اور دوسروں سے ان کے بیان کرنے میں مصروف رہتی تھیں۔ دن میں پانچ وقت مدینہ میں رہنے والی تمام آبادی دس برس تک مستقل آپ کی ایک ایک حرکت و سکون ایک ایک جنبش کو دیکھتی رہی۔ غزوات اور لڑائیوں کے موقع پر ہزارہا صحابہ کو شب و روز آپ کے دیکھنے اور آپ کے

حالات مبارکہ سے واقف ہونے کا موقعہ ملتا تھا۔ غزوہ فتح مکہ میں دس ہزار، تبوک میں تیس ہزار اور حجۃ الوداع میں تقریباً ایک لاکھ صحابہ کو آپ کی زیارت کا موقعہ ملا تھا۔ اور خلوت وجلوت گھر باہر، صفہ اور مسجد حلقہ تعلیم اور میدان جنگ تک میں جس نے جس حال میں آپ کو دیکھا، اس کی عام اشاعت کی نہ صرف اس کو اجازت بلکہ حکم اور تاکید تھی۔ اب آپ سمجھ سکتے ہیں کہ آپ کی زندگی کا کون سا پہلو ہوگا جو زیر پردہ رہا ہوگا اور اس پر بھی ایک شخص تک آپ پر خردہ گیری ذکر سکا۔ آج بھی آپ کے دشمن اور مخالف پوری چھان بین اور تلاش وجستجو کے بعد آپ پر کوئی حرف گیری نہ کر سکے تو اب ایسی زندگی کو کامل زندگی کہنا زیبا ہے یا ان زندگیوں کو جن کا بڑا حصہ ہماری نگاہوں سے اوجھل اور پوشیدہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ السلام کی زندگی کا کوئی پہلو تاریک نہیں رہا ہے اور نہ ناقص، بلکہ آپ کی زندگی ہر پہلو سے اپنے اندر کمال ہی کمال رکھتی ہے۔

باسورتھ سمتھ کی یہ شہادت پیش کرنے کے لائق ہے۔

یہاں پورے دن کی روشنی ہے جو ہر چیز پر پڑ رہی ہے اور ہر ایک تک وہ پہنچ سکتی ہے۔ شخصیت کی تاریک گہرائیاں درحقیقت اور ہماری پہنچ کے خطہ سے باہر وہ ہمیشہ رہیں گی لیکن ہم محمد کی بیرونی تاریخ کی ہر چیز کو جانتے ہیں۔ ان کی جوانی، ان کا ظہور، ان کے تعلقات، ان کے عادات، ان کا پہلا تخیل اور تدریجی ترقی ان کی عظیم الشان وحی کا تو بت بر نوبت آنا، اور ان کی اندرونی تاریخ کے لیے اس کے بعد کہ ان کے مشن کا اعلان کیا جا چکا۔ ہم ایک کتاب قرآن رکھتے ہیں جو اپنی اصلیت میں اپنے محفوظ رہنے میں اپنے مضامین کی بے ترتیبی میں بالکل یکتا ہے لیکن اس کی جوہری صداقت کوئی شخص کبھی سنجیدہ شک نہ کر سکا۔ اگر کوئی کتاب ہم ایسی رکھتے ہیں جو اپنے زمانے کے ماسٹر اسپرٹ کا آئینہ ہو تو یہ کتاب ہے۔ عمداً تصنع اور بناوٹ سے پاک غیر مرتب ٹھکا ٹھیٹے والی لیکن چند عظیم الشان خیالات سے معمور ایک دماغ جو اس روحانیت سے لبریز جو اس کے اندر بند ہے خدا کے نشہ میں مست و سرشار لیکن انسانی کمزوریوں کے ساتھ جن سے پاک ہونے کا کبھی انہوں نے دعویٰ نہیں کیا۔

اور مشہور مورخ گبن کے الفاظ میں

کسی ابتدائی پیغمبر نے کبھی صداقت کا کوئی ایسا سخت امتحان پاس نہیں

کیا جیسا کہ محمد نے۔ جب کہ آپ نے پہلا پہل اپنے کو بحیثیت پیغمبر کے ان لوگوں کے سامنے پیش کیا جو اس کی کمزوریوں سے بحیثیت ایک انسان ہونے کے واقف تھے وہ لوگ جو اس سے سب سے زیادہ واقف تھے ان کی بیوی، ان کا غلام، ان کا چچازاد بھائی اور ان کا سب سے پرانا دوست جس نے جیسا کہ محمد نے خود کہا ہے کہ اس کے پیروؤں میں سے ایک ہے۔ جس نے دہشت پھیری اور نہ گھبرایا۔ یہی لوگ اس کے سب سے پہلے معتقد ہوئے۔ پیغمبروں کی عام قسمت محمد کے حق میں بالکل الٹ گئی۔

ان شہادتوں کا مطلب یہ ہے کہ جو جس قدر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے باخبر اور واقف تھا۔ اسی قدر زیادہ ان کا عقیدت مند تھا۔ عام پیغمبروں کا یہ اصول رہا ہے کہ پہلے ان کو واقفوں نے مانا ہے، اس کے بعد گھر والوں کی باری آتی ہے مگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معاملہ اس سے مختلف ہے۔ آپ کو سب سے پہلے انہوں نے مانا جو آپ کے اخلاق عادات اور معاملات سے زیادہ واقف تھے اور ان میں سے ہر ایک نے اپنے ایمان واعتقاد کا شدید خطرناک امتحان دیا ہے۔ حضرت خدیجۃ الکبریٰ تین برس تک آپ کے ساتھ شعب ابی طالب میں محصور رہیں، جس میں بھوک اور فقر و فاقہ سے دوچار ہونا پڑا۔ حضرت ابوبکر صدیق نے اس وقت جب ہر چہار طرف دشمن تعاقب میں تھے۔ رات کی تاریکی میں آپ کے ساتھ خطرناک رفاقت کا حق ادا کیا۔ حضرت علی نے اس بستر پر قدم رکھا جو صبح کو مقتل بننے والا تھا۔ حضرت زید غلام خاص وہ تھے جو پتہ ملنے پر بھی اپنے باپ کے اصرار کے باوجود آپ سے جدا نہ ہوئے۔

گاڈفری ہیگنس اپالوجی فار محمد میں کہتا ہے:

> عیسائی اس کو یاد رکھیں تو اچھا ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام نے وہ نشہ آپ کے پیروؤں میں پیدا کر دیا تھا جس کو عیسیٰ کے ابتدائی پیروؤں میں تلاش کرنا بے سود ہے۔ جب عیسیٰ کو سولی پر لے گئے تو ان کے پیروکار بھاگ گئے۔ ان کا نشہ دینی جاتا رہا اور اپنے مقتدا کو موت کے پنجے میں گرفتار چھوڑ کر چل دیے برعکس اس کے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے پیرو اپنے مظلوم پیغمبر کے گرد جمع ہوئے اور آپ کے بچاؤ میں اپنی جانیں خطرہ میں ڈال کر کل دشمنوں پر اس کو غالب کر دیا۔

یہ جاں نثاری ان میں تھی جو آپ کو ہر طرح اور ہر حیثیت سے جانتے تھے کیا ایسے شخص کے ساتھ جس کی زندگی اس کے ساتھیوں اور رفیقوں میں کامل نہ ہو اس لائق ہو سکتی ہے کہ اس پر

وہ جانیں قربان کریں۔

اسی کمال کی بنا پر قرآن نے آپ کی زندگی کو کامل ترین نمونہ بنایا ہے اور اس کی پیروی کو خدا کی محبت کا ذریعہ بتایا ہے۔

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

آپ کی اتباع یعنی مجمع الکمالات کی زندگی کی نقل کو خدا کی محبت کا معیار قرار دیا۔ قرآن کی نگاہ میں آپ کی حیات ایک مسلمان کے لیے کامل نمونہ ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس نمونے کے سارے پہلو سب کے سامنے ہونے چاہئیں اور وہ سب کے سامنے ہیں، اسی سے ثابت ہوتا ہے کہ آپ کی زندگی کے سلسلے کی کوئی کڑی گم نہیں ہے کوئی واقعہ زیر پردہ نہیں ہے۔ جو کچھ ہے وہ تاریخ کے صفحات میں آئینہ ہے۔ اور یہی ایک ذریعہ کسی زندگی کے کامل معصوم اور بے گناہ یقین کرنے کا ہے نیز ایسی ہی زندگی جس کے ہر پہلو اس طرح روشن ہوں انسانوں کے لیے نمونہ کا کام دے سکتی ہے۔

دنیا میں بابل، اسیریا، ہندوستان و چین، مصر و شام اور یونان و روم میں بڑے بڑے تمدن پیدا ہوئے۔ اخلاق کے بڑے بڑے نظریے قائم کیے گئے۔ تہذیب و شائستگی کے بڑے بڑے اصول بنائے گئے، اٹھنے بیٹھنے، کھانے پینے، ملنے جلنے، پہننے اوڑھنے، رہنے سہنے، سونے جاگنے، شادی بیاہ، مرنے جینے، غم و مسرت، دعوت و ملاقات، مصافحہ و سلام، غسل و طہارت، عبادت و تعزیت، تبریک و تہنیت، دفن و کفن کے رسوم و آداب، شرائط اور ہدایات مرتب ہوئے اور ان سے ان قوموں کی تہذیب و تمدن اور معاشرت کے اصول بنائے گئے۔ یہ اصول صدہا سال میں بنے۔ پھر بھی بگڑ گئے، صدیوں میں ان کی تعمیر ہوئی تاہم وہ فنا ہو گئے۔ لیکن اسلام کا یہ تمدن چند برسوں میں بنا اور تعمیر ہوا اور ۱۴ سو برس سے کل روئے زمین کی سینکڑوں مختلف اقوام میں یکسانی کے ساتھ قائم ہے، کیونکہ اس کا ماخذ ایک ہے اور وہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ہے۔ اس زندگی کے آئینے میں صحابہ نے اپنی زندگیاں سجائیں اور ان کا عکس تابعین نے اتارا اور اس طرح وہ تمام دنیائے اسلام کا عمل اور رسم بن گئی۔ وہ مقدس زندگی مرکزی نقطہ تھی، صحابہ نے اس کو خط اور بعد کی نسلوں نے اسے دائرہ بنا دیا۔ وہ تمدن اگرچہ آج مکمل نہیں مگر اس کے نقش قدم آج بھی ہیں اور اسی پر کل مسلمان چل رہے ہیں۔ ایک محمد رسول اللہ کی زندگی تھی جو سارے صحابہ کی زندگی بن گئی اور وہی کبھی دنیائے اسلام

کی زندگی تھی۔ افریقہ یا ہندوستان کا کوئی قبیلہ آج جب عیسائی ہوتا ہے تو اس کو مذہب اگرچہ انجیل سے ملتا ہے لیکن تمدن و تہذیب اور عملی زندگی کا سبق یورپ کے ساختہ تمدن سے سکھایا جاتا ہے لیکن وحشی سے وحشی قبیلہ جو مسلمان ہوتا ہے اس کو جہاں سے روحانی نظام ملتا ہے وہیں سے تمدن و تہذیب اور شائستگی کا سبق بھی ملتا ہے۔ مسلمان ہونے کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی انسانی ضروریات اور حالات کے ساتھ اس کے سامنے آجاتی ہے اور یہ بولتی چالتی، جیتی جاگتی تصویر ہر مسلمان کی زندگی کی ہر حالت اور ہر کیفیت کا آئینہ بن جاتی ہے۔ گویا سیرت محمدی دُنیا کا آئینہ خانہ ہے جس میں دیکھ کر ہر شخص اپنے جسم و رُوح، ظاہر و باطن، قول و عمل، زبان و دل، آداب و رسوم، طور و طریق کی اصلاح کر سکتا ہے اور اسی لیے مسلمان اپنی شائستگی اور ادب و اخلاق کے لیے محمد رسول اللہ سے باہر اور آپ کی سیرت سے الگ کوئی چیز نہیں مانگتی۔ اور نہ اس کو اس کی ضرورت ہے۔ سیرت محمدی دُنیائے اسلام کا عالمگیر آئینہ ہے اسی کے مقابلے سے حسن و قبح اور نیکی و بدی کا راز اس پر کھلتا ہے۔ اور چونکہ کوئی انسانی کامل زندگی اس استیعاب و استقصاء کے دُنیا کے سامنے موجود نہیں ہے اس لیے تمام انسانوں کے لیے بھی ایک کامل نمونہ ہے اور ایسی ہی کامل اور بے پردہ زندگی انسانوں کے لیے قابل نمونہ ہو سکتی ہے[1]

بہر حال دین کو مکمل کرنے سے مقصود اس کو ایک مستقل نظام و فکر اور ایک ایسا مکمل نظام تہذیب و تمدن بنا دینا ہے جس میں زندگی کے جملہ مسائل کا جواب اصولاً یا تفصیلاً موجود ہو اور ہدایت و رہنمائی حاصل کرنے کے لیے کسی حال میں اس سے باہر جانے کی ضرورت پیش نہ آئے۔

کمال دین اور ختم نبوت

کمال دین اور ختم نبوت لازم و ملزوم ہیں یعنی جیسے آپ کی نبوت عالمگیر ہے اسی طرح ہمیشہ کے لیے بھی ہے۔ آپ کے ساتھ وحی و رسالت کا سلسلہ اپنی آخری حد کو پہنچ گیا اور قیامت تک اب کوئی رسول نہیں آئے گا۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ولکن رسول اللہ وخاتم النبیین خاتم مہر کو کہتے ہیں۔ جب کسی لفافے یا دستاویز پر مہر لگا دی جاتی ہے تو اس کے بعد اس میں کوئی

---

[1] خطبات مدراس

چیز نہیں ڈال جاسکتی یا کسی اور بات کا اضافہ نہیں کیا جاسکتا۔ بلکہ یوں کہیے کہ اس طرح کسی کی بات کا عملی امکان ہی ختم ہو جاتا ہے۔ اسی لیے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کو خود اللہ تعالیٰ کی طرف سے سارے انبیا کا خاتم فرمایا جانا اس حقیقت کا نہایت بلیغ انداز میں اعلان ہے کہ اب دین کامل ہو چکا ہے اور یہ آخری رسول قیامت تک کے لیے ہمارا پیام لے کر آ چکا ہے۔ اس کے بعد کوئی نبی نہیں آئے گا۔ اس کی اہمیت کو جس علمی انداز میں علامہ اقبال نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب تشکیل جدید الٰہیات میں پیش کیا ہے وہ ان ہی کا حصہ ہے۔

> اس نقطہ خیال سے دیکھا جائے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم دنیائے قدیم اور دنیائے جدید کے درمیان بطور حد فاصل کھڑے دکھائی دیں گے۔ اگر یہ دیکھا جائے کہ آپ کی وحی کا سرچشمہ کیا ہے تو آپ دنیائے قدیم سے متعلق نظر آئیں گے۔ لیکن اگر اس حقیقت پر نظر کی جائے کہ آپ کی وحی کی روح کیا ہے ؛ تو جناب کی ذات گرامی دنیائے جدید سے متعلق نظر آئے گی۔ آپ کی بدولت زندگی نے علم کے ان سرچشموں کا سراغ پالیا جن کی اسے اپنی شاہراہوں کے لیے ضرورت تھی، اسلام کا ظہور استقرائی علم کا ظہور ہے۔ اسلام میں نبوت اپنی تکمیل کو پہنچ گئی اور اس تکمیل سے اس نے خود اپنی خاتمیت کی ضرورت کو بے نقاب دیکھ لیا۔ اس میں یہ لطیف نکتہ پنہاں ہے کہ زندگی کو ہمیشہ عہد طفولیت کی حالت میں نہیں دیکھا جاسکتا ہے۔ اسلام نے دینی پیشوائی اور وراثتی بادشاہت کا خاتمہ کر دیا۔ قرآن حکیم غور و فکر اور تجارت و مشاہدات پر بار بار زور دیتا ہے اور تاریخ و فطرت دونوں کو علم انسانیت کے ذرائع ٹھہراتا ہے یہ سب اسی مقصد کے گوشے ہیں جو ختم نبوت کی تہ میں پوشیدہ ہے، پھر عقیدۂ ختم نبوت کی ایک بڑی اہمیت یہ بھی ہے کہ اس سے لوگوں کے باطنی واردات کے متعلق ایک آزادانہ اور ناقدانہ طرز عمل قائم ہوتا ہے اس لیے ختم نبوت کے معنے یہ ہیں کہ اب نوع انسانی کی تاریخ میں کوئی شخص اس امر کا مدعی نہیں ہو سکتا کہ وہ کسی مافوق الفطرت اختیار کی بنا پر دوسروں کو اپنی طاعت پر مجبور کرے۔

اتمام نعمت کیا ہے ؟

اتمام نعمت کا جلد دوم آیت ۱۵۰ میں لاتمـم نعمتی علیکم میں وعدہ کیا گیا تھا، یہاں

اس کو پورا کیا جا رہا ہے۔ اتمام نعمت سے یہاں مراد یہی ہے کہ اُمت ہر جگہ ہر خوف اور ہر بیرونی مداخلت سے محفوظ ہو کر پوری طرح اسلامی تمدن، اسلامی قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے گی اور ان کو یہ طاقت بھی نصیب ہو جائے گی کہ وہ دنیوی منصب امامت کے تقاضے پورے کر سکے۔ کفر کا غلبہ اہلِ ایمان کے لیے سب سے بڑی مصیبت تھا جسے قرآن فتنہ کہتا ہے۔ اس فتنہ سے خلاصی پا کر جب ان کو دارالاسلام میسر آ گیا جس میں نبوت کا لایا ہوا علم و عمل بلا کم و کاست نافذ ہو گیا اور اس کے ساتھ ان کو وہ ذرائع بھی مل گئے جن سے وہ اللہ کی زمین پر کفر و فسق کی جگہ ایمان و تقویٰ کو جاری کر سکیں تو یہ ان پر اللہ کی نعمت کا اتمام تھا۔ اس آیت میں جس وعدہ کے پورا ہونے کی بشارت دی جا رہی ہے وہ وعدہ اُمت سے وراثت کی وجہ سے کیا گیا تھا اور سورۃ فتح میں بھی وعدہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اصالتاً ہوا تھا و يتم نعمتہ عليك۔ دوسرے شارحین قرآن نے یہاں اتمام نعمت سے نعمت ہدایت کی تکمیل مراد لی ہے۔ مولانا دریا بادی فرماتے ہیں کہ اتمام نعمت دین کی تکمیل سے ہوا۔ مولانا اصلاحی فرماتے ہیں اتمام نعمت سے مراد اس آخری شریعت کا اتمام ہے۔ اور مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ نعمت تمام کرنے سے مراد نعمت ہدایت کی تکمیل کر دینا ہے۔ لیکن مفتی محمد شفیع نے عام شاہراہ سے ہٹ کر یہ بات اچھی لکھی ہے کہ ___ اتمام نعمت سے مراد مسلمانوں کا غلبہ اور عروج اور ان کے مخالفین کا مغلوب و مفتوح ہونا ہے جس کا ظہور فتح مکہ کے موقع پر ہوا۔

یہاں الفاظِ قرآن میں یہ بات بھی قابلِ غور ہے کہ دین کے لیے لفظ اکمال اور نعمت کے لیے لفظ اتمام بولا گیا ہے، دونوں میں فرق ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ کسی چیز کا اکمال یہ ہے کہ اس چیز سے جو غرض تھی وہ پوری ہو گئی اور اتمام کے معنی یہ ہیں کہ اب دوسری چیز کی ضرورت نہیں۔ د اس لیے اکمال کا حاصل یہ ہوا کہ قانون الٰہی اور احکام دین کے اس دُنیا میں رواج کرنے کا جو مقصد تھا وہ آج پورا کر دیا گیا اور اتمام نعمت کا مطلب یہ ہے کہ اب مسلمان کسی کا محتاج نہیں ہے۔ ان کو اللہ سبحانہٗ نے غلبہ قوت اور اقتدار عطا فرما دیا ہے جس کے ذریعے وہ اس دینِ حق کے احکام کو جاری اور نافذ کر سکیں گے۔ یہاں حافظ ابن القیم نے یہ بات بڑی لطیف لکھی ہے کہ اس آیت میں دین کی نسبت مسلمانوں کی طرف کی گئی ہے اور نعمت کی نسبت خود اپنی طرف کی ہے۔ وجہ یہ ہے کہ دین کا ظہور اہل ایمان کے افعال و اعمال کے ذریعہ ہوتا ہے اور نعمت کی تکمیل براہ راست اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہے۔

اسلام اللہ کا منظور کردہ دین ہے

اسلام کو بطور دین اللہ نے پسند کر لیا۔ اصل ارشاد میں رضیت لکم الاسلام دینا آیا ہے
یہاں یہ گمان کرنا کسی طرح صحیح نہ ہوگا کہ اس آیت میں اسلام سے مراد عام مفہوم کا اسلام ہے نہ کہ مخصوص
اصطلاحی اسلام، اس لیے اس سے مراد ہر آسمانی مذہب کی پیروی ہو سکتی ہے۔ اس گمان کی یہاں
اس لیے کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس آیت میں لفظ الاسلام استعمال کیا گیا ہے نہ کہ مطلق اسلام
اور جیسا کہ عربی زبان کے اصول کا تقاضا ہے کہ قرآن جب الاسلام بولتا ہے تو اس وقت اس
کے سامنے اسلام کا محض لغوی یا عام مفہوم نہیں ہوتا بلکہ اصطلاحی مفہوم ہی ہوتا ہے۔ لیکن اگر
اس بات سے اتفاق نہ کیا جائے پھر بھی اوپر کے استدلال پر کوئی اثر نہیں پڑتا حقیقت پھر بھی
وہی رہے گی جو بیان کی گئی۔ کیونکہ اس صورت میں آیت کا مفہوم یہی ہوگا۔ اللہ کے نزدیک صحیح
مقبول طریق بندگی یہ ہے کہ اس کی کامل اطاعت کی جائے۔ اور اپنے آپ کو پوری طرح اس کے
حوالہ کر دیا جائے۔ غور فرمائیے کیا اس مفہوم کے ماننے کا حاصل اور عملی نتیجہ کچھ اور ہوگا یقیناً نہیں۔ کیونکہ
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عالمی پیغمبر کی حیثیت سے آجانے کے اللہ کی کامل اطاعت کی اور
اپنے آپ کو پوری طرح حوالہ کر دینے کی کوئی صورت اس کے سوا باقی نہیں رہ جاتی ہے کہ آپ
پر ایمان لایا جائے اور آپ ہی کی پیروی کی جائے۔ کیونکہ قرآن صراحت کے ساتھ یہ اعلان کر
چکا ہے کہ یہ رسالت ساری دنیا کے لیے ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ اب اگر کوئی شخص اس
رسالت پر ایمان نہیں لاتا یا آپ کو سچا رسول ماننے کے باوجود آپ ہی کی پیروی کا راستہ
اختیار نہیں کرتا تو یہ اللہ کی کامل طاعت نہیں بلکہ اپنے نفس کی کامل اطاعت ہوگی۔ یہ اللہ تعالیٰ
کی کھلی ہوئی نافرمانی ٹھہرے گی۔

اس بات کا ثبوت کہ اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل
میں موجود ہے اور ایسا ثبوت موجود ہے جس کے آگے جھک پڑنے سے صرف ناانصافی اور خود پرستی
ہی روک سکتی ہے۔ اگر یہ بات بھی قرآن کے نزدیک صحیح ہوتی کہ سارے دین سچے ہیں اور ہر
رسول کی پیروی یکساں طور پر حق ہے تو اس کا بالکل منطقی تقاضا یہ تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ
وسلم یہود و نصاریٰ کو اسلام لانے کی دعوت نہ دیتے، کیونکہ وہ خود صاحب کتاب تھے۔ اگر
دعوت دیتے بھی تو کم از کم اسلام لانے کے مطالبے پر اصرار تو کسی طرح نہ کرتے۔ اس کے برخلاف

آپ ان سے صرف یہ کہتے کہ تورات و انجیل کی مخلصانہ پیروی کرو۔ میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں کہ اپنی نبوت کے تسلیم کرنے اور قرآن کی پیروی کا تم سے کوئی مطالبہ نہیں رکھتا لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ آپ نے انہیں بھی اسی طرح اسلام کی دعوت دی جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے بھی اپنی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا جیسا کہ ان کے لیے ضروری قرار دیا تھا۔

یاایہا الذین اوتوا الکتاب آمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی تھی ایمان لاؤ اس کتاب پر جسے ہم نے اتارا ہے

نہ صرف یہ کہ آپ نے انہیں اسلام لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا انہیں صاف لفظوں میں کفر کا مرتکب اور دوزخی فرمایا حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو ان کے اس انکار اسلام کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ بدترین کفر اور انہیں صرف کافر ہی نہیں بلکہ پکا کافر کہا ہے، جیسا کہ اسی پارے کے آغاز میں پڑھ آئے کہ اہل کتاب کو اولئک ہم الکافرون حقا کہا ہے۔ ان کے جس طرز عمل کی بنا پر یہ کہا گیا ہے وہ صرف یہ تھا کہ وہ جہاں دوسرے انبیاء کو اللہ کے رسول مانتے تھے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ماننے کے لیے کسی طرح تیار نہ ہوتے تھے حالانکہ جس طرح اللہ کے رسول وہ تھے اسی طرح آپ بھی تھے۔ پھر یہی چیز ہے جسے ایمان و کفر کے درمیان راہ نکالنا کہا گیا ہے۔ کیونکہ دوسرے انبیاء کو مان کر اگر وہ ایمان باللہ کے تقاضے پورے کر رہے تھے تو رسالت محمدی کا انکار کر کے اللہ کی معبودیت اور حاکمیت کو وہ ٹھکرا بھی رہے تھے۔ پھر یہی رویہ تھا جس کو اللہ کا اور اس کے رسولوں کا کفر کرنا کہا گیا ہے کیونکہ خدا کے کسی رسول کو ماننا اور کسی کو نہ ماننا دراصل نہ خدا کو ماننا ہے نہ کسی رسول کو ماننا ہے بلکہ محض اپنی خواہش نفس کو ماننا ہے۔

غرض قرآن حکیم نے اہل کتاب کے انکار اسلام کو بھی ٹھیک وہی حیثیت دی ہے جو مشرکوں کے انکار کو دی تھی اور نتائج بھی دونوں کے ایک ہی بتائے ہیں۔ اس نے اہل کتاب کے لیے اس طرح کی کوئی گنجائش نہیں رکھی تھی کہ وہ اسلام کے بجائے اپنے ہی دین پر قائم رہ سکتے ہیں خدا اسے بھی قبول نہ فرمائے گا۔

پھر یہ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی ہے بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

لوکان موسیٰ حیاً ما وسعہ الا اتباعی

اگر موسیٰ زندہ ہوتے تو ان کے لیے بھی اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا کہ میری پیروی کریں۔
یہ ارشادِ نبوی مسئلہ کو اس حد تک واضح کر دیتا ہے جس کے بعد وضاحت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہ جاتا ہے۔ جس نبی کی حیثیت یہ ہو کہ دوسرے انبیاً اگر اس زمانے میں موجود ہوتے تو وہ بھی اسی کے اُمتی اور پیرو بنتے۔ اور ان کی لائی ہوئی شریعتوں کی پیروی کی گنجائش خود ان کے لیے باقی نہ رہتی۔ اس کی پیروی کی ذمہ داری اور ضرورت سے بھلا کوئی عام انسان کیسے مستثنیٰ رہ سکتا ہے اور اس لائے ہوئے دین کی موجودگی میں کوئی اور دین اس کے لیے کس طرح قابل اتباع ہو سکتا ہے۔ بہرحال اس آیت میں اسلام کو دین کی حیثیت سے پسند کر لینے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت کی نجات اسلام ہی پر موقوف ہے، کیونکہ جب ہر شخص کے لیے اسلام کی پیروی ضروری ہے اور اب کوئی دین اللہ کے حضور پسندیدہ اور قابلِ قبول نہیں ہے تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ اسلام ہی شرطِ نجات ہے واضح بات ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی جن شریعتوں کو اب خود منسوخ اور ناقابلِ قبول ٹھہرا چکا ہے اس کی پیروی پر وہ اجر کیسے دے گا۔

ومن یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ

فرمانے کے بعد ہی وہ اپنے اس فیصلے کا بھی اعلان کرتا ہے کہ وھو فی الاخرۃ من الخاسرین ایسا شخص آخرت میں قطعاً نامراد رہے گا۔

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلہ خداوندی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں :
قسم ہے اس ذات کی جس کے ہاتھ میں محمد کی جان ہے اس اُمت میں سے جس کسی شخص تک مثلاً یہودی یا نصرانی تک میری نبوت کا پیغام پہنچا، اور اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لاتے بغیر مرگیا وہ دوزخی ہوگا۔ (صحیح مسلم)

اس ارشادِ نبوت میں نام اگرچہ یہود و نصاریٰ کے لیے گئے ہیں مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نام صرف مثال کے طور پر لیے گئے ہیں۔ ورنہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل عام ہے اور ایک کلیہ اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ دُنیا کا کوئی گروہ، کوئی قوم اور کوئی ملت ایسی نہیں ہے جس پر اس کا اطلاق نہ ہوتا ہو۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جو کھینچ تان کر نکالی جا رہی ہو بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جو اس حدیث کے الفاظ احد من ھذہ الامۃ کا صریح مفہوم ہے۔ ظاہر ہے کہ ھذہ الامۃ اس اُمت سے مراد اُمت اجابت نہیں بلکہ اُمت دعوت ہے۔ یعنی وہ

پورا گروہ انسانی جس کی طرف آپ نبی بنا کر روانہ کیے گئے اور یہ معلوم ہو چکا ہے کہ وہ گروہ جس کے لیے آپ نبی بن کر آئے پوری نوع انسانی پر مشتمل ہے اس لیے یہ حدیث اس حقیقت پر کوئی پردہ نہیں پڑنے دیتی ہے کہ آپ پر ایمان لانا ہر شخص کے لیے ضروری ہے اور شرط نجات ہے۔ اس فیصلہ کے تحت جس طرح یہود و نصاریٰ آتے ہیں اسی طرح دوسری قومیں اور ملتیں بھی آتی ہیں۔

غرض جہاں تک اس آیت قرآنی کے فیصلہ کا تعلق ہے وہ بالکل دوٹوک انداز میں اسلام کی پیروی کو سارے انسانوں کے لیے ضروری اور شرط نجات قرار دیتی ہے۔ اس سے مستثنیٰ صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جسے اس کا پیغام پہنچا ہی نہ ہو جیسا کہ لا یسمع بی کی قید کا منشا ہے۔

آیت پر مجموعی نظر

اجزاء کی وضاحت کے بعد آیت کے مجموعی نظام پر بھی ایک نظر ڈال لیجئے۔ اس آیت میں اکمال دین، اتمام نعمت اور دین کی حیثیت سے اسلام کی پسندیدگی کے انعامات بتائے ہیں۔ اکمال دین اور اتمام نعمت کے بعد ظاہر ہے کہ اب دین میں کسی ترمیم و اضافہ تصرف کی گنجائش نہیں ہے نہ کسی نبی کی بعثت کی حاجت، البتہ ہر دور میں نئے نئے مسائل کا انکشاف اہل علم و اجتہاد اپنی بصیرت سے کتاب و سنت کے اصول و قواعد کے مطابق و ماتحت کرتے رہیں گے۔

دنیا اب تک مختلف جغرافی حصوں اور ٹکڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ ایک ملک سے دوسرے ملک کا سفر نہایت دشوار تھا۔ اور اس میں نامہ و پیام کی بھی کوئی آسان راہ نہ تھی ہر علاقہ اپنے جغرافی اور طبعی سرحدوں کے اندر محفوظ تھا۔ دریا، پہاڑ، سمندر وغیرہ جو راہ میں حائل ہوتے ان کا عبور کرنا محال تھا۔ موٹر لاری، ریل، ٹیلیفون، ریڈیو، ٹیلیویژن وغیرہ خواب و خیال میں بھی نہ تھے۔ اب کائنات ارضی کی تاریخ میں پہلی بار یہ وقت آ رہا تھا کہ انسانیت کے ٹکڑے ایک دوسرے سے ملیں۔ رسل و رسائل کے ذرائع وسیع ہوں اور جس طرح نظام تکوینی میں ہر فرد کے لیے اس کے وجود میں آنے سے پہلے ہی ہوا کا اور روشنی کا اور پانی کا سامان حکمت الٰہی موجود رکھتی ہے اسی طرح نظام تشریعی میں رحمت حق نے چاہا کہ نوع انسانی کی انفرادی و اجتماعی دونوں زندگیوں کی روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی تربیت کا انتظام پیشتر سے موجود ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت نے بتا دیا کہ اہل ایمان کے لیے دین اسلام ایک بڑی نعمت ہے

اور یہی دین ہر حیثیت سے کامل و مکمل ہے، نہ اس کے بعد کوئی نیا دین آئے گا اور نہ اس میں کوئی کمی بیشی ہوگی۔ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی تو عام مسلمان اس کو سن کر خوشیاں منا رہے تھے لیکن حضرت ابوبکر پر گریہ طاری تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے رونے کی وجہ پوچھی، عرض کیا کہ اس آیت سے اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ اب آپ کا قیام اس دنیا میں بہت کم ہے کیونکہ دین کی تکمیل نے رسول کی ضرورت پوری کردی۔ حضور انورؐ نے اس کی تصدیق فرمائی۔

اضطرار کی شرعی حد

۱۸۲- دیکھو جو کوئی بھوک سے بے بس ہو جائے یہ نہ ہو کر دانستہ گناہ کرنا چاہے، تو اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔ یعنی حلال و حرام کا قانون تو مکمل ہو چکا، اس میں اب کوئی تغیر و تبدل نہیں ہو سکتا۔ البتہ مضطر جو بھوک اور پیاس کی شدت سے بے تاب اور لاچار ہو کر وہ اگر حرام چیز کھالے بشرطیکہ مقدار ضرورت سے تجاوز نہ کرے اور لذت مقصود نہ ہو غیر باغ و لا عاد تو اللہ تعالیٰ اس تناول محرم کو اپنی بخشش اور مہربانی سے معاف فرمائے گا گویا وہ چیز تو حرام ہی رہی مگر اسے کھا کر جان بچانے والا خدا کے نزدیک مجرم نہ رہا۔ یہ بھی اتمام نعمت کا ایک شعبہ ہے[1]

مخمصہ کے معنے بھوک کے ہیں۔ بھوک سے مضطر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی بھوک کی ایسی مصیبت میں مبتلا ہو جائے کہ موت یا حرام میں سے کسی ایک کے اختیار کرنے کے سوا کوئی اور راہ بظاہر کھلی ہوئی باقی نہ رہے ایسی حالت میں اس کو اجازت ہے کہ حرام چیزوں میں سے بھی کسی چیز سے فائدہ اٹھا کر جان بچا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ غیر متجانف کی قید اسی مضمون کو ظاہر کر رہی ہے جو دوسرے مقام پر غیر باغ و لا عاد سے ظاہر ہوا ہے، یعنی نہ دل سے چاہنے والا بنے اور نہ سدرمق سے آگے بڑھے۔ مخمصہ کی قید سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ جہاں دوسرے غذائی بدل موجود ہوں وہاں صرف اس عذر پر کہ شرعی ذبیحہ کا گوشت میسر نہیں آتا جیسا کہ یورپ اور امریکہ کے اکثر ملکوں کا حال ہے ناجائز کو جائز بنا لینے کا حق کسی کو نہیں ہے۔ گوشت زندگی کی بقا کے لیے ناگزیر نہیں ہے، دوسری غذاؤں سے نہ صرف زندگی بلکہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

صحت بھی نہایت اعلیٰ معیار کے ساتھ قائم رکھی جا سکتی ہے غیر متجانف لاثم کی قید بتا رہی ہے کہ رخصت بہرحال رخصت ہے اور حرام بہرحال حرام ہے نہ کوئی حرام چیز شیر مادر بن سکتی ہے اور نہ کوئی رخصت ابدی پروانہ ہے اس وجہ سے یہ بات کسی کے لیے جائز نہیں ہے کہ وہ رفع اضطرار سے تجاوز کرے۔ اگر ان پابندیوں کو ملحوظ رکھتے ہوئے کوئی شخص کسی حرام سے اپنی زندگی بچائے گا تو اللہ بخشنے والا ہے۔

حرام کھا لینے کے لیے اضطرار کی وہ حد جس سے حرام کھانا مباح ہو جاتا ہے، فقہا میں اختلافی ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ ہلاکت کا اندیشہ ہو یا یقینی اور ظن غالب کے طور پر عضو کے ہلاک ہونے کا اندیشہ ہو، علامہ زرقانی نے امام مالک کا بھی یہی نقطہ نظر نقل کیا ہے۔ البتہ امام نووی نے شرح المہذب میں امام شافعی کی ترجمانی اس طرح کی ہے کہ حرام کھانے کے لیے صرف بھوک کا زیادہ لگنا کافی نہیں ہے۔ صرف اتنا اندیشہ کافی ہے کہ اگر بھوک کی حالت میں نہ کھائے گا تو ساتھیوں سے بچھڑ جائے گا یا سواری پر سوار نہ ہو سکے گا اور چل نہ سکے گا۔ امام الحرمین کہتے ہیں کہ ان حالات کے رونما ہونے کے لیے صرف ظن غالب کافی ہے۔ علامہ ابن قدامہ نے مغنی میں صرف اندیشہ ہلاکت کو اضطرار قرار دیا ہے۔

حرام کھانا واجب ہے یا رخصت

اندیشہ ہلاکت میں کیا حرام کھا لینا واجب ہے یا صرف اجازت ہے اس موضوع پر علماء قانون کا اختلاف ہے۔ احناف کے نزدیک حفظ جان یعنی جان بچا لینا اولین فرائض میں سے ہے اور ایسے موقع پر غذا نہ کھانا خودکشی کے مترادف ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے جو شخص مباح سے مجتنب رہا تا آنکہ مرگیا وہ خود اپنا قاتل ہے۔ آیات قرآنی لا تقتلوا انفسکم اور لا تلقوا بایدکم الی التھلکۃ اسی کی مقتضی ہیں کہ جان بچانا واجب ہے۔ یہی امام مالک اور امام شافعی کا مذہب راجح ہے۔ حنابلہ نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔ صرف شوافع میں سے ابو اسحاق اور احناف میں سے امام ابو یوسف کہتے ہیں کہ واجب نہیں ہے۔

یہاں یہ سوال بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ حالت اضطرار میں مضطر کو دو حراموں میں سے کون سا حرام کر لینے کی اجازت ہے، مردار کھا لینے کی یا کسی کا کھانا چوری کر کے یا غصب کر کے یا لوٹ مار کر کے کھا لینے کی؟ ابن قدامہ نے اسی کو ترجیح دی ہے کہ مردار کھالے لیکن چوری

غصب یا لوٹ مار نہ کرے اور وجہ یہی بتائی ہے کہ مردار کی حرمت اللہ تعالیٰ کا حق ہے اور چوری وغیرہ حق العباد ہے۔ حق اللہ کے لیے اجازت مل ہے لیکن حق العباد کے لیے اجازت نہیں ہے۔
اسی سے فقہائے اسلامی قانون میں نظریہ ضرورت استنباط کیا ہے اور قاعدہ لکھا ہے کہ الضرورات تبیح المحظورات ضرورتیں ممنوعات کو مباح کر دیتی ہیں۔ یہ تفصیل کا محل نہیں انشاء اللہ اس پر تفصیل بحث چودھویں جلد میں آئے گی۔

يَسْـَٔلُونَكَ مَاذَآ أُحِلَّ لَهُمْ ۖ قُلْ أُحِلَّ لَكُمُ ٱلطَّيِّبَٰتُ ۙ وَمَا عَلَّمْتُم
مِّنَ ٱلْجَوَارِحِ مُكَلِّبِينَ تُعَلِّمُونَهُنَّ مِمَّا عَلَّمَكُمُ ٱللَّهُ ۖ
فَكُلُوا۟ مِمَّآ أَمْسَكْنَ عَلَيْكُمْ وَٱذْكُرُوا۟ ٱسْمَ ٱللَّهِ عَلَيْهِ ۖ وَ
ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ ۚ إِنَّ ٱللَّهَ سَرِيعُ ٱلْحِسَابِ ﴿٤﴾ ٱلْيَوْمَ أُحِلَّ لَكُمُ
ٱلطَّيِّبَٰتُ ۖ وَطَعَامُ ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ حِلٌّ لَّكُمْ وَطَعَامُكُمْ
حِلٌّ لَّهُمْ ۖ وَٱلْمُحْصَنَٰتُ مِنَ ٱلْمُؤْمِنَٰتِ وَٱلْمُحْصَنَٰتُ مِنَ
ٱلَّذِينَ أُوتُوا۟ ٱلْكِتَٰبَ مِن قَبْلِكُمْ إِذَآ ءَاتَيْتُمُوهُنَّ أُجُورَهُنَّ
مُحْصِنِينَ غَيْرَ مُسَٰفِحِينَ وَلَا مُتَّخِذِىٓ أَخْدَانٍ ۗ وَمَن يَكْفُرْ
بِٱلْإِيمَٰنِ فَقَدْ حَبِطَ عَمَلُهُۥ وَهُوَ فِى ٱلْءَاخِرَةِ مِنَ
ٱلْخَٰسِرِينَ ﴿٥﴾

اے پیغمبر لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کے لیے
کیا کیا چیزیں حلال ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ جتنی اچھی

اور ستھری چیزیں ہیں سب تمہارے لیے حلال ہیں[۲۲]۔ اور
شکاری جانور جو تم نے شکار کے لیے سدھا رکھے ہوں اور شکار
کا طریقہ جیسا کچھ اللہ نے تمہیں سکھا دیا ہے تم ان کو سکھاتے
ہو تو جو کچھ وہ تمہارے لیے روک رکھیں تم اسے کھا سکتے ہو
البتہ اس پر اللہ کا نام لے لیا کرو[۲۳]۔ اور ہر حال میں اللہ کی
نافرمانی سے بچو یاد رکھو کہ اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے[۲۴]
آج ساری اچھی چیزیں تمہارے لیے حلال کر دی گئی ہیں[۲۵]
ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال
ہے[۲۶]۔ اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے[۲۷]۔ نیز تمہارے لیے
مسلمان پاکدامن بیبیاں اور کتابی عورتیں حلال ہیں بشرطیکہ
ان کے مہر ان کے حوالے کر دو اور مقصود قید نکاح میں
لانا ہو[۲۸]، نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے

آشنائیاں کرو۔ اور جو بھی ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کرے گا تو اس کا سارا کارنامۂ زندگی بیکار ہو جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہو گا۔

تحلیل و تحریم کا ضابطہ عام

چونکہ لوگ پچھلی پابندیوں اور سختیوں کے عادی ہو چکے تھے اس لیے بار بار پوچھتے تھے کہ ہمارے لیے کیا کیا چیزیں حلال ہیں۔ آیت ۴ میں فرمایا کہ تمام اچھی چیزیں حلال ہیں۔ صرف ان ہی چیزوں سے روک دیا گیا ہے جو اچھی نہیں ہیں۔ پچھلے صحیفوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے متعلق جو پیشین گوئیاں آئی ہیں ان میں یہ تصریح بھی موجود ہے کہ جب آخری نبی آئے گا تو اہل کتاب کو طیبات اور خبائث کے متعلق اللہ کے امر و نہی سے آگاہ کرے گا اور حلال و حرام کے موضوع پر ان تمام پابندیوں اور سختیوں سے آزاد کرے گا جو انہوں نے اپنے اوپر یا تو از خود عائد کر رکھی ہیں یا ان کی سرکشی کی بنا پر اللہ تعالیٰ نے ان پر عائد کر دی ہیں۔ قرآن عزیز نے ان پیشین گوئیوں کا حوالہ سورۂ اعراف میں دیا ہے:

الذین یتبعون الرسول النبی الامی الذی یجدونہ مکتوباً عندھم فی التوراۃ والانجیل یامرھم بالمعروف و ینھاھم عن المنکر و یحل لھم الطیبات و یحرم علیھم الخبائث و یضع عنھم اصرھم و الاغلال التی کانت علیھم

جو لوگ اس رسول نبی امی کی پیروی کریں گے جس کو اپنے ہاں تورات و انجیل میں لکھا ہوا پاتے ہیں جو انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے برائی سے روکتا ہے اور ان کے لیے پاکیزہ چیزوں کو جائز ٹھہراتا ہے اور ناپاک چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے اور ان سے اس بوجھ اور پابندیوں کو دور کرتا ہے جو ان پر تھیں۔

یہ انہیں باتوں کا حوالہ ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ظہور میں آنے والی تھیں چنانچہ آپ کے ظہور نے ان میں سے ایک ایک بات کی عملاً تصدیق کر دی۔ آپ نے تمام طیب اور پاکیزہ چیزیں جائز کر دیں جن میں کچھ یہود کے ہاں حرام تھیں۔ تمام خبیث چیزوں کو حرام قرار دیا اور وہ تمام پابندیاں اور بیڑیاں ختم کر دیں جو انہوں نے یا تو از خود اپنے اوپر لاگو کر لی تھیں یا ان کی ضد سرکشی کے باعث اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان پر عائد کی گئی تھیں۔ اس مرحلے پر آکر چونکہ یہ کام مکمل ہو چکا تھا اور یہ بات بالکل واضح ہو چکی تھی کہ اہل کتاب نے جو خبیث چیزیں جائز بنائی ہیں محض اپنی بدعت سے جائز بنائی ہیں اور جو طیب چیزیں ان پر حرام ہیں وہ محض ان کی سرکشی کی سزا کے طور پر حرام ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے بعد یہ پابندیاں ختم ہو گئیں تو مسلمانوں کو اجازت دی گئی کہ حرام و حلال اور خبیث و طیب کی اس وضاحت کے بعد تمہارے لیے اب شکاری جانور بھی جائز ہے اور تم اہل کتاب کا کھانا بھی کھا سکتے ہو۔ اس لیے کہ اب تمہارے لیے کسی خبیث سے آلودہ ہونے کا اندیشہ نہیں ہے اور ساتھ اس بات کا بھی اعلان کر دیا گیا کہ تمہارا کھانا اہل کتاب کے لیے جائز ہے اور اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے۔ ضمناً اس حکم کی بھی تصریح کر دی کہ ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی بھی کوئی ممانعت نہیں ہے۔

۲۲۔۔ اے پیغمبر لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کہ ان کے لیے کیا کیا چیزیں حلال ہیں۔ آپ ان سے کہہ دیجیے کہ جتنی صاف اچھی اور ستھری چیزیں ہیں سب تمہارے لیے حلال ہیں۔ پچھلی آیات میں بہت سی حرام چیزوں کی فہرست دی گئی تھی تو قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ حلال چیزیں کیا ہیں؟ اس کا جواب یہ دیا کہ حلال کا دائرہ تو بہت وسیع ہے۔ چند چیزوں کو چھوڑ کر جن میں کوئی دینی یا بدنی نقصان ہے دنیا کی تمام ستھری اور پاکیزہ چیزیں حلال ہی ہیں اور چونکہ شکاری جانور سے شکار کرنے کے متعلق بعض لوگوں نے خصوصیت سے سوال کیا تھا اس لیے آیت کے اگلے حصہ میں اس کو تفصیلاً بتا دیا گیا تھا[1] یہ جواب کا صرف ایک حصہ ہے جو کلیہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ قرآن کا یہ بھی ایک انداز ہے کہ وہ کسی سوال کا جواب دیتا ہے تو اس کا آغاز بالعموم جامع بات سے کرتا ہے کہ جواب صرف سوال ہی تک محدود نہ رہ جائے بلکہ ایک وسیع دائرے میں مسائل کی رہنمائی کرے۔ جواب کے اس انداز میں ایک لطیف نکتہ یہ ہے کہ مذہبی طرز خیال کے لوگ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اکثر اس ذہنیت کے شکار ہوتے رہے ہیں کہ دُنیا کی ہر چیز کو حرام سمجھتے ہیں جب تک صراحت کے ساتھ کسی چیز کو حلال نہ قرار دیا جاتا۔ اس ذہنیت کی وجہ سے لوگوں پر قانونیت کا تسلط ہو جاتا ہے وہ زندگی کے ہر شعبہ میں حلال اشیا اور جائز کاموں کی فہرست مانگتے ہیں۔ اور ہر کام اور ہر چیز کو اس شبہ کی نظر سے دیکھنے لگتے ہیں کہ کہیں وہ منع تو نہیں ہے۔ یہاں قرآن اسی ذہنیت کی اصلاح کرتا ہے۔ پوچھنے والوں کا مقصد یہ تھا کہ انہیں تمام حلال چیزوں کی فہرست بتا دی جائے تاکہ ان کے سوا ہر چیز کو وہ حرام سمجھیں۔ جواب میں قرآن نے حرام چیزوں کی تفصیل بتائی اور اس کے بعد یہ عام ہدایت دے کر چھوڑ دیا کہ ساری پاک چیزیں حلال ہیں۔ اس طرح قدیم مذہبی نظریہ بالکل الٹ گیا قدیم نظریہ یہ تھا کہ سب کچھ حرام ہے بجز اس کے جسے حلال ٹھہرایا جائے۔ قرآن نے اس کے برعکس یہ اصول مقرر کیا کہ سب کچھ حلال ہے بجز اس کے جس کی حرمت کی تصریح کر دی جائے یہ ایک بہت بڑی اصلاح تھی جس نے انسانی زندگی کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے آزاد کر کے دُنیا کی وسعتوں کا دروازہ اس کے لیے کھول دیا۔ پہلے حلت کے ایک چھوٹے سے دائرے کے سوا ساری دُنیا اس کے لیے حرام تھی۔ اب حرمت کے ایک مختصر سے دائرے کو مستثنیٰ کر کے ساری دُنیا اس کے لیے حلال ہو گئی۔ حلال کے لیے پاک اور ستھری کی قید اس لیے لگائی کہ ناپاک چیزوں کو اس عام اباحت کی دلیل سے حلال ٹھہرانے کی کوشش نہ کی جائے۔ اب رہا یہ سوال کہ اشیا کے پاک ہونے کا تعین کس طرح ہوگا تو اس کا جواب یہ ہے کہ جو چیزیں اصول شرع میں سے کسی اصل کے تحت ناپاک قرار پائیں یا جن چیزوں سے ذوق سلیم کراہت کرے یا جنہیں مہذب انسان نے بالعموم اپنے فطری احساس نظافت کے خلاف پایا ہو ان کے سوا سب کچھ پاک ہے۔[1]

سوال چونکہ جانوروں کے متعلق ہے اس لیے طیبات سے مراد وہ جانور ہوں گے جو اولاً تو خود اپنے مزاج اپنی سرشت اور انسان کے لیے اپنی افادیت اور اپنے اثرات کے لحاظ سے اچھے اور پاکیزہ ہوں۔ ثانیاً ان کو اللہ کے نام پر ذبح کر لیا جائے۔ اس طرح اس سے وہ تمام جانور نکل جائیں گے جو اپنے مزاج اور سرشت کے اعتبار سے انسان کے صالح مزاج سے مناسبت رکھنے والے نہ ہوں۔ مثلاً خنزیر، کتا، بندر درندے اور شکاری پرندے وغیرہ یا مزاج سے

---

[1] تدبر و تفہیم

مناسبت تو رکھنے والے ہوں لیکن کسی خارجی سبب سے ان کے اندر خبث پیدا ہو گیا ہو مثلاً جانور مرگیا یا غیر اللہ کے نام پر یا کسی استھان پر اس کو ذبح کیا گیا ہو۔ یہ خبائث میں داخل ہیں۔ قرآن کے اس جواب سے یہ رہنمائی ملی ہے کہ شکار کیے ہوئے جانوروں میں بھی حلال صرف طیبات ہیں۔ خبائث اس سے خارج ہیں۔

سدھائے ہوئے شکاری جانور کا شکار

۲۲ - اور شکاری جانور جو تم نے شکار کے لیے سدھا رکھے ہوں اور شکار کا طریقہ جیسا اللہ نے تمہیں سکھایا ہے تم ان کو سکھاتے ہو تو جو کچھ وہ تمہارے لیے روک رکھیں تم اسے کھا سکتے ہو البتہ اس پر اللہ کا نام لے لیا کرو۔ شکاری کتے یا باز وغیرہ سے شکار کیا ہوا جانور ان شروط سے حلال ہے۔

اوّل یہ کہ شکاری جانور سدھا ہوا ہو
دوسرے یہ کہ شکار پر چھوڑا جائے

تیسرے یہ کہ اس طریقہ سے تعلیم دی گئی ہو جس کو شریعت نے معتبر رکھا ہے یعنی کتے کو سکھلایا جائے کہ شکار کو پکڑ کر کھائے نہیں، اور باز کو یہ تعلیم دی جائے کہ جب اس کو بلاؤ تو شکار کے پیچھے جا رہا ہو فوراً چلا آئے۔ اگر کتا شکار کو خود کھانے لگے یا بلانے سے نہ آئے تو سمجھا جائے گا کہ جب اس کے کہنے میں نہیں ہے تو شکار بھی اس کے لیے نہیں پکڑا ہے بلکہ اپنے لیے پکڑا ہے۔ اسی کو حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ جب اس نے آدمی کی خو سیکھی تو گویا آدمی نے ذبح کیا۔[1]

چوتھی شرط یہ ہے کہ چھوڑنے کے وقت اللہ کا نام لو، یعنی بسم اللہ کہہ کر چھوڑو۔ ان چار شرطوں کی تصریح نص قرآنی میں ہو گئی ہے

پانچویں شرط جو امام ابوحنیفہ کے نزدیک معتبر ہے کہ شکاری جانور شکار کو زخمی بھی کردے کہ خون بہنے لگے اس کی طرف لفظ جوارح اپنے مادہ جرح کے اعتبار سے اشارہ کر رہا ہے۔

ان میں سے اگر ایک شرط بھی مفقود ہوئی تو شکاری جانور کا مارا ہوا شکار حرام ہے۔ ہاں اگر مرا نہ ہو اور ذبح کر لیا جائے تو وما اکل السبع الا ما ذکیتم کے قاعدہ سے حلال ہو گا۔ جوارح جارحہ کی جمع ہے اس کے معنے ہر شکاری جانور کے ہیں خواہ پرندہ ہو یا درندہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کا نام ہی جارحہ اس لیے ہے کہ وہ شکار کو زخمی کرتا ہے۔ خازن لکھتے ہیں کہ شکاری جانور کو جارحہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ شکار کو زخمی کرتا ہے ما علمتم من الجوارح کا پیوند الطیبات سے ہے اور مطلب یہ ہے کہ طیبات حلال ہیں اور ان شکاری جانوروں کا شکار حلال ہے جن کو تم نے سدھایا ہو۔ شکاری جانوروں سے مراد کتے، چیتے، باز شکرے اور تمام وہ درندے اور پرندے مراد ہیں جن سے انسان شکار کی خدمت لیتا ہے۔ سدھائے ہوئے جانور کی یہ خصوصیت ہوتی ہے کہ وہ جس کو شکار کرتا ہے اسے عام درندوں کی طرح پھاڑ نہیں کھاتا بلکہ اپنے مالک کے لیے پکڑ رکھتا ہے۔ اسی وجہ سے عام درندوں کا پھاڑا ہوا جانور حرام ہے اور سدھائے ہوئے درندوں کا شکار حلال ہے۔

اس مسئلہ میں فقہاء کا کچھ اختلاف ہے۔ ایک گروہ کہتا ہے کہ اگر شکاری جانور نے خواہ درندہ ہو یا پرندہ شکار میں سے کچھ کھا لیا تو وہ حرام ہو گا۔ کیونکہ اس کا کھا لینا یہ معنے رکھتا ہے کہ اس نے شکار کو مالک کے لیے نہیں بلکہ اپنے لیے پکڑا ہے۔ یہی مسلک امام شافعی کا ہے۔ دوسرا گروہ کہتا ہے کہ اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھا لیا تب بھی وہ حرام نہیں ہوتا حتیٰ کہ اگر ایک تہائی حصہ بھی کھا لے تو بقیہ دو تہائی حلال ہے اور اس معاملے میں درندے اور پرندے کے درمیان کوئی فرق نہیں ہے۔ یہ مسلک امام مالک کا ہے۔ تیسرا گروہ کہتا ہے کہ شکاری درندے نے اگر شکار میں سے کھا لیا ہو تو وہ حرام ہو گا لیکن اگر شکاری پرندے نے کھایا ہو تو حرام نہ ہو گا۔ کیونکہ شکاری درندے کو ایسی تعلیم دی جا سکتی ہے کہ وہ شکار کو مالک کے لیے پکڑ رکھے اور اس میں سے کچھ نہ کھائے لیکن تجربے سے ثابت ہے کہ شکاری پرندہ ایسی تعلیم قبول نہیں کرتا۔ یہ مسلک امام ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کا ہے۔

کتے کو شکار کی ٹریننگ

کلب کتے کو کہتے ہیں، اسی سے تکلیب بنا لیا ہے جس کے معنے کتے کو شکار کی ٹریننگ دینے کے ہیں۔ مکلبین مکلب کی جمع ہے ایک معنے تو کتے کو تعلیم دینے والے کے ہیں اور دوسرے معنے شکار پر چھوڑنے والے کے ہیں۔ دونوں میں کوئی منافات نہیں اور اہل لغت نے دونوں کی گنجائش رکھی ہے۔ چنانچہ علامہ زبیدی نے تاج العروس میں منظور افریقی نے لسان العرب اور راغب نے مفردات القرآن میں تصریح کی ہے۔ مکلبین کے لفظ سے یہ دھوکہ نہ ہو کہ یہ تعلیم و تربیت صرف کتوں کے ساتھ مخصوص ہے۔ ابتداءً تو یہ لفظ اسی معنے کے لیے استعمال ہوا ہے لیکن پھر اس کا

استعمال شکاری جانوروں کی تربیت کے لیے ہونے لگا خواہ کتا ہو یا شکاری درندوں اور پرندوں میں سے کوئی اور جانور، شکاری پرندے بھی بلا اختلاف فقہا اسی حکم میں داخل ہیں۔ الجصاص نے تصریح کی ہے۔

اس میں کتوں کی تخصیص نہیں ہے وہ معنے مراد لینا ضروری ہے۔ فقہا میں اس موضوع پر کوئی اختلاف نہیں ہے۔

تعلمونھن مما علمکم اللہ سے اس تربیت اور ٹریننگ کی نوعیت بتائی جارہی ہے کہ تم نے اس سلیقہ میں سے ان کو کچھ سکھایا ہو جو اللہ نے تم کو بتایا ہے۔ ظاہر ہے کہ ہر تربیت میں مربی کے ذوق اس کی پسند اور ناپسند اور اس کے مقصد تربیت کی جھلک ہوتی ہے اور اس چیز کو جس طرح زیر تربیت انسان اپناتا ہے اسی طرح اپنی جبلی استعداد کی حد تک حیوانات بھی اپناتے ہیں۔ یہ چیز سدھائے ہوئے جانوروں کو دوسرے جانوروں سے بالکل الگ کر دیتی ہے اس وجہ سے ایک عام کتے کے شکار اور ایک سدھائے ہوئے کتے کے شکار میں فرق ایک امر فطری ہے بلکہ ایک مسلمان کے تربیت کردہ کتے اور ایک عیسائی کے تربیت کردہ کتے کے میلان اور سلیقہ میں بھی فرق ہو جائے گا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ شکاری جانور سکھائے ہوئے سدھائے ہوئے ہوں۔ فقہا نے اسی سے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ یہ قید صرف وحشی جانوروں کے لیے نہیں بلکہ گھریلو جانوروں کے لیے بھی ہے چنانچہ گھریلو جانور اگر ٹریننگ پایا ہوا نہ ہو تو اس کا کیا ہوا شکار بھی حلال نہ ہوگا۔ البتہ جو جانور وحشی ہو یا گھریلو سکھایا ہوا ہوگا اس کا فعل خود شکاری کا ہوگا۔ اور فقہا نے تعلیم کا معیار جیسا کہ شیخ الاسلام نے بتایا ہے کتے کے حق میں یہ رکھا ہے کہ سکھایا ہوا کتا شکار کو پکڑ کر خود نہ کھائے اور باز کے حق میں رکھا ہے کہ سدھے ہوئے باز کو جب آواز دی جائے تو وہ شکار کا پیچھا چھوڑ کر واپس چلا آئے۔ اس سے جہاں یہ بات معلوم ہوئی کہ شکاری جانور سدھائے ہوئے ہوں یہ بات بھی معلوم ہوئی کہ وہ شکاری جانور تمہارے چھوڑے ہوئے جھپٹیں یہ نہیں کہ از خود شکار پکڑ لائیں اور تمہارے سامنے ڈال دیں۔

ان دو شرطوں کے ساتھ تیسری شرط یہ ہے کہ تربیت ایسی ہو کہ شکاری کتا شکار مسلمان شکاری کے لیے روکے نہ کہ اپنے لیے۔ مما امسکن علیکم اساک کے معنے روکنے اور تھامنے کے ہیں۔ یہی اصل سوال کا جواب ہے کہ اگر مذکورہ بالا شرائط کے مطابق تربیت کیا جانور ہو تو اس کے کیے ہوئے شکاروں میں وہ شکار تمہارے لیے جائز ہوگا جو وہ خاص تمہارے

لیے روک رکھے ۔ چونکہ یہاں یہ بات خصوصیت سے کہی گئی ہے اس لیے میں ان لوگوں کے مذہب کو بلحاظ دلیل زیادہ قوی سمجھتا ہوں جو کہتے ہیں کہ شکاری جانور شکار میں سے کچھ کھالے تو وہ شکار جائز نہ ہوگا ۔ یہی بات بعض احادیث سے ثابت ہوتی ہے اور علامہ قرطبی نے اس مسئلے پر صحابہ میں سے عبد اللہ ابن عباس اور ابوہریرہ اور تابعین میں سے عکرمہ ، قتادہ ، ابن جبیر ، ادر علماء اور ائمہ فقہا میں سے نخعی ، شافعی ، احمد اسحاق ، ابو ثور اور ابو حنیفہ اور ان کے شاگردوں کا اتفاق نقل کیا ہے ۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں والیہ ذھب اکثر الفقہاء ہاں البتہ باز ، شکرہ وغیرہ شکاری پرندوں کی تادیب اس حد تک دشوار ہے اس لیے فقہائے انہیں اس قاعدہ سے مستثنیٰ کر دیا ۔

شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ

آخر میں واذکروا اسم اللہ علیہ فرما کر واضح کر دیا کہ شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت بسم اللہ کہہ لیا کرو ۔ آیت میں ضمیر مجرور علیہ کے مرجع میں اختلاف ہے ۔ کچھ کہتے ہیں کہ شکاری جانور کو چھوڑتے وقت اس پر بسم اللہ پڑھ لیا کرو ۔ ان کے خیال میں ضمیر کا مرجع ما علمتم من الجوارح ہے ۔ ارشادِ نبوت سے اسی کی تائید ہوتی ہے ۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عدی بن حاتم طائی نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ میں کتے کے ذریعے شکار کر سکتا ہوں ۔ آپ نے فرمایا کہ اگر اسے چھوڑتے وقت تم نے اللہ کا نام لیا ہو تو کھاؤ ورنہ نہیں اور اگر اس نے شکار میں سے کچھ کھالیا ہو تو نہ کھاؤ کیونکہ اس نے شکار کو دراصل اپنے لیے پکڑا ہے ۔ پھر انہوں نے پوچھا کہ اگر میں شکار پر اپنا کتا چھوڑ دوں اور بعد میں دیکھ کر اور کوئی کتا وہاں موجود ہے ۔ آپ نے جواب دیا کہ اس شکار کو نہ کھاؤ اس لیے کہ تم نے خدا کا نام اپنے کتے پر لیا تھا نہ کہ دوسرے کتے پر ۔

اس آیت سے یہ مسئلہ معلوم ہوا کہ شکاری جانور کو شکار پر چھوڑتے وقت خدا کا نام لینا ضروری ہے اور یہ بھی شکار کے حلال ہونے کی شرط ہے ۔ اس کے بعد اگر زندہ شکار ہے تو پھر خدا کا نام لے کر اسے ذبح کر لینا چاہیے اور اگر زندہ نہ ملے تو اس کے بغیر ہی وہ حلال ہوگا ۔ فقہائے حدیث بالا ہی سے یہ قاعدہ معلوم کیا ہے کہ ذبح حیوانات کے وقت جو بسم اللہ پڑھی جاتی ہے اسی کے قائم مقام وہ بسم اللہ ہے جو شکار پر شکاری جانور کے چھوڑتے وقت پڑھی

جائے۔ الجصاص نے احکام القرآن میں اور صاحب درمختار نے اس کی تصریح کی ہے۔

حدود اللہ کی یاد دہانی

۲۴ - ہر حال میں اللہ کی نافرمانی سے بچو یاد رکھو کہ اللہ حساب لینے میں بہت تیز ہے یعنی ہر حالت میں خدا سے ڈرتے رہو کہیں طیبات کے استعمال اور شکار وغیرہ سے منتفع ہونے میں حدود و قیود شرعیہ سے تجاوز نہ ہو جائے۔ عموماً آدمی دنیوی لذتوں میں منہمک ہو کر اور شکار وغیرہ کے مشاغل میں پڑ کر خدا اور آخرت سے غافل ہو جاتا ہے۔ اس لیے تنبیہ کی ضرورت تھی کہ خدا کو مت بھولو اور یاد رکھو کہ حساب کا دن کچھ دُور نہیں ہے۔ خدا کے انعامات اور تمہاری شکر گزاری کا موازنہ اور عمر عزیز کے ایک ایک لمحہ کا حساب ہونے والا ہے[1] منشا یہ ہے کہ ہر معاملہ کی طرح اس معاملہ میں بھی اس کے احکام کی خلاف ورزی کرنے سے بچو۔ ذرا موقع کی نزاکت چشم تصور میں لائیے خوب بھوک لگی ہوتی ہے، بڑے لذیذ گوشت کا جانور شکرہ یا کتا پکڑ کر لایا ہے۔ طبیعت سے بے قرار ہے کہ جلد سے جلد اس کے کباب لگیں اور بھنے ہوئے شکار سے جی بھر کر لذت حاصل کی جائے۔ اب کون اس موقع پر یاد دلائے کہ شرائط حلت ذرا مستحضر کر لیجئے۔ جانور سدھا ہوا ہے یا نہیں اسے چھوڑتے وقت بسم اللہ کہہ دی گئی تھی یا نہیں۔ بجز تقویٰ الٰہی کے اور کس میں اس وقت یاد دلانے کی قوت ہے۔ یہی مراقبہ ہر دشوار حکم کی تعمیل کو آسان بنائے گا۔ قرآن حکیم میں احکام جہاں جہاں بھی آئے ہیں ان کے متصل ہی کوئی اس قسم کا فقرہ ضرور مل جاتا ہے جس سے یاد آخرت یا اللہ کے علم کل کا استحضار ہو جائے بڑی شہود کو آسان بنا دینے کا اور پہاڑ کو پانی بنا دینے کا اس سے بڑھ کر نسخہ اور کیا ہو سکتا ہے۔ گویا آخر میں اس طرح واتقوا اللہ فرما کر اللہ کے مقرر کردہ حدود اور اس کے عہد و پیمان کے احترام کی یاد دہانی یہاں بھی فرما دی کہ شکار کی حرص و آز میں خدا کے حدود حلت و حرمت کو نہ بھولنا ورنہ روز حساب بہت دُور نہیں ہے۔ یہ یاد دہانی اس پہلو سے ضروری تھی کہ جب شکار معاشی ضرورت ہو تو اس میں بے احتیاطی کے کتنے امکانات ہیں۔

سب اچھی چیزیں حلال ہیں

۲۵ - آج ساری اچھی چیزیں تمہارے لیے حلال کر دی گئی ہیں۔ یعنی جیسے آج دین کامل

[1] افادات شیخ الاسلام

کر دیا گیا ہے۔ دنیا کی تمام پاکیزہ چیزیں بھی تمہارے لیے دائمی طور پر حلال کر دی گئی ہیں جو کبھی منسوخ نہیں کی جائیں گی۔ یہاں یہ بات دوبارہ کہی گئی ہے اور اس سے مقصود یہ بتانا ہے کہ اہل کتاب کا جو کھانا تمہارے لیے حلال کیا جا رہا ہے اس کے لیے بھی بنیادی طور پر طیب ہونا ضروری ہے۔ اس فقرہ میں الیوم کا لفظ خاص اہمیت رکھتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تمہیں خبیث وطیب کا پورا امتیاز ہو چکا ہے۔ اس وجہ سے تمہیں یہ اجازت دی جا رہی ہے۔ اب یہ خطرہ نہیں رہا کہ تم ان کے دستر خوان پر بیٹھ کر کسی حرام یا مشتبہ میں مبتلا ہو جاؤ گے۔ لغت میں طیبات صاف ستھری اور مرغوب چیز کو کہا جاتا ہے اور خبائث اس کا مقابل ہے گندی اور قابلِ نفرت چیزوں پر بولا جاتا ہے۔ اس لیے مطلب یہ ہوا کہ جتنی چیزیں صاف ستھری، مفید اور پاکیزہ ہیں وہ انسان کے لیے حلال ہیں اور جو گندی، قابلِ نفرت اور مضر ہیں وہ حرام ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں کہ جتنے جانور اسلامی قانون میں حرام کیے گئے ہیں ان سب پر غور کیا جائے تو سمٹ کر یہ سب دو اصولوں کے تحت آجاتے ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی جانور اپنی فطرت وطبیعت کے اعتبار سے خبیث ہو۔ دوسرے یہ کہ اس کے ذبح کا طریقہ غلط ہو جس کے نتیجہ میں وہ ذبیحہ مردار ہو جاتے۔ یہاں سورۃ مائدہ میں نو چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ان میں خنزیر پہلی قسم میں داخل ہے باقی آٹھ قسم دوم ہیں۔ قرآن عزیز نے ویحرم علیھم الخبائث فرما کر اجمالی طور پر تمام خبیث جانوروں کے حرام ہونے کا حکم دیا اور اسی کی تفصیلات میں سے چند چیزیں قرآن نے صراحۃً بتا دی ہیں مثلاً لحم خنزیر اور دم مسفوح باقی چیزوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے واضح فرما دیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی جانور کے خبیث ہونے کی ایک علامت یہ بتائی ہے کہ کسی قوم کو بطور عذاب کے اس کی شکل میں تبدیل کر دیا گیا ہو مثلاً قرآن میں ہے وجعل منھم القردۃ والخنازیر یعنی کچھ لوگوں کو خنزیر اور بندر کی صورت میں بطور عذاب کے مسخ کر دیا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جانوروں کی یہ دو قسمیں بالطبع خبائث میں داخل ہیں۔ اور بہت سے جانور ایسے ہیں کہ افعال و آثار سے ان کا خبیث ہونا عام لوگ خود ہی محسوس کر لیتے ہیں مثلاً درندے جن کا کام ہی دوسروں کو زخمی کرنا اور پھاڑنا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نے بھیڑیے کے متعلق دریافت کیا تو فرمایا کہ کیا کوئی انسان اس کو کھا سکتا ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

لے افادات شیخ الاسلام

نے بطور ضابطہ بتایا ہے کہ ہر درندہ جانور جو دانتوں سے پھاڑ کر کھاتا ہے جیسے شیر وغیرہ اور ہر پرندہ جو اپنے پنجے سے شکار کرتا ہے جیسے باز، شکرہ وغیرہ یہ سب حرام ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ جن جانوروں کو اسلامی قانون نے حرام قرار دیا ہے ان میں سے ایک قسم تو وہ ہے جس میں ذاتی طور پر نجاست پایا جاتا ہے۔ دوسری قسم وہ ہے کہ ان کی ذات میں کوئی خبث نہیں ہے مگر جانوروں کے ذبح کرنے کا جو طریقہ اللہ تعالیٰ نے مقرر فرمایا ہے اس طریقہ پر اس کو ذبح نہیں کیا گیا ہے خواہ سرے سے ذبح ہی نہ کیا گیا ہو جیسے جھٹکا یا ذبح تو کیا مگر اس پر اللہ کے نام کے بجائے کسی غیر اللہ کا نام لیا تو یہ ذبح شرعاً معتبر نہیں ہے۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ انسان جو کچھ بھی کھاتا اور پیتا ہے وہ سب اللہ کی دی ہوئی نعمتیں ہیں لیکن جانوروں کے سوا کسی چیز کے کھانے پینے اور استعمال کرنے پر یہ پابندی نہیں ہے کہ اللہ اکبر یا بسم اللہ کہہ کر ہی یہ حلال ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ ہر چیز کے کھانے پینے کے وقت بسم اللہ کہنا مستحب ہے مگر یہ مدار حلت نہیں ہے برخلاف جانوروں کے کہ ان کے حلال ہونے پر شرط بسم اللہ اللہ اکبر کہنا ہے اور بالارادہ جان بوجھ کر بسم اللہ اللہ اکبر کو چھوڑ دینا جانور کو مردار بنا دیتا ہے۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ جانداروں کی جانیں ایک حیثیت سے سب برابر ہیں اس لیے ایک جاندار کا دوسرے جاندار کو فنا کرنا جائز نہیں ہے۔ اب جن کو جاندار کی جان لینے کی اجازت دی گئی ہے ظاہر ہے کہ یہ ان پر اللہ کا بہت بڑا انعام ہے اس لیے جانور کو ذبح کرتے وقت اس انعام الٰہی کا استحضار ضروری قرار دیا گیا، برخلاف دوسری اشیاء کے کہ ان کی تخلیق ہی اس لیے ہے کہ انسان ان کو فنا کرکے اپنی ضروریات کی بہم رسانی کرے۔ ان پر بسم اللہ کہنے کا درجہ استحبابی ہے، وجوبی نہیں ہے۔[1]

اہل کتاب کا کھانا تمہارے لیے حلال ہے

۲۶ - اور ان لوگوں کا کھانا جن کو کتاب دی گئی ہے تمہارے لیے حلال ہے۔ یہاں طعام کھانے سے مراد ذبیحہ ہے۔ یعنی کوئی یہودی یا نصرانی بشرطیکہ اسلام سے مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی نہ بنا ہو،

---

[1] معارف مفتی

اگر حلال جانور ذبح کرتے وقت غیر اللہ کا نام نہ لے تو اس کا کھانا مسلمان کو حلال ہے۔ مرتد کے احکام جدا گانہ ہیں لیکن اہل کتاب کے کھانا حلال ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہمارے اور ان کے درمیان کھانے پینے میں کوئی رکاوٹ اور کوئی چھوت چھات نہیں ہے ہم ان کے ساتھ کھا سکتے ہیں اور وہ ہمارے ساتھ۔ لیکن یہ عام اجازت دینے سے پہلے اس فقرے کا اعادہ فرمایا گیا ہے کہ تمہارے لیے پاک چیزیں حلال کر دی گئی ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگر اہل کتاب پاکی و طہارت کے ان قوانین کی پابندی نہ کریں جو اسلامی قانون کے نقطۂ نظر سے ضروری ہیں یا اگر ان کے کھانے میں حرام چیزیں شامل ہوں تو اس سے پرہیز کرنا چاہیے مثلاً اگر وہ خدا کا نام لیے بغیر کسی جانور کو ذبح کریں یا اس پر خدا کے سوا کسی اور کا نام لیں تو اسے کھانا ہمارے لیے جائز نہیں ہے۔ اسی طرح اگر ان کے دسترخوان پر شراب یا سؤر یا اور کوئی چیز حرام ہو تو ہم ان کے ساتھ شریک نہیں ہو سکتے۔ اہل کتاب کے سوا دوسرے غیر مسلموں کا بھی یہی حکم ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ذبیحہ اہل کتاب ہی کا جائز ہے جبکہ انہوں نے اس پر خدا کا نام لیا ہو مگر غیر اہل کتاب تو ان کے ہلاک کیے ہوئے جانور کو ہم نہیں کھا سکتے۔[1]

آیت کی تشریح میں چونکہ بعض شارحین قرآن سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں اس لیے ضروری ہے کہ یہاں چند ضروری باتوں کی طرف اشارہ کر دیا جائے۔ اول یہ کہ اہل کتاب کون ہیں۔ دوم یہ کہ آیت میں طعام اہل کتاب سے کیا مراد ہے۔ باتفاق امت کتاب سے مراد وہ آسمانی کتاب ہے جس کا کتاب اللہ ہونا قرآن سے معلوم ہو چکا ہے جیسے تورات، انجیل، زبور، صحف موسیٰ، اور صحف ابراہیم وغیرہ اس لیے وہ قومیں جو ان میں سے کسی کتاب پر ایمان رکھتی ہوں اہل کتاب ہیں۔ مشرکین مکہ، مجوس بت پرست ہندو، بدھ، آریہ، سکھ وغیرہ اہل کتاب نہیں ہیں۔

یہاں یہ سوال بھی بعد ازاں اہمیت رکھتا ہے کہ یہود و نصاریٰ کو اہل کتاب سمجھنے اور کہنے کے لیے یہ شرط ہے کہ وہ صحیح طور پر اصلی تورات و انجیل پر ایمان و عمل کے پابند ہوں۔ قرآن کی بے شمار تصریحات سے واضح ہوتا ہے کہ اہل کتاب ہونے کے لیے صرف اتنی بات کافی ہے کہ وہ کسی آسمانی کتاب کے قائل ہوں اور اس پر عمل کے مدعی ہوں۔ خواہ وہ کتنی گمراہیوں کے شکار ہو چکے ہوں یہ حقیقت ہے کہ قرآن نے جن کو اہل کتاب کا لقب دیا ہے ان کے بارے میں یہ بھی انکشاف کیا ہے کہ وہ آسمانی کتابوں میں تحریف کرتے ہیں بلکہ عزیر کو خدا کا بیٹا اور مسیح کو خدا کا فرزند

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم

قرار دیتے ہیں، ان کی طرف مشرکانہ اعمال اور افکار کی بھی نسبت کی ہے لیکن ان حالات و صفات کے حامل ہونے کے باوجود قرآن نے ان کو اہل کتاب کہا ہے۔ الجصاص نے احکام القرآن میں نقل کیا ہے کہ فاروق اعظم کے زمانہ خلافت میں آپ کے کسی گورنر نے دریافت کیا کہ یہاں کچھ لوگ ایسے ہیں جو تورات کو مانتے ہیں اور یہود کی طرح یوم السبت کی تعظیم کرتے ہیں مگر قیامت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ایسے لوگوں سے کیا معاملہ کیا جائے۔ فاروق اعظم نے جواب دیا کہ ان کو اہل کتاب ہی سمجھا جائے۔

کیا یہودی کے لیے اصلاً یہودی ہونا اور عیسائی کے اصلاً عیسائی ہونا ان کے ذبیحہ کے مسلمان کے لیے حلال ہونے کی شرط ہے؟ یا محض اسماً اور نسلاً ان کا اہل کتاب ہونا کافی ہے؟ کچھ بزرگوں نے اگرچہ یہی سمجھا ہے کہ یہودی کے لیے اصلاً یہودی ہونا اور عیسائی کے لیے اصلاً عیسائی ہونا حلت کی بنیادی شرط ہے۔ حضرت علی نے بنی تغلب کے نصاریٰ کے بارے میں فتویٰ دیا تھا کہ

بنی تغلب کے نصاریٰ کا ذبیحہ نہ کھاؤ کیونکہ انہوں نے مذہب نصرانیت میں سے شراب نوشی کے علاوہ کچھ نہیں لیا۔ (مظہری)

لیکن عام صحابہ و تابعین کی تحقیق یہی ہے کہ یہ بھی عام نصرانیوں کی طرح ہیں اس لیے انہوں نے بنی تغلب کے عیسائیوں کے ذبیحہ کو بھی حلال قرار دیا۔ چنانچہ القرطبی نے جمہور امت کی طرف نسبت کرکے لکھا ہے کہ

جمہور امت کہتے ہیں کہ نصرانی کا ذبیحہ حلال ہے خواہ بنی تغلب میں سے ہو یا ان کے سوا کسی دوسرے قبیلے سے ہو اسی طرح ہر یہودی کا بھی ذبیحہ حلال ہے۔
(قرطبی ص ۸، ج ۶)

ہاں جن عیسائیوں اور یہودیوں کے بارے میں یقینی طور پر یہ بات معلوم ہو جائے کہ وہ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کو نبی ہی نہیں مانتے ہیں وہ اہل کتاب کے حکم میں نہیں۔

آیت میں طعام سے مراد

طعام کے لغوی معنے کھانے کی چیز کے ہیں۔ جس میں از روئے لغت ہر قسم کی کھانے کی چیز داخل ہے لیکن جمہور امت کے نزدیک یہاں طعام سے مراد صرف اہل کتاب کا ذبیحہ ہے کیونکہ گوشت کے سوا دوسری اشیائے خوردنی میں اہل کتاب اور دوسرے کفار میں کوئی فرق نہیں ہے۔ کھانے پینے کی خشک چیزیں گیہوں، چنا، چاول اور پھل وغیرہ ہر کافر کے ہاتھ کا حلال و جائز ہے۔ اس میں کسی کا

کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مقصد یہ ہے کہ اہل کتاب اور دوسرے کفار کے طعام میں جو فرق شرعاً ہو سکتا ہے وہ صرف ان کے ذبیحہ میں ہے۔ اس لیے اس آیت میں باتفاق اُمت طعام اہل کتاب سے مراد ان کا ذبیحہ ہے۔ یہ مقرر ہو جانے کے بعد کہ طعام سے مراد ذبیحہ ہے یہ بات سمجھ لینی آسان ہے کہ اہل کتاب کا ذبیحہ تین شرطوں کے ساتھ حلال ہے۔

اوّل: کہ وہ ذبیحہ ان جانوروں میں سے نہ ہو جو اسلامی قانون میں مسلمانوں کیلیے حرام ہیں جیسے سُور کا گوشت وغیرہ۔

دوم یہ کہ ذبح کے وقت اس پر اللہ کا نام لیا جاتے غیر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ ایسا ذبیحہ جس پر خدا کا نام نہ لیا جاتے یا غیر اللہ کا لیا جائے خود مسلمان کا بھی حلال نہیں ہے چہ جائے کہ یہودی اور عیسائی۔ الجصاص نے امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور امام محمد کا یہی مذہب لکھا ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ وہ اسلام سے مرتد ہو کر یہودی یا نصرانی نہ بنے ہوں اس لیے کہ مرتد کا ذبیحہ حلال نہیں ہے جیسا کہ شیخ الاسلام نے بتایا ہے۔

مسلمان کا کھانا کتابی کیلیے جائز ہے

۲۷ - اور تمہارا کھانا ان کے لیے حلال ہے۔ اس مقام پر مسلمان کے کھانے کا کتابی کے لیے جائز ہونے کو ذکر بطور مجازات اور مکافات کے استطراداً فرما دیا۔ یعنی بعض احادیث میں جو آیا ہے لا یاکل طعامك الا تقی تیرا کھانا نہ کھائے مگر پرہیزگار۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ غیر پرہیزگار لوگوں کے لیے تمہارا کھانا حرام ہے۔ جب مسلمان کے لیے کافر کتابی کے ذبیحہ کی اجازت ہو گئی تو ایک وہم ہوتا کہ ذبیحہ اور کھانا دوسروں کے لیے کیوں حرام ہوگا لہ مسلمان رک رہے تھے کہ معلوم نہیں کہ ان کیلیے جائز بھی ہے یا نہیں کہ ہم کتابیوں کو اپنے کھانے میں سے کھلا سکیں۔ یہاں تصریح کردی گئی ہے کہ بے تکلف جائز ہے۔ نسفی اور رازی نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے۔ یہاں یہ صراحت اس لیے بھی ضروری ہے کہ نکاح کا بیان اس کے فوراً بعد آ رہا ہے۔ ذبیحہ تو طرفین سے حلال ہے لیکن نکاح کا قیاس اس پر درست نہیں ہے۔ نکاح صرف ان کی عورتوں سے مسلمان مرد کا جائز ہے مسلمان عورت کا نکاح ان کے مرد سے جائز نہیں ہے۔ یہ امام رازی کی نکتہ آفرینی ہے اور خوب ہے۔

لہ افادات شیخ الاسلام

شادی کا مقصد عفت ہے

۲۸ - نیز تمہارے لیے مسلمان پاک دامن اور کتابی عورتیں حلال ہیں بشرطیکہ ان کے مہران کے حوالے کر دو اور مقصود قیدِ نکاح میں لانا ہو۔ پاکدامن کی قید شاید ترغیب کے لیے ہو۔ یعنی ایک مسلمان کو چاہیے کہ نکاح کرتے وقت پہلی نظر عورت کی عفت پر ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ پاکدامن کے سوا کسی اور سے نکاح صحیح نہیں ہے[1]۔ اصل ارشاد میں محصنات کہا ہے۔ شارحین قرآن نے اسے پاکبازی و عفت کے معنے میں لیا ہے۔ اس کا مصدر احصان ہے۔ یہ حصن سے بنا ہے حصن قلعہ کو کہتے ہیں۔ اسی سے حصان، احصان، محصن اور محصن الفاظ بنائے گئے ہیں۔ حصان قرآن میں نہیں آیا ہے مگر عرب شاعروں نے استعمال کیا ہے۔ اس کے معنے پاکدامن عورت کے ہیں۔ احصان کے معنے حفاظت میں لینے کے ہیں۔ لفظ احصان سے محصنات لاکر نکاح کی غرض کی طرف اشارہ کیا ہے کہ شادی کا مقصد یہ ہے کہ عورت کو عصمت و حفاظت میں لایا جائے۔ صرف حیوانی خواہش کا پورا کرنا نکاح کا مقصد نہیں ہے یعنی ایسا نہ ہو کہ صرف لطف اندوزی کا ارادہ ہو اور بس۔ اس لفظ کے ذریعے کھلے لفظوں میں بتایا گیا ہے کہ شادی سے عورتوں کا مقصد یہی ہے کہ وہ عفت و عصمت کی زندگی گزاریں گی۔ اخلاق و کردار بلند رکھیں گی اور اپنے داعیاتِ فطرت کو اپنے شوہر کے ذریعے پورا کریں گی۔ اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے جیسا کہ شیخ الاسلام نے بتایا ہے کہ شادی کرتے وقت اوّل نظر عورتوں کی پاکدامنی اور عفت و عصمت پر ہی ہونی ضروری ہے۔ گویا قرآن نے بتا دیا کہ شادی کے ذریعے گوہرِ عصمت کو محفوظ رکھا جائے۔ بہرحال نکاح کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ عفت و عصمت اور ناموس و آبرو کی انمول دولت جو انسان کو بخشی گئی ہے۔

کتابی عورت سے نکاح

اس دولت کی حفاظت کا آئینی طریقہ صرف نکاح ہے۔ چونکہ نکاح کا مقصد عفت و عصمت کا تحفظ ہے اس لیے کتابی عورتوں سے شادی کرنے میں بھی احصان یعنی عورتوں کے پاکدامن ہونے کو اولیت دی ہے مگر یاد رہے کہ بتایا یہ جا رہا ہے کہ ایک مسلمان کو چاہیے کہ نکاح

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرتے وقت پہلی نظر عورت کی عفت اور پاکدامنی پر رکھے اسی لیے فرمایا کہ

تمہارے لیے کتابی عورتیں حلال ہیں بشرطیکہ ان کے مہران کے حوالہ کر دو اور مقصود قید نکاح میں رکھنا ہو۔

اہل کتاب کے ایک مخصوص حکم کے ساتھ دوسرا مخصوص حکم بھی بیان فرمادیا یعنی یہ کہ کتابی عورت سے نکاح کرنا شرعاً جائز ہے۔ مشرکہ سے اجازت نہیں ہے ولا تنکحوا المشرکات حتی یؤمن [1] نکاح کی اجازت صرف یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے دی گئی ہے اور اس کے ساتھ یہ شرط بھی لگا دی گئی ہے کہ وہ محصنات ہوں۔ اس حکم کی تفصیلات میں علماء کا اختلاف ہے۔ عبداللہ ابن عباس کا خیال ہے کہ یہاں اہل کتاب سے مراد وہ اہل کتاب ہیں جو اسلامی حکومت کے شہری ہوں۔ رہے دارالحرب اور دارالکفر کے یہود و نصاریٰ تو ان کی عورتوں سے نکاح کرنا درست نہیں ہے۔ احناف اس سے تھوڑا سا اختلاف کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک بیرونی ممالک کے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کرنا حرام تو نہیں مگر مکروہ ضرور ہے۔ برخلاف اس کے سعید بن المسیب اور حسن بصری اس کے قائل ہیں کہ آیت اپنے حکم میں عام ہے لہٰذا ذمی اور غیر ذمی میں فرق کرنے کی ضرورت نہیں پھر محصنات کے مفہوم میں یہاں فقہاء کے درمیان اختلاف ہے۔ حضرت عمر کے نزدیک اس سے پاک دامن عصمت مآب عورتیں ہیں اور اس بنا پر وہ اہل کتاب کی آزاد منش عورتوں کو اس اجازت سے خارج کرتے ہیں۔ یہی رائے حسن، شعبی اور نخعی کی ہے اور ابو حنیفہ نے بھی اسی کو پسند کیا ہے امام شافعی کی رائے یہ ہے کہ یہاں یہ لفظ لونڈیوں کے مقابلے میں استعمال ہوا ہے یعنی اس سے مراد اہل کتاب کی وہ عورتیں ہیں جو لونڈیاں نہ ہوں [2]

احناف نے جو دارالکفر اور دارالحرب میں کتابی عورتوں سے نکاح کو مکروہ قرار دیا ہے۔ ان کے یہاں اس کے جواز کے لیے دار اسلام اور اسلامی حکومت کا شہری ہونا شرط ہے۔ یہ بات دلیل کی بنی تلی ترازو میں اگر رکھی جائے تو بہت وزنی معلوم ہوتی ہے۔ یہ بات انہوں نے غالباً فحوائے کلام سے استنباط فرمائی ہے۔ آیت میں الیوم سے معلوم ہوتا ہے کہ اس اجازت میں وقت کے حالات کو بھی دخل ہے۔ کہا یہ جاتا ہے کہ جب اجازت مل رہی ہے اس وقت کفار کا دبدبہ ختم ہو گیا اور مسلمان ایک ناقابل شکست طاقت بن چکے تھے۔ یہ اندیشہ نہیں تھا کہ ان کو کتابیات سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

نکاح کی اجازت دی گئی تو وہ کسی احساس کمتری میں مبتلا ہو کر تہذیب معاشرت اور اعمال و اخلاق میں ان سے متاثر ہوں گے بلکہ توقع تھی کہ مسلمان ان سے نکاح کریں گے تو ان کو متاثر کریں گے اور اس راہ سے ان کتابیات کے عقائد و اعمال میں خوشگوار تبدیلی ہوگی اور عجب نہیں کہ ان میں بہت سی ایمان و اسلام سے مشرف ہو جائیں۔ نیز یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہیے کہ کتابی عورتوں سے نکاح کی اجازت بہرحال ایک اجازت ہے اس میں آدمی کے خود اپنے اور اپنے خاندان کے دین و ایمان کے لیے جو خطرہ ہے وہ مخفی نہیں ہے۔ چنانچہ اسی بنا پر مسلمان مردوں کو تو کتابی عورتوں سے نکاح کی اجازت دی گئی لیکن مسلمان عورتوں کو کسی صورت میں بھی کسی غیر مسلم سے نکاح کی اجازت نہیں ہے خواہ کتابی ہو یا غیر کتابی۔ یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ یہ اجازت صرف ایک اجازت ہے یہ کوئی مستحسن چیز نہیں ہے۔ اگر ماحول اسلامی تہذیب و معاشرت کا ہو اور مسلمان کسی نیک چلن کتابی عورت سے نکاح کرے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے لیکن کافرانہ ماحول میں جہاں کفر اور اہل کفر کا غلبہ ہو اس قسم کا چاہے اس آیت کے الفاظ کے خلاف نہ ہو لیکن اس کی رُوح کے خلاف ضرور ہے۔ شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی قدس اللہ سرہ العزیز نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ کسی چیز کے حلال ہونے کے معنے یہ ہیں کہ اس میں فی حد ذاتہٖ کوئی وجہ تحریم نہیں، لیکن اگر خارجی اثرات و حالات ایسے ہوں کہ اس حلال سے منتفع ہونے میں بہت سے حرام کا ارتکاب کرنا پڑے بلکہ کفر میں مبتلا ہونے کا احتمال ہو تو ایسے حلال سے انتفاع کی اجازت نہ دی جائے گی۔ موجودہ زمانے میں یہود و نصاریٰ کے ساتھ کھانا پینا بے ضرورت اختلاط کرنا ان کی عورتوں کے جال میں پھنسنا یہ چیزیں جو خطرناک نتائج پیدا کرتی ہیں وہ مخفی نہیں لہٰذا بد دینی کے اسباب و ذرائع سے بچنا ہی چاہیے۔

جمہور صحابہ و تابعین کے نزدیک اگرچہ از روئے قرآن اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح فی نفسہٖ جائز ہے لیکن ان سے نکاح کرنے پر جو دوسرے مفاسد اور خرابیاں اپنے لیے اپنی اولاد کے لیے بلکہ پوری اُمّت اسلامیہ کے لیے لازمی طور پر پیدا ہوں گے ان کی وجہ سے اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کو بھی مکروہ سمجھتے تھے۔

الجصاص نے احکام القرآن میں شقیق بن سلمہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضرت حذیفہ بن الیمان جب مدائن پہنچے تو وہاں ایک یہودی عورت سے شادی کرلی۔ حضرت فاروق اعظم کو جب اس کی اطلاع ہوئی تو انہوں نے حضرت حذیفہ کو خط لکھا کہ اس کو طلاق دے دو۔ حضرت حذیفہ نے جواب میں دریافت کیا کہ کیا یہ شادی حرام ہے۔ فاروق اعظم نے جواب میں تحریر فرمایا

کو میں حرام نہیں کہتا لیکن ان لوگوں کی عورتوں میں بالعموم عفت و پاکدامنی نہیں ہوتی ہے اس لیے مجھے خطرہ ہے کہ کہیں آپ لوگوں کے گھرانے میں اس راہ سے بدکاری نہ آ جائے۔ اور امام محمد بن الحسن نے کتاب الآثار میں اس واقعہ کو بروایت امام ابوحنیفہ اس طرح نقل کیا ہے کہ دوسری بار فاروق اعظم نے جب حضرت حذیفہ کو خط لکھا تو اس کے الفاظ یہ تھے۔

> میں آپ کو قسم دیتا ہوں کہ میرا یہ خط اپنے ہاتھ سے رکھنے سے پہلے ہی اس کو طلاق دے کر آزاد کر دو۔ مجھے یہ خطرہ ہے کہ کہیں دوسرے مسلمان بھی اقتدا نہ کریں۔ اور اہل ذمہ اہل کتاب کی عورتوں کو ان کے حسن و جمال کی وجہ سے مسلمان عورتوں پر ترجیح دینے لگے۔ تو مسلمان عورتوں کے لیے اس سے بڑی مصیبت کیا ہوگی۔
> (کتاب الآثار ص ۱۵۶)

اس خط کو نقل کر کے امام محمد نے لکھا ہے کہ فقہاء حنفیہ اسی کو اختیار کرتے ہیں کہ وہ اس نکاح کو حرام تو نہیں کہتے لیکن دوسرے مفاسد اور خرابیوں کی وجہ سے مکروہ سمجھتے ہیں۔ اور شیخ ابن الہمام نے فتح القدیر میں لکھا ہے کہ حذیفہ کے علاوہ طلحہ اور کعب بن مالک کو بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا کہ انھوں نے اس آیت کی بنا پر اہل کتاب کی عورتوں سے نکاح کر لیا جب فاروق اعظم کو اس کی اطلاع ملی تو سخت ناراض ہوتے اور ان کو حکم دیا کہ طلاق دے دیں۔ (مظہری)

فاروق اعظم کا زمانہ خیر القرون کا زمانہ ہے جبکہ اس کا کوئی احتمال نہ تھا کہ کوئی یہودی، نصرانی عورت کسی مسلمان کی بیوی بن کر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف کوئی سازش کر سکے۔ اس وقت تو صرف یہ خطرات سامنے تھے کہ کہیں ان میں بدکاری ہو تو ان کی وجہ سے ہمارے گھرانے گندے ہو جائیں یا ان کے حسن و جمال کی وجہ سے لوگ ان کو ترجیح دینے لگیں جس کا نتیجہ یہ ہو کہ مسلمان عورتیں تکلیف میں پڑ جائیں۔ فاروق اعظم کی دور بین نگاہ ان مفاسد کے پیش نظر ان بزرگوں کو طلاق پر مجبور کرتی ہے۔ اگر موجودہ دور کا نقشہ ان کے سامنے ہوتا تو اندازہ کیجیے کہ ان کا فیصلہ کیا ہوتا۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نفس جواز میں کوئی گفتگو نہیں اور نہ آیت قرآنی کے بعد اس کی کوئی گنجائش ہے۔ البتہ فقہاء نے مفاسد پر نظر کر کے اور مصلحت شرعی کا لحاظ کر کے یہ فتویٰ دیا ہے کہ بلا ضرورت ایسے نکاح سے بچنا چاہیے۔ شیخ ابن الہمام کہتے ہیں کہ کتابی عورت سے نکاح جائز ہے لیکن اچھا یہ ہے کہ نہ کرے۔ در مختار میں ہے کہ نکاح ہو سکتا ہے مگر مکروہ ہے۔

اور کتابیہ حربیہ کے ساتھ نکاح کی کراہت تو ہر شبہ سے بالا ہے۔ حضرت علیؓ کا ایک اثر ہے جس میں اپنے کتابیہ مقیم دارالحرب سے نکاح پر کراہت ظاہر کی ہے۔ (المبسوط)

علامہ شامی نے فیصلہ کیا ہے کہ نکاح غیر حربیہ کے ساتھ تو مکروہ تنزیہی ہے لیکن حربیہ کے ساتھ مکروہ تحریمی ہے۔

نکاح کا بنیادی مقصد عفاف ہے

آخر میں ارشاد ہوا ہے اور مقصد قید نکاح میں لانا ہو۔ اصل الفاظ میں محصنین آیا ہے۔ یعنی قید نکاح میں لانے کو، گویا اس طرف اشارہ ہو گیا کہ نکاح بظاہر قید ہے لیکن یہ قید ان آزادیوں اور ہوس رانیوں سے بہتر ہے جن کی طلب میں انسان تمام سلسلہ ازدواج ہی کو معدوم کر دینا چاہتے ہیں۔ گویا اس طرح صحت نکاح کی شرطوں کی طرف اشارہ کر دیا کہ اہل کتاب کی عورتوں کے ساتھ تم نکاح کر سکتے ہو بشرطیکہ ان کا مہر ادا کرو اور بشرطیکہ نکاح سے مقصود ان عورتوں کو فی الواقع بیوی بنانا مقصود ہو۔ یہاں صحت نکاح کی دو بنیادی شرطیں قائم کیں، ایک یہ کہ نکاح مال یعنی مہر کے ساتھ ہو۔ دوسری یہ کہ عورت کو اپنے قبضہ میں رکھنا مقصود ہو، ان دو شرطوں کے ساتھ تمہارے لیے کتابی عورتوں سے نکاح جائز ہے۔ اس آیت میں لفظ احصان عفاف اور پاکدامنی کے معنے میں ہے یعنی ایک مرد ایک عورت کو سنجیدہ ارادے کے ساتھ اور زندگی بھر کی رفاقت کے عزم کے ساتھ اپنی حفاظت و حمایت میں لے اور عورت اسی شعور و ارادے کے ساتھ اس کے حصن حمایت میں داخل ہو۔ اس احصان کے بغیر عورت اور مرد کے تعلق سے وہ مقصد پورا نہیں ہو سکتا جو اسلامی قانون کے نکاح میں پیش نظر ہے۔ اگر کوئی شخص کسی عورت سے وقتی تعلق پیدا کرتا ہے تو اگرچہ اس کے لیے اس نے نکاح کی رسم بھی پوری کر دی ہے اور اس کو مال بھی دے دیا ہے لیکن یہ روح احصان کے خلاف ہے۔ قرآن نے احصان کی شرط لگا کر نکاح کے بنیادی اور اہم مقصد کو واضح کر دیا ہے کہ اسلامی قانون میں نکاح کا مقصد اخلاق کی حفاظت اور عفاف ہے، اسی لیے وہ زنا کو حرام کرتا ہے اور نوع انسانی کی صنفوں کو مجبور کرتا ہے کہ اپنے فطری تعلق کو ایک ایسے ضابطہ کا پابند بنا دیں جو اخلاق کو فحش اور بے حیائی سے اور تمدن کو فساد

ؔ افادات شیخ الاسلام

سے محفوظ رکھنے والا ہو۔ اسی لیے یہاں نکاح کو احصان سے تعبیر کیا ہے جو نکاح کرتا ہے وہ محصن ہے اور جس سے نکاح کیا جاتا ہے وہ محصنہ ہے۔ اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت اس چیز کی ہے کہ مرد و عورت کے تعلق میں احصان ہو یعنی اخلاق اور عفت و عصمت کا پورا پورا تحفظ ہو۔ یہ ایسا مقصد ہے جس کے لیے ہر چیز کو قربان کیا جا سکتا ہے مگر کسی دوسری چیز پر اس کو قربان نہیں کیا جا سکتا۔

نکاح اسلام میں اخلاقی و روحانی ادارہ ہے

۲۹۔ نہ یہ کہ آزاد شہوت رانی کرنے لگو یا چوری چھپے آشنائیاں کرو۔ جس طرح پہلے عورت کی پاکدامنی کا ذکر کیا تھا یہاں مرد کو پاکباز اور عفیف رہنے کی ہدایت فرما دی ہے الطیبات للطیبین والطیبون للطیبات اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کی نظر میں نکاح کی غرض گوہر عصمت کو محفوظ اور مقصد ترویج کو پورا کرنا ہے۔ شہوت رانی اور ہوس پرستی نہیں ہے لے

دراصل نکاح اسلام میں کوئی ضمنی اور ثانوی حیثیت کی چیز نہیں ہے بلکہ ایک اہم اور زبردست اخلاقی اجتماعی اور روحانی ادارہ ہے۔ اس کے مصالح اور منافع فرد کے خاندان کے معاشرے کے، سب کے لیے بے شمار ہیں۔ اسی لیے نکاح کو اردو میں خانہ آبادی کہتے ہیں۔ اُجڑے ہوئے سنسان اور ویران گھرانے اسی ذریعے سے آباد ہوتے ہیں۔ مرد و عورت کے اس باہمی تعلق کو اسلام نے صرف اسی صورت میں جائز رکھا ہے کہ زوجین کا اس سے اصل مقصود ایک خاندان کی بنیاد رکھنا ایک مستقل معاشرہ قائم کرنا ہو۔ اپنے کو مہذب و متمدن کہلانے والی قوموں میں نکاح کی اس صورت کے علاوہ مرد و زن کے باہمی تعلق کے لیے دو اور صورتیں بھی رائج ہیں۔ ایک صورت تو صاف اور کھلی بدکاری کی ہے۔ عورت زنا کے لیے آزاد ہے۔ اس کو باقاعدہ پیشہ بناتے نہ سوسائٹی اسے اس سے روک سکے نہ حکومت، جو مرد جب چاہے اس کے ہاں جا کر ایک خاص کرایہ دے کر اپنے جسم کا پانی بہائے اور منہ کالا کرے۔ دوسری صورت چوری چھپے آشنائی کی ہے یعنی عصمت کے معنے ہی مٹ جائیں اور شریف و بیسوا میں کوئی فرق نہ رہے۔ قرآن نے دونوں صورتوں کو لعنت قرار دیا ہے۔ پہلی صورت سفاح ہے اور

لے افادات شیخ الاسلام

دوسری صورت اتخاذ خدان ہے۔ جائز صورت مرد و عورت کے جنسی تعلق کی صرف نکاح بتائی ہے نکاح چوری چھپے نہیں اعلان کے ساتھ ہوتا ہے۔ اس میں خدا کا نام درمیان میں لاکر خالق کائنات کا واسطہ ڈال کر مرد و عورت کی راحت و آسائش کا ذمہ لیتا ہے۔ اور عورت مرد کی خدمت کی ذمہ داریوں کو قبول کر لیتی ہے۔ دونوں پر ایک دوسرے کے حقوق قائم ہوتے ہیں، فرائض عائد ہوتے ہیں، دونوں اپنے کو مستقل پناہ کے لیے عمر کے ہر دور، مال و اقبال کے ہر اتار چڑھاؤ کے لیے حتی الامکان تیار کرتے ہیں اور یہ سب کچھ مجلس میں گواہوں کی موجودگی میں ہوتا ہے۔ محصنین غیر مسافحین اور متخذی اخدان لاکر قرآن نے ازدواجی و خانگی زندگی کا وہ بلند ترین معیار پیش کر دیا جس میں کوئی مادی تہذیب آج تک نہیں پہنچ سکی ہے۔[1]

ایمان و کفر کا تقابلی مطالعہ

۳۰ - اور جو بھی ایمان کی روش پر چلنے سے انکار کرے گا اس کا سارا کارنامہ زندگی بے کار ہو کر رہ جائے گا اور وہ آخرت میں دیوالیہ ہوگا۔ جن کتابی عورتوں سے نکاح کی اجازت ملی ہے اس کا قاعدہ یہ ہونا چاہیے کہ مومن قانت کی حقانیت عورت کے دل میں گھر کر جاتے، نہ یہ کہ کتابیات پر مفتون ہو کر اُلٹا اپنا متاع ایمان ہی گنوا بیٹھے اور خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق ہو کر رہ جاتے۔ چونکہ کافر عورت سے نکاح کرنے میں اس فتنہ کا قوی احتمال تھا۔ اس لیے ومن یکفر بالایمان کی تہدید نہایت برموقع ہے۔ یہ میرا خیال ہے۔ باقی حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اہل کتاب کو کفار سے دو حکم میں مخصوص کیا، یہ فقط دُنیا میں ہے اور آخرت میں ہر کافر خراب ہے گر نیک عمل بھی کرے تو قبول نہیں ہے۔[2] حضرت شاہ صاحب کا مطلب یہ ہے کہ اہل کتاب کو دُنیا کی زندگی میں جو یہ رعایت دی گئی ہے کہ ان کا ذبیحہ حلال ہے اور ان کی عورتوں سے شادی جائز ہے تو اس رعایت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ آخرت میں بھی ان کو کوئی رعایت ملے گی، آخرت میں ان میں اور دوسرے کافروں میں کفر کی حد تک کوئی فرق نہیں ہے۔ اس صورت میں کفر بالایمان کے مجرم کے مرتکب اہل کتاب ہوں گے اور حضرت مولانا عثمانی نے جو مطلب بتایا ہے اس کی بنیاد پر کفر بالایمان کے مجرم اہل ایمان ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص اہل کتاب کے ذبیحہ کھانے

---

[1] تفسیر ماجدی [2] افادات شیخ الاسلام

اور ان کی عورتوں سے نکاح کرنے کی اجازت ہے فائدہ اٹھاتے وہ اپنے ایمان و اخلاق کی طرف سے ہوشیار رہے، کہیں ایسا نہ ہو کہ کافر بیوی کے عشق میں مبتلا ہو کر یا اس کے عقائد و اعمال سے متاثر ہو کر وہ اپنے ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھے یا اخلاق و معاشرت میں ایسی روش پر چل پڑے جو ایمان کے منافی ہو۔ صاحبِ کشاف نے تصریح کی ہے کہ ایمان سے یہاں شرائع ایمان مراد ہیں۔ گویا ایمان مصدر ہے اور معنے میں اسم مفعول کے ہے یعنی مومن بہ وہ باتیں وہ احکام جن پر ایمان کا مطالبہ ہے۔ مقتضیات اور ایمان کے تقاضے یعنی جو شخص ایمان لانے کے بعد ایمان کے تقاضوں کو نہیں مانے گا تو اس کا خواہ کیسا ہی عمل ہو بے کار ہو کر رہ جائے گا۔ حاصل یہ ہے کہ آدمی خدا اور رسول کو ماننے کا دعویٰ بھی کرے اور ساتھ ہی خدا اور رسول کے احکام کے خلاف محض اپنی خواہشات کی اتباع میں قانون و شریعت ایجاد کر کے اس پر عمل پیرا بھی ہو۔ یہ وہی ایمان جس کو قرآن نے نؤمن ببعض و نکفر ببعض سے تعبیر کیا ہے۔ کفر و ایمان دونوں کے اس ملغوبہ کی خدا کے ہاں کوئی قیمت نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں صرف وہ ایمان معتبر ہے جو نبوت کی شرطوں پر ہو۔ جو لوگ اپنی شرائط پر ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان ان مدعیانِ ایمان کے منہ پر پھینک مارا جائے گا۔ اور اس قسم کے ایمان کے تحت کیے ہوتے سارے اعمال خدا کے ہاں بے قیمت ہوں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان روح ہے کوئی عمل کیسا ہی خوشنما ہو اگر روح سے خالی ہے تو اس کا شمار نیکی میں ہرگز نہیں ہو سکتا۔ ایمان نام اسی روحِ عمل کا ہے۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا قُمْتُمْ إِلَى الصَّلَوٰةِ فَاغْسِلُوا وُجُوهَكُمْ
وَأَيْدِيَكُمْ إِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوا بِرُءُوسِكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ إِلَى الْكَعْبَيْنِ
وَإِنْ كُنْتُمْ جُنُبًا فَاطَّهَّرُوا وَإِنْ كُنْتُمْ مَرْضَىٰ أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ
أَوْ جَاءَ أَحَدٌ مِنْكُمْ مِنَ الْغَائِطِ أَوْ لَامَسْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمْ تَجِدُوا
مَاءً فَتَيَمَّمُوا صَعِيدًا طَيِّبًا فَامْسَحُوا بِوُجُوهِكُمْ وَأَيْدِيكُمْ
مِنْهُ مَا يُرِيدُ اللَّهُ لِيَجْعَلَ عَلَيْكُمْ مِنْ حَرَجٍ وَلَٰكِنْ يُرِيدُ
لِيُطَهِّرَكُمْ وَلِيُتِمَّ نِعْمَتَهُ عَلَيْكُمْ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ۝٦
وَاذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمِيثَاقَهُ الَّذِي وَاثَقَكُمْ بِهِ
إِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا وَاتَّقُوا اللَّهَ إِنَّ اللَّهَ عَلِيمٌ
بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝٧

۳۱

اے ایمان والو! جب تم نماز کو اٹھو تو اپنے چہروں اور اپنے
ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لیا کرو اور اپنے سروں پر مسح

کرلیا کرو[۳۲] اور اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت (دھولیا کرو)[۳۳] اور اگر تم حالتِ جنابت میں ہو تو خوب پاک وصاف ہو جاؤ[۳۴]،

اور اگر تم بیمار ہو یا سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی استنجا سے آتے یا تم نے عورتوں سے صحبت کی ہو، پھر تمہیں پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کرلو، اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کا مسح کرلو[۳۵]، اللہ نہیں چاہتا ہے کہ تمہارے پر کوئی تنگی ڈالے بلکہ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ تمہیں خوب پاک وصاف رکھے[۳۶]، اور تم پر اپنی نعمت پوری کردے تاکہ تم اس کے شکر گزار ہو جاؤ[۳۷]، اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کے اس عہد کو بھی یاد کرو جس کا اس نے تم سے معاہدہ لیا ہے جب کہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا[۳۸] اور اللہ کی نافرمانی سے بچو بے شک اللہ سینوں کے اندر تک کا علم رکھتا ہے[۳۹]۔

عہد عبودیت اور نماز کی اہمیت

امام رازیؒ نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ آغاز سورت میں اہل ایمان کو عقود پورا کرنے کی تلقین کی تھی۔ بندے اور خدا کے درمیان دو قسم کے عہد ہیں ایک عہد ربوبیت، دوسرے عہد عبودیت۔ دنیا کی ساری منفعتوں کو اگر کوزہ میں بند کیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ دو ہی قسموں میں محصور ہیں۔ کام ودہن کی لذت اور ازدواجی زندگی کی مزے داری۔ قرآن نے سابقہ آیات میں دونوں کے حلال وحرام کے دائرے بتاتے۔ اور گویا آخر میں فرمادیا کہ عہد ربوبیت کی میری جانب سے تکمیل ہو چکی ہے۔ اب تمہیں بندے ہونے کی حیثیت میں اس دنیا میں رہتے ہوتے کام ودہن کی لذتوں اور ازدواجی زندگی کی لطف اندوزیوں سے بہرہ ورش ہوتے ہوئے عہد عبودیت کو پوری وفاداری سے پورا کرنا چاہیے۔ ایمان کے بعد طاعات میں سب سے اونچا درجہ چونکہ نماز کا ہے اور نماز طہارت کے بغیر ہوتی نہیں ہے۔ اس لیے وضو، تیمم اور غسل کا ذکر کیا ہے۔ اور سید رشید رضا نے یہ بات بڑی پتے کی لکھی ہے کہ اصل مناسبت یہ ہے کہ پہلے کھانے اور شادی کا ذکر تھا۔ کھانے کا نتیجہ بول وبراز ہے اور شادی کا نتیجہ جنابت ہے۔ بول وبراز سے وضو واجب ہوتی ہے اور جنابت سے غسل کا وجوب ہوتا ہے، اس لیے یہاں اوّلاً وضو اور غسل کا تذکرہ کر دیا ہے اور لکھنے والوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ اوپر طعام ونکاح کے طیبات وخبائث کا ذکر فرماکر ان کی تطہیر فرمائی، اب نماز کی طہارت کا بیان ہو رہا ہے۔ نماز کی طہارت بصورت حدث وضو ہے اور بصورت جنابت غسل ہے۔ اسی ذیل میں پانی نہ ملنے یا کسی عذر کی صورت میں تیمم کی اجازت مرحمت فرما کر اس امت پر اتمام نعمت فرمادیا اور یہ بھی اس موضوع کا تکمیلی پہلو ہے۔ توحید ورسالت کے اقرار کے بعد اسلام کا دوسرا ستون نماز ہے۔ یہ عملی ارکان میں سرفہرست ہے اور دین میں اس کا جو مقام ہے وہ کسی بھی دوسرے عمل کا نہیں ہے۔ مومن کا ہر کام اللہ کی بندگی کا کام ہوتا ہے مگر نماز جیسی بندگی کی شان کسی کام میں نہیں ہوتی ہے، اس کا باطن ہی نہیں ظاہر بھی سراپا بندگی ہوتا ہے نماز ہی ایمان کا سب سے بڑا مظہر ہے۔ یہاں نماز کو ذکر کر کے اشارہ کیا ہے۔ اگر انسان کے اندر ایمان موجود ہو اور اللہ کی معبودیت اور اپنی عبدیت پر اسے یقین ہو تو یہ یقین سب سے پہلے نماز کی شکل اختیار کرتا ہے۔ یہ بات اسی آیت میں نماز کے ذکر سے معلوم نہیں ہوتی بلکہ قریب قریب ہر اس آیت قرآنی میں دکھائی دیتی ہے جس میں دین کے بنیادی اعمال گنائے گئے ہیں۔ اس انداز بیان سے قرآن اپنے مخاطبوں کے جگر دماغ میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ دل میں اگر ایمان کا بیج پڑ چکا

ہو تو اس سے عمل کا جو پورا نکلے گا وہ نماز کا پورا ہو گا۔ حضرت شیخ الاسلام نے اس موقعہ پر یہ بات خوب فرمائی ہے۔

امت محمدیہ پر جو عظیم الشان احسانات کیے گئے ان کا بیان سن کر ایک شریف اور حق شناس مومن کا دل شکر گزاری اور اظہار وفاداری کے جذبات سے لبریز ہو جاتے گا اور فطری طور پر اس کی یہ خواہش ہو گی کہ اس منعم حقیقی کی بارگاہ رفیع میں دست بستہ کھڑے ہو کر جبین نیاز خم کرے اور اپنی غلامانہ منت پذیری اور انتہائی عبودیت کا ثبوت دے اس لیے ارشاد ہوا کہ جب ہمارے دربار میں حاضری کا ارادہ ہو یعنی نماز کے لیے اٹھو تو پاک وصاف ہو کر آؤ۔ جن لذائذ دنیوی اور مرغوبات طبعی کا ذکر ابتداءً آیت وضو سے پہلی آیت میں اجازت دی گئی تھی یعنی طیبات اور محصنات وہ ایک حد تک انسان کو ملکوتی صفات سے دور بہیمیت سے نزدیک کرنے والی چیزیں ہیں اور کل احداث موجبات وضو وغسل، ان ہی کے استعمال سے لازمی نتیجہ کے طور پر پیدا ہوتے ہیں۔ لہٰذا مرغوبات نفسانی سے یکسو ہو کر جب ہماری طرف آنے کا قصد کرو تو پہلے بہیمیت کے آثار اور اکل وشرب وغیرہ کے پیدا کیے ہوتے کدرات سے پاک ہو جاؤ۔ یہ پاکی وضو اور غسل سے حاصل ہوتی ہے نہ صرف یہ کہ وضو کرنے سے بندہ مومن کا بدن پاک ہو جاتا ہے بلکہ جب وضو باقاعدہ کیا جاتے تو پانی کے قطرات کے ساتھ گناہ بھی جھڑ جاتے ہیں۔

۱۳۱ - اے اہل ایمان جب تم نماز کو اٹھو۔ یعنی سو کر اٹھو یا دنیا کے مشاغل چھوڑ کر نماز کے لیے اٹھ کھڑے ہو تو پہلے وضو کر لو، لیکن وضو کرنا اس وقت ضروری ہے جبکہ پہلے سے باوضو نہ ہو۔ آیت کے آخر میں ان احکام کی جو غرض وغایت بتائی گئی ہے یعنی و لکن یرید لیطہرکم اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ منہ وغیرہ دھونے کا وجوب اسی لیے ہے کہ حق تعالیٰ تم کو پاک کر کے اپنے دربار میں جگہ دے اگر یہ پاکی پہلے سے حاصل ہے اور کوئی ناقض پیش نہیں آیا تو پاک کو پاک کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اس کو ضروری قرار دینے سے امت حرج میں پڑتی ہے جس کی نفی ما یرید اللہ لیجعل علیکم من حرج میں کی گئی۔ ہاں مزید نظافت، نورانیت اور نشاط حاصل کرنے کے لیے اگر تازہ وضو کر لیا جائے تو مستحب ہے۔ شاید اسی لیے اذا قمتم الی الصلوٰۃ میں سلسلہ کلام ایسی رکھی گئی ہے جس سے ہر مرتبہ نماز کی طرف جانے کے وقت تازہ وضو کی ترغیب ہوتی ہے۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔

اصل ارشاد میں اذا قمتم آیا ہے اور اس کے بعد الی الصلاۃ ہے۔ قام کے بعد جب الی آتا ہے تو اس کے معنی قصد کرنے کے آتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ جب تم نماز کا قصد کرو۔ اسی بنا پر شارحین قرآن نے اس کی تشریح اذا اردتم سے کی ہے یعنی جب تم ارادہ کرو، شاید اس تشریح سے ان بزرگوں کے پیش نظر یہ ہے کہ اس کے عموم میں بیٹھ کر نماز پڑھنے والا بھی داخل ہو جاتے۔ ارشاد کا عموم بتا رہا ہے کہ یہ طہارت ہر نماز کے لیے ضروری ہے چنانچہ داؤد ظاہری کا یہی مذہب ہے لیکن مسلمانوں کی ملتِ عامہ کو اس سے اتفاق نہیں ہے، وہ وضو کو اسی پر ضروری کہتے ہیں جس کے وضو نہ ہو، اس لیے بالاتفاق یہاں اتنا فقرہ محذوف مانا گیا ہے کہ حالت وضو میں نہ ہو یعنی محدث ہو۔ اسی لیے وضو پر وضو ضروری نہیں ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ اس موضوع پر فقہا میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ مگر تازہ وضو کی بہت بڑی فضیلت ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خلفائے راشدین کا عام تعامل بھی یہی تھا۔ اس تشریح کی اصل اساس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور صحابہ کا عمل ہی ہے۔ چنانچہ مسند احمد، مسلم اور اصحاب سنن نے حضرت بریدہ کے حوالے سے نقل کیا ہے کہ

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لیے وضو کرتے تھے لیکن فتح مکہ کے روز آپ نے ایک ہی وضو سے ساری نمازیں پڑھیں۔ حضرت عمر نے کہا کہ یا رسول اللہ آج ایک ایسی بات دیکھنے میں آئی جو کبھی نہ دیکھی تھی یعنی یہ کہ آپ نے ایک ہی وضو سے نمازیں ادا کی ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں نے بالارادہ ایسا کیا ہے۔

ایسے ہی امام بخاری اور اصحاب سنن نے حضرت عمرو عامر الانصاری کے حوالے سے بتایا ہے کہ

> میں نے انس بن مالک سے سنا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہر نماز کے لیے وضو فرماتے تھے۔ میں نے عرض کیا کہ تمہارا طرز عمل کیا ہوتا تھا؟ فرمایا کہ ہم تو ایک ہی وضو سے اس وقت تک نمازیں پڑھتے رہتے تھے جب تک وضو نہ ٹوٹے۔

اسی سنت عملیہ کی بنا پر علما نے اجماعاً یہ قید لگائی ہے کہ جب نماز کے لیے اٹھو اور تمہارا وضو نہ ہو، امام نووی نے قاضی عیاض سے اس پر اہل فتویٰ کا اجماع نقل کیا ہے۔

نماز کے لیے وضو کی فرضیت

۳۰۲۔ تو اپنے چہروں اور اپنے ہاتھوں کو کہنیوں سمیت دھو لیا کرو اور اپنے سروں کا مسح کر لو، یعنی تر ہاتھ سر پر پھیر لو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مدۃ العمر میں مقدار ناصیہ سے

کم کا مسح ثابت نہیں ہوتا۔ مقدار ناصیہ چوتھائی سر کے قریب ہے، حنفیہ اس قدر مسح کرنے کو فرض کہتے ہیں۔[1]

یہاں وضو کے چار فرض بتاتے ہیں، منہ کا دھونا، ہاتھوں کا کہنیوں سمیت دھونا اور سر کا مسح کرنا۔ ان میں پہلا فرض منہ کا دھونا، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت عملی سے معلوم ہوتا ہے کہ منہ دھونے میں کلی کرنا اور ناک صاف کرنا بھی شامل ہے بغیر اس کے منہ کے غسل کی تکمیل نہیں ہوتی ہے۔ فقہائے نے دونوں یعنی مضمضہ کلی کرنا اور استنشاق ناک صاف کرنا کو سنت قرار دیا ہے لیکن امام احمد، امام اسحٰق، امام ابوعبید اور ابن المنذر اس کے وجوب کے قائل ہیں۔ اور اس کے واجب ہونے پر ان کا موقف یہ ہے کہ منہ اور ناک چہرے میں داخل ہیں۔ نیز احادیث میں اس کا حکم اور التزام ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ کلی کرنا اور ناک صاف کرنا ایک امر مسنون ہے اور بس، بالکل ایسے ہی جیسے وضو شروع کرنے سے پہلے ہاتھ دھو لینے آداب وضو میں داخل ہیں تاکہ جن ہاتھوں سے آدمی وضو کر رہا ہے وہ زرد پہلے پاک ہو جائیں۔

دوسرا فرض وضو میں ہاتھوں کا کہنیوں سمیت دھونا ہے یہ بات کہ کہنیوں کا وضو میں دھونا فرض ہے یا سنت، جمہور کی رائے میں فرض ہے۔ علامہ شوکانی نیل الاوطار میں رقمطراز ہیں۔

علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ کہنیوں کا دھونا فرض ہے اور اس موضوع پر امام زفر اور ابوبکر بن داؤد الظاہری کو چھوڑ کر کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے۔

اس اختلاف کا سرچشمہ یہ ہے کہ لفظ قرآنی الی المرافق میں لفظ الی کے معنے کیا ہیں؟ اگرچہ کچھ لوگوں نے اسے مع کے معنے میں لے کر بتایا ہے کہ آیت کے معنے یہ ہیں کہ کہنیوں سمیت ہاتھوں کو دھوؤ، لیکن محققین الی کو انتہائے غایت کے معنے میں ہی بتاتے ہیں۔ ابن جریر نے بھی لکھا ہے کہ عربی زبان میں ہر غایت جو الی کے ذریعے محدود ہو۔ اس میں دونوں احتمال ہیں کہ غایت حد میں داخل ہو یا خارج ہو اور دوسرے علماء لغت نے اس کے لیے ایک ضابطہ لکھا ہے کہ الی کا مابعد اگر الی کے ماقبل کی جنس سے ہوگا تو غایت حد میں داخل ہوگی اور اگر جنس سے نہ ہوگا تو غایت خارج ہوگی۔ اس فیصلہ کا تعلق سباق سے ہے جہاں سباق کہہ رہا ہو وہاں غایت داخل ہوگی اس لیے یہاں سباق بتا رہا ہے کہ چونکہ مرافق یدین کی جنس ہے اس لیے اس کا دھونا فرض ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور ثم اتموا الصیام الی اللیل میں چونکہ رات صوم کی جنس سے نہیں ہے اس لیے خارج ہے۔ خیر اس معاملہ میں رائے کا اختلاف ہو سکتا ہے لیکن اس پر سب کا اتفاق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وضو میں مرافق دھوتے تھے۔ آپ سے چھوڑنا کبھی ثابت نہیں ہے اس لیے درجہ فرضیت کہنیوں کا دھونا ہی ہے۔ اس میں درجہ استحباب ہو سکتا ہے تو کہنیوں سے آگے دھونا ہے جیسا کہ حضرت ابوہریرہ کا عمل صحیح مسلم میں آتا ہے کہ

> آپ نے وضو فرمایا چہرہ دھویا اور اس کو خوب دھویا، ہاتھ دھوئے تو بانہوں تک دھوتے، سر کا مسح کیا اور پاؤں دھوئے تو پنڈلیوں تک دھوتے۔

اگرچہ علماء نے اسے حضرت ابوہریرہ کا اجتہاد قرار دیا ہے۔ چنانچہ ابن القیم فرماتے ہیں کہ یہ حضرت ابوہریرہ کا اجتہاد ہے ورنہ حضور انور سے ایسا کرنا ثابت نہیں ہے۔ بہرحال جیسا کہ علامہ آلوسی نے ابن ہبیرہ سے نقل کیا ہے کہ کہنیوں سمیت دونوں ہاتھوں کے دھونے کی فرضیت پر چاروں مذاہب فقہ کا اتفاق ہے۔

وضو میں تیسرا فرض سر کا مسح ہے۔ اصل ارشاد ہے وامسحوا برءوسکم مسح کا مطلب بھیگے ہوئے ہاتھ کو سر پر پھیرنا۔ اصل میں مُرَوّ کے ساتھ لگا ہیں۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے المسح الاصابۃ فقرے کی ساخت کہہ رہی ہے کہ معلق ہاتھ لگانا مراد نہیں بلکہ بھیگا ہوا ہاتھ لگانا مراد ہے کیونکہ مسح لغت میں خود متعدی ہے اور یہاں باء کے ساتھ اس کا دوبارہ تعدیہ اسی معنویت کی خاطر ہے۔ اس موضوع پر علماء کا اختلاف ہے کہ مسح میں کم سے کم درجہ کیا ہے جس کے کرنے سے قرآن کا مسح کا مطالبہ پورا ہو سکتا ہے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ اگر سر پر ایک انگلی بھی لگا دی تو قرآن کا مطالبہ پورا ہو جائے گا۔ امام ثوری، امام اوزاعی اور امام لیث بن سعد کہتے ہیں کہ کچھ سر کا مسح کافی ہے۔ امام مالک اور جبائی کی رائے ہے کہ سارے سر کا مسح فرض ہے۔ امام ابوحنیفہ سر کے چوتھائی حصہ کے مسح کو فرض کہتے ہیں۔ وہ آیت قرآنی کو یہاں مسح میں مجمل قرار دیتے ہیں اور عمل نبوت کو قرآن کے اجمال کا مبین بتاتے ہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت مغیرہ ابن شعبہ کا بیان ہے کہ

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی پیشانی، عمامہ اور خفین پر مسح کیا۔

یہی سنت رسول قرآن کے لیے مبین ہے۔ یہ گفتگو مقدار فرض میں ہے ورنہ مسح کا مسنون طریقہ وہی ہے جو امام بخاری، مسلم اور اصحاب سنن نے عبداللہ بن زید کے حوالے سے بتایا ہے کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اپنے سر کا اپنے دونوں ہاتھوں سے مسح فرماتے پہلے دونوں ہاتھوں کو آگے سے پیچھے کی طرف لے جاتے پھر دونوں کو پیچھے سے آگے کی طرف لاتے۔ یعنی آغاز مسح کا سر کے ابتدائی حصہ سے کرتے اور گدی تک لے جاتے پھر دونوں ہاتھوں کو پلٹا کر وہیں لاتے جہاں سے آغاز کیا تھا۔

وہ مسح کی فرضیت کا درجہ تھا اور یہ مسح کا مسنون طریق ہے، چونکہ کان بھی سر کا حصہ ہیں اس لیے سر کے مسنون مسح میں کانوں کا اندرونی و بیرونی حصہ بھی شامل ہے جیسا کہ آپ آگے چل کر وضو کے مسنون طریقہ میں پڑھیں گے۔

وضو میں پیروں کا دھونا

۳۰۳۔ اور اپنے پیروں کو ٹخنوں سمیت دھولیا کرو۔ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہ العزیز نے ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ اور پاؤں ٹخنوں تک۔ مترجم محقق نے پاؤں کے بعد لفظ کو ہٹا کر نہایت لطیف اشارہ فرمادیا کہ ارجلکم کا عطف مغسولات پر ہے یعنی جس طرح منہ ہاتھ دھونے کا حکم ہے پاؤں بھی ٹخنوں تک دھونے چاہئیں۔ سر کی طرح مسح کافی نہیں ہے۔ چنانچہ اہل سنت والجماعت کا اس پر اتفاق ہے اور احادیث کثیرہ سے یہی ثابت ہے کہ اگر پاؤں میں موزے نہ ہوں تو دھونا فرض ہے ہاں موزوں پر ان شرائط کے ساتھ جو کتب فقہ میں مذکور ہیں مقیم ایک دن رات اور مسافر تین دن رات تک مسح کر سکتا ہے[۱] مطلب یہ ہے کہ اس کا عطف ایدیکم پر ہے۔ اس وجہ سے یہ ان اعضاء کے تحت داخل ہے جن کے لیے دھونے کا حکم ہے۔ وضو میں ترتیب فطری بھی ہے اور شرعی بھی۔ کچھ لوگوں نے اس کو برؤسکم کے ساتھ جوڑ کر اسے ممسوح بنادیا ہے لیکن یہ قول متواتر قرأت اور متواتر سنت کے بھی خلاف ہے اور عربیت کے بھی۔ اگر پاؤں کا مسح ہوتا تو اس کے ساتھ الی الکعبین نہ ہوتا جیسا کہ تیمم کی جہاں مسح کا حکم دیا ہے وامسحوا بوجوھکم وایدیکم منہ میں لفظ الی المرافق بتادیا ہے اور وضو میں ہاتھ دھونے کے لیے الی المرافق کی قید لگا دی ہے کیونکہ مسح میں اس قسم کی پابندی ایک بالکل غیر مفید بات تھی۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

اختلاف قراۃ کی تحقیق

تفصیل اس کی یہ ہے کہ اس لفظ وارجلکم الی الکعبین میں ایک قراۃ میں ارجل منصوب ہے۔ یہ نافع، ابن عامر، حفص، کسائی اور یعقوب کی قراۃ ہے اور دوسری قرأت میں ارجل مجرور ہے اور یہ قرأت ابن کثیر، حمزہ، ابو عمرو اور عاصم کی ہے۔ پہلی قرأت کی بنا پر وارجلکم کا عطف ایدیکم پر ہے۔ اور ترجمہ یوں ہے، اور اپنے پیروں کو ٹخنوں تک دھویا کرو۔ اس قرأت سے وضو میں پیروں کے دھونے کی فرضیت ثابت ہوتی ہے۔ یہی اہل السنت والجماعت کا مذہب ہے۔ دوسری قراۃ یعنی بکسر اللام کی وجہ سے وارجلکم کا عطف بظاہر لفظ برؤسکم پر ہے اور ترجمہ اس طرح ہے کہ سروں اور پیروں پر مسح کرلیا کرو۔ اس قرأت سے وضو میں مسح رجلین کی فرضیت ہوتی ہے یہ اہل تشیع میں امامیہ کا مذہب ہے۔

اہل السنۃ کا موقف یہ ہے کہ یہ دونوں قرأتیں متواتر ہیں۔ لیکن یہ پتہ لینا کہ ان میں مراد خداوندی کیا ہے تو اس اجمال اور اشتباہ کو دور کرنے کے لیے ہمیں نبوت کی سنت اور صحابہ کے تعامل کو پیش نظر رکھنا ہوگا۔ احادیث متواترہ صحیح اور صریحہ سے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو جو تعلیم دی۔ اس میں پیروں کے دھونے کا حکم دیا۔ اور یہ بھی فرمایا کہ ھذا وضوء لا یقبل اللہ الصلاۃ الا بہ یعنی اس طرح کی وضو کے بغیر نماز قبول نہیں کرتا۔ پھر آپ نے مدت العمر کبھی بھی مسح رجلین پر عمل نہیں کیا نہ سفر میں نہ حضر میں بلکہ جن کو پاؤں کے دھونے میں کوتاہی کرتے دیکھا تو باواز اعلان فرمایا ویل للاعقاب من النار ان ایڑیوں کے لیے ہلاکت ہے اور عذاب نار ہے جن کو پانی نہیں لگا ہے۔ چنانچہ یہ حدیث حضرت عبداللہ ابن عمر کے حوالہ سے آئی ہے کہ

> ایک سفر میں حضور اقدس ہم سے پیچھے رہ گئے، آپ ہم سے آملے جبکہ ہم نماز عصر کے لیے وضو کر رہے تھے اور اپنے پیروں کو پونچھ رہے تھے۔ آپ نے باواز بلند فرمایا ویل للاعقاب من النار

اگرچہ اس حدیث کے مطلب میں دونوں جانب سے کھینچا تانی ہوتی ہے۔ غسل کے مدعی کہتے ہیں کہ یہ تہدید پاؤں نہ دھونے پر ہے جبکہ مسح کے قائل دعویٰ کرتے ہیں کہ یہ تہدید مسح پورا نہ کرنے پر ہے۔ اور تو اور علامہ شوکانی نے نیل الاوطار میں خود امام بخاری کا بھی یہی

میلان بتایا ہے کہ

حضور کی تہدید مسح میں کوتاہی پر تھی پاؤں کو دھونے میں کوتاہی پر تھی ۔

لیکن دوسری روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے کہ تنبیہہ پاؤں خشک رہنے پر ہے۔ چنانچہ حافظ عسقلانی نے مسلم کے حوالہ سے جو روایت نقل کی ہے اس میں یہ تصریح ہے واعقابھم بیض تلوح لم یمسھا الماء ان کے ٹخنوں میں وہ سپید جگہ چمک رہی تھی جہاں پانی نہ لگا تھا اور اس سے زیادہ صاف اور واضح وہ روایت ہے جو حضرت ابوہریرہ کے حوالے سے مسلم میں آئی ہے کہ

آپ نے ایک شخص کو دیکھا کہ اس نے اپنا ٹخنہ نہیں دھویا تھا۔ آپ نے اس موقعہ پر فرمایا کہ ویل للاعقاب من النار۔

عمرو بن عنبسہ کی ایک طویل حدیث میں ہے کہ حضور انور نے وضو کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا پھر قدموں کو دھو جیسا کہ اللہ نے ان کے دھونے کا حکم دیا ہے اور امام ابن جریر اور امام بیہقی نے سنن کبریٰ میں حضرت علی سے نقل کیا ہے کہ

اغسلوا القدمین الی الکعبین کما امرتم

قدموں کو ٹخنوں تک دھوؤ جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے ۔

مشہور محقق ابن امیر الحاج نے شرح تحریر الاصول میں لکھا ہے کہ تیس صحابہ سے زیادہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وضو کو روایت کیا ہے اور سب اس پر متفق ہیں کہ آپ اکثر میں پیروں کو دھویا ہے ۔ سفر اور حضر سردی اور گرمی کسی حالت میں بھی پیروں پر مسح نہیں فرمایا ۔ بعد ازاں محقق ابن امیر الحاج نے ان تیس سے زیادہ صحابہ کی روایتوں کو نام بنام مع تخریج روایت اور حوالہ کتاب بیان کیا ہے ۔ ہم یہاں ان کا مفصل بیان نقل نہیں کر سکتے لیکن ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے ان صحابہ کے نام پیش کرتے ہیں ۔

حضرت عثمان ابن عفان بخاری ومسلم ، حضرت علی ابن ابی طالب ، اصحاب سنن حضرت عائشہ صدیقہ سنن نسائی ، حضرت عبداللہ بن عباس بخاری ، حضرت مغیرہ ابن شعبہ بخاری ، عبداللہ بن زید اصحاب ستہ ، ابو مالک الاشعری ، مسند احمد ، حضرت ابوہریرہ مسند احمد ، حضرت ابوامامہ مسند احمد ، حضرت براء بن عازب ، حضرت ابوبکر (بزار) ، حضرت وائل بن حجر ، ترمذی ، نفیل بن مالک ابن حبان ۔ حضرت انس بن مالک ، دار قطنی ، حضرت ابوایوب انصاری ، حضرت

ابوکاہل مزنی۔ حضرت عبداللہ ابن انیس طبرانی، حضرت مقداد بن معدیکرب ابوداؤد، حضرت کعب بن عمرو والیمی ابوداؤد، حضرت عبداللہ بن ابی اوفی، ابویعلی، حضرت عمر بن الخطاب، عبد بن حمید، حضرت عبداللہ بن عمر ابن ماجہ، حضرت ابی ابن کعب ابن ماجہ، حضرت معاویہ ابوداؤد، حضرت معاذ بن جبل طبرانی۔ حضرت ابورافع، طبرانی۔ حضرت جابر بن عبداللہ طبرانی۔ حضرت تمیم بن غزیہ الانصاری۔ طبرانی۔ حضرت ابوالدرداء، طبرانی، حضرت ام سلمہ طبرانی۔ حضرت عمار، ترمذی۔ حضرت زید بن ثابت، دار قطنی۔ حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاص ابوداؤد۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ احادیث متواترہ سے یہ امر ثابت ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وضو میں پیروں کو دھوتے تھے اور عہد صحابہ سے لے کر اس وقت تک امت کا یہی عمل ہے۔ اور پوری امت کا یہ عمل خود ایک بہت بڑی طاقتور دلیل ہے جس کے بعد کسی دلیل کی ضرورت نہیں رہتی۔ کیونکہ دلیل عمل بہ نسبت دلیل قول کے زیادہ طاقتور ہوتی ہے۔

سوال یہ ہے کہ اگر صورت حال یہی ہے تو پھر قرأت جر کے بارے میں شارحین قرآن کا موقف کیا ہے؟ شارحین قرآن نے اس کے متعدد جوابات دیے ہیں۔

لفظ مسح غسل خفیف کے معنے میں ہے

اس آیت میں ارجلکم کا عطف تو برؤسکم پر ہے لیکن مسح سے مراد غسل خفیف ہے۔ کیونکہ عربی زبان میں لفظ مسح کا اطلاق غسل خفیف پر ہوتا ہے۔ جیسا کہ امام قرطبی نے ابوزید انصاری سے نقل کیا ہے کہ اہل عرب جب یہ کہنا چاہتے ہیں کہ میں نے نماز کے لیے وضو کیا تو بولتے ہیں تمسحت للصلٰوۃ نیز جب کہنا ہوتا ہے کہ وضو کے لیے پانی لاؤ تو بولتے ہیں هات ما اتمسح به للصلٰوۃ وہ چیز لاؤ جس سے میں وضو کرلوں۔ امام ابوحاتم کہتے ہیں کہ وضو کو مسح کے لفظ سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وضو کرنے والا محض پانی بہا لینے سے خوش نہیں ہوتا جب تک کہ اپنے اعضا کو پونچھ نہ لے۔ یہ محاورات کہہ رہے ہیں کہ مسح کا اطلاق غسل خفیف پر بھی ہوتا ہے اس لیے اس آیت میں سر کے مسح سے سر پر تر ہاتھ پھیرنا اور مسح رجلین سے غسل خفیف مراد ہے اور دلیل اس کی یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے پیروں کے مسح میں الی الکعبین کی قید لگائی ہے۔ اگر سر اور پیروں کے مسح کی نوعیت یکساں ہوتی تو یہ قید نہ ہوتی جیسے سر کو بلا تعیین مقدار بیان کیا گیا ہے اسی طرح پیروں میں بھی کوئی حد اور مقدار نہ ہوتی۔ یہ

میں کعبین کی قید اور سر کا ذکر بلا قید صاف طور پر بزبان حال کہہ رہا ہے کہ ہاتھوں اور پیروں کا حکم ایک ہے اور سر کا حکم ان سے مختلف ہے۔ یہاں شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ منہاج السنہ میں بڑی پتے کی بات لکھ گئے کہ عربی زبان میں لفظ مسح بمنزلہ جنس ہے۔ اس کے نیچے اس کی دو نوعیں ہیں ایک اسالہ دوسرے اصابہ، اسالہ کے معنے بہانا اور اصابہ کے معنے لگانا ہیں۔ اصل لغت کے اعتبار سے لفظ مسح دونوں معنے میں آتا ہے جیسے لفظ ذوی الارحام لغت کے اعتبار سے اصحاب الفرائض اور عصبات دونوں معنے میں آتا ہے مگر چونکہ عرف میں ذوی الفروض اور عصبات خاص قسم کے وارثوں کو کہتے ہیں اس لیے لوگوں کی سوچ یہ ہو گئی کہ لفظ ذوی الارحام، ذوی الفروض اور عصبات دونوں ذوی الارحام کی قسم ہیں۔ عرف میں چونکہ عصبات ایک خاص نام سے پکارے جانے لگے اس لیے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ لفظ ذوی الارحام عصبات کا قسیم اور مقابل ہے۔ جیسے لفظ حیوان اصل لغت کے لحاظ سے انسان کو بھی شامل ہے مگر عرف میں غیر انسان کے لیے حیوان بولا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح لفظ مسح اصل لغت کے اعتبار سے عرفی مسح یعنی اصابہ اور غسل یعنی اسالہ دونوں کو شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں وامسحوا کے تحت دو چیزوں کو ذکر کیا۔ ایک رؤسکم یعنی سروں کا جس میں مسح سے اصابہ عرفی معنے مراد ہیں۔ دوسرا وارجلکم اس میں مسح سے غسل یعنی اسالہ مراد ہے یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قرآن میں ذو معنی لفظ کیوں استعمال ہوا ہے۔ اور دل کا پتہ نہیں لیکن علامہ زمخشری نے اس موقعہ پر جو بات بتائی ہے وہ سنانا چاہتا ہوں پاؤں ان تین اعضاء مغسولہ میں سے ہے جو کہ پانی بہا کر دھوئے جاتے ہیں اس لیے اس میں احتمال تھا کہ کہیں اسراف کا ارتکاب نہ ہو جائے جس کی قرآن میں ممانعت ہے اس لیے مغسول کا ممسوح پر عطف کر دیا۔ اور اشارہ کر دیا کہ پانی کے استعمال میں میانہ روی اختیار کرنی چاہیے اور ممکن ہے کہ کوئی گمان کر بیٹھے کہ پاؤں کا مسح ہونا چاہیے اسی گمان کو ختم کرنے کے لیے الی الکعبین کی قید لگا دی ہے۔

ارجلکم جوار کی وجہ سے مجرور ہے

بے شک ارجلکم میں جر کی قرأت آئی ہے اور اس کا عطف لفظ رؤسکم پر ہے لیکن معنے اس کا عطف وجوھکم وایدیکم پر ہے اور پاؤں اعضاء مغسولہ کے ساتھ وجوب غسل میں شریک ہے اور قرأت جر میں ارجلکم جوار کی وجہ سے مجرور ہے۔ یعنی رؤسکم کے پڑوس اور قرب ہونے کی وجہ سے مجرور ہے ورنہ فی الواقع اس کا پیوند وجوھکم وایدیکم سے ہے۔

قرآن اور کلام عربی میں جرجوار کی بکثرت مثالیں ہیں۔ مثلاً سورہ رحمان میں ہے یرسل علیکما شواظ من نار و نحاس اس آیت میں نحاس کو مجرور نار کے جوار کی وجہ سے پڑھا گیا ہے ورنہ اصل میں اس کا عطف شواظ پر ہے اور سورۂ بروج میں ہے بل ھو قرآن مجید فی لوح محفوظ۔ اس آیت میں لفظ محفوظ کو مجرور محض جوار کی وجہ سے پڑھا گیا ہے ورنہ اصل میں قرآن کی صفت ہے اور مرفوع ہے۔ ایک اور آیت ہے عذاب یوم محیط اس میں لفظ محیط کو یوم کے جوار کی وجہ سے پڑھا گیا ہے ورنہ فی الواقع محیط عذاب کی صفت ہے۔

امرء القیس کا شعر ہے۔

کأن ابانا فی افانین ودقہ　　کبیر اناس فی بجاد مزمل

اس شعر میں مزمل کو محض جوار کی وجہ سے مجرور پڑھا گیا ہے ورنہ یہ بجاد کی صفت نہیں بلکہ کبیر کی ہے۔ عربی امثال میں بھی جر جوار کی مثالیں موجود ہیں مثلاً یہ مثل مشہور ہے جحر ضب خرب ضرب کا جر محض جوار کی وجہ سے ہے ورنہ خرب دراصل جحر کی صفت ہے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جر جوار عربی زبان میں عام ہے۔ تمام ائمہ لغت اور نحو میں کلام فصیح میں اس کے استعمال کے قائل ہیں سوائے زجاج کے کہ وہ اسے نہیں مانتا۔ ٹھیک اسی طرح قرآن کی اس آیت میں لفظ ارجلکم جوار کی وجہ سے مجرور ہے ورنہ فی الواقع وہ منصوب ہے۔

آئیے ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیے۔ ہم مانتے ہیں کہ ظاہر میں وارجلکم کا عطف روٴسکم پر ہے لیکن اس کے باوجود حکم دونوں کا مختلف ہے کیونکہ عربی زبان میں ایسا بکثرت ہوتا ہے کہ ایک شے کا دوسری شے پر عطف ہوتا ہے مگر حکم میں دونوں مختلف ہوتے ہیں، اور یہ صورت وہاں ہوتی ہے کہ جہاں دو فعل متقارب المعنے ہوتے ہیں اور ہر ایک کا متعلق اور معمول جداگانہ ہوتا ہے ایسے موقع پر ایک فعل کو حذف کر دیتے ہیں مگر اس کے معمول اور مفعول کا فعل مذکور کے معمول پر عطف کر دیتے ہیں۔ بظاہر معطوف، معطوف علیہ کے ساتھ حکم میں شریک ہوتا ہے اور مفعول کو فعل مذکور کے معمول پر عطف کر دیتے ہیں۔ علامہ جمال الدین القاسمی نے محاسن التاویل میں الانتصاف کے حوالہ سے لکھا ہے کہ بظاہر معطوف معطوف علیہ کے ساتھ حکم میں شریک ہوتا ہے لیکن باعتبار معنے مختلف ہوتا ہے جیسے ایک شاعر کہتا ہے:

یالیت بعلک قد غدا　　متقلدا سیفا و رمحاً

اس شعر میں رمحاً کا عطف بظاہر سیفا پر ہے جو متقلدا کا مفعول ہے لیکن حقیقت میں

رماً متقلداً کا مفعول نہیں ہے کیونکہ تیر گلے میں ڈالنے کی چیز نہیں ۔ اصل بات یوں ہے کہ متقلداً سیفاً و حاملاً رمحاً یعنی تلوار گلے میں ڈالے ہوئے اور نیزہ ہاتھ میں اٹھاتے ہوئے ۔ لیکن چونکہ حاملاً اور متقلداً معنے کے لحاظ سے قریب قریب تھے اس لیے حاملاً کو حذف کر دیا اور حاملاً کے مفعول کا عطف متقلداً کے مفعول پر کر دیا ۔ صاحب انتصاف لکھتے ہیں کہ شاید آپ کے ذہنوں میں یہ خلش محسوس ہو کہ ایسا کیوں کرتے ہیں ۔ ایسا ایجازاً اختصاراً اور کلام کو مؤکد بنانے کے لیے کیا جاتا ہے جیسے ہی اس آیت میں کیا گیا ہے اصل بات اس طرح تھی وامسحوا برؤسکم واغسلوا ارجلکم چونکہ غسل اور مسح دونوں معنے کے اعتبار سے قریب قریب تھے اس لیے واغسلوا کو حذف کر کے اس کے مفعول ارجلکم کا عطف برؤسکم پر کر دیا ۔

امام شافعی کی رائے

امام شافعی فرماتے ہیں کہ دونوں قرأتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے ہر قرأت میں ایک جداگانہ حالت کا حکم بیان کیا گیا ہے ۔ قرأت جر جس سے مسح قدمین معلوم ہوتا ہے یہ حکم اس حالت میں ہے کہ جب قدمین پر خفین ہوں یعنی جس حالت میں موزے پہنے ہوتے ہو تو مسح رجلین کرے اور اگر پیروں میں موزے نہ ہوں تو ایسی حالت میں غسل قدمین فرض ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دو قرأتیں دو حالتوں پر محمول ہیں ۔ اس لیے کہ عقلاً یہ ناممکن ہے کہ وقت واحد اور حالت واحد میں عضوِ واحدہ کا غسل بھی فرض ہو اور مسح بھی فرض ہو ۔ معلوم ہوا کہ ان دو قرأتوں میں دو مختلف حالتوں کا حکم بیان کیا گیا ہے ۔ علامہ بحر العلوم نے شرح مسلم الثبوت میں لکھا ہے کہ فخر الاسلام بزدوی نے بھی اسی کو اختیار کیا ہے ۔ اور یہ توجیہ نہایت لطیف ہے اور فرماتے ہیں کہ قرأت جر میں الی الکعبین کا لفظ مسح کی غایت نہیں اس لیے کہ مسح تو ظاہر خفین پر کافی ہے ۔ کعبین تک مسح کرنا بالاجماع ضروری نہیں ہے بلکہ یہ تخفف کی غایت ہے کہ جو سیاق کلام سے معلوم ہو رہی ہے اور مطلب آیت کا یہ ہے کہ پیروں پر مسح کر لیا کرو بشرطیکہ تم ٹخنوں تک موزے پہنے ہوتے ہو اور اگر موزہ ٹخنوں سے نیچے ہو تو پھر موزوں پر مسح درست نہ ہوگا مطلب یہ ہے کہ پیر کھلے ہوں تو ان کو دھو لینا چاہیے اور اگر پیروں پر موزے ہوں تو مسح کر لینا چاہیے ۔

مسح علی الخفین تاریخ کی روشنی میں

چونکہ آیت قرآنی ضمناً مسح علی الخفین کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے اس لیے ضروری ہے کہ تاریخ و فقہ کی روشنی میں اس کا حکم بھی معلوم کر لیا جائے ۔

مسح علی الخفین کے موضوع پر متعدد احادیث آئی ہیں جن کی صحت پر محدثین کا اتفاق ہے۔ شرح مسلم میں امام نووی رقمطراز ہیں کہ مسح علی الخفین کو روایت کرنے والے ان گنت صحابہ ہیں، امام حسن بصری فرماتے ہیں کہ مجھ سے ستر صحابہ کرام نے بیان کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مسح علی الخفین کرتے تھے ۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں رقمطراز ہیں کہ حفاظ محدثین نے تصریح کی ہے کہ مسح علی الخفین تاریخ و روایت میں متواتر ہے ۔ کچھ لوگوں نے ۸۰ تک تعداد بتائی ہے ۔ ابن المنذر نے عبد اللہ ابن المبارک سے نقل کیا ہے کہ مسح علی الخفین کے موضوع پر صحابہ میں کوئی اختلاف نہیں ہے ۔ یہ بات صاف طور پر تاریخ میں بتائی گئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مائدہ کی یہ آیت نازل ہونے کے بعد مسح الخفین کیا۔ چنانچہ امام احمد، امام بخاری، امام مسلم، امام ابوداؤد اور امام ترمذی نے جریر کی یہ حدیث لکھی ہے کہ

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے استنجا فرمایا ۔ پھر وضو کیا اور پھر خفین پر مسح کیا ۔ پوچھنے والے نے جریر سے دریافت کیا کہ تم بھی ایسا ہی کرتے ہو، انہوں نے جواباً کہا کیوں نہیں، ہاں میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو وضو میں مسح علی الخفین کرتے دیکھا ہے ۔

امام ابوداؤد کہتے ہیں کہ جب جریر سے یہ دریافت کیا گیا کہ کیا یہ بات نزول مائدہ سے پہلے کی ہے یا بعد کی تو انہوں نے کہا کہ میں تو مسلمان ہی نزول مائدہ کے بعد ہوا ۔ امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ان لوگوں کے خلاف چیلنج ہے جو کہتے ہیں کہ مسح علی الخفین نزول مائدہ سے پہلے تھا بعد میں منسوخ ہو گیا ۔ واقعہ یہی ہے کہ تاریخ و روایت میں مسح علی الخفین متواتر روایات سے ثابت ہے ۔

مسح علی الخفین فقہ کی روشنی میں

فقہا مذاہب کی حد تک اہل السنۃ قاطبۃ اس پر متفق ہیں کہ مسح علی الخفین جائز ہے

حافظ ابن عبدالبر رقمطراز ہیں کہ مجھے مسح علی الخفین کے موضوع پر امام مالک کو چھوڑ کر فقہائے سلف میں سے کسی کا انکار اور مخالفت معلوم نہیں ہے۔ علامہ ابن رشد نے بدایۃ المجتہد میں لکھا ہے کہ مسح کے موضوع پر تین راہیں ہیں ایک یہ مطلقاً جائز ہے، یہی جمہور کا مسلک ہے، دوسرے یہ کہ سفر میں جائز ہے، تیسرے یہ کہ مطلقاً ناجائز ہے۔ علامہ شوکانی نیل الاوطار میں رقمطراز ہیں کہ مسح علی الخفین کا سنت ہونا اس کا متواتر ہونا اور امام مالک کو چھوڑ کر سلف کا اس پر متفق ہونا محتاج دلیل نہیں ہے۔ صرف شیعہ میں سے امامیہ اور خوارج کہتے ہیں کہ مسح علی الخفین جائز نہیں ہے۔ استدلال آیت وضو سے کرتے ہیں اور تعلیم وضو کے موقعہ پر حضور کے اس ارشاد سے کہ اغسل رجلیک اپنے پاؤں دھوؤ۔ اور آیت مائدہ سے مسح علی الخفین کو منسوخ بتاتے ہیں۔ علامہ شوکانی نے ان کے دلائل کا مبسوط جواب دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس آیت کے ذریعے مسح علی الخفین کو منسوخ کہنا بہت بڑی جرأت ہے۔ آیت قرآنی میں عموم ہے، احادیث خفین اس کی مخصص ہیں اس لیے نسخ کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اصول میں یہ مسئلہ طے شدہ ہے کہ عام کی بنا خاص پر مطلق رکھی جاتی ہے یہ کہنا کہ بعد میں آنے والا عموم ناسخ ہوتا ہے۔ اس وقت تک مفید مدعا نہیں جب تک یہ ثابت نہ ہو جائے کہ آیت قرآنی بعد میں نازل ہوئی ہے اور اس کے نزول کے بعد مسح ثابت نہیں ہے۔ جریر کی سابقہ روایت اس معاملہ میں حرف آخر ہے اور یہ کہنا کہ حضرت جریر حضرت علی سے الگ ہو گئے تھے غلط ہے بلاریب وہ حضرت علی کے ساتھ ہی رہے۔ معاویہ کے پاس کسی وجہ سے رک ضرور گئے تھے اس لیے ان اعذار باردہ کی بنا پر ایسے جلیل القدر صحابی کی جامہ تلاشی کچھ مناسب اقدام نہیں ہے۔ حافظ عسقلانی نے تصریح کی ہے کہ آیت مائدہ غزوہ مریسیع میں نازل ہوئی حدیث مغیرہ کا تعلق غزوہ تبوک سے ہے اور تبوک بالاتفاق بعد میں ہے۔

مسح علی الخفین کی شرط

خفین پر مسح کے جواز کی اہم ترین اور بنیادی شرط یہ ہے کہ ان کو باوضو پہنا جائے۔ حضرت مغیرہ کی جو حدیث صحیحین میں آتی ہے اس میں تصریح ہے کہ

میں ایک رات حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھا، وضو کے لیے پانی پیش کیا۔ آپ نے چہرہ اور دونوں ہاتھ دھوئے اور سر کا مسح کیا۔ میں نے چاہا کہ پیروں سے موزے نکال دوں آپ نے فرمایا کہ مغیرہ ان کو پہنے

لے میں نے با وضو پہنے تھے پھر آپ نے ان پر مسح کر لیا۔

اور امام حمیدی نے اپنے مسند میں جو حضرت مغیرہ سے روایت کی ہے اس میں ہے کہ

ہم نے دریافت کیا کہ یا رسُول اللہ کیا کوئی شخص خفین پر مسح کر سکتا ہے، آپ نے فرمایا کہ کیوں نہیں ضرور کر سکتا ہے بشرطیکہ باوضو پہنے ہوں۔

امام احمد ابن خزیمہ، ترمذی اور نسائی نے مشہور صحابی حضرت صفوان بن عسال کے حوالہ سے بتایا ہے کہ

رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ ہم خفین پر اس وقت مسح کریں جب ان کو باوضو ہو کر پہنیں، سفر میں تین دن رات اور حضر میں ایک دن رات۔ اور جنابت کے سوا کسی حالت میں نہ اتاریں۔

جمہور علماء نے مسح کے جواز کے لیے ان ارشاداتِ نبوت کی وجہ سے یہ شرط لگائی ہے کہ اگر موزے وضو کر کے پہنے جائیں تو ان پر مسح کرنا جائز ہے۔ داؤد ظاہری کو چھوڑ کر سب کا اس پر اتفاق ہے

خفین میں مقامِ مسح

مسح موزوں کے بالائی حصے کا کیا جاتا ہے نچلے حصہ کا مسح نہیں ہے۔ ابوداؤد اور دارقطنی نے حضرت علی کا یہ ارشاد نقل کیا ہے اور حافظ عسقلانی نے بلوغ المرام اور التلخیص میں اس کی سند کو حسن کہا ہے

دین میں اگر رائے کی گنجائش ہوتی تو موزوں کا مسح نچلے حصہ کا ہونا چاہیے تھا نہ کہ بالائی حصہ کا۔ میں نے خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو موزوں کے بالائی حصے کا مسح کرتے دیکھا ہے۔

مسند احمد، ابوداؤد اور ترمذی میں حضرت مغیرہ ابن شعبہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ

میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا کہ موزوں کے بالائی حصہ کا مسح کر رہے تھے۔

اس لیے جمہور علماء کی رائے یہی ہے کہ موزوں میں مسح کے لیے بالائی حصہ کا مسح کافی ہے اور یہی مشروع ہے۔ اگرچہ کچھ لوگ یہ بھی کہتے ہیں کہ بالائی اور زیریں دونوں حصوں کا مسح ضروری ہے اور اس سلسلے میں وہ ابوداؤد و ترمذی اور دارقطنی کی حضرت مغیرہ کی وہ روایت پیش کرتے ہیں

جن میں موزوں کے بالائی اور زیریں حصے کے مسح کرنے کی تصریح ہے لیکن محققین کے یہاں مغیرہ کی یہ حدیث روایتی نقطہ نظر سے ثابت نہیں ہے۔ حافظ ابوزرعہ اور امام بخاری اسے صحیح نہیں مانتے ہیں، اس لیے موزوں کے بالائی حصہ کا مسح ہی مشروع ہے۔

موزوں کے مسح کی مدت

اس سے پہلے صفوان بن عسال کے حوالہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد سن چکے ہو کہ حالت سفر میں مدت مسح تین دن رات اور حالت حضر میں ایک دن رات ہے۔ امام احمد، مسلم، ترمذی، نسائی اور ابن ماجہ نے شریح بن ہانی کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ:

میں نے حضرت عائشہ سے مسح علی الخفین کے بارے میں دریافت کیا تو انہوں نے فرمایا کہ حضرت علی سے دریافت کرو وہ اس بارے میں مجھ سے زیادہ عالم ہیں کیونکہ وہ حضور کے ساتھ سفر میں ہوتے تھے۔ میں نے حضرت علی سے دریافت کیا تو آپ نے فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مسافر کے لیے تین دن رات اور مقیم کے لیے ایک دن رات مسح کی مدت ہے۔

امام احمد، ابوداؤد، ترمذی، ابن حبان نے حضرت خزیمہ ابن ثابت کے حوالہ سے بتایا ہے کہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مدت مسح کے بارے میں دریافت کیا گیا تو آپ نے فرمایا کہ مسافر کے لیے تین دن رات اور مقیم کے لیے ایک دن رات مدت مسح ہے۔

اس لیے جمہور علماء سلف کا یہی فیصلہ ہے کہ مدت مسح مسافر کے لیے تین دن رات اور مسافر کے لیے ایک دن رات ہے۔

اعمال وضو کا مسنون پیمانہ

قرآن کی اس آیت میں وضو کے چار فرض بتائے گئے ہیں، اول منہ دھونا، دوسرے کہنیوں سمیت ہاتھ دھونا، تیسرے سر کا مسح اور چوتھے پاؤں کا دھونا، قرآن پاک اللہ کی کتاب ہے اور یہ علم نبوت ہے۔ اللہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو صرف علم سے نہیں بلکہ علم و عمل کے دونوں کمالوں سے نوازا ہے۔ بحیثیت ایک رہبر کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ

درحقیقت قرآن پاک کی عملی تفسیر ہے۔ جو حکم آپ پر اتارا گیا۔ آپ نے خود کرکے اس کو بتایا۔ وضو، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، صدقہ، خیرات، جہاد، ایثار و قربانی، عزم، استقلال، صبر و شکر ان کے علاوہ اور حسن عمل، حسن اخلاق کی باتیں جس قدر قرآن نے بتائیں ان کے لیے سب سے پہلے آپ نے اپنا ہی نمونہ پیش کیا۔ جو کچھ قرآن میں منشا الٰہی تھا وہ سب مجسم ہو کر آپ کی زندگی میں نظر آیا اور اس طرح کمال علم اور کمال عمل کا آپ کو اللہ نے نمونہ بنادیا۔ اور اسی کی پیروی کا نام اسلام ہے۔ نماز کی طرح وضو کے اعمال کی بھی آپ نے تفصیل بتائی ہے مثلاً وضو کے آغاز میں نیت، بسم اللہ کہنا دائیں جانب سے آغاز کرنا، مسواک کرنا، پے درپے کرنا، ترتیب سے کرنا، آغاز میں پہنچوں تک ہاتھ دھونا، ہر عضو کو تین بار دھونا، کلی کرنا، ناک میں پانی دینا، پورے سر کا مسح کرنا، کانوں کا مسح کرنا، وضو کے بعد دعا پڑھنا وغیرہ وہ اعمال ہیں جن کے ذریعے نبوت نے نماز کی طرح وضو کی تکمیل فرمائی ہے امام ابوحنیفہ کے نزدیک وضو میں یہ سب اعمال سنت ہیں فرض صرف وہ چار ہیں جن کی قرآن نے رہنمائی ہے اور جن اعمال کی نبوت نے رہنمائی کی ہے وہ سب سنت ہیں۔

امام احمد، بخاری و مسلم نے حضرت عثمان بن عفان کے حوالے سے جو وضو کا مسنون طریقہ بتایا ہے یہ ہے کہ:

> حضرت عثمان نے وضو کے لیے پانی طلب فرمایا، آپ نے تین بار اول ہاتھ دھوتے پھر آپ نے تین بار کلی کی، تین بار ناک کو پانی سے صاف کیا، پھر تین بار چہرہ دھویا پھر اپنے دونوں ہاتھوں کو کہنیوں تک تین بار دھویا پھر سر کا مسح کیا۔ پھر آپ نے تین بار پاؤں دھوتے، پھر فرمایا کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی طرح وضو کرتے دیکھا ہے۔ حضور نے وضو کے بعد فرمایا تھا جو شخص میرے وضو کی طرح وضو کرے گا، پھر دو رکعت نماز پڑھے گا جس میں اپنے جی سے کوئی بات دنیا کی نہ کرے گا اللہ اس کے گناہ بخش دے گا۔

اس کردار میں تمام سنتوں کا استیعاب نہیں باقی سنتیں دوسری احادیث سے معلوم ہوتی ہیں مثلاً،

وضو میں نیت کرنا

مالک، شافعی، احمد، لیث بن سعد اور اسحاق بن راہویہ وضو میں نیت کو شرط اور

فرض کا درجہ دیتے ہیں۔ الجصاص نے امام ابوحنیفہ کا مذہب یہ بتایا ہے کہ ہر طہارت جو پانی سے ہوتی ہیں آتی ہو وہ کسی نیت کی محتاج نہیں ہے۔ یہی ابویوسف، امام محمد اور امام ثوری کا مذہب ہے امام اوزاعی بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ بدایۃ المجتہد میں علامہ ابن رشد نے امام مالک، شافعی اور امام احمد کا مذہب یہ بتایا ہے کہ وضو میں نیت شرط ہے۔ ان بزرگوں کا استدلال اس ارشاد نبوت سے ہے جو حضرت عمر کے حوالہ سے حدیث کی متعدد کتابوں میں آیا ہے۔

سارے اعمال معتبر نیت سے ہیں اور ہر آدمی کے لیے وہ ہی کچھ ہے جس کی اس نے نیت کی ہے۔ وہ شخص جس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہو اس کی ہجرت اللہ و رسول کی طرف ہے اور جس کی ہجرت دنیا کی طرف ہو یا نکاح کی خاطر عورت کی طرف ہو اس کی ہجرت اسی کی طرف ہوگی۔

امام ابوحنیفہ کو اس ارشاد نبوت کی اہمیت سے کوئی انکار نہیں مگر وہ یہ فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق مقاصد سے ہے وسائل سے نہیں۔ وضو عبادات میں مقاصد سے نہیں بلکہ وسائل سے تعلق رکھتی ہے یعنی وضو وسیلہ عبادت ہے اسی بنا پر وضو کی نذر نہیں مانی جا سکتی ہے کیونکہ منذور کے لیے مقاصد میں سے ہونا ضروری ہے اور پھر اس ارشاد کی حیثیت آحاد کی ہے اور آحاد میں قطعیت نہیں ظنیت ہوتی ہے اور کسی چیز کے فرض ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس کی پشت پر دلیل کی قطعیت ہو اور معلوم ہے کہ قرآن اس باب میں خاموش ہے قرآن نے صرف چار ہی فرض وضو میں بتاتے ہیں۔ فرض کی حیثیت کسی کو بھی ان چار کے علاوہ دینا بر قرآن پر اضافہ ہے۔ ارشاد نبوت سے ہم واجب، سنت اور مستحب کو ثابت کر سکتے ہیں مگر فرض کے لیے قرآن کا منطوق ناگزیر ہے۔

وضو کے آغاز میں بسم اللہ کہنا

اس موضوع پر مختلف ارشادات نبوت آتے۔ اگرچہ روایتی اعتبار سے ان کا کچھ مقام زیادہ بلند نہیں مگر علماء نے ان ارشادات کے مجموعہ سے بسم اللہ کی سنت بتائی ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی رقمطراز ہیں کہ تاریخی لحاظ سے اگرچہ ان کی منفرداً کچھ زیادہ اہمیت نہیں مگر ان کی مجموعی حیثیت بتاتی ہے کہ اس کی کچھ اصل ضرور ہے۔ کچھ بزرگوں نے اگرچہ اسے واجب کہا ہے۔ احناف میں شیخ ابن الہمام نے بسم اللہ کہنے کو واجب قرار دیا ہے لیکن اکثر علماء نے سنت ہی بتایا ہے

وضو کے آغاز میں بسم اللہ کے علاوہ ذکر کا کوئی پیمانہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ ایسے وضو کے دوران مختلف اعضاء کو دھوتے وقت ذکر کا کوئی پیمانہ حضور سے ثابت نہیں۔ مجالس الابرار میں ملا احمد رومی نے اور زاد المعاد میں حافظ ابن القیم نے اس کی تصریح کی ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ

ذکر کا ہر پیمانہ بسم اللہ کے علاوہ اور اذکار وضو کی ہر حدیث موضوع ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موضوع پر نہ کچھ فرمایا ہے اور نہ اُمت کو تعلیم دی ہے۔

ہاں وضو کے اختتام پر ذکر کا یہ پیمانہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے۔

اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمداً عبده ورسوله، اللهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين

مسند احمد، بخاری اور مسلم میں حضرت عمر بن الخطاب کے حوالہ سے یہ ارشاد آیا ہے کہ:

جو شخص تم میں سے وضو کرے گا اور پوری کرے گا اور پھر یہ کہے گا کہ اشهد ان لا اله الا الله وحده لا شريك له واشهد ان محمداً عبده ورسوله تو اس کے لیے جنت کے آٹھوں دروازے کھلے ہوں گے جس میں سے چاہے داخل ہو جائے۔

اور باقی حصہ یعنی اللهم اجعلني من التوابين واجعلني من المتطهرين ترمذی کی روایت میں آتا ہے۔ اور امام نسائی نے عمل الیوم واللیلۃ میں اس کے بعد یہ اضافہ بھی لکھا ہے

سبحانك اللهم وبحمدك اشهد ان لا اله الا انت استغفرك واتوب اليك

اگرچہ مرفوعاً ضعیف ہے لیکن موقوفاً امام نسائی نے اسے صحیح قرار دیا ہے۔

وضو میں مسواک

علماء نے وضو میں مسواک کو بھی بہت اہمیت دی ہے۔ اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ مسواک وضو کی سنت ہے یا نماز کی۔ امام احمد اس کو نماز کی سنت بتاتے ہیں جبکہ امام ابوحنیفہ اسے

وضو کی سنت کہتے ہیں. بعض بزرگوں نے اسے واجب قرار دیا ہے۔ مسند احمد، بخاری، مسلم اور سنن اربعہ میں حضرت ابو ہریرہ کے حوالے سے یہ ارشادِ نبوت آیا ہے ؛

اگر میں اپنی اُمت پر مشقت محسوس نہ کرتا تو ان کو ہر نماز کے وقت مسواک کرنے کا حکم دیتا۔

اور امام بخاری نے تعلیقاً یوں لکھا ہے کہ میں ان کو ہر وضو کے وقت مسواک کا حکم دیتا۔ مسند احمد اور نسائی میں حضرت عائشہ کے حوالے سے یہ ارشاد بھی آیا ہے کہ ؛

مسواک منہ کو صاف کرنے والی ہے اور اللہ کو راضی کرنے کا ذریعہ ہے۔

صحاح اور سنن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کا یہ پیمانہ بھی آیا ہے کہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نیند سے بیدار ہونے کے وقت دن ہو یا رات اور گھر میں داخل ہونے کے وقت مسواک کرتے تھے

بہرحال مسواک کرنا سنت ہے اور مقصود دانتوں کو الائش سے صاف کرنا ہے اور یہ مقصد جس ذریعے سے حاصل ہو جائے جائز ہے لیکن مسواک کرنا افضل ہے اس کی فضیلت میں کبھی ملا میں دو رائے نہیں ہوئی ہیں

حدث اکبر یعنی غسلِ جنابت

۳۰۴ ۔ اگر تم حالتِ جنابت میں ہو تو خوب پاک ہو. یعنی جنابت سے پاک ہونے میں صرف اعضا بار بار دھو لینا کافی نہیں ہے۔ سطحِ بدن کے جس حصے تک پانی بدون تعذر کے پہنچ سکتا ہو وہاں تک پہنچانا ضروری ہے اسی لیے حنفیہ غسلِ جنابت میں مضمضہ اور استنشاق کو بھی ضروری کہتے ہیں۔ وضو میں ضروری نہیں سنت ہے[1]

سورۂ نساء میں غسلِ جنابت کا ذکر آدابِ زندگی کے سلسلے میں تھا۔ یہاں اس کا ذکر کرنے کا منشا یہ ہے کہ یہ نماز کے لیے تمہیدی فعل ہے۔ نماز کے لیے طہارت ضروری ہے۔ حدثِ اصغر سے اور حدثِ اکبر سے بھی۔ مطلب یہ ہے کہ جب تم نماز کی تیاری کرو اور تم حالتِ جنابت میں ہو تو خوب پاک ہو جاؤ۔ یعنی اس طرح غسل کرو کہ جہاں جہاں تک پانی پہنچانا ممکن ہو وہاں پانی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

پہنچاؤ۔ اصل ارشاد میں فاطّہروا آیا ہے۔ یہ طہارت سے مبالغہ ہے، طہارت کے معنے پاک ہونا اور اطّہر کے معنے خوب پاک ہونا ہے۔ غالباً اسی انداز بیان سے امام اعظم ابوحنیفہ نے غسل جنابت میں مضمضہ کلی کرنا اور استنشاق ناک میں پانی دینا کو فرض بتایا۔ یہ دونوں وضو میں سنت ہیں کیونکہ وضو میں صرف چہرہ دھونے کا حکم ہے اور یہاں غسل میں خوب پاک ہونے کا حکم ہے اور ظاہر ہے کہ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ وضو میں اگرچہ صرف ظاہری چہرہ کا دھولینا کافی ہے کیونکہ وجہ مواجہت سے نکلا ہے، غسل میں خوب پاک ہونے کا حکم ہے کیونکہ فاطّہروا میں معنوی مبالغہ ہے مطلب یہ ہے کہ جسم کے دھونے میں اتنا مبالغہ کرو کہ ایک بال بھی باقی نہ رہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر بال کے نیچے جنابت ہے۔ اور اس کی وجہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بتائی ہے کہ جنابت کی حالت میں انسان کا بدن رُواں رُواں غرق لذت ہوتا ہے اس لیے ازالہ جنابت کے لیے، رونگٹیں رونگٹیں کا دھونا فرض کیا گیا ہے۔ بخلاف وضو کے جس کا سبب حدث اصغر ہے یعنی پیشاب اور پاخانہ وغیرہ۔ ان میں جنابت جیسی نہ لذت ہوتی ہے اور نہ غفلت۔

جنابت کی دو صورتیں

جنابت کے معنے ناپاکی کے ہیں اس کی دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ منی خارج ہو جاتے خواہ بحالت بیداری ہو یا سوتے ہوتے، اور دوسرے یہ کہ مرد و عورت کی مجامعت خواہ اس میں انزال ہو یا نہ ہو۔ پہلی حالت کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جس بلیغ انداز میں پیش فرمایا اس کا ذکر صحیح مسلم میں بحوالہ ابوسعید خدری اس طرح آیا ہے کہ انما الماء من الماء یعنی غسل واجب ہوتا ہے پانی کے نکلنے سے خواہ اس کا سبب کچھ ہو۔ اور دوسری حالت کے لیے آپ کا یہ ارشاد ہے کہ اذا التقی الختانان وجب الغسل، عورتوں کی صحبت سے غسل واجب ہوتا ہے اور مسلم میں تصریح ہے وان لم ینزل خواہ انزال نہ ہو۔ جمہور کا یہی مذہب ہے اور ظاہر قرآن کا تقاضا بھی یہی ہے کہ جنابت خواہ مباشرت سے لاحق ہوئی ہو یا خواب میں مادہ منویہ خارج ہونے کی وجہ سے۔ دونوں صورتوں میں غسل واجب ہے۔ اس حالت میں غسل کے بغیر نماز پڑھنا، قرآن پڑھنا اور قرآن کو ہاتھ لگانا سب ناجائز ہے۔ بہرحال جمہور کا مذہب یہی ہے کہ دونوں حالتوں میں غسل واجب ہے۔

آیت میں نماز کی یہ شرط بتائی گئی ہے کہ جنابت سے پاک ہو۔ بغیر غسل کے نماز پڑھنی جائز نہیں ہے کیونکہ جنابت کا کسل اور انقباض اس انشراح صدر اور حضور قلب کے منافی ہے

جو نماز کے لیے مطلوب ہے جنابت کے لیے طہارت غسل ہے۔

اس آیت میں غسل کا حکم ہے لیکن غسل کے طریقہ سے بحث نہیں کی گئی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ سبحانہ نے قرآن کا مبین بنایا ہے اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غسل کا طریقہ بتایا ہے۔ حضور انور کی ازواج مطہرات کے ذریعے آپ کے غسل کا جو طریقہ نقل ہو کر ہم تک پہنچا ہے یہ ہے۔ صحیح بخاری میں ہے:

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب غسل جنابت فرماتے پہلے ہاتھ دھوتے پھر وضو فرماتے پھر تین بار سر پر پانی ڈالتے، پھر اپنے بدن مبارک کو دھوتے۔

اس کی مزید توضیح بخاری میں اس طرح آتی ہے:-

حضرت میمونہ کہتی ہیں کہ میں نے آپ کے غسل کے لیے پانی رکھا۔ آپ نے پہلے اپنے دونوں ہاتھ دھوئے پھر استنجا کیا، پھر زمین پر ہاتھ مارا اور مٹی سے ہاتھ صاف کیے، ان کو دھویا، پھر غرارے کیے اور ناک میں پانی دیا، چہرہ دھویا، سر پر پانی ڈالا، پھر آپ نے پیر دھوئے۔

سنن ابوداؤد میں حضرت علی کے حوالے سے ہے:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو غسل جنابت میں ایک بال برابر چھوڑتا ہے وہ غسل نہیں کرتا۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ غسل جنابت میں خوب صفائی کرنا ضروری ہے۔

پانی نہ ہو تو تیمم کافی ہے

۳۰۵ - اور اگر تم بیمار ہو یا حالت سفر میں ہو یا تم میں سے کوئی استنجا سے آئے یا تم نے عورتوں سے صحبت کی ہو پھر تمہیں پانی دستیاب نہ ہو تو پاک مٹی سے تیمم کر لو اس طرح کہ اس سے اپنے چہروں اور ہاتھوں کو مسح کر لو۔ یعنی بیماری کی وجہ سے پانی کا استعمال مضر ہو یا سفر میں پانی بقدر کفایت نہ ملے یا مثلاً کوئی قضائے حاجت کر کے آئے اور وضو کی ضرورت ہے یا جنابت کی وجہ سے غسل ناگزیر ہے مگر پانی کے حاصل کرنے میں یا استعمال کرنے پر کسی وجہ سے قادر نہ ہو، تو ان صورتوں میں وضو یا غسل کی جگہ تیمم کر لے۔ وضو اور غسل دونوں کے تیمم میں کوئی فرق

نہیں ہے مگر تیمم کی مشروعیت سے جو غرض ہے وہ بہرصورت یکساں طور پر حاصل ہوتی ہے۔ تیمم کے اسرار و مسائل اور اس آیت کے فوائد پانچویں پارے کے تیسرے رکوع میں مفصل گزر چکے ہیں حضرت شیخ الہند نے لامستم النساء کا جو ترجمہ کیا ہے کہ پاس گئے ہوں عورتوں کے وہ محاورے کے اعتبار سے حالت جنابت ہی پر دلالت کرتا ہے۔ یہ ترجمہ ابن عباس اور ابو موسیٰ اشعری کی تفسیر کے موافق ہے جسے ابن مسعود نے بھی سکوتاً تسلیم کیا ہے کما فی البخاری، نیز حضرت شیخ الہند نے فتیمموا کے ترجمہ میں قصد کرو کہہ کر اشارہ فرما دیا کہ اہل لغت کے اعتبار سے تیمم کے معنے میں قصد معتبر ہے اور اس لغوی معنے کی مناسبت کا خیال رکھتے ہوئے تیمم شرعی میں بھی قصد یعنی نیت کو علماء نے ضروری قرار دیا ہے[1]

تیمم کے لغوی و شرعی معنے، صعید کی لغوی تحقیق، تیمم کا مسنون طریق، تیمم میں مسح کے اعضاء وغیرہ ہم جلد پنجم میں سورہ نساء کے نوٹ نمبر ۲۰ میں تفصیل بحث کر چکے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ فلم تجدوا ماء میں پانی نہ ملنے کا مطلب پانی کے استعمال پر قادر نہ ہونا ہے خواہ یہ بسبب بیماری کے خواہ بسبب فاصلے کے یا کسی اور سبب سے ہو۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ پانی پر قدرت ہو مگر سردی لگ جانے کا اندیشہ، بیماری بڑھ جانے کا خوف، پانی لانے میں بہت زیادہ دشواریاں، یہ ساری چیزیں پانی نہ ملنے کے حکم میں ہیں۔ حدیث میں تصریح ہے کہ عمرو بن العاص نے پانی ہوتے ہوئے بھی تیمم کر لیا۔ اس لیے کہ پانی سے انہیں سردی لگ جانے کا اندیشہ تھا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی اجازت دی۔ حنفیہ کے یہاں سردی کے عذر پر بجائے غسل کے تیمم کر لینا بالکل جائز ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ امام ابو حنیفہ اور امام محمد کا فتویٰ یہی ہے کہ جس کو پانی سے سردی لگتی ہو اسے غسل کی جگہ تیمم کر لینا جائز ہے۔ تیمم کے ساتھ نماز با جماعت میں شرکت کی بھی حدیث میں اجازت ہے قرطبی نے بخاری کے حوالہ سے لکھا ہے،

ایک شخص کو حضور نے نماز کی جماعت سے الگ بیٹھے دیکھا۔ آپ نے دریافت کیا کہ نماز میں کیوں نہیں ملے، بولے کہ میں حالت جنابت میں ہوں اور پانی نہیں ہے، فرمایا کہ تیمم کر لو، یہی کافی ہے۔

فقہاء نے یہاں تک بات کھول دی ہے کہ پانی ملتا ہے لیکن بہت گراں قیمت پر ملتا ہے یا موجود تو ہے لیکن اتنی کم مقدار ہے کہ پینے کے لیے نہ بچ سکے گا تو ایسے موقع پر پانی کا ہونا،

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کے نہ ہونے کے برابر ہے اور تیمم بالکل درست ہے۔ چنانچہ الجصاص نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے اس لیے فلم تجدوا ماء کا مطلب یہ ہے کہ تم پانی کے استعمال پر قادر نہ ہو خواہ اس وجہ سے کہ پانی نایاب ہے یا اس لیے کہ ایک میل دور ہے یا اس لیے کہ اس کے استعمال سے بیمار ہو جائے گا یا پیاس کا اندیشہ لاحق ہو جائے گا۔

امام شافعی فرماتے ہیں کہ پانی نہ ملنے کی صورت میں مسافر کے لیے جواز تیمم کی شرط یہ ہے کہ وہ پانی تلاش کرے۔ ساتھیوں سے مانگے، اگر بیابان میں ہو تو دور تک نظر دوڑائے۔ اگر درمیان میں ٹیلہ یا دیوار ہو اس کے پار جائے کیونکہ قرآن نے فلم تجدوا ماء فرمایا ہے کہ نہ پانے کا مصداق وہی ہو سکتا ہے جو طلب اور جستجو کرے۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ہر وہ شخص جس کی ملک میں پانی نہ ہو وہ فلم تجدوا ماء کا مصداق ہے۔ اگر پانی پاس موجود نہیں ہے، کسی سے مانگنا شرط نہیں ہے پتہ کی بات یہ ہے کہ قرآن نے بیمار اور مسافر کو تیمم کی رخصت دی ہے۔ بیمار کو اس لیے کہ پانی تو موجود ہے مگر نقصان دیتا ہے اور مسافر کو اس لیے کہ پانی کا حاصل کرنا دشوار ہے اور اس تندرست کو بھی رخصت دی ہے جسے پانی دستیاب نہ ہو خواہ اسے وضو کی حاجت ہو یا غسل کی، ان سب صورتوں میں تیمم جائز ہے۔ ظاہر قرآن سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ بیمار ہونا، مسافر ہونا اور حدث اصغر یا اکبر کے بعد پانی نہ ملنا جواز تیمم کے مراتب ہیں۔ بیمار کے پاس اور مسافر کے پاس پانی ہو تا تیمم میں مانع نہیں ہے۔ کیونکہ بیمار کو پانی نقصان دیتا ہے اور مسافر کو سفر میں پانی کی ضرورت ہے تو اصل لم تجدوا ماء بیمار اور مسافر کی قید نہیں بلکہ صحت مند آدمی جو حدث اصغر یا اکبر میں مبتلا ہو اس کی قید ہے۔ یعنی اگر تندرست انسان بے وضو ہو یا جنبی ہو اور اسے پانی دستیاب نہ ہو تو اسے تیمم کی اجازت ہے۔

وضو کے نواقض

آیت او جاء احد منکم من الغائط او لامستم النساء سے بطور کنایہ یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ قضائے حاجت سے خواہ پیشاب ہو یا پاخانہ وضو ٹوٹ جاتا ہے یعنی ان دونوں راہوں سے جو کچھ معتاد طریقہ سے نکلتا ہے اس سے طہارت ختم ہو جاتی ہے اور یہ بات بھی سمجھ میں آرہی ہے کہ یہ دونوں ناپاک ہیں۔ اور ان دونوں راہوں سے غیر معتاد طریق پر جو کچھ نکلتا ہے وہ بھی نجاست ہے اور ناقض وضو ہے جیسے مذی ودی وغیرہ، اور اس سے جمہور کے نزدیک طہارت ختم ہو جاتی ہے حتیٰ کہ اگر ریح بھی خارج ہو تو اس سے بھی وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ مسند احمد ترمذی

اور ترمذی اور ابن ماجہ میں بحوالہ ابوہریرہ حدیث آتی ہے۔
وضو نہیں مگر آواز سے یا بُو سے

امام بیہقی نے اس کی صحت کا لوہا مانا ہے اور شیخین نے ابوہریرہ کی حدیث تو نہیں مگر اس مفہوم پر مشتمل عبداللہ بن زید سے روایت کیا ہے۔

البتہ اس امر میں علماء کا اختلاف ہے کہ انسانی بدن سے جو چیزیں ان راہوں کے علاوہ دوسری جگہوں سے نکلتی ہیں، مثلاً بدن سے خون نکل آیا، ناک سے نکسیر آ گئی، یہ بھی طہارت ختم کرتی ہے یا نہیں۔ قرآن کی یہ آیت اس موضوع پر خاموش ہے۔ امام شافعی خون کو ناقض وضو نہیں بتاتے، امام احمد معمولی سے خون کو ناقض وضو نہیں بتاتے، لیکن امام ابوحنیفہ خون کو ناقض وضو کہتے ہیں بشرطیکہ ناپاک ہو اور خون کے ناپاک ہونے کا معیار بہنا ہے، اگر بہتا نہیں تو ناپاک نہیں ہے۔

خون کی قے کے بارے میں بھی یہی اختلاف ہے۔ امام شافعی خون کو ناقض وضو نہیں کہتے جبکہ امام ابوحنیفہ قے کو ناقض وضو کہتے ہیں، ہاں اگر قے معمولی ہے تو اس کو ناقض نہیں کہتے اور غیر معمولی یعنی منہ بھر کر ہو تو اسے ناقض کہتے ہیں۔ امام ابوحنیفہ خون اور قے وغیرہ کو ان دونوں راہوں سے نکلی ہوئی نجاست پر قیاس کرتے ہیں کیونکہ وہاں طہارت کے وجوب کی علت صرف نجاست ہے۔

سونا بھی وضو کو توڑ دیتا ہے

سونے کے ناقض ہونے میں علماء کے درمیان اچھا خاصا اختلاف ہے۔ شارحین حدیث نے آٹھ مذاہب بتائے ہیں۔ اول یہ کہ سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے یہ شیعہ امامیہ کی رائے ہے۔ دوسرے یہ کہ مطلق سونا ناقض وضو ہے۔ یہ حسن بصری شوافع میں سے مزنی اور محدثین میں سے اسحاق ابن راہویہ اور ابن المنذر کا خیال ہے تیسرے یہ کہ زیادہ سونا وضو کو توڑ دیتا ہے یہ امام زہری ربیعہ امام اوزاعی اور امام احمد کی رائے ہے، چوتھے یہ کہ چت لیٹ کر یا کروٹ سے یا کسی چیز کے سہارے سے سوئے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے۔ یہ امام ابوحنیفہ اور داؤد ظاہری کی رائے ہے پانچویں یہ کہ نماز میں سونا وضو کو توڑتا ہے۔ پھر دن کی نماز میں نہیں، یہ زید بن علی کہتے ہیں، چھٹے یہ کہ حالت رکوع و سجود میں سونے سے وضو ٹوٹتا ہے، باقی کسی حالت میں سونے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے، ساتویں یہ کہ صرف حالت سجود میں سونے سے وضو ٹوٹتا ہے۔ یہ دو نوں اقوال امام احمد سے منقول ہیں۔ آٹھویں یہ کہ سونا حدث نہیں بلکہ احتمال حدث کے حکم میں ہے اگر کوئی

زمین پر سرین کے سہارے بیٹھ کر سوتا ہے اس کا وضو ٹوٹتا ہے ورنہ نہیں۔ اس موضوع پر احادیث مختلف آئی ہیں اور سب نے جو موقف اختیار کیا ہے وہ روایات کے سہارے ہی اختیار کیا ہے۔ ہاں البتہ اس بات پر امام نووی نے علماء کا اتفاق لکھا ہے کہ جنون اور بے ہوشی اور وہ تمام حالتیں جن میں زوال عقل ہو جاتے۔ ناقض وضو ہیں۔

کیا عورت کو ہاتھ لگانا ناقض وضو ہے ؟

آیت کے اس حصے او لامستم النساء سے حضرت امام شافعی نے یہ بات سمجھی ہے کہ عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے، یہی عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمر اور زہری کا مذہب ہے لیکن امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو نہیں ٹوٹتا ہے۔ حضرت علی، حضرت عبداللہ بن عباس، عطاء ابن ابی رباح، طاؤس یمانی بھی یہی رائے رکھتے ہیں۔ اس اختلاف کا سرچشمہ یہ ہے کہ اس آیت قرآنی میں لفظ ملامستہ کون سے معنے میں استعمال ہوا ہے۔ لغت میں اس کے معنے چھونے اور ہاتھ لگانے کے ہیں جب کنائی زبان میں یہ مباشرت کے لیے استعارہ ہے اس امر میں اختلاف ہے کہ یہاں کنائی معنے مراد ہیں یا لغوی۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کہتے ہیں کہ کنائی معنے مراد ہیں یعنی مباشرت اور اسی کو امام ابوحنیفہ، امام سفیان ثوری نے اپنایا ہے برخلاف اس کے حضرت عبداللہ ابن مسعود حضرت عمر فاروق اور حضرت عبداللہ بن عمر کی رائے یہ ہے کہ آیت میں ملامستہ اپنے لغوی معنے میں ہے اسی لئے کہ امام شعبی اور امام شافعی نے اپنایا ہے۔

ہماری رائے میں ذوق تشریع سے قریب تر یہی ہے کہ آیت قرآنی میں ملامست کنائی معنے میں ہے۔ اگر چھونے کے معنے میں ہو تو خود اعمال نبوت کے لیے توجیہات تلاش کرنی ہوں گی مثلاً مسلم اور ترمذی میں حضرت عائشہ کا بیان ہے کہ

> انہوں نے حضور کے قدم مبارک پر ہاتھ رکھا جب کہ آپ مسجد میں نماز پڑھ رہے تھے۔

اور حدیث کی متعدد کتابوں میں ہے کہ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم رات کو نماز پڑھتے۔ میں آپ کے سامنے لیٹی ہوتی تھی جب آپ سجدہ کا ارادہ کرتے تو پیر سے ٹہوکا دیتے۔

یہاں سید رشید رضا کی یہ بات بہت اچھی ہے کہ اگر عورت کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹنے کا مسئلہ اسلام میں ہوتا تو تواتر کے ساتھ اس کی نقل ہوتی۔ اور ایک نہیں بلکہ متعدد راہوں سے یہ بات روایت و حدیث کے دفتر میں ہوتی۔

کیا شرمگاہ کو ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹتا ہے؟

اس موضوع پر فقہاء میں اختلاف ہے۔ امام شافعی، امام احمد، امام مالک اور امام اسحاق کا مذہب یہی ہے کہ ہاتھ لگانے سے وضو ٹوٹ جاتا ہے خواہ مرد کی پیشاب گاہ ہو یا عورت کی، صحابہ میں حضرت عمر، ان کے صاحبزادے عبداللہ، ابوہریرہ، ابن عباس، سعد بن ابی وقاص، عائشہ اور تابعین میں عطا، زہری اور سعید بن المسیب کا یہی مسلک ہے۔ اس کے برعکس امام ابوحنیفہ اور امام سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ اس سے وضو نہیں ٹوٹتا۔ صحابہ میں حضرت علی، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عمار بن یاسر اور تابعین میں الحسن البصری اور ربیعہ کا یہی مسلک ہے اور اس اختلاف کی بنیاد در اصل اس موضوع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل شدہ علمی سرمایہ کا اختلاف ہے جو کہتے ہیں کہ وضو ٹوٹ جاتا ہے وہ حضرت بسرۃ کے حوالے سے آیا ہوا ارشادِ نبوت پیش کرتے ہیں کہ جس شخص نے اپنی پیشاب گاہ کو ہاتھ لگایا وہ بغیر وضو نماز نہ پڑھے۔ یہ ارشادِ نبوت بخاری اور مسلم کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابوں میں آتی ہے اور جن علماء نے وضو نہ ٹوٹنے کا فیصلہ فرمایا ہے ان کا موقف یہ ہے کہ مسند احمد اور سنن اربعہ میں یہ ارشادِ نبوت حضرت طلق بن علی کے حوالے سے آیا ہے کہ

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ کیا یا رسول اللہ کوئی شخص اگر اپنی پیشاب گاہ کو ہاتھ لگاتا ہے اس کے ذمے وضو ہے، آپ نے فرمایا کہ وہ بھی تیرے جسم کا ایک حصہ ہے۔

اس ارشادِ نبوت کی صحت کا لوہا سب مانتے ہیں۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ ہمارے نزدیک یہ حدیث زیادہ طاقتور ہے۔ امام علی ابن المدینی فرماتے ہیں کہ اس میں بسرۃ کے مقابلہ میں زیادہ خوبصورتی ہے۔ پہلی حدیث جس سے ان بزرگوں نے استدلال کیا ہے جو وضو ٹوٹنے کے قائل ہیں اس کی صحت میں علماءِ حدیث کو کافی تردد ہے۔

نزولِ شرائع کا مقصد

۳۰۶ ۔ اللہ نہیں چاہتا ہے کہ تمہارے اوپر کوئی تنگی ڈالے بلکہ وہ تو چاہتا ہے کہ تمہیں

خوب پاک کر دے، اسی لیے جو احداث کثیر الوقوع تھے۔ ان میں سارے جسم کا دھونا ضروری نہ رکھا صرف وہ اعضاء جن کو اکثر بلاد متمدنہ کے رہنے والے عموماً کھلا رکھتے ہیں مضائقہ نہیں سمجھتے ہیں، ان کا دھونا اور مسح کرنا ضروری بتلایا تاکہ کوئی تنگی اور دقت نہ ہو، ہاں حدث اکبر یعنی جنابت جو احیاناً پیش آجاتی ہے اور اس حالت میں نفس کو ملکوتی خصال کی طرف ابھارنے کے لیے کسی غیر معمولی تنبیہ کی ضرورت ہے اس کے ازالہ کے لیے تمام بدن کا دھونا فرض کیا۔ پھر مرض اور سفر وغیرہ حالات میں کس قدر آسانی فرمادی۔ اول تو پانی کی جگہ مٹی کو مطہر بنادیا۔ پھر اعضائے وضو میں سے نصف کی تخفیف اس طرح کردی کہ جہاں پہلے ہی سے تخفیف تھی یعنی سر کا مسح اسے بالکل اڑادیا۔ اور پاؤں کو شاید اس لیے نظر انداز کر دیا کہ وہ عموماً مٹی میں یا مٹی کے قریب رہتے ہیں۔ اور تمام اعضاء بدن کے مقابلہ وہ گرد و غبار کا زیادہ نشانہ ہیں، لہٰذا ان پر مٹی کا ہاتھ پھیرنا بے کار تھا۔ اب صرف دو عضو رہ گئے منہ اور ہاتھ ان پر ہی کو ملنے سے وضو اور غسل دونوں کا تیمم ہو جاتا ہے[1] یہ وضو اور غسل کے حکم کی حکمت بیان ہو رہی ہے کہ اگر کچھ لوگوں نے پابندیوں کو سخت محسوس کیا ہو تو ان پر ان کی افادیت واضح ہو جاتے۔ اس میں شبہ نہیں کہ غیر عادی طبائع پر غسل اور وضو کی یہ پابندی بڑی شاق ہوتی ہے لیکن اللہ سبحانہ نے یہ پابندی بندوں کو مشقت میں ڈالنے کے لیے قائم نہیں کی ہے۔ اگر مشقت مقصود ہوتی تو بیماری اور سفر وغیرہ کی حالت میں تیمم کی اجازت ہی نہ ہوتی بلکہ یہ بندوں کی پاکیزگی کی خاطر عائد کی گئی ہے تاکہ وہ زیادہ سے زیادہ ملائکہ سے مشابہت حاصل کر کے خدا کا قرب حاصل کرنے کے اہل ہو سکیں۔ اصلاً تو پاکیزگی باطن کی مطلوب ہے، اور نماز باطن ہی کی پاکیزگی کے لیے فرض کی گئی ہے لیکن ظاہر اور باطن میں گہرا رشتہ ہے۔ ظاہر کا اثر باطن پر باطن کا اثر ظاہر پر پڑتا ہے اس وجہ سے اسلام نے نماز کے لیے وضو کا حکم دیا ہے اور ناپاکی کی حالت ہو تو غسل کا۔

اس آیت میں اسلامی قانون کی حکمت پر روشنی ڈالی گئی ہے اگرچہ یہ آیت طہارت کے مسائل بیان کرنے کے بعد ایک اٹھتے ہوئے سوال کے جواب میں آئی ہے۔ سوال ہوا تھا کہ طہارت کے ان احکام و ضوابط کا فائدہ کیا ہے۔ قرآن نے بتایا کہ یہ احکام و قوانین جو تمہارے لیے بیان ہو رہے ہیں۔ ان کا مقصد صرف یہ ہے کہ تمہارے اندر ہر نوع کی پاکیزگی رونما ہو،

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یعنی روحانی طہارت کے ساتھ جسمانی طہارت بھی تمہارے اندر موجود ہو۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں ایک یہ کہ اللہ تم پر کوئی تنگی نہیں چاہتا ہے، دوسرے یہ کہ اللہ تمہارے جسم کی پاکیزگی چاہتا ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ پہلی بات میں ایک بڑی اصل اور ضابطہ کلی کو بیان کیا گیا ہے۔ یعنی یہ کہ شرائع الٰہیہ میں مشقت اور تعب نہیں۔ اگرچہ یہاں اصلاً تو آیت کا تعلق احکام طہارت سے ہے لیکن ضمناً اور تبعاً اس کی حیثیت تمام قوانین اسلامی کے لیے ایک ضابطہ اور کلیہ کی ہے کیونکہ قرآن نے پورے دین کے بارے میں یہی بات فرمائی ہے ماجعل علیکم فی الدین من حرج یہ آیت سورہ حج کے آخر میں ہے جہاں پہلے اُمت کی مخصوص ذمہ داری کا تذکرہ کیا ہے کہ :

وجاھدوا فی اللہ حق جہادہ ھو اجتبٰکم

اس عظیم ذمہ داری کے ذکر کے بعد یہ فرمایا کہ اللہ نے دین میں تم پر کوئی تنگی نہیں رکھی، یہ اس بات کی دلیل ہے کہ دین کی خاطر خوب محنت کرنا، جان کھپانا جیسے عزائم امور کی بجا آوری دین میں تنگی نہیں ہے۔ تنگی نام ہے نقصان کے زیادہ ہونے کا جیسے خود کشی کرنا، جان بچانے کے لیے بقدر سدرمق حرام نہ کھانا، بیمار کو پانی استعمال کرنے کا۔ بیماری میں روزہ رکھنے کا حکم، علماء نے اس آیت سے ایک سے زیادہ اصول و ضوابط کا استخراج کیا ہے اور پھر ان پر فروع و جزئیات کی پوری قانونی عمارت قائم کی ہے۔ عبادات میں بھی معاملات میں بھی

معنوی اور ظاہری طہارت

آخر میں فرمایا ہے ولکن یرید لیطھرکم بلکہ اللہ چاہتا ہے کہ تمہیں پاک وصاف بنائے کیونکہ وہ خود پاک ہے پاک ہی پسند کرتا ہے، یعنی معنوی اور ظاہری ہر اعتبار سے، طہارت کا لفظ صفائے قلب اور جسمانی پاکیزگی دونوں کے لیے عام ہے۔ قرآن میں کہیں جسمانی پاکیزگی کے لیے کہیں باطنی صفائی کے لیے اور کہیں دونوں کے لیے آیا ہے۔ جسمانی پاکیزگی کے لیے سورۃ مدثر میں آیا ہے وثیابک فطھر اور سورہ بقرہ میں ہے فلا تقربوھن حتی یطھرن اور آیت کو ختم ان الفاظ پر کیا ہے ان اللہ یحب التوابین و یحب المتطھرین اس میں دونوں طہارتوں کی گنجائش ہے یعنی اللہ ان سے محبت کرتا ہے جو میل گندگی اور نجاست سے پاک وصاف ہوتے ہیں اور جو فواحش اور منکرات سے بے داغ ہوتے ہیں۔ اور صرف حدث باطنی اور صفائے

قلب کے موضوع پر سورۃ مائدہ کی یہ آیت ہے اولئک الذین لم یرد اللہ ان یطھر قلوبھم اگر قرآن کے استعمالات پر غور کیا جائے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ پیش نظر آیت میں دونوں معنے کی گنجائش ہے۔ وضو اور غسل کے بعد طہارت کا لفظ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ طہارت جسم کی پاکیزگی کے معنے میں ہے اور سیاق قرآنی اور طہارت کے بعد اتمام نعمت کا ذکر اس بات کا قرینہ ہے کہ طہارت صفائے قلب اور باطنی پاکیزگی کے معنے میں ہے۔

شارحین قرآن نے طہارت کے فوائد اور اس کی حکمتوں پر خوب سیر حاصل بحث کی ہے اور عرفا میں سے احیاء العلوم میں امام غزالی نے المیزان الکبریٰ میں امام شعرانی نے اور حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ نے خوب داد تحقیق دی ہے۔ تفصیل کے لیے معالم القرآن کے صفحات متحمل نہیں اور اختصار مفید مدعا نہیں۔

روحانی اور جسمانی طہارت

۲۰۷۔ اور تم پر اپنی نعمت پوری کر دے تاکہ تم اس کے شکر گزار ہو جاؤ۔ پچھلے رکوع میں جو نعمائے عظیم بیان ہوئی تھیں ان کو سن کر بندے کے دل میں جوش اٹھا کہ اس منعم حقیقی کی بندگی کے لیے فوراً کھڑا ہو جاتے لسے بتلادیا کہ ہماری طرف آؤ تو کس طریقے سے پاک ہو کر آؤ۔ یہ بتلانا خود ایک نعمت ہوئی۔ اور بدن کی سطح ظاہر پر پانی ڈالنے یا مٹی لگانے سے اندرونی پاکی عطا کر دینا یہ دوسری نعمت ہوئی۔ بندہ ابھی پچھلی نعمتوں کا شکر ادا نہیں کر سکا تھا قصد ہی کر رہا تھا کہ یہ جدید انعامات فائض ہوتے، اس لیے ارشاد ہوا کہ لعلکم تشکرون یعنی ان پہلی نعمتوں کو یاد کرنے سے پہلے ان جدید نعمتوں کا جو احکام وضو وغیرہ کے ضمن میں مبذول ہوئیں شکر ادا کرنا چاہیے۔ شاید لعلکم تشکرون ہی سے حضرت بلال نے تحیۃ الوضو کا سراغ لگایا ہو۔ اس درمیانی نعمت کے شکریہ پر متوجہ کرنے کے بعد اگلی آیت میں ان سابق نعمتوں اور احسانات عظیمہ کو پھر اجمالاً یاد دلاتے ہیں جن کی شکر گزاری کے لیے بندہ اپنے مولیٰ کے حضور کھڑا ہونا چاہتا تھا۔ چنانچہ فرماتے ہیں واذکروا نعمۃ اللہ[1]

گویا اشارہ کر دیا کہ جس طرح پاکیزگی نفس ایک نعمت ہے۔ اسی طرح جسم کی پاکیزگی بھی ایک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نعمت ہے۔ انسان پر اللہ کی نعمت اسی وقت مکمل ہو سکتی ہے جبکہ نفس و جسم دونوں کی پاکیزگی کے لیے پوری ہدایت اسے مل جاتے، کیونکہ انسان روح و جسم دونوں کا نام ہے۔ دونوں کی تکمیل سے ہی انسانیت درجہ کمال حاصل کر سکتی ہے۔ نماز اگر روح کی طہارت اور نفس کا تزکیہ کرتی ہے تو وضو اور غسل جسم کی صفائی اور طہارت کا کام کرتے ہیں۔ اور جسم کی صفائی میں نبوت نے صرف طہارت ہی کی ہدایت نہیں فرمائی بلکہ طہارت کے ساتھ نظافت اور نفاست کی بھی ہدایت کی ہے اور قرآن نے مسجد کا نام لے کر یہ ہدایت کی ہے کہ خذوا زینتکم عند کل مسجد یعنی مسجد میں بن ٹھن کر سج کر آؤ۔ ظاہر ہے کہ پاک صاف اور بنا ٹھنا شخص ہی اس لائق ہے کہ مجلسی زندگی کو اپنائے۔ قرآن نے یہاں اتمام نعمت کہہ کر صاف اشارہ کر دیا کہ جو لوگ باطن کو صاف رکھتے ہیں مگر ظاہر کی پروا نہیں کرتے یا جو ظاہر کی ٹیپ ٹاپ پر زور دیتے ہیں مگر باطن کی صفائی سے یکسر غافل رہتے ہیں، قرآن کی نگاہ میں دونوں ناپسند ہیں، قرآن کا مطالبہ دونوں کو یکجا کرنے کا ہے۔

نیز لیتم نعمتہ علیکم میں اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ نماز کے باب میں وضو اور تیمم کے ان احکام کے بعد اللہ کی نعمت تم پر تمام کر دی گئی ہے جب کہ یہود کے ہاں طہارت کے معاملے میں بڑی سخت قیدیں اور پابندیاں تھیں۔ اول تو ان کی شریعت میں احکام سخت ہی تھے، پھر ان پر مزید اضافہ ان کے فقہاء کے تشددات نے کر دیا تھا۔ تیمم کا ان کے ہاں تصور بھی نہ تھا اور یہ بات تو ان کے ہاں انتہائی بد دینی کی تھی کہ کوئی شخص حدث و جنابت کی حالت میں خواہ کیسی ہی معذوری و مجبوری ہو، صرف تیمم کر کے نماز پڑھ لے۔ یہود کے یہ تشددات بھی من جملہ ان اغلال کے تھے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دور ہونے والے تھے چنانچہ تیمم کی اجازت نے طہارت کے باب میں اللہ کی نعمت کا اتمام فرما دیا اور اس اتمام نعمت سے اس امت کو جو سہولتیں اور برکتیں حاصل ہوئی ہیں ان پر ہر آن شکر واجب ہے۔[1]

اتمام نعمت کو تیمم کے ذکر میں لا کر یہ بھی بتا دیا ہے کہ اسلام میں دی ہوئی قانونی رخصتوں سے تنگ دل ہونا اور نفس کا ان پر شبہ کرنا جیسا کہ عمل میں غلو رکھنے والے کرتے رہتے ہیں۔ یہ مزاحمت حق ہے۔

---

[1] تدبر قرآن۔

اُمت کو ذمہ داریوں کی یاد دہانی

۲۰۸ ۔ اور اپنے اوپر اللہ کی نعمت یاد کرو اور اس کے اس عہد کو بھی یاد کرو جس کا اس نے تم سے عہد لیا ہے جبکہ تم نے کہا تھا کہ ہم نے سن لیا اور مان لیا ۔ غالباً یہ وہ عہد ہے جو البقرہ کے آخر میں مومنین کی زبان سے نقل فرمایا تھا قالوا سمعنا و اطعنا غفرانک ربنا و الیک المصیر جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر بیعت کرتے تھے اس وقت بھی یہ اقرار کرتے تھے کہ ہم اپنی استطاعت کے مطابق آپ کی ہر بات کو سنیں گے اور مانیں گے خواہ ہمارے منشا اور طبیعت کے موافق یا خلاف ہو یہ تو عام عہد تھا ، اس کے بعد بعض ارکان اسلام یا مناسبہ حال اہم چیزوں کے متعلق خصوصیت سے بھی عہد لیا جاتا تھا ۔ گویا اس سورت کے شروع میں اوفوا بالعقود فرمایا تھا درمیان میں بہت سے احسانات کا ذکر کر کے جن کو سن کر ایفائے عہد کی مزید ترغیب ہوتی ہے پھر وہی اصل سبق یاد دلایا گیا ہے [1]

اس آیت میں دو باتیں تشریح طلب ہیں ، ایک اللہ کی نعمت ، دوسرے اللہ کا میثاق ، نعمت یہ ہے کہ زندگی کی شاہراہ مستقیم تمہارے لیے روشن کر دی اور دُنیا کی ہدایت و رہنمائی کے لیے ہدایت کے منصب پر تمہیں سرفراز کر دیا ۔ اسی کو قرآن نے سورہ فاتحہ میں صراط الذین انعمت علیہم فرمایا ہے مطلب یہ ہے کہ ہم نے کامل شریعت نازل کر کے اور پوری دُنیا کی امامت عطا کر کے جو تم پر فضل و انعام فرمایا ہے اور تم کو جو عزت و سرفرازی عطا کی ہے ۔ یہود کی طرح سے اسے بھول نہ جانا بلکہ اس کو ہمیشہ یاد رکھنا ۔ یاد رکھنا اپنے حقیقی معنے میں ہے یعنی ظاہراً و باطناً ہر پہلو سے اس کا حق ادا کرنا ، اس کے بعد اس ذمہ داری کی نوعیت ظاہر فرما دی کہ یہ تمہارے اور تمہارے رب کے درمیان ایک مضبوط میثاق کی حیثیت رکھتی ہے جو خدا نے اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے تم سے لیا ہے اور تم نے پیغمبر کے سامنے سمعنا و اطعنا کہہ کر اس میثاق کی ذمہ داری اٹھائی ہے ۔ خدا نے تمہارے لیے دُنیا و آخرت کی کامرانیوں کے جو وعدے فرمائے ہیں وہ اسی میثاق پر منحصر ہیں ۔

وہ ذمہ داری کیا ہے ؟ جس کا اُمت کو میثاق کے ذریعے ذمہ دار قرار دیا گیا ہے ۔ دراصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پوری دُنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی تھے ۔ لیکن آپ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

عالمگیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی عملی شکل اللہ تعالیٰ نے یہ متعین کی تھی کہ وہ آپ کے بعد حق کی شہادت دے سکے اور پھر یہ گروہ اپنے بعد کی نسل کو اس کام کے لیے تیار کرے اور یہ سلسلہ آخر تک یونہی چلتا رہے اس طرح حقیقت دائمی یہ قرار پاتی ہے کہ آپ کی بعثت اہل عرب کی طرف تو براہ راست تھی مگر باقی دنیا کی طرف اس امت مسلمہ کے توسط سے تھی جسے آپ تیار کر گئے تھے اور جو نسلاً بعد نسل تیار ہوتی رہے گی۔ اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تشریف لے جانے کے بعد اب قیامت تک یہ اس امت کی ذمہ داری ہے کہ دنیا کے سامنے حق کی شہادت دیتی رہے۔

کذالک جعلنا کم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس

اور اسی طرح لیتے رہے جس طرح کہ اگر نبی موجود ہوتا تو دیتا، مختصر یہ کہ یہ امت اپنے وجود میں اپنے پیغمبر کی قائمقام ہے اور بحیثیت امت اس کی زندگی کا مشن یہی ہے کہ فرض شہادت انجام دے کر اپنی ذمہ داری پوری کرے۔

امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ وہی اس کے وجود کا کل مقصد بن جاتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ فرمانا کہ ہم نے تمہیں ایک بہترین امت بنایا ہے تاکہ تم باقی سارے انسانوں کے لیے دین حق کے گواہ بنو۔ اس امت کی حیثیت صاف طور سے یہی متعین کر رہا ہے۔ امت کی ذمہ داری کا یہی وہ میثاق ہے جس کو عہد اول کے مسلمانوں نے سمعنا و اطعنا کہہ کر قبول کیا۔ یہی سمع طاعت کا وہ میثاق ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے لیتے رہے۔ قرطبی نے حضرت عبداللہ ابن عباس کی طرف نسبت کرکے لکھا ہے:

ھوالعھد والمیثاق الذی جری لھم مع النبی صلعم علی السمع والطاعۃ فی المنشط والمکرہ

وہ عہد اور میثاق جو حضور سے صحابہ نے کیا کہ ہم آپ کی سنیں گے اور آپ کی طاعت کریں گے ہمیں گوارا ہو یا ناگوار۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں امام بغوی نے معالم میں اسی کو راجح قرار دیا ہے۔

یہ کہنا کہ اس میثاق سے عالم ارواح کا وہ عہد ہے جو سارے بنی آدم سے اقرار ربوبیت کے بارے میں لیا گیا تھا درست نہیں ہے کیونکہ یہاں خطاب عام نوع بشری سے نہیں بلکہ اہل ایمان سے ہے اس لیے آسان اور بے تکلف تفسیر یہی ہے کہ وہ عہد مراد لیا جائے

جس کی اُمت پر ذمہ داری ڈالی گئی ہے وہ شہادت علی الناس کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اسلامی تصورِ تقویٰ کا آئینہ

۳۰۹ - اور اللہ کی نافرمانی سے بچو بے شک اللہ سینوں کے اندر کا علم رکھتا ہے۔ ایک شریف اور حیادار آدمی کی گردن اپنے محسنِ اعظم کے سامنے جھک جانی چاہیے، مروت و شرافت اور احسانمندی کے جذبات کی توقع اسی کو مقتضی ہے کہ بندہ اس منعمِ حقیقی کا بالکل تابع فرمان بن جائے خصوصاً جب کہ زبان سے اطاعت و وفاداری کا پختہ عہد و اقرار بھی کیا ہو۔ ممکن ہے کہ حق تعالیٰ کی بے انتہا مہربانیاں دیکھ کر بندہ مغرور ہو جائے، اس کی نعمتوں کی قدر اور اپنے قول و قرار کی کوئی پروا نہ کرے اس لیے فرمایا واتقوا اللہ یعنی خدا سے ہمیشہ ڈرتے رہو، وہ ایک لمحہ میں تم سے سب نعمتیں چھین سکتا ہے۔ اور ناشکری اور بدعہدی کی سزا میں بہت سخت پکڑ سکتا ہے۔ بہرحال مروت، شرافت اور خوف ہر چیز کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اس کی مخلصانہ اطاعت اور وفاداری میں پوری سرگرمی دکھلائیں گے وہ علیم بذات الصدور ہے ہم جو کچھ کریں گے وہ ہمارے اخلاص و نفاق، ریاکاری یا قلبی نیازمندی کو خوب جانتا ہے فقط زبان سے سمعنا و اطعنا کہنے یا شکر گزاری کے رسمی و ظاہری الفاظ سے ہم اس کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔ [1]

اصل تقویٰ یہ ہے کہ نفس کی خواہشوں کی طرح ذوق ذات کی آزادیوں پر بھی احکامِ الٰہی کا پورا کنٹرول ہو۔ تقویٰ کا یہ تصور شاید عام ذہنوں کو کچھ عجیب معلوم ہو مگر یہی اس دینِ حق کا وہ خاص وصف ہے جو اسے دوسرے ادیان سے ممتاز کرتا ہے۔ قرآن جو بار بار اور ہر موقعہ پر تقویٰ پر زور دیتا ہے اور نبوت جو اس کی ہر موقعہ پر تلقین کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن کے پیشِ نظر پچھلی امتوں کی تاریخ تھی، تحریفِ ادیان کے تجربے تھے۔ نفس کشی اور رہبانیت کے تجربے تھے۔ قرآن کو معلوم تھا کہ اللہ کے دین کو صرف نفس کے پجاری ہی پامال نہیں کرتے رہے ہیں بلکہ اپنوں کا غلو اور تشدد اس کو نئی ہیئت اور نیا مزاج دیتے رہے ہیں اور جس چیز میں یہ بے راہ روی سب سے زیادہ راہ پاتی رہی وہ یہی اُمت کی ذمہ داری ہے۔ شہادت علی الناس کے فریضہ کو لوگوں نے دین میں فالتو چیز سمجھ لیا اور اس معصوم یقین کے ساتھ سمجھ لیا۔ عزلت، گوشہ نشینی، خلوت خدا کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پسند ہے، پھر یہ طرزِ فکر آگے بڑھا اور تنہائی اور اجتماعی زندگی سے گریز پائی دینداری کا کمال بن گئی اور اس کے نتیجہ میں ذمہ داری کا وہ کام چھوڑ بیٹھے۔ یہ وہ پس منظر ہے جس کی موجودگی میں قرآن نے مزید سمجھا کر اہلِ ایمان کو اچھی طرح متنبہ کر دیا اور ان خطرات سے اسلام کے مستقبل کو اچھی طرح محفوظ رہنے کا پورا پورا سامان کر جاتے جو ہمیشہ سے دینِ خداوندی کو پیش آتے رہے ہیں اور اسے بدل کر کچھ سے کچھ بناتے رہے ہیں اور اس غرض سے شہادت علی الناس کی ذمہ داری کے فریضہ کو خاص طور پر کھیل اور تماشہ بننے سے روک دے اس لیے قرآن نے یہ بات اچھی طرح لوگوں کے ذہن نشین کرا دی کہ اللہ تعالیٰ نے امت کی ذمہ داری کا جو پیمانہ مقرر کیا ہے عملاً اسے برقرار رکھا جاتے۔ گویا اتقوا اللہ فرما کر تعمیلِ احکام میں اخلاص پیدا کرنے پر زور دیا گیا ہے۔ سید رشید رضا لکھتے ہیں کہ،

> جو کچھ ہم نے کرنے کو کہا ہے اور جس چیز سے ہم نے روکا ہے اس کی خلاف ورزی کر کے عہد شکنی نہ کرو اور نبوتِ خدا کی جانب سے دین کے نام پر جو کچھ لے کر آئی ہے اس میں نہ اضافہ کرو اور نہ کمی کرو اور اس کے یاد رکھنے میں کوئی کوتاہی نہ کرو۔ اس میں کسی قسم کی تحریف نہ کرو۔ اگر تم نے ایسا کیا تو تمہارا حال بھی ان سے ہرگز مختلف نہ ہوگا جن سے اللہ نے عہد لیا تھا یعنی اہلِ کتاب اور وہ اسے فراموش کر بیٹھے تھے تحریف کے خوگر ہو گئے اور پھر اپنی لائے سے دین میں اضافہ اور کمی کرتے رہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُونُوا قَوَّامِينَ لِلَّهِ شُهَدَاءَ بِالْقِسْطِ
وَلَا يَجْرِمَنَّكُمْ شَنَآنُ قَوْمٍ عَلَىٰ أَلَّا تَعْدِلُوا ۚ اعْدِلُوا
هُوَ أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ إِنَّ اللَّهَ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿٨﴾
وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ ۙ لَهُمْ مَغْفِرَةٌ
وَأَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٩﴾ وَالَّذِينَ كَفَرُوا وَكَذَّبُوا بِآيَاتِنَا
أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١٠﴾ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اذْكُرُوا
نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ هَمَّ قَوْمٌ أَنْ يَبْسُطُوا إِلَيْكُمْ
أَيْدِيَهُمْ فَكَفَّ أَيْدِيَهُمْ عَنْكُمْ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ ۚ وَعَلَى
اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ﴿١١﴾

اے اہل ایمان! تم اللہ کی خاطر مضبوطی سے کھڑے ہونے والے
اور انصاف کی شہادت دینے والے ہو جاؤ۔ اور دیکھو کہ
کسی گروہ کی دشمنی تمہیں بے انصافی پر نہ ابھارے ،

ہر حال میں انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے[۴۲]۔ اور اللہ کی نافرمانی سے بچ کر رہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے[۴۳]۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ ان کے لیے مغفرت ہوگی، اور بہت ہی بڑا اجر ہوگا لیکن جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور ان کی تکذیب کی تو وہ دوزخی[۴۴] ہیں۔ اے ایمان والو! اپنے اوپر اللہ کا وہ انعام یاد کرو کہ جب ایک گروہ نے پورا پورا ارادہ کر لیا تھا کہ تم پر ہاتھ بڑھاتے تو اللہ نے ان کے ہاتھوں کو روک دیا تھا، اللہ کی نافرمانی سے بچو اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے[۴۵]۔

میثاق کی اجتماعی ذمہ داری

پہلی آیت میں میثاق کی انفرادی ذمہ داری بتائی گئی تھی۔ اب اس آیت میں میثاق کی اجتماعی ذمہ داری واضح کی گئی ہے کہ مسلمانوں پر بحیثیت اُمتِ مسلمہ یہ ذمہ داری ہے کہ

وہ اس حق و عدل کے علمبردار بنیں جو آخری نبوت علم و عمل کی صورت میں لائی ہے خود اپنے اندراس کو قائم کریں اور اسی کی دُنیا کے سامنے شہادت دیں۔ شہادتِ حق کے دو پہلو ہیں، قولی شہادت اور عملی شہادت۔

قولی شہادت یہ ہے کہ اسلام کے بنیادی عقائد سے لے کر اس کے تفصیلی احکام تک غیر مسلموں کے سامنے موزوں ترین الفاظ اور عبارات میں پیش کیا جاتے یہاں تک کہ دین ان کے لیے کھلی کتاب بن جاتے اور ان کے لیے اپنے دین کا پورا اور اسلام کی صداقت پا لینے میں کوئی معقول رکاوٹ نہ رہے۔

عملی شہادت یہ ہے کہ اسلام کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جاتے وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں بھی دیکھ لی جاتے۔ اُمت کے افراد اپنی انفرادی حیثیتوں میں اور پوری اُمت اپنی اجتماعی حیثیت میں سب کے سب اسلام کے عملی ترجمان ہوں۔ انہیں توحید، آخرت اور رسالت وغیرہ عقائد پر گہرا یقین ہو اور یہ یقین ان کی ایک ایک ادا سے ٹپک رہا ہو۔ ان کے اخلاق وہ ہوں جن کی اسلام نے تلقین کی ہے۔ ان کے معاملات ان ہی خطوط پر انجام پائیں جو نبوت کے علم و عمل نے متعین کر دیئے ہیں ان کی معاشرت، ان کی معیشت اور ان کی سیاست غرض ان کی زندگی کا پورا نظام، اور اس نظام کا ایک ایک شعبہ اس نقشے کے مطابق تعمیر ہو جو اللہ و رسول نے بنا کر دیے ہیں۔ تاکہ دنیا اپنی آنکھوں سے کہ اسلام کیا ہے وہ کس قسم کے معاشرہ اور کس قسم کا اسٹیٹ وجود میں لانا چاہتا ہے۔

عملی شہادت کا مرتبہ قولی شہادت سے مقدم تر بھی ہے اور اہم تر بھی ایک تو اس لیے کہ جب تک کوئی شخص یا گروہ خود ہی کسی دین کی پیروی نہ کر رہا ہو اسے کسی طرح زیب نہیں دیتا کہ وہ دوسروں کو اس کی پیروی کی دعوت دے۔ دوسرے اس لیے کہ لوگوں کی بہت بڑی اکثریت شاید سو میں سے ۹۵ سے بھی زیادہ بڑی اکثریت اصلاً عملی دلائل ہی کی زبان سمجھتی ہے عقلی دلائل تک اس کی رسائی بہت کم ہوتی ہے۔

یہ ہے تو این لنہ کا پورا مفہوم۔ اُمتِ مسلمہ کی عملی کوششیں اس معیار کے جس حد تک قریب ہوں گی اسی حد تک وہ تو این بلنہ کے فرض میں کامیاب اور قرآن کے مطالبہ کو پورا کرے گی۔

۳۴ ۔ اے اہلِ ایمان تم اللہ کی خاطر مضبوطی سے کھڑے ہونے والے اور انصاف کی شہادت

لینے والے ہو جاؤ ۔ اس سے پہلی آیت میں مومنین کو حق تعالیٰ کے احسانات اور اپنا عہد و پیمان یاد کرنے کا حکم دیا تھا۔ یہاں بتلا دیا کہ صرف زبان سے یاد کرنا نہیں بلکہ عملی رنگ میں ان سے اس کا ثبوت مطلوب ہے۔ اس آیت میں اسی پر تنبیہہ کی گئی ہے کہ اگر تم نے خدا کے لیے بے شمار احسانات اور اپنے عہد و اقرار کو بھلا نہیں دیا تو لازم ہے کہ اس محسن حقیقی کے حقوق ادا کرنے اور اپنے عہد کو سچا کر دکھانے کے لیے ہر وقت کمربستہ رہو اور جب کوئی حکم اپنے آقائے ولی نعمت کی طرف سے ملے فوراً تعمیل حکم کے لیے کھڑے ہو جاؤ ۔ اور خدا کے حقوق کے ساتھ مخلوق کے حقوق ادا کرنے میں بھی پوری جدوجہد اور اہتمام کرو۔ چنانچہ قوامین للہ میں حقوق اللہ کی اور شہداء بالقسط میں حقوق العباد کی طرف اشارہ کیا ہے ۔ اسی قسم کی ایک آیت پانچویں پارے کے آخر میں گزر چکی ہے صرف اس قدر فرق ہے کہ وہاں بالقسط کو للہ پر مقدم کیا ہے۔ شاید اس لیے کہ وہاں دور سے حقوق العباد کا ذکر چلا آ رہا تھا اور یہاں پہلے سے حقوق اللہ کا ذکر ہو رہا ہے اس لحاظ سے وہاں بالقسط اور یہاں شہداء کی تقدیم ہوئی ہے ۔ نیز یہاں سیاق میں مبغوض دشمن سے معاملہ کرنے کا ذکر ہے جس کے ساتھ قسط کو یاد دلانے کی ضرورت ہے اور سورۃ نساء کے سیاق میں محبوب چیزوں کا ذکر ہے اس لیے وہاں سب سے بڑے محبوب اللہ کو یاد دلایا گیا ہے[1] ایک وجہ تو یہی ہے جو شیخ الاسلام نے پیش فرمائی ہے لیکن ابوحیان اندلسی نے اپنی تفسیر البحر المحیط میں ایک اور لطیف وجہ بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ سورۃ نساء اور سورہ مائدہ میں یہ تعبیری فرق کیوں ہوا ہے کہ نساء میں کونوا قوامین بالقسط شہداء للہ فرمایا اور مائدہ میں کونوا قوامین للہ شہداء بالقسط فرمایا یعنی ایک جگہ بالقسط کو قوامین کا اور للہ کو شہداء کا متعلق بنا کر پیش فرمایا اور دوسری جگہ للہ کو قوامین کا اور بالقسط کو شہداء کا متعلق بنا کر لایا گیا۔ لکھتے ہیں کہ انسان دو وجہ سے جادۂ انصاف سے ہٹتا ہے غلبہ محبت اور غلبہ عداوت سورہ نساء میں روئے سخن محبت کی طرف ہے اور سورہ مائدہ میں روئے سخن عداوت کی طرف ہے۔ اگرچہ دونوں عنوان ایک ہی انجام بتاتے ہیں کیونکہ جو شخص انصاف کا علمبردار ہوگا وہ اللہ ہی کے لیے کھڑا ہوگا اور جو اللہ کے لیے کھڑا ہے وہ ضرور انصاف کرے گا لیکن دراصل یہاں قوامین کے ساتھ للہ لگا کر میثاق کی اجتماعی ذمہ داری کو یاد کرایا گیا ہے ۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ اللہ کے لیے کھڑا ہونا کیا ہے ، اللہ کے لیے کھڑے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ نبوت جو علم و عمل خدا کی جانب سے لے کر آئی ہے اسے پوری دنیا میں رائج کرنے کے لیے قولاً و فعلاً معلم اور ذمہ دار ہو جاؤ ۔ اس کے لیے یہاں صرف یہی نہیں فرمایا قوموا للہ جیسا کہ البقرہ میں آچکا ہے نیز فرمایا کہ کونوا قائمین للہ بلکہ قیام سے مبالغہ کا صیغہ لے کر آتے اور فرمایا کونوا قوامین للہ ، دوسری تعبیرات کو چھوڑ کر یہ انداز بیان اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات آجائے کہ جو کچھ کہا جا رہا ہے اور جس بات کا مطالبہ کیا جا رہا ہے وہ صرف یہ نہیں ہے کہ اللہ کا کام کرو بلکہ یہ کہا جا رہا ہے کہ جس دین کو اللہ کی جانب سے نبوت علم و عمل کی صورت میں لے کر آئی ہے اس کے لیے بہت زیادہ محنت کرنے والے ہو جاؤ اور یہ کام وقتی طور پر نہیں بلکہ دائمی طور پر کرو گویا اس فقرے میں دو مطالبے ہیں، ایک یہ کہ یہ کام خوب کیا جائے اور بہت زیادہ کیا جائے یہ بات قوام کو مبالغہ کا صیغہ لا کر بتاتی ہے ، دوسرے یہ کہ یہ کام ہنگامی طور پر نہ ہو بلکہ ہمیشہ کیا جائے یہ بات قوامین کو کونوا کی خبر بنا کر بتاتی ہے مطلب یہ ہے کہ نبوت کے علم و عمل کو اپنانا اور قبول کرنا ہی تمہاری ذمہ داری نہیں بلکہ تمہارا فرض یہ ہے کہ تم دنیا کے سامنے تا قیام قیامت اس کے علمبردار اور اس کے داعی بن کر رہو اسی بلیغ معنویت کی خاطر کونوا قوامین للہ کی تعبیر اختیار کی ہے ۔ یعنی زندگی کی ساری شاخوں میں نبوت کے علم و عمل کے علمبردار ہو جاؤ اور اس میں اجتماعی حیثیت سے خوب محنت کرو اور جانیں کھپاؤ اور یہ کام اس طرح انجام دو کہ یہ تمہارا قومی نشان بن جائے گویا نبوت کے لاتے ہوئے علم و عمل کو اپنے قیام کے لیے جس سہارے کی ضرورت ہے مومن کی حیثیت سے تمہارا مقام یہ ہے کہ تم وہ سہارا بنو ۔ امت کی اسی اجتماعی ذمہ داری کو قرآن نے دوسرے موقعہ پر ان الفاظ میں پیش کیا ہے ۔

جاھدوا فی اللہ حق جھادہ

اللہ کی خاطر خوب محنت کرو جیسا کہ اس کی خاطر محنت کرنے کا حق ہے
اور پھر اس کی وجہ یہ بتاتی ہے

ھو اجتبٰکم و ما جعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ
ابیکم ابراھیم ھو سمٰکم المسلمین من قبل و فی ھذا
لیکون الرسول شھیدا علیکم و تکونوا شھداء

علی الناس (حج ۷۸)

اس نے تمہیں منتخب کیا ہے اور تمہارے لیے دین میں کوئی تنگی نہیں رکھی ہے اپنے باپ ابراہیم کے راستہ کی پیروی کرو، اسی نے پہلے ہی تمہارا نام مسلم رکھا ہے اور اسی لیے رکھا ہے تاکہ رسُول تمہارے لیے دینِ حق کی گواہی دینے والا ہو اور تم دوسرے تمام لوگوں کے سامنے دین حق کی گواہی دینے والے بنو۔

اس آیت میں اُمت مسلمہ کی مخصوص حیثیت اور اس کی مخصوص ذمہ داری دونوں چیزوں کو پوری طرح اجاگر کر دیا ہے۔ اس میں اُمت کے لیے اجتبا کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ اس کے معنے ہیں بہتر شے کا انتخاب۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے اس اُمت کو اس کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ لفظ قرآن مجید میں عام طور پر انبیاء کے لیے استعمال ہوا ہے۔ غور فرمائیے کہ ایسا لفظ جو عموماً منصب نبوّت و رسالت کی خاطر کیے جانے والے انتخاب کے لیے بولا گیا ہو اسے اگر ایک اُمت کے لیے بولا گیا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ یہ اس اُمت کے پیغمبرانہ کام کے ذمہ دار ہونے کی کھلی دلیل ہے اس کے بعد ھو سماکم المسلمین من قبل بتا رہا ہے کہ اس اُمت کو اُمتِ مسلمہ کے نام سے آج نہیں بلکہ مدتوں پہلے نوازا گیا ہے۔ یہ اس اُمت کے ممتاز اور غیر معمولی اُمت ہونے کی دوسری دلیل ہے۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کی بشارت آپ کی تشریف آوری سے ہزاروں سال پہلے ہی دی جا چکی تھی۔ ٹھیک اسی طرح کا معاملہ آپ کی اُمت کا بھی ہے ابھی اس کے وجود میں آنے کے لیے شب و روز کی ہزاروں لاکھوں گردشیں باقی تھیں مگر اس کے نام کا اور اس کے کام کا اور اس کے اوصاف کا اعلان پہلے ہی ہو چکا تھا۔ اس اُمت کو یہ نام اور مقام عطا صرف اس لیے ہوا ہے کہ اس کا کام بھی اسی نام کے شایانِ شان انجام دینا ہے۔ بہرحال اس آیت میں یہ حقیقت ساری دُنیا کو سمجھا دی گئی ہے کہ اس اُمت کا کام دُنیا میں قوامون للہ بن کر رہنا ہے۔

اصل تو اس اُمت کے وجود کی غرض و غایت دینِ حق کی اپنی زندگی میں اور پھر پوری دُنیا میں برتری اور اس کا بول بالا ہے۔ شہادت، جہاد، دعوت اور قیام للہ اسی منزل تک پہنچنے کی راہیں ہیں۔ قرآن یہاں اس کا چہرہ پیش کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ مسلمانو! تمہیں اجتماعی حیثیت سے اس ذمہ داری کو پورا کرنا چاہیے، اور اس کے بعد فرمایا کہ

صرف یہی نہیں کہ تم دنیا میں دینِ حق کا بول بالا کرنے والے بن کر رہو بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ تم دنیا میں عدل و انصاف کے گواہ ہو جاؤ۔ یہ نہیں فرمایا کہ انصاف کرو بلکہ فرمایا کہ تمہیں پوری دنیا میں عدل و انصاف کو جھنڈا لے کر کھڑا ہونا ہے۔ تمہیں اس بات پر کمربستہ ہونا چاہیے کہ ظلم مٹے اور عدل و انصاف قائم ہو۔

عدل و انصاف کی گواہی دینے والے ہو جاؤ شہداء بالقسط کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ سچی گواہی دو جیسا کہ عام شارحین قرآن کی رائے ہے لیکن اس موقع پر صرف یہی بات نہیں کہی جا رہی ہے بلکہ یہ بتایا جا رہا ہے کہ دنیا میں اس عدل و انصاف کے علمبردار بن کر رہو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے لے کر آئے ہیں اور اس قانونی نظام کو قائم کرو جو اسلام کے نام پر نبوت لے کر آئی ہے۔ قانون کی طاقت ناقابلِ شکست ہے کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہوتا۔ نہ امیر و غریب اور خواص و عوام کا یہاں کوئی امتیاز نہیں ہے۔ اونچے سے اونچا شخص حتیٰ کہ سربراہِ مملکت بھی قانون کا اسی طرح محکوم ہے جس طرح ایک بے کس اور بے بس شہری۔ اگر کسی معاملہ میں خود سربراہِ مملکت مدعی یا مدعا علیہ ہو تو عدالت میں اسے بھی اسی طرح اور اسی حیثیت میں حاضر ہونا ہوگا جس طرح اور جس حیثیت سے دوسرے لوگ حاضر ہوتے ہیں۔ اسی طرح اگر قانون کسی مقدمے میں اسے مجرم قرار دیتا ہے تو اسے بھی سزا لازماً بھگتنی پڑے گی۔ قرآن کے یہ الفاظ شہداء بالقسط قانون کی بالادستی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے ہیں۔

راہِ عدل کی سب سے بڑی رکاوٹ

۴۱۔ کسی گروہ کی دشمنی تمہیں بے انصافی پر نہ ابھارے۔ عدل کا مطلب یہ ہے کہ کسی شخص کے ساتھ بغیر افراط و تفریط کے وہ معاملہ کرنا جس کا وہ واقعی مستحق ہے۔ عدل و انصاف کی ترازو ایسی صحیح اور برابر ہونی چاہیے کہ عمیق سے عمیق محبت اور شدید سے شدید عداوت بھی اس کے دونوں پلڑوں میں سے کسی پلے کو نہ جھکا سکے لیے[1]

اس فقرے میں عدل کی راہ کے سب سے بڑے فتنے سے آگاہ کیا گیا ہے کہ کسی قوم کی دشمنی

۱۔ افادات شیخ الاسلامؒ

اور اس کا غلط سے غلط رویہ بھی تمہیں اس حق و عدل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو۔ شیطان نے راہ عدل سے ہٹانے میں سب سے زیادہ جس حربے سے کام لیا ہے وہ یہی ایک دوسرے کے ساتھ دشمنی کا حربہ ہے یہود نے محض بنی اسماعیل اور مسلمانوں کی دشمنی میں اس عہد و پیمان کو خاک میں ملا دیا جس کے وہ گواہ اور زندہ بنائے گئے تھے۔ اس وجہ سے مسلمانوں سے یہ عہد لیا گیا کہ وہ شیطان کے اس فتنے سے بچ کر رہیں۔ دوستوں اور دشمنوں دونوں کے لیے ان کے پاس ایک ہی باٹ ہو اور ایک ہی ترازو ہو۔

عدل کا مقصد یہ ہے کہ قانون کی بنا پر جو حقوق افراد کو حاصل ہیں ان کی حفاظت کی جائے اور انہیں ظلم و جور سے محفوظ رکھا جائے خواہ یگانے ہوں یا بیگانے۔ دوستی اور دشمنی عدل کی راہ میں رکاوٹ نہ ہو۔

مسند امام احمد میں بحوالہ جابر بن عبداللہ یہ واقعہ آیا ہے کہ جب خیبر پر مسلمانوں کا قبضہ ہو گیا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وہاں کے شہریوں کے زمینوں پر قبضہ رہنے دیا اور ان سے معاملہ طے کر لیا۔ طے شدہ معاملہ کے مطابق حضرت عبداللہ بن رواحہ کو وصولیابی کے لیے بطور گماشتہ روانہ کیا۔ عبداللہ نے ساری پیداوار کو اندازے سے تقسیم کر دیا کہ یہ سرکاری ہے اور یہ کاشت کرنے والوں کی۔ زمینوں پر کام کرنے والے یہودی تھے۔ انہوں نے عبداللہ کو کچھ رشوت دینے کا ارادہ کیا تاکہ بٹائی میں ان کی رعایت ہو جائے۔ حضرت عبداللہ بن رواحہ نے فرمایا کہ

اے یہودیو! سن، میں تمہارا مخالف ہوں، تم نبیوں کے قاتل ہو اور اللہ پر بے پر کی اڑاتے ہو۔ لیکن اس کے باوجود میری تم سے دشمنی مجھے جادۂ انصاف و عدل سے نہیں ہٹا سکتی۔ میں نے بیس ہزار وسق کا اندازہ لگایا ہے چاہئے ہو تو لے لو ورنہ میرا ہے۔ انہوں نے کہا اسی عدل و انصاف پر تو پوری کائنات قائم ہے ہم لیتے ہیں بس۔

عدل میں تقویٰ کی ضمانت ہے

۴۲ - ہر حال میں انصاف کرو کہ یہی تقویٰ سے لگتی ہوئی بات ہے۔ جو چیز شرعاً مہلک یا کسی درجے میں مضر ہیں۔ ان سے بچاؤ کرتے رہنے سے ایک خاص نورانی کیفیت آدمی کے دل میں راسخ ہو جاتی ہے اس کا نام تقویٰ ہے۔ تحصیل تقویٰ کے اسباب قریبہ اور بعیدہ بہت

سے ہیں۔ تمام اعمال حسنہ اور خصال خیر اس کے اسباب و معدات میں شمار کیا جا سکتا ہے لیکن معلوم ہوتا ہے کہ عدل و قسط یعنی دوست دشمن کے ساتھ یکساں انصاف کرنا اور حق کے معاملہ میں جذبات محبت و عداوت سے قطعاً مغلوب نہ ہونا۔ یہ خصلت حصول تقویٰ کیلئے موثر ترین اور قریب ترین اسباب میں سے ہے اسی لیے ھو اقرب للتقوٰی فرمایا یعنی یہ عدل جس کا حکم دیا گیا تقویٰ سے نزدیک تر ہے کہ اس کی مزاولت کے بعد تقویٰ کی کیفیت بہت جلد حاصل ہو جاتی ہے۔[1]

پہلے حکم دیا تھا کہ کسی قوم کی دشمنی کی وجہ سے بے انصافی نہ کرو۔ اب حکم ہو رہا ہے کہ عدل کرو عدل میں اور تقویٰ میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ لغت میں عدل نام ہے کسی بوجھ کو دو برابر حصوں میں اس طرح تقسیم کر دینے کا کہ ان دو میں سے کسی میں ذرہ برابر کمی یا بیشی نہ ہو اور اسی سے اس میں یہ مفہوم پیدا ہوتا ہے کہ جو بات ہم کہیں یا جو کام ہم کریں اس میں سچائی کی میزان کسی طرف جھکنے نہ پائے اور وہی بات کہی جائے اور وہی کام کیا جائے جو سچائی کی کسوٹی پر پورا اترے۔ علامہ فیومی مصباح فرماتے ہیں ،

عدل کے معنے ہیں معاملات میں میانہ روی سے کام لینے کے یہ جور کے خلاف ہے عدل فی امرہ عدلا اور عدل علی القوم عدلا باب ضرب سے آتا ہے۔

علامہ ابن الاثیر نے نہایہ میں عدل بالفتح عدل بالکسر کو مثل کے اور عدیل کو مثیل کا مرادف قرار دیا ہے۔ یہاں عدل کا مطلب یہ ہے کہ جماعتی حیثیت سے تمہارا دامن بے انصافی سے آلودہ نہ ہو۔ جس قوم اور جماعت سے تمہاری دشمنی ہو اس سے معاملات میں اور ادائے حقوق میں وقت کی مصلحتیں سیاسی تقاضے اور ملکی مفادات تمہیں عدل و انصاف کی شاہراہ مستقیم سے نہ ہٹائیں قرآن نے انفرادی سے لے کر اجتماعی زندگی تک اور گفتار سے لے کر کردار، اخلاق اور روحانی عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی زندگی کے ہر پہلو میں عدل کو قائم کرنے کی تلقین کی ہے عدل کا حکم قرآن میں جیسا صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں اسی طرح وہ عدل کو صرف یگانوں تک محدود رکھنا نہیں چاہتا بلکہ اس آیت میں کھول کر منفی اور مثبت انداز میں بتایا

[1] افادات شیخ الاسلام

گیا ہے کہ بے انصافی نہ کرو۔ اور پھر فرمایا کہ انصاف کرو اور پھر اس میں اور زور پیدا کیا کہ عدل ہی تقویٰ کی ضمانت ہے یعنی تقویٰ جو تمام اسلامی زندگی کی روح اور اہل ایمان کے ہر قول و فعل کے لیے کسوٹی ہے اس سے قریب ترین عمل یہی ہے کہ بیگانوں کی ساری عداوت کے باوجود ان کے ساتھ کوئی معاملہ عدل و حق سے ہٹ کر نہ کیا جائے اس سے عدل کے ساتھ اسلام کی انفرادی اور اجتماعی زندگی میں تقویٰ کا مقام بھی معلوم ہوا کہ تمام نیکیاں فی الواقع اسی خیر سے وابستہ ہیں۔ اس کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ عدل و انصاف اہل ایمان میں خدا ترسی کی صفت اور تقویٰ کا جوہر پیدا کرتا ہے۔ یعنی اللہ کی ناراضگی سے بچنے کے اس گہرے احساس کو بیدار کرتا ہے جو آدمی کو ہر بھلے کام پر ابھارتا ہے اور ہر بُرے کام سے روکتا ہے یا یوں کہیے کہ وہ ایک خاص قلبی کیفیت ہے جس سے ایک خاص عملی رویہ وجود میں آتا ہے۔ یہ عملی رویہ اللہ کی طاعت اور رضا جوئی کا رویہ ہوتا ہے۔ اس خاص کیفیت سے جو دل بہرہ ور ہوتا ہے وہ ہر وقت یہ دیکھتا ہے کہ میرا خدا مجھ سے ناراض نہ ہونے پائے۔ میں کوئی ایسی حرکت نہ کر جاؤں جس کو وہ پسند نہیں کرتا اور کسی ایسے کام کے کرنے سے رک نہ جاؤں جسے وہ پسند کرتا ہے۔

اللہ کی ناراضگی سے بچنے کی اور اس کی خوشنودی حاصل کر لینے کی یہ خواہش اور کوشش سوچیے عملاً کب پوری ہوتی ہے؟ کوئی شک نہیں کہ یہ خواہش اور یہ کوشش اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب کہ انسان اپنے آپ کو قابو میں رکھے اور اپنے نفس کو من مانی کرنے سے روکے رہے گویا تقویٰ کا مقام پا لینے کا واحد راستہ یہ ہے کہ انسان ہر معاملے میں اپنے نفس کو لگام لگائے خواہ اس کی اپنی ذات ہو اس کے رشتہ دار ہوں، امیر ہوں، غریب ہوں، یگانے ہوں بیگانے ہوں، دوست ہوں یا دشمن ہوں کسی جگہ اپنی خواہشوں کو آزاد نہ چھوڑے، اسی کا نام عدالت یعنی افراط و تفریط سے ہٹ کر راہ اعتدال اختیار کر لینا ہے۔ اللہ اکبر دنیا کا کون سا قانون ہے جس نے اپنے باغیوں اور معاندوں کے حقوق کی اتنی رعایت رکھی ہے جتنی اسلام کے قانون نے۔ قرطبی نے کیا اچھی بات لکھی ہے کہ کافر کا کفر اسے اس سے محروم نہیں کرتا کہ اس کے حق میں عدل کیا جائے یا اس کے شہری و انسانی حقوق ادا کیے جائیں اور جب کافر کے بارے میں قرآن کا یہ مطالبہ ہے کہ شہری زندگی میں اس کے انسانی حقوق ادا کیے جائیں تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ فاسق اور بدعتی کے بارے میں قرآن کیا چاہتا ہے؟ یعنی جب منکروں باغیوں، سرکشوں کے ساتھ عدل واجب ہے تو مسلمان فاسقوں اور بدکاروں کے ساتھ یہ

وجوب کتنا مؤکد ہوگا۔ علامہ زمخشری اور امام رازی نے اس آیت سے یہی بات سمجھی ہے۔ حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے یہاں یہ لطیف نکتہ آفرینی فرمائی ہے[1] کہ معاملات میں طبیعیات پر عمل نہ کرنا ایک مجاہدہ ہے اور یہاں اسی کی تعلیم ہو رہی ہے۔

عدالت تقویٰ کا لازمی ذریعہ ہے

۴۳۔ اور اللہ کی نافرمانی سے بچ کر رہو جو کچھ تم کرتے ہو اللہ کو اس کی خبر ہے۔ یعنی ایسا عدل و انصاف جسے کوئی دوستی اور دشمنی نہ روک سکے اور جس کے اختیار کرنے سے آدمی کو متقی بنا سہل ہو جاتا ہے۔ اس کے حصول کا واحد ذریعہ خدا کا ڈر اور اس کی شان انتقام کا خوف ہے اور یہ خوف ان اللہ خبیر بما تعملون کے مضمون کا بار بار مراقبہ کرنے سے حاصل ہوتا ہے جب کسی مومن کے دل میں یہ یقین مستحضر ہوگا کہ ہماری کوئی چھپی یا کھلی حرکت حق تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں ہے تو اس کا قلب خشیت الٰہی سے لرزنے لگے گا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ تمام معاملات میں عدل و انصاف کا راستہ اختیار کرے گا۔ اور احکام الٰہیہ کے امتثال کے لیے غلامانہ تیار رہے گا۔ پھر اس نتیجہ پر ثمرہ وہ ملے گا جسے اگلے آیت میں بیان فرمایا ہے وعد اللہ الذین اٰمنوا الخ اللہ کی اس ہمہ بینی اور ہمہ دانی کا استحضار ہی تقویٰ کی ہر منزل اور ہر مرحلہ کو آسان بنا دیتا ہے اسی لیے قرآن عزیز میں جہاں تقویٰ کا ذکر آیا ہے اسی کے آس پاس اللہ تعالیٰ کی ہمہ دانی اور ہمہ بینی کے اوصاف بھی بیان کیے گئے ہیں۔

عدل و انصاف کی سب سے بڑی اہمیت یہ ہے کہ وہ انسان کے اندر تقویٰ کی صفت مطلوبہ پیدا کرنے کے لیے ناگزیر ہے یعنی بات صرف اتنی نہیں ہے کہ عدل و انصاف تقویٰ پیدا کرتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ اس کے بغیر صحیح تقویٰ پیدا ہو ہی نہیں سکتا، بلا شبہ ایسی بہت سی چیزیں ہیں جو تقویٰ کو نشو و نما دیتی ہیں مگر عدل و انصاف اس سلسلے میں جو کام کرتا ہے وہ اسی کا حصہ ہے دوسرا کوئی عمل اس کا نعم البدل نہیں ہو سکتا۔ یہ حقیقت ہمیں مذکورہ بالا آیت کے الفاظ ھو اقرب للتقوٰی کے بعد واتقوا اللہ کے اندر سے دکھائی دیتی ہے اس آیت کا منشا اگر صرف یہ بتانا ہوتا کہ عدل و انصاف کا اہل ایمان کو اس لیے حکم دیا گیا ہے کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہو سکے تو اس اضافہ کی کوئی ضرورت نہ تھی بلکہ اس لیے کیا گیا ہے کہ حصولِ تقویٰ کے بارے میں عدالت کی ناگزیر ضرورت کا اظہار ہو جائے۔ لوگوں کو عدل و انصاف کی فرضیت اور اس کی غرض و غایت کے ساتھ یہ بھی معلوم ہو جائے کہ تقویٰ کے مقامِ مطلوب تک پہنچنے کے لیے عدل و انصاف بہرحال ضروری ہے کوئی بھی دوسری چیز اس سلسلے میں وہ کام نہیں کر سکتی ہے جسے یہ عدل و انصاف انجام دے سکتا ہے۔

عدل و انصاف بعض اعتبارات سے اسلام کے اصل مزاج کا سب سے بڑا شارح ہے اور دین کا جو تصور قرآن حکیم نے پیش کیا ہے اس کے امتیازی خدوخال عدل و انصاف کے آئینے میں سب سے زیادہ واضح شکل میں دکھائی دیتے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ عدل و انصاف انسان کو صرف عمل کا متقی نہیں بناتا بلکہ گفتار اور فکر و نظر کا بھی متقی بناتا ہے وہ انسان کو صرف تقویٰ نہیں دیتا بلکہ تقویٰ کا جامع اور مانع مفہوم بھی دیتا ہے اور زبان سے دینداری کے ایک انقلابی تصور کا اعلان کرتا ہے۔ اسی معنے کے اعتبار سے عدل و انصاف اور روزے میں گہری مشابہت ہے قرآن روزے کے بارے میں بھی بتاتا ہے کہ لعلکم تتقون اس کے ذریعے تمہارے اندر تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی اور یہی بات بلند تر پیرائے میں زور دے کر عدل و انصاف کے متعلق فرمائی ہے ھو اقرب للتقویٰ۔ گویا عدل و انصاف صرف تقویٰ ہی پیدا نہیں کرتا بلکہ اس کو ایسی حقیقت بھی سمجھاتا ہے جو عام طور سے بہت کم سمجھی جاتی ہے کیونکہ تقویٰ کا لفظ سنتے ہی ذہن کے اندر عموماً کچھ اس طرح کا تصور ابھرنے لگتا ہے کہ انسان اپنے نفس کے مطالبات ٹھکرانے میں زیادہ سے زیادہ آگے بڑھتا جائے لیکن ھو اقرب للتقویٰ کی تعبیر کہہ رہی ہے کہ تقویٰ یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو سرکشی نہ ہونے اور اپنے گفتار، کردار اور فکر و نظر میں آوارگی سے روک کر حق کے علم و عمل کا تابع بنائے اور بس۔

تقویٰ کا منشا نفس کشی نہیں ہے

عدل و انصاف اور روزہ جو تقویٰ پیدا کرتے ہیں اس کا منشا نفس کشی نہیں بلکہ ضبطِ نفس ہے اور ضبطِ نفس میں ضبطِ رائے اور ضبطِ ذوق بھی داخل ہے یعنی جس طرح اپنے نفس کو احکامِ الٰہی کے تابع رکھا جائے اسی طرح احکامِ الٰہی کی پیروی کرنے میں اپنے ذوق و رجحان اور اپنی رائے کو بھی کسی طرح کی آزادی نہ دی جائے۔ حقیقی تقویٰ کا اصل مقام صرف اتنی بات سے حاصل

نہیں ہوتا ہے کہ نفس کو احکامِ خدا اور رسول کی مخالفت سے باز رکھا جاتے بلکہ اس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ان احکام کی بجا آوری اور رضائے الٰہی کی طلب میں اپنی رائے اپنے رجحان اور اپنے ذوق کو اس وقت بھی کچھ بولنے کا حق نہ دیا جائے جبکہ وہ بظاہر خدا پرستی کے حق میں جاتے نظر آتے ہوں۔ انسان کو خدا کی بندگی انقیاد و ایثار ہر حالت میں ٹھیک اس طرح کرنی چاہیے جس کی اوپر سے ہدایت ملی ہو وہ عدل و انصاف میں جس طرح اپنے نفس کی اپنے اقربا کی اپنی قوم کی اپنے ملک کی اپنے ماحول کی ان خواہشوں کو دیوار پرے مارتا ہے جو اسے نبوت کے علم و عمل کی بجا آوری سے روک رہی ہوں۔ اسی طرح ان احکام کی بجا آوری کی شکلیں اور حدیں مقرر کرنے میں بھی اپنے جی کی بات نہ سنے۔ بہرحال تقویٰ کا منشا نفس کشی نہیں بلکہ ضبطِ نفس ہے۔ اگر تقویٰ نفس کشی کا مطالبہ کرتا تو روزے کے بارے میں احادیث میں سحری کھانے اور اس میں تاخیر کرنے اور افطار میں جلدی کرنے کا ہرگز حکم نہ ہوتا۔ یہ احادیث زور سے کہہ رہی ہیں کہ جس تقویٰ کو روزے کا مقصد قرار دیا گیا ہے اس کا منشا نفس کشی نہیں بلکہ ضبطِ نفس ہے۔

اجتماعی ذمہ داری کو پورا کرنے کے نتائج

۴۴۔ جو لوگ ایمان لائے اور نیک کام کیے اللہ کا ان سے وعدہ ہے کہ ان کے لیے مغفرت ہوگی اور بہت بڑا اجر ہوگا لیکن جن لوگوں نے ہماری آیات کا انکار کیا اور ان کی تکذیب کی تو وہ دوزخی ہیں یعنی نہ صرف یہ کہ ان کوتاہیوں کو معاف کریں گے جو بمقتضائے بشریت رہ جاتی ہیں بلکہ عظیم الشان اجر و ثواب بھی عطا کریں گے اور جنہوں نے قرآن حکیم کے ان اوصاف اور صریح حقائق کو جھٹلایا یا ان نشانات کی تکذیب کی جو سچائی کی طرف رہنمائی کرنے والے ہیں ان کے لیے دوزخ ہے[1]

یہ گویا مذکورہ بالا میثاق پر عمل کرنے اور نہ کرنے کا نتیجہ بیان فرمایا ہے کہ جو لوگ اس میثاق پر قائم رہیں گے ان کے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے اور جو اس کو توڑیں گے ان کے لیے دوزخ ہے۔ اس سے صاف طور پر دو باتیں معلوم ہوتی ہیں۔

اوّل یہ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے ہم پر اس میثاق کی ذمہ داری ڈالی ہے اسی طرح اپنے اوپر اس کے جواب میں عہد کی ذمہ داری لی ہے اس کا اظہار وعداللہ کے الفاظ سے ہو رہا ہے۔ اللہ سبحانہٗ

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کی کتنی بندہ نوازی ہے کہ اپنی ہی پیدا کی ہوئی اور اپنی ہی پروردہ مخلوق کے ساتھ ایک معاہدے میں شریک ہوا اور جواب میں اپنی ذات پر بھی ایک عہد کی ذمہ داری اٹھائے انسان کو اللہ سبحانہٗ نے یہ وہ شرف بخشا ہے جس میں مخلوقات میں کوئی اس کا سہیم نہیں ہے۔

دوسری بات یہ معلوم ہوئی کہ قرآن نے اُمتِ مسلمہ سے بھی دنیوی اور اخروی فلاح کا وعدہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر میثاق پر قائم ہے تو تمہارے لیے مغفرت اور اجرِ عظیم ہے اور یہ وعدہ ہر مرحلے میں کیا گیا۔ مکہ کے تاریک ماحول میں بھی اور مدینے کے پُرآشوب دور میں بھی، انھیں بھی خطاب کر کے کہا گیا جو اسلام لا چکے تھے اور انہیں بھی جو اسلام نہیں لاتے تھے۔ ایمان و عملِ صالح کرنے کے نتیجے میں یہ وعدے کس طرح پورے ہوتے اس سے دُنیا ناواقف نہیں ہے وہ جانتی ہے کہ اسلام نے مسلمانوں کو وہ سب کچھ دیا جو دُنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہو سکتا ہے یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جس طرح سچا ایمان اور اچھا عمل آخرت کی فلاح کے لیے ضروری ہے اسی طرح دُنیا کی فلاح کے لیے بھی ضروری ہے۔ یعنی دنیوی برکتوں کے دروازے اس وقت کھولے جاتے ہیں جب وہ ایمان و عملِ صالح کی شرط پوری کر دیں۔ دُنیا میں جس نبی کی اُمت سے بھی فلاح دُنیا کا وعدہ کیا گیا تھا وہ ایمان و عملِ صالح کی شرط کے ساتھ ہی کیا گیا تھا۔ خود مسلمانوں کو جب کفار پر غلبہ کی بشارت دی گئی تو اٰمنوا وعملوا الصّٰلحٰت کی قید کے ساتھ دی گئی۔ غرض جہاں اللہ سبحانہٗ کا ایک عمومی وعدہ ہے کہ وہ اپنے دین کے ماننے والوں کو دنیوی فلاح سے نوازتا ہے وہیں اس کا یہ ایک عمومی ضابطہ بھی ہے کہ یہ ایمان و عملِ صالح کی لازمی شرط کے ساتھ مشروط ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان و عملِ صالح کے بغیر صرف آخرت ہی نہیں دُنیا کی فلاح بھی ہاتھ نہیں آتی۔ دین کے بغیر صحیح معنوں میں دُنیا بھی نہیں مل سکتی۔ یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ افراد کو بھی اپنی انفرادی زندگی کی دنیوی فلاح، مثلاً امن و سکون، عزت و محبوبیت اور ضروریاتِ زندگی وغیرہ، اسی وقت ملے گی جب وہ اپنی حد تک ایسے خداشناس اور آخرت پسند ہوں جیسا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے۔

اسی طرح اُمت کو بھی اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح، آزادی، دولت مندی، سربلندی، اقتدار اور بین الاقوامی احترام وغیرہ، اسی وقت میسر آ سکتا ہے جب وہ اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع اُمت ہو، یعنی ایک طرف تو اس کی ترکیب ایسے افراد سے ہوئی ہو جو ایمان کے سچے اور عملِ صالح کے پکے ہوں۔ دوسری اس میں وہ مضبوط اجتماعی تنظیم ہو جس کے بغیر

کوئی جماعت جماعت نہیں ہوتی اور جس کی اللہ و رسول کی جانب سے اسے انتہائی تاکید کی گئی ہے۔

مخالفوں کی سازشوں کی پروا نہ کرو

۴۵ — اے ایمان والو اپنے اوپر اللہ کا وہ انعام یاد کرو کہ جب ایک گروہ نے پورا پورا ارادہ کر لیا کہ تم پر ہاتھ بڑھاتے تو اللہ نے ان کے ہاتھوں کو روک دیا تھا، اللہ کی نافرمانی سے بچو اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے۔ عمومی احسان یاد دلانے کے بعد بعض خصوصی یاد دلاتے ہیں۔ یعنی قریش مکہ اور ان کے پٹھوؤں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو صدمہ پہنچانے اور اسلام کو مٹانے کے لیے کس قدر ہاتھ پاؤں مارے، مگر حق تعالیٰ کے فضل و کرم نے ان کا کوئی داؤ نہ چلنے دیا، اس احسان عظیم کا یہ اثر ہونا چاہیے کہ مسلمان غلبہ اور اقتدار حاصل کر لینے کے باوجود اپنے دشمنوں کو ہر قسم کے ظلم اور زیادتی سے محفوظ رکھیں اور جوش انتقام میں عدل و انصاف کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑیں جیسا کہ پچھلی آیات میں اس کی تاکید کی گئی ہے ممکن ہے کہ کسی کو یہ شبہ ہو کہ ایسے معاند دشمنوں کے حق میں اس قدر رواداری کی تعلیم کہیں اصول سیاست کے خلاف تو نہ ہوگی کیونکہ ایسا نرم برتاؤ دیکھ کر مسلمانوں کے خلاف شریروں اور بدباطنوں کی جرأت بڑھ جانے کا قوی اندیشہ ہے۔ اس کا ازالہ واتقوا اللہ وعلی اللہ فلیتوکل المؤمنون سے فرمادیا، یعنی مومن کی سب سے بڑی سیاست توکل علی اللہ اور تقویٰ ہے۔ خدا سے ڈرنے کا مطلب یہ ہے کہ ظاہر و باطن میں اس سے اپنا معاملہ صاف رکھو اور جو عہد و قرار کیے ہیں ان میں پوری وفاداری دکھلاتے رہو پھر بحمد اللہ کسی سے کوئی خطرہ نہیں ہے۔[1]

اوپر والی آیت میں اہل ایمان سے ہر حالت میں حق و عدل پر قائم رہنے اور اس کو نباہنے اور اس کی شہادت دینے کا جو عہد لیا ہے اس میں یہ اشارہ موجود ہے کہ اب تمہیں مخالفوں کی مخالفت کی پروا نہیں کرنی ہے۔ اگر تم میثاق پر جمے رہے اور تمہاری وفاداریاں میثاق کے مطابق نبوت کے علم و عمل سے قائم رہیں تو اللہ سبحانہ کی مدد و نصرت ہر قدم پر تمہارے ساتھ ہوگی، اور تمہارے دشمن تمہارا کچھ بھی نہ بگاڑ سکیں گے۔ یہاں اسی بات کی تائید میں واقعاتی شہادت پیش کی جارہی ہے کہ دیکھ لو ایک قوم نے اس راہ میں تمہاری مزاحمت کی کوشش کی۔ اصل ارشاد

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان یبسطوا الیکم ایدیھم سے بسط ید عربی محاورات میں پکڑنے مارنے اور حملہ کرنے کو کہتے ہیں اور وہی یہاں مراد ہیں۔ ایسا کرنے والوں یعنی حملہ آوروں کو قرآن نے قوم کہا ہے اذ ھم قوم پر کون لوگ ہیں۔ اشارہ اگر اسلام کی ابتدائی تاریخ کی طرف سمجھا جاتے تو سب سے بڑے دشمن قریش مکہ تھے، اور ارباب تفسیر کا ایک گروہ اسی کی طرف مائل ہے۔ شیخ الاسلام کا بھی رجحان اسی طرف ہے۔ اور اگر اشارہ مابعد کی طرف ہو تو اس وقت مدینے میں سب سے زیادہ قوت مخالفین میں یہود کی تھی۔ شارحین قرآن کی ایک جماعت کا میلان اسی طرف ہے۔ بہرحال کچھ ہو قریش ہوں یا یہودی، افراد ہوں یا فرد جتایا یہ ہے کہ فکف ایدیھم کہ اللہ نے ان کے ہاتھ باندھ دیئے۔ مطلب یہ ہے کہ دشمنوں نے حملہ کرکے تمہارا قلع قمع کرنا چاہا تھا لیکن اللہ نے ان کے حملوں کو ناکام رکھا اور ان کے منصوبے خاک میں ملا دیئے۔ اسی طرح اگر تم اپنے رب کے عہد و پیمان اور میثاق پر قائم رہے اور میثاق کے مطابق تمہاری وفاداریاں اسلام سے رہیں تو اللہ سبحانہ ہر اس قوم کے مقابلے میں تمہاری مدد فرمائے گا جو تمہارے مقابلہ میں سر اٹھائے گی۔ ضرورت صرف اس بات کی ہے کہ تم اپنے اندر تقویٰ کی روح پیدا کرو۔ غلبہ و کامیابی کی مسرت کو یاد دلا کر یہاں تقویٰ کی تلقین سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ غلبہ و کامیابی میں تقویٰ کو بڑا دخل ہے۔ قناعت۔ بے طمعی، بے نفسی، ہمدردی، صداقت شعری، ایثار، حفظ حدود غرض سیرت و کردار کی ساری انفرادی و اجتماعی خوبیاں اس ایک لفظ تقویٰ میں سمٹی ہوئی ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے وعلی اللہ فلیتوکل المومنون اہل ایمان کو صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرنا چاہیے اپنے دست و بازو اور اپنی ہمت و تدبیر پر اعتماد نہ ہو۔ اس موقعہ پر توکل کی تعلیم اس لیے دی گئی ہے کہ کامیابی و کامرانی کے بعد بڑا گھمنڈ اپنی قوت بازو اور اپنی عقل و فرزانگی پر ہو جاتا ہے قرآن حکیم انسان کو پست ہمتی اور تعطل کی تعلیم نہیں دیتا ہے برابر سرگرم عمل رکھنا چاہتا ہے لیکن ساتھ ہی اس کا بھی روادار نہیں ہے کہ انسان خود پسندی اور خود پرستی کی بیماری کا شکار ہو جائے اس لیے وہ بار بار اس کی تعلیم دیتا ہے کہ نظر اسباب سے ہٹا کر مسبب الاسباب پر رکھنی چاہیے۔ اسی نے پہلے بھی بگڑے ہوتے کام بناتے تھے اور اب بھی وہ ہی بناتے گا۔ توکل نام ہے کسی کام کو پورے ارادے، عزم اور تدبیر کے ساتھ انجام دینے اور اس کے نتائج کے لیے اپنی کوشش و ہمت پر نہیں بلکہ اللہ پر بھروسہ کرنے کا۔ اگر تدبیر اور کوشش نہ کرنے کا نام توکل ہوتا تو قرآن میں تلاش رزق کا حکم نہ ہوتا اور جنگ کی خاطر سامان جنگ فراہم کرنا اور استطاعت کے مطابق تیاری کرنے کی ہدایت نہ ہوتی۔ اس موضوع پر حافظ ابن تیمیہ نے عجیب و غریب بحث فرمائی ہے

دُعا و توکل میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ اپنے معاملات میں اگر اللہ پر توکل ہوگا تو اللہ سے مانگے گا۔ عالم شہادت میں اسباب کی پابجائی اور عالم غیب میں اللہ پر بھروسا اور اعتماد اور اس کے سامنے گریہ وزاری کرنا قرآن کی تعلیم ہے۔ ان دونوں میں یعنی عالم غیب میں دعا و توکل اور عالم شہادت میں اسباب کی پابجائی اور تدبیر وصورت نے ہم آہنگی پیدا فرمائی ہے نہ تو اسباب سے چمٹ کر مادی ہو کر رہنے کی اجازت کی ہے اور نہ اسباب سے بیگانہ رہ کر تارک دنیا بنایا ہے۔ اسلام کا راستہ دونوں میں مفاہمت کا ہے اور مفاہمت زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے۔ غزوہ بدر ان دونوں میں ہم آہنگی کی بہترین مثال ہے ایک طرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ کے ضوابط اختیار کرنے میں کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا عالم شہادت میں اسباب کی حد تک میدان جنگ میں بہترین جگہ کا انتخاب، فوج کی صف بندی، صفوں کی ترتیب، اسلحہ کے استعمال کی ترکیب، تیر کب چلائے جائیں، تلوار کب نکالی جائے پتھر اور ڈھیلوں سے غیر پر کس وقت حملہ کیا جائے۔ یہ عالم شہادت میں اسباب کی پابجائی ہے دوسری طرف عالم غیب میں اللہ پر توکل و اعتماد کا عالم یہ تھا کہ دعا میں اس قدر انہماک تھا کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

> میں بدر کے روز ایک لڑائی لڑا، پھر آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گرے ہوئے یا حی یا قیوم فرما رہے ہیں، میں واپس میدان جنگ میں اور لڑا، پھر گیا تو میں نے حضور کو سجدے ہی میں پایا۔ (فتح الباری)

بہرحال مادی زندگی میں کامیابی کے لیے دونوں تدبیریں ہیں ایک اسباب کے تحت عقلی تدبیر اور دوسرے اسباب پر قابو پاتے ہوئے روحانی تدبیر، روحانی تدبیر ہی کا نام توکل ہے یعنی پیدائش کی راہوں اور اپنی طاقتوں پر نہیں بلکہ خود پیدا کرنے والے اور اسباب کے خالق پر اعتماد کیا جائے اور اس سے مانگنا اس پر توکل کے منافی نہیں بلکہ اس کا تقاضا ہے۔ توکل بھی اسباب میں سے جلب منفعت اور دفع مضرت کا ایک سبب ہے۔ جمہور علماء کے خیال کے مطابق توکل سے وہ کچھ ملتا ہے جو دوسرے اسباب کی پابجائی سے نہیں ملتا۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ جو بھی اللہ پر توکل کرتا ہے اللہ اس کو کافی ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذَ اللّٰهُ مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۚ وَبَعَثْنَا مِنْهُمُ اثْنَيْ عَشَرَ
نَقِيْبًا ۭ وَقَالَ اللّٰهُ اِنِّىْ مَعَكُمْ ۭ لَىِٕنْ اَقَمْتُمُ الصَّلٰوةَ وَاٰتَيْتُمُ
الزَّكٰوةَ وَاٰمَنْتُمْ بِرُسُلِيْ وَعَزَّرْتُمُوْهُمْ وَاَقْرَضْتُمُ اللّٰهَ
قَرْضًا حَسَنًا لَّاُكَفِّرَنَّ عَنْكُمْ سَيِّاٰتِكُمْ وَلَاُدْخِلَنَّكُمْ جَنّٰتٍ
تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ۚ فَمَنْ كَفَرَ بَعْدَ ذٰلِكَ مِنْكُمْ فَقَدْ
ضَلَّ سَوَاۗءَ السَّبِيْلِ ۝١٢

اور بلاشبہ یقیناً[46] اللہ نے بنی اسرائیل سے بھی عہد اطاعت لیا تھا۔ اور ان میں بارہ سردار مقرر کیے تھے[47]۔ اللہ نے فرمایا تھا دیکھو میں تمہارے ساتھ ہوں[48]۔ بشرطیکہ تم نے نماز کو قائم رکھا اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے[49]، اور ان کی مدد کی[50]، اور اللہ کو قرض حسنہ دیتے رہے[51]، میں ضرور تم سے تمہاری برائیاں دُور کر دوں گا اور تمہیں ضرور باغات میں داخل کر دوں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی[52]

پھر اس کے بعد تم میں سے جو بھی راہِ کفر اپنائے گا وہ بلاشبہ شاہراہِ مستقیم سے ہٹ جائے گا۔۵۳

سعادت و شقاوت کا معیار

یہاں سے سلسلہ بیان بنی اسرائیل کے واقعات کی طرف متوجہ ہوگیا ہے تاکہ ان کے حالات سے اہلِ ایمان عبرت پکڑیں یعنی یہود و نصاریٰ سے جو عہد ایمان و طاعت لیا گیا تھا اس کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اور یہاں اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس روش پر چلنے سے روکا جائے جس پر ان کے پیش رو اہلِ کتاب چلتے رہے تھے چنانچہ انہیں بتایا جارہا ہے کہ جس طرح آج تم سے عہد لیا گیا ہے اسی طرح کل یہی عہد بنی اسرائیل اور حضرت عیسیٰ کی اُمت سے بھی لیا جا چکا ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس طرح وہ اپنے عہد کو توڑ کر گمراہیوں میں مبتلا ہوگئے تھے اسی طرح تم بھی مبتلا ہو جاؤ۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ان آیات کا اساسی اور بنیادی مقصد مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ اب تم سے جو عہد لیا جارہا ہے یہ بھی اسی نوعیت کا ہے۔ اگر تم نے بھی اس عہد کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو تمہارے سامنے بھی وہی نتیجہ آئے گا جو ان کے سامنے آیا، انہوں نے اطاعت کی جگہ شقاوت کی راہ اختیار کی ایسا نہ ہو کہ تم بھی ایمان و عمل کا عہد فراموش کر بیٹھو، پہلے یہود کا ذکر کیا ہے اس کے بعد نصاریٰ کا، اور اس داستان کو بیان کرکے اجمالاً یہ بتانا بھی پیشِ نظر ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان دونوں کی جانب سے اللہ کا رسول نہ ماننے کی یہ علت ہے اور یہ بھی مقصد ہے کہ یہود و نصاریٰ کو ان کی غلطیوں پر متنبہ کیا جاتے اور انہیں دینِ حق کی طرف دعوت دی جائے۔

۴۶ - اور اللہ نے بنی اسرائیل سے عہدِ طاعت لیا تھا۔ یعنی کچھ اُمتِ محمدیہ ہی کی خصوصیت نہیں ہے پہلی اُمتوں سے عہد لیے جا چکے ہیں[1] یہ بنی اسرائیل کی تاریخ سے شہادت پیش کی گئی ہے کہ دیکھو اس موحد قوم نے جب نافرمانی کی کیسے وبال میں مبتلا ہوئی۔ بتانا یہ ہے کہ جیسے کائنات کا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

عام قانون یہ ہے کہ ہر حالت کوئی نہ کوئی اثر رکھتی ہے اور ہر چیز کا کوئی نہ کوئی خاصہ ہے لیکن نہیں کہ یہاں کوئی چیز اپنا وجود رکھتی ہو اور آثار و نتائج کی گرفت سے بالا ہو جیسے اللہ سبحانہ نے اجسام میں خواص و نتائج رکھے ہوں، اسی طرح اعمال میں بھی خواص و نتائج ہیں اور جیسے جسم انسانی کے قدرتی انفعالات ہیں، اسی طرح روح انسانی کے لیے بھی انفعالات ہیں۔ جسمانی مؤثرات جسم پر مرتب ہوتے ہیں اور معنوی مؤثرات سے روح انسانی متاثر ہوتی ہے۔ اعمال کے یہی قدرتی خواص و نتائج ہیں جنہیں سعادت و شقاوت سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اچھے اعمال کا نتیجہ سعادت ہے اور بُرے اعمال کا نتیجہ شقاوت ہے۔ سعادت و شقاوت کے اس نقشہ میں نسب اور نسبتیں بے کار ہیں پچھلی آیت میں صحابہ کرام کو مخاطب کر کے کہا کہ اللہ نے تم سے ایمان و طاعت کا جو عہد لیا ہے اسے یاد کرو۔ دین کامل ظہور میں آچکا ہے اب تمہارا فرض ہے کہ ذکر نعمت سے غافل نہ ہو اور طاعت حق میں اخلاص و استقامت کا مظاہرہ کرو۔ اس سلسلے میں بنی اسرائیل سے عبرت پکڑو اللہ نے ان سے ایمان و طاعت کا عہد لیا تھا لیکن انہوں نے محرومی و شقاوت کی راہ اختیار کی۔ سعادت و شقاوت کا پیمانہ سب کے لیے ایک ہے۔

بنی اسرائیل کا سیاسی نظام

۴۷ - اور ہم نے ان میں بارہ سردار مقرر کیے۔ بنی اسرائیل کے بارہ قبائل میں سے بارہ سردار حضرت موسیٰ علیہ السلام نے چن لیے تھے جن کے نام مفسرین نے تورات سے نقل کیے ہیں۔ ان کا فرض یہ تھا کہ وہ اپنی قوم پر عہد پورا کرنے کی تاکید اور ان کے احوال کی نگرانی رکھیں۔ عجب اتفاق یہ ہے کہ ہجرت سے قبل جب انصار نے لیلۃ العقبہ میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی تو ان میں سے بھی بارہ ہی نقیب نامزد ہوئے۔ ان ہی بارہ آدمیوں نے اپنی قوم کی طرف سے حضور کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ جابر بن سمرہ کی حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اُمت کے متعلق جو بارہ خلفاء کی پیشین گوئی فرمائی تھی ان کا عدد بھی ٹھیک بنی اسرائیل کے مطابق ہے اور مفسرین نے تورات سے نقل کیا ہے کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام سے حق تعالیٰ نے فرمایا کہ میں تیری ذریت سے بارہ سردار پیدا کروں گا، غالباً یہ وہی بارہ ہیں جن کا ذکر حضرت جابر بن سمرہ کی حدیث میں ہے[1]
نقیب کے معنے کھوج لگانے والا، معاملات کی تہ میں پہنچنے والا کے ہیں۔ نقیب عن الشی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سے بنا ہے اس کے معنے کھوج لگانے کے ہیں۔ اصل میں دیوار کی پھٹن کو کہتے ہیں۔ لکڑی میں سوراخ کو بھی نقب کہتے ہیں۔ یہیں سے یہ قوم اور قبیلہ کے سردار، زعیم، نگران، ذمہ دار کے معنے میں بولا جانے لگا ہے۔ کیونکہ سردار و زعیم کا اصل کام لوگوں کے حالات کی نگرانی اور ان کی محافظت ہی ہوتا ہے۔
بنی اسرائیل کی تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے شریعت کی پابندی اور اس کی حفاظت لینے کے بعد بنی اسرائیل کے ہر قبیلہ پر ایک ایک نقیب اس مقصد کی خاطر مقرر کیا کہ وہ لوگوں کی نگرانی کریں کہ قانون الٰہی کی حدود و قیود کی پابندی کرتے ہیں یا نہیں اور ان میں کوئی چیز ایسی داخل ہونے پاتے جو ان کو اللہ کے عہد سے روگرداں کرے۔ بنی اسرائیل چونکہ بارہ قبیلے تھے اس لیے نقیب بھی بارہ مقرر ہوئے۔ ان کا تقرر حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے مطابق کیا تھا۔ ۱۲ سرداروں کا یہ قرآنی عدد تورات کے بیان کے بالکل مطابق ہے۔ تورات میں ہے کہ مصر سے نکلنے کے دوسرے برس خدا نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا:

"تو بنی اسرائیل کی ساری جماعت کا ان کے فرقوں کے مطابق اور ان کے آبائی خاندانوں کے اسم شماری کے ساتھ ہر ایک مرد سر بسر گن کر حساب کر ... اور ہر فرقہ سے ایک ایک آدمی ہر ایک جو اپنے آبائی خاندان کا سردار ہے تمہارے ساتھ ہو۔ (گنتی)

اس کے بعد ان سرداروں کے نام درج ہیں اور تعداد میں بارہ ہیں، اسی طرح تورات میں دوسری جگہ کنعان پر فوج کشی سے ذرا پہلے کے موقع پر ہے۔

خداوند نے موسیٰ کو خطاب کر کے فرمایا کہ تو لوگوں کو بھیج تاکہ کنعان کی زمین جو میں بنی اسرائیل کو دیتا ہوں جاسوسی کریں، ایک ایک مرد ان کے آبائی فرقہ میں سے جو اس میں سردار ہے بھیج دیے۔ چنانچہ موسیٰ نے خداوند کے ارشاد کے مطابق دشت فاران میں ان کو بھیج دیا وہ سب لوگ سردار تھے۔

یہاں بھی سرداروں کی تعداد ۱۲ درج ہے۔
اگرچہ تورات میں بارہ سرداروں کا ذکر موجود ہے مگر ان کی حیثیت جو یہاں قرآن نے لفظ نقیب استعمال کر کے بتائی ہے تورات کے بیان سے ظاہر نہیں ہوتی، تورات ان کو صرف رئیسوں اور سرداروں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور قرآن ان کی حیثیت سیاسی و اخلاقی نگران کار کی مقرر کرتا ہے۔
یہاں علامہ بقاعی نے تفسیر میں بنی اسرائیل کے نقباء کے نام بتا کر لکھا ہے کہ حضرت مسیح کے نقباء کی

تعداد بھی بارہ ہے جن کو حواریین کہتے ہیں اور انصار میں سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نقباء کی تعداد بھی بارہ ہے جنہوں نے لیلۃ العقبہ میں حضور کے ہاتھ پر بیعت کی تھی۔ یہ بارہ نقیب ۹ قبیلہ خزرج اور ۳ اوس میں سے تھے۔ تورات میں بنی اسرائیل کے نقباء کی روانگی دو مرتبہ بتائی گئی ہے۔ پہلی بار جب حضرت موسیٰ سرزمین سینا میں تھے اس کی تفصیل تورات میں فصل اوّل میں ہے اور دوسری روانگی ان بارہ نقیبوں کی کنعان میں جاسوسی کے لیے ہے اس کی تفصیل تورات میں ۱۳ فصل میں ہے۔ اسرائیلی نقباء میں سے یوشع بن نون اور کالب بن تفنا کے علاوہ کسی نے حضرت موسیٰ سے وفاداری نہیں کی، جب کہ عیسائی نقباء میں سے صرف یہودا نامی نے حضرت عیسیٰ سے بے وفائی کی۔ لیکن حضور انور نے جن بارہ انصار کو یہ کہہ کر نقیب بنایا تھا اخرجوا الی منکم اثنی عشر نقیبا ان میں سے ہر ایک نے بفضلہٖ خدا کی توفیق سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے وفاداری کی اور آج تک تاریخ ان کے کارناموں کے گیت گا رہی ہے۔

اللہ کی معیت اور اس کا مقام

۴۸۔ اور اللہ نے فرمایا کہ میں تمہارے ساتھ ہوں۔ یا تو یہ خطاب بارہ سرداروں کو ہے یعنی تم اپنا فرض ادا کرو، میری حمایت اور امداد تمہارے ساتھ ہے یا سب بنی اسرائیل کو کہ میں تمہارے ساتھ ہوں یعنی کسی وقت تم مجھے اپنے سے دُور نہ سمجھو جو کچھ بھی معاملہ تم سراً یا علانیۃً کرو گے وہ ہر جگہ اور ہر وقت میں دیکھ رہا اور سن رہا ہوں۔ اس لیے جو کچھ کرو خبردار ہو کر کرو[1] یہ ایک جامع تعبیر ہے اللہ کی تائید و نصرت کے وعدے کی۔ اس میں دو باتوں کی طرف اشارہ ہے ایک یہ کہ اگر تم میثاق پہ قائم رہے تو میری امداد تمہارے ساتھ رہے گی اور تم ہر قدم پر اس کا مشاہدہ کرو گے۔ دوسرے یہ کہ اللہ تعالیٰ ہر وقت اور ہر جگہ تمہارے ساتھ ہے اور اس میثاق کی نگرانی فرما رہا ہے۔ تمہارا کوئی عزم و ارادہ اور فکر و خیال یا حرکت و عمل اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔ وہ تمہاری خلوتوں کے رازوں کو بھی دیکھتا اور سنتا ہے وہ تمہارے دلوں کے ارادوں اور نیتوں سے بھی واقف ہے[2]

معیت الٰہی کا تصور ایک مومن کے لیے کس قدر ہمت آفریں و شوق افزا ہے۔ اس تصور کے بعد دل میں کس قدر قوت آتی ہے اور اطمینان کی کیسی نعمت ملتی ہے۔ اس کے بعد شکست کا کوئی

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] معارف م ش

امکان بھی اس کے بعد ذہن کے سامنے نہیں آسکتا۔ آج محض وزیر اعظم اگر شہریوں کے ایک معمولی فرد سے کہہ دے کہ گھبراؤ مت ہم تمہارے ساتھ رہیں گے تو اسے کس قدر قوت و استقامت حاصل ہو جائے، چہ جائے کہ یہاں خالق کائنات مالک الملک، حاکم علی الاطلاق اپنی معیت کا یقین دلا رہا ہے تسکین و اطمینان کا درجہ اس کے بعد کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ایک پہلو ہے، اب دوسرے پہلو سے دیکھئے کوئی گناہ اس استحضار معیت الٰہی کے بعد بندہ سے ممکن ہے! جہاں کوئی اپنے سے ذرا بڑا اگر نگرانی کے لیے پاس موجود رہتا ہے جب تو اس کی مروت، لحاظ یا دباؤ سے ہم اپنے اوپر قابو رکھتے ہیں اور کوئی لغزش یا معصیت سرزد نہیں ہونے دیتے چہ جائے کہ ہر بین، ہمہ دان، ہمہ توان مالک و مولیٰ کی معیت کا استحضار ہو پھر کیا کوئی معصیت اس کے بعد ہو سکتی ہے۔ غرض ترغیب و ترہیب کے جس گوشہ سے بھی غور کیا جائے معیتِ الٰہی کا مراقبہ بہترین اور موثر ترین ہے۔ محققین نے یہاں یہ بات کھول کر سمجھا دی ہے کہ خدا کی معیت سے یہاں معاذ اللہ معیت جسمانی نہیں جیسی مخلوق و مخلوق کے درمیان ہوتی ہے بلکہ احاطہ، علم، قدرت، معونت و نصرت کے لحاظ سے ہے رازی نے لکھا ہے۔

میں علم قدرت کے لحاظ سے تمہارے ساتھ ہوں تمہاری باتوں کو اور تمہارے کردار کو دیکھ رہا ہوں، تمہارے دلوں کی گہرائیوں کو جانتا ہوں اور تمہارے اعمال پر بدلہ دینے پر پوری پوری قدرت رکھتا ہوں۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

میری معیت میری حفاظت میری نگرانی اور میری نصرت کے ذریعے ہے۔

علامہ جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں کہ اللہ کی معیت علم قدرت اور نصرت کے ذریعے ہوتی ہے اور سید رشید رضا فرماتے ہیں:

میں معونت و نصرت کے ذریعے تمہارے ساتھ ہوں گا جب تک تم میثاق کے نگران بن کر رہو گے۔

بہر حال خدا کی معیت اور اس کے ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اپنے علم و قدرت، اپنی نصرت اور مدد کے ذریعے بندوں کے ساتھ ہوتا ہے۔

میثاق کی دفعات میں اولین نماز

۴۹۔ بشرطیکہ تم نے نماز کو قائم رکھا اور زکوٰۃ کی ادائیگی کی اور میرے رسولوں پر ایمان لائے۔

یہ میثاق کی دفعات کی تفصیل ہے۔ ان دفعات میں سب سے پہلی دفعہ اقامت صلوٰۃ ہے۔ جس طرح اُمت مسلمہ کے میثاق میں بنیادی دفعہ اقامت صلوٰۃ ہے اسی طرح بنی اسرائیل کے میثاق میں بھی اس کو بنیادی حیثیت حاصل تھی حکمت دین کے پہلو سے دین میں اس کا جو مقام ہے وہ کسی بھی دوسرے عمل کا نہیں ہے مومن کا ہر کام اللہ کی بندگی کا کام ہوتا ہے مگر نماز جیسی بندگی کی شان کسی کام میں نہیں ہوتی۔ اس کا باطن ہی نہیں ظاہر بھی سراپا بندگی ہوتا ہے۔ نماز کی ہیئتوں کو دیکھئے اور اس کی دعاؤں، تسبیحوں اور قرأتوں پر غور کیجئے۔ عاجزی اور سرافگندگی کے اظہار کی کوئی ممکن صورت نہیں جو نماز کے ظاہر اور اس کے باطن میں موجود نہ ہو۔ یہ سینے پر ہاتھ باندھے اور آنکھیں جھکائے ادب سے کھڑا ہونا، یہ کمر کا خم کرنا، یہ زمین پر پیشانی کا ڈال دینا، یہ زبان پر اللہ کی حمد کے، تسبیح کے، تکبیر کے توحید کے کلمات کا مسلسل جاری رہنا اور یہ دل کا اللہ کی خشیت اور عظمت اور محبت سے معمور رہنا۔ آخر بندگی کی کون سی ادا ہے جس سے یہ نماز خالی ہے۔ قرآن و سنت کا مطالعہ فرمائیے تو نماز کی اہمیتوں اور فضیلتوں سے ان کے صفحات بھرے نظر آئیں گے۔ نماز ہی ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہے۔ اگر انسان میں ایمان موجود ہو اور اللہ کی معبودیت اور اپنی عبدیت پر اسے یقین ہو تو یہ یقین سب سے پہلے نماز کی شکل اختیار کرتا ہے۔ نہ صرف یہ کہ نماز ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہے بلکہ وہ ایمان کا لازمی مظہر ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ دل میں ایمان تو ہو مگر سر میں رکوع اور سجدے کی تڑپ نہ ہو ایمان دل کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہی کیفیت ہے جو خارج میں نماز کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے جہاں ایمان ہو وہاں نماز ضرور ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح کہ جہاں سورج نکلا ہوا ہو وہاں روشنی اور گرمی ضرور ہوتی ہے۔ میثاق میں اسے دفعہ اول لا کر پیش کرنا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ نماز پوری شریعت اور پورے قانون کے جذبۂ اتباع کا سرچشمہ بھی ہے اور اس کی محافظ بھی۔ وہ اگر ادا ہوگی تو شریعت کے باقی احکام بھی ادا ہو سکیں گے اور اگر اس کا حق ادا نہ ہو تو باقی شریعت بھی غفلت کی نذر ہو جانے سے نہ بچ سکے گی۔ یوں سمجھئے کہ شریعت کے سارے احکام کے اندر نماز کی حیثیت وہی ہے جو انسانی جسم میں دل کی ہوتی ہے۔ دل میں اگر حرکت اور گرمی اور زندگی موجود ہو تو جسم کے دوسرے تمام حصوں تک بھی خون کی روانی قائم رہتی ہے اور وہ زندہ رہتے ہیں لیکن جس وقت یہ دل اپنی حرکت اور زندگی کھو دیتا ہے اس وقت دوسرے اعضا بھی سرد اور بے جان ہو کر رہ جاتے ہیں۔ نماز کی اس حیثیت کے بارے میں قرآن نے کئی جگہ اشارے کیے ہیں۔

میثاق کی دوسری دفعہ زکوٰۃ

میثاق کی دوسری دفعہ یہ ہے کہ اگر تم نے زکوٰۃ کی ادائیگی کی۔ قرآن میں دوسرے مقامات پر بھی

اور اس آیت میں بھی زکوٰۃ کا مقام نماز کے مقام سے ایک ہی درجہ نیچے دکھایا گیا ہے۔ قرآن کا مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن میں بکثرت مقامات پر ایمان کے بعد صرف دو اعمال صالحہ کا ذکر آتا ہے ایک نماز کا دوسرے زکوٰۃ کا۔ جب ایک معیاری مومن کا تصور سامنے لانا ہوتا ہے تو وہ عموماً اس طرح کے الفاظ فرماتا ہے۔

ان الذین آمنوا وعملوا الصالحات واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ

حالانکہ نماز اور زکوٰۃ کے ساتھ ساتھ ایسے بہت سے اچھے اعمال اور اخلاق اور بھی ہیں جن کا وجود معیاری مومن بننے کے لیے ضروری ہے۔ پھر قرآن حکیم نے ایسا انداز بیان کیوں اختیار فرمایا ہے اور معیاری مومن ومسلم کا تصور دینے کے لیے اکثر ایمان کے بعد صرف نماز اور زکوٰۃ ہی کے نام لے کر خاموش کیوں ہو جاتا ہے، دوسری نیکیوں کا بھی کیوں ذکر نہیں کرتا۔ ظاہر ہے کہ گفتگو کا یہ انداز اس نے بلاوجہ اختیار نہیں کیا ہے۔ غور کیجئے تو اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں نماز اور زکوٰۃ ہی دو عمل دین کی اصلی بنیادیں ہیں جس نے دونوں فرائض کو اچھی طرح ادا کر لیا اس نے گویا پورے دین پر عمل کرنے کی پکی ضمانت اور عملی شہادت فراہم کر دی اور اب اس سے اس بات کا واقعی کوئی اندیشہ باقی نہیں رہا کہ دوسرے احکام شریعت سے بے نیازی کا برتاؤ کر جائے گا۔ ایسا کیوں ہے؟ اس بات کا جواب آپ کو ایک طرف دین کی اور دوسری طرف نماز اور زکوٰۃ کی حقیقتوں پر غور سے نظر ڈالتے ہی مل جائے گا۔ احکام دین کی اصولی تقسیم کیجئے تو ان کی دو ہی قسمیں ہو سکیں گی۔ ایک قسم ان احکام کی ہوگی جن کا تعلق اللہ کے حقوق سے ہے۔ دوسری قسم ان احکام کی ہوگی جن کا تعلق بندوں کے حقوق سے ہے۔ اس طرح دین کی پیروی دراصل اس بات کا نام ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے حقوق اور اس کے بندوں کے حقوق دونوں سے عہدہ برآ ہو جائے۔ نماز کی اور زکوٰۃ کی جو حقیقت قرآن وسنت میں بیان ہوئی ہے ان دونوں سے صاف عیاں ہے کہ نماز حقوق اللہ اور زکوٰۃ حقوق العباد کا مغز اور جوہر ہے۔ اگر ایک شخص نے مسجد میں نماز کا حق ادا کر دیا تو ممکن نہیں وہی مسجد سے باہر اللہ کے حقوق بھول جائے گا۔ اس سے تو یہ حقوق اسی طرح ادا ہوتے رہیں گے جس طرح چشمے سے پانی ابلتا رہتا ہے، اسی طرح جس نے زکوٰۃ کا حق ادا کر دیا اس سے یہ ممکن نہیں کہ وہ بندگان خدا کے حقوق پامال کرتا رہے گا۔ جو شخص اپنے بھائیوں اور پڑوسیوں پر اپنی گاڑھے پسینے کی کمائی خود اپنی خوشی سے صرف کرے گا اور صرف ان کو اپنا احسان مند بنانے کے بجائے الٹا پھر انہی کا شکرگزار ہوگا وہ تو ان کا ایک ایک حق ادا کر کے چین پا سکے گا۔

میثاق کی تیسری دفعہ ایمان بالرسل

یہ میثاق کی تیسری دفعہ ہے کہ اللہ کے رسولوں پر ایمان لانا ہے۔ یعنی ان رسولوں پر ایمان لانا ہے جن کو میں موسیٰ علیہ السلام کے بعد روانہ کروں گا جیسے داؤد، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم۔ ایمان والی دفعہ کو نماز اور زکوٰۃ کے بعد ذکر کرنے کی وجہ یہی ہے کہ ان سے آنے والے پیغمبروں کے بارے میں ایمان لانے کا عہد لیا گیا تھا اور اس وقت لیا گیا تھا جبکہ وہ حضرت موسیٰ پر ایمان لا چکے تھے یوں تو حضرت موسیٰ کے بعد آنے والے تمام انبیاء کی طرف اشارہ ہے لیکن اس میں اشارہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہے جن کا ذکر تورات میں نمایاں علامات کے ساتھ ہوا ہے۔ بالخصوص اس میثاق میں یہ بات تورات میں واضح اور صاف الفاظ میں بتاتی ہے اور یہ حضرت موسیٰ پر آنے والی آخری وحی ہے۔

> یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خدا وند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ہوگی۔ (استثناء ۳۳-۲)
> اس کی مزید تفصیل انشاء اللہ سورہ اعراف جلد نہم میں آئے گی۔

اللہ کے رسولوں کی مدد

۵۔ میثاق کی چوتھی دفعہ یہ ہے کہ تم اللہ کے رسولوں کی مدد کرنا۔ اصل ارشاد میں عزرتموھم کے الفاظ آئے ہیں۔ تعزیر اس مدد کو کہتے ہیں جس میں تعظیم کی آمیزش ہو۔ خدا کے سوا قانون میں دوسری سزاؤں کو بھی تعزیر کہتے ہیں کیونکہ یہ تادیب ہے اور تادیب بھی ایک قسم کی مدد ہے کیونکہ اس کے ذریعے انسان کو نقصان رسانی سے بچایا جاتا ہے۔ اسی لیے ایک ارشاد میں ظالم کو ظلم سے روک دینے کے لیے نصرت کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔ ارشاد ہے انصر اخاک ظالما او مظلوما اپنے بھائی کی مدد کرو ظالم ہو یا مظلوم۔ دریافت کیا گیا کہ مظلوم کی مدد کریں مگر ظالم کی مدد کیا ہے؟ فرمایا کہ اس کے ظلم سے اس کو باز رکھو۔ یہاں رسولوں کی تعزیر کا شارحین قرآن نے مطلب یہ بتایا ہے کہ دشمنوں کے مقابلہ میں ان کی مدد کرو (قرطبی) ان سے ان کے دشمنوں کو ہٹا دو۔ (مدارک) مطلب یہ ہے کہ نبوت جو دعوت لے کر آئے اور جو مشن پیش کرے اس کام میں اس کا ہاتھ بٹاؤ۔

اس سے تعاون کرو، اس کی راہ سے رکاوٹوں کو دور کرو۔ اگر اس کا دشمنوں سے مقابلہ ہو تو اس کی مدد کرو۔ رسولوں پر ایمان کی دفعہ سے اس تعزیر یعنی رسولوں کی مدد کرنے کا اتنا گہرا تعلق ہے کہ اسے ایمان کی موت و حیات کا پیمانہ بنا دیا گیا ہے۔ ایسے ایمان کی کوئی قیمت نہیں ہے جس میں رسولوں کی مدد کرنے کا کوئی جذبہ اور کوئی تقاضا نہ ہو۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں کہ جو رسول حضرت موسیٰ کے بعد آئیں گے ان سب کی تصدیق کروگے اور دلی تعظیم سے پیش آؤگے اور دشمنانِ حق کے مقابلہ پر ان کا ساتھ دوگے۔

اللہ کو قرضِ حسن

۱۵۔ میثاق کی پانچویں دفعہ یہ ہے کہ اللہ کو قرضِ حسنہ دینا۔ پہلے زکوٰۃ کا ذکر کیا، اب یہاں قرضِ حسنہ کا تذکرہ کیا ہے۔ یہ خالص قرآن کی اصطلاح ہے۔ اس سے مراد وہ رقم ہے جو دین کی برتری کے لیے خرچ کی جائے۔ زکوٰۃ کا ادا کرنا ہر ایک کے لیے اخلاقی نہیں بلکہ قانونی طور پر ضروری ہے۔ اس دفعہ کا مقصود ہے کہ دین کی برتری اور رفاہِ عام کے سارے اجتماعی کاموں کے لیے انفرادی ذمہ داری کے ساتھ اجتماعی ذمہ داری یہ ہے کہ زکوٰۃ کے علاوہ بھی مالی ذمہ داریاں ہیں جن سے وقت کے ملی تقاضوں اور مطالبات کو پورا کیا جاتا ہے، فرق اتنا ہے کہ زکوٰۃ ایک قانونی ذمہ داری ہے اور قرضِ حسنہ اسی مالی ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے اور آگے بڑھنے کی رضاکارانہ کوشش ہے تاکہ جماعتی مقاصد کے پورا ہونے کی زیادہ سے زیادہ توقع ہو سکے۔ آگے بڑھنے کی اس کوشش کو اگرچہ لوگوں کی اپنی مرضی پر رکھا گیا ہے لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ یہاں ان کی مرضی ہی سب کچھ ہے اور اب اسے قانون کسی حال میں بھی اپنا پابند نہیں بنا سکتا۔ قانون اب بھی مطالبہ کر سکتا ہے۔ آیت ہیں اسی طرف رہنمائی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مال کی متعینہ زکوٰۃ ادا کر دینے کے بعد بھی ایک مسلمان دین کے مالی مطالبات سے سبکدوش نہیں ہو جاتا اور اب بھی اس کی دولت میں حق باقی رہتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لوگوں کے اخلاقی احساسات معاشرے کی بھوک اور ناداری پر قابو نہ پاسکے ہوں یا دین کی حفاظت اور نصرت کا فرض ادا کرنے سے قاصر ہوں تو ایسی حالت میں قرضِ حسن یقیناً اخلاقی سے قانونی بن جائے گا اور اس دفعہ کی رُو سے اسلامی حکومت اس بات کی مجاز ہوگی بلکہ شاید یہ ذمہ داری ہی اس کی ہوگی کہ وہ غریب و نادار شہریوں کی ضرورتوں اور دین کے مفاد کی خاطر مال داروں پر مزید بار ڈالے۔

فقہاء کی اصطلاحی زبان میں جس چیز کو فرض عین اور فرض کفایہ کہا جاتا ہے اسی کو ہم نے قانونی اور اخلاقی ذمہ داری سے تعبیر کیا ہے۔ زکوٰۃ ان کے یہاں فرض عین ہے تو قرض حسن فرض کفایہ۔ فرض کفایہ کے معنے یہ ہیں کہ امت کے چند افراد یا جماعت نے ان مطالبات کو پورا کر دیا تو سب مسلمان فرض سے سبکدوش ہو گئے اور اگر کسی نے بھی نہ کیا تو سب گنہگار ہوں گے۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

خدا کو قرض دینے سے مراد اس کے دین اور اس کے پیغمبروں کی حمایت میں مال خرچ کرنا ہے جس طرح روپیہ قرض دینے والا اس امید پر دیتا ہے کہ اس کا روپیہ واپس مل جائے گا اور قرض لینے والا اس کے ادا کرنے کو اپنے ذمہ لازم کر لیتا ہے۔ اسی طرح خدا ہی کی دی ہوئی جو چیز یہاں اس کے راستہ میں خرچ کی جائے گی، وہ ہرگز گم یا کم نہیں ہو گی۔ حق تعالیٰ نے کسی مجبوری سے نہیں محض اپنے فضل و رحمت سے اپنے ذمہ لازم کر لیا ہے کہ وہ چیز تم کو عظیم الشان نفع کی صورت میں واپس کر دے۔ اور قرض حسن سے مراد یہ ہے کہ اخلاص سے دو اور اپنے محبوب و مرغوب اور پاک و صاف مال میں سے دو۔

نیکیاں بُرائیوں کو ملیامیٹ کر دیتی ہیں

۵۲۔ میں ضرور تم سے تمہاری برائیاں دُور کر دوں گا اور تمہیں ضرور باغات میں داخل کروں گا جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہوں گی۔ یعنی نیکیاں جب زیادہ ہوں تو وہ برائیوں کو دبا لیتی ہیں جب آدمی خدا کے عہد کو پورا کرنے کی کوشش میں لگا ہے تو حق تعالیٰ اس کی کمزوریوں کو دُور کر کے اپنی خوشنودی اور قرب کے مکان میں جگہ دیتا ہے۔[1]

یہ نتیجہ ہے میثاق پر پابجائی اور وفاداری کا۔ مطلب یہ ہے کہ میثاق کی ان پانچ دفعات پر اگر تم نے عمل کیا اور اس طرح تم ہمارے وفادار بن کر رہے تو میں ان حسنات کے ذریعے تمہاری برائیاں ملیامیٹ کر دوں گا جن کے دھبے تمہارے دامنوں پر ماضی میں پڑ چکے ہیں۔ برائیاں ملیامیٹ کرنے کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ راہ راست کو اختیار کرنے اور اللہ کی ہدایت کے مطابق فکر و عمل

[1] افادات شیخ الاسلام

کے صحیح طریقے پر چلنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ انسان کا نفس بہت سی برائیوں سے اور اس کا طرزِ زندگی بہت سی خرابیوں سے پاک ہو جائے گا۔ دوسرے یہ کہ اس اصلاح کے باوجود اگر کوئی شخص بحیثیت مجموعی کمال کے مرتبہ کو نہ پہنچ سکے اور کچھ نہ کچھ برائیاں اس کے اندر باقی رہ جائیں تو اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے ان پر مواخذہ نہ فرمائے گا اور ان کو اس کے حساب سے ساقط کر دے گا کیونکہ جس نے اساسی ہدایت اور بنیادی اصلاح قبول کر لی ہو۔ اس کی جزئی اور ضمنی برائیوں کا حساب لینے میں اللہ تعالیٰ سخت گیر نہیں ہے۔[1]

آخر میں فرمایا ہے کہ میں تمہیں ضرور باغات میں داخل کروں گا۔ جنات کا بول قرآن میں آخرت کی پُر بہار زندگی کے لیے کنایہ ہے۔ یہودیوں کے یہاں بھی جنت اور آخرت کی پر بہار زندگی کا تصور تھا۔ یہاں تاکید لاکر فرمایا ہے کہ اس میثاق سے وفاداری کا لازمی اور ناگزیر نتیجہ عالمِ آخرت میں پُر بہار زندگی ہے۔

کفر شاہراہِ مستقیم سے بھٹک جانا ہے

۵۳ ۔ پھر اس کے بعد تم میں سے جو بھی راہِ کفر اپنائے گا وہ بلاشبہ سیدھی راہ سے ہٹ جائے گا یعنی ایسے صاف اور پختہ عہد و پیمان کے بعد بھی جو شخص خدا کا وفادار ثابت نہ ہوا اور غدر و خیانت پر کمر بستہ ہو گیا تو سمجھ لو کہ اس نے کامیابی اور نجات کا سیدھا راستہ گم کر دیا۔ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ ہلاکت کے کس گڑھے میں جا گرے گا۔ بنی اسرائیل سے جن باتوں کے عہد لینے کا یہاں ذکر ہے وہ یہ ہیں، نماز، زکوٰۃ، پیغمبروں پر ایمان لانا، ان کی جان و مال سے مدد کرنا۔ ان میں سے پہلی جانی عبادت ہے، دوسری مالی، تیسری قلبی و زبانی، چوتھی فی الحقیقت تیسری ان کی اخلاقی تکمیل ہے۔ گویا ان چیزوں کو ذکر کر کے اشارہ کر دیا کہ جان و مال اور قلب و قالب ہر چیز سے خدا کی طاعت اور وفاشعاری کا اظہار کرو۔ لیکن بنی اسرائیل نے چن چن کر ایک ایک عہد کی خلاف ورزی کی، کسی قول و قرار پر قائم نہ رہے۔ ان عہد شکنیوں کا جو نتیجہ ہوا اس اگلی آیت میں بیان فرماتے ہیں۔[2]

اصل ارشاد میں سواء السبیل آیا ہے۔ اس لفظ کی معنویت سمجھنے کے لیے پہلے یہ ذہن نشین کر لینا چاہیے کہ انسان بجائے خود اپنی ذات میں ایک عالمِ اصغر ہے جس کے اندر بے شمار مختلف قوتیں اور قابلیتیں ہیں، خواہشیں ہیں، خدمات اور رجحانات ہیں۔ نفس اور جسم کے مختلف مطالبے

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

ہیں۔ رُوح اور طبیعت کے مختلف تقاضے ہیں، پھر ان افراد کے ملنے سے جو اجتماعی زندگی بنتی ہے وہ بھی بیحد و حساب پیچیدہ تعلقات سے مرکب ہوتی ہے اور تمدن و تہذیب کے نشو و نما کے ساتھ ساتھ اس کی پیچیدگیاں بڑھتی چلی جاتی ہیں پھر دُنیا میں جو سامانِ زندگی انسان کے چاروں طرف پھیلا ہوا ہے اس سے کام لینے اور اس کو انسانی تمدن میں استعمال کرنے کا سوال بھی انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے بکثرت شاخ در شاخ مسائل پیدا کرتا ہے۔ انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے اس پورے عرصہ حیات پر بیک وقت ایک متوازن نظر نہیں ڈال سکتا۔ اس بنا پر انسان اپنے لیے خود زندگی کا کوئی ایسا راستہ بھی نہیں بنا سکتا جس میں اس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف ہو۔ اس کی تمام خواہشوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جائے، اس کے سارے جذبات و رجحانات میں توازن قائم رہے۔ اس کے سب اندرونی و بیرونی تقاضے تناسب کے ساتھ پورے ہوں۔ اس کی اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کی مناسب رعایت ملحوظ ہو اور ان سب کا ایک ہموار اور متناسب حل نکل آئے۔ اور مادی اشیا کو بھی شخصی اور تمدنی زندگی میں عدل و انصاف اور حق شناسی کے ساتھ استعمال کیا جاتا ہے۔ جب انسان خود اپنا رہنما اور اپنا شارع بنتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے کوئی ایک پہلو زندگی کی ضرورتوں میں سے کوئی ایک ضرورت، حل طلب مسئلوں میں سے کوئی ایک اس کے دماغ میں اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ وہ بالارادہ یا بلا ارادہ بے انصافی کرنے لگتا ہے اور اس کی اس رائے کے زبردستی نافذ کرنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے اور اس کی وجہ سے وہ مسائل جن کے ساتھ بے انصافی ہوتی ہے بغاوت شروع کر دیتے ہیں۔ اس طرح انسانی زندگی کو کبھی سیدھا چلنا نصیب نہیں ہوتا۔ ہمیشہ وہ جھکولے ہی کھاتے رہتی ہے تمام وہ راستے جو انسان کے اپنے خود ساختہ و پرداختہ ہیں خط منحنی کی صورت میں ہیں۔ ان بہت سی غلط راہوں میں ایک ایسی راہ جو بالکل سیدھی ہو، جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے اس کے تمام جذبات و رجحانات کے ساتھ اس کی رُوح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ اور اس کی زندگی کے تمام مسائل کے ساتھ پورا انصاف کیا گیا ہو، انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء اور اس کی کامیابی کے لیے نہایت ضروری ہے۔ انسانی فطرت اسی راہ کی طالب ہے لیکن انسان خود اس شاہراہ کو معلوم کرنے پر قادر نہیں ہے اس کی طرف صرف اللہ سبحانہٗ ہی رہنمائی کر سکتا ہے اور اللہ نے اپنے رسول اسی لیے روانہ کیے ہیں کہ انسانوں کو یہ راہ راست بتائیں۔

قرآن نبوت کی پیش کردہ اسی راہ کو سواء السبیل اور صراط مستقیم کہتا ہے۔ یہ شاہراہ دُنیا کی

زندگی سے لے کر آخرت کی دوسری زندگی تک بے شمار ٹیڑھے راستوں کے درمیان سے گزر کر سیدھی چلی جاتی ہے جو اس پر چلا وہ یہاں راست رو اور آخرت میں کامیاب اور بامراد ہے اور جس نے اسے گم کر دیا وہ یہاں غلط بیں غلط رو اور غلط کار ہے اور آخرت میں لامحالہ اسے جہنم میں جانا ہے۔

موجودہ زمانے میں بعض نادان فلسفیوں نے یہ دیکھ کر کہ انسانی زندگی پے در پے ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتی چلی جا رہی ہے۔ یہ نتیجہ نکال لیا کہ جدلی عمل انسانی زندگی کے ارتقاء کا فطری طریق ہے وہ اپنی حماقت سے یہ سمجھ بیٹھے کہ انسان کے ارتقاء کا راستہ یہی ہے کہ پہلے ایک انتہا پسندانہ دعوٰی اسے ایک رُخ پر بہائے جاتے، پھر اس کے جواب میں دوسرا دلیاہ ن انتہا پسندانہ دعوٰی اسے دوسری انتہا کی طرف کھینچے اور پھر دونوں کے امتزاج سے ارتقاء حیات کا راستہ بنے حالانکہ دراصل یہ ارتقاء نہیں ہے بلکہ بدنصیبی کے دھکے ہیں جو انسانی زندگی کے صحیح ارتقاء میں بار بار مانع ہو رہے ہیں۔ ہر انتہا پسندانہ دعوٰی زندگی کو اس کے کسی ایک پہلو کی طرف موڑتا ہے اور اسے کھینچے لیے جاتا ہے یہاں تک کہ جب وہ سواء السبیل سے بہت دُور جا پڑتی ہے تو خود زندگی ہی کی بعض دوسری حقیقتیں جن کے ساتھ بے انصافی ہو رہی تھی اس کے خلاف بغاوت شروع کر دیتی ہیں اور یہ بغاوت ایک جوابی دعوٰی کی شکل اختیار کر کے اسے مخالف سمت میں کھینچنا شروع کر دیتی ہے۔ جس قدر سواء السبیل نزدیک آتی ہے۔ ان متصادم دعوؤں کے درمیان مصالحت ہونے لگتی ہے اور ان کے امتزاج سے وہ چیزیں وجود میں آتی ہیں جو انسانی زندگی میں نافع ہیں لیکن جب وہاں سواء السبیل کے نشانات دکھانے والی روشنی نہیں ہوتی ہے اور نہ اس پر ثابت قدم رکھنے والا ایمان، تو وہ جوابی دعوٰی زندگی کو اس کے مقام پر نہیں ٹھہرنے دیتا بلکہ اپنے زور سے اسے دوسری جانب انتہا تک کھینچا چلا جاتا ہے یہاں تک کہ پھر زندگی کی کچھ دوسری حقیقتوں کی نفی شروع ہو جاتی ہے اور نتیجہ میں ایک دوسری بغاوت اٹھ کھڑی ہوتی ہے اگر ان کم نظر فلسفیوں تک قرآن کی روشنی پہنچ گئی ہوتی اور انہوں نے سواء السبیل کو دیکھ لیا ہوتا تو انہیں معلوم ہو جاتا کہ انسان کے ارتقاء کا صحیح راستہ یہی سواء السبیل ہے نہ کہ خط منحنی پر ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف دھکے کھاتے پھرنا۔[1]

❖

---

[1] تفہیم القرآن

فَبِمَا نَقْضِهِمْ مِّيْثَاقَهُمْ لَعَنّٰهُمْ وَجَعَلْنَا قُلُوْبَهُمْ قٰسِيَةً ۚ
يُحَرِّفُوْنَ الْكَلِمَ عَنْ مَّوَاضِعِهٖ ۙ وَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا بِهٖ ۚ
وَلَا تَزَالُ تَطَّلِعُ عَلٰى خَآئِنَةٍ مِّنْهُمْ اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْهُمْ فَاعْفُ
عَنْهُمْ وَاصْفَحْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝ وَمِنَ الَّذِيْنَ
قَالُوْٓا اِنَّا نَصٰرٰٓى اَخَذْنَا مِيْثَاقَهُمْ فَنَسُوْا حَظًّا مِّمَّا ذُكِّرُوْا
بِهٖ ۠ فَاَغْرَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاۗءَ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ ۭ وَ
سَوْفَ يُنَبِّئُهُمُ اللّٰهُ بِمَا كَانُوْا يَصْنَعُوْنَ ۝

لہذا اُن کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان کو ملعون بنا دیا اور اُن کے دلوں میں سختی ڈال دی۔ وہ کلام کو اپنے موقع و محل سے ہٹاتے ہیں، اور جس چیز کے ذریعے ان کی یاد دہانی کی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے ہیں، اور تم ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہو گے لیکن تھوڑے سے ان میں سے

ایسے نہیں ہیں[۵۸]، ان کو معاف کر دو اور ان سے درگزر کرو، اللہ
حسن کار لوگوں کو پسند کرتا ہے[۵۸]۔ اور جو لوگ اپنے تئیں نصاریٰ ہونے
کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے بھی ہم نے عہد لیا تھا[۵۹]، وہ بھی اس
چیز کا ایک حصہ فراموش کر بیٹھے جو اُن کو یاد کرائی گئی تھی[۶۰]،
لہٰذا ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان عداوت
اور بغض کی آگ بھڑکا دی اور اللہ ان کے کرتوتوں سے عنقریب
اُن کو آگاہ کرے گا[۶۱]"

میثاق سے گریز پائی اور غداری

پہلی آیت میں بنی اسرائیل سے جو میثاق لیا تھا اس کی تاریخ بیان کی تھی اب اسی میثاق کے بارے میں ان کے کردار کی تاریخ بیان ہو رہی ہے۔ اور یہودیوں کے ساتھ عیسائیوں کی تاریخ سے بھی دونوں پہلو زیرِ بحث آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ سے جو عہد لیا گیا تھا اس کا ذکر فرمایا ہے اور اس عہد کو توڑ کر وہ جن نتائج سے دوچار ہوئے بالاجمال ان کی طرف بھی اشارہ ہے مقصود مسلمانوں کو متنبہ کرنا ہے کہ اب تم سے جو عہد لیا جا رہا ہے یہ بھی اسی نوعیت کا ہے اگر تم نے بھی اس عہد کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو تمہیں بھی ان نتائج کو بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے جو ان کو پیش آئے۔ یاد رکھو کہ نقضِ عہد کی یہ تاریخ مسلمانوں کو محض ماضی کی ایک سرگزشت کی حیثیت سے نہیں سنائی جا رہی ہے بلکہ اس لیے سنائی جا رہی ہے کہ

مسلمان اس سے سبق لیں اور یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے اپنے میثاق کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا قرآن کا بھی وہی حشر ہوگا جو یہود و نصاریٰ کا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ اعمال کے نتائج زمانوں، مکانوں اور قوموں کے بدلنے سے مختلف نہیں ہوتے، ہر جگہ ہر زمانے اور ہر قوم میں یکساں ہوتے ہیں۔ سعادت و شقاوت کا پیمانہ ایک ہے۔ اچھے اعمال کا نتیجہ سعادت ہے اور بُرے اعمال کا نتیجہ شقاوت۔ سعادت و شقاوت کے اس نقشہ میں نسب اور نسبتیں بیکار ہیں زمانوں اور مکانوں کے اختلاف اس پر اثر انداز نہیں ہوتے ہیں۔

۵۴ - لہٰذا ان کی عہد شکنی کی وجہ سے ہم نے ان کو ملعون بنا دیا، اور ان کے دلوں میں سختی ڈال دی، لعن کے معنٰے طرد اور ابعاد کے ہیں یعنی عہد شکنی اور غداری کی وجہ سے ہم نے اپنی رحمت سے ان کو دور پھینک دیا ہے اور ان کے دلوں کو سخت کر دیا فبما نقضھم میثاقھم کے لفظ سے ظاہر فرمایا کہ ان کے ملعون ہونے کا سبب عہد شکنی اور غداری ہے جو خود انہی کا فعل ہے۔ اسباب کا سبب پر مرتب کرنا چونکہ خدا ہی کا کام تھا اس لحاظ سے جعلنا قلوبھم قاسیۃ کی نسبت اسی کی طرف کی گئی ہے[1]

اس فقرے میں میثاق سے غداری کا نتیجہ یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ نے ان پر لعنت ڈال دی اور ان کے دلوں میں سختی پیدا ہو گئی۔ اللہ تعالیٰ کسی قوم کے ساتھ معاہدہ کر کے اس کو جس درجے کی عزت و سرفرازی بخشتا ہے۔ معاہدہ توڑ دینے کی صورت میں وہ اس کو اسی درجے کی ذلت کے ساتھ دھتکار بھی دیتا ہے۔ اس دھتکار کے لیے جامع تعبیر لعنت ہے یعنی کسی کو راندہ درگاہ قرار دینا۔ راندہ درگاہ قرار دینے کا پہلا اثر جو اس قوم پر پڑتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے خدا کی خشیت جو دل کی زندگی کی ضامن ہے ختم ہو جاتی ہے اور دل پتھر ہو کر توبہ و انابت کی روئیدگی کے لیے بالکل بنجر ہو جاتا ہے۔ یہ حالت پیدا تو ہوتی ہے عہد شکن قوم سے اپنے عمل کے نتیجہ کے طور پر لیکن چونکہ واقع ہوتی ہے، اللہ کی مقررہ سنت کے مطابق، اس وجہ سے اس کو منسوب اللہ تعالیٰ اپنی طرف فرماتا ہے۔

قرآن میں دوسری جگہ جہاں بنی اسرائیل کی تاریخ حیات کا چہرہ بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ مال و دولت کا حصول، حق اور باطل میں التباس، کتمان حق دین کا کاروبار، شخصی مسئولیت سے

[1] افادات شیخ الاسلام

بے پروائی، غلامی سے آزادی کے بعد سرکشی، گوسالہ پرستی، گستاخی اور بے ادبی، ظلم کاری اور معصیت پر اصرار فطرت کا فساد اور اخلاق کا بگاڑ، قتل انبیاء اللہ کی آیات کا کفر، عہد و پیمان کے بعد اس سے روگردانی، غداری، اور عہد شکنی، حیلہ سازی، تعمق اور کثرت سوال اور نبوت کی شان میں گستاخیاں ان کے مزاجوں میں اسی قساوت قلبی کے مظاہر ہیں۔ قساوت عربی زبان میں ہر چیز کی سختی کو کہتے ہیں۔ سخت پتھر کو حجر قاسیہ اور ایسی زمین کو جس میں پیداوار کی صلاحیت نہ ہو ارض قاسیہ کہتے ہیں۔ قساوت یہ ہے کہ قبول کرنے اور نصیحت سے اثر پذیری کی اس میں کوئی صلاحیت نہ ہو۔ قرآن نے ایک موقعہ پر ان کی قلبی قساوت کے لیے بلیغ تشبیہ پیش کی ہے

قست قلوبکم من بعد ذالک فهی کالحجارة او اشد قسوة

اس کے باوجود تمہارے دل سخت ہو گئے وہ پتھروں کی طرح ہیں بلکہ اس سے بھی سخت

یعنی یہودیوں کی اخلاقی حالت اتنی گر گئی ہے یا اس درجے میں آگئی ہے کہ عبرت پذیری اور تنبیہ کی استعداد ان میں یک قلم معدوم ہو گئی، ان کی اسی حالت کا نام قرآن نے قساوت رکھا ہے۔ امام حمزہ اور امام کسائی نے قاسیہ کو قسیئۃ پڑھا ہے یعنی فعیلۃ کے وزن پر صفت مشبہ کا صیغہ۔ یہ قاسیہ سے لحاظ معنے زیادہ بلیغ ہے۔ یہودیوں کی اس قساوت کا انجیل میں بار بار ذکر آیا ہے۔ اس نے ان کی سخت دلی کے سبب غمگین ہو کر اور چاروں طرف ان پر غصہ سے نظر کر کے اس آدمی سے کہا۔ (مرقس ۳-۵) ان کی بے اعتقادی اور سخت دلی پر ملامت کی (مرقس ۱۶-۱۴) تو اپنی سختی اور غیر تائب دل کے مطابق اس قہر کے دن کے لیے اپنے واسطے غضب کما رہا ہے (رومیوں ۲-۵)

کلام الٰہی میں تحریف

۵۵۔ وہ کلام کو اپنے موقعہ و محل سے ہٹاتے ہیں یعنی خدا کے کلام میں تحریف کرتے ہیں، کبھی اس کے الفاظ میں، کبھی تلاوت میں تحریف کی یہ سب اقسام قرآن و حدیث میں بیان کی گئی ہیں جس کا قدرے اعتراف آج کل بعض یورپین عیسائیوں کو بھی کرنا پڑا ہے[1] علامہ ابوالسعود فرماتے ہیں کہ یہ فقرہ استیناف بیانی ہے اور اس کے ذریعے ان کے دلوں کی قساوت کے مرتبے کی نشاندہی ہو رہی ہے۔ ایسا مقام جس میں انسان دل کی سختی کی وجہ سے اللہ کے کلام کا منہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بگاڑنے پر دلیر ہوتا ہے ، قساوت کا آخری مرتبہ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ قساوت عہد شکن قوم میں ایسی جسارت پیدا کر دیتی ہے کہ وہ میثاق الٰہی کی خلاف ورزی پر بس نہیں کرتی بلکہ وہ اس معاہدے کو اپنی خواہش کے مطابق بنانے کے لیے اس کے الفاظ و کلمات میں تحریف بھی کرتی ہے ۔ یہ تحریف یہود نے کن کن شکلوں میں کی اس کی تفصیل انشاء اللہ اسی پارے میں آ رہی ہے ۔ یہاں تو صرف یہودی علماء کی یہ شقاوت بتانی ہے کہ کتاب اللہ کی اطاعت کرنے کی بجائے کتاب اللہ کو اپنی خواہشوں اور رایوں کے مطابق کام میں لاتے تھے یا تو کسی آیت کا مطلب اس طرح ٹھہراتے تھے کہ بات کچھ سے کچھ ہو جاتی یا کتاب اللہ کی آیتیں سناتے ہوئے اپنی طرف سے کچھ گھٹا اور بڑھا دیتے کہ اصل مطلب ظاہر نہ ہو اور جو بات بنانی چاہتے ہیں کسی نہ کسی طرح بن جاتے ۔ تحریف حرف سے بنا ہے اس کے معنے کسی چیز کو اپنی جگہ سے ہٹا دینے کے آتے ہیں یعنی کسی کو ایک طرف کر دینا کیونکہ حرف لغت میں جانب اور طرف کے آتے ہیں ۔ اس میں لفظی اور معنوی دونوں قسم کی تحریفیں آگئیں ہیں ۔ یہود عیسائیوں کی طرح خود بھی وحی لفظی کے قائل نہیں اور اپنے صحیفوں بلکہ خود تورات تک کی محفوظیت کے مدعی نہیں ہیں ۔ ان کا سارا کام مسیحیوں کی طرح بجائے اصل متن کے ترجمہ کے زور پر چل رہا ہے اور ترجمہ بہتر سے بہتر ہی ہو پھر بھی اصل سے جتنا دور ہوتا جائے گا ۔ ہر عقلمند جانتا ہے اس کا مقام کیا ہے ؟

تورات کے متعلق قرآن کا تاریخی انکشاف

۵۶ ۔ اور جس چیز کے ذریعے ان کو یاد دہانی کرائی گئی تھی اس کا ایک حصہ وہ بھلا بیٹھے ۔ یعنی چاہیے تو یہ تھا کہ ان قیمتی نصیحتوں سے فائدہ اٹھاتے جو مثلاً نبی آخر الزمان کی آمد اور دوسرے معاملات دینیہ کے متعلق ان کی کتابوں میں موجود تھیں مگر اپنی غفلتوں اور شرارتوں میں پھنس کر یہ سب بھول گئے بلکہ نصیحتوں کا وہ ضروری حصہ ہی گم کر دیا اور اب بھی جو نصیحتیں اور مفید باتیں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ان کو یاد دلائی جاتی ہیں ان کا کوئی اثر قبول نہیں کرتے ۔ حافظ ابن رجب حنبلی نے لکھا ہے کہ نقض عہد کی وجہ سے ان میں دو باتیں آئیں ۔ ملعونیت اور قساوت قلب ان دونوں کا نتیجہ یہ دو چیزیں ہوئیں ۔ تحریف کلام اللہ اور عدم انتفاع بالذکر یعنی لعنت کے اثر سے ان کا دماغ مسخ ہو گیا حتیٰ کہ نہایت بے باکی اور بدعقلی سے کتب سماویہ کی تحریف پر آمادہ ہو گئے دوسری طرف جب عہد شکنی کی نحوست سے . . . . . . دل سخت ہو گئے تو

قبول حق اور نصیحت سے متاثر ہونے کی صلاحیت نہ رہی اور اس طرح علمی اور عملی دونوں قسم کی قوتیں ضائع ہوگئیں لے

اصل میں نسوا حظاً مما ذکروا بہ ارشاد ہوا ہے اس کی تشریح شارحین قرآن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے۔ ہمارے خیال میں ما ذکروا بہ سے تورات مراد ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہودی تورات کا ایک حصہ بھلا بیٹھے۔ دراصل تورات حضرت موسیٰ کے زمانے میں مرتب نہیں ہوئی بلکہ ان کی وفات کے لتنے دنوں کے بعد اس کی ترتیب عمل میں آئی جب کسی کو یہ علم بھی نہ رہا تھا کہ ان کی قبر کہاں ہے ؟ اس کے مرتبین کا نام بھی معلوم نہیں ہے کہ وہ کون اور کس صفات کے لوگ تھے۔ استثنا باب ۳۲ کے آخر میں ہے کہ

پھر آج تک کسی آدمی کو اس کی قبر معلوم نہیں ہے۔

اسی طرح یہ الفاظ بھی اسی باب میں ہیں۔

اور اس وقت سے اب تک کوئی نبی موسیٰ کی مانند جس سے خداوند نے روبرو باتیں کیں نہیں پیدا ہوا۔

ظاہر ہے کہ جو کتاب اپنے لانے والے کی وفات کے طویل عرصہ کے بعد مرتب ہوئی کہ لوگ اس کی قبر بھی بھول گئے۔ اس کی تعلیمات کو محفوظ رکھنا ان کے لیے کس طرح ممکن تھا۔ چنانچہ نتیجہ یہ ہوا کہ تورات کی بہت سی باتیں وہ بھول گئے پھر جو باتیں مرتب بھی ہوئیں وہ بھی اصل الفاظ میں محفوظ نہیں رہیں بلکہ ان کے پاس اصل تورات کے بجائے صرف اس کے ترجمے رہ گئے اور یہ ترجمے بدلتے بدلتے اصل سے لتنے مختلف ہو گئے کہ یہ تمیز کرنا ناممکن ہو گیا کہ اس میں اصل کتنی بات ہے اور کتنی جامعین اور مترجمین کی حاشیہ آرائی ہے اس طرح تورات کا ایک بڑا حصہ اس کے حاملین نے ضائع کر دیا۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ کتاب الٰہی کو فراموش کر بیٹھے، اور یہی بات امام مجاہد نے فرمائی ہے مطلب دونوں بزرگوں کا یہ ہے کہ اصل کتاب کا کچھ حصہ فراموش کر بیٹھے، کچھ علماء نے نسیان کو ترک عمل کے معنے میں لیا ہے۔ معنے دونوں ہیں ایک یہ کہ کتاب کا کچھ حصہ انہوں نے طاق نسیان بنا دیا دوسرے یہ کہ انہوں نے تورات کے کچھ حصہ پر عمل کرنا چھوڑ دیا پہلے معنی حقیقی ہیں اور دوسرے مجازی ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ اصل حقیقت ہے نہ کہ مجاز، مجازی۔

لے افادات شیخ الاسلام

معنے اسی وقت لیے جا سکتے ہیں جبکہ حقیقی معنے میں کوئی مانع ہو۔ یہاں کوئی مانع نہیں بلکہ دوسرے موقعہ پر اسی مفہوم کے لیے اوتوا نصیباً من الکتاب کی تعبیر معنے حقیقی کی مؤید ہے۔ غالباً جن بزرگوں نے یہاں مجازی معنے لیے ہیں وہ اس بات کو ممکن تصور نہیں کرتے کہ تورات کا کوئی حصہ ضائع ہو چکا ہے۔ ان کا گمان ہے کہ تورات بھی متواتر ہے لیکن ایسا سمجھنا ٹھیک نہیں ہے کیونکہ تورات کا تواتر روایتی اور تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے۔ امر واقعہ یہی ہے کہ جب اہل بابل نے ہیکل کو آگ لگائی اور شہر کو برباد کیا اور شہریوں کو مارا اور قید کیا تو یہودیوں کے ہاتھوں سے کتاب تورات ضائع ہو گئی۔ عرصہ کے بعد جب وہ آزادی کی نعمت سے ہمدوش ہوتے تو انہوں نے دوبارہ کچھ تورات کو اپنی یادداشتوں سے مرتب کیا لیکن یہ ساری تورات نہ تھی، بلاشبہ تورات کا حصہ وقت کی اس دستبرد سے طاق نسیان ہو کر رہ گیا۔ یہ نبوت محمدیہ کا اعجازی شاہکار ہے کہ جس چیز کی نشاندہی آج علم و تحقیق اور تاریخ کر رہی ہے۔ آپ نے اس کا اعلان ہا صدیاں پہلے و نسوا حظا مما ذکروا بہ اور اوتوا نصیباً من الکتاب کہہ کر قرآن میں کر دیا اور بتا دیا کہ یہود نے کتاب الٰہی کا ایک حصہ فراموش کر دیا۔ اور آل عمران اور نسا میں پہلے گزر چکا ہے کہ اوتوا نصیبا من الکتاب یعنی یہودی ... تورات کا ایک حصہ فراموش کر بیٹھے ہیں۔

کچھ شارحین قرآن کی رائے میں فراموش کردہ حصہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے بارے میں بشارات ہیں لیکن ہمارے خیال میں یہ درست نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو قرآن یہودی علماء کے بارے میں یوں نہ کہتا کہ یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم حالانکہ یہ ثابت شدہ حقیقت اور امر واقعہ ہے بلکہ ایمان لانے والوں نے اس پر قسم کھائی ہے۔

یہاں اور آل عمران اور نسا۔ میں ایک ہی بات بتائی گئی ہے کہ بیت المقدس کی تباہی کے بعد سے لے کر آج تک یہودیوں کی تورات کا ایک حصہ مفقود ہے اور جو کچھ موجود ہے وہ بھی ترجمہ در ترجمہ ہو کر ہم تک پہنچا ہے اور اس میں بھی ان کے تصرفات، تحریفات، اضافات ہیں۔

یہودیوں کی زندگی سراپا خیانت ہے

۵۔ اور تم ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی خیانت سے آگاہ ہوتے رہو گے لیکن تھوڑے سے ان میں ایسے نہیں ہیں۔ یعنی ان کی دغابازی اور خیانت کا سلسلہ آج تک چل رہا ہے اور آئندہ بھی چلتا رہے گا، اسی لیے ہمیشہ ان کی کسی نہ کسی دغابازی اور مکر و فریب پر آپ مطلع ہوتے رہتے ہیں

لیکن ان میں تھوڑے سے ایسے نہیں جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ جو اسلام میں داخل ہو چکے ہیں لے
یہاں لفظ خائنۃ سے مراد خیانت ہے۔ حضرت قتادہ سے قرطبی نے یہی معنے نقل کیے ہیں۔
اہل عرب کبھی مصدر کو صیغہ فاعل سے تعبیر کر دیتے ہیں جیسے قائلۃ بول کر قیلولہ اور خاطئۃ بول کر خطیئۃ اور لائمۃ بول کر ملامت مراد لیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم ان یہودیوں کی نت نئی خیانتوں سے جب تک آپ کے ساتھ مطلع ہوتے رہوگے۔ یہودیوں کی پوری تاریخ ہر پہلو سے خیانت کا شاہکار ہے قرآن نے یہاں اور متعدد مقامات پر یہود کی خیانت کی داستان سنائی ہے۔ دنیوی معاملات اور دینی احوال دونوں میں ان کی خیانت کو طشت ازبام کیا ہے خالص دنیوی معاملہ میں قرآن نے ان کی خیانت پر مبنی اجتماعی زندگی کا چہرہ پیش کرتے ہوئے بتایا ہے منھم من ان تامنہ بدینار لایؤدہ الیک اور جب دنیوی معاملہ میں ان کی امانت کا یہ حال ہے تو قیاس کیا جا سکتا ہے کہ دینی معاملے میں کتاب کی حفاظت اور نبوت کے بارے میں پیشین گوئیوں کی حفاظت میں وہ کیوں کر قابل اعتبار ہو سکتے ہیں۔ یہودیوں کی خیانت پر مبنی زندگی کا کچھ چہرہ جلد سوم نوٹ نمبر ۱۳۹-۱۴۰-۱۴۱ میں پیش کیا جا چکا اور بتایا جا چکا ہے کہ دین کی زندگی میں امانت و دیانت کی بڑی قدر و منزلت ہے کیونکہ زندگی میں جو اخلاقی جوہر مرکزی حیثیت رکھتا ہے وہ دیانتداری اور امانت ہے اور اس سے مقصود یہ ہے کہ انسان اپنے کاروبار میں ایماندار ہو اور جس کسی پر جتنا ہو اس کی پوری دیانت سے رتی رتی دے۔ قرآن میں امانت کا دائرہ صرف روپے پیسے، جائداد اور مالی اشیاء تک محدود نہیں بلکہ ہر مالی، قانونی اور اخلاقی امانت تک وسیع ہے۔ کسی کا کوئی بھید آپ کو معلوم ہے تو اس کو چھپانا امانت ہے۔ کسی مجلس میں آپ ہوں، اور کچھ باتیں دوسروں کے متعلق وہاں سن لیں تو ان کو اسی مجلس تک محدود رکھنا امانت ہے۔ اگر کسی جگہ ملازم ہے تو اس کو ملازمت کے شرائط کے مطابق اپنی ذمہ داری کو انجام دینا امانت ہے۔ بہرحال خیانت ہر حال میں خیانت ہے اور دیانت ہر حال میں دیانت ہے۔

مدینہ کے ارد گرد یہود کے تین قبائل موجود تھے۔ بنو قینقاع، بنو نضیر اور بنو قریظہ۔ حضور انور نے مدینہ میں قدم رنجہ فرماتے ہی ان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا۔ جنگ نہ کرنے پر اور کسی سے جنگ ہونے کی صورت میں مسلمانوں کے خلاف مدد نہ کرنے پر معاہدہ کیا لیکن انہوں نے

لے افادات شیخ الاسلام

معاہدہ سے بے پرواہ ہو کر اس کی ایک ایک دفعہ کو توڑا اور سیاسی طور پر خیانت کی۔ قرآن یہاں ان کی اسی خیانت سے لبریز زندگی کا حوالہ دے رہا ہے۔

عفو و درگزر حسن کاری ہے

۵۸ - ان کو معاف کر دو، ان سے درگزر کرو، اللہ حسن کار لوگوں کو پسند کرتا ہے۔ یعنی جب ان کی عادت قدیمہ ہی یہ ہے تو ایسے لوگوں سے ہر چیز پر اُلجھنا اور ان کی ہر خیانت کا پردہ چاک کرنا ضروری نہیں ہے۔ ان کو چھوڑ دیجئے اور درگزر کیجئے اور ان کی بُرائی کا بدلہ عفو و احسان سے دیجئے، شاید اسی سے کچھ متاثر ہوں۔ قتادہ وغیرہ نے کہا ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الآخر سے مگر اس کی کچھ حاجت نہیں ہے۔ قتال کے حکم سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی وقت اور کسی موقع پر بھی ایسی قوم کے مقابلہ میں عفو و درگزر اور تالیف قلب سے کام نہ لیا جائے[1]

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن نے جس مطلب کو ترجیح دی ہے وہ تو آپ شیخ الاسلام کی زبانی سُن چکے ہیں لیکن دوسرے علماء نے جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں کن لوگوں سے عفو و درگزر ہو رہا ہے۔ ان تھوڑوں سے جن کو عام خیانت پیشہ یہودیوں سے الا قلیلا کے ذریعے مستثنیٰ کیا گیا ہے یا ان سب سے جن کے بارے میں خیانت پیشہ ہونے کا اظہار ہوا ہے۔ مشہور معتزلی مفکر ابو مسلم اصفہانی کی رائے یہ ہے کہ یہ حکم ان تھوڑوں کے بارے میں ہے جن میں خیانت نہیں ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان کی گزشتہ بے راہ رویوں اور خیانتوں کو معاف کر دیجئے اور ان کے غلط کار لوگوں کو نظر انداز کر دیجئے اور ان سے اس احسان کا معاملہ کیجئے جو اللہ پسند کرتا ہے لیکن ایسے عام شارحین قرآن نے پسند نہیں کیا بلکہ آیت میں سب خیانت پیشہ یہودیوں سے عفو و درگزر کے حکم کو ترجیح دی ہے اور مطلب یہ بتایا کہ اگر یہ اپنی حرکات سے توبہ کر لیں اور پُرامن شہری بن کر رہنا قبول کر لیں تو ان سب کو معاف کر دیجئے۔ ان دونوں تشریحات کی روشنی میں یہ آیت قرآنی محکم ہے منسوخ نہیں ہے۔

بہر حال اس آیت میں قرآن نے عفو و درگزر کا حکم دیا ہے اور عفو و درگزر کو حسن کاری قرار دیا ہے۔ نکتہ سنجوں نے یہیں سے یہ بات بھی نکال لی ہے کہ جب کافروں اور کافر بھی وہ جو

[1] افادات شیخ الاسلام

خائن ہیں ان سے قرآن عفو و درگزر کی ہدایت کر رہا ہے اور اسے حسن عمل اور حسن کاری قرار دے رہا ہے تو پھر غیر خائن کے ساتھ عفو و درگزر کے معاملہ کی فضیلت کے کیا کہنے ہیں۔ قاضی بیضاوی رقمطراز ہیں۔

اس میں اشارہ ہے کہ خائن کافر کو معاف کرنا حسن کاری ہے اور اگر کافر خائن نہ ہو تو اس کو بدرجہ اولیٰ معاف کیا جائے۔

اور اس میں ہمارے لیے بڑی عبرت ہے کہ اللہ سبحانہٗ جب خائن کافر کے لیے معافی کو پسند کرتا ہے تو خائن مسلمان تو اس کا زیادہ مستحق ہے کہ اسے معاف کیا جائے۔

عیسائی نصاریٰ ہونے کے مدعی ہیں

۵۹ ۔ اور جو لوگ اپنے تئیں نصاریٰ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں ان سے عہد لیا۔ نصاریٰ کا ماخذ یا تو نصر ہے جس کے معنے مدد کرنے کے ہیں اور یا ناصرہ سے ہے جو ملک شام میں ایک بستی کا نام ہے جہاں حضرت مسیح علیہ السلام رہتے تھے اسی لیے ان کو مسیح ناصری کہتے ہیں۔ جو لوگ اپنے کو نصاریٰ کہتے ہیں وہ گویا اس بات کے مدعی تھے کہ ہم خدا کے سچے دین اور پیغمبروں کے حامی ہیں اور حضرت مسیح ناصری کے متبع ہیں۔ اس زبانی دعویٰ اور لقبی تفاخر کے باوجود دین کے معاملہ میں جو رویہ تھا وہ آگے آرہا ہے [1]

یہود کے نقض عہد کے بعد اب یہ نصاریٰ کے نقض کا ذکر ہو رہا ہے اور تمہید ہی اس انداز سے اٹھائی ہے جس سے بقول علامہ جمال الدین قاسمی یہ مترشح ہو رہا ہے کہ نصاریٰ ہونے کے مدعی محض انصار اللہ کا مصداق نہیں بلکہ اس سے کوسوں دور ہیں یا یہ کہ یہ نصاریٰ قرآن کے نزدیک نصاریٰ نہیں بلکہ صرف نصاریٰ ہونے کے مدعی ہیں۔ یا بقول علامہ ابوالسعود یہ تعبیر ان کے قول و فعل میں تضاد ظاہر کرنے کے لیے اختیار کی ہے۔ علامہ ناصر صاحب انتصاف نے یہاں یہ عجیب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ خاص طور پر اس موقعہ پر یہ تعبیر یہ بتانے کے لیے اختیار کی گئی ہے کہ یہ مدعیان نصرت دعویٰ نصرت کے باوجود اللہ کے دین کی نصرت میں بالکل ناکام رہے۔ ان کا قول ان کے کردار کے ہرگز مطابق نہیں ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نصاریٰ سے میثاق

۶۰ - ان سے بھی ہم نے عہد لیا تھا وہ بھی اس چیز کا ایک حصہ فراموش کر بیٹھے جو ان کو یاد کرائی گئی تھی۔ یعنی یہود کی طرح نصاریٰ سے بھی عہد لیا گیا لیکن یہ بھی عہد شکنی اور بیوفائی میں اپنے پیشروؤں سے کچھ کم نہیں ہیں۔ انہوں نے بھی ان بیش بہا نصائح سے جن پر نجات و فلاح ابدی کا مدار تھا۔ کوئی فائدہ نہ اٹھایا بلکہ بائیبل نصیحتوں کا وہ حصہ باقی ہی نہ چھوڑا جو حقیقتہً مذہب کا مغز تھا لہ

پہلے یہودیوں کے بارے میں فرمایا تھا کہ انہیں جو کچھ نصیحت کی گئی تھی وہ اس کا ایک حصہ بھلا بیٹھے اب نصاریٰ کے متعلق بھی انکشاف فرمایا ہے کہ نصاریٰ بھی اپنی کتاب کا بیشتر حصہ فراموش کر چکے ہیں۔ یہ امر واقعہ ہے کہ عیسائی جن کتابوں کو انجیل کہتے ہیں وہ انجیل نہیں بلکہ حضرت مسیح کی ایک مجمل اور مختصر سی تاریخ ہے۔ مختصر اس لیے کہہ رہا ہوں کہ یوحنا نے اپنی انجیل کے آخر میں کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے۔

> اور بھی بہت سے کام ہیں جو یسوع نے کیے اگر وہ جدا جدا لکھے جاتے تو میں سمجھتا ہوں کہ جو کتابیں لکھی جاتیں ان کے لیے دنیا میں گنجائش نہ ہوتی۔
>
> (یوحنا ۲۱-۲۵)

ذخیرۃ الالباب کے مصنف نے بھی بتایا ہے کہ

> انجیل مسیح کی زندگی کے نہ تو سارے اعمال کو بیان کرتی ہے اور نہ ان کے سارے ارشادات کو جیسا کہ یوحنا نے تصریح کی ہے۔

فی الواقع انجیل تو وہ مقدس کتاب ہے جس کی وحی حضرت مسیح علیہ السلام کو آئی اور جس میں زندگی کے لیے ہدایات اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آمد کے بارے میں بشارات تھیں۔ اسی انجیل کا ان چاروں مورخین کے یہاں ذکر ہوتا ہے۔ چنانچہ متی کھلے لفظوں میں کہتا ہے کہ

> میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ تمام دنیا میں جہاں کہیں اس خوشخبری یعنی انجیل کی منادی کی جائے گی یہ بھی جو اس نے کیا اس کی یادگاری میں کیا جائے گا۔ (متی ۲۶-۱۳)

لہ افادات شیخ الاسلام

ان تاریخوں کو اناجیل صرف اس لیے کہہ دیا گیا ہے کہ ان کا موضوع بحث انجیل مسیح ہے اور کچھ آیتیں ان میں انجیل کی ہیں۔ اسی لیے مرقس نے اپنی انجیل کا آغاز اس طرح کیا ہے:

"انجیل مسیح کا آغاز" اور بعدازیں حضرت مسیح سے نقل کیا ہے کہ

"لوگو! توبہ کرو اور انجیل پر ایمان پر ایمان لاؤ" لہٰذا وہ انجیل جس پر ایمان لانے کا لوگوں کو حکم دیا جارہا ہے ان چاروں تاریخوں میں سے ایک بھی نہیں ہے۔

عہد اول میں حضرت مسیح کی طرف منسوب کرکے ایک نہیں بلکہ ستر سے زیادہ اناجیل منصۂ شہود پر آئی ہیں کینیسر کے کچھ مورخین کہتے ہیں کہ ان میں سے ۳۵ جھوٹی تھیں۔ اگرچہ ذخیرۃ الالباب کے مصنف نے یہ کہہ کر اناجیل کی کثرت کے الزام سے گلو خلاصی کرنی چاہی ہے کہ ایک ہی انجیل کو مختلف ناموں سے موسوم کر دیا گیا ہے اور آخر میں، سے ہٹ کر صرف ۱۲ کا اعتراف کیا ہے اور ان بیس میں برنابا کی انجیل کو بھی شمار کیا ہے مگر سچ یہ ہے کہ وہ جواب نہ دے سکا۔

انجیل میں تحریف کا آغاز

قرن اول ہی انجیل میں تحریف شروع ہو گئی تھی۔ چنانچہ پولس نے اپنے اس خط میں جو اہل غلاطیہ کو لکھا ہے اقرار کیا ہے:

مجھے حیرت ہے کہ تم اتنی جلدی مسیح کی انجیل سے دوسری انجیل کی طرف پلٹ رہے ہو حالانکہ اس کے سوا کوئی انجیل نہیں ہے۔ ہاں کچھ لوگ ہوں گے جو تمہیں انجیل مسیح سے ہٹائیں گے اور انجیل مسیح کو تبدیل کرنا چاہیں گے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضرت مسیح کی ایک ہی انجیل تھی۔ اور پولس ہی نے اس خط میں جو اس نے اہل کرنتھوس کے نام لکھا ہے تصریح کی ہے کہ

یہ لوگ جو انجیل مسیح میں تحریف کر رہے تھے جھوٹے مکار بپائی فرستادے ہیں۔ انہوں نے مسیح کے فرستادوں کا بھیس لپیٹا ہوا ہے۔

کتاب اعمال کی پندرھویں فصل میں اس موضوع کی زیادہ وضاحت پیش کی گئی ہے کہ

یہودی عیسائیوں میں وہ چیزیں پھیلاتے تھے اور ان چیزوں کی تعلیم دیتے جو حضرت مسیح کے فرستادوں کی تعلیمات کے علاوہ کچھ اور بھی۔

اور حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہ نے اظہار الحق میں ۱۰۰ شواہد سے کتب مقدسہ میں تحریف کا ہونا ثابت کیا ہے۔ ہم یہاں مولانا موصوف کی کتاب ازالۃ الشکوک سے ایک اقتباس نقل کرتے ہیں تاکہ ناظرین اندازہ کر سکیں کہ اس موضوع میں مسیحیوں کی بے بسی کا کیا حال ہے۔

جب تحریف کی گفتگو میں درس ساتواں اور آٹھواں باب پانچویں نامہ اول یوحنا کا پیش کیا گیا اس پر ان کو اور پادری فرنچ صاحب کو جو ان کے شریک تھے ان درسوں میں اور اسی طرح اور کسی جگہ انجیل کے اندر وہ تحریف ماننی پڑی جس سے ہم لوگ مدعی ہیں اور صاف اقرار کیا کہ آٹھ دس جگہ انجیل مقدس کے اندر آیتوں کی تحریف ہوئی ہے اور چالیس ہزار چھوٹی چھوٹی غلطیاں اور تحریفیں ہوئی ہیں۔ مگر تھوڑے عرصہ کے بعد قائل ہوتے کہ تحقیق سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ آٹھ دس میں نہیں بلکہ چار پانچ آیتوں میں تحریف ہوئی ہے اور چالیس ہزار کی نہیں بلکہ تیس ہزار کی۔ اس پر میں نے ان سے کئی بار بذریعہ خطوط دریافت کیا کہ آپ ان چار پانچ آیتوں کو کھول کر بتائیں کہ فلانے صحیفہ یا فلاں نامہ یا مشاہدات کے فلانی آیت ہے کہ بعد اس کے کچھ عرض کروں۔ اس کے جواب میں کبھی کچھ عذر کیا اور کبھی وعدہ اور جب ان سے امید ٹوٹی تو ان کے شریک کی خدمت میں ۲۳ ذی الحجہ ۱۲۷۰ھ کو ایک خط روانہ کیا۔

بہر حال انہوں نے بھی تفصیل سے پہلو تہی کی۔ . . . مگر اتنا غنیمت ہے کہ اپنے یہاں کے اختلاف کے عذر میں صاف اقرار کر گئے کہ انجیل کے اندر چار پانچ آیتیں یقیناً تحریف کی راہ سے گھس گئی ہیں اور یوں لکھا کہ ــــ تحریفوں کے عدد کا جو ہمارے بیان میں اختلاف ہوا ہے سو اس کی حقیقت حال یہ ہے کہ عدد کلاں کے باب میں مصححین کا اتفاق کسی صورت میں نہیں ہے۔ چار پانچ آیتوں کے حق میں خوب یقین ہوا کہ یا سہواً یا عمداً یہ راہ تحریف تین کی درمیان میں آئیں۔ اگر سارے امور سے قطع نظر کر لیں اور فقط ان کے ارشاد ہی پر اکتفا کریں تو بھی ناظرین با انصاف کو تین باتیں ہاتھ لگتی ہیں۔

پہلی یہ کہ اہل کتاب کا حال یہ ہے کہ باوجودیکہ چار پانچ آیتیں انجیل میں یقیناً محرف ہیں۔ پھر بھی ان تحریف شدہ آیتوں کو اپنے سب ترجموں میں نقل کرتے چلے آتے ہیں۔ ان کی دیانت سے کب بعید ہے کہ اور مواضع میں بھی ان کے

تحریف یقینی ہو مگر چونکہ اس کا اقرار ان کے مقصد کے خلاف ہے اس لیے ان کو چھپاتے ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ اس کو کلام الٰہی بتاتے ہیں۔ دیکھو ساتویں آٹھویں باب پنجم نامہ اول یوحنا میں کسی تثلیثی یار نے تحریف کر کے تثلیث کو ثابت کرنے کے لیے اتنی عبارت اپنی طرف سے بڑھا دی ـــــ جو آسمان پر گواہی دیتے ہیں باپ اور کلام اور رُوح القدس اور یہ تینوں ایک ہیں اور تین ہیں جو زمین پر ـــــ اور اصل میں اتنی عبارت تھی ـــــ تین ہیں جو گواہی دیتے ہیں رُوح پانی اور لہو۔ الخ اور ان جناب اور میزان الحق کے مؤلف نے جو ان کے شریک تھے مجمع عام میں اقرار کیا تھا کہ اس جگہ ہم بھی تحریف مانتے ہیں، باوجود اس کے دافع البہتان والا تثلیث کے ثابت کرنے کو آٹھویں فصل میں ص ۱۲۳ پر یوں لکھتا ہے کہ ـــــ

فی الحقیقت ماہیت الٰہی میں یہ تین باپ بیٹا کلمہ اور رُوح القدس موجود ہیں جیسا کہ یوحنا کے پہلے خط باب پنجم آیت، میں ہے کہ تین ہیں جو گواہی دیتے ہیں آسمان میں، باپ بیٹا اور رُوح القدس یہ تینوں ایک ہیں۔

بہرحال انجیل میں تحریف کی داستان بڑی طویل ہے۔ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اس کے تابوت میں آخری کیل ٹھونک دی ہے اور اظہار الحق میں تحریف لفظی اور معنوی کے لیے بے شمار شواہد پیش کیے ہیں۔

اناجیل اربعہ کی تاریخی حیثیت

تحریف انجیل کے سلسلے میں سرِ راہے یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں ہے کہ جن چار انجیلوں کو کلیسا نے چوتھی صدی میں اعتماد و اعتبار کا سرٹیفیکیٹ دیا ہے۔ خود ان کی تاریخی حیثیت مشکوک ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ ان کے لکھنے والے کون ہیں۔ یہ کب لکھی گئی ہیں اور کس زبان میں لکھی گئی ہیں اور ان کے اصلی نسخے کیسے لاپتہ ہو گئے ؟

آیئے کچھ خیالات اور آرا۔ آپ بھی سن لیجئے۔ "مرشد الطالبین الی الکتاب المقدس الثمین" کے مصنف کا انکشاف ہے کہ

عام مسیحیوں کے اعتقاد کے مطابق متی کی انجیل لوقا، مرقس اور یوحنا سے پہلے لکھی گئی ہے۔ مرقس اور لوقا نے اورو شلیم کی بربادی سے پہلے انجیل قلم بند کی۔

لیکن یہ بات یقین سے نہیں کہی جا سکتی کہ حضرت مسیح کے روانہ ہونے کے بعد یہ کام انہوں نے کون سے سال میں کیا کیونکہ ہم اس معاملہ میں نص الٰہی سے خالی ہاتھ ہیں۔

چونکہ ان کے خیال کے مطابق سب سے پہلے متی نے انجیل لکھی ہے اس لیے متی کی انجیل کے بارے میں پہلے ان کے خیالات کا ہمیں مطالعہ کرنا چاہیے۔ ذخیرۃ الالباب کا مصنف یہ دعویٰ کرنے کے باوجود کہ متی نے انجیل سنہ ۴۱ء میں لکھی ہے یہ بتانے سے قاصر ہے کہ کون سی زبان میں لکھی ہے عبرانی یا سیرو کلدانی۔ پھر یہ بھی بتاتا ہے کہ اسی انجیل کا پھر ترجمہ یونانی زبان میں ہوا ہے اور ترجمہ ہی نے اصل متن کی جگہ لے لی متن غائب ہو گیا اور ترجمہ کو لکھنے والوں کی ہاتھ کی صفائی نے اس قدر مسخ کر دیا کہ کچھ سے کچھ ہو کر رہ گیا۔ ذخیرۃ الالباب ہی کے مصنف نے یہ بھی لکھا ہے کہ متی نے یہ انجیل یروشلیم میں لکھی ہے لیکن یہ حضرت مسیح کی زندگی کی سوانح نہیں ہے بلکہ ایک جدلی روایت ہے۔ ڈاکٹر پوسٹ نے "قاموس کتاب مقدس" میں کھلے لفظوں میں اقرار کیا ہے کہ متی نے انجیل یونانی زبان میں لکھی ہے ان ٹامک ٹوئیوں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان بیچاروں کو فی الواقع یہ معلوم ہی نہیں ہے کہ متی کی انجیل کس زبان میں لکھی گئی ہے۔ متقدمین مسیحی علماء کا خیال ہے کہ یہ انجیل متی نے لکھی ہی نہیں ہے۔

انجیل مرقس کا بھی کچھ یہی حال ہے۔ صاحب ذخیرہ نے مرقس کا جو چہرہ لکھا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مرقس پطرس کا منہ بولا بیٹا اور شاگرد تھا اور ان کی انجیل کچھ متی کی انجیل کے اقتباسات اور کچھ پطرس کے مواعظ پر مشتمل ہے اور کچھ پروٹسٹنٹ متی کی انجیل میں سولھویں فصل کی بارہ آیات کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔

ڈاکٹر پوسٹ کا یہ انکشاف بڑا عجیب ہے کہ مرقس یوحنا ہی کا لقب ہے اور یہودا اور یروشلیم میں پیدا ہوا۔ پولس اور برنابا کے ساتھ تبلیغی سفر میں جا رہا لیکن برجہ نامی مقام پر ان سے جدا ہو گیا۔ اور کہتے ہیں کہ یہی برنابا اور پولس کے باہمی تنازعہ کا باعث بنا۔ بعد ازیں پولس کے ساتھ روم کا سفر کیا ان کی انجیل کی زبان یونانی تھی۔ لیکن ڈاکٹر موصوف بھی نہیں بتا سکے کہ یہ انجیل کب لکھی گئی ہے ہاں ایریناوس کی ایک روایت کے سہارے یہ ضرور لکھا ہے کہ مرقس کی انجیل پطرس اور پولس کی وفات کے بعد وجود میں آئی ہے۔

انجیل لوقا۔ یہ انجیل بھی روایتی اور تاریخی حیثیت سے خود اپنوں میں اتنی مضبوط اور طاقتور نہیں ہے۔ لوقا کے بارے میں صاحب ذخیرہ نے تو یہی بتایا ہے کہ انطاکیہ کا باشندہ تھا لیکن انجیل کے شارحین کہتے ہیں کہ افریقی ہے۔ اور یہ بھی بتانے والے کہتے ہیں کہ بت پرست تھا

اور حق قبول کر لیا تھا۔ پولس کا شاگرد اور اس کا معاون تھا۔ صاحب ذخیرہ ہی نے یہ بھی لکھا ہے کہ متی اور مرقس نے اپنی اناجیل میں حضرت مسیح کی سیرت سے متعلق کچھ احوال منظر انداز کر دیئے تھے۔ بعد میں کچھ لوگوں نے اس کا ترجمہ کیا تو تلبیس اور تدلیس کر کے اس کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا۔ لوگوں کا یہی کردار لوقا کے انجیل لکھنے کا باعث ہوا۔

انجیل یوحنا۔ خود یوحنا کے بارے میں بے حد اختلاف ہے کہ کون ہے۔ ابن زبدی کا شاگرد ہے یا پولس کا، صاحب ذخیرہ فرماتے ہیں کہ یوحنا نے انجیل صرف اس لیے لکھی ہے کہ حضرت مسیح کی الوہیت ثابت کرے اور اناجیل ثلاثہ کی کمی پوری کرے اور اس کی زبان یونانی تھی اور یوحنا نے یہ کام لوگوں کے بہت زیادہ اصرار کے بعد کیا تھا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر لوگ اصرار نہ کرتے تو یوحنا انجیل نہ لکھتا۔ یہ انجیل تناقضات اور اضداد کا پلندہ ہے۔

ان چاروں انجیلوں کا یہ تاریخی اور واقعاتی پس منظر بتا رہا ہے کہ مسیحی دنیا اپنی دینی دستاویز کی حد تک روایت، اسناد متصل اور منقطع سے محروم ہے۔ قرآن کے اس انکشاف کی کہ ونسوا حظا مما ذکروا بہ کیسی واقعاتی تفسیر ہے۔ جو بات آج ہم علم و تحقیق سے معلوم کر رہے ہیں وہ ہی بات نبوت محمدیہ نے زبان وحی سے آج سے چودہ سال پہلے بتا دی ہے۔

اور یہ بھی مزے دار بات ہے اور نبوت محمدیہ کا یہ عجیب اعجاز ہے کہ ساری تحریفات، سارے تصرفات کے باوجود آج بھی انجیل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی بشارات موجود ہیں چنانچہ حضرت یحیٰی کے سلسلے میں ہے:

جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہن اور لاوی یہ پوچھنے کو اس کے پاس آئے کہ تو کون ہے؟ تو اس نے انکار نہ کیا بلکہ اقرار کر لیا کہ میں تو مسیح نہیں ہوں۔ انہوں نے اس سے پوچھا کہ پھر تو کون ہے کیا تو ایلیاہ ہے؟ اس نے کہا میں ایلیاہ نہیں ہوں۔ کیا تو وہ نبی ہے اس نے جواب دیا کہ نہیں۔ پس انہوں نے کہا کہ پھر ہے تو کون؟

(یوحنا ۱۹-۲۲)

انہوں نے سوال کیا کہ اگر تو نہ مسیح ہے نہ ایلیاہ نہ وہ نبی تو پھر بپتسمہ کیوں دیتا ہے

(یوحنا باب ۱-۲۵)

ایک حوالہ اور ملاحظہ فرمائیے۔ حضرت مسیح دنیا سے رخصت ہونے سے پہلے اپنے شاگردوں کو تسلی دیتے ہیں کہ

اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے تو میں باپ سے درخواست
کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔

(یوحنا ۱۴-۱۶)

مددگار کے لفظ اردو انجیل میں وکیل یا شفیع بطور نسخہ کے درج ہے۔ اب آپ ہی سوچئے کہ یہ ابد تک ساتھ رہنے والا مددگار یا شفیع اور وکیل بجز نبی خاتم النبیین کے اور کون ہو سکتا ہے۔ اسی کی تاکید ایک بار پھر حضرت مسیح کی زبان سے ملاحظہ ہو۔

میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ میرا جانا تمہارے لیے فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں
گا تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے گا لیکن اگر میں جاؤں گا تو تمہارے پاس بھیج دوں
گا وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت کے بارے میں قصوروار ٹھہرائے گا۔

(یوحنا ۱۶-۷،۸)

اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ وہ نبی آکر پرانی شریعتیں منسوخ کر دے گا اور نیا قانون، نئی شریعت چلائے گا۔

بہرحال جو کچھ وہ نہیں بھولے اس کچھ میں سے حضور انور کی ذات گرامی کے بارے میں یہ بشارات ہیں ان ہی بشارات کے سہارے قرآن حضور انور کو ان کے لیے جانی پہچانی شخصیت قرار دیتا ہے۔

الذین یعرفونہ کما یعرفون ابناءھم

عیسائیوں کا باہم بغض و عناد

۱۴ - لہٰذا ہم نے قیامت تک کے لیے ان کے درمیان عداوت اور بغض کی آگ بھڑکا دی اور اللہ اُن کے کرتوتوں سے عنقریب ان کو آگاہ کرے گا۔ یعنی باہم نصاریٰ میں یا یہود و نصاریٰ دونوں میں عداوتیں اور جھگڑے ہمیشہ کے لیے قائم ہو گئے۔ آسمانی سبق کو ضائع کرنے اور بھلا دینے کا جو نتیجہ ہونا چاہیے تھا وہ ہوا یعنی جب وحی الٰہی کی اصلی روشنی ان کے پاس نہ رہی تو اوہام و اہواء کے اندھیروں میں ایک دوسرے سے اُلجھنے لگے۔ مذہب تو نہ رہا مگر مذہب کے نام پر جھگڑے رہ گئے بیسیوں فرقے پیدا ہو کر اندھیرے میں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگے۔ یہی فرقہ وارانہ تصادم آخر کار آپس کی شدید ترین عداوت و بغض پر منتہی ہوا۔ کوئی شبہ نہیں کہ آج مسلمانوں میں بھی بیحد تفرق اور تشتت اور مذہبی تصادم موجود ہے لیکن چونکہ ہمارے پاس وحی الٰہی اور قانون سماوی بحمداللہ

بلاکم و کاست محفوظ ہے اس لیے اختلافات کی موجودگی میں بھی مسلمانوں کی بہت بڑی جماعت برابر مرکزِ حق و صداقت پر قائم رہی اور قائم رہے گی۔ اس کے برخلاف یہود و نصاریٰ کے اختلاف مثلاً پروٹسٹنٹ اور رومن کیتھولک وغیرہ فرقوں کی باہم آویزش میں کوئی ایک فریق بھی آج شاہراہ حق و صداقت پر قائم ہے اور نہ قیامت تک قائم ہو سکتا ہے کیونکہ وہ وحی الٰہی کی روشنی کو جس کے بغیر کوئی انسان خدا تعالیٰ اور اس کے قوانین کی صحیح معرفت حاصل نہیں کر سکتا۔ اپنی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں سے ضائع کر چکے ہیں۔ اب جب تک وہ اس محرف بائیبل کے؛ ان سے وابستہ رہیں گے۔ محال ہے کہ قیامت تک ان کو ماننا اور محض بے اصول اختلافات اور فرقہ وار بغض و عناد کی ظلمت سے نکل کر حق کا راستہ دیکھ سکیں اور نجات ابدی کی شاہراہ پر چل سکیں۔ باقی جو لوگ آج نفس مذہب خصوصاً عیسائیت کا مذاق اڑاتے ہیں اور جنہوں نے لفظ مسیحیت یا موجودہ بائیبل کو محض چند سیاسی مصلحتوں کے لیے رکھ چھوڑا ہے۔ اس آیت میں ان نصاریٰ کا ذکر نہیں ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ وہ بھی آیت کے تحت میں داخل ہیں تو ان کی باہمی عداوتیں اور ایک دوسرے کے خلاف ریشہ دوانیاں اور علانیہ محاربات بھی باخبر اصحاب پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

قیامت تک کا لفظ ایسا ہے جیسے ہمارے محاورات میں کہہ دیتے ہیں کہ فلاں شخص تو قیامت تک بھی فلاں حرکت سے باز نہ آئے گا۔ اس کے یہ معنے نہیں ہوتے کہ وہ شخص قیامت تک زندہ رہے گا اور یہ حرکت کرتا رہے گا۔ مراد یہ ہے کہ اگر قیامت تک بھی زندہ رہے تو اس بات کو نہ چھوڑے گا اسی طرح یہاں الیٰ یوم القیامہ کا لفظ آنے سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ یہود و نصاریٰ کا وجود قیامت تک رہے گا جیسا کہ ہمارے زمانے کے بعض مبطلین نے اپنی تفسیر میں لکھ دیا ہے۔ آخر میں ارشاد ہے کہ اللہ ان کے کرتوتوں سے ضرور ان کو خبردار کرے گا یعنی آخرت میں پوری طرح اور دنیا میں بھی بعض واقعات کے ذریعے ان کو اپنی کرتوت کا نتیجہ معلوم ہو جائے گا[1]

یہ نتیجہ بیان ہوا ہے کتاب الٰہی میں تحریف اور اس کے ایک حصہ کو ضائع کر دینے کا ملت کی شیرازہ بندی، اللہ کے میثاق اور اس کی کتاب ہی سے ہوتی ہے۔ اگر اسی میں فساد و اختلال پیدا ہو جائے تو پھر ملت کو فساد و اختلال اور خون خرابے سے کیا چیز بچا سکتی ہے۔ یہ صورت حال عہد شکنی کا قدرتی نتیجہ بھی ہے اور اس جرم کی سزا بھی۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نصاریٰ کے لیے اس سے نجات کی واحد شکل یہ تھی کہ قرآن کی رہنمائی میں ان تاریکیوں سے نکل کر ہدایت کی روشنی اور امن و سلامتی کی شاہراہ پر آجاتے لیکن ان کے تعصب نے ان کو یہ سیدھی راہ اختیار نہ کرنے دی۔ اب نہ کوئی کتاب آنی ہے اور نہ کوئی رسول۔ اس وجہ سے اس جنگ و جدل سے نکلنے کا اب ان کے لیے قیامت تک کوئی امکان باقی نہیں رہا۔

یہ ملحوظ رہے کہ نقض عہد کی یہ تاریخ مسلمانوں کو محض ماضی کی ایک سرگزشت کی حیثیت سے نہیں سنائی جارہی ہے بلکہ اس لیے سنائی جارہی ہے کہ مسلمان اس سے سبق لیں اور یاد رکھیں کہ اگر انہوں نے بھی اپنے میثاق کے ساتھ وہی معاملہ کیا جو یہود و نصاریٰ نے کیا تو ان کا بھی وہی حشر ہوگا جو یہود و نصاریٰ کا ہوا[1]

---

[1] تدبر قرآن

يَٰٓأَهْلَ ٱلْكِتَٰبِ قَدْ جَآءَكُمْ رَسُولُنَا يُبَيِّنُ لَكُمْ كَثِيرًا مِّمَّا كُنتُمْ
تُخْفُونَ مِنَ ٱلْكِتَٰبِ وَيَعْفُوا۟ عَن كَثِيرٍ ۚ قَدْ جَآءَكُم مِّنَ ٱللَّهِ
نُورٌ وَكِتَٰبٌ مُّبِينٌ ﴿١٥﴾ يَهْدِى بِهِ ٱللَّهُ مَنِ ٱتَّبَعَ رِضْوَٰنَهُۥ
سُبُلَ ٱلسَّلَٰمِ وَيُخْرِجُهُم مِّنَ ٱلظُّلُمَٰتِ إِلَى ٱلنُّورِ بِإِذْنِهِۦ وَ
يَهْدِيهِمْ إِلَىٰ صِرَٰطٍ مُّسْتَقِيمٍ ﴿١٦﴾

اے اہلِ کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے، تورات و انجیل کی بہت سی باتیں جن کو تم چھپاتے تھے وہ تم سے صاف صاف بیان کرتا ہے اور بہت سی باتوں سے درگزر کر جاتا ہے۔[۶۲] بلاشبہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی آچکی ہے اور ایسی کتاب آچکی جو روشن اور واضح ہے[۶۳]۔ اللہ اس کے ذریعے ان لوگوں پر جو خدا کی خوشنودی کے پیروکار ہوں، سلامتی کی راہیں کھولتا ہے اور ان کو تاریکیوں سے نکال کر

روشنی میں لاتا ہے اور ان کو سیدھی راہ پر لگا دیتا ہے۔"[۶۴]

اہل کتاب کے لیے علم و بصیرت کی روشنی

روزمرہ کا تجربہ ہے کہ انسان کی ایک سائیکالوجی یہ ہے کہ کسی سلسلۂ حیات کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جائے کہ فرضی اور خیالی ہے یا مشتبہ ہے تو خواہ وہ کسی قدر موثر انداز میں کیوں نہ ہو طبیعتیں اس سے دیرپا اور گہرا اثر نہیں لیتی ہیں، اس لیے ایک کامل سیرت کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے تمام اہم اجزاء کی تاریخیت پر یقین ہو، یہی سبب ہے کہ تاریخی افسانوں سے جو اثر طبیعتوں میں پیدا ہوتا ہے وہ خیالی افسانوں سے نہیں ہوتا۔ دوسرا سبب تاریخی سیرت کے ضروری ہونے کے لیے ضروری یہ ہے کہ آپ اس سیرت کاملہ کا نقشہ محض دلچسپی یا فرصت کے گھنٹوں کی مشغولی کے لیے نہیں پیش کرتے بلکہ اس غرض سے پیش کرتے ہیں کہ آپ اپنی زندگی اس نمونہ پر ڈھالیں اور اس کی پیروی اور تقلید کریں، لیکن وہ زندگی اگر تاریخی اور واقعی طور پر ثابت نہیں تو آپ کیوں کر اس کے قابل عمل ہونے پر زور دے سکتے ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ یہ فرضی اور میتالوجیکل قصے ہیں جن پر کوئی انسان اپنی عملی زندگی کی بنیاد نہیں رکھ سکتا اس لیے پراثر ہونے اور لائق تقلید ہونے کے لیے سب سے پہلے ضروری یہ ہے کہ اس کامل انسان کی سیرت، دعوت، تاریخی اور واقعاتی اعتبار سے بالکل واضح اور صاف ہو۔ تاریکی اور خفا میں نہ ہو۔

ہر ملک، ہر قوم میں ہر زمانے میں کتنے لاکھ انسان خدا کا پیغام لے کر آتے ہیں مگر آج ان میں سے کتنوں کے نام ہم جانتے ہیں اور جتنوں کے نام ہم جانتے بھی ہیں ان کا حال کیا جانتے ہیں۔ سب تاریکی میں ہیں۔ دنیا کی تمام قوموں کو چھوڑ کر صرف اہل کتاب کو دیکھئے۔ ان میں سینکڑوں پیغمبر آتے لیکن نام کے سوا تاریخ نے ان کا کچھ اور حال نہ جانا۔ حضرت اسحاق، حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ کے حالات اور سیرتوں کے ایک ایک حصہ کے علاوہ کیا ہم کو کوئی کچھ بتا سکتا ہے۔ ان کی سیرتوں کے ضروری اجزاء تاریخ کی کڑیوں سے بہرحال تاریکی میں ہیں۔ اب ان کی مقدس زندگیوں کے ادھورے اور غیر مربوط حصے کیا ایک کامل انسانی زندگی کی تقلید اور پیروی کا سامان کر سکتے ہیں۔ یہودیوں کے جن اسفار میں ان کے حالات درج ہیں وہ ان میں سے ہر ایک کی

نسبت محققین کو مختلف شکوک ہیں اور اگر ان شکوک سے ہم قطع نظر بھی کر لیں تو ان کے اندر ان بزرگوں کی تصویریں کس درجہ ادھوری ہیں ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ہم کو تورات سے معلوم ہوتا ہے مگر وہ خود تورات جو آج موجود ہے اہل تحقیق کے بیان کے مطابق جیسا کہ خود مصنفین انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا تسلیم کرتے ہیں، حضرت موسیٰ کے صدہا سال بعد عالم وجود میں آئی ہے ۔ اس پر اب جرمن سکالر نے پتہ لگایا ہے کہ موجودہ تورات میں پہلو بہ پہلو ہر واقعہ کے متعلق دو مختلف صورتوں اور روایتوں کا سلسلہ موجود ہے جو باہم متضاد ہے یہی وجہ ہے کہ تورات کے سوانح و واقعات میں ہر ہر قدم پر تضاد بیانی سے سابقہ پڑتا ہے ۔

حضرت عیسیٰ کے حالات انجیلوں میں درج ہیں مگر ان بہت سی انجیلوں میں سے آج عیسائی دنیا کا بڑا حصہ صرف چار انجیلوں کو تسلیم کرتا ہے باقی اناجیل غیر مستند ہیں ۔ ان چار انجیلوں میں سے ایک انجیل کے لکھنے والے بھی خود حضرت عیسیٰ کو نہیں دیکھا ۔ انہوں نے کس سے سن کر یہ مجموعہ لکھا ۔ یہ بھی معلوم نہیں بلکہ اب تو یہ بھی مشکوک سمجھا جاتا ہے کہ جن چار آدمیوں کی طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے وہ درست بھی ہے یا نہیں ۔ تاریکیوں کے اسی ہجوم میں قرآن کی یہ آیت کہہ رہی ہے کہ واقعاتی لحاظ سے اے اہل کتاب روشنی کا مینار تمہارے پاس اب آچکا ہے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صرف آیا نہیں بلکہ اپنے ساتھ کتاب مبین لایا ہے ۔ اب اس روشنی اور واضح کتاب کے بعد تمہارے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہا ۔ یہ اللہ کی جانب سے اتمام حجت ہے ۔

اللہ کا رسول یہود کی کچھ چوریاں کھولتا ہے

۱۴ ۔ اے اہل کتاب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے ۔ تورات و انجیل کی بہت سی باتیں جن کو تم چھپاتے تھے وہ تم سے صاف صاف بیان کرتا ہے اور بہت سی باتوں سے درگزر کر جاتا ہے ۔ یہ یہود و نصاریٰ کو خطاب ہے کہ وہ نبی آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم جن کی آمد کی بشارت تمہاری کتابوں میں اس قدر تحریف ہونے پر بھی موجود ہیں تشریف لے آئے جن کے منہ میں خدا نے اپنا کلام ڈالا ہے اور جنہوں نے ان حقائق کی تکمیل کی جو حضرت مسیح ناتمام چھوڑ گئے تھے ۔ تورات و انجیل کی جن باتوں کو تم چھپاتے تھے اور بدل کر بیان کرتے تھے ان میں سے سب ضروری باتیں اس نبی آخر الزماں نے ظاہر کر دی ہیں اور جن باتوں کی چنداں ضرورت نہ تھی ان سے درگزر کیا ہے[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

تحریف خواہ تبدیلی الفاظ کی نوعیت کی ہو یا تبدیلی معنے کی نوعیت کی، اس کا اصل مقصد حقیقت پر پردہ ڈالنا اور خلق کی آنکھوں میں خاک ڈالنا ہوتا ہے۔ اس وجہ سے قرآن نے اس کے لیے جامع لفظ اخفار کا استعمال کیا ہے جس کے تحت ان کی لفظی و معنوی تحریفیں بھی آگئیں اور ان کی کتابوں کی وہ آیتیں بھی جن کو اہل کتاب کے علماء اس اندیشے سے عام لوگوں سے چھپاتے تھے کہ ان کے خلاف شریعت اقدام کی پردہ دری نہ ہو یا ان کی بنا پر آخری بعثت کے باب میں ان پر کوئی حجت نہ قائم ہو سکے۔ فرمایا یہ رسول تمہاری بہت سی تحریفات بے نقاب کر رہا ہے اور ایسی بھی بہت سی ہیں جن کو نظر انداز کر رہا ہے اس لیے کہ مقصود اصل حقیقت کو ظاہر کرنا اور شریعت الٰہی کی تجدید و تکمیل ہے نہ کہ تمہاری تذلیل۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پیغمبر تمہاری بعض چوریاں اور خیانتیں کھول دیتا ہے جن کا کھولنا دین حق کے قائم کرنے کے لیے ناگزیر ہے اور بعض سے چشم پوشی اختیار کرتا ہے جن کے کھولنے کی کوئی حقیقی ضرورت نہیں ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ یہ پیغمبر اُمی ہونے کے باوجود تورات و انجیل کے اصل مضامین کو تمہاری اخفائی کار سازیوں کے باوجود وحی الٰہی سے معلوم کر کے ظاہر کر دیتا ہے اور یہ بجائے خود ایک شہادت ہے۔ آپ کے پیغمبرانہ علم کی اور ساتھ ہی پیغمبرانہ اخلاق کا حال یہ ہے کہ ان مضامین کو نظر انداز کر دیتا ہے جن کے اظہار سے بجز مجرموں کی تفضیح کے اور کوئی شرعی غرض وابستہ نہیں زمخشری اور رازی نے یہی مطلب بتایا ہے۔

اسلام کی شانِ کمال

۶۳ - بلا شبہ اللہ کی طرف سے تمہارے پاس روشنی آچکی ہے اور ایسا کتاب آچکی جو روشن اور واضح ہے۔ شاید نور سے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور کتاب مبین سے قرآن حکیم مراد ہے۔ یعنی یہود و نصاریٰ جو وحی الٰہی کی روشنی کو ضائع کر کے ابہام اور اسرار کی تاریکیوں اور باہمی خلاف و شقاق کی وادیوں میں پڑے بھٹک رہے ہیں۔ جس سے نکلنے کا بحالت موجودہ قیامت تک امکان نہیں ہے۔ ان سے کہہ دو کہ خدا کی سب سے بڑی روشنی آگئی اگر نجات ابدی کے صحیح راستہ پر چلنا چاہتے ہو تو اس روشنی میں حق تعالیٰ کی رضا کے پیچھے چل پڑو۔ سلامتی کی راہیں کھلی پاؤ گے اور اندھیرے سے نکل کر اُجالے میں بے کھٹکے چل سکو گے اور جس کی رضا کے تابع ہو کر چل رہے ہو اسی کی دستگیری سے صراط مستقیم کو بے تکلف طے کر لو گے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اگرچہ کچھ شارحین قرآن نے نور اور کتاب مبین میں عطف تفسیری مان کر دونوں سے قرآن مراد لیا ہے مگر ہمارے خیال میں حضرت قتادہ اور زجاج کی بات از روئے بلاغت زیادہ وزنی ہے کہ یہاں نور سے مراد حضور کی ذات گرامی اور کتاب سے مراد قرآن حکیم ہے۔ چونکہ آپ کی زندگی کا ایک ایک عمل قرآن کی ہدایات کا پرتو اور عکس تھا اس لیے یقیناً آپ کی زندگی پوری انسانیت کے لیے روشنی کا سامان ہے قرآن اگر آفتاب ہے تو حضور انور کی ساری زندگی اسی آفتاب کی روشنی ہے۔

اگرچہ دنیا میں انبیاء بہت گزرے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک نے اپنے اپنے وقت میں اپنی اپنی قوموں کے سامنے اس زمانے کے حالات کے مطابق اخلاق عالیہ اور صفات کاملہ کا ایک نہ ایک بلند ترین معیار اور نمونہ پیش کیا۔ کسی نے صبر، کسی نے ایثار، کسی نے زہد غرض ہر ایک نے دنیا میں انسان کی پیچ در پیچ زندگی کے راستہ میں ایک ایک مینار قائم کر دیا ہے جس سے صراط مستقیم کا پتہ لگ سکے مگر ضرورت تھی ایک نور کی جو اس سرے سے لے کر اس سرے تک پوری راہ کو اپنی تعلیمات اور عملی مثالوں سے روشن کر دے گویا ہمارے ہاتھوں میں اپنی عملی اور علمی زندگی کا پورا گائیڈ بک دے دے جس کو لے کر اسی کی تعلیم و ہدایت کے مطابق ہر مسافر بے خطر منزل مقصود کا پتہ لے لے۔ اسی نور کو قرآن نے دوسرے موقعہ پر سراج منیر کہا ہے۔ گویا آپ کی ذات گرامی دنیا میں خدا کی تعلیم و ہدایت کے لیے خود ہمہ تن نور اور چراغ ہے یعنی آپ کی ذات اور آپ کی زندگی راستہ کی روشنی ہے جو راہ کی تاریکیوں کو کافور کر رہی ہے۔

آپ کی تعلیم چونکہ عالمگیر تھی اور قیامت تک زندہ رہنے والی تھی اس لیے آپ کی ذات پاک کو نور، سراج منیر بنا کر روانہ کیا گیا ہے۔ یہ محض دعویٰ نہیں ہے بلکہ یہ وہ واقعہ ہے جس کی بنیاد، دلائل اور شہادتوں پر قائم ہے۔

کسی زندگی کے انسانوں کے لیے نور ہونے کے لیے جو بنیادی اور اہم شرطیں ہیں وہ سب آپ میں موجود ہیں۔ یعنی تاریخیت، جامعیت، کاملیت اور عملیت۔

حضور کے نور ہونے کی پہلی وجہ

تاریخیت سے مقصود یہ ہے کہ ایک کامل شخصیت کے جو سوانح اور حالات پیش کیے جائیں وہ تاریخ اور روایت کے لحاظ سے مستند ہوں۔ ان کی حیثیت قصوں اور کہانیوں کی نہ ہو۔ روزمرہ کا تجربہ ہے کہ انسان کی ایک سائیکالوجی یہ ہے کہ کسی سلسلہ حیات کے متعلق اگر یہ معلوم ہو جائے کہ یہ فرضی اور خیالی ہے یا مشتبہ ہے تو خواہ وہ کس قدر موثر انداز میں ہو طبیعتیں اس سے دیرپا اور

گہرا اثر نہیں لیتی ہیں۔ اس لیے ایک کامل سیرت کے نمونہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے اس کے تمام اہم اجزاء کی تاریخیت پر یقین ہو۔

دوسرا سبب تاریخی سیرت کے نمونہ ہونے کا یہ ہے کہ آپ اس سیرت کا کامل نقشہ محض دلچسپی یا بازمت کے گھنٹوں کی مشغولی کے لیے نہیں پیش کرتے بلکہ اس غرض سے پیش کرتے ہیں کہ ہم اپنی زندگی اس نمونہ پر ڈھالیں اور اس کی پیروی کریں اس لیے کسی شخصیت کے نمونہ ہونے کے لیے سب سے پہلے یہ ضروری ہے کہ اس کی پوری زندگی تاریخی اور روایتی معیار پر پوری ہو۔ ہم تمام انبیاء کرام کا احترام کرتے ہیں اور ان کے پیغمبر ہونے کا یقین رکھتے ہیں لیکن دوام، بقا، ختم نبوت اور آخری کامل سیرت ہونے کی حیثیت سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خاص شرف و امتیاز حاصل ہے وہ دوسرے انبیاء کو اس لیے مرحمت نہیں ہوا کہ ان کو دائمی، آخری پیغمبر نہیں بنایا گیا۔ ان کی زندگیوں کا مقصد ایک خاص قوم کو ایک مقررہ وقت تک نمونہ دینا تھا اس لیے اس زمانہ کے بعد بتدریج وہ دنیا سے ناپید ہو گئیں۔

سامی قوم میں سینکڑوں پیغمبر آئے لیکن نام کے سوا تاریخ نے ان کا اور کچھ حال نہ جانا۔ حضرت نوح، حضرت ابراہیم، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت زکریا، حضرت یحییٰ کے حالات اور سیرتوں کے ایک ایک حصہ کے علاوہ کیا ہم کو کوئی کچھ بتا سکتا ہے۔ ان کی سیرتوں کے ضروری اجزاء تاریخ کی کڑیوں سے بہرحال گم ہیں۔ اب ان کی مقدس زندگیوں کے ادھورے اور نامربوط حصے کیا ایک کامل انسانی زندگی کی تقلید اور پیروی کا سامان بن سکتے ہیں۔ قرآن عزیز کو چھوڑ کر یہودیوں کے جن اسفار میں ان کے حالات درج ہیں ان میں سے ہر ایک کی نسبت محققین کو مختلف شکوک ہیں۔ اگر ان شکوک سے ہم قطع نظر بھی کر لیں تو ان کے اندر ان بزرگوں کی تصویریں کس درجہ ادھوری ہیں۔

حضرت موسیٰ کا حال ہم کو تورات سے معلوم ہوتا ہے مگر وہ خود تورات جو آج موجود ہے اہل تحقیق کے بیان کے مطابق جیسا کہ خود مصنفین دائرۃ المعارف برطانیہ تسلیم کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کے صدہا سال بعد وجود میں آئی، اس پر اب جرمن سکالرس نے پتہ لگایا ہے کہ موجودہ تورات میں پہلو بہ پہلو ہر واقعہ کے متعلق دو مختلف صورتوں اور روایتوں کا سلسلہ ہے جو باہم کہیں کہیں متضاد ہیں۔ اور یہی سبب ہے کہ تورات کے سوانح و واقعات میں ہر قدم پر ہم کو تضاد بیان سے سابقہ پڑتا ہے اس نظریہ کی پوری تفصیل برطانوی دائرۃ المعارف کے آرٹیکل بائبل میں موجود ہے۔ اب ایسی صورت میں حضرت موسیٰ بلکہ آدم سے لے کر حضرت موسیٰ تک کے واقعات کی تاریخی حیثیت کیا رہ جاتی ہے۔

حضرت عیسٰی کے حالات اناجیل میں درج ہیں مگران بہت سی انجیلوں میں سے آج عیسائی دنیا کا بڑا حصہ صرف چار انجیلوں کو مانتا ہے باقی انجیل طفولیت انجیل برنا باس وغیرہ نامستند ہیں ان چار انجیلوں میں سے ایک انجیل کے لکھنے والے نے بھی حضرت عیسٰی کو خود نہیں دیکھا تھا۔ انہوں نے کسی سے سن کر حالات کا یہ مجموعہ لکھا۔ یہ بھی معلوم نہیں بلکہ اب تو یہ بھی مشکوک ہے کہ جن چار آدمیوں کی طرف ان کی نسبت کی جاتی ہے۔ وہ صحیح بھی ہے یہ بھی واضح طور پر ثابت نہیں ہے کہ وہ کن زبانوں میں اور کن زمانوں میں لکھی گئیں۔ سنہ۶۰ء سے لے کر بعد کے مختلف سالوں تک مختلف مفسرین اناجیل ان کی تصنیف کا زمانہ بتاتے ہیں۔ حضرت عیسٰی کی پیدائش، روانگی اور تثلیث کی تعلیم دیکھ کر اب بعض امریکی ناقدین کا فیصلہ یہ ہے کہ حضرت عیسٰی کا وجود محض فرضی ہے۔ اس بیان سے عیسائی روایتوں کے ذریعہ سے حضرت عیسٰی کی زندگی کی تاریخی حیثیت کتنی کمزور معلوم ہوتی ہے۔

حضور کے نور ہونے کی دوسری وجہ

کسی شخصی سیرت کے نور بننے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ اس کے صحیفہ حیات کے تمام حصے منظر عام پر ہوں۔ کوئی واقعہ پردہ راز اور ناواقفیت کی تاریکی میں نہ ہو۔ بلکہ اس کے تمام سوانح اور حالات زندگی روز روشن کی طرح دنیا کے سامنے ہوں تاکہ معلوم ہو سکے کہ اس کی سیرت کہاں تک انسانی سوسائٹی کے لیے ایک آئیڈیل زندگی کی صلاحیت رکھتی ہے۔

اس معیار پر اگر شارعین ادیان اور بانیان مذاہب کے سوانح اور سیرتوں پر نظر ڈالو تو معلوم ہوگا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا اور کوئی ہستی اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ اسی سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ خاتم الانبیاء ہوکر دنیا میں تشریف لائے تھے۔

انبیاء سابقین میں سب سے مشہور زندگی حضرت موسٰی علیہ السلام کی ہے، موجودہ تورات کے مستند یا غیر مستند ہونے کی بحث سے قطع نظر کرکے ہم اس کے بیانات کو بالکل صحیح تسلیم کیے لیتے ہیں۔ تاہم تورات کی پانچوں کتابوں سے ہم کو حضرت موسٰی کی زندگی کے کس قدر اجزاء ہاتھ آتے ہیں۔ جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ حضرت موسٰی پیدا ہوکر فرعون کے گھر پرورش پاتے ہیں۔ جوان ہوکر فرعونیوں کے مظالم کے خلاف بنی اسرائیل کی ایک دو موقعوں پر مدد کرتے ہیں۔ پھر مصر سے مدین آتے ہیں۔ یہاں شادی ہوتی ہے اور ایک عرصہ تک یہاں زندگی بسر کرکے مصر واپس جاتے ہیں۔ راہ میں نبوت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ فرعون کے پاس پہنچتے ہیں، معجزات دکھاتے ہیں اور بنی اسرائیل کو

مصر کو رے جانے کی رخصت چاہتے ہیں، رخصت نہیں ملتی۔ بالآخر غفلت میں اپنی قوم کو لے کر نکل جاتے ہیں۔ خدا کے حکم سے سمندر میں ان کو راہ مل جاتی ہے۔ فرعون غرق ہو جاتا ہے اور وہ اپنی قوم کو لے کر عرب اور شام میں داخل ہوتے ہیں۔ کافر باشندوں سے لڑائیاں پیش آتی ہیں۔ اسی حالت میں جب وہ بہت بوڑھے ہو جاتے ہیں تو ایک پہاڑی پر ان کی وفات ہو جاتی ہے۔ تورات استثنار کے اختتامی فقرے میں ہے۔

سو خداوند کا بندہ موسیٰ خداوند کے حکم کے موافق موآب کی سرزمین میں مرگیا۔
اس نے لسے موآب کی ایک وادی میں بیت فغور کے مقابل گاڑا۔ پھر آج کے دن تک
کوئی اس کی قبر کو نہیں جانتا اور موسیٰ اپنے مرنے کے وقت ۱۲۰ برس کا تھا اور اب
تک موسیٰ کے مانند بنی اسرائیل میں کوئی نبی نہیں پیدا ہوا۔

حضرت موسیٰ نے ایک سو بیس برس عمر پائی مگر غور کر کر ایک سو بیس برس کی عمر کے طویل زمانے کی وسعت کو بھر سکنے کے لیے ہم کو حضرت موسیٰ کے کیا واقعات معلوم ہیں۔ اور ان کے سوانح کے ضروری اجزار ہمارے ہاتھ میں کیا ہیں۔ پیدائش، جوانی میں ہجرت، شادی اور نبوت کے واقعات معلوم ہیں۔ پھر چند لڑائیوں کے بعد بڑھاپے میں ۱۲۰ برس کی عمر میں ان کی وفات کی خبر ہے اور بس۔ ان واقعات کو جانے دیجیے یہ تو شخصی حالات ہیں جو ہر شخص کی زندگی میں الگ الگ پیش آتے ہیں۔ انسان کو اپنی سوسائٹی کے عملی نمونہ کے لیے جن اجزار کی ضرورت ہے وہ اخلاق و عادات اور زندگانی کے طور طریقے ہیں اور یہی اجزار حضرت موسیٰ کی پیغمبرانہ سوانح عمری سے گم ہیں۔ ورنہ عام جزوی حالات یعنی اشخاص کے نام و نسب، مقامات کے پتے، مردم شماریاں اور قانونی اقوال بہت کچھ تورات میں مذکور ہیں۔ مگر یہ معلومات خواہ جغرافیہ، نسب ناموں اور قانون دانی کے لیے کسی قدر ضروری کیوں نہ ہوں مگر عملی حیثیت سے بالکل بے کار اور اجزائے سوانح کی قابلیت سے معرا ہیں۔

اسلام سے قرب العہد پیغمبر حضرت عیسیٰ ہیں جن کے پیرو آج یورپ میں مردم شماری کے مطابق تمام دوسرے مذاہب کے پیروؤں سے زیادہ ہیں۔ مگر یہ سن کر آپ کو حیرت ہوگی کہ اسی مذہب کے پیغمبر کی زندگی کے اجزار تمام دوسرے مذاہب کے بانیوں اور پیغمبروں کے سوانح سے سب سے کم معلوم ہیں۔ آج عیسائی یورپ کے تاریخی ذوق کا یہ حال ہے کہ وہ بابل اسیریا، عرب و شام، مصر و افریقہ، ہندوستان و ترکستان کے ہزارہا برس کے واقعات کتابوں اور کتبوں کو پڑھ کر اور کھنڈروں اور پہاڑوں اور زمین کے طبقوں کو کھود کر منظر عام پر لا رہا ہے اور دنیا کی تاریخ کے گم شدہ اوراق از سر نو ترتیب

لے رہا ہے مگر اس کا مسیحائی معجزہ جس چیز کو زندہ نہیں کر سکتا وہ خود حضرت عیسٰی کی زندگی کے مدفون واقعات ہیں۔ پروفیسر انبان نے کیا خوب کہا کہ حضرت عیسٰی کی زندگی ۳۳ برس کی تھی۔ موجودہ انجیلوں کی روایتیں اوّلاً تو نامعتبر ہیں اور جو کچھ ہیں وہ صرف ان کے آخری تین سالوں کی زندگی پر مشتمل ہیں۔ ہم کو ان کی تاریخی زندگی کے صرف یہ حصے معلوم ہیں کہ وہ پیدا ہوئے اور پیدائش کے بعد مصر لائے گئے۔ لڑکپن میں ایک دو معجزے دکھاتے، اس کے بعد وہ غائب ہو جاتے ہیں اور پھر یکایک تیس برس کی عمر میں بپتسمہ دیتے ہیں اور پہاڑوں اور دریاؤں کے کناروں ماہی گیروں کو وعظ کہتے نظر آتے ہیں چند شاگرد پیدا ہوتے ہیں۔ یہودیوں سے چند مناظرے ہوتے ہیں۔ یہودی ان کو پکڑ دیتے ہیں اور رومی گورنر کی عدالت میں مقدمہ پیش ہوتا ہے اور پھانسی ہو جاتی ہے۔ تیسرے دن ان کی قبر ان کی لاش سے خالی نظر آتی ہے۔ تیس برس اور کم از کم پچیس برس کا زمانہ کہاں گزرا اور کیوں کر گزرا۔ دنیا اس سے ناواقف ہے اور رہے گی۔ ان تین آخری برسوں کے واقعات میں بھی کیا ہے؟ معاعظ، چند معجزے اور پھر سُولی۔

حضور کے نُور ہونے کی تیسری وجہ

کسی شخصیت کے نُور ہونے کے لیے تیسری ضروری شرط جامعیت ہے۔ جامعیت سے مقصود یہ ہے کہ مختلف طبقات انسانی کو اپنی ہدایت اور روشنی کے لیے جن نمونوں کی ضرورت ہوتی ہے یا ہر فرد انسان کو اپنے مختلف تعلقات و روابط اور فرائض و واجبات کو ادا کرنے کے لیے جن مثالوں اور نمونوں کی حاجت ہوتی ہے وہ سب اس آئیڈیل زندگی کے آئینے میں موجود ہوں۔ اس نقطۂ نگاہ سے بھی دیکھیے تو معلوم ہوگا کہ سوائے خاتم الانبیاء علیہ السلام کے کوئی دوسری شخصیت اس معیار پر پوری نہیں اترتی۔ دین کیا ہے؟ خدا اور بندوں اور باہم بندوں کے جو فرائض و واجبات ہیں۔ ان کو تسلیم کرنا اور ادا کرنا، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جا سکتا ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی بجا آوری کا نام دین ہے، اس لیے ہر دین کے پیروؤں کا فرض ہے کہ وہ اپنے اپنے پیغمبروں اور بانیوں کی سیرتوں میں ان حقوق و فرائض اور واجبات کی تفصیلات تلاش کریں اور ان کے مطابق اپنی زندگی کو اس قالب میں ڈھالنے کی کوشش کریں۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں حیثیتوں سے جب آپ تفصیلات ڈھونڈیں گے تو وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا آپ کو کہیں نہیں ملیں گی۔

مذاہب دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ جن میں خدا کو یا تو تسلیم ہی نہیں کیا گیا ہے جیسے بدھ اور

چین کے متعلق کہا جاتا ہے اس لیے ان مذاہب میں خدا اور اس کی ذات وصفات اور دیگر حقوق الٰہی کا پتہ ہی نہیں اور اس لیے ان کے بانیوں میں محبت الٰہی، خلوص، توحید پرستی وغیرہ کی تلاش ہی بیکار ہے۔ دوسرے وہ مذاہب ہیں جنہوں نے خدا کو کسی نہ کسی رنگ میں تسلیم کیا ہے۔ ان مذاہب کے انبیاء اور بانیوں کی زندگیوں میں بھی خدا طلبی کے واقعات مفقود ہیں۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں جو لوگ عقائد کیا ہوں اور ان کے کیا تھے اور ان عقائد پر ان کو کس حد تک عملاً یقین تھا اس کی تفصیل سے ان کی زندگیاں بالکل خالی ہیں۔ پوری تورات پڑھ جاؤ، خدا کی توحید اور اس کے احکام اور قربانی کے شرائط کے علاوہ تورات کی پانچ کتابوں میں کوئی ایسا فقرہ نہیں ہے جس سے یہ معلوم ہو کہ حضرت موسیٰ کے تعلقات قلبی اور طاعت وعبادت اور خدا پر توکل و یقین، خدا کے صفات کاملہ والٰہیہ کی جلوہ گری ان کے قلب اقدس میں کہاں تک تھی۔ حالانکہ اگر موسوی مذہب ہمیشہ کے لیے اور آخری مذہب کے طور پر آیا ہوتا تو اس کے پیروؤں کا فرض تھا کہ وہ ان واقعات کو قید تحریر میں لاتے۔ مگر اللہ سبحانہ کی مصلحت یہ نہ تھی اس لیے ان سے یہ کام نہ ہو سکا۔

حضرت عیسیٰ کی زندگی کا آئینہ انجیل ہے۔ انجیل میں ایک مسئلہ کے علاوہ کہ خدا حضرت عیسیٰ کا باپ تھا ہم کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ اس دنیاوی زندگی میں اس مقدس باپ اور بیٹے میں کیا تعلقات تھے۔ بیٹے کے اقرار سے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ باپ کو بیٹے سے بڑی محبت تھی مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ بیٹے کو باپ سے کس قدر محبت تھی۔ وہ کہاں تک اپنے باپ کی اطاعت کرتا تھا۔ وہ اس کے آگے کبھی شب و روز میں جھکتا بھی تھا، اور آج کی روٹی کے علاوہ کوئی اور چیز بھی کبھی اس نے اس سے مانگی ہے۔ گرفتاری کی رات سے پہلے کوئی ایک رات بھی اس پر ایسی گزری جب وہ باپ کے حضور میں دعا مانگ رہا ہو۔ پھر ایسی سیرت سے ہم روحانی حیثیت سے کیا فائدہ اٹھا سکتے ہیں؟ اگر حضرت عیسیٰ کی سیرت میں خدا اور بندے کے تعلقات واضح ہوتے تو ساڑھے تین سو برس کے بعد پہلے عیسائی بادشاہ کو مسیں میں تین سو عیسائی علماء کی مجلس اس کے فیصلے کے لیے فراہم کرنی پڑتی اور وہ اب تک ایک ناقابل فہم راز نہ بنے رہتے۔

اب حقوق عباد کو لیجئے تو اس سے بھی حضرت خاتم النبیین کے سوا تمام دیگر انبیاء اور بانیان مذاہب کی سیرتیں خالی ہیں۔

حضرت موسیٰ کی زندگی کا ایک ہی پہلو　　　نہایت واضح ہے اور وہ جنگ اور سپہ سالاری کا پہلو ہے، ورنہ اس کے علاوہ ان کی سیرت کی پیروی کرنے والوں کے لیے دنیوی

حقوق واجبات فرائض اور ذمہ داریوں کا کوئی نمونہ موجود نہیں ہے۔ میاں بیوی باپ بیٹے بھائی بہن، دوست واحباب کے متعلق ان کا کیا طرزِ عمل تھا۔ صلح کے فرائض میں ان کا کیا دستور تھا۔ اپنے مال و دولت کو کن مفید کاموں میں انہوں نے لگایا۔ بیماروں، یتیموں، مسافروں اور غریبوں کے ساتھ ان کا برتاؤ کیا تھا اور ان کے ماننے والے ان امور میں ان کی زندگی کی مثالوں سے کیوں کر فائدہ اٹھائیں۔ حضرت موسیٰ بیوی رکھتے تھے بچے رکھتے تھے، بھائی رکھتے تھے، دوسرے اعزہ اور متعلقین رکھتے تھے اور ہمارا اعتقاد ہے کہ ان کا پیغمبرانہ طرزِ عمل بلاشبہ ہر حرف گیری سے پاک ہوگا مگر ان کی موجودہ سیرت کی کتابوں میں ہم کو یہ ابواب نہیں ملتے جو ہمارے لیے قابلِ تقلید اور نمونہ ہوں۔

حضرت عیسیٰ کی ماں تھیں اور انجیل کے بیان کے مطابق ان کے بھائی بہن بھی تھے مگران کی زندگی کے واقعات ان عزیزوں اور رشتہ داروں کے ساتھ ان کا تعلق، طرزِ عمل، سلوک اور برتاؤ نہیں ظاہر کرتے۔ حالانکہ دُنیا ہمیشہ انہی تعلقات سے آباد رہی ہے اور رہے گی۔ مذہب کا بڑا حصہ انہی کی متعلقہ ذمہ داریوں کے ادا کرنے کا نام ہے۔ علاوہ ازیں حضرت عیسیٰ نے مکومی کی زندگی بسر کی اس لیے ان کی سیرت تمام حاکمانہ فرائض کی مثالوں سے خالی ہے۔ وہ متاہل یعنی بیوی بچوں والے نہ تھے اس لیے میاں بیوی کے لیے حضرت عیسیٰ کی زندگی میں تقلید کا کوئی سامان نہیں ہے اور چونکہ دُنیا کی بیشتر آبادی متاہلانہ زندگی رکھتی ہے اس لیے اس کے معنے یہ ہیں کہ دُنیا کے بیشتر حصہ آبادی کے لیے ان کی سیرت نمونہ نہیں بن سکتی، جس نے گھر بار، اہل وعیال، مال و دولت، صلح و جنگ، دوست اور دشمن کے تعلقات سے کبھی واسطہ نہ رکھا ہو وہ اس دُنیا کے لیے جو ان ہی تعلقات سے معمور ہے کیوں کر مثال ہو سکتا ہے۔ اگر آج دُنیا یہ زندگی اختیار کرے تو کل وہ سنسان قبرستان بن جاتے، تمام ترقیاں دفعتہً رک جائیں اور یورپ تو شاید ایک منٹ بھی زندہ نہ رہے۔

حضورِ اقدس کے نمونہ ہونے کی چوتھی وجہ

زندگی کے نمونہ ہونے کا سب سے آخری معیار عملیت ہے۔ عملیت سے مقصود یہ ہے کہ شارعِ دین اور ربانی مذہب جس تعلیم کو پیش کر رہا ہے خود اس کا ذاتی عمل اس کی مثال اور نمونہ ہو اور خود اس کے عمل نے اس کی تعلیم کو عملی یعنی قابلِ عمل ثابت کیا ہو۔

خوش کن سے خوش کن فلسفہ، دلچسپ سے دلچسپ نظریہ اور خوش آئند سے خوش آئند اصول ہر شخص ہر وقت پیش کر سکتا ہے لیکن جو چیز ہر شخص ہر وقت پیش نہیں کر سکتا وہ عمل ہے۔

انسانی سیرت کے بہتر اور کامل ہونے کی دلیل اس کے نیک اور معصوم اقوال، خیالات اور اخلاقی فلسفیانہ نظریے نہیں بلکہ اس کے اعمال اور کارنامے ہیں۔ اگر یہ معیار قائم نہ کیا جاتے تو اچھے اور بُرے کی تمیز اُٹھ جاتی اور دُنیا صرف بات بنانے والوں کا مسکن رہ جاتی۔ بتائیے کہ آج لاکھوں بانیانِ مذاہب میں سے کس کی زندگی کو آپ اس ترازو پر تول سکتے ہیں؟ یہ نصیحتیں پڑھیے۔

تو اپنے خداوند خدا کو اپنی ساری جان و مال سے پیار کر تو دشمن کو پیار کر، جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے تو اس کے سامنے اپنا بایاں گال کر دے۔ جو تجھ کو ایک میل بیگار لے جائے تو اس کے ساتھ دو میل جا۔ جو تیرا کوٹ مانگے تو اس کو کرتا بھی دے دے۔ تو اپنے تمام مال و اسباب کو خدا کی راہ میں دے دے، تو اپنے بھائی کو ستر بار معاف کر۔ آسمان کی بادشاہت میں دولتمند کا داخل ہونا مشکل ہے یہ اور اسی قسم کی نصیحتیں نہایت دل خوش کن ہیں مگر عمل سے ان کی تصدیق ہو تو وہ سیرت کا ٹکڑا نہیں بلکہ معصومانہ شیریں بیانی کا شاہکار ہیں، جس نے اپنے دشمن پر قابو نہ پایا ہو وہ عفو کی عملی مثال کیسے پیش کر سکتا ہے، جس کے پاس خود کچھ نہ ہو وہ غریبوں اور مسکینوں اور یتیموں کی مدد کیوں کر کر سکتا ہے۔ جو عزیز و اقارب بیوی بچے نہ رکھتا ہو وہ ان ہی تعلقات سے دُنیا کے لیے نمونہ کیوں کر بن سکتا ہے۔ جس نے بیماروں کی تیمارداری اور عیادت نہ کی ہو وہ اس کا وعظ کیونکر کہہ سکتا ہے جس کو خود دوسروں کے معاف کرنے کا موقعہ نہ ملا ہو اس کی زندگی ہم میں سے غضب ناک اور غصہ والوں کے لیے اسوہ کیوں کر بنے گی۔

نیکیاں دو قسم کی ہوتی ہیں ایک سلبی اور ایک ایجابی مثلاً آپ پہاڑ کے ایک غار میں جا کر عمر بھر کے لیے بیٹھ گئے تو صرف یہ کہنا صحیح ہوگا کہ بدیوں اور برائیوں سے آپ نے پرہیز کیا۔ یعنی آپ نے کوئی کام ایسا نہیں کیا جو آپ کے لیے قابلِ اعتراض ہو مگر یہ تو سلبی تعریف ہوتی۔ ایجابی پہلو آپ کا کیا ہے، کیا اپنے غریبوں کی مدد کی، محتاجوں کو کھانا کھلایا، کمزوروں کی حمایت کی، ظالموں کے مقابلے میں حق گوئی سے کام لیا، گرتوں کو سنبھالا، گمراہوں کو راستہ دکھایا۔ عفو و کرم، سخا، معاف نوازی، حق گوئی، رحم، حق کی نصرت کے لیے جوش، جدوجہد، مجاہدہ، اداۓ فرض، ذمہ داریوں کی بجا آوری غرض تمام وہ اخلاق جن کا تعلق عمل سے ہے۔ صرف سلبِ فعل اور عدمِ عمل سے نیکیاں نہیں بن جائیں گی۔ نیکیاں صرف سلبی پہلو ہی نہیں رکھتیں۔ زیادہ تر ایجابی اور عملی پہلو پر ان کا مدار ہوتا ہے۔ اس تقریر سے ظاہر ہوگا کہ جس زندگی کا عملی حصہ سامنے نہ ہو اس کو "نمونہ" کا خطاب نہیں دیا جا سکتا کہ انسان زندگی کی مختلف شاخوں میں اس سے کیوں کر روشنی حاصل کرے گا۔ ہمیں تو

صلح و جنگ، فقر و دولت، ازدواج و تجرد، تعلقات خداوندی، تعلقات عباد، حاکمیت و محکومیت، سکون و غضب، جلوت و خلوت غرض زندگی کے ہر پہلو کے متعلق عملی مثال چاہیے۔ دنیا کا بیشتر بلکہ تمام تر حصہ ان ہی مشکلات اور تعلقات میں اُلجھا ہوا ہے۔ اس لیے انسانیت کو ان ہی مشکلات کے حل کرنے اور ان ہی تعلقات کو بوجہ احسن انجام دینے کے لیے عملی مثالوں کی ضرورت ہے۔ اس معیار پر بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ کوئی دوسری زندگی پوری نہیں اترتی۔ بہرحال کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس آیت میں نور اس لیے کہا گیا ہے کہ آپ کی زندگی کے لشکر میں چار باتیں پائی جاتی ہیں، تاریخیت، جامعیت، کاملیت اور عملیت اور دوسرے انبیاء کی زندگیاں ان خصوصیات سے خالی تھیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان کی سیرتیں جو ان کے بعد عام انسانوں تک پہنچیں یا جو آج موجود ہیں وہ ان خصوصیات سے خالی ہیں اسی لیے آپ کی نورانیت کو جتانے کے لیے قرآن نے خاص طور پر اہل کتاب کو مخاطب کیا ہے۔ اور ایسا ہونا مصلحتِ الٰہی کے مطابق تھا، تاکہ یہ ثابت ہوسکے کہ وہ انبیاء محدود زمانہ اور متعین قوموں کے لیے تھے اس لیے ان کی سیرتوں کو دوسری قوموں اور آئندہ تک محفوظ رہنے کی ضرورت نہ تھی۔ صرف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تمام دنیا کی قوموں کے لیے اور قیامت تک کے لیے نمونہ بنا کر بھیجے گئے تھے اس لیے آپ کی زندگی کو ہر حیثیت سے مکمل جامع، دائمی اور ہمیشہ رہنے کی ضرورت تھی اور یہی نور ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ آپ کی ذات علم و عمل کا مجموعہ ہے۔ آپ کا عمل نور ہے اور آپ کا علم کتاب مبین ہے۔ آپ کا علم انسان کو اگر ذہنی تاریکیوں سے نکالتا ہے تو آپ کی سیرت زندگی کے لیے عمل کی صحیح شاہراہ متعین کرتی ہے۔ اس وجہ سے آپ کی سیرت نور ہے اور آپ کا علم کتاب مبین ہے۔ اہل کتاب کو اللہ سبحانہ نے جو روشنی عطا فرمائی تھی اس کو ضائع کر کے وہ تاریکیوں میں گم ہو گئے تھے اصل حقیقت گم تھی اور شاہراہ ناپید تھی[1]

نبوت کے علم و عمل کا مقصد

۶۴۔ اللہ اس کے ذریعے ان لوگوں پر جو خدا کی خوشنودی کے پیروکار ہوں سلامتی کی راہیں کھولتا ہے اور ان کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لاتا ہے اور ان کو سیدھی راہ پر لگاتا ہے۔

---

[1] خطبات۔

سلامتی کی راہوں سے مراد غلط بینی، غلط اندیشی اور غلط کاری سے بچنا اور اس کے نتائج سے محفوظ رہنا ہے جو شخص نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے روشنی حاصل کرتا ہے اسے فکر و عمل کے ہر پہلو پر یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ وہ کس طرح ان غلطیوں سے محفوظ ہے۔ یہ گویا نبوت کے علم و عمل کا مقصد بتایا گیا ہے کہ نبوت کا علم و عمل اس لیے آیا ہے کہ اگر تم اسے اپنایا تو یہ تم کو امن و سلامتی کی راہ پر لگائے گا اور تاریکی سے نکال کر روشنی میں، کج روی اور ضلالت کی وادیوں سے نکال کر اللہ کی صراط مستقیم پر چلائے گا۔ بشرطیکہ تم خدا کی خوشنودی کے طالب ہو اور اپنے تعصبات کی پٹیاں اپنی آنکھوں سے کھول کر اس روشنی کو دیکھو اور اس کی قدر کرو۔ یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ جن میں رضائے الٰہی کی جستجو نہ ہو بلکہ وہ اپنی خواہشات کے پرستار بنے رہیں اس کے لیے توفیق کا دروازہ نہیں کھلتا۔ باذنہٖ کے لفظ سے اسی قانون کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی یہ سعادت خدا کے اذن سے حاصل ہوتی ہے اور یہ اذن ان کے لیے ہوتا ہے جن کے اندر رضائے الٰہی کی جستجو ہو۔[1] مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ اصل مقصود طلبِ رضا ہے دخول جنت اس کے تابع ہے۔ اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ ہر قسم کی سلامتی کی راہیں کھلنے کی بنیادی شرط نبوّت کے علم و عمل سے وابستگی ہے فکری بھی اور عملی بھی۔ مطلب یہ ہے کہ نبوّت کے علم و عمل پر ایمان اطاعت کے بغیر صرف آخرت ہی میں جنّت نہیں دُنیا میں بھی سلامتی کی راہیں نہیں کھلتی ہیں۔ یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ افراد کو بھی اپنی انفرادی زندگیوں کی دنیوی فلاح مثلاً امن و سکون، عزت و محبوبیت اور ضروریاتِ زندگی وغیرہ اسی وقت ملے گی جب وہ اپنی حد تک ایسے خدا شناس، آخرت پسند اور رضائے الٰہی کے طالب ہوں جیسا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے نبی کریم صلی اللہ علیہ السلام نے اسی حقیقت کی وضاحت کی تھی جب آپ نے یہ فرمایا تھا:

> جس نے اپنی کل کی فکر ایک ہی فکر، اپنی آخرت کی فکر، کو اپنا لیا، اللہ تعالیٰ اس کی دُنیا کا انتظام کر دینے کے لیے کافی ہے۔ اور جس کے ذہن کو بے شمار افکار، دُنیا کے افکار و معاملات، نے منتشر کر رکھا ہو اللہ کو اس کی کوئی پرواہ نہیں کہ وہ اس دُنیا کی کس گھاٹی میں ہلاک ہو رہا ہے۔
>
> (مشکوٰۃ بحوالہ ابن ماجہ)

---

[1] تدبر قرآن۔

ایک اور ارشادِ نبوی پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے کہ :

جو شخص آخرت کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے معاملات کو درست کر دیتا ہے اور اس کے دل کو غنی بنا دیتا ہے اور دنیا تابع فرمان بن کر اس کے حضور کھڑی ہوتی ہے۔

اسی طرح اُمت کو بھی اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح اور اس میں سلامتی کی راہیں اسی وقت میسّر آسکتی ہیں جب وہ اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع رضائے الٰہی کی طالب ہو۔ یعنی ایک طرف تو اس کی ترکیب ایسے افراد سے ہو جو نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے وابستہ ہوں۔ دوسری طرف اس میں وہ مضبوط اجتماعی تنظیم ہو جس کے بغیر کوئی جماعت جماعت نہیں ہو سکتی ہے۔

لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ هُوَ الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۚ
قُلْ فَمَنْ يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَنْ يُهْلِكَ
الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَنْ فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا ۗ وَ
لِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۚ يَخْلُقُ مَا
يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝ وَقَالَتِ الْيَهُودُ
وَالنَّصَارَىٰ نَحْنُ أَبْنَاءُ اللَّهِ وَأَحِبَّاؤُهُ ۚ قُلْ فَلِمَ يُعَذِّبُكُمْ
بِذُنُوبِكُمْ ۖ بَلْ أَنْتُمْ بَشَرٌ مِمَّنْ خَلَقَ ۚ يَغْفِرُ لِمَنْ
يَشَاءُ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَلِلَّهِ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَ
مَا بَيْنَهُمَا ۖ وَإِلَيْهِ الْمَصِيرُ ۝ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ قَدْ جَاءَكُمْ رَسُولُنَا
يُبَيِّنُ لَكُمْ عَلَىٰ فَتْرَةٍ مِنَ الرُّسُلِ أَنْ تَقُولُوا مَا جَاءَنَا
مِنْ بَشِيرٍ وَلَا نَذِيرٍ ۖ فَقَدْ جَاءَكُمْ بَشِيرٌ وَنَذِيرٌ ۗ وَ
اللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ۝

بلاشبہ ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ مریم کا بیٹا مسیح
ہے۔ تم ان لوگوں سے کہہ دو اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس

کی ماں کو اور روئے زمین پر جتنے انسان ہیں سب کو ہلاک کر دینا چاہے تو کون ہے جو اس کی پادشاہی میں دخل دینے کی جرأت کرے۔[۲۶] آسمان و زمین کی اور جو کچھ ان میں ہے سب کی سلطانی اللہ ہی کے لیے ہے جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا ہے اور ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔[۲۷] اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔[۲۸] آپ فرما دیجیے کہ بتاؤ پھر اللہ تم کو تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں دیتا رہا ہے[۲۹]، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اسکے پیدا کیے ہوئے انسانوں میں سے تم بھی انسان ہو۔[۳۰] اللہ جسے چاہتا ہے بخش دے جسے چاہے عذاب دے، آسمانوں کی زمین کی اور اس سب کی جو ان کے درمیان ہیں مالکی و سلطانی صرف اسی کے لیے ہے اور سب کو بالآخر اسی کی طرف لوٹنا ہے۔[۳۱] اے اہل کتاب ایسی حالت میں کہ رسولوں کا ظہور مدتوں

سے بند تھا ہمارا رسول تمہارے پاس آیا وہ تمہارے سامنے احکام
کھول کر بیان کر رہا ہے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہماری طرف کوئی رسول
نہیں بھیجا گیا نہ بشارت دینے والا اور نہ ڈرانے والا، تو اب دیکھو
بشارت دینے والا اور متنبہ کرنے والا تمہارے پاس آگیا ہے
اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے ۔[۴۲]

توحید کے متعلق غلط فہمیاں

اللہ سبحانہٗ کو، اللہ کی صفتوں کو، خدا اور بندوں کے باہمی تعلق کو واضح کرنے کے لیے خیالی یا مادی تشبیہیں اور تمثیلیں مذاہب میں خوش اعتقادی کی پیداوار ہیں۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ اصل خدا تو جاتا رہا اور اس کی جگہ یہ تشبیہیں اور تمثیلیں رہ گئیں اللہ سبحانہٗ کو اپنے بندوں کے ساتھ جو لطف و کرم اور محبت و پیار ہے اس کو تشبیہ و تمثیل کے رنگ میں ادا کر کے مجسم کر دیا گیا۔ آرین قوموں میں چونکہ عورت محبت کی دیبی ہے اس لیے خدا اور بندے کے تعلق کو ماں اور بیٹے کے لفظ سے ادا کیا گیا اور اس لیے خدا ماتا کی شکل میں آگیا۔ بعض دوسرے ہندو فرقوں میں اس بے کیف محبت کو زن و شو اور میاں بیوی کے الفاظ میں ظاہر کیا گیا۔ سدا سہاگ فقیروں نے ساڑھی اور چوڑی پہن کر اسی حقیقت کو نمایاں کیا ہے رومیوں اور یونانیوں میں بھی عورت ہی کی شکل میں خدا ظاہر ہوا ہے۔ سامی قوموں میں عورت کا برملا ذکر تہذیب کے خلاف ہے اس لیے خاندان کی اصل بنیاد باپ کو قرار دیا گیا ہے۔ اس طرح بابل اسیریا اور شام کے کھنڈروں میں خدا مرد کی صورت میں جلوہ نما ہوا ہے۔ بنی اسرائیل کے ابتدائی تخیل میں خدا، باپ اور تمام فرشتے اور انسان اس کی اولاد قرار دیئے گئے ہیں۔ بعد کو خدا کی اولاد صرف بنی اسرائیل قرار پاتی ہے۔ بنی اسرائیل کے کچھ صحیفوں میں عورت و مرد کا تخیل بھی

خدا اور بنی اسرائیل کے درمیان منظر آتا ہے یہاں تک کہ بنی اسرائیل اور یروشلم بیوی فرض کیے جاتے ہیں اور خدا شوہر بنتا ہے۔ عیسائیوں میں باپ اور بیٹے کی تمثیل نے اصلیت اور حقیقت کی جگہ لے لی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے لیے مسیح کی حقیقت ایک معمہ بن کر رہ گئی جسے ان کے علماء نے لفاظی اور قیاس آرائی کی مدد سے حل کرنے کی جتنی کوشش کی اتنے ہی زیادہ اُلجھتے گئے۔ ان میں سے جس کے ذہن پر اس مرکب شخصیت کے جزو انسانی نے غلبہ کیا اس نے مسیح کو ابن اللہ ہونے اور تین مستقل خداؤں میں سے ایک ہونے پر زور دیا، اور جس کے ذہن پر جزو الوہیت کا اثر زیادہ غالب ہوا اس نے مسیح کو اللہ تعالیٰ کا جسمانی ظہور قرار دے کر عین اللہ بنا دیا اور اللہ ہونے کی حیثیت سے ہی مسیح کی عبادت کی۔ یہ بھی عیسائیوں کے نقض عہد کی ایک مثال ہے کہ انہوں نے تمام عہد و میثاق کی جو جڑ ہے یعنی توحید اس پر کلہاڑا مار دیا ہے اور اللہ سبحانہٗ کی جگہ مسیح ابن مریم کو خدا بنا بیٹھے۔ قرآن اس آیت میں اس تشبیہی اور تمثیلی طریقہ کو یک قلم موقوف کر رہا ہے اور اس کے استعمال کو کفر قرار دے رہا ہے۔

۶۵ - بلاشبہ ان لوگوں نے کفر کیا جنہوں نے کہا کہ اللہ مریم کا بیٹا مسیح ہے۔ یعنی مسیح کے علاوہ خدا کوئی اور چیز نہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ عقیدہ نصاریٰ میں سے فرقہ یعقوبیہ کا ہے جن کے نزدیک مسیح کے قالب میں خدا حلول کیے ہوتے ہے معاذ اللہ یا یوں کہا جائے کہ جب نصاریٰ حضرت مسیح کی نسبت الوہیت کے قائل ہیں اور ساتھ ہی توحید کا بھی زبان سے اقرار کرتے ہیں یعنی خدا ایک ہی ہے تو ان دونوں دعووں کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ ان کے نزدیک مسیح کے سوا کوئی خدا نہ ہو، بہرحال کوئی صورت لی جائے اس عقیدے کے کفر صریح ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے [1] قاضی بیضاوی اور امام رازی کی رائے میں یہ عیسائیوں کے عقیدہ حلول و استحاد کا لازم ہے۔ کیونکہ موجودہ مسیحیت جس کا بانی پال ہے اصلاً تو حلول و استحاد کے اعتقاد پر مبنی ہے۔ یعنی پال کے نزدیک مسیح کی شکل میں خدا ہی نے ظہور کیا ہے لیکن بعض اعتراضات سے بچنے کے لیے اس کو اس نے اس چیستان کی شکل میں پیش کیا ہے جس کو تثلیث کہتے ہیں۔ گویا حلول اس عقیدے کی رُوح ہے اور تثلیث اس کی تعبیر۔ قرآن نے کہیں اس گمراہی کی روح کو واضح کیا ہے کہیں اس کی معروف تعبیر سے اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ پال کا اصل مقصود مسیح کو خدا ثابت کرنا تھا اس کے لیے اس نے حضرت مسیح کی خارق عادت ولادت اور ان کے کلمۃ اللہ اور روح اللہ ہونے سے مواد فراہم کیا لیکن

[1] افادات شیخ الاسلام

انجیلوں میں چونکہ باپ اور روح القدس کا بھی ذکر تھا۔ اس وجہ سے لیے یہ محنت کرنی پڑی کہ الوہیت کے مسئلہ کا حل کرنے کے لیے کوئی ایسی تعبیر اختیار کرے کہ ان سب کے لیے اس میں کوئی نہ کوئی جگہ نکل آتے۔ لیکن یہ سارا گورکھ دھندا تو بس چند بال کی کھال ادھیڑنے والوں کے ذہن میں یا چند چیستان قسم کی کتابوں کے اندر بند رہتا ہے۔ عام ذہن تو خلاصہ پسند کرتا ہے وہ ان موشگافیوں میں کہاں پڑتا ہے چنانچہ عوام نے اس سارے افسانے میں سے صرف اتنی چیز اپنے ذہن میں راسخ کر لی کہ مسیح خدا ہیں۔ عقیدہ اتھانیسیس جو کیتھولک پروٹسٹنٹ وغیرہ سب مشہور و مقبول فرقوں میں مشترک ہے اس میں یہ الفاظ صراحۃً موجود ہیں۔

باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے جلال برابر عظمت ازلی برابر جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا۔ باپ غیر مخلوق بیٹا غیر مخلوق۔ باپ غیر محدود بیٹا غیر محدود۔ باپ ازلی بیٹا ازلی۔ یونہی باپ قادر مطلق بیٹا قادر مطلق۔ ویسا ہی باپ خدا بیٹا خدا۔

الشہرستانی نے الملل والنحل میں عیسائی فرقوں کے تذکرے میں لکھا ہے کہ

ان میں سے یعقوبیہ بھی ہیں۔ ان کا عقیدہ اقانیم ثلاثہ کا ہے لیکن اتنا اضافہ ہے کہ کلمہ گوشت اور خون کا لبادہ پہن کر بصورت مسیح الٰہ بن گیا ہے ان کے بارے میں قرآن نے لقد کفر الذین قالوا میں خبر دی ہے لہٰذا کچھ کی رائے ہے کہ مسیح ہی اللہ ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ لاہوت ناسوت کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔

امام ماوردی نے اعلام النبوۃ میں لکھا ہے کہ عیسائیوں کے تین فرقوں میں سے نسطوریہ کا عقیدہ تھا کہ حضرت عیسٰی اللہ ہیں۔

اللہ کی قدرت کاملہ اور اختیار ناطق

۶۶۔ تم ان لوگوں سے کہہ دو "اگر خدا مسیح ابن مریم کو اور اس کی ماں کو اور روئے زمین پر جتنے انسان ہیں سب کو ہلاک کر دینا چاہے تو کون ہے جو اس کی بادشاہی میں دخل دینے کی جرأت کرے۔ یعنی اگر فرض کرو خدائے قادر و قہار یہ چاہے کہ حضرت مسیح اور مریم اور اگلے پچھلے سب روئے زمین پر بسنے والوں کو اکٹھا کر کے ایک دم میں ہلاک کر دے تو تم ہی بتاؤ کہ اس کا ہاتھ کون پکڑ سکتا ہے۔ یعنی ازل و ابد کے سارے انسان بھی اگر فرض کرو مجمع کر دیے جائیں اور خدا ایک آن میں سب کو ہلاک کرنا چاہے تو سب کی اجتماعی قوت بھی خدا کے ارادے کو تھوڑی

ویسے لیے ملتوی نہیں کر سکتی کیونکہ مخلوقات کی قدرت جو عطائی اور محدود ہے خدا کی ذاتی اور لامحدود قدرت کے مقابلہ میں عدم محض ہے، جس کا اعتراف خود وہ لوگ بھی کرتے ہیں جن کے رد میں یہ خطاب کیا جارہا ہے بلکہ خود مسیح بن مریم بھی جن کو یہ لوگ خدا بتاتے ہیں اس کے معترف ہیں چنانچہ مرقس کی انجیل میں حضرت مسیح کا یہ مقولہ موجود ہے۔

اے باپ ہر چیز تیری قدرت کے تحت میں ہے تو مجھ سے یہ موت کا پیالہ ٹلا دے
اس طرح نہیں جو میں چاہتا ہوں بلکہ اس طرح جیسے تیرا ارادہ ہے۔

پس جب حضرت مسیح جن کو تم خدا کہتے ہو اور ان کی والدہ ماجدہ مریم صدیقہ جو تمہارے زعم میں خدا کی ماں ہوئیں وہ دونوں بھی تمام من فی الارض کے ساتھ مل کر خدا کی مشیت و ارادے کے سامنے عاجز ٹھہرے تو خود سوچ لو کہ ان کی یا ان کی کسی اور مخلوق کی نسبت خدائی کا دعویٰ کرنا کس قدر گستاخی اور شوخ چشمی ہو گی۔ آیت کی اس تقریر میں ہم نے ہلاک کو موت کے معنے میں لیا ہے مگر جمیعاً کے لفظ کی تھوڑی سی وضاحت کر دی جو مدلول لفظ جمیعاً کا ہم نے بیان کیا ہے وہ اکثر ائمہ کی تصریحات کے عین مطابق ہے۔ اس کے سوا یہ بھی ممکن ہے کہ آیت میں ہلاک کے معنے موت کے نہ لیے جائیں جیسا کہ راغب نے لکھا ہے کبھی ہلاک کے معنے کسی چیز کا مطلقاً نیست و نابود ہو جانا ہوتے ہیں مثلاً کل شیئ ھالک الا وجھہ یعنی خدا کی ذات کے سوا ہر چیز ناپید ہونے والی ہے۔ اس معنی پر آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اگر خدا تعالیٰ تدبیر حضرت مسیح، ان کی والدہ اور تمام من فی الارض کو قطعاً نیست و نابود اور بالکلیہ فنا کر ڈالنے کا ارادہ کرے تو کون ہے جو اس کے ارادے کو روک دے گا۔

اوست سلطاں ہر چہ خواہد آں کند
عالمے را در دمے ویراں کند

حضرت شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کسی جگہ نبیوں کے حق میں ایسی بات فرماتے ہیں تاکہ ان کی امت بندگی کی حد سے زیادہ نہ چڑھا دے ورنہ نبی اس لائق کا ہے کو ہیں کہ ان کے مرتبہ عالی اور وجاہت عند اللہ کا خیال کرتے ہوئے ایسا خطاب کیا جاتا۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے ارادے میں کوئی چیز بھی رکاوٹ نہیں ہو سکتی ہے جیسے حضرت

[1] افادات شیخ الاسلام

ابراہیم نے اسی اختیار ناطق اور قدرت کاملہ کی طرف اشارہ کیا ہے لاستغفرن لك وما املك لك من الله من شیء۔ میں آپ کے لیے خدا سے مغفرت مانگوں گا لیکن میں آپ کے معاملہ میں خدا کے کسی فیصلہ میں کوئی دخل نہیں رکھتا۔ اس آیت میں حضرت مسیح کو الٰہ و معبود بنانے پر اللہ تعالیٰ کی جانب سے اظہار غضب ہے۔ مقصد یہ ہے کہ نادانو! یہ کس قسم کی باتیں کرتے ہو کیا مسیح کیا ان کی والدہ اور کیا یہ ساری مخلوق، خدا سب سے بے نیاز اور مستغنی ہے، سب کو وجود اسی نے بخشا ہے اور اگر وہ ان سب کو فنا کر دینا چاہے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے، آسمان و زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے سب خدا ہی کی ملکیت ہے۔ کوئی نہیں ہے جو اس میں اس کا شریک ہو، وہ جو چاہے، جس طرح چاہے اور جتنی مقدار میں چاہے پیدا کرتا اور پیدا کرسکتا ہے، کسی کا بن باپ کے پیدا ہونا اس بات کی دلیل نہیں ہو جاتا کہ وہ خدا بن گیا یا خدائی میں شریک ہو گیا۔

کائنات میں سلطانی اللہ کی ہے

۶۷۔ آسمان و زمین اور جو کچھ ان میں ہے سب کی سلطانی اللہ کے لیے ہے جو کچھ چاہتا ہے پیدا کرتا اور اللہ ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے جو چاہے جس طرح چاہے مثلاً حضرت مسیح کو بغیر باپ کے، حضرت حوا کو بغیر ماں کے اور حضرت آدم کو بغیر ماں اور باپ کے پیدا کر دیا اسے سب کچھ قدرت ہے کسی کا زور اس کے سامنے نہیں چلتا[1]

اس فقرے میں میں ایک لطیف اشارہ ہے اس طرف کہ محض مسیح کی اعجازی پیدائش اور ان کے اخلاقی کمالات اور محسوس معجزات کو دیکھ کر جو لوگ اس دھوکہ میں پڑ گئے کہ مسیح ہی خدا ہے وہ درحقیقت نہایت نادان ہیں۔ مسیح تو اللہ کے بے شمار عجائب تخلیق میں سے محض ایک نمونہ ہے جسے دیکھ کر ان ضعیف البصر لوگوں کی نگاہیں چوندھیا گئیں۔ اگر ان لوگوں کی نگاہ کچھ وسیع ہوتی تو انہیں نظر آتا کہ اللہ نے اپنی تخلیق کے اس سے زیادہ حیرت انگیز نمونے پیش کیے ہیں اور اس کی قدرت کسی حد کے اندر محدود نہیں ہے۔ یہ بڑی بے دانشی ہے کہ مخلوق کے کمالات کو دیکھ کر اسی پر خالق ہونے کا گمان کر لیا جائے۔ دانشمند وہ ہیں جو صاحب کمال کو دیکھ کر خالق کمال کی عظیم الشان قدرت کے نشانات دیکھتے ہیں اور ان سے ایمان کا نور حاصل کرتے ہیں[2]

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

اہل کتاب کا نجات یافتہ ہونے کا غرور

۱۸ - اور یہودی اور عیسائی کہتے ہیں کہ ہم خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے ہیں۔ شاید اپنے کو بیٹے یعنی اولاد اس لیے کہتے ہیں کہ ان کی بائیبل میں خدا نے اسرائیل یعقوب علیہ السلام کی نسبت پہلوٹا بیٹا اور اپنے کو اس کا باپ کہا ہے۔ ادھر نصاریٰ حضرت مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ مانتے ہیں تو اسرائیل کی اولاد اور حضرت مسیح کی امت ہونے کی وجہ سے غالباً ابناء اللہ کا لفظ اپنی نسبت استعمال کیا ہوگا اور یہ بھی ممکن ہے کہ بیٹا کہنے سے مراد یہ ہو کہ ہم خدا کے خواص اور محبوب ہونے کی وجہ سے گویا اولاد ہی جیسے ہیں۔ اس صورت میں ابناء کا حاصل وہی ہو جاتا ہے جو لفظ احباء کا ہے[1]۔ مطلب یہ ہے کہ چونکہ ہم خدا کے بیٹے اور پیارے ہیں اس لیے ہم عام نوعِ انسانی سے افضل و اشرف ہیں اور ہم جو کچھ بھی کریں ہمارے لیے نجات ہی نجات ہے۔ اہل کتاب کا یہی زعم باطل تھا جس نے ان کو عہد الٰہی کی ذمہ داریوں سے سب سے زیادہ بے پرواہ بنا دیا تھا۔ انہوں نے گمان کیا کہ وہ خدا کے محبوبوں اور برگزیدوں کی اولاد ہیں اس لیے عمل و اطاعت کی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہیں۔ جنت ان کا پیدائشی حق ہے۔ دوزخ میں اول تو وہ ڈالے نہیں جائیں گے اور اگر ڈالے بھی گئے تو بس یونہی چند دنوں کے لیے۔ اس فتنے کے اصل بانی تو یہود ہوتے ہیں لیکن آخر نصاریٰ ان کو جنت کا واحد اجارہ دار کیوں بننے دیتے حضرت مسیح نے یہودی تصور کی سختی اور قہرمانی کی جگہ رحمت و شفقت کا تصور پیدا کرنے کے لیے خدا کو باپ کے لفظ سے تعبیر کیا تھا اور اس بات پر زور دیا کہ شریعت کے ظواہر و رسوم کچھ سود مند نہیں اگر دل میں نیکی اور محبت نہ ہو۔ عیسائیوں نے اس بات کو کچھ سے کچھ بنا لیا اور کہنے لگے کہ نجات کے لیے صرف یہی کافی ہے کہ کفارہ مسیح پر ایمان لے آئے اور سمجھ لے کہ خدا ہمارا باپ ہے۔ وہ کبھی اپنے بیٹوں پر آسمان کی بادشاہت کا دروازہ بند نہیں کرے گا۔

آیتِ قرآنی میں نحن ہم سے مراد افراد نہیں بلکہ قوم ملت مجموعہ افراد مراد ہے۔ یعنی یہود من حیث القوم اور نصاریٰ بحیثیت ملت مراد ہیں۔ موجودہ بائیبل میں اس قسم کے حوالے موجود ہیں:

" خداوند نے یوں فرمایا ہے کہ اسرائیل میرا بیٹا بلکہ میرا پہلوٹھا ہے۔

(خروج ۴ - ۲۲)

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

تم خداوند اپنے خدا کے فرزند ہو۔ (استثنا ۱۴-۱)
جب اسرائیل لڑکا ہی تھا میں نے اس کو عزیز رکھا اور بیٹے کو مصر بلایا۔
(ہوسیع ۱۱-۱)
جتنوں نے اسے قبول کیا، اس نے انہیں خدا کے فرزند بننے کا حق بخشا۔
(یوحنا ۱-۱۲)
جتنے خدا کی روح کی ہدایت سے چلتے ہیں وہی خدا کے بیٹے ہیں۔
(رومیوں ۸-۱۴)

یہاں ابنا اللہ سے حقیقی صلبی بیٹے مراد نہیں اور نہ یہ ابن کے لازمی معنے ہیں۔ اس کے بیے عربی میں لفظ ولد بھی ہے۔ ابن کا اطلاق مجازی منہ بولے لڑکوں پر بھی ہوتا ہے اور عربی زبان میں ابن کا مجازی استعمال بہت زیادہ ہے۔ ابن حرب، ابن السبیل، ابن اللیل، ابن العلم، ابن یوم، وغیرہ اہل لغت نے لکھا ہے کہ اب، ابن، بنت یہ تین لفظ ایسے ہیں کہ بڑی کثرت سے چیزیں ان کی طرف منسوب ہیں، ازہری لغوی اور ابن العربی نے ایسے ناموں کی ایک طویل فہرست دی ہے جو عربی میں کسی کے ابن کی حیثیت سے مشہور ہیں۔ مثلاً ابن الطین حضرت آدم کے لیے ابن اللیل چور کے لیے ابن القول با تونی کے لیے۔ بہرحال ان کے اس دعویٰ کا مطلب یہی ہے کہ ہم خاصان خدا میں سے ہیں۔ ہمارا اور عام لوگوں کا مقابلہ کیا۔ یعنی سب سے اونچی ذات والے اور خاص مقربین حق ہیں ہیں۔ یہ ٹھیک وہی ذہنیت ہے جو ہندوستان کے برہمنوں میں پائی جاتی ہے کہ اپنے کو چندر بنسی اور سورج بنسی کہلاتے ہیں اور بڑے درد کی بات ہے کہ مسلمانوں کے اندر بھی پیرزادگی، مشائخ زادگی، مخدوم زادگی کے گھمنڈ اس سے کچھ بہت زیادہ مختلف نہیں۔ انا للہ والی اللہ المشتکی۔

یہودیوں کی تردید خود ان کی تاریخ سے

۹۷۔ آپ فرما دیجئے کہ بتاؤ پھر اللہ تمہیں تمہارے گناہوں کی پاداش میں عذاب کیوں دیتا رہا ہے۔ چونکہ کسی مخلوق کا حقیقتہً ابن اللہ ہونا بالکل محال اور بدیہی البطلان ہے اور خدا کا محبوب بن جانا ممکن ہے بحیثیت مجموعی قرآن میں ہے اس لیے اس جگہ ہیں اول محبوبیت پیارے ہونے کے دعویٰ کا رد کیا گیا۔ یعنی جو قوم علانیہ بغاوتوں اور شدید ترین گناہوں کی بدولت یہاں بھی کئی طرح کی رسوائیوں اور عذاب میں گرفتار ہو چکی ہے۔ اور آخرت میں بھی حبس دوام کی سزا کا

عقلاً و نقلاً استحقاق رکھتی ہے۔کیا ایسی باغی و عاصی قوم کی نسبت ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی ذی شعور خیال کر سکتا ہے کہ وہ خدا کی محبوب اور پیاری ہو گی خدا سے کسی کا نسبی رشتہ نہیں۔ اس کا پیار اور اس کی محبت صرف اطاعت اور حسن عمل سے حاصل ہوتا ہے۔ ایسے کٹر مجرموں کو جو سخت سے سخت سزا کے مستحق اور موردبن چکے ہیں فخر نما چاہیے کہ وہ نحن ابناء اللہ واحباءہ کا دعویٰ کریں۔ حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو باوجودیکہ ان کا صلبی بیٹا تھا خدا نے فرما دیا انہ لیس من اھلک انہ عمل غیر صالح[1]

دراصل یہاں سے اس زعم باطل کی تمہید خود ان کی تاریخ سے کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کے محبوب اور چہیتے ہونے کے سبب سے تم خدا کے مواخذے اور عذاب سے بری ہو تو تمہاری یہ محبوبیت اور تمہارا یہ چہیتا پن اس دنیا میں تمہارے کچھ کام کیوں نہ آیا۔ یہاں تو تمہاری پوری تاریخ اس بات کی شہادت دے رہی ہے کہ جب تم نے خدا سے سرکشی کی ہے۔ اس نے تمہیں نہایت عبرت انگیز سزائیں بھی دی ہیں۔ ایسی عبرت انگیز کہ دنیا کی کسی قوم کی تاریخ میں ایسی سزاؤں کی مثال نہیں مل سکتی۔ پوری قوم کی غلامی، پوری قوم کی صحرا نوردی، پوری قوم کی جلا وطنی، متعدد بار پوری قوم کا قتل عام اور بیت المقدس کی عبرت انگیز تباہی، یہ سارے واقعات خود تورات میں موجود ہیں۔ اگر ابراہیم واسحاق کی اولاد ہونے کی وجہ سے تمہیں خدا کی جانب سے کوئی برأت نامہ حاصل ہے تو اس برأت نامہ نے تمہیں عذاب سے کیوں نہیں بچایا۔ بداعمالی پر دنیوی سزاؤں کا ترتب تو ایک کھلی حقیقت ہے جس سے ان کو یارائے انکار نہ تھا اور ان دنیوی سزاؤں سے عہد عتیق کے صحیفے بھرے پڑے ہیں۔ حضرت تھانوی کا یہ ارشاد یہاں بالکل برمحل ہے کہ یہ آیت صراحۃً ان لوگوں کے خلاف چیلنج ہے جو اللہ کے ساتھ ایسے قرب کا دعویٰ کرتے ہیں جس میں معصیت پر بھی مواخذہ اور گرفت نہ ہو۔

قانون کی بالادستی

بل۔ بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس کے پیدا کیے ہوئے انسانوں میں سے تم بھی انسان ہی ہو۔ بشر اصل لغت میں کھال کی اوپر کی سطح کو کہتے ہیں۔ تھوڑی سی مناسبت سے آدمی کو بشر کہنے لگے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شاید اس نقطہ کے یہاں اختیار کرنے میں یہ نکتہ ہو کہ تم کو خدا کا بیٹا اور پیارا تو در کنار شریف اور ممتاز انسان بھی نہیں کہا جاسکتا صرف بشرہ اور شکل و صورت کے لحاظ سے خدا کے پیدا کیے ہوئے ایک معمولی آدمی کہلاتے جاسکتے ہو جن کی پیدائش بھی اسی معتاد طریقہ سے ہوتی ہے جس طرح عام انسانوں کی ہوتی ہے پھر بھلا ابنیت کا وہم کہاں راہ پاسکتا ہے؟ مطلب یہ ہے کہ جزا و سزا کا جو قانون سب کے لیے ہے وہی تمہارے لیے بھی ہے جس طرح خدا کی ساری مخلوق ہے اسی طرح تم بھی اس کی مخلوق ہو اور جس طرح سب کو خدا سے نسبت ایمان و عمل صالح کے توسل سے حاصل ہوتی ہے اسی طرح تمہیں بھی اگر خدا سے نسبت حاصل ہوگی تو ایمان و عمل صالح ہی کے ذریعے حاصل ہوگی اور بس۔ اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ نسب اور نسبت کے رشتے بے کار ہوتے ہیں۔ اگر ایمان و عمل کی نعمت سے محروم ہو تو قانون یہی ہے اور سب کے لیے ہے اور قانون کی طاقت ناقابل شکست ہے۔ کوئی بھی قانون سے بالاتر نہیں ہے۔ امیر و غریب اور خاص و عام کا یہاں کوئی امتیاز نہیں ہے اونچے سے اونچا شخص حتیٰ کہ نبی زادہ بھی قانون کا اسی طرح محکوم ہے جس طرح ایک عام آدمی دُنیا کی زندگی میں بھی یہی قانون ہے اور آخرت میں نجات کا بھی یہی ضابطہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ قانون کی بالادستی کی تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے کہ "اگر محمد کی بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو خدا کی قسم میں اس کے بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔"

جزا و سزا اللہ ہی کے اختیار میں ہے

اے۔ اللہ جسے چاہتا ہے بخش دے جسے چاہے عذاب دے آسمانوں کی زمین کی اور اس سب کی جو ان کے درمیان میں مالکی و سلطانی صرف اسی کے لیے ہے اور سب کو بالآخر اسی کی طرف لوٹنا ہے کیونکہ وہی جانتا ہے کہ کون بخشش کے لائق ہے اور کسے سزا دی جائے جسے وہ اپنی رحمت و حکمت سے معاف کرنا چاہے یا عدل و انصاف سے سزا دینا چاہے اس میں کون مزاحم ہو سکتا ہے نہ کسی مجرم کے لیے یہ گنجائش ہے کہ اس کے قلمرو آسمان و زمین سے باہر نکل جائے اور نہ یہ کہ مرنے کے بعد دوسری زندگی میں کہیں اور بھاگ جائے [2]

مطلب یہ ہے کہ مغفرت اور عذاب اللہ ہی کے اختیار میں ہے۔ وہ جن کو مغفرت کا مستحق

---

[1]، [2] افادات شیخ الاسلام

پائے گا ان کی مغفرت فرمائے گا جن کو سزا کا مستحق پائے گا ان کو سزا دے گا۔ اگر کسی نے بزرگوں سے خاندانی نسبت یا ان کی موہوم شفاعتوں پر بھروسہ کر کے خدا کے عہد ہی کو توڑ دیا ہے تو اس کو خدا کے عذاب سے بچانے والا کوئی بھی نہ ہو گا۔ سماوات کی سلطانی بلاشرکت غیرا اللہ کی ہے نہ اس میں کسی کی حصہ داری ہے اور نہ خدا کے سوا بہشتی کے لیے کوئی اور عدالت ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی نے اس موقع پر یہ بات پتے کی لکھی ہے کہ یہ دعویٰ مذکورہ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسا ہمارے زمانہ کے جاہل پیرزادوں کا انتساب یا اتصال سلسلہ کی بنا پر گھمنڈ ہے کہ حق تعالیٰ کو ہمارے ساتھ ایک گونہ ذاتی خصوصیت اور نسبت ہے جو معاصی وغیرہ سے قطع نہیں ہوتی اور ہم کیسے ہی ہوں مگر اس انتساب یا اتصال کے زور سے ضرور جنت میں جا ملیں گے۔

یہود و نصاریٰ کو قرآن کی تنبیہہ

۲۷۔ اے اہل کتاب ایسی حالت میں تمہارے پاس رسول آیا جبکہ رسولوں کا ظہور مدتوں سے بند تھا، وہ تمہارے سامنے احکام کھول کر بیان کر رہا ہے تاکہ تم یہ نہ کہو کہ ہماری طرف کوئی رسول نہیں آیا نہ بشارت دینے والا اور نہ ڈرانے والا تو اب دیکھو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ بشارت دینے والا اور تنبیہہ کرنے والا تمہارے پاس آگیا ہے اور اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یعنی ہمارے احکام و شرائع نہایت وضاحت کے ساتھ کھول کر بیان کرتا ہے۔ اس رکوع کے شروع میں بنی اسرائیل یہود و نصاریٰ کی مختلف قسم کی شرارتوں اور حماقتوں کو بیان فرما کر یہ بتلایا تھا کہ اب ہمارا رسول تمہارے پاس آچکا ہے جو تمہاری غلط کاریوں کو واضح کرتا ہے اور تم کو ظلمت سے نکال کر نور کی طرف لے جانا چاہتا ہے اس کے بعد اس پر متنبہ فرمایا کہ اب نور ہدایت کی طرف جانا دو چیزوں پر موقوف ہے ایک یہ کہ حق تعالیٰ کی صحیح معرفت حاصل کرو اور مخلوق و خالق کے متعلق غلط عقیدے مت جماؤ لقد کفر الذین قالوا سے یہاں تک اسی جزو کو بیان فرمایا۔ دوسری چیز یہ ہے کہ نبی الانبیاء پر ایمان لاؤ جو تمام انبیاء سابقین کے کمالات کے جامع اور شرائع الٰہیہ کے سب سے بڑے اور آخری شارح ہیں اس اس جزو کا بیان اس آیت میں کیا گیا ہے۔ حضرت مسیح کے بعد تقریباً چھ سو برس سے انبیاء کی آمد کا سلسلہ منقطع تھا۔ ساری دنیا الا ماشاء اللہ جہل و غفلت اور اوہام و اہوا کی تاریکیوں میں پڑی تھی۔ ہدایت کے چراغ گل ہو چکے تھے، ظلم و عدوان فساد و الحاد کی گھٹا تمام آفاق پر چھائی ہوئی تھی اس وقت سارے جہاں کی اصلاح کے لیے اللہ نے سب سے بڑے ہادی اور نذیر و بشیر کو روانہ

کیا جو جاہلوں کو فلاح دارین کے راستے بتلاتے ۔ غافلوں کو اپنے انذار و تخویف سے بیدار کرے اور پست ہمتوں کو بشارتیں سنا کر ابھارے اس طرح ساری مخلوق پر خدا کی حجت تمام ہو گئی کوئی مانے نہ مانے [1]

اس آیت گرامی میں یہ باتیں بتائی گئی ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا زمانہ، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام اہل کتاب کو تنبیہہ کہ خدا کی حجت پوری ہو چکی ۔

حضور اقدس کی تشریف آوری کے بارے میں اہل کتاب کو مخاطب کرکے فرمایا کہ قد جاءکم رسولنا ہمارا وہ رسول جس کی بشارتیں تمہاری کتابوں میں موجود ہیں، عقیدہ جس کا تمہیں شدید انتظار ہے وہ تمہارے پاس آچکا ہے ۔ یعنی جن کے بارے میں تمہیں اللہ نے حضرت موسیٰ کی وساطت سے بتایا تھا کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے بھائیوں بنی اسماعیل میں سے ضرور ایک نبی روانہ کرے گا اور جن کے بارے میں حضرت عیسیٰ نے فرمایا تھا کہ میرے بعد وہ فارقلیط ضرور آئے گا جو تمہیں ہر چیز کی تعلیم دے گا ۔ بشارتیں تمہاری کتابوں میں ساری تحریفات کے باوجود موجود ہیں یہی وہ نبی کامل ہے جس کے بارے میں تمہارے آباد و اجداد نے حضرت یحییٰ سے دریافت کیا تھا ۔ انجیل میں ہے کہ یہودیوں نے کاہنوں کو حضرت یحییٰ سے یہ دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا کہ کیا آپ ہی مسیح ہیں؟ انہوں نے جواب دیا نہیں پھر پوچھا کہ کیا آپ ایلیا ہیں ؟ فرمایا کہ نہیں پھر سوال کیا کہ کیا آپ وہ نبی ہیں فرمایا نہیں ۔

آیت میں رسول کے لیے آنے کی تعبیر بتا رہی ہے کہ مخاطبوں کو جس کا انتظار تھا وہ آگیا ہے اور چونکہ انتظار اہل کتاب کو تھا اس لیے مخاطب ان کو ہی کیا گیا ۔ خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے وہ رسول جن کی آمد آمد تم اہل کتاب مدت سے سن رہے تھے وہ آگئے ۔

زمانہ فترت

دوسری بات کہ حضور انور کی تشریف آوری کا زمانہ کیا ہے قرآن میں اس کے لیے علی فترۃ من الرسل کی تعبیر اختیار کی ہے فترۃ کے لغوی معنے کام کے رک جانے اور بند ہونے کے ہیں اسی سے اردو میں فتور بولا جاتا ہے ۔ اصطلاح میں دو نبوتوں کے درمیانی عرصہ کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہتے ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا درمیانی وقفہ کم و بیش چھ سو سال کا ہے حضور کا سال ولادت ۵۷۰ء ہے اور سال بعثت ۶۱۰ء۔ مطلب یہ ہے کہ آپ اس دور میں آئے ہیں جبکہ دنیا میں سلسلہ وحی کو بند ہوتے چھ صدیاں گزر گئی تھیں۔ اس وقت دنیا میں نیکی و سعادت کا جغرافیہ کیا تھا۔ علامہ جمال الدین قاسمی نے محاسن التاویل میں مفتی محمد عبدہ مصری کے حوالہ سے نقل کیا ہے لیکن زیادہ خوبصورت اور کامل تفسیر وہ ہے جس کی حضرت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ (م ۱۱۷۶ھ) نے اپنی جلیل القدر تصنیف "حجۃ اللہ البالغہ" میں ماقبل اسلام کی اس صورت حال کی پوری تصویر کھینچی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

صدیوں سے آزادانہ حکومت کرتے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک رہنے آخرت کو یکسر بھول جانے اور شیطان کے پورے اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں اور رومیوں نے زندگی کی آسائیوں اور سامان آرائش میں بڑی موشگافی اور نازک خیالی پیدا کر لی تھی، اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے اہل ہنر اور اہل کمال جمع ہو گئے تھے۔ جو اس سامان آرائش و راحت میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے، اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے، ان پر عمل فوراً شروع ہو جاتا تھا اور اس میں برابر اضافے اور جدتیں ہوتی رہتی تھیں اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا تھا کہ امراء میں سے کسی کا ایک لاکھ درہم سے کم کا پٹکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا، اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رو جوان اور غلام نہ ہوتے، کھانے میں تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی۔ اس کی تفصیل بہت طویل ہے، اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اس سے قیاس کر سکتے ہو، یہ تمام تکلفات ان کی زندگی اور معاشرت کا جزو بن گئے تھے اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ گئے تھے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے۔ اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے پورے نظام تمدن میں سرایت کر گیا تھا پھر ایک مصیبت عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر و غریب میں سے کوئی

محفوظ نہیں رہا تھا ہر شہری پر یہ پر تکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط ہو گئی تھی جس نے اس کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا اور اس کے سر پر غم و افکار کا ایک پہاڑ ہر وقت رکھا رہتا تھا، بات یہ تھی کہ یہ تکلفات، بیش قرار رقمیں صرف کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشت کاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کیے بغیر دستیاب نہیں ہو سکتی تھی۔ اگر وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزائیں دی جاتیں اور اگر وہ تعمیل کرتے تو ان کو گدھے اور بیلوں کی طرح بنا لیتے جن سے آب پاشی اور کاشت کاری میں کام لیا جاتا اور صرف خدمت کرنے کے لیے ان کو پالا جاتا ہے اور محنت و مشقت سے ان کو کسی وقت چھٹی نہیں ملتی۔ اس پر مشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کسی وقت سر اٹھانے اور سعادت اخروی کا خیال بھی کرنے کا موقع اور مہلت نہیں ملتی تھی، بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک فرد بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی۔

خلاصہ یہ کہ اس ساتویں صدی عیسوی میں روئے زمین پر کوئی قوم ایسی نظر نہیں آتی تھی جو مزاج کے اعتبار سے صالح کہی جا سکے، اور نہ ایسی کوئی سوسائٹی تھی جو شرافت اور اخلاق کی اعلیٰ قدروں کی حامل ہو، نہ ایسی کوئی حکومت تھی جس کی بنیاد عدل و انصاف اور رحم پر ہو اور نہ ایسی قیادت تھی جو علم و حکمت اپنے ساتھ رکھتی ہو اور نہ کوئی ایسا صحیح دین تھا جو انبیاء کرام کی طرف صحیح نسبت رکھتا ہو اور ان کی تعلیمات و خصوصیات کا حامل ہو۔ اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں کہیں کہیں عبادت گاہوں اور خانقاہوں میں اگر کبھی کبھی کچھ روشنی نظر آجاتی تھی تو اس کی حیثیت ایسی ہی تھی جیسے برسات کی اندھیری رات میں جگنو چمکتا ہے۔ صحیح علم اور صحیح عمل اتنا نایاب تھا اور خدا کا سیدھا راستہ بتلانے والے اس قدر خال خال پائے جاتے تھے کہ ایران کے بلند ہمت اور بے چین طبیعت نوجوان سلمان فارسی کو جو اپنے قومی و نسلی مذہب (مجوسیت) سے غیر مطمئن و مایوس ہو چکا تھا اور حق و صداقت کا جویا تھا۔ ایران سے لے کر شام کی آخری حدود تک اپنے طول و طویل سفر میں صرف چار آدمی ایسے مل سکے جن سے اس کی روح کو سکون اور قلب کو اطمینان حاصل ہوا اور جو پیغمبروں کے بتلائے ہوئے راستہ پر قائم تھے۔

اسی عالمگیر بے راہ روی تاریکی کا نقشہ قرآن نے یہاں علی فترۃ من الرسل کے مختصر لفظوں میں

جس طرح کھینچا ہے اس سے بہتر ممکن نہیں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مقام

آپ کے مقام کو ظاہر کرنے کے لیے اس آیت میں آپ کے تین وصف بیان کیے ہیں۔ ایک تبیین، دوسرے بشارت، تیسرے انذار۔ یہاں رسول کو بطور منصب پیش کیا ہے اور ان تین اوصاف کو بطور مقام ظاہر کیا ہے۔ منصب نام ہے عہدے کا اور مقام کہتے ہیں کام کی ذمہ داری کو۔ یہاں پیغمبر کی اولین ذمہ داری یہ بتائی گئی ہے کہ وہ بیان کرتا ہے کیا بیان کرتا ہے اس کو عمومیت کی خاطر حذف کر دیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ پیغمبر وہ سب کچھ بیان کرتا ہے جس کی تمہیں ضرورت ہے عقائد، اعمال، اخلاق اور آداب اور احوال سب کچھ بیان کرتا ہے۔ گویا یبین لکم کے ذریعے نبوت کے دنیا میں آنے کی غرض بتائی گئی ہے کہ نبوت تمہارے سامنے اللہ کی بندگی اور پرستش کے وہ سارے ضوابط اور قوانین بیان کرے جن کی تمہیں ضرورت ہے۔ رسول دین و شریعت کے نام لوگوں کے سامنے جو کچھ بیان کرتا ہے وہ سب اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔ کوئی بات بھی آپ کے اپنے جی کی نہیں ہوتی ہے۔ نبی کے بیان کے اللہ کی جانب سے ہونے کا مطلب ذرا وسیع ہے اس کی دو صورتیں ہیں۔

ایک یہ کہ اللہ سبحانہ اپنے احکام متعین لفظوں میں خود براہ راست یا فرشتہ کے ذریعے سے نبی کو بتائے اور نبی لوگوں کے سامنے بیان کرے۔

دوسری یہ کہ اللہ تعالیٰ کی جانب سے نبی کو جو احکام بتلائے گئے ہیں ان ہی کو سامنے رکھ کر نبی اجتہاد کرے اور اللہ کی مرضیات کی ترجمانی کرتے ہوئے ان سے مزید احکام نکال کر بیان کرے۔

گویا پہلی قسم کی تعلیمات کا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونا اصلاً اور براہ راست ہوتا ہے اور دوسری قسم کی تعلیمات کا اللہ کی طرف سے ہونا نبی کے اجتہاد کے ذریعے ہوتا ہے۔ دونوں صورتوں میں نبی کا بیان ہوتا ہے۔

اہل کتاب کو تنبیہہ

اس میں ان تقولوا ما جاءنا فرما کر اہل کتاب کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ اپنی کتاب کی جن چیزوں کو تم نے چھپایا یا ضائع کر دیا ان سب کو واضح اور خدا کی صراط مستقیم کی طرف رہنمائی کرتا ہوا ہمارا رسول تمہاری طرف آیا ہے۔ اب تمہارے پاس اپنی گمراہی پر جمے رہنے کے لیے یہ عذر بھی باقی

نہیں رہا کہ پہلے رسولوں کی بعثت پر ایک زمانہ گزر گیا اور تم ایک نذیر و بشیر کے محتاج تھے۔ تمہارے اس عذر کو ختم کرنے کے لیے ہم نے نذیر و بشیر روانہ کیا۔ اب اس اتمام حجت کے بعد بھی تم نے اپنی روش نہ بدلی تو خدا کو بے بس ہستی نہ سمجھنا وہ ہر چیز پر قادر ہے۔ یہ ملحوظ رہے کہ اہل کتاب کا یہ عذر کوئی قابل لحاظ عذر نہیں تھا لیکن جب اللہ تعالیٰ نے اس کا بھی لحاظ فرمایا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان پر آخری حجت پوری کر دی۔

یہ آیت اس فکری گمراہی کے خلاف کھلا چیلنج ہے کہ سارے مذاہب سچے ہیں۔ سبھی خدا تک پہنچانے والے ہیں۔ ایک یہودی حضرت موسیٰ کی شریعت پر عمل کرتا ہوا ایک عیسائی حضرت کو مانتا ہوا نجات یافتہ ہے چاہے وہ حضور انور کو نبی نہ مانے۔ قرآن کی اس آیت نے اہل کتاب کو مخاطب کر کے بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ کو ماننے کے باوجود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ماننا اور ان کی پیروی کرنا شرط نجات ہے۔ اگر یہ بات قرآن کے نزدیک صحیح ہوتی کہ یہودی اور عیسائی سب سچے ہیں تو اس کا بالکل منطقی نتیجہ یہ تھا کہ قرآن یہود و نصاریٰ کو حضور اقدس پر ایمان لانے کی دعوت نہ دیتا بلکہ قرآن ان سے یہ کہتا کہ تورات و انجیل کی مخلصانہ پیروی کرو لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ قرآن نے انہیں بھی اسی طرح اسلام کی دعوت دی جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے بھی نبوت محمدیہ کی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا ہے جیسا کہ دوسروں کے لیے قرار دیا تھا۔

نہ صرف یہ کہ قرآن نے نبوت محمدیہ کو ماننے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے نبوت محمدیہ کو قبول نہیں کیا انہیں صاف صاف لفظوں میں کفر کا مرتکب اور دوزخی قرار دیا۔ غرض قرآن عزیز اہل کتاب کے انکار اسلام کو بھی ٹھیک وہی حیثیت دیتا ہے جو مشرکوں کے انکار کو دیتا ہے۔ اور نتائج بھی دونوں کے ایک ہی بتاتے ہیں۔ قرآن نے اہل کتاب کے لیے ایسی کوئی گنجائش نہیں رکھی کہ وہ اسلام کے بجائے اپنے ہی دین پر قائم رہ سکتے ہیں۔ اس آیت کی دھمکی پر غور فرمایئے آخر میں اس دھمکی کو پُرزور بنانے کے لیے فرمایا واللہ علیٰ کل شیئٍ قدیر یعنی تم اگر اس پیغمبر کی بات نہ مانوگے تو خدا کی قدرت ہے کہ کوئی دوسری قوم کھڑی کر دے جو اس کے پیغام کو پوری طرح قبول کرے گی اور پیغمبر کا ساتھ دے گی خدا کا کام کچھ تم پر موقوف نہیں ہے۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بلکہ اس موقع پر یہ فقرہ نہایت بلیغ و لطیف ہے اس کا مطلب یہ بھی ہے کہ جو خدا بشارت دینے والے اور ڈرانے والے بھیجنے پر قادر ہے اسی نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس خدمت پر مامور کیا ہے اور وہ ایسا کرنے پر قادر ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے اس بشیر و نذیر کی بات نہ مانی تو یاد رکھو اللہ قادر و توانا ہے، ہر سزا جو وہ تمہیں دینا چاہے بلا مزاحمت دے سکتا ہے [1]

---

[1] تفہیم القرآن ۔

وَإِذْ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ يَٰقَوْمِ اذْكُرُوا نِعْمَةَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ إِذْ جَعَلَ
فِيكُمْ أَنبِيَاءَ وَجَعَلَكُم مُّلُوكًا وَآتَاكُم مَّا لَمْ يُؤْتِ أَحَدًا مِّنَ
الْعَالَمِينَ ۝ يَٰقَوْمِ ادْخُلُوا الْأَرْضَ الْمُقَدَّسَةَ الَّتِي كَتَبَ اللَّهُ
لَكُمْ وَلَا تَرْتَدُّوا عَلَىٰ أَدْبَارِكُمْ فَتَنقَلِبُوا خَاسِرِينَ ۝ قَالُوا يَٰمُوسَىٰ
إِنَّ فِيهَا قَوْمًا جَبَّارِينَ وَإِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا حَتَّىٰ يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِن
يَخْرُجُوا مِنْهَا فَإِنَّا دَاخِلُونَ ۝ قَالَ رَجُلَانِ مِنَ الَّذِينَ يَخَافُونَ
أَنْعَمَ اللَّهُ عَلَيْهِمَا ادْخُلُوا عَلَيْهِمُ الْبَابَ فَإِذَا دَخَلْتُمُوهُ فَإِنَّكُمْ
غَالِبُونَ وَعَلَى اللَّهِ فَتَوَكَّلُوا إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝ قَالُوا
يَٰمُوسَىٰ إِنَّا لَن نَّدْخُلَهَا أَبَدًا مَّا دَامُوا فِيهَا فَاذْهَبْ أَنتَ وَرَبُّكَ
فَقَاتِلَا إِنَّا هَٰهُنَا قَاعِدُونَ ۝ قَالَ رَبِّ إِنِّي لَا أَمْلِكُ إِلَّا نَفْسِي
وَأَخِي فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۝ قَالَ فَإِنَّهَا
مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ أَرْبَعِينَ سَنَةً يَتِيهُونَ فِي الْأَرْضِ فَلَا
تَأْسَ عَلَى الْقَوْمِ الْفَاسِقِينَ ۝

اور اس واقعہ کو دھیان میں لاؤ جب موسٰی نے اپنی قوم سے کہا لوگو
اللہ کا اپنے اوپر یہ احسان یاد کرو کہ اُس نے تم میں انبیاء بنائے اور
تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا تھا جو دُنیا میں کسی کو نہیں
دیا"۔ لوگو! مقدس سرزمین میں جسے اللہ نے تمہارے لیے مقرر فرما
دیا ہے داخل ہو جاؤ اور اُلٹے پیچھے نہ پلٹو کہ نقصان اٹھاؤ گے"۔
لوگوں نے اس کے جواب میں کہا اے موسٰی اس سرزمین میں ایسے
لوگ رہتے ہیں جو بڑے ہی زبردست ہیں۔ جب تک وہ لوگ
وہاں موجود ہیں ہم اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے، ہاں
اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔
اس پر ان ڈرنے والوں میں سے ان دو آدمیوں نے کہا جن کو خدا
نے انعام سے نوازا تھا کہ ہمت کر کے شہر کے دروازے میں
داخل ہو جاؤ، جب تم داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تمہارے لیے
ہوگا اگر ایمان والے ہو تو اللہ ہی پر توکل کرو"۔ وہ بولے اے

موسیٰ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل ہونے والے نہیں تم خود جاؤ اور تمہارا رب ہی تمہارے ساتھ ہو اور دونوں ان سے جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے۔" حضرت موسیٰ نے کہا خدایا مجھے اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں ہے لہٰذا تو ہم میں اور ان نافرمانوں میں فیصلہ کر دے۔" اللہ کا حکم ہوا کہ اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کر دی گئی ہے یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے لہٰذا اے موسیٰ تو ان نافرمانوں پر غمزدہ نہ ہو۔[49]

اسرائیلی تاریخ کے ایک واقعہ سے استشہاد

یہود کے ابتدائی تاریخ کے ایک واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے جس سے ایک طرف تو یہ حقیقت روشنی میں آتی ہے کہ یہ قوم ابتدا ہی سے خدا کے عہد اور اس کے حقوق و فرائض کے معاملہ میں نہایت بودی اور لچکی رہی ہے۔ دوسری طرف یہ بات بھی واضح ہوتی ہے کہ اللہ نے ابتدا ہی سے اس کی بدعہدیوں اور نالائقیوں پر اس کو سزا بھی ہمیشہ عبرتناک دی ہے۔ اور ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ جب ایک قوم عرصہ تک غلامی کی حالت میں رہتی ہے تو اس میں بلند مقاصد کے لیے جدوجہد کی استعداد باقی نہیں رہتی وہ غلامی کا امن پسند کرتی ہے اگرچہ ذلت و نامرادی کے ساتھ ہو اور مقاصد کی جدوجہد

سے جی چرانے لگتی ہے اگرچہ اس کا نتیجہ کامرانی و اقبال ہو۔ یہی حال بنی اسرائیل کا تھا۔ مقاصد امور کے لیے ان میں عزم و ہمت نہ تھی۔ بزدلی اور بے طاقتی نے ان کے قدم جکڑ لیے تھے۔ واقعہ کی تفصیلات بائیبل کی کتاب گنتی، استثناء اور یشوع میں ملیں گی۔ خلاصہ اس کا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے دشت فاران سے بنی اسرائیل کے بارہ سرداروں کو فلسطین کا دورہ کرنے کے لیے روانہ کیا تاکہ وہاں کے حالات معلوم کرکے آئیں۔ یہ لوگ چالیس دن دورہ کرکے وہاں سے واپس آئے اور انہوں نے قوم کے مجمع عام میں بیان کیا کہ واقعی وہاں دودھ اور شہد کی نہریں بہتی ہیں لیکن جو لوگ وہاں بسے ہوتے ہیں وہ بڑے زورآور ہیں ہم اس لائق نہیں ہیں کہ ان لوگوں پر حملہ کریں۔ وہاں جتنے آدمی ہم نے دیکھے وہ سب بڑے قدآور ہیں۔ اور ہم نے وہاں بنی عناق کو بھی دیکھا جو جبار ہیں اور جباروں کی نسل سے ہیں اور ہم تو اپنی ہی نگاہ میں ایسے تھے جیسے ٹڈی ہوتے ہیں اور ایسے ہی ان کی نگاہ میں تھے۔ یہ بیان سن کر سارا مجمع چیخ اٹھا کرلے کاش ہم مصر ہی میں مرجاتے یا کاش اس بیابان میں ہی مرتے۔ خداوند کیوں ہم کو اس ملک میں لے جاکر تلوار سے قتل کرانا چاہتا ہے۔ پھر تو ہماری بیویاں اور بال بچے لوٹ کا مال ٹھہریں گے۔ کیا ہمارے لیے بہتر نہ ہوگا کہ ہم مصر کو واپس چلے جائیں۔ پھر وہ آپس میں کہنے لگے آؤ ہم کسی کو اپنا سردار بنالیں اور مصر کو لوٹ چلیں۔ اس پر ان بارہ سرداروں میں سے جو فلسطین کے دورے پر گئے تھے دو سردار یوشع اور کالب اٹھے اور انہوں نے اس بزدلی پر قوم کو ملامت کی۔ کالب نے کہا چلو ہم ایکدم جاکر اس ملک پر قبضہ کرلیں کیونکہ ہم اس قابل ہیں کہ اس پر تصرف کریں۔ پھر دونوں نے یک زبان ہوکر کہا کہ اگر خدا ہم سے راضی ہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو اور ہمارے ساتھ خداوند ہے سو ان کا خوف نہ کرو مگر قوم نے اس کا جواب یہ دیا کہ انہیں سنگسار کردو، آخر کار اللہ نے فیصلہ فرما دیا کہ اصحاب یوشع اور کالب کے سوا اس قوم کے بالغ مردوں میں سے کوئی بھی اس زمین میں داخل نہ ہونے پائے گا۔ یہ لوگ چالیس برس تک بے خانماں پھرتے رہیں گے یہاں تک کہ جب ان میں سے بیس برس سے لے کر اوپر کی عمر کے سب مرد مر جائیں گے اور نئی نسل جوان ہوکر اٹھے گی تب ان کو فلسطین فتح کرنے کا موقع ملے گا چنانچہ اس خداوندی فیصلہ کے مطابق بنی اسرائیل کو دشت فاران سے شرق اردن تک پہنچتے پہنچتے پورے ۳۸ سال لگ گئے۔ اس دوران میں وہ سب مر گئے جو جوانی کی عمر میں مصر سے نکلے تھے شرق اردن کی فتح کے بعد حضرت موسیٰ کا وصال ہوگیا۔ اس کے بعد حضرت یوشع نے فلسطین فتح کیا۔

۲۰ ۔ اور اس واقعہ کو یاد کرو جب موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا لوگو! اللہ کا اپنے اوپر احسان

یاد کرو کہ اس نے تم میں انبیاء بنائے اور تمہیں بادشاہ بنایا اور تمہیں وہ کچھ دیا جو دُنیا میں کسی کو نہیں دیا۔ یعنی تمہارے جدِ اعلیٰ حضرت ابراہیم سے لے کر آج تک جتنے نبی تم میں پیدا کیے۔ مثلاً حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب، حضرت یوسف اور خود حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون علیہم السلام پھر ان کے بعد بھی یہ سلسلہ مدت دراز تک قائم رہا۔ یہ تو نبوت کا انعام ہوا اور بادشاہی کا انعام یہ کہ فرعونیوں کی ذلیل ترین غلامی سے آزادی دلا کر ان کے اموال و املاک پر قابض کیا اور اس سے پہلے تم ہی میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کو مصر کے خزائن اور سلطنت پر کیسا تسلط عطا فرمایا۔ پھر مستقبل میں بھی حضرت سلیمان وغیرہ نبی اور بادشاہ پیدا کیے گویا دین اور دُنیا دونوں کی اعلیٰ نعمتوں سے تم کو سرفراز کیا۔ کیونکہ دینی مناصب میں سب سے بڑا منصب نبوت اور دنیوی اقبال کی آخری حد آزادی اور بادشاہت ہے۔ یہ دونوں چیزیں مرحمت کی گئیں۔ اسی پر بس نہیں بلکہ اللہ نے تمہیں وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا تھا یعنی اس وقت جب موسیٰ علیہ السلام کو خطاب فرما رہے تھے بنی اسرائیل پر تمام دُنیا کے لوگوں سے زیادہ اللہ کی نوازشیں ہوئیں اور اگر احداً من العالمین کو عموم پر محمول کیا جائے تو یہ اس لیے صحیح نہیں ہے کہ اُمتِ محمدیہ کی نسبت خود قرآن حکیم میں تصریح ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس اور کذالک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شہداء علی الناس[1]

یہ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کے سامنے تقریر کی۔ تقریر میں دو اہم اور بنیادی باتیں ارشاد فرمائیں ایک یہ کہ تم پر اللہ کا انعام ہوا ہے اور دوسرے یہ کہ بے مثال ہوا ہے اور تمہیں وہ کچھ عطا ہوا ہے جو کسی کو نہیں ہوا ہے۔ یہ تقریر کس موقعہ پر ہوئی اور کب ہوئی؟ سوال کا جواب یہ ہے کہ اس تقریر کا وہ زمانہ ہے جب بنی اسرائیل مصریوں کی غلامی و محکومی سے آزاد ہو کر جزیرہ نمائے سینا میں آزادی سے نقل و حرکت کر رہے ہیں۔ حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا زمانہ تازہ ترین تاریخی اور اثری تحقیق کے مطابق مصر سے خروج بنی اسرائیل کا زمانہ ۱۴۴۰ قبل مسیح کا ہے اور فلسطین پر فوج کشی کا زمانہ ۱۴۰۰ قبل مسیح کا۔ اس لحاظ سے حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا زمانہ اسی درمیانی مدت کا ہے۔ یہ تقریر حضرت موسیٰ نے دشتِ فاران میں اس موقع پر فرمائی جب بنی اسرائیل کو فلسطین پر حملہ کے لیے ابھارا ہے۔ تورات کی کتاب گنتی باب ۱۳، ۱۴ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد تمام منازل سفر طے کرتے ہوئے جب حضرت موسیٰ دشت فاران میں پہنچے ا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فلسطین کا علاقہ قریب آیا۔ آپ نے ۱۲ سرداروں کی ایک پارٹی کو علاقہ کے حالات دریافت کرنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ پارٹی اپنی مہم سے فارغ ہو کر جب واپس آئی تو اس نے علاقے کی زرخیزی و شادابی سے متعلق تو نہایت شوق انگیز رپورٹ دی لیکن ملک پر قابض باشندوں کے قد و قامت اور ان کی زور آوری سے متعلق اس نے جو بیان دیا وہ بنی اسرائیل کے لیے نہایت حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ یہی موقعہ ہے جب حضرت موسیٰ نے تقریر فرمائی اور فرمایا کہ لوگو اللہ کا اپنے اوپر انعام یاد کرو کہ اس نے کیسی کیسی نعمتوں سے تمہیں نوازا ہے اس نے تم میں نبی پیدا کیے اور تمہیں بادشاہ بنایا۔

انبیاء کا مشن اور اقتدار

نبوت اور حکومت کو جمع کر کے نعمت کہا گیا ہے یعنی اللہ کا تم پر احسان عظیم یہ ہے کہ نبوت اور بادشاہت دونوں تمہارے لیے جمع فرما دی ہیں۔ اس ارشاد میں ان لوگوں کے لیے بہت بڑی عبرت ہے جو کہتے ہیں کہ دین سے سیاست کا رشتہ زیادہ سے زیادہ ثانوی درجہ کا ہے۔ دین میں سیاست کو کوئی بنیادی اہمیت حاصل نہیں ہے نہ حکومت دین کے لیے کچھ ناگزیر ہے۔ ناگزیر ہونا تو دُور رہا وہ اس کے لیے مطلوب بھی نہیں ہے نہ اس کے لیے کوشش کرنا دین کے پیروؤں کی کوئی دینی ذمہ داری ہے۔

اصل واقعہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام جس مشن پر مامور ہوتے تھے وہ آخری عملی شکل کے لحاظ سے ایک دینی حکومت کا قیام ہی ہوتا تھا کیونکہ اقتدار حکومت کے بغیر جس طرح آج اسلام اسلام نہیں رہ جاتا اور دین خدا پر پورا عمل نہیں ہو سکتا اسی طرح کسی بھی نبی کے زمانے میں نہیں ہو سکتا تھا اس لیے ہر دور کے دین خداوندی کی نظر اس بات پر لازماً ہونی چاہیے کہ معاشرے کا اقتدار اس کے اپنے ہاتھ میں آئے۔ یہ دوسری بات ہے کہ ان انبیاء میں سے بہتوں کے ساتھ حالات نے سازگاری نہ کی ہو اور اس لیے ان کی دعوتی جدوجہد کے نتائج اس حد کمال کو نہ پہنچ پاتے ہوں لیکن ظاہر ہے کہ کسی دعوت کا اس حد کمال تک نہ پہنچنا اور بات ہے اور اس چیز کا حد کمال نہ ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ نبوت کی دعوت کی جو تاریخ ہمارے سامنے ہے اس میں اس بات کا تذکرہ تو ضرور ملتا ہے کہ ان میں سے اکثر سیاسی نظام قائم کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے مگر اس بات کا کوئی ثبوت نہیں ملتا کہ وہ ایسا ہی چاہتے تھے۔ بلاشبہ ہر نبی کی دعوت کا اساسی کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہی تھا۔ لا حاکم الا اللہ نہ تھا مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم میں لا حاکم الا اللہ بھی

شامل ہے اور الوہیت کا ایک جز حاکمیت بھی ہے یعنی یہ بات کہ اللہ کے سوا کوئی الہٰ نہیں یہ معنے بھی رکھتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ الٰہ کو صرف حاکم سمجھنا ضرور غلط بات ہے مگر اس سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ الٰہ کے اصل مفہوم میں حاکمیت کا تصور بھی نہ مانا جائے۔ اسی طرح یہ بھی بالکل صحیح ہے کہ کسی نبی نے اپنی دعوت ان لفظوں میں ہرگز نہ دی تھی کہ لوگو اللہ کی حکومت قائم کرو، کیونکہ اس کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں بلکہ ہر نبی کے الفاظ یہی تھے کہ اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ، مگر کون کہہ سکتا ہے کہ ان الفاظ کے مفہوم میں ان لفظوں کا مفہوم بھی اپنی پوری اہمیت کے ساتھ شامل نہیں ہے کیونکہ یہ بات اسی وقت کہی جا سکتی ہے جب کہ عبادت کا مفہوم پرستش تک محدود ہو لیکن جب امر واقعہ یہ ہے کہ عبادت کے مفہوم میں پرستش اور بندگی دونوں موجود ہیں تو ان احکام دین کی پیروی کو عبادت سے کسی طرح خارج قرار نہیں دیا جا سکتا ہے جو زندگی کے مختلف قسموں سے تعلق رکھتے ہیں اور جن کی آخری کڑی سیاست اور حکومت کے احکام ہوتے ہیں۔ اور جب ان احکام کی پیروی بھی عبادت ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ انبیا کی جو اصل دعوت تھی اس کے عین مفہوم ہی میں سیاسی احکام کی پیروی کا تصور بھی لازماً موجود تھا۔

بہرحال اس آیت میں نبوت اور حکومت کو اپنا انعام بتایا گیا ہے اور حضرت موسیٰ نے اپنی تقریر کا آغاز ان دونعمتوں کے تذکرہ سے کیا ہے۔

ایک تفسیری نکتہ

ذکر تو نبوت اور حکومت دونوں کا کیا ہے مگر انداز بیان اور تعبیر اس انوکھے طرز کی ہے کہ دونوں میں جوہری فرق بتادیا گیا ہے۔ نبوت کے لیے تعبیر یہ اختیار فرمائی کہ جعل فیکم انبیاء تم میں انبیاء بنائے لیکن حکومت واقتدار کے لیے انداز یہ اختیار کیا وجعلکم ملوکا تم کو بادشاہ بنا دیا۔ یہ تم میں اور تم کو کے انداز سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ نبوت ایک مرتبہ اختصاص ہے صرف وہ نبی ہوتا ہے جسے اللہ سبحانہ اس منصب پر فائز فرماتا ہے۔ اس میں دوسرا کوئی شریک نہیں ہوتا۔ اس کے برعکس حکومت ایک منصب اشتراکی اور اجتماعی ہے جس میں بادشاہ کے ساتھ اس کی پوری قوم شریک ہوتی ہے اگر کسی حکومت میں قوم شریک نہ ہو تو وہ استبداد اور مطلق العنانی ہے۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

اس تقریر میں حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو جن دو نعمتوں کی یاد دہانی کرائی ہے ان کا تعلق اس وقت بنی اسرائیل کے ماضی سے ہے یا مستقبل سے۔ ہماری رائے میں یہ مستقبل کے بارے میں وعدہ ہے اور حضرت موسیٰ بنی اسرائیل سے کہہ رہے ہیں کہ اللہ کے ان وعدوں کو دھیان میں رکھ کر ہمت کرو۔ اللہ کے جو وعدے مستقبل سے متعلق ہوتے ہیں بسا اوقات ان کو ماضی کے صیغوں سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یہ وعدوں کی قطعیت کے اظہار کا ایک بلیغ انداز ہے۔ قرآن میں یہ انداز بیان بہت زیادہ اختیار کیا گیا ہے گویا یہ وعدے محض وعدے نہیں بلکہ واقعات ہیں جو واقع ہو چکے ہیں۔ حضرت موسیٰ سے پہلے اگرچہ بنی اسرائیل میں بعض انبیاء مبعوث ہو چکے تھے لیکن نبوت کا غیر منقطع سلسلہ آپ کے بعد شروع ہوا جو حضرت مسیح کی بعثت تک جاری رہا ہے۔ بادشاہوں کے سلسلے کا تعلق تمام تر حضرت موسیٰ کے بعد ہی کے دور سے ہے۔ اس سے پہلے خاندان کے بزرگوں کو ایک قسم کی سیادت ضرور حاصل رہی ہے لیکن اسے بادشاہی نہیں کہہ سکتے۔ تورات میں بھی اسے بادشاہی سے تعبیر نہیں کیا گیا ہے۔ جن شارحین قرآن کی نظر اس نکتہ پر نہ تھی انہوں نے لفظ ملوک کی تاویل کی اور بتایا کہ ملوک ملک کی جمع ہے اور ملک وہ ہے جو آزاد، خود مختار اور صاحب حیثیت ہو، حالانکہ یہاں بات ماضی کی نہیں بلکہ مستقبل کی ہو رہی ہے۔

آخری فقرہ واٰتاکم مالم یؤت احدا من العالمین کی نشست بھی اپنی جگہ بالکل درست ہو جاتی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تمہیں وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا۔ یعنی نبوت اور بادشاہت دونوں تم میں جمع ہو گئیں۔ جن لوگوں نے اس کا پیوند ماضی سے جوڑا ان کو اس فقرے کے مطلب متعین کرنے میں گوناگوں پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا۔ کسی نے کہا کہ اس سے مراد وہ منصب امامت و شہادت حق ہے جس پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو مامور فرمایا تھا۔ کسی نے بتایا کہ اس سے توحید کی نعمت مراد ہے کوئی بولا یہ اشارہ ہے بنی اسرائیل کی اس عظمت گزشتہ کی طرف جو حضرت موسیٰ سے پہلے ان کو کسی زمانے میں حاصل تھی۔ کسی نے یہ نکتہ آفرینی کی کہ تمہارے لیے سمندر کو پھاڑ دیا اور تمہارے سامنے تمہارے دشمن کو دریا برد کر دیا۔ پھر آیت کی یہ تشریح کرنے کے بعد یہ دشواری سامنے آگئی کہ اگر بنی اسرائیل کو یہ تمام دے دیا جائے تو پھر امت محمدی کے لیے کون سا تمغہ باقی رہے گا حالانکہ پورا کیس ہی سرے سے غلط ہے یہاں

مقابلہ تو اس دور کی قوموں اور نسلوں سے ہو رہا ہے نہ کہ اُمت سے۔ بے شک بنی اسرائیل اپنے زمانہ کی قوموں اور نسلوں میں یہ ممتاز حیثیت رکھتے تھے۔ اُمت محمدیہ کسی نسل یا قوم کا نام نہیں ہے۔

جہاد کے لیے حضرت موسیٰ کی تقریر

۴۷۔ لوگو! مقدس سرزمین میں جسے اللہ نے تمہارے لیے مقرر فرما دیا ہے، داخل ہو جاؤ اور الٹے پیچھے نہ پلٹو کہ نقصان اٹھاؤ گے۔ خدا نے پیشتر حضرت ابراہیم سے وعدہ فرمایا تھا کہ تیری اولاد کو یہ ملک دوں گا وہ وعدہ ضرور پورا ہونا ہے۔ خوش قسمت ہوں گے وہ لوگ جن کے ہاتھوں پر پورا ہو اور جہاد فی سبیل بزدلی، پست ہمتی نہ کھاؤ کہ اس سے دوبارہ غلامی کی طرف پلٹ جاؤ گے[1]

یہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی اس تقریر کا حوالہ ہے جو انہوں نے دشتِ فاران میں اس موقع پر فرمائی جب بنی اسرائیل کو فلسطین پر حملہ کے لیے ابھارا ہے۔ تورات کی کتاب گنتی باب ۱۳، ۱۴ کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مصر سے نکلنے کے بعد تمام منازل سفر طے کرتے ہوئے جب حضرت موسیٰ دشتِ فاران میں پہنچے اور فلسطین کا علاقہ قریب آیا تو چونکہ یہی علاقہ منزل مقصود تھا۔ اس وجہ سے اپنے بارہ سرداروں کی ایک پارٹی علاقے کے حالات دریافت کرنے کے لیے بھیجی۔ یہ پارٹی اپنی مہم سے فارغ ہو کر جب واپس آئی تو اس نے علاقہ کی زرخیزی و شادابی سے متعلق تو نہایت شوق انگیز رپورٹ دی لیکن ملک پر قابض باشندوں کے قد و قامت اور ان کی زور آوری سے متعلق اس نے جو بیان دیا وہ بنی اسرائیل کے لیے نہایت حوصلہ شکن ثابت ہوا۔ چنانچہ یہ بیان سنتے ہی انہوں نے واویلا شروع کر دیا اور جس ملک پر قبضہ کرنے کی امنگیں لیے ہوئے یہاں تک پہنچے تھے اس پر قبضہ کرنا تو در کنار پھر مصر پلٹ جانے کی باتیں کرنے لگے اور یہ بات انہیں یاد ہی نہیں رہی کہ خدا نے ان کو اس ملک کی میراث دینے کا قسم کے ساتھ وعدہ کیا ہوا ہے۔

یہی موقع ہے جب حضرت موسیٰ نے یہ تقریر فرمائی ہے۔ قرآن نے اگرچہ تقریر کا صرف خلاصہ دیا ہے اس لیے مقصود بالاجمال واقعہ کی طرف صرف اشارہ کرنا ہے۔ تاہم وہ سارے پہلو اس میں موجود ہیں جو اس موقع پر حوصلے کو بحال کرنے اور پست حوصلگی کے انجام بد سے آگاہ کرنے کے لیے ضروری تھے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

آیت میں ارضِ مقدس سے مراد کنعان اور فلسطین کا علاقہ ہے۔ اس کو مقدس کہنے کی وجہ یہ ہے کہ یہی علاقہ ہے جہاں حضرت ابراہیم، حضرت یعقوب، حضرت اسحاق نے اللہ کے دین کی دعوت کا کام کیا۔ یہ علاقہ اگرچہ بعد میں کافروں اور بت پرستوں کے قبضے میں آگیا تھا لیکن توحید اور خدا پرستی کی آذان چونکہ سب سے پہلے اسی علاقے میں گونجی تھی۔ اس وجہ سے اس کو ارضِ مقدس سے تعبیر کیا۔ مصر سے نکلنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اسی علاقے کو بنی اسرائیل کی میراث قرار دیا اور تورات سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم کھا کر ان سے وعدہ کیا کہ میں نے یہ علاقہ تم کو دیا۔ تورات میں ان وعدوں کی صراحت موجود ہے۔ مثلاً استثنا میں ہے کہ

دیکھو میں نے یہ زمین جو تمہارے آگے ہے تمہیں عنایت کی، داخل ہو اور اس سرزمین کو جس کی بات خداوند نے تمہارے باپ دادوں ابراہام اور اصحاق اور یعقوب سے قسم کی کہ تم کو اور تمہارے بعد تمہاری نسل کو دوں گا میراث میں لو۔ ۱-۸۔

تو اس زمین میں جس کی بابت خداوند نے تیرے باپ دادوں ابراہام، اصحاق اور یعقوب سے قسم کھا کر کہا کہ اسے میں تمہیں دوں گا سکونت کرے۔ ۳۰-۲۰۔

مضبوط ہو جاؤ اور دلاور ہو جاؤ، خوف نہ کھاؤ اور ان سے مت ڈرو کیونکہ خداوند تیرا خدا وہی ہے جو تیرے ساتھ جاتا ہے وہ تجھ سے غافل نہ ہوگا اور تجھ کو نہ چھوڑے گا۔ ۳۱-۶۔

اس بنا پر ماکتب اللہ لکم کا مطلب یہ ہے کہ جس سرزمین کا تمہارے لیے اللہ نے حضرت ابراہیم سے وعدہ فرمایا ہے وہ تمہارے لیے علم الٰہی میں مقدر ہو چکی ہے ذرا سی ہمت اور کوشش کرو تو تمہیں مل سکتی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ اُلٹے پیچھے نہ پلٹو کر نقصان اٹھاؤ گے۔ اس کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ توحید عدل و ہدایت کی دعوت میں نے کر آیا ہوں اس سے ہٹ کر بت پرستی اور ملک میں شورش اختیار نہ کرو کہ اس کا نتیجہ تمہارے حق میں نقصان کے سوا کچھ نہیں ہے۔ دوسرا مطلب یہ ہے کہ جہاد کے موقع پر نامردی اور بزدلی کا مظاہرہ نہ کرو، اس میں سرتاسر تمہارا خسارہ ہے۔ جب ایک قوم عرصے تک غلامی کی حالت میں رہتی ہے تو اس میں بلند مقاصد کے لیے جدوجہد کی استعداد باقی نہیں رہتی۔ وہ غلامی کا امن پسند کرنے لگتی ہے۔ اگرچہ ذلت و نامرادی کے ساتھ ہو اور مقاصد کی راہ میں جدوجہد سے جی چرانے لگتی ہے اگرچہ اس کا نتیجہ کامرانی و اقبال ہو۔

خسارہ بھی دو قسم کا ہے ایک دنیوی اور دوسرا اخروی۔ دنیوی خسارہ یہ ہے کہ ارض مقدس سے محروم ہو جاؤ گے اور اخروی خسارہ یہ ہے کہ اللہ کی راہ میں محنت کرنے کے اجر و ثواب سے محروم ہو جاؤ گے۔ یہاں دونوں کا احتمال ہے۔

جہاد سے گریز پائی

۵ ۷۔ لوگوں نے اس کے جواب میں کہا کہ اے موسیٰ اس سرزمین میں ایسے لوگ رہتے ہیں جو بڑے ہی زبردست ہیں جب وہ لوگ وہاں موجود ہیں۔ ہم اس سرزمین میں قدم نہیں رکھیں گے ہاں اگر وہ وہاں سے نکل جائیں تو پھر ہم ضرور داخل ہو جائیں گے۔ زبردست یعنی بہت قوی ہیکل تنومند اور اور پُر عیب ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم میں ان سے مقابلہ کی ہمت نہیں ہے۔ ہاں بدون ہاتھ پاؤں ہلاتے پکی پکائی کھالیں گے۔ اب معجزے کے زور سے ان کو نکال دیں۔[1]

یہ حضرت موسیٰ کی اس تقریر کا جو پہلے گزر چکی ہے۔ بنی اسرائیل کی طرف سے جواب ہے کہ جب اس ملک پر ایسے عظیم اور قدآور لوگ قابض ہیں تو ہم ان کی تلواروں کا لقمہ بننے کے لیے تیار نہیں ہیں، البتہ اگر قدرت کے کسی ایسے معجزے کے ذریعے سے جیسے تم اب تک ہمیں دکھاتے رہے ہو یہ لوگ اس علاقے سے نکل جائیں تو پھر ہم اس علاقہ پر قابض ہونے کے لیے تیار ہیں۔

جن کو یہاں جبار کہا ہے یہ عمالقہ کی قوم تھی جو ایک بڑی زورآور اور جنگ آزما قوم تھی۔ بنی اسرائیل کی پرانی حریف، تورات اور تاریخ اسرائیل اس کی خون ریزیوں کی داستان سے اٹی پڑی ہے تورات میں اس قوم کا چہرہ بنی اسرائیل کی زبانی یہ بتایا ہے کہ

> ہمیں زور نہیں ہے کہ ہم ان لوگوں پر چڑھیں کیونکہ وہ ہم سے زیادہ زورآور ہیں۔ گنتی ۱۳، ۳۲۔

> یہ زمین جس کی جاسوسی میں ہم گئے تھے ایک زمین ہے جو اپنے بسنے والوں کو نگل جاتی ہے اور سب لوگ جنہیں ہم نے وہاں دیکھا بڑے قدآور ہیں اور ہم نے وہاں جباروں کو ہاں بنی عناق کو جو جباروں کی نسل میں ہیں دیکھا۔ اور ہم اپنی نظروں میں ان کے سامنے ایسے تھے جیسے ٹڈے اور ایسے ہی ہم ان کی نظروں میں تھے۔ (گنتی ۱۳-۳۳۔)

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جبار کا لفظ بڑے ڈیل ڈول والے کے علاوہ پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں یہی مراد ہے۔ یہودی روایات میں خرافات کی حد تک ان کے قد و قامت کی درازی کا ذکر کیا ہے۔ عربی میں نخلۃ جبارۃ ایسے لمبے تنے والے کھجور کے درخت کو کہتے ہیں جس پر آسانی سے آدمی کا ہاتھ نہ پہنچ سکے۔ لحیانی نے اس کے معنے لمبائی طاقت اور بڑائی کے بتاتے ہیں۔ ازہری کہتے ہیں کہ جبار طویل عظیم اور قوی کو کہتے ہیں۔

ایمانی قوت کا فیصلہ

۲۶۔ اس پر ان ڈرنے والوں میں سے ان دو آدمیوں نے کہا جن کو خدا نے انعام سے نوازا تھا کہ ہمت کر کے شہر کے دروازے میں داخل ہو جاؤ۔ جب تم داخل ہو جاؤ گے تو غلبہ تمہارے لیے ہو گا اگر ایمان والے ہو تو اللہ پر توکل کرو۔ وہ دو شخص حضرت یوشع بن نون اور کالب بن یوحنا تھے جو خدا سے ڈرتے تھے۔ اسی لیے عمالقہ وغیرہ کا ان کو کچھ ڈر نہ رہا۔

ہر کہ ترسید از حق و تقوی گزید
ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

ان دونوں نے کہا تھا کہ ہمت کر کے شہر کے پھاٹک تک تو چلو پھر خدا تم کو غالب کرے گا خدا اسی کی مدد کرتا ہے جو خود بھی اپنی مدد کرے اور یہ بھی بتایا کہ اللہ پر توکل کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسباب مشروعہ کو ترک کرنا توکل نہیں۔ توکل یہ ہے کہ کسی نیک مقصد کے لیے انتہائی کوشش کرے۔ پھر اس کے مثمر اور منتج ہونے کے لیے خدا پر بھروسہ رکھے۔ اپنی کوشش پر نازاں اور مغرور نہ ہو۔ باقی اسباب مشروعہ کو چھوڑ کر خالی امیدیں باندھتے رہنا توکل نہیں تعطل ہے[1]

اس آیت میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔ اوّل یہ کہ رجلان سے کون مراد ہیں دوم یہ کہ یخافون کا مفعول کیا ہے، تیسرے یہ کہ ان کی اس تقریر کا پس منظر کیا ہے؟

اس پر سارے شارحین قرآن کا اتفاق ہے کہ رجلان سے مراد یوشع بن نون اور کالب بن یفنۃ ہیں۔ تورات کا بیان بھی یہی ہے اور اسی کی پیروی میں مفسرین کا بھی یہی فیصلہ ہے الذین یخافون میں عام شارحین قرآن نے اللہ کو محذوف مان کر مطلب یہ بتایا ہے کہ یہ دو شخص جو اللہ سے ڈرتے تھے۔ انہوں نے کہا، لیکن یہ بات میرے دل کو نہیں لگتی ہے کیونکہ اس سے یہ مترشح ہوتا ہے کہ

[1] افادات شیخ الاسلام

صرف یہی خدا سے ڈرنے والے نہ تھے بلکہ ان کے ساتھ خدا سے ڈرنے والی ایک جماعت تھی، اگر صورتِ حال یہی ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب قرآن نے الذین یخافان چھوڑ کر الذین یخافون کی تعبیر اختیار کی ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ ڈرنے والے سارے بنی اسرائیل تھے لیکن یخافون کے معنول میں دو احتمال ہیں ایک یہ کہ خدا سے ڈرنے والے ، دوسرے یہ کہ دشمن سے ڈرنے والے۔ میری رائے میں دوسری بات زیادہ وزنی ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ سب لوگ جن کو دشمن کی قوت کا اندیشہ ستا رہا تھا ان میں سے ان دو نے اپنی ایمانی قوت کا مظاہرہ کیا جن پر اللہ کا انعام ہوا ہے اور باوجود خوف کے انہوں نے اعلانِ حق کیا اور جرأت دکھائی۔ یہ حقیقت ہے کہ جب پوری قوم اس طرح ہمت ہار بیٹھے جس طرح بنی اسرائیل ہار بیٹھے تو بہادر سے بہادر آدمی کے اعصاب بھی جواب دے جاتے ہیں۔ بڑا ہی باوفا اور صداقت شعار ہے وہ شخص جو ایسے نازک موقع پر بھی اپنی وفاداری اور صداقت شعاری نباہ لے جاتے۔ یوشع اور کالب کے کردار کا یہی پہلو ہے جس کے سبب عہد و میثاق کی اس سورت میں قرآن نے ان کا ذکر کرکے ان کو زندہ جاوید بنا دیا تاکہ جو لوگ خدا کی راہ پر چلنے کا عہد کریں وہ ان کے مثالی کردار سے یہ سبق لیں کہ جب سب سو جائیں تو جاگنے والے کس طرح جاگتے ہیں اور جب سب مر جاتے تو زندہ رہنے والے کس طرح زندہ رہتے ہیں۔ قرآن نے یہاں بزدلوں کے اندر کے بہادروں اور مردوں کے اندر کے زندوں کو اس لیے نمایاں کیا ہے کہ بہادروں کے اندر بہادر اور زندوں کے اندر زندہ تو بہت نظر آجائیں گے لیکن وہ ہستیاں بہت کمیاب ہیں جو مردوں کو زندگی بخشتی ہیں۔ اگرچہ اسی راہ میں انہیں خود اپنی زندگیوں سے ہاتھ دھونے پڑ جائیں۔

ان دونوں مردانِ حق کی تقریر یہ ہے کہ ادخلوا علیہم الباب فاذا دخلتموہ فانکم غالبون انہوں نے اعلان کیا کہ شہر کے پھاٹک سے ان پر چڑھائی کرو جب تم قدم اٹھاؤ گے تم ہی غالب رہو گے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ بندہ جب اپنا فرض ادا کرنے کے سلسلے میں اپنے پاس جو طاقت و قوت موجود ہے اس کو میدان میں جھونک دیتے ہیں تب اللہ اُن کو مدد سے نوازتا ہے گھروں میں بیٹھ جانے والوں کی وہ مدد نہیں کرتا۔ تورات میں ان کی تقریر ان الفاظ میں ہے:

> اور نون کا بیٹا یشوع اور یفنہ کا بیٹا کالب جو اس ملک کا حال دریافت کرنے والوں میں سے تھے اپنے اپنے کپڑے پھاڑ کر بنی اسرائیل کی ساری جماعت سے کہنے لگے کہ وہ ملک جس کا حال دریافت کرنے کو ہم اس میں سے گزرے نہایت اچھا ملک ہے اگر خدا ہم سے راضی رہے تو وہ ہم کو اس ملک میں پہنچائے گا اور وہی ملک جس

میں دودھ اور شہد بہتا ہے ہم کو دے گا فقط اتنا ہو کہ تم خداوند سے بغاوت نہ کرو اور
نہ اس ملک کے لوگوں سے ڈرو، وہ تو ہماری خوراک ہیں ان کی پناہ ان کے سر سے جاتی
رہی ہے اور ہمارے ساتھ خداوند ہے سو ان کا خوف نہ کرو تب ساری جماعت
بول اٹھی کہ ان کو سنگسار کرو۔　　　　(گنتی باب ۱۳، ۷ تا ۱۰)

نبوت کے مقابلے میں بنی اسرائیل کا تمرد

ملے ۔ وہ بولے لے موسیٰ جب تک وہ لوگ وہاں موجود ہیں ہم کبھی اس میں داخل نہ ہوں گے
تم خود جاؤ اور تمہارا رب بھی تمہارے ساتھ ہو اور دونوں ان سے جنگ کرو ہم تو یہاں بیٹھے رہیں گے
یہ اس قوم کا مقولہ ہے جو نحن ابناء اللہ و احباءہ کا دعویٰ رکھتی تھی۔ مگر یہ گستاخانہ کلمات ان
کے مستمر تمرد و طغیان سے کچھ بھی مستبعد نہیں ہے؛ یہ کہنے والے عام بنی اسرائیل تھے۔ توریت میں اس
موقعہ کی منظر کشی یوں کی گئی ہے ۔ تب ساری جماعت چلا کر رو دی اور لوگ اس رات پھر روتے رہے،
پھر سارے بنی اسرائیل موسیٰ و ہارون پر کڑ کڑانے اور ساری جماعت نے انہیں کہا کہ اے کاش ہم
مصر میں مر جاتے اور کاش ہم اسی بیابان میں فنا ہو جاتے، خداوند کس لیے ہمیں اس سرزمین میں
لا کر تلوار سے مروانا ہے اور ہماری جوروان اور بچے پکڑے جائیں۔ (گنتی ۱۴- ۱ تا ۳) تب ساری
جماعت نے چاہا کہ ان پر یعنی یوشع اور کالب پر پتھراؤ کرے۔ (گنتی ۱۴: ۱۰)

ظاہر ہے کہ جن کی بزدلی کا یہ عالم ہو ان کے لیے حضرت موسیٰ اور یوشع و کالب کی یہ تقین بھائی
کہ خدا ہمارے ساتھ ہے تم ان سے نہ ڈرو بالکل بے سود تھی، انہوں نے یقیناً اس کے جواب میں یہی
کہا ہوگا کہ خدا اگر تمہارے ساتھ ہے تو تم اور تمہارا خدا جا کر لڑو ہم تو یہیں بیٹھے ہیں۔

اس آیت میں جہاد کے مقابلے میں لفظ قعود لا کر بتا دیا ہے کہ جہاد کے معنی اگر محنت اور کوشش
کے ہیں تو قعود کے بیٹھنا یا بیٹھے رہنا ہیں جس سے مقصود سستی، تغافل اور ترک فرض ہے۔ قرآن
میں یہ لفظ ان معنے میں کئی جگہ بولا گیا ہے ۔ اسی کے قریب قریب جہاد کے اصطلاحی معنے یہی ہیں
یعنی حق کی بلندی اور اس کی اشاعت اور حفاظت کے لیے ہر قسم کی جد و جہد، قربانی اور ایثار گوارا
کرنا اور ان تمام جسمانی و مالی اور دماغی قوتوں کو جو اللہ تعالیٰ نے دی ہیں اس راہ میں صرف کرنا یہاں

لے افادات شیخ الاسلام

تک کر اس کے لیے اپنے اپنے عزیز واقارب کی اہل وعیال کی خاندان وقوم کی جان تک کو قربان کر دیتا۔ اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی قوت کو توڑنا، ان کی تدبیروں کو رائیگاں کرنا، ان کے حملوں کو روکنا اور اس کے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے پوری طرح تیار رہنا بھی جہاد ہے، اسی کے مقابلے میں فقط قعود (یا) ہے اس کے معنے بیٹھنا اور رکھ رکھنا ہیں۔ اس تقابل سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ جہاد کی حقیقت بیٹھنے، سستی کرنے اور آرام ڈھونڈھنے کے سراسر خلاف ہے جب ایک قوم عرصہ دراز تک غلامی کی خوگر ہو جاتی ہے تو اس میں بلند مقاصد کی خاطر جدوجہد کی استعداد باقی نہیں رہتی۔ یہی حال بنی اسرائیل کا تھا۔ مقاصد امور کے لیے ان میں عزم وہمت نہ تھی۔ بزدلی اور بے طاقتی نے قدم پکڑ لیے تھے۔ جب حضرت موسیٰ نے انہیں حکم دیا کہ سرزمین کنعان میں داخل ہو جاؤ جو تمہاری موعودہ سرزمین ہے تو کہنے لگے وہاں بڑے طاقتور لوگ رہتے ہیں ان کے مقابلے کی ہم میں طاقت نہیں ہے جب تک وہ وہاں سے نہ نکل جائیں ہم قدم نہ اٹھائیں گے۔

حضرت موسیٰ کی دعا

۲۵ ۔ حضرت موسیٰ نے کہا خدایا مجھے اپنے اور اپنے بھائی کے سوا کسی پر اختیار نہیں ہے لہٰذا تو ہم میں اور ان نافرمانوں میں جدائی کر دے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سخت دلگیر ہو کر یہ دعا فرماتی چونکہ تمام قوم کی عدول حکمی اور بزدلانہ عصیان کو مشاہدہ فرمائے تھے اس لیے دعا میں بھی اپنے اور ہارون علیہ السلام کے سوا کہ وہ نبی معصوم تھے اور کسی کا ذکر نہیں کیا۔ یوشع اور کالب بھی دونوں کے ساتھ تبعاً آگئے ہیں لے

حضرت موسیٰ کو بنی اسرائیل سے مذکورہ بالا جواب سن کر کسی خیر کی توقع نہ رہی اس لیے حضرت موسیٰ نے نہایت رنج وغم میں اپنے مولیٰ سے درخواست کی کہ میرے رب میرا اپنی ذات اور اپنے بھائی کی جان کے سوا کسی پر کوئی بس نہیں ہے اب تو ہمارے اور ان بدکرداروں کے درمیان فیصلہ کر لے۔ اتنی طویل محنت اور اتنے عظیم معجزانہ کارناموں کے بعد بھی ان کی بے یقینی کا یہ عالم ہے کہ ایک شخص بھی ہماری آواز پر لبیک کہنے کے لیے تیار نہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں اب تو بس اب ہمارے اور ان کے درمیان فیصلہ بھی فرمائے۔ ایک طرف ہم دو بھائی بے بس اور بے اختیار ہیں، اور

لے افادات شیخ الاسلام

دوسری طرف یہ جرم عظیم ہے ہر طرح گستاخ و نافرمان۔ یہ دُعا ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنی ناکارہ قوم کی سرکشی و بغاوت اور اپنی بے بسی پوری طرح محسوس کرنے کے بعد کی۔ اس میں ان لوگوں کے لیے تسکین کا بڑا سامان ہے جو اصلاح کی خاطر محنت کرتے ہیں لیکن نتائج سے ہمدوش نہیں ہوتے۔ قوم جب سرکشی اور نافرمانی کے لیے تُل جاتے تو انبیاء تک کی محنتیں بے نتیجہ ہو کر رہ جاتی ہیں۔ پھر کسی ولی، بزرگ، علماء کی سعی اصلاح اگر ناکامیوں سے دوچار ہو جاتے تو دل شکستہ کیوں ہوں۔ اللہ نے حضرت موسیٰ کی دُعا کو شرفِ قبول عطا فرمایا۔

بنی اسرائیل کو صحرا گردی کی سزا

۷۹۔ اللہ کا حکم ہوا کہ اب چالیس برس تک وہ سرزمین ان پر حرام کر دی گئی۔ یہ اسی بیابان میں سرگرداں رہیں گے لہٰذا اے موسیٰ تو ان نافرمانوں پر غمزدہ نہ ہو۔ یعنی فیصلہ کی دُعا، حسی اور ظاہری طور پر تو قبول نہ ہوئی۔ ہاں معنی فیصلہ ہو گیا کہ وہ سب تو عذابِ الٰہی میں گرفتار ہو کر حیران و سرگرداں پھرتے تھے اور حضرت موسیٰ و حضرت ہارون پیغمبر از اطمینان اور پورے قلبی سکون کے ساتھ اپنے منصب ارشاد و اصلاح پر قائم رہے جیسے کسی بستی میں عام وبا پھیل پڑے اور ہزاروں بیماروں کے مجمع میں دو چار تندرست اور قوی القلب ہوں جو ان کے معالجے، پارہ سازی اور تفقدِ احوال میں مشغول ہوں۔

بنی اسرائیل اور اُمتِ محمدیہ

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ سب قصہ اہل کتاب کو سنایا اس پر کہ تم پیغمبر آخر الزماں کی رفاقت نہ کرو گے جیسے تمہارے اجداد نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رفاقت چھوڑ دی تھی اور جہاد سے جان چرا بیٹھے تھے تو یہ نعمت اوروں کو نصیب ہو گی چنانچہ نصیب ہوئی ایک لحظہ کے لیے اس سلسلے رکوع کو سامنے رکھ کر اُمتِ محمدیہ کے احوال پر غور کیجئے۔ ان پر خدا کے وہ انعامات ہوتے جو نہ پہلے کسی اُمت پر ہوتے نہ آئندہ ہوں گے۔ ان کے لیے خاتم الانبیاء سید الرسل صلی اللہ علیہ وسلم کو ابدی شریعت دے کر روانہ کیا۔ ان میں وہ علماء اور ائمہ پیدا کیے جو باوجود غیر نبی ہونے کے انبیاء کے وظائف کو نہایت خوش اسلوبی سے انجام دیتے رہے۔ ایسے ایسے خلفاء نبی علیہ السلام کے بعد اُمت کے قائد بنے جنہوں نے سارے جہان کو اخلاق اور اصول سیاست وغیرہ کی ہدایت کی۔

اس اُمت کو بھی جہاد کا حکم ہوا۔ عمالقہ کے مقابلے میں نہیں روئے زمین کے تمام جباروں کے مقابلہ میں۔ محض سرزمین شام فتح کرنے کے لیے نہیں بلکہ شرق و غرب میں کلمۃ اللہ بلند کرنے اور فتنہ کی جڑ اکھاڑنے کے لیے بنی اسرائیل سے خدا نے ارض مقدس کا وعدہ کیا تھا لیکن اس اُمت سے یہ وعدہ فرمایا:

وعد اللہ الذین امنوا منکم و عملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم و لیمکنن لھم دینھم الذی ارتضیٰ لھم ولیبدلنھم من بعد خوفھم امناً

اگر بنی اسرائیل کو موسیٰ علیہ السلام نے پیٹھ پھیرنے سے منع کیا تھا تو اس اُمت کو بھی خدا نے اس طرح خطاب کیا۔

یاایھا الذین امنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفا فلا تولوا ھم الادبار

انجام یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ کے رفقاء تو عمالقہ سے ڈر کر یہاں تک کہہ گزرے کہ اذھب انت و ربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون لیکن اصحاب محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا کہ خدا کی قسم اگر آپ سمندر کی موجوں میں گھس جانے کا حکم دیں گے تو ہم اسی میں کود پڑیں گے اور ایک شخص بھی ہم میں سے علیٰحدہ نہ ہوگا۔ امید ہے کہ خدا آپ کو ہماری طرف سے وہ چیز دکھلائے گا جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی، ہم اپنے پیغمبر کے ساتھ ہو کر اس کے داہنے بائیں آگے اور پیچھے ہر طرف سے جہاد کریں گے۔ خدا کے فضل سے ہم وہ نہیں ہیں جنہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے کہہ دیا تھا اذھب انت و ربک فقاتلا انا ھٰھنا قاعدون اسی کا یہ نتیجہ ہے کہ جتنی مدت بنی اسرائیل فتوحات سے محروم ہو کر وادی تیہ میں بھٹکتے رہے اس سے کم مدت میں محمد رسول اللہ کے اصحاب نے مشرق و مغرب میں ہدایت و ارشاد کا جھنڈا گاڑ دیا، رضی اللہ عنہم و رضوا ذالک لمن خشی ربہ[1]

حضرت موسیٰ کی درخواست کے مطابق اللہ سبحانہ نے یہ فیصلہ فرمایا کہ سرزمین مقدس کو چالیس سال کے لیے ان پر حرام کر دیا اور فرمایا کہ مدت اسی صحراگردی میں گزار دیں گے۔ تورات میں اس کا ذکر اس طرح ہوا ہے:۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا، میں کب تک اس خبیث گروہ کی جو میری شکایت کرتا رہتا ہے برداشت کروں۔ بنی اسرائیل جو میرے خلاف شکایتیں کرتے رہتے ہیں۔ میں نے وہ سب شکایتیں سنی ہیں سو تم ان سے کہہ دو، خداوند کہتا ہے مجھے اپنی حیات کی قسم ہے کہ جیسے تم نے میرے سنتے کہا ہے میں تم سے ضرور ویسا ہی کروں گا۔ تمہاری لاشیں اسی بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمہاری ساری تعداد میں سے یعنی بیس برس سے لے کر اس سے اوپر اوپر کی عمر کے تم سب جتنے گنے گئے اور مجھ پر شکایت کرتے رہے ان میں سے کوئی اس ملک میں جس کی بابت میں نے قسم کھائی تھی کہ تم کو وہاں بساؤں گا جانے نہ پائے گا سوائے یفنہ کے کالب اور نون کے یشوع کے۔ اور تمہارے بال بچے جن کی بابت تم نے یہ کہا کہ وہ تو لوٹ کا مال ٹھہریں گے ان کو میں وہاں پہنچاؤں گا اور جس ملک کو تم نے حقیر جانا وہ اس کی حقیقت کو پہچانیں گے اور تمہارا یہ حال ہو گا کہ تمہاری لاشیں اس بیابان میں پڑی رہیں گی اور تمہارے لڑکے بالے چالیس برس تک بیابان میں پھرتے اور تمہاری زناکاریوں کا پھل پاتے رہیں گے۔　　گنتی باب ۱۴، ۲۷، ۳۴۔

ان دنوں کے شمار کے مطابق جن میں تم اس سرزمین میں جاسوسی کرتے رہے جو چالیس دن ہیں دن پیچھے ایک سال ہو گا سو تم چالیس برس تک اپنے گناہ کو اٹھاتے رہو گے۔ تب تم میری عہد شکنی کو جان لو گے۔ میں نے جو خداوند ہوں کہا ہے کہ میں سارے خبیث گروہ سے جو میری مخالفت پر جمع ہیں ایسا ہی کروں گا اس دشت میں وہ برباد ہوں گے اور یہیں ہلاک ہوں گے۔

محمۃ علیہم کا مطلب یہ ہے کہ تکوینی طور پر اب یہ ممکن ہی نہ ہوگا کہ یہ سال سے قبل اس ارض مقدس میں داخل ہو سکیں اور جو نعمت انہیں تھوڑی سی جدوجہد کے بعد فی الفور مل رہی تھی اب اس کے لیے انہیں چالیس سال انتظار کرنا ہوگا۔ اس میں مصلحت یہ تھی کہ چالیس سال کے اندر پچھلی نسل ختم ہو جائے گی جسے مصر کی غلامانہ زندگی نے نکما کر دیا ہے اور ایک نئی نسل پیدا ہو جائے گی جس نے بیابان کی آزادانہ آب وہوا میں نشوونما پائی ہوگی اور غلامانہ ذہنیت کی سمیت سے محفوظ ہوگی چنانچہ جب چالیس سال گزر گئے اور ایک نئی نسل ظہور میں آگئی تو وہ بڑھی اور موعودہ سرزمین پر قابض ہو گئی۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ ابْنَيْ اٰدَمَ بِالْحَقِّ ۘ اِذْ قَرَّبَا قُرْبَانًا فَتُقُبِّلَ مِنْ
اَحَدِهِمَا وَلَمْ يُتَقَبَّلْ مِنَ الْاٰخَرِ ۭ قَالَ لَاَقْتُلَنَّكَ ۭ قَالَ
اِنَّمَا يَتَقَبَّلُ اللّٰهُ مِنَ الْمُتَّقِيْنَ ۝ لَىِٕنْۢ بَسَطْتَّ اِلَيَّ يَدَكَ
لِتَقْتُلَنِيْ مَآ اَنَا بِبَاسِطٍ يَّدِيَ اِلَيْكَ لِاَقْتُلَكَ ۚ اِنِّىْٓ اَخَافُ اللّٰهَ
رَبَّ الْعٰلَمِيْنَ ۝ اِنِّىْٓ اُرِيْدُ اَنْ تَبُوْۗاَ بِاِثْمِيْ وَاِثْمِكَ فَتَكُوْنَ
مِنْ اَصْحٰبِ النَّارِ ۚ وَذٰلِكَ جَزٰۗؤُا الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَطَوَّعَتْ لَهٗ
نَفْسُهٗ قَتْلَ اَخِيْهِ فَقَتَلَهٗ فَاَصْبَحَ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ۝ فَبَعَثَ
اللّٰهُ غُرَابًا يَّبْحَثُ فِي الْاَرْضِ لِيُرِيَهٗ كَيْفَ يُوَارِيْ سَوْءَةَ اَخِيْهِ ۭ
قَالَ يٰوَيْلَتٰٓى اَعَجَزْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِثْلَ هٰذَا الْغُرَابِ فَاُوَارِيَ سَوْءَةَ
اَخِيْ ۚ فَاَصْبَحَ مِنَ النّٰدِمِيْنَ ۝

اور اے پیغمبر ان لوگوں کو آدم کے دو بیٹوں کا حال سچائی کے
ساتھ سنادو۔ جب ان دونوں نے قبولیت کے لیے قربانی

پیش کی تو ان میں سے ایک کی قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قربانی قبول نہیں کی گئی[۸۱]، اس پر اُس نے یعنی جس کی قربانی قبول نہ ہوئی تھی کہا کہ میں یقیناً تجھے مار ڈالوں گا جس کی قربانی قبول ہو گئی تھی اس نے کہا کہ اللہ صرف متقی لوگوں کی قربانی قبول کرتا ہے[۸۲]۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو اس پر بھی میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا، میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو ساری کائنات کا مالک ہے[۸۳]۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا دونوں کا گناہ سمیٹ لے اور پھر دوزخیوں میں سے ہو جائے کہ ظلم کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے[۸۴]۔ بہرحال اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل پر آمادہ کر دیا اس نے اسے مار ڈالا بس وہ تباہ کاروں میں سے ہو گیا[۸۵]۔ اس کے بعد خدا نے ایک کوا روانہ کیا اور وہ زمین کریدنے لگا تاکہ اسے دکھاتے

کہ اپنے بھائی کی لاش کیوں کر زمین میں چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ
بول اٹھا افسوس مجھ سے اس کوے کی طرح بھی نہ ہو سکا کہ اپنے
بھائی کی لاش چھپا دیتا اس کے بعد وہ اپنے کیے پر پشیمان ہو گیا۔[۴۶]

حسد کے لیے واقعاتی تمثیل

روئے زمین کی امامت اور قیادت کے لیے اللہ نے اُمت محمدیہ کو قبول فرمایا اور اہل کتاب کو رد کر دیا۔ بنی اسرائیل کی یہ شقاوت کہ وہ اُمت محمدیہ سے حسد میں بالکل بے لگام ہو گئے تھے۔ اور انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو قتل کرنے کے لیے سازش کی تھی۔ یہاں اس واقعہ کے ذکر کرنے سے مقصد یہودیوں کی اس سازش پر لطیف طریقے سے ملامت کرنا ہے۔ دونوں واقعات میں مماثلت بالکل واضح ہے۔ یہ بات کہ اللہ سبحانہ نے اُمت محمدیہ کو قبولیت کا درجہ عطا فرمایا اور ان پرانے اہل کتاب کو رد کر دیا سراسر اس بنیاد پر تھی کہ ایک طرف متقیانہ سیرت تھی اور دوسری طرف فسق و فجور تھا لیکن بجائے اس کے کہ وہ لوگ جن کو رد کیا گیا تھا اپنے مردود ہونے کی وجہ پر غور کرتے اور اس قصور کی تلافی کرنے پر مائل ہوتے جس کی وجہ سے وہ منصب امامت سے ہٹائے گئے تھے ان پر ٹھیک اسی جاہلیت کا دورہ پڑا جس میں آدم کا وہ غلط کار بیٹا مبتلا ہوا تھا اور اسی کی طرح وہ حسد کی آگ میں جل کر قتل کی سازشیں کرنے لگے۔ یہ واقعہ بتاتا ہے کہ حسد کرنے کے بجائے قیادت کے منصب قائم رہنے کے لیے مقدم چیز یہ ہے کہ آدمی کے اندر خدا کا خوف ایسا ہو جو سخت سے سخت آزمائش میں بھی اس کے قدم راہ حق پر استوار رکھے۔ اور پھر یہ کہ امامت کے منصب سے ہٹنے کا باعث وہ فاسد جذبات ہیں جو شیطان کی انگیخت سے پیدا ہوتے ہیں اور بالآخر وہ انسان کو ایسے جرائم پر آمادہ کر دیتے ہیں جو عہد الٰہی کے بالکل منافی ہوتے ہیں جس طرح اللہ کے نیک بندے پیروانِ محمد رسول اللہ عام فساد اخلاق و کردار کے باوجود متقیانہ سیرت اور اخلاق پر استوار رہے۔ انہوں نے اپنی جانوں کی پرواہ نہ کی اسی طرح اللہ کے نیک بندے ہابیل نے اپنے بھائی قابیل کے

ظلم. تعدی کے مقابلہ میں اپنے آپ کو حق و عدل کی حفاظت پر استوار رکھا اور قابیل کی دشمنی اس کو حق و عدل سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو سکی یہاں تک کہ اسی حق و عدل کی حفاظت میں اس نے اپنی جان قربان کر دی۔ یہاں بھی دو بھائیوں کی اولاد ہے۔ ایک طرف بنی اسماعیل ہیں، اور دوسری طرف اولادِ اسحاق ہے۔ بنی اسماعیل اُمت محمدیہ ہے اور اولادِ اسحاق اہل کتاب ہیں۔ امت محمدیہ عدل و حق کی علمبردار ہے اور اس کی حفاظت میں اپنی جانوں کی بازی لگا رہی ہے اور اولادِ اسحاق چڑ رہی ہے اور ان کو ختم کرنے کی سازشیں کر رہی ہے۔ قرآن واقعہ کے رنگ میں اہل کتاب کو ملامت کے ساتھ اُمت محمدیہ کو سمجھا رہا ہے کہ تم دنیا میں حق و عدل کے قائم کرنے آئے ہو اور اس کی تاریخ نہایت قدیم ہے اس راہ کا سب سے پہلا شہید آدم کا بیٹا ہابیل ہے جس نے اپنے عمل سے بعد کی نسلوں کے لیے یہ زندہ جاوید مثال قائم کی کہ حق پر ڈٹے رہنا باطل پر زندہ رہنے سے ہزار درجہ بہتر ہے۔ یاایها الذین آمنوا کونوا قوامین لله شهداء بالقسط اور بس اہل کتاب کے حسد کی پرواہ نہ کرو۔ ان کے پاس قابیل کی وراثت ہے تم حق پر ڈٹے رہو کہ تم ہابیل کے کردار کے وارث ہو۔

۸۰۔ اور اے پیغمبر ان لوگوں کو آدم کے دو بیٹوں کا حال سچائی کے ساتھ سنا دو۔ یعنی آدم کے دو صلبی بیٹے قابیل و ہابیل کا قصہ ان کو سنا دو، کیونکہ اس قصہ میں ایک بھائی کے دوسرے بھائی کی مقبولیت اور تقویٰ پر حسد کرنے اور اسی غیظ میں اس کو ناحق خون کرنے کے عواقب بیان کیے ہیں۔ پچھلے رکوع میں یہ بتلایا تھا کہ بنی اسرائیل کو جب یہ حکم دیا گیا کہ ظالموں اور جابروں سے قتال کرو تو خوفزدہ ہو کر بھاگنے لگے۔ اب ہابیل و قابیل کا قصہ سنانا اس کی تمہید ہے کہ متقی اور مقبول بندوں کا قتل جو شدید ترین جرائم میں سے ہے اور جس سے ان لوگوں کو بے انتہا تہدید و تشدید کے ساتھ منع کیا گیا تھا۔ اس کے لیے یہ ملعون ہمیشہ کیسے مستعد اور تیار نظر آتے ہیں۔ پہلے بھی کتنے نبیوں کو قتل کیا اور آج بھی خدا کے سب سے بڑے پیغمبر کے خلاف ازراہ بغض و حسد کیسے کیسے منصوبے گانٹھتے رہتے ہیں۔ گویا ظالموں اور شریروں کے مقابلے سے جان چرانا اور بے گناہ معصوم بندوں کے خلاف قتل و اسر کی سازشیں کرنا یہ اس قوم کا شیوہ رہا ہے اور اس پر نحن ابناء الله واحباءه کا دعویٰ بھی رکھتے ہیں۔ اس تقریر کے موافق قابیل و ہابیل کا قصہ۔ پھر اس پر من اجل ذالك كتبنا على بنی اسرائیل کی یہ سب تمہید ہو گی۔ اس مضمون کی جو اس قصہ اور تصریح کے ختم پر فرمایا

ولقد جاءتهم رسلنا بالبينات ثم ان كثيرا منهم

بعد ذالک فی الارض لمسرفون انما جزاء الذین یحاربون اللہ ورسولہ الخ [1]

اس آیت میں چند ضروری باتیں تشریح طلب ہیں۔ اول یہ کہ علیہم کی ضمیر مرجع اہل کتاب ہیں جن کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے اگرچہ نفس واقعہ حکمت و موعظت کے لحاظ سے عام ہے۔ جیسے یہود کے لیے سبق آموز ہے ایسے ہی مسلمانوں کے لیے بھی ہے لیکن واقعہ کی زد میں براہ راست یہود ہیں کیونکہ یہود نے اس اُمت کے معاملہ میں بالکل وہی طرز عمل اختیار کیا تھا جو قابیل نے ہابیل کے معاملہ میں اختیار کیا تھا جس طرح ہابیل کی عنداللہ مقبولیت سے قابیل میں حسد کی آگ بھڑک رہی تھی، اسی طرح یہود نے جب اس اُمت پر ربانی نوازشیں دیکھیں تو حسد کے جنون میں ایسے بے لگام ہوتے کہ بدبختی اور شقاوت کی آخری حدیں پھاند گئے۔

دوم یہ کہ قرآن نے جن کو ابنی آدم کہا ہے ان کا نام کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ قرآن نے ان کا نام نہیں بتایا ہے۔ شارحین قرآن نے تورات کی مدد سے آدم کے ان دونوں بیٹوں کے ہابیل اور قابن بتاتے ہیں۔ اہل عرب ان کو ہابیل اور قابیل کہتے تھے۔ قرآن نے ان کے واقعہ کے لیے نبا کی تعبیر اختیار کی ہے۔ نبا کسی اہم حادثے اور واقعہ کی خبر کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ واقعہ اس آسمان کے نیچے عدل و ظلم وفاداری اور عہد شکنی، خدا خوفی اور تعدی کی کشمکش کا تاریخ انسانی میں پہلا واقعہ ہے اس لیے اس کو نبا سے تعبیر کیا ہے لیکن چونکہ واقعہ میں تاریخ کی غلط کر دلوں نے ہاتھ کی صفائی بھی دکھائی تھی۔ اس لیے واقعہ کے آغاز ہی میں بالحق کی قید لگا دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن جو کچھ بیان کر رہا ہے وہ واقعہ اور حقیقت ہے اور قرآن سے باہر محض داستان سرائی کے لیے جو کچھ بیان کیا جاتا ہے وہ واقعہ اور حقیقت نہیں ہے۔ ہم یہاں اسی واقعہ کو تورات سے نقل کرتے ہیں اس کو پڑھیے اور پھر قرآن کے بیان سے مقابلہ کر کے دیکھئے تو اس سے آپ کو خود اندازہ ہو جائے گا کہ بالحق کی قید لگانے کا مقصد کیا ہے۔

اور آدم اپنی بیوی حوا کے پاس گیا اور وہ حاملہ ہوئی اور اس کے قائن پیدا ہوا، تب اس نے کہا کہ مجھے خداوند سے ایک مرد ملا پھر قائن کا بھائی ہابیل پیدا ہوا اور ہابیل بھیڑ بکریوں کا چرواہا تھا اور قائن کسان تھا۔ چند روز کے بعد یوں ہوا کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قائین اپنے کھیت کے پھل کا ہدیہ خداوند کے واسطے لایا اور ہابل بھی اپنی بھیڑ بکریوں کے کچھ پہلوٹھے بچوں کا اور کچھ ان کی چربی کا ہدیہ لایا اور خداوند نے ہابل اور اس کے ہدیہ کو منظور کر لیا پھر قائین اور اس کے ہدیہ کو منظور نہ کیا۔ اس لیے قائین نہایت غضبناک ہوا اور تیرا منہ کیوں بگڑا ہوا ہے اگر تو بھلا کرے تو کیا تو مقبول نہ ہوگا۔ اور اگر تو بھلا نہ کرے تو گناہ دروازے پر دبکا بیٹھا ہے اور تیرا مشتاق ہے پھر تو اس پر غالب آ، اور قائین نے اپنے بھائی ہابل کو کچھ کہا اور جب وہ دونوں کھیت میں تھے۔ تو یوں ہوا کہ قائین نے اپنے بھائی ہابل پر حملہ کیا اور اسے قتل کر ڈالا تب خداوند نے قائین سے کہا کہ تیرا بھائی ہابل کہاں ہے اس نے کہا مجھے معلوم نہیں۔ کیا میں اپنے بھائی کا محافظ ہوں۔ پھر اس نے کہا تو نے یہ کیا کیا۔ تیرے بھائی کا خون زمین سے مجھ کو پکارتا ہے اور اب تو زمین کی طرف سے لعنتی ہوا جس نے اپنا منہ پسارا کہ تیرے ہاتھ سے تیرے بھائی کا خون لے جب تو زمین کو جوتے گا تو اب وہ تجھے اپنی پیداوار نہ دے گی اور زمین پر تو خانہ خراب اور آوارہ ہوگا۔　　　(کتاب پیدائش باب ۴، ۱-۱۲)

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ بالحق کی قید لگا کر قرآن نے بتا دیا کہ جو کچھ میں بتا رہا ہوں وہ واقعہ اور حقیقت ہے جس میں کوئی التباس اشتباہ نہیں۔ جھوٹ اور وہم کا کوئی تعلق نہیں زیادتی اور کمی کوئی نہیں ہے

تاریخی روایات میں احتیاط

اس طرح بالحق کی قید لگا کر مورخین کے لیے ایک اہم اصولی حقیقت کو فراہم کر دیا کہ روایات تاریخ کی نقل میں بہت بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ صرف یہیں نہیں بلکہ قرآن نے ایک سے زیادہ مواقع پر اس اصول کی نشاندہی کی ہے مثلاً ان ھذا لھو القصص الحق، نحن نقص علیك نباھم بالحق۔ اس قسم کے مواقع میں قرآن کا بالحق کی قید لگانا یہ بتانے کے لیے ہے کہ نقل واقعات اور تاریخی روایات میں صداقت و واقعیت کا دامن کسی حال میں نہ چھوڑنا چاہیے تاریخ کی بے سند اور غیر واقعی روایات کی بنا پر دنیا میں جو مفاسد اور خرابیاں بروئے کار آتی ہیں وہ محتاج بیان نہیں مذہب کا واقعی چہرہ بگاڑنے والی چیز افسانوی روایات ہیں۔ یہود اس میدان میں سب سے آگے ہیں۔ اس کے نتیجے میں مذہب، نبوت اور خدا کی کتاب تاریخیت سے بیگانہ ہو کر رہ جاتی ہے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ حقائق اور واقعات چھوڑ کر مذہب نام ہی عجائب و

عذاب کا ہوکر رہ جاتا ہے۔ سوم یہ کہ ان دونوں یعنی ہابیل و قابیل کا واقعہ تو وہی ہے جو آپ قرآن میں آگے پڑھیں گے لیکن شارحین قرآن نے دونوں کی اس قربانی کے پیش کرنے کا پس منظر بھی بتانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ حافظ عماد الدین ابن کثیر رقمطراز ہیں،

دنیائے انسانی میں اضافہ کے لیے حضرت آدم کا یہ دستور تھا کہ حواء سے توام (جوڑواں) پیدا ہونے والے لڑکے اور لڑکی کا عقد دوسرے پیٹ سے پیدا ہونے والے توام بچوں کے ساتھ کر دیا کرتے تھے۔ اسی دستور کے مطابق قابیل اور ہابیل کی شادی کا معاملہ تھا۔ قابیل عمر میں بڑا تھا اور اس کی ہمشیر ہابیل کی ہمشیرسے زیادہ خوبصورت تھی۔ قابیل کو یہ انتہائی ناگوار تھا کہ دستور کے مطابق ہابیل کی ہمشیر سے اس کی شادی ہو اور ہابیل کی اس کی ہمشیر سے۔ معاملہ کو ختم کرنے کے لیے حضرت آدم نے یہ فیصلہ فرمایا کہ دونوں اپنی اپنی قربانی خدا تعالیٰ کی جناب میں پیش کریں، جس کی قربانی منظور ہو جائے وہی اپنے ارادے کے پورا کر لینے کا مستحق ہے۔

واقعہ کا یہ پس منظر سدی نے ایک سے زیادہ صحابہ کرام مثلاً عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن عباس کے حوالے سے پیش کیا ہے۔ سدی کے علاوہ ہمارے پاس اس واقعہ کے علم کا کوئی ذریعہ نہیں ہے خود سدی کا ارباب تحقیق کے یہاں کیا مقام ہے اس میں اہل علم کے خیالات اگرچہ مختلف ہیں کچھ کی ان کو حمایت حاصل ہے لیکن کچھ کی رائے ہیں ان پر تشیع کا الزام ہے اور جوزجانی ان کو کذاب کہتے ہیں۔ اگر ان کی صداقت کا لوہا مان بھی لیا جائے تو پھر بھی آدم کے بیٹوں کا یہ واقعہ اپنی عبرت و موعظت کے لیے کسی پس منظر کا محتاج نہیں ہے۔

ہابیل و قابیل کی قربانی

۱۸۔ جب ان دونوں نے قبولیت کے لیے قربانی پیش کی تو ان دونوں میں سے ایک کی قبول کر لی گئی اور دوسرے کی قبول نہیں کی گئی۔ یعنی آدم علیہ السلام دستور کے موافق جو لڑکی ہابیل کے نکاح میں دینا چاہتے تھے قابیل اس کا طلبگار ہوا۔ آخر حضرت آدم کے اشارے سے دونوں نے خدا کے لیے کچھ نیاز کی کہ جس کی نیاز قبول ہو جائے لڑکی اسی کو دے دی جائے۔ آدم علیہ السلام کو غالباً یہ یقین تھا کہ ہابیل کی ہی نیاز قبول ہوگی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ آتش آسمانی ظاہر ہوئی۔ اور ہابیل کی نیاز کو کھا گئی اور یہی علامت اس وقت عند اللہ قبول کی تھی۔ جمال الدین قاسمی

نے لکھا ہے کہ ہابیل کی نذر مخلصانہ تھی اس نے اپنے گلے کی بہترین بھیڑ پیش کر دی تھی وہ قبول ہو گئی۔ بڑے بھائی قابیل نے اپنے کھیت کی پیداوار کا ناقص حصہ پیش کیا وہ قبول نہ ہوا۔ قبولِ نیاز کی اس وقت علامت یہ تھی کہ آسمان سے آگ آ کر نذر قبول کر لیتی تھی تورات میں اس کے اشارے ملتے ہیں۔

قربان کا لفظ صدقہ اور قربانی دونوں کے لیے آتا ہے جو چیز بھی اللہ کے حضور بمقصدِ قربِ الٰہی پیش کی جاتے وہ قربان ہے یہودیوں میں کئی قسم کی قربانیاں تھی۔

۱۔ وہ قربانیں جن کو گناہوں کی معافی کے لیے نذرِ آتش کیا جاتے۔ ۲۔ وہ نذرانے جو آٹے زیتون اور لوبان پر مشتمل ہوں، ۳۔ پیداوار کا تروتازہ پھل۔ عیسائیوں میں قربان وہ شراب اور روٹی ہے جسے کاہن مقدس بناتے۔ اصل میں عربی لفظ قربان مصدر ہے ہر وہ چیز جس کے ذریعے بطور نیاز اللہ کا قرب حاصل کیا جاتے قربان ہے۔ یہاں قرآن نے یہ وضاحت نہیں کی ہے کہ ہابیل اور قابیل کو قبولیت اور عدمِ قبولیت کا پتہ کیسے چلا کیونکہ یہ وضاحت قرآن کے پیشِ نظر مقصد کے لحاظ سے غیر ضروری تھی لیکن اسرائیلی روایات کہتی ہیں کہ قبولِ نیاز کی اس وقت علامت یہ تھی کہ آتشِ آسمانی آ کر کھا جاتی اور تورات کے مذکورہ بالا بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کی خبر خداوند نے دی تھی۔

مدارِ قبولیت صرف تقویٰ ہے

۲۸۔ اس پر اس نے یعنی جس کی قربانی قبول نہ ہوئی تھی کہا کہ میں یقیناً تجھے قتل کر دوں گا اور جس کی قربانی قبول ہو گئی تھی اس نے کہا کہ اللہ صرف متقی لوگوں کی قربانی قبول کرتا ہے۔ قابیل یہ دیکھ کر آتشِ حسد میں جلنے لگا اور بجائے اس کے کہ مقبولیت کے وسائل تلاش کرتا غیظ و غضب میں اپنے حقیقی بھائی کو قتل کی دھمکیاں دینے لگا۔ اس پر بھی ہابیل نے شرافت و متانت کو ہاتھ سے نہیں جانے دیا بلکہ کہا کہ اگر تیری قربانی قبول نہیں ہوتی تو اس میں میرا کیا قصور ہے۔ خدا کے یہاں کسی کی زبردستی نہیں چلتی تقویٰ چلتا ہے۔ گویا میری نیاز جو قبول کر لی گئی اس کا سبب تقویٰ ہے تو بھی اگر تقویٰ اختیار کرے تو اللہ کو مجھ سے کوئی ضد نہیں ہے [1]

ہابیل نے ایسی اصولی بات کہی جس میں قابیل کی ہمدردی اور خیر خواہی بھی تھی کہ اللہ کا دستور یہ ہے کہ پرہیزگار اور متقی کا عمل قبول کرتا ہے۔ اگر تم تقویٰ و پرہیزگاری اختیار کرتے تو تمہاری

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

قربانی بھی قبول ہو جاتی۔ تم نے ایسا نہیں کیا تو قربانی قبول نہ ہوئی اس میں میرا کیا قصور ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ تقوی میں تین باتوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک یہ کہ قبول طاعت میں خشیتِ الٰہی کا استحضار ہو، دوسرے یہ کہ کوشش اس کی کرے کہ طاعت سے رضائے الٰہی کے سوا کچھ اور مقصود نہ ہو، تیسرے یہ کہ غیراللہ کی شرکت و آمیزش ذرا نہ ہو۔ محققین کا اس پر اتفاق ہے کہ تقوی سے یہاں مراد شرک سے بچنا ہے۔ لہٰذا جو شرک سے محفوظ ہوا اور توحید پر قائم ہو تو جن اعمال میں اس نے صدق نیت سے کام لیا وہ مقبول ہوں گے اور جو شرک و معصیت دونوں سے بچ کر رہا وہ قبول و رحمت دونوں کا حقدار ہے۔ اس فقرے کو علمائے حق نے عبادت گزاروں اور اللہ کے دین کا کام کرنے والوں کے لیے بہت بڑا تازیانہ قرار دیا ہے۔ اسی لیے حضرت عبداللہ بن عامر کے بارے میں لکھا ہے کہ وہ اپنی وفات کے وقت رو رہے تھے۔ لوگوں نے عرض کیا کہ آپ تو عمر بھر اعمال صالحہ اور عبادات میں مشغول رہے پھر رونے کی کیا وجہ؟ فرمایا تم یہ کہتے ہو اور میرے کانوں میں اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد گونج رہا ہے انما یتقبل اللّٰہ من المتقین مجھے کچھ معلوم نہیں کہ میری عبادت قبول بھی ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ میرا کوئی عمل اللہ تعالیٰ قبول فرمالیا تو یہ وہ نعمت ہے کہ ساری زمین کا سونا بن کر اپنے قبضہ میں آ جائے تو بھی اس کے مقابلہ میں کچھ نہ سمجھوں۔ ایسے ہی حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں کہ اگر یہ بات یقینی طور پر طے ہو جائے کہ میری ایک نماز اللہ تعالیٰ کے نزدیک قبول ہوگئی تو میرے لیے وہ ساری دنیا اور اس کی نعمتوں سے زیادہ ہے۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز نے ایک شخص کو خط میں یہ نصائح لکھیں کہ:

> میں تجھے تقویٰ کی تاکید کرتا ہوں جس کے بغیر کوئی عمل قبول نہیں ہوتا۔ اور اہل تقویٰ کے سوا کسی پر رحم نہیں کیا جاتا اور اس کے بغیر کسی چیز پر ثواب نہیں ملتا۔ اس بات کا وعظ کہنے والے تو بہت ہیں مگر عمل کرنے والے بہت کم ہیں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ تقویٰ کے ساتھ کوئی چھوٹا سا عمل بھی چھوٹا نہیں ہے اور جو عمل مقبول ہو جاتے وہ چھوٹا کیسے کہا جا سکتا ہے۔[1]

---

[1] معارف م سس۔

ہابیل کا عظیم کردار

۲۸۔ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ اٹھائے گا تو اس پر بھی میں تجھے قتل کرنے کے لیے ہاتھ نہ اٹھاؤں گا میں اللہ سے ڈرتا ہوں جو ساری کائنات کا مالک ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ :

> اگر کوئی ناحق کسی کو مارنے لگے اس کو رخصت ہے کہ ظالم کو مارے اور اگر صبر کرے تو شہادت کا درجہ ہے۔

اور یہ حکم اپنے مسلمان بھائی کے مقابلے میں ہے ورنہ جہاں انتقام و مدافعت میں شرعی مصلحت اور ضرورت ہو وہاں ہاتھ پیر کو توڑ کر بیٹھنا جائز نہیں ہے مثلاً کافروں اور باغیوں سے قتال کرنا، والذین اذا اصابہم البغی ہم ینتصرون۔ آخر میں فرمایا کہ انی اخاف اللہ مطلب یہ ہے کہ میں تجھ سے ڈر کر نہیں بلکہ اللہ سے ڈر کر یہ چاہتا ہوں کہ جہاں تک شرعاً گنجائش ہے بھائی کے خون سے ہاتھ رنگین نہ کروں۔ ایوب سختیانی فرماتے ہیں کہ اُمت محمدیہ میں سے پہلا شخص جس نے اس آیت پر عمل کر کے دکھلایا، عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ ہیں جنہوں نے اپنا گلا کٹوا دیا لیکن اپنی رضا سے کسی مسلمان کی انگلی نہ کٹنے دی۔[1]

اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر تو مجھے قتل کرنے کے لیے آئے گا تو میں ہاتھ باندھ کر تیرے سامنے قتل ہونے کے لیے بیٹھ جاؤں گا اور مدافعت نہ کروں گا۔ یہ ہے کہ تو میرے قتل کے درپے ہوتا ہے تو ہو میں تیرے قتل کے درپے نہ ہوں گا تو میرے قتل کی تدبیریں کرنا چاہے تو تجھے اختیار ہے لیکن میں یہ جاننے کے بعد بھی کہ میرے قتل کی تیاریاں کر رہا ہے یہ کوشش نہ کروں گا کہ میں پہلے ہی تجھے مار ڈالوں۔ یہاں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ کسی شخص کا اپنے آپ کو خود قاتل کے آگے پیش کر دینا اور ظالمانہ حملہ کی مدافعت نہ کرنا کوئی نیکی نہیں ہے۔ البتہ نیکی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص میرے قتل کے درپے ہو اور میں جانتا ہوں کہ وہ میری گھات میں لگا ہوا ہے تب بھی میں اس کے قتل کی فکر نہ کروں اور اسی بات کو ترجیح دوں کہ ظالمانہ اقدام اس کی طرف سے ہو نہ کہ میری طرف سے ہو۔ یہی مطلب تھا اس بات کا جو آدم علیہ السلام کے اس نیک بیٹے نے کہی۔[2]

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

یہ بات یہاں ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہ میدان جنگ میں مقابلے کی صورت نہیں ہے بلکہ بھائی کا بھائی سے معاملہ ہے۔ ایک بھائی دوسرے بھائی کو قتل کی دھمکی دے رہا ہے۔ اس صورت میں صحیح مومنانہ رویہ یہی ہے کہ آدمی یہ جانتے ہوئے بھی کہ اس کا کوئی بھائی قتل کے درپے ہے اس کے قتل کے لیے پہل نہ کرے لیکن پہل نہ کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ اپنا بچاؤ بھی نہ کرے۔ ہابیل نے پہل کرنے کی نفی کی ہے بچاؤ کی نفی نہیں کی۔ اپنی جان یا اپنے مال کی مدافعت خوف خدا کے منافی نہیں ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اگر شخص مجھ سے میرا مال چھیننا چاہتا ہے تو میں اس کے ساتھ کیا معاملہ کروں۔ ارشاد ہوا کہ اس کو خدا کا خوف دلاؤ سائل نے کہا اگر وہ خدا کا خوف نہ مانے ارشاد ہوا کہ اپنے گرد و پیش کے مسلمانوں سے اس کے مقابلے کے لیے مدد چاہو۔ سائل نے کہا کہ اگر میرے ارد گرد ایسے لوگ نہ ہوں ارشاد ہوا کہ پھر حکومت سے مدد چاہو سائل نے کہا کہ اگر حکومت کے ذمہ دار بھی دور ہوں، ارشاد ہوا اپنے مال کی حفاظت کے لیے لڑو تا آنکہ اپنے مال کو بچا لو یا شہید ہو جاؤ[1]

خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم جیسا کہ دھمکی دے رہے ہو میرے قتل کے لیے اقدام کرنا چاہتے ہو تو میں یہ فرض کر کے کہ تم میرے قتل کے درپے ہو تمہارے قتل میں پہل کرنے والا نہیں ہوں میں اللہ رب العالمین سے ڈرتا ہوں۔

یہاں مسند احمد، ابوداؤد، ترمذی کی وہ حدیث قابل تنبیہ ہے جس میں سعد بن ابی وقاص نے دربار نبوت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ اس معاملہ میں کیا فرماتے ہیں کہ اگر ایک شخص میرے گھر میں گھس آئے اور مجھے قتل کرنے کے لیے دست درازی کرے تو میں کیا کروں؟ فرمایا کہ ابن آدم ہابیل کا کردار پیش کر اور آپ نے یہ آیت گرامی تلاوت کی۔

بار گناہ پہل کرنے والے پر ہے

۲۹۔ میں چاہتا ہوں کہ تو میرا اور اپنا دونوں کا گناہ سمیٹ لے اور پھر دوزخیوں میں سے ہو جائے کہ ظلم کرنے والوں کا یہی بدلہ ہے۔ یعنی میرے قتل کا گناہ بھی اپنے دوسرے گناہوں کے ساتھ حاصل کرے۔ ابن جریر نے مفسرین کا اجماع نقل کیا ہے کہ باثمی کے معنے یہی ہیں۔ باقی جنہوں نے یہ لکھا

---

[1] تدبر قرآن

ہے کہ قیامت میں مظلوم کے گناہ ظالم پر ڈالے جائیں گے وہ مضمون بھی ایک حیثیت سے صحیح ہے مگر محققین کے نزدیک وہ اس آیت کی تفسیر نہیں ہے۔ اب ہابیل کے کلام کا حاصل یہ ہوا کہ اگر تو نے یہی ٹھان لی ہے کہ میرے قتل کا وبال اپنے سر رکھے تو میں نے بھی ارادہ کر لیا ہے کہ کوئی مدافعت اپنی جانب سے نہ کروں حتیٰ کہ ترکِ عزیمت کا حرف بھی مجھ پر نہ آئے اور تیرے عمر کے گناہ تجھ پر ثابت رہیں اور میرے خون کا گناہ تیرے سر چڑھے اور مظلومیت کی وجہ سے میرے گناہ اتریں [1]

عبد اللہ بن عباس، عبد اللہ بن مسعود، حسن اور قتادہ سے یہی تفسیر منقول ہے۔ اور امام ابن جریر طبری اور حافظ ابن کثیر نے اسی کو اپنایا ہے اور جلالین میں حافظ سیوطی نے بھی اسی کو ترجیح دی۔ اس کے علاوہ شارحین قرآن نے اس کے دوسرے مطالب بھی بتاتے ہیں مثلاً صاحب انتصاف سے القاسمی نقل کرتے ہیں ۔

میں تمہارے قتل میں پہل اس لیے نہیں کرتا کہ میں کوئی بارِ گناہ اپنے سر لینا نہیں چاہتا۔ اگر تم اس جرم کے لیے پہل کرنا چاہتے ہو تو کرو اگر تم مجھے قتل کر دو گے تو میرے قتل کا بارِ گناہ بھی تمہارے سر ہوگا اور میری طرف سے مدافعت کے نتیجے میں اگر تمہیں کوئی نقصان پہنچ گیا تو اس کا گناہ تمہارے ہی سر ہوگا اس لیے کہ اس کا سبب میں نہیں بلکہ تم ہی بنو گے ۔

صاحب معالم امام بغوی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اگر تو میرے قتل سے باز نہ آیا تو قیامت کے روز تیری گردن پر تیرے گناہ کا بھی بوجھ ہوگا اور میرے گناہوں کا بوجھ بھی تجھ پر ڈالا جائے گا کیونکہ روزِ قیامت مظلوم مقتول کے گناہ قاتل پر ڈالے جائیں گے ۔ اس طرح دونوں کا بوجھ تجھے اٹھانا پڑے گا اس لیے کہ اللہ کے یہاں قاتل کی سزا یہ ہے کہ اس کے ذمہ اس کا گناہ بھی لکھا جاتے اور اس کے مقتول کا بھی اور اس کو دوہری سزا دی جاتے ۔ یہ امام مجاہد کا قول ہے ۔

اس آیت میں اس اصول عدل کی طرف اشارہ ہے جو ایک حدیث میں فعلی البادی ما لم یعتد المظلوم کے الفاظ سے بیان ہوا ہے ۔ یعنی اگر مظلوم نے کوئی زیادتی نہیں کی ہوگی تو جو کچھ اسے اپنی عزت کی حفاظت کے لیے کرنا پڑا ہے اس کا بارِ گناہ پہل کرنے والے پر ہے بائی اور آنک میں تقابل مماثلت کا ہے ۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قتل مومن کا انجام تباہ کاری ہے

۸۵۔ بہرحال اس کے نفس نے اس کو اپنے بھائی کے قتل کرنے پر آمادہ کر دیا اس نے اُسے مار ڈالا بس وہ تباہ کاروں میں سے ہو گیا۔ شاید ابتداء میں کچھ جھجک ہوگی۔ شدہ شدہ نفس امارہ نے خیال پختہ کر دیا اور یہی کیفیت عموماً معاصی کی ابتداء میں ہوتی ہے اور اس کے نتیجہ میں وہ تباہ کاروں میں سے ہو گیا۔ دُنیوی خسران تو یہ کہ ایسا نیک بھائی جو قوت بازو بنتا ہاتھ سے کھویا اور خود پاگل ہو کر مرا۔ حدیث میں ہے کہ ظلم اور قطع رحم دو گناہ ایسے ہیں جن کی سزا آخرت سے پہلے دُنیا میں بھی ملتی ہے اور اخروی خسران یہ کہ ظلم وقطع رحم قتل عمد اور بدامنی کا دروازہ دُنیا میں کھول دینے سے ان سب گناہوں کی سزا کا مستحق ہوا اور آئندہ بھی جتنے اس نوعیت کے گناہ دنیا میں کیے جائیں گے سب میں بانی ہونے کی وجہ سے اس کی شرکت رہی جیسا کہ حدیث میں مصرح ہے۔[1]

شیخ الاسلام نے جس حدیث کی طرف اشارہ کیا ہے وہ امام بخاری نے اپنی صحیح میں بحوالہ عبداللہ بن مسعود لکھی ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

دنیا میں ظلماً جو بھی مارا جاتا ہے اس میں آدم کے بیٹے کا حصہ ہوتا ہے کیونکہ دنیا میں پہلے ظالمانہ قتل کا موجد وہی ہے۔

قرآن نے قاتل کی اندرونی کشمکش کے اظہار کے لیے طوعت کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ باب تفعیل ہے اور باب تفعیل اپنے مادے کے لیے دو زائد چیزیں ظاہر کرتا ہے ایک تدریج اور دوسرے تکرار۔ مطلب یہ ہے کہ قاتل کو اس کا حسد دیر تک بار بار قتل پر آمادہ کرتا رہا۔ اور قابیل اس معاملہ میں کروں نہ کروں کی کشمکش سے دوچار رہا۔ بالآخر اس کے حسد نے اس کو اس ہولناک جرم پر آمادہ کر دیا۔ ابتداء ہر مجرم کو یہی جھجک پیش آتی ہے لیکن جب وہ مجرمانہ احساسات و جذبات کی پرورش کرتا رہتا ہے تو اس کا ضمیر بالکل مردہ ہو جاتا ہے اور وہ جرم کے لیے دلیرانہ قدم اٹھا دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہابیل کی اس موثر تقریر سے قابیل ذرا بھی متاثر نہ ہوا۔ اس کے نفس نے اس کام پر رفتہ رفتہ دلیر و مستعد بنا دیا اور اسے اس کی نظر میں خوشگوار اور پسندیدہ بنا دیا۔ یہ حال ہر بدی اور معصیت کا ہے۔ ابتداء ہر فطرت سلیم اس سے رکتی ہے، ہچکچاتی ہے لیکن نفس رفتہ رفتہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کی جانب مائل اور اس پر گرویدہ ہوتا جاتا ہے اور اس کی طرف سے جھجک ہٹتی جاتی ہے یہاں تک کہ انسان اسے بے دھڑک کر گزرتا ہے۔

زمین میں مُردے کو دفن کرنے کی تعلیم

۸۶۔ اس کے بعد خدا نے ایک کوا روانہ کیا اور وہ زمین کریدنے لگا تاکہ اسے دکھائے کہ اپنے بھائی کی لاش کیونکر زمین میں چھپائے۔ یہ دیکھ کر وہ بول اٹھا کہ افسوس مجھ پر کہ میں اس کوے کی طرح بھی نہ ہو سکا کہ اپنے بھائی کی لاش چھپا دیتا اس کے بعد وہ پچھتانے لگا۔ چونکہ اس سے پہلے کوئی انسان مرا نہ تھا اس لیے قتل کے بعد اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ لاش کو کیا کرے۔ آخر ایک کوے کو دیکھا کہ زمین کرید رہا ہے یا دوسرے مُردے کو مٹی ہٹا کر زمین میں چھپا رہا ہے اسے دیکھ کر کچھ عقل آئی کہ میں بھی اپنے بھائی کی لاش دفن کر دوں اور افسوس بھی ہوا کہ میں عقل و فہم اور بھائی کی ہمدردی میں اس جانور سے گیا گزرا ہوا۔ شاید اسی لیے حق تعالیٰ نے ایک ادنیٰ جانور کے ذریعہ سے اسے تنبیہ فرمائی کہ وہ اپنی وحشت و حماقت پر کچھ شرمائے۔ جانوروں میں کوے کی یہ خصوصیت ہے کہ اپنے بھائی کی لاش کو کھلا چھوڑنے پر بہت شور مچاتا ہے[1]

اس طرح ایک کوے کے ذریعے آدم کے اس غلط کار بیٹے کو اس کی جہالت و نادانی پر متنبہ کیا اور جب ایک مرتبہ اس کو اپنے نفس کی طرف توجہ کرنے کا موقعہ مل گیا تو اس کی ندامت صرف اسی بات تک محدود نہ رہی کہ وہ لاش چھپانے کی تدبیر نکالنے میں کوے سے پیچھے کیوں رہ گیا بلکہ اس کو یہ بھی احساس ہونے لگا کہ اس نے اپنے بھائی کو قتل کر کے کتنی بڑی جہالت کا ثبوت دیا ہے بعد کا فقرہ فاصبح من النادمین اسی مطلب پر دلالت کرتا ہے لیکن پچھتانا وہ نافع ہے جس کے ساتھ گناہ سے معذرت ہو انکسار اور فکرِ تدارک بھی ہو۔ اس موقع پر اس کا پچھتانا حق تعالیٰ کی نافرمانی پر نہیں بلکہ اپنی بدحالی پر تھا جو قتل کے بعد اسے لاحق ہوتی۔ دراصل قاتل اب بکمال حسرت و ندامت یہ کہہ رہا ہے کہ مجھے تو اس مردار خوار جانور کے برابر بھی شعور نہیں ہے۔ تورات میں ہابیل کی تدفین کا کوئی ذکر نہیں۔ البتہ شارحین تورات نے ایک پرندہ کا ذکر کیا ہے کہ اس کے عمل تدفین کو دیکھ کر آدم و حوا نے بھی ہابیل کا لاشہ دفن کیا لیکن پرندہ کا نام کو انہیں فاختہ آیا ہے۔ قرآن نے کھول کر بتایا ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لیکن دو کووں کی کہانی قرآن میں نہیں ہے۔ قرآن میں صرف ایک کوے کا ذکر ہے۔ علامہ کتیبی فرماتے ہیں کہ قرآن میں اختصار ہے لیکن اگر قرآن ہی کے بیان پر اکتفا کر لیا جاتے اور یوں کہا جائے کہ قابیل قتل کے بعد حیران تھا کہ اس نعش کو کیا کرے۔ ابھی تک نسل آدم موت سے دوچار نہ ہوئی تھی۔ یکایک اس نے دیکھا کہ ایک کوے نے زمین کرید کرید کر گڑھا کھودا، قرآن میں یہی بات بتانے کے لیے بحث مضارع کا صیغہ آیا ہے۔ قابیل کو تنبہ ہوا کہ مجھے بھی اپنے بھائی کے لیے اسی طرح گڑھا کھودنا چاہیے قابیل نے یہ دیکھا تو اپنی ناکارہ زندگی پر بے حد افسوس کیا اور کہنے لگا کہ میں اس حیوان سے بھی گیا گزرا ہوں کہ اپنے اس جرم کو بھی چھپانے کی اہلیت نہیں رکھتا ندامت سے سر جھکا لیا اور پھر اسی طرح اپنے بھائی کو سپرد خاک کر دیا۔

دمشق کے شمالی حصے میں جبل قاسیون پر ایک زیارت گاہ بنی ہوئی ہے جو مقتل ہابیل کے نام سے مشہور ہے اور اس کے متعلق حافظ ابن عساکر نے احمد بن کثیر کے تذکرے میں ایک خواب بھی نقل کیا ہے لیکن خواب کے سچے ہونے کے باوجود بھی اس سے کوئی شرعی یا تاریخی حکم ثابت نہیں ہو سکتا۔

مِنْ اَجْلِ ذٰلِكَ ۛۚ كَتَبْنَا عَلٰى بَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اَنَّهٗ مَنْ قَتَلَ نَفْسًۢا
بِغَیْرِ نَفْسٍ اَوْ فَسَادٍ فِی الْاَرْضِ فَكَاَنَّمَا قَتَلَ النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ
وَمَنْ اَحْیَاهَا فَكَاَنَّمَاۤ اَحْیَا النَّاسَ جَمِیْعًا ؕ وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ
رُسُلُنَا بِالْبَیِّنٰتِ ثُمَّ اِنَّ كَثِیْرًا مِّنْهُمْ بَعْدَ ذٰلِكَ فِی الْاَرْضِ
لَمُسْرِفُوْنَ ۝

اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ حکم لکھ دیا تھا، کہ جس کسی نے انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اُس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی زندگی بچالی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دے دی۔ اور بلاشبہ ان کے پاس ہمارے رسول پے در پے کھلی کھلی ہدایات لے کر آئے لیکن اس پر بھی اُن میں اکثر ملک میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔

قانونِ قصاص کی حکمت و عظمت

آدم کے دو بیٹوں کا تاریخی واقعہ بیان کیا گیا ہے اس سے کتنی ہی باتیں سمجھ میں آتی ہیں اولاً یہ کہ قتل پر کوئی خدا ترس آمادہ نہیں ہوتا ہے یہ ان لوگوں کا کام ہے جن کے دلوں میں خدا کا خوف نہیں ہوتا۔ ثانیاً یہ کہ اس کی عموماً وجہ بغض و حسد ہوتی ہے۔ ثالثاً یہ کہ قاتل خدا کے احکام کا باغی ہوتا ہے اور سخت گنہگار۔ رابعاً یہ کہ قاتل دین و دُنیا دونوں لحاظ سے خسارے میں رہتا ہے۔ تجزیہ کیجئے تو معلوم ہوگا کہ حق سبحانہٗ نے قرآن میں تفصیل سے یہ واقعہ اس لیے بیان کیا ہے تاکہ لوگ اس کی قباحت کو محسوس کریں اور اس گناہ سے ہمیشہ اپنے آپ کو دُور رکھنے کی کوشش کریں۔ یہ گویا اللہ تعالیٰ نے قرآن میں قتل کی تاریخ بیان کی ہے تاکہ لوگوں کو اس سے عبرت ہو اور سنجیدگی سے اس کے نشیب و فراز پر غور کر سکیں یہاں قرآن نے واضح کیا ہے کہ قتلِ ناحق سب سے بڑا جرم ہے اس سے بڑھ کر کوئی اور جرم نہیں ہے کیونکہ یہ چیز رُوئے زمین کا امن و امان تباہ کرتی ہے اور انسانوں کا سکونِ قلب چھین لیتی ہے۔ اس سلسلے میں سب سے زیادہ بلیغ تعبیر جو ہو سکتی ہے قرآن نے اسے اختیار کیا ہے تاکہ قتل کی شناعت اچھی طرح ذہن نشین ہو جائے۔ آدم کے دونوں بیٹوں کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے من اجل ذالک کتبنا علی بنی اسرائیل امن و امان کو برقرار رکھنے کی جو بلیغ تعبیر اللہ تعالیٰ نے یہاں اختیار فرمائی ہے اس سے بڑھ کر دوسرا پیرایہ بیان ممکن نہیں ہے۔ ایک شخص کا قاتل پوری کائناتِ انسانی کا قاتل ہے۔ اس کے مختلف معنے بیان کیے گئے جس کی تفصیل آپ ابھی پڑھیں گے۔ یہاں مجھے امام ابن جریر کی یہ بات بہت پسند آئی ہے کہ:

> اس آیت میں عقوبت کی عظمت اور وعید کی شدت مراد ہے اور بتانا ہے کہ ایک انسان کا ناحق خون اللہ تعالیٰ کے غضب اور عذاب کو اسی طرح حرکت میں لے آتا ہے جس طرح تمام انسانوں کا قتل۔

منشا یہ ہے کہ گنہگاروں میں بدترین گنہگار قاتل ہے۔ صحابہ کرام نے اس مسئلہ کو خوب سمجھا تھا۔ حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ جن دنوں باغیوں نے حضرت عثمان کو اپنے محاصرے میں لے لیا تھا میں کسی طرح حضرت عثمان کی خدمت میں پہنچ گیا اور درخواست کی کہ حضرت میں امداد کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ میری باتیں سن کر آپ نے فرمایا

کیا تجھے یہ بات پسند ہے کہ تو پوری انسانیت اور ساتھ میرا قاتل بن جائے، حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ تو مجھے ہرگز پسند نہیں۔ میرا جواب سن کر حضرت عثمان نے فرمایا کہ،
سن لو اگر تم نے ایک شخص کو قتل کیا تو سمجھو کہ تم پوری انسانیت کے قاتل ہو۔
حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ میں یہ سن کر واپس آگیا۔ تاریخ گواہ ہے کہ حضرت عثمان نے خود جام شہادت نوش کر لیا مگر تلوار اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ یہ تھی عملی تفسیر اس آیت کی اور یہ تھا حضرت عثمان کی نظر میں امن وامان کا جس کا ہمارے اس دور میں تصور بھی ناممکن ہے۔¹
اس آیت میں دراصل قانون قصاص کی حکمت بیان ہو رہی ہے کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل اور ایک کا بچانے والا سب کا بچانے والا ہے۔

۸۷۔ اسی بنا پر ہم نے بنی اسرائیل کے لیے یہ حکم لکھ دیا تھا یعنی ناحق قتل وخون ریزی میں جو دنیوی اور اخروی نقصانات ہیں اور جو بدنتائج اس پر مرتب ہوتے ہیں حتیٰ کہ قاتل بھی اس حرکت کے بعد بسا اوقات پچھتاتا اور کف افسوس ملتا ہے۔ اسی سبب سے بنی اسرائیل کو ہم نے یہ ہدایت کی تھی۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ ذالک سے اشارہ قصہ قتل ہابیل کی جانب نہیں بلکہ ان مفاسد کی جانب ہے جو قتل ناحق سے پیدا ہوتے ہیں۔ السید رشید رضا لکھتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اس جرم اور اس فعل کی وجہ سے جو ظلم وعدوان کی صورت میں دو بھائیوں میں رونما ہوا ہم نے بنی اسرائیل کو یہ ہدایت دی تھی۔ اور دوسرے شارحین لکھتے ہیں کہ چونکہ بنی اسرائیل کے اندر انہی صفات کے آثار پائے جاتے تھے جن کا اظہار آدم کے اس بیٹے نے کیا تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو قتل نفس سے باز رہنے کی سخت تاکید کی تھی اور اپنے فرمان میں یہ الفاظ لکھ دیے تھے۔ افسوس ہے کہ آج جو بائیبل پائی جاتی ہے وہ فرمان خداوندی کے الفاظ سے خالی ہے۔¹
ہابیل کی صدا میں تمام نوع انسانی کی راست بازی اور نیک عملی بول رہی تھی، اور قابیل کے عمل میں تمام ظالم انسانوں کی شقاوت کا ہاتھ تھا۔ اب انسان کے سامنے دو راہیں کھل گئیں، نیکی وراستی کبھی انسان کے خون سے ہاتھ نہیں رنگے گی ظالم کا ہاتھ ہمیشہ رنگین رہے گا۔ قرآن کہتا ہے کہ اسی بنا پر خدا نے بنی اسرائیل کے لیے یہ حکم لکھ دیا۔²
یہ سوال کہ اگر صورت حال یہی ہے تو پھر بنی اسرائیل کی تخصیص کیوں ہے۔ اس وجہ کا تقاضا

---

¹ افادات شیخ الاسلام ² تفہیم، ³ ترجمان القرآن

تو یہ ہے کہ یوں کہا جاتا کتبنا علی الناس، ہم نے پوری انسانیت کو یہ ہدایت دی ہے۔ شارحین قرآن نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ یہاں بنی اسرائیل کی تخصیص اس لیے کی گئی کہ وہ قابیل کی طرح حضور نزر صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے حسد رکھتے تھے اور یہ حسد ان کو قتل کی سازشوں پر ابھار رہا تھا ان کے اسی کردار پر تعریض کے لیے بنی اسرائیل کا ذکر ہوا ہے۔ ورنہ یہ واقعہ تو بنی اسرائیل سے بہت پہلے کا ہے۔ اور معلوم ہے کہ جان کے بدلے جان کا قانون ہر ملت میں ابتدا سے موجود رہا ہے۔ حضرت نوح اور حضرت ابراہیم کی ملت میں بھی یہ قانون موجود تھا جیسا کہ تورات کی کتاب پیدائش کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ دراصل یہاں ضابطہ فوجداری کی تاریخ بتانی مقصود نہیں ہے بلکہ یہ واضح کرنا ہے کہ بنی اسرائیل اللہ کے میثاق کے معاملہ میں اتنے دلیر اور بے باک ہیں کہ یہ جاننے کے باوجود کہ ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے برابر اللہ کی زمین میں فساد کیے جا رہے ہیں۔ اس سے من اجل ذالک کا اشارہ شروفساد کی اس ذہنیت کی طرف ہے جس کا قابیل نے اظہار کیا اور جس کا مظاہرہ ان یہودیوں کی جانب سے ہوتا رہتا ہے اور ہو رہا ہے جو قابیل کی سنت بد کی پیروی کر رہے ہیں، یعنی کینہ، جذبات اور شیطانی تحریکات کے تحت اللہ کے بندوں کا خون بہاتے ہیں۔

انسانی جان کی حفاظت

۸۸۔ کہ جس نے انسان کو خون کے بدلے یا زمین میں فساد پھیلانے کے سوا کسی اور وجہ سے قتل کیا اس نے گویا تمام انسانوں کو قتل کر دیا اور جس نے کسی کی زندگی بچا لی تو گویا اس نے تمام انسانوں کو زندگی دے دی۔ ملک میں فساد کرنے کی بہت سی صورتیں ہیں مثلاً اہل حق کو دین حق سے روکے یا پیغمبروں کی اہانت کرے یا العیاذ باللہ مرتد ہو کر اپنے وجود سے دوسروں کو مرتد ہونے کی ترغیب دے وقس علی ذالک اور زندہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اول روئے زمین پر بڑا گناہ یہی ہوا کہ قابیل نے ہابیل کو قتل کیا اس کے بعد رسم پڑ گئی اسی سبب سے تورات میں اس طرح فرمایا کہ ایک کو مارا جیسے سب کو مارا، یعنی ایک کے ناحق خون کرنے سے دوسرے بھی اس جرم پر دلیر ہو جاتے ہیں۔ تو اس حیثیت سے جو شخص ایک کو قتل کر کے بدامنی کی جڑ قائم کرتا ہے گویا وہ سب انسانوں کے لیے قتل اور عام بدامنی کا دروازہ کھول رہا ہے اور جو کسی ایک کو زندہ کرتا یعنی کسی ظالم قاتل کے ہاتھ سے بچاتا ہے گویا وہ اپنے عمل سے سارے انسانوں کے بچانے اور زندہ کرنے کی دعوت دے رہا ہے۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ دنیا میں نوعِ انسانی کی زندگی کا بقا منحصر اس پر ہے کہ ہر انسان کے دل میں دوسرے انسانوں کی جان کا احترام موجود ہو اور ہر ایک دوسرے کی زندگی کے بقا و تحفظ میں مددگار بننے کا جذبہ رکھتا ہو۔ جو شخص ناحق کسی کی جان لیتا ہے وہ صرف ایک ہی فرد پر ظلم نہیں کرتا بلکہ یہ بھی ثابت کرتا ہے کہ اس کا دل حیاتِ انسانی کے احترام اور ہمدردیٔ نوع کے جذبے سے خالی ہے۔ للذا وہ پوری انسانیت کا دشمن ہے کیونکہ اس کے اندر وہ صفت پائی جاتی ہے جو اگر تمام افرادِ انسانی میں پائی جاتے تو پوری نوع کا خاتمہ ہو جاتے اس کے برعکس جو شخص انسان کی زندگی کے قیام میں مدد کرتا ہے وہ درحقیقت انسانیت کا حامی ہے کیونکہ اس میں وہ صفت پائی جاتی ہے جس پر انسانیت کے بقا کا انحصار ہے [1]۔

دنیا میں سب سے زیادہ قابلِ حفاظت اور لائقِ اہمیت انسانی جان ہے۔ غریب ہو یا امیر، بادشاہ ہو یا فقیر، بچہ ہو یا جوان، مرد ہو یا عورت، شہر کا رہنے والا ہو یا دیہاتی، تعلیم یافتہ ہو یا جاہل۔ پھر وہ اپنے خاندان کا چشم و چراغ ہو یا محتاج دست نگر گھرانے کا، مسلم ہو یا غیر مسلم، تندرست ہو یا بیمار و ناکارہ، ہر ایک کو ایک وفادار شہری کی حیثیت سے حق حاصل ہے کہ ملک میں آزادی کا ساتھ رہے۔ آسودہ زندگی بسر کرے اپنے خیال و عقیدے میں اس کو آزادی ہو۔ کوئی پابندی نہ ہو اور ہر خطرہ و اندیشہ سے اس کا دل مطمئن ہو۔ قرآن نے دو صورتوں کے علاوہ کسی صورت میں قتلِ انسانی کی اجازت نہیں دی ہے۔ ایک یہ کہ جان کا بدلہ لیتا ہو، دوسرے یہ کہ ملک میں دنگا و فساد کیا ہو۔ ان دو صورتوں کے علاوہ انسان کو مارنا قرآن کے نقطۂ نظر سے پوری انسانیت کے قتل کے مترادف ہے۔ قرآن نے افساد فی الارض اور سفک دم کو ہم پلہ بتایا ہے۔ کسی جان کو مارنا خواہ کسی طرح ہو اور خواہ کسی وجہ سے ہو، قرآن نے سب پر قدغن قائم کر دی ہے۔ مشرکین مکہ فقر و فاقہ کو حیلہ بنا کر قتل ناحق کا خون اپنے سر لیتے تھے۔ قرآن میں مشرکین کی اس قبیح رسم کا ذکر آٹھویں پارے میں آ رہا ہے۔ تنگدستی کے اندیشہ سے بچوں کو مار ڈالنا اور ننگ و عار کے خیال سے بچوں کو قتل کرنا ان کا محبوب مشغلہ تھا۔ قرآن نے ان کو سختی کے ساتھ بچوں کے قتل سے روکا اور فقر و فاقہ کے وساوس کو یہ کہہ کر دور کیا کہ نحن نرزقہم وایاکم۔

اس آیت میں قرآن نے قتل و خون ریزی کو اولاً ترغیب و ترہیب کے ذریعے بند کرنے کی

---

[1] تفہیم القرآن۔

کوشش کی ہے اور لوگوں کے دلوں میں خون ناحق کی برائی بٹھائی اور اس کی ممانعت کی حکمت بتائی اور ان مفاسد پر روشنی ڈالی جو خون ناحق سے پیدا ہوتے ہیں ساتھ ہی امن وامان سے یہ اس کا گہرا رشتہ ہے اسے اجاگر کیا تاکہ انسان گناہ سے اپنے آپ کو بچاتے ۔ علماء نے تصریح کی ہے چنانچہ محدث ابن جریر نے حسن بصری سے نقل کیا ہے کہ :

یہ آیت قرآنی ہمارے لیے رہنما اصول ہے جیساکہ بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ ان کے خون ہمارے خونوں سے زیادہ محترم نہیں ہیں ۔

امام شاطبی نے الموافقات میں یہ قاعدہ لکھا کہ گزشتہ امتوں کے جو قوانین واحکام قرآن میں ذکر ہوتے ہیں وہ سب حق ہیں اور امت اسلامیہ بھی اس کی مخاطب ہے جب تک قرآن ہی سے استثنا معلوم نہ ہو ۔

سب سے بڑا گناہ

اس آیت میں ناحق ایک شخص کے قتل کو پوری انسانیت کا قتل بتایا ہے ۔ اسی بنا پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سب سے بڑا گناہ قرار دیا ہے ۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ ایک بار میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا ای الذنب اعظم عند اللہ خدا کے یہاں سب سے بڑا گناہ کون سا ہے ، فرمایا یہ کہ تو خدا کا کسی کو ہمسر و شریک بنائے ۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے پھر پوچھا کہ شرک کے بعد سب سے بڑا گناہ کون سا ہے ، آپ نے فرمایا کہ پھر یہ کہ تو اپنے بچے کو روزی کھانے کے اندیشے سے مار دے ۔

امام نووی صحیح مسلم کی شرح میں فرماتے ہیں کہ :

سب سے بڑا گناہ شرک ہے جو ظاہر اور بے غبار ہے اور پھر قتل ناحق ہے جو اسی کے قریب قریب ہے اسی لیے ہمارے اصحاب کہتے ہیں کہ شرک کے بعد اکبر الکبائر قتل ناحق ہے ۔ امام شافعی نے بھی اس کی صراحت کی ہے ۔

ایک بار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ، سات تباہ کن چیزوں سے بچو۔ آپ سے پوچھا گیا کہ وہ کیا ہیں ۔ آپ نے فرمایا اللہ کا شریک بنانا اور اس شخص کو قتل کرنا جس کو قتل کرنا اللہ نے حرام کیا ہو ، ہاں حق شرعی کے ساتھ ۔ (مسلم)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مختلف انداز میں قتل وخون ریزی کی شناعت ذہن نشین کرنے کی سعی فرمائی ہے ۔ ایک بار آپ نے خون ناحق کی مذمت کرتے ہوئے فرمایا ۔

مومن جب تک ناحق خون ریزی میں مبتلا نہیں ہوتا اپنے دین کے بارے میں کشادگی میں رہتاہے ۔ (بخاری)

کتنا موثر انداز بیان ہے کہ آدمی پڑھنے کے ساتھ ہی یہ دُعا کرتاہے کہ خدایا مجھے اس گناہ سے بچائے قتل وخون ریزی بند کرنے کی جو کوشش اسلام نے کی ہے وہ اپنی آپ مثال ہے اور اس سلسلے میں جو موثر سے موثر انداز بیان ہو سکتاہے وہ سب اس نے اختیار کیے ہیں ۔ ایک مرتبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ :

مومن اس وقت تک ہمیشہ نیکیوں میں تیزرو اور نیکوکار رہتاہے جب تک ناحق خون ریزی نہیں کرتا مگر جب وہ اس گناہ میں مبتلا ہو جاتاہے تو پھر وہ سست پڑجاتاہے ۔ (مشکوٰۃ)

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ ان تباہ کن کاموں میں سے جن میں انسان اپنے آپ کو ڈال کر بچا نہیں سکتا اور اس کی ہلاکت ضروری ہے ۔ یہ بھی ہے کہ کوئی ناحق خون بہاتے جس کی کوئی شرعی وجہ نہ ہو ۔

اشارۃً قتل کا گناہ

قتل کی ایک صورت یہ بھی ہے کہ انسان اپنا ہاتھ خون آلود نہ کرے مگر اپنے اثر و رسوخ اور جاہ واقتدار سے کام لے کر کسی دوسرے کو اس میں استعمال کرے اور اس کے ذریعے کسی بے گناہ کو قتل کرائے اسلام اس صورت کو بھی برداشت نہیں کرتا اور اصل مجرم صاحب اثر ورسوخ ہی کو گردانتا ہے حدیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قاتل اور آمر کے بارے میں پوچھا گیا ۔ آپ نے فرمایا ۔

آگ ستر حصوں میں تقسیم کی گئی ہے ان میں سے ۶۹ حصے اس کے لیے ہوں گے جو قتل کا حکم دیتاہے اور ایک حصہ اس قاتل کے لیے ہے جو دوسرے کے کہنے سے قتل کرے ۔ (جمع الفوائد عن احمد)

حدیث میں ہے کہ قیامت کے دن قاتل ومقتول بارگاہ الٰہی میں پیش ہوں گے مقتول عرض کرے گا کہ اے مولیٰ قاتل سے پوچھئے کہ اس نے مجھے کس قصور پر قتل کیا ۔ قاتل آمر کی طرف

اشارہ کرکے جواب دے گا پروردگار اس نے مجھے حکم دیا تھا۔ اس جواب کے بعد قاتل و مقتول دونوں کے ہاتھ پکڑے جائیں گے اور دونوں کو ایک ساتھ جہنم میں جھونک دیا جائے گا۔ (جمع الفوائد)

ہتھیاروں پر پابندی اور اس کی وجہ

قتل تو بہر حال قتل ہے۔ اسلام یہ بھی پسند نہیں کرتا کہ آدمی ایسی ہیئت اختیار کرے جس سے کسی کو کوئی زخم پہنچنے کا احتمال ہو یا کسی کے دل میں اس کی طرف سے شبہ بھی پیدا ہو۔ حضور انور کا ارشاد ہے:

جو ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ (بخاری)

حافظ ابن جریر تحریر فرماتے ہیں:

ہتھیار اٹھانے سے مراد یہ ہے کہ ان سے جنگ کی جائے تاکہ ان کو خوف زدہ کیا جائے لہذا وہ شخص اس وعید میں داخل نہ ہوگا جو مسلمانوں کی حفاظت کے لیے ایسا کرے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ننگی تلوار لے کر چلنے سے منع فرمایا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کو دھوکہ سے کوئی خراش آجائے یا کوئی کمزور دل اپنے قلب کی کمزوری کی وجہ سے ننگی تلوار دیکھ کر خطرہ محسوس کرنے لگے۔ ارشاد ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ننگی تلوار دینے سے منع فرمایا ہے۔

قتل و خون ریزی کی برائی ذہن نشین کرنے اور دنیا سے فتنہ و فساد مٹانے کے لیے آپ نے فرمایا ہے:

دوزخ کے سات دروازے ہیں ان میں سے ایک دروازہ ان مجرمین کے لیے ہے جو میری امت پر تلوار چلائے۔ (مشکوٰۃ)

کوئی ایسا پیرایہ بیان باقی نہیں چھوڑا گیا ہے جس سے امت کا ذہن اس سلسلے میں براہ راست متاثر ہو سکتا ہو۔ مختلف انداز سے کوشش کی گئی ہے کہ انسان قتل و خون ریزی کے نقصان کو سمجھ کر اس سے بیزاری کا اعلان کرے اور فتنہ و فساد سے دامن بچا کر رکھے۔ ایک موقع پر حضور انور نے فرمایا کہ:

جو شخص اپنے مسلمان بھائی کی طرف ہتھیار سے اشارہ کرتا ہے اس پر

فرشتے لعنت کرتے ہیں تا آنکہ وہ اسے رکھ نہ دے اگرچہ اس کا سگا بھائی کیوں نہ ہو۔ (مشکوٰۃ)
شاہ عبدالحق محدث دہلوی اشعۃ اللمعات میں فرماتے ہیں۔

اس حدیث میں اشارے سے مقصود ہنسی اور مذاق کے طور پر اشارا کرنا ہے کیونکہ سچ مچ قصد و ارادے کے معنے یہاں بن نہیں سکتے اور ہنسی و مذاق پر لعنت ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اس کام سے شدت سے روکا جا رہا ہے۔

پیرایہ بیان ہر موقعہ پر ایسا اختیار کیا گیا ہے کہ انسانی ذہن میں انسانی خون اور امن وامان کی قدر و قیمت مضبوطی سے جم جاتے اور اس سلسلے میں مزید چون و چرا کی گنجائش باقی نہ رہے۔ انسانی جان کی یہ حفاظت اسلام کے سوا اور کہاں مل سکتی ہے۔ موجودہ دور میں امن و سلامتی کا تصور بھی مشکل ہے۔ یہ اسلام ہی کو فخر حاصل ہے کہ اس نے پوری قوت کے ساتھ انسانی احترام کی برتری کا اعلان کیا اور ساری کائنات کو انسان کا تابع اور خدمت گزار قرار دیا۔

خون کی اہمیت اسلام میں

انسانی زندگی میں انسانی خون کی عظمت اور قدر و قیمت کا مزید اندازہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد سے لگائیے جو عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے صحیح بخاری کی کتاب الدیات میں آتا ہے:

قیامت میں جس مسئلہ کا سب سے پہلے فیصلہ کیا جاتے گا وہ خون کا کیس ہوگا۔

امام نووی فرماتے ہیں کہ اس ارشاد نبوت میں خون کی اہمیت کا بیان ہے۔ اور حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ:

قیامت میں پہلا فیصلہ خون کا ہوگا۔ یعنی ان مقدمات کا فیصلہ سنایا جاتے گا جو قتل سے متعلق ہوں گے۔ اس حدیث میں مسئلہ قتل کی اہمیت کا اظہار ہے اس لیے کہ آغاز ہمیشہ اہم معاملہ سے ہوتا ہے۔

یہاں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اس کا تعلق من قتل نفساً بغیر نفس سے ہے۔ یعنی ناحق خونریزی کرنا۔ اسے قرآن کبھی بغیر نفس سے تعبیر کرتا ہے اور کبھی اسی کو الا بالحق کہہ کر ظاہر کرتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جواز قتل کی اس وقت اجازت ہے جب جان کے بدلے میں جان لینا ہو۔ اور اس وقت اجازت ہے جب ملک میں فساد کر رہا ہو۔ زمین سے مراد وہ ملک یا علاقہ ہے جس میں امن و انتظام قائم کرنے کی ذمہ داری اسلام نے دے رکھی ہو۔

زمین میں فساد کی ممانعت

قرآن میں ایک سے زیادہ مقامات پر فساد کی مذمت اور اس کی ہلاکت خیزیاں بیان کی گئی ہیں ہر زمانے میں اس مہلک خباثت کی نشاندہی کی گئی ہے جو انسانی امن و سکون کے لیے شدید طور پر مضر رہاں ہے۔ فساد کا لفظ جب مطلق استعمال ہوتا ہے اس وقت یہ تمام معاشرتی و اخلاقی اور فکری برائیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ کتاب الایمان میں لکھتے ہیں۔

صلاح کا لفظ جب مطلق استعمال ہو تو تمام امور خیر کو شامل ہوتا ہے اور ایسے ہی لفظ فساد تمام برائیوں کو اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔

یہ کون نہیں جانتا کہ کسی ملک اور قوم میں اطمینان و سکون کی دولت فراوانی کے ساتھ اس وقت تک نہیں پائی جا سکتی جب تک ان اسباب کا سرے سے قلع قمع نہ کیا جاتے جو انسانی چین اور سکون و اطمینان کے لیے زہر ہلاہل کی حیثیت رکھتے ہیں اور ان تمام لوگوں کا پوری قوت سے سر نہ کچل دیا جاتے جو انسانی راحت و عافیت پر شب خون مارنے کے عادی مجرم ہیں۔ چنانچہ اسلام نے ان تمام اسباب و محرکات کی سختی کے ساتھ نگرانی کی ہے جو انسانی آبادی میں شور و ہنگامہ، دنگا و فساد اور فتنہ پردازی کے ممد و معاون بنتے ہیں۔ اسلام سراسر رحمت و رافت ہونے کی وجہ سے ایک لمحہ کے لیے اپنے معاشرے میں ایسی چیزوں کو گوارا نہیں کرتا جو ملک کے امن و امان اور خرمن عافیت پر بجلی بن کر گرتی ہیں۔ اور نہ افراد انسانی پر ترس کھاتا ہے جو قوم اور ملک کی خوشگوار زندگی سے کھیلنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اس سلسلے میں نہ وہ اپنوں کی پرواہ کرتا ہے اور نہ غیروں کی نہ مسلم کی نہ غیر مسلم کی، نہ دارالاسلام میں بسنے والوں کی نہ دار الحرب میں رہنے والوں کی اس کی عدالت میں مجرم خواہ کوئی ہو اس کو سزا ضرور ملتی ہے۔ وہی افراد جن کی حرمت و عزت کے لیے اس کی پوری مشینری حرکت کرتی رہتی ہے۔ جب ان ہی کے دامن جرم سے داغدار ہو جاتے ہیں تو جرم کے اقرار یا اس کے ثابت ہو جانے کے بعد اسلام کی نگاہ لطف و کرم میں کسی رحم کے مستحق نہیں ہوتے ہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ زمین میں فساد اور قانون امن و امان کی خلاف ورزی انتہائی ہلاکت خیز ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں فساد کی بے انتہا مذمت کی گئی ہے اور مفسدین سے بیزاری کا اعلان کیا ہے یہ فساد خواہ کفر و شرک کے راستہ سے آتے یا اجتماعی نظم میں خلل اندازی سے آتے۔ یہ شخصی مظالم کا

نیتجہ ہو یا اجتماعی بگاڑ کا یہ بُرائی جس روپ میں آئے ہر حال میں برائی ہے۔ فساد کے موضوع پر قرآن میں جو آیات ہیں ان کا مطالعہ فرمائیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ قرآن پاک نے فتنہ و فساد کے استیصال کے لیے کیا کیا انداز اختیار کیا ہے۔

ملک میں فساد کی صرف تین ہی صورتیں نہیں ہیں بلکہ تین سے زیادہ ہیں جیسا کہ شیخ الاسلام نے بتایا ہے۔ صرف قرآن ہی کا اس منظر سے مطالعہ کیا جائے تو فکری و اعتقادی، معاشرتی و اخلاقی، معاشی و اقتصادی، سیاسی و اجتماعی فسادات کی ایک طویل فہرست مرتب ہو سکتی ہے۔

فسادات پر اسلام میں دو طرح کی سزائیں ہیں حدود اور تعزیرات۔

جن جرائم اور فسادات کی سزائیں قرآن و سنت میں صراحتہً مذکور ہیں وہ حدود کہلاتی ہیں۔ اور جن جرائم کی سزاؤں کو اسلام نے عدالت کے صوابدید اور اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا ہے ان کو تعزیرات کہتے ہیں۔

حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ ـــ اللہ سبحانہ نے جن نافرمانیوں اور قانون شکنی پر حد مقرر کی ہے ایسی نافرمانیاں ہیں جن میں گوناں گوں مختلف مفاسد ہیں ان جرائم کی وجہ سے زمین میں فتنہ و فساد کی گرم بازاری ہوتی ہے اور انسانوں کے سکون و اطمینان پر ڈاکہ زنی ہوتی ہے۔

ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے

آخر میں دو باتیں ارشاد ہوتی ہیں ایک یہ کہ ایک کا قاتل پوری انسانیت کا قاتل ہے۔ اس کا مطلب ہرگز یہ نہیں ہے کہ ایک کا قاتل اور سب کا قاتل قانون کی نظر میں برابر ہوگا۔ قانون عدالت، ضابطہ کی نظر میں دونوں کی مساوات کا یہاں ذکر نہیں ہے۔ مقصود قاتل کی فطرت پر روشنی ڈالنا ہے۔ جو ظالم و فاجر ایک شخص کی بھی جان بلا وجہ اور بے قصور لے ڈالنے میں نہیں ہچکچاتا اس کی جسارت اور خباثت نفس سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ سارے انسانوں کو تہ تیغ کر دے۔ یہ بات قرآن میں لفظ کانما پر غور کرنے سے سمجھ میں آرہی ہے۔ اصل چیز تو قاتل کی نظر میں قانون و شریعت کی بے وقری اور اس کی خلاف ورزی پر اس کی دلیری ہے۔ قرطبی نے صحیح لکھا ہے ایک کے قتل کو حلال جاننے والا سب کے قتل کو حلال سمجھتا ہے۔ اور امام رازی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ ایک کے قاتل کو سب قاتلوں سے تشبیہ سے مقصود قتل کی شناعت اور برائی میں مبالغہ اور اس جرم کی سنگینی کو ظاہر کرنے کے لیے ہے۔ اور قاضی بیضاوی کا یہ کہنا بھی بالکل بجا ہے چونکہ ایک کا قاتل خون کے تقدس

کو تباہ کرکے لوگوں کے لیے قتل کی شاہراہ بناتا ہے اور لوگوں کو اس کے عمل کے ذریعے دلیری ہوتی ہے اس لیے ایک کا قاتل سب کا قاتل ہوتا ہے۔ قرآن کی اس بلیغ تعبیر سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کی نظر میں ساری انسانی برادری کی حیثیت اکائی کی ہے۔ یہاں ایک کی جان سب کی جان ہے یہاں ہر ایک کا خون قابل احترام ہے۔

قانون کی ذمہ داریاں ہر فرد پر ہیں

اس آیت کے اشارات کی مدد سے معاشرے کے ہر فرد کی جو قانونی ذمہ داریاں معلوم ہوتی ہیں وہ بھی سن لیجئے۔

اول یہ کہ قرآن کی یہ تعبیر کہہ رہی ہے کہ ہر حادثہ قتل پوری قوم میں ایک ہلچل پیدا کرے جب تک اس کا قصاص نہ لیا جائے گا۔ ہر شخص یہ محسوس کرے کہ وہ اس تحفظ سے محروم ہو گیا ہے جو اب تک اسے حاصل تھا۔ قانون ہی سب کا محافظ ہوتا ہے اگر قانون کی عمارت منہدم ہو گئی تو صرف مقتول ہی قتل نہیں ہوا بلکہ ہر شخص قتل کی زد میں ہے۔

دوم یہ کہ قاتل کا کھوج لگانا صرف مقتول کے وارثوں کی ذمہ داری نہیں ہے بلکہ پوری جماعت کی ذمہ داری ہے کیونکہ قاتل نے صرف مقتول ہی کو قتل نہیں کیا بلکہ سب کو قتل کیا ہے۔

سوم یہ کہ اگر کوئی شخص کسی کو خطرے میں ڈالے تو اس کو پرایا جھگڑا سمجھ کر نظر انداز کرنا اس کے لیے جائز نہیں ہے بلکہ اس کی حفاظت و حمایت تا بحد مقدور اس پر واجب ہے کیونکہ جو شخص کسی مظلوم کی حمایت و نصرت میں قدم اٹھاتا ہے وہ صرف مظلوم ہی کی حمایت میں سینہ سپر نہیں ہوتا بلکہ تمام مخلوق کی حمایت میں سینہ سپر ہوتا ہے۔

چہارم یہ کہ اگر شخص کسی قتل کو چھپاتا ہے یا قاتل کے حق میں جھوٹی گواہی دیتا ہے یا قاتل کا ضامن بنتا ہے یا قاتل کو پناہ دیتا ہے یا قاتل کی دانستہ وکالت کرتا ہے یا دانستہ اس کو جرم سے بری کرتا ہے وہ گویا خود اپنے اور اپنے باپ بھائی بیٹے کے قاتل کے لیے یہ سب کچھ کرتا ہے کیونکہ ایک کا قاتل سب کا قاتل ہے۔

پنجم یہ کہ کسی مقتول کے معاملہ میں مقتول کے وارثوں یا حکام کی مدد کرنا یہی درحقیقت مقتول کی مدد کرنا ہے۔ اسی لیے قرآن میں قصاص کو زندگی فرمایا ہے۔

قانون اور اس کی یاد دہانی

۸۹۔ اور بلاشبہ ان کے پاس ہمارے رسول پے درپے کھلی کھلی ہدایات لے کر آتے لیکن اس پر بھی ان میں اکثر ملک میں زیادتیاں کرنے والے ہیں۔ ترجمہ میں بینات سے حضرت شیخ الہند نے کھلے ہوئے حکم مراد لیے۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ بینات سے وہ کھلے کھلے نشان مراد لیے جائیں۔ جن سے کسی پیغمبر کے من عند اللہ ہونے کی تصدیق ہوتی ہو۔ بنی اسرائیل کی اکثریت ایسے کھلے نشان دیکھ کر اور ایسے کھلے احکام سن کر بھی اپنے ظلم و طغیان اور دست درازیوں سے باز نہ آئے۔ انبیاء معصومین کو قتل اور آپس میں ناحق خون کرنا ان کا ہمیشہ سے وتیرہ رہا ہے اور آج بھی معاذ اللہ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل یا ایذا رسانی اور مسلمانوں کی تذلیل کے لیے ہر قسم کی ناپاک سازشیں کرتے رہتے ہیں اور اتنا نہیں سمجھتے کہ جب تورات کے حکم کے مطابق کیفما اتفق کسی آدمی کا ناحق مار ڈالنا اتنا بڑا جرم ہے کہ گویا اس کا قاتل تمام دنیا کے انسانوں کا قاتل ہے تو دنیا کے سب سے زیادہ کامل و اکمل انسان اور سب سے زیادہ مقبول و مقدس جماعت کے قتل و ایذا رسانی کے درپے ہونا اور ان سے لڑائی اور مقابلہ کے لیے کمر باندھنا خدا کے نزدیک کتنا بھاری جرم ہے۔ خدا کے سفراء سے لڑائی تو درحقیقت خدا ہی سے لڑائی ہے شاید اسی لیے اگلی آیت میں ان لوگوں کی دنیوی اور اخروی سزا کا ذکر کیا گیا ہے جو خدا اور پیغمبر سے لڑائی کرتے ہیں یا دنیا میں طرح طرح کے فساد پھیلا کر مسرفون فی الارض کے مصداق بنتے ہیں[1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کو یہ قانون بتا دینے ہی پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ اتمام حجت کے لیے برابر ان کے اندر خدا کے رسول بھی آتے رہے جو نہایت واضح احکام و ہدایات اور نہایت بلیغ تعلیمات کے ذریعے سے ان کو آگاہ کرتے رہے کہ اللہ کے عہد و میثاق کی ذمہ داریوں سے غافل نہ ہو جائیں لیکن اس سارے اہتمام کے باوجود یہ لوگ خدا کی زمین میں لگاتار مختلف قسم کی زیادتیاں کرتے رہے ہیں۔ آخر میں ان کثیرا منہم بعد ذالک فی الارض لمسرفون کہہ کر نہایت بلیغ اشارہ فرما دیا کہ مفسد تو سب ہی تھے لیکن ان کی اکثریت صرف فساد ہی نہیں کرتی تھی بلکہ فساد میں حدود سے تجاوز کر چکی تھی اور یہ اسراف بھی ان کی زندگی میں رچ بس گیا تھا۔ رچنے بسنے کی طرف جملہ اسمیہ لا کر اشارہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کیا ہے۔ فساد نام ہے حدِ اعتدال سے نکل جانے کا اور اسراف کہتے ہیں چھوٹ اور بے لگام ہونے کو مطلب یہ ہے کہ وہ ملک میں صرف جادۂ اعتدال ہی سے نکلے ہوئے نہ تھے بلکہ ان کی اکثریت اس فساد میں چھوٹ اور بے لگام ہو چکی تھی اور ان کی پوری زندگی اسی پر چل رہی تھی۔ اللہ نے جو قانون اتارا ہے اس میں اگر نافرمانیوں کے ذریعے خلل اندازی کر دی جاتے تو قانون کا اجتماعی معاشرتی اور سیاسی نظام برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ پھر نہ تو نظامِ تکوینی کے ساتھ اس کے نظامِ سیاسی کی ہم آہنگی رہتی ہے اور نہ اس کے نظامِ اجتماعی و سیاسی میں کوئی ربط قائم رہ جاتا ہے۔ اسی صورت کو یہاں اسراف سے تعبیر فرمایا ہے۔

مدینہ کے یہود اور ان کا اسراف

اس اصولی حقیقت کے ساتھ ساتھ اس تاریخی حقیقت کو یاد رکھنا چاہیے جس کا تجربہ ان آیات کے نزول کے زمانے میں مسلمانوں کو لگاتار یہودیوں کی طرف سے ہو رہا تھا۔ یہود کے متعدد قبائل مثلاً بنونضیر، بنوقریظہ اور بنوقینقاع مدینہ کے گرد و نواح میں آباد تھے۔ انہوں نے یوں تو مسلمانوں کے ساتھ امن و صلح اور باہمی حمایت و مدافعت کے معاہدے کر رکھے تھے لیکن ایک دن بھی انہوں نے معاہدوں کا احترام نہیں کیا بلکہ ہمیشہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانے اور مدینہ سے ان کے قدم اکھاڑنے کی سازشیں کرتے رہے۔ قریش نے مسلمانوں پر جتنے حملے کیے سب میں در پردہ یہودی شریک تھے۔ انصار و مہاجرین کے درمیان پھوٹ ڈالنے کی بھی انہوں نے بار بار کوشش کی۔ صحابہ بلکہ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی بھی انہوں نے بارہا تدبیریں کیں۔ اگرچہ ان کی یہ چالیں اکثر و بیشتر ناکام رہیں لیکن متعدد نہایت اندوہناک واقعات بھی پیش آئے۔ عورتوں اور بچوں کے اغوا اور قتل میں بھی یہ نہایت شاطر اور سنگدل تھے۔ مسلمانوں کو ہر وقت یہود کی طرف سے اپنی جان اور عزت کے معاملہ کھٹکا لگا رہتا تھا حد یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو وہ کسی قضیے کے طے کرانے اور کسی معاملے پر گفتگو کرنے کے لیے بلاتے تھے ان سے بھی ہلاک کرنے کی سازش پہلے سے تیار کر لیتے تھے۔ اس آیت میں اس صورتحال کی طرف اشارہ ہے۔

اور حافظ ابن جریر نے یہاں یہ نکتہ آفرینی خوب فرمائی ہے کہ بنی اسرائیل صرف قانون کی خلاف ورزی کا ارتکاب کر کے مفسد ہی نہ تھے بلکہ اپنی پوری قانون اسی کی بغاوت پر قائم کر کے انبیاء کی اپوزیشن اور ان کے مدمقابل بن گئے تھے اور یہی ان کا اسراف تھا۔

إِنَّمَا جَزَٰٓؤُا۟ ٱلَّذِينَ يُحَارِبُونَ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَيَسْعَوْنَ فِى ٱلْأَرْضِ
فَسَادًا أَن يُقَتَّلُوٓا۟ أَوْ يُصَلَّبُوٓا۟ أَوْ تُقَطَّعَ أَيْدِيهِمْ وَأَرْجُلُهُم مِّنْ
خِلَٰفٍ أَوْ يُنفَوْا۟ مِنَ ٱلْأَرْضِ ۚ ذَٰلِكَ لَهُمْ خِزْىٌ فِى ٱلدُّنْيَا ۖ وَلَهُمْ
فِى ٱلْءَاخِرَةِ عَذَابٌ عَظِيمٌ ﴿٣٣﴾ إِلَّا ٱلَّذِينَ تَابُوا۟ مِن قَبْلِ أَن
تَقْدِرُوا۟ عَلَيْهِمْ ۖ فَٱعْلَمُوٓا۟ أَنَّ ٱللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٣٤﴾

بلاشبہ ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں اور ملک میں خرابی پھیلانے کے لیے دوڑتے پھرتے ہیں[90] یہی ہے کہ قتل کر دیے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہتوں سے کاٹ دیے جائیں یا انہیں جلاوطن کر دیا جائے، یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے اور آخرت میں بھی ان کے لیے عذاب عظیم ہے[91]۔ مگر ہاں جو لوگ ان میں سے قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ توبہ کر لیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے[92]۔

قانون اور نظم کے لیے خطرہ

پچھلی آیت قرآنی میں یہ بات پڑھنے کے بعد ملک کے نظم و نسق کو پامال کرنا اور امن و سلام کو تباہ کرنا بہت بڑا سنگین جرم ہے قاری کا ذہن اس کا منتظر ہوتا ہے کہ یہ معلوم کرے کہ اس سنگین جرم کی سزا کیا ہے ؟ اس جرم کی سنگینی کا تقاضا یہ ہے کہ اس کی سزا بھی سنگین ہو قرآن ذہن میں اسی اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب اس آیت میں دے رہا ہے کہ کوئی شخص یا گروہ جرأت و جسارت، ڈھٹائی اور بے باکی کے ساتھ اس نظامِ حق و عدل کو درہم برہم کرنے کی کوشش کرے جو اسلام نے قائم کیا ہے اس طرح کی کوشش اگر بیرونی دشمنوں کی طرف سے ہو تو اس کے مقابلے کے لیے جنگ و جہاد کے احکام تفصیل کے ساتھ الگ بیان ہوتے ہیں۔ یہاں بیرونی دشمنوں کے بجائے اسلامی حکومت کے ان اندرونی دشمنوں کی سرکوبی کے لیے تعزیرات کا ضابطہ بیان ہو رہا ہے جو اسلامی حکومت کے شہری ہوتے ہوئے عام اس سے کہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم اس کے قانون اور نظم کو چیلنج کریں۔ قانون کی خلاف ورزی کی ایک صورت تو یہ ہے کہ کسی شخص سے کوئی جرم صادر ہو جائے۔ اس صورت میں اس کے ساتھ شریعت کے عام ضابطہ حدود و تعزیرات کے تحت کارروائی کی جائے گی۔ دوسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یا گروہ قانون کو اپنے ہاتھ میں لے لے، اپنے شر و فساد سے علاقے کے امن و امان اور نظم و نسق کو درہم برہم کر دے لوگ اس کے ہاتھوں اپنی جان و مال، عزت و آبرو کی طرف سے ہر وقت خطرے میں مبتلا رہیں۔ قتل، ڈکیتی، رہزنی، آتش زنی، لوٹ مار، اغوا، تخریب، اور اس نوع کے سنگین جرائم اسلامی حکومت کے لیے لا اینڈ آرڈر کا مسئلہ پیدا کر دیں ایسے حالات سے نمٹنے کے لیے عام ضابطہ حدود و تعزیرات کے بجائے اسلامی حکومت جو اقدامات کرے ان کی تفصیل ان آیات میں بیان کی گئی ہے۔ اسلامی نظام جب کسی ملک میں قائم ہو جائے تو اس کو خراب کرنے کی سعی کرنا قطع نظر اس سے کہ وہ چھوٹے پیمانہ پر ہو یا بڑے پیمانہ پر۔ قتل و غارت گری اور رہزنی و ڈکیتی کی حد تک ہو یا بڑے پیمانے پر پُرامن زندگی کو تباہ کرنے کی کوشش کرے اس کی سزا یہاں بتائی گئی ہے۔

۹۰۔ بلاشبہ ان لوگوں کی سزا جو اللہ اور اس کے رسُول سے جنگ کرتے ہیں اور ملک میں خرابی پھیلاتے پھرتے ہیں یہی ہے بدامنی کرنے سے اکثر مفسرین نے اس جگہ رہزنی اور ڈکیتی مراد لی ہے مگر الفاظ کو عموم پر رکھا جائے تو مضمون زیادہ وسیع ہو جاتا ہے۔ آیت کی جو شانِ نزول

احادیث صحیحہ میں بیان کی گئی ہے وہ بھی اسی کو متقضی ہے کہ الفاظ کو ان کے عموم پر رکھا جائے۔ اللہ اور اس کے رسول سے جنگ کرنا یا زمین میں فساد و بدامنی پھیلانا یہ دو لفظ ایسے ہیں جن میں کفار کے حملے، ارتداد کا فتنہ، رہزنی اور ڈکیتی، ناحق قتل و نہب مجرمانہ سازشیں اور مغویانہ پروپیگنڈے سب داخل ہو سکتے ہیں اور ان میں سے ہر جرم ایسا ہے جس کا ارتکاب کرنے والا ان چار سزاؤں میں سے جو آگے مذکور ہیں کسی نہ کسی سزا کا ضرور مستحق ٹھہرتا ہے [1]

جو زمین میں فساد برپا کرتے ہیں وہ ہی اللہ اور اس کے رسول سے لڑتے ہیں۔ ملک میں فساد پھیلانے کی شناعت کی سنگینی بتانے کے لیے یہ تعبیر اختیار کی گئی ہے اسی لیے محققین کے نزدیک دونوں فقروں کے درمیان حرف واو تفسیری ہے۔ اس لیے آیت میں دوسرا فقرہ یسعون فی الارض فسادا پہلے فقرے یحاربون اللہ و رسولہ کی تشریح و تفسیر ہے اور اس کی مراد بتا رہا ہے۔ یہاں اس سے مراد ڈاکو اور رہزن ہیں۔ علامہ آلوسی رقمطراز ہیں کہ اکثر مفسرین اور سارے فقہائے کے نزدیک آیت میں ڈاکو اور رہزن مراد ہیں۔ ابن کثیر فرماتے ہیں صحیح یہ ہے کہ یہ آیت اپنے عموم کے لحاظ سے مسلم اور غیر مسلم دونوں کے لیے ہے جو بھی ان صفات کا حامل ہو۔ امام رازی بھی حافظ ابن کثیر کے ہمنوا ہیں۔ الجصاص نے ایک قول یہ بھی لکھا ہے کہ آیت کا مصداق صرف مسلمان ڈاکو ہیں۔ مسلمان تو خیر مسلمان ہیں اسلامی مملکت غیر مسلم شہریوں کے جان و مال دونوں اللہ و رسول کے بخشے ہوئے حفظ و امن میں ہوتے ہیں۔ اگر کوئی ان پر حملہ کرتا ہے تو وہ بلاشبہ فساد فی الارض کا مرتکب ہوتا ہے اور یہی اللہ و رسول سے محاربہ ہے۔ گویا اس طرح اس آیت قرآنی میں ان فسادیوں کو محارب قرار دیا گیا ہے جو لوگوں کی راحت چھینتے اور فتنہ و فساد کے شعلے بھڑکاتے ہیں۔ اس کا حاصل یہ ہوا کہ بندگان خدا کا امن و امان جو لوگ غارت کرتے ہیں وہ دراصل اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول سے جنگ کرتے ہیں۔ سارے انسان اللہ کی "عیال" ہیں جس کی خبر خود رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے دی ہے ان میں جو ارعیال اللہ" کو فساد کر کے اذیت پہنچاتے اللہ کے ساتھ اس کے محارب ہونے میں شبہ ہی کیا ہو سکتا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول نے ان فتنوں سے منع فرمایا ہے اور اس کی قباحت بیان کی ہے۔ اس کے باوجود لوگ فتنہ پردازی کرتے ہوئے نہیں شرماتے۔ ان کو باغی کے سوا کیا کہا جا سکتا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فتنہ و فساد کے مختلف عنوان ہوتے ہیں۔ کبھی آدمی صرف ہنگامہ آرائی کرتا ہے جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر شخص بے انتہا پریشانی سے دوچار ہوتا ہے۔ کبھی یہ منظم سازش کے ذریعے ہوتا ہے خواہ یہ لوٹ مار کرنے والوں کی جماعت ہو یا رہزنوں کی پھر وہ اسلامی مملکت کے باغی ہوں یا انسانی امن و سلامتی کے دشمن ہوں۔ اللہ تعالیٰ ان میں سے کسی کو کبھی پسند نہیں کرتا اور نہ کسی کو عدالت تک پہنچنے پر معاف کرتا ہے خواہ وہ کوئی بھی ہو، امیر ہو یا فقیر، بادشاہ ہو یا گدا، وزیر ہو یا چپراسی، مسلم ہو یا غیر مسلم جرم ثابت ہو جانے یا اقرار کے بعد ہر ایک کی قرار واقعی سزا ہوتی ہے۔ ابن رشد رقمطراز ہیں :

> محارب خدا و رسول وہ ہے جس کا خون اس لڑائی سے پہلے محفوظ ہو اور وہ مسلمان اور اسلامی مملکت کا غیر مسلم شہری ہے۔

اس فتنہ و فساد کی گرم بازاری جس عنوان سے بھی کوئی کرے اور جہاں بھی کرے اسلام کی نگاہ میں وہ مجرم ہے۔ بدایۃ المجتہد میں ہے۔

> محاربہ یہ ہے کہ ہتھیار سونتے یا رہزنی کرے۔ اگر یہ معاملہ آبادی سے باہر ہو تو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ رہزنی اور بدامنی ہے اور اگر آبادی کے اندر ہو تو اس میں اختلاف ہے البتہ امام مالک فرماتے ہیں کہ آبادی کے اندر اور باہر دونوں برابر ہیں۔

اور فقہا نے تصریح کردی ہے کہ اس کا مصداق صرف وہ جماعت یا فرد ہے جو مسلح ہو کر عوام پر ڈاکہ ڈالے اور اسلامی حکومت کے قانون کو بزور بازو توڑنا چاہے عام انفرادی جرائم کرنے والے چور گرہ کٹ اس میں داخل نہیں ہیں۔

محاربین کی سزا

۹۱۔ یہ ہے کہ قتل کردیے جائیں یا سولی پر چڑھائے جائیں یا ان کے ہاتھ پاؤں مخالف جہتوں سے کاٹ دیے جائیں یا انہیں جلا وطن کر دیا جانے یہ ان کے لیے رسوائی ہے دنیا میں اور آخرت میں ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

ایسے مجرم پر دو حق ہیں ایک اللہ تعالیٰ کا دوسرا انسانوں کا۔ اللہ تعالیٰ کا اس لیے کہ اس نے اس کے قانون کی خلاف ورزی کی ہے اور اس کی حدود کو توڑا۔ اور انسانوں کا اس لیے کہ اس نے

انسان کے جان یا مال اور یا دونوں کو اذیت پہنچائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حق کا تقاضا ہے کہ اس پر شرعی حد قائم ہو اور انسانی حقوق کا مطالبہ ہے کہ اس سے بدلہ لیا جائے۔ زخم و قتل کا بھی اور مال و دولت کا بھی چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ،

جب کوئی رہزنی کرے اور بدامنی پھیلائے تو دیکھا جائے گا کہ اس نے قتل کا ارتکاب بھی کیا ہے اور مال بھی لیا ہے تو اس کا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹا جائے گا پھر قتل کیا جائے گا اور پھانسی پر چڑھایا جائے گا۔ اور اگر اس نے صرف قتل کیا ہے اور مال نہیں لیا ہے تو اسے قتل کیا جائے گا۔ اور اگر صرف مال چھینا ہے اور قتل نہیں کیا تو اس کا دایاں ہاتھ اور بایاں پیر کاٹا جائے گا اور اگر یہ صورت پیش آئی کہ اس نے نہ قتل کیا اور نہ مال لوٹا تو صرف قید کر دیا جائے گا۔ (احکام القرآن)

خلاصہ یہ ہے کہ صاحب قوت فسادیوں کی چار صورتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ وہ کسی سے از راہِ فساد لڑیں اور اسے مار ڈالیں اور اس کا مال بھی چھین لیں تو اس صورت میں ان کا دایاں ہاتھ اور بایاں پیر کاٹا جائے گا۔ پھر ان کو قتل کیا جائے پھانسی پر لٹکایا جائے گا تاکہ ان کی یہ سزا پوری قوم اور سارے ملک کے لیے سامانِ عبرت ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ فسادیوں اور ڈاکوؤں نے کسی مسلم یا ذمی سے لڑائی کی اور اسے قتل کر ڈالا۔ مگر مال نہ لیا تو ایسے فسادیوں کی سزا یہ ہے کہ ان کو قتل کر ڈالیں۔

تیسری صورت یہ ہے کہ مال لوٹ لیا مگر قتل نہیں کیا تو اس صورت میں ان کا دایاں ہاتھ کاٹ دیا جائے اور بایاں پیر بھی۔

چوتھی صورت یہ ہے کہ لڑائی اور فساد تو کیا مگر نہ مال گیا اور نہ جانی نقصان ہوا اس صورت میں ان کی سزا جلا وطنی ہے۔

مفسدین کو سزا لینے کے مسئلہ میں تو اتفاق ہے لیکن ائمہ کا تفصیل میں باہم اختلاف ہے اور منشاءِ اختلاف یہ ہے کہ سزا کے بیان میں حرف او آیا ہے۔ عربی زبان میں یہ لفظ دو معنے دیتا ہے تخییر اور تنویع۔ سعید بن المسیب، عطاء ابن ابی رباح، داؤد الحسن البصری، ضحاک، ابراہیم نخعی، مجاہد اور امام مالک اس کو تخییر کے لیے بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ عدالت کو اختیار ہے کہ رہزنوں کی قوت و شوکت اور جرائم کی شدت و خفت کے پیش نظر یہ چاروں سزائیں دے یا ان میں سے کوئی ایک دے اور امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام احمد اسے تنویع کے لیے بتاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ رہزنوں کے لیے

رہزنی کے مختلف حالات پر مختلف سزائیں مقرر ہیں. جس کی تفصیل آپ سن چکے ہیں. لیکن الجصاص نے امام ابوحنیفہ کی طرف نسبت کر کے اس صورت میں جب کہ رہزنوں نے قتل اور لوٹ دونوں کا ارتکاب کیا ہو یہ بھی لکھا ہے کہ :

> اگر رہزنی اور بدامنی پھیلانے والے قتل کا بھی ارتکاب کریں اور مال بھی لوٹ لیں تو اس صورت میں امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ عدالت کو چار طرح کے اختیارات ہیں ان میں سے جونسی صورت بھی اسے مناسب معلوم ہو عمل میں لائے ، دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ کر قتل کر ڈالے یا دایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں کاٹ کر پھانسی دے دے یا صرف پھانسی پر چڑھا دے یا صرف قتل کر دے اور ہاتھ پیر نہ کاٹے۔　　(احکام القرآن)

قرآن کے الفاظ بھی اس کے مؤید ہیں کہ حالات کی نوعیت اور بدامنی و قانون شکنی کے موجودہ اور متوقع اثرات کے لحاظ سے عدالت ان میں سے جو بھی اقدام کرے کر سکتی ہے ۔عربی زبان میں او کا استعمال اسی مفہوم کو ظاہر کرتا ہے اس لیے مجھے ان لوگوں کی رائے درست معلوم ہوتی ہے جو عدالت کو اختیار دیتے ہیں کہ قیام امن و قانون اور استیصال فتنہ کے نقطہ نظر سے ان میں سے جو بھی صورت اس کو مفید اور مؤثر معلوم ہو اسے اختیار کر سکتی ہے ۔

مختصر یہ ہے کہ ان فسادی مردم آزار اور رہزنوں کو ہر حال میں سزا دینے کی تفصیل میں اختلاف ہے سزا دینے میں نہیں. اس میں سب کا اتفاق ہے اور ہونا بھی چاہیے کہ یہ رہزنی کر کے شہری زندگی کا امن و سلام خراب کرتے ہیں بلاشبہ یہ کام اپنے مفاسد کے اعتبار سے چوری سے بڑھ کر ہے۔ صاحب البنایہ رقمطراز ہیں ۔

> یہ بڑا فتنہ اس لیے ہے کہ اس کا نقصان عام شہریوں کو پہنچتا ہے اس طرح کہ راستہ کا امن و امان ختم ہو جاتا ہے اور رہزنی شروع ہو جاتی ہے اور اس لیے بھی کہ اس کی سزا بہت سخت ہے اس میں ہاتھ پاؤں مخالف جانب سے کاٹے جاتے ہیں اور قتل و صلب کی سزا دی جاتی ہے ۔

محاربہ کی شرطیں

محاربہ اور رہزنی کے لیے یہ شرط ہے کہ ان فسادیوں کے پاس اتنی قوت اور ایسا دبدبہ ہو کہ مسافر اور دوسرے لوگ جن پر حملہ آور ہوتے ہیں مقابلہ کی تاب و طاقت نہ رکھتے ہوں خواہ یہ حملہ آور

حملہ میں ہتھیار استعمال کریں یا کوئی دوسرا آلہ خواہ دن میں ہو یا رات میں۔ اسی طرح آبادی میں ہو یا آبادی سے باہر پھر یہ حملہ اور ایک ہو یا بہت ہوں ہر حال میں یہ رہزن ہیں اور ان کی سزا آیت بالا کے مطابق ہوگی درمختار میں ہے :

رہزنی جو بھی کرے سرقہ کبری ہے اگرچہ رات میں آبادی کے اندر ہو اور اسی پر فتوی ہے ۔

علامہ ابن عابدین الشامی لکھتے ہیں :

مذکورہ من کے ساتھ تعبیر اس لیے کیا ہے کہ رہزنی کا جماعت کی صورت میں ہونا شرط نہیں ہے بلکہ اگر ایک شخص بھی یہ کام کرے گا جس کے پاس طاقت وقوت ہوتو اس پر بھی یہی حکم ہوگا ۔

پھر یہ فساد کرنے والے اور امن وامان کے دشمن مرد ہوں یا عورتیں ، غلام ہوں یا آزاد سب کو سزا ہوگی کسی کو معاف نہ کیا جائے گا۔

رات میں اگر یہ ڈرائیں اور لوٹ مار کریں تو اس وقت ہتھیار کی شرط نہیں ہے البتہ دن میں اس کارروائی کے لیے ہتھیار کا ہونا ضروری ہے ۔ علامہ شامی لکھتے ہیں :

رات میں آبادی کے اندر کا مطلب یہ ہے کہ وہ مسلح ہوں یا نہ ہوں، دونوں حالتوں میں ڈاکو کا حکم رکھتے ہیں ۔ اور ایسا ہی وہ دن میں بھی رہزن کا حکم رکھتے ہیں مگر شرط یہ ہے کہ وہ مسلح ہوں امام ابویوسف سے بھی روایت ہے جس پر مشائخ نے فتویٰ دیا ہے تاکہ مفسدین کا شر دور ہو سکے ۔

جلاوطنی کا مفہوم

نفی کے معنے ہیں جلاوطن کردینا ۔ مگر جلاوطنی ایسی ہو کہ فسادی اپنی سزا بھی پالیں اور دوسرے لوگ اس کی اذیت رسانی سے محفوظ بھی ہو جائیں ۔ اگر ایک شہر سے دوسرے شہر میں جلاوطن کردیا گیا تو کچھ دنوں ممکن ہے کہ اجنبیت کی وجہ سے کچھ نہ کرے لیکن کچھ دنوں کے بعد پھر پوری ڈھٹائی سے وہ شب خون مارنے لگا تو یہ کوئی سزا نہیں ہے کیونکہ نہ پبلک اس کی اذیت کوشیوں سے محفوظ ہوتی اور نہ اس پر پابندی عائد ہوتی ہے ۔ دوسری صورت یہ ممکن ہے کہ ملک بدر کردیا جائے لیکن یہ اس لیے درست نہیں ہے کہ وہ دارالحرب کا رخ کرے گا اور دار کفر میں ایسے

شخص کے متعلق اس کے سوا اور کیا توقع ہو سکتی ہے کہ وہ ایمان واسلام سے ہی ہاتھ دھو بیٹھے اس لیے یہ بھی درست نہیں ہے۔ چونکہ یہ جرم اس کا پہلا جرم ہے اس لیے قتل بھی جائز نہیں لہٰذا یہاں جلاوطنی یہی ہے کہ اسے جیل روانہ کر دیا جائے کہ عوام سے اس کا رشتہ باقی نہ رہے اور پوری آبادی سے جلاوطنی کی زندگی گزارے۔ محققین علماء کی یہی رائے ہے۔ قرآن نے او ینفوا من الارض کی تعبیر اختیار کی ہے اس کی صورت اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتی کہ جیل میں ڈال دیا جائے اور یا ملک سے مجرمین کا انڈیمان کے طرز پر علاقہ بنایا جائے اور وہاں روانہ کر دیا جائے۔ کیونکہ منشایہ ہے کہ اسے سزا بھی ملے اور اس کے شر سے شہری زندگی محفوظ بھی ہو جائے۔ بلاشبہ قید میں ڈالنا ہی ایسی صورت ہے کہ اس کی سزا بھی ہو جائے گی اور اس کے شر سے شہری محفوظ بھی ہو جائیں گے ابوبکر الجصاص نے پوری بحث کے بعد لکھا ہے۔

پس یہ بات ثابت ہو گئی کہ نفی کے معنے یہ ہیں کہ اسے تمام آبادی سے جلاوطن کر دیا جائے سوائے جیل کے جہاں اس کے لیے فتنہ وفساد ممکن ہی نہیں ہے۔ اس کا اور کوئی محل نہیں ہے۔

قتل ورہزنی سے پہلے گرفتاری

اسلام مفسدین کا دشمن ہے جب تک وہ اپنے اعمال بد سے تائب نہ ہو جائیں۔ وہ ایک لمحہ کے لیے بھی ایسے افراد کو معاف نہیں کرتا ہے۔ چنانچہ اگر یہ فتنہ بردار اور مردم آزار افراد لوٹ مار قتل خونریزی سے پہلے گرفتار ہو جائیں۔ پھر بھی سزا کے بعد جیل میں بند کر دیے جائیں اور اس وقت تک بند رکھے جائیں گے جب تک توبہ نہ کر لیں۔

> اگر مال وغیرہ لیتے اور قتل کے ارتکاب سے پہلے وہ گرفتار کر لیے جائیں تو سزا کے بعد ان کو جیل خانہ میں بند کر دیا جائے اور قرآن میں نفی کا یہی مطلب ہے اور یہ اس وقت تک بند رہیں گے جب تک توبہ نہ کر لیں۔ اور اس توبہ کے لیے نیکوکاروں کے آثار کا ظاہر ہونا ضروری ہے۔

سزا اجتماعی حیثیت سے دی جائے گی

اس طرح کے حالات میں سزا بھی انفرادی حیثیت سے نہیں بلکہ گروہی حیثیت سے دی جائے گی اگر قتل، اغواء، لوٹ مار، آتش زنی کے واقعات پیش آئے ہیں تو یہ جستجو نہیں کی جائے گی کہ متعین

طور پر ان جرائم کا ارتکاب کن ہاتھوں سے ہوا ہے بلکہ ان کی ذمہ داری تمام رہزن گروہ کا ہر فرد شریک سمجھا جائے گا اور اسی حیثیت سے اس کے ساتھ معاملہ کیا جائے گا اس لیے کہ ہر جرم کے ارتکاب میں سب نے مجموعی اثر سے کام لیا ہے۔ صاحب الہدایہ رقمطراز ہیں۔

ان ڈاکوؤں میں سے ارتکاب جرم خواہ ایک نے کیا ہو مگر حد تمام پر جاری ہوگی یہی امام مالک اور امام احمد کی رائے ہے کیونکہ یہ رہزنی کی سزا ہے یہ قصاص نہیں ہے بلکہ حد ہے اس میں مساوات معتبر نہ ہوگی لہٰذا تمام ہی مجرم یکساں برابر ہوں گے۔

جب سارے کے سارے اس گروپ میں شریک ہیں تو قاعدہ کے مطابق سب ہی مجرم ہیں۔ یہ تو ہوتا ہی ہے کہ کوئی قتل کرتا ہے کوئی دوسرا کام جماعت میں تقسیم کار ہوتا ہے۔ در مختار میں ہے،

اگر جماعت میں سے کسی سے بھی مال چھیننے، قتل کرنے اور ڈرانے کا مظاہرہ ہو جاتے تو سب پر احکام مذکورہ جاری ہوں گے۔

حافظ ابن تیمیہ نے تصریح کی ہے کہ اگر وہ سینکڑوں کی تعداد میں ہوں گے پھر بھی سب کے سب قتل کیے جائیں گے کیونکہ خلفاء راشدین سے یہی ثابت ہے۔

هذا هو المأثور عن الخلفاء الراشدين

(السیاسۃ الشرعیہ)

عکل اور عرینہ والوں کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بیت المال کے اونٹوں کو ہنکالے جانے اور ان کے چرواہوں کو قتل کرنے کی پاداش میں جو عبرت انگیز سزا دی تھی، امام بخاری نے اس کو اسی آیت کے تحت درج کیا ہے۔ بنو نضیر، بنو قریظہ، بنو قینقاع کے ساتھ جو معاملہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا وہ بھی اسی حکم الٰہی کے تحت کیا۔ سیدنا ابو بکر نے مانعین زکوٰۃ کی جو سرکوبی کی وہ بھی ہمارے نزدیک اسی حکم کے تحت ہوئی۔ حضرت عمر نے یہود کو جزیرہ عرب سے آخری بار نکالا وہ بھی اسی حکم خداوندی کی تعمیل تھی۔

حافظ ابن تیمیہ نے حضرت فاروق اعظم کا یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ انہوں نے رہزنوں کی جماعت کے اس شخص کو بھی قتل کر ڈالا جو اونچی جگہ بیٹھ کر راہ گیروں کو دیکھا کرتا تھا کہ کون شخص کدھر سے آرہا ہے اور ادھر ڈاکو لوٹ مار میں مشغول تھے۔

حد اور قصاص میں فرق

ایک صورت یہ ہے کہ قتل کیا لیکن مال نہیں چھینا تو اس صورت میں یہ مجرم حد میں قتل کیا جائے گا

ذکر قصاص میں۔ حد اور قصاص میں فرق یہ ہے کہ قصاص ولی مقتول معاف کر سکتا ہے لیکن حد کو کوئی بھی معاف نہیں کر سکتا۔ لہٰذا اس کے قتل کو نہ کوئی معاف کر سکتا ہے اور نہ روک سکتا ہے کیونکہ یہ خالص اللہ کا حق ہے۔ جب مجرم کا قتل اس بنیاد پر ہو کر اس نے اللہ کے حکم کی خلاف ورزی کی ہے اور قانون شکنی کا مرتکب بنا ہے لہٰذا اس حد میں ان شرائط کی رعایت نہ ہوگی جو قصاص کے سلسلے میں بیان کیے گئے ہیں بلکہ محارب ہونے کی حیثیت سے اسے قتل کیا جائے گا اور اس کے اعوان و انصار کو بھی، قتل کا ہونا کافی ہے یہ نہیں دیکھا جائے گا کہ کس چیز سے مارا ہے۔ علامہ شامی لکھتے ہیں :

> عدم شرط کا خلاصہ یہ ہے کہ قاتل اور معین مددگار سب قتل کیے جائیں گے خواہ تلوار سے مارا ہو یا پتھر اور لاٹھی سے۔

رہزنوں کی نماز جنازہ نہیں ہے

آخر میں فرمایا ہے ذٰلک لھم خزی فی الدنیا یہ ان کے لیے دنیا میں رسوائی ہے یہ اس شبہ کا ازالہ ہے جو مذکورہ بالا سزاؤں سے متعلق ان لوگوں کے ذہن میں پیدا ہو سکتا ہے جو اللہ و رسول کو چیلنج کرنے کے جرم کی سنگینی کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے بتایا ہے کہ دنیا میں ان کی یہ رسوائی دوسروں کے لیے عبرت و بصیرت کا ذریعہ ہوگی اور اس کے اثر سے ان لوگوں کے اندر بھی قانون کا ڈر اور احترام ہوگا جو یہ صلاحیت نہیں رکھتے کہ مجرد قانون کی افادیت و عظمت کی بنا پر اس کا احترام کریں۔

یہیں سے فقہائے نے یہ بات بھی لکھی ہے کہ اس امن و امان کے دشمن کو نہ غسل دیا جائے اور نہ اس کی نماز جنازہ پڑھی جائے البتہ دفن کر دیا جائے گا۔ در مختار کے باب الجنائز میں ہے :

> نماز جنازہ چار شخصوں کے علاوہ اور تمام مسلمانوں کی فرض ہے۔ ان چار میں باغی اور ڈاکو بھی ہیں ان کو غسل نہ دیا جائے گا اور نہ ان کی نماز جنازہ پڑھی جائے گی۔

ایسا برتاؤ اس وجہ سے کیا گیا کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی کی اور امن و راحت جیسی قیمتی دولت برباد کرنے کی سعی کی اس لیے یہ اس سزا کا مستحق قرار پایا کہ اس کی توہین و تذلیل ہر پہلو سے ہو تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ جو لوگ خدا و رسول کے مقابلہ میں جرأت و جسارت کا اظہار کریں اور بغاوت کا اعلان کریں وہ مستحق ہیں کہ دنیا میں رسوا ہوں۔

حقوق اللہ و حقوق العباد

یہ یاد رہے کہ اگر حق اللہ اور حق العبد دونوں جمع ہو جائیں مثلاً شرپسندوں نے مال چھین لیا اور لے زخمی بھی کر دیا تو اس صورت میں حق اللہ پر عمل کرتے ہوئے حق العبد کو نظر انداز کر دیا جائے گا کیونکہ جب حد جاری ہو چکی تو عصمت نفس ختم ہو سکتی ہے۔ حد اور قصاص دونوں جمع نہیں ہو سکتے۔

گرفتاری سے پہلے توبہ

۹۲ - مگر ہاں جو لوگ ان میں سے قبل اس کے کہ تم ان پر قابو پاؤ توبہ کر لیں تو جان لو کہ اللہ بخشنے والا رحمت رکھنے والا ہے۔ یعنی مذکورہ بالا سزائیں جو حدود اور حق اللہ کے طور پر ہیں وہ گرفتاری سے قبل توبہ کرنے سے معاف ہو جاتی ہیں۔ حقوق العباد معاف نہ ہوں گے۔ مثلاً اگر کسی کا مال لیا تھا تو ضمان دینا ہوگا۔ قتل کیا تھا تو قصاص لیا جائے گا ہاں ان چیزوں [illegible] معاف کرنے کا حق صاحب مال اور ولی مقتول کو ہے۔ اس حد کے سوا باقی حدود مثلاً حد زنا، حد شرب خمر، حد سرقہ اور حد قذف توبہ سے مطلق ساقط نہیں ہوتی ہے ۱؎

مطلب یہ ہے کہ یہ خاص اختیارات صرف ان کے خلاف استعمال کیے جائیں گے جو حکومت کے حالات پر قابو پانے سے پہلے تک اپنی بغاوت پر اڑے رہے ہوں اور حکومت نے اپنی طاقت سے ان کو مغلوب و مقہور کیا ہو جو لوگ حکومت کے ایکشن سے پہلے ہی توبہ کر لیں ان کے خلاف ان کے پہلے رویہ کی بنا پر کوئی ایکشن نہ لیا جائے گا۔

مولانا تھانوی فرماتے ہیں کہ اوپر جو سزا مذکور ہوئی وہ حد اور حق اللہ کے طور پر ہے جو کہ بندہ کے معاف کرنے سے معاف نہیں ہوتی۔ قصاص اور حق العبد کے طور پر نہیں کہ بندہ کے معاف کرنے سے معاف ہو جاتا ہے لہٰذا جب گرفتاری سے پہلے ان لوگوں کا تائب ہونا ثابت ہو جائے تو حد ساقط ہو جائے گی۔ البتہ حق العبد باقی رہے گا۔ اگر کسی نے مال لیا ہوگا تو اس کا ضمان دینا پڑے گا اور قتل کیا ہوگا تو اس کا قصاص لیا جائے گا لیکن اس میں قصاص و ضمان معاف کرنے کا حق صاحب مال اور ولی مقتول کو ہوگا۔

۱؎ افادات شیخ الاسلام

آپ نے دیکھ لیا ہے کہ یہاں حق اللہ تو معاف ہوگیا لیکن حق العبد مجرمین سے چمٹا رہا۔ اللہ تعالیٰ نے ظاہر حال پر رحم فرمایا لیکن حقوق العباد سے بری قرار نہیں دیا۔ ابوبکر الجصاص فرماتے ہیں۔

> جب وہ حد ساقط ہو جائے گی جو قرآن کی آیت میں مذکور ہے تو انسانی حقوق واجب ہو جائیں گے جیسے قتل کرنا، زخمی کرنا، مال کا تاوان اور جب حد واجب ہوگی تو انسانی حقوق ختم ہو جائیں [illegible] مالی حق ہو یا جانی۔

قانون کی سختی اور سنگینی

لکھا ہے کہ اسلامی سزاؤں کی اس سختی پر کچھ وہ لوگ چیں بجبیں ہوں جو اللہ و رسول کو چیلنج کرنے کے جرم کی سنگینی کا صحیح اندازہ نہیں کر سکتے۔ اس کائنات میں حقیقی عزت اللہ اور رسول کے لیے ہے وللّٰہ العزۃ ولرسولہ۔ اس وجہ سے جو لوگ اللہ اور اس کے رسول کے مقابلے کی جسارت کرتے ہیں وہ اسی سنگین سزا کے مستحق ہیں۔ ساری قیاسی اور عقلی بحثوں کو چھوڑ کر صرف عملی اور تجرباتی حیثیت سے دیکھ لیا جائے کہ جن ملکوں میں لیپنے ہاں قانون کو نرم سے نرم کر کے سزائیں ہلکی کر دی ہیں ان کے ہاں جرائم اور بدامنی کا کیا حال ہے؟ اور ان قوموں میں زندگی کا دعا کیا ہے جہاں اب تک اسلامی تعزیرات و حدود کا نفاذ ہے۔ امریکہ برطانیہ فرانس اور دوسرے ممالک کا ریکارڈ جرائم کے لحاظ سے، چوروں ڈاکوں، قتل و غارت کے لحاظ سے کیا ہے اور نجد و حجاز اور کویت کا کیا ہے۔ بدنام زمانہ ٹریپ ٹیکسوٹ۔ کتنے دخول میں عرب کے بدو تھے لیکن اب روز روشن میں ان کو مہذب دنیا کے ڈاکوؤں سے کیا نسبت ہے۔ یہ خوش اعتقادی نہیں بلکہ واقعات ہیں۔ عقلی بات بھی یہی ہے کہ معاش معیشت اور معاشرت کا جو بہترین نظام اسلام نے دنیا کے سامنے پیش کیا ہے اور فرد و اجتماع دونوں کے لیے فراغ خاطری اور آسائش و سہولت کے جتنے مواقع بہم پہنچائے ان کے بعد بھی جو ظالم اللہ کی ان نعمتوں کی شدید ناشکری کر کے امن عامہ پر ڈاکے ڈالتا ہے اور اللہ کے بندوں کی جان و مال ہڑپ لینا چاہتا ہے ایسا خبیث الفطرت ایسی سخت سزا کا مستحق ہے۔

موجودہ زمانے میں جرم اور مجرمین کے لیے فلسفہ کے نام سے جو بیہودہ اور رحمدلانہ نظریات پیدا ہو گئے ہیں یہ انہی کا نتیجہ ہے کہ انسان بظاہر جتنا بھی ترقی کرتا جاتا ہے دنیا اتنی جہنم بنتی جا رہی ہے۔ اسلام اس قسم کے جاہل نظریات کی حوصلہ افزائی نہیں کرتا اس کا قانون ہوائی نظریات پر نہیں بلکہ انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔

حدود زواجر ہیں کوافر نہیں

قانونی نقطۂ نظر سے یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اسلام میں حدود کی حیثیت کیا ہے کیا ان کا مقصد جرائم پیشہ لوگوں کے جرائم پر پردہ ڈالنا ہے یا ان کی حیثیت معاشرے کو جرائم سے محفوظ رکھنا ہے۔ اگر ان کی حیثیت پہلی ہے تو پھر یہ کوافر ہیں اور اس کا مطلب یہ ہے کہ جس فرد کو یہاں اپنے جرم کے نتیجہ میں قرآنی سزا مل چکی ہے وہ پاک و صاف ہو گیا ہے اور آخرت میں اس سے کوئی باز پرس نہ ہوگی یعنی یہ سزا اس کے سابقہ گناہوں کے لیے پردے کا کام دے گی۔ اگرچہ اسلامی قانون کے بعض مدارس کا میلان بھی ہے لیکن ہمیں یہاں قرآن کی یہ آیت ان لوگوں کی مؤید بن کر نظر آتی ہے۔ جو کہتے ہیں کہ حدود کی حیثیت زواجر کی ہے یعنی ان کی مدد سے معاشرے کو برائیوں سے روکا جاتا ہے اس آیت میں دنیوی سزا بیان کر دینے کے بعد بتایا گیا ہے ولھم فی الاخرۃ عذاب عظیم۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ دنیوی سزا تکفیر سیئات کا کام نہیں کرتی ہے۔ لیکن کہنے والے یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ یہ محاربین کی خصوصیت ہے کہ ان کو دنیا و آخرت میں سزا ملے گی اور ان کی سزا ان کے گناہوں کا کفارہ نہیں ہوتی خواہ یہ مجرم مسلمان ہی کیوں نہ ہوں۔ السیوطی نے ابن الفرس کے حوالے سے لکھا ہے کہ یہ آیت بتاتی ہے کہ محاربین کی سزا ان کے لیے کفارہ نہیں ہوتی ہے جبکہ دوسری حدود کفارہ ہو جاتی ہیں۔ عارف شعرانی نے المیزان میں شیخ الاسلام زکریا سے سنا ہے، کہ محاربین کے سوا دنیا و آخرت میں عذاب کسی کے لیے نہیں ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَابْتَغُوا إِلَيْهِ الْوَسِيلَةَ وَ
جَاهِدُوا فِي سَبِيلِهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ۞ إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا لَوْ
أَنَّ لَهُمْ مَا فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا وَمِثْلَهُ مَعَهُ لِيَفْتَدُوا بِهِ
مِنْ عَذَابِ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَا تُقُبِّلَ مِنْهُمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۞
يُرِيدُونَ أَنْ يَخْرُجُوا مِنَ النَّارِ وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنْهَا ۖ وَلَهُمْ
عَذَابٌ مُقِيمٌ ۞

اے پیروان دعوت ایمانی اللہ کی نافرمانی سے بچو اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو کہ تم کامیابی سے ہمدوش ہو جاؤ۔[۹۲] بلاشبہ جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے اگر ان کے قبضہ میں روئے زمین کی ساری دولت آ جائے اور اتنا ہی اور بھی پھر یہ سب کچھ روز قیامت عذاب سے بچنے کے لیے فدیہ دے دیں جب بھی ان سے قبول نہ کیا جائے

گا۔ ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔[۹۴] وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل بھاگیں لیکن اس سے باہر نہ آسکیں گے ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔[۹۵]

اسلام کی سب سے بڑی ذمہ داری

پہلی آیت میں تعزیری قانون بتایا گیا تھا، اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ تعزیری قوانین انسان کی حیات خارجی اور باطنی زندگی کی اصلاح نہیں کرتے۔ انسانی زندگی کے کسی شعبہ کو صرف تعزیرات سے درست نہیں کیا جا سکتا جب تک کہ خود انسان کا نفس بھلائی کی طرف مائل اور اعلیٰ اخلاقی اصولوں کی روشنی سے منور نہ ہو جائے۔ تعزیری قوانین بیکار ہیں جب تک کہ افراد اور نظام دونوں کی اصلاح ساتھ ساتھ نہ ہو۔ وہ نظام کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا جو محض تعزیری قوانین کی مدد سے تمدن کے جملہ مسائل و مشکلات کا حل دریافت کرنا چاہتا ہو۔ اسلام کا مقصد انسان کی تکمیل ذات اور تسخیر نفس ہے اور تعزیری قوانین اس مقصد کی تکمیل کا ایک ذریعہ ہیں۔ وہ خارجی زندگی اور باطنی زندگی کے مختلف شعبوں کے لیے بھی اپنا ایک اصلاحی نظام رکھتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ افراد کی تکمیل ذات اور ان کی شخصیتوں کے نشوونما کا مناسب انتظام کرے کیونکہ نظامات درست نہیں ہو سکتے جب تک افراد درست نہ ہو جائیں۔ زندگی میں تعزیری قوانین اس وقت تک بیکار ہوں گے جب تک پاکیزہ شخصیت اور عمدہ سیرت کے نشوونما کا سامان نہ ہو۔ بہتر سے بہتر تقریری ڈھانچہ بھی برے نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ اگر اس نظام کو چلانے والے افراد نیک نیت، ایماندار، مجاہد، قرب الٰہی کے متلاشی، زندگی میں پھونک پھونک کر قدم رکھنے والے نہ ہوں یا بحیثیت مجموعی ان اخلاقی صفات سے عاری ہوں جن کے بغیر اسلامی نظام کا قیام غیر ممکن ہے۔

اسلام اپنے ماننے والوں سے صرف خدا کی ذات و صفات کے اقرار کا مطالبہ نہیں کرتا ہے بلکہ انہیں دنیا کی اجتماعی صلاح و فلاح کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور ان سے تقاضا کرتا ہے کہ اپنی اس ذمہ داری

عہدہ برآہ ہونے کے لیے ہیئت اجتماعی میں وہ تبدیلیاں عمل میں لائیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ وہ اپنے اقرار میں سچے ہیں۔ اسلام صرف طرزِ فکر نہیں بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک راہِ عمل ہے جس کے مطابق انسان اپنے گردو پیش اور اپنے اجتماعی ماحول کو بدلتا ہے۔ تبدیلی کی اسی کوشش کا نام جہاد ہے اور جہاد اسلامی زندگی کا اصل الاصول اور ایمان و عمل کا حقیقی جوہر ہے۔ اگر فریضہ جہاد کو اسلامی زندگی سے خارج کر دیا جائے تو پھر اسلام بھی کائنات کا ایک بے جان فلسفہ رہ جاتا ہے اسی لیے قرآن نے اہل ایمان کو حکم دیا ہے کہ زندگی کی ہر شاخ میں خدا کی نافرمانی سے بچو اور طاعات و اعمال صالحہ اور اخلاقِ حسنہ کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرو اور اس کے ساتھ راہِ خدا میں خوب محنت کرو، جانیں کھپاؤ، اوقات لگاؤ، اموال خرچ کرو اگر تم نے یہ کام کر لیے تو فلاح یقینی ہے۔

۹۳۔ اے پیروانِ دعوتِ ایمانی اللہ کی نافرمانی سے بچو اور اس تک پہنچنے کا ذریعہ تلاش کرو اور اس کی راہ میں جدوجہد کرو تاکہ تم کامیابی سے ہمکنار ہو جاؤ۔ وسیلہ کی تفسیر ابن عباس، مجاہد، ابووائل، حسن وغیرہم اکابر سلف نے قرب سے کی ہے تو وسیلہ ڈھونڈھنے کے معنے یہ ہوں گے کہ اس کا قرب و وصول تلاش کرو، قتادہ نے کہا ای تقربوا الیہ بالطاعۃ والعمل بما یرضیہ یعنی خدا کی رضا حاصل کرو، اس کی فرمانبرداری اور پسندیدہ عمل کے ذریعے سے ایک شاعر کہتا ہے:

اذا غفل الواشون عُدنا لوصلنا

وعاد التصافی بیننا والوسائل

اس میں بھی معنے قرب و اتصال کے مراد ہیں اور وہ جو حدیث میں آیا ہے کہ وسیلہ جنت میں ایک اعلیٰ منزل ہے جو دنیا میں سے کسی ایک بندے کو ملے گی۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ تم اذان کے بعد میرے لیے خدا سے وہی مقام طلب کیا کرو۔ تو اس مقام کا نام بھی وسیلہ اسی لیے رکھا گیا ہے کہ جنت کی تمام منزلوں میں وہ سب سے زیادہ عرش رحمان کے قریب ہے اور حق تعالیٰ کے مقاماتِ قرب میں سب سے بلند واقع ہوا ہے۔ بہرحال پہلے فرمایا کہ ڈرتے رہو اللہ سے لیکن یہ ڈر ایسا نہیں جیسے آدمی سانپ اور بچھو سے ڈرتا ہے اور شیر بھیڑیے سے ڈر کر بھاگتا ہے اس بات سے ڈرنا کہ کہیں اس کی خوشنودی اور رحمت سے دور نہ جا پڑو۔ اسی لیے اتقوا اللہ کے بعد وابتغوا الیہ الوسیلۃ فرمایا یعنی اس کی ناخوشی اور بعد و ہجر سے ڈر کر قرب و وصول حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ ظاہر ہے کسی چیز سے ہم قریب اسی وقت ہو سکتے ہیں جب کہ درمیانی راستہ قطع کر لیں جس پر چل کر اس کے پاس پہنچ سکتے ہوں اسی کو فرمایا وجاھدوا فی سبیلہ

جہاد کرو اس کی راہ میں یعنی اس پر چلنے کی پوری پوری کوشش کرو لعلکم تفلحون تاکہ تم اس کی نزدیکی حاصل کرنے میں کامیاب ہو سکو پچھلے رکوع کے آخر میں ان لوگوں کی دنیوی اور اخروی سزا بیان کی تھی جو خدا اور رسول سے جنگ کرتے اور ملک میں بدامنی اور فساد پھیلاتے ہیں۔ اس رکوع میں مسلمانوں کو ان سزاؤں سے ڈرا کر بتلایا گیا کہ جب شقی اور بدبخت لوگ خدا و رسول سے جنگ کریں تو تم خدا اور رسول کی طرف ہو کر جہاد کرو وہ اگر زمین میں فساد پھیلاتے ہیں تو تم اپنی کوشش اور حسن عمل سے امن و سکون قائم کرنے کی فکر کرو۔[1]

ہماری رائے میں یہاں چونکہ اہل ایمان مخاطب ہیں اس لیے اتقاء کے معنے صرف ڈرنے کے نہیں بلکہ خدا کی نافرمانی سے دامن بچانے کے ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے بھی اسی کو اپنایا ہے۔ فرماتے ہیں کہ تقویٰ جب طاعت کے ساتھ آتا ہے تو اس سے مراد محرمات سے بچنا اور منہیات کو چھوڑنا ہوتا ہے۔ علامہ آلوسی نے بھی روح المعانی میں یہی لکھا ہے۔

اللہ نے اہل ایمان کو اپنے اعمال میں متقی بن کر رہنے کا حکم دیا ہے

حضرت عمر نے ابی بن کعب سے پوچھا تھا کہ تقویٰ کی حقیقت کیا ہے انہوں نے کہا کہ اما سلکت طریقا ذا شوک؟ تم کبھی ایسے راستہ میں نہیں چلے جس میں کانٹے ہوں فرمایا ہاں چلا ہوں بولے کہ فاعملت اس حالت میں تم نے کیا کیا، فرمایا حضرت واجتهدت میں نے کوشش کی کہ دامن سمیٹ کر نکل جاؤں کہا فذالک التقوی بس یہی تقویٰ ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ جہاں چپہ چپہ پر خدا کی نافرمانیوں کے کانٹے بکھرے ہوں ان سے بچنا اور ہٹ جانا ہی تقویٰ ہے۔ گویا تقویٰ نام ہے محرمات ومنہیات اور رذائل سے دامن کو بچا کر رکھنے کا،

اس آیت میں فلاح اور کامیابی کی راہ یہ بتائی گئی ہے کہ ایمان رکھتے ہوئے اگر

۱۔ تمہارا دامان ایمان رذائل سے پاک ہو،

۲۔ فضائل اعمال و اخلاق کی متاع تمہارے دامن میں ہو۔

اور ان دونوں کو رکھتے ہوئے اللہ کی راہ میں تمہاری محنتیں اور کوششیں لگ رہی ہوں تو پھر دین و دنیا میں فلاح و کامیابی کی تمہیں اُمید رکھنی چاہیئے اور اگر یہ نہیں تو پھر بنی اسرائیل کی طرح اس خوش فہمی میں نہ رہنا چاہیے کہ ہمارے پاس نسبی شرافت ہے اور ہم پیغمبر زادے ہیں کہ

[1] افادات شیخ الاسلام

اندریں راہ فلاں بن فلاں چیزے نیست

ان چاروں میں ترتیب طبعی ہے پہلے فکر صحیح یعنی ایمان پھر رذائل سے بچنا، پھر لفضائل کا اثاثہ فراہم کرنا اور ان کے ساتھ محنت اور تگ و دو کرنا، کامیابی کی ساری عمارت ان ہی چار سے بنتی ہے۔

وابتغوا الیہ الوسیلۃ میں اعمال صالحہ، اخلاق حسنہ اور احوال صادقہ فراہم کرنے کی ہدایت فرمائی ہے۔

وسیلہ کے لغوی معنے

امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ وسیلہ نام ہے رغبت اور چاہت کے ساتھ کسی چیز کی طرف پہنچنے کا، اگر رغبت کے بغیر پہنچتا ہے تو پھر وسیلہ نہیں بلکہ وصیلہ ہے۔ یہ لفظ قربت کی طرح ہے۔ اور لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے کہ وسیلہ مرتبہ درجہ اور قربت کا نام ہے وتسل فلان الی اللہ وسیلہ کے معنے ہیں ایسا عمل کیا جس سے اللہ کا قرب حاصل ہوگیا۔ لبید شاعر کہتا ہے؛

ارى الناس لا يدرون ما قدر امرهم

بلى كل ذي راي الى الله واسل

شارحین قرآن نے بھی وسیلہ کے یہی معنے بتائے ہیں۔ حافظ ابن جریر لکھتے ہیں کہ وسیلہ بمعنے قربت ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں الوسیلۃ القربۃ مفسرین قرآن میں ابووائل، الحسن، مجاہد، قتادہ، عطاابن ابی رباح، ابن زید اور عبداللہ ابن کثیر نے بھی یہی معنے بتاتے ہیں۔ اللہ سے قربت کا بہترین ذریعہ احکام الٰہی کی تعمیل اور اعمال صالحہ ہیں۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ اعمال صالحہ کے ذریعے درجات میں اللہ کا قرب تلاش کرو اور اعمال صالحہ، اخلاق حسنہ کی فراہمی کا طریقہ صرف ایک ہے کہ نبوت کی راہ سے آئے ہوئے علم و عمل سے زندگی میں بھرپور وابستگی ہو۔ بہرحال وسیلہ کے معنے قرب کے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ زندگی میں نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل کے مطابق اعمال صالحہ کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرو اور فضائل پیدا کرو، الغرض وسیلہ کے معنے قرب کے ہیں اور فقرے کے معنے یہ ہیں کہ اللہ کا قرب تلاش کرو، وسیلے کے معنے ذریعہ کے نہیں ہیں جیسا کہ ہم اردو میں بولتے ہیں کہ فلاں کے وسیلہ سے مجھے کامیابی ہوگئی۔ لوگوں نے قرآن میں عربی کے وسیلہ کو اردو کا وسیلہ سمجھ کر اس کی نئے انداز میں تشریح کی ہے اور اس آیت گرامی کو بزرگوں سے استعانت اور استغاثہ کا سہارا بنا لیا ہے۔ آیت قرآنی کا منطوق تو اپنی

جگہ بے غبار ہے لیکن خود وسیلہ بمعنے ذریعہ کا اسلام میں کیا مقام ہے۔ وسیلہ بمعنے ذریعہ کے تین مطلب ہیں ایک یہ کہ کسی مخلوق سے مانگے اور دُعا و طلب گاری کے لیے اُس کے سامنے ہاتھ پھیلائے یہ بالاجماع حرام ہے اور اس موضوع پر اُمت میں دو رائیں نہیں ہو تی ہیں۔

دوسرے یہ کہ کسی شخص سے دُعا کی درخواست کرنا، یہ ایسے شخص کے حق میں جائز ہے جس سے دُعا کی درخواست ممکن ہو، میت میں یہ امکان چونکہ کسی دلیل سے ثابت نہیں ہے اس لیے میت سے یہ دعائی توسل جائز نہیں ہے۔ صحابہ کرام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دُعا کی درخواست کرتے تھے۔

تیسرے یہ کہ اللہ سے دُعا کرنا کہ اے اللہ اس مقبول بندے کے طفیل میرا یہ کام کر دے۔ جمہور کے نزدیک یہ جائز ہے لیکن حافظ ابن تیمیہ اسے ناجائز کہتے ہیں اور اس موضوع پر قاعدة جلیلة فی التوسل والوسیلہ کے نام سے ایک رسالہ بھی لکھا ہے لیکن اقسام، استعانت، استغاثہ اور توسل میں کوئی فرق نہیں کیا۔ جو لوگ جائز کہتے ہیں ان کا موقف یہ ہے کہ توسل میں کسی مخلوق سے کچھ نہیں مانگا جاتا اور نہ مخلوق سے مدد لی جاتی ہے صرف اتنا کہا جاتا ہے کہ اے اللہ ہماری یہ دُعا فلاں نیک بندے کے طفیل قبول فرمالے اور یہ بھی یاد رہے کہ اختلاف صرف جواز میں ہے ورنہ دُعا میں اس انداز کے مسنون اور مستحب ہونے کا کوئی مدعی نہیں ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ جواز میں کوئی نقلی اور عقلی خرابی نہیں ہے۔ البتہ عوام کو دینی مصلحت اور انتظام شریعت کے لیے منع کیا جاتے تو ہم بھی حافظ ابن تیمیہ کے ساتھ ہیں لیکن گفتگو کا موضوع مسئلہ کی تحقیق ہے اور وہ جواز ہے

اچھا معلوم ہوتا ہے کہ مشہور محدث علامہ قاضی محمد بن علی الشوکانی کے رسالہ الدر النضید سے اس مسئلہ کی تحقیق نقل کر دیں، انہوں نے اس موضوع پر جو کچھ لکھا ہے وہ اچھا بھی ہے معتدل بھی ہے اور خالص علمی رنگ میں ہے۔ ان کے ایک دوست نے ان سے اس موضوع پر سوال کیا ہے اور انہوں نے اس کا جواب دیا ہے۔ اگرچہ جواب استعانت، استغاثہ، تشفع اور توسل کے ابحاث پر مشتمل ہے لیکن ہم ان کی توسل سے متعلق رائے نقل کرتے ہیں، فرماتے ہیں:

توسل کسی بندے کا اپنے پروردگار سے کوئی چیز طلب کرنے کیلئے کسی دوسرے بندے کو بطور وسیلہ استعمال کرنا، اس کے بارے میں شیخ عزالدین ابن عبدالسلام کی رائے یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں سوائے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی سے توسل کرنا جائز نہیں ہے بشرطیکہ وہ حدیث جواس پر دلالت کرتی ہے صحیح مان لی جائے اور غالباً ان کا مقصود وہ حدیث ہے جو نسائی

نے اپنی سنن میں اور ترمذی نے اپنی جامع میں بیان کی ہے اور اسے درست قرار دیا ہے اور ابن ماجہ وغیرہ نے بھی اسے روایت کیا ہے کہ

ایک نابینا حضور انور کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ میری بینائی جاتی رہی ہے میرے لیے اللہ سے دعا کیجئے، حضور نے اس سے فرمایا کہ وضو کر دو رکعت نماز پڑھ اور کہہ

اللهم انى اسئلك واتوجه اليك بنبيك محمد الى استشفع بك فى رد بصرى اللهم شفع النبى فى

اے اللہ میں آپ سے سوال کرتا ہوں اور آپ کی طرف متوجہ ہوتا ہوں آپ کے نبی محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ اور اے محمد میں آپ کی شفاعت چاہتا ہوں اپنی بینائی کے لوٹنے میں اے اللہ تو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو میرے حق میں میرا شفیع بنا دے۔

اور اس کے بعد اسی نابینا سے حضور نے فرمایا کہ اگر تیری کوئی حاجت ہو تو اسی طرح کر لے اللہ تعالیٰ نے اس کی بینائی لوٹا دی۔

اور توسل کے بارے میں دو رائیں ہیں۔

اوّل توسل وہی ہے جس کا ذکر حضرت عمر بن الخطاب سے صحیح بخاری میں ہے کہ اے پروردگار بارش نہ ہونے کے وقت ہم تیرے رسول کو تیری بارگاہ میں بارش کی دعا کے لیے لاتے تھے اور تو ہم پر باران رحمت نازل فرماتا تھا اب چونکہ وہ ہم میں نہیں ہیں اس لیے ان کے چچا عباس کو لاتے ہیں تو گویا حضرت عمر کا توسل بارش کے لیے دعا کرانا تھا یعنی اللہ کی بارگاہ میں حضرت عباس وسیلہ تھے یعنی حضرت عباس ان سب کے ساتھ مل کر دعا کرتے تھے اور حضرت عمر ہم ان کی معیت میں دعا کرتے تھے۔ یعنی دعا میں صرف شرکت ہی توسل تھی اور بس۔

دوسرا توسل یہ ہے کہ آپ کی زندگی میں اور آپ کی وفات کے بعد بھی اور آپ کی موجودگی میں اور آپ کی عدم موجودگی میں یکساں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے توسل ہو سکتا ہے اور یہ امر مخفی نہیں کہ حضور انور کی زندگی میں آپ سے توسل اور آپ کے بعد کسی دوسرے سے توسل صحابہ کے اجماع سکوتی سے ثابت ہے کیونکہ حضرت عمر نے جب حضرت عباس سے توسل کیا تو کسی نے آپ کو نہیں ٹوکا۔

میرے نزدیک شیخ عزالدین بن عبدالسلام کی رائے کہ آپ کے سوا کسی دوسرے سے توسل جائز نہیں ہے صحیح نہیں ہے اور اس کے وجوہ ہیں۔

۱۔ صحابہ کا اجماع جیسا کہ اوپر ذکر ہو چکا ہے شیخ کی رائے کے خلاف ہے

۲۔ اللہ کی بارگاہ میں اہل فضل و علم سے توسل کرنا فی الحقیقت ان کے اعمال صالحہ اور مزایائے فاضلہ کا توسل ہے کہ ہر بزرگ اعمال ہی کے باعث بزرگ ہوتا ہے لہٰذا جب کہنے والا کہتا ہے کہ اے اللہ میں فلاں عالم کو تیری بارگاہ میں وسیلہ بناتا ہوں تو وہ باعتبار اس کے علم کے ہوتا ہے۔ صحیحین اور دوسری کتب حدیث میں وارد ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے غار کے تین پناہ گزینوں کا ذکر فرمایا جن کے غار کے منہ پر پتھر آگیا تھا تو ان میں سے ہر ایک نے اپنے سب سے بڑے عمل سے توسل کیا تو خدائے ذوالجلال نے اسے قبول فرمایا اور پتھر کو غار کے منہ سے ہٹا دیا۔ لہٰذا اگر شیخ عزالدین بن عبدالسلام یا ان کے متبعین متشددین کا خیال صحیح اور اعمال صالحہ کا توسل شرک یا ناجائز ہو تو ان کی دعا کیوں قبول ہوتی اور وہ پتھر کیوں ہٹتا۔ اور حضور انور واقعہ بیان فرمانے کے بعد اس کا انکار کیوں نہ فرماتے۔

اللہ کی بارگاہ میں انبیاء و صلحاء کا توسل پر منکرین اعتراض کرتے ہیں کہ قرآن حکیم میں۔ ما نعبد هم الا لیقربونا الی اللہ زلفی۔ ہم ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ وہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔

اور فلا تدعوا مع اللہ احداً اللہ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔

اور لہ دعوۃ الحق والذین یدعون حقیقی پکار تو اللہ کے لیے ہے اور جن کو وہ اللہ کے من دونہ لا یستجیبون لہم بشیء سوا پکارتے ہیں وہ ان کی کسی چیز کو قبول نہیں کر سکتے

لیکن یہ اعتراضات اس قسم کے توسل پر وارد ہی نہیں ہوتے بلکہ وہ ایسے محل نزاع میں دلیل بن سکتے ہیں جو یہاں موجود نہیں کیونکہ پہلی آیت ما نعبدھم بتا رہی ہے کہ وہ حصول تقرب کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے اور معلوم ہے کہ عالم کے ساتھ توسل کرنے والا اس کی عبادت نہیں کرتا بلکہ یہ جانتا ہے کہ اسے فقط علم کی وجہ سے قربت حاصل ہے اسی لیے وہ اس سے توسل کرتا ہے اور اسی طرح فلا تدعوا مع اللہ احداً میں اللہ تعالیٰ نے اس بات کی ممانعت فرمائی ہے کہ اس کے ساتھ کسی کو پکارا جائے مثلاً یا اللہ اور یا فلاں اور عالم کے ساتھ توسل کرنے والا سوائے اللہ کے اور کسی کو نہیں پکارتا بلکہ اس سے توسل صرف اس لیے کرتا ہے کہ وہ صاحب عمل صالح ہے گویا عامل کی ذات سے نہیں بلکہ اس کے عمل صالح سے توسل کیا جاتا ہے جیسا کہ غار میں گرنے

والے تین آدمیوں نے کیا۔

اور ایسے ہی اللہ سبحانہ کا یہ ارشاد والذین یدعون من دونہ بتا رہا ہے کہ یہ کفار ان کو پکارتے تھے جو ان کا جواب نہیں دے سکتے تھے اور اپنے پروردگار کو نہیں پکارتے جو ان کا جواب دے سکتا ہے اور معلوم ہے کہ بزرگ اور عالم سے توسل کرنے والا سوائے اللہ کے کسی کو نہیں پکارتا، نہ وہ غیر اللہ کو پکارتا ہے اور نہ غیر اللہ سے دُعا کرتا ہے۔

اس تقریر سے مانعین توسل کی اور تمام دلیلیں بھی بیکار ہو جاتی ہیں مثلاً ان کا استدلال مندرجہ ذیل آیت سے

یوم لا تملک نفس لنفس شیئاً والامر یومئذ للہ۔

یہ آیت اس پر دلالت کرتی ہے کہ یوم الدین کا امر اللہ تعالیٰ کے لیے منفرد ہو جائے گا اور اس کے سوا کسی معاملے میں کسی کو کوئی قدرت نہیں اور انبیاؑ میں سے کسی نبی یا علماء میں سے کسی عالم کے ساتھ توسل کرنے والا بھی یہ اعتقاد نہیں رکھتا کہ اس کا وسیلہ اللہ تعالیٰ کا امر یوم الدین میں شریک ہے۔ کیونکہ جو شخص ایسا عقیدہ رکھے چاہے وہ انبیاؑ کے بارے میں یا دوسرے اشخاص کے بارے میں تو وہ نہایت سخت فاش گمراہی میں مبتلا ہے۔

اسی طرح ان کا استدلال منع توسل کے بارے میں لیس لک من الامر اور قل لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً سے بھی درست نہیں ہے کیونکہ یہ آیتیں یہ بتاتی ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو امر الٰہی میں کوئی دخل نہیں ہے لیکن ان سے آنحضرت سے توسل کرنے یا آپ کے سوا انبیاؑ اور اولیاؑ سے توسل کی ممانعت ثابت نہیں ہوتی ہے[1]

توسل کا انکار نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفاعت کا انکار ہے اور شفاعت کا انکار قرآن کا انکار ہے کیونکہ قرآن میں اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مقام محمود یعنی شفاعتِ عظمٰی کے اعزاز سے مشرف فرمایا ہے اور لوگوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ آپ کے لیے اللہ تعالیٰ سے اس شرف عظیم کی درخواست کریں اور اللہ تعالیٰ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمایا ہے کہ مقام محمود کی درخواست

---

[1] یہاں تک ترجمہ ہم نے الدر النضید فی اخلاص کلمۃ التوحید کے اس ترجمہ سے نقل کیا ہے جو مشہور اہلحدیث عالم مولانا محمد علی ایم اے کنٹب سوداگر حرم مکی نے کیا ہے اور جو لاہور سے ۱۹۲۳ء میں جمعیت تبلیغ دعوۃ اسلام نے شائع کیا ہے اس سے آگے وہ ترجمہ ہے جو العدل ۲۹ جون ۱۹۲۴ء میں شائع کیا ہے۔

کیا کردو آپ کردیا جائے گا اور اُمت کے حق میں آپ کی سفارش منظور کی جائے گی، ہاں شفاعت کا حق اللہ سبحانہٗ کی اجازت سے ہوگا پھر خاص اس کو جس کے لیے اللہ منظور فرمائیں۔

اسی طرح منکرین کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کو کہ انی لا اغنی عنک من اللہ شیئا میں تمہیں اللہ سے ہرگز نہیں بچا سکتا، پیش کرنا درست نہیں۔ اس لیے کہ یہ جواز توسل کے خلاف نہیں ہے کیونکہ اس کا تو صرف یہ مطلب ہے کہ جب کسی کو اللہ نفع یا نقصان پہنچانا چاہے تو میں اس کے خلاف نہیں کر سکتا اور یہ بات ہر مسلمان جانتا ہے۔ اس سے یہ کہاں ثابت ہوا کہ توسل ناجائز ہے کیونکہ متوسل کا یہ عقیدہ نہیں ہوتا کہ وسیلہ امر اللہ میں دخیل ہے بلکہ اس کا تو مطلب ہوتا ہے کہ اختیار کل صرف اللہ کو حاصل ہے اور میں اسی سے درخواست کرتا ہوں۔ ہاں پہلے ایسے شخص کے عمل کو پیش کرتا ہوں جو اللہ کے ہاں مقبول ہے اور بس تاکہ وہ اجابت دعا کا سبب یعنی وسیلہ بن جائے[1]

بہرحال اس پر تو جملہ اکابر علماء و محدثین اور فقہائے کرام کا اتفاق ہے کہ دعا میں توسل بالاعمال الصالحہ درست ہے جس کے استدلال میں صحیحین کی وہ روایت شاہد ہے جس میں تین آدمیوں کا ذکر ہے جو کسی پہاڑ کے غار میں پھنس گئے تھے اور اعمال صالحہ کا توسل کر کے اللہ تعالیٰ کے حضور دعا مانگی اور اس مصیبت سے رہائی پائی۔ یہ تو امر متفق ہے ہاں اس میں بعض حضرات کا اختلاف ہے کہ توسل کسی کی ذات کے ساتھ کرنا درست ہے یا نہیں۔ جمہور علماء محدثین اور فقہاء اس کے جواز کے قائل ہیں چنانچہ اگر کوئی شخص اپنی دعا میں یوں کہے کہ الٰہی بحرمۃ فلاں یا بوسیلہ یا بواسطہ یا بصدقہ یا بحق فلاں میرا یہ کام کر دے تو ایسا کرنے میں کوئی خرابی نہیں یہ جائز اور مباح ہے۔ دعا کا اصل قاعدہ تو یہ ہے کہ سب سے پہلے دعا کرنے والا اللہ کی حمد و ثنا کرے اس کے بعد درود شریف پڑھے پھر دعا مانگے، جیسا کہ احادیث میں صراحت کے ساتھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے۔ یہ درود شریف کا پڑھنا بھی ایک قسم کا توسل ہے۔

جوازِ توسل کے دلائل

اب ہم یہاں اس موضوع پر قرآن و حدیث اور بزرگانِ دین کے کچھ اقوال ذکر کرتے ہیں تاکہ مسئلہ کی حقیقت بالکل واضح ہو جائے۔

---

[1] الدر المنضد

قرآن میں ہے

کذالک حقا علینا ننج المومنین اسی طرح ہم پر حق ہے کہ ہم ایمان والوں کو بچائیں، اس آیت کی تشریح میں حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں

یہ ایسا حق ہے جسے اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کریمہ پر لازم کرلیا ہے

قرآن میں دوسری آیت ہے۔

وکان حقا علینا نصر المومنین

حق ہے ہم پر ایمان والوں کی مدد کرنا۔

حافظ ابن کثیر نے اس آیت کے تحت مشہور محدث ابن ابی حاتم کے حوالے سے حضرت ابوالدرداء کی روایت نقل کی ہے وہ بیان کرتے ہیں کہ

میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے کہ جو مسلمان اپنے مسلمان بھائی کی عزت و ناموس کی طرف سے دفاع کرے گا تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ قیامت کے روز اس سے جہنم کی آگ ہٹائے، پھر آپ نے یہی آیت قرآنی تلاوت فرمائی۔

حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے ایک گدھے پر سوار تھا، میرے اور آپ کے درمیان صرف پالان کے پچھلے حصہ کا فاصلہ تھا، آپ نے فرمایا:

معاذ جانتے ہو کہ اللہ کا بندوں پر کیا حق ہے اور بندوں کا اللہ پر کیا حق ہے معاذ نے جواب دیا کہ اللہ اور اس کا رسول بہتر جانتے ہیں۔ حضور نے فرمایا کہ اللہ کا حق بندوں پر یہ ہے کہ بندے اس کی عبادت کریں اور اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہ ٹھہرائیں اور بندوں کا حق اللہ پر یہ ہے کہ جب وہ شرک نہ کریں تو اللہ ان کو بخش دے۔ (بخاری و مسلم)

مسند احمد اور ترمذی میں حضرت ثوبان کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

جو مسلمان صبح و شام تین بار رضیت باللہ ربا و بالاسلام دینا و بمحمد نبیا کہے گا تو اللہ پر حق ہے کہ ایسے شخص کو قیامت کے دن راضی کرے۔

ترمذی میں حضرت معاذ بن جبل کا بیان ہے کہ حضور کا ارشاد ہے:

جس نے رمضان کے روزے رکھے، نماز ادا کی، بیت اللہ کا حج کیا، معاذ

کہتے ہیں کہ مجھے یاد نہیں کہ حضور نے زکوٰۃ کا ذکر کیا یا نہیں تو اللہ تعالیٰ پر حق ہے کہ اس بندے کو بخش دے خواہ وہ اللہ کی راہ میں ہجرت کرے یا اپنے ملک میں رہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے قاعدہ جلیلہ فی التوسل والوسیلہ میں امام اعظم ابوحنیفہ اور ان کے اصحاب کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ کوئی شخص کسی مخلوق کے حوالے سے اللہ سے نہ مانگے اور یوں نہ کہے کہ اے اللہ میں آپ سے بحق انبیاء سوال کرتا ہوں۔ ایسی عبارت فقہ کی ہر کتاب میں موجود ہے۔ دراصل فقہاء کی یہ تعبیر علی الاطلاق نہیں ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ فقہا معتزلہ کے عقیدے کی تردید کرتے ہیں کیونکہ معتزلہ کا عقیدہ ہے کہ جو چیز بندے کے لیے اصلح ہو وہ اللہ پر حق ہے انکی تردید کے لیے فقہاء نے یہ تعبیر اختیار کی ہے لیکن وہ حق جو اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل و اختیار سے اپنے ذمے لیا ہے اس کی تردید نہیں احادیث بالا میں اسی حق کا ذکر ہے یعنی حق الفضل والکرم لا حق الوجوب۔ توسل میں یہی حق دعا مانگنے والا استعمال کرتا ہے ظاہر ہے کہ فقہاء کے پیش نظر باطل فرقے جہمیہ اور معتزلہ کا عقیدہ ہے۔ اس کی تردید منظور ہے نہ کہ مطلقاً عدم جواز، ورنہ ان مذکورہ بالا حدیثوں کا کوئی مصداق ہی باقی نہ رہے گا۔

حجۃ اللہ البالغہ میں حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

> اور دعا کے آداب میں یہ ہے کہ دعا مانگنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا کرے اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ توسل کرے تاکہ دعا مستجاب ہو۔

مولانا مدنی کی قیمتی تحقیق

حضرت مولانا حسین احمد مدنی قدس اللہ سرہ العزیز نے بحق . توسل کی نہایت ہی قیمتی تحقیق فرمائی ہے، فرماتے ہیں :

حقیقت یہ ہے کہ لفظ حق متعدد معنوں میں آتا ہے۔

واجب عقلی، واجب شرعی، مستحق ثابت، مشابہ بالواجب، موجود، احترام اور مہتم بالشان۔ عربی زبان میں لفظ حق مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے جیسا کہ شراح حدیث عینی قاری اور عسقلانی وغیرہ اور قاموس، لسان العرب مجمع البحار وغیرہ علماء لغت فرماتے ہیں کہ واجب عقلی کے معنے میں سلف میں اختلاف ہوا۔ معتزلہ چونکہ عدل اور اصلح کو اللہ تعالیٰ پر عقلاً واجب قرار دیتے ہیں اس لیے اہل توحید کی مغفرت کو اللہ تعالیٰ پر واجب کہتے ہیں اور یہ حق بندوں کا اس پر لازم بالالزام

العقلی قرار دیتے ہیں اور اہل السنۃ والجماعت کسی فعل کو اللہ تعالیٰ پر عقلاً اور ذاتاً واجب نہیں کہتے اس لیے یہ دعا کرنا اللھم انی اسئلک بحق الانبیاء والمرسلین اہل اعتزال کے موافق ہوگا۔ اہل السنۃ والجماعۃ کے خلاف ہوگا۔ قرون تابعین اور تبع تابعین میں معتزلہ کا بہت زور و شور تھا اس لیے فقہا نے سداللذریعہ منع فرما دیا تھا، اب جبکہ ان کے عقائد معدوم ہو گئے تو اشتباہ ہی معدوم ہو گیا تو اس لفظ کے استعمال میں پہلے معنے کے ارادہ کرنے کا احتمال ہی نہیں بلکہ دوسرے معانی ہی لیے جاتے ہیں اس لیے اس میں کوئی حرج نہ ہوگا۔ شرح نقایہ جلد ثانی کتاب الکراہیہ میں ہے ۔

حضرت ملا علی قاری فرماتے ہیں کہا گیا ہے کہ دعا میں بحق فلاں کہنا ناجائز ہے خواہ نبی ہو یا ولی، اور ایسے ہی بحق البیت الحرام یا بحق المشعر الحرام کہنا ناجائز ہے کیونکہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں ہے لیکن اس کا مطلب یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ بے شک ان کا حق وجوباً نہیں ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے ان کا حق بتایا ہے یا حق سے مراد حرمت ہے تو پھر یہ وسیلہ کے باب سے ہوگا اور آداب دعا میں توسل بتایا گیا ہے جیسا کہ الحصن الحصین میں ہے ۔

علامہ ابن عابدین الشامی رد مختار میں رقمطراز ہیں ۔

اس مسئلہ میں امام ابو یوسف نے جواز کا موقف اختیار کیا ہے اور فتاوی تاتارخانیہ میں ہے کہ اس موضوع پر ایسے آثار آئے ہیں جن سے جواز معلوم ہوتا ہے اور یہ کہنا کہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ وجوبی حق اللہ تعالیٰ پر کسی کا نہیں لیکن اس نے اپنے فضل سے ان کا حق اپنے ذمہ لیا ہے اور یا حق سے مراد حرمت ہے اور یہ باب وسیلہ سے ہے ۔

خلاصہ یہ ہے کہ دعا میں بحق فلاں یا بحرمت فلاں کہنا نہ صرف جائز ہے بلکہ وارد اور مستحسن ہے[1] یہ بات دھیان میں رہے کہ دعا میں انبیاء کا توسل صرف جائز ہے اور ساری گفتگو جواز ہی کے ارد گرد گھوم رہی ہے ورنہ توسل کے وجوب، سنت اور استحباب کا کوئی قائل نہیں ہے۔ اسی بنا پر فاروق اعظم نے حضرت عباس کی دعا کا توسل اختیار کیا تھا۔ کیونکہ زندہ کا دعائی توسل ایک مسنون پیمانہ تھا۔ اس پیمانہ کو چھوڑ کر محض جائز کو اختیار نہیں کیا یعنی بے شک یہ جائز تھا کہ حضرت عمر یوں

---

[1] فیوضات حسنی

دُعا کر لیتے کہ اے اللہ بحرمت النبی بارانِ رحمت نازل فرمائے مگر آپ نے افضل صورت کو اختیار کیا۔ بہرحال یہ ایک ضمنی بحث تھی ورنہ آیتِ قرآنی کے منطوق سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ کچھ پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کی وجہ سے یہاں چند اشارات لکھ دیے گئے ورنہ وابتغوا الیہ الوسیلۃ کا مطلب صرف یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کا قرب تلاش کرو اور اس قرب کا ذریعہ ایمان و اعمال صالحہ ہیں اور ایمان و عمل میں مدارِ ہدایت نبوت کا لایا ہوا علم و عمل ہے اور نبوت کے علم و عمل کا موضوع ذات پیغمبر ہے اس طرح ذاتِ نبوت بھی وسیلہ ہے اور ذاتِ نبوت تک پہنچنے کی جس قدر راہیں ہیں وہ سب وسائل ہیں۔ صحابہ کرام، تابعین عظام، مجتہدین، محدثین، صوفیائے کرام، مفسرینِ قرآن حتی کہ علوم الیہ اور عالیہ کے مؤلفین و شارحین اشارۃً وسیلہ کے مفہوم میں داخل ہیں۔ جن بزرگوں نے مشائخ طریقت کو وسیلہ کہا ہے اسی معنے کے اعتبار سے کہا ہے مثلاً مولانا اسماعیل شہید فرماتے ہیں کہ

مرشد بلاشبہ راہِ خدا کا وسیلہ ہے قرآن میں ہے وابتغوا الیہ الوسیلۃ اس آیت میں فلاح کے لیے چار چیزیں مقرر فرمائی ہیں۔ ایک ایمان، دوسرا تقویٰ، تیسرے طلب وسیلہ اور چوتھے اللہ کی راہ میں جہاد، اہلِ سلوک اس آیت سے اشارہ سمجھے ہوئے مرشد کو وسیلہ گردانتے ہیں۔

اور ایسی ہی بات شاہ ولی اللہ کے والد محترم شاہ عبدالرحیم سے بھی منقول ہے۔ بہرحال یہ اس آیت کا مفہوم تو ہو سکتا ہے مگر اس کا منطوق وہی ہے جو عرض کر دیا گیا۔

جہاد اور اس کی قسمیں

چوتھی بات جو اس آیت میں کہی گئی ہے وہ وجاھدوا فی سبیلہ یعنی اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ یہ دُنیا خیر و شر کا مسکن ہے یہاں بھلائی کی بھی طاقتیں ہیں اور برائی کی بھی، اور دونوں کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کے لیے پوری آزادی ملی ہوتی ہے جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دونوں آپس میں ٹکراتی رہتی ہیں اور باہم ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے برابر زور لگاتی رہتی ہیں اس لیے یہ ایک فطری سی بات ہے کہ اسلام کی راہ بھی روکی جائے اور نہ صرف یہ کہ اس کی دعوت کو قبول نہ کیا جائے بلکہ سرے سے اس دعوت کو برداشت ہی نہ کیا جائے اس لیے قدرتی طور پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان رکاوٹوں کے بارے میں اہلِ ایمان کا رویہ کیا ہو۔ قرآن اس سوال کے جواب میں ہدایت دیتا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی کوشش کی جائے مسلسل کی جائے اور

آخری حد تک کی جاتے اسی کوشش کو قرآن وسنت کی زبان میں جہاد کہتے ہیں۔ جہاد کے لفظی معنے ہیں کہ کسی کام کے لیے اپنی اپنی کوششیں صرف کی جائیں اور مقصد تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری طاقت نچوڑ دی جاتے۔ اس لیے راہِ خدا میں جہاد کرنے کا مفہوم یہ ہوا کہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر اس کے دین کی پیروی اور شہادت کا حق ادا کر دینے کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالے جو بس میں ہو۔

ظاہر بات ہے کہ کسی مقصد کی خاطر جو جدوجہد کی جاتی ہے اس کا حالات سے گہرا تعلق ہوتا ہے جیسے حالات ہوتے ہیں انہی کی مناسبت سے جدوجہد کی شکلیں بھی اختیار کی جاتی ہیں۔ یہ موقع پرستی نہیں ہے بلکہ عین اصول پسندی ہے کیونکہ کوئی جدوجہد محض جدوجہد کی خاطر نہیں ہوتی۔ بلکہ کسی مقصد کی خاطر ہوتی ہے اور کسی مقصد کی واقعی خدمت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کے لیے جدوجہد کا طریقہ وقت اور ماحول کو سامنے رکھ کر مقرر کیا گیا ہو ورنہ جدوجہد میں تو سب کچھ لگا دیا جاتے گا مگر اس کا حاصل شاید ہی کچھ نکلے اور یہ یقیناً کوئی دانشمندی کی بات نہ ہوگی اور جو بات دانش مندی کی نہیں ہوتی وہ اصول پسندی کی بھی نہیں ہو سکتی اس لیے جہاد فی سبیل اللہ کی شکل کب کیا ہو اس کا تعین حالات ہی کرتے ہیں۔ اسلام نے اصولی طور پر مختلف حالات کے لیے اس کی جو مختلف قسمیں مقرر کر دی ہیں وہ تین ہیں۔ داخلی جہاد، دعوتی جہاد، مسلح جہاد،

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

داخلی جہاد کا مطلب یہ ہے کہ خود اسلامی معاشرے میں جو برائیاں سر اٹھاتی نظر آئیں ان کے خلاف آواز اٹھائی جاتے اور انہیں مٹا دیا جاتے۔ کیونکہ اندر کی برائیاں اسلام کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلم معاشرے سے برائیاں مٹانے کے لیے یہ ہدایت دی ہے کہ:

> مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا تھا اس کو اپنی اُمت میں سے ایسے مخلص پیرو اور ساتھی ضرور ملے جو اس کے طریقہ کو مضبوطی سے اختیار کیے رہتے اور اس کے احکام کا اتباع کرتے پھر ان کے بعد ان کی جگہ ایسے ناخلف آتے جن کا حال یہ ہوتا کہ کہتے وہ جس پر عمل نہ کرتے اور کرتے وہ جس کی ان کو ہدایت نہ ہوتی، لہٰذا جس نے ان کے خلاف اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے

اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا
وہ بھی مومن ہے اس کے بعد ایمان کا رائی برابر بھی درجہ نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ یہ ارشاد صرف ایک خبر کی حیثیت نہیں رکھتا بلکہ ایک ہدایت اور حکم کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کا مقصد امت کو یہ بتانا ہے کہ آئندہ چل کر اسے بھی اگر ایسے ہی حالات درپیش آئیں تو اسے کیا کرنا چاہیے۔

اس حدیث سے دو باتیں صاف اور کھل کر سامنے آتی ہیں

ایک تو یہ کہ مسلم معاشرے کے اندر جو برائی اور ضلالت بھی پیدا ہو اسے ختم کرنے کی کوشش جہاد ہے۔

دوسرے یہ کہ اس جہاد کی عملی صورتیں کیا ہو سکتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا ایمانی مرتبہ کیا ہے سب سے افضل صورت تو یہ ہے کہ اس برائی اور ضلالت کے خلاف مناسب انداز میں قوت کا استعمال کیا جائے۔ لیکن اگر اتنی جرأت نہ ہو کہ کسی معنے اور کسی صورت میں بھی ہاتھ کی قوت استعمال کی جا سکے تو پھر زبان کی قوت سے کام لیا جائے، برائی کو کھلم کھلا برائی کہا جائے، نصیحت کی جائے سمجھایا جائے، آخرت یاد دلائی جائے، اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے ڈرایا جائے اور جب ان باتوں سے کام نہ چلے تو موقع ومحل کے مطابق زجر وتوبیخ بھی کی جائے اور اگر اتنی بھی ہمت نہ ہو تو ایسا لازماً کیا جائے کہ اس برائی کے خلاف دل بے چینی سے بھر جائے، آنکھوں میں وہ کانٹا بن کر چبھتی رہے، آرزو کی جائے کہ یہ برائی جلد مٹ جائے، دعائیں کی جائیں کہ اللہ اپنے اس بندے کو شیطان کے حملے سے بچالے۔ اس کے ضمیر کو زندہ اور اس کے ایمان کو بیدار کر دے تاکہ اس برائی سے اسے نفرت ہو جائے اور اس نحوست سے وہ اپنے کو پاک کرے۔

مسلم معاشرے کو پاک کرتے رہنے کی یہ تین عملی شکلیں ہیں اور یہی تین شکلیں ممکن بھی ہیں ان میں سے ہر شکل جہاد ہے کیونکہ یہ حق کے قائم رہنے کا ایک حصہ ہے اور ان کی خاطر کوشش کرنے ہی کا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے۔

برائیوں کے مٹانے اور اچھائیوں کے بروئے کار لانے کی جن کوششوں کو یہاں جہاد کہا جا رہا ہے اسی کا دوسرا نام قرآن وسنت کی زبان میں امر بالمعروف نہی عن المنکر ہے۔

دعوتی اور فکری جہاد

فکری جہاد کا مطلب یہ ہے کہ غیر مسلم حلقوں کی طرف سے اسلام کے خلاف جن شبہات کو

پیش کیا جائے ان کا مناسب جواب دیا جائے اور کوئی ایسا زینہ دیا جائے جو اسلام کے چہرے کے لیے باریک سا حجاب بھی بن سکتا ہو۔ مکی دور سراسر اسی جہاد کا دور تھا جب کہ اللہ سبحانہ نے اپنے نبی کو حکم دیا کہ

فلا تطع الکافرین وجاھدھم بہ جھادا کبیرا۔

ان منکرین کا کہا نہ مانو اور قرآن کے ذریعے ان سے بھرپور جہاد کرو۔

قرآن کے ذریعے جہاد کرنے کا مطلب یہ ہے کہ منکرین اسلام کے سامنے ان قرآنی نوامیس کو برابر پیش کرتے رہو جو اسلام کی سچائی کو اور ان کے وجوہ انکار کو بے وقعتی کو کھول کر رکھ دیتی ہیں اور اس طرز استدلال سے ان کے موقف کی کمزوری برابر عیاں کرتے رہو جو قرآن نے تمہیں سکھایا ہے یہ کام پورے زور کے ساتھ انجام دیتے رہو یہاں تک کہ انہیں اپنے انکار کے حق میں کہنے کے لیے کوئی نام کی بھی معقول بات نہ رہ جائے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کو زبان کا جہاد فرمایا ہے چنانچہ آپ کا ارشاد ہے، ابوداؤد میں ہے:

مشرکوں سے اپنے مالوں اور اپنی جانوں اور زبانوں سے جہاد کرو۔

دعوتی اور فکری جہاد دراصل عقل و استدلال کے ہتھیاروں سے لڑنے کا نام ہے یہ لڑائی اس وقت تک لڑنی چاہیے جب تک کہ اسلام کی مخالفت کے سارے فکری اور استدلالی قلعے مسمار نہ ہو جائیں خواہ ان کا تعلق الٰہیات سے ہو اور چاہے طبیعیات سے، تمدن و تہذیب کے میدان ہوں یا معاشیات و سیاسیات کے، سائنس سے حاصل کیے ہوتے ہوں یا فلسفہ سے۔

مسلح جہاد

مسلح جہاد کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی راہ روکنے والوں کے خلاف مسلح جنگ کی جائے۔ اور اس وقت تک کی جائے جب تک وہ اس راہ کو کھلا چھوڑ کر ہٹ نہیں جاتے۔ یہ جہاد کی آخری شکل ہے اور اس کا دوسرا اصطلاحی نام قتال ہے اور عمل کے میدان میں یہ جہاد کی سب سے مشکل اور صبر آزما قسم ہے لیکن دین کے بقا کے لیے بہت ضروری ہے جیسا کہ اسی وقت واضح کر دیا گیا تھا جس وقت کہ اس مسلح جہاد کا سب سے پہلے حکم دیا گیا تھا۔

کتب علیکم القتال وھو کرہ لکم وعسی ان تکرھوا شیئا وھو خیر لکم

یہ قتال اور مسلح جہاد اسلام اور اہل اسلام کے حق میں بہتر کس طرح ہے اس کی وضاحت ان قرآنی آیتوں میں ملے گی جن میں قتال کی غایت بتائی گئی ہے مثلاً

وقاتلوا هم حتیٰ لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ

یعنی جنگ کا حکم اس لیے دیا گیا ہے تاکہ اللہ کا نام لینے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی بسر کرنے کی راہ صاف ہو جائے اور لٹنے کی حالت ختم ہو جائے فتنہ قرآن کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اس کی تفصیل آپ دوسرے پارے میں پڑھ چکے ہیں۔

جہاں تک ان رکاوٹوں کا تعلق ہے جنہیں دور کرنے کے لیے مسلح جہاد کا حکم دیا گیا ہے۔ ہر شخص محسوس کرے گا کہ وہ سب ایک ہی نوعیت کی نہیں ہو سکتیں۔ اس لیے ان کے خلاف کیے جانے والے جہاد کی نوعیت بھی ایک سی نہ ہوگی بلکہ اس میں بھی فرق ہوگا۔ جائزہ بتاتا ہے کہ یہ رکاوٹیں اصولی طور پر دو قسم کی ہوتی ہیں۔ ایک تو وہ جن کا تعلق اسلام لا چکنے والوں سے ہوتا ہے یعنی یہ کہ جو لوگ اسلام لا چکے ہیں انہیں اسلام لانے کے جرم میں ستایا جائے اور مطالبہ کیا جائے کہ اسلام سے باز آجاؤ اور اس غرض سے ان کے خلاف طاقت بھی استعمال کی جائے۔ دوسری وہ جس کا تعلق غیر مسلم حلقوں سے ہوتا ہے یعنی یہ کہ غیر مسلموں کے سامنے اسلام کو پیش ہی نہ کرنے دیا جائے یا ان کے اوپر ایسا ایک اجتماعی نظام مسلط رکھا جائے جس کے ہوتے ہوتے انہیں اسلام کو قریب سے دیکھنے کا موقع ہی نہ مل سکے اور جب رکاوٹیں دو طرح کی ہوتی ہیں تو ان ہی کی مناسبت سے جہاد بھی دو قسم کا ہوگا دفاعی اور اقدامی۔

ان دونوں قسموں پر تفصیلی بحث اور ان کی شرائط آپ کو انشاء اللہ سورۂ حج پارہ ۱۷ میں ملیں گے۔

کفر کے لیے عذاب کا اشتداد

۴ ۹ - بلاشبہ جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ہے اگر ان کے قبضے میں روئے زمین کی ساری دولت آجائے۔ اور اتنا ہی اور بھی۔ پھر سب کچھ روز قیامت عذاب سے بچنے کے لیے فدیہ میں دے دیں تو ان سے قبول نہ کیا جائے گا ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ پچھلی آیت میں بتایا تھا کہ انسان خدا سے ڈرنے اس کا قرب حاصل کرنے اور اس کی راہ میں جہاد کرنے ہی سے فلاح و کامیابی کی امید کر سکتا ہے۔ اس آیت میں متنبہ فرما دیا کہ جن لوگوں نے خدا سے روگردانی کی وہ

آخرت میں اگر روئے زمین کے سارے خزانے بلکہ اس سے بھی زیادہ خرچ کر ڈالیں اور فدیہ دے کر عذاب الٰہی سے بچنا چاہیں گے تو یہ ممکن نہ ہوگا۔ غرض وہاں کی کامیابی تقویٰ، ابتغائے وسیلہ اور جہاد فی سبیل اللہ سے حاصل ہوتی ہے رشوت اور فدیہ سے نہیں ہو سکتی۔ لے

موقعہ و محل دلیل ہے کہ یہاں راہ کفر اختیار کرنے والوں سے وہ لوگ مراد ہیں جنہوں نے فلاح کی راہ ایمان، تقویٰ، قرب الٰہی کی تلاش اور جہاد فی سبیل اللہ سے ہٹ کر بے بنیاد سہاروں اور خیالی سہاروں کے اعتماد پر زندگی گزاری۔ کبھی اپنے نسب کے عالی ہونے اور کبھی اپنی نسبت کے اشرف ہونے کے خیال میں پڑ گئے اور یہ امید باندھ بیٹھے کہ فلاح ہمارے حصہ میں ہے، اور آخرت میں نجات کے لیے یہ چیزیں کافی ہیں ان کو غلط فہمی یہ ہے کہ مدار نجات اور معیار فلاح جس طرح اس دنیا میں لین دین ہے ایسے ہی آخرت میں بھی دے دلا کر کام چل جائے گا قرآن بتا رہا ہے اور بار بار بتاتا ہے کہ کفر کا فدیہ آخرت میں نہ نسب سے ہوگا نہ نسبت سے جیسا کہ بنی اسرائیل کا خیال ہے اور نہ جاہ و منصب اور مال و دولت سے ہوگا جیسا کہ مشرکین کا خیال ہے مطلب یہ ہے کہ ان چار چیزوں کے بغیر نجات نہ ہوگی اگر وہ لوگ زمین کے تمام خزانے اور اس کے ساتھ انہی کے برابر مزید خزانوں کے مالک بن جائیں اور ان سب کو عذاب الٰہی سے بچنے اور چھٹکارے کے لیے فدیہ میں دیں جب بھی ان کا فدیہ قبول نہ ہوگا۔

کفر کے لیے عذاب کا امتداد

۹۵ - وہ چاہیں گے کہ دوزخ سے نکل بھاگیں لیکن اس سے باہر نہ نکل سکیں گے ان کے لیے دائمی عذاب ہے۔ احادیث کثیرہ سے ثابت ہے کہ بہت سے گنہ گار مومنین ایک مدت تک دوزخ میں رہ کر پھر نکالیں جائیں گے اور حق تعالیٰ اپنے فضل و رحمت سے جنت میں داخل کر دے گا یہ آیت ان احادیث کے مخالف نہیں ہے کیونکہ یہاں شروع آیت سے صرف کفار کا حال بیان کیا گیا ہے۔ مومنین کے متعلق اس آیت میں کوئی حرف نہیں ہے پہلے پہلی آیت میں کفر کے لیے جس عذاب کے اشتداد کا ذکر ہوا تھا۔ اس آیت میں اسی عذاب کے امتداد کا ذکر ہو رہا ہے۔ دراصل یہ آیت گرامی یہاں بطور استیناف بیانی آتی ہے یعنی اس میں ذہن

سلہ لے افادات شیخ الاسلام

میں اٹھے ہوتے سوال کا جواب دیا گیا ہے۔ سننے والوں نے جب پہلی آیت سُنی تو فوراً ذہن میں سوال آیا کہ جب ان سے فدیہ قبول نہیں کیا جائے گا تو پھر ان کا کیا بنے گا، جواب دیا کہ یہی بنے گا کہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔

پہلی آیت یعنی ان الذین کفروا۔ بھی بطور جملہ مستانفہ الی تھی مگر وہ استیناف اُٹھے ہوئے سوال کے جواب کے لیے نہیں بلکہ اپنے سے پہلی آیت کے مضمون کو مؤکد اور زوردار بنانے کے لیے ہے۔ پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ آخرت میں کامیابی کا مدار ایمان کے ساتھ رذائل سے بچنے فضائل کو اپنانے اور اللہ کی راہ میں ان تھک محنت پر ہے۔ یعنی مدار نجات خود انسان میں ہے انسان سے باہر نہیں ہے جیسا کہ کفار سمجھتے ہیں کہ فدیہ سے کام چل جائے گا۔ اسلام دین فطرت ہے اور اللہ کا قانون یہی ہے کہ دُنیا و آخرت میں انسان کی جسمانی و روحانی سعادت کا رشتہ خود انسان کی اپنی ذات سے وابستہ ہے۔ عیسائیوں کے عقائد کے مطابق انسان کی نجات مسیح کے فدیہ میں ہے لیکن مسلمان کے اعتقاد میں انسانی سعادت کا مدار خود انسان کا ایمان و عمل صالح سے آراستہ ہونا ہے اسی راہ سے انسان رضائے الٰہی حاصل کر سکتا ہے۔ دُنیا اور آخرت دونوں کی فلاح کا مدار یہی ہے۔ شاید یہاں آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ دین تو انسان کو آخرت کی طرف جھکاتا ہے اور دُنیا سے بے پروا بناتا ہے۔ پھر اسے ایمان و تقویٰ، اعمال صالحہ اور اللہ کی راہ میں جہاد سے وابستہ ہونے کے نتیجے میں دُنیا کی فلاح کیسے مل سکتی ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے آپ کو اٹھویں پارے کا انتظار کرنا ہوگا لیکن یہاں یہ اصولی حقیقت ذہن نشین کر لیجئے کہ دولت یہ عزت، یہ اقتدار حکومت جنہیں دُنیا کی فلاح کہا جاتا ہے دین کی نگاہ میں سیاسی خود مجوب چیزیں نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ نعمتیں اور اس کا فضل ہیں۔ چنانچہ قرآن نے آیات میں ان کو یہی حیثیت دی ہے۔ ابھی ابھی آپ ایک رکوع پہلے پڑھ چکے ہیں کہ اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء و جعلکم ملوکا۔ اسی طرح آپ پوری پارے میں پڑھیں گے۔

ضرب اللہ مثلاً قریۃ کانت اٰمنۃ مطمئنۃ یاتیھا رزقھا رغدا من کل مکان فکفرت بانعم اللہ

اس میں زندگی کی سہولتوں اور رزق کی فراوانیوں کو اللہ کی نعمتیں کہا گیا ہے۔

اور پھر یہ کہ انسان اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب بنا کر پیدا کیا گیا ہے اس کا منصب یہی ہے کہ وہ اس زمین کا انتظام ہاتھ میں لے اور اسے اپنے مالک کے احکام کے مطابق چلائے۔

یہ دونوں بنیادی حقیقتیں اگر سامنے ہوں تو زیرِ نظر خلش اس حد تک بالکل حل ہو جاتی ہے کہ دنیا کی عزت و دولت اور اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے تعلق رکھنا اور فائدہ اٹھانا دین داری کے منافی ہو، کیونکہ جو چیزیں اللہ کی نعمت اور اللہ کا فضل ہوں وہ اس کے حق شناس بندوں کے لیے ممنوع نہیں ہو سکتیں۔

یہ تو ہوا دنیوی عزت و دولت کے فضل اور نعمت ہونے کا تقاضا۔

اب انسان کے پیدائشی منصب کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ اس کا تقاضا کیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور چاہتا ہے کہ اس زمین پر وہ اس کے احکام کے مطابق اپنے اختیارات استعمال کرے تاکہ یہاں بھی اس کی مرضی پوری ہوتی رہے جس طرح کہ باقی کائنات میں پوری ہوتی رہتی ہے تو جب یہاں ایسے لوگ موجود ہوں جو اپنے اس فرضِ منصبی کا پورا احساس رکھتے ہوں۔ اس وقت تک یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت و دانائی اور انصاف کے بالکل خلاف ہو گی کہ انہیں اس زمین کے اقتدار سے محروم رکھے دوسری طرف خود ان فرض شناس اور خدا کے فرمانبردار بندوں کے لیے بھی یہ بات کسی طرح صحیح نہ ہو گی کہ وہ اس اقتدار کے حاصل کرنے سے بے نیازی برتیں۔ جس کے بغیر وہ اپنے فرضِ خلافت سے کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہو سکتے۔ جس چیز سے ان کی زندگی کا اصل فریضہ وابستہ ہو وہ تو ان کے لیے صرف پسندیدہ ہی نہیں بلکہ ضروری بھی ہو جائے گی۔ ان پہلوؤں کو سامنے رکھئے تو یہ بات اچھی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ مسلمان صرف اخروی فلاح ہی کا نہیں بلکہ دنیوی فلاح کا بھی حقدار اور طلب گار ہوتا ہے اور اس کے لیے ایسا ہونا اس کی پکی دینداری کا تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچے اور صحیح الفکر مسلمان کی دعا یہ ہوتی ہے۔

ربنا آتنا فی الدنیا حسنۃ و فی الآخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار

وَالسَّارِقُ وَالسَّارِقَةُ فَاقْطَعُوٓا اَيْدِيَهُمَا جَزَآءًۢ بِمَا كَسَبَا نَكَالًا
مِّنَ اللّٰهِ ؕ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۳۸﴾ فَمَنْ تَابَ مِنْۢ بَعْدِ ظُلْمِهٖ
وَاَصْلَحَ فَاِنَّ اللّٰهَ يَتُوْبُ عَلَيْهِ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۳۹﴾ اَلَمْ تَعْلَمْ
اَنَّ اللّٰهَ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ يُعَذِّبُ مَنْ يَّشَآءُ وَيَغْفِرُ
لِمَنْ يَّشَآءُ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴۰﴾

اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو[۹۶]، ان کے کیے کی پاداش میں، اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا کے طور پر اور اللہ غالب حکمت والا ہے[۹۷]۔ پھر جس نے اپنے اس ظلم کے بعد توبہ کی اور اصلاح کر لی تو اللہ تعالیٰ اس پر نظر عنایت فرمائے گا بے شک اللہ غفور رحیم[۹۸] ہے۔ کیا تم نہیں جانتے کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے وہی جس کو چاہے سزا دیتا ہے اور جسے چاہے

معاف کرنے اور اللہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔ 99

اسلام میں ضابطہ دیوانی

اسلامی نظام اپنے شہریوں کو چار چیزوں کے تحفظ کی ضمانت دیتا ہے، ایک جان، دوسرے مال، تیسرے آبرو و عزت، چوتھے ایمان و دین۔ جیسے وہ جان کی حفاظت کے لیے قانون فوجداری پیش کرتا ہے اسی طرح وہ مال کے لیے دیوانی ضابطہ لوگوں کے سامنے رکھتا ہے۔ جیسے وہ جان کی قدر و قیمت جتاتا اور اس کی حفاظت کا نظم قائم کرتا ہے تاکہ شہری سکون و اطمینان کی زندگی بسر کر سکیں ٹھیک اسی طرح وہ شہریوں کے اموال کی بھی حفاظت کرتا ہے تاکہ شہریوں کا سکون مجروح نہ ہو۔ یہ واقعہ ہے کہ سرمایہ کو راحت و عافیت کے پہنچانے میں بہت بڑا دخل ہے۔ سرمایہ محفوظ نہ ہو تو زندگی پریشانیوں سے دوچار ہو جاتی ہے۔ قرآن پاک میں اسی لیے مال کو زینت سے تعبیر کیا ہے المال والبنون زینۃ الحیاۃ الدنیا۔ اس تعبیر میں مال کو اولاد سے پہلے لائے ہیں اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کا مال و دولت سے کس قدر شدید لگاؤ ہے۔ اسی شدت کا قرآن نے اس طرح اظہار کیا ہے وانہ لحب الخیر لشدید یہ حقیقت ہے کہ دولت جسے انسان جائز طریقے پر کماتا ہے۔ مالک کو اپنی املاک کی حفاظت کرنے اور دوسروں کو ان پر دست اندازی سے روکنے کا حق حاصل ہے۔ یہ حق ملکیت کے حق کے اولین لوازم میں سے ہے۔ حق ملکیت کو موثر اور حقیقی بنانے کے لیے ضروری ہے کہ مالک کو اس بات کا اختیار ہو کہ وہ دوسرے افراد کو بغیر کسی حق کے اس میں مداخلت کرنے سے روک سکے۔ قرآن نے اس آیت گرامی کے ذریعے مالک کے حق تحفظ کو واضح الفاظ میں تسلیم کیا ہے۔ اس سے آگے بڑھ کر اس حق کے استعمال کو بعض حالات میں ضروری قرار دیا گیا ہے تاکہ وہ اہم مقاصد اور مصالح ضائع نہ ہو جائیں جو ملکیت کے ساتھ وابستہ ہیں۔ اپنی ملکیت کی حفاظت کے لیے انسان اپنی جان تک دے سکتا ہے جو خود اللہ کی ایک مقدس امانت ہے۔ اپنی ملکیت کی حفاظت میں مارا جانے والا شہادت کا درجہ پاتا ہے۔ صحیح بخاری میں بحوالہ عبداللہ بن عمرو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

من قتل دون مالہ فھو شہید۔

جو شخص اپنے مال کی حفاظت میں مارا گیا ہے وہ شہید ہے۔

حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا اور اس نے کہا کہ لے اللہ کے رسول آپ کی کیا رائے ہے؟ اگر میرے پاس کوئی شخص میرا مال چھیننے آتے۔ آپ نے فرمایا کہ تم اسے اپنا مال نہ دو۔ اس نے کہا کہ اگر وہ مجھ سے لڑائی کرے تو آپ کا کیا خیال ہے آپ نے فرمایا کہ تم بھی اس سے لڑائی کرو، اس نے کہا کہ اگر وہ مجھے قتل کر دے تو؟ آپ نے فرمایا کہ تم شہید ہو گئے۔ اس نے کہا کہ اگر میں اسے قتل کر دوں تو آپ کی کیا رائے ہے؟ آپ نے فرمایا کہ وہ جہنم میں جائے گا۔

جب کسی ملک سے کسی دوسرے کا حق بھی متعلق ہو تو اس کا تحفظ صرف ایک انفرادی حق نہیں بلکہ ایک قانونی ذمہ داری بھی ہے۔ قرآن نے چوری کی سزا کا تعین اسی قانونی ذمہ داری کی خاطر کیا ہے۔ مرشد الحیران میں ہے جو شخص کسی چیز کا مالک ہو اس پر اس چیز کی حفاظت واجب ہے جس سے وہ انتفاع کر رہا ہے۔

۹۶ - اور چور مرد اور چور عورت دونوں کے ہاتھ کاٹ دو۔ یعنی پہلی مرتبہ چوری کرے تو داہنا ہاتھ گٹے پر سے کاٹ دو۔ باقی تفصیل کتب فقہ میں ملیں گی۔ پچھلے رکوع میں ڈکیتی وغیرہ کی سزا ذکر کی گئی تھی درمیان میں بعض مناسبات کی وجہ سے جن کو ہم بیان کر چکے ہیں مومنین کو چند ضروری نصائح کی گئیں۔ اب پھر اسی پچھلے مضمون کی تکمیل کی جاتی ہے۔ یعنی وہاں ڈکیتی کی سزا مذکور ہوئی تھی اس آیت میں چوری کی سزا بتلا دی[1]

چوری کی تعریف

قرآن میں السارق اور السارقہ کے الفاظ بولے ہیں۔ یہ چونکہ صفت کے صیغے میں ان سے اشارۃً یہ بات سمجھی جا رہی ہے کہ اس کام کی نوعیت ایسی ہو جسے چوری کہا جا سکے اور جس کے مرتکب کو چور کہہ سکیں۔ لغوی معنے کے اعتبار سے تو مطلقاً ہر چوری سرقہ ہے۔ لیکن قانون کی زبان میں اس سے مراد غیر کے مال کو کسی خاص جگہ اور کسی خاص مقدار میں چھپکے سے لے لینا ہے۔ قانون کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دائرے میں چوری کے چوری ہونے کے لیے نہیں بلکہ چوری کے قابل قطع ید ہونے کے لیے کچھ شرطیں ہیں یہ ممکن ہے کہ اداء حقوق کی حد تک ایک ایک عمل چوری تو ہو سکتا ہے مگر قابل سزا نہیں ہو سکتا۔ مثلاً آپ نے راہ چلتے کسی درخت سے پھل توڑا ہے یا کسی کھیت سے کچھ سبزی بغیر مالک کی مرضی کے چپکے سے اٹھا لی یا کسی کی ٹال سے کچھ لکڑیاں لے لیں یا کسی کے کچن سے کچھ روٹیاں لے لیں۔ یہ سب چوریاں ہیں اور ناجائز و حرام ہیں مگر یہ وہ قانونی چوری نہیں ہے جس پر ہاتھ کاٹنے کی سزا ہے۔ چوری وہ کہلائے گی جو محفوظ جگہ سے مخصوص مقدار میں عاقل بالغ نے نظر بچا کر کی ہو۔ بشرطیکہ جس چیز کی چوری کی گئی ہے وہ کسی کی ملک ہو اور قیمتی ہو۔ فقہا نے چوری کے چوری ہونے کے لیے ایک سے زیادہ شرطیں بتائی ہیں مثلاً چوری کسی قدر و قیمت رکھنے والی چیز کی کی گئی ہو۔ محفوظ مال کی کی گئی ہو۔ وہ چیز چور کے پاس امانت نہ ہو اور اس میں اس کا کوئی حصہ نہ ہو بہرحال چوری کے قانونی ہونے کے لیے ان باتوں کا ہونا ضروری ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ چوری نہیں بلکہ مطلب یہ کہ چوری تو ہے اور ناجائز بھی لیکن ہاتھ کاٹنے کے قابل نہیں ہے۔ اگر عدالت تعزیر دینا چاہے تو کوئی رکاوٹ نہیں ہے۔

چوری کا نصاب

چوری کے قانونی اور قابل سزا ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ چیز جس کی چور نے چوری کی ہے اس کی مالیت دس درہم ہو۔ یعنی ساڑھے سات ماشے چاندی کی قیمت کے برابر ہو۔ یہ امام ابوحنیفہ کا مذہب ہے اس سے کم پر چور کو ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں دی جا سکتی۔ فقہا کا باہم اختلاف ہے کہ کتنی مالیت کی چوری پر ہاتھ کاٹا جائے۔ علمائے ظاہر اس بات کے قائل ہیں کہ سرے سے اس سلسلے میں کوئی نصاب نہیں ہے۔ ہر حال میں ہاتھ کاٹا جائے گا خواہ زیادہ مال چوری کرے یا تھوڑا، قطع ید کے لیے نفس مال کی چوری کافی ہے۔ ائمہ اربعہ میں جن کا مذہب پوری دنیا میں رائج ہے۔ ان میں امام مالک نصاب سرقہ تین درہم قرار دیتے ہیں اور امام شافعی چوتھائی دینار یہ مقدار بھی تین درہم کے برابر ہے۔ امام اعظم نے جو دس درہم بتلائے ہیں یہ مقدار اس اعتبار سے مناسب تر ہے کہ اس نصاب میں تین درہم اور ربع دینار سب شامل ہو جاتے ہیں اور چونکہ معاملہ ایک انسانی عضو کے کاٹنے کا ہے اس لیے احتیاط اسی کی متقاضی ہے۔

جو لوگ کوئی نصاب نہیں مانتے وہ آیت قرآنی کو استدلال میں پیش کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ

اس میں نصاب کی کوئی قید نہیں ہے۔ جمہور جو نصاب کے قائل ہیں حدیث نبوی پیش کرتے ہیں۔
امام مالک اور امام شافعی حضرت عائشہ کی یہ حدیث دلیل میں پیش کرتے ہیں کہ
چور کا ہاتھ نہ کاٹا جاتے مگر چوتھائی یا اس سے زیادہ دینار کی چوری پر (متفق علیہ)
دوسری حدیث حضرت عبداللہ بن عمر کی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ڈھال کی چوری
پر ہاتھ کاٹا جس کی قیمت تین درہم تھی۔
امام اعظم ابوحنیفہ دس درہم نصاب کی دلیل میں عمرو بن شعیب کی حدیث پیش کرتے ہیں کہ حضور انور
صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ؛
چور کا ہاتھ دس درہم سے کم مالیت کی چوری پر نہ کاٹا جائے گا۔
حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسے ڈھال کی چوری پر ہاتھ کاٹا جس کی
قیمت ایک دینار یا دس درہم تھی۔ (ابوداؤد و نسائی)
ایک دوسری حدیث میں رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے ؛
دس درہم سے کم کی چوری پر ہاتھ نہ کاٹا جائے گا۔
ایک اور حدیث میں ہے کہ جب مال مسروقہ ڈھال کی قیمت کے برابر ہو تو ہاتھ کاٹا جائے گا
اور پھر ڈھال کی قیمت کے سلسلے میں صراحت ہے۔
ڈھال کی قیمت دس درہم تھی۔
ایک دفعہ ایک چور دربار فاروقی میں حاضر کیا گیا جس نے کچھ کپڑے چرائے تھے۔ حضرت عمر نے
حضرت عثمان سے فرمایا کہ آپ اس کی قیمت لگائیں۔
حضرت عثمان نے اس کپڑے کی آٹھ درہم قیمت لگائی۔
ان تمام روایات کو سامنے رکھ کر فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ نصاب سرقہ کم از کم تین درہم اور زیادہ
سے زیادہ دس درہم حدیث میں بیان کیا گیا ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ دس درہم
ایسا نصاب سرقہ ہے جس میں ہاتھ کاٹنے میں ائمہ اربعہ میں سے کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے
بلکہ اس پر سب کا اتفاق ہے غالباً احتیاط کے اسی پہلو کے پیش نظر احناف نے دس درہم نصاب
سرقہ قرار دیا۔ ابن عربی کا قول ہے کہ
سفیان ثوری فن حدیث میں اپنا بلند مقام رکھنے کے باوجود اسی کے قائل ہیں کہ دس درہم سے

کم کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے اس لیے کہ ہاتھ ایک محترم عضو انسانی ہے اور ایسا محترم حصۂ بدن اس وقت تک مباح قرار نہیں دیا جاسکتا ہے جب تک اس پر لوگوں کا اجماع و اتفاق نہ ہو جائے اور یقیناً دس درہم ایسا نصاب ہے جس پر سب نے اتفاق کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ دس درہم یا اس سے زیادہ کی چوری پر اسلام چور کو معاف نہیں کرتا ہے البتہ اس میں ایک شرط یہ بھی ہے کہ وہ مال بحفاظت رکھا گیا ہو جو مال محفوظ جگہ میں نہ ہو گا اس کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جائے گا کیونکہ ممکن ہے کہ چور نے یہ خیال کیا ہو کہ مالک مال کو اس کی کچھ زیادہ ضرورت نہیں ہے۔ یہ حفاظت خواہ حقیقۃً ہو یا حکماً۔ حقیقۃً مثلاً کسی سپاہی چوکیدار کے پہرے میں ہو اور حکماً مثلاً مکان کے اندر صندوق وغیرہ میں ہو۔ سرراہ اور کھلے پڑے ہوتے مال کے اٹھالینے پر حد سرقہ نہ ہو گی۔ چوکیدار اور پہرہ دار وغیرہ اگر چوری کریں تو وہ خیانت کے جرم میں ملزم ہوں گے حد سرقہ کے مستوجب نہ ہوں گے اور یہ بھی ضروری ہے کہ وہ مال کسی کی ملک ہو غیر مملوک مال کی چوری پر حد نہ ہو گی۔

چوری کا ثبوت

چوری کے ثبوت کے دو ہی طریقے ہیں ایک اقرار دوسرے شہادت، اور ظاہر ہے کہ شہادت عدالت میں ہو گی اس لیے چوری کی سزا انفرادی نہیں ہو گی بلکہ عدالت کے ذریعے ہو گی اور عدالت کا وجود حکومت پر موقوف ہے اس لیے علماء نے اس آیت سے یہ بات بھی سمجھی ہے کہ اُمت پر نظام حکومت قائم کرنا ضروری ہے کیونکہ حدود کا نفاذ درجہ فرض میں ہے اور نفاذ کی صورت پوری اُمت کے اجماع کے فیصلے کے مطابق افراد سے ممکن نہیں اس لیے حکومت کا نظام ضروری ہے۔ امام رازی نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ

متکلمین نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ حکومت کا قائم کرنا اُمت کے فرائض میں داخل ہے۔

امام رازی کا یہ کہنا بالکل برمحل اور بجا ہے۔ کیونکہ اسلامی قانون جن احکام و ہدایات پر مشتمل ہے ان میں سے بے شمار احکام ایسے ہیں جن کی تعمیل ایک سیاسی نظام اور ایک بااختیار حکومت کے بغیر ممکن ہی نہیں۔ ظاہر ہے کہ احکام قانونی و سیاسی و اجتماعی کی پیروی بھی ٹھیک اسی طرح ضروری ہے جس طرح دوسرے حکموں کی، کیونکہ یہ بھی اسی طرح قرآنی احکام ہی ہیں جس طرح کہ وہ دوسرے

احکام اور ان کی بھی سمجھا آوری اسی طرح تقاضائے ایمان ہے جس طرح ان کی۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اپنے احکام میں کسی انتخاب کی آزادی نہیں دی ہے کہ جن کی چاہیں تعمیل کریں اور جنہیں چاہیں چھوڑ دیں اس کا مطالبہ تو یہ ہے کہ جو کچھ بھی میری جانب سے نازل کیا گیا ہے سب کی پیروی کرو اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم اگر تم نے ایسا نہ کیا بلکہ میرے حکموں میں اپنے منشا کے مطابق تفریق کی جن احکام پر چاہا عمل کیا جن کو چاہا چھوڑ دیا تو یہ ایمان کی نہیں کفر کی روش ہو گی۔ چنانچہ یہود کا معاملہ ہمارے سامنے ہے جن پر اسی طرح کے طرز عمل کی بنا پر صاف لفظوں میں یہ جرم عائد کیا گیا تھا کہ

افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔

قانونِ اسلام میں مساوات

اس آیت میں صفت کے صیغے لا کر اشارہ کر دیا ہے کہ یہ چوری کی صفت جہاں بھی پائی جائے گی وہ سزا کا مستحق ہے۔ اس میں امیر غریب، حاکم و محکوم اور چھوٹے بڑے میں کوئی امتیاز نہیں ہے جو بھی چوری کا مرتکب ہو گا سزا پائے گا۔ خواہ کوئی بھی ہو، مرد ہو یا عورت، کافر ہو یا مسلمان، شہری ہو یا دیہاتی۔ اس قانون میں اس کی ہرگز گنجائش نہیں ہے کہ کوئی بڑا آدمی یا شریف خاندان کا فرد جرم کرے تو اسے معاف کر دیا جائے اور غریب نادار کرے تو اسے سزا کے شکنجے میں کس دیا جائے بلکہ جس جرم کی جو سزا حق تعالیٰ کی طرف سے متعین ہے سب کے لیے ہے، نہ انگریزوں کے قانون کی طرح کالے گورے کا امتیاز ہے اور نہ منو مہاراج کی طرح برہمن شودر کی کوئی تفریق ہے۔

زمانۂ نبوت کا چوری ہی کا واقعہ مشہور ہے اور امام بخاری، امام مسلم صحیحین میں اس کے راوی ہیں کہ ایک دفعہ ایک مخزومی عورت نے چوری کی اور سرکارِ نبوت میں اس کی چوری ثابت ہو گئی تو قریش پر طبعی طور پر یہ گراں گزرا کہ ایک نامی گرامی خاندان کی خاتون کا ہاتھ اس جرم میں کاٹا جاتے اس لیے کہ اس سے پورے قبیلہ کی توہین ہوتی تھی۔ چنانچہ انہوں نے یہ طے کیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موضوع پر گفتگو کی جائے ممکن ہے کہ اس سے بچنے کی کوئی صورت نکل آئے۔ صحابہ کرام بہرحال آپ کے مزاج شناس تھے اس لیے کسی کو جرأت نہ ہوتی۔ سب نے مل کر حضور انور کے چہیتے حضرت اسامہ کو اس کے لیے تیار کیا کہ وہ خدمت گرامی میں حاضر ہو کر اس موضوع پر آپ سے بات کریں۔ لوگوں کے مشورے کے مطابق حضرت اسامہ نے خدمت اقدس میں حاضر ہو کر ترجمانی کی اور اس مخزومی عورت کے سلسلے میں بات شروع کی۔ یہ سننا تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ تمتما

اظہار رنگ بدل گیا اور ارشاد فرمایا اے اسامہ تم اللہ کی مقرر کردہ حدود میں سے ایک حد میں سفارش کے لیے حاضر ہوتے ہو، پھر آپ نے ایک خطبہ دیا جس میں فرمایا کہ تم کو معلوم نہیں ہے کہ بنی اسرائیل صرف اس وجہ سے تباہ ہو گئے کہ انہوں نے باہم امتیازی سلوک برتنا شروع کر دیا تھا۔ ان میں سے کوئی شریف آدمی چوری کرتا تو لوگ اسے چھوڑ دیتے اور اگر کوئی کمزور آدمی چوری کا مرتکب ہوتا تو اس پر حد جاری کرتے، اس کے بعد آپ نے فرمایا:

خدا کی قسم اگر میری بیٹی فاطمہ بھی چوری کرتی تو میں اس کا بھی ہاتھ کاٹ دیتا۔

ایک روایت میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا رنگ دیکھ کر حضرت اسامہ کانپ گئے اور کہنے لگے یا رسول اللہ میرے لیے مغفرت کی دعا فرمائیے، اور اسی پر بس نہیں بلکہ اس کے بعد آپ نے بلا رورعایت اس عورت کا ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا۔ چنانچہ حسب قانون ہاتھ کاٹا گیا۔ وہ خاتون اس کے بعد بہت دنوں تک زندہ رہی ہیں، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ وہ کبھی کبھی میرے گھر آتی تھیں۔

اس واقعہ سے اس اسلامی قانون کی اہمیت کا اندازہ ہوتا ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ لکھتے ہیں:

شریف وکمین، قوی وکمزور سبھوں پر حدود کا اجراء ضروری ہے۔ کسی حال میں اس سزا کا معطل کرنا درست نہیں ہے، نہ سفارش سے مرعوب ہو کر اور نہ ہدیہ و تحفہ سے مرہون ہو کر، جو حاکم اور امیر اقامت حدود پر قادر ہونے کے باوجود حد قائم نہ کرے تو ایسے افراد حکومت پر اللہ اور فرشتوں کی لعنت ہے۔ اللہ تعالیٰ ان کی طرف سے کچھ قبول نہ فرماتے گا۔ اور ان کا شمار ان لوگوں میں ہوگا جو اللہ تعالیٰ کی آیات کے بدلے دنیا ئے دنی خریدتے ہیں، رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جس کی سفارش اللہ کے احکام کے نفاذ میں آڑ بن جاتے وہ اللہ کے احکام کا مخالف ہے۔

چوری کی سزا میں رعایت

دس درہم یا اس سے زیادہ کی چوری پر خواہ وہ سکہ ہو یا اس کی قیمت کی کوئی چیز ہو، دونوں صورتوں میں ہاتھ کاٹا جاتے گا۔ لیکن بہت سی چیزیں ایسی ہیں جن کی چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جاتے گی۔ مثلاً ایسی چیزیں جو دیرپا نہیں ہوتی ہیں جیسے گوشت اور پھل وغیرہ۔ یہ چیزیں

دس درہم سے زیادہ کی بھی اگر کوئی چوری کرے تو ہاتھ کاٹنے کی سزا دی جائے گی۔ نسائی اور ابن ماجہ میں حضرت ابوہریرہ کے حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے کہ،

پھل اور ترکاری کی چوری میں ہاتھ نہ کاٹا جاتے گا۔

معمولی چیزوں کی چوری پر بھی ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جائے گی۔ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا فرماتی ہیں ۔

معمولی چیزوں کی چوری پر زمانہ نبوت میں ہاتھ نہیں کاٹا جاتا تھا۔

کھانے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں۔ حضور کا ارشاد ہے کہ،

کھانے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی کوئی سزا نہیں ہے۔

حضرت علی اور حضرت عثمان کا فیصلہ ہے اور صحابہ کرام میں سے کسی نے اس میں اختلاف نہیں کیا ہے کہ پرندے کی چوری میں ہاتھ کاٹنے کی سزا نہیں ہے۔ نیز سیدنا عمر و علی رضی اللہ عنہما نے سرکاری خزانہ سے چوری کرنے والے کا ہاتھ بھی نہیں کاٹا۔ اور اس معاملہ میں بھی صحابہ کرام میں سے کسی کا اختلاف منقول نہیں ہے، اچکے، لیٹرے اور خائن کا بھی ہاتھ نہیں کاٹا جائے گا حضور انور کا ارشاد ہے۔

خیانت کرنے والے لیٹرے اور اچکے کے لیے قطع ید کی سزا نہیں ہے۔

ان مآخذ کی بنیاد پر مختلف ائمہ فقہ نے مختلف چیزوں کو قطع ید کی سزا سے مستثنیٰ قرار دیا ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نزدیک پھل ترکاریاں گوشت، پکا ہوا کھانا، غلہ جس کا ابھی کھلیان نہ کیا گیا ہو۔ کھیل اور گانے بجانے کے آلات وہ چیزیں ہیں جن کی چوری میں قطع ید کی سزا نہیں ہے نیز جنگل میں چرتے ہوتے جانوروں کی چوری اور بیت المال کی چوری میں وہ قطع ید کے قائل نہیں ہیں۔ اسی طرح دوسرے ائمہ نے بھی بعض چیزوں کو اس حکم سے مستثنیٰ قرار دیا ہے، لیکن اس کے معنے یہ نہیں ہے کہ ان چوریوں پر سرے سے سزا ہی نہ دی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ان جرائم میں ہاتھ نہ کاٹا جاتے گا۔

رشتہ داروں کی چیز کی چوری

اسی طرح کوئی اپنے قریبی رشتہ دار کی کوئی چیز چرائے تو اس کو بھی ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دی جاتے گی۔ جیسے اولاد ماں باپ کی چیز چوری کرے یا باپ اولاد کی چیز یا بیوی شوہر کی چیز چرالے

اور شوہر بیوی کی۔ قریبی رشتہ داروں میں بھائی، بہن، چچا، ماموں اور پھوپھی بھی داخل ہیں۔ تفصیل کے لیے قانون کی کتابوں کا مطالعہ کیا جائے۔

یہ واضح رہے کہ چوری کے ثبوت میں عدالت کے پاس ذرا بھی تاویل کی گنجائش نکل آئے گی تو پھر عدالت ہاتھ کاٹنے کی سزا نہ دے سکے گی اس لیے کہ لینے والا کہہ سکتا ہے کہ میری نیت چوری کی نہ تھی بلکہ اس ارادہ سے اٹھایا تھا۔ مثلاً کوئی قرآن چوری کرے، اس میں وہ کہہ سکتا ہے کہ پڑھنے کے لیے لیا تھا۔ چوری کے ثبوت کے لیے چور کا خود اقرار ضروری ہے جس میں کسی جبر و اکراہ کو دخل نہ ہو۔ یا دو قابل شہادت مردوں کی گواہی ہو۔

کب کون سا عضو کاٹا جائے

ہاتھ کون سا کاٹا جائے اور کہاں سے کاٹا جائے۔ اس سلسلہ میں ائمہ قانون کا احادیث کے پیش نظر فیصلہ ہے کہ دایاں ہاتھ کاٹا جائے گا اور صرف پہونچا تک دیا جائے گا۔ ہاتھ کی صراحت خود قرآن کی اس آیت میں ہے اور دایاں کا ثبوت اس سے ملتا ہے کہ عبداللہ ابن مسعود کی آیت کی قرأت فاقطعوا ایمانھما اس طرح بھی آئی ہے۔ شیخ ابن الہمام فتح القدیر میں رقمطراز ہیں،

> دایاں ہاتھ کا تعین عبداللہ بن مسعود کی قرأت میں ہے کہ ان کے دائیں ہاتھ کاٹو اور یہ قرأت مشہورہ ہے لہٰذا خبر مشہور کا درجہ لے حاصل ہے جس سے مطلق کی تقیید درست ہے۔ فتح القدیر ج ۵ ص ۱۵۳۔

رہا یہ سوال کہ کہاں سے کاٹا جائے تو بتایا جا چکا ہے کہ ہتھیلی سے نیچے والا جوڑ کاٹا جائے گا حضرت عبداللہ بن عمرو کا بیان ہے کہ

> نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک چور کا ہاتھ جوڑ سے کاٹا جو ہتھیلی کے نیچے ہوتا ہے۔

اس سے مراد ہتھیلی اور کلائی کے درمیان کا جوڑ ہے اور کاٹنے کے بعد خون بند کرنے کی فوری ترکیب کی جائے۔ زمانۂ نبوت و صحابہ میں گرم لوہے سے داغ دیا جاتا تھا تاکہ خون بند ہو جائے ورنہ لولا مقصود نہیں ہے۔ حدیث میں ایک چور کا واقعہ ہے کہ وہ خدمت نبوی میں حاضر کیا گیا۔ آپ نے اسے دیکھ کر فرمایا۔ میرا خیال یہ ہے کہ اس نے چوری نہیں کی۔ کے جو درخود بو، اٹھایا یا رسول اللہ میں نے چوری کی ہے یہ سن کر آپ نے فرمایا:

اسے لے جاؤ اور ہاتھ کاٹ کر اسے داغ دو۔

حضرت علی کے متعلق یہ صراحت آئی ہے کہ

آپ نے چوروں کے ہاتھوں کو کلائی سے کاٹ کر داغ دیا۔

داغا اس لیے جاتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا جائے تو تمام جسم کا خون بہہ جائے گا اور چور ہلاک ہو جائے گا۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے کہ

اگر داغا نہ جائے تو ہاتھ کی کٹائی ہلاکت کا ذریعہ ہو جائے گی حالانکہ منشا زجر و تادیب ہے نہ کہ موت و ہلاکت۔

دوبارہ چوری کی سزا

سزا یافتہ چور جب دوبارہ چوری میں گرفتار ہو کر آئے اور اس کی چوری ثابت ہو جائے تو اس کا بایاں پیر کاٹا جائے اور تیسری بار چوری کرے گا تو اسے ہمیشہ کے لیے جیل بھیج دیا جائے گا۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ ایک ہاتھ ایک پیر باقی رکھا جائے گا تاکہ وہ بالکل لنجا اور کھانے پینے سے مجبور ہو کر نہ رہ جائے۔ حضرت علی فرماتے ہیں کہ :

چور جب چوری کرے تو اس کا دایاں ہاتھ کاٹا جائے۔ پھر اگر چوری کرے تو بایاں پیر کاٹا جائے۔ اور تیسری بار چوری کرے تو قید خانہ میں ڈال دیا جائے تاکہ اس میں خیر و صلاح آ جائے۔ مجھے اللہ سے شرم آتی ہے کہ میں اسے اس طرح بنا دوں کہ کھانے اور استنجا کے لیے کوئی ہاتھ اور چلنے کے لیے کوئی پیر باقی نہ رہے۔ فتح القدیر ج ۵ ص ۱۵۵۔

اگرچہ قانون کے بعض مدارس یہ بھی کہتے ہیں کہ تیسری مرتبہ چوری ثابت ہو تو پھر دوسرا ہاتھ کاٹ دیا جائے اور چوتھی مرتبہ میں دوسرا پاؤں لیکن بات یہ ہے کہ وہ اس طرح قوم و ملک پر بار بن جائے گا۔ ایک طرف وہ سارے اعضا سے محروم ہو جائے گا۔ دوسری طرف اس کے کھانے پینے اور پاخانہ پیشاب کرانے کی ساری ذمہ داری حکومت پر آ جائے گی اور ایسا شخص سرکار کے لیے وبال بن جائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ احناف نے اس کا ہر جگہ لحاظ رکھا ہے۔ اس حد تک کہ اگر کسی چور کا دایاں ہاتھ شل ہو چکا ہے اور ایسے ہی ایک پاؤں تو اس کا نہ ہاتھ کاٹا جائے اور نہ پاؤں۔ ہدایہ میں صراحت ہے
چور کا بایاں ہاتھ شل یا کٹا ہوا ہو یا اس کا دایاں پیر کٹا ہوا ہو تو اس کا پہلی

دفعہ میں دایاں ہاتھ اور دوسری دفعہ بایاں پیر کاٹ دیا جائے گا کیونکہ اس طرح کرنے میں چلنے اور پکڑنے کی قوت سے محروم کر دیتا ہے۔
جس حدیث میں تیسری مرتبہ میں دوسرا ہاتھ اور چوتھی مرتبہ میں دوسرا پیر کاٹنے کا حکم ہے۔ اولاً محدثین نے اس کی صحت میں کلام کیا ہے ثانیاً اگر وہ حدیث صحیح ہو تو اس صورت میں علماء اسے سیاست پر محمول کرتے ہیں۔

چوری کے مفاسد

چوری کی بُرائی کی وجہ یہی نہیں ہے کہ چور دوسرے کے مال کو اس کی اجازت کے بغیر چپکے سے تصرف میں لاتا ہے بلکہ یہ بھی ہے کہ ایک شخص اپنی جائز محنت سے کما کر جو کچھ حاصل کرتا ہے۔ دوسرا بغیر کسی جائز محنت کے بے وجہ اس پر قبضہ کرکے پہلے کی محنت کو اکارت کر دیتا ہے اور اگر اس کی روک تھام نہ کی جائے تو کسی کو اپنی محنت کا پھل نہ ملے۔ اس کے علاوہ اس ایک برائی میں کتنی برائیاں شامل ہیں۔ بے وجہ دوسروں کے گھر میں داخل ہونا۔ اس کی ملکیت کا جائزہ لینا جو کہ فعل کے خبث باطن کو ظاہر کرتا ہے۔ چوری کی بدولت ناحق خون بھی بہتا ہے اور بے گناہ جانیں بھی ضائع جاتی ہیں اور چونکہ چور بڑے بڑے سرمائے پر کسی جائز محنت کے بغیر قبضہ پالیتا ہے اس لیے وہ اس کو بڑی بیدردی سے ضائع کر دیتا ہے اور خود بھی اس سے بہت کم فائدہ اٹھاتا ہے بلکہ اس دولت کا بڑا حصہ اخفائے جرم کی خاطر برباد کر ڈالتا ہے۔
اہل عرب میں شاید عام افلاس کے سبب سے یہ بیماری اتنی پھیلی تھی کہ قرآن نے اس کے انسداد کے لیے مسلمان ہونے والوں سے اس کی بیعت لینی بھی ضروری سمجھی۔ سورہ ممتحنہ میں ان چند باتوں کا ذکر ہے جن کا عہد مسلمان ہونے والی خواتین سے لیا جاتا تھا۔ ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ چوری نہ کریں گی۔ فتح مکہ کے دن جب مکہ کی خواتین اسلام قبول کرنے آئی ہیں تو آپ نے ان سے بھی عہد لیا۔ اس موقع پر ابوسفیان کی بی بی ہندہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یا رسول اللہ ابوسفیان ایک بخیل آدمی ہیں، وہ میرے اور میرے بچوں کے لیے پورا خرچ نہیں دیتے مگر یہ کہ میں ان کے مال سے کچھ چھپا کر لے لوں۔ فرمایا کہ تم ان کے مال سے اتنا لیا کرو جو انصاف اور دستور کے مطابق تمہارے اور تمہارے بچوں کے لیے کافی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس کا نفقہ ہمارے ذمہ ہو اگر ہم اس کو ادا نہ کریں اور وہ حسب ضرورت پوچھے بغیر ہمارے حساب سے کچھ لے لے تو

چوری نہیں ہے ۔

چور کی سزا کی حیثیت

۹۷ ۔ ان کے کیے کی پاداش میں اللہ کی طرف سے عبرتناک سزا کے طور پر اور اللہ غالب حکمت والا ہے ۔
چونکہ غالب ہے اس لیے اسے حق ہے کہ جو چاہے قانون نافذ کرے کوئی چون وچرا نہیں کر سکتا ۔
لیکن چونکہ حکمت والا بھی ہے اس لیے یہ احتمال نہیں کہ محض اپنے اختیار کامل سے کام لے کر کوئی قانون بے موقع نافذ کر دے ، نیز وہ اپنے ناتواں بندوں کے اموال کی حفاظت کا کوئی انتظام نہ کر سکے یہ اس کی عزت اور غلبہ کے منافی ہے اور چوروں کو یوں ہی چھوڑ دے یہ اس کی حکمت کے خلاف ہے ۔ آیت میں بما کسبا نکالا من اللہ کہہ کر اشارہ کر دیا کہ جو سزا چور کو دی جا رہی ہے وہ مال مسروق کا بدلا نہیں بلکہ اس کے فعل سرقہ کی سزا ہے تاکہ اسے اور دوسرے چوروں کو تنبیہ ہو جائے ۔ بلاشبہ جہاں یہ حد جاری ہوتی ہے وہاں دو چار ہی کی سزا پانے کے بعد چوری کا دروازہ قطعاً بند ہو جاتا ہے ۔ آج کل مدعیان تہذیب اس قسم کی سزاؤں کو وحشیانہ سزا بتاتے ہیں لیکن چوری کرنا اگر ان کے نزدیک کوئی مہذب فعل نہیں ہے تو یقیناً آپ کی مہذب سزا اس غیر مہذب دستور کے استیصال کا جواب نہیں ہے ۔ اگر تھوڑی سی وحشت کر کے بہت سے چور مہذب بنائے جا سکتے ہیں تو تہذیب کے علمبرداروں کو خوش ہونا چاہیے کہ ان کے تہذیبی مشن میں اس وحشت سے مدد مل رہی ہے ۔ بعض نام نہاد مفسر قرآن بھی اس کوشش میں ہیں کہ قطع ید کی سزا کو چوری کی انتہائی سزا قرار دے کر اس سے ہلکی سزاؤں کا اختیار شریعت حقہ سے حاصل کر لیں ، مگر مشکل یہ ہے کہ نہ تو چوری کی اس سے ہلکی سزا قرآن کریم میں کہیں موجود ہے اور نہ عہد نبوت وصحابہ میں اس کی کوئی نظیر پائی گئی ۔ کیا کوئی شخص یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ اتنے طویل عرصہ میں جتنے چور پکڑے گئے ان میں ایک بھی ابتدائی چور نہ تھا جس پر کم از کم بیان جواز ہی کے لیے قطع ید سے کوئی ہلکی ابتدائی سزا جاری کی جاتی ۔

کسی ملحد نے پرانے زمانے میں اس حد سرقہ پر یہ بھی شبہ کیا تھا کہ جب شریعت نے ایک ہاتھ کی دیت پانچ سو دینار رکھی ہے تو اتنا قیمتی ہاتھ جس کے کٹنے پر پانچ سو دینار واجب ہوں دس درہم کی چوری میں کس طرح کاٹا جا سکتا ہے ۔ ایک عالم نے اس کا جواب دیا انھا لما کانت امینۃ کانت ثمینۃ ، فلما خانت ھانت ، یعنی جو ہاتھ امین تھا قیمتی تھا جب چوری کر کے خائن ہوا تو ذلیل ہو گیا ۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

دراصل اس فقرے میں قطع ید کے دو سبب بتاتے ہیں ایک یہ کہ یہ مجرم کے جرم سرقہ کی سزا ہے دوسرا یہ کہ یہ سزا نکال ہے۔ نکال کے معنے کسی کو ایسی سزا دینے کے ہیں جو دیکھنے والوں کے لیے تازیانۂ عبرت ہو۔ یہ دونوں باتیں چوری کی سزا میں بیک وقت مطلوب ہیں یعنی یہ پاداش عمل بھی ہے اور دوسروں کے لیے سامان عبرت بھی۔ جو لوگ ان دونوں پہلوؤں پر نظر نہیں ڈالتے وہ بسا اوقات اسی طغیان کا شکار ہو جاتے ہیں کہ جرم کے اعتبار سے سزا زیادہ سخت ہے حالانکہ اس سزا میں صرف اس جرم ہی کی سزا نہیں ہے جو مجرم سے سرزد ہوا ہے بلکہ ان بہت سے جرائم کی روک تھام بھی اس میں شامل ہے جن کا وہ اپنے فعل سے محرک بن سکتا ہے اگر اس کو ایسی سزا دی جاتی جو دوسروں کے حوصلے پست کردے۔

یہ امر واقعہ ہے کہ جنس کی طرح مال کی بھوک بھی انسان کے اندر بڑی شدید ہے اگر اس حرص کو ذرا ڈھیل مل جاتی تو پھر اس کے نتائج کیا کچھ نکل سکتے ہیں اس کا اندازہ کرنے کے لیے موجودہ زمانے کے حالات میں کافی سامان بصیرت ہے۔

اس زمانے کے کسی متمدن سے متمدن ملک کے صرف ایک سال کے وہ ہولناک جرائم جمع کر لیے جائیں جو محض چوری کی وجہ سے پیش آتے ہیں تو وہ آنکھیں کھول دینے کے لیے کافی ہیں، لیکن تہذیب جدید کے مارے ہوئے انسان کی پیشانی یہ سن کر تو عرق آلود ہو جاتی ہے کہ چوری پر کسی کا ہاتھ کٹ جائے لیکن ان ہزاروں دل ہلا دینے والے واقعات سے اس کا دل نہیں پسیجتا جو بالواسطہ یا بلاواسطہ چوری کی راہ سے ظہور میں آتے ہیں۔ چوری کوئی منفرد جرم نہیں بلکہ یہ جرائم کا مجموعہ ہے جس سے قسم قسم کے ہولناک جرائم جنم لیتے ہیں۔ اگر چوری کی راہ مسدود ہو جاتے تو یہ یا تو بالکل ناپید ہو جائیں گے یا کم از کم یہ کہ انتہائی حد تک کم ضرور ہو جائیں گے۔ چنانچہ تجربہ گواہ ہے کہ چوری پر ہاتھ کاٹنے کی سزا سے نہ صرف چوری کے واقعات انتہائی حد تک کم ہو گئے بلکہ دوسرے جرائم میں بھی کمی آگئی۔ پھر اگر کچھ ہاتھ کٹ جانے سے ہزاروں سر، ہزاروں گھر، اور ہزاروں آبروئیں محفوظ ہو جائیں، ظلم و شقاوت اور حرث و نسل کی بربادی کے بہت سے ابواب کا خاتمہ ہو جاتے تو عقل سلیم تو یہی کہتی ہے کہ یہ مہنگا سودا نہیں ہے بلکہ نہایت بابرکت سودا ہے [1]

ہاتھ کی قیمت اسلام میں

شیخ الاسلام نے اس کی طرف اجمالی اشارہ کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ اعضاء انسانی اسلام میں

[1] تدبر قرآن

بڑی قدر وقیمت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے قانون میں صراحت ہے کہ اگر کوئی کسی انسان کا ہاتھ کاٹ دے تو ملت اسلام کی عدالت سے پانچ سو دینار کی سزا ملے گی اور یہ رقم حکومت کے خزانے میں داخل کرنے کے بجائے اس شخص کو دی جائے گی جس کا ہاتھ کاٹا گیا ہے۔ حضور انور کا ارشاد ہے کہ :

ایک ہاتھ میں آدھی دیت ہے۔

حدیث ہے کہ اگر کوئی ایک شخص کی ایک انگلی کاٹ دے تو اس کی دیت میں دس اونٹ دلائی جائے گی۔ اسلام میں ایک انگلی کی قیمت دس اونٹ ہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :

دونوں ہاتھ اور پاؤں کی انگلیوں کی دیت برابر ہے، ہر انگلی کی دیت دس اونٹ ہیں۔

غور کریں کہ جس ہاتھ کی قیمت اسلام میں پانچ سو دینار ہے وہ محض دس درہم کی چوری پر تُرنت کاٹ دیا جاتا ہے اور اس سلسلے میں اسلام اس پر کوئی رحم نہیں کرتا۔ اس سے بآسانی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ اسلامی قانون میں پُرامن شہری زندگی کی کیا اہمیت ہے۔ اور اسے قائم رکھنے کے لیے وہ کس سختی سے کام لیتا ہے۔

حافظ ابن القیم اعلام الموقعین میں رقمطراز ہیں۔

ایک طرف چوتھائی دینار میں ہاتھ کاٹنے کا حکم اور دوسری طرف ہاتھ کی دیت پانچ سو دینار مقرر کرنا انتہائی حکمت و مصلحت پر مبنی ہے۔ اس لیے کہ دونوں جگہ احتیاط ہے اور مال و اعضاء دونوں کی حرمت کا لحاظ ہے۔ چوتھائی دینار میں ہاتھ کاٹنا مال کی حفاظت کے لیے ہے اور پانچ سو دینار دیت مقرر کرنا ہاتھ کی حفاظت کی خاطر ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اسلام کے پیش نظر انسان کے مال کی بھی حفاظت ہے اور اس کے ہاتھ کی بھی۔ یعنی دونوں کی حرمت باقی رہے۔ اس کی صورت اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے جو اسلامی قانون نے اختیار کی ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں :

اگر ہاتھ کی دیت صرف چوتھائی دینار ہوتی تو ہاتھوں کا قانونی تحفظ نہ ہوتا اور اگر نصاب سرقہ پانچ سو دینار مقرر کیا جاتا تو پھر غریبوں کے اموال کے تحفظ کا

سامان نہ ہوتا اور چوریاں زیادہ ہوتیں۔ لہٰذا حکمت کے تقاضے سے دونوں پہلوؤں کا لحاظ رکھا گیا اور اس طرح کرنے میں دونوں کی قدر وقیمت باقی رہی ہے۔
قاضی عبدالوہاب مالکی نے کیا اچھی بات فرمائی ہے کہ ؎

صیانۃ العضو اغلاھا و ارخصھا
خیانۃ المال فافھم حکمۃ الباری

اور امام شافعی کی طرف منسوب کر کے لکھا ہے ؎

ھناک مظلومۃ غالت بقیمتھا
وھٰھنا ظلمت ھانت علی الباری

اور شمس الدین الکردری فرماتے ہیں ؎

نفیمۃ الید نصف الالف من ذھب
فان تعدت فلا تسوی بدینار

سب کا حاصل یہ ہے کہ ہاتھ جب تک برائی سے بچ کر رہا قیمتی رہا اور جب برائی کے کرایا بے قیمت ہو کر رہ گیا۔

چوری میں ہاتھ کیوں کاٹا جاتا ہے

شاید یہاں آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ چوری میں ہاتھ کیوں کاٹا جاتا ہے جب کہ دوسرے جرائم میں اعضا کاٹنے کا حکم نہیں ہے۔ بات معقول ہے مگر ذرا اس پر غور فرمائیے کہ اگر ہر مجرم کا وہ عضو کاٹ دیا جاتا جس سے وہ ارتکاب جرم کرتا ہے تو انسانی معاشرے میں ایک تباہی آ جاتی اور اصلاح کی جگہ اس سے بڑی خرابیوں سے معاشرہ دوچار ہو جاتا۔ اگر بدنظری کے جرم میں آنکھیں نکال لی جاتیں، برائی سننے کی پاداش میں اس کی قوتِ شنوائی ختم کر دی جاتی، بدزبانی کرنے والے کی زبان قلم کر دی جاتی، زانی کو عضوِ تناسل سے محروم کر دیا جاتا تو پھر کیا ہوتا، یہی ناکہ سزائیں زواجر نہ ہوتیں بلکہ انسانی زندگی کے لیے بربادی اور تباہی کا سامان ہو جاتیں۔ حالانکہ مقصد جرائم کو ختم کرنا اور انسانوں کی اصلاح ہے۔ قرآن و نبوت کا پیش نہاد مٹانا نہیں بلکہ بنانا ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے انسان میں جتنی قوتیں رکھی ہیں انہیں صحیح مصرف میں خرچ کرنا سکھائیں، اور انسانی زندگی میں اعتدال پیدا کریں۔ یہی حال حدود کا ہے۔ یعنی بندوں کو ظلم و جور سے ہٹا کر

صحیح راہ پر ڈالنا اور ایسی سزا دینا جس سے نفسیاتی طور پر دوسرے انسان متاثر ہوں اور ان کو اس طرح کے کاموں کی جرأت نہ ہو سکے پاتے۔ ہر جرم میں قطع اعضاء سے یہ منشا پورا نہیں ہوتا۔

یہ سوال کہ چور کا ہاتھ ہی کیوں کاٹا جاتا ہے اس کی وجہ جہاں تک میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ چور چھپ چھپا کر چوری کرتا ہے اور بھاگتا ہے۔ گویا اس کی آرزو یہ ہوتی ہے کہ دوسروں کا مال لے کے بھاگے اور کسی کو کانوں کان پتہ نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اسی کردار کی بنا پر اس کی سزا ایسی تجویز کی کہ اس کے چھپانے کے جذبات کا ردعمل سامنے آجائے اور ساری دنیا پر عیاں ہو جائے کہ یہ شخص چور ہے۔ حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حدود پر جو تبصرہ فرمایا ہے وہ بھی سننے کے لائق ہے فرماتے ہیں:

"حق سبحانہ نے جن نافرمانیوں اور قانون شکنی پر حد مقرر کی ہے وہ ایسی نافرمانیاں ہیں جن میں گوناں گوں اور مختلف قسم کے مفاسد ہیں۔ ان جرائم کی وجہ سے زمین میں فتنہ و فساد کی گرم بازاری ہوتی ہے۔ مسلمان اور دوسرے شہریوں کے سکون و اطمینان اور پرامن شہری زندگی پر ڈاکہ زنی ہوتی ہے۔ ان میں سے بعض جرائم ایک بری لت کی حیثیت رکھتے ہیں، جب انسانی قلوب میں یہ پیوست ہو جاتی ہے تو انسان کو برے کاموں پر ابھارتی ہے۔ اور ہر مظلوم کا حال یہ ہوتا ہے کہ غریب بسا اوقات اپنے سے ان جرائم کے دور کرنے کی قدرت نہیں رکھتا ہے۔ لہٰذا ان نافرمانیوں اور گناہ کے ایسے کاموں میں صرف عذابِ آخرت سے ڈرانا کافی نہیں ہوتا بلکہ ایسی سخت تکلیف پہنچانے اور ملامت کرنے کی بھی ضرورت ہے جو ان کو ان کاموں سے روک دے جیسے جنس کی ناروا خواہش کردہ شہوت اور عورتوں کے حسن و جمال سے برانگیختہ ہوتی ہے اور یہ فعل عموماً فاعل و مفعول کی باہمی رضامندی سے انجام پاتا ہے لہٰذا اگر اس جرم کے لیے سزا متعین نہ ہو تو روکنا اور انسانوں کی آبرو کو محفوظ رکھنا مشکل ہوتا۔ اسی طرح چوری ہے کہ انسان کو جب کوئی روزگار میسر نہیں آتا تو وہ چوری کی طرف مائل ہوتا ہے اور یہ کام اس طرح چھپ کر کرتا ہے کہ کسی کی نگاہ نہ پڑنے پاتے، یا ڈکیتی کہ مظلوم میں اس کے دفعیہ کی تاب نہیں ہوتی۔ اس لیے ضروری ہے کہ اس کی سزا بھی یقینی طور پر سخت ہو۔ چوری کی سزا میں ہاتھ کاٹ جانا یقیناً ایک دردناک منظر ہے۔ ہاتھ کا کٹا ہوا ہونا ایک عار کی چیز ہے اور اس سزا کے اثر کو لوگوں سے چھپانا بھی چاہے تو چھپا نہیں سکتا۔"

عدالت کو سزا معاف کرنے کا حق نہیں

آیت میں من اللہ کے اضافہ سے اشارہ کر دیا ہے کہ جب مقدمہ عدالت میں پہنچ جائے اور چور کی چوری ثابت ہو جائے تو پھر دنیا کی کوئی طاقت اسے سزا سے نہیں بچا سکتی۔ کیونکہ یہ وہ سزا ہے جو اللہ کی جانب سے ہے۔ اس میں انسان کو دم مارنے کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ یہ شرط ضرور ہے کہ چوری کے ثبوت میں کسی قسم کا کوئی شبہ نہ ہے۔ اگر ذرا سا شبہ بھی پیدا ہو گیا تو پھر کسی کو ہاتھ جیسی نعمت سے محروم نہ کیا جائے گا۔

ہاں جب تک معاملہ عدالت میں نہ پہنچے صاحب معاملہ کو اختیار ہے کہ وہ معاف کر دے حضرت زبیر کا بیان ہے کہ معاملہ جب عدالت میں پہنچ جائے تو اس میں سفارش کرنے والے اور سفارش قبول کرنے والے دونوں پر اللہ کی لعنت ہے۔

حافظ زیلعی نے نصب الرایہ میں یہ واقعہ لکھا ہے کہ حضرت صفوان بن امیہ مسجد میں سر کے نیچے چادر رکھ کر سو رہے تھے، ایک شخص آیا اور اس نے آہستہ سے وہ چادر کھینچ لی اور بھاگنا چاہا مگر پکڑا گیا۔ حضرت صفوان اسے ساتھ لے کر دربار نبوت میں حاضر ہوئے اور واقعہ بیان کیا۔ حضور انور نے ثبوت کے بعد ہاتھ کاٹنے کا حکم دیا، حضرت صفوان کو یہ دیکھ کر رحم آگیا۔ انہوں نے کہا یا رسول اللہ میں نے یہ چادر اسے ہبہ کر دی ہے، مطلب یہ تھا کہ درگزر فرمائیے۔ آپ نے فرمایا:

میرے پاس لانے سے پہلے ہی کیوں نہ ایسا کیا؟

یعنی پہلے ہی کیوں نہ معاف کر دیا، یہاں کیوں لائے۔ اب عدالت میں پیش ہو جانے کے بعد معافی کی کوئی صورت نہیں۔ چنانچہ اس چور کا حسب قانون ہاتھ کاٹا گیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ چور جب حاضر عدالت ہو جائے اور اس کا جرم ثابت ہو جائے تو پھر عدالت کے فرائض میں سزا دینا ہے۔ خود مدعی اور صاحب مال بھی معاف کرنا چاہے تو اس کا مجاز نہیں ہے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود کا بیان ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

حدود کا معاملہ جب تک حکام کے پاس نہ پہنچے اس وقت تک لوگ خود معاف کر سکتے ہیں لیکن جب حکام تک مقدمہ آجائے تو وہ کتاب اللہ کے مطابق ہی فیصلہ کریں۔

(مجمع الزوائد ج ۶ ص ۲۵۹)

حضرت عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:
باہم حدود معاف کر دیا کرو اس لیے کہ حد کا جو معاملہ میرے پاس پہنچ گیا اس میں حد واجب ہو گئی۔ (ابو داؤد)

چور کی سزا میں رحم کی اپیل نہیں

یہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس سزا میں رحم کی کوئی اپیل نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ سزا اگرچہ عبرتناک ہے مگر جرم کے مطابق ہے اور انسانی طبیعت خواہ جس قدر بھی اس سے متاثر ہو مگر اسے مجرم کو سزا دینے میں عملاً رحم نہ کرنا چاہیے۔ اللہ کی ذات عزیز اور غالب ہے اس وجہ سے اس کو حق ہے جو چاہے حکم کرے۔ اور حکیم ہے اس لیے اس کا حکم حکمت پر مبنی ہے اس کے بندوں کو نہ تو اس کے سے سرتابی جائز ہے اور نہ یہ زیبا ہے کہ وہ اس کے کسی حکم کو خلاف حکمت قرار دیں۔ اس میں رد و بدل جائز نہیں ہے۔ انسان قانون ساز نہیں ہے قانون کا نافذ کرنے والا ہے، زنا کی سزا جہاں قرآن نے بتائی ہے وہاں یہ بات صراحتہً کہہ دی ہے۔

لا تاخذکم رافۃ فی دین اللہ

تم کو ان دونوں پر اللہ کے قانون کے بارے میں کوئی رحم نہ آئے۔

قرآن کے قانون سرقہ کا تقابلی مطالعہ

اس موضوع پر عبدالقادر عودہ نے التشریع الجنائی الاسلامی کی جلد اول میں اچھی بحث کی ہے، ہم یہاں کچھ اضافہ کے ساتھ ان کی بحث کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

اسلام نے چوری کی جو سزا مقرر کی ہے اس کی تفصیل آپ پڑھ چکے ہیں، اب آپ اس کے مقابلے میں دوسرے قوانین کا مطالعہ کریں کہ وہ چور کی کیا سزا تجویز کرتے ہیں۔ اس سلسلے میں بنی اسرائیل کے یہاں جو قانون ملتا ہے وہ یہ ہے:

۱۔ اگر چور نقب زنی کرتے ہوئے اور کوئی مار بیٹھے اور وہ مر جائے تو اس کے لیے خون نہ کیا جائے۔ (خروج ۲۲-)

۲۔ اگر چوری کی چیز چور کے ہاتھ میں زندہ پائی جائے تو وہ ایک ایک کے دو دوے۔ (خروج)

کوئی تاکستان یا کھیت کہلاتے اور چار پلتے اس میں چھوڑ دے یا دوسروں کے میدان میں چرائے تو اپنا اچھا سے اچھا کھیت اور بہتر سے بہتر انگوری باغ اس کے بدلے میں دے۔

۴۔ تم چوری نہ کرو اور نہ جھوٹا معاملہ کرو۔

مصر قدیم نے چوری کے سلسلے میں جو قانون بنایا تھا وہ یہ تھا

مصر میں چوری کوئی بڑا جرم نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ وہاں چوری کا ایسا عجیب و غریب طریقہ رائج تھا جس کی نظیر دنیا کے کسی ملک اور کسی قوم میں تلاش نہیں کی جا سکتی۔ جس کی تفصیل یہ ہے کہ جو شخص پولیس کا افسر ہوتا تھا وہی چوروں کا سب سے بڑا سرغنہ ہوتا تھا۔ جو شخص چوری کا پیشہ اختیار کرتا وہ اپنا نام پتہ مذکورہ بالا افسر کے دفتر میں درج کراتا اور جب چوری کرتا تو اس کی پوری کیفیت بھی اگر درج کراتا، رپورٹ ہونے پر پولیس چوتھائی مال بطور تاوان مالک سے لے کر باقی مال واپس کر دیتی، وصول شدہ مال میں سے کچھ حصہ چور کو ملتا اور کچھ سرکاری خزانے میں داخل ہو جاتا، اور بس۔ (نظام سلطنت اکبر شاہ)

ہندوستان کے مقنن منو مہاراج کا جو قانون منو سمرتی میں لکھا ہے یہ ہے:

خاندانی عورت یا عمدہ جواہرات کو جو چرائے تو اسے قتل کر دینا چاہیے۔ جو چور نقب زنی کر کے رات میں چوری کرتے ہیں۔ ان کے دونوں ہاتھ کاٹ کر ان کی تشہیر کرنی چاہیے۔ جو چور اول مرتبہ اول بار گرہ کاٹے اس کا انگوٹھا اور انگوٹھے کے پاس کی انگلی کاٹنی چاہیے اور دوسری بار ارتکاب جرم ہو تو ہاتھ پاؤں کاٹ دینا چاہیے اور تیسری مرتبہ میں قتل کر دینا چاہیے۔ ۲۷۴ ۲۷۳

سرکار برطانیہ کا بنایا ہوا قانون یہ ہے:

جو کوئی شخص سرقہ کا مرتکب ہو اس کو دونوں قسموں میں سے کسی قسم کی سزا دی جائے گی قید کی سزا دی جائے گی جس کی میعاد تین برس تک ہو سکتی ہے یا جرمانے کی سزا یا دونوں سزائیں ہوں گی۔

ان سب کے مقابلے میں اسلام نے چوری کی جو سزا متعین کی ہے وہ انسان کی نفسیات سے بالکل قریب تر ہے کہ اس سزا کا تصور ہی اسے لرزہ براندام کر دیتا ہے۔ تجربہ کے لیے ان قوانین کے ساتھ اسلام کا قانون جاری کر دیا جائے تو بڑی آسانی سے اندازہ ہو جائے گا کہ اس سزا میں

کیا تاثیر ہے۔ اگر چند مہینوں ہی اس سزا کے اجراء کے بعد جرم نہ ہونے کے درجہ میں نہ ہو جائے تو پھر جو چاہیں کہہ سکتے ہیں۔

تاریخ گواہ ہے کہ جہاں بھی اور جب بھی یہ قانون رائج ہوا چوری کا نام و نشان مٹ گیا۔

چور کی چوری سے توبہ اور اصلاح

۹۸۔ پھر جس نے اپنے اس ظلم کے بعد توبہ کر لی اور اپنے کو ٹھیک کر لیا تو اللہ تعالیٰ اس پر نظر عنایت فرمائے گا بے شک اللہ غفور و رحیم ہے۔ یعنی توبہ اگر ٹھیک ٹھیک ہو جس کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ چوری کا مال مالک کو واپس کرے اور اگر تلف ہو گیا ہو تو ضمان دے اور اگر ضمان نہ دے سکے تو معاف کرائے اور اپنے فعل پر نادم ہو اور آئندہ کے لیے اس سے مجتنب رہنے کا عزم رکھے تو اس طرح کی توبہ سے اُمید ہے کہ حق تعالیٰ اخروی عقوبت جس کے مقابلہ میں دنیوی سزا کچھ حقیقت نہیں ہے اس پر سے اٹھا لے[1]

اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کا ہاتھ نہ کاٹا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ہاتھ کٹنے کے بعد جو شخص توبہ کرے اور اپنے نفس کو چوری سے پاک کر کے اللہ کا صالح بندہ بن جائے وہ اللہ کے غضب سے بچ جائے گا۔ اور اللہ اس کے دامن سے اس داغ کو دھو دے گا۔ لیکن اگر کسی شخص نے ہاتھ کٹوانے کے بعد بھی اپنے آپ کو بدنیتی سے پاک نہ کیا اور وہی گندے جذبات اپنے اندر پرورش کیے جن کی بنا پر اس نے چوری کی اور اس کا ہاتھ کاٹا گیا۔ تو اس کے معنے یہ نہیں کہ ہاتھ تو اس کے بدن سے جدا ہو گیا مگر چوری اس کے نفس میں بدستور موجود رہی اس وجہ سے وہ خدا کے غضب کا اسی طرح مستحق رہے گا جس طرح ہاتھ کٹنے سے پہلے تھا۔ اسی لیے قرآن عزیز چور کو ہدایت کرتا ہے کہ وہ اللہ سے معافی مانگے اور اپنے نفس کی اصلاح کرے۔ کیونکہ ہاتھ کاٹنا تو انتظام تمدن کے لیے ہے۔ اس سزا سے نفس پاک نہیں ہو سکتا۔ نفس کی پاکی صرف توبہ اور رجوع الی اللہ سے حاصل ہو سکتی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق احادیث میں ہے کہ ایک چور کا جب آپ کے حکم سے ہاتھ کاٹا جا چکا تو آپ نے اسے اپنے پاس بلایا اور اس سے فرمایا کہ استغفر اللہ و اتوب الیہ کہہ اس نے آپ کی تلقین کے مطابق یہ الفاظ کہے، پھر آپ نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کے حق میں دعا فرمائی کہ اللھم تب علیہ خدایا اسے معاف کر دے [1]

اس آیت میں لفظ ظلم اپنے فاعل کی طرف بھی مضاف ہو سکتا ہے اور اپنے مفعول کی طرف بھی۔ فاعل تو خود چوری کرنے والا ہے اور مفعول وہ ہے جس کی چوری ہوتی ہے۔ مفعول کی طرف مضاف ہونے کی صورت میں اس کے معنے یہ ہونگے کہ اس ظلم کے بعد جس کا اس نے اس مظلوم کا مال چرا کر اس پر کیا ہے اور پہلی صورت میں معنے یہ ہوں گے۔ اس ظلم کے بعد جو اس ظالم نے اپنے آپ پر کیا ہے اور دونوں معنے یہاں صحیح ہیں لیکن زیادہ راجح دوسرے معنے ہیں۔ توبہ کے بعد اصلاح کا ذکر درحقیقت توبہ کی ایک لازمی شرط کی حیثیت سے ہے۔ بندہ جب کوئی اس طرح کا جرم کرتا ہے تو ایک تو وہ خدا کی نافرمانی کرتا ہے، دوسرے وہ اپنے نفس کی یا دوسروں کی حق تلفی کرتا ہے۔ خدا سے معاملہ درست کرنے کے لیے تا حدِ امکان اپنے رویّہ کی اصلاح اور اپنے ظلم کی تلافی ناگزیر ہے۔ بغیر اس دوطرفہ عمل کے توبہ بالکل بے معنے ہو کر رہ جاتی ہے [2]

یہ آیت اس بات کی صریح دلیل ہے کہ اجرائے حد کفارۂ سرقہ کے لیے کافی نہیں ہے۔ سزا ملنے کے بعد جب تک توبہ نہ کرے اور اصلاحِ حال نہ کرے تو اس گناہ کی سزا اخروی معاف نہ ہوگی۔ اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہی ہے کہ حدود کوا فر نہیں بلکہ زواجر ہیں۔ یعنی یہاں جو سزائیں دی جاتی ہیں وہ انتظامِ تمدن کے لیے اور معاشرہ کو برائی سے بچانے کے لیے ہیں اس لیے نہیں کہ اس کے ذریعے اخروی سزا کا کفارہ ہوگا۔

ایمان باللہ اور تصورِ سیاست

۹۹۔ کیا تم نہیں جانتے کہ زمین و آسمان کی بادشاہت اللہ ہی کی ہے وہی جسے چاہے سزا دے اور جسے چاہے معاف کرے اور اللہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔ یعنی جب حقیقی سلطنت اور حکومت اسی کی ہے تو بلاشبہ اسی کو یہ اختیار ہوگا کہ جسے مناسب جانے معاف کرے اور جسے اپنی حکمت وعدل کے موافق سزا دینا چاہے سزا دے اور نہ صرف یہ کہ اسے معاف کر دینے اور سزا دینے کے کلی اختیارات حاصل ہیں بلکہ ان اختیارات کے استعمال سے کوئی روکنے والا بھی نہیں ہے کیونکہ وہ ہر چیز پر پوری قدرت رکھتا ہے [3]

---

[1] تفہیم القرآن [2] تدبر قرآن [3] فوائد شیخ الاسلام

یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ تعالیٰ انسانوں کا رب اور الٰہ ہی نہیں بلکہ ملک بادشاہ اور مالک بھی ہے جس کا کھلا ہوا مطلب یہ ہے کہ انسان کا حقیقی بادشاہ، حاکم اور قانون ساز اللہ تعالیٰ ہی ہے اور یہ اس کی مسلمہ اور اہم صفتوں میں سے ایک ہے۔ جب تک انسان کو اس صفت کا یقین نہ ہو وہ اللہ پر ایمان رکھنے والا مانا ہی نہیں جا سکتا۔ اسی بنا پر آغاز الم تعلم سے کیا گیا ہے۔ بظاہر مخاطب حضور انور ہیں لیکن سنایا مسلمانوں کو جا رہا ہے کہ زمین و آسمان میں بادشاہت اللہ کی ہے۔ اس وجہ سے ہر ایک کا فرض ہے کہ وہ اپنے آپ کو اللہ کے قانون کے تابع بنائے، نہ کوئی اس سے بھاگنے کی کوشش کرے، نہ کوئی اس سے دوسروں کو بچانے کی تدبیر کرے۔ گویا مخاطبوں کو درس توحید دیا جا رہا ہے کہ توحید صرف یہی نہیں ہے کہ رکوع و سجود اسے کیا جائے یہ بھی توحید ہے کہ یہ یقین پیدا کیا جائے کہ زمین کا ایک ایک ذرہ اللہ کی مِلک ہے اور یہاں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے وہ اللہ کی مِلک ہے جب مِلک بھی اس کی اور مُلک بھی اس کا یعنی مالک بھی وہی اور بادشاہ بھی وہی ہے تو پھر اسے اپنی ملک میں پورا تصرف حاصل ہے اور اپنے ملک میں حکم کے نافذ کرنے سے اسے کون روک سکتا ہے اعلانِ شہنشاہت کے بعد اپنی قدرت کا اعلان یہ بتانے کے لیے ہے کہ بندوں کے نفع و نقصان کا رشتہ اسی سے وابستہ ہے۔ یہ بات اس وجہ سے ضروری تھی کہ جو سیاسی فوجداری احکام اس سورت میں بیان ہوئے ہیں پہلی امتیں ان ہی میں ڈگمگاتی ہیں۔ انہوں نے ان سے بچنے کے لیے چور دروازے نکال لیے یہاں تک کہ یہ تمام قوانین بے اثر ہو کر رہ گئے۔ اگر اس کی حقیقت کا کھوج لگایا جائے تو یہ بات صاف نظر آئے گی کہ ان قوموں نے توحید کی وہ حقیقت فراموش کر دی جس کی اس آیت میں یاددہانی کرائی گئی ہے۔

يَا أَيُّهَا الرَّسُولُ لَا يَحْزُنْكَ الَّذِينَ يُسَارِعُونَ فِي الْكُفْرِ مِنَ الَّذِينَ
قَالُوا آمَنَّا بِأَفْوَاهِهِمْ وَلَمْ تُؤْمِنْ قُلُوبُهُمْ ۛ وَمِنَ الَّذِينَ هَادُوا ۛ سَمَّاعُونَ معٓ
لِلْكَذِبِ سَمَّاعُونَ لِقَوْمٍ آخَرِينَ لَمْ يَأْتُوكَ ۖ يُحَرِّفُونَ الْكَلِمَ مِنْ
بَعْدِ مَوَاضِعِهِ ۖ يَقُولُونَ إِنْ أُوتِيتُمْ هَٰذَا فَخُذُوهُ وَإِنْ
لَمْ تُؤْتَوْهُ فَاحْذَرُوا ۚ وَمَنْ يُرِدِ اللَّهُ فِتْنَتَهُ فَلَنْ تَمْلِكَ
لَهُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا ۚ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ لَمْ يُرِدِ اللَّهُ أَنْ يُطَهِّرَ
قُلُوبَهُمْ ۚ لَهُمْ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ ۖ وَلَهُمْ فِي الْآخِرَةِ عَذَابٌ
عَظِيمٌ ۝ سَمَّاعُونَ لِلْكَذِبِ أَكَّالُونَ لِلسُّحْتِ ۚ فَإِنْ
جَاءُوكَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ أَوْ أَعْرِضْ عَنْهُمْ ۖ وَإِنْ تُعْرِضْ
عَنْهُمْ فَلَنْ يَضُرُّوكَ شَيْئًا ۖ وَإِنْ حَكَمْتَ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ
بِالْقِسْطِ ۚ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُقْسِطِينَ ۝ وَكَيْفَ
٩ ع ١٠ يُحَكِّمُونَكَ وَعِنْدَهُمُ التَّوْرَاةُ فِيهَا حُكْمُ اللَّهِ ثُمَّ
يَتَوَلَّوْنَ مِنْ بَعْدِ ذَٰلِكَ ۚ وَمَا أُولَٰئِكَ بِالْمُؤْمِنِينَ ۝

اے پیغمبر وہ لوگ تمہارے لیے غمگینی کا باعث نہ ہوں جو کفر کی راہ میں تیز گامی کر رہے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو زبان سے ایمان کے مدعی ہیں مگر ان کے دل ایمان نہیں لاتے اور یا ان میں سے ہوں جو یہودی ہیں[100]۔ یہ لوگ جھوٹ کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں ان لوگوں کے لیے جو تمہارے پاس نہیں آتے جاسوس ہیں[101]۔ یہ لوگ کتاب اللہ کے حکموں کو باوجودیکہ ان کا صحیح محمل متعین ہے اپنے مقام سے ہٹا دیتے ہیں[102]، اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مانو نہ دیا جائے تو بچ کر رہو[103]، اور دیکھو جس کے لیے اللہ ہی فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیتا ہے تم اس کو اللہ کی گرفت سے بچا نہیں سکتے[104]۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ پاک کرنا نہیں چاہتا ہے ان کے لیے دُنیا میں رُسوائی ہے اور ان کے لیے آخرت میں بہت بڑا

عذاب ہے[۱۰۵]۔ یہ جھوٹ سننے والے اور حرام کھانے والے ہیں
لہٰذا اگر تمہارے پاس آئیں اور تم سے فیصلہ چاہیں تو آپ کو اختیار
ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کر دو یا ان سے کنارہ کش ہو جاؤ[۱۰۶]۔
اور اگر کنارہ کشی اختیار کرو گے تو یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے
اور اگر فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو بلاشبہ اللہ انصاف کرنے
والوں کو پسند کرتا ہے[۱۰۷]۔ اور یہ لوگ تمہیں منصف کیسے بناتے
ہیں جبکہ تورات ان کے پاس موجود ہے اس میں اللہ کا حکم ہے
اس کے باوجود وہ اس سے روگرداں ہیں واقعہ یہ ہے کہ یہ
ایمان والے نہیں ہیں[۱۰۸]۔

ایمان اور سیاست کی کش مکش

ان آیات میں منافقین اور یہود کی اس سازش کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جو انہوں نے قرآن کے سیاسی قوانین کی گرفت سے بچنے اور ایک دوسرے کو اس سے بچانے کے لیے باہم کر رکھی تھی۔ ان آیات کے نزول تک اگرچہ اسلام کا سیاسی اقتدار بروئے کار آ چکا تھا لیکن ابھی یہ اقتدار مکمل نہیں تھا۔ یہودی اس وقت تک اسلامی حکومت کے باقاعدہ اور قانونی شہری نہ تھے بلکہ اسلامی حکومت

کے ساتھ ان کے تعلقات معاہدات پر مبنی تھے۔ ان معاہدات کی رو سے یہودیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی حاصل تھی۔ اور ان کے مقدمات کے فیصلے انہی کے قوانین کے مطابق ان کے اپنے جج کرتے تھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس یا آپ کے مقرر کردہ قاضیوں کے پاس اپنے مقدمات لانے کے لیے وہ از روئے قانون مجبور نہ تھے لیکن یہ لوگ جن معاملات میں خود اپنے مذہبی قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرنا چاہتے تھے ان کا فیصلہ کرانے کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اس اُمید پر لاتے تھے کہ شاید آپ کی شریعت میں ان کے لیے کوئی دوسرا حکم ہو اور اس طرح وہ اپنے مذہبی قانون کی پیروی سے بچ جائیں۔ ان کی عدالتیں ویسے بھی قیام عدل و انصاف کے نقطہ نظر سے بالکل بے جان اور بے مصرف ہو چکی تھیں۔ اوّل تو یہود نے خود ہی قانون کو اپنے اغراض و مقاصد کے لیے مسخ کر کے بالکل بے اثر کر دیا تھا، دوسرے جھوٹ اور رشوت کا ان کی سوسائٹی میں اتنا ہنگامہ تھا کہ کسی معاملہ میں نہ گواہوں کی گواہی کام دیتی اور نہ عدالتوں کے انصاف کا کوئی وزن تھا۔ اقتدار کی یہ دوعملی اور یہودی عدالتوں کی انصاف فروشی ان لوگوں کے لیے ایک چور دروازہ فراہم کرتی تھی جو قانون کے تقاضوں سے گریز پائی اختیار کرنا چاہتے تھے۔ چنانچہ منافقین اور یہود اس صورت حال سے فائدہ اٹھانے کے لیے یہ سازش کرتے کہ جن معاملات میں ان کو توقع ہوتی کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت سے فیصلہ ان کے حسبِ منشا ہو جائے گا۔ ان کے لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے رجوع کرتے۔

یہاں خاص طور پر جس مقدمہ کی طرف اشارہ ہے وہ یہ تھا کہ خیبر کے معزز یہودی خاندانوں میں سے ایک عورت اور ایک مرد کے درمیان ناجائز تعلقات پائے گئے۔ تورات کی رُو سے ان کی سزا رجم تھی یعنی یہ کہ دونوں کو سنگسار کیا جائے لیکن یہودی اس سزا کو نافذ کرنا نہ چاہتے تھے اس لیے انہوں نے آپس میں مشورہ کیا کہ اس مقدمہ کا فیصلہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے . . . . کرایا جائے اگر آپ رجم کے سوا کوئی اور حکم دیں تو مان لیا جائے اور رجم ہی کا حکم دیں تو نہ مانا جائے۔ ان کا خیال تھا کہ حضور انور کو تورات کے احکام کی خبر نہیں اور اگر خبر بھی ہو تو یہ ایک نئی دعوت لے کر آئے ہیں تورات والا حکم کیوں دینے لگے بس بہتر ہے کہ معاملہ ان کے حضور میں پیش کر دیا جائے، مجرم سزا سے بھی بچ جائیں گے اور ذمہ داری بھی ہم پر نہ رہے گی۔ چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مقدمہ پیش ہوا، جیسا کہ آپ شیخ الاسلام کے افادات میں مطالعہ کریں گے ایمان و دیانت کی اس کشمکش میں یہودی اور منافقین چاہتے تھے کہ ایمان کے دعویدار بھی رہیں اور خدا کے

قانون سے بچے رہیں۔ قرآن نے ان آیات میں ان کی اسی دکھتی رگ پر انگلی رکھی ہے۔

۱۰۰۔ اے پیغمبر وہ لوگ تمہارے لیے غمگینی کا باعث نہ ہوں جو کفر کی راہ میں تیز گامی کر رہے ہیں خواہ وہ ان میں سے ہوں جو زبان سے ایمان کے مدعی ہیں مگر ان کے دل ایمان نہیں لاتے یا ان میں سے ہوں جو یہودی ہیں۔ یعنی منافقین اور یہود بنی قریظہ۔ پچھلی آیات میں ڈکیتی اور چوری وغیرہ کی حدود بیان کی گئی تھیں اب کچھ ان قوموں کی حالت سناتے ہیں جنہوں نے حدود اللہ میں تحریف کر کے اپنے کو عذاب عظیم کا مستحق ٹھہرایا۔ اس کا مفصل واقعہ بغوی نے معالم میں یہ لکھا ہے کہ خیبر کے ایک یہودی مرد اور عورت نے جو شادی شدہ تھے زنا کیا، باوجودیکہ تورات میں اس جرم کی سزا رجم سنگسار کرنا تھی مگر ان دونوں کی بڑائی مانع تھی کہ یہ سزا جاری کی جاتے۔ آپس میں یہ مشورہ ہوا کہ یہ شخص جو مدینہ میں ہے یعنی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان کی کتاب میں زانی کے لیے رجم کا حکم نہیں ہے کوڑے مارنے کا حکم ہے تو بنو قریظہ کے یہود میں سے کچھ لوگ ان کے پاس بھیجو کیونکہ وہ ان کے ہمسائے ہیں اور ان سے صلح کا معاہدہ بھی کر چکے ہیں وہ ان کا خیال معلوم کر لیں۔ چنانچہ ایک جماعت اس کام کے لیے روانہ کی گئی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا عندیہ معلوم کر لیں کہ زانی محصن کی کیا سزا تجویز کرتے ہیں۔ اگر وہ کوڑے مارنے کا حکم دیتے ہیں تو ان پر رکھ کر قبول کر لو اور رجم کا حکم دیں تو مت مانو۔ ان کے دریافت کرنے پر حضور نے فرمایا کہ تم میرے فیصلہ پر رضامند ہو گئے ہو۔ انہوں نے اقرار کر لیا۔ اللہ کی جانب سے جبریل رجم کا حکم لے آئے مگر وہ لوگ اپنے اقرار سے پھر گئے۔ آخر حضور نے فرمایا کہ فدک کا رہنے والا ابن صوریا تم میں کیسا شخص ہے۔ سب نے کہا کہ آج روئے زمین پر "شرائع موسویہ" کا اس سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں ہے۔ آپ نے اس کو بلوایا اور نہایت ہی شدید حلف لے کر پوچھا کہ تورات میں اس گناہ کی سزا کیا ہے، باوجودیکہ دوسرے یہود اس حکم کو چھپانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے تھے جس کا پردہ حضرت عبداللہ بن سلام کے ذریعے فاش ہو چکا تھا تاہم ابن صوریا نے جو ان کا معتمد تھا کسی نہ کسی وجہ سے اس کا اقرار کر لیا کہ بے شک تورات میں اس مجرم کی سزا رجم ہی ہے۔ بعدہٗ اس نے ساری حقیقت ظاہر کر دی کہ کس طرح یہود نے رجم کو اڑا کر زنا کی سزا یہ رکھ دی ہے کہ زانی کو کوڑے لگائے جائیں، کالا منہ کر کے اور گدھے پر سوار کر کے گشت کرایا جائے۔ الحاصل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان دونوں مرد عورت پر رجم کی سزا جاری کی اور فرمایا کہ اے اللہ آج میں پہلا شخص ہوں جس نے تیرے حکم کو دنیا میں نافذ کیا اس کے بعد کہ وہ اسے مردہ کر چکے تھے یہ واقعہ ہے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

لفظ رسول سے خطاب یہاں یہ حقیقت ظاہر کر رہا ہے کہ رسول کی اصل ذمہ داری صرف اللہ کے دین کی تبلیغ اور انذار و تبشیر کے فرض کی ادائیگی ہے۔ اس امر کی کوئی ذمہ داری رسول پر نہیں ہے کہ لوگ اس کی دعوت کے بارے میں کیا رویہ اختیار کرتے ہیں۔ اگر رسول نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا ہے تو وہ عند اللہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو گیا۔ لوگ اگر کفر کی راہ میں سبقت کرتے ہیں تو اس کی پرسش رسول سے نہیں ہوتی ہے بلکہ خود لوگوں سے ہوتی ہے۔ پھر جو بات رسول سے متعلق نہیں اس کا غم رسول کیوں کرے۔ یہاں چونکہ مقصداً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو منافقین اور یہود کی مخالفانہ سازشوں پر تسلی دینا اور اس حقیقت کو ظاہر کرنا ہے کہ جن کا فتنہ میں پڑنا سنت الٰہی کے بموجب مقدر ہو چکا ہے وہ فتنہ میں پڑ کر رہیں گے۔ یہاں امام رازی نے یہ نکتہ آفرینی خوب کی ہے کہ یا ایھا النبی تو قرآن میں متعدد بار آیا ہے لیکن یا ایھا الرسول سے خطاب قرآن میں صرف دو جگہ آیا ہے۔ ایک یہاں دوسرے اسی پارے کے آخر میں یا ایھا الرسول بلغ، اور ان دونوں جگہوں پر یہ طرز خطاب شرف و عظمت کے اظہار کے لیے ہے۔ اس لفظ سے محبت و عظمت کے وہ سارے تقاضے بھی پورے ہو جاتے ہیں جو ایک کامل سے کامل انسان کے فطرت انسانی میں مرجون ہوتے ہیں اور عبد و معبود کی وہ ساری حدود بھی محفوظ رہتی ہیں جو کفر و ایمان کے درمیان حد فاصل ہو سکتی ہیں۔

یسارعون میں تیز گامی سے اشارہ یہاں منافقین و یہود دوستی کی طرف ہے کہ یہ لوگ خدائی قوانین سے گریز پائی کے لیے یہود کو اپنا ملجا و ماویٰ سمجھتے ہیں۔ اگرچہ زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن جب کوئی معاملہ اور قضیہ پیش آتا ہے تو ان کی انتہائی کوشش یہ ہوتی ہے کہ اس کو حضور انور کی عدالت میں پیش کرنے کی جگہ یہود کی عدالت میں لے جائیں تاکہ وہاں سے حسب منشا فیصلہ حاصل کر سکیں حالانکہ اللہ و رسول کی عدالت کے ہوتے ہوئے کسی اور کی عدالت کی طرف رجوع کرنا ایمان و اسلام کو چھوڑ کر کفر کی طرف لوٹنا ہے۔ جو لوگ غیر اسلامی نظامات اور باطل افکار و نظریات کی اسلامی نظام حیات کے مقابلے میں خدمت کرتے ہیں اور ان سے نفع حاصل کرنے کے بعد محض روزہ نماز تسبیح و تہلیل کی بنا پر اپنے کو نجات کا مستحق سمجھتے ہیں۔ اس آیت کی روشنی میں ان کو غور کرنا چاہیے کہ کہیں وہ بھی قالوا آمنا ولم تؤمن قلوبھم کا مصداق تو نہیں ہیں۔ کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ غیر اسلامی نظام سے ان کی وابستگی اتنی پختہ ہو گئی ہے کہ نہ صرف ان میں ان نظاموں سے باہر نکلنے کی خواہش باقی نہیں رہی ہے بلکہ جب کبھی ان کو خطرہ لاحق ہوتا ہے تو ان کی تمام کوششیں

ان باطل نظاموں کی بقا و حفاظت میں مصروف ہو جاتی ہیں، انا للہ فالی اللہ المشتکی ۔

منافقین کا چہرہ

۱۰۱ ۔ یہ لوگ جھوٹ کے لیے جاسوسی کرنے والے ہیں۔ یعنی ان لوگوں کے جاسوس ہیں جو تمہارے پاس نہیں آتے۔ سماعون کے معنے ہیں بہت زیادہ سننے والے اور کان دھرنے والے۔ پھر بہت زیادہ سننا کبھی تو جاسوسی پر اطلاق ہوتا ہے اور کبھی اس کے معنے ہوتے ہیں بہت زیادہ قبول کرنے والا جیسے سمع اللہ لمن حمدہ میں سننے کے معنے قبول کرنے کے ہیں۔ حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے یہاں پہلے معنے مراد لیے ہیں لیکن ابن جریر وغیرہ محققین نے دوسرے معنے پر محمول کیا ہے سماعون للکذب یعنی جھوٹ اور باطل کو بہت زیادہ ماننے والے اور قبول کرنے والے سماعون لقوم آخرین یعنی دوسری جماعت جس نے ان کو بھیجا اور خود تمہارے پاس نہیں آئی ان کی بات بہت زیادہ ماننے والے ہیں[1]

یہ منافقین و یہود کی ملی جلی خصلت بتائی جا رہی ہے۔ اس کے دو مطلب ہیں۔ سماعون کا لفظ سمع سے مبالغہ کا صیغہ ہے یہ لوگ چونکہ خواہشوں اور چاہتوں کی بندگی میں بے لگام ہو چکے تھے اس لیے ان کو سچائی سے نفرت تھی اور جھوٹ ان کا من بھاتا کھانا تھا۔ ان کے نفس کی پیاس اسی سے بجھتی تھی۔ انہیں جھوٹی گواہی، جھوٹی عدالت، اور جھوٹا فیصلہ چاہیے اور وہ نظام حیات جس کی عمارت ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت پر قائم ہو۔ اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اہل ایمان کی مجالس میں جھوٹ کی خاطر آتے ہیں تاکہ یہاں جو کچھ دیکھیں اور سنیں ان میں جھوٹ کی اپنی جانب سے آمیزش کر کے لوگوں میں پھیلائیں اور اہل ایمان کو بدنام کریں۔ سماعون لقوم آخرین کے بھی دو مطلب ہیں ایک یہ کہ جاسوس بن کر آتے ہیں اور حضور کی مجلس میں اور اہل ایمان کے پاس اس لیے آتے ہیں کہ یہاں سے کوئی راز کی بات مل جائے تو اسے آپ کے دشمنوں تک پہنچا دیں۔ گویا وہ اپنے ذوق و شوق سے اور حق و انصاف کے لیے نہیں آتے بلکہ دوسروں کے بھیجے ہوئے آتے ہیں۔ دوسروں سے اشارہ یہود کے علماء اور لیڈروں کی طرف ہے۔ دوسرے یہ کہ جھوٹے الزامات عائد کرنے اور افترا پردازیاں کرنے کے لیے

---

[1] افادات ۔ شیخ الاسلام

مواد فراہم کرتے رہتے ہیں تاکہ لوگوں میں بدگمانیاں اور غلط فہمیاں پھیلائیں جن کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں سے براہِ راست تعلقات پیدا کرنے کا موقع نہیں ملا ہے۔

یہودیوں کی کلامِ الٰہی میں تحریف

۱۰۲۔ وہ لوگ کتاب اللہ کے حکموں کو باوجودیکہ ان کا صحیح محل متعین ہے اپنے مقام سے ہٹا دیتے ہیں۔ یعنی خدا کے احکام میں تحریف کرتے ہیں، کہیں کی بات کہیں لگا دیتے ہیں لے یہ وصف ان یہودی علماء اور زعماء کا بیان ہو رہا ہے جو خود سامنے نہیں آتے اور جن کے اشاروں پر منافقین ناچ رہے ہیں۔ یعنی تورات کے جو احکام ان کی خواہش کے مطابق نہیں ہیں ان کے اندراجات بوجھ کر رد و بدل کرتے ہیں اور الفاظ کے معنے بدل کر من مانے احکام ان سے نکالتے ہیں مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے کلام اور اس کے احکام کا موقع و محل اور اس کا محمل و مصداق متعین ہو جانے کے باوجود اس کو اس موقع و محل سے ہٹا دیتے ہیں جس سے حکم کا مقصد بالکل فوت ہو کر رہ جاتا ہے۔ اگر کسی حکم کا موقع و محل اور محمل و مصداق واضح نہ ہو جس کی وجہ سے قاضی و مفتی تطبیق میں غلطی کر جائیں تو ان کو معذور کہا جا سکتا ہے لیکن موقع و محل کے تعین کے باوجود اس حکم کو اس کے موقع و محل سے ہٹانا صریح تحریف دین ہے۔

غرض پوری ہو تو مانو ورنہ نہیں

۱۰۳۔ اور لوگوں سے کہتے ہیں کہ اگر تمہیں یہ حکم دیا جائے تو مان لو دیا جائے تو اس سے بچ کر رہو۔ یعنی اگر کوڑے لگانے کا حکم دے تو قبول کرو ورنہ نہیں۔ گویا خدا کی شریعت کو اپنی ہوا کے تابع رکھنا چاہتے تھے لے مطلب یہ ہے کہ یہ ان منافقین کو یہ سکھا کر آپ کے پاس روانہ کرتے ہیں کہ اگر تمہارے معاملہ کا فیصلہ یہ ہو تو مان لینا اور اگر یہ نہ ہو تو اس کو نہ قبول کرنا۔ گویا اول تو علمائے یہود اور زعمائے قوم خود ہی تحریف کے چور دروازے سے مجرم کے لیے راہ فرار کی نشاندہی کر دیتے ہیں لیکن اگر کاروائی کچھ زحمت محسوس کرتے ہیں تو معاملہ سرکار نبوت کی عدالت میں بھیجتے ہیں لیکن ہدایت یہ دے دیتے ہیں کہ منشا پورا ہو تو مان لینا ورنہ طرح دے جانا۔ منشا یہ ہے

لے افادات شیخ الاسلامؒ

کہ یہ لوگ اس طرح کے فتنہ کاروں کا شکار ہو جاتے ہیں ان لوگوں کو قسمت پر چھوڑ دو آپ ان کی اس حالت پر غمگین نہ ہوں۔ اس آیت میں عوام کے لیے علماء کے اتباع کا ایک ضابطہ بھی بتا دیا ہے کہ اگرچہ عوام کے لیے دین پر عمل کرنے کا راستہ صرف یہی ہے کہ علماء کے فتویٰ پر عمل کریں۔ لیکن اس ذمہ داری سے عوام بھی بری نہیں کہ فتویٰ لینے اور عمل کرنے سے پہلے اپنے مقتداؤں کے متعلق اتنی تحقیق تو کر لیں جتنی کوئی بیمار کسی ڈاکٹر یا حکیم سے رجوع کرنے سے پہلے کیا کرتا ہے کہ جاننے والوں سے تحقیق کرتا ہے کہ اس بیماری کے لیے کون سا ڈاکٹر ماہر ہے اور کون سا حکیم اچھا ہے۔ کس کی ڈگریاں کیا کیا ہیں، اس کے مطلب میں جانے والے مریضوں پر کیا گزرتی ہے۔ اپنی امکانی تحقیق کے بعد بھی اگر کسی غلط ڈاکٹر کے جال میں پھنس گیا یا اس نے کوئی غلطی کر دی تو وہ قابل ملامت نہیں، لیکن جو شخص بلا تحقیق کسی عطائی حکیم کے جال میں پھنس گیا اور پھر کسی مصیبت کا شکار ہو گیا، تو وہ اپنی خودکشی کا خود ذمہ دار ہے۔

یہی حال عوام کے لیے دینی زندگی کے بارے میں ہے کہ اگر انہوں نے اپنی بستی کے اہل علم و فن اور تجربہ کار لوگوں سے تحقیق حال کرنے کے بعد کسی عالم کو اپنا مقتدا بنایا اور اس کے فتویٰ پر عمل کیا تو وہ عند اللہ اور عند الناس معذور ہوگا۔ ایسی ہی حالت کے بارے میں حضور کا ارشاد ہے فان اثمہ علی من افتی یعنی ایسی صورت میں گناہ کا بوجھ مفتی پر ہوگا۔ لیکن اگر کوئی شخص بلا تحقیق محض اپنے خیال سے کسی کو عالم و مقتدیٰ قرار دے کر اس کے قول پر عمل کرے اور وہ فی الواقع اس کا اہل نہیں ہے تو اس کا وبال تنہا اس مفتی پر اور عالم پر نہیں ہے بلکہ یہ شخص بھی برابر کا مجرم ہے۔ قرآن کی یہ آیت ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہے سماعون للکذب یعنی یہ لوگ جھوٹی باتیں، افسانے من گھڑت کہانیاں سننے کے عادی ہیں۔ اور امانت و دیانت کی تحقیق کیے بغیر ان کے پیچھے لگے ہوئے ہیں۔ اور ان سے موضوع اور غلط روایات سننے اور ماننے کے عادی ہو گئے ہیں [1]

شقاوت کا قانون

۱۰۴۔ اور دیکھو جس کے لیے اللہ ہی فتنہ میں ڈالنے کا ارادہ کر لیتا ہے تم اسے اللہ کی گرفت سے نہیں بچا سکتے۔ ہدایت و ضلالت، خیر و شر کوئی چیز بھی بدون ارادہ خداوندی عالم وجود میں

[1] معارف م ش

نہیں آسکتی۔ یہ ایک ایسا اصول ہے کہ جس کا انکار کرنا اس کے تسلیم کرنے سے زیادہ مشکل ہے۔ فرض کرو کہ ایک شخص چوری کرنے کا ارادہ کرتا ہے لیکن خدا کا ارادہ یہ ہے کہ چوری نہ کرے۔ اب اگر وہ شخص اپنے ارادے میں کامیاب رہا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ معاذ اللہ خدا اس کے مقابلہ میں عاجز ہو اگر خدا ہی کا ارادہ بندے کے ارادے پر غالب آتا ہے تو لازم آتا ہے کہ دُنیا میں کہیں چوری وغیرہ کسی شر کا وجود نہ ہے اور اگر خدا خیر و شر میں سے کسی چیز کا بھی ارادہ نہیں کرتا تو اس سے معاذ اللہ اس کا تعطل یا غفلت و سفاہت لازم آتی ہے تعالیٰ اللہ عن کل الشرور، ان تمام صورتوں پر غور کرنے کے بعد ناچار یہی ماننا پڑے گا کہ کوئی چیز بھی اس کے ارادہ تخلیق کے بدون موجود نہیں ہو سکتی، یہ مسئلہ نہایت اہم اور طویل الذیل ہے۔ ہمارا قصد ہے کہ اس قسم کے مسائل سے متعلق مستقل مضمون لکھ کر فوائد کے ساتھ ملحق کر دیا جاتے۔ واللہ الموفق [1]

ہمارے نزدیک یہ متکلمانہ نکتہ سنجی ایک بڑے محقق کے بہناتے علم کے مطابق ہے ورنہ اس جیسے مقام کے لیے آسان تعبیر یہ ہے کہ صداقتیں دو ہیں اور دونوں اپنی جگہ پر صحیح ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دُنیا اور اس کے ذرّے ذرّے پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے۔ کوئی چیز کوئی کام اور کوئی حالت نہیں جو اس کے ارادے کے بغیر حرکت کر سکے اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اسی کے ارادے کے تحت ہیں یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور بالخصوص اسلام کی جان ہے۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا گیا ہے کہ اگر یہ اختیار تسلیم نہ کیا جاتے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت کتاب تعلیم اور انبیا کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جائیں۔ ظلم و انصاف کے نام کی دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے، انسان کا اپنے فعل پر قابل مدح یا قابل ملامت ہونا بے معنی ہو جاتے۔ کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام اور بُرے کام پر عذاب دینا سرتاسر ظلم بن جاتے بلکہ اس دُنیا کی عدالت میں بھی وہ کسی فعل کا ذمہ دار نہ ٹھہرے۔

الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کا ارادہ ہر جزو کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی

[1] افادات شیخ الاسلام

ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے۔ نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے۔ اور اسی وجہ سے وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزا و سزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا۔ اور اسی پر وہ فطرت کے سامنے دُنیا کی عدالت میں اور آخرت میں مواخذہ اور باز پرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے۔

قرآن نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے۔ ایک طرف وہ کہتا ہے کہ خدا کے ارادہ کے بغیر پتہ بھی نہیں گرتا اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے۔ یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور نافابل ارادہ و مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنے ارادہ و حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادے کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی ہے۔ یہی ارادہ اور اعضا کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری تکلیف باز پرس اور مواخذے کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے اس لیے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادے اور نیت سے صادر نہ ہوئی بلکہ اس کے کرنے نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار ہو، انما الاعمال بالنیات اس تطبیق سے نہ تو اللہ سبحانہٗ کی قدرت و اختیار کی وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمامتر مجبور ہونا لازم آتا ہے۔ خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے مگر ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدہ کے مطابق وہ اس کو اس اختیار اور قدرت سے محروم نہیں کرتا۔

اس آیت میں ہدایت و ضلالت کے باب میں اس سنت الٰہی کا بیان ہو رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل میں انسان کو اختیار کی نعمت دے کر آزماتا ہے۔ جو لوگ جانتے بوجھتے اور دیکھتے سنتے شر کو خیر پر اور باطل کو حق پر ترجیح دیتے ہیں۔ نہ خدا کی تنبیہات سے سبق حاصل کرتے ہیں اور نہ اہل حق کی نصیحتوں سے وہ آہستہ آہستہ اپنے ضمیر اور اپنے عقل و ارادے کو اس درجہ کند اور بے حس بنا لیتے ہیں کہ ان کے اندر حق کی طرف بڑھنے کا کوئی عزم اور حوصلہ سرے سے باقی ہی نہیں رہتا۔ باطل ہی ان کا اوڑھنا بچھونا بن جاتا ہے۔ یہ لوگ ہیں جن کو اللہ اس فتنے ہی میں چھوڑ دیتا ہے اس لیے اللہ کی طرف سے فتنہ میں ڈالے جانے کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کے اندر اللہ تعالیٰ بُرے میلانات پرورش پاتے دیکھتا ہے اس کے سامنے پے درپے ایسے مواقع لاتا ہے جس میں اس کی

سخت آزمائش ہوتی ہے اگر وہ شخص ابھی برائی کی طرف پوری طرح نہیں جھکا ہے تو ان آزمائشوں سے سنبھل جاتا ہے اور اس کے اندر بدی کا مقابلہ کرنے کے لیے نیکی کی جو قوتیں ہوتی ہیں وہ ابھرتی ہیں لیکن اگر وہ برائی کی طرف پوری طرح جھک چکا ہوتا ہے اور اس کی نیکی اس کی بدی کے مقابلہ میں شکست کھا چکی ہوتی ہے تو ہر ایسی آزمائش کے موقعہ پر وہ زیادہ سے زیادہ بدی کے پھندے میں پھنستا چلا جاتا ہے۔ یہی اللہ تعالیٰ کا وہ فتنہ ہے جس سے کسی انسان کو بچا لینا اس کے کسی خیر خواہ کا کام نہیں ہے اور اس فتنہ کا شکار صرف افراد ہی نہیں بلکہ قومیں بھی ہوتی ہیں۔ منشا یہ ہے کہ جس شخص کے دین کی اللہ آزمائش لینا چاہتا ہے تو اس کے سامنے آزمائش کے لیے مواقع لاتا ہے جس میں اس کی سخت آزمائش ہوتی ہے۔ ٹھیک اس طرح جیسے سونے کو آگ میں تپا کر اس کا کھوٹ منظرِ عام پر لایا جاتا ہے۔ آپ کے قبضہ و اختیار میں ایسے شخص کو خدا کی جانب سے ہونے والے امتحان سے بچانا نہیں ہے ٹھیک اس طرح جیسے تانبے کو سونا بنانا آپ کے قبضہ و اختیار میں نہیں ہے۔ زمین کی کانیں ہوں یا انسانی اخلاق و اعمال کی کانیں ہوں سب کے لیے اللہ کا ضابطہ ایک ہے اور ناقابلِ تبدیل ہے۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایسا کیوں ہے۔ اسی آسٹے ہوتے سوال کا جواب اگلے فقرہ میں دیا جا رہا ہے کہ جب یہ لوگ خود ہی اپنی اصلاح کا ارادہ نہیں کرتے بلکہ اس کے برعکس پر مصر ہیں تو اللہ کی سنت یہی ہے کہ بندے کے عزمِ فعل پر اس فعل کی تخلیق بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتی ہے اور اس قانونِ تکوینی کو کوئی روک نہیں سکتا۔

شقاوت کا آخری مرحلہ

۱۰۵۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ پاک کرنا نہیں چاہتا ہے ان کے لیے دنیا میں بھی رسوائی ہے اور آخرت میں بھی بہت بڑا عذاب ہے۔ اوّل منافقین اور یہود کا طرزِ عمل بیان فرمایا جس میں یہ چند اعمال بالخصوص ذکر کیے گئے ہیں۔ ہمیشہ جھوٹ اور باطل کی طرف جھکنا۔ اہلِ حق کے خلاف جاسوسی کرنا بد باطنی اور شریر جماعتوں کو مدد پہنچانا۔ ہدایت کی باتوں کو تحریف کر کے بدل ڈالنا، اپنی خواہش اور مرضی کے خلاف کسی حق بات کو قبول نہ کرنا۔ جس قوم میں یہ خصائل پائی جائیں اس کی مثال ایسے مریض کی سمجھو جو نہ دوا استعمال کرے نہ مہلک اور مضر چیزوں سے پرہیز کرے۔ اطبّاء اور ڈاکٹروں کا مذاق اڑائے۔ فہمائش کرنے والوں کو گالیاں دے، نسخہ پھاڑ کر پھینک دے یا اپنی رائے سے اس کے اجزا بدل ڈالے اور یہ عہد بھی کرے کہ جو دوا

میری خواہش کے خلاف ہوگی کبھی استعمال نہ کروں گا۔ ان حالات کی موجودگی میں کوئی ڈاکٹر یا طبیب خواہ اس کا باپ ہی کیوں نہ ہو۔ اگر معالج سے دستبردار ہوکر یہی ارادہ کرے کہ اس کی بے اعتدالیوں، غلط کاریوں، ضد اور ہٹ دھرمی کا خمیازہ بھگتنے دو تو کیا یہ طبیب کی بے رحمی یا بے اعتنائی کا ثبوت ہوگا یا خود مریض کی خودکشی سمجھی جائے گی۔ اب اگر مریض اس بیماری سے ہلاک ہوگیا تو طبیب و ڈاکٹر کو مورد الزام نہیں ٹھہرا سکتے کہ اس نے علاج نہیں کیا اور تندرست کرنا نہ چاہا بلکہ بیمار خود ملزم ہے کہ اس نے اپنے ہاتھوں سے اپنے کو تباہ کیا اور طبیب کو موقع نہ دیا کہ وہ اس کی صحت واپس لانے کی کوشش کرتا۔ ٹھیک اسی طرح یہاں یہود کی شرارت، ہوا پرستی، ضد اور ہٹ دھرمی کو بیان فرما کر یہ لفظ فرماتے ومن یرد اللہ فتنتہ الخ اور اولٰئک الذین لم یرد اللہ ان یطھر قلوبھم (یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے پاک کرنا نہ چاہا) اس کا یہی مطلب ہے کہ خدا نے ان کی استعداد بد اور بدکاریوں کی وجہ سے اپنی نظر لطف و عنایت ان پر سے ہٹالی جس کے بعد ان کے راہ پر آنے اور پاکی قبول کرنے کی کوئی توقع نہیں رہی۔ آپ ان کے غم میں اپنے کو نہ گھلائیں لقولہ تعالیٰ لا یحزنک الذین الخ باقی رہا یہ شبہ کہ خدا تو اس پر بھی قادر تھا کہ ان کی سب شرارتوں اور غلط کاریوں کو جبراً روک دیتا اور مجبور کر دیتا کہ وہ کوئی ضد اور ہٹ دھرمی ہی نہ کر سکیں تو بے شک میں تسلیم کرتا ہوں کہ خدا کی قدرت کے لئے یہ چیز کچھ مشکل نہ تھی ولو شاء ربک لامن من فی الارض کلھم جمیعاً لیکن اس دنیا کا سارا کارخانہ ہی ایسا رکھا گیا ہے کہ بندوں کے خیر و شر کو اکتساب پر مجبور نہ کیا جائے۔ اگر خیر کے اکتساب پر سب کو مجبور کر دیا جاتا تو تخلیق عالم کی حکمت و مصلحت پوری نہ ہوتی اور حق تعالیٰ کی بہت سی صفات ایسی رہ جائیں کہ ان کے ظہور کے لیے کوئی محل نہ ہوتا۔ مثلاً عفو، غفور، حلیم، منتقم، ذوالبطش الشدید، قائم بالقسط اور ملک یوم الدین۔ حالانکہ عالم کے پیدا کرنے کی غرض ہی یہ ہے کہ اس کی تمام صفات کمالیہ کا مظاہرہ ہو، کوئی مذہب یا کوئی انسان جو خدا کو فاعل مختار مانتا ہے انجام کلاس کے سوا کوئی غرض نہیں بتلا سکتا لیبلوکم ایکم احسن عملاً؟ اس سے زائد تفصیل کی یہاں گنجائش نہیں بلکہ اس قدر بھی ہمارے موضوع سے خارج ہے۔[1]

شیخ الاسلام نے جس حکیمانہ انداز میں یہاں سخن نوازی فرمائی ہے اس کی بزرگی اور برتری

---

[1] فوائد شیخ الاسلام

قطعاً بے غبار ہے لیکن عوام کو سمجھانے کے لیے عرض کرتا ہوں کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ از خود پاک ہونا نہیں چاہتے ہیں الا یہ کہ خدا خود زبردستی ان کو پاک کرئے مگر ایسی زبردستی سے پاک کرنا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے یعنی اللہ کی عادت نہیں ہے کہ وہ بندے کے ارادے کے بغیر از خود کسی کو پاک کرے اللہ تعالیٰ کی طرف سے گمراہی آتی ہے مگر کن کے لیے بتصریح فرمادیا۔ وما یضل بہ الا الفاسقین اور فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم اور واللہ لا یھدی القوم الفاسقین اور بل طبع اللہ علیھا بکفرھم۔ ان آیتوں میں سے ہر ایک پر غور کرو۔ ہر ایک سے یہ صاف وصریح معلوم ہوگا کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے اور اللہ کا اس کے جزائی اثر کو اپنی طرف سے ضلالت، گمراہی، زنگ، مہر اور بیماری فرمانا موخر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ضلالت، زنگ، مہر اور بیماری کا اترنا علت اور انسانوں کا کفر و گناہ و نفاق معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسان کا فسق و فجور، کجی، زنگ، کفر، انحراف، نادانی اور قلب کی بیماری پہلے ہوتی ہے اور خدا کی طرف سے اس کے جواب میں ضلالت و گمراہی اور دل پر مہر بعد کو ہوتی ہے۔ اور یہی طبعی اصول بھی ہے۔ انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے تب آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں اگر کوئی اس کو الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی مخت نادانی ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اس آیت میں بھی اسی سنت الٰہی کی طرف جو قرآن میں ختم قلوب کے الفاظ سے تعبیر ہوتی، اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دلوں کی تطہیر کے لیے ان کے ہاں ایک خاص ضابطہ ہے۔ لوگ نیکی اور تقویٰ کی راہ پر چلتے ہیں اگر آتے جاتے راہ میں ان کو کوئی ٹھوکر لگ جاتی ہے وہ گر جاتے ہیں لیکن گرنے کے بعد پھر اٹھ کھڑے ہوتے ہیں اور توبہ و اصلاح کے ذریعے سے دامن جھاڑ کر پھر چل دیتے ہیں تو خواہ ہزار بار گریں اور اٹھیں لیکن ان کے دامان دل پر زنگ جمنے نہیں پاتا۔ لیکن جو لوگ برائی اور نافرمانی ہی کو اپنا پیشہ بنالیتے ہیں اور گناہوں کے سڑاس ہی میں پڑے رہتے ہیں ان کے دلوں پر آہستہ آہستہ اتنی گندگی جم جاتی ہے کہ ان کی پاکی کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوتی ہے۔ اللہ ایسے پاک کرنا نہیں چاہتا جو خود پاک ہونے کی خواہش نہیں رکھتا ہے۔ اللہ کا دستور یہ نہیں ہے کہ جو خود پاکیزگی کا خواہاں نہ ہو اور اس کے لیے کوشش نہ کرے اسے جبراً پکڑ پکڑ کر پاکیزہ بنائے۔ یہودیوں کے یہ زعماء اور ان کے پیروکار گندگی کے لیسے خوگر ہوگئے ہیں کہ ان کی طبائع میں طہارت قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے۔ اللہ تو ان کو ہی پاک کرتا ہے جو خود پاکیزگی کا خواہش مند ہو اور اس کے لیے کوشش کرے۔

اسلامی مملکت میں اجنبیوں کے مقدمات

۴۲۔ یہ جھوٹ سننے والے اور حرام مال کھانے والے ہیں۔ لہٰذا اگر تمہارے پاس آئیں اور تم سے فیصلہ چاہیں تو آپ کو اختیار ہے کہ ان کے درمیان فیصلہ کر دو یا ان سے کنارہ کش ہو جاؤ۔ ابن عباس مجاہد عکرمہ وغیرہ اکابر سلف سے منقول ہے کہ حضور کو یہ اختیار ابتدار میں تھا۔ آخر میں جب اسلام کا تسلط اور نفاذ کامل ہو گیا تو ارشاد ہوا وان احکم بینھم بما انزل اللّٰہ یعنی ان کے نزاعات کا فیصلہ قانون شریعت کے مطابق کرو۔ مطلب یہ کہ اعراض اور کنارہ کشی کی ضرورت نہیں ہے یہ اس دور کی بات ہے جبکہ یہودی اسلامی حکومت کے باقاعدہ شہری نہ تھے بلکہ اسلامی حکومت کے ساتھ ان کے تعلقات معاہدات پر مبنی تھے۔ ان معاہدات کی رو سے یہودیوں کو اپنے اندرونی معاملات میں آزادی تھی۔ اور ان کے مقدمات کے فیصلے ان ہی کے قوانین کے مطابق ان کے اپنے جج کرتے تھے۔ اس لیے علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اس آیت میں جو اختیار دیا گیا ہے کہ یہ صرف واقعہ کے ساتھ خاص ہے یا سب معاہدین کا یہ حکم ہے اور یا پھر آیت تمام دُنیائے کفر کے بارے میں ہے۔ مختار یہی ہے کہ یہ اسلامی حکومت تمام غیر مسلم شہریوں کے بارے میں نہیں بلکہ معاہدین کے بارے میں یہ آیت ہے۔ آج بھی غیر مسلم اگر اسلامی حکومت کے شہری نہ ہوں بلکہ اسلامی مملکت میں کسی معاہدے کے تحت قیام پذیر ہوں تو اسلامی حکومت کے حکمرانوں کو اختیار ہے کہ چاہیں تو ان کے مقدمات کا فیصلہ کریں اور چاہیں تو نہ کریں وقت کی مصلحت کا جو تقاضا ہو اس پر عمل کریں۔ مطلب یہ ہے کہ اسلامی حکومت کے حکمرانوں پر فیصلہ تو اسلامی حکومت کے شہریوں کے درمیان کرنا واجب ہے۔ دوسرے ملک کے شہریوں کے لیے واجب نہیں ہے صرف جائز ہے حسب ضرورت و مصلحت، قرطبی اور رازی نے اسی کو اپنایا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اوپر قیام عدل کی ذمہ داری اصلاً صرف ان ہی لوگوں سے متعلق ہے جو تمہارے دائرہ اقتدار و اطاعت کے اندر ہیں۔ جو اس سے باہر ہیں جن کی وفاداری ابھی تقسیم ہے۔ جو آپ کے پاس بھی آتے ہیں اور دوسروں سے سازباز بھی رکھتے ہیں ان کی ذمہ داری شرعاً آپ پر نہیں ہے مصالح کا تقاضا ہو تو ان کے مقدمات کا فیصلہ کر دو اور نہ ہو تو رد کر دو۔

لہ افادات شیخ الاسلام

اُمت مسلمہ کو اس کے فرائض کی یاددہانی

۱۰۷۔ اور اگر کنارہ کشی اختیار کرو گے تو یہ تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکیں گے اور اگر فیصلہ کرو تو انصاف کا فیصلہ کرو بلاشبہ اللہ انصاف کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ قرآن کریم نے بار بار اس پر زور دیا ہے کہ کوئی شخص کتنا ہی شریر اور بدمعاش کیوں نہ ہو مگر اس کے حق میں بھی تمہارا دامان عدالت ناانصافی کے چھینٹوں سے داغدار نہ ہونے پائے۔ یہ ہی وہ صفت ہے جس کے سہارے زمین و آسمان کا نظام قائم ہے۔

پہلی آیت میں یہ تو آپ کے اختیار تمیزی اور صوابدید پر موقوف رکھا گیا ہے کہ جو لوگ اسلامی مملکت کے شہری نہ ہوں اور وہ بطور خود اپنے مقدمات کا آپ سے فیصلہ کرانا چاہیں تو آپ چاہیں تو فیصلہ کر دیں اور چاہیں تو نہ کریں لیکن اگر ان کا فیصلہ کرنا چاہیں اور مصالح کا بھی تقاضا ہو تو یہ قطعی ہے کہ آپ کو ہر حال میں اللہ کے قانون پر مبنی ہی فیصلہ کرنا ہوگا۔ اس کا اختیار نہیں ہے کہ فیصلہ کسی اور قانون کے مطابق کر دیا جائے۔ دراصل یہ بات آپ کے حوالہ سے اُمت کو سنائی گئی ہے اور سنانے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ پہلے اسی آیت میں منافقین اور یہود کا یہ ملا جلا چہرہ پیش کیا تھا کہ سماعون للکذب اکالون للسحت یعنی یہ جھوٹ کے رسیا اور پکے حرام خور ہیں۔ یہ دونوں مبالغے کے صیغے ہیں۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ یہ دونوں بیماریاں ان میں وبا کی طرح پھیلی ہوئی تھیں اور ان کا پورا معاشرہ اس کا شکار تھا۔ جھوٹ اور رشوت کے ساتھ دنیا میں حق و عدل کا کبھی بول بالا نہیں ہوا ہے۔ حق و عدل دو چیزوں کا سہارا چاہتے ہیں۔ ایک یہ کہ حق کی بے لاگ شہادت دینے والے موجود ہوں اور دوسرے یہ کہ قانون عدل و قسط کے مطابق بے لاگ فیصلہ کرنے والے ہوں۔ جھوٹ اور رشوت ان دونوں کو جڑ سے اکھاڑ کر پھینک دیتے ہیں۔ شہادت علی الناس اور قیام حق جیسے فرض کی ادائیگی اسی وقت ممکن ہے جب تک جھوٹ اور رشوت کی چاٹ نہ لگے۔ اگر جھوٹ اور رشوت کی بیماری معاشرے میں عام ہو جائے تو سمجھ لو کہ معاشرے سے حق و انصاف کا جنازہ اٹھ چکا ہے قرآن نے منافقین و یہود کی اس بیماری کو بیان کرنے کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا ہے کہ آپ ان کے درمیان جب فیصلہ کریں تو عدل و انصاف پر مبنی کریں۔ ان کے جھوٹ اور

ان کی رشوت کا میل بھی آپ کے فیصلے پر نہ آتے۔ یہ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے پوری امت سے کہا جا رہا ہے کہ فیصلہ یگانوں کے کسی معاملہ کا ہو یا بیگانوں کا بہرحال بے لاگ بے لپیٹ قانون عدل و انصاف کے مطابق ہو۔

شریعت سے یہود کی گریز پائی

۱۰۸۔ اور یہ لوگ تمہیں منصف کیسے بناتے ہیں جبکہ تورات ان کے پاس موجود ہے اس میں اللہ کا حکم ہے اس کے باوجود وہ اس سے روگرداں ہیں، واقعہ یہ ہے کہ یہ ایمان والے نہیں ہیں۔ یعنی تعجب کی بات ہے کہ آپ کو حکم ٹھہراتے ہیں اور جس تورات کو آسمانی کتاب مانتے ہیں اس کے فیصلے پر بھی راضی نہیں ہیں تو حقیقت میں ان کا ایمان کسی پر نہیں ہے، نہ قرآن پر نہ تورات پر۔ اگلے رکوع میں تورات و انجیل کی مدح فرما کر متنبہ کیا ہے کہ کیسی عمدہ کتاب اور کیسے علوم و ہدایت تھے جن کی ان نالائقوں نے بے قدری کی اور انہیں ایسا ضائع کیا کہ آج اصل چیز کا پتہ لگانا بھی مشکل ہے۔ آخر حق تعالیٰ نے اپنی رحمت کاملہ سے بالکل آخر میں وہ کتاب بھیجی جو ان سب پہلی کتابوں کے مطالب اصلیہ کی محافظ اور مصدق ہے اور جس کی ابدی حفاظت کا انتظام نازل کرنے والے نے خود اپنے ذمہ لیا ہے [1]

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کی بددیانتی کو بالکل بے نقاب کر دیا ہے۔ یہ مذہبی لوگ جنہوں نے تمام عرب پر دینداری اور اپنے علم کتاب کا سکہ جما رکھا ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ جس کتاب کو خود اللہ کی کتاب مانتے ہیں اور جس پر ایمان کے مدعی ہیں اس کے حکم کو چھوڑ کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس اپنا مقدمہ لاتے ہیں جن کو وہ پیغمبر ہی نہیں مانتے ہیں۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ یہ لوگ کسی چیز پر بھی صداقت سے ایمان نہیں رکھتے اور اصل میں ان کا ایمان اپنے نفس اور اپنی خواہشات پر ہے جسے وہ کتاب اللہ کہتے ہیں اس سے صرف اس لیے روگرداں ہیں کہ اس کا حکم ان کی خواہشات اور مفادات کا ساتھ نہیں دیتا اور جن کی نبوت پر ایمان نہیں رکھتے۔ ان کے پاس صرف اس پر آتے ہیں کہ شاید وہاں کوئی ایسا فیصلہ ہو جائے جو ان کی خواہشات اور مفادات سے ہم آہنگ ہو۔ تورات میں زانی کے لیے سنگسار کرنے اور قاتل کے لیے قتل کا حکم دیا گیا ہے لیکن جب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کسی بڑے آدمی سے یہ جرائم سرزد ہوتے تو یہودیوں کے دنیا پرست علماء انہیں سزا سے بچانے کے لیے دوراز کار تاویلیں کرتے اور طرح طرح کے شرعی حیلے نکالتے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ایسا ہی ایک واقعہ پیش آیا جیسا کہ پیچھے پڑھ چکے ہو۔ یہاں اسی معاملہ کی طرف اشارہ ہے فرمایا کہ جب ان کے پاس تورات موجود ہے تو کیوں اس کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے اور کیوں تمہارے پاس فیصلے کے لیے آتے ہیں اس لیے کہ دولت مند مجرموں سے رشوت لے کر یا ان کی جاہ سے مرعوب ہو کر انہیں سزا سے بچانا چاہتے ہیں۔ بس معلوم ہوا کہ یہ لوگ کتاب الٰہی پر ایمان ہی نہیں رکھتے اگر ایمان رکھتے تو راست بازی کے ساتھ اس کے حکموں کا اعلان کرتے۔

یہاں قرآن کے اعجاز کے لیے یہ دلیل بھی بجائے خود کافی ہے کہ یہود کی ساری اخفائی کوششوں کے باوجود زنا کاروں کے لیے رجم کی سزا کسی نہ کسی صورت میں آج تک باقی ہے۔ ارشاد میں فیھا حکم اللہ کا انداز بتا رہا ہے کہ جہاں تورات میں اللہ کا حکم موجود ہے وہاں ایسے احکام بھی ہیں جو حکم اللہ نہیں ہیں۔ اگر ساری تورات زمانہ نبوت میں حکم اللہ پر مشتمل ہوتی تو قرآن کا انداز تعبیر یہ ہوتا، ’’وھو کتاب اللہ‘‘ یعنی ان کے پاس تورات ہے اور وہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس انداز کو چھوڑ کر فیھا حکم اللہ کی تعبیر یہی بتانے کے لیے اختیار کی ہے کہ اس میں سارے احکام تو خداوندی نہیں ہیں مگر رجم ضرور اللہ کا حکم اس میں موجود ہے۔

إِنَّآ أَنزَلْنَا ٱلتَّوْرَىٰةَ فِيهَا هُدًى وَنُورٌ ۚ يَحْكُمُ بِهَا
ٱلنَّبِيُّونَ ٱلَّذِينَ أَسْلَمُوا لِلَّذِينَ هَادُوا وَٱلرَّبَّـٰنِيُّونَ
وَٱلْأَحْبَارُ بِمَا ٱسْتُحْفِظُوا مِن كِتَـٰبِ ٱللَّهِ وَكَانُوا عَلَيْهِ
شُهَدَآءَ ۚ فَلَا تَخْشَوُا ٱلنَّاسَ وَٱخْشَوْنِ وَلَا تَشْتَرُوا بِـَٔايَـٰتِى ثَمَنًا
قَلِيلًا ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلْكَـٰفِرُونَ ﴿٤٤﴾
وَكَتَبْنَا عَلَيْهِمْ فِيهَآ أَنَّ ٱلنَّفْسَ بِٱلنَّفْسِ وَٱلْعَيْنَ بِٱلْعَيْنِ وَ
ٱلْأَنفَ بِٱلْأَنفِ وَٱلْأُذُنَ بِٱلْأُذُنِ وَٱلسِّنَّ بِٱلسِّنِّ وَٱلْجُرُوحَ
قِصَاصٌ ۚ فَمَن تَصَدَّقَ بِهِۦ فَهُوَ كَفَّارَةٌ لَّهُۥ ۚ وَمَن لَّمْ يَحْكُم بِمَآ
أَنزَلَ ٱللَّهُ فَأُو۟لَـٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّـٰلِمُونَ ﴿٤٥﴾ وَقَفَّيْنَا عَلَىٰٓ ءَاثَـٰرِهِم بِعِيسَى
ٱبْنِ مَرْيَمَ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ ۖ وَءَاتَيْنَـٰهُ ٱلْإِنجِيلَ
فِيهِ هُدًى وَنُورٌ وَمُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ ٱلتَّوْرَىٰةِ وَ
هُدًى وَمَوْعِظَةً لِّلْمُتَّقِينَ ﴿٤٦﴾ وَلْيَحْكُمْ أَهْلُ ٱلْإِنجِيلِ بِمَآ

أَنْزَلَ اللّٰهُ فِيْهِ ۚ وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ

الْفٰسِقُوْنَ ﴿٤٧﴾

بلاشبہ ہم نے تورات نازل کی، اس میں ہدایت اور روشنی ہے[109]۔ اللہ کے پیغمبر جو احکامِ الٰہی کے فرمانبردار تھے اسی کے ذریعے یہودیوں کے فیصلے کرتے تھے نیز یہودیوں کے مشائخ اور علما بھی اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے[110]، کیونکہ وہ کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور اس کی خبرگیری پر مقرر تھے[111]۔ لہٰذا تم لوگوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو اور سستے داموں پر میری آیات کی نہ خرید و فروخت کرو[112]۔ اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں[113]، اور ہم نے تورات میں یہودیوں کے لیے لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک،

کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے ویسے ہی زخم ہیں[۱۴]۔ پھر جو کوئی بدلہ لینا معاف کر دے تو وہ گناہ کے لیے کفارہ ہے[۱۵]، اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرے گا تو یہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں[۱۶]۔ اور پھر ہم نے ان نبیوں کے بعد عیسیٰ ابن مریم کو روانہ کیا، تورات کی تصدیق کرتا ہوا جو اس کے سامنے موجود تھی، اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی ہے اور تورات کی جو اس کے سامنے تھی سراسر تصدیق ہے اور متقیوں کے لیے نصیحت اور ان کو راہ بتانے والی ہے[۱۸]۔ اور انجیل والوں کو اسی کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے جو اللہ نے نازل کی اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا تو یہی لوگ فاسق ہیں[۲۱]۔

کتبِ الٰہی کا چہرہ اور ان کی قانونی حیثیت

نام کی تخصیص کے ساتھ قرآن پاک میں چار آسمانی کتابوں کا ذکر ہے۔ تورات جس کو ایک جگہ صحفِ موسیٰ بھی کہا گیا ہے اور حضرت داؤد کی زبور اور حضرت عیسیٰ کی انجیل اور خود قرآن۔ ان کے علاوہ ایک موقعہ پر صحفِ ابراہیم کا بھی ذکر آیا ہے۔ اس جگہ صرف تین کتابوں کا ذکر کیا ہے یعنی تورات، انجیل اور قرآن۔ یہود تورات کے سوا کچھ نہیں مانتے، عیسائی تورات کے احکام نہیں مانتے۔ لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں، تاہم انجیل سے پہلے کی دوسری زبانوں اور ملکوں کی آسمانی کتابوں کی نسبت مسلمانوں کی طرح ادب اور احتیاط کا پہلو بھی اختیار نہیں کرتے لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ تورات، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں یقین کرے۔ فی الواقع قرآن کی یہ تعلیم دُنیا کی مہتم بالشان تعلیمات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسرے مذہب میں نہیں ہے۔

یہ تعلیم صرف نظریاتی نہیں ہے بلکہ عملاً اس پر اسلامی مملکت کے احکام و قوانین کی تشکیل ہوتی ہے اور قانونی حیثیت سے دُنیا کی قوموں کو قرآن نے چار حصوں میں تقسیم کیا ہے اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق بتاتے ہیں۔ یہ تقسیم حسب ذیل ہے۔

۱۔ مسلمان، ۲۔ اہلِ کتاب، ۳۔ شبہ اہلِ کتاب، ۴۔ کفار و مشرکین۔

قرآن نے ان کتابوں کا چہرہ بتاتے ہوئے اعلان کیا ہے فیہ ھدی و نور۔ ان آیات میں کس خوبی کے ساتھ قرآن نے اگلی کتابوں کی تصدیق اور مدح و تعریف کی۔ اور ان اہلِ مذاہب کو جو اسلام پر ایمان نہیں لاتے اپنی اپنی کتب منزلہ پر عمل کرنے کی دعوت دی اور ساتھ ہی یہ بھی ان کو بتا دیا ہے کہ نسوا حظاً مما ذکروا بہ یعنی جن کتابوں کی حفاظت و نگرانی ان کے سپرد کی گئی تھی ان کا بیشتر حصہ طاقِ نسیان ہو چکا ہے اور جو کچھ باقی رہ گیا ہے ان کے ماننے والوں نے اسے چھوڑ کر غلط خواہشوں کی پیروی شروع کر دی۔ یہ خواہشیں کیا ہیں کتاب الٰہی میں تحریف و تصرف کر کے آسانیاں پیدا کرنا اور احکام الٰہی کے مقابلے میں انسانی فکر کی آمیزش ہے۔ اسی بنا پر قرآن نے اہلِ کتاب کو اسلام قبول کرنے کی دعوت دی ہے اور اسلام قبول کرنے پر ان کو ہدایت تامہ کی بشارت دی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دوسری کتابوں کے مقابلے میں قرآن ہدایت تامہ و کاملہ ہے۔ یہی وہ دین ہے جس کو یہود و نصاریٰ نے گم کر دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ کے ذریعے دوبارہ دنیا والوں کے سامنے پیش کیا گیا ہے اس لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ نامکمل تھی۔

اور قرآن جس کو لے کر آیا ہے وہ تمام اور کامل ہے۔ قرآن کا تورات و انجیل کے مقابلہ میں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ وہی ایک ہدایت ہے اور اس کے سوا سب ضلالت ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی کامل ہدایت ہے اور بقیہ کتابیں موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی اور کامل ہدایت جو اپنے اپنے دفتروں میں سب انبیاء لے کر آئے تھے چونکہ ان کے پیرو اپنی تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے اس کو برباد کر چکے تھے اس لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اسی کو لے کر آخری دفعہ تشریف لائے ہیں اب وہ ہمیشہ کامل رہے گی۔ کبھی ناقص نہ ہوگی۔ کیونکہ قرآن تحریف و اختلاف سے محفوظ رہے گا۔

الغرض دینِ محمدی کو قبول کرنا اس لیے تمام انسانوں کے لیے ضروری ہے کہ وہ دینِ ازلی جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیروؤں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا، اسی کو قرآن لے کر آیا ہے۔ اس سورت کے آغاز میں تکمیلِ دین کا اعلان کیا تھا اور درمیان میں اس کے علم و عمل کو نور کہا تھا آئندہ آیات میں اعلان ہو رہا ہے کہ قرآن تمام صحفِ الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے۔ اس لیے ہدایت تامہ نبوت عمومی اور سنہات کامل اور فلاح عالم اب صرف محمد رسول اللہ کے علم و عمل میں ہے۔

۱۰۹۔ فاشبہ ہم نے تورات نازل کی اس میں ہدایت اور روشنی ہے۔ یعنی وصول الی اللہ کے طالبین کے لیے ہدایت اور شبہات و مشکلات میں پھنسنے والوں کے لیے روشنی کا کام دیتی ہے[1]۔ یہ تورات کی قدر و قیمت واضح کی ہے کہ اللہ نے اس کو زندگی کے اعلیٰ اقدار کے تحفظ کا وسیلہ، اللہ اور اس کے رسول کے بتائے ہوئے طریقوں کی طرف رہنمائی کا ذریعہ صراطِ مستقیم کی ہدایت اور خواہشات و بدعات کی تاریکیوں سے نکالنے والی روشنی بنا کر اتارا تھا۔

تورات صرف یہودیوں کے لیے دستور تھا

۱۱۰۔ اللہ کے پیغمبر جو احکامِ الٰہی کے فرمانبردار تھے اسی کے ذریعے یہودیوں کے فیصلے کرتے تھے نیز یہودیوں کے مشائخ اور علماء بھی اسی کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ یعنی تورات میں ایسا عظیم الشان دستور اور آئین ہدایت تھا کہ کثیر التعداد پیغمبر اور اہل اللہ اور علماء برابر اسی کے موافق حکم دیتے تھے اور نزاعات کا فیصلہ کرتے رہے[2]۔

مطلب یہ ہے کہ ہم نے تورات کو احکام و قوانین کا آئین بنا کر اتارا تھا۔ حضرت موسیٰ اور

[1، 2] افادات شیخ الاسلام

ان کے بعد انبیائے بنی اسرائیل ایک زمانے تک اسی تورات کے مطابق فیصلے کرتے رہے۔ اس فقرے میں تورات کے بارے میں یہ باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔

ایک یہ کہ اس کے ذریعے یہودیوں کی زندگی کے معاملات و نزاعات کا فیصلہ ہوتا تھا۔ اور تمام اجتماعی و سیاسی اور قانونی معاملات اسی کی ہدایات کے مطابق اور اسی کی روشنی میں انجام پاتی تھیں یہاں خاص طور پر للذین ھادوا فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ تورات صرف یہودیوں کے لیے آئین ہدایت اور دستور زندگی تھی۔ اس کی حیثیت عمومی دستور کی نہ تھی۔

دوسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ یہودیوں کے فیصلے تورات کے مطابق انبیاء کرتے تھے۔ آیت میں النبیوں کی صفت الذین اسلموا لا کر یہ بتایا ہے کہ یہ انبیاء جو تورات کے ذریعے یہود کے معاملات کے فیصلے کرتے تھے۔ صرف دوسروں ہی کے لیے تورات کو واجب العمل نہیں سمجھتے تھے بلکہ خود بھی خدا کے فرمانبردار اور تورات کے احکام و قوانین کے پابند تھے۔ لیکن یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ انبیاء کا چہرہ اسلام سے کیوں پیش کیا گیا ہے۔ دراں حالانکہ اسلام ایک صفت ہے جس میں امتی بھی شریک ہیں۔ گویا اس میں امت بھی انبیاء کی شریک ہے۔ اگر علامہ زمخشری کی یہ بات مان لی جائے کہ یہ صفت بطور مدح لائی گئی ہے۔ اس سے تفصیل و توضیح مقصود نہیں بلکہ یہود کے کردار پر ایک لطیف تعریض ہے جنھوں نے تورات کو زندگی کے معاملات سے بالکل بے دخل کر رکھا تھا پھر بھی یہ سوال اپنی جگہ قائم رہتا ہے کہ نبوت کی زندگی تو سراپا اسلام ہوتی ہے۔ صرف یہ کہہ دینا ہی کافی ہے کہ نبی ہے نبی ہونے کے ساتھ زندگی کا اسلامی ہونا ناگزیر ہے اس لیے اسلام نبوت کے لیے کوئی تعریفی پیمانہ نہیں۔ مدح کے لیے ضروری ہے کہ ایسی صفات خاصہ سے ہو جس سے ممدوح اپنے سے کمتر لوگوں سے ممتاز ہو جائے۔ اور ظاہر ہے کہ اسلام ایک صفت عامہ ہے جس کے انبیاء کی امتیں اور ان کے متبعین بھی علم بردار ہوتے ہیں۔ کیا آپ حضور انور کی مدح میں یہ کہہ سکتے ہیں کہ حضور ایک مرد مومن اور مسلم تھے۔ ایک ادنیٰ سے ادنیٰ امتی بھی یہ شرف رکھتا ہے۔ یہاں علامہ ناصر کی انتصاف ہیں وہ رائے بے حد پسندآتی ہے جو علامہ جمال الدین قاسمی نے محاسن التاویل میں پیش کی ہے:

> جیسا صفت کے ذریعے موصوف کی عظمت بیان کی جاتی ہے ایسا ہی کبھی موصوف کے ذریعے صفت کی عظمت ظاہر کی جاتی ہے۔ یہاں ایسا ہی ہے، بتایا یہ جا رہا ہے کہ اسلام تو وہ عظیم الشان راہ ہے جس پر اولوالعزم انبیاء بھی چلتے رہے

ہیں تمہاری ترجیثیت ہی کیا ہے۔ قرآن میں اس کی متعدد مثالیں ہیں۔ حضرت اسحاق کے بارے میں ہے وبشرنا ہ باسحاق نبیا من الصالحین یعنی صلاحیت تو وہ مقام ہے جس کے نبی ہونے کے باوجود حضرت اسحاق بھی حامل تھے۔ اس میں صلاح کو نبی کی صفت بنا کر نبی کی نہیں بلکہ صلاح کی شان دوبالا کی گئی ہے اور لوگوں کو اس صفت کے حاصل کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس آیت میں اسلام کی شان کو دوبالا کرنے کے لیے انبیاء کی صفت بنا کر پیش کیا ہے۔ عربی ادب میں بھی اس قسم کی مثالیں موجود ہیں۔ ایک شاعر حضور کی مدح میں کہتا ہے۔

فان مدحت محمد القصید تی
فلقد مدحت قصید تی بمحمد

یہاں ہم اگر یہ نکتہ آفرینی نہ کریں تو بلاغت قرآنی کا خون ہو کر رہ جاتے۔ اب فقرے کا حاصل یہ ہوا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو اسلام کے نام سے دعوت پیش کر رہے ہیں یہ انبیاء کی مشترکہ دعوت ہے اور یہ وہ عظیم دعوت ہے جسے انبیاء نے اپنایا اور قبول کیا ہے۔ وہ سب کے سب مسلم تھے برخلاف تمہارے کہ تم اسلام سے ہٹ کر یہودی بن گئے ہو۔

تیسری بات اس میں یہ بتائی گئی ہے کہ ربانیون اور احبار تورات کے قوانین کے مطابق یہودیوں کے مقدمات و معاملات کا فیصلہ کرتے تھے۔

ربانیون جمع ربانی کی ہے۔ اس سے مراد روحانی اور محاسن آداب سے آراستہ اشخاص ہیں۔ یعنی مشائخ۔ حضرت علی فرماتے ہیں انا ربانی ھذہ الامۃ اور احبار جمع حبر کی ہے اس کے معنے عالم کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مشائخ اور علماء حقانی ان اوقات اور ان جگہوں میں جہاں کہ انبیاء نہ ہوتے تھے۔ تورات کے مطابق لوگوں کے فیصلے کرتے رہے ہیں۔ گویا وقت کے علماء اور مشائخ یہود پر لطیف طنز ہے کہ تم جن اسلاف کے خلاف ہو ان میں ایسی برگزیدہ ہستیاں بھی گزری ہیں جو تمہاری طرح اللہ کی کتاب کے معاملہ میں چور اور بددیانت نہ تھے۔

عہدالہٰی کی حفاظت کی ذمہ داری

۱۱۱ - کیونکہ وہ کتاب اللہ کے محافظ ٹھہرائے گئے تھے اور اس کی خبرگیری پر مقرر تھے۔ یعنی تورات کی حفاظت کا ان کو ذمہ دار بنایا گیا تھا۔ قرآن حکیم کی طرح انا لہ لحافظون کا وعدہ

نہیں تھا۔ تو جب تک علمار و مشائخ نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا تورات محفوظ و معمول رہی۔ آخر دُنیا پرست علمائے سُوء کے ہاتھوں سے تحریف ہو کر ضائع ہو گئی۔[لے] یہ اس حقیقت کا اعلان ہے کہ تورات کی حفاظت اور زندگی میں عمل درآمد کے لیے یہودیوں کے اکابر علمار و مشائخ کی سپردگی میں دے دی گئی تھی۔ استحفاظ کے معنے کسی سے حفاظت و نگہداشت میں رکھنے کے لیے سوال کرنے کے ہیں۔ یعنی ان مشائخ اور علمار کو اللہ نے اپنی کتاب کا محافظ، امین اور لوگوں کے سامنے اس کا شاہد اور گواہ بنایا تھا۔ یہ اندازِ بیان بھی وقت کے یہودیوں پر ایک بیٹھی سی تعریض ہے کہ وہ ذرا اپنے گریبانوں میں منہ ڈال کر دیکھیں کہ نگران اور پاسبان ہو کر انہوں نے خدا کے حرم میں کس طرح نقب لگائی ہے اور گواہ ہو کر کس طرح کتمانِ شریعت میں مہارت دکھائی ہے۔ استحفاظ سے آیت میں صیغہ مجہول آیا ہے۔ اس میں دونوں احتمال ہیں ایک یہ کہ اللہ نے ان سے اسے محفوظ رکھنے کا مطالبہ کیا، دوسرے یہ کہ انبیائے ان سے اس کا مطالبہ کیا ہو۔ چنانچہ حضرت موسیٰ کا عہد پہلے پڑھ چکے ہو، اور یہ بھی فرمایا وکانوا علیہ شھدا اور وہ اس کے گواہ تھے۔ یعنی ان کے اسلاف مشائخ و علمار اس امر کے گواہ تھے کہ یہ کتاب الٰہی ہے قولی شہادت بھی دیتے تھے اور عملی شہادت۔ قولی شہادت تو یہ ہے کہ تورات میں بیان کردہ بنیادی عقائد سے لے کر اس کے تفصیل احکام تک بنی اسرائیل کے سامنے موزوں ترین الفاظ میں وعظ و ارشاد کے درس و تدریس کے ذریعے پیش کرتے، تاکہ یہ دین ان کے کمل کتاب بن جاتے اور ان کے لیے دین موسیٰ کی صداقت ایک واقعہ بن جاتے۔ اور عملی شہادت یہ ہے کہ تورات کی جو تصویر الفاظ میں پیش کی جاتے وہ پیش کرنے والے کی اپنی زندگی میں دیکھ لی جاتے یہ نہ ہو کہ دوسروں کو تو وعظ و ارشاد کے ذریعے تورات کی دعوت دیں لیکن خود اپنے آپ کو اس کا مخاطب نہ سمجھیں۔ قرآن حکیم نے

اتامرون الناس بالبر و تنسون انفسکم

کے الفاظ سے ان کی اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اعلانِ حق میں کسی کی پروا نہ کرو

۱۱۴۔ لہٰذا تم لوگوں سے نہ ڈرو مجھ سے ڈرو اور سستے داموں پر میری آیات کی خرید و فروخت

لے : افادات شیخ الاسلام

نہ کرو۔ یعنی لوگوں کے خوف یا دنیوی طمع کی وجہ سے آسمانی کتاب میں تبدیل و تحریف نہ کرو۔ اس کے احکام و اخبار کو مت چھپاؤ اور خدا کی تعذیب و انتقام سے ڈرتے رہو۔ تورات کی عظمت شان اور مقبولیت جتلانے کے بعد یہ خطاب یا تو ان رؤساء و علماء یہود کو کیا گیا ہے جو نزول قرآن کے وقت موجود تھے کیونکہ انہوں نے حکم رجم سے انکار کیا تھا اور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق پیشین گوئیوں کو چھپاتے اور ان کے معنے میں عجیب طرح کے ہیر پھیر کرتے تھے اور یا درمیان میں اُمت مسلمہ کو نصیحت ہے کہ تم دوسری قوموں کی طرح کسی سے ڈر کر یا حب مال و جاہ میں پھنس کر اپنی آسمانی کتاب کو ضائع مت کرنا۔ چنانچہ اس اُمت نے بحمداللہ ایک حرف بھی اپنی کتاب کا گم نہیں کیا۔ اور آج تک اسے مبطلین کی تغییر و تحریف سے محفوظ رکھنے میں کامیاب رہی اور ہمیشہ رہیں گے[1]

اس فقرے کی نشست مقرر کرنے میں شارحین قرآن کا کچھ اختلاف ہے۔ علامہ زمخشری نے تو سیاق و سباق سے الگ کر کے اس کا مخاطب اُمت اسلامیہ کے حکمرانوں کو قرار دیا ہے چنانچہ فرماتے ہیں کہ:

> اس میں حکمرانوں کو اپنی حکومت میں اللہ کے سوا کسی سے ڈرنے سے اور مداہنت کرنے سے روکا گیا ہے کہ کسی ظالم بادشاہ کے خیال سے یا رشتہ داروں اور دوستوں کی کسی تکلیف کے اندیشہ سے خدا کے حکم کے خلاف فیصلہ نہ کرو۔

لیکن علامہ ابوالسعود اور دوسرے شارحین قرآن کہتے ہیں کہ بطور التفات یہ زمانہ نبوت کے علماء اور رؤساء یہود کو خطاب ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب صورت حال یہ ہے تو تم لوگوں سے ڈر کر احکام الٰہی کو نہ چھپاؤ بلکہ مجھ سے ڈرو اور میرے سے وفاداری کرو۔ اور کسی دنیوی منفعت کی خاطر کتاب الٰہی کو بیان کرنا، اس پر عمل کرنا اس پر فتویٰ دینا اور اس کے مطابق فیصلہ کرنا ہرگز نہ چھوڑو۔ یہاں خلقت سے ڈرنا ان کا یہ ہے کہ اگر ہم نے حسب بشارات تورات نبوت محمدی کی تصدیق کر دی تو ہمارے عوام ہمارے ہاتھوں سے نکل جائیں گے۔ علماء یہود کے لیے قبول حق یا تصدیق محمدی سے پہلا مانع یہی حب جاہ تھا۔ سب سے پہلے یہ اسی پر ضرب ہے اور دوسرا مانع حب مال تھا۔ اس پر وَلَا تَشْتَرُوا سے متنبہ کیا کہ یہ نذرانے وغیرہ جو عوام سے ملتے ہیں ان کے بند ہو جانے کا اندیشہ نہ کرو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور کچھ لوگوں نے اس کا تعلق وکانوا علیہ شہداء سے قائم کر کے یہ مطلب بتایا ہے کہ ان شہداء ہی سے یہ بات کہی گئی ہے کہ انہیں ڈرنا انسانوں سے نہ ڈرنا۔ یعنی چونکہ تمہیں کتاب الٰہی کا گواہ بنایا گیا ہے اس لیے واجب ہے کہ تم صرف خدا ہی سے ڈرو دوسروں کا خوف دل سے اپنے سینے سے نکال دو، اس کے بغیر ہر طرح کے حالات میں اس کے لیے کتاب الٰہی کی شہادت کی ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونا ممکن نہیں ہے۔ اسی طرح جو جماعت کتاب الٰہی کی امین بنائی گئی ہے اس پر حرام ہے کہ وہ اپنے دنیوی مفادات واغراض کی خاطر خدا کی اس امانت میں خیانت کرے اور کتاب الٰہی میں تاویل وتحریف کرے۔ حافظ ابن کثیر کا میلان بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ گویا دراصل اس فقرے میں شہادت کی راہ میں پیش آنے والی رکاوٹوں کی نشاندہی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی بھرپور کوشش کی جائے۔ یہ رکاوٹیں دو ہی ہیں حُبِّ جاہ اور حبِ مال لا تخشوا الناس میں حبِ جاہ اور لا تشتروا میں حبِ مال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی نہ تو جاہ منصب، قیادت زعامت اور حکومت کو خاطر میں لاؤ اور نہ مفادات، منفعتوں اور خواہشوں کو دھیان میں لاؤ، ان سب سے بالا ہو کر فرضِ شہادت انجام دو۔

قضاء وافتاء میں قانون الٰہی کی خلاف ورزی

۱۱۳۔ اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا ہے تو یہی لوگ کافر ہیں۔ ما انزل اللہ کے موافق حکم نہ کرنے سے غالباً مراد یہ ہے کہ منصوص حکم کے وجود ہی سے انکار کرے اور اس کی جگہ دوسرے احکام اپنی رائے اور خواہش سے تصنیف کرے جیسا کہ یہود نے حکم رجم کے متعلق کیا تھا تو ایسے لوگوں کے کافر ہونے میں کیا شبہ ہے اور اگر مراد یہ ہو کہ ما انزل اللہ کو عقیدۃً ثابت مان کر پھر فیصلہ عملاً اس کے خلاف کرے تو کافر سے مراد عملی کافر ہے یعنی اس کی عملی حالت کافروں جیسی ہے[1]

یہ آیتِ قرآنی مہمات معارف میں سے ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے کچھ گوشوں پر یہاں اجمالی تبصرہ کر دیا جائے۔ شیخ الاسلام نے نچوڑ اور خلاصہ کے طور پر جو کچھ فرمایا ہے وہ اپنی جگہ لاجواب ہے لیکن بےحد مختصر ہونے کی وجہ سے اس سے معالم القرآن کے قاریوں کی تشنگی دور نہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہو گی اس لیے عرض ہے کہ یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں۔ کفر کا لفظ بولا ہے اور آگے دو آیتوں میں ظلم اور فسق کہا ہے۔ کچھ نے یہ کہہ کر اس آیت کی زد سے بچنے کی کوشش کی کہ یہ آیت یہودیوں کے بارے میں ہے اور کچھ نے کہا یہ تینوں آیتیں کفار کے متعلق ہیں اور کچھ نے کفر کے معنے میں اپنی طبعی جولانی دکھائی ہے۔ یہ بات کہ یہ آیات یہودیوں کے بارے میں ہیں یا یہ کافروں سے متعلق ہیں بالکل صحیح ہے اور اس میں دو رائیں نہیں۔ صحیح مسلم میں حضرت براء بن عازب کہتے ہیں کہ یہ آیات کافروں کے حق میں ہیں اور ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عباس کا ارشاد ہے کہ یہ آیات قریظہ اور نضیر یہود کے بارے میں ہے لیکن اس کا مطلب یہ ہے کہ ان آیات کے نزول کا پس منظر یہ ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اسی جرم کا اگر مسلمان ارتکاب کریں تو ان کے حق میں یہ جرم نہیں ہے۔ کیونکہ اعتبار تو قرآن کے عام الفاظ کا ہوتا ہے نہ کہ پس منظر اور اسباب کا۔ شاید حضرت حذیفہ کے سامنے اسی قسم کے ذہن رکھنے والے نے کہا کہ یہ تینوں آیتیں بنی اسرائیل کے حق میں نازل ہوئی ہیں، کہنے والے کا مطلب یہ تھا کہ یہودیوں میں سے جس نے خدا کے نازل کردہ حکم کے خلاف کیا وہی کافر ہے وہی ظالم ہے وہی فاسق ہے اس پر حضرت حذیفہ نے فرمایا کتنے اچھے بھائی ہیں تمہارے لیے یہ بنی اسرائیل کڑوا کڑوا سب ان کے لیے اور میٹھا میٹھا سب تمہارے لیے ہے ہرگز نہیں بخدا تم بھی ان ہی کے نقش قدم پر چلو گے یہ صرف حضرت حذیفہ ہی کا تاثر نہیں بلکہ صحابہ میں سے حضرت عبداللہ بن مسعود اور تابعین میں سے الحسن البصری اور ابراہیم نخعی بھی یہی کہتے ہیں۔

ان ھذہ الآیات الثلاث عامۃ فی الیھود وفی ھذہ الامۃ

یہ تینوں آیتیں یہود کے اور امت محمدیہ کے حق میں آئی ہیں۔

علامہ اسماعیل قاضی نے احکام القرآن میں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ قرآن کا ظاہر یہی ہے کہ جو شخص بھی یہودیوں جیسا کردار پیش کرے گا اور خدا کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے قانون پر عمل کرے گا وہ اسی وعید کا مستحق ہے حاکم ہو یا مفتی یا کوئی اور۔

یہ آیت اس بارے میں نص قطعی و ظاہر ہے کہ جو مسلمان دانستہ بلا کسی وجہ شرعی کے خدا کے احکام کی بجائے دوسرے احکام اپنی رائے اور خواہش سے تصنیف کرے یا دوسروں کے تصنیف کردہ لے کر نافذ کرے اس کے کفر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے وہ یقیناً کافر بھی ہے ظالم بھی ہے اور فاسق بھی۔ کافر اس لیے کہ اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کے ہم معنے ہے، ظالم اس لیے کہ اس کا

یہ فعل عدل و انصاف کے خلاف ہے اور فاسق اس لیے کہ بندہ ہونے کے باوجود وہ اپنے مالک کے قانون کے دائرے سے نکل رہا ہے۔ اسلامی زندگی کا مدار ہی اللہ کی حاکمیت ہے اور شریعت کے نزدیک اس فعل سے بڑھ کر اور کون سا فعل ہے جو ایک مسلمان کے لیے کفر، ظلم اور فسق کا موجب ہوگا؟ — یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس کردار کے لیے وہ وعید فرمائی جو کسی معصیت کے لیے نہیں فرمائی یعنی فاولٰئک ھم الکافرون۔ سارے قرآن میں یہ انداز وعید کافروں کے لیے مخصوص ہے۔ لیکن یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح ایمان و اسلام کی ستر سے اوپر کچھ شاخیں ہیں اور ان میں سے ہر شاخ ایمان و اسلام ہے اسی طرح کفر کی بھی شاخیں ہیں اور اس کے بھی مراتب ہیں۔ اسی لیے صحابہ و سلف سے مروی ہے کفر دون کفر و ظلم دون ظلم۔ امام بخاری نے کتاب الایمان میں باب باندھا ہے کفران العشیر و کفر دون کفر لیکن دراصل یہ خود صحابہ کرام کے آثار سے ماخوذ ہے جیسا کہ امام احمد نے کتاب الایمان میں عطاء ابن ابی رباح کے طریق سے روایت کیا ہے اور امام ابوالحسن الاشعری نے بھی مقالات طوائف الاسلامیہ میں لکھا ہے کہ متعدد صحابہ سے منقول ہے۔[1]

پھر جس طرح ایمان اعتقادی بھی ہے اور عملی بھی۔ یعنی اعتقادات و افکار میں سے بھی ہے۔ اور عملیات و ظواہر میں سے بھی۔ فکر بھی ہے اور فعل بھی ایمان باللہ والرسل بھی ایمان ہے اور نماز بھی ایمان ہے ٹھیک اسی طرح کفر کی بھی دو قسمیں ہیں اعتقادی اور عملی۔ ایک کفر اعتقادات و افکار کا ہے اور ایک اعمال و افکار کا۔ شرک کفر اعتقادی ہے اور ترک صلاۃ متعمداً کفر عملی۔ لہٰذا یہ جو فرمایا کہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولٰئک ھم الکافرون۔ تو اس میں اور عموم کفر و ایمان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ نہ لفظ کفر کی یہاں کوئی تاویل کرنی چاہیے اور نہ یہودیوں سے مخصوص کرنا چاہیے۔ قرآن نے جس فعل کو کفر کہا ہے وہ کفر کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا۔ اور جب تک دنیا باقی ہے وہ کفر ہی رہے گا۔ ہاں یہ کفر بھی دوسرے اعمال کفریہ کی طرح کفر عملی ہے نہ کہ کفر اعتقادی و مخرج من الملت، اس کا کرنے والا ویسا ہی فعل کفر کا مرتکب ہوگا جیسا نماز جان کر چھوڑ دینے والا لیکن یہ وہ کفر نہیں جو ملت اسلامیہ سے نکال دیتا ہے۔ جب تک ایک شخص اعتقاد کے اس دروازے سے پلٹ نہ جائے جس دروازے سے اسلام میں داخل ہوا تھا

---

[1] تفصیلات حافظ ابن تیمیہ کی کتاب الایمان میں ہیں۔

اس وقت تک اس معنے میں کافر نہیں ہو سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کرنا اور خود تراشیدہ ہوئے یا انسانوں کے بنائے ہوئے قانون پر فیصلہ کرنا قرآن کے نزدیک ان انتہائی معاصی میں سے ہے جو عملاً کفر ہیں اس لیے اس کفر کے بعد جو مسلمان کو قطعاً کافر و مرتد کر دیتا ہے اس کفر سے بڑھ کر کوئی برائی نہیں ہے اور قریب ہے کہ اس کا مرتکب اس کفر کے حدود میں بھی داخل ہو جائے۔ قرآن میں جن لفظوں میں اس کا ذکر کیا ہے وہ عام گناہوں کے لیے کبھی اختیار نہیں کیا جاتا۔ یہ انداز بیان اتنا شدید ہے کہ اوّل تو کافر کہا جا رہا ہے پھر تاکید بر تاکید اور قصر الصفۃ علی الموصوف کے ذریعے اس میں اس قدر سنگینی پیدا کر دی گئی ہے کہ جس دل میں رائی برابر بھی اللہ اور یوم آخرت پر ایمان ہو اس کو لرزا دینے اور خوف الٰہی سے بدحال کرنے کے لیے کافی ہے۔ اگر ایک مسلمان کا ایمان بالکل مردہ نہیں ہو گیا ہے تو سارے گناہ جو زمین پر کیے جاتے ہیں اس سے سرزد ہو سکتے ہیں مگر اس کفر کے ارتکاب کا کبھی دھیان بھی نہیں کر سکتا۔ اس تاکید اور زور کے ساتھ ان کو کافر قرار دینے کی وجہ وہ اہتمام ہے جو اللہ تعالیٰ ان کو اپنی شریعت اور کتاب کی تعلیم دینے اس کی ذمہ داریوں سے آگاہ کرنے اور اس راہ کے خطرات سے متنبہ کرنے کے لیے فرمایا۔ قرآن نے جن اعمال پر جو تعبیر اختیار کی ہے اور جو الفاظ استعمال کیے ہیں ہمیں حق نہیں ہے کہ تاویل و توجیہ کر کے ان کے لغوی مفہوم کا اصلی زور گھٹا دیں۔ ایسی کوششیں جن لوگوں نے کی ہیں۔ مسلمانوں کو اسلام و ایمان کی عملی زندگی سے محروم کر دیا۔ یہ جو آج تمام عالم اسلامی میں تقریباً دو تہائی مسلمان عملاً ایک قلم مرجی جیسی زندگی بسر کر رہے ہیں تو اس کے متعدد اسباب میں سے ایک بڑا سبب یہی فتنہ تاویل ہے۔ اسی بدعت کی وجہ سے اعمال کی اہمیت مطلوبیت بالکل ناپید ہو چکی ہے۔

یہی وجہ ہے کہ ائمہ سلف نے ہمیشہ ایسی تاویلوں سے انکار کیا اور ان تمام راہوں سے بچتے رہے جو رلتے اور تعمق کی بدعتوں کی طرف لے جانے والی ہوں۔ حافظ ابن کثیر نے براء بن عازب، حذیفہ ابن الیمان، عبداللہ بن عباس، ابو مجلز، ابو رجاء، عکرمہ، عبیداللہ بن عبداللہ اور الحسن البصری کا یہ خیال نقل کر کے نزلت ھذہ الآیات فی بنی اسرائیل صحابہ اور تابعین سے یہ بھی نقل کیا ہے کہ حسن بصری کہتے ہیں کہ ان آیات کا وجوب ہم پر بھی ہے۔ ابراہیم نخعی کہتے ہیں کہ یہ آیات بنی اسرائیل کے باب میں ہیں لیکن اس امت کے لیے بھی اللہ کی رضا یہی ہے۔ عبداللہ ابن مسعود کہتے ہیں کہ مسلمان کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنے

ہے۔ عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ یہ کفر ہے۔ عطا ابن ابی رباح کہتے ہیں کہ یہ کفر دون کفر ہے۔ ان سب بزرگوں کا مقصود یہی تھا کہ اس کی تاویل نہ کرنا چاہیے۔ آیت کا صاف مطلب یہی ہے کہ جو غیر شرعی احکام کو شرعی احکام قرار دے اور انسانی قانون کو خدائی قانون کے مقابلے میں چلائے۔ بڑی جسارت رکھنے والوں کے کفر میں شک کیا ہو سکتا ہے؟

یہودیوں کا ضابطہ فوجداری

۴۵۔ اور ہم نے تورات میں یہودیوں کے لیے لکھ دیا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ، ناک کے بدلے ناک، کان کے بدلے کان، دانت کے بدلے دانت اور زخموں کے بدلے ویسے زخم ہیں۔ یعنی قصاص کا یہ حکم شریعت موسوی میں تھا اور بہت سے علماء نے تصریح کی ہے کہ جو پچھلی شرائع قرآن کریم یا ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے نقل فرمائی ہیں بشرطیکہ ان کی نسبت کسی جگہ حضور نے کوئی انکار یا ترمیم نہ فرمائی ہو تو وہ اس امت کے حق میں بھی تسلیم کی جائے گی گویا بدون انکار کے ان کا سنانا تلقی بالقبول کی دلیل ہے[1]

یہ بھی یہودیوں پر طنز ہے کہ تورات میں تو اللہ نے تمہارے لیے یہ قانون بنایا تھا کہ جان کے بدلے جان، آنکھ کے بدلے آنکھ۔ اور تم نے یہ کر لیا کہ اگر نضیر کا آدمی قریظہ کے کسی آدمی کو مار ڈالے تو قصاص نہیں لیتے اور آدھی دیت لے کر چھوڑ دیتے ہو۔ اگر قریظہ کا کوئی آدمی نضیر کے کسی آدمی کو مار ڈالے تو اس سے پوری دیت لیتے ہو۔ امیر غریب کی یہ تفریق تورات میں کہاں تھی۔ یہ تو کھلم کھلا خدائی قانون کی بغاوت ہے۔ ہم نے تورات میں بلا تفریق قصاص کا حکم دیا تھا۔ تم نے یہ تفریق کہاں سے نکالی ہے۔ اگرچہ ابن عباس سے منقول ہے کہ یہ آیات زنا کے کیس میں نازل ہوئی ہیں جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے مگر امام احمد نے مسند میں اور ابن جریر نے تفسیر میں یہ واقعہ بھی عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے لکھا۔ ابو داؤد اور نسائی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ قتادہ اور مقاتل بھی یہی کہتے ہیں۔ اسباب میں تعدد ہو سکتا ہے۔ دونوں واقعات پیش آتے ہوں اور وحی الٰہی نے ایک ہی جگہ اتحاد نوعیت کی وجہ سے دونوں کا مداوا کر دیا۔

اس آیت سے بہت سے اصولیین اور فقہاء نے اسلامی قانون کے اس موقف کو واضح کیا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے کہ اسلام سے قبل کے قوانین بھی اسلامی حکومت کے لیے قانونی حیثیت رکھتے ہیں بشرطیکہ ان کا نسخ نہ ثابت ہوا ہے۔ چونکہ یہاں اس ضابطہ فوجداری کے منسوخ ہونے کا کوئی اشارہ تک نہیں اس لیے تمام مدارس قانون کا یہ متفقہ فیصلہ ہے کہ یہی اسلام کا قانون فوجداری ہے۔ ابو منصور بن الصباغ کی کتاب الشامل کے حوالے سے القاسمی نے نقل کیا ہے کہ تمام اُمت کے اہل علم کی اجتماعی قوت اس کی پشت پر ہے۔

جس ضابطہ فوجداری کا تورات کا نام لے کر یہاں ذکر کیا گیا ہے۔ تورات میں سارے تحریفی انقلابات کے باوجود یہ حکم کتاب خروج ۲۱، ۲۳، ۲۵ کتاب احبار ۲۴، ۲۰ اور کتاب استثنا ۱۹، ۲۱ میں صراحۃً موجود ہے۔

سارے ائمہ نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ مرد کو عورت کے بدلے میں قتل کیا جائے گا۔ اور امام ابو حنیفہؒ نے النفس بالنفس کے عموم سے اپنے اس قانونی موقف پر بھی استدلال کیا ہے کہ مسلمان اگر قاتل ہو اور مقتول کافر بشرطیکہ اسلامی مملکت کا شہری ہو اور ایسے ہی اگر آقا قاتل ہو اور غلام مقتول ہو تو مسلمان قاتل سے قصاص لیا جائے گا۔ اگرچہ دوسرے مدارس فقہ کو اس موضوع پر ابو حنیفہ سے اختلاف بھی ہے لیکن سچی بات یہ ہے کہ راویوں کی تعبیرات سے الگ ہو کر اگر قرآن کا مطالعہ کیا جائے تو قرآن کا رجحان یہی ہے۔ یہاں تورات کے اس ضابطہ فوجداری پیش کرنے کی رُوح یہ ہے کہ تورات میں واضح احکام کے باوجود یہ یہود کیسے آپ کو حکم بنا کر فیصلے سے گریز پائی کر رہے ہیں۔ اس سے یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ دراصل یہ حدود ہی کے معاملات تھے جو یہود کے لیے سب سے بڑا پرچہ امتحان بنے ہوئے تھے۔ ان کی دینی زندگی کا سب سے بڑا جرم حدود و تعزیرات سے فرار تھا۔ وجوہ و اسباب کے تجزیے سے ہٹ کر اگر غور کیا جائے تو موجودہ دور کے مسلمانوں کی اسلامی زندگی میں بھی آپ کو حدود و تعزیرات ہی سب سے بڑی آزمائش محسوس ہوں گے۔

آیت میں والجروح قصاص سے مراد یہ ہے کہ زخم بھی محل قصاص ہیں۔ یعنی جسم انسانی میں ہر زخم کا قصاص لیا جائے گا لیکن جس زخم کے لینے سے موت کا اندیشہ ہو یا زخم کا طول و عرض اور عمق معلوم نہ ہو سکے تو ان صورتوں میں تاوان لیا جائے گا جس کو قانون کی زبان میں ارش کہتے ہیں

معافی گناہوں کا کفارہ ہے

۱۱۵۔ پھر جو کوئی بدلہ لینا معاف کر دے تو وہ گناہ کے لیے کفارہ ہے۔ یعنی جو روح کے قصاص کو

معاف کر دینا مجروح کے گناہوں کا کفارہ بن جاتا ہے جیسا کہ بعض احادیث میں اس کی تصریح ہے۔ اور بعض مفسرین نے اس آیت کو جارح کے حق میں رکھا ہے۔ یعنی اگر مجروح نے جارح کو معافی دے دی تو اس کا گناہ معاف ہو جائے گا والراجح ہو الاول [1]

اصل میں آیت میں لفظ لہ کی ضمیر کے متعین کرنے میں شارحین قرآن کا اختلاف ہے۔ کچھ کی رائے ہے کہ اس کا مرجع مجروح یعنی وہ شخص ہے جسے زخمی کیا گیا ہے اور جو معاف کر رہا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ اگر مجروح اپنے مجرم کو معاف کر دے اور اس سے بدلہ نہ لے تو اس کی یہ نیکی اس کے گناہوں کے لیے کفارہ ہو جائے گی۔ اس طرح یہ آیت مجروح کو معاف کرنے کی ترغیب دے رہی ہے۔ امام شعبی بھی یہی فرماتے ہیں اور بیشتر مفسرین کی رائے بھی یہی ہے۔ ارشاد نبوت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے فرمایا جس کے جسم میں کوئی زخم لگایا گیا اور اس نے معاف کر دیا تو جس درجہ کی یہ معافی ہوگی اسی کے بقدر اس کے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ درجات کی تشریح حضور انور ہی نے اس ارشاد میں فرمائی ہے جو بحوالہ عبداللہ بن عمر دیلمی نے نقل کیا ہے کہ:

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت تلاوت فرمائی اور بتایا کہ اس کا مصداق وہ شخص ہے جو کسی کا دانت توڑتا ہے یا اس کو زخمی کرتا ہے اور مجروح اسے معاف کر دیتا ہے تو مجروح کے اس قدر گناہ معاف ہو جاتے ہیں جتنی اس نے معافی دی ہے اگر آدھی دیت معاف کی ہے تو آدھے گناہ اور اگر چوتھائی معاف کی ہے تو چوتھائی گناہ۔ اگر تہائی دیت معاف کی ہے تو تہائی گناہ اور اگر ساری دیت معاف کی ہے تو سارے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

اس کے برعکس عبداللہ بن عباس، مجاہد اور حضرت جابر یہ فرماتے ہیں کہ لہٗ میں ضمیر کا مرجع مجروح نہیں بلکہ جارح ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر مجروح مجرم کو معاف کر دے تو یہ معافی مجرم کے لیے کفارہ بن جائے گی۔ عدالت اس پر کوئی مقدمہ نہ چلائے گی اور قانون اس سے کوئی باز پرس کرے گا۔

قانونی اور اخلاقی تقاضا

دونوں تشریحات میں ایک جوہری فرق ہے۔ پہلی رائے محض ایک اخلاقی وعظ و تلقین ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جبکہ دوسری سزا کے لیے ایک قانونی ضابطہ فراہم کرتی ہے وہ یہ کہ مجروح کے معاف کرنے کے بعد عدالت کو مجرم پر مقدمہ چلانے اور اسے سزا دینے کا کوئی اختیار نہیں ہے۔ قانونی اور اخلاقی ہدایات کی یہ تقسیم انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ انسانی زندگی کو پوری طرح قانون کے شکنجے میں کس دینا نہ تو مناسب اور مفید ہے نہ ممکن العمل۔ اسی طرح ہر ہدایت کو اختیاری اور اخلاقی درجہ دینا انسان کو ہلاکت کے غار میں دھکیل دینے کے مترادف ہے۔

اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ فساد اور برائیوں کے انسداد کے لیے دو چیزیں ہیں۔ قانون اور اخلاق، اگرچہ منشا دونوں کا ایک ہے مگر منزل مقصود تک پہنچنے کی راہیں مختلف ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا۔ جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ بہرحال جن مفسرین کی منظر اخلاق پر ہے انہوں نے لہٗ کی ضمیر کا مجروح کو قرار دیا اور آیت قرآنی سے عفو کی ترغیب معلوم کی اور جن کے پیش نظر قانون ہے انہوں نے ضمیر کا مرجع جارح کو بتایا اور اس سے عدلیہ کے لیے ایک قانونی دفعہ معلوم کر لی اور دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور دونوں کو سلف کی حمایت حاصل ہے۔

خدائی قانون کے خلاف فیصلہ کرنے والے ظالم ہیں

۴۱۱۔ اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرے گا تو یہی لوگ ظلم کرنے والے ہیں۔ یہود نے حکم قصاص کے خلاف بھی تعامل قائم کر لیا تھا۔ ان میں بنی نضیر جو زیادہ معزز اور قوی تھے۔ بنو قریظہ سے پوری دیت وصول کرتے اور جب ان کو دینے کی نوبت آتی تو نصف دیت ادا کرتے۔ بنی قریظہ نے اپنی کمزوری کی وجہ سے ان سے اس طرح کا معاہدہ کر رکھا تھا۔ اتفاقاً بنی قریظہ کے ہاتھ سے بنی نضیر کا آدمی مارا گیا۔ انہوں نے دستور سابق کے موافق ان سے پوری دیت طلب کی۔ بنو قریظہ نے جواب دیا کہ جاؤ وہ زمانہ گیا جب ہم نے تمہاری قوت سے مجبور ہو کر یہ ظلم منظور کیا تھا۔ اب محمد صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں آ چکے ہیں، ان کا دور دورہ ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ جو دیت تم سے لیتے ہیں اس سے دگنی ادا کریں۔ اس سے غرض یہ تھی کہ جناب محمد رسول اللہ کی موجودگی میں یہ محال ہے کہ کوئی قوی ضعیف کو کچل دے۔ کیونکہ سب کو یقین تھا کہ آپ ہر ضعیف و قوی کے ساتھ یکساں

انصاف کرتے ہیں اور طاقتوروں کے مظالم کے مقابلے میں ضعفاء کی دستگیری فرماتے ہیں۔ انجام کار یہ معاملہ حضور کی عدالت میں پیش ہوا اور بنی قریظہ نے جو خیال اس پیکرِ عدل و انصاف کے بارے میں ظاہر کیا تھا۔ بلاکم و کاست صحیح نکلا۔ حکم قصاص کے بعد و من لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک هم الظلمون۔ فرمانے سے اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے اور چونکہ رجم کی طرح قصاص کے حکم شرعی ہونے کا صریحاً انکار نہیں کیا تھا بلکہ آپس کی مفاہمت سے خلاف حکم شرعی ایک دستور قائم کرلیا تھا تو قانون کی یہ اعتقادی نہیں صرف عملی مخالفت تھی اس لیے یہاں کافرون کی جگہ ظالمون فرمایا یعنی یہ ظلم صریح ہے کہ قوی سے کم اور ضعیف سے زیادہ دیت لی جائے [1]

یہاں فوجداری قانون ذکر کرنے کے بعد ان لوگوں کو ظالم کہا ہے جو عدل و انصاف کے اس خداوندی قانون کو محض طاقت کے گھمنڈ میں نظر انداز کرتے ہیں وہ اپنی ذات پر اور اپنے معاشرے پر سب سے بڑا ظلم کرتے ہیں۔ قتل دنیا میں سب سے بڑا ظلم ہے۔ اسی بنا پر ارشاد فرمایا ہے کہ اول ما یقضی بین الناس الدماء قیامت کے روز سب سے پہلے جس معاملہ کا فیصلہ چکایا جائے گا وہ انسان کا خون ہے۔

شاید یہاں ذہن میں آپ یہ خلش محسوس کریں کہ یہ حدیث مشہور حدیث محاسبہ صلاۃ کے معارض ہے کیونکہ نماز کے متعلق قضا (فیصلہ) کا نہیں بلکہ حساب کا لفظ آیا ہے۔ بخاری کی روایت میں اول ما یحاسب بہ الصلاۃ۔ قیامت میں سب سے پہلے آدمی سے جس عمل کا حساب لیا جائے گا وہ نماز ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جن کاموں میں محاسبہ ہوگا ان میں سب سے پہلا کام نماز ہے لیکن جن کاموں میں فیصلہ چکایا جائے گا ان میں سب سے پہلا معاملہ قتل کا ہوگا۔ ان میں سب سے پہلے معاملہ خون کا معاملہ ہوگا لہٰذا دونوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ محاسبہ اور قضا میں فرق ہے۔ کچھ کام انسان کی ذات سے تعلق رکھتے ہیں اور کچھ دوسروں کے حقوق سے۔ شریعت نے اسی فرق کو حقوق اللہ اور حقوق العباد سے تعبیر کیا ہے۔ پہلی قسم کے کاموں میں قضا اور فیصلہ کی ضرورت نہیں کیونکہ یہ ہر شخص کا ذاتی معاملہ ہے اس کا کوئی دوسرا مدعی نہیں ہے۔ اس میں باز پرس ہو سکتی ہے۔ لیکن دوسری قسم کے لیے پرسش کافی نہیں فیصلہ چکانے کی ضرورت ہے کیونکہ وہ ایسے کام ہیں جن میں دوسروں کے حقوق تلف ہوتے ہیں اور وہ بحیثیت مدعی حاضر ہوں گے۔ نماز پہلی

[1] افادات شیخ الاسلام

قسم کے اعمال میں سب سے اہم ہے اور قتل کا معاملہ دوسری قسم میں سب سے زیادہ اہم ہے لہٰذا حساب کے موقع پر سب سے پہلے نماز کی پوچھ گچھ ہوگی اور جب فیصلہ چکایا جائے گا تو سب سے پہلے قتل نفس کا معاملہ پیش ہوگا۔ مالیات کے موضوع پر صرف یہ آتا ہے کہ

بندے قیامت کے روز اپنی ٹانگوں پر کھڑے رہیں گے جب تک چار باتوں کے جواب سے فارغ نہ ہوں گے ان میں ایک بڑا سوال یہ ہوگا کہ مال کو کن ذرائع سے حاصل کیا اور کن راہوں پر خرچ کیا۔

تورات کی تصدیق

۱۱۷- اور پھر ہم نے ان نبیوں کے بعد حضرت عیسیٰ بن مریم کو روانہ کیا تورات کی تصدیق کرتا ہوا جو اس کے سامنے موجود تھی، اور ہم نے اسے انجیل دی جس میں ہدایت اور روشنی ہے اور تورات کی جو اس کے سامنے ہے تصدیق کرتی ہے اور متقیوں کے لیے نصیحت اور راہ کو راہ بتانے والی ہے۔ یعنی ان کے نقش قدم پر حضرت عیسیٰ بھی چلتے تھے وہ خود اپنی زبان سے تورات کی تصدیق فرماتے تھے اور جو کتاب انجیل ان کو دی گئی تھی وہ بھی تورات کی تصدیق کرتی تھی۔ اور انجیل کی نوعیت بھی نور و ہدایت ہونے میں تورات کی طرح تھی۔ احکام و شرائع کے اعتبار سے دونوں میں بہت ہی قلیل فرق ہے جیسا کہ و لاحل لکم بعض الذی حرم علیکم میں اشارہ کیا گیا ہے اور یہ فرق تورات کی تصدیق کے منافی نہیں ہے جیسے ہم آج قرآن کو مانتے اور صرف اسی کے احکام کو ماننے کے باوجود بحمد للہ تمام کتب سماویہ کے من عند اللہ ہونے کی تصدیق کرتے ہیں[1]

اصل ارشاد قفینا آیا ہے یہ لفظ قفا سے ہے گدی کو یعنی گردن کے پچھلے حصہ کو کہتے ہیں۔ تقفیتہ اور قفیت ب۔ اور قفیت بہ بمعنی تبعتہ سب کے معنے پیچھے چلنے اور نقش قدم پر چلنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان ہی انبیاء کے نقش قدم پر جو تورات کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ ہم نے حضرت عیسیٰ کو روانہ کیا۔ یعنی ان کی شریعت بھی تورات ہی تھی اور حضرت عیسیٰ کو ہم نے انجیل دی۔ حضرت مسیح اور انجیل دونوں تورات کی تصدیق کرتے تھے۔ یہ تصدیق

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بھی من جملہ علامات نبوت ایک تھی جس طرح ایک ہی درخت کے برگ وبار میں مماثلت ہوتی ہے اسی طرح اس مقدس گروہ کے افراد میں ایک دوسرے کی تصدیق میں ہم آہنگی ہوتی ہے۔ ان میں ہر ایک دوسرے کی تصدیق کرتا ہے اس میں بھی یہود پر طنز ہے کہ ان کو نہ مان کر تم نے اپنی بے بصیرتی کا ثبوت دیا ہے اور اس میں یہ بھی اشارہ ہے کہ حضرت مسیح کوئی نیا مذہب لے کر نہیں آئے تھے بلکہ وہی ایک دین جو پچھلے انبیا کا متفقہ دین تھا مسیح کا بھی دین تھا اور اسی کی طرف ان کی دعوت تھی۔ تورات کی اصل تعلیمات میں سے جو کچھ ان کے زمانے میں محفوظ تھا اس کو مسیح خود بھی مانتے تھے اور انجیل بھی اس کی تصدیق کرتی تھی۔ چنانچہ اس انجیل میں بھی ہے کہ

> یہ نہ سمجھو کہ میں تورات کو منسوخ کرنے آیا ہوں، منسوخ کرنے نہیں بلکہ پورا کرنے آیا ہوں۔ متی باب ۵ آیت ۱۷، ۱۸

یہاں انجیل کے بارے میں اور پہلے تورات کے بارے میں یہ ایک جگہ آیا ہے کہ فیہ ھدی و نور کہ تورات میں ہدایت اور روشنی ہے اور انجیل میں ہدایت اور روشنی ہے۔ دو باتیں الگ الگ ہیں ایک کسی چیز کا ہدایت و روشنی کے لیے ظرف ہونا اور دوسرے کسی چیز کا بجائے ظرف ہونے کے خود ہدایت اور روشنی ہونا۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ اتنا ہی فرق جیسے ایک کسی کے لیے رحمت کا ظرف ہونا اور کسی کا خود رحمت ہو جانا۔ دوسرے انبیا کے لیے رحمت ظرف ہے ادخلنا ھم فی رحمتنا اور حضور کی ذات گرامی خود سراپا رحمت ہے اس میں اشارہ ہے کہ قرآن سے پہلے ہر کتاب اور حضور انور سے پہلے ہر نبی اسلام کے باغ میں درخت کی اور مکان میں کمرے کی حیثیت رکھتے رہے جس کتاب کو اسلام کا پورا باغ اور پورا مکان اور جس ذات کو ساری بارات کا دولہا بنا کر روانہ کیا گیا ہے وہ قرآن حکیم اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اسی لیے جیسے قرآن کو سراپا ہدایت، رحمت اور نور کہا ہے ایسے ہی حضور انور کو رحمۃ للعالمین ہادی اور نور کہا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ قرآن اور محمد رسول اللہ جو کچھ لے کر آئے ہیں وہ مکمل اور ان کے ذریعے دین الٰہی اپنے تمام اصول و فروع کے لحاظ سے پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضور انور سے پہلے آنے والوں میں سے ہر ایک نے یہی کہا کہ اس کے بعد ایک اور کتاب اور نبوت آئے گی جو اللہ کے دین کی تکمیل کرے گی چنانچہ تورات کہتی ہے کہ حضرت موسیٰ سے خدا نے فرمایا۔

> میں ان کے بھائیوں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے فرماؤں گا وہ سب ان سے کہے گا۔

اور انجیل میں ہے ؛

لیکن وہ فارقلیط (احمد) پاکیزگی کی روح ہے جسے باپ خدا میرے نام سے بھیجے گا ، وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو میں نے تم سے کہی ہیں یاد دلائے گا۔ یوحنا ۱۴ - ۲۶ -

آخر وہ نور ، ہدایت ، رحمۃ آیا اور دعویٰ کیا کہ میں برہان ہوں ، نور ہوں ، ہدایت ہوں ، اور رحمت للعالمین ہوں ۔ میری کتاب نور مبین ہے رحمت ہے ہدایت کا مظہر ہے اور آخر زمانہ نبوت کے ختم پر وحی الٰہی نے آپ کی زبان سے یہ اعلان عام کیا ۔

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی ۔

اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ آپ نے یہود کے بعض سخت فقہی احکام کو جو ان کی سخت گیری کے باعث ان پر عائد تھے ۔ اور در اصل دین ابراہیمی میں داخل نہ تھے ۔ یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام عطا کیے جو ہر زمانہ کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں ۔ اسی لیے آپ نے کسی اپنے بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں کی ، نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی ۔ نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کہ سراپا شریعت ، نور رحمت ہونے کے بعد کسی نئے آنے والے ، کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کی گنجائش کہاں ؟ اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ما انزل من قبلک پر ایمان لانے کی تاکید کی اور ما انزل من بعدک کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا ۔

اور یہاں انجیل کے تعارف میں یہ جو فرمایا ہے ھدی و موعظۃ للمتقین تو یہ تورات و انجیل کے باہمی فرق کی طرف اشارہ ہے کہ تورات محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق ہے ۔ تورات کا اصول عادلانہ انتقام پر مبنی ہے اس کا حکم ہے ۔

جو انسان مار ڈالے گا یا مار ڈالا جائے گا . . . . اور اگر کوئی اپنے ہمسائے کو چوٹ لگاتے سو جیسا کرے گا ویسا پاتے گا ۔ توڑنے کے بدلے توڑنا ، آنکھ کے بدلے آنکھ ، دانت کے بدلے دانت (احبار)

اور انجیل کی تعلیم سر تا سر عفو ہے ۔

تم سن چکے ہو کہ کہا گیا کہ آنکھ کے بدلے آنکھ اور دانت کے بدلے دانت پھر تمہیں میں کہتا ہوں کہ ظالم کا مقابلہ نہ کرنا بلکہ جو تیرے داہنے گال پر تھپڑ مارے دوسرا گال بھی اس کی طرف پھیر دے ۔ (متی)

قرآن کی اہل انجیل کو تنبیہہ

۱۱۸۔ اور انجیل والوں کو اسی کے مطابق فیصلہ کرنا چاہیے جو اللہ نے نازل کی اور جو کوئی اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا تو یہی لوگ فاسق ہیں۔ یا تو عیسائی جو نزول کے وقت موجود تھے ان کو یہ حکم دیا گیا تھا اسی کو یہاں نقل فرمایا ہے اور ہو سکتا ہے کہ نزول قرآن کے وقت جو عیسائی مخاطب تھے ان سے کہا گیا ہو کہ جو کچھ انجیل میں اللہ تعالیٰ نے اتارا ہے اس کے موافق ٹھیک ٹھیک حکم کریں یعنی ان پیشین گوئیوں کو چھپانے یا لغو اور مہمل تاویلات سے بدلنے کی کوشش نہ کریں جو انجیل میں پیغمبر آخر الزماں اور مقدس فارقلیط کی نسبت حضرت مسیح کی زبانی کی گئی ہیں۔ یہ خدا تعالیٰ کی سخت نافرمانی ہوگی کہ جس ہادی جلیل اور مصلح اعظم کے متعلق حضرت مسیح نے فرمایا کہ "جب وہ روح حق آئے گی تو تمہیں سچائی کی ساری راہیں بتائے گی۔ اسی کی تکذیب پر کمربستہ ہو کر اپنے لیے ابدی خسران قبول کرو۔" کیا مقدس مسیح اور اس کے پروردگار کی فرمانبرداری کے یہی معنے ہیں لہ

مطلب یہ ہے کہ اہل انجیل کو انجیل دیتے وقت ہم نے کہا تھا کہ اپنے احوال وظروف کو انجیل کی ترازو میں رکھ کر تولیں ورنہ فاسق ہوں گے۔ اس صورت میں اصل عبارت یوں ہوگی۔ قلنا لیحکم اھل الانجیل الخ اور یا مطلب یہ ہے کہ اب ان سے کہا جا رہا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں اہل انجیل کو فیصلہ انجیل کی روشنی میں کرنا چاہیے۔ کیونکہ اس وقت یہی پیش پا افتادہ مسئلہ ہے اور لفظ فاسق یہاں فقہی اصطلاح میں عادل کے مقابلہ پر نہیں ہے بلکہ عدل سے غداری، عہد شکنی اور سرکشی کے معنے میں ہے۔ قرآن میں پڑھ چکے ہو۔

الفاسقین الذین ینقضون عھد اللہ من بعد میثاقہ

فاسق وہ ہیں جو اللہ کے عہد کو مضبوط کرنے کے بعد توڑتے ہیں

لفظ فاسق قرآن کے مصطلحات میں سے ہے، ورنہ ائمہ لغت لکھتے ہیں کہ فاسق کے استعمال کی قرآن سے پہلے عربی زبان میں عادت نہ تھی۔ فیروزآبادی فرماتے ہیں کہ عرب جاہلیت کے نظم ونثر میں عربی ہونے کے باوجود لفظ فاسق کا استعمال نہیں ہوا ہے۔ اور ابن الاعرابی

لہ افادات شیخ الاسلام

نے کہا ہے کہ زمانہ جاہلیت کے ادبی ذخیرے میں لفظ فاسق نہیں ہے۔ فسق بحیثیت فعل بے جان چیزوں کے لیے ضرور استعمال ہوتا تھا لیکن بحیثیت اسم فاسق کا استعمال کلام عرب میں انسان کے لیے نہیں ہے۔

وَاَنْزَلْنَآ اِلَيْكَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَيْنَ يَدَيْهِ مِنَ الْكِتٰبِ
وَمُهَيْمِنًا عَلَيْهِ فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَهُمْ
عَمَّا جَآءَكَ مِنَ الْحَقِّ ؕ لِكُلٍّ جَعَلْنَا مِنْكُمْ شِرْعَةً وَّمِنْهَاجًا ؕ وَلَوْ شَآءَ
اللّٰهُ لَجَعَلَكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَّلٰكِنْ لِّيَبْلُوَكُمْ فِيْ مَآ اٰتٰىكُمْ فَاسْتَبِقُوا
الْخَيْرٰتِ ؕ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيْعًا فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ فِيْهِ
تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۴۸﴾ وَاَنِ احْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَلَا تَتَّبِعْ
اَهْوَآءَهُمْ وَاحْذَرْهُمْ اَنْ يَّفْتِنُوْكَ عَنْۢ بَعْضِ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ
اِلَيْكَ ؕ فَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمْ اَنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّصِيْبَهُمْ بِبَعْضِ
ذُنُوْبِهِمْ ؕ وَاِنَّ كَثِيْرًا مِّنَ النَّاسِ لَفٰسِقُوْنَ ﴿۴۹﴾ اَفَحُكْمَ
الْجَاهِلِيَّةِ يَبْغُوْنَ ؕ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ حُكْمًا لِّقَوْمٍ يُّوْقِنُوْنَ ﴿۵۰﴾

اور ہم نے تمہاری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری، یہ ان
کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو سامنے موجود ہیں اور اُن پر

نگہبان[119]، لہٰذا تم ان کے درمیان خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آچکا ہے اس سے ہٹ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو[120]۔ تم میں ہر گروہ کے لیے ہم نے ایک شرعہ اور ایک منہاج مقرر کر دی[121]۔ اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک اُمّت بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور اس لیے نہیں کیا تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے[122]۔ لہٰذا نیکی کی راہ میں ایک دوسرے سے آگے بڑھو، تم کو بالآخر اللہ ہی کی طرف پلٹ کر جانا ہے، پھر وہ تمہیں ان باتوں کی حقیقت بتائے گا جن میں تم اختلاف رکھتے تھے[123]، اور اے پیغمبر ہم نے تمہیں حکم دیا ہے کہ جو کچھ خدا نے اتارا ہے اس کے مطابق ان لوگوں کا فیصلہ کرو اور اُن کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو، اور ان کی جانب سے چوکنے رہو،

کہیں تمہیں اس قانون کے کچھ حصہ سے نہ بچلا دیں جو اللہ نے نازل کیا ہے[۱۲۴]۔ پس اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو جان لو کہ اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ ان کے کچھ گناہوں کی وجہ سے ان پر افتاد آئے اور یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں میں اکثریت نافرمانوں کی ہے[۱۲۵]۔ اگر لوگ اللہ کا حکم نہیں چاہتے ہیں تو کیا جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں، اور ایمان و یقین والوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے[۱۲۶]؟۔

قرآن کا چہرہ

دنیا میں وقتاً فوقتاً انبیا کے ذریعے پیغام آتے رہے ہیں۔ موسیٰ تورات لے کر آئے اور عیسیٰ انجیل لے کر، لیکن یہ خاص زمانہ اور قوم کے لیے اور وقتی تھے اور اس لیے ان کی دائمی حفاظت کا سامان نہ ہوا۔ ان کی اصل برباد ہو گئی، مدتوں کے بعد مرتب کیے گئے اور ان میں تحریفیں کی گئیں۔ ان کے ترجموں نے ان کو کچھ سے کچھ بنا دیا۔ ان کی تاریخی سند کا کوئی ثبوت باقی نہیں۔ بہت سے جعلی پیغام ان میں شریک کر دیے گئے۔ اگر خدا کا کام مصلحت اور حکمت سے خالی نہیں ہوتا ہے تو ان کا مٹنا اور برباد ہونا ہی ان کے وقتی فرمان اور عارضی تعلیم ہونے کا ثبوت ہے لیکن جو پیغام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے آیا وہ مہیمن ہو کر آیا دائمی اور عالمگیر ہو کر آیا اسی لیے وہ جب سے آیا اب تک پوری طرح محفوظ ہے اور رہے گا کیونکہ اس کے بعد کوئی نیا پیغام آنے والا نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے

کسی گزشتہ پیغام کے بارے میں یہ نہیں فرمایا کہ اس کی تکمیل ہو چکی ہے اور ان تمام تعلیمات برحق کو جو پچھلی آسمانی کتب میں دی گئی تھیں اس کے اندر ان کو محفوظ کر دیا ہے اور وہ ان پر نگہبان ہے۔ یہ صرف قرآن کے بارے میں فرمایا ہے۔ دُنیا کے وہ تمام صحیفے جو گم ہو چکے ہیں ان کا گم ہو جانا ہی ان کے وقتی اور عارضی ہونے کی دلیل ہے اور جو موجود ہیں ان کی ایک ایک آیت تلاش کر لو ان کی تکمیل اور حفاظت کے وعدہ کے متعلق ایک حرف نہ پاؤ گے بلکہ اس کے خلاف ان کے نقص کے اشارے اور تصریحات ملیں گی۔

تورات میں ہے

یہ وہ برکت ہے جو موسیٰ مرد خدا نے اپنے مرنے سے پہلے بنی اسرائیل کو بخشی اور اس نے کہا کہ خداوند سینا سے آیا اور سعیر سے ان پر طلوع ہوا اور فاران کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا اور اس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشیں شریعت ہوگی۔

(استثنا ۳۳ ، ۲)

اس سے معلوم ہوا کہ تورات آخری اور دائمی پیغام کی حیثیت سے نہیں آئی تھی اور یہ تمام پچھلی صداقتوں کی نگران اور محافظ نہ تھی۔

انجیل اعلان کرتی ہے:

میں اپنے باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا فارقلیط بخشے گا کہ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا۔ (یوحنا ۱۴ ، ۱۶)

اس سے پتہ لگ گیا کہ انجیل خدا کا آخری پیغام اور دائمی نہیں اور دوسری صداقتوں کی نگران تو کیا وہ خود کامل بھی نہیں ہے۔

یہ صرف قرآن ہے جو اپنے بارے میں اعلان کرتا ہے کہ وہ پچھلی تمام صداقتوں کا محافظ اور نگران ہے اور کامل ہے، آخری پیغام ہے، سب کے لیے ہے اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔ قرآن نے کسی آیت میں کسی بعد آنے والے پیغام کے لیے یہ کہہ کر د مهیمناً علیه کوئی جگہ نہیں چھوڑی ہے اسی لیے حفاظت کی ذمہ داری خود خدا نے لی ہے۔

۱۱۹۔ اور ہم نے تمہاری طرف سچائی کے ساتھ کتاب اتاری ہے یہ ان کتابوں کی تصدیق کرتی ہے جو سامنے موجود ہیں اور ان پر نگہبان۔ مهیمن کے کئی معنے بیان کیے گئے ہیں۔ امین، غالب، حاکم، محافظ و نگہبان اور رہنما کے اعتبار سے قرآن کریم کا کتب سابقہ کے لیے مهیمن ہونا صحیح ہے۔ خدا

کی جو امانت تورات و انجیل وغیرہ کتب سماویہ میں ودیعت کی گئی تھی وہ مع شے زائد قرآن میں محفوظ ہے جس میں کوئی خیانت نہیں ہوتی ہے اور جو بعض فروعی چیزیں ان کتابوں میں اس زمانے یا ان مخصوص مخاطبین کے حسب حال تھیں ان کو قرآن نے منسوخ کر دیا اور جو حقائق نا تمام تھیں ان کی تکمیل فرما دی ہے اور جو حصہ اس وقت کے اعتبار سے غیر مبہم تھا سے بالکل منظر انداز کر دیا ہے۔ لہ

اس آیت میں قرآن کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ کتاب چار اوصاف کی حامل ہے، اوّل یہ کہ اللہ کی جانب سے ہے۔

دوم یہ کہ اس کا نزول بالحق ہوا ہے یعنی یہ کتاب بجائے خود سچی اور ہر شک وشبہ سے بالا ایک حقیقت، قول فیصل اور اٹل ہمیشہ رہنے والی ہے۔

تیسرے یہ کہ وہ گزشتہ کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے یعنی یہ بتانے والی ہے کہ وہ بھی منزل من اللہ ہیں۔ اس تصدیق سے ان کتابوں کی تحریفات کی تصدیق ہرگز لازم نہیں آتی۔ اس آیت میں قرآن کی مصدق کی حیثیت بتاتے ہوئے یہ نہیں فرمایا کہ قرآن اپنے سامنے موجود کتابوں کی تصدیق کرتا ہے، بلکہ فرمایا کہ قرآن الکتاب کی تصدیق کرتا ہے۔ اس سے یہ اشارہ ملتا ہے کہ قرآن اور وہ تمام کتابیں جو مختلف زمانوں اور متفرق زبانوں میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں سب کی سب فی الاصل ایک ہی کتاب ہیں ایک ہی ان کا مصنف ہے، ایک ہی ان کا مدعا اور مقصد ہے، ایک ہی ان کی تعلیم ہے اور ایک ہی علم ہے جو ان کے ذریعے سے نوع انسانی کو عطا کیا گیا ہے۔ فرق اگر ہے تو عبارات کا ہے جو ایک ہی مقصد کے لیے مختلف مخاطبوں کے لحاظ سے مختلف طریقوں سے اختیار کی گئیں۔ بس حقیقت صرف اتنی نہیں ہے کہ یہ کتابیں ایک دوسرے کی مخالف نہیں مؤید ہیں تردید کرنے والی نہیں مصدق ہیں بلکہ اصل حقیقت اس سے بڑھ کر ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ سب ایک ہی الکتاب کے مختلف ایڈیشن ہیں۔ ٹہ

چہارم یہ کہ قرآن بقیہ کتابوں پر مہیمن ہے۔ عربی میں مہیمن کے معنے محافظت، نگرانی، شہادت، امانت، تائید اور حمایت کے ہیں۔ قرآن کو الکتاب پر مہیمن کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے ان تمام برحق تعلیمات کو جو پچھلی آسمانی کتابوں میں دی گئی تھیں اپنے اندر محفوظ کر لیا ہے وہ ان پر نگہبان ہے اس معنے میں کہ اب ان کی تعلیمات برحق کا کوئی حصہ ضائع نہ ہونے پائے گا وہ ان کی مؤید ہے

لہ افادات شیخ الاسلام ٹہ تفہیم القرآن۔

اس معنے میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کا کلام جس حد تک موجود ہے قرآن سے اس کی تصدیق ہوتی ہے وہ ان پر گواہ ہے اس معنے میں کہ ان کتابوں کے اندر خدا کے کلام اور لوگوں کے کلام میں جو آمیزش ہو گئی ہے قرآن کی شہادت سے اسے پھر چھانٹا جا سکتا ہے جو کچھ ان میں قرآن کے مطابق ہے وہ خدا کا کلام ہے اور جو قرآن کے خلاف ہے وہ لوگوں کا کلام ہے۔

مصدق اور مہیمن ان دو صفات کے لانے سے قرآن عزیز کی دو حیثیتوں کو اجاگر کرنا ہے۔ ایک یہ کہ پہلی کتابوں کے سارے مضامین اس کے اندر آ گئے اور اس میں جمع ہیں، دوسرے یہ کہ قرآن ان کتابوں پر بطور نگران کے بھی کام دے گا۔ یعنی ان کی تحریفات و تصرفات کے لیے ایک کسوٹی کا بھی کام دے گا۔ اسے ذرا اس طرح سمجھئے کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی معرفت یہ پیغام یعنی قرآن دنیا میں آیا تو اس نے خدا کے سب دینوں کی عظمت از سر نو زندہ کر دی۔ سب رسولوں کا احترام کرنا فرض و لازم قرار دیا۔ حضرت عیسٰی کے منکر کو اسی طرح کافر ٹھہرایا جیسا کہ حضور انور کے منکر کو۔ اس نے پہلے ملیوں کے سر جو تہمتیں لگا دی گئی تھیں تحقیق و تنقید کی روشنی میں ان کو غلط ثابت کیا۔ خدا کی مقدس کتابوں میں سازشوں کا انکشاف کیا اور اس طرح ان کی عظمت رفتہ کو از سر نو قائم کیا۔ اس نے پچھلے رسولوں سے کٹ کر اور پہلے دینوں کو جھوٹا کہہ کر کسی نئے دین کی دعوت نہیں دی بلکہ اسی حقیقت کی طرف بلایا جس کی انبیاء دعوت ہمیشہ دیتے رہے۔ تورات یہ نہیں کہتی کہ انجیل کو نہ مانو اور انجیل یہ نہیں کہتی کہ تورات غلط ہے۔ قرآن کا یہ دعویٰ نہیں ہے کہ تورات و انجیل خدا کی نازل کردہ کتابیں نہیں ہیں بلکہ وہ اپنے ماننے والوں پر یہ بھی لازم قرار دیتا ہے کہ تم ان کتابوں کو بھی خدا ہی کی تصور کرو۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ میرے سوا کسی رسول پر ایمان نہ لاؤ بلکہ سب سے پہلے وہ خدا کے مقدس رسولوں کی عظمت کا سکہ دلوں میں جماتا ہے۔ حقیقت بھی یہ ہے کہ جو کتاب اپنے مہیمن ہونے کا دعویٰ رکھتی ہے اسے ایسے ہی تعلیمات کا مجموعہ بن کر آنا چاہیے جس میں تمام عالم کے لیے یکساں جاذبیت موجود ہو اور زمانہ ماضی میں کسی صداقت پر عمل کرنے والے کی تغلیط نہ کرتا ہو اور آج جب اپنی طرف دعوت دے تو یہ کہہ کر دعوت دے کہ تم میری دعوت کی اپنی کتاب سے تصدیق کر لو۔ قرآن ان سے کسی ایسی بات کا مطالبہ نہیں کرتا جو ان کی کتابوں کے خلاف ہو۔ وہ مطالبہ کرتا ہے تو یہ کہ تم نے صحیح طور پر حضرت عیسٰی کا مقام نہیں پہچانا۔ حضرت موسیٰ کی شخصیت کو ٹھیک نہیں سمجھا، تورات و انجیل کی صحیح تعلیمات تم نے حاصل نہیں کی۔ تم ایک فرضی عیسٰی ایک موہوم موسیٰ، ایک خود تراشیدہ تورات و انجیل پر ایمان رکھتے ہو آؤ مجھے مان لو میں تمہارے رسولوں اور تمہاری کتابوں کی تعلیمات کا محافظ بن کر آیا ہوں۔

قرآن خدا کی تمام صداقتوں کو اپنے دامن میں جمع کیے ہوئے نازل ہوا ہے۔ کیا وہی صداقت اگر تورات میں ہو اور انجیل میں ہو تو قابلِ پذیرائی ہے اور وہی اگر قرآن میں ہو تو قابلِ انکار ہو سکتی ہے۔ وہی رسول جس کی بشارت تورات اور انجیل دیں تو قابلِ انتظار ہو اور اسی کی آمد کو قرآن بتاتے تو نا قابلِ قبول ہو۔ پھر صرف ان چند مسائل کی بنا پر جو تمہارے ہی لیے تخفیف تمہارے ہی لیے سہولت کا ذریعہ بنے یہ عداوت یہ ضد کیوں ہے۔ ایسی عالمگیر تعلیم، جذبات سے اتنی خالی فرقہ پرستی اور تعصب سے اتنی دور گزشتہ اور موجودہ ادیانِ سماویہ کا اتنا احترام سکھانے والی، پھر ضروریاتِ زمانہ کے لیے اتنی مناسب اور پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ اپنے ایک ایک شوشے کے ساتھ اتنی محفوظ۔ اگر قرآن سے پہلے کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی۔ لاکھوں انبیاؑ میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دُنیا میں باقی نہیں رہا۔ اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے قالب میں بدلتا رہا ہے تورات جل جل کر خاک ہوئی، پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی۔ انجیل میں تحریف وجعل تو اسی زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ پھر مترجموں کی کثرت بیونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی۔ زردشت کا صحیفہ سکندر کی نذر ہوا۔ ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو مہیمن محافظ دائمی اور آخری کتاب بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ اس بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا لیکن قرآن کی نسبت پہلے یہ دعویٰ ہوا و انزلنا الیک الکتاب بالحق مصدقا لما بین یدیہ من الکتاب و مھیمنا علیہ اور یہ وعدہ ہوا کہ انا نحن نزلنا الذکر و انا لہ لحافظون۔ اور یہ بھی اعلان کیا گیا کہ اس حق میں کسی باطل کی آمیزش کبھی راہ نہ پا سکے گی و انہ لکتاب عزیز لا یاتیہ الباطل من بین یدیہ ولا من خلفہ اس کتاب کو عزیز فرمایا گیا یعنی جو اپنے ہر حریف کو اپنے دلائل کے زور سے پچھاڑ دے گی۔ باطل نہ اس کے سامنے سے اس میں مل سکتا ہے اور نہ پیچھے سے یعنی نہ لفظ وعبارت کی طرف سے اور نہ حقیقت ومعنے کی طرف سے۔

اُمتِ اسلامیہ کی ذمہ داری

۱۲۰۔ لہٰذا تم ان کے درمیان خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ کرو اور جو حق تمہارے پاس آچکا ہے اس سے ہٹ کر ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ یہود میں باہم کچھ نزاع ہو گئی تھی ایک فریق جن میں ان کے بڑے مشہور علما۔ اور مقتدر شامل تھے۔ آنحضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور فصلِ نزاع کی درخواست کی اور یہ بھی کہا کہ آپ کو معلوم ہے کہ عموماً قوم یہود ہمارے

اختیار و اقتدار میں ہے۔ اگر آپ فیصلہ ہمارے موافق کردیں گے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے اور ہمارے اسلام لانے سے جمہور یہود اسلام قبول کرلیں گے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس رشوتی اسلام کو قبول نہ کیا اور ان کی خواہشات کی پیروی سے صاف انکار فرمادیا۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں (ابن کثیر) لہ

یہ قرآن سے متعلق عہد میثاق کی ایک دفعہ ہے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے آپ کی اُمت سے لیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اسی کتاب حق و باطل کی کسوٹی اور احکام الٰہی کا قابل اعتماد مجموعہ ہے تم لوگوں کے درمیان اسی کے مطابق فیصلہ کرو۔ اس سے ہرگز منحرف ہو کر منافقین اور یہود کی خواہشات و بدعات کی پیروی نہ کرو۔ اس آیت میں یہ بات بالکل واضح طور پر فرمائی گئی ہے کہ قرآن کو چھوڑ کر کسی اور کتاب کے مطابق فیصلے کرنا منع ہے خواہ یہ کتاب تورات ہو یا انجیل۔ یعنی اس کتاب کا انکار اسلام میں ٹھیک وہی حیثیت رکھتا ہے جو دوسرے کا فروں کے انکار کی ہے اور نتائج بھی دونوں کے ایک ہیں۔ قرآن نے اہل کتاب یہودی اور عیسائیوں کے لیے اس طرح کی کوئی گنجائش نہیں رکھی ہے کہ وہ اسلام کے بجائے اپنے ہی دین پر قائم رہ سکتے ہیں۔ پھر یہ بات لتنے ہی پر ختم نہیں ہو جاتی۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں لوکان موسٰی حیاً ماوسعہ الا اتباعی اگر موسٰی زندہ ہوتے تو ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہ ہوتا کہ میری پیروی کریں۔ یہ ارشاد نبوت مسئلہ کو اس حد تک واضح کر دیتا ہے جس کے بعد وضاحت کا کوئی درجہ باقی نہیں رہتا ہے۔ جس نبی کی حیثیت یہ ہو کہ دوسرے انبیاء اگر اس کے زمانے میں موجود ہوتے تو وہ بھی اسی کے امتی اور پیروکار بنتے اور ان کی لائی ہوئی کتابوں کی پیروی کی گنجائش جب خود ان کے لیے باقی نہیں ہے تو قرآن کی پیروی کی ذمہ داری اور ضرورت سے بھلا کوئی عام انسان کیسے مستثنیٰ ہو سکتا ہے؟ اور جب قرآن کی موجودگی میں نبیوں کی لائی ہوئی کتابوں کی پیروی نہیں کی جاسکتی اور ان کی پیروی قرآن کی نظر میں اتباع ہوا ہے تو پھر غیر انبیاء مثلاً دانشور، وکلاء، زعماء، قومی اسمبلی کے ممبران۔ ملک کے حکام اور حکومت کے انتظامی ارکان عدلیہ کے ججوں اور گورنروں کے بنائے ہوئے قوانین و ضوابط کی پیروی کی، قرآن کب اجازت دے سکتا ہے اور ان کے مطابق قرآن کو نظر انداز کر کے معاملات کا فیصلہ کرنا کب روا ہو سکتا ہے اس آیت میں قرآن سے ہٹ کر تورات و انجیل کے مطابق معاملات کے فیصلہ کرنے کو قرآن نے اتباع اہواء، خواہشوں کی پیروی کہا ہے۔ اس کے ذریعے قرآن نے ایک اصولی مسئلہ رکھا ہے

لہ افادات شیخ الاسلام

اور وہ یہ کہ جب تمہارے عمل کے لیے الحق خدا کی جانب سے قرآن کی صورت میں آچکا ہے تو اب پہلی کتاب سے بحث کرنا ہی غلط ہے ظاہر ہے کہ اگر پہلی کتابوں کو قائم رکھنا منظور ہوتا تو ضرور ان کو محفوظ بھی رکھا جاتا لیکن جب محفوظ نہیں رکھا گیا تو معلوم ہوگیا کہ آئندہ قدرت کو اس پر عمل درآمد بھی منظور نہیں ہے۔

شرائع سماوی گو سب حق تھیں مگر تحریف کے بعد ان میں بہت باطل داخل ہو چکا ہے جو نامعلوم ہے۔ اب اس سے بحث کا حاصل یہی ہے کہ اگر تصدیق کرتے ہو تو باطل کی تصدیق کا احتمال ہے اور تکذیب کرتے ہو تو حق کی تکذیب کا احتمال ہے۔ اس لیے جب عمل کے لیے ایک راہ موجود ہے تو پھر اس گرداب میں پھنسنے کی ضرورت ہی کیا ہے اور اگر تسلیم ہی کر لیا جائے کہ ان میں تحریف نہیں ہوئی تو بھی ہر صداقت پر عمل کرنا اسی وقت موجب نجات ہو سکتا ہے جبکہ وہ وقت کی کتاب بھی ہو اگر اس کی بجائے دوسری کتاب آچکی ہے تو اب پہلی صداقت پر عمل کرنا وقتی کتاب کی توہین ہوگی۔ اگر دین صرف اپنی رائے پر ہوتا تو شریعت اور کتاب کی حاجت نہ ہوتی اور جب کتاب کی ضرورت تسلیم ہے تو صرف کسی صداقت کا صداقت ہونا نجات کے لیے کافی نہیں ہے جب تک کہ اس کا وقتی ہونا بھی ثابت نہ ہو جائے۔ ہر صداقت کا شریعت ہونا لازمی نہیں ہاں ہر شریعت کا صداقت پر مبنی ہونا ضروری ہے اس لیے یہ محض ایک بے بنیاد خیال ہے کہ جب سب ادیان سماوی حق ہیں تو ان پر عمل کرنا بھی نجات کے لیے کافی ہونا چاہیے جس دور میں خود موسیٰ علیہ السلام کو وقت کی صداقت پر عمل کرنا ضروری ہے اس میں تورات کا ذکر بے معنے ہے۔

کیا یہ آیت منافی عصمت ہے ؟

حیرت ہے کہ اس قدر واضح بات کو جو اس آیت میں بتائی گئی ہے لوگوں نے کچھ سے کچھ بنا دیا کتنی صاف بات ہے اور کیسی بے غبار ہے کہ اس حق کو نظر انداز کر کے لوگوں کی خواہشات کے پیچھے نہ چلو۔ حضرت مولانا عثمانی شیخ الاسلام نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے آپ بھی مستفید ہوئیے فرماتے ہیں کہ، گزشتہ ان آیات کی جو شان نزول ہم لکھ چکے ہیں اس سے صاف عیاں ہے کہ آیت کا نزول بعد اس کے ہوا کہ آپ ان کی خوشی اور خواہش پر چلنے سے انکار فرما چکے تھے تو یہ آیات آپ کی استقامت کی تصویب اور آئندہ بھی ایسی ہی شان عصمت پر ثابت قدم رہنے کی تاکید کے لیے نازل ہوئیں۔ جو لوگ اس قسم کی آیات کو نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شان عصمت کے خلاف تصور کرتے ہیں وہ نہایت ہی قاصر الفہم ہیں اول تو کسی چیز سے منع کرنا اس کی دلیل نہیں کہ جس کو منع

کیا جا رہا ہے وہ اس ممنوع چیز کا ارتکاب کرنا چاہتا تھا، ثانیاً انبیا علیہم السلام کی معصومیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی معصیت ان سے صادر نہیں ہو سکتی یعنی کسی کام کو یہ سمجھتے ہوئے کہ خدا کو ناپسند ہے ہرگز اختیار نہیں کر سکتے۔ اور اگر اتفاقاً کسی وقت بھول چوک یا رائے و اجتہاد کی غلطی سے راجح و افضل کی جگہ مرجوح و مفضول کو اختیار کر لیں یا غیر مرضی کو مرضی سمجھ کر عمل کر لیں جس کو اصطلاح میں زلہ کہتے ہیں تو اس طرح کے واقعات مسئلہ عصمت کے منافی نہیں جیسا کہ حضرت آدم اور بعض دیگر انبیا علیہم السلام کے واقعات شاہد ہیں، اس حقیقت کو سمجھ لینے کے بعد ولا تتبع اھواءھم عما جاءک من الحق اور واحذرھم ان یفتنوک عن بعض ما انزل اللہ الیک اور اسی طرح کی دوسری آیات کا مطلب سمجھنے میں کوئی الجھن نہیں رہتا کیونکہ ان میں صرف اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ ان ملو نوں کی ملمع کاری اور سخن سازی سے قطعاً متاثر نہ ہوں اور کوئی ایسی رائے قائم نہ فرمائیں جس میں بلا قصد ان کی خواہشات کے اتباع کی صورت پیدا ہو جائے مثلاً اسی قصہ میں جو ان آیات کی شان نزول ہے یہود نے کیسی عیارانہ اور پرفریب صورت حضور کے سامنے پیش کی تھی کہ اگر آپ ان کے حسب منشا فیصلہ کر دیں تو سب یہود مسلمان ہو جائیں گے وہ جانتے تھے کہ اسلام سے بڑھ کر دنیا میں کوئی چیز آپ کے نزدیک محبوب اور عزیز نہیں۔ ایسے موقع پر امکان تھا کہ بڑے سے بڑا مستقیم انسان بھی یہ رائے قائم کرے کہ ان کی چھوٹی سی خواہش قبول کر لینے میں جبکہ اتنی عظیم الشان دینی منفعت کی توقع ہو کیا مضائقہ ہے اس طرح کے خطرناک مزلۃ الاقدام موقع پر قرآن حکیم حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو متنبہ کرتا ہے کہ دیکھو بھول کر بھی کوئی ایسی رائے قائم نہ کر لیجئے جو آپ کی شان رفیع کے مناسب نہ ہو حضور کا کمال تقویٰ اور انتہائی فہم و تدبر تو نزول آیت سے پہلے ہی ان ملاعین کے مکر و فریب کو رد کر چکا تھا لیکن فرض کیجئے اگر ایسا نہ ہو چکا ہوتا تب بھی آیت کا مضمون جیسا کہ ہم تقریر کر چکے ہیں حضور کی شان عصمت کے اصلاً مخالف نہیں۔[1]

ہر امت کے لیے شرع اور منہاج

۱۲۱۔ تم میں سے ہر گروہ کے لیے ہم نے ایک شرع اور ایک منہاج مقرر کر دی۔ یعنی خدا نے ہر امت کا آئین و دستور کار اس کے احوال و استعداد کے مطابق جداگانہ رکھا ہے اور باوجودیکہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تمام انبیاء اور رسل سماویہ اصول دین اور مقاصد کلیہ میں جن پر نجات ابدی کا مدار ہے باہم متحد اور ایک دوسرے کے مصدق رہے ہیں۔ پھر بھی جزئیات و فروع کے لحاظ سے ہر اُمت کو ان کے ماحول اور مخصوص استعداد کے موافق خاص احکام و ہدایات دی ہیں۔ اس آیت میں اسی فروعی اختلاف کی طرف اشارہ ہے۔ صحیح بخاری کی ایک حدیث میں جو سب انبیاء علیہم السلام کو آپس میں علاتی بھائی فرمایا ہے جن کا باپ ایک ہو اور مائیں مختلف ہوں اس کا مطلب بھی یہی ہے کہ اصول سب کے ایک ہیں اور فروع میں اختلاف ہے اور چونکہ بچہ کی تولید میں باپ فاعل ومفیض اور ماں قابل اور محل فاضہ بنتی ہے اس سے نہایت لطیف اشارہ اس طرف ہے کہ شرائع سماویہ کا اختلاف مخاطبین کی قابلیت اور استعداد پر مبنی ہے ورنہ مبدا فیاض میں کوئی اختلاف و تعدد نہیں ہے سب شرائع ولوایان سماویہ کا سرچشمہ ایک ہی ذات اور اس کا علم ازلی ہے۔[1]

دراصل یہ استیناف بیانی ہے اور مخاطبوں کے ذہنوں میں اٹھنے ہوئے سوال کا تذکرہ ہے سوال یہ ہے کہ اگر قرآن تورات و انجیل ایک ہی صداقت کی دعوت ہیں اور قرآن تمام پچھلی صداقتوں کا مصدق ہے تو پھر شرائع و احکام میں اختلاف کیوں ہے ایسا کیوں ہوا ہے کہ عبادات کی صورتوں میں حلال وحرام کی قیود میں اور قوانین تمدن و معاشرت کے فروع میں مختلف انبیاء کی شریعتوں میں اختلاف ہے۔

واقعی قرآن کی یہی تعلیم ہے کہ اسلام اسی ایک دین کا نام ہے جو آدم سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک باری باری پیغمبروں کے ذریعے اُتارا۔ یہ قرآن کا بتایا ہوا راز ہے کہ دین الٰہی ہمیشہ سے ایک تھا ایک رہا اور ایک رہے گا۔ نور معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہو۔ اصل دین میں سارے پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی، ایک ہی دین تھا جس کو لے کر اول سے آخر تک سارے انبیاء آتے رہے۔ اس میں زمان و مکان کے تغیر کو دخل نہ تھا اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا۔ وہ ہر زمانہ اور مقام میں یکساں آیا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی۔

یہ دائمی حقیقت اور یکساں تعلیم کیا ہے؟ یہ مذہب کے اصل اصول ہیں یعنی خدا کی ہستی، اس کی توحید، اس کے صفات کاملہ، انبیاء کی بعثت، خدا کی خالص عبادت، حقوق انسانی، اخلاق فاضلہ، اچھے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور بُرے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا یہ وہ بنیادی اصول ہیں جن پر تمام مذاہب حقہ کا اتفاق ہے۔ اگر ان میں کسی جہت سے کوئی اختلاف ہے تو طریقِ تعبیر کی غلطی ہے یا باہر سے آکر اس تعلیم میں کوئی آمیزش ہوئی ہے۔

دوسری چیز جس کو قرآن نے شرعہ اور منہاج کہا ہے وہ جزئیات احکام اور متفقہ مقصد کے حصول کے جدا جدا راستے ہیں جو ہر قوم و مذہب کی زمانی و مکانی خصوصیات کے سبب سے بدلتے رہتے ہیں مثلاً عبادت الٰہی، ہر مذہب کا جزو لازم ہے لیکن طریق عبادت میں تھوڑا تھوڑا اختلاف ہر آسمانی مذہب میں موجود ہے۔ عبادت کے لیے کوئی خاص سمت ہر مذہب نے مقرر کی ہے۔ اسی طرح اعمال قبیحہ کا انسداد تمام مذاہب کا متفقہ نصب العین ہے مگر اس کے انسداد کے رستے اور طریقے جداجدا، غرض یہ راستے اور طریقے مختلف پیغمبروں کے زمانے میں اگر اصلاح و تبدیل کے قابل پائے گئے تو بدلتے رہے مگر اصل دین جو ازلی سچائی اور ابدی طاقت ہے ناقابل تبدیل اور ناقابل تغیر رہا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا وقتاً فوقتاً ظہور اسی ضرورت سے ہوتا رہا کہ وہ اسی ازلی و ابدی صداقت کو ہمیشہ اہل دنیا کے سامنے پیش کرتے رہیں اور دین کو اس کے اصلی مرکز پر ہمیشہ قائم رکھیں اور ساتھ ہی اپنی اپنی قوم و ملک اور زمانہ کے حالات کے مطابق خاص احکام و جزئیات جو قوم کے مناسب حال ہوں وہ اس کو بتائیں اور سکھائیں۔

اس آیت میں یہی انکشاف کیا گیا ہے کہ ہم نے ہر جماعت کے لیے ایک شرع اور منہاج ٹھہرا دی ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ ایک دین ٹھہرا دیا کیونکہ دین تو سب کا ایک ہی ہے۔ اس میں تعدد اور تنوع نہیں ہو سکتا۔ البتہ شرع اور منہاج سب کے لیے یکساں نہیں ہو سکتے تھے۔ ضروری تھا کہ ہر عہد اور ہر ملک کے احوال و ظروف کے مطابق مختلف ہوں لہٰذا انبیاء کی دعوتوں کا اختلاف اصل کا اختلاف نہیں ہے محض فروع کا اختلاف ہے۔

آیت کا یہ ٹکڑا اپنے سیاق و سباق کی رُو سے اہل کتاب سے رواداری کے اظہار کے لیے نہیں بلکہ ان کے رویہ سے بیزاری کے اظہار کے لیے ہے۔

یہاں لکل سے مراد وہی تین گروہ ہیں جن کا شروع سے ذکر آرہا ہے۔ یعنی مسلمان یہودی اور عیسائی۔ فرمایا کہ ہم نے تم میں سے ہر ایک کے لیے الگ الگ شرعہ اور منہاج مقرر کیا ہے۔ شرعہ اور منہاج سے مراد شریعت کا وہ ظاہری ڈھانچہ اور قالب ہے جو دین کے حقائق کو بروئے کار لانے کے لیے ہر مذہب میں اختیار کیا گیا ہے مثلاً عبادت ایک نظریہ ہے جس کی واقعاتی صورت

مختلف مذاہب میں نماز روزہ، قربانی اور حج کی مختلف شکلوں میں ظاہر ہوتی ہے۔ بعض حقائق کے لیے قالب خود اللہ سبحانہ نے مقرر فرمایا ہے اور بعض کے لیے اللہ تعالیٰ کے حکم سے نبی نے مقرر فرمایا ہے شاید اسی کی رعایت سے آیت میں شرعۃ اور منہاج کے الفاظ استعمال ہوتے ہیں۔

وحدتِ دین اور قرآن

اس سے یہ بات بھی واضح ہو کر سامنے آگئی کہ وحدتِ دین کا قرآنی منشا کیا ہے یہ اور صرف یہ کہ جہاں تک دین کے حقائق کا تعلق ہے وہ ہمیشہ سے غیر متغیر ہیں اور غیر متغیر رہیں گے اور اس معاملہ میں انبیاء میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یعنی اصل دین ایک ہی دین ہے جو تمام انبیاء نے پیش کیا لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے ہاتھ میں تحریف و تصرف کی وجہ سے بگڑتا رہا۔ اسی دین ازلی کو لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آئے اور اسی کا نام اسلام ہے جو اپنے صحیفہ کی بقا و حفاظت، دین کی تکمیل اور نبوت کے اتمام کی وجہ سے ہمیشہ قائم اور باقی رہے گا۔ اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اصل دین پر آجائیں جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہ ہی دین ازلی ہوگا جس کا نام اسلام ہے اور نوحی، ابراہیمی، موسوی، عیسوی اور محمدی میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا۔

قرآن کے پیش کردہ وحدتِ دین کے نظریہ کا یہ ہرگز مفہوم نہیں ہے کہ سارے مذاہب سچے ہیں۔ سبھی خدا تک پہنچانے والے ہیں اور سب کے سب آخرت کی فلاح و نجات کا یکساں ذریعہ ہیں۔ یہ وحدتِ دین نہیں وحدتِ ادیان ہے یقیناً قرآن وحدتِ دین کا قائل ہے مگر وحدتِ ادیان کو قطعاً تسلیم نہیں کرتا۔

اگر یہ بات قرآن کے نزدیک صحیح ہوتی کہ سارے دین سچے ہیں اور ہر رسول کی پیروی یکساں طور پر حق ہے تو اس کا بالکل منطقی تقاضا یہ تھا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہود و نصاریٰ کو اسلام لانے کی دعوت نہ دیتے کیونکہ وہ خود صاحبِ کتاب تھے۔ اور اگر دعوت دیتے بھی تو کم از کم اسلام لانے کے مطالبہ پر اصرار تو کسی طرح نہ کرتے۔ اس کے برعکس آپ ان سے صرف یہ کہتے کہ تورات و انجیل کی مخلصانہ پیروی کرو۔ میں تم سے صرف یہ چاہتا ہوں اپنی نبوت کے تسلیم کرنے اور قرآن کی پیروی کا تم سے کوئی مطالبہ نہیں کرتا لیکن ساری دنیا جانتی ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ آپ نے انہیں بھی اسلام لانے کی اسی طرح دعوت دی جس طرح عرب کے مشرکوں کو دی تھی اور ان کے لیے اپنی پیروی کو ویسا ہی ضروری قرار دیا جیسا کہ ان کے لیے ضروری قرار دیا تھا۔

یا ایھا الذین اوتوا الکتاب آمنوا بما نزلنا مصدقا لما معکم

اے وہ لوگو جن کو کتاب دی گئی ایمان لاؤ اس کتاب پر جو ہم نے اتاری ہے۔ اور
جو اس کتاب کے عین مطابق بھی ہے جو تمہارے پاس ہے۔

نہ صرف یہ کہ قرآن نے ان کو اسلام لانے کی دعوت دی بلکہ ان میں سے جنہوں نے اسلام قبول نہیں کیا انہیں صاف لفظوں میں کفر کا مرتکب اور دوزخی حتیٰ کہ بعض مقامات پر تو ان کے اس انکار اسلام کو صرف کفر ہی نہیں بلکہ بدترین کفر اور انہیں کافر ہی نہیں بلکہ پکا کافر اولئک ھم الکافرون حقاً کہا ہے۔ ان کے جس طرز عمل پر اولئک ھم الکافرون حقاً کا فتویٰ لگایا گیا ہے وہ صرف یہ تھا کہ وہ جہاں دوسرے انبیاء کو اللہ کے رسول اور دوسرے کتابوں کو اللہ کی کتاب مانتے تھے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ کا رسول اور قرآن کو اللہ کی کتاب نہ مانتے تھے۔ قرآن عزیز نے ایک اور جگہ اہل کتاب کے اس انکار اسلام کا تذکرہ اور پھر اس پر اپنا تبصرہ ان لفظوں میں کیا ہے۔

واذا قیل لھم آمنوا بما انزل اللہ قالوا نؤمن بما انزل علینا و
یکفرون بما وراءہ

دعوت اسلام کے جواب میں وہ یہ جو کہتے تھے اسے غور سے دیکھئے۔ یہ ٹھیک وہی فلسفہ تھا جو آج وحدت ادیان کے نظریے کی بنیاد ہے۔ یعنی یہ کہ جب ہمارے پاس بھی خدا ہی کا بھیجا ہوا دین ہے تو کیا اس پر ایمان رکھنا اور اس کی پیروی کرنا کافی نہیں ہے۔ آخر پھر کسی اور چیز کو اپنانا ہمارے لیے ضروری کیوں ہو۔ وہ اپنی جگہ حق یہ اپنی جگہ حق۔ لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ ان کے اس فیصلے کو اللہ تعالیٰ نہ صرف یہ کہ صحیح نہیں کہا بلکہ اسے صاف طور پر کفر کا فلسفہ قرار دیتا ہے اور انہیں یہ بھی حق وہ بھی حق کہنے کے باوجود اصل حق کا منکر کافر ٹھہراتا ہے اس لیے آیت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ سارے مذاہب سچے ہیں سبھی خدا تک پہنچانے والی راہیں ہیں اور سب کے سب آخرت کی فلاح و نجات کا یکساں ذریعہ ہیں۔ یہاں قرآن نے ایک خاص ترتیب کے ساتھ مختلف دعوتوں کا ذکر کیا ہے ذکر حضرت موسیٰ کی تورات سے شروع ہوتا ہے انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی و نور پھر حضرت مسیح کے ظہور کا ذکر کیا جاتا ہے ثم قفینا علی آثارھم بعیسی ابن مریم حضرت مسیح کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا وانزلنا الیک الکتاب پھر ان مختلف دعوتوں کے ذکر کے بعد وہ لوگوں کو مخاطب کرتا ہے لکل جعلنا منکم شرعۃ و منھاجا اس میں پوری انسانیت کو مخاطب کیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ ہم نے تم میں سے ہر امت کے لیے ایک شریعت اور منہاج مقرر کی تھی۔ ہر امت اپنے دور میں اپنی شریعت کی حامل تھی۔ امت موسیٰ امت عیسیٰ

کے ظہور تک شریعت موسیٰ کی حامل اور علم بردار ہی تھی اور یہی اس کی شریعت تھی۔ امت عیسیٰ اپنے زمانے میں محمد رسول اللہ کے زمانہ ظہور تک حضرت عیسیٰ کی شریعت انجیل کی حامل اور ذمہ دار تھی۔ اور اب تم سب محمد رسول اللہ کے ظہور کے بعد امت محمد ہو اور تمہاری شریعت قرآن ہے لہذا اس پر ایمان لاؤ اس میں یہودی، عیسائی بلکہ ساری انسانیت برابر ہے۔

اختلاف شریعت تقاضائے حکمت ہے

۱۲۲۔ اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک ہی امت بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا اور اس لیے نہیں کیا تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے یعنی کون تم میں خدا کی مالکیت مطلقہ، علم محیط، اور حکمت بالغہ پر یقین کرکے ہر نئے حکم کو حق وصواب سمجھ کر بطیب خاطر و رغبت قبول کرتا ہے اور ایک وفادار غلام کی طرح ہر جدید حکم کے سامنے گردن جھکا دینے کو تیار رہتا ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ بلا شبہ یہ ممکن تھا کہ شروع ہی سے تمام انسانوں کے لیے ایک ضابطہ مقرر کرکے سب کو ایک امت بنا دیا جاتا۔ لیکن وہ فرق جو اللہ تعالیٰ نے مختلف انبیا کی شریعتوں کے درمیان رکھا ہے اس کے اندر دوسری مصلحتوں کے ساتھ ایک بڑی مصلحت یہ بھی تھی کہ اللہ تعالیٰ اس طریقہ سے لوگوں کی آزمائش لینا چاہتا تھا جو لوگ اصل دین اور اس کی روح اور حقیقت کو سمجھتے ہیں اور دین میں ان ضوابط کی حقیقی حیثیت کو جانتے ہیں اور کسی تعصب میں مبتلا نہیں ہیں، وہ حق کو جس صورت میں بھی وہ آئے گا پہچان لیں گے اور قبول کرلیں گے ان کو اللہ کے بھیجے ہوئے سابق احکام کی جگہ بعد کے احکام تسلیم کرنے میں کوئی تامل نہ ہوگا۔ بخلاف اس کے کہ جو لوگ دین کی روح سے بیگانہ ہیں اور ضوابط اور ان کی تفصیلات ہی کو اصل دین سمجھتے ہیں اور جنہوں نے خدا کی طرف سے آئی ہوئی چیزوں پر خود اپنے حاشیے چڑھا کر ان پر جمود اور تعصب اختیار کرلیا ہے وہ ہر اس ہدایت کو رد کرتے چلے جائیں گے جو بعد میں خدا کی طرف سے آتے۔ ان دونوں قسم کے آدمیوں کو ممیز کرنے کے لیے یہ آزمائش ضروری تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے شرائع میں اختلاف رکھا [2]

آیت کا مطلب یہ بھی بتایا گیا ہے کہ ہم نے تم میں سے ہر طبقہ کے لیے ایک خاص شریعت اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

خاص طریق عمل بنایا ہے جس میں اصول مشترک اور متفق علیہ ہونے کے باوجود فروعی احکام میں کچھ اختلاف بمصلحت ہوتے ہیں اور اگر اللہ تعالیٰ چاہتا تو اس کے لیے کچھ مشکل نہ تھا کہ تم سب کو ایک ہی اُمت بنا دیتا سب کی ایک ہی کتاب ایک ہی شریعت ہوتی لیکن اللہ تعالیٰ نے اس کو اس لیے پسند نہیں کیا کہ لوگوں کی آزمائش مقصود تھی کہ کون لوگ ہیں جو عبادت کی حقیقت سے واقف ہو کر ہر وقت گوش برآواز رہتے ہیں کہ جو حکم ملے اس کی تعمیل کریں - جو نئی کتاب یا نئی شریعت آتے اس کا اتباع کریں اور پہلی شریعت و کتاب ان کو کتنی ہی محبوب ہو اور آبائی مذہب ہونے کی وجہ سے اس کا ترک کرنا ان پر کتنا ہی شاق ہو مگر وہ ہر وقت گوش برآواز طاعت کے لیے تیار رہتے ہیں - اور کون ہیں جو اس حقیقت سے غافل ہو کر کسی خاص شریعت یا کتاب کو مقصد بنا بیٹھے اور اس کو ایک آبائی مذہب کی حیثیت سے لیے ہوتے ہیں اس کے خلاف کسی حکم خداوندی پر کان نہیں دھرتے ہیں [1]

اور یہ بھی مطلب بتایا گیا ہے کہ اللہ نے ہر اُمت کے لیے شرعۃ اور منہاج الگ بنائے ہیں اگر وہ چاہتا تو سب کو ایک ہی منہاج دیتا لیکن اس کی حکمت کا یہ تقاضا ہوا کہ منہاج کی اس تبدیلی کو لوگوں کے امتحان کا ذریعہ بنائے اور دیکھے کہ کون حق کا طالب بنتا ہے اور کون صرف لکیر کا فقیر اور رسوم و ظواہر کا غلام بن کر رہ جاتا ہے - اللہ عقل، اختیار اور شریعت کی جو نعمت دیتا ہے اس میں وہ لوگوں کا امتحان کرتا رہتا ہے کہ کون ان نعمتوں سے فائدہ اٹھاتا ہے ان کی قدر کر رہا ہے ان کے مغز و قشر میں امتیاز رکھتا ہے اور کون بالکل اندھا بہرہ بن کر محض اسم کا پجاری بن کر رہ گیا ہے [2]

یہ بھی لکھا ہے کہ اگر خدا چاہتا تو تمام نوع انسانی کو ایک ہی اُمت بنا دیتا مگر تم دیکھ رہے ہو کہ اس نے ایسا نہیں کیا - الگ الگ قومیں ہوتی ہیں، الگ الگ احوال ہوتے، الگ الگ ضرورتیں ہوتیں - بس ضروری تھا کہ فروع اور ظواہر کے طور اور ڈھنگ بھی الگ ہوں [3]

ہم نے بالارادہ یہاں سب بزرگوں کی تشریحات نقل کر دی ہیں - یہ سب تشریحات اپنی جگہ بالکل برمحل اور بجا ہیں - مگر پڑھنے والا ان کو پڑھ کر یہ تاثر لیتا ہے کہ شرائع کا یہ اختلاف شاید ایک ہی جگہ اور ایک ہی وقت میں رونما ہوا ہے اور گویا مدینہ میں رہنے والے مسلمانوں، عیسائیوں اور یہودیوں کو قرآن مخاطب کر کے ان کے بالفعل باہمی اختلاف کی یہ توجیہ پیش کر رہا ہے اور

---

[1] معارف القرآن م سش [2] تدبر قرآن [3] ترجمان القرآن -

بتا رہا ہے کہ تمہارے درمیان یہ اختلاف اس لیے ہے کہ اللہ تمہیں آزمانا چاہتا ہے۔ ہمیں افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ صورتِ حال یہ نہیں ہے بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن اپنے مخاطبوں کے کوزۂ ذہن میں یہ بات ڈالنا چاہتا ہے کہ اے انسانو! اگر خدا تمہیں ایک شریعت والی ایک اُمت بنانا چاہتا تو بنا دیتا۔ اس طرح کہ تمام انسانوں کو روزِ اول ہی ایک ہی طرح کی طبیعت ایک ہی طرح کی استعداد اور ایک ہی طرح کی فکری و عملی حالت پر بنا دیتا۔ تمہارے اخلاق ایک ہوتے، تمہارے اطوار معیشت ایک ہوتے اور ہر زمانے کے انسانوں کے احوال و ظروف میں یکسانی اور ہم آہنگی ہوتی اور اس طرح ہر دور میں شریعت و قانون بھی ایک ہی ہوتا۔ لیکن خدا نے ایسا نہیں کیا۔ اس کی حکمت کا یہی فیصلہ ہوا کہ انسان تمام مخلوقات میں ایک ممتاز نوع ہو جو اطوارِ حیات میں بتدریج ترقی کرے۔ آگے بڑھنے کی استعداد اور ہر طرح کی راہ اس کے سامنے کھلی ہوئی ہے اسی تنوعِ استعداد کے نتیجہ میں ارتقاء کا تنوع رونما ہوا۔ جھگڑے سے ترقی کر کے راَلٹ چلاتے۔ انفرادی زندگی سے نکل کر بین الاقوامی زندگی اختیار کرے۔ اسی ارتقاء کا نتیجہ ہے کہ انسانی زندگی کے مختلف اطوار میں شریعتیں مختلف آتی رہی ہیں۔ انسانیت کے بچپنے میں جو شریعت تھی وہ یقیناً انسانیت کے لڑکپن میں نہ تھی اور جو لڑکپن میں شریعت تھی وہ انسانیت کی جوانی میں نہیں ہے اور جو جوانی میں تھی وہ اب رشد و کمال کے زمانہ میں نہیں ہے۔ اب جبکہ پوری انسانی زندگی رشد و کمال کے آخری مرحلہ میں داخل ہو چکی ہے اس کے لیے ایک ایسے خاتم الشرائع خاتم الکتب اور خاتم الانبیاء کی ضرورت تھی جو اس ترقی یافتہ دنیا کی ضروریات کی کفالت کر سکے۔ چنانچہ ہمیشہ کے لیے وحی کا دروازہ بند کر کے دنیا کو وحی کے بدلے اجتہاد پر مبنی شریعت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے ملی ہے۔

آیت میں لیبلوکم کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ تم سے تمہاری استعداد و صلاحیت کے مطابق ایک مستحق کا معاملہ کرتا ہے اور اس کا یہ امتحانی معاملہ اولین مخاطبوں سے ہو رہا ہے یعنی پوری دنیا کو چھوڑ کر تمہیں جو بین الاقوامی شریعت کی نعمت عطا کی ہے۔ اس میں تمہارا امتحان مقصود ہے کہ تم کہاں تک اس میں پورے اترتے رہو۔ اور یا مطلب یہ ہے کہ ساری مخلوقات کو چھوڑ کر جو اس شریعت کو اپنانے کی ذمہ داری نوعِ انسانی پر حیوانیت اور ملکیت کا معجون ہونے کی وجہ سے ڈالی گئی ہے اس سے مقصود تمہارا امتحان ہے۔ اللہ جیسے اپنے تمام شانوں میں نرالا بے مثل اور بے نظیر ہے۔ اسی طرح ابتلا و امتحان کا جو فعل خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس امتحان سے جو ایک مخلوق دوسری مخلوق سے لیتی ہے قطعاً مختلف ہے اور اس کو مختلف ہونا چاہیے۔

باقی رہا یہ سوال کہ اللہ کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں ابتلاء و امتحان یا آزمانے جانچنے کے ان الفاظ کا کیا مطلب ہوتا ہے۔ یہ بھی ایسی بات نہیں جو سمجھ میں نہ آئے۔ آخر سب جانتے ہیں کہ قرآن میں ایک جگہ نہیں متعدد مقامات پر بار بار مختلف الفاظ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کی کوئی خاص حالت و کیفیت ہی نہیں بلکہ جس زندگی کو ہم زمین پر گزار رہے ہیں۔ یہ پوری کی پوری زندگی ہی ابتلاء و امتحان ہے خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو اور خاص رُخ ہی نہیں بلکہ پوری زندگی ہی امتحان و ابتلاء کی زندگی ہے اور یہ کیا ہے۔ تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں انسانی فطرت میں خواہ وہ کسی رنگ میں ہو۔ دو راہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو صلاحیت رکھی گئی ہے دراصل فطرت کے اسی اقتضاء کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی ہی ابتلاء و امتحان کی زندگی ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ خدا کی طرف ابتلاء و امتحان کے الفاظ منسوب کرنے کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جن باتوں کو خدا نہیں جانتا وہ امتحان لے کر جان لے بلکہ مطلب یہ ہے کہ انسانی فطرت میں اقتدار و اختیار، انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے اسی قوت کے صحیح استعمال کا مظاہرہ ہو جائے۔ یہ پوری دُنیا امتحان گاہ ہے۔ حکومت و اقتدار مال و دولت سب کچھ یہاں پرچہ امتحان ہیں۔ آیتِ قرآنی میں ما اتاکم یعنی شریعتِ محمدیہ کو پرچہ امتحان بنایا ہے یگانوں کے لیے بھی اور بیگانوں کے لیے بھی۔ بیگانوں کے لیے اس طرح کہ کون مانتا ہے اور کون نہیں مانتا اور یگانوں کے لیے اس طرح کہ ماننے کے بعد کون برتتا ہے اور کون نہیں برتتا۔

خیر میں پیش رفت مقصودِ شریعت ہے

۱۲۳۔ نیکی کی راہ میں آگے بڑھو تم کو بالآخر اللہ ہی کی طرف پلٹ کر آنا ہے پھر وہ تمہیں بتا دے گا ان باتوں کی حقیقت جن میں تم اختلاف رکھتے تھے۔ یعنی شرائع کے اختلاف کو دیکھ کر خواہ مخواہ کی قیل و قال اور کج بحثوں میں پڑ کر وقت نہ گنواؤ، وصول الی اللہ کا ارادہ کرنے والوں کو عملی زندگی میں اپنی دوڑ دھوپ رکھنی چاہیے اور جو عقائد، اخلاق اور اعمال کی خوبیاں آسمانی شریعت پیش کر رہی ہے اس کے لینے میں چستی دکھلانی چاہیے اور اہتمام کا خیال کر کے حسنات و خیرات کی تحصیل میں مستعدی دکھانی چاہیے۔ اختلافات کی سب حقیقت وہاں جا کر کھل جائے گی۔[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ جب صورت حال یہ ہے کہ شریعت سے اصل مقصود نیکیوں کی فراہمی ہے اور وہ اسی طرح حاصل ہو سکتی ہیں کہ جس وقت جو حکم ملا ہو اس کی پیروی کی جائے۔ لہٰذا جو لوگ اصل مقصد پر نگاہ رکھتے ہیں ان کے لیے شرائع کے اختلافات اور مناہج کے تنوع پر جھگڑا کرنے کے بجائے صحیح طرزِ عمل یہ ہے کہ مقصد کی طرف اس راہ سے پیش قدمی کریں جس کو اللہ تعالیٰ کی منظوری حاصل ہو جو اختلافات انسانوں نے اپنے جمود تعصب ہٹ دھرمی اور ذہن کی اپچ سے خود پیدا کر لیے ہیں ان کا آخری فیصلہ نہ مجلس مناظرہ میں ہو سکتا ہے نہ میدان جنگ میں۔ آخری فیصلہ اللہ تعالیٰ خود کرے گا جبکہ حقیقت بے نقاب ہو کر لوگوں کے سامنے آجائے گی۔

اصل ارشاد فاستبقوا الخیرات ہے فا کے ذریعے یہ اپنے ماقبل سے مربوط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر صورت حال وہی ہے جو سن چکے ہو کہ تمہیں بھی سابقہ امتوں کی طرح شریعت و منہاج دے کر روانہ کیا ہے تو پھر نیکیوں کی راہ میں تمہیں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ تمہیں امتوں کی جاسوسی کے لیے نہیں بلکہ خیرات کی فراہمی کے لیے روانہ کیا ہے۔ خیرات کا لفظ سب خوبیوں کا جامع ہے اس میں اخلاقی قدریں، اجتماعی قدریں اور احسانی قدریں سب سمٹی ہوئی ہیں یہ نہیں فرمایا کہ نیکی کرو بلکہ فرمایا کہ نیکیوں اور بھلائیوں کے کاموں میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے کی فکر کرو یہ گویا اشارہ ہے کہ جو منصب تمہیں دیا گیا ہے اس کی ذمہ داریوں سے تم صرف ذاتی نیکی ~~تحمیل~~ بلکہ اجتماعی نیکی کے ذریعے عہدہ برآ ہو سکتے ہو۔

قرآن نے دوسری جگہ یہ بتاتے ہوئے کہ نبوت کو قرآن اگر وحی کے ذریعے ملا ہے تو اس امت کو جسے اللہ نے نبوت کے کام کے لیے منتخب کیا ہے۔ قرآن نبوت سے وراثت کے ذریعے ملا ہے، ارشاد ہے:

ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا

پھر ہم نے وارث بنایا اس کتاب کا ان لوگوں کو جن کو ہم نے اپنے بندوں میں سے منتخب کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ مسلمان پوری نوع انسانی میں چھانٹ کر اس کام کے لیے منتخب کیے گئے ہیں کہ وہ کتاب اللہ کے وارث ہوں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے کو اٹھائیں۔ یہی امانت کا

تدبر القرآن

وہ منصب جلیل ہے جس کا ذکر قرآن میں شھداء علی الناس میں کیا گیا ہے۔ یہ بتانے کے بعد یہ بھی انکشاف فرمایا ہے کہ اس وراثت کو پانے والے تین قسم کے مسلمان ہوں گے۔

فمنھم ظالم لنفسہ ومنھم مقتصد ومنھم سابق بالخیرات
باذن اللہ ذالک ھو الفضل الکبیر۔

ظالم یعنی وہ لوگ جو قرآن کو سچے دل سے اللہ کی کتاب اور محمد رسول اللہ کو ایمانداری کے ساتھ اللہ کا رسول مانتے ہیں مگر عملاً نبوت کے علم و عمل کی پیروی کا حق نہیں ادا کرتے۔ مومن ہیں مگر نافرمان ہیں۔ مقتصد میانہ رو یعنی وہ لوگ جو فرمان بردار ہیں مگر اپنی ذات کی حد تک اور سابق بالخیرات وہ لوگ ہیں جو ذاتی طور پر نیکیاں کرتے ہیں اور جو کچھ مانتے ہیں اسے دنیا سے منوانے کے لیے سر دھڑ کی بازی لگا رہے ہیں۔ یہی دراصل امامت کا حق ادا کرنے والے ہیں۔ یہ نبوت کے لاتے ہوئے علم و عمل سے رشتہ استوار کرنے میں پیش پیش ہیں۔ اللہ سبحانہ کا پیغام اس کے بندوں تک پہنچانے میں پیش پیش دین حق کی خاطر قربانیاں کرنے میں پیش پیش اور بھلائی کے ہر کام میں گوئے سبقت حاصل کرنے کی فکر میں ہیں فاستبقوا الخیرات کہہ کے قرآن اُمت سے کہہ رہا ہے کہ مقصد کی لگن کا تقاضا یہ ہے کہ تم اپنی پوری طاقت سابق بالخیرات بننے پر لگا دو۔ اگر تم چاہتے ہو کہ امامت کا حق ادا ہو۔ اسی قسم کی بات البقرہ میں بھی فرمائی گئی تھی، ولکل وجھۃ ھو مولیھا فاستبقوا الخیرات۔ مطلب یہ ہے کہ قبلہ کا معاملہ صرف اسلام ہی کی خصوصیت نہیں ہے دُنیا میں جو اُمتیں آئی ہیں سب ہی کا قبلہ ایک نہ ایک رہا ہے تو پھر قبلہ کے موضوع کو بحث و جدال کا موضوع بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ اصل نظر تو مقاصد پر ہونی چاہیے اور مقصد ہی کے پیش نظر محنت اور کوشش کرنی چاہیے۔ اسی طرح یہاں فرمایا ہے کہ شریعت اور منہاج کو موضوع بحث بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دنیا میں نبیوں کی جو اُمتیں آتی رہی ہیں ہر اُمت کو شریعت اور منہاج ملتا رہا ہے اور اب تمہیں بھی یہ نعمت ملی ہے۔ تمہاری نظر محنت اور کوشش پر ہونی چاہیے اور تمہیں تو نیکیاں فراہم کرنے کے لیے ایک دوسرے سے آگے بڑھنا چاہیے۔ بات ناتمام رہ جائے گی۔ اگر ہم یہاں یہ نہ بتائیں کہ ابوحیان اندلسی نے تصریح کی ہے۔ کہ یہاں استباق تسابق کے معنے میں ہے یعنی انفرادی اور ذاتی عمل کا مطالبہ نہیں بلکہ اجتماعی عمل کا قرآن مطالبہ کر رہا ہے۔

خیرات میں مسابقت کا قانون

اور پھر بے قید استباق کا مطالبہ نہیں کیا بلکہ خیرات میں مسابقت کا مطالبہ کیا ہے۔ یعنی تم سے صرف

فعل خیرات مطلوب نہیں بلکہ افعال خیر میں پوری اُمت کے افراد کا اشتراک اور اس میں مسابقت مطلوب ہے۔ قرآن نے انبیاؑ کی امامت کا تذکرہ کرتے ہوتے بتایا واوحینا الیھم فعل الخیرات اس طرح یہ آیت قرآنی اہل ایمان کی اجتماعی فلاح کے لیے ایک رہنما اصول فراہم کر رہی ہے کہ اُمتوں کو مسابقت کا جذبہ کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتا ہے۔ مقاصد کی خاطر مسابقت کی کشش امتوں میں ان کی جدوجہد کا اصلی محرک ہے۔ مسابقت ہی حیات ہے۔ انفرادی زندگی میں ہم روزانہ اس کا مشاہدہ کرتے ہیں کہ کامیابی اور عزت ان ہی افراد کے حصہ میں آتی ہے جو مسابقت کا جذبہ رکھتے ہیں اور مقصد کے حصول میں زندگی کی دوسری دلچسپیوں کو قربان کرنے پر آمادہ رہتے ہیں۔ وہ جسے اپنے مقصد کا شعور نہیں یا مقصد کی خاطر جذبہ مسابقت نہیں رکھتا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ مسابقت ہی سے زندگی میں ترتیب و تنظیم پیدا ہوتی ہے۔ اور انسانی قومیں ایک مرکز پر جمع ہونے لگتی ہیں۔ قرآن نے اس آیت میں اُمت مسلمہ کو اسی قانون مسابقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ خیرات کا لفظ قرآن میں ان اعمال کے لیے استعمال ہوا ہے جن سے اخلاق حسنہ کی تکوین ہوتی ہے۔ گویا اُمت کا اُمت ہونے کی حیثیت سے نصب العین یہ بتایا گیا ہے کہ خیرات میں مسابقت کی جاتے اور اسی الخیرات میں بھرپور اور سرتوڑ کوشش کی وجہ سے اُمت کو خیر امت کہا ہے، اشارۃً بتا دیا ہے کہ یہ اُمت انسانیت کے امن وسلام، مساوات واخوت، امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کی علمبردار اُمت ہے۔ اخلاقی اور معنوی خوبیاں اس کا اجتماعی اور قومی نشان ہیں۔[1]

دام ہمرنگ زمین

۱۲۴۔ اور اے پیغمبر ہم نے تمہیں حکم دیا ہے کہ جو کچھ خدا نے اتارا ہے اس کے مطابق ان لوگوں کا فیصلہ کرو، اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو۔ اور ان کی جانب سے چوکنے رہو کہیں اس قانون کے کچھ حصہ سے نہ بہکا دیں جو اللہ نے نازل کیا ہے یعنی آپس کے اختلافات میں خواہ دنیا کیسی ہی دست بگریبان ہے آپ کو یہی حکم ہے کہ ما انزل اللہ کے موافق حکم دیتے رہیں اور کسی کے کہنے سننے کی کوئی پروا نہ کریں۔[2] دوسرے شارحین قرآن نے تو اس کو پہلے سے مربوط کیا ہے اور درمیان کے جملے کو جملہ معترضہ قرار دیا ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کا عطف کتاب پر ہے اور ابوالبقاء نے یہاں امرناک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کو مقدم مانا ہے لیکن علامہ طبیسی کی رائے میں یہ فقرہ پہلے فاحکم کے ساتھ مربوط ہے ان کے درمیان اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ کیجئے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے اور اب کہا جا رہا ہے کہ ان کے معاملات کا فیصلہ اللہ کے قانون کے مطابق کیجئے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ کیجئے اور مزید یہ کہ ہوشیار رہیے کہ مبادا وہ آپ کو قانون الٰہی کے کسی حصہ سے ہٹانے میں کامیاب نہ ہو جائیں۔ یہاں حالتیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ اہل ایمان غیر مسلموں کی وجہ سے خدا کے نازل کردہ شریعت سے دستبردار ہو جائیں۔ یہ ایک کھلی حالت ہے۔ دوسری حالت یہ ہے کہ اہل ایمان غیر مسلم شہریوں یا مسلمان نما شہریوں کی سازش کا شکار ہو کر پورے قانون الٰہی سے تو نہیں کچھ سے دستبردار ہو جائیں اور یہ دستبرداری اسلام بیزاری کی بنا پر نہیں بلکہ اسلام سے ہمدردی کی بنا پر اختیار کر لی جائے۔ مثلاً یہ کہ غیر مسلم آبادی مسلمانوں کو اپنے مسلمان ہونے کی رشوت دے اور کہے اگر اسلام کے سیاسی اور فوجداری ضابطہ کو بس انداز کیا جائے تو ہم مسلمان ہو جائیں گے فرمایا کہ یہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ اس سے بچ کر رہنا، پہلی حالت ظاہر ہے اور اس سے بچنا ممکن ہے دوسری حالت دام ہمرنگ زمین ہونے کی وجہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ یہ مرحلہ کوئی آسان مرحلہ نہ تھا۔ مخالف تو کیں اس کی سرگرم کوشش کر رہی تھیں کہ تعزیری اور فوجداری ضوابط کو چھوڑ کر اسلام کو پیش کیا جائے۔ یہ کون لوگ ہیں وہی جو مسلمانی کا لباس پہن کر یہودیوں سے ملے ہوتے تھے اور ان سے کہتے تھے کہ

سنطیعکم فی بعض الامر

کچھ باتوں میں ہم تمہاری مان لیں گے۔

ان ہی کا قرآن نے آغاز میں من الذین قالوا امنا بافواھھم ولم تؤمن قلوبھم کے الفاظ میں چہرہ پیش کیا تھا۔ فتنہ کا لفظ خود بتا رہا ہے کہ یہ لوگ نبوت اور اہل ایمان کو کچھ اسلام سے ہٹانے کے لیے اپنا پورا زور صرف کر رہے تھے۔ اسی خطرے کی اہمیت کے پیش نظر پہلے پورے فقرے کو دہرایا ہے اور تاکید کر دی ہے کہ وہ خواہ کتنا ہی زور لگائیں اور کتنا دباؤ ڈالیں اور کیسا خوشنما سبز باغ دکھائیں اور کیسی ملکی اور قومی مصلحتیں درمیان میں لائیں تمہیں بہرحال اللہ کے پورے قانون کو دنیا میں نافذ کرنا ہے۔

اس آیت پر سرسری نظر ڈال کر آگے نہ بڑھ جاؤ بلکہ اس کے ایک ایک لفظ پر غور کرو کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے اور ہم کیا کر رہے ہیں علانیہ محسوس ہوگا کہ عملی طور پر تو گویا پوری طرح ہم بعض ما انزل اللہ سے دستبردار ہو چکے ہیں اور فکری طور پر بھی دین کی یہ ہمہ گیری ایک بھولی بسری داستان بن چکی ہے۔

قانونِ الٰہی سے روگردانی کرنے والوں کو ڈانٹ

۱۲۵ ۔ بس اگر یہ لوگ روگردانی کریں تو جان لو کہ اللہ کا ارادہ یہی ہے کہ ان کے کچھ گناہوں کی وجہ سے ان پر افتاد آئے اور یہ واقعہ ہے کہ ان لوگوں میں اکثریت نافرمانوں کی ہے پوری سزا تو قیامت میں ملے گی لیکن کچھ تھوڑی سی سزا دے کر یہاں بھی مجرم کو یا دوسرے دیکھنے والوں کو ایک گونہ تنبیہ کر دی جاتی ہے اور آپ ان لوگوں کے اعراض و انحراف سے زیادہ ملول نہ ہوں دنیا میں فرمانبردار بندے ہمیشہ تھوڑے ہی ہوتے ہیں وما اکثر الناس ولو حرصت بمومنین [1]

مطلب یہ ہے کہ آپ پورے ما انزل اللہ پر جمے رہیں ۔ یہ اگر ما انزل اللہ کو چھوڑ کر اپنے رسوم و رواج کے بنائے ہوئے گھر وندے کی پیروی پر اڑے رہے تو سمجھ لو کہ وہ وقت دور نہیں کہ اللہ ان کو ان کچھ جرائم کی پاداش میں جلدی سزا دے ۔ ان کا یہ جرم کہ مقدمات کا فیصلہ اللہ کے قانون کے مطابق نہ کرنا اتنا سنگین جرم ہے کہ اس دنیا ہی میں ان کو اس کی سزا ملے گی ۔ عام شارحین قرآن تو یہی لکھتے ہیں کہ یہ یہودی ہیں اور روایات تفسیری میں جو واقعات اور پس منظر بتائے گئے ہیں وہ بھی یہی تاثر دیتے ہیں کہ یہ یہودی ہیں لیکن اگر یہ ضابطہ درست ہے اور درست نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ علماء کا طے کردہ ہے کہ العبرۃ لعموم اللفظ لا لخصوص السبب اعتبار تو قرآن کے عموم کا ہوگا خاص اسباب کا نہ ہوگا تو پھر قرآن کا سیاق و سباق یہ کہتا ہے کہ یہ ان تمام لوگوں کا حکم ہے جو قانونِ الٰہی کی موجودگی میں اپنے مفادات ، اپنی مصالح کی وجہ سے وضعی قوانین کو اپناتے ہیں ۔ اس جرم کی سنگینی کا اندازہ لگانے کے لیے یہی بات کافی ہے کہ قرآن اس کو بعض ذنوب کہہ رہا ہے اور اس کی سزا کو وہ آخرت پر موقوف نہیں کرتا بلکہ دنیا ہی میں اس کی دھمکی دے رہا ہے ۔ اگر ایک یہودی یہودی ہو کر اللہ کے قانون سے روگردانی کرتا ہے اس کی سزا یہ ہے تو ذرا غور فرمائیے ایک مسلمان مسلمان ہو کر اگر یہی جرم کرے تو پھر جرم کی سنگینی کیسی ہوگی ۔ ان کو اگر دنیا میں اس جرم کی سزا ملے گی تو کیا اہل ایمان کو یہ سزا معاف کر دی جائے گی ۔ ہم جیسے دوسروں کو سزا دینے میں سخی ہیں ایسے ہی اپنے کو رعائتیں دینے میں بڑے فراخ دل ہیں

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

قانونِ الٰہی اور قانونِ وضعی کا تقابل

۱۲۶۔ اگر یہ لوگ اللہ کا حکم نہیں مانتے تو کیا پھر جاہلیت کا فیصلہ چاہتے ہیں اور ایمان و یقین والوں کے لیے اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہو سکتا ہے۔ یعنی جو لوگ خدا کی شہنشاہیت، رحمتِ کاملہ اور علمِ محیط پر یقین کامل رکھتے ہیں ان کے نزدیک دُنیا میں کسی کا حکم خدا کے حکم کے سامنے لائقِ التفات نہیں ہو سکتا پھر کیا یہ لوگ احکام الٰہیہ کی روشنی آجانے کے بعد ظنون و اہوا اور کفرو جاہلیت کے اندھیرے ہی کی طرف جانا پسند کرتے ہیں لے

اس آیت میں اسلامی قانون کا غیر اسلامی قانون سے مقابلہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ اسلامی قانون اگر ما انزل اللہ اور حکم اللہ ہے تو غیر اسلامی قانون حکم الجاہلیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ کیا یہ لوگ اسلامی قانون سے روگرداں ہو کر جاہلی قانون کے متلاشی ہیں۔ جاہلیت سے مراد غیر اسلامی قانون ہے۔ یعنی ہر ایسا قانون جو خدائی قانون کے مقابلے میں انسانی دماغ نے بنایا ہو ایک نے بنایا یا جماعت نے۔ اسلامی قانون سرتاسر علم ہے کیونکہ اس کو بنانے والا خدا ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے اور اس کے برعکس ہر طریقہ جو اسلام سے مختلف ہو جاہلیت کا طریقہ ہے۔ قرآن کی زبان ما انزل اللہ کے مقابلہ میں جو نظام ہے وہ نظامِ جاہلیت اور اس دور کے مقابلے میں جس میں اسلام یعنی ما انزل اللہ بروئے کار ہے۔ وہ دور دورِ جاہلیت ہے اور ان افکار کے مقابلہ میں جو ما انزل اللہ نے بتائے ہوں، ہر فکر فکرِ جاہلیت ہے۔ قرآن میں صرف حکم الجاہلیہ نہیں بلکہ ظن الجاہلیہ، حمیۃ الجاہلیہ اور تبرج الجاہلیہ کی بھی مخالفت آتی ہے اس لیے جاہلیت وہ نظامِ قانون، نظامِ تہذیب اور وہ نظامِ تمدن ہے جو اسلامی قانون، اسلامی تہذیب، اور اسلامی تمدن کے مقابلہ پر ہو۔ یہاں اسلامی قانون کے مقابلے میں غیر اسلامی قانون کو حکم الجاہلیہ کہا ہے یہ طریق کار جہاں اور جس زمانے میں انسان اختیار کریں بہرحال جاہلیت ہی کا طرزِ عمل ہوگا۔ احادیث میں بھی جاہلیت کا اطلاق اسلامی نظامِ حیات کے مقابلے پر ہوا ہے۔ اسلام سے پہلے اہلِ عرب پر جو زمانہ گزرا ہے اس کو بھی اسی لیے جاہلیت کہا گیا ہے کہ وہ نبوت کے علم و عمل سے بے پروا ہو کر گمراہی میں زندگی گزار رہے تھے۔

قانونِ الٰہی کے مقابلے میں ہر دور کا بنایا ہوا قانون وضعی جاہلیت ہے خواہ اس کے بنانے والے

لے افادات شیخ الاسلام

کالجوں اور یونیورسٹیوں کے فضلا اور دانشور ہوں۔ چونکہ یہاں حکم الجاہلیہ ما انزل اللہ کے مقابلہ پر آیا ہے، اس لیے ہر وہ قانون جو خدا کے آئے ہوئے قانون کے خلاف ہو وہ جاہلیت کا قانون ہے چاہے وہ زمانہ گزشتہ میں اسلام سے پہلے ہو اور چاہے آج بیسویں صدی کی روشنی میں۔ حافظ ابن کثیر تاتاریوں کے عہد میں ہوئے ہیں۔ ان تاتاریوں نے بھی اپنی مملکت میں ایک اپنا خود ساختہ قانون نافذ کر رکھا تھا۔ اسی کا ذکر کرتے ہوتے ابن کثیر نے ان لوگوں کو نشانہ بنایا ہے جو خدائی قانون کے مقابلے اور اسے کلاً یا جزاً بے دخل کر کے غیر قوموں کے قانون چلاتے ہیں ان کو قطعی کافر قرار دیا ہے، لکھا ہے۔

قرآن کی یہ آیت ان لوگوں کے خلاف کھلا چیلنج ہے جو اللہ کے نازل کردہ قانون سے ہٹ کر آراء و اہواء اور اصطلاحات کو اپناتے ہیں جیسا کہ زمانہ جاہلیت والوں کا دستور تھا اور جیسا کہ تاتاری ملکی سیاسیات میں اس قانون کو استعمال کرتے ہیں جو ان کو چنگیز خاں سے ملا ہے۔ چنگیز خاں کا قانونی مجموعہ ان قوانین کو کہتے ہیں جس میں متفرق مذاہب، یہودیت، عیسائیت اور اسلام کے قوانین کو منتخب کیا گیا ہے اور اس میں اس کے علاوہ اور بھی قوانین ہیں۔ تاتاری اپنی مملکت میں اسی قانون پر عمل پیرا ہیں۔ جو بھی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو چھوڑ کر اس قانون کو اپناتا ہے وہ کافر ہے اس سے قتال واجب ہے۔

کیسا سخت ہے یہ فیصلہ اور کس قدر سنگینی ہے اس میں۔ یہ تو تاتاریوں کے زمانے میں مسلمانوں کے بارے میں ابن کثیر کا فیصلہ ہے۔ آئیے ذرا انگریز کے دور میں انگریز کے بناتے ہوئے قانون کو چلانے والے مسلمانوں کے بارے میں کچھ غور فرمایئے اور ان کے اعمال و افکار کا بھی جائزہ لیجئے آپ محسوس کریں گے کہ بہت بڑی حد تک اسلامی قانون، اسلامی نظام ایک بھولی بسری داستان بن چکی ہے۔

عملی صورت حال یہ ہے کہ انسان کے پردہ باطن سے لے کر اس کی اجتماعی زندگی کے آخری کنارے تک چھا جانے والا یہ دین مسجدوں اور خانقاہوں کی محدود ترین چار دیواری میں محدود ہو چکا ہے اور اس کی اس قید مسلسل پر اس کے پیروؤں نے قریب قریب مکمل صبر و رضا کا رویہ اختیار کر لیا ہے زندگی کے اکثر و بیشتر حصوں سے خصوصاً اس کے اجتماعی شعبوں سے اللہ کے دین کی اس بے دخلی پر ان کا ایمانی احساس جیسے راکھ کا ڈھیر بنا ہوا ہے اور اس معاملے میں عوام و خواص، دنیادار اور دیندار، مفاد پرست اور اہل اخلاص کی کوئی تفریق ہی نہیں ہے۔ اگر ایک طرف دنیادار مسلمان قانون

معیشت اور سیاست کے میدانوں میں اپنی اغراض اور جاہ طلبیوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں اور نہیں چاہتے کہ ان کا دین بازاروں، منڈیوں، عدالتوں، قانون ساز اداروں اور حکومت کے ایوانوں میں بھی ان کے افکار و اعمال کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھے اور پھر اپنی اس نامبارک روش پر پردہ ڈالنے کے لیے پوری شدت سے یہ پُر فریب نعرے بھی لگاتے ہیں کہ مذہب ہر شخص کی ایک مقدس مگر ذاتی متاع ہے لسے دنیوی معاملات میں دخیل بنانا اور سیاسیات میں گھسیٹتے پھرنا اس کی عظمت و حرمت کی توہین کرنا ہے تو دوسری طرف مخلص حاملان دین کو بھی اس صورت حال پر کوئی بے چینی محسوس نہیں ہوتی حالانکہ ان کے دلوں کا خدا سے تعلق بھی ہے اور اسلام کا درد بھی ہے اور دین کے معاملے میں ان کے احساسات بڑے ہی نازک ہیں۔ اگر ایک مسجد کی دیوار بلکہ اگر کسی مزار کی جالی بھی توڑ دی جاتے تو انہیں ایسا محسوس ہوگا کہ کسی نے ان کے دل پر ہتھوڑا رکھ دیا ہے مگر دین ہی کا جو ایک خاص بڑا حصہ معطل پڑا ہوا ہے اس کے لیے ان کے دلوں میں کوئی اضطراب نہیں ہے۔ فالی اللہ المشتکی۔

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الْيَهُوْدَ وَالنَّصٰرٰٓى اَوْلِيَآءَ ۘ بَعْضُهُمْ
اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۭ وَمَنْ يَّتَوَلَّهُمْ مِّنْكُمْ فَاِنَّهٗ مِنْهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ فَتَرَى الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ يُّسَارِعُوْنَ
فِيْهِمْ يَقُوْلُوْنَ نَخْشٰٓى اَنْ تُصِيْبَنَا دَاۗىِٕرَةٌ ۭ فَعَسَى اللّٰهُ
اَنْ يَّاْتِيَ بِالْفَتْحِ اَوْ اَمْرٍ مِّنْ عِنْدِهٖ فَيُصْبِحُوْا عَلٰي مَآ اَسَرُّوْا
فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ نٰدِمِيْنَ ۝ وَيَقُوْلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَهٰٓؤُلَاۗءِ
الَّذِيْنَ اَقْسَمُوْا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ ۙ اِنَّهُمْ لَمَعَكُمْ ۭ حَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ فَاَصْبَحُوْا خٰسِرِيْنَ ۝

اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ[127]، یہ آپس
میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں[128]۔ اور تم میں سے جو بھی ان کو
اپنا رفیق بنائے گا تو وہ ان ہی میں سے ہوگا اللہ ظلم کرنے والوں
کو رہنمائی نہیں کرتا ہے[129]۔ بس تم دیکھ رہے ہو کہ جن کے دلوں

میں نفاق کا روگ ہے وہ ان ہی کی طرف دوڑ رہے ہیں ، وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم پر افتاد آن پڑے گی۔[۱۳۰] وہ وقت دور نہیں ہے کہ اللہ تمہیں فیصلہ کن فتح بخشے گا یا اپنی طرف سے کامیابی کی کوئی بات لے آئے گا تو اس وقت یہ لوگ اس بات پر شرمندہ ہوں گے جو چھپا رکھی ہے[۱۳۱]، اور ایمان والے کہیں گے کیا یہ ہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ان کے سارے اعمال اکارت گئے اور وہ ناکام و نامراد ہو کر رہے۔[۱۳۲]

یہود و نصاریٰ سے ترکِ موالات

اتنی بات تو سب جانتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینے میں تشریف آوری کے بعد یہودِ مدینہ سے صلح و مصالحت کا پیمان کیا اور ایک دستاویز کی صورت میں یہودیوں سے عہد و پیمان کیا۔ اس دستاویز میں یہ بات خاص طور پر لکھی تھی کہ یہودیوں سے جو بھی ہمارے ساتھ رہے گا اس کی مدد کی جائے گی اور ملکی دفاع کی حد تک اس دستاویز میں یہ دفعہ بھی درج تھی کہ

یہود جب تک اہل ایمان کے ساتھ ہو کر دشمن کے خلاف جنگ کرتے رہیں گے
اپنے مصاریف خود ہی برداشت کریں گے ۔
اور یہ بھی لکھا تھا ۔
بنو عوف کے یہودی ایمان والوں کے ساتھ ایک امت متصور ہوں گے ۔ یہودی
اپنے دین پر رہنے کے مجاز ہوں گے اور مسلمان اپنے دین پر خواہ موالی ہوں۔ البتہ جو لوگ
ظلم یا زیادتی کے مرتکب ہوں گے وہ اپنی ذات یا گھرانے کے سوا کسی کو مصیبت میں
نہ ڈالیں گے ۔

یہ دستاویز ۵۳ دفعات پر مشتمل ہے ۔ ڈاکٹر حمید اللہ نے اس معاہدے کو جسے صحیفہ کا نام دیا گیا ہے دُنیا کا سب سے پہلا تحریری دستور قرار دیا ہے ۔ حافظ ابن القیم زاد المعاد میں رقمطراز ہیں کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ تشریف لے آئے تو آپ کے مخالف تین حصوں میں تقسیم ہو گئے ۔

ایک قسم ان لوگوں پر مشتمل تھی جن سے حضور انور نے جنگ نہ کرنے کا معاہدہ کر لیا تھا ، وہ کافر ہوتے ہوئے ایک پُرامن شہری کی حیثیت سے رہتے ان کی جان اور ان کے مال کی حفاظت ہوتی تھی ان کو معاہدین کہتے ہیں ۔

دوسری قسم ان لوگوں کی جنہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اعلان جنگ کیا تھا اور اسلام اور مسلمان کی عداوت ہی کو اپنا رکھا تھا یہ لوگ محاربین کہلاتے ہیں ۔

تیسری قسم اُن لوگوں کی تھی جن سے نہ جنگ تھی اور نہ صلح تھی ۔ یہ وہ لوگ تھے جو حالات کو دیکھ رہے تھے ، حالات کا اونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے کون غالب ہوتا ہے ۔ حضور انور یا آپ کے مخالفین ۔ ان میں وہ بھی تھے جو دل سے حضور انور کے غلبہ کے خواہاں تھے اور حالات کے دباؤ سے مجبور تھے اور ان میں وہ بھی تھے جو بظاہر مسلمان تھے مگر اندر سے دشمن کے ساتھ تھے ۔ قرآن نے ان کو ہی منافقین کہا ہے ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سب سے الگ الگ معاملہ کیا ہے ۔ یہودیوں سے مصالحت کی ۔ مدینہ منورہ میں یہودیوں کے تین قبیلے آباد تھے ۔ بنو قینقاع ، بنو نضیر اور بنو قریظہ ۔ بنو قینقاع نے بدر کے بعد اعلان جنگ کیا ۔ بنو نضیر نے جیسا کہ امام بخاری نے کہا ہے بدر ہی کچھ ماہ بعد عہد شکنی کی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کی سازش کی ۔ اور بنو قریظہ نے غزوہ خندق میں عہد شکنی کی ۔ عیسائیوں کا بھی یہی حال تھا ۔ ان ہی اسباب کی بنا پر یہاں قرآن نے مسلمانوں پر ان سے موالات پر پابندی عائد کی ہے ۔

آیات کا پس منظر

ان آیات کے پس منظر کے موضوع پر شارحین قرآن کے مختلف خیالات ہیں۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں یہ آیتیں رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی کے باب میں نازل ہوئی ہیں۔ یہود سے اس کے بہت دوستانہ تعلقات تھے۔ اس کا خیال تھا کہ اگر مسلمانوں پر کوئی افتاد پڑی اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جماعت مغلوب ہوگئی تو یہود سے ہماری دوستی کام آئے گی۔ اسی واقعہ کے متعلق اگلی آیت میں اشارہ کیا گیا ہے۔

امام تفسیر ابن جریر طبری فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ میں تشریف فرما ہونے کے بعد اطراف مدینہ کے یہود و نصاریٰ سے ایک معاہدہ کیا تھا لیکن یہودی اپنی سازشی فطرت اور اسلام دشمنی کی وجہ سے اس معاہدہ پر قائم نہ رہ سکے اور مسلمانوں کے خلاف مشرکین مکہ ت سازش کر کے ان کو اپنے قلعہ میں بلانے کے لیے خط لکھ دیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر جب اس سازش کا انکشاف ہوا تو آپ نے ان کے مقابلے کے لیے مجاہدین کا ایک دستہ روانہ کر دیا۔ بنو قریظہ کے یہودی ایک طرف تو مشرکین مکہ سے یہ سازش کر رہے تھے اور دوسری طرف مسلمانوں میں گھسے ہوئے بہت سے مسلمانوں سے دوستی کے معاہدے کیے ہوتے تھے اور اس طرح مسلمانوں کے خلاف جاسوسی کا کام کرتے تھے اس لیے یہ آیت نازل ہوئی۔

ابن ابی شیبہ اور ابن جریر نے عطیہ ابن سعد کے حوالہ سے بتایا ہے کہ عبادہ ابن الصامت نے حضور انور کی خدمت گرامی میں حاضر ہو کر یہود کی موالات سے بیزاری کا اعلان کیا اور عبداللہ ابن ابی نے یہود کی موالات کو چھوڑنے سے انکار کیا تو اللہ نے یہ آیات نازل کیں۔

"تاریخی روایات سے بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے کہ انہی احوال و ظروف کے بعد ان آیات کا نزول ہوا ہے اور ان واقعات کو سبب نزول کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ان آیات میں ان کا حل موجود ہے۔

۵۱۔ اے ایمان والو! یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا رفیق نہ بناؤ۔ اولیاء جمع ولی کی ہے ولی دوست کو بھی کہتے ہیں، قریب کو بھی ناصر اور مددگار کو بھی۔ غرض یہ ہے کہ یہود و نصاریٰ بلکہ تمام کفار سے جیسا کہ سورۂ نساء میں تصریح کی گئی ہے۔ مسلمان دوستانہ تعلقات قائم نہ کریں۔ اس موقعہ پر یہ ملحوظ رکھنا چاہیے کہ موالات، مروت و حسن سلوک، مصالحت، رواداری اور عدل و انصاف یہ سب چیزیں الگ الگ ہیں۔ اہل اسلام اگر مصلحت سمجھیں تو ہر کافر سے صلح و مصالحت اور عہد و پیمان مشروع طریقہ پر کر سکتے ہیں وان جنحوا للسلم فاجنح لها وتوکل علی اللہ عدل و انصاف کا حکم

جیسا کہ گزشتہ آیات سے معلوم ہو چکا مسلم و کافر ہر فرد و بشر کے حق میں ہے ۔ مروت، رواداری یا حسن سلوک کا برتاؤ ان کفار کے ساتھ ہو سکتا ہے جو جماعت اسلام کے مقابلے میں دشمنی اور عناد کا مظاہرہ نہ کریں جیسا کہ سورہ ممتحنہ میں تصریح ہے ۔ باقی موالات یعنی دوستانہ اعتماد اور برادرانہ مناصرت و معاونت تو کسی مسلمان کو حق نہیں کہ یہ تعلق کسی غیر مسلم سے قائم کرے ۔ البتہ صوری موالات جو الا ان تتقوا منہم تقاۃ کے تحت میں داخل ہو ۔ اور عام تعاون جس کا اسلام اور مسلمان کی پوزیشن پر کوئی برا اثر نہ پڑے اس کی اجازت ہے ۔ بعض خلفائے راشدین کے بارے میں جو غیر معمولی تشدید و تضییق منقول ہے اس کو محض سد ذرائع اور مزید احتیاط پر مبنی سمجھنا چاہیے ۔

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات جن میں ترک موالات کا حکم آیا ہے یعنی اس بات پر زور دیا ہے کہ یہود و نصاریٰ یا دوسرے کافروں سے رفاقت و اعانت کے تعلقات نہ رکھو ۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے احکام احکام جنگ سے ہیں نہ زندگی کے عام احکام یقیناً ہر نیک تحریک کے بانی کا یہ فرض ہے کہ وہ تحریک کے قیام و بقا اور حفاظت کی خاطر اس تحریک کے پیروؤں کو اس کے مخالفین سے میل جول، رواداری اور رفاقت سے روک دے جو زور یا سفارش سے اس کے مٹانے اور برباد کرنے کے درپے ہوں ۔ خصوصاً ایسے وقت میں جب اس تحریک کو تیغ و خنجر اور فوج و لشکر سے مٹا دینے کی کوششیں ہو رہی ہوں اور طرفین میں لڑائی کی حالت قائم ہو یا غلط شبہے اور افواہیں پھیلا کر اس کے پیروؤں کو وہ برگشتہ کرنا چاہتے ہوں ۔ اور یہ بات بھی ایک بے غبار حقیقت ہے کہ جب حق و باطل معرکہ آرا ہوں تو اہل حق کے درمیان حق کی خاطر جس قدر محبت ہوگی فطرۃً ان اہل باطل سے اسی قدر بیزاری بھی ہوگی جو اس حق کو مٹانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہوں اس لیے حق کی حفاظت کی خاطر اہل حق کو اہل باطل سے اس قسم کی محبت اور موالات سے قرآن نے روکا ہے قرآن کے اس قسم کے احکام کے وہی معنے ہیں جو شہزادہ امن کے اس اعلان کے ہیں ۔

یہ مت سمجھو کہ میں زمین پر صلح کروانے آیا ہوں بلکہ تلوار چلانے کو آیا ہوں، کیونکہ میں آیا ہوں کہ مرد کو اس کے باپ اور بیٹے کو اس کی ماں اور بہو کو اس کی ساس سے جدا کر دوں، آدمی کے دشمن اس کے گھر کے لوگ ہوں گے، جو کوئی باپ یا ماں کو مجھ سے زیادہ چاہتا ہے وہ میرے لائق نہیں ہے ۔ (متی کی انجیل باب ۱۰، ۳۴)

یہی وجہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کے اخلاق میں یہودیوں کے ساتھ وہ نرمی، رحمدلی نہیں جو دوسروں کے ساتھ تھی، وہ یہودیوں کو بے تکلف سخت سے سخت الفاظ سے

خطاب کرتے تھے۔ جب حجاز کے یہودیوں اور سرحد شام کے عیسائیوں سے مسلمان کی جنگ چھڑی اور بظاہر مال و دولت، ساز و سامان اسلحہ اور مستحکم قلعوں کے سبب سے ان کا پلہ مسلمانوں سے زیادہ بھاری نظر آتا تھا تو مدینہ کے منافقوں اور کمزور دلوں کی عاقبت بینی اور دور اندیشی ان کو اس پر مجبور کرتی تھی کہ وہ اسلام کے ان دشمنوں سے سازباز رکھیں تاکہ ان کے مقابلے میں اگر مسلمان کو شکست ہو تو ان کو پناہ مل سکے۔ اسی کے ساتھ وہ مسلمانوں کو اپنے ساتھ ملا کر ان کو دین اسلام سے ہٹانے کی کوشش کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اس موقع پر مسلمانوں کو ان اہل کتاب سے رازدارانہ دوستی و محبت کے تعلقات رکھنے سے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اے ایمان والو یہود و نصاریٰ سے رفاقت کے تعلقات نہ رکھو، ورنہ جہاں تک ایک انسان کے دوسرے انسان کے ساتھ معاملہ کرنے کا تعلق ہے۔ اصل اس میں محبت و شفقت، ہمدردی و سلوک اور تعاون و سازگاری ہے اس کے سوا کوئی بات نہیں ہر انسان دوسرے انسان کا بھائی ہے خواہ اس کا ہم وطن ہو یا نہ ہو، ہم نسل ہو یا نہ ہو، ہم عقیدہ ہو یا نہ ہو اور امتیاز کی وہ تمام باتیں جو اس انسانی بھائی چارگی کا رشتہ قطع کر دیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں خود انسانوں کی گھڑی ہوئی ہیں، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعاؤں میں سب سے زیادہ اعتراف اسی حقیقت کا ہوتا تھا۔ انی اشھد ان العباد کلھم اخوۃ لیکن جب تمام ملک و قوم نے اس دعوت کو نابود کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔ اور اہل ایمان پر محض اختلاف افکار کی بنا پر ظلم و ستم کرنے لگے تو قدرتی طور پر جنگ کی حالت پیدا ہو گئی۔ اب دو فریق ایک دوسرے کے خلاف صف آرا تھے ایک فریق مسلمانوں کا تھا جو اپنا بچاؤ کر رہا تھا دوسرا دشمنوں کا تھا جو حملہ آور تھا۔ ایسی حالت میں ناگزیر ہو گیا کہ دوستوں اور دشمنوں میں صاف امتیاز ہو جائے جو دوست ہیں وہ دشمن کے کیمپ سے تعلق نہ رکھیں۔ جو دشمن ہیں وہ دوستوں سے کسی طرح کی سازش نہ کریں۔ قرآن میں جس قدر احکام عدم موالات ہیں وہ سب اسی صورت حال سے تعلق رکھتے ہیں اور قرآن کی یہ آیت بھی اسی سے متعلق ہے۔

قرآن نے اس بارے میں ایک اصولی تقسیم کر دی ہے تمام غیر مسلم خواہ کتابی ہوں یا غیر کتابی۔ ان کو دو قسموں میں بانٹ دیا ہے۔ ایک قسم ان غیر مسلموں کی ہے، یہ نہ تو مسلمانوں سے لڑتے ہیں نہ ان پر حملہ آور ہوتے ہیں نہ ان کی آبادیوں پر قابض ہیں اور نہ ہونا چاہتے ہیں۔ دوسری قسم ان غیر مسلموں کی ہے جو یہ ساری باتیں کر رہے ہیں۔ قرآن کا فیصلہ یہ ہے کہ دوسری قسم کے غیر مسلموں کے ساتھ مسلمان کوئی علاقہ نہ رکھیں، اگر رکھیں گے تو ان کا شمار بھی اللہ اور اس کے رسول کے دشمنوں میں ہوگا۔

یہود و نصاریٰ کا سیاسی گٹھ جوڑ

۱۲۸۔ یہ آپس میں ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ یعنی مذہبی فرقہ بندی اور اندرونی بغض و عداوت کے باوجود وہ باہم ایک دوسرے سے دوستانہ تعلقات رکھتے ہیں۔ یہودی یہودی کا اور عیسائی عیسائی کا دوست بن سکتا ہے لیکن اہل ایمان کے مقابلے میں سب کفار ایک دوسرے کے دوست اور معاون بن جاتے ہیں۔ الکفر ملۃ واحدۃ[1] آیت کے آغاز میں اہل کتاب کی تعبیر چھوڑ کر یہود و نصاریٰ کہنے کی وجہ یہی ہے کہ ان کی یہ عداوت نبوت اور اسلام سے کتابی ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہود و نصاریٰ کی سیاسی سنگٹھن کی وجہ سے ہے ورنہ ان کی کتاب توان کو نہیں کہتی ہے۔ وہ اسلام اور مسلمانوں کو اپنے لیے مشترک طور پر ایک سیاسی خطرہ سمجھتے ہیں اور اس خطرے سے نمٹنے کے لیے باہم ایک دوسرے کے دوست اور معاون ہیں۔ اس لیے مسلمانوں کا رویہ ان کے ساتھ انفرادی نہیں بلکہ جماعتی بنیاد پر ہونا چاہیے، جس طرح وہ مسلمانوں کے خلاف بحیثیت جماعت واحدہ ہیں اسی طرح مسلمان بھی ان کے مقابلے میں ملت واحدہ بنیں۔ جماعت سے الگ ہو کر مسلمانوں کا کوئی گروہ ان کے کسی گروہ کے ساتھ اپنے ذاتی اغراض و مصالح یا ذاتی تعلقات و مراسم کی بنا پر اتحاد و دوستی کا ربط و ضبط نہ رکھے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودی یہودی اور نصرانی نصرانی تو باہم دوست ہوتے ہی ہیں باقی خود یہود و نصاریٰ کے درمیان بھی بہت کچھ مناسبت ہے۔ کم از کم یہی کہ اسلام اور مسلمانوں کی عداوت پر دونوں متحد ہیں۔ ان کے آپس میں اگر تمہارے خلاف ساز باز ہو جاتے تو کچھ تعجب نہیں ہے۔ آج بھی اگر اس سیاسی گٹھ جوڑ اور بعضھم اولیاء بعض کا تماشا دیکھنا چاہتے ہو تو سرزمین فلسطین میں یہودیوں اور عیسائیوں کا مسلمانوں کے خلاف گٹھ جوڑ دیکھ لو۔

دشمن کا دوست دشمن ہے

۱۲۹۔ اور تم میں سے جو بھی ان کو اپنا رفیق بنائے گا تو وہ ان ہی میں سے ہے۔ ہرگز اللہ ظالم لوگوں کی رہنمائی نہیں کرتا ہے۔ یعنی فی الواقع یہود کے ساتھ منافقین کی موالات کا اصلی منشا یہ ہے کہ یہود جماعت اسلام کے مدمقابل اور مذہب اسلام کے بدترین دشمن ہیں۔ ظاہر ہے کہ جو شخص یہود و نصاریٰ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یا کسی جماعت کفار کے ساتھ اس نیت اور حیثیت سے موالات کرے کہ وہ دشمنِ اسلام ہے۔ اس کے کفر میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ منافقین میں کچھ لوگ اور بھی تھے جنہوں نے جنگِ اُحد میں لڑائی کا پانسہ بدلا ہوا دیکھ کر کہنا شروع کیا تھا کہ ہم تو اب فلاں یہودی یا فلاں نصرانی سے دوستانہ گانٹھیں گے اور ضرورت پیش آنے پر ان ہی کا مذہب اختیار کرلیں گے۔ اس قماش کے لوگوں کی نسبت بھی ومن یتولھم منکم فانہ منھم کا ظاہری مدلول علانیہ صادق ہے جب وہ مسلمان جو اس قسم کی نیت اور منشا سے خالی ہو کر یہود و نصاریٰ کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کریں۔ چونکہ ان کی نسبت بھی قوی خطرہ رہتا ہے کہ وہ کفار کی حد سے زیادہ ہم نشینی اور اختلاط سے متاثر ہو کر رفتہ رفتہ ان ہی کا مذہب اختیار کرلیں یا کم از کم شعائر کفر اور رسوم فسق سے کنارہ اور نفور نہ رہیں۔ اس اعتبار سے فانہ منھم کا اطلاق ان کے حق میں بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ حدیث المرء مع من احب نے اس مضمون کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور جو لوگ کہ دشمنانِ اسلام سے موالات کر کے خود اپنی جان پر اور مسلمانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ اور جماعت اسلام کے مغلوب و مقہور ہونے کا انتظار کر رہے ہیں۔ ایسی بدبخت، معاند اور دغاباز قوم کی نسبت یہ اُمید نہیں کی جاسکتی کہ وہ کبھی راہِ ہدایت پر آئے گی[1] مطلب یہ ہے کہ جو جماعت سے الگ ہو کر ان کو اپنا دوست اور معتمد بنائے گا اس کا شمار ان ہی میں ہوگا۔ اس کا دعویٰ اسلام بے حقیقت ہو کر رہ جائے گا۔ یعنی جن یہود و نصاریٰ کا چہرہ پیش کیا جارہا ہے ان سے اس طرح کا کوئی علاقہ بھی مسلمان نہ رکھیں، اگر رکھیں گے تو ان کا شمار بھی اللہ اور اس کے رسُول کے دُشمنوں میں ہوگا۔ ایک مسلمان کے سارے گناہوں سے شریعت درگزر کرسکتی ہے لیکن اس قسم کے یہود و نصاریٰ سے محبت کرتا ہے یا کسی طرح کا واسطہ رکھتا ہے تو یہ گناہ نہیں نفاق ہے اور منافق مومن نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا کہ ان اللہ لا یھدی القوم الظالمین، ہدایت سے یہاں منزلِ مقصود تک پہنچانا ہے اور ظالمین سے مراد اپنی جانوں پر ظلم ڈھانے والے ہیں۔ یعنی جو لوگ اسلام اور اہلِ ایمان کے مقابل میں ایمان و اسلام کے دُشمنوں کو اپنا دوست و معتمد بنائیں گے وہ خود اپنی جانوں پر ظلم کریں گے اور ایسے لوگ راہ یاب نہ ہوں گے اس لیے کہ انہوں نے راہِ راست پر چلنے والوں کا ساتھ نہیں دیا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

منافقین کے دل کا چور

۱۳۰۔ پس تم دیکھ لیتے ہو کہ جن کے دلوں میں روگ ہے وہ ان ہی کی طرف دوڑ رہے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ہمیں اندیشہ ہے کہ ہم پر کوئی افتاد آن پڑے گی۔ یہ وہی لوگ ہیں جن کے دلوں میں شک اور نفاق کی بیماری ہے جن کو خدا کے وعدوں پر اعتماد اور مسلمانوں کی حقانیت پر یقین نہیں، اسی لیے دوڑ دوڑ کر کافروں کے آغوش میں پناہ لیتے ہیں تاکہ ان کے موہوم غلبہ کے وقت ثمرات فتح سے متمتع ہو سکیں۔ اور ان کے زعم میں جو گردشیں اور آفات جماعت اسلام پر آنے والی تھیں ان سے محفوظ رہیں نخشی ان تصیبنا دائرۃ کے یہی معنے ان کے دلوں میں پوشیدہ تھے لیکن یہی الفاظ جب پیغمبر اسلام اور مخلص مسلمانوں کے سامنے یہود سے دوستانہ رکھنے کی معذرت میں رکھتے تھے تو گردش زمانہ کا یہ مطلب ظاہر کرتے کہ یہود ہمارے ساہوکار ہیں۔ ہم ان سے قرض لے لیتے ہیں اگر کوئی مصیبت قحط وغیرہ آن پڑے تو وہ ہمارے دوستانہ تعلقات کی وجہ سے آڑے وقت میں کام آجائیں گے ان ہی خیالات کا آگے جواب آرہا ہے۔[1]

اس وقت تک عرب میں کفر اور اسلام کی کش مکش کا فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اگرچہ اسلام اپنے پیروؤں کی سرفروشیوں کے سبب ایک طاقت بن چکا تھا لیکن مقابل کی طاقتیں بھی زبردست تھیں۔ اسلام کی فتح کا جیسا امکان تھا ویسا ہی کفر کی فتح کا بھی تھا، اس لیے مسلمانوں میں جو لوگ منافق تھے وہ اسلامی جماعت میں رہتے ہوئے یہودیوں اور عیسائیوں کے ساتھ بھی ربط ضبط رکھتے تھے تاکہ یہ کشمکش اگر اسلام کی شکست پر ختم ہو تو ان کے لیے کوئی نہ کوئی جائے پناہ ضرور رہے۔ علاوہ ازیں اس وقت عرب میں عیسائیوں اور یہودیوں کی معاشی قوت سب سے زیادہ تھی، ساہوکاری سب سے زیادہ تھی۔ ساہوکارہ بیشتر انہی کے ہاتھ میں تھا۔ عرب کے بہترین سرسبز و شاداب حصے ان کے قبضے میں تھے۔ ان کی سودخواری کا جال ہر طرف پھیلا ہوا تھا۔ لہٰذا معاشی اسباب کی بنا پر بھی یہ منافق لوگ ان کے ساتھ اپنے سابق تعلقات برقرار رکھنے کے خواہش مند تھے۔ ان کا گمان تھا کہ اگر اسلام و کفر کی اس کش مکش میں بمرتن منہمک ہو کر ہم نے ان سب قوموں سے اپنے تعلقات منقطع کر لیے جن کے ساتھ اسلام اس وقت برسرپیکار ہے تو یہ فعل سیاسی اور معاشی دونوں حیثیتوں سے ہمارے لیے خطرناک ہو گا۔[2]

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

سارے شارحین قرآن کا اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں منافقین کا چہرہ پیش کیا گیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ اخلاص نہ ہونے کی وجہ سے ان میں اصول وصداقت کے مقابلے میں منافع ومصالح اور آجل کے مقابلہ میں عاجل کو ترجیح دینے کی بیماری پیدا ہو گئی تھی۔ اس سے وہ ایک با اصول، بلند اخلاق، پختہ سیرت جماعت کے بلند مقام سے گر کر ایک بے اصول ناقابل اعتبار، ابن الوقت اور مصلحت پرست بن کر رہ گئے تھے۔ ان کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہ تھا بلکہ صرف منافع ومصالح پر ان کا سہارا تھا۔ اس کا نتیجہ تھا کہ دنیوی کامیابی اور مادی فوائد ومنافع ان کا منتہائے نظر تھا۔ اصول واخلاقی معیار منافع وفوائد کے مقابلے میں ان کے یہاں بے قیمت تھے۔ یہاں مضمون فیمہ کے انداز بیان نے اس سلسلے میں ان کی تگ ودو، بھاگ دوڑ، محنت اور جانفشانی کو بے نقاب کر دیا ہے۔ ہر دور میں منافقین کا یہی حال ہوتا ہے۔ سیاسی زندگی میں سیاسی پارٹیوں سے سازباز اور اقتدار بدلنے کے ساتھ پارٹیوں کی تبدیلی ان ہی لوگوں کا شیوہ ہوتا ہے۔

مستقبل میں ان کی ندامت کا سامان

۱۳۱۔ وہ وقت دور نہیں ہے کہ اللہ تمہیں فیصلہ کن فتح بخشنے گا یا اپنی طرف سے کامیابی کی کوئی بات لے آئے گا تو اس وقت یہ لوگ اس بات پر شرمندہ ہوں گے جو چھپا رکھی ہے۔ یعنی وہ وقت نزدیک ہے کہ حق تعالیٰ اپنے نبی علیہ السلام کو فیصلہ کن فتوحات اور غلبہ عطا فرمائے اور مکہ معظمہ میں بھی جو تمام عرب کا مسلم مرکز تھا حضور کو فاتحانہ داخل کرے یا اس کے ماسوا اپنی قدرت اور حکم سے کچھ اور امور بروئے کار لائے جنہیں دیکھ کر ان منافقین کی ساری باطل توقعات کا خاتمہ ہو اور انہیں پتہ لگ جائے کہ دشمنان اسلام کی موالات کا نتیجہ دنیوی ذلت و رسوائی اور اخروی عذاب الیم کے سوا کچھ نہیں۔ جب فضیحت و رسوائی کے یہ نتائج سامنے آجائیں گے اس وقت بجز پچھتانے کے اور کف افسوس ملنے کے کچھ حاصل نہ ہوگا۔

الآن قد ندمت وما ینفع الندم

چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ اسلام کے عام غلبے اور فتح مکہ وغیرہ کو دیکھ کر تمام اعدائے کے حوصلے پست ہو گئے۔ بہت سے یہود مارے گئے۔ بہت سے جلاوطن ہوئے۔ منافقین کی ساری امیدوں پر پانی پھر گیا۔ مسلمانوں کے سامنے صریح طور پر جھوٹے ثابت ہو گئے۔ موالات یہود میں جو کوششیں کی تھیں وہ اکارت گئیں اور اخروی و دنیوی ہلاکت ابدی کا طوق گلے میں پڑ گیا۔ اگلی آیت میں

اسی مضمون کو بیان فرمایا ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے دلوں میں تو ڈر سمایا ہوا ہے کہ اس وقت مسلمانوں اور ان کے مخالفین کے درمیان جو کش مکش برپا ہے معلوم نہیں یہ اونٹ کس کروٹ بیٹھے گا ہو سکتا ہے کہ فتح بالآخر مخالفین کی ہو۔ چونکہ ان منافقین کا قلبی رشتہ مخالف اسلام طاقتوں کے ہی ساتھ تھا اس وجہ سے وہ آسانی سے یہ باور کرنے کو تیار نہیں تھے کہ اسلام کے مقابلے میں ان کے ٹھہرنے کا کوئی امکان باقی نہیں رہا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کو سمجھایا اور بتایا کہ آخری اور مکمل فتح آنے والی ہے جس کے بعد دشمن کی قوت بالکل ختم ہو جائے او امر من عندہ یا اللہ کی طرف سے کوئی خاص بات ایسی نمایاں ہو جائے گی جس سے منافقین کا سارا بھرم کھل جائے گا۔ یعنی فیصلہ کن فتح سے کمتر درجہ کی کوئی ایسی چیز جس سے عموماً لوگوں کو یقین ہو جائے کہ مستقبل میں میدان اسلام کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس وقت یہ لوگ مایوس ہوں گے اور یہود کی دوستی جسے اب تک وہ چھپائے ہوئے تھے اس پر پچھتائیں گے۔

منافقین کی روش پر اہل ایمان کا تعجب

۱۳۲۔ اور ایمان والے کہیں گے کیا یہ ہی وہ لوگ ہیں جو اللہ کے نام سے کڑی کڑی قسمیں کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں ان کے سارے اعمال اکارت گئے اور وہ ناکام و نامراد ہو کر رہے۔ یہ مسلمانوں کی طرف سے ان منافقین کے حال پر اس وقت اظہار ہوگا جب ان کا سارا راز فاش ہو جائے گا اس وقت مسلمان باہم کہیں گے۔ کیا یہی وہ لوگ ہیں جو بڑے زور شور سے ہمیں قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے تھے کہ ہم تمہارے ساتھ ہیں۔ اس سے مقصد منافقین کو تنبیہ ہے کہ کب تک اپنی سازشوں کو راز بنائے رکھو گے بالآخر ایک روز برسر عام رسوائی ہونی ہے۔ آخر میں فرمایا کہ حبطت اعمالھم یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہے کہ ان کے سارے اعمال اکارت ہو جائیں اور یہ نامرادیوں کی تصویر بن کر رہ جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ انہوں نے جو کچھ اسلام کی پیروی میں کیا، نمازیں پڑھیں، روزے رکھے، زکوٰۃ دی، جہاد میں شریک ہوئے۔ اسلامی اخلاق و آداب کو اپنایا۔ یہ سب کچھ اس لیے ضائع ہو گیا کہ ان کے دلوں میں اسلام کے لیے خلوص نہ تھا۔ اعمال کے مثمر ہونے کا انحصار تمام تر ایمان و اخلاص پر ہے۔ نفاق کے ساتھ دینداری کی جو نمائش کی جاتی ہے وہ محض نمائشی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوتی ہے۔ حقیقت کی میزان میں اس کا کوئی وزن نہیں ہوتا۔ ایک مطلب تو یہی ہوتا ہے لیکن علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ان کے وہ اعمال رائیگاں ہو جائیں گے جو وہ یہودیوں سے موالات کی خاطر کرتے رہے اور وہ تمام کوششیں بیکار ہو کر رہ گئیں جواب تک وہ اس راہ میں کرتے رہے۔

اعجازِ قرآنی کا ایک نمونہ

اس بابت پر تو سب کا اتفاق ہے کہ قرآن معجزہ ہے لیکن اختلاف اس میں ہے کہ وہ کس حیثیت سے معجزہ ہے اور وجہ اعجاز کیا ہے؟ ان وجوہ اعجاز میں ایک وجہ اعجازِ قرآن مجید کا اظہارِ غیب اور پیشین گوئیاں ہیں جو انسان کے حیطۂ امکان سے باہر ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں صراحۃً غیب کی خبر دی گئی ہے۔ اگرچہ عسیٰ کے ذریعے دی گئی ہے اور وہ اصلاً امکان غالب اور ظن غالب ہی کے لیے آتا ہے لیکن جہاں موقع دلیل ہو تو عسیٰ وعدے کی تعبیر کے لیے بھی ایک لطیف انداز بیان ہے، یہاں اسی مفہوم میں ہے۔ یہاں فتح مکہ کی خبر دی گئی ہے۔ اور دنیا نے یہ تماشا آنکھوں سے دیکھ لیا کہ اللہ نے اپنا وعدہ پورا کر دیا۔ اپنے بندے کو فتح و نصرت سے نوازا اور مدِمقابل ساری طاقتوں کو کمل شکست دی۔ اس سورت کا زمانہ نزول ۵ھ کا اواخر یا ۶ھ کا اوائل ہے اور فتح مکہ ۲۰ رمضان ۸ھ یعنی ۱۱ فروری ۶۳۰ء میں ہوئی ہے۔ قرآن میں اس قسم کی خبریں اور بھی ہیں۔ اہلِ کتاب اس قسم کی غیب کی خبروں ہی کو نبوت سمجھتے ہیں۔

اور اس کے ساتھ ذرا قرآن کی اس معجزانہ بلاغت کو پیشِ نظر رکھیے کہ اس آیت میں کس قدر خوبصورت انداز میں مختلف طریقوں سے اہلِ ایمان کو یہود و نصاریٰ کی موالات سے روکا ہے۔

۱۔ بصیغہ نہی موالات سے روکا اور نام لے کر روکا۔
۲۔ ان کے سیاسی گٹھ جوڑ کی نشاندہی فرما کر موالات سے روکا۔
۳۔ یہ کہہ کر روکا کہ ان سے موالات کرنے والے کا شمار ان میں ہی ہوگا۔
۴۔ یہ کہہ کر روکا کہ ایسا کرنے والے ظلم کار ہیں۔
۵۔ یہ کہہ کر روکا کہ وہ اللہ کی رہنمائی سے محروم ہو جاتے ہیں۔
۶۔ یہ کہ موالات شک و نفاق کے نتائج میں سے ایک نتیجہ ہے۔

۷۔ یہ کہہ کر روکا کہ موالات کا نشہ ان کو ہوتا ہے جو مستقبل کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔
۸۔ یہ خبر دے کر موالات سے روکا کہ فتح و نصرت عنقریب اسلام کی ہوگی اور تمہارے اندیشوں کا گھروندا گر جائے گا۔
۹۔ یہ کہہ کر جن کے اقتدار کے اندیشے سے تم موالات کر رہے ہو وہ ذلیل ہوں گے۔
۱۰۔ یہ بتا کر موالات سے روکا کہ تمہیں اپنے موجودہ کردار پر مستقبل میں شرمندہ ہونا پڑے گا۔
۱۱۔ یہ کہہ کر موالات سے روکا کہ وقت آرہا ہے جب تم سرعام رسوا ہوگے اور اہل ایمان کو تم پر حیرت ہوگی۔
۱۲۔ یہ کہہ کر روکا کہ موالات کے سلسلے میں تمہاری ساری کوششیں رائیگاں جائیں گی۔[1]

---

[1] المحاسن ملخصاً

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَن يَرْتَدَّ مِنكُمْ عَن دِينِهِ فَسَوْفَ
يَأْتِي اللَّهُ بِقَوْمٍ يُحِبُّهُمْ وَيُحِبُّونَهُ أَذِلَّةٍ عَلَى الْمُؤْمِنِينَ
أَعِزَّةٍ عَلَى الْكَافِرِينَ يُجَاهِدُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَ
لَا يَخَافُونَ لَوْمَةَ لَائِمٍ ۚ ذَٰلِكَ فَضْلُ اللَّهِ يُؤْتِيهِ مَن
يَشَاءُ ۚ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿٥٤﴾ إِنَّمَا وَلِيُّكُمُ اللَّهُ وَرَسُولُهُ
وَالَّذِينَ آمَنُوا الَّذِينَ يُقِيمُونَ الصَّلَاةَ وَيُؤْتُونَ
الزَّكَاةَ وَهُمْ رَاكِعُونَ ﴿٥٥﴾ وَمَن يَتَوَلَّ اللَّهَ وَرَسُولَهُ وَ
الَّذِينَ آمَنُوا فَإِنَّ حِزْبَ اللَّهِ هُمُ الْغَالِبُونَ ﴿٥٦﴾

اے اہل ایمان! جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا
تو قریب ہے کہ اللہ ایسا گروہ پیدا کر دے جنہیں خدا دوست رکھتا
ہو اور وہ بھی خدا کو دوست رکھنے والے ہوں، مومنوں کے
مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوتے لیکن دشمنوں کے مقابلے

نہایت سخت، اللہ کی راہ میں جان لڑا دیں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت سے نہیں ڈریں گے[۱۳۳]۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہے عطا فرمائے اور وہ بڑی ہی وسعت والا اور جاننے والا ہے[۱۳۴]۔ تمہارا رفیق و مددگار تو اللہ ہے اس کا رسول ہے اور وہ لوگ ہیں جو ایمان والے ہیں جو نماز قائم رکھتے ہیں، زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ہر حال میں اللہ کے سامنے جھکے ہوتے ہیں[۱۳۵] اور دیکھو جو بھی اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان سے دوستی رکھے گا تو بلاشبہ اللہ کا گروہ ہی غالب آنے والا ہے[۱۳۶]۔

مستقبل میں غلبہ اسلام کی پیشین گوئی

یہ آیات دراصل پہلے ہی موضوع کا تتمہ ہیں۔ پہلے یہ بات کھول دی گئی ہے کہ کافروں سے موالات کرنے والوں کو کافروں ہی میں شمار کیا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ جو لوگ اس بیماری میں آج مبتلا ہیں وہ مستقبل میں کھل کر اسلام کے مخالف کیمپ میں جا کھڑے ہوں اور اس طرح وہ ارتداد اختیار کرلیں (بایں) اگر مستقبل میں ایسا ہوا تو اللہ کو اپنے دین کی حفاظت کے لیے ان کی پروا نہیں ہے۔ اللہ ایسے لوگوں کے ذریعے اقامتِ دین کا کام کرائے گا جو صرف باہمت ہی نہیں بلکہ عشق و شیفتگی کی ایسی تصویریں ہیں جو مصیبتوں کو مصیبتوں کی طرح جھیلتے ہی نہیں بلکہ عیش و راحت کی طرح ان سے لذت و سرور

حاصل کرتے ہیں۔ راہِ محبت کی ہر مصیبت ان کے لیے عیش و راحت کی ایک نئی لذت بن جاتی ہے۔ اگر اس راہ میں کانٹوں پر لوٹنا پڑے تو کانٹوں کی چبھن میں انہیں ایسی راحت محسوس ہوتی ہے جو کسی کو پھولوں کی سیج پر لوٹ کر بھی نہیں مل سکتی۔ حتیٰ کہ اس راہ میں مصیبتیں جس قدر بڑھتی جاتی ہیں، اتنی ہی زیادہ ان کے دل کی خوشحالیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں ان کے لیے صرف اس بات کا تصور کہ یہ سب کچھ کسی کی راہ میں پیش آرہا ہے اور اس کی نگاہیں ہمارے حال سے بے خبر نہیں ہیں۔ عیش و سرور کا ایک ایسا بے پایاں جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی سرشاری میں جسم کی کوئی کلفت اور ذہن کی کوئی اذیت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ دورِ اول کے مسلمانوں کی محبت کا یہی حال تھا۔ ہر شخص جو ان کی زندگی کی سوانح کا مطالعہ کرے گا بے اختیار تصدیق کرے گا کہ انہوں نے راہِ حق کی مصیبتیں صرف جھیلی نہیں ہیں بلکہ دل کی پوری خوشحالی اور روح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگیاں ان میں بسر کر ڈالی۔ ان میں سے جو لوگ اول دعوت میں شریک ہوئے ان پر شب و روز کی جانکاہیوں اور قربانیوں کے پورے ۲۳ سال گزر گئے لیکن اس تمام مدت میں کبھی سے بھی یہ بات دکھائی نہ دی کہ مصیبتوں کی کڑواہٹ ان کے چہروں پر کسی طور نمایاں ہو۔ انہوں نے مال و علائق کی ہر قربانی اس جوش و مسرت کے ساتھ گوارا کی گویا دنیا جہاں کی خوشیاں اور راحتیں ان کے لیے فراہم ہوگئی ہیں۔ وہ یحبھم و یحبونہ کی ایک جیتی جاگتی تصویر تھے۔ تاریخِ انسانی ان کی قربانیوں کی مثال پیش نہیں کر سکتی۔ انہوں نے ایمان خالص کا معیار ہی یہ پیش کیا ہے کہ انسان معبودانِ باطل کے مقابلے میں خدا کا بول بالا کرنے کے لیے بے تاب ہو اور اس کی راہ میں جان لڑانے پر آمادہ ہو جائے۔ دنیا کی اور نیکیوں میں ذاتی منفعت کی توقع اور خواہشاتِ نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے لیکن خدا کی راہ میں جان نثاری صرف محبت کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ ماں باپ کی خبر گیری میں رضائے الٰہی سے زیادہ، والدین کی محبت کا جذبہ بھی کارفرما ہو سکتا ہے غریب رشتہ داروں کی امداد بنی نوعِ انسان کی عام ہمدردی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے لیکن خدا کے دین کے لیے سر دے دینا صرف رضائے الٰہی کی طلب کا نتیجہ ہو سکتا ہے جس میں کسی اور جذبہ کی آمیزش ممکن نہیں ہے۔

۱۳۳۔ اے اہلِ ایمان جو کوئی تم میں سے اپنے دین سے پھر جائے گا تو قریب ہے کہ اللہ ایسا گروہ پیدا کر دے جنہیں خدا دوست رکھتا ہو اور وہ بھی خدا کو دوست رکھنے والے ہوں۔ مومنوں کے مقابلے میں نہایت نرم اور جھکے ہوئے لیکن دشمنوں کے مقابلے میں نہایت سخت، اللہ کی راہ میں جان لڑا دیں گے اور کسی ملامت گر کی ملامت سے نہ ڈریں گے۔ اس آیت میں اسلام کی بقاء حفاظت کے متعلق عظیم الشان پیشین گوئی کی گئی ہے۔ پچھلی آیات میں کفار کی موالات سے منع

کیا گیا تھا۔ ممکن تھا کہ کوئی شخص یا قوم موالات کفار کی بدولت صریحاً اسلام سے پھر جائے جیسا کہ و من یتولھم منکم فانہ منھم میں تنبیہ کی گئی ہے۔ قرآن کریم نے نہایت قوت اور صفائی کے ساتھ آگاہ کر دیا کہ ایسے لوگ اسلام سے پھر کر کچھ اپنا ہی نقصان کریں گے۔ اسلام کو کوئی ضرر نہیں پہنچا سکتے۔ حق تعالیٰ مرتدین کے بدلے میں یا ان کے مقابلے میں ایسی قوم لے آئے گا جن کو خدا کا عشق ہو اور خدا ان سے محبت کرے وہ مسلمانوں پر شفیق و مہربان اور دشمنانِ اسلام کے مقابلے میں غالب اور زبردست ہوں گے۔ یہ پیشین گوئی بحول اللہ و قوتہ ہر قرن میں پوری ہوتی رہی۔ ارتداد کا سب سے بڑا فتنہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صدیق اکبر کے عہد میں پھیلا۔ کئی طرح کے مرتدین اسلام کے مقابلے میں کھڑے ہو گئے مگر صدیق اکبر کی ایمانی جرأت اور اعلیٰ تدبر اور مخلص مسلمانوں کی سرفروشانہ اور عاشقانہ خدماتِ اسلام نے اس آگ کو بجھایا اور سارے عرب کو متحد کر کے از سر نو جادۂ ایمان کے راستہ پر گامزن کیا۔ آج بھی ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں کہ جب کبھی چند جاہل اور طامع البشر اسلام کے حلقہ سے نکلنے لگتے ہیں تو ان سے زیادہ اور ان سے بہتر تعلیم یافتہ اور محقق غیر مسلموں کو اسلام فطری کشش سے اپنی طرف جذب کر لیتا ہے اور مرتدین کی سرکوبی کے لیے خدا ایسے وفادار اور جاں نثار مسلمانوں کو کھڑا کر دیتا ہے جنہیں خدا کے راستہ میں کسی کی ملامت اور طعن و تشنیع کی پروا نہیں ہوتی[1]

ان آیات میں پہلے اسلام کے لیے ایک رکاوٹ کا ذکر کر کے پھر اُمتِ مسلمہ کو بتایا ہے کہ اس رکاوٹ کے بارے میں اُمت کا رویہ کیا ہونا چاہیے؟۔

یہ دُنیا خیر و شر کا مسکن ہے، یہاں بھلائی کی بھی طاقتیں موجود ہیں اور بُرائی کی بھی۔ اور دونوں کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کی پوری آزادی ہے جس کا نتیجہ ہے کہ یہ دونوں باہم ٹکراتی رہتی ہیں اور ایک دوسرے کو زیر کرنے کے لیے برابر زور لگاتی رہتی ہیں اس لیے ایک فطری سی بات ہے کہ اسلام کی راہ بھی روکی جائے اور یہ رکاوٹ کبھی اندر سے ہو گی اور کبھی باہر سے۔ باہر سے رکاوٹ کا نام کفر ہے اور اندر کی رکاوٹ کا نام نفاق ہے۔ کفر اگر ایمان کا مقابل ہے تو نفاق اخلاص کا۔ ایمان و کفر کی طرح نفاق کی تمام حالتیں بھی یکساں نہیں ہوتی ہیں۔ چونکہ اصل کے اعتبار سے یہ حالت بھی انکار ہی کی ایک اقرار نما صورت ہے اس لیے جب بڑھتی ہے تو انکار

---

[1] فوائد حضرت شیخ الاسلام

قطعی کی طرف بڑھتی ہے اور اسی کے خصائص رونما ہونے لگتے ہیں کسی میں کم اور کسی میں زیادہ۔ یہاں اسی کی ترقی یافتہ صورت کو ارتداد کہا ہے۔

تاریخ اسلام بتاتی ہے کہ زمانہ نبوت میں اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد اسلام کو ارتداد کے فتنہ سے دوچار ہونا پڑا۔ تاریخ میں اس کی تفصیلات محفوظ ہیں۔ ہم اس کا خلاصہ ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ،

> اس آیت قرآنی کا مقصد دو باتیں ہیں ایک اس حادثہ کی خبر دینا جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مرض وفات میں پیش آیا اور آپ کی وفات کے بعد ترقی کر گیا۔ دوسرے اس تدبیر سے آگاہ کرنا جو خدا نے غیب الغیب میں اس حادثہ کے لیے مقرر فرمائی ہے تاکہ جس وقت حادثہ رونما ہو لوگ اس سے کچھ باخبر ہوں اور ان کے دلوں میں کوئی اضطراب نہ ہو اور رعب غیب سے وہ تدبیر ظاہر ہو تو اس میں پورے اہتمام سے کوشش کریں اور اسے پورا کرنے میں بھرپور حصہ لیں۔

حادثہ ارتداد کی تاریخ

حضور انور کے زمانے میں جو لوگ ارتداد کا شکار ہوتے ان میں بنو مدلج، بنو حنیفہ اور بنو اسد کے تین خاندان ہیں۔ بنو مدلج میں اسود عنسی نبوت کا دعویٰ لے کر کھڑا ہوا اور یمن کے شہروں پر قابض ہو گیا اور فیروز دیلمی کے ہاتھ سے قتل ہوا۔ بنو حنیفہ میں مسیلمہ نے دعویٰ نبوت کیا۔ اور بنو اسد میں سے طلیحہ بن خویلد نے دعویٰ نبوت کیا۔

حضرت ابوبکر کے زمانہ خلافت میں سات خاندان فزارہ، غطفان، بنو سلیم، بنو یربوع، تمیم، کندہ، بنو بکر میں نوفل ارتداد کا شکار ہوئے۔ اور غسان کا قبیلہ حضرت عمر کے زمانے میں مرتد ہوا۔ علامہ زمخشری لکھتے ہیں کہ عرب کے گیارہ قبیلے مرتد ہوتے، تین قبیلے تو حضور انور کے آخری زمانے میں۔ باقی حضرت ابوبکر اور عمر کے زمانے میں اور علامہ خطابی رقمطراز ہیں کہ جن لوگوں نے راہ ارتداد اختیار کی تھی وہ دو قسم کے تھے کچھ تو وہ تھے جو اسلام ہی کو کلی طور پر خیرباد کہہ چکے تھے۔ ان کی بھی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو حضور کی نبوت کے منکر تھے اور دوسرے وہ جو اسلامی قوانین کی بالادستی نہ مانتے ہوئے نماز اور زکوٰۃ چھوڑ بیٹھے تھے۔ اور ایک قسم وہ تھی جو نماز اور زکوٰۃ میں فرق کرتی تھی، زکوٰۃ ترک کر کے

دیتی تھی۔ یہ لوگ درحقیقت باغیوں کے زمرے میں داخل ہیں لیکن اس دور میں ردۃ کے غلبہ کے پیش نظر ان کو باغی نہیں بلکہ مرتد کہہ دیا گیا ہے۔

شوکانی نے نیل الاوطار میں اس طرف اشارا کیا ہے، فرماتے تھے۔

وہ مانعین زکوٰۃ جو اصل دین پر قائم ہوں وہ باغی ہیں ان کو علیحدہ کر کے کافر نہیں کہا گیا۔ اگرچہ ارتداد کی نسبت تاریخ میں ان کی طرف ہے کیونکہ وہ مرتدین کے اس معاملہ میں ہمنوا تھے۔ لغت میں ارتداد کے معنے پلٹنے کے ہیں ہر شخص جو اختیار کردہ راہ سے ہٹتا ہے وہ مرتد ہے اس معنے لغوی کے لحاظ سے مانعین زکوٰۃ میں طاعت سے انحراف کار فرما تھا اس لیے ان کو مرتد کہہ دیا گیا ہے[1]

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں اس حادثہ ارتداد پر جو تشریحی نوٹ لکھا ہے وہ بہت قیمتی ہونے کے ساتھ ایک تاریخی دستاویز بھی ہے اس لیے میں یہاں وہ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں، فراتے ہیں کہ،

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے آخر زمانے میں عرب کے تین فرقے مرتد ہو گئے اور ہر فرقہ میں سے ایک ایک شخص دعویٰ نبوت لے کر اٹھا اور اس کی قوم نے اس کی تصدیق کی اور ایک فتنہ عظیم برپا ہو گیا۔ اول ذوالخمار عنسی نے جو کہانت اور شعبدہ بازی میں بڑی مہارت رکھتا تھا۔ قبیلہ مذحج میں دعویٰ

---

[1] قرطبی نے یہ بات لکھی ہے کہ مرتد اپنے ارتداد میں دو قسم کے تھے۔ ایک قسم تو وہ تھی جس نے اسلام ہی کو چھوڑ دیا تھا اور ایک قسم وہ تھی جس نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار کر دیا تھا۔ اس تشریح میں اور علامہ خطابی و شوکانی کے بیان میں جوہری فرق ہے۔ اس تشریح کی صورت میں ان سب سے قتال ارتداد کی بنا پر ہوا لیکن خطابی اور شوکانی کی تشریح پر سب سے قتال ردۃ کی بنا پر اور مانعین زکوٰۃ سے قتال بغاوت کی بنا پر تھا امام بخاری نے صحیح میں عنوان ہی یہیں اس طرف اشارا کیا ہے فرماتے ہیں قتل من ابی قبول الفرائض و ما نسبوا الی الردۃ۔ ان لوگوں کو قتل کرنا جو فرائض کا انکار کر دیں لا انکہ ان کو مرتد نہیں کہا گیا۔ مجھے کرمانی کی اس رائے سے اتفاق ہے کہ یہاں ما نافیہ ہے۔ اس میں امام بخاری نے اشارہ کیا کہ اگر قبول فرائض کا انکار ہو تو یہ طاعت سے روگردانی ہے اور یہ باغی ہیں اور ان کی طرف ارتداد کی نسبت نہیں ہے۔ ان کا قتل انکار قبول کی وجہ سے ہے۔ اگرچہ حافظ عسقلانی نے ما کو مصدریہ اور حافظ عینی نے ما کو موصولہ قرار دیا ہے لیکن کرمانی کی بات جی کو لگتی ہے۔

نبوت سے کر اٹھا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ بن جبل کو اور ان تمام مسلمانوں کو یمن کے ہمراہ تھے خط لکھا کر ذوالخمار سے لڑنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ حضرت فیروز دیلمی نے معاذ کے حکم سے ذوالخمار کو قتل کر ڈالا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس واقعہ کی بذریعہ وحی اطلاع ہو گئی اور فرمایا فاز فیروز فیروز کامیاب ہو گیا۔ اور بظاہر اس واقعہ کی خبر ربیع الاول کے آخر میں حضور کے وصال کے بعد حضرت صدیق اکبر کو ملی۔ دوسرا مسیلمہ کذاب یہ قبیلہ بنی حنیفہ میں شہر یمامہ میں دعویٰ نبوت لے کر کھڑا ہوا اور بارگاہِ نبوت میں اس گستاخ نے ایک خط بھی لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

مسیلمہ رسول اللہ کی طرف سے محمد رسول اللہ کو واضح ہو کہ ملک آدھا میرا ہے اور آدھا رب کا۔

یہ خط مسیلمہ نے بارگاہِ نبوت میں دو آدمیوں کے ہاتھ روانہ کیا۔ آپ نے ان دونوں سے دریافت کیا کہ کیا تم دونوں اس کی شہادت دیتے ہو کہ مسیلمہ اللہ کا رسول ہے، ان دونوں نے کہا کہ ہاں۔ فرمایا کہ اگر قاصد کو قتل نہ کرنے کا دستور نہ ہوتا تو تمہاری گردن مارنے کا میں ضرور حکم دیتا۔ اس کے بعد حضور انور نے اس خط کا جواب لکھا جس کا مضمون یہ تھا۔

محمد رسول اللہ کی طرف سے مسیلمہ کذاب کو معلوم ہو کہ ملک اللہ کا ہے جس کو چاہتا ہے اس کو مالک بناتا ہے اور انجام پرہیزگاروں کے لیے ہے۔

اس کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بیمار ہو گئے اور بالآخر رفیق اعلیٰ سے جا ملے۔ صدیق اکبر نے بڑے لشکر کے ساتھ حضرت خالد بن الولید کو مسیلمہ کذاب کی طرف روانہ کیا۔ انہوں نے اس کا کام تمام کر دیا۔

تیسرا طلیحہ اسدی یہ بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں قبیلہ بنی اسد میں دعویٰ نبوت لے کر اٹھا آپ کی وفات کے بعد حضرت صدیق اکبر نے خالد بن الولید کو اس جماعت کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا حضرت خالد نے ان کو شکست دی اور طلیحہ بھاگ گیا۔ اس کے بعد وہ مسلمان ہو گیا اور جنگ قادسیہ میں خوب کام کیا۔

اس کے بعد ارتداد کی آگ خوب پھیل گئی۔ حرمین اور قریہ جواثی کے علاوہ سارا عرب اس کی لپیٹ میں آگیا اور ایک گروہ نے زکوٰۃ دینی بند کر دی۔ اسی گروہ کے بارے میں فقہائے صحابہ میں باہم مباحثہ ہوا کہ یہ لوگ اہل قبلہ ہیں ان سے قتال جائز نہیں ہے۔ ان فقہائے صحابہ میں فاروق اعظم تھے۔ آپ حضرت ابوبکر سے فرماتے تھے کہ آپ ان لوگوں سے جنگ کیسے کر سکتے ہیں جو لا الٰہ الا اللہ کہتے ہیں حضور انور

کا ارشاد ہے، مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں لوگوں سے اس وقت تک جنگ کروں تا آنکہ وہ لاالٰہ الااللہ کہہ لیں، جو یہ کہہ دے گا اس کی جان اور مال محفوظ ہے۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ میں اس شخص سے ضرور لڑوں گا جو نماز اور زکوٰۃ میں تفریق کرتا ہے کیونکہ زکوٰۃ حق مال ہے، بخدا اگر وہ ایک بکری کا بچہ جو زمانہ نبوت میں ادا کرتے تھے اب نہ دیں گے تو میں ان سے اس کے نہ دینے پر بھی جنگ کروں گا۔ حضرت عمر کہتے ہیں کہ بس میں سمجھ گیا کہ یہی حق ہے۔

مستقبل میں اس حادثہ کی خبر کے بعد قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کا مداوا کیا ہے اور اسلام کی راہ میں اس عظیم رکاوٹ کو ہٹایا کیسے جائے گا۔ قرآن نے اس سوال کا جواب فسوف یاتی اللہ بقوم میں دیا ہے کہ اللہ کی جانب سے اس رکاوٹ کو ہٹانے کا یہ کام ان لوگوں کے سپرد کیا جائے گا جن کا چہرہ قرآن کے لفظوں میں یہ ہوگا۔

صحابہ خدا کے محبوب اور خدا ان کا محبوب ہے

اصل ارشاد ہیں یحبھم و یحبونہ آیا ہے یعنی جن سے خدا محبت کرتا ہے اور جو خدا سے محبت کرتے ہیں، دین و دنیا کی سب سے بڑی نعمت محبت ہے، خاص کر وہ محبت اور پیار جو خدا کو اپنے بندے کے ساتھ ہو۔ یہ غیر فانی نعمت اور یہ لازوال دولت جن ذریعوں سے انسان کو حاصل ہو سکتی ہے ان میں دیگر مذہبیات کے بعد سب سے بڑا اور اہم ذریعہ حسن اخلاق ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت پر زور تو سب دیتے ہیں مگر اصل سوال یہ ہے کہ خدا کی محبت کے حصول کا طریقہ کیا ہے اور یہ دولت انسان کو کیونکر مل سکتی ہے۔ اس کا جواب قرآن نے دیا ہے مختصراً یہ کہ ہر کام اور ہر چیز افکار و اعمال، اخلاق میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی محبت الٰہی کا ذریعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کی زبان سے فرمایا قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

اس سے معلوم ہوا کہ جن کا چہرہ یہاں یحبھم کے ذریعے پیش کیا جا رہا ہے یعنی صحابہ کرام ان کے افکار، اعمال، اخلاق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات، ارشادات، احکام، اخلاق اور اعمال کا پورا پورا عکس اور کاپی تھے۔ اگر ان کے افکار، اعمال اور اخلاق اس بتائے ہوئے پیمانہ سے ذرا ہٹے ہوتے تو قرآن ان کا چہرہ یحبھم سے پیش نہ کرتا اور صرف اتنا ہی نہیں کہ یہ تو مختصر بات ہے بلکہ قرآن نے نام بنام بتایا ہے کہ اللہ کی محبت کے مستحق کون لوگ ہیں اور اس دولت سے محروم کون ہیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ خدا کن لوگوں سے محبت کرتا ہے۔ پڑھیے اور ٹھنڈے دل سے

پڑھیے اور پھر سوچیے کہ قرآن یحبھم ودیحبونہ کی جن کی تعریف کر رہا ہے وہ ان کی ان آیات کا الگ الگ ہی ذکر کیا ہے جن سے اللہ محبت کرتا ہے مثلاً ان اللہ یحب المحسنین اور ان اللہ یحب التوابین اور ان اللہ یحب المتوکلین اور ان اللہ یحب المقسطین ، ان اللہ یحب المتقین اور واللہ یحب الصابرین اور واللہ یحب المطھرین اور ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا

اس کا مطلب صاف اور کھلے لفظوں میں یہ ہے کہ جن اشخاص کے بارے میں یہاں قرآن نے اعلان کیا ہے کہ اللہ ان سے محبت کرتا ہے وہ حضرات اگر ایک طرف اپنے افکار، اعمال اور اخلاق میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے افکار، اعمال اور اخلاق کا کامل ترین نمونہ ہیں اور ہونا بھی چاہیے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن میں محمد رسول اللہ کے ساتھ والذین معہ نہ ہوتا۔ دوسری طرف یہ حضرات احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی اور اللہ کی راہ میں جہاد کے اوصاف سے بھی موصوف ہیں، کیونکہ یحبھم کے ذریعے اعلان کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں یہ صفات موجود ہیں اور ساتھ ہی یحبھم کا اطلاق بتاتا ہے کہ خدا کے ان محبوبوں کے دامن ان رذائل سے بھی پاک ہیں جو محبت الٰہی کے فیضان سے انسان کو محروم کر دیتے ہیں۔ مثلاً کفر، فخر و غرور، بدلہ لینے میں حد سے بڑھ جانا، خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، ظلم گناہ، تکبر، قرآن میں ان آیات کا مطالعہ کرو جن میں ان رذائل کا نام لے کر بتایا ہے کہ خدا ان لوگوں سے محبت نہیں کرتا جن میں یہ اوصاف موجود ہوں مثلاً ان اللہ لا یحب الکافرین اور ان اللہ لا یحب المعتدین اور ان اللہ لا یحب کل خوان اثیم، ان اللہ لا یحب من کان مختالاً فخورا، ان اللہ لا یحب الفرحین۔ ان اللہ لا یحب المفسدین، لا یحب المسرفین، انہ لا یحب المستکبرین انہ لا یحب الظالمین وغیرہ وغیرہ۔

اس صورت میں یحبھم کا مطلب یہ ہے کہ محبت سے جن کا یہاں تعارف کرایا جا رہا ہے وہ اگر ایک طرف ایمان، احسان، توبہ، توکل، انصاف، تقویٰ، صبر، پاکیزگی اور جہاد جیسے اخلاقی فضائل کی دولت سے مالا مال ہیں تو دوسری طرف کفر، بدگوئی، بدلہ لینے میں حد سے بڑھ جانا، فخر و غرور، شیخی خیانت، ناشکری، فساد، اسراف، استکبار، ظلم جیسے رذائل کا بھی ان کے دامن پر کوئی داغ نہیں ہے کیونکہ یہ وہ بداخلاقیاں ہیں جو انسان کو محبت الٰہی کے سائے سے دور کرتی ہیں۔

ان کی خدا سے محبت

صرف اسی پر اکتفا نہیں فرمایا کہ اللہ ان سے محبت کرتا ہے بلکہ فرمایا یحبونہ وہ بھی اللہ سے

محبت کرتے ہیں۔ یہ فقرہ بتاتا ہے کہ ان کا سینہ اس ازلی و ابدی عشق و محبت کے لو سے کس درجہ معمور ہے اور وہ خم خانہ الست کی سرشاری کی یاد بھٹکے ہوتے انسانوں کو کس کس طرح دلاتے ہیں۔ ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حب الٰہی ہے اور یہ وہ دولت ہے کہ اہل ایمان کی جماعت کو جو نصیب ہو چکی تھی۔ زبان الٰہی نے اس کی شہادت دی۔ والذین آمنوا اشد حبا للہ۔ اس نشۂ محبت پر باپ ماں اولاد بھائی بیوی جان مال اور خاندان سب کچھ قربان کر دیا جاتا ہے یہاں یحبونہ کی تعبیر بتا رہا ہے کہ وہ اس راہ کی ساری منزلوں سے عملاً گزر چکے تھے۔ ایمان اللہ حقیقی امتحان محبت میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے۔ اسی پر زندگی کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں۔ اسی سے نظریہ ایک جاندار، انقلاب انگیز اور متحرک نظام فکر و عمل بنتا ہے۔ اس کا ضمیر عشق کی ولولہ انگیزیوں اور جنون نوازیوں سے تیار ہوتا ہے۔ اس میں ایثار و قربانی اور سرفروشیوں کی ایک دنیا آباد ہوتی ہے جن سے پہلے یہ کہا گیا تھا کہ

ان کان اباؤکم و ابناؤکم و اخوانکم و ازواجکم و عشیرتکم و
اموال اقترفتموھا و تجارۃ تخشون کسادھا و مساکن ترضونھا احب
الیکم من اللہ و رسولہ و جھاد فی سبیلہ فتربصوا حتی یاتی اللہ بامرہ
اگر تمہارے والدین تمہاری اولاد تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہارا خاندان تمہارا جمع کردہ سرمایہ تمہارا کاروبار جس کے نقصان کا تمہیں اندیشہ ہے اور تمہاری پسندیدہ رہائش گاہیں، تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں محنت سے زیادہ محبوب ہیں تو بس انتظار کرو۔

اب یہاں ان ہی کے بارے میں پوری دنیا کو سنایا جا رہا ہے کہ یحبونہ وہ اللہ سے محبت کرتے ہیں۔

یہ بات کہ اللہ سبحانہ محبت کرتے ہیں اور اللہ سے محبت کی جاتی ہے۔ اپنے حقیقی معنے میں ہے لیکن اس کی محبت بھی اس کے علم، اس کی قدرت کی طرح بے مثال ہے اس لیے زمخشری کی ہمنوائی میں محبت کی تاویل ثواب دینے سے کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ تفسیر خالص متکلمانہ ہے زمخشری نے اس کا بھی انکار کیا ہے کہ بندے اللہ سے محبت کرتے ہیں۔ یہاں بھی وہ تاویل کرتا ہے کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ طاعت کرتے ہیں۔ صاحب انتصاف نے زمخشری کی بھرپور تردید کی ہے امام غزالی نے احیاء العلوم میں حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین اور روضۃ المحبین میں علامہ مرتضیٰ زبیدی

نے اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اگر ہمیں اس جلد کی ضخامت کا اندیشہ نہ ہوتا تو ہم اس موضوع پر بیان تفصیلی بحث کرتے تاہم خلاصہ کے طور پر اتنا سمجھ لیجئے کہ لغت میں محبت نام ہے صاحب محبت کے محبوب کی طرف مائل ہونے کا۔ جن لذتوں کی وجہ سے انسان محبت کرتا ہے وہ دو قسم کی ہیں حسی اور عقلی۔ حسی جیسے کھانے میں ذوق کی لذت خوبصورتی میں نگاہ کی لذت، خوشبوؤں میں ناک کی لذت، نغموں میں کان کی لذت اور عقلی جیسے جاہ و منصب، امامت و حکومت اور علوم و فنون کی لذت اور عقلی لذتوں میں بھی فرق مراتب ہے۔ علوم کی لذتیں معلمات کے تابع ہوتی ہیں۔ معلومات میں اللہ سے زیادہ کامل اور جمیل کوئی معلوم نہیں ہے۔ اللہ کی معرفت اور اس کے جلال و کمال کی معرفت سے حاصل شدہ لذت تمام لذتوں سے بالا ہے اور جو محبت اس راہ سے آئے گی وہ سب محبتوں سے برتر ہوگی اور یہی محبت خدا کی طاعت کا باعث ہے اس سے معلوم ہوا کہ بندے کا اللہ سے محبت کرنا نہ صرف ممکن ہے بلکہ امر واقعہ ہے۔ یہ لوازم و شرائط ایمان سے ہے۔ لوگ اس محبت میں فرق مراتب رکھتے ہیں۔

صحیح بخاری اور مسلم میں متعدد طریقوں سے حضرت انس سے روایت ہے کہ ایک دفعہ ایک صحابی نے خدمت والا میں حاضر ہو کر دریافت کیا کہ یا رسول اللہ قیامت کب آئے گی؟ فرمایا تم نے اس کے لیے کیا سامان کر رکھا ہے۔ انھوں نے نادم ہو کر شکستہ دلی سے کہا کہ یا رسول اللہ میرے پاس نہ تو نمازوں کا بڑا ذخیرہ ہے نہ روزوں کا اور نہ صدقات و خیرات کا جو کچھ سرمایہ ہے وہ صرف اللہ و رسول کی محبت ہے اور بس فرمایا تو انسان جس سے محبت کرے گا اسی کے ساتھ رہے گا۔ صحابہ نے اس بشارت کو سن کر اس دن بڑی خوشی منائی۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جب خدا کسی بندے کو چاہتا ہے تو حضرت جبریل سے کہتا ہے کہ میں فلاں بندے کو پیار کرتا ہوں تم بھی پیار کرو تو جبریل بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور آسمان والے بھی اس کو پیار کرتے ہیں اور پھر زمین میں اس کو ہر دلعزیزی اور حسن قبول بخشا جاتا ہے۔

عام ایمان خدا اور رسول پر یقین کرتا ہے لیکن اس کی آخری منزل اس راہ میں یہ ہے جیسے میں ہے کہ خدا اور رسول کی محبت کے آگے تمام سوا کی محبتیں ہیچ ہو کر رہ جائیں۔

ایمان کے سامنے جھکے ہوئے اور کفر کے مقابلے میں تنے ہوئے

ان لوگوں کا چہرہ بیان کرتے ہوئے جن کے ذریعے قرآن فتنہ ارتداد کی سرکوبی کرکے اسلام کا بول بالا کرنا چاہتا ہے دوسری صفت یہ بتاتا ہے کہ وہ اپنوں کے سامنے جھکے رہتے اور غیروں کے

مقابلے میں تن کر رہتے ہیں۔ اصل ارشاد میں اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین کی تعبیر آئی ہے۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ اذلۃ ذلیل کی جمع ہے اور اس کے معنے خاکسار نیاز مند اور متواضع کے ہیں۔ یہاں بجائے اذلۃ للمومنین کے اذلۃ علی المومنین کی تعبیر یہ بتانے کے لیے اختیار کی ہے کہ یہ نیاز مندی اور خاکساری رحمت و شفقت کی بنا پر ہے اور رفعت شان اور علو مرتبہ کے باوجود وہ اہل ایمان کے سامنے بچھے رہتے ہیں اور آخر میں اعزۃ علی الکافرین پہلے فقرے کی تکمیل ہے ممکن ہے کوئی اذلۃ علی المومنین کا بول سن کر یہ خیال کرے کہ ان میں عزت نفس اور خودداری نہیں ہے اس لیے خاکسار ہیں فرمایا نہیں اس لیے نہیں بلکہ ان میں عزت نفس اور خودداری بدرجہ اتم موجود ہے۔ یہ خاکساری اہل ایمان کے مقابلہ میں اختیاری ہے ورنہ وہ کافروں کے مقابلہ میں عزیز ہیں۔ زمخشری نے کشاف میں ابن حیان نے البحرالمحیط میں قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اور ابن کثیر نے تفسیر میں اس آیت کو اشداء علی الکفار کا مرادف قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ اس آیت کے وہی معنے ہیں جو اشداء علی الکفار رحماء بینھم کے ہیں الفاظ مختلف ہیں روح دونوں کی ایک ہے اعزۃ علی الکافرین اور اشداء علی الکفار کے معنے یہ نہیں ہیں کہ وہ کافروں کے ساتھ سنگ دلی، بے رحمی اور بداخلاقی سے پیش آتے ہیں بلکہ معنے یہ ہیں کہ یہ اہل ایمان اپنی ہمت، استقلال، باہمی اتحاد اور قدرت ایمان کے سبب سے ایسے سخت ہیں کہ کفار ان سے مرعوب ہیں اس لیے محاورے کے مطابق اشداء کا ترجمہ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ وہ کافروں پر سخت ہیں بلکہ یہ کہنا چاہیے کہ وہ کفار پر بھاری ہیں یعنی ان پر غالب اور ان کے مقابلہ میں کافی مضبوط ہیں۔ اس سے یہ بات اشارۃً معلوم ہو گئی کہ حق کے مخالفوں کے ساتھ جس شدت اور عزت کا حکم دیا گیا ہے اس کا منشا ذاتی قومی، ملکی اور لسانی نفرت و بیزاری نہیں بلکہ وہ صرف حق کی نصرت اور کفر کی نفرت کے لیے دیا گیا ہے۔ لیکن اس کے باوجود ان اہل کے حامیوں کے ساتھ عدل و انصاف اور نیک برتاؤ سے نہیں روکا۔

تصحیح اخلاق کا اسلامی طریقہ

اخلاقیات پر خود مسلمانوں نے بھی بڑی بڑی کتابیں لکھی ہیں لیکن اگر اسے جرات بے جا نہ قرار دیا جائے تو کہا جا سکتا ہے کہ اس قسم کی کتابوں میں زیادہ غیر اسلامی مکاتب کے افکار کی تقلید کی گئی ہے اور بزور اسلامی اخلاق پر ان کو چسپاں کرنے کی لاحاصل بلکہ ناکام کوشش کی گئی ہے۔ اخلاقی مسائل جن کا بالکلیہ عمل اور صرف عمل سے تعلق تھا ان کو فلسفہ اور نظریات کی بھول بھلیوں میں اس طرح

گم کر دیا ہے کہ عمل کے لیے مشکل ہی سے ایک عامی آدمی ان کتابوں کی روشنی میں کسی لائحہ عمل کا انتخاب کر سکتا ہے۔ قرآن نے اخلاق انسانی کے اس مسئلہ کو اس آیت میں کس خوبصورتی سے حل کر دیا ہے: اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین اس مختصر سے فقرے میں فطرت انسانی کے وہ سارے اوصاف جن کی شدت و حدت سے دنیا چیخ رہی ہے۔ غصہ، عداوت، حسد الغرض وہ سب کچھ جن سے دوسروں کو تکلیف ہوتی ہے۔ بجائے اس بات کے مسلمانوں کو حکم دیا جاتا کہ اپنے کو ان رذائل سے پاک کرو، کفر کی طرف ان کا رُخ پھیر کر عزت کی ان ہی صفات کو قرآن نے کتنا کارآمد اور قیمتی بنا دیا۔ کفر کس چیز کا نام ہے۔ ان ہی چیزوں کا جنہیں اختیار کر کے اپنے ہاتھوں آدمی خود اپنے آپ کو اپنی توانائیوں کو خطرناک انجام تک پہنچا دیتا ہے۔ یہ کیسا لطیف انداز ہے کہ جن صفات کی سختیوں سے انسانیت بے قرار تھی صرف ایک لفظ میں قرآن نے ان ہی کو خس و خاشاک کے اس انبار کی صفائی کا ذریعہ بنا دیا جس کا نام قرآن کی اصطلاح میں کفر ہے جن سے زحمت ہو رہی تھی وہی اولادِ آدم کی خدمت کا وسیلہ بن گئے اس طرح اس آیت میں ہمیں تعلیمِ اخلاق کا قرآنی طریقہ بتا دیا۔ لہٰذا یہ چاہتا ہوں کہ

قدیم فلسفہ اخلاق کے واقف کار خوب جانتے ہیں کہ انسان کے تمام اخلاق کی بنیاد اس کی دو قوتوں پر ہے قوتِ غضب اور قوتِ شہوت۔ مسیحیت کی تعلیم کا منشا انسان کی ان دونوں غضبی اور شہوی قوتوں کا استیصال ہے اور قرآنی تعلیم کی غرض ان دونوں کو افراط و تفریط سے بچا کر ان میں توسط اور اعتدال پیدا کرنا ہے۔ امام غزالی کے بقول قرآن نے غصہ کے دبانے کی تعریف کی ہے غصہ کے مٹانے کی نہیں۔ اس نے والکاظمین الغیظ فرمایا ہے والفاقدین الغیظ نہیں فرمایا۔

دُنیا میں جو دبدبہ، خوشی و مسرت، ولولہ و انبساط، رونق و ترقی، جدوجہد جو کچھ ہے وہ ان ہی دو قوتوں کی جلوہ آرائیاں ہیں۔ اگر یہ دونوں قوتیں یک قلم مٹ جائیں یا ان میں افراط و تفریط پیدا ہو جائے تو نیکی و سعادت اور خوش بختی کی آدھی دنیا مر جاتے۔ فلسفہ اخلاق میں یہ نکتہ ملحوظ نہیں رہا کہ نفس غصہ اور خواہش بری چیز نہیں ہے بلکہ بے جا غصہ اور بے محل خواہش بُری چیز ہے۔ قرآن نے پنے پیرووں میں ان دو قوتوں کو اعتدال کے ساتھ جمع کیا ہے۔ اس نے جہاں اذلۃ علی المومنین کہا ہے وہیں اس نے یہ بھی تعلیم دی ہے کہ اعزۃ علی الکافرین۔ اس کو بتایا کہ عزت صرف اللہ و رسول اور ان کے فرمانبرداروں کے لیے ہے۔

خدا کے لیے محبت اور ناراضگی

تو یہ سب کے ذہن میں یہاں یہ خلش ہو کہ قرآن نے برے سے نفرت اور بیزاری کے جذبات

ہی کا خاتمہ کیوں نہ کردیا۔ ایسا کہنا فطرت کے قوانین سے چشم پوشی ہے۔ محبت، عداوت، موافقت اور مخالفت، رضامندی اور ناراضگی انسان کے فطری جذبات اور دنیا کے تمام کام تمام تحریکیں اور تمام جدوجہد ان ہی دو برابر کے جذبات کے نتیجے ہیں۔ اگر انسان کو ان دونوں جذبات سے پاک کر دیا جائے تو اس کے نیک و بد ہر قسم کی گرم جوشیاں سرد پڑ جائیں اور یہ آگ کا شعلہ جس سے انسان کا دل عبارت ہے برف کا تودہ بن جائے اس لیے یہ ممکن ہے اور نہ مناسب ہے کہ اس کے محبت اور ناراضی کے جذبات کو سرے سے فنا کر دیا جائے بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس کے اندر سے ذاتی رجحانات اور شخصی میلانات کا عنصر علیحدہ کر دیا جائے۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ نفس غیظ و غضب اور ناراضگی کے فطری جذبات کو نکال کر پھینک دو جو یقیناً ناممکن ہے بلکہ یہ کہتا ہے کہ ان جذبات کے استعمال کا صحیح موقع و محل متعین کیا جائے چنانچہ قرآن نے ان موقعوں کی تعیین کی ہے اور بتایا ہے کہ کسی سے مخالفت اور آزردگی، ذاتی خود غرضی اور شخصی نفع و نقصان کے لیے نہ ہو بلکہ اگر یہ ہو تو صرف حق کی حمایت نیکی کی اعانت اور خدا کی خوشنودی کے لیے ہو۔ صلح و جنگ، دوستی و دشمنی خوشی و ناخوشی اور محبت و عداوت جو کچھ ہو وہ خدا کے لیے ہو الحب للہ والبغض اللہ۔

یہ کہنا بظاہر بہت خوشنما ہے کہ ہر قسم کی ناخوشی کے جذبات سے انسان کو پاک ہونا چاہیے مگر یہ امر فطرت کے خلاف ہے۔ ناخوشی ناراضی کو سرے سے تنہا نہیں کیا جا سکتا ہے بلکہ جو ہو سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ناخوشی و ناراضی کے موقع و محل کی اصلاح کی جائے۔ یہ ناممکن ہے کہ انسان کسی چیز سے اور اس کی ضد سے بھی برابر کی محبت کرے وہ جب خیر سے محبت کرے گا تو شر سے ضرور نفرت کرے گا وہ ایمان کو چاہے گا تو کفر سے بیزار بھی ہوگا وہ نیکیوں سے دوستی کرے گا تو شروں سے علیحدہ بھی ہوگا جب اہل ایمان کے لیے خاکسار ہوگا تو اہل کفر کے لیے سنگین بھی ہوگا۔ انسان کے سینے میں صرف ایک دل ہے اور ایک ہی چیز کی اور پھر اسی کی ضد کی دونوں کی محبت نہیں ہو سکتی۔ قرآن میں ہے۔ ماجعل اللہ لرجل من قلبین فی جوفہ سینے میں کسی شخص کے دو دل نہیں ہوتے۔

گویا اب ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ وہ مومنوں پر نرم ہیں یعنی اہل ایمان کے مقابلے میں اپنی طاقت کبھی استعمال نہیں کرتے۔ ان کی ذہانت، ان کی ہوشیاری، ان کی قابلیت، ان کا رسوخ و اثر ان کا مال ان کا زور اور کوئی چیز بھی مسلمانوں کو دبانے اور ستانے کے لیے نہ ہو مسلمان اپنے درمیان ہمیشہ نرم خو، رحمدل، ہمدرد اور حلیم ہی پائیں اور کفار پر سخت ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ مومن اپنے ایمان کی پختگی، دینداری کے خلوص اصول کی مضبوطی، سیرت کی طاقت اور ایمانی فراست کی وجہ سے مخالفین

اسلام کے مقابلے میں پتھر کی چٹان کے مانند ہوں کہ کسی طرح کسی لالچ کسی مفاد کی وجہ سے اپنے مقام سے نہ ہٹائے جاسکیں وہ کبھی ان کو موم کی ناک اور نرم چارہ نہ پائیں انھیں جب بھی اہلِ ایمان سے سابقہ پڑے ان کو پتہ لگ جائے کہ یہ اللہ کے بندے مرسکتے ہیں مٹ نہیں سکتے۔

راہِ خدا میں جہاد

ان لوگوں کا چہرہ پیش کرتے ہوئے جن کے ذریعے فتنۂ ارتداد کو ختم کرکے اسلام کو دُنیا میں بالادستی دینی ہے تیسری صفت یہ بتائی ہے کہ وہ اللہ کے راستہ میں جہاد کریں گے۔ اصل ارشاد میں عربی تعبیر یجاھدون فی سبیل اللہ ان ہے۔ جہاد سے یہاں مقصود ہر وہ جدوجہد ہے جو اللہ کا کلمہ بلند کرنے اور اس کے دین کو قائم کرنے کے لیے کی جاتے۔ یہی ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی ہے۔ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ انسان معبودانِ باطل کے مقابلے میں خدا کا بول بالا کرنے کے لیے بیتاب ہو اور اس کی راہ میں جان لڑا دینے پر آمادہ ہوجائے۔ دُنیا کی اور نیکیوں میں ذاتی منفعت کی توقع اور خواہشاتِ نفس کی آمیزش ہوسکتی ہے لیکن خدا کی راہ میں جاں نثاری صرف محبت کے جذبہ سے پیدا ہوتی ہے۔

ایمان باللہ کا حقیقی امتحان صرف جہاد میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہوجاتی ہے اس لیے مسلمانوں کو اپنی نیکیوں پر قانع ہوکر نہ بیٹھنا چاہیے کیونکہ ممکن ہے ہماری نیکیاں خالص اور بے آمیز نہ ہوں بلکہ ان میں ذاتی اور قومی مفاد کی آمیزش شامل ہو۔ اپنے ایمان کا امتحان کرنا چاہتے ہو تو دیکھو خدا کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی خواہش تم میں کتنی ہے کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

من مات ولم یغز ولم یحدث بہ نفسہ مات علی شعبۃ من النفاق

جس کو اس طرح موت آئے کہ نہ تو اس نے خدا کی راہ میں جہاد کیا اور نہ اپنے دل میں جہاد کی خواہش کی تو وہ ایک طرح سے نفاق کی حالت میں مرا۔

اسلام کے لیے وہ بیباک ہیں

ان کی آخری صفت یہ بتائی گئی ہے کہ لا یخافون لومۃ لائم یعنی اللہ کے دین کی پیروی کرنے میں اس کے احکام پر عمل کرنے میں۔ اور اس دین کی رو سے جو کچھ حق ہے اسے حق اور جو کچھ باطل ہے اسے باطل کہنے میں انہیں کوئی باک نہ ہوگا کسی کی مخالفت کسی کی طعن و تشنیع کے

اعتراض اور کسی کی پھبتی اور آوازے کی وہ پروا نہ کریں گے۔ اگر رائے عام اسلام کے خلاف ہو اور اسلام کے طریقے پر چلنے کے معنے اپنے آپ کو دنیا میں "لکو" کے ہوں تب بھی وہ اسی راہ پر چلیں گے جسے وہ سچے دل سے حق جانتے ہیں[1] زمخشری نے لکھا ہے کہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ فقرے میں واو کو حالیہ قرار دیا جاتے اور مطلب یہ ہو کہ ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اپنے تمام مفادات اور دلچسپیوں سے منہ موڑ کر اور دوسروں کی نصیحتوں اور ملامتوں سے کان بالکل بند کر کے جہاد کے میدان میں اترتے ہیں۔ جو شخص ہر قدم پر پیچھے مڑ کر دیکھے گا اور اپنے ناصحوں اور ملامت گروں کی نصیحتوں اور ملامتوں کو بھی اہمیت دے گا وہ اگر ایک قدم آگے بڑھائے گا تو دو قدم پیچھے ہٹائے گا عرب شعراء جب اولوالعزمی، بہادری اور فیاضی کی داستان سناتے ہیں تو اس کی تمہید میں ملامت گروں کی ملامت کا ضرور ذکر کرتے ہیں اس لیے کہ اس راہ کی سب سے بڑی آفت یہی ہے ممکن نہیں ہے کہ آدمی کوئی عزم لے کر اٹھے اور دائیں بائیں سے کچھ ناصح اور کچھ ملامت گر دامن گیر نہ ہو جائیں یہ اس راہ کی پہلی آزمائش ہے اور زمخشری نے یہ بھی بتایا ہے کہ واو عاطفہ ہو اور بتایا یہ جا رہا ہے کہ ان کے اوصاف میں سے جہاد ہے اور یہ بات بھی ہے کہ وہ اپنے دین میں اتنے پختہ ہیں کہ جب دین کا کوئی کام شروع کر دیتے ہیں تو اس میں اتنے منہمک ہو جاتے ہیں کہ ان کو کسی معترض کا اعتراض کسی ملامت گر کی ملامت مرعوب نہیں کرتی ہے اور سید رشید رضا فرماتے ہیں کہ بلاغت اس میں ہے کہ یہ مستقل وصف ہو اور بتایا جا رہا ہے کہ دین میں ان کے قدم اس قدر مضبوط اور ایمان میں ان کو اس قدر کمال حاصل ہے کہ وہ کسی قسم کی ملامت کی قطعاً پروا نہیں کرتے۔ کیونکہ ان کی عملی زندگی میں کوئی اقدام نہ خرایا لوگوں کی واہ واہ کے لیے ہوتا ہے اور نہ کسی اندیشہ کی خاطر ہوتا ہے بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ احقاق حق اور ابطال باطل ہو اور بس۔

مسند امام احمد میں حضرت ابوذر غفاری کا بیان ہے کہ مجھے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے سات کاموں کا حکم دیا ہے ایک مساکین سے محبت کرنے اور ان سے قرب ہونے کا، دوسرے اپنے سے کمتر کو دیکھنے اور اپنے سے بالا کو نہ دیکھنے کا تیسرے صلہ رحمی کرنے کا، چوتھے کسی سے سوال نہ کرنے کا پانچویں حق کہنے کا چاہے کیسا ہی تلخ ہو، چھٹے اللہ کے معاملے میں کسی ملامت گر کی ملامت کی پروا نہ کرنے کا اور ساتویں لاحول ولا قوۃ الا باللہ بکثرت کہنے کا۔

---

[1] تفہیم القرآن

واقعات کی روشنی میں مصداق آیت

واقعات کی روشنی میں اس آیت قرآنی کا مصداق تاریخ اسلام میں کون ہے اور اللہ سبحانہٗ کا یہ وعدہ کب پورا ہوا اس کے لیے ہم یہاں حضرت شاہ ولی اللہ کا وہ بیان نقل کرتے ہیں جو انہوں نے ازالۃ الخفاء میں پیش کیا ہے اور واقعات کی روشنی میں اس کا مصداق بتایا ہے۔

اللہ سبحانہٗ کا وعدہ سچا ہے۔ لیکن یہ وعدہ حضور انور کے زمانے میں پورا نہیں ہوا کیونکہ آپ کے زمانے میں مرتدوں کے خلاف کوئی فوجی کارروائی نہیں ہوئی اور شیخین یعنی ابوبکر و عمر کے بعد بھی تاریخ میں ایسی کسی فوجی مہم کا ذکر نہیں ہے جس میں مرتدوں کی سرکوبی کی گئی ہو۔ تاریخ میں اس کا مصداق صدیق اکبر کی فوجی مہم کے سوا کوئی نہیں ہے۔ آپ کی فوج ظفر موج ہی مرتدوں کی سرکوبی کے لیے میدان میں آئی اور اس نے بہت جلد اور نہایت عمدہ طریق پر اس فرض کو انجام دیا اور چونکہ فوج کی مہم رسائی اور اہل ارتداد سے لڑنا خلافت خاصہ کے لوازم سے ہے کیونکہ خلافت راشدہ کہتے ہی اسے ہیں جو اقامت دین کی خاطر دشمنان خدا سے جہاد کرے اور کلمۃ اللہ کا بول بالا کرنے کے لیے وجود میں آئی ہو۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ مرتدوں سے جہاد کرنا اقامت دین کی اعلیٰ ترین قسم ہے۔ اور اہل ارتداد سے جہاد کرنے والوں کی تعریف ان آیات میں روز روشن کے آفتاب سے زیادہ واضح ہے۔

اور یہ بھی سمجھ لینا چاہیے کہ اللہ سبحانہٗ نے پوری قوت سے یہ بات فرمائی ہے کہ یہ جماعت مرتدین سے قتال کے وقت میں اللہ کی محبوب اور اللہ کی محب ہونے کے ساتھ مختلف صفات سے موصوف تھے اور یہ تمام صفات کمال ہیں۔ لہٰذا اگر صدیق اکبر اپنی خلافت میں برحق نہ ہوں تو لازم آتا ہے کہ جس جماعت نے ان کے حکم کی تعمیل میں جہاد کیا اور صدیق اکبر سے بیعت کی اور ان کو خلیفہ بنانے پر راضی ہوتے وہ اوصاف کمال سے تہی دامن ہوں۔ اور یہ بات صراحۃً قرآن کے خلاف ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ فتنۂ ارتداد پیدا ہوا تو اللہ سبحانہٗ نے حضرت صدیق اکبر کے دل میں ان مرتدین سے جہاد کرنے کا داعیہ پیدا فرمایا اور آپ نے عزم کی پوری قوت اور ہمت و استقلال سے جماعت صحابہ کے ذریعے اس فتنہ کا استیصال کیا۔ تاریخ میں اس کام کی اہمیت اور عظمت لگانے کے لیے

شاہ ولی اللہ کا یہ بیان پڑھیے۔

حضرت صدیق اکبر کے دل میں جو داعیہ رونما ہوا اس کی حیثیت ایک روشن چراغ کی تھی جو بھی سامنے آتا اس چراغ کی روشنی میں منور ہو جاتا۔ تمام صحابہ ابوبکر کے ہم نوا ہو گئے اور مہم پایۂ تکمیل کو پہنچی۔ ابوحصین کہتے تھے کہ انبیا کے بعد حضرت ابوبکر سے افضل کوئی نہیں۔ انہوں نے زمانہ ارتداد میں وہ کام کیا جو ایک نبی ہی کر سکتا ہے۔ حضرت عائشہ کہتی ہیں کہ حضور انور کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر پر وہ افتاد آن پڑی کہ اگر پہاڑوں پر پڑتی تو وہ بھی ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ نفاق تمام مدینے میں پھیل گیا اور اہل عرب مرتد ہو گئے۔ بخدا لوگوں نے ایک نقطہ میں بھی اختلاف کیا تو میرے والد اسے ختم کرنے کے لیے اڑ کر گئے۔ (ازالۃ الخفا)

عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ ہم ابتدا میں اس لڑائی کو پسند نہ کرتے تھے مگر آخر میں تو ہم ابوبکر کے شکر گزار ہوئے کہ اسلام کو ایک بڑے فتنہ سے بچا لیا۔ اور فاروق اعظم فرماتے تھے کہ اگر صدیق اکبر میری تمام عمر کی عبادت لے لیں اور مجھے صرف اپنی ایک رات اور ایک دن دے دیں تو میں راضی ہوں۔ رات سے غار ثور کی رات مراد ہے اور دن سے فتنہ ارتداد کا دن مراد ہے اور حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ قام فی الردۃ مقام الانبیاء یعنی فتنہ ارتداد میں ابوبکر نے انبیاء والا کام کیا ہے۔

اللہ کی بڑی مہربانی اور فضل

۱۳۴۔ یہ اللہ کا فضل ہے جس کو چاہے عطا فرماتے اور اللہ بڑی وسعتوں والا اور بڑے علم والا ہے۔ انسان کی سب سے بڑی سعادت اور اس پر خدا کا بڑا فضل یہ ہے کہ وہ فتنہ کے وقت خود جادہ حق پر ثابت قدم رہے، دوسروں کو ہلاکت سے بچانے کی فکر کرے۔ خدا جن بندوں کو چاہے اس سعادت کبریٰ اور فضل عظیم سے حصہ وافر عطا فرماتا ہے۔ اس کا فضل غیر محدود ہے اور وہی خوب جانتا ہے کہ کون سا بندہ اس کا اہل ہے[1] جن کو چاہتا ہے سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ کی ٹھہرائی ہوئی سنت کے مطابق اس کے اہل ہوتے ہیں۔ ذالک سے اشارہ ایمان اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان اوصاف واعمال کی جانب سے جو ابھی اوپر بیان ہو چکے ہیں۔ اس کے یہاں وسعتیں اور گنجائشیں لامتناہی ہیں وہ چاہے تو سب کو ان اوصاف کا حامل بنا دے لیکن ان اوصاف سے ان ہی کو موصو[illegible] تا ہے جو اس کے علم کامل میں اس کے اہل ہوتے ہیں۔

اس فقرے پر پوری آیت کے ساتھ مربوط کر کے حکیم الامت نے جو نکتہ آفرینی فرمائی ہے اسے یہاں نظر انداز کر دینا علم کی ناقدری ہے۔ فرماتے ہیں۔

یہ جو فرمایا ہے فسوف یاتی اللّٰہ بقوم۔ اللہ ایک قوم کو لاتے گا حالانکہ ظاہر میں مسلمانوں کو مرتدین کی سرکوبی کے لیے جمع کرنے والے حضرت صدیق اکبر تھے اس کی حیثیت بالکل ایسی ہے جیسے بدر کے موقعہ پر حضور انور کی مشت خاک کو اللہ نے اپنی مشت خاک بتایا وما رمیت اذ رمیت ولکن اللّٰہ رمیٰ۔ فی الواقع ان اوصاف کی حامل جماعت کو میدان میں لے آنا اللہ سبحانہ کا کام تھا۔ حضرت صدیق اکبر کی حیثیت توآلہ جارحہ کی تھی غور کرنا چاہیے کہ اس مرتبہ کے بعد کون سا مرتبہ اس سے بالا ہو سکتا ہے جو ابوبکر کو ملا ہے اور نبوت کے بعد ابوبکر جیسا کون کامل اور مکمل ہو سکتا ہے یہ اللہ ہی کا فضل ہے جسے چاہے وہ نوازتا ہے۔

موالات کے لیے اہل ایمان کا میدان

۱۳۵ تمہارا رفیق و مددگار اللہ ہے، اس کا رسول ہے اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور ہر حال میں اللہ کے سامنے جھکے رہتے ہیں۔ پچھلی آیتوں میں یہود و نصاریٰ کی موالات اور رفاقت سے روکا تھا جس کو سننے کے بعد طبعاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر مسلمانوں کے تعلقات وداد اور معاملات رفاقت کس سے ہونے چاہییں؟ اس آیت میں بتلا دیا گیا کہ ان کا رفیق اصلی خدا، پیغمبر اور مخلص مسلمانوں کے سوا کوئی نہیں ہے[1]

یاایھا الذین آمنوا لا تتخذوا الیھود والنصاریٰ اولیاء۔ میں جو بات منفی انداز میں کہی تھی اور جس کے لیے ایک سے زیادہ تعبیری انداز اختیار کیے تھے اس کو پڑھ کر قاری کے ذہن میں یہ سوال خود بخود چٹکیاں لینے لگتا ہے کہ پھر ہمارے تعلقات کا دائرہ کیا ہے اور ہماری موالات کا میدان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہاں تک ہے؟ اسی کے جواب میں ارشاد ہوا ہے کہ اہل ایمان کی موالات اللہ سے، پھر اللہ کے رسول سے اور پھر اہل ایمان سے ہوتی ہے جو نماز اور زکوٰۃ کی پابندی کرتے ہوئے پوری زندگی میں اللہ کے سامنے جھکے ہوئے ہوں۔ راکعون رکوع سے ہے اور رکوع یہاں اصطلاحی معنے میں نہیں بلکہ لغوی معنے میں ہے عام شارحین قرآن تو اس کو یقیمون اور یوتون کی ضمیر سے حال قرار دیتے ہیں لیکن میں اسے پورے جملے سے حال سمجھتا ہوں، یعنی الذین یقیمون الصلوٰۃ و یوتون الزکوٰۃ سے اور مطلب یہ ہے کہ اسلام کے یہ دونوں شعائر ادا کرتے ہوئے وہ پوری زندگی میں اسلام پر عمل پیرا ہوتے ہیں، منافقین کی طرح نہیں کہ کچھ زندگی میں اسلام کو مانیں اور کچھ میں نہ مانیں۔ اور جو لوگ اس کو یقیمون اور یوتون سے حال بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ نماز اور زکوٰۃ دل کی پوری خوشنودی اور رضامندی سے ادا کرتے ہیں۔

اللہ کی جماعت کو غلبہ ہوتا ہے

۱۳۶۔ اور دیکھو جو بھی اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان سے دوستی رکھے گا تو بلاشبہ اللہ کا گروہ غالب آنے والا ہے۔ کفار کی کثرت اور مسلمانوں کی قلت دیکھتے ہوئے ممکن تھا کہ کوئی ضعیف القلب اور ظاہر بین مسلمان اس تردد میں پڑ جاتا کہ تمام دنیا سے موالات منقطع کرنے اور چند مسلمانوں کی رفاقت پر اکتفا کر لینے کے بعد غالب ہونا تو درکنار، کفار کے حملوں سے اپنی زندگی اور بقا کی حفاظت بھی دشوار ہے۔ ایسے لوگوں کی تسلی کے لیے فرمایا کہ مسلمانوں کی قلت اور ظاہری بے سروسامانی پر نظر مت کرو۔ جس طرف خدا، اس کا رسول اور سچے وفادار مسلمان ہوں گے وہی پلہ بھاری ہوگا۔ اس آیت نے گویا حضرت عبادہ ابن الصامت کی حوصلہ افزائی کی جن کے یہود بنی قینقاع سے بہت دوستانہ تعلقات تھے مگر اللہ و رسول کی موالات اور مومنین کی رفاقت کے سامنے انہوں نے اپنے سارے تعلقات منقطع کر لیے[1] علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ یہاں نہایت بلیغ ایجاز سے کام لیا گیا ہے پوری بات یوں ہے کہ جو لوگ اللہ، اس کے رسول اور اہل ایمان سے موالات کرتے ہیں وہ اللہ کی جماعت ہیں اور اللہ ہی کی جماعت غالب ہونے والی ہے۔ اللہ کی ولایت تو حقیقی ہے کیونکہ وہ ہر خیر کے فیضان کی علت ہے، اللہ کے پیغمبر کی ولایت اس فیضان میں واسطہ ہونے کی وجہ سے ہے اور اہل ایمان کی ولایت اس فیضان کا ظرف ہونے کی وجہ سے جیسے محبوبیت میں بالذات اللہ کی محبت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے اور پیغمبر کی محبت اللہ کے رسول ہونے کی وجہ سے ہے اور اہل ایمان سے محبت خدا کے بندے ہونے کی وجہ سے ہے۔

ان دونوں آیتوں یعنی ۵۵ اور ۵۶ کو آیات ولایت کہتے ہیں۔ اس سے ہمارے جعفری دوستوں نے حضرت علی کی حضور انور کے بعد بلا فصل امامت کی صحت پر استدلال کیا ہے۔ چنانچہ شیخ ابو علی الفضل بن الحسن الطبرسی اپنی مشہور تفسیر مجمع البیان میں رقمطراز ہیں۔

هذه الاية من اوضح الدلائل على صحة امامة على بعد النبي بلا فصل

اور اس دعوے پر جو دلائل قائم فرمائے ہیں وہ بھی ذرا ان ہی کی زبانی ملاحظہ فرمائیے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں الذین آمنوا سے جماعت نہیں بلکہ حضرت علی مراد ہیں۔ اس سے کام نہ چلا تو ایک قدم آگے بڑھایا کہ حضرت علی نے حالت رکوع میں ایک سوال کرنے والے کو اپنی انگشتری دے دی تھی یہ اس آیت کے نزول کی وجہ ہے پھر جب اس من گھڑت روایت سے بھی دعویٰ کا پیٹ نہ بھرا تو اس پر یہ اضافہ فرمایا کہ یہاں لفظ ولی رفیق و مددگار کے معنے میں نہیں بلکہ یہ ولایت سے ہے اور صاحب حکومت اور صاحب اقتدار کے معنے میں ہے۔ اس سے بھی جب دعوے کی تشنگی دور نہ ہوئی تو بلا فصل کا اضافہ اپنی طرف سے کیا۔ اور آیت کا مطلب یہ بتایا کہ اے مسلمانو! تمہارے بلا فصل حاکم حضرت علی ہیں جو اہل ایمان ہیں، نماز قائم کرتے ہیں زکوٰۃ دیتے ہیں اور حالت رکوع میں خیرات کرتے ہیں۔

یہی بات طبرسی نے احتجاج میں، محقق عارف محمد بن المرتضیٰ محسن نے الفیض الکاشانی میں اور مشہور مفسر قرآن فتح اللہ کاشانی نے منہج الصادقین میں لکھی ہے۔ آئیے ہم ذرا ان کے اس دعویٰ اور دعویٰ کے ان دلائل کا مطالعہ کریں اور آزاد ماحول میں معلوم کریں کہ ان میں کس قدر جان ہے۔

وہ فرماتے ہیں کہ ولی اس آیت میں بمعنے حاکم ہے۔ ولی کے یہ معنے خلاف لغت عرب ہیں یہاں اسی ولی کی جمع اولیاء آئی ہے بعضهم اولياء بعض اور لا تتخذوا اليهود والنصارى اولياء ولی کے جو معنے وہاں ہیں وہی معنے یہاں بھی ہیں۔ مصدر دو آتے ہیں ایک ولی اور دوسرے ولایت ہے۔ ولی کے معنے لگاؤ اور تعلق کے آتے ہیں۔ اسی سے ولی صفت مشبہ کا صیغہ ہے، اسی کی جمع اولیاء آئی ہے۔ مصدر اگر ولایت ہو تو المبرد کی تصریح کے مطابق ریاست کے معنے میں آتا ہے اسی سے والی صفت کا صیغہ آتا ہے جس کے معنے حاکم کے ہیں۔ فقہائے کرام کا اس مسئلہ میں اختلاف ہے کہ اگر کسی جنازے میں ولی اور والی دونوں موجود ہوں تو امامت کس کا حق ہے۔ معلوم ہوا کہ ولی اور والی میں فرق ہے۔ خود قرآن کی متعدد آیات میں یہ لفظ محب اور دوست کے معنے میں آیا ہے مثلاً

والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض اور الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم الا لفظ ولی قرآن میں بغیر اضافت ۳۳ جگہ پر آیا ہے اور لفظ اولیاء بلا اضافت ۴۲ بار استعمال ہوا ہے۔ سب جگہ یہی معنے ہیں۔ یہاں آیت کا سیاق و سباق بھی یہی نشاندہی کر رہا ہے کہ ولی کے معنے یہاں دوست اور رفیق کے ہیں کیونکہ اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے یہود و نصاریٰ کی رفاقت سے منع فرمایا ہے۔ اب اس آیت میں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ رفاقت کا دائرہ خدا، اللہ کے رسول اور اہل ایمان تک محدود رکھو۔ اگر اس آیت میں معنے رفاقت کے نہ لیے جائیں تو بات بے ربط ہو کر رہ جاتی ہے اور یہ قرآن کی بلاغت کے خلاف ہے۔

ان کا یہ کہنا کہ الذین آمنوا سے حضرت علی مراد ہیں یہ بھی قرآن کے ساتھ نہیں بلکہ محاورہ زبان کے ساتھ بھی بہت بڑی بے انصافی ہے۔ آیت کے الفاظ قطعاً عام ہیں کوئی وجہ نہیں کہ ہم صرف حضرت علی کو مراد لیں، سارے اہل ایمان جن میں یہ اوصاف ہوں اس میں داخل ہیں۔ عموم ہی کی وجہ سے جابر بن عبداللہ نے اس کا مصداق عبداللہ بن سلام کو قرار دیا ہے۔ چونکہ ان کو یہود نے مسلمان ہونے کی وجہ سے چھوڑ دیا تھا۔ حضرت علی بھی اس کا ایسا ہی مصداق ہیں جیسے حضرت ابو بکر اور دوسرے صحابہ کرام چنانچہ امام ابو جعفر محمد بن علی الباقر کے حوالہ سے امام بغوی رقمطراز ہیں کہ یہ آیت اہل ایمان کے بارے میں نازل ہوئی ہے ان سے کہا گیا کہ یہ تو حضرت علی کے متعلق ہے فرمایا کہ حضرت علی بھی اہل ایمان میں داخل ہیں۔

اس کے لیے اس افسانہ کا سہارا لیا کہ حضرت علی نماز پڑھ رہے تھے کہ سائل نے آ کر سوال کیا، حضرت علی نے نماز پڑھنے کی حالت میں بحالت رکوع اپنی انگوٹھی نکال کر اس کو دی۔ اس کہانی کی محققین کے یہاں تاریخی طور پر کوئی قیمت نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ

> اس قصہ کی کوئی روایت صحیح نہیں ہے کیونکہ اس کی سند ہی کمزور اور اس کے راوی مجہول ہیں۔

حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ کی چوتھی جلد میں اس پر مبسوط بحث کی ہے۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ

> شیعہ لوگ جو ایک جھوٹا قصہ روایت کرتے ہیں اور ترکیب نحوی بھی ما کھوتا کو یہ تسون الزکوۃ کا حال بتاتے ہیں اور حالت رکوع میں حضرت علی کا ایک فقیر کو انگوٹھی دینا بیان کرتے ہیں اس طرح آیت قرآنی کا سیاق و سباق درہم برہم کرتے ہیں۔

اور پھر اس پر بھی ذرا غور فرمائیے کہ اگر اس آیت میں ولی سے مراد والی اور حاکم ہوتا تو دوسری آیت کے معنے کیا ہوں گے د من یتول اللہ ورسولہ والذین آمنوا۔ کیا اس کے معنے یہ کیے جائیں گے کہ جو شخص اللہ، رسول اور اہل ایمان پر حاکم بنے گا۔ یہ معنے کوئی صاحب ایمان نہیں کر سکتا۔ دراصل اینٹ کا پہلا رداہی غلط ہے اس پر جو عمارت اُٹھے گی وہ غلط ہوگی۔ اگر اس جلد کے ضخیم ہونے کا اندیشہ نہ ہوتا تو اس پر تفصیلی بحث کرتے ۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَتَّخِذُوا الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَكُمْ هُزُوًا
وَّلَعِبًا مِّنَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ مِنْ قَبْلِكُمْ وَالْكُفَّارَ
اَوْلِيَآءَ ۚ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ۞ وَاِذَا نَادَيْتُمْ
اِلَى الصَّلٰوةِ اتَّخَذُوْهَا هُزُوًا وَّلَعِبًا ۚ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ
لَّا يَعْقِلُوْنَ ۞ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ هَلْ تَنْقِمُوْنَ مِنَّآ
اِلَّآ اَنْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْنَا وَمَآ اُنْزِلَ مِنْ قَبْلُ
وَاَنَّ اَكْثَرَكُمْ فٰسِقُوْنَ ۞ قُلْ هَلْ اُنَبِّئُكُمْ بِشَرٍّ مِّنْ
ذٰلِكَ مَثُوْبَةً عِنْدَ اللّٰهِ ۭ مَنْ لَّعَنَهُ اللّٰهُ وَغَضِبَ
عَلَيْهِ وَجَعَلَ مِنْهُمُ الْقِرَدَةَ وَالْخَنَازِيْرَ وَعَبَدَ
الطَّاغُوْتَ ۭ اُولٰٓئِكَ شَرٌّ مَّكَانًا وَّاَضَلُّ عَنْ سَوَآءِ
السَّبِيْلِ ۞ وَاِذَا جَآءُوْكُمْ قَالُوْٓا اٰمَنَّا وَقَدْ دَّخَلُوْا
بِالْكُفْرِ وَهُمْ قَدْ خَرَجُوْا بِهٖ ۭ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا كَانُوْا

يَكْتُمُونَ ﴿٦١﴾ وَتَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يُسَارِعُوْنَ فِي الْاِثْمِ
وَالْعُدْوَانِ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا
يَعْمَلُوْنَ ﴿٦٢﴾ لَوْلَا يَنْهٰىهُمُ الرَّبّٰنِيُّوْنَ وَالْاَحْبَارُ عَنْ
قَوْلِهِمُ الْاِثْمَ وَاَكْلِهِمُ السُّحْتَ ۭ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا
يَصْنَعُوْنَ ﴿٦٣﴾

اے اہل ایمان تم ان لوگوں کو جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق و تفریح کا سامان بنالیا ہے یعنی اہل کتاب اور دوسرے کفار کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ، اگر ایمان والے ہو تو متقیانہ سیرت اپناؤ۔[۱۳۷] اور دیکھو جب نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ اس کا بھی مذاق بناتے ہیں اور اس سے کھیلتے ہیں اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے۔[۱۳۸] ان سے کہو کہ اے اہل کتاب تم جس چیز کا ہم سے انتقام لینا چاہتے

ہو وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس
تعلیم پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی اور جو کچھ ہم سے
پہلے نازل ہوئی ہم اسے بھی مانتے ہیں، اور تم میں اکثریت
فاسقوں کی ہے۔[۱۳۹] اے پیغمبر ان سے کہہ دو کیا میں ان
لوگوں کی نشاندہی کر دوں جن کا انجام خدا کے یہاں فاسقوں
کے انجام سے بھی بدتر ہے، وہ جن پر خدا نے لعنت کی
جن پر خدا کا غضب ٹوٹا جن میں سے بندر اور سور بنا دیے
گئے، جنھوں نے شریر قوتوں کی بندگی کی، یہی لوگ
سب سے زیادہ بدتر درجے میں ہوں گے اور سب سے زیادہ
سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے۔[۱۴۰] جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں
تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لائے حالانکہ وہ کفر لیے ہوئے آئے
تھے اور کفر ہی لیے ہوئے واپس ہو گئے اور اللہ خوب جانتا

ہے جو کچھ یہ دلوں میں چھپاتے ہوتے ہیں[۱۴۱]. تم دیکھتے ہو کہ ان میں بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے پھرتے ہیں اور حرام کا مال کھاتے ہیں بہت بُری حرکات ہیں جو یہ لوگ کر رہے ہیں[۱۴۲]۔ کیوں ان کے علماء اور مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے یقیناً بہت ہی بُرا کارنامہ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں[۱۴۳]۔

اخلاقی اور دینی زندگی کا انحطاط

امتوں میں جب اخلاق اور دین بگڑتے بگڑتے اس درجے پر آجائیں جس کی عکاسی ان آیات میں کی گئی تو پھر اہل ایمان کے لیے ان سے رفاقت کے تعلقات خود اہل ایمان کے لیے زہر بن جاتے ہیں۔ اُمت کی تعمیر فضائل اخلاق پر کرنے کے لیے رذائل کا جیتا جاگتا نقشہ آنکھوں کے سامنے رکھنا ناگزیر ہے۔ اہل ایمان میں اخلاق فضائل کی نشو و نما کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے گئے ہیں تعلیم و تلقین، عقل مندی بتا کر کہیں کہیں اچھی اچھی اور موثر تشبیہوں کے ذریعے کہیں اس کے اچھے یا برے نتائج کو کھول کر اور کہیں اُمتوں کے اخلاقی رذائل کا نقشہ اس طرح پیش کیا کر سننے والے متاثر ہو کر اس کو چھوڑنے اور فضائل کو اپنانے کے لیے فوراً تیار ہو جاتے ہیں۔ یہاں یہودیوں کے اخلاقی رذائل کا نقشہ پیش کیا اور ان کی ان شقاوتوں کی طرف اشارہ کیا ہے جن کا خود یہودیوں کو بھی اعتراف ہے اور جو ان کے یہاں مسلمہ روایتیں ہیں۔ مثلاً اللہ کے دین کا مذاق اڑانا، اذان پر آوازے کسنا، احکام الٰہی کی نافرمانی کی وجہ سے ایک گروہ کا ملعون ہونا، ان کا ایمان و کفر کو یکجا کرنا، ظلم اور حرام خوری میں تیز گام ہونا۔ ان کے علماء اور مشائخ کا جھوٹ بولنے اور حرام کھانے میں بے باک ہونا۔ یہ وہ رذائل

ہیں جن کو اللہ تعالیٰ ناپسند کرتا ہے جن سے بچنے کا حکم اللہ نے اپنے بندوں کو دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں نافرمان ٹھہرتے ہیں، جن کی بُرائی کو ہر عقلمند جانتا ہے اور مانتا ہے اور جن کی بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے بلکہ جب وہ کسی قوم میں عام ہو جائیں تو پوری قوم کی تباہی اور بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔ یعنی اس کی دینی اور دنیوی ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ اور سعادت و فعال کا دروازہ ان پر بند ہو جاتا ہے یہودیوں کی اخلاقی اور دینی زندگی کا یہ نقشہ پیش کر کے اہل ایمان سے کہا ہے کہ کیا تم ان سے موالات کے خواہاں ہو۔ اور ان کی برائیاں اپنے اندر جذب کرنا چاہتے ہو۔ قرآن دراصل کسی شخص سے شخص کی حیثیت سے نفرت پیدا کرنا نہیں چاہتا بلکہ دراصل اس کے افعال، اعمال اور اخلاق سے نفرت پیدا کرنا چاہتا ہے اسی لیے یہاں یہودیوں سے ترکِ موالات کا حکم دینے کے بعد ان کے اعمال و اخلاق کا نقشہ پیش کیا ہے ورنہ قرآن میں شخصی، نسلی یا وطنی کسی پیدائشی یا ذاتی نفرت کا کوئی وجود نہیں ہے۔

۵۷ اے اہل ایمان تم ان لوگوں کو جنہوں نے تمہارے دین کو مذاق و تفریح بنا لیا ہے۔ یعنی اہل کتاب اور کفار کو اپنا دوست اور رفیق نہ بناؤ، اگر ایمان والے ہو تو متقیانہ سیرت اپناؤ۔ کفار سے مراد یہاں مشرکین ہیں جیسا کہ عطف سے ظاہر ہے۔ گزشتہ آیات میں مسلمانوں کو موالات کفار سے منع فرمایا تھا۔ اس آیت میں ایک موثر انداز سے اسی ممانعت کی تاکید کی گئی ہے۔ ایک مسلمان کی نظر میں کوئی چیز اپنے مذہب سے زیادہ معظم و محترم نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا اسے بتایا گیا کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین تمہارے مذہب پر طعن و استہزاء کرتے ہیں اور شعائر اللہ اذان وغیرہ کا مذاق اڑاتے ہیں اور جو ان میں خاموش ہیں وہ بھی ان افعال شنیعہ کو دیکھ کر اظہار نفرت نہیں کرتے بلکہ خوش ہوتے ہیں۔ کفار کی ان احمقانہ اور کمینہ حرکات پر مطلع ہو کر کوئی فرد مسلم جس کے دل میں خشیتِ الٰہی اور غیرتِ ایمانی کا ذرا سا شائبہ ہو کیا ایسی قوم سے موالات اور دوستانہ راہ و رسم پیدا کرلے، قائم رکھنے کو ایک منٹ کے لیے گوارا کرے گا۔ اگر ان کے کفر و عناد اور عداوتِ اسلام کو بھی نظر انداز کر دیا جاتے تو دین قیم کے ساتھ ان کا یہ تمسخر و استہزاء ہی علاوہ دوسرے اسباب کے ایک مستقل سبب ترکِ موالات ہے[1]

یہ گویا اہل کتاب اور دوسرے کافروں سے رفاقت و نصرت کے تعلقات ختم کرنے کے لیے یہ بات سمجھائی ہے کہ جو اہلِ کتاب اور کفار اس قسم کے رذائل کا شکار ہیں کہ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہیں۔ افسوس ہے کہ تم ان سے رفاقت کے تعلقات رکھو۔ تمہیں ایک مسلمان کی حیثیت سے اپنے ایمان میں بہت زیادہ حساس ہونا چاہیے۔ یہاں موالات کی ممانعت کے لیے یہود و نصاریٰ اور کفار کے اس گندے کردار کو کہ وہ مسلمانوں کے دین کا مذاق اڑاتے ہیں بطور بنیاد پیش کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے عدم موالات کی علت یہی ہے اور یہ علت جہاں بھی موجود ہو وہ دوستی و رفاقت کے لائق نہیں بلکہ بغض و بیر اور علیٰحدگی کے لائق ہے۔ آخر میں ان کے جذبۂ ایمان کو ابھارا ہے اور فرمایا ہے کہ اگر تم ایمان رکھتے ہو تو اس کا تقاضا پورا کرو۔ ایمان کا سب سے بڑا تقاضا یہ ہے کہ ان سے موالات چھوڑ دو۔

اذان کا مذاق اڑانا عقل سے محرومی ہے

۱۳۸۔ اور دیکھو جب تم نماز کے لیے پکارتے ہو تو وہ اس کا بھی مذاق اڑاتے ہیں اور اس سے کھیلتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ عقل نہیں رکھتے ہیں۔ یعنی جب اذان کہتے ہو تو وہ اس سے جلتے ہیں اور ٹھٹھا کرتے ہیں، جو ان کی کمال حماقت اور بے عقلی کی دلیل ہے۔ کلمات اذان میں خداوند قدوس کی عظمت و کبریائی کا اظہار، توحید کا اعلان، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم جو تمام انبیاء سابقین اور کتب سماویہ کے مصدق ہیں۔ ان کی رسالت کا اقرار، نماز جو تمام اوضاع عبودیت کو جامع اور غایت درجہ کی بندگی پر دال ہے۔ اس کی طرف دعوت فلاح دارین اور اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی حاصل کرنے کے لیے بلاوا ان چیزوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے۔ پھر ان میں کون سی چیز ہے جو ہنسی اڑانے کے لائق ہو۔ ایسی نیکی اور صداقت و حق کی آواز پر مسخراپن کرنا صرف اسی شخص کا کام ہے جس کا دماغ عقل سے یکسر خالی ہو اور جسے نیک و بد کی قطعاً تمیز باقی نہ رہے۔ بعض روایات میں ہے کہ مدینہ میں ایک نصرانی جب اذان میں اشہد ان محمداً رسول اللہ سنتا تو کہتا قد حرق الکاذب جھوٹا جل گیا یا جل جاتے، اس کی نیت تو ان الفاظ سے جو کچھ ہو مگر یہ بات بالکل اس کے حسب حال تھی، کیونکہ وہ خبیث جھوٹا تھا اور اسلام کا عروج و شیوع دیکھ کر آتش حسد میں جلا جاتا تھا۔ اتفاقاً ایک شب کوئی چھوکری آگ لے کر اس کے گھر میں آئی، وہ اور اس کے اہل و عیال سو رہے تھے۔ ذرا سی چنگاری نادانستہ اس کے ہاتھ سے گر گئی جس سے سارا گھر مع رہنے والوں کے جل گیا اور اس طرح خدا نے دکھلا دیا کہ جھوٹے لوگ دوزخ کی آگ سے پہلے ہی دنیا کی آگ میں کس طرح جل جاتے ہیں۔ اذان کے ساتھ استہزاء کرنے کا ایک اور واقعہ صحیح روایات میں منقول ہے وہ یہ کہ فتح مکہ کے بعد آپ حنین سے واپس ہو رہے تھے۔ راستہ میں حضرت بلال نے اذان

کہی ۔ چند نوعمر لڑکے جن میں ابو محذورہ بھاتھے اذان کی ہنسی اور نقل اتارنے لگے ۔ آپ نے سب کو پکڑ بلوایا ۔ آخر نتیجہ یہ ہوا کہ ابو محذورہ کے دل میں خدا نے اسلام ڈال دیا اور حضور نے ان کو مکہ کا مؤذن مقرر فرما دیا ۔ اس طرح خدا کی قدرت نقل سے اصل بن گئی ہے۔[1]

الجصاص نے لکھا ہے کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ نماز کے لیے بلانے کی خاطر اذان ہوتی تھی اور زمخشری رقمطراز ہیں کہ اس آیت کے ذریعے اذان قرآن سے ثابت ہے اور اس آیت سے صرف یہی نہیں کہ اذان کا ہونا معلوم ہوتا ہے بلکہ اذان کے عظیم شعائر دین میں سے ہونا بھی معلوم ہو رہا ہے ۔ اذان کا آغاز کیسے ہوا، کب ہوا، یہ ایک معرکۃ الآرا بحث ہے ۔ انشاء اللہ اس پر ۲۸ جلد میں سورہ جمعہ میں سیر حاصل بحث ہوگی ۔ یہاں اتنی بات ضرور ذہن میں رکھ لیجئے کہ اذان جس شکل میں موجود ہے اس کو امت کے تواتر قولی اور عملی کے ساتھ قرآن کی تصدیق و تصویب حاصل ہے ۔

شعیرہ ہونے کی حیثیت سے اس کو اتنی اہمیت دی گئی ہے کہ اسلامی ملک میں اس کا اظہار واجب کہا گیا اور اس شعیرہ پر تدغن قائم کرنے والوں سے قتال واجب بتایا ہے ۔ بلکہ بعض مدارس فقہ نے تو اذان جمعہ اور عیدین کو ملک کے اسلامی مملکت ہونے کی علامت قرار دیا ہے ۔

کلمات اذان کا روحانی تاثر

اذان اسلام کے امتیازات خصوصی میں سے ہے ۔ اس کی خوبصورتی کا اندازہ تقابل سے ہوتا ہے عبادت کے اعلان دعوت کا ایسا ڈھنگ کہیں نہیں ہے اس کی خوبی یہ ہے کہ یہ عبادت کا ذریعہ ہی نہیں بلکہ بجائے خود بھی عبادت ہے ۔ اس کے کلمات میں ایک خاص منطقی ربط ہے ۔ جب مؤذن چار بار اللہ اکبر کہتا ہے تو سننے والے سن کر چونک جاتے ہیں اور مؤذن کا حیرت سے منہ تکنے لگتے ہیں اور ان کی حیرت مؤذن کے لیے ایک سوالیہ فقرہ بن جاتی ہے گویا پوچھ رہے ہوں کہ اگر وہ سب سے بڑا ہے تو ہم کیا کریں مؤذن فوراً جواب دیتا ہے اور زور دے کر دوبارہ کہتا ہے کہ اشہد ان لا الٰہ الا اللہ سننے والے یہ سن کر سوچ میں ڈوب جاتے ہیں کہ بات بڑے پتے کی ہے اور اونچی ہے مگر اے منادی تجھے کس نے بتائی ہے مؤذن سننے والوں کے چہروں سے سوال پڑھتا ہے اور جواب میں کہتا ہے اشہدان محمد رسول اللہ سننے والے یہ سن کر پھر مجسم سوال بن جاتے ہیں اور گویا پوچھ رہے ہیں کہ ہمیں

---

[1] انعامات شیخ الاسلام

کیا کرنا چاہیے موذن فوراً کہتا ہے حی علی الصلاۃ موذن کے اس کہنے کے ساتھ سننے والوں کے نہاں خانہ دماغ میں یہ سوال گھومنے لگتا ہے کہ نماز میں ہمیں کیا ملے گا کہ موذن کہتا ہے حی علی الفلاح اب سننے والوں کے قدم ایک غرض مند کے قدم بن کر اٹھنے والے ہوتے ہیں کہ موذن اللہ اکبر اور لا الہ الا اللہ کو دہرا کر اس کی نفسیات کا علاج کرتا ہے کہ قدم بے غرض ہو کر اٹھا کر نمازی اب اس تاثر سے دب کر نماز کی طرف جاتا ہے کہ

ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں میری جبین نیاز میں

لوگ اسی کا مذاق اڑاتے، نقلیں اتارتے، قرآن نے آخر میں کہا ہے کہ ان کی یہ حرکتیں محض بے عقلی کا نتیجہ ہیں۔ اگر وہ جہالت اور نادانی میں مبتلا نہ ہوتے تو اہل ایمان سے اختلاف رکھنے کے باوجود ایسی ہلکی حرکتیں نہ کرتے۔ آخر کون معقول آدمی یہ پسند کر سکتا ہے کہ جب کوئی گروہ خدا کی عبادت کے لیے منادی کرے تو اس کا مذاق اڑایا جائے۔

یہود کی یاوہ گوئی کی وجہ

۱۳۹۔ ان سے کہو کہ اے اہل کتاب تم جس چیز کا ہم سے انتقام لینا چاہتے ہو وہ اس کے سوا کیا ہے؟ کہ ہم اللہ پر اور دین کی اس تعلیم پر ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر نازل ہوئی اور ہم سے پہلے جو نازل ہوئی تھی ہم اسے بھی مانتے ہیں اور تم میں اکثریت فاسقوں کی ہے۔ کسی کام پر طعن کرنا مذاق اڑانا دو وجہ سے ہو سکتا ہے یا تو وہ کام ہی قابل استہزاء ہو یا کام کرنے والے کی حالت قابل استہزاء ہو۔ پچھلی آیت میں بتلایا گیا تھا کہ اذان کوئی ایسی چیز نہیں جس پر بجز پرلے درجے کے احمق اور خفیف العقل کے کوئی شخص طعن یا استہزاء کر سکے۔ اس آیت میں اذان دینے والوں کے مقدس حالات پر بعنوان سوال متنبہ کیا گیا ہے۔ یعنی استہزاء کرنے والے جو خیر سے اہل کتاب اور عالم شرائع ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں وہ ذرا سوچ کر انصاف سے بتائیں کہ مسلمانوں سے ان کو اتنی ضد کیوں ہے۔ اور کیا ایسی برائی وہ ہماری طرف دیکھتے ہیں جو ان کے خیال میں لائق استہزاء ہو۔ بجز اس کے کہ ہم اس خدائے وحدہ لاشریک پر اور اس کی اتاری ہوئی تمام کتابوں پر اور اس کے بھیجے ہوئے تمام رسولوں پر صدق دل سے ایمان رکھتے ہیں اور اس کے بالمقابل استہزاء کرنے والوں کا حال یہ ہے کہ نہ خدا کی سچی اور صحیح توحید پر قائم ہیں اور نہ تمام انبیاء و رسل کی تصدیق و تکریم کرتے ہیں۔ اب تم ہی انصاف سے کہو کہ انتہا درجہ کے نافرمان کو خدا کے

فرمانبردار بندوں پر آوازہ کسنے اور طعن وتشنیع کرنے کا کہاں تک حق حاصل ہے [1]

اصل ارشاد میں تنقمون آیا ہے جو نقم سے بنا ہے نقم کے معنے انتقام لینا بدلہ لینا اور کسی پر غصہ کھا لینے کے ہیں۔ قرآن یہودیوں سے دریافت کر رہا ہے کہ تم ہم سے کس چیز کا انتقام لے رہے ہو یا کس بات پر ہم پر غصہ نکال رہے ہو۔ وجہ نزاع تو بتاؤ کیا ہے؟ کیا یہ ہے کہ ہم نے انبیاء و رسل کا انکار کر دیا ہے یا ہم ان کے نوشتوں کو نہیں مانتے، یا یہ ہے کہ ہم یہ کہہ رہے ہیں کہ خدا کی سچائی صرف ہمارے حصہ میں آئی ہے اور ہم سے پہلے سچائی سے سب محروم تھے یا پھر ہم نے دین کے نام پر کوئی ایسی چیز پیش کر دی ہے جو تمہارے لیے انجان ہے۔ اگر واقعہ یہ ہے کہ ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات نہیں تو اس ساری دشمنی کی علت اس کے سوا اور کیا ہے کہ ہماری نیکی تمہارے لیے بدی بن گئی ہے۔ آخر ہمارا قصور کیا ہے یہی نا کہ خدا کو مانتے ہوئے اس کتاب پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم پر اُتاری گئی ہے اور ان کتابوں پر بھی ایمان رکھتے ہیں جو ہم سے پہلے اتاری گئی ہیں۔ یعنی تمہارے نزدیک ہمارا قصور یہی ہے نا کہ ہم ساری صداقتوں کو مانتے ہیں۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حضرت موسیٰ اور عیسیٰ کو بھی مانتے ہیں اور قرآن کے ساتھ تورات و انجیل کو بھی مانتے ہیں برعکس اس کے تمہارا حال یہ ہے کہ تم میں سے اکثر فاسق ہیں۔ نہ اس کتاب پر ایمان رکھتے ہو جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے اور نہ اس کتاب پر ایمان لانے کو تیار ہو جو ہم پر اتاری گئی ہے۔ اس طرح قرآن نے اس آیت میں یہودیوں کی بے راہ روی پر یہ کہہ کر مہر لگا دی ہے کہ تم ایمان کی بنا پر ہم سے ناراض ہو، حالانکہ اس میں غصہ اور ناراضگی کی کوئی بات نہیں ہے اور نہ ہی اس میں تمہارے لیے مذاق کا کوئی جواز ہے۔ قرآن نے یہ انداز بیان عرب بلغاء کے مطابق اختیار کیا ہے۔ علمائے بیان اسے تاکید المدح لمایشبہ الذم یا تاکید الذم لمایشبہ المدح کہتے ہیں۔ قرآن کی یہ آیت دوسری قسم سے تعلق رکھتی ہے اور اس میں ان کی کافرانہ زندگی پر طنز کے ساتھ نیکی کا مقابلہ بدی سے کرنے پر تعریض بھی ہے اور اکثریت کو فاسق کہہ کر اشارہ کر دیا کہ جو اقلیت دولت ایمان سے مالا مال ہو چکی ہے وہ فاسق نہیں ہے جیسے عبداللہ بن سلام وغیرہ۔ حافظ ابن جریر نے بحوالہ عبداللہ ابن عباس اس آیت کا جو پس منظر نقل کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اولین مخاطب وہ یہودی علماء ہیں جنہوں نے قرآن کی آیت ایمان سننے کے بعد حضرت عیسیٰ کی نبوت پر اظہار ناراضگی کیا تھا۔ بلاشبہ آیت کا مصداق اول وہی ہیں اور اپنے عموم کے لحاظ سے ہر ناقم اس کا مصداق ہے۔

یہود کی ملعونیت اور مغضوبیت

۱۴۰۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کیا میں ان لوگوں کی نشاندہی کر دوں جن کا انجام خدا کے یہاں فاسقوں کے انجام سے بدتر ہے۔ وہ جن پر خدا نے لعنت کی جن پر خدا کا غضب ٹوٹا جن میں سے بندر اور سور بنائے گئے اور جنہوں نے شریر قوتوں کی بندگی کی یہی لوگ سب سے زیادہ بدترین درجہ میں ہوں گے اور سب سے زیادہ سیدھی راہ سے بھٹکے ہوئے۔ یعنی اگر ایمان باللہ پر مستقیم ہونا اور ہر اس چیز کی جو خدا کی طرف سے کسی زمانے میں نازل ہو سچے دل سے تصدیق کرنا ہی تمہارے زعم میں مسلمانوں کا سب سے بڑا جرم ہے اور سب سے بڑی برائی ہے اور اسی وجہ سے تم ان کو مورد طعن و ملام بناتے ہو تو آؤ کہ میں تم کو ایک ایسی قوم کا پتہ بتلاؤں جو اپنی شرارت اور گندگی کی وجہ سے بدترین خلائق ہے جن پر خدا کی لعنت اور غضب کا اثر آج بھی نمایاں طور پر آشکارا ہے جس کے بہت سے افراد اپنی مکاری اور بے حیائی اور حرص دنیا کی سزا میں بندر اور سور بنائے جا چکے ہیں اور جس نے خدا کی بندگی سے نکل کر شیطان کی غلامی اختیار کر لی اگر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ بدترین اور گمراہ قوم ہی اصل معنے میں تمہارے طعن و استہزاء کی مستحق ہو سکتی ہے اور وہ خود تم ہی ہو۔ [1]

آیت میں لطیف اشارہ ہے خود یہودیوں کی طرف جن کی اپنی تاریخ یہ کہہ رہی ہے کہ بارہا وہ خدا کے غضب اور اس کی لعنت میں مبتلا ہوئے، سبت کا قانون توڑنے پر ان کی قوم کے بہت سے لوگوں کی صورتیں مسخ ہوئیں۔ حتیٰ کہ وہ تنزل کی اس انتہا کو پہنچے کہ طاغوت کی بندگی تک انہیں نصیب ہوئی۔ بس کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آخر تمہاری بے حیائی اور جرمانہ بے باکی کی کوئی حد بھی ہے کہ خود فسق و فجور اور انتہائی اخلاقی تنزل میں مبتلا ہو اور اگر کوئی دوسرا گروہ خدا پر ایمان لا کر سچی دینداری کا طریقہ اختیار کرتا ہے تو اس کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑ جاتے ہو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

گویا ان سے کہا گیا ہے کہ تمہارے نزدیک تو اس دُنیا میں ہم سب سے بُرے ہیں اور اس وجہ سے ہم تمہارے غصہ اور ناراضی کا نشانہ ہیں۔ لیکن کچھ پتہ ہے کہ اللہ کے نزدیک اپنے انجام کے لحاظ سے سب سے بُرا کون ہے یہ وہ ہے جس پر اللہ کا غضب ہوا، جس پر اللہ نے لعنت کی اور جس کو اللہ نے بندر اور خنزیر بنا دیا اور جس نے طاغوت کی پرستاری کی۔

من لعنہ اللہ ترکیب میں بشرّ سے بدل ہے اور مضاف محذوف ہے۔ اصل عبارت یوں تھی بشر من ذالک مثوبۃ من لعنہ اللہ یا یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے۔ یعنی برے میں بدترین وہ لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت ڈالی، اپنی رحمت سے دُور کر دیا، ان کے کفر اور معاصی میں انہماک کی وجہ سے ان پر ناراض ہوا، کچھ کو بندر اور کچھ کو سُور بنا دیا۔ ایک قریہ کو واقع میں بندر اور سُور بنا دیا جیسا کہ عام قارئین قرآن کا خیال ہے لیکن یہ رائے بھی سلف ہی سے منقول ہو کر آئی ہے کہ مسخ محض معنوی ہوا تھا۔ انسان کے عمل اور ارادے کے درمیان سے جب عقل و ارادہ کی کڑی غائب ہو جاتے اور وہ یکسر اپنی خواہشوں کا غلام بن کر رہ جاتے تو پھر اس کے اور حیوانات کے درمیان کوئی جوہری فرق باقی نہیں رہتا۔ یہ چیز اس کے باطن کو بالکل مسخ کر دیتی ہے اور باطن کے مسخ ہو جانے کے بعد ظاہر بھی بالتدریج مسخ ہو کے رہ جاتا ہے۔ جو نگاہیں حقیقت بین ہوتی ہیں وہ سیرت کا عکس صورت میں بھی دیکھ لیتی ہیں۔ اگرچہ کچھ مفسرین نے اس کو مسخ معنوی ہی قرار دیا ہے مگر میرے قلب کا میلان قرآن کے انداز بیان کے پیش نظر یہی ہے کہ مسخ صوری تھا۔ قرآن میں لفظ جَعَلَ دو مفعول چاہتا ہے۔ اگر مفعول ثانی ایسی چیز ہو جو پہلے کے خلاف نہ ہو تو تعبیر میں کوئی بلاغت نہیں رہتی۔ مثلاً یوں کہیں جعل القردۃ قردۃ تو اس میں کوئی معنویت نہیں رہتی ہاں یوں کہیں جعلھم قِرَدَۃً کہ اللہ نے ان کو بندر بنا دیا اور پھر سورہ بقرہ میں فجعلنٰھا نکالا میں بھی کوئی معنویت نہیں رہتی۔ جسمانی سزا پر تو نکال بولا جا سکتا ہے مگر عقائد و اخلاق فاسدہ تو خود سزا کا سبب ہیں نہ کہ سزا۔ بہرحال اصل صحیح تو یہ مسخ صوری تھا اور جنہوں نے اسے معنوی کہا ہے یہ ان کی رائے ہے اور رائے کسی کی فہم قرآن میں کسی پر حجت نہیں ہے۔

عبد الطاغوت میں لفظ عبد فعل ماضی ہے اور اس کا پیوند عطف کے ذریعے من لعنہ اللہ سے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جنہوں نے طاغوت کی پرستش کی وہ بھی انجام کے لحاظ سے بدترین ہوں گے اور دوسری قرأت میں اس کو عبد کی جمع بنا کر پڑھا گیا ہے۔ اس صورت میں عبد کا عطف القردہ والخنازیر پر ہو گا اور معنے ہوں گے کہ انہیں بندر سور اور پرستار شیطان بنا دیا۔ طاغوت کی

بندگی اور پرستاری خدا کے نزدیک اتنا بڑا سنگین جرم ہے کہ اس کو سزا کی جگہ میں پیش کیا ہے گویا فرمایا کہ جنہوں نے اہل کتاب ہو کر طاغوت کی بندگی کی وہ انجام کی فکر کریں۔ ہمیں بُرا بھلا کہنے اور ہم پر لال پیلا ہونے سے ان کو کیا ملے گا۔

آخر میں فرمایا ہے اولٰئک شر مکانا واضل عن سواء السبیل اس کے دو حصے ہیں اور دونوں میں دو باتیں فرمائی ہیں۔ پہلے حصہ میں ان کے آخرت میں انجام کا ذکر ہے اور دوسرے میں دُنیا میں ان کی بے راہ روی کو بتایا ہے گویا آخرت میں ان کے بدترین ہونے کی وجہ یہ ہے کہ وہ دُنیا کی زندگی میں گمراہ اور جادۂ حق سے ہٹے ہوئے تھے یہاں مکان کو بُرا کہنا کنایہ ہے مکان والوں کے بُرا ہونے سے گویا ان کی شرارت اس قدر عظیم ہے کہ اس سے جگہ بھی متاثر ہو گی۔

یہودیوں کا سازشی گروہ

۱۴۱۔ جب یہ تمہارے پاس آتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ایمان لاتے حالانکہ وہ کفر لیے ہوئے آئے تھے اور کفر ہی لیے واپس ہو گئے اور اللہ خوب جانتا ہے جو کچھ وہ دلوں میں چھپاتے ہوئے ہیں۔ یہاں ان ہی استہزاء کرنے والوں کے بعض مخصوص افراد کا بیان ہے جو غائبانہ تو مذہب اسلام پر طعن و تشنیع کرتے اور مسلمانوں کا مذاق اڑاتے تھے۔ لیکن جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یا مسلمانوں سے ملتے تو ازراہِ نفاق اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے۔ حالانکہ شروع سے آخر تک ایک منٹ کے لیے بھی انھیں اسلام سے تعلق نہیں ہوا۔ نہ پیغمبر علیہ السلام کے ربانی وعظ و تذکیر کا کوئی اثر انھوں نے قبول کیا۔ کیا محض لفظ ایمان و اسلام زبان سے بول کر وہ خدا کو معاذ اللہ دھوکہ دے سکتے ہیں۔ اگر اس عالم الغیب والشہادت کی نسبت جو ہر قسم کے ضمائر و سرائر پر مطلع ہے۔ ان کا گمان یہ ہو کہ محض لفظی ایمان سے اسے خوش کر لیں گے تو اس سے بڑھ کر کون سی حرکت قابل استہزاء و تمسخر ہو سکتی ہے۔ گویا اس آیت سے یہود و نصاریٰ کے ان مضحکہ خیز افعال و حرکات کا بیان شروع ہوا جن پر متنبہ کیے جانے کے بجائے انھیں خود اپنا استہزاء کرنا چاہیے۔[1]

یہ بھی یہود ہی کا ذکر ہے یعنی ان لوگوں کا جو اپنے کفریہ عقائد کے باوجود مسلمانوں کی مجلس میں اگر اپنے کو اہل ایمان میں سے ظاہر کرتے۔ مطلب یہ کہ یہ تو ان کا آپ سے دور ہو کر حال تھا اور جبکہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آپ کے پاس آتے تو کہتے آمنا ہم بھی رسول پر اور اس کی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں۔ عام مسلمان ان کی باتوں سے دھوکہ میں آجاتے اور ان سے ایک قسم کے حسن ظن میں مبتلا ہو جاتے۔ قرآن نے یہاں ان کو بے نقاب کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ اہل ایمان میں سے نہیں ہیں کیونکہ جس کفر کے ساتھ وہ آتے ہیں اسی کفر کے ساتھ واپس جاتے ہیں۔ ایمان نہ مجلس میں آتے وقت ان کے ساتھ ہوتا ہے اور نہ واپسی کے وقت۔ ایمان کا دعویٰ کر کے تمہیں دھوکہ دے رہے ہیں۔ ان کے دلوں میں جو کچھ ہے اللہ خوب جانتا ہے۔

یہودی عوام اخلاقی جرائم کے خوگر ہیں

۶۲۔ تم دیکھتے ہو کہ ان میں بکثرت لوگ گناہ اور ظلم و زیادتی کے کاموں میں دوڑ دھوپ کرتے رہتے ہیں اور مال حرام کھاتے ہیں۔ یہ لوگ بہت بری حرکات کرتے ہیں۔ غالباً اثم سے لازمی اور عدوان سے متعدی گناہ مراد ہیں۔ یعنی ان لوگوں کا حال یہ ہے کہ بہت شوق اور رغبت سے ہر قسم کے گناہوں کی طرف جھپٹتے ہیں، خواہ ان کا اثر اپنی ذات تک محدود ہو یا دوسروں تک پہنچے۔ جن کی اخلاقی حالت ایسی زبوں ہو اور حرام خوری ان کا شیوہ ہو، ان کی برائی میں کسے شبہ ہو سکتا ہے یہ تو ان کے عوام کا حال ہے آگے خواص کا حال بیان ہو رہا ہے[1]

یہ یہودی عوام کی اخلاقی زندگی کا خاکہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی بڑی تعداد اثم اور عدوان اور حرام خوری میں حد سے زیادہ تیز گام ہے۔

اصل ارشاد میں یسارعون فی الاثم آیا ہے۔ مسارعت کے معنے تیز روی میں ایک دوسرے سے آگے نکلنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ گویا ان کے معاشرے میں ان برائیوں میں ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی اور بھرپور مہمت ہو رہی ہے اور مسارعت کے ساتھ قرآن میں الیٰ آتا ہے جیسے سارعوا الی مغفرۃ لیکن یہاں الیٰ نہیں بلکہ فی یہ بتانے کے لیے لایا گیا ہے کہ ان کے عوام اثم عدوان اور حرام خوری میں بالفعل مبتلا ہیں۔ اگر الیٰ آتا تو یوں سمجھا جاتا کہ ان برائیوں میں مبتلا نہیں بلکہ ان تک پہنچنے کی تگ و دو کر رہے ہیں۔ اثم اور عدوان میں ایک فرق تو وہی ہے جس کی نشاندہی شیخ الاسلام نے فرمائی ہے کہ اثم سے لازمی اور عدوان سے متعدی گناہ مراد ہیں۔ لیکن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ یہ دونوں یکجا بھی آتے ہیں اور علیحدہ علیحدہ بھی ۔ ایسے عدوان نام ہے ان کاموں کے کرنے کا جن سے اللہ پاک نے روکا ہے یا ان کاموں کے ترک کرنے کا جن کے کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے لہٰذا ہر عدوان اثم ہے لیکن جب دونوں یکجا آئیں تو اثم نام ہے ان گناہوں کا جن کی جنس ہی حرام ہو جیسے جھوٹ ، زنا ، شراب نوشی اور عدوان نام ہے اس گناہ کا جس میں مقدار زیادتی حرام ہو ، ایک چیز کی مقدار مقررہ حلال ہے اس سے تجاوز کر کے زیادہ لینا عدوان ہے اور یہ تجاوز مال میں جان میں اور آبرو میں ہوتا ہے سا آپ نے کسی کو دو گاجریں دی ہیں اب اس کے بدلے میں اس کے گاجروں کے ٹوکرے پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں ۔ آپ کی دوات کسی سے ٹوٹ گئی ہے اس کے بدلے میں آپ اس کی تین دواتیں توڑ رہے ہیں ۔ آپ کو کسی نے خبیث کہا ہے اس کے بدلہ میں آپ اس کو ماں بہن کی مغلظ گالیاں دے رہے ہیں ۔ عدوان ، حقوق اللہ اور حقوق العباد دونوں میں ہوتا ہے حلال بیوی کو چھوڑ کر حرام کی طرف قدم بڑھانا عدوان ہے ۔ جسے یہاں عدوان کہا ہے اسی کو سورۃ اعراف میں بغی کہا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ یہودی عوام جھوٹ ، زنا ، شراب نوشی اور فوجداری ، دیوانی اور اخلاقی جرائم میں بے لگام ہیں اور یہ جرائم ان میں اتنے عام ہیں اور ان کا ان میں اس قدر انہماک ہے کہ دیکھنے والا یہ محسوس کرتا ہے کہ پورا معاشرہ کبڈی کھیل رہا ہے اکلھم السحت میں سود ، رشوت یا جبر اور مکر سے حاصل کی ہوئی ہر آمدنی داخل ہے ۔ اگرچہ عدوان میں یہ داخل ہے مگر اس کی شناعت کی وجہ سے اسے علیحدہ ذکر کیا ہے ۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن اس دعویٰ ایمان کو قطعاً بے وزن سمجھتا ہے جس کے ساتھ رات دن بھاگ دوڑ حق تلفی ، تعدی اور حرام خوری کی راہ میں ہو رہی ہو ۔

علماء و مشائخ کا کردار

۶۳ ۔ کیوں ان کے علماء و مشائخ انہیں گناہ پر زبان کھولنے اور حرام کھانے سے نہیں روکتے ۔ یقیناً یہ بہت ہی برا کارنامہ زندگی ہے جو وہ تیار کر رہے ہیں ۔ جب خدا کسی قوم کو تباہ کرتا ہے تو اس کے عوام گناہوں اور نافرمانیوں میں غرق ہو جاتے ہیں اور اس کے خواص یعنی درویش اور علماء گونگے شیطان بن جاتے ہیں ۔ بنی اسرائیل کا یہی حال ہوا کہ لوگ عموماً دنیوی لذات و شہوات میں منہمک ہو کر خدا تعالیٰ کی عظمت و جلال اور اس کے قوانین و احکام کو بھلا بیٹھے ۔ اور جو مشائخ اور علماء کہلاتے تھے انہوں نے امر بالمعروف و نہی عن المنکر کا فریضہ ترک

کر دیا کیونکہ دُنیا کی حرص اور اتباع شہوات میں وہ اپنے عوام سے بھی آگے تھے۔ مخلوق کا خوف یا دُنیا کا لالچ حق کی آواز بلند کرنے سے مانع ہوتا تھا۔ اسی سکوت اور مداہنت سے پہلی قومیں تباہ ہوئیں۔ اسی لیے اُمت محمدیہ علی صاحبہا السلام کو قرآن وحدیث کی بے شمار نصوص میں بہت ہی سخت تہدید و تاکید کی گئی ہے کہ کسی وقت اور کسی شخص کے مقابلہ میں اس فرض امر بالمعروف کے ادا کرنے سے تغافل نہ برتیں لے

پہلی آیت میں یہودی عوام کا کردار پیش کیا تھا۔ اس آیت میں ان کے خواص یعنی علماء و مشائخ کا چہرہ پیش کیا جارہا ہے کہ عوام کا گناہ اگر یہ تھا کہ وہ گناہوں میں جھوٹ اور بے لگام ہوگئے تھے تو ان کے علماء و مشائخ کو کیا ہو گیا تھا کہ وہ لوگوں کو حرام خوری اور گناہوں کی گفتار سے کیوں نہ روکتے تھے عوام کا جرم یہ تھا کہ وہ منکرات میں مبتلا تھے اور ان کی ساری زندگی گناہ کی زندگی تھی اور ان کے علماء اور مشائخ کا جرم یہ تھا کہ سارے اختیارات کے باوجود وہ لوگوں کے اعمال پر کوئی گرفت نہ کرتے تھے۔ مجرم دونوں ہیں، عوام بھی کہ وہ گناہ کر رہے ہیں اور خواص بھی کہ وہ گناہوں کو روک نہیں رہے ہیں۔ لیکن تقابلی مطالعہ میں قرآن کا انداز بیان بتا رہا ہے کہ بڑے مجرم علماء و مشائخ ہیں اسی بنا پر حافظ ابن جریر نے اس آیت کے بارے میں علماء کا یہ تاثر نقل کیا ہے کہ پورے قرآن میں علماء کو ڈانٹ والی آیت اس سے زیادہ سخت کوئی نہیں ہے۔ زمخشری نے عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ آیت سخت ترین ہے اور مشہور تابعی ضحاک کہتے ہیں کہ پورے قرآن میں اس سے زیادہ خوفناک آیت کوئی نہیں ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں خلش ہو کہ ایسا کیوں ہے!

اس لیے کہ عوام اور خواص کے بارے قرآن کا انداز تعبیر مختلف ہے۔ عوام کی بدکرداری، بے ایمانی کو قرآن نے بدعملی لبئس ما کانوا یعملون کہا ہے جبکہ علماء کے کردار کو بدعملی نہیں بلکہ بدسازی اور بدکاری کہا ہے۔ اشارہ کیا ہے کہ علماء و مشائخ کا نہ روکنا صرف ان کے فرض کی ادائیگی سے تغافل نہ تھا بلکہ یہ ان کا پیشہ تھا اور وہ اس میں وہ فن کار ہیں۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ علماء مشائخ کے جرم پر صنعت کا لفظ بول کر ان کو جرائم کے مرتکب لوگوں سے زیادہ گنہ گار بنا دیا گیا عوام اگر ارتکاب جرم کر کے مجرم ہیں تو ان کے علما اپنے کردار کی وجہ سے صرف مجرم نہیں

لے افادات شیخ الاسلام

بلکہ جوم پیشہ میں کوئی عامل صالح اور کوئی عمل صنعت اس وقت تک نہیں ہو سکتا جب تک عمل میں مشق و تمرین کے ذریعے فن کاری دا آ جائے۔

شاید قرآن یصنعون کی تعبیر سے ان کے دینی اور دینی علوم میں کاروباری ہونے کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ اب تو یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہبی حلقوں اور اداروں کی تاریخ منضبط ہو چکی ہے اس پر نظر ڈالی جائے تو قرآن کے لبئس ما کانوا یصنعون کی تفسیر میں بے شمار باتیں سامنے آئیں گی لیکن خصوصیت کے ساتھ یہ بات قابل غور ہے کہ بادشاہوں اور امیروں کی مطلب برآری کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا دیتے اور اس کے فتوے دے کر انعام و اکرام لیتے۔ حلال کو حرام بنا دینے اور حرام کو حلال بنا دینے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ تورات کے کسی حکم سے انکار کر دیتے تھے بلکہ یہ ہے کہ اس کے حکموں کو توڑ مروڑ کر یا طرح طرح کے حیلے بہانے نکال کر ایسی صورتیں نکال لیتے کہ ان کی ہوائے نفس پوری ہو جائے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ يَدُ اللّٰهِ مَغْلُولَةٌ ۚ غُلَّتْ أَيْدِيهِمْ وَلُعِنُوا بِمَا
قَالُوا ۘ بَلْ يَدَاهُ مَبْسُوطَتَانِ يُنْفِقُ كَيْفَ يَشَاءُ ۚ وَلَيَزِيدَنَّ را
كَثِيرًا مِّنْهُم مَّا أُنزِلَ إِلَيْكَ مِن رَّبِّكَ طُغْيَانًا وَكُفْرًا ۚ
وَأَلْقَيْنَا بَيْنَهُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَاءَ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ ۚ
كُلَّمَا أَوْقَدُوا نَارًا لِّلْحَرْبِ أَطْفَأَهَا اللّٰهُ ۚ وَيَسْعَوْنَ فِي
الْأَرْضِ فَسَادًا ۚ وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الْمُفْسِدِينَ ﴿٦٤﴾ وَلَوْ أَنَّ
أَهْلَ الْكِتَابِ آمَنُوا وَاتَّقَوْا لَكَفَّرْنَا عَنْهُمْ سَيِّئَاتِهِمْ وَ
لَأَدْخَلْنَاهُمْ جَنَّاتِ النَّعِيمِ ﴿٦٥﴾ وَلَوْ أَنَّهُمْ أَقَامُوا التَّوْرَاةَ
وَالْإِنجِيلَ وَمَا أُنزِلَ إِلَيْهِم مِّن رَّبِّهِمْ لَأَكَلُوا مِن فَوْقِهِمْ
وَمِن تَحْتِ أَرْجُلِهِم ۚ مِّنْهُمْ أُمَّةٌ مُّقْتَصِدَةٌ ۖ وَكَثِيرٌ مِّنْهُمْ
سَاءَ مَا يَعْمَلُونَ ﴿٦٦﴾

اور یہودی کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں۔[۱۴۴]

انہی کے ہاتھ بندھ جائیں اور ان کے کہنے کی وجہ سے ان پر لعنت پڑی[۱۴۵]۔ اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوتے ہیں[۱۴۶] خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے[۱۴۷]۔ اور خدا کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے یہ ان میں سے بہتوں میں سرکشی اور کفر میں اضافہ کا سامان ہوگا[۱۴۸]۔ اور ہم نے ان کے درمیان روز قیامت تک عداوت اور دشمنی ڈال دی ہے[۱۴۹]۔ جب کبھی یہ جنگ کی آگ سلگاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈی کر دیتا ہے اور یہ لوگ زمین میں فساد برپا کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے[۱۵۰]۔ اور اگر یہ اہل کتاب ایمان لے آتے اور متقیانہ سیرت اختیار کرتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ہم ان کو نعمت کے باغات میں پہنچا دیتے[۱۵۱]۔ اور اگر یہ لوگ قائم رکھتے تورات اور انجیل کو

اور اس کو جو ان کے پروردگار کی جانب سے ان پر نازل ہوا ہے تو ضرور وہ بہرہ مند ہوتے اس رزق سے جو اوپر سے برستا اور ان کے قدموں کے نیچے سے اُبلتا[۱۵۲] ۔ ان میں سے کچھ لوگ میانہ رو بھی ہیں لیکن زیادہ تر ایسے ہی ہیں کہ جو کچھ کرتے ہیں بُرائی ہی بُرائی ہے[۱۵۳] ۔

---

۱۵۲ انسان شقاوت کی ایک اور تصویر

ہر دعوت کے ابتدائی دور کی طرح اسلام کا ابتدائی زمانہ بھی تنگی اور سختی کا زمانہ تھا۔ اور اللہ کے دین کا بول بالا کرنے کے لیے مال کی ضرورت برابر پیش آتی رہتی تھی۔ منافقوں پر یہ بات شاق گزرتی تھی جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ وہ کہتے کہ یہ جو بار بار خدا کے نام پر مال طلب کیا جا رہا ہے تو کیا خدا محتاج ہے اور ہم غنی ہیں۔ ابن ابی حاتم، ابن جریر اور محمد بن اسحاق نے حضرت عبداللہ ابن عباس کے حوالہ سے اسی زمانہ کا یہ واقعہ بھی نقل کیا ہے کہ حضرت ابوبکر ایک روز یہود کے بیت المدراس میں گئے وہاں بہت سے یہودی اپنے بڑے عالم فنحاص کے گرد جمع تھے۔ فنحاص کے ساتھ ان کا ایک اور بہت بڑا عالم بھی موجود تھا جس کا نام اشیع تھا۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اے فنحاص تو اللہ سے ڈر اور اسلام قبول کرلے تو خوب جانتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور تمہارے پاس اللہ کی جانب سے حق لے کر آئے ہیں۔ اور آپ کی صفات تم تورات و انجیل میں پاتے ہو۔ اس پر فنحاص نے کہا کہ مجھ کو ایسے اللہ کی کوئی ضرورت نہیں جو فقیر ہے اور ہم سے قرض مانگتا ہے۔ یہ بات غالباً اس لیے کہی کہ قرآن نے جب مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں خرچ کرنے کی دعوت دی اور اس دعوت کے لیے یہ موثر انداز اختیار کیا ہے من ذالذی یقرض اللہ قرضاً حسناً تو یہود نے اسلام

اور قرآن کی تحقیر کے لیے اس دعوت کو مذاق بنا لیا۔ فنحاص کے اس کہنے پر کہ اللہ فقیر ہے۔ حضرت ابوبکر نے فنحاص کے منہ پر چپت مارا اور فرمایا کہ اگر ہمارے اور تمہارے درمیان معاہدہ نہ ہوتا تو میں تجھے قتل کر دیتا۔ فنحاص کی اس بات کی یہودنے کوئی تکذیب نہیں کی تو گویا سب کی فنحاص کو اشیرباد حاصل تھی اس لیے یہاں یہ بات سب کی طرف منسوب کر دی گئی ہے۔ کچھ بزرگوں نے اس پس منظر سے ہٹ کر آیت کی تشریح کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہودی کہتے تھے کہ تورات کے بعد کوئی کتاب نہیں آسکتی اور نہ بنی اسرائیل کے بعد کسی دوسری قوم کو برکت و سعادت حاصل نہیں ہوسکتی ہے خدا کے خزانے میں سب کچھ ہے مگر اس کے ہاتھ بندھ گئے اب وہ کسی دوسری قوم کو برکت و سعادت نہیں دے سکتا۔ یہاں ان کی اسی شقاوت کی طرف اشارہ ہے اس طرح اس کی نسبت میں کوئی اشکال نہیں ہے۔ یہودی دنیا اسی کے قابل ہے۔

۱۴۴ - اور یہودی کہتے ہیں کہ اللہ کے ہاتھ بندھے ہوتے ہیں۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت اہل کتاب کے قلوب ان کی شرارت، کفر و طغیان، بدکاری، حرام خوری وغیرہ کی ممارست سے اس قدر مسخ ہوگئے تھے کہ بارگاہ ربوبیت میں گستاخی کرنے سے بھی ان کو کچھ باک نہ ہوتا تھا خداوند قدوس کا احترام ان کے یہاں ایک معمولی انسان سے زیادہ نہیں رہا تھا۔ حق تعالیٰ کی جناب میں بے تکلف ایسے واہی تباہی کلمات بک دیتے تھے جنہیں سن کر انسان کے رونگٹے کھڑے ہوجائیں کبھی یہ کہ ان اللہ فقیر و نحن اغنیاء کبھی یہ الفاظ منہ سے نکالتے ید اللہ مغلولۃ اس سے مراد یا تو وہی ہوگی جو ان اللہ فقیر سے تھی کہ خدا معاذ اللہ تنگدست ہوگیا اور اس کے خزانہ میں کچھ نہیں رہا۔ یا غل ید کنایہ ہے بخل و امساک سے۔ یعنی تنگدست تو نہیں مگر آج کل بخل کرنے لگا ہے العیاذ باللہ۔ بہرحال کوئی معنے ہوں اس کلمہ کفر کا منشاء یہ تھا کہ جب تمرد و طغیان کی پاداش میں حق تعالیٰ نے ان ملاعین پر ذلت و نکبت، ضیق عیش، بدحالی اور تنگ حالی مسلط فرمادی تو بجائے اس کے کہ اپنی سیہ کاریوں اور شرارتوں پر متنبہ اور نادم ہوتے اُلٹے حق تعالیٰ کی جناب میں گستاخیاں کرنے لگے۔ شاید یہ خیال ہوا ہو گا کہ ہم تو پیغمبروں کی اولاد ہیں، خدا کے بیٹے اور اس کے پیارے تھے۔ پھر کیا معاملہ ہونے لگا۔ آج بنی اسماعیل تو دنیا میں پھیلتے جارہے ہیں۔ زمینی فتوحات اور آسمانی برکات ان پر کشادہ ہو رہی ہیں اور ہم بنی اسرائیل کہ خدا صرف ہمارا اور ہم اس کے تھے۔ اس طرح ذلیل و مغلوب اور تنگ حال ہو کر در بدر بھٹکتے پھر رہے ہیں۔ ہم تو وہی اسرائیل کی اولاد اور ابناء اللہ و احباء۔ آج بھی ہیں جو پہلے تھے مگر معلوم ہوتا ہے کہ جس خدا کے ہم اولاد اور محبوب تھے معاذ اللہ

اس کے خزانہ میں کمی آگئی یا اُن کو بخل و امساک نے اس کا ہاتھ بند کر دیا ہے۔ احمق اتنا نہ سمجھے کہ حق تعالیٰ کے خزائن تو لا محدود اور اس کے کمالات غیر متبدل اور غیر متناہی ہیں۔ اگر معاذ اللہ اس کے خزانے میں کمی آگئی یا مخلوق کی تربیت و اعانت سے وہ ہاتھ کھینچ لیتا تو دنیا کا نظام کسی طرح قائم رہ سکتا تھا اور جو روز افزوں عروج و فروغ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے رفقاء کا تم آنکھوں سے دیکھ رہے ہو یہ کس کے خزانہ اور دست کرم کا رہین منت ہوتا۔ لہٰذا تم کو سمجھ لینا چاہیے کہ اس کا ہاتھ بند نہیں ہوا۔ البتہ گستاخیوں اور شرارتوں کی وجہ سے خدا کی جو لعنت اور پھٹکار تم پر پڑی ہے اس نے تمہارے حق میں خدا کی زمین باوجود ساری وسعتوں کے تنگ کر دی اور آئندہ اور زیادہ تنگ ہونے والی ہے۔ اپنی اتنی تنگ حالی کو خدا کی تنگدستی سے منسوب کرنا تمہاری انتہائی سفاہت ہے [1]

حضرت شیخ الاسلام نے غل ید کو بخل کے لیے کنائی زبان بتا کر جو تشریح کی وہ قرآنی سیاق و سباق اور لغت عرب کے بہت زیادہ قریب ہے۔ واقعی عربی محاورے کے مطابق کسی کے ہاتھ بند ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ بخیل ہے، عطاء و بخشش سے اس کا ہاتھ رکا ہوا ہے یعنی اللہ معاذ اللہ بخیل ہے۔ غل ید اور بسط ید دونوں عربی میں بخل و سخاوت کے لیے بولے جاتے ہیں اسی سے قرآن میں یہ آیت ہے لا تجعل یدك مغلولة الی عنقك

وجہ اس کی یہی ہے کہ ہاتھ اکثر کاموں میں بطور آلہ استعمال ہوتا ہے بالخصوص دولت کے دینے اور خرچ کرنے میں۔ سبب بول کر مسبب مراد لیتے ہیں۔ اسی لیے سخی کو فیاض الکف مبسوط الید اور بخیل کو کز الید صالع اور مقبوض الکف کہتے ہیں۔ لہٰذا یہودیوں کے اس کہنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ واقعی اللہ کے ہاتھ بندھے ہوئے ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ اللہ بخیل ہے چونکہ صدیوں سے یہودی خود ذلت و نکبت میں مبتلا تھے اور ان کی گزشتہ عظمت محض ایک افسانہ پارینہ بن کر رہ گئی تھی جس کے پھر واپس آنے کا کوئی امکان انہیں نظر نہیں آتا تھا اس لیے بالعموم اپنے قومی مصائب پر ماتم کرتے ہوئے اس قوم کے نادان لوگ یہ بیہودہ فقرہ کہا کرتے تھے کہ معاذ اللہ خدا تو بخیل ہو گیا ہے۔ اس کے خزانے کا منہ بند ہے۔ ہمیں دینے کے لیے اب اس کے پاس آفات و مصائب کے سوا اور کچھ نہیں رہا۔ یہ بات کچھ یہودیوں تک محدود نہیں۔ دوسری قوموں کے جہلاء کا بھی یہی حال ہے کہ جب ان پر کوئی سخت وقت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آتا ہے تو خدا کی طرف رجوع کرنے کے بجائے وہ جل جل کر اس قسم کی گستاخانہ باتیں کیا کرتے ہیں۔

گستاخیوں کی پاداش میں لعنت

۱۴۵- انہیں کے ہاتھ بند ہو گئے ہیں اور ان کے کہنے کی وجہ سے ان پر لعنت پڑی۔ یہ دعا کے رنگ میں پیشین گوئی ہے یا ان کی واقعی حالت کی خبر دی گئی ہے چنانچہ واقع میں بخل و امساک نے ان کے ہاتھ بالکل بند کر دیے ہیں[1]

ان کی اس گستاخی پر لعنت اور پھٹکار ہے۔ اس فوری لعنت اور پھٹکار کی وجہ یہ ہے کہ یہود اللہ اور اس کی شان سے بے خبر نہ تھے وہ ہر چیز سے واقف تھے لیکن قرآن اور حضور انور کی عداوت میں ایسے اندھے بہرے ہو گئے کہ ان کو یہ احساس تک نہ ہوتا تھا کہ کیا کہہ رہے ہیں۔ یہاں حضرت مولانا تھانوی کی یہ نکتہ آفرینی بہت خوب اور اسلام میں تکفیر کے لیے قانونی موقف کی اچھی توضیح ہے کہ یہود کا یہ کہنا خواہ ان کے اعتقاد پر مبنی نہ ہو لیکن کلمہ کفر کا تلفظ بھی بلاضرورت اور بغیر تردید کے کفر ہی ہوتا ہے اسی لیے بما قالوا کو لعنوا کی علت بنایا گیا ہے۔ شاید اسی بنا پر فقہائے ایمان میں زبان کے اقرار کی ضرورت کو محسوس کیا ہے۔ اگرچہ اس میں اختلاف ہے کہ اقرار کی ایمان میں حیثیت کیا ہے۔ ایک جماعت رکن کی حیثیت بتاتی ہے۔ اور دوسری جماعت شرط قرار دیتی ہے۔ پہلی جماعت کا خیال ہے کہ اقرار بھی ایک قسم کی تصدیق ہے۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ ایک تصدیق قلب سے ہوتی ہے اور ایک زبان سے۔ اقرار زبان کی تصدیق ہے اس لیے کوئی وجہ نہیں ہے کہ تصدیق کی ایک نوع رکن اور دوسری شرط قرار دی جائے یہ اور بات ہے کہ تصدیق قلبی رکن اصلی ہے یعنی کسی حالت میں یہاں تساہل برداشت نہیں کیا جا سکتا اور اقرار رکن زائد یعنی بعض صورتوں میں یہاں اغماض و چشم پوشی کر لینا بھی ممکن ہے جیسا کہ اکراہ میں۔

شیخ ابو منصور ماتریدی، شیخ ابوالحسن اشعری اور امام نسفی کا میلان خاطر اقرار کی شرطیت کی طرف ہے۔ یہ حضرات فرماتے ہیں کہ ثبوت اسلام سے قبل ہی احکام اسلام کا نافذ کرنا تو غیر معقول ہے لیکن زبانی اقرار کے بغیر ہمارے پاس اسلام کی کوئی شہادت نہیں اس لیے اس کے سوا چارہ ہی کیا ہے کہ اسلام کا وفادار شہری کہنے کے لیے اقرار کو شرط قرار دیا جائے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

گویا ایمان و کفر دونوں کے لیے زبان کی گفتار معتبر ہے۔ اگر زبان سے اقرار کرتا ہے اور قلب سے تصدیق نہیں کرتا ہے اور اگر زبان سے انکار کرتا ہے اور قلب سے تصدیق کرتا ہے تو پہلی صورت میں ہم مسلمان اور دوسری صورت میں کافر قرار دیں گے جیسے گفتار ایمان کے لیے شرط ہے ایسے ہی گفتار کفر کے لیے بھی شرط ہے۔

صفات باری کیف و کم سے بالا ہیں

۱۴۶ - اللہ کے دونوں ہاتھ کھلے ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ عبدالقادر نے ان آیات پر جو فائدہ لکھا ہے اس میں دو ہاتھوں سے مراد مہر اور قہر کا ہاتھ لیا ہے۔ یعنی آج کل مہر کا ہاتھ اُمت محمدیہ پر اور قہر . . . . . کا بنی اسرائیل پر کھلا ہوا ہے۔ جیسا کہ اگلی آیتوں میں اشارہ فرمایا[1] یہود اس حقیقت سے باخبر تھے کہ عربوں کو قرآن کا ملنا صرف قرآن ہی کا ملنا نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ امامت اور سیادت بھی ان کی طرف منتقل ہو رہی ہے جس کے تنہا اجارہ دار اب تک وہ خود بنے بیٹھے تھے اس حسد نے ان کو جناب الٰہی میں گستاخ بنا دیا۔ اسی کا جواب یہاں قرآن دے رہا ہے کہ اللہ کی ذات بخل کے شائبہ سے بھی پاک ہے اس کے جود و سخا اور کریمی و رزاقی برابر جاری ہے۔

یہاں اللہ سبحانہ کے لیے ید کے استعمال نے بہتوں کو چونکا دیا۔ زمخشری نے اپنی شان اعتزال کو باقی رکھنے کے لیے علی الاعلان کہہ دیا کہ اللہ سبحانہ کے لیے ہاتھ کا ثابت کرنا ٹھیک نہیں ہے اور زمخشری ہی کی پیروی میں اُردو شارحین قرآن میں سے بعض نے بھی یہ بات لکھ دی کہ

یداللہ کے لفظ آجانے سے حق تعالیٰ کے لیے اثبات ید کا قطعاً کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ (تفسیر ماجدی)

لیکن خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے حضرت مولانا شیخ الاسلام عثمانی کو کہ وہ یہ مفید بات لکھ گئے۔

حق تعالیٰ کے لیے جہاں ہاتھ، پاؤں، آنکھ وغیرہ لغوت ذکر کی گئی ہیں ان سے بھول کر بھی یہ وہم نہ ہونا چاہیے کہ وہ معاذ اللہ مخلوق کی طرح جسم اور اعضائے جسمانی رکھتا ہے بس جس طرح خدا کی ذات اور وجود، علم حیات وغیرہ تمام صفات کی کوئی نظیر، مثال اور کیفیت اس کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سوا بیان نہیں ہو سکتی۔

اے برتر از خیال و قیاس و گماں و وہم
از ہرچہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم
منزل تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہم چناں در اوّل وصف تو ماندہ ایم

اسی طرح ان نعوت وصفات کو خیال کرو۔ خلاصہ یہ کہ جیسے خدا کی ذات بے چون و بے چگون ہے اس کے سمع و بصر، ید وغیرہ نعوت وصفات کے معانی بھی اس کی ذات اور شان اقدس کے لائق اور ہمارے کیف وکم اور تعبیر و بیان کے احاطہ سے بالکل وراء الوراء ہیں لیس کمثلہ شیئ وھو السمیع البصیر۔[1]

حافظ ابن عبدالبر شرح موطا میں رقمطراز ہیں کہ

اہل السنۃ والجماعۃ کا اتفاق ہے کہ قرآن وسنت میں حق تعالیٰ کے لیے جو صفات آئی ہیں وہ اپنے معنے حقیقی پر محمول ہیں معنے مجازی پر نہیں، ہاں اتنا ضرور ہے کہ وہ ان کی کیفیت اور کیت سے بحث نہیں کرتے ہیں۔

اور قاضی ابویعلی اپنی کتاب ابطال التاویل میں رقمطراز ہیں۔

ان احادیث کو جن میں صفات الٰہی کا چہرہ بیان ہوا ہے نہ تو رد کیا جا سکتا ہے اور نہ تاویل کی جا سکتی ہے۔ ظاہری پر محمول کرنا چاہیے لیکن یہ یاد رکھنا چاہیے کہ مخلوقات میں سے ان صفات کے موصوفین اللہ کی ذات مشابہ نہیں ہے، اور تشبیہ کا کسی درجے میں بھی اعتقاد نہ ہونا چاہیے۔ صحابہ اور تابعین کا صفات کو ظاہر پر محمول کرنا اور کوئی تاویل نہ کرنا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ ان کے یہاں تاویل پسندیدہ نہ تھی۔

اور امام ابوالحسن اشعری کتاب الابانہ میں فرماتے ہیں۔

اگر ہم سے پوچھا جائے کہ اللہ کے دو ہاتھوں کے بارے میں تم کیا کہتے ہو ہم جواب دیں گے کہ ہم وہی کچھ کہتے ہیں جو قرآن کہتا ہے ید اللہ فوق ایدیھم۔

[1] افادات شیخ الاسلام

لما خلقت بیدی اور جو کچھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے۔
اور اس موضوع پر طویل بحث کی ہے۔ اس کے علاوہ قاضی ابوبکر الباقلانی نے الا بانۃ میں اور شیخ تقی الدین نے رسالہ مدنیہ میں اس پر لطیف بحث کی ہے۔ علامہ آلوسی نے سلف اُمت کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ یہ تشابہات میں سے ہے اس میں مسلک تاویل نہیں مسلک تفویض کو اپنانا سلامتی کی راہ ہے۔
اصل یہ ہے کہ قرآن نے اس موضوع پر جو راہ اختیار کی ہے وہ ایک طرف تو تنزیہہ کو اس کے درجہ کمال تک پہنچا دیتا ہے، دوسری طرف تعطیل سے بچا لیتا ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات اور افعال کا اثبات کرتا ہے مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کر دیتا ہے وہ زندہ ہے، قدرت والا ہے پالنے والا ہے، رحمت والا ہے، دیکھنے اور سننے والا، سب کچھ جاننے والا ہے اور پھر آنا ہی نہیں بلکہ انسانوں کی بول چال میں قدرت و اختیار اور ارادہ و فعل کی جتنی شائستہ تعبیرات ہیں انہیں بھی بلا تامل استعمال کرتا ہے۔ مثلاً خدا کے ہاتھ تنگ نہیں ہیں بل یداہ مبسوطتان لیکن یہ بھی صاف اور بے لچک کہتا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں وہ عدیم المثال ہے لیس کمثلہ شیئ للہذا ظاہر ہے کہ اس کا زندہ ہونا ہمارے زندہ ہونے کی طرح نہیں ہو سکتا اس کا دیکھنا سننا جاننا ویسا نہیں ہو سکتا جس طرح کے دیکھنے سننے اور جاننے کا ہم تصور کر سکتے ہیں اس کا ہاتھ آنکھ چہرہ ضرور ہے لیکن یقیناً اس کا مطلب وہ نہیں ہو سکتا جو ان الفاظ کے مدلولات سے ہمارے ذہن میں متشکل ہوتا ہے۔

اللہ کا قانون انفاق

۱۴۷- وہ خرچ کرتا ہے جیسے چاہتا ہے۔ یعنی اس کو وہی خوب جانتا ہے کہ کس وقت کس پر کس قدر خرچ کیا جائے۔ کبھی ایک وفادار کو امتحان یا اصلاحِ حال کی غرض سے تنگی اور عسرت میں مبتلا کر دیتا ہے اور کبھی اس کی وفاداری کے صلے میں نعمائے آخرت سے پہلے دنیوی برکات کے دروازے بھی کھول دیتا ہے۔ اس کے بالمقابل ایک مجرم متمرد پر کبھی آخرت کی سزا سے پہلے تنگ حالی، ضیق عیش اور مصائب و آفات دنیوی کی سزا بھیجتا ہے اور کسی وقت دنیوی ساز و سامان کو فراخ کر کے مزید مہلت دیتا ہے کہ یا خدا کے احسانات سے متاثر ہو کر اپنے فسق و فجور پر کچھ شرمائے یا اپنی شقاوت کا پوری طرح پیمانہ لبریز کر کے

انتہائی سزا کا مستحق ہو۔ ان مختلف احوال و اغراض اور متنوع حکمتوں کی موجودگی میں کسی شخص کے مقبول و مردود ہونے کا فیصلہ خدا کی اطلاع یا قرائن و احوال خارجیہ کی بنا پر کیا جا سکتا ہے جس طرح ایک چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے یا ڈاکٹر کسی مریض کا ہاتھ کاٹے دونوں کی نسبت ہم احوال خارجیہ اور قرائن سے سمجھ لیتے ہیں کہ ایک بطور سزا اور دوسرا بطور شفقت و علاج کاٹا گیا ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ ان گستاخوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اب جو فیضان الٰہی سے تم محروم ہو چکے ہو اس کی وجہ نہ فیض میں کمی ہے اور نہ مفیض میں بخل ہے بلکہ اس کی اصلی وجہ تمہارے اعمال ہیں ورنہ اس کا فیضان تو اس کی مشیت کے تابع ہے اس کی مشیت میں کوئی دخیل نہیں ہے۔ اُمتوں کی دوسری گمراہیوں کی طرح ایک فکری گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ اکثر نیک لوگوں کی بہ نسبت یہ سمجھا جاتا ہے کہ ان کی مشیت بھی عین خدا کی مشیت ہے اس میں نہ صرف بدعقیدہ لوگ بلکہ اہل توحید بھی غلطی سے مبتلا ہو جاتے ہیں جیسا کہ یہودیوں کے سخن ابناء اللہ و احباءہ سے مفہوم ہوتا ہے۔ قرآن نے یہاں اس دقیق غلطی سے آگاہ کیا اور بتایا کہ دنیا میں مشیت صرف خدا کی ہے۔ اس کی خواہش کے مطابق دنیا چل رہی ہے۔ تمام مشیتیں اور خواہشیں اسی کی مشیت اور خواہش کے تابع ہیں۔ اس کے ساتھ کسی مخلوق کی مشیت عالم کے کاروبار میں شریک نہیں ہے لیکن یہودیوں نے اللہ کی مشیت میں اوروں کی مشیت کو بھی شریک کر لیا تھا۔ قرآن نے بار بار اس حقیقت کو واضح کیا، کہ مشیت الٰہی کے علاوہ اور کوئی مشیت نہیں ہے۔ اور یہاں امام رازی کی یہ نکتہ آفرینی بھی خوب ہے کہ اس آیت میں کھلے بندوں ان ارباب اعتزال کی بھی تردید ہو رہی ہے جو کہتے ہیں خدا پر مطیع کو ثواب دینا واجب ہے۔ خدا پر کوئی چیز واجب نہیں وہ جیسے چاہتا ہے کرتا ہے۔

اسلام کی ترقی سے بیماری میں اضافہ

۱۴۸۔ اور خدا کی طرف سے جو کچھ تم پر نازل ہوا ہے یہ ان میں سے بہتوں میں سرکشی اور کفر میں اضافہ کا سامان ہو گا ان کی گستاخی کا جواب دیا جا چکا ہے لیکن قرآن کے ایسے حکیمانہ جوابات سے ان معاندین اور سفہاء کو تسکین نہیں ہوتی بلکہ کلام الٰہی سن کر شرارت اور انکار میں اور زیادہ ترقی کریں گے۔ اگر غذائے صالح ایک بیمار کے معدہ میں پہنچ کر اس کے مرض کو زیادہ کر دیتی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے تو اس میں غذا کا قصور نہیں ہے مریض کے مزاج کی خرابی ہے[1]

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں اے اللہ کے پیغمبر اللہ سبحانہ آپ پر جو انعامات فرما رہا ہے یہ انعامات ہی آپ کے مخالفین یعنی یہود کے حق میں عذاب کا سامان ہو جائیں گے۔ اہل ایمان میں یہ انعامات اگر ایمان و عمل صالح میں ترقی کا ذریعہ ہیں تو اہل کفر میں یہی انعامات حسد کی آگ بھڑکائیں گے اور حسد کے نتیجے میں وہ کفر اور سرکشی میں بڑھتے جائیں گے۔

مطلب یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اس کلام کو سن کر وہ کوئی مفید سبق لیتے اپنی غلطیوں اور غلط کاریوں پر متنبہ ہو کر ان کی تلافی کرتے اور اپنی گری ہوئی حالت کے اسباب معلوم کر کے اصلاح کی طرف متوجہ ہوتے۔ ان پر اس کا الٹا اثر یہ ہوا ہے کہ ضد میں آکر انہوں نے حق و صداقت کی اور مخالفت شروع کر دی ہے۔ خیر و صلاح کے بھولے ہوئے سبق کو سن کر خود راست پر آنا تو درکنار ان کی الٹی کوشش یہ ہے کہ جو آواز اس سبق کو یاد دلا رہی ہے اسے دبا دیں تاکہ کوئی دوسرا بھی اسے سننے نہ پائے۔

یہودی اور عیسائی میں آگ پانی کا بیر ہے

۱۴۹ - اور ہم نے ان کے درمیان روز قیامت تک عداوت اور دشمنی ڈال دی۔ اگرچہ قریب میں خاص یہود کا مقولہ ہے لیکن القینا بینہم سے مراد غالباً وہ اور ان کے بھائی سب ہیں یعنی یہود و نصاریٰ سب اہل کتاب کا حال بیان فرمایا ہے جیسا کہ پہلے اسی سورت میں گزرا۔ اور اگلی آیت میں بھی سب اہل کتاب کو خطاب فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ جوں جوں ان کی شرارت اور انکار کو ترقی ہوگی اسی قدر اسلام اور مسلمانوں کے خلاف سازشیں اور منصوبے زیادہ باندھیں گے اور لڑائی کی آگ سلگانے کے لیے تیار ہوں گے لیکن ان کے آپس میں پھوٹ پڑ چکی ہے جو مٹ نہیں سکتی۔ اس سبب سے اسلامی برادری کے خلاف ان کی جنگی تیاریاں کامیاب نہیں ہو سکیں[1] عام شارحین قرآن کی رائے یہی ہے[2] کہ بینہم کی ضمیر کا مرجع یہود و نصاریٰ دونوں ہیں۔ ابن جریر نے امام مجاہد سے یہی نقل کیا ہے۔ ابن جریر کے علاوہ دوسرے شارحین نے الحسن البصری کی ہمنوائی بھی نقل کی ہے۔ زمانہ نبوت ہی میں نہیں آج بھی جرمن، انگلینڈ اور فرانس میں یہی حال ہے۔

[1،2] افادات شیخ الاسلام

لیکن کچھ مفسرین کا خیال ہے کہ یہ یہودیوں کے بارے میں ہے۔ چنانچہ مولانا آزاد فرماتے ہیں،
عیسائیوں کی طرح یہودی بھی مختلف فرقوں میں بٹ گئے ہیں اور مذہبی فرقہ بندی
نے ہمیشہ کے لیے ان میں باہمی بغض و عناد کے جذبات پیدا کر دیے ہیں۔
حافظ ابن کثیر کا میلان بھی یہی معلوم ہوتا ہے لیکن ان کی یہ نکتہ آفرینی داد کے قابل ہے کہ
تمہاری مخالفت اور دشمنی کے بعد بھی یہودی کبھی حق پر جمع نہ ہوں گے۔
اب جو دنیا میں اجتماعیت نظر آ رہی ہے یہ حق پر نہیں بلکہ باطل پر ہے روحانیت پر نہیں مادیت
پر ہے۔ بہرحال تفسیریں دونوں ہیں اور قرآن کے الفاظ میں گنجائش ہے۔

اہل ایمان کو تسلی کہ یہود ناکام ہوں گے

۱۵۰ ۔ جب کبھی یہ جنگ کی آگ سلگاتے ہیں اللہ اس کو ٹھنڈی کر دیتا ہے اور یہ لوگ زمین میں فساد بپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں اور اللہ فساد کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل اسلام میں جب تک باہمی محبت اور اخوت مستحکم رہے گی اور رشد و صلاح کے طریق پر گامزن ہو کر فتنہ اور فساد سے مجتنب رہنے کا اہتمام رہے گا جیسا کہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں تھا۔ اس وقت تک اہل کتاب کی ساری کوششیں ان کے مقابلے میں بیکار رہیں گی[1]

یہ دراصل اہل ایمان کو تسلی ہے کہ اگرچہ عداوت اور حسد کے جوش میں یہ اندھے ہو رہے ہیں اور برابر تمہارے خلاف جنگ کی آگ بھڑکانے میں کوشاں رہیں گے مگر اللہ سبحانہ ان کو کوششوں کو کامیابی عطا نہیں کرے گا بلکہ جب بھی یہ آگ بھڑکائیں گے اللہ تعالیٰ بجھائے گا۔ اس طرح آگ بھڑکانا کنایہ ہے جنگ سے اور آگ بجھانا کنایہ ہے جنگ کی مدافعت سے۔ اس میں تاریخ کی اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ کفار نے جب بھی اہل ایمان پر چڑھائی کی ہے۔ اس میں یہود کی سازش کا ضرور تعلق رہا ہے۔ جمہور مفسرین اسے استعارہ کہتے ہیں اور کچھ اسے کنایہ کہتے ہیں۔ جو استعارہ کہتے ہیں وہ آگ کے روشن کرنے سے اہل ایمان کے خلاف سازش مراد لیتے ہیں اور جو کنایہ کہتے ہیں ان کی رائے میں آگ بھڑکانے سے جنگ مراد ہے۔ آلوسی کا فیصلہ یہ ہے کہ کنایہ والی بات زیادہ لطیف ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسری بات یہ فرمائی گئی ہے ویسعون فی الارض فسادا کہ ان کا پیش نہاد اس کردار میں اخلاق و اعمال اور اجتماعی احوال و ظروف کی درستگی اور اصلاح نہیں بلکہ نرا فساد ہی فساد اور بگاڑ ہی بگاڑ ہے ان کی کوشش کا مقصد یہ ہے کہ اہل عرب میں افتراق کی جگہ اجتماعیت، نادانی اور جہالت کی جگہ علم و دانش اور شرک و بت پرستی کی جگہ توحید اور یگانہ خدا کی عبادت نہ آنے پاتے تاکہ ان کی مصنوعی قیادت کا گھروندا قائم رہے اور اللہ روئے زمین میں مفسدین کو پسند نہیں کرتا ہے کیونکہ اللہ کے تکوینی اور تشریعی نظام میں تصادم واقع ہوتا ہے جس سے زمین کی برکتیں اٹھ جاتی ہیں اور اس سے ان فتنوں کو راہ ملتی ہے جن کی وجہ سے دنیا شیطان کی بازی گاہ بن جاتی ہے۔ اللہ سبحانہٗ کو دنیا کی صلاح و فلاح مطلوب ہے اس لیے وہ ان مفسدانہ کوششوں کو اسی حد تک پنپنے کا موقع دیتا ہے جہاں تک اس کے قانون ابتلا کا تقاضا ہوتا ہے۔ اللہ کو پسند ان لوگوں کی جدوجہد ہے جو اس دنیا میں نظام حق و عدل کے علمبردار ہیں یہی چیز اس کائنات کے مجموعی نظام سے ہم آہنگ اور فطرۃ اللہ کے موافق ہے۔ اس وجہ سے وہ ان کی جو حق و عدل کی شہادت کے تقاضے پورے کرتے ہیں مدد فرماتا ہے اور مفسدین کی مخالفتوں اور ریشہ دوانیوں اور جنگ آزمائیوں کے مقابلے میں ان کو فتحیاب کرتا ہے۔ اس آیت نے بتا دیا کہ دنیا میں قانون الٰہی کے نفاذ کی مخالفت کرنا خواہ وہ کسی عنوان سے ہو بہرحال اور بہر صورت فساد فی الارض ہے۔

اہل کتاب کو خاتم النبیین پر ایمان کی دعوت

۱۵۱۔ اور اگر یہ اہل کتاب ایمان لے آتے اور متقیانہ سیرت اختیار کرتے تو ہم ان کی برائیاں ان سے دور کر دیتے اور ہم ان کو نعمت کے باغات میں پہنچا دیتے۔ یعنی باوجود ایسے شدید جرائم کے اور سخت شرارتوں کے اگر اب بھی اہل کتاب اپنے رویہ سے تائب ہو کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن پر ایمان لے آتے اور تقویٰ اختیار کر لیتے تو دروازہ توبہ کا بند نہیں ہوا حق تعالیٰ کمال فضل و رحمت سے ان کو اخروی و دنیوی نعمتوں سے سرفراز فرما دیتا۔ اس کی رحمت بڑے سے مجرم کو بھی جب وہ شرمسار و معترف ہو کر آئے تو مایوس نہیں کرتی۔ [1]

اصل ارشاد آمنوا آیا ہے یہاں آمنوا کا مفعول محذوف ہے کچھ شارحین قرآن تو یہی کہتے ہیں کہ یہاں ایمان سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی یہی اختیار کیا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

لیکن علامہ آلوسی نے سیاق و سباق کی رعایت سے آمنوا کا مفعول یہ بتایا ہے بما نفی عنہم الایمان یعنی اگر وہ ایمان لے آتے جس کی ان سے نفی کی گئی ہے۔ اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی ایمان داخل ہے لیکن اکثریت کی رائے یہی ہے کہ یہاں ایمان سے حضور ہی پر ایمان مراد ہے۔ سید رشید رضا اپنی مشہور تفسیر المنار میں فرماتے ہیں ؛

اگر اہل کتاب خاتم النبیین پر ایمان لے آتے اور تقیاء سیرت اختیار کرتے یعنی ان خرابیوں اور ریشہ دوانیوں سے دامن بچا کر رکھتے جن کا ارتکاب بے ایمانی کی حالت میں کرتے رہے تو اللہ تعالیٰ ان کے پچھلے گناہوں کو معاف کر دیتا اور ان کو اپنی نعمت کے باغوں میں داخل کرتا۔

علامہ زمخشری یہاں بھی نہیں چوکے اور چوٹ کر ہی گئے کہ ایمان میں عمل کے بغیر نجات کی ہرگز ضمانت نہیں ہے کیونکہ یہاں آمنوا کے ساتھ واتقوا بھی آیا ہے۔ صاحب انتصاف نے یہاں بھی موصوف کا اچھا تعاقب کیا ہے کہ اس پر معتزلہ اور اہل السنہ دونوں متفق ہیں کہ ایمان کی طاقت ماضی کی غلط کاریوں کو ختم کر دیتی ہے۔ قرآن میں ہے

قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف

اگر ایک شخص ایمان لاتے ہی موت کی آغوش میں پہنچ جاتا ہے تو سب کے نزدیک اس کی تکفیر سیئات ہو جائے گی پتہ چلا کہ دونوں کا اجتماع شرط نجات نہیں ہے۔

اہل کتاب کے ایمان کی آرزو

۱۵۲ ۔ اور اگر یہ لوگ قائم رکھتے تورات اور انجیل کو اور اس کو جو ان کے پروردگار کی جانب سے ان پر نازل ہوا ہے تو ضرور وہ بہرہ مند ہوتے اس رزق سے جو اوپر سے برستا اور ان کے قدموں کے نیچے سے ابلتا۔ یعنی اگر تورات و انجیل کو اور قرآن حکیم کو جو تورات و انجیل کے بعد ان کی تبلیغ اور ہدایت کے لیے نازل ہوا ہے اس کو قائم کرتے کیونکہ اس کے تسلیم کے بدون تورات و انجیل کی بھی صحیح معنے میں اقامت نہیں ہو سکتی بلکہ تورات و انجیل اور جملہ کتب سماویہ کی اقامت کا مطلب ہی اب یہ ہو سکتا ہے کہ قرآن حکیم اور پیغمبر آخرالزماں صلی اللہ علیہ وسلم جو کتب سابقہ کی پیشین گوئیوں کے مطابق بھیجے گئے ہیں ان کو قبول کیا جائے گویا اقامت تورات و انجیل کا حوالہ دے کر آگاہ فرما دیا کہ اگر قرآن کو انہوں نے قبول نہ کیا تو اس کے معنے یہی ہیں کہ اپنی کتابوں کے

قبول کرنے سے بھی منکر ہو گئے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو کھاتے یعنی تمام ارضی و سماوی برکات سے ان کو متمتع کیا جاتا اور ذلت و بدحالی اور ضیق عیش کی جو سزا ان کے عصیان و تمرد پر دی گئی تھی وہ اٹھا لی جاتی۔ [1]

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن نے ما انزل الیھم من ربھم کے بارے میں دو مختلف موقف اختیار کیے ہیں۔ ایک تو وہ ہی ہے جس کی ترجمانی شیخ الاسلام نے فرمائی ہے کہ ما انزل الیھم من ربھم سے مراد قرآن ہے اس کے قائم کرنے کے ساتھ تورات اور انجیل کے قائم کرنے کے حوالے سے مقصود ایک تو یہ ظاہر کرنا ہے کہ اس کو قائم کرنا صرف اسی کو قائم کرنا نہیں ہے بلکہ یہ درحقیقت تورات اور انجیل سب کی تکمیل کرنے والی اور محافظ ہے، دوسرا یہ کہ اہل کتاب نے محض دنیا کی متاع حقیر کے لیے اللہ کے ساتھ اپنے عہد کو توڑا اور تورات و انجیل کو برباد کیا اور اب اسی دنیا کی محبت انہیں قرآن کے قبول کرنے سے مانع ہے۔ اگر یہ تورات و انجیل کو قائم کرتے اور اب اللہ کی اس آخری کتاب کو قبول کرتے اور اس کو قائم کرنے کی جدوجہد میں شریک ہوتے تو آسمان و زمین دونوں ان کے لیے اپنے خزانے اگلتے۔

قائم کرنے سے مراد زندگی کے معاملات کا اللہ کی کتاب سے تعلق قائم کرنا ہے۔ یعنی لوگ اپنی انفرادی اور اجتماعی زندگی اس کے احکام و قوانین کے مطابق قائم کریں۔ اگر زندگی کتاب الٰہی سے بے تعلق ہو جائے تو چاہے زبان سے کتاب الٰہی کی مدح میں کتنی ہی قصیدہ خوانی کی جاتی رہے کتاب الٰہی کو قائم کرنا ہے اور نہ اس قصیدہ خوانی سے کسی کو قوانین اللہ کا درجہ حاصل ہو سکتا ہے۔

اس رائے کو بڑے بڑے جلیل القدر مفسرین کی ہمنوائی حاصل ہے حافظ ابن کثیر نے عبداللہ ابن عباس کی یہی رائے بتائی ہے۔ آلوسی، قرطبی، نسفی، ابن جریر، رازی اور نیشاپوری وغیرہ نے اسی کو اولیت دی ہے۔ رشید رضا، المراغی نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

دوسرا موقف یہ ہے کہ ما انزل الیھم من ربھم سے انبیاء بنی اسرائیل کی کتابیں جیسے کتاب اشعیا، کتاب حزقیل، کتاب حبقوق، کتاب دانیال وغیرہ مراد ہیں مطلب یہ ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی تورات و انجیل اور اپنے انبیاء کے دوسرے صحائف پر عمل کرتے اور ان میں بتائی ہوئی بشارتوں پر عمل کرتے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت مان لیتے تو بلا شبہ ہر قسم کی نعمتوں سے ہمدوش ہوتے۔ الغرض

[1] افادات شیخ الاسلام

نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ محاسن التاویل میں القاسمی کا رجحان بھی یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی اسی تعلیم پر قائم رہتے جو ان کتابوں میں خدا اور پیغمبروں کی طرف سے منقول ہے تو یقیناً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے وقت وہ ایک حق پرست اور راست رو گروہ پاتے جاتے اور انہیں قرآن کے اندر وہی روشنی نظر آتی جو پچھلی کتابوں میں ہے۔

میانہ رو اُمت

۱۵۲۔ ان میں سے کچھ لوگ میانہ رو بھی ہیں لیکن زیادہ تر ایسے ہیں کہ جو کچھ بھی کرتے ہیں برائی ہی بُرائی ہے۔ یہ وہ معدودے افراد ہیں جنہوں نے فطری سعادت سے توسط و اعتدال کی راہ اختیار کی اور حق کی آواز پر لبیک کہی۔ مثلاً عبداللہ بن سلام اور ملک حبشہ نجاشی وغیرہ[1] اصل ارشاد میں امۃ مقتصدۃ آیا ہے اقتصاد قصد سے بنا ہے اس کے معنے عمل میں راہ اعتدال اختیار کرنے کے ہیں۔ فلاں اقتصد فی امرہ وہ اپنے معاملہ میں میانہ رو ہے۔ اس سے کون لوگ مراد ہیں، کچھ کی رائے ہیں وہ لوگ جو دین میں اعتدال کو اپناتے ہوتے تھے، نہ تو افراط کے ذریعے غلو کرتے اور نہ تفریط کے ذریعے اسے بیکار کرتے۔ کچھ کا خیال ہے کہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہو گئے تھے۔

اصل بات یہ ہے کہ دُنیا میں کوئی اُمت اعتدال پسند طبقہ سے خالی نہیں ہوتی لیکن اُمت کے زمانہ ارتقاء میں اس طبقہ کی بہتات ہوتی ہے اور زمانہ تنزل میں اور انحطاط میں یہ طبقہ قلیل ہو جاتا ہے۔ یہی اعتدال پسند طبقہ نبوت کی اصلاحی دعوت کا استقبال کرتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کے وقت میں مدینہ میں اہل کتاب کے اسی اعتدال پسند طبقہ نے اپنے عرب بھائیوں کے ساتھ مل کر حالات کے ہمہ گیر بگاڑ کے باوجود اسلام کو قبول کیا۔

اقتصاد بھی اسلامی اخلاق کا وہ باب ہے جس میں وہ منفرد ہے اسلام کی خاص خوبی یہ ہے کہ اس کا راستہ افراط و تفریط سے ہٹ کر نقطہ اعتدال پر ہے قرآن پاک میں اُمت مسلمہ کو اُمت وسطاً کا خطاب جن وجوہ سے دیا گیا ہے ان میں ایک یہ بھی ہے کہ یہاں کا مذہب افراط و تفریط کے درمیان ہے اس لیے اس نے بیشتر معاملات میں اعتدال و اقتصاد اور میانہ روی کی تعلیم دی ہے یہاں مزید تفصیل کا موقع نہیں ہے ۲۱ اور ۲۲ پارے میں اس کی تفصیلات آ رہی ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ

فَمَا بَلَّغْتَ رِسَالَتَهٗ ۭ وَاللّٰهُ يَعْصِمُكَ مِنَ النَّاسِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ لَا

يَهْدِي الْقَوْمَ الْكٰفِرِيْنَ ۝ قُلْ يٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ لَسْتُمْ عَلٰي شَيْءٍ

حَتّٰي تُقِيْمُوا التَّوْرٰىةَ وَالْاِنْجِيْلَ وَمَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ ۭ

وَلَيَزِيْدَنَّ كَثِيْرًا مِّنْهُمْ مَّآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ طُغْيَانًا

وَّكُفْرًا ۚ فَلَا تَاْسَ عَلَي الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَالصّٰبِـُٔوْنَ وَالنَّصٰرٰى مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ

وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَعَمِلَ صَالِحًا فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ

يَحْزَنُوْنَ ۝

اے رسول! تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے اس کو اچھی طرح پہنچا دو، اگر تم نے ایسا نہیں کیا تو تم نے پیغام نہیں پہنچایا اور اللہ لوگوں سے تمہاری حفاظت

کرے گا اللہ کافروں کو بامراد نہیں کرے گا[۱۵۴]۔ کہہ دو کہ اے اہل کتاب تم کچھ نہیں ہو جب تک تم تورات و انجیل کو اور جو کچھ تمہاری طرف اب روانہ کیا گیا ہے قائم نہ کرو اور اے پیغمبر جو کچھ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر اتارا گیا ہے وہ ان میں اور زیادہ سرکشی اور انکار کا اضافہ کرے گا آپ ان منکرین پر افسوس نہ کریں[۱۵۵]۔ بلاشبہ اہل ایمان ہوں یا یہودی اور صابی اور نصاریٰ کوئی ہو جو کوئی بھی اللہ اور روزِ آخرت پر ایمان رکھے گا اور نیک عمل کرے گا تو اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہو گا اور نہ کسی طرح کی غمگینی[۱۵۶]۔

پوری دُنیا کو اسلام کی دعوت

ان آیات اور بعد کی آیات میں یہودی و نصاریٰ کی دینی حیثیت پر آخری ضرب لگائی جارہی ہے اور عین اس وقت لگائی جارہی ہے کہ جب وہ پورا زور اس بات پر صرف کر رہے ہیں کہ مسلمان ان کی دینی حیثیت تسلیم کر لیں۔ یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ پورے عرب میں اسلام کی اپوزیشن مدینے میں تسلط کے بعد یہودیوں کی طاقت تھی جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے

ہوتے تھے۔ ان کے ہاتھ میں مضبوط قلعے تھے۔ فن جنگ سے واقف تھے۔ سامان اور اسلحہ وافر رکھتے تھے دولت کی بہتات تھی، باغوں اور زمینوں پر قبضہ تھا۔ عرب کے تمام مادی ذرائع معاش کے وہ تنہا اجارہ دار تھے۔ قرآن نازل ہوا اس طرح کہ اس نے یہودیوں کی ایک ایک برائی کو طشت از بام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا۔ اس لیے انہیں صاف منظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں ابھر کر ان کو بنیاد سے اکھاڑ دے گی۔ چنانچہ قریظہ، بنی نضیر، بنی قینقاع اور یثرب، خیبر، فدک تیماء، وادی القریٰ وغیرہ کے یہودی زمیندار سوداگر، مہاجن، اور قلعہ نشین دل سے چاہتے تھے کہ اس قوت کو کسی طرح ابھرنے نہ دیں اور آخر لڑائیاں پیش آئیں، اور دین توحید کے مقابلے میں انہوں نے اہل شرک کا ساتھ دے کر خندق واحزاب اور غطفان کے معرکے پیش کیے۔ عرب کے سرحدی صوبوں پر ایران اور روم کی سلطنتیں تھیں۔ عراق، یمن اور بحرین پر ایران کی حکومت تھی اور حجاز کی شامی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا۔

یہاں قاضی عبدالجبار الہمدانی ۴۱۵ھ میں اپنی شہرہ آفاق کتاب تثبیت دلائل النبوۃ میں بڑی مفید بات لکھ گئے کہ:

> مدینہ میں حضور انور کی تشریف آوری کے بعد یہود اوس اور خزرج قبیلوں کے پاس چل کر آتے اور بولے کہ تم نے اس شخص کو یعنی حضور انور کو نبی مان کر اپنے خلاف پوری دنیا کا چیلنج قبول کیا ہے۔ یہی بات اوس وخزرج سے عیسائیوں نے بھی کہی اور ان کو عرب میں نصاریٰ کی طاقت سے ڈرایا اور ساتھ ہی روم کے شاہی طاقت کے اندیشے کا بھی ذکر کیا ـــــ ادھر مکہ والے یہود و نصاریٰ کو انگیخت دے رہے تھے کہ کسی نہ کسی صورت سے حضور انور کو قتل کر دیا جائے۔ ایک طرف اوس وخزرج کو باہم ٹکرانے کی سازشیں کر رہے تھے۔ دوسری طرف ان کو مسلمانوں کے خلاف بھڑکا رہے تھے ـــــ یہود کی مدینہ، حجاز اور جزیرہ عرب میں بہت بڑی تعداد تھی، ان کی بستیاں تھیں، ان کے قلعے تھے، ان کے پاس سامان جنگ کی فراوانی تھی۔ ان کے بادشاہوں سے تعلقات تھے اور عرب کے نصاریٰ ان سے بھی زیادہ طاقتور تھے اور ان کی عددی طاقت بھی یہودیوں سے زیادہ تھی۔
>
> تثبیت دلائل النبوۃ ج ۲ ص ۴۰۲

یہاں نبوت کا ان ہی دونوں طاقتوں سے مقابلہ ہے۔ قرآن نے ان کے ہی مقابلہ میں اپنے

پیغمبر سے کہا اور یا ایھا الرسول کے عنوان سے مخاطب کر کے فرمایا کہ اب ڈنکے کی چوٹ جو کچھ آپ کی طرف نازل کیا گیا ہے اسے پہنچا دیجئے آپ کی حفاظت کی ذمہ داری ہماری ہے۔ آپ کے مقابلہ میں کفر ہرگز کامیاب نہ ہوگا۔

۴ ۱۵۔ اے رسول تمہاری طرف جو چیز تمہارے رب کی جانب سے اتاری گئی ہے۔ اس کو اچھی طرح پہنچا دو اگر تم نے ایسا نہ کیا تو تم نے پیغام نہیں پہنچایا اور ان لوگوں سے تمہاری حفاظت فرماتے گا۔ بلاشبہ اللہ کافروں کو بامراد نہیں کرے گا۔ پچھلی آیات میں اہل کتاب کی شرارت اور سیہ کاریوں کا ذکر کر کے تورات وانجیل اور قرآن اور کل کتب سماویہ کی اقامت کی ترغیب دی گئی تھی۔ آئندہ قل یا اھل الکتاب لستم علی شیئ الا سے اہل کتاب کے مجمع میں اعلان کرنا چاہتے ہیں کہ اس اقامت کے بغیر تمہاری مذہبی زندگی بالکل صفر اور لاشے محض ہے یا ایھا الرسول بلغ میں اسی دوٹوک اعلان کے لیے حضور کو تیار کیا گیا ہے۔ یعنی آپ پر جو کچھ پروردگار کی طرف سے اتارا جاتے خصوصاً اس طرح کے فیصلہ کن اعلانات آپ بے خوف وخطر اور بلا تامل پہنچاتے رہیے اگر بفرض محال کسی ایک چیز کی تبلیغ میں بھی آپ سے کوتاہی ہوئی تو بحیثیت رسول ہونے کے رسالت وپیغام رسانی کا جو منصب جلیل آپ کو تفویض ہوا ہے سمجھا جائے گا کہ آپ نے اس کا حق کچھ بھی ادا نہ کیا۔ بلاشبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں فریضہ تبلیغ کی انجام دہی پر بیش از بیش ثابت قدم رکھنے کے لیے یا ایھا الرسول سے بڑھ کر کوئی موثر عنوان نہ ہو سکتا تھا۔ آپ نے بیس بائیس سال تک جس بے نظیر اولوالعزمی، جانفشانی مسلسل جد وجہد اور صبر واستقلال سے فرض رسالت وتبلیغ کو ادا کیا۔ وہ اس کی واضح دلیل ہے کہ آپ کو دنیا میں ہر چیز سے بڑھ کر اپنے فرض منصبی کی اہمیت کا احساس ہے۔ حضور کے اس احساس قوی اور تبلیغی جہاد کو ملحوظ رکھتے ہوتے حالات کے تحت وظیفہ تبلیغ میں مزید استحکام وتثبیت کی تاکید کے موقع پر موثر ترین عنوان یہ ہی ہو سکتا تھا کہ حضور کو یا ایھا الرسول سے خطاب کر کے صرف اتنا کہہ دیا جائے کہ اگر بفرض محال تبلیغ میں ادنیٰ سی کوتاہی ہوئی تو سمجھو کہ آپ اپنے فرض منصبی کے ادا کرنے میں کامیاب نہیں ہوتے۔ اور ظاہر ہے کہ آپ کی تمام کوششوں کا مقصد وحید ہی یہ تھا کہ آپ خدا کے سامنے فرض رسالت کی انجام دہی میں اعلیٰ سے اعلیٰ کامیابی حاصل فرمائیں لہٰذا یہ کس طرح ممکن ہی نہیں ہے کہ کسی ایک پیغام کے پہنچانے میں بھی ذرا سی کوتاہی کریں۔ عموماً یہ تجربہ ہوا ہے کہ فریضہ تبلیغ ادا کرنے میں انسان چند وجوہ سے مقصر رہتا ہے یا تو اسے اپنے فرض کی اہمیت کا کافی احساس

نہیں ہوتا یا لوگوں کی عام مخالفت سے نقصان شدید پہنچنے یا کم از کم بعض مفادات کے خطرے میں پڑ جانے کا خوف ہوتا ہے اور یا مخاطبین کے عام تمرد و طغیان کو دیکھتے ہوئے جیسا کہ پچھلی اور اگلی آیات میں اہل کتاب کی نسبت بتلایا گیا ہے۔ تبلیغ کے مثمر اور منتج ہونے سے مایوسی ہو۔ پہلی وجہ کا جواب یا ایہا الرسول سے فما بلغت رسالتہ تک ہے دوسری کا واللہ یعصمک من النا س میں ہے اور تیسری کا ان اللہ لا یھدی القوم الکافرین۔ میں ہے۔ یعنی اپنا فرض ادا کیے جاؤ اللہ تعالیٰ آپ کی جان اور عزت و آبرو کی حفاظت کرنے والا ہے وہ تمام روئے زمین کے دشمنوں کو بھی آپ کے مقابلے میں کامیاب نہیں کرے گا۔ باقی ہدایت و ضلالت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ ایسی قوم جس نے کفر و انکار ہی پر کمر باندھ لی ہے۔ اگر راہ راست پر نہ آئی تو غم نہ کرو اور نہ مایوس ہو کر اپنے فرض کو چھوڑ دو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ہدایت ربانی اور امین آسمانی کے موافق امت کو ہر چھوٹی بڑی چیز کی تبلیغ کی۔ نوع انسانی کے خواص و عوام میں جو بات جس طبقہ کے لائق اور جس کی استعداد کے مطابق تھی۔ آپ نے بلا کم و کاست اور بے خوف و خطر پہنچا کر خدا کی حجت بندوں پر تمام کر دی۔ اور وفات سے دو ڈھائی ماہ پہلے حجۃ الوداع کے موقع پر جہاں چالیس ہزار سے زیادہ فدایان اسلام اور عاشقان رسول کا اجتماع تھا۔ آپ نے علی روس الاشہاد اعلان فرمادیا کہ۔

"اے خدا گواہ رہ میں تیری امانت پہنچا چکا ہوں" [1]

سلاطین و رؤسا کو دعوت اسلام

پہلے سن چکے ہو کہ سورہ مائدہ کا نزول سنہ کے اواخر یا سنہ کے اوائل میں ہوا ہے اس سورت کے نزول تک پہنچتے پہنچتے حالات میں بہت تغیر واقع ہو چکا تھا۔ اب اسلامی اصول اور نقطہ نظر کے مطابق مسلمانوں کی اپنی مستقل تہذیب بن چکی تھی جو زندگی کی تمام تفصیلات میں دوسروں سے الگ اپنی ایک امتیازی شان رکھتی تھی۔ اخلاق معاشرت تمدن ہر چیز میں اب مسلمان غیر مسلموں سے بالکل ممتاز تھے۔ تمام اسلامی مقبوضات میں مساجد اور نماز باجماعت کا نظم قائم ہو گیا تھا۔ ہر بستی اور ہر قبیلے میں امام مقرر تھے۔ اسلامی قوانین دیوانی و فوجداری بڑی حد

[1] افادات شیخ الاسلام

مکمل تفصیل کے ساتھ بن چکے ہیں اور اسلامی عدالتوں کے ذریعے نافذ ہو رہے تھے۔ لین دین اور خرید و فروخت کے پرانے معاملات بند اور نئے اصلاح شدہ طریقے رائج ہو چکے تھے۔ وراثت کا مستقل ضابطہ بن گیا تھا نکاح اور طلاق نے قوانین زنا اور قذف کی سزائیں جاری ہونے سے مسلمانوں کی معاشرتی زندگی ایک نئے سانچے میں ڈھل گئی تھی۔ اسلامی زندگی کی ایسی مکمل صورت گری ہو جانے کے بعد غیر مسلم دنیا میں اس طرف سے قطعاً مایوسی ہو چکی تھی کہ یہ لوگ جن کا اپنا تمدن بن چکا ہے پھر کبھی ان میں آملیں گے۔ اس موقع پر قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا کہ آپ کا پیغام صرف عرب کے لیے نہیں پوری کائنات انسانی کے لیے ہے۔ اس کے ہر پہلو کی حیثیت عالمی اور آفاقی ہے۔ اور یہ عالمیت و آفاقیت اصل پیغام کے عالمگیر اور آفاق گیر ہونے کی روشن ترین دلیل ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں قرآنی تاریخ کی روشنی میں ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ معاہدہ حدیبیہ کے بعد جب آپ مدینہ منورہ پہنچے تو آپ کو قرآن نے حکم دیا کہ آپ اس پیغام کو پورے عالم میں پہنچا دیجیے اور تمام طاقتوں کو دعوت دیجیے۔ یا ایھا الرسول بلغ ما انزل الیک من ربک چنانچہ محرم ۷ھ کو اسی ارشاد کی تعمیل میں چھ دعوت نامے تیار کیے گئے۔ چونکہ اواخر محرم میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیبر روانہ ہو گئے تھے اس لیے اغلب یہی ہے کہ دعوت نامے اوائل محرم میں روانہ کیے گئے۔ قاضی سلیمان منصور پوری نے لکھا ہے کہ ۷ھ کے محرم کی پہلی تاریخ تھی۔ یعنی ۱۱ مئی ۶۲۸ء۔ ان میں سے ہر ایک کی تفصیل الگ الگ یہ ہے۔

نجاشی شاہ حبشہ کے نام مکتوب

سب سے پہلا گرامی نامہ اصحمہ شاہ حبشہ کے نام تھا جس کا لقب نجاشی ہے۔ یہ والا نامہ حضرت عمرو بن امیہ ضمری کے ہاتھ روانہ کیا گیا۔ اس کے آغاز میں حضرت مسیح علیہ السلام اور حضرت مریم کی کیفیت قرآنی نقطہ نظر سے ٹھیک ٹھیک بیان کر دی گئی تھی جس حصے کا تعلق تبلیغ سے ہے وہ یہ ہے:

میں تجھے اس خدا کی طرف بلاتا ہوں جو یگانہ و یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور اس کی فرمانبرداری پر موالات کی دعوت دیتا ہوں اور اس بات کی کہ تو میری پیروی کر اور اس تعلیم پر ایمان لا جو میرے پاس آئی ہے۔ میں اللہ کا رسول ہوں تجھے اور تیری فوجی طاقت کو اللہ سبحانہ عزوجل کی طرف بلاتا ہوں۔ میں پیغام پہنچا چکا ہوں اور نصیحت کر چکا میری نصیحت کو قبول کرو، سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کا پیرو کار ہو۔

سنجاشی نے بے تامل اسلام قبول کیا اور اپنے جوابی معروضے میں لکھا کہ یارسول اللہ آپ نے مسیح علیہ السلام کے بارے میں جو کچھ فرمایا ہے میں زمین و آسمان کے پروردگار کی قسم کھا کر کہتا ہوں کہ حضرت مسیح رتی بھر بھی اس سے زیادہ نہیں ہیں۔ آپ کے عم زاد بھائی اور ان کے رفیق ہمارے مقرب ہیں۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ آپ اللہ کے سچے رسول ہیں۔

قیصر روم کے نام والا نامہ

دوسرا دعوت نامہ ہرقل قیصر روم کے نام تھا۔ اس کے لیے دحیہ ابن خلیفہ الکلبی کو قاصد یا سفیر مقرر کیا گیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عام مکاتیب گرامی کی طرح یہ مکتوب گرامی بھی تکلف سے پاک اور مبرا اور صرف مطلب پر مشتمل تھا۔

میں تجھے اسلام کی دعوت دیتا ہوں۔ اسلام قبول کرلے ساری آفات سے محفوظ ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ تجھے دوگونہ اجر دے گا اور اگر روگردانی کی تو تیرے سارے شہریوں کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔ اور اے اہل کتاب اختلاف و نزاع کی ساری باتیں چھوڑ کر آؤ۔ اس بات پر جو ہمارے اور تمہارے درمیان یکساں طور پر مسلم ہے یعنی اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ کسی ہستی کو اس کا شریک نہ ٹھہرائیں۔ ہم میں سے کوئی بھی کسی انسان سے ایسے برتاؤ کا روادار نہ ہوگا گویا خدا کو چھوڑ کر اسے رب بنالیا۔ پھر اگر اس سے روگردانی کروگے تو گواہ رہو کہ ہم خدا کے فرمانبردار ہیں یعنی اسی کو ماننے والے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دحیہ کو تاکید فرمائی تھی کہ یہ خط حاکم بصریٰ کے ذریعے پیش کیا جائے۔ حضرت دحیہ نے اسی ہدایت پر عمل کیا۔ قیصر اس زمانے میں بیت المقدس آیا ہوا تھا۔ دحیہ نے مکتوب گرامی حارث غسانی حاکم بصریٰ کی وساطت سے قیصر کے پاس بھجوایا۔ ہرقل اس سے متاثر ہوا جو لوگ عرب کے حالات سے واقف تھے ان سے بھی مختلف باتیں دریافت کیں۔ اتفاق سے وہاں ابوسفیان ایک قافلے کے ساتھ تجارت کے لیے پہنچا ہوا تھا۔ قیصر نے ابوسفیان سے گفتگو میں بہت سے سوالات کیے۔ اس وقت تک ابوسفیان قریش مکہ کا لیڈر تھا۔ اس کے باوجود اسے کوئی بات ایسی نہ مل سکی جسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف بطور الزام پیش کرسکتا۔ قیصر کو بظاہر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا پختہ یقین ہوگیا۔ پھر اس نے رومیہ کے حاکم اور اسقف ضغاطر کے نام ایک خط دحیہ کو دے کر بھیجا کہ اس کی رائے معلوم کرے۔ ضغاطر کے نام ایک خط حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

نے بھی دیا تھا۔ صغاطر نے رسول اللہ کی رسالت کی تصدیق کی لیکن قیصر یا درباریوں کی مخالفت سے اتنا خوفزدہ ہوا کہ اسلام کے قبول کرنے کا حوصلہ نہ کر سکا۔

خسرو پرویز شہنشاہ ایران کے نام

تیسرا دعوت نامہ ایران کے مشہور شہنشاہ خسرو پرویز کے نام تھا، جو فرہاد و شیریں کے سلسلے میں ہمارے فارسی اور اردو ادبیات کی ایک معروف شخصیت بنا ہوا ہے۔ یہ بھی دوسرے دعوت ناموں کی طرح نہایت سادہ اور مختصر تھا اسے ذیل میں من و عن درج کیا جاتا ہے؛

اللہ کے نام سے جو رحمن و رحیم ہے۔ اللہ کے رسول محمد (صلعم) کی طرف سے کسریٰ کے نام جو ایران کا حکمران ہے۔ سلامتی ہو اس پر جو ہدایت کی پیروی کرے۔ اللہ پر اور اس کے رسول پر ایمان لائے، میں گواہی دیتا ہوں کہ خدا کے سوا کوئی معبود نہیں اور میں اللہ کا رسول ہوں، جسے پورے عالم انسانیت کی ہدایت کے لیے بھیجا گیا ہے تاکہ جو لوگ زندہ ہیں انہیں بدعملیوں کے نتائج سے ڈرایا جاسکے، اسلام قبول کرے ورنہ ساری مجوسی قوم یعنی اس وقت کے اہل ایران کا وبال تیری گردن پر ہوگا۔

یہ دعوت نامے لے جانے کے لیے عبداللہ بن حذافہ سہمی مقرر ہوتے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں تاکید فرمادی تھی کہ دعوت نامہ حاکم بحرین کے پاس لے جائیں اور اس کی وساطت سے کسریٰ کے دربار میں پیش کریں۔ عبداللہ بن حذافہ نے اس ہدایت پر حرفاً حرفاً عمل کیا، جب یہ خسرو کے دربار میں پیش ہوا تو وہ محض رسول اللہ کا اسم گرامی اپنے نام سے پہلے دیکھ کر مشتعل ہو گیا، کیونکہ ساسانیوں کے مقررہ آداب کے مطابق ساسانی شہنشاہ کا نام ہر حال میں پہلے آنا چاہیے تھا۔ عربوں کے طریق مکتوب نگاری کے مطابق کاتب اپنا نام پہلے اور مکتوب الیہ کا نام بعد میں لکھتا تھا اور یہی طبعی و فطری طریق تھا۔

پرویز کی سیہ نصیبی

پھر یہ مئی ۶۲۸ء کا واقعہ ہے جب پرویز رومیوں پر غیر معمولی فتوحات کے بعد پے در پے شکستیں کھا ہوا اپنی سلطنت کے بچاؤ کے لیے شدید تشویشات میں مبتلا تھا۔ ۱۲-۱۰ دسمبر ۶۲۷ء کو نینوی میں آخری خوفناک شکست نے اس پر اک گونہ وحشت کی کیفیت طاری کر رکھی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات ہر فرد کے احساسات میں غیر معمولی رکاوٹ پیدا کر دیتے ہیں اور وہ بھی معاملے کو معمولاً و مروجات

کے رنگ میں دیکھنے کے قابل نہیں رہتا بلکہ ہر معاملے کو اس رنگ میں دیکھتا ہے گویا جو کچھ اس کے سامنے آرہا ہے وہ اس کی شکستوں، ہزیمتوں اور بے چارگیوں کے ہجوم میں دل ہر چیز کے کھٹکنے کے لیے بڑا اہتمام خاص تیار کیا جارہا ہے۔ پرویز نے جوش غیظ و اشتعال میں نامہ مبارک کو چاک کر ڈالا، رسول اللہ کو یہ اطلاع ملی تو فرمایا، خدا اس کے اقتدار سلطنت کو پارہ پارہ کرے۔ یہی ہوا، پہلے پرویز کا ورق تقدیر ٹکڑے ٹکڑے ہوا، پھر وہ جس سلطنت کے عزور و شوکت میں نامہ مبارک چاک کرنے کی جسارت پر آمادہ ہوا تھا وہ تختۂ قرطاس کی طرح پارہ پارہ کر دی گئی۔

نامہ مبارک چاک کرنے کے بعد پرویز نے یمن کے نائب الحکومت بازان کو حکم دیا کہ حجاز کے مدعی نبوت کو ہمارے پاس بھیجا جائے۔ بازان نے دو آدمی ایک خط دے کر مدینہ منورہ بھیجے جن میں سے ایک کا نام قہرمانہ تھا۔ حضور انور خط دیکھ کر مسکرائے اور فرمایا، کل مجھ سے جواب لینا، وہ دوسرے روز حاضر ہوئے تو آپ نے فرمایا:

> "اپنے صاحب (بازان) کو یہ خبر پہنچا دو کہ اس کے رب (پرویز) کو میرے رب (اللہ تعالیٰ) نے قتل کر دیا۔" یہ واقعہ سہ شنبہ کی رات ۱۰ جمادی الاولیٰ سنہ ۷ھ (مطابق ۱۴ ستمبر ۶۲۸ء) کو پیش آیا۔ رات کی سات گھڑیاں گزری تھیں (یعنی دو گھنٹے اور اٹھائیس منٹ)

جب کسی قوم پر بدبختی کا دور آتا ہے تو وہ اپنے ہاتھوں اپنا سب کچھ برباد کر ڈالتی ہے۔ شیرویہ نے باپ یعنی خسرو کو اس لیے قتل کر دیا کہ وہ شکستیں کھا رہا تھا اور صلح کے لیے تیار نہ تھا۔ شیرویہ نے بادشاہ بنتے ہی رومیوں کی شرطیں مان کر صلح کر لی۔ شیرویہ نے باپ کو اس لیے قتل کیا ہوگا کہ عسکری اور کشوری سب لوگ اس کے خلاف ہو گئے تھے۔ پھر شیرویہ نے خاندان کے ایک ایک مرد کو چن چن کر قتل کیا تاکہ کوئی مدعی سلطنت باقی نہ رہے۔ صرف وہی ایک دو بچے جو اس کی دسترس سے باہر تھے لیکن خود بھی چھ ماہ کے اندر اندر گناہوں کا گرانبار پشتارہ اٹھا کر اس عالم میں پہنچ گیا، جہاں محاسبۂ نیک و بد سے کسی کے لیے بھی مفر نہیں۔

والیِ مصر

چوتھا دعوت نامہ مقوقس کے نام تھا جو اسقف اعظم کے منصب پر فائز تھا۔ اور قیصر نے سنہ ۶۳۱ء میں اسے ملکی نظم و نسق کے لیے اپنی طرف سے نمائندہ بنا دیا تھا۔ اس دعوت نامے کے لیے

حاطب بن ابی بلتعہ نے اپنے آپ کو پیش کیا اور حضور والا نے فرمایا ہ بارک اللہ فیک یا حاطب ،، (حاطب خدا تجھے برکت سے نوازے) اس دعوت نامے کی عبارت بھی وہی تھی جو قیصر روم کے دعوت نامے کی تھی اور وہ اوپر نقل ہو چکا تھا۔

سیوطی نے "حسن المحاضرہ" میں لکھا ہے حاطب سکندریہ پہنچے تو مقوقس کشتی پر دریائے نیل میں سیر کر رہا تھا۔ حاطب نے بھی ایک کشتی کرایہ پر لے لی تاکہ نامہ مبارک جلد سے جلد مقوقس کے پاس پہنچ جائے۔ مقوقس نے پوچھا کہ اگر تمہارا نبی سچا ہے تو خدا سے یہ دعا کیوں نہیں مانگا کہ اسے وطن سے نکالنے والے مخالفین تباہ ہو جائیں۔

حاطب نے بلا توقف جواب دیا کہ آپ کے عقیدے کے مطابق یہودیوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو سولی دی اور سولی ہی پر ان کی موت واقع ہوئی۔ انہوں نے خدا سے دعا مانگ کر دشمنوں کو ہلاک کیوں نہ کرا دیا؟

مقوقس نے جواب دیا کہ بے شک تو خود بھی دانا ہے اور جس کا تو سفیر ہے وہ بھی دانا اور حکیم ہے پھر نامہ مبارک کو ہاتھی دانت کی دو تختیوں کے درمیان رکھوا کر سرکاری خزانے میں محفوظ کرا دیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ایک عریضہ بڑے اچھے انداز میں لکھا۔ اس میں کہا کہ یہ تو مجھے علم تھا کہ ایک نبی آنے والا ہے لیکن میرا گمان تھا وہ شام میں ظاہر ہوگا۔ ساتھ ہی حضور انور کی خدمت میں دو معزز قبطی لڑکیاں، قیمتی کپڑا اور ایک خچر بھیجا۔ یہی خچر دلدل کے نام سے مشہور ہے جو رسول اللہ کے بعد حضرت علی کے پاس رہا۔

لڑکیوں میں سے ایک حضرت ماریہؓ تھیں جو رسول اللہ کے صاحبزادے حضرت ابراہیم کی والدہ تھیں۔ دوسری سیرین جسے حضور نے حضرت حسانؓ کے سپرد فرما دیا تھا۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ دلدل جیسا خچر اس زمانے میں عرب کے اندر کوئی نہ تھا۔ غالباً اسی وجہ سے اسے تحفہ خاص کے طور پر بھیجا گیا۔

حاکم یمامہ

پانچواں دعوت نامہ ہوزہ بن علی حاکم یمامہ کے نام تھا یہ سلیط بن قیس بن عمرو العامری کے ذریعے سے بھیجا گیا تھا۔ یمامہ آجکل دولت سعودیہ کا حصہ ہے اس کے حدود اربعہ یہ ہیں شمال میں سنجد، مغرب میں حجاز و یمن، جنوب میں احقاف و ربع الخالی، مشرق میں عمان بحرین اور خلیج فارس، بحرین و یمن کی طرح یمامہ بھی ساسانیوں کے زیر اثر آ گیا تھا لیکن ہوزہ اور اس کے

ہم قوم عرب تھے۔ ہوزہ کے نام جو دعوت نامہ بھیجا گیا وہ بہت مختصر تھا۔ آغاز میں فرمایا گیا تھا کہ دین اسلام عرب و عجم میں ہر جگہ پہنچے گا اور غالب رہے گا۔ پھر وہی دو لفظ تھے جو دعوت ناموں میں عموماً آتے یعنی اسلم، تسلم، اسلام قبول کرلے تو محفوظ رہے گا۔

ہوزہ نے نامہ مبارک بھی پڑھا پھر حضور انور کے سفیر کی ایک نہایت پُر تاثیر تقریر بھی سنی۔ یعنی ہر کہ تو ایک بڑی قوم کا سردار ہے، تیری توجہ سے تیری قوم ایمان کی سعادت کبریٰ حاصل کر سکتی ہے میں تجھے بہترین چیز یعنی اسلام قبول کرلینے کا مشورہ دیتا ہوں اور بدترین چیز یعنی کفر سے بچاتا ہوں۔ اللہ کی عبادت کے لیے کہتا ہوں اور شیطان کی عبادت سے روکتا ہوں۔

لیکن ہوزہ اسلام کی دولت سرمدی سے محروم رہا اور حضور انور فتح مکہ اور غزوہ حنین و طائف سے فارغ ہوکر مدینہ منورہ پہنچے تو اطلاع ملی کہ ہوزہ فوت ہوگیا ہے۔ اس کی قوم کے ایک وفد نے حاضر ہوکر اسلام قبول کیا

حارث بن ابی شمر غسانی

چھٹا دعوت نامہ شجاع بن وہب اسدی کے ذریعے سے حارث بن ابی شمر غسانی کو بھیجا گیا۔ حارث کا مرکز دمشق تھا، مگر جب شجاع پہنچے تو حارث سخت مصروف تھا کیونکہ قیصر ہرقل بیت المقدس آرہا تھا اور اس کے لیے جا بجا رسد اور استقبال کے انتظامات حارث ہی کے ذمے تھے۔ شجاع نے حارث کے ایک حاجب سے رابطہ استوار کرلیے۔ اس نے رسول اللہ کے مفصل حالات سن کر اسلام قبول کرلیا، پھر دمشق کے ایک دربار میں نامہ مبارک پیش ہوا۔

اس میں فرمایا گیا تھا کہ اللہ پر ایمان لے آ، وہ یگانہ و یکتا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں، تیرا ملک تیرے پاس محفوظ رہے گا۔ حارث نے کہا کہ میرا ملک مجھ سے کون چھین سکتا ہے! پھر قیصر کو لکھا کہ مجھے عرب پر حملہ کی اجازت دی جائے۔ نیز گھوڑوں کی نعل بندی کا حکم دے دیا، پھر قیصر کی طرف سے جواب آیا کہ بالفعل یہ ارادہ ترک کردو اور بیت المقدس پہنچو۔ پھر حارث نے ایک سو مثقال سونا شجاع بن وہب کو دینے کا حکم صادر کیا۔ حاجب نے جو خفیہ خفیہ مسلمان ہو چکا تھا زادِ راہ اور پارچے دیے۔

حارث کی وفات ۸ھ میں ہوئی یعنی جس سال مکہ مکرمہ فتح ہوا۔

مزید قاصد

محرم سنہ ۷ھ میں ایک ہی وقت چھ قاصد بھیجے گئے اس کے بعد بھی یہ سلسلہ جاری رہا۔ مثلاً ۱۔ عبداللہ بن حذافہ جو خسرو پرویز کے نام دعوت نامہ لے کر گئے تھے۔ ان کے ہاتھ ایک دعوت نامہ ہرمزان کے نام بھی بھیجا گیا تھا۔ جو اس علاقے کا حکمران تھا جسے آج کل خوزستان کہتے ہیں۔ اہواز، سوس، رام ہرمز اور تستر یا ششتر مشہور شہر تھے۔ غالباً اسی کو ایک زمانے میں "سوسیانہ" کہتے تھے۔ یہ نامہ گرامی بھی مختصر تھا۔ ہرمزان نے حضرت عمرؓ کے عہد خلافت میں اسلام قبول کرلیا۔

۲۔ ایک دعوت نامہ علاء بن حضرمی کے ہاتھ منذر بن ساویٰ حاکم بحرین کے نام بھیجا گیا تھا۔ یہ فتح مکہ کے بعد کا واقعہ ہے۔ منذر بن ساویٰ اور اس کے بہت سے ہم قوموں نے اسلام قبول کرلیا۔ حضور انورؐ نے علاء بن حضرمی کو زکوٰۃ وصدقات اور غیر مسلموں سے جزیے کی تحصیل کے لیے مقرر فرمایا۔ ایک نامہ مبارک بعد میں ابوہریرہ کے ہاتھ بھیجا گیا۔

۳۔ ایک دعوت نامہ جبلہ بن ایہم غسانی کو بھیجا گیا تھا۔ اس نے برضا ورغبت اسلام قبول کرلیا۔ سنہ ۱۴ھ (اوائل سنہ ۶۳۵ء) میں وہ حج کے موقعہ پر مکہ مکرمہ پہنچا۔ طواف میں جبلہ کی چادر کا ایک گوشہ اتفاقاً ایک بدوی عرب کے پاؤں تلے دب گیا۔ جبلہ نے بے تامل بدوی کو طمانچہ رسید کیا۔ معاملہ حضرت عمرؓ کے پاس پہنچا تو فیصلہ ہوا کہ جبلہ کو بدلہ دینا ہوگا۔ وہ سمجھتا تھا کہ شہزادے کی عزت عامی شخص کے مقابلے میں بہت زیادہ ہوگی۔ جب معلوم ہوا کہ قانون شریعت کی نگاہ میں شاہ و گدا کے درمیان کوئی تمیز نہیں تو وہ رات کو چھپ کر نکلا اور شام پہنچا اور وہاں سے عیسیٰ بن کر قسطنطنیہ چلا گیا۔ مگر تمام عمر اس حرکت پر حسرت و افسوس کے آنسو بہاتا رہا۔

۴۔ ایک دعوت نامہ جیفر بن جلندی حاکم عمان کے نام ذیقعدہ سنہ ۸ھ فروری سنہ ۶۳۰ء میں بھیجا گیا یہ عمرو بن العاص لے گئے تھے۔ جیفر کا بھائی عبد بہت صالح اور نیک تھا۔ پھر دونوں بھائیوں نے اسلام قبول کرلیا اور اسلامی احکام جاری کردیے۔ اس میں نیکی اور سعادت کا زیادہ تر حصہ دار عبد ہی تھا۔

۵۔ ایک دعوت نامہ مسعود بن سعد کے ہاتھ فروہ بن عمرو الجزامی کے نام بھیجا گیا جو قیصر روم کی طرف سے معان کا گورنر تھا۔ اس نے اسلام قبول کرلیا۔ ایک گھوڑا، ایک سفید خچر، ایک عربی گدھا اور عمدہ پارچات بطور تحفہ بھیجے۔ ان میں ایک عبا سندس کی تھی جس کا حاشیہ سنہری تاروں سے مزین تھا۔ اس پر پادریوں میں شور برپا ہوا۔ قیصر نے فروہ کو اسلام سے منحرف کرنا چاہا لیکن

کامیابی نہ ہوئی لہذا پہلے اس مرحوم کو قید کیا۔ پھر فلسطین کے ایک چشمے کے پاس جس کا نام عفرا تھا اسے قتل کرا دیا۔ فروہ نے راہ حق میں یہ تمام آفتیں صابرانہ برداشت کرلیں۔
دین حق پر فروہؓ کے ثبات واستواری کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ سزائے موت کے وقت یہ شعر اس کی زبان پر تھا۔

مسلمان سرداروں تک میری یہ بات پہنچا دو
کہ پروردگار کی راہ میں میرا جسم اور میری عزت نثار ہیں

متفرق دعوت نامے

ان کے علاوہ بے شمار دعوت نامے تھے جن کی تفصیل کے لیے دفتر درکار ہیں، ان کے صرف نام لکھے جاتے ہیں۔

۱۔ ہلال بن امیہ (بحرین کا ایک رئیس)
۲۔ امیر بصریٰ۔ یہی نامہ گرامی تھا جسے پہنچانے کے لیے حارث بن عمیرؓ تجویز ہوئے تھے مگر شرجیل حاکم موتہ نے انہیں راستے ہی میں شہید کرا دیا۔ اسی وجہ سے موتہ کی جنگ پیش آئی۔
۳۔ اُکیدر حاکم دومۃ الجندل
۴۔ قبیلہ بنی کلب اور اس کے سردار اصبغ بن عمرو
۵۔ ذوکلاع اور ذوعمرو کے قبیلے کا خاندان
۶۔ حکمرانانِ حمیر کے افراد و خاندان
۷۔ سرداران حضرموت
۸۔ سردار آئند
۹۔ البحت سردار جمر
۱۰۔ بنی حارثہ
۱۱۔ بنی عذرہ
۱۲۔ شاہ سمارہ
۱۳۔ امرائے بنی وائل
۱۴۔ بنی زہیر

۵۔ مختلف سرداران عرب جن کی تعداد چالیس اور پچاس کے درمیان ہے۔
یہ ان دعوت ناموں کی سرسری کیفیت ہے جو مختلف روایتوں میں محفوظ رہ گئے۔ حقیقی تعداد اور کیفیت کا صحیح اندازہ کون کر سکتا ہے۔
اگرچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کا ایک ایک لمحہ تبلیغ حق ہی کے لیے وقف تھا چونکہ آپ کی رسالت مقامی نہیں بلکہ عالمی و آفاقی تھی اس لیے اس کے لیے تبلیغ کا اہتمام بھی خاص اہتمام چاہتا تھا۔ اس آیت میں اسی اہتمام کی طرف آپ کو متوجہ کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت سے یہ آپ کے فرائض میں داخل ہے کہ عالمی طاقتوں تک آپ یہ پیغام پہنچائیں تاکہ اللہ کی حجت ان پر تمام ہو۔ اس معاملے پر غور کا ایک اور پہلو بھی ہے۔
۱۔ خدا رب العالمین ہے۔
۲۔ اس کا رسول پاک رحمۃ للعالمین ہے۔
۳۔ خود ما انزل الیک ذکر للعالمین ہے۔
۴۔ دین حق کا مرکز مشہود یعنی کعبہ مبارک ہدی للعالمین ہے۔
غرض اس کی ہر حیثیت عالمی اور آفاقی ہے
بتانا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن کی یہ آیت تبلیغ کے عالمی اور آفاقی کرنے کی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت کر رہی ہے اور جن حالات میں کر رہی ہے ان کی سنگینی کا حال تاریخ کے طالب علم سے پوشیدہ نہیں ہے اور قرآن میں واللہ یعصمک من الناس کا فقرہ بھی حالات کی سنگینی کو بتا رہا ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مراد رومی عیسائی اہل کتاب ہی ہیں۔ کیونکہ اس وقت اگرچہ ایران کے مجمانی فرمانی شہنشاہی کے اوراق منتشر تھے لیکن روم کے حالات اس سے بالکل مختلف تھے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضور انور کو اطمینان دلایا کہ حالات کی پرواز کیجیے آپ کی حفاظت کا اللہ نے ذمہ لیا ہے چنانچہ حضور انور نے بے دھڑک ہو کر حالات کی ساری سنگینی کے باوجود اردگرد کے تمام سلاطین و روسا کو دعوت دی اللہ سبحانہ نے یہاں دونوں باتیں بتا دی ہیں ایک یہ کہ اللہ آپ کی حفاظت فرمائے گا اور دوسری یہ کہ آپ کے مقابلے میں وہ کامیاب نہ ہوں گے۔ تیسری بات یہاں سے خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ حالات آپ کے ساتھ ہوں گے اور مستقبل میں آپ کی کامیابی یقینی ہے۔ چونکہ اس وقت رومیوں کی طاقت سب سے بڑی طاقت تھی۔ اسی لیے قرآن نے یہاں عیسائیت کا بھرپور چہرہ پیش کیا ہے۔ حبشہ میں عیسائی، روم میں عیسائی، مصر میں عیسائی غرض کہ مدینے کی اردگرد اصل طاقت کا مرکز عیسائی قوم تھی۔

ادھر یہودی مایوسیوں کے بعد اپنی آخری بازی کھیلنے کے لیے آخری درجہ میں ان طاقتوں کا سہارا لے رہے تھے۔ اس کا اندازہ اس نقشہ سے ہو سکتا ہے۔ یہ آیت تبلیغ کے نزول کے زمانے کا عرب ہے اس سے آپ کو معلوم ہوگا کہ خلیج فارس کی سمت چھوڑ کر عرب کے شمال میں مملکت بنی غسان اور جنوب میں نجران اور بحر ابیض کی جانب سلطنت روم اور بحر احمر کی جانب سلطنت نجاشی حبشہ میں موجود ہے۔

شیعوں کا عجیب استدلال

خبر نہیں ہمارے شیعہ دوستوں کو کیا ہوگیا کہ اس آیت گرامی کی عالمی اور آفاقی حیثیت کو حضرت علی کی خلافت کے مسئلہ کی آڑ میں مجروح کر دیا ہے۔ گویا ان کے خیال میں نبوت کو اسلام کے لیے عالمی طاقتوں سے کوئی اندیشہ نہ تھا بلکہ حضرت علی کی خلافت کے بارے میں خود اہل ایمان سے خطرہ تھا۔ چنانچہ علامہ طبرسی نے یہی بات مجمع البیان میں لکھی ہے اور اس کو زوردار بنانے کے لیے ایک داستان بھی سنائی ہے لیجئے خود ان کی زبانی سن لیجئے،

> کلبی ابوصالح کے حوالے سے کہتے ہیں کہ عبداللہ بن عباس اور جابر بن عبداللہ نے بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور انور کو حکم دیا کہ حضرت علی کا امامت کے لیے تقرر فرمائیں اور لوگوں کو اس کی اطلاع کریں لیکن (معاذ اللہ) حضور انور ڈر رہے تھے کہ لوگ کہہ دیں گے کہ اپنے بھتیجے کے لیے راہ بنا رہے ہیں۔ اللہ نے آپ پر اس آیت کی وحی فرمائی۔ آپ نے غدیر خم والے روز اس کا اعلان کیا۔

انا للہ فالی اللہ المشتکی دیکھ لیا آپ نے کہ بات کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ آیت نازل ہو رہی ہے سنہ ۸ھ کے اواخر میں اور اس کی پیوندکاری کی جا رہی ہے سنہ ۱۰ھ سے حجۃ الوداع کے بعد اگرچہ اس آیت گرامی کا اس سے کوئی پیوند نہیں ہے لیکن آ گئے ہیں تو اس کے متعلق بھی کچھ کام کی باتیں ذہن میں تازہ کر لیجئے۔

غدیر خم کا خطبہ اور مسئلہ امامت

حجۃ الوداع سے فارغ ہو کر جب حضور مکہ سے واپس ہوتے اور غدیر خم پر پہنچے۔ خم بضم خاء معجمہ تشدید میم جحفہ سے تین میل پر مکہ اور مدینہ کے درمیان ایک مقام ہے۔ یہاں ایک غدیر ہے یعنی

آیت تبلیغ کے زمانے کا عرب

نوٹ: خط کشیدہ اسماء مقامات ہیں باقی تمام نام قبائل کے ہیں ۔

تالاب ہے۔ اس جگہ جب حضور پہنچے تو ایک خطبہ ارشاد فرمایا۔ صحیح مسلم میں حضرت زید بن ارقم کی روایت ہے کہ اس خطبہ میں آپ نے پہلے خدا کی حمد و ثنا بیان کی، پھر وعظ و نصیحت کی، اس کے بعد فرمایا۔

اما بعد۔ اے لوگو میں انسان ہوں۔ شاید میرے پاس میرے رب کا قاصد آئے گا یعنی ملک الموت اور میں قبول کروں گا اور تم میں دو بھاری چیزیں چھوڑے جاتا ہوں۔ پہلی چیز کتاب اللہ ہے اس میں ہدایت اور نور ہے تو خدا کی کتاب کو پکڑے رہو اور اسی سے دلیل لیا کرو۔ لوگوں کو کتاب اللہ کی طرف بہت رغبت دلائی۔ پھر فرمایا کہ دوسری چیز اہل بیت ہیں۔ میں اپنے اہل بیت کے بارے میں تم کو خدا کی یاد دلاتا ہوں۔

یہ الفاظ صحیح مسلم کے ہیں۔ لیکن امام احمد نے حضرت براء بن عازب اور زید بن ارقم سے روایت کی ہے کہ جب حضور غدیر خم پر ٹھہرے تو حضرت علی کا ہاتھ پکڑ کر فرمایا۔

کیا تم لوگ نہیں جانتے کہ میں مومنین کے لیے اُن کی اپنی ذاتوں سے اولیٰ ہوں سب نے کہا کہ ہاں۔ فرمایا کہ کیا تم کو معلوم نہیں کہ میں ہر مومن کے لیے اس کے اپنے نفس سے اولیٰ ہوں، سب نے کہا کہ ہاں۔ تب فرمایا کہ اے اللہ جس کا میں مولا ہوں، اس کا علی بھی مولا ہے۔ اے اللہ جو علی کو دوست رکھے ان کو تو دوست رکھ۔ اور جو علی سے عداوت کرے اُس سے تو عداوت کر۔ اس کے بعد حضرت علی سے حضرت عمر ملے تو کہا کہ مبارک ہو اے ابن ابی طالب آپ ہر مومن مرد و عورت کے مولا ہو گئے۔

ترمذی میں بھی حضرت زید بن ارقم سے مروی ہے کہ غدیر خم کے خطبہ میں حضور نے یہ فرمایا من کنت مولاہ فعلی مولاہ اور طبرانی وغیرہ نے بسند صحیح روایت کیا ہے کہ حضور نے غدیر خم میں شجرات کے نیچے خطبہ ارشاد فرمایا۔ اس میں کہا کہ میرے رب لطیف خبیر نے مجھ کو خبر دی ہے کہ ہر نبی کی عمر اس کے پہلے نبی سے نصف ہوتی ہے اس لیے میرا گمان ہے کہ اب میں بلایا جاؤں اس کے بعد لوگوں کو اسلامی تعلیمات یاد دلائیں اور ضروریات دین کی تعلیم فرمائی۔ پھر فرمایا:

اے لوگو! بے شک اللہ میرا مولیٰ ہے اور میں مومنین کا مولیٰ ہوں۔ اور ان کے لیے اُن کی اپنی ذاتوں سے اولیٰ ہوں تو جس کا میں مولیٰ ہوں اس کا یہ مولیٰ ہے یعنی حضرت علی، اے اللہ جو علی کو دوست رکھے اس کو تو دوست رکھ اور جو علی سے عداوت رکھے اس سے تو عداوت رکھ۔

اس خطبہ میں حضور کے اس ارشاد کی ضرورت کیا پیش آئی تھی۔ اس کو ابن حجر مکی نے صواعق محرقہ میں ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ حافظ شمس الدین جزری نے ابن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ جو لوگ حضرت علی کے ساتھ یمن گئے تھے اُن میں بعض حضرت علی سے ناراض ہو گئے تھے۔ اور صحیح بخاری سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت بریدہ کو حضرت علی کے ایک فعل کی وجہ سے حضرت علی سے بغض ہو گیا تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی تردید کی۔ حافظ ذہبی نے اس کی تصحیح کی ہے کہ حضرت بریدہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے شکایت کی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ مبارک متغیر ہو گیا اور حضرت بریدہ خود کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

اے بریدہ! کیا میں مومنین کے لیے اُن کے نفسوں سے اولیٰ نہیں ہوں، میں نے کہا ہاں یا رسول اللہ! تو فرمایا کہ جس کا میں مولا ہوں اس کا علی مولا ہے۔

ابوداؤد والسجستانی اور حاتم الرازی وغیرہ نے اس روایت کی صحت میں کلام کیا ہے مگر ابن حجر مکی لکھتے ہیں کہ سولہ صحابیوں نے اس قصہ کو روایت کیا ہے اور امام احمد کی ایک روایت ہے کہ تیس صحابہ بیان کرتے ہیں کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا اور حضرت علی کی خلافت کے ایام میں جب آپس میں اختلافات پیدا ہوتے تو اُن اصحاب نے حضرت علی کی فضیلت پر اس سے استدلال کیا۔ یہ روایت مختلف اسانید سے مروی ہے جن میں بعض صحیح ہیں بعض حسن۔ اس لیے یہ روایت یقیناً صحیح ہے اور بعض ائمہ حدیث کے اختلاف کے باوجود صحیح ہے اور بلاشبہ اس سے حضرت علی کی بہت بڑی فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ آپ تمام مومنین کے مولیٰ ہیں۔ آپ کا دوست خدا اور رسول کا دوست ہے۔ اور آپ کا دشمن خدا اور رسول کا دشمن ہے۔

لیکن شیعوں نے اس روایت کو حضرت علی کی خلافت پر سب سے بڑا استدلال بنایا ہے اور شیخین کی خلافت کے خلاف اس سے استدلال کیا ہے وہ محض لغو ہے اور چونکہ شیعوں کے نزدیک مسئلہ امامت پر صرف متواتر روایات سے استدلال کیا جا سکتا ہے اس لیے وہ اس روایت کو متواتر بھی کہتے ہیں وہ بھی محض جھوٹ ہے۔

معلوم ہو چکا ہے کہ بعض ائمہ حدیث کو اس کی صحت میں بھی کلام ہے، متواتر کہاں۔ بخاری نے اس قصہ کو روایت ہی نہیں کیا، امام مسلم خطبہ کا ذکر کرتے ہیں اور اس کے الفاظ بھی روایت کرتے ہیں مگر اس میں وہ الفاظ نہیں ہیں جس پر بحث کی بنیاد ہے یعنی من کنت مولاہ فعلی مولاہ یہ حدیث کثرت طرق کی وجہ سے اگر صحیح بھی ہو پھر بھی امامت پر استدلال اس سے کسی طرح صحیح نہیں۔ مولیٰ چند

معانی میں مشترک ہے۔ معتق، عتیق، ناصر، محبوب، متصرف فی الامر۔ لیکن کوئی معنی خلافت یا امامت کو مستلزم نہیں ہے۔ اور اگر بالفرض امام اور مطاع کے معنی بھی اس کے لیے جائیں تو اس کا یہ مطلب تو قطعاً نہیں ہو سکتا کہ حضرت علی اسی وقت امام المومنین تھے جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہا، اس لیے کہ اس وقت خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم موجود تھے لامحالہ مطلب یہ ہوگا کہ بیعت کے بعد امام حق ہوں گے جیسا کہ ہوتے۔ اس سے شیخین کے مقابلہ میں خلافت وامامت بلافصل پر استدلال کیونکر صحیح ہوگا۔

تعجب ہے کہ یہ لوگ اس زور شور سے اس روایت کو حضرت علی کی امامت کے ثبوت میں پیش کرتے ہیں لیکن یہ نہیں دیکھتے کہ جس وقت خلافت وامامت کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی نہ حضرت علی نے خود اس کو استدلال میں پیش کیا نہ حضرت عباس نے نہ بنی ہاشم نے نہ کسی دوسرے صحابی نے۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں خلافت کے مسئلہ پر گفتگو ہوئی۔ جلیل القدر مہاجرین وانصار اس میں شریک تھے اور وہ صحابہ بھی شریک تھے جو غدیر خم کے خطبہ میں موجود تھے۔ اس خطبہ کے بعد صرف دو مہینے درمیان میں گزرے تھے مگر کسی نے امامت پر اس سے استدلال نہیں کیا۔ البتہ انہی لوگوں نے پیچھے حضرت علی کی فضیلت پر اس سے استدلال کیا ہے۔

اس کے علاوہ حضرت علی نے بار بار تصریح کر دی ہے کہ حضور نے کسی کی امامت یا خلافت کی تعیین وتصریح نہیں کی۔ خلافت کا انعقاد مسلمانوں کے مشورہ سے ہوا۔ بے شمار روایتیں حضرت علی سے اس باب میں مروی ہیں۔ ذہبی نے ذکر کیا ہے کہ بزار نے بسند حسن اور امام احمد نے بسند قوی روایت کیا ہے کہ حضرت علی سے لوگوں نے استدعا کی کہ اپنا خلیفہ بنائیں تو فرمایا کہ نہیں جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو تمہاری رائے پر چھوڑ دیا اسی طرح ہم بھی تمہاری رائے پر چھوڑتے ہیں اور بزار کی ایک روایت ہے جس کے رجال بخاری کے رجال ہیں کہ حضرت علی نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی کو خلیفہ نہیں بنایا۔ دارقطنی، ابن عساکر اور ذہبی وغیرہ نے حضرت علی سے روایت کیا ہے کہ انہوں نے بصرہ میں بیان کیا کہ خدا کی قسم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے لیے کوئی عہد نہیں کیا۔ اگر رسول اللہ کا عہد ہوتا تو ہم اپنے بھائی بنی تیم بن مرہ کو اور عمر بن الخطاب کو رسول اللہ کے منبر پر نیابت نہ کرنے دیتے اور اپنے انہی ہاتھوں سے ان کے ساتھ مقابلہ کرتے۔ ابو نعیم روایت کرتے ہیں کہ حسن المثنیٰ سے کہا گیا کہ من کنت مولاہ فعلی مولاہ۔ حضرت علی کی امامت پر استدلال ہے تو انہوں نے فرمایا کہ خدا کی قسم اگر مولیٰ سے رسول اللہ کی غرض امیر یا سلطان بنانا ہوتا تو آپ اس

زیادہ صاف اور صریح لفظ استعمال کرتے۔ کیونکہ آپ فصیح البیان تھے۔ اور اگر امامت کے لیے رسول اللہ حضرت علی کی تعیین فرما دیتے اور حضرت علی اس علم کے باوجود ساکت رہتے اور رسول اللہ کے حکم کو ترک ہوتا دیکھتے تو سب سے بڑے گنہگار حضرت علی ہوتے، حاشا وکلا، یہ ہرگز نہیں ہو سکتا۔

الغرض اس روایت سے امامت کے مسئلہ پر استدلال کسی طرح صحیح نہیں نہ لغۃً نہ دیانۃً اگر یہ صحیح ہوتا تو صحابہ اس سے استدلال کرتے، بنی ہاشم کرتے، حضرت علی کرتے، حضرت عباس کرتے، مگر کسی نے ایسا نہیں کیا۔ اور اس وقت نہیں کیا جب اس کے فیصلہ کی اشد ضرورت تھی۔ مولا کے معنی یہاں ناصر یا محبوب کے ہیں اور اس معنی میں کسی طرح کا محذور لازم نہیں آتا۔

تصدیقِ نبوّتِ محمدیہ کے بغیر ایمان نہیں ہے

۱۵۵۔ کہہ دو کہ اے اہلِ کتاب تم جو کچھ بھی ہو جب تک تم تورات اور انجیل کو اور اس کو جو تمہاری طرف اب روانہ کیا گیا ہے لے قائم نہ کرو اور اے پیغمبر جو کچھ تمہارے پروردگار کی جانب سے تم پر اتارا گیا ہے وہ ان میں اور زیادہ سرکشی اور انکار کا اضافہ کرے گا، آپ ان منکرین پر افسوس نہ کریں۔ یہ انداز بتا رہا ہے کہ قرآن کا روئے سخن کن کی طرف ہے اور پیغمبر کو کن لوگوں کے بارے میں کہا جا رہا ہے کہ ان سے کہہ دو اہلِ کتاب کو عام اس سے کہ یہودی ہوں یا نصرانی ان سے صاف صاف کہہ دو کہ تم کسی چیز پر نہیں ہو یعنی تمہارا دینی مقام کوئی نہیں ہے اور تمہیں حضرت موسیٰ و حضرت عیسیٰ کی نسبت قطعاً سودمند نہیں ہے۔ یہ کلمہ اندازِ تحقیر ہے اندازِ تعظیم نہیں ہے۔ جب تک تم تورات، انجیل اور اس چیز کو جو تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف تمام صداقتوں کی نگران بنا کر اتاری گئی ہے قائم نہ کرو تم کچھ بھی نہیں ہو۔ یعنی تمہارا کوئی مقام نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا کوئی عمل قبول نہیں ہے کیونکہ قبولِ عمل کے لیے ایمان شرط ہے اور ایمان کی صحت کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے۔ اس لیے اگر تم سارے رسولوں کو نہیں مانتے ہو تو تم دین و ایمان کے لحاظ سے کچھ نہیں ایک حرفِ بے معنے ہو۔ تورات و انجیل اور خدا کی اتاری ہوئی چیز کو قائم کرنے کا مطلب یہ ہے کہ زندگی کے مسائل و معاملات سے عملاً ان کا ربط قائم کرو۔ آیت میں ما انزل الیکم من ربکم سے مراد قرآن حکیم ہے۔ قرآن حکیم کے سوا کوئی اور چیز مراد لینے کی یہاں گنجائش نہیں ہے۔ اسی آیت میں ایک ہی سانس میں ما انزل الیک من ربک کے الفاظ سے یہ بالکل واضح کر دیا ہے کہ اس سے قرآن ہی مراد ہے۔ یہاں قرآن کے انزال کی ان کی طرف نسبت ان پر ایک شیریں طنز ہے کہ تورات و انجیل دونوں میں

اللہ نے اہل کتاب سے عہد لیا تھا کہ تمہارے پاس ان صفات کا پیغمبر، خدا کا آخری اور کامل صحیفہ لے کر آئے گا تو تم اس پر ایمان لانا۔ اس کی پیروی کرنا، اس کی مدد کرنا اور اس کی گواہی دینا۔ اسی کی طرف یہاں اشارہ ہے اور اس موقعہ پر جب کہ قرآن یہ تمام اوصاف لے کر آچکا ہے تو تورات اور انجیل کا قائم کرنا یہی ہے کہ خدا کی اتاری ہوئی اس کتاب کو قائم کریں۔ اس کا قائم کرنا ہی تورات و انجیل کو قائم کرنا ہے دین میں آدم سے لے کر نشوونما ہوتا رہا۔ یہی جو سنت اللہ نے قائم فرمائی ہے۔ اس کے مطابق قرآن کے ذریعے دین انبیاء کی تکمیل فرما دی ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ نہیں ہے کہ وہی ہدایت ہے اور اس کے ماضی میں جو کچھ تھا سب ضلالت ہے بلکہ یہ دعویٰ ہے کہ وہی کامل ہدایت ہے اور بقیہ مذاہب سابقہ موجودہ حالت میں ناقص ہیں یعنی وہ ابدی ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے اسی کو محمد رسول اللہ لے کر آخری دفعہ تشریف لائے اب وہ ہمیشہ کامل رہے گی کبھی ناقص نہ ہوگی اس سے ہٹ کر اے اہل کتاب تم کچھ نہیں ہو۔ پہلی آیت میں اہل کتاب کے ماضی کو پیش کیا گیا تھا اس آیت میں ان کے حال اور مستقبل کی عکاسی کی گئی ہے۔ اور سید رشید رضا نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ "اہل کتاب تورات و انجیل کے مطابق اپنی زندگیاں بنانے پر نہ پہلے قادر تھے اور نہ اب قادر ہیں۔ قرآن ان سے کہہ رہا ہے کہ اس صورت حال کے باوجود ختم نبوت سے تم میں پریشان استغنا کیوں ہے۔ ہم بھی اب امریکہ، جرمنی اور انگلستان کے مشنریوں سے کہہ سکتے ہیں کہ تم دنیا کو تورات و انجیل کی دعوت دے رہے ہو، ذرا سوچ کر بتاؤ کہ کس منہ سے تم ایک ایسی چیز کی دنیا کو دعوت دے رہے ہو جس کو تم خود قائم نہیں کر رہے ہو، تم میں سے کتنے ہیں جو اپنے دشمنوں سے پیار کرتے ہیں اور اپنے پر لعنت کرنے والوں کو مبارک باد کے پیغام بھیجتے ہیں۔ قیصر کا قیصر کو کون دیتا ہے اور ہر ظلم و استبداد کے سامنے خدا کی جانب سے سمجھ کر کون سر نگوں ہوتا ہے کون زیادتی کے جواب میں زیادتی نہیں کرتا بلکہ کون دائیں رخسار پر چپت کھا کر بایاں رخسار آگے کرتا ہے۔ تمہاری پوری کی پوری زندگی اپنی کتابوں کی نقیض ہے۔ اسی صورت حال کو قرآن نے لستم علیٰ شیٔ سے تعبیر کیا ہے۔

ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اہل کتاب اس کتاب کے علمبردار ہوتے۔ لیکن ہو رہا ہے کہ قرآن نے ان کی سرکشی اور کفر میں اور اضافہ کر دیا پہلے یہ صرف انکار کرتے تھے اور یہ پوری طاقت سے اس کو ختم کرنے پر تل گئے ہیں اور اس کے لیے یہود کے قبائل اور مشرکین عرب سے گزر کر عالمی طاقتوں تک بات پہنچ گئی اور وہ پوری قوت سے حق کا مقابلہ کرنے کے لیے میدان میں آگئے ہیں اور اس کے لیے سنگٹھن قائم کر رہے ہیں اس کے لیے قرآن نے طغیان کی تعبیر کیسی شاندار اور بلیغ اختیار کی ہے۔

آخر میں مستقبل کے اسی خطرے کے پیش نظر حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی ہے کہ ان کے حال پر غم نہ کرو۔ فلا تاس علی القوم الکافرین۔ یعنی اس غم اور افسوس میں پڑ کر تنگ دل نہ ہو۔ اپنا فرض امن و اطمینان سے ادا فرماتے رہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں پر آپ کوئی افسوس نہ کریں کہ کفر جن کی طبیعت بن چکا ہے آپ کو اللہ کافی ہے۔

اس آیت میں ہمارے لیے بڑی عبرت ہے کہ اگر یہودی اور عیسائی تورات و انجیل سے زندگی کے معاملات و مسائل کا عملاً ربط قائم کیے بغیر دین کی زندگی میں کچھ نہیں ہیں تو مسلمان قرآن سے زندگی کے مسائل و معاملات کو عملاً مربوط کیے بغیر دین کی زندگی میں کیوں لستم علی شیئ کے مصداق نہیں ہیں۔ اللہ کی حجت سب کے لیے یکساں ہے کوئی وجہ نہیں کہ اللہ یہودیوں سے برگزیدہ امت ہونے خدا کے محبوب اور چہیتے ہونے برگزیدوں اور چہیتوں کی اولاد ہونے کا عذر پسند نہ کرے اور یہی چیز مسلمانوں سے قبول کرے جبکہ پوری زندگی کے عملی روابط نبوت سے لاتے ہوتے علم و عمل سے ٹوٹ چکے ہوں۔ افکار، اعمال، اخلاق اور احوال کے سانچے نقشۂ نبوت سے ہٹ کر بن رہے ہوں، اور حکمت دین اور مقاصد سے بے خبر ہو کر سمجھ رہے ہیں کہ ہماری دینی بنیاد مستحکم ہے ویحسبون انہم علی شیئ الا انہم ھم الکاذبون۔

نجات وسعادت کا قانون

۱۵۶ — بلاشبہ اہل ایمان ہوں یا یہودی، صابی ہوں یا نصاریٰ کوئی ہو جو کوئی بھی اللہ اور روز آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک عمل کرے گا تو اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہوگا اور نہ کسی طرح کا غم۔ یعنی جو قوم مسلمان کہلاتی ہے یا یہود و نصاریٰ یا صابی یا اور کچھ تمثیلاً چند مشہور مذاہب کا ذکر کر دیا گیا۔ کوئی شخص ان ناموں کی بدولت یا نسل رنگ پیشہ وطن وغیرہ احوال و خصائص کے لحاظ سے حقیقی فلاح اور دائمی کامیابی حاصل نہیں کر سکتا۔ کامیاب و مامون و مصئون ہونے کا ایک اور صرف ایک معیار ہے یعنی ایمان و عمل صالح۔ جس قوم کو اپنے مقرب الٰہی ہونے یا کامیاب ہونے کا دعویٰ ہو وہ اسی کسوٹی پر اپنے کو کس کر دیکھ لے۔ اگر اس میں کھری اترے تو بے خوف و خطر مطلع اور کامیاب ہے ورنہ ہر وقت اپنے کو خدا کے قہر و غضب کے نیچے سمجھے۔ پچھلی آیات میں خاص اہل

لہ افادات شیخ الاسلام

کتاب کو تبلیغ تھی۔ اس آیت میں تمام اقوام و ملل کے سامنے بلا رو رعایت ایسا عجیب و غریب معقول اور منصفانہ قانون پیش کیا گیا ہے جس کے بعد کسی سلیم الفطرت انسان کو اسلام کی صداقت اور ہمہ گیری میں شبہ نہیں رہ سکتا۔ ایک شخص جب تک خدا، اس کے وجود، وحدانیت، صفات کمالیہ، نشانہائے قدرت، تمام احکام و قوانین، کل انبیین و سفراء اور روز جزا پر ایمان نہ لاتے اور نیکی اختیار کرے کیا عقل سلیم قبول کر سکتی ہے کہ وہ نعیم دائم رضائے حق اور سرمدی سے ہمکنار ہو سکے گا۔ ایمان باللہ کے تحت میں یہ سب چیزیں داخل ہیں۔ فرض کرو ایک شخص روشن دلائل نبوت کی موجودگی میں کسی پیغمبر کی توہین کرتا ہے اور اس کو دعوے نبوت میں جھوٹا کہنا بھی اس کی توہین ہے تو کیا کسی حکومت کے پیغمبر کی توہین اور اس کے صاف و صریح اسناد سفارت کی تکذیب اس حکومت کی توہین و تکذیب نہیں ہے! اسی طرح سمجھ لو کہ جو شخص کسی ایک سچے پیغمبر کی تکذیب کرتا ہے اور اس کو قبول نہیں کرتا وہ فی الحقیقت خدا کے ان صاف و صریح نشانات و دلائل کو جھٹلا رہا ہے جو اس نے تصدیق نبوت کے لیے اتارے تھے۔

فانھم لا یکذبونک ولکن الظلمین بایات اللہ یجحدون

یہ دراصل تمہیں نہیں جھٹلاتے بلکہ یہ ظالم جان کر اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں

سوچئے کیا اللہ کی آیات اور صریح و علانیہ نشانات کو جھٹلانے کے بعد بھی ایمان باللہ کا دعویٰ رہ سکے گا۔ قرآن نے جن تفصیلات کی طرف ایمان باللہ و عمل صالح کے اجمالی عنوان سے یہاں اشارہ کیا ہے دوسرے مقامات پر وہ پوری شرح و بسط سے موجود ہیں۔ میرے نزدیک زیادہ صحیح اور قوی قول یہ ہے کہ صابئین عراق میں ایک فرقہ تھا جن کے مذہبی اصول عموماً حکمائے اشراقیین اور فلاسفہ طبیعیین کے اصول سے ماخوذ تھے۔ یہ لوگ روحانیات کے متعلق نہایت غلو رکھتے تھے بلکہ ان کی پرستش کرتے تھے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ ارواح مجردہ اور مدبرات فلکیہ وغیرہ کی استعانت و استمداد سے ہی ہم رب الارباب یعنی بڑے معبود تک پہنچ سکتے ہیں لہٰذا ریاضات شاقہ اور کسر شہوات سے روح میں تجرد اور صفائی پیدا کر کے عالم روحانیات کے ساتھ ہم کو اپنا رشتہ پیدا کرنا چاہیے۔ پھر ان کی خوشنودی اور دستگیری سے خدا تک پہنچ سکتے ہیں۔ انبیاء کی اتباع کی ضرورت نہیں ہے۔ کواکب ارواح مدبرہ اور اسی طرح دوسری روحانیات کو اپنے سے خوش رکھنے کے لیے ہیاکل بناتے تھے اور ان ہی ارواح کے لیے نماز روزہ اور قربانی وغیرہ کرتے تھے۔ خلاصہ یہ کہ حنفاء کے مقابلے میں صابئین کی جماعت تھی جن کا سب سے بڑا حملہ نبوت اور اس کے لوازم و خواص پر ہوتا تھا۔ حضرت ابراہیم حنیف علیہ الصلوٰۃ والسلام

کی بعثت کے وقت نمرود کی قوم صابی العقیدہ تھی جس کے رد و ابطال میں خدا کے خلیل ابراہیم علیہ السلام نے جانبازی دکھلائی [1]

اس موضوع پر ہم جلد اول میں کچھ اجمالی اشارات کر چکے ہیں۔ یہاں شیخ الاسلام نے جو مربوط اور جامع بات ارشاد فرمائی وہ ان کی علمی بلندیوں کا پتہ دے رہی ہے اور اس پر مزید کچھ لکھنے کی یہاں ضرورت نہیں ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لَقَدْ اَخَذْنَا مِيْثَاقَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ وَاَرْسَلْنَآ اِلَيْهِمْ رُسُلًا ؕ
كُلَّمَا جَآءَهُمْ رَسُوْلٌۢ بِمَا لَا تَهْوٰٓى اَنْفُسُهُمْ ۙ فَرِيْقًا كَذَّبُوْا
وَفَرِيْقًا يَّقْتُلُوْنَ ﴿۷۰﴾ وَحَسِبُوْٓا اَلَّا تَكُوْنَ فِتْنَةٌ فَعَمُوْا وَصَمُّوْا
ثُمَّ تَابَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ ثُمَّ عَمُوْا وَصَمُّوْا كَثِيْرٌ مِّنْهُمْ ؕ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ
بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۷۱﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ
ابْنُ مَرْيَمَ ؕ وَقَالَ الْمَسِيْحُ يٰبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّيْ وَ
رَبَّكُمْ ؕ اِنَّهٗ مَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ فَقَدْ حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْهِ الْجَنَّةَ وَمَاْوٰىهُ
النَّارُ ؕ وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ اَنْصَارٍ ﴿۷۲﴾ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا
اِنَّ اللّٰهَ ثَالِثُ ثَلٰثَةٍ ۘ وَمَا مِنْ اِلٰهٍ اِلَّآ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ ؕ وَاِنْ لَّمْ يَنْتَهُوْا وقف غفران
عَمَّا يَقُوْلُوْنَ لَيَمَسَّنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۷۳﴾
اَفَلَا يَتُوْبُوْنَ اِلَى اللّٰهِ وَيَسْتَغْفِرُوْنَهٗ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۷۴﴾

ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان کی طرف

بہت سے رسُول روانہ کیے تھے، جب بھی ان کے پاس کوئی
رسُول ان کی خواہشاتِ نفس کے خلاف کچھ لے کر آیا تو انہوں نے
کسی کو جھٹلا دیا اور کچھ کو قتل کر دیا[۱۵۰] اور اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے
ہوتے ہیں کہ کوئی آزمائش نہ ہو گی لہٰذا اندھے اور بہرے ہو گئے
پھر اللہ نے ان سے درگزر فرمایا لیکن اکثر ان میں سے لوگ پھر
اندھے اور بہرے ہو گئے اور اب اللہ ان کے کرتوتوں کو
خوب دیکھ رہا ہے[۱۵۸]۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے
کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ اے
بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا
رب بھی، جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرایا اس پر
اللہ نے جنت حرام ٹھہرا دی اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور
ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے[۱۵۹]۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے

جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ ایک معبود
کے سوا کوئی معبود نہیں ہے اگر یہ لوگ اپنی باتوں سے باز
نہ آئے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک
سزا دی جائے گی کیا پھر یہ اللہ کے حضور میں توبہ نہ کریں گے
اور اس سے معافی نہ مانگیں گے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے ١٦٠

یہود و نصاریٰ کا تاریخی نقشہ

پہلے اہل کتاب کو مخاطب کر کے فرمایا تھا کہ لستم علی شیٔ اس کے بعد قانون نجات بتایا۔ اب پہلے یہاں یہود کا تاریخی چہرہ پیش کیا جا رہا ہے کہ اس قانون نجات کے مطابق ان کی تاریخ کا فیصلہ خود ان کے ؛ ب میں کیا ہے۔ فرمایا کہ ان سے ایمان و عمل صالح کا عہد لیا گیا تھا۔ بائیبل کی کتاب احبار باب ۲۶ اور استثنا باب ۲۸ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی ایک تقریر نقل کی گئی ہے جس میں انہوں نے بنی اسرائیل کو بڑی تفصیل سے بتایا تھا کہ اگر تم احکام الٰہی کی ٹھیک ٹھیک پیروی کرو گے تو کس کس طرح اللہ کی رحمتوں اور برکتوں سے نوازے جاؤ گے اور اگر کتاب اللہ کو پس پشت ڈال کر نافرمانیاں کرو گے تو کس طرح بلائیں اور مصیبتیں اور تباہیاں ہر طرف سے تم پر ہجوم کریں گی۔ حضرت موسیٰ کی یہ تقریر قرآن کے اس مختصر فقرے کی بہترین تفسیر ہے۔ اسی کی تجدید اور یاددہانی کے لیے اللہ نے پیچھے بعد دیگرے اپنے بہت سے رسول روانہ کیے۔ لیکن ہوا کیا ہے! ان کی تاریخ یہی بتاتی ہے کہ انہوں نے عہد شکنی کی اور جو رسول اس کی تجدید کے لیے آئے ان کی تکذیب کر دی یا ان کو قتل کر دیا۔ قرآن نے اس تاریخی حقیقت کا انکشاف فریقاً کذبوا و فریقاً یقتلون کے مختصر سے مختصر فقرے کے ذریعہ کیا لیکن اسی حقیقت کو انجیل متی میں جس انداز سے حضرت مسیح کی طرف

طرف منسوب کرکے بیان کیا ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجیے۔

اے سانپو! اے افعی کے بچو! تم جہنم کی سزا سے کیونکر بچو گے اس لیے میں نبیوں، داناؤں اور فقیہوں کو تمہارے پاس بھیجتا ہوں، ان میں سے بعض کو قتل کرو گے اور صلیب پر چڑھاؤ گے اور بعض کو اپنی عبادت خانوں میں کوڑے مارو گے اور شہر بہ شہر ستاتے پھرو گے

متی ۲۳ - ۳۴

اس کے بعد قرآن نے بنی اسرائیل کی تاریخ سے ان کے دو دوروں کا پتہ دیا ہے کہ بنی اسرائیل کی قتل انبیاء کے جرم میں اللہ کی جانب سے فوری گرفت نہ ہوئی تو وہ یہ سمجھ بیٹھے کہ اب کوئی پکڑ نہیں ہوگی لیکن ایسا نہیں ہوا بلکہ ان پر یکے بعد دیگرے دو تباہیاں آئیں۔ پہلی بربادی بابل کے بادشاہ کی جانب سے دوسری رومیوں کے حملہ سے۔ قرآن نے یہاں ان دونوں کی طرف فعموا وصموا ثم عموا وصموا سے اشارہ کیا ہے۔ بنی اسرائیل میں ان دونوں کا تفصیلی تذکرہ آرہا ہے۔ اس تمہیدی بیان کے بعد عیسائیوں کا ذکر شروع ہوا ہے اور بتایا کہ جس طرح یہودی اصل تعلیم سے منحرف ہو کر اندھے بہرے ہو گئے اور اس کے نتیجے میں خدا کی گرفت ان پر آئی ٹھیک اسی طرح عیسائی بھی ایمان و عمل سے منحرف ہو گئے، اور الوہیت مسیح اور تثلیث کا اعتقاد پیدا کر لیا۔ یہاں سے دوسرے رکوع کے ختم تک الوہیت اور تثلیث کا باطل ہونا مسیح کی صحیح حیثیت، تثلیث کی تاریخ اس کا ماخذ و سرچشمہ غرض کہ ہر پہلو کو پورے طور پر کھول کر بیان کیا ہے، پھر آخر میں اخلاقی اور سیاسی طور پر یہودی و نصاریٰ کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا ہے کہ آفاقی پیغمبر ہونے کی حیثیت میں نبوت کا مقابلہ بین الاقوامی دنیا میں سب سے پہلے نصرانیت سے ہوا ہے۔ اسی کے نتیجے ایک سال کے بعد ۹ھ میں قیصر روم نے مدینہ پر حملے کا حکم دیا ہے اور پورے عرب کے عیسائی قبائل اس میں شامل ہوگئے۔ یہ نبوت کے لیے پہلا موقعہ ہے کہ عرب سے باہر کی ایک سب سے بڑی طاقت اور شہنشاہی آمادۂ پیکار ہوئی۔ یہ نبوت کا اعجاز ہے کہ ۸ھ کے اوائل ہی میں اہل ایمان کو اس کے لیے ذہنی طور پر تیار کر رہا ہے۔ جنگ کے لیے دوسری تیاریوں کے ساتھ سب سے قیمتی تیاری یہی ہے ان ذہنی تحفظات کی روشنی میں قرآن کی تشریحات شارحین قرآن کی زبانی سنیے۔

۷۰۵ا- ہم نے بنی اسرائیل سے پختہ عہد لیا تھا اور ان کی طرف بہت سے رسول روانہ کیے تھے۔ جب بھی ان کے پاس کوئی رسول ان کی خواہشات نفس کے خلاف کچھ لے کر آیا تو انہوں نے کچھ کو جھٹلایا اور کچھ کو قتل کر دیا۔ گزشتہ آیت میں عنداللہ قبولیت کا جو معیار بیان ہوا ہے

یعنی ایمان اور عمل صالح یہاں یہ دکھلانا ہے کہ بنی اسرائیل اس معیار پر کہاں تک پورے اترتے ہیں۔ اور سمجھایا ہے کہ ان کا وطیرہ یہ رہا ہے کہ ایمان وعمل صالح کے عہد پر قائم رکھنے کے لیے جب بھی ان پاس خدا کے رسول ایسا حکم لے کر آتے جو ان کی نفسانی خواہشات کے خلاف ہوتا تو ان کی تکذیب کرتے اور قتل تک کی جرأت کر بیٹھتے حالانکہ غلام کی وفاداری کا امتحان اس میں ہے کہ جس بات کو دل نہ چاہے آقا کے حکم سے کر گزرے اور اپنی رائے اور خواہش کو آقا کی مرضی کے تابع بنا دے۔ ورنہ صرف ان چیزوں کا مان لینا جو مرضی اور خواہش کے موافق ہوں یہ کون سا کمال ہے[1]

دراصل یہاں یہود کی تاریخ بیان ہو رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ ان کی یہ کمزوری شروع ہی سے رہی ہے کہ وحی الٰہی کے مقابلے میں وہ اپنے ہوائے نفس کو بالا رکھتے ہیں اور وحی کے ذریعے جو احکام ان کو اپنی خواہشوں یا اپنی ناقص عقل یا اپنی محدود معلومات کے خلاف نظر آتے ہیں ان کا انکار کر دیتے ہیں اور ان کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیتے ہیں اور یہ امر واقعہ ہے کہ قدیم ترین زمانے سے دنیا میں دو متقابل دعوتیں پائی جاتی ہیں ایک پیروی نفس اور انسان کی مکمل آزادی اور غیر ذمہ داری کی۔ دوسری انسان کی عبدیت اللہ سبحانہ کے سامنے جوابدہی اور ذمہ داری کی پہلی دعوت کو قرآن کی اصطلاحی زبان میں اتباع ہوٰی اور جاہلیت کہتے ہیں اور دوسری کو اسلام اور اتباع ہدیٰ کہتے ہیں۔ یہودی علماء پہلی دعوت کے علمبردار تھے جبکہ انبیاء دوسری دعوت کے۔ یہودی پیروی نفس اور خواہشوں کے لئے دلدادے تھے کہ انبیاء کی دعوت کا مذاق اڑاتے، ان کی تعلیمات پر حملہ کرتے۔ اور ان کی دعوت کو اس حد تک اپناتے جہاں تک ان کی سیاسی قومی، ملکی، تمدنی خواہشیں اور غرضیں پوری ہوتی نظر آئیں اور جوں ہی انبیاء کی دعوت کا ان کے قومی مفادات ان کی سیاسی اغراض، ان کے ملکی مصالح اور ان کی اقتصادی اور معاشی منفعتوں سے تصادم ہوتا تو انبیاء کے سامنے ایک حریف کی حیثیت سے آجاتے اور ان کو ناکام بنانے کے سارے حربے استعمال کرتے جہاں تکذیب سے کام چلتا تکذیب کرتے اور اگر تکذیب سے دعوتِ انبیاء ختم نہ ہوتی تو ان کے قتل کے درپے ہو جاتے یہاں اگرچہ علامہ زمخشری نے کلما کا جواب محذوف مان کر یہ بتایا ہے کہ مطلب یہ ہے کہ جبکہ رسول علم وعمل کا پیمانہ ان کی خواہشات کے برعکس لاتا تو وہ رسالت کا مقابلہ کرتے لیکن علامہ ناصر نے الانتصاف میں یہ کہہ کر اور زور پیدا کر دیا کہ جواب محذوف نکالنے کے لیے جدت کی ضرورت نہیں خود قرآن میں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جواب شرط دوسرے مقام پر مذکور ہے۔

اَفَكُلَّمَا جَاءَكُمْ رَسُولٌ بِمَا لَا تَهْوَىٰ أَنفُسُكُمُ اسْتَكْبَرْتُمْ

یہاں بھی جواب استکبروا محذوف ہے اور مطلب یہ ہے کہ جب نبی نبوت کے علم و عمل کی دعوت لے کر آئی وہ سامنے تن گئے۔ یہاں مولانا اشرف علی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ استکبار ہی تمام گناہوں کی جڑ ہے کیونکہ یہاں قرآن نے تکذیب اور قتل انبیاء جیسے سنگین جرائم کو اسی کا ثمرہ قرار دیا ہے یہ علامہ زمخشری نے ماضی اور مضارع کے ذریعے یہاں "تنوع" پیدا کرنے کی وجہ تو صرف یہ بتائی ہے کہ تقتلون مضارع اس لیے لایا گیا ہے کہ ماضی کیے گئے اس عظیم جرم کی حال میں عکاسی ہو جائے لیکن علامہ ناصر نے انتصاف میں یہ کہہ کر خوب نکتہ پیدا کیا ہے کہ حال سے تعبیر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ یہودی اب بھی حضور انور کے قتل کے درپے ہو رہے ہیں۔

اگرچہ عام شارحین قرآن نے کلما جاءرسول کو رسلا کی صفت بتایا ہے لیکن زیادہ وزن اس میں ہے کہ اسے استیناف بیانی قرار دیا جائے۔ گویا سننے والے نے جب یہ بات سنی کہ ارسلنا الیہم رسلا، تو ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ پھر یہودیوں کا ان کے ساتھ معاملہ کیا رہا۔ جواب میں ارشاد ہوا کلما جاءہم رسول الخ ان کا معاملہ ان رسولوں میں سے ایک ایک رسول کے ساتھ یہ رہا ہے کہ وہ ان کی تکذیب کرتے رہے اور قتل کرتے رہے یعنی قتل اور تکذیب میں تکرار رہا۔ اور یہ معاملہ ان کی تاریخ کا ایک واقعہ نہیں بلکہ اس قسم کے متعدد واقعات ہیں۔

گناہوں کے نتائج سے بے پروائی

۱۵۸- اور اپنے تئیں یہ سمجھ بیٹھے کہ کوئی آزمائش نہ ہوگی لہٰذا اندھے اور بہرے ہو گئے، پھر اللہ نے ان سے درگزر فرمایا لیکن ان میں سے اکثر لوگ پھر اندھے بہرے ہو گئے، اور اب ان کے کرتوتوں کو خوب دیکھ رہا ہے یعنی پختہ عہد و پیمان باندھ کر خدا سے غداری کی، اس کے سفراء میں سے کسی کو جھٹلایا کسی کو قتل کیا۔ یہ تو ان کے ایمان باللہ اور عمل صالح کا حال تھا۔ ایمان بالیوم الآخر کا اندازہ اس سے کر لو کہ اس قدر شدید مظالم اور باغیانہ جرائم کا ارتکاب کر کے بالکل بے فکر ہو بیٹھے گویا ان حرکات کا کوئی خمیازہ بھگتنا نہیں پڑے گا اور ظلم و بغاوت کے نتائج کبھی سامنے نہ آئیں گے۔ یہ خیال کر کے خدائی نشانات اور خدائی کلام کی طرف سے بالکل اندھے اور بہرے ہو گئے اور

جو ناکردنی کام تھے وہ کیے حتیٰ کہ بعض انبیا کو قتل کیا اور بعض کو قید کر دیا۔ آخر اللہ تعالیٰ نے ان پر بخت نصر کو مسلط کر دیا۔ پھر ایک مدت دراز کے بعد بعض ملوک فارس نے بخت نصر کی قید ذلت سے چھڑا کر بابل سے بیت المقدس کو واپس کیا اس وقت ان لوگوں نے توبہ کی اور اصلاح حال کی طرف متوجہ ہوتے، خدا نے توبہ قبول کی لیکن کچھ زمانے کے بعد پھر وہی شرارتیں سوجھیں اور بالکل اندھے بہرے ہو کر حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ علیہما السلام کے قتل کی جرأت کی اور حضرت عیسیٰ کے قتل پر آمادہ ہو گئے [1]

یہاں ان کے ان جرائم کا ذکر کیا ہے جن کی پاداش میں بنی اسرائیل کو دو بربادیوں سے دوچار ہونا پڑا، جیسا کہ یشعیاہ یرمیاہ اور حزقیل کی کتابوں میں دو بڑے فسادوں اور دو بڑی بربادیوں کا ذکر ہے اور قرآن میں بنی اسرائیل میں اس کو بیان کیا گیا ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں جرائم کے چہرے سے پردہ ہٹایا ہے اور وہاں نتائج کو بے نقاب کیا ہے۔ پہلی بربادی بابل کے بادشاہ بخت نصر کے حملہ سے ہوئی۔ اس حملے نے صرف یہود کی آبادیوں ہی کو پامال نہیں کیا تھا بلکہ بنی اسرائیل کی نسل و قومیت بھی ہلاک و منتشر ہو گئی تھی لیکن ایک صدی کے بعد گردش زمانہ نے پھر پلٹا کھایا اور کارساز قدرت نے وقت کی سب سے بڑی فاتح شہنشاہیت کو ان کی اعانت و دستگیری کے لیے کھڑا کر دیا یعنی شہنشاہ فارس کو اب یہود کی تمام اجڑی بستیاں پھر آباد ہو گئیں لیکن اس دوسری مہلت کی بھی انھوں نے قدر نہ کی اور اپنی توبہ و انابت کے وہ تمام عہد بھلا دیے جو بابل کی اسیری کے زمانے میں کیے تھے تو پھر دوسری ہلاکت کا وقت نمودار ہو گیا۔ یعنی رومی حملہ کا یہ بنی اسرائیل کی آخری ہلاکت تھی۔ اس کے بعد تاریخ گواہ ہے کہ بنی اسرائیل سنبھل نہ سکے۔

آیت میں جرائم کو عمیٰ و صمم سے تعبیر کیا ہے یعنی اندھے ہونے اور بہرے ہونے سے۔ اندھے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نبوت کے لاتے ہوئے علم و عمل سے اندھے ہو چکے تھے۔ آنکھیں ہونے کے باوجود نبوت کے معالم اور مناہج کو نہ دیکھتے، اور یہ دونوں چیزیں ان کے فکر و مطالعہ اور علم و فن کا مرکز نہ تھیں بلکہ اپنی مادہ پرستی میں ان کو اس قدر استغراق ہو چکا تھا کہ نبوت سے ان کا علمی رشتہ منقطع ہو چکا تھا اور بہرے ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی مجالس میں اپنے اجتماعات میں نبوت کی بات سننے کو بھی تیار نہ تھے۔ گویا یہ یہود کے خواص اور عوام کی حالت بیان ہوئی ہے کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پڑھا لکھا طبقہ نبوت کے علم سے بیگانہ تھا اور ان پڑھ طبقہ جن کا اونہ سننا بھی گوارا نہ کرتا تھا اور نبوت کے علم و عمل سے اس بیگانگی کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کی زندگی کا ہر شعبہ نبوت سے منقطع تھا۔

آخر میں کثیر منہم کے لاحقہ سے اشارہ کر دیا کہ سب ایسے نہ تھے بلکہ کچھ اپنے احوال کا رابطہ نبوت کے علم و عمل سے وابستہ کیے ہوئے تھے لیکن اکثریت کا حال وہ کچھ تھا جو بیان ہوا ہے اسی لیے کثیر یہاں بطور بدل آیا ہے یعنی یہ حال سب کا نہیں بلکہ اکثر کا تھا اور جزا و سزا میں اکثر ہی کا اعتبار ہوتا ہے۔ آخر میں فرمایا واللہ بصیر بما یعملون یعنی وہ اگرچہ خدا کے غضب و قہر کی طرف سے اندھے ہو گئے ہیں لیکن خدا ان کی تمام حرکات کو برابر دیکھتا رہا ہے چنانچہ ان حرکات کی سزا اب اُمتِ محمدیہ کے ہاتھوں دلوار ہا ہے[1]

شارحین قرآن نے یہاں بلا وجہ یعملون مضارع کو ماضی کے معنے میں لے کر نکتہ آفرینی کے لیے طبع آزمائی فرمائی ہے لیکن اگر یعملون اپنے ہی معنے میں ہو اور مطلب یہ ہو کہ اب یہودیوں نے خاتم الانبیاء کے ساتھ جو طرزِ عمل اختیار کیا ہوا ہے وہ اللہ کی نگاہ میں ہے وہ دیکھ رہا ہے کہ ان کو اتباع ہوئی یعنی جاہ و منصب کی چاہت نے کیسا اندھا اور بہرا بنا رکھا ہے۔ اور خواہشوں کے ہجوم میں دن دہاڑے آفتاب نبوت نظر نہیں آتا ہے، انبیاء کی ساری بشارتوں اور اوصاف سے باخبر ہو کر وہ اندھے بنے ہوئے ہیں نہ تلاوت آیات سنتے ہیں اور نہ نبوت کے موضوع پر کوئی حجت و برہان پر کان دھرتے ہیں اس کے نتیجے میں وہ وقت قریب ہے جبکہ خدا کا قانون پہلے کی طرح پھر حرکت میں آئے گا۔

عقیدہ الوہیت مسیح کی تردید

۱۵۹۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ مسیح ابن مریم ہی ہے حالانکہ مسیح نے کہا تھا کہ اے بنی اسرائیل اللہ کی عبادت کرو جو میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی۔ جس نے بھی اللہ کے ساتھ کسی کو شریک کیا اس پر اللہ نے جنت حرام ٹھہرا دی ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہے۔ یہاں سے نصاریٰ کے ایمان باللہ کی کیفیت دکھلائی گئی ہے کہ وہ کہاں تک حقانیت کے اس معیار پر پورے اترے۔ ان کے ایمان باللہ کا حال یہ ہے کہ عقل کے خلاف،

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فطرت سلیمہ کے خلاف اور خود حضرت مسیح کی تصریحات کے خلاف مسیح ابن مریم کو خدا بنا دیا۔ ایک تین اور تین ایک کی بھول بھلیاں تو محض بر تے نام ہے۔ حقیقۃً سارا زور اور قوت صرف حضرت مسیح کی الوہیت ثابت کرنے پر صرف کیا جاتا ہے حالانکہ خود حضرت مسیح خدا کے رب ہونے اور دوسرے آدمیوں کی طرح اپنے مربوب ہونے کا علانیہ اعتراف فرما چکے ہیں اور جس شرک میں ان کی امت مبتلا ہونے والی تھی اس کی برائی کہیں زور شور سے بیان کر رہے ہیں پھر بھی ان اندھوں کو عبرت نہ ہوئی[1]

قاضی عبدالجبار ہمدانی نے اپنی شہرہ آفاق کتاب تثبیت دلائل النبوت میں الوہیت مسیح کے عقیدے کے بارے میں کھول کر بتایا ہے کہ یہ عیسائیوں میں ملکیہ، یعقوبیہ اور نسطوریہ تینوں کا عقیدہ ہے کہ حضرت مسیح عبد صالح اور رسول نہیں ہیں بلکہ فی الواقع الٰہ اور حقیقت میں اللہ ہیں۔ وہی آسمان و زمین کے خالق ہیں، ملائکہ اور انبیاء کے پیدا کنندہ انبیاء کو روانہ کرنے والے اور ان کے لیے معجزاتی قوت عطا کرتے ہیں۔

تسبیحۃ الایمان

عیسائیوں نے ۳۲۰ء میں بمقام نقا ایک مجلس منعقد کی۔ اس میں ۳۱۸ پادری شریک ہوتے مجلس کے انعقاد کا اہتمام قسطنطاس ابن فیلاطس بادشاہ روم نے کیا علماء سب نے مل کر عیسائیوں کے لیے جو تسبیحۃ الایمان تجویز کی جس کے بغیر کوئی عیسائی ایمان کی دولت سے مالا مال نہیں ہو سکتا یہ ہے۔

ہم اللہ یگانہ باپ پر ایمان رکھتے ہیں جو دیکھی اور ان دیکھی مخلوق کا خالق ہے اور ہم یگانہ یسوع مسیح پر ایمان رکھتے ہیں جو اپنے باپ کا اکلوتا اور پہلوٹا فرزند ہے وہ بنایا نہیں گیا بلکہ واقعی اللہ سے الٰہ ہے اور اپنے باپ کے اس جوہر سے ہے جس سے سارے عالم میں حسن و جمال اور ہر چیز کی تخلیق ہوئی ہے جو ہم انسانوں کی خاطر اور ہماری نجات کی خاطر آسمان سے نازل ہوا روح القدس اور مریم البتول سے جسمانی لبادہ لیا مریم اس سے حاملہ ہوئی اور مریم کے پیدا ہوا، گرفتار ہوا، تختہ دار پر چڑھا اور فیلاطس رومی کے سامنے قتل کیا گیا، مرگیا دفن ہوگیا اور تیسرے روز اٹھا اور آسمان پر چڑھ گیا۔ اور اپنے باپ کی دائیں جانب بیٹھ گیا، اور وہ مُردوں اور زندوں

[1] افادات شیخ الاسلام

کے درمیان فیصلہ کرنے کی خاطر آنے کو تیار ہو رہا ہے۔

اس سلسلے میں دائرۃ المعارف بریطانیہ کے ایک دوسرے مضمون تاریخ کلیسا کی یہ عبارت بھی علامہ عبدالجبار ہمدانی کے بیان کی صرف تصدیق نہیں کرتی ہے بلکہ اس کی پوری روشنی پڑتی ہے۔

تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلام" کا جسدی ظہور مان لیا گیا تھا تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے۔ چوتھی صدی میں اس مسئلے پر کافی بحثیں چھڑی ہوئی تھیں۔ آخرکار ۳۲۵ء میں نیقیا کی کونسل نے الوہیت مسیح کو باضابطہ طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔

اس انکشاف کے بعد قرآن نے واقعہ کے ذریعے یہ بھی بتایا ہے کہ حالانکہ مسیح نے یہ بات نہیں فرمائی ہے کہ وہ اللہ ہے بلکہ اس نے یہ ضرور بتایا ہے کہ اللہ ربی وربکم اللہ میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی، اس لیے تمہارے عابدانہ تعلقات اللہ سے ہونے چاہیے۔ میں رب نہیں بلکہ اس کا بندہ اور رسول ہوں۔ یہاں بھی صاحب تثبیت دلائل النبوت نے انجیل یوحنا کے اقتباسات لے کر بتایا ہے کہ اس طرف انجیل سے بھی قرآن کے بیان کی تائید ہوتی ہے اور مولانا دریابادی نے یوحنا اور لوقا کے حوالوں سے بھی اس کے قریب قریب تائیدی اقتباسات نقل کیے ہیں۔ یہ بھی نبوت کا اعجاز ہے کہ باوجود اس کے کہ حضور انور نے نہ انجیل پڑھی ہے اور نہ ان سے تاریخ میں حضور کے تعلقات منقول ہیں اس کے باوجود وحی کی رہنمائی میں آپ بتاتے ہیں کہ یہ حضرت مسیح کی اصل تعلیم ہے اور یہ بار لوگوں کا اضافہ ہے۔

توحید کے ساتھ شرک کا ذکر

توحید خالص کی تعلیم کے بعد حضرت مسیح نے شرک پر وعید کا بھی ذکر فرمایا اور بتایا ہے کہ ہر قسم کا شرک خواہ ذاتی ہو یا صفاتی انسان کو نجات سے محروم کر دیتا ہے۔ توحید عبادت کے ساتھ شرک کا ذکر اس لیے فرمایا ہے کہ ذہنوں میں کوئی تصور واضح اسی وقت ہو پاتا ہے جب اس کے مخالف کا تصور بھی ساتھ کے ساتھ بیان کر دیا جائے اس لیے اہم اصول و نظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا اہتمام ضرور کیا جاتا ہے کہ ان کے مخالف اصولوں اور نظریوں کو ان کے بالمقابل رکھ دیا جائے۔ عقیدۂ توحید سے زیادہ اہمیت کس نظریے اور عقیدے کو حاصل ہو سکتی ہے

اس لیے ضروری ہے کہ اس کے مخالف نظریہ یعنی شرک کو بھی بتا دیا جائے جیسا کہ یہاں مسیح علیہ السلام نے اپنے طرز عمل سے ہمیں ہدایت فرمائی ہے۔ چنانچہ آپ نے توحید کی تعلیم دیتے ہوئے بات صرف اسی پر ختم نہیں فرمائی ہے کہ یگانہ اللہ سے حادرانہ تعلقات پیدا کرو بلکہ پوری تفصیل کے ساتھ یہ بتانا بھی ضروری سمجھا ہے کہ جو شخص بھی شرک کرتا ہے اس پر نہ صرف یہ کہ جنت حرام ہے بلکہ اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

شرک کے معنے ساجھے پن کے ہیں اور شریعت کی اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساجھی ٹھہرایا جائے شرک کی تین قسمیں ہیں۔

ایک شرک وہ جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہوتا ہے

دوسرا وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی صفات سے ہوتا ہے

تیسرا وہ شرک جس کا تعلق اس کی صفتوں کے لوازم سے ہے

پہلے شرک کی عملی صورتیں یہ ہیں ۱۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہم جنس قرار دیا جائے، ۲۔ اسے اس کا باپ یا اس کی اولاد سمجھ لیا جائے۔ ۳۔ یہ مان لیا جائے کہ وہ کسی اور ہستی سے مل کر ایک قالب ہو گیا۔ ۴۔ یہ تصور کر لیا جائے کہ وہ کسی مخلوق کی شکل اختیار کر کے نمودار ہوا کرتا ہے۔ یعنی کوئی مخلوق اس کا اوتار ہو سکتی ہے مثلاً اہل عرب فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں اور جنوں کو اس کی ذات برادری سمجھتے تھے۔ اسی طرح عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا اکلوتا بیٹا اور اس کا اوتار قرار دیتے تھے۔

دوسرے شرک کی عملی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن صفتوں سے موصوف ہے۔ ان میں سے کسی صفت کو کسی اور کے اندر بھی موجود مان لیا جائے اور اسی معنے و مفہوم میں مان لیا جائے جس معنے و مفہوم میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اندر پائی جاتی ہے۔ مثلاً علم اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھلی اور چھپی ہر بات کو جانتا ہے۔ اس کے لیے غائب بھی حاضر ہے اور گزرا ہوا زمانہ بھی حال کا زمانہ ہے۔ اب اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ حضرت عیسیٰ بھی اسی طرح ہر بات کو جانتے ہیں تو شرک فی الصفات ہو گا۔ اسی طرح نفع و نقصان پہنچانا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے مسرت و راحت پہنچاتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم کرتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ خیال کر بیٹھے کہ حضرت عیسیٰ بھی ہماری بگڑی بنا سکتے ہیں یا ہمیں تکلیف اور نقصان پہنچا سکتے ہیں تو وہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت میں لے ساجھی ٹھہرا رہا ہے۔

تیسری قسم کے شرک کی صورت یہ ہے کہ صفات الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں انہیں اور ان سب کو اللہ ہی کے لیے خاص نہ سمجھا جائے بلکہ انہیں یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے لیے بھی ثابت اور موجود مان لیا جائے مثلاً صفات الٰہی کا تقاضا یہ عبادت صرف اللہ کا حق ہے۔ اب اگر کوئی شخص اور کو بھی اس کا مستحق قرار دے تو یہ صفات الٰہی کے تقاضوں میں غیر اللہ کو شریک بنانا ہوگا۔ اسی طرح ان صفات کا ایک لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور حکم دینے اور قانون بنانے کا حق اصلاً اسی کا ہے۔ اس لیے اگر کسی اور کو بھی اللہ کے حکم کے بغیر یہ حیثیت دے دی جاتی تو یہ شرک ہوگا۔ حضرت عیسیٰ نے من یشرک باللہ عام فقرہ بولا ہے اس لیے اس میں شرک کی ساری قسمیں داخل ہیں۔

عقیدہ تثلیث کا گورکھ دھندا

۱۶۰۔ یقیناً کفر کیا ان لوگوں نے جنہوں نے کہا کہ اللہ تین میں کا ایک ہے حالانکہ ایک معبود کے سوا کوئی نہیں ہے۔ اگر یہ لوگ اپنی باتوں سے باز نہ آتے تو ان میں سے جس جس نے کفر کیا ہے اس کو دردناک سزا دی جائے گی، کیا پھر یہ اللہ کے حضور میں توبہ نہ کریں گے اور اس سے معافی نہ مانگیں گے اور اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی حضرت مسیح روح القدس اور اللہ یا مسیح مریم اور اللہ تینوں خدا ہیں۔ العیاذ باللہ ان میں کا ایک حصہ دار اللہ ہوا پھر وہ تینوں ایک اور ایک تین ہیں۔ عیسائیوں کا عام عقیدہ یہی ہے اور اس خلاف عقل و بداہت عقیدہ کو عجیب گول مول اور پیچدار عبارتوں سے ادا کرتے ہیں اور جب کسی کی سمجھ میں نہیں آتا تو اس کو ایک ماورائے العقل حقیقت قرار دیتے ہیں سچ ہے لن یصلح العطار ما افسد الدھر

العقائد الوثنیہ فی الدیانۃ النصرانیہ کے مصنف نے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے مسیحیت میں تصور تثلیث دراصل بت پرست قوموں سے مانگا ہوا تصور ہے۔ وہ لوگ جو بت پرستی چھوڑ کر مسیحی ہوئے انہوں نے اپنے بت پرستانہ تصورات کو مسیحیت میں کر دیا، خود یورپ کے علماء نے یہی بتایا ہے کہ یہ عقیدہ خالصتاً بت پرستانہ ہے۔ انہوں نے لکھا ہے کہ تثلیث کا تصور سب سے پہلے ہندوستان کے برہمنوں میں پایا جاتا ہے۔ ان کے یہاں لاہوتی عبادت ہی تثلیث ہے اور ان کی ہندی زبان میں اس کا نام "ترے مورتی" ہے۔ ترے مورتی سے ان کی مراد برہما وشنو اور شیوجی ہیں اور یہ تینوں مل کر ایک ہیں۔ اسی تثلیث کو وہ مختصر کر کے تین حروف یعنی ا۔ و۔ م سے تعبیر کرتے

ہیں۔ اسی طرح بدھ مذہب والے بھی تاریخ میں اسی بیماری کے شکار ہیں۔ یونانی اور رومانی بھی اسی تعصب کے حامل ہیں۔

تاریخی طور پر یہ سوال طلب ہے اہمیت کا حامل ہے کہ عیسائیوں میں یہ تعصب کیسے آیا جبکہ حضرت مسیح خالص توحید کے علمبردار تھے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر انسائیکلو پیڈیا کے حوالہ سے مولانا مودودی نے لکھا ہے۔

باپ بیٹا اور روح القدس کی اصطلاحیں یہودی ذرائع کی بہم پہنچائی ہوئی ہیں۔ آخری اصطلاح اگرچہ خود یسوع نے شاذ و نادر ہی کبھی استعمال کی تھی اور پال نے بھی جو اس کو استعمال کیا اس کا مفہوم بالکل غیر واضح تھا تاہم یہودی لٹریچر میں یہ لفظ شخصیت اختیار کرنے کے قریب پہنچ چکا تھا۔ بس اس عقیدہ کا مواد یہودی ہے۔ اصل سوال جس پر یہ عقیدہ بنا وہ نہ کوئی اخلاقی سوال تھا نہ مذہبی بلکہ وہ سراسر ایک فلسفیانہ سوال تھا یعنی یہ کہ ان تینوں اقانیم باپ بیٹا اور روح القدس کے درمیان تعلق کی حیثیت کیا ہے۔ کلیسا نے اس کا جو جواب دیا ہے وہ اس عقیدے میں درج ہے جو نیقیا کی کونسل میں مقرر کیا گیا تھا اور اسے دیکھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی تمام خصوصیات میں بالکل یونانی فکر کا نمونہ ہے۔

رومیوں نے عیسائی مذہب کو جس صورت میں قبول کیا تھا اس کی تصویر ڈریپر کے الفاظ میں حسب ذیل ہے۔

> دونوں عیسائیت اور بت پرستی باہمی آمیزش کا یہ نتیجہ ہوا کہ دونوں کے اصول شیر و شکر ہو گئے اور ایک نیا مذہب پیدا ہو گیا جس میں بت پرستی و عیسائیت دونوں کی شامیں پہلو بہ پہلو اجاگر تھیں۔ جوں جوں زمانہ گزرتا گیا وہ مذہبی عقائد جن کی تفصیل ٹرٹلین نے بیان کی ہے متغیر ہو کر ایک عام پسند مگر پایہ اخلاق سے گرے ہوئے مذاہب کی شکل اختیار کرتے گئے۔ ان عقائد میں قدیم یونانی اصنام پرستی کا عنصر مخلوط ہو گیا۔ عقیدہ تثلیث قدیم مصری روایات کے سانچے میں ڈھال لیا گیا۔

شاید آپ یہاں یہ خلش محسوس کریں کہ پہلے بتایا ہے کہ عیسائی کہتے ہیں کہ مسیح ابن مریم ہی خدا ہے اور اب بتایا ہے کہ ان کا عقیدہ تثلیث ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہ دونوں باتیں درست ہیں اور حاصل دونوں کا ایک ہے۔ عیسائی مانتے تو یہی ہیں کہ تین اقنوم ہیں باپ بیٹا اور روح القدس مگر عملی رنگ میں صرف مسیح ہی مسیح رہ جاتا ہے کیونکہ نجات دہندہ وہی ہے اور سارا تعلق اسی سے ہے

اور سارا زور اسی کی خدائی ثابت کرنے پر صرف ہوتا ہے اور دنیا میں اسی کی خدائی کی اشاعت ہوتی ہے بس دونوں باتیں درست ہیں۔ ایک ان کا کتابی عقیدہ ہے اور ایک عمل۔

آخر میں فرمایا ہے کہ اخلاقیت ولبون میں ان کو توبہ کی تلقین کی ہے اور بتایا ہے کہ ان کے لیے توبہ اصلاح کا دروازہ اب بھی کھلا ہوا ہے۔ اب بھی اگر وہ اپنی اس بیہودہ سرائی سے باز آجائیں اور قرآن کی دعوت قبول کرلیں تو اللہ غفور رحیم ہے۔ لیکن اگر وہ اپنی یاوہ گوئی سے باز نہ آئے اور حلول واتحاد اور تثلیث ہی کے نعرے بلند کرتے رہے تو لازماً ان کو اس کفر کی پاداش میں سزا بھگتنی پڑے گی۔ منھم لاکر بتادیا کہ ان میں سے الذین کفروا کو سزا ملے گی جو لوگ توبہ کر جائیں گے وہ بچ جائیں گے جو بات یہاں اہل کتاب سے کہی گئی ہے وہی دنیا کے سارے کافروں سے کہی گئی ہے

قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف
اہل کفر سے کہہ دیجیے کہ اگر وہ باز آجائیں تو پچھلے سارے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔

ظاہر ہے کہ جو دین تمام ادیان کو ایک دین اور ساری ملتوں کو ایک ملت بنانے آیا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ سارے اہل ملل کی اس مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے سب جانتے ہیں کہ یہ سب کی خواہش ہے کہ بندہ اپنے خالق کے قہر سے نجات حاصل کرے اور فطرۃً یہی ہر ایک کی خواہش ہونی بھی چاہیے اس لیے قرآن اس کا اعلان کرتا ہے کہ ہر ملک وملت، ہر نسل، قوم کا جو گنہگار بھی اس کی آغوش میں آجائے گا وہ اس کے گناہوں کی مغفرت اور نجات ابدی کے لیے ضامن ہوگا۔

آیت میں گفتار سے باز آنے پر عذاب کو اور توبہ واستغفار پر مغفرت کو موقوف قرار دیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ گفتار سے باز آنے سے کفر وشرک کی اصل تاریکی محو ہو جائے گی اب اس کے بعد اس کو ایسے اعمال کی بھی ضرورت ہے جو اس کی نئی زندگی کے لیے نشانی کا کام دیں۔ قرآن کی دونوں آیتوں نے اس کے لیے یہاں دو عمل بتاتے ہیں ایک انتہا اور دوسرے توبہ واستغفار یہ دونوں کام اگر پورے شرائط کے ساتھ ادا کیے جائیں تو بقول شیخ الاسلام

یہ اس غفور رحیم کی شان ہے کہ ایسے ایسے باغی اور گستاخ مجرم بھی جب شرمند ہو کر اور اصلاح کا عزم لے کر حاضر ہوں تو ایک منٹ میں عمر بھر کے جرائم معاف کر دیتا ہے۔

اور ساری دنیائے کفر کے مقابلے میں قرآن نے اور نبوت نے اہل کتاب کو یہ خاص رعایت بھی دی ہے کہ کتابی جو ایمان لاتا ہے اسے دوہرا اجر ملتا ہے۔

ہر شخص کی فطرت ہے کہ اس کو اپنے دین سے ایک والہانہ محبت اور دوسرے دین سے رقابت ہوتی ہے۔ دوسرا دین اختیار کرنا فطرۃً شاق گزرتا ہے۔ قرآن یہ کہتا ہے کہ ادیان سماویہ میں کوئی رقابت نہیں ہے یہ ایک ہی صداقت کی مختلف کڑیاں ہیں۔ ایک دین کے مصدق کو دوسرے دین کی تصدیق لازم ہے، اس لیے اگر کوئی اہل کتاب اسلام قبول کرے تو اس کو یہ وسوسہ نہ گزرنا چاہیے کہ اپنے نبی پر اس کا ایمان رائیگاں چلا گیا بلکہ اگر وہ حضور انور پر ایمان لائے گا تو دو اجر کا مستحق ہوگا، ہاں یہ یقینی ہے کہ اگر حضور انور پر ایمان نہ لایا تو پہلا ایمان بھی قابل اجر نہ رہے گا کیونکہ رسولوں کے درمیان ایمان کے موضوع پر تقسیم نہیں ہو سکتی جو ایک کا منکر ہے وہ سب ہی کا منکر شمار ہوگا۔ اس بشارت میں دراصل اہل کتاب کو یہ دعوت دی گئی ہے کہ اگر وہ اپنے ایمان کو قائم رکھنا چاہتے ہیں تو اس کی صورت یہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لے آئیں۔ آپ پر ایمان لانا سب پر ایمان ہے اور آپ کا انکار سب کا انکار ہے۔

مَا الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ اِلَّا رَسُوْلٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ
الرُّسُلُ ۗ وَاُمُّهٗ صِدِّيْقَةٌ ۗ كَانَا يَاْكُلٰنِ الطَّعَامَ ۗ اُنْظُرْ
كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْاٰيٰتِ ثُمَّ انْظُرْ اَنّٰى يُؤْفَكُوْنَ ۝ قُلْ
اَتَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا ۗ
وَاللّٰهُ هُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ۝ قُلْ يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لَا تَغْلُوْا فِيْ
دِيْنِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعُوْۤا اَهْوَآءَ قَوْمٍ قَدْ ضَلُّوْا مِنْ
قَبْلُ وَاَضَلُّوْا كَثِيْرًا وَّضَلُّوْا عَنْ سَوَآءِ السَّبِيْلِ ۝ لُعِنَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْۢ بَنِيْۤ اِسْرَآءِيْلَ عَلٰى لِسَانِ دَاوٗدَ وَعِيْسَى
ابْنِ مَرْيَمَ ۗ ذٰلِكَ بِمَا عَصَوْا وَّكَانُوْا يَعْتَدُوْنَ ۝ كَانُوْا
لَا يَتَنَاهَوْنَ عَنْ مُّنْكَرٍ فَعَلُوْهُ ۗ لَبِئْسَ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ ۝
تَرٰى كَثِيْرًا مِّنْهُمْ يَتَوَلَّوْنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۗ لَبِئْسَ مَا قَدَّمَتْ
لَهُمْ اَنْفُسُهُمْ اَنْ سَخِطَ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ وَفِي الْعَذَابِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ۝

وَلَوْ كَانُوا يُؤْمِنُونَ بِاللّٰهِ وَالنَّبِيِّ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مَا اتَّخَذُوهُمْ

أَوْلِيَاءَ وَلٰكِنَّ كَثِيرًا مِّنْهُمْ فٰسِقُونَ ﴿۸۱﴾

مریم کا بیٹا مسیح اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کا ایک رسول
ہے اس سے پہلے بھی کتنے رسول ہو چکے[۱۶۱]، اور ان کی والدہ
صدیقہ تھیں، یہ دونوں کھانا کھاتے تھے دیکھو ہم کس طرح ان
لوگوں کے لیے دلائل بیان کر رہے ہیں پھر دیکھو کہ یہ لوگ کس
طرف پھرے جا رہے ہیں[۱۶۲]۔ اے پیغمبر ان سے کہو کیا تم اللہ
کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جس کے اختیار میں نہ تمہارا
نقصان ہے نہ نفع اور اللہ ہی سننے والا علم رکھنے والا ہے[۱۶۳]۔ کہہ دو
کہ اے اہل کتاب اپنے دین میں حقیقت کے خلاف حد سے نہ بڑھو
اور اس گروہ کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے ہی خود
گم کردہ راہ ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور وہ حق کی سیدھی

راہ کھو بیٹھے۔[162] بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم کی زبانی لعنت ہو چکی ہے، اور یہ اس لیے ہوا کہ نافرمانی کرتے تھے اور وہ حد سے تجاوز کرتے تھے۔[165] وہ برائی سے ارتکاب کے بعد باز نہ آتے تھے، کیسا برا کام ہے جو وہ کرتے تھے۔[166] اے پیغمبر تم دیکھو گے کہ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کفر کرنے والوں سے مدد رفاقت کا رشتہ رکھتے ہیں کیا ہی برا سامان ہے جو انہوں نے اپنے لیے آگے روانہ کیا ہے، ان کے خلاف اللہ کی ناراضگی ہوئی اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں۔[167] اور اگر فی الواقع یہ لوگ اللہ کو، اللہ کے رسول کو، رسول پر نازل شدہ کتاب کو ماننے والے ہوتے تو مشرکین کو مددگار اور دوست نہ بناتے لیکن ان میں اکثریت ایسی ہے جو جادہ حق سے ہٹی ہوئی ہے۔[168]

حضرت مسیح کا واقعی چہرہ

ان آیات میں قرآن نے حضرت مسیح کا واقعی اور حقیقی چہرہ پیش فرمایا ہے لیکن حق کی حقانیت اس وقت تک سمجھ میں نہیں آ سکتی جب تک باطل کا پورا نقشہ ذہن میں موجود نہ ہو، ظاہر ہے کہ باطل جو کچھ ہے وہ قرآن سے باہر ہے اس لیے واقعی اور چہرہ جو قرآن نے پیش کیا ہے، اسے سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ حضرت مسیح کا وہ بناوٹی چہرہ آپ کو معلوم ہو جو عیسائی پیش کرتے ہیں، کچھ اشارات اس سلسلے میں پہلے ہو چکے ہیں۔ آیئے کچھ انہی کی زبانی سن لیجئے۔ عیسائیوں کی مذہبی کتاب "دعائے عمیم" میں مسئلہ عقیدہ مقدس اتھاناسیس کا یوں لکھا ہے۔

جو کوئی نجات چاہتا ہے اس کو سب باتوں سے پہلے ضروری ہے کہ عقیدہ جامع رکھے۔ اس عقیدہ کو جو کوئی کامل اور بے داغ نگاہ میں نہ رکھے وہ بے شک عذاب ابدی میں پڑے گا۔

عقیدہ جامع یہ ہے۔

ہم تثلیث میں واحد خدا کی اور توحید میں تثلیث کی پرستش کریں نہ اقانیم کو ملائیں نہ ماہیت کو تقسیم کریں کیونکہ باپ ایک اقنوم بیٹا ایک اقنوم اور روح القدس ایک اقنوم ہے مگر باپ بیٹے اور روح القدس ایک اقنوم ہے مگر باپ بیٹے اور روح القدس کی الوہیت ایک ہی ہے، جلال برابر عظمت ازلی یکساں، جیسا باپ ہے ویسا ہی بیٹا اور ویسا ہی روح القدس ہے۔ باپ غیر مخلوق بیٹا غیر مخلوق اور روح القدس غیر مخلوق باپ غیر محدود بیٹا غیر محدود اور روح القدس غیر محدود ہے۔ باپ ازلی بیٹا ازلی اور روح القدس ازلی۔ تاہم تین ازلی نہیں ایک ازلی اسی طرح تین غیر محدود اور تین غیر مخلوق نہیں بلکہ ایک غیر محدود ایک غیر مخلوق اور یوں ہی باپ قادر مطلق، بیٹا قادر مطلق اور روح القدس قادر مطلق تو بھی تینوں قادر مطلق نہیں بلکہ ایک قادر مطلق ہے۔ ویسا ہی باپ خدا بیٹا خدا اور روح قدس خدا پھر بھی تین خدا نہیں بلکہ ایک خدا، اسی طرح باپ خداوند بیٹا خداوند اور روح قدس خداوند تو بھی تین خداوند نہیں بلکہ ایک خداوند۔

(دعائے عمیم مطبوعہ افتخار دہلی ۱۹۰۹ء ص ۱۲۴)

پادری فنڈر صاحب جو عیسائیوں میں پادری ہونے کی حیثیت میں اونچا مقام رکھتے ہیں بڑی فراخ دلی سے لوگوں کو بتاتے ہیں۔

ایمانداروں پر لازم اور واجب ہے کہ جیسا باپ بیٹے پر ویسا ہی روح القدس پر ایمان لاکر اس کی عبادت اور بندگی کریں اور عنایت اور نعمت کی اس سے امید باندھیں۔
(مفتاح الاسرار طبع پنجم)

یہ عبارات بتارہی ہیں کہ ہر ایک ان تینوں میں سے مستقل خدا اور معبود ہے، یہ ہے عیسائیوں کا دعویٰ، اسی مفتاح الاسرار میں یہ بھی صاف صاف لکھا ہے کہ

مسیح نے خدا کی ذات و صفات اور لفظ خدا کو بھی اپنے ساتھ نسبت دیا ہے چنانچہ آئندہ آیتوں سے معلوم ہوتا ہے اور اس بات سے صاف ظاہر ہے کہ وہ ایسے معنے سے خدا کا بیٹا نہیں ہے جن معنے میں متقی پرہیزگار ایماندار لوگ خدا کے فرزند کہلاتے ہیں بلکہ اس معنے سے خدا کا بیٹا ہے کہ صفات اور ذات میں خدا کے برابر ہے۔ پرہیزگار اور ایماندار لوگ تو اپنے ایمان کی جہت سے خدا کے بیٹے ہیں لیکن مسیح وحدت ذات کی نسبت خدا کا بیٹا ہے۔ (مفتاح الاسرار ص ۱۴)

آئیے اب اس کے ابطال میں قرآن کے دلائل سنیئے:

[۱۶] - مریم کا بیٹا مسیح اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کا ایک رسول ہے اس سے پہلے بھی کتنے رسول ہو چکے ہیں۔ یعنی اسی مقدس جماعت کے حضرت مسیح بھی ایک فرد ہیں انہیں خدا بنا لینا۔ خدا کا بیٹا کہنا یا تین میں سے ایک کہنا تمہاری سفاہت ہے ہے[1]

قرآن کی یہ آیت ایک دعویٰ اور دلائل پر مشتمل ہے۔ دلائل اگر حکیمانہ ہوں تو تین قسم کے ہوتے ہیں ایک کو دلیل خلف دوسرے کو استقراء تیسرے کو تمثیل کہتے ہیں۔

خلف یہ ہے کہ جب دو نقیضوں میں سے ایک کو باطل کر دیا جائے تو دوسری کا وجود ضروری ہو یا ایک کا وجود ثابت ہو تو دوسرے کا عدم ہو مثلاً ثابت کیا جائے کہ کسی خاص وقت میں رات نہیں تو دن ضرور ہوگا اور اگر ثابت کیا جائے کہ کسی خاص وقت میں دن ہے تو رات نہ ہوگی۔

استقراء وہ دلیل ہے جس میں حکم بہت سی جزئیات اور نظائر کو تلاش کے بعد لگایا جائے مثلاً بہت آدمیوں کو دو پاؤں والا دیکھ کر یہ حکم لگا دینا کہ انسان دو پایہ ہوتا ہے۔

تمثیل وہ دلیل ہے جس میں حکم کی بنیاد مشابہت ہو جیسے شراب کے نشہ پر دوسری نشہ آور

[1] افادات شیخ الاسلام

پیمبروں کا قیاس۔

قرآن کی اس آیت میں ان تینوں دلائل کی طرف اشارہ ہے دعویٰ یہ ہے کہ مسیح اللہ کے رسول ہیں۔ اصل ارشاد ما المسیح ابن مریم الا رسول آیا ہے۔ یہاں یہ فقرہ بطور استیناف لایا گیا ہے گویا سننے والے جب پہلی آیات سنتے ہیں کہ تثلیث غلط ہے، اللہ کی ذات واحد ہے نہ اس میں اصول کی ترکیب ہے اور نہ اقانیم کی کہ معاً ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر صورت حال یہی ہے تو پھر حضرت مسیح فی الواقع کیا ہے۔ اسی کا جواب ہے ما المسیح ابن مریم الا رسول مسیح ابن مریم صرف اللہ کے رسول ہیں۔ اور ظاہر ہے کہ رسول ہونے کی وجہ سے وہ ایک انسان ہیں، نہ وہ خدا ہیں اور نہ خدائی میں ان کا کوئی حصہ ہے۔ یہ دعویٰ مخاطبوں کے ذہنوں میں واضح طور پر پیش کرنے کے بعد اس کے دلائل پیش کیے۔ اس لفظ میں مسیح اللہ کے رسول میں تمثیل کی طرف اشارہ ہے۔ یعنی جیسے رسول ہونے کی حیثیت میں اس دنیا میں اللہ کے دوسرے رسولوں کا مقام ہے وہی مسیح کا مقام ہے۔ انسانیت رسول کا ایک کمال ہے۔ کیونکہ اصلاح کے لیے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے جو کچھ نہیں کھا سکتا وہ ایک گرسنہ کی پوری تسلی بھی نہیں کر سکتا اور جو فطرت انسانی کی کمزوریوں سے واقف نہیں وہ کمزوریوں پر اغماض بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے قرآن عزیز نے جابجا رسولوں کا انسان ہونا ایک مستقل انعام قرار دیا ہے۔ لفظ رسول ایسا پر عظمت کلمہ ہے کہ حضرت مسیح کے واقعی تعارف کے لیے اس سے زیادہ موزوں اور کوئی کلمہ نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ رسول کا لفظ ہر دور میں مشہور و معروف رہا ہے، اس کے لوازم سب کے ذہن نشین ہیں اس کے فرائض سب کو معلوم ہیں۔ اس کی شخصیت واحترام سے سب آشنا ہیں اور یہ تو کسی ناسمجھ سے ناسمجھ انسان پر بھی پوشیدہ نہیں ہے کہ بادشاہ اور اس کے رسول کے درمیان نوازش وکرم کے سوا برابری اور مساوات کا کوئی شائبہ تک نہیں ہوتا۔ ایک لفظ رسول سے سننے والوں کے دلوں میں وہ ساری عظمتیں دوڑنے لگتی ہیں۔ محبت و توقیر، اطاعت و فرمانبرداری کے وہ تمام جذبات امڈنے لگتے ہیں جو رسول کے لیے امڈنا چاہئیں اور بیک وقت وہ تمام حدود بھی نظروں کے سامنے آجاتی ہیں جو ایک بادشاہ اور اس کے ایلچی درمیان فاصل رہنی چاہئیں، اس لیے محبت و طاعت کے جذبات کے ساتھ ان کا جوہر توحید شرک کے گرد سے کبھی بے آب نہیں ہوتا۔

اور ساتھ ہی یہ فرما کر قد خلت من قبلہ الرسل کہ حضرت مسیح سے پہلے اور رسول گزر چکے ہیں۔ استقراء کی طرف اشارہ کر دیا ہے یعنی سارے پیغمبر جو خدا کی طرف سے آئے ہیں وہ نہ خدا تھے

نہ اس کا اوتار و بروز ہے اور نہ اس کے بیٹے اور اقنوم ہے تو پھر حضرت مسیح رسول، رب خدا، خدا کے بیٹے اور اقنوم کیوں کر ہو سکتے ہیں۔ عربی میں دوسرے کی خدمت انجام دینے کے لیے دو ہی لفظ ہیں ایک رسول دوسرے وکیل۔ ان دونوں کا تصرف دراصل دوسرے کے لیے ہوتا ہے اپنے لیے نہیں ہوتا مگر ان دونوں میں جوہری فرق ہے۔ وکیل کا تصرف بہ نسبت رسول کے زیادہ وسیع ہوتا ہے۔ وکیل اپنے مؤکل کی جانب سے مختار ہوتا ہے جو چاہے بطور خود بھی کر سکتا ہے۔ رسول صرف اس امانت کے پہنچا دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے جو اسے سپرد کی گئی ہے۔ اسی لیے پیغمبر کو حکم ہوتا ہے کہ اعلان کرو قل لست علیکم بوکیل میں وکیل نہیں ہوں۔

مسیح کے معبود نہ ہونے کی واضح ترین دلیل

۱۶۲ – اور ان کی والدہ صدیقہ تھیں وہ دونوں کھانا کھاتے تھے۔ دیکھو ہم ان لوگوں کے لیے کس طرح دلائل بیان کر رہے ہیں، پھر دیکھو کہ یہ لوگ کدھر پھیرے جاتے ہیں۔ جمہور امت کی تحقیق یہی ہے کہ خواتین میں نبوت نہیں آئی یہ مردوں ہی کے لیے مخصوص رہا ہے۔ حضرت مریم بتول بھی ایک خدا رسیدہ بی بی تھیں، نبی نہیں۔ اس آیت پر غور کرنے سے معلوم ہو سکتا ہے کہ جو شخص کھانے پینے کا محتاج ہو وہ تقریباً دنیا کی ہر چیز کا محتاج ہے۔ زمین، ہوا، آگ، پانی، سورج، حیوانات حتیٰ کہ لوہے اور کمہار سے بھی اسے استغنا نہیں ہو سکتا۔ غذا کے پیٹ میں پہنچنے اور ہضم ہونے تک خیال کرو۔ بالواسطہ اور بلاواسطہ کتنی چیزوں کی ضرورت ہے۔ پھر کھانے سے جو اثرات اور نتائج پیدا ہوں گے ان کا سلسلہ کہاں تک جاتا ہے۔ احتیاج و افتقار کے اس طویل الذیل سلسلہ کو ملحوظ رکھتے ہوئے، ہم الوہیت مسیح و مریم کے ابطال کو بشکل استدلال یوں بیان کر سکتے ہیں کہ مسیح کھانے پینے کی ضروریات سے مستغنی نہ تھے جو مشاہدہ اور تواتر سے ثابت ہے اور جو کھانے پینے سے مستغنی نہ ہو وہ دنیا کی کسی چیز سے بھی مستغنی نہیں ہو سکتا۔ پھر تم ہی کہو کہ جو ذات تمام انسانوں کی طرح اپنے بقا میں عالم اسباب سے مستغنی نہ ہو وہ کیوں کر خدا بن سکتی ہے۔ یہ ایسی قوی اور واضح دلیل ہے جسے عالم و جاہل یکساں طور پر سمجھ سکتے ہیں یعنی کھانا پینا الوہیت کے منافی ہے۔ اگرچہ نہ کھانا الوہیت کی دلیل نہیں ہے ورنہ معاذ اللہ سارے فرشتے خدا بن جائیں۔ [1]

[1] تفہیم القرآن

ان چند لفظوں میں عیسائیوں کے عقیدۂ الوہیتِ مسیح کی ایسی صاف تردید کی گئی ہے کہ اس سے زیادہ صفائی کے ساتھ ممکن نہیں ہے۔ مسیح کے بارے میں اگر کوئی یہ معلوم کرنا چاہے کہ فی الواقع وہ کیا تھے؟ تو ان علامات سے بالکل غیر مشتبہ طور پر معلوم کر سکتا ہے کہ وہ محض ایک انسان تھے۔ ظاہر ہے کہ جو ایک عورت کے پیٹ سے پیدا ہوا، جو انسانی جسم رکھتا تھا، جو ان تمام حدود و قیود سے مقید اور ان تمام صفات سے متصف تھا جو انسان کے لیے مخصوص ہیں، جو سوتا تھا کھاتا تھا گرمی اور سردی محسوس کرتا تھا اس کے متعلق کون معقول انسان یہ تصور کر سکتا ہے کہ وہ خود خدا ہے یا خدائی میں خدا کا شریک ہے لیکن یہ انسانی ذہن کی ضلالت پذیری کا ایک عجیب کرشمہ ہے کہ عیسائی خود اپنی مذہبی کتابوں میں مسیح کی زندگی کو صریحاً ایک انسانی زندگی پاتے ہیں اور پھر بھی اسے خدائی سے متصف قرار دینے پر اصرار کیے چلے جا رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ اس تاریخی مسیح کے قائل ہی نہیں ہیں جو عالم واقعہ میں ظاہر ہوا تھا بلکہ انہوں نے خود اپنے وہم و گمان سے ایک خیالی مسیح تصنیف کر کے اسے خدا بنا لیا ہے[1]

اللہ اکبر یہ کتنا بڑا تضاد ہے کہ ایک طرف حضرت مسیح اپنے سارے کمالاتِ بشری کے باوجود لوازمِ بشری سے منزہ نہ تھے اور ماں بیٹا دونوں قواتے بشریہ سے مرکب تھے اور کھانے پینے اور ساری انسانی ضرورتوں کے محتاج اور دوسری طرف یہ لوگ اس طرح کے خرافات میں کھوتے گئے ہیں کہ باپ بیٹا اور روح القدس تین جدا جدا اور مستقل اقنوم ہیں۔ عالم لاہوت میں تینوں کی وحدت ایک خدا ہے۔ تین خدا نہیں، بیٹا ازل ہی میں خدا سے پیدا ہوا۔ اور روح القدس کا صدور بھی ازل ہی میں خدا سے ہوا ہے۔ روح القدس کا صدور اکیلے باپ سے نہیں بلکہ بیٹے سے بھی ہوا۔ خدا ہونے میں تینوں اقنوم برابر کے شریک ہیں۔ ایک ایک پورا اور باقی دونوں اپنی اپنی جگہ جزوی حصہ ہیں۔" یہاں ترکیب سے وحدت پیدا ہوتی ہے اور وحدت کا نام ہی نام ترکیب ہے۔ یا اور اس قسم کی دوسری خرافات جو مفتاح الاسرار کے مصنف پادری فنڈر نے اور رسالہ مسیح ابن اللہ کے مصنف نے قدم قدم پر درج کی ہیں۔ ان کو دیکھو اور پھر قرآن کے صاف سادہ اور ہر شخص کی سمجھ میں آنے والے مسیح کے تعارف کو دیکھو اور پھر خود ہی انصاف سے بتاؤ کہ حقیقت وہ گورکھ دھندہ ہے جو مسیحی دنیا بتا رہی ہے یا وہ ہے جو قرآن پیش کر رہا ہے۔ امام رازی نے اسی

---

[1] تفہیم القرآن۔

پریشان ہو کر یہ کہا ہے۔ سورہ نسا کی تفسیر میں فرماتے ہیں،
بلاشبہ اس موضوع پر نصاریٰ کا مذہب بالکل مہمل ہے۔
اور پھر فرماتے ہیں
خلاصہ یہ ہے کہ جیسا اس مسئلے میں عیسائی مذہب بڑا ہی رکیک اور عقل سے
بعید ہے۔ ایسا دُنیا میں کوئی مذہب رکیک اور بعید از عقل نہیں ہے۔
اور پھر اس آیت کی تشریح کرتے ہوتے رقمطراز ہیں۔
دُنیا میں کوئی مقالہ عیسائیوں کے مقالے سے زیادہ فاسد اور باطل نہیں ہے۔
اس موضوع پر حضرت مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی کی کتاب احسن الاحادیث فی ابطال التثلیث بڑے معرکہ کی کتاب ہے۔

عبادت صرف اللہ کا حق ہے

۱۶۳۔ اے پیغمبر ان سے کہو کیا تم اللہ کو چھوڑ کر اس کی پرستش کرتے ہو جس کے اختیار میں نہ تمہارا نقصان ہے اور نہ نفع اور اللہ ہی سننے والا اور علم رکھنے والا ہے۔ یعنی معبود بننا صرف اس ذات کے ساتھ خاص ہے جو ہر قسم کے نفع و ضرر کا مالک ہو اور پورا با اختیار ہو کیونکہ عبادت انتہائے تذلل کا نام ہے اور انتہائی تذلل صرف اسی کے سامنے اختیار کر سکتے ہیں جو انتہائی عزت، غلبہ رکھنے والا ہر آن سب کی سننے والا اور سب کے احوال کا پوری طرح جاننے والا ہو اس میں تثلیث کے عقیدہ شرکیہ کے ساتھ تمام مشرکین کا رد ہو گیا[1]

مطلب یہ ہے کہ جب یہ حقیقت بے نقاب ہو کر تمہارے سامنے آچکی ہے کہ حضرت مسیح اور ان کی والدہ اپنے تعارمیں کھانے کی محتاج ہیں تو پھر تمہیں خود سوچ لینا چاہیے کہ جو اپنی ذات تک احتیاجات رکھتا ہے وہ دوسروں کے لیے حاجت روا کیوں کر ہو سکتا ہے۔ ایک ذات محتاج بھی ہو اور معبود بھی ہو یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ یہ خدا ہی کی شان ہے کہ وہ کسی کا محتاج نہیں ہے اور سب اس کے محتاج ہیں، وہ کسی کا محکوم نہیں سب اس کے محکوم ہیں اور جس کا حال یہ ہو کر کھانا پینا سونا اور جاگنا، بھوک اور پیاس، صحت اور بیماری، موت اور زندگی، گرمی اور سردی سب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس پر حکمراں ہوں اور ان تمام حکومتوں کا اس پر دباؤ ہو اور وہ ان سب کے ناز اور دبدبے کو سہتا ہو اور جو دوسروں کو تو کیا اپنے کو بھی نفع نہ پہنچا سکتا ہو کیا وہ اس لائق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اور اس ذات گرامی کی عبادت چھوڑ کر کی جاتے جو ہر قسم کے نفع و نقصان کی مالک ہے۔

دراصل یہ بھی مسیحیوں کی غلط فکر کی دوسرے انداز سے تردید ہے اور ما تعبدون سے مراد حضرت عیسٰی اور ان کی والدہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ حضرت عیسٰی اور ان کی والدہ تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتے جیسے اللہ کی ذات تمہاری جانوں اور مالوں، بلائیں اور مصائب کے ذریعے تمہیں نقصان پہنچا سکتی ہے اور ایسے ہی یہ دونوں تمہیں ویسا نفع نہیں پہنچا سکتے جیسے اللہ کی ذات تمہیں تندرستی کی نعمت، اموال میں فراوانی اور زندگی میں خوشحالی دے کر نفع پہنچا سکتی ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ دونوں قطعاً تمہارے نفع و نقصان کے مالک نہیں اس لیے اللہ کی عبادت چھوڑ کر جس کے قبضہ و قدرت میں تمہارا ہر قسم کا نفع و نقصان ہے۔ ان کی عبادت کرنا جو کبھی نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں کس قدر عقل کی محرومی اور دانش کی یتیمی ہے۔

فتح البیان میں نواب صدیق حسن خاں کا یہ استنباط لطیف اور بالکل برمحل ہے۔

جب اللہ کا فیصلہ حضرت عیسٰی کے حق میں نبی ہونے کے باوجود یہ ہے تو اولیاءؒ کے بارے خدا کا فیصلہ کیا ہوگا! اس کا اندازہ کرنے کے لیے کسی صراحت کی ضرورت نہیں ہے۔

عیسائیوں کی دو گمراہیاں

۱۶۴ - کہ دو کہ اے اہل کتاب اپنے دین میں حقیقت کے خلاف حد سے نہ بڑھو۔ اور اس گروہ کی خواہشوں کی پیروی نہ کرو جو تم سے پہلے خود ہی گم کردہ راہ ہیں اور بہتوں کو گمراہ کر چکے ہیں اور وہ حق کی سیدھی راہ کھو بیٹھے۔ عقیدہ کا غلو یہ ہے کہ ایک مولود بشری کو خدا بنا دیا۔ اور عمل میں غلو وہ ہے جسے رہبانیت کہتے ہیں۔ یہود کی جو قبائح بیان ہو چکیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ دنیا پرستی میں غرق ہونے کی وجہ سے دین اور دینداروں کی یہاں کوئی عظمت و وقعت نہیں تھی۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام کی توہین و قتل وغیرہ ان کا خاص شعار تھا برخلاف اس کے کہ نصاریٰ نے تعظیم انبیاء میں اس قدر غلو کیا کہ ان میں سے بعض کو خدا کا بیٹا کہنے لگے اور ترک دنیا کرکے رہبانیت اختیار کر لی اور ساتھ یہ بھی بتا دیا کہ دین میں اس بگاڑ کا غلو کی صورت کا سرچشمہ کیا

ہے فرمایا کہ اصل انجیل وغیرہ کتب سماویہ میں اس عقیدہ فکریہ کا کہیں پتہ نہ تھا۔ بعد میں یونانی بت پرستوں کی تقلید میں پولوس نے ایجاد کیا، اسی پر سب چل پڑے اور اسی پر جمے ہوئے ہیں۔ ایسی اندھی تقلید سے سنجات کی توقع رکھنا کسی عاقل کو زیبا نہیں ہے [1]

اس آیت میں دو باتوں سے منع کیا ہے ایک دین میں ناحق غلو سے اور دوسرے گمراہ قوموں کی پیروی سے۔ غلو کے لیے اصل ارشاد یہ ہے لا تغلوا فی دینکم غیر الحق۔ غلا یغلو کے معنے بڑھنے زیادہ ہونے کے ہیں۔ دیگچی میں ابال آجاتے تو بولتے ہیں غلت القدر یہاں غلو کے ساتھ دو قیدیں ہیں ایک فی دینکم اور دوسرے غیر الحق۔ دین میں غلو یہ ہوتا ہے کہ دین میں جس چیز کا جو درجہ، مرتبہ یا جو وزن اور مقام ہے اس کو بڑھا کر کچھ سے کچھ کر دیا جائے۔ یہ عقائد میں بھی ہوتا ہے اور اعمال میں بھی۔ عقائد کی حد تک جیسے عیسائیوں نے حضرت عیسیٰ کو جو خدا کے بندے اور رسول تھے ان کو انہوں نے خدا کا بیٹا بنایا اور پھر لے جا کر خدا کے عرش پر بٹھا دیا۔ حضرت مریم حضرت عیسیٰ کی والدہ تھیں ان کو نعوذ باللہ خدا کی ماں بنا دیا۔ حضرت جبریل خدا کے بندے اور فرشتے تھے ان کو بھی ایک اقنوم کی حیثیت دے کر خدائی تثلیث میں شریک کر دیا۔ اور اعمال میں غلو یہ ہے کہ جو حکم صرف استحباب و استحسان کا درجہ رکھتا ہے اس کو فرض و واجب کا درجہ دے دیا جائے۔ حضرت مسیح نے دنیا اور دنیوی زندگی کے زخارف سے بچنے کی تلقین کی تو عیسائیوں نے رہبانیت کا ایک پورا نظام کھڑا کر دیا۔ یہ اور اس قسم کی ساری باتیں غلو میں داخل ہیں اور جس طرح مذہب کے معاملہ میں تفریط ایک بہت بڑا جرم ہے اسی طرح یہ افراط بھی بہت بڑا فتنہ ہے۔ افراط ہو یا غلو، تفریط ہو یا عدوان اس سے مذہب کا وہ مزاج جو سرتاسر اعتدال ہے بالکل درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے اور اس سے وہ خدائی ترکیب و تالیف جو دین کے اجزاء کو حسن و جمال کا ایک دلآویز پیکر بناتی ہے بالکل مسخ ہو جاتی ہے۔ یوں اس غلو میں سارے ادیان مبتلا ہیں لیکن نصاریٰ کو اس میں امامت کا درجہ حاصل ہے۔ ان کی اصل بیماری یہی ہے کہ انہوں نے عقائد و عمل میں غلو کر کے پورے دین کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے۔

یہاں علامہ زمخشری کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ غیر الحق کی قید نے یہ بتا دیا ہے کہ غلو بھی دین میں دو طرح کا ہے ایک غلو حق دوسرے غلو بغیر الحق۔ غلو حق یہ ہے کہ جو کچھ فرمایا جا رہا ہے اس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حق کے حقائق کی تلاش و جستجو کی جاتے اس کے بعید سے بعید تر معانی پر غور کر کے اس کے منطوق کے ساتھ اس کے مدلول اور اس کے مفہوم سے قانونی دفعات کا استنباط کیا جاتے۔ یا حق کے ثابت کرنے کے لیے عقلی دلائل کا سرمایہ فراہم کیا جاتے۔ یہ غلو محمود ہے کیونکہ یہ غلو حق ہے اور غلو غیر حق یہ ہے کہ دلائل حق سے ہٹ کر اپنی چاہتوں کے مطابق پیمانہ بنا دیا جاتے۔ دونوں روح کے اعتبار سے الگ ہیں اور دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ لے مثلاً یوں سمجھ لیجیے کہ پیمانہ عقیدہ و عمل کا آپ خود بنائیں اور اس کے لیے نبوت کے علم و عمل میں اس کے مذاق کے خلاف دلائل تلاش کریں۔ اور آپ ان کو توڑ مروڑ کر اپنے مزعومہ پر چسپاں کریں اور نبوت کے علم و عمل کی کھلی ہدایات سے بے پروا ہو کر اپنے موقف پر جمے رہیں۔ مثلاً یہی مسئلہ تثلیث ہے۔ اس موضوع پر انجیل کی کھلی اور واشگاف آیات کو چھوڑ کر اپنے ہوائے نفس کے بنائے ہوتے پیمانے پر اڑے ہوتے ہیں۔ انجیل یہ چیخ رہی ہے کہ۔

"ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں۔

(یوحنا باب ۱۷ آیت ۳)

"اس سے پوچھا کہ سب حکموں میں اول کون سا ہے ۲۹۔ یسوع نے جواب دیا کہ اول یہ ہے ۳۰۔ اے اسرائیل سن خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے۔

(انجیل مرقس باب ۱۲ آیت ۲۸)

"اے استاد کیا خوب تو نے سچ کہا کہ وہ ایک ہی ہے اور اس کے سوا اور کوئی نہیں ہے۔

(مرقس باب ۱۲ آیت ۳۲)

"اور جو کلام تم سنتے ہو وہ میرا کلام نہیں بلکہ باپ کا ہے جس نے مجھے بھیجا ہے۔

(یوحنا باب ۱۴ آیت ۲۴)

یسوع نے کیا لکھا ہے کہ تو اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر

افسوس کہ مسیحی ان نصوص صریحہ کے مخالف ہیں اور تثلیث میں بہکے جا رہے ہیں۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر پادری فنڈر جو ہندوستان میں عیسائیوں کے امام مناظر مانے جاتے ہیں۔ ان کی کتاب مفتاح الاسرار اسی غلو کا شاہکار ہے۔ سنیے اور ماتم کیجیے۔

"مسیح نے اپنی الوہیت کا اشارہ کر کے یوحنا کے باب ۸ آیت ۲۳ میں یہودیوں سے ایسا فرمایا ہے کہ تم پستی میں ہو اور میں بلندی پر ہوں۔ تم اس جہان کے ہو میں

اس جہان کا نہیں ہوں۔ اور اسی باب کی آیت ۵۸ میں فرمایا ہے کہ پیشتر اس کے کہ ابراہیم سو میں ہوں۔ اور اس آیت کو بیان کر کے یوحنا باب ۱۷ آیت ۵ میں کہا ہے کہ اے باپ اب تو مجھے اپنے ساتھ اس جلال سے جو میں دُنیا کی پیدائش سے پیشتر تیرے ساتھ رکھتا تھا بزرگی دے اور مکاشفات کے پہلے باب کی ۱۸ آیت میں فرمایا ہے کہ میں ایفا اور امیگا اوّل و آخر ہوں۔ اب ان آیتوں میں مسیح صاف بیان کرتا ہے کہ میں آسمان سے اترا اور ابراہیم سے پیشتر بلکہ سارے عالم کے پیدا ہونے سے پہلے موجود اور اوّل و آخر ہوں بس ظاہر و عیاں ہے کہ مسیح قدیم اور ازلی ہے۔

(مفتاح الاسرار طبع پنجم)

دیکھا آپ نے کہ کس کس انداز سے آیات کے مطالب کو مسخ کر کے مسیح کی خدائی کا پرچم لہرانے کی کوشش ہو رہی ہے یہی وہ غلو باطل ہے جس سے قرآن اہل کتاب کو روک رہا ہے۔ اسی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اُمت کو دین میں غلو سے منع فرمایا ہے۔ مسند امام احمد، نسائی اور ابن ماجہ میں بحوالہ عبداللہ بن عباس جناب رسُول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

مسلمانو! تمہیں دین میں غلو سے بچ کر رہنا چاہیے تم سے پہلے لوگ دین میں غلو کی وجہ سے تباہ ہو گئے۔

امام بخاری نے کتاب الانبیاء میں بحوالہ حضرت عمر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشادِ گرامی نقل کیا ہے۔

میری تعریف میں حد سے ایسے نہ بڑھ جانا جیسے عیسائی حضرت عیسٰی کی تعریف میں آگے چلے گئے۔ بلاشبہ میں ایک بندہ ہوں مجھے اللہ کا بندہ اور اللہ کا رسُول ہی کہو۔

عیسائیوں کی ضلالت کا سرچشمہ

دوسری بات جس سے اس آیت میں اللہ نے اہل کتاب کو روکا ہے وہ یہ ہے کہ گمراہ قوموں کی پیروی نہ کرو۔ اصل ارشاد یہ ہے لا تتبعوا اھواء قوم قد ضلوا من قبل۔ اس میں اشارہ ہے ان گمراہ قوموں کی طرف جن سے عیسائیوں نے غلط عقیدے اور باطل طریقے لیے، خصوصاً فلاسفر یونان کی طرف جن کے تخیلات سے متاثر ہو کر عیسائی اس صراط مستقیم سے ہٹ

گئے جس کی طرف ابتداء ان کی رہنمائی کی گئی تھی۔ مسیح کے ابتدائی پیرو جو عقائد رکھتے تھے وہ بڑی حد تک اس حقیقت کے مطابق تھے جس کا مشاہدہ انہوں نے خود کیا تھا اور جس کی تعلیم ان کے ہادی و رہنما نے ان کو دی تھی مگر بعد کے عیسائیوں نے ایک طرف مسیح کی عقیدت و تعظیم میں غلو کر کے اور دوسری طرف ہمسایہ قوموں کے اوہام اور فلسفوں سے متاثر ہو کر اپنے عقائد کی مبالغہ آمیز فلسفیانہ تعبیریں شروع کر دیں۔ اور ایک بالکل ہی نیا مذہب تیار کر لیا جس کو مسیح کی اصل تعلیمات سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔

اس باب میں خود ایک مسیحی عالم دینیات رلوانید چارلس اینڈرسن سکاٹ کا بیان قابل ملاحظہ ہے۔ انسائیکلو پیڈیا برٹینیکا کے چودھویں ایڈیشن میں "یسوع مسیح" کے عنوان پر اس نے جو طویل مضمون لکھا ہے اس میں وہ کہتا ہے۔

"پہلی تین انجیلوں متی مرقس لوقا میں کوئی چیز ایسی نہیں ہے جس سے یہ گمان کیا جا سکتا ہو کہ ان انجیلوں کے لکھنے والے یسوع کو انسان کے سوا کچھ اور سمجھتے تھے ان کی نگاہ میں وہ ایک انسان تھا ایسا انسان جو خاص طور پر خدا کی روح سے فیض یاب ہوتا تھا اور خدا کے ساتھ ایسا غیر منقطع تعلق رکھتا جس کی وجہ سے اگر اس کو خدا کا بیٹا کہا جاتے تو حق بجانب ہے۔ خود متی اس کا ذکر بڑھئی کے بیٹے کی حیثیت سے کرتا ہے اور ایک جگہ بیان کرتا ہے کہ پطرس نے اس کو مسیح تسلیم کرنے کے بعد الگ ایک طرف لے جا کر اسے ملامت کی۔ متی ١٦-٢٢ - لوقا میں ہم دیکھتے ہیں کہ واقعہ صلیب کے بعد یسوع کے دو شاگرد اماؤس کی طرف جاتے ہوئے اس کا ذکر اس حیثیت سے کرتے ہیں کہ وہ خدا اور ساری امت کے نزدیک کام اور کلام میں قدرت والا نبی تھا۔ لوقا ٢٤ ، ١٩) یہ بات خاص طور پر قابل توجہ ہے کہ اگرچہ مرقس کی تصنیف سے پہلے مسیحیوں میں یسوع کے لیے لفظ خدا وند عام طور پر چل پڑا تھا لیکن مرقس کی انجیل میں یسوع کو کہیں اس لفظ سے یاد کیا گیا ہے اور نہ متی کی انجیل میں۔ بخلاف اس کے دونوں کتابوں میں یہ لفظ اللہ کے لیے استعمال ہوا ہے۔ یسوع کے ابتلاء کا ذکر تینوں انجیلیں پورے زور کے ساتھ کرتی ہیں جیسا کہ اس واقعہ کے شایان شان ہے مگر مرقس کی فدیہ والی عبارت اور آخری فتح کے موقع پر چند الفاظ کو مستثنیٰ کر کے ان کتابوں میں کہیں اس واقعہ کو وہ معنے نہیں پہنائے گئے ہیں جو بعد میں پہنائے گئے ہیں۔

اس کے بعد یہی مصنف لکھتا ہے

وہ سینٹ پال تھا جس نے اعلان کیا کہ واقعہ رفع کے وقت اسی فعل رفع کے ذریعے سے یسوع پورے اختیارات کے ساتھ ابن اللہ کے مرتبہ پر علانیہ فائز کیا گیا۔ لے

یہ سوال یہاں بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ مسیحیت میں یہ انقلاب یکبارگی آیا یا دھیرے دھیرے؟ اس کا جواب قاضی القضاۃ عبدالجبار ہمدانی نے بڑی تفصیل سے دیا ہے۔ یاد رہے کہ قاضی صاحب موصوف چوتھی صدی میں ہوئے ہیں اور پانچویں صدی ہجری کے آغاز میں ان کی وفات ہوئی ہے۔ ان کی کتاب تثبیت دلائل النبوۃ دو جلدوں میں ۱۹۶۶ء میں لبنان میں دارالعربیہ نے شائع کی ہے اور ڈاکٹر عبدالکریم عثمان نے اس پر تحقیقی کام کیا ہے۔ قاضی صاحب فرماتے ہیں کہ دین مسیحی میں یکبارگی تبدیلی نہیں آئی ہے بلکہ آہستہ آہستہ مختلف زمانوں میں تبدیلی ہوتی رہی ہے۔ اہل حق کم ہوتے گئے اور اہل باطل کی تعداد بڑھتی رہی تاآنکہ اہل باطل کا غلبہ ہو گیا اور حق ختم ہو گیا۔

آغاز میں مسیحی اور یہودیوں کی عبادت گاہیں مشترک تھیں، ایک ہی جگہ نمازیں پڑھتے اور تہوار بھی مناتے ہیں۔ مسیح کی ذات کی حد تک ان میں باہم اختلاف تھا۔ دونوں رومیوں کی حکومت میں رہتے تھے۔ عیسائی رومی سرکار سے یہودیوں کی شکایات کرتے تھے۔ رومی حکومت ان شکایات کے جواب میں ان سے کہتی کہ یہودیوں سے ہمارا معاہدہ ہے کہ ہم ان کے دین میں مداخلت نہ کریں گے تم اگر ان سے الگ اپنا دینی ڈھانچہ قائم کر لو اور ان سے بالکل الگ ہو کر ہماری طرح مشرق کی طرف منہ کر کے نماز پڑھو اور جائز و ناجائز پیمانے ہماری طرح سے اختیار کر لو تو ہم تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور اس کے بعد یہود تمہارا بال بھی بیکا نہ کر سکیں گے۔ تم ان سے زیادہ ہمارے یہاں معزز ہو گے۔ ان لوگوں نے جب یہ بات قبول کر لی تو انہوں نے کہا کہ جاؤ اپنے سربرآوردہ لوگوں اور اپنی کتاب کو لے کر آؤ۔ یہ لوگ اپنے ساتھیوں کے پاس آئے اور معاہدے کی کہانی سنائی اور کہا کہ تم بھی چلو اور انجیل بھی لے کر چلو۔ ان لوگوں نے ان معاہدہ کرنے والوں کو سخت سست کہا اور بتایا کہ تم نے جو کچھ کیا غلط کیا، ہم کسی حال میں بھی ناپاک رومیوں کو انجیل مقدس نہ دیں گے۔ تم یہ معاہدہ کر کے دین عیسٰی سے نکل گئے اور مرتد ہو گئے۔ اب ہمارے اور تمہارے تعلقات ختم ہیں بلکہ ہماری یہ دینی ذمہ داری ہے کہ تمہارا معاشرتی بائیکاٹ کریں اور انجیل مقدس کو بھی تمہیں ہاتھ نہ لگنے دیں۔ اس طرح دونوں میں ایک عظیم کشمکش پیدا ہو گئی۔ بالآخر معاہدہ کرنے والا طبقہ رومی سرکار میں حاضر ہوا اور سرکار سے درخواست کی کہ ان ساتھیوں کے مقابلہ میں ہماری مدد کریں اور ان سے ہمیں انجیل لے کر دیں۔ سرکار نے ان کے وارنٹ گرفتاری جاری کر دیے یہ لوگ روپوش ہو گئے۔ مرکزی گورنمنٹ نے موصل اور جزیرۃ العرب کے گورنروں کے نام ان کی گرفتاری کے بارے میں سرکلر جاری کر دیے، کچھ پکڑے گئے، جلا دیے گئے اور قتل کر دیے گئے اور اسی کشمکش میں انجیل کے نسخے بھی نذر آتش ہو گئے۔ ان سے یکسو ہونے کے بعد ان مسیحیوں کی

بیلنگ بورن جنہوں نے سرکار سے معاہدہ کیا تھا اور اس میں یہ طے پایا کہ ایک متبادل انجیل ضرور ہونی چاہیے اور اس کے لیے علمی سرمایہ اس طرح فراہم کیا کہ تورات میں انبیاء کی جائے پیدائش، ان کی عمریں، اور تاریخ وفات موجود ہیں اس سے مدد لی جاتے اور انجیل جو کچھ جسے بھی یاد ہے لے لکھا جائے اور حضرت کے متعلق جتنی باتیں زبانی یاد ہیں ان کو قلم بند کیا جائے چنانچہ اس طرح کچھ لوگوں نے اس مقررہ خاکہ کے مطابق انجیل تیار کر لی۔ پھر بعد ازیں کچھ لوگوں نے اور انجیلیں لکھی ہیں۔ اس طرح یکے بعد دیگرے لکھتے لکھتے اناجیل کی تعداد ۸۰ ہو گئی۔ اور نقل و اختصار کے بعد چار انجیلیں قانونی رہی ہیں باقی غیر قانونی ہیں۔ اور لطف یہ ہے کہ ان اناجیل میں کوئی انجیل بھی حضرت مسیح کی زبان میں نہیں ہے یعنی اس عبرانی زبان میں جس میں انجیل نازل ہوئی تھی جو حضرت ابراہیم اور حضرت مسیح کی زبان تھی۔ عبرانی زبان کو چھوڑ کر دوسری زبانوں میں انجیل کی تدوین ایک گہری سازش کی نشاندہی کر رہی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ اس طریق سے دینِ مسیحی کو بگاڑنے اور مسخ کرنے کی سازش آسانی سے پایۂ تکمیل کو پہنچ سکتی ہے کیونکہ اس دور میں عبرانی زبان دینی سرمایہ کی زبان تھی اور اہلِ علم کا علمی اثاثہ اسی سے وابستہ تھا۔ اس سے ہٹ کر دوسری زبانوں کی آغوش میں نہ صرف اس لیے لی گئی ہے تاکہ وقت کے اہل علم کی نگاہوں سے اوجھل رہے اور ان کی سازشوں پر پردہ پڑا رہے اور اس طرح ان کو اپنے دنیوی مقاصد کے حصول میں آسانی ہو۔

اس طرح مسائل میں بھی تدریجی طور پر تغیر رونما ہوا ہے۔ اسی سلسلہ میں انسائیکلوپیڈیا برٹانیکا کے ایک مضمون تاریخ کلیسا کی یہ عبارت بھی قابل ملاحظہ ہے

تیسری صدی عیسوی کے خاتمہ سے پہلے مسیح کو عام طور پر "کلام" کا جسدی ظہور تو مان لیا گیا تھا۔ تاہم بکثرت عیسائی ایسے تھے جو مسیح کی الوہیت کے قائل نہ تھے، چوتھی صدی میں اس مسئلہ پر تند بحثیں چھڑی ہوئی تھیں جن سے کلیسا کی بنیادیں ہل گئی تھیں۔ آخر کار ۳۲۵ء میں نیقیا کی کونسل نے الوہیتِ مسیح کو باضابطہ سرکاری طور پر اصل مسیحی عقیدہ قرار دیا اور مخصوص الفاظ میں اسے مرتب کر دیا۔ اگرچہ اس کے بعد بھی مدت تک جھگڑا چلتا رہا۔ لیکن آخری فتح نیقیا ہی کے فیصلے کو ہوئی جسے مشرق و مغرب میں اس حیثیت سے تسلیم کر لیا گیا کہ صحیح العقیدہ عیسائیوں کا ایمان اسی پر ہونا چاہیے بیٹے کی الوہیت کے ساتھ روح القدس کی الوہیت بھی تسلیم کر لی گئی اور اسے اصطباغ کے کلمہ اور راسخ الوقت شعائر میں باپ بیٹے کے ساتھ جگہ دی گئی۔ اس طرح نیقیا میں مسیح کا جو تصور قائم کیا گیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عقیدہ تثلیث اصل مسیحی مذہب کا ایک جزو لاینفک قرار پا گیا۔

پھر اس دعوے پر کر بیٹے کی الوہیت مسیح کی ذات میں مجسم ہوئی تھی، ایک دوسرا مسئلہ پیدا ہوا جس پر چوتھی صدی میں اور اس کے بعد بھی مدتوں تک بحث و مناظرہ کا سلسلہ جاری رہا۔ مسئلہ یہ تھا کہ مسیح کی شخصیت میں الوہیت اور انسانیت کے درمیان کیا تعلق ہے۔ ۴۵۱ء میں کالسیڈن کونسل نے اس کا یہ تصفیہ کیا کہ مسیح کی ذات میں دو طبیعتیں ہیں ایک الٰہی طبیعت دوسری انسانی طبیعت اور دونوں متحد ہو جانے کے بعد بھی اپنی جداگانہ خصوصیات بلا کسی تغیر و تبدل کے برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ تیسری کونسل میں جو ۶۸۰ء میں بمقام قسطنطنیہ ہوئی اس پر اتنا اضافہ اور کیا گیا کہ دونوں طبیعتیں اپنی الگ الگ مشیئتیں بھی رکھتی ہیں۔ یعنی مسیح بیک وقت دو مختلف مشیئتوں کا حامل ہے ..... اسی دوران میں کلیسا نے گناہ اور فضل کے مسئلہ پر بھی خاص توجہ کی اور یہ سوال مدتوں زیر بحث رہا کہ نجات کے معاملہ میں خدا کا کام کیا ہے اور بندے کا کام کیا، آخرکار ۵۲۹ء میں اورنیج کی دوسری کونسل میں ... یہ نظریہ اختیار کیا گیا کہ ہبوط آدم کی وجہ سے ہر انسان اس حالت میں مبتلا ہے کہ وہ نجات کی طرف کوئی قدم نہیں اٹھا سکتا جب تک وہ اس فضل خداوندی سے جو اصطباغ میں عطا کیا جاتا ہے نئی زندگی حاصل نہ کرے۔ یہ نئی زندگی شروع کرنے کے بعد اسے حالت خیر میں استمرار نصیب نہیں ہو سکتا جب تک وہ فضل خداوندی دائماً اس کا مددگار نہ ہو اور فضل خداوندی کی وجہ دائمی اعانت اسے صرف کیتھولک کلیسا ہی کے توسط سے حاصل ہو سکتی ہے۔

ان تصریحات سے صاف پتہ چلتا ہے کہ عیسائیت کی گمراہی کا اصل باعث رومی افکار ہیں۔ الهمدانی نے صاف لکھا ہے۔

هذا التثليث الذي للنصارى قد كانت فلا سفة الروم تنحو نحوه

حضرت عیسیٰ اور داؤد نے لعنت بھیجی ہے

۱۶۵ - بنی اسرائیل میں سے جن لوگوں نے کفر کی راہ اختیار کی ہے ان پر داؤد اور عیسیٰ ابن مریم لعنت ہو چکی ہے اور یہ اس لیے ہوا کہ وہ اللہ کی نافرمانی کرتے تھے اور حد سے تجاوز کرتے تھے۔ یوں تو تمام کتب سماویہ میں کافروں پر لعنت کی گئی ہے لیکن بنی اسرائیل کے کافروں پر جب وہ عصیان و تمرد میں حد سے گزر گئے کہ نہ مجرم کسی طرح جرم کے ارتکاب سے باز آتا تھا اور نہ غیر مجرم کو جرم سے روکتا تھا بلکہ سب شیر و شکر ہو کر بے تکلف ایک دوسرے کے ہم پیالہ و ہم نوالہ بنے ہوئے تھے منکرات و فواحش کا ارتکاب کرنے والوں پر کسی طرح کے انقباض و تکدر اور ترشروئی کا اظہار بھی نہ

ہوتا تھا تب خدا نے حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت مسیح علیہ السلام کی زبان سے ان پر لعنت کی، جیسے گناہوں پر ان کی جسارت حد سے گزر چکی تھی یہ لعنت بھی جو ایسے جلیل القدر انبیا کے توسط سے کی گئی۔ غیر معمولی طور پر تباہ کن ثابت ہوئی۔[1]

اب روئے سخن عیسائیوں سے ہٹ کر پھر یہودیوں کی طرف ہو گیا ہے۔ بنی اسرائیل پر لعنت کے لیے قرآن نے یہاں حضرت داؤد اور حضرت عیسٰی کا حوالہ دیا ہے۔ حضرت داؤد نے زبور میں کئی دفعہ بنی اسرائیل کی سرکشی اور نافرمانی کا ماتم اپنے سوز و گداز کی لے میں کیا ہے۔ زبور ۷۸ میں ہے۔

اے میرے گروہ میری تعلیم پر کان رکھ، میرے منہ کی بات کان دھر کے سن ....
تاکہ آنے والی پشت سے وہ فرزند پیدا ہوں جو سیکھیں اور وہ خدا پر توکل کریں اور خدا کے کاموں کو نہ بھلا دیں بلکہ اس کے حکموں کو حفظ کریں اور اپنے باپ دادوں کی طرح ایک ایک شریر اور سرکش نسل نہ ہوں۔ نہ ایسی نسل کہ جس نے اپنا دل مستعد نہ کیا اور ان کے جی خدا سے نہ لگے رہے .... باوجود اس سب کے پھر انہوں نے گناہ کیے اور اس کے عجائب قدرت کے سبب اعتقاد نہ کیا .... لیکن انہوں نے اپنے منہ سے اس کے ساتھ ریاکاری کی، اور اپنی زبانوں سے اس سے جھوٹ بولے اور وہ اس کے عہد میں وفادار نہ رہے کیونکہ ان کے دل ان کے ساتھ قائم نہ رہے .... کتنی بار انہوں نے بیابان میں خدا کے ساتھ بغاوت کی اور ویرانہ میں اسے بیزار کیا تس پر بھی انہوں نے خدا تعالیٰ کو آزمایا اور اسے بیزار کیا اور اس کی شہادتوں کو حفظ نہ کیا، بلکہ برگشتہ ہوتے اور اپنے باپ دادوں کی مانند بیوفائی کی۔ وہ ٹیڑھی کمان کے مانند ایک طرف پھر گئے۔

زبور ۸۱ میں ہے۔

اے میرے لوگو سنو کہ میں تجھ پر گواہی دوں گا۔ اے اسرائیل اگر تو میری سنے گا تو تیرے درمیان کوئی دوسرا معبود نہ ہو تو کسی اجنبی معبود کو سجدہ نہ کرنا، خداوند تیرا خدا میں ہوں جو تجھے مصر کی سرزمین سے باہر لایا۔ اپنا منہ کھول کر اسے بھر دوں گا۔ پھر میرے لوگوں نے میری آواز پر کان نہ دھرا اور اسرائیل نے مجھے نہ چاہا۔ تب میں نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اا کے دلوں کی سرکشی کے بس میں چھوڑ دیا۔

بہت سے بنی اسرائیل جو حضرت داؤد سے باغی ہو کر لڑنے پر آمادہ ہوئے تھے۔ حضرت داؤد نے ان کے متعلق یہ بد دعا کی کہ

> تو وہ خدا نہیں جو شرارت سے خوش ہو، شریر تیرے سامنے نہیں رہ سکتے تو سب بدکرداروں سے عداوت رکھتا ہے توان کو جو جھوٹ بولتے ہیں نابود کرے گا ..... اے خداوند اپنی صداقت میں میرا رہبر ہو، میرے دشمنوں کے سبب سے میرے سامنے اپنی راہ سیدھی کر.... ان کے باطن میں سراسر کھوٹا پن ہے .... اے خدا تو انہیں ملزم ٹھہرا کر ایسا ہو کہ وہ اپنی مشورتوں سے آپ ہی گر جائیں۔ ان کو ان کے گناہوں کی کثرت کے سبب نکال پھینک کہ انہوں نے تجھ سے سرکشی کی ہے۔

حضرت عیسٰی نے بھی بنی اسرائیل کو لعنت کی اور فرمایا:

> اے ریاکار فقیہو اور فریسیو! تم پر افسوس کہ تم سفیدی پھری ہوئی قبروں کی مانند ہو جو باہر سے بہت اچھی معلوم ہوتی ہیں پھر بھی مردوں کی ہڈیوں اور ہر طرح کی ناپاکی سے بھری ہیں۔ اسی طرح تم ظاہر میں لوگوں کو راست باز دکھائی دیتے ہو باطن میں ریاکاری اور شرارت سے بھرے ہو۔ اے ریاکار فقیہو اور فریسیو تم پر افسوس کیونکہ نبیوں کی قبریں بناتے ہو اور راست بازوں کی گوریں سنوارتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر ہم اپنے باپ دادوں کے دنوں میں ہوتے تو نبیوں کے خون میں شریک نہ ہوتے۔ اسی طرح تم اپنے اوپر گواہی دیتے ہو کہ تم نبیوں کے قاتلوں کے فرزند ہو پس اپنے باپ دادوں کا پیمانہ بھرو اے سانپو! اے سانپوں کے بچو! تم جہنم کے عذاب سے کیوں کر بھاگو گے۔　　　(متی ۲۳، ۳۳۲)

برائیوں سے باز آنے کا احساس نہ رہا[1]

۱۶۶ ۔ وہ برائی سے ارتکاب کے بعد باز نہ آتے تھے۔ اصل ارشاد میں لا یتناھون ہے۔ اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ نہیں رکتے تھے کما فی روح المعانی، دوسرے یہ کہ نہیں روکتے تھے کما ہو المشہور، جب بدی کسی قوم میں پھیل جائے اور روکنے ٹوکنے والا کوئی نہ ہو تو عذاب عام کا اندیشہ ہے۔ یہ بھی اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ عصیان و عدوان کو سن کر مخاطب کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ذہن میں خلش ہوتی کہ اس کی صورت کیا۔ ارشاد فرمایا کہ اس طرح کہ برائیوں میں پڑ کر پھر اس سے باز آنے کا احساس ان میں باقی نہیں رہا تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب اُمت کی حالت ایسی ہو جائے کہ برائیوں میں پڑ کر پھر ان سے باز رہنے کا احساس اور ولولہ نہ پیدا ہو اور اپنی حالت پر قانع ہو جاتے ہیں تو یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ برائی اور شقاوت کی انتہائی حالت پیدا ہو گئی۔ یہ ٹکڑا ان کے جرائم کی سنگینی کو کھول کر بتا رہا ہے کہ وہ صرف جرائم کا ارتکاب ہی نہ کرتے تھے بلکہ اس سے انبیاء اور راست بازوں کے روکنے کے باوجود باز نہ آتے تھے اور ان کے روکنے کی کوششوں کو بالکل خاطر میں نہ لاتے تھے بلکہ ان کے دشمن ہو جاتے۔ کسی قوم کی اخلاقی بربادی اور ایمان میں مفلسی کی یہی وہ حد ہے جس پر پہنچ کر وہ اللہ کی لعنت کی مستحق ہو جاتی ہے۔

کچھ شارحین قرآن نے یہاں لا یتناہون کے نہیں روکتے تھے کے معنے لکھے ہیں لیکن ہماری رائے میں اس کے معنے نہیں رکتے تھے، سیاق و سباق اور لغت کے زیادہ مناسب ہیں۔ دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ برائیوں کے دلدل میں اس طرح پھنس گئے تھے کہ باوجود اس کے روکنے والے ان کو روکتے تھے مگر وہ رکتے ہی نہ تھے۔ گویا برائی ان کی طبیعت بن گئی تھی۔ اسی بنا پر قسم کھا کر ان کے اس کردار کی مذمت کی ہے لبئس ما کانوا یفعلون ۔ دوسری صورت یہ ہے کہ ان کو برائیوں پر ٹوکنے والا ہی کوئی نہ تھا اور پورا کا پورا معاشرہ برائیوں میں گھر گیا تھا۔ دونوں معنے صحیح ہیں اور آیت میں دونوں معنے کی گنجائش ہے۔

یہود کی اخلاقی پستی کی انتہا

۱۶۷ ۔ اے پیغمبر تم دیکھو گے کہ ان میں بہت سے لوگ ایسے ہیں جو کفر کرنے والوں سے مُرافقت کا رشتہ رکھتے ہیں کیا ہی بُرا سامان ہے جو انہوں نے اپنے لیے آگے روانہ کیا ہے۔ ان کے خلاف اللہ کا غضب ہوا اور وہ ہمیشہ عذاب میں رہنے والے ہیں۔ غالباً اسی لعنت کے نتیجہ میں ان میں کے بہت افراد ظاہراً و باطناً بندر و خنزیر کی شکل میں مسخ کر دیے گئے اور باطنی مسخ کا دائرہ تو اس قدر وسیع ہوا کہ ان کے بہت سے لوگ آج بھی ان مسلمانوں کو چھوڑ کر جو خدا کی تمام کتب سماوی، تمام انبیاء کی تصدیق و تعظیم کرتے ہیں۔ مشرکین مکہ سے جو بت پرست اور نبوت وغیرہ سے جاہل محض ہیں مسلمانوں کے خلاف دوستی گانٹھتے ہیں۔ اگر ان اہل کتاب کو خدا پر اور وحی الٰہی پر واقعی اعتقاد ہوتا تو کیا یہ ممکن تھا کہ اس قوم کی ضد میں جو ان تمام چیزوں کو مکمل طور پر مانتے ہیں بت پرستوں

سے ساز باز کرتے۔ یہ بے حسی اور بدمذاقی اور خدا پرستوں سے بھاگ کر بت پرستوں سے دوستی کرنا اسی لعنت اور پھٹکار کا اثر ہے جس نے انہیں خدا کی رحمت عظیمہ سے کوسوں دور کر دیا ہے۔ پچھلی آیات میں ان کی گزشتہ کفریات اور جرائم کو بیان کیا تھا اور اب ان کے ملعون ہونے کے آثار کو بیان فرمایا تاکہ اب بھی اپنی ملعون حرکات سے باز آ کر حق و صداقت کے راستہ پر چلنے کی کوشش کریں۔ اس رکوع میں ان کی موجودہ حالت پر تنبیہ کرتے ہوئے بتادیا کہ داؤد اور مسیح علیہما السلام کی زبانی جو لعنت ہوئی تھی اس کے آثار آج تک موجود ہیں۔ اہل اللہ اور عارفین سے نفرت وعداوت اور جاہل مشرکوں سے محبت یہ کھلی دلیل اس کی ہے کہ ان کے قلوب خدائی لعنت کے اثر سے مسوخ ہو چکے ہیں۔ اگر اب بھی انہوں نے اپنی حالت کو نہ سنبھالا اور حق کی طرف رجوع نہ کیا تو ایسی شدید لعنت کے مورد بنیں گے جو خدا تعالیٰ خاتم الرسل کی زبان سے ان پر بھیجے گا۔ یہاں کافروں سے مراد مشرکین ہیں اور ان آیات کا مصداق یہود مدینہ ہیں جنہوں نے مشرکین مکہ کے ساتھ سازش کر کے مسلمانوں سے لڑائی کی ٹھانی تھی۔[1]

اس آیت میں یہود کی اخلاقی پستی کی یہ انتہا بیان ہوئی ہے کہ وہ مشرکین تک سے اہل ایمان کے مقابلے میں دوستی و اعتماد کے نہایت گہرے تعلقات رکھتے تھے اور ان کو مسلمانوں سے زیادہ ہدایت یافتہ بتاتے تھے۔ یہ گراوٹ اور پستی اخلاق کی انتہا ہے۔ یہ انقلاب انگیز تبدیلی جو یہود کی ذہنیت اور نفسیات میں ہوئی تھی کہ ان میں اصول صداقت کے مقابلے میں منافع و مصالح اور آجل کے مقابلے میں عاجل کو اور ایمان کے مقابلے میں کفر کو ترجیح دینے کا مرض پیدا ہو گیا تھا۔ یہی گویا ان کے ملعون ہونے کے اسباب تھے۔

ایمان و کفر میں تضاد ہے

۱۶۸۔ اور اگر وہ فی الواقع اللہ کو، اللہ کے رسول کو، رسول پر نازل شدہ کتاب کو ماننے والے ہوتے تو مشرکین کو مددگار اور دوست نہ بناتے لیکن ان میں اکثریت ایسی ہے جو جادۂ حق سے ہٹی ہوئی ہے۔ النبی سے آیت میں مراد بعض مفسرین نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور بعض نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو لیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان یہود کو واقعی یقین حضرت موسیٰ

[1] افادات شیخ الاسلام

کی صداقت اور تعلیمات پر ہوتا تو نبی آخرالزمان کے مقابلہ میں جن کی بشارت خود حضرت موسیٰ نے دی
تھی مشرکین سے دوستی نہ کرتے یا یہ کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر مخلصانہ ایمان لے آتے تو ایسی
حرکت ان سے سرزد نہ ہوتی کہ دشمنانِ اسلام سے سازباز کریں اس دوسری صورت میں آیت کا مصداق
منافقین یہود ہیں لے

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا، نبی اور کتاب کے ماننے والے ہوتے ہیں انہیں فطرۃً مشرکین
کے مقابلے میں ان لوگوں سے زیادہ ہمدردی ہوتی ہے جو مذہب میں خواہ ان سے اختلاف ہی
رکھتے ہوں مگر بہر حال ان ہی کی طرح خدا اور سلسلہ وحی و رسالت کو مانتے ہوں لیکن یہ یہودی عجیب
قسم کے اہلِ کتاب ہیں کہ توحید اور شرک کی جنگ میں کھلم کھلا مشرکین کا ساتھ دے رہے ہیں۔ اقرار
نبوت اور انکارِ نبوت کی لڑائی میں علانیہ ان کی ہمدردیاں منکرینِ نبوت کے ساتھ ہیں اور پھر بھی
وہ بلا کسی شرم و حیا کے یہ دعویٰ رکھتے ہیں کہ ہم خدا اور پیغمبروں اور کتابوں کے ماننے والے ہیں ۲

آیت میں بتایا یہ ہے کہ اگر ان کا واقعی اللہ، رسول اور نبوت کی ہدایات پر ایمان ہوتا تو وہ مادہ پرستی
اور مفاد کیشی کو نہ اپناتے اور دنیوی ترقی اور مادی فوائد ان کا منتہائے نظر نہ ہوتے۔ اصول و اخلاق اور
منافع و فوائد کے مقابلے میں اپنی اہمیت نہ کھوتے اور ایمان کے مقابلے میں کفر صریح کو نہ ترجیح دیتے۔
بہر حال اسلام کے خلاف عداوت کے جنون نے ان کو انتہائی پستی میں گرا دیا تھا۔ یہاں تک کہ اہلِ
کتاب ہونے کے باوجود مشرکین سے دوستی و رفاقت رکھتے تھے گویا ان کا تصورِ حق و صداقت ہی
تبدیل ہو گیا تھا اور اہلِ کتاب ہونے کا دعویٰ محض نمائشی جس کی حقیقت کوئی نہ تھی۔ دین سے
ان کو جو کچھ محبت تھی وہ صرف اپنے دھڑے کے بچانے تک محدود تھی، اس کے نتیجے میں
ان میں اتباعِ حق کی جگہ جتھا بندی اور گروہ پرستی کی روح پیدا ہو کر حق و باطل کا امتیاز باقی نہیں
رہا تھا۔ گروہی تعصب چاہتا ہے کہ جس طرح بھی بنے اپنی بات بنائی جائے اور مخالف گروہ
کو زک پہنچائی جائے۔ اگر ایسا کرنے میں سلسے خود اپنے اصولوں اور عقیدوں کے خلاف بھی
جانا پڑے تو بلا تامل چلا جائے۔ یہی حال مدینے کے یہودیوں کا تھا وہ ہمیشہ بت پرستی کے
مخالف رہے اور بت پرستوں کی تحقیر کرتے رہے لیکن اب اہلِ ایمان کی ضد میں آکر بت
پرستوں سے دوستی و رفاقت کرتے بلکہ بت پرستوں کی تعریف کرتے اور کہتے کہ ھٰؤلاء

لے افاداتِ شیخ الاسلام ۲ے تفہیم القرآن۔

اھدیٰ من الذین امنوا ان مسلمانوں سے تو مشرکین ہی زیادہ ہدایت یافتہ ہیں۔ اسی بنا پر قرآن نے کہا تھا کہ اولئک الذین لعنھم اللہ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ نے لعنت کی ہے۔ یعنی یہ لوگ جنہوں نے اہل کتاب ہو کر اغراض نفسانی کی وجہ سے طریق کفر کو اسلامی شاہراہ ہدایت سے افضل بتایا ہے ان پر خدا کی لعنت ہے۔

الحمد للہ معالم القرآن کی چھٹی جلد آج مورخہ ۱۰ جمادی الاوّل ۱۳۹۹ھ مطابق ۱۹ اپریل ۱۹۸۰ء بدھ کے روز بوقت ۸ بجے شب اللہ تعالیٰ کی توفیق سے مکمل ہوئی۔

رب تقبل منی انک انت السمیع العلیم

معالم القرآن

جلد ہفتم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

علم وکتاب واٹس ایپ گروپ

نام ——— معالم القرآن

موضوع ——— تفسیر و تشریح

تالیف ——— حضرت مولانا محمد علی صاحب الصدیقی الکاندھلوی

عناوین ——— ۴۶۹

آیات ——— ۱۱۱

طابع ——— محمد شریف قاسمی

تزئین و آرائش ——— سید انور حسین نفیس رقم

کتابت ——— محمود احمد صوفی، گوجرانوالہ

ناشر ——— ناظم ادارۂ تعلیمات قرآن

صفحات ——— ۶۰۵

تاریخ اشاعت ——— شعبان المعظم ۱۳۹۹ھ مطابق جولائی ۱۹۷۹ء

قیمت ۰ ۱۵۰ روپے

— ملنے کا پتہ —

دارالعلوم الشہابیہ، رنگ پورہ روڈ، سیالکوٹ

(پاکستان)

انتساب

میں تفسیر معالم العرفان کی ساتویں جلد کو جس میں اُمت کو دین کی تکمیل کی خوشخبری سُنا کر رہتی دُنیا تک قوامیت اور شہادت علی الناس کے منصب جلیل پر فائز کیا گیا ہے قابلِ صد احترام حافظ عبدالرشید خاقان صاحب کے نام منسوب کرتا ہوں جن کی قرآن کی اشاعت میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ دریادلی سے یہ جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس جذبۂ خیر کو تا دیر قائم رکھے اور ان کے لیے دُنیا اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثم آمین۔

قاری عبدالرحمٰن ایم۔ اے

ناظم ادارہ تعلیمات قرآن سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

سورۃ الانعام

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

باسمہٖ سبحانہٗ،

اللہ سبحانہٗ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس نے معالم القرآن جلد ہفتم کی تکمیل کا سامان بہم پہنچایا، اور مجھ گنہگار کو یہ توفیق ارزانی فرمائی کہ ساتویں پارے کی تشریح کر کے اپنے نامۂ اعمال کی سیاہی کو دھونے کے لیے رحمت کے چند قطرے مہیا کر دوں۔ جلد ششم اکتوبر ۱۹۸۳ء میں طبع ہوئی تھی۔ اب چھ ماہ کے بعد یہ جلد ہفتم مشتاق نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس جلد میں جو عرق ریزی کی گئی ہے اس کا بڑا مقصد یہی ہے کہ قلم جادۂ حق سے بھٹکنے نہ پایا ہو اور حقیقت کی منزل سے دوری نہ ہوئی ہو۔

الحمد للہ اس جلد پر سارا کام دارالعلوم [illegible] میں ہوا ہے اور مئی ۱۹۸۳ء سے شروع ہو کر دسمبر ۱۹۸۳ء کو یہ جلد مکمل ہوئی۔

اس جلد میں جن گراں قدر علمی گہواروں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے:

التفہیمات الالٰہیہ	حکیم الامت شاہ ولی اللہ
فیوض الحرمین	•
اقتضاء الصراط المستقیم	شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ
فتاویٰ عالمگیری	مرتبہ علمائے ہند
البحر الرائق	الشیخ ابن نجیم
ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین	علامہ الشیخ ابوالحسن علی میاں
منہاج السنۃ	شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ
تشکیل جدید الٰہیات	فلاسفر علامہ شیخ محمد اقبال
عقیدۃ الاسلام	السید انور شاہ کشمیری
الرد علی المنطقیین	شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ

شرح المواقف	میر سید شریف
الفوز الکبیر	حکیم الامت شاہ ولی اللہؒ
ترجمان السنہ	مولانا بدر عالم
صراط مستقیم	ملفوظات الشیخ سید احمدؒ
شریعت و طریقت	حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ
تاریخ تصوف قبل الاسلام	مولانا عبدالماجد دریا بادی

یہ ان تفسیر و حدیث کی کتابوں کے علاوہ ہیں جن سے استفادہ شرح قرآن میں اس کی آیات کی تفسیر میں اور مسائل و نظریات کی بحث و تحقیق میں کیا جاتا ہے۔

یہ اللہ کا بہت بڑا انعام ہے کہ اس نے مجھ سیاہ کار کو قرآن کی شرح کرنے کی توفیق بخشی۔ یہ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ اور میری محنت کا سب سے بڑا اندوختہ ہے اور خدائے قدوس اگر قبول فرمائے تو میری نجات کا سب سے بڑا ذریعہ ہے۔

یاد رکھیے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اور اس ارشاد گرامی کے بیان کرنے والے حضرت عمرؓ ہیں۔

ان اللہ یرفع بھذا الکتاب اقواما و یضع بہ آخرین

اللہ سبحانہ اس کتاب کے ذریعے کتنے ہی لوگوں کو اونچا کرے گا اور کتنے لوگوں کو پست کرے گا۔

یعنی جو لوگ اس پر ایمان لاتے ہیں اور عمل کرتے ہیں اللہ سبحانہ ان کو دنیا و آخرت میں رفعت و عزت عطا فرماتے ہیں اور جو لوگ اس پر عمل نہیں کرتے اللہ ان کو ذلیل کرتے ہیں۔ اس کا واضح اور صاف مطلب یہی ہے کہ اگر امت کا علم و عمل میں قرآن سے رابطہ ہوگا تو آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں بھی آسائش، اور عزت و اقتدار ملے گا۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب بھی مسلمانوں نے قرآن سے علم و عمل میں رابطہ کی راہ اپنائی ان کے حق میں یہ ضابطہ اور وعدہ لازماً پورا ہوا اور جن کی آخرت سنور رہی تھی، ان کی دنیا بھی باغ و بہار بنی رہی۔ کوئی وجہ نہیں کہ قرآن ماننے والوں کے بارے میں اللہ کا یہ فیصلہ اور ضابطہ بدل جائے۔ آج بھی وہ قانون ہے جو کل تھا۔ یہی قانون مکہ کے تاریک ماحول میں تھا اور یہی مدینے کے پُرخطر دور میں رہا۔ انہیں بھی مخاطب کرکے کہا گیا جو ابھی ایمان نہیں لائے تھے اور انہیں بھی جو ایمان لا چکے تھے۔ اللہ کے رسول نے انہیں یقین دلایا تھا۔

اگر تم میرا لایا ہوا پیغام قبول کر لوگے تو وہ دنیا میں بھی تمہاری خوشحالی کا

باعث ہوگا اور آخرت میں بھی۔

اس امت سے یہ وعدہ کس طرح پورا ہوا اس سے دنیا ناواقف نہیں ہے وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کو وہ سب کچھ دیا جو دُنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہو سکتا ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ قرآن سے علم و عمل کا رابطہ استوار کرنے سے آخرت کی فلاح کے ساتھ دُنیا کس طرح ہاتھ آتی ہے۔ اس سوال کا جواب معلوم کرنے کے لیے یہ اصولی بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ دولت، عزت، اقتدار جن کو دُنیا کی فلاح کہا جاتا ہے قرآن کی نگاہ میں بجائے خود معیوب نہیں ہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی نعمتیں اور اس کا فضل ہیں اور پھر یہ کہ انسان اس دُنیا میں اللہ تعالیٰ کا خلیفہ اور نائب بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ اس زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھے اور اسے اپنے مالک کے احکام کے مطابق چلائے۔ یہ دونوں بنیادی حقیقتیں اگر سامنے ہوں تو یہ خلش اس حد تک بالکل صاف ہو جاتی ہے کہ دُنیا کی عزت، دولت اور اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے تعلق رکھنا اور فائدہ اٹھانا دین و ایمان کے منافی ہو، کیونکہ جو چیزیں اللہ کی نعمت اور اس کا فضل ہوں وہ اس کے حق شناس بندوں کے لیے ممنوع نہیں ہو سکتی ہیں۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مقدمہ

باسمہ سبحانہٗ

الحمد للہ ثم الحمد للہ معالم القرآن کی ساتویں جلد آج ناظرین کے سامنے ہے۔ یہ ان اعتقادی تعلیمات کی تفصیل اور تشریح ہے جو مکی زندگی میں اللہ سبحانہٗ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے سے دنیائے انسانیت کو عموماً اور اہل مکہ کو خصوصاً بتائی اور سکھائی گئیں۔ یہ عجیب بات ہے کہ عقائد کی تعلیم کو نظری حیثیت سے جتنی اہمیت ہے عام لوگ اس کو اتنا ہی کم درجہ دیتے ہیں حالانکہ عقائد کی حیثیت بالکل ایک درخت کی جڑ کی ہے۔ جڑ کے بغیر درخت کا تصور آپ ذہن میں قائم کر سکتے ہیں لیکن وجود کی دنیا میں ایسے درخت کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ درخت کو تمثیل کے لیے میں نے بطور تفنن ذکر نہیں کیا بلکہ افکار و نظریات کے لیے یہی تمثیل حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اختیار فرمائی ہے ارشاد ہے کہ،

ایمان کی ستر یا ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ ہے اور سب سے ادنیٰ راستہ سے کسی تکلیف دہ چیز کو ہٹا دینا ہے اور شرم بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔

یعنی ایمان درخت کی اس خشک جڑ کا نام نہیں ہے جس میں عمل صالح کی ایک شاخ بھی نہ ہو بلکہ اس تر و تازہ درخت کی جڑ کو ایمان کہتے ہیں جس میں اعمال صالحہ کی بے شمار شاخیں پھوٹتی رہیں۔ اس پر رنگ برنگ کی عبادات کے پھول کھلیں اور ایسے ایسے سودمند اعمال کی بہار آئے کہ راستہ سے کانٹا ہٹا دینا ان میں ایک ادنیٰ ترین عمل شمار ہو، اسی بات کو قرآن عزیز نے اپنے بلیغ انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔

مثل کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت و فرعھا فی السماء توتی اکلھا کل حین باذن ربھا۔

ایک اچھی بات کی مثال ایسی ہے جیسے اچھا درخت جڑ اس کی جمی ہوئی ہو اور ٹہنیاں آسمان میں پھیلی ہوئی ہوں اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل

دینار بنتا ہو۔

اس آیت میں کلمہ طیبہ یعنی عنوان ایمان کو درخت سے تشبیہ دی گئی ہے لیکن اس درخت سے نہیں جس پر پھل پھول پتہ کوئی نہ ہو بلکہ اس درخت سے تشبیہ دی ہے جو سدا بہار ہو اور اس پر کبھی خزاں نہ آتے وہ دوسرے درختوں کی طرح سال بھر میں ایک ہی بار پھل نہ دے بلکہ موسم کی قید سے آزاد ہو کر پھلوں اور پھولوں سے ہمیشہ لدا رہے ۔

اس سے آپ کو تطہیر فکر اور ایمان کی اہمیت کا اندازہ ہوگا۔ اس پارے میں سورہ انعام ہے اور اس میں توحید، آخرت اور رسالت کے دلائل واضح کردیے ہیں۔ انسانیت کو ایمان کی دعوت دی ہے اور ساتھ ہی یہ تنبیہ کی ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لائیں گے تو اس انجام سے دوچار ہونے کے لیے تیار رہنا چاہیے جس سے تکذیب کرنے والی قوموں کو دوچار ہونا پڑا ہے۔ اہل عرب چونکہ حضرت ابراہیم کی اولاد تھے اور ان کا یہ دعویٰ تھا کہ جس مذہب پر وہ ہیں یہ ان کو حضرت ابراہیم سے وراثت میں ملا ہے اس وجہ سے اس سورت میں اس حجت کو خاص طور پر نمایاں کیا گیا ہے جو حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کے سامنے پیش کی ہے ۔

اسلامی قانون اپنی جامعیت میں بے مثال ہے۔ یہ افکار و نظریات، قوانین اور اخلاق کا مجموعہ ہے۔ یہ انسان کے اعتقادی فکر سے لے کر اس کے ذاتی اخلاق اور اس کے اجتماعی معاملات کو اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ یہ دنیوی قانون کی طرح صرف انتظامی ضابطہ نہیں ہے۔ یہ کامل ہے اس میں کسی پہلو سے کوئی کمی نہیں ہے، جامع ہے ہر حالت کے بارے میں اس کا ایک حکم ہے انسانی زندگی کا کوئی پہلو اس کی گرفت سے باہر نہیں۔ افراد، جماعتوں اور حکومتوں کے سارے احوال و ظروف اس کی دسترس سے باہر نہیں ہیں۔ یہ شخصی اور انفرادی احوال سے بھی بحث کرتا ہے یہ اجتماعی انتظامات سے بھی تعلق رکھتا ہے اور بین الاقوامی احوال سے بھی علاقہ رکھتا ہے۔ یہ قانون ہنگامی اور وقتی نہیں ہے۔ بہرحال اسلامی قانون میں ایمانیات کو اولیت کا درجہ حاصل ہے اور یہ ایمانیات ہی اسلامی نظام حیات کے تمام قوانین اور تمام اخلاق کے لیے جڑ کی حیثیت رکھتی ہیں۔ جس طرح کسی درخت کے لیے ضروری ہے کہ اس کی ایک جڑ ہو جس پر درخت کا تنا اس کی شاخوں، پھولوں اور پھل کا بوجھ ہو اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ یہ جڑ اتنی گہری اور مضبوط ہو جو تنے، شاخوں اور پھلوں کا بوجھ سنبھال سکے ورنہ وہ درخت ہوا کے ایک تیز جھونکے کی بھی تاب نہ لا سکے گا۔ ایک دانا اور دوراندیش باغبان کبھی اس اصول کو فراموش نہیں کر سکتا کہ

جس جسامت کا تنا اور وزن کی شاخیں ہوں اسی کے تناسب سے درخت کی جڑ کا لحاظ رکھنا چاہیے ۔

ایمان کی علم برداری ایک ایسا نصب العین ہے جس کی مشکلات کی بے پایاں اور جس کی ذمہ داریوں کی گرانباری اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتی، دوست دشمن، موافق اور مخالف سب اس امر واقعی کا اعتراف کرتے ہیں۔ غیر اس کا اظہار اس نصب العین کی خاطر تگ و دو کرنے والوں کو مسلانیہ فریب خوردہ بلکہ مجنون کہا کرتے ہیں اور جو لگا لے ہیں وہ اس کا اعلان اس کی کامیابی کو ناممکن بنا کر فرماتے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے کتاب الایمان میں امام الحسن البصری سے نقل کیا ہے کہ

ایمان صرف ظاہرداری اور ٹیپ ٹاپ کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان اسے کہتے ہیں جو دل میں گھر کر جائے اور اعمال اس کی تصدیق کریں۔

مطلب یہ ہے کہ اعمال انسان کی کیفیات قلبیہ کا آئینہ ہیں۔ ابتداءً ایمان اگرچہ تصدیق قلبی کا نام ہے مگر یہ تصدیق اعمال صالحہ کی آبیاری سے نشوونما پا کر ایک نور کی سی شکل اختیار کر لیتی ہے اور یہی نور فی الواقع ایمان ہے۔ امام بیہقی نے حضرت علی رضی اللہ عنہ سے روایت کیا ہے کہ پہلے ایمان ایک سفید نقطہ کی صورت میں قلب میں نمودار ہوتا ہے اور جتنا بڑھتا جاتا ہے اسی قدر یہ نقطہ پھیلتا جاتا ہے یہاں تک کہ جب ایمان مکمل ہو جاتا ہے تو سارا دل منور ہو جاتا ہے یہی حال نفاق کا ہے کہ پہلے سیاہ نقطہ کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے اور بالآخر تمام قلب سیاہ ہو جاتا ہے۔ خدا کی قسم اگر تم ایک مومن کا قلب نکال کر دیکھو تو بالکل سفید پاؤ گے اور ایک منافق کا دل دیکھو تو بالکل سیاہ دیکھو گے۔ (اتحاف النبلاء المتقین)

یہ نور تصدیق جس قدر رسوخ پیدا کرتا جاتا ہے اتنا ہی خواہشات نفسانیہ، جہالت اور نادانی اور گرد و پیش کی تاریکیوں کے حجابات اٹھ جاتے ہیں اور جیسے جیسے یہ حجابات اٹھتے جاتے ہیں اسی قدر یہ نور پھیلتا جاتا ہے تا آنکہ یہ نور انسان کے تمام جوارح کا احاطہ کر لیتا ہے اور یہ مومن خود ایمان مجسم بن جاتا ہے جسے دیکھ کر خدا یاد آتا ہے۔

اس نور کی وسعتوں کے مقدار میں اوامر الٰہیہ کے امتثال اور نواہی ربانیہ سے اجتناب کا جذبہ پیدا ہوتا ہے۔ اخلاق رذیلہ زائل ہو جاتے ہیں اور اخلاق حمیدہ ظاہر ہو جاتے ہیں۔ ایمان کی اسی وسعت کا اس سورت انعام میں ان لفظوں میں چہرہ پیش کیا ہے۔

فمن یرد اللہ یشرح صدرہ للاسلام

ارشاد نبوت ہے کہ جب نور یقین قلب میں داخل ہوتا ہے تو اس میں ایک فراخی اور کشادگی

نمودار ہوتی ہے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ اس کی علامت کیا ہے ؟ فرمایا کہ اس کی تین علامتیں ہیں۔ اوّل آخرت کی طرف میلان دوم دُنیا سے نفرت اور دوری سوم موت سے پیشتر اس کی تیاری۔

یہی واقعی اور حقیقی ایمان ہے۔ یہی دعوت انبیاؑ کا مرکزی نقطہ ہے اور اسی پر نجات اور فلاح ابدی کا مدار ہے۔ یہ ایمان صرف ذہنی و عقلی نہیں بلکہ دب کر محسوسات کی طرح محسوس ہونے لگتا ہے اس کا نور شاہراہ عام پر ہوتا ہے سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود۔ قلب اس کی حلاوت اور شیرینی اس طرح محسوس کرنے لگتا ہے جیسے زبان مٹھائی کی۔ یہ ایمان فطرت انسانی کا ایک تقاضا بن جاتا ہے جس طرح دوسرے جبلی اور فطری اخلاق لازوال ہوتے ہیں۔ اسی طرح یہ ایمان بھی زوال کے ہر خطرہ سے بڑی حد تک محفوظ ہوتا ہے۔

اس سورت میں ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر، کی دعوت دی گئی ہے اور نبوت کی زبانی دی گئی ہے۔

ایمان باللہ اسلامی نظام حیات کا سب سے پہلا بنیادی پتھر ہے اور اسی لیے سب سے زیادہ اہم بھی ہے اس قدر اہم کہ اس کے بغیر اسلام کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔

ایمان باللہ کہنے میں تو صرف ایک بات ہے مگر اس پر سے ظاہر کا پردہ اٹھا دیجیے اور اس کی گہرائیوں میں ڈوب کر دیکھئے تو اس کی تہ میں حقائق و معانی کی پوری دنیا آباد نظر آئے گی جس کو اللہ کی ذات اور اس کی تمام صفات کی صحیح معرفت حاصل ہو گی۔ اس کو نہ پھر یہ بتلانے کی ضرورت ہے کہ جزا و سزا کا ایک دن آنے والا ہے، نہ وہ اس تذکیر کا محتاج ہے کہ اپنے رب اور حقیقی معبود کی یاد سانس کی طرح زندگی کا ایک لازمی وظیفہ ہے اور نہ وہ اس تلقین کا منتظر ہوگا کہ اللہ کی رضا جوئی کے لیے اس کے احکام کی اطاعت میں کسی مرعوبیت کا شکار نہ ہونا چاہیے بلکہ وہ ایمان باللہ کی روشنی میں یہ دیکھ لے گا کہ یہ ساری صداقتیں پائے گا۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت نے اُمت کو دعوت حق دینے کا آغاز اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ سے کیا ہے۔ لہٰذا ہر اس شخص کے لیے جو قرآن و سنت کی بتائی اسلامی زندگی بسر کرنے کی سچی نیت رکھتا ہے سب سے زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اپنے اندر ایمان باللہ کی رُوح بیدار کرے اور یہ معلوم کرے کہ ایمان باللہ کا مطلب اور تقاضا کیا ہے۔ قرآن سے رہنمائی حاصل کرے اور یہ ہرگز نہ بھولے کہ عقائد و کلام کی کتابوں میں جس ایمان سے بحث کی گئی ہے وہ صرف ایک اسلامی حکومت کے شہری کا سیاسی ایمان ہے یہ ہمیں اسلامی حکومت اور مسلم سوسائٹی سے اپنے سیاسی حقوق تو دلا سکتا ہے

مگر اللہ کی راہ میں حائل ہونے والے مصائب کے طوفان سے ہماری کشتی کو پار نہیں لگا سکتا ۔ یہ توفیق تو اللہ نے اس ایمان کے لیے مخصوص رکھی ہے جو قرآن اور نبوت کی نگاہ میں ایمان ہے ۔ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ نے ایمان حقیقی اور ایمان سیاسی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے :

نبوت نے ایمان کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک وہ ایمان جو احکام دنیوی کا مدار ہے اور دوسرے وہ ایمان جس پر آخرت کی نجات کا مدار ہے ۔

ہمارا فرض ہے کہ قرآن و سنت کی روشنی میں ایمان کے لوازم اور تقاضے معلوم کریں اور اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھیں اور اپنی سیرت و کردار کے تمام پہلوؤں کا جائزہ لیں ۔ اور اپنے دل و دماغ کی ساری قوتوں کے ساتھ اس روح کو اپنے اندر اتارنے کی فکر کریں اور اس کو از سر نو بیدار کرنے کی سعی میں ڈوب جائیں ۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ ہم ان باتوں کا اہتمام کریں ۔ بصیرت ۔ لوازم صفات کا علم ، ذکر الٰہی ، محبت الٰہی ، ایمانی زندگی کی حدود میں بصیرت اور یقین و معرفت کے حاصل کرنے کے بالعموم تین طریقے ہیں :

ایک طریقہ وہ ہے جو قرآن و سنت نے بتایا ہے
دوسرا وہ ہے جو ارباب تصوف نے بتایا ہے
تیسرا وہ ہے جو فلسفہ و کلام نے ایجاد کیا ہے ۔

تیسرے طریقے یعنی کلام اور متکلمین کی مساعی اور ان کے دعاوی کا جہاں تک تعلق ہے ۔ عمل اور نتیجہ کے اعتبار سے وہ ناقابل پذیرائی ہے ۔ حق یہ ہے کہ اس فلسفہ یونان و عجم نے ایمان کے حصول میں نہ کبھی کوئی مدد کی ہے اور نہ آئندہ دے سکتا ہے ۔ اس کی حیثیت ایمان کے لیے صرف دفاعی سرمایہ کی ہے ۔ صدر الاسلام ابوالیسر بزدوی نے جو یہ لکھا ہے کہ " امام ابوحنیفہ نے یہ علم حاصل کیا ہے اور اس کے ذریعے معتزلہ اور تمام اہل بدعت سے مناظرہ کیا ہے ، تو اس سے وہ اپنے مناظرین کو بھی سمجھانا چاہتے ہیں کہ اس علم کی حیثیت اسلام کے دفاعی ذخیرے کی ہے ۔ اور خود امام بزدوی ہی نے امام ابوحنیفہ کا بھی نظریہ نقل کیا ہے ۔ علامہ بیاضی نے اشارات المرام میں بھی امام صاحب کے اس موقف کی وضاحت کی ہے ۔ جو بات روز اول امام اعظم نے علم الکلام کے بارے میں فرمائی تھی کہ اس کی حیثیت دفاعی سرمایہ کی ہے ۔ یہی بات اس علم کے بڑے بڑے شہسواروں نے آخر میں کہی ہے ۔ چنانچہ امام الحرمین ابومحمد جوینی نصیحۃ المسلمین میں فرماتے ہیں :

قرآن کے دلائل غذا کے درجے میں ہیں ہر شخص ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے

کلامی موشگافیاں دوا کی حیثیت میں ہیں، کچھ کے لیے سودمند مگر بہتوں کو اس کے استعمال سے نقصان ہو رہا ہے۔ قرآنی بیانات پانی کی طرح ہیں دودھ پیتا بچہ بھی پی سکتا ہے لیکن کلامی کچن کے روغنی کھانے صرف طاقتور ہی کھا سکتے ہیں اور وہ بھی زیادہ سے گاہ گاہ بیمار ہو جاتے ہیں۔

امام غزالی جیسے کلامی محقق نے اپنی زندگی کی آخری تصنیف میں اقرار کیا ہے۔

علم کلام کا مقصد صرف بدعتیوں سے اہل السنۃ کے عقائد کی نگرانی ہے۔ [1]

دراصل یہ بھی ہماری دینی تاریخ کا ایک بڑا ہی المناک باب ہے کہ ایمان باللہ کے لیے قرآن کو چھوڑ کر دلائل مہیا کرنے کے لیے یونانی فلسفہ کے اس بیابان کی جادہ پیمائی شروع کر دی جہاں شک وریب اور تذبذب اور وساوس کے سوا کچھ نہ تھا۔

دوسرا طریقہ یعنی ارباب تصور کی راہ تو اس کی خامی یہ ہے کہ اس میں معرفت اور تعلق باللہ کے مقام اعلیٰ تک پہنچنے کی روش غلط اختیار کی ہے۔ ابتدائی زینوں کو تقریباً یوں ہی چھوڑ کر آخری زینے پر قدم رکھ دیا جاتا ہے یعنی سارا زور جذبات کی انگیخت اور کیفیات باطن کی تحصیل پر صرف کر دیا جاتا ہے بجز اس کے پہلے ضرورت اس امر کی بھی ہوتی ہے کہ عقل کو سلیم اور یقین کو راستکام سے بہرور کیا جاتے۔ پھر قوانین شرع سیکھے جاتے۔ اور اپنی عملاً ذمہ داریوں کو سمجھا جائے۔ بعدازاں ان قوانین میں کام کرنے والی حکمتوں سے شناسائی بھی حاصل کی جائے۔ اس غلطی کا سرچشمہ ان بزرگوں کا یہ غلط تصور ہے خواہ شعوری طور پر یا غیر شعوری طور پر کہ مذہب کا تعلق صرف دل سے ہے نہ کہ عقل و دماغ سے۔ حالانکہ باطنی طور پر دین و مذہب کے باب میں دل و دماغ کی یہ تفریق ایسی ہی غلط اور غیر قرآنی ہے جیسی کہ عالم ظاہر میں دین و سیاست کی تفریق۔

دراصل اسلام نے دین کا جو وسیع اور ہمہ گیر تصور پیش کیا ہے۔ اس کا دماغوں میں ٹھیک ٹھیک بیٹھنا اور مرتسم رہنا عملاً کچھ آسان نہیں۔ اگرچہ بالاجمال اس کا اقرار کرنے اور اس کی مدح و ثنا کرتے رہنے کی حد تک تو کسی کی زبان سست نہیں پڑتی۔ اور ہر شخص خواہ وہ صوفی ہو یا عالم یا سیاست دان، زبانی تعریف و توصیف میں سب پیش پیش ہیں لیکن عملی زندگی میں کہیں دین سیاست سے جدا

---

[1] المنقذ من الضلال

ہے اور کہیں عقل و دماغ کا رشتہ دین سے کاٹ دیا جاتا ہے اور قلب و روح ہی میں ساری وسعتِ دین سمیٹ لی جاتی ہے۔ فکر و عمل کا یہ انتشار اپنی ایک مستقل تاریخ رکھتا ہے۔

دین نے اس تصور کی بنیاد عشقِ الٰہی پر رکھی گئی ہے۔ عشق کی حقیقت بیان کرتے ہوئے مولانا اسماعیل شہید فرماتے ہیں۔

> عشق سے مراد وہ بے قراری اور شوریدگی ہے جو اپنا مطلوب اور مقصود حاصل نہ ہونے کے باعث انسان کے اندر پیدا ہو جایا کرتی ہے اور پیدا ہو کر تمام باطنی قوتوں میں سرایت کر جاتی ہے اور اس کی غایت یہ ہے کہ مقصود تک رسائی ہو جائے اور محبوب کا وصال ہو جائے اول اول تو اس کا مقام انسان کا قلب ہوتا ہے جو تمام کیفیات نفسانیہ کا مرکز ہے پھر وہ وہاں سے پھیل کر تمام باطنی قوتوں پر چھا جاتا ہے اور اس کی غایت یہ ہے کہ انسان اپنے محبوب کی یافت میں از خود رفتہ اور بے خبر ہو جائے۔

مولانا اسماعیل کے اس بیان سے عشق اور اس کے مزاج کی یہ خصوصیات متعین ہوتی ہیں۔ اوّلاً عشق کی بارگاہ میں عقل و دانش کی کسی طرح رسائی نہیں ہو سکتی کیونکہ شورش و اضطراب اور تعقل میں کھلا ہوا تضاد ہے۔

ثانیاً یہ کہ عشق انسان کو اجتماعیت سے دور بھاگنے والا اور سخت قسم کا انفرادیت پسند بنا دیتا ہے اور پھر انفرادیت سے بھی پاک کر کے تصورِ حبیب میں گم کر دیتا ہے۔

ثالثاً یہ کہ عشق کے تسلط کے بعد انسان میں توازن اور اعتدال پسندی کا خاتمہ ہو جاتا ہے، یہ اس لیے کہ عشق کا معمول ایک زبردست انجذابی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

رابعاً یہ کہ عشق میں مبتلا انسان آداب و رسوم اور قوانین و ضوابط کا پابند نہیں ہو سکتا، کیونکہ اس کے دل و دماغ پر محبوب کا دلآویز تصور چھایا رہتا ہے۔

اس تصور کے لازماً تقاضے یہ ہوں گے، اوّلاً یہ کہ بندہ کا مقصود بندگی از اوّل تا آخر اللہ تعالیٰ کا دیدار و وصل قرار پاتے۔ عشق کی فطرت اور تصورِ عشق رکھنے والے مذاہب دونوں اس پر متفق ہیں۔ یہاں بھی مولانا شہیدؒ نے تاریکی میں روشنی کا مینار پیش کیا۔ صراطِ مستقیم میں لکھتے ہیں،

> اس حبِّ عشقی کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بشریت کا حجاب چاک ہو جائے اور روحِ الٰہی اپنی اصل سے جا ملے اور بس۔ وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں چاہتی کہ انسان صاحبِ جلال خدا کے جمال کے مشاہدے میں فنا ہوا ہے۔

غرض جس دین کا تصور عشق الٰہی ہو اس کے نزدیک وصالِ الٰہی کا مقصود ہونا ایک بدیہی بات ہو گی۔ چنانچہ وہ مذاہب جو کسی رنگ میں یہ تصور رکھتے ہیں ان میں سے ہر ایک انسان کی غایت مقصود یہی بتاتا نظر آتا ہے اور بعض مذاہب تو اس معاملہ میں بالکل انتہا پسند ہو گئے ہیں۔ یعنی وہ بندے کی غایت مقصود اللہ تعالیٰ کے وصل و دیدار کو نہیں بلکہ اس کی ہستی میں جا کر ختم ہو جانے کو ٹھہراتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان مذاہب میں مکتی (نجات) کا تصور بھی قرآنی تصورِ نجات سے مختلف ہے۔ قرآن کا تصور نجات تو یہ ہے کہ انسان عذاب جہنم سے بچے جب ان مذاہب میں نجات کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جسم کی قید سے چھٹکارا پا جائے اور چھٹکارا پا کر اس کی روح کا قطرہ روحِ خداوندی کے سمندر میں جا ملے۔ وحدت الوجود کا عقیدہ بھی دراصل اسی تصور کی پیداوار ہے کیونکہ عشق کی فطرت ہی یہ ہے کہ انسان محبوب کے وجود کے سوا ہر وجود حتیٰ کہ اپنے وجود سے بھی بیگانہ اور بے خبر ہو جائے۔

ثانیاً اس تصور کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان اس دنیا کو مال کا جال سمجھ کر اس سے دور بھاگے۔ اجتماعیت کا تصور تک اس پر بار ہو۔ زندگی کے مسائل پر ایک غلط نگاہ ڈالنا بھی اس کے لیے گوارا نہ ہو۔ فلاطینوس صاف لفظوں میں کہتا ہے۔

جب روح وجدان کی منزل میں پہنچتی ہے تو وہ عالم معقولات کا تصور کرتی ہے لیکن جب اسے خدا کا شعور حاصل ہوتا ہے تو وہ ہر چیز کو ترک کر دیتی ہے [1]

اور یہ کہ

حقیقی سعادت و فلاح تو صرف ان بندشوں سے مکمل آزادی سے حاصل کی جا سکتی ہے ان میں تبدیلی سے نہیں۔ آپ زنجیروں کو نرم اور ملائم کر دیں لیکن اس سے زنجیروں کی ماہیت نہیں بدل سکتی۔

غرض عشق کا یہ فطری تقاضا ایک مانی ہوئی حقیقت ہے اور جس طرح وہ کل ایک حقیقت تھا آج بھی ایک حقیقت ہی ہے حضرت مولانا اسماعیل شہید عشقِ الٰہی کے آثار بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں،

اس کے آثار اور تقاضوں میں سے ایک تفرد ہے یعنی یہ کہ انسان محبوب کے

---

[1] تاریخ تصوف قبل الاسلام

سوا باقی سارے علائق منقطع کر دیتا ہے۔ زندگی کے رنگارنگ مشاغل اور بے شمار تعلقات کا سامنا کرتے ہوتے اس کا دل بڑی تنگی محسوس کرتا ہے اور طرح طرح کے معاملات کے نظم وانصرام سے مثلاً خانگی مسائل کے انتظام، معاشرتی اور اجتماعی امور کی انجام دہی جماعت کی امامت، عیدین اور جمعہ کی اقامت، حقدار اعزہ کے حقوق کی بجا آوری وغیرہ امور سے اسے سخت انقباض ہوتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نکاح سے جو تمام علائق کی بنیاد ہے اسے حد درجہ نفرت ہوتی ہے [1]

ثالثاً اس تصور کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان وحی و نبوت کی ضرورت سے بالکل بیگانہ ہوجاتا ہے یا کم از کم اس کی صحیح قدر و قیمت اور اصل حیثیت کو فراموش کر دیتا ہے اور اس کا وہ لحاظ نہیں کرتا جو کرنا چاہیے۔ مولانا اسماعیل شہید حُبِ عشقی کے آثار بیان کرتے ہوتے رقمطراز ہیں،

> اس کا بالذات تقاضا تو یہ ہے کہ کسی قانون سے ہم آہنگی ملحوظ رکھی جاتے، خواہ قانون شرع ہو خواہ قانون ادب، نہ یہ ہے کہ کسی کی رضا جوئی کی جاتے چاہے اپنے محبوب کی رضا کا سوال ہو یا کسی اور کی اور نہ یہ ہے کہ کسی کی پیروی کا لازمی اہتمام کیا جاتے خواہ اپنے محبوب کی پیروی ہو یا کسی دوسرے کی۔ مطلب یہ ہے کہ یہ فطری طور پر ان امور کی مقتضی نہیں، اس کا فطری تقاضا تو یہ ہے کہ انسان خداتے ذوالجلال کے جمال کے مشاہدے میں غرق رہے، چاہے جس طرح بھی یہ بات حاصل ہو اس کے لیے کسی خاص طریقے کی پابندی اس کا فطری تقاضا بالکل نہیں ہے۔ مثلاً اگر صاحب عشق کا خیال ہو کہ مزامیر کے ذریعے یا شغل برزخ اختیار کر کے یا اپنے اوقات کو اذکار و طاعات سے خالی رکھ کر یا اسی طرح کے کسی دوسرے ممنوع شرعی کے ارتکاب سے اس کی مقصد برآری ہو سکتی ہے تو یقیناً اس کے دل کی گہرائیوں میں اس کام کی طرف ایک زبردست کشش پیدا ہو جاتے گی۔ (صراط مستقیم)

مزید فرماتے ہیں،

> اس کا ایک فطری تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان ظاہری علوم اور طاعات سے بے نیاز ہو رہے۔ (صراط مستقیم)

---

[1] صراط مستقیم

تیسرا طریقہ وہ ہے جو حصول مقصد کا تنہا اور فطری طریقہ ہے۔ یہ وہ ہے جو قرآن حکیم اور اسوہ رسول نے ہمارے سامنے پیش کیا ہے۔ قرآن نے جب بھی امورِ غیب لوگوں کے سامنے رکھے، اللہ کی ذات و صفات پر ایمان کی دعوت دی۔ قیامت اور محاسبہ اعمال پر یقین رکھنے کا مطالبہ کیا، اس پر فطرت کے واضح حقائق سے استدلال کیا۔ انسان کی اپنی ذات میں چھپی ہوئی حقیقتوں سے شہادت دلوائی۔ اس پورے کارخانہ عالم کے نظام سے اس کی توثیق کرائی۔ پھر ان سے کہا کہ آنکھیں کھول کر دیکھو، یہ سارے انفسی و آفاقی حقائق کیا کہہ رہے ہیں۔ کانوں کی گرانیاں دور کر کے سنو یمین ویسار تم سے کیا کہہ رہے ہیں اور جب بہتوں نے پھر بھی ایمان لانے سے انکار کیا تو اس نے برکھ کر ان پر اظہارِ غضب کیا لھم قلوب لا یفقھون بھا ولھم اعین لا یبصرون بھا ولھم آذان لا یسمعون بھا صرف اس لیے کہ وہ اپنی عقلی اور فکری قوتوں سے کام نہیں لیتے ان کے بالمقابل قرآن نے ان لوگوں کو جن کا طرزِ عمل ان سے مختلف تھا یوں کہہ کر خراج تحسین پیش کیا ہے۔

والذین اذا ذکروا بآیات ربھم لم یخروا علیھا صما وعمیانا

غرض جہاں تک ایمان باللہ کے ایقانی پہلو کا تعلق ہے اسے حاصل کرنے یا بیدار کرنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے قرآن کے اس حصے پر جس میں توحید اور دوسری صفات پر دلائل پیش کیے گئے ہیں خصوصیت سے نگاہ ڈالی جائے اس کے طرزِ استشہاد پر دل و دماغ کی پوری یکسوئی کے ساتھ غور کیا جائے اور پیہم و لگاتار کیا جائے۔ قرآن ہمیں اطمینان دلاتا ہے کہ اس غور و فکر کے نتیجہ میں ذہن کے اندر وہ روشنی پیدا ہو کر رہے گی۔ اور برابر بڑھتی جائے گی۔ یہی فطری ترتیب ہے اور یہی صحیح تدبیر۔

قرآن جسے ایمان کہتا ہے وہ جب تک تصدیق قلبی کے ساتھ التزام طاعت اور انقیاد قلبی نہ ہو حاصل نہیں ہوتا، ہرقل اور اس جیسے اہل کتاب نے تصدیق ضرور کی اور اقرار بھی کیا مگر کیا ایک لمحہ کے لیے بھی اپنا قدیم مذہب ترک کر کے دینِ محمدی میں قدم رکھا۔

انقیادِ باطن، التزام طاعت عہد وفاداری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا ایک مرتبہ رہتی ہے ایمان کے وجودِ ذہنی کے لیے ضروری ہے کہ یہ علم ایسا صفت نفس بن جائے کہ پھر قلب اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دینے پر مجبور ہو جائے، اسی کا نام عملِ قلب ہے۔

منشا یہ ہے کہ ایمان نہ تو اربابِ کلام کی صرف تصدیق ہے اور نہ اربابِ تصوف کا صرف تصور ہے بلکہ انقیادِ قلبی اور التزام طاعت بھی اس کا جزء ہے اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہدِ وفاداری

نہیں کرتا وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح اگر فرمانبرداری کے لیے آمادہ تو ہے مگر قلب و زبان سے تصدیق کے لیے آمادہ نہیں ہے تو وہ بھی مومن نہیں ہے ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور قانون الٰہی پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی مصمم ہو گویا شرعی تصدیق اسی کا نام ہے۔

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ایمان کا لفظ امن سے مشتق ہے اس لیے امانت اور اعتماد کے معنے اس میں ہمیشہ ملحوظ رہنے چاہئیں۔ متکلمین کے نزدیک لفظ تصدیق کو چونکہ یہ خصوصیت نہیں ہے اس لیے ہر خبر میں خواہ وہاں مخبر کی امانت داری کی ضرورت ہو یا نہ ہو تصدیق کا لفظ یکساں استعمال ہوتا ہے ایمان کے معنے بھی اگرچہ تصدیق کے ہیں لیکن اس کا استعمال صرف ان خبروں تک محدود ہے جو چشم دید نہ ہوں کیونکہ یہاں تصدیق صرف مخبر کی امانت و دیانت اس کے اعتماد و وثوق کی بناپر کی جائے گی۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کا تعلق مغیبات سے ہے مشاہدات کے ساتھ ایمان کا کوئی تعلق نہیں ہے، ایمان بالغیب ہی ہدایت حاصل کرنے کی بنیادی شرط ہے۔ نبوت کا مطالبہ ایمان بالغیب ہی کی حدود میں یہ ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ کی بلند و برتر صفات اس کی لامحدود قدرت اور اس کے محیرالعقول افعال کی دل سے تصدیق کریں اور رسولوں کی لائی ہوئی تمام باتوں کو دل کی سچائی سے مانیں اور ان خبروں پر جن کا کبھی انسان نے تجربہ کیا نہ حواس ظاہرہ نے ان کی تصدیق کی نہ عقل نے ان کو قبول کیا یقین کریں اور صرف رسولوں کی خبروں اور ان کی بیان کی ہوئی باتوں پر ان کی سچائی کے اعتماد پر اور اس اعتماد پر کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے جس کو چاہتا ہے پیدا کرتا ہے جو چاہتا ہے کرتا ہے وہ بہت بڑا خالق ہے بے مثل اشیا کا بنانے والا اور اپنے ارادوں میں آزاد خود مختار ہے۔ مولانا ابوالحسن نے صحیح فرمایا ہے کہ

افسوس ہے کہ ہمارے اسلامی ادب اور ہماری مذہبی تعلیم اور دعوت دین کے انداز نے یقین اور جوش کے ساتھ ایمان بالغیب کی طرف دعوت دینے میں بہت بڑی کوتاہی کی ہے اور اس کو تقویت دینے کے لیے ادبی اور فکری غذا مہیا کرنے میں تساہل سے کام لیا ہے اور بعض ہمارے معاصر انشا پرداز دین کو جدید عقلی انداز میں ڈھالنے کی طرف متوجہ ہیں۔ اور دین کی ایسی تشریح کر رہے ہیں جو جدید علم اور جدید عقل سے میل کھاتی ہو لیکن اس نے ایک حد تک غیر ارادی طور پر ایمان بالغیب کی روح کو نقصان پہنچایا ہے۔ اور تعلیم یافتہ مسلمان نوجوان اسی کے عادی ہوتے جا رہے ہیں وہ ان ہی چیزوں کی طرف لپکتے ہیں جو مانوس ہوں، مقررہ اصولوں کے مطابق ہوں اور

طبیعیاتی زندگی میں بار بار سامنے آرہی ہوں، لیکن جو واقعات ان اصولوں سے الگ یا ان کے خلاف واقع ہوں اور جن کی تصدیق میں گہرے یقین وایمان کی اور مخبر کی سچائی پر اعتماد کی ضرورت ہو ان کو بہت تذبذب کے بعد اور بڑی مشکل سے قبول کرتے ہیں، نہ ان کی طرف لپکتے ہیں اور نہ ان کو خوش آمدید کہتے ہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اسلام ایک عقلی اور علمی ضابطہ حیات ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ معقول اور منقول میں کوئی تضاد نہیں جیسا کہ حافظ ابن تیمیہ کہتے ہیں لیکن یہ سمجھنا صحیح نہیں ہے کہ عقل انسانی کا درجہ اور معیار ایک ہے بلا شبہ انسانی عقل کے درجات میں بہت بڑا تفاوت ہے۔ ہمارے زمانے کے بڑے شہروں اور حکومتوں کے مراکز میں پائی جانے والی مصنوعات اور تمدن کی سہولتیں ایک دیہاتی انسان کے وہم و گمان میں بھی نہیں آسکتی ہیں اسی طرح ایک عام انسان کی عقل عصر حاضر میں انسانوں کی ایجادات واختراعات مثلاً ایٹمی طاقت کی تسخیر اور مصنوعی چاند وغیرہ کو نہیں قبول کر سکتی پھر جتنی بھی بلند پرواز اور عقل رسا کا تصور کیا جاتے بہرحال اس کے بھی حدود ہوں گے اور اس کا دائرہ انہی حدود تک محدود رہے گا اور اسی کے مطابق اس کی ذمہ داریاں بھی ہوں گی اور وہ انہی ذمہ داریوں کا مکلف ہوگا۔ اس پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالا جا سکتا۔

بظاہر عقل ہمارے ہر کام کے لیے ہم کو رہنما نظر آتی ہے لیکن غور سے دیکھو کہ ہماری عقل بھی آزاد نہیں وہ ہمارے دلی یقین، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی ہے اس لیے اس پابہ زنجیر عقل کے ذریعہ ہم اپنے دلی خیالات، ذہنی رجحانات اور اندرونی جذبات پر قابو نہیں پا سکتے اگر پا سکتے ہیں تو اپنے صحیح دلی یقینیات اور چند مضبوط دماغی و ذہنی تصورات کے ذریعے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح کے ذکر سے پہلے لازمی طور سے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادے اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادے کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسن عمل کا دار و مدار ہے۔

غرض ایمان ہمارے تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر عمل بے بنیاد ہے وہ ہماری سیرابی کا سرچشمہ ہے جس کے فقدان سے ہمارے کاموں کی حقیقت سراب سے زیادہ نہیں رہتی۔ کیونکہ وہ دیکھنے میں تو کام معلوم ہوتے ہیں مگر روحانی اثر و فائدے سے خالی اور بے نتیجہ ہوتے ہیں۔ اللہ سبحانہ کی رضا کا حصول ہمارے اعمال کی غرض و غایت ہے یہ نہ ہو تو ہمارے کام بے نظام اور بے مقصد ہو کر رہ جائیں۔ وہ ہمارے دل کا نور ہے وہ نہ ہو تو پوری زندگی تیرہ و تاریک نظر آئے۔

پارہ ہفتم ایک نظر میں

شرک

توحید

صفات

رسالت

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

حضرت عیسٰی علیہ السلام

دعوت و تذکیر

قرآن

صحابہ کرام کا چہرہ

دستوری قواعد

حیات بعد الموت

اخلاقی قوانین

اجتماعی قوانین

قوانینِ عدلیہ

سیاسی قوانین

معاشرتی قوانین

شعائر

اصطلاحاتِ قرآنی

اعتداء :- یہ لفظ عدو سے بنا ہے۔ اس کے معنے حد سے گزر جانے کے ہیں۔ اللہ کی مقرر کردہ حدود کو لانگ جانا اعتداء کہلاتا ہے۔ اگر کوئی شخص حدود الٰہیہ سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتا ہے تو وہ محارم الٰہیہ میں مداخلت کرتا ہے۔ اس میں حلال کو حرام کرنا اور خدا کی ٹھہرائی ہوئی پاک چیزوں سے اس طرح پرہیز کرنا گویا وہ ناپاک ہیں، یہ بجائے خود ایک زیادتی ہے۔ پھر پاک چیزوں کے استعمال میں اسراف و افراط بھی زیادتی ہے۔ حلال کی سرحد سے باہر قدم نکال کر حرام کی حدود میں داخل ہونا بھی اعتداء ہے۔

ازلام :- زلم کی جمع ہے۔ عرب کے مال و دولت کا تمام سرمایہ اونٹوں کے چند گلوں تک محدود تھا اس لیے جوا بھی ان ہی کے ذریعے کھیلا جاتا تھا۔ جوئے کی خاطر اونٹوں کو ذبح کرتے۔ ان کے گوشت کو دس ٹکڑوں میں تقسیم کرتے۔ ان ہی ٹکڑوں پر پانسے ڈالتے تھے۔ ان کی صورت یہ تھی کہ دس تیر مقرر تھے۔ ان میں ہر تیر کے مختلف حصے مقرر تھے اور جب جوا کھیلتے تو ان تیروں کو ایک تھیلے میں ڈال کر ایک منصف شخص کے ہاتھ میں دے دیتے۔ وہ ان کو گڈمڈ کر کے ایک ایک تیر کو ایک ایک شخص کے نام پر نکالتا جاتا جن کے نام پر وہ تیر نکل آتے جن جن کے حصے مقرر ہوتے وہ کامیاب ہوتے تھے اور جن تیروں کا کوئی حصہ نہ تھا وہ جن کے نام پر نکلتے ان کو تاوان ادا کرنا ہوتا تھا۔ اس طرح گوشت کے جو ٹکڑے جمع ہوتے ان کو فقیروں اور محتاجوں اور دوستوں میں تقسیم کرتے۔ چونکہ یہ فیاضی کے اظہار کا ایک طریقہ تھا اس لیے قمار بازی کی مجلسوں میں شریک نہ ہونا ایک قومی عار تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ جوئے کی قسم کے وہ سارے کھیل اور کام جن میں اشیا کی تقسیم کا مدار حقوق اور خدمات اور عقلی فیصلوں پر رکھنے کے بجائے محض کسی امر اتفاقی پر رکھا جائے مثلاً یہ کہ لاٹری میں اتفاقاً فلاں شخص

کا نام نکل آیا ہے لہٰذا ہزار ہا آدمیوں کی جیبوں سے نکلا ہوا روپیہ اس ایک شخص کی جیب میں چلا جائے یا یہ کہ علمی حیثیت سے تو ایک معمّہ کے بہت سے حل صحیح ہیں مگر انعام وہ شخص پائے گا جس کا حل کسی معقول وجہ کی بنا پر نہیں بلکہ محض اتفاق سے اس حل کے مطابق نکل آیا ہو جو صاحب معمّہ کے صندوق میں بند ہے۔

الٰہ :- اس سورت میں خاص طور پر توحید فی الالوہیت کا اثبات اور شرک فی الالوہیت کی تردید ہے اس لیے الٰہ کے معنے خاص طور پر قرآنی اصطلاح میں سمجھ لینے چاہئیں۔ یہ لفظ عربی زبان میں فعال کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے جیسے اَمَّ سے امام بنا ہے وہ شخص جس کی اقتدار کی جاتے ایسے ہی اَلِہَ سے الٰہ بنا ہے۔ الٰہ عربی میں ایک سے زیادہ معانی میں بولا جاتا ہے مثلاً حیران اور سرگشتہ ہونے کے معنے میں اَلِہَ بولا جاتا ہے۔ کسی سے تعلق پیدا کرکے یا کسی کی پناہ میں جاکر سکون حاصل ہونے پر الہت الی فلان بولتے ہیں۔ آدمی کسی مصیبت سے خوفزدہ ہو اور کوئی اسے پناہ دے اس وقت بولتے ہیں آلہ الرجل آدمی کسی کی طرف شدت شوق سے متوجہ ہو تو اسے بولتے ہیں الہ الرجل الی فلان اونٹنی کا بچہ جب اس سے بچھڑ جانے کے بعد ماں سے ملے اور ماں سے چمٹ جائے تو بولتے ہیں الہ الفصیل۔ ان سب استعمالات پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ الٰہ وہ ذات ہے جو انسانوں کی حاجتیں پوری کر سکتی ہو، بیقراریوں کو سکون بخش سکتی ہو۔ اسی بنا پر الٰہ کا ترجمہ معبود اور حاکم کیا جاتا ہے۔ شاہ عبدالقادر اور حضرت شیخ الہند کے تراجم میں اس کی موقعہ کے لحاظ سے رعایت کی گئی ہے۔ مثلاً شاہ صاحب سورۃ انعام کی آیت قل انما ھو الٰہ واحد کا ترجمہ فرماتے ہیں تو کہہ وہی ہے معبود ایک اور سورہ نمل میں متعدد بار آتے ہوئے فقرے أالٰہ مع اللہ کا ترجمہ فرماتے ہیں کیا کوئی ہے حاکم اللہ کے ساتھ اور کبھی حاکمیت کو ظاہر کرنے کے لیے لفظ بندگی اختیار کرتے ہیں اللہ لا الٰہ الا ھو کا ترجمہ فرماتے ہیں اللہ اس کے سوا کسی کی بندگی نہیں اور معبودیت کو ظاہر کرنے کے لیے کبھی پوجنا بولتے ہیں لا الٰہ الا ھو الرحمٰن الرحیم کا ترجمہ کرتے ہیں کسی کو پوجنا نہیں ہے اس کے سوا بڑا مہربان رحم والا۔ اللہ کی شان معبودیت اور شان حاکمیت کے لیے موقع اور محل کے اعتبار سے ترجمہ میں شاہ صاحب نے لطیف فرق پیدا کیا ہے نہ تو ان لوگوں کی طرح جن کے ذہنوں میں توحید کا متکلمانہ تصور بسا ہوا ہے الٰہ کا ترجمہ خدا کرتے ہیں اور نہ ان لوگوں کی طرح جن کے

ذہنوں میں صرف خدا کی محبوبیت ہے ہر جگہ معبود ترجمہ کرتے ہیں اور ان لوگوں کی طرح جو حکومت کے شوق میں مغلوب ہیں ہر جگہ حاکم کا ترجمہ کرتے ہیں۔ باتیں ساری اپنی اپنی جگہ درست ہیں لیکن کسی ایک کا اس طرح ہو جانا کہ دوسرا رُخ مغلوب ہو جائے یہ شان رسوخ فی العلم کے خلاف ہے۔ اللہ کی ذات معبود بھی ہے حاکم بھی ہے۔ معبود ہونے کی حیثیت میں اس کو یاد کیا جاتا ہے اس سے محبت کی جاتی ہے اور حاکم ہونے کی حیثیت میں اس کی طاعت کی جاتی ہے اس کے دربار میں دست بستہ حاضری دی جاتی ہے۔ اللہ کی الہیت کی ایسی تفہیم جس سے اس کی وسعتیں سمٹ جائیں کوئی تحقیق نہیں ہے۔

انصاب:۔ نصب۔ نشان اور استھان کو کہتے ہیں۔ عرب میں ایسے استھان بے شمار تھے جہاں دیویوں، دیوتاؤں، بھوتوں اور جنوں کی خوشنودی کے لیے قربانیاں کی جاتی تھیں۔ قرآن نے اس قسم کے ذبیحوں کو بھی حرام قرار دے دیا۔ قرآن کے الفاظ سے یہ بات صاف نکلتی ہے کہ ان کے اندر حرمت مجرد بارادہ تقرب و خوشنودی استھانوں پر ذبح کیے جانے ہی سے پیدا ہوتی ہے، اس سے بحث نہیں کہ ان پر نام اللہ کا لیا گیا ہے یا کسی غیر اللہ کا۔ اگر غیر اللہ کا نام لینے کے سبب سے ان میں حرمت ہوتی تو سورہ مائدہ میں ان کے علیحدہ ذکر کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اسی حکم میں وہ قربانیاں اور نذریں بھی داخل ہیں جو مزاروں پر پیش کی جاتی ہیں۔ ان میں بھی صاحب مزار کی خوشنودی مدنظر ہوتی ہے ذبح کے وقت خواہ اللہ کا نام لیا جاتے۔

بصائر:۔ یہ بصیرۃ کی جمع ہے کھلی دلیلیں، ظاہر نصیحتیں۔ واضح رہے کہ بصیرۃ صرف دل کی بینائی کے لیے ہوتا ہے آنکھ سے دیکھنے اور نظر کرنے کے لیے نہیں ہوتا۔ بصیرۃ کے مختلف معانی آتے ہیں۔ عقل، سمجھ، عبرت، دلیل اور حجت۔ قرآن میں سوجھ بوجھ کے معنے میں بھی استعمال ہوا ہے اور سوجھ بوجھ پیدا کرنے والے دلائل و براہین کے معنے میں بھی یہاں اس سے مراد قرآن حکیم اور اس کی آیات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن جس راہ کی طرف بلاتا ہے وہ علم و یقین کی اور دلیل و حجت کی راہ ہے۔ اتباع علم و یقین کا کرنا چاہیے۔

بحیرہ:۔ اس اونٹنی کو کہتے تھے جس سے پانچ بچے پیدا ہو چکے ہوتے اور ان میں آخری نر ہوتا۔ ایسی اونٹنی کے کان چیر کر اس کو آزاد چھوڑ دیتے نہ اس پر سواری کرتے نہ اس کا دودھ پیتے۔ حضرت شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ یہ کفر کی رسمیں تھیں کہ مواشی میں کوئی بچہ

نیاز رکھتے بت کی تو اس کا کان پھاڑ دیتے نشان کو، اور اس کو بحیرہ کہتے، چونکہ بحر کے مانے
میں وسعت اور کثرت کے معنے ہیں اس لیے اونٹ کے اچھی طرح کان پھاڑ نے کے لیے
عرب والے بولتے تھے بحرن البعیر، اس اعتبار سے یہاں فعیلہ بمعنے مفعول ہے۔ صحیح
بخاری میں حضرت سعید بن المسیب سے مروی ہے کہ بحیرہ کا دودھ بتوں کے نام پر
محفوظ کر دیا جاتا تھا اس لیے کوئی شخص اس کے تھن نہیں دوہ سکتا تھا۔ مصنف
عبدالرزاق میں قتادہ سے روایت ہے کہ بحیرہ اونٹنی ہوتی تھی۔ جب ناقہ پانچویں مرتبہ
بچہ دیتی۔ اگر بچہ نر ہوتا تو صرف مرد ہی کھاتے عورتیں نہ کھاتیں اور اگر مادہ ہوتا تو اس کے
کان پھاڑ کر چھوڑ دیتے پھر نہ اس کی اون کاٹتے نہ دودھ دوہتے نہ اس پر سوار ہوتے
اور جو بچہ مردہ پیدا ہوتا تو پھر مرد اور عورتیں سب مل کر کھاتے۔ بحیرہ کی تعیین میں اہل
لغت کے اس سے زیادہ خیالات ہیں۔

تائید :- حضرت مسیح کے ذکر میں قرآن نے بار بار ایدناہ بروح القدس کا جملہ بولا ہے۔ دراصل
یہ فقرہ یہود کے رد میں آیا ہے۔ یہود حضرت مسیح کے کھلے کھلے معجزات کو معاذ اللہ شیطانی تصرف
کا نتیجہ قرار دیتے تھے۔ قرآن نے یہود کے اسی الزام کی تردید کے لیے حضرت عیسیٰ کے بارے
میں بار بار فرمایا ہے کہ ایدناہ بروح القدس یعنی حضرت عیسیٰ سے جو معجزے ظاہر ہوتے ہیں
یہ روح القدس کی تائید کا نتیجہ ہیں نہ کہ کسی شیطانی تصرف کا جیسا کہ یہود کا خیال ہے، ورنہ
جہاں تک روح القدس کی تائید کا تعلق ہے وہ ہر پیغمبر کو حاصل ہوتی ہے۔ حضرت عیسیٰ
کے باب میں اس کا خاص طور پر اعلان اس لیے فرمایا گیا ہے کہ یہود ان پر الزام لگاتے تھے
روح القدس سے مراد وہ پاکیزہ روح ہے جو خدا کی طرف سے آتی ہے اور اس سے مراد
حضرت جبریل ہیں۔ ابن ابی حاتم نے باسناد ثقات حضرت عبداللہ بن مسعود سے اور طبری
نے محمد بن کعب قرظی سے روایت کیا ہے کہ روح القدس جبریل ہیں۔ ابوعبیدہ اور بہت
سے علماء کا اس پر یقین ہے۔ امام بخاری نے بھی سورہ نحل کی تفسیر میں اسی کو اختیار
کیا ہے۔

حُرُمٌ :- حرام کی جمع ہے۔ احرام باندھنے والے۔ چونکہ حالت احرام میں انسان کو بہت سی باتوں سے
رکنا پڑتا ہے اس لیے اس کو حرام کہتے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں جس چیز سے منع کر دیا جائے
وہ حرام ہے خواہ بو تسخیر الٰہی ممنوع ہو یا یہ منع ٹھہری یا عقل کی رو سے یا شریعت کی طرف

ہے یا اس شخص کی وجہ سے جس کا حکم مانا جاتا ہے۔ تسخیرِ الٰہی کے سبب سے حرام ہونے کی مثال وحرمنا علیہ المراضع اور ہم نے دایوں کا دودھ اس پر حرام کر دیا ہے کہ اللہ نے اپنی تسخیر سے دائیوں کا دودھ پینے سے روک دیا اور منع تھری سے حرمت کی مثال ان اللہ حرمہما علی الکافرین، یعنی بزور قوت کافروں کو اس سے محروم کر دیا۔ باقی وجوہ حرمت کی مثالیں ظاہر ہیں۔ حرمت کے مہینوں کو اشہر الحرم کہتے ہیں کیونکہ ان وقتوں میں اللہ تعالیٰ نے بعض ان چیزوں کو حرام کر دیا ہے جو دوسرے اوقات میں حلال تھیں۔ اسی طرح بیت الحرام اور مشعر حرام ہے۔

حام :- اس سانڈ یا اونٹ کو کہتے ہیں جس کی پشت سے کئی پشتیں پیدا ہوئیں۔ ایسے سانڈ کو بھی آزاد چھوڑ دیتے۔ حامی چرانے والا اونٹ، شاہ عبدالقادر صاحب فرماتے ہیں کہ جس اونٹ کی پشت سے دس بچے پڑے پیدا ہوتے لائق سواری کے اور بوجھ کے اس باپ کو لادنا موقوف کر دیتے اور بجائے پانی پر سے نہ ہانکتے۔

رب :- عربی، عبرانی، سریانی تینوں زبانوں میں اس کے معنے پالنے کے ہیں۔ لیکن عربی میں پالنے کو اس کے وسیع اور کامل معنوں میں لینا چاہیے۔ امام راغب نے اس کی تعریف ان لفظوں میں کی ہے ھو انشاء الشیء حالا فحالا الی حد التمام یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے اس کی مختلف حالتوں اور ضرورتوں کے مطابق اس طرح نشوونما دینا کہ اپنے حد کمال کو پہنچ جائے۔ اس معنے کے اعتبار سے امام حلیمی نے جو رب کی تعریف کی ہے وہ ان کے ہی الفاظ میں پڑھنے کے لائق ہے۔ امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں ان سے ناقل ہیں رب وہ ہے جو اس چیز کو جسے اس نے ایجاد کیا ہے کمال کی اس حد تک پہنچائے کہ جو حد اس نے اس چیز کے لیے مقرر فرمائی ہے انسان کو دیکھئے وہ نطفہ کو پشت سے نکالتا ہے پھر اس کو بستہ خون بناتا ہے پھر بستہ خون کو بوٹی، پھر بوٹی سے ہڈیاں بناتا ہے۔ پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتا ہے۔ پھر بدن میں جان ڈالتا ہے اور اس کو ایک نئی صورت میں جب کہ وہ ناتواں بچہ ہوتا ہے بنا دیتا ہے اور لگاتار اس کی نشوونما کرتا رہتا ہے تاآنکہ اسے پورا کر دیتا ہے۔ وہ جوان ہوتا ہے پھر اس پر کہولت آتی ہے بعد ازیں وہ بوڑھا ہوتا ہے۔ اور ہر مخلوق کے لیے اس کا اندازِ ربوبیت یہی ہے لہٰذا رب وہ ہے جو اس کا نگران ہو اور اس حد پر اس کو پہنچانے والا ہو جو حد اس نے اس کے لیے

معروف ہے۔ ابن خالویہ نے تصریح کی ہے کہ رب کے معنے آقا اور مالک کے ہیں۔ امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں امام خطابی سے ناقل ہیں کہ بہت سے مفسرین سے الحمد للہ رب العالمین کی تفسیر میں مروی ہے کہ رب کے معنے آقا اور سردار کے ہیں۔ اور کچھ کی رائے میں رب بمعنے مالک ہے۔ امام راغب نے یہ بھی لکھا ہے کہ رب مطلقاً اور بلا قید سوائے اللہ تعالیٰ کے اور کسی کے لیے نہیں بولا جاتا اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ اور غیر خدا کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

الساعۃ :- قرآن عزیز میں الساعۃ کا لفظ جہاں بھی استعمال ہوا ہے اس سے قیامت مراد ہے۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔ زمانہ کے حصوں میں سے کوئی سا بھی حصہ ہو ساعت ہے اور قیامت بھی اس سے مراد لی جاتی ہے ارشاد ہے اقتربت الساعۃ اور یسئلونک عن الساعۃ اور عندہ علم الساعۃ یا تو حق تعالیٰ کے جلد حساب لینے کی وجہ سے اس کو قیامت سے تشبیہ دی گئی ہے اور یا اس وجہ سے کہ جس پر یہ کہہ کر متنبہ فرمایا ہے کان لم یلبثوا الا ساعۃ من النہار اور بعض کا خیال یہ ہے کہ وہ ساعات جو قیامت کے معنے دیتی ہیں تین ہیں۔ ایک الساعۃ الکبریٰ یعنی لوگوں کا حساب دینے کے لیے اٹھنا اسی کی طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے لا تقوم الساعۃ حتی یظھر الفحش والتفحش وحتی یعبد الدرھم والدینار قیامت قائم نہ ہوگی یہاں تک فحش اور بے حیائی کھلم کھلا ہونے لگے اور یہاں تک کہ روپیہ اور اشرفی کی پوجا ہونے لگے۔ دوسری الساعۃ الوسطیٰ، یہ ایک قرن کے لوگوں کا مرجانا ہے چنانچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ ابن انیس کو دیکھ کر فرمایا ان یطل عمر ھذا الغلام لم یمت حتی تقوم الساعۃ، اگر اس لڑکے کی عمر دراز ہوئی تو یہ اس وقت تک نہ مرے گا جب تک قیامت قائم نہ ہو بیان کیا جاتا ہے کہ یہ صحابہ میں سب سے آخر میں ہونے والے صحابی ہیں، تیسرے الساعۃ الصغریٰ یہ انسان کی موت ہے، لہٰذا ہر انسان کی ساعت اس کی موت ہے۔

شہادۃ :- گواہی قطعی خبر، ظاہر کھلا، اصل میں یہ شھد یشھد کا مصدر ہے لیکن اسم ہو کر بھی استعمال ہوتا ہے، شہادات جمع ہے، امام راغب فرماتے ہیں، شہود اور شہادت کے معنے اس حضور کے ہیں جو مشاہدے کے ساتھ ہو خواہ مشاہدہ بصر سے ہو یا بصیرت کے ذریعے اور کبھی صرف حضور کو بھی کہتے ہیں جیسے عالم الغیب والشہادۃ لیکن شہود

کا استعمال حضور محرک کے ساتھ اولی ہے اور شہادت کا اس حضور کے لیے جو مشاہدے کے ساتھ ہو نیز شہادت وہ بیان ہے جو اس علم کی بنا پر سرزد ہو جو مشاہدے، بصیرت یا مشاہدہ بصر کے ذریعے حاصل ہوا ہو۔

شہید :- گواہ، شاہد، نگہبان، احوال لکھنے والا، اقرار کرنے والا۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ شہید شاہد کو بھی کہا جاتا ہے اور کسی چیز کے مشاہدہ کرنے والے کو بھی۔ علامہ ابو السعادات مبارک ابن الاثیر جزری النہایہ فی غریب الحدیث والاثر میں رقمطراز ہیں۔ حق تعالیٰ کے اسماء میں شہید وہ ذات ہے جس کے علم سے کوئی چیز غائب نہ ہو اور شاہد کے معنی حاضر کے ہیں فعیل فاعل کے معنے مبالغہ کے اوزان میں سے ہے۔ جب مطلق علم کا اعتبار ہو تو اللہ علیم ہے اور امور باطنہ کا خیال کیا جائے تو خبیر ہے اور امور ظاہرہ کی طرف نسبت ہو تو شہید ہے اور کبھی اس معنے کے ساتھ یہ بھی ملحوظ ہوتا ہے کہ وہ قیامت میں خلق پر گواہ ہوگا۔

طیبات :- طیبہ کی جمع ہے، ستھری چیزیں، نفیس اشیاء، پاک چیزیں، پاکیزہ چیزیں، عمدہ چیزیں، طاب یطیب سے صفت مشبہ، امام راغب فرماتے ہیں اصل میں طیب وہ چیز ہے کہ جس سے حواس لذت اٹھائیں اور جی مزہ پائے۔ طعام طیب وہ کھانا ہے جو جائز طور پر جائز مقدار میں جائز مقام سے حاصل کیا گیا ہو، جو کھانا ایسا ہوگا وہ اب بھی اور آئندہ بھی طیب ہوگا۔ اسی معنے میں ہے کلوا من طیبات ما رزقناکم کھاؤ صاف اور ستھری چیزیں جو دیں ہم نے تم کو۔ اور لا تحرموا طیبات ما احل اللہ، ان صاف اور ستھری چیزوں کو حرام نہ کرو جو اللہ نے حلال کی ہیں۔ اور انسانوں میں طیب وہ ہے جو جہالت، فسق اور بداعمالیوں کی نجاست سے پاک ہو اور علم و ایمان اور محاسن اعمال سے آراستہ ہو، الذین تتوفاھم الملائکۃ طیبین، ایسے ہی لوگ مراد ہیں۔

عبادۃ :- بندگی اور پرستش یہ عبد یعبد کا مصدر ہے جس کے معنے پوجنے اور بندگی کرنے کے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ عبودیت اظہار فروتنی کا نام ہے اور عبادت اس سے بلیغ ہے کیونکہ اس کے معنے انتہائی فروتنی کے ہیں اور اس کا استحقاق بھی سوائے اس ذات عالی کے کہ جس کے افضال و انعام بے حد و نہایت ہیں اور کسی کو نہیں، اسی لیے ارشاد ہے ان لا تعبدوا الا ایاہ، اور عبادت کی دو قسمیں ہیں عبادت بالتسخیر اور عبادت بالاختیار جو ذوی العقول کے ساتھ خاص ہے جس کا حکم اعبدوا ربکم میں دیا گیا ہے۔ اہل لغت اور

علمائے شریعت نے عبادت کے معنے اس طرح بیان کیے ہیں۔ لسان العرب میں زجاج سے نقل کیا ہے کہ لغت میں عبادت کے معنے اس طاعت کے ہیں جس میں عاجزی اور فروتنی پائی جاتی ہو۔ مجدالدین فیروزآبادی نے قاموس میں عبادت کے معنے طاعت کے بتلاتے ہیں لیکن ابن الاثیر نے نہایہ میں یہ اضافہ کیا ہے کہ لغت میں عبادت نام اس طاعت کا ہے جو عاجزی کے ساتھ ہو۔ علامہ ابن الاثیر کی یہ تعریف بہت جامع ہے۔ راغب اصفہانی اور فیروزآبادی نے اس کے صرف ایک جز کو بیان کیا ہے۔ قاضی شوکانی نے تفسیر فتح القدیر میں حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے عبادت کی شرعی تعریف ان لفظوں میں نقل کی ہے۔ شریعت میں عبادت وہ ہے جو انتہائی محبت فروتنی اور خوف پر مشتمل ہو۔ اور علامہ علاءالدین نے تفسیر لباب التاویل میں بعض علماء سے اس طرح نقل کیا ہے کہ عبادت اس فعل کا نام ہے جس کے ذریعہ تعظیم الٰہی کے لیے فرض کی ادائیگی عمل میں آتی ہے۔ اور مخدوم علی مہائمی اپنی مشہور تفسیر تبصیر الرحمان و تیسیر المنان بعض ما یشیر الی اعجاز القرآن میں رقمطراز ہیں عبادت اپنے اختیار سے دوسرے کی انتہائی تعظیم کی غرض سے اس کے لیے فروتنی کا نام ہے۔ حافظ ابن تیمیہ اپنے مشہور رسالہ العبودیہ میں لکھتے ہیں عبادت جس کا حکم دیا گیا ہے اس میں فروتنی اور محبت دونوں داخل ہیں۔ اس طرح اللہ کی عبادت مکمل عاجزی اور کمال محبت کا نام ہے۔ اور اس پر تفریع کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔ اگر کوئی کسی کے ساتھ بغض رکھتے ہوئے اس کا تابع رہتا ہے تو وہ اس کا عابد نہیں ہے ایسے ہی اگر کوئی کسی سے محبت کرتا ہے لیکن اس کی بڑائی تسلیم نہیں کرتا تو وہ بھی اس کا عابد نہیں ہے۔ الغرض عبادت نہ منفرد طاعت کا نام ہے اور نہ منفرد محبت کا بلکہ طاعت و محبت دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ اللہ سے بندوں کے تعلقات دوگونہ ہیں حاکم و محکوم کے اور محب و محبوب کے۔ حاکم ہونے کی حیثیت میں اللہ کے لیے خضوع و تذلل، طاعت اور انقیاد ہوتا ہے اور معبود ہونے کی حیثیت میں اس کا ذکر، انابت محبت اور اخلاص ہوتا ہے اللہ سبحانہ کے ان ہی دوگونہ تعلقات کو ظاہر کرنے کے لیے عبادت کے معنے پرستش اور بندگی کیے جاتے ہیں۔ پرستش ہوتی ہے معبود کی اور بندگی کی جاتی ہے حاکم کی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کی زندگی میں ان دو کی عکاسی ہے۔ علامہ سید مرتضیٰ زبیدی بلگرامی تاج العروس میں لکھتے ہیں کہ بعض ائمہ اشتقاق کا بیان ہے کہ عبودیت کی اصل عاجزی اور فروتنی ہے اور دوسرے حضرات یہ کہتے ہیں کہ عبودیت کے معنے ہیں جب جو کرے اس پر راضی رہے

اور عبادت کے معنے ہیں وہ کام کرنا جس سے رب راضی ہے اور زیادہ محنت و مشقت کا کام ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ عبادت تو عالمِ آخرت میں ساقط ہو جائے گی مگر عبودیت بدستور باقی رہے گی کیونکہ عبودیت کا مطلب یہ ہے کہ دونوں جہان میں اللہ کے سوا کسی کو متصرف نہ سمجھے۔ اس عبارت کو نقل کرنے کے بعد علامہ زبیدی لکھتے ہیں، ہمارے شیخ نے کہا ہے کہ یہ صوفیانہ نقطہ نظر ہے۔ لفظ کی لغوی ساخت کو اس تشریح میں کچھ دخل نہیں ہے۔ امام محی السنہ معالم التنزیل میں حضرت عبداللہ بن عباس سے ناقل ہیں کہ قرآن پاک میں جہاں بھی عبادت کا ذکر ہے اس سے توحیدِ عبادت مراد ہے۔ حافظ ابن تیمیہ اس موقع پر بڑی اونچی بات فرما گئے ہیں جب ان سے پوچھا گیا کہ یا ایھا الناس اعبدوا، میں جس عبادت کا حکم دیا گیا ہے اس کا مدعا کیا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ عبادت ایک جامع لفظ ہے۔ اس کے اندر وہ تمام باطنی اور ظاہری اعمال اور اقوال داخل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور جو اس کی خوشنودی کا باعث ہیں مثلاً نماز، زکوٰۃ، روزہ، حج، راست گوئی، امانت داری، صلہ رحمی، دیانت، اطاعت والدین، وفائے عہد، امر بالمعروف نہی عن المنکر، جہاد فی سبیل اللہ، پردیسیوں، یتیموں، مسکینوں، اور مملوکوں کے ساتھ اچھا سلوک، دعا، ذکر الٰہی تلاوتِ قرآن، اور اسی قسم کے تمام اعمال صالحہ عبادت کے اجزاء ہیں اسی اللہ اور اس کے رسول کی طاعت رحمتِ خداوندی کی اُمید اور عذابِ الٰہی کا خوف خشیت، انابت، اخلاص، صبر و شکر، توکل تسلیم و رضا وغیرہ، ساری اچھی صفات عبادت کے اندر شامل ہیں (العبودیت ص ۲) آگے چل کر فرماتے ہیں۔ ان نصوص سے جہاں ایک طرف یہ حقیقت روشنی میں آتی ہے کہ عبدیت کسی مخلوق کے شرف مجد اور اس کی سعادت کی معراج کمال ہے وہاں دوسری طرف یہ امر بھی بے نقاب ہو جاتا ہے کہ دین اپنے تمام اجزاء کے ساتھ عبادت میں داخل ہے۔ سارے انبیاء اللہ کا دین سکھاتے آئے ہیں اور ہر نبی نے اپنے مخاطبوں کو اعبدوا اللہ کی ہدایت کی ہے اس سے معلوم ہوا کہ دین اور عبادت ایک ہی مدعا کی دو تعبیریں ہیں

کفارہ:- کفر سے بنا ہے لغت میں کفر کے معنے ڈھانپ لینے کے ہیں۔ شریعت نے گناہ کی سزا سے محفوظ رکھنے کے لیے جو بدلہ تجویز کر دیا ہے اس کو کفارہ گناہ کہا جاتا ہے جیسے اس بارے میں قسم کا کفارہ بیان ہوا ہے۔ اسلام میں عبادات اور جنایات میں کئی قسم کے کفارے ہیں،

مثلاً رمضان میں روزے کا کفارہ، یمین کا کفارہ، ظہار کا کفارہ، قتل خطأ کا کفارہ۔

مفاتح الغیب:۔ لفظ مفاتح جمع ہے، اس کے واحد دو ہو سکتے ہیں۔ ایک مَفتح میم کے زبر سے دوسرے مِفتح میم کے زیر سے۔ مفتح میم کے زبر کے معنے خزانے کے اور زیر والے مفتح کے معنے چابی کے ہیں۔ آیت میں دونوں مراد ہو سکتے ہیں خزانے بھی اور چابیاں بھی۔ اگر چابیاں مراد ہوں تو مطلب یہ ہے تو یہ استعارہ ہے کیونکہ چابیوں کے ذریعے خزانوں تک رسائی ہوتی ہے جو ان چابیوں سے واقف ہو اور کھولنے کا طریق ان سے جانتا ہو وہ خزانوں تک پہنچ سکتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ چونکہ ماکان و مایکون کی تمام معلومات کا عالم ہے اس لیے اس کے علمی احاطہ کے لیے یہ بلیغ استعارہ ہے اور اگر خزانے مراد ہوں تو مطلب یہ ہے کہ اللہ کے پاس غیب کے خزانے ہیں حکما نے اس آیت کی تشریح میں یہ لکتہ آفرینی کی ہے کہ علت کا علم معلول کے علم کی علت ہوتا ہے مگر معلول کا علم علت کے علم کی علت نہیں ہوتا۔ اس بنیاد پر ان کا کہنا ہے کہ موجود دو قسم کا ہے ایک واجب بالذات دوسرے ممکن بالذات، واجب بالذات صرف اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی ہے اور اللہ کے سوا جو کچھ ہے وہ ممکن ہے اور ممکن کا وجود واجب کی تاثیر سے ہے لہٰذا اللہ کے سوا تمام موجودات اللہ کی تکوین سے موجود ہیں۔ یہ ایجاد بلا واسطہ ہو یا بالواسطہ ہو اور واسطہ ایک ہو یا متعدد ہوں، اللہ کے علم ذاتی کے لیے ناگزیر ہے کہ اس کا تعلق اثر اول سے ہو اور اثر اول کے علم کے لیے لازمی ہے کہ اس کا تعلق اثر ثانی سے ہو کیونکہ اثر اول اثر ثانی کی علت ہے اور ہم یہ پہلے بتا چکے ہیں کہ علت کے علم کے لیے معلول کا علم ضروری ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ غیب کا علم صرف علم خداوندی ہو سکتا ہے اور کسی ممکن کا علم علم غیب نہیں ہو سکتا چونکہ غیب کا علم صرف علم خداوندی ہے اس لیے یہ حصر بالکل واقعی ہے، عندہٗ مفاتح الغیب، صحیح بخاری میں اسی سورت کی تفسیر میں حضرت سالم بن عبداللہ نے اپنے والد محترم کے حوالے سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ مفاتح الغیب خمس، امام بخاری نے سورہ لقمان کی تفسیر میں بھی الفاظ روایت کیے ہیں لیکن سورہ مائدہ اور رعد کی تفسیر میں مفاتیح کی جگہ مفاتح کی تعبیر آئی ہے۔

دون اللہ:۔ وہ سوائے غیر جو کسی چیز سے نیچے ہو دون کہلاتا ہے بعض کی رائے ہے کہ یہ دنو کا مقلوب ہے جس کے معنے نزدیک کے ہیں۔ السیوطی لکھتے ہیں کہ دون ظرف ہو کر استعمال ہوتا ہے فوق کی نقیض ہے غیر کے معنے میں بھی آتا ہے۔ زمخشری لکھتے ہیں کہ من دونہ

کے معنی کسی چیز کے ورے کے ہیں اور حالت کا فرق بتانے کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے
الغرض دون کے معنے ورے نیچے، سامنے اور علاوہ کے آتے ہیں۔ ورے کے معنے میں
یہ لفظ قرآن میں، حدیث میں اور اشعار عرب میں آیا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر
سے بھاگ کر مدین پہنچے تو وہاں ایک کنویں پر تشریف لاتے اور وہاں وجد من دونہم
امرأتین تذودان یہاں دون کے معنے غیر کے نہیں ورنہ معنے یہ ہوں گے کہ وہاں لوگ
نہ تھے یہ دو بیبیاں ہی تھیں اور یہ مقصود الٰہی کے خلاف ہے بلکہ من دون کے معنے ورے
کے ہیں۔ الزمخشری نے من دونہم کی تشریح فی مکان اسفل من مکانہم سے کی ہے۔
یعنی دونوں عورتیں، مردوں کی نسبت نچلی جگہ پر تھیں۔ اسی طرح سورہ مریم میں ہے فاتخذت
من دونہم حجابا، اس کے معنے یہی ہیں، پھر اس نے گھر والوں سے ورے پردہ بنایا۔ نیز
سورہ کہف میں ذوالقرنین کے واقعہ میں ہے لم نجعل لہم من دونہا ستراً ہم نے
ان سے ورے کوئی آڑ نہیں رکھی تھی اور ایسے ہی ذوالقرنین کے ذکر میں ہے وجد من
دونہما قوماً اس نے دو پہاڑوں سے ورے ایک قوم پائی۔ ان تمام آیتوں میں لفظ
من دون کے معنے ورے اور سامنے کے ہیں۔ ایک حماسی شاعر کہتا ہے:

عجبتُ لمسراها وانی تخلصت
الی وباب السجن دونی مُغلَقُ

مجھے حیرت ہوئی محبوب کے رات کو چلنے پر اور اس پر کہ اس کی مجھ تک رسائی
کیونکر ہوئی حالانکہ میرے ورے یا آگے جیل کا پھاٹک بند تھا۔

ایک اور حماسی شاعر یہی کہتا ہے

ملکت بہا کفی فانہرت فتقہا
یری قائم من دونہا ما وراءہا

میں نے نیزہ مضبوط ہاتھ میں تھام کر اس کے زخم کو ایسا کشادہ کر دیا تھا
کہ اس زخم سے ورے کھڑے ہونے والے کو پار کی چیزیں نظر آ سکتی ہیں۔

مصر کی مجمع اللغۃ العربیہ نے لغت کی نئی کتاب شائع کی ہے اس کا نام المعجم الوسیط ہے
اس میں دون کے معانی تفصیل سے بتائے ہیں لکھا ہے دون ظرف منصوب ہے یہ کبھی نیچے
کے معنے میں ہوتا ہے جیسے دون قدمک بساط، کبھی اوپر کے معنے میں ہوتا ہے جیسے السما،

دو ثلث کبھی پیچھے کے معنے میں ہوتا ہے جیسے جلس الوزیر دون الامیر اور کبھی آگے کے معنے میں ہوتا ہے جیسے سار الہ ائد دون الجماعۃ کبھی غیر کے معنے میں ہوتا ہے جیسے و بعض ما دون ذالک کبھی پہلے اور ورے کے معنے میں ہوتا ہے جیسے دون قتل الاسد اھوال کبھی پکڑ لو کے معنے میں ہوتا ہے جیسے دون الکتاب اگر مشرکین عرب کی اس ذہنیت کو سامنے رکھا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کو خالق، مالک، رازق، مدبر اور ہر چیز کا اختیار رکھنے والا مان کر پھر بزرگوں، نبیوں کی تصاویر کو یہ کہہ کر پوجتے ہیں کہ ھو لاء شفعا ئنا عند اللہ تو دون کے معنے نیچے ورے سامنے کے ہی بنتے ہیں۔ وہ اللہ سے ورے ان کو پکارتے تھے اور ان کے ناموں کی نذر و نیاز دیتے تھے تاکہ وہ راضی ہو کر خدا تعالیٰ سے ان کے کام کرا دیں اور یہی ان کا شرک تھا۔

لَتَجِدَنَّ اَشَدَّ النَّاسِ عَدَاوَةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الْيَهُوْدَ وَالَّذِيْنَ
اَشْرَكُوْا ۚ وَلَتَجِدَنَّ اَقْرَبَهُمْ مَّوَدَّةً لِّلَّذِيْنَ اٰمَنُوا الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّا
نَصٰرٰى ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّ مِنْهُمْ قِسِّيْسِيْنَ وَرُهْبَانًا وَّاَنَّهُمْ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ ۝
وَاِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰٓى اَعْيُنَهُمْ
تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ ۚ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ
اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ ۝ وَمَا لَنَا لَا نُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَ
مَا جَآءَنَا مِنَ الْحَقِّ ۙ وَنَطْمَعُ اَنْ يُّدْخِلَنَا رَبُّنَا مَعَ الْقَوْمِ
الصّٰلِحِيْنَ ۝ فَاَثَابَهُمُ اللّٰهُ بِمَا قَالُوْا جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ
تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا ۭ وَذٰلِكَ جَزَآءُ الْمُحْسِنِيْنَ ۝
ع ١١ ١٥ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَآ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ ۝

١٦٩
تم ایمان والوں کی دشمنی میں سب سے زیادہ یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔ اور
اہل ایمان سے دوستی میں قریب تر ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے

کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں، یہ اس وجہ سے کہ ان کے اندر عالم اور راہب ہیں اور یہ تکبر نہیں کرتے[۱۴۰] اور جب یہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھو گے کہ حق کی معرفت کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ جاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے رب ہم ایمان لے آئے تو ہمیں اس کی گواہی دینے والوں میں لکھ[۱۴۱] اور آخر ہم اللہ پر اور اس حق پر جو ہم کو پہنچا ایمان کیوں نہ لائیں جبکہ ہم یہ توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیکوکاروں کے زمرے میں شامل کرے گا[۱۴۲] تو اللہ ان کے اس قول کے صلہ میں ان کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسے باغ عطا فرمائے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور خوب کاروں کا یہی صلہ ہے اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ دوزخ میں پڑنے والے ہیں[۱۴۳]۔

اسلام دشمنی میں یہود و مشرکین برابر ہیں

یہاں قرآن نے دورِ نبوت میں اسلام سے تعلق کی حد تک یہود، مشرکین اور عیسائیوں کا تقابلی

مطالعہ پیش کیا ہے۔ یہ تقابلی مطالعہ اسلام کو اپنانے اور قبول کرنے کی حیثیت میں ہے یا اسلام کی مخالفت کرنے میں۔ میرا اپنا خیال ہے کہ یہ تقابل اسلام کو قبول کرنے کی حد میں ہے۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ اسلام کے استقبال کرنے میں جس وسعت صدر کا عیسائیت نے مظاہرہ کیا ہے وہ نہ یہودیوں نے کیا اور نہ مشرکین مکہ نے۔ نبوت کی حد تک اگر مشرکین اور یہود کی جانب سے حضور کو مارنے کی سازشیں ہوتی ہیں تو عیسائیوں کی جانب سے سب سے پہلے حبشہ میں استقبال پایا گیا ہے حتیٰ کہ شارحین قرآن کی اکثریت نے اس آیت کے پس منظر میں واقعات ہی وہ تحریر کیے ہیں جن میں عیسائیوں کے استقبال کی نشاندہی کی گئی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جو دعوت اسلام بھیجے سربراہان ممالک کو خطوط روانہ کیے ہیں۔ ان میں بعض سربراہوں کی جانب سے حوصلہ افزا جواب آئے وہ بیشتر عیسائی ہیں۔ اس پر عام شارحین قرآن کا اتفاق ہے کہ یہ آیات سنجاشی اور اس کے روانہ کردہ وفد کے بارے میں نازل ہوتی ہیں لیکن الفاظ میں عموم ہے اس لیے اس کا حکم ان تمام عیسائیوں کے لیے عام ہے جو اہل حبشہ کی طرح حق پرست اور انصاف پسند ہوں۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میرا ذوق یہ کہتا ہے کہ یہ عام عیسائیوں کا نہیں بلکہ دور نبوت کے ان عیسائیوں کا خصوصیت سے ذکر ہو رہا ہے جن کا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے آغاز اسلام میں سابقہ پڑا لتجدن کا تکرار اور خطاب اس کا قرینہ ہے۔ عام اہل ایمان سے عیسائیوں کے رویہ کا یہاں ذکر نہیں ہے اور یہ قرآن کا بہت بڑا انصاف ہے کہ عیسائیوں میں جس دور میں اور جہاں بھی اچھی بات ظاہر ہوئی قرآن نے وسعت صدر کے ساتھ اس کا علی الاعلان اقرار کیا ہے۔ افسوس کہ بعد کو عیسائیوں کا یہ طرز عمل نہیں رہا ہے۔

۱۶۹۔ تم ایمان والوں کی دشمنی میں سب سے زیادہ یہود اور مشرکین کو پاؤ گے۔ یعنی اسلام سے عداوت اور دشمنی تو سب غیر مسلموں کو ہے لیکن اس عموم میں مرتبہ خصوصی مشرکین و یہود کو حاصل ہے کہ وہ شدید ترین دشمن اسلام ہیں۔ اس فقرے میں مکہ کے جور و ستم اور مدینہ میں یہودیوں کی مخالفانہ سازشوں کو ہم پلہ قرار دیا ہے۔ دعوت اسلام کے ساتھ ہی قریش کی آتش عداوت ایک دم بھڑک اٹھی اور ہر سمت جور و ستم کا آغاز ہو گیا۔ حالانکہ اسلام کی دعوت میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس پر بگڑنا یا جوش میں آجانا کسی مدعی شرافت کے لیے کسی بھی اعتبار سے زیبا ہوتا مثلاً خدا ایک ہے وہی پوجا کے لائق ہے سورج، چاند، ستارے، شجر، حجر بت وغیرہ کسی کو کوئی نفع یا نقصان نہیں پہنچا سکتے دین میں دیانت، وعدے کا ایفا، محتاجوں، مسافروں اور غریبوں کی خبر گیری، آپس میں مل جل کر رہنا، برائیوں سے بچنا، اچھائیوں کی پیروی کرنا۔۔

خاص باتیں تھیں لیکن قریش اسے برداشت نہ کر سکے۔

مدینہ میں یہودیوں نے شرارتوں، ایذا رسانیوں اور سازشوں کا ایک منظم سلسلہ قائم کر لیا تھا مثلاً

۱۔ اوس و خزرج میں تفرقہ ڈال کر خانہ جنگی کی وہی آگ بھڑکانے کی کوشش کی جو چند سال پیشتر تک دونوں گروہوں کی بربادی کا باعث بن چکی تھی اور وہ یہودیوں کے دست نگر ہو کر رہ گئے تھے۔

۲۔ اسلام کے خلاف عداوت کے جنون نے انہیں انتہائی پستی میں گرا دیا تھا یہاں تک کہ اہل کتاب ہونے کے باوجود مشرکین کے مسلک کو پیروان اسلام کے طور طریقے سے بہتر اور قابل ترجیح بتاتے تھے۔ گویا ان کا تصور حق و صداقت ہی بدل گیا تھا اور اہل کتاب ہونے کا دعویٰ بھی برائے نام رہ گیا تھا۔

۳۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات بابرکات کے خلاف منصوبہ بندیوں میں بھی انہیں کوئی تامل نہ تھا۔ یہاں تک کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم رات کے وقت گھر سے نکلتے تو مسلمانوں کو یہودیوں کے ہاتھوں آپ کی جان کا خطرہ رہتا۔

بہرحال نبوت کی ذات کی حد تک دونوں یعنی قریش اور یہود کی دشمنی میں ہم آہنگی تھی۔ شارحین قرآن نے دونوں کی عداوت کی اور پھر عداوت میں ہم آہنگی کی وجہ یہی بتائی ہے۔ مثلاً المہائمی رقمطراز ہیں کہ یہود کی عداوت اہل ایمان سے اس لیے تھی کہ مسلمان حضرت عیسیٰ اور حضور انور کی نبوت کو مانتے تھے اور مشرکین کو عداوت اس لیے تھی کہ مسلمان توحید و نبوت کو مانتے ہیں۔ علت دونوں میں الگ الگ تھی مگر عداوت میں برابری تھی۔ دوسرے شارحین کہتے ہیں کہ ان کی عداوت کی بنیادی وجہ ان کا انکار اور کفر میں حد سے زیادہ ہونا اور اپنے مفادات و خواہشات میں زیادہ دلچسپی، تحقیق سے دوری تقلید پر جماؤ اور نبوت انبیاء کے خلاف باغیانہ میلانات تھے۔ ماضی میں وہ انبیاء کے قاتل رہے ہیں اور حال میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف قتل کی سازشوں میں سرگرم تھے۔ حضور انور کو زہر دیا، آپ پر جادو کیا، مشرکین کو حملہ کی ترغیب دی۔ ارشاد میں مشرکین سے پہلے یہود کے ذکر کرنے میں کہ یہود اپنی عداوت میں مشرکین سے بھی دو قدم آگے ہیں۔ اس میں قرآن نے ان پر طنز کی ہے کہ جو لوگ خدا اور نبی اور کتاب کے ماننے والے ہوتے ہیں انہیں تو فطرتاً مشرکین کے مقابلہ میں ان لوگوں سے زیادہ ہمدردی ہونی چاہیے جو مذہب میں خواہ ان سے اختلاف رکھتے ہیں مگر بہرحال انہی کی طرح خدا اور سلسلہ نبوت کو مانتے ہیں لیکن یہ یہودی عجیب قسم کے اہل کتاب ہیں کہ توحید کے مقابلے میں مشرکین کا ساتھ دے رہے ہیں بلکہ اسلام کی عداوت میں مشرکین سے بھی بازی لے گئے ہیں۔ اقرار نبوت اور انکار نبوت کے

مقابلے میں ان کی ساری ہمدردیاں منکرینِ نبوّت کے ساتھ ہیں۔

بہ نسبت یہودیوں کے عیسائی زیادہ محبت کرتے ہیں

۱۷۰۔ اور اہلِ ایمان سے دوستی میں قریب ان لوگوں کو پاؤ گے جنہوں نے کہا کہ ہم نصاریٰ ہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ ان کے اندر علماء اور مشائخ ہیں اور یہ تکبر نہیں کرتے۔ یہ دُنیا کے سارے عیسائیوں کے بارے میں قرآن کا فیصلہ نہیں ہے بلکہ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو زمانہ نبوّت میں موجود تھے اور آیت میں لتجدن اس کا قرینہ دلیل ہے۔ یعنی نزُولِ قرآن کے وقت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں کی یہ حالت تھی آگے چل کر مسیحی ریاستوں اور حکومتوں میں بھی وہی کیفیت پیدا ہو گئی جو یہودیوں کی تھی آیت میں بتایا یہ گیا ہے کہ نصاریٰ اہلِ ایمان سے زیادہ قریب ہیں۔ یہاں نصاریٰ سے عام عیسائی مراد نہیں ہیں جو پال کی ایجاد کردہ مسیحیت کے پیرو تثلیث و کفارہ وغیرہ کے قائل اور اسلام دشمنی میں تمام اسلام دشمن دُنیا کے سرخیل ہیں بلکہ اس سے مراد صرف حبشہ کے وہ مسیحی ہیں جنہوں نے اہلِ ایمان کا حضور انور کے زمانہ اقدس میں استقبال کیا تھا۔ اگر دنیا کے سارے عیسائی مراد ہوتے تو پھر مخاطب سیاق و سباق کے لحاظ سے صرف حضور نہ ہوتے بلکہ مسلمان ہوتے اور تعبیر بجائے لتجدن کے لتجدُنّ جمع کے صیغے سے ہوتی۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ نبوّت کو اسلام کی دعوت و تبلیغ کے سلسلے میں جن لوگوں سے اپنے زمانے میں سابقہ پڑا ہے قرآن یہاں ان ہی کا تقابلی مطالعہ پیش کر رہا ہے۔ نبوّت کے مخاطبوں میں یہودی، مشرکین اور عیسائی تھے۔ مشرکین مکہ اور یہود دُور دُور تک پھیلے ہوتے تھے۔ یہود کی مدینہ سے شروع ہو کر شام تک آبادیاں تھیں جبکہ عیسائی نجران، یمن اور حبش میں تھے۔ حبش کیا ہے۔

حبش کی اصلیت

عربی میں لفظ حبش کے معنے اختلاط و امتزاج کے ہیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ عربوں کے نزدیک یہ ایک ممزوج النسل اور مختلط النسب قوم تھی۔ اسی قسم کا ایک قبیلہ مکہ کی پہاڑیوں میں آباد تھا۔ عرب اس کو بھی احابیش کہتے تھے۔ اسلام نے ابھی چھ سال کی عمر نہ پائی تھی کہ ستر مسلمانوں نے تمام دُنیا کو چھوڑ کر صرف ملک حبش کا رُخ کیا۔ حبش کا صوبہ زیلع جس کو آج کل سمالی لینڈ اور اریٹریا کہتے ہیں، وہ ہمیشہ تاریخ اسلام میں عرب قوت کا مرکز رہا ہے اور اب بھی حبش اور تمام افریقی سواحل صرف عربوں سے متاثر ہیں۔ شہر کے شہر ان سے آباد ہیں۔ زبان تک عربی کی نقل ہے۔ لباس و

طعام وتمدن کی ہمہ رنگی فراوانی چیزیں ہیں حبش کے ساحل پر ایک شہر زیلع ہے وہاں ایک کتبہ سے معلوم ہوا ہے کہ دوسری صدی عیسوی کے اوائل میں نجاشی مدعی ہے کہ اس نے سبا کے ملک تک عرب میں جنگ کی۔ چوتھی صدی کے اوائل میں جب حبش میں مذہبی انقلاب پیدا ہوا تو مذہب عیسوی کے نئے پیروؤں کے دل وفور جوش سے لبریز تھے۔ شاہ اذینہ جو حبش کا پہلا بادشاہ عیسائی تھا۔ اور نیز اس کے جانشین اپنے کتبات میں اپنے نام کے ساتھ یہ القاب لکھتے ہیں۔ شاہ اکسوم وحمیر و ریدان وحبشات و سبا و زیلع۔ ان مخلوط سبائی عربوں کا پایہ تخت شہر اکسوم تھا جو ملک حبش کے صوبہ تیجرے میں ۱۴ درجہ ۷ دقیقہ ۳۲ ثانیہ بطرف شمال اور ۳۸ درجہ ۳۱ دقیقہ ۱۵ ثانیہ بطرف مشرق واقع تھا اور جہاں اب تک اس کے کھنڈر باقی ہیں۔ اہل حبش اس کو نہایت مقدس شہر سمجھتے ہیں۔ شاہان حبش کی تاجپوشی انقلاب حکومت کے بعد بھی اب تک یہیں ہوتی ہے۔

تقریباً اسی زمانے میں جب کہ سبائے حمیر نے ریدان میں اپنی مستقل حکومت قائم کی۔ سبائے حبش نے اکسوم میں ایک خاندان شاہی کی بنا ڈالی جو اس وقت سے چھٹی صدی تک قائم رہا۔ اس کے عروج و کمال کا زمانہ چوتھی اور پانچویں صدی ہے۔ عربوں میں شاہان حبش کا لقب نجاشی ہے۔ یہ نجاشی عیسائی ہے۔ لیکن یہ عیسائیوں کے کون سے فرقہ سے تعلق رکھتا تھا۔ اس موضوع پر ڈاکٹر جواد علی مصنف تاریخ عرب قبل الاسلام اور سید سلیمان ندوی مصنف ارض القرآن دونوں خاموش ہیں۔ ابو حیان اندلسی نے حضرت قتادہ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ یہ لوگ اہل کتاب میں سے وہ لوگ تھے جو حضرت عیسٰی کی شریعت پر عمل پیرا تھے ایسے ہی محدث ابن جریر نے یہ انکشاف کیا ہے کہ یہ لوگ حضرت عیسٰی کی شریعت سے وابستہ تھے۔

برامر واقعہ ہے کہ نجاشی آریوسی عیسائیوں سے تعلق رکھتا تھا جو حضرت عیسٰی کی وحدت فطرت کے قائل تھے۔ تثلیث کے ماننے والوں کی طرح کہ حضرت عیسٰی میں دو فطرتیں ہیں ایک عبدیت کی اور دوسری الوہیت کی۔ آریوس اسکندریہ کا پادری تھا۔ چوتھی صدی مسیحی کے اوائل میں حضرت مسیح کی وحدت فطرت کا عقیدہ پیش کیا یعنی حضرت مسیح کی الوہی فطرت کے انکار کے لیے زمین ہموار کر دی تھی۔ اہل حبش مدت تک آریوس کے عقیدے پر قائم رہے۔ بہرحال کچھ ہو قرآن نے ان کا چہرہ یہ بتایا ہے کہ ان میں علماء اور مشائخ ہیں اور یہ لوگ تکبر نہیں کرتے، ظاہر ہے کہ یہ بات ان کی مدح میں بولی گئی ہے۔ بلاشبہ وہ نصاریٰ جن میں یہ اوصاف ہوں کہ

الف۔ اپنے آپ کو مسیحی نہیں بلکہ نصاریٰ کہتے ہیں۔

ب: ان میں فکر کی اصلاح کے لیے علماء علمی کارنامے دین کی حدود میں انجام دے رہے ہوں۔
ج: ان میں اخلاق و قلب کی اصلاح کے لیے مشائخ اور اہلِ تقویٰ محنت کر رہے ہوں اور چاہتوں مفادات اور منفعتوں سے بالا ہوں۔

د: ان میں پوری انسانیت کے لیے نیازمندی اور تواضع ہو اور متکبر نہ ہوں۔ آج بھی ایسے لوگ یہودیوں اور مشرکین کے مقابلے میں اہلِ ایمان کے زیادہ قریب ہیں۔ اور آئیے یہ کسوٹی لے کر پوری عیسائی دُنیا کا جائزہ لیجئے۔ آپ کو نصاریٰ سے نہیں مسیحوں سے سابقہ پڑے گا۔ علماء و زہاد سے نہیں خالص مادہ پرستانہ ذہنیت رکھنے والے لوگ آپ کو ملیں گے۔ نیازمند اور متواضع نہیں بلکہ آپ کو متکبر اور مغروروں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں،

ان آیات میں اسی جماعت کا حال بیان فرمایا ہے۔ قیامت تک کے لیے کوئی خبر نہیں دی گئی ہے کہ ہمیشہ عیسائیوں اور یہود و مشرکین وغیرہ کے تعلقات کی نوعیت اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ یہی رہے گی۔ آج جو لوگ عیسائی کہلاتے ہیں ان میں کتنے قیس و رہبان اور متواضع و منکسر المزاج ہیں اور کتنے ہیں جن کی آنکھوں سے کلامِ الٰہی سن کر آنسو ٹپک پڑتے ہیں۔ جب اقربھم مودۃ کی علت ہی جو ذالک بان منھم قسیسین و رھبانا سے بیان کی گئی ہے موجود نہیں ہے تو معلول قربِ مودت کیوں موجود ہوگا۔ بہرحال جو اوصاف عہدِ نبوی کے عیسائیوں اور یہود و مشرکین کے بیان ہوئے۔ وہ جب کبھی اور جہاں کہیں جس مقدار میں موجود ہوں اسی نسبت سے اسلام و مسلمین کی محبت و عداوت کو خیال کر لیا جاتے۔

نصاریٰ نے قرآن کا خیر مقدم کیا

۱۷۱- اور جب یہ سنتے ہیں اس چیز کو جو رسُول کی طرف اتاری گئی ہے تو تم دیکھو گے کہ حق کی معرفت کی وجہ سے ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ جاتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ اے ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے تو ہمیں اس کی گواہی دینے والوں میں لکھ لے۔ جن کا پہلے چہرہ بیان ہوا ہے ان ہی کا یہاں بیان ہو رہا ہے کہ انہوں نے جس والہانہ انداز میں قرآن اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا استقبال کیا یہ اس کا بیان ہے۔ اس بیان میں یہ بات صاف نظر آتی ہے کہ حضرت عیسٰی نے انجیل میں جس تسلی دینے والے اور جس نجات دہندہ کی بشارت دی تھی اور اس کی جو علامتیں بتائی تھیں وہ ان میں ایک ایک چیز کو محفوظ کیے ہوتے اس آنے والے کی راہ تک رہے تھے، فرمایا کہ ان کا حال یہ ہے

کہ جب انہوں نے قرآن پاک کی آیات سنیں اور ان کے اندر اس حق کی کرنیں جلوہ گر دیکھیں تو جوش مسرت سے ان کی آنکھیں ڈبڈبا آئیں اور وہ پکار اٹھے ربنا آمنا، اے ہمارے رب ہم اس کتاب پر اور اس کے لانے والے پر ایمان لے آئے تو ہمیں اس کی گواہی دینے والوں کے زمرے میں لکھ لے۔ جو بات انہوں نے یہاں کہی ہے یہی بات حواریین نے حضرت مسیح کی دعوت ایمان پر لبیک کہتے ہوئے فرمائی تھی ربنا آمنا بما انزلت واتبعنا الرسول فاکتبنا مع الشاھدین گویا انہوں نے قرآن سن کر یہ اقرار کیا کہ ہم قرآن پر ایمان لا کر تیرے رسول کا اتباع کریں گے اور اللہ سے درخواست کی کہ ہمارا نام ماننے والوں کی فہرست میں درج فرمالیجئے۔ دراصل اس میں دعا کے انداز میں ان کی جانب سے ادائے فرض شہادت کی تمنا اور آرزو ہے۔ کیونکہ یہی شہادت وہ ذمہ داری ہے جو اللہ کی جانب سے نبی پر اور نبی کی امت پر ڈالی گئی ہے۔ شہادت یا گواہی عرف عام میں اس کو کہتے ہیں کہ آدمی کسی واقعہ کے بارے میں جو کچھ یقین کے ساتھ جانتا ہے دوسروں کو ٹھیک ٹھاک بتا دے۔ اس لیے اللہ کے دین کی شہادت کا لغوی اور عرفی مفہوم یہ ہے کہ لوگوں پر نبی کے دین کو جیسا کچھ وہ ہے پوری طرح واضح کر دے۔ اب رہا یہاں شہادت کا مفہوم تو اگرچہ بنیادی طور پر یہی ہے مگر اس میں بڑی وسعت ہے ایک تو یہی ہے کہ ہمیں ان لوگوں میں شمار کرلے جنہوں نے قرآن کے اور نبوت کے حق ہونے کی شہادت دی ہے۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہمارا شمار امت محمدؐ میں فرمائے۔ امت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ نے منصب شہادت عطا فرمایا ہے۔ وہ اس بات کے گواہ ہیں کہ ان کے پیغمبر نے اللہ کا پیغام پہنچا دیا ہے۔

نصاریٰ یہ کیوں کہہ رہے ہیں؟ اس لیے کہ ان کو اپنی کتابوں کے ذریعے یہ معلوم ہے کہ آخری نبی جس کے ذریعے اللہ سبحانہٗ دین میں کمال پیدا فرمائے گا۔ اس کی پیروی کرنے والے پوری انسانیت کے سامنے فرض شہادت انجام دیں گے۔ چنانچہ عبداللہ ابن عباس سے روایت ہے کہ اس آیت میں شاہدین سے مراد وہی لوگ ہیں جن کو قرآن نے شہداء علی الناس کا منصب دیا ہے۔

سامان ایمان موجود ہے

۱۷۴۔ اور آخر ہم اللہ اور اس حق پر جو ہم کو پہنچا ہے ایمان کیوں نہ لائیں جب کہ ہم توقع رکھتے ہیں کہ ہمارا رب ہمیں نیکو کاروں کے زمرے میں شامل کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ جب ایمان لانے کا سامان موجود ہے تو ایمان نہ لانے کی وجہ کیا ہے۔ یعنی جب ہم خود یہ توقع رکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ

ہمیں صالحین کے گروہ میں داخل کرے گا تو پھر اللہ اور اس حق پر جو ہمارے پاس آیا ہے ایمان لاتے بغیر ہمیں یہ توقع کرنے کا کیا حق ہے۔

ایمان و کفر کی جزا و سزا

۱۷۳۔ تو اللہ ان کے اس قول کے صلے میں ان کو ہمیشہ رہنے کے لیے ایسے باغات عطا فرماتے گا جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی اور خوب کاروں کا یہی صلہ ہے، اور جنہوں نے کفر کیا اور ہماری آیات کو جھٹلایا وہ دوزخ میں پڑنے والے ہیں۔ خاص سے عام کی طرف آنا اور جزئیات سے کلیات پہلے کرنا قرآن کا ایک عام اسلوب ہے۔ اوپر ایک خاص گروہ کے انعامات کا ذکر تھا۔ اب قانون عام بیان کر دیا کہ ہمارے قانون میں ایسی جزائے خیر تو ہر نیکوکار کو ملتی ہی رہتی ہے اور اخلاص طلب رائیگاں نہیں جاتا۔ متکلمین نے فاثابھم بما قالوا سے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ زبان کا اقرار شرط ایمان ہے۔ عرفائے یہاں یہ بات خوب سمجھی ہے کہ ان آیات میں تین باتیں موجود ہیں، زیادتیوں پر دفاع، دین اور عطا کے لیے دعا اور پھر جو کچھ مل جاتے اس پر رضا۔ اگر کوئی شخص ان تینوں کی عدم موجودگی میں معرفت کا دعویٰ کرتا ہے تو وہ جھوٹا ہے۔ شیخ الاسلام نے تمام آیات پر ایک جامع نظر ڈالی ہے سمجھتے وہ بھی گوش گزار فرما لیجئے۔ ان آیات میں بتلایا گیا ہے کہ یہود کا مشرکین سے دوستی کرنا محض اسلام اور مسلمانوں کی عداوت و بغض کی وجہ سے ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو جن اقوام سے زیادہ سابقہ پڑتا تھا ان میں یہ دونوں قومیں یہود اور مشرکین علی الترتیب اسلام و مسلمین کی شدید ترین دشمن تھیں۔ مشرکین مکہ کی ایذا رسانیاں تو اظہر من الشمس ہیں لیکن ملعون یہود نے کوئی کمینہ سے کمینہ حرکت اٹھا کر نہیں رکھی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بے خبری میں پتھر کی چٹان گرا کر شہید کرنا چاہا۔ کھانے میں زہر دینے کی کوشش کی۔ سحر اور ٹوٹکے کرائے غرض غضب پر غضب اور لعنت پر لعنت حاصل کرتے رہے۔ اس کے بالمقابل نصاریٰ باوجودیکہ وہ بھی کفر میں مبتلا تھے۔ اسلام سے جلتے تھے مسلمانوں کا عروج ان کو ایک نظر نہ بھاتا تھا تاہم ان میں قبول حق کی استعداد ان دونوں گروہوں سے زیادہ تھی۔ ان کے دل اسلام اور مسلمانوں سے محبت کرنے کی طرف نسبتاً جلد مائل ہو جاتے تھے۔ اس کا سبب یہ تھا کہ اس وقت تک عیسائیوں میں علم دین کا چرچا دوسری قوموں سے زیادہ تھا۔ اپنے طریقہ کے موافق ترک دنیا اور زاہدانہ زندگی اختیار کرنے والے ان میں بکثرت پائے جاتے تھے۔ نرم دلی اور تواضع ان کی خاص صفت تھی۔ جس قوم میں یہ خصائل کثرت سے پائی جائیں اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا

چاہیے کہ اس میں قبول حق اور سلامت روی کا مادہ دوسری اقوام سے زیادہ ہو کیونکہ قبول حق سے عموماً تین چیزیں مانع ہوتی ہیں جہل، حبّ دنیا یا حسد وتکبر، نصاریٰ میں قسیسین کا وجود جہل کو رہبان کی کثرت حبّ دنیا کو نرم دلی اور تواضع کی صفت کبر ونخوت وغیرہ کو کم کرتی تھی۔ چنانچہ قیصرِ روم، مقوقس مصر اور نجاشی ملک حبشہ نے جو کچھ برتاؤ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام رسالت کے ساتھ کیا وہ اس کا شاہد ہے۔ اس وقت نصاریٰ میں قبول حق اور مودت مسلمین کی صلاحیت نسبتہً دوسری قوموں سے زائد تھی۔ مشرکین مکہ کے ظلم وستم سے تنگ آکر جب ایک جماعت صحابہ کرام نے حبشہ کو ہجرت کی اور مشرکین نے وہاں بھی ملک حبشہ کے دربار تک اپنا پروپیگنڈا نہ چھوڑا تو بادشاہ نے ایک روز مسلمانوں کو بلا کر کچھ سوالات کیے اور حضرت مسیح کے بارے میں بھی ان کا عقیدہ دریافت کیا۔ حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی آیات پڑھیں اور اپنا عقیدہ صاف صاف بیان کر دیا۔ بادشاہ بے حد متاثر ہوا اور اقرار کیا کہ جو کچھ قرآن میں حضرت مسیح علیہ السلام کے بارے میں ہے وہ بلا کم وکاست صحیح ہے۔ اس نے کتب سابقہ کی بشارات کے موافق حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی آخر الزمان تسلیم کیا۔ قصہ طویل ہے انجام کار ہجرت کے کئی سال بعد ایک وفد جو ستر نو مسلم عیسائیوں پر مشتمل تھا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں روانہ کیا۔ یہ لوگ جب مدینہ پہنچے اور قرآن کریم کے سماع سے لذت اندوز ہوتے تو کلام الٰہی سن کر وقف گریہ وبکا ہو گئے۔ آنکھوں سے آنسو اور زبان پر ربنا آمنا کے کلمات جاری تھے۔ شیخ الاسلام نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے اس کی تفصیل یہ ہے۔

خدا کی راہ میں پہلی ہجرت

جب قریش کے ظلم وتعدی کا بادل پیہم برس کر بھی نہ کھلا تو رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جاں نثاران اسلام کو ہدایت فرمائی کہ حبشہ ہجرت کر جائیں جو قریش کی قدیم تجارت گاہ تھی۔

حبش کے ساتھ قریش کے تجارتی تعلقات پشتوں سے چلے آ رہے تھے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم نے قیصرِ روم سے تجارت کا پروانہ حاصل کیا تھا تو قیصر نے اپنے ہم مذہب حکمران شاہِ حبش کے نام بھی ایک سفارشی خط لکھ دیا تھا کہ اہل مکہ کے تجارتی قافلے اپنے ملک میں آنے دے۔ سیرۃ النبیؐ میں ہے کہ ہاشم نے شاہ حبش سے قریش کے تجارتی مال پر ٹیکس نہ لینے کا فرمان حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت سے قریش بڑی تعداد میں حبش جاتے آتے تھے۔

حبش کے بادشاہ کو عرب نجاشی کہتے تھے جو حبشی زبان کے لفظ نجوس یا نیگوش کی تعریب ہے

اور اس کے معنے بادشاہ کے ہیں۔ وقت کے نجاشی کا نام اصحمہ تھا۔ ڈاکٹر جواد علی تاریخ العرب قبل الاسلام میں رقمطراز ہیں کہ نجاشی کا اصل نام الااصبحہ کا لب ہے۔ یہی عربی میں آکر اصحمہ بن گیا ہے۔ الا ذوی آل کے معنے میں ہے۔ اصبحہ اس کے اجداد میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ کالب جو آل اصبحہ میں ہے۔ اس کے عدل و انصاف کی شہرت تھی۔

ہجرت سے ایک بدیہی فائدہ تو یہ تھا کہ مظلومین کے لیے امن مہیا ہو جاتا دوسرا اور اہم فائدہ یہ بھی تھا کہ دعوت حق کے پیرو جہاں جاتے وہاں اسلام کی روشنی خود بخود پھیلنے کا سر و سامان ہو جاتا وہ زبان سے بھی اسلام کی دعوت دیتے، اپنے حسن عمل اور فضائل اخلاق کی بدولت بذات خود بھی ایک موثر عملی دعوت اسلام تھے۔

شروع میں گیارہ مرد اور چار عورتوں نے ہجرت کی جن میں حضرت عثمان مع اہلیہ حضرت رقیہ بنت آنحضرت، حضرت زبیر بن العوام، حضرت عبدالرحمان بن عوف، حضرت مصعب بن عمیر، حضرت ابوسلمہ مخزومی مع اہلیہ حضرت ام سلمہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت عثمان بن مظعون، بعد میں، وقتاً فوقتاً متفرق قافلے جاتے رہے، یہاں تک حبش میں کل مہاجرین کی تعداد ایک سو ایک تک پہنچ گئی۔ ستراسی مرد اور اٹھارہ عورتیں بعد کے قافلوں میں جو اہم شخصیتیں گئیں ان میں سے ایک حضرت جعفر بن ابی طالب تھے جو آگے چل کر نجاشی کے دربار میں مہاجرین حبش کے ترجمان بنے۔

قریش کی بے پناہ عداوت

اس زمانے میں اہل مکہ کے لیے بندرگاہ شعیبہ تھی، جہاں سے جہاز حبش جاتے تھے۔ یہ مقام جدہ سے تھوڑے سے فاصلے پر جنوب میں ہے۔ خود جدہ حضرت عثمان کے عہد خلافت میں بندرگاہ بنا اور شعیبہ کی رونق ادھر منتقل ہو گئی۔ مہاجرین کا پہلا قافلہ ۵ ؁ھ یعنی ۶۱۴ ؁ء میں روانہ ہوا تھا۔ یہ حضرات دو تجارتی جہازوں پر سوار ہو کر گئے تھے۔ قریش کو ہجرت کا علم ہوا تو مہاجرین کے تعاقب میں بندرگاہ تک گئے لیکن قافلہ پیشتر جا چکا تھا۔ بعد میں مہاجرین کے قافلے چھپ چھپا کر جاتے رہے۔ قریش کی عداوت کا یہ عالم تھا کہ مظلومین کا تعاقب نہ چھوڑا۔ ایک وفد بطور سفارت شاہ حبش کے پاس پہنچا، جس میں عبداللہ بن ابی ربیعہ اور عمرو بن العاص جو حلقہ بگوش اسلام ہونے کے بعد فاتح مصر بنے شامل تھے۔ وفد نے نجاشی اور اس کے درباریوں کے لیے تحائف بھی ساتھ لیے تھے مقصد یہ تھا کہ درباریوں کو ہمنوا بنا کر مظلوم مسلمانوں کو حبش سے نکلوا کر اپنے ساتھ لے آئیں تاکہ

پہلے کی طرح ظلم و جور کا شوق پورا کرتے رہیں۔

قریش کے وفد نے حبش پہنچتے ہی درباریوں اور پادریوں سے ملاقات کی۔ تحائف دے کر انہیں ہموار کرلیا۔ سب سے یہی کہا کہ ہمارے ہاں کے چند لوگ آبائی دین چھوڑ چکے ہیں اور یہاں آگئے ہیں۔ انہوں نے مسیحیت یا یہودیت بھی قبول نہیں کی لہٰذا انہیں ملک سے نکال دینے پر زور دینا چاہیے۔ پھر اہل وفد خود دربار میں پہنچے اور نجاشی سے بھی اسی انداز میں گفتگو کی کہا کہ یہ جو لوگ آپ کے ملک میں آئے ہیں۔ ہمارا دین چھوڑ بیٹھے ہیں آپ کے دین میں بھی داخل نہیں ہوتے۔ انہوں نے نیا دین نکالا ہے۔ اشراف قوم نے جن میں ان لوگوں کے باپ دادا، چچا اور دوسرے اہل قبیلہ شامل ہیں ہمیں آپ کے پاس بھیجا ہے کہ انہیں واپس کر دیں۔ درباریوں اور پادریوں نے بھی حسب قرارداد وفد کے مطالبے کی تائید کی۔

نجاشی نے مطالبہ سن کر کہا کہ جب تک ان لوگوں سے بات چیت نہ کرلی جاتے اور ان کا مسلک معلوم نہ ہو جاتے ان کے خلاف کوئی حکم دے دینا قرین انصاف نہیں ہے۔ چنانچہ مسلمان مہاجرین کے نمائندے دربار میں بلائے گئے، وہ آئے تو دستور عام کے مطابق بادشاہ کو سجدہ نہ کیا۔

حضرت جعفر کی تقریر

نجاشی نے مسلمانوں سے ان کے مذہب کی کیفیت پوچھی، ان کی طرف سے حضرت جعفر نے ایک جامع اور پُرتاثیر تقریر فرمائی، جس میں اسلام کے اہم اجزاء بھی آگئے تھے اور اسلام سے قبل عربوں کی حالت کا نقشہ بھی کھینچ دیا تھا۔ یہی پوری دنیا کا نقشہ تھا۔ حضرت جعفر نے فرمایا۔

اے بادشاہ! ہم لوگ جاہلیت میں مبتلا تھے، بتوں کو پوجتے تھے، بے حیائی کے کام کرتے تھے۔ اقربا کے حقوق سے قطع نظر کیے بیٹھے تھے۔ ہمسایوں سے ہمارا برتاؤ اچھا نہ تھا ہم میں سے طاقتور کمزوروں کو کھا گئے تھے۔ یہ حالت تھی جب اللہ نے ہم میں سے ایک رسول بھیجا، جس کے حسب و نسب، صدق و دیانت، تقویٰ اور پرہیزگاری سے ہم خوب واقف تھے۔ اس نے ہمیں توحید کی دعوت دی سمجھایا کہ اکیلے خدا کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔ پتھروں اور بتوں کی عبادت چھوڑ دو جنہیں ہم اور ہمارے باپ دادا پوجتے تھے۔ سچ بولو، امانتیں ادا کرتے رہو۔ اقربا کے حقوق کا خیال رکھو۔ ہمسایوں سے اچھا برتاؤ کرو۔ حرام باتوں اور خون ریزی سے

دُور رہو۔ اس نے ہمیں تاکید کی کہ بے حیائی سے بچو، جھوٹ نہ بولو، یتیموں کا مال نہ کھاؤ، پاک دامن عورتوں پر بدنامی کے داغ نہ لگاؤ۔ وعدے پورے کرو، گناہوں سے دُور رہو، حکم دیا کہ صرف ایک خدا کی عبادت کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہراؤ، ہم نماز پڑھو، زکوٰۃ دو، روزے رکھو، اس نے جس چیز کو حرام بتایا ہم نے حرام جانا جس چیز کو حلال بتایا ہم نے حلال جانا، ہم اس پر ایمان لائے۔ شرک اور بت پرستی چھوڑ دی۔ بُرے کاموں سے باز آ گئے۔ اس پر ہماری قوم ہماری جانی دشمن ہو گئی۔ مجبور کر رہی ہے کہ ہم وحدہٗ لا شریک کی عبادت چھوڑ دیں۔ لکڑی اور پتھر کی مورتیں پوجیں۔ ہم نے قوم کے ہاتھوں بہت ظلم سہے، مجبور ہو کر پناہ لینے کے لیے تیرے ملک میں آئے ہیں۔

نجاشی نے یہ تقریر سُن کر کہا جو کلام الٰہی تمہارے پیغمبر پر اترا ہے وہ کہیں سے پڑھو۔ حضرت جعفر نے سُورۃ مریم کی چند آیتیں سنائیں جنہیں سنتے ہی نجاشی کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور اس نے کہا خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔

قریش کے وفد کو جواب دے دیا کہ تم چلے جاؤ میں ان لوگوں کو ہرگز واپس نہ کروں گا۔ دوسرے روز عمرو بن العاص نے پھر دربار میں رسائی حاصل کی اور نجاشی سے کہا کہ اے بادشاہ آپ کو بھی معلوم ہے کہ حضرت عیسٰی کے متعلق ان لوگوں کا عقیدہ کیا ہے۔ چنانچہ مسلمان دوبارہ دربار میں بلائے گئے۔ خود انہیں بھی اندیشہ تھا کہ نجاشی عیسائی ہے ممکن ہے وہ حضرت عیسٰی کے بارے میں مسلمانوں کے خیالات سن کر ناراض ہو جائے، حضرت جعفر نے فرمایا کچھ بھی ہو ہمیں سچ کہنا چاہیے، ہم وہی کہیں گے جو ہمارے خدا اور ہمارے رسُول نے فرمایا۔ دربار میں حضرت عیسٰی کے بارے میں سوال کیا گیا تو حضرت جعفر نے فرمایا کہ

وہ اللہ کے بندے، اس کے رسُول، اس کی رُوح اور اس کا کلمہ تھے۔

نجاشی نے یہ سُنتے ہی زمین سے تنکا اٹھایا اور کہا جو کچھ تم نے بتایا خدا کی قسم عیسٰی اس تنکے کے برابر بھی اس سے زیادہ نہیں ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تُحَرِّمُوْا طَيِّبٰتِ مَآ اَحَلَّ اللّٰهُ لَكُمْ
وَلَا تَعْتَدُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ وَكُلُوْا مِمَّا
رَزَقَكُمُ اللّٰهُ حَلٰلًا طَيِّبًا ۠ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ الَّذِيْٓ اَنْتُمْ بِهٖ
مُؤْمِنُوْنَ ۝

اے پیروانِ دعوتِ ایمان! اللہ نے جو چیزیں تم پر حلال کر دی ہیں
انہیں اپنے لیے حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو اللہ حد سے گزر جانے
والوں کو پسند نہیں کرتا ہے[۱۳]۔ اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے
اس میں پاکیزہ اور حلال کھاؤ اور اس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس
پر تم ایمان لاتے ہو[۱۳۵]۔

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے

چونکہ پچھلی آیات میں عیسائی راہبوں کی نرم دلی اور فروتنی کی تعریف کی گئی تھی اس سے ممکن ہے کہ کوئی سمجھ لے کہ اسلام میں رہبانیت کی گنجائش ہے اس لیے ضروری تھا کہ کھول کر بتا دیا جائے کہ اسلام میں رہبانیت نہیں ہے اور انداز بیان کچھ ایسا بلیغ اختیار فرمایا ہے کہ ایک ہی بات میں متقشف کے تقشف اور مادہ پرست کے تعشق دونوں کی تردید ہو گئی۔ اور بتا دیا کہ اسلام کے

نام پر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو نظام لے کر آئے وہ رہبانیت کا ہرگز متحمل نہیں ہے کیونکہ اسلام میں اللہ کا تصور صرف ایک مطلوب حقیقی کا تصور نہیں ہے بلکہ اس کے ساتھ وہ انسانوں کا حقیقی فرمانروا اور حقیقی قانون ساز بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ترک دنیا، نفس کشی اور گیان دھیان کے ذریعے خدا تک پہنچ جانے کا نظریہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جبکہ وہ انسان کا صرف مطلوب اور مقصود ہو اور اس کے سوا اور کچھ نہ ہو لیکن جب حقیقت یوں نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ اس کا فرمانروا اور قانون ساز بھی ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس کے لیے اس کے کچھ احکام اور قوانین بھی ہوں گے جن کی اطاعت کرنی چاہیے اس لیے انسان کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے ذکر و فکر میں مشغول رہے بلکہ یہ بھی ہے کہ زندگی کے میدان میں آئے اور ان احکام کی اطاعت میں فرمانبردار رعیت ہونے کا ثبوت دے۔

رہبانیت دراصل دین کے اس تصور پر قائم ہوتی ہے کہ دنیا انسان کے لیے فی الواقع قید خانہ ہے اس کا جسم اس کی روح کے حق میں ایک پنجرے کی حیثیت رکھتا ہے اور اس کے اندر جو مادی خواہشیں پائی جاتی ہیں وہ اس پنجرے کی تیلیاں ہیں۔ انسان نجات اسی وقت پا سکتا ہے جب وہ اس قید خانے کی دیواروں کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالے اور اس پنجرے سے اپنی روح کو آزاد کرالے، یعنی وہ دنیا چھوڑ دے، بستیوں سے دور نکل جائے اور کسی گوشے میں اپنے خدا سے لو لگا کر بیٹھ جائے۔ اپنی خواہشوں کو دبا کر کچل ڈالے اور فنا کر کے رکھ دے۔ صرف اسی شکل میں اس کی روح کے اوپر سے وہ پردہ ہٹ سکتا ہے جو اسے خدا کے جلووں کو دیکھ پانے اور اس کی جناب تک رسائی حاصل کر لینے سے روکے ہوئے ہے اس انسان کا فرض ہے کہ وہ ریاضتیں کر کے مایا کے اس جال سے باہر نکل آئے۔ قرآن نے عیسائیوں پر جنہوں نے رہبانیت کو دین اور خدا پرستی کا کمال سمجھ کر اپنا رکھا تھا تنقید کرتے ہوئے فرمایا ورھبانیۃ ابتدعوھا ما کتبنا ھا علیھم انہوں نے رہبانیت کی خود ساختہ راہ اختیار کر لی ہم ان کو اس کا حکم نہیں دیا تھا اور یہاں اس آیت میں بھی اس گمراہی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۱۷۴ ۔ اے پیروان دعوت ایمانی! اللہ نے جو چیزیں تم پر حلال کر دی ہیں انہیں اپنے لیے حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو اللہ حد سے گزر جانے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ اس آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں ایک یہ کہ جو چیزیں اچھی اللہ نے حلال کر دی ہیں ان کو حرام نہ کرو۔ دوسری یہ کہ حد سے تجاوز نہ کرو۔ ان دونوں باتوں میں رہبانیت کی تردید کی ہے۔ اچھی چیزوں کو حرام کرنے کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ اپنے آپ حلال و حرام کے مختار نہ بن جاؤ۔ اپنے اختیار سے کسی حلال کو حرام یا حرام کو حلال ٹھہرانا قانون الٰہی سے ہٹ کر اپنے نفس کی پیروی ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ

عیسائیوں کے راہبوں کی رہبانیت اور ترک لذات کا طریقہ اختیار نہ کرو۔ رہبانیت اختیار کرنے والوں میں ہمیشہ یہ طریقہ رہا ہے کہ نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے کو وہ روحانی ترقی میں مانع سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ اپنے آپ کو تکلیف میں ڈالنا، اپنے نفس کو دنیوی لذتوں سے محروم کرنا، دنیا کے سامان زیست سے تعلق توڑنا بجائے خود ایک نیکی ہے اور خدا کا تقرب اس کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا۔ اور حد سے تجاوز کرنا وسیع مفہوم کا حامل ہے۔ حلال کو حرام کرنا اور خدا کی ٹھہرائی ہوئی پاک چیزوں سے اس طرح پرہیز کرنا کہ گویا وہ ناپاک ہیں، بجائے خود ایک زیادتی ہے۔ پھر پاک چیزوں کے استعمال میں اسراف اور افراط بھی عدوان ہے اور حلال کی سرحد سے باہر قدم نکال کر حرام کی حدود میں داخل ہونا بھی زیادتی ہے اللہ کو یہ تینوں باتیں ناپسند ہیں۔

ارشاد میں لا تحرموا اور لا تعتدوا دونوں ممانعتیں الگ الگ ہیں ضروری ہے کہ ان کی معنویت بھی الگ الگ ہو۔ یعنی جس طرح اللہ تعالیٰ کی جائز کردہ چیزوں میں سے طیبات کو حرام ٹھہرانا جائز نہیں ہے اسی طرح اس کی حرام کردہ چیزوں کو حلال بنا لینا بھی جائز نہیں ہے۔ یہ اعتداً اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ حدود سے تجاوز ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ساری چیزیں ہمارے لیے پیدا کی ہیں۔ ہمیں ان کے کھانے اور برتنے کی اجازت ہے۔ گنتی کی چند چیزیں ہیں جو حرام قرار دی گئی ہیں۔ ان کی حیثیت اللہ کی حدود کی ہے اور حدود کو پھلانگنے کی اجازت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص ان حدود سے آگے بڑھنے کی جسارت کرتا ہے تو وہ محارم الٰہی کی حدود الٰہی میں مداخلت کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے گستاخوں کو پسند نہیں کرتا ہے اعتدا یا حدود سے نکل جانا یہی ہے کہ اللہ کی قیدوں اور احتیاطوں کو ناکافی سمجھ کر ان پر اپنی رائے سے اضافہ کرے یا اس کے برعکس انہیں زیادہ سمجھ کر ان میں سے کچھ چیزوں کو گھٹائے۔ محققین نے لکھا ہے کہ اس آیت میں دونوں کی تردید ہو رہی ہے۔ ان مذہبی ذہنیت کے نیک مزاج لوگوں کی بھی جن میں یہ میلان پایا جاتا ہے کہ نفس و جسم کے حقوق ادا کرنے کو وہ روحانی ترقی میں مانع سمجھتے ہیں اور ان دنیاداروں کی بھی جو قانونی پابندیوں سے بے پرواہ ہو کر زندگی گزارتے ہیں۔

غلو وجفا اور افراط و تفریط کے درمیان اعتدال

۱۷۵۔ اور جو کچھ اللہ نے تمہیں دے رکھا ہے اس میں سے پاکیزہ اور حلال کھاؤ اور اس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس پر تم ایمان لاتے ہو۔ آغاز سورت میں ایفائے عہود کی تاکید کے بعد حلال و حرام کا بیان شروع ہوا تھا۔ اس ضمن میں خاص خاص مناسبات سے جن کا ذکر موقع بموقع ہم کر چکے

ہیں۔ دوسرے مفید مضامین کا سلسلہ شروع ہو گیا الشیٔ بالشیٔ یذکر بات میں سے بات نکلتی رہی ہے تمام استطرادی مضامین کو تمام کر کے اس پارے کے پہلے رکوع سے پھر اصل موضوع بحث کی طرف عود کیا گیا ہے اور لطف یہ ہے کہ اس رکوع سے متصل پہلے رکوع میں جو مضمون گزرا اس سے بھی اس رکوع کا مضمون پوری طرح مربوط ہے کیونکہ پچھلے رکوع میں جو یہود و نصاریٰ کی فضائح بیان کی گئیں سمجھنے والوں کے نزدیک ان کا خلاصہ دو چیزیں تھیں یعنی یہود کا لذات و شہوات دنیا اور حرام خوری میں انہماک جو تفریط فی الدین کا سبب ہوا اور نصاریٰ کا دین میں غلو اور افراط جو آخر کار رہبانیت وغیرہ پر منتہی ہوا۔ بلاشبہ رہبانیت جسے دینداری یا روحانیت کا ہیضہ کہنا چاہیے، نیت اور منشائے اصلی کے اعتبار سے فی الجملہ محمود ہو سکتی تھی، اسی لیے ذالک منھم قسیسین و رھبانا کو من وجہ معرض مدح میں پیش کیا گیا لیکن چونکہ اس طرح کا تجرد و ترک دنیا اس مقصد عظیم اور قانون قدرت کے راستہ میں حائل تھا جو فاطر السماوات والارض نے عالم کے پیدا کرنے میں ملحوظ رکھا ہے۔ اس لیے وہ عالمگیر دین جو ابدی طور پر تمام بنی نوع انسان کی فلاح دارین اور اصلاح معاش و معاد کا متکفل ہو کر آیا ہے ضروری تھا کہ اس طرح مبتدعانہ طریق عبادت پر سختی سے نکتہ چینی کرے۔ کوئی آسمانی کتاب ایسی جامع معتدل فطری تعلیم انسانی ترقیات کے ہر شعبہ کے متعلق پیش نہیں کر سکتی جو قرآن حکیم نے ان دو آیتوں میں پیش کی ہے۔ ان آیتوں میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کو صاف طور سے روک دیا کہ وہ کسی لذیذ حلال و طیب چیز کو اپنے اوپر عقیدۃً یا عملاً حرام ٹھہرا لیں نہ صرف یہی بلکہ ان کو خدا کی پیدا کی ہوئی حلال و طیب نعمتوں سے متمتع ہونے کی ترغیب دی ہے مگر سلبی اور ایجابی دو شرطوں کے ساتھ۔ ۱۔ اعتدا نہ کریں۔ ۲۔ تقویٰ اختیار کریں۔ اعتدا کے دو مطلب ہو سکتے ہیں حلال چیزوں کے ساتھ حرام کا سا معاملہ کریں۔ اور نصاریٰ کی طرح رہبانیت میں مبتلا ہو جائیں۔ یا لذائذ و طیبات سے تمتع کرنے میں حدِ اعتدال سے گزر جائیں۔ حتیٰ کہ لذات و شہوات میں مبتلا ہو کر یہود کی طرح دنیوی زندگی ہی کو اپنا مطمح نظر بنا لیں۔ الغرض غلو و جفا اور افراط و تفریط کے درمیان متوسط و معتدل راستہ اختیار کرنا چاہیے۔ نہ تو لذائذ دنیوی میں غرق ہونے کی اجازت ہے اور نہ ازراہ رہبانیت مباحات و طیبات کو چھوڑنے کی۔ ازراہ رہبانیت کی قید ہم نے اس لیے لگائی ہے کہ بعض اوقات بدنی یا نفسی علاج کی غرض سے کسی مباح سے عارضی طور پر پرہیز کرنا ممانعت میں داخل نہیں ہے۔ نیز مسلمان تقویٰ کے مامور ہیں جس کے معنے ہیں خدا سے ڈر کر ممنوعات سے اجتناب کرنا۔ اور تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ بعض مباحات کا استعمال بعض اوقات کسی حرام یا ممنوع کے ارتکاب کی طرف مفضی ہو جاتا ہے۔ ایسے مباحات کو عہد و قسم یا

تقرب کے طور پر نہیں بلکہ بطریقِ احتیاط اگر کوئی شخص کسی وقت باوجود اعتقادِ اباحت ترک کر دے تو یہ رہبانیت نہیں بلکہ ورع و تقویٰ میں شامل ہے۔ حدیث میں ہے ؛

لا یبلغ العبد ان یکون من المتقین حتیٰ یدع ما لا باس به حذراً لما به باس۔ (ترمذی)

بندہ متقین میں سے نہیں ہو سکتا تا آنکہ ان چیزوں کو بر بناتے احتیاط نہ چھوڑ دے جن میں کوئی مضائقہ نہیں ان کی وجہ سے جن میں حرج ہے۔

الحاصل ترکِ اعتدال اور اختیارِ تقویٰ کی قید کو ملحوظ رکھ کر ہر قسم کی طیبات سے مومن استفادہ کر سکتا ہے اور زندگی کے ہر شعبے میں ترقیات کے دروازے کھلے ہوتے ہیں [1]

رہبانیت دین کا غلط تصور ہے

دراصل اس سورت کے آغاز سے یہاں تک قرآن نے اسلام کے مقابلے میں دین کے دو مختلف تصور پیش کیے ، ایک تو وہی ہے جسے رہبانیت کہا جاتا ہے۔ یعنی اس دُنیا کو مایا کا جال سمجھ کر اس سے دُور بھاگے ، اجتماعیت کا تصور تک اس پر بار ہو۔ زندگی کے مسائل پر ایک نگاہ غلط ڈالنا بھی اس کے لیے گوارا نہ ہو۔ بستیوں سے اسے وحشت ہو اور وحشت کدوں سے اسے انس ہو۔ مادی رشتوں کو مادی ضرورتوں کو مادی خواہشوں کو سر تا سر شیطان کے پھندے یقین کرے ، ایک ایک دنیوی نعمت کو اپنے لیے حرام قرار دے لے ، اپنے جسم کے اعضا کو گھلا گھلا کر بے کار اور بے حس بنا لینے کے درپے ہو جائے۔ غذا اگر استعمال کرے تو انتہائی مجبوری کے وقت میں۔ ہوا کو اپنے پھیپھڑوں میں اگر داخل ہونے دے تو اس وقت جب حبسِ دم کے ذریعے اسے آخری حد تک روکے رکھنے کی کوشش کر چکا ہو ، غرض ہر وہ شے جو مادیات اور جسمانیات سے تعلق رکھتی ہے اس کے نزدیک یکسر ترک کر دینے اور جلا کر رکھ دینے کے لائق ہو۔ یہ اس لیے کہ عاشق خدا کو اپنے معشوقِ حقیقی کے جاں بخش رُوح پرور اور وجد انگیز تصور سے ایک لمحہ کی مہجوری بھی گوارا نہیں ہوتی۔ لذّت اسرار کا جو کیف اسے شاہدِ مطلق کی ایک تجلی دیکھ لینے کی آرزو نے پیہم اور سعی مسلسل میں حاصل ہو رہا ہے۔ دُنیا جہان کی کوئی شے بھی اس کا بدل نہیں ہو سکتی۔ ایک طرف تو تصورِ معشوق کی یہ دل ستاں کیفیت دوسری طرف دنیوی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

علائق کا یہ رُوح فرسا اثر و عمل کہ وہ نگاہ تصور کے سامنے حجاب بن بن کر حائل ہوتے رہتے ہیں اور اس طرح جمالِ حق کے مشاہدے کی محویت میں دخل انداز ہوتے ہیں اور وصالِ معشوق کی کوششوں کو درہم برہم کر دیا کرتے ہیں۔ پھر یہ کیسے ممکن ہے کہ بندہ عاشق ان علائق کو برداشت کرے۔ اس دُنیا کو قید خانہ تصور نہ کرے اور اس جسم کو اپنے لیے قفس باور نہ کرے۔ ان مزدوروں کو بیڑیاں تصور نہ کرے ان رشتوں کو بدبختی کے پھندے نہ گمان کرے۔ اس دنیوی زندگی کو اپنے لیے عذاب خیال نہ کرے فلاطینوس صاف کہتا ہے۔

جب رُوح وجدان کی منزل میں پہنچتی ہے تو وہ عالم معقولات کا تصور کرتی ہے لیکن جب اسے خدا کا شعور حاصل ہوتا ہے وہ ہر چیز کو چھوڑ دیتی ہے۔

اور یہ کہ

حقیقی سعادت و فلاح تو صرف ان بندشوں سے مکمل آزادی سے حاصل ہو سکتی ہے ان میں تبدیلی سے نہیں، آپ زنجیروں کو نرم اور ملائم کریں لیکن اس سے زنجیروں کی ماہیت نہیں بدل سکتی۔

عرفانی حکما تو اسی اندازِ فکر کے منطقی تقاضوں کی انتہا تک جا پہنچے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ

انسان کی روحانیت کی بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ اس مادی دُنیا سے مکمل بیزاری اور نفرت کا اظہار کرے۔

اور یہ کہ

یہ کائنات خدائے مطلق کی تخلیق کا نتیجہ نہیں بلکہ شیطان کی اہلیت کا کارنامہ ہے۔ انسانی ارواح جب اس مادی کائنات میں وارد ہوتی ہیں تو شیطنت کے بُرے اثرات سے ملوث ہو جاتی ہیں۔ ان کی نجات ان کے اپنے اعمال و افعال کے ذریعے ممکن نہیں۔ عالم بالا سے ایک نجات دہندہ ہی ان کو اس قید سے چھڑا سکتا ہے۔

فلاطینوس کے شاگرد فرافوریس کا بیان ہے کہ " اسے اپنے جسم سے ہمیشہ نفرت رہی"

عیسائیوں کے ایک فرقے جو ویلیسین کہلاتا تھا یہ عقیدہ تھا کہ نجات کے لیے اختہ ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح ایک اور فرقہ جو اس کو لیمنی کہلاتا تھا اور جو غالباً ۱۷۷۰ء میں روس میں قائم ہوا تھا اپنے اراکین کے خصیے نکلوا دیتا تھا یہ لوگ اپنے کو خدائی جماعت کہتے تھے۔

تاریخ ادیان میں اس طرز فکر اور طرزِ عمل کی اتنی زیادہ مثالیں ہیں کہ کوئی صاحبِ نظر ان سے

نادا قف نہیں ہو سکتا۔ یہ سنیاسی یہ لوگ یہ برہمچر یہ اسی رہبانیت کی عملی شکلیں ہیں کوئی کامل کوئی ناقص کوئی کلی کوئی جزئی، کوئی خالص کوئی مخلوط۔

غرض رہبانیت کا یہ فطری تقاضا ایک مانی ہوئی حقیقت ہے جس طرح وہ کل تک ایک حقیقت تھا آج بھی حقیقت ہی ہے۔ مولانا اسماعیل شہید عشق الٰہی کے آثار بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ

اس محبت یعنی حب عشقی کے آثار و مقتضیات میں سے ایک تفرد ہے یعنی یہ کہ انسان محبوب کے سوا باقی سارے علائق منقطع کر دیتا ہے۔ زندگی کے رنگا رنگ مشاغل اور بے شمار تعلقات کا سامنا کرتے ہوئے اس کا دل بڑی تنگی محسوس کرتا ہے اور طرح طرح کے نظم و انصرام سے مثلاً خانگی مسائل کے انتظام معاشرتی اور اجتماعی امور کی انجام دہی جماعت کی امامت، عیدین اور جمعہ کی اقامت، حقدار اعزہ کے حقوق کی ادائی وغیرہ سے اسے سخت انقباض ہوتا ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ نکاح سے جو تمام علائق کی بنیاد ہے اسے حد درجہ نفرت اور وحشت ہوتی ہے۔ (صراط مستقیم)

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ رہبانیت اور ترک دنیا کا اسلام سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے۔ یہ چیز انسان کے اپنے ذہن کی تخلیق ہے۔ قرآن کی ہدایت تو یہ ہے کہ انسان اللہ کی بندگی کا فریضہ اس دنیا سے الگ ہو کر نہیں اس میں رہ کر ہی انجام دے۔ عقل و فہم کی اور اعضاء و جوارح کی جن قوتوں اور صلاحیتوں سے اسے آراستہ کر کے پیدا کیا گیا ہے ان میں سے ہر ایک اس ادائے فرض کے سلسلے میں کارآمد اور مطلوب ہے۔ یہی حال ان فطری مطالبات اور جذبات کا بھی ہے جو اس کے اندر پائے جاتے ہیں۔ یہ سرتاسر مادی ہونے کے باوجود اس کی منصبی ذمہ داریوں کی ٹھیک ٹھیک انجام دہی کے لیے مطلوبہ آلات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ اس لیے ان فطری قوتوں کا صحیح استعمال اور ان جبلی مطالبوں کی مناسب تکمیل عین تقاضائے دین ہے اور ان میں سے کسی قوت یا کسی خواہش کو کچل ڈالنا اور فنا کر کے رکھ دینا ایک نادانی کی بات اور منشاء الٰہی کی کھلی بغاوت ہے۔

دراصل رہبانیت دین کا جو تصور پیش کرتی ہے اس کی بنیاد عشق الٰہی پر رکھی گئی ہے جبکہ قرآن کے تصور دین کی بنیاد سرتاسر محبت و طاعت پر ہے۔ دونوں میں جو فرق ہے عام لوگ اس سے بہت کچھ نابلد ہیں اور محبت الٰہی کی عقلی اور طبعی یا ایمانی اور نفسانی تقسیم کو نظر انداز کر کے محبت الٰہی اور عشق الٰہی کو ایک ہی چیز سمجھ لیتے ہیں حالانکہ یہ فکر و نظر کی ایک ایسی زبردست لغزش ہے جس کے بعد دین کے صحیح قرآنی تصور پر کوئی شخص باقی نہیں رہ سکتا، اور عشق الٰہی پر مبنی تصور دین

اس کے راستہ میں رکاوٹ بن کر رہتا ہے اور وہ اپنی جگہ پورے اخلاص سے یہی سمجھتا رہتا ہے کہ میں سچا پیرو قرآن ہوں مگر اس کے ذہن میں فی الواقع دین کا وہ خالص تصور نہ ہوگا جو قرآن نے دیا ہے بلکہ ایک ایسا تصور ہوگا جو دونوں تصورات کا آمیزہ ہوگا۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے یہ کہنا کسی طرح غلط نہ ہوگا کہ قرآنی تصورِ دین سے مکمل اور طمانیت بخش واقفیت حاصل نہیں ہو سکتی جب تک عشقِ الٰہی پر مبنی تصورِ دین یعنی رہبانیت سے ضروری حد تک واقفیت نہ ہو جائے کیونکہ قرآنی تصور پر اگر منفی پہلو سے پوری طرح سے روشنی پڑ سکتی ہے تو اسی واقفیت سے پڑ سکتی ہے۔ اسی سے معلوم ہو سکتا ہے کہ وہ کون سی غیر قرآنی باتیں ہیں جو قرآن کی پیروی کے مخلصانہ دعوے کے باوجود بھی دین سمجھ کر اختیار کر لی جا سکتی ہیں۔

رہبانیت کے متعلق یہ ضروری واقفیت حاصل کر لینے کے لیے ہمیں تین بنیادی سوالوں کا جواب معلوم کرنا ہوگا۔

۱۔ اس کا سرچشمہ کیا ہے؟
۲۔ اس کا فطری مزاج کیا ہے؟
۳۔ اس کے بنیادی تقاضے کیا ہیں؟

رہبانیت کا سرچشمہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب قرآن نے صاف اور کھلے الفاظ میں یہ دیا ہے کہ

وَرَهْبَانِيَّةً ابْتَدَعُوهَا مَا كَتَبْنَاهَا عَلَيْهِمْ

مطلب یہ ہے کہ رہبانیت اسلامی اور قرآنی تصور نہیں ہے۔ دوسرے لفظوں میں یہ کہ اس کا سرچشمہ قرآن نہیں ہے۔ جس کا مفہوم یہ ہے کہ اس کا کوئی بھی تعلق کتاب الٰہی سے نہیں ہے وہ اپنے پاس اللہ تعالیٰ کی کسی بھی وحی اور ہدایت کی سند نہیں رکھتا وہ صحیفہ آدم سے لے کر حضرت عیسیٰ کی انجیل تک کسی بھی کتاب الٰہی کی تعلیم نہیں ہے۔ یہ اس لیے کہ اللہ کا دین اصولوں کی حد تک ہمیشہ سے ایک ہی رہا ہے۔ نوعِ انسانی کو نیابتِ الٰہی کا ذمہ دار نزولِ قرآن ہی کے وقت نہیں بلکہ روزِ اول ہی میں بنایا جا چکا تھا۔ انسان کی غایتِ آفرینش وحی الٰہی نے جو قرآن میں بتائی ہے وہی ہمیشہ بتائی گئی ہے اللہ سبحانہٗ نے اپنی ذات سے اولادِ آدم کے منصبی تعلق کی جو نوعیت زبانِ نبوتِ محمدیہ سے واضح کی ہے آدم، نوح، ابراہیم، یعقوب، موسیٰ، اور عیسیٰ ہر پیغمبر نے وہی بیان کی ہے۔ اللہ کے دین کے

جو اصول جو عقائد جو بنیادی احکام اور جو ضروری تقاضے قرآن میں مذکور ہیں کسی بھی پہلی شریعت میں ان سے مختلف نہیں تھے۔ یہی عقل اور منطق کا تقاضا بھی ہے اور یہی صاف اور صریح قرآن کا اعلان بھی ہے۔ اس منفی جواب کے بعد زیر بحث سوال کے مثبت جواب کی طرف آیئے اور یہ معلوم کیجئے کہ پھر رہبانیت کا تصور کہاں سے لیا گیا ہے۔ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اس کا ماخذ اللہ کی وحی نہیں اس سوال کا جواب کچھ زیادہ مشکل نہیں ہے۔ ظاہر ہے کہ پھر رہبانیت خود انسان کے اپنے ذہن کی تخلیق اور اس کے اپنے ہی افکار و جذبات کی پیداوار ہے کیونکہ انسان جو کچھ مانتا اور جانتا ہے وہ یا تو معلم حقیقی کی وحی و ہدایت کا عطیہ ہے یا پھر اس کے اپنے ہی دل و دماغ کی پیداوار ہے۔ تیسرا ماخذ اس کے کسی تصور یا عقیدے کا ہو ہی نہیں سکتا۔ اس لیے اگر رہبانیت کا تصور وحی الٰہی کا بتایا ہوا نہیں ہے تو پھر لازماً وہ اس انسان کا اپنا ہی ساختہ و پرداختہ ہے۔ قرآن نے صاف طور پر بتایا ہے کہ یہ انسان کی اپنی اختراع ہے۔

رہبانیت کا فطری مزاج

دوسرا سوال کہ رہبانیت کا فطری مزاج کیا ہے؟ اس کے جواب میں یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ جس کا سنگ بنیاد عشق ہو اس کا مزاج بھی عقل و بصیرت کا مزاج نہیں ہو سکتا بلکہ وہی ہوگا جو عشق کا مزاج ہے حتیٰ کہ اس کی تشکیل میں عقل و بصیرت کے کسی مؤثر اشتراک کی بھی گنجائش نہیں ہو سکتی، اس لیے عشق الٰہی پر مبنی رہبانیت کا فطری مزاج معلوم کرنے کی واحد صورت یہ ہے کہ پہلے خود عشق کا مزاج معلوم کر لیا جائے تاکہ وہ آئینہ ہاتھ آ جائے جس کے اندر اس کے ایک ایک خدوخال کے ساتھ پوری طرح دیکھ لیا جا سکے۔

عشق کی حقیقت بیان کرتے ہوئے حضرت مولانا اسماعیل شہیدؒ فرماتے ہیں:

> عشق سے مراد وہ شوریدگی اور بے قراری ہے جو اپنا مطلوب مقصود حاصل نہ ہونے کے باعث انسان کے اندر پیدا ہو جایا کرتی ہے اور پیدا ہو کر تمام باطنی قوتوں میں سرایت کر جاتی ہے اور اس کی غایت یہ ہے کہ مقصود تک رسائی ہو جائے اور محبوب کا وصال میسر ہو جائے۔ اول اول تو اس عشق کا مقام انسان کا قلب ہوتا ہے جو تمام کیفیات نفسانیہ کا مرکز ہے، پھر وہ وہاں سے پھیل کر تمام باطنی قوتوں پر چھا جاتا ہے اور اس کی غایت یہ ہے کہ انسان اپنے محبوب کی یافت میں محو اور اپنے سے بے خبر ہو جائے۔
>
> (صراط مستقیم)

شاہ صاحب کے اس بیان سے عشق اور اس کے مزاج کی حسب ذیل خصوصیات متعین ہوتی ہیں۔

اولاً، عشق کی بارگاہ میں عقل و دانش کو کسی طرح رسائی حاصل نہیں ہو سکتی کیونکہ باطنی شورش و اضطراب اور تعقل میں کھلا تضاد ہے اس لیے کہ جس کسی کے اندرون میں ہر چہار طرف بے قراری ہی بے قراری چھائی ہوتی ہو گی وہ عقل کو اپنے قریب ہرگز نہ آنے دے گا اور اگر آنے دے گا بھی تو صرف اس شکل میں کہ وہ اپنے وظیفہ حیات سے دستبردار ہو چکی ہو گی اور کسی بات پر بھی کیوں اور کیا نکالنے کی گستاخی نہ کرے گی۔ غرض عشق اسے اپنا فرمانبردار اور غلام بنا کر تو اپنے قریب رہنے دے سکتا ہے لیکن نگران اور پاسبان بن کر نہیں رہنے دے سکتا اور نہ اسے یہ حق دے سکتا ہے کہ وہ اپنی طرف سے کچھ حدود پیش کر کے اس سے ان کی پابندی کا مطالبہ کرے۔ اور کہے کہ راہ عشق کو ان کا پابند ہو کر سفر کرنا چاہیے۔ تیسری صدی عیسوی کے مشہور نو فلاطونی مفکر اور صوفی فلاطینوس کی جس کے افکار نے عیسائی تصوف پر بہت کچھ اثر ڈالا ہے یہ بات کسی طرح غلط نہیں ہے کہ

عشق کی شراب سے انسانی عقل خراب ہو جاتی ہے۔

ثانیاً، عشق انسان میں اجتماعیت گریز رجحانات کی پرورش کرتا ہے اور اسے سخت قسم کا انفرادیت پسند بنا دیتا ہے اور پھر انفرادیت سے بھی پاک کر کے تصور حبیب میں گم کر دیتا ہے یہاں تک کہ وہ اپنے محبوب و مقصود کے سوا ہر شے کے وجود سے بلکہ خود اپنے وجود سے بھی بے خبر ہو رہتا ہے۔

ثالثاً، عشق کے تسلط کے بعد انسان کے اندر سے توازن اور اعتدال پسندی کا خاتمہ ہو جاتا ہے یہ اس لیے کہ عشق کا ممول ایک زبردست انجذابی کیفیت میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ محبوب کی یاد اسے اس طرح اپنی طرف کھینچتی ہے کہ اگر وہ گرد و پیش کی صداؤں پر کان دھرنا چاہے تو دھر نہیں سکتا۔ اس کی باگیں ایسے جوش جنون کے ہاتھوں میں ہوتی ہیں جو ساری حد بندیوں کو آگ لگا دینے والا ہوتا ہے۔ آخر عشق جب نام ہی شورش قلب اور اضطراب باطن کا ہے۔

عاشقی چیست بگو بندہ جاناں بودن

دل بدست دگرے دادن و حیراں بودن

تو اس کے ساتھ توازن پسندی کہاں باقی رہ سکتی ہے؟

رابعاً، یہ کہ عشق میں مبتلا انسان آداب و رسوم اور ضوابط کا پابند نہیں رہ سکتا۔ کیونکہ اس کے تو دل و دماغ اور افکار و احساسات سبھی پر اپنے محبوب کا دل آویز تصور چھایا رہتا ہے اور وہ اسی ایک تصور کی کیفیتوں میں غرق رہتا ہے۔ قدرتی طور پر ایسے شخص کو باہر کی دنیا سے کوئی واسطہ نہیں

رہ سکتا۔ اور جب اسے باہر کی دُنیا سے کوئی واسطہ نہیں رہ سکتا تو سوسائٹی کے آداب و رسوم اور ضوابط و قوانین کو وہ کیا جانے کہ یہ کیا بلا ہیں ؟

یہ ہے عشق کا مزاج ، اب جس تصورِ دین کی بنیاد عشقِ الٰہی پر ہو اس کا مزاج مزاجِ عشق کے اس آئینے میں خود جھانک کر دیکھ لیجیے کہ کیا ہے !

رہبانیت کے عملی تقاضے

رہبانیت کے سرچشمے اور اس کا مزاج بتانے کے بعد اب ہم اس قابل ہو گئے ہیں کہ رہبانیت کے عملی تقاضے بتا سکیں۔ اس کے تقاضے کیا ہو سکتے ہیں ظاہر ہے کہ یہ تقاضے رہبانیت کے مزاج سے معلوم ہو سکتے ہیں یا پھر ان تجربات اور مشاہدات سے معلوم ہو سکتے ہیں جو رہبانیت کے عملی نتائج کے سلسلے میں تاریخ ادیان نے فراہم کیے ہیں اور یا پھر رہبانیت کا لٹریچر یہ معلومات فراہم کر سکتا ہے ان تینوں بنیادوں سے کام لیتے ہوئے رہبانیت کے جن نمایاں تقاضوں تک نگاہ پہنچ سکتی ہے وہ حسبِ ذیل ہیں۔

اوّلاً یہ کہ بندے کا مقصودِ بندگی از اوّل تا آخر اللہ تعالیٰ کا وصل اور دیدار ہے۔ عشق کی فطرت اور تصورِ عشق رکھنے والے مذاہب دونوں اس پر متفق ہیں۔ چنانچہ آپ سن چکے ہیں کہ عشق کی غایت وصلِ حبیب کے سوا کچھ نہیں ہے۔ مولانا اسماعیل شہید فرماتے ہیں :

اس حبِ عشقی کا بالذات لازمی تقاضا یہ ہے کہ بشریت کا حجاب چاک ہو جائے اور رُوح اپنی اصل یعنی ذاتِ خداوندی سے جا ملے اور بس . . . . وہ اس کے سوا کچھ اور نہیں چاہتی کہ انسان صاحبِ جلال خدا کے جمال کے مشاہدے میں فنا ہو لے ۔

اسی طرح مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ فرمانے کے بعد کہ سلوک و لایت والوں پر حبِ عشقی غالب ہوتی ہے واضح کرتے ہیں کہ

سلوک و لایت کی انتہا مقامِ رضا یا فنا ٓ الفنا ہے ۔ (شریعت و طریقت)

غرض جس دین کا بنیادی تصور عشقِ الٰہی ہو اس کے نزدیک وصالِ الٰہی کا مقصود ہونا ایک بدیہی بات ہوگی۔ چنانچہ وہ مذاہب جو کسی نہ کسی رنگ میں یہ تصور رکھتے ہیں۔ ان میں سے ہر ایک انسان کی غایت مقصود یہی بتاتا نظر آتا ہے اور بعض مذاہب تو اس معاملہ میں بالکل انتہا کو پہنچ گئے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان مذاہب میں تصورِ نجات بھی قرآنی تصورِ نجات سے بالکل مختلف ہے

قرآنی تصورِ نجات تو یہ ہے کہ انسان عذابِ جہنم سے چھٹکارا پا جائے جب کہ ان مذاہب میں نجات کا مفہوم یہ ہے کہ انسان جسم کی قید سے چھٹکارا پاکر اس کی رُوح کا قطرۂ رُوحِ خداوندی کے سمندر میں جاملے۔

ثانیاً، رہبانیت کا دوسرا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اس دُنیا سے دور بھاگے۔ اجتماعیت کا تصور بھی اس پر بار ہو۔ اس تقاضے کے نمایاں اور عملی مظاہر تین ہیں -

۱۔ عزلت ۲- تجرد ۳- ترک لذات

ان تینوں کے بارے میں واقعات کی شہادت ذرا تفصیل کی محتاج ہے -

ثالثاً، رہبانیت کا تیسرا تقاضا یہ ہے کہ انسان وحی و نبوت کی ضرورت سے بیگانہ ہوجائے یا کم از کم یہ کہ اس کی صحیح قدر و اہمیت اور اصل حیثیت فراموش کر بیٹھے۔ یہ صورتِ حال جس بنا پر پیش آتی ہے وہ منطقی بھی ہے اور نفسیاتی بھی کیونکہ جس تصورِ دین کا سرچشمہ وحی الٰہی نہ ہو بلکہ انسان کا خود اپنا ہی ذہن اور وجدان اس کا خالق ہو وہ وحی و رسالت کی ضرورت اور وہ بھی قرار واقعی ضرورت کا احساس قدرتی طور پر کرہی نہیں سکتا۔ جو نظریہ اپنی اصل تشکیل ہی میں وحی کی ضرورت سے بے نیاز ہو وہ اپنی عملی تشکیل میں اس کا ضرورت مند کیوں ہوگا۔ فلاطینوس اس حقیقت کی ایک مکمل مثال ہے۔ اس کی زندگی اگرچہ عیسائی راہبوں[1] سے مشابہ تھی لیکن وہ عیسائیت قبول نہ کر سکا، وجہ صرف یہ تھی کہ عیسائیت نجات کے لیے حضرت عیسٰی پر ایمان لانے کو ضروری قرار دیتی تھی جبکہ فلاطینوس کے نزدیک نجات کے لیے کسی واسطے اور وسیلے کی ضرورت نہ تھی بلکہ خدا اور انسان کے درمیان بلا کسی واسطہ کے ربط پیدا کیا جاسکتا تھا۔

اسی طرح اس تصورِ دینِ عشقِ الٰہی کے ایک مشہور پنجابی علم بردار بابا کبیرداس فرماتے ہیں۔

ہم اسی ایک اللہ سے لو لگاتے ہیں جو بے نشان ہے نہ وہاں مندر کی ضرورت ہے نہ مسجد کی۔ وہاں وہ آپ ہی آپ موجود ہے اس کی پوجا کے لیے کسی خاص رِیت رواج کی بھی ضرورت نہیں سچے گرو نے ہمیں دکھایا ہے کہ آدمی کا جسم ہی مسجد ہے اور یہی مندر ہے۔ اسی کے اندر بیٹھ کر ہم اللہ کی سیوا بندگی کر سکتے ہیں کہیں باہر جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ دل کے اندر ایشور کے وجود کا موہن بھرا ہوا ہے۔ اس میں ہم اچھی طرح نہا سکتے ہیں اور وضو کرکے وہیں پر اللہ کے سامنے نماز پڑھ سکتے ہیں ہمارا یہ جسم ہی مسجد ہے۔ ہمارے پانچوں حواس جماعت ہیں، ہمارا من ہی ملّا اور امام

[1] تاریخ تصوف قبل از اسلام

ہے۔ اس امام کو سامنے رکھ کر ہمیں اس بے نشان خدا کے سامنے سجدہ کرنا چاہیے اور اسی کو سلام کرنا چاہیے۔ (بحوالہ گیتا اور قرآن)

اگر آپ خدا پرستی کے اس طرزِ فکر کا گہری نظر سے جائزہ لیں تو آپ محسوس کریں گے کہ عشقِ الٰہی کو بنانے دین قرار دینے کے بعد مرضیاتِ الٰہی کی اور ان کے طریق حصول کی نوعیت یہی ہونی چاہیے۔ چنانچہ حضرت مولانا اسماعیل شہید حبِ عشق کے آثار بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اس عشق کا بالذات تقاضا نہ تو یہ ہے کہ کسی قانون سے ہم آہنگی ہو خواہ قانون شرع ہو یا قانونِ اخلاق، نہ یہ ہے کہ کسی کی رضا جوئی کی جائے، چاہے اپنے محبوب کی رضا کا سوال ہو یا کسی اور کی اور نہ یہ ہے کہ کسی کی پیروی کا لازمی اہتمام کیا جائے خواہ اپنے محبوب کی پیروی ہو یا کسی دوسرے کی۔ . . . کہنے کا مطلب یہ ہے کہ حب بالذات اس کی مقتضی نہیں اس کا فطری تقاضا تو یہ ہے کہ انسان خدائے ذوالجلال کے مشاہدے میں غرق ہو رہے چاہے جس طرح بھی یہ بات حاصل ہو اس کے لیے کسی خاص طریقے کی پابندی اس کا فطری تقاضا بالکل نہیں ہے مثلاً اگر صاحب عشق کا خیال ہو کہ مزامیر کے سننے سے یا عشق مجازی کے ذریعے یا تسلسل برزخ اختیار کر کے یا اپنے اوقات کو اذکار و طاعات سے خالی رکھ کر یا اسی طرح کے کسی دوسرے ممنوع شرعی کے ارتکاب سے اس کی مقصد برآری ہو سکتی ہے تو یقیناً اس کے دل کی گہرائیوں میں اس کام کی طرف ایک کشش پیدا ہو جائے گی۔ (صراطِ مستقیم)

مزید فرماتے ہیں :

اس حب عشق کا ایک فطری تقاضا یہ بھی ہے کہ انسان ظاہری علوم و طاعات سے بے نیاز ہو جائے۔ (ص : ۱۱)

یہ ہے رہبانیت کا حقیقی اور واقعی چہرہ، قرآن نے لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم کہہ کر اسی پر ضرب کاری لگائی ہے اور بتایا ہے کہ مسلمانو! زندگی کی جائز لذتیں اور راحتیں جو اللہ نے تمہارے لیے حلال کر دی ہیں ان کو حرام نہ کرو اور عیسائی راہبوں، ہندو جوگیوں بدھ مذہب کے بھکشوں اور اشراقی متصوفین کی طرح رہبانیت اور قطع لذات کا طریقہ اختیار نہ کرو اور خود حلال و حرام کے مختار نہ بنو حلال وہی ہے جو اللہ نے حلال کیا اور حرام وہی ہے جو اللہ نے حرام کیا ہے منشا یہ ہے کہ اسلام میں راہبانہ میلانات کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔ جو کچھ بھی تمہارے سامنے

ہے سب کچھ تمہارا ہے اور اسی لیے ہے کہ جس حد تک اپنی اکتسابی قوتوں کو بیدار کر کے تم ان سے استفادہ کرنا چاہو کر سکتے ہو کلوا مما رزقکم اللہ حلالاً طیباً اسلام کے اس رجائی صلائے عام اور حوصلہ پرور ندائے دوام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ رہبانیت کے اس افسردہ قنوطی پیغام کو کوئی ادنیٰ اور معمولی مناسبت اسلام کے پیغام سے نہیں ہے رہبانیت میں غریب انسان کو باور کرایا جاتا ہے کہ جو کچھ تیرے سامنے ہے اس میں کچھ بھی تیرا نہیں ہے ۔ اور بتایا جاتا ہے کہ انسان کا ارتقائی کمال اس سے گریز میں ہے حتیٰ کہ اسی رہبانیت نے کتنوں کے بدن سے کپڑے اتروا لیے ، ان کے منہ سے لقمے چھینے گئے ، ان پر پانی بند کیا گیا بلکہ کبھی کبھی اسی رہبانیت کے جنون نے اس حد تک ترقی کی کہ عام آدمی جو ہوا کے بغیر عام نظری حالات میں چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا ہے اسی کو حبس دم وغیرہ کے نام سے ہوا میں سانس لینے سے محروم کر دیا گیا ۔ قرآن نے صاف صاف لفظوں میں مالا بدمنہ ضروریات سے گزر کر آسائش وراحت ، رفاہیت و زینت وغیرہ کے ساز و سامان تک کے متعلق صرف جواز کے فتویٰ پر قناعت نہیں کی بلکہ زینۃ اللہ اور الطیبات من الرزق کے استعمال سے گریز کرنے والوں پر یہ عتابی استفہام کیا ہے

قل من حرم زینۃ اللہ التی اخرج لعبادہ والطیبات من الرزق

فقہائے محققین نے لکھا ہے کہ جو غذائیں اللہ نے حلال وطیب قرار دی ہیں انہیں چھوڑ دینے میں کوئی دینی فضیلت نہیں ہے جیسا کہ رہبانیت پسند لوگوں نے ترک لذائذ کو تقویٰ کا معیار سمجھ رکھا ہے الجصاص رقمطراز ہیں لا فضیلۃ فی الامتناع من اکلھا ۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے گوشتوں میں علاوہ بکری ، بھیڑ ، اونٹ کے مرغ کا گوشت بھی تناول فرمایا ہے ۔ فواکہ اور شیرینی اور حلوے کی دوسری لذیذ قسمیں بھی آپ سے نوش فرمانا ثابت ہے ۔ آیت میں کلوا کے امر و اجازت کا دائرہ صرف کھانے کی چیزوں تک محدود نہیں ہے ۔ کھانے پینے ، پہننے اوڑھنے ، سواری مکان غرض برتنے کی ساری چیزیں اس کے اطلاق میں داخل ہیں ۔ قرطبی رقمطراز ہیں کہ کھانا اس آیت میں فائدہ اٹھانے اور استعمال کرنے کے معنے میں ہے ۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ جو چاہو کھاؤ اور جو چاہو پیو بس اتنا خیال رکھو کہ اسراف اور فخر نہ ہو ۔ الجصاص ہی نے لکھا ہے کہ صحابہ میں سے حضرت عثمان ، حضرت عبدالرحمان بن عوف ، حضرت حسن ، حضرت عبداللہ ابی اوفیٰ ، حضرت عمران بن حصین ، حضرت انس بن مالک ، حضرت ابوہریرہ اور مشہور تابعی قاضی شریح سے لباس میں پشمینہ کا استعمال ثابت ہے ۔

نبوت رہبانیت کے خلاف ہے

رہبانیت پسند لوگوں کو دیکھ کر کچھ لوگوں میں اسے اپنانے کا داعیہ پیدا ہوا چنانچہ ایک بار جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو معلوم ہوا کہ بعض حضرات نے عہد کیا ہے کہ ہمیشہ دن کو روزہ رکھیں گے راتوں کو بستر پر نہ سوئیں گے بلکہ جاگ جاگ کر عبادت کریں گے۔ گوشت اور چکنائی استعمال نہ کریں گے عورتوں سے واسطہ نہ رکھیں گے۔ اس پر آپ نے ایک خطبہ دیا اور اس میں فرمایا کہ مجھے ایسی باتوں کا حکم نہیں دیا گیا ہے تمہارے نفس کے بھی تم پر حقوق ہیں، روزہ بھی رکھو اور کھاؤ پیو بھی۔ راتوں کو قیام بھی کرو اور سوؤ بھی، مجھے دیکھو میں سوتا بھی ہوں اور قیام بھی کرتا ہوں، روزے رکھتا بھی ہوں اور نہیں بھی رکھتا۔ گوشت بھی کھاتا ہوں اور گھی بھی، بس جو میرے طریقے کو پسند نہیں کرتا ہے وہ مجھ سے نہیں ہے پھر فرمایا کہ ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے کہ انہوں نے عورتوں کو اور اچھے کھانے کو اور خوشبو اور نیند کو اور دنیا کی لذتوں کو اپنے اوپر حرام کر لیا ہے۔ میں نے تو تمہیں یہ تعلیم نہیں دی ہے کہ تم راہب اور پادری بن جاؤ۔ میرے دین میں نہ عورتوں اور گوشت سے اجتناب ہے اور نہ گوشہ گیری و عزلت نشینی ہے ضبط نفس کے لیے میرے ہاں روزہ ہے۔ رہبانیت کے سارے فائدے یہاں جہاد میں حاصل ہوتے ہیں۔ اللہ کی بندگی کرو، اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو، حج اور عمرہ کرو، نماز قائم کرو اور زکوٰۃ دو اور رمضان کے روزے رکھو تم سے پہلے لوگ جو ہلاک ہوتے وہ اس لیے ہلاک ہوئے کہ انہوں نے اپنے اوپر سختی کی تو اللہ نے بھی ان پر سختی کی۔ یہ انہی کے بقایا ہیں جو تم کو صومعوں اور خانقاہوں میں نظر آتے ہیں۔ یہ داعیہ پیدا اس لیے ہوتا ہے کہ تصور عشق میں بے پناہ نفسیاتی کشش اور وسیع مقبولیت ہے چونکہ رہبانیت کا تعلق عقل سے نہیں بلکہ جذبات سے ہے اس لیے عام انسان بڑی آسانی سے اس کی طرف کھنچ جاتا ہے۔ چنانچہ یہ ایک جانی پہچانی حقیقت ہے کہ دین کا یہ تصور نامعلوم مدت سے دین اور خدا پرستی پر اپنا گہرا نقش ثبت کرتا چلا آرہا ہے اور آج اس کے شعوری پیروؤں کی تعداد بھی حد شمار سے باہر ہے۔ رہا اس سے غیر شعوری طور پر اثر قبول کر لینے کا معاملہ تو خدا ہی بہتر جانتا ہے کہ اس کی حدیں کتنی دور تک پھیلی ہوئی ہیں۔

بہر حال اللہ کی معرفت، اور وصول الی اللہ کی دو راہیں ہیں۔ ایک قرآن و سنت کی بتائی ہوئی اور دوسری رہبانیت کے ذریعے لوگوں کی بنائی ہوئی۔ خود ہمارے بزرگوں نے کھلے سینہ کے ساتھ اس کا اعتراف کیا ہے۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں :

میں کہتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ تک پہنچانے والے راستے دو قسم کے ہیں۔ ایک قسم تو وہ ہے جس کی وحی الٰہی اور تعلیمات نبوت نے تلقین فرمائی ہے اور دوسری قسم وہ ہے جو الہام اور معارف اولیاء نے متعین کیا ہے۔　　　　(التفہیمات الالٰہیہ ص ۲۸ جلد دوم)

فیوض الحرمین میں مزید توضیح فرماتے ہیں :

خدا رسیدگی کے دو راستے ہیں۔ ایک راستہ تو وہ ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے واسطے سے مخلوق تک پہنچا ہے، دوسرا وہ ہے جو اللہ اور اس کے بندے کے درمیان ہے۔ اس جہت سے کہ وہ اسی کے وجود میں لانے سے وجود میں آیا ہے اور اسی کے فیضان تخلیق کا ایک راست ظہور ہے۔ اصلاً اس طریقہ میں کوئی بھی درمیانی واسطہ نہیں۔　　　　(فیوض الحرمین)

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ طریق نبوت کے متوازی بندگی اور خدا رسیدگی کا ایک اور راستہ طریق ولایت بھی تسلیم کیا جا چکا ہے اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اس دوسرے طریقے کی بنیاد وحی الٰہی اور تعلیمات قرآنی پر نہیں بلکہ حضرات اولیاء کرام کے کشف والہام پر ہے جبکہ طریق نبوت کی بنیاد سرتاسر وحی اور قرآنی تعلیمات پر ہے۔ دونوں راستوں کی نوعیتوں میں اس فرق کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ ان دونوں کے جیسے آداب و شرائط مختلف ہوں ایسے ہی ان کے نتائج و ثمرات بھی مختلف ہوں۔ ان کی عابدانہ اور نیازمندانہ قدریں اور ان کے معیار بھی مختلف ہوں اور آخری بات یہ کہ ان کے بناتے ہوتے ذہنی سانچے اور خدا پرستی کے عملی نمونے بھی مختلف ہوں چنانچہ حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں :

سلوک دو قسم پر ہے سلوک نبوت اور سلوک ولایت اور ہر ایک کے آثار و خواص جدا جدا ہیں ..... اولیاء میں سے کسی پر کسی وقت فیض نبوت کا غلبہ ہوتا ہے اور کبھی فیض ولایت کا۔

(مبادی تصوف بحوالہ شریعت اور طریقت)

اس کے بعد موصوف نے دونوں طریقوں کے آثار و خواص کی کچھ تفصیل دی ہے جس کے بعض اجزاء ترتیب کے تغیر کے ساتھ یہ ہیں :

طریق ولایت والوں سے شرائع میں کبھی تسامح بھی ہو جاتا ہے اور وہ معذور ہیں ان کو اپنے مکاشفات اور تحقیقات پر اعتماد اور اس پر عمل کرتے ہیں اگر خلاف شرع

نہ ہو۔ شیخ کو سارے جہاں سے افضل سمجھتے اور اس پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ ان پر سکر یعنی
عالم بے خودی غالب ہوتا ہے۔ سلوک مقام کی انتہا مقام رضا یا فنا الفنا ہے جب کہ
طریق نبوت والے شریعت پر بڑی پختگی سے عمل کرتے ہیں، ان پر ادب غالب ہوتا ہے
جیساکہ اس پر اپنی طرف سے بذریعہ کشف وغیرہ کچھ نہیں بڑھاتے اگرچہ وہ زیادت خلاف
شرع نہ ہو۔ شیخ کی افضلیت کا یقین نہیں کرتے، محبت کرتے ہیں ان پر صحو عالم ہوش
غالب ہوتا ہے سلوک نبوت کی انتہا مقام عبودیت ہے۔

حضرت اقدس کے الفاظ اگرچہ بہت محتاط ہیں لیکن اس کے باوجود ان کے اندر یہ تو موجود ہی ہے کہ، طریق ولایت والوں سے شرائع میں کبھی تسامح ہو جاتا ہے"، پھر اس ضمن میں یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ حضرت اقدس کے اس تبصرے اور اظہار حال کا تعلق سارے اہل ولایت سے نہیں ہے بلکہ ان میں سے صرف محتاط لوگوں اور شریعت کا پاس و لحاظ رکھنے والے بزرگوں ہی سے ہے ورنہ جہاں تک غیر محتاط اور غالی قسم کے لوگوں کا تعلق ہے۔ وہ حضرت اقدس کی تحقیق کے مطابق بھی شرائع میں صرف تسامح ہی کے نہیں بلکہ ان کی کھلی ہوئی ناقدری کے مرتکب ہیں۔ چنانچہ ایک جگہ صاف لفظوں میں فرماتے ہیں:

غالی صوفی یوں کہتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں ظاہری احکام ہیں۔ تصوف علم باطن
ہے ان کے نزدیک نعوذ باللہ قرآن وحدیث کی ضرورت نہیں ہے۔

(شریعت وطریقت)

حافظ ابن تیمیہ اس سے بھی زیادہ دہشت انگیز صورت واقعہ کی اطلاع دیتے ہیں۔

کتنے ہی نام نہاد صوفیوں اور درویشوں کو تم پاؤ گے کہ وہ شریعت اور علم دین
کو بالکل ہیچ سمجھتے ہیں، یہاں تک کہ ان کے خیال میں وہ شخص جو ان چیزوں کو مضبوطی
سے پکڑنے ہوتے ہو اللہ تعالیٰ سے یکسر بے تعلق ہوتا ہے اور اس کے دامن میں
کوئی ایسی چیز ہوتی ہی نہیں ہے جو اسے اللہ کی بارگاہ میں فائدہ پہنچا سکے۔

(اقتضاء الصراط المستقیم)

غرض یہ حقیقت اپنی جگہ ناقابل انکار ہے کہ طریق ولایت اختیار کرنے والوں میں ایسے لوگ بھی موجود ہیں جو خدا پرستی اور خدا رسیدگی کے معاملے میں قرآن وسنت ہی کی پیروی کو ضروری قطعا ہی نہیں سمجھتے۔ چاہے ان کا نام غالی نام نہاد یا گمراہ صوفی رکھیں۔ پھر جہاں تک محتاط اور پاس شریعت

رکھنے والے اہل ولایت کا تعلق ہے۔ ان کا معاملہ بھی صرف اسی بات تک پہنچ کر ختم نہیں ہو جاتا کہ انہوں نے طریق ولایت کو اختیار فرمایا جو قدرتی طور پر اپنے لوازم و مقتضیات اور آثار و خواص میں اس سے بہت کم مختلف ہے بلکہ کتنوں ہی کی نگاہ میں یہی طریقہ افضلیت رکھتا ہے اور اسے طریق نبوت پر برتری حاصل ہے۔ مولانا اشرف علی فرماتے ہیں :

اس میں گفتگو ہے کہ نبوت افضل ہے یا ولایت مگر اس پر اتفاق ہے کہ ولی سے نبی افضل ہے کیونکہ وہ نبوت اور ولایت کے جامع ہیں جو حضرات نبوت کی افضلیت کے قائل ہیں وہ نبی کی افضلیت سے استدلال کرتے ہیں اور جو ولایت کی افضلیت کے قائل ہیں وہ کہتے ہیں کہ ولایت میں توجہ الی الحق ہے اور نبوت میں توجہ الی المخلوق، چونکہ خدا کی طرف توجہ مخلوق کی طرف توجہ کرنے سے افضل ہے پس ولایت افضل ہے۔

(مبادی تصوف بحوالہ شریعت و طریقت)

یہ ولایت اور طریق ولایت کی افضلیت ہی کا نظریہ تھا جس کے تحت ایک بزرگ نے فرمایا ہے

اصحاب کہف کو قرآن نے فتیۃ "مردان خدا" اس وجہ سے کہا ہے کہ وہ اللہ پر براہ راست اور کسی واسطہ کے بغیر ایمان لائے تھے۔ (رسالہ قشیریہ)

بہرحال قرآن نے اس آیت میں رہبانیت کے نظریہ پر یہ کہہ کر ضرب کاری لگائی ہے کہ لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم یہ عیسائیوں کا نظریہ تھا۔

اللہ رحمتوں کی بارش نازل کرے مجدد الف ثانی، شاہ ولی اللہ اور مولانا اشرف علی کی قبروں پر جنہوں نے دونوں راستوں کو الگ الگ کر دیا اور تصوف سے ان تمام چیزوں کو نکال دیا جو خلاف سنت تھیں اور جن کو باقی رکھا ہے ان کی حیثیت غذا کی نہیں بلکہ دوا کی ہے۔ ان بزرگوں نے اس موضوع پر جو مجددانہ کارنامہ انجام دیا ہے یہاں اسے پیش کرنا ایک طویل فرصت چاہتا ہے حضرت مولانا قاری محمد طیب نے اچھوتے انداز میں ان بزرگوں کے علمی سرمایہ کو مسلک علمائے دیو بند میں اس طرح پیش فرمایا ہے :

حضرات صوفیائے اولیائے قدس اللہ سرہ العزیز کی محبت و عقیدت ـــــ ان کے مسلک پر بلاشبہ ایک شرعی حقیقت ہے مگر اس میں غلو و مبالغہ، رسم بندی اور زمان و مکان کی قید و بند اور از خود حدود سازی محض رواجی چیز ہے۔ ممکن ہے ایسی

چیزیں کسی صاحب حال اور مخلص سے ابتداءً اتفاقیہ عمل میں آئی ہوں مگر بعد والے بے بصیرت عقیدت مندوں اور بے شعور عشاق نے انہیں ایک مستقل اصول اور قانون کے انداز بے پڑھے لکھے عوام میں بنام شریعت واسلام پھیلا دیا جس سے انہوں نے بعد میں ایک جزدِ شریعت بلکہ اصل شریعت کی صورت اختیار کر لی بہرحال اس قسم کی رواجی صورتیں بے بصیرت اہل محبت کے اندر سے نکلی ہوتی ہیں۔ باشعور اور بصر عشاق کے جذبات سے جو خدا اور رسول کی پیروی سے پیدا شدہ ہوں نکل ہوئی نہیں ہیں اس لیے جو مسلک بھی شعوری انداز کا ہوگا وہ اس فرق کو ہر مقام پر محسوس کرے گا۔ حاصل یہ ہے کہ ان کے مسلک میں تعظیم اولیاء اللہ جزدِ دین ہے۔ رسم بندی جزد دین نہیں ہے، احترام آثار دین میں سے ہے عبادت آثار دین میں سے نہیں ہے۔ رسوم پیغمبر اصل دین ہیں، ان کے متوازی من گھڑت رسوم دین نہیں ہیں۔

آگے فرماتے ہیں :

بہرحال اتباع سنت علماء دیوبند کے مسلک میں اصل ہے جسے وہ ہرحالت میں قائم رکھنا ضروری سمجھتے ہیں، خلاف سنت امور جن کی کتاب وسنت میں کوئی اصل نہ ہو یا عارفانِ شریعت کے تعامل اور ذوق کے دائرے میں اس کا کوئی ماخذ نہ ملتا ہو یا ایسی رواجی عادات جنہیں دین کے نام پر رسوم دین باور کرایا جاتا ہو دراں حالیکہ دین یا دینی ذوق میں ان کی کوئی بنیاد نہ ہو، ان کے نزدیک قابل رد و انکار ہیں اس لیے اس قسم کی بدعات واختراعات سے الگ رہ کر اتباع سنت اور ادب طریق ہی علماء دیوبند کا مسلک ہے۔

اور فرماتے ہیں :

بعض لوگ سننِ نبوت پر عمل کا نام لے کر معمولاتِ اولیاء کو تحقیر سے رد کر دیتے ہیں اور بعض لوگ اولیاء کے سلوک راستوں کو سامنے رکھ کر سننِ نبوت کو نذر بے التفاتی کر دیتے ہیں لیکن علماء دیوبند اپنے مسلک میں ان دونوں سے الگ درمیانہ نقطہ اعتدال رکھتے ہیں، ان کے یہاں اصل اصول اتباع سنت ہے لیکن معمولاتِ مشائخ بھی جس حد تک غلبہ حال یا سکر کے دائرے میں نہ ہوں بے اعتنائی اور بے توجہی کے مستحق نہیں ہو سکتے بلکہ وہ سننِ انبیاء کی عمل مشق کے ثمرات و نتائج ہوتے ہیں یا

ان کے لیے مبادی و اسباب جن سے سنن انبیاء پر چلنے کی توفیق ہوتی ہے اس لیے ان سے بے اعتنائی محرومی ہے البتہ وہ شریعت نہیں ہوتے کہ شرائع کی طرح ان کی تبلیغ و ترویج کو اسٹیج کا موضوع بنا لیا جائے جس سے سنت نبوی جو اصل مقصد ہے غیر اہم ہو کر رہ جائے

(مسلک علمائے دیوبند)

دوسرا دین کا غلط تصور وہ ہے جو یہودی پیش کر رہے ہیں یعنی یہ کہ انسان کو دنیا سے منہ موڑ لینے اور اپنے نفس کو مار ڈالنے کی ضرورت نہیں بلکہ اسے دنیا کو برتتے ہوئے اور اپنی جبلی خواہشوں کو معقول حدود کے اندر پوری کرتے ہوئے خدا کی عبادت کرنی چاہیے رہے دنیوی معاملات اور مسائل تو صرف انفرادی زندگی کی حد تک دین اسے متعینہ ہدایتیں دیتا ہے جن کی پوری پوری پابندی کرنی چاہیے۔ باقی زندگی میں وہ آزاد ہے کیونکہ عبادت فرد کا کام ہے جماعت کا کام نہیں ہے اس لیے دین بھی انسان اور خدا کے درمیان کا ایک نجی معاملہ ہے جو دنیا کے عام اجتماعی مسائل اور معاملات سے کوئی تعرض نہیں کرتا ہے نہ اسے کوئی تعرض کرنا چاہیے ان مسائل میں انسان کو اختیار ہے جو راستہ چاہے اختیار کرے اور زندگی کا جو نظام چاہے اپنائے خدا اور مذہب کو اس سے بحث نہیں ہے۔ اسی غلط تصور کی تردید کے لیے لا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین کی بلیغ تعبیر اختیار فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ یہ نظریہ اسلام پر راست نہیں آتا ہے وہ اس طرح کا دین نہیں ہے کہ بندے اور خدا کے درمیان کا بس ایک نجی معاملہ ہو اگر ایسا ہوتا تو اس کی تعلیمات لازماً انفرادی زندگی کے مسائل تک محدود ہوتیں وہ صرف مسجد کی باتیں کرتا، نماز روزے کا حکم دیتا۔ چند اخلاقیات کی تلقین کرتا، کچھ معاشرتی ہدایتیں دے دیتا پھر خاموش ہو رہتا مگر نبوت کے علم و عمل کا ایک ایک گوشہ گواہ ہے کہ صورت واقعہ یہ نہیں ہے۔ اسلام کی مسند ارشاد عبادت گاہوں اور زندگی کے انفرادی دائروں ہی میں بچھی ہوئی نہیں ہے بلکہ وہ بازاروں، کاروباری اداروں، معاشی میدانوں، تمدن کے دائروں، سیاست و حکومت کے ایوانوں غرض زندگی کے ایک ایک شعبے میں ہدایتیں دیتا، کچھ باتوں سے روکتا اور کچھ باتوں کا امر کرتا نظر آتا ہے اور ان میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں جس کو وہ دین سے باہر کہتا ہو مثلاً قرآن حکم دیتا ہے کہ زانی کو کوڑے مارو۔ اس کا یہ حکم صریح طور پر ایسا ہے جس کا تعلق پولیس، عدالت اور حکومت سے ہے اس لیے وہ بداہۃً اجتماعی زندگی کا معاملہ ہے لیکن اس حکم کی حیثیت وہ اللہ کے دین کی بتاتا ہے لا تاخذکم بهما رافة فی دین اللہ

اس سے معلوم ہوا کہ کوڑے لگانے کا حکم بھی دین ہی کا ایک حصہ ہے۔ یہ ایک مثال اس حقیقت کو

کھول دینے کے لیے بالکل کافی ہے کہ اللہ کا ہر فرمان اور اس کے رسول کا ہر ارشاد اسلامی نظام کا حصہ اور دین کا جزو ہے۔

قرآن یہودیوں کے اسی غلط طرزِ عمل کو عدوان کہتا ہے اور اسی کی یہاں اہلِ ایمان کو ممانعت کی گئی ہے۔ اس طرح اس آیت میں عیسائیوں کے افراط اور یہودیوں کی تفریط دونوں سے بچنے کا اہلِ ایمان کو حکم ہوا۔ افراط و تفریط نہ ہو تو اسی کا نام اعتدال ہے۔ اب بھی ہماری زندگی کا المیہ یہی دو ہیں افراط و تفریط، ہمارے دیندار افراط کی بیماری کا اور ہمارا دنیادار طبقہ تفریط کی بیماری کا شکار ہے اور ہمارے عوام ان دو ہی میں بٹے ہوتے ہیں۔ صورت حال یہ ہے کہ تفریط کی حد تک اگر ایک طرف دنیادار مسلمان تمدن، معیشت اور سیاست کے میدانوں میں اپنی اغراض اور جاہ طلبیوں کے پیچھے دیوانہ وار دوڑ رہے ہیں اور نہیں چاہتے کہ اسلام بازاروں، منڈیوں، عدالتوں، قانون ساز اداروں اور حکومت کے ایوانوں میں رہ کر ان کے اعمال و افکار کی باگ ڈور اپنے ہاتھ میں رکھے اور پھر اپنی ان نامبارک روش پر پردہ ڈالنے کے لیے پوری شدت سے یہ پُرفریب نعرے بھی لگاتے رہتے ہیں کہ مذہب ہر شخص کی ایک مقدس مگر ذاتی متاع ہے اسے دنیوی معاملات میں دخیل بنانا اور گھسیٹتے پھرنا اس کی عظمت کی توہین کرنا ہے۔ تو دوسری طرف مخلص حاملان دین کو بھی اس صورت حال پر کوئی بے چینی محسوس نہیں ہوتی، حالانکہ ان کے سینوں میں خدا سے تعلق بھی ہے اور اسلام کا درد بھی ہے اور دین کے معاملے میں ان کے احساسات بھی بڑے ہی نازک ہیں۔ یہ دو ہی باتوں کا نتیجہ ہو سکتا ہے اولاً اس بات کا مفادِ آخرت پر مفادِ دنیا کو ترجیح دی جا رہی ہے اور اصول و صداقت کے مقابلے میں منافع اور مصالح کو آجل کے مقابلہ میں عاجل کو اپنانے کی بیماری پیدا ہو گئی ہے یہی قرآن کی زبان میں اعتداء ہے، کیونکہ اس سے اُمت ایک با اُصول بلند اخلاق، سچی سیرت جماعت کے مقام سے گر کر ایک بے اُصول ناقابلِ اعتبار ابن الوقت اور مصلحت پرست قوم کی ادنیٰ سطح پر آ جاتی ہے جس کے سامنے کوئی اخلاقی معیار نہیں ہوتا بلکہ صرف منافع و مصالح، اور اغراض و مفادات اس کی زندگی کا نصب العین ہو جاتے ہیں یہ دنیادار مسلمانوں کا معاملہ ہے۔

ثانیاً اس بات کا کہ للٰہیت اور آخرت پسندی کے باوجود کسی خاص دینی فلسفہ کے زیرِ اثر اسلام کی ہمہ گیری کو فراموش کر دیا گیا اور اس کے اجتماعی احکام کو نامراز دین اور عبادت کے معاملہ میں نامطلوب خیال کر لیا گیا ہے اور یہی اہلِ صلاح و تقویٰ کا معاملہ ہے۔

لَا يُؤَاخِذُكُمُ اللّٰهُ بِاللَّغْوِ فِيْٓ اَيْمَانِكُمْ وَلٰكِنْ يُّؤَاخِذُكُمْ بِمَا
عَقَّدْتُّمُ الْاَيْمَانَ ۚ فَكَفَّارَتُهٗٓ اِطْعَامُ عَشَرَةِ مَسٰكِيْنَ
مِنْ اَوْسَطِ مَا تُطْعِمُوْنَ اَهْلِيْكُمْ اَوْ كِسْوَتُهُمْ اَوْ تَحْرِيْرُ رَقَبَةٍ ۭ
فَمَنْ لَّمْ يَجِدْ فَصِيَامُ ثَلٰثَةِ اَيَّامٍ ۭ ذٰلِكَ كَفَّارَةُ اَيْمَانِكُمْ اِذَا
حَلَفْتُمْ ۭ وَاحْفَظُوْٓا اَيْمَانَكُمْ ۭ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمْ اٰيٰتِهٖ لَعَلَّكُمْ
تَشْكُرُوْنَ ۝۸۹

تمہاری قسموں میں لغو قسموں پر اللہ تمہارا مواخذہ نہیں کرے گا[146]،
لیکن ان قسموں پر ضرور مواخذہ کرے گا جنہیں تم نے جان بوجھ کر
کھایا ہو[147]۔ لہذا ایسی قسم توڑنے کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے
یہ کھانا درمیانے درجہ کا ہو جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو، یا ان
کو کپڑے پہنا دینا یا ایک غلام آزاد کر دینا[148]، اور جس کو یہ دستیاب نہ
ہو تو تین دن کے روزے رکھے، یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب

تم قسم کھا بیٹھو[۱۷۹] اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو[۱۸۰]- اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام تمہارے لیے واضح کرتا ہے شاید تم شکر ادا کرو[۱۸۱]۔

تحریم کی ایک صورت قسم بھی ہے

گزشتہ آیات میں بتایا تھا کہ مسلمان دنیا کو اپنی دینی زندگی کے لیے قابل اجتناب نہ سمجھے مادے کو اپنی روح کا قفس نہ گمان کرے۔ اپنی جبلی ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کو خدا پرستی کی راہ کی آفت خیال نہ کرے، دو لفظوں میں یہ کہ مسائل زندگی سے کنارہ کش ہو رہنے، دنیا چھوڑ دینے اور اللہ کو پالینے کے لیے گوشوں میں بیٹھ رہنے کی وہ روش اختیار نہ کرے جسے رہبانیت کہتے ہیں نہ کسی جائز لذت سے بہ قصد قربت حق اپنے کو ہمیشہ کے لیے محروم کرے اور نہ حلال چیزوں کو اپنے اوپر حرام کر لینے کی قسمیں کھائے۔ اور واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ قدرت کی ان نعمتوں سے گریز کو تقدس و پارسائی سمجھ لیں گے ان کے کراہت زدہ قلوب میں اُخروی نعمتوں کی قدر و قیمت کا وزن بھی نہ رہے گا۔ یہی وجہ ہے کہ عام مسلمانوں ہی کو نہیں بلکہ مسلمانوں کے سب سے بڑے روحانی قائد سید الانبیا تک کو قرآن نے یا ایھا النبی لم تحرم ما احل اللہ لک کے الفاظ سے مخاطب کیا ہے جس کا یہی مطلب ہے کہ روحانیت کے بلند سے بلند مقام تک میں ان چیزوں سے گریز جنہیں قدرت نے معاشی استغنا کے لیے پیدا کیا ہے۔ قرآن کے نقطۂ نظر سے مفید نہیں بلکہ نقصان دہ ہے۔ قرآن کا مطالبہ یہ ہے کہ مسلمان کو چاہیے کہ مسائل حیات سے پوری طرح متعلق رہے۔ متاہل اور متمدن زندگی گزارے۔ اپنی ایک ایک فطری قوت کو زندہ و بیدار رکھے۔ اپنے جبلی مطالبات کو مناسب حدود کے اندر پورا کرتا رہے۔ غرض آبادی سے جنگلوں کی طرف نہیں بلکہ جنگلوں سے آبادی کی طرف آئے۔ اور یہ سب کچھ دینداری کا کام اور دین کا مطالبہ سمجھ کر کرے۔ اپنے فریضہ حیات کی ادائیگی کے لیے ضروری سمجھ کر کرے، دینی ذوق کے ساتھ کرے اور اس یقین کے ساتھ کرے کہ اس کے خلاف طرز عمل اختیار کرنے میں دینداری کا نقصان ہے کمال بندگی سے محرومی ہے، عتاب الٰہی کا اندیشہ ہے حتیٰ کہ اگر کسی شخص نے جان بوجھ کر قسم کھا کر کوئی چیز حلال اپنے اوپر حرام کر لی تو وہ اسے توڑ دے اور کفارہ ادا کرے۔ کیونکہ قسم بھی تحریم ہی کی ایک صورت ہے۔

۱۶۶۱۔ تمہاری قسموں میں لغو قسموں پر اللہ تمہارا مواخذہ نہ کرے گا۔ یعنی ان قسموں پر دنیا میں کفارہ نہیں جیسا کہ یمین منعقدہ میں واجب ہے لغو و بیہودہ قسم کی تفسیر دوسرے پارے میں گزر چکی ہے چونکہ اوپر تحریم طیبات کا ذکر تھا اور تحریم کی ایک قسم یمین بھی ہے اس لیے یمین کے احکام بیان کیے جاتے ہیں[1]

تعبیر کا انداز کہہ رہا ہے کہ یہ کسی اٹھے ہوتے سوال کا جواب ہے چنانچہ ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے بتایا ہے کہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی یا ایہا الذین آمنوا لا تحرموا طیبات ...الخ، تو صحابہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ ہماری ان قسموں کا کیا بنے گا کہ جو ہم عورتوں کو اور گوشت وغیرہ کے حرام کرنے کے بارے میں کھا بیٹھے ہیں۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اسی بنا پر بعض علماء نے یمین لغو اس قسم کو قرار دیا ہے جس میں کوئی شخص کسی حلال کو قسم کے ذریعہ اپنے لیے حرام کرے چنانچہ سعید بن جبیر کی یہی رائے ہے ورنہ لغو اور بیہودہ قسم تو یہی ہے کہ منہ سے عادت اور عرف کے مطابق بے ساختہ اور ناخواستہ نکل جائے اور دل کو خبر تک نہ ہو ایسی قسم کا نہ کفارہ ہے نہ اس میں گناہ ہے۔ حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ یہ آیت اس شخص کے بارے میں ہے جو لا واللہ، بلی واللہ، کلا واللہ جیسے الفاظ بولتا رہتا ہے یعنی بیہودہ طور پر منہ سے یہ الفاظ بغیر ارادے کے نکل جاتے ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے لغو کے موضوع پر سارے اقوال بحث دیے ہیں اور قول راجح اسی کو قرار دیا ہے یہی امام شافعی اور امام ابو حنیفہ کا مذہب ہے۔

لغو قسموں کو اگرچہ مواخذہ سے بالا قرار دیا ہے لیکن اس کے لیے لغو کی تعبیر اختیار کرکے اشارہ کر دیا ہے کہ بلند اخلاقی اور پاکبازی کا تقاضا یہ ہے کہ اس سے پرہیز کرے۔ زبان انسان کو اظہارِ مطلب کے لیے ملی ہے اس لیے ضروری ہے کہ پہلے مطلب یعنی گفتگو کا مقصد و معنی درست ہوں پھر ان کے اظہار کا طریقہ مناسب ہو اور یہ دونوں باتیں اعراض عن اللغو میں داخل ہیں۔ قرآن میں شائستہ لوگوں کے اوصاف میں یہ بات بتائی گئی ہے والذین ھم عن اللغو معرضون۔ یعنی فضول باتوں سے اعراض کرنا وقار کی نشانی ہے۔ لغو کی حیثیت اقوال اور گفتگو میں بالکل وہی ہے جو افعال اور کردار میں عبث کی ہے۔

ابو بکر الجصاص رازی نے اس موقعہ پر ایک مفید بات لکھی ہے کہ جیسے اللہ تعالیٰ نے مختلف مقامات پر قرآن میں لفظ لغو استعمال کیا ہے اور ہر موقعہ پر لغو کے معنے مقام اور موقع کے لحاظ سے الگ ہیں مثلاً بری باتوں کے معنے میں ہے لا تسمع فیہا لاغیۃ بیکار کے معنے میں ہے اذا مروا باللغو مروا کراماً۔ اسی طرح سلف صالحین سے لغو کے معنے یمین کی حد تک ایک سے زیادہ منقول ہوتے ہیں۔

---

[1] فوائد شیخ الاسلام

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ یمین لغو یہ ہے کہ آدمی کسی بات پر قسم کھائے کہ وہ ہے اور وہ جانتا ہو کہ ہے لیکن واقعہ میں نہ ہو، یہی معنے امام مجاہد اور ابراہیم نخعی سے ثابت ہیں، اور حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ یمین لغو یہ ہے کہ دوران گفتگو بطور تکیہ کلام لا واللہ بلی واللہ بول دیا جاتے۔ ہمارے نزدیک اس کا منشا ماضی پر قسم کھانے سے روکنا ہے۔ چنانچہ حضرت عطا نے حضرت عائشہ سے منسوب کرکے انکشاف فرمایا ہے کہ آدمی کا یہ کہنا کہ بخدا ہم نے یہ نہیں کیا تھا اور بخدا ہم نے ایسا بنایا تھا یمین لغو ہے۔ امام حسن بصری اور امام شعبی نے بھی یہی معنے بتائے ہیں۔ سعید بن جبیر کہتے ہیں کہ یمین لغو یہ ہے کہ آدمی حرام پر قسم اٹھاتے۔ چونکہ یمین لغو میں ان سب معانی کی گنجائش ہے اور سب جانتے ہیں کہ البقرہ میں ولکن یواخذکم بما کسبت قلوبکم کا اور یہاں ولکن یواخذکم بما عقدتم الایمان کا عطف لا یواخذکم اللہ باللغو فی ایمانکم پر ہے دل کی کمائی اور عقد یہی ہے کہ جھوٹ اور گناہ پر مشتمل قسم ہو اس لیے ضروری ہے کہ اس میں مواخذہ سے مراد آخرت کا مواخذہ ہے۔

قابل مواخذہ قسمیں

۱۷۷۔ لیکن ان قسموں پر ضرور مواخذہ کرے گا جنہیں تم نے جان بوجھ کر کھایا ہو۔ قسم کی تین قسمیں ہیں۔ یمین لغو، یمین غموس اور یمین منعقدہ۔ لغو کے معنے بیان ہو چکے ہیں۔ یمین غموس یہ ہے کہ کسی گزری ہوئی بات پر جھوٹی قسم کھائی جاتے اور بالارادہ کھائی جاتے ان دونوں میں کفارہ نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دنیا میں ان کی قانونی سزا کوئی نہیں ہے یہ مطلب نہیں ہے کہ آخرت میں بھی کوئی سزا نہیں ہے قسم کھانا حقیقت میں شہادت یعنی گواہی ہے۔ جو شخص کسی بات کو خدا کی قسم کھا کر کہتا ہے وہ اصل میں اپنے بیان کی سچائی پر خدا کو گواہ بناتا ہے۔ ایسی حالت میں خیال کرنا چاہیے کہ اس معاملہ کی اہمیت کتنی بڑی ہے اور قسم کھانا کتنی غیر معمولی بات ہے۔ اوّل تو بے ضرورت قسم کھانا ہی برا ہے پھر جھوٹی قسمیں کھانا اور بھی برا ہے اسی لیے قرآن میں اس قسم کی قسم کھانے اور قسم کھانے والوں کی بہت برائی آئی ہے۔ یہ جھوٹ کی بدترین شکل ہے جس میں جھوٹ بولنے والا اپنے ساتھ خدا کو بھی شریک کر لیتا ہے۔ اس لیے اگر تم نے کسی آئندہ بات پر قسم کھالی تو یہ بھی من جملہ عقود کے ایک عقد ہے اس کا پورا کرنا واجب ہے۔ جب تم نے کسی بھی شخص سے خدا کو درمیان میں ڈال کر مستقبل کے بارے کوئی قول قرار کر لیا تو یہ عہد اللہ ہو گیا ہے یعنی ایسا عہد جس کے لیے تم اللہ کے ذمہ دار ہو گئے ہو اس کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اگر کسی وجہ سے پورا نہ کر سکے تو وہ عہد [illegible]

اور اس پر کفارہ ہے، اسی کو یمین منعقدہ کہتے ہیں خدا کا نام لے کر کوئی معاہدہ کرنا اور اس کو توڑ ڈالنا خدا کے مقدس نام کی تحقیر ہے اسی لیے فرمایا کہ جس بات پر کسی نے قسم کھائی اس پر اس نے گویا خدا کو ضامن ٹھہرایا اس لیے قسم کھا کر توڑا نہ کرو اور لوگوں کو دھوکا نہ دیا کرو۔ پھر ایسی قسم کو توڑ ڈالنا خدا کے مقدس نام کی تحقیر ہے۔

صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا جو کسی مسلمان کے حق کو جھوٹی قسم کھا کر لینا چاہے گا تو خدا اس پر دوزخ کی آگ کو واجب کر دے گا۔ صحابہ نے دریافت کیا یا رسُول اللہ اگرچہ کوئی معمولی سی چیز ہو۔ فرمایا درخت اراک کی ڈالی ہی کیوں نہ ہو۔ حضرت انس صحابی کہتے ہیں کہ بڑے بڑے گناہ یہ ہیں خدا کا شریک بنانا، ماں اور باپ کی نافرمانی کرنا، کسی بے گناہ کی جان لینا اور جھوٹی قسم کھانا ایک اور حدیث میں ہے، آپ نے فرمایا جس شخص سے قسم کھلوائی جاتے اور وہ جھوٹ قسم کھا جائے تو وہ اپنا چہرے کو دوزخ میں ٹھکانا پائے گا۔ چہرہ کی خصوصیت شاید اس لیے ہے کہ اس نے انسانی عزت و آبرو کے خلاف کام کیا، اور بڑی ڈھٹائی دکھائی جس کا اثر چہرہ پر نمایاں ہوتا ہے۔

قسموں کا کفارہ

۱۷۸۔ لہٰذا ایسی قسم توڑنے کا کفارہ دس مسکینوں کو کھانا کھلانا ہے یہ کھانا درمیانے درجہ کا ہو جو تم اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو یا ان کو کپڑے پہنا دینا یا ایک غلام کو آزاد کر دینا۔ یعنی قسم توڑنے کے بعد یہ کفارہ دیا جائے گا۔ کھانا دینے میں اختیار ہے خواہ دس مساکین کو گھر بلا کر بٹھا کر کھانا کھلا دے یا صدقہ فطر کے برابر ہر مسکین کو غلہ یا اس کی قیمت دے دے اور کپڑا اس قدر جس سے بدن کا اکثر حصہ ڈھک جائے مثلاً کرتہ یا جامہ یا لنگی اور چادر اور غلام میں مومن ہونے کی شرط نہیں ہے[1]

قسم کے توڑ دینے کی صورت میں تین قسم کی نیکیاں اس کا کفارہ ہو سکتی ہیں اور ان تینوں میں اس کو اختیار ہے جو چاہے کرے۔

اول یہ کہ دس مسکینوں کو کھانا کھلاتے، کتنا اور کیسا اور کس طرح، ان تینوں سوالوں کے جواب سے قرآن نے بظاہر خاموشی اختیار کی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو قرآن میں ہی اس کا جواب ہے ظاہر ہے کہ جب قرآن نے دس مساکین کو کھانا کھلانا فرمایا ہے تو اس سے مقصود دس کا پیٹ بھرنا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک مسکین کا جتنی مقدار میں پیٹ بھر سکتا ہے اتنا دینا چاہیے۔ احناف نے ایک مسکین کے صدقہ پونے دو سیر گندم کی مقدار طعام کے لحاظ سے کی ہے وہ دور زمانہ تبادل اجناس تھا۔ جنس کے تبادلے کے ذریعے طعام یعنی روٹی سالن مہیا ہوتا تھا۔ احناف اس کی اجازت دیتے ہیں کہ ایک ہی مسکین کو دس روز تک کھانا کھلائے جبکہ دوسرے ائمہ دس مسکینوں کی تعداد کو ضروری بتاتے ہیں۔ دوسرے سوال کا جواب قرآن نے من اوسط ما تطعمون اھلیکم میں دیا ہے یعنی وہ اوسط درجہ کا کھانا کھلاؤ جو اپنے بال بچوں کو کھلاتے ہو۔ یعنی نہ تو ادنیٰ درجہ کا ہو جو کبھی کبھار گھروں میں ہوتا ہے اور نہ ایسا اعلیٰ درجہ کا ہو جو معزز مہمانوں کی آمد کے موقعہ پر تیار کیا جاتا ہے۔ اگر کسی گھر میں گیہوں کی روٹی اور سبزی گوشت عموماً کھایا جاتا ہے تو یہی کھلانا چاہیے

آیت میں لفظ طعام آیا ہے۔ لغت میں اس کے دونوں معنے آتے ہیں کھانا دینا اور کھانا کھلانا۔ اس لیے فقہا نے اس میں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ تملیک واباحت دونوں جائز ہیں۔ یعنی کفارہ دینے والے کو دونوں باتوں کا اختیار ہے چاہے تو دس مسکینوں کو گھر بلا کر کھانا کھلائے اور چاہے تو کھانا ان کی ملکیت میں دے دے۔ مگر اباحت یعنی گھر بلا کر کھانا کھلانے کی صورت میں ضروری ہے کہ متوسط درجہ کا کھانا جو عادۃً اپنے گھر کھاتا ہے دس مسکینوں کو پیٹ بھر کر کھلائے اور تملیک کی صورت میں ایک مسکین کو پونے دو سیر گیہوں یا اس کی قیمت دے دے۔

دوسرے یہ کہ دس مسکینوں کو کپڑے پہنائے۔ اصل ارشاد میں لفظ کسوہ آیا ہے۔ کسوہ کے معنے پہنا دینے کے آتے ہیں، اتنا کپڑا جو ستر پوشی کر سکے۔ ایک پاجامہ کرتہ یا ایک چادر اور تہ بند دے دے۔ امام الحسن اور ابن سیرین دو کپڑوں کو واجب کہتے ہیں۔ اور امام ابوجعفر باقر، امام عطاؒ، امام ابراہیم نخعیؒ ایک کپڑا واجب بتاتے ہیں۔ امام مالک اور امام احمد اتنا کپڑا واجب بتاتے ہیں جس میں نماز ہو سکے۔ سب کا حاصل یہی ہے کہ بقدر ستر پوشی دینا ضروری ہے۔

تیسرے یہ کہ غلام آزاد کرے۔ اس میں فقہا کا اختلاف ہے کہ کفارہ یمین میں آزاد ہونے والے غلام کے لیے مسلمان ہونا ضروری ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہ کہتے ہیں کہ ضروری نہیں ہے مومن ہو یا کافر سب کی آزادی کفارہ ہو سکتی ہے کیونکہ قرآن میں ایسی کوئی قید نہیں ہے لیکن امام مالک، امام شافعی، امام احمد کہتے ہیں کہ مسلمان ہونا ضروری ہے۔ وہ مطلق کو مقید پر محمول کرتے ہیں۔ قتل وظہار کے کفارہ میں فتحریر رقبۃ مومنۃ آیا ہے جیسے اشھدوا اذا تبایعتم میں گواہوں کے مسلمان ہونے کو ضروری قرار دیتے ہیں کیونکہ دوسرے موقع پر اشھدوا ذوی عدل منکم آیا ہے اور ان کا کہنا یہ بھی ہے کہ یہ قسم توڑنے کا جرمانہ نہیں ہے بلکہ توبہ اور کفارہ ہے۔ جرمانہ میں ندامت اور شرمساری اور

اصلاحِ نفس کی کوئی رُوح نہیں ہوتی ہے بلکہ وہ سخت ناگواری کے ساتھ مجبوراً دیا جاتا ہے اور بیزاری و تلخی اپنے پیچھے چھوڑ جاتا ہے برعکس اس کے اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ جس بندے سے خطا ہوتی ہے وہ عبادت کارِ خیر کے ذریعہ سے اس کا اثر اپنی رُوح سے دھوئے اور شرمساری و ندامت کے ساتھ اللہ کی طرف رجوع کرے اس طرح کفارے میں عبادت کی حیثیت آجاتی ہے اور عبادت ہونے کی وجہ سے ضروری ہے کہ آزاد ہونے والا اہلِ ایمان میں سے ہو۔

قسم کے کفارے میں روزہ

۱۷۹ - اور جس کو یہ دستیاب نہ ہو تو تین دن کے روزے رکھے یہ تمہاری قسموں کا کفارہ ہے جب تم قسم کھا بیٹھو یعنی متواتر روزے تین دن کے رکھے۔ اور میسر نہ ہونے سے مراد یہ ہے کہ صاحبِ نصاب نہ ہو کما فی روح المعانی۔[۱]

احناف اور حنابلہ نے روزوں میں پے درپے ہونے کی شرط لگائی ہے۔ ان بزرگوں نے بعض قرارت میں وایام متتابعات کی تصریح کی وجہ سے پے درپے کی قید لگائی ہے۔ لیکن امام شافعی اس قید کو نہیں مانتے اور اس نوع کی شاذ قرءت کو قابلِ استدلال بھی نہیں سمجھتے۔ بہرحال مطلب یہ ہے کہ جس شخص کو ان تین میں سے کسی ایک پر مقدرت نہ ہو یعنی جو شخص بوجہ افلاس دس مسکینوں کو کھانا یا کپڑا دینے اور غلام آزاد کرنے پر قادر نہ ہو تو اس کی قسم کا کفارہ تین دن کے روزے ہیں۔ روزوں کا رکھنا ایک رعایتی کفارہ ہے۔ جونہی عدمِ مقدرت کا عذر ختم ہو جائے گا رعایت بھی ختم ہو جائے گی۔ چنانچہ فقہا نے لکھا ہے کہ کسی نے کفارے کے روزے شروع کیے اور دو روزے ہو بھی چکے تھے کہ اسے طعام یا لباس کی مقدرت حاصل ہو گئی تو اب تیسرا روزہ رکھنے کے بجائے اسے اصل کفارہ ہی دینا چاہیے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قسم توڑنے سے پہلے بھی کفارہ دیا جا سکتا ہے یا نہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں دیا جا سکتا ہے لیکن امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ کفارے کا وجوب قسم توڑنے کے وقت ہوتا ہے۔

قسموں کی حفاظت کا مطلب

۱۸۰ - اور اپنی قسموں کی حفاظت کرو۔ قسموں کی حفاظت یہ ہے کہ بے ضرورت بات بات پر

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

قسمیں نہ کھائے یہ عادت بھلی نہیں ہے اور اگر قسم کھالی تو مقدور بھر پوری کرے اور اگر کسی وجہ سے توڑ دی تو کفارہ ادا کرے یہ سب چیزیں حفاظت یمین میں داخل ہیں۔[1]

قسم کی حفاظت کے کئی مفہوم ہیں ایک یہ کہ قسم کو صحیح مصرف میں استعمال کیا جائے فضول باتوں اور معصیت کے کاموں میں استعمال نہ کیا جائے۔ دوسرے یہ کہ جب کسی بات پر آدمی قسم کھائے تو اسے یاد رکھے ایسا نہ ہو کہ اپنی غفلت کی وجہ سے وہ اسے بھول جائے اور پھر اس کی خلاف ورزی کرے، تیسرے یہ کہ جب کسی معاملہ میں بالارادہ قسم کھائی جائے تو اسے پورا کیا جائے اور اگر اس کی خلاف ورزی ہو جائے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔[2]

اصل ارشاد میں احفظوا ایمانکم آیا ہے حفظ کے معنے نگرانی اور حفاظت کے ہیں۔ حفاظت یہ ہے کہ جس بات پر نیت کر کے قسم کھائی ہے اگر وہ کوئی خلاف شرع یا غیر انسب نہ ہو تو اس کی پوری ذمہ داری محسوس کی جائے اور اس کو حتی المقدور پورا کیا جائے اور اگر پوری نہ کر سکے تو اس کا کفارہ ادا کیا جائے۔ یہ کفارہ اسی لیے مقرر کیا گیا ہے تاکہ قسم کھا کر اس کے پورا کرنے کی ذمہ داری اور اہمیت کے خیال کو نقصان نہ پہنچے۔

کسی خلاف شرع بات پر جو قسم کھائی جاتی ہے یا وہ بات جس پر قسم کھائی گئی ہے بعد کو غیر انسب معلوم ہو تو اس قسم کو توڑ دینا اور کفارہ ادا کر دینا درست ہے۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے:

قد فرض اللہ تحلۃ ایمانکم

احادیث میں اس کی تصریح موجود ہے مثلاً صحیحین اور مسند احمد میں عبدالرحمٰن بن سمرہ کے حوالہ سے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ

عبدالرحمان جب تو قسم اٹھائے بعد میں تجھے اسی کام میں بھلائی معلوم ہو تو بھلائی والا کام کر اور اپنی قسم کا کفارہ دے۔

حافظ سیوطی نے الکلیل میں تا مقدور قسم توڑنے سے بچنے کو ہی قسم کی حفاظت قرار دیا ہے، ہاں یہ کہ قسم توڑنے ہی میں بھلائی ہو اور زیادہ قسموں کے کھانے سے بچ کر رہنا بھی اس میں داخل ہے ایسا شخص جو بات بات پر قسمیں کھاتا رہتا ہے حد درجہ بے اعتبار اور ناقابل اعتماد سمجھا جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں ایسے شخص پر اعتبار نہ کرنے کا حکم دیا ہے اور اس کو انسان کا بہت بڑا عیب

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن۔

بتایا ہے۔ ارشاد ہے ؛

لا تطع کل حلاف مہین

بہت قسمیں کھانے والے ذلیل کا کہا نہ مان

سوچنے کی بات ہے کہ قسم کھانے کا مدعا یہ ہے کہ لوگ اس کا کہنا مانیں اور اس پر اعتبار کریں، لیکن اللہ تعالیٰ اس طرح کی قسمیں کھانے والے کی بات کے نہ ماننے کی ہدایت اور اس کی بے قدری اور بے اعتباری کا اعلان کرتا ہے۔

غیر اللہ کی قسم حرام ہے

قسم کے مسائل میں بنیادی مسئلہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے اسماء وصفات کے علاوہ قسم جائز نہیں ہے اور یہ بھی قسموں کی حفاظت ہے۔ شیخین نے صحیحین میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد حفظان قسم کے سلسلے میں نقل کیا ہے کہ آپ نے فرمایا

سن لو جس کو قسم کھانا ہی ہو وہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کے نام کی قسم کھائے۔ قریش کی عادت تھی کہ وہ اپنے باپ دادوں کی قسم کھاتے تھے۔ آپ نے منع فرمایا کہ ان کے نام کی قسمیں مت کھایا کرو۔

اس سے معلوم ہوا کہ قسمیں کھانے کی عادت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں، لہٰذا بے ضرورت قسمیں نہ کھائی جائیں۔ اور اگر کسی مجبوری سے قسم کھانی ہی ہو تو صرف اللہ تعالیٰ کی ذات وصفات کی قسم کھائی جائے ماں باپ اور کسی کی قسم نہ کھائی جائے۔ حافظ ابن عبدالبر رقمطراز ہیں کہ غیر اللہ کی قسم کھانے کے ناجائز ہونے پر اجماع ہے۔ علامہ شامی نے بھی اسے بالاتفاق مکروہ تحریمی قرار دیا ہے۔ امام بخاری نے ابراہیم نخعی سے نقل کیا ہے کہ لڑکپن میں ہمیں اس بات پر تنبیہ کی جاتی تھی کہ ہم باہم گفتگو میں شہادت یا عہد وغیرہ کے الفاظ بے محابا استعمال نہ کریں تاکہ ان کی اہمیت ہمارے ذہنوں سے نہ نکل جائے۔

ابوداؤد اور ترمذی میں یہ بات اور زیادہ وضاحت سے آئی ہے عبداللہ بن عمر کہتے ہیں میں نے یہ بات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے سنی ہے کہ:

جس نے اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور کی قسم کھائی اس نے شرک کیا۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہاں حلف بغیر اللہ کو ویسا ہی شرک کہا گیا ہے جیسا کہ دوسری حدیث میں ریا کو شرک کہہ دیا گیا ہے۔ دونوں حدیثوں کا مطلب شرک کا حقیقتہً حکم لگا دینا نہیں ہے بلکہ ان

افعال کی شناعت ذہن نشین کرنا ہے اس لیے ان کو تغلیظاً شرک کہہ دیا گیا ہے۔ بات یہ ہے کہ جس کی قسم کھائی جاتی ہے اس کی غیر معمولی عظمت قلب میں جاگزین ہوتی ہے اس لیے اگر کوئی شخص غیر اللہ کی قسم کھاتا ہے تو اس کے یہی معنے ہیں کہ اس کے قلب میں غیر اللہ کی عظمت اللہ کی عظمت کے برابر ہے۔ اس لیے جن لوگوں کے پیشِ نظر محلوف بہ کی تعظیم ہے انہوں نے حلف بغیر اللہ کو حرام قرار دیا ہے اور جن کے نزدیک معاملہ صرف تاکید کا ہے انہوں نے مکروہ قرار دیا ہے۔ اہلِ عرب قسم تعظیم کے لیے کھاتے تھے یا تاکید کے لیے اور بس۔

نذر بھی قسم ہی ہے

فقہا نے نذر کو بھی قسم اور یمین ہی میں شمار کیا ہے کیونکہ فقہا کے نزدیک علی نذر کا ملفوظ بھی قسم ہے صرف یہ کہا کہ مجھ پر نذر ہے اور کچھ اضافہ نہ کیا اور نیت بھی نہ کی تو یہ قسم ہی شمار ہوگی۔ عدم ایفا کی صورت میں قسم کا کفارہ دینا پڑے گا۔ نذر کی تعریف یہ کی گئی ہے التزام مسلم مکلف قربة یعنی کسی مسلمان بالغ عاقل کا قربت کو اپنے ذمے لے لینا۔ نذر اور یمین معلق میں فرق یہ ہوتا ہے کہ نذر سے مقصود تقرب ہوتا ہے جبکہ یمین معلق سے مقصد باز رہنا ہوتا ہے۔ علامہ شامی نے نذر کو قربت مشروعہ قرار دیا ہے۔ قربت تو اس لیے کہ یہ ذریعہ قربِ الٰہی ہے اور مشروعہ اس لیے کہ اس کے پورا کرنے کا قرآن میں حکم ہے ولیوفوا نذورھم چونکہ نذر قربت مشروعہ ہے اس لیے اس کی صحت کی دو اہم اور بنیادی شرطیں ہیں۔

اوّلاً یہ کہ اللہ کے لیے ہو کسی مخلوق کے لیے نہ ہو۔ صاحب البحر الرائق نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ لانہ عبادة نذر عبادت ہے اور اسلام میں مخلوق کے لیے عبادت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ثانیاً یہ کہ جس چیز کی نذر مانی جاتے اس کی جنس کی کوئی چیز اسلام میں بطورِ عبادت مقصودہ ہو آپ روزے کی نماز کی، صدقہ کی، وقف کی اور حج کی اعتکاف کی نذر مان سکتے ہیں۔ کیونکہ یہ عبادات مقصودہ ہیں لیکن آپ وضو کی، بیمار کی عیادت کی، مسجد میں جانے کی، نمازوں کے بعد تسبیحات کی نذر نہیں مان سکتے۔ نذر کی صحت کے یہ دو اصول ہیں۔ اسی بنا پر فقہا احناف نے اہلِ قبور کی خاطر کی جانے والی تمام نذروں کو ناجائز کہا ہے۔ فقہ حنفیہ کی مشہور متداول اور مستند کتابوں میں یہ مسئلہ وضاحت کے ساتھ لکھا ہے۔

> تو بخوبی جان لے کہ وہ نذر و منت جو اکثر عوام مردوں کے لیے مانتے ہیں اور جو چیزیں از قسم روپیہ موم بتی، تیل اور اس قسم کی دوسری چیزیں بزرگوں کی قبروں تک ان کا تقرب

حاصل کرنے کے لیے پہنچائی جاتی ہیں۔ مثلاً کوئی کہتا ہے اے میرے آقا فلاں اگر میرا گم شدہ آدمی واپس آگیا۔ یا میری حاجت پوری کردی گئی تو آپ کو اتنا سونا اتنی چاندی یا اتنا اناج یا اتنی موم بتیاں یا اتنا تیل دوں گا تو یہ نذر باطل اور حرام ہے اور اس کے باطل ہونے کی چند وجہیں ہیں۔ اولاً اس لیے کہ یہ نذر ہے اور نذر عبادت ہے جو مخلوق کے لیے ناجائز ہے۔ ثانیاً، جس کے لیے نذر مانی گئی ہے وہ میت ہے اور میت میں مالک ہونے کی صلاحیت نہیں ہوتی ثالثاً: نذر ماننے والے کا یہ گمان ہے کہ میت اللہ کے معاملات میں تصرف کرتی ہے۔ ایسا اعتقاد کفر ہے۔ (البحر الرائق ج ۲ ص ۲۹۸، ردمختار ج ۳ ص ۱۷۵۔)

اور فتاویٰ عالمگیری میں ہے:

اور وہ نذر جو اکثر عوام سے عمل میں آتی ہے مثلاً یہ کہ کسی نیک کی قبر پر جاکر اس کی چادر اور پردہ ہٹاکر یہ کہے اے میرے سردار اگر میری حاجت پوری ہوگئی تو آپ کو اتنا سونا دوں گا یہ نذر بالاجماع باطل ہے، ہاں اگر یہ کہے کہ اے اللہ میں نے تیرے لیے نذر مانی ہے کہ اگر تو نے میرے بیمار کو شفا دے دی تو میں سیدہ نفیسہ کے دربار میں رہنے والے فقیروں کو کھانا کھلاؤں گا یا ان کی مسجد کے لیے چٹائی خریدوں گا یا فقراء کے جلانے کے لیے وہاں تیل دوں گا یا جو شخص وہاں خدمت کرے گا اسے درہم دوں گا اور ایسے تمام کام جن میں فقراء کا فائدہ ہو اور نذر صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو۔ حضرت اور شیخ کا ذکر محض نذر کے مستحقین پر صرف کرنے کی غلط ہو تو یہ نذر جائز ہے لیکن اس نذر کو صرف فقراء پر ہی صرف کیا جاسکتا ہے نہ تو کسی عالم پر اس کے علم کی وجہ سے اور نہ وہاں شیخ کے دربار میں رہنے والوں پر لیکن اگر کوئی وہاں رہنے والا فقیر ہو تو اور بات ہے جب یہ معلوم ہوگیا تو اب یہ سمجھنا چاہیے کہ جو دراہم اولیاء کی قبروں پر ان کے تقرب کے لیے پیش کیے جاتے ہیں تو وہ بالاجماع حرام ہیں جب تک ان کو زندہ فقراء پر صرف کرنے کا ارادہ نہ ہو وہ حلال نہیں ہیں اس میں صرف ایک ہی بات ہے اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے افسوس ہے کہ لوگ اس میں بکثرت مبتلا ہیں ایسا ہی النہر الفائق اور البحر الرائق میں ہے۔

اس سے یہ بات الم نشرح ہوکر سامنے آگئی کہ حضرات اولیاء کرام کے تقرب کے ارادے سے جو نذر مانی جاتی ہے وہ بالاجماع حرام ہے اور اکثر عوام اس میں مبتلا ہیں، ہاں نذر تو صرف اللہ تعالیٰ کے لیے ہو اور اولیاء کرام کا نام صرف اس لیے لیا گیا ہو کہ ان کے مزارات پر فقراء رہتے ہیں اور محل صرف

سمجھ کر وہاں صرف کرو تو اس میں چنداں مضائقہ نہیں ہے۔

نعمتوں کا شکر واجب ہے

۱۸۱ – اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنے احکام تمہارے لیے واضح کرتا ہے تاکہ تم شکر ادا کرو۔ یہ کتنا بڑا احسان ہے کہ تم نے طیبات سے گریز کیا تو ہم نے اس گریز سے منع کیا اور کسی نے غلطی سے طیبات کو اپنے اوپر حرام کر لیا تو اس کو حفاظت یمین کے ساتھ اس سے حلال ہونے کا طریقہ بتلا دیا۔[1] اللہ سبحانہٗ نے جن جن نعمتوں کو پیدا فرمایا ہے ان کو منعم کی مرضی میں استعمال کرنا اور نعمتوں کے متعلق جو صحیح علم ہے اس کے احساس کو زندہ اور بیدار رکھنے کا نام شکر ہے۔ انسان مختلف قسم کی قوتیں اور صلاحیتیں رنگا رنگ خواہشیں اور ضرورتیں اور گوناں گوں جذبات و میلانات لے کر پیدا ہوا ہے۔

وہ غور و فکر کی استدلال و استنباط کی، ایجاد و اکتشاف کی غیر معمولی صلاحیتیں رکھتا ہے۔ اسے بولنے کی دیکھنے کی سننے کی قوتیں دی گئی ہیں۔ اسے جسمانی طاقت عطا ہوئی ہے۔ اسے بھوک اور پیاس لگتی ہے جس کی وجہ سے وہ کھانے اور پانی کا طلب گار ہوتا ہے۔ دھوپ سے بارش سے اگرمی اور سردی سے اسے تکلیف پہنچتی ہے۔ اس تکلیف سے بچنے کے لیے وہ لباس اور مکان کی ضرورت محسوس کرتا ہے وہ محنت و مشقت کے بعد آرام کا اور بیداری کے بعد نیند کا محتاج ہوتا ہے۔ وہ جنسی خواہش اور بادلاد کی بقاءِ نسل کی آرزوئیں رکھتا ہے اور ان آرزوؤں کی تکمیل کے لیے ازدواجی رشتے قائم کرنے کا ضرورت مند ہوتا ہے۔ اس کے دل میں اپنے اہل و عیال کی اپنے والدین کی اپنے قرابت داروں کی اور اپنے دوستوں کی محبت گھر کیے ہوتی ہے اس لیے وہ ان کے ساتھ خصوصی شفقت کا رویہ اختیار کرنا چاہتا ہے، وہ اپنی جنس سے گہرا انس رکھتا ہے جس کی بنا پر وہ ان سے الگ تھلگ ہو کر یہ ذ تنہا زندگی گزارنے سے وحشت کھاتا ہے اور ان سے مل جل کر رہنے ہی سے سکون قلب پاتا ہے۔ اسی طرح اس کے اندر ایک طرف محبت اور رحمدلی کے صبر و تحمل کے، صلح اور درگزر کے مسرت و انبساط کے جذبات موجود ہیں تو دوسری طرف وہ بغض اور سخت دلی کے غصہ و نفرت کے، لڑائی اور انتقام کے رنج اور غم کے جذبات سے بھی خالی نہیں ہے۔ انسان کے اندر ان مختلف قوتوں اور خواہشوں کو سامنے رکھ کر قرآن نے بتایا ہے کلوا من طیبات ما رزقناکم واشکروا للّٰہ ان کنتم ایاہ تعبدون یعنی اگر تمہارے اللہ سے بندگی کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تعلقات ہیں تو اللہ کی دی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ اور اللہ کا شکر ادا کرو اور مشرکانہ پابندیوں کی پروا نہ کرو۔ یہاں بھی فرمایا کہ تم کو اللہ نے جو حلال وطیب عطا فرمایا ہے رہبانیت کی لگائی ہوئی پابندیوں سے بے پروا ہو کر ان کو استعمال کرو۔ اللہ کا تم پر انعام ہے کہ اس نے نعمتوں سے فائدہ اٹھانے کی اجازت دے دی ہے اور اب اس اجازت کی توضیح فرما دی ہے تاکہ تم اس کے شکر گزار بندے بن جاؤ۔ یعنی اس نعمت سے متعلق جو صحیح علم ہے اس کے احساس کو زندہ اور بیدار رکھنے کی مسلسل کوشش کرتے رہو کر عمل کو آسان کرنے کی یہی تجربی اور نفسیاتی راہ ہے۔ نہ صرف زبان سے بلکہ دوسرے اعضاء وجوارح سے بھی شکر کی مشق کر کے اپنے باطنی احساس کو بیدار رکھنا چاہیے۔ اصل مقصود تو عمل کی تصحیح ہے اسی کے لیے علم کی تصحیح کرائی گئی ہے اور علمی احساس کو مسلسل زندہ اور بیدار رکھنے کے لیے قرآن نے شکر کی راہ بتائی ہے یعنی لوگ زبان سے بھی اور اعضاء سے بھی الغرض ہر اس ذریعہ سے جس سے اس احساس کی بیداری میں مدد ملے کام لینا چاہیے تاکہ اللہ نے جو احکام دیے ہیں ان کے صحیح استعمال میں آسانی ہو۔ اجمالاً اسی سارے کاروبار کا نام خواہ عملی شکل میں ہو یا علمی پھر زبان سے ہو یا جوارح سے اس کا تعلق ہو سب کا نام شکر ہے۔

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ
رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝ اِنَّمَا
يُرِيْدُ الشَّيْطٰنُ اَنْ يُّوْقِعَ بَيْنَكُمُ الْعَدَاوَةَ وَالْبَغْضَآءَ فِي الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ
وَيَصُدَّكُمْ عَنْ ذِكْرِ اللّٰهِ وَعَنِ الصَّلٰوةِ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّنْتَهُوْنَ ۝
وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ وَاحْذَرُوْا ۚ فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ
فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا عَلٰى رَسُوْلِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِيْنُ ۝ لَيْسَ عَلَى
الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جُنَاحٌ فِيْمَا طَعِمُوْٓا اِذَا مَا
اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ ثُمَّ اتَّقَوْا وَّاٰمَنُوْا ثُمَّ اتَّقَوْا وَّ
اَحْسَنُوْا ۗ وَاللّٰهُ يُحِبُّ الْمُحْسِنِيْنَ ۝

اے اہل ایمان شراب جوا آستھان اور پانسے گندے شیطانی کام
ہیں ان سے بچ کر رہو امید ہے کہ تم بامراد اور کامیاب ہو جاؤ گے [۱۸۲]
شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے

درمیان دشمنی اور بیر ڈال دے اور تمہیں یادِ الٰہی اور نماز سے ہٹا دے، بتاؤ کیا تم باز آؤ گے[۱۸۳]، اللہ اور اس کے رسول کے کہے پر چلو اور محتاط رہو پھر اگر تم نے حکم عدولی کی تو خوب جان لو کہ ہمارے رسول کی ذمہ داری صرف پیغام کو پہنچا دینا ہے[۱۸۴]۔ یاد رکھو جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے ان پر ماضی میں کھائے پیئے پر کوئی گرفت نہیں جب کہ اب وہ متقی ہو گئے اور ایمان لے آئے اور اچھے اچھے کام کیے پھر پرہیزگار رہے اور ایمان لائے پھر پرہیز کیا اور نیک کردار ہو گئے، اللہ نیکوکاروں سے محبت کرتا ہے[۱۸۵]۔

شراب اور جوا اور معاشرتی برائیاں

شراب خوری ان بری عادات میں سے ہے جن کی برائی کھلی ہوئی ہے پھر بھی یہ کتنی عجیب بات ہے کہ دُنیا کی اکثر قومیں اس میں مبتلا نظر آتی ہیں۔ یہاں طیبات کی تحریم سے ممانعت کے بعد شراب جوئے کا ذکر کیا ہے تاکہ کوئی یہ خیال نہ کرے کہ شراب اور جوا بھی طیبات میں سے ہے ان کو بھی حرام نہ کرنا چاہیے بتا دیا کہ یہ طیبات میں داخل نہیں ہیں۔ ارشاد ہے :

ومن ثمرات النخیل والاعناب تتخذون منہ سکرا ورزقاً حسناً

اس آیت میں سکر کو رزق حسن کے مقابلہ میں رکھ کر بتا دیا کہ نشہ رزق حسن نہیں ہے اگرچہ شارحین قرآن نے اس آیت پر بہت کچھ لکھا ہے مگر میرے نزدیک درحقیقت خیر و باطل کے التباس کی تشبیہیں ہیں۔ اوپر دودھ اور گوبر اور نیچے شہد کا ذکر ہے کہ یہ بھی دودھ کی طرح الائشوں کے اندر سے کیسا پاک و صاف نکلتا ہے یہی حال کھجور اور انگور کا ہے کہ ان سے نشہ جیسی ناپاک اور غذا جیسی پاک چیز دونوں پیدا ہوتی ہیں۔

بہرحال اسلام سے پہلے جو مذاہب تھے ان میں بھی اس کی برائی کچھ نہ کچھ بیان کی گئی ہے لیکن اس کو حرام قطعی ٹھہرانے کی عزت صرف اسلام کو حاصل ہے۔ شراب عرب کی گھٹی میں پڑی تھی۔ شراب پینا پلانا اچھے اچھے گھرانوں میں لطف و تفریح کا ذریعہ سمجھا جاتا تھا یہاں شوہروں کو اور چھوٹے اپنے بزرگوں کو اپنے ہاتھوں سے پلاتے تھے۔ اسلام سے پہلے اگرچہ بعض نیک بخت لوگوں نے شراب چھوڑ دی تھی مگر سارا ملک اس بیماری میں گرفتار تھا۔ لوگ شراب پیتے اور متوالے ہو کر آپس میں لڑتے جھگڑتے ایک دوسرے کا سر پھوڑتے جس سے دلوں میں آپس کی دشمنی بیٹھ جاتی۔ کبھی ترنگ میں آتے تو جو اونٹ ملتا اس کو پھاڑ ڈالتے اور یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس کا ہے۔ دوست احباب کسی گھر میں جمع ہو شراب کا دور چلتا۔ ساتھ ہی جوا کھیلتے، اس میں اونٹوں کی ہار جیت ہوتی۔ جو جیت جاتا وہ جیتے ہوئے اونٹوں کو اسی وقت ذبح کرتا اور لوگوں کو کھلا دیتا۔ کبھی نشہ میں سرشار ہو کر صاحب خانہ کھڑا ہوتا اور اپنے اونٹوں کو کاٹ کاٹ کر ڈھیر کر دیتا۔ لوگ گوشت بھونتے کباب بناتے کھاتے کھلاتے اور اپنی اسی بے جا فیاضی پر فخر کرتے رہتے، فاحشہ مغنیہ عورتیں گاتی بجاتی تھیں اور وہ اسی مخموری کی حالت میں بے شرمی کی باتیں کرتے۔ افسوس کہ معالم القرآن کا تقدس ان شعراء کے کلام کو نقل کرنے کی اجازت نہیں دیتا جنہوں نے بے پردگی، عریانی اور بے حجابی کا اشعار میں مظاہرہ کیا ہے۔ انتہا یہ ہے کہ تجارت کا لفظ شراب فروشی کا نام معنے بن گیا تھا۔ ایک جاہلی شاعر عمرو قمیئہ کہتا ہے

اِذَا سُحِبَ الربطَ والمروط الی

ادنی تجارى والنفض اللمما

وہ دن ہے جب میں اپنی چادر گھسیٹتا ہوا قریب ترین شراب خانہ میں جاتا تھا اور اپنے گیسوؤں کو جھاڑتا تھا۔

حضرت حمزہ ۳ھ میں مسلمان ہوئے اس وقت تک شراب حرام نہ ہوئی تھی۔ شراب کی حرمت

جس تدریج سے ہوئی اسی سے اندازہ ہوگا کہ تمام ملک کس طرح اس میں مبتلا تھا اور کس طرح وہ مقبول عام ہو چکی تھی کہ اس کی حرمت کی طرف ذہن منتقل نہیں ہوتا تھا اور کنایہ اور اشارے سے گزر کر جب تک صاف صاف ممانعت نہیں کر دی گئی لوگ سمجھ نہیں سکے۔

۱۸۲ - اے اہل ایمان شراب، جوا، تھان اور پانسے گندے شیطانی کام ہیں ان سے بچ کر رہو امید ہے کہ تم بامراد اور کامیاب ہو جاؤ گے۔ انصاب ازلام کی تفسیر اسی سورت کی ابتدا میں وما ذبح علی النصب وان تستقسموا بالازلام کے تحت گزر چکی اور اس آیت سے پہلے بعض آیات خمر کے بارے میں نازل ہو چکی تھیں۔ اول یہ آیت نازل ہوئی یسئلونك عن الخمر والمیسر قل فیھما اثم کبیر و منافع للناس واثمھما اکبر من نفعھما گو اس سے نہایت واضح اشارہ تحریم خمر کی طرف ہو رہا تھا مگر چونکہ صاف طور پر اس کے چھوڑنے کا حکم نہ تھا اس لیے حضرت عمر نے سن کر فرمایا اللھم بین لنا بیانا شافیا اس کے بعد دوسری آیت آئی یا ایھا الذین آمنوا لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ اس میں بھی تحریم خمر کی تصریح نہ تھی گو نشہ کی حالت میں نماز کی ممانعت ہوتی اور یہ قرینہ اسی کا تھا کہ غالباً یہ چیز عنقریب کلیۃً حرام ہونے والی ہے مگر چونکہ عرب میں شراب کا رواج انتہا کو پہنچا ہوا تھا اور اس کا یکبارگی چھڑا دینا مخاطبین کے لحاظ سے سہل نہ تھا اس لیے نہایت حکیمانہ تدبیر سے اولاً قلوب میں اس کی نفرت بٹھلائی گئی۔ اور آہستہ آہستہ حکم تحریم سے مانوس کیا گیا چنانچہ حضرت عمر نے دوسری آیت کو سن کر پھر وہی لفظ کہے اللھم بین لنا بیانا شافیا آخر کار مائدہ کی یہ زیر تشریح آیتیں نازل ہوئیں جس میں صاف صاف بت پرستی کی طرح اس گندی چیز سے اجتناب کرنے کی ہدایت تھی چنانچہ حضرت عمر فھل انتم منتھون سنتے ہی چلا اٹھے انتھینا انتھینا لوگوں نے شراب کے مٹکے توڑ ڈالے، خم خانے برباد کر دیے، مدینہ کی گلیوں اور کوچوں میں شراب پانی کی طرح بہتی تھی۔ سارا عرب اس گندی شراب کو چھوڑ کر معرفت ربانی اور محبت و طاعت نبوی کی شراب طہور سے مخمور ہو گیا اور ام الخبائث کے مقابلے پر حضور کا یہ جہاد ایسا کامیاب رہا جس کی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی ہے۔ خدا کی قدرت دیکھو کہ جس چیز کو قرآن حکیم نے اتنی شدت سے روکا تھا آج سب سے بڑے شراب خوار ملک امریکہ وغیرہ اس کی خرابیوں اور نقصانات کو محسوس کر کے اس کے مٹا دینے پر تلے ہوتے ہیں [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مولانا ابوالحسن علی میاں نے ماذا خسر العالم بانحطاط المسلمین میں شراب کی حرمت کو جس انوکھے اور اچھے انداز میں پیش کیا ہے وہ بہت زیادہ دلاویز ہے فرماتے ہیں۔ شراب جو ان گنت جسمانی اور روحانی بیماریوں کا سبب، اخلاقی اور معاشی خرابیوں کی جڑ اور فتنہ و فساد کی علت ہے۔ اسلام کے پاکیزہ نظام حیات میں اس کی کیونکر گنجائش ہو سکتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اسے حرام قطعی کر دیا لیکن حرمت کا حکم آہستہ آہستہ اور تدریجاً نازل ہوا تاکہ لوگوں کو اس پر عمل کرنا آسان ہو جائے۔ چنانچہ سورہ بقرہ میں تو اتنا کہنے پر اکتفا کیا گیا فیھما اثم کبیر و منافع للناس فائدہ یہ ہے کہ لوگوں کا کچھ غم غلط ہو جاتا ہے بہجت اور تفریح طبع کا لطف آتا ہے۔ لوگ کھاتے پیتے ہیں۔ دوسروں کو بھی ان کی بدولت کچھ کھانے پینے کو مل جاتا ہے لیکن اس کی خرابیاں اس تھوڑے سے فائدے سے بہت زیادہ ہیں۔ اس آیت نے بہت سے لوگوں کو ہشیار کر دیا اور وہ تائب ہو گئے۔ اس کے کچھ عرصہ بعد یہ آیت نازل ہوئی۔ لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ کہ نشہ کی حالت میں نماز نہ پڑھا کرو۔ یہ آیات اس آخری حکم کا پیش خیمہ تھیں اگرچہ شراب کی حرمت کا صراحۃً ان میں ذکر نہ تھا لیکن کئی سلیم طبیعتوں نے اُس وقت ہی شراب چھوڑ دی تھی۔ حضرت فاروق اعظم اس کی قطعی حرمت کے لیے بارگاہ الٰہی میں التجائیں کرتے اللھم بین لنا بیانا شافیا اس اثنا میں چند ایسے واقعات بھی رونما ہوئے جس سے شراب پینے کے مفاسد اور نقصانات کا صحابہ کرام کو زیادہ سے زیادہ احساس ہونے لگا جب ایمان پختہ ہو گئے۔ تعلیمات اسلامیہ قلب و روح کی گہرائیوں میں بس گئیں۔ اور اللہ اور اس کے رسُول کے ہر حکم کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی عادت فطرت بن گئی، تو یہ آیت کریمہ نازل ہوئی حضور رحمت عالمیان نے ایک خادم کو حکم دیا کہ مدینے کے گلی کوچوں میں پھر کر بلند آواز سے ان آیات کا اعلان کرے جب وہ منادی کرنے والا اعلان کرنے نکلا تو کئی جگہ شراب کی محفلیں آراستہ تھیں، مے خوار جمع تھے، پیالے گردش میں تھے۔ جونہی کان میں ھل انتم منتھون کی آواز پہنچی، ہاتھوں پر رکھے ہوئے پیالے زمین پر پٹخ دیے گئے، ہونٹوں سے لگے ہوئے جام خود بخود الگ ہو گئے۔ جام و سبو توڑ دیے گئے۔ مشکوں اور مٹکوں میں بھری ہوئی مے ناب انڈیل دی گئی۔ وہ چیز جو انہیں از حد عزیز تھی اب گندے پانی کی طرح گلیوں میں بہ رہی تھی۔ حیرت یہ ہے کہ اس کے بعد کسی صحابی نے شراب پینے کی خواہش کا اظہار تک نہیں کیا۔ قرآن کی اثر آفرینی، حضور کے فیض صحبت، صحابہ کرام کی کامل ترین اطاعت و فرمانبرداری اور اسلام کی انقلاب آفریں قوت کا یہ وہ عدیم النظیر مظاہرہ ہے جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ہے۔ شراب کے زہریلے اثرات دیکھ کر یورپ اور امریکہ کے

ڈاکٹر اور دانشور لرزہ براندام ہیں۔ اس مصیبت سے اپنی قوم کو چھٹکارا دلانے کے لیے بڑی بڑی مخلصانہ اور حکیمانہ کوششیں کی جا رہی ہیں۔ حکومت امریکہ نے پورے چودہ سال تک شراب کے خلاف زور سے جہاد جاری رکھا اور اس جہاد میں نشر و اشاعت اور پروپیگنڈے کے جدید ترین اور قوی ترین وسائل اختیار کیے۔ اخبارات و رسائل، لیکچرز، تصاویر اور فلمیں سبھی شراب سے نفرت دلانے کے لیے برسرپیکار رہے۔ اس عظیم مہم پر حکومت نے تقریباً چھ کروڑ ڈالر خرچ کیا۔ پچیس کروڑ پونڈ کا خسارہ برداشت کیا۔ تین سو افراد کو سزائے موت، پانچ لاکھ سے زیادہ اشخاص کو قید و بند کی سزائیں دیں، بھاری جرمانے کیے، بڑی بڑی جائدادیں ضبط کی گئیں لیکن ساری کوششیں بیکار ثابت ہوئی ہیں۔ آخرکار حکومت کو اپنی شکست کا اعتراف کرنا پڑا اور اس نے شراب نوشی جس کے خلاف عرصہ دراز تک وہ معرکہ آرا رہی تھی اس کو ۱۹۳۳ء میں قانوناً جائز قرار دے دیا۔

بہرحال حرمتِ شراب کی یہ آخری آیت ہے جس وقت یہ آیت نازل ہوئی حضرت ابوعبیدہ امین الامت اور ابی بن کعب جو سید القراء تھے، حضرت ابوطلحہ کے گھر میں مہمان تھے اور شراب کا دور چل رہا تھا۔ ساقی گری کی خدمت حضرت انس سے متعلق تھی۔ چنانچہ صحیح بخاری کتاب الاشربہ میں خود حضرت انس کی زبانی روایت ہے۔

میں ابوعبیدہ اور ابی بن کعب اور ابوطلحہ کو شراب پلا رہا تھا کہ ایک شخص نے آکر کہا کہ شراب حرام ہو گئی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے اس حدیث کی شرح میں صحیح مسلم اور دیگر حدیث کی کتابوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ اس جلسہ میں گیارہ بزرگ شریک تھے۔

اس آیت میں چار چیزوں کی ممانعت کی جا رہی ہے۔ خمر، میسر، انصاب اور ازلام۔ علامہ مہائمی نے یہاں یہ عجیب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ خمر میں اگر عقلِ انسانی کی اضاعت ہے تو میسر میں اضاعت مال ہے۔ انصاب میں اگر انسانی شرف و مجد کی اضاعت ہے تو ازلام میں علم کی اضاعت ہے۔

اگرچہ ان کے بارے میں تشریحات دوسری اور چھٹی جلدوں میں گزر چکی ہیں لیکن ایک بار پھر ان پر ایک نظر ڈال لیجیے۔

خمر اور اسلام کو اس کی حرمت پر اصرار

خمر اصل میں انگور کے کچے پانی کا نام ہے جبکہ وہ نشہ آور ہو خمر ہے لیکن مجازاً ہر نشیلی چیز کو

خمر کہتے ہیں۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی لغوی صاحب تاج العروس شرح قاموس میں رقمطراز ہیں ۔

یہ جان لینا چاہیے کہ باتفاق اہل لغت انگور کے کچے پانی کا جبکہ وہ نشہ آور ہو خمر نام ہونا حقیقت ہے حتیٰ کہ خمر کا استعمال اس میں مشہور ہے ۔ دوسری شرابوں میں کہ جو مختلف ناموں سے موسوم ہیں اس کا استعمال مجازاً ہے ۔

خمر یا تو اختمار سے ماخوذ ہے جس کے معنے خمیر اٹھنے کے ہیں چونکہ اس میں خمیر اٹھ کر جوش پیدا ہوتا ہے اور جھاگ آنے لگتے ہیں اس لیے اس کا نام خمر ہوا ، یا مخامرۃ سے مشتق ہے جس کے معنے چھپالینے کے ہیں چونکہ یہ وسواس کو گم کر دیتی ہے اور عقل و ہوش کو چھپا دیتی ہے اس لیے خمر سے موسوم ہوئی ۔ خمر کا استعمال عربی میں مونث ہوکر شائع و ذائع ہے اگرچہ بعض ائمہ لغت نے اس کی تذکیر کو جائز بتایا ہے لیکن لغت فصیح تانیث ہی ہے ۔ اصل میں لفظ خمر کے معنے چھا جانے کے ہیں اس لیے ہر وہ شے جس کا کھانا یا پینا عقل و ہوش پر چھا جائے وہ خمر میں شامل ہے ۔ حضرت عمر نے منبر نبوی پر کھڑے ہوکر فرمایا خمر وہ ہے جو عقل کو ڈھانک لے ۔ اگر صرف انگور کے کچے پانی نشہ آور کو ہی خمر کہتے ہیں تو پھر جیسا کہ بخاری میں ہے کہ عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں ۔

خمر کے حرام ہونے کے وقت میں پانچ شرابیں تھیں لیکن ان میں انگوری شراب کوئی نہ تھی ۔

کوئی بھی شراب نہ چھوڑتا کیونکہ حرام تو صرف انگوری شراب ہوتی تھی لیکن وہاں صورت معاملہ برعکس تھی ، لکھا ہے کہ

جرت فی سکک المدینہ

مدینہ کی گلیوں میں شراب بہتی تھی

اگر ان کے نزدیک شراب انگوری کو ہی خمر کہتے تھے اور وہاں انگوری شراب موجود نہ تھی تو پھر بہانے اور گرانے کی ضرورت ہی کیا تھی اس لیے خمر کے لفظ سے یہ سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ اس سے مراد کوئی خاص قسم کی شراب ہے جس کے لیے قرآن نے خمر کا لفظ استعمال کیا ہے ۔ امر واقعہ یہ ہے کہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہ نے یہی سمجھا کہ نشہ آور شراب سے بچنے کا حکم ہو رہا ہے مسلم ، ابوداؤد اور ترمذی میں عبداللہ ابن عمر کے حوالے سے حضور انور کا ارشاد گرامی آیا ہے کہ نشہ آور خمر ہے اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے اس لیے خمر ہر نشہ آور شراب ہے ۔ یہی مالکیہ ، شوافع اور حنابلہ کا مذہب ہے ۔

اور یہ بات بھی توجہ میں رکھیے کہ اگر خمر صرف انگوری شراب کو کہتے تو پینے والوں کے لیے لامحالہ ضرور دوسری شرابوں کے پینے کے لیے ایک بہانہ ہوتا جیسے پہلے دو بار ہو چکا تھا۔ لوگ انگوری نہ پیتے دوسری ان گنت شرابیں پی لیتے۔ امام قرطبی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے۔

> حضرت انس کی احادیث اپنی صحت اور بہتات میں ان لوگوں کے خلاف کھلا چیلنج ہیں جو کہتے ہیں کہ خمر شیرہ انگوری کو کہتے ہیں اور کسی شراب کو خمر نہیں کہتے، ان کا یہ کہنا لغت سنت اور تعامل صحابہ کے مخالف ہے۔ کیونکہ اس آیت کے نازل ہونے کے بعد صحابہ نے یہی سمجھا کہ ہر نشہ آور مشروب سے بچنے کا حکم ہوا ہے۔ انہوں نے انگوری اور غیر انگوری کی کوئی تفریق نہیں کی بلکہ ہر نشہ آور شراب کو پھینک دیا۔ یہ لوگ صاحب زبان ہیں ان کی زبان ہی میں قرآن نازل ہوا ہے۔ اگر ان کے خیال کے کسی گوشہ میں یہ بات ہوتی کہ خمر انگوری شراب کو کہتے ہیں وہ کبھی بھی شراب نہ پھینکتے۔

اگرچہ احناف نے خمر کے موضوع پر طول طویل بحثیں کی ہیں لیکن ہمیں امام محمد کا یہ فیصلہ پسند ہے۔ ما اسکر کثیرہ فقلیلہ حرام ہر وہ شراب جس کا کثیر مسکر ہو اس کا تھوڑا بھی حرام ہے۔ انگور، گیہوں، کھجور، انجیر، شہد سے تیار شدہ مشروب امام محمد کے نزدیک قطعاً حرام ہیں۔ صاحب درمختار کا یہ کہنا ہے۔ یعنی کہ قانون حنفی میں اسی پر فتویٰ ہے اور صرف یہی نہیں کہ شراب جسے قرآن نے خمر کہا ہے وہ حرام ہے بلکہ احناف نے اس معاملہ میں کچھ دوسروں سے زیادہ تشدد آمیز پالیسی اختیار کی ہے۔ وہ اسے صرف حرام نہیں کہتے بلکہ ناپاک اور نجس العین بھی بتاتے ہیں اسے حلال بتانے والے کو دائرہ اسلام میں داخل نہیں سمجھتے، مسلمان کے حق میں اسے مالیت والی چیز نہیں مانتے، ہر طرح سے اس سے انتفاع پر قدغن قائم کرتے ہیں اس کے پینے پر حد قائم کرتے ہیں۔ دوا بھی اس کے استعمال کو ناجائز کہتے ہیں۔ یاد رہے فقہ حنفی میں قانون وہ ہے جس پر ان کے یہاں فتویٰ ہو۔ اقوال منتشرہ کا نام فقہ حنفی نہیں ہے۔ بلکہ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ شراب پینے والے کا پسینہ بھی ناپاک ہوتا ہے اور پسینہ آنے سے اس کا وضو ٹوٹ جاتا ہے۔

بہرحال ہمیں احناف کی تفصیلی قانونی بحثوں سے ایک طرف ہو کر شیخ الحدیث مولانا محمد زکریا صاحب کا یہ فیصلہ ہی مناسب معلوم ہوتا ہے کہ

> نشہ آور ساری شرابیں ائمہ ثلاثہ اور امام محمد کے نزدیک حرام ہیں وہ سب کو خمر ہی قرار دیتے ہیں اور بغیر کسی تفصیل کے سب کو حرام قرار دیتے ہیں۔

اور

ائمہ ثلاثہ امام مالک، امام شافعی اور امام احمد نے شراب کی ساری قسموں کو حرام قرار دیا ہے اور بلاشبہ اس دور کے مطابق اس رائے کو اپنانا ہی احتیاط کا تقاضا ہے

اوجز المسالک

اسلام نے جب شراب کو حرام کیا تو اس کے سارے لوازم پر بھی سد ذرائع کے طور پر قانونی قدغن قائم کر دی۔ شروع شروع میں ان برتنوں کے استعمال کو بھی حرام کر دیا جن میں عموماً شراب بنائی جاتی تھی پھر جب لوگ شراب چھوڑنے کے عادی ہو گئے تو اس سختی کو ہٹا دیا۔

اس اصول کا ذکر کئی بار ہو چکا ہے کہ لا تعاونوا علی الاثم والعدوان گناہ اور تعدی میں ایک دوسرے کی مدد نہ کرو کے اصول کی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے: صرف شراب پینا بلکہ اس کا پلانا بنانا فروخت کرنا، خریدنا، لینا لے جانا سب حرام قرار دیا، فرمایا

خدا نے شراب پر اس کے پینے والے، پلانے والے، بیچنے والے، خریدنے والے، دوسروں کے لیے نچوڑنے والے، اپنے لیے نچوڑنے والے، اس کے لے جانے والے اور جس کے پاس لے جائی جائے سب پر لعنت فرمائی ہے۔

آیئے ذرا شراب کے بارے میں قرآن کی اس سنگینی کے نتائج پر بھی ایک نگاہ ڈال لیجئے اور اندازہ لگائیے کہ اسلام میں شراب کا مقام کیا ہے۔

شراب نگاہِ نبوت میں

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس گناہ سے بچانے کے لیے اور شراب کی نوعیت سمجھانے کے لیے مختلف طریقے اختیار فرمائے ہیں۔ ایک بار فرمایا:

ہر نشہ آور شراب ہے اور ہر نشہ آور حرام ہے۔ جو شخص دنیا میں شراب پیتا ہے اور اسی حال میں مر جاتا ہے اور اسے توبہ نصیب نہیں ہوتی ہے تو اسے آخرت میں شراب طہور نہ ملے گی۔

ایک بار جیشان کا ایک شخص بارگاہ نبوت میں حاضر ہوا اور کہا کہ ہمارے یہاں مکئی کی شراب پی جاتی ہے وہاں اصطلاح میں اسے مزر کہتے ہیں۔ آپ نے دریافت کیا کہ کیا وہ نشہ آور ہوتی ہے اس نے جواب دیا جی ہاں۔ آپ نے فرمایا۔

ہر نشہ آور حرام ہے اور اللہ تعالیٰ کے یہاں طے ہے کہ جو شخص نشہ آور چیز استعمال کرے گا اسے دوزخیوں کا پسینہ اور دھوون پلایا جائے گا۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب سے نفرت دلانے اور اس کے نقصان کو بتانے کے سلسلے میں فرمایا !

جو شخص کوئی نشہ آور چیز پیتا ہے اس کی چالیس دن کی نماز بے کیف اور معلق رہتی ہے جب وہ توبہ کرتا ہے تو اللہ اس کی توبہ قبول کرتا ہے۔

اور اس بات کی بھی حضور انور نے صراحت فرمادی ہے کہ کچھ لوگ شراب کو اس کا نام بدل کر استعمال کریں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہوگی مے نوشی مگر نام نئے ہوں گے۔ آپ کے الفاظ یہ ہیں۔

لَيَشْرَبَنَّ ناس من امتی الخمر يسمونها بغير اسمها

میری اُمت کے کچھ لوگ شراب نوشی اس کا نام بدل کر کریں گے

موجودہ دور میں یہی ہو رہا ہے۔ شراب کی بیسیوں قسمیں ہیں جنہیں لوگ استعمال کر رہے ہیں۔ نادان ہیں وہ لوگ جو اپنے نفس کو یہ کہہ کر دھوکہ دے رہے ہیں کہ اس قسم پر شراب کی تعریف صادق نہیں آتی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عباس کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :

شراب تمام بدکاریوں کی جڑ ہے اور سب سے بڑا گناہ۔ جو شخص پیتا ہے وہ ایسا مست ہوتا ہے کہ اسے خبر نہیں ہوتی کہ اپنی ماں پر جا پڑا یا خالہ پر یا پھوپھی پر۔

(جمع الفوائد)

جب عقل ہی زائل ہو جاتی ہے تو پھر اس کی ضمانت کیا ہے کہ وہ کیا نہیں کرے گا اور کیا کرے گا۔ اس وقت اور بھی جبکہ نشہ کے سرور میں اس کا دماغ آسمان سے باتیں کرتا ہو اور جنسی ہیجان قابو سے باہر ہو یقیناً نہ اس کو ماں کی تمیز باقی رہے گی اور نہ خالہ کی اور نہ پھوپھی کی۔

شراب اور ایمان

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

شراب پینے والا جس وقت شراب پیتا ہے ایمان کی حالت میں نہیں ہوتا، اس سے بچو اس سے بچو۔

مطلب یہ ہے کہ شراب نوشی شانِ ایمان کے منافی ہے اور ایک مومن کے لیے زیبا نہیں ہے کہ وہ شراب کو ہاتھ لگائے۔ ایمان عقل و شعور کو چاہتا ہے اور شراب نوشی ان کی موت ہے۔ جب ہوش و حواس قائم نہ رہیں تو جو زبان پر آئے آدمی بکتا چلا جاتے خواہ وہ کلمات کفر ہی کیوں نہ ہوں۔ شراب کی ان ہی برائیوں کی وجہ سے ان تمام لوگوں پر لعنت ڈالی گئی ہے جو اس میں کسی حیثیت سے بھی حصہ لیں اور اسی وجہ سے کسی حال میں بھی شراب نوشی کی اجازت نہیں ہے۔ دیلم الحمیری کا بیان ہے کہ میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ حضرت ہم لوگ ایک سرد علاقہ کے رہنے والے ہیں، جہاں ہمیں سخت محنت کے کام کرنے پڑتے ہیں۔ وہاں سردی کی شدت اور محنت شاقہ سے نمٹنے کے لیے شراب ضروری ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارے یہاں گیہوں سے شراب تیار کی جاتی ہے اور ہم لوگ اسے پیتے ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر پوچھا کیا وہ شراب نشہ آور ہوتی ہے۔ انہوں نے کہا جی ہاں نشہ آور ہوتی ہے۔ آپ نے فرمایا تو پھر اس سے اجتناب کرو۔ حضرت دیلم کہتے ہیں میں نے کہا یا رسول اللہ وہ لوگ نہیں چھوڑیں گے حضور انور نے فرمایا کہ اگر وہ شراب بند نہ کریں تو ان سے قتال کرو۔ (ابوداؤد)

شراب اور اسلام

جو کچھ پیش کیا گیا ہے اس سے یہ بات صراحت کے ساتھ معلوم ہوئی کہ شراب عقل کو زائل کرتی ہے اور اس میں دوسرے بیسیوں مفاسد ہیں وہ اسی لائق تھی کہ اسے حرام قرار دیا جاتے اور لوگوں کو اس لعنت سے جس طرح بن پڑے بچایا جاتے اور آج تجربہ کے بعد ساری دُنیا بھی چاہتی ہے کہ شراب نوشی بند ہو جاتے لیکن ناکام ہے یہ صرف اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے شراب کے نتائج بد دیکھ کر اس سے روکا۔ یہودیوں میں شراب کی حرمت قطعی نہ تھی بلکہ بعض اوقات اس کی تعریف بھی کر دی گئی ہے۔ دیکھو قاضیوں ۹: ۱۳ سموئیل ۲: ۱۶ امثال ۳۱: ۶ حکمائے یہود میں سے بعض نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جہاں شراب نہ ہو وہاں دوائیوں کی ضرورت پڑتی ہے۔ ہندوؤں میں بھی شراب کا استعمال کتب مقدسہ کی بنا پر جائز مانا گیا ہے۔ یجر وید میں جو چیز دیوتاؤں کو پیش کی جاتی ہیں ان میں سے ایک شراب بھی ہے۔ منو سمرتی میں ہے کہ مانس اور شراب ان دونوں کے کھانے میں کوئی دوش نہیں ہے۔ منو سمرتی ہی سے یہ ثابت ہے کہ بعض مذہبی تیوہاروں میں شراب پینے میں کوئی دوش نہیں ہے۔ عیسائیت نے تو یہی کر دی کہ مذہب کی بنیاد ہی شراب پر رکھ دی۔ دیکھو انجیل یوحنا ۲: ۱-۱۱ میں حضرت مسیح کا سب سے پہلا معجزہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ ایک شادی میں کچھ شراب کم ہو گئی لوگ پورے بدمست نہ ہونے تھے کہ حضرت مسیح نے پانی کے

مٹکوں کو شراب میں تبدیل کر کے اس کمی کو پورا کر دیا۔ یوں کہنا چاہیے کہ اس معجزے میں عیسائی مذہب کی آئندہ تاریخ کا نقشہ کھینچا ہے کہ یہ قوم پانی کی جگہ شراب ہی پیئے گی اور اس سے بھی بڑھ کر یہ ہے کہ کوئی شخص عیسائی رہ نہیں سکتا جب تک سال بھر میں ایک بار شراب نہ پیئے کیونکہ عید فسح میں شراب جزو لازم ہے بلکہ اسی شراب کے گھونٹ کو مسیح کے خون کے قائمقام قرار دے کر استحاد عیسائیت کو چھوڑ کر سب مذاہب میں نیک اور راست باز لوگ شراب سے مجتنب رہے ہیں۔ گروہ دوسروں کو اس سے نزدیک سکے ہوں مگر شراب کے خطرناک دیو کو ہلاک کرنے کے لیے اسی عظیم الشان قوت قدسی کی ضرورت تھی جو محمد رسول اللہ کے علاوہ اور کسی کو نہیں دی گئی اور آپ کی یہ قوت درجہ کمال کو پہنچی ہوئی تھی کہ وہ چیز جس کی خطرناک گرفت سے ایک انسان کو بچانا بھی مشکل ترین کام ہے۔ اس سے آپ نے آناً فاناً ایک قوم کی قوم اور ایک ملک کے ملک کو ایسا پاک کر دیا کہ شراب تو کیا وہ برتن بھی باقی نہ رہے جن میں شراب بنائی جاتی تھی۔

شراب نوشی کی سزا

اسلام نے صرف سمجھانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس نے اس کے مرتکب کے لیے قانون بھی بنایا ہے تاکہ شراب نوشی بند ہو۔ اور اس راستہ سے جو خانہ جنگی، بغض و عداوت، ملکی امن و امان میں خلل اور دوسری مصیبتیں پیش آتی رہتی ہیں۔ ان پر آہنی دیوار تعمیر ہو سکے۔ شراب نوشی کا جرم ثابت ہو جائے گا۔ اقرار سے ہو یا شہادت سے۔ اگر وہ عاقل و بالغ مسلمان ہے، مجبور و مضطر نہیں ہے تو اس پر حد جاری ہو گی۔ قانون کی کتابوں میں تفصیلات موجود ہیں کہ کن صورتوں میں حد جاری ہوتی ہے اور کن حالتوں میں نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً صرف شراب کی بو یا اس کی قے پر حد نہیں لگتی ہے۔ اسی وجہ سے حکم ہے کہ مقدمہ جب حاکم کے پاس آئے تو وہ گواہوں سے دریافت کرے کہ شراب کی ماہیت کیا ہے؟ پینے والے نے بخوشی پی، یا جبراً۔ وہ کب پی اور کہاں پی۔ پھر وہ یہ بھی دیکھے کہ گواہ شرعی قانون شہادت کے مطابق معتبر ہیں یا نہیں۔ مقدمہ جب ان تمام منزلوں سے گزر کر پورے طور پر ثابت کر دے کہ مجرم نے ٹھیک ٹھیک شراب پی ہے تو اس کے لیے عدالت اسی کوڑے مارنے کا فیصلہ دے گی۔ مگر یہ ہدایت ضروری ہے کہ کوڑے بدن کے مختلف حصوں پر مارے جائیں اور یہ بھی ضروری ہے کہ یہ سزا وہاں دی جائے گی جہاں اسلامی قانون نافذ ہو یعنی وہ ملک دارالاسلام ہو۔

شرابی کی سزا زمانہ نبوت میں

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں جس پر شراب نوشی کا جرم ثابت ہوجاتا یا وہ اقرار کرتا اور آپ سے حد جاری کرنے کی درخواست کرتا تو آپ اس کی ضرب و تادیب کا حکم دیتے، کوئی ہاتھ سے مارتا، کوئی جوتے مارتا کوئی کوڑے سے اور کوئی کھجور کی ٹہنیوں سے۔ حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ ایک شرابی خدمت اقدس میں لایا گیا۔ اس کا جرم ثابت تھا۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا:

اس کی پٹائی کرو، حکم ملتے ہی ہم میں سے کوئی ہاتھ سے مارنے لگا کوئی اپنے جوتے سے کوئی اپنے کپڑے سے۔

اس سزا کے بعد جب وہ واپس ہوا تو کسی نے اس کو مخاطب کرکے کہا کہ اللہ تجھ کو ذلیل کرے اخزاک اللہ حضور انور نے جب یہ جملہ سنا تو فرمایا ایسا نہ کہو اور اس کے خلاف شیطان کی مدد نہ کرو، اس سے معلوم ہوا کہ شرابی کو سزا دینا درست ہے لیکن اسے بددعا دینی ٹھیک نہیں ہے کیونکہ یہ بظاہر دعا کا محتاج ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دے۔

حدیث میں عبداللہ نامی ایک شخص کا واقعہ مذکور ہے جن کا لقب حمار تھا اور جن کی باتوں سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی ہنس پڑتے تھے کیونکہ ان کے مزاج میں خوش طبعی تھی کہ ان کی باتوں پر خواہ مخواہ ہنسی آتی تھی۔ شراب نوشی کے سلسلے میں ان کو سزا دی گئی۔ یہ جب مجرم کی حیثیت سے بارگاہ نبوت میں لائے گئے تو حسب دستور سزا دی گئی۔ اسی وقت حاضرین میں سے کسی کے منہ سے نکل گیا اے اللہ اس پر لعنت فرما کہ یہ شراب جیسی گندی چیز پیتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ بات سنی تو فرمایا:

اس پر لعنت نہ بھیجو۔ مجھے یہی معلوم ہے کہ یہ اللہ اور اس کے رسول سے محبت کرتا ہے۔

مطلب یہی ہے کہ قانونی سزا تو بے شک دی جاتے لیکن ایک مسلمان کو دوسرے مسلمان پر لعنت کی اجازت نہیں ہے۔ بددعا کی جگہ ایسا شخص دعاؤں کا محتاج ہے کہ اللہ تعالیٰ اسے حرام کے ارتکاب سے آئندہ بچائیں۔ اور اپنی مرضیات پر چلائیں۔

شرابی کی سزا زمانہ خلافت میں

حضرت صدیق اکبر کے زمانہ خلافت میں بلکہ فاروق اعظم کے ابتدائی دور خلافت میں شراب نوشی کی

سزا چالیس کوڑے تھی۔ مگر جب اس قسم کے مقدمات زیادہ آنے لگے تو حضرت عمرؓ نے صحابہ کرام کو جمع کر کے اس موضوع پر مشورہ کیا۔ گفتگو اور بحث و مباحثہ کے بعد متفقہ طور پر اسی کوڑے کی سزا مقرر ہوئی۔ یہی سزا قرآن نے تہمت لگانے والے کے لیے مقرر کی ہے۔ حضرت انسؓ کا بیان ہے :

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرابی کو کھجور کی شاخ اور جوتے لگوائے، پھر حضرت ابوبکرؓ نے چالیس کوڑے سزا دی لیکن فاروق اعظمؓ کے زمانے میں سبزہ زاروں اور دیہات سے لوگ جمع ہو گئے تو حضرت عمرؓ نے مشورہ کیا کہ شرابی کو کیا سزا دی جائے۔ عبدالرحمٰن بن عوف نے کہا کہ میری رائے میں قرآن کی بتائی ہوئی حدود میں جو سب سے ہلکی سزا ہے وہ آپ مقرر کر دیں۔ لہٰذا حضرت عمرؓ نے اسی کوڑے سزا مقرر کر دی۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس سزا پر صحابہؓ کا اجماع ہو گیا۔ سب نے اس کی تائید کی کسی نے مخالفت نہیں کی۔ اس پر استدلال تہمت لگانے والے کی سزا سے اس طرح کیا کہ شراب پینے والے کی عقل جاتی رہتی ہے وہ حالتِ نشہ میں اول فول بکتا ہے اور خواہ مخواہ الزام لگاتا ہے۔ گویا افتراء پردازی کا جرم کرتا ہے اور افتراء کی سزا قرآن نے اسی کوڑے بتائی ہے لہٰذا شرابی کی سزا بھی زیادہ سے زیادہ یہی ہو سکتی ہے۔ چنانچہ ثور بن زید الدیلمی کہتے ہیں کہ :

حضرت عمرؓ نے شراب نوشی کی سزا کے سلسلے میں صحابہ سے مشورہ کیا۔ حضرت علیؓ نے فرمایا کہ اسی کوڑے مقرر فرمائیے کیونکہ شرابی جب شراب پیتا ہے مدہوش ہو جاتا ہے اور ہوش و حواس کھو کر بکواس کرتا ہے اور بکواس میں افتراء پردازی کرتا ہے چنانچہ حضرت عمرؓ نے شراب کے لیے اسی کوڑے سزا مقرر کر دی۔

صحیح مسلم میں حضرت علیؓ کا بیان نقل ہوا ہے کہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اور حضرت ابوبکرؓ نے شرابی کو چالیس کوڑے سزا دی اور حضرت عمرؓ نے اسی کوڑے سزا دی اور دونوں باتیں سنت ہیں۔

حاکم نے اپنی سند کے ساتھ حضرت عثمانؓ کا بھی ذکر کیا ہے کہ حضرت عثمانؓ نے بھی اسی کوڑے سزا دی اور یہ سب سنت ہے۔

یہاں سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو گیا کہ زمانہ خلافت راشدہ کے کسی عمل کو بدعت نہیں کہا جا سکتا خواہ اس کی نظیر زمانہ نبوت میں موجود نہ ہو۔ یہ روایت صحیح مسلم کی ہے اور کہنے والے حضرت علیؓ خلیفہ راشد ہیں جو سنت اور بدعت کے مفہوم کو بخوبی جانتے ہیں اور اس میں وہ حضرت عمرؓ اور حضرت عثمانؓ کے

کے عمل کو بھی سنت ہی کہتے ہیں جو بظاہر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل کے خلاف ہے چنانچہ امام نووی اس کی شرح میں لکھتے ہیں :

یہ روایت اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت علی حضرت عمر کے آثار کو عظمت کی نگاہ سے دیکھتے تھے اور ان کے حکم اور قول کو سنت کہتے تھے ۔ اسی طرح حضرت ابوبکر کے بارے میں بھی ان کے یہی تاثرات تھے ۔

اسی بنا پر حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں پوری قوت کے ساتھ لکھا ہے کہ

شیخین کا قول حجت ہے جب دونوں یعنی ابوبکر و عمر متفق ہو جائیں تو اس سے ہٹنا جائز نہیں ہے اسی طرح ائمہ اربعہ ابوبکر، عمر، عثمان اور علی کا اتفاق بھی حجت ہے ۔

پتہ نہیں امیر یمانی محمد بن اسماعیل نے یہ بات سبل السلام میں کیسے لکھ دی ہے کہ "خلیفہ راشد کو کوئی ایسا طریقہ رائج کرنے کا حق نہیں ہے جس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم عامل نہ تھے، حالانکہ اگر صحابہ کرام کا کسی بات پر اتفاق ہو جائے تو اس کے حجت اور قطعی ہونے میں شاید ہی کوئی کلام کرتا ہو چنانچہ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ اقامۃ الدلیل میں رقمطراز ہیں کہ صحابہ کرام کا اجماع واجب الاتباع ہے بلکہ صحابہ کرام کا اجماع قوی تر حجت اور دوسری غیر منصوص حجتوں پر مقدم ہے ۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لکھتے ہیں :

اہل السنہ والجماعۃ اس پر متفق ہیں کہ صحابہ کرام کا اجماع حجت ہے ۔

اسی بنا پر ملا علی قاری نے شرابی کی سزا اسی کوڑوں کے بارے میں لکھا ہے کہ

شراب نوشی کی سزا اسی کوڑے طے پائی جس پر صحابہ کرام نے اجماع کیا ۔ اب کسی کے لیے اس کی مخالفت جائز نہیں ہے چاہے سرکشی میں کتنا ہی اضافہ ہو جائے

(مرقاۃ ص ۱۰۱ ج ۴)

حافظ ابن عبدالبر کے حوالہ سے مولانا عبدالحی لکھنوی نے لکھا ہے کہ جمہور کے نزدیک شراب نوشی کی سزا طے ہے کیونکہ حضرت عمر کے زمانہ میں اس سزا پر صحابہ کرام کا اجماع ہو چکا ہے ۔ کسی صحابی نے اس کی مخالفت نہیں کی ہے ۔

شراب کے موضوع پر اہل علم مزید تفصیل دیکھنا چاہیں تو تفسیر المنار جلد ہفتم کا مطالعہ کریں مولف نے اس موضوع پر سیر حاصل بحث کی ہے ۔

قمار بازی کی حرمت

اہل عرب میں شراب خوری کے ساتھ قمار بازی کا بھی عام رواج تھا ۔ عرب کی سوسائٹی میں جو تے

اور شراب کے جہاں بہت مضر پہلو تھے وہاں کچھ مفید پہلو بھی تھے۔ جیسا کہ ہم دوسری جلد میں تفصیل سے بتا آئے ہیں۔ عرب کے سخی اور حوصلہ مند لوگوں میں یہ روایت تھی کہ خاص طور پر سردیوں کے موسم میں وہ اکٹھے ہو کر خوب شراب پیتے، پھر شراب کی مستی میں جس کسی اونٹ یا اونٹنی کو چاہتے ذبح کر دیتے، پھر اس کے مالک کو منہ مانگے دام دیتے اور اس کے گوشت پر جوا کھیلتے اور ہر شخص جتنا گوشت جیتتا وہ اس کو غریبوں اور فقیروں پر لٹا دیتا۔ یہ روایت عرب میں بڑی محبوب تھی۔ جو لوگ اس قسم کی تقریب منعقد کرتے یا اس میں شریک ہوتے ان کو بڑا سخی سمجھا جاتا اور معاشرے میں ان کی بڑی عزت ہوتی اس کے برعکس جو لوگ اس سے الگ رہتے ان کے لیے برم کا لفظ استعمال کرتے۔

میسر یا قمار ہر وہ معاملہ ہے، جو نفع و نقصان کے درمیان دائر اور مبہم ہو، اُردو زبان میں اس کو جوا کہتے ہیں مثلاً دو شخص باہم ایک دوسرے سے معاملہ کریں کہ دونوں دوڑتے ہیں اگر تم آگے نکل گئے تو میں تم کو ہزار روپیہ دوں گا اور اگر میں نکل گیا تو تم مجھے ہزار روپیہ دینا، یا اس طرح کہ اگر آج بارش ہو گئی تو تم ایک ہزار دینا اور اگر نہ ہوئی تو میں تم کو دوں گا۔ یا بند ڈبے میں ایک مقررہ قیمت مثلاً چار آنے فی ڈبہ کے حساب سے فروخت کیے جائیں، کسی ڈبے میں پانچ روپے کی چیزیں ہوں اور کسی ڈبے میں دو پیسے کی تو اس ابہام اور دائرٌ بین النفع والضرر صورت میں اس کی خریداری قمار ہے۔ اس کی لاتعداد صورتیں ہو سکتی ہیں اور تمدن میں تغیر و تبدیلی کے ساتھ اس کی صورتوں میں بھی تنوع ہوتی رہتی ہے قرآن نے شراب کے ساتھ میسر اور قمار بھی حرام کیا ہے۔

قمار کی مروجہ صورتیں

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ، فرماتے ہیں کہ شطرنج بھی قمار میں داخل ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ ہر چیز جو قمار میں داخل ہے وہ میسر کے حکم میں ہے یہاں تک کہ بچے جو اخروٹ کھیلتے ہیں وہ بھی قمار ہے۔ حضرت راشد بن سعد اور حمزہ ابن حبیب کہتے ہیں کہ بچے جو لکڑیوں سے یا اخروٹ سے اور بیضوں سے ہار جیت کا جو کھیل کھیلتے ہیں یہ بھی قمار میں داخل ہے۔

قمار کی مذکورہ بالا تعریف اور صحابہ کرام کی تشریح سے معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے زمانہ کے مختلف اقسام کے کھیل بھی قمار میں داخل ہیں۔

موجودہ زمانے میں م[illegible] بالا مرتبہ بھی قمار میں داخل ہے جس کی سینکڑوں صورتیں بازاروں اور کارخانوں میں رائج ہیں جن [illegible] معروف اقسام کے احکام یہ ہیں۔

آج کل وبا کی طرح قمار کی ایک صورت معمّہ کی شکل میں عام ہو گئی ہے جو حل معمّہ کے عنوان سے بہت سے اخبارات اور ماہوار رسالوں کا بہت بڑا کاروبار ہے۔ معمّہ کی مختلف صورتیں لکھ کر اشتہار دیا جاتا ہے کہ جو شخص اس کا کوئی حل کر کے روانہ کرے اور اس کے ساتھ اتنی فیس روانہ کرے۔ مثلاً ایک روپیہ فیس بھیجے تو جن لوگوں کے حل صحیح ہوں گے ان میں سے انعام اس شخص کو دیا جائے گا جن کا نام لاٹری یا قرعہ اندازی کے ذریعے نکل آئے۔ یہ صورت قمار ہے اور شرعاً ناجائز ہے۔

اسی طرح بازاروں اور نمائشوں میں بند ڈبے فروخت کیے جاتے ہیں کسی میں ایک پیسہ کا بھی مال نہیں ہوتا ہے اور کسی میں زیادہ مال ہوتا ہے۔ لوگ اس کو قسمت آزمائی سمجھ کر اختیار کرتے ہیں یہ بھی کھلا ہوا میسر ہے جو حرام ہے۔

بعض شہروں میں بچے بادام، اخروٹ یا کانچ کی گولیوں وغیرہ سے ہار جیت کرتے ہیں۔ یہ بھی قمار وغیرہ میں داخل ہے اور حرام ہے۔ بعض شہروں میں کنکوے اڑا کر پیسوں کی ہار جیت کا کھیل کھیلا جاتا ہے دیہات میں لکڑیوں کی گٹھڑیوں یا سرکنڈے کے پوروں سے ہار جیت کا کھیل ہوتا ہے یہ بھی قمار ہے۔

اسی طرح سٹہ کا سارا کاروبار سٹہ ہی ہے اور بنص قرآن حرام ہے اس کاروبار میں کسی قسم کی اعانت بھی حرام ہے۔

بعض لوگ پتنگ بازی اور کبوتر بازی پر روپیہ کی ہار جیت کھیلتے ہیں۔ یہ کھیل قمار میں داخل ہونے کی وجہ سے حرام ہیں۔

بیمہ کے کاروبار کو امداد باہمی کا نام دے کر جائز قرار دینے کی کوشش کی جاتی ہے لیکن اس کی مروجہ صورتیں جتنی ہمیں معلوم ہیں سود اور قمار سے خالی نہیں ہیں اس لیے حرام ہیں۔ اس کی تفصیل تیسری جلد میں گزر چکی ہے۔

کیا ریس قمار میں داخل ہے؟

گھوڑ دوڑ جسے آج کل ریس کہا جاتا ہے۔ اس میں ابتلائے عام ہے۔ یہ صحیح ہے کہ قرآن و سنت نے جن کھیلوں کی حوصلہ افزائی کی ہے جن کے ذریعے قوت جہاد اور تربیت جسمانی ہوتی ہے۔ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے عمل سے اس کے استحسان کو ظاہر فرمایا۔ آپ نے خود گھوڑ دوڑ کرائی پیادہ دوڑ پر انعام دیا، تیر اندازی اور پیراکی سیکھنے کی ترغیب دی۔ حبشیوں کی نیزہ بازی کو خود کھڑے ہو کر معائنہ فرمایا اور صدیقہ عائشہ کو دکھلایا۔ اس کے مقابلے میں ان کھیلوں کی حوصلہ شکنی فرمائی جن میں کوئی دینی یا

دنیاوی فائدہ نہیں یا جن میں انفرادی و اجتماعی نقصانات ہیں۔ ان ہی ضرر رساں صورتوں میں وہ کھیل ہیں جن میں قمار ہو۔

گھوڑ دوڑ بلاشبہ ایک مفید ریاضت ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے قولاً و فعلاً اس کی اجازت دی ہے اور اس میں بازی لگانے اور بازی لے جانے والے کے لیے مشروط انعام کی بھی خاص شرائط کے ساتھ اجازت دی ہے۔ آئیے اسی موضوع پر چند ارشادات نبوت گوش گزار فرمالیجئے۔

سنن اربعہ، مسند امام احمد اور مستدرک حاکم بحوالہ حضرت ابوہریرہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

لا سبق الا فی خف او نصل او حافر

سبق کے معنے اس معاوضہ یا انعام کے ہیں جو کسی بازی میں آگے بڑھنے والے کو دیا جاتا ہے اور یہ انعام سرکار کی جانب سے ہو یا متسابقین میں سے کسی ایک کی جانب سے ہو۔ جیساکہ جمہور کی رائے ہے۔ حدیث کے معنے یہ ہیں کہ کسی مسابقت میں معاوضہ یا انعام مقرر کرنا جائز نہیں ہے بجز اونٹوں کی دوڑ کے یا گھوڑ دوڑ کے یا تیر اندازی کے۔ ان تین کے علاوہ بعض فقہا نے پیادہ دوڑ کو بھی بیان کیا ہے۔ کیونکہ پیادہ دوڑ بھی جہاد میں معین و مددگار ہوتی ہے۔ اسی سلسلے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ عمل بھی ہے کہ عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ حضور انور نے گھوڑ دوڑ کرائی۔

اس لیے گھوڑ دوڑ کی جائز صورتیں یہ ہیں۔

اول یہ کہ فریقین جو اپنے گھوڑے دوڑا رہے ہوں ان کو باہم ایک دوسرے سے کچھ لینا دینا نہ ہو بلکہ سرکار یا کسی تیسرے شخص یا جماعت کی طرف سے بطور انعام کے کوئی رقم آگے بڑھنے والے کے لیے مقرر ہو۔

دوسری صورت یہ ہے کہ آگے بڑھنے والے کے لیے معاوضہ یا انعام فریقین ہی میں سے کسی ایک کی جانب سے ہو دونوں طرف سے نہ ہو۔ مثلاً رشید اور حامد گھوڑوں کی دوڑ میں حصہ لے رہے ہیں۔ رشید یہ کہے کہ اگر حامد آگے بڑھ گیا تو میں ایک ہزار دوں گا۔ حامد کی طرف سے ایسی کوئی بات نہ ہو دونوں جانب سے اگر شرط ہوگی تو یہ قمار ہے۔

تیسری صورت میں فریقین میں دو طرفہ شرط بھی حنفیہ کے نزدیک اس وقت جائز ہے جب کہ فریقین ایک تیسرے گھوڑے سوار کو اپنے ساتھ شامل کرلیں۔ اس کی دو صورتیں ہو سکتی ہیں ایک یہ کہ معاملہ اس طرح طے ہو کہ رشید آگے بڑھ جاتے تو حامد ایک ہزار روپیہ اس کو دے اور اگر حامد آگے بڑھ جائے تو رشید اتنی رقم اس کو دے گا اور اگر خالد آگے بڑھ جاتے تو اس کو کچھ نہ ملے گا۔ دوسرے یہ کہ شرط

اس طرح ہو کر خالد آگے بڑھ جائے تو رشید و حامد دونوں اس کو ایک ہزار روپیہ دیں۔ اور رشید و حامد دونوں یا ان دونوں میں سے کوئی ایک آگے بڑھے تو خالد کے ذمہ کچھ نہیں ہے لیکن رشید و حامد میں باہم جو آگے بڑھے دوسرے پر اس کو ایک ہزار روپیہ ادا کرنا لازم ہو۔

ان دونوں صورتوں میں جو تیسرا آدمی شریک کیا گیا ہے اس کو حدیث کی اصطلاح میں مُحلّل کہا گیا ہے اور دونوں صورتوں میں یہ امر مشترک ہے کہ تیسرے آدمی کا معاملہ نفع و ضرر میں دائر نہیں ہے بلکہ ایک صورت میں اس کا نفع متعین ہے۔ دوسری میں اس کا کچھ نقصان نہیں ہے۔ اس تیسری صورت کے لیے حدیث میں یہ ضروری شرط بتائی گئی ہے کہ یہ تیسرا خالد کا گھوڑا رشید و حامد کے گھوڑوں کا ہم پلہ ہو ایسا نہ ہو کہ کمزور ہو یا اس میں کوئی عیب ہو یا ان سے زیادہ طاقتور ہو کر اس کا آگے بڑھ جانا یقینی ہو ارشاد ہے:

جس شخص نے دو گھوڑوں میں تیسرا گھوڑا داخل کیا اور اسے اس کے آگے بڑھ جانے کا اندیشہ نہیں ہے تو کوئی مضائقہ نہیں ہے اور آگے بڑھ جانے کا اندیشہ ہے تو یہ قمار ہے (ابوداؤد)

فقہ احناف کی مختلف کتابوں مثلاً بدائع الصنائع، فتاویٰ عالمگیری اور درمختار میں بھی یہ سب تفصیل موجود ہے۔

اس کے علاوہ فقہائے نے یہ شرطیں بھی لکھی ہیں کہ مسابقت میں ابتدا اور انتہا معلوم ہو۔ مسافت بھی معلوم ہو اور انعام کی مقدار بھی مقرر ہو اور دو گھوڑے یا دو سے زائد بھی معین ہوں۔

گھوڑ دوڑ کی ناجائز صورتیں

اوّل معاوضہ یا انعام کی شرط فریقین میں دو طرفہ ہو تو یہ قمار ہے۔

دوسرے، ریس کی مروجہ شکل کہ گھوڑوں کی دوڑ کسی کمپنی کی جانب سے ہو، گھوڑے کمپنی کی ملک ہوں اور سوار کمپنی کے ملازم ہوں۔ اور تماشہ بین گھوڑوں کے نمبر پر اپنا داؤ لگائیں اور اس کی فیس داخل کریں۔ جس نمبر کا گھوڑا آگے بڑھ جائے اس پر داؤ لگانے والے کو انعام کی رقم مل جائے باقی سب کی فیس ضبط ہو جائے۔

یہ صورت قطعاً میسر میں داخل ہے اور بالکل حرام ہے۔ اسی طرح اگر اونٹوں کی دوڑ ہو یا پیدل دوڑ ہو اور نشانہ بازی لگانے کا مقابلہ ہو تو اس کا بھی یہی حکم ہے کہ میسر ہے جو از روئے قرآن حرام ہے۔ ہاں ایسے کھیل جن کا مقصد بدن کی ریاضت ہو اور کوئی معاوضہ یا انعام باہم مقرر نہ ہو جائز ہیں مثلاً والی بال

فٹ بال، ہاکی، پہلوانوں کی کشتی، معمہ بازی، شعر بازی اور تعلیمی تاش وغیرہ میں ہار جیت کی بازی لگانا جائز ہے مگر اس پر کوئی رقم معاوضہ مقرر کرنا جائز نہیں ہے۔

انعامی بانڈز

صحیح صورت یہ ہے کہ اپنی نوعیت کے لحاظ سے یہ بانڈز بھی اسی نوعیت کے قرضے ہیں جو حکومت اپنے مختلف کاموں میں لگانے کے لیے لوگوں سے لیتی ہے اور ان پر سود ادا کرتی ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ پہلے ہر وثیقہ دار کو اس کی دی ہوئی رقم پر فرداً فرداً سود دیا جاتا تھا مگر اب جملہ رقم کا سود جمع کر کے اسے چند وثیقہ داروں کو بڑے بڑے انعامات کی شکل میں دیا جاتا ہے اور اس امر کا فیصلہ کہ یہ انعامات کن کو دیے جائیں۔ قرعہ اندازی کے ذریعے سے کیا جاتا ہے۔ پہلے ہر وثیقہ دار کو سود کا لالچ دے کر اس سے قرض لیا جاتا تھا اب اس کے بجائے ہر ایک کو یہ لالچ دیا جاتا ہے کہ شاید ہزاروں روپے کا انعام تیرے ہی نام نکل آئے اس لیے قسمت آزمائی کرے۔ یہ صورت واقعہ صاف بتاتی ہے کہ اس میں سود بھی اور قمار بھی ہے۔ جو شخص وثائق خریدتا ہے وہ اولاً رہا رد پیر جان بوجھ کر ایسے کام میں قرض دیتا ہے جس میں سود لگایا جاتا ہے۔ ثانیاً جس کے نام پر انعام نکلتا ہے لسے دراصل وہ سود اکٹھا ہو کر ملتا ہے جو عام سودی معاملات میں فرداً فرداً ایک ایک وثیقہ دار کو دیا جاتا تھا۔ ثالثاً جو شخص بھی یہ وثیقے خریدتا ہے وہ مجرد قرض نہیں دیتا بلکہ اس لالچ میں قرض دیتا ہے کہ اسے اصل سے زائد انعام ملے گا اور یہی لالچ دے کر قرض لینے والا اس کو قرض دینے پر آمادہ کرتا ہے اس لیے اس میں نیت سودی لین دین ہی کی ہوتی ہے۔ رابعاً جمع شدہ سود کی وہ رقم جو بصورت انعام دی جاتی ہے اس کا کسی وثیقہ دار کو ملنا اس طریقہ پر ہوتا ہے جس پر لاٹری میں لوگوں کے نام انعامات نکلا کرتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ لاٹری میں انعام پانے والے کے سوا باقی تمام لوگوں کے ٹکٹوں کی رقم ماری جاتی ہے اور سب ٹکٹوں کا روپیہ ایک انعام دار کو مل جاتا ہے لیکن یہاں انعام پانے والوں کے سوا باقی سب وثیقہ داروں کی اصل رقم قرض ماری نہیں جاتی بلکہ صرف وہ سود جو سودی کاروبار کے عام قاعدے کے مطابق ہر دائن کو اس کی دی ہوئی رقم قرض پر ملا کرتا ہے انہیں نہیں ملتا بلکہ قرعہ کے ذریعے سے نام نکل آنے کا اتفاقی حادثہ ان سب کے حصوں ایک یا چند آدمیوں تک اس کے پہنچنے کا سبب بن جاتا ہے۔ اس بنا پر یہ بعینہٖ قمار تو نہیں مگر اس میں روح قمار ضرور موجود ہے۔

بہرحال میسر یا قمار لوگوں کے مال کو ناجائز طور پر کھانے کی ایک وہ شکل ہے جس میں لاکھوں اور

کروڑوں کی دولت ملنے والے کو اس طرح مل جاتی ہے کہ پورے ملک کے کسی باشندے کو اس کے معاوضہ میں کچھ نہیں ملتا ہے۔ غور فرمائیے کہ قمار اور میسر میں جو رقم جیتنے والے کو ملتی ہے اس کے بدلے میں ہارنے والوں کو نہ سہی کسی اور کو وہ کیا دیتا ہے۔ واقعہ یہ ہے قمار میں جتنے غصہ میں بھرے ہوتے دل سے مال دیا جاتا ہے شاید اتنا غصہ تو چوروں اور ڈاکوؤں پر ان لوگوں کو نہیں ہوتا جن کا مال چوری ہوتا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں صحیح فرمایا ہے۔

جوئے باز جوئے میں لوگوں کے اموال کو اس طرح اچکتا ہے کہ اس میں بالکلیہ جہالت حرص اور جھوٹی آرزوؤں کے ہاتھوں آدمی گرفتار ہوتا ہے۔ اور دھوکہ پر سوار ہو کر اس میدان میں کودتا ہے اور حرص، غلط آرزو وغیرہ اسکو ان شرائط کے مان لینے پر آمادہ کر دیتی ہے جنہیں نہ شہری زندگی کی تعمیر اور نہ باہمی امداد میں دخل ہے۔ ہارنے والا اگر ہارنے کے بعد خاموش رہتا ہے تو اس کی یہ خاموشی غصہ اور ایسی ناکامی ونامرادی کی چنگاریوں پر قائم ہوتی ہے جن میں وہ اپنے قصد وارادے سے گھسا تھا۔ یوں ہی جیتنے والا اپنی جیت سے لذت گیر ہوتا ہے اور اس کاروبار کی چھوٹی مقدار بڑی مقدار کو دعوت دیتی ہے اور اس کی حرص اس کو اس فعل سے باز آنے کی اجازت نہیں دیتی ہے بالآخر کچھ ہی عرصہ کے بعد اس کا تاوان اس پر اس کے سر پر مسلط ہو جاتا ہے۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ اگر کسی ملک کے باشندوں میں لین دین کی اس عادات بد کا رواج ہو جاتا ہے تو بالآخر اس کا نتیجہ۔

ملک کی دولت عامہ کے نظام میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے اور باہمی طویل جھگڑوں کے سلسلے کی بنیاد پڑ جاتی ہے اور حصول معاش کے جو صحیح اور مطلوب ذرائع ہیں ان کے دروازے بند ہونے لگتے ہیں، لوگ اس باہمی امداد و اعانت سے لاپرواہی برتنے لگتے ہیں جس پر تمدن کی بنیاد قائم ہے۔

فرماتے ہیں،

دوسروں کی خبر سے خود معائنہ اور مشاہدہ اس باب میں تمہیں بے نیاز کر سکتا ہے آخر جواریوں میں تم نے ان امور کے سوا جن کا میں نے ذکر کیا ہے کبھی بھی کسی اور چیز کا مشاہدہ کیا ہے۔

بہرحال ملک کی معاشی قوتوں کا ایک بڑا حصہ قمار کے ذریعہ سے ضائع ہو جاتا ہے اس لیے اسلام

نے صرف قمار کی حقیقی شکلوں ہی کو نہیں بلکہ بعض معاملات میں تھوڑا بہت بھی قمار ہی رنگ پایا جاتا تھا ان کو بھی ممنوع قرار دے دیا۔ عرب میں خرید و فروخت کی کچھ صورتیں ایسی تھیں جنہیں موجودہ زمانے کا سٹہ کہنا چاہیے اور متمدن ممالک میں اب تک ان کا رواج ہے۔ اسلام نے اسی قمار کی وجہ سے ان کو غیر قانونی قرار دیا۔ مثلاً منابذہ، کپڑے کو پھینک دیا جاتا تھا جس پر کسی کا ہاتھ پڑ جاتا وہ اس کا جبری خریدار بن جاتا تھا۔ ملامسہ، جس کپڑے پر ہاتھ پڑ گیا جبراً اس کی خریداری ناگزیر تھی۔ اسی طرح کی اور بہت سی صورتیں تھیں جو اسلامی معاشیات کے باب سے خارج کر دی گئیں۔

انصاب اور ازلام کے بارے میں ہم تشریحی نوٹ چھٹی جلد میں لکھ چکے ہیں۔ بہرحال خمر ہو یا میسر انصاب ہو یا ازلام، قرآن نے یہاں ان کو رجس اور عمل شیطانی قرار دیا ہے۔ رجس کے معنے ناپاک، پلید، گندہ، عقوبت، عذاب اور بلا کے آتے ہیں

امام راغب فرماتے ہیں کہ رجس چار طرح سے ہوتا ہے۔ ۱۔ طبعی طور پر، ۲۔ عقلی طور پر، ۳۔ شرعی طور پر۔ ۴۔ طبعی عقلی اور شرعی طور پر۔ رجس شرعی جوا اور شراب ہے۔ رجس عقلی شرک اور لحم الخنزیر ہے۔ تینوں کا مجموعہ مردار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سب کے لیے رجس استعمال کیا ہے اور یہ جو فرمایا ہے کہ من عمل الشیطان کہ یہ شیطانی کام ہیں۔ اس کے کئی مطلب ہو سکتے ہیں۔ ایک چیز تو کھلی ہوئی ہے یعنی شراب اور بتوں کے چڑھاوے اور بانٹ کے پانسوں کو ملا کر شیطان کے ناپاک اور گندے کاموں میں شمار کیا ہے اس لیے ان سب کی باطنی گندگی اور نجاست میں کوئی شبہ نہیں ہے اس کے علاوہ کسی کام کے شیطان کی طرف نسبت کرنے سے مقصود حد درجہ کی برائی کا اظہار بھی ہے جیسا کہ آیت ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین میں ہے مطلب یہ ہے کہ شراب جوتے بتوں کے چڑھاوے اور جیتے ہوئے جانوروں کے لیے بے کار ذبح کر کے پانسوں سے ان کی بانٹ ہیں جن کو عرب جاہلیت میں فیاضی کا کام سمجھا جاتا تھا، مال و دولت کی بے فائدہ بربادی کی طرف بھی اشارہ نکلتا ہے۔ کون نہیں جانتا شراب خوری قمار بازی اور دکھاوے کی جھوٹی فیاضیوں نے خاندان کے خاندان اور قوم کی قوم کو تباہ کر دیا ہے جس کی مثالیں ان گنت موجود ہیں۔

شراب اور جوئے کی معاشرتی و مذہبی برائی

۹۱ ۔ شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی اور بیر ڈال دے اور تمہیں یاد الٰہی اور نماز سے ہٹائے بتلاؤ کیا تم باز آؤ گے۔ شراب پی کر جب عقل جاتی رہتی ہے تو بعض اوقات

شرابی پاگل ہو کر آپس میں لڑ پڑتے ہیں حتیٰ کہ نشہ اترنے کے بعد بھی بعض دفعہ لڑائی کا اثر باقی رہتا ہے اور باہمی عداوتیں قائم ہو جاتی ہیں۔ یہی حال بلکہ کچھ بڑھ کر جوئے کا ہے۔ اس میں ہار جیت پر سخت جھگڑے اور فساد برپا ہوتے ہیں جس سے شیطان کو ادھم مچانے کا خوب موقع مل جاتا ہے۔ یہ تو ظاہری خرابی ہوتی اور باطنی نقصان یہ ہے کہ ان چیزوں میں مشغول ہو کر انسان خدا کی یاد اور عبادتِ الٰہی سے بالکل غافل ہو جاتا ہے اس کی دلیل مشاہدہ اور تجربہ ہے۔ شطرنج کھیلنے والوں ہی کو دیکھ لو نماز تو کیا کھانے پینے اور گھر بار کی بھی خبر نہیں رہتی ہے۔ جب یہ چیز اس قدر ظاہری و باطنی نقصانات پر مشتمل ہے تو کیا ایک مسلمان اتنا سن کر بھی باز نہ آئے گا[1]

یہاں قرآن نے شیطانی کاموں کی دو برائیاں بتائی ہیں۔ ایک معاشرتی اور دوسرے مذہبی۔ معاشرتی خرابی یہ کہ شراب سے بدمست ہو کر لوگ آپس میں لڑتے ہیں اور وہ کام کر گزرتے ہیں جن کو ہوش کی حالت میں کبھی نہ کرتے کتنے قتل کتنی خودکشیاں اور کتنے سخت حادثے اس کی بدولت پیش آتے ہیں۔ یہ واقعہ ہے کہ جس معاشرے میں یہ برائی پھیل جاتی اس میں عفت، عزت، ناموس اور حیا کا احساس مٹ جائے گا اور یہ بجائے خود ایک حادثہ ہے۔ عرب عفت و عصمت، خودداری اور غیرت کے معاملے میں بڑے حساس تھے اور یہ ان کی بڑی خوبی تھی لیکن ساتھ ہی شراب اور جوئے کے بھی متوالے تھے اس لیے جام شراب اور جوئے سے عشق ان کے لیے بہت مہنگا پڑ رہا تھا۔ جہاں کسی نے شراب کی بدمستی میں کسی کی عزت و ناموس پر حملہ کیا، کسی کی تحقیر کی، کسی کو چھیڑا اور جوئے میں ہارنے والے پر آوازہ کس دیا وہیں فریقین تلواریں سونت لیتے اور افراد کی یہ لڑائی چشم زدن میں قوموں اور قبیلوں کی جنگ بن جاتی۔ اور انتقام در انتقام ایسا لامتناہی سلسلہ قائم ہوتا کہ صرف مہینے اور سال نہیں بلکہ پوری صدی گزر جاتی اور لڑائی ختم نہ ہوتی۔ عبس و ذبیان کی چہل سالہ جنگ گھوڑ دوڑ ہی کی قماربازی کا نتیجہ تھی۔ حصولِ دولت اور کسب شہرت کے اس غلط طریقہ سے خاندان تباہ ہو جاتے۔

مذہبی برائی کو قرآن نے ویصدکم عن ذکر اللہ و عن الصلوٰۃ کے بلیغ فقرے میں بیان کیا ہے کہ انسان شراب پینے اور جوا کھیلنے میں ایسا محو ہو جاتا ہے کہ خدا کی یاد اور نماز سے جو زندگی کا سب سے بڑا فرض ہے غافل ہو جاتا ہے بلکہ خود اپنے مفید کاموں سے بھی ایسا کھویا جاتا ہے کہ وہ دین کے ساتھ دنیا کے کام کا بھی نہیں رہ جاتا اور اس کی ساری زندگی ناکام اور نامراد ہو کر رہ جاتی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اللہ کی یاد کا فائدہ یہ ہے کہ وہ انسان کو زندگی کی اصل حقیقتوں سے کبھی بے پروا نہیں ہونے دیتی جس کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ انسان کبھی راہ سے بے راہ نہیں ہوتا۔ اگر کبھی کوئی لغزش ہو جاتی ہے تو خدا کی یاد اسے سنبھال لیتی ہے۔

آیتِ قرآنی میں قانونی نکتہ

قرآن نے یہاں شراب اور جوئے کی حرمت کی وجہ بیان کر کے اسلامی مملکت کی قانون ساز مشینری کے لیے ایک قانونی اساس بتائی ہے بلکہ اسلامی دستور کے لیے ایک رہنما اصول پیش کر دیا ہے کہ جو چیزیں، جو اعمال اخلاقی اعتبار سے معاشرے میں فساد، باہمی عداوت و بغض پیدا کرتے ہوں، اسلامی سرکار کو اس پر قدغن قائم کرنے کا حق ہے۔ اور اسی بنا پر جو چیزیں اور معاشرے میں جو اعمال افراد کو یادِ الٰہی سے غافل بناتے ہوں ان پر اسلامی قانون پابندی لگانے کا مجاز ہے خواہ کھیل اور تماشہ کی کوئی نوع ہو۔ اسی سے آپ اپنے معاشرے میں سرکس، سینما اور دوسرے تماشوں کا حکم معلوم کر سکتے ہیں۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسلام ایک [illegible] شرہ وجود میں لاتا ہے جس میں ذکر اللہ سے افراد میں انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے لگاؤ اور جس کی اجتماعی زندگی میں عداوت و بغض کی جگہ اتحاد، ائتلاف، امتزاج اور نظم موجود ہو۔

آخر میں فرمایا ہے فھل انتم منتھون عربی زبان میں کسی کام سے باز رکھنے اور روکنے کے لیے یہ تعبیر زیادہ بلیغ ہے۔ یہ امر کے مفہوم میں ہے صاحب کشاف نے لکھا ہے من ابلغ ما ینھی بہ ممانعت کے اسالیب اور پیمانوں میں یہ انداز سب سے زیادہ بلیغ ہے۔ ذرا غور فرمائیے۔ اندازِ کلام بتا رہا ہے کہ شراب اور جوئے کے مفاسد اب جبکہ کھل کر سامنے آ گئے ہیں تو ان آیات میں سات عنوانوں سے اللہ سبحانہ نے شراب اور جوئے کی خباثت کو پیش کیا ہے۔ مثلاً،

اولاً شراب اور جوئے کو رجس یعنی پلید بتایا

ثانیاً، جملہ کی پیشانی پر انما لگا کر بتایا کہ صرف پلید ہی نہیں بلکہ ان دونوں میں پلیدی کے سوا کسی اور بات کا تصور ہی نہیں۔

ثالثاً ان دونوں کو انصاب و ازلام کے ساتھ بیان کیا تاکہ جاننے والے جان لیں کہ کس قدر بری چیز ہے۔

رابعاً ان کو شیطانی عمل قرار دیا ہے اور شیطانی عمل ہونا علامت ہے اللہ کی ناراضگی کی۔

خامساً ممانعت کے لیے اجتناب سے فعل امر لاتے ہیں ترک سے امر کو چھوڑ کر اجتناب سے امر لانا نشاندہی کر رہا ہے کہ شراب اور جوئے کو صرف چھوڑنا نہیں بلکہ ان دونوں سے دور رہنا ہے۔

قرآن نے یہ لفظ شرک و طاغوت کے سوا کسی چیز سے بچنے کے لیے استعمال نہیں کیا ہے۔ یہ اس بات کی نشانی ہے کہ قرآن کے نقطہ نظر سے شرک و طاغوت اور شراب و جوا برائی میں ہم پلہ ہیں۔

سادساً، شراب و جوئے سے اجتناب پر فلاح کو موقوف کیا ہے یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ ان دونوں کا مرتکب دُنیا و آخرت میں ناکام اور نامراد ہوتا ہے۔

سابعاً، شراب اور جوئے کو معاشرے میں عداوت اور دشمنی کا سامان بتایا ہے یعنی شراب اور جوئے کے ذریعے معاشرے میں دشمنی اور انتقام کی آگ بھڑکتی ہے گویا ان دونوں میں ایک دوسرے سے ایسے مفاسد ہیں جن کے نتیجے میں قسم قسم کے معاصی رونما ہوتے ہیں۔

ثامناً ان دونوں کو افراد میں بیر اور کینہ کا ذریعہ قرار دیا ہے۔ اسی لیے شراب کو ام الخبائث اور ام الفواحش کہتے ہیں۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ شراب سے بچو کیونکہ یہ ساری خباثتوں کی جڑ ہے اور اس کے بعد یہ قصہ سنایا کہ تم سے پہلے جو لوگ گزرے ہیں ان میں ایک شخص پر ایک بدکار عورت کا دل آگیا۔ اس نے اپنی خادمہ کو اس کے پاس بھیجا کہ تو جا اور ان سے میرا نام لے کر کہہ کہ وہ آپ کو گواہی کے لیے بلا رہی ہے خادمہ گئی پیغام سنایا، وہ صاحب اس خادمہ کے ساتھ آگئے، جوں ہی وہ اندر داخل ہوتے دروازہ بند کر دیا گیا۔ انہوں نے دیکھا کہ ایک پیکر حسن و جمال بیٹھی ہوئی ہے اور اس کے پاس ایک لڑکا اور شراب کا جام ہے۔ اس آنے والے کو دیکھتے ہی وہ ملکہ حسن و جمال آگے بڑھی اور ان سے کہا خدا کی قسم میں نے آپ کو شہادت کے لیے نہیں بلایا بلکہ میری دلی خواہش یہ ہے کہ آپ میرے ساتھ ہم بستر ہوں یا شراب کا ایک جام میرے سے پی لیں اور یہ بھی منظور نہیں ہے تو اس لڑکے کو قتل کر دیں۔ ان میں سے ایک کام آپ کو بہرحال کرنا ہوگا۔ اس کے بغیر چھٹکارا نہیں ہے۔ وہ سوچ میں پڑ گئے سوچ کر کہا کہ شراب ایک جام پلا دو یہ گناہ ذاتی ہے اس میں کسی کی حق تلفی نہیں ہے۔ عورت نے شراب کا ایک پیالہ دیا، پی گئے شراب نے اپنا اثر دکھایا، ہوش و حواس جاتے رہے، کہنے لگے اور پلا پھر اس عورت نے اس سے منہ کالا کیا اور لڑکے کو بھی قتل کرایا۔ یہ قصہ بیان کرنے کے بعد حضرت عثمان نے فرمایا:

> شراب سے بچو خدا کی قسم شراب اور ایمان ایک ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ ایمان شراب پینے والے سے نکل بھاگتا ہے۔

تاسعاً۔ شراب اور جوا انسان کو یادِ الٰہی سے روکتے ہیں۔ اسلامی زندگی کی تمام رفعت و عظمت ذکر اللہ کے ساتھ وابستہ ہے۔ ذکر ہی کے ذریعہ اُمت اسلامیہ اس بے جان معرفت سے نکل کر ایک ایسے واضح اور عمیق عقیدے تک پہنچ گئی تھی جو قلب و نفس و جوارح پر قابو یافتہ تھی ذکر معاشرت کو

متاثر کرنے والا زندگی اور اس کے متعلقات پر حاوی تھا۔ وہ لوگ اس خداوند قدوس پر ایمان لاتے تھے جس کو بہترین ناموں سے یاد کیا جاتا ہے۔

عاشراً، شراب اور جوا نماز سے روکنے والا ہے جو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کے لیے بس کی گانٹھ اور ریڑھ کی ہڈی ہے۔ فرد اور جماعت، نظام اور اقتدار کی اسلامیت کی بنیادی شرط نماز ہے۔ یہ نماز ایک کامیاب اخلاقی مدرسہ اور نفسیاتی تربیت گاہ ہے جو نمازی کو اعلیٰ درجہ کی قوتِ ارادی، محاسبۂ نفس اور خود اپنے ساتھ انصاف کی قوت عطا کرتی ہے۔"تاریخ میں کسی دوسری طاقت کا سراغ نہیں ملتا جو نفس کی ترغیبات اور اخلاقی لغزشوں پر اس کامیابی کے ساتھ فتح حاصل کر لیتی۔

حادی عشر، صیغۂ استفہام کے ساتھ شراب اور جوئے سے روکا گیا ہے اس میں امر کے ساتھ زجر، موعظت اور تاکید و تنبیہ اور اتمام حجت کا پہلو بھی مضمر ہے۔

پورے قرآن میں کسی چیز کے حرام کرنے کے لیے ایسا مؤکد اندازِ بیان اختیار نہیں کیا گیا ہے جیسے یہاں شراب اور جوئے کے لیے اختیار کیا گیا ہے۔

حضرت عمرؓ کو جس وقت یہ آیت سنائی گئی خوشی سے بھڑک اٹھے اور فهل انتم منتهون؟ سن کر بول پڑے انتهينا انتهينا ہم باز آ گئے ہم باز آ گئے انما تذهب العقل وتذهب المال یہ مال اور عقل کو برباد کرتی ہے

مکمل سپردگی اختیار کرو

۱۸۴۔ اللہ اور اس کے رسول کے کہنے پر چلو اور محتاط رہو، پھر اگر تم نے حکم عدولی کی تو خوب جان لو کہ ہمارے رسول کی ذمہ داری صرف پیغام کو پہنچانا ہے۔ اگر کسی چیز کے منافع اور مضار کا احاطہ نہ کر سکو تب بھی خدا اور رسول کے احکام کا امتثال کرو اور قانون کی خلاف ورزی سے بچتے رہو۔ اگر نہ بچو گے تو ہمارے پیغمبر تم کو قانون و احکام الٰہی کھول کر پہنچا چکے ہیں۔ نتیجہ خلاف ورزی کا خود سوچ لو کیا ہوگا[1] اس کے ذریعے پہلی بات میں زیادہ زور پیدا کیا گیا ہے کہ ایک طرف شیطان اور اس کی دعوت ہے۔ نفسیاتی طور پر جذبات اور خواہشوں کو یہ اپیل کرتی ہے اور دوسری طرف اللہ اور اس کے رسول کی دعوت ہے۔ تمہارے ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ نفس کی ساری چاہتوں، خواہشوں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور رغبتوں کے ساتھ اللہ اور اس کے رسول کی طاعت میں داخل ہو جاؤ اور اللہ و رسول کی نافرمانی و سرکشی سے بچو اور احکام الٰہی کی غیر مشروط اطاعت کرو اور حکم الٰہی کے سامنے اپنے اختیارات سے کلیۃً دستبردار ہو جاؤ اپنی عقل اپنی رائے اپنے افکار اور اپنے اعمال، اپنے احساسات اور اپنے جذبات، اپنے رجحان طبع اور اپنے ذوق سب کی گردنوں میں اس بے قید غلامی کا قلادہ ڈال لو، تم اللہ کے بندے ہو جاؤ تمہیں صرف اس کی مرضیات پوری کرنے کا فرض انجام دینا ہے۔ اس آیت میں اسی غیر مشروط طاعت کا حکم ہوا ہے۔ آگے فرمایا کہ اگر اس کے باوجود تم نے اعراض کی راہ اختیار کی تو اس کے ذمہ دار تم ہو گے۔ رسول کی ذمہ داری تو صرف خدا کے احکام کو پہنچانا ہے۔ اللہ کے رسول کے صحابہ نے اطاعت اور فوری تعمیل کا کہاں تک مظاہرہ کیا۔ اس کے بارے میں شراب کے موضوع پر کچھ باتیں سن آئے ہو۔ اسی کی مثال وہ واقعہ بھی ہے جو حافظ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں نقل کیا ہے۔ حضرت ابوبریدہ اپنے والد سے روایت کرتے ہیں کہ

> ہم مجلس میں بیٹھے شراب پی رہے تھے کہ میں اٹھا تاکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت اقدس میں حاضری دوں اور سلام کروں۔ ادھر قرآن کی یہ آیت نازل ہو چکی تھی یا ایھا الذین امنوا انما الخمر میں اپنے ساتھیوں کے پاس آیا اور میں نے یہ آیت فھل انتم منتھون تک پڑھ کر سنا دی، کہتے ہیں کہ کچھ لوگوں کے ہاتھ میں ساغر تھا کچھ پیا تھا اور کچھ ساغر میں بچ رہا تھا جو شراب ہونٹوں میں پہنچ گئی تھی فوراً تھوک دی گئی۔

یہ مکمل سپردگی کا عملی مظاہرہ تھا۔ اطاعت و تابعداری محبت کا لازمی نتیجہ ہے۔ جب صحابہ محبت کی دولت سے مالا مال ہو گئے تو انہوں نے اپنی ساری طاقت آپ کی طاعت میں صرف کر دی۔

روحانی ترقیات کا انتہائی مقام

۱۸۵۔ یاد رکھو جو لوگ ایمان لے آئے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے ان پر ماضی میں کھانے پینے پر کوئی گرفت نہیں ہے جبکہ اب وہ متقی ہو گئے اور ایمان لے آئے اور اچھے اچھے کام کیے پھر پرہیزگار رہے اور ایمان لاتے پھر پرہیز کیا اور نیک کردار ہو گئے اور اللہ نیکو کاروں سے محبت کرتا ہے۔

نہایت صحیح اور قوی احادیث میں ہے کہ جب تحریم خمر کی آیات نازل ہوئیں تو صحابہ رضی اللہ عنہم نے سوال کیا کہ یا رسول اللہ ان مسلمانوں کا کیا ہو حال ہو گا جنہوں نے حکم تحریم خمر آنے سے پہلے شراب پی اور اسی حالت میں انتقال کر گئے۔ مثلاً بعض صحابہ جو جنگ احد میں شراب پی کر شریک ہوئے اور

اسی حالت میں شہید ہو گئے کہ پیٹ میں شراب موجود تھی۔ اس پر یہ آیات نازل ہوئیں۔ عموم الفاظ اور دوسری روایات کو دیکھتے ہوئے ان آیات کا مطلب ہے کہ زندہ ہوں یا مردہ جو لوگ ایمان اور عمل صالح رکھتے ہیں ان کے لیے کسی مباح چیز کے بوقت اباحت کھا لینے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ خصوصاً جب کہ وہ لوگ عام حالات میں تقویٰ اور ایمان کے خصائل سے متصف ہوں۔ پھر ان خصائل میں برابر ترقی کرتے رہے ہوں حتیٰ کہ مدارج تقویٰ اور ایمان میں ترقی کرتے کرتے مرتبہ احسان تک جا پہنچے ہوں جو ایک مومن کے لیے روحانی ترقیات کا انتہائی مقام ہے جہاں پہنچ کر حق تعالیٰ اپنے بندے کے ساتھ خصوصی محبت کرتا ہے (فی حدیث جبریل الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ) لہٰذا جو پاکباز صحابہ ایمان و تقویٰ میں عمر گزار کر اور نسبت احسان حاصل کر کے خدا کی راہ میں شہید ہو گئے ان کی نسبت اس قسم کے خلجان اور توہمات پیدا کرنے کی قطعاً گنجائش نہیں کہ وہ ایک ایسی چیز کا استعمال کرتے ہوئے دنیا سے رخصت ہوتے ہیں جو اس وقت حرام نہیں تھی مگر بعد کو حرام ہوئی۔ محققین نے لکھا ہے کہ تقویٰ یعنی مضار دینی سے مجتنب ہونے کے کئی درجے ہیں اور ایمان و یقین کے مراتب بھی بلحاظ قوت و ضعف متفاوت ہیں، تجربہ اور نصوص شرعیہ سے ثابت ہے کہ جس قدر آدمی ذکر و فکر عمل صالح اور جہاد فی سبیل اللہ میں ترقی کرتا ہے اسی قدر خدا کے خوف اور اس کی عظمت و جلال کے تصور سے قلب معمور اور ایمان و یقین مستحکم ہوتا رہتا ہے۔ مراتب سیر الی اللہ کی اسی ترقی و عروج کی طرف اس آیت میں تقویٰ اور ایمان کی تکرار سے اشارہ فرمایا اور سلوک کے آخری مقام احسان اور اس کے ثمرہ پر بھی متنبہ فرما دیا۔ اور جن حضرات صحابہ کے متعلق سوال کیا گیا تھا اس کا جواب ایک عام و تام ضابطہ بیان فرما کر ایسے عنوان سے دے دیا گیا جس میں ان مرحومین کی فضیلت و منقبت کی طرف بھی لطیف اشارہ ہو گیا ذخیرہ احادیث میں دو موقعے ایسے ہیں جہاں صحابہ رضی اللہ عنہم نے اس قسم کا سوال کیا ہے۔ ایک موقع تو یہی تحریم خمر کا ہے اور دوسرا تحویل قبلہ کے وقت سوال کیا گیا تھا کہ یا رسول اللہ جو لوگ حکم تحویل سے پہلے وفات پا گئے اور ایک نماز بھی کعبہ کی طرف نہیں پڑھی، ان کی نمازوں کا کیا حال ہو گا، اسی پر آیت وما کان اللہ لیضیع ایمانکم نازل ہوئی ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہی دو مسئلے ایسے تھے جن میں صاف صاف دوٹوک حکم نازل ہونے سے پہلے نہایت ہی واضح آثار و قرائن ایسے موجود تھے جن کو دیکھ کر صحابہ رضی اللہ عنہم ہر آن نزول حکم صریح کا انتظار کر رہے تھے۔ خمر کے متعلق تو ابھی چند فوائد پہلے ایسی روایات نقل کر آئے جن سے ہمارے اس دعویٰ کا کافی ثبوت ملتا ہے اور تحویل قبلہ کے باب میں قرآن کریم کی آیت قد نری تقلب وجھک فی السماء فلنو لینک

قبلۃً ترضاھا جو پارہ دوم کے شروع میں ہے خبر دے رہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہر وقت منتظر تھے کہ کب تحویل قبلہ کا حکم آتا ہے اور ظاہر ہے کہ ایسے واضح حالات صحابہ پر مخفی نہیں رہ سکتے تھے اس لیے تحویل قبلہ کا حکم جب ایک آدمی نے کسی محلہ کی مسجد میں جاکر سنایا تو سارے نمازی محض خبر واحد کو سن کر بیت المقدس سے کعبہ کی طرف پھر گئے، حالانکہ بیت المقدس کا استقبال قطعی طور پر انہیں معلوم تھا اور خبر واحد ظنی قطعی کے لیے ناسخ نہیں ہو سکتی تھی اس لیے علمائے اصول نے تصریح کی ہے کہ یہ خبر واحد محفوف بالقرائن ہونے کی وجہ سے قطعی سمجھی گئی۔ پس چونکہ قرائن و آثار حتمی طور پر خبر دے رہی تھی کہ تحریم خمر یا تحویل قبلہ کا حکم عنقریب آیا ہی چاہتا ہے یا آیا ہے ایسے ہی ان دونوں حکموں کا نزول ہوا۔ گویا ایک طرح سے وہ صحابہ کو نزول حکم سے پہلے مرضی الٰہی پر فی الجملہ مطلع کر رہے تھے اس لیے ان دو مسئلوں میں نزول حکم سے پہلے کی حالت کے متعلق سوال کرنا محلِ استبعاد نہیں خصوصاً خمر کی نسبت جس کی ممانعت کے نہایت واضح اشارات وإثمهما أكبر من نفعهما وغیرہ میں موجود تھے واللہ سبحانہ اعلم[1]

اس آیت میں تحریم خمر سے پہلے شراب پینے والوں کی بے گناہی کو بتانے کے لیے تین بار تقویٰ کی دو بار ایمان کی اور ایک بار احسان کی شرط سے شارحین قرآن جس حیرت کا شکار ہو رہے تھے، حضرت شیخ الاسلام کے اس تشریحی نوٹ نے اس راہ کی ساری مشکلات کو اس خوبصورت انداز میں حل فرمادیا کہ کم از کم میں علم کی حد تک کہہ سکتا ہوں کہ آیت کی اس سے بہترین تشریح کہیں دیکھنے میں نہیں آئی ہے اگرچہ یہاں زمخشری، خفاجی، وغیرہ نے خوب دادِ تحقیق دی ہے مگر علامہ قرطبی نے اس موقع پر اچھوتی بات ارشاد فرمائی ہے۔

منشا یہ ہے کہ اہل ایمان سے یہ مطالبہ نہیں ہے کہ کام و دہن کی لذتوں سے بچ کر رہیں اور طیبات سے کنارہ کش ہوں بلکہ ان سے یہ مطالبہ ہے کہ تقویٰ و ایمان کے درجات میں مرتبہ کمال یعنی اخلاص و یقین پیدا کریں اور اس کی راہ یہ ہے کہ شرک سے بچیں اور ایمان کے سارے تقاضے پورے کریں اور اعمالِ صالحہ پر مداومت کریں تاکہ وہ استقامت حاصل ہو سکے جس کے ذریعے ایک مومن مرتبہ احسان اور مشاہدہ حق تک پہنچ سکتا ہے۔ یہی منشا ہے واحسنوا کا، اور اسی پر اللہ کی محبت و قرب کی انتہا ہے۔ اسی کی طرف اس آیت میں واللہ یحب المحسنین اشارہ کر رہا ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَيَبْلُوَنَّكُمُ ٱللَّهُ بِشَىْءٍ مِّنَ ٱلصَّيْدِ تَنَالُهُۥٓ
أَيْدِيكُمْ وَرِمَاحُكُمْ لِيَعْلَمَ ٱللَّهُ مَن يَخَافُهُۥ بِٱلْغَيْبِ ۚ فَمَنِ ٱعْتَدَىٰ
بَعْدَ ذَٰلِكَ فَلَهُۥ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝٩٤ يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَقْتُلُوا۟
ٱلصَّيْدَ وَأَنتُمْ حُرُمٌ ۚ وَمَن قَتَلَهُۥ مِنكُم مُّتَعَمِّدًا فَجَزَآءٌ مِّثْلُ مَا
قَتَلَ مِنَ ٱلنَّعَمِ يَحْكُمُ بِهِۦ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ هَدْيًۢا بَٰلِغَ ٱلْكَعْبَةِ أَوْ
كَفَّٰرَةٌ طَعَامُ مَسَٰكِينَ أَوْ عَدْلُ ذَٰلِكَ صِيَامًا لِّيَذُوقَ وَبَالَ
أَمْرِهِۦ ۗ عَفَا ٱللَّهُ عَمَّا سَلَفَ ۚ وَمَنْ عَادَ فَيَنتَقِمُ ٱللَّهُ مِنْهُ ۗ وَٱللَّهُ
عَزِيزٌ ذُو ٱنتِقَامٍ ۝٩٥ أُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ ٱلْبَحْرِ وَطَعَامُهُۥ مَتَٰعًا لَّكُمْ وَ
لِلسَّيَّارَةِ ۖ وَحُرِّمَ عَلَيْكُمْ صَيْدُ ٱلْبَرِّ مَا دُمْتُمْ حُرُمًا ۗ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ
ٱلَّذِىٓ إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ۝٩٦

اے اہل ایمان، اللہ تمہاری کچھ ضرور آزمائش لے گا اس شکار
کے ذریعہ جسے تمہارے ہاتھ اور نیزے پا رہے ہوں گے تاکہ

اللہ معلوم کرے کہ کون اللہ سے غائبانہ ڈرتا ہے، اس کے بعد
جس نے اللہ کے قانون سے تجاوز کیا اس کے لیے دردناک عذاب
ہے[۱۰۶]۔ اے اہل ایمان حالت احرام میں شکار کے جانور کو نہ مارو
اور اگر کوئی تم میں سے جان بوجھ کر یہ کام کرے تو اسے بدلہ دینا
چاہیے یعنی جیسا جانور مارا ہے اسی کی مانند مویشی میں سے ایک
جانور قربان کرے اور اس کا فیصلہ دو منصف کریں اور یہ قربانی
خانہ کعبہ میں پہنچا کر کی جاتے یا کفارہ دے یعنی مسکینوں کو کھانا
کھلاتے اور یا اس کے برابر روزے رکھے تاکہ وہ اپنے کیے کی جزا
کا مزا چکھ لے[۱۰۷]۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے خدا نے اسے
معاف کر دیا ہے اور جو کوئی پھر کرے گا تو اللہ اس سے نافرمانی
کا بدلہ لے گا، اللہ سب پر غالب اور بدلہ لینے والا ہے[۱۰۸]۔ تمہارے
لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال کر دیا گیا ہے تاکہ اس سے

تمہیں بھی فائدہ ہو اور قافلے کے لیے بھی زادِ راہ ہو، اور تم پر خشکی کا شکار جب تک تم حالتِ احرام میں ہو حرام ہے، اور اس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس کے حضور میں تم سب جمع کیے جاؤ گے ۔[۱۸۹]

اتباع و اطاعت کی آزمائش

بات میں تسلسل قائم ہے۔ آغاز سورت میں کھانے کے موضوع پر حلال و حرام اور حج سے متعلق خاص طور پر سرزمینِ حرم میں اور حالتِ احرام میں شکار کے احکام بیان ہو رہے تھے۔ اس کے بعد روئے سخن اہلِ کتاب کی طرف ہو گیا اور الشئی یذکر بالشئی بات میں سے بات نکلنے سے مضمون طویل ہو گیا۔ بالآخر پھر گفتگو کھانے کی طرف پھر گئی۔ اور اہلِ ایمان کو طیبات کو حرام کرنے سے روکا۔ اور حلال و طیب کھانے کی تلقین کی۔ چونکہ بعض متقشفین طیبات استعمال نہ کرنے کی قسمیں کھا بیٹھے تھے ان کو بتایا کہ کفارہ دینا چاہیے پھر کھانے ہی کے سلسلے میں شراب اور جوئے پر پابندی لگائی۔ کھانے سے متعلق تتمہ بیان کرنے کے بعد اب حج سے متعلق حالتِ احرام میں شکار کا تتمہ بیان ہو رہا ہے اور اس کے لیے تمہید یہ اٹھائی ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری اتباع و طاعت کی ضرور آزمائش لے گا۔ چونکہ امتِ اسلامیہ کا قیام ایک عہد و میثاق کے ذریعے عمل میں آیا ہے، جس کا ذکر اسی سورت کے آغاز میں اس آیت میں ہو چکا ہے واذکروا نعمۃ اللہ علیکم و میثاقہ الذی واثقکم بہ اذ قلتم سمعنا واطعنا اسی میثاق کا تقاضا ہے کہ خدا اور رسول کی غیر مشروط طاعت کی جائے اور یہ جب تقابلی طور پر ہو تو اسی کو آزمائش کہتے ہیں۔ یعنی اگر مقابلہ پر کوئی فکر کوئی عمل ہو اور پھر ان کے مقابلے میں اللہ و رسول کی طاعت کا حکم دیا جائے تو یہ اطاعت کرنے والوں کی آزمائش ہے یہاں اگرچہ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ مقابلہ پر کام و دہن کی لذت بھی اور سفر کی حالت میں اس کی شدید ضرورت بھی ہوتی ہے اس لیے یہاں امتحان بولا گیا ہے۔ اس صورت میں مقابلہ جذبات اور چاہتوں سے ہو گا۔ پھر ابتلا اور بلا لینے دجود کے لیے ایک تقابل حالت کو چاہتا ہے۔

۱۸۶۔ اے اہلِ ایمان، اللہ تمہاری کچھ ضرور آزمائش لے گا اس شکار کے ذریعے جسے تمہارے ہاتھ اور

نیزے پا رہے ہوں گے تاکہ اللہ معلوم کرے کہ کون اللہ سے غائبانہ ڈرتا ہے اس کے بعد جس نے اللہ کے قانون سے تجاوز کیا اس کے لیے دردناک عذاب ہے۔ پچھلے رکوع میں تحریم طیبات اور اعتداء سے منع فرما کر بعض چیزوں سے اجتناب کا حکم دیا تھا جو دائمی طور پر حرام ہیں۔ اس رکوع میں بعض ایسی اشیا کے ازتکاب سے منع کیا گیا ہے جن کی حرمت دائمی نہیں ہے بلکہ بعض احوال و اوضاع سے مخصوص ہے یعنی بحالت احرام شکار کرنا۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کی طرف سے مطیع و فرمانبردار بندوں کا امتحان یہ ہے کہ وہ حالت احرام میں جبکہ شکار ان کے سامنے ہو اور بسہولت اس کے مارنے پر یا پکڑنے پر بھی قادر ہوں کون ہے جو بن دیکھے خدا سے ڈر کر اس کے حکم کا امتثال کرتا اور اعتداء یعنی احکام خداوندی سے تجاوز کرنے کی خدائی سزا سے خوف کھاتا ہے۔ اصحاب سبت کا قصہ سورہ بقرہ میں گزر چکا کہ ان کو حق تعالیٰ نے خاص شنبہ کے دن مچھلی کے شکار کی ممانعت فرمائی تھی مگر انہوں نے مکاری اور حیلہ سازی سے اس حکم کی مخالفت کی اور حد سے تجاوز کر گئے۔ خدا نے ان پر نہایت رسوا کن عذاب نازل فرمایا۔ اسی طرح حق تعالیٰ نے اُمتِ محمدیہ کا تھوڑا سا امتحان اس مسئلہ میں لیا کہ حالت احرام میں شکار نہ کریں۔ حدیبیہ کے موقع پر جب یہ حکم بھیجا گیا تو شکار اس قدر قریب تھا کہ ہاتھوں اور نیزوں سے مار سکتے تھے مگر اصحاب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ثابت کر دکھایا کہ خدا کے امتحان میں ان کے برابر دُنیا کی کوئی قوم نہیں ہے اور لیعلم اللہ کے لفظ سے جو حدوث علم باری کا وہم گزرتا ہے اس کے ازالہ کے لیے پارہ دوم کے شروع میں الا لنعلم من یتبع الرسول کا فائدہ ملاحظہ کر دلیے

اس آیت میں سب سے پہلے امتحان اور آزمائش کی بات سمجھنے کی ہے لیبلون بلا سے بنا ہے۔ مضارع موکد کا صیغہ ہے مصدر اس کا بلاء ہے۔ اسی سے ابتلا بنا ہے جو اُردو میں مستعمل ہے۔ امتحان، آزمانا اور جانچنا اس کا ترجمہ ہے تو اب لیبلون کا ترجمہ اس طرح ہوا کہ ضرور آزمائش لے گا۔ اللہ امتحان لے گا آزمائے گا اور جانچے گا یہ تو اس لفظ کے لغوی معنے ہوتے، رہا مطلب تو غور کرنے کی بات یہ ہے کہ امتحان، آزمانے جانچنے کے الفاظ جب انسانوں کے لیے بولے جاتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس کا امتحان لیا جاتا ہے اس کے ایسے حالات سے امتحان لینے والا باخبر ہونا چاہتا ہے جن کی اسے واقفیت نہیں ہوتی ہے۔ مثلاً یہ کہ اس کی معلومات کیسی ہیں، فلاں علم میں استعداد کیسی ہے۔ ظاہر ہے کہ خدا کی طرف جب امتحان کی نسبت ہو گی تو اس کا مطلب تو یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ العیاذ باللہ خدا بندوں کے جن حالات سے

ناواقف ہے امتحان سے کران حالات کو وہ جاننا چاہتا ہے۔ قرآن میں صرف یہی نہیں بلکہ دوسرے مقامات پر بھی یا اور اسی کے ہم معنے الفاظ اللہ تعالیٰ کے لیے بولے گئے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ الفاظ جب اللہ سبحانہٗ کی طرف منسوب ہوں تو اس کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ جب یہ بات مانی ہوئی ہے بلکہ خود قرآن ہی کی بنائی ہوئی ہے کہ اللہ کی باتوں کو مخلوقات اور مخلوق کی صفات و افعال کے مماثل قرار دینا ممنوع ہے اور قرآن نے لیس کمثلہ شیئ کہہ کر اہلِ ایمان کو منع کیا ہے کہ ذات میں ہو یا صفات میں اور یا افعال میں کسی اعتبار سے کسی چیز کو خدا کے مماثل نہ قرار دینا چاہیے۔ اسی لیے سماعت، بصارت، علم حیات وغیرہ جو صفات قرآن میں خدا کی طرف منسوب ہو کر آئی ہیں سب جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی نسبت سے ان کا وہ مطلب نہیں ہے جو انسانوں کی طرف نسبت کرنے میں ہوتا ہے۔ مثلاً بصارت ایک صفت ہے آدمی کی طرف جس بصارت اور بینائی کے الفاظ کو ہم منسوب کرتے ہیں تو اس سے مراد ایسی صفت ہے جو عمل کرنے میں رنگ اور روشنی کی محتاج ہوتی ہے اور بعد مُفرط نہ ہو قرب مفرط نہ ہو۔ ان شرطوں کے ساتھ اس کے آثار کا ظہور وابستہ ہوتا ہے لیکن ظاہر ہے کہ اسی بصارت کے لفظ کو خدا کی طرف جب منسوب کیا جاتا ہے اور کہا جاتا ہے کہ خدا بصیر ہے تو ہم میں ہر ایک جانتا ہے کہ خدا کی یہ صفت نہ رنگ کی محتاج ہے نہ روشنی کی نہ دوسرے شرط کی بلکہ وہ دیکھتا ہے اور ہر حال میں دیکھتا ہے۔ پھر دیکھئے کہ اس لفظ کا جو حال ہے اگر ابتلا اور امتحان کے الفاظ کا بھی یہی حال ہو یعنی انسان کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں اور معنے ہوں اور خدا کی طرف منسوب ہونے کی صورت میں دوسرے معنے ہوں تو اس میں حرج ہی کیا ہے۔ یہ ایک عام قانون کلی ہے جو ذات و صفات و افعال وغیرہ سب پر حاوی ہے وہ اپنی تمام شانوں میں جیسے نرالا بے مثال بے نظیر ہے اسی طرح ابتلا و امتحان کا جو فعل خدا کی طرف منسوب کیا جاتا ہے وہ اس امتحان سے جو ایک مخلوق دوسری مخلوق کا لیتی ہے قطعاً مختلف ہے۔ قرآن میں بار بار مختلف الفاظ میں یہ اعلان کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کی کوئی خاص وکالت و کیفیت ہی نہیں بلکہ جس زندگی کو انسان اس وقت زمین پر گزار رہا ہے اس کی یہ ساری زندگی ہی ابتلا و امتحان کی زندگی ہے خلق الموت والحیاۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا اس کا حاصل یہی ہے کہ زندگی کا کوئی پہلو خاص رُخ نہیں بلکہ پوری زندگی ہی آدمی کی ابتلا و امتحان کی زندگی ہے۔ تمام آفاق کائنات کے مقابلے میں بشری فطرت میں خواہ وہ کسی رنگ میں ہو دو راہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے انتخاب و اختیار کرنے کی خصوصیت رکھی گئی ہے فی الواقع فطرت کے اسی اقتضا کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی ہی ابتلا و امتحان

کی زندگی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ خدا کی طرف ابتلا و امتحان کے جو الفاظ منسوب ہوتے ہیں تو ان کا مطلب یہ نہیں ہوتا کہ جن باتوں کو خدا نہیں جانتا امتحان سے کر ان کو جاننا چاہتا ہے بلکہ انسانی فطرت میں اقتدار و اختیار اور انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے اسی قوت کے صحیح استعمال کے مطالبہ کا نام ابتلا و امتحان ہے۔

آیت میں اس آزمائش سے آگاہ کیا جا رہا ہے جو حالتِ احرام میں دفعتہً شکار نظر آجانے کی وجہ سے پیش آسکتی ہے۔ چونکہ اس ممانعت جذبات کے ہجوم میں لوگوں کے ایمان و تقویٰ کو جانچنے کے لیے کی گئی ہے اس لیے پہلے ہی فرما دیا گیا ہے کہ ایسے مواقع درپیش رہیں گے کہ تم احرام باندھے ہوئے ہو گے اور تمہاری نگاہوں میں شکار کا تماشا ہوگا۔ اس موقعہ پر اپنے ایمان و تقویٰ اور احساس بندگی کی حفاظت کرنا اس طرح اس امتحان میں ناکام نہ ہو جانا جیسے بنی اسرائیل یوم سبت کے معاملہ میں ناکام ہو گئے۔ اہل عرب جانوروں اور پرندوں کا شکار کر کے گزر اوقات کرتے تھے۔ احرام کی حالت میں ان کا شکار سے باز رہنا ایک صبر آزما مسئلہ تھا خصوصاً ایسی حالت میں جب کہ ان کی تفریح اور معاش دونوں کا انحصار بڑی حد تک اس زمانے میں شکار ہی پر تھا۔

آخر میں لیعلم اللہ میں اس آزمائش کا مقصد بتایا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ امتحان اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کے ذریعے اللہ ان لوگوں کو ممتاز کر دے جو بن دیکھے اللہ سے ڈرتے ہیں یعنی مطیع و فرمانبردار ہیں۔ اس امتحان کا اصل مقصد بندوں کی اطاعت اور وفاداری کو منظر عام پر لانا ہوتا ہے۔

یہاں لیبلونکم اللہ کے بعد بشیء کے لفظ سے اگرچہ علامہ زمخشری نے یہی سمجھا ہے کہ یہ آزمائش بہت ہلکی سی ہوگی اور سخت نہیں ہوگی یعنی یہ کوئی بڑی آزمائش نہ ہوگی لیکن علامہ ناصر نے انتصاف میں زمخشری کی اس رائے سے اختلاف کر کے بشیء میں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ مطلب یہ ہے کہ یہ آزمائش اللہ تعالیٰ کی عظیم آزمائشوں میں سے کچھ ہے سب کچھ نہیں ہے ورنہ اللہ اس پر قادر ہے کہ وہ اس سے بڑی آزمائش لے آتے۔ اسی لیے آزمائش کے ذکر سے پہلے آزمائش کے بارے میں تنبیہ کر دے تاکہ مدافعت میں آسانی ہو جائے بالکل آخر میں اسی بنا پر یہ فرمایا فمن اعتدی بعد ذالک فلہ عذاب الیم یعنی جو اس آزمائش میں حد سے تجاوز کر جائے گا اس کے لیے عذاب الیم ہے۔ یہ بات اس لیے فرمائی گئی ہے کہ تم سے پہلی امتوں کو اس قسم کی آزمائش سے دوچار ہونا پڑا مگر وہ ناکام ہو گئے اور انہوں نے حدود الٰہی کی خلاف ورزی کی۔ بنی اسرائیل کے امتحان کا ذکر اشارۃً پہلے ہو چکا ہے اور تفصیلاً اعراف میں آرہا ہے۔ ان کو سبت کے دن شکار سے منع کیا گیا تھا لیکن انہوں نے اس معاملہ میں اعتدار سے کام لیا ولقد علمتم الذین

اعتدوا منکم فی السبت اسی طرح اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر اس امتحان میں تمہارے دامانِ عمل میں بھی اعتداء حد سے تجاوز کر گیا تو تم بھی اللہ کے قانونِ مجازات کی گرفت سے بچ نہیں سکتے ۔

حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت

۹۵ ۔ اے اہل ایمان حالتِ احرام میں شکار کے جانور کو نہ مارو ۔ اگر کوئی تم میں سے جان بوجھ کر یہ کام کرے تو اسے بدلہ دینا چاہیے یعنی جیسا جانور مارا ہے اسی کی مانند مویشی میں سے ایک جانور قربان کرے اور اس کا فیصلہ دو منصف کریں اور یہ قربانی خانہ کعبہ میں پہنچا کر کی جائے یا کفارہ دے یعنی مسکینوں کو کھانا کھلائے اور یا اس کے برابر روزے رکھے تاکہ وہ اپنے کیے کی جزا کا مزہ چکھ لے ۔ اس کے متعلق بعض احکام سورہ مائدہ کے شروع میں گزر گئے ۔ جان کر مارنے کا مطلب یہ ہے کہ اپنا محرم ہونا یاد ہو اور یہ بھی مستحضر ہو کہ حالتِ احرام میں شکار جائز نہیں ۔ یہاں صرف متعمداً کا حکم بیان فرمایا کہ اس کے فعل کی جزا یہ ہے اور خدا جو انتقام لے گا جیسا کہ ومن عاد فینتقم اللہ منہ سے تنبیہ فرمائی اور اگر بھول کر شکار کیا تو جزا تو یہی ہے گی یعنی ہدی یا طعام یا صیام البتہ خدا اس سے انتقامی سزا نہ اٹھائے گا ۔ احناف کے یہاں مسئلہ یہ ہے کہ اگر احرام میں شکار پکڑا تو فرض ہے کہ چھوڑ دے اگر مار دیا تو دو صاحبِ بصیرت اور تجربہ کار معتبر آدمیوں سے اس جانور کی قیمت لگوائے اسی قدر قیمت کا مویشی میں سے ایک جانور لے کر مثلاً بکری ، گائے ، اونٹ وغیرہ کعبہ کے نزدیک یعنی حدودِ حرم پہنچا کر ذبح کرے اور خود اس میں سے نہ کھائے یا اسی قیمت کا غلہ لے کر محتاجوں کو فی محتاج صدقۃ الفطر کی مقدار تقسیم کر دے یا جس قدر محتاجوں کو پہنچتا ہو اتنے ہی دنوں کے روزے رکھ لے [1]

اس آیت میں متعدد باتیں تشریح طلب ہیں ، احرام ، حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت ، جان بوجھ کر شکار کی صورت میں جزا ، جزا کے بارے میں اربابِ بصیرت کا فیصلہ ۔ جزا قربانی ہونے کی صورت میں ہو تو اس کا کعبہ میں پہنچانا ، کفارہ طعامِ مسکین کی صورت میں ، یا روزوں کی شکل میں ۔

احرام اور اس کی حج میں حیثیت

حج کی حقیقت جن ارکان سے ترکیب پاتی ہے ان میں احرام کی کلیدی حیثیت ہے ، تمام اعمال

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اگرچہ نیت پر مبنی ہوتے ہیں لیکن نیت کا اظہار عمل کے بغیر نہیں ہوتا ہے۔ نماز کے لیے تکبیر اسی نیت کا اعلان ہے۔ احرام ہی حج کی تکبیر ہے۔ احرام باندھنے کے ساتھ انسان اپنی معمول کی زندگی سے نکل کر ایک خاص حالت میں آجاتا ہے اس لیے اس پر وہ تمام چیزیں حرام ہوجاتی ہیں جو دنیوی عیش و نشاط زیب و زینت اور تفریح طبع کا ذریعہ تھیں۔ وہ شکار نہیں کرسکتا کہ محض کام و دہن کی لذت کے لیے کسی جاندار کی جان لینا بہرحال خودغرضی ہے۔ بی بی سے متمتع نہیں ہوسکتا کہ یہ نفسانی و شہوانی لذتوں سے احتراز کا موقع ہے سلے ہوئے کپڑے نہیں پہن سکتا کہ یہ جاہ و جلال کے اظہار کا ذریعہ ہے۔ اور یہ مقرر کیا کہ احرام کی نیت کے ساتھ شاہ و گدا اپنے اپنے سلے ہوئے کپڑوں کو اتار دیں ایک چادر کمر سے لپیٹ لی جائے اور دوسری سر کھول کر گردن سے لپیٹ لی جائے کہ داہنا ہاتھ ضروری کاموں کے لیے باہر رہے یہ عہد ابراہیمی کے لباس کی تمثیل ہے یہ گویا شہنشاہ کائنات کے دربار میں حاضری کی یونیفارم ہے۔

حالت احرام میں شکار کی ممانعت

حالتِ احرام میں شکار کی ممانعت کی گئی ہے۔ یہ شکار آدمی خواہ خود کرے یا کسی دوسرے کو شکار میں کسی طور سے مدد دے۔ دونوں باتیں حالتِ احرام میں منع ہیں۔ البتہ اگر کسی شخص نے اپنے لیے خود شکار کیا اور پھر وہ اس میں سے محرم کو بھی تحفہ دے دے تو اس کے کھانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے صید کا لفظ عام ہے خواہ وہ جانور ہو جس کا گوشت کھانا حلال ہے اور خواہ وہ جانور ہو جس کا گوشت حرام ہے سب کا شکار حالتِ احرام میں حرام ہے اور پھر قتل کا لفظ یہ بتانے کے لیے بولا ہے کہ حالت احرام میں جو شکار کیا جاتا ہے وہ محرم کے حق میں ذبیحہ نہیں بلکہ مردار ہے۔ اور صید کے لفظ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ جن جانوروں کا شکار نہیں کیا جاتا مثلاً گائے بھینس بکری ان کا ذبح کرنا اور کھانا احرام والے کے لیے جائز ہے ہاں اس سے وہ موذی جانور مستثنیٰ ہیں جن کا ذکر صحیحین میں حضرت عائشہ کی حدیث میں آتا ہے جیسے کوا، چیل، بچھو، چوہا، کٹ کھنا کتا، زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ کٹ کھنا کتا میں سانپ بھی شامل ہیں۔ یعنی ایسے دوسرے جانور جو انسان کو نقصان پہنچانے والے ہیں حالت احرام میں ان کو مارنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

حالتِ احرام میں شکار کا کفارہ

ارشاد ہے من قتله منكم متعمدا "اگر کسی شخص نے جان بوجھ کر شکار مار ڈالا تو اس کا کفارہ یہ ہے

کہ اس کا خون بہادے یعنی اس مقتول جانور کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی دے۔ یہ مماثلت کس چیز میں ہونی چاہیے۔ خلقت میں یا قیمت میں جمہور کی رائے ہیں خلقت میں ہونی چاہیے۔ یہی امام مالک، امام شافعی اور امام محمد بن الحسن کا مذہب ہے اور جن جانوروں کی نظیر نہ ہو جیسے چڑیا اس کی قیمت دینی چاہیے لیکن امام ابوحنیفہ اور امام ابو یوسف فرماتے ہیں کہ مماثلت خلقت میں نہیں بلکہ قیمت میں مراد ہے اور قیمت کے ذریعہ قربانی کا جانور خریدنا چاہیے۔ یہی ابراہیم نخعی کی رائے ہے۔ آگے ارشاد دو ارباب بصیرت سے فیصلہ کرانے کی قید سے یہی بات قوی معلوم ہوتی ہے کہ مماثلت قیمت میں مراد ہے۔ اگر جسامت اور قامت میں مماثلت مراد ہوتی تو اس کے لیے یحکم بہ ذوا عدل منکم کی قید کی چنداں حاجت نہ تھی۔

قرآن میں اگرچہ متعمداً کی قید ہے لیکن سنت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ قید احترازی نہیں ہے بلکہ اتفاق ہے مطلب یہ ہے کہ شکار حالت احرام میں جان بوجھ کر کیا ہو یا غلطی سے بھول کر کیا ہو دونوں کا حکم ایک ہے اگرچہ کچھ لوگ خطا کی صورت میں کفارے کے قائل نہیں ہیں لیکن حافظ ابن کثیر نے اسے مذہب غریب قرار دے کر اس پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔ جمہور کی رائے یہی ہے کہ اس معاملہ میں عامد اور ناسی کی حیثیت ایک ہے امام زہری نے بھی اسی کو اپنایا ہے۔ حضرت فاروق اعظم نے یہی بات مملکت کے گورنروں کو لکھ کر روانہ کی تھی کہ خطاء اور عمداً دونوں میں کفارہ ہے اور صحابہ میں سے کسی سے اس پر کوئی نکیر ثابت نہیں ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر مجھے الجصاص کی یہ رائے زیادہ وزنی معلوم ہوتی ہے کہ متعمداً کی قید صرف یہ بتانے کے لیے کہ نسیان کی صورت میں آخرت میں مواخذہ نہ ہوگا جبکہ عمداً شکار کرلے میں کفارہ دینے کے باوجود مواخذہ آخرت سے بری نہ ہوگا۔ ہر حال میں حالت احرام میں اگر شکار کیا ہے خواہ جان کر کیا یا غلطی سے کیا ہو ہر حال میں اسے کفارہ دینا ہوگا۔ کفارہ اولین یہ ہے کہ اس مقتول جانور کی قیمت کے برابر کسی حلال جانور کی قربانی کرے۔

جزا کے بارے میں ارباب بصیرت کا فیصلہ

یہ فیصلہ کہ کون سا جانور کس قیمت کا ہے خود نہ کرے بلکہ دو منصف آدمیوں سے کرائے اور ان دونوں کے لیے شرط یہ ہے کہ مسلمان ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ جزا سے مراد وہ قیمت ہے جو دو بصیر آدمی اس شکار کی تجویز کریں اور یہ قیمت اس مقام کے اعتبار سے ہو جہاں وہ شکار مارا گیا ہے یا اس کے قریب تر مقام کے اعتبار سے ہو کیونکہ ایک چیز کی قیمت مختلف مقامات کے اعتبار سے بدل جاتی ہے نیز اس زمانہ کے اعتبار سے ہو جس زمانہ میں وہ شکار مارا گیا ہے کیونکہ مختلف اوقات میں ایک چیز کی قیمت مختلف ہوتی ہے اور دو منصف مسلمانوں کو حکم بنانے کا حکم اس لیے دیا ہے کہ شکاری جانوروں اور دوسرے پالتو جانوروں میں

قیمت کے توازن کا پتہ لینا ہر شخص کے بس کی بات نہیں ہے۔ اور پھر اس میں یہ بات بھی ہے کہ اگر مجرم کو خود ہی فیصلہ کرنے کا اختیار دے دیا جاتے تو ہر شخص اپنے لیے رعایتوں کے معاملہ میں بڑا فراخ حوصلہ ہوتا ہے اس لیے صحیح قیمت مقرر نہیں کر سکے گا اور جن بزرگوں کے خیال میں مماثلت سے مراد قیمت میں نہیں بلکہ خلقت، قامت اور جسامت میں مماثلت مراد ہے ان کا کہنا ہے کہ چونکہ شکاری جانوروں اور پالتو جانوروں میں مماثلت کا عام لوگوں کو پتہ نہیں ہوتا ہے اس لیے دو منصف مسلمانوں سے فیصلہ کرانے کا حکم دیا گیا ہے۔

یحکم بہ ذوا عدل منکم سے علامہ جمال الدین قاسمی نے یہ نکتہ خوب معلوم کیا ہے کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ مماثلت کے معاملہ میں اہل عدل و تقویٰ سے دریافت کرنا چاہیے۔ اس سے دلالۃً معلوم ہو رہا ہے کہ اسلامی قانون میں جمود نہیں ہے بلکہ وہ ایک لچکدار ضابطہ ہے اور اس میں نہ صرف اجتہاد کی گنجائش ہے بلکہ اس میں مجتہدین کی تصویب کی ضمانت ہے اور آئین و قانون کی زندگی میں غالب ظن پر عمل کیا جا سکتا ہے اور یہ بھی رہنما اصول اس میں موجود ہے کہ نادان کو دانا سے دریافت کرنا چاہیے اور اہل فن پر اعتماد کرنا چاہیے اور جب کسی معاملہ میں اختلاف ہو جائے تو ارباب بصیرت سے فیصلہ کرانا چاہیے۔

میمون بن مہران کہتے ہیں کہ ایک دیہاتی صدیق اکبر کی خدمت میں حاضر ہوا اور کہا کہ میں نے حالت احرام میں شکار کر لیا ہے مجھ پر کفارہ کیا ہے۔ صدیق اکبر نے حضرت ابی بن کعب کی طرف روئے سخن کر کے فرمایا کہ اس دیہاتی کے معاملہ میں آپ کی کیا رائے ہے؟۔ دیہاتی بول پڑا کہ میں آپ کے پاس خلیفہ ہونے کی حیثیت میں مسئلہ پوچھنے آیا ہوں اور آپ دوسرے سے دریافت کر رہے ہیں۔ مطلب یہ کہ مجھے آپکے سوا کسی اور سے پوچھنا ہوتا تو مجھے آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی کیا ضرورت تھی۔ صدیق اکبر نے فرمایا اللہ کے بندے میں ان سے اس لیے دریافت نہیں کر رہا کہ مجھے مسئلہ معلوم نہیں ہے بلکہ اس لیے مشورہ کر رہا ہوں کہ قرآن کا حکم یہ ہے کہ یحکم بہ ذوا عدل منکم اب ہم دونوں مشورہ کے بعد بالاتفاق رائے پیش پا افتادہ معاملہ کا فیصلہ کریں گے۔

اسی قسم کا ایک واقعہ فاروق اعظم کے بارے میں حافظ ابن جریر اور ابن کثیر نے نقل کیا ہے کہ قبیصہ ابن جابر کہتے ہیں کہ ہم حج کے ارادے سے چلے۔ معمول یہی تھا کہ صبح کی نماز کے بعد روانگی ہوتی۔ راہ میں ہم باتیں کرتے چلتے ایک روز اسی طرح صبح صبح جا رہے تھے کہ سامنے ایک ہرن نظر آگیا۔ساتھیوں سے ایک شخص نے پتھر اٹھا مارا۔ خدا کا کرنا ایسا کہ وہیں ڈھیر ہو گیا۔ ہم چل تو دیے مگر پریشان کافی تھے۔ مکہ پہنچے۔ میں اس ہرن مارنے والے ساتھی کو لے کر فاروق اعظم کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے سامنے

ساری کہانی دہرا دی۔ ان کے پاس ایک صاحب سپید جھک جھکے چاندی جیسے رنگ کے بزرگ تشریف فرما تھے ان کا نام عبدالرحمان بن عوف تھا۔ حضرت عمرؓ نے ان کی طرف متوجہ ہو کر ان سے باتیں کیں اور پھر ہم سے دریافت کیا عمداً قتل کیا ہے یا غلطی سے ایسا ہو گیا ہے عرض کیا نشانہ تو عمداً لگایا تھا مگر قتل کا ارادہ نہ تھا۔ فرمایا بکری ذبح کر دو اور اس کے گوشت کو صدقہ کر دو۔ ہم یہ سن کر وہاں سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ راستہ میں میں نے اپنے دوست سے کہا برادر اللہ کے شعائر کی تعظیم کرو۔ اونٹ ذبح کرو۔ شاید یہ کفارہ ہو جائے۔ امیر المومنین بیچارے کو تو خود مسئلہ کا پتہ نہیں ہے دیکھا نہیں کہ وہ ہماری موجودگی میں اس شخص سے پوچھ رہے تھے قبیصہ کہتے ہیں کہ مجھے قرآن کی اس آیت یحکم بہ ذوا عدل منکم کا کوئی پتہ نہ تھا۔ حضرت عمرؓ کو میری گفتگو کا علم ہو گیا۔ دیکھتا کیا ہوں کہ ہاتھ میں درہ لیے آ رہے ہیں۔ درہ میرے ساتھی پر اٹھا کر فرمایا حالتِ احرام میں شکار مارتے ہو اور فتویٰ میں غلطیاں نکالتے ہو۔

قربانی ہونے کی صورت میں کعبہ میں پہنچانا

اصل ارشاد ھدیا بالغ الکعبۃ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شکاری جانور کے مقابلے میں جس جانور کا جیسا کہ جمہور کی رائے ہے یا جس قیمت کا جیسا کہ امام ابوحنیفہ اور ابویوسف کی رائے ہے۔ ان دو منصف مسلمانوں نے فیصلہ کیا کہ اس قیمت سے اس کو اختیار ہے کہ کوئی جانور قربانی کا خرید کر حرم بھیج دے اور وہ وہاں ذبح کر دیا جائے۔ تفصیل یہ ہے کہ وہ مقتول جانور اگر غیر ماکول ہے تب تو یہ قیمت ایک بکری کی قیمت سے زیادہ واجب نہ ہو گی اور اگر وہ جانور ماکول ہو تو جو تخمینہ لگایا جائے گا وہ سب واجب ہو گا۔ اور اس کی قیمت کا کوئی جانور لا کر حرم میں ذبح کرے۔

آیت میں لفظ بلوغ سے کچھ بزرگوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قربانی کو حرم سے باہر سے لے کر حرم میں روانہ کرنا واجب ہے یہ امام مالک کا خیال ہے لیکن جمہور کو امام مالک کے اس خیال سے اتفاق نہیں ہے ان کے خیال میں حرم ہی میں خرید کر قربان کر دینا جائز ہے۔ ان کے خیال میں بالغ الکعبہ کی قید صرف بتانے کے لیے ہے کہ حدِ حرم ذبح کے لیے شرط ہے۔ قربانی کا بیرونِ حرم سے آنا یا لانا مقصود نہیں ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل بھی اسی کی تائید کرتا ہے۔

یہ بات کہ حرم میں قربانی کرنے کے بعد قربانی کا گوشت فقرا مکہ ہی پر صدقہ کرنا ضروری ہے یا نہیں جمہور کی رائے میں ایسا کرنا ضروری ہے۔ ان کے خیال میں آیت میں کعبہ کی قید اس کی نشاندہی کر رہی ہے۔ مگر امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ قربانی کے لیے تو حرم کا ہونا ضروری ہے لیکن گوشت کی

تقسیم کے لیے فقراء حرم کا ہونا ضروری نہیں ہے بلکہ یہ صدقہ دینے والے کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے کہ جہاں چاہے صدقہ کرے ۔ وجہ اس کی یہ بتائی ہے کہ ذبح ایک خالص غیر معقول المعنے عابدانہ پیمانہ ہے اس میں تو مکان کی شرط ہونی چاہیے لیکن گوشت کی تقسیم کا مسئلہ ایک معقول پیمانہ عبادت ہے۔ اس میں حرم کے مساکین کی پابندی ضروری نہیں ہے ۔

کفارہ طعام مسکین اور روزے کی صورت میں

اصل ارشاد میں او کفارۃ طعام مساکین او عدل ذالک صیاما مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص حالت احرام میں ہونے کے باوجود عمداً شکار کے گناہ کا ارتکاب کرے تو اس کا حکم یہ ہے کہ اسے کفارہ ادا کرنا چاہیے اس کی تین صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جس طرح کا جانور شکار کیا ہے اس کی قیمت کا دو منصف آدمیوں سے اندازہ کرا کے اس قیمت کا جانور خرید کر حرم بھیج دے اور وہ وہاں ذبح کر دیا جائے ، دوسری یہ کہ اس جانور کی قیمت سے گیہوں وغیرہ مول لے کر ہر فقیر کو ایک مقدار صدقہ فطر کی ادا کرے تیسری یہ کہ ہر مسکین کے کھانے کے بدلے ایک ایک روزہ رکھ لے ۔ اگر قیمت اس قدر واجب ہوئی ہے کہ اس سے قربانی نہیں ہو سکتی تو پھر صرف دو ہی باتوں کا اختیار ہے صدقہ دینے اور روزہ رکھنے کا ، اور اگر قدر قیمت واجب ہوئی ہے کہ اس میں ایک مقدار صدقہ فطر بھی نہیں بنتی ہے تو اختیار ہے کہ جس قدر مل جائے اسی قدر خرید کر محتاج کو دے یا اس کے بدلے روزہ رکھ لے لیکن اگر شکار کسی کا مملوک ہو تو اس کے قاتل کو دو قیمتیں ادا کرنی ہوں گی۔ ایک وہ جو دو منصف تجویز کریں گے اسے صدقہ کرے گا دوسرے وہ قیمت جو شکار کے مالک کو ادا کرے گا۔

یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جمہور کے نزدیک اس آیت میں او تخییر کے لیے ہے۔ یعنی یہ شکار کرنے والے کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے کہ چاہے تو قربانی دے دے چاہے تو مسکین کو کھانا کھلائے اور چاہے تو روزے رکھ لے۔ امام ابو حنیفہ ان کے صاحبین مالک شافعی اور ایک روایت میں امام احمد کا یہی مسلک ہے اور کچھ بزرگوں کا خیال یہ ہے کہ آیت میں او ترتیب کے لیے ہے امام شعبی نے ایک روایت میں امام احمد کا یہی مسلک بتایا ہے ۔

آخر میں فرمایا لیذوق وبال امرہ تاکہ مجرم اپنے کیے کا مزہ چکھ لے۔ اس سے حضرت امام ابو حنیفہ نے یہ لطیف نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ اگر احرام والے نے شکار کیا اور اس کے نتیجے میں اس کو حرم میں قربانی دینی پڑی ۔ اگر احرام والے نے اس شکار میں سے کھا لیا تو جتنا کھایا اس کی قیمت کر

صدقہ کرنا احرام والے کے ذمہ لازم ہوگا۔

گزشتہ را صلوات آئندہ را احتیاط

۱۸۸۔ اس سے پہلے جو کچھ ہو چکا خدا نے اسے معاف کر دیا ہے اور جو کوئی پھر کرے گا تو اللہ اس سے نافرمانی کا بدلہ لے گا، اللہ سب پر غالب اور بدلہ لینے والا ہے۔ یعنی نزول حکم سے پہلے یا اسلام سے پہلے زمانہ جاہلیت میں کسی نے یہ حرکت کی تھی تو اس سے اب خدا تعرض نہیں کرتا الا کہ اسلام سے پہلے بھی عرب میں حالت احرام میں شکار کو نہایت برا سمجھتے تھے اس لیے اس پر مواخذہ ہونا بے جا نہ تھا کہ جو چیز تمہارے زعم کے موافق جرائم میں داخل تھی اس کا ارتکاب کیوں کیا گیا اور عزیز ذوانتقام کا مطلب یہ ہے کہ کوئی مجرم نہ اس کے قبضہ وقدرت سے نکل کر بھاگ سکتا ہے اور بمقتضائے عدل جو جرائم سزا دینے کے قابل ہیں نہ خدا ان سے درگزر کرنے والا ہے۔ [1]

یعنی احرام کی حالت میں شکار کی ممانعت سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے وہ اللہ نے معاف کر دیا ہے یہ ایک ضابطہ عام ہے سیاسی، معاشرتی، دیوانی اور اخلاقی معاملات کے متعلق قرآن نے یہ بات واشگاف لفظوں میں بتائی ہے کہ قانون آنے سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہے وہ سب کچھ معاف ہے۔ خالص مالیاتی مسائل میں سود کے موضوع پر فرمایا فلہ ما سلف یعنی سود حرام ہونے سے پہلے جو کچھ لے چکا سے چکا۔ معاشرتی زندگی کے مسائل میں والد کی منکوحہ اور دو بہنوں کو نکاح میں جمع کرنے کو حرام قرار دے کر فرمایا الا ما قد سلف یعنی اس حکم کے نازل ہونے سے پہلے جو کچھ ہو چکا ہو چکا اب اس پر باز پرس نہیں ہے۔ اخلاقیات میں ابھی یہ آیت ہو لیس علی الذین آمنوا وعملوا الصالحت جناح فیما طعموا اور سیاسیات میں صاف طور پر کھلے لفظوں میں اعلان ہوا ہے ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف اگر وہ باز آجائیں تو پچھلے گناہوں کی باز پرس نہ ہوگی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے بتاتے ہوتے رحمت وعفو کے اس ضابطہ عام کو ان الفاظ میں پیش فرمایا ہے۔

الاسلام یجب ما قبلہ من الذنوب

اسلام پہلے تمام گناہوں کا قصہ تمام کر دیتا ہے

جو دین تمام ادیان کو ایک دین اور سب ملتوں کو ایک ملت بنانے آیا ہے اس کے لیے ضروری ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ وہ گنہ گاروں کی سب سے زیادہ اس مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے کہ اس کے ماضی کے گناہ معاف ہو گئے ہیں اور فطرۃً بھی ایک گنہ گار کی سب سے بڑی خواہش ہے اس لیے قرآن قدم قدم پر یہ اعلان کرتا ہے کہ ہر گنہ گار بھی اس کی آغوش میں آجائے گا وہ اس کے گناہوں کی مغفرت اور سیئات ابدی کے لیے ضامن ہو گا۔ اس کے باوجود اگر کوئی شخص پھر اس جرم کا تکرار کرے گا تو اللہ اس سے بدلہ لے گا اصل ارشاد ومن عاد فینتقم اللہ منہ ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس نے اس ارشاد کو بالکل الفاظ کی سطح تک محدود رکھ کر یہ مطلب بتایا ہے کہ اگر کوئی احرام والا ایک مرتبہ شکار کرتا ہے اور اس کا کفارہ ادا کرتا ہے تو اس کو اللہ سزا دے گا چنانچہ ان کے یہاں جب کوئی محرم کے شکار کا کیس آتا تو وہ دریافت کرتے کہ اس سے پہلے بھی یہ جرم کیا ہے اگر وہ کہتا کہ ہاں تو فرما دیتے جاؤ تم سے اللہ بدلہ لے گا اور اگر کہتا نہیں تو کفارہ کا فیصلہ فرما دیتے لیکن جمہور اس کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ دنیا میں سزا عذاب آخرت سے اس وقت بچائے گی جب کہ جرم کا تکرار نہ ہو اگر جرم میں تکرار ہو گا تو وہ دنیوی سزا کے ساتھ اخروی سزا کا بھی مستحق ہو گا۔ اور قاضی ثناء اللہ پانی پتی اس کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ اگر محرم نے شکار کیا اور کفارہ ادا کر دیا تو اللہ ماضی کے گناہ کو معاف کر دے گا اور اگر دوبارہ یہی گناہ کیا اور کفارہ ادا کیا تو اللہ اُسے آخرت میں سزا دے گا۔

حالتِ احرام میں سمندری شکار حلال ہے

۱۸۹۔ تمہارے لیے سمندر کا شکار اور اس کا کھانا حلال ہے تاکہ اس سے تمہیں بھی فائدہ ہو اور قافلے کے لیے زادِ راہ بھی ہو، اور تم پر خشکی کا شکار جب تک تم حالتِ احرام میں ہو حرام ہے اور اس اللہ کی نافرمانی سے بچو جس کے حضور میں تم سب جمع کیے جاؤ گے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ احرام میں دریا کا شکار یعنی مچھلی حلال ہے اور دریا کا کھانا یعنی مچھلی پانی سے جدا ہو کر مر گئی۔ اس نے نہیں پکڑی وہ بھی حلال ہے فرمایا کہ یہ تمہارے فائدے کو رخصت دی پھر کوئی یہ نہ سمجھے کہ حج کے طفیل سے حلال ہے فرمایا کہ اور سب مسافروں کے فائدے کو مچھلی اگر تالاب میں ہو وہ بھی دریا کا شکار ہے۔ یہ حکم شکار کا معلوم ہوا احرام کے اندر۔ اور احرام قصد ہے مکہ کا اس شہر اور گرد و پیش میں ہمیشہ شکار مارنا حرام ہے بلکہ شکار کو ڈرانا اور بھگانا بھی۔[۱]

یہاں دو چیزیں ہیں ایک صید البحر دوسرے طعام، مطلب یہ ہے کہ سمندر، دریا، نہر، تالاب کا شکار

---

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

کہ احرام والے کے لیے جائز ہے اور اس کے ساتھ دریائی شکار کا تیار کیا ہوا کھانا بھی محرم کے لیے حلال ہے یہ رخصت اللہ نے اس لیے عطا فرمائی ہے کہ احرام والوں کو اور اہلِ قافلہ کو زادِ راہ میں آسانی ہو۔ فائدہ: صید البحر پر طعام کا عطف کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ صید البحر دو قسم کا ہے ایک وہ جو کھایا جاتا ہے اور دوسرے وہ جو کھایا نہیں جاتا ہے۔ طعام وہ ہے جو کھایا جاتا ہے۔ یا یہ کہ صید البحر تر و تازہ شکار ہے اور طعام باسی اور خشک شکار ہے۔ جمہور نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ سمندر میں مرا ہوا جانور حلال ہے۔ روایات سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ سید رشید رضا لکھتے ہیں کہ اگر طعام بحر کے موضوع پر روایات نہ ہوتیں تو آیت قرآنی کا بظاہر مطلب یہی ہوتا کہ تمہارے لیے سمندر سے شکار کرنا حلال ہے اور سمندری شکار کا تیار شدہ کھانا بھی تمہارے لیے حلال ہے خواہ تم نے خود شکار کیا ہو یا نہ کیا ہو، طعامہ میں ضمیر بحر کی طرف نہیں بلکہ صید کی طرف راجع ہے۔

یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ احرام والے کے لیے حالتِ احرام میں شکار منع ہے لا تقتلوا الصید و انتم حرم۔ ظاہر ہے کہ یہی بات دہرائی نہیں جا رہی ہے بلکہ اب بتایا جا رہا ہے کہ خواہ بغیر قتل کے شکار پکڑا ہو۔ ہر حال میں احرام والے کے لیے شکار حرام ہے۔ کچھ بزرگوں نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ احرام والے کے لیے خشکی کا شکار مطلق حرام ہے خواہ کسی غیر محرم نے محرم کی اعانت، اشارے دلالت کے بغیر شکار کیا ہو اس کا کھانا بھی احرام والے کے لیے ناجائز ہے۔ طاؤس اور سفیان ثوری نے یہی رائے ظاہر کی ہے لیکن دوسرے جمہور علماء کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے اپنے لیے شکار کیا ہو تو احرام والے کے لیے اس کے کھانے کی ممانعت نہیں ہے اس پر اہلِ ایمان کا اتفاق ہے۔ احادیث صحیح سے اس کی تائید ہوتی ہے اس لیے آیت میں لفظ صید مصدری معنے میں ہے یعنی احرام والوں کے لیے شکار کرنا حرام ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ احرام والوں کے لیے شکار حرام ہے۔

البتہ اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف ہے کہ اگر کسی شخص نے احرام والے ہی کے لیے شکار کیا ہو تو احرام والے کے لیے اس کا کھانا کیسا ہے۔ امام ابوحنیفہ اسے محرم کے لیے حلال بتاتے ہیں جبکہ امام مالک احرام والے کے لیے اور حلال کے لیے اس کا کھانا ناجائز کہتے ہیں اور امام شافعی اور امام احمد فرماتے ہیں کہ جو شکار احرام والے کے لیے کسی نے کیا ہو اس کا کھانا احرام والے کے لیے ناجائز ہے اور غیر محرم کے لیے جائز ہے اور ایسے اس محرم کے لیے بھی جائز ہے جس کی خاطر شکار نہ کیا گیا ہو۔ روایات دونوں قسم کی ہیں۔ بعض روایات سے حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل یہ معلوم ہوتا ہے کہ دوسرے کا کیا ہوا شکار حالتِ احرام میں کھایا اور بعض سے حضور انور کا عمل یہ معلوم ہوتا ہے کہ انکار کر دیا۔ ان روایات میں کچھ لوگ مفاہمت اس طرح کرتے ہیں کہ جو شکار شکاری نے اپنے لیے کیا وہ حضور نے نوش فرمایا اور جو شکار شکاری نے حضور ہی کے لیے کیا حضور نے اس کے کھانے

سے انکار فرمایا اور دوسرے بزرگ ان روایات میں مناسبت اس طرح کرتے ہیں کہ شکار جو محرم ہی کے لیے کیا گیا ہو اس کا کھانا محرم کے لیے جائز ہے لیکن افضل نہ کھانا ہے۔ حضور انور نے نہ کھا کر درجہ استحباب و فضیلت بتا دیا اور کھا کر جواز کی طرف رہنمائی کی ہے۔ اور اس موضوع پر جو حدیث پیش کی جاتی ہے وہ اگرچہ صریح ہے مگر صحیح نہیں ہے۔

جَعَلَ اللّٰهُ الْكَعْبَةَ الْبَيْتَ الْحَرَامَ قِيٰمًا لِّلنَّاسِ وَالشَّهْرَ الْحَرَامَ وَالْهَدْيَ وَالْقَلَآئِدَ ۚ ذٰلِكَ لِتَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ وَاَنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ﴿٩٧﴾

اللہ نے کعبہ کو حرمت والا گھر بنایا ہے لوگوں کے لیے قیام کا ذریعہ ٹھہرادیا ہے نیز حرمت کے مہینوں کو اور حج کی قربانی کو اور قربانی کے ان جانوروں کو جن کی گردنوں میں پٹے پڑے ہوں[۱۹۰]۔ یہ اس لیے کیا گیا ہے تاکہ تم جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ سب کا حال جانتا ہے اور اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے[۱۹۱]۔

کعبہ انسانی اجتماعیت کا سنگ میل ہے

اس سے پہلی آیت میں ھدیا بالغ الکعبۃ میں کعبہ کا ذکر آیا تھا لیکن وہاں کعبہ سے حرم اور جوار کعبہ مراد تھا اب یہاں اسی تقرب سے کعبہ کا ذکر ہو رہا ہے اور تصریح موجود ہے کہ یہاں کعبہ سے البیت الحرام مراد ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ پہلے ذکر تھا کہ احرام والے پر شکار حرام ہے اب بتایا جا رہا ہے کہ

جیسے حرم حیوانوں کے لیے سامانِ امن ہے ایسے ہی بیت اللہ انسانی زندگی کے لیے امن کا ذریعہ ہے۔ کعبہ وہ مقام ہے جو مسلمان عرفاء کے خیال کے مطابق عرشِ الٰہی کا سایہ اور اس کی رحمتوں اور برکتوں کا سمت القدم ہے وہ ازل سے اس دنیا میں خدا کا معبد اور خدا پرستی کا مرکز رہا ہے سب سے بڑے پیغمبروں نے اس کی زیارت کی اور بیت المقدس سے پہلے اپنی عبادتوں کی سمت اس کو قرار دیا اول بیت وضع للناس لیکن حضرت ابراہیم سے بہت پہلے دنیا نے اپنی گمراہیوں میں اس کو بھلا کر بے نشان کر دیا تھا۔ حضرت ابراہیم کے وجود سے جب اللہ تعالیٰ نے اس ظلمت کدے میں توحید کا چراغ پھر روشن کیا تو حکم ہوا کہ اس گھر کی چاردیواری بلند کر کے دنیا میں توحید کا پتھر پھر نصب کیا جائے چنانچہ قرآن کی تصریح کے مطابق کعبہ حضرت ابراہیم کے زمانے میں بھی البیت العتیق تھا۔ کوئی گھر نہ تھا۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل نے مل کر اس گھر کی پرانی بنیادوں کو تلاش کر کے پھر نئے سرے سے ان پر چاردیواری قائم کی۔ حضرت ابراہیم و اسماعیل نے اس افتادہ بنیاد کو از سرِ نو بلند کیا۔ حضرت ابراہیم نے عراق، شام، مصر ہر جگہ پھر کر آخر اس گمنام گوشہ کو منتخب کیا جو باسطوت جباروں اور بت پرست اور ستارہ پرست قوموں کے حدود سے دور ایک بے نام و نشان صحرا میں ہر چہار طرف سے پہاڑیوں میں گھرا تھا اس لیے ارشاد ہوا ہے واذ بوّانا لابراھیم مکان البیت۔ اس سے معلوم ہوا کہ گھر کی جگہ تو پہلے سے متعین تھی البتہ دیواریں بے نشان تھیں۔

۱۹۰۔ اللہ تعالیٰ نے کعبہ کو حرمت والا گھر لوگوں کے لیے قیام کا ذریعہ بنایا ہے نیز حرمت والے مہینے کو اور حج کی قربانی کو اور قربانی کے ان جانوروں کو جن کے گلوں میں پٹے پڑے ہوں۔ کعبہ شریف دینی و دنیوی دونوں حیثیت سے لوگوں کے قیام کا باعث ہے، حج و عمرہ تو وہ عبادات ہیں جن کا ادا کرنا براہِ راست کعبہ ہی سے متعلق ہیں لیکن نماز کے لیے بھی استقبالِ قبلہ شرط ہے۔ اس طرح کعبہ لوگوں کی دینی عبادات کے قیام کا سبب بن گیا۔ پھر حج وغیرہ کے موقع پر تمام بلادِ اسلامیہ سے لاکھوں مسلمان جب وہاں جمع ہوتے ہیں تو بے شمار تجارتی، سیاسی، اخلاقی، مذہبی اور روحانی فوائد حاصل کر سکتے ہیں خدا نے اس جگہ حرمِ امن بنایا اس لیے انسانوں بلکہ بہت سے جانوروں تک کو وہاں رہ کر امن نصیب ہوتا ہے۔ عہدِ جاہلیت میں جبکہ ظلم و خونریزی اور فتنہ و فساد محض معمولی بات تھی۔ ایک آدمی اپنے باپ کے قاتل سے حرم شریف میں تعرض نہ کرتا۔ مادی حیثیت سے انسان یہ دیکھ کر حیرت زدہ رہ جاتا ہے کہ اس وادی غیر ذی زرع میں اتنی افراط سے سامان خورد و نوش اور نفیس قسم کے پھل اور میوے کہاں سے کھنچے چلے آتے ہیں۔ یہ سب حیثیات قیاماً للناس میں معتبر ہو سکتی ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ علمِ الٰہی میں پہلے ہی مقدر ہو چکا تھا کہ نوعِ انسانی کے لیے اس جگہ سے عالمگیر ابدی ہدایت کا

چشمہ پھوٹے گا اور مصلح اعظم سید کائنات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مولد و مسکن مبارک بننے کا شرف بھی سارے جہاں میں سے اسی خاک پاک کو حاصل ہوگا۔ ان سب وجوہ سے کعبہ کو قیاماً للناس کہہ سکتے ہیں کیونکہ کعبہ تمام روئے زمین کے انسانوں کے حق میں اصلاح اخلاق تکمیل روحانیت اور علوم ہدایت کا مرکزی نقطہ ہے اور کسی چیز کا قیام اپنے مرکز کے بغیر نہیں ہوسکتا۔ اس کے علاوہ محققین کے نزدیک قیاماً للناس کا مطلب یہ ہے کہ کعبہ شریف کا مبارک وجود کل عالم کے قیام اور بقا کا باعث ہے دُنیا کی آبادی اسی وقت تک ہے جب تک خانہ کعبہ اور اس کا احترام کرنے والی مخلوق موجود ہے۔ جس وقت خدا کا ارادہ یہ ہوگا کہ کارخانہ عالم کو ختم کیا جائے تو سب کاموں سے پہلے اسی مبارک مکان کو جسے بیت اللہ شریف کہتے ہیں اٹھالیا جائے گا جیسا کہ بنانے کے وقت بھی زمین پر سب سے پہلے یہی مکان بنایا گیا تھا ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ بخاری کی حدیث میں ہے کہ ایک سیاہ فام حبشی جسے ذوالسویقتین کے لقب سے پکارا ہے۔ عمارت کعبہ کا ایک پتھر اکھاڑ کر ڈالدے گا جب تک خدا کو اس دُنیا کا نظام قائم رکھنا منظور ہے کوئی طاقتور سے طاقتور قوم جس کا مقصد کعبہ کو ہدم کرنا ہو اپنے اس ناپاک ارادے میں کامیاب نہیں ہوسکتی۔ اصحاب فیل کا قصہ تو ہر شخص نے سنا ہے لیکن ان کے بعد بھی ہر زمانے میں کتنی قوموں اور شخصوں نے ایسے منصوبے باندھے ہیں اور باندھتے رہتے ہیں۔ یہ محض خدائی حفاظت اور اسلام کی صداقت کا عظیم الشان نشان ہے کہ باوجود سامان اور اسباب ظاہر کے فقدان کے آج تک کوئی شخص اس ابلیسانہ مقصد میں کامیاب نہ ہوسکا اور نہ ہوسکے گا انشاءاللہ اور جب عمارت کعبہ کے گرانے میں قدرت کی جانب سے مزاحمت نہ رہے گی تو سمجھو کہ عالم کی ویرانی کا حکم آن پہنچا۔ دُنیا کی حکومتیں اپنے دارالسلطنت اور قصر شاہی کی حفاظت کے لیے لاکھوں سپاہی کٹوا دیتی ہیں لیکن کبھی خود ہی قصر شاہی کو کسی مصلحت سے تبدیل یا ترمیم کرنا چاہیں تو معمولی مزدوروں سے اس کے گرانے کا کام لیا جاتا ہے۔ شاید اسی لیے امام بخاری نے باب جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس۔ میں ذوالسویقتین کی حدیث درج کرکے قیاماً للناس کے اسی مطلب کی طرف اشارہ کیا ہے جو ہم نقل کرچکے ہیں نبہ علیہ شیخنا المترجم قدس اللہ روحہ فی درس البخاری بہرحال آیت زیر بحث میں احکام محرم بیان فرمانے کے بعد کعبہ شریف کی عظمت و حرمت کو بیان کرنا مقصود ہے۔ پھر کعبہ اور احرام کی مناسبت سے شہر حرام اور ہدی و قلائد کا بھی ذکر فرمادیا جیسا کہ اسی سورت کے آغاز میں غیر محلی الصید و انتم حرم کے لا تحلوا شعائر اللہ ولا الشھر الحرام ولا الھدی ولا القلائد کو ملحق فرمادیا [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کعبہ لغت میں چوکھٹے کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ گھر چوکھٹا بنا تھا اور اب بھی اسی طرح ہے اس لیے کعبہ کے نام سے مشہور ہوگیا اور کچھ کے خیال میں کعب کے معنے بلند مقام کے ہیں۔ آدمی کے ٹخنے کو بھی کعب اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ قدم سے اونچا ہوتا ہے گویا کعبہ کو کعبہ اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ اپنی عظمت اور بزرگی کے اعتبار سے دوسرے تمام امکنہ سے بلند ہے۔ امام رازی نے اسی کو اپنایا ہے لیکن پہلے معنے زیادہ صحیح ہیں۔ اور بیت الحرام اس لیے کہا گیا ہے کہ اس میں چھت اور دیواریں ہیں اور یہی بیت کی حقیقت ہے۔ نہ اس لیے کہ اس میں کسی کی سکونت ہے۔

خود مکہ بھی قدیم زمانوں کے بعض محققین کے نزدیک بابلی یا کلدانی لفظ ہے جس کے اصل معنے گھر کے ہیں۔ اس سے دو حقیقتیں ظاہر ہوتی ہیں کہ آبادی اس وقت قائم ہوئی جب بابل اور کلدان کے قافلے ادھر گزرتے تھے اور یہ اس کی ابراہیمی نسبت کی ایک اور دلیل ہے۔ دوسرے یہ معلوم ہوا کہ اس شہر کی آبادی اسی گھر کے تعلق سے وجود میں آئی اور یہ کعبہ کی قدامت اور تقدس اور اہل عرب کی روایات کی صحت پر دلیل قاطع ہے۔

یونانی تاریخوں میں بھی کعبہ کا حوالہ موجود ہے۔ یونان کے مشہور مورخ ڈیوڈرس جو حضرت عیسٰی سے ایک صدی پہلے گزرا ہے وہ عرب کے ذکر میں کہتا ہے۔

> ثمودیوں اور عرب والوں کے درمیان ایک معبد ہے جس کی تمام عرب بہت بڑی عزت کرتے ہیں۔

اور ثمود کا مقام شام و حجاز کے حدود میں تھا اور سبا کا یمن۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں ملکوں کے درمیان حجاز ہی ہے اور وہاں کا مشہور معبد جس کی سارے عرب عزت کرتے ہیں کعبہ ہے۔ رومیوں کی تاریخ میں خانہ کعبہ کا ذکر ملتا ہے۔ پروکوپیس مورخ لکھتا ہے کہ ۵۴۱ء میں رومی سپہ سالار بلیزیریس نے اپنے تمام فوجی افسروں کا ایک جلسہ مشاورت کیا۔ اس میں شام کے دو افسروں نے اٹھ کر کہا کہ وہ آئندہ لڑائی میں شریک نہیں ہو سکتے۔ کیونکہ اگر وہ اپنی جگہ سے ہٹے تو عرب کا بادشاہ منذر سوم فوراً حملہ کر دے گا اس پر سالار نے کہا۔

> تمہارا یہ خطرہ صحیح نہیں کہ عنقریب وہ موسم آنے والا ہے جس میں عرب اپنے "دو مہینے" عبادت کے لیے خاص کرتے ہیں اور اس زمانے میں ہر قسم کے ہتھیاروں سے وہ پرہیز کرتے ہیں۔ (نتائج الافہام فی تقویم العرب قبل الاسلام)

ظاہر ہے کہ یہ صاف حج کا بیان ہے۔

قرآن نے یہاں کعبہ کو البیت الحرام کہنے کے بعد قیاماً للناس کہا ہے یعنی اللہ نے کعبہ کو لوگوں کے

قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ بنانے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ خلقی اور تکوینی طور پر اللہ نے کعبہ کو لوگوں کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے اور دوسرے یہ کہ امری اور تکلیفی طور پر اللہ نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ تکوینی لحاظ سے اس طرح کہ اللہ نے اس گھر کی عزت و عظمت لوگوں کے دلوں میں اس طرح مستحکم کر دی ہے کہ وہاں کے باشندوں کی تمام معاشی، سیاسی شیرازہ بندی اس گھر کی بدولت تھی اور امری طور پر اس طرح کہ حج اور عمرہ کی عبادات یہاں ہی ادا کی جاتی ہیں۔ ہماری رائے میں دونوں لحاظ سے کعبہ لوگوں کے لیے حفظ و بقا کا ذریعہ ہے۔ کیونکہ عرب میں کعبہ کی حیثیت محض ایک مقدس عبادت گاہ کی نہ تھی بلکہ اپنی مرکزیت اور اپنے تقدس کی وجہ سے وہ پورے ملک کی معاشی و تمدنی زندگی کا سہارا بنا ہوا تھا۔ حج اور عمرے کے لیے سارا ملک اس کی طرف کھنچ کر آتا تھا۔ اور اس اجتماع کی بدولت انتشار کے مارے ہوئے عربوں میں وحدت کا ایک رشتہ پیدا ہو گیا۔ مختلف علاقوں اور قبیلوں کے لوگ باہم تمدنی روابط قائم کرتے۔ شاعری کے مقابلے سے ان کی زبان اور ادب کو ترقی ہوتی۔ تجارتی لین دین سے سارے ملک کی معاشی ضروریات پوری ہوتیں۔ حرام مہینوں کی بدولت عربوں کو سال کا ایک پورا تہائی زمانہ امن کا نصیب ہو جاتا۔ بس یہی ایک ایسا زمانہ تھا جس میں ان کے قافلے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک بسہولت جاتے تھے۔ قربانی کے جانوروں اور قلادوں کی موجودگی سے اس نقل و حرکت میں بڑی مدد ملتی کیونکہ نذر کی علامت کے طور پر جن جانوروں کی گردنوں میں پٹے پڑے ہوتے انہیں دیکھ کر عربوں کی گردنیں احترام سے جھک جاتیں اور کسی غارت گر قبیلے کو ان پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہ ہوتی۔[1]

اس موضوع پر حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے جو داد تحقیق دی ہے وہ آپ ہی کا حصہ ہے۔ جی چاہتا ہے کہ سینۂ قاسم سے اُبلے ہوتے علوم لوگوں کے سامنے پیش کر دوں لیکن معالم القرآن کے صفحات اس کے متحمل نہیں ہیں۔ مولانا عثمانی نے محققین کے نام سے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ لیجئے سب کچھ نہیں تو کچھ تو ضرور پڑھ لیجئے۔ مولانا فرماتے ہیں :

جب بیت المقدس تجلی گاہ مرتبہ حکومت ٹھہرا اور خانہ کعبہ تجلی گاہ مرتبہ محبوبیت تو بیت المقدس کو تو بمنزلہ کچہری حکام یا دیوانِ عام خیال فرمائیے اور خانہ کعبہ کو بمنزلہ محل سرائے بادشاہی یا دیوانِ خاص بلکہ بمنزلہ جلوہ گاہ و محفل محبوب انام اور ظاہر ہے کہ کچہری کا مکان نفقط داد رسی مظلومان اور سزا دہی ظالمین کے واسطے ہوتا ہے۔ سو یہ جب ہی تک متصور ہے کہ جب تک عمائد رعیت برسر اطاعت ہوں۔ اور اگر

---

[1] تفہیم القرآن۔

عمائد رعیت خود سرکش ہو جائیں تو پھر وہ مکان کسی کام کا نہیں اور اُس زمانہ میں اگر وہ ویران اور مسمار ہو جاتے
تو بلا سے اور محل سرا اور دیوان خاص چونکہ شب و روز کے رہنے کے لیے ہوتا ہے۔ اُس کی نگہبانی ہمیشہ
کے لیے ضروری سمجھی جاتی ہے اس لیے خانہ کعبہ کو کوئی شخص مسمار نہ کر سکا۔ اور بیت المقدس بوجہ سرکشی
بنی اسرائیل جو اُس زمانہ میں بمنزلہ عمائد رعیت تھے بیکار ہو گیا۔ اور اس وجہ سے اس کی نگہبانی بے سود نظر آئی۔
یہاں تک کہ کفار کے ہاتھوں سے ویران اور مسمار ہونے کی نوبت آئی۔ علاوہ بریں کار حکام کیا ہے۔ عزل و
نصب اہل خدمات اور رتق و فتق مہمات سو یہ بات بدون تبدیل و تغیر ممکن الوقوع نہیں اس لیے بیت المقدس
مظہر خاصیت تغیر و تبدیل ہوگا اور اس لیے اگر وہاں آبادی کی جا ویرانی اور ویرانی کی جا آبادی ہوتی رہے تو
دُور از عقل نہیں کیونکہ جس چیز میں خاصیت تغیر و تبدیل ہوتی ہے۔ مثلاً آتش وہ جہاں خود ہوتی ہے وہاں
زیادہ تغیر و تبدیل کا احتمال ہوتا ہے اور تاثیر محبوبیت یہ ہے کہ ہجوم خلائق اور ہنگامہ اجتماع ہو اگر ویرانہ میں
بیٹھ جائے تو ہر عام و خاص پروانہ وار وہیں جان قربان کرنے کو تیار ہو جائیں یہی وجہ معلوم ہوتی ہے کہ خانہ
کعبہ کے گرداگرد ایسا ملک رکھا جہاں سامان عیش و عشرت کو چراغ لے کر ڈھونڈھیے تو پتہ نہ ملے" تاکہ
اس ہجوم خلائق سے جو ہر سال ہر موسم حج میں اس قدر ہوتا ہے کہ عالم میں کسی میلہ اور ہنگامہ میں آنا نہ ہوگا
ہر کوئی یہ سمجھ جائے کہ واقعی یہاں کوئی ایسا دلبر جلوہ گر ہے جس کے جمال عالم فریب کا ایک عالم دیوانہ ہے بالجملہ
یہ ہفت اقلیم کے آدمیوں کی آمد جس میں خانہ کعبہ تمام عالم کے مقامات متبرکہ اس مقام مقدس اور زیارت گاہ
مکہ معظمہ سے بالبداہتہ بالاتفاق ممتاز ہے اور پھر اُس پر اس ملک کی یہ خشکی اور کمی پیداوار مفقودہ عقل کو اس
اس بات پر شاید ہے کہ ہو نہ ہو یہاں جلوہ محبوب حقیقی ہے اور اس لیے احرام کی حالت کی یہ کیفیت کہ
نہ عمامہ نہ ٹوپی نہ موزہ نہ جراب نہ سیا ہوا کپڑا نہ خوشبو نہ مرد کو عورت سے مطلب نہ عورت کو مرد سے سروکار،
پھر ذکر لبیک کی نعرہ زنی اور پروانہ وار طواف کعبہ و صفا و مروہ اور میدان عرفات و مزدلفہ کی تضرع و زاری
اور منیٰ کی قربانی و جاں نثاری اور جمرات ثلاثہ کی سنگساری جس سے ناصح نادان کی طرف سنگ باری یاد آتی
ہے اور سوا اس کے اور وہ ارکان جو منجملہ خواص عاشقان جاں نثار ہوتے ہیں۔ اول سے آخر تک چسپاں
نظر آتے ہیں۔ علاوہ بریں حکومت خداوندی بدلالت تقریرات گزشتہ منجملہ آثار محبوبیت ہے کیونکہ مرتبہ
وجود جو صادر اول اور مصداق اسم مالک اور حاکم ہے۔ اُس تجلی اول سے صادر ہوا ہے جو بوجہ اجتماع
جملہ محاسن مصداق اسم جمیل ہے۔ اس لیے مرتبہ حکومت میں جو کچھ ہوگا۔ وہ مرتبہ محبوبیت کا پرتو
ہوگا۔ اور باہم ایسا فرق ہوگا جیسا آفتاب اور زمین میں نظر آتا ہے۔ یعنی آفتاب کے تو رگ و ریشہ
میں نور رچا ہوا ہوتا ہے اور زمین کے اوپر اوپر اور گرداگرد اور اس لیے زمین میں کبھی نور آجاتا ہے،

کبھی چلا جاتا ہے۔ اور آفتاب میں برابر یکساں رہتا ہے مگر یہ ہے تو پھر برکات کا خانہ کعبہ سے جدا ہونا ممکن نہیں اور بیت المقدس سے منفصل ہو جائیں تو عجب نہیں اور شاید یہی وجہ معلوم ہوتی ہے۔ جو بہ نسبت خانہ کعبہ لفظ مبارکاً قرآن میں آیا اور بہ نسبت بیت المقدس بارکنا حولہ قرآن میں فرمایا تاکہ معلوم ہو جائے کہ جیسے لفظ مبارک میں ہیئت صیغہ جو موصوف بالبرکت پر دلالت کرتی ہے اور مادہ مصدری جو وصف برکت پر دلالت کرتا ہے باہم ایسے مخلوط ہیں کہ جدا کرو تو جدا نہیں ہو سکتے ایسے ہی خانہ کعبہ سے اس کی برکات منفصل نہیں ہو سکتیں اور جیسے لفظ بارکنا حولہ میں بدلالت لفظ حول اور نیز بایں وجہ کہ دال علی البرکت

اعنی لفظ بارکنا اور دال علی الموصوف بالبرکت اعنی ہای حولہ میں فاصلہ ہے۔ موصوف بالبرکت اور وصف برکت میں انفصال ہے ایسے ہی بیت المقدس کی برکات اُس سے اتصال ذاتی نہیں رکھتیں جو جدا ہی نہ ہو سکیں۔ مگر جب خانہ کعبہ کی برکات ممکن الانفصال نہیں، اور بیت المقدس کی برکات ممکن الانفصال ہیں تو بیت المقدس کا بے دینوں کے ہاتھوں سے مسمار ہو جانا اور خانہ کعبہ کا مسمار نہ ہو سکنا دوراز عقل نہیں مگر چونکہ یہ ارتباط برکات اس مرتبہ محبوبیت کا نتیجہ ہے۔ جس کے اثبات سے ہم بوجہ اکمل فراغت پا چکے ہیں تو اگر وہ تجلی محبوبانہ جس کی تاثیر محبت ہے مبدل بہ تجلی غضبان ہو جائے تو پھر بجائے محبت خوف اور بجائے اجتماع و ہجوم تفرق اور افتراق لازم ہے۔ چنانچہ ظاہر ہے۔ باقی بجائے محبوبیت بعد محبوبیت تجلی غضب کا ہونا۔ اوّل تو یوں مستبعد نہیں کہ غضب اوروں کے افعال ناشائستہ کا ثمرہ ہوتا ہے اور اس لیے بدون ظہور نافرمانی اُس کے ظہور کی کوئی صورت نہیں۔ اور محبوبیت کسی غیر کے کسی فعل کا نتیجہ نہیں ہوتا بلکہ ایک صفت اصلی اور ذاتی ہوتی ہے۔ مثل حکومت اور غضب اوروں کے افعال سے سروکار نہیں ہوتا۔ اس لیے یہ یقین کامل چاہیے کہ محبوبیت اصل ہے اور غضب اس سے بعد دوسرے صفات انسانی نمونہ صفات ربانی ہیں جیسے یہاں نوبت بہ نوبت ظہور ہوتا ہے اور ایک کے ظہور کے وقت اُس کی صفات متضادہ کا اثر بھی محسوس نہیں ہوتا ایسے ہی جناب باری کی صفات کو خیال فرمایئے اور کیوں نہ ہو۔ یہاں جو کچھ ہے وہیں کا پرتو ہے سو جو کیفیت یہاں ہوگی وہ وہاں اوّل ہوگی سو جیسے یہاں وقت محبت و عنایت غضب کا نام و نشان نہیں ہوتا اور وقت غضب محبت کا پتہ نہیں لگتا۔ ایسے ہی وقت ظہور محبوبیت جو محبت کی بھی اصل ہے غضب کا اثر نمایاں نہ ہوگا اور وقت ظہور غضب محبوبیت کا اثر عیاں نہ ہوگا کیونکہ محبوبیت اور غضب میں باہم تضاد ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ محبت جو ضد عداوت

ہے خود ایک سامان محبوبیت ہے۔ یہی وجہ ہے کہ محبت اور اخلاق والوں سے محبت و اخلاق سے پیش آیا کرتے ہیں۔ اور یہ بھی ظاہر ہے کہ خدا کا جو وصف ہے علی الاطلاق ہے اور اُس کا جو کمال ہے بدرجۂ کمال ہے ورنہ کسی وجہ سے اگر مقید اور کسی طرح سے اگر ناقص تصور کریں تو اُس سے اوپر اور کسی میں اُس وصف کو علی الاطلاق اور کامل ماننا پڑے گا کیونکہ ہر مقید کے لیے وجود مطلق ضروری ہے اور ہر ناقص کے لیے کامل کی ضرورت جس کے لحاظ سے اس کو کامل کہا ورنہ اور کوئی اگر کامل نہیں تو یہ ناقص بھی نہیں کانے اور لنگڑے اور لنجے کا نقصان اگر معلوم ہوتا ہے تو دو آنکھوں والوں اور دو پاؤں والوں اور دو ہاتھ والوں کے کمال کے مقابل میں معلوم ہوتا ہے ورنہ اس کو نقصان کہنا غلط مگر جب خدا سے اوپر کسی کمال اور وصف میں کوئی کامل نکلا تو پھر اُسی کو خدا کہنا چاہیے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ خدا کو خدا اس لیے کہتے ہیں کہ وہ بذاتِ خود موجود ہوتا ہے کسی اور کے موجود کرنے کی حاجت نہیں بلکہ وہی اوروں کو موجود کرتا ہے یعنی یہ بات بے اس کے متصور نہیں کہ وجود اس کے حق میں خانہ زاد اور وصف ذات اور لازم ذات ہو اور جب وجود خانہ زاد اور لازم ذات ہوگا تو ہر کمال اور ہر وصف کمالی بدرجۂ کمال ہوگا کیونکہ سب کمالات وجود کے حق میں لازم ذات ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بے وجود صاحب کمال اُن کا وجود ممکن نہیں مگر جب وجود کے حق میں تمام کمالات لازم ذات ہوتے تو لاجرم ممکنات میں جن کا وجود مطلق نہیں مقید ہے وہ کمالات بھی مقید ہو کر آئیں گے سو اگر خدا میں بھی کمال محبوبیت مقید ہو علی الاطلاق اور بدرجۂ کمال نہ ہو تو یوں کہو وہ خدا نہیں ممکن ہے اور اُس کے اوپر کوئی اور ہے جس کے اصل میں خدا ہے اس لیے اس کی محبوبیت بھی بدرجۂ کمال اور علی الاطلاق اور بوجہ اتم ہوگی اور بالضرور بوجہ محبت بھی وہ محبوب ہوگا اور اس لیے وصف غضب کو جو منجملہ آثار عداوت ہے اس کی محبوبیت کے ساتھ تضاد ہوگا اور یہ جو اقربا اور احباب کا غصہ اور ان کا رنج اس قول کے مخالف نظر آتا ہے تو وہ بوجہ قلت تدبر مخالف نظر آتا ہے احباب و اقارب کا رنج اور غصہ اگر ہوتا ہے تو بے وجہ تو ہوتا ہی نہیں کسی نہ کسی بے اعتدالی کا نتیجہ ہوتا ہے اور ظاہر ہے کہ وہ بے اعتدالی اور ہی چیز ہے اور قرابت اور دوستی اور چیز ہے در صورت اجتماع موجب محبت وہ قرابت اور دوستی ہوگی اور موجب رنج و غضب وہ بے اعتدالی اور بد افعالی سو جیسے قرابت اور محبت بذاتِ خود محبوب ہیں ایسے ہی بے اعتدالی اور بد افعالی بذاتِ خود مبغوض۔ سو اس صورت میں وہ رنج اور غصہ احباب سے نہیں ہوتا اعدا ہی سے ہوتا ہے کیونکہ اس صورت میں نہ اقربا اور احباب بجمیع الوجوہ محبوب ہوتے ہیں۔ اور نہ بجمیع الوجوہ مبغوض بجہت قرابت و محبت محبوب ہوتے ہیں اور بجہت بد افعالی اور بے اعتدالی مبغوض سو وہ غصہ حقیقت میں اقربا اور احباب پر نہیں

ہوتا، عداوت ہی پر ہوتا ہے۔ بالجملہ وصف غضب کو بایں وجہ کہ وہ منجملہ آثار عداوت اور بغض ہے۔ صفت محبوبیت کے ساتھ تضاد ہے۔ اور جب تضاد ہوگا تو پھر باعتبار ظہور اجتماع ممکن نہیں بلکہ وقت ظہور غضب مرتبہ محبوبیت کا استتار اسی طرح لازم ہے جیسے ایک جسم کی آڑ میں دوسرا جسم مستور ہوجاتا ہے اور ایک رنگ کے پردہ میں دوسرا رنگ چھپ جاتا ہے۔ سو جیسے کسی جسم کے اور آئینہ کے بیچ میں کوئی دوسرا جسم حائل ہوجاتا ہے تو بجائے جسم اول جسم ثانی اُس میں منعکس ہوجاتا ہے اور جسم اوّل کا عکس مفقود ہوجاتا ہے ایسے ہی اگر تجلی محبوبیت اور آئینہ بود ربجود یعنی خانہ کعبہ کے بیچ میں تجلی غضب و جلال

حائل ہوجائے تو تجلی اوّل کے عکس کے بدلے تجلی ثانی کا انعکاس لازم ہے۔ اور در صورت حیلولت یہ ہوکر خدا کا جامع الکمالات ہونا تو مسلم اس لیے یہ ضروری ہے کہ وہ محبوب عالم ہے۔ گو گنہگاروں کے حق میں غضب ناک بھی ہو۔ مگر اور کمالات کو دیکھا تو باعتبار ظہور آثار محبوبیت سے اُن کو تضاد نہیں۔ بلکہ ایک طرح کا لزوم ہے۔ چنانچہ حکومت کا منجملہ لوازم محبوبیت ہونا بذریعہ ضرورت رضا جوئی پہلے ثابت ہوچکا اور سوا اس کے اور صفات کو چنداں محبوبیت سے بُعد نہیں اگر تھا تو حکومت ہی کو یہ بُعد تھا کیونکہ بوجہ قرب جو حکومت کو لازم ہے محکومیت کا احتمال ظاہر و باہر ہے اور سوا اس کے اور صفات میں کوئی وجہ تضاد نہیں جو بعد ہو بلکہ سمع و بصر و وجود و علم و حیا کا تناسب سب پر ظاہر ہے علیٰ ہذا القیاس اور صفات کو سمجھ لیجئے مگر ہاں صفت غضب کا باعتبار ظہور آثار متضاد ہونا بھی ظاہر ہو چکا گو باعتبار اصل غضب جس کو بالقوہ کہیے صفت غضب بھی منجملہ مبادی اور متممات جمال اور سامان محبوبیت ہے کیونکہ جمال کے لیے ہر ہر تجلی میں تمام کمالات مکنونہ کا ظہور ضرور ہے اور جب غضب باعتبار ظہور آثار زیر و بالا مخالف محبوبیت ہے تو پھر جیسے اجزاء آب وقت حرکت زیر و بالا ہوجاتے ہیں۔ خصوصاً آب حوض و تالاب اور وہ بھی فوق و تحت کی حرکت کے وقت ایسے ہی صفات بنی آدم وغیرہم کو ہم دیکھتے ہیں کہ باعتبار ظہور آثار زیر و بالا ہوتے رہتے ہیں۔ چنانچہ ظاہر ہے کہ وقت غضب محبت اور رحمت کا پتہ نہیں لگتا اور وقت رحمت و محبت غضب اور عداوت کا نشان نہیں ملتا۔ اس لیے یہ ضرور ہے کہ وقت ظہور آثار غضب محبوبیت مستور ہوجاتے اور اس استتار کے باعث بجائے عکس محبوبیت عکس غضب و جلال جلوہ گر ہو کیونکہ مبدا جملہ صفات وہی تجلی اوّل ہے چنانچہ پہلے عرض کرچکا ہوں بالخصوص صفت غضب جو حسب تحریر بالا ضد محبوبیت ہے کیونکہ اوصاف متضادہ محل واحد پر متوارد ہوا کرتے ہیں اس لیے مبدا ظہور اور محل نمود صفت غضب بھی وہ تجلی اوّل ہی

ہو گی الغرض وقت ظہور آثار صفات متضادہ آثار کا تہ و بالا ہونا لازم ہے اور بوجہ تقابل مذکور اس خانہ کعبہ میں ان سب کا انعکاس ضرور ہے مگر جیسے انعکاس محبوبیت کو بوجہ تضمن محبت جس کی طرف ابھی اشارہ گزرا ساختگی اور پرداختگی عالم ضرور تھا ایسے ہی انعکاس غضب کو ویرانی اور بربادی زمین و آسمان اور انسانوں اور جنوں و حیوانوں لازم ہے۔ اس صورت میں سب میں بوجہ اتصال و قرب خانہ کعبہ کے ویرانی چاہیے اس کے بعد اور عالم کی بربادی بقدر قرب علی الترتیب مناسب ہے۔ چنانچہ مشاہدہ حال آتش سے جو مظہر غضب ذوالجلال ہے یہ بات عیاں ہے کہ اشیاء قریبہ اور متصلہ اول طعمہ آتش ہوتی ہیں۔ پھر جوں جوں آتش بھڑکتی جاتی ہے دور دور اور اشیاء زیر تصرف آتی جاتی ہیں بالجملہ جس وقت ظہور تجلی صفت غضب ہو اس وقت اس عالم کی خیر نہیں اس لیے جیسے یہ خانہ پاک جس کو خانہ خدا کہیے یعنی خانہ کعبہ وقت ظہور آثار محبوبیت و رحمت مظہر اول تھا ایسے ہی وقت ظہور آثار غضب و جلال بھی یہی مظہر اول ہوگا اور اس لیے خانہ کعبہ کی ویرانی کو قیامت یعنی عالم کی ویرانی کی ابتداء سمجھتے اور کیوں بادشاہی مکانات آبادی اور بربادی میں اور خیمہ حکام نصب اور قلع قمع میں اوروں کے مکانات اور اوروں کے خیموں کی نسبت اول رہتے ہیں۔ یعنی جب دار الخلافت آباد کیا جاتا ہے تو اول شاہی مکانات کے لیے زمین اور میدان تجویز کر کے تہیہ تعمیر کیا جاتا ہے۔ اس کے بعد امراء وزراء وغیرہم شاگرد پیشوں کے مکانات کے نقشے جمائے جاتے ہیں۔ علی ہذا القیاس اگر دار الخلافت بوجہ تبدیل دار الخلافت یا کسی اور وجہ سے ویران ہوتا ہے تو اول بادشاہ اپنے مکانات کو ترک کرتے ہیں پھر ان کے سبب اور سب اپنے گھروں کو ترک کر کے چل دیتے ہیں ایسے ہی وقت دورہ حکام جہاں کہیں ڈیرہ ہوتا ہے اول کہیں خیمہ حکام نصب کیا جاتا ہے اس کے بعد اس کے گرد و پیش میں اوروں کے خیمے اور پالیں قائم کی جاتی ہیں اور پھر وقت روانگی اول خیمہ حکام اکھاڑا جاتا ہے اس کے بعد اوروں کے خیمے اکھڑنے شروع ہو جاتے ہیں۔ سو اس عالم اجسام میں خانہ کعبہ کو منزلہ مکان شاہی یا خیمہ شاہی خیال فرمایئے اور کیوں نہ ہو تجلی گاہ ربانی اور آئینہ جمال یزدانی ہے اس لیے بنانے میں بھی اسی کو اول رکھا اور ویرانی عالم کے وقت بھی اسی کو اول رکھیں گے۔ چنانچہ آیت ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ جس کا حاصل یہ ہے کہ سب سے پہلا گھر جو لوگوں کے لیے بنایا گیا ہے جو کہ مکہ معظمہ میں ہے اس کی اولیت تعمیر پر دلالت کرتی ہے اور اہل اسلام اس روایت پر نظر کیجیے جس میں کچھ ایسا ہے کہ اول پانی تھا اور اس پانی ہی پر عرش کبریائی تھا۔ پھر اس پانی میں سے اس جگہ سے جہاں پر اب خانہ کعبہ ہے ایک بلبلا سا اٹھا، جھاگ سے اٹھے اور وہیں سے زمین کی بناء شروع ہوئی تو اولیت خانہ کعبہ دور تک پہنچتی ہے کیونکہ موافق اشارات قرآنی مثل خلق لکم ما فی الارض جمیعا ثم استوی الی السماء

فسوّٰھن سبع سمٰوٰت۔ زمین جملہ عناصر اور تمام افلاک سے پہلے پیدا ہوئی ہے گو اس کا پھیلاؤ آسمانوں کے بعد وقوع میں آیا ہو پھر جب زمین کا یہ ٹکڑا خاص جہاں خانۂ کعبہ ہے زمین کے اجزاء میں بھی سب میں اوّل نکلا تو یوں کہو بعد عرش کے جو عالم ہے ایک علیحدہ چیز ہے کیونکہ وہ تخت ربانی ہے۔ اور عالم بمنزلہ ملک و رعیت یزدانی خانۂ کعبہ کی جگہ سب میں اوّل ہوئی۔ بہرحال ان اوّل بیت اور روایت مشارٌ الیہا اور اشارہ مذکورہ جن کا حاصل یہ ہے کہ سب میں پہلا گھر اور سب میں پہلی جگہ یہ ہے جہاں خانۂ کعبہ ہے۔ اوّلیت تعمیر خانۂ کعبہ اور اوّلیت پیدائش بقیہ خانۂ کعبہ پر دلالت کرتی ہے اور آیت جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ گھر لوگوں کے قیام کا باعث ہے اس کی اوّلیت ویرانی پر دلالت کرتی ہے اس لیے کہ حاصل اشارہ قرآنی یہ ہوا کہ جب تک یہ گھر قائم ہے لوگ بھی اس عالم میں قائم ہیں۔ جس روز یہ گھر ویران ہوا اس روز عالم کو خراب اور ویران سمجھو۔ الغرض بوجہ عکس تجلی مشارٌ الیہ خانۂ کعبہ کا آبادی اور بربادی دونوں میں اوّل رہنا ضرور ہے اور چونکہ خانۂ کعبہ نمائش گاہ اصل تجلی ہے چنانچہ تحقیق متعلق عکس سے یہ بات اوّل بخوبی واضح ہو چکی ہے اور تجلی مذکور باعتبار معبودیت ہے تو اس کی طرف سجدہ عبادت بھی ہوتا ہے اور سوا اس کے اور ارکان عبادت بھی اس سے تعلق رکھتے ہیں اور جو وہ تجلی اوّل مسمیٰ اسم جمیل اور مصداق محبوبیت ہے تو تمام انداز عاشقانہ یعنی ارکان حج اُس کے ساتھ متعلق رہے اور چونکہ وہ تجلی مذکور بوجہ محبوبیت مرتبہ میں صادر اوّل یعنی وجود اوّل ہے تو آئینہ عکس محبوبیت اعنی خانۂ کعبہ بھی بہ نسبت آئینہ عکس حکومت یعنی بیت المقدس مرتبہ میں اوّل رہا اور اس لیے اُس کے استقبال کی نوبت بعد میں آئی اور اس لیے حج بھی علی العموم جب ہی فرض ہوا۔ شرح اس معمہ کی یہ ہے کہ دیوانِ عام اور کچہری حکام تک تو ہر کسی کو رسائی ممکن ہے اور دیوانِ خاص اور محل سرائے شاہی اور عشرت کدہ دلآرام خاص و عام تک ہر کسی کو پہنچنا نصیب نہیں ہوتا اور جسے یہ دن نصیب ہوتے ہیں اُس کو بھی بہت دنوں میں نصیب ہوتے ہیں۔ القصہ اُس در دولت تک سوائے حبیب رب العالمین خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم بالاصالت کسی کو اجازت نہ ہوئی۔ حضرت ابراہیم خلیل اللہ علیہ وعلیٰ نبینا الصلوٰۃ والسلام جو بنی آدم میں سے بانی اوّل کعبہ ہیں اگر اوّل باریاب ہوتے تو وہ باریاب ہونا ایسا تھا کہ وقت تعمیر عشرت کدہ جو ملاقات یارانِ خاص و ہمدمان باختصاص کے لیے بنایا جاتا ہے یارانِ خاص سے پہلے معمار اور مہتممانِ تعمیر اُس میں آنے جاتے ہیں اور سوا اُن کے اور کوئی آیا تو کیا ہوا۔ گرچہ دلآرام عالم فریب میں کون نہیں آتا مگر بلایا ہوا وہی جاتا ہے جس کے لیے عشرت کدہ

خاص بنایا جاتا ہے۔

مولانا محمد قاسم نانوتوی کے بیان کے لفظ لفظ پر غور فرمایئے اور اندازہ لگایئے کہ مولانا کا علمی مقام کتنا بلند ہے۔ ان بلندیوں تک ہم کم علموں کی رسائی کیسے ہو سکتی ہے۔ یہ بھی اللہ کا بہت بڑا انعام ہے کہ اس نے نقل کی توفیق عطا فرما دی والحمد للہ علی ذالک۔

کعبہ کی مرکزیت کا راز

۱۹۱۔ یہ اس لیے کہا گیا ہے تاکہ تم جان لو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اللہ سب کا حال جانتا ہے اور اللہ ہر بات کا علم رکھنے والا ہے۔ یعنی کعبہ وغیرہ کے قیاماً للناس بنانے میں جو مصالح دینی و دنیوی کی رعایت فرمائی اور بظاہر بالکل خلاف قیاس جو عظیم الشان پیشین گوئی کی گئی ہے وہ اس کی دلیل ہے کہ آسمان و زمین کی کوئی چیز حق تعالیٰ کے غیر محدود علم کے احاطہ سے باہر نہیں ہو سکتی ہے[1] یعنی اگر تم اس انتظام پر غور کرو تو تمہیں خود اپنے ملک کی تمدنی و معاشی زندگی ہی میں اس امر کی بین شہادت مل جائے کہ اللہ تعالیٰ اپنی مخلوق کے مصالح اور ان کی ضروریات کا کیسا مکمل اور گہرا علم رکھتا ہے اور اپنے ایک حکم کے ذریعہ سے انسانی زندگی کے کتنے شعبوں کو فائدہ پہنچا دیتا ہے۔ بدامنی کے یہ سینکڑوں برس جو محمد عربی کے ظہور سے پہلے گزرے ہیں ان میں، لوگ خود اپنے مفاد سے ناواقف تھے اور اپنے آپ کو تباہ کرنے پر تلے ہوتے تھے مگر اللہ تعالیٰ تمہاری ضرورتوں کو جانتا تھا اور اس نے صرف ایک کعبہ کی مرکزیت قائم کر کے تمہارے لیے وہ انتظام کر دیا جس کی بدولت تمہاری قومی زندگی برقرار رہ سکی۔ دوسری بے شمار باتوں کو چھوڑ کر اگر صرف اسی ایک بات پر دھیان کرو تو تمہیں یقین حاصل ہو جاتے کہ اللہ تعالیٰ نے جو احکام تمہیں دیے ہیں ان کی پابندی میں تمہاری بھلائی ہے اور ان میں تمہارے لیے وہ مصلحتیں پوشیدہ ہیں جن کو نہ تم خود سمجھ سکتے ہو اور نہ اپنی تدبیروں سے پورا کر سکتے ہو۔[2]

اس آیت میں کعبہ کو قیاماً للناس بنانے کی حکمت بیان ہوئی ہے۔ کعبہ کو انسانوں کے مرکز بنانے میں جن مصالح دینی و دنیوی کی رعایت کی گئی ہے اس کا احاطہ تو علم الٰہی کر سکتا ہے لیکن اس علم الٰہی کا جو ایک قطرہ اس کے بندوں کو نظر آ رہا ہے اسی سے علم الٰہی کی پہنائی معلوم ہو سکتی ہے فی الواقع خانہ کعبہ دنیا میں وہ آئینہ ہے جس میں اللہ کی رحمت و غفاری کی صفتیں اپنا عکس ڈال کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

تمام کرہ ارض کو اپنی شعاعوں سے منور کرتی ہیں۔ یہ وہ منبع ہے جہاں سے حق پرستی کا چشمہ ابلا۔ اور اس نے تمام دنیا کو سیراب کیا۔ یہ روحانی علم و معرفت کا وہ منبع ہے جس کی کرنوں نے زمین کے ذرے ذرے کو درخشاں کیا۔ یہ وہ جغرافی شیرازہ ہے جس میں ملت کے وہ تمام افراد بندھے ہوتے ہیں جو مختلف ملکوں اور اقلیموں میں بستے ہیں مختلف زبانیں بولتے ہیں مختلف لباس پہنتے ہیں مختلف تمدنوں میں زندگی بسر کرتے ہیں مگر وہ سب کے سب باوجود ان فطری اختلافات اور طبعی امتیازات کے ایک ہی خانہ کے گرد چکر لگاتے ہیں اور ایک ہی قبلہ کو اپنا مرکز سمجھتے ہیں۔ اور ایک مقام کو ام القریٰ مان کر وطنیت، قومیت، تمدن و معاشرت، رنگ و روپ اور دوسرے تمام امتیازات مٹا کر ایک ہی وطن ایک ہی قومیت، ایک تمدن و معاشرت اور ایک ہی زبان میں متحد ہو جاتے ہیں اور یہ وہ برادری ہے جس میں دنیا کی تمام قومیں اور مختلف ملکوں کے بسنے والے جو وطنیت اور قومیت کی لعنتوں میں گرفتار ہیں ایک لمحہ اور ایک آن میں داخل ہوتے ہیں جس سے انسانوں کی بنائی ہوئی تمام زنجیریں اور قیدیں اور بیڑیاں کٹ جاتی ہیں اور تھوڑے دن کے لیے عرصہ حج میں تمام قومیں ایک ملک میں ایک لباس میں ایک وضع میں دوش بدوش ایک قوم بلکہ ایک خانوادہ کی برادری بن کر کھڑی ہوتی ہیں اور ایک ہی بولی میں عدل سے باتیں کرتی ہیں یہی وحدت کا وہ رنگ ہے جو ان تمام مادی امتیازات کو مٹا دیتا ہے جو انسانوں میں جنگ و جدل، اور فتنہ و فساد کے اسباب کا گہوارہ ہیں اس لیے یہ کعبہ نہ صرف اس معنے میں قیاماً للناس ہے کہ یہاں ہر قسم کی خون ریزی اور ظلم و ستم ناروا ہے بلکہ اس لحاظ سے بھی قیاماً للناس ہے کہ تمام دنیا کی قوموں کی ایک برادری کعبہ کے ذریعے قائم کر کے ان تمام ظاہری امتیازات کو جو دنیا کی بدامنی کا سبب ہیں مٹا دیتا ہے۔

کعبہ بین الاقوامی برادری بناتا ہے

لوگ آج یہ خواب دیکھ رہے ہیں کہ قومیت اور وطنیت کی تنگنائیوں سے نکل کر وہ انسانی برادری کی وسعت آباد میں داخل ہوں مگر خانہ کعبہ کو قیاماً للناس بنا کر علم الٰہی کی پہنائیوں نے ہزاروں برس پہلے انسانی زندگی کے اس خواب کو شرمندہ تعبیر کر دیا۔ لوگ آج تمام دنیا کے لیے ایک واحد زبان کی ایجاد کی کوشش میں ہیں مگر کعبہ کو قیاماً للناس بنا کر اللہ سبحانہ نے مدت دراز سے انسانیت کے لیے اس مشکل کو حل کر دیا۔ لوگ آج دنیا کی قوموں میں اتحاد پیدا کرنے کے لیے ایک بین الاقوامی کانفرنس یا عالمگیر مجلس کے انعقاد کے درپے ہیں لیکن اللہ سبحانہ کے بیکراں علم نے کعبہ کو

قیاماً للناس بنا کر یہ مجلس دُنیا میں قائم کر دی ہے جو اسلام کے علم، تمدن، مذہب اور اخلاق کی وحدت کی علمبردار ہے۔ آج دُنیا کی قومیں اقوامِ عالم کی مشترکہ عدالت یو این او کی وساطت بنا رہی ہیں۔ لیکن اقوامِ عالم کے مسلمانوں کے لیے یہ مشترکہ عدالت اللہ تعالیٰ نے جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاماً للناس فرما کر قائم کر دی ہے جس کی عدالت کا حقیقی کرسی نشین خود اللہ احکم الحاکمین ہے جس کے فیصلے سے کسی کو سرتابی کی مجال نہیں ہے۔

آیت بالا میں الشہر الحرام، الھدی اور القلائد کو اگرچہ عام شارحین نے کعبہ پر عطف مان کر ان کو بھی قیاماً للناس سے مربوط کیا ہے اور مطلب یہی بتایا ہے کہ کعبہ، شہرِ حرام　　اور قربانی کے پٹوں کو لوگوں کے قیام کا ذریعہ بنایا ہے۔ لیکن شارحین کی اس رائے سے اتفاق نہیں ہے ہماری رائے میں ان سے متعلق مفعول ثانی محذوف ہے اور وہ شعائر ہے اسی سورت میں پہلے بتایا گیا ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا لا تحلوا شعائر اللہ ولا الشھر الحرام ولا الھدی ولا القلائد۔

اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے خانہ کعبہ کو لوگوں کے ٹھہرنے کا ذریعہ بنایا اور الشہر الحرام الھدی اور القلائد کو شعائر بنایا ہے۔ شعائر کسی اہم دینی و روحانی حقیقت کے مظہر اور پیکر ہوتے ہیں، لاان میں اصل مقصود کی حیثیت تو ان روحانی و معنوی حقائق کی ہے جو ان مظاہر کے اندر مضمر ہیں۔ چونکہ کعبہ کے معمارِ اوّل حضرت ابراہیم ہیں اور ملّتِ ابراہیمی کی اصلی بنیاد قربانی تھی اور یہی قربانی حضرت ابراہیم کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصل خصوصیت تھی اور اسی امتحان و آزمائش میں پورے اترنے کی وجہ سے وہ اور ان کی اولاد ہر قسم کی نعمتوں اور برکتوں سے مالامال کی گئی ان حقائق کی احساس دلانے کے لیے ان کو بطور نشان مقرر کیا گیا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں لیکن میرا خیال یہی ہے کہ ان دو باتوں کی رعایت سے پہلی یہ کہ اللہ نے کعبہ کو قیاماً للناس بنایا اور دوسری یہ کہ اللہ نے الشہر الحرام، الھدیٰ اور القلائد کو شعائر بنایا۔ یہاں حکمت کے موقعہ پر خدا کے فعلی اور وضعی علم کا حوالہ دیا ہے۔ کعبہ کو قیاماً للناس بنایا تاکہ تمہیں پتہ لگ جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی فعلاً سب کچھ جانتا ہے اور الشہر الحرام، الھدیٰ اور القلائد کو شعائر بنایا ہے تاکہ علم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ ہی کا علم بطور صفت رکھتا ہے۔

اِعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ وَاَنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝
مَا عَلَى الرَّسُوْلِ اِلَّا الْبَلٰغُ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا تُبْدُوْنَ وَمَا تَكْتُمُوْنَ ۝
قُلْ لَّا يَسْتَوِي الْخَبِيْثُ وَالطَّيِّبُ وَلَوْ اَعْجَبَكَ كَثْرَةُ الْخَبِيْثِ ۚ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ يٰٓاُولِي الْاَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۝

جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے اور بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔[۱۹۲] خدا کے پیغمبر کے ذمہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پیغام پہنچا دے اور جو کچھ تم کھلے طور پر کرتے ہو اور جو کچھ چھپا کر کرتے ہو خدا کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔[۱۹۳] اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ پاکیزہ اور گندی چیز برابر نہیں ہو سکتی اگرچہ تمہیں گندی چیز کی بہتات بھلی لگے، لہذا اے ارباب دانش اللہ کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم فلاح سے ہمدوش ہو جاؤ۔[۱۹۴]

قدر و قیمت کا فیصلہ کثرت سے نہیں ہوتا

اسلامی نظام کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ انسانیت کو چند اخلاقی جھلکیاں دکھانے پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ اس تک پہنچنے کے سارے راستوں سے پوری طرح آگاہ کرتا ہے۔ اس نے انسان کو بتایا ہے کہ اس کی زندگی میں کبھی سکون اور اطمینان نہیں پیدا ہو سکتا جب تک وہ روحانی ترقی نہ کرے مگر یہاں روحانیت کے معنے وہ نہیں جو عموماً اس سے وابستہ کیے جاتے ہیں۔ اسلام روح اور جسم کو ایک دوسرے کی ضد نہیں سمجھتا اس لیے اسلام کا روحانی نظام بھی دُنیا کے تمام فلسفی اور مذہبی نظاموں سے مختلف ہے۔ یہاں خدا کی رضا ترکِ دُنیا، ترکِ علائق، صحرا نشینی، رہبانیت، خودکشی اور جسمانی تعذیب سے حاصل نہیں ہوتی بلکہ اللہ تعالیٰ کا قرب حاصل کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ انسان اس کارگاہ حیات میں اپنی قابلیت کا ثبوت دے۔ جسم رُوح کا قید خانہ نہیں بلکہ اس کا کارخانہ ہے اس لیے اس پر فرض عائد ہوتا ہے کہ وہ اس کارخانے کے آلات اور طاقتوں کو استعمال کرکے اپنی قابلیت کا اظہار کرے مگر اس استعمال میں بھی ایک مومن دوسرے لوگوں سے بالکل جداگانہ طرزِ عمل اختیار کرتا ہے۔ وہ ایک دُنیا پرست کی طرح دُنیا پر چمٹتا نہیں بلکہ کائنات کے خزانوں اور خود اپنے جسم و اعضا کو خدا کی امانت سمجھتے ہوئے انہیں خالق کائنات کے دیے ہوئے قواعد و ضوابط کے تحت برتتا ہے۔ اس عالم اور زندگی کے بامقصد ہونے کا خیال اور انسان کے آزاد ہونے کا اعتقاد انسان میں اپنی ذمہ داری اور زندگی کی حقیقی قدر و قیمت کا شعور پیدا کرتا ہے مگر یہ شعور اس لیے نہیں کہ عیش و تفریح کے لیے زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہ کرے بلکہ اس لیے کہ اللہ کی معصیت سے بچ کر اور طاعت کی دولت سے سرشار ہو کر آخرت کی زندگی کے لیے راحت کا سامان پیدا کرے۔ شدید العقاب اور غفور رحیم سے اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ ایک مسلمان اس دُنیا کو آزمائش گاہ سمجھتے ہوئے اس میں داخل ہوتا ہے اور اس کا ہر قدم سوچ سمجھ کر پڑتا ہے۔ اس کے نزدیک وہ جد و جُہد بالکل بیہودہ ہے جو خالص مادی نقطۂ نظر سے کی جاتی ہے۔ وہ اشیا و اعمال اور اشخاص کو وزن کرنے کے لیے اپنی ایک الگ میزان رکھتا ہے اور وہ دینی نفع اور اُخروی اجر ہے اور بس۔ ان کے نزدیک بُرائی ہر حال میں بُرائی ہے اس کی کثرت اس کے جواز اور استحسان کی دلیل نہیں ہے۔ ان کے ہاں ہر چیز و عمل اور شخص کی قدر و قیمت کا فیصلہ کثرت سے نہیں بلکہ حقیقت سے ہوتا ہے۔

۱۹۲ - جان لو کہ اللہ سخت سزا دینے والا ہے اور بلا شبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ یعنی

جو احکام حالتِ احرام یا احترامِ کعبہ وغیرہ کے متعلق دیے گئے اگر ان کی عمداً خلاف ورزی کرو گے تو سمجھ لو کہ خدا کا عذاب بڑا سخت ہے اور بھول چوک سے اگر کوئی تقصیر ہو جائے تو پھر کفارہ وغیرہ سے اس کی تلافی کر لو تو بے شک اللہ بڑا بخشنے والا اور مہربان ہے[1]

یہ آیتِ قرآنی ہمارے سامنے یہ رہنما اصول پیش کرتی ہے کہ قرآن کی نگاہ میں اصلی اہمیت فرد کی ہے نہ کہ جماعت اور اجتماعی نظام کی۔ ہر فرد سے انفرادی حیثیت میں خدا کی نافرمانی سے بچنے کا اور خدا کی طاعت اور فرمانبرداری کا سرمایہ فراہم کرنے کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ ہر فردِ انسانی کو اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے شعورِ شخصیت عطا کیا ہے خودی کا احساس دیا ہے۔ انفرادی خصوصیات دی ہیں۔ اسی بنا پر ایک انسان منفرد اللہ کا خلیفہ ہے اور اسی حیثیت سے وہ اپنے اعمال کا ذمہ دار اور جواب دہ ہے۔ یہی بات ہے جسے قرآن عزیز نے اس آیت میں شدید العقاب اور غفور رحیم کے عنوان سے پیش کیا ہے اور اسی بات کو قرآن نے آخرت کے ذکر میں بڑی کثرت سے بیان فرمایا ہے کہ اللہ کی عدالت میں ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت سے پیش ہوگا اور اسی حیثیت سے اپنے اعمال کا نتیجہ دیکھے گا۔ یعنی جس طرح ہر شخص ہر فرد کی شخصیت انفرادی ہے اور ذمہ داری انفرادی ہے اسی طرح اس کا نتیجہ اور انجام بھی آخر کار انفرادی ہی ہے۔ لہٰذا اس آیت کی روشنی میں یہ ایک بدیہی حقیقت ہے کہ فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل بجائے خود مطلوب ہے دین کا فرد مخاطب ہے۔ خدا کی عبدیت اور اطاعت کی طرف فرد کو دعوت دی گئی ہے۔ حقوق و فرائض فرد پر عائد کیے گئے ہیں۔ امر و نہی کے احکام فرد کو دیے گئے ہیں۔ طاعت و جزا کی اُمید فرد کو دلائی گئی اور عصیان پر سزا کی دھمکی بھی فرد ہی کو دی گئی ہے اور بھول چوک، غلطی اور قصور پر معافی کا مطالبہ فرد سے کیا گیا ہے اور مغفرت و رحمت کا فرد سے وعدہ ہوا ہے۔ نافرمانی پر شدید العقاب اور معافی مانگنے پر غفور رحیم کا فرد ہی مخاطب ہے۔ اس نظامِ فکر و عمل میں فرد ہی وہ اصل اکائی ہے جس کو ابتداء ہی میں عامل کی حیثیت سے بنیادی اہمیت حاصل ہے۔ اسی کی عقل اور جذبات سے اپیل یہ کرتا ہے۔ اسی کو اپنی ہدایت و رہنمائی کا مخاطب بناتا ہے۔ مگر اس کا مطلب یہ نہیں کہ جماعت اور اجتماعیت قرآن کی نگاہ میں کوئی اہمیت نہیں رکھتے ہیں۔ فی الواقع ان کو بڑی اہمیت حاصل ہے مگر اس حیثیت سے نہیں کہ وہ بجائے خود مقصود ہیں بلکہ اس حیثیت سے کہ فرد کی شخصیت کا ارتقاء اور اس کی ذات کی تکمیل اجتماعی نظام کی بہتری پر منحصر ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رسول کی ذمہ داری

۱۹۳- خدا کے پیغمبر کے ذمہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ پیغام پہنچا دے اور جو کچھ تم کھلے طور پر کرتے ہو اور جو کچھ چھپا کر کرتے ہو خدا کے علم سے پوشیدہ نہیں ہے۔ پیغمبر علیہ السلام نے خدا کا قانون اور پیام پہنچا کر اپنا فرض ادا کر دیا اور خدا کی حجت بندوں پر تمام ہو چکی ہے۔ اب ظاہر و باطن میں جیسا عمل کرو گے وہ سب خدا کے سامنے ہے۔ حساب و جزا کے وقت ذرہ ذرہ تمہارے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ پہلی آیت میں ممنوعات کا بے باکی کے ساتھ ارتکاب کرنے والوں اور اس پر تکرار کرنے والوں کو شدید العقاب کہہ کر دھمکی دی تھی اور اللہ کی قائم کردہ حدود کی نگرانی کرنے والوں سے مغفرت و رحمت کا وعدہ کیا تھا۔ اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ رسول اپنی ذمہ داری کا فرض ادا کر چکا ہے اب تقصیر کوتاہی کے باب میں کوئی عذر باقی نہیں رہا۔ اب تمہیں خلوت اور جلوت میں قانون کا مطیع و فرمانبردار اور وفادار بن کر رہنا چاہیے۔ رسول کا کام رسول ہونے کی حیثیت میں پیغام پہنچانا ہے۔ لوگوں کے جلوت و خلوت کے اعمال و اقوال کا حساب لینا اور ان کے اعمال کی جزا دینا رسول کا کام نہیں ہے۔ یہ کام صرف اللہ کی ذات کا ہے۔ اس آیت میں کلمہ حصر کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ رسول کا کام اللہ کے احکام کا پہنچانا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ رسول احکام الٰہی کے علم کا ذریعہ ہے اس میں دو باتیں سمجھائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی کی مکمل اطاعت اور پیروی ضروری ہے اس کا ایسا سمجھنا شرط ایمان ہے قانون کے دائرے میں نبی جو کچھ کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چون و چرا نہ کرے۔ اور خواہ اس کی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے بہرصورت یہ یقین رکھے کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور سراپا حق ہے۔ اور ایسا ہونا ضروری بھی ہے۔ عقل اس کے سوا ایک نبی کے لیے کسی اور حیثیت کا تصور بھی نہیں کر سکتی انسان اگر اللہ تعالیٰ کی بندگی اور اس کے احکام کی اطاعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اگر اس بندگی کا طریقہ معلوم کرنے اور ان احکام کے جاننے کا واحد ذریعہ صرف رسول ہی ہے تو رسول کی کامل اطاعت اور پیروی کے بغیر اللہ کی اطاعت اور بندگی کی کوئی شکل ممکن ہی نہیں رہ جاتی۔ اگر راستہ چلے بغیر آپ منزل تک نہیں پہنچ سکتے اور آلات پرواز استعمال کیے بغیر فضائی سفر نہیں کر سکتے تو رسول کی باتوں کو مانے بغیر اللہ کی بندگی بھی نہیں کر سکتے۔

دوسری بات اسی فقرے ما علی الرسول الا البلاغ سے یہ بھی معلوم ہوئی ہے کہ قرآن نے

لہ افادات شیخ الاسلام

اپنی اشاعت کے لیے صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ اختیار کیا ہے۔ اس نے اس کے اصول بتائے ہیں۔ اس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کے ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہے، ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہے۔ حصر کا یہ پیمانہ بتا رہا ہے کہ رسول کا کام صرف لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا ہے لوگوں کو مجبور کرنا نہیں ہے۔ قرآن نے نہ صرف اسلام کی جبری اشاعت پر قدغن قائم کی بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ دین زبردستی کی چیز نہیں ہے۔ دین کا اولین جز ایمان ہے ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ذرہ بھی بزور پیدا نہیں کر سکتی بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی طرح دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی۔ آخر میں واللہ یعلم ما تبدون وما تکتمون کہہ کر بتا دیا کہ رسول تو صرف احکام پہنچانے آیا ہے وہ تمہارے اعمال کی جزا دینے کا منصب لے کر نہیں آیا اور نہ ہی اس کا کام تمہارے اعمال کا حساب لینا ہے یہ اللہ سبحانہ کا کام ہے کہ وہ تمہارے اعمال کا حساب لے گا اور ان کی جزا دے گا۔ اس لیے تمہاری خلوتوں اور جلوتوں کا علم رکھنا صرف اللہ کا کام ہے۔

قدر و قیمت کا اسلامی معیار

۱۰۴۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ پاکیزہ اور گندی چیز برابر نہیں ہو سکتی اگرچہ تمہیں گندی چیز کی بہتات بھلی لگے لہٰذا اے ارباب دانش اللہ کی نافرمانی سے بچو تاکہ تم فلاح سے ہمدوش ہو جاؤ۔ اس رکوع سے پہلے رکوع میں فرمایا تھا کہ طیبات کو حرام مت ٹھہراؤ بلکہ ان سے اعتدال کے ساتھ تمتع کرو۔ اس مضمون کی تکمیل کے بعد خمر وغیرہ چند ناپاک اور خبیث چیزوں کی حرمت بیان فرمائی۔ اسی سلسلے میں محرم کے شکار کو حرام کیا یعنی جس طرح خمر، میت وغیرہ خبیث چیزیں ہیں اسی طرح محرم کے شکار کو سمجھو۔ محرم کی مناسبت سے چند ضمنی چیزوں کا بیان فرمانے کے بعد اب متنبہ فرماتے ہیں کہ طیب اور خبیث یکساں نہیں ہو سکتی ہیں۔ تھوڑی چیز اگر طیب و حلال ہو وہ بہت سی خبیث و حرام چیزوں سے بہتر ہے عقل مند کو چاہیے کہ ہمیشہ طیب و حلال کو اختیار کرے گندی اور خراب چیزوں کی طرف خواہ وہ دیکھنے میں کتنی زیادہ ہوں اور بھلی لگیں نظر نہ اٹھائے[1] "الخبیث" فرمان یا نافرمانی ذات و صفات سب کے لیے جامع تعبیر ہے۔ قرطبی نے لکھا ہے کہ،

صحیح یہ ہے کہ لفظ اپنے عموم کی وجہ سے مکاسب اعمال معارف اور اشخاص کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے۔

منشا یہ ہے کہ اچھی اور بری چیزیں، اچھے برے اعمال، اچھے برے اموال اور اچھے برے اشخاص برابر نہیں ہوتے۔ خواہ دنیا میں بری چیزوں، برے کاموں، برے سرمایے اور برے اشخاص کتنے زیادہ ہوں نقصان دہ اور نفع بخش چیز، غلط اور عمدہ کردار، حرام اور حلال، ظالم اور عادل، جاہل اور عالم، مفسد اور مصلح، نیک اور بد، مومن و کافر کبھی برابر نہیں ہو سکتے۔ اشیاء، اعمال، اشخاص کی قدر و قیمت معلوم کرنے کا پیمانہ اس کی کثرت نہیں ہے۔ دیانت دار ملازم کی تھوڑی تنخواہ، ایماندار تاجر کی تھوڑی کمائی رشوت اور بے ایمانی سے پیدا کی ہوئی زیادہ دولت کے مقابلہ میں حسن عاقبت کے اعتبار سے دنیا و آخرت میں زیادہ قیمتی ہے۔

ایسے ہی اچھے لوگ خواہ تھوڑے ہوں اچھے ہیں ان بہتوں سے جو تعداد میں زیادہ ہوں۔ دراصل یہ آیت قدر و قیمت کا ایک دوسرا ہی معیار پیش کرتی ہے جو ظاہر بین انسان کے معیار سے بالکل مختلف ہے۔ ظاہر بین نظر میں سو روپے بمقابلہ پانچ روپے کے لازماً زیادہ قیمتی ہیں کیونکہ وہ سو ہیں اور یہ پانچ۔ لیکن یہ آیت کہتی ہے کہ سو روپے اگر خدا کی نافرمانی کر کے حاصل کیے گئے ہیں تو وہ ناپاک ہیں اور پانچ روپے اگر خدا کی فرمانبرداری کرتے ہوئے کمائے گئے ہوں تو وہ پاک ہیں اور ناپاک خواہ مقدار میں کتنا ہی زیادہ ہو بہرحال وہ پاک کے مقابلہ میں کسی طرح برابر نہیں ہو سکتا۔ غلاظت کے ایک ڈھیر سے عطر کا ایک قطرہ زیادہ قدر رکھتا ہے۔ اور پیشاب کی ایک لبریز ناند کے مقابلہ میں پاک پانی کی ایک چلو زیادہ وزنی ہے لہٰذا ایک سچے دانشمند انسان کو لازماً حلال ہی پر قناعت کر لی چاہیے خواہ وہ ظاہر میں کتنا ہی حقیر و قلیل ہو۔ اور حرام کی طرف کسی حال میں ہاتھ نہ بڑھانا چاہیے خواہ وہ بظاہر کتنا ہی کثیر اور شاندار ہو۔[1]

گویا خدا نے جن چیزوں سے روک دیا ہے وہ گندی اور مضر چیزیں ہیں جن کی اجازت دی ہے وہ اچھی اور مفید چیزیں ہیں۔ گندی چیزیں کتنی ہی زیادہ ملیں اور اچھی چیزیں کتنی ہی کم میسر آئیں لیکن گندی چیزوں کی طرف رغبت نہ کرو۔ کیونکہ دانشمند آدمی اشیاء کی قلت و کثرت نہیں دیکھتا۔ ان کے نفع و نقصان پر نظر رکھتا ہے۔ یہ کلمہ جامع ہے۔ اس کی ترازو میں رکھ کر ہم سارے افکار و نظریات، زندگی تشکیل کرنے والے سارے اصولوں، دنیا میں قائم شدہ تمام نظامہائے حیات کو تول سکتے ہیں۔ قرآن کے اس نظریہ کی گہرائی میں جا کر جب ہم اس کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ یہی ایک ایسا نظریہ

---

[1] تفہیم القرآن

ہے جس کے ذریعہ ہم ہر فکر، ہر عمل، ہر نظام، ہر شخص، ہر علم، ہر معاشی ذریعہ کے بارے میں بغیر کسی ادنیٰ مزاحمت کے فیصلہ کر سکتے ہیں۔ اس انسان کو آگے بڑھا کر انسانیت کے کل مفاد پر جمع کیا گیا ہے۔ اس میں ایک ایک ایسے نظام حیات کا تصور ملتا ہے۔ جس کو قائم کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے۔ بلا شبہ وہ تمام انسانوں کے لیے مفید ہے۔ اس کے مقابلے میں خدا نے جن نظاموں سے روک دیا ہے وہ سر تا سر مضر اور انسانیت کے لیے نقصان دہ ہیں۔ یہ نظریہ انسانیت کو خیر و شر کی ایسی معروضی اقدار دیتا ہے جو زمان و مکان کے ساتھ تبدیل نہیں ہوتی ہیں۔ وہ گورے کالے، آقا و غلام، امیر و غریب، ظالم و مظلوم سب کے لیے ایک ہی ہیں۔ اور حسی تمدن کے سیمابی اصولوں کی طرح رفتارِ زمانہ ان میں کسی قسم کا تغیر پیدا نہیں کر سکتی۔ اسی موضوع پر علامہ اقبال نے اظہارِ خیال کرتے ہوئے لکھا ہے:

اگر عالم بشریت کا مقصد اقوام انسانی کا امن، سلامتی اور ان کی موجودہ اجتماعی ہیئتوں کو بدل کر واحد اجتماعی نظام بنانا قرار دیا جائے تو سوائے اسلامی نظام کے کوئی اور اجتماعی نظام ذہن میں نہیں آسکتا کیونکہ جو کچھ قرآن سے میری سمجھ میں آیا ہے اس کی رو سے اسلام محض انسان کی اخلاقی اصلاح کا داعی نہیں بلکہ عالم بشریت کی اجتماعی زندگی میں ایک تاریخی مگر اساسی انقلاب بھی چاہتا ہے جو اس کے قومی اور نسلی نقطۂ نگاہ کو یکسر بدل کر اس میں خالص انسانی ضمیر کی تخلیق کرے۔ تاریخ ادیان اس بات کی شاہد عدل ہے کہ قدیم زمانے میں دین قومی تھا جیسے مصریوں، یونانیوں اور ہندیوں کا، بعد میں نسلی قرار پایا جیسے یہودیوں کا۔ مسیحیت نے یہ تعلیم دی ہے کہ دین انفرادی اور پرائیویٹ ہے جس سے بدبخت یورپ میں یہ بحث پوری ہوئی کہ دین پرائیویٹ عقائد کا نام ہے اس واسطے انسان کی اجتماعی زندگی کی ضامن صرف اسٹیٹ ہے۔ یہ اسلام ہی تھا جس نے بنی نوع انسان کو سب سے پہلے یہ پیغام دیا کہ دین نہ قومی ہے نہ انفرادی اور نہ پرائیویٹ بلکہ خالصۃً انسانی ہے اور اس کا مقصد باوجود تمام فطری امتیازات کے عالم بشریت کو متحد و منظم کرنا ہے۔ ایسا دستور العمل قوم و نسل کی بنیاد پر بنایا نہیں جاسکتا نہ اس کو پرائیویٹ کہہ سکتے ہیں بلکہ صرف معتقدات پر ہی اس کی بنیاد رکھی جاسکتی ہے۔ صرف یہی ایک طریقہ ہے جس سے عالم انسانی کی جذباتی زندگی اور اس کے افکار میں یک جہتی اور ہم آہنگی پیدا ہو سکتی ہے جو ایک امت کی تشکیل اور بقا کے لیے ضروری ہے۔

اس آیت کی روشنی میں ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک طرف خدا کا پسندیدہ اسلامی نظام ہے جو خالصۃً انسانی ہے

اور دوسری طرف دنیا کے دوسرے نظام ہیں۔ اسلامی نظام خدائی نظام ہونے کی وجہ سے سرتاسر طیب ہے۔ دوسرے نظام انسانی فکر کی تخلیقات ہونے کی وجہ سے سرتاسر خبیث ہیں۔ اگر دنیا میں خبث پر مبنی نظام زیادہ ہیں ان کو اپنانے والے اکثریت میں ہیں اور اس کے مقابلے میں اسلامی نظام کو اپنانے والے تھوڑے ہیں۔ بتایا جا رہا ہے کہ کسی نظام کی حقیقت کا فیصلہ اس کے ماننے والوں کی اقلیت اور اکثریت سے نہیں بلکہ خدا کی جانب سے ہونے میں ہے۔ اسلام چونکہ خدا کی جانب سے ہے اس لیے وہ حق ہے خواہ وہ کیسی بے کسی اور بے بسی کی حالت میں ہو۔ مشرکین مکہ کہتے تھے نحن اکثر اموالا و اولاداً ہمارے پاس مالی طاقت اور عددی طاقت زیادہ ہے۔ اس کے مقابلہ میں اہل ایمان مالی قوت اور عددی طاقت سے محروم ہیں۔ قرآن کا فیصلہ ہے کہ حق اہل ایمان کے پاس ہے۔

درحقیقت راہ حق کے علمبرداروں کو اس آیت میں سب سے بڑے فتنے سے آگاہ کر دیا۔ وہ یہ کہ بہت سے لوگوں کے لیے کسی برائی کی کثرت اس کے جواز و استحسان کی دلیل بن جاتی ہے جیسے اس دور میں غیر اسلامی نظامہائے حیات کی کثرت نادان مسلمانوں کے لیے ان کے استحسان کی دلیل ہے بلکہ ایک لیڈر نے اسی سے دھوکہ کھا کر ماضی میں برملا کہہ دیا تھا۔

المغربیون اولئک ھم المومنون حقاً

انگریز ہی سچے اور پکے مومن ہیں۔

جو فتنہ عام ہو جاتا ہے اور جو بدی فیشن میں داخل ہو جاتی ہے وہ اپنے دروازے بھی اس کے لیے چوپٹ کھول دیتی ہے۔ بے خبر اور نادانوں کا ضمیر اول تو اس سے کوئی انقباض محسوس ہی نہیں کرتا اور اگر شروع شروع میں کچھ محسوس کرتا بھی ہے تو وہ اس کو اس عقلی تسلی سے مطمئن کر لیتے ہیں بھلا اس دور میں کوئی اپنے آپ کو اس چیز سے کس طرح الگ رکھ سکتا ہے۔ اس طرح پورا معاشرہ برائی کا معاشرہ بن جاتا ہے اور پھر حالت یہ ہو جاتی ہے کہ شریف اور مہذب وہ نہیں کہلاتا جو کپڑے پہن کر نکلتا ہے بلکہ وہ کہلاتے ہیں جو اپنی عریانی کی نمائش کرتے ہیں۔ اگر ان سے ان کے اس رویہ کے جواز کی دلیل پوچھئے تو وہ اس کے حق میں جو سخن سازی بھی کریں اس کی تہ میں صرف یہ چیز نکلے گی کہ کیا کیا جائے یہی زمانے کا چلن ہے اور یہی وقت کا فتویٰ ہے یعنی اکثریت کا عمل ان کے لیے دلیل راہ بن جاتا ہے۔

قرآن کے الفاظ سے یہاں یہ بات صاف نکلتی ہے کہ اگرچہ کسی برائی کا غلبہ اور خبیث کی کثرت اپنے اندر کشش تو رکھتی ہے لیکن اس کشش سے مغلوب ہو کر جو اپنے آپ کو اس کے حوالے کر دیتے

ہیں وہ سب بیوقوفوں کی دنیا میں بستے ہیں۔ اولوالالباب اور دانش مند وہ ہیں جو اس وبائے عام میں بھی اس کے اثرات سے محفوظ اور تقویٰ کی راہ پر گامزن ہیں۔ فلاح ان کا ہی مقدر ہے۔ اس لیے کہ اللہ کے یہاں خبیث و طیب برابر نہیں ہیں۔

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَسْأَلُوا عَنْ أَشْيَاءَ إِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَإِنْ تَسْأَلُوا عَنْهَا حِينَ يُنَزَّلُ الْقُرْآنُ تُبْدَ لَكُمْ عَفَا اللَّهُ عَنْهَا وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ۝ قَدْ سَأَلَهَا قَوْمٌ مِنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ أَصْبَحُوا بِهَا كَافِرِينَ ۝

اے اہلِ ایمان ان چیزوں کی نسبت سوال نہ کرو کہ وہ اگر تم پر ظاہر کردی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں۔ اگر نزولِ قرآن کے وقت میں ان چیزوں کے بارے میں سوالات کروگے تو تم پر ظاہر کردی جائیں گی۔[195] خدا نے ان کو معاف کردیا ہے اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔[196] تم سے پہلے لوگوں نے ایسے سوالات کیے تھے پھر بالآخر وہ منکر ہوگئے تھے۔[197]

اسلامی نظام میں فکر و رائے کا مقام

اسلام میں قانون سازی کے لیے اصُول استناد اور اصُول اجتہاد دونوں کو اپنایا ہے کیونکہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں اور کسی ایک میں غلو برتنے سے دوسرا مجروح ہوجاتا ہے۔ اگر انسانی فکر کو غیر محدود آزادی دی جاتی ہے تو تمدنی زندگی کی بنیاد اور اس کے مقصد و نصب العین پر کبھی اتفاق نہیں ہوسکتا۔

اس قسم کی بے قید آزادی قانون کے لیے خطرناک ہے۔ تمدنی امور اور انسانی معاملات میں محض عقلی بنیادوں پر کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کیونکہ عقل جذبات کی تابع، خواہشات کی غلام، تعصبات کی اسیر اور انفرادی تجربات میں محصور ہوتی ہے۔ دوسری طرف اگر صرف اصول استناد پر زور دیا جائے اور اصول اجتہاد کو نظر انداز کر دیا جائے تو انسان کے فکری ارتقاء کی راہیں بالکل مسدود ہو جاتی ہیں اور اس کی حیثیت صرف ایک مشین کے پرزے کی رہ جاتی ہے۔ اصول استناد میں غلو برتنا انسان کی ذہنی موت ہے۔ اسلام نے اصول استناد اور اصول اجتہاد میں مصالحت کی راہ نکالی ہے۔ اصول استناد کی حد تک قانون کا ماخذ یہاں قرآن و سنت ہیں جن امور کی بابت قرآن نے صاف صریح احکام دیے ہیں ان کی نسبت اور کوئی قانون نہیں بنایا جاسکتا۔ اسی طرح جہاں کسی معاملہ کے بارے قرآن ساکت ہو اور اس سے کوئی ہدایت نہ ملتی ہو وہاں سنت رسول یا صحابہ کرام کے متفقہ تعامل سے مدد لینا ضروری ہے۔ ان حدود کے اندر اسلام عقل کی مداخلت گوارا نہیں کرتا لیکن اسلام نے اصول اجتہاد کی مناسب رعایت بھی ملحوظ رکھی ہے اور انسان کو موقع دیا ہے کہ وہ متذکرہ بالا حدود سے باہر اپنی عقل و فہم کو کام میں لائے جہاں کسی صورت حال کی نسبت قرآن و سنت دونوں خاموش ہوں وہاں اسلامی معاشرے کے ان افراد کو عقل و استدلال کا حق عطا کیا گیا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم و فضل کی وسعتوں کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر سکتے ہوں۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ پہلے بتایا گیا تھا کہ رسول کا فریضہ اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ اس کا مفہوم یہ ہے کہ جو پیغام رسول پہنچاتے اسے اپناؤ اور اس کے مطیع بن کر رہو اور جو نہ پہنچاتے تو اس کے بارے میں نہ سوال کھڑا کرو نہ بحث و کرید کرو۔ اگر کرو گے تو اصول استناد کا وزن بڑھتا جائے گا اور تمہاری فکری صلاحیتوں پر زیادہ سے زیادہ قدغن قائم ہوگی۔ خدا یہ نہیں چاہتا کہ انسانی تمدن و معیشت کی سختیاں اور جکڑ بندیاں پیدا کرے یہ شریعت کامل شریعت ہے اس میں کوئی بات بھی معیار سے مختلف نہیں ہو سکتی۔ اگر سوالات کرو گے تو اصول استناد کا زور بڑھے گا اجتہاد و رائے اور آزادی فکر کے لیے کوئی گنجائش باقی نہ رہے گی۔ اسلام کی تاریخ میں اصحاب حدیث اور اصحاب رائے کے مدرسے اصول استناد اور اصول اجتہاد میں مفاہمت نہ کرنے کی وجہ سے پیدا ہوئے۔ اصحاب حدیث اصول استناد پر زور دیتے ہیں۔ اجتہاد و رائے اور آزادی فکر کا اصحاب حدیث کے یہاں کوئی مقام نہیں۔ اصحاب رائے کی اموی اور عباسی دور میں سارے ممالک محروسہ میں کامیابی دراصل اصول اجتہاد کی کامیابی تھی۔

١٩٥ اے اہل ایمان ان چیزوں کی نسبت سوال نہ کرو کہ اگر وہ تم پر ظاہر کر دی جائیں تو تمہیں ناگوار ہوں، اگر نزول قرآن کے وقت ان چیزوں کے بارے میں سوالات کرو گے تو تم پر ظاہر کر دی جائیں گی۔

* پچھلے دو رکوع کا حاصل احکامِ دینیہ میں غلو اور تساہل سے روکنا تھا یعنی جو طیبات خدا نے حلال کی ہیں ان کو اپنے اوپر حرام مت ٹھہراؤ اور جو چیزیں خبیث و حرام ہیں خواہ دائمی طور پر یا خاص احوال و واقعات میں ان سے پوری طرح اجتناب کرو۔ ان آیات میں تنبیہہ فرمادی کہ جو چیزیں شارع نے تصریحاً بیان نہیں کیں ان کے متعلق فضول اور دور از کار سوالات مت کرو۔ جس طرح تحریم و تحلیل کے سلسلے میں شارع کا بیان موجب ہدایت ہے اس کا سکوت بھی ذریعہ رحمت و سہولت ہے۔ خدا نے جس چیز کو کمال حکمت اور عدل سے حلال یا حرام کر دیا وہ حلال یا حرام ہو گئیں اور جس سے سکوت کیا اس میں گنجائش اور توسیع رہی مجتہد کو اجتہاد کا موقع ملا عمل کرنے والے اس کے فعل و ترک میں آزاد ہے۔ اب اگر ایسی چیزوں کی نسبت کھود کرید اور بحث و سوال کا دروازہ کھول دیا جائے گا بحالیکہ قرآن شریف نازل ہو رہا ہے اور تشریع کا باب مفتوح ہے تو بہت ممکن ہے کہ سوالات کے جواب میں بعض ایسے احکام نازل ہو جائیں جن کے بعد تمہاری آزادی اور گنجائش اجتہاد باقی نہ رہے۔ پھر یہ سخت شرم کی بات ہوگی کہ جو چیز خود مانگ کر لی ہے اس کو نباہ نہ سکیں سنت اللہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب کسی معاملہ میں بکثرت سوال اور کھود کرید کی جاتے اور خواہ مخواہ شقوق و احتمالات نکالے جائیں تو ادھر سے تشدید و سختی بڑھتی جاتی ہے۔ کیونکہ اس طرح کے سوالات ظاہر کرتے ہیں کہ گویا سائلین کو اپنے نفس پر بھروسہ ہے اور جو حکم ملے گا اس کے اٹھانے کے لیے وہ ہمہ وجوہ تیار ہیں۔ اس قسم کا دعویٰ جو بندہ کے ضعف و افتقار کے مناسب نہیں مستحق بنا دیتا ہے کہ ادھر سے حکم میں کچھ سختی ہو اور جتنا یہ اپنے کو قابل ظاہر کرتا ہے اسی کے موافق امتحان بھی سخت ہو جائے چنانچہ بنی اسرائیل کے ذبح بقرہ والے قصہ میں ایسا ہی ہوا۔ حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اے لوگو خدا نے تم پر حج فرض کیا۔ ایک شخص بول اٹھا کیا ہر سال یا رسول اللہ، فرمایا اگر میں ہاں کر دیتا تو ہر سال واجب ہو جاتا پھر تم ادا نہ کر سکتے جس چیز میں میں تم کو آزاد چھوڑ دوں تم بھی مجھ کو چھوڑ دو۔ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ مسلمانوں میں وہ شخص بڑا مجرم ہے جس کے سوالات کی بدولت ایسی چیز حرام کی گئی جو حرام نہ تھی۔ بہرحال یہ آیت احکام شرعیہ کے باب میں اس طرح کے دور از کار اور بے ضرورت سوالات کا دروازہ بند کر دی ہے باقی بعض احادیث میں جو یہ مذکور ہے کہ کچھ لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے جزئی واقعات سے متعلق لغو سوالات کرتے تھے ان کو رد کیا گیا وہ ہماری تقریر کے مخالف نہیں ہم لا تسئلوا عن اشیاء میں اشیاء کو عام رکھتے ہیں جو واقعات و احکام دونوں کو شامل ہے اور تسؤکم میں جو برا لگنے کے معنے ہیں سے تعمیم رکھی جائے۔ حاصل یہ ہوگا کہ نہ احکام کے باب میں فضول سوالات کیا کرو اور نہ واقعات کے سلسلے میں کیونکہ ممکن ہے کچھ جواب آئے وہ تم کو ناگوار ہو۔ مثلاً کوئی

سخت حکم آیا یا کوئی قید بڑھ گئی یا ایسے واقعہ کا اظہار ہوا جس سے تمہاری فضیحت ہو یا بیہودہ سوالات پڑ ڈانٹ بتا دی گئی۔ یہ سب احتمالات تسؤکم کے تحت میں داخل ہیں۔ باقی ضروری بات پوچھنے میں یا شبہ ناشی عن دلیل کے رفع کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے [1]

آیت کا پس منظر

اس آیت کے پس منظر میں مختلف واقعات پیش کیے ہیں۔ صاحب محاسن التاویل نے ان واقعات کی جو تفصیلات بتائی ہیں ان سے اندازہ ہوتا ہے کہ آیت کے مدلول اور مفہوم کے عموم میں جو بات داخل نظر آتی ہے بتانے والوں نے اسی کو آیت کا پس منظر بتا دیا ہے ہم ان میں سے صرف دو واقعہ کو ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں ایک واقعہ وہ ہے جسے انس بن مالک کے حوالہ سے امام بخاری نے کتاب الاعتصام میں پیش کیا ہے۔

> انس بن مالک کہتے ہیں کہ آفتاب ڈھلنے کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم باہر تشریف لائے اور صحابہ کو ظہر کی نماز پڑھائی۔ جب سلام پھیر چکے تو منبر پر کھڑے ہوتے اور قیامت کا ذکر فرمایا۔ اس ضمن میں یہ بھی ذکر فرمایا کہ قیامت سے پہلے بڑے بڑے واقعات ہوں گے اس کے بعد فرمایا جو شخص چاہے وہ مجھ سے جو چاہے پوچھ لے۔ خدا کی قسم جب تک میں اس جگہ کھڑا ہوں تم مجھ سے جو دریافت کرو گے میں تم کو بتا دوں گا۔ انس کہتے ہیں لوگ یہ سن کر بہت روئے۔ ادھر آپ باربار فرماتے تھے کہ پوچھو پوچھو۔ آخر عبداللہ بن حذافہ کھڑے ہوتے اور پوچھا کہ یا رسول اللہ میرے والد کون ہیں؟ فرمایا میرے والد حذافہ ہیں۔ جب اس کے بعد بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم یہی فرماتے رہے کہ اور پوچھو اور پوچھو تو حضرت عمر گھٹنوں کے بل بیٹھ گئے اور فرمایا ہم خدا کو رب اور اسلام کو دین اور محمد کو رسول مان کر راضی ہیں۔ راوی کہتا ہے کہ حضرت عمر کی اس معذرت کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم خاموش ہو گئے۔ پھر فرمایا کہ خبردار اس ذات کی قسم ہے جس کے قبضے میں محمد کی جان ہے ابھی ابھی دیوار کی طرف جنت اور دوزخ مثالی طور پر میرے سامنے پیش کی گئی تھیں میں نے برائی اور بھلائی کا ایسا منظر جیسا آج دیکھا ہے کبھی نہیں دیکھا۔ امام محمد بن

[1] افادات شیخ الاسلام

شہاب زہری اپنی سند سے بیان کرتے ہیں کہ عبداللہ بن حذافہ کی والدہ نے عبداللہ سے کہا کہ تجھ جیسی نالائق اولاد میں نے نہیں دیکھی۔ تیرے پاس اس کی کیا ضمانت تھی کہ تیری ماں نے زمانہ جاہلیت کی عورتوں کی طرح کوئی نازیبا حرکت نہیں کی۔ اگر کہیں ایسا ہوا ہوتا تو آج بھری محفل میں تو نے اپنی ماں کو رسوا کر دیا ہوتا۔ عبداللہ بن حذافہ نے کہا خدا کی قسم اگر حضور مجھے کسی حبشی غلام کی بھی اولاد کہہ دیتے تو میں اپنے آپ کو اسی کی اولاد سمجھ لیتا۔

امام بخاری نے اس واقعہ کو کتاب العلم میں بھی ذکر کیا ہے مگر کتاب الاعتصام میں ایک ایسی قید مذکور ہے جو اور جگہ موجود نہیں اور وہ مادمت فی مقامی ھذا یعنی جب تک میں اس جگہ ہوں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کا ہر سوال کے جواب کے لیے تیار ہو جانا صرف وقتی کیفیت تھی۔ جیسا کہ سامنے دیوار پر اس وقت جنت اور نار کا تمثل۔ اس کی علت یہ نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو رسالت کے ذیل میں قیامت تک کے انسان اور ان کے باپ دادوں کے نام بھی بتا دیے جاتے ہیں۔ اگر یہ بھی علوم رسالت میں داخل ہوتا تو ان کے دریافت کرنے سے آپ کو غصہ ہی کیوں آتا۔ لیکن گاہ گاہ ایسا ہو جاتا ہے کہ جب رسول کو تنگ کیا جاتا ہے تو قدرت الٰہی اس کا تکفل فرما لیتی ہے کہ جو ان سے پوچھا جائے گا اس کا جواب وہ اسی وقت القاء کر دے گا جیسا کہ سیر معراج کے واقعہ میں جب آپ کا بیت المقدس کا سفر مشرکین مکہ کو بعید نظر آیا تو انہوں نے امتحاناً آپ سے مسجد اقصیٰ کے متعلق سوالات شروع کیے۔ حدیث میں آتا ہے کہ آپ کو اس وقت اتنی بے چینی ہوئی کہ کبھی نہ ہوئی تھی ظاہر ہے کہ ایک دیکھنے والا ہمہ وقت اتنے غور سے تو نہیں دیکھتا کہ ہر چیز کے سارے خط و خال محفوظ کر لے۔ اب اگر آپ ان کے سوالات کا جواب نہیں دیتے تو منکرین کو مذاق اڑانے کا موقعہ ہاتھ آتا ہے اور اگر جواب دیتے ہیں تو اس ارادے سے کہ آپ نے بیت المقدس کو دیکھا نہ تھا کہ قریش مکہ کو اس کا امتحان بھی دینا ہے۔ یہ بے چینی آپ کے مربی حقیقی اللہ سبحانہٗ نے محسوس کی آپ فرماتے ہیں۔ کہ بیت المقدس میرے سامنے کر دیا گیا۔ وہ مجھ سے سوال کرتے جاتے میں بڑی سہولت سے دیکھ دیکھ کر جواب دیتا جاتا تھا۔ بہرحال اس قسم کی جزئیات بھی رسول کی زندگی میں ملتی ہیں مگر یہ منصب رسالت کا نہ جزو ہے اور نہ اس کا کمال بلکہ حق تعالیٰ کی اس وقت مشیت پر موقوف ہے اگر چاہے تو خرق عادت کے طور پر اس کا نقشہ بھی دکھا دے۔ یہی حال تمام معجزات کا ہے۔ وہ بھی نبی کی طاقت سے باہر ہوتے ہیں۔ اس کی طاقت سے ظاہر نہیں ہوتے نہ اصولی طور پر معجزات کی کلی طاقت ان کو دی جاتی ہے بلکہ وقت و مصلحت کے لحاظ سے اگر اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا ہے تو اپنی غیر متناہی طاقت کا ان کے ہاتھوں پر اظہار کر دیتا ہے اور جب نہیں چاہتا تو نہیں کرتا۔

اس کے ساتھ اسی آیت کے پس منظر میں یہ واقعہ بھی شارحین قرآن نے بڑے کروفر سے نقل کیا ہے۔
حضرت علی فرماتے ہیں کہ قرآن کی یہ آیت جب نازل ہوئی و للہ علی الناس حج البیت من استطاع الیہ سبیلاً تو لوگوں نے دریافت کیا یارسول اللہ بتائیے کہ کیا ہر سال حج ہے۔ حضور انور خاموش رہے پھر دریافت کیا کہ کیا ہر سال حج فرض ہے پھر آپ نے سکوت فرمایا۔ پھر پوچھا کیا ہر سال حج ہوگا۔ فرمایا نہیں۔ اگر میں ہاں کہہ دیتا تو ہر سال واجب ہو جاتا اور اگر واجب ہو جاتا تو تمہارے بس سے باہر ہو جاتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ سوال کرنے والے حضرت اقرع بن حابس تھے۔ یہ حدیث بھی حدیث کی متعدد کتابوں میں آئی ہے۔
پس منظر میں اگرچہ اور بھی واقعات ہیں۔ لیکن عام شارحین قرآن نے زیادہ تر ان دو واقعوں کو اس آیت کی تشریح میں اپنایا ہے۔

سوال سے ممانعت کا پس منظر

ان دو واقعات سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ سوال سے ممانعت کا پس منظر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے بعض لوگوں کے عجیب عجیب سوالات تھے۔ جن کی نہ دین کے کسی معاملے میں ضرورت تھی اور نہ دنیا ہی کے کسی معاملہ میں ایسے لایعنی اور غیر ضروری سوالات سے اس آیت میں منع کیا گیا ہے۔ اس صورت میں آیت گرامی کا مطلب کیا ہے۔ مجھے افسوس سے کہنا پڑتا ہے کہ شارحین قرآن نے اس کا جواب وضاحت کے ساتھ نہیں دیا۔ یعنی ان واقعات کو تو آیت کے پس منظر میں بڑی قوت کے ساتھ درج کیا ہے لیکن واقعات کے ساتھ مطالب کی تطبیق میں قوت کا وہ مظاہرہ نہیں کیا جو کرنا چاہیے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیے کہ کچھ تو طرح ہی دے گئے گویا انہوں نے کوئی پس منظر لکھا ہی نہیں ہے۔ صرف شیخ الاسلام نے آیت کے عموم میں ان واقعات کو کھپانے کی تھوڑی سی کوشش فرمائی ہے جیسا کہ آپ ان کے افادات میں مطالعہ فرما چکے ہیں۔ دوسرے شارحین قرآن اور خود شیخ الاسلام نے سوال سے ممانعت کا پس منظر ان واقعات سے ہٹ کر پیش کیا ہے اور وہ یہ بھی ہیں۔ امام بخاری نے صحیح میں اسی آیت کا حوالہ دے کر عنوان قائم کیا ہے باب ما یکرہ من کثرۃ السوال۔ اور یہ ارشاد نبوت اس میں درج کیا ہے کہ

مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ شخص ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال چھیڑا جو لوگوں پر حرام نہ کی گئی تھی اور پھر محض اس کے سوال کی وجہ سے وہ چیز حرام ہو گئی۔

حافظ ابن کثیر نے ایک اور صحیح حدیث پیش کی ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ لوگو! اللہ نے تمہارے ذمے کچھ فرائض لگائے ہیں انہیں ضائع نہ کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام کر دیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو، کچھ حدود مقرر کر دی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو اور کچھ چیزوں کے متعلق خاموشی اختیار کی ہے بغیر اس کے کہ اس کو بھول لاحق ہوئی ہو لہٰذا ان کی کھوج نہ لگاؤ۔

یہ حدیث ابو ثعلبہ الخشنی کے حوالے سے سنن دار قطنی میں ہے اور صاحب مشکوٰۃ نے کتاب الاعتصام بالکتاب والسنۃ میں درج کی ہے۔

ان دونوں حدیثوں میں یہ اہم حقیقت واضح کی گئی ہے کہ بعض امور کو شارع نے مجمل چھوڑ دیا ہے اور ان کی تفصیل نہیں بتائی ہے یا جو احکام بر سبیل اجمال دیے ہیں اور مقدار یا تعداد یا دوسرے تعینات کا ذکر نہیں کیا ہے ان میں اجمال اور عدم تفصیل کی وجہ یہ نہیں ہے کہ شارع سے بھول ہو گئی ہے بلکہ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ شارع ان امور کی تفصیلات کو محدود کرنا نہیں چاہتا اور احکام میں لوگوں کے لیے وسعت رکھنا چاہتا ہے اس پس منظر کے تحت شارحین قرآن نے اس آیت کی جو تشریح کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔ شیخ المفسرین امام محمد بن جریر طبری فرماتے ہیں:

اے اہل ایمان تم جو میرے رسول سے ان چیزوں کے بارے میں سوالات کرتے ہو جن کے بارے میں نے وحی نازل نہیں کی۔ ان چیزوں کے بارے میں سوالات مت کیا کرو کیونکہ اگر وحی کے ذریعے ان کو ظاہر کر دیا جاتے تو یہ تمہاری پریشانی کا سامان ہوگا کیونکہ زبان وحی پر جو بات آتے گی اس میں تمہیں کسی نہ کسی پابندی کے ذریعے امتحان سے دوچار ہونا ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس میں مشقت ہی مشقت ہے اور اگر کسی بات کی حرمت وحی کے ذریعے یا کسی چیز کی حلت مقرر ہو گئی تو اس سے بھی تمہاری پریشانی میں اضافہ ہوگا۔ اور یہ آیت اس حدیث کی نظیر ہے جس میں ہے کہ اللہ نے کچھ فرائض تم پر عائد کیے ہیں انہیں ضائع نہ کرو، کچھ چیزوں کو حرام کیا ہے ان کے پاس نہ پھٹکو۔ آخر حدیث تک۔ اور اسی کی تائید میں عبداللہ ابن عباس کا یہ بیان بھی ہے کہ ان اشیا کے بارے میں سوالات نہ کرو کہ اگر قرآن ان کے بارے میں کوئی سختی پر مبنی حکم نازل کر دے تو تم غمگین ہو جاؤ بلکہ انتظار کرو، پھر جب قرآن نازل ہو رہا ہو تو تم کسی چیز کے بارے میں سوال نہ کرو گے لیکن تمہیں اس کی توضیح مل جائے گی۔

اور حافظ ابن کثیر ارشاد فرماتے ہیں:

کسی چیز کے بارے میں تم نئے نئے سوالات نہ کرو ممکن ہے کہ تمہارے سوال کی وجہ سے کوئی سختی نازل ہو جائے۔ حدیث میں ہے مسلمانوں کے حق میں سب سے بڑا مجرم وہ ہے جس نے کسی ایسی چیز کے متعلق سوال کیا جو لوگوں پر حرام نہ تھی مگر اس کے سوال کی وجہ سے حرام ہو گئی۔ لیکن جب قرآن میں کوئی بات مجمل نازل ہوئی ہو اور تم نے اس کی توضیح پوچھ لی تو اس کو بیان کرنا تمہاری خاطر ضروری ہو گیا۔ اور عفا اللہ عنہا کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے جس چیز کا ذکر نہیں کیا سمجھ لو کہ اس نے معاف کر دیا تم بھی خاموش رہو جیسے اللہ نے خاموشی اختیار کر لی ہے۔ حدیث صحیح ہے۔ مجھے چھوڑ دو جب تک میں چھوڑے رکھوں تم سے پہلے لوگ کثرتِ سوال کی وجہ سے تباہ ہو گئے ہیں اور حدیث صحیح میں ہے کہ اللہ نے کچھ فرائض مقرر کیے ہیں ان کو ضائع نہ کرو الخ حدیث تک۔

ابن جریر اور ابن کثیر کی تشریحات کا خلاصہ یہ ہے کہ ان چیزوں کے بارے میں سوالات کرنے سے منع کیا گیا جن کا اظہار تمہارے لیے پریشانی کا سامان ہو جاتے۔ ہاں صرف ایک صورت میں سوال کرنا روا ہے کہ کسی چیز کے بارے میں قرآن نے اجمالاً کچھ کہا ہو اور تم سوال کے ذریعے اس کی توضیح چاہتے ہو جیسا کہ مسئلہ خمر میں پہلے سن چکے ہو۔

صاحب المنار علامہ سید رشید رضا نے یہ بھی مطلب بتایا ہے کہ اگر تم ان چیزوں کے بارے میں نزولِ وحی کے زمانے میں سوال کرو گے تو اللہ سبحانہ تمہارے سوال کا جواب ضرور دے گا۔ اگر سوال کا تعلق فکر و عقیدہ سے ہو گا تو اس کی اس حد تک توضیح ضرور ہو گی جتنی اعتقاد کے لیے ناگزیر ہے اور عملی زندگی سے متعلق سوال ہو گا تو اس کا حکم ضرور بیان ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اصول استناد کی حد تک بندوں کی ان تمام چیزوں میں رہنمائی کرنا جن کی بندوں کو اپنی معاش اور معاد کی حد تک ضرورت ہے اور اصولِ اجتہاد کی حد تک اللہ نے اپنے بندوں کو آزادی دی ہے اسی میں دین کی آسانی ہے لہٰذا تشریع کی حد تک ایسے سوالات ہرگز نہ کیے جائیں کہ اگر ان کا جواب دیا جاتے تو وہ پریشانی کا سامان ہو جاتے اور زمانہ نزول وحی میں جواب ناگزیر ہے لیکن یہ جواب تمہاری فکری آزادی کا خاتمہ کر دے گا اور اجتہاد کا دائرہ تنگ سے تنگ تر ہو جائے گا۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ زمانہ نزولِ قرآن میں اگر سوالات ہوں گے تو جواب بھی ضروری ہو گا لیکن یہ جواب تمہاری پریشانی کا باعث ہو گا اس لیے سوالات سے بچ کر رہنا چاہیے۔

مولانا عثمانی کی تشریح ہو یا ابن جریر اور ابن کثیر کی تشریح ہو اور یا بالآخر سید رشید رضا کی تفسیر ہو

ان سب سے جو بات بھی جا رہی ہے وہ یہ ہے کہ اسلام میں قانون کا ماخذ عام لوگ یا کسی خاص طبقہ اور جماعت کے اغراض و مفادات نہیں ہیں۔ کیونکہ قانون کا ماخذ تمام تر قرآن ہے جس کے احکام و ہدایات اور جس کے متعین کردہ اصول کار اور مقاصد جملہ افرادِ معاشرہ کے لیے یکساں تسلیم ہیں کہ اسلام میں قانون کا پہلا ماخذ قرآن ہے جن امور کی بابت قرآن نے صاف اور صریح احکام دیے ہیں ان کی نسبت اور کوئی قانون نہیں بنایا جا سکتا الا یہ کہ کسی ایسے حکم کے تحت ضمنی قوانین و ضوابط مرتب کرنے کی ضرورت پیش آئے ایسی صورت میں سنت کی طرف رجوع کرنا پڑے گا۔ اسی طرح جہاں کسی معاملہ میں قرآن خاموش ہو وہاں سنتِ رسول یا صحابہ کرام کے متفقہ تعامل سے مدد لی جائے گی۔ یہ اصول استناد ہیں ان میں اسلام نے عقل کی مداخلت کو بالکل رد کر دیا ہے اور کسی انسان کو یہ حق نہیں دیا ہے کہ وہ اس دائرے میں اپنی عقلی موشگافیوں سے فکر و عمل کا انتشار پیدا کرے جب کسی معاملہ میں اصول استناد کی صاف و صریح ہدایت موجود ہو تو یہ قطعاً ناجائز ہے کہ اس کی ہدایت کو چھوڑ کر افراد اپنی عقل و فہم کی رہنمائی قبول کریں لیکن قرآن نے قانون کی خاطر اصولِ استناد کے ساتھ اصول اجتہاد کی مناسب رعایت بھی ملحوظ رکھی ہے اور اہلِ ایمان کو موقع دیا ہے کہ وہ اصول استناد سے باہر اپنی عقل و فہم کو کام میں لائیں جہاں کسی صورتِ حال کے بارے میں اصول استناد خاموش ہوں وہاں اسلامی معاشرے کے ان افراد کو عقل و استدلال کا حق عطا کیا گیا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم و فضل کی وسعتوں کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر سکتے ہوں اس پس منظر کی روشنی میں اس آیت قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ ایسے سوال نہ کرو جن کے جواب اگر دیے جائیں تو اجتہاد کا دروازہ تمہارے لیے تنگ سے تنگ تر ہو جائے۔ ساتھ ہی یہ بھی حقیقت واضح کر دی کہ یہ زمانہ نزولِ قرآن کا زمانہ ہے اس وقت جو سوال بھی کرو گے اس کا جواب نازل ہو سکتا ہے۔ اس وجہ سے سوچ سمجھ کر وہی سوالات کرو جو تمہارے لیے نافع ہوں اور علم شریعت میں اضافہ کا موجب ہوں۔ جن باتوں کو ہم نے بیان نہیں کیا اس لیے نہیں کہ ہم بھول گئے بلکہ اس لیے کہ ہماری رحمت نے تمہارے لیے عفو و درگزر سے کام لیا ہے۔ ہم تمہاری فکری آزادی کو سلب کرنا نہیں چاہتے۔ ہم نے ان معاملات کو تمہاری عقل اور اجتہاد پر چھوڑ دیا ہے جن میں تمہاری عقل تمہاری رہنمائی کے لیے کافی ہے۔

ایسا کیوں ہوا؟ اس لیے کہ یہ شریعت آخری شریعت اور کامل شریعت ہے۔ کمال یہی ہے کہ ہمیشہ کے لیے اس میں کسی پہلو سے نقصان نہ ہو۔ اصول استناد میں تبدیلی نہیں ہو سکتی اس لیے وہ کم سے کم رکھے گئے اور اصول اجتہاد حالات زمانہ کے لحاظ سے تبدیل ہوتے رہے ہیں اور بلاشبہ بہت سے تفصیلی امور میں تبدیلی حالات کے لحاظ سے تبدیلی حکم کی ضرورت ہوتی ہے اس لیے یہی طریقہ اعتدال

ہے کہ اصولِ استناد کے ساتھ اصولِ اجتہاد کی رعایت دی جائے ۔

اصولِ استناد اور اصولِ اجتہاد

دراصل اصولِ استناد ہوں یا اصولِ اجتہاد دونوں اجتماعی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہیں۔ ان میں ضروری ہونے کے ساتھ نزاکت یہ ہے کہ اصولِ استناد اور اصولِ اجتہاد میں کس طرح مصالحت کی جائے۔ علمی طور پر یہ اسلامی زندگی کا نازک ترین موڑ ہے۔ حافظ ابن حزم ظاہری اور ان کے ہمنوا صرف اصولِ استناد کو صحیح تسلیم کرتے ہیں جب کہ کچھ لوگ صرف اصولِ اجتہاد پر زور دیتے ہیں حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ اور کسی ایک میں غلو برتنے سے دوسرا مجروح ہوتا ہے۔ اگر انسانی فکر کو غیر محدود آزادی عطا کی جاتی ہے تو تمدنی زندگی کی بنیاد اور اس کے مقصد و نصب العین پر کبھی اتفاق ہوتے نہیں ہو سکتا۔ اور افراد متضاد نظریات رکھنے والے گروہوں میں بٹ جاتے ہیں جس میں سے ہر گروہ دوسرے گروہوں کا رقیب اور خصم بن جاتا ہے۔ اس طرح سے اعمال و عقائد کی وہ یکسانیت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی جو قانون کے موثر وجود کی شرط ہے۔ اس قسم کی بے قید آزادی خطرات سے خالی نہیں ہے اور اس طرح تمدنی امور اور انسانی معاملات میں محض عقلی بنیادوں پر کوئی صحیح فیصلہ نہیں کیا جا سکتا۔ کیونکہ عقل جذبات کی تابع، خواہشات کی غلام تعصبات کی اسیر اور انفرادی تجربات میں محصور ہوتی ہے۔ دوسری طرف اگر صرف اصولِ استناد پر زور دیا جائے اور اصولِ اجتہاد کو نظر انداز کر دیا جائے تو انسان کے فکری ارتقار کی راہیں بالکل مسدود ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اور اس کی حیثیت صرف ایک مشین کے پرزے کی رہ جاتی ہے۔ اصولِ استناد میں غلو برتنا انسان کی ذہنی موت ہے۔ جو اجتماع محض اصولِ استناد پر استوار ہو اس میں ترقی کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں۔ مغربی تمدن کبھی ان دونوں اصولوں کے مابین مصالحت پیدا نہ کر سکا اور ہمیشہ کسی نہ کسی اصول میں غلو برتا رہا کیتھولک تسلط کے عہد میں اصولِ استناد کا زور تھا جس شخص نے ذرا بھی آزادی سے کام لے کر راسخ الوقت مذہبی قوانین کے خلاف آواز نکالی اسے طاقت کے زور سے بالکل دبا دیا گیا۔ اجتہاد و رائے اور آزادی فکر کے لیے اس سوسائٹی میں کوئی گنجائش نہ تھی۔ پروٹسٹنٹ فرقہ کی کامیابی دراصل اجتہاد کی کامیابی تھی۔ کیونکہ اس فرقہ کا اصول ہی یہ تھا کہ انسان اپنی آزادی رائے استعمال کر سکتا ہے۔ اس کے بعد جو دور آیا اس میں انفرادیت بطور ایک سیاسی اور مذہبی اصول کے مغربی تمدن پر حاوی ہو گئی اور یورپ عقل و فکر کی بے قید آزادی کا میدانِ کارزار بن گیا۔ اس آزادی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مغربی تمدن کی بنیادیں ہلنے لگیں۔ یہ تو ہم بیگانوں کے آئینہ میں اپنا چہرہ دیکھ رہے ہیں۔ آئیے اپنے ہی آئینے میں ذرا اپنا چہرہ بھی دیکھ لیجئے خلافت راشدہ کی حکومت

کی کامیابی کا راز اصول استناد اور اصول اجتہاد میں مصالحت اور مفاہمت ہی رہا ہے۔ اسلامی تاریخ میں خلافتِ عباسیہ میں اعتزال و سنت کا خلق قرآن کے نام پر تصادم دراصل اصول استناد اور اصول اجتہاد کا تصادم ہے۔ اعتزال کا اصول ہی یہ تھا کہ قرآن و سنت کے معاملہ میں انسان کو آزادی ہاتھ حاصل ہے۔ اس لیے معتزلہ کی کامیابی دراصل انفرادی عقلیت کی کامیابی تھی۔ مولانا آزاد نے اس دور کی پوری پوری تصویر پیش کی ہے۔

" تیسری صدی ہجری کے اوائل میں جب فتنہ اعتزال و تعمق فی الدین اور بدعت معتلہ تکلم بالفلسفہ والانحراف از اعتصام بالسنہ نے اٹھایا اور صرف ایک ہی نہیں کہ لگاتار تین عظیم الشان فرمانرواؤں یعنی مامون، معتصم اور واثق باللہ کی شمشیر استبداد و قہر نے حکومت کا ساتھ دیا۔ حتیٰ کہ بقول علی ابن المدینی فتنہ ارتداد کے بعد یہ دوسرا فتنہ تھا جو اسلام کو پیش آیا۔ یہ وہ وقت تھا کہ قیام سنت و دین خالص کا قیامت تک فیصلہ ہونے والا تھا اور مامون و معتصم کے جبر و قہر او بشر مریسی اور قاضی ابن ابی داؤد جیسے جبابرہ معتزلہ کے تسلط و حکومت نے علمائے حق کے لیے صرف دو راستے باز رکھے تھے یا اصحاب بدعت کے آگے سر جھکا دیں اور مسئلہ خلق قرآن پر ایمان لا کر اس کی نظیر قائم کر دیں کہ شریعت میں اتنا ہی نہیں ہے جو رسول تبلا گیا بلکہ اس کے علاوہ بھی بہت کچھ کہا اور کیا جا سکتا ہے اور ہر ظن کو اس میں دخل ہے، ہر رائے اس پر قاضی و آمر ہے ہر فلسفہ اس کا مالک و حاکم ہے "

ظاہر ہے کہ امام احمد کا موقف یہی تھا کہ اصول اجتہاد میں انتہا پسندی نہ برتی جائے بلکہ اصول استناد اور اصول اجتہاد میں توازن قائم رکھا جائے۔ معتزلہ اس توازن کو نہیں مانتے تھے اور وہ اجتہاد کو خود رائی کا لبادہ پہنا کر اصول استناد کو بے جان بنائے ہوئے تھے۔ اصول استناد اور اصول اجتہاد میں مفاہمت صرف امام احمد ہی کا مسلک نہیں بلکہ امام مالک، امام ابو حنیفہ اور امام شافعی سب کا یہی مسلک ہے۔ یہ سب بزرگ اصول استناد کے ساتھ اسلام کی سیاسی زندگی میں اصول اجتہاد کے قائل ہیں۔

اسلامی نظام میں اجتہاد کا مقام

اصول استناد کے ساتھ قرآن نے اہل ایمان کے لیے اصول اجتہاد کی بنیاد رکھی ہے اور اہل ایمان کو موقع دیا ہے کہ وہ متذکرہ بالا حدود سے باہر اپنی عقل و فہم کو کام میں لائیں۔ جہاں کسی بھی صورت حال کی نسبت اصول استناد قرآن و سنت دونوں خاموش ہوں وہاں اسلامی معاشرے کے ان افراد کو عقل و استدلال کا حق عطا کیا گیا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم و فضل کی وسعت کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر

سکتے ہوں۔ تاریخ فقہ اسلامی کے آغاز میں اجتہاد رائے کے معنے میں بولا گیا ہے۔ رائے کے مقابل علم کی اصطلاح تھی جس کے معنے اصول استناد کے تھے یعنی ایک بات اگر قرآن و سنت میں ہے تو وہ علم ہے اور اگر نہیں ہے تو وہ رائے ہے۔ اس میں انکار حدیث یا ترک حدیث کا سوال ہی نہ تھا بلکہ اصل مسئلہ یہ تھا کہ ایک مسئلہ کا حل ایک عالم قرآن و سنت میں نہ ملنے کی وجہ سے اپنی سوچی اور سمجھی ہوئی رائے سے تلاش کرتا تھا۔ یہ رائے اس عالم کی دانست میں قرآن و سنت کے مقاصد سے ہم آہنگ ہوتی تھی۔ کسی واقعہ میں اگر قرآن و سنت کی کوئی ظنی الدلالہ نص موجود ہو اس کی مراد متعین کرنے کا نام اجتہاد نہیں ہے۔ ایسے ہی اصول استناد میں نص نہ ہونے کی صورت میں غیر شرعی راہوں سے تفکیر کا نام اجتہاد نہیں ہے بلکہ اجتہاد نام ہے کسی واقعہ میں قانون معلوم کرنے کا جس میں نص نہ ہو ان راہوں پر غور و فکر کرکے جن کے رہنما اصول خود اصول استناد میں بتاتے ہیں اسی کو قرآن نے نبوت کی طرف نسبت کرکے لتبین للناس پیغمبر کا بیان کہا ہے اور اسی کو اہل ایمان کی طرف نسبت کرکے لعلھم یتفکرون اہل ایمان کا تفکر کہا ہے۔ ارشاد ہے :

انزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون ۔

اور ہم نے تجھ پر الذکر یعنی قرآن اتارا تاکہ جو کچھ لوگوں کی طرف اتارا گیا ہے تو اسے بیان کردے اور تاکہ لوگ غور و فکر کرلیں۔

نبوت کا بیان تو اللہ کی اراءت ہوتا ہے۔ قرآن کا اعلان ہے ۔

لتحکم بین الناس بما اراک اللہ

رسول کے مقابلے میں دوسروں کی تفکیر کی حیثیت اراءت خداوندی کی نہیں بلکہ رائے کی ہے۔ ایک مرتبہ حضرت عمر کے منشی نے حضرت عمر کے فیصلے پر یہ الفاظ لکھ دیے ھذا ما اری اللہ امیرالمومنین یہ وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے امیرالمومنین کے خیال میں ڈالا۔ اس پر حضرت عمر نے منع فرمایا اور کہا کہ یوں مت لکھو بلکہ یہ لکھو ھذا ما رای امیرالمومنین یہ امیرالمومنین کی رائے ہے ۔

ایک بار بر سر منبر اعلان فرمایا،

لوگو! دیکھو حضور انور کی رائے دین کے بارے میں اس لیے صواب ہوتی ہے کہ وہ خدا کی اراءت ہوتی تھی ہماری رائے تو صرف ایک ظن اور تکلف ہے ۔

یعنی وہ رائے جو اصول استناد کے پیش کردہ رہنما اصولوں کی روشنی میں نہ ہو وہ ظن اور تکلف ہے اور جو تفکیر قرآن و سنت کے رہنما اصولوں کی روشنی میں ہو وہ رائے محمود ہے ۔ یہی اجتہاد ہے۔ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ کو جب یمن کا والی مقرر کیا گیا اور وہ روانگی کے لیے تیار ہو گئے تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

نے ان سے سوال کیا کہ تم معاملات کا تصفیہ کیسے کرو گے ؟ انہوں نے جواب دیا کہ قرآن کی رُو سے حضورانور نے پوچھا کہ اگر قرآن کسی معاملہ میں خاموش ہو تو پھر کیا کرو گے ؟ حضرت معاذ نے کہا کہ اس صورت میں سنت رسُول پر عمل کروں گا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا کہ اگر میری سنت میں بھی زیر بحث معاملہ کے متعلق کوئی ہدایت نہ ہو۔ معاذ نے فرمایا کہ ایسی صورت میں میں اپنی رائے سے کام لوں گا۔ اور اجتہاد کروں گا اور اس میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھوں گا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس جواب سے بہت خوش ہوتے اور اظہار پسندیدگی فرمایا۔

لیکن فکر و اجتہاد کی یہ آزادی غیر مشروط اور بے قید نہیں ہے بلکہ کچھ قیود اور تحدیدات رکھتی ہے کیونکہ اگر بنیادی امور و مسائل اور اساسی اصولوں کو طے کرنے کے بعد انسانی عقل کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا تو اندیشہ یہ تھا کہ ضمنی قوانین اور تفصیلی ضوابط کا رشتہ اس اساس و بنیاد سے منقطع ہو جاتا جس پر یہ قوانین و ضوابط مبنی ہیں اور ایسی صورت میں اسلامی قوانین و احکام ایک بے ربط مجموعہ کی صورت اختیار کر لیتے جن کی اصل و اساس اور فروع و تفصیلات کے مابین کوئی موافقت نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ ضمنی قوانین اور تفصیلی ضوابط کی ترتیب اور اصولوں کے عملی انطباق میں اجتہاد اس شرط کے ساتھ مشروط ہے کہ اس عمل میں اصل کی اسپرٹ ہاتھ سے نہ جانے پائے۔ یعنی ایسا اجتہاد جو اسلام کی رُوح اور قرآن و سنت کے بنیادی اصُول و احکام سے متعرض ہو جائز نہیں ہے۔ اسی غرض سے یہ قید لگا دی گئی ہے کہ اجتہاد صرف وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے علم و اطلاع، اپنی اصابت رائے اور فکری صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کے اہل ہوں۔ قرآن و سنت پر جو قانون کے اساس و ماخذ ہیں ایمان راسخ اور یقین کامل رکھتے ہوں اور متقی و متبع شریعت ہوں۔

اسلام میں فکر و اجتہاد کی آزادی نے بالعموم چھ صورتیں اختیار کی ہیں جنہیں علی الترتیب اجماع، قیاس، استحسان، استصلاح، عرف اور استصحاب کہتے ہیں۔ یہ درحقیقت فکری اجتہاد کے بڑے اصُول ہیں جنہیں اسلامی فکر نے زمانہ کے تبدیل پذیر مطالبات کو پورا کرنے کے لیے ترتیب دیا ہے افسوس کہ یہاں ان پر تفصیلی بحث کا موقعہ نہیں ہے۔ اگر انفاس حیات باقی ہیں تو انشاءاللہ اس کے تفصیلی مباحث ہماری مجوزہ کتاب "اصول استناد و اصُول اجتہاد" میں آپ کو ملیں گے۔

آج ہم جس دور سے گزر رہے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ اسلامی نظام دونوں اصولوں یعنی اُصول استناد اور اصول اجتہاد پر یکساں زور دیں اور کسی ایک اصُول کی یک طرفہ حمایت نہ کریں جس سے دوسرا مجروح و معطل ہو جائے نہ تو معتزلہ کی طرح عقلیت پر زور دیں کہ فکری آوارگی کا شکار

ہوکر رہ جائیں اور ترداؤ و ظاہری اور ابن حزم کی طرح استناد پر زور دیں کہ پیش پا افتادہ حالات میں فکری جمود کا نشانہ بن جائیں۔ کیونکہ اس زمانہ میں ایک طرف جدید تعلیم یافتہ طبقہ ہے جو یورپ کی لائی ہوئی جمہوریت کی تقلید میں اصول اجتہاد اور آزادی فکر پر غیر متوازن زور دے کر اصول استناد کو خطرہ میں ڈال رہا ہے اس طبقہ کے افراد انفرادی واجتماعی زندگی کے معاملات ومسائل میں سرے سے قرآن وحدیث کی ہدایت ہی سے آزاد ہونا چاہتے ہیں۔ حالانکہ قرآن حکیم نے صراحت کر دی ہے کہ جو شخص اللہ اور رسول کے فیصلوں کو اپنی زندگی کے معاملات اور تمدنی مسائل میں آخری فیصلہ نہیں مانتا اس کے لیے اسلام میں کوئی جگہ نہیں ہے زندگی کے مسائل میں اصول استناد کی ہدایت سے انحراف اس اساس و بنیاد ہی کو منہدم کر دیتا ہے جس پر اسلامی معاشرہ قائم ہے اور اس اساس کے بغیر کوئی معاشرہ اسلامی نہیں ہو سکتا۔ اسلامی زندگی کی حقیقت کو باقی رکھنا ہے تو قرآن وسنت کے مرکز سے وابستہ رہنا ہوگا۔ اور اصول اجتہاد کے ساتھ اصول استناد کو ترتیب دینا ہوگا۔ دوسری طرف علم برداران مذہب ہیں جو خدا ورسول کے دیے ہوتے حق اجتہاد کو سلب کر لینا چاہتے ہیں اور خدا پرستی و اتباع رسول کے سوا کچھ اور اضافہ چاہتے ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں جو ائمہ فقہ کے ہر قول کو خدا ورسول کے حکم کی طرح اٹل سمجھتے ہیں۔ نظری حیثیت سے اجتہاد کی ضرورت کے قائل ہوتے ہوتے عملاً یہ لوگ اجتہاد کے منکر ہیں۔ ان کے نزدیک بعد کے لوگ فطرۃً اجتہاد کے نااہل ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ اسلام کی اجتماعی زندگی میں بیداری اور حرکت کی روح اسی وقت پیدا ہو سکتی ہے جب استناد کے ساتھ اجتہاد کا عمل جاری رہے۔ اسلام کی مثال ایک تناور درخت کی ہے جس کی جڑیں زمین میں ایسی مضبوطی سے گڑی ہوئی ہوں کہ حوادث کا کوئی طوفان اور انقلاب کی کوئی آندھی اسے اپنی جگہ سے نہ ہلا سکے اور جس کی وسیع اور پھیلی ہوئی شاخیں آندھیوں میں ادھر اُدھر ہلتی رہتی ہیں اور جس کے گھنے پتے گرتے اور پھر نکل آتے ہیں۔ اس درخت کی حفاظت جس طرح جڑوں کی مضبوطی پر موقوف ہے اسی طرح شاخوں کی لچک اور پتوں کے گرنے اور پھر نکلنے پر بھی منحصر ہے جو لوگ اس کی جڑوں کو کاٹتے ہیں، وہ اس کے دشمن ہیں جو اس کی شاخوں کی لچک۔ برباد کرنا چاہتے ہیں وہ اس کے نادان دوست ہیں۔

اباحت، توقف اور حرمت

۱۹۶۔ خدا نے ان کو معاف کر دیا ہے اور اللہ بخشنے والا بردبار ہے۔ یا تو یہ مراد ہے کہ ان اشیاء سے درگزر کیا۔ یعنی جب خدا نے ان کے متعلق کوئی حکم نہ دیا تو انسان ان کے بارے میں آزاد ہے۔ خدا ایسی چیزوں پر گرفت نہیں کرے گا چنانچہ اسی سے بعض علمائے اصول نے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اصل

اشیاء میں اباحت ہے اور یا یہ کہ ان فضول سوالات سے جو پہلے کر چکے ہو اللہ نے درگزر کی آئندہ احتیاط رکھو۔[1] یہ دونوں مطلب ہم پہلے ابن جریر اور ابن کثیر کے حوالہ سے پیش کر چکے ہیں۔ ہمارے نزدیک راجح پہلا مطلب ہے اور عبداللہ بن عباس کا بیان بھی اسی کا مؤید ہے جیسا کہ پڑھ آئے ہو۔ اس موضوع پر علماء کے خیالات مختلف ہیں کہ جن معاملات، احوال، کوائف اور اشیاء کے بارے میں قرآن خاموشی اختیار کرے اس کے بارے میں عام قانونی پالیسی کیا ہے۔ کچھ علماء اصول کی رائے تو وہی ہے جو حضرت شیخ الاسلام نے بتائی ہے۔ یعنی اباحت اور قانون کے مزاج کے بھی ہم آہنگ ہے لیکن ہمارے خیال میں یہاں عفو کے معنے آسانی بہم پہنچانے کے ہیں۔ قرآن میں عفو ان معنے میں آیا ہے فتاب علیکم و عفا عنکم عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں حلال وہ ہے جو اللہ نے حلال کیا ہے اور جس سے خاموشی اختیار کی ہے وہ معاف ہے یعنی ان میں اُمت کے لیے تسہیل اور وسعت ہے۔ کچھ علماء کی رائے میں اصل توقف ہے جیسا کہ صاحب درمختار نے تصریح کی ہے اور کچھ کی رائے میں اصل حرمت ہے جیسا کہ ملا جیون نے اسے جمہور کا مذہب قرار دیا ہے ہمارے نزدیک ان تینوں میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ یہاں انسانی زندگی کے دوائر تین ہیں، افکار، عبادات اور معاملات۔ افکار کی حد تک اصل توقف ہے۔ یعنی عالم غیب سے متعلق ہر فکر کے بارے میں اس وقت تک توقف رہے گا جب تک نبوت کی رہنمائی نہ ہو۔ ہم کسی عقیدہ کی کوئی عمارت بطور خود کھڑا کرنے کے مجاز نہیں ہیں اور اصل عبادات میں حرمت ہے یعنی دین کے نام پر عبادت کا ہر پیمانہ ممنوع ہے جب تک قرآن و سنت سے اس کی اجازت نہ ہو خواہ صراحۃً ہو یا دلالۃً یا اشارۃً اور اصل اشیاء و معاملات تمدن و تہذیب اور حکومت و سیاست میں اباحت ہے یعنی صرف وہ چیزیں منع ہیں جن سے قرآن و سنت نے صراحۃً یا دلالۃً منع کیا ہو اس لیے تینوں باتیں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔

عقائد و احکام میں موشگافیاں

۱۹۷۔ تم سے پہلے لوگوں نے ایسے سوالات کیے تھے پھر بالآخر وہ منکر ہو گئے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ پہلی قومیں کثرت سوال اور انبیاء سے اختلاف کرنے کی بدولت ہلاک ہو گئیں۔[2] یعنی پہلے انہوں نے خود ہی عقائد و احکام میں موشگافیاں کیں اور ایک ایک چیز کے متعلق سوال کر کر کے تفصیلات اور قیود کا ایک جال اپنے لیے تیار کرایا۔ پھر خود ہی اس میں اُلجھ کر اعتقادی گمراہیوں اور عملی نافرمانیوں میں مبتلا ہو گئے۔

---

[1] [2] افادات شیخ الاسلام

اس گروہ سے مراد یہودی ہیں جن کے نقشِ قدم پر چلنے میں قرآن اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تنبیہات کے باوجود مسلمانوں نے کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل نے پہلے سوالات کر کے پابندیاں بڑھائیں اور اصول استناد میں دفعات کا اضافہ کرایا۔ پھر جب دائرہ تنگ ہو گیا تو سرے سے عمل کرنا ہی چھوڑ دیا۔ مسلمانوں کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اللہ نہیں چاہتا کہ انسانی معیشت کے لیے سختیاں اور جکڑ بندیاں پیدا کرے اور تمہارے ہر عمل کو کسی نہ کسی پابندی سے ضرور باندھ دے جو کچھ ضروری تھا بتلا دیا جو کچھ چھوڑ دیا گیا وہ معاف ہے۔ اب تم اپنے جی سے کاوشیں کر کے طرح طرح کے سوالات نہ کرو۔ اگر کرو گے تو دین میں آسانی کی جگہ تنگی ہو جائے گی اور تمہارا وہی حال ہو گا جو بنی اسرائیل کا ہوا۔ لفظ سوال کے اندر کئی مفہوم ہیں۔ سوال بعض صورتوں میں اعتراض کی نوعیت کا ہوتا ہے۔ بعض حالات میں تحقیق کی نوعیت کا ہوتا ہے۔ اس صورت میں اس کا صلہ عن ہوتا ہے۔ یہاں قرآن کی بلاغت پر غور فرمائیے کہ صحابہ کے سوال کے تذکرے کے موقعہ پر سوال کا ذکر کیا ہے اور دونوں جگہ عن استعمال کیا ہے اور یہودیوں کے سوال کے ذکر میں عن ہٹا دیا۔ لا تسئلوا عن اشیاء ، ان تسئلوا عنها صحابہ مخاطب ہیں اور قد سالها قوم من قبلكم میں یہود کی کہانی ہے۔ اس اندازِ تعبیر سے بتا دیا کہ صحابہ کے سوالات تحقیقی نوعیت کے تھے جب کہ یہودیوں کے سوال کی نوعیت اعتراض کی تھی۔

---

[1] تفہیم القرآن

مَا جَعَلَ اللّٰهُ مِنْۢ بَحِيْرَةٍ وَّلَا سَآئِبَةٍ وَّلَا وَصِيْلَةٍ وَّلَا حَامٍ ۙ

وَّلٰكِنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَفْتَرُوْنَ عَلَى اللّٰهِ الْكَذِبَ ؕ وَاَكْثَرُهُمْ لَا

يَعْقِلُوْنَ ۝ وَاِذَا قِيْلَ لَهُمْ تَعَالَوْا اِلٰى مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ وَاِلَى الرَّسُوْلِ

قَالُوْا حَسْبُنَا مَا وَجَدْنَا عَلَيْهِ اٰبَآءَنَا ؕ اَوَلَوْ كَانَ اٰبَآؤُهُمْ لَا

يَعْلَمُوْنَ شَيْـًٔا وَّلَا يَهْتَدُوْنَ ۝

اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ اور نہ وصیلہ اور نہ حام
لیکن جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے وہ اللہ پر جھوٹا بہتان
اٹھا رہے ہیں، اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں[۱۹۸] - اور
جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ
نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف تو جواب دیتے ہیں کہ
ہمارے لیے تو بس وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ
دادا کو پایا ہے کیا یہ لوگ باپ دادا ہی کی تقلید کریں گے چاہے

ان کے باپ دادا بے علم ہوں اور بے ہدایت ہوں۔[199]

اللہ کے شعائر سے رسوم کا مقابلہ

یہ آیت گرامی پہلی آیت جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام کے مقابلہ پر ہے۔ وہاں بتایا گیا تھا کہ یہ اللہ کے بنائے ہوئے اور قائم کردہ شعائر ہیں اور یہاں بتایا گیا ہے کہ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام اللہ کے بنائے ہوئے نہیں بلکہ لوگوں کے افترائی اور اختراعی شعائر ہیں۔ وہ نشان توحید ہیں اور یہ نشان شرک ہیں۔ ان کو مشرکین نے رسوم کا درجہ دے کر مذہبی تقدس کا جامہ پہنا رکھا ہے۔ ان کی حیثیت رواجی رسوم سے زیادہ کچھ نہیں۔ اللہ کے قائم کردہ شعائر اور لوگوں کی افترائی رسموں کو ایک دوسرے کے مقابل ذکر کیا ہے کیونکہ ذہنوں میں کوئی تصور واضح اسی وقت ہوتا ہے جب اس کے مقابل تصور کو بھی ساتھ بیان کر دیا جائے۔ اسی بنا پر اہم اصول و نظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ ان کے مخالف اصولوں اور نظریوں کو ان کے بالمقابل رکھ دیا جائے۔ عقیدہ توحید سے زیادہ اہمیت کس نظریے اور عقیدے کو حاصل ہو سکتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ شعائر اللہ کے ساتھ ان رسوم کا بھی ذکر دیا جائے جن کی بنیاد ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت پر قائم ہے۔ یہ قرآن کا عام انداز بیان ہے چنانچہ توحید کی تعلیم دیتے ہوئے بات صرف اسی پر ختم نہیں کی کہ توحید اسے کہتے ہیں بلکہ پوری پوری تفصیل کے ساتھ یہ بتانا بھی ضروری سمجھا ہے کہ شرک کیا ہے اس کے اشکال کیا ہیں؟ چنانچہ یہاں ان مشرکانہ رسوم کا ذکر کیا اور بتایا کہ یہ سب جھوٹ کا گھروندا ہے اور بے عقلوں کا ساختہ پرداختہ ہے۔ اور اس کے بعد اس عملی زندگی کی اس فکری اساس پر یہ کہہ کر ضرب کاری لگائی کہ جب ان سے اپنے اس مشرکانہ کردار پر دلائل کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو ان کے پاس ایک جواب ہوتا ہے۔ حسبنا ما وجدنا علیہ اٰبائنا۔ اس پر قرآن نے کھلے لفظوں میں کہا اولو کان اٰباؤھم لا یعلمون شیئًا ولا یھتدون یعنی تمہاری زندگی کی ساری عمارت جن معماروں کے ہاتھوں بنی ہے وہ بے علم اور بے ہدایت تھے۔ تو یہ صرف جہل و کوری اور گمراہی کے سوا اور کیا ہے؟

۱۹۸۔ اللہ نے نہ کوئی بحیرہ مقرر کیا ہے نہ سائبہ، نہ وصیلہ اور نہ حام۔ لیکن جن لوگوں نے راہ کفر اختیار کی ہے وہ اللہ پر جھوٹا بہتان اٹھاتے ہیں اور ان میں سے اکثر بے عقل ہیں۔ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام یہ سب زمانہ جاہلیت کے رسوم و شعائر سے متعلق ہیں۔ مفسرین نے ان کی تفسیر میں بہت اختلاف

کیا ہے۔ ممکن ہے کہ ان میں سے ہر لفظ کا اطلاق مختلف صورتوں پر ہوتا ہو۔ ہم صرف سعید بن المسیب کی تفسیر صحیح بخاری سے نقل کرتے ہیں۔ بحیرہ جس جانور کا دودھ بتوں کے نام کر دیتے تھے کوئی اپنے کام نہ لاتا تھا۔ سائبہ جو جانور بتوں کے نام ہمارے زمانے کے سانڈ کی طرح چھوڑ دیا جاتا تھا۔ وصیلہ جو اونٹنی مسلسل مادہ بچہ جنے۔ درمیان میں نر بچہ پیدا نہ ہو اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ حامی نر اونٹ جو ایک خاص عدد سے جفتی کر چکا ہو اسے بھی بتوں کے نام پر چھوڑ دیتے تھے۔ علاوہ اس کے کہ یہ چیزیں شعائر شرک میں سے تھیں جس سے جانور کے گوشت یا دودھ یا سواری وغیرہ منتفع ہونے کو حق تعالیٰ نے جائز رکھا اس کی حلت و حرمت پر اپنی طرف سے قیود لگانا گویا اپنے لیے منصب تشریع تجویز کرنا تھا۔ اور بڑی ستم ظریفی یہ تھی کہ اپنی ان مشرکانہ رسوم کو حق تعالیٰ کی خوشنودی اور قربت کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ اس کا جواب دیا گیا کہ اللہ نے ہرگز یہ رسوم مقرر نہیں کیں۔ ان کے بڑوں نے خدا پر بہتان باندھا ہے۔ اور اکثر بے عقل عوام نے اسے قبول کر لیا۔ الغرض یہاں تنبیہ کی گئی کہ جس طرح فضول اور بے کار سوالات کر کے احکام شرعیہ میں تنگی اور سختی کرانا جرم ہے اس سے کہیں بڑھ کر یہ جرم ہے کہ بدون حکم شارع کے محض اپنی آراء سے حلال و حرام تجویز کر لیے جائیں[1] واقعی ان کی معنوی تشریح میں شارحین قرآن نے خوب داد تحقیق دی ہے۔ اہل شرک کی رسوم ہر ملک میں ہر قوم میں اور تاریخ کے ہر دور میں الگ ہوتی رہی ہیں اور ہوتی رہتی ہیں لیکن روح کے اعتبار سے ملتی جلتی ہیں۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس قسم کی گڑھی ہوئی رسمیں اور ایسے جانوروں کا ادب و احترام ہرگز مشروع نہیں ہے اور اللہ نے یہ ہرگز مشروع نہیں کیا۔ جس طرح ہمارے ملک میں بھی گائے، بیل کسی بت، قبر یا دلیتا یا پیر کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ ان سے کوئی خدمت لینا یا انہیں ذبح کرنا یا کسی طور پر ان سے فائدہ اٹھانا حرام سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح زمانہ جاہلیت میں اہل عرب بھی مختلف طریقوں سے جانوروں کو پن کر کے چھوڑ دیا کرتے تھے۔ اور ان طریقوں سے چھوڑے ہوتے جانوروں کے الگ الگ نام رکھتے تھے۔

ان ہی میں سے قرآن نے یہاں چار کا ذکر کیا ہے۔ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام۔

بحیرہ کان پھٹا۔ حضرت شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں یہ کفر کی رسمیں تھیں کہ مواشی میں کوئی بچہ نیاز رکھتے بت کی، تو اس کا کان پھاڑ دیتے نشان کو اور اس کو بحیرہ کہتے۔ چونکہ بحر کے مادہ میں وسعت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور کثرت ہے اس لیے اونٹ کے اچھی طرح کان پھاڑنے کے لیے عرب والے بولتے تھے بحرت البعیر میں نے اونٹ کے اچھی طرح کان چیر دیے۔ اس لحاظ سے یہاں فعیل" بمعنے مفعول ہے۔ صحیح بخاری میں سعید بن المسیب سے مروی ہے کہ بحیرہ کا دودھ بتوں کے نام پر محفوظ کر دیا جاتا۔ اس لیے کوئی شخص اس کے تھن نہیں دوھ سکتا تھا۔ مصنف عبدالرزاق میں قتادہ سے روایت ہے کہ بحیرہ اونٹنی ہوتی تھی۔ جب پانچویں مرتبہ بچہ دیتی اگر بچہ نر ہوتا تو صرف مرد ہی کھاتے عورتیں نہ کھاتی تھیں۔ اور اگر مادہ ہوتا تو اس کے کان پھاڑ کر چھوڑ دیتے۔ پھر نہ اس کی اون کاٹتے اور نہ دودھ پیتے نہ اس پر سوار ہوتے۔ اور جو بچہ مردہ پیدا ہوتا تو پھر مرد اور عورتیں سب مل کر کھاتے۔ بحیرہ کی تعیین میں اہل لغت کے دس سے زیادہ اقوال ہیں۔

سائبہ، امام فخرالدین رازی تفسیر کبیر میں رقمطراز ہیں۔ سائبہ بروزن فاعلہ ہے اور ساب سے بنا ہے جو سطح آب پر کسی چیز کے رواں ہونے کے لیے بولا جاتا ہے۔ کہتے ہیں "ساب الماء" پانی رواں ہوا۔ سابت الحیۃ، سانپ رواں ہوا۔ پس جو جانور اس لیے چھوڑ دیا جائے کہ جدھر چاہے چلا جائے وہ سائبہ ہے۔ اور یہ بمعنی مسیبہ ہے رواں شدہ" اسم فاعل بمعنے اسم مفعول جیسا کہ عیشۃ راضیۃ میں راضیۃ بمعنے مرضیہ ہے اور اس کے متعلق علماء نے متعدد صورتیں بیان کی ہیں۔

۱۔ ابو عبید کا بیان ہے کہ کوئی شخص جب بیمار ہوتا یا سفر سے واپس ہوتا یا کوئی منت مانتا یا کسی نعمت کا شکرانہ ادا کرتا تو اونٹ چھوڑ دیتا جو تمام احکام میں بحیرہ کی طرح ہوتا تھا۔

۲۔ فراء کا قول ہے کہ جب ناقہ دس بچے دے چکتی جو سب کے سب مادہ ہوتے تو اسے چھوڑ دیا جاتا۔ نہ اس پر سواری کی جاتی نہ اس کا دودھ دوہا جاتا اور نہ اس کی اون کاٹی جاتی اور نہ بجز یا مہمان کے کوئی اس کا دودھ پیتا تھا۔

۳۔ حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ سائبہ وہ ہے جو بتوں کے لیے لی جاتی یعنی ان کے لیے چھوڑ دی جاتی تھی۔ ایک شخص اپنے مال میں سے جو چاہتا چھوڑ دیتا اور اسے کر پجاریوں کے پاس آتا تھا اور وہ مسافروں کو اس کا دودھ پلاتے تھے۔

۴۔ سائبہ وہ غلام ہے جو اس طرح پر آزاد کر دیا جاتا کہ نہ اس پر ولا ہوگی نہ دیت اور نہ میراث شیخ نورالحق محدث دہلوی تیسیر القاری میں فرماتے ہیں :

ابو عبید گوید سائبہ از ہمہ انعام میباشد کہ نذر بتان کردند و می گذاشتند و بعضے میگویند کہ مخصوص بشتر است۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میں نے عمرو بن عامر خزاعی کو دیکھا کہ وہ اپنی آنتیں جہنم میں گھسیٹ رہا ہے یہ پہلا شخص ہے جس نے سوائب یعنی سانڈنیوں کو چھوڑا ہے۔

وصیلہ، وہ نرخیز بکری جو یکے بعد دیگرے مادہ جنتے چونکہ دونوں مرتبہ کے کابھی میں مادہ بچہ پیدا ہوتا تھا درمیان میں نر کا فاصلہ نہ ہوتا تھا۔ اس لیے اس کو وصیلہ کہتے تھے نرخیز اونٹنی کو بھی جس کے یکے بعد دیگرے مادہ ہو وصیلہ کہتے تھے۔ امام راغب فرماتے کہ اہل عرب میں رواج تھا کہ بکری پہلے پیٹ میں نر اور دوسرے پیٹ میں مادہ جنتی تو عرب والے کہتے کہ بہن بھائی میں ملاپ ہوگیا اور اس بہن کی وجہ سے اس کے بھائی کو ذبح نہ کرتے تھے اور عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ وہ بکری جس کے سات بچے ہو جاتے تو اگر ساتواں بچہ مادہ ہوتا تو اسے ذبح نہ کرتے اور اسے وصیلہ کہتے۔ علامہ منظور افریقی نے یہ بھی بتایا ہے کہ اونٹنی ہو یا بکری اہل عرب ان کو بتوں کے نام پر بطور سانڈ چھوڑ دیتے اور اس کا دودھ نہ پیتے تھے۔

حامی یہ حمایت سے اسم فاعل ہے جفتی کرنے والا اونٹ، موضح القرآن میں شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں جس اونٹ کی پشت سے دس بچے پورے ہوتے لائق سواری کے اور بوجھ کے اس باپ کو لادنا موقوف کرتے اور جائے پانی پر سے نہ ہانکتے وہ حامی تھا۔"

پھر ان چاروں الفاظ کی تفسیر میں شارحین قرآن اور اہل لغت کا اختلاف ہے۔ ان سب میں قوی تر اور مضبوط ترین وہ ہے جو امام بخاری نے سعید بن المسیب سے روایت کیا ہے اور جسے مولانا عثمانی نے نقل کیا ہے۔

آیت کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لیے تشریع کا حق اللہ سبحانہ کا ہے کسی انسان کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ انسانوں کے لیے شارع بن بیٹھے۔ ان کا سنگین جرم یہ ہے کہ وہ انسانوں پر قانون سازی کر کے خدائی قائم کر رہے ہیں اور انسان پر انسان کی خدائی قائم ہونے کا نتیجہ وہی ہے جو ایک کم ظرف آدمی کو پولیس کمشنر بنا دینے یا ایک جاہل کو وزیر اعظم بنا دینے کا ہوتا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

> اللہ سبحانہ فرماتا ہے کہ میں نے اپنے بندوں کو صحیح فطرت پر پیدا کیا تھا پھر شیطانوں نے ان کو آن گھیرا، ان کو فطرت کی راہ راست سے بھٹکا لے گئے اور جو کچھ میں نے ان کے لیے حلال کیا تھا ان شیطانوں نے ان کو اس سے محروم کر دیا۔

یہی وہ چیز ہے جو انسان کے سارے مصائب اس کی ساری تباہیوں، اس کی تمام محرومیوں کی جڑ ہے۔ یہی اس کی ترقی میں اصلی رکاوٹ ہے۔ یہی وہ روگ ہے جو اس کے اخلاق، اس کی روحانیت کو اس کی

علمی اور فکری قوتوں کو اس کے تمدن اور اس کی معاشرت کو اس کی سیاست اور اس کی معیشت کو اور قصہ مختصر اس کی انسانیت کو تپ دق کی طرح کھا جاتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے یہ فرما کر ان کی اس بیماری کی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہ سب غلط رسمیں ڈال کر اس کو حکم شرعی سمجھتے تھے۔

اور مولانا عثمانی نے بھی اسی کی نشاندہی یہ کہہ کر فرمائی ہے۔

اس سے کہیں بڑھ کر جرم یہ ہے کہ بدون حکم شارع کے محض اپنی آراء و اہواء سے حلال و حرام تجویز کر لیے جائیں۔

بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام اللہ کے حکم کے بغیر تحریم کی مثالیں ہیں۔ یعنی یہ انسانی تحریمات کے پیمانے ہیں۔ ان کا خدائی تحریمات سے کوئی تعلق نہیں ہے اور طرہ یہ کہ اپنی ان تحریمات کو اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کا ذریعہ تصور کرتے تھے۔ صاحب جواہر القرآن نے اپنے افادات میں اس کی نشاندہی کی ہے فرماتے ہیں:

مشرکین جس طرح غیر اللہ کی خوشنودی اور اپنے معبودان باطل کی رضاجوئی کے لیے نذریں مانتے تھے اسی طرح وہ بعض جانوروں کو اپنے معبودوں کی خاطر آزاد چھوڑتے تھے نہ ان کا گوشت کھاتے تھے نہ دودھ پیتے تھے نہ ان پر سواری کرتے نہ بوجھ لادتے۔ یہ تحریمات وہ اپنے معبودوں کی خوشنودی کے لیے کرتے۔ بحیرہ، سائبہ، وصیلہ، حام تحریمات غیر اللہ میں داخل ہیں۔ مشرکین غیر اللہ کی نیازوں کو حلال سمجھتے تھے۔ اور جن چیزوں کی اپنی طرف سے تحریم کر دی تھی ان کو حرام سمجھتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے دونوں کا حکم بیان فرمایا کہ غیر اللہ کی نذریں حرام ہیں، ان کو نہ کھاؤ اور بحیرہ، سائبہ وغیرہ کی تحریمات خود ساختہ ہیں اور یہ حلال ہیں۔ ان کو کھاؤ اور اپنی خود ساختہ تحریمات کو اٹھاؤ۔ کیونکہ جو چوپائے اللہ نے اپنے بندوں کے لیے حلال کیے ہیں وہ حلال ہی رہیں گے اور بندوں کے حرام کرنے سے حرام نہ ہوں گے۔ بعض مفسرین نے بحیرہ، سائبہ وغیرہ کو نذر غیر اللہ میں شمار کر کے حرام قرار دیا ہے مگر یہ درست نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ایک طرف یہ حکم دیا ہے لا تحرموا طیبات ما احل اللہ اور دوسری طرف یہ فرمایا کہ ما جعل اللہ من بحیرۃ ولا سائبۃ یعنی اللہ تعالیٰ نے بحیرہ و سائبہ وغیرہ کی تحریم کا کوئی حکم نہیں دیا اور نہ اس کی اجازت دی ہے اس لیے یہ جانور حلال ہی رہیں گے۔ بندوں کی تحریم سے حرام نہیں ہو سکتے۔

مطلب یہ ہے کہ بندگی کی حدود میں اللہ کی بندگی صرف ان قوانین کے ذریعے کی جا سکتی ہے جو اللہ نے انبیاء کے ذریعے لوگوں کو بتائی ہیں۔ نہ پرستش کے حدود میں کوئی عبادت اور نہ بندگی کی حدود میں کوئی طاعت اس سے باہر ہو سکتی ہے ۲۲ کا کسی کو حق نہیں ہے اور اس کا کوئی بھی مجاز نہیں ہے۔ صرف

نبوت اس کی مجاز ہے کہ وہ خدائی قانون بتاتے۔ اگر کوئی شخص تحریم و تحلیل کا معیار خدا کے نام پیش کرتا ہے تو وہ افترا علی اللہ کذبا کا سنگین جرم کر رہا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ خود ساختہ تحریم سے نہ تو کوئی چیز حرام ہوتی ہے اور نہ ہی تحریم کا قانون بنانا کسی کے لیے روا ہے۔ آخر میں فرمایا کہ اکثرھم لا یعقلون یعنی ان کی اکثریت کو اس کے افترا علی اللہ کذبا ہونے کا اور اس عمل کے کفر ہونے کا پتہ نہیں ہے بلکہ ان کی خیالی پلاؤ یہ ہے کہ یہ بھی اللہ کے قرب کا ایک ذریعہ ہے۔ دین میں ہر موجد کا حال یہی ہوتا ہے۔ ایجاد و اختراع خوش گمانی کی بنیاد پر بے سمجھی کی حالت میں کی جاتی ہے۔

یہاں ایک سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ بحیرہ ہوں یا سائبہ اور وصیلہ ہوں یا حام یا اور اس قسم کے جو جانور بتوں کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں جن کی جان لینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف کام لینے سے آزاد کرنا مقصود ہوتا ہے۔ اہل ہنود اپنے دیوتاؤں کے یا مردوں کے نام پر داغ لگا کر چھوڑ تے ہیں یا مسلمان شیخ سدو یا پیران پیر کا نام لے کر بکرا یا مرغا چھوڑتے ہیں۔ ایسی گائیوں کی اولاد بھی ہو جاتی ہے کیا اس قسم کے جانوروں کو پکڑ کر ذبح کر کے کھا لینا جائز ہے؟ شارحین قرآن نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے۔ اس پر سب کا اتفاق ہے کہ یہ جانور ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل نہیں ہیں اور یہ کہ اس طرح آزاد کرنے سے یہ جانور ملک غیر سے خارج نہیں ہوتے ہیں اس موضوع پر حضرت مولانا عبدالحی کا فتویٰ بھی ہے باقی رہی آیت ما جعل اللہ اس کی تفصیل یہ ہے کہ کفار مکہ نے جانوروں میں اپنی رائے سے تحلیل و تحریم کر دی تھی۔ کبھی مادہ شتر کو کان شق کر کے بتوں کے نام چھوڑ دیتے تھے اور اس کا دودھ کسی کو نہیں دیتے تھے اور اس کے ذبح کو حرام سمجھتے تھے اور اس کے اکرام میں خوشنودی اصنام تصور کرتے تھے۔ اسی کو بحیرہ کہتے ہیں۔ اور سائبہ اس جانور کو کہتے ہیں جو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتے اور اس سے کسی قسم کی باربرداری کی محنت نہ لی جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس حکم کا ان سے ابطال کر دیا اور ما جعل اللہ من بحیرۃ فرمایا۔ بس آیت سے ان کے احکام کا بطلان ثابت ہوتا ہے نہ کہ ان جانوروں کا ذبح کرنا ہر گاہ یہ امر مہد ہوا بس سمجھنا چاہیے کہ جو جانور گنگا پر چڑھاتے جاتے ہیں یا بتوں کے نام پر چھوڑے جاتے ہیں ان کو پکڑ کر ذبح کرنا نہ اس وجہ سے حرام ہے کہ وہ ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل ہیں اور نہ اس وجہ سے حرام ہیں کہ بحیرہ اور سائبہ کا ذبح کرنا حرام ہے بلکہ اس وجہ سے کہ وہ جانور اس آزادی سے ملک مالک سے خارج نہیں ہوتے ہیں لہٰذا بغیر مالک کی اجازت کے ان کا حکم مسروق اور مغصوب کا ہے۔ اگر مالک اجازت دے دے یا اباحت عامہ کر دے تو اس وقت ان کو بسم اللہ کہہ کر ذبح کرنا اور ان کو کھانا درست ہوگا

اور جانور کو آزاد کرنے والے کی حرکت قبیحہ اور نیت شنیعہ سے حکم حرمت نہ ہوگا۔ در مختار میں ہے۔ شامی میں مختار یہی ہے کہ کسی کی ملک کا مالک نہ ہوگا جب تک کہ مالک اس کو مباح نہ کرے اور ایسے ہی وہ جانور جسے مالک نے سائبہ بنا دیا ہو، "شرنبلالی نے اسے تفصیل سے لکھا ہے اور زیلعی نے شرح کنز میں لکھا ہے،

اگر جانور آزاد چھوڑ دیا گیا ہے تو وہ ملک غیر ہے اسے بغیر مالک کی اجازت کے پکڑنا جائز نہیں ہے۔

اور حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ نے بھی اسی قسم کا فتویٰ دیا ہے کہ جو جانور بتوں کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں اور ان کی جان لینا مقصود نہیں ہوتا بلکہ صرف کام لینے سے آزاد کرنا مقصود ہوتا ہے وہ ما اھل بہ لغیر اللہ میں داخل نہیں ہیں۔ ان کو سائبہ کہتے ہیں۔ اور ان کی حرمت صرف بوجہ ملک غیر ہونے کے ہے کہ وہ مالک کی ملک سے خارج نہیں ہوتا۔ اگر مالک کسی کو ان کے ذبح کرنے اور کھانے کی اجازت دے دے تو وہ حلال ہیں اور ایسی گایوں کی اولاد بھی مالک کی ہوتی ہے۔ بس ان گایوں کا اور ان کی اولاد کو بلا اجازت مالک کے کھانا حلال نہیں ہے۔

اسی بنا پر السیوطی نے لکھا ہے کہ یہ آیت جیسے ان کاموں کی حرمت بتاتی ہے یہ بھی بتاتی ہے کہ منافع کو کلی طور پر معطل کر دینا ناجائز ہے۔

بے علموں اور بے عقلوں کی تقلید

۱۹۹۔ اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ اس قانون کی طرف جو اللہ نے نازل کیا ہے اور آؤ پیغمبر کی طرف تو جواب دیتے ہیں کہ ہمارے لیے تو وہی طریقہ کافی ہے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے کیا یہ لوگ باپ دادا کی تقلید ہی کریں گے چاہے ان کے باپ دادا بے علم ہوں اور بے ہدایت ہوں۔ جاہلوں کی سب سے بڑی حجت یہ ہوتی ہے کہ جو کام باپ دادا سے ہوتا آیا ہے اس کے خلاف کیسے کریں۔ ان کو بتلایا گیا ہے کہ اگر تمہارے اسلاف بے عقل یا بے راہی سے تعصب کے گڑھے میں جا گرے ہوں تو کیا پھر بھی تم ان ہی کی راہ پر چلو گے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ باپ کا حال معلوم ہو کہ حق کا تابع اور صاحب علم تھا تو اس کی راہ پکڑئے نہیں عبث ہے یعنی کیف ما اتفق ہر کسی کی کورانہ تقلید جائز نہیں ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

عام شارحین قرآن نے اس آیت کا لب لباب جو کچھ بتایا ہے یہ ہے قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں والحاصل ان الاقتداء لا یجوز الا بالعلماء المهتدين یعنی تقلید تو صرف اہل علم اور ہدایت یافتہ لوگوں کی جائز ہے۔ اور امام رازی فرماتے ہیں الاقتداء بالعالم المهتدي وانما یکون عالماً مهتدیاً اذا بنی قوله علی الحجة والدلیل۔ یعنی تقلید تو صرف ان لوگوں کی کرنی چاہیے جو وہ عالم ہوں اور ہدایت یافتہ ہوں اور ان کی ہر بات دلیل و حجت پر پہنچی تلی ہو۔ اور علامہ زمخشری کشاف میں رقمطراز ہیں والمعنى ان الاقتداء انما یصح بالعالم المهتدي تقلید تو صرف اہل علم اور اہل ہدایت کی درست ہے۔ مفسر قرآن جناب نواب صدیق حسن خاں فتح البیان میں لکھتے ہیں والمعنى انما یصح الاقتداء بالعالم المهتدي الذي یبنی قوله علی الحجة والبرهان مطلب یہ ہے کہ تقلید تو صرف اس ہدایت یافتہ عالم کی ہونی چاہیے۔ جس کی بات دلیل پر مبنی ہو۔ اسی طرف حدیث ذیل میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اشارہ فرمایا ہے:

"اللہ تعالیٰ علم کو لوگوں کے سینوں سے یکبارگی نہیں نکالے گا بلکہ علماء کو ایک ایک کرکے اٹھائے گا۔ یہاں تک جب کوئی صحیح عالم نہ رہے گا تو لوگ جاہلوں کو اپنا پیشوا بنا لیں گے وہ بغیر علم کے فتوے دیں گے خود بھی گمراہ ہوں گے دوسروں کو بھی گمراہ کریں گے (بخاری)

ظاہر ہے کہ یہاں اصل زور اس طرز عمل پر ہے کہ لوگوں کی قیادت بے علموں نادانوں کے ہاتھ میں آجائے گی اور بے علم لوگ علمی سہارے کے بغیر لوگوں کو فتوے دے کر خود بھی گمراہ ہوں گے۔ اگر تقلید جائز نہ ہوتی تو ارشاد نبوت میں افتوا بغیر علم نہ ہوتا۔ قرآن اور نبوت کے نزدیک قابل اعتراض بات تقلید نہیں ہے بلکہ یہ بات ہے کہ وہ بے علموں کی تقلید کرتے ہیں یعنی اگر وہ اہل علم کی تقلید کرتے اور اہل علم علم کے ذریعے ان کو مسائل بتاتے تو پھر نہ قرآن کو ان پر کوئی اعتراض ہوتا اور نہ نبوت ان پر گمراہ کرنے کا فتویٰ لگاتی۔ الغرض سارے ہی شارحین قرآن نے اس آیت سے یہ بات سمجھی ہے کہ اگر ان کے آباؤ اجداد میں علم کی روشنی یا نور ہدایت ہوتا تو قرآن کو ان کی تقلید پر کوئی بھی اعتراض نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں گمراہ تقلید یہ ہے کہ گمراہی اور بے علمی کی تقلید کی جائے اور یہ پیچھے معلوم کر آئے ہو کہ قرآن کی نظر میں دلیل نام ہے اصول استناد اور اصول اجتہاد کے سہارے بات کہنے کا۔ یعنی اللہ کی کتاب اللہ کے رسول کی سنت اجماع اور قیاس کے ذریعے بات بتلانے کا۔

اجتہاد کے ساتھ تقلید ضروری ہے

اصول استناد اور اصول اجتہاد پر گفتگو پہلے ہو چکی ہے اور یہ سن چکے ہو کہ اسلامی نظام کی کارگزاری ان

دو پہیوں سے چلتی ہے اور یہی اس کے کمال کی نشانی ہے۔ اگر اجتہاد حجت شرعیہ ہے تو ظاہر ہے کہ غیر مجتہد کے لیے بجز اس کے چارہ کار ہی کیا ہے کہ اس اجتہاد کی متابعت کرے اور جب خود علم نہیں رکھتا تو علم والے کا اتباع کرے۔ جو خود ان مخفی علل اور دلائل تک نہیں پہنچ سکتا تو وہ ایمان اسرار وعلل کے سامنے جھک جائے کیونکہ بقول حضرت مولانا اسماعیل شہید حصول علم کی دو ہی راہیں ہیں۔ تحقیق اور تقلید یعنی خود سمجھنا یا فہمیدہ لوگوں کی اطاعت کرنا۔ چنانچہ یہی دو مرتبے بلا کسی واسطے کے قرآن نے ہدایت کے رکھے ہیں۔ روز قیامت اسی پر افسوس کریں گے کہ ہم نے دین کو نہ خود اپنی عقل سے سمجھا اور نہ عقل کی سنی۔

قالوا لو کنا نسمع او نعقل ما کنا فی اصحاب السعیر۔

کہیں گے اے کاش اگر ہم سنتے یا سمجھتے تو ہم دوزخیوں میں نہ ہوتے۔

یہی اُن کا سمع وطاعت جو علم والے کے حق میں ایک لاعلم یا ایک محقق کے سامنے ایک غیر محقق عمل میں لاتا ہے تقلید کہلاتا ہے۔ یہ فی نفسہٖ بھی اور بضرورت اجتہاد بھی جائز اور معقول ہے ورنہ اگر عوام کو غیر اہل اجتہاد کے حق میں اہل اجتہاد کی تقلید جائز نہ ہو تو خود اجتہاد کا اسلامی نظام ہی ہونا ہی بے کار ہو کر رہ جائے گا اور قرآن کی اس آیت کے کوئی معنے نہ رہیں گے۔

فاسئلوا اهل الذکر ان کنتم لا تعلمون

اگر تم بے علم ہو تو علم والوں سے سوال کر لو

لہٰذا اگر اجتہاد شرعی حجت ہے اور غیر مجتہد قرآن کے بیان کے مطابق دنیا میں موجود ہیں تو غیر مجتہد کے لیے اجتہادی مسائل میں بجز مجتہد کی تقلید کے کوئی دوسرا چارہ کار نہیں ہے۔ اس لیے حضور کا ارشاد ہے

جس شخص نے بغیر تحقیق کے کوئی فتویٰ دیا تو اس کا گناہ فتویٰ دینے والے پر ہوگا

(ابوداؤد)

ظاہر ہے کہ اگر تقلید جائز نہ ہوتی اور کسی کے فتوے پر دلیل جانے بغیر عمل جائز نہ ہوتا تو گنہ گار ہونے میں مفتی کی تخصیص نہ ہوتی بلکہ جس طرح مفتی کو غلط فتویٰ دینے کا گناہ ہوتا اسی طرح پوچھنے والے کو بلا دلیل ماننے اور عمل کرنے پر گناہ ہوتا۔ حضور انور کا پوچھنے والے کو گنہ گار قرار نہ دینا جواز تقلید کی نشاندہی کر رہا ہے سوچنے کی بات ہے کہ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بغیر دلیل کے مسئلہ پوچھنے والے کو گنہ گار نہیں فرماتے ہیں تو پھر کون ہے جو کسی مسئلہ دریافت کرنے والے کو غلط رو قرار دے یہ تقلید نہیں تو اور کیا ہے؟

صحابہ میں تقلید کا رواج

صحابہ کرام میں جیسے اجتہاد رائج تھا ویسے ہی تقلید بھی رائج تھی۔ یعنی غیر مجتہد کے فتویٰ پر دلیل دریافت کیے بغیر محض اس حسن ظن کی بنا پر عمل کرتا تھا کہ وہ مجتہد ہے۔

یہ حقیقت ہے کہ جب دین کے مسائل پر بحث ہو گی تو سب سے پہلے یہ دیکھا جائے گا کہ اس میں صحابہ کی کیا رائے تھی اور ان کی رائے کے بالمقابل دوسری سب آراء اسی طرح ٹھکرا دینے کے قابل ہوں گی۔ جس طرح ہائی کورٹ کے نظائر کے مقابلے میں دوسری عدالتوں کے فیصلے ٹھکرا دینے کے قابل سمجھے جاتے ہیں وہ دین کا ہائی کورٹ تھے اور ان سے زیادہ صحیح مراد حاصل کرنا عقلاً تو ممکن ہے مگر واقعات کے دائرے میں ممکن نہیں ہے۔

آئیے ہم اسی موضوع پر ان بزرگوں کا طرز عمل دیکھیں۔

مؤطا امام مالک میں ہے حضرت سالم فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ ابن عمر سے یہ مسئلہ دریافت کیا گیا کہ کسی شخص کا دوسرے پر کچھ دین میعادی واجب ہے اور صاحب حق اس میں سے اس شرط پر کچھ معاف کرتا ہے کہ وہ قبل از میعاد اس کا دین دے دے۔ آپ نے اس کو ناپسند کیا اور منع فرمایا۔

اس مسئلہ میں چونکہ اصول استناد میں کوئی آیت قرآنی اور کوئی حدیث نبوی منقول نہیں ہے اس لیے یہ ابن عمر کا اصول اجتہاد میں سے قیاس کا سہارا ہے اور چونکہ پوچھنے والے نے ابن عمر سے دلیل نہیں پوچھی ہے اس لیے اس کا قبول کرنا تقلید ہے کیونکہ تقلید نام ہے کسی بات کو بلا دلیل مان لینے کا۔ اور پھر ابن عمر کا سائل کے سامنے دلیل پیش نہ کرنا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ خود ابن عمر جواز تقلید کے قائل ہیں۔

اسی طرح مؤطا میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ایک شخص نے کسی کو غلہ اس شرط پر قرض دے دیا کہ وہ شخص اس کو دوسرے شہر میں ادا کر دے۔ حضرت عمر نے اسے ناپسند کیا اور فرمایا کہ بار برداری کا کرایہ کہاں گیا؟

چونکہ اس موضوع پر کوئی صریح ارشاد نبوت نہ تھا۔ اس لیے حضرت عمر نے اصول اجتہاد میں سے قیاس سے کام لیا اور چونکہ سائل نے جواب کا ماخذ دریافت کیے بغیر حضرت عمر کی بات مان لی تھی یہ تقلید ہے۔ لہٰذا تقلید کا جواز حضرت عمر کے فعل سے بھی ثابت ہو گیا۔ اسی طرح بروایت مالک بن انس

ثابت ہے کہ :

> حضرت ابوایوب انصاری حج کے لیے نکلے ۔ راستہ میں اونٹنیاں گم ہوگئیں اور حج کا وقت نکلنے کے بعد پہنچے ۔ حضرت عمرؓ سے پوچھا ۔ انہوں نے فرمایا کہ افعال عمرہ ادا کر کے احرام کھول دو اور اگلے سال حج کر کے میسر شدہ قربانی دو ۔

اس سے واضح ہے کہ جو صحابہ اجتہاد نہ کر سکتے تھے وہ مجتہدین صحابہ سے استفسار کر کے اس کی تقلید کرتے تھے ۔ چنانچہ ابوایوب انصاری نے صرف حضرت عمرؓ سے حکم سنا اور دلیل کی تحقیق نہ کی ۔ یہی تقلید ہے ۔

یہی صورت حال زمانہ تابعین میں بھی بکثرت پائی جاتی ہے ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ تاریخ کے ان ادوار میں جن کو خیر القرون کہا جاتا ہے اجتہاد و تقلید دونوں رائج تھے اور دونوں کے افراد و اشخاص الگ الگ تھے یہ اگر اس کی دلیل ہے کہ ہر کس و ناکس کے لیے اجتہاد جائز نہیں ہے تو اس کی بھی دلیل ہے کہ ان تمام کس و ناکس کے لیے تقلید کے سوا چارہ کار بھی نہیں ہے ۔

اجتہاد و تقلید کے حدود

اسلام کی یہ شان کمال ہے کہ اس نے اُمت میں بیک وقت اجتہاد و تقلید دونوں کی ضرورت محسوس کی ۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام نہ تو اجتہاد بلا تقلید چاہتا ہے اور نہ تقلید بلا اجتہاد بھی اس کی جامعیت اور عدل و اعتدال کا تقاضا بھی ہے ورنہ جیسے اجتہاد بلا تقلید افراط ہے ایسے تقلید بلا اجتہاد تفریط ہے عدل کا تقاضا یہی ہے کہ دونوں ہوں اور اپنی اپنی حدود میں ہوں ۔ پھر ساتھ ہی اسلام تقلید و اجتہاد کا ایک نظم بھی چاہتا ہے ۔ کہ مقلدین کی اکثریت مجتہدین کی مقتدی ہو کر اپنے دین کی حفاظت کرے ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلامی نظام چونکہ کمال اعتدال اور شان جامعیت رکھتا ہے ۔ اسی لیے یہ اُمت بھی قرآن کی زبان میں اُمت وسط ہے اس لیے منشا قانون یہ ہے کہ اُمت میں ہر ایک کام جامعیت کے ساتھ اجتماعی رنگ میں ہو اور اجتماعیت ہر پہلو میں نظم رکھتی ہو ۔ خواہ نظام سیاسی ہو یا غیر سیاسی ۔ نظم اس طرح ہو کہ نہ اس میں تشتت و پراگندگی ہو جو بدنظمی ہے اور نہ جمود و استبداد ہو جو اجتماعیت اور جمہوریت کے منافی ہے اس لیے اس نے اُمت کے ہر نظام میں یہی معتدل صورت قائم رکھی ہے ۔

اسلام کا سیاسی نظام

مثلاً اسلام کے سیاسی نظام میں ایک طرف تو امارت رکھی تاکہ اُمت میں وہ نہ مرکزیت (انارکی) اور

لامرکزیت نہ آنے پائے جو پراگندگی اور بدنظمی کی رُوح ہے اس سے حکومت میں امیر کی بالادستی قائم ہوئی۔ دوسری طرف امیر کے لیے شوریٰ کو لازم قرار دیا تاکہ امیر میں ڈکٹیٹرشپ اور استبدادیت کی راہ نہ پاسکے۔ اور اُمت کے اجتماعی فکر و تدبیر کی صلاحیتیں معطل ہو کر نہ رہ جائیں۔ اس صورت میں اُمت میں جمہوریت باقی رہے۔ لہٰذا اسلام کے سیاسی نظام میں نہ تو ایسی شخصی حکومت ہے جس میں جمہور کی کوئی مداخلت نہ ہو اور نہ ایسی جمہوریت ہے کہ وہ لامرکزیت کی حد تک پہنچ کر امیر کو معطل اور بیکار کردے اور عوام ہی اس پر حکومت کرنے لگیں۔ امیر کی شخصیت سے تو اُمت میں طوائف الملوکی اور پراگندگی کا خاتمہ کیا اور اُمت کی شورائی تشکیل سے امیر کے استبداد کی روک تھام کردی۔ اس طرح امارت اور جمہوریت کو مفاہمت کے ذریعے ایک معتدل درجہ کے ساتھ اسلام کے سیاسی نظام میں شامل کردیا۔ یعنی دونوں کے مضر پہلوؤں کو نکال پھینکا اور دونوں کے نافع پہلو اختیار کرلیے گئے یہی کمالِ اعتدال ہے۔

اسلام کا قانونی نظام

ٹھیک اسی طرح اسلام کے قانونی نظام میں اسلام نے اصولِ استناد میں تصریح نہ ہونے کی صورت میں نہ تو عام فکر کو اس طرح آزاد چھوڑ دیا کہ اُمت کا ہر شخص مدعی اجتہاد ہو اور اصولِ استناد میں ہر کہ ومہ کے قیاسات کا دروازہ کھل جائے اور نہ اس اُمت کو ایسی تقلیدِ جامد میں چھوڑا کہ اس کی فکری و اجتہادی قوتیں معطل ہو کر جمود کا شکار ہوجائیں بلکہ ایک طرف تو قانون سازی میں اصولِ استناد کے ساتھ اصولِ اجتہاد کو باقی رکھا تاکہ اُمت کے قوائے فکر و تدبر ترقی پذیر دُنیا کا مقابلہ کرسکیں اور دوسری طرف تقلید کو قائم رکھا تاکہ عامی اور ناواقف آدمی اپنی رائے کو دین کا لباس پہنا کر سارے نظامِ قانون کو آراء و قیاسات کا مجموعہ نہ بنادے اور اس طرح خود قانون میں تشتت و پراگندگی کے جراثیم نہ پھیل جائیں۔ گویا اُمت کے قانونی تشتت کو تقلیدی سمع و طاعت سے رفع کردیا، اور تقلیدی جمود کو شانِ اجتہاد و تحقیق سے رفع کردیا۔ اور اجتہاد و تقلید کے مضر پہلوؤں سے اُمت کے لیے شاہراہِ اعتدال قائم کردی جس میں نافع پہلو سب موجود ہیں چنانچہ اُمت اگر مقلد بھی ہے تو وہ اس تقلید میں محقق بھی ہے۔ اور اگر وہ اجتہادی فکر بھی رکھتی ہے تو اس میں اُسوہ سلف کی مقلد بھی ہے۔ غرض اس درجہ اعتدال ہی کا یہ اثر ہے کہ ان کے اجتہاد میں تقلید اور تقلید میں شانِ تحقیق نمایاں ہے اس لیے نہ تو تقلید کو ایک قانون بنا کر اس سے جنسِ اجتہاد کی تردید ہوسکتی ہے اور نہ اجتہاد کو ایک مسلکِ عام مان کر اس سے تقلید پر رد و انکار کوئی موزوں فعل ہوسکتا ہے۔

اختلافی مسائل میں تقلید شخصی

یہیں سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ اختلافی مسائل میں تقلید شخصی ناگزیر ہے۔ کیونکہ ایک مسئلہ دو متضاد جانبین میں کبھی دائر نہیں ہو سکتا نہ اعتقاداً اور نہ عملاً، ایک ہی وقت میں آپ ناسخ و منسوخ، راجح و مرجوح، اولیٰ و غیر اولیٰ، حقیقت و مجاز، مشترک و مؤول واجب و مکروہ اور فرض و حرام پر عمل یا اعتقاد کیسے کر سکتے ہیں۔ چار و ناچار آپ کو ایک پہلو کو ہی اختیار کرنا پڑے گا۔ جس کا مطلب یہ ہے کہ آپ کو غیر مجتہد ہونے کی حالت میں اختلافی مسائل میں کسی ایک ہی مجتہد کی تقلید کرنی پڑے گی۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ آپ ایک مسئلہ میں سب کی نہیں ایک ہی کی بات مانیں گے تو امام ایک ہوا اور تقلید بھی ایک ہی کی ہوئی۔ یہ تو نہیں ہوا کہ اسی ایک مسئلہ میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی تقلید ہوئی اور اسی ایک میں فلاں کی بھی۔ تقلیدات متعددہ ہو گئیں، امام متعدد ہو گئے مگر جس میں بھی جس امام کی تقلید واضح ہوئی وہ شخصی رہی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اختلافی مسائل میں تقلید شخصی کے سوا عقلاً کوئی چارہ کار ہی نہیں خواہ کوئی طریقہ بھی اختیار کر لیا جائے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس تقلید شخصی میں کون سی مذموم ہے اور کون سی محمود۔ مگر اختلافی مسائل میں کوئی نوعیت لی جائے تقلید شخصی کے سوا عامی کے لیے اور تحقیق شخصی کے سوا مجتہد کے لیے کوئی چارہ کار نہیں جس کا راز یہ ہے کہ آدمی عقلاً بیک وقت دو مختلف سمتوں میں نہیں چل سکتا۔ اور پھر دین میں شرعاً تناقض ممکن نہیں ہے جو بھی کوئی جانب اختیار کرے گا خواہ وہ مجتہد ہو جو فقہی نظریے علماً اس کی ایک طرف بڑھے یا وہ مقلد ہو جو اعتقاداً و عملاً مسئلہ کی ایک جانب اختیار کر رہا ہے ضروری ہے کہ اس مسئلہ کی دوسری جانب کو ترک کرے۔ غرض یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک نقیض کو مانتے ہوئے دوسری نقیض بھی مانی جائے یا ایک پر عمل کرتے ہوئے دوسری پر بھی عمل کرے[1]

بہرحال یہ حقیقت تو بے نقاب ہو کر سامنے آگئی کہ جو مسئلہ معلوم نہ ہو اس میں جانکار کی تقلید ضرور کرنی چاہیے اس لیے کہ مطلق تقلید کو تمام محققین اہل حدیث بھی واجب جانتے ہیں بلکہ اکثر اہل حدیث مطلق تقلید کی فرضیت کے بھی قائل نہیں۔ اختلاف صرف تقلید شخصی میں ہے یعنی کسی امام معین کی تقلید ہر مسئلہ میں کرنا یہ علماء مذاہب اربعہ کے نزدیک واجب ہے کیونکہ مطلق تقلید

---

[1] من افادات الشیخ القاری محمد طیب زادت معالیہ

جس کی فرضیت قرآن کی آیت، فاسئلوا اھل الذکر سے فریقین کے نزدیک مسلم ہے۔ اس کے دو فرد ہیں شخصی اور غیر شخصی اس لیے جائز ہے کہ اس مطلق فرض کو اس کے جس فرد میں چاہیں ادا کریں۔ تقلید غیر شخصی کر کے بھی اس فریضہ سے ایسے ہی بری ہو سکیں جیسے تقلید شخصی کر کے بری ہوتے ہیں۔ کیونکہ مامور بہ جب مطلق ہوتا ہے تو لا علی التعیین اس کے کسی فرد کو ادا کر دینے سے مامور بہ کی الزمہ ہو جاتا ہے۔ چونکہ مامور بنص قرآن مطلق تقلید ہے اور اس کے دو فرد ہیں۔ صحابہ اور تابعین کے زمانے میں دونوں فرد پر عمل ہوتا رہا۔ کوئی تقلید شخصی کرتا تھا اور کوئی غیر شخصی۔ تقلید شخصی کرنے والے غیر شخصی تقلید کرنے والوں پر کوئی گرفت نہ کرتے تھے اور علی ہذا تقلید غیر شخصی کرنے والے شخصی کرنے والوں کو باطل پر نہ کہتے تھے۔ الغرض دونوں قسم کی تقلید زمانہ صحابہ و تابعین میں ہوتی رہی لیکن جب دوسری صدی کے آخر میں دیکھا گیا کہ مذاہب مجتہدین بکثرت پیدا ہو گئے بہت کم احکام ایسے باقی رہے جن کی حرمت و جواز میں یا کراہت و استحباب میں اختلاف نہ ہو۔ ادھر لوگوں میں ہوا و ہوس کا غلبہ اس قدر ہو گیا کہ وہ رخصتوں کو تلاش کرنے لگے۔ اندیشہ ہو گیا کہ اللہ کا دین لوگوں کی خواہشات کا مجموعہ بن کر رہ جائے۔ حالات کی سنگینی کا احساس علامہ شاطبی کی تصریح کے مطابق عدم تقلید کے بہت بڑے علمبردار حافظ ابن حزم کو بھی ہوا اور انہوں نے بھی اس پر اجماع نقل کیا کہ شرعی حجت کے بغیر صرف مذاہب کی رخصتوں پر عمل کرنا ناجائز بلکہ فسق ہے۔ اسی لیے دور اندیش علماء نے اس ضرورت کو محسوس کیا کہ لوگوں کو تقلید غیر شخصی سے روکا جائے اور سب کو تقلید شخصی پر جمع کر دیا جائے۔ اس پر اجماع منعقد ہو گیا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جن کی جلالت قدر کا اہل حدیث کو بھی اعتراف ہے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں :

من جملہ ان کے ایک بڑا مسئلہ تقلید اور عدم تقلید کا ہے اس امت کے وہ تمام علماء جن کی حیثیت استدلالی ہے اس پر متفق ہیں۔ یہ چار مذہب جو آج کل اسلامی دنیا میں مروج ہیں اور ہر ایک مذہب کے مسائل و احکام مدون صورت میں موجود ہیں۔ ان کی تقلید کرنا جائز ہے۔ اس تقلید میں کئی ایک مصالح ہیں خصوصاً آجکل کے زمانے میں جبکہ ہمتیں پست ہو گئی ہیں۔ لوگوں پر ہوائے نفسانی کا بھوت مسلط ہے اور ہر ایک اپنی ہی سمجھ اور اپنی ہی رائے پر نازاں ہے۔

اور عقد الجید میں فرماتے ہیں :

جاننا چاہیے کہ ان چاروں مذہبوں کے اختیار کرنے میں بڑی مصلحت ہے

اور ان سے روگردانی میں بڑا فساد ہے ۔
اور الانصاف میں فرماتے ہیں :

دوسری صدی کے بعد لوگوں میں خاص خاص ائمہ کے مذہب کی پابندی یعنی تقلید شخصی شروع ہوئی اور اس زمانے میں بھی واجب تھی ۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اس پر اجماعِ اُمت کا دعویٰ کیا ہے کہ اپنی خواہش نفسانی کے مطابق سمجھ کر بغرض اتباع ہوا کسی حدیث یا کسی امام کے مذہب کو اختیار کرنا حرام ہے ۔

ہم نے یہاں اس بحث کو طول اس لیے دیا ہے کہ حافظ ابن حزم ظاہری اور زیدی علماء نے اسی آیت کو تقلید کے عدم جواز کے لیے بطور دلیل پیش کیا ہے اور عام منکرین تقلید قرآن کی اس آیت سے ہی استدلال کرتے ہیں ائمہ اربعہ کسی ایک کی تقلید کی حد تک حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حافظ ابن حزم کے اس استدلال کا حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیلی جواب دیا ہے ۔ ایک جگہ تقلید شخصی کا ذکر کرتے ہوئے حافظ ابن حزم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں :

سائل کا سوال کرنا اور مجتہد کا جواب دینا زمانہ نبوت سے مسلمانوں میں چلا آرہا ہے اور اس سے اصل مسئلہ ہرگز متاثر نہیں ہو سکتا کہ ہمیشہ ایک ہی سے مسئلہ دریافت کیا جائے یا کبھی کسی سے اور کبھی کسی سے ، جبکہ نفس تقلید پر سب کا اجماع ہے جیسا کہ ہم بتا چکے اور اجماع آخر کیسے نہ ہو جبکہ صورت حال یہ ہے کہ ہمارا کسی بھی فقیہہ و مجتہد کے بارے میں یہ گمان نہیں ہے کہ اس کے پاس خدا کی وحی آتی ہے اور اس کی طاعت فرض ہے اور وہ معصوم ہے اگر ہم ان میں سے کسی ایک کی تقلید کرتے ہیں تو صرف اس لیے کہ ہم جانتے ہیں کہ یہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے واقف ہیں ۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

بہرحال آیت کا مدلول یہ ہے کہ چونکہ ان کے باپ دادے بے علم اور بے ہدایت تھے اس لیے قرآن کے نزدیک ان کا یہ کہنا حسبنا ما وجدنا علیہ آباءنا لغو اور عذر لنگ ہے ۔ اگر ان کے باپ دادے عالم اور ہدایت یافتہ ہوتے تو پھر قرآن کو ان کی تقلید پر کوئی اعتراض نہ ہوتا ۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا عَلَيْكُمْ أَنفُسَكُمْ ۖ لَا يَضُرُّكُم مَّن ضَلَّ إِذَا اهْتَدَيْتُمْ ۚ إِلَى اللَّهِ مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا فَيُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿١٠٥﴾

اے اہل ایمان! تم پر تمہاری ذمہ داری ہے اگر تم سیدھے راستہ پر گامزن ہو تو کسی کا گمراہ ہونا تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتا یاد رکھو تم سب کو اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے وہی تم کو ان کاموں کے بارے میں بتائے گا جو تم کرتے تھے۔[۲۰۱]

فرد و جماعت کے بارے میں اسلام کا نقطۂ نظر

اسلام ایسے تجریدی فرد کا تصور نہیں کر سکتا جو اجتماعی زندگی سے قطعاً بے نیاز ہو۔ فرد کی امتحان گاہ جس میں اسے اپنی صلاحیتوں کو برومند کرنے کا موقعہ ملتا ہے وہ اس کی اجتماعی زندگی ہی ہے۔ اس کو اکیلا نہیں رکھا گیا ہے بلکہ اسے بتایا گیا ہے کہ اس کے وہ اعمال جو وہ خالصۃً اللہ کے لیے اور آخرت کی کامیابی کے لیے کرتا ہے وہ کسی نہ کسی شکل میں اجتماعی نوعیت کے ہوتے ہیں، اسے حیات اجتماعی کے عین منجدھار میں رکھ کر پھر اس سے مطالبہ کیا گیا ہے کہ اپنی قوتوں کو اللہ تعالیٰ کے منشا کے مطابق بروئے کار لائے۔ اسلام اس حقیقت کو نظر انداز نہیں کرتا کہ انسان کی زندگی میں ان تعلقات کا اثر انداز ہونا لازمی ہے جو وہ سوسائٹی کے دوسرے افراد سے ساتھ رکھتا ہے۔ ان تعلقات کی گوناگونی ان کی وسعت اور ان کی معنوی تنظیم سے شعور کی گہرائیوں پر اثر پڑتا ہے اور انسان کی تخلیقی استعداد میں بہت کچھ اضافہ ہوتا ہے۔ اسلام فرد اور جماعت کے ظاہری تضاد کو بڑی خوبی سے دور کرتا ہے۔

انفرادیت کے پاسبان کی حیثیت سے وہ انسان کو انتہائی حریت ضمیر کی ضمانت دیتا ہے کیونکہ اس کے بغیر فرد کی تکمیل ذات ممکن نہیں ہے مگر اس کا نقطۂ نظر ان نظامات سے مختلف ہے جو جماعت سے قطع نظر کرکے فرد کو مجرد فرد ہونے کی حیثیت میں لیتے ہیں۔ اور اجتماعی زندگی سے الگ تھلگ رکھ کر اس کو روحانی ارتقاء کے مدارج طے کرانا چاہتے ہیں۔ وہ اس معاملہ میں ان لوگوں سے بھی اختلاف کرتا ہے جو فرد کو یہ حق دیتے ہیں کہ وہ بلا کسی روک ٹوک پورے سماج کو اپنے ذاتی منافع پر قربان کردے۔ اس کے برعکس وہ اس نظامِ حیات کو بھی قبول نہیں کرتا جس میں فرد کی زندگی بحیثیت فرد بے مقصد بنادی گئی اور اسے صرف اس صورت میں با معنے تسلیم کیا جاتا ہے جبکہ وہ اجتماعی مقصد کے لیے وقف ہو۔ ان تینوں نقطہ ہائے نظر سے الگ قرآن کا نقطۂ نظر یہ ہے کہ ہر شخص اپنی انفرادی حیثیت میں خدا کے سامنے اپنی ذمہ داریوں کے لیے جوابدہ ہے اس لیے ہر فرد کو فرداً فرداً خدا کے امتحان میں کامیابی کے لیے تیار رہنا چاہیے مگر چونکہ خدا کے سامنے اس کی جوابدہی بڑی حد تک اجتماعی حقوق و فرائض اور ذمہ داریوں ہی سے متعلق ہے اور آخری امتحان میں اس کی کامیابی بھی بہت حد تک اجتماعی صلاح و فلاح ہی پر منحصر ہے۔ نیز اپنی ذمہ داری پوری کرنے میں وہ اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتا جب تک حتی الامکان فساد کو مٹانے اور خدا کے احکام اس کی زمین پر اور اس کی مخلوق پر جاری کرنے کا وہ فریضہ انجام نہ دے جو شہداء علی الناس ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد کیا گیا ہے۔ لہٰذا اس کی تیاری محض ذاتی اصلاح کی حد تک محدود نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان اجتماعی تقاضوں کو بھی پورا کرے جو مومن سوسائٹی ہونے کی حیثیت سے اس پر عائد ہوتے ہیں۔ قرآن نے یہ طرزِ فکر اختیار کرکے انفرادی حریت اور اجتماعی گرفت کے ظاہری تضاد میں جو درحقیقت تضاد نہیں ہے ایک معنوی وحدت پیدا کردی۔

۲۰۰۔ اے اہل ایمان، تم پر تمہاری ذمہ داری ہے۔ اگر تم سیدھے راستہ پر گامزن ہو تو کسی کا گمراہ ہونا تمہیں نقصان نہیں پہنچا سکتا۔ یعنی اگر کفار رسوم شرکیہ اور آباؤ اجداد کی تقلید سے باوجود اس قدر فہمائش و نصیحت کے باز نہیں آتے تو تم زیادہ اس غم میں نہ پڑو کسی کی گمراہی سے تمہارا کوئی نقصان نہیں ہوتا بشرطیکہ تم سیدھی راہ پر چل رہے ہو۔ سیدھی راہ یہ ہے کہ آدمی ایمان و تقویٰ اختیار کرے۔ خود برائی سے بچے اور دوسروں کو روکنے کی کوشش کرے۔ پھر بھی اگر لوگ برائی سے نہ رکیں تو اس کا کوئی نقصان نہیں۔ اس آیت سے یہ سمجھ لینا کہ جب ایک شخص اپنا نماز روزہ ٹھیک کرلے تو امر بالمعروف چھوڑ دینے سے اسے کوئی مضرت نہیں ہوتی سخت غلطی ہے۔ لفظ اھتدا میں امر بالمعروف وغیرہ تمام وظائف ہدایت کو شامل ہے۔ اس آیت میں گو روئے سخن بظاہر مسلمانوں کی طرف ہے لیکن ان کفار کو بھی متنبہ کرنا ہے

جو باپ دادا کی کورانہ تقلید پر اڑے ہوئے ہیں۔ یعنی اگر تمہارے باپ دادا راہِ حق سے بھٹک گئے تو ان کی تقلید میں اپنے کو جان بوجھ کر کیوں ہلاک کرتے ہو۔ انہیں چھوڑ کر تم اپنی عاقبت کی فکر کرو اور نفع و نقصان کو سمجھو۔ باپ دادا اگر گمراہ ہوں اور اولاد ان کے خلاف راہِ حق پر چلنے لگے تو آباؤ اجداد کی یہ مخالفت اولاد کو قطعاً مضر نہیں۔ یہ خیالات محض جہالت کے ہیں کہ کسی حال میں بھی آدمی باپ دادا کے طریقہ سے باہر قدم نہ رکھے، رکھے گا تو ناک کٹ جائے گی عقل مند کو چاہیے کہ انجام کا خیال کرے۔[1]

اصل ارشاد میں علیکم انفسکم آیا ہے۔ علیکم اسمائے افعال میں سے ہے اور انفسکم اس کا مفعول بہ ہے۔ شارحین نے یہاں علیکم کے معنے لازم پکڑلو چمٹ جاؤ لکھے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے سے چمٹ جاؤ اور اپنی فکر کرو۔ اللہ نے جن فرائض کی ادائیگی کی ذمہ داری تم پر ڈالی ہے اس کی فکر کرو۔ لوگ کہتے ہیں کہ یہ خطاب فرد فرد سے ہے لیکن یہ درست نہیں بلکہ خطاب اہلِ ایمان کی جماعت سے ہے اور منشا یہ ہے کہ من حیث الجماعت تم اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنے کی فکر کرو۔ یہ نہ سوچو کہ اس کے نتائج کیا ہیں اور لوگ کیا کہہ رہے ہیں، کیا کر رہے ہیں۔ اگر لوگ گمراہ ہو جائیں تو تم سے یہ دریافت نہ کیا جائے گا کہ وہ کیوں گمراہ ہوئے تم سے تو تمہارے فرائض اور ذمہ داریوں کے بارے میں پوچھا جائے گا۔ کسی کی گمراہی تمہارے لیے دلیل و حجت نہیں ہو سکتی کہ تم کہو کہ آوہ کا آوہ خراب ہے ہم اکیلے کیا کریں۔ تم پر اپنی ذمہ داری ہے دوسروں کی ذمہ داری نہیں ہے۔ اگر ساری دنیا بھی گمراہ ہو جائے پھر بھی تمہیں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کرنا ہے۔

اُمت کی مخصوص ذمہ داری

قرآن نے اہلِ ایمان کی ذمہ داری یہ بتائی ہے لتکونوا شھداء علی الناس تاکہ تم دوسرے تمام لوگوں کے سامنے فرضِ شہادت ادا کرو۔

اس ذمہ داری کو پورا کرنے کی عملی صورت یہ ہے کہ :

۱۔ اسلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا جو کام اللہ کا رسول اپنی زندگی میں کرتا رہا ہے یہی کام اس کے پیروؤں کے ذمے ہو گیا ہے اور اب یہ لوگ اس وقت تک اس کام کے ذمہ دار ہیں جب تک وہ اس سرزمین پر موجود ہیں۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

۲- اسلام کو دوسروں تک پہنچانے کا مطلب محض عام طرز کی تبلیغ نہیں ہے بلکہ ایسی تبلیغ و اشاعت ہے جسے شہادت کہہ سکیں۔

۳- اسلام کی شہادت دینے کا بھی ایک متعین مفہوم ہے جس کا تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا عمل کرتا ہے۔ یعنی اسلام کو لوگوں تک پہنچانے کا کام مسلمان اپنے بس تک ٹھیک اسی طرح کریں گے جس طرح کہ آنحضرت نے خود ان تک اس کے پہنچانے کا کام کیا۔

معلوم ہوا کہ پچھلی امتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی رہی ہیں اور وہ یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کرتی رہیں تو یہ امت اس عام ذمہ داری کے ساتھ ایک ذمہ داری اور بھی رکھتی ہے اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کی اس طرح گواہی دیتی رہے جس طرح گواہی دینے کا حق ہے اور جس طرح عملی نمونہ اس کا رسول اس کے سامنے رکھ گیا۔ دراصل اس معاملہ میں صورت واقعہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی تھے لیکن اس عالمگیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی عملی صورت اللہ تعالیٰ نے یہ متعین فرمائی ہے اور فطری طور پر یہی ممکن بھی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا قائم مقام ایک ایسا گروہ تیار ہو جو اپنے ایمان میں اتنا پختہ ہو اور اپنے عمل میں اتنا معیاری مسلم ہو کہ وہ آپ کے بعد آپ ہی کی طرح فرض شہادت انجام دے سکے۔ قرآن کی یہ آیات غور سے پڑھیے۔

والذی اوحینا الیک من الکتاب ھو الحق مصدقا لما بین یدیہ ان اللہ بعبادہ لخبیر بصیر ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا۔

اور وہ جو ہم نے کتاب کی تمہاری طرف وحی کی یعنی قرآن وہی حق ہے تصدیق کرنے والا ہے اپنے سے اگلی کتابوں کی۔ بے شک اللہ اپنے بندوں سے خبردار دیکھنے والا ہے پھر ہم نے اس کتاب کا وارث بنادیا ان لوگوں کو جن کو اپنے بندوں میں سے چن لیا۔ یعنی پیغمبر کے بعد اس قرآن کا وارث اس امت کو بنایا جو بحیثیت مجموعی تمام امتوں سے بہتر اور برتر ہے۔

دوسری جگہ ہے۔

کذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا

اسی طرح یہ بات بھی ہوئی کہ ہم نے تمہیں نیک ترین امت ہونے کا درجہ عطا کیا

تاکہ تم انسانوں کے روبرو حق کی گواہی دینے والے ہو جاؤ اور رسول تمہارے روبرو حق کی گواہی دینے والا ہو جائے۔
ایک اور مقام پر ہے
وجاھدوا فی اللہ حق جہادہ ھو اجتبٰکم وما جعل علیکم فی الدین من حرج ملۃ ابیکم ابراھیم ھو سمٰکم المسلمین من قبل وفی ھذا لیکون الرسول شھیدا علیکم وتکونوا شھداء علی الناس۔
اور اللہ کی راہ میں جان لڑا دو اس کی راہ میں جان لڑا دینے کا جو حق ہے۔ اس نے تمہیں برگزیدگی کے لیے چن لیا۔ تمہارے لیے دین میں کسی طرح تنگی نہیں رکھی۔ وہی طریقہ تمہارا ہو جو تمہارے باپ ابراہیم کا تھا۔ اس نے تمہارا نام مسلم رکھا۔ پچھلے وقتوں میں بھی اور اس قرآن میں بھی اور یہ اس لیے کیا تاکہ رسول تمہارے لیے حق کا گواہ ہو اور تم تمام انسانوں کے لیے حق کے گواہ ہو جاؤ۔
ایک اور جگہ ارشاد ہے ،
کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر
مسلمانو! تم تمام امتوں میں بہتر امت ہو جو لوگوں کی ارشاد و صلاح کے لیے ظہور میں آئی ہے تم نیکی کا حکم دینے والے اور برائی سے روکنے والے ہو۔
ان آیات میں امت کی ذمہ داریوں کا واشگاف اعلان ہوا ہے کہ یہ امت اس کتاب کی جو محمد رسول اللہ لے کر آئے ہیں وارث ہے۔ اس کا کام نبی کی طرح لوگوں کے سامنے شہادت حق کا فرض انجام دینا ہے۔ اس فرض کی پاسبانی کے لیے اسے جان لڑا دینے کا حکم ہوا ہے۔ دنیا میں انسانوں کے منافع اس سے وابستہ ہیں اس کا کام نیکی کا حکم دینا اور برائی کو روکنا ہے۔ ان ہی ذمہ داریوں کی وجہ سے اس امت کو ان القاب سے نوازا گیا ہے کہ یہ امت مصطفیٰ ہے، امت وسطا ہے، یہ امت مجتبیٰ ہے اور یہ امت خیر امت ہے۔ افسوس لوگوں نے القاب یاد کر لیے ہیں لیکن وہ ذمہ داریاں بھول گئے جن کی بنا پر یہ القاب بارگاہِ الٰہی سے ملے تھے۔ قرآن علیکم انفسکم کہہ کر امت کو بھی اجتماعی ذمہ داری یاد کرا رہا ہے۔ یہی بات اس آیت سے حضرت صدیق اکبر نے سمجھی ہے۔ فرمایا کہ لوگو! تم کو اس آیت کے ظاہری معنے دھوکے میں نہ ڈال دیں۔ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر ظالم کو لوگ ظلم کرتے دیکھیں اور پھر اس کے دونوں ہاتھ نہ پکڑیں تو ہو سکتا ہے کہ وہ سب کے سب

عذاب میں گرفتار ہو جائیں۔ ایک دوسرے صحابی ابو ثعلبہ سے اس آیت کے معنے دریافت کیے گئے تو جواب دیا کہ میں نے خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس کے معنے دریافت کیے تھے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ نہیں بلکہ نیکی کا باہم حکم کرو اور بری سے ایک دوسرے کو روکو۔ لیکن جب دیکھو حرص اور بخل کی اطاعت ہے اور خواہش نفسانی کی پیروی ہے اور دنیا کو دین پر ترجیح دی جا رہی ہے اور ہر ایک اپنی رائے پر مغرور ہے تو اس وقت عوام کو چھوڑ کر اپنی خبر لو۔ کہ تمہارے بعد وہ زمانہ آنے والا ہے جس میں ثابت قدم رہنا شعلہ کو ہاتھ میں پکڑنے کے مترادف ہوگا۔

دراصل شہادت کی ذمہ داری دو طرح کی ہے ایک خارجی دوسرے داخلی۔ خارجی تو یہی ہے کہ اسلام کو لوگوں تک پہنچانے کا کام کیا جائے اور داخلی کا مطلب یہ ہے کہ خود اسلامی معاشرے کے اندر جو برائیاں سر اٹھاتی نظر آئیں ان کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی جائے اور انہیں پھلنے اور پھولنے کا موقعہ نہ دیا جائے۔ کیونکہ یہ اندر کی برائیاں شہادت اسلام کی راہ میں بڑی خطرناک بلکہ سب سے خطرناک رکاوٹ ہوتی ہیں۔ حضرت ابوبکر اور حضرت ابو ثعلبہ اسی کی نشاندہی فرما رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ اس آیت قرآنی کا مطالبہ یہ ہے کہ جماعت کے افراد پر دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ اسی اخلاقی فرض کا شرعی نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کے اخلاق کی نگرانی کے اصول کو نمایاں کرتی ہے اور اہل ایمان کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور قوم کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔ تورات میں ہابیل کا یہ فقرہ کہ

کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں۔

عیسائی مذہب کے بیلے اخلاق کا ایک اہم اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ کے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام شخصی آزادی کی بحالی ہے لیکن اسلام کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا۔ آیت میں انفسکم کی تعبیر اس کی غمازی کر رہی ہے۔ قرآن حکیم میں صراحت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور بدی سے بچنے اور باز رکھنے کا فرض مسلمانوں پر واجب ٹھہرایا گیا ہے تاکہ سوسائٹی کی شرم اور جماعت کا خوف لوگوں کی نیک چلنی کا ضامن ہو سکے اور ساتھ ہی جماعت کا ہر فرد اپنے دوسرے بھائی کو ضلالت کی تاریکی سے نکال کر ہدایت کی روشنی میں لانے کا ذمہ دار ٹھہرے۔

اس آیت نے اخلاق کے تورات والے غلط اصول کو منسوخ کر دیا۔ واقعہ یہ ہے کہ جب تک

اخلاقی تعلیمات کو جماعت اپنے ہاتھ میں نہ رکھے گی ان کی حفاظت نہیں ہوسکتی۔ قوموں کے رسوم وآداب اسی اصول پر قائم ہیں۔ اور یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ اخلاقی اُمور میں ہر شخص کی پرائیویٹ اور سچ کی باتیں معلوم ہوتی ہیں جن کا نفع ونقصان کرنے والے کی ذات تک محدود ہے مگر ذرا گہری نظر سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ ان کے اثرات اور نتائج پوری سوسائٹی کو متاثر کرتے ہیں ان کا اثر ایک سے دوسرے تک اور دوسرے سے تیسرے تک پہنچتا ہے اور اسی طرح رفتہ رفتہ پوری سوسائٹی میں پھیل جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اگر ان کی روک تھام نہ کی جائے تو ان برائیوں کی برائی نہایت ہلکی ہوکر رہ جاتی ہے اور لوگ اس کو ایک معمولی بات سمجھنے لگتے ہیں اور آہستہ آہستہ یہ زہر اتنا پھیلنے لگتا ہے کہ ان برائیوں کا برا ہونا بھی مشکوک معلوم ہونے لگتا ہے۔ پھر اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ چند روز میں پوری قوم کا اخلاق فاسد ہو جاتا ہے اور وہ اپنی بلندی کے معیار سے نیچے گر جاتی ہے۔ اسی موضوع پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے:

> مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث فرمایا اس کو اپنی امت میں ایسے مخلص پیرو اور ساتھی ضرور ملے جو اس کے طریقے کو مضبوطی سے اختیار کیے رہتے اور اس کے احکام کا اتباع کرتے۔ پھر ان کے بعد ان کی جگہ ایسے ناخلف آتے جن کا یہ حال ہوا کہ کہتے وہ جس پر عمل نہ کرتے اور کرتے وہ جس کا حکم نہ ہوتا۔ بس جس نے ان کے خلاف اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مومن ہے اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا وہ بھی مومن ہے۔ اس کے بعد رائی برابر بھی ایمان کا درجہ نہیں ہوتا۔ (صحیح مسلم)

مسلم معاشرے کو برائیوں سے پاک کرنے رہنے کی یہ تین عملی شکلیں ہیں اور یہی تین شکلیں ممکن بھی ہیں۔ ان میں کی ہر شکل جہاد ہے۔ کیونکہ یہ حق کے قائم رہنے اور اسلام کی شہادت حق انجام پانے ہی کی کوششوں کا ایک حصہ ہے اور حق کی خاطر کوشش کرنے ہی کا نام جہاد ہے۔

برائیوں کو مٹانے کی جن کوششوں کو اس حدیث میں جہاد کہا گیا ہے ٹھیک ان ہی کو بعض احادیث میں "تغییر منکر" بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً

> تم میں سے جس شخص کو کوئی بُرائی نظر آئے تو چاہیے کہ اسے اپنے ہاتھ سے بدل دے اور اگر ایسا نہ کر سکے تو اس کے لیے اپنی زبان سے کام لے اور اگر اس کی بھی جرأت نہ ہو تو یہ کوشش اپنے دل سے کرے اور یہ ایمان کا کمتر درجہ ہے۔ (مسلم)

پھر ان ہی کوششوں کو نہی عن المنکر بھی کہا گیا ہے۔ مثلاً

نیکی کی ایک دوسرے کو تلقین کرو اور برائی سے ایک دوسرے کو منع کرو۔ (سنن ترمذی)

ان حوالوں سے معلوم ہوا کہ مسلم معاشرے کے برے افراد سے جہاد کرنا ان کی برائیوں اور ضلالتوں کو بدل ڈالنا اور انہیں برائیوں سے روکنا یہ سب دراصل ایک ہی مدعا کے بیان کرنے والے مختلف الفاظ ہیں اور ہم ان میں سے جس لفظ یا اصطلاح کو بھی لیں۔ منشا ومقصد میں کوئی فرق نہ ہوگا۔

پھر ایک بات قرآن کی اس آیت اور ان احادیث سے یہ بھی معلوم ہوتی ہے کہ یہ جہاد امت کا اجتماعی فریضہ ہے۔ اس فریضہ سے نہ تو افراد بری الذمہ ہیں نہ اسٹیٹ۔ بلکہ اپنی اپنی حیثیت کے مطابق اس عظیم ذمہ داری میں جس کی قرآن نے علیکم انفسکم کے ذریعہ ہدایت کی ہے سبھی شریک ہیں مزید دلیل اور وضاحت کی ضرورت ہو تو قرآن عزیز کی یہ آیات تلاوت فرمائیے۔ افراد کے بارے میں ہے:

والمومنون والمومنات بعضهم اولياء بعض يامرون بالمعروف و ينهون عن المنكر۔

مومن مرد اور مومن عورتیں ایک دوسرے کی رفیق ہیں وہ باہم نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائی سے روکتے ہیں۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ معروف کا حکم دینا اور منکر سے روکنا مسلمان کی ایمانی صفت کا تقاضا ہے بلکہ یہ ایمان کی فطرت ہے یہ اسلام کا خاصہ ہے جہاں مومن ہوگا یہ کام بھی وہاں ضرور کیا جا رہا ہوگا اور جو مسلمان ہوگا وہ یہ کام ضرور کرے گا۔

اسلامی حکومت کے متعلق حکم ہوتا ہے

الذين ان مكنا هم في الارض اقاموا الصلوة واتوا الزكوة وامروا بالمعروف ونهوا عن المنكر

یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار بخشیں گے تو نماز قائم کریں گے زکوۃ دیں گے، بھلائی کا حکم کریں گے اور برائی سے روکیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ مسلمان جس طرح اپنی عام اور انفرادی حیثیت میں برائی کو پنپتے دیکھنا گوارا نہیں کر سکتا۔ اسی طرح صاحب اقتدار ہو کر بھی وہ یہی کرے گا اور منکرات کو مٹانا اس کے اقتدار کے بنیادی مقاصد اور فرائض میں شامل ہوگا۔

اسی روشنی میں علیکم انفسکم کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانو! تم اپنی فکر کرو اور جو فرائض اور ذمہ داریاں

تمہارے سپرد کی گئی ہیں ان کو ادا کرو۔ تم سے یہ نہیں پوچھا جائے گا کہ فلاں ملک نے کیوں نہیں مانا بلکہ یہ دریافت کیا جائے گا کہ تم نے اپنے فرائض ادا کیے یا نہیں بیگانوں کی حد تک شہادت اور یگانوں کی حد تک امر بالمعروف اور نہی عن المنکر تمہاری ذمہ داری ہے۔

شاید یہاں آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ بیگانوں کی حد تک تو شہادت میں ایک معنویت مگر یگانوں کے بارے میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر کیوں اس قدر زور ہے؟ اوروں کا پتہ نہیں مگر جہاں تک میں اپنے مطالعہ قرآنی کی روشنی میں سمجھا ہوں اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے یہ قانون بنایا ہے کہ جب وہ کسی گروہ کو اپنی نعمتوں سے سرفراز کرتا ہے تو اس میں کبھی تغیر نہیں کرتا جب تک وہ خود اس گروہ کے افراد اپنی حالت متغیر نہیں کر دیتے۔ چنانچہ امتوں کی عموماً اور امت اسلامیہ کی خصوصاً اس موضوع پر بھرپور شہادت ہے۔ ہر قوم خود اپنے افکار اپنے اعمال اور اپنے اخلاق سے اپنی زندگی کا گہوارہ بناتی ہے اور خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر کھودتی ہے۔ ارشاد ہے:

ان اللہ لا یغیر ما بقوم حتی یغیروا ما بانفسہم

اللہ کبھی اس حالت کو نہیں بدلتا جو کسی قوم کو حاصل ہوتی ہے جب تک وہ خود ہی اپنی حالت نہ بدل ڈالے۔

مابقوم سے مراد دنیوی برکتوں کے دروازے، اللہ کے انعامات، آسمان و زمین کی برکتیں، عزت و جاہ، اقتدار، حکومت ہے اور ما بانفسہم سے مراد وہ ایمان اور عمل صالح ہے جس کے نتیجے میں اللہ انعامات سے سرفراز فرماتے ہیں۔ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ایمانی زندگی میں ما بانفسہم کو ایمان و عمل صالح کے جادہ حق پر قائم رکھنے کا ذریعہ ہے کیونکہ جہاں اللہ تعالیٰ کا یہ عمومی وعدہ ہے کہ وہ اپنے ماننے والوں کو دنیوی فلاح سے بھی نوازتا ہے وہیں اس کا ایک عمومی ضابطہ بھی ہے کہ یہ ایمان و عمل صالح کی لازمی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان و عمل صالح کے بغیر صرف آخرت ہی کی نہیں دنیا کی فلاح بھی ہاتھ نہیں آسکتی۔ دین کے بغیر صحیح معنوں میں دنیا بھی نہیں چل سکتی۔ یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ اس طرح گویا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ما بانفسہم کے لیے ایمان کے تقاضوں کے مطابق اسلامی زندگی کو سوسائٹی اور امت میں قائم رکھنے کی ایک محسوس تدبیر ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اگر تم نے امت میں اپنی ذمہ داریوں کو پورا کر کے امت میں اسلامی زندگی کو ایمان کے تقاضوں کے مطابق قائم رکھا تو پھر دنیائے کفر کی کوئی ضلالت، اہل باطل کا بطلان، اہل بدعت کا ابتداع، ظالموں کا ظلم تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گا۔

ذمہ داریوں کی بازپرس ہوگی

۱۰۲ - یاد رکھو تم سب کو اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے وہی تم کو ان کاموں کے بارے میں بتلائے گا جو تم کرتے تھے - یعنی جو گمراہ رہا اور جس نے راہ پائی سب کے نیک و بد اعمال اور ان کے نتائج سامنے کر دیے جائیں گے[1]۔ جس طرح دُنیا میں مادی اشیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں - اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات معانی و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے - ایمان و کفر امر بالمعروف نہی عن المنکر، شہادت حق دعوت الی اللہ جہاد فی سبیل اللہ ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح شکھیا سے تمیت تنکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جُدا نہیں ہو سکتی اور ان معنوی، روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی اور طبعیاتی اشیا میں ہے - اشخاص کی نیکو کاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں - وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہیں - جس طرح ایک سائنٹسٹ حکیم کا کام ان مادی فزیکل اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت ہے - اسی طرح ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیا علیہم السلام کا کام ہے - انبیاء کی تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے روحانی آثار اور نتائج کا وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہمیں جسمانی اشیا کے آثار و خواص کا ہوتا ہے - سائیکالوجی علم النفس اور سوشیالوجی علم الاجتماع نے اس مفہوم کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے -

---

[1] افادات شیخ الاسلام

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ شَهَٰدَةُ بَيْنِكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ ٱلْمَوْتُ
حِينَ ٱلْوَصِيَّةِ ٱثْنَانِ ذَوَا عَدْلٍ مِّنكُمْ أَوْ ءَاخَرَانِ مِنْ غَيْرِكُمْ
إِنْ أَنتُمْ ضَرَبْتُمْ فِى ٱلْأَرْضِ فَأَصَٰبَتْكُم مُّصِيبَةُ ٱلْمَوْتِ ۚ
تَحْبِسُونَهُمَا مِنۢ بَعْدِ ٱلصَّلَوٰةِ فَيُقْسِمَانِ بِٱللَّهِ إِنِ ٱرْتَبْتُمْ
لَا نَشْتَرِى بِهِۦ ثَمَنًا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۙ وَلَا نَكْتُمُ شَهَٰدَةَ ٱللَّهِ
إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ ٱلْءَاثِمِينَ ﴿١٠٦﴾ فَإِنْ عُثِرَ عَلَىٰٓ أَنَّهُمَا ٱسْتَحَقَّآ إِثْمًا
فَـَٔاخَرَانِ يَقُومَانِ مَقَامَهُمَا مِنَ ٱلَّذِينَ ٱسْتَحَقَّ عَلَيْهِمُ
ٱلْأَوْلَيَٰنِ فَيُقْسِمَانِ بِٱللَّهِ لَشَهَٰدَتُنَآ أَحَقُّ مِن شَهَٰدَتِهِمَا
وَمَا ٱعْتَدَيْنَآ إِنَّآ إِذًا لَّمِنَ ٱلظَّٰلِمِينَ ﴿١٠٧﴾ ذَٰلِكَ أَدْنَىٰٓ
أَن يَأْتُوا۟ بِٱلشَّهَٰدَةِ عَلَىٰ وَجْهِهَآ أَوْ يَخَافُوٓا۟ أَن تُرَدَّ أَيْمَٰنٌۢ
بَعْدَ أَيْمَٰنِهِمْ ۗ وَٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَٱسْمَعُوا۟ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ
ٱلْفَٰسِقِينَ ﴿١٠٨﴾

اے اہل ایمان! جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آ کھڑی ہو
تو بوقت وصیت گواہی کے لیے تم میں سے دو معتبر آدمی گواہ
ہونے چاہئیں۔ اگر ایسا ہو کہ تم سفر میں ہو اور موت کی مصیبت
آجائے تو مسلمان گواہوں کی جگہ غیر مسلم بھی گواہ ہو سکتے ہیں[۲۰۲]۔
اگر تمہیں ان گواہوں کے بارے میں شبہ پڑ جائے تو ان کو نماز
کے بعد روک لو وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں، ہم نے اپنی قسم کسی
معاوضہ کے بدلے فروخت نہیں کی ہے ہمارا قریب و عزیز
کیوں نہ ہو ہم اللہ کے لیے سچی گواہی کبھی نہ چھپائیں گے۔ اگر
ایسا کریں تو ہم گنہ گاروں میں سے ہوں[۲۰۳]۔ پھر اگر معلوم ہو جائے
کہ وہ دونوں گواہ گناہ کے مرتکب ہوئے ہیں تو ان کی جگہ دوسرے
دو گواہ ان میں سے کھڑے ہوں جن کا حق گواہوں میں سے ایک
نے دبانا چاہا تھا اور یہ گواہ ان میں سے ہوں جو فریق مظلوم سے

تعلق رکھنے والے ہوں پھر یہ دونوں خدا کی قسم کھا کر کہیں ہماری گواہی پچھلے گواہوں کی گواہی سے زیادہ درست ہے ہم نے گواہی دینے میں کسی طرح کی زیادتی نہیں کی اگر کی ہو تو ہم ظالموں میں سے ہوں[204]۔ اس قسم سے زیادہ امید کی جا سکتی ہے کہ گواہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں گے یا کم از کم ان کو اس کا اندیشہ رہے گا کہ کہیں ہماری قسمیں فریق ثانی کی قسموں کے بعد رد نہ کر دی جائیں۔ بہر حال اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرتے رہو اور اس کا حکم سنو اور یاد رکھو اللہ بدکاری کرنے والوں کو کامیاب اور بامراد نہیں بناتا ہے[205]۔

وصیت اور اس کی گواہی کا حکم

قرآن نے وراثت کا قانون مقرر کرنے کے ساتھ مسلمان کو یہ ہدایت بھی دی کہ وہ مرنے سے پہلے اپنے ترکہ کے بارے میں وصیت کرے۔ ارشاد ہے:

كتب عليكم اذا حضر احدكم الموت ان ترك خيرا الوصية للوالدين والاقربين بالمعروف -

تم پر لکھ دیا گیا ہے کہ جب تم میں سے کسی کی موت کا وقت قریب آجاتے اور وہ کافی مال چھوڑ رہا ہو تو والدین اور رشتہ داروں کے لیے جائز طریقہ سے وصیت کرے۔

اس کا منشا یہ تھا کہ ایک تو مرنے والا خصوصیت کے ساتھ اپنے والدین کے حق میں اپنی اولاد کو حسن سلوک کی وصیت کر جائے کیونکہ ان سے بوڑھے دادا دادی کی خدمت کی توقع کم ہی ہو سکتی ہے۔ دوسرے اس کے خاندان میں جو افراد ایسے ہوں جنہیں قانون کے مطابق میراث میں حصہ نہ پہنچتا ہو مگر مرنے والا ان کو مدد کا مستحق سمجھتا ہو تو انہیں اپنے ترکہ میں سے حصہ دینے کی وصیت کرے۔ اس کے علاوہ ایک شخص اگر بہت مال چھوڑ رہا ہے تو وہ رفاہ عام کے کاموں کے لیے بھی وصیت کرنے کا مجاز ہے کیونکہ مذکورہ بالا آیت کا منشا یہ نہیں ہے کہ وصیت کی اجازت صرف والدین اور رشتہ داروں تک محدود ہے۔

وصیت اور میراث کے قانون سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ شخصی املاک کے ترکوں میں اسلامی اسکیم یہ ہے کہ دو تہائی تو لازماً قانون میراث کے مطابق تقسیم ہو اور ایک تہائی مرنے والے کے اختیار تمیزی پر چھوڑ دیا جائے تاکہ وہ جس غرض کے لیے چاہے اسے صرف کرے بشرطیکہ وہ جائز طریقے پر ہو۔ یعنی وہ کام بھی جائز ہو جس کے لیے وصیت کی گئی ہے اور اس میں کسی کی حق تلفی نہ ہو۔

اس آیت میں اسی وصیت کے بارے میں قانون شہادت کو بتایا جا رہا ہے۔ یہاں خالص مالیاتی مسئلہ لاکر اشارہ کر دیا ہے کہ اسلام میں دین اور دنیا میں جدائی نہیں بلکہ ہم آہنگی ہے۔ حفاظت دین کے سلسلے میں حفاظت مال کا طریقہ بتانا اور یہ ہدایت کرنا کہ مرتے وقت کسی کو وصی اور گواہ بنا لینا چاہیے اکی کی غمازی کر رہا ہے، جیسے دینی مصلحت پر ہدایات دی گئی ہیں ایسے ہی اس آیت میں خالص دنیوی مصلحت پر زور دے کر بتا دیا کہ یہ بھی دین ہے۔

اس آیت کی یہاں ٹھیک وہی حیثیت ہے جو دوسرے پارے میں روزے، اعتکاف اور حج کے ذکر میں اس مالیاتی دفعہ کی حیثیت تھی۔

لا تاکلوا اموالکم بینکم بالباطل و تدلوا بھا الی الحکام لتاکلوا فریقا من اموال الناس بالاثم و انتم تعلمون۔

مطلب یہ تھا کہ صرف یہی عبادت نہیں ہے کہ چند گھنٹوں کے لیے حلال روزی سے اجتناب کیا جائے۔ یہ بھی عبادت ہے کہ ہمیشہ کے لیے حرام روزی سے بچ کر رہو۔ یہاں بھی گویا یہی فرمایا کہ صرف حالت احرام میں شکار سے رک جانا ہی عبادت نہیں ہے بلکہ یہ بھی عبادت ہی ہے کہ دوسروں کے مال سے بچ کر رہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے نزدیک معاشیات اور اقتصادیات

کی کس قدر اہمیت ہے۔ گویا ایک ہی ذات ہے جو اپنی رحمت سے بندوں کے لیے اصلاح معاد اور اصلاح معاش دونوں کا انتظام کرتی ہے اور ان دونوں کے مجموعہ کا نام دین ہے۔ قرآن محض ایک پندنامہ اخلاق نہیں ہے قانون کی کتاب بھی ہے۔ زندگی میں قانون اخلاق خطابت سب ہی کی اپنی اپنی جگہ ضرورت ہے اور قرآن مکمل ہدایت نامہ اور زندگی کا مکمل دستور ہے۔ اس میں سب کچھ موجود ہے۔

۲۰۲۔ اے اہل ایمان جب تم میں سے کسی کے سامنے موت آکھڑی ہو تو بوقت وصیت گواہی کے لیے تم میں سے دو معتبر آدمی گواہ ہونے چاہئیں۔ اگر ایسا ہو کہ تم سفر میں ہو اور موت کی مصیبت آجائے تو مسلمان گواہوں کی جگہ غیر مسلم بھی گواہ ہو سکتے ہیں۔ یعنی بہتر یہ ہے کہ باقی اگر دو نہ ہوں یا معتبر نہ ہوں پھر بھی وصی بنا سکتا ہے۔ گواہ سے مراد وصی ہے۔ اسی کے اقرار و اظہار کو گواہی سے تعبیر کیا ہے۔ یہ وصی مسلمانوں میں سے ہوں اور اگر مسلمان نہ ہوں تو غیر مسلم بھی ہو سکتے ہیں[1] علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ شہادۃ متعدد معانی میں استعمال ہوتا ہے حاضر کرنا، فیصلہ کرنا، حکم کرنا، قسم لینا، جاننا اور وصیت کرنا۔ یہاں شہادت وصایۃ کے معنے میں ہے۔ وصایۃ وہ معاملہ ہے جس کے ذریعے مالک اپنی زندگی میں اس بات کا اعلان کرتا ہے کہ اس کی وفات کے بعد اس کے ترکہ کا ایک حصہ متعین فرد یا متعین افراد کی میری نیابت میں فلاں شخص ملکیت بنائے گا۔ وصایۃ کے لیے وصی، موصی لہ، موصی بہ اور موصی کا ہونا ضروری ہے۔ جس کے یہ معاملہ مرنے والا سپرد کر رہا ہے وہ وصی ہے اور خود وصیت کرنے والا موصی ہے اور جن کی خاطر وصیت کی جا رہی ہے وہ موصی لہ ہیں اور جس چیز کی وصیت کی جا رہی ہے وہ موصی بہ ہے اور اس عمل کا نام وصایت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو شخص مرتے وقت اپنے ترکہ کے متعلق عزیزوں کو وصیت کرنا چاہے اور اپنا مال و متاع ان کے حوالہ کرنا چاہے تو اس کو چاہیے کہ مسلمانوں میں دو معتبر شخصوں کو اپنا وصی بنائے تاکہ وہ اس کی وصیت پوری کریں اور اس کے مال میں خیانت نہ کریں۔

ان اوصیاء کے قرآن نے یہ اوصاف بتائے ہیں

ایک یہ کہ دو ہوں، دوسرے یہ کہ عدل و انصاف والے ہوں، تیسرے یہ کہ مسلمان ہوں۔ سوال یہ ہے کہ یہ سارا معاملہ قانونی ہے یا اس کی حیثیت صرف ایک اخلاقی کردار کی ہے۔ اگر اس کی حیثیت قانونی ہے تو ایسا کرنا ضروری ہے اور اوصیاء کے لیے دو کا ہونا، عادل ہونا اور مسلمان ہونا ناگزیر اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

واجب ہے اور اگر اس کی حیثیت قانونی نہیں بلکہ اخلاقی ہے تو پھر یہ ایک استحبابی عمل ہے۔ دو کا ہونا ضروری نہیں ایک ہی کام دے سکتا ہے عادل ہونا بھی صرف افضل ہے شرط لازم نہیں ہے بلکہ فقہا نے یہاں تک لکھا ہے کہ وصی اگر دو نہ ہوں بلکہ ایک بھی نہ ہو پھر بھی وصیت جائز ہے۔

اخلاق و قانون میں فرق

ٹھہر جائیے ذرا قانون اور اخلاق کا فرق معلوم کر لیجئے۔ قرآن و سنت میں تمام احکام و ہدایات انسانی مصالح کی محافظ ہیں اور سب کو اللہ تعالیٰ کی پسندیدگی حاصل ہے۔ اس اعتبار سے ان تمام احکام اور ہدایات کی تعمیل مطلوب اور پسندیدہ ہے۔ لیکن ہر حکم یا ہدایت کو لازمی اور واجب التعمیل قرار نہیں دیا گیا ہے۔ فرائض اور اختیاری اعمال کی یہ تقسیم اس بنیادی حکمت سے ہم آہنگ ہے جو نوع انسانی کے سلسلے میں خالق کائنات کے پیش نظر رہی ہے یعنی امتحان و آزمائش کھرے اور کھوٹے اور عالی ہمت اور کم ظرف کے درمیان تمیز، بہت سے اعمال خیر کو اختیاری قرار دے کر اور ان کے سلسلے میں صرف ترغیب و تلقین پر اکتفا کر کے اسلام نے اس بات کا موقع فراہم کیا ہے کہ فرد اپنے تزکیہ اور ارتقاء میں جتنے مدارج طے کر سکتا ہے کرے اور جو فرد خود کو جتنا اونچا لے جا سکتا ہے لے جائے یہ تقسیم عبادات میں بھی پائی جاتی ہے اور سیاست و معیشت اور دوسرے معاملات زندگی میں بھی۔ مالیاتی مسائل میں بھی، اسلامی ہدایات دونوں قسم پر مشتمل ہیں۔ املاک کے سلسلے میں اسلام کے ترغیبی احکام پر جو فرد جتنا زیادہ عمل کرے گا اتنا ہی زیادہ مسلم اور اتنا ہی اچھا بندہ سمجھا جائے گا ان رضا کارانہ اعمال خیر سے اسے دنیا میں بھی سکون و راحت میسر ہو گی اور اس کا اخروی انجام بھی بہتر ہو گا۔

ہدایات کے ایک حصہ کو قانوناً نافذ کرنا اس لیے ضروری ہوا کہ ایسا کرنا زندگی کے بقا تسلسل اور انسانیت اور خیر کے اس کم سے کم معیار کو برقرار رکھنے کے لیے ضروری ہے جن کے بغیر نہ فرد کو ارتقاء کا موقع مل سکتا ہے نہ اجتماع کو فلاح نصیب ہو سکتی ہے۔ ہدایات کے ایک حصہ کو قانونی نفاذ کے ذریعے اس بات کو یقینی کر لیا گیا کہ سماج جب تک اطاعت الٰہی کے بنیادی فیصلے پر قائم ہے اور قانون اسلام نافذ ہے۔ اس سماج کی سمت سفر نہ بدلنے پائے منزل کی طرف اس کا اقدام جاری رہے اور شر پسند عناصر کو پورے سماج کی فضا خراب کر دینے کا موقع نہ ملے۔ قانون کے ذریعے نافذ کی جانے والی ہدایات انسان کے بنیادی مصالح جان و مال، عقل و دین اور نسل کا ایک ناگزیر حد تک تحفظ عمل میں لاتی ہیں۔

شریعت کے قوانین کا منشا مقاصد شریعت کا اس حد تک حصول ہے کہ انسانی زندگی بحیثیت مجموعی حکمت تخلیق سے ہم آہنگ رہے۔

اسلامی قانون کی بعض ہدایات ایسی ہیں جن کو عام حالات میں اخلاقی ذمہ داری کا درجہ قرار دیا گیا ہے اور ترغیب و تلقین کے ذریعے افراد کو ان کی تعمیل پر آمادہ کرنا کافی سمجھا گیا ہے۔ وصیت کا معاملہ بھی اسلامی قانون میں ایسا ہی ہے۔ اسی لیے علماء نے اسے استحبابی مقام دیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن نے خدائی وصیت کے ذریعے مال کے ورثاء کے لیے حصے مقرر کر کے مالک مال کو اپنی وصیت کی ذمہ داری سے سبکدوش کر دیا ہے۔ قرآن نے میراث کے قانون کا آغاز ہی یوصیکم اللہ کے پر شوکت عنوان سے کیا ہے اور اسی بنا پر وصیت کے موضوع پر اس کے جواز کی دو اہم ضروری شرطیں عائد کی گئی ہیں ایک یہ کہ وصیت صرف ترکہ کے ایک تہائی حصہ کی حد تک کی جا سکتی ہے۔ بقیہ املاک کی تقسیم ضابطہ میراث کے مطابق عمل میں آئے گی۔ یہ تحدید نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد سے ثابت ہے اور تمام مکاتب قانون کے درمیان متفق علیہ ہے جیسا کہ آپ چوتھی جلد میں پڑھ چکے ہیں۔ اسلام نے ایک تہائی کی حد تک وصیت کا حق دے کر اہم انسانی مفادات کا تحفظ کیا ہے۔ مثلاً بعض اوقات مالک کا کوئی رشتہ دار دوسرے قریبی ورثاء کے موجود ہونے کی وجہ سے ترکہ میں حقدار نہیں ہوتا حالانکہ وہ ناداری کے باعث اس کا مستحق ہوتا ہے۔ یا اس سے تعلق یا کسی اور مصلحت کا تقاضا ہوتا ہے۔ کہ ترکہ میں اسے بھی حصہ ملے حق وصیت کے ذریعے مالک کو اس بات کا موقعہ ملتا ہے کہ ایسے رشتہ داروں کے حق میں بھی کچھ مال چھوڑ جائے۔ اسی طرح اس حق سے کسی محسن کے احسان کا بدلہ دینے، کمزور کو سہارا دینے اور رفاہ عامہ یا دینی امور کے نگران کسی ادارے کی مدد کرنے کے بھی مواقع ملتے ہیں۔ وصیت کے محرکات زیادہ تر یہی ہیں۔ اور عملاً ان اغراض کے علاوہ کسی اور غرض کے لیے اس حق کو بہت کم استعمال کیا جاتا ہے۔

اگر کسی فرد کا کوئی وارث نہ ہو تو احناف کے نزدیک وہ اپنے پورے ترکہ پر وصیت کا حق استعمال کر سکتا ہے کیونکہ اس حق کی تحدید کا اصل مقصد ورثاء کے حق کا تحفظ ہے۔ لیکن امام شافعی اور امام مالک اس صورت میں بھی تہائی ترکہ سے زیادہ کی وصیت کو درست نہیں سمجھتے۔ کیونکہ جب کوئی متعین فرد اس کا وارث نہیں تو مسلمانوں کی جماعت اس کی وارث ہوگی۔ اور اس شخص کو ان لوگوں کا حق کالعدم کرنے کا اختیار نہیں ہے۔

دوسرے یہ کہ وصیت کا حق ورثاء کے علاوہ دوسروں کو مال منتقل کرنے کے لیے دیا گیا ہے کسی ایسے شخص کے حق میں وصیت نہیں کی جا سکتی ہے جو وارث کی حیثیت سے ترکہ کے ایک حصہ کا

حقدار ہو وارث کے حق میں وصیت عملاً اس تناسب میں ترمیم کر دیتی ہے جس کے مطابق مال کو فرضاً تقسیم ہونا چاہیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وارث کے حق میں وصیت کی ممانعت فرمائی ہے۔ ارشاد ہے:

ان اللہ قد اعطی کل ذی حق حقہ فلا وصیۃ لوارث

اللہ نے ہر حقدار کا حق مقرر کر دیا ہے لہٰذا وارث کے لیے کوئی وصیت نہیں ہے۔

عام قانون ساز اداروں کے نزدیک اگر تمام ورثاء مل کر اس پر رضامندی کا اظہار کریں تو کسی وارث کے لیے بھی وصیت کی جا سکتی ہے۔

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمانو! اگر تم میں سے کسی کی موت کا وقت آجائے اور اس کو اپنے مال کے بارے میں کوئی وصیت کرنی ہو تو اس کا طریق یہ ہے کہ اس کے دو متدین اور عادل مسلمانوں کو اپنا وصی بنا لے۔ اور اگر تم سفر میں ہو اور مسلمان نہ ہوں تو دو غیر مسلموں کو بھی وصی بنایا جا سکتا ہے۔ اس مطلب کی تائید اس پس منظر سے بھی ہوتی ہے جو اسی آیت کے تحت شارحین قرآن نے پیش کیا ہے۔ اور احادیث کی کتابوں میں محدثین نے مختصر اور مطول کر کے اسے روایت کیا ہے کہ تمیم بن اوس داری اور عدی بن بداء، کہ اس وقت دونوں عیسائی تھے بغرض تجارت مدینہ سے شام گئے اور ان کے ہمراہ حضرت عمرو ابن العاص کے آزاد کردہ غلام حضرت بدیل رضی اللہ عنہ بھی گئے۔ موصوف رضی اللہ عنہ وہاں جا کر بیمار ہو گئے۔ انہوں نے بیماری کی حالت میں اپنے کل مال کی فہرست بنائی اور اسے اپنے سامان میں رکھ دیا اور ان دونوں عیسائیوں کو انہوں نے اس کا پتہ نہ دیا۔ اتفاقاً زیادہ بیمار ہو گئے اور جب موت یقینی ہو گئی تو انہوں نے اپنے ان دونوں ہم سفر عیسائیوں کو اپنا سارا سامان یہ کہہ کر سپرد کر دیا کہ جب مدینہ پہنچو، میرا یہ کل سامان میرے گھر پہنچا دینا۔ حضرت بدیل کا انتقال ہو گیا اور وہ دونوں عیسائی اپنے کام سے فارغ ہو کر مدینہ واپس آتے۔ اس سامان میں ایک چاندی کا پیالہ تھا جس پر سونے کا جھول تھا اور اس میں تین سو مثقال چاندی تھی۔ ان دونوں ہم سفر عیسائیوں نے سامان میں سے پیالہ رکھ لیا اور باقی سارا سامان بدیل کے ورثاء کے سپرد کر دیا وارثوں نے جب مال کی پڑتال کی تو ان کو اس میں ایک فہرست بھی ملی جس میں پوری تفصیل درج تھی۔ فہرست کے مندرجات میں سے ان کو پیالہ نہ ملا۔ بدیل کے ورثاء تمیم اور عدی کے پاس گئے اور جا کر دریافت کیا کہ کیا بدیل نے اپنی بیماری میں اپنا کچھ مال فروخت کیا تھا؟ انہوں نے نفی میں جواب دیا اس پر ورثاء نے بتایا کہ ہمیں سامان میں سے ایک پورے سامان کی فہرست ملی ہے اس فہرست کے مطابق ہمیں چاندی کا وہ پیالہ نہیں ملا جس پر سونے کا جھول تھا۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں کوئی علم نہیں ہے۔ اس نے جو کچھ ہمارے سپرد کیا تھا ہم نے وہ تمہارے حوالہ کر دیا۔ یہ

مقدمہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں پیش ہوا۔ دونوں عیسائی مدعی علیہ تھے اور میت کے ورثاء مدعی تھے۔ مدعیوں کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا اور مدعا علیہ انکاری تھے اس لیے دونوں سے قسم لی گئی کہ ہم نے میت کے مال میں خیانت نہیں کی۔ فیصلہ قسم پر ہوا۔ کچھ مدت کے بعد پتہ چلا کہ وہ پیالہ ان دونوں نے مکہ میں کسی سنار کے ہاتھ فروخت کیا ہے۔ جب سوال ہوا تو کہنے لگے کہ ہم نے میت سے خریدا تھا چونکہ خریداری کے گواہ موجود نہ تھے اس لیے ہم نے پہلے اس کا ذکر نہیں کیا۔ مبادا ہماری تکذیب کر دی جاتے۔ میت کے وارثوں نے پھر بارگاہ نبوت میں دعویٰ دائر کر دیا۔ اب پہلی صورت کے برعکس میت کے وصی یعنی دونوں عیسائی خریداری کے مدعی تھے اور وارث منکر تھے۔ شہادت موجود نہ تھی۔ وارثوں سے قسم لی گئی کہ پیالہ میت کی ملک تھا اور یہ دونوں عیسائی جھوٹے ہیں چنانچہ اب فیصلہ کیا گیا کہ پیالہ کی قیمت ورثاء کو دی جاتے۔ یعنی ایک ہزار درہم وارثوں کو دیے گئے۔

غیر مسلموں کی شہادت

ارشاد میں اگرچہ حکم یہی ہے کہ مسلمانو! قرب موت میں تمہارا وصی یا تمہاری وصیت کے گواہ ذوا عدل منکم دو مسلمان انصاف والے ہوں۔ لیکن اس کی بھی اجازت ہے او آخرٰن من غیرکم یہ گواہ اور وصی غیر مسلم بھی ہو سکتے ہیں۔ بشرطیکہ تم سفر میں ہو اور مسلمان دستیاب نہ ہو۔ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ سفر میں وصیت پر غیر مسلموں کی شہادت بالکل درست ہے جبکہ مسلمان موجود نہ ہوں۔ آیت میں غیرکم سے کفار مراد ہیں۔ عبد اللہ ابن عباس، ابو موسیٰ اشعری، سعید بن المسیب، شریح القاضی، ابن سیرین، اوزاعی، سفیان ثوری، ابو عبید اور امام احمد کا حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہی مسلک نقل کیا ہے۔ ظاہر آیت اور آیت کا پس منظر اسی موقف کا موید ہے۔ احناف نے اس موضوع پر عجیب پالیسی اختیار کی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ کافر کی شہادت کا جو جواز اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے وہ قرآن میں البقرہ میں مالیات والی اس آیت ممن ترضون من الشھداء سے منسوخ ہے لیکن ساتھ ہی وہ امام ابو حنیفہ کی طرف نسبت کر کے یہ بھی بتاتے ہیں کہ اس سے امام ابو حنیفہ نے یہ مسئلہ استنباط کیا ہے کہ کفار کی شہادت بعض کی بعض پر جائز ہے کیونکہ اس آیت میں کفار کی شہادت مسلمانوں پر جائز قرار دی ہے تو کفار کی شہادت بعض کی بعض پر بطریق اولیٰ جائز ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ قرآن کی یہ آیت اپنے منطوق کے اعتبار سے ناقابل عمل اور اپنے مفہوم کے لحاظ سے قابل عمل ہے۔ حالانکہ قرآن کی واضح آیت ایسی کوئی رہنمائی نہیں کر رہی ہے بلکہ دونوں باتیں آیت کی رو سے صاف

میں غیرمسلموں کی شہادت مسلمانوں کے حق میں اور غیرمسلموں کی غیرمسلموں کے حق میں جائز ہے ۔ یہ کہنا کہ بقرہ کی آیت نے آیت کے منطوق کو منسوخ کر دیا حیرتناک ہے ۔ حالانکہ سورہ مائدہ کے بارے میں تاریخی طور پر یہ حقیقت ثابت شدہ ہے کہ یہ سورت قرآن کی تمام سورتوں میں آخری سورت ہے ۔ یہاں حافظ ابن القیم کی یہ بات بہت زیادہ اپیل کرتی ہے ۔

> اللہ تعالیٰ نے شہادت کے موضوع پر سفر میں وصیت کے لیے اجازت دی ہے کہ دو مسلمانوں کو گواہ بنائیں یا دو غیرمسلموں کو گواہ بنائیں ۔ یہ آیت اس موضوع پر صاف ہے کہ سفر میں وصیت پر اگر دو مسلمان گواہ نہ ہوں تو غیرمسلموں کو گواہ بنا لینا جائز ہے ۔ اسی کے مطابق دربارِ نبوت میں فیصلہ ہوا ہے اور آپ کے بعد صحابہ نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے ۔ اس حکم کا ناسخ کوئی نہیں ۔ کیونکہ سورہ مائدہ باعتبارِ نزول قرآن کی آخری سورت ہے ۔ اس سورت میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہے ۔ اس آیت کا کوئی معارض نہیں ہے ۔

امام رازی نے تفسیر میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے اور دوسرے شارحین قرآن نے بھی جی کھول کر خوب دادِ تحقیق دی ہے ۔

گواہوں کی بحلف گواہی

۲۰۳ ۔ اگر تمہیں گواہوں کے بارے میں شبہ پڑ جائے تو ان کو نماز کے بعد روک لو ۔ وہ اللہ کی قسم کھا کر کہیں کہ ہم نے اپنی قسم کسی معاوضے کے بدلے فروخت نہیں کی ہے ہمارا قریب وعزیز ہی کیوں نہ ہو ، ہم اللہ کے لیے سچی گواہی نہ چھپائیں گے ۔ اگر ایسا کریں تو ہم گنہ گار ہوں گے ۔ یعنی نمازِ عصر کے بعد کہ وہ وقت اجتماع اور قبول کا ہے ۔ شاید ڈر کر جھوٹی قسم نہ کھائیں یا کسی بھی نماز کے بعد یا وصی جس مذہب کے ہوں ان کی نماز کے بعد ۔ مطلب یہ ہے کہ جب خدا کے پاس سب کو جانا ہے تو جانے سے پہلے سب کام ٹھیک کر لو اسی میں سے ایک اہم کام ضروری اُمور کی وصیت اور اس کے متعلقات ہیں ۔ ان آیات میں وصیت کا بہترین طریقہ بتایا ہے ۔ یعنی مسلمان اگر مرتے وقت کسی کو اپنا مال وغیرہ حوالہ کرے تو بہتر ہے کہ وہ معتبر مسلمانوں کو گواہ کرے ۔ مسلمان اگر نہ ملیں جیسے سفر وغیرہ میں اتفاق ہو جاتا ہے تو دو کافروں کو وصی بنائے ۔ پھر اگر وارثوں کو شبہ پڑ جائے کہ ان شخصوں نے کچھ مال چھپا لیا ہے اور وارث دعویٰ کریں اور دعوے کے ساتھ شاہد موجود نہ ہوں تو

وہ دونوں شخص قسم کھائیں کہ ہم نے نہیں چھپایا اور کسی طرح یا قرابت کی وجہ سے جھوٹ نہیں کہہ سکتے اگر کہیں تو گنہ گار ہیں۔[1]

یہ گواہوں سے متعلق خاص ہدایت ہے کہ اپنوں میں سے جن دو معتبر گواہوں کو گواہی کے لیے منتخب کرو اگر تمہیں اندیشہ ہو کہ وہ اپنی گواہی کسی جانب داری کی وجہ سے بدل نہ دیں تو اس کو زور دار بنانے کے لیے یہ تدبیر کر سکتے ہو کہ کسی نماز کے بعد ان کو روک لو اور ان سے اللہ کے نام پر قسم لو کہ وہ اپنی گواہی کسی نفع دنیوی کی خاطر اور کسی کی جانبداری میں خواہ وہ ان کا عزیز ہی کیوں نہ ہو بدلیں گے نہیں، اگر وہ بدلیں گے تو گنہ گار ٹھہریں گے۔

من بعد الصلاۃ میں صلاۃ سے مراد کوئی مخصوص نماز نہیں۔ عبداللہ ابن عباس نے شاید نمازِ عصر اس کی اہمیت کے پیشِ نظر بتائی ہے ورنہ جیسا کہ امام زہری کہتے ہیں کہ عصر کی کوئی تخصیص نہیں ہے کوئی نماز ہو۔ نماز کی قید کا فائدہ یہ ہے کہ جو قول و قرار اور جو شہادت و قسم نماز کے بعد اور مسجد میں نمازیوں کی موجودگی میں انجام پائے ایک صاحب ایمان سے توقع ہے کہ وہ اس پر مضبوطی سے قائم رہے گا۔ کوئی ترغیب و تحریص اسے نہ بدلے گی۔

قسم کے لیے زمان و مکان کی قید

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ کیا قرآنی نقطہ نظر سے قسم کو موکد بنانے کے لیے زمان و مکان ناگزیر ہیں۔ جمہور کا خیال تو یہی ہے کہ زمان و مکان کی اثر انگیزی قسم کے لیے ضروری ہے۔ انہوں نے من بعد الصلاۃ سے یہی بات سمجھی ہے کہ وقت نماز عصر کا بعد ہو اور جگہ مدینہ میں حضور کے منبر کے پاس اور مکہ میں حجر اسود اور مقام ابراہیم کے درمیان ہو یا بیت المقدس میں صخرہ سلیمان کے پاس ہو اور کسی دوسرے شہر میں جامع مسجد میں ہو۔ یہ امام مالک، امام شافعی کا خیال ہے۔ لیکن امام ابوحنیفہ اور امام احمد کا خیال ہے کہ قسم کے زور دار بنانے میں زمان و مکان کا کوئی دخل نہیں ہے۔

آیت میں من بعد الصلاۃ کی قید واقعیت کے اظہار کے لیے ہے۔ اس دور میں عرف یہی تھا کہ نماز کے بعد یہ کام کرتے تھے ورنہ مقصود صرف قسم لینا ہے۔

اور یہ بھی پیش نظر رہنا چاہیے کہ قرآن میں یہ قید بھی ہے ان ارتبتم اگر تمہیں گواہوں کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بارے میں کوئی شک مرتب قسم لی جائے۔ اگر کوئی اندیشہ نہ ہو گواہ ثقاہت و عدالت کے اعتبار سے ایسے مرتبہ کے ہوں کہ ان سے کسی سوءظن کا احتمال نہ ہو تو بلاوجہ ان سے قسم لینے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے روایت کے بارے میں بھی یہ وضاحت کی ہے۔

ان جاءکم فاسق بنبأ فتبینوا

اگر فاسق تمہارے پاس کوئی خبر لے کر آئے تو چھان بین کر و۔

مطلب یہی ہے کہ اگر خبر رساں فاسق نہیں بلکہ عادل ہو تو پھر تحقیق و جستجو اور چھان بین کی ضرورت نہیں ہے۔ حافظ ابن القیم نے یہی بات اس آیت سے سمجھی ہے اور مدارج السالکین میں تصریح کی ہے۔ اس طرح قرآن نے شہادت اور روایت دونوں کی اہمیت واضح کر دی اور بتا دیا کہ نہ تو عادل سے قسم لی جاتے اور نہ عادل کی خبر کو رد کیا جائے۔ کیونکہ قرآن نے فاسق کی خبر کی تحقیق کا حکم دیا ہے یہ حکم نہیں دیا کہ رد کر دو ایسے ہی یہاں گواہوں کے بارے میں فرمایا کہ قسم لی جائے بشرطیکہ تمہیں ان کی دیانت پر شبہ ہو۔ اور آخر میں لا نکتم شھادۃ اللہ کہہ کر شہادت کی عظمت واضح فرمائی ہے کیونکہ مومن کی ہر گواہی چھوٹی ہو یا بڑی شھداء بالقسط کی وجہ سے اس عظیم فریضہ منصبی کا ایک حصہ ہے جس پر اسے اللہ نے مامور فرمایا ہے۔ اگر اس میں ادنیٰ خیانت بھی اس سے صادر ہو تو وہ صرف بندوں ہی کا خائن نہیں بنتا بلکہ اپنے رب کا بھی خائن ہوتا ہے۔

وارثوں کا عدالت سے رجوع

۲۰۴۔ پھر اگر معلوم ہو جائے کہ وہ دونوں گواہ گناہ کے مرتکب ہوئے تو ان کی جگہ دو سرے دو گواہ ان میں سے کھڑے ہوں جن کا حق گواہوں نے دبانا چاہا تھا اور یہ گواہ ان میں سے ہوں جو فریق مظلوم سے تعلق رکھنے والے ہوں۔ یہ دونوں قسم کھا کر کہیں کہ ہماری گواہی پچھلے گواہوں سے زیادہ بہتر ہے ہم نے گواہی دینے میں کسی طرح کی زیادتی نہیں کی۔ اگر کی ہو تو ہم ظالموں میں سے ہوں۔ یعنی اگر قرائن سے اوصیاء کی قسم کا جھوٹ ہونا معلوم ہو جائے اور وہ بذریعہ شہادت شرعی اپنا سچا ہونا ثابت نہ کر سکیں تو میت کے وارثوں کو قسم دی جائے گی کہ ان کو اوصیاء کے دعوے کی واقعیت کا کوئی علم نہیں اور یہ کہ ان کی گواہی اوصیاء کی گواہی سے زیادہ احق بالقبول ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شیخ الاسلام نے اگلے آیت کی شان نزول لکھی ہے وہ چونکہ ہم پہلے لکھ آئے ہیں اس لیے یہاں چھوڑ دی گئی ہے

مطلب یہ ہے کہ اگر ایک مسلمان کا سفر میں وقت رحلت آجائے تو اسے چاہیے کہ دو مسلمانوں کو اپنا وصی بنالے اور اپنا اثاثہ ان کے سپرد کر دے۔ اگر مسلمان نہ ہوں تو غیر مسلم بھی وصی ہو سکتے ہیں۔ یہ اوصیا میت کی وصیت کے مطابق اس کا سامان میت کے وارثوں کو دیں۔ اگر میت کے ورثاء ان اوصیا کی بات میت کے ترکہ کے بارے میں قبول کرلیں تو فبہا اور اگر ان کو اوصیا کی بات کا اعتبار نہ ہو تو وہ عدالت میں اس کے خلاف استغاثہ دائر کریں، عدالت کا کام یہ ہے کہ ان اوصیا سے حلف لے اگر میت کے اولیا کو قرائن سے پتہ لگ جائے کہ اوصیا نے جھوٹ بولا ہے اور جھوٹی قسم کھائی ہے تو اب عدالت اولیا میت سے قسم لے اگر میت کے اولیا قسم کھالیں تو اوصیا کی شہادت کو رد کر دے اور اولیا کے حق میں فیصلہ کرے۔

ارشاد میں عثر آیا ہے اس کا مصدر عثر اور عثور ہے۔ اس کے معنی راز سے آگاہ ہونے کے ہیں اولیان اولی کا تثنیہ ہے ولی سے بنا ہے۔ اس کے معنے لگاؤ اور تعلق کے ہیں۔ یعنی اولیان بالمیت میت کے اولیا اور ورثا ان سے مراد میت کے وہ ورثا ہیں جو میت کی میراث کے زیادہ حقدار ہیں۔ پہلی آیت اوصیا سے قسم شہادت کو مستحکم کرنے کے لیے لی گئی تھی۔ اب میت کے ورثا سے قسم لی جارہی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر پتہ لگ جائے کہ اوصیا نے وصیت کرنے والے کی وصیت کے خلاف کوئی قدم اٹھایا ہے تو جن کی حق تلفی ہوئی ان میں سے دو آدمیوں سے قسم لی جائے کہ ہماری گواہی ان دونوں اوصیا کی گواہی سے زیادہ سچی ہے اور ہم ذرا بھی حق سے تجاوز نہیں کر رہے ہیں۔ دونوں صورتوں میں عام شارحین قرآن کی تشریح کے مطابق جوہری فرق ہے۔ پہلی صورت میں اولیا میت مدعی تھے اور ان کے پاس گواہ نہ تھے۔ اس لیے اوصیا سے قسم لی گئی۔ دوسری صورت میں اوصیا مدعی تھے اور ان کے پاس کوئی گواہ نہ تھا اس لیے وارثوں سے قسم لی گئی یہاں وارثوں سے قسم لینے کا ذکر ہے۔ اور ہم نے پہلی قسم کو اوصیا کے لیے تاکیدی قرار دیا ہے یعنی وصیت کو مستحکم کرنے کے لیے قسم لی جاتی ہے بشرطیکہ اوصیا کی دیانت و امانت پر موصی کو کوئی شبہ ہو۔

شہادت کا فائدہ

۲۰۵۔ اور اس قسم سے زیادہ امید کی جاسکتی ہے کہ گواہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں گے یا کم از کم

ان کو اس بات کا اندیشہ رہے گا کہ کہیں ہماری قسمیں فریق ثانی کی قسموں کے بعد رد نہ کر دی جائیں۔ بہرحال اللہ کی نافرمانی کے نتائج سے ڈرتے رہو اور اس کا حکم سنو اور یاد رکھو کہ اللہ بدکاروں کو کامیاب و بامراد نہیں بناتا ہے یعنی وارثوں کو شبہ پڑ جائے تو قسم دینے کا حکم رکھا اس لیے کہ قسم کے ڈر سے اول ہی جھوٹ ظاہر نہ کریں پھر اگر ان کی بات جھوٹ نکلے تو وارث قسم کھائیں۔ یہ بھی اسی واسطے کہ وہ قسم میں دغا نہ کریں۔ جانیں کہ آخر ہماری قسم الٹی پڑ جاتے گی۔ (کذا فی موضح القرآن) خدا کی نافرمانی کرنے والا انجام کار رسوا اور ذلیل ہوتا ہے، حقیقی کامیابی کا چہرہ نہیں دیکھتا[1]

یہاں شہادت کو اس طریق سے لینے کا فائدہ بتایا ہے کہ اگر شہادت کے بارے میں یہ طریق کار اپنایا جائے گا تو شاہدوں کی شہادت سے واقعہ کی حقیقت سب کے سامنے کھل کر آجائے گی اور احتساب کے خیال سے گواہ ٹھیک ٹھیک گواہی دیں گے ورنہ ان کو ڈر ہوگا کہ اگر ان سے کوئی بدعنوانی ہوئی تو ان کی قسمیں دوسروں کی قسموں سے باطل ہو جائیں گی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

يَوْمَ يَجْمَعُ اللّٰهُ الرُّسُلَ فَيَقُوْلُ مَاذَآ اُجِبْتُمْ ۭ قَالُوْا لَا عِلْمَ لَنَا ۭ اِنَّكَ
اَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوْبِ ﴿١٠٩﴾ اِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيْسَى ابْنَ مَرْيَمَ اذْكُرْ نِعْمَتِيْ
عَلَيْكَ وَعَلٰى وَالِدَتِكَ ۘ اِذْ اَيَّدْتُّكَ بِرُوْحِ الْقُدُسِ ۣ تُكَلِّمُ النَّاسَ
فِي الْمَهْدِ وَكَهْلًا ۚ وَاِذْ عَلَّمْتُكَ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ وَالتَّوْرٰىةَ وَ
الْاِنْجِيْلَ ۚ وَاِذْ تَخْلُقُ مِنَ الطِّيْنِ كَهَيْـَٔةِ الطَّيْرِ بِاِذْنِيْ فَتَنْفُخُ
فِيْهَا فَتَكُوْنُ طَيْرًۢا بِاِذْنِيْ وَتُبْرِئُ الْاَكْمَهَ وَالْاَبْرَصَ بِاِذْنِيْ ۚ
وَاِذْ تُخْرِجُ الْمَوْتٰى بِاِذْنِيْ ۚ وَاِذْ كَفَفْتُ بَنِيْٓ اِسْرَاۗءِيْلَ عَنْكَ اِذْ
جِئْتَهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ فَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ اِنْ هٰذَآ اِلَّا
سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١١٠﴾

وہ دن کہ اللہ تمام رسولوں کو جمع کرے گا پھر ان سے دریافت
کرے گا کہ بتاؤ تمہیں تمہاری اُمتوں کی جانب سے تمہاری
دعوت کا کیا جواب ملا؟ وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں ہے

یہ تو تیری ہی ناہمسنی ہے جو غیب کی باتوں کو جاننے والی ہے۔[۲۰۶] اس دن اللہ کہے گا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ میں نے تم پر اور تمہاری ماں پر جو انعام کیے ہیں ان کو یاد کرو۔[۲۰۷] میں نے رُوح القدس سے تمہیں قوت دی تھی تم لوگوں سے گہوارے میں باتیں کرتے تھے اور بڑی عمر میں پہنچ کر بھی، اور یاد کرو اس کو بھی کہ میں نے کتاب حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دی تھی، اور جب ایسا ہوا تھا کہ تم میرے حکم سے مٹی لیتے اور پرندے کی شکل جیسی چیز بناتے پھر اس میں پھونک مارتے اور وہ میرے حکم سے ایک پرندہ بن جاتا اور یہ بھی یاد کرو کہ تم میرے حکم سے اندھے اور برص سے بیمار کو اچھا کر دیتے اور یہ بھی یاد کرو کہ تم میرے حکم سے مُردوں کو نکالتے تھے۔[۲۰۸] اور وہ وقت بھی یاد کرو جب میں نے تم سے بنی اسرائیل کو ہٹا دیا اس وقت جبکہ تم ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر پہنچے تھے تو انہوں نے ان کو دیکھ کر کہا

تھا کہ یہ نشانیاں جادوگری کے سوا کچھ نہیں ہیں۔ ۲۰۹

روز قیامت کی ہولناکی

کچھ کی رائے ہے کہ یوم یجمع اللہ اپنے سے پہلے فقرے لا یھدی القوم الفاسقین سے مربوط ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس روز فاسقین کے لیے راہ نجات نہیں کھولے گا جس روز تمام رسُولوں سے پوچھا جائے گا اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ مستقل بات ہے اور مقصود قیامت کی ہولناکی کو بیان کرنا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ روز اس قدر ہولناک ہوگا کہ اس روز اللہ انبیاء سے بھی پوچھے گا۔ اس سوال سے مقصود امتوں اور قوموں کی توبیخ اور سرزنش ہے۔ تاکہ امتیں سن لیں اور ڈر جائیں۔ جیسا کہ قرآن ہی میں ہے واذا الموؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت؟ کہ زندہ درگور لڑکی کس گناہ میں ماری گئی۔ یہ سوال اگرچہ موؤدہ سے ہوگا لیکن سوال سے مقصود زندہ درگور کرنے والوں کی توبیخ ہو گی۔ ایسے یہاں سوال اگرچہ انبیاء و رسل سے ہوگا مگر مقصود اس سے ان انبیاء کی امتوں کی توبیخ ہوگی۔

اور امام رازی فرماتے ہیں کہ قرآن حکیم کا عام انداز بیان یہ ہے کہ احکام و قوانین ذکر کرنے کے بعد فوراً اللہ کی صفات کو پیش کرتا ہے یا انبیاء کے احوال و ظروف کو بیان کرتا ہے اور قیامت کے کچھ مناظر کی جھلک دکھا دیتا ہے اور مقصد اس سے عمل کے لیے اور تعمیل احکام کے لیے دلوں میں گرمی پیدا کرنا ہوتا ہے۔ چنانچہ یہاں بھی یہی صورت ہے۔ آغاز میں اگرچہ تمام انبیاء سے سوال کا ذکر کیا ہے لیکن اس کے بعد خاص طور پر حضرت عیسٰی علیہ السلام کا ذکر کیا ہے جن کو عیسائیوں نے خدا بنا رکھا ہے۔ کیونکہ اوپر سے سلسلہ کلام اہل کتاب کے غلو اور افراط و تفریط کے متعلق آرہا ہے۔ اس تذکرہ سے اصل مقصد تو عیسائیوں کے افکار کا بودا پن ظاہر کرنا ہے جو ان کو خدا یا خدا کا بیٹا تصور کرتے ہیں کیونکہ دوسری امتوں کا کفر انبیاء کی ذات تک محدود ہے لیکن عیسائیوں کا کفر نبوت سے آگے اللہ تعالیٰ تک پہنچا ہوا ہے اور تو یہی کہتے ہیں کہ یہ نبی نہیں ہے اور عیسائی یہ کہتے ہیں کہ یہ نبی نہیں بلکہ خدا کا بیٹا ہے۔ یہ جناب الٰہی علیم میں گستاخی ہے اور پھر حضرت عیسٰی کا خاص طور پر اس لیے بھی ذکر کیا ہے کہ آنجناب اسرائیلی سلسلہ نبوت کی آخری کڑی ہیں۔

۲۰۶۔ وہ دن کہ اللہ تمام رسُولوں کو جمع کرے گا اور ان سے دریافت کرے گا کہ بتاؤ تمہیں

تمہاری امتوں کی جانب سے تمہاری دعوت کا کیا جواب ملا؟ وہ کہیں گے کہ ہمیں کچھ علم نہیں ہے یہ تو تیری ہی ہستی ہے جو غیبوں کی باتوں کی جاننے والی ہے۔ یہ سوال محشر میں امتوں کے روبرو پیغمبروں سے کیا جائے گا کہ دنیا میں جب تم ان کے پاس پیغام لے کر گئے تو انہوں نے کیا جواب دیا اور کہاں تک دعوت الٰہی کی اجابت کی۔ گزشتہ رکوع میں بتایا تھا کہ خدا کے یہاں جانے سے پہلے بذریعہ وصیت وغیرہ یہاں کا انتظام ٹھیک کر لو اب فرماتے ہیں کہ وہاں کی جوابدہی کے لیے تیار ہو جاؤ۔ یعنی محشر کے دن جب خدائے قہار کی شان جلالی کا انتہائی ظہور ہو گا اور ماحاظم کے بھی ہوش بجا نہ رہیں گے اولالعزم انبیاء کی زبان پر نفسی نفسی ہو گا اس وقت انتہائی خوف وخشیت سے حق تعالیٰ کے سوال کا جواب لا علم لنا ہمیں کچھ خبر نہیں کے سوا نہ دے سکیں گے۔ پھر جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے طفیل میں سب کی طرف خدا کی نظر لطف ورحمت ہو گی تب کچھ عرض کرنے کی جرأت کریں گے۔ امام حسن اور امام مجاہد سے ایسا ہی منقول ہے لیکن حضرت عبداللہ ابن عباس کے نزدیک " لا علم لنا " کا مطلب یہ ہے کہ خداوندا تیرے علم کامل ومحیط کے آگے ہمارا علم کچھ بھی نہیں ہے گویا یہ الفاظ تادیب مع اللہ کے طور پر کہے۔ ابن جریج کے نزدیک لا علم لنا، سے مراد یہ ہے کہ ہم کو معلوم نہیں کہ انہوں نے ہمارے پیچھے کیا کیا۔ ہم صرف ان ہی افعال واحوال پر مطلع ہو سکتے ہیں جو ہمارے سامنے ظاہری طور پر پیش آئے تھے۔ بواطن وسرائر کا علم علام الغیوب ہی کو ہے۔ آئندہ رکوع میں حضرت مسیح علیہ السلام کی زبانی جو جواب نقل فرمایا ہے وکنت علیھم شھیدا ما دمت فیھم اس سے آخری معنے کی تائید ہوتی ہے اور صحیح حدیث میں ہے کہ جب حوض پر بعض لوگوں کی نسبت حضور فرمائیں گے اصحابی اصحابی تو جواب ملے گا لا تدری ما احدثوا بعدک۔ یعنی آپ کو پتہ نہیں کہ آپ کے پیچھے انہوں نے کیا حرکات کیں [1]

حضرت شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ یہ اللہ صاحب پوچھے گا کافروں کے سنانے کو کہ میں نے تم کو جن کی طرف روانہ کیا تھا انہوں نے قبول کیا یا نہیں اور پیغمبر حوالے رکھیں گے اللہ کے علم پر کہ ہم کو دل کی خبر نہیں، ظاہر کی ہے۔ یہ ان کو سنایا جو مغرور ہیں پیغمبروں کی شفاعت پر تا معلوم کریں کہ اللہ کے آگے کوئی کسی کے دل پر گواہی نہیں دیتا اور کوئی کسی کی شفاعت نہیں کرتا۔

یہاں لا علم لنا کا مطلب یہ ہے کہ ہم تو صرف اس محدود اور ظاہری جواب کو جانتے ہیں جو

[1] افادات شیخ الاسلام

ہمیں اپنی زندگی میں محسوس ہوا تھا فی رہا کرکے لطفینت ہماری دعوت کا ردعمل کیا کہاں کس صورت میں کتنا ہوا تو اس کا صحیح جواب رب کے سوا کسی کو معلوم نہیں ہے۔[1]

انبیاء سے سوال کرنا فی الحقیقت ان کے منکروں یعنی امت دعوت سے متعلق نہیں کیا جاتے گا بلکہ ان کی امتوں کے بارے میں ہوگا۔ جنہوں نے ان کی دعوت کو قبول کر لیا ہے۔ یعنی امت اجابت کہ جن لوگوں کو تم نے اسلام کی دعوت میں داخل کیا ان کا رویہ اور ردعمل کیا رہا؟ انبیاء علیہم السلام پر سوال کی حقیقت چونکہ واضح ہوگی اس وجہ سے وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے کیونکہ ان کا علم صرف دنیا میں اپنی موجودگی کے زمانے تک ہی محدود ہوگا اور اس سوال کے صحیح جواب کا انحصار اس پر ہے کہ انہیں اپنی امتوں کی بعد کی تبدیلیوں کا بھی علم ہو۔ چونکہ بعد کی تبدیلیوں کا انہیں علم نہ ہوگا۔ اس وجہ سے وہ اس جواب کے معاملے کو خدا ہی کے سپرد کریں گے۔

بہرحال علماء نے لاعلم لنا پر بہت کچھ لکھا ہے ایک توجیہ یہ ہے کہ ہمیں علم نہیں کہ انہوں نے ہمارے بعد کیا کیا۔ ہم تو اپنے سامنے ان کے صرف ظاہری اقوال و اعمال کو جانتے تھے باطن کا علم تو صرف تجھی کو ہو سکتا ہے۔ دوسری تفسیر یہ بھی کی گئی ہے کہ یہ جواب محض غلبہ خشیت سے لوبا ہوگا یعنی تیرے علم محیط کامل کے آگے ہمارا علم ہیچ ہے جو کچھ ہمیں علم ہے بھی خود اس کا بھی تو ہم سے زیادہ عالم ہے۔ عبداللہ ابن عباس سے یہی منقول ہے۔ امام المفسرین ابن جریر طبری اور امام رازی دونوں نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ دونوں تفسیروں کے درمیان کچھ زیادہ فرق نہیں ہے۔ امام رازی نے ایک تیسرے معنے بھی بیان کیے ہیں کہ ہمیں جو کچھ حاصل ہے وہ محض درجہ ظن کی چیز ہے اور آج جو کشف حقائق کا دن ہے محض ظن کام نہیں دے سکتا۔ آج تو علم ہی کام دے گا اور وہ آپ ہی کو حاصل ہے۔

حضرت عیسیٰ پر انعام الٰہی

۲۰۷۔ اس روز اللہ کہے گا اے مریم کے بیٹے عیسیٰ میں نے تم پر اور تمہاری والدہ پر جو انعام کیے ہیں ان کو یاد کرو۔ غالباً یہ پورا رکوع آنے والے رکوع کی تمہید ہے۔ احسانات یاد دلا کر وہ سوال ہوگا جو آئندہ رکوع میں مذکور ہے اول تو اولاد پر احسان کرنا من وجہ ماں پر احسان ہے دوسرے ظالم لوگ جو تہمت مریم صدیقہ پر لگاتے تھے حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ السلام کو ان کی برائت و نزاہت کے لیے

---

[1] تفہیم القرآن۔

بُرہان مبین بنا دیا اور تولد مسیح سے پہلے اور بعد عجیب و غریب نشانات حضرت مریم کو دکھلاتے جو ان کی تقویت و تسکین کا باعث ہوتے یہ احسانات بلا واسطہ ان پر تھے[1] ابتدائی سوال تمام رسولوں سے ہوگا پھر ایک ایک رسول سے الگ الگ شہادت لی جائے گی جیسا کہ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر تصریح ہے۔ اسی سلسلہ میں حضرت عیسٰی سے جو سوال کیا جائے گا وہ یہاں بطور خاص اس لیے نقل کیا جا رہا ہے کہ عیسائیوں اور یہودیوں کو بتا دیا جائے کہ دُنیا میں حضرت عیسٰی کے بارے میں دونوں گروہ افراط و تفریط کا شکار تھے۔ عیسائیوں کو بتا دیا کہ حضرت عیسٰی خدا کے بندے ہیں۔ اللہ تعالٰی ان کے محسن ہیں ان میں جو کچھ خوبی تھی وہ اللہ کا عطیہ اور دین تھی۔ عیسائیوں نے حضرت عیسٰی کو ان کے کمالات کی وجہ سے خدا بنا لیا اور حضرت عیسٰی کے محسن یعنی خالق کمال کو بھول گئے۔ اور یہودیوں کو جتا دیا کہ جس ذات پر اللہ سبحانہٗ نے ایسے عجیب و غریب انعامات فرمائے ہیں اس پر تہمت لگاتے ہیں اور اسے کذاب کہتے ہیں یہاں حضرت کی والدہ پر احسانات کی تفصیل نہیں کی بلکہ اشارہ کر دیا ہے اس کی پوری تفصیل سورہ آل عمران معالم القرآن کی جلد سوم میں آچکی ہے۔

حضرت عیسٰی کی شان اعجاز

۲۰۸۔ جب کہ میں نے رُوح القدس سے تمہیں قوت دی تھی، تم لوگوں سے گہوارے میں باتیں کرتے اور بڑی عمر میں پہنچ کر بھی۔ اور یاد کرو اس کو بھی کہ میں نے کتاب حکمت تورات اور انجیل کی تمہیں تعلیم دی تھی۔ اور جب ایسا ہوا تھا کہ تم میرے حکم سے مٹی لیتے اور پرندے کی شکل جیسی چیز بناتے پھر اس میں پھونک مارتے اور وہ میرے حکم سے ایک پرندہ بن جاتا اور یہ بھی یاد کرو کہ تم میرے حکم سے اندھے اور برص کے بیمار کو اچھا کر دیتے اور یہ بھی یاد کرو کہ تم میرے حکم سے مردوں کو نکال لیتے تھے۔ گود میں جو کلام کیا اس کا ذکر سورہ مریم میں آئے گا انی عبد اللہ آتانی الکتاب تعجب ہے کہ عیسائیوں نے حضرت مسیح کے تکلم فی المہد کا کچھ ذکر نہیں کیا۔ البتہ یہ لکھا ہے کہ بارہ برس کی عمر میں یہود کے سامنے انھوں نے ایسی حکیمانہ دلائل اور براہین بیان فرمائیں کہ تمام علماء عاجز و مبہوت رہ گئے اور سامعین عش عش کرنے لگے یوں تو روح القدس سے حسب مراتب سب انبیاء علیہم السلام بلکہ بعض مومنین کی بھی تائید ہوتی ہے۔ لیکن حضرت عیسٰی علیہ السلام کو جن کا وجود "نفخہ جبرئیلیہ" سے ہوا کوئی خاص فطری تائید اور مناسبت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حاصل ہے جسے تفضیل انبیاؑ کے بیان میں پیش کیا ہے تلک الرسل فضلنا بعضھم علی بعض منھم من کلم اللہ ورفع بعضھم درجات و اتینا عیسی ابن مریم البینات وایدنٰہ بروح القدس۔

"روح القدس" کی مثال عالم ارواح میں ایسی سمجھو جیسے عالم مادیات میں قوت کہربائیہ (بجلی) کا خزانہ جس وقت اس خزانہ کا مالک معین اصول کے موافق کرنٹ چھوڑتا ہے اور جن اشیاء میں بجلی کا اثر پہنچتا ہے ان کا کنکشن درست کر دیتا ہے تو فوراً خاموش اور ساکن مشینیں بڑے زور وشور سے گھومنے لگتی ہیں۔ اگر کسی مریض پر بجلی کا عمل کیا گیا تو مشلول اعضا اور بے حس ہو جانے والے اعصاب میں بجلی کے پہنچنے سے حس وحرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ بعض اوقات ایسے بیمار کے حلقوم میں جس کی زبان بالکل بند ہو گئی ہو قوتِ کہربائیہ کے پہنچانے سے قوتِ گویائی واپس کی گئی ہے حتیٰ کہ بعض غالی ڈاکٹروں نے تو یہ دعویٰ کر دیا کہ ہر قسم کی بیماری کا علاج قوتِ کہربائیہ سے کیا جا سکتا ہے۔ (دائرۃ المعارف)

جب اس مادی قوتِ کہربائیہ کا حال یہ ہے تو اندازہ کر لو کہ عالم ارواح کی کہربائیہ میں جس کا خزانہ روح القدس ہے کیا کچھ طاقت ہو گی۔ حق تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ السلام کی ذات گرامی کا تعلق روح القدس سے کسی ایسی خاص نوعیت اور اصول کے تحت رکھا ہے جس کا اثر کھلے ہوئے غلبہ روحیت تجرد اور مخصوص آثار حیات کی شکل میں ظاہر ہوا۔ ان کا روح اللہ سے ملقب ہونا، بچپن جوانی اور کہولت میں یکساں کلام کرنا۔ خدا کے حکم سے افاضہ حیات کے قابل کالبد خاکی تیار کر لینا۔ اس میں باذن اللہ روح حیات پھونکنا، مایوس العلاج مریضوں کی حیات کو باذن اللہ بدون توسط اسباب کے کارآمد اور بے عیب بنا دینا۔ حتیٰ کہ مردہ لاشہ میں باذن اللہ دوبارہ روح حیات کو واپس لے آنا۔ بنی اسرائیل کے ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملا کر آپ کا آسمان پر اٹھا لیا جانا۔ وغیرہ وغیرہ سب آثار اسی تعلق خصوصی سے پیدا ہوتے ہیں جو رب العزت نے کسی مخصوص نوعیت و اصول سے آپ کے اور روح القدس کے مابین قائم فرمایا ہے۔ ہر پیغمبر کے ساتھ کچھ امتیازی معاملات اللہ تعالیٰ کے ہوتے ہیں۔ ان کے علل و اسرار کا احاطہ اسی علام الغیوب کو ہے۔ ان ہی امتیازات کو علماء کی اصطلاح میں فضائل جزئیہ کے نام سے موسوم کرتے ہیں۔ ایسی چیزوں سے کلی فضیلت ثابت نہیں ہوتی چہ جائیکہ "الوہیت" ثابت ہو، واذ تخلق من الطین میں خلق کا لفظ محض صوری اور حسی لحاظ سے استعمال کیا گیا ہے ورنہ خالق حقیقی احسن الخالقین کے سوا کوئی نہیں۔ اسی لیے باذنی کا بار بار اعادہ کیا گیا ہے اور آل عمران میں باذن اللہ کی تکرار کرائی گئی ہے۔ بہرحال جو خوارق ان آیات میں اور ان سے پہلے "آل عمران" میں حضرت مسیح علیہ السلام کی طرف منسوب ہوتے ہیں۔ ان کا انکار یا تحریف

صرف اسی طرح کا کام ہے جو آیات اللہ کو اپنی عقل شخصی کے تابع کرنا چاہے۔ باقی جو لوگ قانون قدرت کا نام لے کر معجزات و خوارق کا انکار کرنا چاہتے ہیں۔ ان کا جواب ہم نے ایک مستقل مضمون میں دیا ہے۔ اس کے مطالعہ سے تمام شکوک و شبہات کا ازالہ ہو سکے گا[1]

ان آیات میں حضرت عیسٰی کے بارے میں یہ باتیں بتائی گئی ہیں۔ اولاً آپ کو روح القدس کی تائید حاصل تھی، ثانیاً آپ گہوارے اور بڑی عمر میں باتیں کرتے تھے۔ ثالثاً اللہ نے آپ کو کتاب و حکمت اور تورات و انجیل کی تعلیم دی، رابعاً آپ مٹی سے پرندے جیسی شکل بناتے اس میں پھونک مارتے، تو وہ جیتا جاگتا پرندہ ہو جاتا۔ خامساً آپ مادر زاد اندھے اور برص والے کو اچھا کر دیتے تھے۔ سادساً آپ مُردوں کو موت کی حالت سے نکال کر زندگی کی حالت میں لے آتے۔ ان سب پر تشریحی بحث تیسری جلد میں گزر چکی ہے اس لیے ہم یہاں اس کا اعادہ نہیں کرتے ہیں۔ البتہ یہاں ہم اعجاز اور اس کی حیثیت، عقیدہ معجزات کی قرآنی اصطلاح، معجزہ کا سبب، معجزہ کا اہل ایمان پر اثر، سحر اور معجزے میں فرق، ساحر اور پیغمبر میں امتیاز، امکان استبعاد، یقین اور غایت معجزات پر کچھ اجمالی گزارشیں پیش کرتے ہیں۔

کیا معجزہ قرآنی اصطلاح ہے

حافظ ابن تیمیہ نے اپنی متعدد تصانیف میں بہت اصرار کے ساتھ اس پر زور دیا ہے کہ معجزات کا عنوان صحیح قرآن و سنت میں آیات و براہین ہیں۔ اور یہی عنوان سلف نے اختیار کیا ہے اور معجزے کی صحیح حقیقت سمجھنے کے لیے یہی تعبیر کافی ہے لفظ آیت کا ترجمہ علامت اور نشانی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم و احساس کے جو ذرائع عطا کیے ہیں وہ فی الواقع صرف آیات و علامات کی شناخت اور یاد ہے دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں تم ان کو کس طرح جانتے ہو صرف آیات و علامات سے، کلیات سے لے کر جزئیات تک جو کچھ ہم کو خارج سے علم حاصل ہوا ہے وہ محض نشانیوں کو دیکھ کر ہم جانتے ہیں کہ یہ گھوڑا ہے یہ انسان ہے، یہ درخت ہے۔ ہم پہچانتے ہیں کہ یہ زید ہے یہ عمر ہے یہ میرا عزیز ہے، یہ میرا گھر ہے یہ تمام شناختیں آیات و علامات کی مدد سے ہیں۔ جس طرح ہر چیز کی شناخت کے لیے کچھ علامات اور نشانیاں ہوتی ہیں۔ ٹھیک اسی طرح نبوت کے ساتھ بھی کچھ خاص نشانیاں ہوتی ہیں جن کو دیکھ کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بآسانی ان کی نبوت و رسالت کا یقین ہو سکتا ہے۔ ان ہی کا نام آیات نبوت ہے اور چونکہ یہ آیات ان کے فرستادہ الٰہی ہونے کا علم و ثبوت ہوتی ہیں اس لیے قرآن نے ان کو برہان کے نام سے پکارا ہے۔
علم کلام کی اصطلاح میں ان آیات کا نام معجزات ہے۔ امام بخاری نے اپنی کتاب میں ان کا عنوان علامات نبوت رکھا ہے اور بعض مولفین نے اس موضوع پر کام کیا ہے انہوں نے اپنی تصانیف کا نام دلائل نبوت رکھا ہے۔
حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ معجزے کے عنوان سے یہاں بہت سی الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں۔
بہرحال قرآن کی زبان میں آیت و برہان ہو یا محدثین کی تعبیر میں اس کا عنوان دلائل و علامات ہو اور یا پھر متکلمین کی اصطلاح میں معجزات ہو ہمیں یہاں اس سے بحث نہیں ہے چونکہ ہماری زبان میں معجزہ کا لفظ عام طور پر چل پڑا ہے اس لیے اسی کو اختیار کرتے ہیں۔

معجزہ کی حقیقت

معجزہ لغۃً لفظ عجز سے بنا ہے جو قدرت کی ضد ہے حرف ۃ اس میں یا تو مبالغہ کے لیے ہے اور یا لفظ معجزہ آیت وغیرہ کی صفت ہے۔ یعنی آیت معجزہ ایسی نشانی جو لوگوں کو اس کے معارضہ سے عاجز کرنے والی ہے اور معجزہ میں فعل عجز پیدا کرنے والا اور فی الحقیقت منکروں کو عاجز کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور معجزہ صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہے جو نبی کے ذریعے صادر ہوتا ہے نبی کا اس میں کوئی دخل نہیں ہوتا چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

> اور معجزہ کو معجزہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جن کے سامنے وہ پیش کیا جاتا ہے وہ اس کے معارضہ سے عاجز ہو جاتے ہیں اور حرف ۃ اس میں مبالغہ کے لیے ہے یا لفظ معجزہ صفت ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے۔ اور حضور انور کا مشہور معجزہ قرآن ہے
> (فتح الباری جلد ۶)

قاضی ابوبکر ابن الطیب الباقلانی فرماتے ہیں:

> ہمارے اس کہنے کا مطلب کہ قرآن معجزہ ہے ہمارے اصول پر یہ ہے کہ بندے اس پر قادر نہیں اور یہ ثابت ہو چکا ہے کہ معجزہ جو نبی کی صداقت کی دلیل ہوتا ہے اس کے بارے میں یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ وہ بندوں کی قدرت کے تحت داخل ہے بلکہ معجزہ کی قدرت پر اللہ تعالیٰ ہی منفرد ہے۔

بالکل اسی قسم کی تشریحات دوسرے علماء نے پیش کی ہیں مثلاً قاضی عیاض نے شفا میں، امام غزالی نے احیاء العلوم میں، امام عبدالوہاب شعرانی نے الیواقیت والجواہر میں شیخ ابن الہمام نے مسامرہ میں اور ان کے علاوہ دوسرے متکلمین نے بھی معجزہ کی یہی تشریح کی ہے۔ مشہور مفسر قرآن علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر کے مقدمہ میں لکھا ہے کہ معجزہ کے معجزہ ہونے کے لیے ضروری ہے کہ اس میں پانچ شرطیں ہوں
اولاً یہ کہ اس جنس کا ہو جس پر سوائے اللہ کے کسی کو قدرت نہ ہو۔ ثانیاً یہ کہ وہ خرق عادت ہو لہٰذا اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میرا معجزہ یہ ہے کہ رات کے بعد دن آئے گا تو یہ معجزہ نہ ہوگا۔ اگرچہ اس پر اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو قدرت نہیں ہے لیکن یہ بات خارق عادت نہیں ہے۔
ثالثاً مدعی رسالت اس کے ساتھ یہ دعویٰ بھی کرتا ہو کہ اللہ اس کے کہنے پر یہ معجزہ دکھلائے گا مثلاً وہ یہ کہے کہ اللہ تعالیٰ اس کی تصدیق کے لیے اس پانی کو تیل بنا دے گا یا جب وہ زمین کو حکم دے گا کہ حرکت میں آجائے تو فوراً ہلنے لگے گی۔
رابعاً یہ کہ وہ معجزہ مدعی نبوت کا مؤید ہو تاکہ وہ اسے اپنی نبوت کی دلیل بنا سکے۔ لہٰذا اگر کوئی جانور اس کے حکم سے بولنے لگے مگر یہ بولے کہ یہ شخص جھوٹا ہے نبی نہیں ہے تو اگرچہ جانور کا بولنا خرق عادت ہے لیکن اس کے دعویٰ کے خلاف ہے۔
خامساً یہ کہ مقابلہ میں کوئی شخص اس جیسا نہ لا سکے اگر کوئی شخص مقابلہ میں اس جیسا کردار پیش کر دے تو اسے معجزہ نہ کہیں گے۔
علامہ شاطبی غرناطی فرماتے ہیں۔

> انبیاء علیہم السلام کی تشریف آوری سے پہلے چونکہ انسان کی نگاہیں اس عالم میں سلسلہ اسباب کی خوگر ہوتی ہیں اور کسی خارجی قوت کے تحت اس سلسلہ اسباب کے محکوم ہونے کو انسان سوچ بھی نہیں سکتا بلکہ وہ اسباب اور مسببات کے درمیان عقلی لزوم سمجھتا ہے۔ اسی لیے انسان خرق عادت کو محال کہتا ہے۔ اگر نبوت آکر اعجازی کارناموں کی نمائش نہ کرتی تو انسان کا علم یہیں تک محدود ہو کر رہ جاتا۔ نبوت نے معجزات پیش کر کے ان اسباب کا راز فاش کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان اسباب عادیہ کے درمیان لزوم عقلی نہیں ہے بلکہ یہ صرف اللہ سبحانہٗ کی شان خالقیت کا کرشمہ ہے اسباب میں تاثیر بھی اسی کی پیدا کردہ ہے اور وہ اس کے سلب کرنے پر بھی قادر ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ آگ کا جلانا ایک دائمی تجربہ کے سوا کسی عقلی دلیل کا تقاضا ہے۔ چونکہ اسباب و مسببات کے مابین یہ ارتباط

کسی عقلی دلیل کا تقاضا نہیں ہے اس لیے خرق عادت کو محال رکھنا صحیح نہیں ہے۔

علامہ سید رشید رضا اپنی تفسیر المنار میں رقمطراز ہیں۔

> معجزے کی حقیقت کے متعلق سب سے زیادہ مشہور اور تحقیقات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عادی نظام کے خلاف صرف اپنی قدرت سے ظاہر فرماتا ہے تاکہ یہ ثابت کر دے کہ نوامیس طبعیہ خود اس کے محکوم ہیں۔ وہ ان کا محکوم نہیں ہے جیسے چاہے وہ ان میں تصرف کر سکتا ہے۔

معجزہ کوئی فن اور آرٹ نہیں ہے

بلاشبہ خدائی کام اور بندوں کے کام میں نمایاں امتیاز ہوتا ہے۔ خدائی کام کی نقل بندہ اتارتا ہے لیکن عاقل کو کبھی التباس بھی نہیں ہو سکتا۔ انسان جانداروں، درختوں، پھولوں کی تصویر کھینچ لیتا ہے مگر ایک مچھلی کی آنکھ ایک مکھی کا پَر ایک مچھر کی ٹانگ بلکہ ایک جو کا دانہ تمام عالم مل کر بھی نہیں بنا سکتا۔ لاکھوں مجسمے کروڑوں بیل بوٹے دنیا میں کاریگر اور فن کار بناتے ہیں لیکن مچھر کا ایک پَر بنانے سے بالکل عاجز ہیں۔

اسی کا نام فعل خداوندی ہے اور جب ایسا فعل ان اسباب کے بغیر جو اس کے وجود و بروز کے لیے ضروری ہیں کسی مدعی نبوت کے ذریعہ ظاہر ہوتا ہے تو اسی کا نام معجزہ ہے اور جب معجزہ کا فعل خداوندی ہونا معلوم ہو گیا تو دوسرے خدائی کاموں کی طرح اس میں بھی کسی صانع کی صنعت کو اور کسی فن کار کی فن کاری کو دخل نہیں ہو سکتا۔ اس لیے تنجیم، کہانت، مسمریزم، سحر اور شعبدہ کی طرح معجزہ کوئی فن نہیں ہے کہ تعلیم و تعلم سے حاصل ہو جائے۔ یہ فنون سیکھنے سکھانے سے حاصل ہو سکتے ہیں لیکن معجزہ میں نہ تعلیم و تعلم ہے اور نہ نبی کے اختیار کو اس میں دخل ہے، نہ معجزہ ظاہر کرنے کا کوئی خاص ضابطہ اور قاعدہ ان کو معلوم ہے کہ جب چاہیں ویسا ہی عمل کر کے ایسا ہی معجزہ دکھلا دیں بلکہ جس طرح ہم قلم لے کر لکھتے ہیں اور بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ قلم لکھتا ہے اور فی الواقع اس کو لکھنے میں کوئی اختیار نہیں ہوتا۔ یہی صورت معجزے کی بھی ہے۔ ایسا نہیں کہ انبیاء جس وقت چاہیں انگلیوں سے پانی کے چشمے جاری کر دیں۔ بلکہ جس وقت اللہ کی حکمت بالغہ مقتضی ہوتی ہے تو جاری ہو سکتی ہیں برخلاف ان فنون کے جو تعلیم و تعلم سے حاصل کیے جاتے ہیں۔ ان میں جس وقت چاہیں قواعد و ضوابط مقررہ اور خاص خاص اعمال کی پابندی سے یکساں نتائج اور ایک ہی طرح کے آثار و کوائف دکھلائے جا سکتے ہیں۔ آج تک مدعیان نبوت و اعجاز کی طرف سے معجزہ کی تعلیم و تعلم کے لیے کوئی درس گاہ وجود میں نہیں آئی۔

اور نہ کوئی قاعدہ اور ضابطہ مقرر ہوا نہ کوئی کتاب تنجیم اور مسمریزم کی طرح معجزات کے فن میں تصنیف ہوئی۔ اس سے پتہ چلا کہ معجزہ خدائی فعل ہے۔ اسی لیے اس جیسے فعل سے پوری دنیا عاجز ہے۔

معجزے میں دعوئ نبوت کی شرط

معجزے میں دعوئ نبوت کی شرط اس لیے لگائی گئی ہے کہ سب فرقے مانتے ہیں کہ خدا سب سے زیادہ سچا ہے اور جھوٹ کی کمزوری سے اللہ کی ذات پاک ہے۔ جھوٹ کبھی تو اس طرح ہوتا ہے کہ ایک شخص خود خلاف واقعہ بات کہے اور کبھی اس طرح کہ جھوٹی بات جو دوسرے نے کہی اس کی تصدیق کرے۔ پھر تصدیق بھی قولی اور عملی دونوں طرح ہوتی ہے اور عملی تصدیق کا وزن کبھی تصدیق قولی سے زیادہ ہوتا ہے جیسے ایک شخص بادشاہ کی مجلس میں کہتا ہے کہ بادشاہ کو میرے ساتھ خاص لگاؤ ہے اور اس کا یہ دعویٰ بادشاہ خود مجلس میں سن رہا ہو۔ اس کے بعد وہ شخص اپنے دعویٰ کو ثابت کرنے کے لیے بادشاہ سے کہتا ہے کہ آپ ذرا کھڑے ہو جائیے اور بادشاہ ازراہ مہربانی اس کے کہنے سے کھڑا ہو جاتا ہے یہ بادشاہ کی عملی تصدیق ہے جو قولی تصدیق سے کہیں زیادہ وزنی ہے۔ لہٰذا جو نبی دعویٰ کرتا ہے کہ میں نبی ہوں میری بات سنو گے تو نجات ہے ورنہ عذاب میں گرفتار ہو جاؤ گے اور یہ اللہ کی زمین میں کھلے آسمان کے نیچے کرتا ہے کہ میری پیروی کے بغیر نجات نہیں ہے اور اس کی یہ دلیل پیش کرتا ہے کہ اللہ جل شانہ میرے ہاتھوں اور زبان سے وہ چیزیں ظاہر فرمائے گا جو اس کی عام عادت کے خلاف ہوں گی اور دنیا اس کی مثال لانے سے عاجز ہو گی۔ پھر اس کے موافق مشاہدہ بھی کیا جا رہا ہو تو یہ خدا کی جانب سے عملاً اس کے دعوے کی تصدیق ہو گی۔ فی الواقع معجزہ نبی کے دعویٰ کی تصدیق عملی ہوتی ہے اور اللہ چونکہ جھوٹی تصدیق نہیں کر سکتا لہٰذا نبی کا دعویٰ معجزہ کے ظہور کے بعد سچا ثابت ہو جاتا ہے اس لیے ہم بلا خوف تردید یہ یقین رکھتے ہیں کہ خداوند جو کہ تمام سچائیوں کا سرچشمہ ہے۔ کسی انسان کو یہ دسترس نہیں کہ وہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کر کے ایسے خوارق دکھلائے کہ دنیا اس کے مقابلہ سے عاجز ٹھہرے۔

قرآن میں سنت اللہ کا مفہوم

وہ لوگ جو خرق عادت اور خلاف اسباب و علل کے محال ہونے پر قرآن عزیز کی ان آیات سے استدلال کرتے ہیں جن میں سنت الٰہی کے تبدیل نہ کرنے کا ذکر ہے۔ وہ فی الواقع دانستہ یا نادانستہ

مفہوم قرآن کی مجددیں کے مجرم ہیں۔ قرآن میں سنت الہٰی کا ایک خاص مفہوم ہے اور اسی اصطلاح میں یہ لفظ کئی جگہ قرآن میں استعمال ہوا ہے۔ خیر و شر، حق و باطل، نور و ظلمت اور ظلم و انصاف جب باہم ٹکراتے ہیں تو بالآخر اللہ تعالیٰ خیر کو شر پر، حق کو باطل پر، نور کو ظلمت پر اور انصاف کو ظلم پر فتح و کامیابی عطا فرماتا ہے۔ گنہگار اور مجرم قومیں جب حق کی دعوت قبول نہیں کرتی ہیں۔ اور پند و موعظت ان کے لیے موثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان قوموں پر عذاب نازل کرتا ہے وہ بالآخر بجلی کی کڑک، آسمان کی گرج، زلزلے کی تھرتھراہٹ، آندھی کی گڑگڑاہٹ، دریا کے طوفان، پہاڑ کی آتش فشانی یا دشمن کی تلوار سے ہلاک اور برباد ہو جاتی ہیں۔ یہ سنت الہٰی ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی اور اس میں کبھی کوئی فرق پیدا نہ ہوگا۔ قرآن مجید میں جہاں جہاں یہ لفظ آیا ہے۔ اسی مفہوم میں آیا ہے۔ لفظ سنت کی طرح فطرت کے ساتھ ان لوگوں کا برتاؤ یہی ہے۔ قرآن میں ہے فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ۔ اعجاز کے محال ہونے پر اس آیت کو پیش کرنا قرآن کی کھلی معنوی تحریف ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں فطرۃ اللہ سے توحید مراد ہے جسے قرآن دین فطری سے تعبیر کرتا ہے۔ قرآن کی اس اصطلاح کی تفسیر خود زبان نبوت نے بھی فرمائی ہے۔ ارشاد ہے :

> کوئی بچہ ایسا نہیں جو فطرت پر پیدا نہیں ہوتا لیکن اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی اور مجوسی بنالیتے ہیں جس طرح ہر جانور صحیح و سالم بچہ پیدا کرتا ہے۔ کیا تم نے دیکھا کہ کوئی کان کٹا بچہ بھی وہ جنتا ہے۔ اس کے بعد یہ آیت پڑھی فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ۔ (صحیح بخاری)

بہرحال سنت اللہ اور فطرۃ اللہ کو آڑ بنا کر معجزات کا انکار کرنا قرآن کی نبوت کی اور اسلام کی کوئی خدمت نہیں ہے۔

عقیدہ معجزہ کی قرآنی اصلاح

عام لوگوں میں انبیاء کی نسبت یہ غلط عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ وہ براہ راست عالم کائنات میں تصرف پر قادر ہیں۔ چنانچہ موجودہ انجیلوں کے مصنفوں نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے معجزات کو جس انداز میں پیش کیا ہے۔ اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسٰی کے قبضہ و قدرت میں تھی اور وہ اس میں جیسے چاہتے تھے تصرف کرتے تھے۔ یہی بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے دین حق کی دیوار کج کھڑی کی ہے اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت

اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن نے ان آیات میں نہایت شدت سے اور نہایت اصرار سے باذنی کا اضافہ کر کے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات پیغمبر کی قوت اور ارادہ سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ صاف اور کھلے طور پر یہ ضابطہ بتایا ہے۔

ما کان لرسول ان یاتی بآیۃ الا باذن اللہ

کسی رسول میں یہ قدرت نہیں کہ وہ خدا کی اجازت کے بغیر کوئی معجزہ لاتے۔

انجیل میں حضرت عیسٰی کے معجزات جس عبارت اور لب و لہجے میں بیان ہوتے ہیں ان کا صاف منشا یہ ہے کہ گویا حضرت عیسٰی کو تمام کائنات کی بادشاہی سپرد کر دی گئی ہے اس لیے وہ خاص اپنی قدرت اور اختیار سے جو چاہتے تھے کرتے تھے لیکن قرآن مجید نے حضرت عیسٰی کے تمام معجزات کو بیان کر دیا ہے مگر اسی کے ساتھ اس عقیدہ باطلہ کو بھی رد کرتا گیا ہے اور نہایت تصریح کے ساتھ یہ ظاہر کر دیا ہے کہ جو کچھ تھا خدا کی قدرت سے تھا۔ حضرت عیسٰی کے اختیار سے نہیں۔ قرآن کی اس آیت کو بار بار پڑھیے اور غور فرمایئے کہ قرآن کی راہ کیا ہے۔ قرآن کی اسی تعلیم کا اثر ہے کہ اسلام میں توحید اور نبوت کی حقیقتیں کبھی مشتبہ نہیں ہوئیں۔ اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میں الوہیت کا ادنٰی سا شائبہ بھی مسلمانوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا اور تمام دنیا میں توحید کامل کی علمبرداری صرف اسلام کے سپرد ہوئی۔ اس کے لیے معالم القرآن کی تیسری جلد کا بھی مطالعہ فرمایئے۔ معجزات پر اصولی بحث کے لیے تیرہویں جلد کا انتظار فرمایئے۔

یہودی سازش اور اللہ کا تحفظ

۲۰۹ - اور وہ وقت بھی یاد کرو جب میں نے تم سے بنی اسرائیل کو ہٹا دیا اس وقت جبکہ تم ان کے پاس کھلی نشانیاں لے کر پہنچے تھے انہوں نے ان کو دیکھ کر کہا تھا کہ یہ نشانیاں جادو کے سوا کچھ نہیں یعنی معجزات اور فرق العادت تصرفات کو جادو کہنے لگے اور انجام کار حضرت مسیح کے قتل کے درپے ہوتے۔ حق تعالٰی نے اپنے لطف و کرم سے حضرت مسیح کو آسمان کی طرف اٹھا لیا۔ اس طرح یہود کو ان کے ناپاک مقصد میں کامیاب ہونے سے روک دیا گیا۔[1] اس آیت میں بنی اسرائیل کی ان سازشوں کی طرف اشارہ ہے جو انہوں نے سیدنا مسیح کے قتل اور سُولی کے لیے کیں۔ یہ آیت صراحتہً رفع عیسٰی کو بتا رہی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالٰی یہود کو

[1] افادات شیخ الاسلام

حضرت عیسٰی سے روکنے کو حضرت عیسٰی پر اپنا انعام بتا رہا ہے اور اس کو حضرت کے معجزات میں شمار کر رہا ہے معاذ اللہ اگر حضرت عیسٰی یہودی سازش کا شکار ہو کر تختہ دار پر لٹک جائیں تو اس صورت میں نہ کوئی اعجاز ہوگا اور نہ امتنان۔ یعنی اگر یہودی سازش کو ناکام کر کے حضرت عیسٰی کو اللہ سبحانہ نے صلیب اور قتل سے حفاظت نہ کی ہوتی و اصد روز قیامت اس کا احسان نہ جتاتا کیونکہ اس سے خدا کا کذب لازم آتا ہے تعالیٰ اللہ عما یقول الظالمون۔ اصل ارشاد میں کففت آیا ہے یعنی میں نے بنی اسرائیل کو تم سے روک دیا۔ قرآن میں اسی قسم کی تعبیر اہل ایمان کے لیے آئی ہے۔

اذ ھم قوم ان یبسطوا الیکم ایدیھم فکف ایدیھم عنکم

جب کافروں نے تمہاری طرف دست درازی کا ارادہ کیا تو اللہ نے ان کے ہاتھوں کو تم سے روک دیا۔

اس آیت میں اس یہودی سازش کی طرف اشارہ ہے جو حضور انور کے خلاف انہوں نے کی تھی حضرت عبداللہ بن عباس نے بتایا ہے کہ یہودیوں کے ایک گروہ نے حضور انور اور آپ کے خاص خاص صحابہ کرام کو کھانے کی دعوت پر بلایا اور پوشیدہ طور پر یہ سازش کی تھی کہ اچانک ان پر ٹوٹ پڑیں گے اور اس طرح اسلام کی جان نکال دیں گے لیکن عین وقت پر اللہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مطلع کر دیا۔ آپ دعوت پر تشریف نہ لے گئے۔ اس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کے ہاتھوں کو روک دیا۔ ٹھیک اسی طرح یہودیوں نے حضرت کو مارنے کی سازش کی اور اللہ تعالیٰ نے یہود کو حضرت سے روک دیا۔ دونوں معجزے ہیں۔ ایک محمد رسول اللہ کا اور دوسرے عیسٰی رسول اللہ کا دونوں کی روح ایک ہے اور دونوں کا انداز بیان ایک ہے حضرت عیسٰی کو خطاب کر کے فرمایا یا عیسٰی ابن مریم اذکر نعمتی علیک اور اہل ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا یا ایھا الذین آمنوا اذکروا نعمۃ اللہ علیکم حضرت کو فرمایا کففت عنک بنی اسرائیل اور اہل ایمان سے کہا اذ ھم قوم ان یبسطوا الیکم ایدیھم فکف ایدیھم عنکم۔ جیسے اس واقعہ میں حضور انور کو کوئی گزند نہیں پہنچا۔ ٹھیک اسی طرح حضرت مسیح کو بھی یہودیوں کی جانب سے کوئی تکلیف نہ پہنچی۔

یہاں حضرت عیسٰی پر امتنان کے موقع پر اس فقرے میں بہت گہری معنوی بلاغت ہے۔ اول سنجات کی تعبیر کو چھوڑ کر کف کی تعبیر اختیار کی۔ یعنی یہ نہیں فرمایا اذ نجیتک من بنی اسرائیل ثانیاً کففت کا مفعول بنی اسرائیل کو بنایا یہ نہیں فرمایا کففتک عن بنی اسرائیل ہٹا دیا میں نے تجھے بنی اسرائیل سے بلکہ فرمایا کففت بنی اسرائیل عنک میں نے بنی اسرائیل کو تیرے سے ہٹا دیا۔ کیونکہ حضرت عیسٰی کو نقصان پہنچانا یہودی چاہتے تھے اس لیے ان ہی کو ہٹا دینے کا ذکر مناسب تھا۔ اس طرح یہ

آیت قرآن کی دوسری آیت کی تفسیر ہے جو اسی موضوع پر جلد سوم میں گزر چکی ہے یعنی ومطہرك من الذین کفروا۔ اس میں بھی تطہیر سے مراد یہی ہے کہ حضرت عیسٰی یہودیوں کے ہاتھ سے پاک رہیں گے ۔تمام شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح میں یہی بات لکھی ہے کہ اللہ سبحانہ ٗ نے حضرت عیسٰی کو یہود کے ہاتھوں میں گرفتاری سے محفوظ رکھا ہے ۔ ابن جریر، ابن کثیر، ابوحیان اندلسی، الوسی بغدادی، رازی، قرطبی اور حال کے مفسرین میں سے سید رشید رضا، المراغی، اور سید قطب نے یہی بات لکھی ہے ۔ الغرض یہ ایک تاریخی حقیقت ہے جس کی طرف یہاں قرآن نے اشارہ کیا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت عیسٰی کے قتل کی بار بار کوشش کی اور ہر دفعہ اس لیے ناکام رہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کو حضرت عیسٰی سے ہٹائے رکھا ۔ انجیل میں بھی ایسی تصریحات موجود ہیں ۔

ساحر اور پیغمبر میں فرق و امتیاز

آخر میں فرمایا کہ بنی اسرائیل نے حضرت عیسٰی کے ان اعجازی کارناموں کو سحر اور جادو کہا ہے ۔حالانکہ سحر و شعبدہ میں صرف دل لگی کے وقتی تماشے ہوتے ہیں لیکن معجزات و آیات قوموں اور جماعتوں کے صلاح و فساد، تعمیر و تخریب، ترقی و تنزل کے اسباب و وسائل ہوتے ہیں ۔ ساحر کا مقصد کسی غیر معمولی واقعہ کا صرف حیرت انگیز طریقہ سے اظہار ہوتا ہے تاکہ دیکھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لیے متحیر کر دے لیکن پیغمبر کا مقصد اپنے ان حیرت انگیز اعمال سے دنیا کی اصلاح ۔ قوموں کی دعوت، جماعتوں کی تہذیب اور دین الٰہی کی تقویت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا ۔ پیغمبر بشیر نذیر، ہادی اور مزکی ہوتا ہے، ساحران تمام اوصاف سے خالی ہوتا ہے اور حیرت انگیز تماشہ گری کے سوا کوئی اور بات اس کے اندر نہیں ہوتی ۔

ساحر صرف کچھ انسانوں میں تصرف کر سکتا ہے چاہے وہ نظر بندی کی حد تک ہو یا اس سے زیادہ بیماری اور ہلاک کرنے کی حد تک بھی ہو ۔ پھر ساحر کی زندگی ہمیشہ ایک پست زندگی ہوتی ہے ۔اس کا نصب العین صرف معاشی مسئلہ ہوتا ہے ۔ آخرت کی لازوال زندگی ساحر کے دائرہ فکر میں بھی نہیں ہوتی ہے ۔ وہ اپنے عملیات میں ہمیشہ ارواح خبیثہ اور شیاطین کا آسرا تلاش کرتے ہیں ۔ اس کے مقابلے میں انبیاء کا مطالعہ کرو تو آپ محسوس کریں گے کہ ان کی تمام تر زندگی تقویٰ طہارت، عفت و پاکیزگی اور اخلاق و مروت کا مرقع ہوتی ہے ۔ان کا نصب العین آخرت کی فوز و فلاح اور انسانی زندگی کی آراستگی ہوتا ہے ۔ ان کے اعجازی کارناموں کا جو بھی مقابلہ کرتا ہے وہ شکست سے دوچار ہوتا ہے ۔ ساحر سحر سے حواس کو معطل کرتا ہے اور نبوت اعجاز سے معطل شدہ حواس کو بیدار کرتی ہے ۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ نبی اور ساحر میں

زمین و آسمان کا فرق ہے بلکہ ان میں کوئی وجہ مشترک ہی نہیں ہے۔ ان دونوں میں خبیر، مخبر اور غایت ہر لحاظ سے فرق ہے۔ نبی کو خبر دینے والی اللہ کی ذات ہوتی ہے اور ساحر کو شیطان۔ نبی کی وحی سرتاسر ہدایت ہوتی ہے اور شیطان کی کار فرمائی سراپا ضلالت۔ نبی کی بات میں صداقت ہی صداقت اور حقیقت ہی حقیقت ہوتی ہے اور ساحر کا کلام بیشتر جھوٹ کا پشتارہ اور بے معنی باتوں کی ملمع کاری اور صرف خیال ہی خیال ہوتا ہے۔

بہرحال یہ تمام باتیں روزِ قیامت حضرت عیسٰی کو مخاطب اللہ تعالیٰ نصاریٰ پر حجت تمام کرنے کے لیے فرمائے گا حضرت عیسٰی کی موجودگی میں نصاریٰ پر یہ حقیقت واضح کر دی جائے گی کہ حضرت عیسٰی اور ان کی والدہ پر جو بھی انعام ہوا ہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوا ہے۔ انہوں نے جو معجزے بھی دکھائے ہیں سب اللہ کے اذن اور حکم سے دکھائے اور یہودیوں نے حضرت عیسٰی کو جن خطرات میں ڈالا ہے ان سے اللہ تعالیٰ ہی نے محفوظ رکھا۔ حضرت عیسٰی اللہ کی عنایات سے صاحبِ کمال ہیں خالقِ کمال نہیں۔ خالقِ کمال صرف اللہ کی ذات ہے۔ عبادت صاحبِ کمال کی نہیں بلکہ خالقِ کمال کی کی جاتی ہے۔ پھر سب کچھ اللہ نے کیا اور اس کے سب بڑے گواہ خود حضرت عیسٰی ہیں تو نصاریٰ بتائیں کہ انہوں نے کس کے کہنے سے ان کو معبود بنایا تھا۔ یہاں باذنی کی تکرار اسی نکتہ کو سمجھانے کے لیے نہایت بلیغ ہے۔

وَاِذْ اَوْحَيْتُ اِلَى الْحَوَارِيّٖنَ اَنْ اٰمِنُوْا بِيْ وَبِرَسُوْلِيْ ۚ قَالُوْٓا اٰمَنَّا
وَاشْهَدْ بِاَنَّنَا مُسْلِمُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ اِذْ قَالَ الْحَوَارِيُّوْنَ يٰعِيْسَى ابْنَ
مَرْيَمَ هَلْ يَسْتَطِيْعُ رَبُّكَ اَنْ يُّنَزِّلَ عَلَيْنَا مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ ؕ قَالَ
اتَّقُوا اللّٰهَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾ قَالُوْا نُرِيْدُ اَنْ نَّاْكُلَ مِنْهَا وَ
تَطْمَئِنَّ قُلُوْبُنَا وَنَعْلَمَ اَنْ قَدْ صَدَقْتَنَا وَنَكُوْنَ عَلَيْهَا مِنَ
الشّٰهِدِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ عِيْسَى ابْنُ مَرْيَمَ اللّٰهُمَّ رَبَّنَآ اَنْزِلْ عَلَيْنَا
مَآئِدَةً مِّنَ السَّمَآءِ تَكُوْنُ لَنَا عِيْدًا لِّاَوَّلِنَا وَاٰخِرِنَا وَاٰيَةً مِّنْكَ ۚ
وَارْزُقْنَا وَاَنْتَ خَيْرُ الرّٰزِقِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالَ اللّٰهُ اِنِّيْ مُنَزِّلُهَا
عَلَيْكُمْ ۚ فَمَنْ يَّكْفُرْ بَعْدُ مِنْكُمْ فَاِنِّيْٓ اُعَذِّبُهٗ عَذَابًا لَّآ اُعَذِّبُهٗٓ اَحَدًا
مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور جب میں نے حواریوں کو الہام کیا کہ مجھ پر اور میرے
رسول پر ایمان لاؤ، انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے اور

خدایا تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں[۲۱۰] - یہ بھی یاد رکھو کہ جب حواریوں نے
کہا تھا کہ اے عیسٰی ابن مریم کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے
کھانے کا ایک خوان اتار سکتا ہے۔ عیسٰی نے کہا کہ خدا سے ڈرو
اگر تم مومن ہو[۲۱۱]- انہوں نے کہا کہ بس ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان
سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں پتہ لگ جائے
کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں[۲۱۲]-
اس پر عیسٰی ابن مریم نے دُعا کی خدایا ہمارے رب ہم پر آسمان
سے ایک خوان روانہ کر دے کہ اس کا آنا ہمارے اگلوں اور پچھلوں
کے لیے عید قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو اور
دے تو ہم کو تو بہترین دینے والا ہے[۲۱۳] - اللہ نے فرمایا میں تمہارے
لیے خوان روانہ کروں گا، لیکن جو شخص اس کے بعد انکار کرے
گا اسے عذاب دوں گا- ایسا عذاب کہ تمام دنیا میں کسی کو بھی

ویسا عذاب نہیں دوں گا۔[۲۱۴]

نزولِ مائدہ کے بارے میں درخواست

چونکہ حواریوں کا ذکر آگیا تھا اس لیے بطور جملہ معترضہ کے یہاں حواریوں ہی کے متعلق ایک اور واقعہ کی طرف بھی اشارہ کر دیا گیا جس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ حضرت مسیح سے براہِ راست جن شاگردوں نے تعلیم پائی تھی وہ حضرت مسیح کو ایک انسان اور محض خدا کا بندہ سمجھتے تھے اور ان کے وہم و گمان میں بھی اپنے مرشد کے خدا یا شریکِ خدا ہونے کا تصور نہ تھا۔ نیز یہ کہ مسیح نے خود بھی اپنے آپ کو ان کے سامنے ایک بندۂ بے اختیار کی حیثیت سے پیش کیا تھا۔

نبوت کی زندگی علم و عمل کا مجموعہ ہوتی ہے اور اس کے تمام ارشادات و تعلیمات سے صرف انہی دونوں کی ترقی اور تکمیل مقصود ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے نبوت کے بعض معجزات کا اثر صرف علم و یقین پر پڑتا ہے۔ اس سے کوئی نتیجہ مرتب نہیں ہوتا، جیسے ہاتھ کا چمک اٹھنا، چاند کا شق ہونا، لاٹھی کا سانپ بن جانا، مادر زاد اندھے کا بینا ہو جانا۔ برص کے بیمار کا تندرست ہو جانا، مردوں کا زندہ ہو جانا، یہ اگرچہ نہایت عظیم الشان معجزے ہیں لیکن ان کا نتیجہ صرف اس قدر ہے کہ ایک گروہ ایمان لایا اور دوسرے نے انکار کیا۔ نبوت کے کچھ معجزے ایسے ہوتے ہیں جن سے نہایت عظیم الشان عملی نتائج ظاہر ہوتے ہیں مثلاً عصا کے سانپ بن جانے سے بنی اسرائیل کو کوئی عملی فائدہ نہ پہنچ سکا لیکن اس کے ذریعے سے پانی کا جو چشمہ اُبلا وہ ان کے لیے حیات بخش ثابت ہوا۔ پہلی قسم کے معجزات کو قرآن میں حجت، برہان اور سلطان کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہ ان سے علم و یقین کو ترقی ہوتی ہے اور دوسرے قسم کے معجزات کو اس نے تائید اور نصرت الٰہی کہا ہے۔ پہلی قسم کے معجزات طلب اور سوال کے محتاج ہوتے ہیں لیکن تائید اور نصرت الٰہی اس کی پابند نہیں ہوتی۔

آغازِ نبوت میں چونکہ انبیاء صرف عقائد کی تعلیم دیتے ہیں اور کفار کی طرف سے انہی عقائد کا انکار کیا جاتا ہے اور انہی کے اثبات پر دلیل طلب کی جاتی ہے۔ اس لیے اوّل انبیاء سے اسی قسم کے معجزات کا ظہور ہوتا ہے جن کا اثر علم و یقین پر پڑتا ہے۔ اس کے بعد انبیاء کی تعلیم و ہدایت سے مومنین مخلصین کا ایک گروہ پیدا ہوتا ہے جو عموماً مفلوک الحال، خانہ بدوش، بے سروسامان اور بے یار و مددگار ہوتا ہے

یہ گروہ اگرچہ صفائے باطن خلوص نیت شدت ایمان کی بنا پر کسی معجزے کا خواستگار نہیں ہوتا۔ تاہم تائید الٰہی خود اس کی طلب گار ہوتی ہے اور ہر موقع پر اس کی حفاظت اور تائید کرتی ہے۔ عام معجزات اور نصرت الٰہی میں یہ فرق ہے کہ جو معجزات بطور حجت و برہان پیش کیے جاتے ہیں وہ صرف انبیا کی تنہا روحانی طاقت کا فیضان ہوتے ہیں۔ یعنی ان کا یہ فیضان سبب ہوتا ہے ارادہ الٰہی کے ظہور کا لیکن نصرت الٰہی میں پیغمبر کی روحانی طاقت کے ساتھ مومنین کے کمال ایمان، شدت یقین، تزکیۂ نفس اور استعداد قلب کی شرکت بھی ہوتی ہے۔ چنانچہ یہاں حواریین مسیح نے جب فاقہ کی حالت میں نزول مائدہ کی درخواست کی تو انہوں نے ان کو تقویٰ اختیار کرنے کی تعلیم دی۔

۱۱۰ - اور جب میں نے حواریوں کو الہام کیا کہ مجھ پر اور میرے رسول پر ایمان لاؤ۔ انہوں نے کہا کہ ہم ایمان لے آئے اور خدایا تو گواہ رہ کہ ہم مسلم ہیں۔ یعنی میرے اس انعام کو بھی یاد کرو کہ جب بنی اسرائیل کی رائے عامہ تمہاری تکذیب کر رہی تھی تو میں نے حواریین کے دل میں یہ بات ڈالی کہ وہ تجھ پر ایمان لائیں اور اس ماحول میں تیرے موید و ناصر بن کر کھڑے ہوں۔ ایمان کو دل میں ڈالنے کا خصوصی طور پر یہ جتانے کے لیے تذکرہ کیا کہ حواریوں کا تجھ پر ایمان لانا بھی ہمارے فضل و توفیق کا نتیجہ تھا ورنہ تجھ میں تو اتنی طاقت بھی نہ تھی کہ اس آبادی میں ایک تصدیق کرنے والا بھی اپنے بل بوتے پر پیدا کر لیتا۔

اصل ارشاد میں اوحیت آیا ہے۔ وحی کا لفظ یہاں اصطلاحی معنے میں نہیں ہے بلکہ لغوی معنے میں ہے یعنی دل میں کوئی ارادہ ڈالنا، حواری پر کچھ اجمالی بحث معالم القرآن کی تیسری جلد میں پڑھ چکے ہو۔ وہاں یہ واضح ہو چکا ہے کہ یہی حواریین ہیں جو پوری قوم کے اندر سے حضرت عیسٰی پر ایمان لاتے تھے۔ انہوں نے دعوت کے کام میں آپ کی مدد کی اور ان سچے انتخاب کے خلیفہ کی حیثیت حاصل ہوتی قرآن نے ان کا جو تیسرے پارے میں اس پارہ میں اور اٹھائیسویں پارے میں پیش کیا ہے۔ قرآن نے جس انداز میں ان بزرگوں کو اچھے انداز میں پیش کیا ہے انا جیل میں اسی قدر ان کو غلط اور بھونڈے انداز میں روشناس کرایا گیا ہے۔ آئیے یہاں دونوں کا تقابلی مطالعہ کر لیجئے۔

حواریین مسیح کا قرآن وانا جیل میں چہرہ

قرآن عزیز نے عیسٰی کے حواریوں کے مناقب بیان کیے۔ سورۂ آل عمران میں پڑھ چکے ہو کہ حضرت مسیح نے جب دین حق کی نصرت و یاری کے لیے پکارا تو ان ہی حواریین نے نحن انصار اللہ کا نعرہ بلند کیا اور یہی

وہ پاک ہستیاں ہیں کہ جب اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے کونوا انصار اللہ کی ترغیب دی تو تذکیر بایام اللہ کے پیش نظر ان ہی مقدس ہستیوں کا ذکر کیا اور ان ہی کی مثال اور نظیر دے کر نصرت حق کے لیے آمادہ کیا۔ مگر اس کے برعکس اناجیل کا حال یہ ہے کہ ان کو بزدل اور منافق ثابت کرتی ہیں۔ انجیل یوحنا میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مشہور و معتمد حواری یہودا کے متعلق اس وقت کا حال جب حضرت مسیح کو یہودی گرفتار کرنا چاہتے تھے اس طرح مذکور ہے۔

یہ باتیں کہہ کر یسوع اپنے دل میں گھبرایا اور یہ گواہی دی کہ میں تم سے سچ سچ کہتا ہوں کہ تم میں سے ایک شخص مجھے پکڑوائے گا۔ شاگرد شبہ کر کے کہ وہ کس کی نسبت کہتا ہے ایک دوسرے کو دیکھنے لگے۔ ایک شخص جس سے یسوع محبت کرتا تھا اس نے یسوع کی چھاتی کا سہارا لے کر کہا کہ اے خداوند وہ کون ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ جسے میں نوالہ ڈبو کر دے دوں گا وہی ہے۔ پھر اس نے نوالہ ڈبویا اور لے کر شمعون اسکریوتی کے بیٹے یہودا کو دیا۔ اس نوالہ کے بعد اس میں شیطان سما گیا۔ باب ۱۳۔ آیت ۲۱-۲۷۔

اور انجیل متی میں اس شمعون پطرس حواری کے متعلق جو بقول اناجیل ساری عمر حضرت مسیح کا پیارا اور معتمد رہا لکھا ہے کہ:

شمعون پطرس نے اس سے کہا اے خداوند تو کہاں جاتا ہے۔ یسوع نے جواب دیا کہ جہاں میں جاتا ہوں اب تو میرے پیچھے نہیں آ سکتا مگر بعد میں میرے پیچھے آئے گا۔ پطرس نے اس سے کہا اے خداوند میں اب تیرے پیچھے کیوں نہیں آ سکتا میں تو تیرے لیے اپنی جان دوں گا۔ یسوع نے جواب دیا کیا تو میرے لیے اپنی جان دے گا۔ میں تجھ سے سچ سچ کہتا ہوں کہ مرغ بانگ نہ دے گا جب تک تو تین بار میرا انکار نہ کرے گا۔

اور اسی متی انجیل میں تمام شاگردوں حواریوں کی بزدلی اور حضرت مسیح کو بے یار و مددگار چھوڑ کر فرار ہو جانے کا ذکر اس طرح کیا گیا ہے۔

اس پر سب شاگرد اسے چھوڑ کر بھاگ گئے۔

یہ تو حواریوں کے بارے میں اناجیل کا بیان ہے مگر قرآن کی شہادت یہ ہے من انصاری الی اللہ کہ حضرت مسیح نے اپنے حواریوں کو دین حق کی نصرت کے لیے پکارا تو سب نے اولوالعزمی اور فداکارانہ جذبے کے ساتھ یہ جواب دیا کہ نحن انصار اللہ اور پھر حضرت مسیح کے سامنے اپنے استقامت دین اور اپنے مخلصانہ ایمان کے متعلق شہادت دے کر نصرت کا پورا پورا یقین دلایا۔

انجیل و قرآن کے اس تقابلی مطالعہ کو دیکھ کر ہر ایک انصاف پسند یہ گواہی دے گا کہ قرآن کی راہ حق و صواب کی راہ ہے اور انجیل کی راہ مسیح کے صلب اور تثلیث کے گھروندے کو قائم کرنے کی ایک ناروا کوشش ہے اور اس آیت نے یہ بھی فیصلہ کر دیا کہ حواریین نے جس دین کو قبول کیا تھا وہ مجوسیت اور نصرانیت نہیں بلکہ اسلام ہے۔

خوانِ نعمت کی فرمائش

۱۱۲ - یہ بھی یاد رکھو کہ جب حواریوں نے کہا تھا کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا آپ کا رب ہم پر آسمان سے کھانے کا ایک خوان اتار سکتا ہے عیسیٰ نے کہا کہ خدا سے ڈرو اگر تم مومن ہو۔ "کر سکتا ہے" اس لیے کہا کہ آپ کی رعایت اور دعا سے ہمارے لیے بطور خرقِ عادت نہ معلوم ایسا کرے یا نہ کرے۔ آسمان کی طرف سے بے محنت روزی پہنچ جایا کرے۔ یہ ضروری نہیں کہ وہ خوان جنت ہی کا ہو۔ حضرت عیسیٰ نے فرمایا کہ اتقواللہ یعنی ایماندار بندے کو لائق نہیں ہے کہ ایسی غیر معمولی فرمائشیں کر کے خدا کو آزمائے خواہ اس کی طرف سے کتنی مہربانی کا اظہار ہو۔ روزی ان ہی ذرائع سے طلب کرنی چاہیے جو قدرت نے اس کی تحصیل کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔ بندہ جب خدا سے ڈر کر تقویٰ اختیار کرے تو اسی پر ایمان و اعتماد رکھے تو حق تعالیٰ ایسی جگہ سے رزق دیتے ہیں جہاں سے وہم و گمان بھی نہیں ہوتا۔ و من یتق اللہ یجعل لہ مخرجا ویرزقہ من حیث لا یحتسب [1]

آیت میں تین باتیں تشریح طلب ہیں۔ اوّل یہ کہ حواریین نے حضرت مسیح کو یا عیسیٰ ابن مریم سے خطاب کیا ہے۔ دوسرے یہ کہ مائدہ کے اتارنے کی درخواست حواریوں نے حضرت مسیح سے نہیں کی بلکہ یہ کہا کہ هل یستطیع ربک، تیسرے یہ کہ حضرت مسیح نے ان کی اس قسم کی درخواست کو خلافِ ادب قرار دیا ہے۔

یا عیسیٰ ابن مریم کہہ کر حواریین کا حضرت مسیح کو مخاطب کرنا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ حضرت مسیح کی الوہیت کا کوئی تصور حواریین کے ذہن میں نہ تھا۔ وہ اللہ تعالیٰ ہی کو حضرت عیسیٰ اور تمام کائنات کا رب مانتے تھے۔ ان کے یہاں حلول اور تثلیث کا کوئی تصور نہ تھا۔ انجیل میں حضرت مسیح کے لیے حواری ربی اور خداوند کے الفاظ ضرور بولتے ہیں لیکن یہ استاد کے معنے میں ہیں انجیل متی میں ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا:

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مگر تم ربی نہ کہلاؤ کیونکہ تمہارا استاد ایک ہی ہے اور تم سب بھائی ہو اور زمین پر کسی کو اپنا باپ نہ کہو۔ کیونکہ تمہارا باپ ایک ہی ہے جو آسمانی ہے اور نہ تم ہادی کہلاؤ۔ کیونکہ تمہارا ہادی ایک ہی ہے یعنی مسیح۔ متی ۲۳ - ۸ تا ۱۰۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ حواری حضرت مسیح کو ربی یا خداوند کہتے تھے وہ استاد اور ہادی کے معنے میں کہتے تھے۔ معبود اور الٰہ کے معنے میں نہیں لہٰذا اس لفظ سے تو اس پر استدلال نہیں کیا جاسکتا کہ وہ حضرت مسیح کو خدا سمجھتے تھے اور اس ایک لفظ کے سوا کوئی ایک حرف بھی ایسا موجود نہیں ہے جس سے عقیدہ تثلیث یا حلول کا کوئی اشارہ ملتا ہو۔ اس کے برعکس ایسی واضح عبارتیں ضرور ملتی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضرت مسیح حواریوں کے نزدیک ایک پیغمبر تھے اور بس، حضرت پطرس حواریوں میں بلند ترین مقام کے حامل ہیں وہ ایک بار یہودیوں کے سامنے تقریر کرتے ہوئے ارشاد فرماتے ہیں ،

اے اسرائیلیو! یہ باتیں سنو کہ یسوع ناصری ایک شخص تھا جس کا خدا کی طرف سے ہونا تم پر ان معجزوں اور عجیب کاموں اور نشانوں سے ثابت ہوا جو خدا نے اس کی معرفت تم میں دکھائے چنانچہ تم آپ ہی جانتے ہو۔"

(اعمال ۲ ، ۲۲)

اور آگے ایک موقع پر فرماتے ہیں :

ابرہام اور اسحاق اور یعقوب کے خدا یعنی ہمارے باپ دادے کے خدا نے اپنے خادم یسوع کو جلال دیا۔ (اعمال ۳ - ۱۳)

اور کتاب اعمال ہی میں ہے کہ ایک مرتبہ تمام حواریوں نے ایک زبان ہو کر خدا سے مناجات کرتے ہوئے کہا۔

کیونکہ واقعی تیرے پاک خادم یسوع کے برخلاف جسے تو نے مسیح کیا ہیرودیس اور پنطیس، پیلاطس غیر قوموں اور اسرائیلیوں کے ساتھ اسی شہر میں جمع ہوئے۔

(اعمال ۴ - ۲۷)

اس کے علاوہ ایک موقع پر برناس حواری کہتے ہیں۔

دلی ارادے سے خداوند سے لپٹے رہو کیونکہ وہ نیک مرد روح القدس اور ایمان سے معمور تھا۔ (اعمال ۱۱ ، ۲۳ ، ۲۴)

اس میں بھی حضرت مسیح کو صرف نیک مرد اور مومن کہا گیا ہے۔

یہ تمام عبارتیں پوری صراحت کے ساتھ اس حقیقت کو آشکارا کرتی ہیں کہ حواریین حضرت مسیح کو ایک شخص اور خدا کی طرف سے پیغمبر اور اللہ کا خادم اور مسیح سمجھتے تھے۔

دوسری بات کہ حواریوں نے مائدہ کے آنے کا مطالبہ حضرت مسیح سے نہیں کیا یہ اس بات کا پتہ دیتی ہے کہ حواری حضرت مسیح کو بالذات معجزے دکھانے والا نہیں سمجھتے تھے بلکہ ان کو صرف ان کے ظہور کا ذریعہ سمجھتے تھے چنانچہ انہوں نے مائدہ آسمانی جانے کے لیے جو درخواست کی وہ حضرت عیسیٰ سے نہیں کی بلکہ یہ درخواست کی کہ اگر یہ بات آپ کے خدا کی حکمت کے خلاف نہ ہو تو آپ اللہ سے درخواست کیجیے کہ وہ ہمارے لیے مائدہ اتار دے۔

اصل ارشاد میں هل یستطیع ربك ان ینزل کے الفاظ آتے ہیں۔ عام شارحین قرآن نے اس کا ترجمہ یوں کیا ہے کیا تیرا رب کر سکتا ہے کہ اتارے، یہ تعبیر دعویٰ ایمان کے ساتھ عام شارحین ذہن پر گراں ہوتی ہے اس کے انہوں نے متعدد جواب دیے ہیں۔ کچھ نے کہا کہ مطلب یہ ہے کہ اے عیسیٰ ابن مریم کیا خداوند عالم آپ کے طفیل میں آپ کے خادموں کے لیے اپنے عام دستور اور عادت کے خلاف آسمان سے خوان نعمت اتار سکتا ہے۔ ہم تو اس قابل نہیں ہیں کہ ہمارے لیے آسمان سے خوان اتارا جائے۔ ہاں یہ ممکن ہے کہ آپ جیسی برگزیدہ ہستی بارگاہ خدا میں یہ سوال کرے اور قبول ہو جائے تو آپ کے طفیل ہماری یہ آرزو پوری ہو جائے۔

اس صورت میں عبارت یوں ہو گی هل تستطیع سوال ربك کیا آپ اپنے رب سے سوال کر سکتے ہیں اس کی تائید اس قرأت سے بھی ہوتی ہے جو حضرت علی، حضرت عائشہ، حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت معاذ جیسے علماء صحابہ سے منقول ہے یعنی هل تستطیع ربك کیا آپ اپنے رب سے یہ سوال کر سکتے ہیں۔ گویا ان کا سوال خدا کے کر سکنے کا نہیں بلکہ حضرت مسیح کے سوال کر سکنے کا ہے۔

اور کچھ کہتے ہیں کہ حواریین کا سوال خدا کی قدرت سے متعلق نہیں بلکہ اس کی حکمت سے متعلق ہے کہ اس قسم کی کھلی ہوئی نشانی دکھانا اس کی حکمت کا تقاضا بھی ہو گا یا نہیں۔ حواریین باایمان لوگ تھے وہ اس حقیقت سے یقیناً باخبر ہوں گے کہ ان کی یہ درخواست بنی اسرائیل کے خدا کو دیکھنے کے مطالبہ سے مشابہ ہے۔

اور کچھ کا خیال ہے کہ یہاں استطاعت اطاعت کے معنے میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ کیا آپ کا رب آپ کی یہ بات مانے گا اور آپ کی یہ دعا قبول کرے گا اگر تو اسے ایک درجہ کا تکلف ہی قرار دیتے

ہیں لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہاں استطاعت ایسا ہے جیسے استجابت، اگر اجابت اور استجابت درست ہے تو اطاعت اور استطاعت میں بھی کوئی قباحت نہیں ہے۔ علامہ سید رشید رضا نے اسی کو ترجیح دی ہے۔

تیسری بات آیت سے یہ معلوم ہوئی کہ حضرت مسیح نے ان کی اس درخواست کو خلاف ادب قرار دیا ہے اور فرمایا اتقوا اللہ ان کنتم مومنین یعنی تمہارا یہ سوال اوّل تو خلاف ادب ہے۔ اس قسم کی فرمائشیں معاندین کا طریقہ ہے اور پھر اس سوال سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ تمہیں میری نبوت و رسالت میں شک ہے۔ گویا اس سوال سے مترشح ہوتا ہے کہ تم اپنے ایمان کو معجزات و خوارق کے مشاہدے پر موقوف رکھنا چاہتے ہو۔ یہ شک و تردد کی علامت ہے۔ مومن صادق کے شایان شان نہیں ہے کہ اپنے مولیٰ کو آزماتے یا یہ مطلب ہے کہ مومن کی شان یہ ہے کہ کام کرے اور محنت کرے اور اپنی معاش کے لیے تگ و دو کرے۔ خوارق کے ذریعے معاش کے مسائل حل کرنا مومن کو زیب نہیں دیتا ہے۔ یہ سن کر حواریوں نے جواب دیا۔

نزول مائدہ کے لیے اصرار

۱۱۲۔ انہوں نے کہا کہ بس ہم یہ چاہتے ہیں کہ اس خوان سے کھائیں اور ہمارے دل مطمئن ہوں اور ہمیں پتہ لگ جائے کہ آپ نے جو کچھ فرمایا ہے وہ سچ ہے اور ہم اس پر گواہ ہوں۔ یعنی آزمانے کو نہیں مانگتے بلکہ برکت کی اُمید پر مانگتے ہیں کہ غیب سے بے محنت روزی ملتی رہے تاکہ اطمینان قلب اور دلجمعی سے عبادت میں لگے رہیں اور آپ نے جو غیبی خبریں نعمائے جنت وغیرہ کے متعلق دی ہیں ایک چھوٹا سا نمونہ دیکھ کر ان کا بھی یقین کامل ہو جاتے اور ایک عینی شاہد کے طور پر ہم اس کی گواہی دیں جس سے یہ معجزہ ہمیشہ مشہور رہے۔ بعض مفسرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے وعدہ فرمایا تھا کہ تم خدا کے لیے تیس روزے رکھ کر جو کچھ طلب کرو گے وہ دیا جائے گا۔ حواریین نے روزے رکھ لیے اور مائدہ طلب کیا و نعلم ان قد صدقتنا سے یہی مراد ہے۔ واللہ اعلم[1]

اس آیت میں حواریین نے اپنی طلب کے تین فائدے بتائے اوّل یہ کہ ضرورت کے وقت میں ہم اسے کھائیں گے اور اس طرح ہم روزی کمانے کی فکر سے آزاد ہو جائیں گے کیونکہ جو رزق آسمان سے آئے گا وہ سراسر بابرکت ہوگا اور اس کے کھانے سے ظاہری اور باطنی شفا اور صحت حاصل ہوگی۔ اور اللہ کی عبادت اور طاعت میں قوت کا ذریعہ بنے گا۔ دُنیا کے رزق سے بعض اوقات طبیعت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں معصیت کا داعیہ پیدا ہوتا ہے مگر جو رزق آسمان سے نازل ہوگا وہ دل میں اللہ کی طاعت اور بندگی ایسا جوش و ولولہ پیدا کرے گا کہ ہم میں رنگ ملائکہ پیدا ہو جائے گا۔ دوسرے کہ ہمارے دل مطمئن ہو جائیں یعنی ہم چاہتے ہیں کہ عالم غیب کے بارے میں ہم جو کچھ مانتے ہیں اس معجزہ کے مشاہدے سے اس کے بارے میں ہمارے دلوں میں سکون و اطمینان حاصل ہو جائے۔ تیسرے یہ کہ ہمیں پتہ لگ جائے کہ نتائج ایمان کے بارے میں آپ نے جو کچھ ہم سے کہا ہے وہ حقیقت اور امر واقعہ ہے۔ اگرچہ استدلالی طریقہ پر آپ کی صداقت کا ہمیں پہلے ہی یقین ہے مگر ہم نظریاتی علم کے ساتھ علم شہودی سے اپنے ایمان و یقین میں اضافہ چاہتے ہیں، چوتھے یہ کہ ہم بنی اسرائیل کے سامنے گواہی دیں اور آپ کی نبوت و رسالت کو ثابت کر سکیں۔

نزول مائدہ کے بارے میں حواریین کی زبان سے مصالح کی یہ فہرست سننے کے بعد حضرت مسیح کا جواب کیا تھا قرآن کہتا ہے۔

نزول مائدہ کے لیے حضرت عیسیٰ کی دعا

۲۱۳۔ عیسیٰ ابن مریم نے کہا خدایا ہمارے رب ہم پر آسمان سے ایک خوان روانہ کر دے کہ اس کا آنا ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے عید قرار پائے اور تیری طرف سے ایک نشانی ہو اور دے تو ہم کو تو بہترین دینے والا ہے۔ یعنی وہ دن جس میں مائدہ آسمانی نازل ہو ہمارے اگلے اور پچھلوں کے حق میں عید ہو جائے کہ ہمیشہ ہماری قوم اس دن کو بطور یادگار تہوار منایا کرے۔ اس تقریر کے موافق تکون عیدا لاولنا کا اطلاق ایسا ہوا جیسا آیت الیوم اکملت لکم دینکم کے متعلق بخاری میں یہود کا یہ مقولہ نقل کیا ہے انکم تقرءون هذه الايته لو نزلت فينا لا تخذ نا ها عيدًا ۔ جس طرح آیت کو عید منانے کا مطلب اس کے یوم نزول کو عید بنانا ہے کما ہو مصرح فی الروایات الأخر۔ اسی پر مائدہ کے عید ہونے کو قیاس کر لو۔ کہتے ہیں کہ وہ خوان اترا اتوار کو جو نصاریٰ کے یہاں ہفتہ کی عید تھی جیسے مسلمانوں کے یہاں جمعہ۔ آیۃ منک کا مطلب ہے کہ یہ نزول مائدہ تیری قدرت اور میری نبوت اور صداقت کی نشانی ہو۔ آخر میں وارزقنا فرمایا یعنی بدون تعب و کسب کے روزی عطا فرمائے آپ کے یہاں کیا کمی اور کیا مشکل ہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یعنی جب حضرت عیسٰی نے دیکھ لیا کہ حواریوں کی غرض فاسد نہیں ہے تو آپ نے ان کے فرمائشی معجزے کے لیے اللہ کی جناب میں درخواست پیش کی اور دُعا کا آغاز اللھم ربنا سے کیا پہلے اسم ذات لیا یعنی اللھم اس کے معنے یا اللہ ہیں۔ اس میں الوہیت قدرت حکمت اور رحمت کے معنے موجود ہیں اور پھر ربنا فرمایا یعنی اے ہمارے رب ہمارے مالک ہمارے مربی اور ہمارے سارے احوال کے نگران اللھم اور ربنا دونوں میں الوہیت اور ربوبیت کا مکرر انتساب حق تعالٰی کی جانب حضرت مسیح کی زبان سے یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ حضرت مسیح میں الوہیت کا شائبہ تک نہیں ہے۔ اس کے بعد درخواست پیش فرمائی کہ انزل علینا مائدۃ من السماء۔ بعدازیں حضرت عیسٰی نے اس خوان نعمت کے نزول کے فائدے بتائے۔ پہلا فائدہ یہ کہ ہمارے لیے اور ہمارے اگلوں اور پچھلوں کے لیے اس کا نزول خوشی ومسرت کا سامان ہوگا۔ عید کے معنے مسرت وشادمانی کے آتے ہیں اور تہوار کے بھی آتے ہیں۔ علامہ نسفی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اس دن کو ہم یوم عید منائیں۔ دوسرا فائدہ یہ کہ یہ ایک خدائی نشان ہو جائے میری صداقت کا کہ اس سے اہل ایمان کے ایمانوں میں اضافہ ہو اور منکرین پر حجت قائم ہو جائے۔ آخر میں فرمایا، وارزقنا وانت خیر الرازقین، آپ ہی عطا فرمائیے۔ آپ ہی بہترین رازق ہیں جسے چاہتے ہیں بے حساب عطا فرماتے ہیں۔

اس دُعا کا خاص حسن یہ ہے کہ حواریین نے جس چیز کو اولیت دی تھی۔ حضرت مسیح نے اسے دُعا میں آخر میں ذکر کیا۔ حواریین نے نزول مائدہ کے فوائد بتاتے ہوئے کہا تھا کہ نأکل منھا کہ ہم کھائیں گے یہ خالص دنیوی اور مادی فائدہ ہے۔ حضرت مسیح نے اپنی دُعا میں پہلے دینی اور روحانی فوائد کا ذکر فرمایا اور خاتمہ دُعا میں وارزقنا فرما کر مادی فائدہ کا ذکر فرمایا۔ حضرت مسیح نے جب یہ دُعا فرمائی تو اس کا جواب اللہ نے کیا دیا۔ اسی کا آگے ذکر ہو رہا ہے۔

حضرت مسیح کی دُعا کا جواب

۲۱۴۔ اللہ نے فرمایا کہ میں تمہارے لیے خوان اتاروں گا۔ پھر جو شخص اس کے بعد انکار کرے گا اسے عذاب دوں گا ایسا عذاب کہ تمام دُنیا میں کسی کو بھی ایسا عذاب نہیں دوں گا۔ جب نعمت غیر معمولی اور نرالی ہوگی تو اس کی شکر گزاری کی تاکید بھی معمول سے بڑھ کر ہونی چاہیے اور ناشکری پر عذاب بھی غیر معمولی اور نرالا آئے گا[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ مائدہ نازل ہوا یا نہیں۔ قرآن عزیز نے اس کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں بتائی اور نہ کسی مرفوع حدیث میں اس کا کوئی تذکرہ پایا جاتا ہے۔ البتہ آثار صحابہ و تابعین میں ضرور کچھ تفصیلات موجود ہیں۔ جمہور کی رائے یہی ہے کہ مائدہ نازل ہوا ہے۔ امام رازی اور حافظ ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ روح المعانی میں علامہ آلوسی نے اسی کو اپنایا ہے۔ پھر اس میں اختلاف ہے کہ اس میں کھانا کیا تھا؟ اور کچھ لوگ یہ کہتے ہیں کہ مائدہ کا نزول نہیں ہوا۔ ان میں امام مجاہد اور الحسن البصری ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ ھذہ اسانید صحیحۃ الی مجاھد والحسن اور حسن بصری کے حوالے سے بتایا ہے کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے اس کے نزول کو شرط کے ساتھ مشروط کر دیا اس لیے طلب کرنے والوں نے یہ محسوس کر کے کہ انسان کمزور ہے کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی لغزش یا معمولی خلاف ورزی کی پاداش میں دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے سوال کو واپس لے لیا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ مائدہ کے نازل نہ ہونے کے خیال کی اس سے بھی تائید ہوتی ہے کہ مائدہ کے واقعہ سے خود عیسائی بے خبر ہیں اور ان کی کتاب میں اس کا کوئی ذکر نہیں اگر مائدہ کا نزول ہوا ہوتا تو یہ ایسا اعجازی شاہکار تھا کہ عیسائی مذہب اس پر جس قدر بھی فخر کرتی کم ہے اور ان کے یہاں جس قدر بھی شہرت ہوتی کم ہے تواتر سے نقل ہو کر یہ واقعہ ان کے یہاں موجود ہوتا اور کم از کم اخبار آحاد کے ذریعے تو ضرور منقول ہوتا۔ اس مسئلہ میں حضرت شاہ عبدالقادر مجاہد اور حسن بصری کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں بلکہ نزول مائدہ سے متعلق ان دونوں جماعتوں سے الگ ایک اور لطیف بات ارشاد فرمائی ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ وہ خوان اترا، چالیس روز تک، پھر بعضوں نے ناشکری کی یعنی حکم ہوا تھا کہ فقیر اور مریض کھائیں محظوظ اور چنگے بھی کھانے لگے، پھر قریب اسی آدمی کے سور اور بندر بن گئے۔ یہ عذاب پہلے یہود میں ہوا تھا، پیچھے کسی کو نہیں ہوا، اور بعضے کہتے ہیں کہ نہیں اترا، یہ تہدید سن کر مانگنے والے ڈر گئے، نہ مانگا، لیکن پیغمبر کی دعا عبث نہیں اور اس کلام میں نقل کرنا بے حکمت نہیں۔ شاید اس دعا کا اثر یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ کی امت میں آسودگی مال ہمیشہ رہی اور جو کوئی ان میں ناشکری کرے یعنی دل کے اطمینان سے عبادت میں نہ لگے بلکہ گناہ میں خرچ کرے تو شاید آخرت میں سب سے زیادہ عذاب پاوے۔ اس میں مسلمان کو عبرت ہے کہ اپنا مدعا خرق عادت کی راہ سے نہ چاہے کہ پھر اس کی شکرگزاری بہت مشکل ہے اسباب ظاہری پر قناعت کرے تو بہتر ہے اس قصہ میں بھی ثابت ہوا کہ حق تعالیٰ کے آگے حمایت پیش نہیں جاتی۔

وَإِذْ قَالَ اللّٰهُ يٰعِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ ءَأَنْتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي
وَأُمِّيَ إِلٰهَيْنِ مِنْ دُونِ اللّٰهِ ۖ قَالَ سُبْحٰنَكَ مَا يَكُونُ لِيٓ أَنْ
أَقُولَ مَا لَيْسَ لِي ۚ بِحَقٍّ ۖ إِنْ كُنْتُ قُلْتُهُ فَقَدْ عَلِمْتَهُ ۚ تَعْلَمُ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم
مَا فِي نَفْسِي وَلَآ أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ ۚ إِنَّكَ أَنْتَ عَلَّامُ الْغُيُوبِ ﴿١١٦﴾
مَا قُلْتُ لَهُمْ إِلَّا مَآ أَمَرْتَنِي بِهِۦٓ أَنِ اعْبُدُوا اللّٰهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ ۚ
وَكُنْتُ عَلَيْهِمْ شَهِيدًا مَّا دُمْتُ فِيهِمْ ۖ فَلَمَّا تَوَفَّيْتَنِي كُنْتَ
أَنْتَ الرَّقِيبَ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنْتَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ ﴿١١٧﴾ إِنْ
تُعَذِّبْهُمْ فَإِنَّهُمْ عِبَادُكَ ۖ وَإِنْ تَغْفِرْ لَهُمْ فَإِنَّكَ أَنْتَ الْعَزِيزُ
الْحَكِيمُ ﴿١١٨﴾ قَالَ اللّٰهُ هٰذَا يَوْمُ يَنْفَعُ الصّٰدِقِينَ صِدْقُهُمْ ۚ
لَهُمْ جَنّٰتٌ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهٰرُ خٰلِدِينَ فِيهَآ أَبَدًا ۚ
رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ ۚ ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١١٩﴾ لِلّٰهِ
مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضِ وَمَا فِيهِنَّ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿١٢٠﴾

اور جب اللہ فرمائے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسٰی کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو خدا کے سوا دو معبود بنا لینا[215]، تو وہ جواب میں عرض کریں گے پاک ہے تیری ذات میرے لیے ممکن نہیں کہ ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں ہے، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو تجھے ضرور معلوم ہوتا، تو میرے دل کی بات جانتا ہے مجھے تو آپ کے جی کی بات کا پتہ نہیں ہے تو ہی غیب کی ساری باتوں کا جاننے والا ہے[216]۔ میں نے تو ان سے صرف وہی بات کہی تھی جس کے کہنے کا مجھے آپ نے حکم دیا تھا۔ یعنی یہ کہ اللہ کی بندگی کرو، میرا اور تمہارا پروردگار وہی ہے[217]۔ جب تک میں ان میں رہا ان کا نگران تھا پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان کا نگہبان تھا اور تو ہر چیز سے خبردار ہے[218]۔ اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر

انہیں بخش دے تو تو سب پر غالب اور اپنے تمام کاموں میں حکمت

والا ہے[۲۱۹]۔ اللہ فرمائے گا آج وہ دن ہے کہ سچے انسانوں کو ان کی

سچائی کام دے گی، ان کے لیے باغات ہیں جن کے تلے نہریں

بہ رہی ہیں ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہو گیا اور

وہ اللہ سے راضی ہو گئے یہی بڑی کامیابی ہے[۲۲۰]۔ زمین و آسمان

اور تمام موجودات کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر

چیز پر قدرت والا ہے[۲۲۱]۔

اللہ سبحانہٗ کا حضرت مسیح سے مخاطبہ

اس سے پہلا رکوع حقیقت میں اس رکوع کی تمہید تھی۔ پچھلے رکوع کی ابتدا میں یوم یجمع اللہ الرسل فرما کر آگاہ کیا تھا کہ قیامت کے دن تمام مرسلین سے ان کی اُمتوں کے مواجہ میں علی رؤس الاشہاد سوال و جواب ہوں گے۔ پھر ان میں سے خاص حضرت مسیح کا ذکر فرمایا جن کو کروڑوں آدمیوں نے خدائی کا درجہ دے رکھا ہے کہ ان سے بالخصوص اس عقیدہ باطلہ کی نسبت دریافت کیا جائے گا لیکن اول وہ عظیم الشان احسانات اور ممتاز انعامات یاد دلائیں گے جو ان پر اور ان کی والدہ پر فائض ہوتے بعدہٗ ارشاد ہو گا کہ ءانت قلت للناس اتخذونی کیا تو نے لوگوں سے کہہ دیا کہ مجھ کو اور میری ماں کو بھی خدا کے سوا معبود مانو، حضرت مسیح علیہ السلام اس سوال کا جواب عرض کریں گے جو آگے آتا ہے، آخر میں ارشاد ہو گا ھذا یوم ینفع الصادقین صدقھم، ھذا کا اشارہ اسی یوم کی طرف ہے جو یوم یجمع اللہ الرسل میں مذکور

تھا، بہرحال یہ سب واقعہ روزِ قیامت کا ہے جسے تیقن الوقوع ہونے کی وجہ سے قرآن وحدیث میں بصیغہ ماضی قال تعبیر فرمایا ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ سورۃ مائدہ میں حضرت مسیح علیہ السلام کے مختلف حالات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ پھر یہ سورت ان ہی کے تذکرہ پر ختم ہوئی ہے۔ اس کی تقریب کے لیے اللہ تعالیٰ نے اولاً قیامت کے اس واقعہ کا نقشہ کھینچا ہے۔ جب انبیاء علیہم السلام سے ان کی امتوں کے بارے میں سوال ہوگا اور وہ غایت ادب سے لا علم لنا کہہ کر اپنی لاعلمی کا اظہار کریں گے۔ ظاہر ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا لاعلم لنا فرمانا علم حقیقی کی نفی پر ہی مبنی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ وہ امتوں کے جواب سے لاعلم ہیں کہ کس نے ایمان کو قبول کیا اور کس نے انکار کیا۔ جواب کا اگر یہ مقصد ہو تو یہ صریح جھوٹ ہے اور نبوت کی طرف اس کی نسبت بھی ناممکن ہے سید انور شاہ رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

> یہ بات مسلم ہے کہ ایک انسان کو دوسرے انسان کے متعلق جو کچھ بھی معلوم ہوتا ہے وہ علم حقیقی کے لحاظ سے ظن کے درجہ سے آگے علم تک نہیں پہنچتا۔ اسی بنا پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے نحن نحکم بالظواھر واللہ متولی السرائر ہم ظاہر معاملات پر حکم لگاتے ہیں اور بھیدوں اور حقیقتوں پر تو صرف خدا ہی کو قابو حاصل ہے۔ نیز ایک دوسری حدیث میں ہے ذات اقدس نے ارشاد فرمایا تم میرے پاس اپنے جھگڑے لاتے ہو۔ بعض تم میں سے چرب زبان ہوتے ہیں اور مجھ کو علم غیب نہیں ہے کہ حقیقت سے آگاہ ہو جایا کروں اس لیے جو بھی فیصلہ دیتا ہوں ظاہر حالات پر ہی دیتا ہوں تو یاد رہے کہ جو شخص بھی اپنی چرب زبانی سے کسی بھائی کا ادنیٰ سا ٹکڑا بھی ناحق حاصل کرے گا وہ بلاشبہ جہنم کا ٹکڑا حاصل کرے گا [2]

غرض اس تمہید کے بعد اس مقام پر اصل تذکرہ حضرت عیسیٰ کے اس واقعہ کا ہو رہا ہے جو قیامت میں پیش آئے گا۔ اللہ تعالیٰ ان پر اپنے انعامات شمار کرنے کے بعد ان سے ان کی امت کے متعلق سوال کرے گا۔ خلاصہ یہ کہ اللہ نے پہلے اپنی نعمتیں یاد دلائیں جو حضرت مسیح پر ہوئی تھیں، پھر فرمایا کہ باوجود تعلیم کی ان تمام روشنیوں کے تیرے ماننے والے گمراہی میں پڑ گئے تھے اور تجھے اور تیری ماں کو خدا بنا لیا تھا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] عقیدۃ الاسلام

۲۱۵- اور جب اللہ فرمائے گا کہ اے مریم کے بیٹے عیسٰی کیا تو نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو خدا کے سوا معبود بنالینا۔

اصل ارشاد میں الٰہ آیا ہے۔ الٰہ کے معنے معبود کے آتے ہیں۔ یعنی وہ جس کی عبادت کی جاتے اور من دون اللّٰہ کے معنے خدا کو چھوڑ کر کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم نے یہ کہا تھا کہ یگانہ اللہ کی عبادت چھوڑ کر میری اور میری ماں کی عبادت کرنا اور معبود بنالینا اور خدا کی عبادت کی یگانگت کو ختم کر دینا۔ تعبیر کا یہ انداز جیسے اس شخص کے لیے بولا جا سکتا ہے جو خدا کو چھوڑ کر کسی کی عبادت کرتا ہے ایسے ہی اس پر بھی بولا جاتا ہے جو خدا کے ساتھ کسی کی عبادت کرتا ہے۔ کیونکہ شریک کی عبادت بلا شبہ اللہ کی عبادت کے سوا ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ انہوں نے خدا کی جگہ یا اس کے بدلے میں حضرت عیسٰی اور ان کی والدہ کو معبود بنا لیا تھا بلکہ مطلب یہ ہے کہ تم کہہ کر آئے تھے کہ خدا کے ساتھ مجھے اور میری ماں کو معبود بنالینا، اور بعض علما نے من دون اللہ کو حال قرار دیا ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے عیسٰیؑ تم نے لوگوں سے کہا تھا کہ مجھے اور میری والدہ کو معبود بنالینا حالانکہ تم اور تمہاری والدہ اللہ تعالیٰ سے کمتر ہیں اور جو خدا سے کمتر ہو وہ خدا کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ اس عبادت کی وجہ خواہ کچھ ہو، یہ اعتقاد ہو کہ یہ معبود خدا کے سوا بالاستقلال نافع اور ضار ہے اور یا یہ اعتقاد ہو کہ اللہ کے دیے ہوئے اختیار سے اور عالم اسباب سے بالا اللہ کی سپرد کردہ ذمہ داریوں کی وجہ سے یا بالآخر بندوں اور خدا کے درمیان واسطہ ہونے کی وجہ سے نفع و نقصان کے مالک ہیں حضور انور کی تشریف آوری کے وقت عام مشرکین کا افترا کی پس منظر ہی تھا۔

حضرت مسیح کی عبادت تو معلوم الحال ہے۔ اسی سورت میں اس کی تفصیلات آ چکی ہیں۔ لیکن مریم پرستی میں قسطنطین کے بعد مشرقی اور مغربی کلیساؤں میں کوئی اختلافات نہیں ہے۔ دعائیں اس خدائی کنواری کو مخاطب کر کے کی جاتی ہیں، نذریں، نیازیں ان کے نام پر کی جاتی ہیں۔ کیتھولک گرجاؤں میں ان کی قد آدم تصویریں لگی ہوئی ہیں جن کے آگے پرستش کی ساری رسمیں پوری ہوتی ہیں۔ پروٹسٹنٹ فرقے نے اسلام سے صدیوں بعد اس کا انکار کیا ہے۔ السید رشید رضا نے تفسیر المنار کی ساتویں جلد میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے عبادت مریم کے موضوع پر مفید بحث فرمائی ہے۔ اور مولانا مودودی نے اس موضوع پر اچھی داد تحقیق دی ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ عیسائیوں نے اللہ کے ساتھ صرف مسیح اور روح القدس ہی کو خدا بنانے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ مسیح کی والدہ ماجدہ حضرت مریم کو بھی ایک مستقل معبود بنا ڈالا۔ حضرت مریم علیہا السلام کی الوہیت یا قدوسیت کے متعلق کوئی اشارہ تک بائبل میں موجود نہیں ہے۔ مسیح کے بعد ابتدائی تین سو برس تک عیسائی دنیا اس تخیل سے بالکل ناآشنا تھی۔ تیسری صدی کے آخری دور میں اسکندریہ کے بعض علمائے دینیات نے پہلی مرتبہ حضرت مریم کے لیے ام اللہ یا مادر خدا کے الفاظ استعمال کیے۔ اس کے بعد آہستہ آہستہ الوہیت

مسیح کا عقیدہ، اور مریم پرستی کا طریقہ عیسائیوں میں پھیلنا شروع ہوا لیکن اول چرچ باقاعدہ اسے تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ تھا بلکہ مریم پرستوں کو فاسد العقیدہ قرار دیتا تھا۔ پھر جب نسطوریس کے اس عقیدے پر کہ مسیح کی واحد ذات میں دو مستقل جداگانہ شخصیتیں جمع تھیں، مسیحی دنیا میں بحث و جدال کا ایک طوفان اٹھ کھڑا ہوا تو اس کا تصفیہ کرنے کے لیے ۴۳۱ء میں شہر افسوس میں ایک کونسل منعقد ہوئی اور اس کونسل میں پہلی مرتبہ کلیسا کی سرکاری زبان میں حضرت مریم کے لیے مادرِ خدا کا لقب استعمال ہوا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مریم پرستی کا جو مرض اب تک کلیسا کے باہر پھیل رہا تھا وہ اس کے بعد کلیسا کے اندر بھی تیزی سے پھیلنے لگا۔ حتیٰ کہ نزولِ قرآن کے زمانے تک پہنچتے پہنچتے حضرت مریم اتنی بڑی دیوی بن گئیں کہ باپ بیٹا اور روح القدس تینوں ان کے سامنے ہیچ ہو گئے۔ ان کے مجسمے جگہ جگہ کلیساؤں میں رکھے ہوئے تھے ان کے آگے عبادت کے جملہ مراسم ادا کیے جاتے تھے، انہی سے دعائیں مانگی جاتی تھیں۔ وہی فریاد رس، حاجت روا، مشکل کشا، اور بیکسوں کی پشتیبان تھیں اور ایک مسیحی بندے کے لیے سب سے بڑا ذریعہ اعتماد اگر کوئی تھا تو وہ یہ تھا کہ مادرِ خدا کی حمایت اور سرپرستی اسے حاصل ہو۔ قیصر جسٹنین اپنے ایک قانون کی تمہید میں حضرت مریم کو سلطنت کا حامی و ناصر قرار دیتا ہے۔ اس کا مشہور جنرل نرسیس میدان جنگ میں حضرت مریم سے ہدایت و رہنمائی طلب کرتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہم عصر قیصر ہرقل نے اپنے جھنڈے پر مادرِ خدا کی تصویر بنا رکھی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس تصویر کی برکت سے یہ جھنڈا سرنگوں نہ ہوگا۔ اگرچہ بعد کی صدیوں میں تحریک اصلاح کے اثر سے پروٹسٹنٹ عیسائیوں نے مریم پرستی کے خلاف شدت سے آواز اٹھائی لیکن رومن کیتھولک کلیسا آج تک اس مسلک پر قائم ہے۔

یہ مکالمہ کب ہوگا؟

اللہ سبحانہ، یہ بات حضرت عیسٰی سے کب فرمائے گا۔ علامہ بغوی نے معالم میں بتایا ہے کہ تمام مفسرین قرآن کہتے ہیں کہ یہ بات اللہ سبحانہ، روزِ قیامت فرمائے گا۔ علامہ نسفی نے مدارک میں لکھا ہے کہ جمہور مفسرین کی رائے ہے کہ یہ سوال قیامت کے روز ہوگا۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ قتادہ، ابن جریج اور بیشتر مفسرین کہتے ہیں کہ یہ مخاطبہ روزِ قیامت ہوگا۔ سدی کو چھوڑ کر تمام شارحینِ قرآن کی یہی رائے ہے اور سدی سے متاثر ہو کر ابن جریر کا بھی کچھ جھکاؤ اس طرف ہے کہ یہ خطاب و جواب دنیا میں ہوا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ یہاں اس مخاطبہ کو چونکہ بصیغہ ماضی پیش کیا گیا ہے یہ اس لیے یہ آئندہ کی نہیں بلکہ ماضی کی کہانی ہے لیکن حافظ ابن کثیر نے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ قرآن میں بیشتر احوالِ قیامت کو بصیغہ ماضی

ہی پیش کیا گیا ہے۔ اسی سے ہمارے زمانہ کے بعض زائغین نے سہارا لے کر وفات مسیح کا دعویٰ کیا ہے چنانچہ وہ کہتے ہیں کہ یہ مکالمہ اللہ اور حضرت عیسیٰ کے درمیان وفات کے بعد عالم برزخ میں پیش آیا ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ یہاں قال کی پیشانی پر اذ لگا ہوا ہے اور عربی میں لفظ اذ ماضی کے لیے آتا ہے نہ کہ مستقبل کے لیے۔ حالانکہ یہ کوئی کلیہ نہیں ہے۔ مغنی میں ہے کہ اذا ماضی کے لیے بھی آتا ہے جیسا کہ اذ کبھی مستقبل کے لیے آجاتا ہے۔ الزمخشری نے یہ شعر پیش کیا ہے:

اذ ما دخلت علی الرسول فقل له
حقاً علیك اذا اطمان المجلس

یہاں صیغہ اس بات کی نشانی ہے کہ اذ ماضی پر آ کر مستقبل کے معنے دے رہا ہے۔ قرآن وحدیث اور عربی اشعار میں ایسی بے شمار مثالیں ہیں جن میں اذ بمعنے اذا استعمال ہوا ہے اور اذا بمعنی اذ، مولانا محمد ابراہیم میر سیالکوٹی رحمہ اللہ نے شہادۃ القرآن کے دوسرے حصہ میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

اور پھر قرآن کا سیاق وسباق یہاں خود گواہ ہے کہ یہ تمام واقعہ ماضی کا نہیں بلکہ قصہ مستقبل یعنی قیامت کا ہے۔ سیاق میں یوم یجمع اللہ الرسل اور سباق میں هذا یوم ینفع الصادقین صدقهم سے صاف ظاہر ہے۔ خود حضرت قتادہ نے بھی یوم ینفع الصادقین سے اس مکالمہ کے روز قیامت میں ہونے پر استدلال کیا ہے۔ تفسیر درمنثور میں قتادہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ یہ مکالمہ روز قیامت ہوگا جب کہ یوم ینفع الصادقین بزبان حال بول رہا ہے بلکہ ایک مرفوع حدیث میں اس کی تصریح موجود ہے کہ یہ واقعہ قیامت کا ہے۔

> ابوموسیٰ اشعری روایت کرتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ قیامت کے روز انبیاء اور ان کی امتوں کو بلایا جائے گا، پھر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو بلایا جائے گا۔ حق تعالیٰ حضرت عیسیٰ کو اپنے قریب بلا کر فرمائیں گے کہ تم نے ہی کہا تھا کہ مجھے اور میری ماں کو معبود بنالینا، عیسیٰ علیہ السلام انکار کر دیں گے۔ (ابن کثیر)

درمنثور میں اسی مضمون کی ایک حدیث جابر بن عبداللہ کے حوالہ سے آئی ہے اس میں بھی اس کی تصریح ہے کہ یہ مکالمہ قیامت کے روز ہوگا۔

یہاں قیامت میں ہونے والا یہ واقعہ قرآن میں اس لیے بیان ہو رہا ہے کہ نصاریٰ جنہوں نے دنیا میں حضرت مسیح اور ان کی والدہ کو معبود بنا رکھا ہے ان کو معلوم ہو جائے کہ اس جرم کی پاداش میں میدان حشر میں ان کی رسوائی کا سامان ہوگا، یہ سوال تو دراصل عیسائیوں سے ہونا چاہیے کہ کیا تمہیں

حضرت مسیح یہ کہہ کر آئے تھے کہ ان کو اور ان کی والدہ کو معبود بنا لینا لیکن ان کو ناقابل خطاب سمجھ کر حضرت عیسیٰ سے سوال ہوگا تاکہ ان کے جواب سے ان کی اُمت پر اتمام حجت کی جاسکے۔ واللہ اعلم۔

اللہ کی سبوحیت کا لازمی تقاضا

۲۱۶۔ تو وہ جواب میں عرض کریں گے پاک ہے تیری ذات، میرے لیے ممکن نہیں ہے کہ ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں ہے، اگر میں نے ایسی بات کہی ہوتی تو تجھے ضرور معلوم ہوتا، تو میرے دل کی بات جانتا ہے مجھے تو تیرے جی کی بات کا پتہ نہیں ہے تو ہی غیب کی ساری باتوں کا جاننے والا ہے یعنی میں ایسی گندی بات کیسے کہہ سکتا تھا۔ آپ کی ذات اس سے پاک ہے کہ الوہیت وغیرہ میں کسی کو شریک ٹھہرایا جائے اور جس کو آپ پیغمبری کا منصب جلیل عطا فرمائیں اس کی یہ شان نہیں ہے کہ کوئی ناحق بات منہ سے نکالے۔ پس آپ کی سبوحیت اور میری عصمت دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ میں ایسی ناپاک بات کبھی نہیں کہہ سکتا اور سب دلائل کو چھوڑ کر آخری بات یہ ہے کہ آپ کے علم محیط سے کوئی چیز باہر نہیں ہوسکتی۔ اگر فی الواقع میں ایسا کہتا تو آپ کے علم میں ضرور موجود ہوتا۔ آپ خود جانتے ہیں کہ میں نے خفیہ یا علانیہ کوئی ایسا حرف منہ سے نہیں نکالا بلکہ میرے دل میں اس طرح کے گندے خیال کا کبھی خطرہ بھی نہیں ہوا۔ آپ سے میرے یا کسی کے دل کے چھپے ہوئے بھید بھی پوشیدہ نہیں[1]۔ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے انت قلت سوال کا جواب براہ راست ما قلت دینے اور اپنی صفائی پیش کرنے کے بجائے اسے تمام تر علم الٰہی کے حوالہ کرنا مقام ادب اور عبدیت کے زیادہ مناسب ہے۔ اس موقعہ پر سبحانک اس لیے نہیں لایا گیا کہ آپ یہ کہنا چاہتے ہیں کہ آپ کی ذات اس بات سے پاک ہے کہ میں یہ بات کہوں یا میں آپ کے بارے میں یہ کہوں بلکہ اس لیے لایا گیا ہے کہ آپ کی ذات اس سے بالا اور پاک ہے کہ الٰہ اور رب ہونے میں آپ کا کوئی شریک ہو۔ اس طرح حضرت عیسیٰ نے ثابت کیا ہے کہ مجھے یقینی اور بدیہی طور پر معلوم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی ذات و صفات میں اس سے پاک ہے کہ الوہیت میں اس کا کوئی شریک ہو۔ نامناسب اور خلاف شان باتوں سے اللہ کی تنزیہہ کے لیے آتا ہے۔ یہاں یہ کلمہ اسی مفہوم میں آیا ہے۔ حضرت عیسیٰ کا مطلب یہ ہے کہ تیری شان اس سے کہیں ارفع ہے کہ الوہیت میں تیرا کوئی شریک ہو۔ اور جب تیری شان اس سے بالا و بالاتر ہے تو پھر میری شان یہ کب ہوسکتی ہے کہ آپ کا رسول ہو کر ایسی بات کہوں جس کے کہنے کا مجھے حق نہیں، اس طرح نفی شان سے کلام میں زیادہ بلاغت آگئی ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔

کیونکہ نفی شان کے لیے نفی فعل لازم ہے۔ یعنی نہ تو آپ کی شان اس کی مقتضی ہے اور نہ میرا منصب یہ چاہتا ہے کہ ایسی باطل اور بے حقیقت بات میں آپ کے بارے میں کہوں اور اس کی دلیل یہ ہے کہ اگر بالفرض یہ بات میں نے کہی ہوتی تو آپ کے علم محیط میں ضرور ہوتی کیونکہ آپ کے علم محیط سے کچھ بھی باہر نہیں، آپ تو میرے جی کی بات جانتے ہیں میری تو آپ کے علم ذاتی تک رسائی نہیں ہے۔ آپ تو علوم غیبیہ میں یگانہ ہیں۔ آپ کا علم ماضی، حال اور مستقبل کو محیط ہے، آپ کا علم ذاتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر بالفرض میں نے ایسی کوئی بات کہی ہوتی تو وہ ضرور ہی تیرے علم میں ہوتی اور جب تیرے علم نہیں ہے تو ظاہر ہے کہ وہ سرے سے واقع ہی نہیں ہوئی میرے ناقص محدود علم اور تیرے کامل اور غیر محدود علم کا مقابلہ ہی کیا؟

حضرت مسیح کی دعوت توحید

۱۱۷۔ میں نے ان سے صرف وہی بات کہی تھی جس کے کہنے کا مجھے آپ نے حکم دیا تھا یعنی یہ کہ اللہ کی بندگی کرو، میرا اور تمہارا پروردگار وہی ہے۔ میں نے آپ کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کیا۔ اپنی الوہیت کی تعلیم تو کیسے دیتا۔ اس کے بالمقابل میں نے ان کو صرف تیری بندگی کی طرف بلایا اور کھول کھول کر بتلا دیا کہ میرا اور تمہارا رب وہ ہی ایک خدا ہے جو تنہا عبادت کے لائق ہے۔ چنانچہ آج بھی انجیل میں صریح نصوص اس مضمون کی بکثرت موجود ہیں [۱]

اگرچہ موجودہ اناجیل نے حضرت عیسیٰ کی دعوت توحید کو اس وضاحت کے ساتھ پیش نہیں کیا جس طرح قرآن نے بیان کی ہے تاہم منتشر طور پر اشارات کی شکل میں یہ بات ان کے اندر بھی ملتی ہے کہ صرف اللہ سے عابدانہ تعلقات رکھنے چاہئیں، چنانچہ انجیل متی باب ۴ آیت نمبر ۱۰، ۱۱ میں ہے۔

> یسوع نے اس سے کہا اے شیطان دور ہو کیونکہ لکھا ہے کہ تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ اور صرف اسی کی عبادت کر تب ابلیس اس کے پاس سے چلا گیا اور دیکھو فرشتے آکر اس کی خدمت کرنے لگے۔

اور انجیل لوقا باب ۴ آیت ۸ میں ہے:

> یسوع نے جواب میں اس سے کہا لکھا ہے تو خداوند اپنے خدا کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کر۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

اور صرف یہی نہیں بلکہ حضرت مسیح اس کے بھی قائل تھے کہ زمین پر خدا کے امر شرعی کی اسی طرح اطاعت کی جائے جس طرح آسمان پر اس کے امر تکوینی کی طاعت ہوتی ہے۔ انجیل متی باب ۶ آیت ۱ میں ہے :

تیری بادشاہی آئے تیری مرضی جیسے آسمان پر پوری ہوتی ہے زمین پر بھی پوری ہو۔

یہ بات کہ مسیح علیہ السلام اپنے آپ کو خدا یا خدا کے بیٹے کی حیثیت سے نہیں بلکہ اپنے کو خدا کے رسول کی حیثیت سے پیش کرتے تھے اور اسی حیثیت سے وہ لوگوں کو اپنی طاعت کی دعوت دیتے تھے ان کے ایک سے زیادہ ارشادات سے ہوتا معلوم ہوتی ہے۔ انہوں نے جب اپنے وطن ناصرہ سے دعوت کو شروع کیا تو ان کی مخالفت خود اپنوں نے کی۔ اس پر متی، لوقا اور مرقس تینوں کی متفقہ روایت ہے کہ حضرت مسیح نے فرمایا۔

"نبی اپنے وطن میں مقبول نہیں ہوتا"

اور جب یروشلم میں ان کے قتل کی سازشیں ہونے لگیں اور لوگوں نے ان کو مشورہ دیا کہ آپ کہیں اور چلے جائیں تو انہوں نے جواب دیا۔

ممکن نہیں کہ نبی یروشلم سے باہر ہلاک ہو۔

اب اور رب کا تقابلی مطالعہ

انجیلوں میں میرا باپ اور تمہارا باپ کی جو تعبیر آئی ہے یہاں قرآن میں ربی و ربکم سے اس کی تصحیح فرمائی ہے کہ در اصل حضرت مسیح نے جو بات فرمائی تھی وہ یہ ہے کہ اللہ ہی میرا رب بھی ہے اور تمہارا رب بھی لیکن نصاریٰ نے متشابہات کی پیروی کی اور آپ کی واضح تعلیمات کو نظر انداز کر دیا۔ عبرانی میں اب کا لفظ باپ اور رب کے معنے میں اور ابن کا لفظ بیٹے اور غلام کے معنے میں آتا ہے۔ ظاہر ہے کہ جب کوئی لفظ دو معنوں میں بولا جاتا ہو تو سیاق و سباق ہی بتاتا ہے کہ یہ لفظ کس مفہوم میں ہے۔ قرآن نے انسان کو بیٹا اور خدا کو باپ نہیں کہا۔ کیونکہ عبد و معبود کے تعلقات کے اظہار کے لیے یہ تعبیر کوئی بلند تر تعبیر نہیں ہے۔ وہ خدا کو اب باپ کے بجائے رب کہہ کر پکارتا ہے وہ اس کو تمام دنیا کا باپ نہیں بلکہ تمام دنیا کا رب کہتا ہے۔

اب اور رب دونوں میں لفظوں کا باہمی معنوی مقابلہ کرو تو معلوم ہوگا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل قرآن کے مطمح نظر سے کس قدر پست ہے۔ اب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے۔ پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں بچپن کے ایک محدود عرصہ تک قائم رہتا ہے۔ اسی طرح گو باپ کو بیٹے کے وجود میں ایک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے

مگر یہ تعلق صدر درجہ ناقص محدود اور آنی ہوتا ہے بیٹے کے وجود قیام و بقا۔ ضروریات زندگی، سامان حیات، نشوونما اور ارتقا کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔ وہ اپنے باپ سے الگ مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے مگر ذرا غور کرو کہ کیا عبد و معبود، خالق و مخلوق کے درمیان جو ربط و تعلق ہے۔ اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے کیا بندہ اپنے خدا سے ایک لمحہ کے لیے بھی بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے کیا یہ تعلق باپ بیٹے کے تعلق کی طرح محدود ہو سکتا ہے۔

ربوبیت (پرورش) عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک پیدائش سے وفات تک بلکہ ابد تک قائم رہتا ہے جو ایک لمحے کے لیے بھی منقطع نہیں ہو سکتا۔

بہرحال حضرت عیسیٰ بتائیں گے کہ میں قوم کو یہ کہہ کر آیا تھا اعبدوا اللہ ربی و ربکم۔ اللہ اکبر اس جواب میں کس قدر حسن ادب ہے اور آپ کی کمال عبدیت اور انتہائے عبودیت کا یہ جواب کس قدر بلیغ شاہکار ہے یہ نہیں فرمایا کہ میں ان کو وہی کچھ حکم دے کر آیا تھا جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا بلکہ فرمایا میں تو وہی کچھ کہہ کر آیا تھا جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا اور اس سے زیادہ لطیف بات یہ ہے کہ پیام توحید کو بھی اپنی جانب منسوب نہیں فرماتے کہ میں انہیں یہ پیام دے کر آیا تھا بلکہ فرماتے ہیں کہ جس کا آپ نے مجھے حکم دیا تھا۔

آسمان پر اٹھاتے جانے کا ذکر

۱۱۸۔ جب تک میں ان میں رہا ان کا نگران رہا۔ پھر جب تو نے مجھے اٹھا لیا تو تو ہی ان کا نگہبان تھا، اور تو ہر چیز سے خبردار ہے۔ نہ صرف یہ کہ میں نے مخلوق خدا کو تیری توحید اور عبودیت کی دعوت دی، بلکہ جب تک ان کے اندر قیام پذیر رہا برابر ان کے احوال کی نگرانی کرتا رہا۔ کوئی غلط عقیدہ یا بے موقع خیال قائم نہ کر لیں البتہ ان میں قیام کرنے کی جو مدت آپ کے علم میں مقدر تھی جب وہ پوری کر کے آپ نے مجھ کو ان میں سے اٹھا لیا، کما یظہر من مادۃ التوفی ومقابلۃ مادمت فیہم، تو پھر صرف آپ ہی ان کے احوال کے نگران اور خبردار ہو سکتے تھے میں اس کے متعلق کچھ نہیں عرض کر سکتا۔

تنبیہہ:۔ حضرت مسیح علیہ السلام کی موت یا رفع الی السماء کی بحث آل عمران کی آیت انی متوفیک و رافعک کے فائدے میں ملاحظہ کیجئے۔ حضرت شیخ الہند قدس سرہ نے یہاں فلما توفیتنی، کا جو ترجمہ تو نے مجھے اٹھا لیا ہے کیا ہے یہ باعتبار محاورہ موت اور رفع الی السماء دونوں پر صادق آ سکتا ہے گویا متنبہ کر دیا کہ نہ لفظ توفی کے لیے موت لازم ہے اور نہ خاص توفی بصورت موت کو مضمون زیر بحث میں کسی قسم کا کوئی دخل ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ بعض لوگوں کی نسبت قیامت کے دن اسی طرح

کہوں گا جس طرح بندہ صالح عیسٰی علیہ السلام نے کہا

کنت علیھم شھیدا مادمت فیھم فلما توفیتنی کنت انت .... الخ

اس قسم کی تشبیہات سے یہ نکالنا کہ حضور کی اور حضرت مسیح کی توفی بھی بہمہ وجوہ یکساں اور ہم رنگ ہونی چاہیے۔ عربیت سے ناواقفیت کی دلیل ہے۔ مشرکین مکہ ایک درخت (ذات انواط) پر ہتھیار لٹکایا کرتے تھے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ! ہمارے لیے بھی ذات انواط مقرر کر دیجئے جیسے ان کے یہاں ہے۔ آپ نے فرمایا۔

ھذا کما قال قوم موسٰی اجعل لنا الٰھا کما لھم اٰلھۃ

یہ تو ایسا ہوا جیسے موسٰی کی قوم نے درخواست کی تھی کہ ہمارے لیے بھی ایسا معبود تجویز کر دو جیسا کہ ان بت پرستوں کا ہے۔

کیا کوئی مسلمان اس تشبیہ کو سن کر یہ گمان کر سکتا ہے کہ صحابہ نے معاذ اللہ بت پرستی کی درخواست کی تھی۔ اس طرح کی تشبیہات سے نصوص محکم اور اجماع امت کے مخالف عقائد پر تمسک کرنا صرف اسی جماعت کا حصہ ہو سکتا ہے جن کی نسبت یہ ارشاد فرمایا:

فاما الذین فی قلوبھم زیغ فیتبعون ما تشابہ منہ ابتغاء الفتنۃ وابتغاء تاویلہ۔

جن لوگوں کے دلوں میں کجی ہے وہ ان آیتوں کے پیچھے پڑ جاتے ہیں جو متشابہ ہیں اس غرض سے کہ فتنہ بپا کریں اور حقیقت معلوم کریں[1]

حیات و رفع مسیح علیہ السلام کے موضوع پر معلومات کے لیے معالم القرآن کی جلد سوم اور جلد ششم کا مطالعہ فرمائیے۔ یہاں صرف قرآن کے اعجاز بلاغت اور اسلوب بیان کی لطافت سے استفادے کے پیش نظر صرف اتنی بات گزارش گزار فرما لیجئے کہ اس مقام پر قرآن نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کے قیام زمینی مادمت فیھم اور کائنات ارضی سے انقطاع تعلقات کو توفیتنی سے کیوں تعبیر فرمایا؟

جلد سوم میں لغت اور معانی کے حوالوں سے یہ بتایا جا چکا ہے کہ توفی کے حقیقی معنے لے لینے اور قبضہ کر لینے کے ہیں اور یہ لفظ موت کے معنے میں بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے اور یہ بات بھی واضح ہو چکی ہے کہ کنایہ میں حقیقی معنے برابر ساتھ ساتھ رہتے ہیں۔ مجاز کی طرح یہ نہیں ہوتا کہ حقیقی معنے سے جدا ہو کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لفظ غیر مرشروع ہو ہیں استعمال ہوں گے لہٰذا اگر حضرت عیلی کے بارے میں قرآن اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ ان کی موت آچکی ہے اور مخاطبہ و مکالمہ کا یہ سلسلہ موت کے اسی وقت کی کہانی ہے نہ کہ روز قیامت کی تو پھر بلاغت و معانی کا تقاضا یہ تھا کہ اس موقعہ پر حیات اور موت جیسے متضاد الفاظ استعمال ہوتے تاکہ یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ سوال و جواب کا یہ سلسلہ موت کے قریب ہے اور پھر لفظ موت کی صراحت کا تقاضا تھا کہ اس کے مقابلے میں لفظ حیات لایا جاتے مگر قرآن نے موت و حیات کی صاف اور واضح تعبیر کو چھوڑ کر مادمت فیہم کو حیات کی بجائے اور توفیتنی کو موت کی جگہ استعمال کیا ہے۔ سوچئے کہ ماحییت فلما امتنی کو چھوڑ کر مادمت فیہم فلما توفیتنی کی تعبیر کیوں اختیار کی گئی ہے۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ بلیغانہ نکتہ یہ بھی ہے کہ قرآن نے یہاں اپنا اعجازی انداز اختیار کیا ہے اور ان دو لفظوں میں وہ حضرت مسیح کی زندگی رفع نزول اور موت کے سارے مراحل کو سمو دینا چاہتا ہے وہ اگر یہ انداز بیان اختیار کرتا ماحییت فلما امتنی جب تک میں زندہ رہا پھر جب تو نے مجھے مار دیا تو اس کا مطلب یہ ہوتا کہ حضرت مسیح علیہ السلام کو بھی عام حالات کے مطابق دو ہی مراحل پیش آتے ہیں، ایک زندگی دوسرے موت، ان دونوں مرحلوں کے درمیان کوئی خاص حالت پیش نہیں آتی ہے لیکن چونکہ یہ بات خلاف واقعہ تھی اور ان کی زندگی اور موت کے درمیان دو اہم مراحل اور بھی پیش آچکے ہیں۔ ایک ملاء اعلیٰ کی طرف بقید حیات رفع اور دوسرے کائنات ارضی میں دوبارہ تشریف آوری اور نزول اس لیے ضروری تھا کہ حیات و موت کی جگہ ایسے الفاظ اختیار کیے جائیں جن کی آغوش میں یہ سارے مراحل سما سکیں اور پھر جب کہ قرآن متعدد مقامات پر ان مراحل کی تفصیل بھی بتا چکا ہے تو اب یہاں اعجاز بلاغت کا تقاضا یہی ہے کہ ان سب مراحل کو ایجاز و اختصار سے پیش کیا جائے۔ اسی لیے قرآن نے یہاں ماحییت کی جگہ مادمت فیہم استعمال کیا کہ یہ جملہ اختصار کے ساتھ حضرت مسیح کی زندگی کے دونوں حصوں پر حاوی ہے اس حصہ پر بھی جو ابتداء زندگی سے شروع ہو کر رفع الی السماء پر ختم ہوتا ہے اور اس حصہ پر بھی جو نزول ارضی سے شروع ہو کر موت پر ختم ہوتا ہے۔ اسی طرح قرآن نے فلما امتنی کا انداز چھوڑ کر توفیتنی کی تعبیر اس لیے اختیار کی کہ یہ جملہ بھی پہلے جملے کی طرح باقی دونوں مرحلوں کو اپنی آغوش میں لے لے اس مرحلہ کو بھی جو رفع الی السماء کی صورت میں پیش آیا اور اس مرحلہ کو بھی جو نزول کے بعد موت کی صورت میں واقع ہوا۔ کیونکہ موت سے تو صرف ایک حالت پر روشنی پڑتی تھی مگر توفی میں بیک وقت دونوں حقیقتیں موجود ہیں۔ حقیقی معنے کے لحاظ سے صرف اخذ و تناول اور کنایہ کے اعتبار سے اخذ و تناول کے ساتھ ساتھ موت کے معنے بھی ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام عرض کریں گے کہ خدایا جو وقت میں نے ان کے درمیان گزارا اس کے لیے تو بے شک میں شاہد ہوں لیکن توفی کے وقت میں ان کا فقط تو ہی نگہبان رہا۔ باقی تیری شہادت تو ہر حال ہر وقت ہر شے پر حاوی ہے۔

حضرت مسیح کی جناب الٰہی میں استدعا

۲۱۹ - اگر تو ان کو عذاب دے تو وہ تیرے بندے ہیں اور اگر تو انہیں بخش دے تو تو سب پر غالب ہے اور اپنے سارے کاموں میں حکمت والا ہے۔ یعنی آپ اپنے بندوں پر ظلم اور بے جا سختی نہیں کر سکتا اس لیے اگر ان کو سزا دیں گے تو عین عدل و حکمت پر مبنی ہوگا اور فرض کیجئے کہ معاف کر دیں تو یہ معافی بھی از راہ عجز و سفہ نہ ہوگی چونکہ آپ عزیز ہیں اور زبردست و غالب ہیں اس لیے کوئی مجرم آپ کے قبضہ و قدرت سے نکل کر بھاگ نہیں سکتا کہ آپ اس پر قابو نہ پا سکیں اور چونکہ حکیم حکمت والے ہیں اس لیے یہ بھی ممکن نہیں کہ کسی مجرم کو یوں ہی بے موقع چھوڑ دیں۔ بہر حال جو فیصلہ آپ ان مجرمین کے حق میں کریں گے وہ بالکل حکیمانہ اور قادرانہ ہوگا۔ حضرت مسیح علیہ السلام کا یہ کلام چونکہ محشر میں ہوگا۔ جہاں کفار کے حق میں کوئی شفاعت اور استدعا رحم وغیرہ نہیں ہو سکتی اس لیے حضرت مسیح نے عزیز حکیم کی جگہ غفور رحیم وغیرہ صفات کو اختیار نہیں فرمایا۔ برخلاف اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دنیا میں اپنے پروردگار سے عرض کیا تھا رب انھن اضللن کثیرا من الناس فمن تبعنی فانہ منی و من عصانی فانک غفور رحیم اے پروردگار ان بتوں نے بہت سے آدمیوں کو گمراہ کر دیا تو جو ان لوگوں میں میرا تابع ہوا وہ میرا آدمی ہے اور جس نے میری نافرمانی کی تو غفور رحیم ہے یعنی ایسا موقع ہے کہ تو اپنی رحمت سے آئندہ ان کو توبہ اور رجوع الی الحق کی توفیق دے کر پچھلے گناہوں کو معاف کر دے[1]

واضح رہے کہ یہ ساری گفتگو روز قیامت ہوگی۔ جہاں کافروں اور منکروں کے لیے شفاعت کا کوئی موقعہ و محل نہ ہوگا اس انداز تعبیر کا مقصد معاملہ کو بالکل اللہ کے سپرد کرنا ہے۔ امام رازی کی یہ رائے بالکل درست ہے۔

اس تعبیر سے مقصود سارے معاملہ کی اللہ کی طرف تفویض ہے اور اس موضوع پر کوئی تعرض نہ کرنا ہے۔

اور حافظ ابن کثیر کا یہ کہنا بھی بالکل برمحل ہے کہ سیدنا مسیح علیہ السلام کا مقصود یہ ہے کہ خدایا یہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لوگ کافر و مشرک ہیں اور میں ان سے بالکل بری اور بیزار ہوں۔ یعنی آپ مالک مطلق اور عزیز مطلق ہیں۔ ان کے بارے میں جو چاہیں حکم صادر فرمالیں، مجھے ان لوگوں سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ آپ ان کے حق میں جو بھی فیصلہ فرمائیں گے وہ مالکانہ حاکمانہ ہوگا۔ میں اس فیصلہ میں کیا دم مار سکتا ہوں، آپ مختار ہیں جو چاہیں کریں، یہ فقرہ اگر یوں ہوتا،

ان تغفر لھم فانھم عبادك وان تعذبھم فانك الخ

تو واضح الفاظ میں نصاریٰ کے لیے سفارش بن جاتا۔ اور سب جانتے ہیں کہ نبوت کسی درجے میں مشرکین کی شفاعت نہیں کرتی اس لیے حضرت مسیح نے بات ایسے انداز میں فرمائی ہے کہ بات سچی بھی ہو دربار الٰہی کے شایان شان بھی ہو، دردمندانہ بھی ہو اور ان پر اس سے محرفین دین اور مشرکین کی سفارش کی کوئی دوڑ آئی بھی نہ آئے۔ بہرحال اس دعا سے مقصود کفار کے حق میں سفارش نہیں بلکہ منشا تفویض و تسلیم ہے کہ آپ مختار ہیں جو چاہیں کریں۔

احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً صحیح مسلم میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن میں سے آیت رب انھن اضللن تلاوت فرمائی اور پھر حضرت عیسیٰ کی یہ دعا پڑھی ان تعذبھم فانھم عبادك بعد ازیں بارگاہ الٰہی میں ہاتھ اٹھائے اور دعا میں اللھم امتی اللھم امتی لے اللہ میری امت، کہتے رہے اور روتے رہے اللہ سبحانہ نے حضرت جبریل سے کہا کہ حضور کے پاس جا اور دریافت کر کہ رونے کا سبب کیا ہے؟ جبریل حضور اقدس کی خدمت میں آئے اور دریافت کیا، اللہ سبحانہ نے جبریل سے کہا کہ جا کر حضور اقدس سے کہہ دے کہ ہم تمہیں تمہاری امت کے معاملہ میں ضرور خوش کریں گے اور آپ کو غمگین نہ کریں گے۔

صحیح بخاری میں عبداللہ ابن عباس کے حوالہ سے ہے کہ حضور اقدس فرماتے ہیں کہ روز قیامت میری امت کے کچھ لوگ بلائے جائیں گے ان کو بائیں جانب سے پکڑا ہوگا، میں کہوں گا کہ یہ میرے ساتھی ہیں بتایا جائے گا آپ کو پتہ نہیں ہے کہ یہ لوگ آپ کے بعد دین میں کیا جدت طرازیاں کرتے رہے، میں کہوں گا جیسے عبد صالح حضرت عیسیٰ نے فرمایا وکنت علیھم شھیدا مادمت فیھم فرمایا پھر کہ وہ ہمیشہ پیچھے پلٹتے رہیں گے۔ بخاری ہی میں حضرت ابوہریرہ کی حدیث میں یہ اضافہ ہے میں کہوں گا دوری ہو ان کے لیے اور دھتکار

مسند احمد اور نسائی میں حضرت ابوذر فرماتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات یہ آیت ان تعذبھم الخ پڑھنی شروع کی اسی میں رات بیت گئی۔ ابوذر کہتے ہیں اس کے بارے میں، میں نے

دریافت کیا تو آپ نے بتایا، میں نے اللہ سے شفاعت مانگی تھی اللہ نے مجھے عطا کر دی، یہ ہر اس شخص کی ہوگی جس کا دامن ایمان شرک آلودہ نہ ہوگا۔

اس سے پتہ چلتا ہے کہ شفاعت اور ہے تفویض اور ہے۔

اہلِ صداقت کے لیے مقامِ رضا

۱۲۰ - اللہ فرمائے گا آج وہ دن ہے کہ سچے انسانوں کو ان کی سچائی کام دے گی ان کے لیے باغات ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں، ان میں وہ ہمیشہ رہیں گے اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے یہی بڑی کامیابی ہے۔ جو لوگ اعتقاداً اور قولاً و عملاً سچے رہے ہیں جیسے مسیح علیہ السلام ان کی سچائی کا پھل آج حق تعالیٰ کی رضا ہے اور جنت بھی اس لیے مطلوب ہے کہ وہ محل رضائے الٰہی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ فرمائے گا کہ آج کا دن تو راست بازوں کی فتح مندیوں کا دن ہے بدعہدوں، خائنوں اور جھوٹی آرزوؤں میں زندگی گزارنے والوں کے لیے آج حسرت و نامرادی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے، جنہوں نے اللہ کے ساتھ اپنے عہد و اخلاص و سچائی کے ساتھ پورے کیے ہیں۔ ان کے لیے باغ ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں وہ ان میں ہمیشہ رہیں گے۔ اللہ تعالیٰ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے یعنی ان کے رب نے ان سے جو کچھ چاہا انہوں نے اس کی رضا کے مطابق وہ پورا کر دکھایا اور انہوں نے اپنے رب سے جو امیدیں کیں ان کی توقعات اور ان کے تصورات سے ہزاروں لاکھوں درجہ زیادہ پوری ہو گئیں فرمایا کہ اصلی بڑی کامیابی یہی ہے۔

جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقام رضوان ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے سے خوش ہونا کہ اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے بندے پر عتاب فرمائے گا نہ اس سے ناراض ہوگا بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال نعمت عطا فرمائے گا۔ متقیوں کے لیے اللہ نے جو نعمتیں رکھی ہیں ان میں جنت، نہریں، پاک بیویاں اور سب کے بعد روح کی مسرت رکھی لیکن ان سب کے بعد بھی اپنی سب سے آخری نعمت اپنی اسی رضامندی کو ظاہر فرماتا ہے۔ سورہ توبہ پارہ دہم، سورہ حدید پارہ ۲۷، سورہ آل عمران پارہ ۳ میں اس کا خصوصی تذکرہ کیا ہے۔ اہل جنت کی صفت ہی جگہ جگہ یہ بتائی ہے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ، ان ہی آیتوں کی تفسیر میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

نے یہ بشارت سنائی ہے کہ اللہ سبحانہٗ اہلِ جنت کو آواز دے گا کہ اے جنت والو! وہ جواب دیں گے کہ اے خداوند! ہم حاضر ہیں۔ سب بھلائیاں تیرے پاس ہیں فرمائے گا کہ جنت کی نعمتیں پاکر اب تم خوش ہو گئے؟ عرض کریں گے پروردگار کیوں خوش نہ ہوں کہ تو نے ہم کو وہ کچھ دیا جو کسی کو نہیں دیا، فرمائے گا کہ میں ان تمام نعمتوں سے بڑھ کر جو چیز ہے وہ تم کو نہ دوں کہیں گے کہ اے پروردگار اس سے بہتر کیا ہے فرمائے گا یہ کہ اپنی رضامندی اور خوشنودی تم پر اتاروں اب اس کے بعد کبھی میں تم سے ناراض نہ ہوں گا۔ (صحیح بخاری و مسلم)

شہنشاہِ مطلق کی عظمت

۲۲۱۔ زمین و آسمان اور تمام موجودات کی بادشاہی اللہ ہی کے لیے ہے اور وہ ہر چیز پر قدرت والا ہے۔ یعنی ہر وفادار اور مجرم کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو ایک شہنشاہِ مطلق کی عظمت و جلال کے مناسب ہے[1] یعنی مخلوقات پر حکومت و سلطنت جو کچھ بھی ہے وہ یگانہ خدا کی ہے۔ کسی فرزند خدا یا مظہر خدا کی نہیں۔ اس سے عیسائیوں کے اس عقیدے پر ضرب لگائی ہے کہ قیامت میں عدالت کا کام خدا کے نہیں خدا کے بیٹے کے ہاتھ میں ہوگا۔ فرمایا نہیں بلکہ تمام مخلوق پر اللہ کی حکمرانی ہے سزا دینا اور معاف کرنا اللہ کا کام ہے۔ یہاں **مَا فِيهِنَّ** لاکر اشارہ کر دیا کہ سب کی حیثیت اللہ کے سامنے محکوم و مسخر ہونے کے لحاظ سے ایسی ہے جیسے ان میں جمادات کی طرح نہ کوئی قوت ہے اور نہ بہائم کی طرح عقل ہے۔ اللہ کی قدرت کے سامنے وہ گویا بے قدرت اور اس کے علم کے مقابلہ میں گویا سب لاعلم ہیں۔ قالہٗ الرازی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مَعَالِمُ الْقُرْآن

اَلْاَنْعَامْ

۶

رکوع ۲۰　　　　آیات ۱۶۵

الانعام

سورت کا نام

مشرکین نے اپنے مشرکانہ عقائد کے تحت چوپایوں میں جن چوپایوں کو حرام ٹھہرا لیا تھا، یا اپنے دیوتاؤں کو خوش کرنے کے لیے جانوروں کی جو قربانیاں پیش کرتے تھے ان کی تردید اس میں بھرپور طریقہ پر کی گئی ہے۔ اسی مناسبت اور تعلق سے اس سورت کا نام الانعام ہو گیا۔

سورت کے نازل ہونے کی تاریخ

اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ یہ سورت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی میں نازل ہوئی ہے۔ عبداللہ ابن عباس سے جس قدر روایات ہیں ان سب میں یہ قدر مشترک ہے کہ یہ سورت مکہ میں نازل ہوئی ہے اور یہ بات بھی ابن عباس کی روایت سے معلوم ہوتی ہے کہ ساری سورت کا یکبارگی نزول ہوا ہے۔ محدثین نے یہ بات متعدد صحابہ اور تابعین کے حوالے سے بتائی ہے۔ بلکہ یہ بات اس سورت کی خصوصیات میں شمار کی گئی ہے کہ یہ سورت یکبارگی نازل ہوئی، رات کو نازل ہوئی اور جس رات نازل ہوئی اسی رات آپ نے اسے قلم بند کرا دیا۔ مولانا عثمانی اپنے فوائد میں رقمطراز ہیں :

> یہ سورت مکی ہے صرف چند آیات کو بعض علماء نے مستثنیٰ کیا ہے روایات میں ہے کہ پوری سورت بیک وقت بے شمار فرشتوں کے جلو میں نازل ہوئی مگر ابن الصلاح نے اپنے فتاویٰ میں ان روایات کی صحت سے انکار کیا ہے جو پوری سورت کے دفعۃً نزول پر دال ہیں۔ واللہ اعلم

اس کے باوجود امام رازی نے اس پر اتفاق نقل کیا ہے کہ یہ سورت بیک وقت نازل ہوئی ہے۔ الاتقان میں یکبارگی نزول کی بات عبداللہ ابن عباس، عبداللہ ابن عمر، مجاہد، عطاؒ اور الدرالمنثور میں ان کے علاوہ انس بن مالک، ابی بن کعب، عبداللہ بن مسعود، اسماء بنت یزید، ابو جحیفہ اور

علی مرتضیٰ کے حوالے سے بتائی ہے۔ روایات کی کثرت بزبان حال بول رہی ہے کہ بات صحیح ہے۔ ایسی کوئی روایت نہیں ہے جس میں یہ صراحت ہو کہ سورۃ انعام یکبار نازل نہیں ہوئی۔ ظاہر ہے کہ مثبت روایات کو نافی کے مقابلہ میں اصولاً ترجیح ہونی چاہیے لہٰذا یکبارگی نازل ہونے کی روایت راجح ہے۔

اس سورت کے مضامین پر غور کرنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہ سورت مکی دور کے آخری زمانے میں نازل ہوئی ہے۔

نزول سورت کا پس منظر

یہ بات واضح ہو جانے کے بعد کہ یہ سورت مکی زندگی کے آخر میں نازل ہوئی ہے۔ یہ بات خود بخود صاف ہو جاتی ہے کہ وہ احوال و ظروف کیا تھے جن میں یہ سورت نازل ہوئی۔ اسلام کی عمر بارہ سال ہو چکی تھی۔ قریش کی آتش عداوت بھڑک اٹھی تھی اور ہر سمت جور و ستم کا آغاز ہو گیا تھا۔ خصوصاً ان مساکین کو نہایت خوفناک اذیتیں پہنچائی جا رہی تھیں، جو غلام تھے یا جن کا کوئی مددگار نہ تھا، مثلاً حضرت بلال، حضرت عمار، حضرت خباب، حضرت عثمان کو ان کا چچا صف میں لپیٹ کر لٹکا دیتا اور نیچے سے دھواں چھوڑتا، حضرت مصعب بن عمیر کو ان کی ماں نے گھر سے نکال دیا۔ بعض کو گائے اور اونٹ کے چمڑے میں لپیٹ کر دھوپ میں چھوڑ دیتے۔ بعض کو لوہے کی زرہیں پہنا کر دھوپ میں جلتے پتھروں پر گرا دیتے۔

جب قریش کے ظلم و ستم کا بادل پیہم برس کر بھی نہ کھلا تو رحمت عالم نے جاں نثاران اسلام کو ہدایت فرمائی کہ حبش ہجرت کر جائیں جو قریش کی قدیم تجارت گاہ تھی۔ حبش کے ساتھ قریش کے تجارتی روابط پشتوں سے چلے آ رہے تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے پردادا ہاشم نے قیصر روم سے تجارت کا پروانہ حاصل کیا تھا تو قیصر نے شاہ حبش کے نام ایک سفارشی خط لکھا کہ اہل مکہ کے تجارتی قافلے اپنے ملک میں آنے دے۔ اس وقت سے قریش بڑی تعداد میں حبش جاتے تھے۔ اسی زمانے میں قریش نے بنی ہاشم کا مقاطعہ کیا اور تدبیر یہ سوچی گئی کہ حضور انور کو اور ان کے خاندان کو محصور کر کے ختم کر دیا جائے۔ بنی ہاشم نے محصوری کا یہ زمانہ بڑی تکلیفوں میں بسر کیا۔ محصوری سے نکلنے کے بعد ابو طالب اور حضرت خدیجہ نے چند روز کے تقدم و تاخیر سے وفات پائی۔ یہ سنہ ۱۰ نبوی کا واقعہ ہے۔ ابو طالب آنحضور کی حفاظت کا سب سے بڑا ذریعہ تھے۔ حضرت خدیجہ حضور اقدس کی انتہائی غم خوار اور غمگسار اہلیہ تھیں۔ ان ہمدردوں کی جدائی سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اتنا قلق ہوا کہ اس سال کا نام "عام الحزن" رنج و غم کا سال پڑ گیا۔ اب آپ ہر دنیوی سہارے سے محروم ہو کر شدید مزاحمتوں کے مقابلے میں تبلیغ رسالت کا فرض انجام دے رہے تھے۔ اس

زمانے میں یعنی سنہ میں حضور انور موسم حج میں معمول کے مطابق دعوت کے لیے نکلے عقبہ میں پہنچے جو حرا اور منیٰ کے درمیان ہے تو چند افراد نظر آتے، عادت کے مطابق ان کو اسلام کی دعوت دی قرآن کی کچھ آیات سنائیں۔ یہ مدینہ کے رہنے والے خزرجی ہیں۔ انہوں نے اسلام قبول کر لیا۔ یہی چھ خوش نصیب خزرجی تھے جن کے قبولِ اسلام نے یثرب کے لیے مرکزِ اسلام بننے کا راستہ ہموار کر دیا۔

سورہ انعام کے مطالب

عرب میں صرف تین قومیں آباد تھیں جن کا اسلام لانا گویا تمام جزیرۃ العرب کا اسلام لانا تھا۔ یعنی مشرکین، یہود اور نصاریٰ۔ مشرکین عرب کا مرکز خانہ کعبہ تھا۔ ان کی مذہبی پیشوائی قریش کے ہاتھ میں تھی۔ یہود کا صدر مقام مدینہ اور خیبر تھا۔ نصاریٰ اور مجوس شام اور یمن کے اطراف میں پھیلے ہوئے تھے اس لیے الاقرب فالاقرب کے لحاظ سے دعوتِ اسلام کی قدرتی ترتیب یہ تھی کہ قریش اور کفارِ مکہ کو پہلے دعوت دی جائے پھر یہود کو حلقہ بگوشِ اسلام بنایا جائے۔ اس کے بعد نصاریٰ کو، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی ترتیب کے ساتھ اسلام کی دعوت دی۔ اس سورت میں چونکہ مخاطب قریش اور کفارِ مکہ ہیں اس لیے ان کے سامنے توحید معاد اور رسالت کے دلائل واضح کرتے ہوئے ان کو ایمان لانے کی دعوت دی ہے۔ اس سورت کی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں خالص توحید کا بیان، اسماء و صفات کی تشریح، شرک کے ہر پہلو کی نفی اور توحید کے ہر پہلو کی تکمیل ہے۔ شرک کی جو گوناگوں صورتیں مکہ والوں میں موجود تھیں اور جس طرح سورہ انعام میں ان کا رد کیا گیا، اس کا اجمالی خاکہ یہ ہے، اشخاص پرستی اور آثار پرستی، خدا اور بندوں کے درمیان واسطوں کا مشرکانہ اعتقاد، خوارق کے بارے میں غلط تصورات، تحلیل و تحریم کا دائرہ، غیر خدا کی مشرکانہ تعظیم، صفاتِ الٰہی کی توحید، مخفی قوتوں کا ابطال، اوہام و خرافات کا ابطال، کفارہ و شفاعت کے غلط معنے کی تردید، اجرام سماوی کی قدرت کا انکار، خدا کی مشیت میں کوئی شریک نہیں۔

یہ توحید کے سلبی اجزا تھے یعنی توحید کے مخالف عقائد و خیالات کی نفی اور تردید لیکن سورہ انعام میں اس سے اہم اور بالاتر بات یہ ہے کہ توحید کی اصل بنیاد کی استواری اور اس کے اصول کی تعیین کی گئی ہے۔ شاید اسی لیے علامہ ابو اسحاق اسفرائنی نے سورہ انعام کے بارے میں فرمایا ہے کہ توحید کے تمام قواعد و اصول پر یہ سورت مشتمل ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ نے اس سورت میں توحید اور رسالت معاد کے دلائل قاہرہ بیان فرماتے ہیں اور مشرکین و ملحدین اور متبدعین کے مذہب کا

بھرپور ابطال کیا ہے۔

اس سورت میں تمام انسانوں کو قرآن نے اللہ تعالیٰ کی حقیقی عظمت سے آشنا کیا۔ اس کی وحدت اور بے مثالی سے باخبر کیا، اس کی مشیت وارادہ و قدرت و وسعت سے آگاہ کیا۔ ایک ایسی ہستی کے اعتقاد کی تعلیم دی جس کی قدرت بے انتہا جس کی وسعت غیر محدود ہے، جس کی مشیت کائنات کے ہر ذرے میں نافذ ہے، جس کے علم کے احاطہ میں اندھیرے اور اجالے کی ہر چیز داخل ہے۔ دلوں کے اسرار زبانوں کے الفاظ اور ہاتھ پاؤں کے اعمال سب ہر لحظہ اور ہر لمحہ اس کے روبرو ہیں۔ اس کے سامنے انسان اپنے ہر عمل کا جوابدہ ہے۔ اس کے مواخذے کا خوف اس کی رحمت کی امید ہے۔ اس کی قوت ہر قوت پر غالب اس کا ارادہ ہر ارادے میں نافذ اور اس کا حکم ہر حکم سے بالاتر ہے۔ اس کی عبادت ہر مخلوق پر فرض اور اس کی طاعت ہر مکلف پر واجب ہے۔ وہ ہر عیب سے پاک ومنزہ اور ہر وصف کا مستحق اور اس سے متصف ہے۔ انسانوں کو اپنی یاد دلانے اور ان کے تزکیہ کے لیے رسولوں کو روانہ کرتا رہا ہے۔ وہ اندھیروں کی روشنی، بھوکوں کی سیری، مایوسیوں کی امید، زخمیوں کا مرہم، بے قراروں کی تسلی اور بے کسوں کا سہارا ہے۔ اس کی محبت دنیا کا حاصل، اس کی عبادت ہماری زندگی کا مقصود اور اس کی یاد ہمارے دلوں کی راحت ہے۔

اس سورت میں توحید کا جو چہرہ پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ ہر قسم کی قوت، ہر قسم کی قدرت اور تمام اوصاف کمال صرف ایک بزرگ اور برتر ہستی کے لیے ہیں۔ جو ماورائے عرش سے زیر فرش تک ہر ذرے پر حکمران ہے۔ اس کی اطاعت کے دائرے سے کوئی ذرہ باہر نہیں۔ انسان کی پیشانی کو ہر چوکھٹ سے اٹھ کر صرف اسی کے آستانہ پر جھکنا چاہیے۔ ہماری تمام عقیدت ہماری تمام محبت ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں، ہماری تمام عاجزیاں صرف اسی ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم وکرم کے ذریعے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو۔

آیاتہا ۱۶۵ — (۶) سُوْرَۃُ الْاَنْعَامِ مَکِّیَّۃٌ (۵۵) — رکوعاتہا ۲۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ الَّذِیْ خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَ الْاَرْضَ وَجَعَلَ الظُّلُمٰتِ
وَالنُّوْرَ ؕ ثُمَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا بِرَبِّهِمْ یَعْدِلُوْنَ ۝۱ هُوَ الَّذِیْ
خَلَقَكُمْ مِّنْ طِیْنٍ ثُمَّ قَضٰۤی اَجَلًا ؕ وَ اَجَلٌ مُّسَمًّی عِنْدَهٗ
ثُمَّ اَنْتُمْ تَمْتَرُوْنَ ۝۲ وَ هُوَ اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَ فِی الْاَرْضِ ؕ
یَعْلَمُ سِرَّكُمْ وَ جَهْرَكُمْ وَ یَعْلَمُ مَا تَكْسِبُوْنَ ۝۳

ستائش کی ہر قسم اس اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں
اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا، اس پر
بھی منکرین حق دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہراتے ہیں[۱]۔
وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا، پھر ایک مدت مقرر
فرمادی اور ایک مقررہ مدت اور بھی ہے جو اس کے علم میں مقرر
ہے، تعجب ہے کہ تم شک کر رہے ہو[۲]۔ وہی اللہ ہے

آسمانوں میں بھی، اور زمین میں بھی، وہی تمہاری چھپی اور کھلی باتوں کو جانتا ہے اور تم جو کچھ کمائی کرتے ہو وہ جانتا ہے۔ [۳]

نظامِ تخلیق سے توحید پر استدلال

اہلِ عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے۔ قدرت کے کارخانہ کا اس کو تنہا مالک سمجھتے تھے۔ یہاں قرآن نے اس اللہ سبحانہ' کا جلوہ نمایاں کیا ہے جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک کا تنہا مالک ہے۔ اس کے کاروبار میں کوئی دوسرا شریک نہیں ہے۔ اس کی شہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہے۔ اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں، کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں ہے۔ دُنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں ہے۔ شجر، حجر، جنگل، پہاڑ، صحرا اور سورج چاند، زمین و آسمان، انسان، حیوان زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح و تحمید میں معروف ہیں سب کمزور ہیں وہ ہی ایک قوت والا ہے سب جاہل ہیں اسی ایک کو علم ہے۔ سب فانی ہیں۔ اسی ایک کو بقا ہے سب محتاج ہیں وہی ایک بے نیاز ہے۔ سب اس کے بندے ہیں۔ وہی ایک شہنشاہ ہے۔ غرض عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے اور اس پر صرف اسی کی حکمرانی ہے وہ ہر عیب سے پاک، ہر بُرائی سے منزہ اور ہر الزام سے بری ہے۔ وہ ہر قسم کے صفاتِ عالیہ اوصافِ کمالیہ اور محامدِ جمیلہ سے موصوف ہے۔ ہر قسم کی خوبیاں اور ہر طرح کے کمالات اس کے لیے ہی ہیں۔ انسان کا وجود اور اس کے وجود سے باہر کی ہر چیز ایک اللہ سبحانہ' کی کارفرمائیوں کی جلوہ گاہ ہے۔ اس لیے ساری حمد و ستائش اسی کے لیے ہے۔ انسان کی سب سے بڑی گمراہی یہ رہی ہے کہ اس کی نظریں اصحابِ کمال کے جلووں میں محو ہو کر رہ جاتیں۔ صاحبِ کمال سے آگے بڑھ کر خالقِ کمال تک نہ پہنچتیں وہ پردوں کے نقش و نگار دیکھ کر بے خود ہو جاتا مگر اس کی جستجو نہ کرتا جس نے اپنے جمالِ صنعت پر یہ دلآویز پردے ڈالے ہیں۔ دُنیا میں مظاہرِ فطرت کی پرستش کی بنیاد اسی کوتاہ نظری سے پڑی۔ الحمد للہ اس حقیقت کا اقرار ہے کہ اس کائنات میں تمام جمال و جلال خواہ کسی گوشہ اور کسی صورت میں ہو۔ نہ ایک ذات

حق سبحانہٗ کی صفتوں کا ظہور ہے اور بس۔

ا۔ ستائش کی ہر قسم اس اللہ کے لیے ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو پیدا کیا اور تاریکیوں اور روشنی کو بنایا اس پر بھی منکرین حق دوسروں کو اپنے رب کا ہمسر ٹھہراتے ہیں۔ مجوس دنیا کے لیے دو خالق مانتے ہیں۔ یزدان جو خالق خیر ہے اور اہرمن جو خالق شر ہے۔ اور دونوں کو نور و ظلمت سے منور کرتے ہیں۔ ہندوستان کے مشرک تینتیس کروڑ دیوتاؤں کے قائل ہیں۔ آریہ سماج باوجود ادعائے توحید مادہ اور روح کو خدا کی طرح غیر مخلوق اور قدیم کہتے اور خدا کو اپنی صفت تکوین و تخلیق وغیرہ میں ان دونوں کا محتاج بتلاتے ہیں۔ عیسائی دنیا کو باپ بیٹے کا توازن قائم رکھنے کے لیے آخر تین ایک اور ایک تین کا مشہور عقیدہ اختیار کرنا پڑا۔ یہودیوں نے خدا تعالیٰ کے لیے وہ صفات تجویز کیں کہ ایک معمولی انسان بھی نہ صرف اس کا ہمسر بلکہ اس سے بھی برتر ہو سکتا ہے۔ عرب کے مشرکین نے تو خدائی تقسیم میں یہاں تک سخاوت دکھلائی کہ شاید ان کے نزدیک پہاڑ کا ہر پتھر نوعِ انسانی کا معبود بننے کی صلاحیت رکھتا تھا۔ غرض آگ پانی، سورج ستارے درخت پتھر حیوان کوئی چیز لوگوں نے نہ چھوڑی جسے خدائی کا کوئی حصہ اور عبادت اور استعانت کے وقت خدا کے برابر نہ بٹھایا ہو۔ حالانکہ وہ ذات پاک جو تمام صفات کمال کی جامع اور ہر قسم کی خوبیوں کا منبع ہونے کی وجہ سے سب تعریفوں اور ہر طرح کی حمد و ثنا کی بلا شرکت غیرے مستحق ہے جس نے آسمان و زمین یعنی کل علویات و سفلیات کو پیدا کیا اور رات دن اندھیرا اجالا، علم و جہل، ہدایت و ضلالت، موت و حیات غرض متقابل کیفیات اور متضاد احوال ظاہر فرمائے اس کو اپنے افعال میں نہ کسی حصہ دار یا مددگار کی ضرورت ہو سکتی ہے نہ بیوی اور اولاد کی، نہ اس کی معبودیت اور الوہیت میں کوئی شریک ہو سکتا ہے نہ ربوبیت میں۔ نہ اس کے ارادے پر کوئی غالب آسکتا ہے اور نہ اس پر کسی کا دباؤ چل سکتا ہے۔ پھر تعجب ہے کہ ان حقائق کو سمجھنے کے بعد بھی کسی طرح لوگ کسی چیز کو خدائی کا مرتبہ دیتے ہیں [1]

یاد رہے کہ یہاں مخاطب وہ مشرکین ہیں جو اللہ سبحانہٗ کو اس کائنات کا خالق مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہی دن نکالتا اور رات لاتا ہے اور اسی نے آفتاب کو وجود بخشا ہے۔ ان میں سے کسی کا بھی یہ عقیدہ نہیں ہے کہ یہ اللہ کے سوا کوئی اور کرتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کا مخاطب توحید خالقیت کا قائل ہے۔ یہ چونکہ اس کی مانی ہوئی بات ہے اس لیے اس کی مانی ہوئی بات سے توحید

[1] افادات شیخ الاسلام

عبادت کے لیے بطور دلیل پیش کیا ہے یعنی جب تم مانتے ہو کہ زمین و آسمان کا خالق اور گردش لیل و نہار کا فاعل اللہ ہے تو پھر عبادت میں اللہ کے سوا اوروں سے تعلقات استوار کیوں کرتے ہو ان کے سامنے سجدے ان کے ناموں کی نذریں اور نیازیں کیوں کرتے ہو، ان سے دعائیں کیوں مانگتے ہو اور ان کے سامنے اپنی حاجتیں کیوں پیش کرتے ہو؟

حمد کوئی سی ہو اور کسی قسم کی ہو اللہ کے لیے ہے، حمد کا درجہ لغوی اعتبار سے مدح اور شکر دونوں سے بلند تر ہے۔ حمد محمود کی عام اختیاری خوبیوں پر کی جاتی ہے۔ یہ فقرہ الحمدللہ توحید کے سارے انواع واقسام کے لیے جامع ہے۔ امام رازی نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی کی ہے کہ خود ستائی بندوں کے حق میں عیب ہے لیکن جس نے حمد الٰہی کے حکم کو اللہ کے حق میں عیب سمجھا اس نے اللہ کو بندوں پر قیاس کر لیا۔ اور معتزلہ کے اکثر خیالات کی بھی بنیادی غلطی یہی ہے۔ امام موصوف ہی نے یہاں یہ ضابطہ بھی بتایا ہے کہ جس طرح افعال خلق پر افعال حق کو قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ اسی طرح صفات خلق پر صفات حق کو اور ذات خلق پر ذات حق کو قیاس نہیں کیا جا سکتا ہے۔

یہاں حمد کو پہلے اللہ کے اسم ذاتی اور پھر صفات کے ساتھ متعلق کرنے میں اس طرف اشارا ہے کہ حمد کا استحقاق حق تعالیٰ کو بحیثیت ذات بھی ہے اور بحیثیت صفات بھی۔

خلق کے معنے عدم سے وجود میں لانے کے ہیں۔ السماوات والارض یہ دو نام ان چیزوں کے دیے گئے جن کو فلسفہ کی زبان میں جوہر کہتے ہیں اور الظلمات والنور ان دو چیزوں کے نام ہیں جن کو فلسفہ میں عرض کہتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں جوہر ہو یا عرض ہر چیز کا بلا استثنا خالق و فاطر اللہ ہی ہے کوئی چیز اس کے لیے غیر مخلوق نہیں ہے۔

زمین و آسمان کی بناوٹ کے لیے خلق اور ظلمات و نور کے وجود و ظہور کے لیے جعل کا بلیغ تنوع بتا رہا ہے کہ اگرچہ ایک درجہ میں دونوں میں معنوی ہم آہنگی ہے لیکن جعل میں تضمین کے معنے بھی ہوتے ہیں نور و ظلمت ایک دوسرے کے بعد آتے ہیں اس لیے وہ ایک حیثیت میں ایک دوسرے سے پیدا ہو کر آتے ہیں۔ جعل میں بہ نسبت خلق کے زیادہ عموم ہے یہ تکوینی بھی ہوتا ہے اور تشریعی بھی۔

نور کو مفرد اور ظلمات کو جمع لا کر اشارہ کر دیا کہ نور میں وحدت ہی وحدت ہے جبکہ ظلمات میں تعدد ہے۔ نور کے مصادر میں خواہ تعدد ہو لیکن نور میں قوت اور ضعف تو ہو سکتا ہے مگر تعدد نہیں ہو سکتا۔ برخلاف ظلمت کے کہ اس کا آخر کوئی نہیں۔

بہر حال مطلب یہ ہے کہ یہ مانتے ہو کہ آسمانوں، زمین اور ظلمات و نور کا خالق اللہ ہے تو پھر یہ کیسی

عجیب بات ہے کہ یہ کفار دوسروں کو خدا کا ہمسر اور شریک ٹھہراتے ہیں۔ یہاں ثم اظہارِ تعجب کے لیے ہے یعنی جب ساری چیزوں کا خالق اللہ ہی ہے تو پھر یہ شرک کی گنجائش کہاں سے نکال لیتے ہو۔

۲۔ وہی ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا پھر ایک مدت مقرر فرمادی اور ایک مقررہ مدت اور بھی ہے جو اس کے علم میں معین ہے۔ تعجب ہے کہ تم شک کرتے ہو۔ اوپر عالم کبیر کا ذکر تھا، یہاں عالم صغیر انسان کی خلقت بیان فرماتے ہیں کہ دیکھو شروع میں بے جان مٹی سے آدم علیہ السلام کا پتلا تیار کرکے کس طرح حیات اور کمالات انسانی کا فیضان فرمایا۔ اور آج بھی مٹی سے غذائیں نکلتی ہیں اور غذاؤں سے نطفہ اور نطفہ سے انسان بنتے رہتے ہیں۔ غرض اس طرح تمہیں عدم سے وجود میں لایا۔ پھر ہر شخص کی موت کا وقت مقرر کر دیا جبکہ دوبارہ اسی مٹی سے جاملتا ہے جس سے پیدا کیا گیا تھا۔ اسی پر قیاس کر سکتے ہو کہ عالم کبیر کی فنا کا بھی ایک وقت مقرر ہے جسے قیامت کبریٰ کہتے ہیں۔ قیامت صغریٰ یعنی شخصی موتیں جو کہ ہمیں پیش آتی رہتی ہیں ان کا علم بھی لوگوں کو ہوتا رہتا ہے لیکن قیامت کبریٰ کی ٹھیک مدت کا علم صرف اللہ ہی کے پاس ہے۔ تعجب ہے عالم صغیر یعنی انسانوں میں زندگی اور فنا کا سلسلہ دیکھتے ہوئے بھی عالم کبیر کی فنا میں کوئی آدمی تردد کر سکتا ہے[1]

اجل یا اجل مسمیٰ کا لفظ فرد یا اقوام کے تعلق سے مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک تو اس مدت حیات کے لیے جو ہر فرد کو تقدیر کی طرف سے ملی ہے دوسرے روز بعث اور قیامت کے لیے استعمال ہوا ہے جو خلق کے اٹھائے جانے کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقرر ہے۔ تیسرے ایک مقررہ پیمانے کے لیے استعمال ہوا ہے جو کسی قوم کی ہلاکت کے لیے مقرر ہے۔ اس آیت میں اجل کا ذکر دو مرتبہ ہے۔ ایک اجل تو ظاہر ہے کہ وہی ہے جو ہر فرد کی مدت حیات ہے، دوسرے اجل جس کے ساتھ مسمیٰ لگا ہوا ہے اس سے وہ مدتِ مقررہ مراد ہے جو اس عالم کو اٹھائے جانے کے لیے مقرر ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ وہی خدا ہے جس نے تمہیں مٹی سے پیدا کیا اور یہ ایک حقیقت ہے جس سے تمہیں بھی دانستہ انکار نہیں۔ پھر ہر ایک کے لیے اس نے زندگی کی ایک مدت مقرر کی ہے۔ یہ نہیں کہ جو پیدا ہوتا ہے وہ ہمیشہ ہی رہتا ہے۔ پھر اس میں شک کی کیا گنجائش ہے کہ جس خدا نے تمہیں مٹی سے بنایا وہ تمہیں دوبارہ اسی مٹی سے اٹھائے گا۔ اس کے لیے اس نے

---

[1] افادات۔ شیخ الاسلام

ایک مدت مقرر کر رکھی ہے جس کا علم صرف اسی کو ہے۔ یہ ایک واضح حقیقت ہے جس میں کسی بحث وجدال کی کوئی گنجائش نہیں ہے لیکن تم ہر بات میں الجھتے ہو اور بحث وجدال کرتے ہو۔ بتانا یہ ہے کہ وہی خدا جس نے تمہیں پیدا کیا اور تمہارے لیے دو اجلیں یعنی دو میعادیں ٹھہرا دی ہیں۔ ایک زندگی و معیشت کی مہلت ہے دوسرے روز قیامت کا مقررہ وقت پہلی میعاد عمل کے لیے ہے دوسری نتائج عمل کے فیصلے کے لیے۔ حافظ ابن کثیر نے اجلین کی تشریح صحابہ اور تابعین سے یہ نقل کی ہے۔

عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں پہلی اجل سے مراد انسان کی موت ہے اور دوسری اجل سے مراد قیامت ہے۔ اور یہی تابعین تقریباً دس علمائے تابعین کا مختار ہے اور امام الحسن البصری فرماتے ہیں کہ ثم قضیٰ اجلاً سے پیدائش سے موت تک اور اجل مسمی سے موت سے قیامت تک عرصہ مراد ہے۔ بالفاظ دیگر پہلی اجل سے انسانی زندگی اور دوسری اجل سے پوری کائنات کی زندگی مراد ہے۔

اللہ ہی کار فرمائے عالم ہے

۳۔ وہی اللہ ہے آسمانوں میں بھی اور زمین میں بھی، وہی تمہاری چھپی اور کھلی باتوں کو جانتا ہے اور تم جو کچھ کمائی کرتے ہو وہ جانتا ہے۔ یعنی تمام آسمانوں، زمین میں تنہا وہی معبود، مالک بادشاہ، متصرف اور مدبر ہے۔ اور یہ نام مبارک اللہ بھی صرف اسی کی ذات متعالی الصفات کے لیے مخصوص رہا ہے۔ پھر اوروں کے لیے استحقاق معبودیت کہاں سے آیا؟ اور جب زمین و آسمان میں اسی کی حکومت ہے اور وہی بلاواسطہ ہر کھلی چھپی چیز اور انسان کے ظاہر و باطن اور چھوٹے بڑے عمل پر مطلع ہے تو عابد کو اپنی عبادت و استعانت وغیرہ میں کسی غیر اللہ کو شریک ٹھہرانے کی ضرورت نہیں رہتی۔ مشرکین جو ما نعبد ھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ کہا کرتے تھے یہ ان کا اور ان کے ہمنواؤں کا جواب ہوا اور پہلے اجل مسمی عندہ سے جو قیامت کی طرف اشارہ کیا تھا۔ یہاں سلسلہ مجازات پر متنبہ فرمایا کہ زمین و آسمان میں حکومت ہماری ہے اور تمہارے سب کھلے چھپے، نیک و بد اعمال بھی ہمارے علم میں موجود ہیں پھر کوئی وجہ نہیں کہ تم یوں ہی مہمل چھوڑ دیے جاؤ [1]

دراصل پہلی آیت میں اللہ کی خالقیت سے توحید عبادت پر استدلال کیا تھا اور درمیان میں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اسی کی تاکید کی خاطر قیامت کا ذکر کیا ہے۔ کیونکہ توحید عبادت اور قیامت میں گہرا لگاؤ ہے کیونکہ عبادت نام ہے عملی زندگی میں اللہ کی مرضی کو اپنانے کا جبکہ قیامت کہتے ہیں اسی عملی زندگی کے ظہور نتائج کو قیامت کو ماننے بغیر عبادت کا سارا نظام بے کار ہے۔ اب اس آیت میں اللہ کے کائنات میں متصرف ہونے سے توحید عبادت پر استدلال ہو رہا ہے۔ مشرکین کسی کو اس کائنات میں بڑے بڑے کاموں کی تدبیر، اللہ کا شریک نہیں مانتے تھے۔ ان کا شرک یہ تھا کہ کچھ بندوں کے بارے میں یہ خیال کرتے تھے کہ وہ کچھ مخصوص کام کر سکتے ہیں۔ ان کا خیال یہ تھا کہ علی الاطلاق بادشاہ تو اللہ ہے لیکن وہ اپنے بعض بندوں کو حاجت روائی کی خلعت سے مشرف کر دیتا ہے اور ان کی رضا اور ناراضگی کو سب بندوں پر ترجیح دیتا ہے ٹھیک ایسے ہی جیسے ایک بادشاہ اپنے مخصوص غلاموں کو اطراف مملکت میں روانہ کرتا ہے اور ان کو جزوی معاملات میں تصرف کا اختیار دے دیتا ہے اور ان معاملات سے خود بے رُخ ہو جاتا ہے اور لوگوں کے معاملات ان کے سپرد کر دیتا ہے۔ ان ہی کی سفارش قبول کرتا ہے۔ یہاں قرآن اسی مشرکانہ ذہن پر یہ کھری ضرب کاری لگا رہا ہے وھو اللہ فی السماوات والارض، وہی جو آسمان و زمین کا پیدا کرنے والا تاریکی اور روشنی بنانے والا ہے۔ آسمان و زمین میں اللہ ہے وہ تمہارے اقوال میلانات دل کی کیفیات اور اعمال کو جانتا ہے ہر جگہ اسی کا حکم چلتا ہے یہ نہیں کہ بڑے بڑے کام وہ کرتا ہے اور کچھ اور بھی کرتے ہیں اور وہی یہ بھی جانتا ہے کہ تم کیا کمائیاں کرتے ہو۔ اس طرح یہ مشرکین کے اس خیال کی تردید ہے کہ آسمان و زمین کا خالق خدا ہی ہے اور بڑے بڑے کام بھی وہ کرتا ہے لیکن کچھ کام اس نے کچھ اچھے بندوں کے سپرد کر دیئے ہیں۔ ان کا انتظام و انصرام وہ کرتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مشرکین کا یہ عقیدہ تھا کہ سارے جہاں کا مدبر تو اللہ ہی ہے لیکن وہ اپنے بعض بندوں کو بعض مخصوص علاقوں میں تصرف کرنے کا اختیار عطا فرما دیتا ہے۔ اصل الفاظ یہ ہیں یجعلہ موثرا فی قسط من العالم (بدور بازغہ) پھر آگے لکھتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا نام لینے والے منافقین کا بھی آج کل یہی عقیدہ ہے۔ (بدور بازغہ)

وَمَا تَأْتِيهِم مِّنْ آيَةٍ مِّنْ آيَاتِ رَبِّهِمْ إِلَّا كَانُوا عَنْهَا مُعْرِضِينَ ﴿٤﴾
فَقَدْ كَذَّبُوا بِالْحَقِّ لَمَّا جَاءَهُمْ فَسَوْفَ يَأْتِيهِمْ أَنبَاءُ مَا
كَانُوا بِهِ يَسْتَهْزِءُونَ ﴿٥﴾ أَلَمْ يَرَوْا كَمْ أَهْلَكْنَا مِن قَبْلِهِم
مِّن قَرْنٍ مَّكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ مَا لَمْ نُمَكِّن لَّكُمْ وَأَرْسَلْنَا السَّمَاءَ
عَلَيْهِم مِّدْرَارًا وَجَعَلْنَا الْأَنْهَارَ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمْ
فَأَهْلَكْنَاهُم بِذُنُوبِهِمْ وَأَنشَأْنَا مِن بَعْدِهِمْ قَرْنًا آخَرِينَ ﴿٦﴾

اور ان کے پروردگار کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے
پاس آتی ہے اس سے وہ بے رخی اختیار کر لیتے ہیں۔ ؀
چنانچہ اس حق کی بھی انہوں نے تکذیب کر دی جو وہ ان کے
پاس آیا، جس چیز کا یہ لوگ مذاق اڑاتے رہے ہیں جلد ہی ان کو
اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے ہیں
کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی قومیں ہلاک کر دیں جن کو ہم نے

ملک میں ایسا جماؤ دیا تھا کہ تمہیں بھی ایسا جماؤ نہیں دیا۔ ہم نے ان پر لگاتار برسنے والی آسمانی برسات بھیج دی اور ان کی بادیوں کے نیچے بہتی نہریں بنا دی تھیں، پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسری قوموں کو پیدا کر دیا۔[٦]

تکذیبِ حق کا انجام

دلائل توحید بیان فرمانے کے بعد اب یہاں بتایا جا رہا ہے کہ نبوت کے مخاطبوں میں اس سچائی کو قبول نہ کرنے کا سبب کیا ہے وہ کیوں خدا کی نشانیوں کو دیکھ کر اعراض، تکذیب اور استہزاء کر رہے ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ کفر کے تین درجے ہیں۔ پہلا درجہ اعراض دوسرا درجہ تکذیب اور تیسرا درجہ استہزاء، یہ کفر کا آخری درجہ ہے۔ انسان ہمیشہ خدائی نشانیاں جھٹلاتا ہے۔ چنانچہ آج بھی سچائی کی جو دعوت نمودار ہوتی ہے منکرینِ حق اس سے منہ موڑ رہے ہیں، تکذیب کر رہے ہیں اور مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس کے نتیجہ میں اس کے انجام سے ان کو دوچار ہونا پڑے گا۔ نبوت کی پیش کردہ آیات اگر وہ تکوینی ہوں اور یہاں اسی کا احتمال ہے۔ کفار پر نتائج کے لحاظ سے دو قسم کی ہوتی ہیں آیت ہدایت اور آیت ہلاکت، کفار کو پہلے ہدایت کی نشانیاں دکھاتے ہیں اور ان کو حق کی دعوت دیتے ہیں۔ کفار کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزاء ہوتے ہیں وہ اس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک بالآخر وہ وقت آ جاتا ہے جب مادہ فاسد کے سوا کفار کی جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہتا۔ یعنی اس کثیف مادے سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیفہ الگ ہو جاتے ہیں اور ڈھیر میں پھونس کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا تو اس وقت آیت ہلاکت آسمان کی بجلی، فضا کی آندھی، زمین کا

سیلاب لوہے کی تلوار بن کر رونما ہوتی ہے اور زمین کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو متعدد معجزے عنایت ہوئے مگر وہ اس لیے تھے کہ ان کو دکھا کر فرعون کو حق کی طرف دعوت دی جائے جب ایک مدت کے بعد اہل مصر میں سے جس قدر لوگ ایمان لا سکتے تھے لے آئے تو حضرت موسیٰ کو شق بحر کی آیت ہلاکت ملی۔ حضرت نوح کو آیت طوفان حضرت صالح کو آیت ناقہ، حضرت لوط کو بربادی سدوم کی نشانی، حضرت شعیب کو آیت صاعقہ، حضرت عیسیٰ کو آیت رفع اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو آیت بطشۃ الکبریٰ (بدر) جو دیا گیا وہ اسی دوسری قسم میں داخل ہیں۔ ان میں سے ہر معجزہ اور نشان کے ظہور کے بعد یا خود اسی معجزے اور نشانی کے ذریعے سے معاندین کی ہلاکت استیصال اور بربادی ہوئی۔

۴۔ اور ان کے پروردگار کی نشانیوں میں سے جو نشانی بھی ان کے پاس آتی ہے اس سے روگردانی اختیار کرتے ہیں۔ آیات میں احتمال ہے کہ تکوینی آیات، اور ہوں یا تنزیلی۔[1]

آیات کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری اور مادی، دوسرے باطنی اور روحانی۔ ظاہری اور مادی آیات تو وہ خوارق ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں۔ مثلاً مُردے کو زندہ کرنا، عصا کا سانپ بن جانا باطنی و روحانی آیات مدعی نبوت کی صداقت، معصومیت، تزکیہ، تاثیر تعلیم، ہدایت، ارشاد فلاح اور تائید ہے۔ اہل نظر اور حقیقت آشناؤں کے لیے بھی باطنی آثار و آیات نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں۔ باقی ظاہری نشانیاں صرف سطحی اور ظاہر بین نگاہوں کے لیے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری ہی آنکھوں سے دیکھ کر پہچانتی ہیں۔

مصنف نے نبوت کی ظاہری و باطنی دو نشانیاں قرار دی ہیں اور شیخ الاسلام نے اسی کو تکوینی اور تنزیلی قرار دیا ہے۔ آیت میں لفظ آیت دو معنی کی گنجائش رکھتا ہے۔ اگر تکوینی آیت مراد ہے تو مطلب یہ ہے کہ جو معجزہ دیکھتے ہیں اس سے منہ پھیر لیتے ہیں اور اسے سحر کہہ کر ٹال دیتے ہیں اور اگر تنزیلی آیات مراد ہیں تو مطلب یہ ہے توحید اور قیامت کی ان باتوں سے روگردانی کی گنجائش تو نہیں ہے لیکن یہ لوگ اعراض کرتے ہیں۔

نبوت کی راہ سے آمدہ حق کی تکذیب

۵۔ چنانچہ اس حق کی بھی انہوں نے تکذیب کر دی ہے جب وہ ان کے پاس آیا جس حقیقت کا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لوگ مذاق اڑا رہے ہیں جلد ہی ان کو اس کی حقیقت معلوم ہو جائے گی۔ حق سے مراد قرآن حکیم ہے جو نشانہائے قدرت سے غفلت برتنے والوں کی بد انجامی اور دنیوی و آخروی سزا کو بیان کرتا ہے اسے سن کر منکرین تکذیب اور استہزا کرتے تھے انہیں جتلا دیا کہ جس بات پر تم ہنستے ہو اور آوازے کستے ہو وہ حقیقت ثابتہ بن کر عنقریب تمہارے سامنے آجائے گی۔ آگے ان اقوام کا حوالہ دیا ہے جو آیات اللہ کی تکذیب و استہزاء اور بداعمالیوں کی بدولت ہلاک کی گئیں[1] حق سے اگر مراد قرآن حکیم ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کی ایک ایک آیت سے اعراض اور بے رخی ہوئے قرآن کی تکذیب کا سبب ہو گئی۔ اس صورت میں جس سے اعراض کیا گیا اور جس کی تکذیب کی گئی دونوں ایک ہیں لیکن اگر حق سے مراد دین حق ہو جیسا کہ قرآن میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم دین حق لے کر آئے ۔

هو الذی ارسل رسوله بالهدی و دین الحق لیظهره علی الدین کله

تو اب مطلب یہ ہوگا کہ قرآن کی آیات سے اعراض اور روگردانی کی وجہ سے انہوں نے اس دین حق کی تکذیب کر دی جو ان کے پاس نبوت لے کر آئی ہے۔ حاصل دونوں کا ایک ہے۔ اعراض کا نتیجہ اگر تکذیب ہے تو تکذیب کا نتیجہ لازماً تعذیب ہے ان کل الا کذب الرسل فحق وعید لیکن عذاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک آیات ہدایت سے۔ قوم کے تمام صالح اجزاء اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے اور مومنین و کافرین ایک دوسرے سے پھٹ کر جدا نہیں ہو جاتے اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی نہیں ہو جاتی ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قریش کو ۱۳ برس تک دعوت دی اور ان تیرہ سالوں کے اندر اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور ان کو آیات ہدایت کے مختلف نمونے دکھائے بالآخر شق القمر کا معجزہ بھی ان کی نگاہوں کے سامنے گزرا اور آخر وہ وقت آیا جو اپنے اپنے پیغمبروں کے سامنے دوسری قوموں پر آچکا تھا۔ یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افراد صالحہ جو بے خوف و خطر حق کو قبول کر سکتے تھے انہوں نے حق کو قبول کر لیا اور صرف وہ رؤساء قریش رہ گئے جو قبول حق کی مطلق صلاحیت نہ رکھتے تھے یا وہ ضعفاء تھے جو ان رؤساء کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی طاقت نہ رکھتے تھے اور اس لیے ضرورت ہوئی کہ ان رؤساء کے وجود سے ارض حرم کو پاک کر دیا جائے۔ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے فسوف یأتیهم انباء ما کانوا به یستهزءون کے ذریعے آخری عذاب کی اطلاع دے دی اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سونا کے ذریعے دی کیونکہ ابھی ذرا دیر ہے لیکن وہ نادان استہزا کرتے تھے اور چونکہ قریش پر یہ عذاب مختلف صورتوں میں آنے والا تھا۔ قحط کی صورت میں، اقتدار سے محرومی کی صورت میں ذلت و رسوائی قتل وغارت گری کی صورت میں اور قید و بند کی صورت میں اسی کی رعایت سے آیت میں لفظ انبآ آیا ہے جو نبا کی جمع ہے جس کے معنے عظیم خبر کے ہیں۔ گویا اس میں اشارہ ہے ہجرت اور کامیابیوں کی طرف جو ہجرت کے بعد اسلام کو پے درپے حاصل ہونے والی تھیں جس وقت انبا کے ذریعے ارشاد فرمایا گیا تھا اس وقت نہ کفار یہ گمان کر سکتے تھے کہ کس قسم کی خبریں ان کو پہنچنے والی ہیں اور نہ مسلمانوں ہی کے ذہن میں اس قسم کا کوئی تصور تھا۔

عذاب کے لیے تاریخ کی شہادت

۶۔ کیا یہ لوگ نہیں دیکھتے کہ ان سے پہلے ہم نے کتنی قومیں ہلاک کر دیں جن کو ہم نے ملک میں ایسا جماؤ دیا تھا کہ تمہیں بھی ایسا جماؤ نہیں دیا، ہم نے ان پر لگاتار برسنے والی آسمانی برسات بھیج دی اور ان کی آبادیوں کے نیچے بہتی نہریں بنادی تھیں۔ پھر ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور ان کے بعد دوسری قوموں کو پیدا کیا۔ یعنی عاد و ثمود وغیرہ جن کو تم سے بڑھ کر طاقت اور ساز و سامان دیا گیا تھا۔ بارشوں اور نہروں کی وجہ سے ان کے باغ سرسبز و شاداب تھے۔ عیش اور خوش حالی کا دور دورہ تھا۔ جب انہوں نے بغاوت اور تکذیب پر کمر باندھی اور نشانہائے قدرت کی ہنسی اڑائی تو ہم نے ان کے جرموں کی پاداش میں ایسا پکڑا کہ ان کا نام و نشان مٹ کر رہ گیا۔ پھر ان کے بعد دوسری امتیں پیدا کیں اور منکرین و مکذبین کے ساتھ یہی سلسلہ جاری رہا۔ مجرمین تباہ ہوتے رہے اور دنیا کی آبادی میں کچھ خلل نہیں پڑا۔[1]

پہلے ارشاد ہوا تھا کہ جس چیز کا مذاق اڑا رہے ہیں وہ عنقریب ان کے سامنے واقعہ اور حقیقت بن کر ظاہر ہو جائے گا۔ اسی دعوے پر یہ تاریخ کی شہادت پیش کی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قریش کو یہ دھوکا نہ ہونا چاہیے کہ ان کی طاقت بہت زیادہ ہے ان کو ہلایا نہیں جا سکتا۔ ان سے پہلے ان سے زیادہ طاقتور قومیں گزر چکی ہیں جن کے پاس اقتدار بھی تھا اور رزق و فضل کی بھی فراوانی تھی۔ تاریخ گواہ ہے کہ جب انہوں نے رسولوں کی تکذیب کی تو خدا نے ان کو ہلاک کر دیا۔ قرآن سے معلوم ہوتا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے کہ جن گناہوں کی پاداش میں اُمتیں ہلاک ہوتی ہیں وہ دو قسم کے ہیں ۔

ایک اللہ کے رسولوں کی تکذیب اور ان کی دعوت کا انکار، دوسرے عیش و عشرت میں پڑ کر حق کو پامال کرکے نوابے عام کو حقیر و ذلیل کرکے، کمزوروں پر ظلم ڈھاکر، طاقتوروں کو چھوٹ اور بے لگام بنا کر زندگی کو فسق و فجور میں ڈال کر، دولت و مال پر گھمنڈ کرکے اللہ کی نعمتوں کا کفران اور عدل عام اور نفع عوام سے ہٹ کر ناخدا شناسی اور خدا کی بغاوت میں ان کا استعمال، اور ان دونوں کے نتیجہ میں دنیا میں جو عذاب آتا ہے وہ بھی دو طرح کا ہوتا ہے ۔ ایک آزادی اور اقتدار سے محرومی کی صورت دوسری آفتوں، مصیبتوں خوفناک سیلاب، بازار کی گرانی، باہم آویزش کی صورت میں، تفصیل انشاء اللہ اپنے موقعہ پر آئے گی۔ یہاں قرآن نے ان دونوں کی طرف مکنٰھم فی الارض اور ارسلنا السماء علیھم مدرارًا وجعلنا الانھار تجری من تحتھم کہہ کر اشارہ کیا ہے ۔ تمکین فی الارض سے مراد اگر اقتدار و استقلال ہے تو آسمانی برسات اور نہروں کی روانی سے خوش حالی مراد ہے ۔ آزادی سے محرومی اور بدحالی سے ہم آغوشی دونوں عذاب ہیں ۔

آیت میں دیکھنے سے مراد جاننا ہے اور قرن ایک دور کے لوگوں پر بولا جاتا ہے ۔ قرآن میں ان معنے میں یہ لفظ جگہ جگہ آیا ہے ۔ قوم نوح ایک قرن ہے چاہے ہزار سال ہو ۔ قوم عاد ایک قرن ہے ۔ قوم ثمود ایک قرن ہے ۔ تمکین کا لفظ دونوں طرح استعمال ہوتا ہے لام کے ساتھ اور بغیر لام کے ۔ لام کے ساتھ ہو تو اس کے معنے اقتدار کے لیے حالات سازگار بنا دینا اور وسائل فراہم کر دینا اور بغیر لام کے ہو تو اس کے معنے اقتدار سے ہم آغوش کر دینا ۔ مطلب یہ ہے کہ نبوت کی دعوت کی تکذیب کرنے والوں کو پتہ نہیں ہے کہ ہم نے ان سے پہلے ان قوموں کو ہلاک کر دیا ہے جن کو ہم نے ملک میں اس قدر استقلال اور اقتدار سے ہم آغوش کیا تھا کہ ان تکذیب کرنے والوں کو اس استقلال و اقتدار کے وسائل کی بھی ہوا نہیں لگی تھی اور ہم نے ان کو وہ نعمتیں دے رکھی تھیں کہ بارشوں کی فراوانی اور ان کے ملک میں نہروں کی بہتات سے معاشی اور اقتصادی خوش حالی کا دور دورہ تھا ۔ لیکن ان کا زبردست اقتدار اور بھرپور خوش حالی ان کو ہماری گرفت سے نہ بچا سکی تو تمہاری تو حیثیت ہی کیا ہے کہ نہ تمہارے پاس وہ اقتدار ہے اور نہ وہ خوش حالی ہے ۔

اس تاریخی شہادت کا خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح دوسری قوموں کے لیے مختلف اوقات میں عذاب آئے اسی طرح جس قوم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے ان پر اعراض، تکذیب اور استہزاء کے نتیجے میں عذاب آئے گا ۔ قریش کے لیے غزوہ بدر عذاب تھا ۔ ہجرت سے پہلے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے قریش پر قحط کا عذاب آیا جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں

کے سامنے اندھیرا چھاجاتا تھا۔ حضور انورؐ نے دُعا کی اور یہ بلا دور ہوئی مگر پھر بھی قریش کی سرگرانی کا دہی عالم ہوگیا تو ان کے لیے معجزہ عذاب کے سوا کوئی اور طریقہ علاج باقی نہ رہا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بدر کا بطشۂ کبریٰ ان کے لیے ہلاکت کی نشانی قرار پائی۔ یہاں قرآن نے ہجرت سے پہلے ہی ان دونوں کا اعلان سنا دیا ہے۔

آخر میں فرمایا و انشانا من بعدھم قرنا آخرین یعنی اللہ سبحانہٗ کی قدرت کاملہ کا صرف یہی تصرف نہ تھا کہ بڑی بڑی جاہ و جلال اور حکومت و سلطنت کی مالک اور قوت و طاقت والی قوموں کو چشم زدن میں ہلاک کر دیا بلکہ ان کو ہلاک کرتے ہی ان کی جگہ دوسری قوموں کو بسا دیا کہ دیکھنے والوں کو یہ محسوس بھی نہ ہوا کہ کوئی کمی ہوئی ہے۔

قرآن کے اس انداز بیان نے اس طرف بھی اشارہ کر دیا ہے کہ تاریخ کا صحیح استعمال کیا ہونا چاہیے بتا دیا کہ گزشتہ کا مطالعہ اس لیے کرنا چاہیے کہ آئندہ کے لیے عبرت حاصل کی جائے۔ یعنی جو کچھ گزر چکا ہے وہ آئندہ کے لیے ذخیرۂ بصیرت ہے اور ماضی کے آئینہ میں مستقبل کا چہرہ دیکھا جاتا ہے۔ مقصد یہ جتانا ہے کہ قریش کو اپنی قوت و ثروت پر اہل ایمان کی کمزوری کے مقابلہ میں مغرور نہ ہونا چاہیے اور اس نعرے میں مست نہ ہونا چاہیے کہ نحن اکثر اموالاً واولاداً اور تاریخ کے اس تازیانے سے بے خبر نہ رہنا چاہیے کہ رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کے ساتھ اللہ سبحانہٗ کا کیا معاملہ ہو چکا ہے۔ جو کچھ ماضی میں ہو چکا ہے وہی حال میں ہو سکتا ہے۔

وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَقَالُوْا لَوْلَآ
اُنْزِلَ عَلَيْهِ مَلَكٌ ۭ وَلَوْ اَنْزَلْنَا مَلَكًا لَّقُضِيَ الْاَمْرُ ثُمَّ
لَا يُنْظَرُوْنَ ۝ وَلَوْ جَعَلْنٰهُ مَلَكًا لَّجَعَلْنٰهُ رَجُلًا وَّلَلَبَسْنَا
عَلَيْهِمْ مَّا يَلْبِسُوْنَ ۝ وَلَقَدِ اسْتُهْزِئَ بِرُسُلٍ مِّنْ قَبْلِكَ
فَحَاقَ بِالَّذِيْنَ سَخِرُوْا مِنْهُمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝ قُلْ
سِيْرُوْا فِي الْاَرْضِ ثُمَّ انْظُرُوْا كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ
الْمُكَذِّبِيْنَ ۝

اے پیغمبر اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی ہوئی کتاب بھی
اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو لیتے پھر بھی جو
حق کا انکار کر چکے ہیں یہی کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے
کہتے ہیں کہ اس نبی پر فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ اور اگر

ہم نے کہیں فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا پھر ان کو کوئی مہلت نہ ملتی اور اگر ہم فرشتہ کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اتارتے اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے جس میں اب وہ مبتلا ہیں۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم سے پہلے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے پھر جس بات کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی بات نے گھیر لیا ان کو جو ان میں سے مذاق اڑاتے تھے ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو، پھر ان لوگوں کا انجام دیکھو جو جھٹلانے والے تھے؟

نبوت کا عرب جاہلیت سے مقابلہ

عرب قوم ایک امی محض تھی۔ الوہیت، رسالت، کتاب، معاد، عبادات ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ان کے کان آشنا ہوں اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا ان کو ایک تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ آواز معلوم ہوتی تھی۔ قرآن عزیز نے ان کی اس جاہلانہ حیرت و استعجاب کا متعدد بار ذکر کیا ہے یہ نبوت کے شرف سے محروم قوم ایک آسمانی مذہب کے تمام خصائص سے محض بیگانہ تھی صفات الٰہی آثار نبوت احوال معاد ان میں سے ہر بات کو سن کر وہ اسی طرح سرتاپا حیرت بن جاتے تھے۔ نبوت کے متعلق یہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے سزاوار نہیں اس منصب پر تو فرشتوں

کو ممتاز ہونا چاہیے۔ نبی کا تخیل اگر کبھی ان کے ذہن میں آتا تھا تو بشریت سے ماورا صورت میں یعنی یہ کہ انسانی ضروریات سے منزہ ہو اس کے پیچھے خدا کا اور فرشتوں کا پہرا ہو، آسمان اور زمین کے خزانے اس کے دستِ قدرت میں ہوں۔ یہ اور اس قسم کے تصورات ان کا مبلغ علم تھے۔ ظاہر ہے کہ ان حالات میں ان کی جانب سے متعدد شبہات جنم لیتے اور قرآن کو ان کے جواب کی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونا پڑتا۔ چنانچہ یہاں قرآن اسی سلسلے کے ان کے شبہات کا جواب دے رہا ہے۔ پہلے بتایا تھا کہ قرآن نبوت اور دعوت اسلام کے بارے میں ان میں اعراض اور تکذیب رونما ہو رہی ہے۔ اب بتا رہا ہے کہ اس کے اسباب نبوت اور دعوت اسلام کے بارے میں کچھ شبہات ہیں۔

۷۔ اے پیغمبر اگر ہم تمہارے اوپر کوئی کاغذ میں لکھی ہوئی کتاب بھی اتار دیتے اور لوگ اسے اپنے ہاتھوں سے چھو بھی لیتے پھر بھی جو حق کا انکار کر چکے ہیں یہی کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔ بعض مشرکین مکہ نے کہا تھا کہ اگر آپ آسمان سے ایک لکھی لکھائی کتاب لے آئیں اور اس کے ساتھ چار فرشتے بھی ہوں جو ہمارے سامنے ہو کر گواہی دیں کہ بے شک یہ خدا کی کتاب ہے تو ہم ایمان لے آئیں گے اس کا جواب دیا کہ جو لوگ بحالت موجودہ قرآن کو جادو اور اس کے لانے والے کو جادوگر بتلاتے ہیں۔ اگر واقعی ہم ان پر کاغذ میں لکھی ہوئی کتاب بھی آسمان سے اتار دیں جسے یہ ہاتھوں سے چھو کر معلوم کر لیں کہ کوئی تخیل یا نظر بندی نہیں ہے تب بھی یہی کہیں گے کہ یہ تو صریح جادو ہے جس بدبخت کے حصے میں ہدایت نہیں ہوتی اس کا شبہ کبھی نہیں مٹتا[1] کسی کتاب کے نازل ہونے کے معنے ان کے خیال میں یہ تھے کہ آسمان سے کاغذوں میں ایک لکھی لکھائی، ترشی ترشائی جلد بندھی ہوئی ایک کتاب سب کے سامنے مجمع میں اتر کر سامنے آئے۔ کبھی وہ کہتے لولا نزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ یہ قرآن اس پر یکبارگی کیوں نہیں اتارا گیا اور کبھی کہتے حتی تنزل علینا کتابا نقرؤہ ان کی یہ فرمائشیں حجت و برہان کی طلب میں نہ تھیں بلکہ محض سرکشی اور ہٹ دھرمی کی باتیں تھیں جو اس لیے کہی جاتی تھیں کہ کوئی نہ کوئی بات کہہ کر اپنے انکار کے لیے سہارا پیدا کیا جاتے اور ہمیشہ راست باز انسانوں کے مقابلے میں نہ ماننے والوں نے یہی طرزِ عمل اختیار کیا ہے۔ جب کبھی سچائی کی کوئی بات کہی جاتی ہے تو طلبِ حق رکھنے والی طبیعتیں اور کسی طرف نہیں جاتی ہیں خود اسی بات پر غور کرتی ہیں، اور جب سچائی پالیتی ہیں تو فوراً قبول کر لیتی ہیں لیکن ایک سرکش اور ہٹ دھرم آدمی کبھی ایسا نہیں کرتا۔ وہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلے سے طے کرلیتا ہے کہ کبھی ماننے والا نہیں۔ پھر کوشش کرتا ہے کہ نہ ماننے کے لیے کوئی بات بنائے وہ طرح طرح کی باتیں ادھر ادھر کی نکالے گا۔ کبھی ایک بات کہے گا کبھی دوسری۔ پہلے کسی ایک بات پر زور دے گا کہ اس کا جواب کیا ہے جب اس کا جواب مل جائے گا تو کوئی دوسری بات نکال دے گا۔ یہاں قرآن نے ان کی اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے اور ان کے اس شبہ کا جواب دیا ہے کہ لکھی لکھائی کتاب کیوں نہیں لاتے فرمایا کہ ان کی فرمائش کے مطابق اگر فی الواقع ان پر لکھی لکھائی کتاب بھی اتار دی جاتی جب بھی یہ ایمان نہ لاتے بلکہ کہتے کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن سحر کی حقیقت کو تسلیم نہیں کرتا اور تخییل و نظر بندی سے زیادہ اسے وقعت نہیں دیتا۔ سورہ طٰہٰ میں نہایت تصریح کے ساتھ یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ خیال سے زیادہ اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعی جادوگروں کی لاٹھیاں موسیٰ کے خیال میں جادو کے اثر سے دوڑتی معلوم ہونے لگیں۔ لیکن ہمارے کچھ متکلمین کو اصرار ہے کہ سحر بھی خوارق میں سے ہے، معجزے اور سحر میں فرق صرف اشخاص کا ہوتا ہے۔ حق اور باطل ہونے کا نہیں۔ قرآن کی یہ آیت اس کے خلاف کھلا چیلنج ہے۔ قرآن نے صاف بتایا ہے کہ سحر تخییل اور نظر بندی کا نام ہے اس میں واقعیت کا نام و نشان نہیں ہوتا۔ سحر سرتا سر کید و فریب ہے، آرٹ اور فن ہے جو دوسرے فنون کی طرح حاصل کیا جاتا ہے۔ برخلاف خوارق کے کہ وہ کوئی فن نہیں ہے نہ پڑھنے پڑھانے اور سیکھنے سکھانے سے حاصل ہوتا ہے۔

فرشتہ کے نزول کی فرمائش

۸۔ اور کہتے ہیں کہ اس نبی پر فرشتہ کیوں نہیں اتارا گیا اگر ہم نے کہیں فرشتہ اتار دیا ہوتا تو اب تک کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا پھر ان کو کوئی مہلت نہ ملتی۔ اور اگر ہم فرشتہ کو اتارتے تب بھی اسے انسانی شکل ہی میں اتارتے اور ان کو اسی شبہ میں ڈالتے جس میں وہ اب مبتلا ہیں۔ یعنی فرشتہ ہمارے روبرو ہو کر ان کے صدق کی گواہی دے دیتا۔ اگر فرشتہ اپنی صورت میں آتے تو ہر لوگ ایک منٹ کے لیے اس کا تحمل نہ کر سکیں اس کے رعب و ہیبت سے دم نکل جاتے۔ یہ صرف انبیا علیہم السلام ہی کا ظرف ہوتا ہے جو اصلی صورت میں فرشتہ کی رویت کا تحمل کر سکتے ہیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عمر بھر میں دو مرتبہ حضرت جبریل کو اپنی اصلی صورت میں دیکھا ہے اور کسی نبی کی نسبت ایک مرتبہ بھی دیکھنا ثابت نہیں۔ دوسرے اگر ان لوگوں کی ایسی عظیم الشان خارق عادت فرمائش پوری کر دی

جائے اور اس پر بھی نہ مانے جیسا کہ ان کے معاندانہ احوال واطوار سے ظاہر ہے تو سنۃ اللہ کے مطابق پھر قطعاً مہلت نہ دی جائے گی اور ایسا عذاب آئے گا جو فرمائش کرنے والوں کو بالکل نیست ونابود کر دے گا اس لحاظ سے اس طرح کی فرمائشوں کا پورا نہ کرنا بھی عین رحمت سمجھنا چاہیے۔ چونکہ فرشتہ کو اصلی صورت میں پہنچنے کی نفی تو پہلی آیت میں ہو چکی ہے اب دوسرے احتمال کا جواب دیتے ہیں وہ یہ کہ فرشتہ آدمی کی صورت میں بھیجا جائے کیونکہ اسی صورت میں مجانست صوری کی بنا پر لوگ اس کے نمونہ اور تعلیم سے متمتع ہو سکتے ہیں لیکن اس تقدیر پر منکرین کے شبہات کا ازالہ نہیں ہو سکتا جو شکوک وشبہات رسول کے بشر ہونے پر کرتے تھے وہ ملک کے بصورت بشر آنے کی صورت میں بھی بدستور کرتے رہیں گے[1]

نبوت کے بارے میں مشرکین مکہ کا موقف یہ تھا کہ جب ایک شخص خدا کی جانب سے منصب نبوت پر سرفراز ہو کر آئے تو ضروری ہے کہ اس کے لیے آسمان سے ایک فرشتہ ضرور اترے۔ ان کو اس پر حیرت تھی کہ خدا کسی کو پیغمبر مقرر کرے اور پھر اس طرح بے یار و مددگار ہو۔ کم از کم ایک فرشتہ تو اس کی ہمرکابی میں ہو جو اس کی حفاظت کرے۔

قرآن نے ان کے اس اعتراض کے یہاں دو جواب دیے ہیں۔

ایک یہ کہ ایمان لانے اور اپنے طرزِ عمل کی اصلاح کر لینے کی جو مہلت تمہیں ملی ہوئی ہے یہ اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت پردہ غیب میں پوشیدہ ہے۔

غیب کا پردہ چاک ہونے کے بعد مہلت کا کوئی موقع باقی نہ رہے۔ اس کے بعد تو صرف حساب لینا باقی رہ جائے گا کیونکہ دنیا کی زندگی تمہارے لیے ایک امتحان گاہ ہے اور یہاں امتحان اس بات کا ہے کہ تم حقیقت کو دیکھے بغیر عقل و فکر کے صحیح استعمال اس کا ادراک کرتے ہو یا نہیں اور ادراک کرنے کے بعد اپنے نفس اور خواہشات کو قابو میں لا کر اپنے عمل کو حقیقت کے مطابق درست رکھتے ہو۔ اس امتحان کے لیے غیب کا غیب رہنا شرطاً لازم ہے اور تمہاری دنیوی زندگی دراصل مہلت امتحان ہے اسی وقت تک قائم رہ سکتی ہے جب تک غیب غیب ہے۔ جہاں غیب شہادت میں تبدیل ہوا یہ مہلت لازماً ختم ہو جائے گی اور امتحان کے بجائے نتیجہ امتحان نکلنے کا وقت آ جائے گا۔ لہٰذا تمہارے مطالبے کے جواب میں یہ ممکن نہیں ہے کہ تمہارے فرشتے کو اس کی اصلی صورت

[1] افادات شیخ الاسلام

میں نمایاں کر دیا جاتے کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہارے امتحان کی مدت ختم کرنا نہیں چاہتا [1]

دراصل یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس دُنیا میں انسان کی ساری آزمائش اس بات کی ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھے بغیر مانتا ہے یا نہیں اور ماننے کے بعد اتنی اخلاقی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کہ نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود فرمانبرداری اختیار کرے۔ صاحب کشف نے الاختیار قاعدۃ التکلیف کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے انبیا کی بعثت میں، کتابوں کی تنزیل میں حتیٰ کہ معجزات تک میں عقل کے امتحان اور اخلاقی قوت کی آزمائش کا ضرور لحاظ رکھا ہے اور کبھی حقیقت کو اس طرح بے نقاب نہیں کیا کہ آدمی کو ماننے بغیر چارہ نہ رہے۔ کیونکہ اس کے بعد تو آزمائش بالکل بے معنے ہو کر رہ جاتی ہے اور امتحان میں کامیابی اور ناکامی کا کوئی مفہوم باقی نہیں رہتا۔ اسی بنا پر فرمایا ہے لو انزلنا ملکا لقضی الامر اگر ہم کوئی فرشتہ اتار دیتے تو معاملہ کا فیصلہ ہی ہو جاتا۔ ایمان لانے اور اطاعت میں گردن جھکا دینے کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت تمہاری نگاہوں سے پوشیدہ ہے۔

اس توجیہ کے اچھے ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے لیکن افسوس یہ ہے کہ اس میں بوئے اعتزال ہے ان کا کہنا ہے کہ فرشتہ کی اصلی صورت میں الاسلام کے لیے اکراہی صورت ہے اس سے انسان مسلوب الاختیار ہو جاتا ہے۔ صاحب روح المعانی علامہ آلوسی نے اسے تارِ عنکبوت قرار دیا ہے۔ سید رشید رضا نے اس تفریع سے اختلاف کیا ہے۔ علامہ جمال الدین قاسمی نے محاسن التاویل میں لیس علی قواعد السنۃ کہا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ شارحین قرآن نے بتایا ہے کہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ فرمائشی معجزہ دیے جانے کے بعد مہلت نہیں دی جاتی۔ اس طرح ان کی ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے اور کچھ علماء نے یہ مطلب بتایا کہ فرشتوں کا مشاہدہ ہی اتنا ہولناک ہے کہ ان کی روحیں پرواز کر جائیں گی۔ علامہ ابوالسعود نے اسے اپنایا ہے لیکن ہماری رائے میں اصل بات یہ ہے کہ فرشتوں کی آمد کی صورت میں فرمائش کرنے والوں کا ایمان نہ لانا ان کی ہلاکت کا سامان ہے۔

دوسرا جواب یہ دیا ہے کہ اگر ہم بالفرض فرشتہ ہی روانہ کرتے یعنی بجائے آدمی کے فرشتہ کو رسول بنا کر روانہ کرتے تو ظاہر ہے کہ فرشتہ کو اس کی صورت میں نہیں، بلکہ کسی مرد کی صورت میں روانہ کرتے تاکہ انسان اس سے استفادہ کر سکیں کیونکہ فرشتہ اگر اپنی صورت میں آتا ہے تو لوگ اس سے کمال نورانیت

---

[1] تفہیم القرآن۔

اور کمال جلال و جمال کی وجہ سے استفادہ تو کیا اس کو دیکھنے کی بھی ان میں تاب نہ ہوگی اس لیے لامحالہ اگر فرشتہ کو پیغمبر بنا کر روانہ کرتے تو اسے بھی مرد ہی کی صورت میں روانہ کرتے تاکہ مجانست صوری کی وجہ سے لوگوں کے لیے استفادہ آسان ہو جاتا۔ اگر ایسا ہوتا تو اس کے متعلق بھی وہی اشتباہ ہوتا جو خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے رسول ہونے میں پیش آرہا ہے یعنی یہ کہ انسان خدا کا پیغمبر نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ فرشتہ کی شکل وصورت بھی انسان کی ہوتی۔ مطلب یہ ہے کہ کسی فرشتے کو رسول بنا کر نہ بھیجنا اس بنا پر نہیں ہے کہ خدا کے لیے یہ ناممکن تھا بلکہ اس بنا پر ہے کہ انسان فرشتوں کو فرشتوں کی شکل میں نہیں بلکہ انسانوں ہی کی شکل میں دیکھ سکتے ہیں اور اسی صورت میں ان سے فائدہ اٹھا سکتے تو جب وہ انسان کے روپ میں آتے تو یہ پھر وہی اعتراض اٹھاتے جو اب اٹھا رہے ہیں۔ ما یلبسون سے یہ بات خود بخود معلوم ہو رہی ہے کہ یہ بات نہیں کہ فی الواقع یہ شبہ پیدا ہوتا ہے بلکہ یہ لوگ شبہ پیدا کر رہے ہیں تاکہ اس طرح سادہ لوح لوگوں کو اپنا ہمنوا بنا سکیں۔

دراصل ان شبہات کی اساس یہ ہے کہ ان کے ذہن میں یہ بات آتی ہی نہ تھی کہ ایک انسان خدا کا پیغمبر ہو سکتا ہے۔ یہ دنیا کے تمام مشرکین کا متفقہ شبہ ہے۔ قرآن نے متقدمین و متاخرین کا یہ نظریہ بتایا ہے کہ بشر رسول نہیں ہوتا۔ یہ اوتار مان سکتے تھے، مظہر خدا اور خدا مان سکتے تھے فرزند اور ظل خدا مان سکتے تھے۔ خدا کی بیٹیوں کے وجود کے قائل ہو سکتے تھے لیکن بشر کی رسالت کو ان کا دماغ کسی طرح قبول کرنے کو تیار نہ تھا۔ ان کا فکر یہ تھا کہ روحانی ہدایت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جو محض ایک انسان کے ذریعے ظاہر نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ انسانیت سے کوئی بالاتر ہستی ہو۔ اسی خیال نے دیوتاؤں کے ظہور اور ان کی عجائب آفرینیوں کا اعتقاد پیدا کیا۔ چنانچہ سورہ اعراف اور ہود میں آپ پڑھیں گے کہ ہر داعی حق کے منکروں نے یہ بات ضرور کہی ہے ما نراك الا بشرًا مثلنا تم تو ہماری طرح بشر ہو، پھر تمہارا یہ دعویٰ کیسے مانا جا سکتا ہے کہ ہم رسول ہیں۔ مشرکین مکہ کا بھی یہی ذہن تھا۔ اور قرآن کا انکشاف ہے کہ کفار و مشرکین کو ایمان لانے سے ان کا یہی نظریہ مانع رہا کہ بشر کو رسالت کیوں کر مل سکتی ہے ابعث اللّٰہ بشرًا رسولا۔ کیا اللہ تعالیٰ نے بشر کو رسول بنایا۔ ان نادانوں نے بشر کو رسول ماننے سے تو انکار کیا لیکن پتھر اور مٹی کے تودے کو معبود بنانے سے نہ شرماتے۔ اسی لیے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا اقرار ایک بنیادی عقیدہ ہے۔ اس پر تفصیلی بحث تو انشاء اللہ ۱۵ پارے میں آئے گی۔ یہاں سر دست اتنا سمجھ لیجئے کہ فقہائے کرام اور علمائے ملت نے اس کی تصریح کی ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے

بشر ہونے کا انکار تو کیا اگر کوئی شخص لاعلمی کا اظہار بھی کرے تب بھی اس کے ایمان کی خیر نہیں ہے کہ اس نے ایک ضروری اور بنیادی عقیدہ کو معلوم نہیں کیا چنانچہ فتاوی عالمگیری میں ہے ۔

جو شخص یہ کہے کہ میں نہیں جانتا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم انسان تھے یا جن تو وہ شخص کافر ہے ۔

یعنی اس لیے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشریت کا اقرار ایک بنیادی عقیدہ ہے ۔ علامہ زرقانی شرح مواہب میں لکھتے ہیں ۔

اگر تم یہ دریافت کرو کہ کیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بشر اور عربی ہونے کا علم صحت ایمان کے لیے شرط ہے یا اس کی حیثیت فرض کفایہ ہے تو اس کا جواب حافظ ولی الدین احمد بن عبدالرحیم عراقی نے یہ دیا ہے کہ یہ بات ایمان کے صحیح ہونے کے لیے شرط ہے اگر ایک شخص کہتا ہے کہ میرا ایمان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عالمی رسالت ہے لیکن میں یہ نہیں جانتا کہ آپ بشر تھے یا فرشتہ یا جن یا یہ کہا کہ مجھے پتہ نہیں کہ آپ عربی تھے یا عجمی تو اس شخص کے کفر میں کوئی شک نہیں ہے کیونکہ یہ شخص قرآن کی تکذیب کرتا ہے ۔

آثار قدیمہ کا مطالعہ کرو

۹ ۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم سے پہلے رسولوں کا مذاق اڑایا جا چکا ہے پھر جس بات کا وہ مذاق اڑاتے تھے اسی نے گھیر لیا ان کو جو ان میں سے مذاق اڑاتے تھے ۔ ان سے کہو کہ زمین میں چلو پھرو پھر ان لوگوں کا انجام دیکھو جو جھٹلانے والے تھے ۔ معاندین کی فرمائشوں کا جواب دینے کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تسلی کی جاتی ہے کہ ان کے تمسخر اور استہزاء سے دلگیر نہ ہوں ۔ یہ کوئی نئی بات نہیں ہے ۔ انبیائے سابقین کو بھی ان ہی حالات سے دوچار ہونا پڑا ہے ۔ پھر جو ان کے مکذبین اور دشمنوں کا حشر ہوا سب کے سامنے ہے ان کو بھی خدا اسی طرح سزا دے سکتا ہے جو اگلے مجرموں کو دی گئی ۔ آگے فرمایا ہے کہ ملک کی سیر و سیاحت اور تباہ شدہ اقوام کے آثار ملاحظہ کرنے کے بعد اگر نظر عبرت سے واقعات ماضیہ کو دیکھو گے تو انبیاء کی تکذیب کرنے والی قوموں کا جو انجام دنیا میں ہوا وہ صاف نظر آجائے گا ۔ اسی سے قیاس کر لو کہ جب تکذیب کرنے والوں کا یہ حشر ہوا تو استہزاء کرنے والوں کا کیا حشر ہوگا[1] اس سے پہلے فسوف یاتیھم انباء ما کانوا بہ یستھزءون

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں قریش کو ڈانٹ پلائی گئی کہ وہ دعوت حق کا مذاق اڑا رہے ہیں اس کا انجام یقینی ہے وہ عنقریب اس عذاب کے آثار دیکھ لیں گے جس کا مذاق اڑا رہے ہیں تم سے پہلے بھی رسول آتے رہیں انہوں نے بھی اپنی قوموں کے سامنے دعوت اسلام پیش کی، ان کا بھی اسی طرح مذاق اڑایا گیا جس طرح تمہارا مذاق اڑایا جا رہا ہے۔ بالآخر مذاق کے نتیجے میں عذاب آگیا۔ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا کی قبولیت کی اللہ سبحانہٗ کی جانب سے خبر ہے اور آپ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ آپ قطعاً پریشان نہ ہوں عذاب آرہا ہے۔ اس پچھلے ترتیب نزول کے اعتبار سے جو سورت نازل ہوتی ہے اس میں مذاق کرنے والوں کی سزا اور ہلاکت کا تذکرہ ہے۔ میری مراد سورہ حجر ہے جس میں ارشاد ہے۔

انا کفینٰک المستھزءین

ان ہنسی اڑانے والوں کے لیے ہم تمہاری جانب سے کافی ہیں۔

ایک دفعہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم صحن حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ رؤسائے قریش ادھر ادھر بیٹھ کر ہنسی دل لگی کی باتیں کر رہے تھے۔ ابوجہل نے کہا کون مذبح میں جاکر وہاں سے اونٹ کی اوجھڑی اٹھا لائے گا۔ چنانچہ ایک شریر نے یہ خدمت انجام دی اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سجدے میں گئے تو وہ نجاست آپ کی پشت مبارک پر ڈال دی۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس بوجھ سے سر نہیں اٹھا سکتے تھے۔ اور کفار اس منظر کو دیکھ کر ہنسی سے بے خود ہوئے جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود جو اس موقعہ پر موجود تھے کہتے ہیں کہ میں یہ دیکھ رہا تھا لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں ان کے سامنے کچھ کر سکتا۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے جاکر فاطمہ کو اطلاع دی، جو اس زمانے میں بچی تھیں وہ آئیں اور اس نجاست کو ہٹایا تو آپ نے سر اٹھایا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم رؤسائے قریش کے ایمان سے قطعاً مایوس ہوتے ہیں۔ یہ رؤسائے قریش کی مہلت کا آخری موقع تھا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز میں بد دعا کی لیکن پھر بھی رحمت عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی شفقت دیکھیے کہ حضرت نوح اور حضرت موسیٰ کی طرح پوری قوم کی تباہی اور بربادی کی دعا نہیں کی بلکہ صرف رؤسائے قریش کے حق میں بد دعا کی اور ان میں سے سات رئیسوں کے نام لیے اور فرمایا کہ خداوندا قریش کو لے، خداوندا ابوجہل، عتبہ، شیبہ، عقبہ بن معیط، امیہ ابن خلف، ولید بن عتبہ اور ابی بن خلف کو پکڑ۔ یہ بد دعا سن کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ (بخاری و مسلم) اسی دعا کی قبولیت کی حضور انور کو اس آیت میں خبر دی جا رہی ہے۔ آپ نے اس سے پہلے کہ غزوہ بدر کا واقعہ پیش آئے ہجرت کے بعد ہی ان کی ہلاکت و بربادی کا اعلان کر دیا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ استہزاء کرنے والے رؤسائے قریش تھے اور جس کا استہزاء کیا جا رہا تھا وہ خود حضور کی ذات گرامی تھی۔ نبوت ہی سے استہزاء کا نتیجہ عذاب ہے۔ جیسا کہ فحاق بالذین کی فا رہا رہی ہے۔ اسی بنا پر ہمارے فقہائے نبوت کے استخفاف، توہین کو ناقابل عفو فوجداری جرم قرار دیا ہے۔ خلاصۃ الفتاویٰ میں ہے۔

> محیط میں ہے کہ جس شخص نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو برا کہا اور آپ کی توہین کی یا دینی امور میں آپ کا عیب نکالا یا آپ کی ذات یا آپ کے ذاتی اوصاف میں کسی صفت میں عیب لگایا۔ عام اس سے کہ برا کہنے والا آپ کی اُمت سے ہو یا غیر ہو اور عام اس سے کہ ذمی ہو یا حربی اور برابر ہے کہ آپ کی برائی یا اہانت یا عیب عمداً اس سے سرزد ہوا ہو یا سہواً یا غفلت یا فی الواقع ہو یا دل لگی میں ہو۔ ہر صورت میں یہ دوامی کفر ہے بایں حیثیت کہ اگر وہ توبہ بھی کرے تو اس کی توبہ کبھی قبول نہ ہو گی۔ نہ عنداللہ نہ عندالناس اور شریعت مطہرہ میں اس کا حکم متاخرین مجتہدین کے اتفاق سے اور متقدمین کے نزدیک بھی یہ ہے کہ اس کو یقیناً قتل کیا جاتے۔ بادشاہ اور اس کا نائب اس کے قتل میں قطعاً کوئی نرمی اور مداہنت نہ کرے۔

اس کے بعد ارشاد ہے قل سیروا فی الارض یعنی گزری ہوئی قوموں کے آثار قدیمہ اور ان کے تاریخی واقعات شہادت دیں گے کہ صداقت و حقیقت سے منہ موڑنے اور باطل پرستی پر اصرار کرنے، اور انبیاء کا مذاق اڑانے کی بدولت کس طرح یہ قومیں عبرتناک انجام سے دوچار ہوئیں، بالخصوص خود ملک عرب کے حالات و آثار کا مشاہدہ کرو تو تمہیں اس میں رسولوں کی تکذیب کرنے والی قوموں کی تباہی کے بہت سے آثار ملیں گے۔ ان قوموں نے بھی اپنے اپنے رسولوں کا مذاق اڑایا تھا اور اس عذاب کو محض خالی دھمکی سمجھا تھا جس کی رسول نے خبر دی۔ بالآخر وہ واقعہ کی شکل میں نمودار ہو گیا۔ اور مذاق اڑانے والوں کا بیڑا غرق ہو گیا۔

مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر اپنی قوم کے ان مکذبین سے کہہ دو کہ سفر کرو اور دوران سفر میں ہلاک ہونے والی قوموں کے مکانات دیکھو اور غور کرو کہ وہ زبان حال سے بول رہے ہیں کہ ہمارے انجام سے عبرت پکڑو۔

تعبیر میں یہ بلیغ نکتہ قابل غور ہے کہ بجائے عاقبۃ المستہزئین کے عاقبۃ المکذبین فرمایا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمام مکذبین کو ہلاک کر دیا اگرچہ ہلاکت کا ظاہری

سبب مستہزئین کے مطالبات تھے اور پھر جب ہلاکت مکذب پر آئی ہے تو استہزاء کرنے والے کیونکر بچ سکتے ہیں۔

یہاں اور دوسرے مقامات پر یہ تعبیری تنوع کہ یہاں ثم انظروا فرمایا جبکہ دوسرے مقامات پر فانظروا ہے قابلِ غور ہے۔ اگرچہ اس تعبیر کی بلاغت پر لکھنے والوں نے بہت کچھ دادِ تحقیق دی ہے مگر ہمیں الانتصاف میں علامہ احمد بن المنیر کی یہ بات بہت پسند آئی ہے۔ فرماتے ہیں کہ جن جگہوں پر فا آئی ہے وہاں سبب کا اظہار مقصود ہے اور جہاں ثم آیا ہے وہاں مطالعہ اور معائنہ کی مقصودیت کو بتانا منظور ہے۔ یہاں مقصود ہی چونکہ ہلاک ہونے والوں کے مکانات اور شہروں کا مطالعہ ہے اس لیے ثم لائے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تم سفر تو بہت کرتے ہو، اور تمہارا ان اماکن سے گزر بھی ہوتا ہے لیکن مطالعہ کو مقصد بنا کر ملک کا سفر کرو۔ تاکہ تمہیں اپنے حال کا ماضی سے موازنہ کا موقعہ ملے۔

قُلْ لِّمَنْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ قُلْ لِّلّٰهِ ۭ كَتَبَ عَلٰي نَفْسِهِ
الرَّحْمَةَ ۭ لَيَجْمَعَنَّكُمْ اِلٰى يَوْمِ الْقِيٰمَةِ لَا رَيْبَ فِيْهِ ۭ اَلَّذِيْنَ
خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَهٗ مَا سَكَنَ فِي الَّيْلِ
وَالنَّهَارِ ۭ وَهُوَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ﴿۱۳﴾ قُلْ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَتَّخِذُ وَلِيًّا
فَاطِرِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ ۭ قُلْ اِنِّىْٓ
اُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ اَوَّلَ مَنْ اَسْلَمَ وَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ﴿۱۴﴾
قُلْ اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾
مَنْ يُّصْرَفْ عَنْهُ يَوْمَىِٕذٍ فَقَدْ رَحِمَهٗ ۭ وَذٰلِكَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ﴿۱۶﴾
وَاِنْ يَّمْسَسْكَ اللّٰهُ بِضُرٍّ فَلَا كَاشِفَ لَهٗٓ اِلَّا هُوَ ۭ وَاِنْ يَّمْسَسْكَ
بِخَيْرٍ فَهُوَ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۱۷﴾ وَهُوَ الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ ۭ
وَهُوَ الْحَكِيْمُ الْخَبِيْرُ ﴿۱۸﴾

ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے اس کا مالک

کون ہے؟ کہہ دو کہ سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ اس نے مہربانی کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے[11]۔ قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا یہ ایک بالکل بے اشتباہ حقیقت ہے وہ لوگ جنہوں نے اپنے تئیں گھاٹے میں ڈال دیا ہے وہ اسے نہیں مانتے ہیں[12]۔ اور رات کے اندھیرے اور دن کے اجالے میں جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے[13]۔ کہہ دو کیا میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو کارساز بنالوں اس خدا کے علاوہ جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے[14]۔ اور جو روزی دیتا ہے اور روزی لیتا نہیں ہے[15]۔ تم کہہ دو کہ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ خدا کے سامنے سرنگوں ہونے والوں میں سب سے پہلے میں اس کے سامنے سرنگوں ہو جاؤں اور مجھے کہا گیا ہے کہ شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ

ہونا[16]۔ کہہ دو مجھے بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے اگر میں اس کی نافرمانی کروں[17]۔ اس دن جس کے سر سے عذاب ٹل گیا تو اس پر خدا نے رحم کیا اور بڑی سے بڑی کامیابی یہی ہے[18]۔ اور اے انسان اگر خدا تجھے دکھ پہنچائے تو اس کو ٹالنے والا کوئی نہیں ہے مگر اسی کی ذات اور اگر وہ تجھے بھلائی پہنچائے تو وہ ہر بات پر قادر ہے[19]۔ اور وہی ہے جو اپنے بندوں پر زور اور غلبہ رکھنے والا ہے وہی صاحبِ حکمت اور بڑا باخبر ہے[20]۔

توحید تکمیلِ مقاصد کے لیے ضروری ہے

اللہ کا اعتقاد مقاصد کی تکمیل کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا مملکت کے وجود کے لیے فوج اور پولیس کا ہونا ضروری ہے لیکن خدا کا اعتقاد و تصور اپنے متضمنات رکھتا ہے جو اس سے جدا نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ الوہیت کا ہر تصور بشرطیکہ وہ شخصی نہ ہو اپنے ساتھ خیر و شر کا ایک خاص معیار اور اخلاقی اقدار کا ایک متعین نظام پیدا کرتا ہے اور حقیقت میں خدا کا اعتقاد بے معنے ہے۔ اگر اس کی خوشنودی اور ناخوشی اس کی رحمت اس کے غضب و انتقام کے اصول انسان پر واضح نہ ہوں جس خدا کی پسند و ناپسندیدگی جس کی خوشی و ناخوشی کا کوئی اصول و معیار نہ ہو جس کے متعلق انسان یہ علم نہ رکھتا ہو کہ وہ کس قسم کے عمل سے خوش ہو کر انعام دیتا ہے اور کون سا عمل اس کے غیظ و غضب کا موجب ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے دلوں میں خوف و محبت اور بیم و رجا کے جذبات

کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ خدا کا اعتقاد خیر و شر کا ایک مستقل معیار وجود میں لاتا ہے۔ اگر خدا کا اعتقاد مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے تو اس کے ساتھ ہی وہ اخلاقی اقدار اور معیار خیر و شر ہی ان مقاصد کی تکمیل کے لیے ضروری ہے جو اس تصور سے متعین ہوتا ہے ورنہ خدا کا اعتقاد بے معنے ہو کر رہ جائے گا۔ اور اس کی اصل غرض فوت ہو جائے گی لہٰذا ہم توحید الوہیت کی حدود میں اس نتیجہ پر پہنچنے میں مجبور ہیں کہ سجد میں عبادت کے ساتھ زندگی کے تمام شعبوں میں خدا کی طاعت ہونی چاہیے کیونکہ خدا کی پسند و ناپسندیدگی اور اس کی خوشنودی اور ناخوشی کے اسباب کا علم انسان کو صرف نبوت ہی کے ذریعے حاصل ہو سکتا ہے نبوت کے بغیر شخصیت کا حقیقی مفہوم اور اجتماعی سیرت کا معیار متعین کرنا دشوار ہو جائے گا۔ قرآن کے نزدیک رسُول کی شخصیت و سیرت ایک نمونہ ہے اور اس کی دعوت ہے کہ شخصیت کا نشوو ارتقاء اسی نمونہ کے مطابق ہونا چاہیے۔ رسُول کی شخصیت مسلمانوں کے لیے ایک عملی نمونہ ہے۔ رہی اجتماعی سیرت تو اس کی تشکیل میں صحابہ کی زندگی اسلامی معاشرے کے لیے بطور ایک معیار موجود ہے۔ شخصی اور اجتماعی سیرت کے ان دونوں نمونوں پر مسلمانوں میں کامل اتفاق ہے۔ ایسا کیوں ہے اس لیے کہ ایک دن ایسا بھی آئے گا جب یہ ساری بساطِ حیات اُلٹ جائے گی، کائنات کی یہ مجلس درہم برہم ہو جائے گی اور آسمان و زمین کے کرتے ٹکرا کر چور چور ہو جائیں گے اور پھر وہ خلاقِ عالم اپنی صفتِ خلق و احسان و جزا کے نئے منظر دکھاتے گا اور نئی زمین اور نیا آسمان پیدا کر کے ایک اور عالم کسی نئے نظام پر وجود پذیر ہو گا۔ ان آیات میں ان ہی تین مسائل توحید الوہیت، رسالت اور قیامت کو مختلف انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔ پہلے ان کے شبہات کا جواب دیا ہے اور ان ہی تین کے بارے میں دلائل پیش کیے ہیں اب یہاں ان ہی تین مسائل کے دلائل کو ایک اچھوتے انداز میں پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ سوال و جواب کا انداز ہے۔ اب ان آیات کا مطالعہ فرمائیے

۱۰ ــ ان سے پوچھو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ کس کا ہے کہہ دو سب کچھ اللہ ہی کا ہے۔ یہ ایک لطیف اندازِ بیان ہے۔ پہلے حکم ہوا کہ ان سے پوچھو کہ زمین و آسمان کی موجودات کس کی ہیں سائل نے سوال کیا اور جواب کے انتظار میں ٹھہر گیا۔ مخاطب اگرچہ خود قائل ہیں کہ سب کچھ اللہ کا ہے لیکن نہ تو وہ غلط جواب دینے کی جرأت رکھتے ہیں اور نہ صحیح جواب دینا چاہتے ہیں۔ کیونکہ اگر صحیح جواب دیتے ہیں تو انہیں خوف ہے کہ مخالف اس سے ان کے مشرکانہ عقیدے کے خلاف استدلال کرے گا اس لیے وہ کچھ جواب نہیں دیتے تب حکم ہوتا ہے کہ تم خود ہی کہو کہ سب کچھ اللہ کا ہے [1]

[1] تفہیم القرآن

قرآن میں جہاں سوال کرکے مخاطب کے جواب کا انتظار کیے بغیر خود اس کا جواب دیا ہے۔ غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان مواقع میں مخاطب کے لیے اصل جواب سے یا رائے انکار نہیں ہوتا۔ یعنی جواب اتنا واضح اور صاف ہوتا ہے کہ مخاطب کے پاس انکار کی گنجائش ہی نہیں ہوتی۔ اگر مخاطب کا کوئی فکر کوئی عمل اس کے خلاف ہے تو وہ خود اس کے مسلمہ کے خلاف ہے۔ سوال یہ کیا گیا ہے کہ اے میری دعوت سے اعراض کرنے والو اور میری تکذیب کرنے والو بتاؤ کہ عالم بالا اور عالم زیریں میں ان مخلوقات و مصنوعات سے مالکانہ تعلق کس کا ہے۔ یاد رہے کہ اہل عرب مشرک ہونے کے باوجود آسمان و زمین کا خالق اور مالک اللہ ہی کو مانتے تھے۔ ظاہر ہے کہ ان کے مسلمات کے مطابق اس کا جواب اس کے سوا کیا ہے کہ یہاں ہر چیز اللہ کی ملک ہے نبوت کا اور مشرکین کا اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے اس لیے نبوت ہی کو حکم ہوا ہے کہ تم کہو کہ یہ سب کچھ اللہ کا ہے۔ اس سوال و جواب کو ایک نئے استدلال کے لیے زمین بنایا گیا ہے۔ استدلال یہ ہے کہ جب تمام مخلوقات کے اللہ کے علاوہ مملوکانہ تعلقات کسی سے نہیں ہیں تو پھر مملوک ہو کر تمہارے عابدانہ تعلقات میں اللہ کے ساتھ اوروں کی حصہ داری کیوں ہے؟ یہ بات انسان کے وجدانی اذعان کے خلاف ہے کہ مالکیت کسی اور کی ہو اور عبدیت کسی اور کے لیے ہو۔ ایک انسان غفلت کی سرشاری میں ہر چیز کا انکار کر سکتا ہے لیکن اس کا انکار نہیں کر سکتا کہ جو خالق اور مالک ہے وہی معبود ہے۔ اس کے خلاف کہنا اپنی فطرت کے خلاف جنگ ہے۔ یہاں قل للہ کی تعبیر بتا رہی ہے کہ مخاطبوں میں سوال کے جواب کی ہمت نہ تھی۔ قرآن نے یہاں استدلال کا جو انداز اختیار کیا ہے وہ اگرچہ امام رازی کی کلامی ترازو میں تولا نہیں جا سکتا لیکن انسان کے نہاں خانہ دل پر دستک دے کر اس کے فطری وجدان سے اپیل کر رہا ہے۔ گویا یہ اپنی جگہ ایک مستقل دلیل ہے کیونکہ اس سوال کا صرف ایک ہی جواب ہو سکتا ہے۔ امام رازی کی نظر اس پہلو پر نہ تھی اس لیے قرآن کا اسلوب استدلال ان پر واضح نہ ہو سکا اور وہ دور دراز متکلمانہ بحثوں میں نکل گئے۔

رحمت کی وسعت اور اس کے تقاضے

۱۱۔ اس نے مہربانی کو اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ اصل میں کتب علی نفسہ الرحمۃ ہے۔ یہ فقرہ بھی قل ہی کے تحت ہے۔ یعنی یہ بھی فرما دیجیے کہ اس کی رحمت تمام مخلوقات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس کی رحمت عام ہے۔ یہ تعبیر صرف یہ ظاہر کرنے کے لیے ہے کہ اللہ کی ذات صفت رحمت سے موصوف ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ اسلام کا خدا تمام تر رحمت ہے۔ اس کی رحمت کے فیض سے عرصہ

کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے۔ اس کا نام رحمان ورحیم ہے۔ جو کچھ یہاں ہے سب کچھ اس کی رحمت کا ظہور ہے وہ نہیں تو کچھ نہیں۔ اسی لیے اس کی رحمت سے ناامیدی جرم اور مایوسی گناہ ہے۔ بندوں کی جانب سے خدا پر کوئی پابندی نہیں مگر اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر خود کچھ چیزیں فرض کرلی ہیں من جملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے۔ خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے گنہگاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے۔ سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے۔ وہ غالب ہے قاہر ہے، جبار ہے، منتقم ہے لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار وغفور بھی ہے رحمان و رحیم بھی، اور عفو و رؤف بھی ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی عائد کرلی ہے اور اس کو اپنے اوپر فرض گردان لیا ہے۔

صحیح بخاری اور ترمذی کی صحیح حدیثوں میں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جب اس عالم کو پیدا کیا تو لوح محفوظ میں یہ لکھ دیا کہ میری رحمت میرے غصہ سے بڑھی ہوئی ہے۔ یہ تحریر اس کے سامنے عرش پر موجود ہے کارخانۂ عالم تمام کا تمام اسباب و مسببات کا محکوم ہے اس لیے قرآن اور حدیث میں اگر کہیں کتابت کا ذکر آجاتا ہے تو اس کو نہ مجاز و استعارا بنالے کی ضرورت ہے اور نہ کسی تاویل و تامل کی۔ ہاں اس جسارت اور دلیری کی بھی اجازت نہیں کہ عالم غیب کو عالم شہادت پر قیاس کرکے کاغذ قلم دوات کے جو آلات یہاں درکار ہیں وہی عالم بالا میں تصور کرلیے جائیں۔

غیب را ابرو بہائے دیگر است

رحمت کے لکھے جانے کا مطلب یہ ہے کہ نزول قہر کے لیے سبب درکار ہے مگر رحمت کو سبب کا انتظار نہیں اس لیے رحمت ہمیشہ غضب سے بڑھتی رہتی ہے۔ یہ کتبہ اس لیے عرش پر رکھا گیا ہے کہ اس کے نیچے بسنے والی مخلوق مطمئن رہے کہ اس کے مقدر کی ساعت آئین رحمت کے تحت ہوگی۔

قیامت تقاضائے رحمت ہے

۱۲۔ قیامت کے روز وہ تم سب کو ضرور جمع کرے گا۔ یہ ایک بالکل بے اشتباہ حقیقت ہے وہ لوگ جنہوں نے خود کو گھاٹے میں ڈال دیا ہے وہ اسے نہیں مانتے ہیں۔ یعنی تمام زمین و آسمان میں اس کی حکومت ہے جیسا کہ مشرکین کو بھی اقرار تھا تو مکذبین اور مستہزئین کو فوری سزا سے کہاں پناہ مل سکتی ہے یہ صرف اس کی رحمت عامہ ہے کہ جرائم کو دیکھ کر فوراً سزا جاری نہیں کرتا اور قیامت کے دن بھی جو بلاشبہ آنے والا ہے محض ان ہی بدبختوں کو بے ایمانی کی سزا دے گا جو باختیار خود جان بوجھ کر

اپنے کو نقصان و ہلاکت کے گڑھے میں ڈال چکے ہیں[1]

جیسے اس دنیا میں مادی اور معنوی خوبیوں کا ہونا رحمت کا تقاضا ہے ایسے ہی قیامت کا آنا بھی صفت رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ یہاں قرآن نے اللہ سبحانہ کی توحید و صفات کی طرح آخرت کی زندگی پر رحمت سے استدلال کیا ہے۔ یعنی اگر رحمت کا مقتضا یہ ہے کہ دنیا میں اس خوبی و کمال کے ساتھ زندگی کا ظہور ہو تو یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دنیا کی چند روزہ زندگی کے بعد اس کا فیضان ختم ہو جائے اور خزانہ رحمت میں انسان کی زندگی اور بقاء کے لیے کچھ باقی نہ رہے۔ اس لیے قیامت کا آنا خدا کی رحمت کا لازمی تقاضا ہے۔ اگر قیامت نہ آئے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس کائنات کا خالق رحمٰن و رحیم نہیں ہے اس کے نزدیک نعوذ باللہ عدل و ظلم، نیکی و بدی، خیر و شر دونوں یکساں ہیں۔ یہ ایک کھلنڈرے کا کھیل اور ایک اندھیر نگری ہے۔ یہ باتیں چونکہ بالبداہت باطل ہیں۔ خدا کی شانِ رحمت کے بالکل منافی ہے کہ وہ کوئی بے غایت و مقصد کام کرے اس لیے ضروری ہے کہ ایسا دن آئے جس میں اس کی رحمت کا کامل ظہور ہو۔ اپنے نیک بندوں کو وہ اپنی بے پایاں رحمتوں سے نوازے اور جو بدکار و نابکار ہیں وہ اپنے کیفر کردار تک پہنچیں لیجمعنکم الی یوم القیامۃ ایک تاکیدی جملہ ہے اور عربی اسلوب میں یہ جواب قسم بن کر آتا ہے تعبیر کا یہ زور بتا رہا ہے کہ قرآن کا مخاطب توحید کے بعد جس عقیدے سے شدت کے ساتھ انکار کرتا تھا، جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوتا تھا اور جو اس کی عقل میں کسی طرح نہ سماتا تھا وہ یہی قیامت اور حشر و نشر کا مسئلہ ہے جاہل عرب حیات بعد الموت خدا کے سامنے اپنے اعمال کے مواخذے اور پرسش اور جزا و سزا سے قطعاً لاعلم تھے۔ اسی لیے ان کو اعمال کے خیر و شر اور نیکی و بدی میں وہ تمیز نہ تھی جس پر اخلاق و معاملات کا تمام تر دارومدار ہے۔ قرآن نے یہاں قیامت کو نہ ماننے والوں کو خسارے والا کہا ہے وجہ اس کی بالکل ظاہر ہے کہ جب جزا نہ ہوگی تو گھاٹا ہی گھاٹا ہوگا۔ انفس کا گھاٹا نام ہے فساد فطرت کا اور اللہ کی عطا کردہ ہدایات سے اس زندگی میں فائدہ نہ اٹھانے کا اللہ نے انسان کو اصلی فطرت، عقل سلیم، نعمت نبوت وحی سننے کا موقعہ اور دوسری نعمتیں دی ہیں وہ ان سب سے محروم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ قرآن نے اس حقیقت کو ایمان کے اصول و اساس میں کیوں داخل کیا ہے اگر یہ تعلیم عقائد میں داخل نہ ہوتی تو دلوں میں اعمال کی جزا و سزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکام الٰہی کی طرف

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دلی رجحان ہوتا اس سے یہ بات آپ سے آپ نکل آئی کہ انبیاء کی آخرت پر ایمان کی دعوت صرف اخلاقی یا اصلاحی ضرورت کے تحت نہیں تھی۔ اگرچہ یہ طرزِ فکر بھی قابلِ تعریف ہے لیکن یہ نبوت کے طریق کار اور اس کی سیرت سے بالکل مختلف ہے۔ ان دونوں کے درمیان فرق یہ ہے کہ طریقِ نبوت میں آخرت پر ایمان ایسا عقیدہ ہے کہ انسان کے احساسات، خیالات، افکار و اعمال پر پوری طرح قابو حاصل کر لیتا ہے اور اصلاحی طریقہ میں صرف اعتراف، اقرار ایک ضابطہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ نبوت آخرت کا ذکر کرتی ہے تو تڑپ وار فتگی اور لذت کے ساتھ اور اس کی طرف دعوت دیتی ہے تو جوش و قوت کے ساتھ اور دوسرے لوگ اس کے بارے میں گفتگو کرتے ہیں تو اخلاقی یا معاشرتی ضرورت کی حد تک اور اصلاحی یا اخلاقی تنظیم کے جذبے سے، دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

زمان اور زمانیات اللہ کی ملک ہیں

۱۳ - اور رات کے اندھیرے اور دن کے اُجالے میں جو کچھ ٹھہرا ہوا ہے وہ سب اللہ کا ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ اس سے پہلے حق لمن ما ف ... الخ میں مکان کی تعمیم تھی اور اس آیت میں زمان کی تعمیم ہے۔ یعنی ہر جگہ اور ہر وقت اسی کی حکومت اور قبضہ و اقتدار ہے۔ ہر وہ چیز جو رات میں یا دن میں آرام سے زندگی بسر کرتی اور کتنے معلوم اور نامعلوم دشمنوں سے مامون و محفوظ رہتی ہے۔ یہ اسی کی رحمت کاملہ کے آثار میں سے ہے قل من یکلؤکم باللیل والنھار من الرحمٰن وہی ہے جو دن کے شور و شغب اور رات کے اندھیرے اور سناٹے میں ہر ایک کی پکار سنتا ہے اور سب کی حوائج و ضروریات کو بخوبی جانتا ہے۔ پھر تم ہی بتاؤ کہ ایسے پروردگار کو چھوڑ کر کسی اور سے مدد طلب کرنا کہاں تک موزوں ہوگا؟[1]

شارحین قرآن کا سکن کی تشریح میں اختلاف ہے۔ کچھ اسے سکنی سے مشتق بتاتے ہیں اور معنے استقرار و حلول کے کرتے ہیں۔ چنانچہ امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ سکون حرکت کی ضد نہیں ہے بلکہ حرکت کو شامل ہے محض استقرار کے معنے میں ہے اور مطلب یہ بتاتے ہیں کہ کل موجودات جن پر دن رات گزرتی ہے وہ سب اسی کی ملک ہے۔ زمانہ اور زمانیات اسی کے احاطہ قدرت میں ہیں۔ امام رازی نے ابو مسلم اصفہانی سے بھی اسی سے ملتی جلتی بات نقل کی ہے:

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلی آیت میں آسمان و زمین کا ذکر کیا تھا کیونکہ ان کے سوا مکان کوئی نہیں۔ اس آیت میں رات اور دن کا ذکر کیا ہے کیونکہ زمان اس کے سوا کچھ نہیں۔ زمان اور مکان تمام موجودات کے لیے ظرف ہیں۔ دونوں آیتوں میں بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ، مکان اور مکانیات زمان اور زمانیات کا مالک ہے۔

امام رازی نے اس کی جی کھول کر داد دی ہے اور یہ نکتہ آفرینی بھی فرمائی ہے کہ بیان میں آغاز مکان سے اور اختتام زمان پر ہوا۔ زمان اور زمانیات کو بعد میں پیش کیا کیونکہ بہ نسبت زمان کے مکان اقرب الی العقول ہے۔

ظاہر یہی ہے جیسا کہ عام شارحین قرآن کی رائے ہے کہ لہٗ ما سکن بھی قل کے تحت ہے لیکن ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں اسے استیناف بیانی قرار دیا ہے۔ بہرحال گزشتہ آیت میں یہ بتلایا کہ زمین و آسمان یعنی ہر مکان اور مکین اور تمام مکانیات کا وہی مالک ہے اور اس آیت میں یہ بتلایا کہ مکان اور زمان کی طرح لیل و نہار اور تمام اوقات اور تمام زمانیات بھی اسی کی ملک ہیں اور اسی کے قبضہ و تصرف میں ہیں۔

اور کچھ علماء یہ کہتے ہیں کہ آیت میں لفظ سکن سکون سے مشتق ہے اور اس کے معنے ساکن ہونے اور بے حرکت ہونے کے ہیں۔ یہ حرکت کا مد مقابل ہے اور لیل و نہار کی مناسبت سے سکن کے مقابلہ میں تحرک محذوف مانتے ہیں اور مطلب یہ بتاتے ہیں کہ شب کی تاریکیوں میں جو چیز ساکن ہوتی ہے اور دن کی روشنی میں جو چیز متحرک ہوتی ہے سب خدا ہی کے قبضہ قدرت اور اسی کے کنٹرول میں ہے۔ مجال نہیں ہے کہ کوئی چیز اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو سکے اور اس کے اذن کے بغیر اپنی جگہ سے سرک سکے۔ رات کی تاریکی اور دن کی روشنی دونوں اس کے لیے یکساں ہیں۔ اور جس طرح اس کی قدرت سب کو محیط ہے اسی طرح اس کا علم بھی ہر چیز پر حاوی ہے اس لیے کہ وہ سمیع و علیم ہے۔

اس کائنات میں ایک ہی کارساز ہے

۱۴۔ کہہ دو کیا میں اللہ کے علاوہ کسی اور کو کارساز بنا لوں اس خدا کے علاوہ جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے۔ آسمان و زمین اور ساری کائنات کو محض اپنے ارادے سے بغیر روح مادہ اور ہیولیٰ کے سہارے نیست سے ہست کرنے والا۔ فاطر کا لفظ ان ساری مشرک اور نیم مشرک قوموں کی تردید کر رہا ہے جو اللہ سبحانہ کو صرف صانع مانتے ہیں۔ فاطر کے معنے مبدع کے ہیں اور فعل ابتدا کرنے

کے لیے آتا ہے۔ آسمان و زمین کا خصوصیت سے ذکر یہ جتانے کے لیے ہوا ہے کہ کائنات کی عظیم ترین مخلوقات یہی ہیں دوسری وجہ یہ بھی ہے کہ دنیا کی مشرک قوموں نے ان کو دیوتا تسلیم کیا ہے۔

یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ جب یہ مانتے ہو کہ ساری دنیا کا خالق و مالک اور سارے کارخانۂ ہستی کا چلانے والا ایک اللہ ہی ہے تو میرے لیے یہ کیسے روا ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر کسی اور کو مددگار، کارساز بناؤں! ولی کے معنے مددگار اور کارساز کے ہیں اور استفہام انکاری ہے۔ یہ اللہ کے علاوہ کسی کو مددگار بنانے کی نفی ہے۔ اللہ کے علاوہ کسی کو مددگار بنانے کی صورت یہ ہے کہ اللہ کو چھوڑ کر دوسروں سے مدد لے۔ یہ گویا توحید اعتقادی کے بعد اتخذ کے ذریعے توحید فعلی کا اعلان ہے۔ شاہ ولی اللہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ مشرکین کا یہ عقیدہ تھا کہ سارے جہان کا مدبر تو اللہ ہی ہے لیکن وہ اپنے بعض بندوں کو بعض مخصوص علاقوں میں تصرف کرنے کا مخصوص اختیار عطا فرما دیتا ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ یہود و نصاریٰ اور مشرکین کا یہی عقیدہ تھا اور

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا نام لینے والے انتہائی درجہ کے منافقین کا بھی آج کل یہی عقیدہ ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ جملہ مشرکین غیر اللہ کو کارساز اور مددگار سمجھتے تھے مگر ان کو مستقل سمجھ کر ان سے استعانت نہ کرتے تھے بلکہ ان کو عون الٰہی اور امداد الٰہی کا مظہر سمجھ کر استعانت کرتے تھے۔ کیونکہ دنیا میں کسی مشرک نے غیر اللہ کو حقیقی کارساز اور مددگار کبھی نہیں سمجھا۔ یہاں فاطر السماوات والارض فرما کر شرک کے اسی گھر ندے پر ضرب کاری لگائی ہے کہ جو ذات آسمان و زمین اور ساری کائنات کو محض اپنے ارادے بغیر روح مادہ اور ہیولیٰ کے سہارے نیست سے ہست میں لانے والی ہے میں اسے چھوڑ کر ان کو ولی، کارساز اور مددگار کیسے بنا سکتا ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا میرا مددگار اور کارساز کوئی نہیں ہے۔ اس لیے میں اس کے سوا کسی کو اپنا مددگار نہ بناؤں گا۔

مشرکین پر ایک لطیف تعریض

۱۵۔ جو روزی دیتا ہے روزی لیتا نہیں ہے۔ یعنی کھلاتا ہے کھاتا نہیں ہے۔ کھلا اشارہ ہے سامان بقا کی طرف یعنی ایجاد و ابقاء دونوں میں سب اس کے محتاج ہیں۔ اس کو کسی ادنیٰ سی ادنیٰ چیز میں بھی ہماری احتیاج نہیں۔ پھر اس سے علیحدہ ہو کر کسی کو مددگار بنانا انتہائی حماقت نہیں تو اور کیا ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس میں ایک لطیف تعریض ہے۔ مشرکوں نے اللہ کے سوا جن جن کو اپنا معبود بنا رکھا ہے وہ سب اپنے بندوں کو رزق دینے کے بجائے الٹا ان سے رزق پانے کے محتاج ہیں۔ کوئی فرعون خدائی کے ٹھاٹ نہیں جما سکتا۔ جب تک اس کے بندے اسے ٹیکس اور نذرانے نہ دیں۔ کسی صاحب قبر کی شان معبودیت قائم نہیں ہو سکتی جب تک اس کے پرستار اس کا شاندار مقبرہ تعمیر نہ کریں۔ کسی دیوتا کا دربار خداوندی سج نہیں سکتا جب تک اس کے پجاری اس کا مجسمہ بنا کر کسی عالی شان مندر میں نہ رکھیں اور اس کی تزئین و آرائش کے سامانوں سے آراستہ نہ کریں۔ سارے بناوٹی خدا بیچارے خود اپنے بندوں کے محتاج ہیں۔ صرف ایک خداوند عالم ہی وہ حقیقی خدا ہے جس کی خدائی آپ اپنے بل بوتے پر قائم ہے اور جو کسی کی مدد کا محتاج نہیں بلکہ سب اس کے محتاج ہیں[1] مطلب یہ ہے کہ ساری کائنات کو حیات کے لیے رزق کا سامان اللہ ہی بہم پہنچاتا ہے و لا یطعم اور خود محتاج رزق نہیں ہے کیونکہ اس کی ذات اپنے بقا کے لیے کسی بھی سہارے سے بے نیاز ہے۔ یہ بھی ضرب ہے عقیدہ شرک پر مشرک قوموں کے عقیدے میں بڑے بڑے دیوتا بھی کھانے پینے کے محتاج ہیں۔ حضرت مسیح کو عیسائی دنیا نے معبود بنایا تو قرآن نے برملا کہا کہ مسیح اپنے سارے کمالات بشری کے باوجود وہ اور ان کی والدہ دونوں بہرحال قوائے بشری ہی سے مرکب تھے اور کھانے پینے ساری بشری ضرورتوں کے محتاج تھے تو جو ایسے صاحب احتیاج ہوں انہیں خدائی کا مرتبہ دیتے ہوئے شرم نہیں آتی کانا یاکلان الطعام

توحید عملی کا اعلان

۱۴۔ تم کہہ دو کہ مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ خدا کے سامنے سرنگوں ہونے والوں میں سب سے پہلے میں اس کے سامنے سرنگوں ہو جاؤں اور مجھے کہا گیا ہے کہ شرک کرنے والوں میں سے ہرگز نہ ہونا۔ یعنی ایسے پروردگار کے احکام کے سامنے جس کی صفات اوپر مذکور ہوئیں ضروری ہے کہ سب بندے بلا شرکت غیرے گردن پر ڈال دیں اور سب سے پہلے اس اکمل ترین بندے کو انتہائی انقیاد و تسلیم کا حکم ہوا ہے جو تمام دنیا کے لیے نمونہ طاعت و عبودیت بنا کر روانہ کیا گیا صلی اللہ علیہ وسلم[2] مطلب یہ ہے کہ توحید عبادت کے یہ دلائل سنانے کے بعد اب اعلان کر دیجیے کہ مجھے اسی اللہ کی جانب سے جس کے اوصاف سن چکے ہو یہ حکم ملا ہے کہ میں اسی کا ہو کر رہوں اور اس کے سوا عابدانہ زندگی میں کسی سے تعلقات قائم نہ کروں۔

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

سب سے پہلے اسلام لانے والا اور اپنے آپ کو بالکلیہ اپنے رب کے حوالہ کرنے والا بنوں۔ اور مجھے یہ حکم بھی ملا ہے کہ ان لوگوں سے الگ رہوں اور اظہارِ بیزاری کروں جو اپنے خیال کے مطابق خدائی میں شریک کرتے ہیں۔ ان مشرکین کا شرک یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے معبودوں کو اللہ کی طرح دُنیا کا خالق یا رازق سمجھتے ہوں یا کسی حیثیت یا کسی صفت میں بھی اللہ کے برابر کہتے ہوں بلکہ ان کا شرک یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق و مالک اور مدبر و منتظم ماننے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے تقرب اور تعلق کی وجہ سے ان کو بھی کچھ جزوی اختیارات حاصل ہیں۔ اسی بنیاد پر ان کو خوش کرنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے۔ نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے اور ان سے حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے۔ بس ان کا یہی خیال اور یہی عمل شرک تھا اور اکثر مشرک قوموں میں اسی قسم کا شرک رہا ہے۔

آیت میں اسلام اور شرک کو ایک دوسرے کا مدمقابل بنا کر پیش کیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہاں اسلام سے توحید افعال مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ مجھے اپنے زندگی کے سارے گوشوں میں اسلام کو اپنانے اور شرک کرنے والوں سے علیحدہ رہنے کا حکم دیا گیا۔

اصل یہ ہے کہ خدا کی وحدانیت کے بارے میں قرآن کا اندازِ بیان متکلمانہ نہیں ہوتا جو منطقی مقدمات اور دلائل سے ترتیب پاتا ہے بلکہ قرآن سیدھے سادے طریق پر انسان کے فطری وجدان و ذوق کو مخاطب کرتا ہے اور اس کے معنوی محسوسات کو بیدار کرنا چاہتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ ایک خالق و پروردگار ہستی کا اعتقاد انسان کی فطرت میں موجود ہے۔ اگر وہ انکار کرتا ہے یا پرستش کی گمراہیوں میں مبتلا ہوتا ہے تو یہ اس لیے کہ اس کی وجدانی بصیرت پر غفلت طاری ہو گئی۔ پس چاہیے کہ اسے دُور کر دیا جائے۔ چنانچہ اس مقام پر جس قدر مخاطبات ہیں انہیں اسی اصل کی روشنی میں دیکھا جائے۔ کون ہے جس نے یہ تمام کارخانۂ ہستی پیدا کیا؟ کون ہے کہ جس کی رحمت کا فیضان ہر طرف پھیلا ہوا ہے۔ کون ہے جو سب کو رزق دیتا ہے مگر خود کسی کا محتاج نہیں ہے؟ تمہاری فطرت کہہ رہی ہے کہ ایک خالق و صانع ہستی کے سوا کوئی نہیں ہے۔ پھر یہ کیسی گمراہی ہے کہ اس کی طرف سے گردن پھیرے ہوئے ہو اور اسے چھوڑ کر دوسری ہستیوں کے آگے جھک رہے ہو۔ فرمایا کہ مجھے اسی کے آگے جھک جانے اسی کی بات مان لینے اور فرمانبرداری کرنے کا حکم ہوا ہے اور مجھ سے کہا گیا ہے کہ شرک کرنے والوں سے علیحدہ رہوں اور بس۔

توحید کے اہم اور بنیادی تقاضے

۱۷۔ کہہ دو تم مجھے بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے اگر میں اس کی نافرمانی کروں۔ یہ بات

آپ پر رکھ کر اوروں کو سنائی گئی ہے یعنی بفرض محال اگر خدا کے معصوم اور بے گناہ اور برگزیدہ ترین پیغمبر سے بھی کسی طرح کا عصیان سرزد ہو تو عذاب الٰہی کا اندیشہ ہوتا ہے۔ پھر کسی دوسرے کو کب لائق ہے کہ بادجود شرک وکفر اور تکذیب انبیاء وغیرہ ہزاروں طرح کے جرائم میں مبتلا ہونے کے عذاب الٰہی سے بے فکر اور مامون ہو کر بیٹھ رہیں[1] مطلب یہ ہے کہ جب مجھے یہ حکم ملا ہے۔ کہ میں سب سے پہلے اس کے احکام کی فرمانبرداری کرنے والا بنوں تو میرے لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ اپنے رب کے حکم کی نافرمانی کروں۔ اگر میں بالفرض ایسا کروں تو مجھے بھی اس ہولناک دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قانونی ذمہ داریوں سے کوئی بالا نہیں ہے اور یہ کبھی ساقط نہیں ہوتی ہیں اور یہ بھی معلوم ہوا کہ قانون الٰہی کی ہمہ گیری سے کوئی باہر نہیں ہے۔

اس آیت میں بھی ایک نہایت لطیف تعریض ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم تو گناہوں کے پشتارے اٹھائے ہوئے ہو اور عذاب عظیم کی تیاریاں کر رہے ہو۔ تم تو چیز کیا ہو میں اپنی ذات کی حد تک کہتا ہوں کہ میرے دامن پر گناہ کا کوئی دھبہ نہیں ہے اور منصب رسالت پر فائز ہوں۔ اگر بالفرض میرے دامن پر گناہ کی آلودگی ہو تو اللہ کی بارگاہ میں مجھے بھی اپنے تئیں اندیشہ ہے۔ یعنی باوجود معصیت نہ ہونے کے مجھے اللہ کے جلال وعظمت کا اندیشہ ہے یہ مطلب نہیں کہ حضور انور کو اپنے تئیں معصیت کا اندیشہ ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ معصوم ہونے کے باوجود جب میں بے فکر نہیں تو پھر کسی کو کب لائق ہے کہ کفر وشرک اور معصیت سے دامن آلود ہو کر بے فکر ہو جائے۔

بڑی سے بڑی کامیابی

۱۸۔ اس دن جس کے سر سے عذاب ٹل گیا تو اس پر خدا نے رحم کیا اور بڑی سے بڑی کامیابی یہی ہے۔ جنت اور رضائے الٰہی کے اعلیٰ مدارج کا حاصل کرنا تو بہت اونچا مقام ہے۔ اگر آدمی سے قیامت کے دن کا عذاب ٹل جائے تو یہی بڑی کامیابی سمجھو کما قال عمر رضی اللہ عنہ کفافا لا لی ولا علی[2] مطلب یہ ہے کہ ڈرنے کی اصل چیز خوفناک دن اور اس کا عذاب ہے جو اس سے محفوظ رہا اسی پر درحقیقت اللہ کا رحم ہوا اور چاہنے کی اصل چیز اس دن کی رحمت ہے کیونکہ جو شخص اس رحمت کا سزاوار ہوا وہی فی الواقع کامیابی پانے والا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ آخرت کی ضرورت

---

[1] [2] افادات شیخ الاسلام

اس لیے ہے کہ اللہ کی رحمت اور عذاب اور اس کے جلال و جمال کا ظہور اعلیٰ پیمانے پر ہو سکے۔ ہماری اس دنیا میں اللہ تعالیٰ کی ان صفات کا ظہور اگرچہ ہے لیکن پورے ظہور کی اس دنیا میں صلاحیت نہ ہونے کی وجہ سے یہ ظہور بہت محدود ہے۔ یعنی یہاں اللہ کی جن جمالی صفات کا ظہور ہو رہا ہے وہ بھی محدود ہے اور جن جلالی صفات کا ظہور ہو رہا ہے وہ بھی محدود ہے۔ پورے اور کامل ظہور کی ہماری یہ دنیا تاب ہی نہیں لا سکتی۔ بہرحال اس لیے بھی ایک ایسے عالم کی ضرورت ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی صفات جلال و جمال کا کامل ظہور ہو سکے۔ دراصل یہ ظہور ہی تو عالم کی تخلیق کا خاص مقصد ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے دنیا کی یہ بساط اس لیے بچھائی ہے کہ اس کی صفاتِ کمال کا ظہور ہو۔ بس اگر آخرت کو نہ مانا جائے تو یہ مقصد کہاں پورا ہو گا۔ لہٰذا اس وجہ سے وہاں کے عذاب سے بچ جانا اور رحمت سے ہمدوش ہو جانا بڑی سے بڑی کامیابی ہے اس کے مقابلہ میں جو لوگ اس دنیا کی کامیابیوں کو بڑی چیز سمجھتے ہیں اور ان کے پیچھے آخرت کی فوزمبین کو کھو بیٹھتے ہیں انہیں اپنی بدبختی اور محرومی کا اندازہ کل ہو گا۔

نفع و ضرر صرف اللہ کے اختیار میں ہے

۱۹- اور اے انسان اگر خدا اور تجھے دکھ پہنچائے تو اس کا ٹالنے والا کوئی نہیں ہے مگر اسی کی ذات اور اگر وہ تجھے بھلائی پہنچائے تو ہر بات پر قادر ہے۔ آفرینش کا مسئلہ تو پہلے طے ہو چکا ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کا کوئی شریک و سہیم نہیں۔ یہاں بتایا جا رہا ہے کہ علاوہ آفرینش کے اور سارے تصرفات و اختیارات بھی ہر وقت کے نفع و ضرر، تکلیف و راحت کے سارے اختیارات اللہ ہی کے ہاتھ میں ہیں کوئی اس میں اللہ کے ارادے میں حائل نہیں ہو سکتا اور نہ واقعات، کائنات اور حوادث دہر میں کسی کو کوئی دخل و تصرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نفع و ضرر دونوں خدا ہی کے اختیار میں ہیں۔ اگر وہ کسی کو دکھ میں مبتلا کرے تو کوئی نہیں جو اس کو دور کر سکے اسی طرح اگر وہ کسی کو خیر سے بہرہ مند کرے تو کسی کی طاقت نہیں ہے کہ اس کے ارادے میں مزاحم ہو سکے۔ الحاصل جسمانی روحانی ظاہری باطنی جانی و مالی، نفسی یا آفاقی جو بھی تکلیف یا مصیبت انسانوں اور دیگر مخلوق پر آتی ہے اس کو اللہ کے بغیر کوئی دور نہیں کر سکتا اور اسی طرح اگر کوئی نعمت یا فراخی اللہ تعالیٰ کی طرف سے مقدر ہو تو اللہ تعالیٰ کے بغیر اس کو کوئی روک نہیں سکتا۔ اس آیت میں یہ بات خوب واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر نہ تو کوئی نفع پہنچا سکتا ہے اور نہ ضرر یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے چونکہ مشرکین عموماً اس خیال سے کہ فلاں سے مجھے ضرر پہنچے گا یا نفع اس کو اس عقیدے کے مطابق پکارا کرتے تھے

اس لیے قرآن نے اس کی بھی صاف ممانعت کردی ہے اور بتادیا کہ اللہ تعالیٰ کے دوسرے اور اس کے سوا کسی کو پکارنا صحیح نہیں ہے۔ اس کی مزید تشریح تو معالم القرآن کی جلد ۱۱ میں آئے گی یہاں سرِدست اسی موضوع پر ایک ارشادِ نبوت گوش گزار فرمالیجئے۔

حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سوار تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اے بیٹے اللہ تعالیٰ کے حقوق کی پابندی کرو، اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت کرے گا۔ جب بھی سوال کرنا ہو تو اللہ تعالیٰ ہی سے کرو اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تیرے لیے دکھ مقدر ہے تو تمام کائنات بھی جمع ہوکر اس کو ٹال نہیں سکتی اور اگر تیرے لیے آرام مقدر ہے تو تمام کائنات اس کو روک نہیں سکتی قلمِ تقدیر جو کچھ لکھ چکا وہی ہوگا اور تقدیر کے رجسٹر بھی خشک ہوچکے ہیں۔ (ترمذی)

قرآن کی یہ آیت اور یہ حدیث صحیح آفتاب نیم روز کی طرح بتا رہی ہے کہ نافع اور ضار اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی نہیں وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ یہیں سے صوفیائے کرام نے سب سے زیادہ زور اللہ کی توحید پر دیا ہے۔ فتوح الغیب میں حضرت شیخ اعظم عبدالقادر جیلانی فرماتے ہیں:

جس کسی کو دنیا و آخرت میں عافیت مقصود ہو اسے چاہیئے کہ صبر و تسلیم کا خوگر ہو جائے اور مخلوق سے شکوہ و شکایت نہ کرے اور اپنی حاجتوں کو اپنے رب کے حوالے کردے اور کشائش کی امید صرف اسی سے رکھے اور سب سے ہٹ کر اسی کا ہو رہے۔

اللہ کے سوا کوئی مختارِ کل نہیں

۲۰۔ اور وہی ہے جو اپنے بندوں پر زور و غلبہ رکھنے والا ہے وہی صاحبِ حکمت اور باخبر ہے۔ دنیا یا آخرت میں جو تکلیف و راحت خدا کسی کو پہنچانا چاہے نہ کوئی مقابلہ کرکے روک سکتا ہے اور نہ اس کے غلبہ و اقتدار کے پنجے سے نکل کر بھاگ سکتا ہے وہی پوری طرح خبردار ہے کہ کس بندے کے کیا حالات ہیں اور ان حالات کے مناسب کس قسم کی کارروائی مناسب ہوگی[1]

قہر کے معنے امام راغب نے غلبہ اور تذلیل کے لکھے ہیں اور یہ لفظ دونوں معنے میں استعمال ہوتا ہے یہاں معنی حاکمانہ غلبہ کے ہیں۔ پہلے کمال قدرت کو بتایا تھا اس آیت میں کمالِ سلطان تسخیر اور کمالِ استعلاء

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کو بتایا جا رہا ہے اور وہ بر بھی کمال حکمت اور علم محیط کے ساتھ ۔ معبود ہونے کے لیے جن اوصاف کی ضرورت ہے وہ سب صرف اسی ذات میں جمع ہیں کمال قدرت کمال علم کمال حکمت اور کمال سلطان اور کمال استقلال اس کے باوجود ایسی ذات کامل الصفات اور جامع الکمالات کے اگر کوئی کسی مخلوق کو شریک بناتا ہے تو یہ اس کی حماقت نہیں تو اور کیا ہے ۔

ابن جریر نے وھو القاھر فوق عبادہ کی تفسیر اس طرح کی ہے کہ اللہ کی ذات اپنے بندوں پر غلبہ والی ، ان کو ذلیل کرنے والی ان سے برتر اور بالا اللہ اپنے دباؤ کی وجہ سے ان سے بالا ہے اور وہ سب کمتر ہیں ۔ وہ بندوں پر برتری ان پر دباؤ میں اپنی قدرت اور اپنی تدابیر کے ساتھ حکیم ہے ۔ سب چیزوں کی مصالح اور ان کی مضار سے باخبر ہے ۔ اس پر کسی چیز کا آغاز و انجام پوشیدہ نہیں ہے ۔ نہ اس کی تدبیر میں خلل ہوتا ہے اور نہ اس کی حکمت میں کوئی رخنہ ہوتا ہے ۔

عام شارحین قرآن نے فوق عبادہ میں فوق سے فوقیت قہر اور غلبہ مراد لیا ہے ۔ زمخشری نے اس کی تصریح کی ہے ۔ بیضاوی نے بھی اسے اپنایا اور امام رازی نے اس کے دلائل فراہم کیے ہیں ۔ قرآن کی دوسری آیت زمخشری کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہے ۔ مثلاً قرآن نے فرعون کا مقولہ نقل کیا وانا فوقھم قاھرون ظاہر ہے کہ یہاں فوقیت سے فوقیت مکان نہیں بلکہ فوقیت شان و مرتبہ مراد ہے لیکن بہرحال دونوں میں فرق ہے ۔ اللہ کی فوقیت اس کی شان کے مطابق ہے ۔ وہ اپنے سارے شئون میں مخلوق سے بالا ہے ۔ لیس کمثلہ شیئ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی شان یہ ہے کہ تمام جہان اور تمام بندے ہر آن اس کی مٹھی اور اس کے قابو میں ہیں وہ ان کو قابو میں رکھنے کے لیے نہ کسی مددگار کا محتاج ہے اور نہ اس امر کا اندیشہ ہے کہ جب وہ ان کو پکڑنا چاہے تو کوئی اس کی گرفت سے باہر نکل سکے ۔

قُلْ اَيُّ شَيْءٍ اَكْبَرُ شَهَادَةً ۭ قُلِ اللّٰهُ ۣ شَهِيْدٌۢ بَيْنِيْ وَبَيْنَكُمْ ۣ
وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ اَىِٕنَّكُمْ
لَتَشْهَدُوْنَ اَنَّ مَعَ اللّٰهِ اٰلِهَةً اُخْرٰي ۭ قُلْ لَّآ اَشْهَدُ ۚ قُلْ اِنَّمَا
هُوَ اِلٰهٌ وَّاحِدٌ وَّاِنَّنِيْ بَرِيْۗءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اَلَّذِيْنَ وقف لا ۲ بر خلاف
اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ يَعْرِفُوْنَهٗ كَمَا يَعْرِفُوْنَ اَبْنَاۗءَهُمْ ۘ اَلَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا
اَنْفُسَهُمْ فَهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ۝ وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰي عَلَي
اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ۭ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ۝ وقف لازم

ان سے کہو کہ کس کی گواہی سب سے بڑی ہے؟ کہہ دو کہ میرے
اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے[۲۱] - اور یہ قرآن میری طرف
بذریعہ وحی بھیجا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو
متنبہ کر دوں کیا واقعی تم لوگ گواہی دے سکتے ہو کہ اللہ کے
ساتھ دوسرے معبود بھی ہیں، کہو میں تو اس کی شہادت ہرگز

نہیں دے سکتا اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو[۲۲]۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسے ان کو اپنی اولاد کے پہچاننے میں اشتباہ نہیں ہوتا ہاں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں رکھا ہے وہ اسے نہیں مانتے ہیں[۲۳]۔ اور اس شخص سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگائے یا اللہ کی آیات کو جھٹلائے یقیناً ایسے ظالم کبھی فلاح نہیں پا سکتے[۲۴]۔

توحید پر سب سے بڑی شہادت

اس آیت میں توحید کے تمام دلائل کو خدا کی عظیم شہادت پر ختم کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ توحید پر سب سے بڑی شہادت اللہ سبحانہ کی ہے۔ اللہ کی یہ شہادت تین طرح کی ہے آفاقی، نفسی اور تنزیلی۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے اس کائنات کو جس طرح بنایا ہے اور جس طرح اس کے نظام کو چلا رہا ہے اس سے اس بات کی شہادت مل رہی ہے کہ وہ ایک ہی ہے اس کا کوئی ساجھی نہیں ہے اور جو ذات گرامی تمام کائنات کی پرورش کر رہی ہے اور جس کی پروردگاری کا اعتراف ہر انسان کرتا ہے اس کے سوا کون اس کا مستحق ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے۔

نظام عالم کی وحدت خود توحید کے ثبوت کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ سورج چاند اور ستاروں سے لے کر انسان، حیوان، ہوا، پانی اور گھاس پات تک کو دیکھو تو معلوم ہوگا کہ یہ سب ایک مقدرہ

نظام اور بندھے اصُول کے تحت ہیں جن میں کبھی اور کہیں سرمو فرق نہیں آتا۔ ہر شے ایک اصول کی پابند اور ایک عادت جاریہ کے مطابق چل رہی ہے گویا ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان سب میں یکسانی اور مساوات کی ایک خاص وحدت ہے اور وہ سب کسی ایک کے اشارے پر چل رہے ہیں اور زبان حال سے گواہی دے رہے ہیں کہ ایک اللہ ہی عبادت کے لائق ہے ولہ اسلم من فی السماوات والارض اور کل لہ قانتون قرآن میں اسی کی طرف متوجہ کیا گیا ہے۔

دوسری شہادت انفس کی شہادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے وہ خود توحید کی شہادت دے رہی ہے۔ متمدن سے متمدن اور وحشی سے وحشی قوم میں اس اعتراف کا سراغ ملتا ہے۔ آثار قدیمہ کی تحقیقات نے سینکڑوں مردہ اور گمنام قوموں کی تاریخ کا سراغ لگایا۔ جس میں سامان تمدن اعلیٰ خیالات اور علوم کی لاکھ کمی محسوس ہوتی ہو مگر اللہ سبحانہٗ کے اعتراف کی کمی بالکل نظر نہیں آتی۔ ان کی عمارتوں کے منہدم کھنڈروں میں جو چیز سب سے پہلے ملتی ہے وہ کسی معبد کی چہار دیواری ہے۔ آج بھی دُنیا کے مختلف گوشوں میں جو بالکل وحشی قومیں ملتی ہیں وہ بھی کسی نہ کسی شکل میں عالم کے خالق اور کائنات کے صانع کے تخیل سے بہرہ ور ہیں غرض جماعت انسانی کا کوئی حصہ زمین کا کوئی گوشہ زمانہ کی کوئی کروٹ اس تخیل سے خالی نہیں ہے اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اعتراف انسان کے فطری تصورات اور وجدانی جذبات میں داخل ہے۔ یہ بھی اللہ کی شہادت ہے۔

تیسری اللہ کی شہادت وحی کی شہادت ہے۔ اللہ نے اپنی پسند ناپسند اور اپنے اوامر و نواہی سے بندوں کو آگاہ کرنے کے لیے اپنے بے شمار نبی اور رسُول روانہ کیے اور ان سب پر اپنی توحید کی شہادت دی اور ان رسُولوں کے ذریعے یہ شہادت اپنی اپنی اُمت کو پہنچائی۔ اس شہادت کے آثار آج بھی ان اُمتوں کی روایات اور ان کے صحیفوں کی تعلیمات میں موجود ہیں۔ اس اعتبار سے دلائل نبوت اور براہین رسالت خدا کی شہادت ہیں۔ اللہ دعوتِ حق کو کامیاب کر کے اور معاندوں اور منکروں کو ناکامیاب کر کے سچائی کے حق میں اپنی گواہی کا اعلان کرتا ہے۔

۲۱ ۔ ان سے کہو کہ کس کی شہادت سب سے بڑی ہے؟ جواب دو کہ میرے اور تمہارے درمیان اللہ گواہ ہے جب یہ فرمایا کہ خدا ہی سب کے ضرر اور نفع کا مالک ہے تمام بندوں پر قاہر اور غالب اور رتی رتی سے خبردار ہے تو اس کی شہادت سے زبردست اور بے لوث شہادت کس کی ہو سکتی ہے۔ پس میں بھی اپنے اور تمہارے درمیان اسی کو گواہ ٹھہراتا ہوں۔ کیونکہ میں نے دعویٰ رسالت کر کے جو کچھ اس کے پیغامات تم کو پہنچائے اور جو کچھ تم نے اس کے جواب میں میرے ساتھ اور خود پیغام ربانی کے ساتھ

برنا دُکیا وہ سب باتیں اس کے سامنے ہیں وہ خود اپنے علم محیط کے موافق میرا اور تمہارا فیصلہ کرے گا[1] یعنی اس بات پر اللہ گواہ ہے کہ میں توحید کا جو پیغام پہنچا رہا ہوں اور جو کچھ کہہ رہا ہوں اسی کے حکم سے کہہ رہا ہوں۔ یہاں گویا خدا کی اس سنت کی طرف اشارہ ہے کہ جب کبھی اس کی طرف سے کوئی داعی حق آتا ہے اور لوگ عناد و شرارت سے اسے جھٹلاتے اور اس کا مقابلہ کرتے ہیں تو حق و باطل میں مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بالآخر حق ہی کامیاب ہوتا ہے اور باطل پرست ناکام ہوتے ہیں یہی اللہ کی گواہی ہے جو اس معاملہ کا فیصلہ کر دیتی ہے[2]

ہم آیت کے افتتاحیہ میں بتا چکے ہیں کہ خدا کی شہادت کسی ایک پہلو سے نہیں بلکہ تین مختلف پہلوؤں سے مل رہی ہے۔ اس کی نازل کی ہوئی آیات قرآنی اس بات کی منادی کر رہی ہیں کہ اس کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں۔ اس کی بنائی ہوئی کائنات کا نظام اور اس کی تاریخ شہادت دے رہی ہے اور انسانی فطرت میں اس کی ودیعت کی ہوئی وجدانی اور عقلی آیات اس پر گواہ ہیں۔

شرک کی ہر قسم سے بیزاری کا اعلان

۲۱ - اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے سب کو متنبہ کردوں۔ کیا واقعی تم لوگ گواہی دے سکتے ہو کہ اللہ کے ساتھ دوسرے معبود بھی ہیں کہہ دو میں تو اس کی شہادت نہیں دے سکتا اور میں اس شرک سے قطعی بیزار ہوں جس میں تم مبتلا ہو۔ یعنی اگر مجھ سے میرے صدق پر خدا کی یقینی اور کھلی شہادت یہ قرآن موجود ہے جو اپنے کلام الٰہی ہونے پر خود ہی اپنی دلیل ہے۔

آفتاب آمد دلیل آفتاب

میرا کام یہ ہے کہ تم کو اور ہر اس شخص کو جسے یہ کلام پہنچے خدائی پیغام سے خبردار کر دوں جس میں توحید و معاد وغیرہ تمام اصول دین کی ہدایت کی گئی ہے کیا اس قدر اتمام حجت ہو چکنے اور ایسا قطعی اور صریح پیغام توحید سننے کے بعد بھی تم یہی کہتے رہو گے کہ خدا کے سوا اور بھی معبود ہیں، تم کو اختیار ہے کہ جو چاہے کہو۔ میں کبھی ایسا حرف زبان پر نہیں لا سکتا بلکہ صاف صاف اعلان کرتا ہوں کہ لائق عبادت صرف وہی ایک خدا ہے۔ باقی جو کچھ تم شرک کرتے ہو میں اس سے قطعاً بیزار ہوں اور نفرت کا اظہار کرتا ہوں[3]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن [3] افاداتِ شیخ القرآن

مطلب یہ ہے کہ خدا کا کوئی شریک ہے یا نہیں۔ اس معاملے میں فیصلہ کن گواہی خود خدا ہی کی ہے اور اس نزاع کے فیصلے کے لیے اپنے اور تمہارے درمیان خدا ہی کو گواہ مانتا ہوں۔ اس نے میرے اوپر یہ قرآن اسی گواہی کے لیے نازل کیا ہے کہ میں تم کو خبردار کر دوں کہ اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے اور جن جن کو یہ پیغام پہنچے وہ بھی خبردار کر دیں کہ وہ وحدہ لاشریک ہے کوئی اس کا شریک و سہیم نہیں ہے۔ اب اس کے بعد بھی اگر تم مدعی ہو کہ دوسرے معبود خدا کے شریک ہیں تو میں اس بے دلیل گواہی کے لیے تیار نہیں ہوں۔ کیونکہ کسی چیز کی شہادت دینے کے لیے محض قیاس یا گمان کافی نہیں ہے بلکہ اس کے لیے علم ہونا ضروری ہے جس کی بنا پر آدمی یقین کے ساتھ کہہ سکے کہ ایسا ہے۔ پس سوال کا مطلب یہ ہے کہ کیا واقعی تمہیں یہ علم ہے کہ اس جہان ہست و بود میں خدا کے سوا اور بھی کوئی کارفرما حاکم ذی اختیار ہے جو بندگی و پرستش کا مستحق ہو۔ اگر تم علم کے بغیر جھوٹی شہادت دینا چاہتے ہو تو دو میں تو ایسی شہادت نہیں دے سکتا۔ مجھے تو خدا کا یہی حکم ہوا ہے کہ میں اعلان کر دوں کہ وہ ایک ہی معبود ہے اور میں ان تمام چیزوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں جن کو تم خدا کا شریک کہتے ہو۔

اس ارشاد میں لانذرکم بہ و من بلغ خاص طور پر توجہ کے لائق ہے۔ ہماری رائے میں من بلغ بطور عطف ضمیر سے پیوند رکھتا ہے یعنی اس کا معطوف علیہ انذرکم میں ضمیر منصوب ہے۔ اس سے علمائے دین کی زندگی میں کچھ اہم باتیں معلوم ہو گئی ہیں۔

اولاً یہ کہ من بلغ نے بتلا دیا کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تمام جن و انس اور مشرق و مغرب کے لیے ہے[1]

ثانیاً قاضی بیضاوی نے اس سے یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ یہ آیت یہ رہنما اصول بتاتی ہے کہ قرآن کے احکام نزول کے وقت اور نزول کے بعد سارے موجودین کے لیے ہیں یعنی یہ کہ قرآن کا دائرہ صرف اس کے براہ راست مخاطبین اولین تک محدود نہیں ہے اور یہ بھی کہ جسے قرآن نہیں پہنچے گا اس کا مواخذہ نہ ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ اسلامی دعوت کی اساس قرآن ہے جسے قرآن نہیں پہنچا اس کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اسے اسلام کی دعوت پہنچ گئی ہے۔

مفسرین سلف سے اس آیت کی تشریح میں جو بیانات آئے ہیں ان سے بھی قاضی صاحب کے موقف کی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ حضور انور کا ارشاد ہے:

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جسے قرآن پہنچا ہے لسے گریا میں نے ہی دعوت بالمشافہ دی ہے اور اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت کی وادحی الی ھذا القرآن لانذرکم

وجہ اس کی یہ ہے کہ قرآن باللفظ متواتر ہے حضور انور کے بعد جسے قرآن پہنچتا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود دہانِ نبوت سے سن رہا ہے کیونکہ اس میں کمی اور بیشی نہیں ہے۔ مشہور مفسر قرآن محمد بن کعب القرطبی نے اس آیت کی تشریح میں فرمایا ہے کہ جسے قرآن پہنچا گویا اس نے خود حضور انور کی زیارت کی ہے۔ حضرت ابی بن کعب فرماتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں کچھ قیدی لائے گئے، آپ نے ان سے دریافت کیا کہ کیا تمہیں دعوت اسلام ملی ہے انہوں نے بتایا کہ نہیں۔ آپ نے ان کو رہا کر دیا اور یہی آیت تلاوت فرمائی۔

ثالثاً اس آیت میں توحید الوہیت کے اعلان کے ساتھ شرک سے بیزاری کا اظہار کیا گیا ہے کیونکہ ذہنوں میں کوئی تصور واضح اسی وقت ہوتا ہے جبکہ اس کے مخالف تصور کو بھی ساتھ ساتھ بیان کر دیا جائے۔ اسی لیے اہم اصول و نظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا ضرور اہتمام کیا جاتا ہے کہ ان کے مخالف اصولوں اور نظریوں کو ان کے بالمقابل رکھ دیا جائے۔ عقیدہ توحید سے زیادہ اہمیت کس نظریے کی ہو سکتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ توحید کے مخالف نظریہ شرک کو سمجھ لیا جائے اور یہ معلوم کر لیا جائے کہ مشرکین عرب کی شرک کی حقیقت کیا ہے۔

مشرکین عرب کے شرک کی حقیقت

مشرکین عرب کا شرک یہ نہیں تھا کہ وہ اپنے معبودوں کو اللہ کی طرح دنیا کا خالق یا رازق سمجھتے ہوں یا کسی حیثیت یا کسی صفت میں اللہ کے برابر کہتے ہوں بلکہ ان کا شرک یہ تھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق رازق، مالک مدبر و منتظم ماننے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ کے تعلق اور تقرب کی وجہ سے ہمارے ان دیوتاؤں کو بھی کچھ جزوی اختیارات حاصل ہیں۔ اور یہ چاہیں تو بنا اور بگاڑ سکتے ہیں۔ اسی بنیاد پر یہ ان کو خوش کرنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے یعنی سجدہ اور طواف جیسے اعمال کرتے تھے، نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے اور ان سے حاجتیں اور مرادیں مانگتے تھے پس ان کا یہی خیال اور یہی عمل شرک تھا اور اکثر مشرک قوموں میں اسی قسم کا شرک رہا ہے اور اسی وجہ سے قرآن میں اسی شرک کا رد زیادہ کیا گیا ہے یہاں اتنی بری ما تشرکون میں مشرکین عرب کے جس شرک سے برأت کا اعلان کیا گیا ہے وہ یہی ہے کہ وہ کچھ ہستیوں کے متعلق یہ عقیدہ رکھتے

تھے کہ اگرچہ یہ اللہ کی مخلوق اور مملوک ہیں لیکن خدا کے ساتھ ان کا ایسا تعلق اور اس کے کارخانے میں ان کا ایسا عمل دخل ہے کہ یہ ہماری تکلیفیں دور کر سکتے ہیں اور دولت عزت اور اولاد جیسی چیزیں ہمیں دے سکتے ہیں اور اسی عقیدے کی بنا پر وہ اپنی حاجتیں ان سے مانگتے تھے دعائیں کرتے تھے اور انہیں خوش کرنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے۔ یعنی جس طرح خدا کو راضی کرنے کے لیے اور اپنی عاجزی اس کے سامنے ظاہر کرنے کے لیے اس کی عبادت اور پرستش کی جاتی ہے اسی طرح وہ اپنے ان معبودوں کی بھی عبادت کرتے تھے۔

قرآن عزیز نے ان کے اسی عقیدے کو شرک قرار دیا اور عبادت و استعانت کے ان کے اس عمل کو بھی اور ان کو دعوت دی کہ اللہ کے سوا کسی کو نفع و ضرر کا مالک و مختار نہ سمجھیں اور عبادت و استعانت میں اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کریں۔

اہل کتاب کی گواہی

۲۳۔ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اس کو پہچانتے ہیں جیسے ان کو اپنی اولاد کے پہچاننے میں اشتباہ نہیں ہوتا ہاں جنہوں نے اپنے آپ کو خسارے میں رکھا ہے وہ اسے نہیں مانتے ہیں۔

یعنی اس کے علاوہ کہ میری صداقت کا خدا گواہ ہے اور قرآن کریم اس کی ناطق اور ناقابل تردید شہادت دے رہا ہے، وہ اہل کتاب یہود و نصاریٰ بھی جن کی طرف کتب سماویہ کا عالم سمجھ کر تم میرے معاملہ میں رجوع کرتے ہو اپنے دلوں میں پورا یقین رکھتے ہیں کہ بلاشبہ وہی نبی آخرالزمان ہوں جس کی شہادت انبیائے سابقین دیتے آتے ہیں۔ ان کو جس طرح بہت سے بچوں میں اپنی اولاد کی شناخت میں کوئی دقت نہیں ہوتی ایسے ہی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کی صداقت کے معلوم کرنے میں بھی کوئی شبہ اور دھوکہ نہیں ہوتا۔ البتہ حسد کبر اور تقلید آباء اور حب جاہ و مال وغیرہ اجازت نہیں دیتے کہ مشرف بایمان ہو کر اپنی جانوں کو نقصان دائمی اور ہلاکت ابدی سے بچائیں [1]

مطلب یہ ہے کہ کتب آسمانی کا علم رکھنے والے بھی اس بات کے گواہ ہیں کہ معبود ایک ہی ہے اور پرستش و بندگی میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ قرآن کی گواہی کو اور زیادہ مضبوط کرنے کے لیے فرمایا کہ یہ کوئی غیر معروف گواہی نہیں ہے بلکہ جانی پہچانی ہوئی گواہی ہے اس کا ذکر پچھلے

[1] افادات شیخ الاسلام

آسمانی صحیفوں میں بھی موجود ہے تم سے پہلے جن کو کتاب دی گئی وہ اس پیغمبر کو یا اس کتاب کو یا اس کی دعوت توحید کو خوب جانتے اور پہچانتے ہیں۔ یعرفونہ، کی ضمیر کا مرجع قرآن ہے جس کا ذکر پہلے ہوا ہے اور یا حضور انور کی ذات گرامی ہے دونوں میں کوئی فرق نہیں اس لیے نبی اور قرآن لازم و ملزوم ہیں۔ جس طرح ایک مجبور باپ کو اپنے موعود بیٹے کا انتظار ہوتا ہے۔ اسی طرح اہل کتاب کو نبی اور قرآن کا انتظار تھا۔ اس پر ایمان لانے سے تو محروم صرف وہ رہیں گے جنہوں نے اپنے آپ کو گھاٹے میں ڈالا۔ ورنہ جو شخص کتاب الہٰی کا علم رکھتا ہو اور نبوت سے علمی رابطہ ہو وہ الوہیت کے متعلق بلا کسی شک و شبہ کے یہ جانتا ہے کہ یہ نبوت کی دعوت ہے اور یہی امر حق ہے کہ بندگی اور پرستش کے لائق صرف اللہ ہے

شرک کا مدعی سب سے بڑا ظالم ہے

۲۴۔ اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان لگاتے یا اللہ کی آیات کو جھٹلائے یقیناً ایسے لوگ کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ یعنی نبی نہ ہو اور خدا پر افترا کر کے دعویٰ نبوت کر بیٹھے یا سچے نبی سے جس کی صداقت کے دلائل واضح موجود ہوں۔ خدائی پیام سن کر تکذیب پر کمر بستہ ہو جائے ان دونوں سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہو سکتا۔ اور سنت اللہ یہ ہے کہ ظالم کو کامیابی اور بھلائی نصیب نہیں ہوتی۔ پس اگر فرض کرو معاذ اللہ میں مفتری ہوں تو ہرگز کامیاب نہ ہوں گا اور تم مکذب ہو جیسا کہ دلائل سے ظاہر ہے تو تمہاری خیریت نہیں لہٰذا حالات پر غور کر کے اور انجام سوچ کر عاقبت کی فکر کرو اور اس دن سے ڈرو جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ ابن کثیر نے آیت کے معنے یہی بتاتے ہیں۔ اور بعض مفسرین نے افترا علی اللہ سے مشرکین کا شرک مراد لیا ہے جیسا کہ آگے وضل عنھم ما کانوا یفترون میں اشارہ ہے[1]

من اظلم کے من موصول سے کنایہ تین طرف ہو سکتا ہے۔ نبی کی طرف جیسا کہ ابن کثیر نے اختیار کیا ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اس پیغمبر سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو خدا پر جھوٹ کا افترا کرے دوسرا مشرکین کی طرف، مطلب یہ ہے کہ اس مشرک سے زیادہ ظالم کون ہے جو یہ افترا کرے کہ خدا کے ساتھ دوسری بہت سی ہستیاں بھی عبادت میں شریک ہیں اور خدائی صفات سے متصف ہیں۔ دانائے غیب ہیں مختار کل ہیں، حاضر و ناظر ہیں، حاجت روا اور مشکل کشا ہیں، خداوندانہ اختیارات رکھتی ہیں اور

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کی مستحق ہیں کہ انسان ان کے آگے عبدیت اختیار کرے ۔ تیسرا اہل کتاب کی طرف، مطلب یہ ہے کہ ان اہل کتاب سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو کتاب الٰہی میں تحریف کرکے افترا پردازی کرتے ہیں ۔

اگرچہ تینوں مطالب کی گنجائش ہے مگر ہماری رائے میں سیاق وسباق کے پیش نظر دوسرا مطلب قرآن کا منطوق ہے ۔ پہلا اور تیسرا منطوق نہیں بلکہ مدلول ہے ۔ فرمایا ہے کہ جب خدا کی گواہی یہ ہے کہ عبادت کے لائق صرف وہی ہے اس کے سوا پرستش و بندگی میں کسی کی حصہ داری نہیں ہے تو ان سے بڑھ کر بدقسمت، ظالم اور نامراد کون ہو سکتا ہے جو اس گواہی کے خلاف خدا پر یہ جھوٹ باندھیں کہ اس نے فلاں فلاں کو اپنا شریک بنالیا ہے یا اس کی آیات کی تکذیب کریں جبکہ وہ توحید کی واضح تعلیم کے ساتھ ان کے پاس آگئی ہے ایسے ظالم کبھی فلاح پانے والے نہیں ہیں ۔

تکذیب آیات یہ کہ جن باتوں کا اقرار و اثبات واجب ہے ان سے انکار کرنے لگے یا یہ مطلب ہے کہ قرآن کی آیات کی تکذیب کرے یا جیسا کہ سید رشید رضا نے لکھا ہے کہ آیات سے مراد آیات کونیہ ہیں جو انسان کے اپنے نفس اور ساری کائنات میں پھیلی ہوئی ہیں ۔ ہمارے خیال میں آیات سے مراد سب قسم کی نشانیاں ہیں ۔ آیات کونیہ بھی اور وہ بھی جو نبوت کی سیرت میں پھیلی ہوئی ہیں اور وہ بھی جو قرآن میں پیش کی گئی ہیں ۔ یہ ساری نشانیاں ایک ہی حقیقت کی طرف رہنمائی کرتی ہیں ۔ یعنی یہ کہ موجودات عالم میں صرف ایک خدا ہے باقی سب بندے ہیں ۔ اب جو شخص ان سب نشانیوں کے مقابلہ میں کسی حقیقی شہادت کے بغیر، کسی علم کسی مشاہدے اور کسی تجربے کے بغیر مجرد قیاس و گمان یا تقلید آبائی کی بنا پر دوسروں کو الوہیت کی صفات سے متصف اور خداوندی حقوق کا مستحق ٹھہراتا ہے ظاہر ہے کہ اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ہو سکتا وہ حقیقتہً وحدانیت پر ظلم کر رہا ہے اپنے نفس پر ظلم کر رہا ہے اور کائنات کی ہر اس چیز پر ظلم کر رہا ہے جس کے ساتھ وہ اس غلط نظریہ کی بنا پر کوئی معاملہ کرتا ہے[1]

---

[1] تفہیم القرآن

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا أَيْنَ
شُرَكَاؤُكُمُ الَّذِينَ كُنْتُمْ تَزْعُمُونَ ﴿٢٢﴾ ثُمَّ لَمْ تَكُنْ فِتْنَتُهُمْ
إِلَّا أَنْ قَالُوا وَاللَّهِ رَبِّنَا مَا كُنَّا مُشْرِكِينَ ﴿٢٣﴾ انْظُرْ كَيْفَ
كَذَبُوا عَلَىٰ أَنْفُسِهِمْ ۚ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿٢٤﴾

اور یاد کرو اس دن کو جس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے پھر کہیں گے ان شریک ٹھہرانے والوں سے کہ تمہارے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم ہمارا شریک گمان کرتے تھے[۲۵]۔ پھر ان کے پاس کوئی فریب اس کے سوا نہ ہوگا کہ وہ کہیں گے اللہ ہمارے رب کی قسم ہم مشرک نہ تھے[۲۶]۔ دیکھو یہ کس طرح اپنے آپ پر جھوٹ بولیں گے اور ان کی ساری افترا پردازیاں کھوئی جائیں گی[۲۷]۔

میدانِ حشر میں شرک کی رُسوائی

شرک کے معنے ساجھے پن کے ہیں اور دین کی اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات

یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساجھی ٹھہرایا جاتا ہے۔ دیگر کتب سماویہ میں عموماً اور قرآن عزیز میں خصوصاً شرک کی تردید پر جتنا زور دیا ہے اتنا زور کسی اور مسئلہ پر نہیں دیا۔ اور حضرت آدم سے لے کر جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک تمام انبیائے کرام کا اولین سبق اور درس ہی یہ تھا۔ مالکم من الٰہ غیرہٗ توحید کامل کے یہ معنے ہیں کہ جس طرح خدا کی ذات میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اسی طرح اس کی صفات میں اور صفات کے لوازم میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ پیدا کرنا، زندہ رکھنا، مارنا، عالم الغیب اور حاضر وناظر ہونا، دور نزدیک سے یکساں تعلق رکھنا اور کائنات میں تدبیر و تصرف کرنا وغیرہ وغیرہ یہ تمام صفات بحیثیت صرف اللہ تعالیٰ کی ذات گرامی کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب والے اوتاروں، ولیوں، شہیدوں اور نبیوں میں یہ اوصاف مانتے تھے۔ اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی اعتقاد رکھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیاء کو علم غیب ہوتا ہے۔ بنی اسرائیل کے زمانے میں کاہنوں کا کام ہی یہ تھا کہ وہ آئندہ واقعات کی پیشین گوئیاں کرتے تھے۔ حالانکہ جنات اور اسی طرح احبار و رہبان کی پرستش کرنے والوں کا قرآن نے بصراحت ذکر کیا ہے اور یہی ان کی توحید کا نقص ہے۔ اسلام نے توحید کے کمال کے لیے توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصفات توحید فی العبادت اور توحید فی التصرف وغیرہ کو بھی ضروری قرار دیا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ خدا کے اعتراف و اقرار کا دل پر جو روحانی اور اخلاقی اثر پڑتا ہے وہ توحید کامل کے بغیر ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ اطاعت انقیاد خشوع توکل اور اخلاص کی حالت صرف اسی وقت دل پر طاری ہو سکتی ہے جب یہ یقین کامل ہو کر ہماری تمام حاجتوں، تمام ضرورتوں، تمام امیدوں تمام اغراض و مقاصد اور تمام خواہشوں کا صرف ایک ہی مرکز و محور ہے۔

بہرحال شرک چاہے جس قسم کا ہو اس کی موجودگی میں توحید کا اسلامی عقیدہ باقی نہیں رہتا۔ اور جہاں توحید نہ ہو ممکن نہیں کہ وہاں ایمان موجود ہو اور جہاں ایمان موجود نہ ہو وہاں اسلام کے وجود کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اسی لیے قرآن نے یہاں مشرک کو اظلم اور دوسرے مقام پر اس کے کردار کو ظلم عظیم قرار دیا ہے اور اسی لیے شرک ناقابل معافی جرم ہے ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ اس آیت میں میدان حشر میں مشرکین کی بے بسی اور بے کسی کی تصویر پیش کی جا رہی ہے۔

۲۵۔ اور یاد کرو اس دن کو جس دن ہم سب کو اکٹھا کریں گے پھر کہیں گے ان شریک ٹھہرانے والوں سے کہ تمہارے وہ شریک کہاں ہیں جن کو تم ہمارا شریک گردانتے تھے۔ یعنی جن کی نسبت تم کو دعویٰ تھا کہ وہ خدائی کے حصہ دار اور شدائد میں تمہارے شفیع و مددگار ہیں۔ آج ایسی سخت مصیبت کے وقت کہاں چلے گئے۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

شرک کے اسباب میں سے ایک بڑا سبب شفاعت کے وہ غلط معنے تھے جو عربوں اور عیسائیوں میں رائج تھے۔ عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنے سمجھ رکھے تھے اس کا اصلی سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا کہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت ہے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی اس کے دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے۔ اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کے خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے۔ چنانچہ وہ اپنے بتوں، دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور ان شرکاء کو شفعاء کہتے تھے ھٰؤلاء شفعاؤنا عند اللّٰہ بت پرست عربوں کا عقیدہ یہ بھی تھا کہ یہ دیوتا اور ان کے یہ بت خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختار کل ہیں وہ یہاں لینے نہ دینے کا اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس عقیدے کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا۔ اسی کی تردید ہو رہی ہے اور اندازِ کلام طنزیہ ہے لفظ جمیعًا سے مراد ساری مخلوقات یا کفار اور ان کے معبود ہیں یا پھر انسان اور جن ہیں۔ لیکن اچھا یہ ہے کہ مراد کفر کے سارے طبقات ہوں پھر ان میں سے بڑے ظالموں سے دریافت کیا جائے گا کہ وہ شرکاء کہاں ہیں جن کے بارے میں تم دنیا میں اللہ کے شریک ہونے کا نعرہ لگاتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ شفعاء ہیں جیسا کہ اسی پارے میں آرہا ہے۔

وما نریٰ معکم شفعاءکم الذین زعمتم انھم فیکم شرکاء

اور ہم نہیں دیکھتے تمہارے ساتھ تمہارے ان سفارشیوں کو جن کے متعلق تمہارا خیال تھا کہ تمہارے کام بنانے میں وہ شریک ہیں۔

قیامت کی ہولناکی اور مشرک کی بدحواسی

۲۶۔ پھر ان کے پاس کوئی فریب اس کے سوا نہ ہوگا کہ وہ کہیں گے اللہ ہمارے رب کی قسم ہم مشرک نہ تھے۔ یعنی بجز انکارِ واقعات کے کچھ کرتے دھرتے نہ بن پڑے گی۔ باطل معبودین کی جس عقیدت و محبت میں مفتون ہو رہے تھے اس کی حقیقت صرف اتنی رہ جائے گی کہ ساری عمر کے عقیدے اور تعلق سے بھی انکار کر بیٹھیں گے[1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

آیت میں لفظ فتنہ آیا ہے۔ فتنہ عربی میں متعدد معانی میں آتا ہے اس لیے شارحین قرآن نے اس کی تشریح اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے۔ فتنہ کے معنے امتحان کے ہیں اور مراد ان کا کفر و شرک ہے اس صورت میں مضاف محذوف ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ قیامت کی ہولناکیوں کو دیکھ کر ان پر ایسی بدحواسی طاری ہوگی کہ ان کے کفر و شرک کا انجام یہ ہوگا کہ اس بدحواسی میں پکار اٹھیں گے کہ بخدا ہم مشرک نہ تھے۔

فتنہ کے معنے گمراہی کے ہیں اور یہاں اس سے مشرکین کا جواب مراد ہے۔ چونکہ مشرکین کا جواب صریح جھوٹ ہوگا اس لیے اسے فتنہ سے تعبیر کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کا جواب یہ ہوگا کہ بخدا ہم مشرک نہ تھے۔

امام زجاج کہتے ہیں کہ فتنہ کے اصل معنے کسی پر شیفتہ اور فریفتہ ہونے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مشرک جو اپنے بتوں پر اس قدر شیفتہ اور فریفتہ ہیں اس کی حقیقت روز قیامت اس وقت کھل کر سامنے آجائے گی جبکہ قیامت کی ہولناکی میں عشق کی ساری جھکڑی ہوا ہو کر رہ جائے گی اور وہ ان سے اظہار بیزاری کریں گے۔ اس کی مثال ایسی ہے کہ جیسے کوئی شخص کسی پر عاشق ہو پھر جب عاشق کو راہ عشق میں کوئی مصیبت کا سامنا کرنا پڑے تو اس سے بیزار ہو جائے اس پر وہ محبوب یا کوئی دوسرا شخص اس سے کہے کہ بس تیرا عشق سارا یہی ہے کہ بیزاری ظاہر کرے۔

خلاصہ یہ ہے کہ اگر فتنہ آزمائش کے معنے میں ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ جس فتنہ شرک اور جن موہوم آرزوؤں میں آج یہ مبتلا ہیں اس کا پردہ چاک ہو جائے گا اور ان کو پتہ لگ جائے گا کہ جن سہاروں پر وہ جی رہے تھے وہ فریب کے سوا کچھ نہ تھے۔ اس وقت ان کے بس میں اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ ہوگا کہ جس طرح آج اس دنیا میں خدا پر جھوٹ بول کر اپنی دینی زندگی کا گھر وندا بنا رہے ہیں اس طرح اپنے اوپر بھی ماکنا مشرکین کہہ کر جھوٹ بولیں۔ اور اگر لفظ فتنہ کو ظلم و تشدد سے دین سے پھرنے کے معنے میں لیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ آج جس فتنے میں یہ کمزور مسلمانوں کو بجرم انکار شرک میں مبتلا کر رہے ہیں کل اسی فتنہ میں یہ کہہ کر خود مبتلا ہوں گے کہ ماکنا مشرکین، گویا آج جس شرک کی حمایت میں وہ مسلمانوں پر ظلم کر رہے ہیں خدا کی بارگاہ میں پیش ہوتے ہی اس سے بیزار ہو جائیں گے اور جھوٹ بولیں گے۔

مشرکین کا جھوٹ دنیا و آخرت میں

۲۷۔ دیکھو یہ کس طرح اپنے آپ پر جھوٹ بولیں گے اور ان کی ساری افترا پردازیاں کھوئی جائیں گی

یعنی اس صریح جھوٹ سے مشرکین کی انتہائی بدحواسی اور شرکاء کی غایت بے چارگی اور درماندگی کا اظہار ہوگا۔ کاش مشرکین اس رسواکن انجام کو دنیا ہی میں سمجھ لیں۔[1] مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اوپر جھوٹی گواہی دی یعنی دنیا میں جس شرک کی حمایت میں لڑتے رہے۔ آخرت میں پہلے ہی قدم پر قسم کھا کر اس کا انکار کریں گے۔ اس میں یہ لطیف تعریض بھی ہے کہ دنیا میں یہ خدا کے خلاف جھوٹی گواہی دیتے رہے ہیں۔ شارحین قرآن نے تو یہی لکھا ہے کہ آیت میں انظر سے حضور انور کو خطاب ہے لیکن ہر ایک مراد ہے اور تصویر حال کے لیے ہے تاکہ مستقبل میں ہونے والے واقعات ہر شخص چشم تصور سے دیکھ سکے مطلب یہ ہے کہ دیکھئے کہ ان لوگوں نے خود اپنے خلاف ہی اپنا ووٹ ڈال دیا اور قسم کھا کر شرک کا انکار کر دیا۔

ضل عنھم ما کانوا یفترون کا مطلب یہ ہے کہ دنیا میں جھوٹ بول کر جن کو شرکاء اور شفعاء کا درجہ دے رکھا تھا اور جن سے ساری امیدیں باندھ رکھی تھیں وہ سب ہوا ہو گئیں اور ان میں سے کوئی امید بھی بر نہ آئی۔ گویا دنیا میں ان دیوتاؤں کو اللہ کا شریک ٹھہرانا یا ان شرکاء کو شفیع بنانا ایک افترا تھا آج حقیقت سامنے آ کر اس کی قلعی کھل گئی۔ اور بعض شارحین قرآن کا خیال ہے کہ افترا سے مشرکین کی اپنی عبادات کے بارے میں وہ تاویلات ہیں جو دنیا میں کرتے تھے کہ ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی، ہم تو ان کی عبادت صرف اس لیے کرتے ہیں کہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں گے۔

آیت کی بعض مہمات کی تشریح ابھی باقی ہے۔

الف: یہاں سب سے اہم سوال یہ ہے کہ میدان قیامت کے ہولناک مناظر اور رب الارباب کی قدرت کاملہ دیکھ کر ان کو یہ جرأت کیسے ہوگی کہ اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں جھوٹ بولیں۔ عام شارحین قرآن نے اس کے جواب میں بتایا ہے کہ ان کا یہ جواب عقل و ہوش اور انجام بینی کے تقاضوں کے تحت نہیں ہے بلکہ بست کی بہتات اور بوکھلاہٹ کے نتیجے میں ہے۔ بوکھلاہٹ کا جب آدمی شکار ہوتا ہے تو آدمی کے جو کچھ منہ میں آتا ہے کہتا ہے۔ آیت قرآنی کا مقصود بھی میدان قیامت کی ہولناکیوں میں ان کی پریشانی، بے بسی، بے کسی کی تصویر پیش کرنا ہے۔ یعنی ان سے جب یہ سوال ہوگا کہ این شرکاؤکم الذین کنتم تزعمون تو وہ اس قدر پریشان ہوں گے کہ ہوش باختہ ہو کر کہیں گے ماکنا مشرکین۔

یہ بھی ذہن میں رہے کہ میدان محشر کا ایک ہی حال نہ ہوگا بلکہ وہاں مختلف مراحل اور مناظر ہوں گے ایک مرحلہ میں اگر وہ شرک کا انکار کریں گے تو دوسرے مرحلہ پر وہ شرکاء کو پکاریں گے یعنی اس روز

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مشرکین کو جس حیرانی اور پریشانی سے سابقہ پیش آئے گا وہ ایسی ہو گی کہ اس میں ان کو سمجھ کی کوئی راہ سجھائی نہ دے گی اس لیے جس مرحلے میں جو بات بنتی نظر آئے وہ بنانے کی کوشش کریں گے۔ یہاں بات کو قسم کے انداز میں پیش کرنا ان کی حیرت کو ظاہر کر رہا ہے۔

البحر المحیط میں ابوحیان اندلسی اور تفسیر مظہری میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے کچھ کے حوالہ سے یہ نکتہ خوب پیش فرمایا ہے کہ جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے شرک کا انکار کرنے والے وہ لوگ ہوں گے جو کھلے طور پر کسی کو خدا نہ کہتے تھے مگر ان کا عمل یہ تھا کہ خدائی کے سارے اختیارات مخلوقات میں بانٹ رکھے تھے کسی کو بارش برسانے کے کام پر کسی کو اولاد دینے کے کام پر کسی کو پیداوار پر کسی کو ملازمت دینے کے کام پر سمجھتے تھے اور انہی سے حاجتیں مانگتے، انہی کے نام کی نذر نیاز دیتے ان ہی سے روزی، تندرستی، اولاد اور ساری مرادیں مانگتے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو مشرک نہ سمجھتے تھے اس لیے میدان حشر میں بھی قسم کھا کر یہی کہیں گے کہ ہم تو مشرک نہ تھے۔

ب: یہاں یہ بھی سوچنے کی بات ہے کہ کچھ آیات قرآنی سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ کفار سے کلام ہی نہ فرمائے گا اور یہ آیت بتا رہی ہے کہ کفار سے کلام ہو گا۔

جواب یہ ہے کہ جس آیت میں مخاطبہ اور کلام کی نفی ہے وہ بطور اعزاز و اکرام ہے۔ زجر و توبیخ اور ملامت پر مبنی خطاب کی نفی نہیں ہے۔ اور یہ بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ جس کلام کی نفی کی گئی ہے وہ بلا واسطہ ہے اور اس آیت میں جو خطاب مذکور ہے وہ بواسطہ ملائکہ ہے۔

ج: یہ بات بھی یاد رکھنے کی ہے کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ جس وقت مشرکین سے یہ سوال ہو گا کہ تمہارے شرکاء کہاں ہیں؟ وہاں ان کے معبودوں میں سے کوئی نہ ہو گا۔ حالانکہ قرآن میں دوسری جگہ ان معبودوں کے ہونے کا ذکر ہے مثلاً احشروا الذین ظلموا وازواجھم وما کانوا یعبدون۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ محشر میں عابدوں اور ان کے معبودوں کا اجتماع ہو گا۔ جواب یہ ہے کہ اس آیت میں ان کے غائب ہونے سے مراد یہ ہے کہ وہ شریک اور شفیع کی حیثیت سے غائب ہوں گے کہ ان لوگوں کو کوئی نفع نہ پہنچا سکیں گے ویسے حاضر ہوں گے اس طرح دونوں آیتوں میں کوئی تعارض نہ رہا اور یہ بھی ممکن ہے کہ ایک وقت میں یہ سب ایک جگہ جمع کر دیے جائیں پھر متفرق ہو جائیں اور یہ سوال تفریق کے بعد کیا جائے۔

وَمِنْهُم مَّن يَسْتَمِعُ إِلَيْكَ ۖ وَجَعَلْنَا عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ أَكِنَّةً أَن
يَفْقَهُوهُ وَفِي آذَانِهِمْ وَقْرًا ۚ وَإِن يَرَوْا كُلَّ آيَةٍ لَّا يُؤْمِنُوا بِهَا ۚ
حَتَّىٰ إِذَا جَاءُوكَ يُجَادِلُونَكَ يَقُولُ الَّذِينَ كَفَرُوا إِنْ
هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٢٥﴾ وَهُمْ يَنْهَوْنَ عَنْهُ وَيَنْأَوْنَ
عَنْهُ ۖ وَإِن يُهْلِكُونَ إِلَّا أَنفُسَهُمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿٢٦﴾

اوران میں سے ایسے ہیں جو تمہاری بات پر کان لگاتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال دیے ہیں کہ ان کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرہ پن پیدا کر دیا ہے کہ اس کو نہ سن سکیں[۲۸]۔ اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں گے تو بھی ایمان نہ لائیں گے[۲۹]۔ یہاں تک کہ یہ جب تمہارے پاس حجت کرتے آئیں گے تو یہ کہیں گے کہ یہ تو بس اگلوں کا افسانہ ہے[۳۰] اور یہ اس سے دوسروں کو بھی روکتے ہیں اور خود بھی گریز کرتے

ہیں، اور یہ درحقیقت اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں۔[31]

قوموں کے عروج وزوال کا قانون

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ قوموں کا ابھرنا اور فنا ہونا اتفاقی واقعہ کے طور پر کوئی حادثہ نہیں ہوتا بلکہ اس میں اصلی دخل اخلاق عوامل کو ہوتا ہے۔ جب کوئی زندگی اخلاقی فضائل سے تہی دامن ہو جاتی ہے تو اللہ کا قانون اس کو فنا کر دیتا ہے اور کوئی دوسری قوم اس کی جگہ لے آتا ہے پھر اس کی آزمائش کرتا ہے کہ وہ اقتدار پا کر کیا رویہ اختیار کرتی ہے۔ اگر اس کا رویہ بھی بگڑ جاتا ہے تو پھر اس کو بھی فنا کر دیتا ہے اور اس کی جگہ دوسری قوم کو لاتا ہے۔ عروج وزوال کے اس اصول کو پیش نظر رکھ کر قرآن نے عربوں کے سامنے خود ان کے ملک اور ان کے گردو پیش کی تاریخ رکھی کہ عاد، ثمود، مدین، سبا، قوم لوط اور قوم فرعون کے فنا ہونے کے واقعات اتفاقی واقعات نہیں ہیں بلکہ یہ عروج وزوال کے اس خدائی قانون کے تحت ظہور میں آئے ہیں جو قوموں کی زندگی اور موت کے لیے خدا نے مقرر کیے ہیں۔ یہ قومیں اخلاقی اور روحانی بیماریوں میں مبتلا ہوئیں تو اللہ تعالیٰ نے ان کی اصلاح کے لیے روحانی و اخلاقی حکماء روانہ کیے یعنی انبیاء۔ ان انبیاء نے سر توڑ کوشش کی کہ اپنی قوم کی بیماریاں دور کریں لیکن ان قوموں نے ان کی باتوں کو درخور اعتناء نہ تصور کیا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ نے ان کو فنا کر دیا۔ یہ تاریخ سنا کر قرآن نے عربوں کو سمجھایا کہ تمہارے سامنے بھی زندگی اور موت کا یہی مرحلہ ہے۔ تمہارے اندر بھی خدا کا رسول آچکا ہے اگر تم نے اس کی بات نہ سنی تو تم بھی اسی طرح فنا کر دیے جاؤ گے۔ جس طرح تمہاری پیشرو قومیں فنا کر دی گئی ہیں۔ ان آیات میں قرآن نے اپنے مخاطبوں کا اسی پیمانے سے جائزہ لیا ہے۔

۲۸۔ اور ان میں سے ایسے بھی ہیں جو تمہاری بات پر کان لگاتے ہیں لیکن ہم نے ان کے دلوں پر پردے ڈال رکھے ہیں کہ ان کو نہ سمجھیں اور ان کے کانوں میں بہرہ پن پیدا کر دیا ہے۔ یہ ان لوگوں کا ذکر ہے جو بغرض اعتراض و عیب جوئی قرآن اور حضور کی باتوں کی طرف کان لگاتے تھے۔ ہدایت سے منتفع ہونا اور حق کو قبول کرنا مقصود نہ تھا۔ نصیحت و ہدایت سے متدا عراض اور کانشنس کی مسلسل تعطیل کا قدرتی نتیجہ یہ ہوا کہ قبول حق کے وسائل، قوی انجام کار ماؤف ہو کر رہ گئے۔ حق کے سمجھنے سے ان کے دل محروم کر دیے گئے۔ پیغام ہدایت کا سننا کانوں کو بھاری معلوم ہونے لگا۔ آنکھیں نظر عبرت

سے ایسی حالت ہوگئیں کہ ہر قسم کے نشانات دیکھ کر بھی ایمان لانے کی توفیق نہیں ہوئی اور لطف یہ ہے کہ اس حالت موت پر قانع و مسرور بھی ہیں بلکہ فخر کے لہجے میں اس کا اعلان کرتے ہیں۔ سورہ حم میں ہے،

فاعرض اکثرھم فھم لا یسمعون وقالوا قلوبنا فی اکنۃ مما تدعونا الیہ وفی آذاننا وقر ومن بیننا و بینک حجاب فاعمل اننا عاملون۔

پس ان لوگوں میں سے اکثر نے اس سے روگردانی کی، بس وہ سنتے نہیں ہیں اور کہتے ہیں کہ جس چیز کی طرف تو ہمیں بلا رہا ہے اس کے لیے ہمارے دلوں پر غلاف چڑھے ہوئے ہیں ہمارے کان بہرے ہیں اور ہمارے اور تیرے درمیان ایک حجاب حائل ہے تو اپنا کام کر ہم اپنا کام کر رہے ہیں۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ سماع آیات سے منتفع نہ ہونا اور دلوں پر پردہ پڑ جانا خود ان کے اعراض کا نتیجہ تھا اور یہ اعراض ہی اس کیفیت کے حدوث کا سبب ہوا ہے۔

اذا تتلی علیہ ولی مستکبرا کان لم یسمعھا کان فی اذنیہ وقرا

جب اس کے سامنے آیات الٰہی تلاوت کی جاتی ہیں پھر پورے استکبار کے ساتھ اپنے کفر پر اس طرح اڑا رہتا ہے کہ گویا اس نے ان کو سنا ہی نہیں ہے گویا کہ اس کے کان بہرے ہیں۔

اسباب پر مسببات کا مرتب کرنا چونکہ خالق جل و علا کے سوا کسی کا کام نہیں ہے اس لیے آیت حاضرہ وجعلنا علی قلوبھم اکنۃ، میں پردہ ڈالنے کی نسبت حق تعالیٰ کی طرف کر دی گئی لہ مطلب یہ ہے کہ قانون فطرت کے تحت جو کچھ دنیا میں واقع ہوتا ہے اسے اللہ تعالیٰ اپنی طرف منسوب کرتا ہے کیونکہ دراصل اس قانون کا بنانے والا اللہ ہی ہے اور جو نتائج قانون کے تحت رونما ہوتے ہیں وہ سب حقیقت میں اللہ کے اذن اور ارادے کے تحت ہی رونما ہوتے ہیں۔ ہٹ دھرم منکرین سب کچھ سننے پر بھی کچھ نہ سننا اور داعی حق کی کسی بات کا دل میں نہ اترنا ان کی ہٹ دھرمی اور تعصب اور جمود کا نتیجہ ہوتا ہے۔ قانون فطرت یہی ہے کہ جو شخص ضد پر اتر آتا ہے اور بے تعصبی کے ساتھ صداقت پسند انسان کا سا رویہ اختیار کرنے پر تیار نہیں ہوتا۔ اس کے دل کے دروازے

لہ افادات شیخ الاسلام

ہر اس صداقت کے لیے بند ہو جاتے ہیں جو اس کی خواہشات کے خلاف ہو۔ اس بات کو جب ہم بیان کریں گے تو یوں کہیں گے کہ فلاں شخص کے دل کے دروازے بند ہیں۔ اور اسی بات کو جب اللہ بیان فرمائے گا تو یوں فرمائے گا کہ اس کے دل کے دروازے ہم نے بند کر دیے ہیں کیونکہ ہم صرف واقعہ بیان کرتے ہیں اور اللہ حقیقت واقعہ کا اظہار کرتا ہے لہ

یہاں جس حجاب اور جس بہرے پن کا ذکر ہے وہ مادی نہیں بلکہ معنوی اور روحانی ہے جو دلوں اور کانوں کو سننے اور سمجھنے کی اس صلاحیت سے محروم کرتا ہے جو انسانیت کا اصلی خاصہ ہے جس سے محروم ہو کر انسان چوپائے بلکہ اس سے بھی بدتر ہو جاتا ہے۔ انسان پر یہ محرومی اس کی اپنی شامت اعمال کے نتیجہ میں مسلط ہوتی ہے۔ یہ انسانی گمراہی کی انتہائی حالت ہے۔ ضد اور تعصب میں اگر وہ ایسا اندھا بہرہ بن جاتا ہے کہ نہ کسی بات کی حقیقت کو سمجھتا ہے نہ سمجھنے پر آمادہ ہوتا ہے یہ گویا ان کے کمال جہل کے لیے ایک بلیغ تمثیل ہے۔

معاندین کو معجزے سے بھی تسلی نہیں ہوتی

۲۹ - اگر وہ ہر قسم کی نشانیاں دیکھ لیں گے تو بھی ایمان نہ لائیں گے یعنی ان کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ نہیں ہے کہ ان کے سامنے عجائب اور کرشمے ظاہر نہیں ہوئے آخر یہ ساری کائنات آسمان، زمین، سورج چاند، دریا پہاڑ، ابر ہوا، رات دن کیا ہیں۔ کیا یہ عجائبات نہیں ہیں۔ ساری کائنات عجائبات کا گھر ہے لیکن جن کے پاس دیکھنے والی آنکھیں ہی نہ ہوں ان کا کیا علاج، جس طرح ان سارے عجائب سے ان کی آنکھیں بند ہیں اگر ان کو اور عجائب دکھا دیے جائیں پھر بھی یہ کوئی نہ کوئی بات بنا لیں گے اور اپنی ہٹ پر جمے رہیں گے۔ نفسیات انسانی کا خاصہ ہے کہ جب کسی کی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حسن ظن پر محمول نہیں کرتا اور اس کو اس کی ہر چیز کے اندر خبث اور بدی نظر آتی ہے۔ جلی سے جلی اور واضح سے واضح برہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دور نہیں کر سکتے۔ معاندین جو انبیا کے مکارم اخلاق، حسن تعلیم اور دیگر علمی و عملی تعینات کو باور نہیں کر سکتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعوؤں کو بھی تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کو سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو آخرالمیل

تفہیم القرآن

کے طور پر وہ نبوت سے خارق عادت معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور چونکہ انھیں بدگمانی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسے عجیب و غریب چیز پر قدرت نہیں رکھتا اس لیے وہ کبھی کوئی معجزہ پیش نہیں کرے گا اور اس طرح اس کی رسوائی عالم آشکارا ہو جائے گی۔ لیکن قدرت الٰہی آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات اور خوارق عادت بھی پیش کر دیتی ہے تاہم ان کو دیکھ کر بھی معاندانہ روح ان کے دلوں میں پیغمبروں کی سچائی کا اعتبار نہیں پیدا ہونے دیتی اور بدگمانی انھیں یہ بتاتی ہے کہ گو اس خارق عادت کے ظہور میں تو شک نہیں مگر یہ خدائی قوت کا کرشمہ نہیں ہے بلکہ یہ سحر اور جادو ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ ان لوگوں کے سامنے ساری آیات بھی رکھ دی جائیں یہ اپنی ہٹ اور عناد کی وجہ سے ایمان نہ لائیں گے۔

حق پر پرانا ہونے کی پھبتی

۳۰۔ یہاں تک کہ یہ جب تمہارے پاس حجت کرتے آئیں گے تو یہ کہیں گے کہ یہ تو بس اگلوں کا افسانہ ہے۔ جس طرح ہم دوسرے قصے سنتے ہیں اسی طرح قرآن میں قوم عاد اور ثمود کے قصے ہیں یہ کوئی اعجاز نہیں ہے نہ دلیل نبوت ہے تمام اس قسم کی باتیں اور قصے بیان کرتے چلے آتے ہیں۔ عرب میں یہودیوں اور عیسائیوں کی جماعتیں عرصہ سے موجود تھیں وہ تورات کے قصص و ایام سنتے تھے جب قرآن نازل ہوا اور اس میں بھی پچھلی قوموں اور رسولوں کی سرگزشتیں آنے لگیں تو مشرکین عرب کہنے لگے کہ یہ تو وہی پچھلی قوموں کی پرانی داستان ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ نادان لوگوں کا قاعدہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص ان کو حق کی دعوت دیتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ تم نے نئی بات کیا کہی یہ تو سب وہی پرانی باتیں ہیں جو ہم پہلے سے سنتے چلے آ رہے ہیں۔ گویا ان احمقوں کا نظریہ یہ ہے کہ کسی بات کے حق ہونے کے لیے اس کا نیا ہونا بھی ضروری ہے اور جو بات پرانی ہے وہ حق نہیں ہے حالانکہ حق ہر زمانے میں ایک ہی رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی رہے گا۔ خدا کے دیے ہوئے علم کی بنا پر جو لوگ انسانوں کی رہنمائی کے لیے آگے بڑھے ہیں وہ سب قدیم ترین زمانہ سے ایک ہی امر حق کو پیش کرتے آئے ہیں اور آئندہ بھی جو اس منبع علم سے فائدہ اٹھا کر کچھ پیش کرے گا وہ اسی پرانی بات کو دہرائے گا البتہ نئی بات صرف وہی لوگ نکال سکتے ہیں جو خدائی روشنی سے محروم ہو کر ازلی و ابدی حقیقت کو نہیں دیکھ سکتے اور اپنے ذہن کے اپج سے کچھ نظریات گھڑ کر انھیں حق کے نام سے پیش کرتے ہیں۔ اس قسم کے لوگ بلاشبہ ایسے نادرہ کار ہو سکتے ہیں کہ وہ بات کہیں جو

ان سے پہلے کبھی دنیا میں کسی نے نہ کہی ہو[1]

حق سے فرار اور راہِ حق میں رکاوٹ

۲۱۔ اور یہ اس سے دوسروں کو روکتے ہیں اور خود بھی گریز کرتے ہیں اور یہ درحقیقت اپنے ہی کو تباہ کر رہے ہیں۔ یعنی ان میں نہ فہم رہا نہ انصاف، ایمان لانا اور ہدایت ربانی سے متمتع ہونا تو کجا، ان کی غرض تو حضور کی خدمت میں آنے سے صرف مجادلہ جھگڑا کرنا اور پھبتیاں کسنا ہے چنانچہ قرآنی حقائق اور بیانات کو معاذ اللہ اساطیر الاولین کہتے ہیں۔ پھر اس تکذیب اور جدل و تمسخر پر اکتفا نہیں کرتے، کوشش یہ ہے کہ دوسروں کی طرف بھی اپنی بیماری کا تعدیہ کریں۔ چنانچہ لوگوں کو حق سے روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور بھاگتے ہیں تاکہ انہیں دیکھ کر دوسرے قبول حق سے نفور اور بیزار ہو جائیں مگر ان تمام ناپاک کوششوں سے نہ بحمداللہ دین حق کو کوئی نقصان پہنچ سکتا ہے وہ تو غالب ہو کر رہے گا اور نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو کہ ان کی عصمت و رفعت کا تکفل خود خدا فرما چکا ہے۔ ہاں یہ احمق اپنے لیے ہلاکت ابدی کا سامان کر رہے ہیں اور سمجھتے بھی نہیں ہیں کہ اپنے ہاتھ سے خود اپنے پیروں پر کلہاڑی مار رہے ہیں[2]

مطلب یہ ہے کہ قرآن عزیز سے دوسروں کو روکتے ہیں اور خود بھی اس سے دور رہتے ہیں۔ علامہ مہائمی نے بتایا ہے کہ وہ قرآن کے سننے سے کیوں روکتے ہیں۔ کیونکہ ان کو پتہ ہے کہ قرآنی انداز کی حلاوت ان کے نظم و نثر سے زیادہ ہے وہ جانتے ہیں کہ اسے سننے کے ساتھ ہی اس کی شان اعجاز گھر کر جاتی ہے۔ بس اسی تاثیر کے اندیشے سے وہ لوگوں کو قرآن سننے نہیں دیتے، اسے پڑھنے نہیں دیتے ایسا نہ ہو کہ لوگ اثر لے لیں اور ان کی اغراض فاسدہ تار تار ہو کر رہ جائیں۔ یہ گویا قرآن کے سامنے ان کی عجز و بے چارگی کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ عامی تو عامی عرب کے مشہور زبان آور شاعروں نے قرآن عزیز کے سامنے سر نیاز خم کیا ہے۔ لبید عرب کے مشہور شاعر تھے اسلام کے بعد جب حضرت عمر نے ان سے چند اشعار کی درخواست کی تو انہوں نے جواب دیا کہ جب خدا نے مجھے سورہ بقرہ اور آل عمران سکھائی تو مجھے شعر کہنا زیبا نہیں ہے۔ (الاستیعاب) انیس قبیلہ غفار کے شاعر تھے انہوں نے جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا سنا تو چھپ کر مکہ آتے اور حضور انور

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے کلام ربانی کی کچھ آیتیں سن کر واپس گئے۔ ان کے بھائی نے پوچھا کر تم نے کیا پایا انہوں نے جواب دیا کہ قریش کہتے ہیں کہ وہ شاعر ہیں، ساحر ہیں، کاہن ہیں۔ ہم نے کاہنوں کا کلام سنا ہے یہ ان کی بولی نہیں ہم نے شعر کے ایک ایک وزن کو دیکھا ہے وہ شعر بھی نہیں۔ خدا کی قسم محمد سچے ہیں اور قریش جھوٹے ہیں۔ ولید بن مغیرہ قریش میں بڑا دولت مند اور صاحب اثر تھا۔ وہ ایک دفعہ آپ کی خدمت میں آیا اور فرمائش کی کہ کچھ پڑھ کر سنایئے۔ آپ نے چند آیتیں پڑھیں اس نے مکرر کی درخواست کی، آخر بے خود ہو کر بولا خدا کی قسم اس میں کچھ اور ہی شیرینی اور تازگی ہے اس نخل کی شاخوں میں پھل اور اس کا تنا بھاری ہے یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے۔

اس قسم کے بہت سے واقعات محدثین اور سیرت نگاروں نے لکھے ہیں کہ لوگ کیوں کر قرآن مجید کی آیتیں سن کر متاثر ہو جاتے تھے۔ حضرت عمر کا دل ایک سورت کی چند آیتیں پڑھ کر اور سن کر موم ہو گیا۔ حضرت جبیر بن مطعم اسیران بدر کو چھڑانے آئے تھے انہوں نے حضور انور سے سورہ طور کی ایک دو آیتیں سن لیں تو ان کا دل دھڑکنے لگا۔ حضرت عثمان بن مظعون نے چند آیات سن لیں تو فوراً حلقہ بگوش اسلام ہو گئے۔ حضرت طفیل بن عمرو الدوسی کے کانوں میں اتفاقیہ قرآن حکیم کی چند آیات پہنچ گئیں تو مسلمان ہو گئے۔

بہر حال کلام کی یہ شیرینی یہ نمکینی یہ تاثیر جو دوست اور دشمن، موافق اور مخالف، شاہ و گدا اور عالم و جاہل سب کو یکساں فریفتہ کرتی ہیں۔ اسی سے ڈر کر وہ کسی کو قرآن سننے نہ دیتے تھے اور خود بھی اس سے دور ہی دور رہتے تھے اس کا منشا ان کے دلوں میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ناکام کرنا تھا۔ قرآن نے ان کے اسی منشا پر یہاں یہ کہہ کر ان یھلکون الا انفسھم ضرب لگائی ہے اور بتایا ہے کہ وہ اپنے مقصد میں قطعاً کامیاب نہ ہوں گے بلکہ خود ان کی ہلاکت اور تباہی مقدر ہو چکی ہے اور مزہ یہ ہے کہ ان کو اس کا احساس تک نہیں ہے۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلَى النَّارِ فَقَالُوْا يٰلَيْتَنَا نُرَدُّ وَلَا نُكَذِّبَ
بِاٰيٰتِ رَبِّنَا وَنَكُوْنَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝ بَلْ بَدَا لَهُمْ مَّا كَانُوْا
يُخْفُوْنَ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَوْ رُدُّوْا لَعَادُوْا لِمَا نُهُوْا عَنْهُ وَاِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ۝

اور اے انسان تو تعجب کرے گا اگر ان کو اس حالت میں دیکھے جب یہ آتش دوزخ کے کنارے کھڑے ہوں گے اس وقت کہیں گے اے کاش ایسا ہو کہ ہمیں پھر دنیا میں لوٹا دیا جائے اور اپنے پروردگار کی آیتیں نہ جھٹلائیں اور ان میں سے ہو جائیں جو ایمان والے ہیں[۲۲]۔ بلکہ جو کچھ پہلے چھپایا کرتے تھے اس کا بدلہ ان پر نمودار ہو گیا[۲۳]۔ اور اگر یہ دنیا کی طرف لوٹا دیے جائیں تو پھر اسی بات میں پڑ جائیں گے جس سے انہیں روکا گیا ہے اور بلاشبہ یہ جھوٹے ہیں[۲۴]۔

آخرت میں نبوت کی اپوزیشن کا انجام

زیر تشریح آیات میں قرآن کی تکذیب کرنے والوں کا انجام بیان ہو رہا ہے پہلے فرمایا تھا کہ یہ

مکذبین تمہاری باتیں اور تمہارا پیش کردہ قرآن سنتے تو ہیں لیکن سمجھنے اور قبول کرنے کے لیے نہیں بلکہ بحث و جدال کے لیے کہ کوئی ایسی بات ہاتھ آئے جس کو بہانہ بنا کر تم سے کٹ حجتی کر سکیں۔ ان کے دلوں ان کے کانوں پر ان کی بداعمالیوں کے سبب سے مہر ہو چکی ہے۔ اس وجہ سے اب یہ اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ یہ نہ خیال کرو کہ ان کی طلب کے موافق اگر ان کو کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو اس کو مان لیں گے اور پھر اس قرآن پر ایمان لے آئیں گے۔ نہیں اگر دنیا جہان کے معجزے بھی دیکھ لیں گے جب بھی یہ اسی طرح کٹ حجتیاں کریں گے کیونکہ ان کے انکار و تکذیب کی علت اب بھی موجود ہے۔ ان میں بات کو سننے اور سمجھنے کا ارادہ ہی نہیں ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ دوسروں کو بھی اس سے روک رہے ہیں اور خود بھی اس سے متکبرانہ اعراض کر رہے ہیں۔ لیکن اطمینان رکھو نہ یہ خدا کا کچھ بگاڑ رہے ہیں نہ تمہارا بلکہ یہ اپنے آپ ہی کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں لیکن چونکہ ابھی وہ انجام ان کے سامنے نہیں آیا ہے جس سے ان کو خبردار کیا جا رہا ہے اس لیے ان کو احساس نہیں ہے۔ اگر تم ان کو اس وقت دیکھ لو جب یہ اپنے انجام سے دوچار ہوں گے جب یہ دوزخ کے کنارے کھڑے کیے جائیں گے تو کہیں گے اے کاش ہم پھر دنیا میں لوٹائے جائیں کہ قرآن کی تصدیق کریں اور اپنے رب کی آیتوں کی تکذیب نہ کریں اور اہل ایمان سے بنیں فرمایا کہ وہ اپنے اس اعتراف میں جھوٹے ہیں۔ یعنی وہ انکار و سرکشی میں اس مقام پر پہنچ گئے ہیں کہ سارے پردے ہٹا دیے جائیں پھر بھی ان کے دل کے دروازے قبول حق کے لیے نہ کھلیں گے۔ کیونکہ ان کی تکذیب کی علت یہ نہیں ہے کہ حق ان کے سامنے واضح نہیں ہوا ہے بلکہ حب دنیا غرور اور حسد کے حجابات نے ان کی عقلوں کو اندھا کر دیا ہے۔

۳۲۔ اور اے انسان تو تعجب کرے گا اگر ان کو اس حالت میں دیکھے جب یہ آتش دوزخ کے کنارے کھڑے ہوں گے اس وقت کہہ رہے ہوں گے اے کاش ہمیں لوٹا دیا جائے اور ہم اپنے پروردگار کی آیتیں نہ جھٹلائیں اور ان میں سے ہو جائیں جو ایمان والے ہیں۔ یعنی آیات اللہ کی تکذیب و استہزاء وغیرہ ساری خفلتیں اس وقت تک ہے جب تک خدائی سزا کا ہولناک و ہوش ربا منظر سامنے نہیں۔ جس وقت دوزخ کی ذرا سی جھلک بھی ہو گی تو ساری شیخی کرکری ہو جائے گی اور بہ ہزار تمنا یہ درخواست کریں گے کہ ہم کو دنیا میں دوبارہ بھیج دیا جائے تاکہ آئندہ کبھی اپنے رب کی آیتوں کو نہ جھٹلائیں اور پکے ایماندار بن کر رہیں الان ندمت وما ینفع الندم [1]

شاہ عبدالقادر لکھتے ہیں یعنی ان کو دوزخ کے کنارے پر پہنچ کر حکم ہو گا کہ ان کو ٹھہرا دو، کافروں کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کچھ توقع ہو جائے گی کہ شاید ہم کو چھوڑ دیا ہیں واپس کیا جائے تو اب کی بار کفر نہ کریں۔ ایمان سے آویں سو اللہ تعالیٰ فرمائے گا اس واسطے ان کا نہیں ٹھہرایا بلکہ اس طریقہ سے ان سے اقرار کرا دیا ہے کہ ہم نے کفر کیا تھا پہلے انکار کرتے تھے کہ ہم نے شرک نہیں کیا اب ان کو روا ز کرنا ہے کار ہے۔

ان کی جرائم کی وستاویز تو طویل ہے مثلاً کار زندگی نبوت کی تکذیب، آیات الٰہی کی تکذیب واستہزا اور ان سے اعراض، لیکن ان سارے جرائم میں لحاظ حیثیت شرک اور تکذیب نبوت کی ہے یعنی شرک کفر ان ہی دو جرموں کی اس آیت میں سزا بیان ہوئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا ہے کہ آخرت میں شرک و کفر کی بخشش نہیں ہے کیونکہ کفر و شرک کی موجودگی میں ایمان کالعدم ہو جاتا ہے۔ ایمان جس کی حقیقت ایمان بالغیب ہے اس کا حصول موت کے بعد جب حقائق خود بخود ہمارے سامنے آجاتے ہیں ہماری محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ حقائق کے ظہور کا نتیجہ ہے اس لیے شرک و کفر کے گناہ کی مغفرت کی امید قانون الٰہی کے مطابق ناممکن ہے البتہ عمل کی کمی کی تلافی جو دوسری قسم کا گناہ ہے خدا کی رحمت سے بعید نہیں ہے۔

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ آج تو یہ اکڑ رہے ہیں اور قرآن کو ایک داستان پارینہ قرار دے رہے ہیں لیکن حسرت کریں گے کہ کاش ہم پھر دنیا میں آئیں کہ اپنے رب کی آیات کی تصدیق کریں اور ان کی تکذیب نہ کریں لیکن ان کا یہ کہنا فی الواقع عقل و فکر کے کسی صحیح فیصلے اور کسی حقیقی تبدیلی رائے کا نتیجہ نہ ہوگا بلکہ محض مشاہدہ حق کا نتیجہ ہوگا جس کے بعد ظاہر ہے کہ کٹے سے کٹا کافر بھی انکار کی جرأت نہیں کر سکتا۔ مشاہدہ کا ماننا معتبر نہیں ہے ایمان تو صرف غیب کو ماننے کا نام ہے اگر نکلے ہوئے سورج کو دیکھ کر آپ کہیں امنت بالشمس تو یہ ایمان نہیں ہے اس لیے کہ مشاہدہ ہے۔

مجازات و مکافات کا منظر

۲۳ - بلکہ جو کچھ چھپایا کرتے تھے اس کا بدلہ ان پر ظاہر ہو گیا۔ یعنی اب بھی دنیا میں واپس جانے کی تمنا عزم صحیح اور ایمانی رغبت و شوق سے نہیں بلکہ جب مجازات و مکافات عمل کا وہ منظر سامنے آگیا جسے باوجود وضوح ادلہ انکار کے پردے میں چھپایا کرتے تھے۔ عذاب الٰہی کو آنکھوں سے دیکھ لیا تمام اعمال شنیعہ کا جو چھپ چھپ کے کیے جاتے تھے راز فاش ہو گیا۔ ابھی ابھی جو واللہ ربنا ماکنا مشرکین کہہ چکے تھے اس جھوٹ کی بھی قلعی کھل گئی۔ غرض کہ بدی کے جو اثرات مخفی اور غیر مرئی طور پر اندر ہی اندر ان نالائقوں کے دلوں میں پرورش پا رہے تھے وہ دردناک عذاب کی

صورت میں متشکل ہو کر سامنے آگئے تو محض جان بچانے کے لیے دوبارہ دُنیا میں واپس کیے جانے کی تمنا کرنے لگے۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ صورت معاملہ وہ نہیں جو دُنیا میں واپسی اور ایمان کی تمنا کی صورت میں یہ ظاہر کر رہے ہیں بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ دُنیا کی زندگی میں وہ جو کچھ چھپاتے تھے وہ سب کچھ آج چونکہ طشت ازبام ہو گیا ہے اس لیے وہ ایسا کہہ رہے ہیں۔

دُنیا کی زندگی میں وہ کیا کچھ چھپاتے تھے؟ اسے قرآن نے بیان نہیں کیا اس لیے شارحین قرآن نے اپنے ذوق کے مطابق اس کی نشاندہی کی ہے۔ پہلی رائے تو وہی ہے جو مولانا عثمانی نے اختیار کی ہے یعنی وہ تمام اعمال شنیعہ جو چھپ چھپ کر کرتے تھے وہاں ظاہر ہو جائیں گے دوسری یہ کہ ان کے وہ اعمال نمایاں ہو کر سامنے آجائیں گے جن پر وہ دُنیا کی زندگی میں اتراتے تھے۔ اللہ تعالیٰ ان اعمال کو ان کے سامنے خاکستر بنا دیں گے، تیسرے یہ کہ ان کا وہ کفر و شرک جسے میدان حشر میں دوزخ پر پہنچنے سے پہلے چھپا رہے تھے وہ ظاہر ہو جائے گا۔ چوتھے یہ کہ نبوت سے عناد کی وجہ سے حق و ایمان کو کفر و تکذیب کو ظاہر کر کے چھپائے ہوتے تھے وہ نمایاں ہو کر سامنے آجائے گا، پانچویں یہ کہ ان کے زعماء نبوت کے پیش کردہ حق کو اپنے معتقدین سے جو دُنیا چھپاتے تھے اس کی نمائش ہو جائے گی اور ان کے متبعین کو پتہ لگ جائے گا جیسے اہل کتاب کے علماء عوام اہل کتاب سے حضور انور کے اوصاف اور بشارات کو چھپائے ہوتے تھے، چھٹے یہ کہ منافقین دُنیا میں جو کفر چھپاتے ہوتے تھے، وہ کھل کر سامنے آجائے گا، ساتویں یہ کہ عذاب اور بعث و نشر جس پر وہ لوگ کفر و تکذیب کے پردے ڈالے ہوتے تھے وہ ظاہر ہو جائے گا۔ آٹھویں یہ کہ کفر اور تکذیب کا وہ وبال آخرت میں ظاہر ہو جائے گا جو دُنیا میں ان کی نگاہوں سے اوجھل تھا۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی تمناؤں سے حقائق تبدیل نہ ہوں گے بلکہ ان کے لیے وہ کچھ ظاہر ہو کر سامنے آجاتے جسے وہ دُنیا میں چھپاتے تھے اور جس کے ظہور کا ان کو وہم و گمان بھی نہ تھا۔

کفر و تکذیب ان کی طبیعت ہے

۲۸۔ اور اگر یہ دُنیا کی طرف لوٹا دیے جائیں تو پھر اسی بات میں پڑ جائیں گے جس سے انہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

روکا گیا ہے اور بلاشبہ یہ جھوٹے ہیں۔ یعنی اب بھی جھوٹ کہتے ہیں کہ ہم دُنیا میں واپس ہو کر پکے ایماندار بن جائیں گے اور ہرگز آیات اللہ کی تکذیب نہ کریں گے۔ یہ اشقیاء اگر دُنیا میں واپس کر دیے جائیں تو بدی اور شرارت کی جو قوتیں ان میں رکھی ہیں پھر ان ہی کے کام میں لائیں گے اور جس مصیبت سے گھبرا کر واپس جانے کی تمنا کر رہے ہیں اسے خواب و خیال کی طرح فراموش کر دیں گے جیسا کہ بسا اوقات دُنیوی مصائب و مہالک میں پھنس کر آدمی انابت و توبہ اختیار کر لیتا ہے پھر جہاں چند روز گزرے کچھ بھی یاد نہیں رہتا کہ اس وقت کیا عہد و پیمان کیسے تھے کان لم یدعنا الی ضر مسہ[1]

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ جب قیامت میں اپنی آنکھوں سے ۔ سب واقعہ کا معائنہ کر لیا تو پھر دُنیا میں آنے کے بعد کفر اور تکذیب کا احتمال کیسے ہو سکتا ہے۔ جواب یہ ہے کہ تکذیب تو زبان کا فعل ہے یقین قلب کے ساتھ تکذیب لسانی کا جمع ہونا ممکن ہے اور تکذیب لسانی بھی کفر ہے، رہا دل سے یقین ہونا وہ بوجہ معائنہ کے اضطراراً ہوگا جو شرعاً معتبر نہیں اور جو شرعاً مطلوب ہے اس کا حاصل تسلیم و انقیاد اختیاری ہے، لہٰذا تصدیق اضطراری کے ساتھ عدم تصدیق اختیاری کا جمع ہونا بھی ممکن ہے جیسا کہ بعض ضدی لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ دل میں جانتے ہیں مگر مانتے نہیں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ تمنا ہوتی ہے غیر حاصل کی اور ایمان و عدم تکذیب تمنا کے وقت ان کو حاصل ہے پھر تمنا کے کیا معنے جواب یہ ہے کہ تمنا دُنیا میں ایمان اور عدم تکذیب کی کی جا رہی ہے کیونکہ نجات میں سود مند یہی ہے اور یہ وہاں موجود نہیں ہے اور جو موجود ہے وہ مفید نہ ہونے کی وجہ سے قابل تمنا نہیں ہے[2]

بہرحال اللہ سبحانہ نے ان کی اس تمنا کا پول اس طرح کھول دیا کہ یہ لوگ جیسے ہمیشہ سے جھوٹ کے عادی تھے وہ اپنے اس قول اور تمنا میں بھی جھوٹے ہیں اور بات اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ نبوت کے ذریعے جو حقائق ان کے سامنے لائے گئے تھے یہ لوگ ان کے جاننے کے باوجود محض ہٹ دھرمی سے یا دُنیا کی طمع خام کی وجہ سے ان حقائق پر پردہ ڈالنے کی کوشش کرتے تھے۔ آج وہ سب ایک ایک کر کے ظاہر ہو گئے۔ اللہ سبحانہ کی قدرت کاملہ کے مظاہر آنکھوں سے دیکھے انبیاء کی صداقت کا مشاہدہ کیا۔ دوبارہ زندہ ہونے کا مسئلہ حقیقت بن کر سامنے آ گیا۔ جزا و سزا کا مظاہرہ دیکھا اور دوزخ کا مشاہدہ کیا اب ان کے پاس کوئی حجت مخالفت نہ رہی اس لیے یوں کہنے لگے کہ کاش ہم پھر دُنیا میں

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] بیان القرآن۔

واپس ہوتے تو مومن بن جاتے۔ اللہ سبحانہ نے فرمایا کہ اب یہ ایسا کہہ رہے ہیں لیکن بالفرض ان کو دنیا میں دوبارہ
بھیج دیا جائے تو وہ پھر اپنے قول و قرار کو بھول جائیں گے وہ وہی سب کچھ کریں گے جو پہلے کرتے رہے [1]

اس ارشاد ولو ردوا لعادوا میں ہماری ایک اہم اصولی حقیقت کی طرف رہنمائی کی گئی ہے کہ اگر
بالفرض ان کو دوبارہ دنیا میں روانہ کر دیا جاتے تو پھر وہی کفر، شرک، نفاق، مکر و فریب اور معاصی
کا ارتکاب کریں گے کیونکہ یہ اعمال ان کی طبیعت کا تقاضا بن چکے ہیں اور جب تک علت موجود
ہے معلول یقیناً موجود ہے۔ اگر ان کو دنیا میں روانہ بھی کر دیا جائے تو ان سے یہ ملکات، یہ اخلاق
ظاہر ہو کر رہیں گے۔ دوزخ کے کنارے پر کھڑے ہو کر نبوت کی صداقت کو ماننا بالکل ایسا ہے
جیسا شرابی، جوتے باز پھنس کر شراب اور جوتے کی برائی کو مانتا ہے لیکن مصیبت ٹلنے پر پھر
اس کا شکار ہو جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بلاؤں اور مصائب کا جھٹکا انسان کو سب کچھ بھلا دیتا
ہے لیکن جن اخلاق کا انسان ابتدا ہی سے خوگر ہوتا ہے وہ بہرحال عود کرتی ہے۔ جس طرح
دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے
خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں
جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ مصائب کے ہجوم میں وقتی طور پر دب تو سکتے ہیں مگر ختم نہیں ہو سکتے
تقویٰ و فسق، ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نرالا اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص
ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت، شکر سے مٹھاس،
اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی، شرک و کفر کی علت طبیعت کی غلط افتاد اور اس کا نارواتقاضا
ہے اور جب تک علت موجود ہے معلول یقیناً ظاہر ہو گا۔ ان میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے
جو جسمانی اور مادی اشیا میں ہوتا ہے۔ قرآن بتا رہا ہے کہ اگر یہ واپس بھی ہو جائیں پھر بھی یہ ان
ہی افعال شنیعہ کا ارتکاب کریں گے جو ان کی طبیعت کا تقاضا بن چکے ہیں۔ آخر میں فرمایا کہ انہم
لکاذبون وہ جھوٹ بول رہے ہیں۔ یعنی ایمان لانے کے وعدے میں وہ جھوٹے ہیں اور یا مطلب
یہ ہے کہ ہر حال میں جھوٹ ان کی طبیعت ہے۔ علامہ آلوسی نے دنیا میں اکر اسی کردار کو اپنانے کی وجہ
ان کے طبیعت کی خباثت ان کی جبلی نجاست اور ان کی استعداد کی بدی بتا کر شاید اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

۰۰۰

---

[1] معارف م سش۔

وَقَالُوْٓا اِنْ هِیَ اِلَّا حَيَاتُنَا الدُّنْيَا وَمَا نَحْنُ بِمَبْعُوْثِيْنَ ﴿٢٩﴾ وَ
لَوْ تَرٰٓى اِذْ وُقِفُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ؕ قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا بِالْحَقِّ ؕ قَالُوْا
بَلٰى وَرَبِّنَا ؕ قَالَ فَذُوْقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُوْنَ ﴿٣٠﴾
قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَآءِ اللّٰهِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ
بَغْتَةً قَالُوْا يٰحَسْرَتَنَا عَلٰى مَا فَرَّطْنَا فِيْهَا ۙ وَهُمْ يَحْمِلُوْنَ
اَوْزَارَهُمْ عَلٰى ظُهُوْرِهِمْ ؕ اَلَا سَآءَ مَا يَزِرُوْنَ ﴿٣١﴾ وَمَا الْحَيٰوةُ
الدُّنْيَآ اِلَّا لَعِبٌ وَّلَهْوٌ ؕ وَلَلدَّارُ الْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لِّلَّذِيْنَ
يَتَّقُوْنَ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿٣٢﴾

اور کہتے ہیں کہ ہماری دُنیا کی زندگی ہی بس زندگی ہے اور ہم
مرنے کے بعد پھر نہیں زندہ کیے جائیں گے[۳۵]۔ اور اے کاش
تم ان کو اس وقت دیکھو جب یہ اپنے پروردگار کے حضور میں

پیش ہوں گے اور وہ فرمائے گا کیا یہ دوبارہ زندہ ہونا برحق نہیں ہے تو وہ کہیں گے کیوں نہیں پروردگار کی قسم بالکل حق ہے خدا فرمائے گا اب کفر کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو[۳۶]۔ بلاشبہ جن لوگوں نے مرنے کے بعد خدا کی ملاقات ہونے کو جھٹلایا وہ گھاٹے میں آگئے یہاں تک کہ جب ان پر ناگہاں قیامت آجائے گی تو وہ کہیں گے افسوس اس کوتاہی پر جو ہم نے اس بارے میں کی اور وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوں گے دیکھو جو بوجھ یہ اٹھا رہے ہیں بہت ہی برا ہے[۳۷]۔ اور دنیا کی زندگی ایک کھیل اور تماشہ کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور بلاشبہ آخرت کا گھرانہی اہل تقویٰ کے لیے بہترین ہے کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ہو[۳۸]۔

استحضار فکر آخرت

ابھی پڑھ چکے ہو کہ خدا کی صفت رحمت کے واضح تقاضوں میں سے ایک تقاضا یہ بھی ہے کہ ایک یوم جزا ہو تاکہ ان بندگان حق کی سعی و جہد کا جنہوں نے اپنی خواہشوں پر محض رضائے الٰہی کے لیے بہت سی

پابندیاں برداشت کیں اور جو دُنیا میں محض خدا کی خاطر مصائب و آلام کا شکار ہوئے خالق کی طرف سے اعتراف کیا جائے اور انہیں اللہ کی رحمانیت اپنی آغوش شفقت میں لے کر اس طرح ان پر سے دنیوی رنج وغم کو جھاڑ دے جس طرح ایک شفیق ماں اپنے فرمانبردار لاڈلے بچہ کی بلائیں لے کر اس کو دلشاد کرتی ہے جبکہ وہ اس کے حکم کے بموجب کسی کٹھن مہم میں اپنے پسینے بہاکر واپس آیا ہو، بس اس کی رحمت گواہ ہے اس بات پر ایک یوم جزا آئے گا کتب علیٰ نفسہ الرحمۃ ان لیجمعنکم الی یوم القیامۃ میں اسی گواہی کا ذکر ہوا ہے۔ اب یہاں واو عطف کے ذریعے اسی کے متعلق قرآن اپنے مخاطبوں کا نظریہ بیان کررہا ہے اور بتا رہا ہے کہ توحید کے بعد ان کو جس عقیدے سے شدت کے ساتھ انکار تھا جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہ آتا تھا وہ بھی قیامت کا مسئلہ ہے۔ وہ حیات بعد الموت خدا کے آگے اپنے اعمال کے مواخذے اور پرسش اور جزاء وسزا سے قطعاً لاعلم تھے۔ اسی لیے ان کو اعمال کے خیر وشر اور نیکی وبدی میں وہ تمیز نہ تھی جس پر اخلاق ومعاملات کا تمام تر دار ومدار ہے۔ خباب بن الارت نہایت قدیم مسلمانوں میں ہیں۔ یہ لوہاری کا پیشہ کرتے تھے ان کے کچھ دام قریش کے ایک رئیس عاص بن وائل پر واجب الادا تھے۔ وہ جب جاکر تقاضا کرتے تو عاص کہتے جب تک تم محمد کا انکار نہ کروگے میں تم کو کچھ نہ دوں گا۔ انہوں نے کہا کہ یہ اس وقت تک نہیں ہوسکتا جب تک تم مرکر پھر جیو نہیں۔ اس نے کہا کیا مرکر پھر جینا ہے۔ خباب نے کہا بے شک، اس نے مذاق سے کہا تو اچھا پھر وہیں میرا مال ودولت اور سر وسامان ہوگا وہیں تم دام بھی لے لینا۔ اس سے اندازہ ہوگا کہ اس بارے میں اہل عرب کا کفر کس قدر شدید تھا اس لیے قرآن عزیز نے اس مسئلہ کو ان کے سامنے پوری قوت سے پیش کیا ہے۔ اسی مقام کا ذرا بغور مطالعہ فرمایئے کیسی پر شوکت تعبیر میں موثر طریق کے ساتھ بیان کیا ہے کہ اس میں ہیبت الٰہی، ہنگامہ قیامت کی ایسی تصویر پیش کی ہے کہ سننے والا سراپا اثر پذیر ہوجائے۔ ارشاد ہے۔

۲۵۔ اور کہتے ہیں کہ ہماری دُنیا کی زندگی بس زندگی ہے اور ہم مرنے کے بعد پھر نہیں زندہ کیے جائیں گے۔ یعنی خوب مزے اڑالو۔ دنیوی عیش کو فکر آخرت سے منغص نہ کرو یہی حال آج کل یورپ کے مادہ پرستوں کا ہے[1]

فی الواقع مادہ پرستی جہاں رونما ہوتی ہے اس کا نتیجہ خدا پرستی اور فکرِ آخرت سے گریز ہی ہوتا ہے۔ ان لوگوں کے نزدیک جیسے دُنیا کے سوا کوئی چیز نہیں ایسے ہی دُنیا سے باہر بھی کچھ نہیں حتیٰ کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

انسان بھی صرف بر تبیر اور سالمہ ہی کی کرشمہ سازی ہے۔ اسے صرف اس دُنیا کی ضرورت ہے اور اس دُنیا میں اگر کسی چیز کی ضرورت ہے تو وہ صرف مادی احتیاجات کی تسکین ہے۔ مادیت اور انکار آخرت لازم و ملزوم ہیں بلکہ یوں کہو کہ دُنیا میں بے دینی اور بد دینی ان سے ہی پروان چڑھتی ہے۔ یورپ کو دیکھو کہ مادیت کے سیلاب کے سامنے مذہب ٹھہر نہ سکا اور مسیحیت اس کے دھارے کی نذر ہو کر رہ گئی اور اس کی جگہ مادہ پرستی نے لے لی۔ مصنفین، اہل قلم اور اہل دماغ گروہوں نے اپنی جادو بیانی، سحر طرازی اور زور خطابت سے فکر آخرت اور خدا پرستی کے خلاف دُنیا میں ایک عام بغاوت کر دی۔ انہوں نے دُنیا پرستی کو نہایت دلفریب بنا کر پیش کیا۔ جو چیز اس کی راہ میں حائل ہوئی اس کے خلاف غیظ و غضب کا جذبہ بھڑکایا اور اس طرح طبیعتوں کو ہر قسم کی قید و بند سے آزاد کر دیا۔ انہیں زندگی سے بھرپور تمتع، مطالبات نفس کی بے عنان تکمیل اور لذت پرستی کی علانیہ دعوت دی۔ حرص و ہوا کی اس زندگی کی اہمیت جتانے کے لیے بڑے غلو سے کام لیا گیا۔ نقد لذت، ظاہری اور محسوس مادی نفع کے سوا آخرت کی ہر چیز کا ابطال کر دیا گیا۔ یورپ کا موجودہ مذہب آخرت سے بیگانہ صرف مادہ پرستی ہے۔ اس کے متعلق ایک مفکر نے اپنا تاثر ان الفاظ میں پیش کیا ہے:

> اس میں شبہ نہیں کہ یورپ میں اس وقت بھی ایسے اشخاص پائے جاتے ہیں جو دینی طریقہ پر سوچتے ہیں اور مذہبی احساس رکھتے ہیں مگر یہ مستثنیٰ مثالیں ہیں۔ یورپ کا عام اور متوسط آدمی خواہ جمہوریت پر ایمان رکھتا ہو یا فاشزم پر، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی، جسمانی مشقت کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا، وہ ایک ہی مذہب رکھتا ہے اور وہ مادی ترقی کی پرستش اور اس کی منزل صرف یہی ہے کہ وہ اس زندگی کو زیادہ سے زیادہ آسان، پُر راحت اور عام محاورے کے مطابق قدرت سے آزاد بنا سکے۔ اس مذہب کے معابد بڑے بڑے کارخانے، کیمیاوی دارالصنائع، ناچ گھر، بجلی کے مراکز ہیں۔ اس مذہب کے پیشوا بینکوں کے افسر، انجینئر، اداکار، بڑی بڑی صنعتوں کے ناظمین اور ریکارڈ قائم کرنے والے ہوا باز ہیں۔ لذت اور طاقت کی اس ہوس اور جھوڑ پن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ حریف گروہ سامان جنگ سے لیس اور جنگی تیاریوں سے مکمل کھڑے ہیں تاکہ جب کبھی ان کے مصالح میں تصادم ہو تو بغیر کسی تاخیر کے ایک دوسرے کو تباہ کر دیں اور جہاں تک تمدن کا تعلق ہے انسانوں کا ایک ایسا گروہ جنم لے چکا ہے جن کے نزدیک نیکی اور اخلاق کا اصلی پیمانہ صرف ذاتی مفاد ہے اور ان کے ہاں

بھلائی اور برائی کو جانچنے کا اصل معیار صرف مادی کامیابی ہے۔

بہت ممکن ہے کہ اس بیان کو زیادہ وقعت نہ دی جائے کیونکہ ان خیالات کا پیش کرنے والا، اسلامی افکار سے متاثر ہے اس لیے ہم ذیل میں چند دوسرے مفکرین کی آراء پیش کرتے ہیں۔ ان سے آخرت بیزار رجحان کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔ پروفیسر جوڈ کہتے ہیں :

صدیوں سے انگلستان کے تخیل پر دولت اندوزی کا اصول غالب ہے۔ حصول دولت کی خواہش پچھلے دو سو سال سے دیگر محرکات عمل سے زیادہ بڑھ کر کار فرما رہی ہے کیونکہ دولت حصول ملکیت کا ذریعہ ہے اور ذاتی ملکیت کی بہتات اور عظمت و شان سے انسان کی قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے، سیاسیات ادب، سینما، ریڈیو اور کبھی کبھی گرجاؤں کے منبروں سے سال بسال سامعین کو یہی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ مہذب قوم وہی ہے جس میں تملیکی جذبہ انتہائی ترقی کر چکا ہو۔

بہرحال جیسے آج کا یورپ فکر آخرت سے بیگانہ اور خدا شناسی سے بیزار اپنی پوری زندگی کو مادیت پرستی کے لیے وقف کیے ہوئے ہے ٹھیک اسی طرح عرب کے باشندے انکارِ آخرت کو اپنا کر فکرِ آخرت سے بیگانہ اور خدا شناسی سے دُور ہو چکے تھے۔

خدا کی بارگاہ میں پیشی

۳۰ ۔ اور اے کاش تم ان کو اس وقت دیکھو جب یہ اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے اور وہ فرمائے گا کہ کیا یہ دوبارہ زندہ ہونا برحق نہیں ہے تو وہ کہیں گے کیوں نہیں ہمارے پروردگار کی قسم بالکل حق ہے تو خدا فرمائے گا اب کفر کے بدلے عذاب کا مزہ چکھو۔ یعنی جب حقیقت آنکھوں کے سامنے آجائے گی اور بعث بعد الموت وغیرہ کے اقرار سے چارہ نہ رہے گا تب کہا جائے گا کہ انکار حقیقت اور کفر بالمعاد کا مزہ چکھو[1] اللہ کے حضور میں پیش ہونے سے مراد یہ ہے کہ ان کو فرشتے اللہ کے حضور میں پیش کریں گے اور فیصلہ ہونے تک فرشتے ان کو روکے رکھیں گے۔ اسی وجہ سے یہاں وقفوا کے ساتھ علیٰ استعمال ہوا ہے ورنہ یہاں علیٰ بلندی اور برتری کے معنے میں نہیں ہے۔ اور فرشتے ان کو اللہ کے حکم سے ٹھہرائیں گے۔ قرآن میں ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

وقفوھم انھم مسئولون۔ اب وقفوا علیٰ ربھم کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کے حکم پر روکے جائیں گے اور یا مطلب یہ ہے کہ ان کا معاملہ صرف اللہ پر موقوف ہوگا۔ اس میں کسی اور کا کوئی دخل نہ ہوگا۔ یہ فرمانے کے بعد سوال پیدا ہوا کہ پھر کیا ہوگا بتایا کہ پھر یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہٗ فرمائے گا بتاؤ کیا قیامت کا برپا ہونا امر واقعہ نہیں ہے؟ ان کا جواب یہ ہوگا، ہاں بلاشبہ یہ امر واقعہ ہے۔ قیامت کے ہونے کا اقرار بھی کریں گے اور قسم کے ساتھ کریں گے۔ اس طرح وہ اپنے خلاف گواہی کہیں گے۔ ایک تو اس انداز تعبیر کا حاصل یہی ہے کہ منکرین قیامت روز قیامت قیامت کا اقرار کریں گے اور دوسرے اس تعبیر کے ذریعے قیامت برپا ہونے کی اہمیت بتانی مقصود ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ دین حق کی اطاعت اور اقامت کے زاویہ نظر سے اور انسانی زندگی پر اپنے اثرات کے لحاظ سے قیامت کا مسئلہ توحید کے مقابلہ میں کسی طرح بھی کم اہمیت کا حامل نہیں ہے بلکہ بعض اعتبارات سے تو اس سے بھی بڑھ کر معلوم ہوتا ہے۔ انسان کی جبلت میں جو عجلت پسندی، حاضر طلبی اور عاجلہ پرستی رکھی گئی ہے اس کو دیکھتے ہوئے کسی طرح بھی باور نہیں کیا جاسکتا ہے کہ محاسبہ اعمال کا اندیشہ نہ ہونے کے باوجود وہ نیکی اور حق پرستی کی سنگلاخ وادی کو قطع کرنے پر تیار ہوگا۔ اس کو خدا کی ذات اس کی یکتائی کا لاکھ یقین ہی مگر جب اسے یہ معلوم ہو کہ میرے ہر عمل کا آخری انجام وہی ہے جو اس دُنیا میں ظاہر ہوتا ہے اور موت کا پردہ گرتے ہی زندگی اور اس کی تمام حرکات کا تماشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو جانے والا ہے تو نرا نادان ہوگا اگر اس نے "بعیش کوش ... کے فتویٰ پر عمل نہیں کیا اور دنیا اس کی بدقسمتی کا ماتم ہی کرے گی اگر اس نے جی کھول کر داد نفسانیت نہ دی بخلاف اس کے کہ اگر اس کو قیامت کے آنے اور اعمال کا حساب کتاب کا لیے جانے کا پورا یقین ہو تو بہرحال اس سے توقع کی جاسکتی ہے کہ وہ اپنے نفس کو کسی نہ کسی اخلاقی ضابطہ کا پابند رکھے گا نہ صرف وحدانیت کا قائل ہونے ہی کی صورت میں بلکہ بہت ممکن ہے کہ کسی حد میں مشرک ہوتے ہوئے بھی، یہ دوسری بات ہے کہ مشرکانہ عقائد خدا کے ہاں اس کے اعمال کو میزان محاسبہ میں بے وزن بنادیں۔ لیکن جہاں تک اس دُنیا کا تعلق ہے ایک مشرک کا ایک منکر قیامت کے مقابلہ میں کسی ضابطہ اخلاق کا پابند ہونا زیادہ قرین قیاس ہے اور اس سے نسبتاً اس بات کی زیادہ توقع ہوسکتی ہے کہ وہ ہوائے نفس کے ہاتھوں بالکلیہ اپنی زمام کار سونپ دینے سے مجتنب رہے گا۔ اس لیے انسانی اخلاق و کردار پر اپنی تاثیر کے لحاظ سے ایمان بالآخرت کو ایمان باللہ کے برابر اہمیت دینا خلاف واقعہ نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اگر پہلے مشرکین کے بارے میں اذ وقفوا علی النار فرمایا گیا ہے تو یہاں منکرین قیامت کے بارے میں اذ وقفوا علیٰ ربھم فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس شد و مد سے

قرآن نے توحید پر دلائل دیے ہیں۔ قیامت کے وقوع پر آفاق والنفس کی محکم اور دل نشیں شہادتیں بہم پہنچانے میں اس سے کم زور صرف نہیں کیا۔

یہاں آخر میں فرمایا کہ فذوقوا العذاب بما کنتم تکفرون اس کا مطلب یہی ہے کہ کفر بالمعاد کا مزہ چکھو اور یہاں سیاق کا تقاضا بھی یہی ہے۔

ساری خرابیوں کی جڑ آخرت فراموشی ہے

۳۱۔ بلاشبہ جن لوگوں نے مرنے کے بعد خدا کی ملاقات ہونے کو جھٹلایا وہ گھاٹے میں آگئے یہاں تک کہ جب ان پر ناگہاں قیامت آجائے گی تو وہ کہیں گے افسوس اس کوتاہی پر جو ہم نے دنیوی زندگی میں کی اور وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوں گے دیکھو جو بوجھ یہ اٹھائے ہیں بہت ہی بُرا ہے۔ انسان کی بڑی شقاوت اور بدبختی یہ ہے کہ لقاء اللہ کا انکار کردے اور زندگی کے اس بلند مقصد کو جھوٹ سمجھے۔ یہاں تک کہ جب موت یا قیامت سامنے آجائے تب بے فائدہ کف افسوس ملتا رہ جائے کہ ہائے میں نے اپنی دنیوی زندگی میں یوم قیامت کے لیے تیاری کرنے میں کیسی ناقابل تلافی کوتاہی کی۔ اس وقت اس افسوس و حسرت سے کچھ نہ ہوگا۔ جرموں اور شرارتوں کے بارگراں کو جس سے اس کی پشت خمیدہ ہوگی یہ ناوقت کا تاسف و تحسر ذرا بھی ہلکا نہ کرسکے گا[1]

آیت کا آغاز قد خسر سے فرماکر اشارہ کردیا کہ آخرت کی تکذیب کرنے والے لوگ ان تمام فائدوں سے محروم رہیں گے جن سے اہل ایمان متمتع ہوں گے۔ ان کو روز قیامت جو ایمان کے ثمرات ملیں گے ان سے وہ لوگ ہرگز بہرہ یاب نہ ہوں گے جو آخرت کی تکذیب کرتے رہے ہیں۔ گویا آخرت کی تکذیب خسران کا سبب ہے۔ خسران عرف میں اس چیز کو کہتے ہیں کہ کاروبار میں آدمی کا لگایا ہوا سارا سرمایہ ڈوب جائے اور بازار میں اس پر دوسروں کے مطالبے اتنے چڑھ جائیں کہ اپنا سب کچھ دے کر بھی وہ ان سے عہدہ برآ نہ ہوسکے۔ یہی استعارہ منکرین قیامت کے لیے اللہ نے یہاں استعمال کیا ہے۔ انسان کو زندگی، عمر، عقل، جسم، قوتیں اور قابلیتیں، ذرائع اور مواقع جتنی چیزیں بھی دنیا میں حاصل ہیں ان سب کا مجموعہ دراصل وہ سرمایہ ہے جیسے وہ حیات دنیا کے کاروبار میں لگاتا ہے یہ سارا سرمایہ اگر کسی شخص نے اس مفروضہ پر لگا دیا کہ مجھے کسی کو حساب نہیں دینا ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس نے گھاٹے کا سودا کیا اور اپنا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سب کچھ گھاٹے میں ڈال دیا اور اس غلط مفروضہ پر اس نے جتنے کام کیے ان سب میں وہ اپنے نفس سے لے کر بہت سے انسانوں، آئندہ نسلوں اور اللہ کی دوسری مخلوق پر عمر بھر ظلم کرتا رہا اس لیے اس پر بے شمار مطالبات چڑھ گئے مگر اس کے پاس کچھ نہیں ہے جس سے وہ ان مطالبات کو پورا کرسکے۔ اس طرح وہ خود نہیں ڈوبا بلکہ اپنے بال بچوں اور عزیز و اقارب اور دوستوں اور ہم قوموں کو بھی اپنی غلط تعلیم و تربیت سے لے ڈوبا۔ ان ہی خساروں کو قرآن نے یہاں حرف تحقیق لگا کر قد خسر سے تعبیر کیا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے یہاں تک کہ جب ان پر اچانک قیامت آجائے گی۔ اصل میں حتیٰ اذا جاء تھم الساعۃ بغتۃ کے الفاظ ارشاد ہوتے ہیں "یہاں تک" کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ اس کا تعلق تکذیب سے ہے یعنی تکذیب کرتے رہیں گے یہاں تک کہ ان پر وہ چیز واقعہ بن کر رونما ہو جائے گی جس کی تکذیب کرتے تھے یعنی قیامت اور دوسرا یہ کہ اس کا تعلق خسران سے ہے یعنی انکار و اعمال اور اخلاق میں گھاٹا اور نقصان اٹھاتے رہیں گے یہاں تک کہ قیامت آجائے گی۔

ساعۃ کے معنی اصل لغت میں مختصر سے مختصر عرصہ کے ہیں۔ اہل عرب بولتے ہیں جلست الیہ ساعۃ لیکن اصطلاح میں یہ لفظ تین معنے میں بولا جاتا ہے۔ فرد کی دنیوی زندگی کے ختم ہونے پر قوم کی اجتماعی حیات کے خاتمہ پر اور پورے عالم کی تباہی پر، یہاں ساعت سے عام شارحین قرآن کی رائے میں امام راغب کو چھوڑ کر عالم کی بربادی یعنی قیامت کبریٰ مراد ہے۔ امام راغب قیامت صغریٰ مراد لیتے ہیں لیکن جمہور کی رائے میں قیامت کبریٰ مراد ہے۔ یہاں بغتۃ کی تعبیر جمہور کی موید ہے۔ اس آیت کے علاوہ بھی قرآن کی دوسری آیات میں بھی لفظ بغتۃ آیا ہے جس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ یہاں قیامت کبریٰ مراد ہے۔

یہاں پہنچ کر مخاطب کے ذہن میں معاً یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر ان کا کیا بنے گا، قرآن اسی سوال کا جواب دیتا ہے کہ قالوا۔۔ وہ کہیں گے افسوس اس کوتاہی پر جو ہم نے دنیا کی زندگی میں اختیار کیے رکھی ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ یہ اذا کا جواب ہے یعنی جب آئے گی تو یوں کہیں گے اور اس لیے کہیں گے کہ ان کو قیامت کا کوئی انتظار نہ ہوگا۔ اصل میں یاحسرتنا علی ما فرطنا فیھا کے الفاظ آتے ہیں۔ فیھا کی ضمیر کا مرجع ہماری رائے میں حیاتنا الدنیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی دنیوی زندگی پر جو فکر آخرت سے آزاد ہو کر بسر کرتے رہے افسوس، غم اور ندامت ظاہر کریں گے کہ انہوں نے ایمان و عمل صالح کی پلی ہوئی ساری صلاحیتوں میں کوتاہی کی ہے۔

تفریط کے معنے اس کام میں کوتاہی کرنے کے ہیں جس پر انسان جد و جہد کرنے پر قدرت رکھتا ہو، اس پر افسوس ہوگا کہ اس بڑی تکلیف سے بچ جانے کے لیے دنیا کی زندگی میں چھوٹی اور وقتی

تکلیفوں کو برداشت نہیں کیا اور آج کی بڑی خوشی کے حصول کے لیے ہم نے چھوٹی خوشیوں کو قربان نہیں کیا۔ عاجلہ یعنی موجودہ اور آخرہ یعنی آئندہ ان دونوں کا جب کبھی تقابل پیش آتا ہے تو دونوں ہمت اور پست خیال لوگ عموماً موجودہ راحت سے مقابلے میں آئندہ کی راحت کی پرواہ نہیں کرتے کہ ان کی نگاہ میں موجودہ راحت گو چھوٹی ہو مگر نقد ہے اور آئندہ کی راحت گو بڑی اور خوش آئند ہو مگر وہ اُدھار ہے اور ان کا اصول یہ ہے کہ نقد کو اُدھار پر ترجیح دیتے ہیں۔ یہی تنزیلاً ہے جس کا ان کی زندگی کے ہر پہلو میں مظاہرہ ہوتا ہے اسی پر وہ روزِ قیامت افسوس کریں گے۔

آخر میں فرمایا ہے وھم یحملون اوزارھم علیٰ ظھورھم وہ اپنے گناہوں کا بوجھ اپنی پیٹھوں پر اٹھائے ہوں گے۔ اوزار وزر کی جمع ہے اس کے معنے بوجھ کے آتے ہیں۔ بوجھ اٹھانا یہاں دو معنے میں ہو سکتا ہے ایک مجازی دوسرے حقیقی، اگر یہ مجازی معنے میں ہو تو اپنے اعمال کی ذمہ داری کے لیے یہ استعارہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اپنے اعمال کے خود ذمہ دار ہوں گے۔ کیونکہ آخرت میں عذاب و ثواب کی صورت میں جو کچھ ہے وہ انسان کے اپنے ہی عمل کا نتیجہ ہے۔ اور یا بوجھ اٹھانا اپنے حقیقی معنے میں ہے یعنی روزِ قیامت اعمال کو ایک خاص جسمانی شکل دے دی جائے گی۔ اکثر اہل السنۃ کا مذہب بھی یہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جیسا عمل ہوگا اسی کے مناسب اس کی شکل ہوگی اور جو امور معنوی اور غیر مجسم ہیں وہ اپنی مثالی مناسب شکل و صورت میں ظاہر ہوں گے۔ مثلاً ترمذی میں حدیث ہے کہ اہل تکبر قیامت کے دن چیونٹیاں بنا کر اٹھائے جائیں گے جن پر ہر طرف سے ذلت و خواری چھائی ہوگی۔ تکبر کی جزا ذلت و خواری سے ملے گی اور چیونٹیوں سے زیادہ حقیر و ذلیل کوئی ہستی نہیں ہے۔ اس لیے ان کی بُرائی اور تکبر کو چیونٹی کی صورت میں نمایاں کیا جائے گا۔

بالکل آخر میں فرمایا الا ساء ما یزرون۔ دیکھو جو بوجھ یہ اٹھائے ہوتے ہیں بہت بُرا ہے۔ بات کے مہتم بالشان ہونے کی وجہ سے حرف تنبیہ لگا کر مخاطبوں کو چوکنا کیا ہے اس فقرے کے ذریعے ان کی مذمت میں مبالغہ کیا گیا ہے فرمایا کیا ہی بُرا ہوگا وہ بوجھ جس کو یہ اٹھائے ہوں گے کیونکہ یہ بوجھ اب ان کے سروں سے کبھی اترنے والا نہیں ہے۔

دُنیوی اور اُخروی زندگی کا تقابل

۳۸ - اور دُنیا کی زندگی ایک کھیل اور تماشہ کے سوا کچھ نہیں ہے اور بلاشبہ آخرت کا گھر ہی اہل تقویٰ کے لیے بہترین ہے کیا تم اتنی بات بھی نہیں سمجھتے ہو۔ کفار تو یہ کہتے تھے کہ دنیوی زندگی

کے سوا کوئی زندگی ہی نہیں ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ یہ فانی اور مکدر زندگی حیاتِ اُخروی کے مقابلے میں محض ہیچ اور بے حقیقت ہے یہاں کی زندگی کے صرف ان ہی لمحات کو زندگی کہا جا سکتا ہے جو آخرت کی درستی میں خرچ کیے جائیں۔ بقیہ تمام اوقات جو آخرت کی فکر اور تیاری سے خالی ہوں۔ ایک عاقبت اندیش کے نزدیک لہو و لعب سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے۔ پرہیزگار لوگ جانتے ہیں کہ ان کا اصلی گھر آخرت کا گھر اور ان کی حقیقی زندگی آخرت کی زندگی ہے[1] جس دُنیا کی زندگی کی اس آیت میں مذمت ہو رہی ہے وہ ہے جو مقصود بالذات ہو جیسے ملحدوں اور مادہ پرستوں کی ہوتی ہے وہی لوگ جن کا قول ابھی اوپر نقل ہو چکا ہے ان ھی الا حیاتنا الدنیا، ورنہ وہ دُنیا جو آخرت کی تیاریوں کے لیے ہوتی ہے وہ قابلِ مذمت نہیں ہے وہ تو عین مطلوب ہے کیونکہ جیسا کہ امام رازی نے لکھا ہے اس کے بغیر تو آخرت کی سعادتوں کی فراہمی ممکن ہی نہیں یہ تو مزرعۃ الاخرۃ ہے۔ اللہ کی رضا اس کے ثمرات یعنی دائمی عیش و راحت دُنیا میں امن و اطمینان کی حیاتِ طیبہ اور آخرت میں نعمائے جنت حاصل کرنا صرف دُنیا کی زندگی کے ذریعے ہو سکتا ہے نہ اس سے پہلے عالمِ ارواح میں اس کا حصول ممکن ہے اور نہ اس کے بعد عالمِ آخرت میں اس کی تحصیل ممکن ہے۔ اس سے واضح ہو گیا کہ دُنیا کی زندگی بہت بڑی نعمت اور سب سے زیادہ قیمتی چیز ہے جس میں یہ عظیم الشان سودا خریدا جا سکتا ہے۔ اسی لیے اسلام میں خودکشی حرام اور موت کی دُعا کرنا ممنوع ہے۔

آیت میں دُنیا کی زندگی کو لعب کھیل اور لہو تماشا کہا گیا ہے۔ لعب کھیل کود کا نام ہے بالفاظ دیگر ایسے اعمال و افعال جو اپنے اندر کوئی نتیجہ نہیں رکھتے۔ عام خیال یہی ہے کہ بچپن میں بچے مثلاً مٹی خاک کے جو گھر وندے بنا بنا کر خوش ہوتے ہیں۔ اس قسم کا کام آدمی صرف ابتدائی زندگی میں ہی کرتا ہے اس وقت تک کرتا رہتا ہے جب تک اس میں دُنیا کے سمجھنے بوجھنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی لیکن جب یہ دَور گزر جاتا ہے تو اس کے بعد آدمی جو کچھ کرتا ہے۔ شاید اس کی نوعیت یہ نہیں ہوتی۔ ایامِ طفولیت کے کسی دور کے گزر جانے کے جو کچھ عام حالات میں کرنے والے کرتے ہیں۔ لعب کا دور گزرنے کے بعد لہو کا زمانہ آتا ہے لہو کے معنے غفلت کے ہیں۔ طفولیت کے ختم ہونے کے بعد جب شبابی محرکات کا انسانی دماغ پر استیلا ہوتا ہے۔ وہی جس کا نام جوانی دیوانی رکھا گیا ہے یہ غفلت اور سرمستی کا دور ہوتا ہے۔ ہر چیز سے غافل ہو کر عام حالات میں لوگ ان ہی جذبات اور ولولوں میں ڈوب جاتے ہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جن کا تقاضا اٹر کپن کے دلوں میں زور پکڑتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ دنیوی زندگی جس کے بارے میں قیامت کے منکرین یہ کہتے ہیں کہ زندگی یہی ہے اس کے سوا کوئی زندگی نہیں ہے، کچھ بھی نہیں ہے، صرف یہی زندگی ہے اور اس کے بعد کوئی زندگی نہ ہو۔ اس کی حیثیت ایک بے نتیجہ کھیل اور تماشے کے سوا کچھ نہیں۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ دنیا کی زندگی میں کوئی سنجیدگی نہیں ہے اور یہ محض کھیل اور تماشے کے طور پر بنائی گئی ہے بلکہ منشا یہ ہے کہ آخرت کی حقیقی اور پائدار زندگی کے مقابلے میں یہ زندگی ایسی ہے جیسے کوئی شخص کچھ دیر کھیل اور تفریح میں دل بہلائے اور پھر اصل اور سنجیدہ کاروبار کی طرف متوجہ ہو جاتے، نیز اسے کھیل اور تماشے سے تشبیہ اس لیے بھی دی گئی ہے کہ حقیقت کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے بے بصیرت اور ظاہر پرست انسانوں کے لیے غلط فہمی میں مبتلا ہونے کے بہت سے اسباب موجود ہیں۔ اور اس غلط فہمی میں پھنس کر لوگ حقیقت نفس الامری کے خلاف ایسے ایسے عجیب و غریب طرزِ عمل اختیار کرتے ہیں جن کی بدولت ان کی زندگی محض ایک کھیل اور تماشہ بن کر رہ جاتی ہے۔ مثلاً جو شخص یہاں بادشاہ بن کر بیٹھتا ہے اس کی حیثیت میں تھیٹر کے اس مصنوعی بادشاہ سے مختلف نہیں نہیں ہے جو تاج پہن کر جلوہ افروز ہوتا ہے اور اس طرح حکم چلاتا ہے گویا کہ وہ واقعی بادشاہ ہے حالانکہ حقیقی بادشاہی کی اسے ہوا تک نہیں لگی ہوتی۔ ڈائریکٹر کے ایک اشارے پر وہ معزول ہو جاتا ہے قید کیا جاتا ہے اور اسی کے قتل تک کا فیصلہ صادر ہو جاتا ہے ایسے ہی تماشے اس دنیا میں ہر طرف ہو رہے ہیں کہیں کسی ولی یا دیوی کے دربار سے حاجت روائیاں ہو رہی ہیں حالانکہ وہاں حاجت روائی کی طاقت کا نام و نشان تک موجود نہیں، کہیں کوئی غیب دانی کے کمالات کا مظاہرہ کر رہا ہے حالانکہ غیب کے علم کا وہاں شائبہ تک نہیں۔ کہیں کوئی لوگوں کا رازق بنا ہوا ہے حالانکہ بیچارہ خود اپنے رزق کے لیے کسی اور کا محتاج ہے۔ کہیں کوئی اپنے آپ کو عزت اور ذلت دینے والا۔ نفع اور نقصان پہنچانے والا سمجھے بیٹھا ہے اور یوں اپنی کبریائی کے ڈنکے بجا رہا ہے گویا کہ وہی گرد و پیش کی ساری مخلوق کا خدا ہے۔ حالانکہ بندگی کی ذلت کا داغ اس کی پیشانی پر لگا ہوا ہے اور قسمت کا ایک ذرا سا چکر اسے کبریائی کے مقام سے گرا کر انہی لوگوں کے قدموں میں پامال کرا سکتا ہے جن پر وہ کل تک خدائی کر رہا تھا۔ یہ سب کھیل جو دنیا کی چند روزہ زندگی میں کھیلا جا رہا ہے موت کی ساعت آتے ہی یک لخت ختم ہو جائیں گے اور اس سرحد سے پار ہوتے ہی انسان اس عالم میں پہنچ جائے گا جہاں سب کچھ عین مطابق حقیقت ہو گا اور جہاں دنیوی زندگی کی ساری غلط فہمیوں کے چھلکے اتار کر ہر انسان کو دکھا دیا جائے گا کہ وہ صداقت کا کتنا جوہر اپنے ساتھ جو میزان حق میں کسی وزن اور کسی قدر و قیمت کا حامل ہو سکتا ہو۔

صاحب درۃ التنزیل نے یہاں قرآن کی تعبیری بوقلمونی پر نکتہ آفرینی کرتے ہوئے بتایا ہے کہ اس جگہ لعب و لہو اور سورہ عنکبوت میں لہو و لعب کیوں لایا گیا ہے۔ انشا اللہ ہم اس موضوع پر سورہ عنکبوت میں بحث کریں گے کیونکہ یہاں لعب و لہو کی تعبیر طبعی اور واقعی ہے اس لیے یہ جگہ اس نکتہ آفرینی کے لیے موزوں نہیں ہے چونکہ لہو و لعب کی تعبیر غیر طبعی ہے اس لیے اس میں نکتہ بلاغت کی ضرورت ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ دنیا کی زندگی لعب اور لہو ہے اگر اس کے مقابلے میں آخرت نہ ہو۔ یہ پوری دنیا ایک بے مقصد ڈرامہ بن کر رہ جاتا ہے یعنی اگر نتائج و ثمرات عمل کے لیے کوئی دوسری زندگی نہ ہو تو جو کچھ ہے لہو و لعب سے زیادہ نہیں ہے۔ یا یوں کہہ دیجیے کہ دنیا کی زندگی ایسی سریع و فانی ہے جیسے چار گھڑی کا کھیل ہو اور بس اسی لیے فرمایا کہ وللدار الآخرۃ خیر للذین یتقون۔ یعنی جو لوگ متقی ہیں ان کے لیے آخرت ہی کا گھر بہتر ہے۔ اس فقرے کے دو ترجمے ہو سکتے ہیں ایک یہ کچھلا گھرانہ ان لوگوں کے لیے بہتر ہے جو متقی ہیں، دوسرے یہ کہ متقی لوگوں کے لیے پچھلا گھرانہ ہی بہتر ہے۔ پہلے ترجمہ کے لحاظ سے مطلب یہ ہوگا کہ مغفرت پر کسی کا ذاتی یا خاندانی اجارہ نہیں ہے۔ یہ کسی طرح ممکن نہیں ہے کہ تم کام تو وہ کرو جو سزا دینے کے لائق ہوں مگر تمہیں آخرت میں جگہ مل جائے اچھی۔ اگر تم میں کچھ بھی عقل موجود ہے تو تم خود سمجھ سکتے ہو کہ تمہاری اس زندگی کے بعد کوئی ایسی زندگی ضرور ہونی چاہیے جس میں لوگوں کو ان کے اعمال کی جزا اور سزا ملے

قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ

الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ ۝ وَلَقَدْ كُذِّبَتْ رُسُلٌ مِّنْ

قَبْلِكَ فَصَبَرُوْا عَلٰى مَا كُذِّبُوْا وَ اُوْذُوْا حَتّٰٓى اَتٰىهُمْ نَصْرُنَا ۚ وَ

لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ ۚ وَلَقَدْ جَآءَكَ مِنْ نَّبَاِى الْمُرْسَلِيْنَ ۝

وَاِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكَ اِعْرَاضُهُمْ فَاِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَبْتَغِيَ نَفَقًا

فِي الْاَرْضِ اَوْ سُلَّمًا فِي السَّمَآءِ فَتَاْتِيَهُمْ بِاٰيَةٍ ۭ وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ

لَجَمَعَهُمْ عَلَى الْهُدٰى فَلَا تَكُوْنَنَّ مِنَ الْجٰهِلِيْنَ ۝ اِنَّمَا

يَسْتَجِيْبُ الَّذِيْنَ يَسْمَعُوْنَ ۭ وَالْمَوْتٰى يَبْعَثُهُمُ اللّٰهُ ثُمَّ اِلَيْهِ يُرْجَعُوْنَ ۝

ہم کو معلوم ہے کہ ان کافروں کی باتیں تمہیں رنج پہنچاتی ہیں
مگر یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم خدائی آیتوں کا
انکار کرتے ہیں[۳۹]۔ اور تم سے پہلے بھی پیغمبر جھٹلائے جاتے
رہے تو وہ تکذیب اور ایذا رسانی پر صبر کرتے رہے یہاں تک

کہ ان کے پاس ہماری مدد پہنچ گئی اور خدا کی باتوں کو کوئی بھی بدلنے والا نہیں اور تم کو پیغمبروں کے احوال کی خبریں پہنچ چکی ہیں۔[۴۰] اور اگر ان کی روگردانی تم پر شاق گزرتی ہے تو اگر طاقت ہو تو زمین میں سرنگ ڈھونڈھ نکال لو یا آسمان میں سیڑھی تلاش کر لو، پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لے آؤ، اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا لہٰذا تم نادانوں میں نہ ہو۔[۴۱] بات یہ ہے کہ حق کو قبول وہی کرتے ہیں جو سنتے بھی ہیں اور مُردوں کو تو خدا ہی اٹھائے گا پھر اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔[۴۲]

معاندوں کی حق فراموشیوں پر دل گرفتگی

چونکہ معاندین کو حق و باطل کے تمیز کی قوت نہیں ہوتی اور یقین کی سعادت سے وہ محروم ہوتے ہیں اس لیے بڑی سے بڑی دعوت و تبلیغ اور اونچی سے اونچی نشانی بھی ان کو شک و شبہ کے گرداب سے ان کو باہر نہیں نکال سکتی۔ وہ کبھی اس کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں کبھی اس کو سحر و جادو سمجھ کر اس کی تکذیب کرتے ہیں۔ کبھی فریب اور قوتِ شیطانی کا ان کو دھوکا ہوتا ہے اس لیے معجزات سے بھی ان کو ہدایت نہیں ہوتی۔ حجت کے لیے ایک بار ان کو معجزہ دکھایا جاتا ہے تو ان کا شبہ رفع نہیں ہوتا۔ پھر معجزہ طلب کرتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس صورتِ حال سے دل گرفتہ ہوتے ہیں اور

آپ کو فرطِ شفقت سے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ یہ روسائے قریش ایمان کی دولت سے محروم نہ ہونے پائیں۔ اللہ سبحانہٗ یہاں حضور انور سے مخاطب ہوتا ہے کہ معاندوں کی حق فراموشیوں سے دل گرفتہ نہ ہوں۔ آپ داعی حق ہیں اور آپ کو اہل ایمان کی مستعدی اور منکروں کی محرومی دونوں دیکھنی پڑیں گی اور آپ کو دونوں باتوں کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ آپ جوشِ دعوت میں چاہتے ہیں کہ یکبارگی سب راہِ حق پر آجائیں لیکن آپ کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ایسا نہیں ہو سکتا۔ اللہ کی مشیت کا فیصلہ یہی ہے کہ اپنی اپنی حالت، اپنی اپنی استعداد، اپنی اپنی سمجھ اور اپنی اپنی راہ ہو۔ لہٰذا لوگوں کے انکار و جحود پر ملول نہ ہو اپنے کام میں لگے رہو۔ ان کو فی الواقع آپ سے انکار نہیں ہے بلکہ آپ کی نبوت سے اس لیے انکار ہے کہ ان کو اولاً خدا پر یقین نہیں ہے۔ بظاہر نبوت کی نشانیوں کو طلب کرتے ہیں مگر واقعہ یہ ہے کہ ان کو خدا کی نشانیاں بھی تسلیم نہیں ہیں۔ ایسے لوگوں کی قسمت میں ایمان کی سعادت نہیں۔ ان کے لیے معجزے بھی بیکار ہیں۔ یہ سعادت ان ہی کو ملتی ہے جو حق کے طالب ہیں اور حق کو سنتے ہیں۔ دراصل مخاطبین کے لیے ایمان کی آرزو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میں اتنی شدید تھی کہ آپ ان میں سے کسی کو بھی ایمان سے محروم دیکھنا نہیں چاہتے تھے۔ فرمایا کہ آپ کا یہ جذبہ خواہ لوگوں کے حق میں شفقت و ہمدردی کی خاطر ہے اس لیے ان کا ایمان نہ لانا آپ پر شاق ہو رہا ہے لیکن ہم چاہتے ہیں کہ لوگ معجزوں کے بل پر نہیں بلکہ اپنے کان، آنکھ، عقل اور ادراک کو استعمال کریں۔ آفاق و انفس کے دلائل پر غور کریں، آپ کی باتیں سنیں، سوچیں اور سمجھیں اور اپنے ارادہ و اختیار سے ایمان قبول کریں۔ اگر بجبر اور زور سے لوگوں کو ایمان کی راہ پر لانا منظور ہوتا تو ہمارے لیے یہ کام مشکل نہ تھا۔ ہم چشم زدن میں سب کو ایمان کی راہ پر چلا دیتے۔

آپ کی صدائے حق کا جواب تو صرف وہ دیں گے جو زندہ ہیں اور جن کے دل مردہ ہو چکے ہیں ان کو پکارنا بیکار ہے۔ کوئی دعوت، کوئی دلیل، کوئی نشانی، کوئی اعجاز مردوں کو زندہ نہیں کر سکتا۔ آپ آسمان پر چڑھ جائیں یا زمین میں چلے جائیں یہ لوگ کبھی سچائی قبول نہیں کریں گے۔ یعنی یہاں قوتِ فاعلی میں کوئی کمی نہیں ہے جو کچھ کمی ہے وہ قوتِ قابلی میں ہے۔

۳۹۔ ہم کو معلوم ہے کہ ان کافروں کی باتیں تمہیں رنج پہنچاتی ہیں مگر یہ تمہاری تکذیب نہیں کرتے بلکہ ظالم خدا کی آیتوں کا انکار کرتے ہیں۔ خلائق کے حال پر شفقت و ہمدردی سارے جہان سے زیادہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دل میں ڈالی گئی تھی۔ آپ ان بدبختوں کی تکذیب و اعراض مستقبل کی تباہی اور متمسخرانہ و ملحدانہ کلمات سے سخت رنج اور صدمہ محسوس فرماتے ہیں۔ ان آیات میں آپ کو تسلی اور ان اشقیاء کو دھمکی دی گئی ہے کہ آپ ان کے اعراض و تکذیب سے اس قدر دلگیر اور بے چین نہ ہوں

یہ لوگ جو تکذیب کر رہے ہیں فی الحقیقت آپ کو نہیں جھٹلاتے۔ کیونکہ آپ کو تو پہلے سے بالاتفاق صادق وامین سمجھتے تھے بلکہ خدا کی آیات کا جو پیغمبر علیہ السلام کی تصدیق و تائید کے لیے بھیجی گئی ہیں، جان بوجھ کر از راہ ظلم و عناد انکار کر رہے ہیں تو آپ بھی ان ظالموں کا معاملہ خدا کے سپرد کر کے مطمئن ہو جائیے وہ خود ان کے ظلم اور آپ کے صبر کا پھل دینے والا ہے۔[1]

واقعہ یہ ہے کہ جب تک حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کی آیات سنانی شروع نہ کی تھیں آپ کی قوم کے سب لوگ آپ کو امین اور صادق کہتے تھے اور آپ کی راستبازی پر پورا اعتماد رکھتے تھے۔ انہوں نے آپ کو اس وقت جھٹلایا جبکہ آپ نے اللہ کی طرف سے پیغام پہنچانا شروع کیا۔ اور اس دوسرے دور میں بھی ان کے اندر کوئی شخص ایسا نہ تھا جو شخصی حیثیت سے آپ کو جھوٹا قرار دینے کی جرأت کر سکتا ہو۔ آپ کے کسی سخت سے سخت مخالف نے بھی کبھی آپ پر یہ الزام نہیں لگایا کہ آپ دنیا کے کسی معاملہ میں جھوٹ بولنے کے مرتکب ہوتے ہیں۔ انہوں نے جتنی آپ کی تکذیب کی وہ محض نبی ہونے کی حیثیت سے کی۔ آپ کا سب سے بڑا دشمن ابو جہل تھا۔ حضرت علی کی روایت ہے کہ ایک بار اس نے خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے گفتگو کرتے ہوئے کہا انا لا نکذبك ولکن نکذب ما جئت بہ ہم آپ کو تو جھوٹا نہیں کہتے مگر جو کچھ آپ پیش کر رہے ہیں اسے جھوٹ قرار دیتے ہیں۔ جنگ بدر کے موقعہ پر اخنس بن شریق نے تخلیہ میں ابو جہل سے دریافت کیا کہ یہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی تیسرا نہیں ہے۔ سچ بتاؤ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو تم سچا سمجھتے ہو، یا جھوٹا۔ اس نے جواب دیا کہ خدا کی قسم محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک سچا آدمی ہے۔ عمر بھر کبھی جھوٹ نہیں بولا مگر جب لوا اور سقایت اور حجابت اور نبوت سب کچھ بنی قصی ہی کے حصے میں آ جائے گی تو بتاؤ باقی سارے قریش کے پاس کیا رہ گیا! اس بنا پر یہاں اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو تسلی دے رہا ہے کہ تکذیب دراصل تمہاری نہیں بلکہ ہماری کی جا رہی ہے اور جب ہم تحمل و بردباری کے ساتھ اسے برداشت کیے جا رہے ہیں۔ اور ڈھیل پر ڈھیل دیے جاتے ہیں تو تم کیوں مضطرب ہوتے ہو۔[2]

علامہ ابو السعود نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ یہ فقرہ کہ یہ لوگ آپ کی نہیں بلکہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جلالت قدر، رفعت شان اور بارگاہ الٰہی میں ایسے قرب منزلت کی غمازی کر رہا ہے جس کا عقل انسانی ادراک بھی نہیں کر سکتی۔ قرآن میں جیسے رسول کی اطاعت کو اللہ کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

طاعت، رسول کی بیعت کو اللہ کی بیعت بتایا ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ اور ان الذین یبایعونك انما یبایعون اللہ۔ اسی طرح یہاں اللہ سبحانہ نے رسول کی تکذیب کو اللہ کی تکذیب قرار دیا ہے۔ اس سے ایک طرف اگر نبوت کی عظمت و شان معلوم ہو رہی ہے تو دوسری طرف منکرین اور مکذبین کے مجرمانہ کردار کی شناعت کی بڑائی کا بھی پتہ لگ رہا ہے۔ اور پھر آخر میں آیات اللہ کی انکار کے لیے جحود کی تعبیر اختیار کی ہے جحود ایسے انکار کو کہتے ہیں کہ دل تو قائل ہو جاتے مگر زبان ہٹ دھرمی سے انکار کیے جاتے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب کرنے والوں میں، بیشتر لوگ ایسے تھے۔ امام رازی نے اسی لیے حضور انور کو جھوٹا قرار نہ دینے کی جحود کے معنے کی رعایت سے چار صورتیں بتائی ہیں۔ اولاً یہ کہ یہ لوگ آپ کو جلوت میں جھٹلاتے ہیں اور قرآن و نبوت کا انکار کرتے ہیں لیکن خلوت میں آپ کو جھوٹا نہیں سمجھتے ہیں۔ ثانیاً یہ کہ آپ کو کذاب نہیں کہتے بلکہ آپ کی نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ ثالثاً یہ کہ معجزات کے ظہور کے باوجود لوگوں کا آپ کی تکذیب پر اصرار اللہ کی آیات کی تکذیب ہے۔ رابعاً یہ کہ وہ خصوصی طور پر حضور انور کی تکذیب نہیں کرتے بلکہ معجزات کو آپ کی صداقت کی دلیل نہیں مانتے اور ہر معجزہ کو سحر کہہ دیتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا قانونِ آزمائش

۳۰۔ اور تم سے پہلے بھی پیغمبر جھٹلائے جاتے رہے انہوں نے تکذیب اور ایذا رسانی پر صبر کیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس ہماری مدد پہنچ گئی اور خدا کی باتوں کو کوئی بھی بدلنے والا نہیں ہے۔ اور تم کو پیغمبروں کی باتیں پہنچ چکی ہیں۔ یعنی انبیائے سابقین کے ساتھ بھی جن کے کچھ حالات آپ کو سنائے جا چکے ہیں ان کی قوموں نے تکذیب و ایذا رسانی کا برتاؤ کیا جس پر خدا کے معصوم پیغمبر نہایت اولوالعزمی سے صبر کرتے رہے حتیٰ کہ حسبِ وعدہ خدا کی مدد پہنچی اور بڑے زبردست متکبرین کے مقابلہ میں ان کو مظفر و منصور کیا گیا۔ آپ سے جو نصر و ظفر کے وعدے کیے گئے ہیں ایک ایک کر کے پورے ہوں گے۔ پہاڑ اپنی جگہ سے ٹل جائیں مگر خدا کا وعدہ نہیں ٹل سکتا۔ کسی کی طاقت ہے جو خدا کی باتوں کو بدل ڈالے یعنی جو اس نے کہا ہے اسے واقع نہ ہونے دے۔ مکذبین کو یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی جنگ حقیقتاً محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے نہیں بلکہ ربِ محمد سے ہے جس نے ان کو اپنا سفیرِ اعظم اور معتمد بنا کر کھلے نشانات دے کر روانہ کیا ہے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی تکذیب ان خدائی نشانات کی تکذیب ہے۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی کا دلنواز انداز ہے وہ یہ کہ انبیا کی تاریخ گواہ ہے کہ ہدایت سے مدد ہمکنار ہونے کے لیے ابتلاء و امتحان کے ایک طویل اور صبر آزما مرحلے سے گزرنا پڑتا ہے۔ اس کے بغیر خدا کی نصرت ظاہر نہیں ہوتی۔ اس دوران میں ان انبیا کی قوموں کی طرف سے انبیا کی برابر تکذیب ہوتی رہی ہے ان کو ہر قسم کی تکلیفوں سے دوچار ہونا پڑا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ کی تکذیب ہوتی ہے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں ہے سب کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے۔ پیشروؤں کو پیش کر کے تسلی دینا تسکین و تسلی کا طرز انداز ہے یعنی آپ کو انبیا کی اقتدا کرنی چاہیے۔ انبیا سے نصرت الٰہی کی تحقیق آپ کو بذریعہ وحی ہو چکی ہے، اس لیے آپ بھی صبر کیجئے۔ نصرت الٰہی کا آپ تک پہنچنا یقینی ہے۔ اللہ کا قانون یہی ہے۔ اور اللہ کے قانون کو بدل دینے کی کسی میں طاقت نہیں۔ اصل ارشاد میں لا مبدل لکلمات اللّٰہ کے الفاظ ہیں۔ یعنی اللہ نے حق و باطل کی کشمکش کے لیے جو قانون بنا دیا ہے اسے تبدیل کرنا کسی کے بس میں نہیں ہے۔ حق پرستوں کے لیے ناگزیر ہے کہ وہ ایک طویل مدت تک آزمائشوں کی بھٹی میں تپائے جائیں۔ اپنے صبر کا، اپنی راستبازی کا، اپنے ایثار اور اپنی فداکاری کا، اپنے ایمان کی پختگی اور اپنے توکل علی اللہ کا امتحان دیں۔ مصائب اور مشکلات کے دور سے گزر کر اپنے اندر وہ صفات پرورش کریں جو صرف اسی دشوار گزار گھاٹی میں پرورش پا سکتی ہیں۔ اور ابتداءً خالص اخلاق فاضلہ و سیرت صالحہ کے ہتھیاروں سے جاہلیت پر فتح حاصل کر کے دکھائیں۔ اس طرح جب وہ اپنا اصلح ہونا ثابت کر دیں گے تب اللہ کی نصرت ٹھیک اس وقت پر ان کی دستگیری کے لیے آ پہنچے گی۔ وقت سے پہلے وہ کسی کے لائے نہیں آ سکتی۔

صبر کی جو بات یہاں قرآن نے انبیا کی مدح میں بتائی ہے ٹھیک یہی بات قرآن نے اہل ایمان کے لیے بطور ہدایت ارشاد فرمائی ہے۔ ظاہر بات ہے کہ ادعائے ایمان کی صداقت اگر معلوم کی جا سکتی ہے تو صرف ایک طریقہ سے اور وہ ہے اس کے تقاضوں پر عمل کرنے کا جائزہ۔ کسی چھپی ہوئی اور ان دیکھی حقیقت کا وجود آدمی اسی وقت تسلیم کرتا ہے جب اس کے لوازم کا مشاہدہ کرے۔ یہی لوازم اور مقتضیات وہ معیار ہیں جن پر کسی شے کے واقعی وجود کو جانچا اور پرکھا جا سکتا ہے اور پھر اس کے ہونے نہ ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ بس کوئی وجہ نہیں کہ حیات انسانی کی سب سے اہم حقیقت یعنی ایمان کو محض اس ہوائی تو جا کی بنا پر تسلیم کر لیا جاتا جو امنت باللہ کے الفاظ کہنے سے فضا میں پیدا ہو جاتا ہے اور اللہ تعالیٰ ہر اس شخص کو اپنی وفاداری اور بندگی کی سند عطا فرما دیتا جس نے اپنی زبان سے اس کا دعویٰ کر دیا ہو۔ اس نے تو انسان کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ اس کے احساس فرض بندگی کو آزمایا جائے۔

یوں تو دنیا کا کوئی کام اور مقصد نہیں جو بغیر کسی جدوجہد کے محض زبانی دعووں سے پورا ہو جائے

مگر وہ مقصد جو اپنی عظمت میں آپ اپنی نظیر ہو، اس کے لیے سعی وجہد کی کوئی معمولی مقدار ہرگز کافی نہیں ہو سکتی۔ اللہ پر ایمان اس کی بندگی، اس کے دین کی پیروی اور پھر اس کی اقامت کا مقصد وہ مقصد ہے جس کے لیے بڑی پختہ عزیمت کی ضرورت ہے۔ آپ کوئی مشن لے کر اٹھیں، راستہ میں رکاوٹیں کہیں کہیں پیش آئیں گی۔ لیکن نبوت کا مشن تو ایسا ہے جس کی راہ میں دور دور تک پہاڑی چٹانوں، گہرے غاروں اور سنگلاخ وادیوں کے سوا اور کچھ نظر ہی نہیں آتا۔ کسی اونچے کا نام لیجئے۔ اگر ایک طرف سے مخالفت کی ہمت شکن صدا بلند ہوگی تو تین طرف سے حوصلہ افزائی ہوگی مگر نبوت کے کام کا نام لیجئے اور دیکھ لیجئے کہ ہر طرف سے جگر شگاف نعرے بلند ہوتے ہیں، بات صرف اتنی نہیں ہے کہ عام دستور کے مطابق جس طرح اور مقاصد کا حصول کم و بیش کچھ قربانیوں پر موقوف ہے اسی طرح اس مقصد کے لیے بھی کچھ قربانیاں دینی پڑتی ہیں بلکہ قرآن کہتا ہے کہ یہاں عام دستور سے بڑھ کر مشکلیں برداشت کرنی ہوتی ہیں اور محض ان ہی مصائب اور موانع سے سابقہ نہیں ہوتا جو اسباب عام کے تحت پیش آجائیں بلکہ بالقصد اللہ تعالیٰ ایسے حالات سے دوچار کرتا ہے جو ناگوار خاطر ہوں ایسے مواقع پیدا کرتا رہتا ہے جن میں جان و مال کا زیاں ہو اور ایسی باتوں کو کانوں میں پہنچنے سننے کا اہتمام کرتا ہے جو جذبات نفس پر شاق ہوں۔ اسی لیے قرآن نے اہل ایمان کو خاص طور پر نماز کے ساتھ صبر کی تلقین کی ہے اور صبر کرنے والوں کو اپنی معیت کی بشارت دی ہے۔

یا ایھا الذین امنوا استعینوا بالصبر والصلوٰۃ ان اللہ مع الصابرین۔

نصرتِ الٰہی کے ظہور کا قانون

۴۱۔ اور اگر ان کی روگردانی آپ پر شاق گزرتی ہے تو اگر طاقت ہے تو زمین میں سرنگ نکال لو یا آسمان میں سیڑھی تلاش کر لو، پھر ان کے پاس کوئی معجزہ لے آؤ، اور اگر خدا چاہتا تو سب کو ہدایت پر جمع کر دیتا، لہٰذا تم نادانوں میں سے نہ ہو۔ کفار کا مطالبہ یہ تھا کہ یہ نبی ہیں تو ان کے ساتھ ہمیشہ ایسا نشان رہنا چاہیے جسے ہر کوئی دیکھ کر یقین کرے اور ایمان لانے پر مجبور ہو جایا کرے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ تمام دنیا کی ہدایت پر حریص تھے۔ شاید آپ کے دل نے چاہا ہوگا کہ ان کا یہ مطالبہ پورا کر دیا جائے اس لیے حق تعالیٰ نے یہ تلقین فرمائی کہ آپ تکوینیات میں مشیت الٰہی کے تابع رہیں۔ تکوینی مصالح ہرگز اس کو مقتضی نہیں ہیں کہ ساری دنیا کو ایمان لانے پر مجبور کر دیا جائے ورنہ اللہ تعالیٰ کو اس پر بھی قدرت تھی کہ انبیائے کرام علیہم السلام کے توسط کے بغیر اور نشانوں اور معجزات کے

بغیر سب کو شروع ہی سے سیدھی راہ پر جمع کر دیتا مگر جب خدا تعالیٰ کی حکمت ایسے مجبور کن معجزات اور فرمائشی نشانات دکھلانے کو مقتضی نہیں تو مشیتِ الٰہی کے خلاف کسی کو یہ طاقت کہاں ہے کہ وہ زمین یا آسمان سے سرنگ یا سیڑھی لگا کر اب فرمائشی اور مجبور کن معجزہ نکال کر دکھا دے۔ خدا تعالیٰ کے قوانین، حکمت و تدبیر کے خلاف کسی چیز کے وقوع کی اُمید رکھنا نادانوں کا کام ہے[1]

واقعہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی قوم کو سمجھاتے سمجھاتے مدت گزر گئی اور لوگ کسی طرح راستی پر نہ آتے تو آپ کے قلب مبارک میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ کاش خدا کی طرف سے کوئی ایسی نشانی ظاہر ہو جائے جس سے ان لوگوں کا کفر ڈھیلا پڑے اور یہ میری دعوت کو قبول کرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ آپ کی اسی خواہش کے اس آیت میں دو جواب دیے گئے ہیں۔ پہلا جواب ان استطعت سے شروع ہوا ہے اور مطلب یہ ہے کہ آپ دامانِ صبر کو ہاتھ سے نہ چھوڑیں جس انداز اور جس طریق سے اب یہ کام ہو رہا ہے اسی پر صبر سے جمے رہو۔ معجزوں سے کام لینا ہوتا تو کیا خود ہم نہ لے سکتے تھے مگر ہم جانتے ہیں کہ جس اصلاحی انقلاب اور جس تعمیری کام پر آپ مامور کیے گئے ہیں اسے کامیابی کی منزل تک پہنچانے کا صحیح راستہ یہ نہیں، تاہم اگر لوگوں کی موجودہ روش اور ان کے انکار کی سختی پر تم سے صبر نہیں ہوتا اور تمہیں گمان ہے کہ اس جمود کو توڑنے کے لیے کسی محسوس نشانی کا مشاہدہ کرانا ہی ضروری ہے تو ہم تو ان کی فرمائشیں بوجہ عدم ضرورت پوری نہیں کریں گے۔ آپ کے بس میں ہو تو پوری کر دیجیے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ میں ان کافروں کے حال پر شفقت اور ان کے اسلام لانے کی حرص اس درجہ بڑھی ہوئی ہے کہ آپ کے اختیار میں ہو تو آپ ہر فرمائشی معجزہ دکھانے کو تیار ہیں کہ کسی طرح یہ مسلمان ہو جائیں۔ آپ اگر ایسا کر سکتے ہیں تو کر لیں اور کوئی معجزہ لے آئیں لیکن ہم سے امید نہ رکھیں کہ ہم یہ خواہش پوری کریں گے۔ آسمان پر چڑھ جانے اور زمین میں گھس جانے کا ذکر شاید اس لیے کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے مخاطبوں نے آسمان پر چڑھ جانے اور زمین سے چشمہ نکالنے کا مطالبہ کیا تھا جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔

قالوا لن نومن لك حتى تفجر لنا من الارض ينبوعا

اور۔ او ترقى فى السماء ولن نومن لرقيك حتى تنزل علينا كتابا

ان ہی دونوں مطالبوں کی رعایت سے ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فرمایا ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

دوسرا جواب ولو شاء اللہ سے شروع ہوا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر صرف یہی بات مطلوب ہوتی کہ تمام انسان کسی نہ کسی طرح ایمان والے ہو جائیں تو نبی بھیجنے اور کتابیں روانہ کرنے اور نبیوں سے کفار کے مقابلہ میں جدوجہد کرانے اور دعوت حق کو تدریجی تحریک کی منزلوں سے گزروانے کی حاجت ہی نہ تھی۔ یہ کام تو اللہ کے ایک تخلیقی اشارے سے انجام پا سکتا تھا لیکن اللہ اس کام کو اس طریقہ پر کرنا نہیں چاہتا۔ وہ تو یہ چاہتا ہے کہ حق کو دلائل کے ساتھ لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے۔ پھر ان میں سے جو لوگ فکر صحیح سے کام لے کر حق کو پہچان لیں وہ اپنے آزادانہ اختیار سے اس پر ایمان لائیں۔ اپنی سیرتوں کو اس کے سانچے میں ڈھالیں اور باطل پرستوں کے مقابلے میں اپنا اخلاقی تفوق ثابت کریں۔ انسانوں کے مجموعہ سے صالح عناصر کو اپنے طاقتور استدلال، اپنے بلند نصب العین اپنے بہتر اصول زندگی اور اپنی پاکیزہ سیرت کی کشش سے اپنی طرف کھینچتے چلے جائیں۔ اور باطل کے خلاف پیہم جدوجہد کر کے فطری ارتقا کی راہ سے اقامت دین حق کی منزل تک پہنچیں۔ اللہ اس کام میں ان کی رہنمائی کرے گا۔ اور جس مرحلہ پر جیسی مدد اللہ سے پانے کا وہ اپنے آپ کو مستحق بنائے گا وہ مدد بھی انہیں دیتا جائے گا لیکن اگر کوئی یہ چاہے کہ اس فطری راستہ کو چھوڑ کر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت قاہرہ کے زور سے افکار فاسدہ کو مٹا کر لوگوں میں فکر صالح پھیلائے اور تمدن فاسد کو نیست و نابود کر کے مدنیت صالحہ تعمیر کر دے تو ایسا ہرگز نہ ہوگا۔ یہ اللہ کی اس حکمت کے خلاف ہے جس کے تحت انسان کو دنیا میں ایک ذمہ دار اخلاقی وجود کی حیثیت سے پیدا کیا ہے اسے تصرف کے اختیارات دیے ہیں۔ طاعت و معصیت کی آزادی بخشی ہے۔ امتحان کی مہلت عطا کی ہے اور اس کی سعی کے مطابق جزا اور سزا دینے کے لیے فیصلہ کا وقت مقرر کیا ہے۔

قبولِ حق کا ضابطہ

۴۲۔ بات یہ ہے کہ حق کو قبول وہی کرتے ہیں جو سنتے بھی ہیں اور مُردوں کو خدا ہی اٹھائے گا پھر اسی کی طرف لوٹ کر جائیں گے۔ یعنی سب سے توقع نہ رکھو کہ مانیں گے جن کے دل کے کان بہرے ہیں وہ سنتے ہی نہیں پھر وہ مانیں کس طرح۔ ہاں یہ کافر جو قلبی و روحانی حیثیت سے مُردوں کی طرح ہیں قیامت میں دیکھ کر یقین کریں گے اور ان چیزوں کو مانیں گے جن کا انکار کرتے تھے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آیت میں استجابت کے معنے قبول کر لینے کے ہیں اور سماع کے معنے بات کو سمجھنے اور غور کرنے کے ہیں۔ اور موتٰی سے مراد وہ لوگ ہیں جو عقل و فہم سے بیگانہ اور سماع آیات سے کسی طرح کا فائدہ نہ اٹھائیں۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی دعوتِ ایمان کو وہ زندے قبول کریں گے جو اس دعوت کو سمجھیں گے لیکن وہ مُردے جو فہم و تدبر سے محروم ہیں وہ ہدایت قبول نہ کریں گے۔

اس آیت نے بتادیا کہ ہدایت کن لوگوں کو نصیب ہوتی ہے جو لوگ حق کو سننا، سمجھنا گوارا نہیں کرتے ان کو معجزات سے بھی ہدایت نہیں ہوتی ہے اس کے لیے سب سے پہلے اس کی ضرورت ہے کہ طلب موجود ہو معاندین چونکہ عموماً دولت مند اور رؤسا اور مدعیان عقل ہوتے ہیں اس لیے ان کا جذبہ انانیت اور ترفع ان کو داعیانِ حق کے علم کے نیچے کھڑے ہونے سے باز رکھتا ہے اس لیے نبوت سے ہدایت پانے کے لیے ضروری ہے کہ وہ اس جذبہ سے پاک ہوں۔

وَقَالُوْا لَوْلَا نُزِّلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّ اللّٰهَ قَادِرٌ عَلٰۤى
اَنْ يُّنَزِّلَ اٰيَةً وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ وَمَا مِنْ
دَآبَّةٍ فِى الْاَرْضِ وَلَا طٰۤئِرٍ يَّطِيْرُ بِجَنَاحَيْهِ اِلَّاۤ اُمَمٌ
اَمْثَالُكُمْ ؕ مَا فَرَّطْنَا فِى الْكِتٰبِ مِنْ شَىْءٍ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ يُحْشَرُوْنَ ۝
وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا صُمٌّ وَّبُكْمٌ فِى الظُّلُمٰتِ ؕ مَنْ يَّشَاِ اللّٰهُ
يُضْلِلْهُ ؕ وَمَنْ يَّشَاْ يَجْعَلْهُ عَلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝ قُلْ
اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ اللّٰهِ اَوْ اَتَتْكُمُ السَّاعَةُ اَغَيْرَ
اللّٰهِ تَدْعُوْنَ ۚ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ اِيَّاهُ تَدْعُوْنَ
فَيَكْشِفُ مَا تَدْعُوْنَ اِلَيْهِ اِنْ شَآءَ وَتَنْسَوْنَ مَا تُشْرِكُوْنَ ۝ ع

اور کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی، کہہ دو کہ خدا نشانی اتارنے پر قادر ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے[۴۳]۔ اور زمین پر جو چلنے پھرنے والا جانور یا

دو پروں سے اڑنے والا جانور ہے ان کی بھی تم لوگوں کی طرح اُمتیں ہیں، ہم نے نہیں چھوڑی ہے لکھنے میں کوئی چیز، پھر سب اپنے پروردگار کی طرف سمیٹے جائیں گے۔[۳۸] اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا وہ بہرے اور گونگے ہیں اندھیروں میں ہیں، جس کو خدا چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے سیدھے راستہ پر ڈال دے۔[۳۹] کہہ دو لوگو دیکھو اگر آجاوے تم پر اللہ کا عذاب یا آجاوے تم پر قیامت کیا تم ایسی حالت میں خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے، اگر سچے ہو تو بتاؤ، نہیں بلکہ تم اسی کو مصیبت کے وقت پکارتے ہو تو جس دُکھ کے لیے پکارتے ہو وہ اگر چاہتا ہے تو اس کو دُور کر دیتا ہے اور جن کو تم شریک بناتے ہو اس وقت انہیں بھول جاتے ہو۔[۴۰]

معجزات کی فرمائش اور قرآن کا جواب

یہ امر واقعہ ہے کہ قرآن کی نظر میں ان ظاہری معجزات کی چنداں وقعت نہیں ہے وہ ہمیشہ لوگوں کو اصل روحِ نبوت کی طرف متوجہ کرتا ہے اور اس کے خاص اسباب ہیں۔ قرآن دُنیا میں اللہ کے دین کی تکمیل اور گزشتہ

مذہبی اغلاط کی تصحیح کے لیے آیا ہے۔ ان ظاہری معجزات نے گزشتہ قوموں میں بہت سے فاسد عقیدے پیدا کر دیے تھے۔ جن انبیاء اور بزرگوں سے بکثرت معجزات صادر ہوئے ان میں الوہیت اور خدائی عنصر تسلیم کیا گیا۔ اور اس طرح توحید اور نبوت کی اصل حقیقت جس پر اللہ کے دین کی بنیاد ہے متزلزل ہو گئی۔
اس لیے قرآن نے نہایت وضاحت اور نہایت صفائی کے ساتھ اور نہایت تصریح کے ساتھ ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا اور دُنیا میں توحید و نبوت کی اصل حقیقت قائم کر دی۔ اس سے پہلی آیت میں سُن آئے ہو کہ جب مشرکین نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائشی اور من مانے معجزات صادر کرنے کا مطالبہ کیا تو چونکہ آپ کے دل میں شفقت اور رحمت کوٹ کوٹ کر بھری گئی تھی اس لیے آپ نے بارہا اپنے دل میں یہ خیال کیا کہ اگر اللہ تعالیٰ اپنی قدرت سے ان معجزات کو میرے ہاتھ پر صادر کر دے تو اس سے کیا بعید ہے لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کی صداقت پر اور بے شمار معجزات ظاہر کر دیے تھے کسی ایک کی مصلحتیں اور حکمتیں اس کی متقاضی تھیں کہ مشرکین کے لیے فرمائشی معجزات پورے نہ کیے جائیں اور بتا دیا کہ پیغمبر اس معاملہ میں مختار نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اللہ سبحانہٗ کی طرف سے بطور وعظ اور محبت یہ تنبیہہ نہ آتی اور آپ از خود ہی کفار کا یہ مطالبہ پورا کر دیتے۔ اب یہاں اس آیت میں نبوت کے بارے میں اس غلط تصور کی تردید کی جا رہی ہے کہ نبی براہ راست عالم کائنات میں تصرف پر قادر ہے۔ یہاں قرآن نے نہایت شدت سے اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادے سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اس کے بعد نشانیاں مانگنے والوں کو آفاقی نشانیوں کی طرف متوجہ کیا ہے۔

۳۷۔ اور کہتے ہیں کہ اس پر اس کے پروردگار کی جانب سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی کہہ دو کہ خدا نشانی اتارنے پر قادر ہے۔ لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یعنی ان نشانیوں میں سے کوئی نشانی کیوں نہ اتری جن کی وہ فرمائش کرتے تھے جیسا کہ سورہ بنی اسرائیل میں ان کے اس قسم کے مطالبات کا ذکر ہے۔

وقالوا لن نؤمن لك حتى تفجر لنا من الارض ينبوعا ، او تكون لك جنة من نخيل وعنب فتفجر الانهار خلالها تفجيرا او تسقط السماء كما زعمت علينا كسفا او تاتى بالله والملائكة قبيلا او يكون لك بيت من زخرف او ترقى فى السماء ولن نؤمن لرقيك حتى تنزل علينا كتابا نقرؤه قل سبحان

رَبِّی ھَلْ کُنْتُ اِلَّا بَشَرًا رَّسُوْلًا ہ

اور انہوں نے کہا، ہم اس وقت تک تجھے ماننے والے نہیں جب تک کہ تو اس طرح کی باتیں کرکے نہ دکھا دے مثلاً ایسا ہو کہ تو حکم کرے اور زمین سے ایک چشمہ پھوٹ نکلے۔ یا تیرے پاس کھجوروں اور انگوروں کا ایک باغ ہو اور اس کے درمیان بہت سی نہریں رواں کرکے دکھا دے یا جیسا کہ تو نے خیال کیا ہے آسمان کے ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ہم پر گریں یا اللہ اور اس کے فرشتے ہمارے سامنے آکھڑے ہوں یا ہم دیکھیں کہ سونے کا ایک محل تیرے لیے مہیا ہو یا ایسا ہو کہ تو آسمان پر چڑھ جاتے اور اگر تو آسمان پر چلا بھی گیا تو ہم یہ بات ماننے والے نہیں جب تک تو ایک لکھی لکھائی کتاب ہم پر اتار نہ لاتے اور ہم خود اسے پڑھ کر جانچ نہ لیں۔ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دے سبحان اللہ میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ایک آدمی ہوں خدا کا پیغام لے کر آنے والا اور بس۔

ورنہ ویسے تو آپ پر بے شمار علمی و عملی معجزات و نشانات بارش کی طرح اترتے رہتے تھے۔ ان کے اسی مطالبہ اور فرمائش کے جواب میں فرمایا کہ خدا فرمائشی معجزات دکھلانے سے عاجز نہیں ہے لیکن جن قوانین حکمت و رحمت پر نظام تکوین کی بنیاد ہے تم میں سے اکثر ان کے سمجھنے سے قاصر ہیں ان قوانین کا اقتضاء یہ ہے کہ تمام فرمائشی معجزات نہ دکھلائے جائیں۔[1]

"نشانی" سے مراد محسوس معجزہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ معجزہ نہ دکھائے جانے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ہم اس کو دکھانے سے عاجز ہیں بلکہ اس کی وجہ کچھ اور ہے جسے یہ لوگ محض اپنی نادانی سے نہیں سمجھتے۔[2] یہ بات کہ اللہ قادر تو ہے لیکن اکثر لوگ نہیں جانتے۔ یہ بظاہر نہایت مجمل جواب ہے لیکن اس اجمال میں معانی کا سمندر پوشیدہ ہے۔ لا یعلمون کی تعبیر بتا رہی ہے کہ یہ نادان اور مغرور لوگ اس طرح کی نشانی ظاہر ہونے کے نتائج سے بے خبر ہیں۔ ان کے نزدیک یہ محض ایک کھیل تماشا ہے۔ حالانکہ اگر یہ نشانی ظاہر ہو گئی تو سب کے چھکے چھوٹ جائیں گے۔ اور پھر یہ بھی اسی سے پتہ لگ رہا ہے کہ معجزہ کی فرمائش کرنے والے یہ لوگ خدا کی اس حکمت اور سنت سے واقف نہیں ہیں جو انبیاء اور ان کے مکذبین کے معاملے میں اللہ تعالیٰ نے پسند فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ وہ اپنے رسولوں کی تکذیب کرنے والوں کو فوراً پکڑ لے بلکہ وہ ایک خاص مدت تک مہلت دیتا ہے جس میں ان پر ہر پہلو سے

[1] انوارات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

حجت پوری کر دی جائے، جب یہ حجت پوری ہو جاتی ہے تب خدا ان کی پکڑ کرتا ہے اور یہ بھی اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ نبوت کے مخاطب یہ سمجھ رہے ہیں کہ پیغمبر کی دھمکی جھوٹی ہے یا عذاب بس سے حالانکہ اللہ سبحانہ سرکشوں کو جو ڈھیل دیتا ہے تو اس وجہ سے کہ اس کی تدبیر بڑی محکم ہوتی ہے وہ رسی خواہ کیسی دراز کر دے لیکن یہ ممکن نہیں کہ کوئی اس کے قابو سے باہر ہو جائے۔ آیت میں نشانی سے تو کوئی نشانی بھی مراد ہو سکتی ہے لیکن قرینہ سے پتہ لگتا ہے کہ وہ کوئی ایسی نشانی مانگ رہے ہیں جو یہ ثابت کر دے کہ اگر انہوں نے پیغمبر کی تکذیب کی تو ان پر عذاب آجائے گا۔ ان کو معجزہ عذاب دیکھنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ یہ نہیں جانتے تھے کہ جب تک افراد صالحہ الگ نہ ہو جائیں عذاب نہیں آتا۔

نظامِ تکوینی اور قانونِ حیات

۳۸ - اور زمین پر جو چلنے پھرنے والا جانور یا دو پروں سے اڑنے والا جانور ہے ان کی بھی تم لوگوں کی طرح اُمتیں ہیں۔ ہم نے نہیں چھوڑی ہے لکھنے میں کوئی چیز، پھر سب اپنے پروردگار کی طرف سمیٹے جائیں گے۔ ان آیات میں بعض حکمتوں پر متنبہ کیا گیا ہے جو فرمائشی معجزات دکھلائے نہ جانے میں ملحوظ ہیں یعنی تمام حیوانات خواہ زمین پر رینگتے ہوں یا ہوا میں اڑتے ہوں وہ بھی انسانوں کی طرح ایک اُمت ہیں۔ ان میں سے ہر نوع کو حق تعالیٰ نے ایک خاص وضع اور فطرت پر پیدا کیا جو ان کے معین خواص و افعال کے دائرے کام کرتی ہیں۔ کوئی جانور اپنے افعال و حرکات کے محدود حلقہ سے جو قدرت نے باعتبار فطرت و استعداد کے اس کے لیے مقرر کر دیا ہے۔ ایک قدم باہر نہیں نکال سکتا۔ چنانچہ ابتدائے آفرینش سے آج تک کسی حیوان نے اپنی نوع کے محدود دائرہ عمل میں کسی طرح کی ترقی نہیں کی۔ اسی طرح ہر چیز کی فطرت و استعداد کو خیال کر لیجئے۔ حق تعالیٰ کے علم قدیم اور لوح محفوظ میں تمام انواع و اجناس کی تدبیر و تربیت کے اصول و فروع منضبط ہیں۔ کوئی چیز نہ اس زندگی میں اور نہ مرنے کے بعد اس مکمل انضباط و انصرام سے باہر جا سکتی ہے۔ انسان جنس حیوان میں "با اختیار اور ترقی کن" حیوان ہے۔ اسی کسب و اختیار اور ترقی کن عقل و تمیز کی موجودگی نے اس کے نظامِ تکوینی اور قانونِ حیات کو دوسرے تمام حیوانات سے ایسا اعلیٰ اور ممتاز بنا دیا ہے کہ اب اسے حیوان کہتے بھی شرم آتی ہے وہ برخلاف باقی حیوانات کے دیکھنے سننے اور پوچھنے سے نئی نئی معلومات حاصل کرتا ہے اور قوتِ فکریہ سے ان کو ترتیب دے کر حیات جدید کی طرف ترقی کرتا رہتا ہے۔ وہ نیک و بد میں تمیز کرنے، نافع و ضار کے پہچاننے، آغاز و انجام سمجھنے پر قادر اور کسی عمل کے کرنے یا چھوڑنے میں فی الجملہ آزاد ہے۔ اسی لیے اس کو خدا کی جانب سے ایسے نشانات دکھلائے جاتے ہیں جن میں غور و فکر کرنے

کا موقع مل سکے اور فکر و کسب کی فطری آزادی کو سلب کرنے والے نہ ہوں۔ اور اگر وہ خدا کے دیئے ہوئے قوائے عقلیہ سے ٹھیک ٹھیک طور پر ان میں غور کریں تو ان سے حق و باطل اور نیک و بد کی تمیز کرنے میں کچھ دقت نہ ہو۔ بس ایسے فرمائشی معجزات و نشانات کی درخواست کرنا جو بہمہ وجوہ ایمان لانے پر مجبور کردیں انسان کی فطری آزادی اور اس کے نظامِ ترکیبی کو تباہ کرنے بلکہ انسان کو عام حیوانات کی صف میں اتار ڈالنے کا مترادف ہے۔ اور اگر فرمائشی نشان بہمہ وجوہ مجبور کن نہ ہوں تو ان کا دکھلانا بیکار ہے کیونکہ ان میں بھی وہی غیر ناشی عن دلیل شکوک و شبہات پیدا کر لیے جائیں گے جو ہزاروں غیر فرمائشی نشانات میں کیے جا چکے ہیں۔[1]

آیت کا منشا یہ ہے کہ اگر تم نشانی کے خواہاں ہو تو یہ خدا کی پوری کائنات نشانیوں سے بھری ہوئی ہے زمین پر چلنے والا ہر حیوان اور فضائے آسمانی میں اڑنے والا پرندہ خدا کی نشانی ہے۔ غور کرو تو تم دیکھ سکتے ہو کہ جیسے تمہارے انفرادی اور اجتماعی وجود کے اندر خدا کی قدرت و حکمت کی بے شمار نشانیاں موجود ہیں اسی طرح اس کائنات کی دوسری مخلوقات میں بھی اللہ کی وحدانیت قدرت اور حکمت کے دلائل موجود ہیں۔ جس طرح تم ایک نوع ہو اسی طرح یہ بھی الگ الگ انواع رکھتے ہیں۔ جس طرح تم ایک فطرت رکھتے ہو اسی طرح یہ بھی اپنی ایک مخصوص جبلت رکھتے ہیں۔ جس طرح تم شعور اوراک اور جذبات رکھتے ہو اسی طرح اپنے جبلی تقاضوں اور اپنے منشائے تخلیق کے اعتبار سے یہ بھی اپنے اندر شعور اوراک اور جذبات رکھتے ہیں۔ اگر تم نشانیوں کی تلاش میں ہو تو بتلاؤ تمام کائنات خلقت میں جو کچھ موجود ہے وہ کیا ہے۔ تمام فضائے ہستی جن حیرت انگیز اچنبوں سے بھری ہوئی ہے ان کے لیے تمہاری بولی میں کون سا نام ہے۔ یہ سب کچھ اس کی ہستی و صفات کی نشانیاں نہیں ہیں تو اور کیا ہے۔ زمین کے تمام جانوروں کو دیکھو جو تمہارے قدموں کے پاس ہیں ہوا کے پرندوں کو دیکھو جو تمہارے چاروں طرف اڑ رہے ہیں کس طرح ہم نے تمہاری ہی طرح ان کی امتیں بھی بنا دی ہیں۔ ہر امت اپنی پیدائش اور معیشت اور اپنی ضروریات زندگی کے لیے ایک قانونِ حیات رکھتی ہے۔ جو لوگ علم و بصیرت رکھنے والے ہیں انہیں صحیفہ فطرت کی نشانیوں کے بعد اور کسی نشانی کی احتیاج نہیں ہو سکتی۔

اس آیت پر سرسری نگاہ ڈال کر آگے نہ بڑھو بلکہ اس کے ایک ایک نقطہ پر غور کرو اور دیکھو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ قرآن کیا کہہ رہا ہے وہ بتا رہا ہے کہ لوگو! اگر تمہیں محض نمائش بینی کا شوق نہیں ہے بلکہ فی الواقع یہ معلوم کرنے کے لیے نشانی دیکھنا چاہتے ہو کہ یہ نبی جس چیز کی دعوت لے رہا ہے وہ امرِ حق ہے یا نہیں تو آنکھیں کھول کر دیکھو۔ تمہارے گردو پیش میں ہر طرف نشانیاں ہی نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں۔ زمین کے جانوروں اور ہوا کے پرندوں کی کسی ایک نوع کو لے کر اس کی زندگی پر غور کرو۔ کس طرح اس کی ساخت ٹھیک اس کے مناسب بنائی گئی ہے۔ کس نے اس کی جبلت میں اس کی فطری ضرورتوں کے عین مطابق قوتیں ودیعت کی ہیں کس طرح اس کی رزق رسانی کا انتظام ہو رہا ہے۔ کس طرح اس کی ایک ایک تقدیر مقرر ہے جس کے حدود سے وہ نہ آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ پیچھے ہٹ سکتی ہے۔ کس طرح ان میں سے ایک ایک جانور اور ایک ایک چھوٹے سے چھوٹے کیڑے کی اس مقام پر جہاں وہ ہے خبر گیری، نگرانی، حفاظت اور رہنمائی کی جارہی ہے۔ کس طرح اس سے ایک مقرر اسکیم کے مطابق کام لیا جارہا ہے۔ کس طرح اسے ایک ضابطہ کا پابند بنا کر رکھا گیا ہے اور کس طرح اس کی پیدائش تناسل اور موت کا سلسلہ پوری باقاعدگی کے ساتھ چل رہا ہے۔ اگر خدا کی بے شمار نشانیوں میں سے صرف اسی ایک نشانی پر غور کرو تو تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ اللہ کی توحید اور اس کی صفات کا جو تصور یہ پیغمبر تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے اور اس تصور کے مطابق دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے جس رویہ کی طرف تمہیں دعوت دے رہا ہے وہ عین حق ہے۔ لیکن تم لوگ نہ خود اپنی آنکھیں کھول کر دیکھتے ہو نہ کسی سمجھانے والے کی بات سنتے ہو۔ جہالت کی تاریکیوں میں پڑے ہو اور چاہتے ہو کہ عجائب قدرت کے کرشمے دکھا کر تمہارا دل بہلایا جاتا رہے[1]

ذرا اس پہلو پر بھی غور فرمائیے کہ ہمارے شارحین قرآن نے اسی آیت کی روشنی میں کچھ علمی مسائل بھی حل کیے ہیں۔ مثلاً انسانوں اور دوسرے جانداروں کے بارے میں قرآن نے امثالکم کہہ کر جس مماثلت کی طرف اشارہ کیا ہے وہ کون سی ہے۔ اور کیا انسانوں کی طرح دوسرے جانداروں کا بھی حشر ہوگا۔ اور یہ ما فرطنا فی الکتاب میں کتاب سے کیا مراد ہے۔ لوح محفوظ یا قرآن حکیم اور یا ان دونوں کے سوا کچھ اور؟

مماثلت کے موضوع پر اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے لیکن قرآن کے اولین شارحین نے اس سلسلے میں جو کچھ بتایا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ مماثلت کا

---

[1] تفہیم القرآن

مطلب یہ ہے کہ خدا شناسی، توحید اور تسبیح میں انسان اور حیوان ایک جیسی اُمتیں ہیں۔ اس سے کچھ صوفیا نے یہ نکتہ آفرینی بھی فرمائی ہے کہ سارے جاندار عاقل ہوتے ہیں اور ان پر ذمہ داری کا بوجھ بھی ہے یعنی مکلف بھی ہیں اور ان میں انبیاء بھی ہوتے ہیں لیکن محققین کو ان سے اتفاق نہیں ہے۔ کچھ لوگوں کے خیال میں تخلیق میں مماثلت مراد ہے اور امام مجاہد فرماتے ہیں کہ مماثلت سے ان کی اقسام وانواع مراد ہیں۔ ان انواع واقسام میں ہر نوع کے اندر اپنے اجتماعی وجود کے بقاء وتحفظ کا سامان موجود ہے اور اپنے نوعی مقصد تخلیق کی تکمیل میں ان کا ہر فرد اپنا حصہ ادا کر رہا ہے۔ ذرا بغور مطالعہ کیجئے تو آپ کی عقل دنگ رہ جائے گی۔ ان کے اندر اولاد کی پرورش کا کیسا انتظام ہے، خطرات سے بچاؤ کے لیے کیسی بیداری ہے۔ مستقبل کے حالات سے عہدہ برآ ہونے کے لیے کیسی پیش بینی ہے۔ جماعتی فرائض کا کیسا شدید احساس ہے، کیسی اعلیٰ تقسیم کار ہے، کس درجہ مضبوط نظام امر وطاعت ہے، ضروریات کی فراہمی کے لیے کیسی ان تھک سرگرمی ہے۔ رہائش اور اپنے ذخائر کی حفاظت کے لیے تعمیر کا کیا فنی کمال ہے۔ تلاش وجستجو کا کیسا عمیق جذبہ اور حصول مطلوب کے لیے کیسی زیرکی وہوشیاری اور پھر کیسی جان بازی وقربانی ہے۔

انسان کی فطرت اگر مسخ اور اس کی عقل اگر مفلوج نہیں ہے تو وہ اس اعتراف پر مجبور ہے کہ یہ ایک ہی خدائے وحدہ لاشریک کی قدرت وحکمت کی جلوہ گاہ ہے۔ اگر یہ بات صحیح ہے اور صحیح نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ ہماری عقل پکار کر کہہ رہی ہے تو قرآن اسی کو ماننے کی دعوت دے رہا ہے پھر اسے ماننے اور باور کرنے کے لیے کسی معجزے کی کیا ضرورت ہے۔

بہر حال قرآن نے مماثلت کے اعلان کے ساتھ وجہ مماثلت کو بیان نہیں کیا اور اسی لیے بیان نہیں کیا تاکہ ہر شخص اپنی اپنی صلاحیت، اپنی اپنی استعداد اور اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کا پتہ لے۔

مافرطنا فی الکتاب من شیئ میں الکتاب سے عام شارحین قرآن نے کتاب سے وہ خدائی رجسٹر مراد لیا ہے جس میں سب کچھ مندرج ہے۔ اگرچہ یہ مفہوم لینے کی بھی گنجائش ہے لیکن سیاق وسباق کی روشنی میں یہاں الکتاب سے مراد قرآن مجید معلوم ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح یہ کائنات ان نشانیوں سے مملو ہے جو نبوت کی دعوت کی حقانیت کی گواہ ہیں۔ اسی طرح ہم نے قرآن میں بھی دلائل وبراہین بیان کرنے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ہے۔ ایک ایک دعویٰ کو ناقابلِ انکار دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اور اگر الکتاب سے مراد لوح محفوظ ہو جیسا کہ عام شارحین قرآن کی رائے ہے تو پھر امام ابن جریر کی تشریح بہت زیادہ دل کو بھاتی ہے۔

اللہ سبحانہ نے اپنے نبی سے فرمایا ہے کہ لوگوں سے کہہ دو کہ تم اللہ کو اپنے کردار سے بے خبر نہ سمجھو اور یہ خیال نہ کرو کہ وہ تمہیں تمہارے اعمال کی سزا نہ دے گا۔ وہ تمہارے اعمال سے بے خبر یا ان کو بغیر جزا کے کیسے چھوڑ سکتا ہے وہ تو روئے زمین پر چلنے والے کسی بھی جاندار کے کام سے بے خبر نہیں ہے اور نہ کسی فضا میں اڑنے والے پرندے سے غافل ہے اس نے ان سب کی اجناس اور اصناف بنائی ہیں، جن کے ذریعے ان کو پہچانا جاتا ہے جیسا کہ تمہیں پہچانا جاتا ہے اور اپنے اپنے دائرہ کار میں وہ بھی ایسے تصرفات کرتے ہیں جیسے تم تصرف کرتے ہو۔ ان کے سارے اعمال ام الکتاب میں محفوظ ہیں لہٰذا جو بہائم اور دواب اور پرندوں کے اعمال سے ان کی حرکات اور سکنات سے بے خبر نہیں ہے اور سب کچھ اس کے رجسٹر میں محفوظ ہے وہ تمہارے اعمال سے کیوں کر بے خبر رہ سکتا ہے اور تمہیں تمہارے اعمال کی کیوں کر جزا نہ دے گا اچھے عمل کی اچھی جزا اور بُرے عمل کی بُری جزا دے گا۔

بعض لوگوں نے اس آیت سے تناسخ پر استدلال کیا ہے وہ کہتے ہیں کہ قرآن نے حیوانات کو امم امثالکم کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ مماثلت بالفعل تو موجود نہیں بالقوہ ضرور ہوگی۔ اس صورت میں ماننا پڑے گا کہ کچھ انسانی نفوس کا حیوانات میں حلول ہو۔ یہی تناسخ ہے لیکن واقعہ یہ ہے کہ اس قسم کا استنباط کسی طرح صحیح نہیں ہو سکتا اور بقول صاحب روح المعانی علامہ آلوسی اس کی حیثیت مذہب فاسد کے لیے دلیل کاسد سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ بلاشبہ قرآن نے امم امثالکم کی تعبیر اختیار کی ہے لیکن صرف اتنی بات سے تناسخ ثابت نہیں ہوتا۔ فلسفیانہ تناسخ کی بنیاد بالقوہ مماثلت پر نہیں ہے بلکہ زندگی کے بار بار اعادہ و گردش پر ہے اور مذہبی تاریخ کی بنیاد یہ ہے کہ جزائے عمل کا سارا معاملہ اسی اعادہ و گردش سے مرتب ہوتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ قرآن میں ان دونوں عقیدوں کے لیے کوئی تصریح نہیں ہے۔

ہدایت ملنے کا ضابطہ

۳۹۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا ہے اور گونگے ہیں اندھیروں میں ہیں۔ جس کو خدا چاہے گمراہ کر دے اور جسے چاہے سیدھے راستہ پر ڈال دے۔ نہ کہنے والے کی سنتے ہیں نہ خود دوسروں سے پوچھتے ہیں اور نہ اندھیرے میں کچھ دیکھ سکتے ہیں۔ جب سب قوی اپنی بے اعتدالیوں

سے بیدار کر دیے تو حق کو قبول و تصدیق کا کیا ذریعہ ہو۔ اور یہ جو فرمایا خدا جس کو چاہے گمراہ کر دے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ گمراہ کرنا اسی کو چاہتا ہے جو خود ذرائع ہدایت اپنے اوپر مسدود کر دیتا ہے۔

ولو شئنا لرفعناه بها ولكنه اخلد الى الارض واتبع هواه

اور اگر ہم چاہتے تو ان نشانیوں کے ذریعے اس کا مرتبہ بلند کر دیتے مگر وہ پستی کی طرف جھکا اور ہوائے نفس کی پیروی کی۔[1]

مطلب یہ ہے کہ خدا کا بھٹکانا یہ ہے کہ ایک نادان انسان کو آیاتِ الٰہی کے مطالعہ کی توفیق نہ بخشی جائے اور ایک متعصب غیر حقیقت پسند طالب علم اگر آیاتِ الٰہی کا مشاہدہ کرے بھی تو حقیقت اس کے نشانات اس کی آنکھ سے اوجھل ہو جائیں اور غلط فہمیوں میں اُلجھانے والی چیزیں اسے حق سے دور اور دُور تر کھینچے چلی جائیں۔ بخلاف اس کے اللہ کی ہدایت یہ ہے کہ ایک طالب علم کو علم کے ذرائع سے فائدہ اٹھانے کی توفیق بخشی جائے اور اللہ کی آیات میں اسے حقیقت تک پہنچنے کے نشانات ملتے چلے جائیں۔ ان تینوں کیفیتوں کی بکثرت مثالیں آئے دن ہمارے سامنے آتی رہتی ہیں۔ بکثرت انسان ایسے ہیں جن کے سامنے آفاق والنفس میں اللہ کی بے شمار نشانیاں پھیلی ہوئی ہیں مگر وہ جانوروں کی طرح انہیں دیکھتے ہیں اور کوئی سبق حاصل نہیں کرتے اور بہت سے انسان ہیں جو حیوانات، نباتات، حیاتیات، ارضیات، فلکیات، عضویات علم التشریح اور سائنس کی دوسری شاخوں کا مطالعہ کرتے ہیں۔ تاریخ آثارِ قدیمہ اور علومِ اجتماع کی تحقیق کرتے ہیں اور ایسی ایسی نشانیاں ان کے مشاہدے میں آتی ہیں جو قلب کو ایمان سے لبریز کر دیں، مگر چونکہ وہ مطالعہ کا آغاز ہی تعصب کے ساتھ کرتے ہیں اور ان کے پیش نظر دُنیا اور اس کے فوائد و منافع کے سوا کچھ نہیں ہوتا اس لیے اس مشاہدے کے دوران ان کو صداقت تک پہنچانے والی کوئی نشانی نہیں ملتی بلکہ جو نشانی بھی سامنے آتی ہے وہ انہیں الٹی دہریت، الحاد، مادہ پرستی اور نیچریت ہی کی طرف کھینچ کر لے جاتی ہے۔ ان کے مقابلے میں ایسے لوگ بھی ناپید نہیں ہیں جو آنکھیں کھول کر اس کارگاہ عالم کو دیکھتے ہیں اور ان کا حال یہ ہے۔[2]

برگ درختان سبز در نظر ہوشیار
ہر ورقے دفتریست معرفت کردگار[3]

---

[1] افادات شیخ الاسلام[2] تفہیم القرآن

توحید عبادت کی ایک انفسی دلیل

۴۶ - کہہ دو لوگو دیکھو اگر آجاتے تم پر اللہ کا عذاب یا آجاتے تم پر قیامت، کیا تم ایسی حالت میں خدا کے سوا کسی اور کو پکارو گے۔ اگر سچے ہو تو بتاؤ نہیں بلکہ تم اسی کو مصیبت کے وقت پکارتے ہو، تو جس کو دکھ کے لیے پکارتے ہو وہ اگر چاہتا ہے تو اس کو دور کر دیتا ہے اور جن کو تم شریک بناتے ہو اس وقت ان کو بھول جاتے ہو۔ جب اندھے، بہرے، اگرنگے ہو کر آیات اللہ کو جھٹلایا اور گمراہی کے عمیق غار میں جا پڑے۔ اس پر اگر دُنیا میں یا قیامت میں اللہ کا سخت عذاب نازل ہو تو سچ سچ بتاؤ کہ اس وقت خدا کے سوا کسے پکارو گے۔ دنیا کی چھوٹی چھوٹی مصیبتوں میں گر جاتے ہو تو مجبور ہو کر اسی خدائے واحد کو پکارتے ہو اور سب شرکا کو بھول جاتے ہو۔

فاذا ركبوا فى الفلك دعوا الله مخلصين له الدين

جب وہ سوار ہوتے ہیں کشتیوں میں تو اس وقت سب سے ہٹ کر اپنے اعتقاد کو خالص کر کے صرف اللہ کو پکارتے ہیں۔

جس پر اگر خدا چاہتا ہے تو مصیبت کو دُور بھی کر دیتا ہے۔ اس سے اندازہ کر لو کہ نزول عذاب یا قیامت کی ہولناکیوں سے بچانے والا اللہ کے سوا اور کون ہو سکتا ہے۔ پھر یہ کس قدر حماقت اور اندھاپن ہے کہ اس خدا کے عظمت و جلال کو فراموش کر کے اس کی نازل کی ہوئی آیات کی تکذیب اور فرمائشی معجزات کا مطالبہ کرتے ہو[1]

اس سے پہلی آیت میں ارشاد ہوا تھا کہ تم ایک نشانی مانگتے ہو۔ اس کے جواب میں فرمایا تھا کہ اللہ سبحانہ یقیناً نشانیاں دکھانے کی قدرت رکھتا ہے اور اس نے نشانیاں دکھلا بھی دی ہیں۔ اگر تم نشانیوں کی تلاش میں ہو تو بتاؤ کہ تمام کائنات خلقت میں جو کچھ موجود ہے وہ کیا ہے۔ تمام فضائے ہستی جن حیرت انگیز عجائب سے بھری ہوئی ہے اس کے لیے تمہاری بولی میں کونسا نام ہے۔ یہ کچھ اس کی ہستی و صفات کی نشانیاں نہیں ہیں تو اور کیا ہے۔ زمین کے تمام جانوروں کو دیکھو جو تمہارے قدموں کے پاس ہیں، ہوا کے پرندوں کو دیکھو جو تمہارے اوپر دپرواز کر رہے ہیں۔ جو لوگ علم و بصیرت رکھتے ہیں۔ انہیں صحیفہ فطرت کی ان نشانیوں کے بعد اور کسی نشانی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی حاجت نہیں ہو سکتی لیکن جن لوگوں نے خدا کی دی ہوئی بصیرت تاراج کر دی تو ان کے لیے کوئی نشانی بھی سودمند نہیں۔ اب اس آیت میں ان کو ایک دوسری نشانی کی طرف متوجہ کیا جا رہا ہے جو خود ان کی اپنی ذات میں موجود ہے یہ توحید عبادت کی ایک ناقابل تردید نفسی دلیل ہے۔

اس کا آغاز ارأیتکم سے کیا۔ یہ اسی پارے میں دو جگہ آیا ہے۔ ویسے قرآن میں ارأیت تو کئی جگہ آیا ہے لیکن ارأیتکم ان دو جگہوں کے علاوہ کہیں نہیں آیا ہے۔ سورہ بنی اسرائیل میں ایک جگہ صیغہ واحد کے ساتھ ارأیتک آیا ہے ورنہ عام طور پر ارأیت اور ارأیتم ہی آیا ہے۔ جمہور شارحین قرآن اور علمائے لغت اس کا ترجمہ اخبرونی مجھے بتاؤ کرتے ہیں۔ قاضی بیضاوی اسے استفہام اور تعجب کے لیے بتاتے ہیں اور امام راغب اصفہانی اسے تنبیہ کے لیے کہتے ہیں دراصل آگے آنے والی عجیب و غریب بات کے لیے بطور تنبیہ اور تمہید آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر ان مکذبین اور منکرین سے کہہ دیجیے کہ تم مجھے اپنی سمجھ سے بتاؤ یا اس معاملہ میں اپنی علمی دسترس کے تحت جواب دو کہ اگر تم پر اللہ کا عذاب آجائے جو تم سے پہلی امتوں پر آچکا ہے یا موت اپنی ہولناکیوں کے ساتھ تمہارا استقبال کرے، اس وقت ایک خدا کے دامن رحمت کے سوا کوئی دوسری پناہ گاہ تمہیں نظر نہیں آتی ہے۔ بڑے بڑے مشرک ایسے موقع پر اپنے معبودوں کو فراموش کر کے یگانہ خدا کو پکارنے لگتے ہیں اور صرف اللہ کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ پھیلاتے ہیں۔ یہ اس بات کی واضح اور کھلی دلیل ہے کہ خدا پرستی کی شہادت ہر انسان میں موجود ہے جس پر غفلت و جہالت کے خواہ کتنے پردے ڈال دیے جائیں مگر پھر بھی کبھی کبھی حقیقت ابھر کر سامنے آجاتی ہے۔ اس دلیل کا بنیادی نقطہ یہ ہے کہ انسان کی اصل فطرت میں چونکہ ایک ہی خدا کی شہادت موجود ہے دوسروں کو الٰہ جو وہ مانتا ہے ان کی کوئی شہادت اس کی فطرت میں موجود نہیں ہے بلکہ وہ محض اس کی خیالی پلاؤ ہوتی ہے۔ اس لیے جب اس کی زندگی میں کوئی ایسا مرحلہ آجاتا ہے جو اصل آزمائش کا ہوتا ہے تو انسان اپنے تمام فرضی سہاروں کو بھول جاتا ہے صرف اسی خدا کو پکارتا ہے جس کی شہادت وہ اپنی فطرت میں پاتا ہے۔ ابوجہل کے بیٹے عکرمہ کو اسی قسم کی نشانی کے مشاہدے سے ایمان کی توفیق نصیب ہوئی ہے۔ جب مکہ مکرمہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فاتحانہ داخل ہوئے تو عکرمہ جدہ کی طرف بھاگ گئے اور ایک کشتی پر سوار ہو کر حبشہ روانہ ہو گئے۔ راستہ میں سخت طوفان آیا اور کشتی خطرے میں پڑ گئی۔ اول اول تو دیویوں اور دیوتاؤں کو پکارا جاتا رہا مگر طوفان کی شدت بڑھی اور مسافروں کو یقین ہو گیا کہ اب

کشتی ڈوب جائے گی تو سب کہنے لگے کہ یہ وقت اللہ کو پکارنے کا ہے وہی چاہے تو ہم بچ سکتے ہیں اس وقت عکرمہ کی آنکھیں کھلیں۔ اور ان کے دل نے گواہی دی کہ اگر یہاں اللہ کے سوا کوئی مددگار نہیں تو کہیں اور کیوں ہو۔ یہی تو وہ بات ہے جو اللہ کا ایک بندہ ہمیں بیس برس سے سمجھا رہا ہے۔ اور ہم خواہ مخواہ اس سے لڑ رہے ہیں۔ یہ عکرمہ کی زندگی کا ایک انقلابی وقت تھا۔ انہوں نے اسی وقت خدا سے عہد کر لیا کہ اگر میں اس طوفان سے بچ گیا تو سیدھا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جاؤں گا اور ان کے ہاتھ میں ہاتھ دوں گا۔ چنانچہ انہوں نے اپنے اس عہد کو پورا کیا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر نہ صرف مسلمان ہوئے بلکہ اپنی باقی عمر اسلام کی خدمت میں گزار دی۔

قرآن نے سورہ فاتحہ میں عبادت اور استعانت دونوں کو اللہ کے لیے خاص کر لیا۔ ایاك نعبد وایاك نستعین میں غیر اللہ کی عبادت اور غیر اللہ سے استعانت کو ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔ اس میں اول تو عبادت کے ساتھ استعانت کا بھی ذکر کیا گیا ہے پھر دونوں جگہ مفعول کو مقدم کیا گیا ہے جو حصر کا فائدہ دیتا ہے۔ یہاں اس آیت میں بل ایاہ تدعون میں دعا سے استعانت ہی مراد ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ مشرکین مکہ کے شرک کی انواع و اقسام بیان کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

> اقسام شرک میں سے ایک یہ ہے کہ مشرکین اپنی حاجتوں میں غیر اللہ سے استعانت کرتے تھے مثلاً بیمار کی شفایابی اور فقیر کی غنا وغیرہ، اور ان کے لیے نذریں مانتے تھے اور ان کی وجہ سے اپنی مراد پوری ہونے کی آس رکھتے تھے اور برکت حاصل کرنے کی امید پر ان کے ناموں کا ورد کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان پر یہ واجب کر دیا کہ اپنی نمازوں میں کہا کریں ایاك نعبد وایاك نستعین اور نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا لا تدعوا مع اللہ احداً تم اللہ تعالیٰ کے ساتھ کسی کو نہ پکارو۔ اس آیت میں دعا سے عبادت مراد نہیں جیسا کہ کچھ شارحین قرآن کا خیال ہے بلکہ دعا سے مراد استعانت ہے جیسا کہ قرآن میں ہے بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون الیہ بلکہ تم اسی کو پکارو گے سو وہ ہی تمہاری تکلیف دور کرے گا۔ (حجۃ اللہ البالغہ جلد اول ص ۶۲)

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ از روئے قرآن جیسے غیر اللہ کی عبادت حرام ہے ایسے ہی غیر اللہ سے دعا اور استعانت کا تعلق بھی ممنوع ہے بلکہ غیر اللہ سے دعا و استعانت کا تعلق ہی مشرکین مکہ کا اصل شرک تھا۔ چنانچہ شاہ ولی اللہ محدث دہلوی ایک مقام پر لکھتے ہیں:

> اللہ تعالیٰ نے مکہ کے مشرکوں کو اس لیے کافر فرمایا کہ انہوں نے ایک سنگ کو کر

جو ستو گھول گھول کر پلاتا تھا جس کا نام لات تھا حاجت روائی کا منصب دے رکھا تھا
اور تکالیف و مصائب کے مواقع پر وہ اس سے استعانت کرتے تھے۔
(البدور البازغہ)

قاضی ثناء اللہ پانی پتی ارشاد الطالبین میں لکھتے ہیں :
عبادت مرغیر خدا را جائز نیست و نہ مدد خواستن از غیر حق
اللہ کے علاوہ کسی کی عبادت بھی حرام اور استعانت بھی۔

البدور البازغہ ہی میں شاہ ولی اللہ ایک مقام پر لکھتے ہیں کہ مشرکین کا عقیدہ تھا کہ سارے جہاں کا مدبر تو صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن وہ اپنے بعض بندوں کو بعض مخصوص علاقوں میں تصرف کرنے کا اختیار عطا فرما دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ مشرکین غیر اللہ سے استعانت کرتے تھے مگر ان کو مستقل سمجھ کر استعانت نہ کرتے تھے بلکہ وہ ان کو عون الٰہی اور امداد الٰہی کا مظہر سمجھ کر استعانت کرتے تھے اور یہی شرک ہے کیونکہ دنیا میں کسی مشرک نے غیر اللہ کو حقیقی مستعان نہیں سمجھا بایں طور کہ اس کو واجب الوجود تسلیم کیا ہو۔ اور قدرت و طاقت کا بالاستقلال منبع اس کو یقین کیا ہو بلکہ مشرکین عطائی اختیارات کے تحت ان سے استعانت کرتے تھے۔ شاہ صاحب نے الفوز الکبیر میں اس پر تفصیلی اور سیر حاصل بحث کی ہے۔

شرک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی اور کے لیے ان صفات میں سے کوئی چیز ثابت کرے جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ خاص ہیں۔ مثلاً جہان میں اس ارادے سے تصرف کرنا جس کو کن فیکون کہا جاتا ہے یا علم ذاتی ثابت کیا جائے جو بغیر حواس اور دلیل عقلی اور خواب والہام وغیرہ کے ثابت ہو، یا، بیمار کے مرض کو دور کرنے کی صفت ثابت کی جائے یا کسی شخص پر ایسی پھٹکار اور ناراضگی ڈالی جائے کہ اس کی وجہ سے اس پر رزق تنگ ہو جائے یا وہ بیمار ہو جائے یا اس کو شفا ہو جائے یا کسی شخص پر رحمت کی جائے جس کی بنا پر اس پر رزق کی وسعت ہو جائے اور اس کا بدن صحیح ہو جائے اور وہ خوشحال ہو جائے۔ مشرکین کسی کو اللہ تعالیٰ کے ساتھ اجسام و جواہر کے پیدا کرنے اور بڑے بڑے کاموں کی تدبیر میں شریک نہیں ٹھہراتے تھے اور کسی کے لیے یہ قدرت ثابت نہیں کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کام کا فیصلہ کر چکتا ہے تو وہ اسے ٹال سکتے ہیں۔ ان کا شرک یہ تھا کہ بعض بندوں کے بارے میں خیال کرتے

تھے کردہ کچھ مخصوص کام کر سکتے ہیں اور ان کا یہ خیال بھی تھا کہ علی الاطلاق تو بادشاہ اللہ کی ذات ہے لیکن وہ اپنے کچھ بندوں کو حاجت روائی کی خلعت سے مشرف کر دیتا ہے اور ان کی رضامندی اور ناراضگی کو سب بندوں پر ترجیح دیتا ہے۔ جس طرح ایک بڑی شان والا بادشاہ اپنے مخصوص غلاموں کو اطراف مملکت میں بھیجتا ہے اور ان جزوی معاملات میں تصرف کا اختیار دے دیتا ہے تاآنکہ بادشاہ سے اس کے خلاف کوئی حکم صادر ہو بادشاہ ان جزوی امور کی تدبیر کی طرف توجہ نہیں کرتا اور ان سب لوگوں کے معاملات ان غلاموں کے سپرد کر دیتا ہے اور ان لوگوں کے بارے میں ان کی سفارش منظور کرتا ہے جو ان کی خدمت میں رہتے ہیں۔ اسی وجہ سے مشرک لوگ اللہ تعالیٰ کے مخصوص بندوں کے تقرب کو ضروری قرار دیتے تھے تاکہ ان کو بادشاہ مطلق کے یہاں آسانی سے قبولیت حاصل ہو اور ان سے تقرب حاصل کرنے والوں کے حق میں ان کے معاملات کے پورا ہونے میں ان کی سفارش قبول ہو۔ اور ان ہی امور کے پیش نظر شرک پسند طبیعتیں ان خاص بندگان خدا کو سجدہ جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے نام پر جانور ذبح کرتے ہیں، ان کے ناموں کی قسمیں کھاتے ہیں اور اہم معاملات میں ان سے کن فیکون کی قدرت کے تحت استعانت کرتے ہیں اور مشرکین پتھر اور پیتل کی مورتیاں بھی بناتے تھے مگر ان مورتیوں کو ان بزرگوں کی توجہ کا قبلہ سمجھتے تھے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَآ اِلٰٓى اُمَمٍ مِّنْ قَبْلِكَ فَاَخَذْنٰهُمْ بِالْبَاْسَآءِ وَ
الضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَتَضَرَّعُوْنَ ﴿۴۲﴾ فَلَوْلَآ اِذْ جَآءَهُمْ بَاْسُنَا
تَضَرَّعُوْا وَلٰكِنْ قَسَتْ قُلُوْبُهُمْ وَزَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطٰنُ مَا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۴۳﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ
اَبْوَابَ كُلِّ شَيْءٍ ۭ حَتّٰٓي اِذَا فَرِحُوْا بِمَآ اُوْتُوْٓا اَخَذْنٰهُمْ بَغْتَةً
فَاِذَا هُمْ مُّبْلِسُوْنَ ﴿۴۴﴾ فَقُطِعَ دَابِرُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ۭ
وَالْحَمْدُ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿۴۵﴾

اور بلاشبہ ہم نے تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف
انبیاء روانہ کیے پھر ان قوموں کو سختی اور محنت میں گرفتار کیا۔
شاید وہ اللہ کے حضور عجز و نیاز کریں[۴۲]۔ پھر ایسا کیوں نہیں
ہوا کہ جب ہماری جانب سے ان پر گرفت آئی تو وہ اپنی اپنی
بدعملیوں پر ہمارے حضور گڑگڑاتے لیکن ان کے دل

سخت پڑ گئے تھے اور ان کی بدعملیوں کو شیطان نے ان کی نگاہوں میں سجا دیا تھا[۴۸]، پھر جب وہ ان باتوں کو طاق نسیان بنا بیٹھے جن کی ان کو یاد دہانی کرائی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے کھول دیے تاآنکہ جب وہ ان نعمتوں پر خوب اترا گئے جو ان کو عطا ہوئی تھیں تو ہم نے اچانک ان کی گرفت کر لی۔ بس وہ ناگہاں ناامید ہو کر رہ گئے[۴۹] لہٰذا ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جو ظلم کار تھے اور ہر طرح کی ستائش اس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔[۵۰]

نتائج میں تدریج و امہال

جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے مقدار و اوقات کے احکام مقرر ہیں اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشو و نما کے بعد ظہور میں آتے۔ مثلاً فطرت کا قانون یہ ہے کہ اگر پانی آگ پر

رکھا جائے گا تو وہ گرم ہو کر کھولنے لگے گا۔ لیکن پانی کے گرم ہونے اور بالآخر کھولنے کے لیے حرارت کی ایک خاص مقدار ضروری ہے اور اس کے ظہور و تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ایک مقررہ وقت تک انتظار کیا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پانی چولہے پر رکھو اور وہ فوراً کھولنے لگے۔ وہ یقیناً کھولے گا لیکن اس وقت جب حرارت کی مقررہ مقدار بتدریج تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ ٹھیک اسی طرح یہاں انسانی اعمال کے نتائج بھی اپنے مقررہ اوقات ہی میں ظاہر ہوتے ہیں۔ اور ضروری ہے کہ جب تک اعمال کے اثرات ایک خاص مقررہ مقدار تک نہ پہنچ جائیں۔ نتائج کا انتظار کیا جائے اس صورتِ حال سے تدریج و امہال کی حالت پیدا ہو گئی اور عمل حق اور عمل باطل دونوں کے نتائج کے ظہور کے لیے "تاجیل"، یعنی ایک معین وقت کا ٹھہراؤ ضروری ہو گیا۔ دونوں کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہو جائیں گے۔ اپنی مقررہ اجل یعنی مقررہ وقت پر ظاہر ہوں گے۔ اس تاجیل کے لیے کوئی ایک ہی مقررہ مدت نہیں ہے۔ ہر حالت کا ایک خاصہ ہے اور ہر گرد و پیش اپنا ایک خاص مقتضا رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک خاص حالت کے لیے مقررہ مدت کی مقدار بہت تھوڑی ہو اور ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ ہو۔

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ایک قوم ظلم و بدعملی میں مبتلا ہوتی ہے اس کے باوجود ہر طرح کی خوش حالیاں اسے ملتی رہتی ہیں تب لوگ دھوکہ میں پڑ جاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ظلم و بدعملی کے نتائج کیا ہوتے ؟ لیکن یہ اس لیے نہیں ہوتا کہ جزائے عمل کا قانون نہیں بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے ہر چیز کی طرح مفاسد کے نشو و نما اور بلوغ کے لیے بھی مقدار اوقات کا پیمانہ ٹھہرا دیا ہے جب تک وہ وقت نہیں آتا نتائج آشکارا نہیں ہوتے چنانچہ اسی حقیقت کی طرف ان آیات میں اشارہ کیا ہے۔ قرآن نے اس حقیقت کو قانون امہال سے بھی تعبیر کیا ہے یعنی مہلت اور ڈھیل دینے کا قانون۔

۴۷۔ اور بلاشبہ ہم نے تم سے پہلے بہت سی قوموں کی طرف انبیاء روانہ کیے پھر ان قوموں کو سختی اور محنت میں گرفتار کیا۔ شاید وہ اللہ کے حضور عجز و نیاز ظاہر کریں۔ اس سے پہلے نبوت سے لوگوں کے مطالبہ کا ذکر کیا تھا کہ کوئی عذاب کی نشانی ظاہر کرو۔ یہاں تاریخی شہادت لا کر بتایا جا رہا ہے کہ ماضی میں جن لوگوں نے ایمان لانے کی شرط نشانی اور آیت کو مقرر کیا ان کو ایمان کی سعادت نصیب نہیں ہوئی۔ چونکہ معاندین کو حق و باطل کی تمیز کی قوت نہیں اور یقین کی سعادت سے محروم ہوتے ہیں اس لیے بڑی سے بڑی نشانی بھی ان کو شک و شبہ کے گرداب سے باہر نہیں نکال سکتی وہ کبھی اس کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور کبھی اس کو سحر اور جادو سمجھ کر اس کی تکذیب کرتے ہیں۔

کبھی فریب اور قوتِ شیطانی کا ان کو دھوکا ہوتا ہے اس لیے معجزات سے بھی ان کو ہدایت نہیں ہوتی۔ حجت کے لیے ایک دفعہ ان کو معجزہ دکھایا گیا تو ان کا شبہ رفع نہیں ہوا، پھر معجزہ طلب کرتے ہیں تو قرآن کہتا ہے کہ اب بھی ان کی تسلی نہیں ہوگی۔ اس سورت میں ان مراتب کو بیان کیا ہے۔ اب یہاں تاریخ کے حوالہ سے بتایا جا رہا ہے کہ آپ سے پہلے بھی ہم نے قوموں میں رسول روانہ کیے ہیں۔ انہوں نے بھی اپنے پیغمبروں کے ساتھ یہی وطیرہ اختیار کیا۔ معجزات و آیات کی تکذیب کی اور انبیاء کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ ہم نے اولاً ان کی باساء اور ضراء کی حالت پیدا کر کے تربیت کی۔ باساء تنگی کی حالت کو کہتے ہیں۔ جنگ اور فقر کی وجہ سے جو پریشانی پیدا ہوتی ہے۔ اور ضراء کے معنے ہیں اس حالت کے جو قحط، خشک سالی، تکلیف اور بدحالی کی صورت میں رونما ہوتی ہے۔ یہ اللہ کا قانون آزمائش ہے۔ یگانوں اور بیگانوں دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ یگانوں میں اس لیے ہوتا ہے کہ پتہ لگ جائے کہ مومن ہونے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ایمان کا اقرار کر لیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ ان تمام آزمائشوں میں استقامت کا مظاہرہ کیا جائے جو ایمان کی راہ میں مشکلات کی صورت میں پیش آتی ہیں گویا یگانوں میں باساء اور ضراء کی حالت کی نمائش استقامت اور ثابت قدمی دیکھنے کے لیے اور کھرے کو کھوٹے سے ممتاز کرنے کے لیے ہوتی اور بیگانوں میں یہی حالت اس لیے ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے حضور عجز و نیاز کریں اور بدعملیوں سے باز آجائیں۔ شدائد کے ذریعے تربیت اللہ کی سنت ہے۔ باساء اور ضراء کے ذریعے پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کا وہ لوگ شکار ہوئے لیکن اس کے باوجود ان کی آنکھیں نہیں کھلیں اور ان میں عجز و نیاز رونما نہیں ہوا۔ آیت کے آخر میں لعلھم یتضرعون، فرما کر اشارہ کر دیا کہ ان کو باساء اور ضراء میں مبتلا کرنے کا منشا عذاب نہیں تھا بلکہ یہ تھا کہ مصیبت میں طبعاً ہر شخص کو خدا یاد آتا ہے مصیبت میں پڑ کر ان کو بھی خدا یاد آجائے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس سے مقصود ان کی تربیت تھی۔ اور یہ بھی ارشاد کے انداز بیان سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کسی قوم پر دفعۃً اور یکبارگی عذاب نازل نہیں فرماتے بلکہ بطور تنبیہ کے تھوڑی تھوڑی سزائیں نازل فرماتے ہیں جن کے ذریعے سعید و نیک بخت لوگ اپنی غفلت سے باز آکر صحیح راستہ پر لگ سکیں۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا کہ جو تکلیف اور مصیبت دنیا میں بطور سزا کے دی جاتی ہے اس کی صورت اگرچہ سزا کی ہوتی ہے لیکن حقیقت میں یہ سزا نہیں ہوتی بلکہ غفلت سے چونکانے اور بیدار کرنے کے لیے تربیت ہوتی ہے۔

شیطان کی تزئین اور دلوں کی قساوت

۴۸ - پھر ایسا کیوں نہیں ہوا کہ جب ہماری جانب سے ان پر گرفت آئی تو وہ اپنی بدعملیوں پر ہمارے حضور گڑگڑاتے لیکن ان کے دل سخت ہو گئے تھے اور ان کی بدعملیوں کو شیطان نے سجا دیا تھا۔ جملہ کے آغاز میں لولا لا کر بتا دیا کہ بجز عناد اور قساوت قلب اور خود بینی کے کوئی چیز ان کو خدا کی جناب میں گڑگڑانے سے مانع نہ تھی۔ اس میں خدا کی جناب میں نہ گڑگڑانے اور عذاب الٰہی کو دیکھ کر توبہ نہ کرنے کے دو سبب بتائے گئے ایک دلوں کی قساوت اور دوسرے شیطان کی تزئین۔ دلوں کی قساوت اور سنگدلی تو یہ ہے جیسا کہ قرطبی نے لکھا ہے کہ کفر اور معاصی پر ڈٹے رہے۔ دل میں قساوت یکبارگی نہیں بلکہ ایک عرصہ دراز تک گناہوں کی مشق و تمرین سے پیدا ہو جاتی ہے۔ پہلے پہل جب انسان اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف کوئی بات یا کوئی کام کرتا ہے تو اس کے صاف اور سادہ لوح دل پر ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اگر ہوش میں آکر وہ توبہ و استغفار کرتا ہے اور پشیمان و نادم ہوتا ہے تو وہ داغ مٹ جاتا ہے لیکن پھر اگر وہ ہی گناہ کرتا ہے اور بار بار کرتا ہے تو وہ داغ بڑھتا جاتا ہے یہاں تک کہ وہ پورے دل کو سیاہ کر دیتا ہے اور قلب ہر قسم کے احساس سے محروم ہو جاتا ہے۔ اس کے سامنے عبرت کی وعظ و تلقین ہوتی ہے، آیات الٰہی کی تجلی آتی ہے لیکن اس کے باوجود اس کا دل نرم نہیں ہوتا۔ اسی بات کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح بیان فرمایا ہے۔

> بندہ جب کوئی گناہ کرتا ہے تو اس کے دل میں داغ کا ایک سیاہ نقطہ پڑ جاتا ہے۔ اگر اس نے اپنے کو گناہ سے الگ کر لیا اور خدا سے مغفرت مانگی اور توبہ کی تو دل صاف ہو جاتا ہے اور اگر اس نے پھر وہی گناہ کیا تو وہ داغ بڑھ جاتا ہے یہاں تک کہ پورے دل پر چھا جاتا ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہی دل کا وہ زنگ ہے جس کا ذکر اس ارشاد میں ہے بل ران علی قلوبھم ما کانوا یکسبون۔
>
> (ترمذی)

اور شیطان کی تزئین یہ ہے کہ گناہوں، خدا کی کھلم کھلا بغاوت اور خالص کافرانہ زندگی کو ان کی نگاہوں میں حسین و خوبصورت بنا کر پیش کرے، ہر نافرمانی کے لیے ایک تاویل اور ہر بغاوت کے لیے نت نئی توجیہات، پیش کر کے ان کو خدا کی نافرمانی اور بغاوت پر لگاتے۔ اور بتاتے کہ اسی میں بقائے دوام ہے گویا خدا کی ہر بغاوت کو شجرۃ الخلد اور ملک لا یبلیٰ کی صورت میں

پیش کرے اسکے لیے آج کی اصطلاحی زبان میں کبھی قومیت کا اور کبھی وطنیت کا لبادہ پہن کر اپنے چاہنے والوں کو گدگداتے ۔ ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت میں قومی ترقی کا راز سمجھاتے اور جن افکار اعمال اور اخلاق کی وجہ سے جنگ وغیرہ کی سختیاں اور قحط وغیرہ کی مصیبتیں آرہی ہیں ۔ ان کو طبعی اور قدرتی نتائج ہی نہیں بلکہ بین الاقوامی حالات کا ناگزیر تقاضا بتاتے شیطان کا سارا کاروبار اعمال کی تزئین کے بل پر چلتا ہے وہ انسان کو انفرادی و اجتماعی طور پر خدا کی نافرمانی اور کافرانہ زندگی میں ایک سبز باغ دکھاتا ہے ۔ کسی کو انفرادی لطف ولذت اور کامیابیوں کی اُمید کسی کو قومی سربلندی کی توقع کسی کو نوع انسانی کی فلاح و بہبود کا یقین ، کسی کو اعمال کے ذریعے صداقت پہنچ جانے کا اطمینان ، کسی کو یہ بھروسہ کہ اسلام ایک پرائیویٹ اور نجی چیز ہے ۔ اس کا معاشی ، سیاسی اور اجتماعی زندگی سے کوئی تعلق نہیں اور کسی کو یہ تسلی کہ آخرت میں خدا کی گرفت سے فلاں کے طفیل اور صدقے بچ جائیں گے ۔ غرض جو شخص جس قسم کی تزئین سے قابو میں آسکتا ہے اس کے سامنے وہ ہی پیش کرتا ہے اور پھانس لیتا ہے ۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ کسی چیز کو مزین تین طرح سے ہوتا ہے ۔ ایک یہ کہ کسی چیز کو فی الواقع حسین ہی پیدا کرنا ، جیسے قرآن ہی میں ہے زینا السماء الدنیا دوسرے یہ کہ کسی چیز کو بغیر تخلیق کے مزین کرنا جیسے دلہن کا بناؤ سنگار ہوتا ہے ۔ تیسرے یہ کہ کسی چیز کو انسانی طبیعت کے لیے حسین بنا دینا چاہا ہے وہ فی الواقع حسین نہ ہو ۔ قرآن میں کہیں تزئین کا فاعل شیطان ہے جیسے اس آیت میں اور کہیں اللہ تعالیٰ ہے جیسے کذالک زینا لکل امۃ عملھم اور اس کا فاعل انسان ہے جیسے زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم شرکاءھم اس لیے ضابطہ یہ ہے کہ تزئین اگر پہلے معنے میں ہو تو فاعل اللہ تعالیٰ ہے کیونکہ تخلیق و ایجاد اسی کا کام ہے اور دوسرے معنے کے لحاظ سے تزئین کا فاعل انسان اور تیسرے معنے کی رُو سے تزئین کا فاعل شیطان ہے اور جہاں فاعل موجود نہ ہو مقام کی مناسبت سے فاعل مقرر کیا جاتے گا جیسے زین للمسرفین ما کانوا یعملون ۔

آزمائشوں کا تنوع

۴۹ ۔ پھر جب وہ ان باتوں کو طاق نسیاں بنا بیٹھے جن کی یاد دہانی کرائی گئی تھی تو ہم نے ان پر ہر طرح کی خوشحالیوں کے دروازے کھول دیے تا آنکہ جب ان نعمتوں پر اترا گئے جو ان کو عطا

ہوئی تھیں تو ہم نے ان کو اچانک پکڑ لیا بس وہ ناامید ہو کر رہ گئے۔ گزشتہ آیتوں میں عذاب آنے کا احتمال بیان ہوا تھا لقد ارسلنا الی امم میں واقعات کا حوالہ دیا ہے کہ پہلے زمانے میں اس طرح کے عذاب آ چکے ہیں اور یہ بھی یہاں بتا دیا کہ جب مجرم کو ابتداءً ہلکی تنبیہہ کی جاتی تو اس کو معاً خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ سخت دلی اور اغوائے شیطانی سے اسے معمولی نہ سمجھے۔ موضح القرآن میں ہے کہ گنہگار کو اللہ تعالیٰ تھوڑا سا پکڑتا ہے۔ اگر وہ گڑگڑایا اور توبہ کی تو بچ گیا، اور اگر اتنی پکڑ نہ مانی تو پھر بھلا دیا اور وسعت عیش کے دروازے کھول دیے۔ جب نعمتوں کی شکر گزاری کی اور انعام و احسان سے متاثر ہونے کے بجائے خوب گناہ میں غرق ہوا تو دفعتہً بے خبری میں پکڑ لیا گیا۔ یہ اشارہ ہے کہ آدمی کو گناہ پر تنبیہہ پہنچے تو شتاب توبہ کرے یہ راہ نہ دیکھے کہ اس سے زیادہ سختی آئے تو یقین کروں[1]

پہلے اقوام سے متعلق قانون کا ذکر ہوا ہے اور یہ ارشاد فرمانے کے بعد کہ قوموں اور امتوں کو جھنجھوڑنے کے لیے انبیاء روانہ کیے جاتے ہیں تو ابتداءً انکار و سرکشی اختیار کرنے والوں کو باساء اور ضراء میں مبتلا کیا جاتا ہے لیکن جن کے دل سخت اور سینے سیاہ ہوتے ہیں وہ اللہ سبحانہ کی جانب سے ہونے والی ان تنبیہات کو مختلف تاویلیں کر کے سمجھتے ہیں کہ یہ تنبیہات نہیں ہیں بلکہ دنیا کے عام حوادث و واقعات ہیں۔ انسانی اخلاق و کردار سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے یہاں قرآن نے بتلایا ہے کہ اس قسم کی تاویلی ذہنیتیں رکھنے والی قوموں کے ساتھ قدرت کا عام دستور یہ ہے کہ کچھ دنوں کے لیے ان کو ڈھیل دی جاتی ہے ڈھیل ہی نہیں بلکہ گزشتہ حالات سے بھی زیادہ آسانیوں اور آسائشوں کے ان پر دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور "کل شیء"، یعنی زندگی کی ہر قسم کی چیزوں کے اور زندگی کے تمام شعبوں کے ابواب اور دروازے ان پر وا ہو جاتے ہیں۔ اور پھر ان ساری ترقیوں اور اولوالعزمیوں کے باوجود قدرت کا مخفی ہاتھ اچانک ان کو پکڑ لیتا ہے اور اس طرح پکڑتا ہے کہ ان کا سارا کیا کرایا برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ تو ان کے آخری انجام کا حال ہے لیکن سرکش و طاغی قوموں کے ساتھ اللہ سبحانہ کا یہ انتقامی برتاؤ بعض اوقات ہر سرفرازیوں کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے ان لوگوں کے لیے بڑا صبر آزما اور انتہائی خطرات کا سبب بن جاتا ہے جنہیں انجام سے پہلے انتقام کے اس عجیب و غریب عبوری دور میں زندگی گزارنی پڑتی ہے اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جو حال قوموں کا ہے۔ افراد کے ساتھ بھی اللہ سبحانہ کبھی اسی قسم کا سلوک فرماتے ہیں۔ یعنی دیا تو جاتا ہے ان کو بطور سزا لیکن اپنی جگہ وہ اس خیال میں مگن رہتے ہیں کہ وہ ہی اللہ کے لاڈلے ہیں اور ان لوگوں میں سے ہیں جنہیں خدائی نوازشوں کے لیے ہی پیدا کیا گیا ہے۔

قوموں کی حد تک تو شاید فتحنا علیہم ابواب کل شیئ کا یہ سزائی پیمانہ ایسا نہیں ہے جسے جاننے والے بآسانی نہیں جان سکتے۔ آخر دنیا میں ایسی قومیں ہیں جن کی زندگی کا ہر شعبہ خدا اور اس کے رسول کی تعلیم کی کھلم کھلا بغاوت پر قائم ہے اور اسی کے ساتھ ان کی ہر بغاوت ان کے سامنے ایسے دنوں کو لا رہی ہے جن میں ان کے لیے کسی نہ کسی خیر کا دروازہ کھولا گیا ہے۔ ان ہی بغاوتوں اور طغیانیوں میں وہ جس قدر سرشاریاں دکھاتے ہیں اسی حد تک ابواب کل شیئ ہر چیز کے دروازے ان پر وا ہوتے جاتے ہیں۔

بہرحال قوموں کی حد تک تو یہ مسئلہ صاف اور واضح ہے۔ البتہ افراد کا مسئلہ ذرا مشکل ہے۔ لیکن اس میں بھی جو کچھ دشواری ہے وہ دوسروں کے اعتبار سے ہے۔ ان لوگوں کو جو خدائی گوناگوں نعمتوں سے ہمدوش ہو رہے ہیں ان کو دیکھنا چاہیے کہ خدا اور اس کی مرضیات کے ساتھ ان کی زندگی کا کیا تعلق ہے؟ اگر صورت حال یہ ہے کہ جس حد تک اللہ سے اللہ کی مرضیات سے ان کی زندگی میں تصادم پایا جاتا ہے اسی حد تک نعمتوں میں کشادگی ہو رہی ہے تمرد اور سرکشی کے میدانوں میں جتنے رواں دواں ہیں اسی قدر دنیا اور دنیا کی نعمتیں بھی ان کے قدم چومتی جا رہی ہیں تو ایسی حالت میں ان کو یقین کر لینا چاہیے کہ بوقلموں نعمتوں کا یہ تاج ان کے سروں پر اس لیے رکھا گیا ہے کہ وہ اندھے ہو کر جئیں اور اندھے ہی ہو کر دنیا سے کوچ کریں۔ نعمتوں کی یہ فراوانی اس بات کی نشانی ہے کہ اللہ سبحانہ ان سے انتقام لینا چاہتا ہے اور ایسا انتقام کہ جو نکلنے کی ساری راہیں ان پر بند کر دی گئی ہیں۔ ارشادِ نبوت میں اسی کو افراد کی حد تک استدراج کہا گیا ہے۔ مسند امام احمد میں عقبہ بن عامر کے حوالے سے ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

جب تم دیکھو کہ باوجود نافرمانیوں کے کسی پر خدائی انعامات کی بارش ہو رہی ہے سمجھ لو کہ یہ استدراج ہے اور حضور نے قرآن کی یہی آیت فتحنا علیہم ابواب کل شیئ تلاوت فرمائی۔

مطلب یہ ہے کہ قوموں کی حد تک اللہ کا قانون یہ ہے کہ جب نبوت کی تکذیب کرنے والے خدا کی تنبیہات کو نظر انداز کر دیتے ہیں تو خدا ان کی رسی دراز کر دیتا ہے۔ ان کی تمام مطلوبات کے

دروازے ان پر کھول دیے جاتے ہیں یہاں تک کہ وہ اپنی کامیابیوں پر مگن ہوئے اتر اتے اور اکڑ لے لگتے ہیں۔ یہ وقت ان کے پیمانے کے لبریز ہونے کا ہوتا ہے۔ اس وقت خدا ان کی دفعتہً پکڑ کرتا ہے پھر وہ بالکل مایوس اور ششدر ہو کر رہ جاتے ہیں۔

یہاں سے یہ حقیقت بھی معلوم ہو گئی کہ جاہ و ثروت، خوشحالی اور اقبال مندی کو صداقت وحقانیت کی دلیل سمجھ لینا تمام تر حماقت و سفاہت ہے۔ اس کا لازمی تعلق حق و صداقت سے نہیں۔ قرآن کے نقطہ نظر سے یہ تندرست ہونے کی نہیں بلکہ بیمار ہونے کی بھی نشانی ہے اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ نویں پارے کے آغاز میں آرہی ہے۔

ظلم اور ظلم کاروں کا خاتمہ

۵۰۔ لہٰذا ان لوگوں کی جڑ کاٹ دی گئی جو ظلم کار تھے اور ہر طرح کی ستائش اس اللہ کے لیے ہے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے۔ ظالموں کا استیصال بھی اس کی ربوبیت عامہ کا اثر اور مجموعہ عالم کے لیے رحمت عظیم ہے اس لیے یہاں حمد و شکر کا اظہار فرمایا[1] اس کی وجہ بالکل واضح اور صاف ہے کہ جو درخت زہریلا ہو چکا اور اب صرف زہریلا ہی پھل دے رہا ہے اس کا باقی رہنا اس دنیا کی مصلحت کے خلاف ہے جو اس کے رحمان ورحیم خالق و مالک نے اپنی رحمت اور اپنے عدل کے ظہور کے لیے پیدا کی ہے۔ وہ عالم کا پروردگار ہے۔ اس کی شان پروردگاری کس طرح گوارا کر سکتی ہے کہ وہ اپنے چمن میں ایسے درخت کو لگا رہنے دے جس کی زہریلی ہوا پورے چمن کی بربادی کا سامان بن جاتے۔ اس میں دو باتیں سمجھا دی گئی ہیں ایک یہ کہ ان کی تباہی کا سبب ان کی ظلم کاری ہے۔ دوسرے یہ کہ ظالموں کی تباہی بھی پورے عالم کے لیے ایک نعمت ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَخَذَ اللّٰهُ سَمْعَكُمْ وَاَبْصَارَكُمْ وَخَتَمَ عَلٰى
قُلُوْبِكُمْ مَّنْ اِلٰهٌ غَيْرُ اللّٰهِ يَاْتِيْكُمْ بِهٖ ۭ اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ
الْاٰيٰتِ ثُمَّ هُمْ يَصْدِفُوْنَ ۝ قُلْ اَرَءَيْتَكُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ عَذَابُ
اللّٰهِ بَغْتَةً اَوْ جَهْرَةً هَلْ يُهْلَكُ اِلَّا الْقَوْمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝
وَمَا نُرْسِلُ الْمُرْسَلِيْنَ اِلَّا مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ ۚ فَمَنْ اٰمَنَ
وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا يَمَسُّهُمُ الْعَذَابُ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ۝

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کیا تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ
اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں لے لے اور تمہارے
دلوں پر مہر لگا دے، تو اس کے سوا کون معبود ہے جو تمہیں
یہ واپس دے سکتا ہے، دیکھو ہم کس طرح گوناگوں طریقوں سے
بیان کرتے ہیں، پھر بھی یہ لوگ منہ پھیرے ہوئے ہیں۔ ۵۲

ان سے کہو تم نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر تم پر خدا کا عذاب اچانک آجائے یا آشکارا آئے تو ظالموں کے سوا کون ہلاک کیا جائے گا۔[۵۳] اور ہم رسولوں کو صرف اس لیے روانہ کرتے ہیں کہ خوشخبری سنائیں اور آگاہ کریں[۵۴]، پھر جو بھی ایمان لائے اور ٹھیک ہو جائے تو اس کے لیے کوئی اندیشہ نہیں اور نہ وہ غمگین ہو گا اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ان کو بدعملیوں کی وجہ سے ضرور عذاب ہو گا۔[۵۵]

خدا کی حقیقی عظمت

اہل عرب ایک حقیقی قوت کے نام سے واقف تھے اور اس کو خالق بھی مانتے تھے۔ قدرت کے کارخانہ کا اس کو تنہا مالک سمجھتے تھے۔ قرآن نے اس خدا کی توحید کامل کو مکمل نقشہ پیش کیا اور بتایا کہ آسمان و زمین کا تنہا مالک خدا ہے۔ اس کے کاروبار میں کوئی اس کا شریک نہیں۔ اس کی شہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں ہے اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں۔ کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں ہے جس طرح اس کی ذات میں کوئی شریک نہیں ہے اسی طرح اس کی صفات و افعال میں بھی کوئی

شریک نہیں ہے۔ پیدا کرنا، زندہ رکھنا، مارنا، عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہونا۔ دور و نزدیک سے یکساں تعلق ہونا اور کائنات میں تدبیر و تصرف کرنا وغیرہ وغیرہ یہ تمام صفات ہر حیثیت سے صرف اللہ سبحانہٗ کی ذات اقدس کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب اوتاروں، ولیوں، شہیدوں اور پیغمبروں میں بھی یہ اوصاف مانتے تھے اور اب بھی مانتے ہیں۔ ملائکہ اور جنات اور احبار و رہبان کے پرستاروں کا قرآن نے بصراحت تذکرہ کیا ہے لیکن قرآن نے توحید کامل کے لیے توحید فی الذات کے ساتھ توحید فی الصفات توحید فی الافعال توحید فی التصرف اور توحید فی العبادت کو ایمان قرار دیا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ ایمان کی زندگی میں خدا تعالیٰ کے اقرار اور تصدیق کا دل پر جو روحانی اثر پڑتا ہے وہ قرآن کی بتائی ہوئی توحید کے بغیر ہرگز پیدا نہیں ہو سکتا۔ اطاعت و انقیاد، خشوع و انابت توکل و اخلاص کی حالت صرف اس وقت دل میں رونما ہوتی ہے جب یہ یقین کامل ہو کہ ہماری تمام حاجتوں، تمام ضرورتوں اور تمام امیدوں کا صرف ایک ہی مرکز ہے۔

پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ جب وہ اپنی مادی ترقیوں میں مگن ہو جاتے ہیں اور ترقی و عروج، ارتقاء و اعتلاء کی انتہائی بلندیوں پر جب ان کو پہنچا دیا جاتا ہے تو ان کی یکبارگی گرفت کر لی جاتی ہے اب بتایا جا رہا ہے کہ علم کے جن ذرائع کو کام میں لا کر وہ نبوت کا مقابلہ کر رہے ہیں۔ اگر اللہ ان ذرائع ہی کو تلف کر دے نہ دیکھنے کے لیے آنکھ رہے نہ سننے کے لیے کان اور نہ سمجھنے کے لیے عقل و بصیرت تو بتاؤ پھر اللہ کے سوا اور کون ہے جو تمہیں یہ قوتیں عطا کرے۔ یہ بھی توحید کی عقلی دلیل ہے اسی کو قرآن نے ایک جگہ مثبت انداز میں بھی پیش کیا ہے امن یملک السمع والابصار اور اسی کو قرآن نے اللہ کے تعارف میں بھی پیش کیا ہے انشا لکم السمع والابصار والافئدۃ یعنی یہ اللہ ہی ہے جس نے تمہارے سننے کے لیے کان دیے دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں اور سوچنے کے لیے دل پیدا کیے۔

۵۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کیا تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر اللہ تمہارے کان اور تمہاری آنکھیں لے لے اور تمہارے دلوں پر مہر لگا دے کہ نہ تم سن سکو نہ دیکھ سکو اور نہ دل سے سمجھ سکو[1] ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ کانوں کو اللہ کی آیات تنزیلیہ کے سننے آنکھوں کو اس کی آیات تکوینیہ کے دیکھنے میں اور دلوں کو دونوں کے سمجھنے میں لگا کر اللہ کی دی ہوئی ان نعمتوں

[1] افادات شیخ الاسلام

کے لیے شکرگزار بندے بنتے اور پھر یہ رہا ہے کہ کانوں کو اللہ کی بغاوتوں پر مشتمل باتوں کے سننے اور آنکھوں کو خدا کے خلاف دیکھنے اور دلوں کو اس کی نافرمانیوں کے متعلق سازشوں کو سوچنے پر لگاتے ہوتے ہیں اور نتیجہ یہ ہے کہ ہر برائی ان کو اچھی نظر آتی ہے اور اللہ کی نافرمانی ان کو بھاتی ہے۔ اخلاقِ ذمیمہ اور رذائل ان کی طبیعتوں کا تقاضا بن کر رہ گئے ہیں ان کی حالت اس نجاست کے کیڑے کی طرح ہوتی ہے جسے گندگی سے طبعاً رغبت اور خوشبو سے نفرت ہو جاتی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارے ان ذرائع علمی سمع بصر عقل کو سلب کر دے کان نہ رہیں اور تم بہرے ہو جاؤ آنکھیں نہ رہیں تم اندھے ہو جاؤ، دل اور عقل نہ رہے اور تم مجنوں ہو جاؤ۔ فہم و شعور کی تمہاری ساری قوتیں اگر سلب ہو جائیں کہ تم کوئی بات نہ سن سکو اور نہ کوئی راستہ دیکھ سکو اور نفع و ضرر کے لیے کوئی قوتِ تمیز نہ رہے۔

کائنات کا مدبر صرف اللہ ہے

۵۲- تو اس کے سوا کون معبود ہے جو تمہیں یہ واپس دے سکتا ہے، دیکھو ہم کس طرح گوناں گوں طریقوں سے بیان کرتے ہیں پھر بھی یہ لوگ منہ پھیرے ہوتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں یعنی توبہ میں دیر نہ کرے جو کان آنکھ دل اس وقت ملے ہیں شاید پھر نہ ملیں اور اس لیے توبہ و استغفار کی توفیق نہ ہو سکے[1] یہ استفہام انکاری ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جو ان کو یہ نعمتیں دلا سکے۔ قرآن کے مخاطبوں کو بھی اس کا اقرار تھا کہ یہ عظیم الشان کام اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ مستحق عبادت تو وہ ذاتِ گرامی ہے جو ان حواس اور قویٰ کے دینے اور ان کے چھیننے پر قادر ہو اور جب تم جانتے اور مانتے ہو کہ اس کے سوا اس پر کوئی قادر نہیں ہے تو بتاؤ ان انداد و اولیاء کی تم کیوں عبادت کرتے ہو۔ سچ کو چھوڑ کر جھوٹے اوہام اور محض خیالی اور ہوائی قلعوں میں پناہ لینا عاقل کا نہیں بلکہ غافل کا کام ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ کیا اللہ کے سوا کوئی اس پر قادر ہے کہ اگر اللہ تم سے ان کو سلب کرے تو واپس دے سکے۔ بلاشبہ اللہ کے سوا کسی کو یہ قدرت نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا ہے کہ ہم کس طرح گوناں گوں طریقوں سے بیان کرتے ہیں۔ یعنی لوگوں کے سامنے توحید کے موضوع پر قسم قسم اور طرح طرح کے

[1] افادات شیخ الاسلام

دلائل پیش کر رہے ہیں۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کبھی مقدمات عقلیہ پیش کرتے ہیں کبھی ترغیب و ترہیب کا انداز اختیار کرتے ہیں اور کبھی تنبیہ و تذکیر کا اسلوب لاکر سمجھاتے ہیں۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ ہم گوناں گوں طریقوں سے اس مسئلہ کو سمجھا رہے ہیں لیکن اس کے باوجود لوگ اس معاملہ میں غور و فکر سے کام نہیں لیتے اور سب کچھ جانتے ہوئے اعراض کر رہے ہیں۔

رسولوں کی تکذیب کرنے پر عذاب

۵۳ - ان سے کہو تم نے کبھی اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر تم پر خدا کا عذاب اچانک آجائے یا آشکارا آئے تو ظالموں کے سوا کون ہلاک کیا جائے گا۔ اچانک وہ عذاب جس کی کچھ علامات پہلے سے ظاہر نہ ہوں اور جہرۃً سے وہ عذاب مراد ہے جس کی آنے سے پہلے کچھ علامات ظاہر ہونے لگیں[1] اصل ارشاد میں بغتۃً اور جہرۃً آیا ہے بغتۃً کے معنے کسی چیز کے اچانک دفعۃً بالکل بے خبری میں آنے کے ہیں اور جہرۃ کے معنے علانیہ، صاف اور کھلم کھلا ہونے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان سے دریافت کرو کہ اگر خدا کا عذاب یکبارگی بغیر نوٹس کے اچانک آجائے یا دن دہاڑے اور کھلم کھلا آجائے تو کن پر آئے گا ان ہی ظالموں پر آئے گا جو اپنی بداعمالیوں سے اس کے سزاوار ہیں یا کسی اور پر۔ بلاشبہ اہل ایمان بچ جائیں گے اور ظلم کار ہی اپنی ظلم کاری کی پاداش میں پکڑے جائیں گے

کچھ شارحین قرآن نے یہاں عذاب سے عام عذاب مراد لیا ہے جیسے مصائب اور بیماریاں معاشی پریشانیاں، لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ یہاں وہ عذاب مراد ہے جو انبیاء کی تکذیب کرنے والی اُمتوں پر اتمام حجت کے بعد آتا ہے اس عذاب کے معاملہ میں سنت اللہ یہی ہے کہ نبی کی تکذیب کرنے والے ہلاک کر دیے جاتے ہیں اور اہل ایمان بچا لیے جاتے ہیں۔ اسی بنا پر آلوسی نے اس کا مطلب یہ بتایا کہ لوگوں سے کہو کہ بتاؤ اگر خدا کا عذاب اچانک آجائے یا ظہور علامات کے بعد آئے تو تمہارا کیا حال ہوگا۔ اسی کی توضیح یہ کہہ کر کی کہ ہونا کیا تھا تم کو ہی اس کے ذریعے ہلاک کیا جائے گا۔ یہ سورت مکی دور کے آخری زمانے میں نازل ہوئی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قریش مکہ کو تقریباً ۱۳ برس تک دعوت دی اور ان تیرہ سالوں کے اندر اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور آیات ہدایت کے مختلف نمونے دکھائے اور آخر وہ وقت آیا جو اپنے اپنے پیغمبروں کے سامنے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسری قوموں پر آچکا تھا یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افراد صالحہ جو بے خوف و خطر حق کو قبول کر سکتے تھے۔ انہوں نے حق کو قبول کیا اور صرف وہ رؤسائے قریش رہ گئے جو قبول حق کی مطلق صلاحیت نہ رکھتے تھے یا وہ ضعفا تھے جو ان رؤسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی قوت نہ رکھتے تھے اس لیے ضرورت ہوئی کہ ان رؤسا کے وجود سے ارض حرم کو پاک کر دیا جائے۔ اس آیت میں قریش کو آخری عذاب کی اطلاع دی گئی ہے کہ تمہیں اپنے ظلم کی پاداش میں ضرور ہلاک ہونا ہے۔

نبوت کی غرض و غایت

۴۷ - اور ہم رسولوں کو صرف اس لیے روانہ کرتے ہیں کہ خوشخبری سنائیں اور آگاہ کریں۔ یعنی تم جو عذاب الٰہی سے نڈر اور بے فکر ہو کر بیہودہ فرمائشیں اور دور از کار سوالات کر کے پیغمبر علیہ السلام کو دق کرتے اور ان کی تصدیق کے لیے خود ساختہ معیار تراشتے ہو۔ خوب سمجھ لو کہ پیغمبر دنیا میں اس لیے نہیں بھیجے گئے کہ تمہاری ایسی واہی تباہی فرمائشیں پوری کرتے رہا کریں۔ ان کی بعثت کی غرض صرف تبشیر و انذار اور تبلیغ و ارشاد ہے۔ وہ خدا کی طرف سے اس لیے بھیجے جاتے ہیں کہ فرمانبرداروں کو بشارت سنائیں اور نافرمانوں کو ان کے انجام بد سے آگاہ کریں۔ آگے ہر شخص کی کمائی اس کے ساتھ ہے۔ لہ

اس میں نبوت کی آمد کی دو غرضیں بتائی گئی ہیں ایک تبشیر دوسرے انذار۔ تبشیر یہ ہے کہ ان لوگوں کو اعمال نیک کے نتائج کی خوشخبری دی جائے جو خدائی دستور حیات کو قبول و اختیار کر لیں۔ اور انذار یہ کہ ان لوگوں کو ڈرایا جائے جو خدائی دستور حیات کے مقابلہ میں انکار و طغیان قائم کریں۔ تبشیر و انذار ہی کی ہم آہنگی کا نام تبلیغ ہے۔ اگرچہ تبلیغ کے لفظی معنے پہنچانے کے ہیں لیکن اللہ کے دین کو اس طرح پہنچانا کہ فضائل کی ترغیب اور رذائل سے ترہیب پر مشتمل ہو دین کی تبلیغ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو ہم اچھا سمجھتے ہیں اس کی اچھائی اور خوبی کو دوسروں تک پہنچائیں اور ان کو اس کے قبول کرنے کی دعوت دیں اس کا نام تبشیر ہے اور جس چیز کو ہم برا سمجھتے ہیں اس کی برائی کو دوسروں تک پہنچائیں اور ان کو اس سے بچنے کی دعوت دیں اسی کا نام انذار ہے۔ یہاں مبشرین و منذرین کا متعلق محذوف ہے۔ پوری بات یوں ہے کہ ہم نے رسولوں کو انسانوں کے لیے بشیر و نذیر بنا کر بھیجا ہے قرآن میں دوسرے مواقع پر اس کی صراحت موجود ہے۔

لہ افادات شیخ الاسلام

قرآن کی آیت بتا رہی ہے کہ نبی کا سب سے پہلا کام تبشیر و انذار ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا کی جانب سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا، اس نے اس کو جس صداقت سے آشنا کیا ہے اس سے ہم جنسوں کو باخبر کرنا جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں ان کو اس راہ میں صرف کرنا، اور اس سمجھانے، سمجھانے اور راہ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا۔ اس اعلان و دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آئے اس کو راحت جاننا جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا، جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلووں میں چبھیں، ان کو گل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کے لیے جو قوت بھی سر اٹھاتے اس کو کچل دینا اور مال و منال، اہل و عیال غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگ راہ ہو کر سامنے آئے اس کو ہٹا دینا اور اس کی اس ساری کوشش و کاوش کا مقصد خدا کی رضامندی مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرض رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

یہ ہے انبیاء و رسل کے بشیر و نذیر ہونے کا مفہوم دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے انہوں نے اپنے اس فرض کو اسی ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی اور آج دنیا میں جو کچھ خدا کی محبت، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بےکسوں کی مدد، غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطح زمین پر وجود ہے وہ سب بواسطہ یا بلا واسطہ انہی کے فریضہ تبشیر و انذار کا اثر اور نتیجہ ہے۔

انبیاء سے بے نیازی کا انجام

۵۵۔ پھر جو بھی ایمان لائے اور ٹھیک ہو جائے تو اس کے لیے کوئی اندیشہ نہیں اور نہ وہ غمگین ہوگا اور وہ لوگ جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ان کو ان کی بدعملیوں کی وجہ سے ضرور عذاب ہوگا۔ یعنی جس نے انبیاء کی باتوں پر یقین کیا اور اعتقاداً و عملاً اپنی حالت درست کر لی حقیقی امن اور چین اس کو نصیب ہوا اور جس نے خدا کی آیات کو جھٹلا کر ہدایت الٰہی سے روگردانی کی وہ نافرمانی اور بغاوت کی وجہ سے سخت تباہی اور عذاب عظیم کے پیچھے آگیا۔ العیاذ باللہ[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آیات سے مراد آیاتِ نبوت ہیں۔ یعنی وہ آیات جو انبیاءؑ تبشیر و انذار کے موقعہ پر لوگوں تک پہنچاتے ہیں اس میں احکام اور معجزات دونوں داخل ہیں۔

ان دونوں آیتوں میں پوری انسانیت کے لیے مدارِ نجات اور مدارِ ہلاکت بتایا گیا ہے۔ اس میں قرآن نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کر کھڑا کر دیا اور سب کے سامنے ایک ہی پیمانہ پیش کیا اور بتا دیا کہ انبیاءؑ کی رہنمائی کے بغیر نہ انسانوں کو سعادت مل سکتی ہے نہ نجات مل سکتی ہے۔ وہ علم جس کی روشنی میں انسان اپنے خالق اور اس کائنات کا وجود بخشنے والی ذات اس کی اعلیٰ صفات اور اس کے اور بندوں کے تعلقات کی نوعیت کا علم ہوتا ہے۔ اسی کی روشنی میں انسان کی ابتداء اور اس کی انتہا معلوم ہوتی ہے اور اس دنیا میں اس کا مقام اور رب کے مقابلے میں انسان کا موقف متعین ہوتا ہے اور اللہ کو راضی کرنے، غصہ دلانے اور آخرت میں انسان کو خوش نصیب و کامران یا ناکام و نامراد بنانے والے امور و اعمال اور انسان کے افکار و اعمال، اخلاق و عادات کے خواص، ان کی جزا و سزا اور انسانوں سے صادر ہونے والے اقوال و اعمال اور اعتقادات کے نتیجے میں ملنے والے ثواب یا عذاب اور طویل مدت تک اثر انداز ہونے والے نتائج کی نشاندہی ہوتی ہے اور یہی وہ علم ہے جس کو علم النجات کہا جاتا ہے۔ اسی پر انسان کی سعادت و شقاوت کا دار و مدار ہے وہ اسی کو دوسروں تک پہنچانے کی دھن میں لگے رہتے ہیں جو اس کو مانتا ہے اور اس کے مطابق زندگی گزارتا ہے اس کو قرآن یہ خوشخبری دیتا ہے لاخوف علیہم ولا ھم یحزنون۔ یعنی خوف و غم دونوں سے محفوظ ہوں گے۔ درحقیقت انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ خوف اور غم دونوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ قرآن نے یہی چہرہ دوسرے مقام پر اولیاء اللہ کا پیش کیا ہے۔ اس کے مقابلے پر وہ لوگ ہیں جو انبیاءؑ کی تکذیب کرتے ہیں، کر رہے ہیں اور کر چکے ہیں ان کو ان کی بدکرداریوں کے نتائج سے دوچار ہونا پڑے گا۔ آیت میں عذاب سے دنیوی اور اخروی دونوں مراد ہو سکتے ہیں۔

قُلْ لَّآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَآئِنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَلَآ
اَقُوْلُ لَكُمْ اِنِّيْ مَلَكٌ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۭ قُلْ هَلْ يَسْتَوِي
الْاَعْمٰى وَالْبَصِيْرُ ۭ اَفَلَا تَتَفَكَّرُوْنَ ۝ وَاَنْذِرْ بِهِ الَّذِيْنَ
يَخَافُوْنَ اَنْ يُّحْشَرُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ لَيْسَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِهٖ وَلِيٌّ وَّلَا
شَفِيْعٌ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝ وَلَا تَطْرُدِ الَّذِيْنَ يَدْعُوْنَ
رَبَّهُمْ بِالْغَدٰوةِ وَالْعَشِيِّ يُرِيْدُوْنَ وَجْهَهٗ ۭ مَا عَلَيْكَ مِنْ
حِسَابِهِمْ مِّنْ شَيْءٍ وَّمَا مِنْ حِسَابِكَ عَلَيْهِمْ مِّنْ شَيْءٍ فَتَطْرُدَهُمْ
فَتَكُوْنَ مِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَكَذٰلِكَ فَتَنَّا بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّيَقُوْلُوْٓا
اَهٰٓؤُلَآءِ مَنَّ اللّٰهُ عَلَيْهِمْ مِّنْۢ بَيْنِنَا ۭ اَلَيْسَ اللّٰهُ بِاَعْلَمَ بِالشّٰكِرِيْنَ ۝
وَاِذَا جَآءَكَ الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاٰيٰتِنَا فَقُلْ سَلٰمٌ عَلَيْكُمْ كَتَبَ رَبُّكُمْ
عَلٰي نَفْسِهِ الرَّحْمَةَ ۙ اَنَّهٗ مَنْ عَمِلَ مِنْكُمْ سُوْۗءًۢا بِجَهَالَةٍ ثُمَّ تَابَ
مِنْۢ بَعْدِهٖ وَاَصْلَحَ فَاَنَّهٗ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ
الْاٰيٰتِ وَلِتَسْتَبِيْنَ سَبِيْلُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝

اے پیغمبر کہہ دو میں تم سے یہ نہیں کہتا ہوں کہ میرے پاس
خدائی خزانے ہیں نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں
اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۵۰۔ میں تو صرف اس
وحی کا پیرو کار ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے، ان سے پوچھو
کہ کیا بینا اور نابینا دونوں برابر ہو سکتے ہیں کیا تم غور و
فکر سے کام نہیں لیتے ہو۵۰۔ اور اے پیغمبر تم اس وحی کے
ذریعے سے ان لوگوں کو آگاہ کر دو جو اس بات کا اندیشہ رکھتے
ہیں کہ ان کو اللہ کے حضور پیش کیا جائے گا اور وہاں
ان کا اللہ کے سوا کوئی مددگار اور سفارشی نہ ہو گا شاید وہ
متقی ہو جائیں۵۹۔ اور اے پیغمبر ان لوگوں کو جو صبح و شام
خدا کی خوشنودی کی طلب میں پکارتے رہتے ہیں اپنے
پاس سے نہ نکالو ان کے کاموں کی جوابدہی تمہارے

ذمہ نہیں اور نہ تمہاری جوابدہی ان کے ذمہ ہے، پھر بھی اگر ان
کو اپنے سے علیحدہ کروگے تو تم زیادتی کرنے والوں میں سے
ہو جاؤ گے۔[۶۰] اور اسی طرح ہم نے بعض انسانوں کو بعض کے
لیے پرچہ آزمائش بنایا ہے تاکہ کہنے والے کہہ سکیں، کیا یہی لوگ
ہیں جنہیں اللہ نے اپنے انعامات کے لیے ہم میں سے
چن لیا ہے، کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو ان سے زیادہ
نہیں جانتا ہے۔[۶۱] اور جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو
ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں تو ان سے کہو سلام علیکم
تمہارے رب نے رحم و کرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔[۶۲]
یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی نادانی سے کسی
بُرائی کا ارتکاب کر بیٹھے پھر اس کے بعد توبہ اور اصلاح کر لے
تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔[۶۳] اور

اسی طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کر پیش کرتے ہیں اور اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ جرم پیشہ لوگوں کی راہ واضح ہو جائے۔ ۶۴

مقامِ نبوت کی حدبندی

نبی شناسی کے بارے میں انسان کی عالمگیر گمراہی یہ رہی ہے کہ ہمیشہ ماورا رِ فطرت عجائب و غرائب کا خواہشمند رہتا ہے اور اس کی عجائب پسند طبیعت اس پر قانع نہیں ہوتی کہ سچائی اپنی سیدھی سادی شکل میں نمایاں ہو جائے یہی گمراہی ہے جس نے اہلِ مذاہب کی راہ کو توہم پرستیوں کی راہ بنا دیا۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے اپنے داعیوں کو انسانیت کی سطح سے بلند کر کے الوہیت کے درجہ تک پہنچا دیا۔ حضرت عیسیٰ اور رام چندر کو اسی خوش اعتقادی نے آدمی سے خدا بنا دیا۔ اس بارے میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں جا بجا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق وضاحت کی ہے محتاجِ بیان نہیں ہے۔ اس نے سب سے پہلے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور ظاہری معجزات میں کوئی تلازم نہیں ہے اور یہ آثار و دلائل اصل نبوت سے خارج امور ہیں۔ نبوت کے اصل لوازم وحی مخاطبہ الٰہی تزکیہ، انذار، تبشیر، تعلیم اور ہدایت ہیں جیسا کہ پہلے تفصیلاً بیان ہو چکا ہے۔ اس بنا پر جب معاندین نے معجزہ کا مطالبہ کیا ہے تو قرآن مجید نے اکثر اس کے جواب میں نبوت کی اصلی حقیقت کی طرف ان کو متوجہ کیا ہے۔ چنانچہ اس آیت میں پوری قوت سے بتایا ہے کہ نبی کیا ہے اور کیا نہیں ہے فرمایا کہ نبی وہ ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آئے اور اس وحی کے ذریعے انذار کا کام کرے۔ نبی وہ نہیں ہے جو خزانوں کا مالک ہو۔ غیب دان ہو یا فرشتہ ہو۔ غور کرنا چاہیے کہ ایسا کیوں کیا گیا صرف اس لیے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں لوگوں کا ذہن صاف ہو جائے اور اس کا کوئی موقع باقی نہ رہے کہ وحی کی جگہ علم غیب کا اور عبدیت کی جگہ معبودیت کا تخیل پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اس معاملہ کا تحفظ کیا کیا جا سکتا تھا۔ گمراہ قوموں میں نبی کے بارے میں دانائے غیب، حاضر و ناظر، خدا کے بیٹے ہونے "تین میں سے تیسرا ہونے کے تصورات کی بنیاد پر قرآن نے یہاں ضرب کاری لگائی ہے اور اس آیت میں واضح کر دیا کہ حضور انور کا دعویٰ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ کی وحی آتی ہے اور بس۔ یہی نبوت ہے اسی پر آپ چلتے ہیں

دوسروں کو بھی اسی کی طرف بلاتے ہیں۔

۵۷۔ اے پیغمبر کہہ دو میں تم سے یہ نہیں کہتا کہ میرے پاس خدائی خزانے ہیں نہ یہ کہتا ہوں کہ میں غیب کا علم رکھتا ہوں اور نہ یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں۔ اس آیت میں منصب رسالت کی حقیقت پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ یعنی کوئی شخص جو مدعی نبوت ہو، اس کا دعویٰ یہ نہیں ہوتا کہ تمام مقدورات الٰہیہ کے خزانے اس کے قبضے میں ہیں کہ جب اس سے کسی امر کی فرمائش کی جائے وہ ضرور ہی کر دکھائے یا تمام معلومات غیبیہ وشہادیہ پر خواہ ان کا تعلق فرائض رسالت سے ہو یا نہ ہو اس کو مطلع کر دیا گیا ہے کہ جو کچھ تم پوچھو وہ بتا دیا کرے یا نوع بشر کے علاوہ وہ کوئی اور نوع ہے جو لوازم وخواص بشریت سے اپنی برأت ونزاہت کا ثبوت پیش کرے۔ جب ان باتوں میں سے وہ کسی بات کا مدعی نہیں ہے تو فرمائشی معجزات اس سے طلب کرنا یا ازراہ تعنت وعناد اس قسم کا سوال کرنا کہ قیامت کب آئے گی یا یہ کہنا کہ یہ رسول کیسے ہیں جو کھانا کھاتے ہیں اور بازاروں میں خرید و فروخت کے لیے جاتے ہیں اور ان ہی امور کو معیار تصدیق وتکذیب قرار دینا کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے[1]

لوگوں نے جو نبی شناسی کا غلط پیمانہ بنا رکھا تھا کہ جو شخص پیغمبر ہو اسے انسانیت سے ماوراء ہونا چاہیے۔ اس سے عجائب وغرائب صادر ہونے چاہئیں، مقدورات الٰہیہ کے خزانوں پر اسے دسترس ہونی چاہیے، وہ ایک اشارا کرے اور پہاڑ سونے کا ہو جائے۔ اسے معلومات غیبیہ ہونی چاہئیں اس پر اگلے پچھلے سب حالات روشن ہوں۔ بالفاظ دیگر وہ نوع انسان سے بالا مخلوق ہو۔ مختار کل ہو اور دانائے غیب ہو۔ اس آیت میں قرآن نے اسی غلط پیمانے کی اصلاح کی ہے اور بتایا ہے کہ نبی وہ ہوتا ہے جس پر اللہ کی وحی آئے وہ فرشتہ نہیں ہوتا، مختار کل نہیں ہوتا اور دانائے غیب نہیں ہوتا۔

پہلی بات یہ فرمائی گئی کہ لوگو میں یہ نہیں کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں اور میں ان میں مختار ہوں جس کو جو چاہوں عطا کروں۔ قرآن نے اس جملہ کے ذریعے ان لوگوں کے ذہن کی اصلاح کی جو سمجھتے ہیں کہ

باپ بیٹے سے محبت رکھتا ہے اور اس نے سب چیزیں اس کے ہاتھ میں دے دی ہیں۔ (یوحنا ۳۔۳۶)

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں قرآن نے اسی ذہنی افتاد کی اصلاح کی ہے اور بتایا ہے کہ نبوت کے بارے میں یہ احمقانہ تصور ہے۔ اس پر تفصیلی بحث تو پارہ نہم میں آئے گی۔ یہاں صرف اتنی بات سمجھ لیجئے کہ اگرچہ عیسائی دنیا حضرت عیسٰی کے بارے میں تصور یہ رکھتی ہے کہ حضرت عیسٰی کو اللہ نے مختار کل بنا دیا جیسا کہ انجیل متی میں ہے کہ

میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا

اور

یسوع نے پاس آکر ان سے باتیں کیں اور کہا کہ آسمان و زمین کا کل اختیار مجھے دے دیا گیا ہے۔

لیکن قرآن نے مسلمانوں کو نبوت کے بارے میں جو ہدایت کی ہے وہ یہی ہے کہ مالک کل اور مختار کل صرف اللہ کی ذات ہے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختار کل نہیں ہیں اس معاملہ میں شیعہ فرقہ کو چھوڑ کر مسلمانوں میں کبھی دو رائیں نہیں ہوتی ہیں۔ اور صرف تکوینی امور میں نہیں بلکہ اہل السنۃ والجماعۃ کے ائمہ نے پوری قوت کے ساتھ واضح کر دیا ہے کہ تشریعی امور میں بھی انبیائے کرام کا کسی نوع سے دخل نہیں ہوتا۔ ہاں البتہ اہل تشیع کا یہ عقیدہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دین کے سارے معاملات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور ائمہ کے سپرد کر دیے ہیں۔ چنانچہ شیعہ دوستوں کی مشہور و مستند کتاب اصول کافی میں ہے:

باب التفویض الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم والی الائمۃ علیہم السلام فی امر الدین ۔

ایک باب قائم کیا ہے اور اس کی تائید کے لیے امام جعفر صادق سے چند حدیثیں پیش کی ہیں، ایک حدیث یہ ہے،

بے شک اللہ تعالیٰ نے اپنی مخلوق کے معاملات اپنے نبی حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سپرد کر دیے ہیں تاکہ وہ دیکھے کہ ان کی اطاعت کیسی ہے پھر یہ آیت پڑھی ما آتاکم الرسول فخذوہ وما نہاکم عنہ فانتہوا۔

(اصول کافی)

اور ایک دوسری حدیث انہوں نے لکھی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تفویض تمام ائمہ کو بھی حاصل تھی چنانچہ اصول کافی ہی میں لکھا ہے۔

بے شک اللہ تعالیٰ اپنی وحدانیت میں منفرد رہا، پھر اس نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت علی اور حضرت فاطمہ کو پیدا کیا۔ ایک ہزار سال تک سلسلہ یوں ہی رہا، پھر اللہ تعالیٰ نے تمام اشیاء کو پیدا کیا اور ان کو اشیاء کے پیدا کرتے وقت حاضر کیا اور ان کی فرمانبرداری ان پر فرض کی اور ان تمام اشیاء کو ان کے سپرد کر دیا۔ لہٰذا وہ جو چاہتے ہیں حلال کرتے ہیں اور جو چاہتے ہیں حرام کرتے ہیں۔

یہ یاد رہے کہ حضور انور، حضرت علی، حضرت فاطمہ اور دوسرے ائمہ کے بارے میں مختار کل ہونے کا عقیدہ سارے شیعوں کا نہیں ہے بلکہ شیعہ حضرات کا ایک خاص گروہ ہے جس کو المفوضہ کہا جاتا ہے۔ شیخ جیلانی نے غنیۃ الطالبین میں ان کا چہرہ اس طرح پیش کیا ہے۔

ایک فرقہ مفوضہ بھی ہے جو کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مخلوق کے معاملات ائمہ کو تفویض کر دیے ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو جہان کو پیدا کرنے اور اس کی تدبیر کرنے کی قدرت عطا کر دی ہے۔ (غنیۃ الطالبین ص ۲۲۱)

اور مشہور متکلم علامہ سید شریف جرجانی نے اس فرقہ کا تعارف اس طرح کرایا ہے۔

مفوضہ فرقہ کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پیدا کیا اور دنیا و مافیہا کی پیدائش آپ کے سپرد کر دی چنانچہ اب دنیا و مافیہا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی پیدا کیا ہے۔

(شرح مواقف)

لیکن یہ قرآن کی اس قسم کی کھلی تصریحات کے خلاف ہے۔ اسی لیے مسلمانوں کی ملت نے عامہ نے کبھی اس خیال کو شرف پذیرائی نہیں دیا۔ قرآن نے اس خیال کی برملا تردید کی ہے اور بتایا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی مختار کل نہیں ہے۔ احادیث صحیحہ سے بھی یہی ثابت ہے اور یہی تمام صحابہ کرام اور جمہور سلف و خلف کا اسلامی عقیدہ ہے۔ حافظ ابن کثیر نے لا اقول لکم عندی خزائن اللہ کی تشریح اس طرح فرمائی ہے لست املکھا ولا اتصرف فیھا یعنی میں اللہ کے خزانوں کا مالک نہیں ہوں اور نہ ان میں کوئی تصرف کرتا ہوں۔ اور امام بغوی نے معالم التنزیل میں لکھا ہے ای خزائن رزقہ فاعطیکم ما تریدون کہ میرے پاس اللہ کے رزق کے خزانے نہیں ہیں کہ میں تمہیں تمہاری خواہش کے مطابق دوں اور علامہ خازن بغدادی لباب التاویل میں لکھتے ہیں والمعنی لیس عندی خزائن رزق اللہ فاعطیکم منھا ما تریدون۔ مطلب یہ ہے کہ

میرے پاس اللہ کے رزق کے خزانے نہیں ہیں کہ تم کو تمہاری مرضی کے مطابق دے سکوں۔ اسی طرح دوسرے شارحین قرآن نے بھی اس کا مطلب یہی بتایا ہے اور سب نے اس کا مطلب یہی سمجھا ہے کہ اللہ کے خزانے میرے سپرد نہیں کیے گئے ہیں کہ میں جیسے چاہوں ان میں تصرف کروں۔

حیرت ہے کہ مفتی احمد یار خاں نے اس کا یہ مطلب کیسے سمجھ لیا کہ ہوں تو میں اللہ کے خزانوں کا مالک مگر میں دعویٰ نہیں کرتا، چنانچہ وہ فرماتے ہیں کہ،

اس میں دعوٰی کی نفی ہے خزانہ پاس ہونے کی نفی نہیں ہے، حضور نے فرمایا ہے اوتیت مفاتیح خزائن الارض۔

موصوف کی یہ بہت بڑی جسارت ہے کہ وہ لوگوں کو بتاتے ہیں کہ پیغمبر ہے تو مالکِ خزائن مگر اس کا دعویٰ نہیں کرتا ہے، ان دونوں میں کیا تُک ہے۔ حالانکہ جو حدیث پیش کی ہے وہ بھی ایک دعویٰ ہے کہ مجھے روئے زمین کے خزانوں کی چابیاں دی گئی ہیں۔ قرآن کی آیت اور ارشادِ نبوت اپنے مطلب میں واضح ہیں۔ دراصل ارشادِ نبوت کا مطلب وہ نہیں ہے جو مفتی صاحب سمجھے ہوتے ہیں۔ اس ارشاد کا صحیح مطلب وہی ہے جو شارحینِ حدیث نے بتایا ہے اگر یہی بات ہے جو مفتی صاحب فرمارہے ہیں تو پھر اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ تو قرآن کریم میں آپ سے یہ اعلان کراتے کہ آپ فرمادیں کہ میرے پاس اللہ تعالیٰ کے خزانے نہیں ہیں۔ اور حضور اقدس اس کے مقابلہ میں یہ فرمائیں کہ مجھے زمین کے خزانے دیے گئے ہیں۔ یہ سرتاسر غلط ہے بلکہ حدیث کا صحیح مطلب وہی ہے جو شارحین نے پیش کیا ہے۔

امام نووی شرح مسلم میں فرماتے ہیں۔

اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی کو خبر دی ہے کہ آپ کی اُمت زمین کے خزانوں کی مالک ہوگی چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

اور علامہ عزیزی نے اس حدیث کی شرح میں لکھا ہے کہ

اس میں استعارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شہروں کے فتح کرنے کا وعدہ کیا ہے۔

اور دُنیا جانتی ہے کہ بذریعہ خواب آپ کو یہ بشارت سنائی گئی تھی، چنانچہ صحیح مسلم میں بینا انا نائم کی صراحت موجود ہے۔

بہر حال حدیث کے منہ میں اپنی کج فکری سے غلط مطلب ڈالنا اور پھر لسے قرآن بتانا قرآن کی ہرگز خدمت نہیں ہے۔

دوسری بات اس آیت میں یہ کہی گئی ہے کہ آپ فرما دیجئے کہ لوگو میں غیب دان نہیں ہوں۔ لا اعلم الغیب۔ غیب کا علم وہ ہے جو بغیر کسی ذریعے اور وسیلے کے خود بخود حاصل ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا علم صرف اس کا ہو سکتا ہے جس کی ذات خود بخود ہو اور یہ اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ اور جس کا اپنا وجود ہی خود بخود نہ ہو اس کے بارے میں یہ سوال کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اس کا علم خود بخود ہو سکتا ہے۔ انبیاء کا وجود بھی عطائی ہوتا ہے اس لیے ان کا علم بھی عطائی ہوتا ہے۔ عطائی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو غیب کی معلومات بذریعہ وحی عطا فرماتے ہیں اور جو علم کسی ذریعے سے حاصل ہوتا ہے وہ علم غیب نہیں بلکہ اطلاع غیب اور اظہار غیب ہے۔ جب یہ حکم دیا گیا کہ تم یہ کہو لا اعلم الغیب میں غیب نہیں جانتا تو اس کا یہ ہرگز مطلب نہیں کہ میں ذاتی طور پر نہیں جانتا عطائی طور پر غیب جانتا ہوں۔ جب نبی کی ہر چیز وجود رسالت سب کچھ عطائی ہوتا ہے تو علم بھی عطائی ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مجھے وحی کے ذریعے غیب کی اطلاع ہوتی ہے مگر غیب دان نہیں نہ ذاتی طور پر اور نہ عطائی طور پر، اس لیے لا اعلم الغیب سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب کی نفی قطعاً ثابت ہے اور اس آیت سے نفی علم غیب پر استدلال منصوص اور برمحل ہے اور علم غیب عطائی ہی کی نفی مراد اور متعین ہے۔ اس میں رتی برابر شک اور شبہ نہیں، یہ ایک بے غبار حقیقت ہے اور اس نفی کا قرآن حکیم کی کسی آیت سے تعارض نہیں ہے۔

بعض شارحین قرآن نے لا اعلم الغیب کو تواضع پر محمول کیا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے۔ علامہ آلوسی بغدادی روح المعانی میں رقمطراز ہیں کہ جن لوگوں نے لا اعلم الغیب کو تواضع پر محمول کیا ہے ان کا موقف بے معنے اور بے حقیقت ہے۔ یعنی تواضع کی صورت میں آیت قرآنی میں کوئی معنویت نہیں رہتی ہے اور اسے عقل بھی قبول نہیں کرتی ہے کہ آپ ہوں تو دانائے غیب اور تواضع کے طور پر فرمائیں کہ میں دانائے غیب نہیں۔ تواضع خلاف واقعہ بات کہنے کا نام نہیں ہے بلکہ ایسے موقع پر تواضع کا پیمانہ یہ ہے کہ میں غیب دان ہوں لیکن یہ میرا کمال نہیں بلکہ اللہ کا فضل ہے اور قرآن کے اوراق کھلے ہوئے ہیں دنیا جانتی ہے قرآن میں کھلے طور پر آپ کو حکم ہو رہا ہے کہ آپ اعلان کر دیں لا اعلم الغیب، یہی اظہار حقیقت ہے۔

تیسری بات یہ فرمائی ہے کہ کہہ دیجئے لا اقول لکم انی ملک نہ میں یہ کہتا ہوں کہ میں فرشتہ ہوں لوگوں کا خیال تھا کہ نبی کو فرشتہ ہونا چاہیے کیونکہ فرشتہ اللہ کی بڑی مقدس اور نورانی مخلوق ہے لیکن ان لوگوں نے یہ نہیں سمجھا کہ نبی اور پیغمبر کے لیے مقدس ہونے کی طرح بلکہ اس سے بھی زیادہ اس کی ضرورت ہے کہ جن انسانوں کی ہدایت کا اس کو کام کرنا ہے وہ ان کے رجحانات، ان کے مزاج اور

ان کے احساسات اور جذبات سے واقف ہو۔ فرشتے بے شک نورانی ہیں لیکن انسانی جذبات، احساسات اور انسانی مزاج اور اس کی خواہشات سے وہ بے چارے نہ صرف یہ کہ ناواقف ہیں بلکہ وہ تو ان کو سمجھ بھی نہیں سکتے۔ مثلاً بھوک، پیاس، غصہ، حسد، نفسانی شہوت ان چیزوں کی حقیقت بھی نہیں جانتے۔ یہ بات معمولی غور و فکر سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ انسان کی زندگی میں بہت سی کیفیتیں ایسی ہیں جو اسی وقت سمجھ میں آتی ہیں جب انسان ان سے گزرتا ہے۔ بہرحال انسان کی ہدایت کے لیے ضروری ہے کہ جو ہدایت کرنے والا ہو وہ انسان کے حالات سے اور اس کے رجحانات سے پوری طرح واقف ہو اور یہ بات چونکہ انسان ہی کو حاصل ہو سکتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے نبی ہمیشہ انسانوں میں سے روانہ کیے ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ نبی ہوتا تو فرشتہ ہے مگر دعویٰ فرشتہ ہونے کا نہیں کرتا جیسے لوگوں نے پہلے دو فقروں کا یہ کہہ کر منہ بگاڑا ہے کہ ہوں تو اللہ کے خزانوں کا مالک مگر دعویٰ نہیں کرتا اور ہوں تو میں غیب دان مگر غیب دانی کا مدعی نہیں بلکہ واضح مطلب یہ ہے کہ میں نہ اللہ کے خزانوں کا مالک ہوں نہ میں غیب دان ہوں اور نہ ہی فرشتہ ہوں۔ یہاں معاً ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ پھر تم کیا ہو، اسی بات کا جواب آگے آرہا ہے۔

نبی صاحبِ وحی ہوتا ہے

۵۸۔ میں تو صرف اس وحی کا پیروکار ہوں جو مجھ پر کی جاتی ہے، ان سے پوچھو کہ بینا اور نابینا دونوں برابر ہو سکتے ہیں، کیا تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہو۔ یعنی اگرچہ پیغمبر نوعِ بشر سے علیحدہ کوئی نوع نہیں ہے لیکن اس کے اور باقی انسانوں کے درمیان زمین و آسمان کا فرق ہوتا ہے۔ انسانی قوتیں دو قسم کی ہیں علمی اور عملی۔ قوتِ علمیہ کے اعتبار سے نبی اور غیر نبی میں اعمیٰ اور بصیر کا فرق سمجھنا چاہیے۔ نبی کے دل کی آنکھیں ہر وقت مرضیاتِ الٰہی کے لیے کھلی رہتی ہیں جس کے بلا واسطہ مشاہدے سے دوسرے انسان محروم ہیں اور قوتِ عملیہ کا حال یہ ہوتا ہے کہ پیغمبر اپنے قول و فعل اور ہر ایک حرکت و سکون میں رضائے الٰہی اور حکم خداوندی کے تابع و منقاد ہوتے ہیں۔ وحی سماوی اور احکامِ الٰہیہ کے خلاف نہ کبھی ان کا قدم اٹھ سکتا ہے نہ زبان حرکت کر سکتی ہے۔ ان کی مقدس ہستی اخلاق و اعمال اور کل واقعاتِ زندگی میں تعلیماتِ ربانی اور مرضیاتِ الٰہی کی روشن تصویر ہوتی ہے جسے دیکھ کر غور و فکر کرنے والوں کو ان کی صداقت اور مامور من اللہ ہونے میں ذرہ بھی شبہ نہیں رہ سکتا۔[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ جن حقیقتوں کو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں ان کا میں نے مشاہدہ کیا ہے وہ براہ راست میرے تجربہ میں آئی ہیں۔ مجھے وحی کے ذریعے سے ان کا ٹھیک ٹھیک علم دیا گیا ہے ان کے بارے میں میری شہادت آنکھوں دیکھی ہے بخلاف اس کے تم ان حقیقتوں کی طرف سے اندھے ہو، تم ان کے بارے میں جو خیالات رکھتے ہو وہ یا قیاس و گمان پر مبنی ہیں یا محض اندھی تقلید پر لہٰذا میرے اور تمہارے درمیان بینا اور نابینا کا سا فرق ہے اور اسی اعتبار سے مجھے تم پر فوقیت ہے نہ اس اعتبار سے کہ میرے پاس خدائی خزانے ہیں یا میں عالم الغیب ہوں یا فرشتہ ہوں۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت میں نبوت کا چہرہ بتانے کیلئے دو باتیں مثبت اور دو باتیں منفی کہی گئی ہیں۔ صفات مثبتہ میں عبدیت کو پیش کیا گیا ہے جس کے لوازم میں امتثال امر اور اتباع وحی ہے دوسرے بشریت جس کے لوازم میں اکل و شرب اور خوف و رجا ہے۔ اسی طرح دو صفات کی نفی ہے خواص الوہیت کی مثلاً اختیار تام اور علم محیط اور تنزہ عن البشریہ کی۔ حاصل یہ ہے کہ نبی وہ عبد کامل ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آتی ہے وہ نہیں ہے جو مختار کل اور دانائے غیب ہو اس طرح اس آیت میں نبوت و رسالت کی ساری حقیقت بیان فرمادی ہے اور بتا دیا کہ نبی صاحب وحی ہوتا ہے اور اس کا ہر قدم وحی الٰہی کی روشنی میں اٹھتا ہے اور تمام تر وحی الٰہی کا اتباع کرتا ہے۔ اس طرح نبی اور غیر نبی میں وحی کا فرق مان کر وحی والے اور بے وحی والے انسانوں میں خود وحی اور عدم وحی کے سینکڑوں لوازم خصائص اور اوصاف کا فرق تسلیم کرنا پڑے گا۔ انبیاءؑ دوسرے انسانوں کے ساتھ بہت سے انسانی اوصاف میں شریک ہونے کے باوجود وحی اور اس کے خصائص و لوازم میں ان سے صریحاً الگ بلند اور اعلیٰ بلکہ بعض جسمانی خصائص میں بھی ان سے ممتاز ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم صوم وصال رکھتے دیکھ کر جب صحابہ بھی آپ کی پیروی میں کئی کئی دن تک کا مسلسل روزہ رکھتے ہیں تو آپ ان کو منع فرماتے ہیں۔ اور اپنی نسبت فرماتے ہیں ایکم مثلی یطعمنی ربی ویسقین۔ تم میں میرے مثل کون ہے، مجھے تو میرا رب کھلاتا اور پلاتا ہے کیا عام انسانوں کو بھی یہ روحانی غذا اور روحانی سیرابی میسر آتی ہے۔ اسی طرح نیند کی حالت میں بھی نبی کے قلب اور اس کے احساسات کا غافل نہ ہونا صحیح حدیثوں سے ثابت ہے۔ آپ نے فرمایا کہ میری آنکھیں سوتی ہیں لیکن دل نہیں سوتا۔ وکذالک الانبیاء تنام اعینھم و لا تنام قلوبھم اور اسی طرح سارے انبیاء ہیں ان کی آنکھیں سوتی ہیں مگر دل نہیں سوتے۔ الغرض نبی اور غیر نبی میں وحی کا جو فرق ہے اس کے یہی معنے ہیں کہ ان میں وحی و رسالت کے تمام

لوازم، خصوصیات اور ضروری اوصاف میں فرق و امتیاز ہے اسی لیے کسی انسان کو صاحب وحی ماننے کے ساتھ ہی اس کو ان تمام اوصاف و لوازم اور خصوصیات کا مالک بھی ماننا پڑے گا۔

اسلام میں نبوت کا اجتہاد

یہاں امام رازی نے یہ بات خبر نہیں کیوں لکھ دی کہ ان اتبع الا ما یوحیٰ الی کہہ رہا ہے کہ پیغمبر احکام کی حد تک صرف وحی کی پیروکاری کرتا تھا اور اس کو اس آیت کی وجہ سے اجتہاد کی اجازت نہ تھی۔ ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے اور نہ یہ آیت منطوقاً یہ بات بتا رہی ہے کہ حضور انور کو اجتہاد کی اجازت نہ تھی اور آپ ہر حکم وحی کے ذریعے بتلاتے تھے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ آیت مکی ہے، اور مکی زندگی میں کوئی اسلام کا نظام حیات نہ تھا۔ دعوت اسلامی صرف اصول اور کلیات دین تک محدود تھی یعنی توحید، رسالت، جزا و سزا، ترغیب اور ترہیب، اور معلوم ہے کہ ان میں اجتہاد کی ضرورت نہیں ہے، اجتہاد کی ضرورت اس وقت ہوتی ہے جب پورا اسلامی نظام قائم ہوا یعنی مدینہ میں۔ قرآن کے اوراق کھلے ہوئے ہیں آپ پڑھ سکتے ہیں کہ قرآن نے آپ کو یہ کہہ کر اجتہاد کا پروانہ دیا ہے لتحکم بین الناس بما اراک اللہ لیکن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اجتہاد نبوی کے متعلق دو باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔

ایک یہ کہ اجتہاد نبوی کی صورت درحقیقت مجتہدین کے اجتہاد کی طرح نہیں ہے۔ مجتہدین کا اجتہاد کسی خاص نص سے استنباط کا نام ہے اور پیغمبر کے اجتہاد کی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو اجمالی طور پر شریعت کے کل اصول و قواعد کا علم منصب نبوت کے ساتھ ساتھ عطا فرما دیا ہے۔ اسی علم کے مطابق آپ وحی کی توضیح احکام منصوصہ کی تفصیل کسی کلی کے جزئیات، مسائل کی تشریح اپنے الفاظ میں بیان فرماتے تھے۔

دوسری یہ کہ اجتہاد نبوی دوسرے عام مجتہدین کے اجتہادات کے برعکس خطا و غلطی سے یکسر پاک ہوتا ہے کیونکہ ان کی رائے اپنی رائے نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی الآت ہوتی ہے، اسی لیے ان کا پیغمبرانہ اجتہاد بھی منزل وحی کے ہے۔

پیغمبرانہ اجتہاد کی جو تشریح شاہ صاحب نے فرمائی ہے اس کو پیش منظر رکھ کر یہ فیصلہ نہایت آسان ہے کہ اس سے مقصود وہ قوت علمیہ یا الہامیہ یا نبویہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ خاص سینۂ نبوت میں ودیعت فرماتا ہے اس لیے مجتہدانہ اجتہاد اور پیغمبرانہ اجتہاد کے درمیان صرف لفظی مشارکت

ہے معنے کی نہیں ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ دسویں پارے میں آرہی ہے۔

دعوت کا میدان

۵۹ - اور اے پیغمبر تم اس وحی کے ذریعے ان لوگوں کو آگاہ کردو جو اس بات کا اندیشہ رکھتے ہیں کہ ان کو اللہ کے حضور میں پیش کیا جائے گا اور وہاں ان کا اللہ کے سوا کوئی مددگار اور سفارشی نہ ہوگا شاید وہ متقی ہو جائیں۔ یعنی جو لوگ فرمائشی معجزات دکھلاتے جانے پر اپنے ایمان کو موقوف رکھتے اور از راہ تعنت وعناد آیات اللہ کی تکذیب پر تلے ہوئے ہیں ان سے قطع نظر کر لیجئے کیونکہ تبلیغ کا فرض ادا ہو چکا اور ان کے راہ راست پر آنے کی کوئی توقع نہیں، اب وحی الٰہی اور قرآن کے ذریعے ان لوگوں کو متنبہ کرنے کا مزید اہتمام فرمائیے جن کے دلوں میں محشر کا خوف اور عاقبت کی فکر ہے کیونکہ ایسے ہی لوگوں سے امید ہو سکتی ہے کہ نصیحت سے متاثر اور ہدایت قرآنی سے منتفع ہوں گے[1]

مطلب یہ ہے کہ آپ کے مخاطب اس وقت دو قسم کے لوگ ہیں ایک وہ ہیں جن کو اپنے اعمال کی بازپرس کی کوئی فکر نہیں ہے اور جو اس امید پر زندگی گزار رہے ہیں کہ دنیا میں جو چاہیں کریں آخرت میں ہم سے کوئی پوچھ گچھ نہ ہوگی کیونکہ ہمارا نسب فلاں سے ملتا ہے یا ہماری نسبت فلاں سے ہے وہ ہماری مدد کو آجائیں گے اور ہمیں سفارش کر کے بچالیں گے یا فلاں ہمارے لیے کفارہ بن جائے گا۔ دوسرے وہ لوگ ہیں جن کو یہ اندیشہ ستاتے ہوتے ہے کہ ہمیں اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے اور اس اندیشہ کے ساتھ ان کو اس کی بارگاہ میں کسی جھوٹی مدد اور بناوٹی سفارش کا بھی سہارا نہیں۔ قرآن نے اس آیت میں بتایا ہے کہ جو لوگ دنیا کی زندگی میں مدہوش ہیں ان کی طرف سے آپ اپنی توجہ ہٹا لیجئے۔ اس قسم کے لوگوں پر آپ کی نصیحت کارگر نہ ہوگی۔ ان کی ہدایت میں اپنا وقت ضائع نہ کیجئے بلکہ دوسری قسم یعنی ان لوگوں کی طرف توجہ فرمائیے جن کی ایمانی استعداد ظاہر ہو چکی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی دعوت اور نبوت کی پکار ان لوگوں کے لیے نافع ہے جن کے اندر فطرت کی صلاحیتیں زندہ ہیں جو اپنی فطری صلاحیتوں کو مسخ کر دیتے ہیں ان کو نہ قرآن سے نفع پہنچتا ہے اور نہ نبوت سے۔

یاد رہے کہ اس آیت میں اس شفاعت کی نفی نہیں جو مسلمانوں کے نزدیک انبیاء، ملائکہ و صالحین

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے لیے ثابت ہے کیونکہ یہ شفاعت مستقلاً نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نیابتہً ہوگی، دونوں میں فرق ہے کہ آپ اپنا شفیع خود مقرر کریں، دوسرے یہ کہ آپ کا شفیع اللہ سبحانہ مقرر کریں۔ پہلی کافرانہ شفاعت ہے اور دوسری اسلامی شفاعت ہے۔

نبوت پر کسی عیب و صواب کی ذمہ داری نہیں

۶۰ - اور اے پیغمبر ان لوگوں کو جو صبح و شام خدا کو اس کی خوشنودی کی طلب میں پکارتے رہتے ہیں ان کو اپنے پاس سے نہ نکالو ان کے کاموں کی جوابدہی تمہارے ذمہ نہیں اور نہ تمہاری جوابدہی ان کے ذمہ ہے، اس کے باوجود بھی اگر تم ان کو اپنے سے علیحدہ کر دو گے تو تم زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے، یعنی رات دن اس کی عبادت میں حسن نیت اور اخلاص کے ساتھ مشغول رہتے ہیں۔ جب ان کا ظاہر حال یہ ہے تو اسی کی مناسبت سے ان سے معاملہ کیجئے۔ ان کا باطنی حال کیا ہے یا آخری کیا ہوگا اس کی تفتیش و محاسبہ پر معاملات موقوف نہیں۔ یہ حساب نہ آپ کا ان کے ذمہ ہے نہ ان کا آپ کے۔ لہٰذا اگر بالفرض آپ دولت مندوں کی ہدایت کی طمع میں ان غریب مخلصین کو اپنے پاس سے ہٹا دیں گے تو یہ بات بے انصافی کی ہوگی۔ کافروں میں بعض سرداروں نے حضرت سے کہا کہ تمہاری بات سننے کو ہمارا دل چاہتا ہے لیکن تمہارے پاس رذیل لوگ بیٹھتے ہیں، ہم ان کے برابر نہیں بیٹھ سکتے۔ اس پر یہ آیت اتری یعنی خدا کے طالب اگرچہ غریب ہیں لیکن ان کی خاطر ہی مقدم ہے [1]

جس واقعہ کی طرف حضرت شاہ صاحب نے اشارہ فرمایا ہے وہ مسند امام احمد میں حضرت عبداللہ ابن مسعود کے حوالہ سے اس طرح آیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حضرت صہیب، حضرت عمار، حضرت بلال اور حضرت خباب رضی اللہ عنہم جیسے دولت ایمان سے مالا مال لیکن دولت دنیا سے محروم حضرات تشریف فرما تھے کہ مشرکین کے چند سردار آئے اور انہوں نے یہ مطالبہ کیا کہ اگر آپ ان لوگوں کو اپنی مجلس سے باہر نکال دیں تو ہم آپ کی تقریر سُن لیں۔ آپ کے دل میں یہ خیال ہی پیدا ہوا تھا کہ اگر یہ لوگ توحید سن لیں اور میں اپنے رفقاء کو اس مصلحت کے لیے مجلس سے اٹھا دوں تو حرج ہی کیا ہے مگر اللہ تعالیٰ کو غرباء سے وہ محبت ہے جو عموماً سرمایہ داروں سے نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو ہدایت کی کہ آپ ہرگز ایسا نہ کریں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت سے بھی معلوم ہوا کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مختار کل نہ تھے ورنہ یہ تنبیہہ نازل نہ ہوتی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ داعی کو چاہیے کہ اپنی قوت اصلاح مستعد طبیعتوں کی تربیت میں صرف کرے، اگرچہ تھوڑے اور کمزور ہوں۔ ان لوگوں کے پیچھے وقت ضائع نہ کرے جن میں قبولیت کی استعداد نہیں اگرچہ بظاہر طاقتور اور بہت سے ہوں۔ گویا بتا دیا کہ جو شامت زدہ لوگ اپنے غرور مال میں مست ہیں تمہیں کوئی اہمیت نہیں دیتے کیونکہ تمہارے ساتھی سب نوا، غریب اور مفلس ہیں، ان کے پیچھے اپنا وقت ضائع نہ کرو اور ان کے ایمان کی فکر میں پڑ کر ان سے غفلت نہ کرو جو اللہ کی آیات پر ایمان لا چکے ہیں اور صبح و شام اللہ کی عبادت میں لگے ہوتے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت اس لیے نہیں ہوئی کہ آپ سے یہ اندیشہ تھا کہ آپ صحابہ کرام کو نظر انداز کر دیں گے یا ان کو اپنے پاس سے الگ کر دیں گے بلکہ اس لیے ہوئی ہے تاکہ اس طرح سرداران قریش کے تمرد و غرور پر ضرب لگائی جائے لیکن مخاطب ان کو نہیں بنایا بلکہ حضور انور کو مخاطب کر کے واضح کر دیا کہ وہ اس قابل نہیں ہیں کہ ان کو مخاطب بنایا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جو بکواس کرتے ہیں کرنے دو آپ ان کے پیچھے پڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کریں یدعون ربھم بالغداۃ والعشی میں صبح و شام کے مقررہ حسی اوقات مراد نہیں بلکہ دوام مراد ہے۔ یعنی دن رات اپنے فرائض میں لگے رہتے ہیں جانباز سپاہی کی طرح ہر وقت اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہتے ہیں۔ یہ زمخشری کی نکتہ آفرینی ہے۔ یریدون وجھہ کا مطلب یہ ہے کہ یہ ہمہ وقتی دعا طلبگاری عبادت اور فرائض کی ادائیگی میں تمام تر رضائے الٰہی کو پیش نہاد بنا کر لگے رہتے ہیں۔ یعنی ان کی ساری عابدانہ زندگی کا منتہائے نظر اللہ کی رضامندی اور خوشنودی ہے کیونکہ عبادت اور طاعت کے تصور کے ساتھ اجر کا تصور اسی طرح لازم ہے جس طرح سورج کے ساتھ روشنی اور گرمی کا تصور، اس لیے اگر دین کا بنیادی تصور اور فریضہ اللہ کی عبادت ہے تو کوئی شک نہیں کہ اس عبادت سے اس کا مقصد اللہ سبحانہ سے اجر کا حصول ہے۔ پھر چونکہ کسی بالاتر ہستی کی خدمت و طاعت کا اجر اسی وقت حاصل ہوتا ہے۔ جب وہ اس کار خدمت اور عمل طاعت کا پسندیدہ اور قابل قبول پا کر اس سے خوش ہو گئی ہو اس لیے فطری بات ہے کہ طالب اجر کی نظر اجر سے پہلے اپنے مالک کی خوشنودی پر جمی رہے گی، وہ اگر خوش ہو گیا تو گویا اجر حاصل ہی ہو گیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر

یریدون وجھہ کا واضح تقاضا یہ ہے کہ عابد کی غرض اپنے مالک کی رضا جوئی ہوتی ہے اور اپنا فریضہ منصبی ادا کرتے ہوتے اس کی نظریں ہر وقت اسی غایت پر جمی رہتی ہیں۔ یہاں قرآن نے صحابہ کی عابدانہ زندگی کے اسی پہلو سے لوگوں کو روشناس کرایا ہے۔

آخر میں فرمایا ما علیك من حسابھم من شیئ، تو اس کے دو مطلب بتائے گئے ہیں۔ ایک مطلب تو یہ ہے کہ ہر شخص اپنے عیب و صواب کا ذمہ دار خود ہی ہے۔ ان مسلمان ہونے والوں میں سے کسی شخص کی جوابدہی کے لیے آپ نہ کھڑے ہوں گے اور آپ کی جوابدہی کے لیے ان میں سے کوئی نہ کھڑا ہوگا۔ آپ کے حصہ کی کوئی نیکی یہ آپ سے چھین نہیں سکتے اور اپنے حصہ کی کوئی بدی آپ پر ڈال نہیں سکتے پھر جب یہ محض طلبِ حق کے داعیہ سے آپ کے پاس آتے ہیں تو آخر آپ کیوں ان کو اپنے سے دور کریں۔ اور علامہ آلوسی نے یہ مطلب بتایا ہے کہ ان کے ایمان و عمل کا حساب آپ سے نہیں لیا جائے گا۔ آپ کا فریضہ رسالت تو صرف یہ ہے کہ ظاہر اعمال کو دیکھیں اور ان کے مطابق فیصلہ فرمائیں۔ باطن کا معاملہ اللہ کے سپرد کریں۔ ان کا ظاہر وہ ہے جو ہم نے بتا دیا ہے اس صورت میں ضمیر ھم کا مرجع الذین یدعون ربھم ہے اور دوسرا مطلب یہ ہے کہ تم نے ان مشرکین کو دعوت پہنچا دی۔ اب اگر یہ اپنی گمراہی میں پڑے رہے تو اس کے بارے میں خدا کے ہاں آپ سے نہیں پوچھا جائے گا۔ مواخذہ انہیں سے ہوگا۔ ان کے حساب کی کوئی ذمہ داری آپ پر نہیں ہے۔ اس صورت میں ضمیر کا مرجع مشرکین ہوں گے۔ لیکن بعد میں آنے والے فقرے فتطردھم میں ضمیر کا مرجع پھر الذین یدعون ہوگا، اس میں انتشار ضمائر ہے اور یہ شان بلاغتِ قرآنی کے خلاف ہے۔

امیری اور غریبی دونوں پرچہ امتحان ہیں

۶۱ - اور اسی طرح ہم نے بعض انسانوں کو بعض کے لیے پرچہ آزمائش بنایا ہے تاکہ کہنے والے کہہ سکیں کیا یہی لوگ ہیں جنہیں اللہ نے اپنے انعامات کے لیے ہم میں سے چن لیا ہے۔ کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ہے۔ یعنی دولت مندوں کو غریبوں سے آزمایا ہے کہ ان کو ذلیل دیکھتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں کہ یہ کیا لائق ہیں اللہ کے فضل کے اور اللہ ان کے دل دیکھتا ہے کہ اللہ کا حق مانتے ہیں۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں اللہ سبحانہ، نے اپنی ایک سنت اور اپنا ایک دستور بیان کیا ہے کہ ہم نے دنیا میں کسی کو جو دولت دی ہے تو اس بنا پر نہیں دی کہ وہ اسی کا حقدار تھا۔ اسی طرح کسی کو غربت دی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اسی کا سزاوار تھا بلکہ ایک کو دولت دوسرے کو غربت دے کر دونوں کا امتحان کیا ہے وہ جن کو مال وجاہ دیتا ہے تو اس لیے دیتا ہے کہ وہ دیکھے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت پاکر اس کے شکر گزار، متواضع اور فرمانبردار بندے بنتے ہیں یا مغرور و متکبر ہو کر اکڑنے والے، اتراپنے والے، غریبوں کو دھتکارنے والے اور خدائی نعمتوں کے اجارہ دار بن بیٹھے ہیں۔ اسی طرح جن کو غربت دیتا ہے تو یہ دیکھنے کے لیے دیتا ہے کہ وہ اپنی غربت پر صابر اور اپنے نان جویں پر قانع، اپنی تقدیر پر راضی اور اپنے فقر پر خوددار رہتے ہیں یا مایوس و دل شکستہ ہو کر پست ہمت بے حوصلہ، تقدیر سے شاکی، خدا سے برہم اور ذلیل وخوار ہو کر رہ جاتے ہیں۔ فرمایا کہ اسی امتحان میں ہم نے ان کو ڈالا ہے۔ ہم نے ان کو اپنے فضل سے نوازا تاکہ یہ ہمارے شکر گزار بندے بنیں۔ لیکن ان کی کج فہمی کے باعث ہماری نعمت ان کے لیے فتنہ بن گئی۔ یہ سمجھ بیٹھے کہ یہی ساری نعمتوں کے پیدائشی حق دار ہیں۔ اس کج فہمی کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہ یہ کہنے لگے کہ اسلام اگر کوئی فضیلت کی چیز ہوتی تو کیا اس سے سرفراز کرنے اور اس انعام کی نوازش کرنے کے لیے اللہ سبحانہ، کو یہی اراذل اور یہی حقیر و نادار لوگ مل سکے ہیں یعنی غریبوں اور مفلسوں اور ایسے لوگوں کو جو سوسائٹی میں ادنیٰ حیثیت رکھتے ہیں سب سے پہلے ایمان کیوں ملا ہے۔ اگر یہ چیز کوئی اچھی ہوتی تو یہ لوگ اس کی طرف ہم سے سبقت نہ لے جاتے۔ قرآن نے ان کے اس تمرد کے جواب میں کہا کہ الیس اللہ باعلم بالشاکرین کیا اللہ اپنے شکر گزار بندوں کو نہیں جانتا۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کی نعمت روٹی کپڑا مکان نہیں ہے۔ یہ آسمانی نعمت اور یزدانی رحمت ہے۔ یہ تو صرف ان کا حصہ ہے جو ہر حال میں اپنے رب کے شکر گزار رہتے ہیں جنہوں نے خدا کی نعمتوں کی قدر کی۔ جنہوں نے اپنی صلاحیتوں کا حق ادا کیا، جنہوں نے اپنی آنکھوں پر غرور کی پٹی نہ باندھی اور جنہوں نے اپنے دلوں کو مردہ نہ ہونے دیا، دنیا نیک و بد دونوں کو مل جاتی ہے لیکن ایمان کی نعمت صرف ان ہی کو ملتی ہے جو خدا کے شکر گزار ہوتے ہیں۔

اہل ایمان کے لیے رحمت کی بشارت

۶۴۔ اور جب تمہارے پاس وہ لوگ آئیں جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں تو ان سے سلام علیکم کہو تمہارے پروردگار نے رحم وکرم کا شیوہ اپنے اوپر لازم کر لیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ

ان اہل ایمان سے اگر بھول چوک بھی ہو جائے تو ان پر سختی نہ کرو بلکہ خدا کی رحمت کا پیام پہنچاؤ اور اس کی مغفرت کی بشارت سے ان کے دلوں کو تسکین دو۔ گویا فرمایا کہ ہمارے یہ بندے جن کو مشرکین غریب ہونے کی وجہ سے حقیر سمجھتے ہیں جب آپ کے پاس آئیں تو آپ سلامتی اور رحمت کی دعا کے ساتھ ان کا خیر مقدم کریں، اور ہماری طرف سے ان کو بشارت دیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے ایماندار بندوں کے لیے اپنے اوپر رحمت واجب کر رکھی ہے وہ تم کو اپنی رحمت سے ضرور نوازے گا۔ حضرت شیخ الاسلام نے بھی اپنے افادات میں اسی مطلب کو اپنایا ہے فرماتے ہیں:-

مومنین کو کامل سلامتی اور رحمت و مغفرت کی بشارت سنا دیجئے تاکہ ان غریبوں کا دل بڑھے اور دولت مند متکبرین کے طعن و تشنیع اور تحقیر آمیز برتاؤ سے شکستہ خاطر نہ ہوں۔

یہ یاد رہے کہ بندوں کی جانب سے اللہ سبحانہٗ پر کوئی پابندی عائد نہیں ہے مگر اس نے اپنی رحمت کے اقتضا سے اپنے اوپر خود کچھ چیزیں فرض کر لی ہیں۔ من جملہ ان کے ایک رحمت بھی ہے۔ خدا مجرموں کو سزا دے سکتا ہے، گنہ گاروں پر عذاب بھیج سکتا ہے۔ سیہ کاروں کو ان کی گستاخیوں کا مزہ چکھا سکتا ہے۔ وہ غالب ہے قاہر ہے جبار ہے اور منتقم ہے لیکن ان سب کے ساتھ وہ غفار و غفور اور رحمان و رحیم بھی ہے۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ اس نے اپنے اوپر رحمت کی پابندی خود عائد کر لی ہے اور اس کو اپنے اوپر فرض گردان لیا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے کہ ان کو ہماری طرف سے سلام پہنچا دو اور تسلی کا یہ پیغام دو کہ ہمارا باب رحمت ہر وقت کھلا ہے۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث انشاء اللہ نویں پارے میں آ رہی ہے۔

توبہ سے ہر گناہ معاف ہو جاتا ہے

۶۳۔ یہ اس کا رحم و کرم ہی ہے کہ اگر تم میں سے کوئی نادانی سے کسی برائی کا ارتکاب کرے پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اصلاح کرے تو وہ اسے معاف کر دیتا ہے اور نرمی سے کام لیتا ہے۔ پہلے فرمایا تھا کہ پیغمبر تبشیر و انذار کے لیے آتے ہیں۔ چنانچہ اس رکوع کے شروع میں وانذر سے شان انذار کا استعمال تھا۔ اب مومنین کے حق میں شان تبشیر کا اظہار ہے۔ یہ جو فرمایا کہ جو کوئی کرے تم میں برائی ناواقفیت سے، اس سے شاید یہ غرض ہو کہ مومن جو برائی کرتا ہے خواہ نادانستہ ہو یا جان بوجھ کر ہو وہ فی الحقیقت اس برائی اور گناہ کے انجام بد سے ایک حد تک ناواقف اور بے خبر ہی

ہوتا ہے۔ اگر گناہ کے نتائج کا پوری طرح استحضار ہو تو کون شخص ہے جو اس پر اقدام کی جرأت کرے[1]
یہاں ایک جامع قانون بتایا ہے کہ جو شخص گناہ کا ارتکاب جہالت سے کرے پھر اس کے بعد توبہ کرے اور اپنے اعمال کو درست کرے تو اللہ تعالیٰ مغفرت کرنے والا ہے۔ اس کے گناہ کو معاف کر دے گا اور اللہ بہت رحمت کرنے والا ہے کہ صرف معافی پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ مزید انعامات سے بھی نوازے گا۔ یہاں جہل نہیں جہالت کا لفظ بولا گیا۔ جہالت کے معنے عربی میں نہ جاننے کے نہیں آتے بلکہ اس کا غالب استعمال جذبات سے مغلوب ہو کر کوئی شرارت یا ظلم یا گناہ کا کام کر گزرنے کے ہیں۔ یہ لفظ عام طور پر علم کے بجائے حلم کے مقابلہ میں استعمال ہوتا ہے۔ ایک حماسی کا شعر ہے۔

وللحلم خير فاعلمن مغبة
من الجهل الا ان تشمس من ظلم

جہالت جہل کے مقابلہ میں تحمل و بردباری انجام کے لحاظ سے اچھا ہے خوب جان لو ہاں یہ کہ تمہیں ظلم کی وجہ سے ذلیل کرنے کی کوشش کی جائے۔
معلقات کا مشہور شعر ہے۔

الا لا يجهلن احد علينا
فنجهل فوق جهل الجاهلينا

خبردار کوئی ہمارے خلاف جہالت کا مظاہرہ نہ کرے کیونکہ ہم بھی سب جاہلوں سے زیادہ جہالت کا مظاہرہ کر سکتے ہیں۔ اگر غور کیا جائے جب بھی کسی سے گناہ سرزد ہوتا ہے تو جذبات سے مغلوب ہو کر ہی ہوتا ہے۔ اب اس ارشاد کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص جذبات سے مغلوب ہو کر گناہ کرے پھر اس کے بعد توبہ کر کے اصلاح حال کرے تو اللہ غفور رحیم ہے۔ آیت میں مغفرت و رحمت کا وعدہ بے قید نہیں بلکہ دو شرطوں کے ساتھ مقید ہے ایک توبہ دوسرے اصلاح عمل۔ توبہ کے معنے گناہوں پر ندامت کے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے انما التوبة الندم، اصلاح عمل سے مقصود یہ ہے کہ آئندہ اس گناہ کے نہ کرنے کا عزم کرے اور اس میں یہ بھی شامل ہے کہ سابقہ گناہ سے جو حقوق کسی کے پامال ہوئے ہوں تا حد اختیار ان کی ادائیگی کرے چاہے وہ حقوق اللہ ہوں یا حقوق العباد، نماز نہ پڑھنے کا گناہ کیا ہے تو نماز کی قضا کرے اور اگر چوری کی ہے تو مال مالک کو واپس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرے۔ مسند احمد میں حضرت علی کے حوالہ سے ارشاد نبوت ہے کہ

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ اپنے اس مومن بندے سے محبت رکھتا ہے جو فتنوں میں مبتلا ہوتا رہتا ہے اور ہمیشہ توبہ کرتا رہے۔

یہاں دو چیزیں ہیں ایک بندے کی فطرت دوسرے بندے کی صفت۔ گناہ اگر فطرت ہو تو توبہ ضرور اس کی صفت ہونی چاہیے۔ اگر وہ اپنی فطرت کی بنا پر طرح طرح کے فتنوں میں گرفتار ہوتا رہتا ہے مگر ہر بار اپنی صفت توبہ و استغفار کو فراموش نہیں کرتا تو وہ ارحم الراحمین کی نظروں میں کیوں پیارا نہ ہو۔ یہاں محبت اس کے تکرار جرم پر نہیں بلکہ ہر بار اس کی صفت توبہ و استغفار پر ہے۔ یہ انداز بیان اس لیے اختیار نہیں کیا گیا کہ گنہگار اپنے گناہوں پر اصرار کریں بلکہ اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ جو نادم و شرمسار ہیں وہ شکستہ دل نہ ہوں اور اپنی ندامت کی بدولت عصیان کے بعد بھی خدائے تعالیٰ کی مغفرت کی خوشخبری سن لیں۔ ندامت پر خدا تعالیٰ کی مغفرت کی خوشخبری گناہ کی جرأت نہیں پیدا کرتی بلکہ اس کی فطرت سے معصیت کا تخم جڑ سے نکال کر پھینک دیتی ہے اللھم اجعلنی من التوابین آمین

راہِ باطل کی توضیح

۶۴ - اور اسی طرح ہم اپنی نشانیاں کھول کر بیان کرتے ہیں اور اس لیے بیان کرتے ہیں تاکہ جرم پیشہ لوگوں کی راہ واضح ہو جائے۔ یعنی اس لیے ہم احکام و آیات تفصیل سے بیان کرتے ہیں نیز اس لیے کہ مومنین کے مقابلہ میں مجرمین کا طریقہ بھی واضح ہو جائے[1] دراصل یہاں لتستبین کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ زمخشری نے پوری بات کو اس طرح کھولا ہے کہ،

> اس طرح کا اشارہ اس پوری تفصیل کی طرف ہے جو گزر چکی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اس پیش کردہ تفصیل کی طرح ہم مجرمین کی نقاب کشائی میں بھی بات کھول کر بیان کر رہے ہیں تاکہ پتہ لگ جائے کہ ان مجرمین میں وہ کون ہیں جو قبول حق کی استعداد کھو بیٹھے ہیں اور وہ کون ہیں جن سے قبول کی امید ہے اور وہ کون ہیں جو اسلام میں آ رہے ہیں، مگر اسلامی حدود کی نگرانی نہیں کر رہے ہیں۔ ہم ان سب کا چہرہ آپ کے سامنے کھول کر پیش کر رہے ہیں تاکہ آپ ان سے ان کے حالات کے مطابق معاملہ کریں۔

[1] افادات شیخ الاسلام

یعنی تاکہ آپ پر سب کا انداز فکر واضح ہو جائے اور کوئی چیز وجہ پریشانی نہ بنے۔

یہ قرآن عزیز کا اعجازی شاہکار ہے۔ بتانا یہ ہے کہ حقائق کو تفصیل سے بیان کرنے کے دو فائدے ہیں ایک یہ کہ اہل نظر علم و حکمت سے مالامال ہو جائیں اور حق کے بارے میں ان کو دلائل معلوم ہو جائیں تاکہ صحیح معنے میں کہ۔ ما موعظت سے عبرت اندوز ہو سکیں اور دوسرے یہ کہ اہل نظر کے سامنے راہ باطل کھل کر سامنے آجائے تاکہ اہل ایمان سے وہ ممتاز ہو جائیں۔ دونوں راہوں میں کسی قسم کا التباس اور اشتباہ نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ راہ حق کے راہرو کے لیے راہ باطل سے واقف ہونا ناگزیر ہے۔ راہیں دو ہیں ایک سبیل المومنین دوسرے سبیل المجرمین رہرو حق کے لیے ضروری ہے کہ باطل آشنا ہو تاکہ باطل سے اپنا دامن بچا سکے۔ قرآن نے یہاں بیان تو راہ حق کی ہے لیکن انداز بیان ایسا اختیار کیا ہے کہ اہل باطل کی راہ بھی مخاطبوں کے سامنے کھل کر آگئی۔

قُلْ إِنِّي نُهِيتُ أَنْ أَعْبُدَ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ ۚ قُل
لَّا أَتَّبِعُ أَهْوَاءَكُمْ ۙ قَدْ ضَلَلْتُ إِذًا وَمَا أَنَا مِنَ الْمُهْتَدِينَ ۝
قُلْ إِنِّي عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّي وَكَذَّبْتُم بِهِ ۚ مَا عِندِي مَا
تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ ۚ إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلَّهِ ۖ يَقُصُّ الْحَقَّ ۖ وَهُوَ خَيْرُ
الْفَاصِلِينَ ۝ قُل لَّوْ أَنَّ عِندِي مَا تَسْتَعْجِلُونَ بِهِ لَقُضِيَ
الْأَمْرُ بَيْنِي وَبَيْنَكُمْ ۗ وَاللَّهُ أَعْلَمُ بِالظَّالِمِينَ ۝

اے پیغمبر ان منکرین سے کہو کہ مجھے اس بات سے منع کر دیا گیا ہے کہ میں ان کی بندگی کروں جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔[۵۶] نیز ان سے کہہ دو کہ میں کبھی تمہاری خواہشوں کے پیمانوں پر نہیں چلوں گا، اگر میں ایسا کر دوں تو پھر میں راہِ حق سے ہٹ جاؤں گا، اور میں ان میں سے نہ رہوں گا جو ہدایت یافتہ ہیں۔ آپ کہہ دیں کہ میں بلاشبہ اپنے پروردگار کی جانب سے

واضح اور صاف راہ پر ہوں اور تم نے اس کی تکذیب کی ہے ۶۷ میرے پاس وہ کچھ نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی کر رہے ہو حکم تو بس اللہ ہی کا ہے وہ ہی حق کو بیان کرتا ہے اور وہی سب بہتر فیصلہ کرنے والا ہے ۶۸ اے پیغمبر کہہ دو کہ جس بات کے لیے تم جلدی کر رہے ہو اگر وہ میرے اختیار میں ہوتی تو مجھ میں اور تم میں کب کا فیصلہ ہو گیا ہوتا اور اللہ ظالم کار لوگوں کو خوب جانتا ہے ۶۹

راہِ نبوّت سرتاسر یقین کی راہ ہے

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کا مقصد دُنیا کو جنت کی بشارت دینا اور عذاب آخرت سے ڈرانا تھا، آپ مبشر اور نذیر بن کر آئے تھے کہ ساری دُنیا کو خوشخبری دیں، آپ مبعوث فرمائے گئے تھے کہ دنیا کو بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔ تمام دُنیا کو مادی زندگی کی کال کوٹھری سے نکال کر دُنیا و آخرت کی وسعتوں میں پہنچا ئیں۔ مذاہب و ادیان کی ناانصافیوں اور زیادتیوں سے نجات دے کر اسلام کے انصاف سے متمتع ہونے کا موقع دیں۔ آپ کا کام نیکی کی ترغیب دینا، بدی سے روکنا، صاف و پاک چیزوں کو حلال کرنا گندی و ناپاک چیزوں کو حرام قرار دینا تھا۔ اس معاملہ میں آپ کی راہ وہم و گمان، خیال و قیاس سے بنائی ہوئی نہ تھی بلکہ وحی و نبوّت کی بتائی ہوئی تھی۔ نبوّت کی راہ دلیل و یقین اور علم و بصیرت کی راہ ہے۔ اور آپ کی نبوّت کا انکار کرنے والوں کے شک گمان

کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس طرح راہیں دو ہیں، ایک شک وگمان کی دوسری یقین وبصیرت کی۔ جو لوگ نبوت سے بیگانہ ہیں ان کے پاس نبوت کے انکار کے لیے کوئی بصیرت نہیں۔ زیادہ سے زیادہ جو بات وہ کہہ سکتے ہیں یہی ہے کہ ہمیں خبر نہیں، ہمارے پاس کوئی ثبوت نہیں، ہم محسوسات کے دائرے سے آگے نہیں جا سکتے۔ لیکن پیغمبر اعلان کرتا ہے کہ میں اس بارے میں علم و یقین رکھتا ہوں اور جانتا ہوں کہ حقیقت حال کیا ہے۔ اس کی جگہ یقین کی جگہ ہے۔ شک وگمان کی اس پر چھائیں بھی نہیں پڑی ہے علم و عمل میں وہ سب سے الگ راہ اختیار کرتا ہے۔ علم کی حد تک اس کا دعویٰ ہوتا ہے انی علی بینۃ من ربی اور عمل کے دائرے میں اس کا اعلان ہوتا ہے لا اتبع اھواءکم یہ گویا مخاطبوں پر طنز ہے کہ علم کی حد تک تمہارا دامن دلیل ویقین اور علم وبصیرت سے خالی ہے اور عملی زندگی تمہاری سرتاسر خواہشات اور چاہتوں کی پیروی ہے۔

اسی بنا پر جب کفار پیغمبر کی صداقت کی نشانی مانگتے ہیں، اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس کی صداقت کی نشانی تو اس کا علم و عمل ہے اور اہل یقین کے لیے اس کی سچائی کی تمام نشانیاں ظاہر کر دی گئی ہیں۔ اس کی حقانیت نیکوکاروں کو خوشخبری سنانا بدکاروں کو ڈرانا اور متنبہ کرنا اور اس سے انقلاب انسانی اور نتائج روحانی کا ظہور بجائے خود اس کی صداقت کی کھلی نشانیاں ہیں۔ یعنی خود دعوت الٰہی اور پیغام ربانی سب سے بڑی بینۃ ہے کہ ایک اُمّی ہو کر وہ ایک ایسی کتاب اور ایسی تعلیم پیش کر رہا ہے جس کی صداقت روز روشن کی طرح واضح ہے۔

رسول من اللہ یتلوا صحفا مطھرۃ فیھا کتب قیمۃ

۶۵- لے پیغمبر ان سے کہو کہ مجھے اس بات سے روکا گیا ہے کہ میں ان کی بندگی کروں جن کو تم خدا کے سوا پکارتے ہو۔ گزشتہ آیت میں وہ چیزیں بیان ہوئی ہیں جو مومنین سے کہنے کے لائق ہیں اس رکوع میں ان امور کا تذکرہ ہے جو مجرمین اور مکذبین کے حق میں قابل خطاب ہیں۔ یعنی آپ فرمادیجئے کہ میرا ضمیر، میری فطرت، میری عقل، میرا نور شہود اور وحی الٰہی جو مجھ پر اترتی ہے یہ سب مجھے اس سے روکتی ہیں کہ میں توحید کامل کے جادے سے ذرا بھی قدم ہٹاؤں خواہ تم کتنے ہی حیلے اور تدبیریں کر دیکھے[1]

آیت میں دُعا سے مراد وہ پکارنا ہے جو دُعا اور استمداد کے قسم کا ہو، اس طرح اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو پکارنا فی الواقع اس کی عبادت ہے۔ شاید اسی قسم کی آیات سے اشارہ پا کر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نے امت کو یہ تعلیم دی ہے کہ الدعاء ھوالعبادۃ، دعا ہی عبادت ہے جیسا کہ مسند احمد، مصنف ابن ابی شیبہ، ادب المفرد بخاری، ابوداؤد، ترمذی، نسائی، ابن ماجہ، صحیح ابن حبان، مستدرک حاکم میں نعمان بن بشیر اور مسند ابی یعلی میں براء بن عازب کے حوالہ سے آیا ہے الدعاء مخ العبادۃ دعا مغز عبادت ہے۔ سنن ترمذی میں حضرت انس کے حوالہ سے ایک ضعیف حدیث آئی ہے۔

یہاں الذین تدعون لاکر قرآن نے اشارہ کر دیا کہ جن کو عرب کے مشرک پکارتے تھے اور جن کو حاجت روا اور مشکل کشا سمجھ کر ان سے دعائیں مانگتے تھے صرف پتھر کی مورتیاں نہ تھیں بلکہ مشرکین کی دعائیں ان روحانی ہستیوں سے تھیں جن سے یہ پتھر کے بت منسوب تھے۔ پتھر کے یہ بت اشخاص تھے جن کے یہ بت بنائے گئے تھے وہ شخصیتیں تھیں۔ یہ بت اور مورتیاں کچھ روحانی ہستیوں کی نشانی اور یادگار سمجھے جاتے تھے۔ شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بات کھول کر سمجھائی ہے۔

> مشرکین اس بات میں تو مسلمانوں کے ہم خیال تھے کہ بڑے بڑے کاموں کی انجام دہی اللہ سبحانہ کرتا ہے اور کسی کے لیے یہ اختیار نہیں مانتے تھے کہ جب اللہ سبحانہ کسی کام کا فیصلہ کر دیتا ہے تو وہ اسے ہٹا سکتے ہیں لیکن باقی تمام معاملات میں وہ مسلمانوں کے ہمنوا نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ پہلے کچھ اللہ کے نیکوکار بندے ایسے ہوئے ہیں جنہوں نے بہت عبادت کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کیا ہے، اللہ تعالیٰ نے ان کو الوہیت کا خلعت عطا کر دیا ہے اس لیے وہ مخلوق کے نیازمندانہ اور عابدانہ اعمال کے مستحق ہو گئے، ایسے ہی جیسے بڑی شان والے بادشاہ کی کوئی غلام خدمت کرے اور وہ اس کی خدمات سے خوش ہو کر حکومت کے کچھ معاملات میں اس کو مختار بنا دیتا ہے۔ ان بزرگوں کا مقام بھی اللہ کے یہاں یہی ہے۔ اس لیے اب اللہ کی کوئی عبادت ان کی عبادت کی آمیزش کے بغیر نہیں ہوتی بلکہ اللہ کی ذات تو بالاد بالاتر ہے۔ اب تو اللہ کا تقرب حاصل کرنے کے لیے ان کی ہی عبادت ضروری ہے۔ یہی ہماری دعائیں سنتے ہیں یہی ہمارے حالات دیکھتے ہیں اور یہی اللہ کی بارگاہ میں سفارشی ہیں۔ اور یہی سارے امور کو انجام دے رہے ہیں، یہی ہمارے مددگار ہیں۔ ان بزرگوں کے ناموں سے مشرکین نے کچھ مورتیاں بنا لی ہیں اور ان مورتیوں کو ان کی عبادت کے لیے حیلہ بنایا۔ بعد میں آنے والے مورتیوں اور ان ہستیوں میں کوئی فرق نہ

کر سکے۔ انہوں نے مورتیوں ہی کو معبود سمجھ لیا۔ قرآن کبھی توان ہستیوں کا ذکر کر کے ان کے شرک کی تردید کرتا ہے اور کبھی مورتیوں کا ذکر کر کے ان کے مشرکانہ اعمال کا رد کرتا ہے۔ (حجۃ اللہ البالغہ)

مثلاً مورتیوں اور بتوں کے بارے میں ہے

اتعبدون ما تنحتون

کیا تم پتھر کی ان مورتیوں کی عبادت کرتے ہو جن کو تم خود تراشتے ہو

اور کبھی ان ہستیوں اور شخصیتوں کا ذکر کرتا ہے جن کی یہ بت نشانی یا جلوہ گاہ تھے۔

ان الذین تعبدون من دون اللہ لا یملکون لکم رزقاً۔

جن ہستیوں کی تم عبادت کرتے ہو وہ تمہاری روزی کے مالک نہیں ہیں۔

میر سید شریف نے بھی شرح مواقف میں یہی بات لکھی ہے کہ

بت پرست دو واجب الوجود معبودوں کے قائل نہیں ہیں اور وہ نہ بتوں کو صفات الوہیت سے متصف مانتے ہیں۔ وہ ان کو معبود کہتے ہیں لیکن دراصل انہوں نے انبیاء علیہم السلام، اولیاء کرام یا فرشتوں یا ستاروں کی تصویریں اور بت بنا کر ان کی عبادت صرف اس لیے کی ہے کہ وہ اس طریقے سے اللہ سبحانہٗ تک رسائی حاصل کر لیں۔

اور امام رازی کی عبارت بھی اسی کے قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ قدرت علم اور حکمت میں برابر شریک تسلیم کرنے والا آج تک کوئی فرقہ پیدا نہیں ہوا۔

اشخاص اور شخصیتوں کے اس جوہری فرق کو نظر انداز کرنے کی وجہ سے بیگانے تو بیگانے یگانے بھی اسلامی توحید کے بارے میں چند در چند غلط فہمیوں کے شکار ہو گئے ہیں۔ عطائی اور ذاتی کا سہارا لے کر اللہ کی صفات واجبہ اور لوازم الوہیت کو انبیاء اور اولیاء کے لیے ثابت کرنا اپنا شعار بنا لیا اور انبیاء اور اولیاء کو عبادت میں واسطہ بنانے کی فکری کجی میں مبتلا ہو کر مشرکانہ اعمال کا لوگوں کے لیے دروازہ کھول دیا۔ اور اس کے نتیجے میں جب غیر مسلموں کی جانب سے اسلامی توحید پر اعتراضات ہوئے تو پریشان ہو کر رہ گئے۔

مثلاً صابئین کہتے ہیں کہ فرشتوں اور ستاروں کی عبادت کرنی چاہیے کیونکہ یہ خالق و مخلوق کے درمیان واسطہ ہیں۔ ان کے مقابلہ میں جب اہل اسلام توحید کا یہ تصور پیش کرتے ہیں کہ بیگانہ خدا کی عبادت

اور رسُول کی طاعت ہونی چاہیے تو صابئین الزاماً کہتے ہیں کہ خدا اور مخلوق کے درمیان عبادت میں واسطہ تم بھی مانتے ہو، ہم بھی مانتے ہیں، تم رسُول کو واسطہ مانتے ہو، ہم فرشتوں اور ستاروں کو واسطہ مانتے ہیں۔ الشہرستانی نے اپنی کتاب الملل والنحل میں اس کا جواب دیا ہے اور یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ روحانی اعتبار سے بشر ہی کو واسطہ بنانا افضل ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ اس تقابل سے پتہ لگتا ہے کہ شہرستانی کو بھی پورے طور پر اسلامی توحید کا علم نہیں ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ توحید اسلامی میں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں واسطہ کسی کو بھی نہیں بنایا جاتا نہ فرشتہ کو نہ انسان کو، رسُول اگر واسطہ ہے تو وہ عبادت میں نہیں بلکہ ہدایت میں ہے۔ رسُول کی مثال نماز میں امام کی ہے جیسے امام نماز عبادت میں واسطہ نہیں ہوتا بلکہ وہ خود بھی لوگوں کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی بلاواسطہ عبادت کرتا ہے ایسے ہی نبی عبادت میں نہیں بلکہ ہدایت میں واسطہ، وسیلہ اور ذریعہ ہوتا ہے اس کے برعکس صابئین عبادت میں کواکب کو واسطہ تسلیم کرتے ہیں اور ان کی عبادت کرتے ہیں مسلمان انبیاء کو عبادت میں، واسطہ نہیں مانتے اس لیے ان کی عبادت نہیں کرتے۔ چونکہ ہدایت میں واسطہ

مانتے ہیں اس لیے ان کی رہنمائی میں

ان کے بتائے ہوئے طریقہ کے مطابق یکتا خدا کی عبادت کرتے ہیں، ان سے دعا مانگتے ہیں نہ مدد مانگتے ہیں نہ ان کی دہائی دیتے ہیں نہ ان کو دور دور سے پکارتے ہیں نہ ان کی قسم کھاتے ہیں اور نہ ان کے نام نذریں اور منتیں مانتے ہیں اور نہ ان کے چڑھاوے چڑھاتے ہیں۔ یہ سب باتیں اسلامی توحید کے لطیف مزاج کے خلاف ہیں۔

شارع حقیقی اللہ سبحانہٗ ہے

۶۶۔ نیز ان سے کہہ دو کہ میں کبھی تمہاری خواہشوں کے پیمانوں پر نہیں چلوں گا، اگر میں ایسا کر دوں تو پھر میں راہِ حق سے ہٹ جاؤں گا اور میں ان میں سے نہ رہوں گا جو ہدایت یافتہ ہیں یعنی میں کبھی تمہاری خواہش اور خوشی کی پیروی نہیں کر سکتا۔ بفرضِ محال اگر پیغمبر کسی معاملہ میں وحی الٰہی کو چھوڑ کر عوام کی خواہشات کا اتباع کرنے لگیں تو خدا نے جنہیں ہادی بنا کر روانہ کیا تھا معاذاللہ وہ خود ہی بھٹک گئے، پھر ہدایت کا بیج دُنیا میں کہاں رہ سکتا ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلی آیت میں اعلان کیا تھا کہ عابدانہ تعلقات اللہ کے سوا میں کسی سے وابستہ نہ کروں گا اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ طاعت اللہ کے سوا کسی کی نہ کروں گا۔ اللہ کی عبادت میں شرکت اور اللہ کی طاعت میں شرکت قرآن کی نظر میں دونوں کا مقام ایک ہے۔ لیکن دونوں میں ایک جوہری فرق ہے۔ عبادت تقاضائے محبوبیت ہے اور طاعت تقاضائے حاکمیت ہے۔ محبوبیت میں نیابت نہیں ہو سکتی جب کہ حاکمیت میں نیابت ہو سکتی ہے۔ سارا قرآن پڑھ جائیے آپ کو یہ کہیں نہ ملے گا اعبدوا اللہ والرسول لیکن یہ آپ کو بار بار ملے گا اطیعوا اللہ والرسول اس طرح پہلی آیت میں شرک فی العبادۃ سے اور اس آیت میں شرک فی الطاعۃ سے برأت کا اعلان ہوا ہے۔

عام نظر میں شرک فی العبادت جو اہمیت رکھتا ہے شرک فی الطاعۃ نہیں رکھتا۔ لیکن اس پر محققین نے خاص طور پر تنبیہہ فرمائی ہے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں کہ شرک کی ایک قسم شرک فی الطاعۃ بھی ہے۔ سورہ نسا میں زیر آیت ان اللہ لا یغفر ان یشرك بہ میں حضرت شاہ عبدالقادر تحریر فرماتے ہیں:

> اوپر سے ذکر منافقوں کا تھا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہو اور جدی راہ چلے یہ آیت فرمائی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے بس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔

اور سورہ انعام میں زیر آیت وان اطعتموھم انکم لمشرکون۔ فرماتے ہیں شرک فقط یہی نہیں ہے کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔

اسی بنا پر اہل السنۃ والجماعۃ کا حلت وحرمت کے بارے میں تحقیقی مسلک یہ ہے کہ یہ تنہا اللہ تعالیٰ کے اختیار کی چیز ہے۔ کسی چیز کو حلال یا حرام کرنا صرف اسی کا کام ہے اور وہ اس میں منفرد ہے اور یہ خالص اسی کا حق ہے کسی دوسرے کو اس میں کسی نوع سے دخل نہیں ہے نہ بالذات کسی کو یہ اختیار حاصل ہے اور نہ ہی اللہ تعالیٰ نے کسی کو یہ اختیار تفویض کیا ہے۔ چنانچہ اصول فقہ کی ساری کتابوں میں یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے الحاکم لا خلاف فی انہ اللہ رب العالمین۔ یہ عبارت کم وبیش اصول فقہ کی مشہور کتاب مسلم الثبوت، التوضیح والتلویح میں بھی ہے اور اسی مضمون کو ابن امیر الحاج نے شرح تحریر الاصول میں نہایت شرح وبسط کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حکم تشریعی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ باقی حکم رسول، حکم اہل اجماع

اور حکم مجتہد تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کا مظہر ہے حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں لکھا ہے کہ

> دراصل تحلیل و تحریم اس تکوین کا نام ہے جو عالم ملکوت میں نافذ ہوتی ہے کہ فلاں شے پر مواخذہ ہوگا یا نہ ہوگا۔ پس یہی تکوین اللہ کی صفات سے ہے۔ باقی تحلیل و تحریم کی نسبت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تو بہ اس معنی میں ہے کہ آپ کا ارشاد قطعی نشانی ہے۔ اللہ کے حلال و حرام کرنے کی اور مجتہدین کی طرف تحلیل و تحریم کی نسبت اس معنے میں ہے کہ وہ اس کو نص شارع سے روایت کرتے ہیں یا کلام شارع سے استنباط کرکے بتاتے ہیں۔

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ جیسے عبد ہونے کی حیثیت میں میرے عابدانہ تعلقات اللہ کے سوا کسی کے ساتھ نہیں ہیں ایسے ہی پوری زندگی میں مطیع و فرمانبرداری اللہ کے سوا کسی کے حکموں کی نہیں کرتا۔ میں جو کچھ اللہ کی جانب سے لے کر آیا ہوں وہ الھدیٰ ہے۔ اس کے مقابلہ میں تم جو کچھ بتا رہے ہو وہ الھویٰ ہے۔ اگر میں الھدیٰ کو چھوڑ کر تمہاری الھویٰ کا پیروکار بن جاؤں تو میں راہِ حق سے ہٹ جاؤں گا اور میرا شمار بے ہدایتوں میں ہوگا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت جو کچھ لے کر آئی ہے وہ الھدیٰ ہے اور اس کے مقابلہ پر جو کچھ ہے وہ الھویٰ ہے۔ یہ بات کہی جا رہی ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اور سنائی جا رہی ہے مسلمانوں کو۔ اور بتایا جا رہا ہے کہ اصل دین اللہ کی عبادت اور طاعت ہے اور تمہاری زندگی کامیاب اسی وقت ہو سکتی ہے۔ جب تم اس اصل پر اس کی بنیادیں استوار کرو۔ اللہ کے سوا کسی کو اپنی حقیقی عقیدتوں، محبتوں، پرستشوں اور عبادتوں کا مرکز نہ بناؤ کسی کو اپنا اصل فرمارواں نہ مانو، کسی کو اپنی زندگی میں شارع و قانون ساز نہ بناؤ، اور صرف اتنا ہی نہیں بلکہ اسی بنائے حق پر اپنی زندگی کی پوری عمارت تعمیر کرنے کی کوشش کرو اور پھر ساری دنیا کو اس کی دعوت دو، تلقین کرو اور اسی مقصد کے لیے اپنی جانیں کھپاؤ۔

نظامِ اسلام واضح اور صاف ہے

۵۷۔ آپ کہہ دیں کہ میں بلاشبہ اپنے پروردگار کی جانب سے واضح اور صاف راستہ پر ہوں اور تم نے اس کی تکذیب کی ہے یعنی میرے پاس خدا کی صاف اور صریح شہادت اور واضح دلائل پہنچ چکیں جن کے قبول سے سرمو انحراف نہیں کر سکتا۔ تم اس کو جھٹلاتے ہو تو

اس کا انجام سوچ لو[1]

اس سے پہلی آیت میں نبوت کا کام یہ بتایا تھا کہ یگانہ خدا کی عبادت اور زندگی کے سارے گوشوں میں اس کی اطاعت۔ اب اس آیت میں واضح کیا جا رہا ہے کہ نبوت کا یہ کام کسی انسانی رائے خیال اور قیاس سے تیار نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کا منبع اللہ کی روشن اور واضح دلیل ہے۔ شارحین قرآن کہتے ہیں کہ اس سے مراد اللہ کی وحی اور نبوت ہے۔ اصل ارشاد میں بینۃ آیا ہے اور بینہ ویسے تو ہر پیغمبر کا وہ معجزہ ہے جسے وہ قوم کے سامنے بطور چیلنج پیش کرتا ہے لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی حد تک قرآن کو اور حضور انور کی رسالت کو بینہ کہا گیا ہے یعنی ایسی واضح اور صاف بات جو سب کے سامنے کھلی ہو اور سب کے لیے واضح ہو۔ یہاں مراد قرآن ہے اور مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں یہ انسانی رائے، اور خیال نہیں بلکہ رب العالمین کی وحی ہے اور وحی کی رہنمائی یہ ہے کہ وہ بندگان خدا کو باطل کی تاریکی سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتی ہے۔ لوگ جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی اندھیریوں میں پھنس کر عبادت کی حد تک روحانی معرفت اور طاعت کی حد تک فطری بصیرت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں تو نبوت ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتی ہے۔ ان کو شک کی جگہ یقین، جہل کی جگہ علم، باطل کی جگہ حق، اور ظلمت کی جگہ نور عطا کرتی ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ تم تو محض ہوا میں تیر رہے ہو اور اپنی خواہشات کے پیرو کار ہو تمہارے پاس اپنے ان فرضی معبودوں کے حق میں کوئی دلیل نہیں ہے جس سے تم یہ ثابت کر سکو کہ خدا نے ان کو اپنا شریک بنالیا ہے۔ اس کے برعکس میں خدا کی جانب سے ایک حجت، ایک برہان اور ایک قطعی شہادت لے کر آیا ہوں اور اسی کو تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں خدا نے یہ بینہ مجھ پر اتاری ہے اور تم اس کی تکذیب کر رہے ہو اور بجائے اس کے کہ اس کو سمجھو اور مانو مجھ سے یہ مطالبہ کرتے ہو کہ میں تمہیں خدا کی جانب سے کوئی نشانی دکھاؤں تو تم اس کی صداقت کو مانو گے اور تمہارا حال یہ ہے کہ تم جو کچھ کر رہے ہو اس کے لیے تمہارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے

معجزہ اللہ کے اختیار میں ہے

۵۷۔ میرے پاس وہ کچھ نہیں ہے جس کے لیے تم جلدی کر رہے ہو حکم تو بس اللہ کا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

وہ حق کو بیان کرتا ہے اور وہی سب سے بہتر فیصلہ کرنے والا ہے۔ یعنی عذاب الٰہی چنانچہ کفار کہتے ہیں۔
اللّٰھم ان کان ھذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء
او ائتنا بعذاب الیم۔
اے اللہ اگر یہی حق ہے جس کی ہم تکذیب کر رہے ہیں تو ہم پر آسمان سے پتھروں کی بارش کر دے یا ہم پر اور کوئی عذاب بھیج دے لہ

مشرکین عرب نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ مطالبہ کیا کہ اگر واقعی آپ اللہ کے رسول ہیں۔ اللہ ہم آپ کی مخالفت کرتے ہیں تو خدا کے جس فیصلے کا آپ ذکر کرتے ہیں اگر وہ سچ مچ ہونے والا ہے تو کیوں نہیں ہو جاتا جواب میں فرمایا کہ ما عندی ما تستعجلون بہ۔ تم جس فیصلے کے لیے جلدی مچا رہے ہو وہ میرے اختیار میں نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ معجزات کا ظاہر کرنا صرف اللہ تعالیٰ کے قبضہ قدرت میں ہے نبی کا اس میں کچھ بھی دخل نہیں ہوتا۔ یعنی معجزہ پیغمبر کا ذاتی فعل نہیں ہوتا ہے بلکہ درحقیقت اللہ کا فعل ہوتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے اپنے اس پیغمبر کی سچائی ظاہر فرماتا ہے۔ ہمارے عقائد کی کتابوں میں معجزے کی تعریف عام طور پر یہی کی گئی ہے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو اس کے بھیجے ہوئے نبی کی سچائی اور صداقت ظاہر کرنے کے لیے اس نبی کے ہاتھ پر ظاہر کرتا ہے۔ لکھا تو سب نے یہی ہے اہل السنۃ کی عقائد کی تمام کتابوں میں یہی بتایا گیا ہے لیکن ہمارے شاہ عبدالحق محدث دہلوی نے اسے واشگاف لفظوں میں سمجھایا ہے۔ مدارج النبوۃ جلد ثانی ص۱۱۶ پر رقمطراز ہیں۔

معجزہ نبی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ خدا تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جس کو پیغمبر کے ہاتھ پر وہ ظاہر کرتا ہے برخلاف دیگر افعال کے کہ ان میں کسب بندہ کی طرف سے اور خلق خدا کی جانب سے ہوتا ہے مگر معجزے میں کسب بھی بندے کی جانب سے نہیں ہوتا ہے۔

اور فتوح الغیب کے ترجمہ میں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

معجزہ اور کرامت خدا تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو بندے کے ہاتھ پر اس کی تصدیق و تکریم کے لیے صادر ہوتا ہے۔ معجزہ اور کرامت بندے کا فعل نہیں ہوتا جو اس کے قصد و اختیار سے ظاہر ہو جیسے اس کے دوسرے افعال اختیاریہ ہیں جو اس کے قصد اور اختیار سے صادر ہوتے ہیں۔

لہ افادات شیخ الاسلام

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ جس چیز کے بارے میں تم جلد بازی مچا رہے ہو۔ مجھ میں اس کے جلد یا بدیر لانے کی قدرت نہیں ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں لا قدرۃ لی، اور علامہ آلوسی لکھتے ہیں لیس امرہ مفوضا الی۔ یہ معاملہ میرے سپرد نہیں ہے بلکہ اس کا تعلق تو اللہ کے حکم سے ہے۔ ان الحکم الا للہ یہاں حکم سے مراد حکومت نہیں ہے کہ اس معنے میں یہ لفظ خالص اور قدیم عربی میں نہیں آیا ہے یہ اہل عجم کا محاورہ ہے قرآن نے اس کو ہر جگہ فیصلہ اور قوتِ فیصلہ کے معنے میں استعمال کیا ہے۔ آیت کا سیاق و سباق یہی چاہتا ہے۔ اسی بنا پر آگے فرمایا جارہا ہے یقص الحق وھو خیر الفاصلین یعنی نفاذ کی قوت اللہ کی ہے وہی اپنی حکمت مطلقہ کے مطابق صحیح اور مناسب وقت پر اپنا ناطق فیصلہ صادر فرمائے گا اور اللہ سے بہتر فیصلہ کرنے والا کون ہے۔ یہ گویا جواب ہے مخالفین کی اس بات کا کہ اگر تم خدا کے بھیجے ہوئے ہو تو خدا کا عذاب ہمارے انکار پر کیوں نہیں آتا۔ فرمایا یہ میرے اختیار کی چیز نہیں بلکہ اللہ کے اختیار کی ہے وہی فیصلہ کرتا ہے۔ کائنات میں حاکمانہ اختیارات اور تصرفات صرف وہی کرسکتا ہے مجھے پیغمبر بنا کر روانہ کیا ہے۔ مختار کل اور کائنات میں تصرف کرنے والا بنا کر روانہ نہیں کیا ہے۔

حضور انور اور معجزہ ہلاکت

۵۹ — اے پیغمبر کہہ دو کہ جس بات کے لیے تم جلدی مچاتے ہو اگر وہ میرے اختیار میں ہوتی تو مجھ میں اور تم میں کبھی کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور اللہ ظلم کار لوگوں کو خوب جانتا ہے۔ یعنی جس پر جب چاہے اور جس قسم کا چاہے عذاب بھیجے یا نہ بھیجے ویسے ہی توبہ کی توفیق مرحمت فرمائے یہ سب اللہ کے قبضے میں ہے کسی کا حکم اور زور اُس کے سوا نہیں چلتا۔ وہ دلائل و براہین کے ساتھ حق کو بیان کردیتا ہے۔ پھر جو نہ ماننے ان کے متعلق بہترین فیصلہ کرنے والا بھی وہ ہی ہے۔ اگر ان کا فیصلہ کرنا میرے قبضے میں ہوتا اور یہ نزول عذاب کا مطالبہ کرنے کے لیے مجھ سے عذاب کا مطالبہ کرتے تو اب تک کبھی کا جھگڑا ختم ہو چکا ہوتا۔ یہ تو خدا ہی کے علم محیط، حلم عظیم، حکمت بالغہ اور قدرت کاملہ کا پرتو ہے کہ بے شمار مصالح و حکم کی رعایت کرتے ہوئے باوجود پوری طرح جاننے اور قدرت رکھنے کے ظالموں پر فوراً عذاب نازل نہیں کرتا۔ آئندہ آیات میں اس کے علم محیط اور قدرت کاملہ کا ذکر ہے تاکہ ثابت ہو کہ تاخیر عذاب ناواقفیت یا بیچارگی کی وجہ سے نہیں ہے [1] زمخشری نے لکھا ہے کہ مطلب

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ ہے کہ اگر میرے اختیار میں ہوتا تو میں تمہیں فوری طور پر ہلاک کر کے تم سے جلدی چھٹکارا پا لیتا۔ لیکن دوسرے علماء کو زمخشری سے اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ اگر عذاب کا لانا میرے بس میں ہوتا اور یہ معاملہ میرے سپرد ہوتا تو معاملہ کا فیصلہ کبھی کا ہو چکا ہوتا۔ خدا کی جناب میں تمہاری ان گستاخیوں کو میں کب برداشت کرتا اللہ سے درخواست کرتا کہ وہ تمہیں ہلاک کر دے۔ ابوالسعود کہتے ہیں کہ حسن ادب کے پیش نظر فعل مجہول لے کر آئے ورنہ اندازِ بیان کا تقاضا تو یہی تھا کہ لقضی اللّٰہ بینی و بینکم اللہ میرے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دیتا۔

مطلب خواہ کوئی ہو لیکن یہاں حافظ ابن کثیر نے یہ عجیب بات فرمائی ہے کہ اگر اس آیت کا یہی مطلب ہے تو پھر اس آیت اور صحیحین میں آمدہ اس واقعہ میں مفاہمت کیوں کر ہو سکتی ہے۔

حضرت عائشہ فرماتی ہیں کہ میں نے آپ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ اُحد کے علاوہ آپ پر سب سے زیادہ سخت دن کون سا تھا۔ آپ نے فرمایا وہ دن جب میں نے طائف میں عبد یا لیل کے سامنے اپنے آپ کو پیش کیا اور اس نے انکار کیا۔ میں مغموم واپس آ رہا تھا کہ فرشتہ جبال نظر آیا۔ اس نے مجھ سے کہا کہ اگر اجازت ہو تو پہاڑوں سے ان کو چکنا چور کر دیا جائے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابھی یہ معجزہ ہلاکت ظاہر نہ ہو شاید ان کی نسل سے کوئی پرستارِ توحید پیدا ہو۔

یہ ارشاد تو کہہ رہا ہے کہ آپ عذاب کے خواہاں نہ تھے اور آیت بتا رہی ہے کہ اگر میرے بس میں ہوتا تو معاملہ کبھی کا ختم ہو چکا ہوتا۔ حافظ ابن کثیر نے اس کا جواب دیا ہے کہ آیت کا تعلق ان کے مطالبہ عذاب سے ہے لیکن حدیث میں ان کے مطالبہ کا کوئی ذکر نہیں بلکہ ملک الجبال کی درخواست ہے اور دونوں میں فرق ظاہر ہے یہاں ان کے مطالبے پر ان کے فیصلے کو اللہ کی قدرت اور طاقت کے حوالہ کیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ بات میرے بس کی نہیں بلکہ اللہ کے علم محیط، اس کی حکمت بالغہ سے متعلق ہے وہ جو چاہے جب چاہے اور جیسے چاہے کرتا ہے۔

وَعِنْدَهٗ مَفَاتِحُ الْغَيْبِ لَا يَعْلَمُهَآ اِلَّا هُوَ ۚ وَيَعْلَمُ مَا فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۚ
وَمَا تَسْقُطُ مِنْ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعْلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىْ ظُلُمٰتِ الْاَرْضِ وَلَا
رَطْبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿٥٩﴾ وَهُوَ الَّذِىْ يَتَوَفّٰىكُمْ
بِالَّيْلِ وَيَعْلَمُ مَا جَرَحْتُمْ بِالنَّهَارِ ثُمَّ يَبْعَثُكُمْ فِيْهِ لِيُقْضٰٓى اَجَلٌ مُّسَمًّى ۚ
ع ٥ ثُمَّ اِلَيْهِ مَرْجِعُكُمْ ثُمَّ يُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿٦٠﴾ وَهُوَ
الْقَاهِرُ فَوْقَ عِبَادِهٖ وَيُرْسِلُ عَلَيْكُمْ حَفَظَةً ۭ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَ
اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ تَوَفَّتْهُ رُسُلُنَا وَهُمْ لَا يُفَرِّطُوْنَ ﴿٦١﴾ ثُمَّ رُدُّوْٓا
اِلَى اللّٰهِ مَوْلٰىهُمُ الْحَقِّ ۭ اَلَا لَهُ الْحُكْمُ وَهُوَ اَسْرَعُ الْحٰسِبِيْنَ ﴿٦٢﴾

اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں، اس کے سوا ان کو
کوئی نہیں جانتا ہے، خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ
اس سے واقف ہے، کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا
ہے اور نہ زمین کی تہوں میں کوئی دانہ گرتا اور نہ کوئی تر و خشک،

مگر وہ ایک روشن کتاب میں مندرج ہے۔ اور وہی ہے جو تمہیں رات میں وفات دیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے پھر تمہیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ مدت پوری کی جائے پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے، پھر وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے ہو۔ اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح غالب ہے اور وہ تم پر اپنے نگران مقرر کرتا ہے۔ تاآنکہ جب تم میں سے کسی کی موت آتی ہے تو ہمارے فرستادے اسے قبضے میں لے لیتے ہیں اور وہ اس کام میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔ پھر تمام بندے اللہ کی طرف لوٹائے جاتے ہیں جو ان کا مالک حقیقی ہے، یاد رکھو فیصلہ کا پورا اختیار اسی کا ہے اور وہ بہت جلد حساب لینے والا ہے۔

اللہ کا علم محیط اور اختیار ناطق

پیچھے بتایا گیا کہ مکذبین اور منکرین پر عذاب لانا میرے اختیار میں نہیں بلکہ یہ اللہ کے اختیار میں

ہے۔ اس نے جو قانون مقرر کردیا ہے اسی کے مطابق اس کا ظہور ہوگا۔ اب اللہ کے علم کی وسعتوں کا ذکر کیا جا رہا ہے کہ عذاب میں تاخیر بے خبری اور ناواقفیت کی بنا پر نہیں ہے۔ یہاں فرمایا ہے کہ اس کی علمی وسعتوں اور پہنائیوں کا حال یہ ہے کہ غیب کے خزانوں کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔

علم محیط اور اختیار کامل اللہ سبحانہٗ کی بنیادی صفات میں ایک خاص اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے۔ جس طرح سارے عقائد کی جان عقیدہ توحید ہے اسی طرح عقیدہ توحید کی جان توحید فی الصفات کا عقیدہ اور یقین ہے۔ توحید فی العبادۃ اسی کا تقاضا اور اسی کے لوازم میں سے ہے۔ بلکہ اگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ عقیدہ دراصل تمام اعمال کی اساس ہے اور توحید کے باب میں یہی نقطہ کمال ہے۔ اس لیے صرف توحید فی الصفات ساری توحید کی نمائندگی اور قائمقامی کرتی ہے جس نے شعور و یقین کے ساتھ اس کا اقرار کرلیا اس نے فی الواقع اللہ سبحانہٗ کی توحید کے نقطہ کمال کو پالیا۔ کمال توحید کے معنے یہ ہیں کہ جس طرح اس کی ذات میں کوئی شریک نہیں ہے اسی طرح اس کی صفات و افعال میں بھی کوئی شریک نہیں ہے۔ پیدا کرنا، زندہ رکھنا اور جہان کے اندر تدبیر و تصرف کرنا، مارنا، عالم الغیب ہونا، حاضر و ناظر ہونا اور مختار کل ہونا وغیرہ یہ تمام صفات ہر حیثیت میں صرف اللہ تعالیٰ کی ذات کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اسلام کے سوا دوسرے مذاہب والے اوتاروں، ولیوں، نبیوں اور شہیدوں میں بھی یہ اوصاف مانتے تھے اور اب بھی مانتے ہیں۔ ملائکہ، جنات اور اسی طرح احبار و رہبان کی پرستش کرنے والوں کا قرآن حکیم نے بصراحت ذکر کیا ہے اور یہی ان کی توحید کا نقص ہے۔ لیکن قرآن نے توحید کا جو کامل ترین تصور پیش کیا ہے اس کا لازمی تقاضا یہ ہے۔

۱۔ اللہ کے سوا اور کوئی ہستی نہیں جو اپنے سے آپ موجود ہو بلکہ ہر چیز مخلوق ہے اور اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے۔

۲۔ اللہ سبحانہٗ کی ذات بنیادی طور پر تمام موجودات سے مختلف ہے اور کسی طرح بھی کوئی اس کے مشابہ نہیں۔

۳۔ صرف اللہ ہی ہے جس کی رضاجوئی کی انسان کو فکر ہونی چاہیے۔ یہی اس کے ایمان کا اصل محرک بھی ہونا چاہیے اور اصل مقصد بھی۔

۴۔ پیدا کرنا، مارنا، عالم الغیب اور حاضر و ناظر ہونا، دور و نزدیک سے یکساں تعلق رکھنا، اور کائنات میں تدبیر و تصرف رکھنا صرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔

۵۔ اس پوری کائنات کا جس کا ہماری یہ دنیا بھی ایک چھوٹا سا حصہ ہے مقتدر اعلیٰ

مختار کل صرف اللہ ہے۔

۵- اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر شان معبودیت رکھتا ہو کوئی نہیں جو دانائے غیب اور مختار کل ہو جسے ولی، کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے۔

یہ توحید فی الصفات کے بنیادی تقاضے ہیں اور ان میں سے ایک کا بھی انکار اور ان میں سے کسی کی شرکت توحید کامل کے دعویٰ کو بے معنی کر دیتا ہے۔ اس آیت میں ان ہی صفات میں سے علم محیط اور اختیار ناطق کو بتایا جا رہا ہے۔

۶۔ اور غیب کی کنجیاں اسی کے پاس ہیں۔ اس کے سوا ان کو کوئی نہیں جانتا ہے خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس سے واقف ہے۔ کوئی پتا نہیں گرتا مگر وہ اسے جانتا ہے اور زمین کی تہوں میں کوئی دانہ گرتا ہے اور نہ کوئی تر و خشک ہے مگر وہ ایک روشن کتاب میں مندرج ہے یعنی لوح محفوظ میں ہے اور لوح محفوظ میں جو چیز ہو گی وہ علم الٰہی میں پہلے ہو گی۔ اس اعتبار سے مضمون آیت کا حاصل یہ ہوا کہ عالم غیب و شہادت کی کوئی خشک و تر اور چھوٹی بڑی چیز حق تعالیٰ کے علم ازلی محیط سے خارج نہیں ہو سکتی۔ بنا بریں علیہ ان ظالموں کے ظاہری و باطنی احوال اور ان کی سزا دہی کے مناسب وقت و محل کا پورا پورا علم اسی کو ہے۔

یہ تو ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ علم غیب وہ علم ہے جو وسائل و ذرائع کے بغیر خود بخود حاصل ہو اور ظاہر ہے ایسا علم اس کو ہی ہو سکتا ہے جس کی ذات خود بخود ہو۔ وحی کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے جیسے انبیاء کا علم قرآنی اصطلاح میں علم غیب نہیں ہے۔ اسی طرح اسباب و وسائل کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی علم غیب نہیں جیسے محکمہ موسمیات کا علم، دلائل کے ذریعہ جو علم حاصل ہوتا ہے جیسے فلاسفر و حکما کا علم، کشف و الہام کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی علم غیب نہیں جیسے اولیا کا علم روایت کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی علم غیب نہیں ہے جیسے محدثین کا علم، اور اجتہاد کے ذریعے جو علم حاصل ہوتا ہے وہ بھی علم غیب نہیں ہے جیسے مجتہدین کا علم۔ علم غیب اصل میں وہی ہے جو بغیر ذرائع کے خود بخود ہو۔

علم الٰہی کا جامع تصور

یہاں جو بات سمجھنے کی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن نے بتایا ہے وعندہ مفاتح الغیب ...

پاس غیب کے مفاتح ہیں۔ علماء نے مفاتح کو مفتح میم کے زیر کے ساتھ اور میم کے زبر کے ساتھ دونوں کی جمع بتایا ہے۔ اگر یہ مِفتح کی جمع ہو تو اس کے معنے چابی ہیں اور اگر مفتح بفتح میم کی جمع ہو تو اس کے معنے خزانے کے ہیں۔ اب مفاتح کے معنے چابیاں اور خزانے ہوں گے۔ کچھ شارحین قرآن نے ترجمہ یوں کیا ہے اسی کے پاس ہیں چابیاں غیب کی اور کچھ نے ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ اسی کے پاس ہیں خزانے غیب کے اور دونوں صحیح ہیں۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں۔

مفاتح کو جن علماء نے مفتح بفتح المیم کی جمع قرار دیا ہے انہوں نے مفاتح الغیب کا ترجمہ غیب کے خزانوں سے کیا ہے اور جن کے نزدیک مفتح بکسر المیم کی جمع ہے۔ وہ مفاتح الغیب کا ترجمہ غیب کی کنجیاں کرتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ غیب کے خزانے اور کنجیاں صرف خدا کے پاس ہیں وہی ان میں سے جس خزانے کو جس وقت اور جس قدر چاہے کسی پر کھول سکتا ہے۔ کسی کو یہ قدرت نہیں کہ اپنے حواس و عقل وغیرہ آلات ادراک کے ذریعے سے علوم غیبیہ تک رسائی پاسکے یا جتنے علوم غیبیہ اس پر منکشف کر دیئے گئے ہیں۔ ان میں از خود اضافہ کرے کیونکہ علوم غیبیہ کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں نہیں دی گئیں ہیں خواہ لاکھوں کروڑوں جزئیات و واقعات غیبیہ پر کسی بندے کو مطلع کر دیا گیا ہو تاہم غیب کے اصول و کلیات کا علم جن کو مفاتح الغیب کہنا چاہیے حق تعالیٰ نے اپنے لیے مخصوص رکھا ہے۔

اصل یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے علم غیب کا اطلاق دو معنے میں ہوتا ہے ایک علم غیب اجمالی بسیط فعلی ہے جو اللہ کی صفت کمال ہے اور تمام اشیاء کے لیے پورے پورے انکشاف کا سرچشمہ ہے اور تمام معلومات الٰہی کی طرف نسبت یکساں ہوتی ہے اور اس کا ہونا حضور معلوم پر موقوف نہیں ہے نہ بنفسہٖ اور نہ بصورتہٖ اسی لیے اس کو علم غیب کہتے ہیں۔ یہ علم غیب اللہ تعالیٰ ہی کی صفت خاص ہے اور اللہ تعالیٰ کا حقیقی علم غیب اور صفت ذاتی بھی ہے۔ دوسرے علم غیب تفصیلی انفعالی جو حضور معلوم پر موقوف ہے۔ یہ عند اللہ صور علمیہ کا حضور ہے یعنی تمام معلومات الٰہیہ اپنی صور علمیہ کے ساتھ عند اللہ حاضر ہیں۔ یہ علم اجمالی کے تابع اور بعد ہے۔ یہ من وجہ علم غیب اور من وجہ علم شہادت ہے۔ یعنی یہ دراصل عند اللہ تو علم الشہادۃ ہی ہے لیکن تمام مخلوق کے اعتبار سے علم غیب کہلاتا ہے۔ یہ غیب یعنی صور علمیہ مجہول اور حادث نہیں اللہ تعالیٰ کے ارادے کے تحت میں داخل ہیں اور تعلق علم بھی حادث ہے۔ بس غیب کا دریافت کرنا یعنی ان صور علمیہ کو ظہور میں لانا اور

علم غیب اجمالیہ کا صور علمیہ کے ساتھ تعلق اللہ کے اختیار میں ہے جب چاہے جیسے چاہے کرے۔ یہ اللہ تعالیٰ ہی کی شان ہے عندہ مفاتح الغیب میں اسی کی طرف اشارہ ہے یعنی علم غیب اجمالی بسیط جو صفت کمالیہ ہے بمنزلہ مفتاح ہے۔ صور علمیہ تفصیلی کے لیے جو تمام مخلوق سے غائب ہیں اور جو خزانے ہیں ان صور علمیہ پر اطلاع جس قدر اللہ چاہے اپنے اختیار سے دیتا ہے ورنہ کسی کو یہ قدرت نہیں کہ جب چاہے خود ہی غیب کی بات معلوم کرے اور ان صور علمیہ پر اطلاع پائے کیونکہ یہ وہی کر سکتا ہے جس کے پاس ان صور علمیہ کی کنجیاں ہوں اور مبدا انکشاف ہو۔

اس فقرے میں مثبت انداز میں حصر کے ساتھ تصویر کا ایک رخ بتایا ہے کہ غیب کے خزانے یا غیب کے خزانوں کی چابیاں اللہ ہی کے پاس ہیں اور دوسرے جملہ میں پھر حصر کے ساتھ منفی انداز میں تصویر کا دوسرا رخ بھی پیش فرما دیا کہ لا یعلمھا الا ھو اللہ کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا ہے اس میں کوئی استثنا نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ ہی کی خصوصیت ہے کہ وہ دانائے غیب ہے۔ قرآن کی متعدد آیات میں یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے۔ سابقہ امتوں میں عیسائی اللہ سبحانہ کی صفت علم ہی میں سب سے زیادہ گمراہی کے شکار ہوتے ہیں۔ فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدے کی بنیاد اسی صفت پر رکھی ہے اور یہ تاویل کی گئی ہے کہ تثلیث کے اقانیم ثلاثہ خدا کی تین صفتوں سے عبارت ہیں حیات وجود اور علم اور یہ تینوں ایک ہیں یہی باپ بیٹا اور روح القدس ہیں۔ اور تینوں الگ الگ ہیں۔ اس تشریح سے صفات الٰہی کے تجسیم کے مسئلہ نے جنم لیا اور ایک خدا کئی خداؤں کا مجموعہ بن گیا۔ قرآن نے بتایا کہ علم غیب خدا کی صفت ہے اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے و عندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی ہے اور فرمایا کہ مفاتح غیب پانچ ہیں، جن کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

۱۔ حمل لڑکا ہوگا یا لڑکی
۲۔ کل کیا ہوگا
۳۔ بارش کب ہوگی
۴۔ موت کہاں آئے گی
۵۔ قیامت کب آئے گی

قرآن میں ان پانچ کو ان الفاظ میں بتایا ہے۔

ان اللہ عندہ علم الساعۃ و ینزل الغیث و یعلم ما فی الارحام و ما تدری نفس ماذا تکسب غدا و ما تدری نفس بای ارض تموت، ان اللہ علیم خبیر ۔

ارشادِ نبوت میں ان پانچ ہی کو مفاتح قرار دیا ہے۔

شاید آپ یہاں یہ خلش محسوس کریں کہ معلومات الٰہیہ اگر لاتناہی ہیں تو پھر ان پانچ کی تخصیص کیوں کی گئی ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر سید رشید رضا مرحوم نے جو یہاں نکتہ آفرینی فرمائی ہے وہ بہت زیادہ لطیف ہے، اگرچہ دوسرے شارحین قرآن تو اسے یہ کہہ کر آگے چل دیے کہ

غیب کے خزانے پانچ میں منحصر نہیں ہیں بلکہ وہ تمام چیزیں اس میں داخل ہیں جو ابھی موجود نہیں ۔ (مظہری)

اور علامہ محمود آلوسی فرماتے ہیں کہ

استغراق زیادہ اچھا ہے اور احادیث میں جن پانچ کا ذکر ہے ان کو اہم پر محمول کیا جائے کا حصر مقصود نہیں ہے ۔

السید رشید رضا فرماتے ہیں ۔

غیب جو کچھ ہے وہ عالم برزخ، عالم آخرت اور عالم دنیا میں وہ پیداوار جو ابھی موجود نہیں خواہ یہ نباتات ہوں یا حیوانات اور انسان کے وہ اعمال کسبیہ جو مستقبل میں ہونے والے ہیں قرآن کی آیت میں ان پانچوں کی طرف اشارہ ہے لفظ ساعت سے عالم آخرت کی طرف اشارہ ہے اور بارش سے عالم نباتات کی طرف اور ما فی الارحام سے عالم حیوان کی طرف، ما تدری نفس سے عالم اعمال کی طرف اور بای ارض تموت سے عالم برزخ کی طرف اشارہ ہے ۔

بالفاظِ دیگر عالم پانچ ہیں عالم آخرت، عالم برزخ، عالم اعمال، عالم نباتات، عالم حیوانات، پانچ باتیں ان پانچ عالموں کے لیے مفتاح ہیں ۔

علم غیب اور اسلام

شرک کی ایک قسم یہ ہے کہ خدا کے ساتھ جو اوصاف مخصوص ہیں وہ اوروں میں تسلیم کیے جائیں جس کا قدرتی نتیجہ یہ ہے کہ وہ شرکت وصف کی بنا پر خدا کے شریک اور ہمسر بن جائیں۔ ان میں سے

ایک وصف علم غیب ہے۔ اکثر اہل مذاہب اعتقاد رکھتے تھے اور اب بھی رکھتے ہیں کہ انبیاء اور اولیاء کو علم غیب ہوتا ہے جیسا کہ التفتازانی نے لکھا ہے کہ عیسائیوں کا حضرت عیسٰی کے بارے میں خیال ہے کہ اقنوم علم بدن عیسٰی میں منتقل ہو گیا ہے۔ قرآن نے اس تعلیم کے ذریعے خدا کے سوا بلا استثنا سب کی غیب دانی کے عقیدہ کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا۔ اور غیب کی مملکت پر خدا کے سوا کسی اور کی حکومت قائم نہ رہی۔ سب سے زیادہ اہم مسئلہ اس موضوع پر مقام نبوت کی حد بندی کا ہے یعنی آپ کی ذات گرامی کے بارے میں بتا دینا کہ آپ کو جو کچھ علم دیا گیا ہے وہ انبائے اظہار اور اطلاع غیب بذریعہ وحی ہے۔ غیب دانی اور علم غیب نہیں ہے تاکہ خدا کے سوا غیب دانی کے عقیدے کا ہمیشہ کے لیے سد باب ہو جائے۔ اس بارے میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی لفظوں میں حضور انور کی غیب دانی کی نفی پر زور دیا ہے وہ محتاج بیان نہیں اور نہ یہاں تفصیل کا محل ہے۔ ہم یہاں صرف ایک بات کی طرف توجہ دلائیں گے کہ قرآن نے نبوت سے یہ اعلان کرایا ہے۔

لو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر

اگر میں غیب دان ہوتا تو بہت خیر جمع کر لیتا۔

صرف اس لیے کہ ذات پیغمبر کے صاحب وحی ہونے کا اعتقاد اسلام کی اصل و اساس بن جائے اور اس کا کوئی موقع نہ رہے کہ وحی کی جگہ غیب دانی کا اور رسالت کی جگہ خدائی کا تخیل پیدا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس سے زیادہ اس معاملہ کا کیا تحفظ کیا جا سکتا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک محفل مسرت میں ان بچیوں کو بھی اس خیال کے اظہار سے روک دیا کہ

فینا نبی یعلم ما فی غد

ہم میں پیغمبر ہے جو کل کی بات جانتا ہے

جو ایک شادی کی محفل میں شعر پڑھ رہی تھیں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ علم غیب چونکہ اللہ تعالٰی ہی کی صفت مخصوص ہے لہٰذا علم غیب کی نسبت اللہ کے سوا کسی اور کی طرف مکروہ ہے اسی بنا پر حضرت عائشہ صدیقہ نے علی الاعلان لوگوں کے سامنے یہ بات فرمائی جو شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو غیب دان کہتا ہے وہ اللہ تعالٰی پر سفید جھوٹ باندھتا ہے۔

اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ غیب دانی کا عقیدہ پیغمبر پر وحی آنے کا انکار ہے

میر سید شریف نے لکھا ہے۔

انما لم يجز الاطلاق فی غیرہ تعالیٰ لانہ یتبادر منہ تعلق علمہ بہ ابتداء فیکون تناقضاً۔

غیر خدا پر عالم غیب اس لیے نہیں بولا جاتا ہے کہ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کا علم بلا واسطہ ہے اور وحی کو ذریعہ مان کر پھر عالم غیب کہنا دراصل تناقض ہے۔

اسی لیے محققین اہل السنۃ والجماعۃ احناف نے اسے عقائد کفر میں شمار کیا ہے۔ چنانچہ شیخ ابن الہمام حنفی نے المسامرہ میں اور ملا علی قاری حنفی نے شرح الفقہ الاکبر میں تصریح کی ہے۔

جاننا چاہیے کہ انبیاء غیب دان نہیں ہوتے ہیں ہاں وہ باتیں انبیاء کو معلوم ہیں جو اللہ سبحانہ انہیں بتا دیتے ہیں اور احناف نے تصریح کی ہے کہ یہ اعتقاد کہ حضور اقدس غیب دان ہیں کفر ہے۔

دونوں باتیں پوری قوت سے واضح کرنے کے بعد ایک یہ کہ خدا ہی غیب دان ہے اور دوسری یہ کہ خدا کے سوا غیب دان کوئی نہیں۔ اسی کی جامعیت کو بتایا ہے کہ خشکی اور تری میں جو کچھ ہے وہ اس سے واقف ہے۔ یہاں تک معدومات کے علم کا ذکر تھا اب موجودات کے علم کا تذکرہ شروع ہوا ہے۔ یعنی اللہ تمام کائنات و موجودات کا علم محیط رکھتا ہے۔ ما فی البر والبحر سے مراد تمام موجودات ہیں جیسے صبح و شام بول کر پورا زمانہ اور مشرق و مغرب بول کر پوری زمین مراد ہوتی ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کا علم تمام کائنات کو محیط ہے۔ اس کے بعد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا تمام کائنات پر علمی احاطہ صرف یہی نہیں کہ کلیات کا اسے علم ہو بلکہ اس کا علم کائنات کی تمام جزئیات اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی چیز، مخفی سے مخفی چیز اس کے علم میں ہے حتیٰ کہ درخت سے جو پتا گرتا ہے وہ بھی اس کے علم سے باہر نہیں ہے وما تسقط من ورقۃ الا یعلمہا مطلب یہ ہے کہ درخت کا ہر پتا گرنے سے پہلے، گرنے کے وقت اور گرنے کے بعد اس کے علم میں ہے، وہ جانتا ہے کہ درخت پر لگا ہوا پتا کتنی مرتبہ الٹ پلٹ ہوگا اور کب اور کہاں گرے گا۔ گرنے کا ذکر خاص طور پر اس لیے کیا ہے کہ اس سے تمام حالات کی طرف اشارہ ہو جائے کیونکہ پتے کا زمین پر گرنا اس کے نشوونما اور نباتی زندگی کا آخری حال ہے

اس کے بعد فرمایا ولا حبۃ فی ظلمات الارض یعنی ہر وہ دانہ جو زمین کی گہرائی اور اندھیری میں پڑا رہتا ہے۔ ظلمات الارض سے مراد زمین کی تہیں اور طبقات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ زمین

کی گہرائی میں جو دانے پڑتے ہیں وہ سب اللہ کے علم میں ہیں۔ اس کے بعد فرمایا ولا رطب ولا یابس ہر خشک و تر اللہ کے علم میں ہے۔ آخر میں فرمایا الا فی کتاب مبین یہ سب اللہ کے نزدیک کتاب مبین میں ہے۔ کچھ شارحین قرآن کے خیال میں کتاب مبین سے مراد علم الٰہی ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ مراد وہ لوح محفوظ ہے جس میں مقادیر خلق لکھی ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس میں سہو و نسیان کی راہ نہیں۔ اس طرح اللہ سبحانہٗ کا یہ علم محیط تمام کائنات کے ذرے ذرے کو اپنے دامن میں صرف تخمینی طور پر نہیں بلکہ یقینی طور پر سمیٹے ہوئے ہے۔ قرآن کے اس بیان سے ان لوگوں کی پوری پوری تردید ہو گئی جو اللہ سبحانہٗ کو صرف کلیات کا عالم مانتے ہیں۔ بتا دیا کہ خدا صرف کلیات کا نہیں بلکہ تمام جزئیات کا بھی عالم ہے۔ درخت سے جو پتا گرتا ہے زمین کی تہوں میں جو دانہ ڈالا جاتا ہے سب اس کے علم میں ہوتا ہے اور ہر خشک و تر اس کے رجسٹر میں درج ہے اور یہ رجسٹر ایسا نہیں ہے جس میں اس کو کوئی چیز تلاش کرنی پڑتی ہو بلکہ اس کی ہر چیز ہر آن بالکل واضح ہے۔ یہ اللہ کے علم کی جامعیت کا ایک تصور ہے۔

اللہ کے اختیارِ کامل کا تصوّر

اب ارشاد ہوتا ہے وھو الذی یتوفکم بالیل اور وہی ہے جو تمہیں رات میں پورا پورا لیتا ہے اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے۔ پھر تمہیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ مدت پوری کی جائے، پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے پھر وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو۔ یعنی شب میں سوتے وقت ظاہری احساس و شعور باقی نہیں رہتا اور آدمی اپنے گرد و پیش بلکہ اپنے جسم کے احوال تک سے بھی بے خبر ہو جاتا ہے۔ گویا اس وقت یہ قوتیں اس سے لے لی گئیں[1] مطلب یہ ہے کہ تمہاری روح نفسیاتی کو جس سے احساس و ادراک متعلق ہیں معطل کر دیتا ہے یا اسے قبض کر لیتا ہے۔ جدید نفسیات کی بولی میں تمہارے شعور کو باطل کر دیتا ہے۔ اصل ارشاد میں یتوفکم بالیل آیا ہے۔ توفی باب تفعل سے ہو تو اس کے معنی پورا لینا اور توفیہ باب تفعیل سے ہو تو اس کے معنی پورا دینا ہیں۔ یہ آیت اس معاملہ میں فیصلہ کن ہے کہ لغت میں توفی کے معنی موت کے نہیں۔ یہ بعد کا عرف ہے۔ اگر اس کے معنی موت کے ہوتے تو یہاں قرآن سونے کے لیے استعمال نہ کرتا اور دوسری آیت اللہ یتوفی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

الا نفس حین موتہا میں موت کی قید نہ لگاتا۔ یہ اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ اصل لغت عربی میں توفی بمعنے موت نہیں آتا بلکہ یہ اصطلاح بعد کی پیداوار ہے۔ فقرے کی پیشانی پر لفظ ھو لگا کر اشارہ فرما دیا کہ اختیار ناطق اور قدرت کاملہ صرف اللہ کے لیے ہے۔

اس کے بعد فرمایا اور جانتا ہے جو کچھ تم نے دن میں کیا ہے۔ یعنی دن میں جو کچھ چلنا پھرنا نقل و حرکت اور کسب و اکتساب ہوتا ہے وہ سب کامل تفصیل کے ساتھ اللہ کے علم میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بیداری کی حالت میں تم جو کچھ کر چکے ہو خواہ وہ اچھے اعمال ہوں یا بُرے اللہ کو سب معلوم ہیں۔

اس کے بعد ارشاد ہے ثم یبعثکم فیہ پھر تمہیں اس میں اٹھاتا ہے تاکہ مدت پوری کی جائے۔ یعنی اگر وہ چاہتا تو تم سوتے رہتے لیکن موت کا وعدہ پورا ہونے تک پھر نیند کے بعد وہ تم کو بیدار کرتا رہتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر رات میں خدا تم کو وفات دیتا ہے اور جب وفات دیتا ہے تو وہ سب کچھ اللہ کے علم میں ہوتا ہے جو کچھ تم نے دن کی روشنی میں کیا ہوتا ہے پھر دوسرے دن میں خدا تم کو اٹھاتا ہے اور اس طرح تمہاری مدت حیات اور مقررہ اجل پوری ہوتی ہے جو اللہ سبحانہ نے تم میں سے ہر ایک کے لیے مقرر کی ہوئی ہے۔

آخر میں فرمایا ثم الیہ مرجعکم پھر اسی کی طرف تمہیں لوٹنا ہے پھر وہ تمہیں بتائے گا جو کچھ تم کرتے رہے ہو یعنی دن میں کاروبار کر کے رات کو سونا پھر سو کر اٹھنا یہ روزمرہ کا سلسلہ ایک چھوٹا سا نمونہ ہے دنیا کی زندگی اور پھر موت، پھر دوبارہ زندہ کیے جانے کا، اسی لیے نیند اور بیداری کے تذکرے کے ساتھ مسئلہ معاد پر متنبہ کر دیا گیا[1] مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد دوبارہ اٹھنا اور حساب و جزا کے لیے بارگاہ الٰہی میں پیش ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جس کا ریہرسل ہر شب و روز تمہاری اپنی نگاہوں کے سامنے ہو رہا ہے۔ ہر رات اللہ سبحانہ تمہیں مارتا ہے اور پھر تمہیں دن میں بیدار کر دیتا ہے۔ اس طرح گویا زندگی اور موت اور مرنے کے بعد اٹھائے جانے کا مشاہدہ تم میں سے ہر شخص کو روزانہ کرایا جاتا ہے۔ قرآن نے یہاں ہر رات میں سونے کو توفی اور ہر صبح کو بیداری کو بعث سے تعبیر کر کے اشارہ کیا ہے کہ مرنا اور اٹھنا تو روزانہ ہو رہا ہے جیسے یہاں سونا اور جاگنا ہے اسی طرح مرنا اور اٹھنا ہے اور جیسے تم میں سے

[1] افادات شیخ الاسلام

کسی سونے والے کے دن کے کاموں سے اللہ بے خبر نہیں اسی طرح جب تم موت کی آغوش میں جاؤ گے تو اللہ سبحانہٗ تمہاری زندگی کے اعمال سے بے خبر نہ ہوگا اور جس طرح ہر رات کو سونے کے بعد صبح ہوتی ہے اور تم آنکھیں ملتے ہوئے اٹھتے ہو اسی طرح موت کی نیند کے بعد قیامت کی صبح آئے گی۔

یہ طرزِ ادا بیسیوں آیات میں اختیار کیا گیا ہے یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع و بازگشت کے مفہوم میں ورود اور آمد داخل ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواحِ انسانی خدا کے یہاں سے اس جسم و قالب کی قید میں آئی ہیں اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے جہاں سے آئی تھیں۔ اس بازگشت کے سفر میں ان کا زادِ راہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیائے دارالعمل میں انہوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندرونی و بیرونی اعمال اور اس کے بعد جو زندگی ہوگی وہ ان کے ان ہی اعمال کی نوعیت پر منحصر ہوگی۔

ہر شخص کی ہر وقت خدا کی نگرانی

۲۷ ۔ اور وہ اپنے بندوں پر پوری طرح غالب ہے اور وہ تم پر اپنے نگران مقرر کرتا ہے۔
یعنی وہ فرشتے جو تمہاری اور تمہارے اعمال کی نگہداشت کرتے ہیں[1] قرآن میں دو قسم کے فرشتوں کا ذکر ہے۔ ایک اعمال کی کتابت کرنے والے دوسرے جانوں کی حفاظت کرنے والے۔ کتابتِ اعمال کا کام کرنے والے فرشتوں کا ذکر پارہ ۳۰ میں ہے۔

وان علیکم لحافظین کراماً کاتبین یعلمون ما تفعلون

اور بلاشبہ تم پر نگران مقرر ہیں عالی قدر لکھنے والے وہ جانتے ہیں جو کچھ تم کرتے ہو۔

اور جانوں کی حفاظت کرنے والے فرشتوں کا ذکر پارہ ۱۳ میں ہے۔

لہ معقبات من بین یدیہ و من خلفہ یحفظونہ من امر اللہ

انسان کے اگاڑی اور پچھاڑی خدا کے نگران ہیں جو اس کی خدا کے حکم سے حفاظت کرتے ہیں۔

یہاں فرشتوں کے لیے حفظ استعمال ہوا ہے اور قرآن نے فرشتوں کی دونوں قسموں کا کام حفاظت بتایا ہے اس لیے یہاں دونوں مراد ہیں۔ اگرچہ کچھ شارحینِ قرآن نے صرف کراماً کاتبین کو

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اس کا مصداق قرار دیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ کوئی یہ نہ خیال کرے کہ خدا اپنی مخلوق کے کسی فرد اور اپنی مملکت کے کسی شہری سے کبھی غافل ہوتا ہے، سب ہر وقت اس کے کنٹرول میں ہیں۔ وہ برابر اپنے نگران فرشتوں کو ان پر مقرر کرتا ہے جو ایک پل کے لیے بھی ان کی نگرانی سے غافل نہیں ہوتے۔ اور یہ نگرانی دونوں طرح کی ہے اعمال کی بھی اور حالوں کی بھی۔ اعمال کی حد تک فرشتے طاعات معاصی اور مباحات تک کی نگرانی کرتے ہیں۔ نگرانی کے اسی احاطہ کی طرف قرآن کی اس آیت میں اشارہ ہے۔

مال ھذا الکتاب لا یغادر صغیرۃ ولا کبیرۃ الا احصاھا

اور اقوال کے بارے میں آیا ہے

ما یلفظ من قول الا لدیہ رقیب عتید۔

اس موضوع پر زیادہ تفصیل انشاء اللہ تیرھویں پارے میں آئے گی۔

فرشتوں کا قبض روح

۱۳۔ تا آنکہ جب تم میں سے کسی کو موت آتی ہے تو ہمارے فرستادے اسے قبضے میں لے لیتے ہیں اور وہ اس کام میں کسی طرح کی کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔ یعنی جو فرشتے روح قبض کرنے کے لیے بھیجے جاتے ہیں ان کو جس وقت اور جس طرح جان نکالنے کا حکم ہوتا ہے اس میں وہ کسی طرح کی کوتاہی یا رعایت نہیں کرتے ہیں [۱]۔ مطلب یہ ہے کہ یہ عالم اگر ایک مشین ہے تو فرشتے اس کے انجن اور اس کے کل پرزوں کو حرکت دینے والی قوتیں ہیں جو اللہ سبحانہ کے مقررہ احکام اور قوانین کے مطابق ان کو حرکت دے رہے ہیں۔ یعنی وہ خالق اور مخلوق کے درمیان سفارت کی خدمت انجام دے رہے ہیں کہ اللہ اپنے حکم اور مرضی کو ان پر القا کرتا ہے اور وہ ایک بے اختیار محکوم کی طرح اس کو مخلوقات میں جاری اور نافذ کرتے ہیں۔ ان کو خود نہ کوئی ذاتی اختیار ہے اور نہ ان کا کوئی ذاتی ارادہ ہے وہ سراپا اطاعت ہیں اور خدا کے حکم سے سرمو تجاوز نہیں کرتے ہیں۔ گویا ان کی خلقت اطاعت اور فرمانبرداری کے لیے کی گئی ہے اور بس۔ یہاں بتایا ہے کہ جب کسی کی موت کا وقت آتا ہے تو وہ اس کی روح قبض کرتے ہیں اور مجال نہیں ہے کہ وہ اس کام میں کوئی کوتاہی

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کریں۔ نہ ان کے قابو سے کوئی باہر ہو سکتا ہے نہ وہ کسی کو فراموش کر سکتے ہیں۔ یہاں فرشتوں کے لیے لفظ رُسل آیا ہے۔ الزمخشری نے لکھا ہے کہ مراد ملک الموت اور اس کے اعوان و انصار ہیں۔ یاد رہے کہ قبض روح کا عمل حق تعالیٰ کا ہے۔ فرشتے صرف آلہ کی حیثیت رکھتے ہیں ورنہ موت میں موت کے فرشتہ کا کوئی بھی اختیار نہیں ہوتا ہے۔ ان کا کام محض تعمیل حکم ہے جس میں یہ قصور نہیں کرتے حافظ ابن جریر کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ یہ آیت عصمت ملائکہ کی کھلی دلیل ہے۔

خدائی حساب ایک لمحہ میں

۶۲۔ پھر تمام کو اللہ کی طرف لوٹایا جائے گا جو ان کا مالک حقیقی ہے۔ یاد رکھو فیصلہ کا پورا اختیار اسی کا ہے اور بہت جلد حساب لینے والا ہے۔ یعنی ایک لحظہ میں عمر بھر کی برائی اور بھلائی واضح کر دے۔ مطلب یہ ہے کہ مرنے کے بعد سابقہ سب کو خدا ہی سے پیش آتا ہے اس لیے کہ وہ مولائے حقیقی ہے دوسرے جن سے لوگوں نے عابدانہ و نیازمندانہ تعلقات قائم رکھے ہیں وہ کچھ بھی کام نہیں آئیں گے اور یہ بھی بتا دیا کہ الا لہ الحکم فیصلہ کا سارا اختیار تنہا اسی کے ہاتھ میں ہوگا۔ اس کی اجازت کے بغیر کسی کو یارائے گفتار نہ ہوگا۔ آخر میں فرمایا کہ ھو اسرع الحاسبین وہ حساب ایک لمحہ میں لے لے گا یہ نہ خیال کرنا کہ ساری کائنات کے اتنے لمبے چوڑے حساب میں اس کو کچھ زحمت پیش آئے گی یا اس میں زمانہ صرف ہوگا۔ سارا حساب وہ ایک لمحے میں سب کے سامنے رکھ دے گا۔ اس کی کتاب مبین ہر شخص کے ہر چھوٹے بڑے عمل کا سارا حساب اس کے آگے پیش کر دے گی۔

قُلْ مَنْ يُّنَجِّيْكُمْ مِّنْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ تَدْعُوْنَهٗ تَضَرُّعًا وَّ
خُفْيَةً ۚ لَئِنْ اَنْجٰنَا مِنْ هٰذِهٖ لَنَكُوْنَنَّ مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۶۳﴾
قُلِ اللّٰهُ يُنَجِّيْكُمْ مِّنْهَا وَمِنْ كُلِّ كَرْبٍ ثُمَّ اَنْتُمْ تُشْرِكُوْنَ ﴿۶۴﴾
قُلْ هُوَ الْقَادِرُ عَلٰۤى اَنْ يَّبْعَثَ عَلَيْكُمْ عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ
تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ؕ
اُنْظُرْ كَيْفَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّهُمْ يَفْقَهُوْنَ ﴿۶۵﴾ وَكَذَّبَ بِهٖ
قَوْمُكَ وَهُوَ الْحَقُّ ؕ قُلْ لَّسْتُ عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ﴿۶۶﴾ لِكُلِّ نَبَاٍ مُّسْتَقَرٌّ ۫ وَّ
سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۷﴾

اے پیغمبر کہہ دو کہ تم کو دریاؤں اور جنگلوں کے اندھیروں سے کون بچاتا ہے؟ جبکہ تم اسے عاجزی اور نیاز پنہانی سے پکارتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر خدا ہم کو اس تنگی سے نجات بخشے تو ہم اس کے بہت شکر گزار ہوں۔ کہو کہ خدا ہی تم کو اس تنگی سے

اور ہر سختی سے نجات بخشتا ہے پھر تم اس کے ساتھ شریک کرتے ہو[۲]، کہہ دو کہ وہ اس پر بھی قدرت رکھتا ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے یا تمہیں فرقہ فرقہ کر دے اور ایک دوسرے سے لڑا کر آپس کی لڑائی کا مزہ چکھائے[۳]، دیکھو ہم اپنی آیتوں کو کس کس طرح بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ سمجھیں[۴]۔ اور اس قرآن کو تمہاری قوم نے جھٹلایا حالانکہ وہ سراسر حق ہے، کہہ دو کہ میں تمہارا وکیل نہیں ہوں، ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم کو عنقریب معلوم ہو جائے گا۔

توحید کی نفسیاتی دلیل

سیاق کلام سے وہی مطالبہ عذاب کی تردید ہے۔ اس میں انسان کی اس نفسیاتی بیماری کا ذکر ہے کہ انسان کا عجیب حال ہے کہ جب کسی آفت میں گرفتار ہوتا ہے تب تو گڑگڑا کر اور تنہائیوں میں صرف خدا کو پکارتا ہے اور خدا سے یہ پکٹ کرتا ہے کہ اگر خدا نے مجھے اس مصیبت سے بچا لیا تو میں اس کا شکر گزار بندہ بن کر رہوں گا لیکن مصیبت کا دور گزر جاتا ہے اور عیش و راحت کے

مزے لوٹنے لگتا ہے تو پھر اللہ سے منہ موڑ کر وہی مشرکانہ زندگی اختیار کر لیتا ہے جس میں ابتلائے مصائب سے پہلے تھا اور یہ سمجھ لیتا ہے کہ اب کبھی خدا کی پکڑ میں نہیں آسکتا، بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ جاتی ہے کہ اگر اسے عذاب الٰہی سے ڈرایا جائے تو بے غیرتی سے عذاب کا مطالبہ کرنے لگتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ جب تک دنیوی اسباب و علائق کا کوئی ادنیٰ سا سہارا بھی باقی رہتا ہے انسان کا وجدان بیدار نہیں ہوتا اور ایک تنکے کا بھروسہ بھی اس کے لیے کافی ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے غافل ہو جائے لیکن جونہی اسباب و علائق کے رشتے ٹوٹتے اور یاس و قنوط کی کامل حالت طاری ہوتی اور اس نے دیکھا کہ اب دنیا کا کوئی ہاتھ اسے بچا نہیں سکتا تو اچانک اس کا سویا ہوا وجدان بیدار ہو جاتا ہے اور خدا پرستی کا جوش اپنے سارے اخلاص کے ساتھ اس کے اندر ابھر آتا ہے۔ اس وقت وہ خدا کے سوا اور کسی کو نہیں دیکھتا۔ سارے رشتے، سارے بھروسے، ساری ہستیاں یک قلم نابود ہو جاتی ہیں۔ وہ بے اختیار خدا کو پکارنے لگتا ہے اور اس کی یہ پکار دل کی گڑگڑاہٹ سے ہوتی ہے اور صرف جلوت میں نہیں، بلکہ تنہائیوں میں بھی اس کے دل کے ایک ایک ریشے سے یہی صدا اٹھتی ہے۔ قرآن یہاں اسی نفسیاتی کیفیت سے انسان کو توحید کا سبق سکھا رہا ہے کہ جسے مصائب میں پکارتے ہو اسی کو راحتوں میں پکارو۔ قرآن نے مشرکین کا شرک یہی بتلایا ہے کہ وہ اللہ کے نیچے مخلوقات کو پکارتے تھے۔ قرآن یہاں پوچھ رہا ہے کہ آفات سے تمہیں کون بچاتا ہے؟ یہ امر واقعہ ہے کہ تنہا اللہ ہی قادر اور مختار کل ہے۔

۶۵۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ تم کو دریاؤں اور جنگلوں کے اندھیروں میں کون بچاتا ہے جبکہ تم اسے عاجزی اور نیاز پنہانی سے پکارتے ہو اور کہتے ہو کہ اگر خدا ہمیں اس تنگی سے نجات بخشے تو ہم اس کے بہت شکر گزار بندے ہوں گے۔ مطلب ظاہر ہے کہ ہجوم مصائب کے وقت اور شدتِ اضطرار میں جب تم تمام مادی و دنیوی سہاروں سے مایوس ہو جاتے ہو تو فطرت بشری خود بخود اللہ سبحانہٗ کی طرف متوجہ ہوتی ہے اور دعا و زاری سے کام لینے لگتی ہے۔ یہاں فطرت بشری کے اسی احساس توحید کو بیدار کیا گیا ہے۔ یہ توحید کی ایک انفسی دلیل ہے۔ انسان کی یہ ایک نفسیاتی بیماری ہے کہ جب کسی وقت اس پر کوئی آفت آپڑتی ہے تب تو وہ گڑگڑا کر اور دل میں چپکے چپکے خدا ہی کو پکارتا ہے لیکن جب مصیبت ہٹ جاتی ہے تو پھر نافرمانی کی وہی زندگی اختیار کر لیتا ہے جس میں پہلے مبتلا تھا۔ فرمایا کہ ان سے دریافت کرو کہ سمندر میں یا خشکی میں جب تم کسی مصیبت میں پھنس جاتے ہو تو تمہیں کون مصیبت سے بچاتا ہے؟

ظلمات جمع ہے ظلمۃ کی، اس کے معنے تاریکی ہیں۔ قاضی بیضاوی نے اسے ہولناکیوں اور شدائد

کے لیے استعارہ بتایا ہے اور یہی بات امام رازی نے لکھی ہے۔
ظلمات دو قسم کی ہوتی ہیں حسی اور معنوی۔ حسی جیسے رات کی تاریکی، بادلوں کی تاریکی اور بادو باراں کی تاریکی، اور معنوی جیسے راہ ناآشنائی کی تاریکی، نشان راہ کی گم شدگی، شدائد اور خطرات کی تاریکی جیسے تیز و تند آندھیاں، سمندروں کے طوفان، جنگلات میں درندوں اور دشمنوں کا خطرہ ان کو ظلمات مجازاً کہا جاتا ہے۔ ظلمات کے مفہوم میں یہ سب داخل ہیں۔
تضرع کے معنے عجز و بیچارگی کے اظہار کے ہیں اور خفیہ کے معنے پوشیدہ اور چپکے ہیں مطلب یہ ہے کہ تم باواز بلند بھی اللہ ہی سے دعائیں مانگتے ہو اور چپکے چپکے آہستہ آہستہ بھی اسی سے مانگتے ہو اور اس موقعہ پر اللہ کے علاوہ سب حاجت رواؤں کو بھول جاتے ہو اور اس دعا کے وقت تمہارا حال یہ ہوتا ہے کہ تم قسمیں کھا کر اللہ سے عہد کرتے ہو لئن انجانا من ھذہ لنکونن من الشاکرین کہ اگر اس مصیبت سے بچ گئے تو پوری زندگی تیرے ہی ہو کر رہیں گے اور تجھے ہی پکاریں گے۔
اس آیت تدعونہ تضرعا و خفیۃ نے یہ بات کھول دی ہے کہ دعا کے معنے استمداد اور استعانت کے ہیں۔ یہاں دعا بمعنے عبادت نہیں ہے۔ قرطبی نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ

> اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں مشرکین کو اس عملی تضاد پر ڈانٹ پلائی ہے کہ پریشانیوں اور بیقراریوں میں تو اللہ سے دعائیں کرتے ہیں اور خوش حالیوں میں اللہ کے ساتھ اوروں سے بھی دعائیں کرتے ہو۔

اور ابوحیان اندلسی نے تدعون کی تشریح اس طرح کی ہے

> تم اللہ کو پکارتے ہو اپنی حاجات کو ظاہر کر کے علانیہ اور چپکے چپکے۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ

> تم کھلم کھلا اور چپکے چپکے اسی سے دعائیں کرتے ہو۔

صاحب لباب التاویل علامہ خازن لکھتے ہیں:

> یعنی جب تم پر سختیاں آتی ہیں تو صرف اللہ سے دعائیں کرتے ہو جہراً بھی اور سراً بھی۔

اور علامہ بغوی فرماتے ہیں:

> جب وہ سمندر کا یا بیابان کا سفر کرتے راستہ بھول جاتے اور ان کو ہلاکت کا اندیشہ

ہوتا ہے تو سب سے ہٹ کر اللہ سے دعائیں کرتے ۔
حافظ ابن کثیر نے اس کی تشریح یعنی دون الدعا لہ وحدۃ سے کی ہے ۔ یعنی یکا و خدا سے دُعا کرتے ہیں ۔ شارحین قرآن میں سے کسی نے بھی یہاں دُعا کو عبادت کے معنے میں نہیں بتایا ہے ۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں صراحۃ لکھا ہے کہ دُعا سے مراد عبادت نہیں جیسا کہ کچھ مفسرین کا خیال ہے بلکہ دعا سے مراد استعانت ہے ۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ آئے گی ۔

ہر غم اور تکلیف سے اللہ بچاتا ہے

۶۴ ۔ کہو کہ خدا ہی تم کو ہر تنگی اور سختی سے نجات بخشتا ہے پھر تم اس کے ساتھ شرک کرتے ہو ۔ یعنی اللہ تعالیٰ باوجود علم محیط اور قدرت کاملہ کے جس کا بیان اوپر ہوا ۔ تمہاری بداعمالیوں کی فوراً سزا نہیں دیتا ہے بلکہ جب مصائب اور شدائد میں پھنس کر تم اس کو عاجزی سے پکارتے ہو اور پختہ وعدے کرتے ہو کہ اس مصیبت سے نکلنے کے بعد کبھی شرارت نہ کریں گے اور ہمیشہ احسان کو یاد رکھیں گے تو بسا اوقات وہ تمہاری دستگیری کر کے ان مہالک اور ہر قسم کی سختیوں سے نجات دیتا ہے لیکن پھر بھی تم اپنے وعدے پر قائم نہیں رہتے اور مصیبت سے آزاد ہوتے ہی بغاوت شروع کر دیتے ہو ۔[1] مطلب یہ ہے کہ یہ حقیقت ہے کہ تنہا اللہ ہی قادر مطلق ہے اور وہی تمام اختیارات کا مالک اور تمہاری بھلائی اور برائی کا مختار کل ہے ۔ اور اسی کے ہاتھ تمہاری قسمتوں کی باگ ڈور ہے ۔ اس کی شہادت تو تمہارے اپنے نفس میں موجود ہے جب کوئی سخت وقت آتا ہے اور اسباب کے سب رشتے ٹوٹتے نظر آتے ہیں تو اس وقت بے اختیار اسی کی طرف رجوع کرتے ہو لیکن اس کھلی علامت کے ہوتے ہوتے بھی تم نے خدائی میں بلا دلیل و حجت اور بلا ثبوت دوسروں کو اس کا شریک بنا رکھا ہے ، پلتے ہو اس کے رزق پر اور ان داتا بناتے ہو دوسروں کو ، غلام ہو اس کے اور بندگی بجا لاتے ہو دوسروں کی ، مدد چاہتے ہو اس کے فضل و کرم سے اور حامی و ناصر ٹھہراتے ہو دوسروں کو ، مشکل کشائی کرتا ہے وہ بُرے وقت میں گڑگڑاتے ہو اس کے سامنے اور جب وقت گزر جاتا ہے تو تمہارے مشکل کشا بن جاتے ہیں دوسرے اور نذریں اور نیازیں چڑھنے لگتی ہیں دوسروں

[1] افادات شیخ الاسلام

کے نام کی لے

یہاں ثم انتم تشرکون کا زور بہت زیادہ قابل توجہ ہے ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ جب ہر قسم کی سختی اور تکلیف سے ہم بچاتے ہیں تو ہمارا شکر بجالاتے اور ہو یہ رہا ہے کہ بجائے شکر کے باغیانہ کردار پیش کر رہے ہو اور خدا سے جس قسم کا تعلق اور جس درجہ کا عجز و نیاز اور جس مرتبہ کی محبت اور جس درجہ کی التجا درکار ہے وہ دوسروں کے لیے بجالا رہے ہو۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ اللہ کے سوا کائنات کا خالق کوئی نہیں اور نفع و ضرر کا مالک اللہ کے سوا کوئی نہیں لیکن ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں اوروں سے مانگتے ہیں۔ ان ہی کو حاجت روا اور مشکل کشا جانتے ہیں، اٹھتے، بیٹھتے، چلتے پھرتے ان کا نام لیتے ہیں۔ ان ہی پر نذر و نیاز چڑھاتے ہیں۔ غرض براہ راست جو تعلق ان کو ہونا ہے اللہ سے نہیں اوروں سے ہوتا ہے خود مسلمانوں میں ہزاروں لاکھوں کا طرز عمل اولیا کے مزارات کی نسبت اسی کے قریب ہے۔ شاہ ولی اللہ نے البلدور الباز غہ میں لکھا ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دین کا نام لینے والوں میں انتہا درجہ کے منافقوں کا بھی یہی عقیدہ اور طرز عمل ہے۔

خدائی گرفت کی صورتیں

۶۵۔ کہہ دو کہ اس پر وہی قادر ہے کہ تم پر اوپر کی طرف سے یا تمہارے پاؤں کے نیچے سے عذاب بھیجے یا تمہیں فرقہ فرقہ کر دے اور ایک دوسرے سے لڑا کر آپس کی لڑائی کا مزہ چکھا دے۔ یعنی خدا کے امہال و درگزر کو دیکھ کر مامون اور بے فکر نہ ہونا چاہیے۔ جس طرح وہ شدائد و مصائب سے نجات دے سکتا ہے ایسے یہ بھی قدرت ہے کہ کسی قسم کا عذاب تم پر مسلط کر دے۔

اس میں عذاب کی تین قسمیں بیان فرمائی ہیں۔

الف: جو اوپر سے آئے جیسے پتھر برسنا یا طوفانی ہوائیں اور بارش

ب: جو پاؤں کے نیچے سے آئے جیسے زلزلہ اور سیلاب وغیرہ، یہ دونوں خارجی اور بیرونی عذاب ہیں جو اگلی قوموں پر مسلط کیے گئے، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے اس امت کو

لے تفہیم القرآن

اس قسم کے عذاب عام سے محفوظ کر دیا گیا ہے یعنی اس قسم کا عام عذاب جو گزشتہ اقوام کی طرح اس امت کا استیصال کر دے نازل نہ ہوگا۔ جزئی اور خصوصی واقعات اگر پیش آئیں تو اس کی نفی نہیں ہاں تیسری قسم عذاب کی جسے اندرونی اور داخلی کہنا چاہیے اس اُمت کے حق میں باقی ہے اور وہ پارٹی بندی، باہمی جنگ و جدل اور آپس کی خونریزی کا عذاب ہے۔ موضح القرآن میں ہے کہ قرآن شریف میں اکثر کافروں کو عذاب کا وعدہ دیا۔ یہاں کھول دیا کہ عذاب وہ بھی ہے جو اگلی اُمتوں پر آیا آسمان سے یا زمین سے اور یہ بھی ہے کہ آدمیوں کو آپس میں لڑا دے اور ان کو قتل یا قید یا ذلیل کر دے۔ حضرت نے سمجھ لیا کہ اس اُمت پر یہ بھی عذاب ہوگا۔ اکثر عذاب الیم، عذاب مہین، عذاب شدید اور عذاب عظیم ان ہی باتوں کو فرمایا ہے اور آخرت کا عذاب یہی ہے ان پر جو کافر ہی مرے[1]

آیت میں عذاب کی جو تین صورتیں بیان ہوئی ہیں اس میں من فوقکم اوپر سے عذاب کی تفسیر عبداللہ بن عباس نے ظالم حکمرانوں سے اور من تحتکم کی سرکش رعایا اور نافرمان غلاموں سے بھی کی ہے۔ غالباً حضرت عبداللہ بن عباس کا منشا یہ بتانا ہے کہ یہ بھی اس آیت کے مدلول میں داخل ہے۔

اس آیت میں جو بات بتائی گئی ہے اس کی حیثیت ایک عمومی قانون کی ہے یا اس میں کسی کی کوئی تخصیص بھی ہے۔ اگرچہ کہنے والوں نے یہی کہا ہے کہ یہ کفار کے بارے میں ہے۔ لیکن محققین اسی طرف گئے ہیں کہ آیت عام ہے اگرچہ اس کا نزول مشرکین سے خطاب کے سیاق میں ہے مگر قوانین دنیا میں اقوام میں اعتبار عموم الفاظ کا ہے نہ کہ خصوصی اسباب کا۔

اس کی تائید حضرت جابر کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت امام بخاری نے اس آیت کی تفسیر میں پیش کی ہے فرماتے ہیں کہ

> جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی قل ھو القادر علی ان یبعث عذاباً من فوقکم حضور نے فرمایا اعوذ بوجھک اے اللہ میں آپ کی پناہ لیتا ہوں او من تحت ارجلکم پر آپ نے فرمایا اعوذ بوجھک اے اللہ میں آپ کی پناہ لیتا ہوں او یلبسکم شیعاً و یذیق بعضکم بأس بعض سن کر آپ نے فرمایا یہ آسان ہے یا یہ معمولی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلی دو باتوں کے مقابلے میں فرقہ فرقہ بننے اور ان کے باہم ایک دوسرے کو مزہ چکھانے کو معمولی یا آسان فرمانے کی وجہ یہ ہے کہ پہلی دو باتوں میں عذاب استیصال بیان کیا گیا ہے جبکہ بعد کی دو باتوں میں عذاب تو ہے مگر عذاب استیصال نہیں ہے عذاب استیصال یہ ہے کہ عذاب کے نتیجہ میں اُمت کا ایک فرد بھی باقی نہ رہے۔

ابن مردویہ نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالے سے لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

> میں نے اللہ سبحانہٗ سے اپنی اُمت کے لیے چار باتوں کی دعا کی اوّل یہ کہ میری اُمت پر آسمان سے پتھراؤ نہ ہو دوسرے یہ کہ میری اُمت کو زمین میں نہ دھنسایا جائے، تیسرے یہ کہ میری اُمت فرقہ فرقہ نہ ہو، چوتھے یہ کہ میری اُمت باہم دست بگریبان نہ ہو، اللہ سبحانہٗ نے پہلی دو دعائیں قبول فرمالی ہیں لیکن بعد کی دو دعائیں منظور نہیں کی ہیں

یعنی آسمانی عذاب اور زمینی عذاب کے ذریعے تو اُمت کو ختم نہ کیا جائے گا لیکن فرقہ فرقہ ہونے اور باہم سر پھٹول کی یہ اُمت بھی شکار ہوگی۔ اور ابن مردویہ ہی نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے یہ واقعہ بھی لکھا ہے کہ جب قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے وضو فرمایا پھر یوں دُعا فرمائی اے اللہ میری اُمت پر اوپر سے عذاب نازل نہ فرما اور نہ ان کے پیروں کے نیچے سے ان پر عذاب بھیج، نہ ان کو فرقہ فرقہ بنا اور نہ ان میں سر پھٹول کا عذاب نازل کر، حضرت عبداللہ ابن عباس کہتے ہیں کہ حضرت جبریل تشریف لائے اور فرمایا کہ اللہ نے آپ کی اُمت کو اوپر کے اور نیچے کے عذاب سے پناہ دے دی ہے لیکن فرقہ فرقہ بننے اور باہم سر پھٹول کے عذاب سے پناہ نہیں دی ہے۔ اس معاملہ میں" اپنے پیشرو اہل کتاب کی کاپی کریں گے اور اس کے نتیجے میں ان کو ان حالات سے دوچار ہونا ہوگا جو تفرق و خلاف کے لیئے ضروری ہے۔

اس موضوع پر اور بھی بہت سی احادیث آئی ہیں۔ حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں اور علامہ جلال الدین السیوطی نے الدرالمنثور میں ان کو تفصیل سے پیش کیا ہے اسی موضوع پر حضرت ثوبان کی وہ حدیث بھی ہے جو صحیح مسلم میں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ سبحانہ نے زمین کے مشارق و مغارب کا مجھے مشاہدہ کرایا اور میری امت کی حکومت وہاں تک ہو گی جہاں تک مجھے مشاہدہ کرایا گیا ہے اور مجھے سونے اور چاندی کے خزانے ملے ہیں۔ اور میں نے اللہ سبحانہ سے درخواست کی ہے کہ میری امت کو قحط سالی سے ہلاک نہ کرنا اور یہ بھی درخواست کی ہے کہ میری امت پر ایسے بیرونی دشمنوں کو مسلط نہ کرنا جو ان کی بیخ کنی مٹا دے، میرے رب نے میرے سے کہا اے محمد میں جب فیصلہ کر دیتا ہوں تو وہ بدلا نہیں جاتا، بلا شبہ میں تم کو یہ عطیہ دیتا ہوں کہ میں تمہاری امت کو قحط سالی سے ہلاک نہ کروں گا اور کسی ایسے بیرونی دشمن کو ان پر مسلط نہ کروں گا جو ان کی ہستی ہی مٹا دے خواہ ساری دنیا ان کے خلاف ایکا کرے۔ ہاں یہ ضرور ہو گا کہ باہم ایک دوسرے کو ماریں گے اور قیدی بنائیں گے۔

اور اس کے ساتھ حضرت ثوبان کی وہ حدیث بھی گوش گزار فرمایئے جو سنن ابی داؤد میں آئی ہے آپ نے فرمایا کہ قریب ہے کہ قومیں تم پر حملہ آور ہونے کے لیے ایک دوسرے کو اس طرح پکاریں گی جس طرح کھانے والے کھانے کے پیالے پر گرتے ہیں۔ حاضرین میں سے ایک نے پوچھا کہ یا رسول اللہ کیا یہ اس لیے ہو گا کہ ہم اس زمانے میں کم ہو جائیں گے فرمایا نہیں تمہاری تعداد بہت بڑی ہو گی لیکن تم ایسے ہو جاؤ گے جیسے سیلاب کی سطح پر کف اور خس و خاشاک ہوتا ہے کہ سیلاب ان کو بہاتے لے جاتا ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا رعب دور کر دے گا اور تمہارے دلوں میں کمزوری ڈال دے گا۔ کسی نے پوچھا کہ یا رسول اللہ! وہ کمزوری کیا ہو گی فرمایا حُبّ الدنیا وکراہیۃ الموت دنیا کی محبت اور موت سے کراہت۔

بہر حال ان احادیث سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ اس آیت میں جن عذابوں کا ذکر کیا گیا ہے ان کی حیثیت عام قانون الٰہی کی ہے اور دعاؤں کا منشا یہ ہے کہ جب تک امت رشتۂ ایمان تھامے رہے اور ایمان کے تقاضے پورے کرتے رہے گی وہ ان سے محفوظ رہے گی۔ بالخصوص جس عذاب تفرقہ کی اس آیت میں خبر دی گئی ہے اس کی امت اسی وقت شکار ہو گی جب رشتۂ ایمان نبوت سے کمزور پڑ جائے گا۔ عذاب استیصال بلا شبہ نبوت کی دعا سے اس امت میں ختم کر دیا گیا ہے لیکن دوسرے عذاب بالخصوص عذاب تفرق کی یہ امت شکار ہے۔ اسی تفرق و انتشار کا نتیجہ اعداء کا غلبہ اور

تسلط ہے۔ موجودہ دنیا تے اسلام کی پیش نظر تاریخ میں کیا حرف بحرف اس کی تصدیق نہیں ہے۔

یاد رہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جس تفرق اور تشیع کی اُمت کو خبر دی ہے وہ اس لیے نہیں دی ہے کہ اُمت ان فتنوں سے ہمدوش ہونے کے اسباب و وسائل فراہم کرے بلکہ اس لیے دی ہے کہ اس سے مقابلہ کرلے اور بچنے کے لیے اُمت علی وجہ البصیرۃ تیار رہے۔ اسی بنا پر اس آیت کے نازل ہونے پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو مخاطب کرکے فرمایا تھا۔

مسلمانو! میرے بعد کافر نہ بن جانا کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو۔

(ابن کثیر بحوالہ زید ابن اسلم)

اللہ کے قوانین کا علم حاصل کرو

۶۵۔ دیکھو ہم اپنی آیات کو کس کس طرح بیان کرتے ہیں تاکہ لوگ سمجھیں۔ یعنی قرآن کو یا عذاب کے آنے کو۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ سب جھوٹی دھمکیاں ہیں عذاب وغیرہ کچھ نہیں آتا۔ لہٰ مطلب یہ ہے کہ غور و فکر سے کام لو کہ ہم دلائل کو کس کس انداز میں پیش کرتے ہیں کبھی محسوس بنا کر اور کبھی معقول بنا کر اور کبھی خالص معلومات غیبی بنا کر۔ صرف اس لیے کہ وہ بات کی تہ کو پہنچ جائیں فقہ نام ہے بات کو دلیل سے اس طرح سمجھنے کا کہ فکر و عمل تک رسائی ہو جاتے۔

یہ آیات ہی دراصل علم کتاب کی روح ہیں۔ یہی اللہ کی سنن ہیں جن کے ذریعے امتوں اور قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ ہوتا ہے۔ اس کائنات ہستی میں اللہ کی سنن اور نوامیس کا علم اس وقت تک حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ اللہ کی ذات و صفات اور افعال کے علم سے روشناسی نہ ہو۔ اللہ کی صفات کا علم ہی اللہ کی سنن کے علم کے لیے رہنما تے راہ ہے۔ امام غزالی نے احیاء العلوم میں اسی کو علم محمود کہا ہے، فرماتے ہیں،

علم محمود اللہ کی ذات صفات اور افعال، مخلوقات میں اس کی سنن آخرت کے دنیا پر مرتب کرنے میں اس کی حکمتوں کا علم ہے یہی علم مقصود بالذات ہے۔

امام موصوف نے اس علم کے حاملین کو تمام علماء محدثین، فقہاء، متکلمین اور مفسرین پر برتری دی ہے بلکہ بتایا ہے کہ یہی وہ علم ہے جس کے ذریعے عظماء صحابہ کو دوسروں کے مقابلہ

لہٰ افادات شیخ الاسلام

میں امتیازی حیثیت حاصل ہے اور یہی وہ علم ہے جس کے بارے میں عمر بن الخطاب کی وفات کے بعد عبداللہ بن مسعود نے یہ فرمایا تھا کہ علم کو اگر دس پر تقسیم کیا جائے تو نو حصے عمر بن الخطاب کے ساتھ چلا گیا۔

یہ امر واقعہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ذات صفات اور افعال کا علم انسانیت کا معراج کمال ہے تو اللہ کی مخلوقات میں اللہ کی سنن اور نوامیس کا علم اسی معراج کمال تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ یہی وہ عظیم علم ہے جس کے ذریعے انسان کی حیات اجتماعی، تمدنی پروان چڑھتی ہے۔ اور اسی میں امتوں کی تمام ترقیوں کا راز ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سمجھایا جارہا ہے کہ امتوں اور قوموں میں اللہ کے قوانین اور نوامیس کو سمجھو۔ یہاں سب کچھ ہو سکتا ہے اللہ کے عذاب کو آتے کچھ دیر نہیں لگتی ہے۔ ہوا کا ایک طوفان نہیں برباد کر سکتا ہے۔ زلزلے کا ایک جھٹکا تمہاری بستیوں کو پیوند خاک کر سکتا ہے قبیلوں اور قوموں اور ملکوں کی دشمنی کے الاؤ سے بھڑک سکتے ہیں۔ حقائق کو سمجھنے کی کوشش کرو غفلت و مدہوشی میں وقت ضائع نہ کرو۔

اللہ کا رسول اُمت کا وکیل نہیں ہے

۷۹۔ اور اس قرآن کو تمہاری قوم نے جھٹلایا ہے حالانکہ وہ سراسر حق ہے، کہہ دو کہ میں تمہارا وکیل نہیں ہوں ہر چیز کے لیے ایک وقت مقرر ہے اور تم کو عنقریب معلوم ہو جائے گا یعنی میرا یہ منصب نہیں ہے کہ تمہاری تکذیب پر خود عذاب نازل کر دوں یا اس کے وقت اور نوعیت وغیرہ کی تفصیل بتلاؤں، میرا کام صرف باخبر اور متنبہ کر دینا ہے آگے ہر چیز کے وقوع کا علم الٰہی میں ایک وقت مقرر ہے جب وقت آجائے گا تم خود جان لوگے کہ میں جس چیز سے ڈراتا تھا وہ کہاں تک سچ ہے۔[1] مطلب یہ ہے کہ قرآن جو ایک امر حق ہے اس کی تمہاری قوم نے تکذیب کی ہے۔ اب ان کا معاملہ ہم پر چھوڑ دو اور ان سے کہہ دو کہ لست علیکم بوکیل کہ میں تم پر کوئی داروغہ بنا کر روانہ نہیں کیا گیا کہ لازماً تمہیں قرآن ماننے پر مجبور کر دوں ورنہ مجھ سے پوچھا جائے گا۔ میری ذمہ داری صرف پیغام پہنچانا ہے وہ میں پہنچا چکا ہوں۔ اب اگر تم عذاب کے لیے مچلے ہوئے ہو تو نکل نیا مستقر ہر بات کے ظہور کے لیے خدا کی تقویم میں ایک وقت مقرر ہے جب وقت آئے گا تمہیں پتہ لگ جائے گا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ جس طرح پہلی آیات میں یہ اُصول کر سمجھادی ہے کہ اللہ کا رسُول دانائے غیب، مختار کل اور خدا نہیں ہوتا ایسے ہی وہ وکیل بھی نہیں ہوتا ہے۔ عربی زبان میں دوسرے کی خدمت انجام دینے کے لیے دو لفظ ہیں،

۱۔ رسُول

۲۔ وکیل

ان دونوں کا تصرف دراصل دوسرے کے لیے ہوتا ہے اپنے لیے نہیں ہوتا، مگر ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ وکیل کا تصرف بلسبت رسُول کے زیادہ وسیع اور زیادہ قوی ہے وکیل اپنے موکل کی طرف سے مختار ہوتا ہے جو چاہے بطور خود بھی کر سکتا ہے اسی لیے خصومت اور جوابدہی کا بھی اسی کو حق حاصل ہے۔ رسُول صرف اس امانت کے پہنچا دینے کا ذمہ دار ہوتا ہے جو اس کے سپرد کی گئی ہے مثلاً اگر ایک بادشاہ کسی شخص کو اپنا وکیل و مختار بنادے تو اس کو حق ہے کہ وہ موقعہ و محل کے لحاظ سے جو مناسب سمجھے گفتگو کرے بلکہ چاہے تو اس کے قوانین میں اپنے اختیار تمیزی اور صوابدید سے ترمیم بھی کر ڈالے لیکن ایک رسُول کا اس کے سوا کوئی حق نہیں ہے کہ جو پیغام اس کے ذریعے بھیجا گیا ہے وہ بے کم و کاست اس کو پہنچا دے اس لحاظ سے وکیل کی حیثیت اگرچہ بلند ہے مگر بلحاظ ذمہ داری سخت بھی بہت ہے۔

قرآن عزیز نے ایک سے زیادہ جگہ یہ بات دہرائی ہے کہ جسے ہم نے رسُول بنایا ہے وہ صرف رسُول ہے نہ کہ وکیل۔ بظاہر اس کی وجہ یہ ہے کہ جب خود خدا ہی سب کا وکیل ہے تو اب اس کا کوئی وکیل کیوں کر ہو سکتا ہے، دوسرے یہ کہ کسی بڑے سے بڑے انسان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ وہ اس ذمہ داری کا بار اٹھا سکے جو خدا تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی ہے پھر اس کی طرف سے وکالت کیسے ہوگی۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ رسُول کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ احکام الٰہیہ اللہ کے بندوں تک پہنچاتے اور بس۔ احکام الٰہیہ میں ردوبدل کا اس کو حق نہیں ہے اور کسی کی ہدایت وضلالت کا بار اس پر نہیں ہے اور نہ آخرت میں کسی کے اعمال کا وہ جوابدہ ہے۔ جہاں تک کارخانہ عالم کی ذمہ داری و کارسازی کا تعلق ہے اس کے ذرہ ذرہ کی کفالت و وکالت اللہ سبحانہٗ نے خود اپنے ذمہ لی ہے اور اس کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ اور رسُولوں کی پوزیشن واضح کرنے کے لیے اپنی اور رسُولوں کی زبانی یہ بات واضح کر دی ہے کہ ان کی حیثیت صرف رسالت کی ہے وکالت کی

نہیں تاکہ ہر انسان سوچ سمجھ سے کہ ہدایت وضلالت کی جو ابد ہی اسے خود براہ راست کرنی ہے جسے رسولوں کی ذات پر ٹالا نہیں جا سکتا۔

بہر حال آیت کا مطلب یہ ہے کہ میرا یہ کام نہیں ہے کہ جو کچھ تم نہیں دیکھ رہے ہو وہ زبردستی تمہیں دکھا دوں۔ اور جو کچھ تم نہیں سمجھ رہے ہو وہ بزور تمہیں سمجھا دوں اور میرا یہ کام بھی نہیں کہ اگر تم نہ دیکھو اور نہ سمجھو تو تم پر عذاب نازل کر دوں۔ میرا کام صرف یہ ہے کہ حق اور باطل کو ممتاز کر کے تمہارے سامنے پیش کر دوں۔ اب اگر تم نہیں مانتے تو جس بُرے انجام سے میں تمہیں ڈراتا ہوں وہ اپنے وقت پر خود تمہارے سامنے آ جائے گا۔

وَإِذَا رَأَيْتَ الَّذِينَ يَخُوضُونَ فِيٓ ءَايَٰتِنَا فَأَعْرِضْ عَنْهُمْ حَتَّىٰ
يَخُوضُوا فِي حَدِيثٍ غَيْرِهِۦ ۚ وَإِمَّا يُنسِيَنَّكَ الشَّيْطَٰنُ فَلَا
تَقْعُدْ بَعْدَ الذِّكْرَىٰ مَعَ الْقَوْمِ الظَّٰلِمِينَ ﴿٦٨﴾ وَمَا عَلَى الَّذِينَ
يَتَّقُونَ مِنْ حِسَابِهِم مِّن شَيْءٍ وَلَٰكِن ذِكْرَىٰ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿٦٩﴾
وَذَرِ الَّذِينَ اتَّخَذُوا دِينَهُمْ لَعِبًا وَلَهْوًا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيَوٰةُ
الدُّنْيَا ۚ وَذَكِّرْ بِهِۦٓ أَن تُبْسَلَ نَفْسٌۢ بِمَا كَسَبَتْ لَيْسَ لَهَا
مِن دُونِ اللَّهِ وَلِيٌّ وَلَا شَفِيعٌ وَإِن تَعْدِلْ كُلَّ عَدْلٍ
لَّا يُؤْخَذْ مِنْهَآ ۗ أُولَٰٓئِكَ الَّذِينَ أُبْسِلُوا بِمَا كَسَبُوا ۖ لَهُمْ
شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَعَذَابٌ أَلِيمٌۢ بِمَا كَانُوا يَكْفُرُونَ ﴿٧٠﴾

اور اے اللہ کے رسول جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات
پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ،
یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں

لگ جائیں اور اگر کبھی شیطان تمہیں بھول میں ڈال دے تو یاد آجانے پر ان ظلم کار لوگوں کے پاس نہ بیٹھو[۶۸]۔ ان کے حساب میں سے کسی چیز کے ذمہ دار اہل تقویٰ نہیں ہیں ہاں ان کو نصیحت کرنا اہل تقویٰ کی ذمہ داری ہے[۶۹]۔ جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور جن کو دُنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے ان کو چھوڑ دو[۷۰]۔ اور ان کو قرآن کے ذریعے یاد دہانی کراتے رہو تاکہ کوئی شخص اپنے اعمال کے وبال میں وہاں گرفتار نہ ہو جائے جہاں اللہ کے سوا کوئی بچانے والا اور سفارشی نہ ہوگا اور اگر وہ سب کچھ بدلہ میں بھی دے گا تو نہ لیا جائے گا[۷۱]۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اپنے اعمال کی پاداش میں پکڑا جائے گا، ان کے لیے ان کی کافرانہ زندگی کے بدلہ میں کھولتا ہوا پینے کا پانی اور دردناک عذاب ہوگا[۷۲]۔

جدال کی راہ ہدایت کی راہ نہیں

اب تک اُمت دعوت مخاطب تھی۔ یہاں سے روئے سخن امت اجابت کی طرف ہوگیا ہے اور بتایا جارہا ہے کہ جو ضدی اور ہٹ دھرم لوگ بات سننا ہی نہیں چاہتے ہیں ان کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جن لوگوں میں حق کی طلب نہ ہو اور محض اپنی بات کی پچ کرنے کے لیے اور مطالب حق کو ردو کد کا مشغلہ بنانے کے لیے بحث و نزاع کریں تو تمہاری راستبازی کا تقاضا بھی ہے کہ ان سے کنارہ کش ہو جاؤ کیونکہ جدال و نزاع کی راہ ہدایت کی راہ نہیں ہے اور جدال کرنے والے کبھی ہدایت نہیں پاسکتے۔ بدقسمتی سے دُنیا میں طلب حق کی راہ بھی محض جدال و نزاع کی راہ بن گئی ہے لوگ اپنے دنیوی اغراض و مقاصد کے لیے لڑنے جھگڑنے کے عادی ہیں۔ جب کبھی کوئی ایسا جھگڑا پیش آجاتا ہے تو صرف لوگ جیت ہی کے لیے لڑتے ہیں اس خیال سے نہیں لڑتے کہ حق و انصاف کیا ہے۔ ضدی اور ہٹ دھرم انسان اس خیال سے بحث نہیں کرتے کہ حق کو تلاش کیا جائے بلکہ اکثر اوقات ان کو پتہ ہوتا ہے کہ وہ برسرِحق نہیں ہیں اور انصاف مدمقابل کے ساتھ ہے لیکن چونکہ اپنا مطلب کسی نہ کسی طرح حاصل کرنا ہوتا ہے اس لیے کبھی اعتراف حق کے لیے تیار نہیں ہوتے حق و انصاف ان سے جس قدر الگ ہوتا جاتا ہے بحث و نزاع کی سرگرمی اتنی ہی زیادہ بڑھتی جاتی ہے۔ اگر ان کا مقدمہ سب سے زیادہ کمزور ہوگا تو وہ خیال کریں گے کہ بحث و نزاع کی سرگرمی زیادہ ہونی چاہیے۔ ہونا یہ چاہیے تھا کہ کم از کم دین کے معاملہ میں وہ ایسا نہ کریں۔ دنیوی معاملات میں کچھ لینا دینا ہوتا ہے اس لیے غرض پرست آدمی اپنی بات کی پچ کرتا ہی رہتا ہے لیکن دین کی راہ لین دین کی راہ نہیں ہے سچ کو سچ مان لینے کی راہ ہے۔ مصیبت یہ ہے کہ کفر سچائی کے کام کو بھی کاروبار بنا دیتا ہے اور دین کے بارے میں بھی اسی طرح جھگڑتا ہے جس طرح دُنیا کے معاملہ میں۔ قرآن بتارہا ہے کہ جب دیکھو کہ یہ لوگ کج بحثیوں اور استہزاء پر اتر آئے ہیں تو ان کو چھوڑ کر الگ ہو جاؤ صرف اسی وقت ان کے سامنے دعوت پیش کرو جب وہ کچھ سننے اور سمجھنے کے موڈ میں نظر آئیں۔ تمہاری ذمہ داری تبلیغ و تذکیر تک محدود ہے تم ان کے ایمان کے ذمہ دار نہیں ہو۔

۸۰۔ اور اے اللہ کے رسُول جب تم دیکھو کہ لوگ ہماری آیات پر نکتہ چینیاں کر رہے ہیں تو ان کے پاس سے ہٹ جاؤ یہاں تک کہ وہ اس گفتگو کو چھوڑ کر دوسری باتوں میں لگ جائیں اور اگر

کبھی شیطان تمہیں بھول میں ڈال دے تو یاد آ جانے کے بعد ان ظلم کار لوگوں کے پاس نہ بیٹھو۔ یعنی جو لوگ آیات اللہ پر طعن و استہزاء اور ناحق کی نکتہ چینی میں مشغول ہو کر اپنے کو مستحق عذاب بنا رہے ہیں تم ان سے خلط ملط نہ رکھو کہیں تم بھی ان کے زمرے میں داخل ہو کر مورد عذاب نہ بن جاؤ۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے انکم اذا مثلھم ایک مومن کی غیرت کا تقاضا یہ ہونا چاہیے کہ ایسی مجلس سے بیزار ہو کر کنارہ کرے اور کبھی بھول کر شریک ہو گیا تو یاد آنے کے بعد فوراً وہاں سے اٹھ جائے اسی میں اپنی عاقبت کی درستی، دین کی سلامتی اور طعن و استہزاء کرنے والوں کے لیے عملی نصیحت اور تنبیہ ہے[1]

اگرچہ رأیت واحد کا صیغہ ہے لیکن خطاب عام ہے۔ آیات سے مراد آیات قرآنی ہیں عام شارحین قرآن کی یہی رائے ہے۔ الجصاص نے آیات اللہ کو القرآن بتایا ہے۔ بغوی نے معالم میں بھی یہی بات لکھی ہے، وجہ اس کی بالکل ظاہر ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صحابہ بھی تبلیغ و دعوت میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقع مل جاتا وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی۔ اور یہ فرض خود قرآن نے آپ کا قرار دیا تھا۔ اس کی تبلیغ کے لیے جہاد کی ضرورت تھی مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں بلکہ قرآن کی تلوار تھی۔ جس ضرب کی روک خود اور سپر سے تو ممکن نہ تھی لیکن لوگ اس کے جواب کے لیے نکتہ چینی، بیہودہ گوئی کا ہتھیار استعمال کرتے تھے اسی کی طرف قرآن نے الذین یخوضون سے اشارہ کیا ہے خوض کے لفظی معنے کسی چیز میں گھس جانے کے ہیں۔ خاض الماء وہ پانی میں گھس گیا۔ اسی سے خوض فی الحدیث کا محاورہ نکلا ہے جس کے معنے ہیں بات میں سے بات نکالنا، بال کی کھال ادھیڑنا، کسی بات میں اعتراض، نکتہ چینی اور کٹ حجتی کے نت نئے پہلو پیدا کرنے کی کوشش کرنا۔ قرآن میں یہ لفظ کئی جگہ استعمال ہوا ہے اور ہر جگہ اسی طرح کی معنویت کے لیے آیا ہے۔ سورہ نساء جو سورہ انعام کے بعد نازل ہوئی اس میں اس خوض کی تفسیر بھی آئی ہے ارشاد ہے۔

وقد نزل علیکم فی الکتاب ان اذا سمعتم آیات اللہ یکفر بھا ویستھزأ بھا فلا تقعدوا معھم حتی یخوضوا فی حدیث غیرہ۔

اللہ تمہارے لیے یہ حکم نازل کر چکا ہے کہ جب تم دیکھو اور سنو کہ خدا کی آیتوں کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ساتھ کفر کیا جارہا ہے اور ان کی ہنسی اڑائی جارہی ہے تو تم اس مجلس سے اٹھ جاؤ ، جب تک وہ کسی دوسری بات میں نہ لگ جائیں ان کے پاس نہ بیٹھو۔

اس آیت میں فی الکتاب سے اسی سورہ انعام والی آیت کا حوالہ دیا گیا ہے۔ اس سورہ انعام والی آیت میں اہل ایمان کو صاف حکم مل رہا ہے کہ جو لوگ قرآنی احکام و مسائل پر نکتہ چینی کرتے ہوں، بیہودہ گوئی کرتے ہوں ان کے پاس بیٹھنا جائز نہیں ہے بلکہ ایسے لوگوں سے کنارہ کشی واجب ہے۔ اگرچہ آیت اپنے نزول کے اعتبار سے مشرکین کے حق میں ہے مگر علماء کہتے ہیں کہ یہی حکم مسلمانوں کے ان فرقوں کا بھی ہے جو الہامی کو چھوڑ کر الہوی کے پیروکار ہیں اور جو افکار و اعمال کے پیمانے محض اپنے میلان نفس اور رجحان طبع کے تحت تراشتے ہیں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ قرآن نے مسلمانوں کو یہ ہدایت کیوں دی ہے؟ دراصل اس ہدایت کے دو پہلو ہیں اور دونوں نہایت اہم ہیں۔

ایک تو یہ کہ یہ رویہ اس حکمت دعوت کے خلاف ہے جو اللہ تعالیٰ نے اپنے دین کی تبلیغ کے لیے پسند فرمائی ہے۔ جس وقت کسی گروہ پر کسی چیز کی مخالفت، اس کی تضحیک، اس کی تردید کا بخار چڑھا ہوا ہو اور بخار کی شدت سے بیمار کی کیفیت ہذیانی ہو رہی ہو عین اسی حالت میں اس کے سامنے اس چیز کو پیش کرنا اس کے بخار اور ہذیان دونوں کو اور زیادہ بڑھا دیتا ہے۔ اگر کوئی معالج مریض کی بیماری ہی میں اضافہ چاہتا ہو تو وہ آزاد ہے جو چاہے کرے لیکن کوئی مہربان طبیب جو مریض کی صحت کا خواہاں ہو۔ وہ کبھی ایسی غلطی نہ کرے گا۔ اسی رعایت احوال کے پیش نظر یہاں مسلمانوں کو ہدایت ہوئی ہے کہ جب تم دیکھو کہ یہ اسلام کے مخالفین قرآن کا مذاق اڑانے پر تلے ہوئے طنز و تضحیک کے ترکش سنبھالے ہوئے اور مخالفت میں چھوٹ رہے ہیں تو اس وقت طرح دے جاؤ اور کسی ایسے وقت کا انتظار کرو جب ان کی بحرانی کیفیت دور ہو جاتے تو اس وقت ان کو سمجھانے کی کوشش کرو۔

دوسرا یہ کہ یہ اس غیرت حق کے منافی ہے جو اہل ایمان کے اندر ہوتی ہے یا ہونی چاہیے۔ اگر کوئی شخص خدا و رسول کے خلاف بکواس کرتا ہے تو اس سے لڑنا بھی داعی حق کے لیے غلط اور خاموش رہنا بھی غلط اس لیے کہ اس سے وہ حمیت حق مجروح ہوتی ہے جو علامت ایمان ہے اور جس کا ضعف بالآخر درجہ بدرجہ آدمی کو اس نفاق میں مبتلا کر دیتا ہے جس میں مبتلا ہونے کے بعد اللہ، رسول، قرآن اور شریعت ہر چیز کی توہین و تذلیل وہ اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے

سنتا ہے لیکن اس کو ایسا سانپ سونگھ جاتا ہے کہ زبان کھولنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

یہاں اس حکم میں یہ دونوں ہی پہلو پیش نظر ہیں۔ پہلا تو سیاق کلام ہی سے واضح ہے اور دوسرے کو قرآن نے سورہ نساء کی مذکورہ بالا آیت میں واضح فرما دیا۔ اسی لیے اسی ہدایت کا حوالہ دے کر وہاں منافقین کی گرفت فرمائی ہے کہ یہ لوگ مخالفین اسلام کی ان مجلسوں میں شریک ہوتے ہیں جہاں اللہ کی آیات کا علانیہ مذاق اڑایا جاتا ہے حالانکہ قرآن میں اس سے روکا جا چکا ہے[1]

یاد رہے کہ جو حکم قرآن کے احکام کے بارے میں بتایا گیا ہے وہی بعینہٖ سارے اسلامی قانون اور اس کے سارے احکام کا ہوگا۔ اسلام کا جہاں بھی مذاق اڑایا جاتے وہاں بیٹھنا اور ان کی مجالس میں شریک ہونا بے غیرتی اور اس پر راضی ہونا نفاق اور کفر ہے۔ الجصاص نے اس آیت سے یہی بات سمجھی ہے کہ :

> یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ ملحدین اور کفار کی ان مجالس میں شرکت ناجائز ہے جہاں کفر و شرک کی نمائش ہو۔

آخر میں فرمایا ہے وَاِمَّا يُنْسِيَنَّكَ الشَّيْطٰنُ یعنی اگر تجھے شیطان بھلا دے، محققین کی رائے یہی ہے کہ اس میں بھی عام خطاب ہے اور جن لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہی کو مخاطب قرار دیا ہے وہ معنے یہ کرتے ہیں کہ اگر بالفرض شیطان آپ کو بھلا دے۔ بھولنا ہو یا شیطان کا بھلا دینا ہو مقام نبوت کی حد تک اس میں اہل السنہ والجماعۃ کا کیا موقف ہے۔ اس کی تفصیلات انشاء اللہ پارہ ، ا میں آئیں گی۔ یہاں تو صرف یہ سمجھنے کی بات ہے کہ اس تاکید کی ضرورت اس لیے پیش آئی ہے کہ بسا اوقات آدمی کسی مجلس میں جا پہنچتا ہے اور وہاں بات بڑھتے بڑھتے اس حد تک بڑھ جاتی ہے کہ دین و شریعت کے استہزاء تک پہنچ جاتی ہے ایسے وقت میں آدمی محسوس تو کرتا ہے کہ اب یہ جگہ بیٹھنے کی نہیں لیکن خیال کرتا ہے کہ بھری مجلس سے اٹھ کر کیسے جائے۔ یا اگر مناظر قسم کا ہوتا ہے تو یہ خیال کرتا ہے کہ اب میدان چھوڑ کر کس طرح وہاں سے ہٹ جائے حریف کیا کہے گا یہ دونوں خیال آدمی کے لیے فتنہ ہیں۔ اگر مجلس کا پاس و لحاظ مانع ہے تو یہ قلت غیرت کی دلیل ہے آدمی سوچے کہ اگر اس کے منہ پر اس کے ماں باپ کو گالی دی جائے تو کیا وہ اسے خاموشی سے برداشت کرلے گا تو خدا اور اس کے دستور و ضابطہ کا حق تو ماں باپ اور تمام دنیا سے زیادہ ہے۔

---

[1] تدبر قرآن

اس فقرے کا مفہوم صرف یہ ہے کہ اگر کبھی شیطان کسی چکر میں ڈال کر ایسی صورتِ حال سے دوچار کر دے تو ایسے موقعہ پر کیا طرزِ عمل اپنانا چاہیے یہی اور صرف یہی کہ لا تقعد بعد الذکری یعنی متنبہ ہوتے ہی ایسی مجلس سے اٹھ جائیے اور بس۔

اہلِ تقویٰ کی ذمہ داری

۸۱ - ان کے حساب میں سے کسی چیز کی ذمہ داری اہلِ تقویٰ پر نہیں ہے ہاں ان کو نصیحت کرنا اہلِ تقویٰ کی ذمہ داری ہے۔ اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ یعنی اگر پرہیزگار جھگڑنے اور طعن کرنے والوں کی مجلس سے اٹھ کر چلے آتے تو طاعنین کی گمراہی میں پڑا رہنے کا کوئی مواخذہ اور ضرر ان متقین پر عائد نہیں ہو سکتا۔ ہاں ان کے ذمہ بقدر استطاعت اور حسب موقع نصیحت کرتے رہنا ہے۔ شاید وہ بدبخت نصیحت سن کر اپنے انجام سے ڈر جائیں۔ یا یہ مطلب ہے کہ پرہیزگار اور محتاط لوگوں کو اگر کسی واقعی معذ بر دینی یا دنیوی ضرورت سے ایسی مجلس میں جانے کا اتفاق ہو جاتے تو ان کے حق میں طاعنین کے گناہ اور بازپرس کا کوئی اثر نہیں پہنچتا۔ ہاں ان کے ذمہ بشرط قدرت نصیحت کرنا ہے ممکن ہے کہ کسی وقت ان پر بھی نصیحت کا اثر پڑ جاتے [1]

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی نافرمانی سے بچ کر کام کرتے ہیں ان پر نافرمانوں کے کسی عمل کی ذمہ داری نہیں ہے۔ پھر وہ کیوں خواہ مخواہ اس بات کو اپنے اوپر فرض کر لیں کہ ان نافرمانوں سے بحث کر کے ضرور انہیں قائل کر کے چھوڑیں گے اور ان کے ہر لغو و مہمل اعتراض کا ضروری جواب دیں گے اور اگر وہ نہ مانتے ہوں تو کسی نہ کسی طرح اکر ہی رہیں گے۔ ان کا فرض بس اتنا ہے کہ جنہیں گمراہی میں بھٹکتا دیکھ رہے ہیں انہیں نصیحت کریں اور حق بات ان کے سامنے پیش کر دیں۔ پھر اگر وہ نہ مانیں اور جھگڑے اور بحث اور حجت بازیوں پر اتر آئیں تو اہلِ حق کا کام یہ نہیں ہے کہ ان کے ساتھ دماغی کشتیاں لڑیں، اپنا وقت ضائع کرتے پھریں۔ ضلالت پسند لوگوں کے بجائے انہیں اپنے وقت اور اپنی قوتوں کو ان لوگوں کی تعلیم و تربیت اور اصلاح و تلقین پر صرف کرنا چاہیے جو خود طالبِ حق ہوں [2]

اس آیت میں اہلِ ایمان کو یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے کہ ان پر کافروں سے متعلق تبلیغ و دعوت

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

کی جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے وہ صرف اللہ کے دین کو پہنچا دینے کی ہے۔ ان پر ان کے کفر و ایمان کی کوئی ذمہ داری نہیں۔ کفار اگر ایمان لے آئیں تو اس کی جزا خود پائیں گے اور اگر کفر ہی پر اڑے رہیں گے تو اللہ کی عدالت میں خود اس کی جوابدہی کریں گے۔ اہل ایمان نے اگر دعوت پہنچا دی تو ان سے ان سرکشوں کے بارے میں کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔ خدا کے یہاں کسی شخص سے کسی دوسرے کی ذمہ داری سے متعلق سوال نہ کیا جائے گا۔ اہل ایمان پر خود ذمہ داری دوسروں کے باب میں عائد ہوتی ہے وہ صرف تبلیغ و تذکیر کی ہے اور اس فرض کی پاسبانی کے لیے یہ کافی ہے کہ اہل ایمان جب دیکھیں کہ کوئی سازگار موقعہ ان تک بات پہنچا دینے کا ہے تو ان کو اللہ کی بات پہنچا دیں، اپنے کو اہل کفر کی ضلالت و ہدایت کا مسئول سمجھ کر ان کے پیچھے پڑنے کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ بات اسی پارے کے آغاز میں آیت ۱۰۵ کے تحت گزر چکی ہے یعنی

یا ایھا الذین امنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل

اس آیت کا اس پہلو سے بھی مطالعہ فرمائیے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ صحابہ کرام میں دعوت و تبلیغ کا کس قدر جوش تھا اس سے صاف پتہ چل رہا ہے کہ صحابہ کرام کو شہادت حق کی ذمہ داری کا اتنا شدید احساس تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ اگر لوگوں نے ہدایت قبول نہ کی تو شاید اللہ کی بارگاہ میں ان کی کوتاہی کی گرفت ہو۔

یہ سورت مکی ہے اور یہ بات اس وقت کہی جا رہی ہے جب کہ اللہ کے رسول کو اسلام کی دعوت دیتے ہوئے بارہ سال گزر چکے ہیں۔ قریش کی مزاحمت اور ستم گری و جفاکاری انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ ان حالات میں یہ آیت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے پرجوش تبلیغ کی خوب عکاسی کر رہی ہے

مذاق اڑانے والوں کو نظر انداز کر دو

۷۰ - اور جن لوگوں نے اپنے دین کو کھیل اور تماشا بنا رکھا ہے اور جن کو دنیا کی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا ہے ان کو چھوڑ دو۔ یعنی اپنے اس دین کو جس کا قبول کرنا ان کے ذمہ فرض تھا اور وہ مذہب اسلام ہے اور دنیا کی لذتوں میں مست ہو کر عاقبت کو بھلا بیٹھے[1] واقعی دین سے مراد وہی دین ہے جو اللہ نے ان کے لیے اتارا تھا اور جسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

صحابہ کرام دعوت و تبلیغ کے ذریعے ان کے سامنے پیش کر رہے تھے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ جن کو اسلام کی دعوت دی جا رہی تھی اس قدر گر چکے تھے کہ وہ اللہ کے دین کا مذاق اڑاتے تھے، یہ کہہ کر قرآن نے مسلمانوں کے جذبہ غیرت و حمیت کو ابھارا ہے کہ جو لوگ تمہارے دین کا مذاق اڑاتے اور اسے کھیل تماشا بناتے ہیں، تم ان سے کس خیر کی امید رکھتے ہو؟ ان کو چھوڑ دو ان کے درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ جو لوگ زندگی کے معاملے میں اتنے غیر سنجیدہ اور ایسے لاابالی ہیں کہ دین کو بھی وہ اپنے مسخرے پن کا موضوع بنالیں۔ ان کو مطمئن کرنے کے لیے فکر مند ہونے کی ضرورت نہیں۔ اس آیت کے بھی معنے متبادر ہیں۔ اس کے سوا شارحین قرآن نے دوسرے مطالب بھی بنائے ہیں مثلاً یہ کہ ان لوگوں کو نظرانداز کردو جو اعمال حق کی جگہ ایسے کاموں میں لگے رہتے ہیں جو کھیل تماشے کی طرح بے حقیقت ہیں یا یہ کہ جن لوگوں نے ہاتھ سے بنائے ہوئے کھلونوں یعنی بتوں کو دین بنا رکھا ہے یا یہ کہ جن لوگوں نے دین کو اپنی خواہشوں اور چاہتوں کے لیے بازیچہ بنالیا ہے یا یہ کہ جن لوگوں نے دین کو دنیا کے حصول کا ذریعہ مناصب ریاست غلبہ اور سرمایہ فراہم کرنے کا وسیلہ بنا کر پورے دین کو کھیل تماشا بنا رکھا ہے لیکن صحیح مطلب وہی ہے جو ہم نے پہلے پیش کر دیا ہے۔

آخرت فراموشی کا سرچشمہ

آخر میں فرمایا ہے وغرتھم الحیاۃ الدنیا دنیوی زندگی پر وہ مغرور ہیں یہ ہے۔ ساری خرابیوں کی جڑ۔ یہ دنیا پرستی اور عاجلہ پسندی وہ بس کی گانٹھ ہے جو قلب انسانی کی رگوں میں فکر آخرت سے بے نیازی کا زہر پیوست کر دیتی ہے اور پھر اس کے فطری مزاج کو خراب کر دیتی ہے۔ جب تک اس زہر سے اس کا دل پاک نہیں ہوگا اس کے لیے خدا پرستی کی راہ اختیار کرنا محال ہے۔ مؤثر تر تبلیغ کی کوئی مقدار بھی اس کو حسن قبول پر آمادہ نہیں کر سکتی خواہ وہ زبان سے واہ واہ کے نعرے کتنے بلند کرے وہ ایمان کے صحیح تقاضوں کو سنے گا اور اس طرح اغماض کر جائے گا گویا وہ اس کا سرے سے مخاطب ہی نہیں۔ اگر آپ زیادہ اصرار سے کام لیں تو وہ معذرتیں کرے گا۔ پھر تاویلوں کی نقاب منہ پر ڈال لے گا اور بدرجہ آخر انتہائی جسارت کے ساتھ مذاق کرنے پر اتر آئے گا۔ یہی غرور دنیا ہے جس نے ان کی آنکھوں پر پٹی باندھ رکھی ہے اور یہی ان کے زعم کے مطابق وہ کامیاب زندگی ہے جو ان کو حاصل ہے اور جس میں وہ مگن ہیں وہ دیکھ رہے ہیں کہ وہ کھا رہے ہیں عیش کر رہے ہیں، دندنا رہے ہیں اور کہیں سے ان کے اطمینان میں کوئی

رخنہ نہیں ہے۔ اگر ان کی زندگی غلط ہے جیسا قرآن کہتا ہے تو وہ تباہ کیوں نہیں ہو جاتے۔ اور جب وہ یہاں مسلمانوں سے بہتر حالت میں ہیں تو ان کے خدا کے محبوب ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ ان کا اصل مغالطہ یہی ہے کہ جب ہماری زندگی کامیاب ہے تو ہمارا رویہ بھی لازماً صحیح ہے۔ وہ اسی زندگی کو اصلی اور ساری زندگی سمجھے بیٹھے ہیں اور یہ زندگی چونکہ جزا و سزا کے اصول پر نہیں بلکہ امتحان و ابتلا کے اصول پر چل رہی ہے اس لیے وہ اپنی خواہشوں کی پیروی میں باطل ہی کو اپنا دین بنا بیٹھے ہیں اور سمجھ رہے ہیں کہ یہی زندگی اور یہی رویہ صحیح ہے اور قرآن ان کو جس انجام سے خبردار کر رہا ہے اس کی حیثیت ایک واہمہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔

قرآن کے ذریعے آخرت کی تذکیر

۸۳ ۔ اور ان کو قرآن کے ذریعے یاد دہانی کراتے رہو تاکہ کوئی شخص وہاں اپنے اعمال کے وبال میں گرفتار نہ ہو جائے جہاں اللہ کے سوا کوئی بچانے والا اور سفارشی نہ ہوگا اور اگر وہ سب کچھ بدلہ میں دے دے گا تو نہ لیا جائے گا۔ اصل ارشاد میں ان تبسل آیا ہے یہ ابسال سے مضارع مجہول ہے اس کے معنے روکنے محروم کرنے اور ہلاکت کے حوالہ کرنے کے آتے ہیں۔ یہاں تینوں معنے درست ہیں ان سے پہلے مضاف محذوف ہے۔ لفظ مخافۃ یا اس کے ہم معنے کوئی لفظ محذوف ہے۔ ترجمہ تینوں معنے کے لحاظ سے اس طرح ہے، قرآن کے ذریعے تذکیر کرو اس اندیشہ سے کہ کوئی جان اپنے عمل کی پاداش میں ہلاکت کے حوالے کی جائے دوسرا یہ کہ قرآن کے ذریعے تذکیر کرو اس اندیشہ سے کہ گرفتار ہو جائے کوئی جان اپنے کیے میں۔ تیسرا یہ کہ نصیحت کرو اس اندیشہ سے کہ کوئی جان اپنے اعمال کی پاداش میں ثواب سے محروم ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ دینِ اسلام کا مذاق بناتے ہیں اب ان کے زیادہ درپے ہونے کی ضرورت نہیں ہے بس صرف قرآن کے ذریعے اپنا "تذکیر و دعوت کا فرض ادا کیجیے" تاکہ کوئی جان اپنے عمل کی پاداش میں گرفتارِ عذاب نہ ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ سزا جس کو جو بھی ملے وہ اپنے ہی کرتوتوں کے باعث ہوگی۔ اسی کو قرآن نے اس طرح پیش کیا ہے کل نفس بما کسبت رھینۃ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ تبلیغ و تذکیر کا جو حکم بھی ہے اس کی تہ میں شفقت علی الخلق کا جذبہ کار فرما ہے آگے قرآن نے اس گرفتاری کا چہرہ پیش کیا ہے لیس لھا من دون اللہ ولی ولا شفیع ہر ایک کا اپنے عمل سے سابقہ پڑے گا۔ عمل ہی ہلاک کرے گا اور عمل ہی نجات دے گا، نہ کوئی

کسی کا اللہ کے سوا حامی و مددگار ہوگا اور نہ کوئی شفیع و سفارشی ہوگا۔ عربوں نے شفاعت کے جو غلط معنے سمجھ رکھے تھے اس کا اصل سبب ان کا وہ تخیل تھا جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں قائم تھا۔ وہ خدا اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعایا کے درمیان ہے اور جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور معمولی رعایا کی رسائی دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں۔ اسی طرح اس شہنشاہ کے دربار میں بھی وہ اس کے دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر رسائی ممکن نہیں سمجھتے تھے۔ اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کے خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے۔ چنانچہ وہ اپنے دیوتاؤں اور فرشتوں کو اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے کہ فلاں دیوتا یا فلاں اوتار یا تو خود کارسازی کے لیے اور بگڑی ہوئی بنانے کے لیے کافی ہو جائیں گے اور یا ان کی سفارش و مداخلت کام کر جائے گی۔ قرآن نے سفارش کے اسی تصور پر یہاں ضرب کاری لگائی ہے۔

آخر میں فرمایا و ان تعدل لفظ عدل یہاں فدیہ کے معنے میں ہے یعنی جس طرح یہاں معاوضے اور بدلے دے کر کام ہو جاتا ہے وہاں اگر کوئی معاوضہ کی ہر نوع بھی پیش کرے گا قبول نہ کیا جائے گا وہاں عذاب سے چھٹکارے کے لیے صرف افکار صحیحہ اور اعمال صالحہ کی کرنسی کام آئے گی۔

چونکہ دنیا میں انسان اس کا خوگر ہے کہ اگر کبھی کوئی جرم کرتا ہے اور اس کی سزا سامنے آتی ہے تو سزا سے بچنے کے لیے تین ہی قسم کے ذرائع اختیار کرتا ہے۔ کبھی اپنی جماعت کا زور اس کے خلاف استعمال کر کے سزا سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو بڑے آدمیوں کی سفارش سے کام لیتا ہے اور یہ بھی نہ ہو تو پھر یہ کوشش کرتا ہے کہ اپنے آپ کو سزا سے بچانے کے لیے کچھ مال خرچ کرتا ہے۔

اس آیت نے یہ بات کھول کر بتا دی ہے کہ اللہ کے دربار میں سزا سے بچانے والا نہ کوئی دوست ہو سکتا ہے نہ کسی کی سفارش اللہ کی اجازت کے بغیر ہو سکتی ہے اور نہ کوئی مال قبول کیا جا سکتا ہے بلکہ اگر سارے جہان کا مال بھی اس کے قبضہ میں ہوگا اور وہ اسے پیش کرنا چاہے گا تو ہرگز قبول نہ کیا جائے گا۔

کفر کی دردناک سزا

۴۸۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کو اپنے اعمال کی پاداش میں پکڑا جائے گا ان کے لیے ان کی کافرانہ

زندگی کے بدلے میں کھولتا ہوا پانی اور دردناک عذاب ہوگا۔ یعنی ایسے لوگوں کو جو تکذیب و استہزاء کی کرتوت میں پکڑے گئے ہوں نہ کوئی حمایتی ملے گا جو مدد کرکے زبردستی عذاب الٰہی سے چھڑا لے اور نہ کوئی سفارش کرنے والا ہوگا جو سعی و سفارش سے کام نکال دے اور نہ کسی قسم کا فدیہ اور معاوضہ قبول کیا جائے گا۔ اگر بالفرض ایک مجرم دنیا بھر کے معاوضے دے کر چھوٹنا چاہے گا تو چھوٹ نہ سکے گا۔ گزشتہ آیت میں خاص اس مجلس سے کنارہ کشی کا حکم تھا جہاں آیات اللہ کے متعلق طعن و استہزاء اور ناحق جھگڑے کیے جارہے ہوں اس آیت میں ایسے لوگوں کی عام مجالست و صحبت ترک کر دینے کا ارشاد ہے مگر ساتھ ہی حکم ہے کہ ان کو نصیحت کر دیا کرو تاکہ وہ اپنے کیے کے انجام سے آگاہ ہو جائیں[1] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اسلام کا مذاق اڑاتے اور اسے اپنی تفریح کا مشغلہ بنائے ہوتے ہیں یہی وہ لوگ ہیں جو اپنے اعمال اور اپنی کمائی کی وجہ سے ہلاکت کا شکار ہوتے، ان لوگوں کی سزا اپنی کافرانہ زندگی کی وجہ سے یہ ہوگی کہ ان کو کھولتا ہوا گرم پانی اور انواع و اقسام کا دردناک عذاب ہوگا۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ ان آیات میں اہم اور بنیادی بات یہ ہے کہ مسلمان ان مجالس میں شرکت سے اپنے کو بچا کر رکھیں جو منکرات، فواحش، معاصی پر مشتمل ہوں۔ یہ احکام اس لیے ہیں تاکہ بری صحبت کا اثر مسلمانوں پر نہ پڑے۔ قرآن نے اس معاملہ میں راہ اعتدال اختیار کی ہے۔ تنگ ظرف لوگوں کی طرح یہ نہیں فرمایا کہ فلاں قوم چونکہ تمہاری مخالف ہے اس لیے ان کے پاس نہ بیٹھو، ان سے بات چیت نہ کرو اور نہ افراط کا پہلو اختیار کیا ہے کہ صحبت بد کے اثر کی پرواہ ہی نہ کرو۔ پہلی صورت میں معاشی گاڑی رک جاتی دوسری صورت میں اخلاق تباہ ہو جاتے اس لیے درمیانی صورت اختیار کی کہ ایسے لوگوں کی ہم نشینی سے بچ کر رہو جہاں خدا، خدا کا رسول، قرآن، سنت، خلافت اور امامت آخرت کو بازیچہ اطفال اور مجلسی تفریح کا سامان بنایا جاتا ہے۔ ان مجالس کے لیے بعض وہی نہیں ہے کہ وہ خالص کافروں کی ہوں بلکہ اگر نام نہاد مسلمانوں کی مجالس بھی ایسے منکرات پر مشتمل ہوں تو ان کا حکم بھی یہی ہے جب کہ آج کل بیشتر تعلیم یافتہ دین ناآشنا مسلمانوں کی مجالس بھی اس نقصان سے خالی نہیں ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قُلْ أَنَدْعُوا مِنْ دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنْفَعُنَا وَلَا يَضُرُّنَا وَنُرَدُّ عَلَىٰ
أَعْقَابِنَا بَعْدَ إِذْ هَدَانَا اللَّهُ كَالَّذِي اسْتَهْوَتْهُ الشَّيَاطِينُ
فِي الْأَرْضِ حَيْرَانَ لَهُ أَصْحَابٌ يَدْعُونَهُ إِلَى الْهُدَى ائْتِنَا ۗ
قُلْ إِنَّ هُدَى اللَّهِ هُوَ الْهُدَىٰ ۖ وَأُمِرْنَا لِنُسْلِمَ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ﴿٧١﴾
وَأَنْ أَقِيمُوا الصَّلَاةَ وَاتَّقُوهُ ۚ وَهُوَ الَّذِي إِلَيْهِ تُحْشَرُونَ ﴿٧٢﴾
وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ بِالْحَقِّ ۖ وَيَوْمَ
يَقُولُ كُنْ فَيَكُونُ ۚ قَوْلُهُ الْحَقُّ ۚ وَلَهُ الْمُلْكُ يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّورِ ۚ
عَالِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ ۚ وَهُوَ الْحَكِيمُ الْخَبِيرُ ﴿٧٣﴾

اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کیا تم چاہتے ہو کہ ہم خدا کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ تو ہمیں فائدہ دیتے ہیں نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور باوجودیکہ اللہ ہمیں سیدھی راہ دکھا چکا ہے پھر ہم الٹے پاؤں پھر جائیں۔[۶۵] اور ہماری مثال اس آدمی کی سی ہو کر

رہ جائے۔ جسے شیطانوں نے بیابان میں گمراہ کر دیا ہو، وہ حیران و پریشان ہو۔ اس کے کچھ ساتھی اسے ہدایت کی طرف یہ کہہ کر بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آجا[97]۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت ہی اصلی ہدایت ہے[98]۔ اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ رب العالمین کے سامنے سر اطاعت جھکا دیں اور نیز ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نماز قائم کرو اور ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو، اسی کے حضور میں تمہیں اکٹھا کیا جائے گا اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو علم و حقیقت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ جس دن وہ کہہ دے گا کہ ہو جا بس ہو جائے گا[99]۔ اس کی بات حق ہے اور جس دن صور پھونکا جائے گا تو اس دن اسی کے لیے بادشاہت ہوگی وہ غیب و شہادت کا جاننے والا ہے اور

وہ حکمت و دانائی والا اور آگاہ ہے۔

ہدایت کا واحد ذریعہ

اللہ کی ذات و صفات کی نشاندہی صرف نبوت کرتی ہے اور وہی اللہ کی صحیح معرفت کا جس میں نہ جہالت اور گمراہی کا شائبہ ہو نہ غلط فہمی یا غیر مناسب انداز بیان کا شبہ ہو واحد وسیلہ ہے۔ نبوت کے بتائے ہوئے طریقوں کے علاوہ اور کسی ذریعے سے وہ معرفت حاصل نہیں ہو سکتی نہ تنہا عقل رہنمائی کر سکتی ہے نہ ذہن کی تیزی و ذکاوت کافی ہو سکتی ہے نہ فطرت کی سلامتی اس کا ذریعہ بن سکتی ہے نہ ذہن کی بلند پروازی کی وہاں گزر ہے، نہ عقل و خرد کی کاوشیں اس تک پہنچ سکتی ہیں، نہ تجربات کا خزانہ مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔ اللہ نے اسی حقیقت کا اظہار اہل جنت کی زبانی کیا ہے جو سچے بھی ہیں اور صاحب تجربہ بھی، اور یہ موقعہ بھی ایسا ہے کہ وہاں غلط بیانی اور مبالغہ آمیزی کا کوئی گزر نہیں۔ الحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ اور اس اقرار کے ساتھ وہ انبیاء کا تذکرہ کرتے ہیں کہ وہی معرفت صحیح کا ذریعہ اور اس راہ کے رہنما تھے لقد جاءت رسل ربنا بالحق اس سے معلوم ہوا کہ نبوت ہی کے ذریعے ان کے لیے ممکن ہو سکا کہ وہ اللہ کی معرفت حاصل کر سکیں اور اس کی مرضی اور اس کے احکام معلوم کریں۔

ماورائے عقل و حواس حقائق کی دریافت کے بارے میں انسانوں کی عقلی و باطنی قوتیں جتنی ہیں سب بے بس، کمزور، محدود اور ناقابل اعتماد ہیں۔

آئیے اسی سلسلے میں ان عارفین اور محققین کی شہادتیں اور تجربات بھی سنتے جائیے جو عقل و قلب دونوں کوچوں سے نہ صرف آشنا بلکہ دونوں کے محرم اسرار ہیں۔

حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے اپنے تحقیقی مکتوبات میں اس موضوع کو بار بار چھیڑا ہے کہ عقل انسانی نبوت کی رہنمائی کے بغیر وجود باری کا تو اثبات کر سکتی ہے لیکن اللہ سبحانہ کی ذات و صفات کی صحیح معرفت اور تقدیس و تنزیہ اور توحید صحیح کے مقام تک پہنچ نہیں سکتی۔ ایک مکتوب میں فرماتے ہیں کہ،

خلاصہ یہ کہ عقل اس دولت عظمیٰ کے ثابت کرنے سے قاصر اور نبوت کی رہنمائی

کے بغیر اس دولت سرا کا راستہ پانے سے عاجز ہے۔

فلسفہ اشراق اور مذاہب کی تاریخ بھی اس کی پوری طرح پر تائید کرتی ہے کہ محض عقل واستدلال یا فلسفہ واشراق پر تکیہ کرنے والوں نے خدا کی معرفت اور اس کے لیے صحیح صفات ثابت کرنے اور صحیح افعال کی نسبت کرنے میں کیسی کیسی ٹھوکریں کھائی ہیں اور کن کن گمراہیوں اور نادانیوں میں مبتلا ہوتے ہیں۔

مجدد صاحب نے مکتوبات میں واضح کیا ہے کہ جس طرح عقل کا مرتبہ حواس سے بالاتر ہے، اسی طرح نبوت کا مقام عقل سے ماوراء ہے۔ خدا کی تنزیہ کا طریقہ معلوم کرنا نبوت پر منحصر اور نبوت کی تعلیم پر موقوف ہے۔ قرآن نے یہاں اسی ہدایت نبوت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۸۵۔ اے پیغمبر ان لوگوں سے کہو کیا تم چاہتے ہو کہ ہم خدا کو چھوڑ کر ان کو پکاریں جو نہ تو ہمیں نفع دیتے ہیں اور نہ نقصان پہنچا سکتے ہیں اور باوجود یکہ اللہ ہمیں سیدھی راہ دکھا چکا ہے پھر ہم الٹے پاؤں پھر جائیں۔ یہ آیت دراصل تفریع ہے ان باتوں پر جو پچھلی آیات میں بتائی گئی ہیں۔ یعنی جب یہ ثابت ہو چکا ہے کہ ہر جاندار کا روزی رساں اللہ ہے، تمام مصائب و مشکلات وہی آسان کرتا ہے، انسانی حواس اور طاقتیں اسی کے قبضے میں ہیں۔ زمین و آسمان اور بحر و بر کا کامل اور تفصیلی غیب بھی صرف وہی جانتا ہے اور بحر و بر کے شدائد اور ہر کرب و ضرر سے وہی سنجات دیتا ہے اس سے پتہ چلا کہ مالک و مختار، متصرف و کارساز اور عالم الغیب صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے کوئی دوسرا نہیں ہے تو کیا اس کے باوجود ہم اللہ کے سوا ایسوں کو پکاریں جنہیں ہمارے نفع ونقصان کا ذرہ برابر اختیار نہیں جو نہ متصرف و مختار ہیں نہ غیب دان، اگر ہم ایسا کریں تو ہم ہدایت یافتہ ہونے کے بعد پھر گمراہ ہو جائیں۔ کیونکہ اس سے بڑی سفاہت اور حماقت اور کیا ہو سکتی ہے کہ دانائے کل اور مختار کل کو چھوڑ کر ان کو پکارنا شروع کر دیا جائے جو کچھ بھی نہیں ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر پہلے ہم اس گمراہی میں مبتلا ہے تو اس کے لیے کچھ عذر تھا لیکن اب اگر ہم رجعت اختیار کریں گے تو ہمارے پاس کیا عذر ہوگا مالا ینفعنا ولا یضرنا میں ان معبودوں کے لیے ما کا استعمال تحقیر کے لیے ہوا ہے ورنہ جن کی وہ عبادت کرتے تھے اور جن کے تماثیل اور اصنام کو پوجتے تھے، وہ شخصیتیں ہیں۔ یا ما کا استعمال بے جان مجسموں کی وجہ سے کیا گیا ہے۔ آیت میں استفہام انکار و تعجب ہے یعنی اس سے بڑی اچنبہ والی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ ہم اللہ کو چھوڑ کر ان سے دعائیں مانگیں جو ہمیں نہ نفع پہنچا سکتے ہیں اور نہ نقصان، ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ آیت میں نہایت بلیغ انداز

میں اس کی پانچ وجہیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ اس صورت میں قادر و مقتدر کو چھوڑ کر بے بس اور بے اختیار کو اپنانا ہے، دوسرے یہ کہ ایسا کرنا بلندی کے بعد پستی، عزت کے بعد ذلت، علم کے بعد جہل کا شکار ہونا ہے، تیسرے یہ کہ ایسا کرنا تقاضائے عقل نہیں ہے بلکہ یہ پسپائی انتہائی بے عقلی کی دلیل ہے چوتھے یہ کہ جسے اللہ نے ضلالت سے نکال کر ہدایت کی صراط مستقیم پر گامزن کیا ہو، اسے کون ہے جو گمراہ کر سکے۔

ایمان و کفر کی مثال

۸۶ - اور ہماری مثال اس آدمی کی سی ہو کر رہ جائے گی جسے شیاطین نے بیابان میں گمراہ کر دیا ہو وہ حیران و پریشان ہو، اس کے کچھ ساتھی اسے ہدایت کی طرف یہ کہہ کر بلا رہے ہوں کہ ہمارے پاس آجا۔ یعنی مومن کی شان یہ ہے کہ گمراہوں کو نصیحت کر کے سیدھی راہ پر لاتے اور جو خدائے قدوس سے بھاگ کر غیر اللہ کی چوکھٹ پر سر رکھے ہوئے ہیں ان کو خدائے واحد کے سامنے سربسجود کرنے کی فکر کرے اس سے یہ توقع رکھنا فضول ہے کہ وہ خدا کے سوا کسی ایسی ہستی کے آگے سر جھکائے گا جس کے قبضہ میں نہ نفع ہے نہ نقصان یا اہل باطل کی صحبت میں رہ کر توحید و ایمان کی صاف سڑک چھوڑ دے گا اور شرک کی بھول بھلیوں کی طرف الٹے پاؤں پلٹ جائے گا۔ اگر معاذ اللہ ایسا ہو تو اس کی مثال اس مسافر کی سی ہو گی جو اپنی راہ جاننے والے رفقاء کے ساتھ جنگل میں سفر کر رہا تھا کہ ناگاہ غول بیابانی خبیث جنات نے اسے بہکا کر راستہ سے الگ کر دیا۔ وہ چاروں طرف بھٹکتا پھرتا ہے اور اس کے رفقاء ازراہ خیر خواہی اسے آواز دے رہے ہیں کہ ادھر آ، راستہ ادھر ہے مگر وہ حیران و مخبوط الحواس ہو کر نہ کچھ سمجھتا ہے نہ ادھر آتا ہے۔ اسی طرح سمجھ لو کہ مسافر آخرت کے لیے سیدھی راہ اسلام و توحید کی ہے اور جن کی رفاقت و معیت میں یہ سفر طے ہوتا ہے وہ پیغمبر اور اس کے متبعین ہیں۔ جب یہ بدبخت شیاطین و مضلین کے پنجہ میں پھنس کر صحرائے ضلالت میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ اس کے ہادی اور رفقاء ازراہ ہمدردی جادۂ حق کی طرف بلا رہے ہیں مگر یہ نہ کچھ سنتا ہے نہ سمجھتا ہے تو اسے گردہ اشرار کیا تمہاری غرض یہ ہے کہ ہم اپنی ایسی مثال بنا لیں۔ یہ آیت ان مشرکین کے جواب میں اتری جنہوں نے مسلمانوں سے ترک اسلام کی درخواست کی تھی[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

مومن وحی و بصیرت کی ہدایت اور علم و یقین کی روشنی اپنے سامنے رکھتا ہے اس لیے فلاح و سعادت کی شاہراہ سے کبھی بھٹک نہیں سکتا لیکن منکرینِ حق کے سامنے کوئی روشنی نہیں ہوتی۔ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک آدمی بیابان میں کھو گیا ہو اور حیران و سرگرداں پھر رہا ہو، کبھی ایک طرف کو دوڑے کبھی دوسری طرف کوئی متعین اور یقینی راہ اس کے سامنے نہ ہو۔ یہاں تقدیر تشبیہ اس طرح ہے انرد علی اعقابنا بعد الھدایۃ مثل الذی استھوتہ کیا ہم ہدایت کے بعد اس شخص کی طرح پسپائی اختیار کرلیں جسے شیاطین نے کسی صحرا میں بھٹکا دیا ہو۔ اصل ارشاد میں استھوتہ الشیاطین آیا ہے۔ اس کے معنے عقل و خرد سے بیگانہ بنا دینے، راستہ بھلا دینے کے ہیں۔ فعل استھوا کی شیاطین کی طرف نسبت عربی ذہنیت کے مطابق ہے۔ اہلِ عرب کا خیال تھا کہ جنوں کی ساری صورتیں شیاطین کی تاثیر ہیں اور جن اور شیطان کی نسبت عرب کے عجیب عجیب اعتقاد تھے۔ وہ جن شیطان بھوت پلیت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے۔ گر اختلافِ صورت کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام تھے۔ جو جنات جنگلوں اور میدانوں میں رہتے تھے۔ اور مسافروں کو اپنی صورتیں بدل کر دھوکا دیتے تھے ان کے مذکر کا نام غول اور مونث کو سعلاۃ کہتے تھے۔ صحیح مسلم میں حدیث ہے

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ مرض لگنا اور صفر اور غول کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ نویں پارے میں سورہ اعراف کے آخر میں آرہی ہے۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ یہ تشبیہ ایمان و کفر کی حقیقت سمجھانے کے لیے دی گئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایتِ الٰہی اور حق کی شاہراہ پا جانے کے بعد اگر ہم تمہاری راہ پر چلیں اور پھر سے کفر و شرک اپنا لیں تو ہماری مثال اس شخص کی سی ہو جائے گی جس کو شیاطین نے کسی بیابان میں بھٹکا دیا ہو اور وہ حیران و درماندہ ادھر اُدھر مارا مارا پھر رہا ہو۔ اس کے کچھ ساتھی اسے پکار رہے ہیں کہ راستہ ادھر ہے۔ ہماری طرف آؤ لیکن اس کی عقل ایسی گم ہو کر اس کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا ہو کہ کدھر جائے۔

یہ ایمان و کفر کو سمجھانے کے لیے ایک تشبیہ ہے اس میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ کافر بیابان میں بھٹکتے ہوئے مسافر کی مانند ہے شیاطین اور گمراہ لیڈروں نے اسے گمراہ کر دیا ہے اور کچھ اہلِ ایمان اسے اصل راہ کی طرف بلا رہے ہیں لیکن وہ ان کی پکار نہیں سنتا ہے۔ دیکھیے کس خوبی کے ساتھ ایمان و کفر کی پوری تصویر سامنے رکھ دی ہے۔ ایمان کی راہ سرتاسر روشنی اور علم و یقین کی راہ ہے کفر کے سامنے کوئی روشنی نہیں ہوتی وہ تاریکیوں میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ ایک

طرف مومن اعلان کرتا ہے کہ دانائے کل اور مختار کل، کشاف حاجات اللہ سبحانہٗ ہے۔ اور مومن یہ بات علم یقین اور وحی و نبوت کی روشنی میں کہتا ہے دوسری طرف مشرک کہتا ہے کہ فلاں فلاں بھی اختیار رکھتے ہیں۔ ہر قسم کی حاجت روائی فرما سکتے ہیں لیکن اس کے پاس اس دعویٰ کی کوئی دلیل نہیں وہ یہ بات محض اپنے خیال اور گمان سے کہتا ہے وہ اگر علم کا نور ہے تو یہ بلا شبہ جہل کی تاریکی ہے یہ شرک کا بدبودار اور گدلا پانی ہے۔ اس مثال پر غور کرو جس قدر غور کرتے جاؤ گے حقیقت کی وضاحت بڑھتی جائے گی۔

ہدایت کی راہ تو نبوت کی راہ ہے

۷۱ ۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ اللہ کی ہدایت ہی اصلی ہدایت ہے۔ یعنی ہم سے یہ امید نہ رکھو کہ ہم اسے چھوڑ کر شیاطین کی بتلائی ہوئی راہوں پر چلیں گے[۱] یہ الهدیٰ یعنی ہدایت کی حقیقی اور اصلی راہ نبوت و وحی کی راہ ہے۔ جو روز اوّل سے دنیا میں موجود ہے اور بلا تفریق و امتیاز تمام نوع انسانی کے لیے ہے۔ جس طرح اللہ سبحانہٗ کے وجدان حواس اور عقل کی ہدایت میں نہ تو نسل و قوم کا امتیاز رکھا نہ زمان و مکان کا اسی طرح اس کی ہدایت وحی بھی ہر طرح کے تفرقہ و امتیاز سے پاک ہے وہ سب کے لیے ہے اور اس ایک ہدایت کے سوا اور جتنی ہدایتیں بھی انسانوں نے سمجھ رکھی ہیں سب انسانی بناوٹ کی راہیں ہیں۔ خدا کی ٹھہرائی ہوئی راہ صرف یہی ایک راہ ہے۔ یہ جتنی راہیں الگ الگ بنالی گئی ہیں مثلاً یہودیت اور مسیحیت یہ سب انسانی گمراہی کی بناوٹیں ہیں۔ ہدایت کی راہ تو بس ہدایت کی وہ راہ ہے جسے محمد رسول اللہ لے کر آئے ہیں جو کوئی اس پر چلے گا، ہدایت یافتہ ہوگا۔ اسی لیے قرآن ہدایت کی ان تمام صورتوں سے یک قلم انکار کرتا ہے جو نبوت محمدیہ سے ہٹ کر بنائی گئی ہیں۔ یہ انسانی بناوٹ کی راہیں ہیں اور انسانی بناوٹ کی راہیں ہدایت کی راہ نہیں ہو سکتیں ہدایت کی راہ تو ھدی للعالمین وہی عالمگیر ہدایت کی راہ ہے جسے عالمگیر نبوت لے کر آئی ہے۔ اسی عالمگیر ہدایت کو الدین کے نام سے پکارا جاتا ہے یعنی نوع انسانی کے لیے حقیقی دین ہے اور اسی کا نام اسلام ہے۔ الغرض الهدیٰ وہ دین ازلی ہے جس کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم لے کر تشریف لائے ہیں یہ اب ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ آپ خاتم النبیین کا دین کامل دین اور

لہ افادات شیخ الاسلام

آپ کا صحیفہ تمام صحیفہ الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقا کا وعدہ کیا گیا ہے اسی بنا پر اسے الہدیٰ کہا گیا ہے ۔

ہدایتِ الٰہی کی عملی تصویر

۸۸ - اور ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ رب العالمین کے سامنے سرِ اطاعت جھکا دیں اور نیز ہمیں حکم دیا گیا ہے کہ نماز قائم کرو اور ہر حال میں اللہ سے ڈرتے رہو اسی کے حضور میں تمہیں اکٹھا کیا جائے گا۔ یعنی ہمیں حکم ہوا ہے کہ خداوند کائنات کے مکمل ہر جہتی ہمہ گیر و دائمی قانون کے پورے فرمانبردار ہو جائیں۔ اسلام کے معنے کہا مان لینے اور فرمانبرداری کرنے کے ہیں۔ یعنی اللہ نے جو قانون سعادت انسان کے لیے اپنے نبی کی وساطت سے روانہ کیا ہے اس کی ٹھیک ٹھیک اطاعت کی جائے۔ اسی کا نام دین ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ ہی تمام جہانوں کا رب، مالک کارساز اور صاحب روا ہے۔ اس کے سوا کون حقدار ہو سکتا ہے کہ اپنے آپ کو اس کے حوالے کیا جائے۔ یہی الدین القیم ہے۔ یہی دین حنیف ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیم نے دی تھی اسی کا نام اسلام ہے اور اسی کی عملی تصویر اقامت صلاۃ ہے۔ ارشاد ہے وان اقیموا الصلاۃ اقامت صلاۃ اسلام کے عملی ارکان میں چونکہ سرِ فہرست ہے اور اسلام میں اس کا جو مقام ہے وہ کسی بھی دوسرے عمل کا نہیں ہے۔ مومن کا ہر کام نسلم لرب العالمین کی رو سے اللہ کی بندگی کا کام ہے مگر نماز جیسی بندگی کی شان کسی کام میں نہیں ہوتی ہے اس کا باطن ہی نہیں ظاہر بھی سراپا بندگی ہوتا ہے۔ نماز ہی ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہے اور اسی حیثیت سے یہاں نسلم لرب العالمین کے بعد اس کا ذکر ہوا ہے۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر ایک مومن کی زندگی رب العالمین کے لیے مسلمانہ اور مطیعانہ ہو اور اسے اللہ کی معبودیت اور اپنی عبدیت پر یقین ہو تو یہ یقین سب سے پہلے نماز کی شکل اختیار کرتا ہے۔ اس انداز بیان سے صرف یہی معلوم نہیں ہوتا کہ نماز اسلام کا سب سے پہلا مظہر ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ نماز اسلام کا لازمی مظہر بھی ہے۔ غور فرمائیے آخر انداز بیان کو غائب سے بدل کر حاضر کیوں کیا گیا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو اس براہ راست خطاب کے زور میں یہی راز سمجھتا ہوں۔ اسی لیے نماز کے ساتھ تقویٰ پر زور دیا گیا ہے۔ اصل ارشاد میں واتقوہ آیا ہے۔ یہاں تقویٰ اللہ کی ناراضی کے اس گہرے احساس کا نام ہے جو آدمی کو ہر بھلے کام پر ابھارتا اور برے کام سے روکتا ہے یا یوں کہیے کہ تقویٰ

ایک خاص قلبی کیفیت ہے جس سے ایک خاص عملی رویہ وجود میں آتا ہے۔ یہ عملی رویہ اللہ کے لیے اطاعت، فرمانبرداری یعنی مسلمانہ زندگی کا رویہ ہوتا ہے۔ اس خاص کیفیت سے جو دل بہرہ ور ہوتا ہے وہ ہر وقت یہ دیکھتا رہتا ہے کہ میرا خدا مجھ سے ناراض نہ ہو جائے، میں ایسی کوئی حرکت نہ کروں گا جس کو وہ پسند نہیں کرتا۔

اللہ کی ناراضگی سے بچنے کی یہ خواہش اور کوشش اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جبکہ انسان اللہ کی عدالت میں پیش ہونے کے اندیشہ کے تحت اپنے آپ کو قابو میں رکھے اور اپنے آپ کو من چاہی زندگی گزارنے سے روکے رہے گویا التقویٰ کا مقام پا لینے کی واحد سبیل یہ ہے کہ فکرِ آخرت سے دب کر انسان اپنے نفس کو لگام دے اور اپنی خواہشوں میں اسے آزاد نہ چھوڑے جیسا کہ یہاں قرآن نے الیہ تحشرون کہہ کر اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی مسلمانہ زندگی اس لیے گزارنی ہے اور اللہ کی نافرمانی سے اس لیے بچنا ہے کہ ایک روز خدا کی عدالت میں حاضر ہونا ہے۔

تخلیق بالحق سے استدلال

۷۹۔ اور وہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو علم و حقیقت کے ساتھ پیدا کیا ہے اور اس کی شان یہ ہے کہ جس روز وہ کہہ دے گا کہ ہو جا بس ہو جائے گا۔ یعنی وہ کوئی ناقص العلم، ناقص القدرت، ناقص القویٰ، دیوی، دیوتا نہیں ساری موجودات کا خالق، سب کو نیست سے ہست کرنے والا ہے۔ مخلوقات کے سارے مصالح کی رعایت اس کے سوا کوئی نہیں کر سکتا ہے نام تو زمین و آسمان کا لیا گیا ہے مگر مراد جیسا کہ علامہ آلوسی نے سمجھا ہے سارے علویات و سفلیات ہیں۔ بالحق کی قید خاص معنویت کی ناطر لگائی ہے یعنی کائنات کی ہر چیز کی بناوٹ کچھ اس طرح کی واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ضبط و ترتیب کے ساتھ ایک خاص نظام و قانون میں منسلک ہے اور کوئی چیز حکمت و مصلحت سے خالی نہیں۔ یہ تخلیق بالباطل نہیں کہ بغیر کسی معین اور مقرر مقصد و نظم کے وجود پذیر ہو گیا۔ اگر ایسا ہوتا تو ناممکن تھا کہ اس نظم، اس یکسانیت، اس وقت کے ساتھ اس کی ہر بات کسی نہ کسی حکمت و مصلحت کے ساتھ مربوط ہوتی۔ اہل ایمان اور ارباب دانش کی یہ صدا آل عمران میں پڑھ چکے ہو،

ربنا ما خلقت هذا باطلاً

ایک اور مقام پر قرآن میں حق کا مقابلہ لعب سے کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آسمان و زمین کی تخلیق محض کھیل کے طور پر نہیں ہوئی چنانچہ ارشاد ہے۔

وما خلقنا السماوات والارض وما بینهما لاعبین ما خلقناهما الاّ بالحق۔

ہم نے آسمان و زمین اور اس کی درمیانی مخلوقات کو محض کھیل کے طور پر پیدا نہیں کیا بلکہ ہم نے ان کو حق کے ساتھ پیدا کیا ہے۔

ایک مقام پر تخلیق بالحق کے اس پہلو پر توجہ دلائی ہے کہ کائنات کی ہر چیز افادہ و فیضان کے لیے ہے اور اللہ سبحانہٗ چاہتا ہے کہ جو کچھ بناتے اس طرح بناتے کہ اس میں وجود اور زندگی کے لیے نفع اور راحت ہو۔ ایک موقعہ پر اجرام سماویہ کا ذکر کرکے فرمایا ما خلق اللہ ذالک الاّ بالحق۔ ایک جگہ فطرت کے جمال اور زیبائی کو بیان کیا ہے اور تخلیق بالحق سے تعبیر کیا ہے خلق السماوات والارض بالحق وصورکم فاحسن صورکم یہاں تخلیق بالحق سے قرآن کا استدلال یہ ہے کہ اس کائنات کی کوئی چیز نہیں جو کسی ٹھہرائے ہوئے مقصد اور مصلحت سے خالی ہو، اور کسی بالاتر قانون خلقت کے ماتحت ظہور میں نہ آئی۔ یہاں جو چیز بھی اپنا وجود رکھتی ہے ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں کے عالمگیر سلسلہ میں بندھی ہوئی ہے جب کائنات کی تخلیق حکمتوں اور مصلحتوں کے جلو میں یعنی بالحق ہوتی ہے۔ بس ضروری ہے کہ انسانی زندگی کے لیے کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہیٰ ہو اور یہی منتہیٰ آخرت کی زندگی ہے۔ یہ زندگی کیسے وجود میں آئے گی فرمایا و یوم یقول کن فیکون بس اس روز فرمائےگا کہ ہو جا تو بس ہو جائے گا۔

قیامت کی آمد کا اعلان

۹۰۔ اس کی بات حق ہے اور جس روز صور پھونکا جائے گا تو اس روز اسی کے لیے بادشاہت ہوگی وہ غیب و شہادت کا جاننے والا اور وہ حکمت و دانائی والا اور آگاہ ہے۔ بات کے حق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہو کر رہنا ہے۔ عربی زبان میں حق کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے۔ یعنی جو بات ثابت ہو، اٹل ہو، اَنمٹ ہو۔ اسے حق کہیں گے باطل ٹھیک اس کی نقیض ہے۔ منشا یہ ہے کہ خدا کی بات ہو کر رہنی ہے۔ اس میں ایک لمحہ کے لیے بھی کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی اور جس دن حشر کے لیے صور پھونکا جائے اس روز ظاہری اور مجازی طور پر بھی خدا کے سوا کسی کی سلطنت نہ رہے گی لمن الملک الیوم للہ الواحد القہار[1] مطلب یہ ہے کہ اس دن

[1] افادات شیخ الاسلام

سارا اختیار اور ساری بادشاہی صرف خدائے واحد قہار کی ہوگی۔ اس دن کسی کا زور چلے گا نہ کسی کو کوئی اختیار حاصل ہوگا نہ کسی کی سعی و سفارش اللہ کے حکم کے بغیر کسی کو کچھ نفع پہنچا سکے گی سب خدا کے سامنے سرافگندہ ہوں گے صرف اسی کا حکم ناطق و نافذ ہوگا۔

اس روز کا یہاں قرآن نے چہرہ یہ پیش کیا ہے یوم ینفخ فی الصور، صور کے لفظی معنے نرسنگھا کے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ قدیم الایام میں بابلیوں، کنعانیوں، آرامیوں اور عبرانیوں وغیرہ تمام پرانی قوموں میں بادشاہی جلال و جلوس اور اعلان جنگ کے موقعوں پر نرسنگھا پھونکا جاتا تھا اس لیے نرسنگھا پھونکنے کے معنی شاہی جلال کا اظہار یا غیر معمولی خطرہ کا اعلان ہے۔ چنانچہ تورات میں یہ محاورہ بکثرت استعمال ہوا ہے۔ قرآن میں ہے کہ اس دن ندا ہوگی لمن الملك اليوم؟ آج کس کی بادشاہی ہے، پھر اللہ تعالیٰ خود ہی جواب دے گا للّٰہ الواحد القہار، غرض وہ دن آسمان و زمین اور نظم کائنات کے شہنشاہ مطلق کے اظہار جلال اور شدید خطرہ حساب کے اعلان کا ہوگا۔ اس لیے نفخ صور اور نرسنگھا پھونکنے کا قدیم محاورہ اس کے لیے استعمال کیا گیا اور یہ بھی ممکن ہے کہ واقعہ اس دن اپنی شہنشاہی کا نرسنگھا پھونکنے کا حکم دے اور اس کی تعمیل ہو جیسا کہ صور کے لفظی معنے دلالت کرتے ہیں۔ اگرچہ کچھ ارباب لغت نے صور کو صورت کی جمع قرار دیا ہے۔ چنانچہ شیخ ابوالفضل جمال قرشی لکھتے ہیں۔

> صور بالضم معنے شاخ ہے۔ نیز وہ چیز کہ جس کو حضرت اسرافیل خلق کو مارنے اور جلانے کے لیے پھونکیں گے۔ ارشاد الٰہی ہے یوم ینفخ فی الصور، کلبی نے کہا ہے مجھے نہیں معلوم کہ صور کیا ہے نیز بیان کیا جاتا ہے کہ صور صورت کی جمع ہے جس کے معنے پیکر اور پتلے کے ہیں یعنی مردوں کے پیکروں میں روحیں پھونکی جائیں گی اور حسن البصری نے تو اس کو واؤ کے زبر کے ساتھ پڑھا ہے۔

یہ دوسرا قول ابوعبیدہ اور مقاتل کا ہے مگر پہلی بات زیادہ صحیح ہے کیونکہ قرآن میں دوسری جگہ فرمایا ہے ثم نفخ فیہ اخری نیز ارشاد ہے فاذا نقر فی الناقور، یہ صور پھونکنے کا بیان ہے، علاوہ ازیں خود ارشاد نبوت میں اس کے معنے نرسنگھا کے موجود ہیں۔ چنانچہ امام احمد، ابوداؤد، نسائی، دارمی، ترمذی اور حاکم نے حضرت عبداللہ بن عمر کی روایت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے نقل کیا ہے۔ الصور القرن ینفخ فیہ صور نرسنگھا ہے کہ جس کو پھونکا جائے گا صور پھونکنے کی صحیح کیفیت کیا ہوگی؟ اس کی تفصیل ہماری سمجھ سے بالا ہے۔ قرآن نے جو

کچھ بتایا ہے وہ صرف اتنا ہے کہ قیامت کے روز اللہ کے حکم سے صور پھونکا جائے گا اور سب ہلاک ہو جائیں گے، پھر دوسرا صور پھونکا جائے گا اور سب زندہ ہو جائیں گے اور بس۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے عالم الغیب والشھادۃ مطلب یہ ہے کہ جو خدا یہ صفات رکھتا ہے جن کا ذکر ان دو تین آیات میں ہو چکا ہے وہی اس لائق ہے کہ ہم اس کے تابع فرمان ہوں۔ اس کے سامنے انتہائی عبودیت اختیار کریں اور ہر آن اس سے ڈرتے رہیں۔ اسی کا ہم کو حکم ہوا ہے جس سے ہم کسی حال میں منہ نہیں موڑ سکتے ہیں[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَإِذْ قَالَ إِبْرٰهِيْمُ لِأَبِيْهِ اٰزَرَ اَتَتَّخِذُ اَصْنَامًا اٰلِهَةً ۚ اِنِّيْٓ اَرٰىكَ
وَقَوْمَكَ فِيْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ۝ وَكَذٰلِكَ نُرِيْٓ اِبْرٰهِيْمَ مَلَكُوْتَ
السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَلِيَكُوْنَ مِنَ الْمُوْقِنِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَنَّ
عَلَيْهِ الَّيْلُ رَاٰ كَوْكَبًا ۚ قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ قَالَ لَآ اُحِبُّ
الْاٰفِلِيْنَ ۝ فَلَمَّا رَاَ الْقَمَرَ بَازِغًا قَالَ هٰذَا رَبِّيْ ۚ فَلَمَّآ اَفَلَ
قَالَ لَئِنْ لَّمْ يَهْدِنِيْ رَبِّيْ لَاَكُوْنَنَّ مِنَ الْقَوْمِ الضَّآلِّيْنَ ۝
فَلَمَّا رَاَ الشَّمْسَ بَازِغَةً قَالَ هٰذَا رَبِّيْ هٰذَآ اَكْبَرُ ۚ فَلَمَّآ
اَفَلَتْ قَالَ يٰقَوْمِ اِنِّيْ بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُشْرِكُوْنَ ۝ اِنِّيْ وَجَّهْتُ
وَجْهِيَ لِلَّذِيْ فَطَرَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ حَنِيْفًا وَّمَآ اَنَا مِنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ۝

اور ابراہیم کا واقعہ یاد کرو جب اس نے اپنے باپ آزر سے
کہا تھا کہ کیا تو بتوں کو معبود بناتا ہے میرے نزدیک تو تم اور

تمہاری قوم کھلی گمراہی میں مبتلا ہے[۹۲]۔ اور اسی طرح ہم نے
ابراہیم کو آسمانوں کی اور زمین کی بادشاہت کے جلوے
دکھاتے تاکہ وہ یقین رکھنے والوں میں سے ہو جائے[۹۳]۔
پھر جب اس پر رات کی اندھیری چھا گئی تو اس نے ایک
ستارہ دیکھا اس نے کہا کہ یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ
ڈوب گیا تو کہا میں ان کو پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے
والے ہیں[۹۴]۔ پھر جب اس نے چاند چمکتا ہوا دیکھا تو اس
نے کہا کہ یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو
بول پڑا کہ اگر میرے پروردگار نے مجھے راہ نہیں
دکھائی تو میں ضرور ان لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو سیدھے
راستہ سے بھٹک جاتے ہیں[۹۵]۔ پھر جب سورج چمکتا ہوا
دیکھا تو ابراہیم نے کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے یہ بڑا ہے

لیکن جب وہ بھی غروب ہوگیا تو ابراہیم نے کہا اے میری قوم میں ان سے بیزار ہوں جنہیں تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو ۹۶ میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اپنا رُخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ ۹۷

توحید کا جامع تصوّر

اس سے پہلے تخلیق سے توحید پر استدلال کیا تھا، یعنی کائنات خلقت کی تمام باتیں یقین دلا رہی ہیں کہ یہ کارخانہ علم و حکمت کے ساتھ بنایا گیا ہے اور کوئی بنانے والا ہے جو چاہتا ہے کہ ایک منظم، مرتب، کامل اور حسن و خوبی رکھنے والا کارخانہ وجود میں آجائے۔ اب یہاں بتایا جارہا ہے کہ توحید الٰہی کی یہی حجت حضرت ابراہیم پر کیوں کر القا کی گئی۔ حضرت ابراہیمؑ کا ظہور ایک ایسے عہد اور ملک میں ہوا جب بابل اور نینوا کی عظیم الشان قومیں اجرام سماویہ کی پرستش میں مبتلا تھیں، اور شہر اُر میں زہرہ، چاند اور سورج کے مندر تھے جہاں صبح و شام پرستاری کے لیے لوگ جمع ہوتے تھے، لیکن حضرت ابراہیم کے قلب سلیم پر خدا پرستی کی صداقت کھول دی گئی۔ خدا نے ان پر اپنی بادشاہت اور کارفرمائی کے جلوے کچھ اس طرح روشن کیے کہ بے خبری و غفلت کا کوئی پردہ بھی ان کی معرفت میں حائل نہ ہو سکا۔ یہ حقیقت جب ان پر کھول دی گئی تو علم و بصیرت کی حجت نے ان کی رہنمائی کی۔ قرآن نے یہاں ایک ایسے پیرایہ بیان میں جو اس کی عجیب و غریب بلاغت کا مظہر ہے اس کا مرقع پیش کیا ہے۔ زمین و آسمان کے نظام سلطنت کے مطالعہ اور مظاہر فطرت کے مشاہدے سے حضرت ابراہیم کو بصیرت و یقین کی غیر معمولی قوت حاصل ہوگئی۔

اسی غیر معمولی بصیرت کی بدولت آپ نے قوم کے سامنے انہی سیاروں کے نظام طلوع و غروب سے توحید کی ناقابل انکار حجت پیش کی جن کی یہ لوگ پوجا کرتے تھے۔ آپ نے فرمایا یہ تارا ہے، یہ چاند، یہ سورج تمہارے معبود ہیں۔ چلو میں بھی تمہارے ساتھ مانے لیتا ہوں کہ یہ تارا میرا معبود ہے مگر دیکھو تو یہ غائب ہو گیا اور یہ چمکتا ہوا چاند دیکھو یہ تو ڈوب گیا۔ اور یہ تابناک سورج یہ تو واقعی سب سے بڑا ہے مگر دیکھو یہ بھی غروب ہو گیا۔ تم ہی سوچو طلوع و غروب کے نظام میں جکڑے ہوئے بے اختیار سیارے کہیں معبود ہو سکتے ہیں۔ میں تو ان سب سے منہ پھیر کر پوری یکسوئی کے ساتھ اس خدا کی طرف رخ کرتا ہوں۔ جو زمین و آسمان کا پیدا کرنے والا ہے اور جس کے اشارے پر یہ کائنات گردش کر رہی ہے۔ میں تمہارے ان جھوٹے بے اختیار معبودوں سے بالکل بے تعلق ہوں۔
یہ ہے تحقیق بالحق سے توحید الٰہی پر استدلال۔ گویا حضرت ابراہیم نے اثباتی پہلو میں ایسے وجود کو سامنے رکھا جس کی طرف سارے وجود منتہی ہیں اور سلبی پہلو میں صرف اجمالاً شرکت کے حدود کی نفی پر کفایت کی۔ اس بیان میں خدا ایک موجود کو بتایا ہے اور موجود وہ جس نے تمام مخلوق کو خلعت وجود سے سرفراز فرمایا۔ اور جس کا وجود ذاتی اس صفات تبور تیر بھی لامحالہ حقیقی ہوں گی۔ اور جب مخلوقات اپنے وجود ہستی میں اس کی محتاج ہوں گی تو بلاشبہ اپنی صفات میں بھی اس کی محتاج ہوں گی اس لیے حضرت ابراہیم نے صاف کہہ دیا لـم تعبد مالا یسمع ولا یبصر۔

۹۱۔ اور ابراہیم کا واقعہ یاد کرو جب اس نے اپنے باپ آزر سے کہا۔ علماء انساب کا خیال ہے کہ حضرت ابراہیم کے باپ کا نام "تارخ" ہے۔ ممکن ہے کہ تارخ نام ہو اور آزر لقب ہو۔ ابن کثیر نے مجاہد وغیرہ سے نقل کیا ہے کہ آزر بت کا نام تھا۔ شاید اس بت کی خدمت میں رہنے کی وجہ سے خود ان کا لقب آزر پڑ گیا ہو۔[1]

ابراہیم و آزر ناموں کی تحقیق

ابراہیم حضرت خلیل اللہ کا نام نامی ہے۔ حضرت نوح کے بعد سلسلہ نبوت کے بانی ہیں تورات کے سفر تکوین سے معلوم ہوتا ہے کہ ابراہیم سام بن نوح کی اولاد میں دسویں فرزند

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں۔ ان کی پیدائش کلدان کے شہر اُور میں ہوئی ہے۔ تورات میں جو سب سے پہلا سیاسی واقعہ مذکور ہے وہ حضرت ابراہیم کے عہد شمالی عرب میں عراق اور شام کے بادشاہوں کی جنگ ہے۔ اس موقعہ پر شنعار بابل کے بادشاہ کا نام امرافیل یا امورافیل ہے۔ بہر حال اگر یہ قیاس صحیح ہے تو حمورابی اور حضرت ابراہیم کا زمانہ ایک ہی ہوگا۔ یعنی حضرت مسیح سے ۱۹۰۲ سال پہلے۔ حمورابی کے ایک اور کتبہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ شاید یہ دنیا کا سب سے پہلا مقنن، بابل کے ایک منارے پر اس کے قوانین کندہ ملے ہیں جو تورات کے احکام سے بہت متشابہ ہیں۔ گمراہ لوگوں کا خیال ہے کہ تورات کے احکام انہیں قوانین سے ماخوذ ہیں لیکن اہل حق کہہ سکتے ہیں کہ یہ احکام حضرت کی شریعت کے ہیں جن کو حمورابی نے سنا اور قبول کیا اور حمورابی کے یہ قوانین اصلاً عربی کتابت ہے۔ لفظ ابراہیم کو اہل عرب سات طرح بولتے ہیں۔ ۱۔ ابراہیم ۲۔ ابراہام ۳۔ ابراہوم، ۴۔ ابراہم، ۵۔ ابرہم، ۶۔ ابرام، ۷۔ برہم۔ کچھ کے خیال میں ابراہیم مرکب امتزاجی ہے جیسے بعلبک یعنی دو اسموں کو ملا کر نام رکھ دیا گیا ہے۔ اصل میں اب رہم تھا۔ مجد الدین فیروزآبادی نے اس کی تصغیر بُریراہ اور بریہیم بتائی ہے اور علامہ مرتضیٰ زبیدی شارح قاموس نے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ شاید صاحب قاموس کے خیال میں یہ لفظ عربی ہے۔

مورخین نے حضرت ابراہیم کا نسب نامہ یہ بتایا ہے ابراہیم بن تارخ بن ناحور بن سروج بن رعو بن فالغ بن عابر بن شالخ بن ارفکشد بن سام ابن نوح علیہ السلام، یہ تورات کے مطابق ہے اس میں حضرت ابراہیم کے والد کا نام تارخ ہے لیکن یہاں قرآن نے حضرت ابراہیم کے والد کا نام آزر بتایا ہے۔ حیرت ہے کہ شارحین قرآن کی اکثریت اور مورخین کہتے ہیں کہ نام تارخ ہے اور لقب آزر ہے لیکن ہمیں امیرالمومنین فی الحدیث امام بخاری کا تاریخ کبیر میں یہ فیصلہ پسند ہے۔

ابراہیم آزر کے بیٹے ہیں۔ تورات میں ان کا نام تارخ ہے اور اللہ نے قرآن میں آزر بتایا ہے اگرچہ مورخین اور نسابین کے یہاں ان کا نام تارخ ہے۔

مورخین اور شارحین قرآن کو اصرار ہے کہ باپ کا نام تارخ ہے اور کچھ نے قرآن کے سارے مخاطبات سے بے پرواہ ہو کر لکھ دیا ہے کہ

ان کے والد تارخ کا حضرت ابراہیم کے بچپنے ہی میں انتقال ہو گیا تھا۔ چچا نے پرورش کی تھی۔ اور چونکہ وہ مندر کے پجاریوں میں سے تھا اس لیے آزر کے لقب سے پکارا جاتا تھا۔ آزر قدیم کالدی زبان میں بڑے پجاری یا محافظِ معبد کو کہا کرتے

تھے۔ یہی ادار ہے جس نے بعد میں عربی میں آزر کی شکل اختیار کر لی اور اسی لیے قرآن نے اسی کا ذکر آزر کے نام سے کیا ہے۔

محض تکلف بارد ہے کہ باپ کو مارا جاتے اگر قرآن اور تاریخ کو آپ جمع کرنا ہی چاہتے ہیں تو آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ادار کالدانی زبان میں بڑے پجاری کو کہتے ہیں عربی میں آکر یہی آزر ہو گیا۔ تارخ چونکہ بت تراش اور بت پرست تھا یعنی بت گری بت فروشی کے ساتھ بت کی پرستاری کرتا تھا اس لیے آزر ہی کے نام سے مشہور ہو گیا۔ حالانکہ یہ نام نہ تھا بلکہ لقب تھا۔ اور لقب نے چونکہ نام کی جگہ لے لی اس لیے قرآن نے اسی نام سے پکارا۔ یہ تو جمع کی صورت ہے ورنہ اگر جمع ممکن نہ ہو تو ہم قرآن کے مقابلے میں تورات اور تاریخ دونوں کو چھوڑ دیں گے وہ ہمارے خیال میں حجت ہی نہیں ہیں۔ قرآن کی حیثیت ان سب سے بالا ہے۔ قرآن نے یہاں جس تصریح کے ساتھ آزر کا ذکر کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے بارے میں یہود کے علمی سرمایہ میں روایتی اختلاف ہے اور وہ مہیمن ہونے کی حیثیت سے اس کو رفع کرنا چاہتا ہے اور قرآن چونکہ قدیم صحیفوں کے لیے ایک کسوٹی بن کر آیا ہے اور براہ راست وحی ہے اس لیے ماننا چاہیے کہ آزر ہی حضرت ابراہیم کے والد کا نام ہے۔

حضرت ابراہیم کی تین بیویاں تھیں۔ سارہ، ہاجرہ، اور قطورا۔ سارا سے حضرت ابراہیم کے یہاں حضرت اسحاق ہوتے۔ حضرت اسحاق کے دو بیٹے تھے حضرت یعقوب جو بنی اسرائیل کے باپ تھے اور عیسو جن کا لقب ادوم تھا۔ قطورا سے حضرت ابراہیم کے یہاں لابن نامی لڑکا ہوا اور ہاجرہ کے بطن سے صرف ایک ہی بیٹا ہوا یعنی حضرت اسماعیل۔

جی چاہتا ہے کہ یہاں راز کو بھی بے نقاب کر دیا جائے کہ آزر کو کیوں حضرت ابراہیم کا باپ نہیں مانا جاتا اور یہ کس ذہن کا تخلیقی کارنامہ ہے لیکن اس جلد کی ضخامت زیادہ ہونے کے اندیشے سے یہاں قلم کو روکتا ہوں اور ان شاء اللہ سترہویں پارے میں اس راز کو بے نقاب کروں گا۔

شرک کھلی گمراہی ہے

۹۲۔ کیا تو بتوں کو معبود بناتا ہے میرے نزدیک تو اور تیری قوم کھلی گمراہی میں مبتلا ہیں اس سے زیادہ صاف اور صریح گمراہی اور کیا ہوگی کہ اکرم المخلوقات انسان اپنے ہاتھ سے تراشے ہوئے پتھروں کو خدائی کا درجہ دے کر ان کے سامنے سر بسجود ہو جاتے اور انہی سے مرادیں مانگنے لگے[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ اپنے ہی ہاتھوں کے گھڑے بت اور ان کو معبود بنا ڈالا ہے یہ تو ایک کھلی گمراہی ہے جس میں آپ مبتلا ہیں اور آپ کی قوم بھی۔ شہر اُور کی آبادی اڑھائی لاکھ کے قریب تھی۔ یہ جنوبی عراق میں فرات کے کنارے آباد تھا اور محل وقوع وہ مقام تھا جسے آج کل تل العبید کہتے ہیں۔ یہاں بت پرستی کی وہ ساری بنیادیں استوار ہو چکی تھیں جو آگے چل کر نینوا اور بابل میں زیادہ وسیع اور منظم شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ پرستش کا مبدا کواکب تھے۔ سب سے بڑا بت شمس کا تھا یعنی سورج کا اس کے نیچے بہت سے بت مختلف طاقتوں یا مختلف قبیلوں اور آبادیوں کے تھے۔ خود شہر اُور کا محافظ بت ننار تھا یعنی چاند۔ حضرت ابراہیم کا ظہور اسی شہر میں ہوا۔ جب آنکھ کھولی تو خود اپنے گھر میں بت پرستی پائی لیکن اللہ نے سچائی کی حجتوں اور روحی کی دلیلوں سے ان کا قلب سلیم اس طرح معمور کر دیا تھا کہ نہ تو قوم و وطن کی جہالت و گمراہی انہیں چھو سکی نہ خود عزیزوں اور بزرگوں کا اعتقاد راسخ انہیں متاثر کر سکا۔ انہوں نے پہلے اپنے گھرانے میں تبلیغ کی۔ اور اپنے باپ کو مخاطب کر کے کہا اتتخذ اصناماً اٰلھۃ؟ اور تمام قوم کو پیام حق پہنچایا۔ حافظ ابن تیمیہ نے صابئین کی تحقیق میں الرد علی المنطقیین میں جو کچھ لکھا ہے وہ محتاج نہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کی قوم صابی تھی وہ حضرت ابراہیم کے مقام بعثت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یہاں علت اولیٰ، عقل اول اور نفس کلیہ کے ہیکل تھے۔ نیز زحل، مشتری، مریخ، زہرہ، شمس، عطارد اور قمر کے ہیکل تھے۔ یہاں صابئین کا خاص مرکز تھا عیسائیت سے پہلے ان کا مذہب یہی تھا۔ عیسائیت کے بعد ان مشرک صابئین کے بقایا کے ساتھ ساتھ ان میں عیسائیت پھیلی۔ یہاں تک کہ اسلام آیا اور وہاں یہ صابئین اور فلاسفہ حکومتِ اسلامی میں آخری وقت تک موجود رہے، اور انہی میں سے وہ صابئین جو بغداد وغیرہ میں طبیب یا منشی تھے۔ ان میں سے بعض اسلام نہ لائے۔ چوتھی صدی میں فارابی جب حران گیا ہے تو انہیں سے فلسفہ سیکھا۔ اہل دمشق کا مذہب بھی عیسائیت سے پہلے یہی تھا۔ ان کی نماز کا قبلہ قطب شمالی تھا۔ اسی لیے دمشق میں بہت سی کہنہ مسجدیں ہیں جن کا ایک قبلہ قطب شمالی کی طرف بھی ہے۔ دمشق کی جامع مسجد کے نیچے ایک بہت بڑا معبد ہے جس کا ایک قبلہ قطب شمالی کی طرف ہے یہ انہیں لوگوں کا معبد ہے۔

حضرت ابراہیم کا مولد بابل کا شہر اُور اور منشا شہر حران ہے۔ یہ وہ مقامات ہیں جو صابیئت کے مرکز اور درسگاہ ہیں۔ اس بنا پر ہمارے مفسرین اور خصوصاً حافظ ابن تیمیہ کا یہ دعویٰ قابل قبول ہونا چاہیے کہ یہی وہ بدبخت قوم ہے جس میں حضرت ابراہیم نے ظہور پایا تھا۔ تورات میں تصریح ہے کہ حضرت ابراہیم کو عراق کے شہر اُور، حران سے تعلق تھا اور ان کا خاندان غیر خداؤں کو سجدہ کرتا تھا۔ اس آیت میں حضرت ابراہیم اپنے باپ کو مخاطب کر کے ان ہی صابی مجسموں کے بارے میں فرما رہے ہیں۔ یہاں ان ستاروں کے ہیکلوں کو اصنام کہا ہے اور سورہ انبیآ میں قوم سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا ماھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون ۔ یہ کیا تماثیل ہیں جن کی پوجا پر تم جم کر بیٹھے ہوئے ہو۔ اور سورہ عنکبوت میں قوم ہی سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا، انما تعبدون من دون اللہ اوثانا ، خدا کو چھوڑ کر تم اوثان کی عبادت کرتے ہو اور سورہ مریم میں اپنے والد کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا یا ابت لا تعبد الشیطان اے باپ شیطان کی عبادت نہ کر، اور سورہ صافات میں سب کو یکجا کر کے قوم کو خطاب کیا اتعبدون ما تنحتون کیا تم ان چیزوں کو پوجتے ہو جن کو خود گھڑتے ہو۔ اصنام، اوثان اور تماثیل عنوان ہیں ورنہ ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ الٰہ تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ الٰہ ہوتا تھا جو رب البلد سمجھا جاتا تھا۔ اور شہر کا رب البلد ننار سمجھا جاتا تھا اور اس کا احترام دوسرے معبودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ دوسرا بڑا شہر لرسہ تھا جو بعد میں اُور کے بجائے مرکز حکومت ہوا اس کا رب البلد شماس سورج دیوتا تھا۔ ان بڑے الٰہوں کے تحت بہت چھوٹے الٰہ بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی ستاروں اور سیاروں میں سے منتخب کیے گئے۔ ان آسمانی دیوتاؤں کی شبیہیں مختلف شکلوں میں بنائی گئی تھیں جن کو اصنام، اوثان اور تماثیل کہتے تھے اور تمام مراسم عبادت ان ہی کے آگے بجا لاتے تھے۔

اُور کا شاہی خاندان جو حضرت ابراہیم کے زمانے میں حکمران تھا اس کے بانی اول کا نام رانمو تھا جس نے دو ہزار تین سو قبل مسیح میں ایک وسیع سلطنت قائم کی تھی اس کے حدود مملکت مشرق میں سوسہ سے لے کر مغرب میں لبنان تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس خاندان کو نمو کا نام ملا جو عربی میں جا کر نمرود ہو گیا۔ حضرت ابراہیم کی ہجرت کے بعد اس خاندان پر مسلسل تباہی نازل ہوئی۔ پہلے عیلامیوں نے اُور کو تباہ کیا اور نمرود کو ننار کے بت سمیت پکڑ کر لے گئے پھر لرسہ میں ایک عیلامی حکومت قائم ہوئی جس کے ماتحت اُور کا علاقہ غلام کی حیثیت سے رہا۔ آخر کار ایک عربی النسل خاندان کے ماتحت بابل نے زور پکڑا اور لرسہ اور اُور دونوں اس کے

زیر حکم ہو گئے، ان تباہیوں نے ننار کے ساتھ اُور کے لوگوں کا عقیدہ متزلزل کر دیا کیونکہ وہ ان کی حفاظت نہ کر سکا۔

بہرحال حضرت ابراہیم کے مخاطب اصنام، تماثیل اور اوثان کی پرستش کرنے تھے۔ اور یہ بھی قرآن سے معلوم ہو چکا ہے کہ یہ سب ان کے اپنے تراشیدہ اور بنائے ہوتے ہوتے تھے۔ ان بتوں، مورتیوں اور ہیکلوں کی پرستش کا مدار کواکب تھے۔ سب سے بڑا بت شمس کا تھا۔ اس کے نیچے بہت سے بت تھے۔ چاند کے بت کو ننار کہتے تھے۔

اصنام ہوں یا تماثیل اور یا اوثان یہ ان ہی کواکب کے بت، مورتیاں اور ہیکل تھے۔ اور یہ شرک کی ترقی یافتہ صورت تھی جب انسانوں میں کسی قدر تہذیب و تمدن پیدا ہوا تو انسان نے مخلوقاتِ ارضی سے ہٹ کر دیکھا تو اس کو آسمان کے بلند اور روشن ستارے عبادت کے بہترین مستحق نظر آئے چنانچہ اس کی پرستش شروع ہوئی۔ مشہور عرب مورخ مسعودی نے لکھا ہے کہ چونکہ یہ ستارے نکلتے اور ڈوبتے رہتے تھے اس لیے ان کی خیالی تصویریں بنا بنا کر لوگوں نے ان کو پوجنا شروع کیا۔ ستارہ شناسی کا آغاز بھی یہیں سے ہوا ہے۔ آب و ہوا اور جغرافیائی خصوصیات کی بنا پر ان مقامات کی فضائی آسمانی ابر اور گرد و غبار سے عموماً صاف رہتی ہے۔ سامی بدو راتوں کو اپنی بھیڑوں، بکریوں اور مویشیوں کے گلوں کو لے کر آسمانی خیمہ کے ساتے میں رات بسر کرتے تھے۔ جب کبھی آنکھ کھلتی سامنے صحیفہ آسمانی کھلا نظر آتا اس لیے انہوں نے کواکب ہی کو معبود بنا لیا اور ان ہی کی تصاویر مجسمے اور ہیکل پوجنے لگے۔ یاد رہے کہ دنیا میں کوئی قوم بھی ایسی نہیں گزری جس نے محض لکڑی، پتھر اور اینٹ کو پوجا ہو۔ دراصل اس زمانہ کے سامیوں کا اعتقاد تھا کہ تمام دنیا ارواح سے بھری ہوئی ہے جن میں زیادہ تر ارواح خبیثہ اور کچھ ارواح طیبہ ہیں۔ ان کے مذہب کا خلاصہ یہ تھا کہ ارواح خبیثہ کو نذر و نیاز، قربانی اور چڑھاوے سے خوش رکھنا اور ارواح طیبہ کی مدح و ثنا گا کر ان کے مقابلے کے لیے تیار کرنا۔ ان میں سے ہر روح کا مسکن ایک ستارہ ہے۔ بابل کے کھنڈروں میں جو تختیاں اور ہیکلوں کے جو کتبات پڑھے گئے ہیں ان میں بیسیوں معبودوں کے نام ملے ہیں۔ ہم یہاں شہروں کے نام کے ساتھ ان کے کچھ دیوتاؤں کے نام لکھتے ہیں۔

	شہر کا نام	معبود کا نام	
۱۔	اُور	سن	چاند

۲-	لرسہ	شمس	آفتاب
۳-	اروخ	انو	ستاروں کا دیوتا
۴-	—	اشتار	زہرہ
۵-	کوتو	نرغل	مریخ
۶-	بابل	مردوک	مشتری
۷-	بارنیپ	نبو	عطارد
۸-	سپور	شمس	آفتاب
۹-	اکار	نینو	چاند
۱۰-	اشور	اشور	

یہ بابل کا حال ہے۔ مصر میں بھی سامی قوموں کے زمانے میں ستارہ پرستی جاری تھی۔ سب سے بڑا دیوتا آفتاب تھا جس کو وہ اپنی زبان میں رَع کہتے تھے۔ ان کے دارالحکومت کا نام مدینۃ الشمس تھا۔ یہیں آفتاب دیوتا کا مندر تھا۔ بادشاہ آفتاب دیوتا کا بیٹا سمجھا جاتا تھا اس لیے اس کا لقب رعمیس ہوتا تھا یعنی سورج کا بیٹا۔[1]

تاریخ کی یہ داستان اگر صحیح ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کی قوم میں شرک محض ایک عقیدہ اور بُت پرستانہ عبادات کا مجموعہ ہی نہ تھا بلکہ درحقیقت اس قوم کی پوری معاشی، تمدنی، سیاسی اور معاشرتی زندگی کا نظام اسی عقیدے پر مبنی تھا۔ اس کے مقابلے میں حضرت ابراہیم دعوتِ توحید لے کر اٹھے اور سب سے پہلے اس کے خلاف کام کا آغاز گھر سے کیا، اور والد کو مخاطب سامنے رکھ کر ساری قوم سے کہا اتتخذ اصناما آلھۃ انی اراک وقومک فی ضلال مبین

عقل و بینش کی خداداد روشنی

۹۳ - اور اسی طرح ہم نے ابراہیم کو آسمانوں اور زمین کو بادشاہت کے جلوے دکھاتے اور تاکہ وہ یقین کرنے والوں میں سے ہو جاتے۔ یعنی جس طرح بت پرستی کی شناعت واضح ہم نے ابراہیم پر

---

[1] ارض القرآن

ظاہر کر کے اس کی قوم کو قائل کیا اسی طرح علویات و سفلیات کے نہایت محکم اور عجیب و غریب نظام ترکیبی کی گہرائیوں پر بھی اس کو مطلع کر دیا تھا کہ اسے دیکھ کر خدا تعالیٰ کے وجود و وحدانیت وغیرہ پر اور تمام مخلوقاتِ سماوی وارضی کے محکومانہ عجز و بیچارگی پر استدلال اور اپنی قوم کے عقیدہ کواکب پرستی وہیاکل سازی کو علی وجہ البصیرت رد کر سکے۔ اور خود بھی حق الیقین کے اعلیٰ مرتبہ پر فائز ہو بلاشبہ عالم کا یہ مکمل و احکم بہترین نظام اور نظم و نسق ہی ایسی چیز ہے جسے دیکھ کر بالبداہت اقرار کرنا پڑتا ہے کہ اس عظیم الشان مشین کا بنانے اور چلانے والا، اس کے پرزوں کو نہایت منضبط ترتیب اور سلیقہ سے جوڑنے والا اور لاکھوں برس سے ایک ہی انداز پر اس کی حفاظت کرنے والا بڑا زبردست حکیم و قدیر اور صانع ہے جس کے حکیمانہ تصرف اور نفوذ و اقتدار سے مشین کا کوئی چھوٹا سا پرزہ باہر نہیں جا سکتا۔ یہ کام یوں ہی بخت و اتفاق یا بے شور طبیعت یا اندھے بہرے مادے نہیں ہو سکتا۔ یورپ کا مشہور حکیم اسحاق نیوٹن کہتا ہے کہ

کواکب کی حرکات حالیہ ممکن نہیں کہ محض عام قوتِ جاذبہ کے فعل کا نتیجہ ہوں۔ یہ قوتِ جاذبہ تو کواکب کو شمس کی طرف دھکیلتی ہے اس لیے کواکب کو سورج کے گرد حرکت دینے والا ضروری ہے کوئی خدائی ہاتھ ہو جو باوجود قوت جاذبہ کی عام کشش کے ان کو اپنی مدارات پر قائم رکھ سکے۔ کوئی سبب طبیعی ایسا نہیں بتلایا جا سکتا جس نے تمام کواکب کو کھلی فضا میں جکڑ دیا ہو کہ وہ سب سورج کے گرد چکر لگاتے وقت ہمیشہ معین مدارات پر اور ایک خاص جہت ہی میں حرکت کریں جس میں کبھی مختلف نہ ہوں پھر کواکب کی حرکات اور درجات سرعت میں ان کی اور سورج کی درمیانی مسافت کو ملحوظ رکھتے ہوئے جو دقیق تناسب اور عمیق توازن قائم رکھا گیا ہے کوئی سبب طبعی نہیں جس سے ہم ان منظم و محفوظ نوامیس کو وابستہ کر سکیں ناچار اقرار کرنا پڑتا ہے کہ یہ سارا نظام کسی ایسے زبردست حکیم و علیم کے ماتحت ہے جو ان تمام اجرام کے مواد اور ان کی کمیات سے پورا پورا واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ کس مادے کی کس قدر مقدار سے کتنی قوت جاذبہ صادر ہو گی۔ اس نے اپنے زبردست اندازے سے کواکب اور شمس کے درمیان مختلف مسافتیں اور حرکت کے مختلف مدارج مقرر کیے ہیں کہ ایک کا دوسرے سے تصادم و تزاحم نہ ہو۔ اور عالم ٹکرا کر تباہ نہ ہو جائے۔ ہر چھوٹا بڑا سیارہ نہایت مضبوط نظام کے ماتحت

معین وقت پر طلوع ہوتا ہے۔ جب کوئی سیارہ غروب ہو کر دنیا کو اپنے اس فیض و تاثیر سے محروم کر دے جو طلوع کے وقت حاصل تھا تو نہ اس ستارے کی اور نہ کسی مخلوق کی قدرت میں ہے کہ ایک منٹ کے لیے اسے واپس لاتے یا غروب سے روک دے۔

یہ رب العالمین کی شان ہے کہ کسی وقت بھی کسی قسم کے افاضہ سے عاجز نہیں والشمس تجری لمستقر لها ذالك تقدير العزيز العليم، والقمر قدرناه منازل حتىٰ عاد كالعرجون القديم لا الشمس ينبغي لها ان تدرك القمر ولا الليل سابق النهار وكل في فلك يسبحون۔ یہ علویات کا حال ہے اسی سے سفلیات کا اندازہ کر لو۔ یہ ہیں تکوینی عجائب اور ملکوت السماوات والارض ہیں جن کے دیکھنے سے ابراہیم علیہ السلام کی زبان پر لا احب الافلین اور انی وجهت وجهی ... الخ بے ساختہ جاری ہو گیا۔ کما تدل علیه الفاء فی قوله تعالیٰ فلما جن...[1]

اصل ارشاد میں وکذالک آیا ہے۔ اس کے معنے ہیں اور ایسے ہی۔ کیسے؟ یہ یہاں محذوف ہے شارحین قرآن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق اس کی تشریح کی ہے۔ مثلاً شیخ الاسلام نے بتایا ہے کہ جس طرح بت پرستی کی شناعت و قباحت ہم نے ابراہیم پر ظاہر کی تھی اسی طرح ہم نے ابراہیم کو علویات اور سفلیات سے بھی مطلع کر دیا لیکن ہمیں یہاں علامہ زمخشری کی بات زیادہ پسند ہے کہ ذالک کا مشار الیہ نری کا مصدر ہے یعنی ایسے ہی عجیب و غریب بصیرت سے ہم نے ابراہیم کو مالا مال کیا ہے یہ اراءت کس طرح کی تھی مادی آنکھوں سے یا چشم ہوش سے دیدۂ بصارت سے یا دیدۂ بصیرت سے محققین کا قول ہے بصارت حسی نہیں بلکہ بصیرت عقلی سے زمخشری رقمطراز ہیں هدیناه بطریق الاستدلال ہم نے ابراہیم کو عقلی استدلال بتایا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ہم ابراہیم کو طریق استدلال سمجھائیں گے امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ اراءت عقلی بصیرت کی تھی۔ نسفی اور آلوسی کی بھی یہی رائے ہے مطلب یہ ہے کہ جس طرح ہم نے تمہارے سامنے آثار کائنات اور آفاقی آیات نمایاں کی ہیں اسی طرح ابراہیم کے سامنے بھی یہی آفاقی آیات تھیں مگر تم ان آیات کو دیکھ کر بھی ان میں بصیرت سے کام نہیں لیتے۔ حضرت ابراہیم نے ان آیات کو دیکھا اور ان کے ذریعے وہ حقیقت تک پہنچ گیا کہ کائنات کیا ہے، صرف ایک سلسلہ اسباب ہے اور یہاں ایک سبب کا عمل اور بہت سے اسباب پر موقوف ہے۔ مثلاً بارش ہونا ایک سبب ہے لیکن خود اس سبب کے وجود میں آنے کے لیے بہت سے اسباب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں مثلاً یہ کہ

۱۔ پانی حرارت سے بخارات میں تبدیل ہوتا ہے۔
۲۔ پانی کے بخارات کا وزن مخصوص ہوا سے کم ہوتا ہے۔
۳۔ ہوا سے کم وزن مخصوص رکھنے والی گیس فضا میں اوپر اٹھتی ہے۔
۴۔ سورج کی شعاعیں جس واسطے سے گزرتی ہیں اسے گرم نہیں کرتی ہیں لہٰذا ہوا زمین سے حرارت لے کر گرم ہوتی ہے۔
۵۔ زمین کے اندر ایک کشش ثقل ہے جس سے فضا کی نچلی سطح کا دباؤ بڑھ جاتا ہے۔
۶۔ ہوا اپنے دباؤ کی نسبت سے حرارت کو جذب کر سکتی ہے لہٰذا فضا کے اوپر کے طبقے سرد ہوتے ہیں۔
۷۔ بخارات آبی کو جب سردی لگنے لگے تو وہ جم کر پانی کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔
۸۔ مائعات جب زمین پر گرتے ہیں تو کشش ثقل کے عمل سے گول ہو کر قطرات بن جاتے ہیں۔
۹۔ ہوا ایس سرد علاقوں سے گرم علاقوں کی طرف چلتی ہیں۔
۱۰۔ زمین پانی کی بنسبت سورج کی گرمی زیادہ جذب کرتی ہے۔ وہلم جرا

یہ کائنات دراصل ایک سلسلہ ہے گویا اللہ سبحانہٗ کا بنایا ہوا یہ ایک کلیہ ہے کہ اسباب میں اور بہت سے اسباب پوشیدہ ہوتے ہیں۔ نگاہ ابراہیم نے اسی ارآت کے ذریعہ معلوم کر لیا کہ یہ سب قوانین اور اسباب ہیں اور ان سب کی باگ ڈور ایک ذات کے ہاتھ میں ہے وہی مسبب الاسباب ہے۔ وہی اصل یا حقیقت کائنات ہے انسان وجدانی طور پر سمجھتا ہے کہ وہ موجود ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہر فلسفی نے تسلیم کیا ہے کہ کائنات کی رنگا رنگی کا مبدا ایک ہی ہے۔ اور اس کثرت کی ساری عمارت ایک ہی وحدت پر قائم ہے۔ یہی وحدت ہے جس کی فطرت یا ماہیت کے سمجھنے میں لوگوں نے غلطیاں کی ہیں۔ یہی غلطیاں مذاہب، فلسفوں اور نظریوں کے اختلاف کا سبب ہیں۔ اگر ہمیں اس کی معرفت حاصل ہو جائے تو پوری کائنات کو صحیح طور پر جان سکتے ہیں۔ کائنات کا مطالعہ اور اس پر تفکر و غور ہی ہمارے اندر صحیح خدا شناسی پیدا کر سکتا ہے یہ پوری کائنات خدائی صفات اور افعال کا مظہر ہے۔ اللہ سے بیگانگی ہمارے تمام استدلال اور تمام علم کو کمزور کر دیتی ہے۔ تمام قوانین قدرت اللہ تعالیٰ کے افعال ہیں جو اللہ کی ذات میں مخفی ہیں ان کے ظہور میں آنے سے اللہ کی صفات ظہور میں آ رہی ہیں۔ ھو الاول والآخر

والظاھر والباطن۔

اس آیت میں بتایا یہ جارہا ہے کہ حضرت ابراہیم پر کائنات کے مطالعہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنی معرفت کے اسرار وحقائق کھول دیے۔ اور اس کے نتیجے میں حضرت ابراہیم نے یہ بات پالی کہ اس کائنات کا خالق اللہ ہے اور وہ یگانہ تنہا ہے۔ اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور وہ یقین واذعان کی اس منزل پر پہنچ گئے کہ انہوں نے قوم کے سامنے اور باپ کے سامنے شرک وبت پرستی کے خلاف عقل سلیم کی حجتیں اور وجدان صادق کی شہادتیں پیش کیں۔

حضرت ابراہیم کا زہرہ پرستی سے انکار

۹۴۔ پھر جب اس پر رات کی اندھیری چھاگئی تو اس نے ایک ستارہ دیکھا اس نے کہا کہ یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ ڈوب گیا تو کہا میں ان کو پسند نہیں کرتا جو ڈوب جانے والے ہیں۔ کہ انہیں اپنا رب بنالوں کیا ایک مجبور قیدی اور بیگاری کو شہنشاہی کے تخت پر بٹھلا کوئی پسند کرسکتا ہے۔ باقی ابراہیم علیہ السلام کا ھذا ربی کہنا یا تو استفہام انکاری کے لہجے میں ہے یعنی کیا یہ ہے میرا رب اور یا بطریق تہکم وتبکیت ہے یعنی یہ ہے میرا رب تمہارے عقیدے اور گمان کے موافق۔ جیسے موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا۔

انظر الی الھک الذی ظلت علیہ عاکفا ای فی زعمک

اس کے سوا مفسرین کے دوسرے اقوال بھی ہیں مگر ہمارے خیال میں یہی راجح ہے [۱]

حضرت ابراہیم جس زمانے میں پیدا ہوئے ہیں بابل اور مصر پر قدیم سامی قومیں حکمران تھیں۔ حضرت ابراہیم کی دعوت کا جو نقشہ قرآن نے بیان کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصب نبوت پر پہنچنے کے بعد حضرت ابراہیم کی ابتدائی دعوت کی کیفیت کیا تھی؟ اس میں بتایا گیا کہ حضرت ابراہیم کس طرح ملکوت السماوات والارض کا مشاہدہ کرکے اور ان پر غور وفکر اور ان سے صحیح استدلال کرکے راہ توحید معلوم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ حضرت ابراہیم جس گرد وپیش میں پروان چڑھے ان پر ایک نظر ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر طرف چاند، سورج اور زہرہ ومشتری کی پرستش ہو رہی تھی اس لیے قدرتی طور پر حضرت ابراہیم کی دعوت کی ابتدا یہیں سے ہوئی

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

چاہیے کہ کیا فی الواقع ان میں سے کوئی عبادت و پرستاری کے لائق ہے۔ اسی فکر میں وہ ڈوب گئے قرآن نے یہاں بتایا ہے کہ رات ہونے پر جب ان کی نگاہ کوکب پر پڑی۔ کوکب عربی میں زہرہ کو کہتے ہیں جیسے النجم کہکشاں کو کہتے ہیں۔ تحقیقات سے معلوم ہوا ہے کہ قدیم جاہلی قوموں میں سب سے زیادہ پرستش دو ستاروں مشتری اور زہرہ کی ہوتی تھی۔ ابوحیان الاندلسی نے عبداللہ بن عباس اور قتادہ کے حوالے سے بتایا ہے کہ یہاں کوکب سے مراد زہرہ ہے۔ ستارہ دیکھا اور دیکھ کر فرمایا ھذا ربی، یہ میرا رب ہے یعنی میرا مالک ہے میرے کام بنانے والا ہے۔ یہ بات حضرت ابراہیم نے ذاتی سوچ و بچار کے موقع پر فرمائی یا قوم سے مناظرہ کے وقت کہی۔ ہمارے کچھ شارحین قرآن نے پہلی بات کو اختیار کیا ہے اور اس کے لیے حضرت ابراہیم کے بچپنے میں زہرہ پرستی کا ایک قصہ بھی گھڑ لیا ہے۔ حیرت ہے کہ حافظ ابن جریر نے بھی یہی بات کہہ دی ہے لیکن ہماری رائے میں قرآنی سیاق سے قریب تر یہی بات معلوم ہوتی ہے کہ یہ بات حضرت ابراہیم نے میدانِ مناظرہ میں فرمائی ہے۔ یہ بات آپ نے اپنی ستارہ پرست قوم کو مخاطب کر کے فرمائی اور ان پر حجت الزامی قائم کرنے کے لیے کہی۔ مخالف پر حجت الزامی قائم کرنا تبلیغ و مناظرہ علمی کے معمولات میں سے بلکہ عام گفتگو میں دستور ہے کہ دوسرے کے خیال کو اپنی زبان میں بجنسہٖ دہرا دیتے ہیں اور لب و لہجہ سے ہمیشہ یہ معلوم ہو جاتا ہے کہ مخاطب کا خیال نقل ہو رہا ہے۔ اردو و فارسی، عربی اور انگریزی ہر زبان میں یہ انداز بیان عام ہے۔ خود قرآن حکیم میں ایک جگہ قیامت کے موضوع پر ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ ارشاد فرمائیں گے این شرکائی میرے شریک کہاں ہیں۔ مطلب بالکل واضح اور صاف ہے کہ وہ کہاں ہیں جو تمہارے خیال میں میرے شرکاء ہیں۔ یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ خود اپنے شریکوں کا وجود تسلیم کر رہا ہے۔ امام رازی، امام قرطبی، ابوحیان اندلسی، ابن العربی اور ابن قتیبہ نے یہی بات پسند کی ہے کہ خود سیاق قرآن کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ بات میدان مناظرہ میں کہی گئی ہے۔ پہلے بتایا کہ ہم نے ابراہیم پر ملکوت السماوات والارض کے اسرار و حقائق کھول دیے تھے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ اس ارائت کے نتیجے میں کس طرح ابراہیم نے اپنی قوم پر واضح کیا کہ وہ اس کائنات کی جن چیزوں کو معبود سمجھ کر ان کی پرستش کر رہے ہیں وہ ساری چیزیں خود اپنے وجود سے گواہی دے رہی ہیں کہ وہ ملکوت الٰہی کے تابع اور اس کے احکام اور قوانین کے تحت مسخر ہیں، مجال نہیں کہ سرمو اِدھر اُدھر ان سے تجاوز کر سکیں۔

اس کے بعد قرآن نے بتایا کہ اس کہنے کے بعد کیا ہوا فرمایا کہ جس بات کو پہلے تعریضاً و طنزاً

پیش کیا تھا اب اس کو کھول دیا فلما افل قال لا احب الا فلین جب زہرہ ستارہ ڈوب گیا تو آپ نے فرمایا کہ ڈوب جانے والوں کو میں نہیں چاہتا ہوں۔ افلین جمع کا صیغہ لاکر اشارہ کر دیا کہ یہ ستارہ بھی اس زنجیر کی ایک کڑی ہے جو محکومی اور مقہوری کے تحت کسی کے تحت کام کر رہے ہیں۔ یہ کہہ کر حضرت ابراہیم نے اس واضح حقیقت کی طرف متوجہ کیا کہ ان ستاروں کا طلوع ہونا اور چمکنا ہی کیوں دیکھتے ہو طلوع ہونے کے بعد ان کا ڈوبنا کیوں نہیں دیکھتے جب طلوع کے ساتھ غروب اور آنے کے ساتھ جانا بھی ہے اور اس پابندی اور محکومی کے ساتھ کہ مجال نہیں ہے کہ کبھی ایک لمحہ کے لیے بھی وقت یا سمت میں یا ہیئت و شکل میں سر مو تغیر آجائے تو یہ تو گویا وہ خود زبان حال سے بتا رہے ہیں کہ ہم آتے نہیں لائے گئے ہیں اور جاتے نہیں بلکہ لے جائے جاتے ہیں اور لا احب فرما کر حضرت ابراہیم نے اپنے مخاطبوں کے جگر و دماغ میں یہ بات اتار دی ہے کہ اللہ کے ساتھ بندے کا تعلق محبت و درد کا ہے نہ کہ محض خوف کی بنیاد پر، محض خوف ایسی چیز نہیں ہے جس کی بنیاد پر کسی کا کوئی حق قائم ہو۔ انسان کے تمام کاموں کے محرک دو ہی جذبے ہوتے ہیں محبت اور خوف یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ یا آگے پیچھے بھی ان دونوں جذبات کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں چونکہ عبادت کی اصل بنیاد محبت ہے اس لیے یہاں محبت ہی کا ذکر کیا۔

حضرت ابراہیم کا قمر پرستی کا انکار

۹۵۔ پھر جب اس نے چاند چمکتا ہوا دیکھا تو اس نے کہا کہ یہ میرا رب ہے لیکن جب وہ بھی ڈوب گیا تو بول پڑا کہ اگر میرے پروردگار نے مجھے راہ نہیں دکھائی تو میں ضرور ان لوگوں میں سے ہو جاؤں گا جو سیدھے راستہ سے بھٹک جاتے ہیں۔ چاند چونکہ بہت حسین اور چمکدار سیارہ ہے اگر خدا دستگیری نہ فرماتے تو بے شک انسان اس کی چمک دمک پر مفتون ہو کر رہ جاتے [1]

پہلی آیت میں لا احب الا فلین کہہ کر تعریض کی تھی کہ ڈوبنا ایک قسم کی دنائت اور پستی ہے اور ایک طرح کا سقوط و انحطاط ہے اور ایک انداز کا عیب ہے۔ ایسی چیز تو محبت کے

[1] افادات شیخ الاسلام

لائق نہیں۔ ایک حال سے دوسرے حال کی طرف انتقال جہاں ہو وہ قابل عبادت نہیں۔ اور پھر جس طرح ضعف بصارت اس بات کی دلیل ہے کہ نور چشم اس کا ذاتی نہیں بلکہ کسی بصیر قدیم کا عطیہ ہے اسی طرح کواکب کے نور کا ضعف اور اضمحلال اس بات کی دلیل ہے کہ وہ ان کا ذاتی نہیں ہے۔ لہذا کواکب کا یہ غروب ہونا ان کی فقیری اور محتاجی اور بے چارگی بتاتا ہے اور ظاہر ہے کہ بیچارہ و مجبور معبود نہیں ہو سکتا۔ اس آیت میں من القوم الضالین کہہ کر کھلے لفظوں میں ان پر بدراہ اور گمراہ ہونے کا فتویٰ لگا دیا۔ یہ تعریض اور طنز پہلی تعریض سے زیادہ زوردار اور صاف ہے۔ یہاں صرف اتنی بات پر اکتفا نہیں فرمایا کہ ڈوبنے والے سزاوار عبادت نہیں بلکہ یہ بات بھی کھول کر فرما دی کہ ڈوبنے والوں کو معبود بنانا کھلی ہوئی ضلالت ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ میرا اس سے بچنا خاص اللہ کے فضل کی وجہ سے ہے۔ اللہ سبحانہٗ ہدایت کا سرچشمہ ہے اگر وہ ہدایت ارزانی نہ فرماتے تو انسان ہر چمکتی چیز کو سونا سمجھ کر اس کے درپے ہو سکتا ہے۔ ہدایت ہمیشہ اللہ ہی کی جانب سے ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ خدا کا فضل اور اس کی مہربانی ہے کہ میں جادۂ توحید پر گامزن ہوں۔ اگر اس کی ہدایت اور توفیق نہ ہوتی تو میں بھی ان گمراہوں کی صف میں ہوتا۔ بتانا یہ ہے کہ ہدایت کا حصول بھی اللہ سبحانہٗ کی طرف سے اور اس کا بقا اور ہدایت پر ثابت قدم رہنا بھی اللہ سبحانہٗ کی توفیق و امداد سے ہے۔

حضرت ابراہیم کا آفتاب پرستی سے انکار

۹۶۔ پھر جب سورج کو چمکتا ہوا دیکھا تو ابراہیم نے کہا کہ یہ میرا پروردگار ہے یہ بڑا ہے لیکن جب وہ بھی غروب ہو گیا تو ابراہیم نے کہا کہ اے میری قوم میں ان سے بیزار ہوں جن کو تم خدا کا شریک ٹھہراتے ہو۔ یعنی نظام فلکی میں سب سے بڑا اور سب سے زیادہ فیض رساں سیارہ ہے۔ شاید عالم مادی کی کوئی چیز اس کے بلا واسطہ یا بالواسطہ فیض تاثیر سے مستغنی ہو لیکن یہ بھی ڈوب گیا یہ بھی تو کسی کے حکم کے سامنے جھکا ہوا ہے۔ اس کی روشنی کو بھی قرار نہیں ہے پہلے بڑھنے لگی پھر ڈھلنے لگی، پھر رفتہ رفتہ چھپ گئی۔ حضرت ابراہیم نے کہا۔ نہیں ان میں سے کوئی بھی میرا رب نہیں ہو سکتا کیونکہ سب زبان حال سے کہہ رہے ہیں ہم مختار نہیں مجبور ہیں، حاکم نہیں محکوم ہیں۔ یہ تو سب خدا کے مزدور ہیں جو وقت مقرر پر آتے اور چلے جاتے ہیں۔ ایک منٹ کی تقدیم و تاخیر پر قادر نہیں پھر ان کو خدائی کے حقوق میں شریک کرنا کس قدر گستاخی

اور قابل نفرت فعل ہے لے

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ یہ جو کچھ بتایا گیا ہے اس کا تعلق حضرت ابراہیم کی ذاتی اور انفرادی سوچ سے نہیں ہے بلکہ اس ساری داستان کا تعلق قوم سے مناظرہ سے ہے۔ اسی لیے آخر میں لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا ہے انی بری مما تشرکون لوگو! تم جن چیزوں کو خدا کا شریک ٹھہراتے ہو میں ان سے اپنے آپ کو بری کرتا ہوں۔ اس تمام داستان کا مقصد اپنے تاثرات کا اظہار ہی نہیں بلکہ قوم کے ضمیر کو بیدار کرنا تھا۔ جن لوگوں نے اسے حضرت ابراہیم کے ذاتی تاثرات کی داستان قرار دیا ان کے ذہنوں میں یہاں یہ سوال ابھر کر آیا کہ بچپن سے حضرت ابراہیم پر روزانہ رات آتی تھی اور کیا وہ ہر روز چاند تاروں اور سورج کو غروب ہوتے نہ دیکھتے تھے۔ اگر روزانہ وہ دیکھتے تو یہ واقعہ اس طرح کیوں پیش کیا گیا کہ رات ہوئی تو ستارہ دیکھا، اس سے تو معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم کو اس واقعہ سے پہلے تاروں، چاند اور سورج دیکھنے کا کبھی اتفاق ہی نہ ہوا تھا۔ یہ شبہ بعض لوگوں کے اس قدر ناقابل ہو گیا کہ اس سے گلو خلاصی کی خاطر یہ قصہ تراشا گیا کہ حضرت ابراہیم کی پیدائش ایک غار میں ہوئی اور ان کی والدہ نے نمرود کے خوف سے ان کی پرورش بھی غار ہی میں کی۔ کیونکہ نجومیوں نے نمرود کو بتا رکھا تھا کہ ایک لڑکا پیدا ہوگا جو تمام بتوں کو توڑ دے گا اور دین مروجہ کے خلاف بغاوت کرے گا نمرود نے لڑکوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ حضرت ابراہیم غار میں ایک دن میں اتنے بڑھے جتنے دوسرے لوگ مہینے میں بڑھتے اور مہینہ میں ان کا اٹھان آنا تھا جتنا دوسروں کا سال میں ہوتا ہے۔ پندرہ روز کے بعد انہوں نے اپنی ماں سے مطالبہ کیا کہ مجھے غار سے باہر لے چلو۔ باہر آکر انہوں نے جب رات کو ستارہ، چاند اور صبح کو سورج دیکھا تو یوں کہا۔ یہ روایت گھڑی ہوئی ہے۔ اس کی روایت کا سہرا سدی کے سر ہے۔ سدی کا نام محمد بن مروان ہے۔ محدثین کی تحقیق میں یہ کذاب ہے اصل بات وہی ہے کہ یہ ذاتی فکر کی بات نہیں بلکہ میدان مناظرہ اور علمی مجلس کی بات ہے۔

توحید کا زندہ جاوید پیمانہ

۷۹۔ میں نے ہر طرف سے منہ موڑ کر اپنا رخ اس ہستی کی طرف کر لیا جس نے آسمان و زمین کو پیدا کیا ہے اور میں ہرگز شرک کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔ یعنی ساری مخلوق سے

لے افادات شیخ الاسلام

یکسو ہوکر صرف خالق جل وعلا کا در وازہ پکڑ لیا ہے جس کے قبضہ اقتدار میں سب علویات و سفلیات ہیں [1]
یہ اس اعلان براءت کی تعبیر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تمام معبودان باطل سے کٹ کر اور بالکل یکسو ہو کر اپنا رُخ اس رب کی طرف کر لیا ہے جو تمام آسمانوں اور زمین کا پیدا کرنے والا ہے۔ یہ توحید اسلام کی عظیم ربیت ہے۔ گویا اثباتی پہلو میں یہاں ایسے وجود کو سامنے رکھا ہے جس کی طرف سارے وجود ملتجی ہیں۔ اور سلبی پہلو میں صرف اجمالاً شرکت کے حدود کی نفی پر کفایت کی حضرت ابراہیم نے بتا دیا کہ خدا ایک موجود ہے اور موجود بھی وہ جس نے موجودات کو خلعت وجود سے سرفراز فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ صفات ثبوتیہ تابع وجود ہیں۔ جس کا وجود ذاتی ہوگا اس کی صفات ثبوتیہ بھی لامحالہ حقیقی ہوں گی۔ اور مخلوقات چونکہ اپنی ہستی میں اللہ کی محتاج ہیں اس لیے اپنی صفات میں بھی اس کی محتاج ہیں۔

یہاں حضرت ابراہیم نے خدا کے تنزیہی پہلو کو اشراک میں سمیٹ دیا اور اثباتی پہلو کو زیادہ تفصیل سے پیش کیا۔ یہی نبوت کا طریق کار ہے۔ انسان مجرد نہیں مادی بھی ہے۔ اس کا تصور کسی ایسے موجود کا متلاشی ہے جسے خوف دہراس میں پکارے تو پکار سکے اور عیش و راحت میں یاد کرنا چاہے تو یاد کر سکے جتنا یہ اس کا متلاشی ہو اس سے زیادہ وہ اس کا منتظر ہو۔ یہ گرنے لگے تو وہ سہارا دے، یہ بھوکا ہو تو کھانا کھلائے۔ یہ پیاسا ہو تو وہ پانی پلائے، یہ بیمار ہو تو وہ شفا دے۔ اگر یہ سو جائے تو وہ اس کی نگہداشت کرے۔ خلاصہ یہ کہ اس کے ماضی و حال اور مستقبل کے تینوں زمانوں کی زندگیاں اسی نظر رحمت کے نیچے پھل اور پھول رہی ہیں۔

مظاہر کائنات کی تسخیر، ان کے عجز و بیچارگی اور مقہوریت میں توحید کی بہت بڑی دلیل ہے ان کا انقیاد و طاعت اس بات کا قوی ثبوت ہے کہ ان میں سے کسی چیز کی طرف بھی الوہیت کی نسبت نہیں کی جا سکتی۔ الوہیت کی صفت کے ساتھ کوئی ایسی ذات ہی متصف ہے جو ان سب سے اعلیٰ اور ان سب سے برتر ہے۔ سورج، چاند، ستارے اپنے حسن و عظمت کے باوجود ایک مضبوط پائدار نظام حکمت کے ماتحت مقہور و مسخر ہیں۔ اور پھر ان کو جو جتنا شاندار ہے اس کی پیشانی پر اطاعت کا داغ اسی قدر زیادہ ابھرا ہوا نظر آتا ہے۔ دُنیا نے سورج اور چاند کی سب سے زیادہ پرستش کی ہے۔ حالانکہ ذلت و اطاعت، سجود و ہبوط اور کسوف و خسوف

[1] افادات شیخ الاسلام

کے آثار جو ہم ان میں دیکھتے ہیں دوسری کسی چیز میں بھی نہیں دیکھتے۔ لیکن یہ انسان کی عجیب حماقت ہے کہ ان آثار کے مشاہدہ کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس نے ان کو دیوتا بنا کر ان کی پرستش کی بلکہ اس لیے ان کی ذلت کی ان علامتوں کو بھی الوہیت کے دلائل میں سے شمار کیا۔ توحید کی یہ دلیل اجمال و تفصیل کی مختلف صورتوں میں قرآن میں بیان ہوئی ہے۔

وَحَاۤجَّهٗ قَوْمُهٗ ۭ قَالَ اَتُحَاۗجُّوْۗنِّىْ فِى اللّٰهِ وَقَدْ هَدٰىنِ ۭ
وَلَآ اَخَافُ مَا تُشْرِكُوْنَ بِهٖٓ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ رَبِّىْ شَيْـــًٔا ۭ وَسِعَ رَبِّىْ
كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ اَفَلَا تَتَذَكَّرُوْنَ ۝۸۰ وَكَيْفَ اَخَافُ مَآ اَشْرَكْتُمْ
وَلَا تَخَافُوْنَ اَنَّكُمْ اَشْرَكْتُمْ بِاللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ عَلَيْكُمْ
سُلْطٰنًا ۭ فَاَيُّ الْفَرِيْقَيْنِ اَحَقُّ بِالْاَمْنِ ۚ اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُوْنَ ۝۸۱
وقف لازم
اَلَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَلَمْ يَلْبِسُوْٓا اِيْمَانَهُمْ بِظُلْمٍ اُولٰۗىِٕكَ لَهُمُ الْاَمْنُ وَ
ع ۱۲
هُمْ مُّهْتَدُوْنَ ۝۸۲ وَتِلْكَ حُجَّتُنَآ اٰتَيْنٰهَآ اِبْرٰهِيْمَ عَلٰي قَوْمِهٖ ۭ
نَرْفَعُ دَرَجٰتٍ مَّنْ نَّشَاۗءُ ۭ اِنَّ رَبَّكَ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ۝۸۳

اور ابراہیم سے اس کی قوم نے رد و کد کی، ابراہیم نے کہا کیا
تم مجھ سے اللہ کے بارے میں اُلجھتے ہو حالانکہ اس نے مجھے
راہِ راست دکھا دی ہے[۹۰]۔ اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے
شریکوں سے نہیں ڈرتا ہوں میں جانتا ہوں کہ جب تک

میرا رب مجھے نقصان پہنچانا نہ چاہے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہے پھر کیا ہوش میں نہ آؤ گے؟ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو خدائی میں شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے تم پر کوئی سند نازل نہیں کی ہے۔ بتاؤ اگر تمہیں کچھ پتہ ہے کہ دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی واطمینان کا مستحق ہے، فی الواقع امن والے اور کامیاب تو وہی ہیں جو ایمان لے آئے اور جنہوں نے اپنے ایمان میں ظلم کی آمیزش نہیں کی۔ یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی۔ ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبہ عطا کرتے ہیں، واقعہ یہ

ہے کہ تیرا رب نہایت دانا اور علم والا ہے۔[۱۰۲]

توحید عبادت کے لیے حجت بالغہ

شرک کی بنیاد چونکہ تمام تر خوف اور وہم پرستانہ اندیشوں پر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے قوم نے حضرت ابراہیم کو طرح طرح سے ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا اس عہد کی جو تحریرات آثارِ قدیمہ کے کھنڈرات سے معلوم ہوتی ہیں ان سے پتہ چلتا ہے کہ زندگی میں ان لوگوں کا نقطہ نظر خالص مادہ پرستانہ تھا۔ دولت کمانا اور زیادہ سے زیادہ آسائش فراہم کرنا ان کا سب سے بڑا مقصدِ حیات تھا۔ سودخواری کثرت سے پھیلی ہوئی تھی۔ سخت کاروباری قسم کے لوگ تھے۔ ہر ایک دوسرے کو شک کی نگاہوں سے دیکھتا تھا اور باہم بہت مقدمہ بازیاں ہوتی تھیں۔ اپنے معبودوں سے ان کی دعائیں زیادہ درازیٔ عمر خوش حالی اور کاروبار کی ترقی سے متعلق ہوا کرتی تھیں۔ ملک کے مختلف شہروں کے الگ الگ معبود تھے۔ ہر شہر کا ایک خاص محافظ معبود ہوتا تھا۔ اس کا احترام دوسرے معبودوں سے زیادہ ہوتا تھا۔ ہر شہر میں ان بڑے معبودوں کے ماتحت بہت سے چھوٹے معبود بھی تھے جو زیادہ تر آسمانی تاروں اور سیاروں میں سے اور کم تر زمین سے منتخب کیے گئے تھے اور لوگ اپنی مختلف فروعی ضروریات ان سے متعلق سمجھتے تھے۔ ان آسمانی دیوتاؤں کی شبیہیں بتوں کی شکل میں بنائی گئی تھیں اور تمام مراسم عبادت انہی کے آگے بجالاتے تھے۔

ننار کا بت اُور شہر میں سب سے اونچی پہاڑی پر ایک عالی شان عمارت میں نصب تھا۔ اسی کے قریب ننار کی بیوی ننگل کا معبد تھا۔ ننار کے معبد کی شان ایک شاہی محل سرا کی سی تھی۔ اس کی خواب گاہ میں روزانہ ایک پجارن جاکر اس کی دلہن بنتی تھی۔ مندر میں بکثرت عورتیں دیوتا کے نام پر وقف رہتی تھیں اور ان کی حیثیت دیوداسیوں کی سی تھی۔ وہ عورت بڑی معزز خیال کی جاتی تھی جو معبود کے نام پر اپنی بکارت قربان کر دے۔ کم از کم ایک بار اپنے آپ کو راہِ دیوتا میں کسی اجنبی کے حوالہ کرنا ذریعہ نجات خیال کیا جاتا تھا۔ اب یہ بیان کرنا کچھ ضروری نہیں ہے کہ اس مذہبی قحبہ گری سے مستفید ہونے والے زیادہ تر پجاری ہوتے تھے۔ پجاریوں کی ایک خاص جماعت پیدا ہو چکی تھی اور بُت پرستی کی تاریخ میں اصل کار فرما جماعت ہمیشہ یہی رہی ہے

یہ لوگ عوام سے الگ ہو جاتے ہیں اور عوام کو اپنے قبضہ اقتدار میں رکھنے کے لیے مندروں کی معجزانہ قوتیں برابر بڑھاتے رہتے تھے۔

نمارٗد محض دیوتا ہی نہ تھا بلکہ ملک کا سب سے بڑا زمیندار سب سے بڑا تاجر، سب سے بڑا کارخانہ دار اور ملک کی سیاسی زندگی کا سب سے بڑا حاکم بھی تھا۔ بکثرت باغات، مکانات، اور زمینیں اس مندر کے لیے وقف تھیں۔ اس جائداد کی آمدنی کے علاوہ کسان، زمیندار، ستجار سب ہر قسم کے غلے، دودھ، سونا، کپڑا اور دوسری چیزیں لاکر مندر میں نذر کرتے تھے جنہیں وصول کرنے کے لیے مندر میں پجاریوں کا ایک بڑا سٹاف موجود تھا۔ یہ سب کام دیوتا کی جانب سے پوجاری ہی انجام دیتے تھے۔ پھر ملک کی سب سے بڑی عدالت بھی مندر میں تھی۔ پجاری اس کے جج تھے۔ ان کے فیصلے خدا کے فیصلے سمجھے جاتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے شرک اور کواکب پرستی کے خلاف عقلِ سلیم کی حجتیں اور وجدانِ صادق کی شہادتیں پیش کیں تو پجاری اور ان کے ہمنوا دنگ رہ گئے۔ ان کے پاس حضرت ابراہیم کے سوالات کا کوئی جواب نہ تھا اور بجائے عقل و بینش کی بات کے دھونس اور دھاندلی سے کام لینے لگے۔

۹۸ - اور ابراہیم سے اس کی قوم نے رد و کد کی ابراہیم نے کہا کیا تم مجھ سے اللہ کے بارے میں الجھتے ہو حالانکہ اسی نے مجھے راہِ راست دکھائی ہے۔ یعنی جس کو خدا سمجھا چکا اور ملکوت السماوات والارض کی علیٰ وجہ البصیرت سیر کرا چکا کیا اس سے یہ امید رکھتے ہو کہ وہ تمہارے جھگڑنے اور بیہودہ جدل و بحث سے بہک جائے گا، کبھی نہیں [1] مطلب یہ ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے عقل و بینش کی ترازو میں رکھ کر بات کہی اور شرک سے اپنی برأت کا اعلان کر دیا اور توحید کا ڈنکا علیٰ رؤس الاشہاد بجا دیا تو وہ لوگ حضرت سے الجھ گئے۔ یہ الجھن کیا تھی، وہی جو ہر زمانے کی شرک پسند طبائع کیا کرتی ہیں۔ یعنی یہ کہ ہم جو ان کواکب کو مختار کل کہتے ہیں تو اس کے یہ معنے ہیں کہ ان کو یہ اختیارات خدا کی طرف سے عطائی طور پر حاصل ہوتے ہیں مستقل اور ذاتی طور پر تو صرف اللہ مختار کل ہے۔ عطائی طور پر کواکب کو مختار سمجھنا شرک نہیں۔ ان کا موقف یہ تھا کہ جس اللہ نے قوت و طاقت بخشی ہوئی ہے ان کی عبادت کرنا ایمان باللہ کے منافی نہیں ہے کیونکہ یہ عبادت میں واسطہ ہیں اور اللہ کی بارگاہ میں ہمارے شفیع ہیں۔ وہ ذہنی طور پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان کواکب اوران کے نام پر بنائے ہوئے بتوں سے اتنے مرعوب اور خوفزدہ تھے کہ ان کو یقین ہی نہیں آتا تھا کہ ابراہیم جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ سچ ہو۔ وہ کہتے کہ ہم اللہ کے منکر نہیں ہیں مانتے ہیں کہ اللہ خالق ہے مالک ہے لیکن جن کی ہم پرستاری کرتے ہیں یہ بھی اللہ کے منظورِ نظر ہیں۔ ورنہ اللہ کو تو ہم بھی ایک مانتے ہیں۔ حضرت ابراہیم نے اس کے جواب میں فرمایا کہ اتحاجونی فی اللہ تم اللہ کے بارے میں مجھ سے جھگڑتے ہو کہ میں اس کو یگانہ کیوں مانتا ہوں، اس کے شریک کیوں نہیں ٹھہراتا۔ خدا نے ہی تو مجھے یہ راہ بتائی ہے کہ اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یاد رہے کہ حضرت ابراہیم کی قوم خدا کی منکر نہیں تھی بلکہ اس کے شریک ٹھہراتی تھی۔ اور یہ بات صرف حضرت ابراہیم کی قوم کے ساتھ خاص نہیں بلکہ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین اللہ تعالیٰ کو ساری کائنات کا خالق، مالک اور مدبر ماننے کے باوجود یہ سمجھتے تھے کہ جن ہستیوں کو ہم دیوی یا دیوتا مانتے ہیں وہ اگرچہ اللہ کے پیدا کیے ہوئے ہیں لیکن ان کا اللہ سے ایسا تعلق ہے کہ اگر وہ کسی کو کچھ دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں اور کسی سے کچھ چھیننا چاہیں تو چھین سکتے ہیں کسی کو دولت دے کر امیر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ کسی سے دولت چھین کر غریب کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی کو بیمار یا تندرست کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں۔ کسی کو اولاد دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔

الغرض مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ان دیوتاؤں کو ایسے جزوی کاموں کے اختیارات دے رکھے ہیں اور اس بنا پر وہ ان کو راضی اور خوش رکھنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے، نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے۔ ان کی مورتیوں کے گرد طواف کرتے تھے اور اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں ان سے مدد مانگتے تھے۔ قرآن نے ان کے ان ہی اعمال کو شرک قرار دیا ہے اور بیشتر قوموں اور ملکوں میں یہی شرک رہا ہے ایسے مشرک دُنیا میں بہت کم ہوئے ہیں کہ جن کا عقیدہ یہ ہو کہ اس دُنیا کے پیدا کرنے اور چلانے میں اللہ کا کوئی ساتھی اور شریک ہے اور جہاں تک ہماری معلومات ہیں کسی مشرک قوم نے اپنے معبودوں کو اللہ کے برابر نہیں سمجھا اور جیسا کہ میں نے عرض کیا مشرکین عرب کے متعلق تو قرآن و حدیث میں صاف صاف اس کی شہادت موجود ہے اور قرآن ہی میں ان کے اس طرزِ عمل کا جگہ جگہ تذکرہ کیا گیا ہے۔ یہاں بھی قرآن حضرت ابراہیم سے ان کی قوم کے اسی جھگڑے کا ذکر کر رہا ہے کہ ہم ان کو خدا نہیں خدا کے دربار میں شفیع مانتے ہیں اور ہم تو ان کو صرف

عبادت خدا میں واسطہ قرار دیتے ہیں۔ اسی کا حضرت ابراہیم جواب دے رہے ہیں کہ و قد ھدان میں جو کچھ کہہ رہا ہوں وہ خدائی ہدایت کی روشنی میں کہہ رہا ہوں۔ تم جو کچھ کہہ رہے ہو وہ محض وہم و گمان کی بنا پر کہہ رہے ہو۔

اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں

۹۹۔ اور میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے نہیں ڈرتا ہوں ہاں جانتا ہوں کہ جب تک مجھے میرا رب نقصان پہنچانا نہ چاہے مجھے کوئی نقصان نہیں پہنچا سکتا، میرے رب کا علم ہر چیز پر چھایا ہوا ہے پھر کیا ہوش میں نہ آؤ گے۔ حضرت ابراہیم کی قوم کہتی تھی کہ تم جو ہمارے معبودوں کی توہین کرتے ہو آگاہ رہو کہیں اس کے وبال میں تم معاذاللہ مجنون اور پاگل نہ ہو جاؤ یا اور کسی مصیبت میں گرفتار ہو جاؤ اس کا جواب دیا کہ میں ان سے کیا ڈروں گا جن کے ہاتھ میں نفع و نقصان اور تکلیف و راحت کچھ بھی نہیں، ہاں میرا معبود مجھے کوئی تکلیف پہنچانا چاہے تو اس سے دنیا میں کون مستثنیٰ ہے وہ ہی اپنے علم محیط سے جانتا ہے کہ کس شخص کو کن حالات میں رکھنا مناسب ہوگا [1]

شرک کی بنیاد تمام تر خوف اور وہم پرستانہ اندیشوں پر ہوتی ہے۔ اس وجہ سے لوگوں نے حضرت ابراہیم کو طرح طرح سے ڈرانا دھمکانا شروع کر دیا کہ معبودوں سے تم بیزاری کا اعلان کرتے ہو۔ تم ان کی ضرور پکڑ میں آجاؤ گے، اندھے ہو جاؤ گے، اپاہج ہو جاؤ گے، تم پر بجلی گرے گی، بری موت مرو گے۔ بالکل اسی قسم کی بات قوم عاد نے حضرت ہود سے کہی تھی۔

اعتراک بعض آلھتنا بسوء ہمارے معبودوں میں سے کسی کی مار تم پر پڑ گئی ہے اور بس حضرت ہود علیہ السلام نے کہا تم کہتے ہو کہ تمہارے معبودوں کی مار مجھ پر پڑی ہے۔ میں اعلان کرتا ہوں کہ مجھے تمہارے معبودوں سے کوئی سروکار نہیں ہے تم اور تمہارے معبود میرے خلاف جو کچھ کر سکتے ہو کر لو۔ تمہارا بھروسہ اپنے معبودوں پر ہے میرا سہارا اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے یہاں حضرت ابراہیم نے بھی اپنے مخاطبوں کو یہی جواب دیا لا اخاف ما تشرکون بہ مجھے تمہارے ان معبودوں کا کوئی خوف کوئی ڈر اور کوئی اندیشہ نہیں ہے جن کو تم خدا کا شریک ،

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بنائے ہو۔ یہ کواکب اور کواکب کی یہ شبیہیں جن کو اصنام، تماثیل اور اوثان کی صورت میں تم پوجتے ہو میرا کچھ نہیں بگاڑ سکتی ہیں۔ مجھے یقین کامل ہے کہ یہ نہ نفع رساں ہیں اور نہ نقصان بے بصارت بے سماعت مورتیاں ہیں نہ یہ ذریعہ قرب ہیں اور نہ وسیلہ شفاعت ہیں۔ ہاں مجھے اگر نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ صرف اللہ ہے۔ اللہ کے سوا کسی کے پاس کوئی اختیار نہیں ہے۔ نفع و نقصان اسی کے قبضہ میں ہے۔ اس کے حکم کے بغیر کسی کی مجال نہیں ہے کہ میرا بال بھی بیکا کر سکے۔ مجھ پر اگر افتاد آئے گی تو صرف اللہ کی مشیت، ارادے اور حکم سے آئے گی اور اگر میرے اللہ کی مشیت ہو تو ان تمہارے معبودوں کی جانب سے بھی مجھے تکلیف پہنچ سکتی ہے ممکن ہے کہ کوئی بت مجھ پر گر جائے اور میں زخمی ہو جاؤں یا آسمان سے ستارہ ٹوٹ جائے اور میں ہلاک ہو جاؤں۔ یہ اللہ کی مشیت سے ہو سکتا ہے اس میں تمہارے معبودوں کی مشیت کا کوئی دخل نہیں ہے نہ ان کا ارادہ الٰہی پر کوئی اثر ہے۔ مخلوق خواہ کوئی ہو اس کا خالق کی مشیت پر کوئی اثر نہیں ہے۔ آگے اس کی وجہ بتائی ہے وسع ربی کل شیئ یعنی چونکہ اللہ کے ارادہ اور علم باہم مربوط ہیں اور علم الٰہی کے احاطہ سے کوئی چیز باہر نہیں ہے اس لیے ممکن نہیں ہے کہ مخلوقات میں سے کوئی مخلوق اللہ کی صفات اور افعال پر اثر انداز ہو سکے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ پاک سے پاک ارادے اور پکے سے پکے عزم کی تکمیل بھی اللہ کی توفیق ہی پر منحصر ہے۔ اس لیے بندے کو کوئی بات بھی صرف ذاتی اعتماد پر دعویٰ کے ساتھ نہ کہنی چاہیے بلکہ خدا کے اعتماد پر کہنی چاہیے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہاں حضرت ابراہیم نے الا ان یشاء ربی فرمایا کیونکہ پہلے صیغہ متکلم کے انداز میں لا اخاف ما تشرکون فرمایا اور اس میں ایک قسم کا دعویٰ تھا اس لیے فوراً فرمایا الا ان یشاء ربی یہ غایت ادب ہے۔

آخر میں فرمایا افلا تتذکرون کیا اس صاف اور کھلی وضاحت کے بعد بھی تم اپنے معبودوں کے بارے میں اپنے موقف پر ڈٹے رہو گے اور نصیحت یاب نہ ہو گے۔ کہنا تو یہ چاہیے کہ افلا تتفکرون ؟ لیکن تذکر یہ بتانے کے لیے لائے ہیں کہ ان کے دلوں میں کواکب اور ان کی مورتیوں کی عظمت اور روحانی اقتدار و تصرف کی ہیبت اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ اس کے خلاف کسی کا بے دھڑک زبان کھولنا ان کے وہم و گمان میں نہ آ سکتا تھا اس لیے فرمایا کہ کیا تمہارے دلوں میں نصیحت قبول کرنے اور عبرت پذیری کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

شرک کے لیے کوئی دلیل نہیں ہے

۱۰۰ ۔ اور آخر میں تمہارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں سے کیسے ڈروں جب کہ تم اللہ کے ساتھ ان چیزوں کو شریک بناتے ہوئے نہیں ڈرتے جن کے لیے اس نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے یعنی میں تمہارے معبودوں سے کیوں ڈروں حالانکہ نہ ان کے قبضے میں نفع و ضرر ہے۔ اور نہ توحید کو اختیار کرنا کوئی جرم ہے جس سے اندیشہ ہو۔ ہاں تم خدا کے باغی اور مجرم بھی ہو اور خدا مالک نفع و ضرر بھی ہے لہٰذا تم کو اپنے جرائم کی سزا سے ڈرنا چاہیئے[1]۔ مطلب یہ ہے کہ ڈرنا تو تمہیں چاہیے کہ خدا سے جس درجہ کا تعلق جس قسم کا عجز و نیاز جس مرتبہ کی محبت اور جس درجہ کی التجا انسان کو درکار ہے اس کا رُخ تم نے شرکا کی طرف بدل دیا ہے۔ تم اچھی طرح جانتے ہو کہ یہ کواکب اور ان کے اصنام، تماثیل اور اوثان کائنات اور آسمان و زمین کے خالق نہیں ہیں۔ پھر بھی تم ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں ان ہی سے مانگتے ہو، ان ہی کو حاجت روا سمجھتے ہو، اٹھتے بیٹھتے ان ہی کا نام لیتے ہو، ان ہی کی نذریں اور نیازیں چڑھاتے ہو، بتاؤ جرم تم کر رہے ہو یا میں۔ ڈرنا تمہیں اللہ سے چاہیے کہ اس کی پوری زندگی میں بغاوت کر رہے ہو یا مجھے ان تمہارے جھوٹے معبودوں سے ڈرنا چاہیے جن کے اللہ کے شریک ہونے مختار کل ہونے، حاجت روا ہونے پر تمہارے پاس علم و یقین اور وحی کی کوئی دلیل نہیں ہے جو کچھ کر رہے ہو محض افترائی ہے۔ میرے پاس تو اللہ کے معبود ہونے علم و بصیرت کی دلیل اور وحی و نبوت کی حجت بالغہ موجود ہے۔ تمہارا شرک کے موضوع پر موقف افترائی ہے اور میں توحید کے موضوع پر سلطانی موقف رکھتا ہوں۔ یہ عجیب ستم ظریفی ہے کہ تم چور ہو کر مجھے ڈراتے ہو

چہ دلاور است دزدے کہ بکف چراغ دارد

اور قرآن نے شرک کے بارے میں یہاں جو بات کہی ہے کہ مالم ینزل بہ سلطاناً یہ قرآن کے اہم انکشافات میں سے ہے۔ یعنی شرک کا سارا کاروبار محض افترائی اور من گھڑت ہے۔ اس کی پشت پر کوئی سلطانی دلیل نہیں ہے

سلطانی دلیل وہ ہے جس میں سلطانیت کی صفت ہو۔ عربی زبان میں سلطان کے معنے غلبہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور تسلط کے آتے ہیں۔ چونکہ بادشاہوں کو بھی ملک پر غلبہ حاصل ہوتا ہے اس لیے سلطان کے لفظ کا ان پر بھی اطلاق ہونے لگا۔ اس آیت میں سلطان کا لفظ دراصل غلبہ، استیلا اور تسلط کے معنے میں استعمال کیا گیا ہے بنزل تنزیل سے بنا ہے۔ تنزیل کے معنے اتارنے کے ہیں۔ چونکہ عام طور پر قرآن میں وحی کی طرف بھی تنزیل و انزال کے الفاظ منسوب کیے گئے ہیں، اس لیے عام خیال یہی ہوتا ہے کہ اس سے مراد یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس موضوع پر کوئی رہنمائی نہیں ہوئی۔ یا انبیاء کو اس کے متعلق کوئی علم عطا نہیں ہوا۔ لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ اصل یہ ہے کہ اس دنیا میں کچھ قوانین ایسے ہیں جن میں اللہ سبحانہ نے سلطانیت کی صفت پیدا کی ہے۔ یعنی اپنے آثار و نتائج کے لحاظ سے انسانی فطرت پر ان کا تسلط ہے اور ان کی گرفت اتنی سخت اور مضبوط ہے کہ ان کی واقعیت کا انکار آدمی کے بس سے باہر ہے مثلاً آگ جلاتی ہے، مرچ تلخ ہے وغیرہ۔ اللہ سبحانہ کے ان ہی قوانین کو قرآن کی اس آیت کی بنیاد پر سلطانی دلائل کہتا ہوں اور ان کے بالمقابل ایسی چیزیں ہیں جن کے ساتھ انسانی فطرت کا یہ تعلق نہیں ہے وہ قرآن کی زبان میں افترائی ہوں گی۔ اس تقسیم کے بعد اب یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ دنیا میں جو کچھ اور جتنا کچھ ہے اگر اس کا خالق اللہ ہے تو خالق سے ہی ان چیزوں کو مانگنا اور ان راہوں سے حاصل کرنا جن سے خالق دے رہا ہے یہ سلطانی دلائل اور سنت اللہ کہلاتے گی اور اللہ کے علاوہ کسی اور سے مانگنا یا ان راہوں کو چھوڑ کر کسی اور راہ سے تلاش کرنا افترائی عمل ہوگا۔ مثلاً خدا کے ساتھ سورج سے چاند سے پانی سے مورتیوں سے مقابر سے مانگنا۔ یا بغیر بیوی کے اولاد کو ڈھونڈنا، جوتے بغیر لہلہاتی فصلوں کی آس لگانا خدا کے مقررہ قوانین کے متعلق باغیانہ اعتدائی طرزِ عمل کر کے گویا اس سے لڑنے اور جنگ کرنے پر آمادہ ہونا ہے۔ اسی لیے قرآن نے شرک کے لیے منفی انداز میں مالم ینزل بہ سلطاناً کی تعبیر اختیار کی ہے اور اثبات کے انداز میں لسے افتری علی اللہ کذباً فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شرک خدا کی دنیا میں قائم کردہ اور اس کے سلطانی قوانین کی خلاف ورزی ہے۔ قرآن نے صاف بتایا ہے کہ مشرکین جن کو پیدائش اور تخلیق کا وسیلہ اور ذریعہ سمجھتے ہیں وہ لفظی سطوتوں، لسانی طنطنوں، افسانوی مغالطوں، اور شاعرانہ پیراؤں کے سوا کچھ بھی نہیں ہے ان کی پشت پر کوئی سلطان نہیں ہے۔

ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم و آباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطان۔

واقعہ یہ ہے کہ سلطانیت کے قدرتی پیمانہ سے ہٹ کر انسانیت نے عبادت کے باب

ہیں جہاں کہیں ان غیر منطقی تقلیدوں سے کام لیا ہے یا اسی طرح اس راہ میں جہاں ناموں کی پوجا کی گئی ہے وہ حضرت ابراہیم کی زبان میں ضلال مبین کے سوا کچھ نہیں۔ خدا ہی جانتا ہے کہ انسان کی اس بے راہ روی نے لوگوں کو کیا کیا کہنے پر مجبور کیا بلکہ سچ تو یہ ہے کہ ان ہی گمراہیوں کی بدولت قوموں اور اُمتوں کو قرنہا قرن تک غیر سلطانی مذہبی بلکہ افتراقی دلائل و قوانین کی جکڑ بندیوں کا شکار رہنا پڑا ہے اور کتنے ہیں جو ان ہی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں۔ آخر حضرت ابراہیم کو ان افتراقی اور غیر سلطانی افکار سے لوگوں کو ہٹانے کے لیے کتنی محنت کرنی پڑی ہے یہاں شرک اور بت پرستی کے خلاف عقل سلیم کی حجتیں اور وجدان صادق کی شہادتیں پیش کیں اور عقل ہی سے اپیل کر کے کبھی فرماتے ہیں انی بریٔ مما تشرکون اور کبھی اعلان کرتے ہیں کہ لوگو ما انا من المشرکین اور کبھی علی رؤس الاشہاد بتاتے ہیں لا اخاف ما تشرکون بہ اور کبھی افلا تتذکرون کہہ کر جھنجھوڑتے ہیں اور کبھی دریافت کرتے ہیں کہ کیف اخاف ما اشرکتم اور آخر میں ان کے افکار اور اعمال کے گھروندے پر مالم ینزل بہ سلطانا کی ضرب کاری لگاتے ہیں۔

ایمان میں شرک کی ملاوٹ ضلالت ہے

۱۰۱۔ بتاؤ اگر تمہیں کچھ پتہ ہے تو دونوں فریقوں میں سے کون زیادہ بے خوفی اور اطمینان کا مستحق ہے۔ فی الواقع امن و اطمینان والے اور کامیاب تو وہی ہیں جو ایمان لے آئے اور جنہوں نے اپنے ایمان میں ظلم کی آمیزش نہیں کی۔ احادیث صحیحہ میں منقول ہے کہ یہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ظلم کی تفسیر شرک سے فرمائی ہے جیسا کہ سورہ لقمان میں فرمایا ہے

ان الشرک لظلم عظیم

گو یہاں ظلم کی تنوین تعظیم کے لیے ہوتی۔ حاصل مضمون یہ ہوگا کہ مامون اور مہتدی صرف وہ لوگ ہوں گے جو یقین لاتے اس طرح کہ اس میں شرک کی ملاوٹ بالکل نہ ہو۔ اگر خدا پر یقین رکھتے ہوئے شرک کو نہ چھوڑا تو وہ نہ ایمان شرعی ہے اور نہ اس کے ذریعے سے امن و ہدایت نصیب ہو سکتی ہے وہو کما قال، و ما یؤمن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون۔

چونکہ ایمان و شرک کا جمع ہونا بظاہر مستبعد تھا اس لیے حضرت شیخ الہند نے ایمان کا ترجمہ یقین اور ظلم کا ترجمہ نقصان سے کیا جو لغت عرب کے بالکل مطابق ہے جیسا کہ قرآن کی آیت لم تظلم منہ شیئا میں ہے اور اس نقصان سے شرک کو مراد لیا جائے گا جیسا کہ احادیث میں تصریح ہو

چکی ہے اور خود نظم کلام میں لفظ لبس اس کا قرینہ ہے اس کی مفصل تحقیق حضرت شیخ الہند مقدمہ میں فرما چکے ہیں وہاں دیکھ لی جائے۔[1]

جس حدیث کی طرف شیخ الاسلام نے اشارہ فرمایا ہے وہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بحوالہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس طرح آئی ہے کہ ،

جب قرآن کی یہ آیت الذین آمنوا ولم یلبسوا ایمانھم بظلم نازل ہوئی تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کو سخت پریشانی لاحق ہوئی ۔ عرض کیا کہ یا رسول اللہ بھلا ہم میں ایسا شخص کون ہوگا جس نے کوئی بھی ظلم نہ کیا ہو۔ آپ نے فرمایا یہاں ظلم سے مراد یہ ظلم نہیں بلکہ شرک مراد ہے کیا تم نے لقمان کی وہ بات نہیں سنی جو انہوں نے اپنے بیٹے سے کہی تھی ، یا بنی لا تشرک باللہ ان الشرک لظلم عظیم

ایمان میں شرک کی ملاوٹ کرنے کی مختلف صورتیں ہیں۔ سب سے خطرناک یہ ہے کہ زبان پر توحید کا دعویٰ ہو اور عملاً اس کی عبادت میں کسی کو اس کا شریک بھی بنایا جائے ۔ قرآن نے ایسے ہی ایمان کا شکوہ کیا ہے وما یؤمن اکثرھم باللہ الا وھم مشرکون جس کے ایمان میں کسی قسم کا بھی شرک شامل ہوگا وہ نہ تو ہدایت یافتہ ہوگا اور نہ اسے آخرت میں امن و اطمینان نصیب ہوگا۔ ایمان اسی وقت نجات بخش ہوتا ہے جبکہ اس میں شرک کا شائبہ نہ ہو۔

حضرت ابراہیم نے پہلے بتایا تھا کہ ایک تم ہو کہ عقل و بینش سے بالا در سلطانی قوانین کے خلاف موقف اختیار کیے ہوئے کھڑے ہو کہ اللہ کی ہستی کو مانا جائے ، یعنی اس پر یقین کیا جائے کہ اس ساری کائنات کی پیدا کرنے والی اور عالم کے اس سارے کارخانے کو چلانے والی اللہ کی ذات ہے لیکن اس کے ساتھ یہ نہ مانے کہ روزی صرف اللہ ہی دیتا ہے اولاد اللہ ہی دیتا ہے، اللہ ہی مارتا ہے اور جلاتا ہے ، مختار کل صرف اللہ ہے عالم غیب صرف اللہ ہے حاضر و ناظر صرف اللہ ہے بلکہ یہ اعتقاد رکھتے تھے کہ جن ہستیوں کو ہم دیوی یا دیوتا سمجھتے ہیں وہ اگرچہ ہیں تو اللہ کی مخلوق لیکن وہ بھی اگر دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں چھیننا چاہیں تو چھین سکتے ہیں۔ کسی کو دولت دے کر امیر کرنا چاہیں تو کر سکتے ہیں ، کسی سے دولت چھین کر غریب بنانا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چاہیں تو بنا سکتے ہیں۔ اسی طرح اگر کسی کو بیمار بنانا چاہیں تو بنا سکتے ہیں اور کسی کو اولاد دینا چاہیں تو دے سکتے ہیں۔

الغرض حضرت ابراہیم کے مخاطب مشرکین یہ سمجھتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمارے ان دیوتاؤں کو ایسے جزوی کاموں کے اختیارات دے دیے اور اس بنا پر وہ انہیں راضی اور خوش رکھنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے نذریں اور منتیں مانتے تھے، چڑھاوے چڑھاتے تھے، ان کی مورتیوں کے گرد طواف کرتے تھے اور اپنی ضرورتوں اور حاجتوں میں ان سے مدد مانگتے تھے۔ حضرت ابراہیم نے یہاں اور قرآن کے دوسرے مواقع پر ان کے اسی خیال کو اور اسی طرز عمل کو شرک قرار دیا ہے۔ اور اکثر قوموں اور ملکوں کے مشرکوں کا یہی شرک رہا ہے۔ اس سے یہ حقیقت بالکل بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ حضرت ابراہیم کے مخاطب اللہ کی ہستی کے منکر نہ تھے بلکہ ان کا واقعی جرم یہ تھا کہ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو خدائی صفات اور ان صفات کے لوازم میں شریک کرتے تھے۔ اس موقعہ پر حضرت ابراہیم نے اپنے مخاطبوں کو خالص عقلی اور علمی رنگ میں سمجھایا ہے کہ اللہ کی صفات اور صفات کے لوازم میں کوئی شریک نہیں ہے۔ دوسرے موقعہ پر یہی بات عملی رنگ میں سمجھائی ہے یعنی جب آپ نے دیکھا کہ آباؤ اجداد کی کاپی کرنے کی اُلٹی ٹوپ تاریکی ان کے دلوں پر اس طرح چھا گئی ہے کہ عقل و بینش کی کوئی روشنی ان کو نظر نہیں آتی۔ ہر دلیل و حجت کا جواب ان کی زبانوں سے یہی نکلتا ہے وجدنا آبارنا لہا عابدین جب حضرت ابراہیم نے قوم کی جہل و نادانی کی یہ حالت دیکھی تو آپ نے محسوس کیا کہ حجتوں اور دلیلوں کی روشنی ایسے لوگوں کے لیے بالکل بیکار ہے۔ ان کے دلوں میں بتوں کے اقتدار و تصرف کا وہم اعتقاد بن کر جم گیا ہے۔ جب تک اس پر چوٹ نہیں لگے گی ان کی آنکھیں کھلنے والی نہیں ہیں۔ پس ضروری ہے کہ ان کو سمجھانے کے لیے دوسرا طریقہ اختیار کیا جاتے اور وہ طریقہ ایسا ہو کہ میری دلیلوں اور موعظتوں سے نہیں بلکہ عالم واقعہ میں خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ صدیوں کی یہ گھڑی ہوئی عظمتیں اور نسلوں کی مانی ہوئی معبودیتیں بے اختیار مورتیوں اور بے جان پتھروں سے زیادہ کچھ نہیں ہیں اور انسانوں کی بڑی تعداد کا کسی مدت تک کسی بات کو مان لینا اس کی صداقت کا ثبوت نہیں ہے۔ صداقت کا ثبوت صرف عقل سلیم کی حجت ہے۔ یہ عملی طریقہ کیا تھا۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ جلد سترہ سورہ انبیاء میں آئے گی۔

آیت کا مطلب صاف ہے کہ شرعاً وہ ایمان نجات کے لیے کافی نہیں جس میں خدا کو مانا جاتے لیکن اس کی صفات اور لوازم میں دوسری مخلوقات کو شریک کیا جاتے خواہ یہ مخلوق

کواکب ہوں یا فرشتے یا جنات، انبیاً ہوں یا اولیاً عناصر اربعہ یا خواہ کچھ ہوں، شرک ہر حال میں شرک ہے۔ زمانوں، ملکوں، قوموں کے بدلنے سے شرک کے قوالب بدل جاتے ہیں۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں لہ اشباح و قوالب، ہر پیغمبر نے اپنے دور کے قوالب کو سامنے رکھ کر شرک کی قباحت پیش کی ہے۔

اللہ کی حجت بالغہ

۱۰۲۔ یہ تھی ہماری وہ حجت جو ہم نے ابراہیم کو اس کی قوم کے مقابلہ میں دی، ہم جسے چاہتے ہیں بلند مرتبہ عطا کرتے ہیں، واقعہ یہ ہے کہ تیرا رب نہایت دانا اور علم والا ہے۔ یعنی ابراہیم علیہ السلام کو ایسے دلائل قاہرہ دے کر ان کی قوم پر غالب فرمانا اور دنیا و آخرت میں سر بلند کرنا اسی علیم و حکیم کا کام ہو سکتا ہے جو ہر شخص کی استعداد و قابلیت کو جانتا ہے اور اپنی حکمت سے ہر چیز کو اس کے مناسب موقع و مقام پر رکھتا ہے۔[1]

یہاں توحید کی اس دلیل کی طرف اشارہ ہے جو حضرت ابراہیم نے اپنی قوم کے سامنے پیش فرمائی اور جو اوپر تفصیل سے بیان ہو چکی ہے۔ قرآن کے اس انداز بیان سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ جو لوگ اس کو حضرت ابراہیم کا فکری ارتقاء سمجھتے ہیں ان کا یہ خیال قرآن کے خلاف ہے یہ حضرت ابراہیم کے فکر کا ارتقاء بلکہ آپ کی دعوت کا ارتقاء ہے۔ اگر اس میں حضرت ابراہیم کے تخیل کو دخل ہوتا تو یہاں اس کے لیے حجتنا کی تعبیر نہ ہوتی۔ دراصل لوگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ یہ ساری داستان اس سے پہلے کی ہے۔ بنیاد کی یہی اینٹ غلط ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ قرآن کا انداز بیان کہہ رہا ہے کہ یہ سب کچھ نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد پیش آیا ہے۔ آغاز نبوت میں انہوں نے اپنے آپ کو دعوت دی۔ اس کے بعد اپنی قوم کی طرف متوجہ ہوئے اور ان کے سامنے بالتدریج یہ حقیقت پیش کی کہ پرستش اسی کی کرنی چاہیے جس کی پرستش کے لیے علم و بصیرت کی شہادت موجود ہے اور بنیاد اس معاملے کی علم و حقیقت ہے نہ کہ رسوم و رواج، یہی بنیادی صداقت ہے جس سے خدا پرستی کی راہ کی تمام روشنیاں ظہور میں آئیں اس بات کی دلیل کہ یہ نبوت کے بعد کا واقعہ ہے۔ قرآن میں حضرت ابراہیم کا یہ اعلان ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

انی وجہت وجہی للذی فطر السماوات والارض حنیفاً وما انا من المشرکین

صداقت کا یہ اعلان ایک نبی کے علاوہ کون کر سکتا ہے اور اس پر بھی غور فرمائیے کہ اگر معاملہ ذاتی فکری ارتقا کا ہوتا تو یوں نہ کہا جاتا کہ ا تینا ھا ابراھیم علی قومہ بلکہ کہا جاتا کہ اتینا ھا ابراھیم علی نفسہ یہ انداز تعبیر بجائے خود اس بات کی دلیل ہے کہ معاملہ کا تعلق نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد علمی مناظرے سے ہے نہ کہ ذاتی، فکری ارتقا سے ۔

یہاں سب سے بڑی بات جو اس فکری، ذاتی ارتقا کی تائید میں پیش کی جاتی ہے وہ صرف یہ کہ آپ نے تارے، چاند اور سورج کو دیکھ کر ھذا ربی فرمایا ہے۔ گویا تارے، چاند اور سورج کو اپنا رب مانا ہے لیکن میدان مناظرہ میں تدریجی طریقہ استدلال میں متکلم اگر حریف کی کسی بات کو مانتا ہے تو ماننے کے لیے نہیں مانتا بلکہ وہ اس لیے مانتا ہے کہ وہ اپنے حریف کو اسی داؤ پر پچھاڑنا چاہتا ہے جس کو حریف اپنا خاص داؤ سمجھتا ہے۔ آخر ان کی قوم کے پاس سورج، چاند اور زہرہ کی خدائی کی دلیل اس کے سوا کیا تھی کہ یہ طلوع ہوتے اور چمکتے ہیں۔ حضرت ابراہیمؑ نے اسی دکھتی رگ پر انگلی رکھ دی ہاں یہ طلوع ہوتے ہیں اور چمکتے ہیں لیکن ساتھ ہی یہ ڈوبتے بھی ہیں۔ اگر ان کا طلوع تمہارے خیال میں ان کی الوہیت کی دلیل ہے تو آؤ ان کا ڈوبنا اور تاریک ہونا بھی دیکھ لو، ان کی بے ثباتی، بے کسی اور بے بسی کا بھی مشاہدہ کر لو۔ بس اسی ایک ضرب نے ستاروں کی الوہیت و قدوسیت کا گھروندا مسمار کر دیا۔ اور وہ لاجواب ہو کر حضرت ابراہیم کو دھمکیاں دینے لگے۔ اسی موقعہ پر حضرت ابراہیم نے فرمایا لا اخاف ما تشرکون بہ ۔

آخر میں فرمایا ہے کہ نرفع درجات من نشاء یعنی جسے چاہتے ہیں اسی طور پر کمالات کے درجات پر فائز کرتے ہیں۔ درجات درجہ کی جمع ہے۔ سیڑھی کے ڈنڈے کو کہتے ہیں۔ سنائی زبان میں مراتب معنوی مراد ہوتے ہیں، خیر، منصب، علم، قیادت، رزق وغیرہ سب پر بولا جاتا ہے۔ کچھ قاریوں نے درجات کو تنوین کے ساتھ پڑھا ہے اور کچھ نے اضافت کے ساتھ پڑھا ہے۔ پہلی قرات کا مطلب یہ ہے کہ ہم اپنے بندوں میں سے جس کے چاہتے ہیں درجات بلند و بالا کر دیتے ہیں۔ اور دوسری قرات کا مطلب یہ ہے کہ درجات والوں کے جتنے چاہتے ہیں ہم درجات بلند کرتے ہیں منشا یہ بتانا ہے کہ ہم علم و عمل کے جتنے درجات کمال ہیں اس کا فیضان کرتے ہیں ۔

وَوَهَبْنَا لَهٗٓ اِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ ۭ كُلًّا هَدَيْنَا ۚ وَنُوْحًا هَدَيْنَا مِنْ قَبْلُ وَمِنْ
ذُرِّيَّتِهٖ دَاوٗدَ وَسُلَيْمٰنَ وَاَيُّوْبَ وَيُوْسُفَ وَمُوْسٰى وَهٰرُوْنَ ۭ
وَكَذٰلِكَ نَجْزِي الْمُحْسِنِيْنَ ۝٨٤ وَزَكَرِيَّا وَيَحْيٰى وَعِيْسٰى وَ
اِلْيَاسَ ۭ كُلٌّ مِّنَ الصّٰلِحِيْنَ ۝٨٥ وَاِسْمٰعِيْلَ وَالْيَسَعَ وَيُوْنُسَ وَ
لُوْطًا ۭ وَكُلًّا فَضَّلْنَا عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ۝٨٦ وَمِنْ اٰبَاۗىِٕهِمْ وَذُرِّيّٰتِهِمْ وَ
اِخْوَانِهِمْ ۚ وَاجْتَبَيْنٰهُمْ وَهَدَيْنٰهُمْ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝٨٧ ذٰلِكَ
هُدَى اللّٰهِ يَهْدِيْ بِهٖ مَنْ يَّشَاۗءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۭ وَلَوْ اَشْرَكُوْا
لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝٨٨ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ اٰتَيْنٰهُمُ الْكِتٰبَ
وَالْحُكْمَ وَالنُّبُوَّةَ ۚ فَاِنْ يَّكْفُرْ بِهَا هٰٓؤُلَاۗءِ فَقَدْ وَكَّلْنَا بِهَا قَوْمًا لَّيْسُوْا
بِهَا بِكٰفِرِيْنَ ۝٨٩ اُولٰۗىِٕكَ الَّذِيْنَ هَدَى اللّٰهُ فَبِهُدٰىهُمُ اقْتَدِهْ ۭ قُلْ
لَّآ اَسْـَٔــلُكُمْ عَلَيْهِ اَجْرًا ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٰى لِلْعٰلَمِيْنَ ۝٩٠ ع

اور ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے، ان میں سے

ہر ایک کو ہدایت بخشی[103] - اور نوح کو بھی ہدایت سے نوازا اس سے پہلے[104] - اور اس کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ اور ہارون کو بھی اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں، اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو بھی، یہ سب نیکوکاروں میں سے تھے، اور اسماعیل، الیسع، یونس، اور لوط کو بھی اور ان میں سے ہر ایک کو عالم والوں پر فضیلت بخشی، اور ان کے آباؤ اجداد ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی ہم نے ہدایت یافتہ بنائے ہیں، اور ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو ہم نے صراط مستقیم کی ہدایت بخشی،[105] یہ اللہ کی ہدایت ہے اس سے وہ سرفراز فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا دھرا اکارت ہو کے رہ جاتا[106] - یہ لوگ ہیں

جن کو ہم نے کتاب اور شریعت اور نبوت عطا فرمائی، تو اگر یہ لوگ اس کا انکار کر دیں گے تو کچھ پروا نہیں، ہم نے اس کے لیے ایسے لوگ مامور کر دیے ہیں جو اس سے منکر نہیں ہیں[۸۹]۔ یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی تو تم بھی ان ہی کے طریقے پر چلو، اعلان کر دو میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب نہیں ہوں یہ تو بس تمام جہانوں کے لیے ایک یاد دہانی ہے[۹۰]۔

نبوت کی غرض و غایت

انبیاؑ کی آمد کی غرض و غایت کو شاعرانہ زبان اور خطیبانہ جوش میں بہت بتایا جا سکتا ہے لیکن یہاں مقصود یہ ہے کہ اس مقصد کی نشان دہی کی جائے جس کی طرف قرآن کی ان آیات میں اشارا کیا گیا ہے۔ ان آیات میں نبوت کا اولین مقصد ہدایت بتایا گیا ہے کہ وہ فی الواقع اللہ سبحانہٗ کی صفت ہادی کا مظہر بن کر آتے ہیں۔ یہاں ھدینا پھر ھدینٰھم الی صراط مستقیم اور آخر میں کھول کر کہا ہے ذالک ھدی اللہ یھدی بہ من یشاء من عبادہ، اسی طرح ان آسمانی کتابوں کو جو ان کو دی گئی ہیں بار بار قرآن نے ھدیً کہا ہے۔

اس ہدایت کا مفہوم یہ ہے کہ وہ بندگان الٰہی کو باطل کے اندھیرے سے نکال کر حق کی روشنی میں لاتے ہیں۔ لوگ جب فاسد خیالات، بیہودہ افکار، بے سود اعمال کی تاریکیوں میں پھنس کر

فطری بصیرت ۔ اور روحانی معرفت کے نور سے محروم ہو جاتے ہیں - انبیاء ان اندھوں کے ہاتھ پکڑ کر ان کو ظلمات سے انوار میں لاتے ہیں - ان کو شک کی جگہ یقین ، جہل کی جگہ علم ، باطل کی جگہ حق اور ظلمت کے بجائے نور عطا کرتے ہیں -

دراصل اس دنیا کی نجات صرف اعتدال میں ہے جب کبھی مزاج انسانی کی طرح اس کے ان عناصر میں جن سے اس کی ترکیب ہوئی ہے افراط و تفریط پیدا ہو گی ، روئے زمین پر فساد رونما ہوگا انسانی جماعتوں اور قوموں میں بھی یہ ترازو جب اعتدال کے معیار پر پوری نہ ہوگی ، کبھی دونوں پلے برابر نہ ہوں گے ، آسمان سے زمین تک ایک ایک ذرہ اعتدال کی ترازو میں تلا ہوا ہے - کیمسٹری اور علم الفلک کا واقف کار اس ترازو کو اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے اور حیرت کرتا ہے کہ کہیں ایک ذرے کی کمی بیشی نہیں ہے - جس طرح اس مادی دنیا میں یہ حیرت انگیز توازن ہے ٹھیک اسی طرح روحانی اور اخلاقی دنیا میں اسی توازن کی ضرورت ہے - عقائد ہوں کہ عبادات ، اخلاق ہوں کہ معاملات اسی توازن کا نام قرآن کی زبان میں صراط مستقیم ہے ، یہی حق اور عدل ہے -

یہ توازن اور برابر تول جو بے ارادہ اور بے اختیار دنیا کے ذرے ذرے اور اس کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک کام میں خالق فطرت کے اندازے اور تقدیر سے قائم ہے - یہی توازن اور برابری رسولوں کے ذریعے آئی ہوئی میزان شریعت کے مطابق ذی ارادہ اور خود اختیار انسانوں کی ایک ایک حرکت اور ایک ایک جنبش میں ہونی چاہیے - بے ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون فطرت ہے اور با ارادہ دنیا کی میزان کا نام قانون شریعت ہے اور یہی صراط مستقیم ہے - انسانی دنیا کی سکینت و طمانینت اور امن وامان کا نظام اسی صراط مستقیم کے ذریعہ قائم ہو سکتا ہے اگر یہ نہ ہو تو اس کے نظام کا درہم برہم ہونا بھی لازمی ہے - انبیاء کی بعثت کی یہ غرض و غایت کہ لوگ صراط مستقیم پر قائم رہیں دنیا کے نظام کی امن و سلامتی کے لیے ہے -

۸۴ - اور ہم نے اس کو اسحاق اور یعقوب عطا کیے ان میں سے ہر ایک کو ہدایت بخشی یعنی نہ صرف یہ کہ ہم نے ابراہیم کو ذاتی علم و فضل سے سرفراز کیا بلکہ بڑھاپے میں اسحاق جیسا بیٹا اور یعقوب جیسا پوتا عطا فرمایا - یعقوب وہی اسرائیل ہیں جن کی طرف دنیا کی ایک عظیم الشان قوم بنی اسرائیل منسوب ہے جن میں سے ہزاروں نبی اٹھائے گئے بلکہ جیسا کہ قرآن میں دوسری جگہ مذکور ہے کہ ابراہیم کے بعد حق تعالیٰ نے ہمیشہ کے لیے ان ہی کی نسل میں نبوت اور پیغمبری رکھ دی ہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلے حضرت ابراہیم کے روحانی و ایمانی درجات کا ذکر کیا تھا اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اس دنیا میں بھی اللہ نے ان کو رفع ذکر اور لقائے دوام کی عزت سے سرفراز کیا، ان کی ذریت میں بڑے بڑے انبیاء اور بلند مرتبہ ہستیاں ہوئی ہیں۔ دراصل حضرت ابراہیم کے تین بیویاں تھیں سارہ، ہاجرہ اور قطورا۔ سارہ کے بیٹے حضرت اسحاق تھے ان کے دو بیٹے تھے حضرت یعقوب جن کا لقب اسرائیل ہے اور عیصو جن کا لقب ادوم ہے۔ اس سلسلہ میں سے ادوم حضرت یعقوب سے الگ ہو کر اپنے چچا اسماعیل کے پاس عرب میں آباد ہو گئے بقیہ سلسلے شام میں رہے۔ قطورا کے بطن سے تمام اولاد کو جن میں ایک کا نام مدین تھا عرب ہی میں ان کے والد محترم نے بسایا، ان میں سے بنو مدین اور وہاں کے سوا اوروں کے حال کا پتہ نہیں ہے، ہاجرہ کے بطن سے حضرت اسماعیل ہوئے انہوں نے بھی اپنے باپ کے حکم سے عرب ہی میں سکونت کی۔

یہاں سب سے پہلے حضرت اسحاق کا ذکر شاید اس لیے کیا ہے کہ حضرت اسماعیل کے بعد حضرت اسحاق حضرت ابراہیم کو ایک سو سال کی عمر میں حضرت سارہ کے بانجھ ہونے کے باوجود خدا کی نشانی کے طور پر عطا ہوئے۔ حضرت ابراہیم کے ایمان، احسان، اخلاص اور اسلام کا جب حضرت اسماعیل کی قربانی کے ذریعہ امتحان ہو چکا تو دوسرا بیٹا حضرت سارہ کے یہاں ہوا اسحاق اصل تلفظ کے اعتبار سے یضحق ہے۔ یہ عبرانی لفظ ہے جس کا عربی ترجمہ یضحک ہنستا ہے ہوتا ہے۔ خدا کے فرشتوں نے جب حضرت ابراہیم کو سو برس اور حضرت سارہ کو نوے سال کی عمر میں اسحاق کے ہونے کی بشارت دی تھی تو حضرت ابراہیم نے اسے اچنبا سمجھا اور حضرت سارہ کو بھی یہ سن کر ہنسی آگئی تھی اس لیے ان کا نام بھی اسحاق تجویز ہو گیا۔ یا یوں کہہ دیجیے کہ یہ نام اس لیے رکھا گیا کہ ان کی پیدائش حضرت سارہ کی مسرت و شادمانی کا باعث ہوئی۔ عربی قاعدہ سے یضحک مضارع کا صیغہ ہے اور اہل عرب کا ہمیشہ سے دستور ہے کہ مضارع کے صیغوں کو بھی بطور نام استعمال کرتے ہیں جیسے یزید یعقوب یملک اور تورات میں ہے :۔

خدا نے ابرہام سے کہا کہ تیری جورو سری جو ہے اس کو سری مت کہنا بلکہ اس کا نام سرہ ہے اور میں اسے برکت دوں گا اور اس سے بھی میں تجھے بیٹا دوں گا، یقیناً میں اسے برکت دوں گا کہ قوموں کی ماں ہوگی اور ملکوں کے بادشاہ اس سے پیدا ہوں گے تب ابرہام منہ کے بل گرا اور ہنس کے دل میں کہا کہ کیا سو برس کے مرد کے بیٹا پیدا ہوگا اور کیا سارا جو نوے برس کی ہے بیٹا جنے گی

اور ابراہام نے خدا سے کہا کہ کاش اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے تب خدا نے کہا کہ بے شک تیری بیوی سارہ تیرے لیے بیٹا جنے گی تو اس کا نام اسحاق رکھنا۔

(باب ۱۷ آیت ۱۵ تا ۱۹)

حضرت اسحاق کی شادی کے بارے میں قرآن خاموش ہے لیکن تورات بتاتی ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے خانہ زاد الیعزر دمشقی سے فرمایا کہ میں یہ طے کر چکا ہوں کہ اسحاق کی شادی فلسطین کے اس کنعانی خاندان میں نہ کروں گا بلکہ میری خواہش یہ ہے کہ میں اپنے خاندان اور باپ دادا کی نسل میں اس کا رشتہ کروں اس لیے تو سامان لے کر جا اور فدان آرام میں میرے بھتیجے بتوئیل بن ناحور کو یہ پیغام دے کہ وہ اپنی بیٹی کا نکاح اسحاق سے کر دے، اگر وہ راضی ہو جائے تو اس سے یہ بھی کہہ دینا کہ میں اسحاق کو اپنے پاس سے جدا کرنا نہیں چاہتا لہٰذا لڑکی کو تیرے ساتھ رخصت کر دے۔ الیعزر حضرت ابراہیم کے حکم کے مطابق فوراً آرام کو روانہ ہو گیا، جب آبادی کے قریب پہنچا تو اپنے اونٹ کو بٹھایا تاکہ حالات معلوم کرے۔ الیعزر نے جس جگہ اونٹ بٹھایا تھا اسی کے قریب حضرت ابراہیم کے بھائی بتوئیل کا خاندان آباد تھا۔ ابھی یہ اس میں مشغول تھا کہ سامنے ایک حسین لڑکی نظر آئی جو پانی کا گھڑا بھر کر مکان کو لیے جا رہی تھی۔ الیعزر نے اس سے پانی مانگا لڑکی نے اس کو بھی پانی پلایا اور اس کے اونٹ کو بھی اور پھر حال دریافت کیا۔ الیعزر نے بتوئیل کا پتہ دریافت کیا۔ لڑکی نے کہا کہ وہ میرے باپ ہیں اور الیعزر کو مہمان بنا کر لے گئی۔ مکان پر پہنچ کر اپنے بھائی لابان کو اطلاع دی۔ لابان نے الیعزر کی بے حد مدارات کی اور آمد کی وجہ دریافت کی۔ الیعزر نے حضرت ابراہیم کا پیغام سنایا۔ لابان کو اس پیغام سے بے حد مسرت ہوئی اور اس نے بہت ساز و سامان دے کر اپنی بہن رفقہ کو الیعزر کے ہمراہ رخصت کر دیا۔

رفقہ سے حضرت اسحاق کے دو جوڑواں بچے ہوتے عیسو اور یعقوب، اس وقت حضرت اسحاق کی عمر ساٹھ سال کی تھی۔ حضرت اسحاق عیسو کو زیادہ چاہتے تھے اور ان کی اہلیہ رفقہ حضرت یعقوب سے زیادہ لگاؤ رکھتی تھیں۔

حضرت یعقوب اپنی والدہ کے حکم سے فدان آرام اپنی ننہیال چلے گئے تو ان کے ماموں لابان نے ان سے یہ عہد لیا کہ وہ دس سال ان کے یہاں رہ کر کام کریں تو وہ اس عرصہ کو مہر قرار دے کر ان کی اپنی لڑکی سے شادی کر دیں گے۔ چنانچہ حضرت یعقوب نے اس سے شادی کر لی اور

اس کے علاوہ تین شادیاں اور کیں، ایک کا نام لیّہ، دوسری کا نام راحیل، تیسری کا نام زلفا اور چوتھی کا نام بلہا تھا۔ ان سب سے اولاد ہوئی۔ حضرت یعقوب خدا کے برگزیدہ پیغمبر تھے اور کنعانیوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوتے تھے۔ انہوں نے برسوں اس خدمت کو انجام دیا کلاً ھدینا میں لفظ کل کو فعل سے پہلے لاکر اشارہ کر دیا کہ ان دونوں کو ہدایت کی نعمت بالاستقلال ملی تھی ان میں تابع و متبوع کا رشتہ نہ تھا کیونکہ دونوں پیغمبر تھے اور دونوں اسی دین توحید اور صراط مستقیم کے داعی تھے جس کی دعوت حضرت ابراہیم نے دی تھی۔ حضرت اسحاق کا زمانہ سنہ ۲۰۶۰ قبل مسیح تا سنہ ۱۸۸۰ قبل مسیح ہے اور حضرت یعقوب کا زمانہ سنہ ۲۰۰۰ ق م تا سنہ ۱۸۵۰ ق م ہے۔

حضرت نوحؑ بھی ہدایت لے کر آئے

۱۰۴۔ اور ہم نے نوح کو بھی اس سے پہلے ہدایت سے نوازا۔ پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعض فروع کا ذکر تھا۔ اب بعض اصول کا ذکر فرمایا۔ کیونکہ نوح علیہ السلام حضرت ابراہیم کے اجداد میں سے ہیں اور جس طرح ابراہیم کے بعد نبوت و کتاب کا انحصار صرف ان کی ذریت میں کر دیا گیا۔ اسی طرح نوح علیہ السلام کے بعد نوع انسانی کا انحصار نوح کی نسل میں ہو گیا۔ طوفان کے بعد گویا وہ دنیا کے لیے آدم ثانی ہو گئے ارشاد ہے:

وجعلنا ذریتہ ھم الباقین[1]

حضرت نوح بن لمک حضرت ابراہیم کے اجداد میں سے مشہور و معروف نبی ہیں۔ تورات میں بھی جو نسب نامہ درج ہے اس کے اعتبار سے حضرت ابراہیم خلیل حضرت نوح کی گیارہویں پشت میں ہیں۔ آپ کا وطن وہی تھا جو تاریخ کے ابتدائی دور میں نسل انسانی کا وطن تھا۔ یعنی عراق کا دوابہ دجلہ و فرات آپ کا زمانہ قیاسی و تخمینی طور پر سنہ ۲۹۴۸ ق م تا سنہ ۱۹۹۸ ق م سمجھا گیا ہے۔ آیت میں حدیبا کو کر بتایا ہے کہ حضرت ابراہیم سے پہلے حضرت نوح کو بھی ہم نے اسی راستہ کی ہدایت کی تھی اور آپ نے بھی اسی کی دعوت دی۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت ہمیشہ سے ایک ہے۔ خدا کے جتنے پیغمبر گزرے خواہ وہ کسی زمانے اور کسی گوشے میں ہوئے ہوں سب کی راہ ایک تھی اور سب خدا کے ایک ہی عالمگیر قانون عبادت کی تعلیم دینے والے تھے۔ یہ گویا دین کی وحدت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی طرف اشارہ ہے۔ اس میں اس حقیقت کے چہرہ سے پردہ اٹھایا گیا ہے کہ ایک ہی دین ہے جو نوح کو ابراہیم کو اور محمد رسول اللہ کو عطا کیا گیا ہے۔

سب انبیاء صراط مستقیم کے علمبردار تھے

۱۰۵۔ اور اس کی ذریت میں سے داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون کو بھی اور ہم خوب کاروں کو اسی طرح صلہ دیا کرتے ہیں اور زکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس کو بھی اور سب نیکوکاروں میں سے ہیں اور اسماعیل، الیسع، یونس اور لوط کو بھی اور ان میں سے ہر ایک کو جہان والوں پر فضیلت بخشی۔ اور ان کے آباؤ اجداد ان کی اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے ہم نے ہدایت یافتہ بنائے ہیں اور ان کو برگزیدہ بنایا اور ان کو ہم نے صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ ظاہری ملک و سلطنت کے اعتبار سے انبیاء علیہم السلام میں داؤد و سلیمان ہم رنگ ہیں اور مصائب و شدائد میں صبر کرنے کے لحاظ سے ایوب و یوسف میں خاص مشابہت ہے۔ باقی موسیٰ و ہارون کے قریبی تعلقات کی نسبت تو کچھ کہنے کی ضرورت نہیں ہے۔ خود حضرت موسیٰ نے ہارون کو بطور وزیر کے حق تعالیٰ سے طلب کیا تھا[1]

و من ذریتہ میں ضمیر کا مرجع حضرت ابراہیم ہیں۔ یہی بیشتر شارحین قرآن کی رائے ہے۔ اگرچہ حافظ ابن جریر نے ضمیر کو حضرت نوح کی طرف لوٹایا ہے لیکن یہ صحیح نہیں۔ موضوع یہاں حضرت ابراہیم کی ذات گرامی ہے حضرت نوح کا ذکر بھی مناقب ابراہیم ہی کو بتانے کے لیے آیا ہے۔ بتایا یہ ہے کہ حضرت ابراہیم کے اصول و فروع پر اللہ کے انعامات کی بارش ہوئی ہے اور اس پر یہ بھی اضافہ پیش نظر رکھیے کہ اللہ سبحانہٗ نے نبوت کو نوح و ابراہیم کی نسل میں محدود اور محصور کر دیا۔

لقد ارسلنا نوحاً و ابراھیم وجعلنا فی ذریتھما النبوۃ

[1] اسحاق، یعقوب اور نوح کا ذکر کیا تھا اب یہاں ان آیات میں چودہ نبیوں کا تذکرہ کیا ہے لیکن ان کا ذکر نہ تاریخی ترتیب سے ہے اور نہ مراتب و مناقب کے لحاظ سے۔ قرآن نہ تاریخی دستاویز ہے اور نہ مناقب و مدائح کا مجموعہ ہے۔

ان آیات میں انبیاء کو تین قسموں میں پیش کیا ہے۔ پہلی قسم میں حضرت داؤد، سلیمان،

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایوب، یوسف اور موسیٰ وہارون ہیں۔ ان میں قدر مشترک یہ ہے کہ اللہ نے ان کو دُنیا میں نبوت ورسالت کے ساتھ ملک وحکومت اور زعامت وسیادت سے مشرف فرمایا ہے۔ پہلے حضرت داؤد و سلیمان کا ذکر کیا، دونوں مالدار بھی تھے اور صاحب تاج وتخت بھی تھے۔ پھر حضرت ایوب اور یوسف کا ذکر کیا حضرت ایوب سرمایہ دار تھے اور حضرت یوسف حکومت میں وزارت کے منصب پر تھے۔ دونوں مصائب میں مبتلا ہوتے، صبر کیا، انعامات سے نوازے گئے تو شکر کیا اور حضرت موسیٰ و ہارون حاکم تھے لیکن بادشاہ نہ تھے۔ ان میں ہر دو ایک خاص امتیازی شان رکھتے تھے اسی شان کے لحاظ سے ان کا ذکر ہوا ہے۔

دوسری قسم میں حضرت زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کو پیش کیا ہے یہ سب بزرگ انبیاً میں زہد اور ترک دنیا میں مثالی شخصیتیں ہیں۔ پہلی قسم کے انبیاً کو اگر دینی اور دنیوی ریاست کے یک جا ہونے کی بنا پر محسنین کہا ہے تو ان کو ان کی خالص زاہدانہ زندگی کی وجہ سے صالحین کہا ہے ویسے ہر نبی محسن اور صالح ہوتا ہے۔

تیسری قسم میں حضرت اسماعیل، الیسع، یونس اور حضرت لوط کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ ان میں نہ تو پہلی قسم کی طرح دُنیا کا جاہ وجلال تھا اور نہ دوسری قسم کی طرح زاہدانہ زندگی میں مبالغہ تھا اس لیے ان کو بعد میں لائے اور آخر میں ایک جامع بات فرمادی کلا فضلنا علی العالمین ہر نبی بلاشبہ عالمین کی مخلوقات سے اعلیٰ واولیٰ اور افضل ہوتا ہے۔

اس سے آپ کو یقیناً یہ بات معلوم ہوگئی ہوگی کہ قرآن میں یہاں انبیا کے تذکرے میں یہ ترتیب کیوں قائم کی گئی ہے اور یہ بھی معلوم ہوگیا کہ محسنین، صالحین اور فضلنا علی العالمین کے تنوع میں کیا حکمت ہے۔

آئیے اب ان بزرگ ترین ہستیوں کا کچھ تاریخی چہرہ بھی پڑھ لیجئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام

داؤد علیہ السلام مشہور اور جلیل القدر رسول ہیں جن پر زبور نازل ہوئی تھی۔ داؤد عجمی نام ہے اور علمیت وعجمیت کی بنا پر غیر منصرف ہے۔ آپ ذریت ابراہیم علیہ السلام سے ہیں اور آپ کا شمار انبیاً بنی اسرائیل میں ہے۔ اللہ سبحانہ نے آپ کو دونوں نعمتوں سے سرفراز فرمایا تھا کہ صاحب منصب نبوت بھی تھے اور سربراہ مملکت بھی۔ اور بادشاہ ہونے کے باوجود کسب ومحنت

سے اپنی روزی کماتے اور اسی پر ان کا گزر تھا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نہایت پیارا روزہ اللہ کے نزدیک داؤد علیہ السلام کا ہے کہ ایک دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ اور نہایت پیاری نماز اللہ کے نزدیک داؤد علیہ السلام کی نماز ہے۔ آدھی رات تک سوتے تھے اور تہائی رات تہجد پڑھتے تھے اور جب چھٹا حصہ رات کا باقی رہتا تو پھر سو رہتے تھے۔ اور صحیحین میں ابو موسیٰ الاشعری رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے ابو موسیٰ اشعری تجھ کو داؤد علیہ السلام کی بانسریوں میں سے ایک بانسری دی گئی ہے حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ نہایت خوش آواز تھے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک رات سفر میں ان کو قرآن پڑھتے سنا دوسرے روز یہ حدیث بیان فرمائی یعنی تیری آواز ایسی دلکش ہے گویا تیرا گلا بانسری ہے اور تیری آواز میں لحن داؤدی کا اثر ہے۔

یاد رہے کہ توراۃ اور اسرائیلی روایات میں حضرت داؤد اور اوریا کی بیوی کا جو افسانہ مذکور ہے اور جس کو غلطی سے بعض غیر محتاط مفسرین نے بھی سورہ ص کی تفسیر میں نقل کر ڈالا ہے محض کذب و افترا ہے۔ علامہ داؤدی رقمطراز ہیں :-

داؤد اور اوریا کی بیوی کے قصے میں کوئی روایت ثابت نہیں۔

اور قاضی عیاض فرماتے ہیں :

لیکن داؤد علیہ السلام کا قصہ سو ضروری نہیں ہے کہ جو کچھ مورخین نے اہل کتاب سے نقل کیا ہے اور جسے کچھ شارحین قرآن نے بھی اپنی تفسیر میں لکھا ہے اس کی طرف التفات کیا جائے نہ قرآن میں اس کا کوئی ذکر ہے اور نہ کسی حدیث میں۔

بہر حال داؤد علیہ السلام نبی برحق ہیں اور ان کا زمانہ ۹۶۲ قبل مسیح ہے۔

حضرت سلیمان علیہ السلام

حضرت سلیمان حضرت داؤد کے فرزند ارجمند تھے۔ والد کی وفات کے بعد ان کے جانشین ہوئے اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے آپ کی ذات بابرکات میں نبوت و سلطنت دونوں کو مکمل طور پر جمع کر دیا تھا۔ حافظ ابو حیان اندلسی البحر المحیط میں رقمطراز ہیں :

سلیمان عجمی نام ہے۔ علمیت و عجمیت کی بنا پر غیر منصرف ہے۔ عجمیت میں اس کی نظیر اس امر میں کہ اس کے بھی آخر میں الف اور نون ہیں جیسے ہامان، ماہان اور سامان

اور اس کا غیر منصرف ہونا علمیت اور الف نون زائدہ کی وجہ سے نہیں کیونکہ الف نون کا زیادہ ہونا اشتقاق و تصریف پر موقوف ہے اور عجمی ناموں میں عربی اشتقاق اور تصریف کا دخل نہیں ہے۔ (البحر المحیط ج ا ص ۳۱۸)

شام و فلسطین کے علاوہ آپ کی حدود مملکت مشرق کی سمت میں عراق کے دریائے فرات کے ساحل تک اور مغرب میں بحر معز تک وسیع تھی۔ آپ کی سلطنت کی وسعت، عظمت اور شوکت پر دوست دشمن سب کا اتفاق ہے۔

آپ کی والدہ ماجدہ بھی بڑی عابدہ و صالحہ تھیں۔ سنن ابن ماجہ میں حضرت جابر بن عبداللہؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ حضرت سلیمان بن داؤد کی ماں نے حضرت سلیمان سے کہا تھا کہ بیٹا رات میں زیادہ نہ سونا کیونکہ رات میں زیادہ سونا مرد کو روزِ قیامت محتاج کر کے چھوڑتا ہے۔

حضرت سلیمان کا زمانہ حکومت ۹۹۰ء ق م تا ۹۳۰ء ق م ہے۔

حضرت ایوب علیہ السلام

تورات اور کتب تاریخ میں ایک نام یوباب بھی آتا ہے اور محققین کا خیال اس کے متعلق یہ ہے کہ ایوب اور یوباب ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ دراصل عبرانی میں یوباب کو ادب کہا گیا ہے اور یہی ادب عربی میں ایوب ہو گیا۔ لیکن اس تحقیق کے باوجود کہ ایوب اور یوباب اور ادب مختلف زبانوں میں ایک شخصیت کے نام ہیں، حضرت ایوب کی شخصیت سے متعلق مسئلہ پھر بھی حل طلب ہے، اور تفصیل چاہتا ہے۔

تورات کے بیان کے مطابق یوباب دو جدا جدا شخصیتوں کا نام ہے۔ ایک بنی یقطان میں سے ہے اور دوسرا بنی ادوم میں سے۔ اگر ایسا ہے اور یہ بھی صحیح ہے کہ ایوب اور یوباب ایک شخص کے دو نام ہیں تو ان دونوں میں سے ایوب اور یوباب کون ہے؟ مولانا آزاد فرماتے ہیں کہ ایوب اور یوباب اس کا نام ہے جو بنی یقطان کی نسل سے ہے اور عرب عاربہ سے تعلق رکھتا ہے چنانچہ لکھتے ہیں:

اولاً محققین تورات میں سے اکثر اس طرف گئے ہیں کہ حضرت ایوب عرب تھے عرب میں ظاہر ہوئے تھے اور سفر ایوب اصلاً قدیم عربی میں لکھی گئی تھی حضرت

موسیٰ نے لسے قدیم عربی سے عبرانی میں منتقل کیا۔ سفرِ ایوب میں ہے کہ وہ عوض کے ملک میں رہتے تھے اور آگے چل کر تصریح کی ہے کہ ان کے مویشی پر شیبا (سبا) کے لوگوں نے حملہ کیا تھا۔ ان دونوں تصریحوں سے بھی اس کی تصدیق ہو جاتی ہے کیونکہ کتاب پیدائش اور تواریخ اول میں عوض کو ارام بن سام بن نوح کا بیٹا قرار دیا ہے اور آرام بالاتفاق عرب عاربہ کی ابتدائی جماعتوں میں ہیں۔[1]

عرب مورخ ابن عساکر کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ وہ حضرت ایوب کو قریب بعید ابراہیمی مانتا ہے اور کہتے ہیں کہ لوط علیہ السلام کے معاصر اور دینِ ابراہیمی کے پیروکار ہے۔ دیکھو فتح الباری جلد

مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں کہ ایوب علیہ السلام بنو ادوم میں تھے ان کا زمانہ ۱۵۰۰ ق م اور ۱۳۰۰ ق م کے درمیان ہے فرماتے ہیں :

یہ بات کہ حضرت ایوب ایک ادومی عرب تھے۔ خود سفرِ ایوب سے ثابت ہے عوض کی سرزمین میں ایک مردِ صالح راست گو خدا سے ڈرنے والا اور بدی سے دور تھا (۱:۱) عوض تورات میں دو آدمیوں کا نام ہے ایک تو نہایت قدیم عوض بن ارم بن سام بن نوح (تکوین ۳۶، ۲۹) باتفاق اہلِ کتاب اس سے عوض ثانی مراد ہے عوض کے بنی ادومی ہونے کی ایک بڑی دلیل یہ ہے کہ سفرِ ایوب میں رفقاءِ ایوب کے جو مسکن بتاتے ہیں وہ تیمن، نعمان اور شوحان بتاتے ہیں۔ اول کے متعلق تو اچھی طرح معلوم ہے کہ وہ مملکت ادوم کا ایک مشہور شہر تھا۔ (تکوین ۳۶، ۳۵)

زمانہ کے متعلق بھی فیصلہ اس لیے آسان ہے کہ کلدان اور سبا کا اس میں ذکر معاصرت ہے۔ سبا کا زمانۂ عروج ۱۱۰۰ سے ۱۳۰۰ ق م ہے اس لیے ان دونوں کے حدود میں کہیں حضرت ایوب کا زمانہ قرار دینا چاہیے۔[2]

یہ عجیب بات ہے کہ زمانہ کے تعین میں دونوں حضرات سبا اور کلدانیوں کی معاصرت کی سند پیش کرتے ہیں مگر نتیجہ دونوں کا جدا جدا اور متضاد نکالتے ہیں۔

سید سلیمان کی تائید مشہور مورخ یعقوبی سے بھی ہوتی ہے۔ اس لیے بلاشبہ یہی صحیح ہے کہ ایوب بنی الیوب علیہ السلام ہیں اور راجح یہی ہے کہ وہ بنی یقطان سے نہیں بلکہ بنی ادوم سے ہیں ۔ البتہ

---

[1] ترجمان القرآن [2] ارض القرآن

زمانے کے متعلق ہمیں سید صاحب سے اتفاق نہیں ہے کہ حضرت ایوب کا زمانہ [illegible] سے [illegible] قبل مسیح کے درمیان ہے صحیح اور تحقیقی بات یہ ہے کہ ایوب علیہ السلام کا زمانہ حضرت موسیٰ اور حضرت یعقوب کے زمانہ کے درمیان ہے اور سنہ ۱۵۰۰ ق م اور سنہ ۱۳۰۰ ق م کے لگ بھگ ہے۔ اس پر انشاء اللہ سیر حاصل بحث آپ کو سترھویں پارے میں ملے گی۔

حضرت یوسف علیہ السلام

یوسف ابن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم علیہ السلام ہیں اور ان کی والدہ کا نام راحیل بنت لابان ہے حضرت یعقوب کو ان کے ساتھ بے حد محبت تھی۔ یہ بھی اپنے والد، دادا کی طرح سن رشد کو پہنچ کر عظیم کے جلیل القدر نبی بنے اور ملت ابراہیمی کی دعوت و تبلیغ کی خدمت انجام دی۔ یہی وجہ ہے کہ ابتداء ہی سے ان کی دماغی اور فطری استعداد دوسرے بھائیوں کے مقابلے میں بالکل جدا تھی۔ حضرت یعقوب کی محبت کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ یوسف کی پیشانی میں چمکتا ہوا نور نبوت پہچانتے اور وحی الٰہی کے ذریعے اس کی اطلاع پا چکے تھے۔ ان کی پیدائش کنعان میں ہوئی۔ بعد کو مصری حکومت میں وزارت کے منصب پر فائز ہوتے ہیں۔ ان کا زمانہ سنہ ۱۹۱۰ تا سنہ ۱۸۰۰ قبل مسیح ہے۔ ان کے تمام حالات پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ بارہویں پارے میں آئے گا جہاں ان کے نام سے قرآن میں پوری سورت ہے جو ان کے واقعات سے متعلق عبرت و موعظت کا بہترین ذخیرہ ہے۔

حضرت موسیٰ و ہارون علیہم السلام

حضرت موسیٰ کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام سے ملتا ہے۔ ان کے والد کا نام عمران اور ان کی والدہ کا نام یوکابد تھا۔ باپ کا شجرہ نسب یہ ہے۔

عمران بن قاہت بن لاوی بن یعقوب علیہ السلام اور حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے حقیقی اور بڑے بھائی تھے۔ حضرت موسیٰ کا اسم گرامی قرآن میں ۱۳۶ بار آیا ہے جبکہ حضرت ہارون کا ۲۰ جگہ ذکر آیا ہے۔

فرعون شاہ مصر کا لقب ہے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے۔ تین ہزار سال قبل مسیح سے شروع ہو کر عہد اسکندر تک فراعنہ کے ۳۱ خاندان مصر پر حکمران رہے ہیں۔ ان میں سے حضرت یوسف کا فرعون ہیکسوس عمالقہ کے خاندان سے تھا جو دراصل عرب خاندان کی ایک شاخ تھی۔ یہ بات کہ

حضرت موسیٰ کے زمانہ کا فرعون کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ عام مؤرخین عرب اس کو بھی عمالقہ ہی کے خاندان کا فرد بتاتے ہیں لیکن اب جدید مصری عفائر کی تحقیقات اور حجری کتبات نے بتایا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون رعمسیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے جس کا دورِ حکومت ۱۲۹۲ سنہ ق م سے شروع ہو کر ۱۲۲۵ سنہ ق م پر ختم ہوتا ہے۔ اس تحقیق کے متعلق احمد یوسف احمد آفندی نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے۔ یہ مصری دارالآثار کے مصور ہیں اور اثری و حجری تحقیق کے بہت بڑے عالم ہیں۔ ان کے اس مضمون کا خلاصہ سنجار نے قصص الانبیاء میں نقل کیا ہے فرماتے ہیں:

> جس فرعون نے بنی اسرائیل کو مصائب میں ڈالا وہ بھی رعمسیس دوم ہے یہ مصر کے حکمرانوں کا انیسواں خاندان تھا۔ حضرت موسیٰ اس کے زمانے میں پیدا ہوتے اور اسی کی آغوش میں پرورش پائی۔

یہاں صرف اشارات ہیں موسیٰ اور ہارون کے حالات پر تفصیلی بحث کے لیے آپ کو پارہ ۱۶ کا انتظار کرنا ہوگا۔

حضرت زکریا علیہ السلام

زکریا کے نام سے قرآن جس شخصیت کا ذکر کر رہا ہے یہ وہ نہیں جن کا ذکر مجموعہ تورات صحیفہ زکریا میں آیا ہے کیونکہ تورات میں جس کا ذکر ہے ان کا ظہور دارا کے زمانے میں ہوا ہے اور دارا کا زمانہ حضرت مسیح علیہ السلام کی ولادت سے پانچ سو سال پہلے ہے۔ اور قرآن نے جس زکریا کا چہرہ پیش کیا ہے وہ حضرت مسیح کی والدہ حضرت مریم کے کفیل و مربی ہیں اور یحییٰ علیہ السلام کے والد ہیں۔ حضرت زکریا کے والد کا نام کیا ہے اس میں مورخین کا اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں اور ابن عساکر نے "تاریخ" میں وہ سب اقوال نقل کر دیے ایک خیال ہے کہ ان کے والد کا نام ادن ہے کوئی لدن کوئی شبوی اور کوئی یرحنا بتاتا ہے لیکن اس پر اتفاق ہے کہ حضرت سلیمان بن داؤد کی اولاد میں سے ہیں۔

بنی اسرائیل میں کاہن ایک معزز عہدہ تھا اور اس کے ذمہ خدمت یہ تھی کہ وہ ہیکل صخرہ بیت المقدس کی پاکیزہ رسوم ادا کرے ۔۔ ۔۔ کے لیے مختلف قبائل میں کاہن الگ الگ منتخب ہوتے اور اپنی اپنی نوبت پر اس کی خدمت انجام دیتے۔ زکریا علیہ السلام بنی اسرائیل میں معزز کاہن بھی تھے اور جلیل القدر پیغمبر بھی۔ یہاں قرآن نے ان کا صفِ انبیاء میں تذکرہ کیا ہے۔

زکریا علیہ السلام سلالہ داؤد میں سے تھے اور ان کی اہلیہ الیشع حضرت ہارون کی ذریت سے تھیں۔

مسند امام احمد بن حنبل، صحیح مسلم اور سنن ابن ماجہ میں حضرت ابو ہریرہ کے حوالے سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

حضرت زکریا نجار یعنی بڑھئی تھے۔

حیرت ہے کہ امام حاکم نے المستدرک میں اس حدیث کو نقل کرکے یہ لکھ دیا کہ یہ حدیث بخاری اور مسلم کی شرط پر ہے اور بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا اور امام ذہبی نے تلخیص المستدرک میں اس پر کوئی گرفت نہیں کی حالانکہ حدیث صحیح مسلم میں یہ روایت فضائل زکریا کے باب میں موجود ہے اور حافظ ابن کثیر نے اسی روایت کو تفسیر میں بحوالہ بخاری پیش کیا حالانکہ امام بخاری نے سرے سے اس حدیث کی تخریج ہی نہیں کی۔ بہر حال حضرت زکریا اپنی روزی نجاری کے پیشے سے حاصل کرتے تھے۔

حضرت یحییٰ علیہ السلام

حضرت یحییٰ حضرت زکریا کے فرزند ارجمند اور ان کی پیغمبرانہ دعاؤں کا حاصل ہے ان کا نام بھی اللہ سبحانہٗ کا تجویز فرمودہ ہے۔

مالک ابن انس فرماتے ہیں کہ یحییٰ ابن زکریا اور عیسٰی ابن مریم کا رحم مادر میں استقرار ایک ہی زمانے میں ہوا۔ اور ثعلبی کہتے ہیں کہ حضرت عیسٰی سے چھ ماہ پہلے ہوا تھا اور لوقا کی انجیل میں ہے کہ جب حضرت زکریا کی بیوی الیشع کو حاملہ ہوتے چھ ماہ گزر گئے تب جبریل فرشتہ مریم علیہا السلام پر ظاہر ہوتے اور انہوں نے حضرت عیسٰی کے ہونے کی بشارت دی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حضرت یحییٰ حضرت عیسٰی سے چھ ماہ بڑے تھے۔

یحییٰ علیہ السلام کی شخصیت یہودیوں اور عیسائیوں کے درمیان متنازعہ فیہ ہے۔ یہودی ان کے منکر ہیں لیکن عیسائی ان کو حضرت مسیح کا منادی مانتے ہیں اور ان کے والد حضرت زکریا کو صرف کاہن مانتے ہیں اور اہل کتاب ان کا نام یوحنا بیان کرتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ عبری یوحنا یحییٰ کا ہم معنی ہو اور یہ بھی ممکن ہو کہ عبری کے یوحنا نے عربی میں یوحنا کا تلفظ اختیار کر لیا ہو۔ انجیل لوقا میں بھی قرآن عزیز کی طرح یہ تصریح ہے کہ یہ نام ان کے خاندان میں کسی شخص کا ان سے پہلے نہ تھا اس لیے خاندان والوں نے جب سنا تو تعجب کا اظہار کیا اور ان کی عام رہائش کے متعلق

لکھا ہے کہ:

> یوحنا اونٹ کے بالوں کی پوشاک پہنے اور چمڑے کا پٹکا اپنی کمر سے باندھے رہتا تھا اور اس کی خوراک ٹڈیاں اور جنگلی شہد تھا۔ (متی باب ۳ آیت ۴، ۵)

حضرت عیسیٰ علیہ السلام

یہ مشہور پیغمبر ہیں۔ ان کے تفصیلی واقعات پر خود قرآن میں سیر حاصل بحث ہے۔ ان کا ۲۵ بار قرآن میں ذکر آیا ہے۔ جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم علی الاطلاق خاتم الانبیاء والرسل ہیں، ایسے ہی حضرت عیسیٰ خاتم انبیاء بنی اسرائیل ہیں اور سب کا اس پر اتفاق ہے کہ حضور انور اور حضرت عیسیٰ کے درمیان کوئی پیغمبر نہیں آیا۔ حضرت عیسیٰ کی ولادت قدرت خداوندی کا شاہکار ہے یعنی بغیر باپ کے محض حکم الٰہی سے ولادت ہوئی۔ قرآن نے ان کا چہرہ معجزاتی شخصیت کی حیثیت سے پیش کیا ہے اور جیسے ان کی تشریف آوری میں اللہ کی شان قدیری کا اظہار ہے ایسے ہی آپ کی روانگی اور پھر دنیا میں تشریف آوری میں بھی اللہ کی شان قدیری کا مظاہرہ ہے۔ حضرت عیسیٰ پر تبصرہ پچھلے جلدوں میں کچھ گزر چکا ہے اور ان شاء اللہ پارہ ۱۶ میں اس پر تفصیلی تبصرہ آ رہا ہے۔

حضرت الیاس علیہ السلام

قرآن عزیز نے ان کا نام الیاس بتایا ہے اور انجیل یوحنا میں ان کو ایلیاہ نبی کہا گیا ہے۔ بعض آثار میں ہے کہ الیاس اور ادریس ایک شخص کے دو نام ہیں مگر یہ صحیح نہیں ہے۔ اول تو ان آثار کے متعلق محدثین کو کلام ہے اور وہ ان کو ناقابل اعتبار سمجھتے ہیں، دوسرے اس آیت میں قرآن کا انداز بیان بھی اس کی تردید کرتا ہے۔ علاوہ ازیں مؤرخین نے جو حضرت ادریس کا نسب نامہ بیان کیا ہے وہ اس نسب نامے سے قطعاً جدا ہے جو حضرت الیاس سے متعلق ہے۔ بیشتر مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ حضرت الیاس حضرت ہارون کے خاندان سے ہیں اور ان کا نسب نامہ یہ ہے

الیاس ابن یاسین بن فنحاص بن یعزار ابن ہارون یا الیاس بن عازر بن یعزار بن ہارون علیہ السلام

حضرت الیاس کی بعثت کے متعلق مفسرین اور مؤرخین کا اتفاق ہے کہ وہ شام کے باشندوں کی ہدایت کے لیے بھیجے گئے تھے اور بعلبک کا شہر ان کی رسالت و ہدایت کا مرکز تھا۔ ان کا زمانہ ۸۷۵ تا ۸۵۲ قبل مسیح ہے۔

حضرت اسماعیل علیہ السلام

حضرت اسماعیل حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے حضرت ہاجرہ کے بطن سے صاحبزادے ہیں۔ اسماعیل عبرانی شماع ایل ہے۔ شماع سننا اور ایل (اللہ) لفظی معنے خدا کا سننا۔ خدا نے چونکہ ابراہیم کی دعا اور ہاجرہ کی فریاد سنی اس لیے بچہ کا نام شماعیل پڑا۔ ۹۹ برس کی عمر میں حضرت سارہ کے بطن سے بھی ایک فرزند کے تولد کی بشارت ہوئی لیکن حضرت ابراہیم کو اس بشارت سے کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اس بشارت کے جواب میں انہوں نے خدا سے یہ دعا کی۔

اے کاش اسماعیل تیرے حضور جیتا رہے۔ (تکوین)

اللہ سبحانہٗ نے فرمایا

اسماعیل کے حق میں میں نے تیری دعا سنی، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے
برومند کروں گا اور اس کو بہت بڑھاؤں گا اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے
اور میں اس کو بڑی قوم بناؤں گا۔ ۱۸، ۲۰۔

آخر یہ بشارت استجابت کو پہنچی اور اسماعیل کا گھر آباد ہوا اور ان کے ایک لڑکی اور بارہ لڑکے ہوئے۔ لڑکی کا نام تورات میں ایک جگہ باسمہ اور دوسری جگہ محلاہ لکھا ہے۔ بارہ بیٹوں کے نام یہ ہیں۔ نبایوط، قیدار، ادبائیل، بشام، مشماع، دوما، مشا، حدر، تیما، یطور، نفیش، قیدماہ۔ یہ باروں بیٹے حسب بشارت ربانی اپنے خاندان کے بارہ رئیس تھے۔ ان میں سب سے بڑے نبایوط اور ان سے چھوٹے قیدار تھے۔ حضرت اسماعیل اولوالعزم من الرسل میں سے تھے۔ ان کا زمانہ ۲۰۰۰ء تا ۱۹۳۲ء ق م ہے۔

حضرت الیسع علیہ السلام

مؤرخین کا بیان ہے کہ حضرت الیسع حضرت الیاس کے چچازاد بھائی ہیں۔ ابن عساکر نے ان کے نسب کے بارے میں لکھا ہے کہ حضرت یوسف کی اولاد میں سے ہیں اور سلسلہ نسب یہ ہے الیسع بن عدی بن شوتلم بن افرائیم بن یوسف بن یعقوب بن اسحاق ابن ابراہیم علیہ السلام اور اگر تورات کے یسعیاہ نبی اور الیسع ایک ہی شخصیت ہیں تو تورات نے ان کو عموص کا بیٹا قرار دیا ہے۔

حضرت الیسع علیہ السلام حضرت الیاس کے جانشین اور خلیفہ ہیں۔ اوائل عمر ہی میں ان کی رفاقت میں رہتے تھے اور ان کے انتقال کے بعد اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی رہنمائی کی۔ یہ نہیں معلوم ہو سکا کہ حضرت الیسع کی عمر مبارک کیا ہوئی اور بنی اسرائیل میں کتنے عرصے تک انہوں نے حق تبلیغ ادا کیا۔
قرآن عزیز نے ان کے حالات پر زیادہ روشنی نہیں ڈالی۔ یہاں اور سورہ ص میں ذکر پر اکتفا کیا ہے تورات کے بعض صحیفوں میں ان کا ذکر تفصیل سے آیا ہے۔

حضرت یونس علیہ السلام

مورخین اسلام اور اہل کتاب اس پر متفق ہیں کہ یونس علیہ السلام کے نسب سے متعلق اس سے زیادہ کوئی بات ثابت نہیں کہ ان کے والد کا نام متی ہے اور اہل کتاب یونس کو یوناہ اور متی کو امتی بولتے ہیں یہ کوئی اختلاف نہیں ہے بلکہ یہ عبری اور عربی زبانوں کا لفظی اختلاف ہے۔ حافظ ابن حجر فرماتے ہیں کہ یونس علیہ السلام کے زمانے کا تعین تاریخ کی روشنی میں مشکل ہے البتہ بعض مورخین کہتے ہیں کہ جب ایران میں طوائف الملوکی کا دور تھا اس وقت نینوا میں حضرت یونس کا ظہور ہوا لیکن یہ تاریخی نقطہ نظر سے غلط ہے کیونکہ مورخین کا اس پر اتفاق ہے کہ بابلیوں کے ہاتھوں آشوریوں کا یہ مستقر نینوی ۶۱۲ ق م میں تباہ ہوا۔ علاوہ ازیں اہل کتاب کی روایات یہ شہادت دیتی ہیں کہ حضرت یونس علیہ السلام کے عہد کے بعد ۶۹۰ قبل مسیح میں جب نینوی نے دوبارہ کفر و شرک اور ظلم و ستم شروع کر دیا اور ان کی سرکشی بہت بڑھ گئی تب ایک اسرائیلی نبی ناحوم نے دوبارہ ان کو سمجھایا اور ہدایت و رشد کی دعوت دی، اور جب انہوں نے کوئی پروا نہ کی تو نینوی کی تباہی کی پیش گوئی فرمائی اور اس سے ستر برس بعد ۶۱۲ ق م میں نینوی تباہ و برباد ہو گیا لہٰذا حضرت یونس کا عہد ۶۹۰ سے بھی قدیم ہونا چاہیے۔ غالباً شاہ عبدالقادر کی یہ بات درست ہے،

خرقیل کے باروں میں سے تھے۔ یونس علیہ السلام بڑے شوق میں عبادت کی اور دُنیا سے الگ ہو کر حکم ہوا کہ ان کو بھیجو شہر نینوا میں مشرکوں کو منع کریں بُت پوجنے سے۔

(موضح القرآن)

امام بخاری نے کتاب الانبیاء علیہم السلام کے ذکر میں اپنی تحقیق کے مطابق جو ترتیب قائم کی ہے اس میں یونس علیہ السلام کا ذکر حضرت موسیٰ اور حضرت شعیب اور حضرت داؤد علیہم السلام کے درمیان کیا ہے۔

حضرت لُوط علیہ السلام

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم کے برادرزادے ہیں۔ ان کے والد کا نام ہاران ہے حضرت لوط کا بچپن حضرت ابراہیم ہی کے زیرِ سایہ گزرا۔ اسی لیے وہ اور حضرت سارہ ملتِ ابراہیم کے پہلے مسلم اور السابقون الاولون میں داخل ہیں۔ یہ اور ان کی بی بی حضرت ابراہیم کی ہجرتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے اور جب حضرت ابراہیم مصر میں تھے تو اس وقت بھی یہ ہمسفر تھے۔

اُردن کی وہ جانب جہاں آج بحرِ میت یا بحرِ لوط واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں تھیں اس کے قریب بسنے والوں کا یہ اعتقاد ہے کہ پہلے یہ تمام حصہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانے میں خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے۔ سدوم اور عامورہ کی آبادیاں اسی مقام پر تھیں یہ مقام شروع سے بحر نہ تھا۔ جب قوم لُوط پر عذاب آیا اور اس سرزمین کا تختہ اُلٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور بھونچال آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر نیچے چلی گئی۔ اور پانی اُبھر آیا اسی لیے اس کا نام بحرِ میت اور بحرِ لُوط ہے۔

آخر میں فرمایا ومن ذریتھم واخوانھم جتنے حضرات کا اوپر ذکر ہو چکا ہے یہ سب انبیائے صادقین تھے۔ اللہ کے مقبول و برگزیدہ ان کے فسق اعتقادی و عملی سے متعلق جتنی بھی روایات شائع ہوں اگرچہ وہ بائیبل ہی کے ذریعے ہوں سب کی سب موضوع و باطل ہیں۔ من آبائھم میں من تبعیضیہ ہے کچھ کے معنی میں ہے۔ یعنی ان کے باپ دادے، ان کی اولاد، ان کے بھائی بند سب نہیں بلکہ کچھ ہدایت کی دولت سے نوازے گئے ہیں۔ یہاں امام رازی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ اس آیت میں حضرات انبیا کے آباؤ اجداد اور اخوان یعنی اصول و فروع کا ذکر مقامِ شرف و مدح میں کیا گیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ حضرات انبیا سے ہر قسم کا رشتہ باعث شرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہدایت صرف ان نبیوں تک ہی محدود نہیں رہی بلکہ ان کے باپ دادوں، ان کی آل اولاد اور ان کے بھائی بندوں میں سے بھی کچھ کو یہ سعادت حاصل ہوئی۔ اور سب کو ہم نے برگزیدگی دی اور صراط مستقیم کی ہدایت بخشی۔ صراطِ مستقیم سے مراد علم و عمل کی وہ دولت ہے جس کا ذکر آپ سورہ فاتحہ میں پڑھ چکے ہیں۔ صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین یعنی علم و عمل کی وہ راہ جو انعام یافتہ حضرات کو ملتی ہے جس میں علم کی گمراہی اور عمل کی بے راہ روی نہیں ہوتی۔ اسی کا نام قرآن کی زبان میں الھدیٰ، الدین القیم، اور الاسلام ہے۔ اس آیت نے یہ راز کھول دیا کہ اللہ کا دین ہمیشہ

سے ایک تھا ایک رہا اور ایک رہے گا۔ نورِ معرفت ایک ہے خواہ وہ کتنی ہی مختلف شکل و رنگ کی قندیلوں میں روشن ہو۔ اصل دین میں تمام پیغمبروں کی تعلیم یکساں تھی ایک دین تھا جس کو لے کر اول سے آخر تک تمام انبیاءؑ آتے رہے۔ اس میں زمان و مکان کے تغیر کو کوئی دخل نہ تھا اور نہ قوم و ملک کے اختلاف سے اس میں کوئی اختلاف پیدا ہوا۔ وہ ہر زمانہ اور ہر مقام میں یکساں آیا اور وہاں کے پیغمبروں نے اس کی یکساں تعلیم دی۔ یہ تعلیم صراطِ مستقیم کی تھی۔ یعنی نبوت کے علم و عمل کے ذریعے آئی ہوئی اللہ کی توحید اس کے صفاتِ کاملہ، اللہ کی خالص عبادت، اقرارِ نبوت، حقوقِ انسانی، اخلاقِ فاضلہ، اچھے اور برے اعمال کی باز پرس اور جزا و سزا۔ یہ انبیائی ہدایت کے وہ بنیادی امور ہیں جن میں کوئی اختلاف نہیں۔ انبیاءؑ کی تاریخ اس پر گواہ ہے کہ ایک صاحب شریعت پیغمبر کے بعد دوسرا صاحب شریعت نبی اس وقت مبعوث ہوا ہے جبکہ صراطِ مستقیم انسانی دست برد سے ایسا بدل گیا کہ اس کی اصلیت مشتبہ ہو گئی۔ حضرت ابراہیمؑ کی بتائی ہوئی صراطِ مستقیم کے گم ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰؑ تشریف لاتے ہیں۔

دعوتِ انبیاءؑ کا سب سے اہم رُکن

۱۰۶۔ یہ اللہ کی ہدایت ہے اس سے وہ سرفراز فرماتا ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اور اگر وہ شرک کرتے تو ان کا سارا کیا دھرا اکارت ہو کر رہ جاتا۔ یعنی خالص توحید اور معرفت اور اطاعتِ خداوندی کا راستہ وہی ہے جس پر حق تعالیٰ اپنے فضل و توفیق سے مقبول بندوں کو چلاتا ہے۔ پھر اس کے صلہ میں حسب استعداد درجات بلند کرتا ہے اور اس کے مقابلہ میں شرک انسان کے تمام اعمال کو حبط کر دیتا ہے اور کسی کی تو حقیقت کیا ہے اگر بفرضِ محال انبیاءؑ مقربین سے معاذاللہ ایسی حرکت سرزد ہو جاتے تو سارا کیا دھرا اکارت ہو جاتا۔[1]

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نبوت کی راہ سے آئے ہوئے علم و عمل کو قرآن صراطِ مستقیم کہتا ہے اور اسی کو وہ ھدی اللہ کہتا ہے۔ اس کی سب سے بڑی خصوصیت توحید ہے۔ اللہ سبحانہٗ کے بارے میں عقیدہ اور عبد و معبود کے باہمی تعلق کی تصحیح اور صرف ایک کی بندگی کی دعوت ہر زمانہ اور ہر ماحول میں انبیاءؑ علیہم السلام کی پہلی دعوت اور ان کا سب سے بڑا اور اہم مقصد رہا ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہمیشہ ان کی تعلیم بھی رہی ہے کہ اللہ ہی نفع و نقصان پہنچانے کی طاقت رکھتا ہے۔ اور صرف وہی عبادت دعا، نذر اور قربانی کا مستحق ہے۔ اللہ سبحانہ کی تمام صفات میں صفت توحید ایک خاص اور امتیازی حیثیت رکھتی ہے جس طرح پورے اسلام اور اللہ کی صراط مستقیم کی جان اس کے عقائد ہیں، اسی طرح ان عقائد کی جان توحید و یقین ہے۔ اگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہوگا کہ یہ صفت دراصل دوسری تمام صفات ہی کا نقطہ کمال ہے اس لیے صرف یہ ایک صفت فی الواقع ساری صفات کی نمائندگی اور قائمقامی کرتی ہے جس نے شعور و یقین کے ساتھ کہہ دیا کہ اللہ ہی معبود ہے۔ اس نے فی الواقع اللہ تعالیٰ کی ساری صفتوں پر علم الیقین رکھنے کا اعلان کر دیا۔ صفت توحید کی اس ممتاز اور جامع حیثیت کو اگر سامنے رکھا جائے تو ضروری نہیں رہ جاتا کہ ساری صفتوں کے تقاضے بیان کرے اور ان میں سے ہر ایک کے متعلق الگ الگ گفتگو کی جاتے اس کے بجائے صرف اسی ایک صفت کے تقاضوں کا سامنے آجانا کافی ہوگا اس لیے گفتگو ان تقاضوں تک محدود رہے گی۔ قرآن میں حضرت ابراہیم، حضرت نوح اور دوسرے انبیاء کی تقریریں بتاتی ہیں کہ عقیدۂ توحید کے اہم اور بنیادی تقاضے یہ ہیں۔

۱۔ صرف اللہ ہی ہے جس کی رضا جوئی کی انسان کو فکر کرنی چاہیے۔ یہی اس کے سارے کاموں کا اصل محرک بھی ہونا چاہیے اور اصل مقصد بھی۔

۲۔ سارے اعمال و حرکات صرف اسی کے لیے مخصوص رکھنے چاہئیں جو اپنی حقیقت یا اپنی صورت کے اعتبار سے پرستش کی قسم کے ہوں۔ سجدہ صرف اسی کو کیا جا سکتا ہے۔ نذر صرف اسی کے نام کی مانی جا سکتی ہے۔ دعا صرف اسی سے کی جا سکتی ہے، نادیدہ پناہ صرف اسی کی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ غیبی امداد کے لیے صرف اسی کو پکارا جا سکتا ہے۔

۳۔ وہ جذبات اور احساسات بھی اللہ ہی کے لیے خاص کر دینے چاہئیں جن کے اندر بندگی کی روح پائی جاتی ہو، توکل صرف اسی پر کیا جائے، امیدیں صرف اسی سے وابستہ کی جائیں، تقویٰ صرف اسی کا اختیار کیا جائے۔ خوف صرف اسی کا رکھا جائے۔ حقیقی محبت صرف اسی سے کی جائے۔

۴۔ اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر معبودیت کی شان رکھتا ہو، جو پوجے جانے کا مستحق ہو جس کی رضا چاہی جائے۔ کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں، نذریں پیش کی جائیں، اعتراف نعمت کیا جائے۔ کوئی اور نہیں جسے ولی اور کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے کوئی اور نہیں جس پر توکل کیا جائے۔ دل میں جس کا خوف اور تقویٰ رکھا جائے جس سے امیدیں

وابستہ کی جائیں اور جس سے حقیقی محبت رکھی جائے کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا ذرہ بھی ہو۔

توحید کے یہ بنیادی تقاضے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا انکار بھی توحید پر ایمان کے دعویٰ کو بے معنی بنا دیتا ہے۔

توحید کے اسی جامع تصور کو قرآن نے یہاں ھدی اللہ سے تعبیر کیا ہے یعنی جیسے پہلی آیت میں صراط مستقیم فرمایا تھا اسی کو یہاں ھدی اللہ فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ صراط مستقیم ہی اللہ کی ہدایت ہے باقی اس کے سوا جتنی راہیں ہیں سب شیطان کی نکالی ہوئی ہیں۔

توحید کے جامع تصور کے ساتھ یہاں تصویر کا دوسرا رخ بھی بیان کر دیا۔ ولو اشرکوا لحبط عنھم ما کانوا یعملون۔ شرک کے معنے ساجھے پن کے ہیں اور اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساجھی ٹھہرایا جائے۔ اس کی موجودگی میں توحید کا اسلامی عقیدہ باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے قرآن نے شرک کو سب سے بڑا ظلم قرار دیا ہے اور اسی لیے یہاں فرمایا کہ جس شرک میں تم مبتلا ہو اگر بالفرض کہیں یہ ارباب ہدایت بھی مبتلا ہو جاتے تو وہ بھی ان مراتب پر فائز نہ ہوتے ممکن تھا کہ کوئی شخص کامیاب ڈاکہ زنی کرکے فاتح کی حیثیت سے دنیا میں شہرت پالیتا یا زر پرستی میں کمال پیدا کرکے قارون کا سا نام پیدا کر لیتا یا کسی اور صورت میں دنیا کے بدکاروں میں نام ور بدکار بن جاتا۔ لیکن یہ امام ہدایت اور امام المتقین ہونے کا شرف اور یہ دنیا کے لیے خیر و صلاح کے سرچشمہ ہونے کا مقام تو کوئی بھی نہ پا سکتا۔ اگر شرک سے مجتنب اور خالص خدا پرستی کی راہ پر ثابت قدم نہ ہوتے[1]۔ اس میں قرآن نے اپنے مخاطبوں کو تنبیہ کی ہے۔ مخاطب قریش بھی ہیں اور بنی اسرائیل بھی کہ توحید سے منحرف ہو کر جو لوگ پھر اس نسبت پر برگزیدگی کے خواب دیکھ رہے ہیں جو انہیں حضرت ابراہیم کی اولاد ہونے کی وجہ سے حاصل ہے وہ نری حماقت میں مبتلا ہیں۔ تم تو در کنار اگر وہ بھی بفرض محال شرک میں آلودہ ہو جاتے تو ان کے اعمال بھی اکارت ہو کر رہ جاتے۔ اس آیت سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہو گئی کہ شرک سے زندگی کے سارے نیک اعمال رائیگاں ہو جاتے ہیں۔ یعنی کسی قسم کی کوئی نیکی قبول نہیں کی جاتی۔

---

[1] تفہیم القرآن

واضح رہے کہ شرک وکفر تو سب کے نزدیک حقیقتہً حبطِ عمل کا موجب ہیں لیکن کبیرہ گناہوں کے حبطِ عمل کے مفہوم میں ذرا اختلاف ہے ۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ پارہ ۱۶ میں آئے گی ۔

انبیا انسانیت کے کامل ترین نمونے ہیں

۱۰۷ – یہ لوگ ہیں جن کو ہم نے کتاب ، شریعت اور نبوت عطا کی ہے تو اگر لوگ اس کا انکار کردیں گے تو کوئی پرواہ نہیں ہے ہم نے اس کے لیے ایسے لوگ مامور کردیے ہیں جو اس کے منکر نہیں ہیں ۔ اگر مکہ کے کافر یا دوسرے منکرین ان باتوں یعنی کتاب ، شریعت اور نبوت کا انکار کردیں گے تو خدا کا دین ان پر موقوف نہیں ہے ۔ ہم نے دوسری قوم یعنی مہاجرین و انصار اور ان کے اتباع کو ان چیزوں کی تسلیم قبول اور حفاظت و ترویج کے لیے مسلط فرمادیا ہے جو ہماری کسی بات سے بھی منہ موڑنے والے نہیں ہیں[1] مطلب یہ ہے کہ اگر یہ کافر و مشرک لوگ اللہ کی اس ہدایت کو قبول کرنے سے انکار کرتے ہیں تو کردیں ہم نے اہل ایمان کا ایک ایسا گروہ پیدا کردیا ہے جو اس نعمت کا قدر کرنے والا ہے[2] ھٰؤلاء سے اشارہ اہل مکہ کی طرف ہے ۔ منشا یہ ہے کہ اگر یہ اہل مکہ اس نعمت کی قدر نہیں کرتے تو اے اللہ کے پیغمبر آپ اس کی پرواہ نہ کریں کیونکہ ہم نے ایسے لوگوں کو اس کی ذمہ داری اٹھانے کے لیے مقرر کردیا ہے جو اس کا انکار کرنے والے نہیں ہیں ۔ وکلنا توکیل سے ہے اس میں ذمہ دار بنائے جانے کے ساتھ ساتھ حفاظت کا مفہوم بھی ہے اور قوماً سے مراد یہاں صحابہ کی وہ جماعت بھی ہے جو اب تک حلقہ بگوش اسلام ہوچکی تھی اور وہ بھی جو آئندہ ہونے والے ہیں ۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اس فقرے میں اگر ایک طرف صحابہ کی استقامت کی طرف اشارہ ہے تو دوسری طرف مستقبل میں اسلام کے غلبے کی پیش گوئی ہے ۔

اس آیت میں انبیا علیہم السلام کو تین چیزوں کے عطا کیے جانے کا ذکر کیا گیا ہے ۔ ایک کتاب یعنی اللہ کا ہدایت نامہ ، دوسرے حکم یعنی اس ہدایت نامہ کا صحیح فہم اور اس کے اصولوں کو معاملات زندگی پر منطبق کرنے کی صلاحیت اور مسائل حیات میں فیصلہ کن رائے قائم کرنے کی خداداد قابلیت ، تیسرے نبوت یعنی یہ منصب کہ وہ اس ہدایت نامہ کے مطابق خلق اللہ کی رہنمائی کریں ۔ حکم کے معنے عربی لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں ۔ یعنی ہدایت الہٰی کی روشنی میں نبوت جو فیصلہ کرتی ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

اسے حکم کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں:

حکم کے معنے کسی چیز کا فیصلہ کرنا کہ یہ چیز ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسروں کو پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے:

حکم کے معنے علم، سمجھ، فقہ اور منصفانہ فیصلہ کرنے کے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ حکم کے معنے اس فیصلہ کے ہیں جو نبوت پیش یا افتادہ مسائل کے بارے میں وحی الٰہی کی روشنی میں کرتی ہے۔ اسی لیے ہم نے یہاں حکم کے معنے شریعت کے کیے ہیں کیونکہ شریعت نام ہی ان فیصلوں کا ہے۔

وحدتِ دین کا اعلان

۱۰۸ - یہی لوگ ہیں جن کو اللہ نے ہدایت بخشی ہے تم بھی ان کے طریقے پر چلو، اعلان کر دو کہ میں اس پر تم سے کسی صلہ کا طالب نہیں ہوں یہ تو بس تمام جہانوں کے لیے ایک یاد دہانی ہے۔ تمام انبیا علیہم السلام عقائد، اصول دین اور مقاصد کلیہ میں متحد ہیں۔ سب کا دستور اساسی ایک ہے ہر نبی کو اسی پر چلنے کا حکم ہے۔ آپ بھی اسی طریق پر چلتے رہنے کے مامور ہیں۔ گویا اس آیت میں متنبہ کر دیا کہ اصولی طور پر آپ کا راستہ انبیائے سابقین کے راستہ سے جدا نہیں۔ رہا فروع کا اختلاف وہ ہر زمانہ کی مناسبت واستعداد کے اعتبار سے پہلے بھی واقع ہوتا رہا ہے اور اب بھی واقع ہو تو مضائقہ نہیں۔ علماء اصول نے اس آیت کے عموم سے یہ مسئلہ نکالا ہے کہ اگر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کسی معاملہ میں شرائع سابقہ کا ذکر فرمائیں۔ تو وہ اس امت کے حق میں بھی سند ہے۔ بشرطیکہ شارع نے اس پر کلی یا جزئی طور پر انکار نہ فرمایا ہو[1]

یہ آیت قرآنی مہمات معارف میں سے ہے اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ جن کو اللہ نے ہدایت دی ہے وہ یہی لوگ ہیں جن کا پہلے ذکر ہوا ہے اور جن کو اللہ نے کتاب، حکم اور نبوت سے سرفراز فرمایا ہے آپ بھی ان کی اقتدا کریں، ان کے نقش قدم پر چلیں۔ اصل ارشاد میں فبھداھم اقتدہ آیا ہے۔ اقتداء کے معنے لغت میں اس شخص کے طریقہ پر چلنے کے ہیں جس کو قدوہ اور اتباع کے لیے نمونہ بنا لیا جائے۔ اگر لغت میں اقتداء کے معنے یہی ہیں تو یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ حضور انور کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان انبیاء کی اقتداء کرنے کا کس چیز میں حکم ہو رہا ہے۔ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ آپ کو اصول دین میں اقتدار کا حکم ہوا ہے لیکن اصول دین اور عقائد تو قرآن عزیز میں دوسرے ادیان کے مقابلہ میں کامل ترین وضاحت کے ساتھ بیان ہوئے ہیں اور ان مسائل میں جو تکمیل شاہکار قرآن نے پیش کیا ہے وہ دوسرے انبیاء کی کتب میں نہیں ہے اس لیے یہ بات کچھ جچی کو نہیں لگتی کہ وہ ذات گرامی جو دین کے اصول و عقائد میں کمال کی علمبردار ہو کر آئی ہے اس سے یہ کہا جائے کہ ان میں اپنے پیشروؤں کی اقتدار کرو۔ جبکہ ہم زبان نبوت سے یہ اعلان بھی کر رہے ہیں کہ لو کان موسیٰ حیاً ما وسعہ الا اتباعی، اگر موسیٰ علیہ السلام بقید حیات ہوتے تو ان کو بھی میری اتباع کے بغیر چارہ نہ تھا۔ اصل میں مطلب یہ ہے کہ جن ۱۸ انبیاء کے نام بتائے گئے اور جن کو اللہ نے کتاب، حکم اور نبوت سے سرفراز فرمایا ہے اللہ کے پیغمبر اللہ کے دین کو لوگوں تک پہنچاتے ہیں، دین کو دعوت اقامت حجت اور مخاطبوں کی تکذیب پر صبر کرتے ہیں، ان انبیاء کے سابقین کی سیرت عملی کو اپنائیے اور اس راہ میں ان کی عملی سیرت کی ساری خوبیاں سمیٹ لیجئے مثلاً نوح، ابراہیم اور آل داؤد کا شکر، یوسف، ایوب، اسماعیل کا صبر، زکریا، یحییٰ، عیسیٰ اور الیاس کی قناعت اور موسیٰ و ہارون کی ہمت اور شجاعت کو راہ دعوت میں اپنائیے۔ ان میں سے ہر پیغمبر کی اللہ نے رہنمائی کی اور ہر ایک کے درجات بلند کیے ہیں اور پھر رفع درجات میں باہم فرق مراتب قائم کیا ہے۔ ان سب کی سیرت کی خوبیوں کو ایک ایک کرکے آپ اپنالیں آپ کا مقام ان سے بالا ہوگا۔

امام رازی نے یہاں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ علماء کے نزدیک یہ آیت اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی تمام انبیاء سے افضل، اعلیٰ اور برتر ہے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے۔ شرف و مجد کی ساری خوبیاں اور خصال کمال اگر سب میں الگ الگ ہو کر موجود ہیں، داؤد و سلیمان اگر نعمت پر صفت شکر کا نمونہ ہیں تو ایوب بلاؤں میں صبر کی مثال ہیں۔ یوسف میں صبر و شکر یکجا ہے تو موسیٰ علیہ السلام قانون کی سنگینی کے علمبردار ہیں۔ زکریا، یحییٰ، اور الیاس زہد و تقویٰ کی تصاویر ہیں تو یونس و اسماعیل گریہ و زاری میں اور صداقت و راستی کے پیکر ہیں۔ ان سب کی بنیادی حیثیت کو بیان کرکے اللہ سبحانہٗ کا یہ ارشاد فبھداھم اقتدہ، اس بات کی کھلی دلیل ہے کہ آپ کو حکم ہو رہا ہے کہ عبودیت و طاعت کی ساری خوبیاں اپنے اندر پیدا کیجئے۔ معلوم ہوا کہ آپ کی ذات تمام صفات کمال کی جامع ہے اور اس شان جامعیت کی وجہ سے آپ سب سے افضل ہیں۔

آخر میں فرمایا کہ لوگوں سے کہہ دو میں اس پر تم سے کوئی معاوضہ نہیں لیتا ہوں اگر قبول کروگے تو تمہارا فائدہ ہے رد کروگے تو تمہارا ہی نقصان ہے۔ یہ دین کی دعوت ہے کوئی کاروبار نہیں ہے یہ قرآن جس کی میں دعوت لے کر آیا ہوں بلاتمیز پوری کائنات کے لیے ایک تذکیر اور یاد دہانی ہے میرا کام صرف تذکیر ہے اور بس۔

وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖٓ اِذْ قَالُوْا مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى بَشَرٍ مِّنْ شَيْءٍ ؕ
قُلْ مَنْ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ الَّذِيْ جَآءَ بِهٖ مُوْسٰى نُوْرًا وَّهُدًى لِّلنَّاسِ
تَجْعَلُوْنَهٗ قَرَاطِيْسَ تُبْدُوْنَهَا وَتُخْفُوْنَ كَثِيْرًا ۚ وَعُلِّمْتُمْ مَّا لَمْ
تَعْلَمُوْٓا اَنْتُمْ وَلَآ اٰبَآؤُكُمْ ؕ قُلِ اللّٰهُ ۙ ثُمَّ ذَرْهُمْ فِيْ خَوْضِهِمْ
يَلْعَبُوْنَ ۝ وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ مُّصَدِّقُ الَّذِيْ بَيْنَ
يَدَيْهِ وَلِتُنْذِرَ اُمَّ الْقُرٰى وَمَنْ حَوْلَهَا ؕ وَالَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ
بِالْاٰخِرَةِ يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَهُمْ عَلٰى صَلَاتِهِمْ يُحَافِظُوْنَ ۝

اور انہوں نے اللہ کی کوئی قدر نہیں پہچانی جبکہ انہوں نے
کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری[109]۔ ان سے
کہو وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ روشنی اور لوگوں
کے لیے ہدایت کی حیثیت سے لے کر آئے جس کو تم
ورق ورق کر کے کچھ ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے

ہو اور تم کو ان چیزوں کی تعلیم دی گئی جن کو تم نہیں جانتے
تھے اور نہ تمہارے باپ دادا"۔ کہہ دو اللہ ہی نے، پھر ان
کو ان کی کج بحثوں میں چھوڑ دو کھیلتے رہیں"۔ اور یہ ایک کتاب
ہے جو ہم نے اتاری بابرکت تصدیق کرنے والی اپنے سے
پہلی چیز کی[112]۔ اور تاکہ تم آگاہ کرو اُم القریٰ اور اس کے
اردگرد والوں کو[113]، اور جو آخرت پر یقین رکھتے ہیں، وہی اس
پر ایمان لائیں گے اور وہی اپنی نماز کی حفاظت کرتے
ہیں[114]۔

ہدایت کا واحد ذریعہ محمد رسول اللہ ہیں

حضرت ابراہیم کے واقعات کے ضمن میں حضرت ابراہیم کی اولاد کی نبوت و رسالت کا ذکر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کو بیان کرنے کے لیے بطور تمہید پیش کیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ محمد رسول اللہ سے وہی کہا گیا ہے جو پہلے پیغمبروں سے کہا گیا ہے۔ ان معنوں میں آپ کی دعوت کوئی نئی دعوت نہیں ہے بلکہ یہ ان ہی انبیاؑ کی دعوت کا تکرار ہے۔ اگر فرق ہے تو صرف یہ کہ پہلی ساری دعوتیں مقامی اور ملکی تھیں اور آپ کی دعوت بین الاقوامی اور پوری انسانیت کے لیے ہے اور آپ کی ذات ان سب نبیوں کے اوصاف و خصائل کی جامع بن کر تشریف لائی۔ نوح کا جوش تبلیغ،

ابراہیم کا ولولہ توحید، اسحاق و اسماعیل کا ایثار، موسیٰ کی سعی و کوشش، ہارون کی رفاقتِ حق، یعقوب کی خوئے تسلیم، داؤد کا غربت حق پر ماتم، سلیمان کا سرود حکمت، زکریا کی عبادت، یحییٰ کی عفت، عیسیٰ کا زہد، یونس کا اعتراف قصور، لوط کی جانفشانی، ایوب کا صبر سب کچھ بیک وقت آپ کی ذاتِ مبارک میں موجود تھا اور آپ کے مرقع حیات میں یہ سارے نقش و نگار عملاً نمایاں تھے اور یہ اس لیے کہ آپ کی ذات گرامی دُنیا کے لیے آخری پیغمبر بنا کر روانہ کی گئی، آپ کے بعد کوئی دوسرا آنے والا نہ تھا آپ ایسی کتاب لے کر آئے جو کامل ہے جس کی تکمیل کے لیے پھر کسی دوسرے کو نہ آنا تھا۔ آپ کی تعلیم دائمی وجود رکھنے والی ہے یعنی قیامت تک اس کو زندہ رہنا ہے اس لیے آپ کی ذات مبارک کو مجموعہ کمال بنا کر روانہ کیا گیا۔ اسی لیے اب روئے سخن منکرین توحید سے ہٹ کر منکرین نبوت کی طرف ہو گیا اور ان لوگوں کا رد کیا ہے جو وحی و کتاب کے نزول پر تعجب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ خدا کی طرف سے کوئی کتاب کسی انسان پر نازل نہیں ہوئی یہ محض دعویٰ ہی دعویٰ ہے۔

منکرین تنزیل دو طرح کے تھے۔ پہلا گروہ علماء اہل کتاب سے تعلق رکھتا تھا۔ یہ لوگ اگرچہ فی الواقع وحی و تنزیل کے منکر نہ تھے لیکن تعصب اور نفسانیت کی وجہ سے نزول قرآن پر اظہارِ تعجب کرتے تھے اور کہتے کہ خدا کا کلام کبھی اس طرح نازل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ عرب میں یہی لوگ پڑھے لکھے اور باخبر سمجھے جاتے تھے اس لیے مشرک بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتے تھے۔ دوسرا گروہ فی الواقع وحی و نبوت کا منکر تھا۔ یہاں پہلے علماء اہل کتاب کو الزامی جواب دیا ہے۔ اگر خدا اپنا کلام نازل نہیں کرتا تو حضرت موسیٰ پر تورات کس نے نازل کی پھر فرمایا کہ یہ کلام حق جو نازل ہوا ہے مکہ کے شہریوں کو برائیوں سے روکتا ہے، نیکیوں کی دعوت دیتا ہے اور اپنی دعوت سے اس نے ایسی جماعت پیدا کر دی ہے جو عبادتِ الٰہی میں ثابت قدم ہے۔

۱۰۹ — اور انھوں نے اللہ کی کوئی قدر نہیں کی جبکہ انھوں نے کہا کہ اللہ نے کسی بشر پر کوئی چیز نہیں اتاری۔ پچھلے رکوع میں منصب نبوت اور بہت سے انبیاء علیہم السلام کا نام بنام تذکرہ تھا اور یہ کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم بھی توحید و معرفت کی اسی صراط مستقیم پر چلتے رہنے کے مامور ہیں جس پر انبیاء سابقین کو چلایا گیا تھا۔ پیغمبروں کا ہدایت خلق کے لیے بھیجنا حق تعالیٰ کی قدیم عادت رہی۔ آیاتِ حاضرہ میں ان جاہلوں اور معاندوں کا رد کیا گیا ہے جو بدفہمی، جہل و بغاوت یا نبی کریم کی عداوت کے جوش اور غصہ میں بے قابو ہو کر حق تعالیٰ کی اس صفت ہی کا انکار کرنے لگے کہ وہ کسی انسان کو اپنی وحی و مکالمہ خاص سے شرف فرمائے۔ گویا انزال کتب و ارسال رسل کے

سلسلے ہی کی سرے سے نفی کر دی گئی ہے[1]

یہ آیت بتا رہی ہے کہ نبوت اور وحی سے الگ ہو کر اللہ کی ذات اور اس کی حقیقی صفات کی معرفت حاصل نہیں ہوتی۔ اللہ کی صحیح معرفت کا جس میں نہ جہالت و گمراہی کا شائبہ ہو نہ غلط فہمی یا غیر مناسب انداز بیان کا شبہ واحد وسیلہ نبوت اور وحی ہے۔ اور اس کے بتائے ہوئے طریقوں کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے وہ معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ نہ تنہا عقل رہنمائی کر سکتی ہے نہ ذہن کی تیزی و ذکاوت کافی ہو سکتی ہے نہ فطرت کی سلامتی اس کا ذریعہ ہو سکتی ہے نہ ذہن کی بلند پروازی کی وہاں گزر ہو سکتی ہے۔ نہ عقل و خرد کی کاوشیں اس تک پہنچا سکتی ہیں نہ تجربات کا خزانہ ہی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

صرف نبوت اور وحی کے ذریعے یہ ممکن ہے کہ اللہ کی معرفت حاصل ہو اور اس کی مرضی اور احکام معلوم کریں۔

یہ آیت اس بات کی واضح اور صاف دلیل ہے کہ نبوت و وحی کا وجود ظہور اللہ کی صفات ربوبیت و رحمت کا ناگزیر تقاضا ہے۔ جو لوگ وحی و نبوت کے منکر ہیں وہ نہیں جانتے کہ جس کی ربوبیت و رحمت نے انسان کی پروردگاری کا ایسا نظام قائم رکھا کیا ممکن ہے کہ اس نے انسان کی روحانی فلاح و سعادت کے لیے کوئی قانون کوئی نظام کوئی قاعدہ مقرر نہ کیا ہو۔ جس طرح انسانی جسم کی ضرورتیں ہیں اسی روح انسانی کی بھی ضرورتیں ہیں۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جسم کی نشوونما کے لیے تو اس کے پاس سب کچھ ہو لیکن رُوح کی نشوونما کے لیے اس کے پاس کوئی پروردگاری نہ ہو۔

اگر وہ رب العالمین ہے اور اس کی ربوبیت کے فیضان کا حال یہ ہے کہ ہر ذرہ کے لیے سیرابی اور ہر چیونٹی کے لیے کارسازی رکھتی ہے تو کیوں کر باور کیا جا سکتا ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کے لیے اس کے پاس کوئی نظم نہ ہو، حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں یہ بات خوب لکھی ہے کہ،

اللہ کی ذات گرامی انسانی جسم کی پرورش کے لیے تو آسمان سے پانی برسائے لیکن ارواح انسانی کی پرورش کے لیے اس کے پاس ایک قطرہ بھی نہ ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ جب زمین شادابی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے تو اللہ کا قانون ہے کہ باران رحمت نمودار ہوتی ہے اور زندگی کی برکتوں سے زمین کے ایک ایک ذرے کو مالامال کر دیتی ہے۔ پھر کیا ضروری نہیں ہے کہ جب عالم انسانیت ہدایت و سعادت کی شادابیوں سے محروم ہو جاتے تو اس کی باران رحمت نمودار ہو کر ایک ایک روح کو پیام زندگی

[1] افادات شیخ الاسلام

پہنچائے ، روحانی سعادت کی اسی بارش کا نام نبوت اور وحی ہے ۔ فی الواقع منکرین نبوت کو اللہ کی معرفت حاصل نہیں اور اللہ کے قدر شناس نہیں ہیں ۔ ماقدروا اللہ حق قدرہ ۔ میں قرآن نے انہی لوگوں کا چہرہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ لوگ نہ خدا کی صفتوں سے آشنا ہیں اور نہ اس کی عنایات سے باخبر ہیں جو کہتے ہیں کہ ما انزل اللہ علی بشر من شیئ ۔

منکرین نبوت کو الزامی جواب

۱۱۰ ۔ ان سے کہہ دو کہ وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ روشنی اور لوگوں کے لیے ہدایت کی حیثیت سے لے کر آئے جس کو تم ورق ورق کرکے کچھ ظاہر کرتے ہو اور زیادہ کو چھپاتے ہو ، اور تم کو ان چیزوں کی تعلیم دی گئی ہے جن کو نہ تم جانتے تھے اور نہ تمہارے باپ دادا ۔ یعنی اگر واقعی خدا نے انسان پر کوئی چیز نہیں اتاری تو تورات مقدس جیسی عظیم الشان کتاب جو احکام و مرضیات الٰہیہ پر بندوں کو مطلع کرتی اور رشد و ہدایت کی عجیب و غریب روشنی اپنے اندر رکھتی اور ان چیزوں کا علم عطا کرتی تھی جنہیں تم اور تمہارے باپ دادا بلکہ کل بنی آدم بھی بدون اعلام الٰہی محض اپنی عقل و حواس سے دریافت نہیں کر سکتے تھے وہ کہاں سے آگئی اور موسیٰ علیہ السلام پر کس نے اتاری ۔ مانا کہ آج تم اسے ورق ورق اور ٹکڑے ٹکڑے کرکے لوگوں کو اپنی خواہش کے موافق دکھلاتے اور اس کے بہت سے احکام و اخبار کو چھپاتے ہوئے ہو اور اس طرح اس کی اصل روشنی تم نے باقی نہیں چھوڑی ہے تاہم جو حصہ آج باقی رہ گیا ہے وہ ہی پتہ دے رہا ہے کہ جس محل کے یہ کھنڈرات ہیں وہ اپنے زمانہ عروج میں کیا عظیم الشان ہوگا[1] ۔

یہ اس بات کا کہ ” خدا نے انسان پر کچھ نہیں اتارا “ الزامی جواب ہے کہ اگر خدا نے کچھ نہیں اتارا تو یہ بتائیں کہ وہ کتاب کس نے اتاری جس کو موسیٰ علیہ السلام لے کر آتے اور جو لوگوں کے لیے ہدایت اور روشنی بن کر نازل ہوئی ، اس کے بعد تجعلونہ قراطیس تبدونھا و تخفون کثیرا فرمایا اس میں دو قراتیں ہیں ایک تو وہی ہے جو آپ قرآن میں پڑھتے ہیں ۔ دوسری قرات وہ ہے جو ابن کثیر اور ابو عمرو نے اپنائی ہے یعنی یجعلونہ قراطیس یبدونھا و یخفون کثیرا ” پہلی بصیغہ خطاب ہے اور دوسری بصیغہ غائب ہے ۔ اسی لیے شارحین کا اس کے مطلب اور مصداق میں اختلاف ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بلکہ کچھ اکابر نے تو اسے مشکلات میں قرار دیا ہے۔ جن لوگوں نے اسے بصیغہ خطاب پڑھا ہے انہوں نے اس کا مصداق یہودیوں کو قرار دیا ہے۔ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ اگر سورۃ انعام مکی ہے تو یہودی کیوں کر مخاطب ہوسکتے ہیں؟ اس شبہ کی گرفت سے بچنے کے لیے کچھ نے صاف کہہ دیا ہے کہ سورہ انعام اگرچہ مکی ہے لیکن یہ آیت مکی نہیں بلکہ مدنی ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ سورہ انعام کی یہ آیت بھی مکی ہے لیکن چونکہ کفار قریش اور دوسرے مشرکین عرب حضور کے دعویٰ رسالت کی تحقیق کے لیے علماء یہود کی طرف رجوع کرتے تھے اور ان سے دریافت کرتے تھے کہ تم اہل کتاب ہو بتاؤ کہ کیا واقعی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دعویٰ وحی میں سچے ہیں پھر ان کے جواب کی لوگوں میں تشہیر کرتے اس لیے یہاں یہودیوں کے اس قول کو جسے مشرکین مکہ نے حجت بنا رکھا تھا نقل کرکے اس کا جواب دیا ہے لیکن حافظ ابن جریر نے عام شارحین سے علیحدہ یہ تشریح کی ہے کہ گفتگو قریش سے ہو رہی ہے اس سورت میں یہود کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ بات کہ اللہ نے انسان پر کچھ نازل نہیں کیا۔ مشرکین کی بات ہے یہودیوں کی بات نہیں ہے۔ کیونکہ یہودی تو وحی و نبوت کے قائل ہیں۔ اور قرأت بصیغہ غائب زیادہ اچھی ہے مگر ابن جریر نے اس کی وجہ نہیں بتائی کہ اگر مشرکین سے خطاب ہے تو جواب میں حضرت موسیٰ کو بطور حجت کیوں پیش کیا گیا ہے جبکہ مشرکین حضرت موسیٰ کو نبی ہی نہیں مانتے۔ شارحین قرآن نے ابن جریر کی اس دلیل کا کہ یہودی جو خود تورات کو خدا کی طرف سے نازل شدہ کتاب مانتا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ خدا نے کسی بشر پر کچھ نازل نہیں کیا یہ جواب دیا ہے کہ ضد اور ہٹ دھرمی کی بنا پر بسا اوقات آدمی کسی دوسرے کی سچی باتوں کو رد کرنے کے لیے ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جن سے خود اس اپنی مسلم صداقتوں پر بھی زد پڑ جاتی ہے۔ یہ لوگ محمد رسول اللہ کی نبوت کو رد کرنے پر تلے ہوتے اور مخالفت کے جوش میں اس قدر اندھے ہو جاتے ہیں کہ حضور کی رسالت کی تردید کرتے کرتے خود نفس رسالت ہی سے ہاتھ دھو بیٹھتے۔

اصل بات یہ ہے کہ آپ اسی سورت کے آغاز میں پڑھ چکے ہیں۔ الذین اٰتینا ھم الکتاب یعرفونہ کما یعرفون ابناء ھم جن کو ہم نے کتاب دی ہے وہ اسے اپنے بیٹوں کی طرح پہچانتے ہیں۔

اور یہ تاریخ کی ایک بدیہی حقیقت ہے کہ مکہ میں جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی نبوت کا اعلان کیا تو کفار عرب کو آپ کے اس دعویٰ پر یقین نہیں آیا۔ اس لیے انہوں نے معجزات طلب کیے پھر ان کو خیال آیا کہ مدینہ، خیبر اور شام میں جاکر یہودیوں سے ملیں اور ان سے پوچھ کر

چند ایسے سوالات دریافت کریں جن کے جوابات محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے مانگے جائیں اس خیال کی بنا پر وہ یہودیوں سے جاکر ملتے ان سے آپ کے حالات بیان کرتے اور آپ سے پوچھنے کے لیے ان سے سوالات مانگتے تھے۔ جیسا کہ آپ پندرہویں جلد میں تین تاریخی سوالات کے بارے میں پڑھیں گے یعنی اصحاب کہف کا حال، حضرت موسیٰ اور خضر کی ملاقات کا واقعہ اور ذوالقرنین کا قصہ۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ تورات کا کتاب الٰہی ہونا، مشرکین مکہ کو معلوم تھا اسی لیے انہوں نے یہودی علماء کے پاس وفد روانہ کیا تھا۔ اس وفد کی سربراہی نضر بن الحارث اور عقبہ ابن معیط کر رہے تھے۔ اسی لیے یہاں یہودیوں کا ذکر آیا ہے بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ما انزل اللّٰہ علی بشر من شیئ کہنے والے مشرکین ہیں اور ان کا ہی یہاں ذکر کیا جا رہا ہے اور ان ہی سے الزاماً کہا جا رہا ہے کہ اگر انسان پر اللہ نے کچھ نازل نہیں کیا تو بتاؤ کہ موسیٰ پر تورات کس نے اتاری ہے جو واقع میں کفر و شرک کی ظلمتوں کو چاک کرنے والی خدائی روشنی تھی اور جو لوگوں کو ضلالت و گمراہی سے ہٹا کر ہدایت پر لگانے والی تھیں لیکن یہودیوں نے اس کتاب الٰہی کو ورق ورق بنا دیا ہے۔ اصل ارشاد میں قراطیس آیا ہے۔ یہ قرطاس کی جمع ہے قرطاس کے معنے ورق کے ہیں۔ شارحین قرآن نے تورات کو قراطیس بنانے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ یہود نے اس کو پارہ پارہ کر دیا تھا۔ الزمخشری نے لکھا ہے جعلوہ قراطیس مقطعۃ و ورقات متفرقۃ دراصل یہود نے تورات اس طرح جمع نہیں کی تھی جس شکل میں قرآن ہے بلکہ انہوں نے تورات کو مختلف اجزاء میں تقسیم کر لیا تھا اور ہر جز کو الگ قلم بند کیا تھا۔ اس طرح ان کو اس کے احکام کو چھپانے کا موقع آسانی سے مل جاتا تھا۔ جب ایک کتاب کے اجزاء الگ الگ کاپیوں کی صورت میں ہوں تو چھپانے میں بڑی آسانی ہوتی ہے اسی لیے یہاں قرآن نے بتایا ہے کہ تبدونہا وتخفون کثیراً، اس سے صاف طور پر معلوم ہو رہا ہے کہ یہود کے علماء نے اپنے مصالح کی خاطر کتاب الٰہی کا بیشتر حصہ لوگوں سے چھپا لیا تھا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ کتاب الٰہی پر ایک خاص گروہ کی اجارہ داری قائم تھی۔ احوال و ظروف میں آیات کا یہ کتمان اس نسیان اور کتاب فراموشی سے بالکل جدا اور علیحدہ چیز ہے جس کا قرآن نے فنسوا حظا مما ذکروا بہ میں ذکر کیا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ بات قریش سے کہی جا رہی ہے حافظ ابن کثیر نے عبداللہ ابن عباس، مجاہد اور عبد بن کثیر سے یہی بات نقل کی ہے اور حافظ ابن جریر کا بھی یہی مختار ہے اور ابن کثیر نے اسی کو اصح کہا ہے اس لیے صیغہ غائب والی قرأت زیادہ مناسب ہے۔ علامہ سید رشید رضا کی یہ نکتہ آفرینی قابل داد ہے کہ سورت مکی ہے اور یہ آیات بھی مکی ہیں۔ مکہ میں یہ آیت صیغہ غائب ہی سے پڑھی جاتی تھی۔ مدینہ میں آکر جب مسلمانوں کو یہودی علماء سے

کتمان آیات کا عمل تجربہ ہوا تو یہی آیت یہودیوں کو مخاطب بنا کر بصیغہ خطاب تلاوت کی گئی ہے۔ اس وضاحت سے سارے اشکالات حل ہو جاتے ہیں۔ آخر میں فرمایا ہے وعلمتم ما لم تعلموا انتم ولا اباؤکم امام مجاہد فرماتے ہیں کہ اس کے مخاطب مشرکین مکہ ہیں۔ یعنی تم پر یہ اللہ کا احسان عظیم ہے کہ تم کو وہ باتیں سکھائی گئی ہیں جن کا علم نہ تم کو تھا اور نہ تمہارے باپ دادا کو۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ان تمام احسانات سے واقف ہوتے ہوئے اگر کہتے ہو ما انزل اللہ الخ تو یہ دیدہ دلیری کی انتہا ہے

نبوت کو جواب کی تلقین

۱۱۱۔ کہہ دو کہ اللہ ہی نے پھر ان کو ان کی بحثیوں میں چھوڑ دو کھیلتے رہیں۔ یعنی ایسا نور و ہدایت بجز خدا کے اور کس خزانے سے آ سکتا ہے۔ اگر ایسی صاف اور بدیہی چیز کو بھی یہ لوگ نہیں مانتے۔ تو آپ تبلیغ و تنبیہہ کر کے سبکدوش ہو جائیے اور ان کو چھوڑ دیجئے کہ یہ اپنی خرافات اور لہو و لعب میں لگے رہیں جب وقت آئے گا خدا ان کو خود ہی بتلائے گا[1] اس آیت میں اللہ فعل محذوف کا فاعل ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر تم ان کو جتا دو کہ کتاب تورات کا نازل کرنے والا اللہ ہے اور تبلیغ اور بیان حق کے بعد ان کی طرف سے نظر التفات کو ہٹا لیجئے۔ ان کو ان کی باطل پرستیوں میں لگا رہنے دیجئے۔ آپ کی ذمہ داری صرف بیان و تبلیغ ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔ حضور انور کو جواب دینے کے حکم میں اشارہ ملتا ہے کہ مخاطب کو نہ یارائے اقرار ہے اور نہ مجال انکار، انکار میں مکابرہ ہے اور اعتراف میں مغلوبیت کی رسوائی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سوال کا یہی اور صرف یہی جواب ہے۔ اور ایسا ظاہر ہے کہ جس کا کوئی انکار نہیں کر سکتا۔ انسان ہی پر خدا کا کلام نازل ہوتا رہا ہے اور اب بھی انسان ہی پر نازل ہو رہا ہے۔ دراصل مشرکین نے جس ذہنی تحفظ کے ساتھ ما انزل اللہ علی بشر من شیئ کہا ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ بشریت اور نبوت میں تنافی سمجھتے تھے وہ اس کے قائل ہی نہ تھے کہ ایک بشر خدا کا رسول ہو سکتا ہے۔ اسی کو وہ کبھی ابعث اللہ بشراً رسولاً کہتے اور کبھی ابشر یھدوننا کہتے۔

سبحان اللہ قرآن کی معجزانہ بلاغت کہ ایک لفظ اللہ کے اندر وہ سارے دفتر آ گئے جو انکار و سرکشی کی ان ساری صداؤں کے جواب میں کہے جا سکتے ہیں۔ قل اللہ کہہ دو اللہ نے موسیٰ پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کتاب نازل کی ہے اور تم مانتے ہو کہ موسیٰ بشر تھے، پھر میری نبوت کو کیوں نہیں مانتے ہو۔ دراصل وہ سمجھتے تھے کہ روحانی ہدایت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جو محض ایک انسان کے ذریعے ظاہر نہیں ہو سکتا ضروری ہے کہ انسان سے کوئی بالاتر ہستی ہو، اسی خیال نے دیوتاؤں کے ظہور اور ان کی عجائب آفرینیوں کا اعتقاد پیدا کیا ہے۔ ہر داعی کے منکروں نے یہ بات ضرور کہی ہے ما انزلت الا بشرا مثلنا، تم تو ہماری طرح کے بشر ہو پھر تم پر نزول وحی کیسے مان لیں۔ مشرکین مکہ بھی کہتے تھے ابشر یھدوننا؟

نبوتِ محمدیہ کی پہلی علمی دلیل

۱۱۲۔ اور یہ ایک کتاب ہے جو ہم نے اتاری ہے بابرکت ہے تصدیق کرنے والی ہے اپنے سے پہلی چیز کی۔ یعنی اگر خدا نے کوئی چیز نہیں اتاری تو یہ مبارک کتاب کہاں سے آئی جس کا نام قرآن ہے اور جو تمام پچھلی کتابوں کی تصدیق کرنے والی ہے۔ اگر یہ آسمانی کتاب نہیں تو بتلاؤ کس کی تصنیف ہے جس کا مثل لانے پر جن وانس قادر نہ ہوں کیا اسے ایک اُمّی تصنیف کر سکتا ہے [1] یہ بھی اسی الزامی جواب کا تتمہ ہے انسان پر خدا کا کلام نازل ہونے کے لیے پہلے الزاماً کہا تھا من انزل الکتاب حضرت موسیٰ پر نور و ہدایت پر مشتمل کتاب کس نے اتاری معلوم ہوا کہ بشر پر خدا کا کلام نازل ہو سکتا ہے اور نازل ہوا ہے اب یہ اسی کا تتمہ ہے کہ یہ کلام جو محمد رسول اللہ پر نازل ہوا ہے یہ خدا ہی کا کلام ہے۔ اس کے تعارف میں پہلے اس کے دو بنیادی وصف پیش کر کے اس کا مرتبہ و مقام بتایا اور بعد ازیں اس کے نزول کا مقصد بتایا۔

سب سے پہلا وصف یہ بتایا کہ یہ کتاب مبارک ہے۔ مبارک کا لفظ برکت سے بنا ہے۔ برکت کے معنے زیادتی، بڑھوتری، وسعت پہنائی، جماؤ استقرار کے آتے ہیں۔ یہ لفظ لا کر اس عالمگیر برکت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی بشارت حضرت ابراہیم کو دی گئی تھی کہ اس کا ظہور حضرت اسماعیل کی نسل سے پیدا ہونے والے نبی خاتم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے ہوگا۔ پیدائش ۲۲ میں ہے:

خداوند فرماتا ہے کہ تو نے ایسا کام کیا اور اپنا بیٹا اور اپنا اکلوتا ہی بیٹا دریغ

[1] افادات شیخ الاسلام

ذرکھا، میں نے قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا۔ . . . . اور تیری نسل سے زمین کی قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔

یہاں زمین کی ساری قوموں کے لیے جس برکت کی بشارت ہے وہ قرآن کے نزول اور حضور انور کی تشریف آوری سے پوری ہوئی۔ قرآن بڑی خیر و برکت والی کتاب ہے یعنی اس میں اصول عقائد کی مثالوں سے توضیح اور دلائل سے تائید ہے۔ اس میں ایک طرف اگر مکارم اخلاق اور فضائل آداب ہیں تو دوسری طرف عبادات و معاملات کے احکام ہیں۔ اس میں تمدن و تہذیب کا اگر اجتماعی ضابطہ ہے تو سیاست و حکومت کا شورائی نظام ہے۔ الغرض یہ کتاب الٰہی نہ صرف قانونی نظام ہے اور نہ محض اخلاقی ڈھانچہ بلکہ اس میں بیک وقت روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی تقاضوں کا جواب ہے۔ یعنی اس میں انسان کی جسمانی اور روحانی فلاح و بہبود کے بہترین اصول پیش کیے گئے ہیں عقائد صحیحہ کی تعلیم ہے، بھلائیوں کی ترغیب ہے، اخلاق فاضلہ کی تلقین ہے، پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی ہدایت ہے۔ قرآن نے اپنا یہی وصف چار بار دہرایا ہے۔ ایک مقام تو یہی ہے۔ اسی سورت کے آخر میں آرہا ہے،

هذا كتاب انزلناه مبارك فاتبعوه واتقوا

سورہ انبیاء میں ہے،

وهذا ذكر مبارك انزلناه افانتم له منكرون

سورہ ص میں ہے،

كتاب انزلناه اليك مبارك ليدبروا آياته

دوسری صفت قرآن حکیم کی یہ بتائی ہے کہ یہ اس چیز کی تصدیق کرتا ہے جو اس سے پہلے آئی تھی۔ یعنی اس سے پہلے خدا کی طرف سے جو ہدایت نامے آئے تھے یہ کتاب ان سے الگ ہٹ کر کوئی مختلف ہدایت پیش نہیں کرتی بلکہ اسی چیز کی تصدیق و تائید کرتی ہے جو ان میں پیش کی گئی تھی۔ مطلب یہ ہے کہ وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لیے جو کوئی قرآن کو قبول کرتا ہے وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کرتا ہے کیونکہ اس کی ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے، جھٹلاتی نہیں ہے اور جب قرآنی تعلیم دوسری تمام تعلیمات کی تصدیق کرتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان تمام تعلیمات کے اندر ایک ہی ثابت و قائم حقیقت ضرور کام کر رہی ہے کیونکہ اگر مختلف وقتوں، مختلف گوشوں، مختلف قوموں، مختلف ناموں،

مختلف پیرایوں اور مختلف زمانوں میں کوئی بات کہی گئی اور باوجود ان تمام اختلافات کے بات ہمیشہ ایک رہی ہو اور ایک ہی مقصد پر زور دیتی ہو تو قدرتی طور پر ماننا پڑے گا کہ اصل میں ایک ہی دین ہے جو تمام انبیاء کا مذہب رہا ہے لیکن وہ بعد کو ان کے پیروؤں کے صحائف میں تحریف و تصرف کی وجہ سے بگڑتا رہا۔ اسی دین ازلی کو لے کر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں اسی کا نام اسلام ہے جو اپنے صحیفہ کی بقاء و حفاظت، دین کی تکمیل اور نبوت کے تمام کے سبب سے ہمیشہ قائم اور باقی رہے گا۔ اگر تمام مذاہب سابقہ اپنے اپنے اصل دین پر آجائیں جس کی تعلیم ان کے پیغمبروں نے دی تھی تو وہی دین ازلی ہو گا جس کا نام اسلام ہے اور نوحی، ابراہیمی، موسوی، عیسوی اور محمدی میں سوائے اجمال و تفصیل کے کوئی فرق نہ رہے گا اسی لیے ارشاد ہوا ہے:-

یاایھاالذین اوتوالکتاب آمنوا بما نزلنامصدقالمامعکم

اسی حقیقت کی طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان الفاظ میں اشارہ فرمایا ہے،

تمام انبیاء ایسے بھائی ہیں جن کا باپ ایک ہے اور جن کی مائیں الگ الگ ہیں اور ان کا دین ایک ہے۔

یہاں سے یہ بات بھی بے نقاب ہو گئی کہ قرآن وحدت ادیان کا نہیں بلکہ وحدت دین کا علمبردار ہے۔ وحدت دین یہ ہے کہ سب نبیوں کا ایک ہی دین ہے جو از آدم تا محمد رسول اللہ مختلف زبانوں اور مختلف زمانوں میں اُترتا رہا ہے۔ اور وحدت ادیان یہ ہے کہ سارے موجود دینوں کو حق سمجھا جائے توحید کی راہ بھی صحیح ہو اور شرک کی راہ بھی، وہ دو خداؤں کے قائل کو بھی راست رو خیال کرے، اور تین خداؤں کے پرستار کو بھی، وہ وحی و رسالت پر ایمان رکھنے والوں کو بھی صراط مستقیم پر گامزن تصور کرے اور اس کے منکروں کو بھی) وہ حلول و اتحاد اور اوتار کے نظریات سے نفرت کرنے والوں کو بھی برسر حق مانے اور ان نظریات کے پیروؤں کو بھی، کیونکہ یہ سب ایک ہی منزل کے مسافر ہیں جو مختلف سمتوں سے سفر کر رہے ہیں۔ وحدت ادیان کا یہ تصور قرآن کا نہیں بلکہ لیتا اور اس کے بعد ان پڑھ صوفیوں کا ہے۔ قرآن میں بتایا گیا ہے کہ وہی ایک دین ہے جو نوح کو ابراہیم کو موسیٰ کو اور محمد رسول اللہ کو عطا کیا گیا ہے۔ اگلوں کے پچھلوں نے جن کو یہ کتاب ملی اپنی ذہنی تحریفات اور دستی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کیے ہیں اور اس کی ضد اور تعصبات سے فرقہ واری کی الگ الگ راہیں نکال لی ہیں۔ پھر ارشاد ہوتا ہے کہ اس وحدت دین کی حقیقت کا یقین اہل کتاب کو نہیں ہے حالانکہ وہ شکوک و شبہات کے دلدل میں پھنسے ہوئے ہیں۔ پھر حکم ہوتا ہے

کہ اے محمد رسول اللہ تم اس حقیقت کی طرف لوگوں کو بلاؤ اور استواری کے ساتھ اپنی اس دعوت اور دعویٰ پر قائم رہو اور یہ اعلان کر دو کہ میرا مسلک یہ ہے کہ خدا کی طرف سے جو کتاب بھی آئی ہے میں اس کی صداقت کو تسلیم کرتا ہوں۔

نزولِ قرآن کا مقصد

۱۱۳۔ اور تاکہ تم آگاہ کرو ام القریٰ اور اس کے اردگرد والوں کو۔ اُم القریٰ بستیوں کی اصل اور جڑ کو کہتے ہیں۔ مکہ معظمہ تمام عرب کا دینی و دنیوی مرجع تھا اور جغرافیائی اعتبار سے بھی قدیم دُنیا کے وسط میں مرکز کی طرح واقع ہے اور جدید دُنیا امریکہ اس کے پیچھے ہے۔ اور روایات حدیثیہ کے موافق پانی سے زمین بنائی گئی تو سب سے پہلے یہی جگہ نمودار ہوئی۔ ان وجوہ سے مکہ کو ام القریٰ کہا گیا اور آس پاس سے مراد یا عرب ہے کیونکہ دُنیا میں قرآن کے اولین مخاطب وہی تھے۔ ان کے ذریعے سے باقی دُنیا کو خطاب ہوا اور یا سارا جہان مراد ہو جیسے فرمایا لیکون للعالمین نذیرا[1]

مطلب یہ ہے کہ ہم نے قرآن کو اس مقصد کے لیے اتارا کہ تم اس کے ذریعے ام القریٰ اور اس کے اردگرد کے لوگوں کو اعمالِ بد کے نتائج سے آگاہ کرو اور بتاؤ کہ اگر انہوں نے اس کتاب کو اور آپ کی رسالت کو قبول نہ کیا تو اس کے نتائج سنگین ہوں گے۔ گویا اس کتاب الٰہی کا مقصد نزول بھی وہی ہے جو ہر زمانہ میں آسمانی کتابوں کا مقصد رہا ہے یعنی غفلت میں پڑے ہوئے لوگوں کو چونکانا اور کج روی کے انجام بد سے خبردار کرنا۔

شہر مکہ کو ام القریٰ کو کہا ہے۔ لفظی معنے تو وہی ہیں جو شیخ الاسلام نے بتائے ہیں۔ یعنی بستیوں کی جڑ، عربی میں اُم کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت رکھتی ہوں، یا بہت سی چیزوں میں مقدم اور نمایاں ہوں یا پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں۔ چنانچہ سر کے درمیانی حصے کو ام الراس کہتے ہیں کیونکہ وہ دماغ کا مرکز ہے، فوج کے جھنڈے کو ام کہتے ہیں کیونکہ تمام فوج اس کے نیچے جمع ہوتی ہے۔ مکہ کو ام القریٰ کہتے ہیں کیونکہ خانہ کعبہ اور حج کی وجہ سے عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی۔ علماء نے مکہ کو ام القریٰ کہنے کی اور وجوہ بھی بتائی ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ اس لیے کہ ساری اقلیموں کی روحانی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پرورش کا سامان یہیں سے ہوتا ہے ۔ بعض نے کہا اس لیے کہ قدیم جغرافیہ کے لحاظ سے یہ زمین کے عین وسط میں واقع تھا ۔ کسی نے کہا اس لیے کہ اس وقت حجاز خصوصاً اس کا یہ شہر تہذیبوں کا سنگم تھا یعنی اس کے ایک بازو میں مصری، رومی، یونانی تہذیب تھی اور دوسرے بازو میں کلدانی ایرانی اور ہندی تمدن، کسی نے کہا اس لیے کہ آج بھی دُنیا کے تین بڑا عظموں ایشیا، یورپ اور افریقہ کا مرراہ عین ساحل حجاز سے پھوٹتا ہے ۔

بہرحال اُم القریٰ مکہ کا نام ہے، حجاز کا دارالحکومت ہے اور یہ شہر ایک بوڑھے پیغمبر کی بنا ایک نوجوان پیغمبر حضرت اسماعیل کی ہجرت گاہ اور ایک دریتیم پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا مولد ہے ۔ سطح سمندر سے ۳۳۰ کیلومیٹر بلند ہے، چاروں طرف پہاڑیوں نے قدرتی دیواریں کھینچ دی ہیں ۔

ومن حولہا سے مراد حضرت ابن عباس کی رائے میں تمام روئے زمین ہے اور مکہ کے لیے یہاں ام القریٰ کی تعبیر سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے اور اب تو عبادت میں اس کی مرکزیت بالکل واضح اور صاف ہے ۔ رُوئے زمین کے تمام مسلمان اُم القریٰ کے اردگرد بیت اللہ کی طرف رُخ کرکے نماز پڑھتے ہیں ۔ یہ آیت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت عالمگیر ہونے کی دلیل ہے ۔ آپ زمین کے کسی خاص خطے یا کسی خاص قوم کے لیے نبی بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں بلکہ ساری دُنیا کے لیے اور تمام انسانوں کے لیے بھیجے گئے ہیں ۔ اس کے علاوہ دوسری آیات میں بھی یہ بات کھول کر بتائی گئی ۔

نبوّتِ محمّدیہ کی دوسری عملی دلیل

۱۱۴ ۔ اور جو آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہی اس پر ایمان لائیں گے اور وہی اپنی نمازوں کی حفاظت کرتے ہیں ۔ جسے آخرت کی زندگی پر یقین اور بعد الموت کا خیال ہوگا اسی کو ہدایت اور طریق نجات کی تلاش ہوگی وہی پیغام الٰہی کو قبول کرے گا اور نماز وغیرہ عبادات کی حفاظت کرے گا[1] یہ نبوّتِ محمدیہ کی دوسری عملی دلیل ہے ۔ یعنی جیسے آپ اپنی نبوّت کی صداقت کے لیے علمی اعجاز قرآن کی صورت میں لے کر آئے اسی طرح اللہ نے آپ کو نبوّت کی صداقت کے لیے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

عملی اعجاز بھی عطا فرمایا۔ آپ کی دعوت نے انسانوں کے گروہ میں سے ان لوگوں کو نہیں سمیٹا جو دنیا پرست اور خواہش نفس کے بندے ہیں بلکہ ایسے لوگوں کو آپ نے علم و عمل سے تیار کیا جن کی نظر حیات دنیا کی تنگ سرحدوں سے آگے تک جاتی ہے۔ یعنی نبوت کی قوت تاثیر اور فیض صحبت کا اثر ان پر یہ ہوا کہ ان پر اس زندگی کی کم مائیگی، بے حقیقی اور ناپائیداری اور اخروی زندگی کی عظمت و ابدیت واضح ہو گئی اور یہ کہ آخرت ہی وہ اہم اور عظیم حقیقت ہے جس کے لیے مجاہدین جہاد کرتے ہیں اور اس فکر سے متاثر ہو کر جو انقلاب ان کی زندگی میں رونما ہوا اس کی سب سے زیادہ نمایاں علامت یہ ہے کہ وہ انسانوں کے درمیان اپنی خدا پرستی میں ممتاز ہیں۔ کیا یہ خصوصیات اور یہ نتائج کسی ایسے شخص کی صحبت کے ہو سکتے ہیں جو جھوٹا ہو ہرگز نہیں۔ زہد و تواضع، ایثار و ہمدردی، عدالت و شجاعت، حکمت و صداقت جیسے فضائل چھوڑ کر محافظت صلاۃ کا ذکر اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ ان کی پوری زندگی حی علی الصلاۃ تھی۔ زندگی میں محافظت صلاۃ اور فکر آخرت کے بہترین اور مثالی نمونے صحابہ کرام کے حالات میں اس کثرت سے ملتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی مؤرخ و ادیب یا نفسیات و اخلاق کا کوئی عالم جمع کرے اور ان سے ایک جامع اور منفرد شخصیت تیار کرے تو انسانی سیرتوں میں ایک ممتاز ترین سیرت و شخصیت تیار ہو جاتے اور انسانیت کے عظیم مرقع اور انسانیت کی عالمی تاریخ کی جلوہ گاہ میں ایک حسین ترین پیکر کا اضافہ ہو جاتے۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ قَالَ اُوْحِيَ اِلَيَّ وَلَمْ
يُوْحَ اِلَيْهِ شَيْءٌ وَّمَنْ قَالَ سَاُنْزِلُ مِثْلَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ ۭ
وَلَوْ تَرٰٓى اِذِ الظّٰلِمُوْنَ فِيْ غَمَرٰتِ الْمَوْتِ وَالْمَلٰۗىِٕكَةُ
بَاسِطُوْٓا اَيْدِيْهِمْ ۚ اَخْرِجُوْٓا اَنْفُسَكُمْ ۭ اَلْيَوْمَ تُجْزَوْنَ عَذَابَ الْهُوْنِ
بِمَا كُنْتُمْ تَقُوْلُوْنَ عَلَى اللّٰهِ غَيْرَ الْحَقِّ وَكُنْتُمْ عَنْ اٰيٰتِهٖ تَسْتَكْبِرُوْنَ ۝۹۳
وَلَقَدْ جِئْتُمُوْنَا فُرَادٰى كَمَا خَلَقْنٰكُمْ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّتَرَكْتُمْ مَّا
خَوَّلْنٰكُمْ وَرَاۗءَ ظُهُوْرِكُمْ ۚ وَمَا نَرٰى مَعَكُمْ شُفَعَاۗءَكُمُ الَّذِيْنَ زَعَمْتُمْ
اَنَّهُمْ فِيْكُمْ شُرَكٰۗؤُا ۭ لَقَدْ تَّقَطَّعَ بَيْنَكُمْ وَضَلَّ عَنْكُمْ مَّا
كُنْتُمْ تَزْعُمُوْنَ ۝۹۴

اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو خدا پر جھوٹ بول کر افترا کرے ، یا کہے کہ مجھ پر وحی کی گئی ہے اور فی الواقع اس پر کوئی وحی نہیں آئی ، اور اس سے بھی جو کہے کہ میں بھی

ایسی وحی اتارتا ہوں جیسے خدا نے اتاری ہے"[115]۔ اور اے پیغمبر وہ منظر بڑا حیرت انگیز ہوگا اگر ظالموں کو اس حالت میں دیکھو، جب وہ جانکنی کی بے ہوشیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں باہر نکالو"[116]۔ آج وہ روز ہے کہ جو کچھ تم خدا پر تہمتیں باندھتے تھے اور اس کی آیتوں کے مقابلہ میں گھمنڈ کرتے تھے اس کی پاداش میں تمہیں رسوا کرنے والا عذاب دیا جائے گا"[117]۔ اور (پھر اللہ سبحانہ کا ارشاد ہوگا) کہ تم ہمارے حضور میں تن تنہا آئے ہو جس طرح تمہیں ہم نے پہلی مرتبہ اکیلا پیدا کیا تھا اور جو کچھ ساز و سامان ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا وہ سب اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو"[118]۔ اور آج ہم تمہارے ساتھ ان ہستیوں کو نہیں دیکھتے ہیں جنہیں تم شفاعت کا

وسیلہ سمجھتے تھے اور جن کے بارے میں تمہارا گمان تھا کہ تمہارے معاملات میں خدا کے شریک ہیں، تمہارے سارے رشتے ٹوٹ گئے اور جو کچھ تم گمان کرتے تھے سب کے سب تم سے ہوا ہو گئے۔"[۱۹]

ختم نبوت کمال نبوت کا لازمی نتیجہ ہے۔

اس آیت میں جھوٹے مدعیان نبوت کے لیے ایک عظیم وعید اور بہت بڑی تہدید ہے۔ پہلے چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کے لیے دو دلیلیں پیش کی تھیں۔ ایک علمی اور دوسری عملی۔ علمی قرآن عزیز ھذا کتاب انزلناہ مبارک اور عملی معاشرہ صحابہ والذین یومنون بالاخرۃ ان دو کے جلو میں جو نبوت آئی ہے وہ علم و عمل کا کمال لے کر آئی ہے۔ اس کمال کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ آپ کی ذات پر نبوت ختم ہو کیونکہ دین کے کمال اور نبوت کے تمام کے بعد دنیا کو نبوت کی ضرورت نہیں۔ اب انسانیت اپنے اس تنگ دائرے سے نکل چکی تھی، جس میں وہ متعدد تاریخی اسباب کی بنا پر صدیوں سے رہ رہی تھی۔ اب وہ علم و تمدن، باہمی تعارف، عالمی وحدت اور تسخیر کائنات کے مرحلہ میں داخل ہو رہی تھی اور اس کی امید پیدا ہو گئی کہ وہ جغرافیائی تقسیم اور سیاسی اختلافات پر قابو حاصل کر سکے گی۔ قبیلہ، خاندان، قوم و وطن کے بجائے اب وہ کائنات وسیع انسانیت، عالمگیر مدنیت اور مشترک علم و فن کے مفہوم سے آشنا ہو رہی تھی۔ سارے قرائن اور شواہد بتا رہے تھے کہ اب انسانیت کی فلاح و سعادت اس بات پر موقوف ہے کہ وہ اپنی زندگی کی بنیاد اس وحی پر رکھے جو خدا کے آخری پیغمبر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہو چکی اور اس عقیدے اور شریعت پر کاربند ہو۔ ان اصول و کلیات اور ان احکام و حدود کی پابند ہو جو اس آسمانی صحیفے نے عطا کی ہیں جو مبارک اور مصدق لما بین یدیہ اور اللہ کی آخری کتاب ہے۔

سلسلہ نبوت کے خاتمہ سے انسانی صلاحیتیں اور قوتیں اس خطرے سے محفوظ ہو گئیں کہ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد ایک نئے نبی یا دعوت کا ظہور ہو اور وہ سارے کام چھوڑ کر اس کی حقیقت معلوم کرنے اور اس کی تصدیق و تکذیب کا فیصلہ کرنے میں لگ جائیں۔ ختم نبوت قرآن کی مبارکیت اور مصدقیت کا لازمی اور منطقی نتیجہ تھا۔ جسے محمد رسول اللہ ساتھ لے کر تشریف لاتے اور جو عقائد و قوانین اخلاق و اجتماعی تعلیمات کے لحاظ سے ہر طرح اکمل اور ان صالح اور صحیح بنیادوں پر قائم تھا جن پر صالح معاشرہ اور صحت مند تہذیب قائم ہوتی ہے اور خود اپنی مطلوبہ تکمیل اور معاشرہ معراج ترقی و کمال کو پہنچا ہے۔

جو کسی نبی و نبوت کا مدعی یا داعی اور علمبردار ہے وہ نبوت محمدیہ اور قرآن کا بدترین دشمن اور اسلام کے بدخواہوں اور مخالفین کا بہترین معاون اور آلہ کار ہے اور قرآن عزیز کی یہ آیت بتاتی ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے یہاں اس کا جرم ناقابل معافی ہے۔

گویا پہلی آیت میں اگر عموم بعثت کا ذکر تھا تو اس آیت میں ختم نبوت کا ذکر کر دیا گیا تاکہ ہر دیکھنے والا نبوت محمدیہ کے دونوں امتیازات عموم بعثت اور ختم نبوت یکجا دیکھ لے۔

۱۱۵۔ اور اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو خدا پر جھوٹ بول کر افترا کرے یا کہے کہ مجھ پر وحی کی گئی ہے اور فی الواقع اس پر کوئی وحی نہیں آئی اور اس سے بھی جو کہے کہ میں بھی ایسی وحی اتار رہا ہوں جیسے خدا نے اتاری ہے۔ خدا پر بہتان باندھنے سے شاید یہ مراد ہے کہ خدا کی طرف ان باتوں کی نسبت کرے جو اس کی شان رفیع کے لائق نہیں۔ مثلاً کسی شخص کو اس کا شریک ٹھہراتے یا بیوی بچے تجویز کرے یا یوں کہے ما انزل اللّٰہ علی بشر من شیٔ یعنی اس نے بندوں کی ہدایت کا کوئی سامان نہیں کیا ایسا کہنے والا سخت ظالم ہے۔ اسی طرح جو شخص نبوت کا جھوٹا دعویٰ کرے یا یہ ڈینگ مارے کہ خدا کے جیسا کلام میں بھی لا سکتا ہوں جیسا کہ بعض مشرکین کہتے تھے لو نشاء لقلنا مثل ھذا۔ یہ سب باتیں انتہائی ظلم اور دیدہ دلیری کی ہیں جس کی سزا کا تھوڑا سا حال آگے مذکور ہے[1]

اس میں تین صورتیں بیان ہوتی ہیں:

پہلی یہ کہ نبوت ہی کا انکار کر دے اور کہے کہ اللہ سبحانہٗ کسی بندے پر وحی نازل ہی نہیں کرتا ہے دوسری یہ کہ خود مدعی نبوت ہو کر سامنے آجاتے اور کہے مجھ پر بھی وحی آتی ہے۔ تیسری یہ کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وحی الٰہی اور نبوت کا باقاعدہ مقابلہ کرے اور کہے کہ ویسا کلام تو میں بھی پیش کر سکتا ہوں۔ قرآن ان تینوں صورتوں کو صرف ظلم نہیں بلکہ اس کے مرتکب کو اظلم قرار دیتا ہے۔ یہاں افتراء علی اللہ کذبا سے انکار وحی مراد ہے اگرچہ اس کے عموم میں اور بھی بہت سی چیزیں آسکتی ہیں لیکن موقعہ و محل کا تقاضا یہی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جرم کی سنگینی میں یہ تینوں برابر ہیں منکرِ نبوت اور مدعی نبوت اور متقابل نبوت واقعی نبی کا انکار جیسے سنگین جرم ہے ایسے ہی جھوٹا دعویٰ نبوت بھی جرم ہے اور ان دو کی طرح یہ بھی سنگین جرم ہے کہ یہ کہہ کر نبوت کا استخفاف کرے کہ اس جیسی بات تو میں بنا سکتا ہوں۔

یہ دعویٰ کہ اللہ نے انسانی ہدایت کے لیے کسی انسان پر کوئی وحی نہیں اتاری ہے۔ یعنی انسان کو اس کارگاہ میں آزاد، خود مختار چھوڑ دیا ہے۔ خدا پر بہت بڑا الزام ہے اور اس کی صفات رحمت و ربوبیت کا انکار ہے یعنی جس پروردگار کی ربوبیت و رحمت نے جسم کی تربیت کا یہ تمام فیضان قائم کر رکھا ہے کیا یہ ممکن ہے کہ وہ جسمانی پرورش و ہدایت کے لیے سب کچھ کرے لیکن روحانی تربیت کے لیے اس کے پاس کوئی سامان نہ ہو، جو شخص ایسا دعویٰ کرتا ہے اور خدا کی طرف نسبت کر کے کہتا ہے وہ بلاشبہ افتراً علی اللہ کذباً کا سنگین جرم کر رہا ہے ٹھیک اسی طرح وہ بھی ظالم ترین انسان ہے جو نبی نہیں ہے اور نبوت کا دعویٰ لے کر کھڑا ہو جائے۔ حافظ ابن تیمیہ نے آیت کے زور سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ ایک شخص خدا ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور دوسرا نبوت کا جھوٹا دعویٰ لے کر کھڑا ہوتا ہے۔ ان دونوں میں زیادہ ظالم کون ہے فرمایا کہ مدعی نبوت زیادہ ظالم ہے کیونکہ خدائی کے بارے میں انسانیت دھوکا نہیں کھا سکتی ہے وہ جانتی ہے کہ مخلوق خالق نہیں ہو سکتا لیکن نبوت کے بارے میں دھوکا ہو سکتا ہے اور اس کے ساتھ قرآن نے اس شخص کو بھی ظالم ترین انسان قرار دیا جو قرآن کے مقابلے میں یہ کہے کہ اس قسم کا کلام میں بھی پیش کر سکتا ہوں۔ علامہ مہائمی نے اسی میں ان لوگوں کو بھی داخل کیا ہے جو اعجاز قرآنی کا انکار کرتے ہیں۔

مرنے کے وقت کا سماں

۱۱۶۔ اور اے پیغمبر وہ منظر بڑا ہی حیرت انگیز ہو گا اگر تم ظالموں کو اس حالت میں دیکھو کہ جب وہ جانکنی کی بے ہوشیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں باہر نکالو۔ یعنی موت کی باطنی اور روحانی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے روح قبض کرنے اور سزا دینے کو ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے اور مزید تشدد اور اظہارِ غیظ کے لیے کہہ

رہے ہوں گے کہ نکالو اپنی جانیں جنہیں بہت دلوں سے بانواع الحیل سنبھالے ہوئے تھے[1] مطلب یہ ہے کہ جو لوگ افتراً علی اللہ کذباً، نبوت و وحی کا جھوٹا دعویٰ اور نبوت کے لاتے ہوتے علم وعمل کا اپنے فکر و فن سے دنیا میں مقابلہ کرتے ہیں وہ وقت بھی آنے والا ہے جب اس کی زندگی کی مہلت کا زمانہ اور عمل کی فہرست ختم ہو جائے گی۔ کتنا دردناک ہے ؟ اس وقت صرف اس کے گزشتہ اعمال کے قالب میں جلوہ گر ہو گی۔ ہر عمل کی صورت اس کے سامنے موجود ہو گی اور رغیب کی کارکن صورتیں چلتی پھرتی دکھائی اور بولتی چالتی سنائی دیں گی۔ ان آیات میں اسی وقت کا نقشہ پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ موت کے وقت کس طرح فرشتے سامنے آتے ہیں اور رُوح کے جسم سے الگ ہونے کا منظر کیسا ہوتا ہے۔ اس کے گناہوں کی سزا کا دور شروع ہو جاتا ہے۔

کچھ شارحین قرآن نے فرشتوں کے اخرجوا انفسکم کہنے کو تمثیل مجاز کا پیمانہ قرار دیا ہے یعنی ملائکہ کا قبض روح کرنا اس قرض خواہ کے کردار سے مشابہ ہے جو قرض دار سے قرض مانگنے میں سنگین رویہ اختیار کرتا ہے اور کسی قسم کی کوئی مہلت نہیں دیتا، لیکن صاحب انتصاف اسے بے ضرورت بتلاتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ملائکہ فی الواقع یہ اعمال کریں گے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں :

> کافر جب موت کے قریب ہوتا ہے تو فرشتے اس کو عذاب اور نکال، بیڑیوں، ہتھکڑیوں، جہنم، گرم پانی اور رحمان ورحیم کی ناراضگی کی بشارت دیتے ہیں۔ یہ سن کر اس کی روح بدن میں بکھر کر رہ جاتی ہے اور نکلنے سے انکار کرتی ہے۔ فرشتے مارتے ہیں تا آنکہ رُوح کو جسم سے یہ کہہ کر نکال لیتے ہیں، اخرجوا انفسکم،

یہاں امام رازی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ فرشتوں کا اخرجوا انفسکم کہنا بطور امر نہیں بطور زجر وتعریض ہے۔ کافروں کے شدائد نزع کو اور بڑھانے کے لیے ہے ورنہ ظاہر ہے کہ جان تو فرشتے نکال رہے ہوں گے، اپنی جان خود نکالنا انسان کا کام نہیں ہے اور یہ بھی اس سے معلوم ہو رہا ہے کہ انسان کی جان یا روح اس کے جسم سے الگ یا مغائر ہے۔

برزخ کا عذاب

۱۱۷ ۔ آج وہ روز ہے کہ جو کچھ تم خدا پر تہمتیں باندھتے تھے اور اس کی آیتوں کے مقابلہ میں گھمنڈ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرتے تھے اس کی پاداش میں رسواکن عذاب دیا جائے گا۔ یعنی سخت تکلیف کے ساتھ ذلت و رسوائی ہوگی[1] الیوم جس کے معنے آج کے ہیں۔ ظاہر ہے کہ اس سے وہی زمانہ مراد ہے جس وقت سے فرشتے بدن سے روح نکالتے ہیں۔ اس "آج" سے مقصود ہمارا دنیوی آج نہیں ہے جو ۲۴ گھنٹوں میں ختم ہو جاتا ہے بلکہ برزخ کا پورا زمانہ ہے دیکھو فتح القدیر شوکانی تفسیر ابی السعود و تفسیر روح المعانی۔ اور کچھ کا خیال ہے کہ اس سے مراد یوم الحساب ہے۔

آیت میں پہلے تینوں جرائم کے لیے یہاں جامع تعبیر قول علی اللہ بغیر الحق کی اختیار کی گئی ہے پہلی بات کہ اللہ نے انسان کی ہدایت روحانی کا کوئی سامان نہیں کیا، دوسری بات کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ اور تیسری بات کہ اپنی عقل اور رائے کو خدا کے نازل کردہ قانون کے مقابلہ میں پیش کرنا، تینوں قول علی اللہ بغیر الحق میں داخل ہیں، اور اس کے ساتھ دوسرا جرم بھی بیان کر دیا۔ وکنتم عن آیاتہ تستکبرون۔ استکبار کے لفظ میں اعراض کے معنے بھی ہیں، اسی لیے یہاں اس کا صلہ عن آیا ہے اللہ کی آیات سے اعراض کے مختلف اسباب ہو سکتے ہیں۔ سب سے زیادہ مہلک اعراض وہ ہے جس کا منشا غرور اور تکبر ہو، یہاں اسی اعراض کا ذکر ہے اور یہ ابلیس کی وراثت ہے۔ دولت اور ریاست کے گھمنڈ میں انسان حق کو پاتے استحقار سے ٹھکرا دیتا ہے۔ قریش مکہ کو بھی گھمنڈ تھا جس کا وہ مظاہرہ نبوت سے روگردانی کی صورت میں کر رہے تھے۔ ان کا خیال تھا کہ ہماری موجودگی میں عبدالمطلب کے یتیم کو نبوت کیوں ملی ہے مکہ یا طائف کے کسی حاکم کو کیوں نہیں ملی ہے۔ اسی کا نام استکبار ہے سب سے پہلے اس کا ظہور شیطان سے ہوا۔ اس نے آدم کے مقابلہ میں اپنے کو برتر سمجھا اور کہا کہ انا خیر منہ اللہ تعالیٰ نے اس کو اس جرم کی سزا دی ہے۔ اسی تکبر کی وجہ سے دولت مند لوگ اپنے ہی جیسے آدمی کی جو انسانوں کی طرح کھاتا پیتا ہو اور بازاروں میں چلتا ہو اطاعت کرنا پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کو اس سے ننگ و عار تھا کہ جس حلقے میں عام لوگ شامل ہو گئے ہیں اس میں وہ شامل ہوں۔

بارگاہ الٰہی میں بے ساز و سامان پیشی

۱۱۸ – اور پھر اللہ سبحانہ کا ارشاد ہوگا کہ تم ہمارے حضور یاں تن تنہا آئے ہو جس طرح ہم نے پہلی بار تمہیں اکیلا پیدا کیا تھا اور جو کچھ ساز و سامان ہم نے تمہیں دنیا میں دیا تھا وہ سب اپنے پیچھے چھوڑ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آتے ہو، یعنی نہ سر پر ٹوپی نہ پاؤں میں جوتی تہیدست چلے آرہے ہو اور جس ساز و سامان پر فخر و ناز تھا اسے ہمراہ نہیں لاتے کہیں پیچھے چھوڑ آئے ہو۔ پہلی بات فرشتوں نے موت کے وقت کہی تھی، اب یہ ایک بالکل نئی بات ہے جو اللہ سبحانہ روزِ قیامت ان سے کہے گا۔ حافظ ابن جریر نے اسی کو ترجیح دی ہے امام رازی کا یہ فرمانا کچھ درست نہیں کہ اس کا ماقبل پر عطف ہے۔ یہاں خلقنٰکم کا ذکر ہو رہا ہے کہ یہ بات روزِ قیامت میدانِ حشر میں ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ تم سب ہمارے حضور میں متفرق ہو کر تن تنہا آتے ہو یا یہ کہ تم اپنے اہل و عیال، خاندان، رشتہ داروں اور امداد و اعوان کو چھوڑ کر اکیلے آئے ہو نہ تمہارے ساتھ کوئی پارٹی ہے نہ نوکر چاکر ہیں نہ اموال و املاک ہیں، ننگ دھڑنگ ایسے آرہے ہو جیسے ہم نے تمہیں ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کیا تھا۔ وترکتم ما خولنٰکم وراء ظھورکم، یعنی جو کچھ ہم نے تم کو عطا کیا تھا وہ سب پیچھے چھوڑ آتے ہو۔ یہ کہہ کر سمجھا دیا کہ آخری ذمہ داری ہر شخص کی الگ الگ ہے۔ وہ مال و متاع جس کے بھروسہ پر خدا کو چھوڑتا ہے، نبوت کی تکذیب کرتا ہے سب یہیں رہ جاتا ہے، اس میں سے کچھ بھی ساتھ نہ جائے گا۔ ان کا خیال تھا کہ اگر انبیا کا نظریۂ آخرت صحیح ہے تو ہم بڑے سرمایہ دار ہیں وہاں بھی دے دلا کر کام بنا لیں گے۔ قرآن نے صاف کہہ دیا کہ وہاں یگانہ اور تنہا آؤ گے سامان دنیا میں سے کچھ بھی ساتھ نہ ہوگا۔ نبوت کی دعوت میں توحید کے بعد دوسری اہم چیز عقیدۂ آخرت کا اہتمام ہے۔ انبیا کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اپنے ماننے اور چاہنے والوں میں اللہ کی رحمت کی امید اور طلب پیدا کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈراتے ہیں۔ اعمال کا تعلق آخرت کی جزا و سزا سے جوڑتے ہیں۔ اور بتلاتے ہیں کہ یہ ایمان طاعت اور استغفار، اللہ کی رحمت کو جوش میں لاتے ہیں، روزی بکھیرتے ہیں اور بارش لاتے ہیں۔ لوگوں کو قحط اور عسرت سے بچاتے ہیں۔

بناوٹی رہنماؤں کی پیروی کا نتیجہ

۱۱۹۔ اور آج ہم تمہارے ساتھ ان ہستیوں کو نہیں دیکھتے ہیں جنہیں تم شفاعت کا وسیلہ سمجھتے تھے اور جن کے بارے میں تمہارا گمان تھا کہ تمہارے معاملات میں خدا کے شریک ہیں۔ تمہارے سارے رشتے ٹوٹ گئے اور جو کچھ تم گمان کرتے تھے سب کے سب ہوا ہو گئے۔ یعنی جن کو تم

لہ افادات شیخ الاسلام

سمجھتے تھے کہ آڑے وقت میں تمہارا ہاتھ بٹائیں اور مصیبت میں ساتھ ہوں گے وہ کہاں چلے گئے۔ آج ہم ان کو تمہاری سفارش اور حمایت پر نہیں دیکھتے۔ حمایت و نصرت کے وہ علاقے آج ٹوٹ گئے اور جو لمبے چوڑے دعوے تم کیا کرتے تھے سب رفو چکر ہو گئے[1]۔ آیت میں شرکاء سے مراد وہ معبود، مطاع اور مقتدیٰ ہیں جن کو دنیا کی زندگی میں خدا کی ربوبیت اور الوہیت میں شریک سمجھتے تھے، "قرآن کی یہ آیت اس باب میں فیصلہ کن ہے کہ مشرکین جن کو خدا کی عبادت میں شریک کرتے تھے وہ بے جان مجسمے، تصویریں اور بت نہ تھے، کیونکہ بے جان چیزوں کے شفیع ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ "دنیا کا کوئی باہوش انسان اس کو باور نہیں کر سکتا کہ کسی عقل مند نے کبھی محض اینٹ اور پتھر کی عبادت کی ہو۔ یہ جو کچھ بھی ہوا پیغمبروں، بزرگوں، جنوں اور دیگر باعزت اور ذی مرتبہ مخلوق ہی کے نام پر ہوا۔ کسی کا مجسمہ قبلہ توجہ سمجھا گیا تو کسی کا فوٹو، کسی کے اٹھنے بیٹھنے کی جگہ کو متبرک سمجھ کر اس کی پرستش کی گئی، کہیں کسی کی قبر کو قاضی الحاجات سمجھا گیا۔ شرک کی ابتداء ہی بزرگوں اور خدا رسیدہ انسانوں کی قبروں، ان کی عبادت گاہوں اور نشست و برخاست کی جگہوں سے ہوئی ہے میر سید شریف جرجانی نے شرح مواقف میں یہ بات کھول کر بتائی ہے۔

بت پرست دو واجب الوجود الٰہوں کے قائل نہیں ہیں اور نہ وہ اوثان کو صفات الوہیت سے موصوف مانتے ہیں اگرچہ وہ ان کو الٰہ کہتے ہیں بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے انبیاء، اولیاء، فرشتوں اور ستاروں کی تماثیل بنا رکھی تھیں اور عابدانہ طور پر ان کی ہی تعظیم و تکریم کرتے تھے تاکہ ان کے ذریعے سے وہ الٰہ حقیقی تک رسائی حاصل کر سکیں۔

اور امام فخر الدین رازی فرماتے ہیں:

ان مشرکوں نے اصنام اور اوثان اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی صورتوں پر بنا رکھے تھے اور انہوں نے یہ خیال کیا تھا کہ اب ان کی تصاویر اور تماثیل کی عبادت کرتے ہیں تو یہ بزرگ ان سے خوش ہوتے ہیں اور ان کے حق میں اللہ کی بارگاہ میں سفارش کرتے ہیں۔ اور اس کی نظیر اس زمانے میں یہ ہے کہ بہت سے لوگ بزرگوں کی قبروں کی اس عقیدت سے دب کر تعظیم کرتے ہیں کہ اس طرح یہ بزرگ ان کی اللہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی بارگاہ میں سفارش کریں گے۔ (تفسیر کبیر ج ۱۳ ص ۸۱۸)

اور حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں،

مشرکین اور مسلمانوں کا اس بات پر اتفاق ہے کہ بڑے بڑے کاموں کی تدبیر صرف اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے اور ایسے ہی وہ کام بھی جن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے پختہ فیصلہ فرما دیا ہے اس نے ان میں کسی کو اختیار نہیں دیا لیکن تمام امور میں مشرکوں کا مسلمانوں سے اتفاق نہیں ہے۔ ان کا شرک میں مذہب یہ ہے کہ ان سے پہلے خدا کے جو نیک بندے گزرے ہیں۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی ہے اور اللہ کا تقرب حاصل کیا ہے اس لیے اللہ تعالیٰ نے خوش ہو کر ان کو الوہیت اور حاجت روائی کا عہدہ دے دیا ہے لہٰذا وہ بھی عبادت کے مستحق ہیں۔ اور مشرکین کا یہ خیال بھی ہے کہ وہ بزرگ سنتے بھی ہیں دیکھتے بھی ہیں اور اپنی عبادت کرنے والوں کی سفارش بھی کرتے ہیں۔ ان کے کاموں کو بناتے اور بگاڑتے ہیں اور ان کی مدد کرتے ہیں۔ ان ہی نیکوکاروں پر مشرکین نے پتھروں کے بت اور ان مورتوں کو اصل شخصیتوں کی طرف توجہ کے لیے قبلہ بنایا ہے۔

قرآن نے ان ہی شرکاء کے بارے میں یہاں یہ انکشاف کیا ہے لقد تقطع بینکم کہ ان کے باہمی رشتے ٹوٹ جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ عابد اور معبود کے درمیان جو روابط تھے وہ سب ختم ہو جائیں گے اور ان کے تراشیدہ رشتوں میں سے کوئی رشتہ وہاں قائم نہیں رہے گا یعنی مشرکین کے جتنے بھی شرکاء سے تعلقات ہیں یہ سب اسی دنیا تک محدود ہیں۔ آخرت میں جو حقائق کے مشاہدے معائنہ کا وقت ہوگا سب ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔

اِنَّ اللّٰهَ فَالِقُ الْحَبِّ وَالنَّوٰى ؕ يُخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَمُخْرِجُ
الْمَيِّتِ مِنَ الْحَيِّ ؕ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿٩٥﴾ فَالِقُ
الْاِصْبَاحِ ۚ وَجَعَلَ الَّيْلَ سَكَنًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ حُسْبَانًا ؕ
ذٰلِكَ تَقْدِيْرُ الْعَزِيْزِ الْعَلِيْمِ ﴿٩٦﴾ وَهُوَ الَّذِيْ جَعَلَ لَكُمُ النُّجُوْمَ
لِتَهْتَدُوْا بِهَا فِيْ ظُلُمٰتِ الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ
يَّعْلَمُوْنَ ﴿٩٧﴾ وَهُوَ الَّذِيْۤ اَنْشَاَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ فَمُسْتَقَرٌّ
وَّمُسْتَوْدَعٌ ؕ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّفْقَهُوْنَ ﴿٩٨﴾ وَهُوَ الَّذِيْۤ
اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً ۚ فَاَخْرَجْنَا بِهٖ نَبَاتَ كُلِّ شَيْءٍ فَاَخْرَجْنَا مِنْهُ
خَضِرًا نُّخْرِجُ مِنْهُ حَبًّا مُّتَرَاكِبًا ۚ وَمِنَ النَّخْلِ مِنْ طَلْعِهَا قِنْوَانٌ
دَانِيَةٌ وَّجَنّٰتٍ مِّنْ اَعْنَابٍ وَّالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُشْتَبِهًا وَّغَيْرَ
مُتَشَابِهٍ ؕ اُنْظُرُوْۤا اِلٰى ثَمَرِهٖۤ اِذَاۤ اَثْمَرَ وَيَنْعِهٖ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكُمْ
لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٩٩﴾

بلاشبہ اللہ ہی دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے، وہی زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور وہی مردے کو زندہ سے نکال رہا ہے یہ سارے کام اللہ کر رہا ہے پھر تم کدھر بھٹکے جا رہے ہو[۱۲۰]۔ سپیدہ صبح کو وہی نکالتا ہے رات کو سکون اسی نے بنایا ہے اور چاند اور سورج کو حساب کے لیے اسی نے مقرر کیا ہے، یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے[۱۲۱]۔ اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا، بلاشبہ ہم نے علم والوں کے لیے باتیں کھول کر بیان کر دی ہیں[۱۲۲]۔ اور وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا پھر ہر کے لیے ایک جائے قرار ہے اور ایک جائے امانت ہے، یہ نشانیاں ہم نے سمجھ بوجھ والوں کے لیے واضح کر دی ہیں[۱۲۳]۔

اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے ہر قسم کے نباتات اُگاتے پھر اس سے ہرے بھرے کھیت اور درخت پیدا کیے پھر ان سے تہ بر تہ چڑھا ہوا غلہ نکالا، اور کھجور کے شگوفے سے پھلوں کے جھکے ہوتے گچھے پیدا کیے اور انگور، زیتون اور انار کے باغ بناتے جو باہم ملتے جلتے ہیں اور الگ الگ بھی درختوں کے پھل لگنے اور پکنے پر غور کی نظر ڈالو، بلاشبہ ان میں ایمان والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔[۱۲۴]

منکرینِ وحی و تنزیل کا تحقیقی جواب

لوگوں کا وحی کے موضوع پر انکار ان لفظوں میں نقل کیا تھا کہ ماقدروا اللّٰہ الخ اللہ کی خدائی کا جو اندازہ کرنا چاہیے تھا وہ انہوں نے نہیں کیا۔ یعنی اگر خدا کی صفات و اعمال کی انہیں معرفت ہوتی تو کبھی ایسا خیال نہ کرتے یہ مجمل جواب تھا۔ اب یہاں اسی اجمال کی تشریح کی جا رہی ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جس پروردگار عالم کی ربوبیت و رحمت کا یہ حال ہے کہ اس نے تمہاری زندگی و معیشت کے لیے ہر طرح کا سر و سامان مہیا کر دیا اور کارخانہ خلقت کی کوئی چیز نہیں جو فیضان اور افادہ نہ رکھتی ہو یہ کیسے ممکن تھا کہ تمہارے جسم کی ہدایت و پرورش کے لیے تو سب کچھ کر دیتا مگر تمہاری روح کی ہدایت و پرورش کے لیے

کچھ بھی نہ کرتا۔

روح کی ہدایت و پرورش کا یہی سامان ہے جو وحی و تنزیل کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر تم کہتے ہو کہ ایسا ہونا ضروری نہیں ہے تو یقیناً تم نے خدا کی صنعتوں اور کاموں کو جاننے اور سمجھنے کی کوشش نہیں کی اور اسے اس منزلت سے گرا دینا چاہا جس کی تمام کائنات ہستی شہادت دے رہی ہے۔

جو زمین کی موت کو زندگی سے بدل دیتا ہے کیا تمہاری روح کی موت کو زندگی سے نہیں بدل دے گا وہ جو ستاروں کی روشن علامتوں سے بیابانوں اور سمندروں میں تمہاری رہنمائی کرتا ہے کیا تمہاری روح کو چھوڑ دے گا کہ بھٹکتی پھرے اور اس کی رہنمائی کے لیے کوئی روشنی نہ ہو۔ تم اس بات پر تو کبھی حیران نہیں ہوتے کہ کھیت لہلہا رہے ہیں اور آسمان سے باران رحمت برس رہی ہے لیکن اس پر تمہیں تعجب ہوتا ہے کہ انسان کی روحانی پرورش کے لیے سامان زندگی مہیا ہے اور خدا کی وحی نازل ہو رہی ہے افسوس کہ تم نے ایسا سمجھ کر خدا کی رحمت و ربوبیت کی بڑی ہی ناقدری کی ہے[1]

۹۵ ـ بلاشبہ اللہ ہی دانہ اور گٹھلی کو پھاڑنے والا ہے وہی زندہ کو مردے سے نکالتا ہے اور وہی مردے کو زندے سے نکال رہا ہے یہ سارے کام اللہ کر رہا ہے پھر تم کدھر بہکے جاتے ہو یعنی زمین میں دبائے جانے کے بعد گٹھلی اور دانہ کو پھاڑ کر سبزہ پودا اگانا یا جاندار کو بے جان سے اور بے جان کو جاندار سے نکالنا مثلاً آدمی کو نطفہ سے نطفہ کو آدمی سے پیدا کرنا اسی خدا کا کام ہے پھر اسے چھوڑ کر تم کدھر بہکے جاتے ہو کیا اور کوئی ہستی تمہیں ایسی مل سکتی ہے جو ان کاموں کو انجام دے سکے[2]

یہاں سے اس بات کا تحقیقی جواب دیا جا رہا ہے کہ اللہ ہی نے انسان کو ہدایت و سعادت کی شاہراہوں سے محروم رکھا ہے اور اللہ نے اپنے کسی بندے پر کوئی چیز نازل نہیں کی ہے فرمایا کہ جسم کی پروردگاری کی حد تک اس کے نظام ربوبیت پر غور کرو کہ چھوٹے سے دانے اور چھوٹی سی گٹھلی کو پھاڑ کر کلی نکالے پھر ان کو پودے اور درخت بنائے اور پھر ان کی پرورش کے لیے زمین و آسمان، ہوا، گرمی اور سردی، خزاں اور بہار سب کو حکم دیتا ہے کہ سب مل کر اس کی پرورش میں اپنا اپنا حصہ ادا کریں۔ آگے فرمایا کہ یخرج الحی من المیت و مخرج المیت من الحی، بے جان چیز سے زندگی کی نمائش اور پھر زندگی پر فنا کا مشاہدہ اس کائنات کے ہر گوشہ میں موجود

[1] ترجمان القرآن ۲ ص ۱۸۰ مرتب شیخ محمد اسلام

رہا ہے۔ نطفہ سے آدمی اور آدمی سے نطفہ کی مثال تو عام زبان زد خلائق ہے لیکن اس بلیغ فقرے کی معنویت اس سے زیادہ گہری ہے۔ یہ آم کی بے جان گٹھلی اور گیہوں کی بے جان دانے سے ہرا بھرا درخت لہلہاتا ہوا پیدا ہوتا ہے۔ پھر اسی سرسبز و شاداب درخت پژمردگی اور مردنی طاری ہو جاتی ہے۔ اسی طرح انسانوں اور حیوانوں میں ہو رہا ہے یہاں تک کہ قوموں، امتوں، اور ملتوں میں موت و حیات کی یہی داستان برابر دہرائی جا رہی ہے۔ اگر وہ رب العالمین ہے اور اس کی ربوبیت کے فیضان کا یہ حال ہے کہ ہر دانہ اور گٹھلی کے لیے کارسازی اور زندگی و موت کا ایک جامع منصوبہ رکھتی ہے اور یہ تمام کام اللہ ہی کر رہا ہے تو پھر یہ کہنا کہ عالم انسانیت کی روحانی سعادت کیلئے اس کے پاس کوئی سامان نہیں ہے، عقل سے کوری نہیں تو اور کیا ہے۔ یہ عقل کا اندھا پن اور بہکنا نہیں اور کیا ہے۔

اس موقعہ پر اگرچہ دوسرے شارحین قرآن نے ان آیات کو دلائل توحید قرار دیا ہے، پر قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے کہ جس طرح کائنات کی ہر چیز نظر و اعتبار سے مختلف حیثیت رکھتی ہے اسی طرح قرآنی آیات کا استشہاد بھی بیک وقت مختلف پہلوؤں سے تعلق رکھتا ہے، البتہ خصوصیت کے ساتھ زور کسی خاص پہلو کے لیے ہوتا ہے۔ ان آیات کا سیاق و سباق بتلا رہا ہے کہ یہاں زیادہ تر توجہ نظام ربوبیت سے وحی و رسالت کی ضرورت کے استدلال پر دی گئی ہے ورنہ اسی نظام ربوبیت سے توحید عبادت پر بھی استدلال ہو سکتا ہے اور اسی سے وجود معاد پر بھی قرآن میں استدلال ہوا ہے۔

زمین کے بعد ایک نظر آسمان کی طرف

۱۲۱- سپیدہ صبح کو وہی نکالتا ہے، رات کا سکون اسی نے بنایا ہے۔ سورج اور چاند کو حساب کے لیے اسی نے مقرر کیا ہے۔ یہ سب اسی زبردست قدرت اور علم رکھنے والے کا ٹھہرایا ہوا اندازہ ہے۔ یعنی رات کی تاریکی میں سے جو پہلی پھٹ کر صبح صادق نمودار ہوتی ہے اس کا نکالنے والا بھی اللہ ہے اور رات دن اور چاند سورج کا جو حکیمانہ نظام اور ان کی رفتار کا جو حساب اللہ نے مقرر فرمایا ہے اس میں بھی ذرا تخلف یا کم و بیش نہیں[1] مطلب یہ ہے کہ وہی خدا ہے جس نے جسم انسانی کی پرورد گاری کے لیے زمین میں یہ کارسازی فرما رکھی ہے۔ ذرا نگاہ اٹھا کر اس کی شان ربوبیت کا آسمان میں تماشا دیکھو، وہ جس طرح گٹھلی کو پھاڑ کر اس کے اندر سے درخت پیدا کر رہا ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اسی طرح پردۂ شب کو چاک کر کے اس کے اندر سے صبح نمودار کر دیتا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہے۔ وجعل الیل سکنا کہ اللہ سبحانہ نے تمہاری رات کو سکون بخش اور کلفت کو دور کرنے والی بنایا ہے۔ تم اس میں دن بھر کی تھکاوٹ دور کرتے ہو اور تمہارے قویٰ اور اعصاب اس میں از سر نو میدانِ عمل میں اترنے کے لیے تازہ دم ہو جاتے ہیں۔ سکون کی تعبیر رات کے لیے اختیار فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ رات کے بعد صبح اس لیے آتی ہے کہ اس میں طلب و جستجو کی سرگرمیوں میں معروف ہو سکو اور اپنی معاش کے لیے جدّ وجہد کر سکو۔ اور اصباح و لیل کے باہمی تقابل سے شب و روز کی آمد و شد کی دو مختلف حالتیں بھی بتا دی ہیں اور اشارہ کر دیا کہ لیل و نہار کی یہ تبدیلی زندگی کے لیے بڑی ہی تسکین و دل بستگی کا ذریعہ ہے۔ اگر لیل و نہار کا یہ اختلاف نہ ہوتا تو دُنیا میں زندہ رہنا مشکل ہو جاتا۔ اگر تم کبھی قطب شمالی اور قطب جنوبی میں جاؤ جہاں روز و شب کا اختلاف نہیں ہے تو معلوم ہو جائے کہ رات دن کا اختلاف گزران کے لیے کیسی عظیم الشان نعمت ہے۔ رات دن کے اختلاف نے زندگی کو دو حصوں میں بانٹ دیا ہے۔ دن کی روشنی جدّ و جہد کی سرگرمی پیدا کرتی ہے۔ رات کی تاریکی راحت و سکون کا بستر بچھا دیتی ہے۔ ہر دن کی محنت کے بعد رات کا سکون ہوتا ہے اور ہر رات کے سکون کے بعد نئے دن کی نئی سرگرمی شروع ہو جاتی ہے۔

منشا یہ ہے کہ رات دن اور صبح و شام کی اس نوعیت پر غور کرو، کیا تمہاری یہ عقل باور کرتی ہے کہ جو ذاتِ گرامی تمہارے جسم کی نشو و نما کے لیے یہ اہتمام کر رہی ہے اس کے پاس تمہاری رُوح کی پرورد گاری کے لیے کوئی سامان نہیں ہے۔

ایک قدم اور آگے بڑھاؤ دن رات کے اندر ظاہر ہونے والی دو بڑی نشانیوں کو دیکھو والشمس والقمر حسبانا ان کے لیے قدرت کا ٹھہرایا ہوا ایک ضابطہ ہے اس سے وہ سرمو تجاوز نہیں کر سکتے۔ انہی سے دن، مہینے، سال معین ہوتے ہیں، ان ہی سے موسموں کا تغیر وجود میں آتا ہے۔ ان پر غور کرو یہ تمام نظام اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہاں کوئی بات بغیر حکمت و مصلحت کے نہیں ہے۔ سُورج کو دیکھو جس کی درخشندگی سے تمام ستارے روشنی حاصل کرتے ہیں، چاند کو دیکھو جس کی گردش تمہارے لیے ماہ و سال بتا رہی ہے۔ اگر یہ سب کچھ ہو رہا ہے تو بتاؤ کیسے ہو رہا ہے اور کیوں ہو رہا ہے۔ اس کا جواب اس کے سوا کیا ہے کہ یہ ساری منصوبہ بندی عزیز و علیم کی جانب سے ہے۔ کیا ممکن ہے کہ اللہ کی صفت علم تمہاری جسمانی ربوبیت کے لیے سب کچھ کر لے لیکن اس کی یہی صفت تمہاری روحانی پرورش و ہدایت کا کوئی سامان نہ کرے۔ خدا کی وحی

نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے نازل ہورہی ہے۔ اگر تمہیں اس پر تعجب ہے تو یہ اس بات کا نتیجہ ہے کہ تم نے خدا کی صفت عزت اور علم کو اس طرح نہیں مانا جس طرح اسے ماننا چاہیے۔ تمہاری سمجھ میں یہ بات تو آجاتی ہے کہ وہ ایک انسان کی پرورش کے لیے یہ پورا کارخانہ حیات سرگرم رکھے مگر یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ نوعِ انسانی کی ہدایت کے لیے وحی نازل کرے۔

ستاروں کی خدمت گزاری

۱۲۲ - اور وہی ہے جس نے تمہارے لیے تاروں کو صحرا اور سمندر کی تاریکیوں میں راستہ معلوم کرنے کا ذریعہ بنایا، بلاشبہ ہم نے علم والوں کے لیے باتیں کھول کر بیان کر دی ہیں۔ یعنی بلا واسطہ ان سے راستہ معلوم کر و یا بالواسطہ، مثلاً قطب نما کے ذریعے[1] مطلب یہ ہے کہ جس خدا نے تمہاری مادی زندگی میں تمہاری رہنمائی کے لیے یہ کچھ انتظامات کیے کیا وہ تمہاری روحانی و اخلاقی زندگی سے اتنا بے پرواہ ہو سکتا ہے کہ یہاں تمہاری روحانی ہدایت و سعادت کا کوئی انتظام نہ کرے۔ ظاہر ہے کہ مادی زندگی میں بھٹک جانے کا خطرہ سے بڑا نقصان بھی روحانی زندگی میں بھٹکنے کے نقصان سے بڑھ کر ہے۔ پھر جس رب رحیم کو ہماری مادی فلاح کی اتنی فکر ہے کہ صحراؤں اور سمندروں میں ہم کو صحیح سمت سفر بتانے کے لیے آسمانوں پر قندیلیں روشن کرتا ہے۔ اس کے بارے میں یہ کیسے عقل باور کر سکتی ہے کہ اس نے ہماری اخلاقی و روحانی سعادت کے لیے کوئی سامان نہ کیا ہوگا اور اسے صاف صاف دکھانے کے لیے کوئی سراج منیر روشن نہ کیا ہوگا۔

اس کے ساتھ اس آیت میں یہ بھی بتادیا ہے کہ یہ ستارے اللہ نے تمہاری خدمت گزاری کے لیے مقرر فرمائے ہیں۔ اب یہ کیسی بے خبری ہے کہ ستارے خود تو اپنے سے بتا رہے ہیں کہ ان کے خالق نے ان کو تمہاری خدمت میں لگا رکھا ہے اور تم ان کو خدا کی خدائی میں شریک کر کے ان کی عبادت کرنے لگو۔ یہ خود اپنی خدمت گزاری سے اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ زمین و آسمان سب پر ایک ہی خدا کی حکمرانی ہے۔ اس لیے خدا کی ہی عبادت کرنی چاہیے نہ کہ ان ستاروں کی، ستارہ پرست قوموں میں یہ اعتقاد پیدا ہو گیا تھا کہ دنیا میں جو کچھ ہوتا ہے وہ ستاروں کی گردش سے ہوتا ہے۔ یہی اعتقاد عرب کے مشرکوں میں بھی پیدا ہوا تھا۔ اسی کا اثر ہے کہ ہماری شاعری کی زبان میں فلک کج رفتار جیسی تلمیحات نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔

جنم لیا ہے۔ اسی خیال کا یہ بھی اثر تھا کہ اہل عرب بارش کو بچھتر کی طرف منسوب کرتے تھے اور کہتے تھے کہ فلاں بچھتر کی وجہ سے بارش ہوئی۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ کا بیان ہے کہ ،

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ جو برکت بھی آسمان سے نازل فرماتا ہے لوگوں میں ایک نہ ایک فریق اس کا منکر ہو جاتا ہے۔ کتنا ظلم ہے کہ بارش تو خدا کرے اور لوگ یہ کہیں کہ فلاں فلاں ستارے کی وجہ سے بارش ہوئی ہے۔

واضح رہے کہ جب کوئی جماعت کسی مخلوق میں حقیقی یا خلاف واقعہ تاثیر کا اعتقاد رکھتی ہے وہاں اسلامی قانون اپنا لب و لہجہ تہدید میں سخت کر دیتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں ستاروں سے متعلق جو معتقدات کا سرچشمہ ان کے اوہام تھے۔ وہ ستاروں کو بہت سے حوادث میں اسی طرح موثر سمجھتے تھے جیسا کہ آج بہت ضعیف الاعتقاد مسلمان بزرگوں کی قبروں کو سمجھ لیتے ہیں اور تاثیر بھی ایسی جو محض ان کے دماغوں کی تراشیدہ اور صرف وہمی ہوتی ہے۔ قرآن نے عالم اسباب اشیائ کے اسباب خود مقرر کیے ہیں لیکن اس سے روکا ہے کہ غیر سبب کو سبب یا سبب کو بڑھا کر مؤثر حقیقی کے برابر کر دیا جاتے۔ قرآن کی توحید اس رخنہ اندازی کو برداشت نہیں کرتی ہے کہ کوئی شخص کائنات کے اندر ایک ذرے کی جنبش میں بھی اللہ کی قدرت و قوت کے سوا کسی اور کو شریک سمجھے۔ کائنات کا ایک ایک ذرہ اسی کی مخلوق ہے اور اسی کی قدرت سے حرکت کرتا ہے۔

آخر میں فرمایا قد فصلنا الآیات لقوم یعلمون آیات سے مراد آیات تکوین ہو یا آیات تنزیل دونوں کا حاصل ایک ہے۔ اگر آیات سے مراد آیات تکوین ہوں یعنی دلائل تو مطلب یہ ہے کہ ان دلائل کو ہم نے اہل علم کے لیے کھول کر پیش کیا ہے تاکہ اس کے ذریعے ان کی اس حقیقت تک رسائی ہو سکے کہ اس اسباب کی اس کائنات میں علت موثرہ اللہ کا ارادہ ہے اور اگر آیات سے مراد آیات تنزیل ہوں تو مطلب یہ ہے کہ قرآنی آیات کو ہم نے کھول کر ان لیے بیان کیا ہے کہ ان سے اہل علم علم حاصل کریں۔

عالم النفس میں شہادت

۱۲۳- اللہ وہی ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا ہے پھر ہر ایک کے لیے ایک جائے قرار اور ایک جائے امانت ہے، یہ نشانیاں ہم نے سمجھ رکھنے والوں کے لیے واضح کر دی ہیں۔ یعنی حضرت آدم سے پیدا کیا، مستقر یعنی ٹھہرنے کی جگہ سے ٹھکانا لیا اور مستودع سپرد کیے جانے اور امانت کی

جگہ کو کہتے ہیں۔ یہ تو لغوی معنے ہوئے آگے دونوں کے مصداق کی تعیین میں مفسرین کا اختلاف ہے۔ حضرت شاہ عبدالقادر نے موضح القرآن میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہم کو پسند ہے یعنی اوّل سپرد ہوتا ہے ماں کے پیٹ میں کہ آہستہ آہستہ دنیا کے اثر پیدا کرے، پھر آکر ٹھہرتا ہے دنیا میں اور پھر سپرد ہوگا قبر میں کہ آہستہ آہستہ اثر آخرت کے پیدا کرے پھر جا ٹھہرے گا جنت میں یا دوزخ میں[1] مطلب یہ ہے کہ وہی ایک خدا ہے جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور نسل انسانی کا ایک وسیع گھرانا آباد کر دیا۔ ایک جان سے مراد حضرت آدم ہیں جن کو تمام آسمانی مذاہب میں نسل انسانی کی اصل کی حیثیت سے تسلیم کیا گیا ہے۔ مستقر کے معنی قرار و سکونت کی جگہ کے ہیں اور مستودع اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں کوئی چیز بطور امانت رکھی جائے۔ کچھ قراء نے مستقر کو قاف کے زیر سے پڑھا ہے اور کچھ نے قاف کو زبر دے کر پڑھا ہے۔ یہاں مستقر سے کیا مراد ہے عام شارحین قرآن نے عبداللہ بن عباس کی روایت کو اپنایا ہے کہ مستقر ماں کا رحم ہے اور مستودع باپ کی پیٹھ ہے۔ ایک روایت یہ ہے کہ مستقر رحم مادر ہے اور مستودع زمین ہے عبداللہ ابن مسعود فرماتے ہیں کہ مستقر دنیا ہے اور مستودع آخرت ہے اور عبداللہ بن مسعود ہی سے یہ بھی منسوب ہے کہ مستقر رحم مادر ہے اور مستودع قبر ہے۔ الغرض اس موضوع پر ایک سے زیادہ خیالات ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے یہاں یہ بات خوب فرمائی ہے کہ مستقر دو ہیں اور مستودع بھی دو ہیں۔ مستقر اوّل دنیا ہے اور پھر آخرت میں جنت و دوزخ ہے اور مستودع اوّل ماں کا پیٹ ہے اور پھر قبر کا پیٹ ہے۔ ماں کے پیٹ میں رہ کر عالم دنیا میں یعنی مستقر میں آنے کی تیاری کرتا ہے اور قبر کے پیٹ میں رہ کر آخرت میں جانے کی تیاری کرتا ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مستقر سے مراد وہ جگہ ہے جہاں پیدا ہونے کے بعد انسان رہتا ہے ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین۔ مستودع سے مراد وہ جگہ ہے جہاں مرنے کے بعد وہ دفن کیا جاتا ہے۔ دنیا میں آنے کے بعد انسان یہ دونوں ہی چیزیں پاتا ہے حقیقی زندگی اس کے لیے مقدر ہوتی ہے اتنے دن وہ گزارتا ہے اور جو رزق اس کے لیے مقدر ہوتا ہے اس سے متمتع ہوتا ہے اور اس کا یہ جینا اور خدا کے بخشے ہوئے رزق سے متمتع ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی نگرانی اور اس کے علم میں ہے۔ پھر جب اس دنیا میں اس کی مدت حیات ختم ہو جاتی ہے تو وہ اپنی جان، جان آفریں کے سپرد کرتا ہے اور جہاں کہیں بھی دفن ہوتا ہے خدا ہی کی زمین میں دفن ہوتا ہے اور جب خدا کا حکم ہوگا زمین اس امانت کو خدا کے حوالے کر دے گی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آخر میں فرمایا قد فصلنا الآیات لقوم یفقھون یعنی ہم نے ان لوگوں کے لیے آیات کو کھول کر بیان کر دیا ہے ان لوگوں کے لیے جو سمجھتے ہیں۔ پہلی آیت کے آخر میں یعلمون اور یہاں یفقھون فرمایا ہے علم اور فقہ میں فرق ہے۔ علم عقل کا فعل ہے جبکہ فقہ دل کا کام ہے جسے ہم اردو میں تہ کو پہنچ جانا اور مغز سخن کو تاڑ جانا کہتے ہیں وہ ہی عربی میں فقہ ہے۔ یعنی بات کی گہرائی تک پہنچ جانا فقہ ہے۔ اگر کوئی صرف ظاہر کلام کو اور مظاہر اشیا کو جانتا ہے وہ عالم تو ہے لیکن فقیہ نہیں ہے۔ اسلام میں قانون کے علم کو فقہ اسی لیے کہا گیا ہے کہ آیات کی گہرائیوں میں جا کر اور غواصی کر کے دقائق تک رسائی حاصل کی جاتی ہے۔ یہاں ستاروں کا معاملہ دید سے متعلق ہے اور ان کے ذریعے راستہ معلوم کرنے کا تعلق ظواہر سے ہے اس میں دقت نظر کی چنداں حاجت نہیں ہے اس لیے پہلی آیت کا انجام یعلمون پر فرمایا اور دوسری آیت میں نفس واحدہ سے نسل انسانی کے وجود میں آنے اور اس کے مختلف احوال کا ذکر ہے اس زیادہ لطافت اور کاریگری و تدبیری میں زیادہ دقت نظر ہے اس لیے اس کا خاتمہ یفقھون پر فرمایا۔ شارحین قرآن میں سے یہ بات علامہ زمخشری نے بھی کہی ہے۔

نظامِ ربوبیت کی کارسازی

۱۲۴۔ اور وہی ہے جس نے آسمان سے پانی برسایا پھر اس کے ذریعے ہر قسم کے نباتات اگاتے پھر اس سے ہرے بھرے کھیت اور درخت پیدا کیے پھر ان سے تہ بر تہ چڑھا ہوا غلہ نکالا اور کھجور کے شگوفے سے پھلوں کے جھکے ہوئے گچھے پیدا کیے اور انگور، زیتون اور انار کے باغ بناتے جو باہم ملتے جلتے ہیں اور الگ الگ بھی درختوں کے پھل لگنے اور پکنے پر غور و فکر کی نظر ڈالو۔ بلاشبہ ان میں ایمان والوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں۔ آسمان سے بارش سبب ہے نباتات کی روئیدگی کا متشابھا غیر متشابہ یعنی صورت و شکل، مقدار و رنگ، بو اور مزہ کے اعتبار سے بعض پھل ایک دوسرے سے ملتے جلتے ہیں اور بعض نہیں۔ اذا اثمر و ینعہ یعنی جب ابتداءً پھل آتا ہے تو کچا بدمزہ اور ناقابل انتفاع ہوتا ہے، پھر پکنے کے بعد کیسا لذیذ، خوش ذائقہ اور کار آمد بن جاتا ہے۔ یہ سب خدا کی قدرت کا ظہور ہے۔

اس رکوع میں حق تعالیٰ کے جن افعال وصفات اور مظاہر قدرت کا بیان ہوا ان سے خدا کے وجود، وحدانیت اور کامل الصفات ہونے پر استدلال تو واضح ہے لیکن غور کیا جائے تو وحی و نبوت کا مسئلہ بھی بڑی حد تک حل ہو جاتا ہے کیونکہ جب حق تعالیٰ نے اپنے فضل و رحمت سے ہماری

دنیوی زندگی اور مادی حوائج کے انتظام و انصرام کے لیے اس قدر اسباب ارضی و سماوی مہیا فرمائے ہیں تو یہ کہنا کس قدر لغو اور مہمل ہوگا کہ ہماری حیات اخروی اور روحانی ضروریات کے انجام پانے کا اس نے کوئی سامان نہیں کیا۔ یقیناً جس رب کریم نے ہماری جسمانی غذاؤں کے نشوونما کے لیے آسمان سے پانی اتارا ہے ہمارے روحانی تغذیہ کے لیے اسی نے سماء نبوت سے وحی و الہام کی بارش نازل فرمائی ہے۔ جب وہ بحر و بر کے اندھیروں میں ستاروں کے ذریعے ظاہری رہنمائی کرتا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے کہ باطنی رہنمائی کے لیے اس نے ایک ستارہ بھی آسمان روحانیت پر روشن نہ کیا ہو۔ رات کی تاریکی کے بعد اس نے صبح صادق کا اجالا کیا اور مخلوق کو موقع دیا کہ وہ اپنے دنیوی کاروبار میں چاند سورج کی روشنی سے ایک معین حساب کے تحت منتفع و مستفید ہوتی رہے۔ پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ کفر و شرک، ظلم و عدوان اور فسق و فجور کی تاریک رات میں اس کی طرف سے کوئی چاند نہ چمکا۔ نہ صبح صادق کا نور پھیلا نہ رات ختم ہوئی کوئی آفتاب طلوع ہوا، خدا کی ساری مخلوق ابدالآباد کے لیے جہل و ضلالت کی اٹاٹوپ اندھیری میں پڑی چھوڑ دی گئی۔ کیا گیہوں کے دانے اور کھجور کی گٹھلی کو پھاڑ کر خداوند قدوس سرسبز درخت اگاتا ہے مگر انسان کے دل میں معرفت ربانی کی استعداد کا جو بیج فطرۃً بکھیر دیا گیا تھا وہ یوں ہی بیکار ضائع ہو جاتا ہے کہ نہ ابھرے نہ پھلے نہ پکے اور نہ تیار ہو۔ اگر جسمانی حیثیت سے اس دنیا میں حیات و موت کا سلسلہ قائم ہے۔ خدا زندہ کو مردہ سے اور مردہ کو زندہ سے نکالتا رہتا ہے تو روحانی نظام میں خدا کی اس عادت کا کیوں انکار کیا جاتا ہے۔ بلاشبہ وہ روحانی طور پر بھی وہ بہت دفعہ ایک زندہ قوم سے مردہ قوم اور مردہ قوم سے زندہ افراد پیدا کرتا ہے۔ اور جس طرح اس نے ہماری دنیوی زندگی کے مستقر و مستودع کا حکیمانہ بندوبست کیا ہے۔ حیات اخروی کے لیے مستقر و مستودع کا سامان اس سے کہیں بڑھ کر کیا ہے فللہ الحمد و المنۃ و بہ النقمۃ و النعمۃ۔

یہیں سے یہ بھی سمجھ میں آتا ہے کہ جس طرح ہم خدا تعالیٰ کو اس کے کاموں سے پہچانتے ہیں یعنی جو کام وہ اپنی قدرت کاملہ سے کرتا ہے کسی مخلوق کی طاقت نہیں کہ ویسا کام کر سکے۔ ٹھیک اسی طرح اس کے کلام کو بھی ہم اسی معیار پر جانچ سکتے ہیں۔ کہ خدا کا کلام وہی ہو سکتا ہے کہ اس جیسا کلام ساری مخلوق بھی مل کر نہ بنا سکے۔ پھر سأنزل مثل ما انزل اللہ کا دعویٰ کہاں تک صحیح ہو سکتا ہے گویا اس رکوع میں حق تعالیٰ کی صفات و افعال بیان کر کے ان تمام مسائل کی حقیقت پر متنبہ کر دیا جن کی تغلیط گزشتہ رکوع میں کی گئی تھی[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ جس پروردگار کی پروردگاری کا یہ عالم ہے کہ اس نے ہمارے اندر جو طلب بھی ودیعت فرمائی ہے اس کا ہمارے گرد و پیش میں بہتر سے بہتر جواب مہیا فرمایا۔ بھوک دی تو غذا مہیا فرمائی، پیاس دی تو پانی کے دریا بہا دیے، ذائقہ بخشا تو ذوق کی ضیافت کے نت نئے سامان کیے ذوقِ نظر بخشا تو کائنات کے گوشے گوشے کو اپنی قدرت کی نیرنگیوں کی جلوہ گاہ بنا دیا۔ یہ کس طرح ممکن ہے کہ ایسی فیض بخش اور بابرکت ذات جو ہماری مادی ضرورتوں کا اس سیر چشمی اور فیاضی سے اہتمام کرے۔ ہماری اس جستجو کا کوئی جواب نہ دے جو خود اس نے ہماری روح اور ہمارے دلوں میں اپنی ہدایت کے لیے رکھی ہوئی ہے۔ عقل یہ باور ہی نہیں کرتی ہے کہ ہماری جسمانی بھوک اور پیاس کے لیے تو غذا اور پانی فراہم کیا جاتے اور ہماری روحانی تشنگی کے بجھانے کا کوئی سامان نہ ہو۔

اسی کی ضرورت کا احساس دلانے کے لیے زیرِ نظر آیت میں ان آثار و دلائل کی طرف توجہ دلائی ہے جو ہر انسان کو قدم قدم پر نظر آ سکتے ہیں بشرطیکہ دل کے دروازے ایمان کے لیے کھلے ہوتے ہوں۔ اسی لیے آخر میں فرمایا ہے ان فی ذالکم لآیات لقوم یومنون۔

سب سے پہلے ربوبیت عامہ کا انزل من السماء ماء فاخرجنا بہ نبات کل شیئ، کہہ کر ذکر کیا ہے۔ اس کے زور پر غور کرو۔ انسان کتنا ہی غافل ہو جائے اور کتنا ہی اعراض کرے لیکن دلائل حقیقت کی وسعت اور ہمہ گیری کا حال یہ ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے اوجھل نہیں ہو سکتی ہیں۔ ایک طرف سے آنکھ بند کرے لیکن اپنی شب و روز کی اس سے تو آنکھیں بند نہیں کر سکتا کہ آسمان سے پانی برستا ہے اور زمین اپنے خزانے اگل دیتی ہے۔ نباتات کو دیکھو، ربوبیت عامہ کے بعد ربوبیت خاصہ کا ذکر کیا کہ فاخرجنا منہ خضرا نخرج منہ حبا متراکبا، فرمایا کہ ان ہی نباتات میں سے جن کے اندر ہم نے غلہ پیدا کرنے کی صلاحیت رکھی ہے سرسبز خوشے اور بالیں نکالتے ہیں۔ اور اپنی قدرت سے تہ بہ تہ دانے جما دیتے ہیں۔ سوچو گیہوں کا ایک دانہ ہے۔ اسے اپنی ہتھیلی پر رکھ لو اور اس کی پیدائش سے لے کر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام احوال و ظروف پر غور کرو۔ کیا یہ حقیر سا ایک دانہ وجود میں آ سکتا تھا اگر تمام کارخانہ ہستی ایک خاص نظم و ترتیب کے ساتھ اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ ہوتا۔

اس کے بعد پھلوں کا ذکر فرمایا و من النخل من طلعھا الخ کھجور سے پھل کی کیونکہ اہل عرب میں عام پھل کی حیثیت رکھتا تھی۔ کھجور کا ذکر اس طرح فرمایا کہ اس کے درخت کے اندر گابھے کا پیدا ہونا اور پھر اس سے لٹکنے ہونے بوجھل خوشوں کا ظہور میں آنا ہر چیز کی طرف توجہ

دلارہی ہے تاکہ اس کاریگری پر انسان کی نظر پڑے جو اس کے ابتدائے ظہور سے لے کر اس کی تکمیل و پختگی تک قدرت اس پر صرف کرتی ہے۔

کھجور کے بعد انگور، زیتون اور انار کا ذکر کیا ہے والزیتون والرمان الخ ان پھلوں کا ذکر خاص اس لیے ہوا کہ یہ اہل عرب میں مشہور پھل تھے۔ اصل میں یہ بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ نے تمہاری ربوبیت کا جو سامان کیا ہے تو اس میں صرف روٹی نہیں ہے بلکہ مختلف قسم کے فواکہ اور میوہ جات بھی ہیں۔ پھر فرمایا کہ یہ فواکہ جو دیے ہیں تو اس میں بھی اپنی رحمت کی یہ شان دکھائی ہے کہ ایک ایک چیز گونا گوں اور اقسام و انواع کی ایک دوسرے سے ملتی جلتی بھی اور باہم دگر شکل و صورت، رنگ، قامت اور ذائقہ میں مختلف بھی تمہارے لیے مہیا کی ہے

یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ ان میں سے ہر چیز کے اندر انسان اپنے خالق کی صفات کا جلوہ دیکھے اور پھر ان ہی صفات سے اپنے ظاہر و باطن کو سنوارے اور ان میں سے ہر نعمت اس کے اندر اس جذبہ شکر و سپاس کو پیدا کرے جو خدا نے ہر انسان کے اندر ودیعت کیا ہے۔

پھر فرمایا انظروا الی ثمرہ اذا اثمر وینعہ یعنی ان میں سے ہر چیز کو لے کر اس کے پھلنے سے لے کر اس کے پکنے تک کے ہر مرحلے کو دیکھو اور اس پر غور کرو تو اللہ سبحانہ کی قدرت، حکمت، ربوبیت، فیض بخشی اور اس کے حسن و جمال کی اتنی نشانیاں اور اس قدر شہادتیں تمہارے سامنے آئیں گی کہ تم ان کو شمار بھی نہ کر سکو گے۔

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ شُرَكَآءَ الْجِنَّ وَخَلَقَهُمْ وَخَرَقُوْا لَهٗ بَنِيْنَ وَبَنٰتٍۢ بِغَيْرِ

عِلْمٍ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يَصِفُوْنَ ۝ بَدِيْعُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ

اَنّٰى يَكُوْنُ لَهٗ وَلَدٌ وَّلَمْ تَكُنْ لَّهٗ صَاحِبَةٌ ؕ وَخَلَقَ كُلَّ شَىْءٍ ۚ

وَهُوَ بِكُلِّ شَىْءٍ عَلِيْمٌ ۝ ذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمْ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ خَالِقُ كُلِّ

شَىْءٍ فَاعْبُدُوْهُ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَىْءٍ وَّكِيْلٌ ۝ لَا تُدْرِكُهُ الْاَبْصَارُ

وَهُوَ يُدْرِكُ الْاَبْصَارَ ۚ وَهُوَ اللَّطِيْفُ الْخَبِيْرُ ۝

اور لوگوں نے خدا کے ساتھ عبادت میں جنّوں کو شریک ٹھہرا لیا ہے حالانکہ جنّوں کو اللہ ہی نے پیدا فرمایا ہے[۱۲۵]۔ اور انہوں نے بغیر علم کے اللہ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لی ہیں، خدا کی ذات پاک ہے اور اللہ کی ذات ان تمام باتوں سے برتر و بلند ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں[۱۲۶]۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا بغیر نمونہ کے بنانے والا ہے، یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے

بیٹا ہو جبکہ اس کی بیوی نہیں ہے اسی نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں اور وہی ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔[127] یہی خدا تمہارا پروردگار ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے لہٰذا اسی سے عابدانہ تعلقات قائم کرو، ہر چیز کا وہی نگران اور کارساز ہے۔[128] اسے نگاہیں نہیں پا سکتی ہیں اور وہ تمام نگاہوں کو پا رہا ہے، وہ بہت ہی لطیف اور باخبر ہے۔[129]

مشرکانہ عقائد کا رد

یوں تو کفر کی ہر قسم انسانیت کے لیے سب سے بدنما داغ ہے لیکن اس کی جو قسم سب سے بدتر ہے وہ شرک ہے یعنی خدا تعالیٰ کی ذات صفات لوازم صفات عبادت اور اس کی حدودِ عظمت میں کسی کو شریک کرنا، اللہ سبحانہٗ نے ہر شخص کی فطرت کو شرک کی ہر آلودگی سے پاک و صاف بنایا ہے۔ اپنے کو شرک کی سنجاست سے ملوث کرنے کا مجرم انسان خود ہے۔ پروردگار عالم نے تخلیق عالم سے پہلے یہ طے کر دیا ہے کہ اس کی بارگاہ میں ہر کوتاہی و لغزش قابل معافی ہو سکتی ہے مگر شرک کا جرم ہرگز قابل معافی نہیں ہو سکتا۔ قرآن کہتا ہے کہ شرک اللہ سبحانہٗ پر سب سے بڑا افترا ہے۔ سب سے بڑھ کر بے دلیل بات اور نفس انسانی کے لیے ایک ابدی موت ہے۔ شرک انسانی فطرت سے تخم سعادت کو جڑ سے اکھاڑ دیتا ہے اور اس کی روحانی ترقی کی تمام استعدادیں باطل کر دیتا ہے

شدہ شدہ اس کی فطرت کا یہ استعدادی فقدان اس کے حواس ظاہرہ کو بھی اتنا متاثر کر دیتا ہے کہ پوری صحت و سلامتی کے باوجود اپنے فطری احساس سے بھی یکسر معریٰ اور معطل ہو کر رہ جاتے ہیں۔ قرآن نے ان کی اس حالت کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

لهم قلوب لا يفقهون بها و لهم اعين لا يبصرون بها و لهم آذان لا يسمعون بها اولائك كا لانعام بل هم اضل اولئك هم الغافلون ۔

ان کے پاس عقلیں ہیں مگر ان سے سمجھ بوجھ کا کام نہیں لیتے آنکھیں ہیں مگر ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے وہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے بھی زیادہ کھوئے ہوئے۔

چونکہ ان کے حواس ظاہرہ کا یہ تعطل ان کی قلبی استعداد کے فقدان سے شروع ہوتا ہے اسی لیے آیت میں سب سے پہلے ان کی قلبی موت اور قلبی بے حسی کا ذکر کیا ہے۔

۱۲۵۔ اور لوگوں نے عبادت میں خدا کے ساتھ جنّوں کو شریک ٹھہرا لیا ہے حالانکہ جنّوں کو اللہ ہی نے پیدا فرمایا ہے۔ یا تو جن سے مراد یہاں شیاطین ہیں، چونکہ کفر و شرک کا ارتکاب شیطان کے اغواء سے ہوتا ہے اس لیے اس کے اغواء اور اضلال سے غیر اللہ کی عبادت کرنا گویا اس کی عبادت ہوتی، ابراہیم علیہ السلام نے بت پرستی کا رد کرتے ہوئے فرمایا یا ابت لا تعبد الشیطان دوسری جگہ ارشاد ہے،

الم اعهد اليكم يا بنی آدم ان لا تعبدوا الشيطان

اے اولادِ آدم کیا ہم نے تم سے کہہ نہ دیا تھا کہ شیطان کی عبادت نہ کرو

فرشتے قیامت میں کہیں گے؛

سبحانك انت ولينا من دونهم بل كانوا يعبدون الجن

تو پاک ہے تو ہی ہمارا کارساز ہے نہ کہ وہ بلکہ یہ جنّات کی عبادت کرتے تھے۔

اور یا جن سے مراد قوم جن لی جاتے، جن کے بعض سرداروں سے اہل جاہلیت استعانت کیا کرتے تھے۔ بہرحال وہ ہماری طرح خدا کی عاجز مخلوق ہے، پھر مخلوق ہو کر خالق کا شریک کیسے ہو سکتا ہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اہل عرب فرشتوں کی طرح جنات کو بھی خدا کا عزیز و قریب سمجھتے تھے اور خدا کا ان سے رشتہ قائم کرتے تھے و جعلوا بینہ و بین الجنۃ نسبا ، اسی لیے وہ جنات کو خدا کی عبادت میں شریک کرتے تھے ۔ چنانچہ زمانہ جاہلیت میں اہل عرب ان جنوں کو بھی پوجتے تھے ۔ مسافر جب راستہ میں کہیں قیام کرتے تھے تو پہلے وہاں جنوں کی دہائی پکار لیتے تھے ۔ قرآن میں انہ کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن فزادوھم رھقا اور بات یہ تھی کہ کچھ انسان بعض جنوں کی دہائی پکارا کرتے تھے اور انہوں نے ان کو اور مغرور بنا دیا ۔ چنانچہ بعض خوفناک مقامات میں خاص طور سے ان کے نام قربانیاں ہوتی تھیں ۔ ان میں سے ایک مشہور مقام دراہم تھا جہاں کے رہنے والے جنوں پر جانور ذبح کر کے چڑھاتے تھے تاکہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں ۔ قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور پر جنوں کی پوجا کرتی تھی ۔ جن اور شیطان کی نسبت اہل عرب کے عجیب عجیب اعتقادات تھے ۔ وہ جن شیطان بھوت پلیت سب کو ایک ہی جنس سمجھتے تھے ۔ اگرچہ اختلاف صورت اور اشغال کی وجہ سے ان کے الگ الگ نام پڑ گئے تھے جو جن میدانوں اور جنگلوں میں رہتے تھے اور مسافروں کو صورتیں یا لباس بدل بدل کر دھوکا دیتے تھے ان کا نام غول تھا یہ مذکر بھی ہوتے تھے اور مونث بھی ۔

عبید بن ایوب العنبری کہتا ہے :

و غولاً قفرۃ ذکر وانثی
کان علیہما قطع البجاد

اور بیابان کے دو غول مرد بھی اور عورت بھی گویا دونوں پر کمل کے ٹکڑے ہیں ۔ مونث کو سعلاۃ بھی کہتے تھے :

اذل و سعلاۃ و غول بقفرۃ
اذا اللیل وارٰی الجن فیہا ارنت

میں چھلاوہ اور چڑیل اور غول بیابان میں جب رات پردہ پوش ہوتی ہے تو اس میں آواز دیتے تھے ۔

قرآن عزیز نے شرک کی تردید میں جعلوا للہ شرکاء الجن کی بلیغ تعبیر اختیار کر کے شرک پر ضرب کاری لگائی ۔ فقرے کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں نے اللہ کے شریک بنا لیے ۔ یہ کہہ کر شرکاء کی تفسیر بطور بدل فرمائی یعنی جن ۔ یہ نہیں فرمایا جعلوا الجن شرکاء للہ یعنی لوگوں نے جنوں کو اللہ کا

شرکاء بنا لیا ہے۔ فقرے میں تغیر و تبدل یہ بتلانے کے لیے ہوا ہے کہ حیرت اور تعجب کی بات یہ نہیں ہے کہ شرکت کا یہاں وجود ہے نفس شرکت کوئی اچنبھے والی بات نہیں بلکہ اچنبھے والی بات یہ ہے کہ اللہ کا کوئی شریک ہو۔ اگر تعبیر جعلوا الجن شرکاء للہ ہوتی تو معلوم یہ ہوتا کہ جنوں کو شریک بنانا قابل حیرت ہے ورنہ نفس شرکت میں کوئی مضائقہ نہیں ہے اور قاری کا یہ تاثر واقعہ کے خلاف ہوتا۔

اس کے بعد جنات کو خدا کا شریک بنانے کی قباحت کو زیادہ زوردار بنانے کے لیے فرمایا وخلقھم کہ کس قدر عقل کا بودا پن ہے کہ ان کو خدا کا شریک بنائے ہیں جو خود خدا کی مخلوق ہیں۔ خدا کی پیدا کی ہوئی چیز آخر خدا کی عبادت میں کیسے شریک ہو سکتی ہے۔ خدا کی خالقیت کے بارے میں مشرکین بھی ہوت کے ہمنوا تھے۔ اس لحاظ سے جنات کے بارے میں شریک کا عقیدہ ان کے اصل موقف سے متصادم تھا۔ فکر و عمل کے اسی تضاد کو جتانے کے لیے وخلقھم فرمایا ہے۔

شرک سراسر جھوٹ کا گھروندا ہے

۱۲۶ — اور انہوں نے بغیر علم کے اللہ کے لیے بیٹے اور بیٹیاں گھڑ لی ہیں۔ خدا کی ذات پاک ہے اور ان تمام باتوں سے بلند و برتر ہے جو یہ لوگ بیان کرتے ہیں۔ نصاریٰ حضرت عیسیٰ کو کچھ یہود حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا اور مشرکین ملائکہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے۔ اللہ کی ذات ہر شرکت سے پاک ہے اور اس کی شان ترکیب و تحلیل سے پھر باپ بیٹے کا تصور کیسے ہو سکتا ہے[۱]

اصل ارشاد میں خرقوا آیا ہے۔ عربی میں خرق، خزق، خرم، حزب اور خرز جیسے الفاظ میں معنوی ہم آہنگی ہے۔ سب کے معنے سوراخ کرنے کے ہیں۔ امام راغب نے خرق کے معنے کسی کو خراب کرنے کے لیے بغیر سوچ سمجھے کاٹنے کے بتائے ہیں۔ خُرق خا کے پیش کے ساتھ حماقت کو کہتے ہیں۔ اسی سے پھوہڑ عورت کو خرقاء کہتے ہیں۔ یہ باب نصر سے ہے اور جب یہ باب ضرب سے آتے اور خرق الکذب بولا جاتے تو اس کے معنے جھوٹ گھڑنے اور تراشنے کے ہیں۔ زمخشری نے بغیر علم کے معنے یہ بتائے ہیں کہ بغیر اس کے کہ ان کو اپنے دعویٰ کی حقیقت معلوم ہو، محض بیوقوفی اور نادانی سے یہ بے پر کی اڑا رہے ہیں کہ خدا کے بیٹے اور بیٹیاں ہیں۔ خواہ یہ بات بیٹے بنانے کی حد تک عیسائیوں اور یہودیوں کے منہ سے نکلی ہو اور خواہ فرشتوں کو بیٹیاں بنانے کی

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

حد تک مشرکین عرب نے کہی ہو۔ یہ سب باتیں وہ بغیر کسی دلیل عقلی اور علمی کے کہتے ہیں۔ عیسائیوں اور یہودیوں نے حضرت عیسیٰ اور حضرت عزیر کو خدا کا بیٹا کہا تو قرآن نے ان کے اس دعویٰ کو ذالک قولھم بافواھھم یعنی یہ ان کے منہ کی باتیں ہیں۔ کہا اور مشرکین عرب نے فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں قرار دیا تو قرآن نے کہا کہ مالھم بہ من علم ان کو کوئی پتہ نہیں ہے۔

اس آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ دین کی حدود میں خدا کے بارے میں خواہ اس کا تعلق اس کی ذات سے ہو یا صفات سے یا لوازم سے کوئی بات وحی کی رہنمائی کے بغیر محض من گھڑت خیال سے نہیں کہی جا سکتی۔ اگر ایسا انکار میں کیا گیا تو یہ اتباعِ ظن ہوگا اور اگر اعمال میں کیا گیا تو یہ اتباعِ ہوا ہوگا۔

آخر میں سبحانہ وتعالیٰ عما یصفون۔ یعنی خدا ان باتوں سے پاک، بری اور بالا ہے جو یہ مشرکین اس کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ یہ بظاہر تو صرف ایک تنزیہی کلمہ ہے جو ذات خالق مالک قدیر علیم اور کریم و رحیم ہے اس کو ان صفات سے موصوف کرنا جو مخلوق کی صفات میں اس کی ان تمام صفات کے انکار کے مترادف ہے جن کا ماننا عقلاً ضروری ہے اگر خدا کو ماننے کے بعد بھی جنات اور فرشتوں کو اس کا شریک قرار دیا جائے اور اس کو اولاد کا باپ بنا دیا گیا تو وہ خدا کہاں رہا ہے پھر تو اس کے لیے کفاءت اور ہمسری مان لی گئی اور اس سے مدِ مقابل اور حریف بھی مان لیے گئے۔

اللہ سبحانہٗ کی حقیقی عظمت

۱۲۷۔ اللہ آسمانوں اور زمین کا بغیر نمونے کے بنانے والا ہے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے بیٹا ہو جبکہ اس کی بیوی نہیں ہے۔ اسی نے تمام چیزیں پیدا کی ہیں اور وہی ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔ جس نے تنہا تمام آسمان و زمین بدون کسی نمونہ اور توسط آلات وغیرہ کے ایسے انوکھے طرز پر پیدا کر دیے، آج اس کے لیے شریک کی امداد اور بیٹے کا سہارا تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے اور پھر تعجب ہے کہ جب تم کسی مخلوق کو فی الواقع خدا کی اولاد قرار دیتے ہو تو ان بچوں کی ماں کسے بناؤ گے اور ماں کا تعلق خدا کے ساتھ کس قسم کا مانو گے۔ عیسائی حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے ہیں لیکن یہ جسارت وہ بھی نہیں کر سکے کہ مریم صدیقہ کو العیاذ باللہ خدا کی بیوی قرار دے کر تعلقات زناشوئی کے قائل ہو جائیں۔ جب ایسا نہیں تو مریم کے بطن سے پیدا ہونے والا بچہ خدا کا بیٹا کیوں کر ہو گیا۔ دنیا کے دوسرے بچوں کو بھی خدا تعالیٰ ان کی ماؤں کے پیٹوں سے پیدا کرتا ہے اور وہ معاذ اللہ

خدا کی نسل اولاد نہیں کہلاتے۔ یہ فرق کہ کوئی بچہ محض نفخہ جبرلیہ سے بغیر توسط اسباب عادیہ کے پیدا کر دیا جائے اور دوسروں کو عام اسباب کے سلسلہ میں پیدا فرمائیں۔ البوت نبوت کے مسئلہ پر کچھ اثر انداز نہیں ہو سکتا۔ اسباب و مسببات ہوں یا خوارق عادات سب کو خدا ہی نے پیدا کیا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس چیز کو کس وقت کس طرح پیدا کرنا مصلحت و حکمت ہے[1]

اس آیت میں وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جو اس عقیدے کے رد میں کہا جا سکتا ہے۔ یہ زیادہ سے زیادہ فیصلہ کن بحث ہے مگر منطقی طریقہ کی نہیں جو دلوں کو پکڑ نہیں سکتی۔ قرآنی طریقہ کی جو دل کے ایک ایک ریشہ میں اتر جاتی ہے بدیع السماوات والارض الخ ایک نہیں بلکہ متعدد طریقوں سے بتایا ہے۔ پہلے بتایا ہے کہ آسمان و زمین اللہ کے مبدعات میں سے ہیں، مطلب یہ ہے کہ کائنات کی ہر چیز مخلوق ہے، مخلوق ہو کر بیٹے کا درجہ کیسے حاصل کر سکتا ہے، آسمان و زمین کو کوئی بیٹا نہیں کہتا ہے۔ ثانیاً، بتایا کہ اللہ کی ذات خالق الاجسام ہے۔ خالق اجسام خود جسم نہیں ہو سکتا اور ولادت جسم کی خصوصیات سے ہے۔ ثالثاً اولاد جانتی ہے مذکر و مونث کی ہم جنسی کو اور اللہ کی ذات مجانست سے پاک ہے، رابعاً بیٹا والد کا ہمسر اور کفو ہوتا ہے اور اللہ کی ذات کفائت کے داغ سے پاک ہے، کیونکہ مخلوقات میں سے کسی میں بھی یارائے ہمسری نہیں ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ یہاں جو کچھ بھی ہے خدا کی مخلوق ہے مولود کوئی نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ کے متعلق قرآن نے جو بلند تخیل پیش کیا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ قرآن نے جب توحید کا آوازہ بلند کیا اور قرآن کی سب سے چھوٹی سورت قل ھو اللہ احد نازل ہوئی۔ حضرت ابی بن کعب جو صحابہ میں سب سے زیادہ قرآن کے ماہر سمجھے جاتے ہیں وہ اس کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ صمد وہ ہے جو نہ جنتا ہے اور نہ کسی نے اس کو جنا کیونکہ جو جنا جاتا ہے وہ مرتا بھی ہے اور جو مرتا ہے وہ اپنا وارث بھی چھوڑ جاتا ہے اور خدا نہ مرتا ہے نہ اس کا کوئی جانشین ہے اور کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے یعنی کوئی اس کے برابر نہیں اور نہ کوئی اس کے مثل ہے سوچنے کی بات ہے کہ قرآن سے پہلے اہل عرب میں خدا کا کتنا پست و ذلیل تخیل تھا اور قرآن کی تعلیم کے بعد کتنا پاک اعلیٰ اور بلند تخیل ہو گیا جس کا اندازہ حضرت ابی کی تفسیر سے ہو سکتا ہے جو اسی عرب نژاد قبیلہ کے ایک ممتاز فرد تھے لیکن ان کا دل اب قرآن کے فیضِ بیان سے منور ہو چکا تھا۔ حضرت ابوہریرہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سن کر فرماتے ہیں کہ خدا فرماتا ہے کہ آدم کے بیٹے نے مجھے جھٹلایا اور آدم کے بیٹے نے مجھے گالی دی۔ اس کا جھٹلانا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا دوبارہ پیدا نہیں کرے گا حالانکہ پہلی بار کے پیدا کرنے سے دوسری بار کا پیدا کرنا بہت آسان ہے اور اس کا گالی دینا یہ ہے کہ اس نے کہا کہ خدا کی اولاد ہے حالانکہ میں وہ ایک صمد ہوں جس نے نہ کسی دوسرے کو جنا ہے اور نہ اس کو کسی نے جنا اور نہ اس کا کوئی ہمسر ہے تنزیہہ و تقدیس کے یہ کس قدر شاندار موتی ہیں۔

توحیدِ ربوبیت سے توحیدِ عبادت پر استدلال

۱۰۲۔ یہی خدا تمہارا پروردگار ہے اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے وہی ہر چیز کا پیدا کرنے والا ہے لہٰذا اسی سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو ہر چیز کا وہی نگران اور کارساز ہے۔ اس کی عبادت اس لیے کرنی چاہیے کہ مذکورہ بالا صفات کی وجہ سے وہ ذاتی طور پر استحقاق معبود بننے کا رکھتا ہے اور اس لیے بھی کہ تمام مخلوق کی کارسازی اسی کے ہاتھ میں ہے[1] اس آیت میں ربوبیت، خالقیت اور وکالت سے توحید عبادت پر استدلال کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو رب تمہارا پروردگاری کر رہا ہے اور جس نے تمہیں پیدا کیا ہے اور جو تمہاری ہر آن، ہر لمحہ کارسازی کر رہا ہے اور جس کی خالقیت اور ربوبیت کا اعتراف تمہارے دل کے ریشہ ریشہ میں موجود ہے اس کے سوا کون اس کا مستحق ہے۔ کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے؟

مطلب یہ ہے کہ اگر خدا کی ذات خالقیت و ربوبیت میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی شان معبودیت میں بھی یگانہ ہو، کیونکہ اگر کوئی دوسری ہستی اس کی عبادت میں شریک مان لی جائے تو اس کی یگانگت کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی۔

اس فقرے میں پہلے ربکم پھر خالق کل شیء اور آخر میں فاعبدوہ لاکر بتا دیا کہ اللہ کی ذات چونکہ رب ہے خالق ہے، اس لیے عبادت صرف اس کی ہونی چاہیے۔ یہ توحید عبادت کا ایجابی پہلو ہے لیکن لاالٰہ الا ھو کہہ کر توحید عبادت کے سلبی پہلو کو بھی نمایاں کر دیا۔ ایجابی یہ ہے کہ عبادت صرف اس کی کرنی چاہیے اور سلبی یہ کہ اس کے سوا کسی کی نہ کرنی چاہیے۔ قرآن نے یہاں ایجابی اور سلبی دونوں پہلوؤں کے ذریعہ توحید عبادت کا ایسا کامل نقشہ پیش کر دیا ہے کہ عبادت میں ہر قسم کی

[1] افادات شیخ الاسلام

شرکت کی راہیں ہمیشہ کے لیے بند کردی ہیں۔ اور بتا دیا کہ ہر قسم کی قدرت، ہر قسم کی قوت اور تمام اوصاف کمالیہ صرف ایک بزرگ و برتر ہستی کے لیے ہیں جو ماورائے عرش سے لے کر زیر فرش تک ہر ذرے پر حکمران ہے۔ اس کی اطاعت کے دائرے سے کوئی نقطہ باہر نہیں ہے، انسان کی پیشانی کو ہر طرف سے کٹ کر صرف اسی کے سامنے جھکنا چاہیے۔ ہماری تمام عقیدت ہماری تمام محبت، ہمارا تمام خوف، ہماری تمام امیدیں، ہماری تمام دعائیں، ہماری تمام التجائیں، ہماری تمام عاجزیاں صرف اسی ایک درگاہ پر نثار ہوں اور اسی کے رحم و کرم کے سہارے ہماری زندگی کا ہر لمحہ بسر ہو۔

تنزیہہ کی تکمیل

۱۲۹۔ اسے نگاہ نہیں پا سکتی ہیں اور وہ تمام نگاہوں کو پا رہا ہے وہ بہت ہی لطافت والا اور باخبر ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے اس کا مطلب یہ لیا ہے کہ آنکھ میں یہ قوت نہیں ہے کہ اس کو دیکھ لے، ہاں وہ خود از راہ لطف و کرم اپنے کو دکھانا چاہے تو آنکھوں میں ویسی قوت بھی پیدا فرمائے گا۔ مثلاً آخرت میں مومنین کو حسب مراتب رویت ہوگی، جیسا کہ نصوص کتاب و سنت سے ثابت ہے یا بعض روایات کے موافق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو لیلۃ الاسراء میں رویت ہوئی علی اختلاف الاقوال باقی مواضع میں چونکہ کوئی نص موجود نہیں ہے لہٰذا عام قاعدے کی بنا پر نفی رویت ہی کا عقیدہ رکھا جائے گا۔ مفسرین سلف میں سے بعض نے ادراک کو احاطہ کے معنے میں لیا ہے یعنی نگاہیں کبھی اس کا احاطہ نہیں کر سکتی ہیں۔ آخرت میں رویت ہوگی احاطہ نہ ہوگا۔ ہاں اس کی شان یہ ہے کہ وہ تمام ابصار و مبصرات کا احاطہ کیے ہوتے ہے۔ اس وقت لطیف کا تعلق لاتدرکہ اور خبیر کا وھو یدرک سے ہوگا[1]

یہاں قرآن نے تصور الٰہی کی حد تک اگر اثباتی حد تک بدیع، خالق، رب، وکیل، کے ذریعے خدائی تصور پیش کیا ہے تو سلبی حد تک ایسا عجیب انداز اختیار کیا ہے کہ تصور الٰہی کی تمام تصویروں میں قرآن کی پیش کردہ تصویر جامع اور بلند تر ہے۔ یہ آیت تصور تنزیہہ کی ایسی تکمیل ہے، جس کی کوئی نمود نزول قرآن کے وقت دنیا میں موجود نہ تھی۔ قرآن سے پہلے تنزیہہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہن انسانی متحمل ہو سکا تھا کہ اصنام پرستی کی جگہ ایک ان دیکھی ہستی کی پرستش کی جائے۔ لیکن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جہاں تک صفات الٰہی کا تعلق ہے انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت اور جسم و ہیئت کے تمثیل سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا۔ یہودی تصور جس نے اصنام پرستی کی کوئی شکل بھی جائز نہیں رکھی تھی وہ بھی اس طرح کے تشبیہ و تمثیل سے یکسر آلودہ ہے۔ دراصل قرآن سے پہلے فکرِ انسانی اس درجہ بلند نہیں ہوا تھا کہ تمثیل کا پردہ ہٹا کر صفات الٰہی کا جلوہ دیکھ لیتا اس لیے ہر تصور کی بنیاد تمام تر تشبیہ و تمثیل پر رکھنی پڑی۔ قرآن نے تشبیہ و تمثیل کے سارے پردے چاک کر دیے اور تنزیہہ کو اس درجہ کمال تک پہنچا دیا کہ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار۔ البتہ یہ بات یاد رہے کہ تنزیہہ اور تعطیل میں فرق ہے۔ تنزیہہ یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی پہنچ ہے صفات الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور صاف رکھا جائے۔ تعطیل یہ ہے کہ تنزیہہ کے منع و نفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکرِ انسانی کے تصور کے لیے کوئی بات باقی نہ رہے۔ قرآن کا تصور تنزیہہ کی تکمیل ہے تعطیل کی ابتدا نہیں ہے۔

قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ کی ہستی ہے اور ضرور ہے مگر کیسی ہے؟ اس ادراک سے عقل انسانی عاجز و درماندہ ہے۔ اس کے لیے صفات ہیں مگر ایسی نہیں جن کا خیال و وہم ادراک کر سکیں۔ غیر صفاتی تصور کو انسان پکڑ نہیں سکتا اور طلب لے لیے مطلوب کی ہے جو اس کی پکڑ میں آ سکے۔ وہ ایک ایسا جلوہ مجبول چاہتا ہے جس کے عشق میں اس کا دل اٹک سکے، جس کے حسن گریزاں کے پیچھے وہ والہانہ دوڑ سکے۔ جس کا دامن کبریائی پکڑنے کے لیے ہمیشہ اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھاتا رہے جو اگرچہ زیادہ سے زیادہ بلندی پر ہو لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو۔ غیر صفاتی تصور محض نفی و سلب ہوتا ہے اس سے انسانی طلب کی پیاس نہیں بجھ سکتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جو راہ اختیار کی ہے وہ ایک طرف تو تنزیہہ کو اس کے کمال درجہ تک پہنچا دیتی ہے، دوسری طرف تعطیل سے بھی تصور کو بچا لے جاتی ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اثبات کرتا ہے مگر ساتھ ہی مشابہت کی قطعی نفی بھی کر جاتا ہے۔ نزاکت کا عالم یہ ہے کہ اگر تنزیہہ کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو تعطیل میں جا گرتے ہیں۔ اگر اثبات صفات کی صورت آرائیوں میں دور نکل جاتے ہیں تو تشبیہہ میں کھو تے جاتے ہیں۔ راہ نجات یہی ہے کہ دونوں کے درمیان قدم رہے۔ اثبات کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے تنزیہہ کی بھاگ بھی ڈھیلی نہ پڑنے پائے۔ اثبات اس کی دلآویز صفتوں کا مرقع کھینچے گا تنزیہہ تشبیہ کی پرچھائی سے بچاتی رہے گی۔

ہمارے متکلمین میں صفات باری کا مسئلہ بحث و نظر کا ایک معرکۃ الآرا مسئلہ ہے۔ اور باطنیہ نے قطعی انکار کر دیا، معتزلہ نے صاف انکار نہیں کیا مگر ان کا رُخ اسی طرف ہے۔ چنانچہ یہیں انہوں نے ادراک کی نفی کو رویت کی نفی بنا ڈالا۔ اور دُنیا تو دُنیا آخرت میں بھی اہل ایمان کے لیے رویت باری کا

انکار کر گئے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ ہے کہ جنت میں اللہ سبحانہٗ کا دیدار ہوگا۔ قرآن و سنت کی نصوص اس کی مؤید ہیں۔ اس آیت میں رویت کی نفی نہیں بلکہ ادراک کی نفی ہے۔ ادراک اور رویت میں بہت بڑا فرق ہے۔ ادراک کے معنے لغت میں احاطہ میں لے لینے کے ہیں۔ ادراک کی نفی سے رویت کی نفی نہیں ہوتی ہے اس آیت کے معنے یہ ہیں کہ نگاہیں اللہ کی ذات کا احاطہ نہیں کر سکتی ہیں البتہ اللہ تعالیٰ نگاہوں کا احاطہ کر سکتا ہے، نگاہیں اللہ کا احاطہ کیوں نہیں کر سکتی ہیں اس لیے کہ اللہ کی ذات لطیف ہے۔ اور اللہ نگاہوں کا کیوں احاطہ کر لیتا ہے اس لیے کہ اللہ کی ذات خبیر ہے۔

آیت کے ایک اور معنے بھی کیے گئے ہیں کہ اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ خدا نظر تو نہیں آتا تو یہ چیز مایوس ہونے کی نہیں۔ تمہاری نگاہیں تو واقعی اس کا ادراک نہیں کر سکتی ہیں لیکن وہ تمہاری نگاہوں کا ضرور ادراک کر لیتا ہے یعنی جو اسے دیکھنا چاہتا ہے وہ تو اس دُنیا میں ان آنکھوں سے اسے نہیں دیکھ سکتا ہے لیکن اللہ تو اپنے چاہنے والوں کو دیکھ رہا ہے۔ اس طرح یہ آیت قرآنی اس ارشادِ نبوت سے ہم آہنگ ہے جو صحیحین میں حدیثِ جبریل کے نام سے موسوم ہے اور جس میں حضور نے جبریل کے اس سوال کے جواب میں مالاحسان؟ احسان کیا ہے ارشاد فرمایا ہے:

الاحسان ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک

احسان یہ ہے کہ اللہ کی عبادت اس توجہ سے کرنا گویا تم اسے دیکھ رہے ہو کیونکہ اگرچہ اسے "حقیقۃً" نہیں دیکھ سکتے مگر وہ تو تمہیں "واقعۃً" دیکھ رہا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خدا دیکھنے اور چھونے کی چیز نہیں ہے۔ اس سے قرب اور بعد دل کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اگر انسان اسے یاد رکھے تو وہ خدا سے قریب ہے اگر بھول جائے تو دُور ہے۔ اگر آدمی کی نگاہ اسے نہیں دیکھ سکتی تو کوئی بات نہیں اس کی نگاہیں تو ہمہ وقت آدمی کو دیکھ رہی ہیں۔

قَدْ جَاۗءَكُمْ بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنْ اَبْصَرَ فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ عَمِيَ
فَعَلَيْهَا ۭ وَمَآ اَنَا عَلَيْكُمْ بِحَفِيْظٍ ۝ وَكَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ
وَلِيَقُوْلُوْا دَرَسْتَ وَلِنُبَيِّنَهٗ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ اِتَّبِعْ مَآ اُوْحِيَ
اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۚ لَآ اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ وَاَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِيْنَ ۝
وَلَوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَآ اَشْرَكُوْا ۭ وَمَا جَعَلْنٰكَ عَلَيْهِمْ حَفِيْظًا ۚ وَمَآ
اَنْتَ عَلَيْهِمْ بِوَكِيْلٍ ۝

دیکھو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں، اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا، اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا، میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں[۳]۔ اس طرح ہم اپنی آیات کو بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں کہ تم کسی سے پڑھ رہے ہو اور جو لوگ علم رکھتے

ہیں ان پر ہم حقیقت کو روشن کردیں۔[۱۳۱] اے اللہ کے رسول
اس وحی کی پیروی کیجیے جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے
نازل ہوئی ہے کیونکہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے
اور ان مشرکین کے پیچھے نہ پڑو۔[۱۳۲] اگر اللہ کی مشیت ہوتی
تو یہ لوگ شرک نہ کرتے، تم کو ہم نے ان پر نگراں نہیں
بنایا ہے اور نہ تم ان کے وکیل ہو۔[۱۳۳]

نبوّت کا کام دعوت و تبلیغ ہے

نبی کا سب سے پہلا اور اہم کام تبلیغ و دعوت ہے یعنی جو سچائی اس کو خدا کی جانب سے ملی ہے، اس کو دوسروں تک پہنچا دینا اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرنا، خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنا دینا، اس نے اس کو جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا، جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں۔ ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اس سمجھانے بجھانے اور راہِ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا اس اعلان اور دعوت میں جو تکلیف بھی پیش آتے اس کو راحت جاننا، جو مصیبت بھی در پیش ہو اس کو آرام سمجھنا، جو کانٹے بھی اس وادی میں چبھیں ان کو رگ گل سمجھنا، اس حق کی آواز کو دبانے کے لیے جو قوت بھی سر اٹھاتے اس کو کچل دینا، مال و متاع، اہل و عیال غرض جو چیز بھی اس سفر میں سنگِ راہ ہو کر سامنے آجائے اس کو ہٹا دینا اور اس کی اس ساری کوشش و کاوش کا مقصد خدا کی رضا، مخلوق کی خیر خواہی اور اپنے فرضِ رسالت کی ادائیگی کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

نبوت کی دعوت و تبلیغ کا یہی مطلب ہے۔ دنیا میں جس قدر انبیاؑ آئے ہیں انہوں نے اپنے فرض کو اسی ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا ہے اور ایک لمحہ بھی اپنے فرض کے ادا کرنے میں کوتاہی نہ کی اور آج دنیا میں جو کچھ محبت خدا، بھائیوں کا پیار، انسانوں کی ہمدردی، بے کسوں کی مدد غریبوں کی اعانت اور دوسری نیکیوں کا اس سطح زمین پر وجود ہے وہ سب بلاواسطہ یا بالواسطہ، دانستہ یا نادانستہ انہی کی دعوت و تبلیغ اور جدوجہد کا نتیجہ ہے۔ دنیا کے بڑے بڑے مفکر، بڑے بڑے شاعر، بڑے بڑے حکیم اپنا فرض خود سمجھ لینا یا زیادہ سے زیادہ دوسروں کو سمجھا لینا سمجھتے ہیں لیکن انبیاؑ علیہم السلام جس صداقت کو پاتے ہیں اس کو دوسروں کے اور ہر ممکن طریق سے اس کے پھیلانے اور اہل دنیا کو اس کے باور کرانے میں اپنی پوری قوت صرف کر دیتے ہیں، وہ ہر مشکل کو جھیل کر نافہموں کو حقیقت سمجھاتے اور اندھوں کو راہ راست دکھاتے ہیں۔ ان آیات میں قرآن نے اسی حقیقت کی عکاسی کی ہے۔ اور بتایا ہے کہ لوگوں کے پاس سوجھ بوجھ پیدا کرنے والے حقائق آچکے ہیں۔ اب فائدہ اٹھانا اور نہ اٹھانا لوگوں کا اپنا کام ہے آپ کی ذمہ داری صرف یہی ہے کہ ان تک پیغام پہنچے۔

۱۰۴۔ دیکھو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے بصیرت کی روشنیاں آگئی ہیں۔ اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا، میں تم پر کوئی پاسبان نہیں ہوں۔ یعنی اگرچہ خدا ہمیں دکھائی نہیں دیتا مگر اس کے بصیرت افروز نشانات و دلائل ہمارے سامنے ہیں جو آنکھ کھول کر دیکھے گا خدا کو پالے گا اور جو اندھا بن گیا اس نے اپنا نقصان کیا میرے ذمہ یہ نہیں ہے کہ کسی کو دیکھنے پر مجبور کروں[1]

آلوسی فرماتے ہیں کہ محققین کی رائے میں یہاں قل محذوف ہے۔ یعنی اے پیغمبر کہہ دو اور بتا دو کہ تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس بصائر آچکی ہیں۔ بصائر بصیرت کی جمع ہے۔ اس کے معنے دیدہ عقل، دانش کے آتے ہیں۔ جیسے ظاہری آنکھ کے لیے بصر اور جمع ابصار آتی ہے ایسے باطنی دید کے لیے بصیرت اور جمع بصائر آتی ہے۔ حضرت معاویہ نے کسی ہاشمی سے طنزاً کہا اے بنی ہاشم تصابون فی ابصارکم تمہاری آنکھوں میں فتور ہے ہاشمی نے جواباً کہا کہ اے بنی امیہ تصابون فی بصائرکم تمہاری عقلوں میں فتور ہے۔ یہاں بصائر سے مراد دلائل عقلی اور وہ وسائل ہیں جن سے ہر انسان حق کو معلوم کر سکتا ہے۔ مطلب یہ ہوا کہ لوگو! اللہ کی جانب سے تمہارے پاس حق بینی کے وسائل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہنچ چکے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کی ظاہری و باطنی نشانیاں لے کر آگئے ہیں۔ ظاہری نشانیاں اور دلائل تو وہ ہیں جن کو لوگ عموماً معجزات کہتے ہیں اور باطنی آیات و دلائل جیسے مدعی نبوت کی صداقت معصومیت، تزکیہ تاثیر، تعلیم، ہدایت، ارشاد و فلاح اور تائید و نصرت، اہل نظر اور حقیقت شناسوں کے لیے بھی باطنی آثار نبوت کے حقیقی بصائر ہیں۔ باقی ظاہری نشانیاں صرف ظاہر میں لوگوں کے لیے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری آنکھوں ہی سے دیکھتے ہیں اور ان باطنی دلائل میں قرآن کی آیات بھی ہیں جن کو عقل، فقہ اور علم کے حوالے سے ابھی ابھی پیش کیا گیا ہے۔ گویا قرآن نے بتا دیا ہے کہ نبی شناسی کے سارے عقلی پیمانے تمہارے پاس موجود ہیں۔ اب ان کا استعمال کرنا تمہارا کام ہے۔ نبی شناسی کا پیمانہ صرف ظاہری اور مادی معجزہ ہی نہیں ہے بلکہ اس کے دوسرے پیمانے بھی ہیں۔ ایک یہ کہ نبی کے اخلاق و کردار کو دیکھا جائے، دوسرے یہ کہ اسے نبیوں کے ترازو میں رکھ کر تولا جائے۔ تیسرے یہ کہ اس کی تعلیمات کو دیکھا جائے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کی دعوت ایک استدلالی اور عقلی دعوت ہے کیونکہ اس کے بغیر حکمت و دانشمندی، وعظ و نصیحت اور بحث و نظر کی بنیاد قائم نہیں ہو سکتی۔ اس بنا پر مذاہب عالم کی تاریخ میں نبوت محمدیہ ہی وہ ربانی آواز ہے جس نے عقل انسانی کو مخاطب کیا ہے، غور و فکر کی دعوت دی ہے، فہم و تدبر کا مطالبہ کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ دلائل کی روشنی کھلے آفتاب کی طرح تمہارے سامنے موجود ہے اب جو ان کی مدد سے حق کو دیکھ کر ایمان و عمل صالح کا سرمایہ فراہم کرے تو اس کا فائدہ اسی کو پہنچے گا اور جو بدستور اندھا بنے گا اور حق سے روگردانی کر کے گمراہی میں پڑا رہے گا تو اس کا خمیازہ خود ہی بھگتے گا۔ اسی کے ہم معنے قرآن میں اور آیات بھی ہیں لها ما كسبت و عليها ما اكتسبت اور من عمل صالحاً فلنفسه و من اساء فعليها، آخر میں فرمایا ہے و ما انا عليكم بحفيظ یعنی میں تمہارا نگران اور محافظ نہیں ہوں۔ میری ذمہ داری صرف پیغام پہنچانا ہے وہ پوری ہے رقیب و حفیظ تو اللہ کی ذات ہے وہ تمہارے ظاہر اور باطن کو جانتا ہے حساب لینا اس کا کام ہے اور حساب کے بعد جزا و سزا بھی اس کا کام ہے۔

قرآنی دلائل کی قوت تاثیر

۱۳۱۔ اسی طرح ہم اپنی آیات کو بار بار مختلف طریقوں سے بیان کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ یہ لوگ کہیں کہ تم کسی سے پڑھ رہے ہو اور جو لوگ علم رکھتے ہیں ان پر حقیقت کو

روشن کردیں۔ یعنی ان آیتوں کو مختلف پہلوؤں اور عجیب وغریب انداز سے اس لیے سمجھاتے ہیں کہ آپ
سب لوگوں کو پہنچا دیں اور ان میں استعداد واحوال کے لحاظ سے دو فریق ہو جائیں ضدی اور بدفہم
تو یہ کہیں کہ ایسے علوم ومعارف اور موثر مضامین ایک امی سے کیسے بن پڑتے ضرور مختلف اوقات
میں کسی سے سیکھتے رہے ہوں گے۔ پھر پڑھ پڑھا کر ہمارے سامنے پیش کر دیے لیکن سمجھدار اور انصاف پسند
لوگوں پر حق واضح ہو جائے گا اور شیطانی شکوک وشبہات دور ہو جائیں گے[1]

مطلب یہ ہے کہ جیسا کہ ہم نے اس سورت یا اس موضوع پر عجیب وغریب اور پُرشوکت انداز میں
دلائل پیش کیے ہیں ایسے ہی ہم پورے قرآن میں اصول ایمان اور محاسن اخلاق کو ثابت کرنے کے لیے
پلٹ پلٹ کر دلائل بیان کر رہے ہیں اور ہم یہ کام دو وجہ سے کرتے ہیں۔ اوّل اس لیے کہ جو لوگ
اس کلام کو پڑھ کر یا سن کر اس کے مقصد ومدعا پر غور نہیں کرتے بلکہ اسے سننے اور پڑھنے کے بعد اس
ٹوہ میں لگ جاتے ہیں کہ آخر یہ امی انسان یہ مضامین کہاں سے لایا ہے۔ یہ ضرور کہیں سے پڑھ کر
آتا ہے، دوسرے اس لیے کہ کچھ لوگ اس کلام کو سن کر اس کے مقصد ومدعا پر غور کرتے ہیں۔ اور جو
حکمت وموعظت کی باتیں اس میں بتائی گئی ہیں اس سے فائدہ اٹھاتے ہیں۔ ان دونوں وجہوں کے
پیش نظر آیت کا مطلب یہ ہوا کہ ہم اپنی آیتیں مختلف اسلوبوں اور پہلوؤں سے پیش کر رہے ہیں تاکہ
سمجھنے والے چاہیں تو سمجھ لیں اور اگر اپنی روش پر اڑے رہنا پسند کریں اڑے رہیں۔ خلاصہ یہ ہے
کہ ضدی اور معاند تو قرآن سن کر کہتے ہیں کہ اسے پیغمبر ضرور کسی سے پڑھ کر آیا ہے اور اہل علم اس سے
فائدہ اٹھاتے ہیں قریش کو جس شخص کی نسبت شبہ تھا کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو سکھاتا ہے
اس کے متعلق امام جو[illegible]ن نے مختلف روایتیں نقل کی ہیں جن سے اس کی شخصیت اور نام کے متعلق صحیح
فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ تاہم مجموعی حیثیت سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مکہ معظمہ میں کوئی نصرانی غلام تھا
جو اپنی زبان میں کتب مقدسہ کبھی کبھی پڑھتا تھا اور آپ راستہ چلتے کبھی کبھار اس کے پاس کھڑے
ہو جاتے تھے۔ اسی پر قریش نے کہا کہ حضور انور کو بھی قرآن کی آیتیں سکھاتا ہے۔ قرآن میں دوسری
جگہ اس کا جواب ہے کہ اس غلام کی اور جو کتابیں وہ پڑھتا ہے ان کی زبان عربی نہیں ہے اور نہ
وہ عربی جانتا ہے، حضور انور عربی کے سوا کوئی اور زبان نہیں جانتے اور خود قرآن کی زبان عربی مبین
ہے۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ حضور اقدس غیر زبان کو سمجھ لیں اور وہ عجمی غلام قرآن جیسی فصیح زبان میں

[1] افادات شیخ الاسلام

کلام کرے۔ بہرحال قرآن یہاں بتا رہا ہے کہ قرآن سن کر کچھ لوگ آپ پر قرآن سیکھنے کا الزام بھی لگائیں گے اور اس بہانہ سے ہدایت کی سعادت سے محروم ہو جائیں گے۔ دراصل ان لوگوں نے قرآن سننے اور پڑھنے کے بعد مغزِ سخن تک پہنچنے کی کوشش نہیں کی ہے۔ چونکہ مخالفانہ تعصب پہلے سے ان پر قبضہ کیے ہوئے ہے اس لیے خدا کی طرف سے نازل شدہ ہونے کے امکان کو چھوڑ کر باقی تمام ممکن التصور صورتیں وہ اپنے ذہن سے تراش رہے ہیں اور انہیں اس طرح بیان کر رہے ہیں کہ گویا انہوں نے اس کتاب کے ماخذ کی تحقیق کر لی ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضور اقدس کی پیغمبرانہ زندگی مکہ میں پورے ۱۳ برس اور مدینہ میں ۱۰ سال قائم رہی۔ اگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کسی انسانی معلم سے فیض پاتے ہوتے تو ضرور تھا کہ وہ اس پورے زمانے یا بڑی حد تک خلوت وجلوت میں آپ کے ساتھ رہتا کہ وقت ضرورت آپ اس سے قرآن بنواتے، احکام و مواعظ سیکھتے، اسرار و نکات معلوم کرتے اور یہ شخص یقیناً مسلمان نہ ہوتا کیونکہ جو شخص خود مدعی نبوت کو تعلیم دے رہا ہے وہ کیوں کر اس کی نبوت کو تسلیم کر سکتا ہے۔ پھر اس شہرت عام، ذکر جمیل، رفعت مقام کو دیکھ کر جو مدعی نبوت کو حاصل ہو رہی تھی وہ خود پردے کے پیچھے گمنامی پسند کرتا اور صحابہ کرام کی نگاہوں سے اس کا وجود ہمیشہ مستور رہتا۔ جس عجمی کی نسبت قریش کو شبہ تھا اگر آپ فی الواقع اس سے تعلیم حاصل کرتے تو قریش جو آپ کی تذلیل وتکذیب اور آپ کو خاموش کرنے کی ہر تدبیر پر عمل پیرا تھے ان کے لیے آسان تھا کہ اس غلام عجمی کو آپ سے الگ کر دیتے کہ آپ کی وحی اور قرآن کا تمام کاروبار دفعتہً درہم برہم ہو جاتے۔ تاریخ گواہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔

اتباع وحی اور نبوت

۱۰۲۔ اے اللہ کے رسول اس وحی کی پیروی کیجئے جو تم پر تمہارے رب کی طرف سے نازل ہوئی ہے کیونکہ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے اور ان مشرکین سے بے رخی اختیار کر لیجئے۔ یعنی آپ خدائے واحد پر بھروسہ کر کے اس کے حکم پر چلتے رہیں اور مشرکین کے جہل وعناد کی طرف خیال نہ کریں کہ ایسے روشن دلائل و بیانات سننے کے بعد بھی راہ راست پر نہ آئیں لے

پہلے یہ بتایا جا چکا ہے کہ ایک طرح کے انسان وہ ہیں جو قرآن کو سن کر اس کے مقصد پر غور

لے افادات شیخ الاسلام

کرتے ہیں۔ دوسری طرح کے وہ لوگ ہیں جو قرآن سننے کے بعد اس فکر میں لگ رہا۔ تے ہیں کہ آخر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم امی ہو کر یہ مضامین کہاں سے لارہے ہیں۔ یہ لوگ اپنے فطری فساد کا مظاہرہ کرتے ہیں اور قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کا انکار کرتے ہیں۔ یہ بتا دینے کے بعد اب حکم ہو رہا ہے کہ آپ گفتار و کردار میں وحی الٰہی پر جمے رہیں، اسی پر عمل کریں۔ مقتدا ہونے کے لیے علم و عمل میں ہم آہنگی ضروری ہے۔ پوری زندگی میں وحی کا بھرپور اتباع کریں۔ یہ توحید ربوبیت ہے اور اس کا اور توحید الوہیت کا چولی دامن کا ساتھ ہے۔ جیسے اللہ سبحانہٗ اجسام کی پروردگاری کے لیے رزق نازل کر رہا ہے ایسے ارواح کی پرورش کے لیے وحی کا نزول ہوا ہے "اللہ کے سوا الٰہ کوئی نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا کہ ان مشرکین کی پروا نہ کیجئے، ان سے اعراض کر لو۔ یہاں یہ حقیقت واضح کر دی ہے کہ پیغمبر کا مقام وحی کی اتباع اور لوگوں کو اللہ کی طرف بلانا ہے۔ نبوت اور اس کے منکروں کی نزاع صرف اس بات پر تھی کہ نبوت کہتی تھی میری راہ تبلیغ و تذکیر کی ہے مخالف کہتے تھے ہماری راہ جبر و تشدد کی ہے، نبوت کہتی تھی کہ اگر میری بات سمجھ میں آئے تو مان لو سمجھ میں نہ آئے تو ماننے والوں کو ان کی راہ چلنے دو۔

یہاں نبوت کو ہدایت ہو رہی ہے کہ جو نہیں مانتے ان سے اعراض کر لیجئے ان کی خرافات کی کوئی پروا نہ کیجئے کیونکہ صداقت کا معاملہ سرتاسر سمجھنے بوجھنے اور سمجھ بوجھ کر اختیار کر لینے کا ہے۔ اس میں نہ تو کسی طرح کی زبردستی ہے نہ کسی طرح کی لڑائی۔ ان کی بھلائی کے لیے ایک بات کہی گئی ہے اگر سمجھ میں آجائے مان لے نہ آئے نہ مانے۔ ہر شخص اپنے نفس کا مختار ہے چاہے بھلائی کی راہ چلے اور چاہے برائی کی اگر کوئی برائی کی راہ چلے گا تو کسی دوسرے کو کچھ نہ کچھ دے گا کہ وہ اس کے پیچھے پڑ جائے، اگر برائی کی چال چلے گا تو کسی دوسرے کا نقصان نہیں کرے گا کہ وہ اس سے بگڑنے لگے اپنی اپنی راہ ہے اور اپنی اپنی کمائی۔

رسول لوگوں کا نگران اور کارساز نہیں

۱۳۳۔ اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو یہ لوگ شرک نہ کرتے تم کو ہم نے ان پر نگران نہیں بنایا ہے اور نہ تم ان کے وکیل ہو۔ یعنی حق تعالیٰ کی تکوینی حکمت اس کی مقتضی نہیں ہوتی ہے کہ وہ ساری دنیا کو زبردستی مومن بنا دے بے شک وہ چاہتا تو کر دیتے زمین پر کوئی مشرک باقی نہ چھوڑتا لیکن شروع سے انسانی فطرت کا نظام اس نے ایسا بنا رکھا ہے کہ آدمی کوشش کرے تو یقیناً ہدایت قبول کر سکے تاہم قبول کرنے میں بالکل مجبور و مضطر نہ ہو۔ پہلے اس مسئلہ کی تقریر گزر چکی ہے

آپ کا فرض تبلیغ اور احکام الٰہی کا اتباع ہے ان کے ذمہ دار اور جواب دہ آپ نہیں ہیں[1]

اس آیت میں دو قانون بتائے گئے ہیں ایک ولو شاء اللّٰہ ما اشرکوا اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو یہ لوگ شرک نہ کرتے ۔ یعنی اللہ نے ایمان کے معاملہ کو جبر و قہر کے تحت نہیں بلکہ بندے کے ارادے و اختیار کے تحت رکھا ہے ۔ اللہ کی یہ عادت نہیں ہے کہ وہ بندے کے ارادے اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت کر دے ۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو اپنے قانون تکوینی کے تحت کسی کو بھی مشرک نہ بننے دیتا لیکن ایسی زبردستی سے نیک و مومن بنا دینا اللہ کے جاری قانون کے خلاف ہے ۔

امر واقعہ یہ ہے کہ یہاں دو صداقتیں ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام کائنات اور اس کے ذرے ذرے پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے ۔ آسمان و زمین میں کوئی چیز نہیں جو اس کے اشارے اور مشیت کے بغیر حرکت کر سکے ۔ اسی طرح انسان اور اس کے تمام اعمال ، افکار ، اخلاق بھی اسی کی مشیت کے تحت ہیں دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار دیا ہے ۔ اگر یہ اختیار تسلیم نہ کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کر لیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز جزا و سزا شریعت اکتاب تعلیم اور انبیاء کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار ہو جاتیں ۔ ظلم و انصاف دنیا میں باقی نہ رہے ۔ انسان کا اپنے کسی فعل پر قابل مدح یا قابل ملامت ہونا بے معنے ہو جائے ۔ قرآن یہاں یہ سمجھا رہا ہے کہ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ لوگوں تک دلائل کی پوری قوت سے آوازہ حق پہنچائیں اور اس کے پہنچانے میں کوئی کمی نہ کرو ۔ اب اگر کوئی حق کو قبول نہیں کرتا تو نہ کرے یہ تو انسان کے ارادہ اختیار کی چیز ہے ۔ اگر اللہ چاہتا تو تکوینی طور پر انسان کو دوسری مخلوقات کی طرح طاعت و ایمان پر مجبور کر دیتا اور یہاں کوئی بھی مشرک نہ ہوتا ۔ منشاء الٰہی یہ ہے کہ انسان کے لیے حق و باطل کے انتخاب کی آزادی رہے اور پھر حق کی روشنی اس کے سامنے پیش کر کے اس کی آزمائش کی جائے کہ حق و باطل میں سے کس کو منتخب کرتا ہے ۔ آپ کا کام صرف یہ ہے کہ آپ لوگوں کے سامنے حق کی روشنی پیش کریں اور خود اپنی زندگی کے تمام گوشوں میں اس پر قائم رہیں ۔

دوسرا قانون یہ بتایا ہے کہ اللہ نے آپ کو داعی اور منذر بنا کر روانہ کیا ہے ۔ آپ ان کے اعمال و

---

[1] افادات شیخ الاسلام

افکار کے نگران اور وکیل نہیں۔ یعنی آپ کا کام یہ ہے کہ نصیحت بات سمجھا دیں یہ نہیں ہے کہ نگہبان بن کر ان پر مسلط ہو جائیں اور یہ سمجھ لیں کہ آپ کو ان کی ہدایت کی ٹھیکیداری مل گئی ہے۔ دوسری جگہ حضور ﷺ کو مخاطب کرتے ہوئے بھی بات یوں ادا کی ہے وما انت علیھم بجبار آپ ان پر حاکم جابر نہیں ہیں کہ جبراً و قہراً منوالیں گے نیز فرمایا کہ لست علیھم بمصیطر آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں کہ مانیں یا نہ مانیں لیکن آپ ان کو ضرور راہ حق پر چلا کر رہیں گے۔

بالفاظ دیگر یہاں اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دنیا میں فکر و عمل کا اختلاف ناگزیر ہے اور آپ تمام انسانوں کو ایک ہی فکر و رائے کا نہیں بنا سکتے ہو لہٰذا جس بات کو حق سمجھتے ہو اس کی دعوت دو لیکن اس کی فکر نہ کرو کہ ساری دنیا آپ کی ہمنوا بن جائے جن کی بات سمجھ میں آئے گی مانیں گے جن کی سمجھ میں نہیں آئے گی نہیں مانیں گے۔ آپ لوگوں پر پاسبان نہیں بنائے گئے ہیں کہ ان کے ہر فکر و عمل کی پاسبانی کریں نہ آپ پر اس کی ذمہ داری ہے کہ ضرور ہی دوسرے کو نیک بنا دیں۔

اگر خدا چاہتا تو انسانوں کو بھی حیوانات کی طرح بنا دیتا کہ سب اپنی حالت میں ایک طرح کے ہوتے لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ اس نے ایسا نہیں کیا۔ اس نے انسانوں کی طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ہر شخص اپنی سمجھ بوجھ اپنی رائے اور اپنی پسند رکھتا ہے اور ہر شخص کی نظر میں وہی کام اچھا ہے جو وہ کر رہا ہے آپ کی نظر میں اس کی راہ خواہ کتنی بُری ہو لہٰذا ضروری ہے کہ اس بارے میں برداشت اور صبر سے کام لو۔

تَسُبُّوا الَّذِينَ يَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللّٰهِ فَيَسُبُّوا اللّٰهَ عَدْوًا
بِغَيْرِ عِلْمٍ كَذٰلِكَ زَيَّنَّا لِكُلِّ اُمَّةٍ عَمَلَهُمْ ثُمَّ اِلٰى رَبِّهِمْ مَّرْجِعُهُمْ
فَيُنَبِّئُهُمْ بِمَا كَانُوا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٠٨﴾ وَاَقْسَمُوا بِاللّٰهِ جَهْدَ اَيْمَانِهِمْ لَئِنْ
جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ لَّيُؤْمِنُنَّ بِهَا قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ وَمَا
يُشْعِرُكُمْ اَنَّهَآ اِذَا جَآءَتْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٠٩﴾ وَنُقَلِّبُ اَفْئِدَتَهُمْ
وَاَبْصَارَهُمْ كَمَا لَمْ يُؤْمِنُوْا بِهٖٓ اَوَّلَ مَرَّةٍ وَّنَذَرُهُمْ فِيْ
طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١١٠﴾

اور اے اہل ایمان جو لوگ خدا کے سوا جن دوسری ہستیوں کو پکارتے
ہیں تم ان کو بُرا نہ کہو کہ پھر وہ بھی حد سے بڑھ کر نادانی میں خدا کو
بُرا کہنے لگیں۔[۱۳۴] ایسے ہی ہم نے ہر اُمت کے لیے ان کے عمل
کو خوشنما بنا دیا ہے، پھر ان کو اپنے رب کے حضور میں پیش ہونا
ہے وہ ان کو بتائے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے تھے۔[۱۳۵] اور یہ لوگ

خدا کی سخت قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی سامنے آجائے تو وہ اسے ضرور مان لیں گے آپ فرما دیجئے کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں اور مسلمانو! تمہیں ان لوگوں کا حال کیا معلوم ہے اگر نشانیاں آبھی جائیں پھر بھی یہ لوگ یقین کرنے والے نہیں ہیں۔[۱۰۹] اور ہم ان کے دلوں اور نگاہوں کو اسی طرح پلٹ رہے ہیں جیسے یہ پہلی بار اس پر ایمان نہیں لاتے اور ہم ان کو ان کی سرکشی ہی میں بھٹکتا چھوڑ رہے ہیں۔[۱۱۰]

معاندین کو معجزے سے ایمان نہیں ملتا

نفسیات انسانی کا خاصہ ہے کہ جب کسی کی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حسن ظن پر محمول نہیں کرتا اور اس کو اس کی ہر چیز میں برائی اور خباثت نظر آتی ہے جلی سے جلی، واضح سے واضح برہان بھی ان کے دل کے شک اور قلب کے زنگ کو دور نہیں کر سکتے۔ معاندین جو انبیاء کے مکارم اخلاق، حسن تعلیم اور دیگر علمی و عملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعووں کو بھی تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے ہیں اور ہر قسم کی دلیلوں کو سن لینے کے بعد وہ اپنے لاعلاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو آخر الحیل کے طور پر وہ نبوت سے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں۔

چونکہ معاندین کو حق و باطل کی تمیز کی قوت نہیں ہوتی اور وہ یقین کی سعادت سے محروم ہوتے ہیں

اس لیے بڑی سے بڑی نشانی بھی ان کو شک و شبہ کے گرداب سے باہر نہیں نکال سکتی وہ کبھی اس کو بخت و اتفاق کا نتیجہ سمجھتے ہیں اور کبھی اس کو سحر و جادو سمجھ کر اس کی تکذیب کرتے ہیں اور کبھی فریب اور قوتِ شیطانی کا ان کو دھوکا ہوتا ہے اس لیے معجزات سے بھی ان کو ہدایت نہیں ہوتی جحت کے لیے ایک بار ان کو معجزہ دکھایا گیا تو ان کا شبہ رفع نہیں ہوا۔ پھر معجزہ طلب کرتے ہیں تو قرآن کہتا ہے کہ اب بھی ان کو تسلی نہ ہوگی، چنانچہ اس سورت کے آغاز میں اللہ تعالیٰ نے ان تمام مراتب کو بیان کر دیا ہے وان یروا کل آیۃ لا یومنوا بہا اگر وہ تمام نشانیاں بھی دیکھ لیں گے تو ایمان نہ لائیں گے۔

مسلمانوں کو فرطِ شفقت سے بار بار یہ خیال آرہا تھا کہ یہ رو سائے قریش ایمان کی دولت سے محروم نہ رہنے پائیں۔ خدا نے فرمایا کہ معجزہ دیکھنے پر بھی ان کے قلوب کو اطمینان نہ ہو کیونکہ اس شک و شبہ کا منشا محض عناد ہے حق طلبی نہیں ہے۔ اگر حق طلبی مقصود ہوتی تو پہلی ہی دفعہ ایمان لے آتے۔

۱۳۴۔ اور اے اہلِ ایمان یہ لوگ خدا کے سوا جن دوسری ہستیوں کو پکارتے ہیں تم ان کو برا نہ کہو کہ پھر وہ بھی حد سے بڑھ کر نادانی میں خدا کو برا کہنے لگیں۔ یعنی تم تبلیغ و نصیحت کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو گئے اب جو کفر و شرک یہ لوگ کریں اس کے خود ذمہ دار ہیں تم پر اس کی کچھ ذمہ داری نہیں۔ ہاں یہ ضروری ہے کہ تم اپنی جانب سے بلا ضرورت ان کے مزید تعنت و کفر کا سبب نہ بنو، مثلاً فرض کیجئے ان کے مذہب کی تردید یا بحث و مناظرہ کے سلسلے میں تم غصہ میں اگر ان کے معبودوں اور مقتداؤں کو سب و شتم کرنے لگو جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جواب میں تمہارے معبود برحق اور محترم بزرگوں کی بے ادبی کریں گے۔ اس صورت میں اپنے واجب التعظیم معبود اور قابلِ احترام بزرگوں کی اہانت کا سبب تم بنے لہٰذا اس سے ہمیشہ احتراز کرنا چاہیے۔ کسی مذہب کے اصول و فروع کی معقول طریقے سے غلطیاں ظاہر کرنا یا اس کی کمزوری اور رکاکت پر تحقیقی و الزامی طریقوں سے متنبہ کرنا جداگانہ چیز ہے لیکن کسی قوم کے پیشواؤں اور معبودوں کی تحقیر و توہین، دلخراش الفاظ نکالنا قرآن نے کسی وقت بھی جائز نہیں رکھا ہے۔[1]

اوپر کی آیات میں شرک اور مشرکین پر سخت تنقید ہوئی ہے اور نبوت کو حکم ہوا ہے کہ مخاطبوں کے رویہ کے پیش نظر صبر اور حلم سے کام لیجئے اور مشرکین کی خرافات سے بے پرواہ ہو جائیے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حکم کے ساتھ تمام اہل ایمان کو حکم دیا کہ تم بھی شرک کی تردید میں ایسا انداز اختیار نہ کرو جس سے مشرکین کے معبودوں کی تحقیر و تذلیل مقصود ہو۔

یہاں چند باتیں غور طلب ہیں۔

اوّل یہ کہ الذین یدعون من دون اللہ سے کون مراد ہیں؟ وہ لوگ جو اللہ کے علاوہ دوسروں کی عبادت کرتے ہیں یعنی عابدین، اگر عابدین مراد ہیں تو ظاہر ہے قرآن نے اس کی کبھی اجازت نہیں دی کہ اختلاف خیال کی بنا پر کسی کو بُرا کہا جائے یا گالی دی جائے بلکہ حکم دیا ہے قولوا للناس حسنا ایک اور آیت میں بھی یہ حکم دوسرے لفظوں میں اس طرح دیا گیا ہے۔

وقل لعبادی یقولوا التی ھی احسن ان الشیطان ینزغ بینھم

اے پیغمبر میرے بندوں میں کہہ دو کہ وہ بات کہیں جو سب سے زیادہ اچھی ہو بے شک شیطان چھیڑ ڈالتا ہے آپس میں۔

اس میں بتایا گیا ہے کہ خوش گوئی اور خوش کلامی باہم خوشگواری پیدا کرتے ہیں اور بدگوئی اور بدکلامی پھوٹ پیدا کرتی ہے جو شیطان کا کام ہے اس لیے اللہ کے بندوں کو چاہیے کہ نیک بات بولیں نیک بات کہیں اچھے لہجے میں اور نرمی سے کہیں۔ اس میں تلقین کی گئی ہے کہ منکرین سے گفتگو کرو تو پسندیدہ طریقے پر کرو۔ اس طرح کی باتیں نہ کہو جس سے باہم فتنہ و فساد پیدا ہو، اور بجائے کھینچنے کے اور زیادہ لوگ متنفر ہو جائیں۔

احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مسلمانوں نے بعض مشرکوں کو کہا تھا انکم من اھل النار تم جہنمی ہو اس پر یہ آیت نازل ہوئی اور مسلمانوں کو اس بات سے روکا گیا کہ تعین کے ساتھ کسی انسان یا جماعت کو ایسا نہ کہیں کہ تم جہنمی ہو، کیونکہ کوئی نہیں جانتا کس آدمی کا خاتمہ کس حال پر ہونے والا ہے بہت ممکن ہے کہ جسے تم بُرا کہہ رہے ہو اسے ہدایت کی توفیق ملنے والی ہو اور اس کی جگہ جنتیوں میں ہو۔ بلا شبہ تم کہہ سکتے ہو کہ یہ بات حق ہے اور یہ حق نہیں ہے لیکن کسی خاص جماعت یا فرد کی نسبت حکم نہیں لگا سکتے کہ یہ ضرور جہنمی ہے۔ اس طرح کسی کو بُرا بھلا کہنے سے ممکن ہے اور زیادہ اپنی غلطی میں ضدی ہو جائے لہٰذا جو کچھ بھی زبان سے نکالو حُسن و خوبی کی بات ہو، سختی و خشونت اور سب و شتم کی بات نہ ہو۔

دوسری بات یہ کہ الذین یدعون من دون اللہ سے مراد عابد نہیں بلکہ معبود ہیں یعنی جن کی وہ عبادت کرتے تھے وہ اصنام، اوثان، تماثیل کی صورت میں ہوتے تھے لیکن دنیا میں کوئی قوم ایسی

نہیں گزری جس نے محض لکڑی، پتھر اور اینٹ کی بے جان مورت کو معبود بنایا ہو بلکہ بت، تصویر اور تمثال جب بھی بنایا گیا ہے کسی جاندار مخلوق بلکہ بزرگوں، پیغمبروں اور نیک بندوں کے نام اور شکل ہی پر بنایا گیا ہے اور بتوں سے وہ کام لیا گیا جو فوٹو اور تصویر سے لیا جاتا ہے کہ ان کے سامنے رکھنے سے ذی صورت اور صاحب تصویر کا خیال جمنے کی وجہ سے یک جہتی واقع ہوتی ہے اور خیالات میں پراگندگی نہیں ہوتی ہے غور فرمایئے کہ قرآن عزیز میں جن پانچ بتوں کا ذکر ہے ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر، یہ حضرت نوح کے زمانے کے نیک اور صالح انسانوں کے نام ہیں۔ ان ہی کی تصویریں بنا کر ان کی پرستش ہوتی تھی۔ شاہ عبدالعزیز کا انکشاف ہے کہ یہ پانچوں حضرت ادریس کے صاحبزادوں کے نام ہیں، بلکہ حافظ ابن القیم نے اغاثۃ اللھفان میں یہ بھی بتایا ہے کہ

اکثر سلف کا بیان ہے کہ یہ پانچ حضرت نوح کی قوم کی نیکوکار اور بزرگ ہستیاں تھیں جب وہ وفات پا گئے تو لوگوں نے اولاً ان کی قبروں کی مجاوری کی بعد ازیں ان کی تصویریں اور بت بنالیے اور پھر کچھ عرصہ بعد ان کی عبادت شروع کر دی۔

قرآن کریم میں لات بت کا ذکر آتا ہے اس کے متعلق صحیح بخاری میں ہے کہ یہ ایک نیک آدمی تھا جو حاجیوں کو ستو گھول گھول کر پلاتا تھا۔ جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ۸ھ میں مکہ میں فاتحانہ حیثیت سے داخل ہوئے تو اس وقت بیت اللہ میں ۳۶۰ بت نصب تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کا ذکر اس طرح آیا ہے۔

صورۃ ابراھیم و اسماعیل فی ایدیھما من الازلام

حضرت ابراہیم و اسماعیل کے ہاتھوں میں تیر تھے۔

مسند احمد میں ہے کہ بتوں میں ایک مجسمہ حضرت مریم کا بھی تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ عزیٰ ایک عورت تھی منات بھی انسان کا نام تھا۔ الاتقان میں ہے کہ قرآن میں بتوں کے وہ نام جو انسانوں سے تھے ان میں لات و منات ہیں۔ قرآن میں بعل بت کا ذکر آتا ہے۔ الاتقان میں ہے کہ یہ ایک عورت کا نام ہے جس کا مجسمہ بنالیا گیا تھا۔ اساف، نائلہ اور ہبل کے بارے میں بھی یہی انکشاف تاریخ میں موجود ہے۔

بہرحال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ دو چیزیں ایک مجسمے تصویریں، تماثیل اور اصنام ہیں۔ دوسری وہ شخصیتیں ہیں جن کے یہ مجسمے اور بت بنائے گئے ہیں بت اپنی یاد کے لحاظ سے جمادات ہیں۔ لیکن جن کے یہ بت بنائے گئے وہ ذوی العقول ہستیاں ہیں۔ قرآن نے مشرکین کے شرک کی تردید

میں دونوں چیزیں پیشِ نظر رکھی ہیں۔ کبھی وہ بتوں پر جمادات ہونے کی حیثیت میں بھرپور حملہ کرتا ہے اور کہتا ہے انکم و ما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم تم اور تمہارے معبود اللہ کے سوا جہنم کا ایندھن ہیں۔ اس موقعہ پر ایسے الفاظ استعمال کرتا ہے جو عربی زبان میں بے جان چیزوں کے لیے استعمال ہوتے ہیں جیسے ما، اور کبھی ان ہستیوں کا ذکر کرتا ہے جن کے وہ بت بنا لیے گئے ہیں اس موقعہ پر وہ الفاظ استعمال کرتا ہے جو ذوی العقول کے لیے عربی میں استعمال ہوتے ہیں جیسے الذین اور جمع مذکر کے صیغے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایک دقیق نکتہ کی نشاندہی فرمائی ہے؛

> اللہ تعالیٰ ان مشرکین کی یہ کہہ کر کبھی تردید کرتا ہے کہ حکم اور ملک صرف اللہ کا ہے اور کبھی یہ کہہ کر یہ جمادات ہیں۔

عام شارحین قرآن نے الذین یدعون من دون اللہ سے مشرکین کے وہ معبود مراد لیے ہیں جو بتوں کی صورت میں ہیں اور اس کے نتیجے میں تین مشکلوں سے دوچار ہونا پڑا ہے۔ پہلی مشکل یہ ہے کہ خود قرآن حکیم نے بتوں کو سخت و سست کہا ہے مثلاً کہا ہے انکم وما تعبدون من دون اللہ حصب جھنم تم اور تمہارے معبود جہنم میں جائیں گے، ان کو طاغوت کہا ہے۔ دوسری مشکل یہ ہے کہ اگر آیت میں بت مراد ہیں تو قرآن نے ذوی العقول کی تعبیر کیوں اختیار کی یہ کیوں نہیں فرمایا و ما تعبدون من دون اللہ وہ چیزیں جن کی وہ عبادت کرتے ہیں۔ تیسری مشکل یہ ہے کہ مشرکین تو خود اللہ کو مانتے تھے بلکہ اللہ کو اس کائنات کا خالق، مالک، مدبر کہتے تھے اس لیے وہ اللہ کو گالیاں کیسے دے سکتے ہیں؟

ان تینوں مشکلات سے بچنے کے لیے حل یہ بتایا گیا ہے۔

اولاً یہ کہ آیات قرآنی میں جہاں کہیں ایسے الفاظ آئے وہ بطور مناظرہ کسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے کہے گئے ہیں وہاں کسی کی دل آزاری پیشِ نظر نہیں ہے اور نہ کوئی سمجھدار انسان ان سے یہ نتیجہ نکال سکتا ہے کہ اس میں بتوں کو برا کہنا یا مشرکین کو چڑانا مقصود ہے اور یہ ایک ایسا کھلا ہوا فرق ہے جس کو ہر زبان کے اہل محاورہ سمجھتے ہیں جیسے عام طور پر عدالتوں میں ہر روز سامنے آتا رہتا ہے۔ اسی طرح قرآن حکیم نے جا بجا بتوں کے بے حس و شعور اور بے علم و قدرت اور بے بس ہونے کو اس پیرایہ میں بیان فرمایا ہے کہ سمجھنے والے حقیقت کو سمجھ لیں اور نہ سمجھنے والوں کی غلطی یا کوتاہ نظری واضح ہو جاتے۔ لیکن اس جواب میں کوئی جان نہیں ہے۔ اس صورت میں بتوں کو

بُرا کہنا کوئی طاعت نہیں بلکہ ایک امر مباح ہوگا جیسا کہ ابومنصور سے صاحب روح نے نقل کیا ہے۔ اور کچھ نے اس مشکل سے بچنے کے لیے یہ راہ نکالی ہے کہ قرآن میں جو بتوں کی بے بسی کی تصویر کہیں کہیں کھینچی گئی ہے وہ اس کے تحت نہیں آئی ہے بلکہ اس کی حیثیت تنقید و توضیح کی ہے۔

ثانیاً بتوں کے لیے ما تعبدون من دون اللہ کی تعبیر چھوڑ کر الذین تعبدون کی تعبیر مشرکین کے خیال کے مطابق ہے کہ وہ بتوں کو ذوی العقول میں شمار کرتے تھے۔ یہ بات علامہ قرطبی نے لکھی ہے لیکن اس دعویٰ کی انہوں نے کوئی دلیل پیش نہیں کی ہے۔ علامہ آلوسی نے بھی یہی بات لکھی ہے۔

ثالثاً یہ کہ مشرکین اللہ کو مانتے تھے وہ اللہ کو کیسے گالیاں دے سکتے ہیں اس مشکل کو اس طرح حل کیا ہے کہ بعض اوقات غیظ و غضب کی وجہ سے انسان آپے سے باہر ہو جاتا ہے اور اس حالت میں واہی تباہی بکنے لگتا ہے۔ یہ بات علامہ آلوسی نے روح المعانی میں بتائی ہے۔

اصل یہ ہے کہ میرے خیال میں ہمیں ذرا حقیقت میں نگاہ سے معاملہ کے اس پہلو پر غور کرنا چاہیے کہ مسلمانوں کو ہدایت یہ ہو رہی ہے کہ شرک کی تردید یہ رنگ اختیار نہ کرنے پائے کہ مسلمان تردید شرک کے جوش میں ان کو بُرا بھلا کہنا شروع کر دیں جن کی مشرکین عبادت کرتے ہیں۔ الذین یدعون من دون اللہ اپنے حقیقی معنے میں ہے اس سے مراد بُت نہیں بلکہ وہ ہستیاں ہیں جن کی وہ عبادت کرتے ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ بتوں کو بُرا کہتے کہتے اور ان کی بُرائی بیان کرتے کرتے ان ہستیوں کو نشانہ نہ بنا لینا جن کے ان مشرکین نے بُت تیار کیے ہیں۔ تصویر بے شک غلط ہے لیکن جس کی تصویر بنائی گئی ہے وہ بے قصور اور ان کے اس کردار سے بے خبر ہے اپنی تنقید کا ان کو نشانہ نہ بنانا۔ بیت اللہ میں حضرت ابراہیم کے بت کی پرستش دیکھ کر حضرت ابراہیم کو بُرا نہ کہنا، قبر کی پرستش ہوتے دیکھ کر مقبور کو بُرا نہ کہنا۔ اگر تم ایسا کرو گے کہ ان ہستیوں کو بُرا کہو گے تو وہ لوگ نادانی سے جہالت سے شان خدا میں گستاخیوں پر اتر آئیں گے۔

گویا اس آیت میں مسلمانوں کو دعوت توحید کے سلسلے میں بتایا جا رہا ہے کہ شرک کی تردید نہایت ضروری ہے لیکن ضروری ہونے کے ساتھ اس میں ذرا نزاکت بھی ہے۔ ضرورت تو اس کی واضح ہے نزاکت کو یہاں بتایا جا رہا ہے۔ نزاکت یہ ہے کہ اگر مشرکین اپنے مشرکانہ اعمال خدا کے نیک بندوں کو معبود بنا کر رہے ہوں تو اس میں احتیاط کا دامن تھام کر رکھنا چاہیے، شرک کی تردید کرنی چاہیے لیکن جن بزرگوں کو انہوں نے معبود بنا رکھا ہے ان کے دامان احترام کو ہاتھ نہ لگانا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ شرک کی تردید کے جوش میں حضرت عیسیٰ، حضرت مریم کا دامان احترام ہاتھ سے نکل جائے۔ یہی حکم ان سب

بزرگوں کا ہے دنیا جن کی تماثیل بنا کر یا جن کی قبریں بنا کر ان سے عابدانہ تعلقات قائم کیے ہوئے ہے شرک کی برملا تردید کی جائے گی لیکن بزرگوں کے احترام میں ہرگز فرق نہ کیا جائے گا۔ اس تشریح کے بعد کوئی اشکال نہیں رہتا ہے۔ نہ بتوں کو سخت دسست کہنے میں کوئی قباحت ہے۔ الذین میں کسی تاویل کی ضرورت ہے

آیت کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ مسلمانو! بحث و مباحثہ کے موقعہ پر تم مشرکین کے معبودوں کو بُرا نہ کہو جن کو وہ اپنی دعاؤں میں اللہ کے سوا پکارتے ہیں۔ ان کو اپنے اور خدا کے درمیان واسطہ سمجھ کر اور بارگاہِ الٰہی میں دفع بلایا جلب منفعت کے لیے سفارشی سمجھ کر۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ بھی جھگڑے اور بحث و مباحثہ میں حدود سے تجاوز کر جائیں گے اور بغیر علم خدا کی شان میں گستاخیوں پر اتر آئیں گے اگرچہ وہ خدا کو مانتے ہیں مگر انسان حالتِ غضب میں بے قابو ہو جاتا ہے اور سوچ سمجھ سے بالا ہو کر جوابی کاروائی کرتا ہے۔ ایک عیسائی مسلمانوں کے پیغمبر کے دامانِ احترام کو ہاتھ لگاتا ہے مسلمان حالتِ غضب میں عیسائی کے پیغمبر پر حملہ آور ہو جاتا ہے۔ ایک شیعہ سُنی سے اُلجھتا ہے اور حضرت ابوبکر کو اپنی تنقید کا نشانہ بناتا ہے سُنی اس کے مقابلہ میں حضرت علی پر فقرہ کس دیتا ہے حالانکہ مسلمان جانتا ہے کہ حضرت عیسٰی کو بُرا کہنا کفر ہے اور سُنی کو پتہ ہے کہ حضرت علی کے دامانِ احترام کو ہاتھ لگانا فسق ہے بلکہ دو بھائی آپس میں لڑتے ہیں اور غضب کی حالت میں دونوں ماں کی گالیاں دیتے ہیں حالانکہ جانتے ہیں کہ دونوں کی ماں ایک ہے۔ اسی نکتہ کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک حدیث میں اس طرح بیان فرمایا ہے کہ سب سے بڑا گناہ یہ ہے کہ آدمی اپنے والدین کو گالی دے۔ کہا گیا یا رسول اللہ اپنے والدین کو گالی کون دیتا ہے فرمایا اس طرح کہ جب کوئی کسی کے باپ کو بُرا بھلا کہے گا تو وہ بھی اس کے ماں باپ دونوں کو بُرا بھلا کہے گا۔ (صحیح بخاری)

اس لیے آیت میں بغیر علم سے اس علم حضوری کی نفی کی جا رہی ہے جو آدمی میں عمل کی تحریک پیدا کرتا ہے۔

عام شارحین قرآن نے آیت کی تشریح میں مشرکین کے معبودوں سے ان کے بُت ہی مراد لیے ہیں اور عبداللہ بن عباس، قتادہ اور سدی کی تشریحات بھی اسی کی مؤید ہیں۔

مفسر قرآن مشہور محدث ابن جریر نے عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے بتایا ہے:

مشرکین نے کہا کہ اے محمد تم ہمارے معبودوں کو بُرا کہنے سے باز آجاؤ، ورنہ ہم آپ کے رب کی ہجو کریں گے۔

اور ابن جریر نے ہی حضرت قتادہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ

مسلمان کافروں کے بتوں کو برا کہتے تھے اور کفار اللہ کی شان میں نازیبا کلمات کہتے تھے۔

اور ابن جریر ہی نے سدی کے حوالے سے اسی سلسلے میں ایک واقعہ لکھا ہے۔ جس میں بتایا گیا ہے کہ جب ابو طالب کی وفات کا وقت قریب آیا تو قریش نے فیصلہ کیا کہ ہمیں ابو طالب کے پاس چل کر ان سے مطالبہ کرنا چاہیے کہ وہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو روک دے ورنہ یہ بات ہمارے لیے بڑی عار کی ہوگی ابو طالب کے بعد ہمارے ہاتھوں حضور انور کی موت ہو جاتے اور اہل عرب کہیں کہ چچا نہیں رہا تو بھتیجے کو مار دیا۔ چنانچہ ابو سفیان، ابو جہل، البغتری بن الحارث، امیہ ابن خلف، ابی ابن خلف، عقبہ بن معیط، عمرو بن العاص اور الاسود بن البختری اکٹھے ہو کر ابو طالب کے پاس گئے اور بولے کہ آپ ہمارے بڑے ہیں اور سردار ہیں، محمد مصطفیٰ نے ہمیں اور ہمارے معبودوں کو بہت تکلیف پہنچائی ہے ہم آپ سے مطالبہ کرتے ہیں کہ آپ ان کو بلا کر سمجھا دیجئے کہ ہمارے معبودوں کو کچھ نہ کہے۔ ابو طالب نے حضور انور کو بلایا اور کہا کہ یہ قوم کے بزرگ آتے ہیں، حضور نے فرمایا کہ کیا کہتے ہیں؟ سب بول پڑے ہم چاہتے ہیں کہ آپ ہمیں اور ہمارے معبودوں کو کچھ نہ کہیں ہم آپ کو اور آپ کے معبود کو کچھ نہ کہیں گے۔ حضور انور نے فرمایا بالکل ٹھیک کہتے ہو میں اس کی پابندی کروں گا بشرطیکہ تم میری ایک بات مان لو۔ بات بھی معمولی نہیں بلکہ اتنی اونچی ہے کہ اگر مان لوگے تو پورا عرب تمہارے ملک ہو جائے گا اور عجم تمہارا باج گزار ہو جائیگا ابو جہل بولا ایسی بات ایک منواتے ہو ہم تو دس ماننے کو تیار ہیں بتاؤ کیا بات ہے؟ فرمایا کہو لا الٰہ الا اللہ سارے بگڑ گئے۔ ابو طالب نے کہا بھتیجے اس بات کے علاوہ کوئی اور بات منواؤ ان کو اس سے تکلیف ہوتی ہے۔ حضور نے فرمایا چچا جان میں تو اس کے علاوہ کچھ نہیں کہہ سکتا۔ اگر وہ آسمان سے آفتاب اتار لائیں اور میرے ہاتھ پر رکھ دیں پھر بھی میں صرف یہی کہوں گا۔ اس پر وہ غضب میں آگئے اور یک زبان ہو کر بول پڑے کہ یا تو آپ ہمارے معبودوں کو برا کہنا چھوڑ دیں ورنہ آپ کو بھی برا کہیں گے اور اس کو بھی جو آپ کو حکم دیتا ہے۔

ان روایات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ ان بزرگوں کی رائے میں الذین یدعون من دون اللہ سے بت تماثیل اور اوثان مراد ہیں۔ اگر ایسا ہی ہے تو بتوں کو برا کہنا کوئی برائی نہیں ہے بلکہ ایک طاعت ہے اور طاعت نہیں تو کم از کم ایک مباح عمل ہے۔

ایک دستوری دفعہ کا چہرہ

اسی بنا پر علماء نے اس آیت سے یہ دستوری دفعہ معلوم کی ہے کہ جو کام اپنی ذات کے اعتبار سے

جائز بلکہ کسی درجہ میں محمود بھی ہو مگر اس کے کرنے سے فساد لازم آتا ہو۔ یا اس کے نتیجہ میں لوگ مبتلائے معصیت ہوتے ہیں وہ کام بھی ممنوع ہو جاتا ہے کیونکہ معبودات باطلہ یعنی بتوں کو بُرا کہنا کم از کم جائز تو ضرور ہے اور ایمانی غیرت کے لحاظ سے کہا جاتے تو شاید اپنی ذات میں محمود بھی ہو لیکن چونکہ اس کے نتیجہ میں یہ اندیشہ ہے کہ لوگ اللہ کو بُرا کہیں گے تو بتوں کو بُرا کہنے والے اس کا سبب بن جائیں گے اس لیے اس جائز کام کو بھی منع کر دیا گیا۔

مطلب یہ ہے کہ جو کام اپنی ذات میں جائز بلکہ طاعت و ثواب بھی ہو گر مقاصد شرعیہ میں سے نہ ہو اگر اس کے کرنے پر کچھ مفاسد لازم آجائیں تو وہ کام ترک کر دینا واجب ہوگا بر خلاف مقاصد شرعیہ کے کہ وہ لزوم مفاسد کی وجہ سے ترک نہیں کیے جا سکتے۔

فقہا نے اس دستوری دفعہ کی روشنی میں بہت سے اخلاقی، معاشرتی، مالیاتی قوانین ترتیب دیے ہیں ابن العربی اور الجصاص نے ان مسائل کی طرف جستہ جستہ اشارات بھی کیے ہیں یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے

ہر قوم کو اپنا ہی عمل اچھا لگتا ہے

۱۳۵ - ایسے ہی ہم نے ہر امت کے لیے ان کے اعمال کو خوشنما بنا دیا ہے۔ پھر ان کو اپنے رب کے حضور میں پیش ہونا ہے وہ ان کو بتائے گا کہ وہ کیا کچھ کرتے تھے۔ یعنی دنیا چونکہ دار الامتحان ہے اس کا نظام ہم نے ایسا رکھا ہے اور ایسے اسباب جمع کر دیے ہیں کہ یہاں ہر قوم اپنے اعمال اور طور و طریق پر نازاں رہتی ہے انسانی دماغ کی ایسی ساخت نہیں بنائی کہ وہ صرف سچائی کے قبول اور پسند کرنے پر مجبور رہو غلطی کی طرف جانے کی گنجائش ہی نہ رکھے ہاں خدا کے یہاں جا کر جب تمام حقائق سامنے ہوں گے پتہ چل جائے گا کہ جو کام دنیا میں کرتے تھے وہ کیسے تھے [1] مطلب یہ ہے کہ ہر قوم اپنی راہ رکھتی ہے اور اپنی ہی راہ اسے اچھی لگتی ہے۔ اللہ کی یہی سنت ہے جو انسانی اخلاق و اطوار میں ہمیشہ سے چل رہی ہے کہ اپنے مالوف اور اپنی پسندیدہ عادتوں کو جو ان کو وراثت میں ملی ہوں اچھا سمجھتے ہیں خواہ وہ تقلید و جہالت کی وجہ سے کرتے ہوں اور چاہے وہ علم و بصیرت کی بنا پر کرتے ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اختیاری اعمال میں تزئین کا خاص اثر ہوتا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ اللہ نے کچھ دلوں میں کفر کی تزئین اور کچھ دلوں میں ایمان کی تزئین تخلیق فرمائی ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو ایمان و کفر اور خیر و شر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان خلقی اطوار میں سے ہو کر رہ جائیں جن کی دعوت و ترغیب یا ممانعت و ترہیب بیکار ہو کر رہ جاتے، نہ رسول کی ضرورت رہے اور نہ کتابوں کی حاجت اور اس کے نتیجہ میں نیکوں اور بدوں کا معاملہ ملائکہ اور شیطان جیسا ہو کر رہ جاتے، بلکہ اس کے برعکس ہر انسان میں ایمان و کفر اور خیر و شر قبول کرنے کی یکساں صلاحیت اور استعداد رکھی ہے۔ معتزلہ اور جبریہ نے خواہ مخواہ یہاں اپنے غلط مسلکوں پر آیت کو چسپاں کرنے کی کوشش کی ہے۔ مطلب بالکل واضح اور صاف ہے کہ جس طرح ہم نے ان لوگوں کی نظر میں ان کا یہ عمل خوشنما بنا دیا ہے اسی طرح ہر طبقہ کی نظر میں اس کا اپنا ہی عمل پسندیدہ کر دکھایا ہے۔ تزئین بمعنی تخلیق نہیں ہے بلکہ یہاں تزئین اعمال کے معنے اعمال اقوام میں اللہ کے قانون کے ہیں۔ یعنی جو امور قوانینِ فطرت کے تحت رونما ہوتے ہیں اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنا فعل قرار دیا ہے کیونکہ ان قوانین کا بنانے والا وہی ہے اور جو کچھ ان قوانین کے تحت ہوتا ہے وہ اسی کے حکم سے ہوتا ہے، منشا یہ ہے کہ ہر قوم کو اپنی روایات اپنے رسوم اور اپنے معتقدات عزیز ہوتے ہیں اور یہ ایک فطری بات ہے۔

اعجاز صرف ارادہ الٰہی کا نام ہے

۱۰۹ - اور یہ لوگ خدا کی سخت قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اگر کوئی نشانی سامنے آجاتے تو وہ اسے ضرور مان لیں گے آپ فرما دیجئے کہ نشانیاں تو اللہ ہی کے پاس ہیں، اور مسلمانو! تمہیں ان لوگوں کا حال کیا معلوم ہے؟ اگر نشانیاں آبھی جائیں پھر بھی یہ لوگ یقین کرنے والے نہیں ہیں۔ یعنی فرمائشی معجزے مثلاً کوہ صفا خالص سونے کا بن جاتے۔ بعض مسلمانوں کو یہ خیال ہوا کہ اچھا ہو اگر ان کی یہ حجت بھی پوری ہو جاتے۔ اس پر فرمایا کہ تمہیں کیا خبر ہے کہ یہ سرکش ضدی لوگ فرمائشی نشان دیکھ کر بھی ایمان نہیں لائیں گے۔ پھر سنت اللہ کے موافق اس کے مستحق ہوں گے کہ فوراً تباہ کر دیے جائیں جیسا کہ اسی سورت کے شروع میں ہم مفصل لکھ چکے ہیں [1]

اس میں دو باتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ انہوں نے قسمیں کھا کر یہ یقین دلایا ہے کہ اگر معجزہ ظاہر ہو جاتے تو وہ ضرور ایمان لے آئیں گے۔ اس کے جواب میں فرمایا گیا ہے کہ کہہ دو انما الآیات عند اللہ نشانیاں تو اللہ کے پاس ہیں۔ اس آیت کی تشریح میں تمام شارحینِ قرآن اس پر متفق ہیں کہ آیت میں

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

قصر ہے اور معنے یہ ہیں کہ آیات کا معاملہ مستقلاً اللہ کی ذات سے تعلق رکھتا ہے یہ میری دسترس اور قدرت میں نہیں ہے۔ اس انداز تعبیر نے ان لوگوں کی فکری غلطی کی اصلاح کر دی جو سمجھتے ہیں کہ معجزہ پیغمبر کا کام ہوتا ہے یہ اس لیے خاص طور پر بتایا گیا ہے کہ اسلام میں توحید اور نبوت کی حقیقتیں مشتبہ نہ ہو جائیں۔ اسی قسم کی آیات سے ہمارے متکلمین نے یہ بات عقائد میں داخل کر دی ہے کہ معجزہ نبی کا نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے فتح الصفا شرح الشفا میں ہے کہ

> متکلمین کہتے ہیں کہ معجزہ کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے اور انسان کی قدرت و طاقت سے بالا ہوتا ہے۔

احناف میں سے شیخ ابن الہمام نے بھی اپنی عقائد پر لکھی ہوئی مشہور کتاب المسامرہ میں لکھا ہے کہ معجزہ صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور اس کے شارح کمال الدین محمد ابن ابی شریف نے بھی یہی بات لکھی ہے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور عقائد کی مشہور کتاب المواقف میں علامہ عضد الدین عبدالرحمٰن نے معجزہ کی شرائط بیان کرتے ہوئے پہلی شرط یہ بتائی ہے کہ معجزہ اللہ کا فعل ہو اور پھر آگے اس کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> معجزہ ہمارے نزدیک فاعل مختار کا فعل ہے جس کو وہ اس شخص کے ہاتھ پر ظاہر کرتا ہے جس کی نبوت کی اپنی مشیت سے تصدیق کرنا چاہتا ہے۔

ان عبارات سے آفتاب نیم روز کی طرح یہ بات واضح ہے کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے نبی کا فعل نہیں ہوتا اللہ تعالیٰ اپنی مشیت سے اس فعل کے ذریعے نبی کی نبوت اور رسالت کی عملی اور گویا ایک گونہ قولی تصدیق کرتا ہے۔

آیئے ذرا کچھ ان کی زبانی بھی کچھ سن لیجئے جن کو کلام اور تصوف دونوں میں امام مانا گیا ہے۔ امام غزالی احیاء العلوم میں فرماتے ہیں:

> معجزہ انبیاء کرام کی صداقت پر بایں طور دلالت کرتا ہے کہ جب اس کے ظاہر کرنے سے تمام انسان عاجز ہیں تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہوگا اور بس، اور جب یہ نبی کے دعویٰ نبوت کی آغوش میں ہو کر رونما ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے تصدیق کر دی کہ تو دعویٰ نبوت میں سچا ہے۔

یہ عبارت بھی اس بات کی واشگاف دلیل ہے کہ معجزہ بس اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہوتا ہے۔ آیت کا صاف مطلب یہ ہے کہ معجزات و خوارق کا وقوع پیغمبر یا کسی بندے کے ہاتھ میں نہیں ہے۔

تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہے اس لیے کہ معجزے کی حقیقت سے نظام کائنات کے کسی مستمر اور بندھے ہوتے معمول میں کچھ ترمیم کرنا اور اس کا تمام تر خالق کائنات ہی کے اختیار میں ہونا بالکل ظاہر ہے وہی قدرت بھی اس پر رکھتا ہے اور وہی علم بھی اس کا رکھتا ہے کہ کس معجزے کا وقوع موافق حکمت ہوگا اور کس کا مخالف حکمت، لہٰذا کسی مخصوص و متعین معجزہ کی فرمائش ہی سرے سے بے جا ہے۔ البتہ نفس معجزہ یا کوئی غیر معمولی نشان پیغمبر کے دعوے کی تصدیق و تقویت کے لیے عین موافق حکمت ہے اور ایسے نشانات ایک نہیں بے شمار ظاہر ہو چکے۔ مطلب یہ ہے کہ جس قسم کے معجزات کا تم مطالبہ کر رہے ہو، یہ معجزات تو خدا ہی کے پاس ہیں وہ چاہے تو ظاہر فرمائے اس معاملے میں مجھے کوئی اختیار نہیں۔ یہ ٹھیک ٹھیک امر واقعی کا بیان ہے پیغمبر کا اصلی فریضہ انذار و تبشیر ہے۔ لوگوں کی طلب کے مطابق معجزے دکھانا نہ اس کے اختیار میں ہے نہ اس کے فرائض منصبی میں داخل ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ وما یشعرکم انھا اذا جاءت لا یومنون۔ اور تمہیں کیا معلوم ہے کہ اگر نشانیاں آ بھی جائیں پھر بھی یہ لوگ ایمان نہ لائیں گے۔ مسلمانوں کو رہ رہ کر یہ خیال آتا تھا کہ اگر ان منکروں کی فرمائشیں پوری کردی جائیں تو کیا ہی اچھا ہو شاید یہ لوگ اس طرح مسلمان ہو جائیں۔ اس میں اسی بات کا مسلمانوں کو جواب دیا جارہا ہے کہ تمہیں کیا معلوم ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب کیا ہے تم سمجھتے ہو کہ ان کو کوئی معجزہ دکھا دیا جائے تو یہ مان لیں گے حالانکہ اس وقت وہ نہ مانیں گے بلکہ بدستور اڑے رہیں گے۔

قرآن نے یہ بات دوسری آیات میں کھول کر بتائی ہے کہ معجزات و دلائل، آیات اور آثار سے ہدایت ان لوگوں کو ملتی ہے جن کے دلوں میں قبول حق کی طرف میلان ہو۔ بڑے سے بڑے معجزات اور عجیب سے عجیب خوارق ان لوگوں کے نزدیک سحر و جادو سے زیادہ وقعت نہیں رکھتے جن کے دل انابت اور رجوع الی الحق کی استعداد سے خالی ہوں۔ اگر قبولیتِ حق اور اصلاح کی یہ استعداد نہ ہو تو بڑے سے بڑے معجزات بھی کوئی وقعت نہیں رکھتے اور یہی وہ لوگ ہیں جن کے دلوں پر گمراہی اور شقاوت کی مہر لگی ہوئی ہے۔

کُفر و سرکشی کا نتیجہ

۱۲۷ - اور ہم ان کے دلوں اور نگاہوں کو اس طرح پلٹ رہے ہیں جیسے یہ پہلی بار اس پر ایمان نہیں لائے تھے اور ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتا چھوڑ رہے ہیں۔ یعنی جب کُفر و سرکشی میں تمہاری

اور زیادتی ہوگی تو نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم ان کے دل اور آنکھیں اُلٹ دیں گے پھر حق کے سمجھنے اور دیکھنے کی توفیق سے بھی محروم ہو جائیں گے۔ موضح القرآن میں ہے کہ اللہ جن کو ہدایت دیتا ہے اوّل ہی حق سن کر انصاف سے قبول کرتے ہیں اور جس نے پہلے ہی خدا کی اگر نشان بھی دیکھے تو کچھ حیلہ بنا لے گا[1]

یہ اس قانون کا بیان ہو رہا ہے جس کے تحت کسی کو ایمان نصیب نہیں ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہیں کیا پتہ ہے کہ معجزات کی رونمائی کے وقت ہم ان کے دلوں کو خواطر اور تاویلات میں اور ان کی قوتِ فکری کو احتمالات کی تخلیق اور ان کی نگاہوں میں تخیلات کی طرف پلٹ دیں گے اور یہ ٹھیک ایسا ہی ہوگا جیسے بار اوّل یہ ایمان نہ لا کر چکے ہیں۔ جس طرح آج تک وہ ساری نشانیوں کو جھٹلاتے رہے ہیں اب بھی جھٹلا دیں۔ ونذرھم فی طغیانھم۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کے ایمان نہ لانے کا اصلی سبب ان کا طغیان اور ان کی سرکشی ہے۔ معاندین چونکہ عموماً دولت مند، رؤسا اور مدعیانِ عقل و خرد ہوتے ہیں اس لیے ان کا جذبہ انانیت اور ترفع ان کو داعیان کے سامنے سرنگوں ہونے سے باز رکھتا ہے۔

یہ ہیں آخری سطریں جو اس بے مایہ اور خطاکار کے قلم سے ساتویں پارے کی تشریحات میں سپردِ قرطاس ہوئی ہیں۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم۔

۲۴ محرم الحرام ۹۹ھ
۲۴ دسمبر ۷۸ء
اتوار ۶ بجے بعد مغرب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

معالم القرآن

جلد ہشتم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

نام کتاب : ــــــــــــــ معالم القرآن

ملکیت : ــــــــــــــ ادارہ تعلیمات قرآن سیالکوٹ

عناوین : ــــــــــــــ ۲۴۴۔

آیات : ــــــــــــــ ۱۴۲۔

طابع : ــــــــــــــ محمد شریف مولوی فاضل

تزئین و آرائش : ــــــــــــــ سید محمد انور حسین نفیس رقم لاہور

کتابت : ــــــــــــــ محمود احمد صوفی گوجرانوالہ

ناشر : ــــــــــــــ قاری عبدالرحمان ۔ ایم اے

صفحات : ــــــــــــــ ۶۳۲۔

تاریخ اشاعت : ــــــــــــــ رجب المرجب ۱۴۰۱ھ مطابق مئی ۱۹۸۱ء

مطبوعہ ــــــــــــــ زاہد بشیر پرنٹرز لاہور

قیمت : ۵۴ روپے

انتساب

میں تفسیر معالم القرآن کی آٹھویں جلد کو جس میں اُمّت کو دین کی تکمیل کی خوشخبری سُنا کر رہتی دُنیا تک قوامیّت اور شہادت علی النّاس کے منصب جلیل پر فائز کیا گیا ہے قابلِ صد احترام جناب الحاج سراج الدّین صاحب (ولد محمد بخش صاحب) والد حاجی عبد الغنی صاحب سلمہُ اللہ تعالیٰ گوجرانوالہ کے نام منسوب کرتا ہوں جن کی قرآن کی اشاعت میں ڈوبی ہوئی مخلصانہ دریا دلی سے یہ جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔

دُعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کے اس جذبۂ خیر کو تا دیر قائم رکھے اور ان کے لیے دُنیا اور آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنائے۔ آمین ثمّ آمین۔

قاری عبد الرحمٰن ایم۔ اے
ناظم ادارہ تعلیمات قرآن سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

حرفِ آغاز

باسمہ تعالیٰ

یہ معالم القرآن کی آٹھویں جلد ہے

اگرچہ اس بار کچھ تعلیمی اور انتظامی مصروفیتوں کی وجہ سے کام میں کچھ رکاوٹ ہوئی لیکن اس کے باوجود الحمد للہ آٹھویں جلد مکمل ہوگئی -

اس جلد میں مجھے جن علمی گہواروں سے استفادہ کرنے کا موقعہ ملا ہے ان کے نام یہ ہیں :

۱- حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ	ازالۃ الخفاء
۲- حضرت حافظ ابن تیمیہؒ	اقتضاء الصراط المستقیم
۳- رسائل الارکان	علامہ بحر العلوم
۴- ترجمان السنہ	مولانا بدر عالم میرٹھی
۵- منصب امامت	حضرت مولانا اسماعیل شہید
۶- شفاء العلیل	حافظ ابن القیمؒ
۷- حادی الارواح	"
۸- جامع العلوم والحکم	حافظ ابن رجب حنبلی
۹- معالم السنن	علامہ خطابی
۱۰- الکاشف عن حقائق السنن	علامہ طیبی

یہ جلد آٹھویں پارے کے مطالب اور تشریحات پر مشتمل ہے -

اصحاب علم کی طرف سے اس ناچیز خدمت کی جو پذیرائی ہوتی ہے وہ میری توقعات سے بہت زیادہ ہے - میں اس کے لیے اپنے مولیٰ و آقا کا شکر گزار ہوں اور اس کی بارگاہ میں دست بدعا

ہوں کہ وہ باقی قرآن کی تشریح و تفسیر میں میرے ذہن اور قلم کو جادۂ حق پر استوار رکھے اور اس تفسیر کو خلق خدا کے لیے نافع اور میرے لیے ذریعۂ نجات بنائے۔ میں نے اس تفسیر میں کوشش کی ہے کہ مدرسۂ شاہ ولی اللہ کی علمی امانت سفینوں سے نکال کر لوگوں کے سینوں تک پہنچا دوں۔ میری دلی آرزو یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ مجھے اس کوشش میں کامیابی عطا فرمائے۔ کتاب کی ظاہری خوبیوں میں جو کمی ہے تو اس کا تعلق دفتر انجمن دارالعلوم الشہابیہ سے ہے۔ میرے نزدیک دفتر سزاوار ملامت ہرگز نہیں، وہ اس کوچے میں بالکل نووارد ہے۔

بہرحال جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ میں قرآن کو سمجھ سکا ہوں اس کی سوغات آپ کی خدمت میں پیش کر رہا ہوں اور اس جذبے کے تحت پیش کر رہا ہوں کہ آئندہ کے کام کے لیے میری حوصلہ افزائی کریں۔

والسلام
محمد علی الصدیقی
دارالعلوم الشہابیہ، شہر سیالکوٹ

مقدمہ

انسان قرآن کے نقطۂ نظر سے صرف حیوان ناطق نہیں ہے بلکہ وہ روح اور جسم کے مجموعہ کا نام ہے۔ وہ روح کے تقاضے اور جسم کے مطالبات دونوں سے کرایا ہے اس لیے قرآن انسان کے ان دونوں تقاضوں کا جواب ہے۔ روح کے تقاضوں کی بہم رسانی کی خاطر قرآن آئین پرستش ہے اور جسم کے مطالبات کی پاسبجائی کے لیے قرآن دستور بندگی ہے۔ آئین پرستش ہونے کی حیثیت میں قرآن ذکر ہے اور دستور بندگی ہونے کی حیثیت میں قرآن ہدیٰ ہے۔

یاایھا الذین آمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ، مسلمانو! اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔ پورے داخل ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ قرآن کو آئین پرستش اور دستور بندگی کی حیثیت سے قبول کرو یہ نہ کرو کہ اسے آئین پرستش تو مانو مگر دستورِ بندگی نہ مانو۔ یا دستورِ بندگی تو مانو مگر آئین پرستش نہ مانو۔ اگر صرف آئین پرستش مانوگے تو عیسائیوں کی ضلالت کا شکار ہو جاؤ گے۔ اور اگر صرف آئین بندگی مانو گے تو یہودیوں کی طرح مغضوبیت کا نشانہ بن جاؤ گے۔ ضروری ہے کہ دونوں کو اپناؤ کہ الذین انعمت علیھم کی راہ ہے اور اسی کا نام صراط مستقیم ہے۔

پرستش اللہ سبحانہ کی محبوبیت کا تقاضا ہے جب کہ بندگی اللہ سبحانہ کی حاکمیت کا تقاضا ہے صحیح اسلامی زندگی بسر نہیں ہو سکتی جب تک مسلمان اپنے عمل کی وحدت میں ان دونوں کو حل نہ کرے یہی وجہ ہے کہ قرآن نے یہودیوں اور عیسائیوں کے مقابلے میں مسلمانوں کو اُمتِ وسطاً کے لقب سے سرفراز فرمایا ہے۔ وسط کے لفظی معنے درمیان کے ہیں لہٰذا اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ مسلمان ایک ایسی اُمت ہیں جو ٹھیک ٹھیک جادۂ اعتدال پر گامزن ہیں۔ یہ نہیں کہ پرستش ہی کو اپنا کر بندگی کو خیرباد کہہ دیں اور یہ بھی نہیں کہ بندگی کو لے کر پرستش سے بیگانہ زندگی بسر کریں بلکہ پرستش اور بندگی کے مجموعہ کو لے کر زندگی گزارتے ہیں۔ قرآن نے ان دونوں کو

اپنے مخاطبوں کے سامنے اس انداز سے پیش کیا ہے کہ ان دونوں میں جدائی ممکن نہیں۔ بازار کی شورشیں ہوں یا میدانِ جنگ کے ہنگامے قرآن مسلمانوں کو پرستش سے کہیں بیگانہ دیکھنا نہیں چاہتا۔

اس سورت میں بنیادی موضوع اگرچہ بندگی ہے لیکن قدم قدم پر پرستش کا ذکر کیا گیا ہے اس پارے کے آغاز میں بندگی کا ذکر کرتے ہوئے ارشاد ہوا ہے۔

و لئن اطعتموھم انکم لمشرکون اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو تم شرک کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ الغرض اسلام پرستش اور بندگی پر مشتمل ایک مکمل وحدت یا کلیت ہے جس کا کوئی جزو دوسرے جز سے الگ نہیں کیا جا سکتا کیونکہ جدائی کی صورت میں کوئی جز اپنی زندگی برقرار نہیں رکھ سکتا ہر جز کی قیمت اور ہر پہلو کی صداقت اسی وقت تک قائم ہے۔ جب تک مجموعی کلیت سے اس کا رشتہ استوار ہے۔ اسی لیے اسلامی نظامِ حیات میں باہر سے کسی جز کا پیوند نہیں لگایا جا سکتا۔ نہ پرستش میں رہبانیت کا اور نہ بندگی میں اشتراکیت، جمہوریت یا آمریت کا۔ جو لوگ اسلامی نظام میں بندگی کا ڈانڈا اشتراکیت یا جمہوریت یا آمریت سے ملانا چاہتے ہیں ان کی سب سے بڑی کوتاہ فہمی اور کم نظری یہ ہے کہ وہ اس کے اجزاء کو کل سے علیحدہ کر کے دیکھنا چاہتے ہیں اور اس حقیقت کو فراموش کر دیتے ہیں کہ اسلام ایک ناقابلِ تقسیم وحدت ہے جس کا ایک جز دوسرے جز سے مربوط اور ہر پہلو دوسرے سے ہم رشتہ ہے۔ جہاں یہ ربط و ہم رشتگی ختم ہوئی ہر جز بجائے خود بے قیمت ہو گیا۔ قرآن نے نظامِ بندگی کی حیثیت سے اپنے بارے میں یہ بات واشگاف طور پر بتائی ہے

ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم

بلاشبہ یہ قرآن رہنمائی کرتا ہے اس راہ کی جو سب سے زیادہ سیدھی ہے۔

اس لیے بندگی کی حد تک اس میں پیوند کاری کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ ایک دوسرے موقعہ پر ارشاد ہوا ہے:

اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتاب یتلی علیھم

کیا ان کے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ ہم نے تم پر کتاب اتاری ہے جو ان کے سامنے پڑھی جا رہی ہے۔

اس میں اسی حقیقت کی طرف اشارا ہوا ہے کہ قرآن کی موجودگی میں انسان کو کسی کتاب کی ضرورت نہیں ہے۔ حضرت امام بخاری نے سفیان بن عیینہ کے حوالہ سے انکشاف کیا ہے کہ اس ارشادِ نبوت لیس منا من لم یتغن بالقرآن کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ قرآن لے کر

سب کتابوں سے مستغنی نہیں ہوتا وہ ہم سے نہیں اگرچہ دوسرے علماء کو امام بخاری کے اس مطلب سے اتفاق نہیں لیکن بات سفیان بن عیینہ کی ہے اور پیش کرنے والے امام بخاری ہیں اس لیے اس سے بے رخی نہیں برتی جاسکتی ہے۔

بہرحال اس سورت کا اصلی موضوع اللہ کی بندگی ہے لیکن یہ قرآن کی خصوصیت ہے کہ وہ بندگی کو پرستش سے علیحدہ کرکے پیش نہیں کرتا اس لیے قدم قدم پر پرستش کا ذکر کرتا ہے۔ چنانچہ یہی دونوں کی ہم آہنگی ہے کہ سورت کے انجام میں بندگی کے موضوع پر یہ انکشاف فرمانے کے بعد انني هداني ربي الى صراط المستقيم دينا قيما ملة ابراهيم حنيفا"، فوراً پرستش کے بارے میں فرمایا ان صلاتي ونسكي ومحياي ومماتي لله رب العالمين لا شريك له فاموت ان اكون من المسلمين۔ جیسے پرستش میں ملاوٹ یعنی خدا کے علاوہ عالم غیب میں دوسروں کو معبود بنانا اور ان کے سامنے انتہائی ذلت اور مسکنت کا اظہار ان کے سامنے سجدہ ریزی ان سے دعا اور مدد کی طلب اور ان کے لیے نذر و نیاز عالمگیر جاہلیت ہے ایسے ہی سادہ اور کرار کی اطاعت، ان کی فرمانبرداری بھی نوع انسانی کی پرانی کمزوری ہے جو زندگی کے تمام مراحل، تغیرات اور انقلابات میں نوع انسانی کے پیچھے لگی رہتی ہے۔ اللہ کی غیرت اور اس کے غضب کو بھڑکاتا ہے۔ بندوں کی روحانی، اخلاقی اور تمدنی ترقی کی راہ کا روڑا بنتا ہے۔

یہی وہ دعوت توحید ہے جو انبیاء کی دعوت کی خصوصیت ہے۔ اللہ کی پرستش اور صرف اس کی بندگی کی دعوت ہر زمانہ اور ہر حال میں نبوت کی پہلی دعوت اور اس کا سب سے بڑا مقصد رہا ہے۔ ہمیشہ نبوت کی یہی تعلیم رہی ہے کہ اللہ ہی عبادت، دعا، توجہ اور قربانی کا مستحق اور اللہ ہی کی ذات انسانوں کے لیے حلال و حرام کا حق رکھتی ہے۔

ان لا نعبد الا الله ولا نشرك به شيئا ولا يتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون الله۔

اگر آپ کو قرآن سے کچھ بھی تعلق ہے تو آپ کو بدیہی اور یقینی طور پر یہ بات معلوم ہوگی کہ پرستش اور بندگی میں شرک کے خلاف صف آرائی اس سے جنگ کرنا، اس کو نیست و نابود کرنے کی کوشش کرنا، اور انسانی زندگی کو اس کے چنگل سے نجات دلانا نبوت کا بنیادی مقصد تھا۔ نبوت کی دعوت کی اصلی غرض، ان کی دعوت کی اساس، ان کے اعمال کا منتہی اور ان کی جدوجہد کی غایت اصلی تھی۔ اور یہی ان کی زندگی اور ان کی دعوت کا اصل مرکز تھا۔ ان کی سرگرمیاں اس کے اردگرد

گھومتی تھیں۔

اس پارے میں انبیاء کی دعوتوں میں یہی بنیادی نقطۂ نظر بول رہا ہے۔ ایک طرف وہ اگر پرستش میں شرک کے خلاف لوگوں کو ملامت کر رہے ہیں تو دوسری طرف بندگی میں شرک کے خلاف لوگوں کو سمجھا رہے ہیں الا لہ الخلق والامر فرما کر پرستش اور بندگی کا اصولی استحقاق اللہ کے لیے ثابت کرنے کے بعد پرستش کی حد تک ادعوا ربکم تضرعاً و خفیہ فرمایا جا رہا ہے اور بندگی کی حد تک ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا، کی ہدایت ہو رہی ہے۔ حضرت نوح اگر ایک طرف ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر کے خلاف دعوت دے رہے ہیں تو دوسری طرف اپنی قوم کو بندگی کی حد تک یہ کہہ کر للکار رہے ہیں یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہٗ لوگو اللہ کی بندگی کرو اللہ کے سوا تمہارا صاحب کوئی نہیں ہے۔

بہرحال سورت کا موضوع اللہ کی بندگی ہے۔ اسی نقطۂ نظر سے آپ آٹھویں پارے کا مطالعہ کریں۔

پارہ ہشتم ایک نظر میں

صفات الٰہی

شرک

سیاسی قوانین

مالیاتی قوانین

اخلاقی قوانین

معاشرتی قوانین

توحید

رسالت و نبوّت

دستوری قواعد

ایمان و اسلام

اجتماعی قوانین

آخرت کی زندگی

قرآن کی دعائیں

قرآنی تمثیلات

١٢٢ روشنی اور تاریکی سے علم اور جہالت کا مفہوم

قرآن کے قصے

اصطلاحاتِ قرآنیہ

اجل : اس دُنیا میں کوئی تغیر و تبدیلی ایسی نہیں جو اپنا تدریجی دور نہ رکھتی ہو۔ ہر چیز بتدریج بنتی اور بگڑتی ہے۔ بناؤ ہو یا بگاڑ ممکن نہیں کہ ایک خاص مدت گزرے بغیر کوئی حالت بھی اپنی کامل صورت میں ظاہر ہو سکے یہ مدت جو ہر حالت کے ظہور کے لیے اس کی اجل یعنی وقت مقررہ ہے۔ مختلف گوشوں اور مختلف حالتوں میں مختلف مقدار رکھتی ہے۔ اور بعض حالتوں میں اس کی مقدار اتنی طویل ہوتی ہے کہ ہم اپنے نظامِ اوقات سے اس کا حساب بھی نہیں لگا سکتے۔ قرآن نے اسے یوں تعبیر کیا ہے کہ جس مدت کو تم اپنے حساب میں ایک دن سمجھتے ہو۔ اگر اسے ایک ہزار برس تصور کر لو تو ایسے دنوں سے جو مہینے اور برس بنیں گے ان کی مقدار کتنی ہو گی۔ افراد کی موت و حیات کی طرح جماعتوں اور اُمتوں کی موت و حیات کا بھی ایک پیمانہ مقرر ہے اور پیمانہ کے مقرر ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ہر قوم کو دُنیا میں جو کام کرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے اس کی ایک اخلاقی حد مقرر کر دی جاتی ہے۔ بایں معنے کہ اس کے اعمال میں خیر اور شر کا کم سے کم تناسب برداشت کیا جا سکتا ہے جب تک ایک قوم کی بُری صفات اس کی اچھی صفات کے مقابلہ میں تناسب کی اس آخری حد سے فروتر رہتی ہیں اس وقت تک اسے اس کی تمام برائیوں کے باوجود مہلت دی جاتی رہتی ہے اور جب وہ اس حد سے گزر جاتی ہیں تو پھر اس بدکار، بدصفات قوم کو مزید کوئی مہلت نہیں دی جاتی۔

استواء علی العرش :- عرش تختِ شاہی کو کہتے ہیں۔ امام ابوبکر عزیزی سجستانی نزہۃ القلوب میں فرماتے ہیں۔ عرش کے معنے تختِ شاہی کے ہیں چنانچہ آیاتِ ذیل میں عرش سے یہی مراد ہے ورفع ابویہ علی العرش اور اھکذا عرشک؟ استواء علی العرش یعنی خدا کے تخت پر جلوہ فرما ہونے کا مطلب کیا ہے اس کی تفصیلی کیفیت ہمارے لیے سمجھنا مشکل ہے کیونکہ اس کا تعلق عالم

غیب سے ہے اور عالم غیب کے حقائق تک وحی کے بغیر کسی کی رسائی ممکن نہیں ہے۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ استوار علی العرش سے اللہ سبحانہ کا موصوف ہونا مخلوقات جیسا نہیں۔ یہ بات عقل سے بھی ثابت ہے اور یہ بات بالکل بدیہی ہے اور لیس کمثلہ شیئ کی دلیل نقلی سے بھی ثابت ہے۔ نفی مماثلت کے بعد استوار کو سمجھانے کے دو طریق ہیں۔ ایک طریقہ ارباب تفویض اور سلف کا ہے اور دوسرا طریقہ ارباب تاویل اور خلف کا ہے۔ سلف استوار علی العرش کو حقیقی معنے پر محمول فرماتے ہیں اور حقیقی معنے کی حقیقت کو مفوض بعلم الٰہی کرتے ہیں اور اس کی کوئی کیفیت متعین نہیں کرتے۔ ارباب تاویل اور خلف اس میں مناسب تاویل کرتے ہیں وہ استوار کو استیلا کے معنے میں لیتے ہیں یعنی خدا کی بادشاہت کائنات ہستی میں نافذ ہو گئی کیونکہ وہی خالق ہے اور وہی مدبر بھی ہے تمام عالم ہستی اسی کے تخت جلال کے جھکی ہوئی ہے چنانچہ ایک دوسری جگہ فرمایا ثم استوی علی العرش یدبر الامر، اس موضوع پر حضرت مولانا اشرف علی نے ایک رسالہ سپرد قلم فرمایا۔ بڑی عجیب و غریب تحقیق ہے۔ سلف اور خلف کی اس میں کیوں کر وضاحت فرمائی ہے۔ رسالہ کا نام "تمجید الفرش فی تحدید العرش" ہے۔ یہاں قرآن میں اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرانا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق کائنات ہی نہیں ہے بلکہ مدبر کائنات بھی ہے۔ وہ دنیا کو وجود میں لانے کے بعد اس سے بے تعلق نہیں ہو گیا بلکہ عملاً وہ سارے جہان کے جز و کل پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ سلطانی و حکمرانی کے سارے اختیارات بالفعل اس کے ہاتھ میں ہیں۔ ہر چیز اس کے امر کے تابع ہیں، ذرہ ذرہ اس کے فرمان کا مطیع ہے اس لیے خالق ہونے کی وجہ سے اگر وہ انسانوں کی پرستش کا حقدار ہے تو فرمانروا اور مدبر ہونے کی وجہ سے وہ انسانوں کی بندگی کا مستحق ہے۔

امر: حکم کرنا، یہ لفظ اس بارے میں خلق کے ساتھ اللہ سبحانہ کے لیے آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا محض خالق ہی نہیں کہ اس کی پرستش کی جائے بلکہ وہ آمر اور حاکم بھی ہے۔ ہماری پرستاریوں کی طرح ہماری بندگی کا بھی وہ ہی مستحق ہے۔ اس نے اپنی خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالے کیا ہے کہ وہ ان پر حکم چلائیں اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصہ کو خود مختار بنا دیا ہے کہ جس طرح چاہے خود کام کرے بلکہ عملاً تمام کائنات کی تدبیر خدا کے اپنے ہاتھ میں ہے لیل و نہار کی گردش اپنے آپ نہیں بلکہ خدا کے حکم سے ہو رہی ہے۔

اولیاء:۔ یہ ولی کی جمع ہے اس کے معنے حامی اور مددگار کے ہیں۔ اور سرپرست کو بھی کہتے ہیں۔ اس بارے میں یہ لفظ سرپرستوں کے معنے میں آیا ہے یعنی انسان جس کی رہنمائی

میں زندگی گزارتا ہے اسے درحقیقت اپنا ولی و سرپرست بناتا ہے۔ شاہ عبدالقادر نے یہاں اولیا کے معنے رفقا سے کیے ہیں۔ قرآن نے اولیا کا لفظ پرستش اور بندگی دونوں کے لیے بولا ہے۔ یعنی وہ ان کو بھی اولیا بنانا کہتا ہے جن کی خدا کے علاوہ پرستش کی جاتے اور ان کے لیے بھی جن کی خدا کے علاوہ بندگی کی جاتے۔ اس بارے میں اولیا سے وہ لوگ مراد ہیں جن کی اطاعت اور اتباع کی جاتے۔ ظاہر ہے کہ یہ اصنام نہیں ہوسکتے بلکہ وہ اکابر مجرمین، وہ سادہ وہ کبراء اور اولیا الشیطان ہیں جن کی طاعت کو قرآن نے اس بارے میں شرک قرار دیا ہے اور ولا تتبعوا من دونہ اولیاء ہیں جن کی اتباع سے روکا ہے۔ شاہ عبدالقادر نے یہ بات بڑی معنے خیز لکھی ہے۔ شرک فقط یہ نہیں ہے کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک حکم میں ہے کہ کسی اور کا مطیع ہو جاتے۔

حَکَم: منصف، فیصلہ کرنے والا۔ حکم سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ واحد اور جمع سب کے لیے مستعمل ہے۔ خصوصی فیصلہ کرنے والے کو حکم کہتے ہیں اس لیے یہ حاکم سے زیادہ بلیغ ہے۔ شاہ صاحب نے بھی اس کے معنے منصف کے کیے ہیں۔ اصل میں یہ لفظ حکم سے بنا ہے اور حکم کے معنے لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں فیصلہ کرنے کے ہیں جن کا ترجمہ اردو فیصلہ کرسکتے ہیں۔ امام راغب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں۔ کسی چیز پر حکم کرنا یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ چیز ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے۔ عام اس سے کہ اس فیصلہ کا تم دوسرے کو پابند بنا سکو یا نہ بنا سکو۔ عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں حکم کے معنے علم سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کے ہیں۔ اسی لیے خدائی حکم یعنی اسلام کے بالمقابل زندگی کو جاہلیت کہا جاتا ہے۔ اسلام کا طریقہ سراسر علم ہے کیونکہ یہ خدائی فیصلہ ہے اس کے برعکس ہر وہ طریقہ جو اسلام سے مختلف ہے جاہلیت کا طریقہ ہے۔

حیاۃ: حیات کے دو معنے آتے ہیں ایک حقیقی دوسرے مجازی، حقیقی معنے زندگی کے ہیں مجازی طور پر حیاۃ سے مراد علم و ادراک اور حقیقت شناسی کی حالت ہوتی ہے۔ اور موت سے مراد جہالت اور بے شعوری کی حالت ہوتی ہے۔ جس شخص کو صحیح اور غلط کی تمیز نہیں اور جسے معلوم نہیں کہ راہ راست کیا ہے وہ طبیعیات کے نقطہ نظر سے چاہے کیسا ہی زندہ ہو مگر حقیقت کے اعتبار سے اس کو انسانیت کی زندگی میسر نہیں ہے وہ زندہ حیوان تو ضرور ہے مگر زندہ انسان نہیں ہے۔ زندہ انسان درحقیقت صرف وہ شخص ہے جسے حق و باطل، نیکی و بدی، راستی و ناراستی کا شعور حاصل ہے۔

زخرف القول: ملمع، سنہری، سونا، آراستہ زینت اور کسی چیز کے کمال حسن کو زخرف کہتے ہیں اور اسی اعتبار سے سونے کو زخرف کہتے ہیں لیکن قول کے لیے جب اس کا استعمال ہو تو

جھوٹ سے آراستہ کرے اور ملمع کی باتیں کرنے کے معنے ہوں گے زخرف القول غرورا کے معنے دھوکے اور فریب کے طور پر خوش آئند باتیں کرنے کے ہیں۔ اس سے مقصود وہ تمام چالیں، تدبیریں اور شکوک و شبہات ہیں جن سے یہ لوگ عوام کو داعی حق اور اس کی دعوت کے خلاف بھڑکانے اور اکسانے کا کام لیتے ہیں پھر ان سب باتوں کو بحیثیت مجموعی دھوکہ اور فریب سے تعبیر کیا ہے۔ کیونکہ حق کا مقابلہ کرنے کے لیے جو ہتھیار بھی مخالفین استعمال کرتے ہیں وہ نہ صرف دوسروں کے لیے بلکہ خود ان کے لیے بھی حقیقت کے اعتبار سے محض ایک دھوکا ہوتے ہیں۔ اگرچہ بظاہر وہ ان کو نہایت مفید اور کامیاب ہتھیار نظر آتے ہیں جتنے نظامِ حیات دنیا میں پھیلے ہوئے ہیں، یہ سب اسی زخرف القول غرورا کی تخلیقات ہیں سب کے دعوے خوشنما اور پُر فریب ہوتے ہیں کوئی کہتا ہے روٹی کپڑا اور مکان کا نعرہ لگانا، کوئی دنیا سے مفلسی اور محتاجی کو مٹانے کا دعویٰ کرتا ہے یہ سب اسی زخرف القول غرورا کے نمونے ہیں۔

زینتہ:۔ زیبائش، آرائش، سنگار، اسم ہے۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں زینت حقیقی وہ ہے جو انسان کو کسی حالت میں بھی معیوب نہ ہو نہ دنیا میں نہ آخرت میں۔ یہاں زینت سے مراد مکمل لباس ہے۔ خدا کی عبادت میں کھڑا ہونے کے لیے صرف اتنا ہی کافی نہیں ہے کہ آدمی اپنا ستر چھپائے بلکہ اس کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ حسبِ استطاعت وہ اپنا پورا لباس پہنے جس میں ستر پوشی بھی ہو اور زینت بھی۔ اس آیت میں جسے زینتکم کہا ہے اسی کو اگلی آیت میں زینۃ اللہ کہا ہے۔ زینۃ اللہ سے صاف ستھرا، عمدہ اور شاندار لباس تو سب کے نزدیک مراد ہے لیکن اکثر نے اسے وسعت دے کر جملہ سامانِ آرائش کو اس میں شامل کیا ہے۔ امام رازی نے زینت سے مراد جمیع انواع زینت بتائی ہے۔

سوآتہ:۔ لاش، عیب، فضیحت، علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ سوآۃ کے معنے فضیحت کے ہیں کیونکہ اس میں برائی ہوتی ہے۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ شرمگاہ کے لیے سوأۃ بطور کنایہ بولا گیا ہے اور علامہ ابن الاثیر کا بیان ہے کہ اصل میں سوأۃ کے معنے شرمگاہ کے ہیں۔ بعد میں اس کو ہر اس شے کے معنے میں نقل کیا گیا کہ جب وہ ظاہر ہو تو اس سے حیا آنے لگے۔ یہاں قصہ آدم میں سوأۃ سے کیا مراد ہے اس کے متعلق ابوحیان اندلسی لکھتے ہیں کہ کچھ کی رائے میں ستر مراد ہے اور اہتمام کے لیے خاص طور پر ذکر کیا گیا ہے گو سارے جسم کا چھپانا مقصود ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ پوری لاش مراد ہے۔ ابن عطیہ کہتے ہیں کہ یہ بھی احتمال ہے کہ سوآۃ سے یہی حالت مراد

لی جاتے جو کہ مجموعی طور پر دیکھنے والے کو بری لگتی ہو۔ دراصل انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ ایک فطری جذبہ ہے اور اس کا اولین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرۃً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن کی رہنمائی یہ ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کے ارتقاء سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوتی ہے اور نہ یہ اکتسابی چیز ہے بلکہ درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو روزِ اول سے انسان میں موجود تھی۔ شیطان نے پہلی ضرب انسان کے اس جذبۂ شرم و حیا پر لگائی اور برہنگی کے راستے اس کے لیے خواہش کا دروازہ کھولا اور اس کو جنسی معاملات میں زیر کرنے کی کوشش کی۔ شیاطین اور اس کے رفقاء کی یہ روش آج تک جوں کی توں موجود ہے۔ "ترقی" کے نام پر عورت کی بے پردگی اسی کا مظہر ہے۔

شرح صدر :- ربانی علم و معرفت کا ایک مقام شرح صدر ہے۔ شرح صدر کے معنے سینہ کھولنے کے ہیں۔ عام خیال یہ ہے کہ سینہ کی تنگی اور ضیق، جہل و نادانی کی علامت ہے اور سینہ کی کشادگی اور فراخی علم کی وسعت اور معرفت کی فراوانی پر دلالت کرتی ہے۔ اسی طرح شرح صدر کے اصطلاحی اور مجازی معنے علم کی کثرت اور آگاہی کی وسعت کے ہیں اور خاص طور پر اس علم و معرفت اور اطلاع و آگاہی پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے جو کسی دقیق اور مشکل مسئلہ کے متعلق دفعۃً اور یک بیک قلب میں وارد ہوتی ہے اور اس حل سے اس کی تسلی و تسکین ہو جاتی ہے اور اس کے شکوک و شبہات دور ہو کر اس کو یقین، راحت و مسرت حاصل ہو جاتی ہے۔ قرآن حکیم میں ہے کہ حضرت موسیٰ نے نبوت کا منصب ملتے وقت دعا کی تھی۔ رب اشرح لی صدری و یسر لی امری واحلل عقدۃ من لسانی دعا کے پہلے جملہ میں حضرت موسیٰ نے اپنے لیے شرح صدر کی استدعا کی ہے اور آخر میں فصاحتِ بیان کی یعنی اول میں صحیح الفاظ کے انتخاب کی دعا کی ہے تاکہ ان کی دعوت و تبلیغ کو مخاطب سمجھ سکیں لیکن یہ دولت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بن مانگے ملی۔ الم نشرح لک صدرک شرح صدر کی جو تشریح احادیثِ صحیح میں مذکور ہے اس کے لیے عام اصطلاح شق صدر ہے۔

عام لوگوں کے بارے میں قرآن میں بتایا ہے افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ بھلا جس کا سینہ اللہ نے اسلام کے لیے کھول دیا تو وہ اپنے پروردگار کی جانب سے ایک روشنی میں ہے۔ اسلام کے لیے سینہ کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت مؤثر طریقہ سے اس پر اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پورا طرح یقین ہو گیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین ہو گئی۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس اپنی منزل مقصود کے ہر قدم پر

اللہ کی روشنی حاصل ہے۔ یہی شرح صدر کی حقیقت ہے اور اس روشنی کی کمی و بیشی درجوں اور منصبوں کے مطابق ہوتی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو شرح صدر کی جو وسعت عطا ہوئی تھی اس میں اور اُمت کو جو شرح صدر کی نعمت ملتی ہے ایک باریک اور جوہری فرق ہے۔ اُمتی کا سینہ کسی خاص مسئلہ اور بات کے لیے کھولا جاتا ہے۔ مثلاً اسلام کے لیے سینہ کھول دیا، جمع قرآن کے لیے ابوبکر کا سینہ کھول دیا یا تعین زکوٰۃ سے قتال کے لیے ان کا سینہ کھول دیا۔ لیکن نبوت کا سینہ کھولنے سے مقصود یہ ہے کہ نبوت کو امر و نہی میں مطلق اور عمومی شرح صدر عنایت ہوتا ہے۔ یعنی ان کو کلی اور عمومی حیثیت سے یہ چیز عطا ہوتی ہے۔ اس کی تفصیلاتی بحث پارہ ۲۳ میں آرہی ہے۔

لباس التقویٰ:۔ اسلام کی تمام تعلیمات کا خلاصہ اگر ہم صرف ایک لفظ میں ادا کرنا چاہیں تو ہم اس کو تقویٰ سے ادا کر سکتے ہیں۔ اسلام کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی رُوح کو پیدا کرنا ہے۔ قرآن نے کھلے لفظوں میں اعلان کیا ہے کہ اس کی تعلیمات سے وہی فائدہ اٹھا سکتے ہیں جو تقویٰ والے ہوں۔ ھدی للمتقین، اسلام کی ساری عبادتوں کا منشا اسی تقویٰ سے ہے روزے کا نماز کا حج کا قربانی کا بھی مقصد ہے۔ اخلاق کے معاملہ میں زاد بھی زاد تقویٰ اور لباس بھی لباسِ تقویٰ ہونا چاہیے۔ گویا اسلام کا سارا اخلاقی نظام تقویٰ کی اساس پر قائم ہے۔

روحانی اصطلاحات

علمی اصطلاحات

سیاسی اصطلاحات

معاشی اصطلاحات

وَلَوْ اَنَّنَا نَزَّلْنَآ اِلَيْهِمُ الْمَلٰٓئِكَةَ وَكَلَّمَهُمُ الْمَوْتٰى وَ
حَشَرْنَا عَلَيْهِمْ كُلَّ شَيْءٍ قُبُلًا مَّا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْٓا اِلَّآ اَنْ
يَّشَآءَ اللّٰهُ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ يَجْهَلُوْنَ ﴿۱۱۱﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا
لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ
اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا ۭ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ مَا
فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۱۲﴾ وَلِتَصْغٰٓى اِلَيْهِ اَفْـِٕدَةُ
الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ وَلِيَرْضَوْهُ وَلِيَقْتَرِفُوْا
مَا هُمْ مُّقْتَرِفُوْنَ ﴿۱۱۳﴾

اور دیکھو اگر بالفرض ہم ان پر فرشتے بھی اتار دیتے اور ان سے مُردے بھی قبروں سے اٹھ کر باتیں کرنے لگتے اور ساری چیزیں ہم ان کے رُوبرو جمع کر دیتے پھر بھی یہ ایسا نہ کرتے کہ ایمان لے آویں، ہاں یہ کہ اللہ ہی کی مشیت ہو لیکن ان کی اکثریت نادان ہے[۱۲۸] اور اے پیغمبر اسی طرح ہم نے ہر

نبی کے لیئے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین کو دشمن بنا دیا ہے جو باہم ایک دوسرے کو چکنی چپڑی باتیں لوگوں کو فریب دینے کے لیے وحی کرتے ہیں۔ اور اگر تمہارا رب چاہتا تو وہ یہ کام نہ کرتے لہٰذا ان کو اور ان کی افترا پردازیوں کو چھوڑ دو۔[139] اور اس لیے بھی وہ یہ باتیں کرتے ہیں تاکہ آخرت پر ایمان رکھنے والوں کے دل ان کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس لیے بھی کہ لوگ ان کی باتوں کو پسند کریں اور اس لیے بھی کہ جیسی کچھ وہ بدکاریاں کر رہے ہیں لوگ بھی کرنے لگیں۔[140]

معانی مفردات

قُبُلًا سامنے بالمقابل، کچھ کی رائے میں یہ قبیل کی جمع ہے جیسے رغیف کی جمع رغف قسم قسم جماعت، الشیطان سرکش، باغی، شوریدہ سر کو کہتے ہیں۔ انسان اور جن دونوں کے لیے یہ الفاظ آتے ہیں۔ یوحی ایحاء سے ہے اس کے دقیق اور سریع اور خفی اشارہ کرنے کے آتے ہیں زخرف زینت، رونق جیسے باغوں کے لیے پھول اور عورتوں کے لیے زیور غرور باطل کے ذریعہ دھوکہ اور فریب، صغی الیہ مائل ہونا باب سمع سے آتا ہے، مقترفون اقتراف سے ہے اقترف المال مال کمایا اقترف الذنب گناہ کیا عدو صدیق کی ضد ہے دشمن کے معنے ہیں واحد جمع اور مذکر مونث یکساں ہوتا ہے۔

ظاہری نشانات اور آیات

نبوت کے اصلی آثار اور علامات یہ ہیں کہ وہ آیات الٰہی کی تلاوت کرتا ہے، زنگ آلود نفوس اور سیہ کار قلوب کو جلا دیتا ہے، لوگوں کو کتاب و حکمت اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اچھی باتوں کو پھیلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے، لوگوں کو خدا کی دعوت دیتا ہے، نیکوکاروں کو بشارت سناتا ہے۔ بدکاروں کو عذاب الٰہی سے ڈراتا ہے اور اس ظلمت کدہ عالم میں وہ ہدایت کا چراغ بن کر چمکتا ہے۔ کفار صداقت نبوت کی نشانی چاہتے ہیں۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوتا ہے کہ اس کی صداقت کی روشنی تو اس کا سراپا وجود ہے اور اہل یقین کے لیے اس کی سچائی کی تمام نشانیاں ظاہر کر دی گئی ہیں۔ لیکن اس کے یہ معنے نہیں کہ نبوت ظاہری آیات اور مادی نشانات سے خالی ہوتی ہے۔ تمام انبیاؑ کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں کہ باطنی نشانیوں کے ساتھ ظاہری حصہ بھی ان کو ملتا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ یہ مادی اور ظاہری نشانات نبوت کی اصل حقیقت نہیں ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ متعدد مقامات پر قرآن نے کفار کی مادی نشانیوں کی طلب میں آپ کی طرف سے یہ الفاظ کہے ھل کنت الا بشراً رسولاً لیکن نبوت کے ظاہری اور عامیانہ آثار و علامات یعنی خارق عادات معجزات صرف وہ فرد طلب کرتا ہے جس کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں، اور جو تعصب و عناد اور جہل کے باعث حق کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ معاندین جو انبیاؑ کے مکارم اخلاق، حسن تعلیم و دیگر علمی و عملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعوؤں کو بھی تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کے سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لا علاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو آخر الحیل کے طور پر وہ پیغمبر سے خارق عادت معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں۔ یہاں قرآن نے بتایا ہے کہ اگر ان کے سامنے بڑے سے بڑا اعجاز بھی پیش کر دیا جائے تو ان کے قلوب کو اطمینان حاصل نہ ہوگا کیونکہ ان کا شک و شبہ کا منشا عناد ہے حق طلبی نہیں ہے اگر حق طلبی مقصود ہوتی تو پہلی ہی دفعہ دیکھ کر ایمان لے آتے۔ حتیٰ کہ ان سے اگر مردے بھی اس سلسلے میں ہمکلام ہو جائیں اور فرشتے بھی نازل ہو جائیں پھر بھی یہ ایمان لانے والے نہیں ہیں۔

۱۱۱۔ اور دیکھو اگر بالفرض ہم ان پر فرشتے اتار دیتے اور ان سے مُردے بھی قبروں سے اٹھ کر باتیں کرنے لگتے اور ساری چیزیں ہم ان کے روبرو جمع کر دیتے پھر بھی یہ ایسا نہ کرتے کہ ایمان لے آویں ہاں یہ کہ اللہ ہی کی مشیت ہو لیکن اکثریت ان کی نادان ہے۔ یعنی اگر ان کی فرمائش کے موافق بلکہ اس سے بھی بڑھ کر فرض کیجیے کہ آسمان سے فرشتے اتر کر آپ کی تصدیق کریں اور مُردے قبروں سے اٹھ کر ان سے باتیں کرنے لگیں اور تمام اُمتیں جو گزر چکی ہیں دوبارہ زندہ کر کے ان کے سامنے لا کھڑی کی جائیں تب بھی

سوءِ استعداد اور تعنت و عناد کی وجہ سے یہ لوگ حق کو ماننے والے نہیں ، بے شک اگر خدا چاہے تو زبردستی منوا سکتا ہے لیکن ایسا چاہنا اس کی حکمت اور تکوینی نظام کے خلاف ہے جس کو ان میں سے اکثر لوگ اپنے جہل کی وجہ سے نہیں سمجھتے۔ اس کی تشریح پہلے فوائد میں گزر چکی ہے۔[1]

ان کے یہ بھی مطالبے تھے کہ لو ما تاتینا بالملائکۃ ان کنت من الصادقین اگر تو سچا ہے تو فرشتے کیوں نہیں لاتا ہے اور کبھی کہتے فاتوا بابائنا ان کنتم صادقین اگر تم سچے ہو تو ہمارے باپ دادوں کو لے کر آؤ۔ واضح رہے کہ منکروں کی یہ فرمائشیں حجت و برہان کی طلب میں نہ تھیں بلکہ محض سرکشی اور ہٹ دھرمی کی باتیں تھیں جو اس لیے کہی جاتی تھیں کہ کوئی نہ کوئی بات کہہ کر اپنے انکار کے لیے سہارا پیدا کر لیا جاتے اور ہمیشہ انبیاء کے مقابلے میں نہ ماننے والوں کا ایسا ہی طرزِ عمل رہا ہے جب کبھی سچائی کی کوئی بات کہی جاتی ہے تو طلبِ حق رکھنے والی طبیعتیں اور کسی طرف نہیں جاتی ہیں۔ خود اسی بات پر غور کرتی ہیں اور جب سچائی پا لیتی تو فوراً قبول کر لیتی ہیں لیکن ایک سرکش اور ہٹ دھرم آدمی کبھی ایسا نہیں کرتا وہ پہلے سے طے کر لیتا ہے کہ کبھی ماننے والا نہیں ہے پھر کوشش کرتا ہے کہ اپنے نہ ماننے کے لیے کوئی بات بنالے ، وہ طرح طرح کی باتیں اِدھر اُدھر کی نکالے گا ، کبھی ایک بات کہے گا کبھی دوسری پہلے کسی ایک بات پر زور دے گا کہ اس کا جواب کیا ہے جب اس کا جواب مل جائے گا تو کوئی دوسری بات ڈھونڈ نکالے گا اور کہے گا کہ اس کا جواب تمہارے پاس نہیں۔ یہاں تک کہ اگر تم اس کی ساری کٹ حجتیوں کا جواب دے دو اور ساری شرطیں اور فرمائشیں پوری کر دو جب بھی وہ کوئی نہ کوئی اور بات ڈھونڈ نکالے گا۔ اور راست بازی کی راہ کبھی نہ چلے گا۔ قرآن نے جابجا منکروں کی اس حالت کا ذکر کیا ہے اور واضح کیا ہے کہ وہ کبھی ماننے والے نہیں اگر ماننے والے ہوتے تو اس قسم کی روش کبھی اختیار نہ کرتے۔ یہاں فرمایا ہے کہ اگر ہم بالفرض ان کے اس مطالبے کے جواب میں کہ فرشتے کیوں نہیں لاتے فرشتے بھی نازل کر دیتے اور اس مطالبہ کے جواب میں فاتوا بابائنا سے مُردے قبروں سے اٹھ کر بالمشافہ باتیں بھی کر لیتے بلکہ اس سے بھی ترقی کر کے حیوانات ، نباتات اور جمادات میں سے ہر قسم کے دلائل کا ان کے آگے انبار لگا دیتے تو پھر بھی یہ نہ مانتے ۔ قبلاً میں دو صورتیں ہیں یہ واحد ہے اور اس کے معنے سامنے اور آگے کے ہیں یا یہ جمع ہے اور اس کا واحد قبیل ہے اور اس کے معنے کفیل کے ہیں یا گروہ کے ہیں۔ دونوں معنے صحیح ہیں لیکن ہم نے پہلے معنے کو اختیار کیا ہے از روئے بلاغت اس میں زیادہ زور ہے یعنی

[1] افادات شیخ الاسلام

پردۂ غیب کی اگر ساری چیزیں بھی ان کے سامنے کر دی جائیں پھر بھی یہ ایمان لانے والے نہیں کیونکہ وہ عناد جس نے ان کی آنکھوں کو حق کی دید سے محروم کر رکھا ہے پھر بھی باقی رہتا۔

آخر میں فرمایا ہے الا ان یشاء اللہ مگر یہ اللہ چاہے۔ شارحین قرآن میں سے کچھ کہتے ہیں کہ یہ استثنائے منقطع ہے۔ مطلب یہ ہے لیکن اللہ ان معاندین منکرین میں سے کسی کو ایمان کی دولت سے مالامال کرنا چاہے تو مالامال بنا دے اور کچھ کہتے ہیں کہ استثنا متصل ہے اور مطلب یہ ہے کہ یہ معاندین منکرین جب تک ان صفات پر رہیں گے ایمان نہیں لائیں گے اور جب اللہ ہی ان صفات کو ہٹانا چاہے گا تو ہٹا دے گا۔ یہی صحیح ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہ معاندین اس عناد، کبر کی موجودگی میں ایمان نہیں لائیں گے، مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں اللہ کی سنت یہ ہے کہ جو لوگ اپنی ایمانی استعداد و صلاحیت کو مسخ کر دیتے ہیں وہ نعمت ایمان سے محروم رہتے ہیں۔ اگر اللہ چاہے تو اس کے خلاف بھی کر سکتا ہے لیکن اللہ ایسا نہیں چاہتا ہے کیونکہ یہ اس کی سنت کے خلاف ہے اور نوع انسانی کی طبیعت بدلنے کے مرادف ہے۔ نوع بشری کو تمام مخلوقات میں ارادہ و اختیار سے نوازا ہے ایمان و کفر اور طاعت و معصیت ارادی و اختیاری چیزیں ہیں۔ اسی لیے قابل جزا و سزا ہیں اگر بھوک اور پیاس کی طرح یہ بھی ارادی و اختیاری نہ ہوتے بلکہ اضطراری اور طبعی تقاضے ہوتے تو ہرگز جزا و سزا کے قابل نہ ہوتے۔ ایمان کی نعمت ان کو ملتی ہے جو اس کے لیے اپنی وہ صلاحیتیں استعمال کرتے ہیں جو اللہ نے ان کے اندر ودیعت فرمائی ہیں۔ اور جو ان کو استعمال نہیں کرتے تو خدا کسی کے دل میں زبردستی ایمان نہیں ٹھونستا۔ اسی لیے اسلام میں ایمان کے حد تک اکراہ جائز نہیں رکھا گیا ہے۔ جس طرح اسلام پر جبر کرنا صحیح نہیں اسی طرح کسی کے اسلام میں بلاوجہ شک و شبہ پیدا کرنا بھی درست نہیں ہے۔ تم مسلمان ہونے پر کسی کو مجبور نہیں کر سکتے اور اگر کوئی از خود مسلمان ہوتا ہے تو بلاوجہ اس کے اسلام کو شک و شبہ کی نگاہ سے نہ دیکھو۔ گویا ایمان کے معاملہ میں کسی پہلا سے بھی قرآن نے تشدد پسند نہیں کیا۔ کوئی ایمان لاتا ہے تو بسر و چشم قبول کر لو اور نہیں لاتا تو اسے اس کی مرضی پر چھوڑ دو۔ کیا اس سے بڑھ کر آزادی رائے کا کوئی اور مفہوم ہو سکتا ہے۔

بہرحال الا ان یشاء اللہ سے معاندین کے ایمان نہ لانے کی خبر میں زور پیدا کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ جو لوگ معجزات کی نمائش دیکھ کر ایمان لانے کا دعوی کر رہے ہیں وہ کبھی ایمان نہ لائیں گے۔ اسی لیے نفی ایمان کے لیے ما کانوا لیومنوا کی تعبیر اختیار کی ہے۔ یہ نہیں فرمایا لا یومنون وہ ایمان نہیں لائیں گے بلکہ فرمایا کہ ایمان لانا ان کی صلاحیتوں کا تقاضا نہیں ہے۔ نفی فعل سے نفی شان

زیادہ بلیغ اور زیادہ مؤثر ہوتی ہے۔

یہاں نفی ایمان کی علت میں علامہ آلوسی نے ایک لاطائل بحث انسانی اختیار کے موضوع پر کی ہے۔ حالانکہ معاملہ بالکل واضح اور صاف ہے۔ علامہ جمال کا یہ کہنا بالکل برمحل اور بجا ہے کہ یہ آیت معتزلہ کے خلاف بہت بڑا چیلنج ہے۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ ایمان وکفر اور خیر وشر کا وجود اللہ کی مشیت سے ہے سلف امت کا اس پر اتفاق ہے کہ ما شاء اللہ کان وما لم یشا لم یکن جو کچھ اللہ نے چاہا ہو گیا اور جو نہ چاہا نہ ہوا۔ اس موضوع پر تفصیلی بحث اسی پارے میں آگے آ رہی ہے۔

قانون الٰہی سے بے خبری

آخر میں فرمایا ہے کہ ولکن اکثرھم یجھلون علامہ آلوسی نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ اکثر مسلمان ان کے ایمان نہ لانے سے بے خبر ہیں کیونکہ ان کو یہ پتہ نہیں کہ ان کے ایمان کے لیے اللہ کی مشیت نہیں ہے اور دوسرے شارحین قرآن کہتے ہیں کہ یہ فقرہ اہل کفر کے بارے میں ہے۔ اہل کفر کی جہالت زیادہ ہے لیکن قرآن کا سیاق آلوسی کا مؤید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسلمان سب تو نہیں لیکن اکثر اللہ کے قانون کے افراد واقوام پر انطباق سے بے خبر ہیں۔ اسی لیے کچھ اہل ایمان معجزات مانگنے والوں کے ایمان کی خواہش کر رہے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ معجزہ کی نمائش ان کو مومن بنا دے گی۔ حالانکہ معجزات نہ تو ایمان کا لازمہ اور نہ معجزات سے طبیعت انسانی بدلتی ہے۔ اگر اللہ چاہتا تو ان کے دلوں میں ایمان کی تخلیق فرما دیتا۔ حاصل یہ کہ معاندین کے شکوک وشبہات کے بادل معجزات کی روشنی سے بھی نہیں چھٹتے۔ تمام انبیاء کی سیرتیں گواہ ہیں کہ معاندین معجزات دیکھنے پر بھی اپنے انکار واعراض پر نہایت استقلال سے ڈٹے رہے۔ حضرت موسیٰؑ نے فرعون کو بار بار معجزہ دکھایا، لیکن اس کا انکار ایمان میں نہ بدلا۔ عہد محمدی کے فرعون اور معاندوں کی نفسی کیفیت بھی یہی ہے کہ ان کو نشانیاں دکھائی جاتی ہیں مگر انہیں عناد کی کور باطنی کے باعث ان سے تسکین نہیں ہوتی۔ اس لیے بالآخر معاندین کی طلب معجزہ سے تغافل برتا جاتا ہے اور ان کے پیہم اصرار، الحاح اور طلب کی کوئی پروا نہیں ہوتی کیونکہ اس مطالبہ کو پورا کرنے کے بعد ہلاکت یقینی ہو جاتی ہے۔ اور اگر اہل کفر مراد ہوں جیسا کہ دوسرے شارحین قرآن کی رائے ہے کہ اکثر ان میں جاہل ہیں۔ جہالت کے باعث معجزات قاہرہ طلب کرتے ہیں خواہ مخواہ کی فرمائشیں جہالت کی دلیل ہے، حق کی طلب نہیں اور دلائل حقہ کی طرف توجہ والتفات نہیں بے وجہ جو دل میں آتا ہے کہہ دیتے ہیں یہ جہالت نہیں تو اور کیا ہے۔

عدالت میں مدعی سے گواہی طلب کی جاتی ہے اور مدعا علیہ کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ گواہوں پر جرح کرکے اور گواہوں کا ناقابل شہادت ہونا ثابت کرے لیکن اگر مدعا علیہ مدعی کی پیش کردہ شہادت پر تو کوئی جرح نہ کر سکے اور یہ کہے کہ میں اس دعوے کو جب تسلیم کروں گا کہ فلاں فلاں شخص اس کی شہادت دیں تو عدالت مدعا علیہ کو اس کی کبھی اجازت نہ دے گی۔ ٹھیک ایسے ہی مدعی نبوت کے ذمہ صرف دلائل نبوت اور مطلوبہ شواہد رسالت کا پیش کرنا ضروری ہے۔ فرمائشی نشانات کا پیش کرنا ضروری نہیں ہے۔

اللہ تعالیٰ کا قانونِ آزمائش

۱۲۹۔ اور اے پیغمبر اسی طرح ہم نے ہر نبی کے لیے انسانوں اور جنوں میں سے شیاطین کو دشمن بنا دیا ہے جو باہم ایک دوسرے کو چکنی چپڑی باتیں لوگوں کو فریب دینے کے لیے وحی کرتے ہیں، اور اگر تمہارا رب چاہتا تو وہ یہ کام نہ کرتے لہٰذا ان کو اور ان کی افترا پردازیوں کو چھوڑ دو۔ چونکہ خدا کی حکمت بالغہ تکوینیا اسی کو مقتضی ہے کہ نظامِ عالم کو جب تک قائم رکھنا منظور ہے خیر و شر کی قوتوں میں سے کوئی قوت بھی بالکل مجبور اور نیست و نابود نہ ہو۔ اس لیے نیکی بدی، ہدایت و ضلالت کی حریفانہ جنگ ہمیشہ سے قائم ہے۔ جس طرح آج یہ مشرکین و معاندین آپ کو بیہودہ فرمائشوں سے دق کرتے اور بانواع حیل لوگوں کو جادۂ حق سے ڈگمگانا چاہتے ہیں۔ اسی طرح ہر پیغمبر کے مقابل شیطانی قوتیں کام کرتی رہی ہیں کہ پیغمبروں کو ان کے پاک مقصد ہدایتِ خلق میں کامیاب نہ ہونے دیں۔ اسی غرض فاسد کے لیے شیاطین الجن والانس باہم تعاون کرتے اور ایک دوسرے کو فریب دہی اور ملمع سازی کی چکنی چپڑی باتیں سکھاتے ہیں۔ اور ان کی یہ عارضی آزادی اسی عام حکمت اور نظامِ تکوینی کے ماتحت ہے جو تخلیق عالم میں حق تعالیٰ نے مرعی رکھی ہے اس لیے آپ اعداء اللہ کی فتنہ پردازی اور مغویانہ فریب دہی سے زیادہ فکر و غم میں نہ پڑیں ان سے اور ان کے کذب و افترا سے قطع نظر کرکے معاملہ خدا کے سپرد کیجئے [1]

سابقہ مضمون سے دلالۃً یہ بات سمجھ میں آرہی ہے کہ نشانات اور معجزات کا مطالبہ کرنے والے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے دشمن ہیں اور حضور انور سے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں کہ انہیں بدگمانی سے یقین ہے کہ ہماری طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسی عجیب و غریب چیز پر قدرت نہیں رکھتا ہے اس لیے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

وہ کبھی کوئی خارقِ عادت امر پیش نہ کر سکے گا اس طرح آپ کی رسوائی عالم آشکار ہو جاتے گی اور خود آپ کے ہاتھوں سے آپ کی نبوت کا تار پود بکھر جائے گا اس لیے اللہ سبحانہٗ نے یہاں قانونِ آزمائش پیش کر کے حضورِ انور کو تسلی دی ہے اور بتایا ہے کہ اس صورتِ حال سے آپ کو ہی سابقہ پیش نہیں آیا بلکہ جیسے یہ لوگ آپ کے مخالف ہیں اور آپ کی اپوزیشن بنے ہوتے ہیں ایسے ہی آپ سے پہلے جو انبیاء گزرے ہیں ان کو بھی اپنے زمانہ کے شیاطین جن و انس کے ہاتھوں اسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا ہے یہ اللہ کا قانونِ آزمائش ہے جس سے اس کے تمام نبیوں اور رسولوں کو گزرنا پڑا ہے جعلنا لکل نبی عدوا شیاطین الانس والجن کے دو معنے کیے گئے ایک یہ کہ شیاطین کو عدوا کا بدل قرار دیا جائے۔ اس صورت میں معنے یہ ہوں گے کہ ہم نے ہر نبی کے دشمن بنائے یعنی انس و جن کے شیطان، دوسری صورت یہ ہے کہ عدوا کو مفعول اول اور شیاطین کو مفعول ثانی قرار دیا جائے اور معنے یوں کیے جائیں ہم نے ہر نبی کے لیے شیاطین کو دشمن بنایا ہے۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ہر متمرد اور سرکش کو شیطان کہتے ہیں خواہ یہ انسانوں میں سے ہو یا جنات میں سے۔ اور دشمن بنانے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا یہ قانون ہے کہ ہر متمرد، سرکش شریر دعوتِ حق کی مخالف طاقت بن کر سامنے آجاتا ہے۔ حق و باطل کی یہ کشمکش اس دنیا میں قائم رہتی شہرت و جاہ کے رسیا اور چوہدری قسم کے لوگ اور وہ سرمایہ دار جن کو اپنی دولت و سرمایہ سے محبت ہوتی ہے نبوت کا مقابلہ کرتے ہیں۔ یہی قرآن کی زبان میں مفسدین، مترفین اور شیاطین جو زمین میں فساد پھیلاتے ہیں، اخیار اور اشرار کی اس کشمکش کا راز حکمتِ الٰہی میں یہی ہے کہ اس کے نتیجے میں حق کا بول بالا ہو یعنی یہ آویزش اس لیے ہوتی ہے کہ حق باقی رہے اور باطل مٹ جائے۔ حق اس لیے باقی رہتا ہے کہ اسی سے بقا ہے باطل اس لیے مٹ جاتا ہے کہ وہ نقص و فساد ہے۔

اہلِ حق کی یہ آزمائش اور اہلِ باطل کے لیے یہ ڈھیل چونکہ اللہ تعالیٰ کے قانونِ آزمائش کے تحت ظہور میں آتی ہے اور انسان کو اس نے جو ارادہ اور اختیار کی آزادی عطا کی ہے یہ اسی کا ایک لازمی حصہ ہے اس وجہ سے اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف منسوب کیا ہے۔

حق کے یہ مخالفین اور باطل کے علمبردار نبوت اور اہلِ حق کا کن کن ہتھیاروں سے مقابلہ کرتے ہیں، اسی اٹھتے ہوئے سوال کا قرآن نے یہ جواب دیا ہے یوحی بعضھم الی بعض زخرف القول ایحاء وحی سے بنا ہے وحی مخفی اشارے کو کہتے ہیں اور یہاں لغوی معنے میں استعمال ہوا ہے اور زخرف رونق اور شوکت کو کہتے ہیں جیسے پھول پھلواری زمین کے لیے اور زیورات عورتوں کے لیے سامانِ زینت اور رونق ہوتے ہیں ایسے ہی تمام باتیں جو سننے والوں کو حقیقت سے ہٹا کر وہم کا شکار کر دیں اس سے

مراد وہ تمام چالیں اور تدبیریں اور شکوک و شبہات و اعتراضات ہیں جن سے یہ لوگ عوام کو داعی حق اور دعوت حق کے خلاف بھڑکانے اور اکسانے کا کام لیتے ہیں۔ پھر ان سب باتوں کو بحیثیت مجموعی دھوکے اور فریب سے کام لیا گیا ہے، کیونکہ حق سے لڑنے کے لیے جو ہتھیار بھی مخالفین حق کے خلاف استعمال کرتے ہیں وہ نہ صرف دوسروں کے لیے بلکہ خود ان کے لیے بھی حقیقت کے اعتبار سے محض ایک دھوکہ ہوتے ہیں اگرچہ بظاہر وہ ان کو نہایت مفید اور کامیاب ہتھیار نظر آتے ہیں۔

ہم نے زخرف القول کا ترجمہ چکنی چپڑی بات کیا ہے۔ اصل میں ملمع کاری کو کہتے ہیں۔ جھوٹی اور باطل چیز جس پر حق کا رنگ چڑھانے کی کوشش کی گئی ہو۔ یہ بدلتے ہوتے حالات میں بدلتی رہتی ہے۔ کبھی یہ ان مشرکانہ بدعات کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے جسے ہر زمانے کے شیاطین ایجاد کرتے ہیں اور ان پر دین اور مذہب کا لیبل لگا کر ان کو لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں۔ آج اس کی ترقی یافتہ بازار سیاست میں پائی جا رہی ہے۔ شیاطین سیاست اس کے ذریعے رائے عامہ پارٹیوں اور جماعتوں کو گمراہ کرتے ہیں، کفر خالص پر ایمان کا معصیت پر طاعت کا بغاوت پر عبادت کا لیبل لگا کر لوگوں کو گمراہ کرتے ہیں۔ یہ وحدت ادیان کا نعرہ اور اس کے لیے خوبصورت "قرآنی آیات کی تاویل اور یہ خالص ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت اشتراکیت پر اسلام کا لیبل اور اس کے لیے من مانی توجیہات، مشرکانہ افکار کسی مخلوق کو اللہ کے سوا دانائے غیب، مختار کل، حاضر و ناظر ماننا اور مشرکانہ اعمال، قبروں پر چادریں ڈالنا، پھول چڑھانا، نذریں اور منتیں اہل قبور کی ماننا ان کے ناموں کو بطور ورد جپنا، قبروں کو بوسہ دینا ان کے سامنے جبین نیاز جھکانا اور اسی قسم کے دوسرے کام کرنا اور ان پر اہل السنۃ کا لیبل لگانا سب زخرف القول ہیں اور شیاطین الانس کی ایجاد ہیں۔ یہی عوام کو اپنے دام فریب میں پھنسانے اور یہ باور کرانے کی کوشش کرتے ہیں کہ یہ اسلام ہے اور یہی اہل السنۃ کا مذہب ہے۔

آخر میں فرمایا ہے ولو شاء ربك ما فعلوه فذرهم وما يفترون، مطلب یہ ہے کہ اے اللہ یہ فریب دہی کا جو جال تیار کیا گیا ہے اور جو کچھ آپ کے، قرآن کے، اسلام کے اور توحید کے خلاف کر رہے ہیں اگر اللہ چاہتا کہ وہ یہ نہ کریں نہ کرتے لیکن ان کی جبلت کو تبدیل کرنا نہیں چاہا بلکہ اللہ کی مشیت یہی ہوئی کہ ہر انسان حق و باطل، خیر و شر کا استقبال کرنے کے لیے تیار ہو اور پھر اپنے ارادہ و اختیار سے ایک راہ منتخب کرے یعنی اگر وہ سب کو نیکی کی راہ پر چلاتا تو یہ بھی کر سکتا تھا لیکن اس کی حکمت نے یہی پسند فرمایا کہ وہ اس معاملہ میں جبر کی بجائے لوگوں کو اختیار و انتخاب کی آزادی دے کر ان کا امتحان کرے اور دیکھے کہ کون حق پر چلتا ہے اور کون باطل

کی طرف جاتا ہے۔ اب ان کو اور ان کی خرافات، بدعات، ہفوات کو چھوڑ کر اپنا کام کریں۔ ان کے شرکیہ افکار شرکیہ اعمال سے الگ ہو کر آپ توحید کے جادۂ حق پر جمے رہیں اور لوگوں کو توحید عبادت کی دعوت دیں پیغام پہنچانا آپ کا کام ہے اور حساب لینا ہمارا کام ہے۔ ہمارا قانون عنقریب حرکت میں آتے گا اور آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ ان کا انجام کیا ہے۔

قانونِ آزمائش کی حکمتیں

۱۱۴۰- اور اس لیے بھی وہ یہ باتیں کرتے ہیں تاکہ آخرت پر ایمان نہ رکھنے والوں کے دل ان کی طرف متوجہ ہو جائیں اور اس لیے بھی کہ لوگ ان کی باتوں کو پسند کریں اور اس لیے بھی کہ جیسی کچھ وہ بدکاریاں کر رہے ہیں لوگ بھی کرنے لگیں۔ یعنی شیاطین ایک دوسرے کو ملمع کی ہوئی فریب کی باتیں اس لیے سکھلاتے ہیں کہ انھیں سن کر جو لوگ دنیا کی زندگی میں غرق ہیں دوسری زندگی کا یقین نہیں رکھتے ان ابلہ فریب باتوں کی طرف مائل ہو جائیں اور ان کو دل سے پسند کرنے لگیں اور پھر کبھی کاموں اور کفر و فسق کی دلدل سے نکلنے نہ پائیں[1]

پہلے بتایا تھا کہ دنیا میں نبوت کے مقابلے میں شیاطین اپنے نظریات کو ملمع سازی کر کے اور چکنا چپڑا بنا کر لوگوں کے سامنے اس لیے پیش کرتے ہیں کہ لوگ دھوکہ میں آکر ان کے دامِ ہم رنگ زمین کا شکار ہو سکیں۔

اب بتایا جا رہا ہے کہ وہ یہ کام اس لیے بھی کرتے ہیں۔

اولاً، ان کی جانب سے یہ ملمع کاری اس لیے کی جاتی ہے کہ وہ لوگ جو آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں ان کو اپنی طرف متوجہ کر سکیں، اس سے معلوم ہوا کہ شیاطین کی دعوت کا اثر ان لوگوں پر ہوتا ہے جن کے دل فکرِ آخرت سے خالی ہوتے ہیں۔ آخرت پر ایمان اور وہاں ملنے والی ابدی سعادت اور لازوال شقاوت اور ان تمام عذابوں اور تمام انعامات کا استحضار ہی انبیاؑ کی دعوت اور ان کی پند و نصیحت کی پذیرائی کا اصلی محرک ہے۔ جو لوگ فکرِ آخرت سے بیگانہ ہو جاتے ہیں ان میں برائی کو قبول کرنے کی قابلیت ہوتی ہے اور ہر باطل کا آگے بڑھ کر استقبال کرتے ہیں۔ شیاطین کی وسوسہ اندازی سے وہی متاثر ہوتے ہیں جو اس دنیا کے بعد آخرت پر ایمان نہیں رکھتے۔ اصل ارشاد میں لتصغی الیہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

افئدۃ الذین لا یومنون بالاٰخرۃ صغو کے معنے اصل میں مائل ہونے اور جھکنے کے آتے ہیں مطلب یہ ہے کہ شیاطین جو باطل پر حق کا لیبل لگا کر اور بے دینی کو دین بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کرتے ہیں اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ وہ اس طریق سے لوگوں کو اپنے دام تزویر میں پھانسا چاہتے ہیں اور یہ بھی وجہ ہے کہ وہ اس طریق سے یہ چاہتے ہیں کہ فکر آخرت سے آزاد لوگ ان کی بات کو شرف پذیرائی دیں، لیکن دونوں میں فرق کر دیا۔ پہلی بات کو غرور مفعول لہ لا کر ظاہر کیا جب کہ دوسری بات کو لام تعلیل کے ساتھ بیان کیا ہے کیونکہ فریب دینا اور دھوکہ دینا خود اس کا کام جو باطل کو ملمع کاری کر کے پیش کرتا ہے اور دلوں کا متوجہ ہونا اس کی دعوت باطل کا اثر ہے۔ دونوں میں فرق ظاہر کرنے کے لیے تعبیر میں فرق کر دیا۔

ثانیاً یہ ملمع کاری اس لیے بھی ہوتی ہے کہ لوگوں کی نگاہوں میں ان کی بات کھب جاتے اور لوگ اسے پسند کر لیں۔ مطلب یہ ہے کہ اس ملمع کاری سے ان کا بنیادی مقصد رائے عامہ کو گمراہ کرنا ہے اور اس گمراہی کے لیے ضروری ہے کہ بات اس انداز سے پیش کی جائے کہ لوگوں کا مذاق اسے اپنا لے۔ اسی بات کو یہاں قرآن نے لیرضوہ سے تعبیر کیا ہے۔

ثالثاً تیسری وجہ اس ملمع کاری کی یہ بتائی گئی ہے کہ رائے عامہ بھی ان ہی برائیوں میں ملوث ہو جاتے جن میں وہ شیاطین خود مبتلا ہیں۔ اقتراف کے معنے کمائی کرنے کے آتے ہیں یہاں برائیاں کمانے کے معنے میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عام شہری زندگی ان برائیوں میں مبتلا ہو جاتے جن میں وہ خود مبتلا ہیں۔ خدا سے عابدانہ تعلقات ٹوٹ کر اس کی مخلوق سے لوگوں کے عابدانہ تعلقات وابستہ ہو جائیں اور اس کے نتیجے میں ساری معاشرتی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی برائیاں ان میں جنم لے لیں۔ جھوٹ، وعدہ خلافی، خیانت اور بددیانتی، غداری اور دغابازی، حرص اور بے ایمانی، سود خواری اور شراب نوشی، فخر و غرور اور ظلم و جبر جیسے رذائل پرورش پا جائیں۔

أَفَغَيْرَ اللَّهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتَابَ مُفَصَّلًا ۚ وَالَّذِينَ آتَيْنَاهُمُ الْكِتَابَ يَعْلَمُونَ أَنَّهُ مُنَزَّلٌ مِنْ رَبِّكَ بِالْحَقِّ ۖ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ۝ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَعَدْلًا ۚ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمَاتِهِ ۚ وَهُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝

جب صورتِ حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں ؟ حالانکہ اسی نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے۔[۱۱۴] اور جن لوگوں کو ہم نے تم سے پہلے کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو،[۱۱۴] اور تمہارے رب کا فرمان صداقت اور عدالت کے اعتبار سے تمام ہے، کوئی اس کے فرامین کو تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ

۱۴۳
سنتا اور جانتا ہے۔

معانی مفردات

حکمؔ، وہ جس سے لوگ فیصلہ کرائیں اور جس کے فیصلہ پر راضی ہوں، مفصّلاً، کھول کر بیان کیا گیا ہو جس میں حق اور باطل، حلال وحرام کی وضاحت ہو، الممترین، امتراء سے ہے شک کرنا، تردد رکھنا، کلمتؔ، لفظ کلمہ فقرہ کو بھی کہتے ہیں، ایک معنے اور ایک موضوع پر مشتمل بات کو بھی کہتے ہیں، کسی موضوع پر کئی اشخاص تقریر کریں یا مقالہ لکھیں ان میں سے ہر تقریر اور ہر مقالہ کو کلمہ کہیں گے۔ اہل عرب پورے قصیدے کو بھی کلمہ کہتے ہیں، اسی لیے یہاں کلمہ سے مراد قرآن ہے۔ تمّتؔ، تمام سے ہے تمام کے معنے امام راغب نے یہ بتاتے ہیں۔ بات یا کام کا اس حد تک پہنچ جانا کہ اس میں کسی اور چیز کی حاجت نہ ہو۔ صدقؔ، سچائی، راستی، عدلؔ، برابری، صداقت اخبار میں اور عدالت احکام میں ہوتی ہے۔

قرآن نبوّت کا سب سے بڑا اعجاز ہے

اس سے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ نبوّت سے معجزات کا مطالبہ کرنے والے اپنے اس دعوے میں قطعاً جھوٹے ہیں کہ اگر معجزے کی نمائش ہو جاتے تو وہ ایمان لے آئیں گے اور اس کی وجہ یہ بتائی گئی ہے کہ نبوّت کا اعجازی شاہکار قرآن ہے۔ رسالت اور نبوّت کے موضوع پر بھی فیصلہ کن دلیل ہے۔ قرآن حکیم صرف فصاحت و بلاغت ہی کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنی تمام حیثیات کے لحاظ سے اعجاز کامل ہے۔ اس کے اعجاز کامل ہونے کی مختصر ترین دلیل یہ ہے کہ ۱۳سو۹۹ سال گزرے ہیں کہ کوہ صفا کی چٹان پر کھڑے ہو کر ایک اُمّی نے دُنیا سے یہ غیر متزلزل تحدی کی کہ وہ اس کا جواب پیش کرے تو کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ان تیرہ صدیوں کا ایک ایک سال گزر گیا مگر ایک آواز بھی اس چیلنج کو قبول کرنے کے لیے بلند نہ ہوئی۔ اگر صرف فصاحت و بلاغت ہی کو معیار اعجاز قرار دیا جاتے تو کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ عین اس وقت جب ایک اُمّی کی طرف سے جو ایک شعر تک موزوں نہ پڑھ سکتا تھا یہ مدعیانہ اعلان عرب میں شائع ہوا

اس وقت عرب کے قبیلہ قبیلہ میں زبان آور شعراء اور آتش بیان خطباء موجود تھے مگر اس صورت بردی کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ کفار عرب نے اسلام اور پیغمبر اسلام کی تکذیب کی کیا کیا کوششیں کیں، انہوں نے اس راہ میں جان و مال قربان کیا، دین و کیش کو برباد کیا۔ اپنے عزیزوں اور فرزندوں کو نثار کیا، خود اپنی جانیں ہتھیلیوں پر رکھیں۔ ان کے سپاہیوں نے میدان جنگ میں پرے جمائے، ان کے دولت مندوں نے اپنے خزانے کھول دیے، ان کے شاعروں اور خطیبوں نے اپنی آتش بیانیوں سے تمام ریگستان عرب کو تنور بنا دیا۔ یہ سب کچھ کیا مگر یہ نہ ہو سکا کہ قرآن مجید کی ایک سورت کا جواب دیتے جو نبوت کے دعویٰ حق و صداقت کو پل جھپکنے میں تار تار کر دیتا، کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مثال لانے سے بالکل عاجز تھے۔ اور جب وہ جو زبان کے اصل مالک اور محاورۂ عرب کے طبعی ماہر تھے اس کے مقابلہ سے عاجز تھے تو اس زمانہ کے بعد کے لوگوں کے لیے تو یہ عجز و درماندگی اور زیادہ نمایاں ہے حسان بن ثابت، عامر بن اکوع، الطفیل بن عمرو، زید الخیل، زبرقان، شماس، اسود بن سریع، کعب بن زہیر، عبداللہ بن رواحہ وغیرہ عرب کے مشہور زبان آور شاعر تھے مگر قرآن کے سامنے انہوں نے سر نیاز خم کیا۔ لبید عرب کے مشہور شاعر اور سبعہ معلقہ کی بزم مشاعرہ کے ایک رکن تھے۔ اسلام کے بعد جب حضرت عمرؓ نے ان سے چند اشعار کی فرمائش کی تو انہوں نے جواب دیا جب خدا نے مجھے بقرہ اور آل عمران سکھائی تو مجھے شعر کہنا زیبا نہیں ہے۔

یہاں قرآن نے اعجاز قرآن کے لیے فصاحت و بلاغت سے ہٹ کر دوام صداقت اور عدالت کو معیار بنا کر پیش کیا ہے۔

١١٤۔ جب صورت حال یہ ہے تو کیا میں اللہ کے سوا کوئی اور فیصلہ کرنے والا تلاش کروں حالانکہ اس نے پوری تفصیل کے ساتھ تمہاری طرف کتاب نازل کی ہے یعنی شیاطین الانس والجن کی تلبیس و تلمیع پر بدعقیدہ اور جاہل ہی کان دھر سکتے ہیں۔ ایک پیغمبر یا اس کے متبعین جو ہر مسئلہ اور ہر معاملہ میں خدائے واحد ہی کو اپنا منصف اور حکم مان چکے ہیں کیا ان سے یہ ممکن ہے کہ وہ خدا کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی چکنی چپڑی باتوں کی طرف کان لگائیں یا معاذاللہ غیر اللہ کے فیصلہ کے آگے گردن جھکا دیں حالانکہ ان کے پاس خدا کی جانب سے ایسی معجز اور کامل کتاب ہے جس میں تمام اصولی چیزوں کی ضروری توضیح و تفصیل ہے[1] یہ بات نبوت کی زبان سے مشرکین کے مجادلہ کا جواب ہے کہ تم مجھ سے خدا کی عبادت و طاعت

[1] افادات شیخ الاسلام

کے موضوع پر اُلجھ رہے ہو۔ سوال یہ ہے کہ اس معاملہ میں کہ عبادت اور طاعات کا خدا کے سوا کوئی اور بھی حقدار ہے کیا کوئی اور بھی شریک ہے یا وہ تنہا اس کا حقدار ہے کہ اس کی عبادت کی جائے سوچ کر بتاؤ کہ اس کا فیصلہ میں اللہ کے علاوہ اور کس سے کراؤں اور اللہ کے سوا اس معاملہ کا فیصلہ کون کر سکتا ہے۔ یہ بات تم بھی مانتے ہو کہ اس فیصلہ کا حق صرف اللہ کو ہے۔ اگر خدا ہی کو یہ حق ہے اور لاریب اسی کا حق ہے تو میرے لیے یہ بات کس طرح جائز ہے کہ میں اس کے سوا کسی اور کو اس معاملے میں حکم مانوں؟ اور جب تمام جھگڑوں کا فیصلہ کرنے کے لیے اس نے ایک دستور زندگی تمہاری طرف اتار دیا ہے جس میں تفصیل کے ساتھ افکار و قوانین کھول کر بتا دیے ہیں پھر اب کسی آیت تکوینی یا اعجاز مادی کی ضرورت کیا ہے۔ اس کتاب الٰہی کے افکار و شرائع کا میرے جیسے شخص پر نازل ہونا اس بات کی سب سے بڑی نشانی ہے کہ یہ کتاب اللہ کی جانب سے ہے۔ میں تو چالیس سال تم میں رہ چکا ہوں۔ فقد لبثت فیکم عمرًا من قبلہ یہ نبوت کی صداقت کی سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل ہے یعنی ساری باتیں چھوڑ دو صرف اس ایک بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں جس کے اطوار و احوال تمہیں معلوم نہ ہوں، تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں۔ یہ کتاب اللہ نے نازل کی یہ میرے دعوئ نبوت کی صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ اول تو یہ کہ یہ کتاب خدا کی نازل کردہ ہے دوسرے یہ کہ یہ کتاب کامل ہے، تیسرے یہ کہ اس میں افکار سے لے کر زندگی کے سارے عملی گوشوں کے لیے اصول کلیات کھول کر بتائے گئے ہیں۔ یہ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا سرچشمہ ہے، صحف انبیاء اور افکار عالیہ کے نقوش کا پاسبان ہے۔ اصول قانون، مبادی اخلاق اور محاسن علم و عمل اس کی آغوش میں ہیں، علم و حکمت کے پوشیدہ اسرار یہ فاش کرتا ہے۔ اس سے بڑھ کر میری نبوت کی صداقت کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ یہ خدا کی مفصل کتاب ہی میرے نبی ہونے اور میری باتوں کی صداقت کا فیصلہ کرتی ہے۔

علماء اہل کتاب کی شہادت

۱۱۴ اور جن لوگوں کو ہم نے تم سے پہلے کتاب دی تھی وہ جانتے ہیں کہ یہ کتاب تمہارے رب کی طرف سے حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے لہٰذا تم شک کرنے والوں میں سے نہ ہو۔ یعنی جس کی نسبت علمائے اہل کتاب بھی کتب سابقہ کی بشارات کی بنا پر خوب جانتے ہیں کہ یقیناً یہ آسمانی کتاب ہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ قرآن کے کتاب الٰہی ہونے کی تمام وہ لوگ جو کتب آسمانی کا علم رکھتے ہیں اور جنہیں انبیاء کے مشن سے واقفیت ہے شہادت دیں گے۔ یعنی یہ جہلاء اگر اس کے مخالف ہیں تو ان کی پروا نہ کرو۔ اصولی بات ہے کہ فن آشنا ہی یہ فیصلہ کر سکتا ہے کہ یہ اس فن کی کتاب ہے یا نہیں جیسے اگر ایک شخص ڈاکٹری کے موضوع پر کتاب لے کر آتا ہے تو اطبا ہی صاحب کتاب کے طبیب و ڈاکٹر ہونے کا فیصلہ کر سکتے ہیں، اگر نحو کی کتاب لے کر آئے تو نحوی ہی یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ صاحب کتاب نحوی ہے ٹھیک اسی طرح وحی پر ایمان رکھنے والے نبوت کو ماننے والے اور علوم نبوت کو جاننے والے ہی یہ بات جانتے ہیں کہ قرآن اللہ کی وحی ہے بلکہ وحی کا درجہ کمال لے کر نازل ہوا ہے اور انسان ساری علمی وسعتوں کے باوجود اس کی مثال نہیں لا سکتا ہے قرآن نے یہی بات دوسرے موقعہ پر اس طرح کہی ہے

اولم یکن لھم آیۃ ان یعلمہ علماء بنی اسرائیل

یعنی علماء بنی اسرائیل اس بات سے واقف ہیں کہ جو تعلیم قرآن عزیز میں دی گئی ہے وہ ٹھیک وہی تعلیم ہے جو سابق کتب آسمانی میں دی گئی ہے۔ اہل مکہ خود علم کتاب سے نا آشنا سہی بنی اسرائیل کے اہل علم تو گرد و پیش کے علاقوں میں بکثرت موجود ہیں وہ جانتے ہیں یہ کوئی انوکھی اور نرالی بات نہیں ہے جو آج پہلی مرتبہ محمد بن عبداللہ نے لا کر تمہارے سامنے رکھ دی ہو بلکہ ہزار ہا برس سے خدا کے نبی یہی بات پے درپے کہتے رہے ہیں کیا یہ بات اس امر کا اطمینان کرنے کے لیے کافی نہیں ہے کہ یہ قرآن اسی سلسلہ کی کڑی ہے جو پہلے انبیاء کی وساطت سے دنیا میں آتی رہی ہے۔

سیرت ابن ہشام کی روایت سے معلوم ہوتا کہ ماضی قریب میں یہ واقعہ پیش آچکا تھا کہ حبشہ سے حضرت جعفر طیار کی تقریر سن کر ۲۰ آدمیوں کا ایک وفد مکہ آیا اور اس نے مسجد حرام میں قریش کے سامنے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی اور یہ دریافت کیا کہ آپ کیا تعلیم لائے ہیں۔ حضور نے جواب میں ان کو کچھ قرآن کی آیات سنائیں اس پر ان کی آنکھوں سے آنسو بہہ پڑے اور وہ اسی وقت آپ کے رسول برحق ہونے پر ایمان لے آئے، پیچھے پڑھ آئے ہو کہ نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر نے اسلام پر تقریر کی اور سورۃ مریم کی آیتیں پڑھ کر سنائیں تو نجاشی پر رقت طاری ہو گئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے اور کہا، خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ قرآن کی صداقت کی یہ دلیل ہے کہ علمائے بنی اسرائیل اس کی سچائی کی گواہی دیتے ہیں۔

آخر میں فرمایا فلا تکونن من الممترین، خطاب بظاہر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن روئے سخن دوسروں کی طرف ہے مطلب یہ ہے کہ حالات کی ساری ناسازگاریوں کے باوجود قرآن کے حکم ہونے

کا معاملہ ہو کر رہتا ہے کیونکہ قرآن خدا کی جانب سے الحق ہو کر نازل ہوا ہے یعنی یہ باقی اور دائم رہنے والی حقیقت ہے۔ مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھو۔ تم علمبردارِ حق ہو اور کامیابی حق ہی کی ہو کر رہے گی سو حق کی حقیقت خود اس کی اپنی کسوٹی پر پرکھی جاتی ہے۔ اگر اس کے حق میں خارجی شہادت ہی مطلوب ہو تو یہ بات کافی ہے کہ اہلِ علم اور نبوت آشنا لوگ اس کے حق میں شہادت دیں اگرچہ ان کی تعداد کتنی کم ہو، یہ نہ دیکھو کہ قرآن کے ساتھ اکثریت کا رویہ کیا ہے بلکہ یہ دیکھو کہ تم حق کی ہمنوائی میں اپنے فرائض کہاں تک ادا کر رہے ہو اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ حق و باطل کی جنگ میں حق ہی کا بول بالا کرتا ہے اور بس۔

قرآن کا اعجاز صدق و عدل ہے

۱۱۲۔ اور تمہارے رب کا فرمان صداقت اور عدالت کے اعتبار سے تمام ہے، کوئی اس کے فرامین کا تبدیل کرنے والا نہیں ہے اور وہ سب کچھ سنتا اور جانتا ہے۔ یعنی جس کی تمام خبریں سچی اور تمام احکام معتدل اور منصفانہ ہیں جس میں کسی کی طاقت نہیں کہ تبدیل و تحریف کر سکے ایسی کتاب اور مکمل محفوظ قانون کی موجودگی میں کیسے کوئی مسلمان وساوس و اوہام یا محض عقلی قیاسات اور مغویانہ مغالطات کا شکار ہو سکتا ہے جبکہ وہ جانتا ہے کہ خدا تعالیٰ جس کو ہم نے اپنا حکم اور جس کی کتاب مبین کو دستور العمل تسلیم کر لیا ہے وہ ہماری ہر بات سننے والا اور ہر قسم کے مواقع و احوال اور ان کے مناسب احکام و نتائج کی موزونیت کو پوری طرح جاننے والا ہے[1]

اس آیت میں قرآن کے بارے میں صداقت، عدالت کے ذریعے تمامیت کا دعویٰ کر کے اس کے دوام کا اعلان کیا ہے اور ان تینوں کی اجتماعی حالت کا نام کمال ہے۔

صداقت کا مطلب یہ ہے کہ قرآن اپنی تمام خبروں میں راستی، سچائی اور واقعیت لے کر آیا ہے فطرت بشری کے عجز اور بے چارگی کا سب سے بڑا نظارہ مستقبل سے ناواقفیت اور جہالت ہے۔ انسان کی مضطرب اور بے چین فطرت مستقبل کے بحرِ ظلمات میں ہاتھ پاؤں مارتی ہے اور تھک کر اپنی نادانی اور جہالت کا اعتراف کر لیتی ہے اور اسی لیے وہ اس بات پر مجبور رہے کہ جو انسانیت سے مافوق کسی دعویٰ کا مدعی ہو اس کی آزمائش اور امتحان کے لیے اسی بحرِ بیکراں کی شناوری کو معیار اور سند قرار دے۔ چنانچہ یہی اخبارِ غیب اور پیشین گوئی کی قدرت نبوت و رسالت کے ثبوت پر نوعِ انسانی کے عام

---

[1] افادات شیخ الاسلام

افراد کے نزدیک ایک دلیل بیّن اور حجت قائم ہے اور اسی لیے بنی اسرائیل کے نزدیک نبی اور پیغمبر کی صرف اس قدر حقیقت ہے کہ وہ غیب کا قاصد اور جہان نادیدہ کا مخبر ہے۔ بلحاظِ صداقت قرآن کے تمام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے جو جو وعدے کیے ہیں اور جو جو خبریں دی ہیں اور مخالفین کو جو وعیدیں سنائی ہیں وہ حرف بحرف حقیقت پر مبنی اور واقعات پر مشتمل ہیں۔ سب سے زیادہ شاندار سب سے زیادہ واضح سب سے زیادہ معرکۃ الآرا غلبہ روم کی پیشین گوئی ہے۔

عرب کے چپ و راست دونوں پہلوؤں میں روم و فارس کی پرزور حکومتیں قائم تھیں۔ اس وقت ایران کا تاجدار خسرو اور روم کا فرمانروا ہرقل تھا۔ ان دونوں سلطنتوں میں ایک مدت سے معرکہ آرائیوں کا سلسلہ قائم تھا۔ بعثت نبوی کے پانچویں سال یعنی ۶۱۳ میں ان دونوں ہمسایہ سلطنتوں میں ایک خونریز جنگ شروع ہو گئی۔ اگرچہ ان دونوں قوموں میں کسی قوم نے مذہب اسلام قبول نہیں کیا۔ تاہم رومی حضرت عیسیٰ کے پیرو اور اہل کتاب تھے اور ایرانیوں کے عقائد مشرکین مکہ کے عقائد کے ساتھ مطابقت رکھتے تھے اس لیے لازمی طور پر مسلمانوں کی ہمدردیاں عیسائیوں اور مشرکین کی ایرانیوں کے ساتھ تھیں دونوں جنگ کے نتائج کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔ ان دونوں سلطنتوں کے حدود دریائے دجلہ و فرات کے کناروں پر ملتے تھے۔ رومی سلطنت مشرق میں ایشیائے کوچک حدود عراق، شام، فلسطین اور مصر میں پھیلی ہوئی تھی۔ ایرانیوں نے دو طرفہ حملہ کیا ایک طرف تو وہ دجلہ و فرات کے کناروں سے شام کی طرف بڑھے اور دوسری طرف ایشیائے کوچک کی جانب سے آذربائیجان سے آرمینیا ہو کر موجودہ اناطولیہ میں داخل ہو گئے اور دونوں طرف سے رومیوں کو پیچھے ہٹاتے ہٹاتے سمندر میں دھکیل دیا۔ شام کی سمت میں انہوں نے یکے بعد دیگرے اس ارض مقدس کا ایک ایک شہر رومیوں سے چھین لیا ۶۱۴ء میں فلسطین اور اس کا مقدس شہر یروشلم صلیبی علم کے بجائے درفش کاویانی کے زیر سایہ آگیا کلیسے مسمار کیے گئے، مذہبی شعائر کی توہین کی گئی۔ ۲۶ ہزار یہودیوں نے ایرانی فوج میں شامل ہو کر ۹۰ ہزار بے گناہ عیسائیوں کا قتل عام کیا۔ ایرانی فتوحات کا سیلاب اس سے آگے بڑھ کر ۶۱۶ء میں پوری وادئ نیل پر محیط ہو گیا اور آخر اسکندریہ پر جا کر ٹھہرا اور دوسری طرف ساری ایشیائے کوچک کو تباہ کرتا ہوا باسفورس کے ساحل پر جا کر رکا اور قسطنطنیہ کی دیواروں سے جا ٹکرایا۔

جنگ کا نتیجہ جب ایسا خلاف امید ظاہر ہوا تو مسلمانوں کو یقیناً رنج اور مشرکین مکہ کو خوشی حاصل ہوئی۔ ان حالات میں معرکہ جنگ سے بہت دور اور ایک خشک و بنجر زمین کی سنسان پہاڑی سے ایک شہزادہ امن نمودار ہوا اور واقعات عالم کے بالکل خلاف قرآن کے نغمہ قدس میں اعلان کیا۔

غلبت الروم فی ادنی الارض وھم من بعد غلبھم سیغلبون فی بضع سنین
للہ الامر من قبل و من بعد۔

رومی قریب ترین زمین میں مغلوب ہو گئے لیکن وہ چند سال میں مغلوب ہونے کے باوجود
پھر غالب ہوں گے پہلے اور بعد میں حکم اللہ ہی کا ہے۔

قرآن کی یہ خبر واقعات کے لحاظ سے اس قدر بعید از عقل اور ناقابل یقین تھی کہ کفار نے اس کے صحیح ہونے کی صورت میں اونٹوں کے ہارنے کی مسلمانوں سے شرط لگالی۔ اب مسلمانوں اور کافروں کو بڑی بے تابی سے واقعات کے پہلو کا انتظار تھا۔ آخر بضع سنین چند سال کے بعد دُنیا نے خلاف اُمید پلٹا کھایا،
مورخ گبن کے الفاظ میں،

شہنشاہی جو اپنی ابتدائی اور آخری زندگی میں سستی عیاشی اور اوہام کا غلام اور رعایا کے مصائب کا نامرد تماشائی بنی ہوئی تھی جس طرح صبح و شام کا کہرا آفتاب نصف النہار کی روشنی میں پھٹ جاتا ہے دفعتہً ۶۲۱ محلوں کا ارکاڈیوس میدان جنگ کا ہیرو بن گیا اور روم و ہرقل کی عزت نہایت شاندار طریقہ سے بچالی گئی۔[1]

جس وقت ہرقل اپنی بقیہ فوج لے کر قسطنطنیہ سے چلا تھا لوگوں کو معلوم ہوتا تھا کہ رومۃ الکبریٰ کے لشکر ملکی کا منظر دُنیا کے سامنے ہے لیکن قرآن کی خبر حرف بحرف پوری ہوئی اور اس نے دنیا سے اپنی صداقت کا لوہا منوالیا اور یہ عین اس وقت ہوا جب مسلمانوں نے بدر کے میدان میں قریش کو شکست دی۔ اس عظیم الشان خبر کی صداقت نے دُنیا کو محوِ حیرت کر دیا۔ قریش کے بہت سے لوگ اس صداقت کو دیکھ کر مسلمان ہو گئے۔ واقعہ کے ساڑھے بارہ سو برس کے بعد تاریخ زوال روم کا مشہور مصنف گبن اس حیرت انگیز قرآنی خبر کی صداقت سے متحیر ہو کر کہتا ہے :

مشرق کی ان دو عظیم الشان سلطنتوں کے ڈانڈے پر بیٹھ کر ان دولتوں کی ایک دوسرے کو تباہ کر دینے والی روز افزوں کوششوں کی ترقی کو دلی مسرت کے ساتھ بغور مطالعہ کر رہا تھا اور عین اس وقت جبکہ ایرانیوں کو پیہم کامیابیاں حاصل ہو رہی تھیں اس نے اس پیشین گوئی کی جرأت کی کہ چند سال میں فتح و ظفر رومی علم پر سایہ افگن ہوگی جس وقت یہ پیشین گوئی کی گئی تھی کوئی پیشین گوئی اس سے زیادہ دور از قیاس نہیں ہو

---

[1] تاریخ زوال روم بحوالہ سیرت النبیؐ

سکتی تھی کیونکہ ہرقل کی بارہ سال کی ۶۱۰ سنہ سے ۶۲۲ سنہ تک حکومت نے اس بات کا اعلان کر دیا تھا کہ رومی شہنشاہی کا شیرازہ جلد بکھر جائے گا۔[1]

یہ اور اس قسم کی دوسری خبریں جو قرآن نے دی ہیں ان میں بھرپور صداقت ہے۔ صداقت کے اعتبار سے قرآن کے تمام ہونے کا مطلب شارحین قرآن نے یہی بتایا ہے کہ خبروں اور وعدوں میں قرآن پورا اترا ہے اور یہ قرآن کا نمایاں اعجاز ہے۔ اور عدل کے اعتبار سے قرآن کے پورا ہونے کا مطلب شارحین قرآن نے ایک تو یہ بتایا ہے کہ قرآن اپنے احکام اور فیصلوں میں عدل و انصاف لے کر آیا ہے دوسرا مطلب یہ بتایا ہے کہ قرآن کا عدل میں تمام ہونا یہ ہے کہ وہ کفر و ایمان کی سزا اور جزا ٹھیک بتاتا ہے۔ یعنی جو لوگ حق کے معاندین ہیں ان کو سزا ہوگی اور جو لوگ حق کو مانتے ہیں اور اس کے مطابق زندگی بسر کرتے ہیں ان کو جزا ملے گی۔ یہ درست ہے لیکن اگر یوں کہا جائے کہ قرآن اپنے قضایا اور احکام میں افراط و تفریط سے الگ نقطۂ اعتدال لے کر آیا ہے اور عدل کے اعتبار سے قرآن کے تمام ہونے کا مطلب یہ ہے کہ قرآن قانون اور اخلاق دونوں لے کر آیا ہے۔ اگرچہ دونوں کا منشا ایک ہی ہے مگر منزلِ مقصود تک پہنچنے کی راہیں دونوں کی الگ الگ ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روک دیتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل کرنے کے لیے کسی کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا۔ اس لیے اس کے ذریعے عدل و انصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال کلیۃً نہیں ہو سکتا۔ تورات محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق، اسی لیے یہ دونوں الگ الگ امن و امان اور عدل و انصاف کے قیام اور فتنہ و فساد اور بدیوں اور برائیوں کے انسداد کے لیے پوری طرح کافی نہیں ہے۔ قرآن ایسا جامع نظامِ حیات ہے جو عدل و احسان اور قانون اخلاق کا جامع ہے۔ اس جامعیت کی شان قرآن میں دو حیثیتوں سے پائی جاتی ہے ایک تو یہ کہ قرآن نے تورات کی طرح اخلاق کو قانون کی شکل نہیں دی اور نہ انجیل کی طرح قانون کو مذہب کے ہر حصہ سے خارج کر کے قانون کو بھی اخلاق بنا دیا، بلکہ قرآن نے قانون و اخلاق کے درمیان حدِ فاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی ہے اور قانون کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ اس طرح قرآن قانون و اخلاق دونوں کا مجموعہ ہے۔

---

[1] تاریخ زوال روم بحوالہ سیرت النبیؐ

آخر میں فرمایا لا مبدل لکلماتہ یعنی قرآن کے فرامین کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے۔ قرآن سے پہلے کوئی کتاب الہٰی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر بری نہیں رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے۔ تورات جل جل کر خاک ہوئی پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور ترجموں کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی۔ انجیل میں تحریف و جعل تو اسی زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ پھر مترجموں کی کتر بیونت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی۔ زردشت کا صحیفہ سکندر کی نذر ہوا، ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی اور آخری کتاب بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ اسی بنا پر ان کی دائمی حفاظت کا وعدہ نہیں کیا گیا تھا لیکن قرآن کی نسبت یہ وعدہ ہو لیے کردہ ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا اور اس میں کسی قسم کا رد و بدل اور تصرف نہ ہو گا لا مبدل لکلماتہ کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ اس میں کوئی تبدیلی نہ کرے گا اس لیے یہ قیامت تک محفوظ ہے اور دوسرے یہ کہ اب کوئی اور کتاب اور نبی قیامت تک نہیں آئے گا جو اس کے احکام کو بدل دے۔ اس طرح اس فقرے میں تین باتیں آگئی ہیں ایک قرآن کے دائمی کتاب ہونے کی دوسرے اس کے ہر تغیر و تصرف محفوظ ہونے کی اور تیسرے آخری کتاب ہونے کی،

یہاں تک قرآن کا بھرپور چہرہ یہ پیش کیا گیا ہے

اولاً، یہ خدا کی اتاری ہوئی کتاب ہے

ثانیاً، اس میں ہدایت سے متعلق اصول و کلیات کی تفصیل ہے۔

ثالثاً، ہمارے علمائے اہل کتاب کی علمی تائید حاصل ہے۔

رابعاً، یہ کتاب اپنے دامن میں الحق لے کر آئی ہے۔

خامساً، اس کتاب کا مستقبل تابناک ہے

سادساً، اس کی خبروں، وعدوں اور وعیدوں میں صداقت ہے

سابعاً، یہ قانون و اخلاق کا مکمل مجموعہ ہے

ثامناً، یہ کتاب ہر قسم کی تحریف و تصرف سے محفوظ ہے

تاسعاً، یہ کتاب دائمی اور آخری ہے

عاشراً، یہ کتاب الہٰی حکم بن کر آئی ہے۔

آخر میں فرمایا وھو السمیع العلیم، اس فقرے کے دو مطلب ہیں اگر روئے سخن اہل ایمان کی طرف ہے تو مطلب یہ ہے کہ جس کی نازل کردہ اس عظیم المرتبت کتاب کو تم نے اپنا دستور حیات بنایا

ہے وہ تمہاری ہر بات سننے والا اور ہر قسم کے احوال کے مطابق احکام کی مناسبت کو پوری طرح جاننے والا ہے۔ اور اگر روئے سخن مخالفین و معاندین کی طرف ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی جھوٹی قسموں اور مادی معجزات کے مطالبات کو سننے والا اور ان کی اہل ایمان اور نبوت کے خلاف سازشوں کو اور ان کے ہر کام میں ان کے مقاصد، ان کے ارادوں کو خوب جاننے والا ہے۔ ان سے بے پروا ہو کر کام کرو۔ ان کے مطالبات کو پرکاہ برابر وقعت نہ دو۔ لہٰذا اے مسلمانو! اس قرآن کے ہوتے ہوئے جو صداقت اور عدالت کے اعتبار سے کامل ہے تمہیں کسی کو حکم بنانے کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن کے معجزہ ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے کہ یہ اپنی آغوش میں دوسری خوبیوں کے ساتھ صداقت اور عدالت لے کر آیا ہے۔ تورات قانون و شریعت ہے لیکن اخلاق و موعظت نہیں۔ انجیل اخلاق و موعظت ہے لیکن قانون و شریعت نہیں۔ زبور مناجاتوں اور دعاؤں کا مجموعہ ہے لیکن دیگر صفات سے خالی۔ مسیح کے صحیفہ میں خطابت و وعظ کی ہنگامہ آرائیاں ہیں مگر استدلال اور فکر و نظر کی دعوت نہیں۔ صحف بنی اسرائیل پیشین گوئیوں سے لبریز ہیں مگر دقائق حکمت اور اسرار ایمان سے خالی ہیں۔ دُنیا میں یہ ایک ہی کتاب الٰہی ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اور اخلاق و موعظت بھی، مخاطبات قلبی اور دُعاؤں کا گنجینہ بھی ہے اور دیگر کتب الٰہیہ کی مجموعی صفتوں کا حامل بھی، خطابت بھی ہے اور استدلال و فکر بھی۔ اظہار غیب و پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے اور دقائق حکمت و اسرار ایمان و عمل سے معمور بھی، اور ان سب کے ساتھ عین اس وقت جب کتب الٰہی تحریف و تغییر اور تراجم و تعبیر سے اپنی اصلی زبان اور اصلی الفاظ کھو چکی ہیں، اس کی بقا اور حفاظت کی یہ ذمہ داری کہ تیرہ سو برس کے بعد بھی اس کے ایک ایک حرف ایک ایک نقطہ میں تغیر و تبدل نے راہ نہیں پائی۔ وہ اپنی زندگی جاوید کے لیے کاغذ کے نقوش و حروف کی محتاج نہیں کہ لاکھوں انسان کے سینے اس کے خزانے ہیں وہ اسی زبان اور انہی الفاظ اور انہی حروف کے قالب میں اب تک جلوہ گر ہے جس میں دست قدرت نے اس کو ڈھالا تھا اور جبریل امین نے اتارا تھا اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو اُمت کے ہاتھوں میں سونپا تھا۔ اس عظیم الشان کتاب کے ہوتے ہوئے کیا کسی اور معجزے کی ضرورت ہے اور کیا کسی اور چیز کو حکم بنانے کی ضرورت ہے۔

وَإِنْ تُطِعْ أَكْثَرَ مَنْ فِي الْأَرْضِ يُضِلُّوكَ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ
إِنْ يَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿١١٦﴾ إِنَّ رَبَّكَ
هُوَ أَعْلَمُ مَنْ يَضِلُّ عَنْ سَبِيلِهِ ۖ وَهُوَ أَعْلَمُ بِالْمُهْتَدِينَ ﴿١١٧﴾ فَكُلُوا
مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ إِنْ كُنْتُمْ بِآيَاتِهِ مُؤْمِنِينَ ﴿١١٨﴾ وَمَا لَكُمْ
أَلَّا تَأْكُلُوا مِمَّا ذُكِرَ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَقَدْ فَصَّلَ لَكُمْ مَا حَرَّمَ
عَلَيْكُمْ إِلَّا مَا اضْطُرِرْتُمْ إِلَيْهِ ۗ وَإِنَّ كَثِيرًا لَيُضِلُّونَ
بِأَهْوَائِهِمْ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ أَعْلَمُ بِالْمُعْتَدِينَ ﴿١١٩﴾
وَذَرُوا ظَاهِرَ الْإِثْمِ وَبَاطِنَهُ ۚ إِنَّ الَّذِينَ يَكْسِبُونَ
الْإِثْمَ سَيُجْزَوْنَ بِمَا كَانُوا يَقْتَرِفُونَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يُذْكَرِ
اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ وَإِنَّهُ لَفِسْقٌ ۗ وَإِنَّ الشَّيَاطِينَ لَيُوحُونَ إِلَىٰ
ع ۱۱ أَوْلِيَائِهِمْ لِيُجَادِلُوكُمْ ۖ وَإِنْ أَطَعْتُمُوهُمْ إِنَّكُمْ لَمُشْرِكُونَ ﴿١٢١﴾

اور اے پیغمبر اگر تم روئے زمین کی اکثریت کی اطاعت کرو گے تو وہ

تمہیں راہِ حق سے بہکا دیں گے وہ تو صرف گمانوں کے پیروکار ہیں اور
صرف اٹکل سے قیاس آرائیاں کرتے ہیں[۱۴۴]۔ بلاشبہ تیرا رب ہی خوب
جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک رہا ہے اور یہ بھی اسی کو خوب
علم ہے کہ راہِ ہدایت پر کون گامزن ہیں[۱۴۵]، لہٰذا تم ان جانوروں میں
سے بلا کھٹکے کھاؤ جن پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہو اگر تم خدا
کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو[۱۴۶]۔ اور تمہارے لیے کیا رکاوٹ ہے کہ جس
جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہے اسے نہ کھاؤ حالانکہ جو کچھ تم پر حرام کیا
گیا ہے اُسے اللہ نے تمہارے سامنے کھول کر بیان کر دیا ہے ہاں
حالات کی مجبوری جو کچھ تمہیں کھلائے وہ اس سے مستثنیٰ ہے[۱۴۷]۔ اور
بہت سے لوگ بغیر علم کے محض اپنی خواہشات سے لوگوں کو بہکاتے
رہتے ہیں بلاشبہ تیرا پروردگار عدوان پیشہ لوگوں سے خوب واقف ہے[۱۴۸]
اور مسلمانو! جلوت اور خلوت کا ہر گناہ چھوڑ دو، یقیناً جو لوگ

گناہ کرتے ہیں ان کو اپنے جرائم کی ضرور سزا ملے گی۔ اور یاد رکھو کہ جس [۱۴۹] جانور پر خدا کا نام نہ لیا جاتے اُسے مت کھاؤ اس کا کھانا نافرمانی کی بات ہے۔ [۱۵۰] اور بلاریب شیاطین اپنے رفقاء کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے اُلجھا کریں اور اگر تم نے ان کی اطاعت کر لی تو سمجھ لو کہ تم بھی شرک کرنے والے ہو۔ [۱۵۱]

معانی مفردات

تطع اطاعت سے ہے جس کے معنے حکم ماننے کے ہیں، صیغہ واحد مذکر حاضر مضارع، اطاعت خواہ مُردے کی ہو یا زندہ کی عربی لغت میں دونوں اطاعت ہیں۔ یضلو ضلال سے مضارع مجزوم کا جمع مذکر غائب ہے، گمراہ کرنا، بہکانا، بھٹکانا اور سیدھے راستہ سے ہٹا دینا۔ سبیل اللہ، اللہ کا راستہ، حافظ ابوالسعادات ابن الاثیر الجزری لکھتے ہیں۔ ,, سبیل اللہ لفظ عام ہے جو ہر اس خالص عمل کے لیے آتا ہے جس کی بدولت حق تعالیٰ کے تقرب کی راہ پر فرائض، نوافل اور انواع عبادات کی ادائیگی کے ذریعے گامزن ہوا اور جب یہ مطلق ہو تو بیشتر جہاد کے معنے میں آتا ہے حتیٰ کہ کثرتِ استعمال کی وجہ سے ایسا ہو گیا کہ گویا اسی معنے میں منحصر ہو۔ یتبعون، اتباع سے مضارع مرفوع کا جمع مذکر غائب ہے اس کے معنے پیروی کرنا، باب افتعال ہے۔ ظن، لغت کے اعتبار سے ظن یقین اور شک کے خلاف کسی خاص ادراک کا نام نہیں بلکہ علامات اور دلائل کی بنا پر جو انسان کا تخمینہ اور اٹکل قائم ہوتی ہے وہ ظن ہے۔ اس اعتبار سے ظن علم و یقین، شک و وہم اور کذب سب سے عام ہے اور سب کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے علمی اصطلاحات

میں ظن سے اس کے منطقی معنے مراد ہوتے ہیں لیکن لغوی اعتبار سے یہ ٹھیک ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں ہم اُردو میں اٹکل بولتے ہیں۔ یخرصون، وہ اٹکلیں چلاتے ہیں وہ تجویزیں کرتے ہیں، وہ جھوٹ بولتے ہیں، خرص سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے خرص اصل میں پھلوں کے اندازہ لگانے کو کہتے ہیں۔ اضطررتم، تم بے اختیار کیے لاچار کیے گئے۔ اضطرار سے ماضی مجہول کا جمع مذکر حاضر ہے۔ اضطرار کے اصل معنے انسان کو کسی ضرر رساں چیز پر مجبور کرنے کے ہیں۔ اھواء، ہویٰ کی جمع ہے۔ باب سمع سے ہَوِیَ یہوی چاہنے اور خواہش کرنے کے معنے میں ہے۔ معتدین، اعتداء سے اسم فاعل ہے حد سے گزرنے والے، عدو مادہ ہے، اسی سے عدوان ہے حد سے گزر جانے کے معنے میں ہے جلوت کے گناہ کو عدوان کہتے ہیں۔

اطاعت میں شرک کی ممانعت

اب تک توحید عبادت کے موضوع پر مشرکانہ اعمال کی تردید تھی۔ ان آیات میں توحید طاعت کے موضوع پر مشرکانہ اعمال سے منع کیا گیا ہے۔ آپ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اب تک ان کا چہرہ پیش کیا گیا ہے جو اللہ سبحانہ کی الوہیت پر چور دروازے سے ڈاکہ مارتے ہیں اور اب ان کا ذکر ہو رہا ہے جو اللہ سبحانہ کی ربوبیت پر شب خون مارتے ہیں یا یوں کہہ دو کہ یہاں تک اللہ کی پرستش میں آمیزش کرنے والوں کی اصلاح کی ہے اور اب اللہ کی بندگی میں ملاوٹ کرنے والوں کی طرف توجہ فرمائی ہے۔ عبادت میں شرک سنگین جُرم ہے۔ اس کو تو سب جانتے ہیں لیکن طاعت میں شرک بھی شرک ہے اور از روئے قرآن حرام ہے یہ عام نظروں سے ایک عرصہ سے اوجھل رہا ہے اس پر محقق اُمت شاہ عبدالعزیز نے خاص طور پر تنبیہہ فرمائی ہے۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ شرک کی ایک قسم شرک فی الطاعۃ بھی ہے۔ دراصل اللہ سبحانہ کی دو شانیں ہیں، شان محبوبیت اور شان حاکمیت۔ محبوبیت کی وجہ سے اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اور حاکمیت کی وجہ سے اللہ کی طاعت کی جاتی ہے۔ محبوبیت میں نیابت نہیں ہوتی ہے اور حاکمیت میں نیابت ہوتی ہے۔ اسی بنا پر انبیاء کو اللہ کا خلیفہ کہا ہے۔ حاکمیت میں نیابت کی وجہ سے طاعت رسول کا حکم ہے بلکہ ان تمام اہل ایمان کی طاعت جائز ہے جن کے ہاتھوں میں اللہ و رسول کی طاعت کا دامن ہو۔ قرآن میں اطاعت کے موضوع پر بار بار اطیعوا اللہ کے ساتھ اطیعوا الرسول پڑھو گے بلکہ اس سے آگے

وادلی الامر منکم بھی پڑھو گے لیکن عبادت کے موضوع پر کہیں اعبدوا اللہ ورسولہ نہیں پڑھو گے۔ شاہ عبدالقادر نے اپنی تفسیر میں شرک فی العبادۃ اور شرک فی الطاعۃ کی تشریح فرمائی ہے شرک فی العبادت کے موضوع پر لا تنکحوا المشرکات پر لکھتے ہیں یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے مثلاً کسی چیز کو سجدہ کرے اور اس سے حاجت مانگے مختار جان کر اور ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ شرک فی الطاعۃ کے موضوع پر لکھتے ہیں کہ شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو۔ اس دقیق فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے کچھ لوگ تو طاعت رسول ہی کو خیر باد کہہ بیٹھے اور کچھ ائمہ اجتہاد کی طاعت کو ناجائز بتانے لگے۔ اور کچھ تاویل کر کے غیر اللہ کی عبادت کرنے لگے۔ یہ سب افراط و تفریط ہے۔ جادۂ اعتدال یہ ہے کہ عبادت میں اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کیا جائے۔ ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق اللہ کی ذات ہے۔ یہ اسی کی ذات ہے جو انسانوں کی پکار سنتی اور ان کی دعائیں قبول کرتی ہے۔ دُعا استعانت، رکوع و سجود، نذر و نیاز، اعتماد و توکل، انابت و تضرع، خشوع و خضوع اور اس طرح کے تمام نیاز مندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا رشتہ قائم کرتے ہیں۔ اور طاعت میں اللہ کی بالذات طاعت کی جاتی ہے اور اللہ کے رسُول کی رسُول ہونے کی وجہ سے طاعت کی جائے اور مجتہدین کرام کی نائب رسُول ہونے کی وجہ سے۔ ہاں جن کے ہاتھ میں اللہ و رسُول کی طاعت کا دامن نہ ہو وہ خواہ کوئی ہو ارباب روایت ہوں یا ارباب اجتہاد، ارباب ولایت ہوں یا ارباب سیاست کسی کی طاعت بھی از روئے قرآن صرف حرام نہیں بلکہ شرک ہے اور ان آیات میں قرآن اسی شرک کا ذکر کر رہا ہے۔ چونکہ طاعت کا مدار طاقت ہے اور طاقتوں میں سب سے بڑی طاقت عددی طاقت ہے اس لیے سب سے پہلے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ خدا کے قانون کے مقابلے میں اگر روئے زمین کی اکثریت بھی آپ کے مقابلے پر آجائے پھر بھی آپ کو اسی دستور پر چلنا ہے جو آپ کو دے کر ہم نے روانہ کیا ہے اور بتا دیا ہے کہ حق و باطل کے معاملے میں انسانوں کی قلت و کثرت معیار نہیں ہو سکتی بلکہ حقیقت اور سچائی کے بنیادی اصولوں پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ بسا اوقات گمراہی و حق فراموشی کے ایسے اوقات آجاتے ہیں کہ نوع انسانی کی اکثریت حق و یقین کی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے۔ ایسا ہی دور نزول قرآن کے وقت بھی دُنیا پر چھایا ہوا تھا۔ فرمایا یہ نہ دیکھو کہ اکثریت کیا کہتی ہے یہ دیکھو کہ حق کیا اور کدھر ہے کون سی راہ یقین و بصیرت کی راہ ہے اور کون سی جہل و گمان کی راہ ہے۔

۱۱۶ اور اے پیغمبر اگر تم روئے زمین کی اکثریت کی اطاعت کرو گے تو وہ تمہیں راہ حق سے بہکا

دیں گے وہ تو صرف گمان کے پیروکار ہیں اور محض اٹکل سے قیاس آرائیاں کرتے ہیں۔ مشاہدہ اور تاریخ بتلاتے ہیں کہ دُنیا میں ہمیشہ فہیم، محقق اور با اصول آدمی تھوڑے رہے ہیں۔ اکثریت ان ہی لوگوں کی ہوتی ہے جو محض خیالی، بے اصول اور اٹکل پچو باتوں کی پیروی کرنے والے ہوں۔ اگر تم اسی اکثریت کا کہنا ماننے لگو اور بے اصول باتوں پر چلنا شروع کر دو تو خدا کی بتلائی ہوئی سیدھی راہ سے یقیناً وہ تم کو بہکا لیں گے۔ یہ بات آپ پر رکھ کر دوسروں کو سنایا ہے[1]۔ مطلب یہ ہے کہ اگر آپ اللہ سبحانہ کی نازل کردہ کتاب کے خلاف اہل کفر میں سے کسی کی بھی اطاعت کریں گے تو وہ آپ کو اللہ کے دین سے ہٹا دیں گے لہٰذا آپ کو اور پیروکاروں کو چاہیے کہ خدا کے نازل فرمودہ نظام حیات کی موجودگی میں کسی کے حکم کی طاعت نہ کریں خدا کا نازل کردہ دستورِ حیات ہی تام اور کامل دستور ہے۔ لوگوں کو آپ اسی کی دعوت دیں۔ آگے اس کی وجہ بیان کی ہے اور بتایا ہے کہ ان لوگوں نے زندگی کا جو ڈھانچہ بھی فکری، روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی تیار کیا ہے اس کی اساس علم و یقین پر نہیں بلکہ گمان و وہم پر ہے اور یہ جو کچھ بتاتے ہیں محض خیالی پلاؤ، تخمین اور انداز کے سوا کچھ نہیں ہے۔ علم کی بجائے قیاس اور گمان کی پیروی کر رہے ہیں۔ ان کے عقائد، تخیلات، فلسفے، اصول زندگی اور قوانین عمل سب کے سب قیاس آرائیوں پر مبنی ہیں۔ اس کے برعکس اللہ کا راستہ یعنی اسلام دُنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ ہے جو اللہ کی رضا کے مطابق ہے۔ اگر آپ اس کے مقابلے میں ان کے راستہ کو اپنائیں گے اور ان کی اطاعت کریں گے تو یہ آپ کو بہکا دیں گے اور منزل مقصود آپ سے گم ہو جائے گی۔ آپ کے چلنے کے لیے راستہ صرف وہی ہے جس کا علم اللہ نے آپ کو دیا ہے نہ کہ وہ جس کو لوگوں نے بطور خود اپنے قیاسات سے تجویز کیا ہے۔ یہ نہ دیکھنا چاہیے کہ اکثریت کس طرف ہے یہ دیکھنا چاہیے کہ حق کیا اور کدھر ہے خواہ اس پر چلنے والا دنیا میں اکیلا ہو۔ آپ کو خدا کی جانب سے جو علم ملا ہے وہ وحی الٰہی کا نور مبین اور علم قطعی ہے۔ اس کے سوا دُنیا میں عقل اور علوم کے نام پر جو کچھ بھی ہے سب ظن اور اٹکل ہے۔

آیت قرآنی کا منطوق تو یہی ہے لیکن اس کے مدلول اور مفہوم سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے۔

بعثت کے وقت دُنیا کی ضلالت

اوّل یہ کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ بعثت کے وقت دُنیا کی اکثریت گمراہی اور بے راہ روی کی شکار

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تھی۔ آیئے ہم دیکھیں کہ آفتاب نبوت طلوع ہونے کے وقت کون کون قومیں دُنیا میں حکمران تھیں اور ان کی مذہبی و اخلاقی حالت کیا تھی۔ اس وقت رُوئے زمین کی اہم طاقتیں دو تھیں فارس اور روم، فارس کا مذہب مجوسیت تھا جس کا دائرہ عراق سے لے کر پاکستان کی سرحد تک محیط تھا اور روم کا مذہب عیسائیت تھا جو یورپ، ایشیا اور افریقہ کے تینوں براعظموں کو گھیرے ہوئے تھا لیکن مذہبی حیثیت سے دو اور قومیں بھی قابلِ ذکر ہیں جن میں سے ہر ایک کو اپنی اپنی جگہ قدامت کا دعویٰ ہے اور وہ یہود اور ہنود ہیں۔ ان سب کے حالات ایک ایک کر کے تاریخ میں پڑھیے اور پھر ظہورِ اسلام کے وقت عرب کی مذہبی و اخلاقی حالت پڑھیے تو آپ کو اندازہ ہوگا کہ چھٹی صدی مسیحی بلا اختلاف تاریخِ انسانی کا تاریک ترین و پست ترین دور تھا۔ صدیوں سے انسانیت جس پستی و نشیب کی طرف جا رہی تھی اس کے آخری نقطہ کی طرف پہنچ گئی تھی۔ روئے زمین پر کوئی ایسی طاقت نہ تھی جو گرتی ہوئی انسانیت کا ہاتھ پکڑ سکے اور ہلاکت کے غار میں گرنے سے روک سکے نشیب کی طرف جاتے ہوئے روز بروز اس کی رفتار میں تیزی پیدا ہو رہی تھی۔ انسان اس صدی میں خدا فراموش ہو کر خود فراموش بن چکا تھا وہ اپنے انجام سے بالکل بے فکر اور بے خبر اور بُرے بھلے کی تمیز سے قطعاً محروم ہو چکا تھا۔ پیغمبروں کی دعوت کی آواز عرصہ ہوا دب چکی تھی۔ جن چراغوں کو انبیاء روشن کر گئے تھے وہ ضلالت کے ہواؤں کے طوفان میں یا تو بالکل بجھ چکے تھے یا اس گھٹا ٹوپ اندھیرے میں اس طرح ٹمٹما رہے تھے جن سے صرف چند قدر شناس دل روشن تھے جو شہروں کو چھوڑ کر چند گھروں میں بھی اجالا نہیں کر سکتے تھے۔ دیندار اشخاص دین کی امانت کو اپنے سینہ سے لگاتے ہوتے زندگی کے میدان سے کنارہ کش ہو کر دیر و کلیسا اور صحراؤں کی تنہائیوں میں پناہ گزین ہو گئے تھے اور زندگی کی کشمکش، اس کے مطالبات اور اس کی خشک و تلخ حقیقتوں سے دامن بچا کر دین و سیاست اور روحانیت و مادیت کے معرکے میں شکست کھا کر اپنے فرائض قیادت سے سبکدوش ہو گئے تھے اور جو زندگی کے اس طوفان میں باقی رہ گئے تھے۔ انہوں نے بادشاہوں اور اہلِ دُنیا سے سازباز کر لی تھی اور ان کی ناجائز خواہشات اور ظالمانہ نظامِ سلطنت و معیشت میں ان کی دستِ راست اور باطل طریقہ پر لوگوں کا مال کھانے اور ان کی قوت و دولت سے ناجائز فائدہ اٹھانے میں ان کے شریک و سہیم بن گئے تھے۔

رومی و ایرانی اس وقت مغرب و مشرق کی امامت اور دُنیا کی قیادت کے اجارہ دار بنے ہوتے تھے وہ دُنیا کے لیے کوئی اچھا نمونہ ہونے کے بجائے ہر قسم کی خرابی اور فساد کے علمبردار اور ذمہ دار

تھے۔ مختلف اجتماعی، اخلاقی امراض کا عرصہ سے یہ ساری قومیں آشیانہ بنی ہوئی تھیں۔ ان کے افراد تعیش و تکلفات کی زندگی اور مصنوعی تمدن کے سمندر میں سرتاپا غرق تھے۔ بادشاہ اور حکام خواب غفلت میں مدہوش اور نشۂ سلطنت میں سرشار تھے۔ کام و دہن کی لذت اور خواہشاتِ نفس کی تسکین کے سوا ان کو دُنیا میں کوئی فکر اور زندگی میں کوئی اور مشغلہ نہ تھا۔ زندگی کی ہوس اور لذت کی حرص اتنی بڑھ گئی تھی کہ ان کو کسی طرح سیری نہیں ہوتی تھی۔ متوسط طبقہ کے لوگ اس اعلیٰ طبقہ کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرتے تھے اور اس کی نقالی کو سب سے بڑا فخر سمجھتے تھے باقی رہے عوام تو وہ زندگی کے بوجھ اور حکومت کے مطالبات اور محصولات کے بار میں ایسے دبے ہوتے اور غلامی اور قانون کی زنجیروں اور بیڑیوں میں ایسے جکڑے ہوئے تھے کہ ان کی زندگی جانوروں اور چوپاؤں سے ذرا مختلف نہ تھی۔ دوسروں کی راحت کے لیے محنت کرنے اور دوسروں کی عیش و عشرت کے لیے بے زبان جانوروں کی طرح ہر وقت جتے رہنے اور جانوروں کی طرح اپنا پیٹ بھر لینے کے سوا ان کا کوئی حصہ نہ تھا۔ کبھی اگر وہ اس خشک و بے مزہ زندگی اور اس کے یکساں چکر سے اکتا جاتے تو نشہ آور چیزوں اور سستی تفریحات سے اپنا دل بہلا لیتے اور اگر کبھی زندگی کے اس عذاب سے ان کو سانس لینے کا موقع ملتا تو فاقہ زدہ اور ندیدہ انسان کی طرح مذہب و اخلاق کی پابندیوں سے آزاد ہو کر حیوانی لذتوں پر آنکھیں بند کر کے گرتے۔

دُنیا کے مختلف حصوں اور ملکوں میں ایسی دینی غفلت و خود فراموشی اجتماعی بے نظمی، انتشار اور اخلاقی تنزل و زوال رونما تھا کہ یہ معلوم ہوتا تھا کہ یہ ممالک تنزل و انحطاط اور شر و فساد میں ایک دوسرے سے بازی لے جانا چاہتے ہیں اور یہ فیصلہ کرنا مشکل ہو جاتا ہے کہ ان میں سے کون سا ملک دوسرے سے بڑھا ہوا ہے۔

اس دور میں بڑے بڑے مذہب بازیچۂ اطفال اور منافقین کا تختۂ مشق بن گئے تھے۔ ان مذاہب کی صورت و حقیقت دونوں اس درجہ مسخ ہو گئی تھی کہ اگر یہ ممکن ہوتا کہ کسی طرح ان مذاہب کے پیشوا دُنیا میں آ کر اپنے دین کا حال دیکھ لیں تو قطعاً وہ اپنے مذاہب نہ پہچان سکیں۔ تہذیب و تمدن کے گہواروں میں خود سری، بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دور دورہ تھا۔ نظامِ حکومت میں حد درجہ ابتری تھی، حکام کی سخت گیری اور عوام کی اخلاقی گراوٹ کا نتیجہ یہ ہوا کہ تمام قومیں اپنے اندرونی مسائل ہی میں اُلجھ کر رہ گئی تھیں۔ دُنیا کے سامنے پیش کرنے کے لیے ان کے پاس نہ کوئی پیغام تھا اور نہ انسانیت کے لیے کوئی دعوت تھی۔ درحقیقت یہ اقوام و مذاہب اندر سے کھوکھلے

ہو چکے تھے ان کی زندگی کا سوتا خشک ہو چکا تھا۔ ان کے پاس نہ دینی ہدایات تھیں اور نہ نظامِ حکومت کے لیے مستحکم و معقول اصول۔

قرآن نے اس ساری صورتِ حال کو اکثر من فی الارض یضلوک کی معجزانہ بلیغ تعبیر میں پیش کیا ہے۔

عددی اکثریت میں فلاح کی ضمانت نہیں

دوسری بات اس آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہی ہے کہ اگر ایک طرف اللہ و رسول کی ہدایت ہو اور اس کے مقابلے میں دوسرا فکر دوسرا ضابطہ دوسرا قانون ہو اور اس فکر و قانون کی حامل بہت بڑی عددی اکثریت ہو۔ قرآن کی روشنی میں یہ عددی اکثریت اس عددی اقلیت کے مقابلہ جو قرآن و سنت کی حامل ہو سراسر ضلالت اور گمراہی ہے اور قرآن و سنت کے مقابلے میں پائے استحقار سے ٹھکرا دینے کے لائق ہے۔

یہاں ایک اہم سوال یہ ہے کہ افراد اور عام شہریوں کے باہمی اختلافات کو تصفیہ کرنے کے لیے وہ قوت کہاں سے آئے جو قرآن کے لفظوں میں حکم کا کام دے سکے اور جس کے فیصلے کو دونوں فریق بخوشی تسلیم کر لیں۔ یہ تو ناممکن ہے کہ افراد میں کبھی کوئی اختلاف اور نزاع نہ ہو۔ تصوری مملکت میں جب کبھی افراد اور مملکت کے درمیان نزاع ہوتی ہے تو اس جھگڑے کا ایک فریق یعنی مملکت خود ہی حکم بن جاتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس حکم کے یکطرفہ فیصلوں سے دوسرا فریق یعنی فرد کبھی مطمئن نہیں ہو سکتا جیسے قریش مکہ کی سرکار اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میں نزاع ہو رہا تھا۔ پھر چونکہ سرکار مادی طاقت سے مسلح ہے اس لیے وہ اپنے فیصلے کو بجبر منوائے گی اور افراد بادل نخواستہ اس کے فیصلہ کی اطاعت پر مجبور ہوں گے۔ حالانکہ وہ خود اس نزاع میں ایک فریق کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ مملکت کے ساتھ افراد کی وفاداری کا جذبہ کمزور ہو جائے گا جو بالآخر اس کے ضعف و انتشار پر منتج ہوگا یہ دشواری صرف تصوری مملکت ہی میں نہیں بلکہ جمہوری مملکت میں بھی ہے۔ یہاں بھی کوئی غیر جانبدار حکم باہمی اختلافات و تنازعات کا تصفیہ نہیں کر سکتا۔ جمہوری نظام میں معاملات کا تصفیہ افراد کی اکثریت کے ہاتھ میں ہوتا ہے اس لیے اگر کسی امر کی نسبت اختلاف رائے پیدا ہو جاتے تو اس کا تصفیہ اکثریت کی عددی طاقت سے کیا جاتا ہے یعنی یہاں بھی دو فریقوں میں سے ایک فریق خود حکم بن جاتا ہے۔ اقلیت ہمیشہ چار و ناچار اکثریت کے فیصلوں پر تسلیم و رضا کا سر جھکا دیتی ہے۔ پھر یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ یہ اقلیت اکثریت کے مقابلے میں تعداد کے لحاظ سے بہت کم ہو بلکہ اگر افراد کا ۵۱ فی صدی حصہ ایک رائے رکھتا ہو اور ۴۹ فی صدی اس رائے سے اختلاف رکھتے ہوں تو یہ مختصر اکثریت بھی اقلیت

کو دبانے میں کامیاب ہو جاتی ہے۔ اس صورتِ حال سے دو امکانات پیدا ہوتے ہیں اولاً یہ کہ اقلیت اس حکم کا فیصلہ ماننے سے انکار کر دے جو خود ایک فریق ہے۔ اس صورت میں اکثریت و اقلیت کی آویزش انقلاب اور خانہ جنگی کو جنم دے سکتی ہے جس سے معاشرتی نظام درہم برہم ہو جائے گا۔ دوسری صورت یہ ہے کہ اقلیت کو عددی اکثریت کے سامنے سرنگوں ہو جانا پڑے اور اس کا فیصلہ ماننے پر مجبور ہو۔ لیکن یہ حق کی فتح نہیں طاقت کی فتح ہو گی اور اس کا کوئی یقین نہیں ہو سکتا کہ اکثریت اپنی عددی طاقت کے باوجود برسرِ حق ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ اکثریت کا فیصلہ بہر صورت صحیح ہو کیونکہ تمدنی امور اور انسانی معاملات میں صحت و صداقت کا حصول یوں ہی بہت دشوار ہے اور ایسے نظام میں تو اس کا بہت کم امکان ہے جہاں عوام کے جذبات و خواہشات اور ان کی فکری رسائی پر معاملات کے تصفیہ کا دارومدار ہو۔

اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آتی ہے کہ جب تک افراد کے باہمی تنازعات اور مملکت اور فرد کے اختلافات کا تصفیہ کرنے کے لیے کوئی حکم موجود نہ ہو اس وقت تک معاشرہ یا مملکت میں استحکام پیدا نہیں ہو سکتا لیکن اس حکم میں ایک خصوصیت کا پایا جانا بے حد ضروری ہے جس کے بغیر اس کا وجود بے معنے ہے وہ یہ ہے کہ فریقین یعنی افراد اور مملکت یا خود افراد کی مختلف جماعتیں اس کے عدل و انصاف اور غیر جانبداری پر مطمئن ہوں۔ نیز اس کی اصابتِ رائے اور صحتِ فکر ان سب کے نزدیک اتنی مسلم ہو کہ وہ اس کے فیصلوں میں غلطی یا خطا کے امکان کا تصور بھی نہ کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ اس شرط کی تکمیل کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت سے نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ کوئی انسان خواہ کتنا ہی صحیح الرائے کیوں نہ ہو غلطی اور خطا سے بری نہیں ہو سکتا۔ خصوصاً جب کہ تمدنی اور معاشرتی امور میں انسان کے شخصی امیال و عواطف اس کا انفرادی نقطہ نظر جو خود اس کے ذاتی تجربات پر مبنی ہوتا ہے اور اس کی ذہنی خصوصیات اس کی رائے یا فیصلہ کی تشکیل میں دخیل ہوتی ہیں۔ جماعت کے فیصلوں پر بھی یہی بات صادق آتی ہے اور اس کے علاوہ کوئی انسان ہو یا جماعت اس کے فیصلہ کی صحت سے بآسانی انکار کیا جا سکتا ہے۔ ان سب پہلوؤں پر غور و فکر کے بعد یہ نتیجہ اخذ کرنا ناگزیر ہے کہ ان شرائط کی تکمیل صرف وہی ذات کر سکتی ہے جو انسان سے ماوراء اور مافوق ہو افغیر اللہ ابتغی حکماً میں یہی بات بتائی گئی ہے اور یہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جس مملکت کی اساس الہامی ہدایات اور الہامی قوانین و ضوابط پر نہ ہو وہ سرتاسر گمراہی اور بے راہ روی کی داعی ہے وہ انسانیت کی فلاح معاشرے کے استحکام اور تمدنی امن و عافیت کا ہرگز سامان فراہم نہیں کر سکتی۔ الہامی ضابطہ اور دستور العمل ہی وہ حکم ہے جسے ایک مرتبہ تسلیم کر لینے کے بعد انسان اپنے اختلافات اور نزاعوں میں اس کی طرف

رجوع کرسکتا ہے کیونکہ اس کا ماخذ ایک فوق الانسان ہستی کا ارادہ ہے اور اس کا صدور ایک ایسی ذات کی طرف سے ہوتا ہے جو خطا اور لغزش سے پاک ہے۔ اللہ کی ذات گرامی الہامی ہدایات کا سرچشمہ ہے۔ جس مملکت کے افراد وحی پر مبنی قوانین پر اپنی معاشرتی زندگی کی بنیاد رکھتے ہیں اس کے اندر اختلافات کبھی اس حد تک نہیں بڑھ سکتے کہ وہ پورے معاشرتی اور سیاسی نظام کو خطرے میں ڈال دیں۔ ایسا سماج انقلاب کی شورشوں سے محفوظ رہے گا۔ افراد اپنے شخصی اغراض و مفاد کے لیے کتنی ہی خونریزیاں کریں لیکن معاشرہ کی بنیادیں کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی ہیں۔

حاکمیتِ جمہور اور قرآن

آیت میں اکثریت پر اضلال کے قرآنی فتوے سے یہ اشارہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ قرآن حاکمیتِ جمہور کے خلاف ہے۔ حاکمیتِ جمہور کا منشا یہ ہے کہ ایک قوم کے عوام اپنی خواہشات اور اپنی آرا میں ہر قسم کی پابندیوں سے آزاد ہیں وہ جس چیز کو چاہیں کثرتِ آرا سے اپنے لیے خود حلال یا حرام ٹھہرا سکتے ہیں۔ مذہب و اخلاق کا کوئی ضابطہ ان کے فیصلے کی راہ میں حائل نہیں ہو سکتا۔ چونکہ کسی ریاست کی اصل قوت کا انحصار وہاں کے عوام پر ہوتا ہے اس لیے اس سے خواہ مخواہ یہ نتیجہ نکال لیا گیا ہے کہ حاکمیت بھی انہی کی ہونی چاہیے۔ اس فلسفہ کا سب سے بڑا کارنامہ یہ ہے کہ اس نے حاکم و محکوم کی دوئی کو مٹا دیا ہے اب عوام ہی حاکم بھی ہیں اور محکوم بھی۔ بظاہر یہ نظریہ نہایت معقول معلوم ہوتا ہے۔ اس نظریہ کی اصل اساس یہ ہے کہ عوام کی مرضی ہی اصل حاکم ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ عوام کی مرضی کس طرح معلوم کی جائے۔ ہر فرد کی رائے ایک دوسرے سے مختلف ہوتی ہے۔ اتنی متضاد آرا میں سے ایک ایسی رائے کا تلاش کرنا جو سب کے لیے قابلِ قبول ہو جوئے شیر لانے کے مترادف ہے۔ قرآن کے نزدیک حاکمیت جمہور کی نہیں بلکہ حاکمیت اللہ کی ہے افغیر اللہ ابتغی حکماً اس کی صراحت ہے۔ حاکمیت فردِ واحد کی ہو یا ایک گروہ یا ایک پارٹی کی ہو سب کا قدرِ مشترک یہ ہے کہ تختِ اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد افراد اور گروہ اپنے کو غیر مسئول سمجھتے ہیں اور زندگی اس طرز پر گذارتے ہیں گویا وہ کائنات کے بلاشرکتِ غیرے حاکم ہیں۔ کائنات اور اس میں جو کچھ ہے وہ سب ان کا ہے وہ اسے جس طرح چاہیں استعمال کریں۔ قرآن نے اسی اُلجھن سے انسانیت کو بچانے کے لیے حاکمیت کو اللہ کے لیے خاص کر دیا ہے ان الحکم الا للہ غیر اللہ کے آگے سر جھکانا انسان کے لیے موت ہے زمین پر خدا کے خلیفہ اور نائب کی حیثیت سے انسان کا کمالِ مطلوب یہ ہے کہ وہ ذاتِ الٰہی کے ساتھ زیادہ سے زیادہ قرب پیدا کرے

اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ گیارہویں پارے میں آئے گی یہاں صرف اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے۔

ظن و علم کا مفہوم اور اس کی تحقیق

یہاں تیسرا یہ سوال بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اگر اکثریت کی حاکمیت اس لیے غلط ہے کہ اکثریت گمراہی اور بے راہ روی کی شکار ہے اور گمراہی کی وجہ یہ ہے کہ ان یتبعون الا الظن وان ھم الا یخرصون کہ وہ اتباع ظن کر رہے ہیں یعنی علم و بصیرت سے ان کے دامن خالی ہیں تو پھر اصول حدیث میں جو یہ بات بتائی گئی کہ آحاد مفید ظن ہیں اور اصولِ فقہ میں جو یہ بتایا گیا ہے کہ اجتہادی سرمایہ ظنی ہے۔ اس کے بارے میں قرآن کی رہنمائی کیا ہے۔

یہاں ظن کی حقیقت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے ایک طرف منکرین حدیث نے شور مچا رکھا ہے کہ خبر واحد مفید ظن ہوتی ہے مفید یقین نہیں ہوتی لہٰذا دین کی بنیاد غیر یقینی چیزوں پر کیسے رکھی جا سکتی ہے اور پھر اس سلسلے میں تمام وہ آیات کہ جن میں ظن کی مذمت کی گئی ہے بڑے زور شور سے پیش کر کے سادہ لوح عوام کو گمراہ کرتے ہیں۔ دوسری طرف منکرین قیاس نے ہنگامہ اٹھا رکھا ہے کہ قیاس و اجتہاد پر عمل کی حیثیت اتباعِ ظن سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اس موقعہ پر امام رازی نے تفسیر کبیر میں ان لوگوں کی ترجمانی کی ہے اور لکھا ہے کہ تمسک نفاۃ القیاس بھذہ الایۃ یعنی قیاس کے منکرین نے مخالفتِ قیاس پر اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ ان دونوں فرقوں کے نتیجہ میں قانون کے عملی ماخذ سنت اور خود ساختہ نظامِ قانون کی حیثیت عام نگاہوں میں مشکوک ہو کر رہ گئی۔

دراصل اس غلط فہمی کا اصلی سبب ظن کی حقیقت سے ناواقفیت ہے۔ اس لیے پہلے علماء کی زبانی کچھ ظن کے بارے میں سُن لیجئے:

علامہ قاضی ابوبکر بن العربی احکام القرآن میں رقمطراز ہیں:

ہمارے علماء نے کہا کہ ظن کی حقیقت دل میں دو باتوں کا ٹھہرالینا ہے اس طرح کہ ایک کو دوسرے پر ترجیح ہو اور شک کا مطلب ان دونوں کو برابر رکھنا ہے اور علم کہتے ہیں ان دونوں میں سے ایک کو گرا کر دوسرے کو متعین کر دینے کو۔

اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں:

نشان اور علامت سے جو علم حاصل ہو اس کا نام ظن ہے۔ جب علامت قوی ہو تو اُسے علم کہتے ہیں اور جو بہت زیادہ کمزور ہو تو پھر وہم کی حد سے آگے نہیں ہوتا۔ پھر

جب ظن قوی ہوتا ہے یا قوی کی طرح اس کا تصور کیا جاتا ہے تو اس کے ساتھ اَنّ مشددہ اور اَنْ کا استعمال ہوتا ہے جو مخففہ من المثقلہ ہوتا ہے اور جو ضعیف ہوتا ہے تو پھر اس کے ساتھ اس اَنَّ اور اَنْ کا استعمال ہوتا ہے جو معدوم قول و فعل کے ساتھ خاص ہیں۔

اور علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں۔

ظن اس تردد راجح کا نام ہے کہ جو اعتقاد غیر جازم کی طرفین کے مابین ہوتا ہے اور محکم میں ہے کہ اس کے معنے شک اور یقین کے ہیں مگر وہ یقین نہیں جو معائنہ سے حاصل ہو بلکہ وہ یقین جو تدبر سے پیدا ہوتا ہے اور جو یقین کہ معائنہ سے حاصل ہوتا ہے اس کے لیے سوائے علم کے اور کسی لفظ کا استعمال نہیں ہوتا۔ اور مناوی کہتے ہیں کہ ظن اس اعتقاد راجح کا نام ہے جس کے ساتھ اس کی نقیض کا احتمال بھی ہو۔ نیز شک اور یقین میں بھی اس کا استعمال ہوتا ہے۔ اور بصائر میں ہے کہ ظن قرآن عزیز میں چار طرح پر آیا ہے یقین کے معنے میں، شک کے معنے میں، تہمت کے معنے میں اور گمان کرنے کے معنے میں۔

غرض لغت میں ظن یقین اور شک کے خلاف کسی خاص ادراک کا نام نہیں ہے بلکہ علامات و نشانات اور دلائل کی بنا پر جو انسان کا ایک تخمینہ قائم ہوتا ہے وہ ظن ہے اس اعتبار سے ظن علم و یقین شک و وہم اور کذب سب سے عام ہے اور سب کے ساتھ جمع ہو سکتا ہے۔ رہا اس کا فیصلہ کہ کون سا ظن علم و یقین میں داخل ہے اور کون سا شک و وہم میں شامل ہے۔ بہ حسب تصریح ثعلب و راغب اصفہانی ان دلائل و علامات کی بنا پر ہوگا جن کی بنا پر اس ظن کا حصول ہوا ہے۔

ہاں بلاشبہ مناطقہ کی اصطلاح میں ظن اعتقاد راجح کا نام ہے ان کے یہاں اگر قضیہ کی صورت کا حصول بلا تردد ہو تو وہ تخییل ہے اور اگر نسبت باہمی کا ادراک اس طرح ہو کہ اس میں تردد ہے اور جانبین کی تجویز برابر ہے تو اس کو شک کہتے ہیں اور اگر نسبت کا تصور اس طرح ہو کہ جانب مخالف کا رجحان ہے تو ادراک مرجوح کو وہم اور ادراک راجح کو ظن کہتے ہیں۔ اس اعتبار سے منطقی اصطلاح میں ظن اس اعتقاد کا نام ہے کہ جس میں اس کی نقیض کا احتمال بھی باقی رہے اور اس اعتقاد میں نقیض کا احتمال نہ ہو تو پھر وہ جزم کہلاتا ہے۔ پھر یہ جزم اگر مطابق واقع نہیں ہے تو جہل مرکب ہے اور اگر مطابق واقع ہے مگر کسی شک ڈالنے والے کے شک سے زائل ہو جاتا ہے تو اس کو تقلید کہیں گے ورنہ اس کا نام یقین ہوگا۔ اس لحاظ سے منطقیوں کے یہاں تصدیق کی سب سے اعلیٰ قسم کا نام یقین

ہے اور سب سے ادنیٰ قسم کا نام ظن ہے۔ علمی اصطلاحات میں عام طور پر ظن سے اس کے منطقی معنے مراد ہوتے ہیں۔ لیکن لغوی اعتبار سے یہ ٹھیک ایسے مواقع پر استعمال ہوتا ہے جہاں ہم اردو میں اٹکل کا لفظ بولتے ہیں۔ صحابہ کے استعمالات سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ وہ ظن کو اردو کے اٹکل کے موقعہ پر بولتے تھے لہٰذا جو خیال واقعہ کی تحقیق کے بغیر اپنی جانب سے پکا لیا جاتا صحابہ کے یہاں ظن کہلاتا تھا خواہ وہ رجحان کے مرتبے کو پہنچے یا نہ پہنچے۔ اسی ظن کے بارے میں حضرت عمرؓ فرماتے ہیں :

دین کے بارے میں رائے تو صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صواب تھی، ہم تو صرف اٹکل سے کہتے ہیں انما ھو منا الظن والتکلف،

اس میں حضرت عمرؓ نے قرآن کی اس آیت کی طرف اشارہ کیا ہے لتحکم بین الناس بما اراک اللہ اس کا مطلب صاف اور کھلے لفظوں میں یہ ہے کہ جو رائے اللہ سبحانہ کی ارآت اور اصابت کے ساتھ ہو اس کا نام رائے ہے اور وہی صواب بھی ہو سکتی ہے اور جو محض اپنی جانب سے اٹکل ہو خدائے تعالیٰ کی ارآت اور اصابت کے ساتھ ہو اس کا نام رائے ہے اور وہی صواب بھی ہو سکتی ہے اور جو محض اپنی جانب سے ایک اٹکل ہو اس کا نام ظن ہے۔ اسی ظن کو رائے بھی کہا جاتا ہے اور انہی معنی میں قرآن میں رائے زنی کی ممانعت ہے یعنی محض اپنی عقل سے کسی شرعی بنیاد کے بغیر کوئی بات کہہ دینا۔ حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں۔

میں کسی زمین کے اوپر اور کس آسمان کے نیچے رہ سکتا ہوں اگر قرآن کی کسی آیت میں صرف اپنی رائے سے کوئی بات کہوں یا ایسی بات کہوں جس کا مجھے علم نہیں۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ، فرماتے ہیں ،

اگر کسی کے پاس کوئی علم کی بات ہو تو وہ لوگوں کو سکھلائے اور اگر علم نہیں رکھتا تو وہ بات منہ سے نہ نکالے جس کا اس کو علم نہیں تاکہ متکلفین میں اس کا شمار نہ ہو جائے۔

اس سے معلوم ہوا کہ تکلف یہ ہے کہ جب کسی بات کا علم نہ ہو تو بے علمی کو چھپانے کے لیے اپنی جانب سے کوئی بات گھڑ لی جائے اسی کو ظن کہتے ہیں اور یہی قرآن کی اسی آیت کی روح ہے لا تقف مالیس لک بہ علم مطلب یہ ہے کہ لوگ اپنی انفرادی و اجتماعی زندگی میں وہم و گمان کی جگہ علم کی پیروی کریں۔ اسلامی معاشرے میں اس منشا کی ترجمانی وسیع پیمانے پر اخلاق میں قانون میں سیاست اور ملکی انتظام میں، علوم و فنون اور نظام تعلیم میں غرض ہر

شعبہ سیات میں کی گئی ہے۔ اور ان بے شمار خرابیوں سے فکر و عمل کو محفوظ کر دیا گیا جو علم کے بجائے گمان اور تخمین کی پیروی کرنے سے انسانی زندگی میں رونما ہوتی ہیں۔ اخلاق میں ہدایت کی گئی کہ بدگمانی سے بچو اور کسی شخص اور گروہ پر بلا تحقیق کوئی الزام نہ لگاؤ۔ قانون میں یہ مستقل طے کر دیا گیا کہ محض شبہ کی بنا پر کسی کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی جائے۔ تفتیش جرائم میں یہ قاعدہ مقرر کیا گیا کہ گمان پر کسی کو پکڑنا، مار پیٹ کرنا قطعاً ناجائز ہے۔ نظامِ تعلیم میں ان نام نہاد علوم کو ناپسند کیا گیا جو محض ظن و تخمین اور لاطائل قیاسات پر مبنی ہوں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ عقائد میں اوہام پرستی کی جڑ کاٹ دی گئی حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں،

کتاب اللہ کا جو علم اللہ تعالیٰ تجھے مرحمت فرمائے اس پر اس کا شکر ادا کر اور اس کا جو علم اللہ نے اپنے لیے مخصوص کر رکھا ہے اور تجھے نہیں بتایا اس کے متعلق تکلف مت کر اور اس کا جو عالم ہے اس کے سپرد کر کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اپنے نبی سے فرمایا ہے قل ما اسئلکم علیہ من اجر و ما انا من المتکلفین آپ کہہ دیجئے کہ میں تم سے مزدوری نہیں چاہتا ہوں اور میں تکلف کرنے والوں میں سے نہیں ہوں۔

حضرت عمرؓ کا ارشاد ہے "دین میں رائے زنی سے بچو، بتانا یہ چاہتا ہوں کہ سلف اور صدر اول میں ظن اور رائے اپنی جانب سے تخمینہ اور خیال آرائی کو کہتے ہیں۔ جو رائے کتاب اللہ اور سنتِ رسولؐ کی روشنی میں ہو اس کو رائے نہیں کہا جاتا اور نہ وہ مذموم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس کے اس ارشاد میں اس طرف اشارہ ہے۔

جس نے کوئی ایسی رائے ایجاد کی جو نہ قرآن میں ہے اور نہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے موافق ہے وہ نہیں جانتا کہ کل قیامت میں کیا گزرے گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ رائے کی دو قسمیں ہیں ایک قانونی یعنی وہ جو کتاب اللہ کے تحت ہو۔ دوسری غیر قانونی جس کی کوئی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو۔ جس کی اصل کتاب اللہ میں ہو وہ علم ہے اور جس کی اصل کتاب اللہ میں نہ ہو وہ رائے ہے اور اس کا علم سے مقابلہ ہے۔ علم وہ ہی کہلاتا تھا جو قرآن و سنت نے بتایا یا صحابہ سے نقل ہو کر آیا۔ امام اوزاعی فرماتے ہیں علم صرف وہ ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے منقول ہو اور جو ان سے منقول نہیں وہ علم ہی نہیں۔

یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ رائے اور علم یا ظن اور علم سلف صالحین کے یہاں دونوں تقابلی طور پر بولے جاتے تھے۔ واقعی بات کو علم اور تخمینی باتوں کو ظن کہا جاتا تھا۔ جانب راجح اور مرجوح کی

وہاں کوئی تفصیل نہ تھی۔ یہی قرآن کی اصطلاح ہے۔ ارشاد ہے :

یا ایھا الذین آمنوا اجتنبوا کثیرا من الظن، ان بعض الظن اثم،

اے ایمان والو بہت گمان کرنے سے بچا کرو کیونکہ بعض گمان گناہ ہیں ۔

اس آیت میں کچھ گمانوں کے گناہ ہونے کا حکم اس پر نہیں کہ وہ جانب راجح ہے یا مرجوح، بلکہ خلاف واقعہ اور بے تحقیق بات پر ہے۔ اسی آیت کے متعلق امام ابوبکر الجصاص کا یہ تشریحی نوٹ بڑا بیش قیمت ہے :

آیت اس بات کی مقتضی ہے کہ بعض ظن کی ممانعت ہو نہ کہ سارے ظنوں کی، کیونکہ کثیرا من الظن کی تعبیر ہی کہہ رہی ہے کہ سارے نہیں زیادہ گمان گناہ ہیں اور اس کے بعد ان بعض الظن کی تصریح بھی اسی بات کی تائید کر رہی ہے کہ سارے گمانوں سے ممانعت نہیں فرمائی ۔

مطلب یہ ہے کہ ہر ظن ممنوع نہیں۔ یہاں کچھ ظنون قابل تعریف بھی ہیں۔ خود قرآن میں ہے یظنون انھم ملاقو ربھم ظاہر ہے کہ یہاں ظن مقام مدح میں بولا گیا ہے اس لیے یہ حتماً علم ہے اور جیسا کہ امام راغب نے کہا ہے وہ دماغی خیال جو علامات کی تخلیق ہو اگر قوی ہو تو علم بن جاتا ہے اور کمزور ہو تو وہم سے آگے نہیں بڑھتا۔ جو ظن احادیث کے ذریعے حاصل ہوتا ہے وہ یہی ہے اور جسے فخر الاسلام بزدوی نے علم غالب الرائے کہا ہے یہ وہ اٹکل اور تخمین نہیں جس کی مذمت قرآن نے کی ہے۔ اور یہی ظن مجتہدین کے اجتہاد کی اساس ہے۔ یہ دماغی ورزش نہیں بلکہ قانونی تخلیقات ہیں۔ ان کی اساس دلائل شرعیہ ہیں۔ شریعت کے بیشتر معاملات کا دار و مدار ظن پر ہے وہ بھی غالب رائے ہے۔ دنیا کا سارا کاروبار اسی ظن پر ہی چل رہا ہے۔ بہرحال زیر تشریح آیت میں جس ظن کی مذمت ہے وہ اٹکل کے معنے میں ہے اس میں ظن کے اصطلاحی معنے مراد نہیں اور نہ یہ وہ ظن ہے جو دلائل شرعیہ کی تخلیق ہوتا ہے ۔

فخر الاسلام بزدوی نے جسے علم غالب الرائے کہا ہے احادیث اسی کا فائدہ دیتی ہیں اور مجتہدین کا اجتہاد بھی اسی کے سہارے قانونی تخلیقات کرتا ہے اور یہ صرف حدیث و اجتہاد ہی کی بات نہیں بلکہ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ انسان اکثر و بیشتر معاملات میں صرف اس تحقیق پر اعتماد کرنے کے لیے مجبور ہے جس سے ظن غالب حاصل ہوتا ہے اگر وہ اس تحقیق میں شک کرے اور علم و یقین کے بغیر ہر بات ماننے سے انکار کردے تو وہ دنیا کے کام کا نہ رہے گا بلکہ شاید زندہ بھی نہ رہ سکے گا۔ ہماری زندگی کے

بے شمار مسائل ایسے ہیں جن میں ہم اخبارِ آحاد کو تسلیم کرتے ہیں اور انہی پر اپنے فیصلوں اور اپنے علم و عمل کا دارومدار رکھتے ہیں۔ محض خبر ہونے کی حیثیت سے ہر خبر میں سچ اور جھوٹ ہونے کا یکساں احتمال ہوتا ہے۔ مگر ہم ان دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دینے کے لیے محض خبر کے خبر ہونے پر نظر نہیں رکھتے بلکہ عموماً خارجی قرائن سے مدد لے کر صدق یا کذب کے کسی ایک پہلو کو ترجیح دیتے ہیں اور بسا اوقات ہماری یہ ترجیح اتنی زیادہ قوی ہوتی ہے کہ دوسرے پہلو کے امکان کو بھی ہم تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے مثلاً ہر شخص کو یہ بات کہ وہ اپنے باپ کی جائز اولاد ہے صرف ماں کی روایت سے معلوم ہوتی ہے۔ اس خبرِ واحد میں جس کے لیے کوئی دوسرا شاہد سرے سے موجود ہی نہیں ہو سکتا۔ نفس خبر ہونے کی وجہ سے صدق و کذب یکساں احتمال ہے لیکن کوئی شریف آدمی اس میں کذب کے پہلو کو ترجیح دینا تو درکنار کسی درجہ میں بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہ ہوگا خواہ واقعہ کے اعتبار سے اس کا اپنی ماں کے بیان پر یقین کرنا درست نہ ہو۔ آپ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا تعلق جذبات سے ہے۔ میں کہتا ہوں کہ جہاں جذبات کا دخل نہیں ہوتا وہاں بھی ہم اسی طرح اخبارِ آحاد کی امکانی جانچ پڑتال کر کے صدق و کذب کے دونوں پہلوؤں میں سے ایک کو ترجیح دیتے ہیں۔ اگرچہ اس ترجیح سے صرف ظن غالب حاصل ہوتا ہے لیکن اس ظن پر ہم اسی طرح عمل کرتے ہیں جس طرح علم یقین حاصل ہونے کی صورت میں کرتے ہیں۔ ہماری زندگی کے معاملات میں سب سے زیادہ اہم اور نازک معاملہ عدالت کا ہے جس میں جذبات کا ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا بلکہ خالص اور ٹھوس عقلی امتحان پر احکام کی بنا رکھی جاتی ہے قاضی یا جج کے سامنے جتنے معاملات پیش ہوتے ہیں ان سب کا تعلق گزرے ہوئے واقعات سے ہوتا ہے۔ بیشتر معاملات میں جج کے سامنے صرف اخبارِ آحاد پیش ہوتی ہیں جنہیں وہ جرح و تعدیل، قرائن و آثار اور قیاس عقلی کی کسوٹی پر کس کر سچ اور جھوٹ کے امکانی پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کو راجح قرار دیتا ہے اور جب کوئی پہلو راجح ہو جاتا ہے تو اس پر وہ فیصلہ کر دیتا ہے۔ اسی طرح تجارت، تدبیرِ سلطنت اور دوسرے دنیوی کاروبار میں بھی رات دن اخبارِ آحاد پر ہمارے معاملات چلتے ہیں۔ کہیں بھی کوئی خبرِ متواتر کا مطالبہ نہیں کرتا بلکہ جب ایک ظن غالب حاصل ہو جاتا ہے تو اس پر لاکھوں روپے لگا دیتے ہیں۔ خالص دینی معاملات بھی اسی ظن غالب پر چل رہے ہیں سب سے بڑی چیز جس پر ہمارے ایمان کا مدار ہے۔ قرآن حکیم میں ہے اس کا کتاب الٰہی ہونا ہم کو صرف ایک گواہ کی شہادت سے معلوم ہوا ہے اور وہ گواہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے یہ خبر جس گواہ نے دی ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے۔ ان کی راست بازی

دیانت داری اور پاکیزہ سیرت کو دیکھ کر اور جو خبر آپ نے دی ہے اس کی معقولیت اور حقانیت کا لحاظ کر کے ہم نے یقین کر لیا ہے کہ قرآن اللہ کی کتاب ہے ورنہ اب بھی دنیا میں قرآن کو خدا کی کتاب نہ ماننے والے موجود ہیں۔ دونوں میں اگر کوئی فرق ہے تو یہی کہ ہم نے صادق و مصدوق کی گواہی کو تسلیم کر لیا ہے اور ہم مسلمان ہو گئے، انہوں نے اس میں شک کیا کافر ہو گئے اور بس۔

بہرحال آیت میں جس ظن کی مذمت کی گئی ہے وہ علم کا مرادف نہیں بلکہ وہم کا مرادف ہے اور حدیث و قانون میں جس ظن کا ذکر آتا ہے وہ علم کا مرادف ہے۔

نافرمانوں کی سزا اور فرمانبرداروں کی جزا

۱۴۵۔ بلاشبہ تیرا رب ہی خوب جانتا ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹک رہا ہے اور یہ بھی اسی کو خوب علم ہے کہ راہ ہدایت پر کون گامزن ہیں۔ یعنی تیرا رب جس نے تیری اے پیغمبر پروردگاری کی اور کتاب مفصل کی تعلیم دی اور اس کے ذریعے تجھے ان علوم کا شناسا بنایا جن کا تجھے پہلے علم نہ تھا وہ تیرے سے اور تمام مخلوقات سے زیادہ ان لوگوں کا علم رکھتا ہے جو صراطِ مستقیم سے بہکے ہوتے یا بھٹکے ہوتے ہیں، ان کو بھی وہ ہی خوب جانتا ہے جو صراطِ مستقیم پر گامزن ہیں۔ ابوالسعود کہتے ہیں کہ چونکہ اللہ کی ذات دونوں جماعتوں سے خوب واقف ہے اس لیے آپ کو فریق اوّل یعنی اہلِ ضلالت کے بارے میں خوب محتاط رہنا چاہیے۔ ایسا نہ ہو کہ زندگی میں کہیں ان سے ہمنوائی ہو جائے اور کسی صورت میں اہلِ ضلالت کی طاعت نہ ہونی چاہیے۔ اور پھر یہ کہتے ہیں کہ جب اللہ کی ذات فریقین سے واقف ہے تو اس کے حکم سے زیادہ علم و صداقت کہاں ہو سکتا ہے اس لیے آپ کو اس کی کتاب ہی کو حکم بنانا چاہیے اور کچھ نے بتایا ہے کہ اس کے اس علم کامل اور محیط کے لحاظ سے نافرمانوں کی سزا اور فرمانبرداروں کا انعام دونوں یقینی ہیں یا مطلب یہ ہے کہ اکثر من فی الارض کو دیکھ کر آپ کسی غلط فہمی میں مبتلا نہ ہوں۔ یہ پتہ اللہ کو ہے کہ کون اس کی راہ سے بھٹکے ہوتے ہیں اور کون ہدایت یاب ہیں لہٰذا جن کو خدا راہ یاب بتا رہا ہے ان کی راہ اختیار کرو خواہ وہ اقلیت میں ہوں، اور جن کو خدا گمراہ قرار دے رہا ہے ان سے بچ کر رہو خواہ وہ اکثریت میں ہوں۔ اکثریت اور اقلیت حق کا معیار نہیں ہے حق خود حق ہے خواہ وہ کہیں ہو۔ حق کا حق ہونا دلائل سے معلوم ہوتا ہے ووٹوں سے نہیں معلوم ہوتا۔ یہ ہدایت یافتہ لوگوں کے لیے بشارت اور گمراہوں کے لیے تہدید بھی ہے کیونکہ جب اللہ دونوں سے واقف ہے تو ان کے ساتھ معاملہ بھی اپنے علم کے مطابق ہی کرے گا۔

حلال کو حرام قرار دینا ایمان کے منافی ہے

۱۱۸ ۔ لہٰذا ان تمام جانوروں میں سے بلا کھٹکے کھاؤ جن پر ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا گیا ہے اگر تم خدا کی آیتوں پر ایمان رکھتے ہو۔ جاہل عوام کی ان ہی بے اصول اور اٹکل پچو باتوں میں سے ایک یہ ہے جو انہوں نے ذبیحہ کے مسئلہ پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہی تھی کہ جو جانور طبعی موت سے مر جائے اسے مسلمان حرام کہتے ہیں حالانکہ وہ خدا کا مارا ہوا ہے اور جو خود ان کے ہاتھ کا مارا ہوا ہو اسے حلال سمجھتے ہیں۔ یہ عجیب بات ہے اس کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ کئی آیتیں اس پر اتری ہیں کہ کافر کہنے لگے کہ مسلمان اپنا مارا کھاتے ہیں اللہ کا مارا نہیں کھاتے فرمایا ایسی طمع فریب کی باتیں انسانوں کو شبہ میں ڈالنے کے لیے شیطان سکھاتے ہیں خوب سمجھ لو حلال و حرام میں اللہ کا حکم چلتا ہے محض عقلی ڈھکوسلوں کا اعتبار نہیں۔ آگے کھول کر سمجھا دیا کہ مارنے والا سب کا اللہ ہے لیکن اس کے نام کو برکت ہے جو اس کے نام سے ذبح ہوا سو حلال ہے بغیر اس کے مر گیا سو مردار ہے تیغیر یسیر[1]

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا ہے کہ روئے زمین کی اکثریت اپنے پیروکاروں کو ضلالت اور گمراہی میں لے جا رہی ہے کیونکہ وہ خود گم کردہ راہ ہیں۔ ان کی اطاعت کی اہل ایمان کو کسی حال میں اجازت نہیں ہے اہل ایمان کا فرض ہے کہ ان ضالین کی مخالفت کریں اور ان کے مقابلہ میں اس ہدایت کی پیروی کریں جو محمد رسول اللہ لے کر تشریف لائے اور نبوت کی طاعت و اتباع کے موضوع پر پہلا خاص اہتمام سے ایک معاشرتی مسئلہ کا ذکر کیا ہے۔ بظاہر یہ مسئلہ اپنے اندر کوئی خاص اہمیت نہیں رکھتا، لیکن جب اس خاص پہلو پر غور کیا جائے کہ مختلف مذاہب اور بالخصوص مشرکین عرب میں ذبائح کا مسئلہ عابدانہ شعائر میں شمار ہوتا تھا تو اس کی خاص اہمیت اور ضرورت بے نقاب ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ اسی لیے یہاں اصول اور عقائد کے تذکرے میں اس مسئلہ کو بیان کیا ہے، وہ ذبح کے ذریعے اپنے معبودوں سے عابدانہ تعلقات کرتے تھے اور جانوروں پر ذبح کے وقت ان کے نام پکارتے تھے۔ ظاہر ہے کہ یہ کھلا شرک ہے چونکہ عام شارحین قرآن کے پیش نظر یہ حقیقت نہ تھی اس لیے ان کو اس پر حیرت ہے کہ جب مشرکین اس جانور کو حرام ہی نہیں سمجھتے تھے جسے خدا کے نام سے ذبح کیا جائے یہ بات

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان کے اور مسلمانوں کے درمیان نزاعی نہ تھی، نزاعی جزبات تھی وہ مردار کا کھانا ہے وہ مُردار کے کھانے جائز سمجھتے تھے اور مسلمان ناجائز، قرآن نے یہاں نزاعی مسئلہ کو نظر انداز کر کے اتفاقی مسئلہ کو موضوع گفتگو بنایا ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ذبائح میں خالص مشرکانہ عمل کرتے اور اس کو جائز سمجھ کر کھاتے تھے۔ قرآن نے اہل ایمان کو خبردار کیا ہے کہ جب یہ معلوم کر چکے ہو کہ لوگوں کی اکثریت غلط کار اور غلط رو ہے اس لیے صرف وہ ذبائح کھاؤ جس پر اللہ کا نام لیا گیا ہو، اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ ذبائح نہ کھاؤ جن پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو جیسا کہ بعد کی دو آیات میں تصریح ہے بشرطیکہ تمہارا اللہ کی جانب سے آئی ہوئی ہدایت پر ایمان ہے۔ اور اگر تم جانتے ہو شرک و کفر کی گمراہی ایمان کے خلاف ہے۔ اسی کے مدلول میں وہ جانور بھی داخل ہو گیا جو ذبح سے نہیں بلکہ اپنی موت طبعی سے مر گیا ہو جسے مشرکین حلال سمجھتے تھے یہاں دو چیزیں ہیں ایک یہ کہ مشرکین غیر اللہ کے نام پر ذبائح کو حلال سمجھتے تھے اور کھاتے تھے اور دوسرے یہ کہ وہ مُردار کو حلال سمجھتے تھے۔ پہلی بات یعنی جن کو مشرکین نے اپنے مشرکانہ عمل کی بنا پر حلال سمجھ رکھا تھا اس پر تو وہ نہ بولے کیونکہ خدا کو وہ بھی مانتے تھے لیکن انہوں نے مُردار کو سامنے رکھ کر یہ کہنا شروع کر دیا اور یہ بات ایک سنگین مغالطہ کی صورت میں پیش کی کہ جسے خدا مارے وہ تو حرام اور جسے ہم ماریں وہ حلال ہو یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ عبد اللہ بن عباسؓ کے حوالہ سے ابو داؤد اور ترمذی نے یہ بات نقل کی ہے کہ کہنے والوں نے کہا تھا کہ کیا ہم اپنا مارا ہوا کھائیں اور خدا کا مارا ہوا نہ کھائیں۔ قرآن نے بطور کلیہ کے ایک جامع بات بتا دی کہ ذبح کے وقت جس پر اللہ کا نام لیا جائے اسے کھاؤ یعنی جس پر غیر خدا کا نام لیا جائے یا خدا کے ساتھ کسی اور کا نام لیا جائے یا جو اپنی طبعی موت سے مر گیا ہو وہ نہ کھاؤ۔ اللہ کی آیات پر ایمان کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ خدا کے احکام کے مقابلے میں مشرکانہ کردار کی پروا نہ کرو۔ تحلیل و تحریم کا اختیار صرف اللہ کو ہے اگر کسی کے لیے یہ حق تسلیم کر لیا گیا تو یہ ایمان کے خلاف ہے۔ مقصد یہ ہے کہ حلال و حرام کے جو پیمانے لوگوں نے بطور خود اپنی عقل دوڑانے سے بنا رکھے ہیں اس سے نظر ہٹا لو اگر تم حقیقت میں اللہ پر، اس کی آیات پر ایمان رکھتے ہو۔ مسئلہ صرف ایک چیز کے کھانے اور نہ کھانے کا نہیں بلکہ جن چیزوں کو مشرکانہ توہمات کی بنا پر حرام ٹھہرایا گیا ہے اللہ کی طرف سے ان کی حلت کے اعلان کے باوجود ان سے اجتناب کرنا یا جن چیزوں کو اللہ نے حرام قرار دیا ہے لوگوں کی قیاس آرائیوں کی وجہ سے اسے حلال کہنا گویا لوگوں کی تحلیل و تحریم کے بارے میں اتھارٹی ماننا ہے اس لیے یہ مسئلہ کفر و ایمان کا مسئلہ ہے۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں:

جب دلائل صحیحہ کی بنا پر تم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن حکیم کی حقانیت کو تسلیم کر لیا اور کلی طور پر اس کے احکام پر ایمان لا چکے تو اب فروع و جزئیات کی صحت

کو تسلیم کرنا ناگزیر ہے۔ اگر ہر اصل و فرع اور کلی و جزئی کو قبول کرنا ہمارے عقلی قیاسات پر موقوف ہو تو وحی و نبوت کی ضرورت باقی نہ رہے [1]

جائز چیزوں سے اجتناب نہ کرو

۱۴۷۔ اور تمہارے لیے کیا رکاوٹ ہے کہ جس جانور پر اللہ کا نام لیا گیا ہو اسے نہ کھاؤ حالانکہ جو کچھ تم پر حرام کیا گیا ہے اسے اللہ نے تمہارے سامنے کھول کر بیان کر دیا ہے ہاں حالات کی مجبوری جو کچھ تمہیں کھلاتے وہ اس سے مستثنیٰ ہے یعنی اضطرار و مجبوری کی حالت کو مستثنیٰ کر کے جو چیزیں حرام ہیں ان کی تفصیل بیان کی جا چکی ہے ان میں وہ حلال جانور داخل نہیں جو اللہ کے نام پر ذبح کیا جائے۔ پھر اس کے نہ کھانے کی کیا وجہ؟ [2] مطلب یہ ہے کہ جب محرمات کو کھول کر بیان کیا جا چکا ہے اور بتایا جا چکا ہے کہ حرام کیا گیا چیزیں ہیں تو اب ہچکچاہٹ کیا ہے۔ یہ بات تفصیل سے کہاں بتائی ہے قد فصّل ماضی کا صیغہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ محرمات کی تفصیل پہلے ہو چکی ہے تفصیل کہاں ہوئی اس سوال کے جواب میں اگر سورہ مائدہ کا نام لیا جائے تو وہ درست نہیں ہے کیونکہ سورہ انعام مکی ہے اور سورہ مائدہ مدنی ہے اس لیے وہ مراد نہیں ہو سکتی۔ کچھ علماء کی رائے ہے کہ سورہ نحل میں تفصیل ہو چکی ہے کیونکہ سورہ النحل سورہ انعام سے پہلے نازل ہوئی ہے لیکن اس میں اشکال یہ ہے کہ سورہ نحل کی اسی آیت یعنی

انما حرم علیکم المیتۃ والدم ولحم الخنزیر وما اھل بہ لغیر اللہ

کے بعد

وعلی الذین ھادوا حرمنا ما قصصنا علیک من قبل

میں سورہ انعام کی اس آیت کا حوالہ دیا ہے

وعلی الذین ھادوا حرمنا کل ذی ظفر ومن البقر والغنم حرمنا علیھم
شحومھما الا ما حملت ظھورھما او الحوایا او ما اختلط بعظم ذالک جزینٰھم
ببغیھم وانا لصادقون

اور اب یہاں سورہ انعام میں وقد فصل لکم ما حرم علیکم کہہ کر سورہ نحل کی طرف اشارہ کیا ہے کیونکہ مکی سورتوں میں سورہ انعام کے بعد سورہ نحل بس ایک سورت ہے جس میں حرام چیزوں کی تفصیل

---

[1]، [2] افادات شیخ الاسلام

بتائی گئی ہے۔ سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان میں سے کون سی سورت پہلے نازل ہوئی ہے اور کون سی بعد میں۔ ہمارے نزدیک اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ پہلے سورہ نحل نازل ہوئی تھی جس کا حوالہ سورہ انعام کی اس آیت وقد فصل لکم میں دیا گیا ہے۔ بعد میں کسی موقعہ پر کفار مکہ نے سورہ نحل کی آیات پر یہ اعتراض کر دیا کہ بنی اسرائیل کی شریعت میں تو اور بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں جن کو اسلام نے حلال کیا ہے اگر وہ شریعت خدا کی طرف سے تھی تو تم اس کی خلاف ورزی کر رہے ہو اور وہ بھی خدا کی طرف سے تھی اور یہ بھی خدا کی طرف سے تو دونوں میں اختلاف کیا ہے؟ اس اعتراض کے وقت سورہ انعام نازل ہو چکی تھی اس لیے ان کو جواب دیا گیا کہ ہم پہلے سورہ انعام میں بتا چکے ہیں کہ یہودیوں پر چند چیزیں خاص طور پر حرام کی گئی تھیں اور چونکہ یہ اعتراض سورہ نحل پر کیا گیا تھا اس لیے اس کا جواب بھی سورہ نحل ہی میں جملہ معترضہ کے طور پر درج کیا گیا۔

کچھ علماء یہ کہتے ہیں کہ وقد فصل لکم ما حرم علیکم کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اس سے پہلے تفصیل ہو چکی ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ ان چیزوں کا تفصیل سے ذکر کر رہا ہے جو تم پر حرام ہیں جیسا کہ اس کے بعد قل لا اجد فیما اوحی آیت نمبر ۱۴۵ میں آ رہا ہے۔ امام رازی اور آلوسی کا بھی یہی میلان ہے، لیکن ہماری رائے میں راجح یہی صورت ہے۔

یہاں حضرت مولانا اشرف علی نے بہت مفید بات فرمائی ہے کہ ما ذکر اسم اللہ علیہ میں ذبح اختیاری اور ذبح اضطراری یعنی تیر باز اور کتے کا شکار جب کہ اس کو چھوڑ دینے کے وقت بسم اللہ پڑھی جائے اور ذکر حقیقی ذکر حکمی سب داخل ہے پس امام ابوحنیفہ کے نزدیک جس پر بسم اللہ سہواً ترک کر دی جائے وہ حکماً یا ذکر اسم اللہ علیہ میں داخل ہے البتہ عمداً ترک کرنے سے امام صاحب کے نزدیک حرام ہوتا ہے[1]

آخر میں فرمایا ہے الا ما اضطررتم مطلب یہ ہے کہ کھانا نہ ملے اور بھوک کی شدت سے آدمی بے چین اور بے قرار ہو جائے یعنی جان بچانے کا خطرہ ہو جائے تو یہ ایک ضرورت ہے جس میں حرام کھا لینا جائز ہے۔ اگرچہ یہاں یہ آیت مطلق اور بے قید ہے لیکن اسی سورت میں آگے اور اس سے پہلی سورت یعنی نحل میں دو قیدیں آئی ہیں غیر باغ ولا عاد یہ مکی سورتیں ہیں مدنی سورتوں میں البقرہ میں بھی قید آئی ہے لیکن سورہ مائدہ میں فی مخمصۃ غیر متجانف لاثم کی دو قیدوں کا اور اضافہ ہے جلد دوم میں اس پر چھ دفعات پر مشتمل نوٹ نمبر ۱۱۷ میں تفصیلی تبصرہ آ چکا ہے اور جلد ششم میں

[1] افادات شیخ الاسلام

اضطرار کی شرعی حد کے عنوان کے تحت سورہ مائدہ کے نوٹ نمبر میں بھی اس پر بحث ہو چکی ہے۔

اہوا پر مبنی اعمال ضلالت ہیں

۱۱۹ اور بہت سے لوگ بغیر علم کے محض اپنی خواہشات سے لوگوں کو بہکاتے رہتے ہیں بلاشبہ تیرا پروردگار ان حدوان بیشتر لوگوں سے خوب واقف ہے۔ مسلمان کا عقیدہ یہ ہے کہ ہر چیز کو بالواسطہ یا بلاواسطہ خدا ہی پیدا کرتا اور مارتا ہے۔ پھر جس طرح اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں میں بعض کا کھانا ہم کو مرغوب اور مفید ہے جیسے سیب، انگور وغیرہ اور کچھ چیزوں سے ہم نفرت کرتے ہیں یا مضر سمجھتے ہیں جیسے ناپاک گندی چیزیں اور سنکھیا وغیرہ۔ اسی طرح اس کی ماری ہوئی چیزیں بھی دو قسم ہیں ایک وہ جن سے فطرت سلیمہ نفرت کرتی ہے یا اس کا کھانا ہماری روحانی یا جسمانی صحت کے لیے خدا کے نزدیک مضر ہو۔ مثلاً وہ حیوان دموی جو اپنی طبعی موت سے مرے اور اس کا خون وغیرہ گوشت میں جذب ہو کر رہ جاتے۔ دوسرے وہ حلال وطیب جانور جو باقاعدہ خدا کے نام پر ذبح ہو یہ بھی خدا ہی کا مارا ہوا ہے جس پر مسلمان کی چھری کے توسط سے اس نے موت طاری کی ہے مگر عمل ذبح اور خدا کے نام کی برکت سے اس کا گوشت پاک وصاف ہو گیا۔ پس جو شخص دونوں قسموں کو ایک کرنا چاہے وہ معتدی حد سے بڑھنے والا ہے[1]

عابدانہ اعمال کا پیمانہ اگر ناموس وحی اور علوم نبوت پر مبنی نہ ہوں بلکہ اپنے میلانِ طبع ہوائے نفس پر قائم ہو تو اس کا نتیجہ ضلال اور اضلال ہے۔ عابدانہ اعمال کے سارے پیمانے جن میں نبوت کی اتباع کا روح نہ ہو بلکہ اپنی پسند، اپنی چاہت اور اپنی خواہش سے بنائے گئے ہوں اتباع ہوئی ہے۔ دین کی زندگی میں اعمال کی حدود میں ساری بدعتوں کا سرچشمہ اتباع ہوی اور افکار کی حدود میں ساری بدعتوں کا منبع اتباع ظن ہے مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کی تحریم یہ منسوب تو خدا کی طرف کرتے ہیں لیکن دراصل یہ تمام تر ان کے ہوائے نفس کے بناتے ہوئے پیمانے ہیں اللہ سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس باب میں ان کے پاس خدا کی طرف سے کوئی سند یا ثبوت نہیں ہے جس کو وہ پیش کر سکیں۔

آخر میں فرمایا ان ربك هو اعلم بالمعتدين اس سے مقصود دھمکی بھی ہے اور تسلی بھی۔ دھمکی تو اس لحاظ سے کہ یہ لوگ سزا سے بچ کر کہاں جائیں گے یہ تو علم الٰہی میں ہیں۔ اور تسلی اس طرح کہ ہدایت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مقابلہ میں وہ ھو اعلم بالمعتدین ، کے یعنی تیرا رب جیسے مہتدین کو جانتا ہے ان معتدین سے بھی
واقف ہے جو حق کو چھوڑ کر باطل اور حلال کو چھوڑ کر حرام کو پسند کرتے ہیں ۔

سارے گناہ چھوڑ دو

۱۲۰ اور چھوڑ دو تم جلوت اور خلوت کے ہر گناہ کو یقیناً جو لوگ گناہ کرتے ہیں ان کو اپنے جرائم کی ضرور سزا ملے گی۔ یعنی کافروں کے بہکانے پر نہ ظاہر میں عمل کرو اور نہ دل میں شبہ لاؤ ، کذا فی موضح القرآن[1] اثم قانون کی زبان میں اس کو کہتے ہیں جسے اللہ نے حرام کیا ہو۔ لغت میں ہر بُری اور نقصان دہ چیز کو کہتے ہیں۔ اللہ نے اپنے بندوں پر جو کچھ حرام کیا اس میں سر تا سر بندوں کا نقصان ہی نقصان ہے چاہے جانی ہو یا مالی ، اخلاقی ہو یا فکری ، انفرادی ہو یا اجتماعی ، معاشی ہو یا سیاسی ، حافظ ابن القیم نے اثم ان گناہوں کو قرار دیا ہے جن کی جنس ہی حرام ہو جیسے زنا ، جھوٹ ، شراب ، اور لکھا ہے کہ اثم عدوان کے ساتھ بھی آتا ہے جیسے لا تعاونوا علی الاثم والعدوان ہر اثم عدوان ہوتا ہے اور ہر عدوان اثم ہوتا ہے ۔ عدوان وہ ہے جس کی مقررہ مقدار مباح ہو ۔ اس مقررہ مقدار سے تجاوز عدوان ہے ورنہ اصل کے اعتبار سے اثم نام ہے ان کاموں کو کرنے کا جن سے منع کیا گیا ہے یا اوامر کے چھوڑ دینے کا اس لیے اثم وہ تمام رذائل ہیں جن کو خدا ناپسند کرتا ہے اور جن سے بچنے کا حکم اس نے بندوں کو دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہ گار ٹھہرتے ہیں ۔ جن کی بُرائی ہر عقلمند جانتا ہے اور مانتا ہے اور جن کی بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصان پہنچتا ہے اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے بلکہ جب کسی قوم میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی اور بربادی کا سبب بن جاتے ہیں یعنی اس کی دینی و دنیوی ترقیوں کی راہیں مسدود ہو جاتی ہیں اور سعادت و اقبال کا دروازہ اس پر بند ہو جاتا ہے ۔ قرآن کا اس آیت میں مطالبہ ہے کہ رذائل کو بالکل چھوڑ دو خواہ ظاہر ہوں یا باطن ، ظاہر علانیہ باطن پوشیدہ یا ظاہر وہ گناہ جن کی قباحت نمایاں ہو خواہ وہ خلوت میں کیے جائیں اور باطن وہ گناہ جن کی قباحت عام نظروں سے اوجھل ہو خواہ علانیہ کیے جائیں یا ظاہر وہ گناہ جن کا تعلق جوارح سے ہو اور باطن وہ گناہ جن کا تعلق قلوب سے ہو مثلاً کبر ، حسد ، بغض و کینہ ، حرص و طمع ، ہر بُرائی کے تین پہلو ہوتے ہیں ذہنی ، لفظی اور عینی ، ذہنی باطن ہے اور

لہ افادات شیخ الاسلام

لفظی اور عینی وجود ظاہر ہے۔ مثلاً شرک اس کا ذہنی وجود وہ حقیقت ہے جس کا مسکن انسان کا قلب ہے
لفظی وجود اس کا وہ ہے جو زبان بولتی ہے اور عینی وجود شرک کے وہ مظاہر اور قوالب ہیں جنہیں عابرانہ
طور پر اختیار کیا جاتا ہے مثلاً اصنام، دریا، شمس و قمر اور قبور۔ ہر برائی کے ظاہر و باطن میں گہرا لگاؤ ہوتا
ہے۔ دونوں باہم ایک دوسرے کے لیے سہارا ہوتے۔ قرآن کہتا ہے کہ رذائل سے بچنا یہ ہے کہ رذائل
کے ذہنی اور لفظی وجود کے ساتھ اس کے مظاہر اور قوالب بھی ختم ہو جائیں۔ اگر صرف ذہنی اصلاح کر لی
گئی اور بیرونی قوالب اور مظاہر کو ختم نہ کیا گیا تو اس سے برائی کا استیصال نہ ہوگا۔ اسی میں وہ ساری برائیاں
آجاتی ہیں جن پر شارحین قرآن نے اس آیت کی شرح میں نشاندہی کی ہے مثلاً زنا اور محرمات سے نکاح وغیرہ
بلکہ اگر قانونی نقطۂ نظر سے آیت پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا ظواہر سے اگر رذائل مراد ہیں تو بواطن سے
وہ وسائل مراد ہیں جو ان رذائل تک پہنچاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ شرک بھی چھوڑ دو اور شرک کے تمام
وسائل اور ذرائع بھی ختم کر دو، زنا بھی چھوڑ دو اور زنا کے وہ وسائل بھی بند کر دو جن کے ذریعے زنا کو
معاشرے میں پنپنے کا موقعہ ملتا ہے۔

آخر میں فرمایا ان الذین یکسبون الاثم الخ اس میں بتایا ہے کہ جو لوگ جنس اثم کی ہی کمائی کرتے ہیں خواہ
یہ بصورت کفر و شرک ہو یا نفاق و فسوق ہو یا عصیان و عدوان ہو یا بغی و منکر اور قول اللہ کی صورت میں
کچھ ہو اور پھر علانیہ ہو یا پوشیدہ ان کو اس کے نتائج سے ضرور دوچار ہونا پڑے گا بشرطیکہ ان کے کردار
میں تکرار اور استمرار ہوگا۔ اگر تکرار اور استمرار نہ ہوگا بلکہ نادانی کی حالت میں کرنے کے بعد فوراً جناب الٰہی
میں توبہ کر لیں گے تو اللہ کی ذات غفور و رحیم ہے۔ رحمت برائی سے باز آنے والوں کا استقبال کرتی ہے
ارشاد ہے:

قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف

۱۵۰۔ اور یاد رکھو کہ جس جانور پر خدا کا نام نہ لیا جائے اسے مت کھاؤ اس کا کھانا نافرمانی کی بات ہے
یعنی نہ حقیقۃ نہ حکماً، حقیقۃً متروک التسمیہ عمداً کے بارے میں ذکر حکمی کا دعویٰ کرتے ہیں[1] اس آیت
کی تفہیم میں عطا ابن رباح سے امام رازی نے یہ بات نقل کی ہے کہ کھانے اور پینے کی ہر چیز جس پر
خدا کا نام نہ لیا جائے وہ حرام ہے۔ لیکن دوسرے علماء کو ان کے اس موقف سے اتفاق نہیں ہے
ان کا کہنا ہے کہ اس آیت کا مصداق عام نہیں بلکہ خاص ہے یعنی صرف ذبائح تک محدود ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

امام شافعی فرماتے ہیں کہ یہ ممانعت ان جانوروں کے بارے میں ہے جو نصب پر ذبح کیے جائیں۔ نصب سے مراد وہ سب مقامات ہیں جن کو غیر اللہ کی نذر و نیاز چڑھانے کے لیے لوگوں نے مخصوص کر رکھا ہو خواہ وہاں کوئی پتھر کی مورت ہو یا نہ ہو۔ ہماری زبان میں اس کا ہم معنی لفظ آستانہ یا استھان ہے جو کسی بزرگ یا دیوتا سے یا کسی خاص مشرکانہ اعتقاد سے وابستہ ہو۔ امام شافعی نے اس خصوصیت کی وجوہ یہ بتائی ہیں اولاً، اس لیے کہ اس پر قرآن نے یہاں فسق کا حکم لگایا ہے۔ ظاہر ہے متروک التسمیہ ذبیحہ کا کھانے والا مسلمان فاسق نہیں ہوتا، ثانیاً آگے آرہا ہے ان الشیاطین لیوحون الی اولیائھم لیجادلوکم شیاطین اپنے ساتھیوں کے دلوں میں شبہات القا کرتے ہیں تاکہ تم سے اُلجھیں یہ مناظرہ مُردار کے بارے میں ہوا ہے ثالثاً اس پر آگے آیت میں اہل ایمان کو دھمکی ہے کہ اگر تم نے ان کا کھانا کھایا تو تم بھی شرک کرنے والے ہو جاؤ گے امام شافعی فرماتے ہیں کہ اس آیت کا آغاز اگرچہ ایک عمومی بیان سے ہوا ہے لیکن یہ تین قیدیں بزبانِ حال کہہ رہی ہیں کہ یہ مخصوص ذبیحہ کے بارے میں ہے۔ قرآن کی دوسری آیت میں ما اھل بہ لغیر اللہ کو فسق کہا ہے اس لیے یہاں بھی ما اھل بہ لغیر اللہ اور ما ذبح علی النصب مراد ہے۔

حافظ ابن کثیر نے اس موضوع پر مذاہب کی تفصیل لکھی ہے، وہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کو ذبیحہ کے بارے میں رکھا جائے تو اس مسئلہ میں تین رائے ہیں ایک رائے تو یہ ہے کہ جس ذبیحہ پر خدا کا نام نہ لیا جائے خواہ جان کر نہ لیا جائے یا بھول کر وہ ذبیحہ حلال نہ ہوگا صحابہ میں عبداللہ بن عمر اور نافع مولی عبداللہ، تابعین میں عامر الشعبی اور محمد بن سیرین اور ائمہ میں امام مالک اور ایک روایت میں امام احمد اور ابو ثور اور داؤد ظاہری کا یہی مذہب ہے۔ دوسرا مذہب یہ ہے کہ ذبیحہ پر بسم اللہ صرف ایک امر استحبابی ہے بھول کر رہ جائے یا جان کر چھوڑ دے۔ جانور کی حلت پر کوئی اثر نہ پڑے گا۔ یہ امام شافعی اور ایک روایت میں امام احمد کا مذہب ہے۔ تیسرا مذہب یہ ہے کہ بھول کر اگر ذبیحہ پر بسم اللہ رہ جائے تو کوئی حرج نہیں لیکن بالارادہ چھوڑ دی جائے جان کر تو ذبیحہ حلال نہ ہوگا۔ یہی امام مالک کا مشہور مذہب ہے یہی ایک روایت میں احمد بن حنبل کی رائے ہے اور یہی امام ابو حنیفہ، ان کے اصحاب اور محدثین میں سے اسحاق بن راہویہ کا مذہب ہے صحابہ میں سے عبداللہ بن عباس، اور علی مرتضیٰ، تابعین میں سے سعید بن المسیب، عطا ابن ابی رباح، الحسن البصری، جعفر بن محمد، ربیعہ بن ابی عبدالرحمان کی اسے تائید حاصل ہے صاحب ہدایہ نے قبل الشافعی اس پر اجماع نقل کیا ہے۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

> جو شخص بھول کر بسم اللہ چھوڑ دینے سے ذبیحہ کو حرام کہتا ہے وہ اجماع کے مخالف ہے اور اس موضوع پر جو ارشادِ نبوت آتا ہے اس کے بھی خلاف ہے۔

ہماری رائے میں آیت جس سیاق میں آئی ہے اس کا تعلق مشرکین کے مشرکانہ عمل سے ہے۔ مسلمانوں کو خبردار کیا گیا ہے کہ جس پر خدا کا نام نہیں بلکہ غیر خدا کا نام لیا جاتے خواہ یہ ذبح کے وقت لیا گیا ہو یا ذبح ہی ان کے لیے کیا گیا ہو یہ سب حرام ہے۔ غیر اللہ کے نام پر ذبح شدہ جانور یا غیر اللہ کے لیے نامزد ان کے یہاں حلال وطیب تھا۔ ان کے یہاں کسی ذبیحہ کی حلت و طہارت کے لیے یہ چیز ضروری نہ تھی کہ لازماً اس پر اللہ کا نام لیا جائے۔

شرک فی الطاعۃ کا حکم

۱۲۱ اور بلاریب شیاطین اپنے رفقاء کے دلوں میں وسوسے ڈالتے رہتے ہیں تاکہ وہ تم سے الجھا کریں اور اگر تم نے ان کی اطاعت کر لی تو تم بھی شرک کرنے والے ہو۔ یعنی شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں یہی ہے کہ کسی چیز کی تحلیل و تحریم میں مستند شرعی کو چھوڑ کر محض اُمراء و اہواء کا تابع ہو جاتے جیسا کہ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا من دون اللہ کی تفسیر میں مرفوعاً منقول ہے کہ اہل کتاب نے وحی الٰہی کو چھوڑ کر صرف احبار و رہبان پر تحلیل و تحریم کا مدار رکھ چھوڑا تھا[1] پہلی بات سُن کر مشرکین کے مذہبی پندار کو چوٹ لگی تھی۔ انھوں نے عوام کے جذبات اہلِ ایمان کے خلاف بھڑکانے کے لیے پروپیگنڈا شروع کر دیا۔ ان بھڑکانے والوں کو قرآن نے شیاطین کہا ہے اور جن کو وہ بھڑکاتے تھے ان کو اولیاء۔ یعنی ان کے رفقاء کہا اور بھڑکانے کے کردار کو ایحاء سے تعبیر کیا ہے۔

یہ بھڑکانے والے کون تھے؟ حافظ ابن جریر نے اس موضوع پر روایتی نقطہ نظر سے جو سرمایہ جمع کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فارس کے مجوسی نے مشرکین مکہ کو یہ کہلا کر بھیجا کہ اس پیغمبر سے یہ دریافت کرو کہ جو تم ذبح کرو وہ تو حلال ہے اور جسے اللہ ذبح کرے وہ حرام ہے اور عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ علمائے یہود قریش مکہ کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر اعتراض کرنے کے لیے جو باتیں سکھایا کرتے تھے ان میں سے ایک یہ تھا کہ آخر یہ کیا معاملہ ہے کہ جسے خدا مارے وہ تو حرام ہو اور جسے ہم ماریں وہ حلال ہو۔ یہ مجوسیوں کی جانب سے یا یہودیوں کی جانب سے ہو، قرآن نے ان کے اس غوغا سے بے پروا ہو کر کہا ہے کہ انہ لفسق اور اہلِ ایمان کو بتایا ہے کہ تم نے اگر تحلیل و تحریم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے موضوع پر ان کی بات مان لی تو تم مشرک ہو کر رہ جاؤ گے۔ یہاں مشرکین کے لفظ میں بڑی گہری معنویت ہے یاد رہے کہ یہ شرک فی العبادۃ نہیں بلکہ شرک فی الطاعۃ ہے۔ شاہ عبدالقادر صاحب نے اس آیت پر جو تشریحی نوٹ لکھا ہے اس میں فرماتے ہیں،

شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجا جائے بلکہ شرک یہ ہے کہ حکم میں کسی اور کا مطیع ہو جائے۔ (موضح القرآن)

شرک کے معنے ساجھے پن کے ہیں اور قرآن کی اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لوازم میں کسی اور کو اللہ کا ساجھی بنایا جائے گویا شرک کی تین قسمیں ہیں۔

ایک وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہوتا ہے

دوسرے وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی صفات سے ہوتا ہے

تیسرے وہ شرک جس کا تعلق ان صفتوں کے لوازم سے ہوتا ہے۔

نبوت کا مخاطب شرک فی الذات کے نہیں بلکہ شرک فی الصفات اور شرک فی اللوازم کے مرتکب تھے اس لیے قرآن کا نقطہ بحث یہی ہیں۔ شرک فی الصفات یہ کہ اللہ تعالیٰ جن صفات سے متصف ہے ان میں سے کوئی صفت کسی مخلوق میں بھی مان لی جائے مثلاً علم اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھلی اور چھپی ہر بات کو جانتا ہے اس لیے غائب بھی حاضر ہے اور گذرا ہوا حاضر ہے، اور گذرا ہوا زمانہ یا آنے والا زمانہ بھی حال کا زمانہ ہے اب اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ فلاں مخلوق بھی اسی طرح ہر بات کو جانتی ہے تو شرک فی الصفات ہوگا۔

شرک فی اللوازم کی صورت یہ ہے کہ صفات الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں انہیں اور ان سب کو اللہ کے لیے خاص نہ سمجھے بلکہ ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے لیے بھی ثابت اور موجود ماننے۔ مثلاً صفاتِ الٰہی کا ایک لازمی تقاضا یہ ہے کہ عبادت اور محبت صرف اللہ کا حق ہے۔ اب اگر کوئی شخص کسی اور سے بھی ایسی ہی محبت اور عقیدت رکھے یا اسی طرح کی عبادت کا اسے مستحق قرار دے تو یہ صفات الٰہی کے تقاضوں میں غیر اللہ کو شریک ٹھہرانا ہوگا۔ یہی شرک فی العبادۃ اور اللہ کی پرستش میں ملاوٹ ہے۔ اسی طرح ان صفات کا ایک اور تقاضا یہ بھی ہے کہ اقتدار اعلیٰ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور حکم دینے حلال کرنے، حرام کرنے اور قانون بنانے کا حق اصلاً اسی کو پہنچتا ہے اسی لیے اگر کسی اور کو بھی یہ حق دے دیا جائے خواہ وہ ایک فرد ہو یا بہت سے افراد کا مجموعہ تو یہ اللہ کی بندگی میں غیر اللہ کو شریک ٹھہرانا

ہوگا اور اسی کا نام شرک فی الطاعۃ ہے ۔

شرک فی العبادۃ اور شرک فی الطاعۃ میں فرق

آپ چاہیں تو شرک فی العبادۃ کو پرستش اور شرک فی الطاعۃ کو بندگی کہہ دیں۔ پرستش اور بندگی میں جوہری فرق ہے۔ پرستش تقاضائے محبوبیت ہے جبکہ بندگی تقاضائے حاکمیت ہے۔ جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ محبوبیت میں نیابت نہیں ہوتی ہے اس لیے عبادت اور پرستش اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہے لیکن حاکمیت میں نیابت ہوتی ہے اس لیے اطاعت کا حکم اللہ نے اپنے ساتھ رسول کا بھی دیا ہے چنانچہ ارشاد ہے اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول عبادت کے لیے تو کسی ضابطہ اور قانون کی ضرورت نہیں کہ وہ تقاضائے محبوبیت ہے وہ تو ذکر، خشوع، خضوع، انابت، توکل، تضرع، دعا میں اسوۂ حسنہ سے حاصل ہو سکتی ہے لیکن اطاعت چونکہ برائے حاکمیت ہے اس لیے اس کے لیے ضابطہ، دستور، آئین اور قانون کی ضرورت ہے، اللہ کی طاعت کے لیے قرآن اور رسول کی طاعت کے لیے سنت ہے۔ اسی کو آپ وحی متلو اور وحی غیر متلو کہہ سکتے ہیں اور قرآن کی زبان میں اسی کا نام حکمت ہے جس طرح خدا کی اطاعت کے حکم کی وجہ سے قرآن یعنی احکام خداوندی سے بے نیازی نہیں ہو سکتی اسی طرح طاعت رسول کی وجہ سے سنت رسول سے بھی بے پرواہی نہیں ہو سکتی۔ سنت رسول کی پیروی بھی ایسے ہی ضروری ہے جیسی کتاب اللہ کی کیونکہ دونوں کی پیروی حکم الٰہی کی پیروی ہے اور اللہ کی اطاعت حاکم ہونے کی وجہ سے اور اللہ کے رسول کی اطاعت دو مختلف چیزیں نہیں ہیں جس طرح قرآن کی اطاعت خود خدا تعالیٰ کی اطاعت ہے اسی طرح رسول اللہ کی اطاعت بھی حاکمیت میں نیابت کی وجہ سے خود خدا ہی کی اطاعت ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ اور قرآن نے حاکمیت میں درجہ نیابت کو آگے بھی وسیع کر دیا ہے یعنی اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول کے بعد واولی الامر منکم فرمایا ہے اس لیے طاعت کا دائرہ بھی رسول سے آگے صحابہ کرام اور ائمہ عظام اور ان سب علماء تک وسیع ہوگا جن کے علم و عمل کا مرکز قرآن و سنت ہوں گے۔ اس بنا پر خلفائے راشدین کی سنت اور صحابہ کا اجماع بھی طاعت کی حدود میں حجت ہوگا بلکہ مجتہدین کے اجتہاد کی حیثیت بھی قانونی ہے۔ اسی لیے اسلام میں مصادر قانون کی حیثیت سے چار کو اہمیت دی گئی ہے۔ کتاب اللہ، سنت رسول اللہ، اجماع اور قیاس ۔ قرآن و سنت اگر اصول استناد ہیں تو اجماع و قیاس اصول اجتہاد ہیں۔ ان دونوں میں خاص ربط ہے۔ اصول اجتہاد کا مطلب یہ ہے کہ جہاں کسی صورت حال کی نسبت اصول استناد

خاموش ہوں وہاں اسلامی معاشرے کے ان افراد کو عقل و استدلال کا حق دیا گیا ہے جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم و فضل کی وسعت کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر سکتے ہوں۔ فکر و اجتہاد کی یہ آزادی بے قید اور غیر مشروط نہیں ہے بلکہ کچھ قیود اور تحدیدات رکھتی ہے۔ کیونکہ اگر بنیادی امور و مسائل اور اساسی اصول کو طے کرنے کے بعد انسانی عقل کو بالکل آزاد چھوڑ دیا جاتا تو اندیشہ یہ تھا کہ فنی قوانین اور تفصیلی ضوابط کا رشتہ اس اساس و بنیاد سے منقطع ہو جاتا جس پر یہ قوانین و ضوابط مبنی ہیں۔ ایسا اجتہاد جو اسلام کی روح اور اصول استناد یعنی قرآن و سنت کے بنیادی اصول اور ہدایات سے متصادم ہو جائز نہیں ہے اسی غرض سے یہ شرط لگائی گئی ہے کہ اجتہاد وہ لوگ کر سکتے ہیں جو اپنے علم و اطلاع، اپنی اصابت رائے اور فکری صلاحیتوں کے اعتبار سے اس کے اہل ہوں۔ قرآن و سنت پر جو قانون کا ماخذ و اساس ہیں ایمان راسخ اور یقین کامل رکھتے ہوں اور متقی و متبع شریعت ہوں۔ مولانا اسماعیل شہیدؒ فرماتے ہیں :

> تحقیق کے دو طریقے ہیں اوّل اجتہاد بشرطیکہ معقول ذوی العقول ہو، دوم الہام بشرطیکہ مداخلت نفسی سے محفوظ ہو۔ پس مشابہ بانبیاء علم احکام میں یا مجتہدین مقبولین ہیں یا ملہمین محفوظین، اور چونکہ کشف والہام کی طرف نسبت اوائل امت میں موجود نہ تھی اس لیے مشابہ بانبیاء اس فن میں مجتہدین مقبولین ہیں ان کو ائمہ فن سمجھنا چاہیے جیسے ائمہ اربعہ، اگرچہ مجتہدین دین میں بہت گزرے ہیں لیکن امت میں شہرت ان ہی کو حاصل ہے پس گویا اس فن میں مشابہت تامہ ان ہی کو حاصل ہے اور امام کے لقب سے یہی ملقب ہیں۔
> (منصب امامت)

بہر حال حاکمیت کا تقاضا طاعت ہے اور طاعت کے لوازم میں سے دستور و آئین، اس کی تشریح اور قانونی تفصیل ہے۔ اور یہ سب لوازم باہم منطقی ربط رکھتے ہیں۔

أَوَمَنْ كَانَ مَيْتًا فَأَحْيَيْنٰهُ وَجَعَلْنَا لَهُ نُورًا يَمْشِي بِهِ
فِي النَّاسِ كَمَنْ مَثَلُهُ فِي الظُّلُمٰتِ لَيْسَ بِخَارِجٍ مِنْهَا
كَذٰلِكَ زُيِّنَ لِلْكٰفِرِينَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿١٢٢﴾ وَكَذٰلِكَ جَعَلْنَا فِي
كُلِّ قَرْيَةٍ أَكٰبِرَ مُجْرِمِيهَا لِيَمْكُرُوا فِيهَا ۖ وَمَا يَمْكُرُونَ إِلَّا
بِأَنْفُسِهِمْ وَمَا يَشْعُرُونَ ﴿١٢٣﴾

کیا پھر وہ آدمی کہ مُردہ تھا ہم نے اُسے زندگی دی اور اس کے لیے ایک
روشنی ٹھہرائی کہ اس کے اُجالے میں لوگوں کے درمیان چلے پھرے
اس شخص جیسا ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے
اور ان سے باہر نکلنے والا نہیں ہے[۱۵۲]۔ اسی طرح کافروں کی نظر میں
وہی باتیں خوشنما دکھائی دیتی ہیں جو وہ کرتے رہتے ہیں[۱۲۲]۔ اور اسی
طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بدکردار آدمیوں کے سردار بنا دیے
تاکہ وہاں مکر و فریب کے جال پھیلائیں اور فی الواقع وہ مکر و فریب

نہیں کرتے مگر اپنے ہی ساتھ لیکن اُن کو اس کا شعور نہیں ہے۔ ۱۵۴

معانی مفردات

مثلؔ، حال، شان، صفت مثال، اکابرؔ اکبر کی جمع ہے زعیم، سردار کو کہتے ہیں۔ مجرمینؔ، مجرم کی جمع ہے جرم پیشہ لوگ جن کے اعمال واخلاق میں فساد و ضرر ہو، القریہؔ، بہت بڑی مرکزی آبادی، آج کی اصطلاح میں دارالخلافہ شہر بول کر اہلِ شہر مراد ہوتے ہیں۔ المکرؔ دقیق اور باریک تدبیر خواہ گفتار سے ہو یا کردار سے۔

ایمان و کُفر کی تمثیل

پہلی آیات میں بتایا گیا تھا کہ مشرکینِ مکہ میں سے بعض اشخاص جو مخالفت میں پیش پیش تھے احکامِ الٰہی کے خلاف کج بحثیاں کرتے اور طرح طرح کے شبہات پیدا کر کے مسلمانوں کو گمراہ کرنا چاہتے۔ اہلِ ایمان کو بتایا گیا تھا کہ جدال و نزاع کرنے والوں کی راہ طلبِ حق کی راہ نہیں ہے۔ قرآن نے جس چیز سے رد کا ہے اس میں حکمتیں ہیں اور چونکہ ہر سمجھ مصالح و حکم کا ادراک نہیں کر سکتی اس لیے چاہیے کہ راست بازی کے ساتھ خدا کی اطاعت کی جائے اور اس معاملہ میں یہ ہرگز پروا نہ کی جائے کہ اکثریت کیا کہہ رہی ہے۔ حق و باطل کے معاملہ میں انسانوں کی عددی طاقت معیار نہیں ہو سکتی بلکہ حقیقت اور سچائی کے بنیادی اصولوں ہی پر فیصلہ کیا جا سکتا ہے۔ بسا اوقات گمراہی اور حق فراموشی کے ایسے اوقات آجاتے ہیں کہ نوعِ انسانی کی اکثریت حق و یقین کی روشنی سے محروم ہو جاتی ہے۔ فرمایا گمراہوں کی کثرت نہ دیکھو یہ دیکھو کہ کون سی راہ یقین اور بصیرت کی راہ ہے اور کون سی جہل و گمان کی۔ اور ساتھ ہی مشرکینِ عرب کے ان خیالات کی تردید کی ہے جن کے لیے ان کے پاس اوہام و خرافات کے سوا علم و بصیرت کی کوئی روشنی نہ تھی۔ وہ کہتے تھے کہ جن جانوروں کو بتوں کے نام پر چھوڑ دیا جاتے وہ مقدس ہیں۔ اگر ذبح کیا ہوا جانور حلال ہے تو بتوں کی نیاز چڑھا ہوا جانور جو مختلف طریقوں سے مارا جاتا ہے کیوں حلال نہیں ہے۔ قرآن نے بتایا یہ سب باتیں فسق اور بدکاری کی باتیں ہیں اور یہ ان کی اپنی من گھڑت ہیں، ان کی کوئی حقیقت نہیں۔ ان کو لوگوں میں پیش کرنے والے شیاطین ہیں۔ یہ خود گمراہ ہیں اور چاہتے ہیں کہ لوگوں کو گمراہ کر دیں۔ اب اس ضمن میں یہاں

ایمان و کفر کی مثال بیان ہو رہی ہے۔ ایمان زندگی ہے اور علم و بصیرت کی روشنی ہے۔ کفر موت ہے اور اوہام و ظنون کی تاریکی، اس لیے ہدایت یافتہ مومن اور ضلالت میں پڑے ہوئے کافر میں نمایاں فرق ہے۔ اقتدار کے لیے ایمان و ہدایت ہے نہ کہ کفر و ضلالت۔ راہ ان کی چلنی چاہیے جو ہدایت و علم کی روشنی رکھتے ہوں جو تمام عقائد و اعمال میں علم و یقین کا خواہاں ہو اس کے لیے یہ کب جائز ہے کہ کفر و شرک کے اوہام کا اثر قبول کرے جو حیات و موت اور نور و ظلمت میں فرق ہے وہی ایمان و کفر میں ہے۔ ایمان نور ہے تو کفر ظلمت ہے۔ ایمان زندگی ہے تو کفر موت ہے، ایمان بصیرت ہے تو کفر وہم ہے۔

ایمان کی تاریخ یہی ہے کہ اس کے مقابلہ میں صرف عددی طاقت ہی نہیں بلکہ مادی طاقت بھی آتی ہے جب کسی آبادی میں داعیٔ حق کھڑا ہوتا تو وہاں کی مادی طاقت اس کو اپنے خلاف چیلنج محسوس کرتی ہے اور وہ خیال کرتی ہے۔

۱۵۲- کیا پھر وہ آدمی کہ مُردہ تھا ہم نے اُسے زندگی دی اور اس کے لیے ایک روشنی ٹھہرائی کہ اس کے اُجالے میں لوگوں کے اندر چلے پھرے اس شخص کی طرح ہو سکتا ہے جس کا حال یہ ہو کہ تاریکیوں میں گھرا ہوا ہے اور ان سے باہر نکلنے والا نہیں ہے۔ پہلے فرمایا کہ شیاطین اپنے رفقاء کے دل میں ڈالتے ہیں کہ وہ مسلمانوں سے جھگڑا کریں یعنی بحث و جدال، تلبیس و تلمیع اور وسوسہ اندازی کر کے ان کو طریق حق سے ہٹا دیں لیکن ان کو یہ ہوس خام اپنے دلوں سے نکال دینی چاہیے، وہ گروہ یا وہ شخص جو جہل و ضلالت کی موت سے مر چکا تھا پھر اس کو حق تعالیٰ نے ایمان و عرفان کی رُوح سے زندہ کیا اور قرآن کی روشنی عطا کی جسے وہ لے کر لوگوں کے ہجوم میں بے تکلف راہِ راست پر چل رہا ہے کیا اس کا حال اغوارِ شیطانی کے قبول کرنے میں ان اولیآء الشیطان جیسا ہو سکتا ہے جو جہالت و ضلالت کے اندھیروں میں پڑے ٹھوکریں کھا رہے ہیں جس سے نکلنے کی راہ نہیں پاتے کیونکہ وہ اسی ظلمت کو نور اور بُرائی کو بھلائی سمجھتے ہیں ایسا کبھی نہیں ہو سکتا [1]

اصل ارشاد میں آغاز او من کان میتا سے ہوا ہے ہمزہ استفہام یعنی سوالیہ فقرے کی علامت بن کر آیا ہے اس کے بعد واو عطف ہے لیکن واو سے پہلا فقرہ معلوم ہونے کی وجہ سے حذف کر کے دوسرا فقرہ ذکر کیا ہے یہ قرآن کا بلیغ اختصار ہے۔ سوالیہ فقرہ میں اس نوع کا اختصار عربی زبان میں از رُوئے بلاغت بہت جاندار ہوتا ہے۔ پورا فقرہ اس طرح ہے انتم مثلھم ومن کان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اہلِ ایمان کو مخاطب کر کے فرمایا ہے کہ کیا تم اے اہلِ ایمان ان شیطان جیسے ہو سکتے ہو اور کیسے ہو سکتے ہو دونوں کا ذرا تقابلی مطالعہ کرو۔

ایک طرف وہ اہلِ ایمان ہیں جن کو اللہ سبحانہٗ نے کفر و جہل کی موت سے نکال کر ایمان و علم کی زندگی عطا فرمائی ہے اور اس پر مزید انعام یہ کہ قرآن کی صورت میں ایک روشنی بخشی ہے جس سے وہ خود بھی منور ہیں اور دوسروں کے لیے اُجالے کا سامان بن رہے ہیں۔ اس طرح اس فقرے میں موت سے مراد کفر کی زندگی اور جہالت اور حق سے بے خبری ہے اور حیات سے مراد ایمان کی زندگی علم و ادراک اور حقیقت آگاہی ہے جو شخص حق اور باطل میں تمیز نہیں کرتا اور نہیں جانتا کہ حق کیا اور کدھر ہے وہ یقیناً اس لائق نہیں ہے کہ اسے زندوں میں شمار کیا جائے۔ مناطقہ کی زبان میں وہ حیوان ناطق ضرور ہے مگر حقیقت میں اسے انسانیت کی زندگی میسر نہیں ہے۔ اصل میں زندگی اس کی ہے جسے حق و باطل اور نیکی و بدی کا شعور ہو، اور نور سے مراد وہ کتاب ہے جسے اللہ تعالیٰ نے حق و باطل میں امتیاز اور حلال و حرام کی تفصیل کے لیے اتارا ہے۔ کتابِ الٰہی کے روشنی ہونے کا منشا ہی یہ ہے کہ اس سے خود ہی رہنمائی حاصل نہ کرے بلکہ لوگوں میں بھی اسے لے کر نکلے تاکہ جن میں استعداد ہو وہ بھی اس سے فائدہ اٹھائیں۔ روشنی چھپا کر رکھنے کی چیز نہیں ہوتی بلکہ اونچی جگہ سرِ راہ رکھنے کی چیز ہوتی ہے۔

ان کے مقابلے میں وہ اہلِ کفر ہیں جو کفر و جہل اور اوہام کی تہ بر تہ تاریکیوں میں بھٹک رہے ہیں اور ان سے نکلنے کا نام نہیں لیتے حیران و سرگرداں ہیں۔ ان کے بارے میں اللہ کا قانون یہی ہے کہ جو لوگ حق کی پذیرائی کے لیے تیار نہ ہوں اور غلط راہوں پر چلتے رہنے ہی کو ترجیح دیں وہ تاریکی ہی میں رہتے ہیں اور ان کو وہی اچھی لگتی ہے اس تمثیل کے پیش کرنے کا مقصود ایک طرف تو مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ تم ان شیاطین کی غوغا آرائیوں کی پروا نہ کرو تم کو خدا نے حیاتِ ایمانی اور نورِ قرآنی سے مالا مال کیا ہے تمہیں شعور نصیب ہو چکا ہے اور تم علم کی روشنی میں ٹیڑھے راستوں کے درمیان حق کی سیدھی راہ کو دیکھ رہے ہو۔

دوسری اس میں مسلمانوں کو یہ بھی بتایا گیا ہے کہ علمبردارِ حق ہونے کی حیثیت سے تمہاری ذمہ داری یہ ہے کہ تم کو خدا نے ایمان کی زندگی اور علم کا نور بخشا ہے تو تم اسے لے کر آگے بڑھو اور پوری کائناتِ انسانی کو ایمان کی زندگی اور علم کے نور سے مالا مال کر دو۔ علم و ایمان کا جو سرمایہ اللہ نے تمہیں دیا ہے اس کا حق یہ ہے کہ اسے اللہ کے بندوں تک پہنچا دیا جائے یمشی بہ فی الناس میں اس ذمہ داری کی طرف صاف اشارہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف سے کسی کو روشنی ملے تو اس کا حق یہ ہے کہ اس سے بھی فیض حاصل کرے اور لوگوں کو بھی اس کے فیضان سے متمتع ہونے کا سامان کرے۔ اگر دنیا

تاریکیوں میں بھٹک رہی ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ گر رہی ہے ٹھوکریں کھا رہی ہے اور تمہارے پاس روشنی موجود ہے تمہارا فرض ہے کہ گرنے اور بھٹکنے والوں کی مدد کرو۔ تمہارے پاس اگر علم و ایمان کا پانی ہے اور تم دیکھ رہے ہو کہ پوری شہری زندگی پیاسی تڑپ رہی ہے تمہارا فرض ہے کہ پیاسوں کو پانی پلاؤ۔

ایمان کی زندگی اور علم کی روشنی کو انسانوں میں لے کر چلنا کیا ہے اس کا مفہوم اور اس کی عملی شکل کیا ہے۔ اس سلسلے میں اصولاً اور مجملاً اتنا تو معلوم ہو چکا ہے کہ جس طرح حیات اور نور ایک متعین چیز ہے اسی طرح حیات اور نور کو لے کر چلنے کا مفہوم اور اس کی عملی شکل بھی متعین ہے اور یہ تعین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اسوہ کرتا ہے۔ تفسیر ماثور میں عبداللہ بن عباس سے موت سے کفر اور زندگی سے ہدایت، نور سے قرآن عزیز اور ظلمات سے کفر و ضلالت اور شرک و بدعات کی تاریکیاں مراد منقول ہے۔ اسی سے ان کو لے کر چلنے کا مفہوم بھی خود بخود سمجھ میں آرہا ہے کہ ایک مسلمان اپنی گفتار اور کردار میں غیر مسلموں کے لیے ایمان و ہدایت اور علم کی کھلی کتاب بن جائے اور ان کے لیے اسلام کی صداقت کے پا لینے میں کوئی معقول رکاوٹ نہ رہے۔ قرآن کی یہ تمثیل بتاتی ہے کہ صحابہ کرام نے اپنی زندگیوں میں اسلام کی حقانیت پر علم و عقل کی ایسی دلیلیں اور فطرت و وجدان کی ایسی شہادتیں مہیا کر لی تھیں جن سے ان کی سچائی شاہراہ عام پر آگئی تھی۔ قرآن نے توحید و رسالت اور فکر آخرت پر جس زور اور قوت سے اور جس ہمہ گیر انداز میں دلائل پیش کیے ہیں ان کی زندگیاں اس کا بھرپور عکس بن گئی تھیں۔ ان کی انفرادی اور پرائیویٹ زندگی سے لے کر ان کی اجتماعی اور پبلک لائف اس کی عملی مثال تھی۔ اگرچہ بتانے والوں نے اس کا مصداق ایمان کی حدود میں عمر بن الخطاب، حمزہ اور عمار بن یاسر اور کفر کے لیے ابوجہل کا نام لیا ہے لیکن جیسا کہ علامہ آلوسی نے فرمایا کہ قرآن میں تعبیر عمومی ہے اس لیے تخصیص کی کوئی وجہ نہیں ہے اس کا مطلب یہ ہی ہے کہ پوری جماعت اس کی مصداق تھی۔ یہ تمثیل بتا رہی ہے کہ صحابہ کرام کی جماعت انسانیت کا مثالی نمونہ تھی۔ ایمان و علم کے یہ بہترین اور مثالی نمونے صحابہ کے حالات میں اس کثرت سے ملتے ہیں کہ اگر انہیں کوئی مورخ یا ادیب یا نفسیات و اخلاق کا کوئی عالم جمع کرے اور ان سے ایک جامع اور منفرد شخصیت تیار کرے تو انسانی سیرتوں میں ایک ممتاز سیرت و شخصیت تیار ہو جاتی اور انسانیت کے عظیم مرقع اور انسانیت کی عالمی تاریخ کی جلوہ گاہ میں ایک حسین ترین پیکر کا اضافہ ہو جاتا۔ قرآن کی یہ تمثیل بزبان حال بتا رہی ہے کہ اس وقت تمام لوگ نہایت مسخ شدہ موت نما زندگی گزار رہے تھے۔ ہر وہ ہستی جو ان کے لیے وجود میں لائی گئی تھی اور جو ان کے تصرفات کے تابع تھی، امر و نہی، جزا و سزا کی طاقت سے محروم تھی۔ اس کی وہ پرستش کرنے لگے تھے وہ بالکل ایک سطحی اور عام قسم کی مذہبیت رکھتے تھے جس کا زندگی میں کوئی اثر اور ان کے طبائع اور

ارواح و قلوب پر کوئی اقتدار نہ تھا۔

اخلاق و معاشرت اس مذہبیت سے ذرا متاثر نہ تھے۔ اللہ تعالیٰ کی ہستی ان کی نگاہوں میں ایسی ہے جیسا کہ ایک کاریگر اپنا کام پورا کرکے کنارہ کش اور گوشہ نشین ہوگیا ہو۔ ان کے خیال میں اللہ تعالیٰ نے اپنی مملکت ان لوگوں کے حوالے کردی تھی جن کو اس نے خلعتِ ربوبیت سے سرفراز کیا تھا۔ اب وہ حکومت پر قابض اور سیاہ سفید کے مالک تھے لیکن زندگی کا کہیں نام و نشان نہ تھا۔ مذہب کے نام پر صرف چند بے روح رسمیں اور ایمان کی بے جان نقلیں عرب میں رہ گئی تھیں۔ ہر طرف تاریکی ہی تاریکی تھی۔ قرآن آیا اور عرب قوم اس بیمار، غیر واضح اور بے جان معرفت سے نکل کر ایک ایسے واضح اور عمیق عقیدے تک پہنچ گئی جو قلب و نفس و جوارح پر قابو یافتہ تھا۔ معاشرت کو متاثر کرنے والا زندگی اور متعلقات پر حاوی تھا۔ وہ لوگ اس خدائے قدوس پر ایمان لاتے جس کے بہترین نام ہیں جس کی شان سب سے اونچی ہے جو اس کارخانہ عالم کا پیدا کرنے والا بھی ہے اور چلانے والا بھی، جس کے قبضۂ قدرت میں تمام عالم کی باگ ڈور ہے جو پناہ دیتا ہے۔ جنت اس کا انعام اور دوزخ اس کی سزا ہے۔

اس گہرے، وسیع اور واضح ایمان سے ان لوگوں کی نفسیات عجیب طرح سے تبدیل ہوگئیں جب بھی کوئی کفر کی گود سے نکل کر آتا اور ایمان لاتا اور شہادتین کا اقرار کرتا۔ اقرار کے ساتھ اس کی زندگی میں عظیم انقلاب رونما ہوتا۔ ایسا انقلاب جیسے موت اور حیات کا ظلمت و نور کا انقلاب ہوتا ہے ایمان اس میں پیوست ہوجاتا یقین رگ و ریشہ میں سرایت کر جاتا اور اس کے جسم میں خون اور روح کی طرح دوڑ جاتا۔ کفر کے جراثیم کو ختم کر دیتا اوہام کی ظلمتیں چھٹ جاتیں۔ دل و دماغ ایمان کے فیضان سے معمور ہوجاتے اور وہ شخص پہلا آدمی نہ رہتا۔ پہلے وہ مردہ تھا اب زندہ ہوتا، پہلے بے راہ تھا اب راہ رو ہوتا، پہلے وہ ضلالت کی اندھیریوں میں تھا اب وہ ہدایت کی روشنی میں ہوتا۔ اس سے صبر و شجاعت، ایمان و یقین کے ایسے حیرت انگیز واقعات رونما ہوتے کہ عقل دنگ رہ جاتی اور فلسفہ و تاریخ انگشت بدنداں ہوکر رہ جاتے

عامل کے لیے اعمال کی تزئین

۱۵۳- اسی طرح کافروں کی نظر میں وہی باتیں خوشنما دکھائی دیتی ہیں جو وہ کرتے تھے۔ اصل ارشاد میں کذالک آیا ہے اس کے معنے ایسے ہی اور اسی طرح کے ہیں۔ پوری بات یوں ہے کہ جیسے اللہ نے تمہارے دلوں میں نورِ ہدایت کو مزین کردیا ہے ایسے ہی کافروں کے لیے کفر و ضلالت پر مبنی اعمال کو مزین کردیا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کے سامنے روشنی پیش کی جاتی اور وہ اس کے قبول کرنے سے

انکار کر دیں۔ جنہیں راہِ راست کی طرف دعوت دی جائے اور وہ اپنے ٹیڑھے راستوں پر چلتے رہنے کو ترجیح دیں، ان کے لیے اللہ کا قانون یہی ہے کہ پھر ان کو تاریکی ہی اچھی معلوم ہونے لگتی ہے۔ وہ اندھوں کی طرح ٹٹول ٹٹول کر چلنا اور ٹھوکریں کھا کھا کر گرنا ہی پسند کرتے ہیں۔ ان کو جھاڑیاں ہی باغ اور کانٹے ہی پھول نظر آتے ہیں۔ انہیں ہر بدکاری میں مزہ آتا ہے۔ ہر حماقت کو وہ تحقیق سمجھتے اور ہر فساد انگیز تجربے کے بعد اس سے بڑھ کر دوسرے فساد انگیز تجربے کے لیے وہ اس امید پر تیار ہو جاتے ہیں کہ پہلے اتفاق سے دہکتے ہوئے انگاروں پر ہاتھ پڑ گیا تھا تو اب کے لعل بدخشاں ہاتھ آجائے گا۔ [1]

منشا یہ بتانا ہے کہ یہاں قانون یہی ہے کہ جو جس دُھن میں لگ جاتا ہے اس کو وہی اچھا اور خوشنما معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہاں زُیِّنَ فعل مجہول لایا گیا ہے کیونکہ مشبہ بہ میں دونوں احتمال ہیں، پہلا تو بتایا جا چکا ہے کہ جیسے مومن کے لیے ایمان کو مزین کیا گیا ہے ایسے ہی کافر کے لیے اس کے کفر کو سجا دیا ہے اور دوسرا یہ کہ جیسا کہ کافروں کے کفر کو سجایا جاتا ہے ایسا ہی ان کے لیے کفر و ضلالت کے سارے اعمال کو سجایا گیا ہے خالق تو ہر چیز کا اللہ ہی ہے لیکن کافروں کے لیے کفر کی تزئین شیطان وسوسہ اندازی کے ذریعے کرتا ہے ابلیس کا دعویٰ قرآن میں نقل کیا گیا ہے لا زیّنن فی الارض، اسی تمثیل کی مزید وضاحت آگے آرہی ہے۔

حق و باطل کی آویزش کا قانون

۱۲۴- اور اسی طرح ہم نے ہر بستی میں اس کے بدکردار لوگوں کو سردار بنا دیا تاکہ وہاں مکر و فریب کے جال پھیلائیں اور فی الواقع وہ مکر و فریب نہیں کرتے مگر اپنے ہی ساتھ لیکن ان کو اس کا شعور نہیں ہے۔

یعنی کچھ آج رؤسائے مکہ ہی نہیں ہمیشہ کافروں کے سردار حیلے نکالتے رہے ہیں تاکہ عوام الناس پیغمبر دل کے مطیع نہ ہو جائیں جیسے فرعون نے معجزہ دیکھا تو حیلہ نکالا کہ سحر کے زور سے سلطنت لینا چاہتا ہے لیکن ان کے یہ حیلے اور پیچ داؤ بحمد اللہ پکے ایمانداروں پر نہیں چلتے۔ حیلہ کرنے والے اپنی عافیت خراب کر کے خود اپنا ہی نقصان کرتے ہیں جس کا احساس انہیں اس وقت نہیں ہوتا۔ [2]

اصل ارشاد میں یہاں بھی کذالک آیا ہے اس کے معنے ہیں اور ایسے ہی، یہ سنتے ہی ذہن میں یہ سوال آتا ہے کہ کیسے؛ اس کیسے کے جواب میں شارحین قرآن کی تین آرائیں ہیں۔ عموماً تو ان حالات ہی سے اس کا جواب دیا گیا ہے جن احوال و ظروف میں اس پوری سورت کا نزول ہوا ہے اور بتایا ہے کہ جیسے ہم

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

مکہ والوں کے اکابر مجرمین کو داعی کا مقابلہ کرنے کے لیے مکہ میں مکر و فریب اور سازشوں کا موقعہ دیا ہے ایسے ہی ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرمین کو اس کام پر لگا دیا ہے کہ اپنے مکر و فریب کے جال پھیلائیں۔ اور کچھ کی رائے میں اس کا جواب پہلی آیت میں ہے اور پوری بات اس طرح ہے کہ جیسا کہ کافروں کے لیے ان کے اعمال مزین ہوتے ہیں ایسے ہی ہم نے ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے جرائم پیشہ لوگوں کو اس کام پر لگایا ہے کہ داعی حق کے خلاف سازشیں کریں۔ گویا پہلا جواب قرینہ حالیہ سے اور دوسرا جواب قرینہ لفظیہ سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور کچھ نے اس سوال کا جواب دونوں کی مدد سے تیار کیا ہے اور بتایا ہے کہ جیسے اہل مکہ کے اعمال ان کے لیے مزین ہوتے ہیں ایسے ہی ہم ہر بستی میں اس کے بڑے بڑے مجرمین کو اس مہم پر لگا دیا ہے کہ انسانی زندگی میں ہمارے قانون کے مطابق داعی حق کا مقابلہ کریں۔

یاد رہے کہ جعلنا، ہم نے کر دیا، لگا دیا سے مراد حکم طبعی اور قانون تکوینی ہے۔ یعنی قدرتی طور پر ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے کہ جب کسی قوم کی شامت آنے والی ہوتی ہے تو اس کے اکابر جرم پیشہ ہو جاتے ہیں اور یہ جرم پیشہ اکابر دعوت حق کا اپنی چالبازیوں اور عیاریوں سے مقابلہ کرتے ہیں۔

دراصل جس حقیقت پر اس آیت میں متنبہ کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ دعوت حق کا مقابلہ جو چیز کرتی ہے وہ اونچے طبقہ کے جرم پیشہ طبقہ کی مقاومت ہے۔ لفظ اکابر یہاں اکبر کی جمع ہے۔ امام مجاہد اور قتادہ نے اس کی تفسیر عظماء سے کی ہے یعنی سردار اور زعماء قوم۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ ہر دور میں اور ہر قوم میں جب کوئی داعی حق دعوت لے کر کھڑا ہوتا ہے تو قوم کے سردار، زعماء، حکمران اس دعوت حق کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اور اس مقابلہ میں اکثر حق کے خلاف قسم قسم کی سازشوں کا جال بنتے ہیں۔ چونکہ انبیاء کی دعوت کو وہ اپنی جاہ و اقتدار اور اپنی حکومت کے خلاف چیلنج سمجھتے ہیں اس لیے نبوت کی آواز کو دبانے کے لیے ہر ممکن سازش کرتے ہیں۔

اس تعبیر کے انداز میں لفظ جعل کے مفعول کے بارے میں شارحین قرآن کی دو رائیں ہیں۔ کچھ کا خیال ہے اکابر مجرمیھا اس کا ایک ہی مفعول ہے۔ اور کچھ کی رائے میں اکابر مجرمیھا الگ الگ دو مفعول ہیں قاضی بیضاوی نے دو مفعول بتاتے ہیں ایک اکابر مفعول ہے اور ایک مجرمیھا ہے مگر اصل میں مفعول اول مجرمیھا ہے اور اکابر مفعول ثانی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے بستی کے مجرمین کو بستی کا بڑا بنا دیا ہے۔ امام رازی نے اسی کو ترجیح دی ہے اور کچھ کے خیال میں اکابر مجرمیھا مفعول ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے بستی کے بڑے جرم پیشہ لوگوں کو ہر بستی میں موقعہ دیا ہے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ اس عبارت میں فی کل قریۃ کا تعلق جعلنا سے ہے اور اکابر مجرمیھا مفعول اول اور لیمکروا دوسرا مفعول ہے اور مطلب یہ ہے کہ ہم نے ہر بستی میں

بستی کے بڑے بڑے جرائم پیشہ لوگوں کو مکر و فریب کرنے کو لگا دیا ہے اور آلوسی نے شیخ الاسلام سے ایک لطیف بات یہ نقل کی ہے کہ اس فقرے میں کذالک مفعول ثانی ہے اسے جعلنا سے پہلے خصوصیت کی خاطر لایا گیا ہے اور اکابر مجرمیہا مفعول اول ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان ہی جیسوں کو ہم نے ہر بستی میں اکابر مجرمین بنایا ہے تاکہ بستی میں داعی حق کے خلاف مکر و فریب کا جال پھیلائیں۔ لیکن علامہ آلوسی نے اسے پسند نہیں کیا ہے :

مکر کے معنے اصل میں کسی شخص کے کام میں گفتار و کردار کے ذریعہ لطیف حیلہ سے رکاوٹ ڈالنے کے ہیں۔ منشا یہ ہے کہ دعوتِ حق کے مخالفین اس دعوت کی مخالفت میں جو ایڑی چوٹی کا زور صرف کر رہے ہیں یہ کوئی انوکھا واقعہ نہیں ہے۔ ہر ملک میں، ہر قوم میں جب بھی دعوتِ حق بلند ہوئی ہے وہاں جو مادہ پرست لوگ غلط نظامِ زندگی کے علمبردار ہوتے ہیں اور جن کا اس نظامِ زندگی سے مفاد وابستہ ہوتا ہے اسی طرح اپنی تمام چالوں کے ساتھ اس کو دبانے کے لیے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ اپنی سنت کے مطابق ان کو بھی ایک خاص وقت تک ڈھیل دیتا ہے۔

آج بھی دعوتِ حق اس کے داعیوں اور مصلحین کے ساتھ مادہ پرستوں اور حق کے مخالفوں کا یہی حال ہے حق کے خلاف مصنفین، اہلِ قلم اور اہلِ دماغ گروہ اپنی جادو بیانی، سحر طرازی اور زورِ خطابت سے پورے ملک میں ایک عام بغاوت برپا کر دیتے ہیں اور باطل کو نہایت دلفریب بنا کر پیش کرتے ہیں۔ حق کے خلاف غیظ و غضب کا جذبہ بھڑکاتے ہیں اور بس۔

یہی حال ہر باطل کا ہے خواہ اس کا نام کچھ ہو، اسلامی نظام کے مقابلے میں سرمایہ دارانہ نظام یا اشتراکی نظام، توحید کے مقابلے میں شرک ہو یا سنت کے مقابلے میں بدعت ہو، اور بالآخر آخرت کے مقابلے میں دُنیا ہو۔

بہرحال اس آیت نے یہ رہنما اصول ہمیں بتایا ہے کہ جب کسی آبادی میں کوئی داعی حق کھڑا ہوتا ہے تو وہاں کے اکابر و عظما جو پورے معاشرے کو جرائم میں مبتلا کیے ہوتے ہوتے ہیں وہ محسوس کرتے ہیں کہ اگر دعوتِ حق کامیاب ہو گئی تو ان کے ظالمانہ اختیارات کا خاتمہ ہو جائے گا اس لیے انہیں ایک طرح کی ذاتی دشمنی اور کد ہو جاتی ہے۔ وہ طرح طرح کی مکاریاں کرتے ہیں تاکہ لوگ دعوتِ حق قبول نہ کریں۔

آخر میں فرمایا وما یمکرون یعنی وہ تو دعوتِ حق کے خلاف مکاریاں کرتے ہیں لیکن یہ مکاریاں ان ہی کے خلاف پڑتی ہیں۔ حق کی مخالفت کرنے والے حق کو نہیں بلکہ اپنے آپ کو تباہ کرتے ہیں لیکن چونکہ ان کے سامنے اس کا انجام نہیں ہوتا اس وجہ سے ان کو اس کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ فقرہ ایک حیثیت میں

اہل ایمان کے لیے تسلی کا پیغام ہے اور ایک حیثیت میں دعوتِ حق کے مخالفین کے لیے بہت بڑی دھمکی ہے اور ایک اجتماعی قانون کی طرف اشارہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ جرائم پیشہ روساؔ اور عظماؔ اپنے نشۂ اقتدار میں انبیاءؑ اور علمبردارانِ حق کے خلاف جو طرزِ عمل، غیظ و غضب اور مکر و فریب کا اختیار کیے ہوتے ہیں اس کے نتائج سے یہ خود ہی دوچار ہوں گے، دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی۔ دُنیا میں اس طرح کہ ہم انبیاءؑ کی مدد کریں گے اور مخالفین کو ہلاک کریں گے۔ حق کا بول بالا ہوگا اور باطل مٹ کر رہے گا۔ قرآن میں دوسرے موقعہ پر ہے ولا یحیق المکر السیئ الا باھلہ۔ یہ حق و باطل کی آویزش کا مسئلہ ہے اور باطل کے مقابلہ میں سربلندی حق کے لیے ہے۔

وَإِذَا جَآءَتْهُمْ اٰيَةٌ قَالُوْا لَنْ نُّؤْمِنَ حَتّٰى نُؤْتٰى مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ رُسُلُ
اللّٰهِ ۘ اَللّٰهُ اَعْلَمُ حَيْثُ يَجْعَلُ رِسَالَتَهٗ ۗ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا وقف لازم وقف لا
صَغَارٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعَذَابٌ شَدِيْدٌ بِمَا كَانُوْا يَمْكُرُوْنَ ﴿١٢٤﴾ فَمَنْ
يُّرِدِ اللّٰهُ اَنْ يَّهْدِيَهٗ يَشْرَحْ صَدْرَهٗ لِلْاِسْلَامِ ۚ وَمَنْ يُّرِدْ اَنْ
يُّضِلَّهٗ يَجْعَلْ صَدْرَهٗ ضَيِّقًا حَرَجًا كَاَنَّمَا يَصَّعَّدُ فِي السَّمَآءِ ۭ
كَذٰلِكَ يَجْعَلُ اللّٰهُ الرِّجْسَ عَلَى الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٢٥﴾
وَهٰذَا صِرَاطُ رَبِّكَ مُسْتَقِيْمًا ۭ قَدْ فَصَّلْنَا الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّذَّكَّرُوْنَ ﴿١٢٦﴾
لَهُمْ دَارُ السَّلٰمِ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَهُوَ وَلِيُّهُمْ بِمَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٢٧﴾

اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں ہم ہرگز ایمان نہ لائیں
گے جب تک ہمیں ویسی ہی بات نہ ملے جیسی اللہ کے رسولوں کو مل چکی ہے[۱۵۵]
اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس جگہ اور کہاں اپنی رسالت بنائے جو لوگ
جرم پیشہ بن چکے ہیں عنقریب ان کو خدا کے حضور میں ذلت و حقارت

سے دوچار ہونا پڑے گا اور ان کو اپنی مکاریوں کی پاداش میں سخت عذاب بھگتنا ہوگا[156]۔ لہٰذا جس کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت سے نوازے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے[157]۔ اور جس پر راہ گم کردینی چاہتا ہے اس کے سینہ کو اس طرح تنگ کردیتا ہے گویا بلندی پر چڑھ رہا ہو[158]۔ اسی طرح اللہ ان لوگوں پر عذاب روانہ کرتا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے ہیں[159] اور یہ اسلام کی راہ تمہارے پروردگار کی سیدھی راہ ہے، بلاشبہ ہم نے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت پر دھیان دینے والے ہیں نشانیاں کھول کر بیان کردی ہیں[160]۔ ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ہے اور ان کے اعمال کے سبب اللہ ہی ان کا مددگار اور رفیق ہے[161]۔

معانی مفردات

رسالۃ: پیغام ارسال سے اسم ہے، اس کے معنے پیغام اور خط کے آتے ہیں۔ رسالت کی شرعی تعریف علامہ سعدالدین تفتازانی نے ان الفاظ میں کی ہے ھی سفارۃ العبد بین اللہ

وبین ذوی العقول من خلیقتہ لیزیح بہا علتہم فیما قصرت عنہ عقولہم من مصالح الدنیا والآخرۃ ۔ رسالت اللہ اور اس کی مخلوق عقل والی کے درمیان بندے کا سفیر بن کر آنا ہے تاکہ اس کے ذریعے ان کی ان بیماریوں کو دور کرے جن میں ان کی عقلیں دنیا و آخرت کی مصالح کے ادراک سے عاجز ہیں ۔ صغار، ذلت اور رسوائی ۔ دو لفظ ہیں ایک صغار اور دوسرا صِغَر بروزن عِنَب دونوں کے معنے ذلت کے ہیں لیکن دونوں میں فرق ہے صغار معنوی حالات یعنی مراتب کے لیے اور صغر مادی اور حسی کے لیے استعمال ہوتا ہے ۔ صاغر کی امام راغب نے تشریح یہ کی ہے وہ شخص جو کمتر مرتبہ پر خوش ہو ۔ یشرح، کھولتا ہے ، شرح سے مضارع کا واحد ہے اصل میں شرح کے معنے گوشت وغیرہ کے پھیلنے کے ہیں ۔ شرح صدر کا مطلب سینہ کا نور الٰہی سے کشادہ ہونا اور اللہ تعالیٰ کی طرف سے تسکین پانا ہے ضیقا ، ضاق یضیق سے صفت مشبہ کا صیغہ ہے تنگ ۔ امام راغب لکھتے ہیں ضیق سعۃ وسعت اور کشادگی کی ضد ہے اور دونوں طرح بولا جاتا ہے ضاد کے زیر اور زبر کے ساتھ اسی سے ضائق بہ صدرک اور یضیق صدری ہے اور اسی سے ضیقا حرجا تنگ ہے نہایت تنگ آیا ہے حرجا ۔ تنگ مضائقہ ، گناہ ، تنگی ۔ اصل میں حرج کے معنے کسی چیز کے مجتمع ہونے کی جگہ کے ہیں ۔ بہت سے گھنے درخت جو باہم گڈمڈ ہوں کہ ان میں جانا دشوار ہو حرج کہلاتے ہیں ۔ حضرت عمرؓ نے بنی مدلج کے ایک شخص سے حرج کے معنے دریافت کیے ۔ اس نے بتایا کہ وہ درخت جو درختوں کے درمیان ہو ، چرند اور درند کی اس تک رسائی نہ ہو ۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا ایسے ہی منافق کا دل بھی ہوتا ہے کہ اس تک خیر کی رسائی نہیں ہوتی ۔ رجس ، ناپاک ، پلید ، گندہ ، عقوبت ، عذاب ، بلا ، اس کی جمع ارجاس آتی ہے ۔ رجس کی چار صورتیں ہیں ۔ اول طبیعت کی رو سے دوم از روئے عقل ، سوم بتقاضائے شریعت ، چہارم ان تینوں وجہ سے ۔ رجس شرعی جوا ، شراب ، رجس عقلی شرک لحم خنزیر اور تینوں کا مجموعہ مردار ہے ۔ صراط ، راہ ، راستہ سیدھے اور آسان راستہ کو صراط کہتے ہیں ۔ یاد رہے کہ صراط اصل میں سراط ہے اس میں س کا ص سے قلب ہے تاکہ اطباق میں طا کے مطابق ہو جائے ۔ سرط الطعام کے معنے کھانا نگلنے کے ہیں ۔ سراط میں اس کا تصور ہے کہ راہ رو راستہ کو نگلتا ہے یا راستہ راہ گیر کو نگلتا ہے ۔

ہدایت وضلالت کا راز

ہدایت وضلالت کا راز بھی ایک بڑا ہی عجیب راز ہے۔ پہلے بتایا تھا کہ انسانی زندگی میں اللہ کی سنت یہی ہے کہ ہر قوم، ہر ملک اور ہر دور میں مجرم پیشہ لوگ امامت اور قیادت کے منصب پر گامزن ہوتے ہیں اور یہی انبیاء و رسل کا مقابلہ کرتے ہیں۔ اب یہ بتانا چاہتا ہے کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں جبکہ حق بے بسی اور بے کسی کی حالت میں ہو اور باطل پوری قوت و طاقت سے مسلح ہو۔ قبولِ حق اور انکارِ حق کا ضابطہ کیا ہے ایک ہی بات ہے جو ہزاروں آدمیوں کے سامنے کہی جاتی ہے مگر کوئی اس کی طرف توجہ ہی نہیں کرتا۔ کوئی توجہ کرتا ہے مگر وہ اس کے پردہ گوش پر سے اچٹ کر چلی جاتی ہے کوئی اس کو سنتا اور سمجھتا ہے مگر مانتا نہیں کوئی اس کی تعریف و تحسین کرتا ہے مگر قبول و تسلیم نہیں کرتا اور کسی کے دل میں وہ گھر کر جاتی ہے اور وہ اس کی صداقت پر ایمان لے آتا ہے۔ ہمارا روزانہ کا مطالعہ ہے کہ ایک شخص کو بازار میں چوٹ لگ کر گرتے ہوئے سینکڑوں آدمی دیکھتے ہیں۔ بہت سے اس کو ایک معمولی واقعہ سمجھ کر دیکھتے ہوئے گزر جاتے ہیں بہتوں کے دل میں رحم آتا ہے مگر وہ افسوس کرتے ہوتے آگے بڑھ جاتے ہیں۔ بہت سے اس کا تماشہ دیکھتے ہیں اور کچھ اللہ کے بندے ایسے آتے ہیں جو بڑھ کر اسے اٹھاتے ہیں اس سے ہمدردی کرتے ہیں اس کی امداد کی کوشش کرتے ہیں۔

یہ مختلف لوگوں کی مختلف نفسی کیفیات و تاثرات ہیں جن کا اختلاف زیادہ تعجب خیز نہیں ہے یہی حال ضلالت و ہدایت کا بھی ہے۔ ایک ہی قرآن تھا، ایک ہی تعلیم تھی، ایک ہی اس کو سنانے والی زبان تھی ابوجہل اور ابولہب تمام عمر اس کو سنتے رہے مگر کبھی ان کے کانوں سے آگے نہ بڑھ سکا۔ خدیجۃ الکبریٰ رضی اللہ عنہا، ابوبکر رضی اللہ عنہ، علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ، اور زید نے سنا، پہلے ہی لمحہ میں اس پر ایمان لے آتے بغیر اس کے کہ ان کے دل میں شائبہ گزرتا۔ عمر بن الخطاب نے بیسیوں بار سنا اور صرف یہی نہیں کہ تسلیم نہیں کیا بلکہ جوں جوں سنتے رہے مخالف ہوتے گئے لیکن ایک بار انہی کانوں نے اس کو سنا تو کان اور دل کے درمیان جس قدر آہنی دیواریں تھیں یکایک منہدم ہو گئیں اور ان پر ایسا اثر ہوا کہ ان کی زندگی کی کایا پلٹ گئی۔ ہر چند کہ نفسی نقطہ نظر سے اس اختلاف کیفیت اور اختلاف اثر و تاثر کی بہت سی توجیہیں کی جا سکتی ہیں وہ سب اپنی جگہ درست ہیں مگر اس سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ جو چیز چشم و گوش اور دل و دماغ کے درمیان کہیں ایک مستقل حجاب بن جاتی ہے کہیں ایک مدت تک حجاب بنی رہتی ہے اور ایک نفسی موقع پر خود بخود چاک ہو جاتی ہے کہیں سرے سے حجاب بنتی ہی نہیں۔ کہیں کسی بات کے لیے

محاب بنتی ہے اور کسی بات کے لیے نہیں بنتی وہ بالکل انسان کے ارادے و اختیار کے تابع نہیں ہے بلکہ فطری اور جبلی طور پر انسان میں خود بخود پیدا ہوتی ہے۔ یہی نکتہ ہے جسے ان آیات میں اس طرح بیان کیا گیا ہے۔

۱۵۵- اور جب ان کے پاس کوئی نشانی آتی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک ہمیں ویسی ہی بات نہ ملے جیسی اللہ کے رسولوں کو مل چکی ہے۔ ان کی مکاری اور متکبرانہ حیلہ جوئی کی ایک مثال یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے صدق کا جب کوئی نشان دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم ان دلائل و نشانات کو نہیں جانتے ہم تو اس وقت یقین کر سکتے ہیں جب ہمارے اوپر فرشتے نازل ہوں اور پیغمبروں کی طرح ہم کو ہی خدا کا پیغام سنائیں یا خود حق تعالیٰ ہمارے سامنے آجائیں۔

وقال الذین لا یرجون لقاءنا لولا انزل علینا الملائکۃ او نری ربنا لقد استکبروا فی انفسھم [1]

مطلب یہ ہے کہ جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت پر ان مشرکین کے سامنے جنہوں نے قسمیں کھا کر کہا تھا لئن جاءتھم اٰیۃ لیومنن بھا کوئی نشانی ظاہر ہوتی ہے تو یہ معاندین قریش یعنی اکابر مجرمین اور رؤساء ماکرین اور ان کی تقلید میں عوام کہتے ہیں کہ ان نشانیوں سے ہم کو تسلی نہ ہوگی اور ہم یقین نہ کریں گے جب تک گزشتہ پیغمبروں کی طرح خود ہم کو بھی وہی نشانیاں نہ دی جائیں جو امتوں کے پیغمبروں کو دی گئی ہیں۔ اصل ارشاد میں حتی نؤتیٰ مثل ما اوتی رسل اللہ آیا ہے۔ ابن جریر نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ ہم اس وقت تک ہرگز ایمان نہ لائیں گے جب تک آپ کے ہاتھ پر پہلے پیغمبروں جیسے معجزات کا ظہور نہ ہو جیسے حضرت موسیٰ کے لیے سمندر کا پھٹنا، حضرت عیسیٰ کے لیے مادر زاد اندھوں کا بینا، مردوں کا زندہ ہونا۔ اور حافظ ابن کثیر نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ ہم اس وقت تک رسالت و نبوت کو ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں جب تک ہمیں بھی وہ رسالت نہ ملے یعنی نبوت کے تمام آثار و کیفیات خود ہم پر طاری نہ ہوں تاکہ دھوکہ اور فریب کا کوئی شبہ نہ رہے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ اللہ نے ان کو رسول کیوں بنایا اور ہمیں کیوں نظر انداز کیا ہے۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ ابن جریر کے بیان کردہ مطلب میں ان کا مقصد دیگر معجزات کا مطالبہ ہے اور ابن کثیر کو شارحین قرآن کی رائے عامہ کی تائید حاصل ہے اور یہی قرآن کے سیاق و سباق کے مناسب ہے۔ گویا ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم پیغمبروں کے اس بیان کو ہرگز تسلیم نہ کریں گے کہ ان کے پاس فرشتہ آتا ہے اور خدا کا پیغام لایا ہے۔ ہم ان کی یہ بات صرف اس وقت مان سکتے ہیں جب کہ فرشتہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

خود ہمارے پاس آتے اور براہِ راست ہم سے کہے کہ یہ اللہ کا پیغام ہے۔ یہی بات قرآن نے ان کے مطالبہ کی صورت میں دوسرے مقام پر دہرائی ہے۔

و قالوا لولا انزل هذا القرآن علی رجل من القریتین عظیم

کہا یہ قرآن طائف اور مکہ کے کسی بڑے آدمی پر کیوں نہیں اُترا،

ظاہر ہے کہ یہ بات جو وہ کہتے تھے محض چالبازی کے طور پر کہتے تھے۔ اس سے مقصد محض اپنی کبریائی ریاست کے لیے ایک فریب کا پردہ فراہم کرنا اور رائے عامہ کو بیوقوف بنانا تھا۔ رائے عامہ مادہ پرستی کے دور میں دُنیا کے اسباب و وسائل کو بڑی چیز سمجھتی ہے۔ ان کی نظر میں جو دُنیا میں بڑا ہے وہ خدا کے نزدیک بھی بڑا ہوگا۔ یہ عوام کو پھانسنے کا اچھا نعرہ ہے۔

نبوت وہبی ہے کسبی نہیں

۱۵۶- اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کس جگہ اور کہاں اپنی رسالت بناتے جو لوگ جرم پیشہ بن چکے ہیں عنقریب ان کو خدا کے حضور میں ذلت وحقارت سے دوچار ہونا پڑے گا اور ان کو اپنی مکاریوں کی پاداش میں سخت عذاب بھگتنا ہوگا۔ یعنی یہ تو خدا ہی جانتا ہے کہ کون شخص اس کا اہل ہے کہ منصب نبوت پر سرفراز کیا جائے اور اس عظیم الشان امانتِ الٰہیہ کا حامل بن سکے یہ نہ کوئی کسبی چیز ہے کہ دُعا یا ریاضت یا دنیوی جاہ ودولت وغیرہ سے حاصل ہو سکے اور نہ یہ ہر کس و ناکس کو ایسی جلیل القدر اور نازک ذمہ داری پر فائز کیا جاسکتا ہے ہاں ایسے گستاخ، متکبر، حیلہ جو مکاروں کو آگاہ رہنا چاہیے کہ عنقریب اس معزز منصب کی طلب کا جواب ان کو سخت ذلت اور عذاب شدید کی صورت میں دیا جائے گا[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ منصب رسالت ایسی چیز نہیں ہے جو ہر کہ ومہ کو دے دیا جائے، یہ اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ یہ تاج وہ کس کے سر پر رکھے۔ یہ خلعتِ الٰہی اور تشریف آسمانی ہے یہ ان کو ارزانی ہوتی ہے جن کا انتخاب اللہ تعالیٰ فرماتے۔

اصل ارشاد اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ ہے اس سے بیک وقت دو باتیں معلوم ہو رہی ہیں ایک تو یہ کہ نبوت و رسالت ایک موہبت ربانی اور عطیہ الٰہی ہے جو صرف اسی کو عطا کیا جاتا ہے جس کو اللہ اس کے لیے منتخب فرماتے، دوسری بات یہ کہ اللہ اس کے لیے ان ہی کو منتخب فرماتا ہے جو اپنی

[1] افادات شیخ الاسلام

خوبیوں اور کمالات کے اعتبار سے نوعِ انسانی میں کمالِ انسانیت کے مظہرِ اتم ہوتے ہیں۔ پہلی بات تو سب کی جانی بوجھی ہے دوسری بات کی طرف امام رازی نے یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے کہ کم از کم جو چیز حصولِ نبوت کے لیے ناگزیر ہے وہ برائیوں مثلاً فریب، بدعہدی، کینہ اور حسد سے پاک ہونا اور نبوت کے مخاطبوں کا پرکھا ہوا لن نؤمن حتی نؤتی مثل ما اوتی رسل اللّٰہ مکر، غدر، حسد اور کینہ کا شاہکار ہے ان رذائل کی موجودگی میں نبوت کا خواب دیکھ رہے ہیں۔

دراصل نبوت کے کچھ لوازم اور خصوصیات ہیں ان میں سب سے پہلی چیز وہبی استعداد ہے۔ اس حقیقت سے کون انکار کرسکتا ہے کہ مختلف انسانوں میں مختلف قسم کی فطری استعدادیں پائی جاتی ہیں اور ان ہی کی طرف ان کا طبعی میلان ہوتا ہے اور جیسے جیسے وہ آگے بڑھتے جاتے ہیں ان کی استعداد اور میلان طبع کا جوہر برگ و بار پیدا کرنے لگتا ہے یہاں تک کہ خاص مقررہ مدت میں جاکر وہ پوری طرح ظاہر ہوجاتا ہے جس طرح ہر درخت سے آم کا پھل پیدا نہیں ہوسکتا بلکہ اسی سے ہوگا جس کو خدا نے آم کا درخت بنایا ہے۔ پھر آم کے درخت کے آثار خواص پھل، اس کا مزہ، اس کا رنگ و بو غرض جملہ خصوصیات خود اس درخت میں اسی وقت موجود ہوتے ہیں جب وہ ہنوز تخم کی صورت میں ہوتا ہے۔ وہی تخم پودا بنتا ہے، پودا بڑھتا ہے کونپل اور شاخیں پیدا کرتا ہے اور چند سال میں پھل دینے لگتا ہے لیکن اپنی ترقی کے ہر دور میں وہ اپنی مخفی خصوصیات وہی رکھتا ہے جو ایک دن آخر میں اس سے ظاہر ہونے والے ہیں اور اس پھل کی صفت ہمیشہ اس میں بالقوہ موجود تھی۔

اسی تمثیل کے مطابق یہ سمجھنا چاہیے کہ ہر انسان کوشش سے نبی نہیں ہوسکتا بلکہ وہی ہوسکتا ہے جس کو خدا نے نبی بنایا ہے اور نبوت کے یہ آثار، خواص، کیفیات اس میں بالقوہ استعداد کی صورت میں اسی وقت سے موجود رہتے ہیں جب وہ ہنوز آب و گل کے عالم میں ہوتا ہے۔ شاید حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس ارشاد کا

کنت نبیاً و آدم بین الماء والطین

میں اسی وقت نبی تھا جب آدم ہنوز آب و گل میں تھے

یہی مطلب ہے۔

انبیاء علیہم السلام کی سیرتوں پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ جب سے عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ وہ حسب و نسب اور سیرت و صورت میں ممتاز ہوتے ہیں۔ شرک و کفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں۔ اخلاقِ حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہوتی

ہے اور یہ تمہیدیں اس لیے ہوتی ہیں تاکہ منصب نبوت ملنے کے بعد ان کے دعوائے نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلان خاطر کا سامان پہلے سے موجود رہے۔ حضرت ابراہیم، حضرت اسماعیل، حضرت اسحاق، حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت سلیمان، حضرت یحییٰ، حضرت عیسیٰ اور حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات و واقعات قبل نبوت پڑھو تو آپ کو اس بات کی صداقت کا اعتراف کرنا پڑے گا۔ اسی بنا پر اہل حق کے مسلک کی قرآن کی یہ آیت سب سے زیادہ مستحکم دلیل ہے کہ نبوت محض فضل الٰہی ہے کسب سے ریاضت سے نہیں بلکہ موہبت سے ملتی ہے یہاں حافظ ابن کثیر نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے۔ یہ مطالبہ وہ لوگ کر رہے ہیں جن کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے فضل، شرف، نسب، تربیت، نشوونما گھر انہ کی صفائی ستھرائی اور پاکیزگی کا اقرار تھا جو آپ کو امین کہہ کر پکارتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کے مخاطب خانگی، نسبی اور ذاتی فضائل جانتے تھے اور ان کو اس کا اقرار تھا۔ ایک کا نہیں سب کا اقرار تاریخ میں موجود ہے اور آج بھی ہے۔ اس کے باوجود وہ کہہ رہے تھے کہ ہم تمہیں رسول اس وقت مانیں گے جب ہمارے پاس فرشتہ آئے اور خدا کا پیغام دے۔ قرآن نے جواب دیا کہ اللہ اعلم حیث یجعل رسالتہ منصب رسالت ایسی چیز نہیں ہے جس کا اہل ہر کہ و مہ بن جائے یہ تو اللہ ہی خوب جانتا ہے کہ نبوت کا تاج کس کے سر پر رکھے، یہ نبوت ہر ایک کا حصہ نہیں ہے۔ شرف رسالت کا ہر کس و ناکس نہیں ہو سکتا مرتبہ رسالت کے ظرف کا فیصلہ تمام تر اللہ کے ہاتھ میں ہے۔

آخر میں فرمایا سیصیب الذین اجرموا صغار اس میں نبوت کا مطالبہ کرنے والوں کو دھمکی ہے۔ فقرے کے شروع میں سین تاکید کے لیے ہے یعنی ان جرم پیشہ لوگوں کو اللہ کے ہاں ذلت و خواری ضرور لپیٹے گی صغار کے معنے ذلت و رسوائی کے ہیں اور اللہ کے پاس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں ان کو اس عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا یا عند اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے قانون تکوین کے مطابق ان کو منہ کی کھانی پڑے گی یعنی دنیا ہی میں ان کو یہ سزا مل کر رہے گی۔ اجرموا میں اگرچہ وہ تمام جرائم اور ان کی وہ ساری چالبازیاں شامل ہیں جن کے وہ مرتکب ہوتے لیکن یہاں خاص طور پر اس جرم کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جو انہوں نے لن نومن حتی نوتی الخ کہہ کر کیا ہے۔ اس کی پاداش میں ان کو ذلت اور عذاب شدید سے ہمدوش ہونا پڑے گا۔

اسلام کے لیے شرح صدر

۱۵۷۔ لہٰذا جس کو خدا چاہتا ہے کہ ہدایت سے نوازے اس کا سینہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے

یعنی جس میں اپنی فطری سلامتی اور طہارت نفس کی وجہ سے ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے کبر اور حسد جیسے رذائل سے پاک ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے ارادے میں اس کی اہلیت رکھتا ہے کہ قبول اسلام کے لیے اسے ہدایت دی جاتے اور ہدایت کی صورت یہ ہوتی ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے۔ اصل ارشاد میں یشرح صدرہٗ للاسلام آیا ہے۔ شرح کے لغوی معنے عربی زبان میں چیرنے پھاڑنے کے ہیں۔ اسی سے طب کی اصطلاح میں علم تشریح اور تشریح اجسام ہے۔ چونکہ چیرنے پھاڑنے سے اندر کی چیز کھل کر نمایاں ہوجاتی ہے اس لیے اس سے تشریح امر اور تشریح کلام شرح بیان اور شرح کتاب وغیرہ مجازی معنے پیدا ہوتے۔ اسی سے ایک محاورہ شرح صدر کا پیدا ہوا ہے جس کے معنے سینہ کھول دینے کے ہیں اور عربی زبان میں اس سے مقصود بات کا سمجھادینا ہوتا ہے۔ قرآن حکیم اور احادیث مبارکہ میں یہ محاورہ بکثرت استعمال ہوا ہے۔

نبوت کا علم وفہم انسانی تعلیم وتعلم اور مادی حکمت ودانائی سے پاک ومبرا ہوتا ہے اور وہ اپنے اخذ نتائج اور اثبات دعویٰ کے لیے گزشتہ تجربات اور منطق کے استقراء وتمثیل اور ترتیب مقدمات کے ممنون نہیں ہوتے بلکہ وہ جو کچھ جانتے ہیں اور جو کچھ سمجھتے ہیں اس کا ماخذ تعلیم الٰہی، القائے ربانی اور فہم ملکوتی ہوتا ہے۔ اسی کا نام علم لدنی ہے۔ صرف فہم وتمثیل کے لیے یہ سمجھنا چاہیے کہ کبھی کبھی شعراء، مصنفین، موجدین اور دیگر عقلاء کے ذہن میں بے غور وتامل ایک بات اس طرح آجاتی ہے کہ گویا معلوم ہوتا ہے کہ سینہ یا دماغ کا دروازہ یک بیک کھل گیا اور ایک چیز اندر داخل ہوگئی لیکن یہ شرح صدر کی نہایت معمولی مثال ہے۔ اس منصب خاص کے سینکڑوں مدارج ہیں جو انبیاء کو، اولیاء کو اور دیگر مومنین کو اپنے اپنے مرتبہ کے مطابق عطا ہوتے ہیں۔ اس آیت میں شرح صدر کا بالکل ابتدائی اور عوامی درجہ بتایا جارہا ہے۔ یعنی بلا حجت وبرہان اسلام کی صداقت اس کے سامنے آئینہ ہوجاتی ہے۔ اسلام کے لیے سینہ کھول دینے سے مقصود یہ ہے کہ اسلام کی حقیقت مؤثر طریقہ سے اس طرح کھل گئی کہ اس کو اسلام کی سچائی کا پوری طرح یقین ہوگیا اور اس کو اپنے اس یقین پر کامل تسکین ہوگئی۔ یہی شرح صدر کی حقیقت ہے۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر نے حضرت ابوبکر کو ان کی خلافت کے زمانہ میں مشورہ دیا اور اصرار کیا کہ قرآن مجید کو اوراق ومصاحف کی صورت میں لکھوا دیجیے، لیکن حضرت ابوبکر نے مخالفت کی کہ جو کام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے خود اپنی زندگی میں نہیں کیا وہ ہم لوگ کیوں کر کرسکتے ہیں۔ حضرت عمر کو اس پر اصرار اور حضرت ابوبکر کو انکار رہا مگر چند روز میں یک بیک ان کی سمجھ میں بات آگئی۔ اس موقعہ پر فرمایا حتی شرح اللہ صدری یہاں تک کہ خدا نے اس کام کے لیے میرا سینہ کھول دیا۔ حافظ ابن جریر نے متعدد صحابہ کے حوالہ سے بالخصوص حضرت عبداللہ

بن مسعود کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ آیت فمن یرد اللہ ان یھدیہ یشرح صدرہ للاسلام تلاوت فرمائی، صحابہ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ شرح صدر کیا ہے فرمایا کہ قلب میں ایک نور داخل ہوتا ہے جس سے سینہ کھل جاتا ہے۔ پھر سوال کیا کہ یا رسول اللہ اس کی نشانی کیا ہے؟ ارشاد ہوا حیات جاودیہ کے گھر کا اشتیاق اور فریب کدہ عالم سے دل برداشتگی اور موت سے پہلے موت کی تیاری۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ ارشاد نبوت متعدد طرق سے مروی ہے مرسل بھی اور متصل بھی۔

ارباب تصوف میں سے حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے التفہیمات الالٰہیہ میں شرح صدر پر تفصیلی کلام کیا ہے لیکن اس کا یہاں محل نہیں انشاء اللہ ۲۳ جلد میں ہم شاہ صاحب کے علوم سے اور ان کے علاوہ اس موضوع پر امام غزالی اور حافظ ابن القیم کے علوم سے بھرپور استفادہ کریں گے۔

ایمان قبول نہ کرنے کی علت

۱۵۸ - اور جس پر راہ گم کر دینی چاہتا ہے اس کے سینہ کو اس طرح تنگ کر دیتا ہے گویا بلندی پر چڑھ رہا ہو، اس میں ایمان نہ لانے کی وجہ بتائی جا رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حیلہ بازیاں اور سخن سازیاں تو محض ایک بہانہ ہیں، اصلی چیز جس کے باعث ان کو قبول اسلام کی سعادت نہیں ملی ہے وہ ان کے سینہ کی تنگی ہے۔ یہ ان کے سینہ کی تنگی ہے کہ ایمان و ہدایت کی اس میں گنجائش نہیں ہے۔ اسی تنگی کا نتیجہ ہے کہ حق بات کے سننے سے اسے ایسی تکلیف اور انقباض ہوتا ہے گویا وہ بلندی پر چڑھ رہا ہو اور اس کا سانس پھول رہا ہو کانما یصعد فی السماء تشبیہ سے مقصود اس تکلیف کا بتانا ہے جو اس کو اسلام لانے سے ہوتی ہے۔ اس آیت میں ان لوگوں کا چہرہ پیش کیا گیا ہے جو اپنی فطری استعداد کو شرک کی نجاست سے آلودہ کرنے کی وجہ سے قبول اسلام کی صلاحیت نہیں رکھتے ہیں۔ اسلام کے تصور سے بھی ان کا سینہ بھنچتا اور دم اکھڑتا ہے گویا ان کو ایک بلندی پر چڑھائی چڑھنی پڑ رہی ہے جن دلوں میں یہ نجاست رم جاتی ہے اللہ تعالیٰ ان کے سینے اسلام کے لیے تنگ کر دیتا ہے۔ اسلام کے لیے سینے ان کے ہی کھلتے ہیں جن کے سینوں میں اس قسم کی گندگی نہیں ہوتی ہے۔ یہ چیز چونکہ بالکل سنت الٰہی کے مطابق واقع ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے اسے اپنی طرف منسوب کر دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ضلال کا عمل وہاں رونما ہوتا ہے جہاں سینہ اس قدر زیادہ تنگ ہو جس میں کسی نئی چیز کے سمانے کی کوئی گنجائش نہ ہو۔ یعنی ایسی نئی چیز جو اس کے تقلیدی افکار و خیالات کے منافی ہو، جو اس کی قیادت کے لیے چیلنج ہو اور جو اس کی سیاست و امامت سے متصادم ہو، اس کو اپنانا اور قبول کرنا اس کو اتنا ہی دشوار ہو جتنا بلندی پر اپنے جسم کے بھاری بھرکم

بوجھ کو لے کر چڑھنا، یہ گویا اشارہ ہے کہ ایسے تنگ سینہ سے ایمان ایسا ہی ناممکن ہے جیسا آسمان پر چڑھنا ناممکن ہے لیکن جو امتناعِ عقلی نہیں بلکہ عادی ہے۔

ایمان وکفر میں اللہ کا ضابطہ

۱۵۹- اسی طرح اللہ ان لوگوں پر عذاب روانہ کرتا ہے جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ یعنی ایسے معاندین کو کفر و شرک کی نجاست اور گندگی اچھی معلوم ہوتی ہے اور دینِ حق کی خوشبو اُن کو بدبو معلوم ہوتی ہے حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ رجس سے مراد شیطان ہے کیونکہ رجس کے معنے گندا اور ناپاک کے ہیں۔ شیطان سے بڑھ کر گندا کون ہوگا۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ اسی طرح شیطان کو کافروں پر مسلط کر دیتا ہے کہ قبولِ حق کی کبھی توفیق ہی نہیں ہوتی۔ شیطان ان کو بُری باتوں پر ہی اُکساتا رہتا ہے۔ امام مجاہد نے رجس کے معنے ہر اس چیز کے بتاتے ہیں جس میں خیر کا کوئی تصور نہ ہو۔ عبدالرحمان بن زید بن اسلم نے رجس کو عذاب کے معنے میں لیا ہے۔ یہاں لا یومنون ہے اور دوسرے موقعہ پر لا یعقلون آیا ہے۔ منشا یہ ہے کہ ایمان کے بارے میں اللہ کا ضابطہ یہ ہے کہ جو شخص حقیقت کی تلاش میں بے لاگ طریقہ سے اپنی عقل کو ٹھیک ٹھیک استعمال کرتا ہے اس کے لیے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے حقیقت رسی کے اسباب و ذرائع اس کی سعی و طلب کے تناسب سے مہیا کر دیے جاتے ہیں اور اس کو صحیح علم پانے اور ایمان لانے کی توفیق دی جاتی ہے۔ رہے وہ لوگ جو طالبِ حق ہی نہیں ہیں اور جو اپنی عقل کو تعصبات کے پھندوں میں پھانسے رکھتے ہیں یا سرے سے تلاشِ حقیقت میں اسے استعمال ہی نہیں کرتے تو ان کے لیے اللہ کے خزانہ میں جہالت، گمراہی کی نجاست کے علاوہ کچھ نہیں ہے وہ اپنے آپ کو ان ہی نجاستوں کا اہل بناتے ہیں، گندگی اور نجاست ان ہی لوگوں کا حق ہے۔

اسلام ہی صراطِ مستقیم ہے

۱۶۰- اور یہ اسلام کی راہ تمہارے پروردگار کی سیدھی راہ ہے، بلاشبہ ہم نے ان لوگوں کے لیے جو نصیحت پر دھیان دینے والے ہیں نشانیاں کھول کر بیان کر دی ہیں۔ قرطبی اور بیضاوی نے ھذا کا مشار الیہ اسلام کو بتایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہی وہ اسلام ہے جس کے لیے اللہ سبحانہ اس شخص کا سینہ کھول دیتا ہے جسے اسے قبول کرنے کی توفیق دیتا ہے اور یہی تیرے اس پروردگار کا راستہ ہے جس نے تجھے اپنا رسول بنا کر روانہ کیا ہے اور جس نے تیرے سامنے اس سورت میں اس کے اصول و عقائد

دلائل و براہین سے بیان کر دیے ہیں۔ یہ سیدھا راستہ ہے اس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ ہر قسم کی افراط و تفریط سے پاک ہے اس کی مسند ارشاد عبادت گاہوں اور زندگی کے انفرادی دائروں ہی میں بچھی ہوئی نہیں ہے، بلکہ وہ بازاروں، کاروباری اداروں، معاشی میدانوں، تمدن کے دائروں، سیاست اور حکومت کے ایوانوں غرض کہ زندگی کے ایک ایک شعبہ میں ہدایتیں دیتا ہے۔ اس کے علاوہ سب راہوں میں کجی ہے یہی ایک سیدھی راہ ہے۔

مولانا عثمانی نے یہاں ایک جامع تبصرہ فرمایا ہے فرماتے ہیں :

جو لوگ ایمان لانے کا ارادہ نہیں رکھتے ان پر اسی طرح عذاب اور تباہی ڈالی جاتی ہے کہ رفتہ رفتہ ان کا سینہ اس قدر تنگ کر دیا جاتا ہے کہ اس میں حق کے گھسنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی ہے۔ پھر یہی ضیق صدر عذاب ہے جو قیامت میں بشکل محسوس سامنے آجائے گا۔ مولانا شیخ الہند نے رجس کا ترجمہ جو عذاب سے کیا ہے اس کے موافق یہ تقریر ہے۔ عبدالرحمان بن زید بن اسلم نے رجس کے معنے عذاب کے کیے ہیں۔ مگر ابن عباس نے رجس سے یہاں شیطان مراد لیا ہے شاید اس لیے کہ رجس ناپاک کو کہتے ہیں اور شیطان سے بڑھ کر کون ناپاک ہوگا۔ پھر اس تفسیر پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جس طرح خدا تعالیٰ ایمان سے گھبرانے والوں کا سینہ تنگ کر دیتا ہے اسی طرح ان پر بے ایمانیوں کی وجہ سے شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے کہ کبھی رجوع الی الحق کی توفیق نہیں ہوتی۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اول فرمایا تھا کہ کافر قسمیں کھاتے ہیں کہ آیت دیکھیں تو البتہ یقین لاویں اور اب فرمایا کہ ہم نہ دیں گے ایمان تو کیوں کر لائیں گے۔ بیچ میں مردہ حلال کرنے کے لیے حیلے نقل کیے اب اس بات کا جواب فرمایا کہ جس کی عقل اس طرف چلے کہ اپنی بات نہ چھوڑے جو دلیل دیکھے کچھ بات بنالے وہ نشان ہے گمراہی کا اور جس کی عقل چلے انصاف پر اور حکم برداری وہ نشان ہدایت ہے ان لوگوں میں نشان ہیں گمراہی کے ان پر کوئی آیت اثر نہ کرے گی[1]

یہ آیاتِ قرآنی علمائے کلام کے یہاں مہمات معارف میں سے ہیں۔ قدریہ، جبریہ، معتزلہ اور اشاعرہ سب نے اپنے اپنے مذاق اور اپنے اپنے طے شدہ اصولوں کے مطابق اس کی تشریح کی ہے۔ اسی بنا پر حضرت شیخ الاسلام نے لکھا ہے کہ :

یہ مسئلہ طویل الذیل اور معرکۃ الآراء ہے اس لیے ہمارا ارادہ ہے کہ اس پر ایک مبسوط مضمون لکھ کر فوائد کے ساتھ ملحق کر دیا جائے۔

میں یہاں کلامی اصطلاحات سے الگ رہ کر خالص قرآن کی روشنی میں اہل حق کا مسلک پیش کرتا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوں اور اللہ سے دعا کرتا ہوں ارنی الحق حقاً وارزقنی اتباعہ، اصل یہ ہے کہ ان آیات میں اس فطری کیفیت کو جو ایک حق بات کو سن کر اسے قبول کر لینے کے لیے اضطراری طور پر دل میں پیدا ہوتی ہے اور جو آخر کار انسان کو ایمان کی طرف کھینچ لاتی ہے خدائی ہدایت اور اس کے پیدا کرنے کو "شرح صدر" سے تعبیر کیا گیا ہے اور اس ہدایت کے برعکس انسان کے دل میں حق سے انکار اور اعراض کرنے پر آمادگی کی جو کیفیت پیدا ہوتی ہے اس کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے مسلط کی ہوئی گمراہی قرار دیا گیا ہے اور شرح صدر کے مقابل جو انقباضی کیفیت دل میں رونما ہوتی ہے اسے ضیق صدر سے تعبیر کیا گیا ہے۔ پھر اس ہدایت و ضلالت اور شرح صدر اور ضیق صدر کے پیدا ہونے کا سبب یہ بتایا ہے کہ انسان جب ایک مرتبہ خدا کی طرف متوجہ ہو جاتا ہے تو اس کو خود بخود وہ راستہ دکھائی دینے لگتا ہے جو اسے سیدھا خدا کی جانب لے جاتا ہے اور جو شخص سرے سے یہ احساس ہی نہیں رکھتا کہ مجھے خدا کے حضور میں حاضر ہونا اور اپنے قلب و جوارح کے افعال کا حساب دینا ہے اس کو لاکھ کوئی شخص کلمۂ حق سنائے اور وعظ و تلقین کرے کوئی بات اس کے دل میں نہیں اترتی اور وہ راہِ راست پر نہیں آتا۔

یہاں دو باتیں ہیں اور دونوں کو الگ الگ سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ایک طرف ہدایت و شرح صدر اور ضلالت و ضیق صدر کی کیفیت کو اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا ہے دوسری طرف اس ہدایت و شرح صدر کے عطا کرنے کے لیے یہ شرط لگائی ہے کہ انسان خدا کی طرف رجوع کرے اور ضلالت و ضیق صدر کے مسلط کر دینے کا یہ سبب بتایا گیا ہے کہ گمراہ شخص خدا کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور اس کے سامنے مسئول اور جواب دہ ہونے کا احساس نہیں رکھتا۔

ان دونوں چیزوں کے باہمی تعلق کو اس طرح سمجھو کہ انسان کی فطرت میں اللہ سبحانہ نے ایک ایسی قوت رکھ دی ہے جو اس کو حق و باطل میں تمیز اور صحیح و غلط کا فرق سمجھنے میں مدد دیتی ہے اور اس کے ساتھ ہی اسے حق کی طرف بڑھنے اور باطل سے احتراز کرنے پر مائل کرتی ہے۔ یہی قوت وہ فطری ہدایت ہے جسے اللہ سبحانہ اپنی طرف منسوب کرتا ہے فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیہا میں اسی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔ اس کے خلاف ایک اور قوت بھی انسان میں کام کر رہی ہے جو اس کو برائی کی طرف کھینچتی ہے۔ غلطی اور کج روی کی طرف مائل کرتی ہے اور جھوٹ اور باطل کو اس کے سامنے مزین کرتی ہے۔ ان دونوں کے ساتھ بہت سی خارجی اور داخلی قوتیں بھی ایسی ہیں جن میں سے بعض ہدایت کی قوت کو مدد پہنچانے والی ہوتی ہیں اور بعض ضلالت کی قوت کو۔ اکتساب علم اور اس کے مختلف مدارج تربیت اور اس کی مختلف کیفیات، سوسائٹی اور اس کے مختلف احوال یہ وہ چیزیں ہیں جو باہر سے

اس پر انداز ہوتی ہیں اور ترازو کے دونوں پلڑوں میں سے ایک میں اپنا وزن ڈالتی رہتی ہیں۔ اور انسان کا اپنا خیار تمیزی اپنی فہم و فراست، اپنی عقل و بصیرت، اپنے ذرائع اکتساب علم سے صحیح یا غلط کام لینا اور اپنی قوتِ فیصلہ کو بیجا یا بے جا استعمال کرنا یہ وہ چیز ہے جو خود اس کے ارادے کے تابع ہے اور جس سے وہ ہدایت اور ضلالت کی متضاد قوتوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔ اب ہوتا یہ ہے کہ خدا کی بخشی ہوئی ہدایت اور اس کی مسلط کی ہوئی ضلالت دونوں غیر محسوس طور پر اپنا عمل کرتی رہتی ہیں۔ ہدایت کی قوت اسے راہِ راست کی طرف لطیف اشارے کیا کرتی ہے اور ضلالت کی قوت اسے باطل کے ملمع پر چڑھاتے جاتی ہے مگر کبھی ایسا ہوتا ہے کہ انسان غلط اثرات سے متاثر ہو کر اور خود اپنی اختیاری قوتوں کو غلط طریقے سے استعمال کرکے ضلالت کے پھندے میں گرفتار ہو جاتا ہے اور ہدایت کی پکار پر کان ہی نہیں دھرتا۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ وہ غلط راستہ پر چل رہا ہوتا ہے اور اس دوران میں کچھ بیرونی اثرات اور کچھ خود اس کی اپنی عقل اور بصیرت دونوں مل جل کر اسے گمراہی سے بیزار کر دیتے ہیں اور اس وقت ہدایت کی وہی روشنی جو پہلے مدھم تھی دفعتہً تیز ہو کر اس کی آنکھیں کھول دیتی ہے۔ کبھی ایسا ہوتا ہے کہ ایک مدت تک انسان ہدایت اور ضلالت کے درمیان مذبذب رہتا ہے۔ قوتِ فیصلہ اتنی طاقتور نہیں ہوتی کہ بالکل کسی ایک طرف مائل ہو جائے، بعض بدقسمت اسی تذبذب کی حالت میں دنیا سے رختِ سفر باندھ لیتے ہیں۔ بعض کا آخری فیصلہ ضلالت کے حق میں ہوتا ہے اور بعض ایک طویل کشمکش کے بعد ہدایتِ الٰہی کا اشارہ پا لیتے ہیں۔ مگر سب سے زیادہ خوش قسمت وہ سلیم الفطرت صحیح القلب اور سدید النظر لوگ ہوتے ہیں جو خدا کی دی ہوئی عقل اس کی عطا کی ہوئی آنکھوں، اس کے بخشے ہوئے کانوں اور اس کی ودیعت کی ہوئی قوتوں سے ٹھیک ٹھیک کام لیتے ہیں۔ مشاہدات اور تجربات سے درست نتائج اخذ کرتے ہیں۔ آیاتِ الٰہی کو دیکھ کر ان سے صحیح سبق حاصل کرتے ہیں۔ باطل کی زینت ان کو رجھانے میں ناکام ہوتی ہے۔ جھوٹ کا فریب ان کو اپنا گرویدہ نہیں بناتا۔ ضلالت کی کج راہوں کو دیکھتے ہی وہ سمجھ لیتے ہیں کہ یہ آدمی کے چلنے کے قابل نہیں ہیں پھر جونہی وہ حق کی طرف رجوع کرتے ہیں اور اس کی طلب میں آگے بڑھتے ہیں حق ان کے استقبال کو آتا ہے ہدایت کا نور ان کے سامنے جھلکنے لگتا ہے اور بس۔

آئیے اب اسی سلسلے میں کچھ متکلمین کی بھی سنیے۔ قدریہ کہتے ہیں کہ اس آیت کا فیصلہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی کو ہدایت دینا چاہتے ہیں تو اس کے سینے میں اسلام کے لیے انشراح پیدا کر دیتے ہیں، لہٰذا اس کی اسلام کے لیے پذیرائی اللہ کی تخلیق سے ہوتی ہے اور اس تخلیق کا کوئی ضابطہ نہیں ہے۔ اور جبریہ کہتے ہیں کہ کسی شخص کا اسلام قبول کرنا اس کا اختیاری اور کسبی معاملہ نہیں ہے بلکہ صرف اللہ کا فعل ہے

اور اشعریہ کہتے ہیں ہے تو کسی کا اسلام اللہ کی تخلیق لیکن اس میں بندے کا کسب ہے مگر کسب میں تاثیر نہیں ہے اور معتزلہ اس کی چند در چند تاویلات کر کے آیت کا منہ بگاڑنے کی کوشش کرتے ہیں ان بزرگوں نے اس پر غور نہیں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کی کسی چیز کو اٹکل سے نہیں بلکہ ایک اندازے سے بنایا ہے۔ اس کائنات میں جو کچھ، جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے اللہ سبحانہ کی مشیت اور اس کے ارادے سے ہو رہا ہے اور اس کا ارادہ و مشیت کا رشتہ اس کی اس حکمت بالغہ سے وابستہ ہے جس کے تحت پوری کائنات ایک نظام اور تقدیر پر قائم ہے۔ انسان کا ایمان اس کا اختیاری کردار ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو ارادہ اختیار والی مخلوق بنایا ہے اس لیے انسان کا کوئی عمل اللہ کی تخلیق اور اس کی مشیت کے خلاف نہیں ہو سکتا اور نہ انسان اپنے ارادہ و اختیار میں اللہ سے مستغنی اور بے نیاز ہو سکتا ہے وہ ہر آن اور ہر لمحہ اپنے ارادہ و اختیار میں اللہ کی توفیق و امداد کا محتاج ہے۔

دراصل ان آیات میں ہدایت و ضلالت میں سنت الٰہی اور قانون بیان کر کے ان کو تسلی دی گئی ہے جن کی خواہش تھی کہ ان لوگوں کو معجزہ دکھایا جاتے جو قسمیں کھا کر کہہ رہے تھے لئن جاءتهم آية ليؤمنن بها ان کے سامنے ان آیات میں یہ واضح کی ہے کہ انسانی طبیعت و استعداد کا اختلاف فطری ہے اور خدا کی مشیت یہی ہوئی کہ یہ اختلاف ہو اگر وہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طرح کی طبیعت، ایک ہی طرح کی استعداد، ایک طرح کی فکری و عملی حالت پر مجبور کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں چاہا اس کی حکمت کا یہی فیصلہ ہوا کہ انسان میں ہر طرح کی حالت پیدا کرنے کی استعداد ہو اور ہر طرح کی راہ اس کے آگے کھول دے وہ اگر اونچا ہونا چاہے تو زیادہ سے زیادہ اونچا ہو جاتے اور پست ہونا چاہے تو زیادہ سے زیادہ پستی میں گر سکے اسی تنوع استعداد کا نتیجہ ہے کہ فکر و عمل کے ہر گوشہ میں مختلف حالتیں پیدا ہو گئیں، ایک فرد و جماعت کا ذوق ایک طرح کا ہوا دوسرے کا دوسری طرح کا ایک کی سمجھ ایک طرف گئی دوسرے کی دوسری طرف، ایک نے ایک راہ پسند کی کہ حق ہے دوسرے نے اس سے انکار کیا کہ حق نہیں ہے پھر اسی فکر و عمل کے اختلاف سے ہدایت و ضلالت کی وہ کشمکش پیدا کر دی جسے قرآن آزمائش حیات کہتا ہے ليبلوكم ايكم احسن عملا" علامہ مقبلی نے اس موضوع پر اپنی کتاب العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الآباء والمشائخ میں اور حافظ ابن القیم نے مفتاح دار السعادۃ اور شفاء العلیل فی مسائل القضاء والقدر والحکمۃ والتعلیل میں مبسوط بحث کی ہے۔ انشاء اللہ ہم بارہویں جلد میں ان کے علوم سے استفادہ کریں گے حضرت شاہ عبدالقادر نے اس مقام پر جو بات لکھ دی ہے وہ آب زر سے لکھنے کے لائق ہے۔ پہلے بھی آپ پڑھ آئے ہیں پھر تازہ کر لیجئے، فرماتے ہیں:

جس کی عقل اس طرف چلے کہ اپنی بات نہ چھوڑے جو دلیل دیکھے کوئی حیلہ بنائے وہ نشان ہے گمراہی کا اور جس کی عقل چلے انصاف پر اور حکم برداری پر وہ نشان ہے ہدایت کا ان لوگوں میں گمراہی کے نشان ہیں ان پر کوئی آیت اثر نہ کرے گی ۔

امن وسلامتی کا گھر جنت ہے

۱۶۱- ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس سلامتی کا گھر ان ہے اور ان کے اعمال کے سبب اللہ ہی ان کا مددگار اور رفیق ہے ۔ یعنی جو اسلام اور فرمانبرداری کے سیدھے راستہ پر چلے گا وہ ہی سلامتی کے گھر پہنچے گا اور خدا اس کا ولی و مددگار ہوگا ۔ یہ حال تو ان کا ہوا جن کا اللہ ولی ہے یعنی اولیاء الرحمان آگے اولیاء الشیطان کا حال بیان کیا جاتا ہے[1] ۔ یہ ان لوگوں کا صلہ بیان ہو رہا ہے جن کے سینے اللہ سبحانہ اسلام کے لیے کھول دیتا ہے ۔ فرمایا ان کے لیے اس اسلام کے قبول کرنے کے صلہ میں دار السلام ملے گا ۔ انسان امن و سلامتی کا بھوکا ہے لیکن وہ اس امن و سلامتی کو اسباب راحت کے انبار میں تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا ، وہ دُنیا میں امن کا گوشہ بلکہ امن و سلامتی کی ایک دُنیا ملے گی ، وہ پرندہ جو عمر بھر چار عناصر کے قفس میں گرفتار رہا ، یہاں وہ سدرۃ المنتہیٰ کی ہر شاخ پر آزادانہ پرواز کرے گا ۔ جنت کے قرآن نے اور بہت سے نام بتلاتے وہاں اس کا ایک نام دار السلام بھی بتایا ہے جس کے معنی امن و سلامتی کے گھر کے ہیں ۔ اللہ سبحانہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو علم و عمل دے کر روانہ فرمایا ہے وہ فی الواقع اسی امن و سلامتی کی نوید و بشارت ہے ۔

جنت کے ذکر میں امن و سلامتی کا ذکر قرآن پاک میں بار بار آیا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جنت کے در و دیوار سے امن و سلامتی کے ترانے سنائی دیں گے ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ طیبہ تشریف لاتے تو سب سے پہلے اس امن و سلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی ۔ عبد اللہ بن سلام ایک یہودی عالم تھے ۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی جس صدائے نبوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا وہ یہ تھی ، لوگو! سلامتی پھیلاؤ ، بھوکوں کو کھلاؤ جب دُنیا غفلت کی نیند سوئے تو تم اٹھ کر خدا کی عبادت کرو ، امن و سلامتی کے گھر میں رہنا تم کو نصیب ہوگا ۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آخر میں فرمایا وھو ولیھم بما کانوا یعملون۔ ان کے اعمال کے سبب اللہ کی ولایت ان کو حاصل ہوگی۔ بما کانوا میں باء سببیہ ہے باء مقابلہ نہیں ہے یعنی اعمال اللہ کی ولایت کا سبب ہیں اس کی قیمت نہیں ہیں۔

واقعہ یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ دنیا و آخرت میں مومنین و صالحین کو اللہ کی ولایت حاصل ہوگی اس کی محرومی کی ساری سرگزشت ہی یہ ہے کہ اس کے اللہ سے تعلقات درست نہیں رہے اگر اللہ کی ولایت اس کو مل جائے تو اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے جس کے قدم اس پر جم گئے اس کے لیے یقیناً خدا کی ولایت ہے لفظ یعملون فرما کر قدریہ اور جبریہ دونوں کی تردید کر دی ہے۔ عمل کی اسناد اہل ایمان کی طرف کر کے بتا دیا کہ طاعت ارادی اور اختیاری چیز ہے اور باء سببیہ لا کر بتا دیا کہ خدائی جزا اٹکل اور اندازے سے نہیں بلکہ ایک مضبوط نظام اور تقدیر کے تحت ہے اور خدا کا ٹھہرایا ہوا ہے۔ قانون سعادت و شقاوت اور نظام تقدیری کے مطابق جس کو بھی راہ کامیابی ملنے والی ہے اس کا دل اسلام کے لیے کھل جاتا ہے۔ قرآن کا عام انداز بیان یہی ہے کہ دنیا میں خدا کے بنائے ہوئے قوانین کے تحت جو نتائج پیدا ہوتے ہیں وہ ان کو براہ راست خدا کی طرف منسوب کرتا ہے کیونکہ یہاں پورا نظام اسی کے ٹھہرائے ہوئے قوانین کے تحت چل رہا ہے۔

وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ۚ يَٰمَعْشَرَ ٱلْجِنِّ قَدِ ٱسْتَكْثَرْتُم مِّنَ ٱلْإِنسِ ۖ وَقَالَ أَوْلِيَآؤُهُم مِّنَ ٱلْإِنسِ رَبَّنَا ٱسْتَمْتَعَ بَعْضُنَا بِبَعْضٍ وَبَلَغْنَآ أَجَلَنَا ٱلَّذِىٓ أَجَّلْتَ لَنَا ۚ قَالَ ٱلنَّارُ مَثْوَىٰكُمْ خَٰلِدِينَ فِيهَآ إِلَّا مَا شَآءَ ٱللَّهُ ۗ إِنَّ رَبَّكَ حَكِيمٌ عَلِيمٌ ﴿۱۲۸﴾

اور اس روز کیا ہو گا جب خدا ان کو گھیر کر جمع کرے گا اور شیاطین سے پوچھے گا کہ اے گروہ جن تم نے تو نوعِ انسانی میں سے بڑی تعداد کو اپنے ساتھ لگا لیا[۱۶۲]، اور انسانوں میں سے جو ان کے رفیق تھے وہ بول پڑیں گے خداوندا ہم دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اُٹھاتے رہے ہیں اور اب ہم اس میعاد پر آ پہنچے ہیں جو تو نے ہمارے لیے مقرر کر دی تھی[۱۶۳]۔ اللہ سبحانہٗ فرمائے گا اب آگ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں تم ہمیشہ رہو گے مگر جو اللہ چاہے بے شک تیرا رب دانا اور علیم ہے[۱۶۴]۔

معانی مفردات

معشر ایسی جماعت جو ایک ساتھ رہن سہن رکھتی ہو علی ابن اسماعیل نے المحکم والمحیط الاعظم میں لکھا ہے معشر گھر والے کو کہتے ہیں اور معشر جماعت کو کہتے ہیں خواہ بڑے ہوں یا نر ہوں۔ معشر، نفر قوم اور رہط سب اسم جمع ہیں ان کا واحد کوئی نہیں۔ لیکن یہ ضروری ہے کہ جماعت مردوں کی ہو۔ انسان اور جن دونوں کے لیے بولا جاتا ہے۔ جن دوسری مخلوقات کی طرح یہ بھی اللہ کی مخلوق ہے۔ ان کی پیدائش آگ سے ہوئی ہے لیکن ان کی تخلیق کی تفصیلی کیفیت کا ہمیں علم نہیں جن سے مشتق ہے چونکہ عام نگاہوں سے غائب ہیں اس لیے ان کا نام جن ہوا۔ استکثرتم یہ استکثار سے ماضی کا جمع مذکر غائب ہے۔ اس کے معنے بہت اور زیادہ لینا ہیں بہت مانگنا اور چاہنا نہیں۔ استمتع، یہ استمتاع سے فعل ماضی ہے فائدہ اٹھانا، متاع ایسا سامان جس سے فائدہ اٹھایا جاتے۔ بلغنا بلوغ سے فعل ماضی کا جمع متکلم ہے ہم پہنچے اصل میں انتہائی مقصد اور منتہی تک پہنچنے کو کہتے ہیں خواہ وہ مقام ہو یا وقت۔ اجلت تاجیل سے ماضی کا واحد مذکر حاضر ہے، اس کے معنے مقرر کرنا، اصل میں اجل ہے اس کے معنے مدت کے ہیں۔ مثوٰی یہ ثوی یثوی سے اسم ظرف ہے اس کے معنے ٹھکانا اور جائے قرار کے ہیں۔

عقیدہ آخرت کا اہتمام

نبوت کے خدوخال نمایاں کرنے والی باتوں میں توحید کے بعد دوسری چیز عقیدہ آخرت ہے۔ قرآن عزیز نے اس سے دلچسپی اور شیفتگی کا اظہار جس تکرار کے ساتھ کیا ہے اور اس کی تبلیغ و تشہیر اور اس کی اہمیت پر جس قدر زور دیا ہے اسے دیکھ کر قرآن کا قاری محسوس کرتا ہے کہ یہ قرآن کی دعوت کا اساسی نقطہ ہے قرآن اور سیرت نبوت کا مطالعہ کرنے والے جانتے ہیں کہ آخرت کا انداز کیا ہے۔ اس کی تصویر نعمت و مصیبت اور سعادت و شقاوت کی تمام تفصیلات کے ساتھ اس انداز سے پیش کی گئی ہے کہ گویا آنکھوں کے سامنے کھڑی ہے۔ قرآن نے قیامت اور جنت و دوزخ کے حالات کو سب سے پہلے جن اسباب پیش کیا ہے ان کا اندازہ حضرت عائشہ کے اس بیان سے ہوتا ہے کہ پہلے ایک بڑی سورت نازل ہوئی جس میں جنت و دوزخ کا بیان ہے یہاں تک کہ جب لوگ اسلام کی طرف مائل ہوتے تب حلال و حرام کے احکام نازل ہوتے اور اگر پہلے ہی یہ حکم اترتا کہ شراب نہ پیو، بدکاری نہ کرو تو لوگ نہ مانتے بلکہ ساتھ

موعدھم والساعۃ ادھی وامر، مکہ معظمہ میں اتری اور میں اس وقت کم سن بچی تھی، کھیلتی تھی، بقرہ اور نساء کی سورتیں اس وقت اتریں جب میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہنے لگی تھی۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اسلام میں آخرت کو ایمان کے اصول واساس میں کیوں داخل کیا ہے۔ اگر یہ تعلیم عقائد میں داخل نہ ہوتی تو دلوں میں اعمال کی جزا وسزا کی ہیبت اور عظمت نہ بیٹھتی اور نہ احکام الٰہی کی تعمیل کی طرف دلی رجحان اور میلان ہوتا بلکہ یہودیوں کی طرح جن کے صحیفوں میں زیادہ تر دنیوی ہی جزا وسزا کا ذکر باقی رہ گیا ہے دوسرے اہل ایمان کے دل بھی سخت ہوتے اور تاثر سے خالی ہو جاتے۔ چنانچہ قرآن نے اس فلسفہ کو خود بیان کیا ہے۔

فالذین لا یومنون بالاخرۃ قلوبھم منکرۃ وھم مستکبرون ؎

جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے ان کے دل نہیں مانتے اور وہ غرور میں ہیں۔

اسی لیے مسلمانوں کو حکم ہوا کہ نماز کی ہر رکعت میں سورہ فاتحہ کی تلاوت کریں جس میں یہ ہے مالک یوم الدین تاکہ ہر لمحہ استحضار فکر آخرت رہے۔ قرآن چاہتا ہے کہ فکر آخرت مسلمانوں کے دلوں میں پوری طرح گھر کر جائے۔

۱۶۲۔ اور اس روز کیا ہوگا جب خدا ان کو گھیر کر جمع کرے گا اور شیاطین سے پوچھے گا کہ اے گروہ جن تم نے نوع انسانی میں سے بڑی تعداد کو اپنے ساتھ لگالیا۔ یعنی اے شیاطین الجن تم نے بہت سے بدبخت انسانوں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا اور اپنی راہ پر لگالیا۔[1]

اصل ارشاد میں یوم یحشرھم جمیعاً آیا ہے۔ اس قسم کی تعبیر قرآن میں قیامت کے تذکرے میں بہت جگہ آئی ہے۔ عام شارحین یہاں فعل کو محذوف بتاتے ہیں جیسے اذکر یا تقول اور ضمیر ھم سے مراد شیاطین الانس والجن ہیں اور جمیعاً تاکید کے لیے آیا ہے اور یہ بات بتا رہا ہے کہ شیاطین انس کے ساتھ ساتھ شیاطین الجن کو بھی جمع کیا جائے گا۔ ان سب کو جمع کرکے اللہ تعالیٰ شیاطین الجن کو مخاطب کرکے فرمائے گا یا معشر الجن قد استکثرتم من الانس، اے جنوں کے گروہ تم نے انسانوں میں بہتوں کو اپنا عابد بنالیا تھا۔ مشرکین عرب بھوت پریت اور جنات کے قائل تھے اور ان کی عبادت کرتے تھے۔ وجعلوا للّٰہ شرکاء الجن اور انہوں نے جنوں کو عبادت میں اللہ کا شریک بنالیا تھا۔ صحیح مسلم کی کتاب التفسیر میں ہے کہ ذیل کی آیت ان عربوں کی شان میں نازل ہوئی جو جنات کی عبادت کرتے تھے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اولٰئک الذین یدعون یبتغون الی ربھم الوسیلۃ

سورہ جن میں اللہ تعالیٰ نے جنوں کا مقولہ نقل فرمایا ہے۔

انہ کان رجال من الانس یعوذون برجال من الجن

اور کچھ انسان جنوں کی دہائی مانگا کرتے تھے۔

خدا اور جنات میں رشتے اور ناطے بناتے تھے،

وجعلوا بینہ وبین الجنۃ نسباً،

خدا اور جنات میں رشتہ قائم کیا ہے۔

روز قیامت اللہ سبحانہٗ فرشتوں سے دریافت کرے گا کہ اھٰؤلاء ایاکم کانوا یعبدون کیا یہ لوگ تمہاری عبادت کرتے تھے، فرشتے جواب دیں گے

سبحانک انت ولینا من دونھم بل کانوا یعبدون الجن

آپ کی ذات اس سے منزہ ہے کہ کوئی آپ کا شریک ہو ہمارا ان سے کوئی واسطہ نہیں، امر واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ ہماری نہیں بلکہ جنوں کی عبادت کرتے تھے۔

جن سے مراد شیاطین جن ہیں۔ ان ہی اجنہ اور شیاطین کا زور توڑنے کے لیے قرآن نے یہاں قیامت کے اس سوال و جواب کا انداز اختیار کیا ہے کہ ان کے دوست انسان وہاں بھی ان کی دوستی کا دم بھرتے جائیں گے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ عرب جاہلوں پر ان کا کس قدر استیلا تھا۔

یہ آیت صریح طور پر ان لوگوں کے خیال کی غلطی واضح کر دیتی ہے جو جن کو پہاڑی علاقے کے باشندوں یا دہقانوں اور صحراؤں کے معنے میں لیتے ہیں کیا کوئی صاحب عقل آدمی اس آیت کو پڑھ کر یہ تصور کر سکتا ہے کہ یہ شہریوں اور دیہاتیوں کا مکالمہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ شیاطین الجن سے دریافت کرے گا کہ کیا تم نے اپنے اغواء اور اضلال سے انسانوں کی بڑی تعداد کو اپنا عابد بنا لیا تھا۔ مطلب یہ بتایا ہے کہ کیا تم نے انسانوں کی اکثریت کو گمراہ کر رکھا تھا۔ عبداللہ بن عباس نے بھی یہی مطلب بتایا ہے۔ امام مجاہد، قتادہ اور الحسن البصریؒ نے آیت کا مدلول یہ بھی ہے کہ آبادی کی اکثریت شیاطین کے دام تزویر کا شکار ہو کر خدا کی عبادت کو چھوڑ کر جنات و شیاطین کو اپنا حاجت روا سمجھے ہوتے تھی۔ اور ان کے آگے نذرانہ نیاز پیش کرتے تھے۔ بعض جگہ خاص طور سے ان کے نام کی قربانی کی جاتی تھی۔ ان میں سے ایک مشہور مقام دراہم تھا جہاں کے رہنے والے جنوں پر جانور ذبح کرتے تھے تاکہ قربانی کرنے والے ان کی شرارت سے محفوظ رہیں۔ قبیلہ خزاعہ کی شاخ بنو ملیح خاص طور سے جنوں کی عبادت کرتے تھے بلکہ کہانت

پائے عرب میں پھیلی ہوئی تھی۔ اہلِ عرب کا خیال تھا اور خود کاہنوں کا دعویٰ تھا کہ ان کے ساتھ ایک جن رہتا ہے اور وہی ان کو القا کرتا ہے۔ وہ اپنی شکل و صورت ایسی بتاتے تھے کہ پہچان لیے جاتے تھے۔ یہ کاہن تمام مقدمات اور نزاعات کا فیصلہ بھی کرتے تھے اور اس بنا پر تمام ملک پر ان کا اثر چھایا ہوا تھا۔ الجاحظ نے ان کے کاہنانہ فقرے البیان والتبیین میں نقل کیے ہیں۔ یہ کاہن جو خبریں بتلاتے یا تلقین کرتے وہ بڑے مقفیٰ اور مسجع فقرے ہوتے۔ جب لوگ ان سے غیب کی خبریں پوچھتے یا وہ خود آئندہ کے متعلق پیشین گوئی کرتے تو ایک خاص کیفیت ان پر طاری ہو جاتی تھی۔ مرد بھی کاہن ہوتے تھے اور بعض عورتیں بھی ہوتی تھیں جو کاہنہ کہلاتی تھیں۔ یہ مصیبتوں، بلاؤں کے دور کرنے کے لیے مشرکانہ علاج اور تدبیر بتاتے تھے۔ یہ اپنی کہانت کی اُجرت میں بڑی بڑی رقمیں اور نذرانے وصول کرتے تھے۔ غرض ان کاہنوں نے عوام فریبی کا بڑا جال پھیلا رکھا تھا اور یہ ان ہی کا اثر تھا کہ ملک کا ملک سینکڑوں قسم کی وہم پرستیوں میں مبتلا ہو گیا تھا اور شعراء کی نسبت بھی عرب کا خیال تھا کہ ہر شاعر کے ساتھ ایک شیطان الجن رہتا ہے اور وہی اس کو اشعار القا کرتا ہے۔ ستفنان اور شیعبان روسائے شیاطین الجن تھے جو شاعری کہلاتے تھے۔ پوری عرب زندگی پر اس طرح شیاطین کا قبضہ تھا۔ یہی مطلب ہے استکثرتم من الانس اے جنات کے گروہ تم نے انسانی اکثریت کو گمراہ کیا ہے۔ تابع و متبوع، عابد و معبود، مقتدی و مقتدا سب ہی اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوں گے اور مقتداؤں سے سوال ہوگا کہ اے گروہ تم نے انسانوں کی اکثریت کو اپنے فتراک ضلالت کا نخچیر بنایا تھا اور انسانی زندگی تمہارے دام تزویر میں پھنس کر اللہ سے بغاوت کر رہی تھی۔

مجرمین کا اقرارِ جرم

۱۶۳- اور انسانوں میں سے جو ان کے رفیق تھے وہ بول پڑیں گے خداوندا ہم دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے ہیں اور اب ہم اس میعاد پر پہنچ گئے ہیں جو تو نے ہمارے لیے مقرر کر دی تھی، دنیا میں جو انسان بُت وغیرہ پوجتے ہیں وہ فی الحقیقت خبیث جن و شیاطین کی پوجا ہے، اس خیال پر کہ وہ ہمارے کام نکالیں گے ان کو نیازیں چڑھاتے ہیں اور ویسے بھی بہت سے اہلِ جاہلیت تشویش و اضطراب کے وقت جنوں سے استعانت کرتے تھے جیسا کہ سورۂ جن میں اشارہ کیا ہے اور ابن کثیر وغیرہ نے روایات نقل کی ہیں۔ جب آخرت میں وہ شیاطین الجن اور انسان برابر پکڑے جائیں گے اور حقائق کا انکشاف ہوگا تب مشرک یوں عذر کریں گے کہ اے ہمارے پروردگار ہم نے پوجا نہیں کی لیکن آپس میں وقتی کارروائی

کرلی تھی۔ اور موت کا وعدہ آنے سے پہلے پہلے دنیوی کاروبار میں ہم ایک دوسرے سے کام نکالنے کی کچھ ترکیب کرلیا کرتے تھے ان کی عبادت مقصود نہ تھی[1]

دراصل یہ اقرار جرم ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے ہمارے پروردگار بے شک ہم قصوروار ہیں ہم نے دُنیا میں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا ہے یعنی جنوں نے آدمیوں سے فائدہ اور آدمیوں نے جنوں سے، جنوں نے آدمیوں سے یہ فائدہ اٹھایا کہ آدمیوں نے ان کی عبادت کی حلال وحرام میں ان کی اطاعت کی اور باہمی نزاعات اور مقدمات میں ان کی فرمانبرداری کی اور آدمیوں نے جنوں سے یہ فائدہ اٹھایا کہ نفسانی خواہشات اور لذات کے عجیب عجیب طریقے ان کو وساوس کے ذریعے جنوں نے سکھلاتے اور ان کی خواہشات کو مزین اور مستحسن کر کے ان کو شہوتوں کا دلدادہ بنایا، اس طرح ہم نے خوب مزے اڑائے اور شہوات حاضرہ کو لذات غائبہ پر ترجیح دی۔ حتیٰ کہ ہم نے خواہشات کے حصول اور ان کی خاطر میں تگ و دو میں بے حد مشقتیں برداشت کی ہیں۔ یہ تو ہم نے جنات سے فائدہ اٹھایا اور جنات نے ہم سے یہ فائدہ اٹھایا کہ ہم نے ان کو سردار بنالیا۔ ان کے احکام پر چلے، ان کی نذریں نیازیں اور چڑھاوے چڑھاتے۔ عبادت بھی ان کی کی اور طاعت بھی ان کی کی۔ منشا یہ ہے کہ ہم ان کے آلہ کار بنے، ہم نے ان کی پوجا کی، ان کے تھانوں پر قربانیاں پیش کیں اور ان کے کہنے پر حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنایا، اسی طرح ہمارے کاہنوں ساحروں اور سیانوں نے ان کو اپنے مقاصد مزعومہ کے لیے استعمال کیا۔ امام الحسن البصری فرماتے ہیں کہ استمتاع صرف یہی تھا کہ جنات نے حکم دیا اور انسانوں نے اس پر عمل کیا۔

شیاطین اور جراثیم کی تاثیر

ارواح انسانی شیاطین سے اسی طرح اثر پذیر ہوتی ہیں جیسے اجسام انسانی جراثیم سے اثر قبول کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں جسم انسانی سینکڑوں بیماریوں کا شکار ہوجاتا ہے۔ آج کے علمی انکشافات میں یہ بات مانی ہوتی ہے کہ جراثیم کے ذریعے انسانی جسم میں بیماریاں پیدا ہوتی ہیں اور آج ہم خوردبینوں کے ذریعے اس کا مشاہدہ کر رہے ہیں۔ آج سے ایک ہزار سال پہلے اگر یہ بات کہی جاتی کہ جسم انسانی میں ہوا پانی اور کھانے کے ذریعے جراثیم بھی جاتے ہیں اور وہ تیزی سے اتنے بڑھتے اور پلتے ہیں کہ کروڑوں بن جاتے ہیں اور ان سے مہلک بیماریاں اور وبائیں پیدا ہوتی ہیں تو بلاشبہ سننے والے اسے مجنون کی بڑ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہتے ۔ حیرت ہے کہ لوگ اجسام میں جراثیم کو مانتے ہیں لیکن ارواح میں شیاطین نہیں مانتے ۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ ڈاکٹر کی نظر جراثیم کو دیکھتی ہے اور انبیاء کی نگاہ شیاطین کو دیکھتی ہے وہ طبیب جسمانی ہے اور یہ طبیب روحانی ہے ۔

بہر حال انہوں نے اقرار کر لیا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھاتے رہے یہاں تک کہ ہم اس دن میں آپ کے حضور میں پیش ہو گئے اب ہمارا معاملہ آپ کے سپرد ہے اصل ارشاد میں و بلغنا اجلنا الذی اجلت لنا آیا ہے یعنی ہم پہنچ گئے مقررہ وقت کو جس کو تو نے ہمارے لیے ٹھہرایا تھا ۔ یہاں اجل اور وقت سے کیا مراد ہے بیشتر شارحین قرآن کا خیال ہے کہ اس سے قیامت کا دن مراد ہے اور الحسن البصری اور ابن جریج کی رائے میں موت ہے ۔ علامہ آلوسی نے قیامت کو ترجیح دی ہے ۔ سید سلیمان ندوی نے یہ عجیب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ اجل سے مراد تو قیامت ہی ہے مگر بلغنا ہم پہنچ گئے کی تعبیر کنایۃً بتاتی ہے کہ وہ قیامت سے پہلے عذاب کے ایک دور کو ختم کر چکے ہیں ۔ بعض حدیثوں میں بھی اس کنایہ کی تصریح آتی ہے ۔ کنز العمال میں ایک حدیث ہے :

> ابن عمر سے روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میری امت کے لوگوں کا اپنی قبروں میں طول قیام ان کو گناہوں سے خالص کرتا ہے ۔

اسی طرح ایک اور حدیث میں ہے :

> میری امت کے لوگوں کو زیادہ تر عذاب ان کی قبروں میں ہو گا ۔

اس حدیث کا منشا یہ ہے کہ امتِ محمدیہ کے اکثر افراد اسی برزخ کے محدود زمانے کے عذاب میں نکھر کر اور پاک وصاف ہو کر جنت کے قابل ہو جائیں گے اور عذاب دوزخ کی ضرورت ان کو نہ پیش آئے گی ۔ حافظ ابن القیم ایک موقعہ پر لکھتے ہیں :

> اگر ان بیماریوں کا یہ علاج اس دنیا میں نجات کے لیے پورا ہو گیا تو خیر ورنہ برزخ کی سزا سے علاج کیا جائے گا ۔　　(شفاء العلیل)

برزخ کی حدیث میں وہ منظر دکھایا گیا ہے جس میں گنہ گار عذاب کے دور سے نکل کر اور نہر حیات میں نئی زندگی پا کر جنت کے مستحق قرار پاتے ہیں ۔ غالباً ان ہی نجات پانے والوں کو دیکھ کر مشرکین بھی روز قیامت کہیں گے بلغنا اجلنا الذی اجلت لنا ، یہ الفاظ کہ ہم اپنے وقت کو جس کو تو نے مقرر کیا تھا پہنچ چکے ہیں یہ معنے رکھتے ہیں کہ عالم برزخ کا مقررہ دورۂ عذاب ہم ختم کر چکے ہیں اور اب حشر و نشر کے عذاب کا دوسرا دور شروع ہونے والا ہے اس لیے بعض دوسرے نیک بختوں کی طرح ہم کو بھی اب چھٹکارا مل جائے ۔

مجرموں کو دوزخ کا عذاب

۱۶۴ - اللہ سبحانہ فرماتے گا اب آگ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں ہمیشہ تم رہو گے مگر جو چاہے اللہ، بے شک تیرا رب حکمت والا اور علم والا ہے - یہ جو فرمایا کہ جو چاہے اللہ اس واسطے کہ دوزخ کا عذاب دائمی ہے تو اسی کے چاہنے سے ہے وہ جب چاہے موقوف کرنے پر قادر ہے لیکن ایک چیز چاہ چکا اور اس کی خبر پیغمبروں کی زبانی دی جاچکی وہ اب ٹل نہیں سکتی - وہ مجرموں کے جرائم سے پوری طرح باخبر ہے اور حکمت بالغہ سے ہر جرم کی برمحل اور مناسب سزا دیتا ہے[1]

یہ استیناف بیانی ہے متبوعین کی خاموشی اور تابعین کے جواب کے بعد قاری اور سامع کو انتظار تھا کہ پھر کیا ہوا - بتایا کہ اللہ نے فرمایا کہ آتش دوزخ تمہارا ٹھکانا ہے اس میں سدا رہو گے لیکن یہ کہ اللہ جو چاہے مطلب یہ ہے کہ ان مجرمین کے لیے عذاب نار میں جانے کے بعد امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے - کسی کی سعی و کوشش، کوئی سفارش، کسی کا زور، کسی کی فریاد وہاں کارگر نہ ہو گی - اختیار و ارادے کی ساری حدیں ختم ہو جائیں گی - توبہ اصلاح اور حسرت و ندامت کی مہلتیں گزر جائیں گی - جو چیز وہاں کارفرما ہو گی وہ اللہ کی مشیت ہے اور اپنی مشیت کے بھید کو وہ ہی جانتا ہے - وہ فعال لما یرید اور حکیم و علیم ہے اور الا ماشاء کے استثناء، اس کے مدلول، اس کی غایت اور اس کے مطلب کو وہ ہی بہتر جانتا ہے ہمیں اس کے علم کا احاطہ اتنا ہی ہے جتنا اس نے چاہا ہے -

اس آیت میں الا ماشاء اللہ شارحین قرآن کی جولانی طبع کا بہت بڑا شاہکار ہے - اس استثناء نے ہمارے شارحین قرآن کو بہت زیادہ پریشان کر دیا ہے کیونکہ یہ بادی النظر بتا رہا ہے کہ خالدین فیہا میں خلود دوام اور لامتناہی مدت کے معنے میں نہیں ہے - اسی لیے کچھ لوگوں نے ماکو من کے معنے میں لے کر یہ مطلب بتایا ہے بجز ان کے جن کو اللہ بچانا چاہے لیکن علامہ آلوسی نے اسے ناپسندیدہ قرار دیا ہے -

اصل مسئلہ یہ ہے کہ جہنم کا عذاب دائمی ہے یا نہیں - اس موضوع پر ابتدائی اسلامی فرقوں میں بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں جن کی تفصیل ملل و نحل کی کتابوں میں موجود ہے - ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ جنت کا وجود دائمی اور ابدی ہے لیکن دوزخ کا دوام اور ابدیت میں کسی قدر اختلاف ہے - عام اہل السنۃ والجماعۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ جہنم اور جنت دونوں کا وجود دائمی ہے جو گنہ گار مومن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اپنے گناہ کے بقدر عذاب اٹھا کر یا خدا کی رحمت سے مایوس ہو کر بالآخر جنت میں داخل کیے جائیں گے لیکن مشرک و کافر کے گناہ کبھی معاف نہ ہوں گے اور وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ فقہاء اور محدثین کا ایک گروہ جو مرجئہ کہلاتا ہے اس بات کا قائل ہے جو مومن ہوگا وہ گنہ گار بھی دوزخ میں نہ جائے گا بلکہ معافی سے سے سرفراز ہو کر شروع ہی سے جنت میں داخل ہوگا۔ اس کے برخلاف خوارج اور معتزلہ کا یہ عقیدہ ہے کہ مومن بھی اگر گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوگا تو وہ بھی کفار کی طرح ہمیشہ دوزخ ہی میں رہے گا۔ اور بھی اس بارے میں لوگوں کی مختلف رائیں ہیں۔

اہل السنہ کا ایک مختصر گروہ کا جس میں صحابہ کرام اور تابعین کے نام بھی ہیں اور متاخرین میں جس کے پرجوش حامی حافظ ابن القیم ہیں۔ یہ خیال ہے کہ جب گنہ گار اپنے اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پا چکیں گے تو جہنم فنا کر دی جائے گی۔ حافظ ابن القیم نے اپنی دو کتابوں شفاء العلیل اور حادی الارواح میں قرآن وحدیث، آثارِ صحابہ اور عقل کی پچیس دلیلوں سے اپنے مسلک کو مبرہن کیا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل السنہ کے ایک فریق کا خیال تسلیم کیا ہے۔ ایک یمنی زیدی عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو اپنی کتاب العلم الشامخ فی ایثار الحق علی الاباء والمشائخ میں قبول کیا ہے۔ صوفیہ میں شیخ محی الدین بن عربی اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک جن پر خلودِ نار کا حکم ہے وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ ان کو دوزخ میں دوزخ والے محسوس ہونے لگے گی جیسے بعض کیڑے غلاظت کو پسند کرتے ہیں۔

اس موضوع پر تفصیلی بحث تو ان شاء اللہ بارہویں جلد میں آ رہی ہے لیکن ہم یہاں جمہور اہل السنہ والجماعۃ کا مسلک بیان کرتے ہیں۔

جمہور اہل السنہ والجماعۃ کا مذہب یہ ہے کہ بہشت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ رہے گی اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہوں گے کبھی دوزخ سے نجات نہ ملے گی۔

اس عقیدے کے مطابق گنہ گاروں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو اگرچہ گنہ گار تھے مگر دل میں ایمان رکھتے تھے، ایسے لوگ عذاب کے بغیر ہی یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہو کر بالآخر جنت میں جائیں گے۔ دوسرے وہ جو ہمیشہ شرک و کفر میں مبتلا رہے اور اس سے توبہ کیے اور ایمان لائے بغیر مر گئے ایسے لوگوں کی بخشش کبھی نہ ہوگی وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل ہوں گے۔ ان کی گنہ گاری اس درجہ کی ہوگی کہ وہ اللہ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح کبھی جذب نہ کر سکیں گے۔ یہ وہ زمینِ شور ہوں گے جس میں اس رحمت عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔

جمہور اپنے مسلک کے لیے قرآن کی ان آیتوں سے استدلال کرتے ہیں جن میں جہنمیوں کے بارے میں

صراحۃً خالدین فیہا ابدا آیا ہے یعنی وہ ہمیشہ عذاب میں رہیں گے۔ اور جب عذاب ہمیشہ ہوگا۔ تو عذاب کی جگہ بھی ہمیشہ قائم رہے گی۔ اس کے علاوہ ایسی آیات بھی ہیں جن میں تصریح ہے کہ جہنمی جہنم سے نکل نہ سکیں گے۔ کہیں وما ھم بخارجین اور کہیں لا یخرجون آیا ہے۔ ایسی آیات بھی ہیں جن میں جہنمیوں کے بارے میں عذاب مقیم کی خبر دی گئی ہے اور ایسی آیات بھی ہیں جن میں عدم تخفیف عذاب کا ذکر کیا گیا ہے اور شرک و کفر کا نام لے کر بتایا گیا ہے کہ ان کی ہرگز بخشش نہ ہوگی۔ کہیں فرمایا ہے لا یغفر ان یشرک بہ اور کہیں بتایا لن یغفر اللہ لھم اور کہیں اعلان کیا کہ اللہ نے ان پر جنت حرام کر دی ہے کہیں کافر و مشرک کا جنت میں جانا ممکن نہیں ہے۔ یہ اور اس قسم کی بہت سی آیات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو لوگ مرتے دم تک شرک و کفر میں مبتلا رہے اور توبہ نہیں کی ان کا گناہ نہ بخشا جائے گا اور وہ کبھی جنت میں نہ جائیں گے۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ دوزخ ہمیشہ آباد نہ رہے گا ان کا خیال ہے کہ اللہ تعالیٰ کی مقررہ مدت کے بعد ایک دن جہنم کی آگ رحمتِ الٰہی کے چھینٹوں سے بالآخر سرد ہو جائے گی۔ ان کا استدلال قرآن کی زیر تشریح آیت میں الا ما شاء اللہ کے استثنا سے ہے وہ کہتے ہیں کہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ شرک و کفر کی سزا تو اصل میں قانوناً یہی ہے کہ دائمی دوزخ میں سزا جاری رہے گی مگر اس کی رحمت کا تقاضا کچھ اور ہے لیکن وہ حکیم و علیم ہے اس لیے وہ اپنا ہر کام اپنی حکمت اور مصلحت اور علم کے مطابق کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ کس کے حق میں کیا کرنا چاہیے اور کب کرنا چاہیے۔

جمہور کی جانب سے اس کے جوابات دیے گئے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ الا ما شاء اللہ کا استثنا صرف اللہ کی مشیت و اختیار کو بتانے کے لیے آیا ہے تاکہ معلوم ہو جائے کہ کفر و شرک کے عذاب کا دوام اللہ کے ارادے اور مشیت پر موقوف ہے وہ جب چاہے ختم کر سکتا ہے اور یہ بھی جواب دیا گیا ہے کہ آیت کا مطلب یہ ہے رہنا تو ان کو دوزخ میں ہے مگر جو اور زیادہ چاہے تیرا رب وہ اسی کو معلوم ہے کیونکہ دوام اور ابدیت کا اصلی مفہوم جسے لامحدود زمانہ کہنا چاہیے وہ اللہ ہی جانتا ہے اور اسی کے علم غیر متناہی کے ساتھ مخصوص ہے اور اس استثنا سے یہ بھی تنبیہ فرما دی ہے کہ خدا کے ہمیشہ رہنے اور مخلوق کے ہمیشہ رہنے میں فرق ہے۔ کسی مخلوق کا ہمیشہ رہنا بہمہ وجوہ خدا کی مشیت پر موقوف ہے وہ جب چاہے فنا کر سکتا ہے اس کے علاوہ بھی جمہور کی جانب سے جوابات دیے گئے ہیں انشاء اللہ بارہویں جلد میں سیر حاصل بحث آئے گی۔

وَكَذٰلِكَ نُوَلِّيْ بَعْضَ الظّٰلِمِيْنَ بَعْضًا بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۱۲۹﴾
يٰمَعْشَرَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ اَلَمْ يَاْتِكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ
عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ وَيُنْذِرُوْنَكُمْ لِقَآءَ يَوْمِكُمْ هٰذَا ۭ قَالُوْا شَهِدْنَا
عَلٰٓي اَنْفُسِنَا وَغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا وَشَهِدُوْا عَلٰٓي
اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۱۳۰﴾ ذٰلِكَ اَنْ لَّمْ يَكُنْ رَّبُّكَ
مُهْلِكَ الْقُرٰي بِظُلْمٍ وَّاَهْلُهَا غٰفِلُوْنَ ﴿۱۳۱﴾ وَلِكُلٍّ دَرَجٰتٌ
مِّمَّا عَمِلُوْا ۭ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۳۲﴾

اور اسی طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنا دیں گے ان اعمال کے مطابق جو وہ کرتے تھے[۱۶۵]۔ اے جنوں اور انسانوں کی جماعت کیا تمہارے پاس تم میں سے وہ رسول نہیں آتے جو تم کو میری آیات سناتے اور اس دن کے انجام سے تم کو ڈراتے تھے[۱۶۶]۔ وہ کہیں گے ہاں ہم اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں، دنیا کی

زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈالے رکھا[167] اور انہوں نے اپنے خلاف اقرار
کرلیا اس بات کا کہ وہ کافر تھے[168]۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ تیرا
رب بستیوں کو ان کے ظلم پر ہلاک کرنے والا نہیں ہے جب کہ
باشندے بے خبر ہوں[169]۔ اور سب کے لیے ان کے اعمال کے مطابق
درجے ہیں اور تیرا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے[170]۔

معانی مفردات

نُوَلّی، تولیہ سے مضارع کا جمع متکلم ہے، مادہ ولا ہے دو چیزوں یا ایک طرح کی کئی چیزوں کے درمیان حصول یا عمل میں لگاؤ اور تعلق کو کہتے ہیں۔ ولایت واو کے زبر اور زیر کے ساتھ نصرۃ اور حکومت، کے معنے میں آتا ہے اور ولایت سے صفت کا صیغہ ولی اور ولایت بمعنے حکومت سے والی آتا ہے۔ اسی سے وضو میں موالات اور قبلہ کی طرف منہ کرنے کو تولیہ کہتے ہیں۔ اسی سے وَلّی کے معنے حاکم بنانا آتے ہیں اور تولّی کے معنے مدد کے ہیں۔ رُسُل، رسُول کی جمع ہے۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں رسُول وہ ہے جس کو اللہ نے شریعت جدیدہ دے کر مبعوث فرمایا ہو تاکہ وہ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے۔ ملا علی قاری شرح الفقہ الاکبر میں فرماتے ہیں رسُول وہ ہے جو تبلیغ پر مامور ہو اور نبی وہ ہے جس کی طرف وحی کی جائے خواہ تبلیغ پر مامور ہو یا نہ ہو۔ شَهِدنا، ہم نے گواہی دی یہ شہد یشہد سے ماضی کا جمع متکلم ہے۔ اس کا مصدر شہادت اور شہود ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ شہود اور شہادت کے معنے موجود رہنا اور سامنے ہونے کے ہیں جو مشاہدہ کے ساتھ ہو خواہ مشاہدہ بصر کے ساتھ ہو یا بصیرت سے ہو اور کبھی صرف حضور کو کہتے ہیں جیسے

عالم الغیب والشہادۃ وہ دانائے غیب وحضور ہے لیکن شہود کا استعمال حضور مجرد کے ساتھ اولیٰ ہے اور شہادت کا اس حضور کے لیے کہ جو مشاہدہ کے ساتھ ہو۔

نبوت کی دعوت سے بے نیازی کا انجام

اس سے پہلے وقال اولیاءھم من الانس میں انسانوں اور شیاطین کی ولایت کا تذکرہ تھا اب بتایا کہ ان کا باہم تعاون و تناصر اللہ کے قانون تکوین کے تحت ہوتا ہے۔ اللہ کا قانون ہی یہ ہے کہ ہم شیاطین کو انسانوں کے اعمال کے مطابق ان پر تسلط دیتے ہیں۔ ہر شخص اپنے مذاق اور اپنے کردار کے مطابق اپنا رفیق تلاش کرتا ہے۔ اچھے انسانوں کے تعلقات اچھے انسانوں سے اور بُرے انسانوں کے تعلقات بُرے انسانوں اور شیاطین سے ہوتے ہیں۔ ظالم ظالموں سے ملتے ہیں یعنی کند ہم جنس باہم جنس پرواز، اس کے بعد فرمایا کہ یہ تو دُنیا میں اللہ کے قانون تکوین کے تحت جزا ہے آخرت میں ان کی جزا کیا ہوگی جو نبوت سے روگرداں ہو کر شیاطین سے رفاقت پیدا کر رہے ہیں۔ انسان ہوں یا جن سب بارگاہِ الٰہی میں پیش ہوں گے اور سب سے دریافت کیا جائے گا الم یاتکم رسل منکم کیونکہ اللہ کی ذات، اس کی صفات، اس کے احکام، اس کی مرضیات اور عقائد و اعمال کی خاصیات اور صحیح و غلط، اچھے اور بُرے اخلاق کے نتائج کا علم، آخرت میں نیک و بد، ثواب و عذاب اور جنت و جہنم کی معرفت کا انبیائے کرام کا واحد سرچشمہ اور ذریعہ علم ہیں۔ اس زندگی کے بعد کے حالات اور اس عالم میں ہونے والے حشر ونشر، انعام و عذاب اور نعمت و نقمت کے علم کے لیے اللہ نے اپنی مرضی کے مطابق انبیائے کرام کو مخصوص فرمایا ہے۔

اسی وجہ سے قرآن بار بار زور دیتا ہے کہ اللہ کی ذات اور اس کی حقیقی صفات کی نشاندہی کرنے والے صرف انبیائے کرام ہی ہیں اور وہی اللہ کی صحیح معرفت کا جس میں نہ جہالت ہے نہ غلط فہمی کا شائبہ واحد وسیلہ ہیں اور ان کے بتائے ہوئے طریقوں کے علاوہ اور کسی ذریعہ سے وہ معرفت حاصل نہیں ہو سکتی۔ نہ تنہا عقل رہنمائی کر سکتی ہے نہ ذہن کی تیزی اور ذکاوت کافی ہو سکتی ہے نہ فطرت کی سلامتی اس کا ذریعہ ہو سکتی ہے نہ ذہن کی بلند پروازی کی وہاں گنجائش ہے نہ عقل و خرد کی کاوشیں اس تک پہنچ سکتی ہیں نہ تجربات کا خزانہ ہی مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

مہذب اور ترقی یافتہ قومیں جو اپنے زمانے میں تہذیب و ثقافت، ذہانت اور علمی ایجادات میں بلند ترین مقام پر پہنچی ہوئی تھیں وہ بھی انبیائے کرام کی لائی ہوئی تعلیمات اور ان کے مخصوص علم کی

اتنی ہی ضرورت مند تھیں جتنا کہ دریا میں ڈوبنے والا سہارے کے لیے کسی کشتی کا محتاج ہوتا ہے یا زندگی سے مایوس مریض کو اکسیر دوا کی ضرورت ہوتی ہے۔ ان ترقی یافتہ قوموں کے افراد اس مخصوص اور ضروری علم کے اعتبار سے طفلِ شیرخوار، جاہلِ محض اور تہی دست و بے بضاعت تھے اور انہوں نے اپنی علمی کامیابیوں اور تمدنی ترقیوں کے باوجود جب علوم نبوت کو رد کردیا اور اس کا مذاق اڑایا، تو انہوں نے اپنے لیے اور اپنی قوم کے لیے تباہی و ہلاکت کو دعوت دی۔ متعدد ترقی یافتہ قومیں اس انکار تکبر، غرور اور خود پرستی اور اپنے علوم اور صنعتوں پر فخر کا شکار ہوچکی ہیں۔ اپنے زمانے کے نبی کی لائی ہوئی تعلیمات کو انہوں نے حقارت اور نفرت کی نظر سے دیکھا۔ اس سے بے نیازی برتی، اس کو بیکار اور بے قیمت سمجھا تو وہ اس غرور ہی کی نذر ہوگئیں اور انہوں نے اپنے کیے کا مزہ چکھ لیا۔

۱۶۵- اور اسی طرح ہم ظالموں کو ایک دوسرے کا ساتھی بنادیں گے، ان کے اعمال کے مطابق جو وہ کرتے تھے جیسے تم نے شیاطین الجن اور ان کے اولیاء انس کا حال سُنا۔ اسی طرح تمام ظالموں کو اور گنہگاروں کو ان کے ظلم اور سیہ کاریوں کے تناسب سے دوزخ میں ہم ایک دوسرے کے قریب کردیں گے اور جو جس درجہ کا ظالم اور گنہ گار ہوگا اس کو اسی کے طبقہ عصاۃ میں ملادیں گے [۱]

اصل ارشاد میں تولّی آیا ہے اس کا مصدر واؤ کے زیر اور زبر کے ساتھ وِلایت آتا ہے۔ اگر یہ زیر والے وِلایت سے بنا ہے تو تولیہ کے معنے مسلط کردینے کے ہیں، اور اگر واؤ کے زبر والے وَلایت سے بنا ہے تو تولیہ کے معنے مددگار بنادینے کے ہیں۔ اسی اختلاف کی وجہ سے شارحینِ قرآن نے اس کی تفسیر میں دو مختلف رائیں اختیار کی ہیں اور یہ اختلاف تشریح صحابہ اور تابعین میں بھی موجود ہے اور دونوں صحیح ہیں فرق صرف اس قدر ہے کہ اگر ایک مطلب آیتِ قرآنی کا منطوق ہے تو دوسرا مدلول ہے۔

جو لوگ اسے وَلایت بفتح الواؤ سے مشتق بتاتے ہیں وہ آیت کا مطلب یہ بتاتے ہیں کہ جیسے وہ دُنیا میں گناہ کرنے میں ایک دوسرے کے شریک تھے، اسی طرح وہ آخرت میں بھی سزا کے موقعہ پر ایک دوسرے کے ساتھ ہوں گے۔ یعنی آخرت میں لوگوں کی جماعتیں نسل و وطن، رنگ اور زبان کی بنیاد پر نہیں بلکہ اعمال و اخلاق اور افکار کی اساس پر ترتیب پائیں گے، نیکو کار نیکو کاروں اور بدکار بدکاروں کے ساتھ ہوں گے۔ اس مطلب کی صورت میں یہ آخرت میں ہونے والے معاملہ کی خبر ہے لیکن اگر بغور مطالعہ کیا جائے اور آیت کے سیاق و سباق کو دیکھا جائے اور کذالک نولی کے زور کو پیش نظر رکھا جائے تو

---

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

معلوم ہوگا کہ اس آیت میں دُنیا ہی کے بارے میں ایک اور سنتِ الٰہی اور قانون خداوندی کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے کہ اللہ کی سنت انسانی زندگی میں یہ ہے کہ اعمال نفسیات سے متعلق ہوں یا جوارح سے ہر عمل ایک اثر رکھتا ہے تکرار کے ساتھ وہی اعمال اخلاق بن جاتے ہیں اور افراد ہوں یا جماعتیں جس نوع کے اخلاق سے ہمدوش ہوتی ہیں، اسی کے دائرے اور حدود میں ایک دوسرے سے ملتی ہیں تعاون کرتی ہیں یعنی مشترکہ مشن میں ایک دوسرے کا ہاتھ بٹاتے ہیں اور ایک مشن والے باہم یکجہتی پیدا کر کے اس کا مقابلہ کرتے ہیں جو مشن میں ان کا مخالف ہوتا ہے آیتِ قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ جیسے انسان اور جنوں میں ایک دوسرے سے فائدہ اٹھایا جا رہا ہے کیونکہ دونوں کے مقاصد میں ہم جنسی اور مشارکت ہے۔ اسی طرح ہم بدکردار لوگوں میں باہم ان کے مشترکہ اعمال کی اساس پر نصرت و تعاون اور ایک دوسرے سے ملنے کا سامان پیدا کر دیتے ہیں اور ایسا ہمارے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔ بدکار لوگ بدکاروں سے مل کر سنگٹھیں قائم کرتے ہیں۔ حضرت قتادہ نے آیت کا منشا یہی سمجھا ہے فرماتے ہیں :

> اللہ سبحانہٗ لوگوں کے درمیان ان کے اعمال کے مطابق موالات پیدا کرتا ہے۔ مومن اہلِ ایمان سے موالات کرتا ہے خواہ کہیں ہو اور کافر بھی، کافروں سے تعلقات رکھے گا خواہ کوئی ہو اور کہیں ہو، ایمان ولولوں، آرزوؤں اور خوش آئند زینت کاری کا نام نہیں سنجدا اگر تو دُنیا کی زندگی میں اللہ کا مطیع بن کر رہے اور تجھے اللہ کے طاعت گزاروں کا پتہ نہ ہو تو تیرا اس سے کچھ نہ بگڑے گا اور اگر تو نافرمانی کی زندگی گزارے اور طاعت گزاروں سے تیرے تعلقات ہوں تو تجھے اس سے کوئی فائدہ نہ ہوگا۔

یعنی اہلِ ایمان سے صرف نسبت تجھے بغیر ایمان کے کبھی مومن نہ بنائے گی اور اگر ایمان و عمل موجود ہو اور بے خبری کی وجہ سے اہلِ ایمان سے تعلقات نہ ہوں، اس سے تیرا کوئی نقصان نہ ہوگا کیونکہ باخبر ہو جانے کے بعد ان سے تعلقات ناگزیر ہیں۔ علامہ آلوسی نے اسی کو اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے لیکن ان کے خیال میں یہ آیت کا مدلول ہے اور امام رازی فرماتے ہیں کہ خبیث روحیں خبیث روحوں سے ملتی ہیں۔ اور جن لوگوں نے اس آیت میں نولّی کا مادہ ولایت واؤ کے زیر کے ساتھ قرار دے کر تولیہ کے معنے مسلط کر دینے کے کیے ہیں وہ ... مطلب یہ بتاتے ہیں کہ یہ جو شیاطین نے بے شمار انسانوں پر تسلط جما رکھا ہے تو اس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جس قسم کے لوگ اعمال اختیار کرتے ہیں، اعمال کے مطابق ہم ان پر مسلط کر دیتے ہیں۔ ظالموں پر ظالموں، بدکاروں پر بدکاروں کو تسلط کر دیتے ہیں۔ منصور بن ابی الاسود کہتے ہیں کہ میں نے امام اعمش سے اس آیت کے بارے میں دریافت کیا کہ آپ نے صحابہ سے کیا سُنا ہے فرمایا میں نے

ان سے بھی سنا ہے کہ جب لوگ خراب ہو جائیں گے تو ان پر بدترین لوگ حکومت کریں گے۔ حافظ سیوطی نے الدر المنثور میں حاکم کی تاریخ اور بیہقی کی شعب الایمان کے حوالہ سے یہ ارشادِ نبوت بھی اسی آیت کے تحت نقل کیا ہے کما تکونون یولی علیکم تم پر حکمران ویسے ہی بنائے جائیں گے جیسے تم ہو گے۔ اسی بنا پر حافظ ابن کثیر نے آیت گرامی کا یہ مطلب بتایا ہے جیسا کہ ہم نے ان انسانوں پر شیاطین کو تسلط دیا ہے ایسے ہم ظالمین پر ظالمین کو تسلط دیتے ہیں اور بعض کو بعض کے ذریعے ہلاک کرتے ہیں اور بعض کا بعض سے انتقام لیتے ہیں مطلب یہ ہے کہ رعایا جب ظالم ہوتی ہے تو ہم ان پر حاکم بھی ظالم ہی مسلط کر دیتے ہیں۔ اس تسلط کی بنیاد اعمال کا ہی نتیجہ ہوتی ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس تولیت کی جو زمانہ جاہلیت سے تصویر پیش کی ہے میں نے اس سے بہتر تصویر کسی مصنف کے قلم سے نہیں دیکھی فرماتے ہیں :

صدیوں سے آزادانہ حکومت کرنے کرتے اور دنیا کی لذتوں میں منہمک ہونے، آخرت کو فراموش کرنے اور شیاطین کے زیرِ اثر میں آجانے کی وجہ سے ایرانیوں اور رومیوں نے زندگی کی آسائشوں اور سامان آرائش میں بڑی باریک بینی اور نازک خیالی پیدا کر لی تھی اور اس میں ہر قسم کی ترقی اور نفاست میں ایک دوسرے سے سبقت لے جانے اور فخر کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ دنیا کے مختلف گوشوں سے ان مرکزوں میں بڑے بڑے اہلِ ہنر اور اہلِ کمال جمع ہو گئے تھے۔ اس سامان آرائش اور نفاست میں نزاکتیں پیدا کرتے تھے اور نئی نئی تراش خراش نکالتے تھے۔ ان پر عمل فوراً شروع ہو جاتا تھا۔ اور اس میں برابر اضافے اور جدتیں ہوتی رہتی تھیں، اور ان باتوں پر فخر کیا جاتا تھا، زندگی کا معیار اتنا بلند ہو گیا کہ امراء میں سے کسی کا ایک درہم سے کم ٹیکا باندھنا اور تاج پہننا سخت معیوب تھا۔ اگر کسی کے پاس عالی شان محل، فوارہ، حمام، باغات، خوش خوراک اور تیار جانور، خوش رو جوان اور غلام نہ ہوتے کھانے میں تکلفات اور لباس و پوشاک میں تجمل نہ ہوتا تو ہم چشموں میں اس کی کوئی عزت نہ ہوتی۔ اس کی تفصیل بہت طویل ہے۔ اپنے ملک کے بادشاہوں کا جو حال دیکھتے اور جانتے ہو اسی پر قیاس کر لو۔ یہ تمام تکلفات ان کی زندگی اور معاشرت کا جز بن گئے تھے اور ان کے دلوں میں اس طرح رچ اور بس گئے کہ کسی طرح نکل نہیں سکتے تھے۔ اس کی وجہ سے ایک ایسا لاعلاج مرض پیدا ہو گیا تھا جو ان کی پوری شہری زندگی اور ان کے پورے نظامِ تمدن میں سرایت کر گیا تھا۔ یہ ایک مصیبت عظمیٰ تھی جس سے عام و خاص اور امیر و غریب میں سے کوئی محفوظ نہیں رہا تھا ہر شہری پر یہ پُر تکلف اور امیرانہ زندگی ایسی مسلط ہو چکی تھی جس نے اس کو زندگی سے عاجز کر دیا تھا اور اس کے سر پر غم و افکار کا ایک پہاڑ ہمیشہ رکھا رہتا تھا۔ بات یہ تھی کہ یہ تکلفات بیش قرار رقمیں خرچ کیے بغیر حاصل نہیں ہو سکتے تھے اور یہ رقمیں اور بے پایاں دولت کاشت کاروں، تاجروں اور دوسرے پیشہ وروں پر محصول اور ٹیکس بڑھانے اور ان پر تنگی کیے بغیر دستیاب

نہیں ہو سکتی تھیں۔ اگر وہ ان مطالبات کے ادا کرنے سے انکار کرتے تو ان سے جنگ کی جاتی اور ان کو سزا دی جاتی۔ اور اگر وہ تعمیل کرتے تو ان کو گدھے اور بیلوں کی طرح بنا لیتے جن سے آب پاشی اور کاشت کاری میں کام لیا جاتا اور صرف خدمت کرنے کے لیے ان کو پالا جاتا اور محنت و مشقت سے ان کو کسی وقت چھٹی نہ ملتی۔ اس مشقت اور حیوانی زندگی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو کسی وقت سر اٹھانے اور سعادت اخروی کا خیال بھی کرنے کا موقعہ اور مہلت نہ ملتی۔ بسا اوقات پورے پورے ملک میں ایک فرد بشر بھی ایسا نہ ملتا جس کو اپنے دین کی فکر اور اہمیت ہوتی۔[1]

نجات کے لیے نبوّت پر ایمان ضروری ہے

۱۶۶۔ اے جنوں اور انسانوں کے گروہ کیا تمہارے پاس تم میں سے وہ رسول نہیں آئے جو تم کو میری آیات سناتے اور اس دن کے انجام سے تم کو ڈراتے تھے۔ اوپر جن و انس کی شرارت اور سزا کا بیان تھا اور اولیاء الجن کی زبانی فی الجملہ معذرت بھی نقل کی گئی تھی۔ اب بتایا جاتا ہے کہ ان کا کوئی عذر معقول اور قابل سماعت نہیں دنیا میں خدا کی حجت تمام ہو چکی تھی جس کا خود ان کو اقرار کرنا پڑے گا۔ یہ خطاب روز قیامت ہوگا اور جن و انس دونوں مخاطب ہوں گے یعنی کل مکلفین کا مجموعہ، ہر جماعت الگ الگ مخاطب نہیں جو یہ اعتراض ہو کہ رسول تو ہمیشہ انسانوں میں آتے، قوم جن میں سے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا گیا۔ پھر رسل منکم کہنا کیسے صحیح ہوگا۔ اصل یہ ہے کہ مجموعہ مخاطبین میں سے اگر کسی نوع میں سے بھی رسولوں کا آنا متحقق ہو جائے جس کی غرض تمام مخاطبین کو بلا تخصیص فائدہ پہنچانا ہو تو مجموعہ کو خطاب کرنے میں کوئی اشکال نہیں رہتا۔ مثلاً کوئی یہ کہے اے عرب و عجم کے باشندو اور یورپ و پچھم کے رہنے والو کیا تم ہی میں سے خدا نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جیسے انسان کامل کو پیدا نہیں کیا۔ اس عبارت کا مطلب کسی کے نزدیک یہ نہیں ہو سکتا کہ ایک محمد صلی اللہ علیہ وسلم تو عرب میں پیدا کیے گئے اور دوسرے عجم میں ہونے چاہئیں۔ اسی طرح پورب کے علیحدہ اور پچھم کے علیحدہ محمدؐ ہوں تب یہ عبارت صحیح ہوگی ایسے ہی یہاں سمجھ لیجئے! معشر الجن والانس کا مدلول صرف اس قدر ہے کہ جن و انس کے مجموعہ میں سے پیغمبر بھیجے گئے باقی یہ تحقیق کہ ہر نوع میں الگ الگ آئے یا ہر ایک پیغمبر کل افراد جن و انس کی طرف مبعوث ہوا۔ یہ آیت اس کے بیان سے خاموش ہے دوسری نصوص سے جمہور علماء نے یہ ہی قرار دیا ہے کہ نہ ہر ایک پیغمبر کی بعثت عام ہے اور نہ کسی جن کو اللہ

[1] حجۃ اللہ البالغہ جلد اوّل

مستقل رسُول بنا کر بھیجا ہے اکثر معاشی اور معادی معاملات میں اللہ تعالیٰ نے ان کو انسانوں کے تابع بنا کر رکھا جیسا کہ سورہ جن کی آیات اور نصوص حدیثیہ اس پر دلالت کرتی ہیں۔ یہ کوئی ضابطہ نہیں کہ مخلوق کی ہر نوع کے لیے اُس نوع کا کوئی شخص رسُول ہوا کرے۔ باقی انسانوں کی طرف فرشتہ کو رسُول بنا کر بھیجنے کا جو قرآن کے متعدد مواقع میں انکار کیا گیا ہے اس کا اصلی منشا یہ ہے کہ عام انسان بہیئتِ اصلیہ اس کی رویت کا تحمل نہیں کر سکتے اور بوجہ انتہا خوف و ہیبت کی وجہ سے مستفید نہیں ہو سکتے اور بصورتِ انسان آئیں تو بے ضرورت التباس رہتا ہے اسی پر قیاس کر لو کہ قوم جن میں منصبِ نبوت کی اہلیت ہوتی تو وہ بھی انسانوں کے لیے مبعوث نہ کیے جا سکتے تھے۔ کیونکہ وہاں بھی یہی اشکال تھا ہاں رسُول انسی کا جنوں کی طرف مبعوث ہونا اس لیے مشکل نہیں کہ جنوں کے حق میں انسان کی رویت نہ تو ناقابلِ تحمل ہے اور نہ انسان کا صوری خوف و رعب استفادے سے مانع ہو سکتا ہے۔ اور پیغمبر کو وہ قوتِ قلبی عطا فرما دیتا ہے کہ اس پر جن جیسی ہیبت ناک مخلوق کا کوئی رعب نہیں ہوتا [1]

پہلی آیت کو سُن کر اور پڑھ کر واقعی ذہن میں یہ سوال چٹکیاں لیتا ہے کہ ان ظالموں کا روزِ قیامت کیا حال ہوگا۔ اس آیت میں بطورِ استیناف ذہن میں اُٹھتے ہوتے اسی سوال کا جواب دیا گیا ہے کہ ان کو پکارا جائے گا اور ان سے دعوتِ انبیاؑ کے بارے میں پوچھا جائے گا الم یاتکم رسل منکم میں استفہام تقریری ہے اور مقصود توبیخ ہے۔ واقعی رسل منکم کا ظاہری سانچہ اگرچہ اسی کا مقتضی ہے کہ انبیاؑ اور رسُولوں کی بعثت انسانوں اور جنات دونوں میں سے ہو، اور کچھ نے سمجھا بھی ایسا ہی ہے چنانچہ ضحاک سے جب اس کے بارے میں دریافت کیا گیا تو کہنے لگے کیا اللہ کو یہ فرماتے نہیں سُنا یامعشر الجن والانس۔ کلبی کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے پہلے جن و انس دونوں میں رسُول مبعوث ہوتے تھے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ خصوصیت ہے کہ آپ جن و انس سب کی طرف مبعوث ہو کر آتے۔ حافظ عسقلانی نے حافظ ابن حزم ظاہری کے بارے میں فتح الباری میں لکھا ہے کہ وہ کہتے ہیں حدیث میں آیا ہے وکان النبی یبعث فی قومہ اور نبی اپنی قوم میں مبعوث ہوتا تھا اور جنات انسانوں کی قوم نہیں لہٰذا ثابت ہوا کہ جن کے لیے جن ہی انبیاؑ ہوتے ہیں۔ ان کا دعویٰ ہے کہ بجز ہمارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی پیغمبر کی بعثت جن و انس کے لیے نہیں ہوتی ہے صرف آپ کی بعثت بالاتفاق جن و انس کے لیے عام ہے۔

اردو تفاسیر میں مولانا امین احسن اصلاحی بھی اسی کے قائل ہیں کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے اندر انسانوں ہی میں سے رسُول بھیجے اسی طرح جنوں کے اندر بھی جنوں ہی میں سے رسُول بھیجے ہیں۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

لیکن جمہور اُمت اس کے خلاف ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ جیسے رسُول ہونے کے لیے قرآن کے بیان کردہ ضابطہ کے مطابق مرد ہونا اور ذرّیت نوح و ابراہیم ہونا ضروری ہے ایسے ہی رسُول کا انسان ہونا بھی ضروری ہے۔ یہاں منکم سے افراد نہیں بلکہ جملہ اور مجموعہ مراد ہے اس کی نظیر خود قرآن میں موجود ہے۔ قرآن میں مرج البحرین کے بعد ارشاد ہے یخرج منھما اللؤلؤ والمرجان، حالانکہ لولؤ و مرجان سب سمندروں سے نہیں نکلتے ہیں بلکہ کچھ سے نکلتے ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ نے جمہور کے موقف کو دلائل سے ثابت کیا ہے اور حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں۔

جمہور ضحاک کے استدلال کا یہ جواب دیتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ رسل انس وہ رسُول ہیں جو انسانوں کی طرف اللہ کی جانب سے بھیجے گئے اور رسل جن کو اللہ نے زمین میں منتشر کیا کہ وہ رسل انس کی باتوں کو سُن کر اپنی قوم کو تبلیغ کریں اسی لیے ان کا کہنے والا کہتا ہے انا سمعنا کتابا انزل من بعد موسیٰ۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ جن پہلے سے حضرت موسیٰ اور کتب آسمانی پر ایمان لاتے ہوئے تھے۔ قرآن سننے کے بعد انہوں نے محسوس کیا کہ یہ وہی تعلیم ہے جو پچھلے انبیاء دیتے چلے آرہے ہیں۔

نبوّت کا کام اس آیت میں یہ بتایا ہے یقصون علیکم اٰیاتی و ینذرونکم لقاء یومکم ھذا تم کو میری آیات پیش کرتے ہیں اور اس دن کے پیش آنے سے ڈراتے ہیں۔ آیات دو قسم کی ہوتی ہیں ایک ظاہری اور مادی اور دوسری باطنی و روحانی۔ ظاہر و مادی آیات تو وہ خوارق ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں باطنی اور روحانی آیات وہ تشریعی احکام ہیں جو نبوّت لے کر آتی ہے۔ جس میں اصُول ایمان، مکارم اخلاق اور محاسن اعمال کی تفصیل ہے۔ اسی میں نبوّت کی صداقت، معصومیت، تزکیہ، تاثیر، تعلیم و ہدایت، ارشاد، فلاح اور تائید داخل ہے۔ الغرض نبوّت کا کام یہ ہے کہ آیاتِ الٰہی کی تلاوت کرتا ہے۔ زنگ آلود نفوس اور سیاہ کار قلوب کو جلا دیتا ہے۔ لوگوں کو کتاب و حکمت اور اخلاق کی تعلیم دیتا ہے، اچھی باتوں کو پھیلاتا ہے اور برائیوں سے روکتا ہے۔ وہ طیبات کو حلال اور خبائث کو حرام کرتا ہے۔ وہ قوموں کے بوجھ کو اتارتا ہے اور ان کے پاؤں کی بیڑیوں کو کاٹتا ہے۔ وہ خدا کا گواہ بن کر اس دنیا میں آتا ہے۔ لوگوں کو یگانہ خدا کی عبادت کی دعوت دیتا ہے، نیکو کاروں کو بشارت سناتا ہے۔ بدکاروں کو عذاب الٰہی سے ڈراتا ہے اور اس ظلمت کدہ عالم میں وہ ہدایت کا چراغ بن کر چمکتا ہے۔ نبوّت اپنے کام میں توحید اور ایمان بالآخرت کو اساسی اہمیت دیتی ہے نبوّت کو آخرت پر ایمان کی دعوت اور اس کی اہمیت صرف اخلاقی یا اصلاحی ضرورت کے تحت نہیں، بلکہ اس کی حیثیت اس بنیاد کی ہے جس کے بغیر اسلامی معاشرہ وجود میں نہیں آسکتا۔ عقیدہ آخرت کا اہتمام اس سے دلچسپی اور شیفتگی کا اظہار اس کی تبلیغ و تشہیر اور اس کی اہمیت پر اتنا زور کہ یہی پورے دین کی

دعوت کی اساس بن جاتے، جن لوگوں نے نبوت کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ آخرت ہمیشہ اس کی نظروں میں ہوتی ہے اور اس کی تصویر نعمت و مصیبت اور سعادت و شقاوت کی تمام تفصیلات کے ساتھ ان کی آنکھوں کے سامنے رہتی ہے وہ ہمہ وقت جنت کے شدید اشتیاق اور جہنم سے شدید خوف کے عالم میں رہتے ہیں اور یہ فطری بات ہے کہ یہ بات ان کے لیے بالکل مشاہدہ ہے اور ایک واقعہ کی حیثیت رکھتی ہے جو ان کے شعور و احساس، اعصاب اور قوتِ فکریہ پر غالب رہتی ہے۔

آخرت سے غفلت کا راز

۱۶۷۔ وہ کہیں گے ہاں ہم اپنے خلاف گواہی دیتے ہیں، دنیوی زندگی نے ان کو دھوکے میں ڈالے رکھا یعنی دنیا کی لذات و شہوات نے انہیں آخرت سے غافل بنا دیا، کبھی خیال بھی نہ آیا کہ اس احکم الحاکمین کے سامنے جانا ہے جو ذرے ذرے کا حساب لے گا[1]

مطلب یہ ہے کہ ہم اقرار کرتے ہیں کہ آپ کی طرف سے رسول پر رسول آتے رہے اور ہمیں حقیقت سے خبردار کرتے رہے مگر یہ ہمارا اپنا قصور ہے کہ ہم نے ان کی بات نہ مانی[2] یہاں غرتھم الحیاۃ الدنیا لا کر اشارہ کر دیا کہ ان کے انکار اور سرکشی کا اصلی باعث دنیا کی وہ پُرفریب زندگی ہے جس کی ساری کامرانیاں اور دلفریبیاں بے ثبات اور ہنگامی ہیں جہاں کسی چیز اور حالت پر بھروسہ نہیں کہ یہ ضرور ایسی ہی رہے گی۔ اول تو زندگی ہی چند روزہ ہے پھر اس کا بھی ٹھکانا نہیں۔ پھر زندگی کے عیش و تنعم کی جتنی دلفریبیاں ہیں سب کا حال یہ ہے کہ صبح ہیں تو شام نہیں۔ ایسی حالت میں اس سے بڑھ کر غفلت اور گمراہی کی اور کیا بات ہوگی کہ انسان اس سے دھوکہ کھا جاتے اور حق و راستی کی راہ چھوڑ کر سرکشی پر اتر آتے اور کسی کے بھروسے پر مال، جاہ ریاست اقتدار پر اس زندگی کے سر و سامان اور اقتدار کے بھروسہ پر جسے چند لمحوں کے لیے قرار نہیں ہے لیکن انسانی غفلت کے عجائب کا یہی حال ہے وہ دیکھتا ہے کہ نبوت کی دعوت کو اپنا نا بادشاہ امیر کو زندگی کے تمام حقوق اور تمام معاملات میں عام شہریوں کے برابر کر دے گا اس لیے اس کا غرور اس کی بڑائی نبی کے اور اس کے درمیان اپنی دیوار بن جاتی ہے کوئی نہیں جو اس حقیقت سے بے خبر ہو مگر کوئی نہیں جو اس غرورِ باطل کی سرگرانیوں سے اپنی نگہداشت کر سکے۔ یہی غرور ہے جسے نبوت دور کرنے آتی ہے وہ دنیا اور اس کی کامرانیوں سے نہیں روکتی مگر اس کے غرورِ باطل اور بے اعتدالانہ انہماک کی

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

راہیں بند کر دینا چاہتی ہے کیونکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے فتنوں کا سرچشمہ بھی دنیا کا غرور ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ نبوت کی دعوت کے انکار کی بنیاد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اس دنیا کی ظاہر فریبی نے ان کو دھوکے میں ڈال رکھا ہے۔ دنیوی زندگی کا سارا کارخانہ چونکہ جزا و سزا کے اصول پر نہیں بلکہ ابتلا کے اصول پر چل رہا ہے جس میں حق کے ساتھ باطل کو بھی پھلنے اور پھولنے کی مہلت ملی ہوئی ہے اس وجہ سے ان کو دھوکہ ہو گیا ہے کہ جزا و سزا ہے ہی نہیں ہے اور انبیاؑ کی دعوت کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔

آج بھی غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ انسانیت اور نبوت کی راہ میں یہی الحیاۃ الدنیا کے غرور کی دیوار حائل ہے۔ یورپ و امریکہ و روس کو دیکھو یہی الحیاۃ الدنیا یعنی مادہ پرستی اُن کا مذہب ہے اس کے متعلق ایک مفکر لکھتا ہے:

یورپ کا عام اور متوسط آدمی وہ جمہوری ہو یا فاسشسٹی، سرمایہ دار ہو یا اشتراکی ہاتھ سے کام کرنے والا ہو یا دماغی محنت کرنے والا ایک ہی مذہب جانتا ہے، وہ کیا؟ مادی ترقی کی پرستش اور یہ عقیدہ کہ اس زندگی کی غرض و غایت، اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اس کو زیادہ سے زیادہ آسان اور پُر راحت اور آزاد اور بے قید بنائے۔ اس مذہب کے گرجے اور عبادت گاہیں، کارخانے، تھیٹر، کیمادی دارالصنائع، ناچ گھر اور بجلی کے مرکز ہیں۔ اس مذہب کے پروہت بینکوں کے افسران، اداکار عورتیں، فلم اسٹار اور تجارتی صناع ہیں۔ طاقت و ہوس کی اس لذت اور حصول کا یہ لازمی نتیجہ ہے کہ حریف گروہ سامانِ جنگ سے اور جنگی تیاریوں سے مکمل لیس تیار کھڑے ہیں اور جہاں تک تہذیب کا تعلق ہے انسانوں کا ایک ایسا ٹائپ پیدا ہو چکا ہے جس کا عقیدہ ہے کہ نیکی اور اخلاق نام ہے عملی فائدہ کا اس کے نزدیک معیار صرف مادی کامیابی ہے۔

اور سنیے:

> مغربی تہذیب صاف صاف پُر زور طریقہ پر خدا کا انکار کرتی لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس کے دینی نظام میں اللہ کی کوئی جگہ نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت سمجھتی ہے۔
>
> (انسانیت کی تعمیر اور اسلام)

بہت ممکن ہے کہ اس بیان کو زیادہ وقعت نہ دی جائے کیونکہ ان خیالات کا پیش کرنے والا اسلامی افکار سے متاثر ہے اس لیے ہم ذیل میں چند دوسرے مفکرین کی آراء پیش کرتے ہیں۔ ان سے اس رجحان کا صحیح اندازہ ہو سکتا ہے۔

پروفیسر جوڈ اپنی کتاب دی فلاسفی آف آور ٹائمز میں لکھتے ہیں:

صدیوں سے انگلستان کے تخیل پر دولت اندوزی کا اصول غالب ہے حصولِ دولت کی خواہش پچھلے دو سو سال سے دیگر محرکاتِ عمل سے زیادہ بڑھ کر کار فرما رہی ہے۔ کیونکہ دولت حصولِ ملکیت کا ذریعہ ہے اور ذاتی ملکیت کی بہتات اور عظمت و شان سے انسان کی قابلیت کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ سیاسیات ادب، ریڈیو، سینما اور کبھی کبھی گرجاؤں کے منبروں سے سال بسال سامعین کو بھی تعلیم دی جاتی رہی ہے کہ مہذب قوم وہی ہے جس میں تملیکی جذبہ انتہائی ترقی کر چکا ہو۔ اسی عز درِ حیاتِ دُنیا کا یہ اثر ہے کہ اس زمانے میں انسان صرف حصولِ زر اور جلبِ منفعت کے لیے زندہ ہے اس سے زیادہ کچھ بھی سوچنے کے لیے تیار نہیں ہوتا، پروفیسر جوڈ نے بالکل صحیح کہا ہے۔

جو نظریہ حیات اس زمانے پر مستولی اور غالب ہے وہ اقتصادی نظریہ ہے دوسرے لفظوں میں ہر مسئلہ کو پیٹ یا جیب کے نقطۂ نظر سے دیکھنا اور جانچنا۔

نبوت سے کافرانہ تعلق کا انجام

۱۶۸ - اور انہوں نے اپنے خلاف اس بات کا اقرار کر لیا کہ وہ کافر تھے۔ اس سورت میں اُوپر مذکور ہوا کہ اوّل کافر اپنے کُفر کا انکار کریں گے پھر حق تعالیٰ تدبیر سے ان کو قائل کرے گا[1] پہلے ان کے اقرار کا ان کی زبانی ذکر تھا اور یہ اللہ سبحانہ کی جانب سے بطورِ مذمت ان کے کُفر کا بیان ہے تاکہ سننے والوں کو عبرت ہو۔ مطلب یہ ہے کہ وہ روزِ محشر اس کے مختلف مواقف میں سے کُفر کا کُھلے بندوں اقرار کریں گے۔ جب ان کے خلاف حجت قائم ہو جائے گی کہ وہ دُنیا کی زندگی میں نبوت کی پیش کردہ ہدایات اور نوامیس کا انکار کرتے تھے۔ وہاں نہ وہ جھوٹ بول سکیں گے نہ کوئی بات بنا سکیں گے۔ نبوت کا کُفر صرف ان کی تکذیب ہی نہیں ہے بلکہ یہ بھی کُفر ہے کہ نبوت کی باتوں کو اپنی زندگی میں شرفِ پذیرائی نہ دے۔ کُفر دو قسم کا ہے ایک یہ کہ جو کچھ نبوت لے کر آئی ہے اسے نہ مانے اور ایک یہ ہے کہ نبوت جو کچھ پیش کر رہی ہے اس پر نہ چلے۔ مطلب یہ ہے کہ اسلام گو انقیادِ ظاہری کا نام ہے مگر ایمانِ باطن اس کے لیے شرط ہے اسی طرح ایمان گو انقیادِ باطن کا نام ہے مگر انقیادِ ظاہری اس کے لیے ضروری ہے اس سے ظاہر ہو گیا کہ اسلام بلا ایمان کے اور ایمان بغیر اسلام کے شرعاً

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

معتبر نہیں ہے۔ اتحاف السادہ المتقین میں علامہ مرتضیٰ زبیدی نے اس تلازم پر اشاعرہ اور حنفیہ کا اتفاق نقل کیا ہے۔ قرآن نے کُفر کو ایمان و اسلام دونوں کا مقابل قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے کیف یھدی اللّٰہ قوماً کفروا بعد ایمانھم اس میں ایمان کُفر کا مقابل ہے اور ارشاد ہے ایامرکم بالکفر بعد اذ انتم مسلمون اس میں اسلام کفر کا مقابل ہے۔ اس سے یہ بات خود بخود سمجھ میں آرہی ہے کہ دونوں کا نتیجہ کُفر ہے۔ آیت میں کُفر ایمان و اسلام دونوں کے لیے بولا گیا ہے۔

مواخذے کے بارے میں قانونِ الٰہی

۱۶۹۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ تیرا رب بستیوں کو ان کے ظلم پر ہلاک کرنے والا نہیں ہے جب کہ باشندے غافل اور بے خبر ہوں۔ یعنی خدا کی یہ عادت نہیں ہے کہ بدون آگاہ اور خبردار کیے کسی کو اس کے ظلم و عصیان پر دنیا یا آخرت میں پکڑ کر ہلاک کر دے اسی لیے رسُول اور نذیر بھیجے کہ وہ خوب کھول کر تمام جنّ و انس کو اس کے بھلے اور بُرے اور آغاز و انجام سے خبردار کردیں[1] مطلب یہ ہے کہ اُمتوں میں پیغمبروں کو اُمتوں کی اجتماعی، روحانی اصلاح اور اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونے کے خطرہ سے آگاہ کرنے کے لیے رسُولوں کو اس لیے روانہ کیا جاتا ہے کہ اللہ کی سنّت اور قانون یہ نہیں ہے کہ اُمتوں کو عذاب، استیصال یا کسی اور عذاب کے ذریعے ایسی حالت میں ہلاک کر ڈالے کہ گناہ پر ان کو خبردار کرنے والا اور آگاہ کرنے والا کوئی نہ آیا ہو۔ یعنی ہم عذاب دینے سے پہلے رسُول روانہ کرتے ہیں جو گناہوں میں ملوث لوگوں کو آگاہ کریں۔ صلاح، حق، عدل، تقویٰ اور فضائل کی راہ بتائیں۔ اور لوگوں کو ان کی غفلت سے چونکائیں۔ رسُولوں کی روانگی کا مقصد لوگوں پر اللہ کی حجت پورا کرنا ہے تاکہ بندے اللہ کے مقابلے میں یہ احتجاج نہ کرسکیں تو نے حق بتایا ہی نہ تھا اور ہمیں حقیقت سے آگاہ ہی نہیں کیا تھا، ہم تو بے خبر تھے اور بے خبری کی حالت میں ہی ہم سے گناہ ہوتے ہیں اسی حجت کو ختم کرنے کے لیے اللہ نے پیغمبر روانہ کیے ہیں۔ بہشت اور دوزخ جو کچھ بھی ہے انسان کے اپنے ہی عمل کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس طرح دُنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری، پینے کا سیرابی، بھوک کا تکلیف، بیماری کا بے آرامی، گرنے کا چوٹ، زہر کا موت، شہد کا مٹھاس غرض ہر اچھے اور بُرے عمل کا ایک لازمی جسمانی نتیجہ ہے۔ اسی طرح ہم کو اپنے اعمال کا ایک روحانی اور حقیقی نتیجہ آخرت میں ملنے والا ہے تو جس طرح زہر کھا کر مرنے کی

[1] افادات شیخ الاسلام

ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر مر کیوں گئے، اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو ان کے اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی۔ دونوں ہمارے اعمال کے یکساں لازمی نتیجے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی غایت رحمت سے ہم کو اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا ہے ہم کو نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا۔ عقل عنایت کی ضمیر عطا کیا۔ پھر انبیا اور رسول روانہ کیے۔ شریعت دی کتاب مرحمت کی لیکن ظالم و نادان انسان نے نبوت کی رحمت کو قبول کرنے سے انکار کیا۔ اللہ کا دستور یہی ہے کہ انبیاؑ روانہ کر کے لوگوں پر اتمام حجت کرتا ہے۔ قرآن کی آیت کا سادے لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ وہ کسی قوم کو اس کی بداعمالیوں، بداخلاقیوں، بدمعاملگیوں اور غلط افکار پر اس کے نتائج و عواقب سے آگاہ کیے بغیر عذاب نہیں دیتا وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو اس سے پہلے ان کو اچھی طرح آگاہ کر دیتا ہے تاکہ وہ توبہ و اصلاح کرنا چاہیں تو توبہ و اصلاح کر لیں اور اگر نہ کرنا چاہیں تو اپنی ذمہ داری پر اس کے نتائج بھگتیں۔

حافظ ابن جریر آیت کے دو مطلب بتاتے ہیں ایک تو وہی جو سُن چکے ہو دوسرا مطلب یہ بتایا ہے کہ اللہ تعالیٰ لوگوں کو ان کی بے خبری میں ظلماً ہلاک نہیں کرتا ہے لیکن ابن کثیر اور ابن جریر دونوں نے پہلے مطلب کو ترجیح دی ہے لیکن اگر غور کیا جائے تو دونوں باتیں صحیح ہیں یہ بات بھی درست ہے کہ اللہ سبحانہٗ لوگوں کو ان کے گناہوں کی بنا پر بغیر آگاہ کیے ہلاک نہیں کرتا یعنی جب تک لوگوں کو آگاہ نہ کر دے اس وقت تک عذاب نہیں آتا۔ اللہ تعالیٰ کے نظام عدالت میں پیغمبر ایک بنیادی حیثیت رکھتا ہے۔ پیغمبر ہی بندوں پر اللہ کی حجت ہے۔ قرآن میں اس کی تائید موجود ہے۔

وکذالک اخذ ربک اذا اخذ القری وھی ظالمۃ

اور یہ بھی صحیح ہے کہ خدا لوگوں کو ظلماً بے خبری میں ہلاک نہیں کرتا ہے۔ قرآن میں ہے

وماکان ربک لیھلک القری بظلم واھلھا مصلحون

ایمان کے لحاظ سے درجہ بندی

۱۳۰۔ اور سب کے لیے ان کے اعمال کے مطابق درجے ہیں اور تیرا رب لوگوں کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ یعنی جس درجہ کا عمل ہوگا حق تعالیٰ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ فرمائیں گے[1] مطلب یہ ہے کہ انسانوں اور جنوں کے ان تمام افراد کے لیے جن کے پاس نبوت کی دعوت پہنچی ہے ان کے اعمال کے مطابق

---

[1] افادات شیخ الاسلام

درجات ہیں اور اللہ ان کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے بلکہ عالم ہونے کے ساتھ پورے اعمال اس کے احاطہ قدرت میں ہیں۔ اعمال اچھے ہوں یا بُرے، بُرائی کا نتیجہ بُرا ہے لیکن اچھائیاں اپنے پیچھے صرف اچھا نتیجہ ہی نہیں رکھتی ہیں بلکہ اس کے نتائج ترقی پذیر ہوتے ہیں۔ اچھا کا نتیجہ اچھا اگر عدل ہے تو اس کی ترقی پذیری اللہ کا فضل ہے۔ آیت میں بکلّ سے اگر انبیاؑ کو نہ ماننے والے مراد ہوں یعنی مکذبین اور کافرین جیسا کہ یہاں سیاق کا تقاضا تو لفظ درجات بمعنے درکات ہے۔ کیونکہ درجات کا استعمال خیر اور خوبی اور اس کی جزا میں ہوتا ہے اور درکات اس کے مخالف ہے اور امام راغب نے درجہ اور درکہ میں یہ فرق بتایا ہے کہ درجہ بلندی اور بالائی کے لحاظ سے ہوتا ہے جب کہ درکہ پستی اور تنزل کے اعتبار سے ہوتا ہے۔ اور عام شارحین قرآن نے یہاں تغلیبی طور پر لفظ درجات کو یہاں مومنین اور کافرین کے لیے رکھا ہے۔

وَرَبُّكَ الْغَنِيُّ ذُو الرَّحْمَةِ ۚ إِن يَشَأْ يُذْهِبْكُمْ وَيَسْتَخْلِفْ مِن بَعْدِكُم مَّا يَشَاءُ كَمَا أَنشَأَكُم مِّن ذُرِّيَّةِ قَوْمٍ آخَرِينَ ﴿١٣٣﴾ إِنَّ مَا تُوعَدُونَ لَآتٍ ۖ وَمَا أَنتُم بِمُعْجِزِينَ ﴿١٣٤﴾ قُلْ يَا قَوْمِ اعْمَلُوا عَلَىٰ مَكَانَتِكُمْ إِنِّي عَامِلٌ ۖ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ مَن تَكُونُ لَهُ عَاقِبَةُ الدَّارِ ۗ إِنَّهُ لَا يُفْلِحُ الظَّالِمُونَ ﴿١٣٥﴾

اور تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے[۱۴۱]۔ اگر وہ چاہے تو تمہیں ہٹا دے اور تمہارے بعد جس گروہ کو چاہے تمہارا جانشین بنا دے، جیسا کہ ایک دوسری قوم کی نسل سے تمہیں اٹھایا ہے[۱۴۲]۔ جس بات کا تم سے وعدہ کیا ہے وہ یقیناً ہونے والی ہے اور تمہارے بس میں نہیں کہ خدا کو عاجز کر دو[۱۴۳]۔ اے پیغمبر لوگوں سے کہہ دو کہ اے میری قوم تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ میں بھی کام کر رہا ہوں، عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ آخر کار اس کا انجام

بیخبر ہے، بلاشبہ ظلم کار لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ ۱۳۴

معانی مفردات

ذوالرحمۃ ذو کے معنے والا اور صاحب کے آتے ہیں۔ یہ ہمیشہ مضاف ہو کر آتا ہے اور اسم ظاہر اس کا مضاف الیہ ہوتا ہے اس کا تثنیہ بھی آتا ہے اور اس کا مونث ذات ہے ذو کی جمع اولو اور ذات کی جمع اولات آتی ہے۔ علامہ سہیلی رقمطراز ہیں، ذو وصف میں صاحب سے زیادہ بلاغت ہے اور اس کے ذریعے اضافت میں زیادہ شرف ہے، کیونکہ ذو تابع کی طرف مضاف ہوتا ہے جبکہ صاحب متبوع کی طرف۔ حضرت ابوہریرہ کو کو صاحب النبی بولتے ہیں النبی صاحب ابی ھریرہ نہیں بولتے اور ذو کے ساتھ جب ذوالمال بولوگے تو اسم متبوع ہوگا تابع نہیں۔ یہی فرق ہے جس کی وجہ سے حضرت یونس کو سورہ انبیاء میں ذوالنون مچھلی والا اور سورہ قلم میں صاحب الحوت کہا ہے۔ ذریۃ اولاد اصل میں چھوٹے چھوٹے بچوں کا نام ذریت ہے مگر عرف میں چھوٹی اور بڑی اولاد کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اگرچہ یہ جمع ہے مگر واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے ذریۃ کے بارے میں تین رائیں ہیں ایک یہ کہ ذرا سے بنا ہے جس کے معنے پیدا کرنے اور پھیلانے کے ہیں جیسے بریۃ اور خطیئۃ، دوسرے یہ کہ اس کی اصل ذرویۃ ہے، تیسرے یہ کہ ذر سے بنا ہے جس کے معنے بکھرنے کے ہیں۔ ذراری اور ذریات اس کی جمع آتی ہے۔ سوف تعلمون تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ سوف کے معنے عنقریب، جلدی، اب آخر، امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں سوف حرف ہے جو فعل مضارع کو استقبال کے ساتھ خاص کر کے حال سے علیحدہ کر دیتا ہے۔ سوف تعلمون، میں اس پر تنبیہہ ہے کہ جو چیز طلب کر رہے ہیں گو فی الوقت حاصل نہیں ہے مگر بعد میں لامحالہ وہ ہو کر رہے گی اور یہ ڈھیل اور تاخیر کے معنے چاہتا ہے۔ السیوطی نے ابن باب شاہ کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ سوف کا غالب استعمال وعید میں ہوتا ہے اور سین کا وعدے میں۔ اور کبھی سوف وعدے اور سین وعید میں۔ عاقبۃ، عاقبت، انجام، آخر، یہ اصل میں عقب کا مصدر

ہے جس کے معنے پیچھے سے آنے کے ہیں لیکن اس کا استعمال ہر شے کے آخر اور انجام کے لیے ہوتا ہے۔ امام راغب نے تصریح کی ہے کہ اس کا استعمال ثواب کے لیے مخصوص ہے جیسے والعاقبۃ للمتقین اور اضافت کی صورت میں کبھی عقوبت کے لیے بھی ہوتا ہے اس کی جمع عواقب آتی ہے۔

اتمامِ حجت کا اہتمام تقاضائے رحمت ہے

انسانی فطرت خیر و شر کے شعور سے محروم نہیں ہے اور نہ عقل حق و باطل میں امتیاز سے قاصر ہے انسان کو اللہ تعالیٰ نے احسن تقویم پر پیدا کیا ہے اور اس کو خیر و شر کی معرفت بخشی ہے لیکن اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہوا کہ وہ عقل و فطرت کی رہنمائی کے ساتھ وحی و نبوت کی رہنمائی سے بھی انسان کو نوازے تاکہ عقل و فطرت کے تقاضے اس کے سامنے بالکل مبرہن ہو کر آجائیں اور گمراہی کے لیے ادنیٰ عذر بھی باقی نہ رہے یعنی انبیاء کے روانہ کرنے کی ایک ہی مصلحت تھی اور وہ یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ نوعِ انسانی پر اتمامِ حجت کرنا چاہتا تھا تاکہ آخری عدالت کے موقعہ پر کوئی گمراہ مجرم اس کے سامنے یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے اور آپ نے ہمیں حقیقتِ حال سے آگاہ نہیں کیا تھا۔ اسی مصلحت کے لیے خدا نے دُنیا کے تمام گوشوں میں انبیاء روانہ کیے اور کتابیں نازل کیں۔ لیکن اس مصلحت کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ انبیاء کی روانگی سے اللہ کی انسانوں سے کوئی غرض ہے اللہ کی ذات غنی مطلق ہے اسے کسی درجہ میں کسی چیز کی احتیاج نہیں ہے یہ کام اس کے محتاج ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ یہ اس کا نظامِ ربوبیت ہے۔ جس طرح اس کی ربوبیت نے ہر ذرہ کے لیے سیرابی اور ہر چیونٹی کے لیے کارسازی رکھی ہے اسی طرح اس نے انسانی رُوح کی سعادت کے لیے بھی قاعدہ اور قانون بنایا ہے۔ یہ کیسے ممکن تھا کہ اس کی پروردگاری اجسام کی پرورش کے لیے تو آسمان سے پانی برسائے لیکن ارواح کی پرورش کے لیے اس کے پاس ایک قطرۂ فیض نہ ہو۔ روحانی سعادت کی اسی بارش کا نام وحی و نبوت ہے لیکن اس کی یہ ربوبیت کسی غرض سے ہرگز آلودہ نہیں ہے اس کی ذات اغراض، غایات سے بالا ہے۔ غرض محتاجی ہے اور احتیاج سے اس کی ذات پاک ہے۔ پھر ایسا انتظام کیوں ہے؟ قرآن نے یہاں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اللہ سبحانہٗ رب ہونے کے ساتھ ذوالرحمۃ ہے یعنی رحمت والا ہے جو رحمت کارخانہ ہستی کے ہر گوشہ میں افادۂ فیضان کا سرچشمہ ہے کیونکر ممکن ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کے لیے اس کے پاس کوئی فیضان نہ ہو اور وہ انسان کو نقصان د

ہلاکت کے لیے چھوڑ دے۔ یہاں ربک الغنی ذوالرحمۃ فرما کر اسی نکتہ کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نبوت کا فیضان اس لیے نہیں ہے کہ اللہ کی کوئی غرض ہے، اللہ کی ذات غرض سے بالا ہے بلکہ اس لیے کہ اللہ کی ذات رحمان و رحیم ہے اور اس کی رحمت کا تقاضا ہے کہ انسانوں کی روحانی سعادت کے لیے نبوت آئے۔ اپنی صفت غنا کی وجہ سے اس کو کسی کی پروا نہیں ہے وہ سب سے بے نیاز سب سے مستغنی اور سب سے بے پرواہ ہے۔ سب اس کا انکار کر دیں تو اس کا کچھ نہیں بگڑتا اور سب اس کے گن گائیں تو اس کا کچھ نہیں بنتا۔ وہ اگر اپنے رسول بھیجتا ہے تو اس لیے نہیں کہ لوگوں کے ایمان کے بغیر اس کا کام اٹکا ہوا ہے بلکہ بر اس لیے ہے کہ وہ غنی ہونے کے ساتھ ذوالرحمۃ ہے۔ اس کی رحمت کا تقاضا یہ ہے کہ لوگوں پر اتمام حجت کر دے۔

۱۳۳۔ اور تیرا پروردگار بے نیاز رحمت والا ہے۔ پہلی آیت کے آخر میں فرمایا تھا وما ربک بغافل عما یعملون تیرا رب ان کے اعمال سے بے خبر نہیں ہے اور یہاں فرمایا وربک الغنی ذوالرحمۃ تیرا رب بے نیاز رحمت والا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عاملوں اور ان کے اعمال سے باخبر ہونے کے باوجود اللہ کو ان عاملوں اور ان کے اعمال کی پروا نہیں ہے بلکہ وہ ہر چیز سے مستغنی ہے۔ علمائے بلاغت کی زبان میں یہ فقرہ حصر کا فائدہ دے رہا ہے۔ یعنی اللہ ہی کی ذات کامل ترین غنا رکھنے والی اور پوری رحمت والی ہے۔ بے نیازی اور غنا اللہ سبحانہ میں واقعی اور حقیقی ہے۔ اس کے سوا دنیا اور کائنات کی ہر چیز اپنے وجود اور بقا میں اللہ کی محتاج ہے۔ لوگوں میں غنا اضافی ہے، ایک سرمایہ دار جسے ہم غنی کہتے ہیں وہ زیادہ محتاج ہے اور ایک سے زیادہ لوگوں کا محتاج ہے۔ بیوی کا ملازم کارکن کا ڈاکٹر کا اور حاکم کا محتاج ہے۔ اور سب اشیا کا محتاج ہے اپنے وجود اور بقا کے لیے اسباب کا اور اسباب سے بالا اللہ کا محتاج ہے لیکن اللہ کی ذات میں غنا ہے حقیقی ہے، نہ اسے طاعت گزاروں کی طاعت کوئی فائدہ پہنچاتی ہے اور نہ گنہگاروں کا گناہ اسے نقصان دیتا ہے۔

مسند احمد، ترمذی، اور صحیح مسلم میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث قدسی میں اللہ کی شان استغنا کی شاندار تصویر پیش کی ہے:۔

> ابوذر غفاری سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ سبحانہ کا فرمان ہے اے میرے بندو! تم سب قصور دار ہو مگر وہ جسے میں بچا لوں میرے سے بخشش طلب کیا کرو میں تمہیں بخش دوں گا۔ جو شخص یہ جانتا ہے کہ مجھ میں بخشنے کی طاقت ہے پھر مجھ سے بخشش مانگتا ہے تو میں اسے بخش دیتا ہوں اور کوئی

پرواہ نہیں کرتا ہوں، تم سب گم کردہ راہ ہو مگر وہ جسے راہ میں دکھلاؤں تو مجھ سے ہدایت مانگا کرو میں تمہیں ہدایت دوں گا تم سب محتاج ہو مگر وہ جسے میں بے نیاز کردوں تم مجھ سے مانگو میں تمہیں بے نیاز کر دوں گا۔ اگر تمہارے اگلے پچھلے اور ایک روایت میں ہے کہ انسان اور جن، چھوٹے اور بڑے، مرد اور عورت، زندہ اور مردہ، تر اور خشک سب مل کر میرے بندوں میں سب سے زیادہ شقی القلب بندہ کی طرح ہو جائیں تو میری سلطنت میں مچھر کے پر کے برابر کوئی کمی نہیں آتی اور اگر سب کا دل متقی سے متقی انسان کی طرح ہو جائے تو میری سلطنت میں ایک مچھر کے پر کے برابر زیادتی نہیں ہو سکتی۔ اگر تمہارے اول و آخر اور ایک روایت میں ہے انسان و جن، چھوٹے اور بڑے، مرد و عورت، زندہ و مردہ، تر اور خشک سب ہوں اور ان میں سے ہر سائل مجھ سے وہ مانگے جو اس کی انتہائی آرزو ہو، پھر ان میں سے ہر ہر سائل کو میں اس کی منہ مانگی مراد دے دوں تو میرے خزانے میں اتنی بھی کمی نہ آئے گی جیسے کہ تم میں کوئی شخص سمندر کے کنارے گزرے اور اس میں سوئی ڈبو کر نکال لے۔ اسی طرح میری سلطنت میں کوئی کمی نہ آئے گی۔ یہ اس لیے کہ میں سخی ہوں بزرگی والا ہوں، بے نیاز ہوں بات میری بخشش اور بات میرا عذاب ہے اور جب میں کسی کام کے کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں تو صرف یہ کہہ دیتا ہوں کہ ہو جا وہ موجود ہو جاتی ہے۔ اے میرے بندو یہ تمہارے اعمال ہیں ان کو میں تمہارے لیے درج کرتا ہوں پھر ان اعمال ہی کی میں تم کو پوری جزا دوں گا۔ لہٰذا جو شخص بھلائی اور نیکی پائے اسے اللہ کا شکر کرنا چاہیے اور اگر اس کے سوا کچھ اور پائے تو اسے اپنے ہی کو ملامت کرنا چاہیے۔

یہ ارشادِ الٰہی ایک طرف اگر اللہ سبحانہٗ کی شانِ استغنا کی عکاسی کر رہا ہے تو دوسری طرف اللہ سبحانہٗ کی توحید اور عظمتِ شان کی وہ روح پھونک رہا ہے کہ اس کے بعد اب کوئی ہاتھ نہ رہے جو خدا کے سوا کسی دوسرے کی طرف اٹھے، کوئی دوسری بارگاہ نہ رہے جس پر حاجت روائی کا گمان کیا جا سکے۔ گنہگار اگر گناہ کرتا ہے تو جان لے کہ اس کا نقصان اسی کو ہے۔ عابد اگر عبادت کرتا ہے تو سمجھ لے کہ اس کا نفع اسی کی ذات تک محدود ہے۔ اللہ کی بے نیازی کا یہ عالم کہ اگر تمام مجرمین کو بخش ڈالے تو پروا نہیں فیاضی کی یہ انتہا کہ اگر ایک ایک کو منہ مانگی مراد دے تو اس کے خزانۂ غیب میں کوئی نقصان نہیں۔ سلطنت کی یہ قہرمانی کہ اس کے ارادہ و مراد میں تخلف نہیں۔ دنیا میں بڑے سے بڑا نقادن

اسباب وعمل کا گرفتار ہے مگر اللہ کی یہ شان کہ اسباب و مسببات اس کے حکم کے منتظر ہیں۔ یہ ہے ربک الغنی کا مطلب۔ آئیے الغنی ہونے کے ساتھ ذوالرحمۃ پھر بھی یہاں برائے تقریب سخن، ایک اجمالی نظر ڈال لیجئے۔ رحمت کا ابتدائی تعارف اگرچہ ربک کے ذریعے سے قائم ہے کیونکہ ربوبیت کی اصل روح رحمت ہی ہے اگر رحمت نہ ہوتی تو ربوبیت کا یہ نظام بھی نہ ہوتا بلکہ یہ رحمت ہی کا جوش ہے کہ عدم کو وجود کا لباس ملا۔ یہاں رحمت کا ہر چھینٹا اللہ کی رحمت کا فیضان ہے۔ صحیحین میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت عمر کے حوالہ سے ایک ارشاد آتا ہے۔

حضرت عمر فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس کچھ قیدی آئے ان میں ایک عورت پر نظر پڑی جو اپنا بچہ تلاش کرتی پھرتی تھی۔ جوں ہی اس کو اپنا بچہ مل گیا اسی وقت اس نے اٹھا کر اپنے سینہ سے لگا لیا اور دودھ پلانے لگی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے مخاطب ہو کر فرمایا تمہارا کیا خیال ہے کیا یہ عورت اپنے اس بچے کو آگ میں ڈال سکتی ہے ہم نے عرض کیا خدا کی قسم نہیں بالخصوص جبکہ اس کو آگ میں نہ ڈالنے کی قدرت بھی ہے اس پر آپ نے ارشاد فرمایا بلاشبہ اللہ تعالیٰ کو اپنے بندوں سے اس عورت کے مقابلہ میں زیادہ پیار ہے۔

بخاری اور مسلم نے حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے یہ ارشادِ نبوت بھی نقل کیا ہے کہ:

خدائے تعالیٰ کے لیے سو رحمتیں ہیں جن میں اس نے جن و انس، جانوروں میں بہائم اور موذی جانوروں میں رحمت کا صرف ایک حصہ اتارا ہے اسی ایک حصہ سے وہ باہم ایک دوسرے پر لٹو ہیں اور ایک دوسرے سے پیار کرتے ہیں۔ اسی ایک حصہ کی وجہ سے وحشی جانور اپنے بچے سے الفت کرتا ہے بقیہ رحمت کے ننانوے حصے اس نے قیامت کے دن کے لیے رکھ چھوڑے ہیں کہ ان کے ذریعے اپنے بندوں پر رحم فرمائے گا۔

دراصل اللہ سبحانہ کی غیر محدود رحمت کے تصور سے انسان عاجز ہے اور نبوت اسے یہ سمجھانا چاہتی ہے کہ تمام کائنات میں پھیلی ہوئی رحمت اور تنہا خدا کی اس رحمت میں جو روزِ قیامت ظاہر ہو گی کیا فرق ہے اسی فرق کے ذہن نشین کرانے کے لیے یہ ایک فرضی حساب بیان کیا گیا ہے تاکہ فکرِ انسانی کو غیر محدود رحمت کے اندازہ کرنے کا راستہ مل جائے ورنہ غیر محدود کو نہ عدد میں محصور کیا جا سکتا ہے اور نہ اس کی تقسیم ہو سکتی ہے۔ علماء لکھتے ہیں کہ رحمت کی دو قسمیں ہیں ایک وہ رحمت جو صفت ذات ہے

دوسری وہ رحمت جو اللہ کی صفتِ فعلی ہے۔ اس دوسری قسم ہی کو سو کے عدد میں محصور کر کے تقسیم کیا ہے
حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ درجاتِ جنّت سو ہیں اور جنت میں جانا چونکہ بلا رحمتِ الٰہیہ ہو نہیں
سکتا اس لیے ہر درجہ کے مقابلہ میں رحمت کا ایک حصّہ بنایا گیا ہے۔ امام رازی نے اس آیت کے ذیل میں مسلک
اہل السنہ اور مسلک معتزلہ پر بحث کر کے آخر میں اپنے والد ماجد کے حوالہ سے یہ فیصلہ خوب نقل کیا ہے کہ
اہل السنہ کی نظر اللہ سبحانہٗ کی قدرت و مشیت پر ہے اور معتزلہ کی نظر تنزیہہ اور صفتِ عدل پر اور دونوں
کی تشفی و تسلی کے لیے یہی فقرہ وربك الغنی ذوالرحمۃ کافی ہے ۔

اللہ کی قدرت کی عظمت

۱۷۲۔ اگر وہ چاہے تو تمھیں ہٹا دے اور تمھارے بعد جس کو چاہے تمھارا جانشین بنا دے جیسا کہ ایک دوسری قوم کی نسل سے تمھیں اٹھایا ہے۔ خدا نے رسُول بھیج کر اپنی حجت تمام کردی۔ اب اگر تم نہ مانو اور سیدھے راستہ پر نہ چلو گے تو وہ غنی ہے اسے تمھاری کچھ پروا نہیں ہے وہ چاہے تو تم کو ایک دم لے جائے اور اپنی رحمت سے دوسری قوم کو تمھاری جگہ کھڑا کر دے جو خدا کی مطیع و فرمانبردار ہو اور تم کو لے جا کر دوسری قوم کا لے آنا خدا کے لیے کیا مشکل ہے آج تم اپنے جن آباؤ اجداد کے جانشین بنے بیٹھے ہو آخر ان کو اٹھا کر تم کو دُنیا میں اسی خدا نے جگہ دی ہے۔ بہر حال خدا کا کام رک نہیں سکتا، تم نہ کرو گے دوسرے کھڑے کیے جائیں گے[1]

اصل میں مشرکین مکہ سے خطاب ہے اور بطور اتمام حجت بتایا جا رہا ہے کہ اگر وہ دعوتِ حق کی مخالفت سے باز نہ آئے تو اللہ سبحانہٗ ان کو راہِ حق سے ہٹا دے گا اور ان کی جگہ ایک دوسرا گروہ کھڑا کر دے گا وہ اسی طرح پہلی قوموں کو گراتا اور نئی قوموں کو اٹھاتا رہتا ہے۔ اس کی کوئی غرض تم سے اٹکی ہوئی اس کا کوئی مفاد تم سے وابستہ نہیں ہے کہ تمھارے دعوتِ حق کے ٹھکرا دینے سے اس کا کچھ بگڑ جاتے۔ تمھاری راست روی سے اس کا کوئی فائدہ اور غلط روی سے اس کا کوئی نقصان نہیں ہے۔ یہ تو اس کی مہربانی ہے کہ وہ تمھیں نبوت کے ذریعے صحیح طرز کی تعلیم دیتا ہے جس سے تم اولاً دُنیا میں کامیاب ہو جاؤ۔ اور پھر آخرت میں بلند مدارج تک ترقی کرنے کے قابل بن سکو۔ ورنہ اگر تم کو فنا کرنا چاہے تو جب چاہے فنا کر دے اور تمھاری جگہ جس کو چاہے دے دے اور یہ کوئی ایسی بات نہیں جو تمھارے قیاس سے بالا ہو آخر تم بھی تو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس زمین میں روزِ اول سے نہیں ہو۔ تم سے پہلے اس ملک میں دوسری قومیں آباد تھیں جن کی تاریخ سے تم واقف ہو تو جس خدا نے ان کو مٹا کر تمھیں ان کا وارث بنایا، اگر وہ خدا تمھیں ہٹا کر دوسروں کو تمہارا وارث بنا دے تو کون ہے جو اس کا ہاتھ پکڑ سکے۔ تاریخ کے اوراق کھلے ہوتے ہیں اس کی گواہی ہے کہ ایسا ہی ہوا ان نبوت کے معاندین کو ختم کیا گیا اور ان کی جگہ زمین میں ان کو خلافت دی گئی جنہوں نے نبوت کی دعوت کو قبول کیا یہی وہ مہاجرین و انصار ہیں جو انسانیت کے لیے اللہ کی رحمت کا سب سے بڑا مظہر بنے۔ ان کے زمانے میں روحانی، اخلاقی، دینی و علمی روحانی وسائل انسان کامل اور صالح ترین تمدن منصۂ شہود پر آیا۔ اس حکومت میں جس کا شمار دنیا کی عظیم ترین حکومتوں میں تھا اور ایسی سیاسی و مادی قوت کے ساتھ جو اپنے زمانے کی طاقتوں سے برتر تھی اعلیٰ اخلاق نمونے معیار کا کام دیتے تھے اور اخلاقی تعلیمات زندگی اور نظامِ حکومت کے لیے میزان کا درجہ رکھتی تھی تجارت و صنعت کے ساتھ اخلاقی فضائل بھی اپنے پورے عروج پر تھے۔ فتوحات کی وسعت اور تمدن کی ترقی کے ساتھ اخلاق و روحانیت کی ترقی بھی جاری تھی۔ اسلامی حکومت کی غیر معمولی وسعت آبادی کی انتہائی افزونی عیش و عشرت کے وسائل اور ترغیبات کے باوجود جرائم بہت کم تھے۔ فرد کا دوسرے فرد سے اور فرد و جماعت کا باہمی تعلق حیرت انگیز تھا۔ یہ ایک معیاری دور تھا، یگانے تو یگانے بیگانے بھی مان گئے۔ تاریخ کی آنکھوں نے کوئی فاتح اہلِ عرب سے عادل اور شفیق نہیں دیکھا ہے۔

یہ آیت گرامی وربک الغنی ذوالرحمۃ کے بعد بالکل وہی معنویت رکھتی ہے جو فاطر کی یہ آیت رکھتی ہے:۔

یا ایھا الناس انتم الفقراء الی اللہ واللہ ھو الغنی الحمید

لوگو تم ہی اللہ کے محتاج ہو اور اللہ غنی ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہے:

ان یشأ یذھبکم ایھا الناس ویات بخلق جدید

اگر اللہ چاہے تو تمہیں ہٹا دے اور نئی خلقت تمہاری جگہ لے آئے۔

اور سورہ محمد میں بھی اسی قسم کی بات ارشاد ہوئی ہے:

واللہ الغنی وانتم الفقراء وان تتولوا یستبدل قوما غیرکم ثم لا یکونوا امثالکم۔

اللہ ہی غنی ہے اور تم ہی فقیر ہو۔ اگر تم روگرداں ہوگئے تو اللہ بدلے میں لے آئے گا

ایسی قوم کو جو تمہارے علاوہ ہو گی اور تم جیسے نہ ہوں گے۔

اعمال کے نتائج ناگزیر ہیں

۱۷۳- جس بات کا تم سے وعدہ کیا جاتا ہے وہ یقیناً ہونے والی ہے اور تمہارے بس میں نہیں کہ خدا کو عاجز کر دو۔ یعنی یہ سوچ کر کہ کبھی بغاوت و شرارت رہی تو خدا کا عذاب اٹل ہے تم اگر سمجھو کر بھاگ کر یا کسی کی پناہ سے کر سزا سے بچ جاؤ گے تو یہ محض حماقت ہے۔ خدا کو ساری مخلوق مل کر بھی اس کی مشیت کے نفاذ سے عاجز نہیں کر سکتی ہے[1] اصل ارشاد میں ما توعدون، یہ ایعاد سے مضارع مجہول ہے یا وعدے خواہ کچھ ہو معنے دھمکی ہوں یا وعدہ اس سے مراد کیا ہے آخرت میں سزا یا دنیا میں عذاب۔ اگر آخرت کی سزا مراد ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ آخرت میں اعمال کی جزا ضرور ہونی ہے اور اس سے بھاگ کر یا اس کو رد کر کر تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے تو اللہ سبحانہ کو تمہاری موت کے بعد زندگی پر ایسی قدرت ہے جیسے تمہارے اولاً پیدا کرنے پر قدرت تھی۔ اس دنیا کی ہر چیز کے کچھ خواص اور آثار ہیں مثلاً آگ کی خاصیت جلانا ہے پانی کی خاصیت بجھانا ہے۔ اسی طرح ہر جڑی بوٹی میں بھی کچھ خاصیتیں ہیں، ایسے ہی انسان کے مادی اعمال کے بھی خواص و آثار ہیں مثلاً وہ کھانا کھاتا ہے تو اس سے اس کی بھوک مرتی ہے، آسودگی آتی ہے، اسی طرح پانی پینے سے پیاس بجھتی ہے، زہر کھانے سے آدمی مرجاتا ہے۔ ظاہر ہے کہ انسان کے اخلاق و اعمال اور افکار خواہ اچھے ہوں یا برے اس کے مادی اعمال و افکار سے زیادہ اہم ہیں اس لیے ایسا نہیں ہو سکتا کہ اس کے اخلاق و اعمال اور افکار کا کوئی اثر کوئی نتیجہ اور کوئی خاصیت ہی نہ ہو مثلاً ایک شخص اپنا کھانا خود کھانے کے بجائے دوسروں کو کھلاتا ہے اور خود بھوکا رہتا ہے یا کسی پیاسے کو پانی پلاتا ہے اور خود پیاسا رہتا ہے یا کسی لاوارث بیمار کی تیمارداری کرتا ہے یا غریبوں، یتیموں اور بیواؤں کی خبرگیری کرتا ہے تو انسانی عقل اور فطرت کا یہ کھلا ہوا تقاضا ہے کہ ان نیک اعمال کے بھی اثرات اور نتائج ہوں۔

بہرحال جب انسان کے مادی اعمال کے نتائج یہاں ظاہر ہو رہے ہیں تو ضروری ہے کہ ایک زندگی اور بھی ہو جہاں اس کے اچھے برے اخلاقی اور روحانی اعمال و افکار کے آثار و خواص اور نتائج ظاہر ہوں اور انسانوں کو ان کے اچھے اور برے اعمال کی جزا اور سزا ملے اور اگر اسی زندگی میں اعمال کی جزا و سزا مل جاتے تو یہ زندگی ابتلائی نہ رہتی حالانکہ اس دنیا کو اللہ تعالیٰ نے امتحان گاہ بنایا ہے اور جزا و سزا کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پردۂ غیب میں رکھ کر نبوت کے ذریعہ یہ اعلان کیا ہے کہ جو بھی یہاں اچھے احکام کی پیروی کرے گا میں اس کو آئندہ زندگی میں انعام دوں گا اور جو یہاں نافرمانی اور سرکشی کی زندگی گزارے گا اس کو سزا دوں گا۔ بہر حال اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اس دُنیا کی زندگی کے بعد دوسری زندگی میں جو تم سے جزا و سزا کا وعدہ کیا جا رہا ہے وہ ہو کر رہتا ہے اور جب اس کا ظہور ہو گا تو تم خدا کے قابو سے کسی طرح باہر نہ نکل سکو گے۔ شیخ الاسلام کے تشریحی نوٹ میں اشارہ ہے کہ ما توعدون سے دنیوی عذاب مراد ہے۔ یعنی وہ عذاب جو رسول کی تکذیب کی صورت میں آتا ہے اس کی بھی گنجائش ہے۔

انجام کی کامیابی ایمان کے لیے ہے

۱۲۴ - اے پیغمبر کہہ دو کہ اے میری قوم تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ میں بھی کام کر رہا ہوں۔ عنقریب تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ آخر کار کس کا انجام بخیر ہے، بلاشبہ ظلم کار لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔ یعنی ہم سب نیک و بد اور نفع و ضرر سے آگاہ کر چکے ہیں۔ اس پر بھی اگر تم اپنی جانوں پر ظلم کرنے سے باز نہیں آتے ہو تو تم جانو، تم اپنا کام کیے جاؤ میں اپنا فرض ادا کرتا ہوں، عنقریب کھل جائے گا کہ اس دُنیا کا اخروی انجام کس کے ہاتھ میں رہتا ہے۔ بلاشبہ ظالموں کا انجام اچھا نہیں ہو سکتا آگے ان کے چند اعتقادی اور عملی ظلم بیان کیے جاتے ہیں جو ان میں راسخ تھے اور سب سے بڑا ظلم وہی ہے جسے فرمایا ان الشرك لظلم عظيم[1] مطلب یہ ہے کہ اگر میرے سمجھانے سے تم نہیں سمجھتے ہو اور مخالفت حق سے ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہو تو جس ڈگر پر تم چل رہے ہو چلو یعنی جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو میں بھی اپنے موقف سے ایک انچ برابر ہٹنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ آیت اعملوا اور عامل کا تقابل لطیف ہے اعملوا فعل کا صیغہ ہے جب کہ عامل اس کے مقابلہ صفت کا صیغہ ہے۔ صفت لاکر بتا دیا کہ میرے عمل میں دوام، استمرار، استقلال اور عزم ہے جب کہ تمہارے عمل کی ساری کہانی وقت کا ایک ہنگامی دائرہ ہے فسوف تعلمون میں بتا دیا ہے کہ انجام کار جو کچھ ہو گا وہ تمہارے سامنے آ جائے گا اور تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ انجام کی کامیابی کس کو حاصل ہوتی ہے۔ عاقبۃ کا لفظ انجام کے معنے میں آتا ہے، اچھا ہو یا بُرا لیکن یہاں اچھے انجام کے معنے میں ہے جیسے ان العاقبۃ للمتقین اور الدار سے مراد دار آخرت ہے کیونکہ نتائج کے ظہور کی اصلی جگہ وہی ہے۔ اہل ایمان دُنیا میں جو جد و جہد اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

محنت کرتے ہیں وہ آخرت ہی کو پیش نظر رکھ کر کرتے ہیں۔ ان کو دنیا میں جو کامیابی حاصل ہوتی ہے اگرچہ کامیابی وہ بھی ہے لیکن وہ فیصلہ کن نہیں ہے اس لیے اصل توجہات کا مرکز یہ دنیا نہیں بلکہ آخرت ہے آخرت پر ایمان اور وہاں ملنے والی ابدی سعادت اور لازوال شقاوت اور ان تمام انعامات اور تمام عذاب کا ہمہ وقت نگاہوں میں ہونا یہی نبوت کی دعوت کا اصلی محرک ہے، یہی اس کو پریشان کرتا رہتا ہے۔ اس کی آنکھوں سے نیند اڑا دیتا ہے، اس کی پرسکون زندگی کو مکدر کر دیتا ہے۔ ان کو کسی حالت میں سکون اور کسی پہلو قرار نہیں ملتا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے پھیلے ہوئے شر و فساد، حالات کی ابتری اور ماحول میں خرابیوں کے پروان چڑھنے کی صورت میں ان کے دل و دماغ پر سب سے زیادہ اثر انداز اور اس کے لیے سب سے طاقتور محرک بھی فکر آخرت ہے۔ اس لیے اصل کامیابی آخرت کی کامیابی ہے جب تک آخرت میں کامیابی نہ ہو اس وقت تک یہ فیصلہ نہیں کیا جا سکتا کہ کس کی جیت رہی اور کون ہارا۔ اس میں یہ اشارا بھی ہے کہ اس دنیا میں مخالفین حق جو دندناتے پھر رہے ہیں یہ اترانے کی چیز ہے یہ عارضی ڈھیل ہے۔ کل ان کو پتہ لگ جائے گا کہ اصل کامیابی کس کو حاصل ہوتی انہ لا یفلح الظالمون کہہ کر بات کھول دی کہ انجام کار کی کامیابی میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہے جو کفر و شرک کے جرائم کر رہے ہوں یہ تو اس آیت کا منطوق ہے اس آیت کا مدلول یہ بھی ہے کہ الدار سے دنیا مراد ہو اور مقصد یہ بتانا ہو کہ حق و باطل کی اس کشمکش میں جو نبوت اور اس کے مخالفین کے درمیان قائم ہے کامیابی حق کی ہے باطل کی نہیں ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ یہاں زندگی و عمل کی مہلتیں سب کو ملتی ہیں اس بات سے دھوکا نہ کھانا چاہیے اور یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ نتائج اعمال کے قوانین نہیں ہیں دیکھنا یہ چاہیے کہ نتیجہ کی کامیابی کس کے حصے میں آتی ہے اور آخر کار آبرومند کون ہوتا ہے۔ اللہ کا قانون یہی ہے کہ ظلم کرنے والوں کے لیے کامیابی و سعادت کی راہ نہیں کھلتی مگر یاد رہے کہ یہ اسی وقت ہوتا ہے جب حق و باطل کا میدان عمل میں مقابلہ ہو۔ اہل حق کے دامن میں عمل کا استمرار، دوام، استقلال اور عزم بالجزم ہو اور اہل باطل میں عمل کا ہنگامہ ہو۔ یہ مطلب نہیں کہ اہل باطل عمل کے میدان میں ہوں اور اہل حق گوشہ نشین ہو کر حق کی کامیابی کی امید رکھتے ہوں، یہ اللہ کے قانون کے خلاف ہے۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ حق و باطل کی آویزش میں کامیابی حق کے لیے ہے اور ہزیمت و خسران باطل کے لیے۔

اگر آیت کا مدلول مقصود ہو تو یہ آیت اخبار بالغیب کی وجہ سے اس دنیا میں صداقت نبوت کا اعجازی شاہکار ہے۔ دنیا نے آنکھوں سے دیکھ لیا کہ ایسا ہی ہوا۔

یہاں حافظ ابن کثیر نے آیت کے اس مدلول کا تصریحاً ذکر کیا ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

اور صحابہ کرام کو اس دارِ دُنیا میں کفر کے مقابلہ میں کامرانی اور کامیابی حاصل ہوگی۔ تھوڑے ہی عرصہ میں تمام جزیرۃ العرب آپ کے زیرِ نگیں آگیا۔ یمن اور بحرین سے لے کر حدودِ شام تک آپ کی حکومت ہوگئی پھر آپ کے بعد صحابہ کرام کے ہاتھوں فتوحات کا سیلاب آگیا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں قد فعل اللہ ذالک

وَجَعَلُوْا لِلّٰهِ مِمَّا ذَرَاَ مِنَ الْحَرْثِ وَالْاَنْعَامِ نَصِيْبًا فَقَالُوْا هٰذَا
لِلّٰهِ بِزَعْمِهِمْ وَهٰذَا لِشُرَكَآئِنَا ۚ فَمَا كَانَ لِشُرَكَآئِهِمْ فَلَا يَصِلُ
اِلَى اللّٰهِ ۚ وَمَا كَانَ لِلّٰهِ فَهُوَ يَصِلُ اِلٰى شُرَكَآئِهِمْ ؕ سَآءَ مَا
يَحْكُمُوْنَ ﴿۱۳۶﴾ وَكَذٰلِكَ زَيَّنَ لِكَثِيْرٍ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ قَتْلَ
اَوْلَادِهِمْ شُرَكَآؤُهُمْ لِيُرْدُوْهُمْ وَلِيَلْبِسُوْا عَلَيْهِمْ دِيْنَهُمْ ؕ
وَلَوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا فَعَلُوْهُ فَذَرْهُمْ وَمَا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۷﴾ وَقَالُوْا هٰذِهٖٓ
اَنْعَامٌ وَّحَرْثٌ حِجْرٌ ۖ لَّا يَطْعَمُهَآ اِلَّا مَنْ نَّشَآءُ بِزَعْمِهِمْ
وَاَنْعَامٌ حُرِّمَتْ ظُهُوْرُهَا وَاَنْعَامٌ لَّا يَذْكُرُوْنَ اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا
افْتِرَآءً عَلَيْهِ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ بِمَا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۱۳۸﴾ وَقَالُوْا مَا فِيْ
بُطُوْنِ هٰذِهِ الْاَنْعَامِ خَالِصَةٌ لِّذُكُوْرِنَا وَمُحَرَّمٌ عَلٰٓى اَزْوَاجِنَا ۚ
وَاِنْ يَّكُنْ مَّيْتَةً فَهُمْ فِيْهِ شُرَكَآءُ ؕ سَيَجْزِيْهِمْ وَصْفَهُمْ ؕ اِنَّهٗ
حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۳۹﴾ قَدْ خَسِرَ الَّذِيْنَ قَتَلُوْٓا اَوْلَادَهُمْ سَفَهًا بِغَيْرِ

عِلْمٍ وَّحَرَّمُوْا مَا رَزَقَهُمُ اللّٰهُ افْتِرَآءً عَلَى اللّٰهِ قَدْ ضَلُّوْا وَمَا
كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ۝

اور ان لوگوں نے اللہ کے لیے خود اسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے لیے ہے بزعمِ خود اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے کیسے بُرے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ [۱۳۶] - اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شریکوں نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو تباہی کا نشانہ بنا لیں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں، اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ ایسا ہرگز نہ کرتے لہٰذا ان کو اور ان کی افتراء پردازیوں کو چھوڑ دو، [۱۳۷] اور وہ

ہیں کہ یہ جانور اور کھیت ممنوع ہیں، ان کو صرف وہ لوگ کھا سکتے ہیں
جن کو ہم اپنے خیال کے مطابق کھلانا چاہیں[۱۷۸]۔ اور اسی طرح کچھ جانور
ہیں جن پر سواری اور باربرداری حرام کردی گئی ہے[۱۷۹]، اور کچھ جانور
ایسے ہیں کہ ان پر خدا کا نام نہیں لیتے ہیں، یہ سب کچھ ان کی افتراء
پردازیاں ہیں، اللہ ان کو ان کی افتراء پردازیوں کی ضرور سزا دے گا[۱۸۰]
اور کہتے ہیں کہ ان جانوروں کے پیٹ سے جو زندہ بچہ نکلے وہ
صرف ہمارے مردوں کے لیے حلال ہے ہماری عورتوں کے لیے
حلال نہیں ہے لیکن اگر مُردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں
شریک ہو سکتے ہیں اللہ ضرور ان کو ان کی گھڑی ہوئی باتوں کی
سزا دے گا بلاشبہ وہ حکمت والا اور علم والا ہے[۱۸۱]۔ بلاشبہ وہ لوگ
تباہ و برباد ہو گئے جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی سے
قتل کیا اور اللہ کے دیے ہوئے رزق کو اللہ پر افتراء پردازی

کر کے حرام ٹھہرایا یقیناً وہ بھٹک گئے اور ہرگز وہ سیدھی راہ پر نہ تھے۔[۱۸۲]

معانی مفردات

ذَرَأَ اس نے پیدا کیا اس نے پھیلایا، ماضی کا واحد مذکر غائب، ذرأ مصدر ہے جس کے معنے پیدا کرنے بکھیرنے کے آتے ہیں۔ کچھ کے خیال میں ذریۃ بمعنے اولاد اسی سے بنا ہے اس کی ہمزہ ترک کر دی گئی ہے جیسے بریۃ وغیرہ بزعمھم ان کا خیال، ان کا گمان زعم یزعم کا مصدر ہے جو مضاف ہے اور ھم ضمیر جمع مضاف الیہ ہے۔ علامہ احمد فیومی، المصباح المنیر میں لکھتے ہیں زعم میں تین لغات ہیں۔ اہل حجاز کے نزدیک زاء کا زبر ہے قبیلہ اسد کے نزدیک پیش ہے اور قبیلہ قیس کے بعض افراد کے نزدیک زیر ہے، اسی لیے زعمت الحنفیۃ زعم سیبویہ بولا جاتا ہے اور قرآن میں او تسقط السماء کما زعمت بھی اسی معنے میں ہے۔ نیز ظن یعنی گمان کے معنے میں بھی بولتے ہیں فی زعمی کذا میرا گمان یہ ہے اور اعتقاد کے لیے استعمال ہوتا ہے زعم الذین کفروا، ازہری کہتا ہے کہ زعم زیادہ تر اس شے میں ہوتا ہے جس میں شک کیا جاتا ہو اور متحقق نہ ہو اور کچھ کی رائے میں یہ کذب سے کنایہ ہوتا ہے۔ مرزوقی کا بیان ہے کہ اس کا استعمال اکثر اس چیز کے لیے ہوتا ہے جو باطل ہو یا غلط ہو اور ابن القوطیہ کا خیال ہے کہ زعم زعماً کے معنے ہیں ایسی بات کہی جس کے متعلق پتہ نہیں کہ صحیح ہے یا غلط۔ حِجْرٌ، ممنوع، عقل اصل میں جس مکان کا احاطہ پتھروں سے بنایا جاتے وہ حجر کہلاتا ہے۔ اسی لیے ثمود کی آبادیاں چونکہ پتھروں سے تراش کر بنائی گئی تھیں حجر کہلائیں۔ چونکہ پتھروں کے احاطہ سے مقصود روک تھام ہوتی ہے اور عقل بھی انسان کی حفاظت کرتی ہے اور اس کو روکتی رہتی ہے اس لیے اس کو بھی حجر کہتے ہیں اور اسی وجہ سے وہ چیز جس سے روکا جائے اور منع کیا جاتے حجر کہلاتی ہے۔ قرآن میں حجراً محجوراً اسی سے ہے۔

مشرکین کا شش نکاتی ضابطہ

اوپر کا سلسلہ بیان اس بات پر پورا ہوا تھا کہ اگر یہ لوگ نصیحت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اپنی جاہلیت پر اصرار کیے جاتے ہیں تو ان سے کہہ دو کہ تم اپنے طریقہ پر عمل کرو میں اپنے طریقہ پر عمل کر رہا ہوں۔ روزِ قیامت تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ انجام کیا ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس جاہلی نظام کی کچھ تشریح کی جاتی ہے جس پر وہ لوگ اصرار کر رہے تھے اور جسے چھوڑنے کے لیے کسی طرح آمادہ نہ ہوتے تھے۔ انہیں بتایا جا رہا ہے کہ تمہارا وہ ظالمانہ نظام کیا ہے جس پر قائم رہتے ہوئے تم کبھی فلاح نہیں پا سکتے۔ یہاں خاص طور پر ان دفعات کی نشاندہی کی جا رہی ہے جو انہوں نے اپنے مزعوما توہمات کے تحت حلال و حرام پر مبنی قانون سازی کر رکھی تھی۔ قرآن نے ان آیات میں ان کا چھ نکاتی قانون بتایا ہے یہ ہے:

۱۔ وہ منتیں مانتے کہ اپنی زراعت اور مویشی میں سے اتنا حصہ خدا کے لیے نکالیں اور اتنا بتوں کے لیے۔ خدا کا حصہ فقیروں کو دے دیتے اور بتوں کا ان کے مجاوروں کو۔ اگر خدا کے حصے میں سے کچھ کم و بیش ہو جاتا تو اس کی پرواہ نہ کرتے لیکن بتوں کی نیاز کی بڑی نگہداشت کرتے اور کہتے کہ ان کے حصے میں سے کچھ کم نہ ہونا چاہیے۔

۲۔ لڑکیوں کو قتل کر دیتے اور اسے بڑی فخر و شرافت کی بات سمجھتے، ان کے کاہنوں اور بزرگوں نے انہیں حکم دیا تھا کہ ایسا کیا کریں۔

۳۔ اپنی فصل اور مویشی کا ایک حصہ بت خانوں کے لیے مخصوص کر دیتے اور کہتے کہ مجاوروں کے سوا اور کسی کے لیے یہ کھانا جائز نہیں ہے۔

۴۔ بتوں کے نام جانور چھوڑتے اور سمجھتے کہ اب ان سے کام لینا جائز نہیں۔

۵۔ جو جانور بتوں کے نام پر قربان کرتے ان پر خدا کا نام نہ لیتے۔

۶۔ جانور ذبح کیا جاتا اور اس کے پیٹ سے بچہ نکلتا تو اگر زندہ رہتا صرف مرد کھاتے، عورتوں کے لیے جائز نہ تھا، مُردہ ہوتا تو عورتیں بھی کھاتی تھیں۔

یہ تھا ان کا شش نکاتی تحلیل و تحریم پر مشتمل ضابطہ۔ ان کے بارے میں قرآن بتاتا ہے کہ یہ انتہائی جہالت، سفاہت کی باتیں ہیں اور یہ سب بے دینی ہے، لوگوں کو دھوکا دینے کے لیے اللہ پر افتراء پردازی کی جا رہی ہے۔

مشرکانہ ضابطہ کی پہلی دفعہ

۱۳۶۔ اور ان لوگوں نے اللہ کے لیے خود اسی کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے ایک حصہ مقرر کیا ہے اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے لیے ہے بزعم خود اور یہ ہمارے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے پھر جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا مگر جو اللہ کے لیے ہے وہ ان کے شریکوں کو پہنچ جاتا ہے کیسے بُرے فیصلے کرتے ہیں یہ لوگ۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ کافر اپنی کھیتی میں اور مواشی کے بچوں میں سے اللہ کی نیاز نکالتے اور بتوں کی بھی نیاز نکالتے پھر بعضا جانور اللہ کے نام کا بہتر دیکھا تو بتوں کی طرف بدل دیا مگر بتوں کی طرف کا اللہ کی طرف نہ کرتے اس سے زیادہ ڈرتے۔ اسی طرح غلہ وغیرہ میں سے اگر بتوں کے نام کا اتفاقاً اللہ کے حصہ میں مل گیا تو پھر جُدا کر کے بُتوں کی طرف لوٹا دیتے اور اللہ نام کا بُتوں کے حصہ میں جا پڑا تو اسے نہ لوٹاتے۔ بہانہ یہ کرتے سمجھے کہ اللہ تو غنی ہے اس کا کم ہو جائے تو کیا پروا ہے بخلاف بُتوں کے کہ وہ ایسے نہیں۔ تماشہ یہ ہے کہ یہ کہہ کر بھی شرماتے نہ سمجھے کہ جو ایسے محتاج ہوں ان کو معبود و مستعان ٹھہرانا کہاں کی عقلمندی ہے۔ بہرحال ان آیات میں ساء ما یحکمون سے مشرکین کی اس تقسیم کا رد کیا گیا ہے۔ یعنی خدا کی پیدا کی ہوئی کھیتی اور مواشی میں سے اوّل تو اس کے مقابل غیر اللہ کا حصہ لگانا، پھر بُری اور ناقص چیز خدا کی طرف رکھنا کس قدر ظلم اور ناانصافی ہے۔[1]

دراصل پہلی آیات میں دو قسم کے مشرکانہ افکار کا ذکر تھا۔ ایک شرک فی العبادت، دوسرے شرک فی الطاعت، شرک فی العبادت یہ کہ اللہ کے ساتھ اوروں سے بھی عابدانہ تعلقات رکھے جائیں اسے پرستش کہتے ہیں اور شرک فی الطاعت یہ کہ اللہ کے ساتھ حکم میں کسی اور کی بھی طاعت کی جاتے۔ سورہ انعام کے آغاز سے شرک فی العبادت پر مشتمل افکار کی تشریح اور تردید ہو رہی ہے اور اس بارے میں ــــ افغیر اللہ ابتغی حکماً سے شرک فی الطاعت کی توضیح اور تردید کی جارہی ہے۔ اب یہاں دونوں یعنی شرک فی العبادت اور شرک فی الطاعت کی عملی مثالیں پیش کی جارہی ہیں۔ زیادہ تر روئے سخن شرک فی الطاعت کی طرف ہے۔ شرک فی العبادت یہاں ضمناً مذکور ہے۔ آغاز ہی جعلوا سے کیا گیا ہے اس میں اشارہ ہے شرک فی الطاعت کی طرف۔ مطلب یہ ہے کہ یہ کام انھوں نے خود کیا ہے اور عمل کا یہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پیمانہ ان کا اپنا بنایا ہوا ہے اللہ کا نازل کردہ نہیں ہے۔ اسی لیے آخر میں یحکمون لاتے ہیں، حالانکہ اس پوری کائنات کا جس کا ہماری یہ دُنیا بھی ایک حصہ ہے مقتدر اعلیٰ اللہ ہی ہے۔ حکم دینے، منع کرنے، حلال و حرام کا پیمانہ بنانے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا حق صرف اللہ کا ہے۔ حقیقی شارع اور قانون ساز وہی ہے۔ کسی مخلوق کی زندگی کا ذریعہ متعین کرنے، اس کے معاملہ کا فیصلہ کرنے، اسے معاف کرنے یا سزا دینے کا اختیار بھی پورے کا پورا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حکم دینے اور قانون بنانے کا حق اصلاً اسی کو پہنچتا ہے اس لیے اگر کسی اور کو بھی یہ حیثیت دے دی جائے خواہ وہ جماعت ہی کیوں نہ ہو تو یہ شرک ہوگا۔ حضرت شاہ صاحب نے بھی اس آیت سے شرک فی الطاعۃ سمجھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ:

> اب جاننا چاہیے کہ اللہ کی نیاز دینی یہ کہ اسکی راہ میں جن کو دلوا دے ان کو دینا اس کا فائدہ اللہ کو نہیں پہنچتا اس کی حکم برداری ہے اور خیر سے فقیر کو فائدہ اور ثواب سے فائدہ دینے والے کو پھر جو کسی بزرگ کے واسطے کچھ دے اگر اسی وضع پر دے شرک ہے جس پر اللہ نے الزام دیا مگر اس بزرگ کو اپنی جگہ ٹھہرا دے کہ اس کی طرف سے اللہ کی راہ میں کھانے کو ان کو دے تو حکم برداری اللہ کی اور چیز فقیر کو اور ثواب اس شخص کے بدلے بزرگ کو۔

اس کی روح یہی ہے کہ اس آیت میں حکم برداری میں شرک کا بیان ہو رہا ہے آیت میں جعلوا اور پھر بزعمھم کی تصریح بھی اسی کی نشاندہی کر رہی ہے۔ آئیے اب پوری آیت پر ایک جامع نظر ڈال لیجئے۔

سب سے پہلی بات اس سلسلے میں یہ بتائی گئی ہے کہ انہوں نے جو پیمانہ بنا رکھا ہے وہ یہ ہے کہ خدا کی پیدا کی ہوئی کھیتیوں اور مویشیوں میں سے خدا کا ایک حصہ مقرر کیا ہوا ہے اور ایک حصہ ان کا جن کو خدا کا شریک بنایا ہوا ہے خدا کے لیے جو حصہ مقرر کیا ہے اس کے بارے میں ان کا دعویٰ ہے کہ یہ اللہ کے لیے ہے۔ ان کی یہ بات نقل کر کے قرآن نے اس پر یہ تبصرہ کیا ہے بزعمھم، یعنی یہ تمام تر ان کے وہم اور گمان کی تخلیق ہے۔ پہلے جعلوا کہہ کر بتایا کہ یہ ان کی بناوٹ ہے اور اب بزعمھم کہہ کر بتایا کہ یہ ان کی اپنی تخلیق ہے۔ مطلب یہ ہے کہ خدا کے نام پر دینا اپنی جگہ اچھی بات ہے اور اس کے حسن اور اس کی خوبی میں کوئی کلام نہیں مگر اس کا پیمانہ وحی الٰہی سے الگ ہو کر خود بنانا اور اسے رسم و دستور اور قانون بنا دینا ان کا کام نہیں۔ یہ حاکمانہ حیثیت صرف اللہ کو حاصل ہے۔ اعتراض اس پر نہیں کہ خدا کے نام پر کیوں دیتے ہیں بلکہ اس پر ہے کہ خدا کے نام پر دینے کو بطور قانون حاکمانہ حیثیت

میں نافذ کرنا ان کا کام نہیں ہے جعلوا اور بزعمھم میں اس کی صراحت ہے اور یہی غیر اللہ کی حکم برداری اور شرک فی الطاعت ہے اگر زکوٰۃ کی طرح خدائی ہدایت اور وحی کی رہنمائی میں وہ یہ کام کرتے تو قرآن کو ان کے اس عمل پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ایسی تمام رسمیں ایسے تمام رواج جو انسانی رائے، انسانی خیال پر مبنی ہوں اگرچہ وہ خالصۃً خدا کے نام پر کیے گئے مگر وحی الٰہی نے اس کی رہنمائی نہ کی ہو۔ ان کا حکم یہی ہے۔ کیونکہ اس میں غیر اللہ کی حکم برداری اور طاعت ہے۔ یہ ہے شرک فی الطاعت۔ آگے ھذا لشرکائنا، میں شرک فی العبادت کو بیان کیا ہے اور بتایا ہے کہ وہ یہ کہتے ہیں کہ یہ ہمارے شریکوں کے لیے ہے۔ یہاں شرکاء سے ان کے وہ معبود مراد ہیں جن سے ان کے عابدانہ تعلقات تھے۔ یہ شرکاء کون تھے فرشتوں، جنات، آسمانی ستاروں اور بزرگان سلف کی تصاویر ان کی تماثیل ان کے اصنام تھے۔ ان کے بارے میں ان کا تصور یہ تھا کہ اس زندگی میں جو کچھ اللہ کا فضل ان پر ہو رہا ہے۔ وہ ان کے طفیل اور ان کے صدقے میں ہے اس لیے وہ اپنے کھیتوں کی پیداوار اور اپنے جانوروں میں سے دو حصے نکالتے تھے۔ ایک حصہ اللہ کے نام کا اس شکریے میں کہ اس نے یہ پیداوار کی اور دوسرا حصہ اپنے قبیلے یا خاندان کے سرپرست معبودوں کی نذر و نیاز کا تاکہ ان کی مہربانیاں ان کے شامل حال رہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے یہاں سب سے پہلے جعلوا اور بزعمھم لا کر اس پر گرفت کی ہے کہ اپنے شارع خود بن بیٹھے ہیں آپ ہی جو حصہ چاہتے ہیں اللہ کے لیے مقرر کر لیتے ہیں اور جو چاہتے ہیں دوسروں کے لیے طے کر دیتے ہیں حالانکہ اپنی بخشش کا اصل مالک اللہ ہے اور یہ بات اسی کے حکم کے مطابق طے ہونی چاہیے کہ اس بخشش میں سے کتنا حصہ اللہ کے نام کا نکالنا چاہیے۔ پانچواں، دسواں، بیسواں یا چالیسواں، اس خود مختارانہ طریقہ سے خود ہی حاکم و شارع بن کر جو حصہ یہ لوگ خدا کے لیے نکالتے ہیں یہ کوئی نیکی نہیں ہے۔ قاضی بیضاوی نے یہی بات سمجھی ہے ذالک مما اخترعوہ لم یامرھم اللہ بہ یہ ان کا من گھڑت قانون ہے۔ اللہ نے یہ بات ہرگز نہیں بتائی ہے۔ اور اردو شارحین قرآن میں سے شاہ عبدالقادر نے اسی کو منطوق قرآنی قرار دیا ہے۔ دوسری گرفت اس پر ہے کہ یہ سب مویشی اور کھیتیاں اللہ کی پیدا کی ہوئی ہیں اور اسی کی بخشش ہیں۔ ان میں یہ دوسروں کی نذر و نیاز دینا کھلا ظلم ہے۔ محسن کے احسان کو جو اس نے سراسر خود تم پر کیا ہے تم دوسروں کی مداخلت کا نتیجہ قرار دے کر عابدانہ اعمال میں ان کو شریک کرتے ہو۔ یہ بات ھذا لشرکائنا سے معلوم ہو رہی ہے۔

عجیب و غریب قانون

اس پر بھی بس نہیں بلکہ ان کے قانون ساز اداروں نے یہ عجیب و غریب قانون بھی بنا رکھا تھا

ما کان لشرکائهم فلا یصل الی اللہ یعنی جو حصہ ان کے ٹھہرائے ہوئے شریکوں کے لیے ہے وہ تو اللہ کو نہیں پہنچتا لیکن جو اللہ کے لیے ہے وہ شرکار کو پہنچ جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عوام سے جو آمدنی ہوتی تھی اس کی مدات دو تھیں ایک بنام خدا دوسرے بنام شرکار۔ بنام خدا کے مصارف یہ تھے، مہمان نوازی، غریبوں کی امداد، بچوں کی اعانت۔ اور بنام شرکار کے مصارف یہ تھے مجاوروں کے اخراجات، قربان گاہوں کے اخراجات۔ اس میں انہوں نے قانون یہ بنا رکھا تھا۔ بنام خدا کی مد سے مجاوروں کے اخراجات اور بتوں کی قربانیوں کے مصارف تو ہو سکتے ہیں لیکن بنام شرکار کی مد سے غریبوں کی امداد اور مہمان نوازی ہرگز نہیں ہو سکتی۔ اس طرح وہ چالبازیاں کر کے بنام خدا مد کو کم کرتے رہتے اور بنام شرکار مد کو بڑھانے کی کوشش کرتے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی شارحین قرآن نے ان کی عیاریوں کے اسی سلسلے میں نمونے پیش کیے ہیں مثلاً جو غلہ یا پھل وغیرہ خدا کے نام پر آتا اس میں اگر کچھ گر جاتا تو اسے بنام شرکا میں شامل کر دیتے اور اگر بنام شرکا سے گر جاتا تو اسے اسی میں واپس کر دیتے۔ کھیت کا جو حصہ شریکوں کی نذر کے لیے مخصوص کیا جاتا اگر اس میں سے پانی اس حصہ کی طرف چلا جاتا جو بنام خدا کے لیے مخصوص ہوتا تو اس کی ساری پیداوار بنام شرکار میں داخل کر دی جاتی۔ اگر کبھی خشک سالی کی وجہ سے نذر و نیاز کا غلہ خود استعمال کرنے کی ضرورت پیش آجاتی تو بنام خدا کی مد کو کھا لیتے لیکن بنام شرکار کو ہاتھ لگاتے ہوئے ڈرتے تھے کہ کہیں کوئی بلا نازل نہ ہو جائے۔ اگر اتفاق سے بنام شرکار کی بکری مر جاتی یا چوری ہو جاتی یا بنام شرکار کا غلہ چوہے کھا جاتے تو اس کی تلافی بنام خدا سے کر دیتے یہ تھی وہ من گھڑت قانون سازی جس کے بارے میں قرآن نے کہا ہے ساء ما یحکمون کتنا برا فیصلہ ہے جو یہ کرتے ہیں۔

اس فیصلے کے برا ہونے کی وجہ کیا ہے؟ اس کو سمجھنے کے لیے یہ جان لینا ضروری ہے کہ عرب جاہلیت یہ سمجھتی تھی کہ وہ خود شارع اور قانون ساز ہے اور اسے کسی خدائی ہدایت کی ضرورت نہیں ہے۔ قرآن نے اس فقرے میں ایک طرف خدا کے مقابلے میں ان کے حاکمانہ ادعا کو بتایا ہے اور دوسری طرف اس حاکمانہ اقتدار کے نشہ میں جو قانون بناتے تھے اس کی قباحت کا اعلان کیا ہے۔ قباحت کی پہلی وجہ یہ ہے کہ خدا کے مقابلہ میں خود شارع اور قانون ساز بنے ہوتے ہیں۔ دوسری وجہ یہ، کہ غیر اللہ کی نذر مان کر شرک فی العبادت کر رہے ہیں حالانکہ تقربات میں اللہ کے ساتھ کوئی شریک نہیں ہو سکتا۔ تیسری وجہ یہ ہے کہ وہ خدا کے مقابلہ میں اپنے شرکار کا حق مرجح سمجھتے ہیں۔ قرآن نے دوسری جگہ بتایا ہے کہ مشرکین اپنے معبودوں سے خدا کے بالمقابل زیادہ محبت کرتے ہیں۔ یہ چیز مشرکینِ مکہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ تمام مشرک قوموں کا اشتراکی سرمایہ ہے بلکہ

یہ خود شرک کی فطرت ہے۔ مشرکین جن چیزوں کو خدا کا شریک بناتے ہیں ظاہر ہے کہ اس خیال سے بناتے ہیں کہ ان کی تمام معاشی ضروریات انہی سے وابستہ ہیں اور اگر خدا سے کوئی ضرورت وابستہ ہے بھی تو وہ بھی بہرحال ان ہی کی وساطت سے پوری ہوتی ہے یہاں تک کہ اگر خدا پوری نہ کرنی بھی چاہے جب بھی اگر یہ چاہیں تو پوری کرا سکتے ہیں۔ اس کے ہوتے ہوتے خدا کی اہمیت ہی کیا رہ جاتی ہے۔ چنانچہ ان مشرکین کے نزدیک بھی خدا کی حیثیت بس معاذ اللہ اتنی تھی جتنی گھر میں ایک بڑے بوڑھے کی ہوتی ہے وہ اسی حیثیت سے خدا کے ساتھ معاملات کرتے تھے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ ان کی اس رسم اور قانون سازی کے لیے جیسے نقلی ہدایت کوئی نہ تھی خود عقلی روشنی بھی کوئی نہ تھی۔

شش گانہ نکات کی دوسری دفعہ

۱۳۷۔ اور اسی طرح بہت سے مشرکوں کے لیے ان کے شرکاء نے اپنی اولاد کے قتل کو خوشنما بنا دیا ہے تاکہ ان کو تباہی میں ڈال دیں اور ان پر ان کے دین کو مشتبہ بنا دیں اور اگر اللہ کی مشیت ہوتی تو وہ ہرگز ایسا نہ کرتے لہٰذا ان کو اور ان کی افتراء پردازیوں کو چھوڑ دو۔ یہاں شرکاء کی تفسیر امام مجاہد نے شیاطین سے کی ہے۔ مشرکین کی انتہائی جہالت اور سنگدلی کا ایک نمونہ یہ تھا کہ بعض اپنی بیٹیوں کو سسر بننے کے خوف سے اور بعض اس اندیشے سے کہ کہاں سے کھلائیں گے حقیقی اولاد کو قتل کر دیتے تھے اور بعض اوقات منت مانتے تھے کہ اگر اتنے بیٹے ہو جائیں گے یا فلاں مراد پوری ہو جائے گی تو ایک بیٹا فلاں بت کے نام پر ذبح کریں گے پھر اس ظلم اور بے رحمی کو بڑی عبادت اور قربت سمجھتے تھے شاید یہ رسم شیطان نے سنۃ خلیل اللہ کے جواب میں سجھائی ہو گی۔ یہودیوں میں بھی مدت تک قتل اولاد کی رسم بطور ایک عبادت و قربت کے جاری رہی ہے جس کا انبیاء بنی اسرائیل نے بڑی شد و مد سے رد کیا۔ بہرحال اس آیت میں قتل اولاد کی تمام صورتوں کی شناعت بیان فرمائی جو جاہلیت میں رائج تھیں۔ یعنی شیاطین قتل اولاد کی تلقین و تزئین اس لیے کرتے ہیں کہ ان لوگوں کو دنیا و آخرت دونوں جگہ تباہ و برباد کر چھوڑیں اور ان کے دین میں گڑبڑ ڈالیں کہ جو کام ملت ابراہیمی کے بالکل متضاد و منافی ہے اسے ایک دینی کام باور کرائیں۔ والعیاذ باللہ کجا سنت ابراہیمی اور کجا یہ حماقت و جہالت [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

واقعی آیت میں شرکا سے مراد امام مجاہد کی رائے میں شیاطین ہیں لیکن شیاطین سے وہ شیاطین الانس مراد ہیں جنہوں نے قتلِ اولاد کو ان لوگوں کی نگاہ میں ایک جائز اور پسندیدہ عمل بنا رکھا تھا۔ ان کو مشرک شرک فی العبادت کی وجہ سے نہیں بلکہ شرک فی الطاعت کی وجہ سے کہا گیا ہے اور آپ بار بار سن آئے ہیں کہ قرآن میں دونوں شرک مذموم ہیں۔ جس طرح پرستش کا مستحق اللہ سبحانہٗ ہے ایسے ہی بندگی کا مستحق بھی اللہ سبحانہٗ ہے اور ان آیات کا اصل موضوع شرک فی الطاعت ہے۔ جس طرح دوسرے کے سامنے پرستش کے افعال میں سے کوئی فعل کرنا اسے خدا کا شریک بنانے کا ہم معنے ہے اسی طرح کسی کے خود ساختہ قانون کو برحق سمجھتے ہوئے اس کی طاعت کرنا بھی اسے خدائی میں اللہ کا شریک بنانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شیاطین الانس نے عوام کے سامنے قتلِ اولاد جیسے شنیع عمل کو مزین کرکے پیش کیا۔ اس تزئین کی صورت کیا تھی؟

تاریخ نے اس کا سرمایہ جو کچھ محفوظ رکھا ہے وہ یہ ہے کہ

اولاً لڑکیوں کا قتل اس تزئین سے کہ کوئی ان کا داماد نہ بنے یا اس تزئین سے کہ جنگ کی صورت میں وہ دشمن کے قابو نہ آئیں۔ اسی تزئین کی بنا پر وہ عورت کی جنس کو جو مرد کی طرح ایک انسانی جنس ہے ذلیل و حقیر سمجھتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی اولاد کو خود اپنے ہاتھوں قتل کر دینے کے لیے آمادہ ہو جاتے ہیں یہ ظلم و معصیت کی تزئین کی ایک مسلسل سرگزشت ہے اور اسی تزئین کا ایک سب سے زیادہ وحشیانہ نمونہ دختر کشی کی رسم ہے۔ قرآن آیا تو عرب کے اکثر قبیلوں میں یہ رسم اسی طرح جاری تھی جس طرح ہندوستان کی مختلف قوموں میں پچھلی صدی تک ستی کی رسم جاری رہ چکی ہے۔ اس عمل کو ان کے رہنماؤں، لیڈروں، اکابر مجرمین نے اس طرح مزین کر رکھا تھا کہ وہ کہتے تھے۔ ہمارے قبیلہ کے افراد بیٹی کے باپ ہونے کا ننگ گوارا نہیں کر سکتے۔ لیکن قرآن نے نہ صرف یہ رسم مٹا دی بلکہ وہ ذہنیت بھی مٹا دی جو ان تمام وحشیانہ مظالم کے اندر کام کر رہی تھی۔ اس نے اعلان کر دیا کہ مرد و عورت کا جنسی اختلاف کسی برتری اور محرومی کی ہرگز بنیاد نہیں ہے۔ انسان ہونے کی حیثیت میں دونوں برابر ہیں۔ سورہ تکویر میں جہاں قیامت کی ہولناکیوں کا تذکرہ ہے وہاں پرستش اعمال میں سب سے زیادہ نمایاں جگہ اسی ظلم کو دی ہے واذا الموؤدۃ سئلت بای ذنب قتلت؟

ثانیاً بچوں کا قتل اس طرح ان کے ذہنوں میں مزین کیا گیا تھا کہ ان کی پرورش کا بار نہ اٹھایا جا سکے گا اور ذرائع معاش کی کمی سے وہ ناقابلِ برداشت بوجھ بن جائیں گے۔ قرآن میں ہے کہ اپنی جاہلیت کے دور میں عرب کی سرزمین کا یہ عام رواج تھا کہ محض معاشی دشواریوں پر غالب آنے اور حبِ مال سے

جذبہ کی تسکین کے لیے وہاں کے باشندے اپنے جگر گوشوں کو بھی ذبح کرنے سے بھی نہیں ہچکچاتے تھے قرآن کو اسی رواج کے انسداد کے لیے ایک سے زیادہ مقام پر ولا تقتلوا اولادکم خشیۃ املاق کا قانون نافذ کرنا پڑا۔ اس سفاکانہ رسم کی تزئین کے لیے وجہ وہی اور صرف وہی بیان کی گئی ہے جیسے آج برتھ کنٹرول کے جواز بلکہ وجوب کے سلسلے میں عموماً پیش کیا جاتا ہے۔ جہاں تک عرب کا تعلق ہے قرآنی حکم کے بعد پھر سنگدلی اور قساوت کے اس جانگداز فعل کو اس ملک میں آج تک نہیں دہرایا گیا ہے۔ لیکن یہ تو جاہل عرب اپنی جاہلیت کے دور میں کرتا تھا۔ آج تعلیم یافتہ یورپ اور امریکہ پیدا ہونے سے پہلے ہی ماؤں کے پیٹوں میں جو قتلِ اولاد کا عمل کر رہے ہیں اور اس کی تزئین جس طرح کر رہے ہیں اس کی وجہ اس کے سوا اور کیا ہے کہ مال کے عاشقوں نے اپنے سرمایہ کو بچانے کی یہ ایک سائنٹفک تدبیر نکالی ہے کہ معاشی پریشانیوں میں جن سے اضافہ کا اندیشہ ہے اپنے ان بچوں کو پیدا ہونے سے پہلے ہی زندگی سے محروم کر دیا جائے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ معاشی دشواریوں کے مسئلہ کے حل کا ایک طریقہ وہ تھا جسے عرب کے جاہل قتلِ اولاد کی صورت میں اپناتے ہوئے تھے اور ایک وہ ہے جسے آج یورپ کے پڑھے لکھے لوگ ضبطِ تولید کے نام سے پیش کر رہے ہیں۔ ذہن دونوں کا ایک ہے۔

ثالثاً، تزئین یہ کہ بچوں کو اپنے معبودوں کی خوشنودی کے لیے نذر چڑھا دیتے تھے۔ یہ سنگین جرم بعض مزعومہ سرکش جن بھوتوں کو راضی رکھنے کے لیے کیا جاتا تھا، غالباً سخت قسم کے جاہل مشرکین اس وہم کے تحت کہ فلاں وادی یا فلاں درخت کے جن کو انہوں نے اپنی کسی اولاد کی نذر دے کر راضی نہ رکھا تو وہ ان کی ساری اولاد یا ان کے سارے خاندان پر آفت لائے گا یہ حرکت کرتے تھے۔ اس قسم کے اوہام تمام مشرک اور وہم پرست قوموں میں پہلے بھی موجود رہے ہیں اور زمانہ کی ترقی کے باوجود اب بھی بعض قوموں کے نچلے طبقوں میں پائے جاتے ہیں۔ ان اوہام کے پختہ کرنے میں شیاطین جن کے ان ایجنٹوں کو بڑا دخل ہوتا ہے جو انسانوں میں سے ان کے مرید بن جاتے ہیں۔ عرب جاہلیت میں جہاں جہاں بھوتوں کے تھان اور استھان تھے۔ ان کے پروہت کاہن اور مجاور اپنی طرف رجوع کرنے والے سادہ لوحوں کو ورغلاتے کہ فلاں جن تم پر بڑا غضب ناک ہے اگر تم نے اپنے کسی بیٹے یا بیٹی کی قربانی دے کر اس کو راضی نہ کیا تو وہ تمہارے سارے خاندان کو چٹ کر جائے گا بے وقوف لوگ ان کے چکمے میں آکر یہ بیدردانہ اور سنگدلانہ جرم کر بیٹھتے اور اس طرح اپنے دین اور اپنی دنیا دونوں برباد کرتے۔

بہرحال تزئین کی کوئی صورت ہو۔ یہ تزئین ان کے شرکاء یعنی ان شیاطین الانس کی جانب سے ہوتی تھی جن کی لوگ طاعت کرتے تھے۔ قرآن نے آگے بتایا ہے کہ اس تزئین سے ان شرکاء کا کیا

مقصد تھا فرمایا دو گونہ مقاصد تھے ایک لیردو ھم دوسرے لیلبسوا علیھم دینھم دونوں جگہ لام تعلیل ہے اور اچھا یہ ہے کہ لام عاقبت کہا جائے۔ پہلا مقصد اس تزئین سے ان کا یہ تھا کہ وہ لوگوں کو ہلاک کر ڈالیں۔ یردو ارداء سے بنا ہے اس کے معنے ہلاک کرنا ہیں۔ ہلاکت کئی طرح کی ہوتی ہے اخلاقی ہلاکت، قومی ہلاکت، اخلاقی ہلاکت یہ کہ جو شخص سنگدلی اور قساوت کی اس حد کو پہنچ جاتے کہ اپنی اولاد کو اپنے ہاتھ سے قتل کرنے لگے۔ ایسی جوہر انسانیت ہی نہیں رہتا جو اپنی اولاد پر رحم نہیں کرتا اس سے کیا توقع ہو سکتی ہے کہ انسانوں پر رحم کرے گا۔ قومی ہلاکت یہ کہ قتل اولاد کا لازمی نتیجہ آبادی کی کمی ہے۔ جس سے قوم کی افرادی قوت ختم ہو کر رہ جاتی ہے اس طرح پوری قوم آہستہ آہستہ تباہی کے گڑھے میں گر جاتی ہے اور اگر لام تعلیل کے لیے نہیں بلکہ عاقبت کے لیے ہو تو مطلب یہ ہوگا کہ قتل اولاد کی اس تزئین کا انجام اور نتیجہ یہ ہوگا کہ پوری قوم ہلاک ہو جائے گی اور ظاہر ہے کہ جو لوگ نسل کشی کا عمل کریں گے ان کی بقا کا دنیا میں کوئی سوال ہی نہ ہوگا۔

دوسرا مقصد اس تزئین سے یہ تھا کہ اس طرزِ عمل سے قربانی کے اس عمل کی روح کو وہ پامال کر دیں جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کے دین کا بہت بڑا حصہ تھی۔ اس سنتِ ابراہیمی کی جگہ اس خود ساختہ بدعت کو لوگوں میں قائم کر کے دین کو تباہ کر دیں۔ اصل اور نقل میں کوئی تمیز نہ رہے۔ بدعت کا مزاج ہی یہ ہے کہ وہ سنت کو ہڑپ کر جاتی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بدعت کا سنت سے تقابل کر کے فرماتے ہیں:

> کسی قوم نے بدعت ایجاد نہیں کی مگر اس کی مقدار میں سنت اس سے اٹھالی گئی لہٰذا سنت پر کاربند رہنا بدعت کی ایجاد سے اچھا ہے۔

حضرت حسان بن ثابت فرماتے ہیں:

> کسی قوم نے دین میں بدعت نہیں نکالی مگر اللہ تعالیٰ نے اتنی ہی مقدار میں سنت اس سے اٹھالی اور پھر قیامت تک وہ واپس نہ ہوگی۔

آخر میں ہدایت وضلالت کے باب میں سنتِ الٰہی یہ بتائی ہے ولو شاء اللہ ما فعلوہ فذرھم وما یفترون۔ اگر اللہ چاہتا تو وہ ایسا نہ کرتے۔ اب ان کو اور ان کی افترا پردازیوں کو چھوڑ دیجئے۔ یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے کہ اگر یہ اپنی حماقتوں اور سنگدلانہ حرکتوں کی حمایت میں تم سے لڑتے جھگڑتے ہیں تمہاری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہیں تو ان کو ان کے من گھڑت فتنوں میں پڑا رہنے دو۔ ان کا کام کسی کو باندھ کر راہ پر لگانا نہیں ہے۔ اللہ نے اس دنیا میں باطل کو بھی

مہلت دی ہے جو باطل پر جمے رہنا چاہتے ہیں خدا ان کو ان کے باطل ہی پر چھوڑ دیتا ہے۔ ہدایت و ضلالت کے معاملہ میں اس نے جبر کو پسند نہیں کیا۔ اگر وہ زور سے لوگوں کو ہدایت پر لانا چاہتا تو یہ سب ہدایت پر ہو کے کوئی بھی اس گمراہی پر جما نہ رہتا۔ جب سنتِ الٰہی یہ ہے تو آپ کیوں ان کی اس بے راہ روی سے پریشان ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا کہ یہ شرکا، تزئین کا یہ کام نہ کریں۔ یا مشرکین قتلِ اولاد نہ کریں تو وہ نہ کرتے۔ اللہ اپنے قانونِ تخلیق کو تبدیل کر کے ان کو ایسا نہ کرنے پر مجبور کر دیتا لیکن اس کا قانونِ تخلیق اور اس کی سنت بدل نہیں سکتی ہے اور یا مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو ان کو پیدا ہی عبادت والی جبلت پر کرتے اور ان کے ارادہ و اختیار کو اس میں دخل نہ ہوتا جیسے یہ ملائکہ کی تو شان ہے۔ انسان کو اللہ نے استعداد ہی ایسی عطا فرمائی ہے جس میں خیر و شر دونوں قبول کرنے کی صلاحیت ہے اور دونوں طاعت اور معصیت ارادی و اختیاری ہیں۔

شِشْ گانہ نکات کی تیسری دفعہ

۱۳۸ ۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ جانور اور کھیت ممنوع ہیں ان کو صرف وہ لوگ کھا سکتے ہیں جن کو ہم اپنے خیال کے مطابق کھلانا چاہیں۔ مثلاً مرد کھائیں، عورتیں نہ کھائیں یا صرف مہنت کھا سکیں جو بُت خانوں کے مجاور تھے۔ یہ قیود اپنے خیال میں بعض مواشی اور کھیتوں کے متعلق عائد کر رکھی تھیں جو بتوں کے نام پر وقف کیے جاتے تھے[لہ] حجر کے معنے ممنوع کے ہیں۔ یہ بھی ان کے شِش گانہ نکات میں سے ایک رسم ہے، انہوں نے یہ ضابطہ بنا رکھا تھا کہ زمینی پیداوار اور جانوروں کے جو چڑھاوے اور نیازیں آتی تھیں ان کے کھانے کے معاملہ میں چڑھاوے کی نوعیت کے اعتبار سے بڑی بڑی پابندیاں لگا رکھی تھیں۔ یہ چڑھاوے غلّوں کی صورت میں بھی آتے تھے۔ گندم، چاول، دالیں وغیرہ اور جانوروں کی صورت میں بکرے، بھیڑیں، دُنبے، مُرغ، گائیں وغیرہ ان کے لیے ان کے یہاں ایک مفصل ضابطہ تھا جس کی رُو سے مختلف نذروں، نیازوں، منتوں کو خاص قسم کے لوگ کھا سکتے تھے۔ اللہ سبحانہٗ نے ان کے اس فیصلہ کو نہ صرف غلط قرار دیا ہے بلکہ بتایا ہے کہ ان کا یہ فیصلہ خود ان کا تراشیدہ تھا وحیِ الٰہی کی اس موضوع پر کوئی رہنمائی نہ تھی یعنی جس خدا کے رزق میں سے وہ یہ منتیں مان رہے تھے اور نیازیں دے رہے ہیں اس نے نہ ان منتوں اور نیازوں کا حکم دیا ہے اور نہ ان کے کھانے کے

[لہ] افاداتِ شیخ الاسلام

متعلق یہ پابندیاں لگائی ہیں۔ یہ سب کچھ ان کا اپنا ہی کیا دھرا ہے۔ بزعمھم کی تعبیر اسی بات کو ظاہر کرنے کے لیے لائی گئی ہے اور چونکہ یہ فیصلے تمام تر ان کے مجاوروں کے خود ساختہ قانون پر مبنی تھے اور وہی اس کے عالم بھی تھے۔ رائے عامہ کا اس میں کوئی دخل نہ تھا اور نہ اس کے خلاف کچھ کہنے یا کرنے کا کسی میں یارا تھا اس لیے یہاں اس خود ساختہ قانون کی نسبت ان کی طرف کی گئی ہے الا من نشاء بزعمھم شرک کی روح سب جگہ ایک ہوتی ہے لیکن شرک کے قوالب بدلتے رہتے ہیں۔ ہمارے یہاں بھی اسی سے ملتا جلتا ضابطہ ہے۔ بی بی کی صحنک کو مرد نہ کھائیں، لونڈی نہ کھائے، جس عورت نے دوسرا شوہر کیا ہو وہ نہ کھائے۔ شاہ عبدالحق کا توشہ حقہ پینے والا نہ کھائے۔ یہ اور اس قسم کی خرافات کا حکم بھی ہے کہ یہ سب کچھ ہر دور کے مجاوروں کا اپنا بنایا ہوا ضابطہ ہوتا ہے۔ اس میں دوگونہ شرک ہے ایک غیر اللہ کی عبادت کی وجہ سے یہ خالص مشرکانہ فعل ہے خواہ عرب کے بتوں کے نام پر یا اولیاء اور بزرگوں کے نام پر ہو۔ دوسرے غیر اللہ کی اطاعت ہے کہ خدا کے حکم کے بغیر مجاوروں اور مہنتوں کے رجحانِ نفس اور میلانِ طبع پر مبنی ضابطہ کی اطاعت ہو رہی ہے :

شش گانہ نکات کی چوتھی دفعہ

۱۷۹- اور اسی طرح کچھ جانور ہیں جن پر سواری اور بار برداری حرام کر دی گئی ہے یعنی اسی طرح بعض جانوروں کی پیٹھ پر سواری اور بار برداری کو حرام سمجھتے تھے[1] جس طرح ہمارے ملک میں گائے، بیل، بکرے کسی بت کے نام پر یا قبر یا دیوتا یا پیر کے نام پر چھوڑ دیے جاتے ہیں۔ اور ان سے کوئی خدمت لینا یا انہیں ذبح کرنا یا کسی طور پر ان سے فائدہ اٹھانا حرام سمجھا جاتا ہے اسی طرح زمانہ جاہلیت میں اہل عرب بھی جانوروں کو مختلف طریقوں سے پن کر کے چھوڑ دیا کرتے تھے اور ان جانوروں کے الگ الگ نام رکھتے تھے۔ سورہ مائدہ میں ان کا ہی تعارف بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام سے کرایا گیا تھا۔ یہ سب عرب جاہلیت کی نذریں اور منتیں تھیں۔ اس قسم کے جانور آزاد چھوڑ دیے جاتے جس گھاٹ سے چاہتے پانی پیتے اور جس کی چراگاہ میں چاہتے پھرتے نہ ان کو کوئی روک سکتا تھا نہ چھیڑ سکتا تھا ان کو مذہبی تقدس کا ایسا درجہ حاصل تھا کہ ہر شخص ان کو چھیڑنے کے وبال سے لرزہ براندام رہتا تھا۔ ان پر سوار ہونا یا ان کو بار برداری کے لیے استعمال کرنا ان کی خود ساختہ شریعت

[1] افادات شیخ الاسلام

میں قطعاً حرام تھا۔ قرآن نے واضح فرمادیا ہے کہ ان کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ یہ صرف اوہام کی ایجاد ہیں جن کو اللہ کی طرف منسوب کرنا اللہ اور اس کی شریعت پر اتہام ہے۔ جو لوگ عقل سے محروم ہیں وہ اس قسم کی حرکات کرتے ہیں۔ اس کے برعکس قرآن کی تعلیم یہ ہے کہ اپنے دُنیا کے کاموں میں اللہ کو یاد رکھیں اور اس کی تعظیم کرتے رہیں تاکہ ایمان درست رہے اور ان کاموں میں بھی برکت ہو جیسے اُڑے کام پر اللہ کی نذر ماننی اور مشکل کے وقت اس کو پکارنا اور ہر کام کو اللہ کے نام سے شروع کرنا اور جب اولاد ہو تو اس کے شکر میں اس کے نام کا جانور ذبح کرنا اور کھیت باغ میں تھوڑا بہت اس کے نام کا رکھنا اور دہن اور ریوڑ میں سے کچھ اس کی نیاز کرنا اور جو جانور اس کے نام کے لیے بیت اللہ لے جاتے ان کا ادب کرنا یعنی ان پر سوار نہ ہونا اور ان کو باربرداری کے لیے استعمال نہ کرنا وغیرہ وغیرہ، یہ کام خالص خدا کے لیے ہیں، ان میں کسی کی کوئی شرکت نہیں۔ اب اگر کوئی بھی اعمال غیر اللہ کے لیے پیر، امام، شہید، نبی، ولی کی اس قسم کی تعظیم کرے اُڑے وقت میں ان کی نذر مانے، مشکل میں ان کو پکارے، اولاد ہو تو ان کی نذر و نیاز کرے۔ کھیت و باغ میں ان کا حصہ لگا دے پیداوار میں پہلے ان کی نیاز دے اور دہن ریوڑ میں ان کے نام کے جانور چھوڑے اور پھر ان جانوروں کا ادب کرے، پانی سے نہ ہانکے، لکڑی پتھر سے نہ مارے، یہ سب مشرکانہ اعمال ہیں۔

شش گانہ نکات کی پانچویں دفعہ

۱۸۰۔ اور کچھ جانور ایسے ہیں کہ ان پر خدا کا نام نہیں لیتے، یہ سب کچھ ان کی افتراء پردازیاں ہیں، اللہ ان کو ان کی افتراء پردازیوں کی ضرور سزا دے گا۔ بعض جانوروں کی نسبت یہ قرار دیا تھا کہ ذبح کرنے یا سواری لینے یا دودھ نکالنے کے وقت ان پر خدا کا نام نہ لیا جائے، کہیں بتوں کی چیز میں خدا کی شرکت نہ ہو جائے، پھر غضب یہ تھا کہ ان خرافات اور جہالتوں کو خدا کی طرف منسوب کرتے تھے گویا اس نے معاذ اللہ یہ احکام دیے ہیں اور ان ہی طریقوں سے اس کی خوشنودی حاصل کی جا سکتی ہے۔ ایسی بدعنوانیوں کے ساتھ یہ افتراء و بہتان عنقریب ان گستاخیوں کی سزا سے ان کو دوچار ہونا پڑے گا[1]

روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اہلِ عرب کے ہاں بعض مخصوص منتوں اور نذروں کے جانور ایسے

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوتے تھے جن پر خدا کا نام لینا جائز نہ سمجھا جاتا تھا بلکہ ممنوع تھا۔ ان پر سوار ہو کر حج کرنا منع تھا کیونکہ حج کے لیے لبیک اللھم لبیک کہنا پڑتا تھا۔ اسی طرح ان کا دودھ دوہتے وقت یا ان پر سوار ہونے کی حالت میں یا ان کو ذبح کرتے یا ان کو کھانے کے وقت اہتمام کیا جاتا تھا کہ خدا کا نام زبان پر نہ آئے[1] ان کی یہ ساری خرافات ان کے مشرکانہ اوہام پر مبنی ہیں لیکن اس کے باوجود ان کو اللہ کی طرف منسوب کرتے ہیں جیسا کہ ہر مبتدع کا قاعدہ ہے کہ ایجاد خود کرتا ہے اور نام لیتا ہے اللہ کا، اسی لیے قرآن نے اس کو یہاں افترا سے تعبیر کیا ہے یعنی یہ خدا پر سب سے بڑا بہتان ہے اور اللہ سبحانہ ان کو ان کی اس افترا پردازی کی سزا ضرور دے گا۔

شش گانہ نکات کی چھٹی دفعہ

۱۳۹ – اور کہتے ہیں کہ ان جانوروں کے پیٹ سے جو زندہ بچہ نکلے وہ صرف ہمارے مردوں کے لیے حلال ہے ہماری عورتوں کے لیے حلال نہیں ہے لیکن اگر مردہ ہو تو دونوں اس کے کھانے میں شریک ہو سکتے ہیں، اللہ ضرور ان کو ان کی گھڑی ہوئی باتوں کی سزا دے گا بلاشبہ وہ حکمت و علم والا ہے۔ ایک مسئلہ بنا رکھا تھا کہ بحیرہ اور سائبہ کو اگر ذبح کیا جائے اور اس کے پیٹ میں سے زندہ بچہ نکلے تو اسے کوئی عورتیں نہ کھائیں اور اگر مردہ نکلے تو سب کھا سکتے ہیں۔ اس طرح کے بے سند مسئلے گھڑنے والوں کے جرائم سے اللہ بے خبر نہیں ہے، ہاں وہ اپنی حکمت کے مطابق مناسب وقت میں سزا دے گا۔[2]

مطلب یہ ہے کہ اہل عرب میں نذروں اور نیازوں کے جانوروں کے متعلق جو خود ساختہ شریعت بنی ہوئی تھی۔ اس قانون کی ایک دفعہ یہ بھی تھی کہ ان جانوروں کے پیٹ میں سے جو بچہ پیدا ہو اس کا گوشت صرف مرد کھا سکتے ہیں اور عورتوں کے لیے ان کا کھانا جائز نہیں ہے لیکن اگر وہ بچہ مردہ ہو یا مر جائے تو اس کا گوشت کھانے میں مرد و عورت سب شریک ہو سکتے ہیں۔ کچھ شارحین قرآن نے بحائر اور سوائب کی تخصیص کی ہے اور کچھ نے عام بتایا ہے یعنی نذر و نیاز کے تمام جانوروں کے بارے میں یہ قانون بنا رکھا تھا کہ ان کے اندر جو کچھ بھی ہے خواہ وہ بچہ ہو یا دودھ ہو وہ مردوں کے لیے تو حلال ہے لیکن عورتوں کے لیے حرام ہے اور اگر بچہ مردہ پیدا ہو یا پیدا ہونے کے بعد اپنی طبعی موت سے مر جائے تو عورتیں اور مرد سب کھا سکتے ہیں۔ فرمایا کہ سیجزیھم وصفھم

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

اللہ تعالیٰ عنقریب ان کو ان کی کذب بیانی کی سزا دے گا۔ اللہ کے علم و حکمت کے یہ بات منافی ہے کہ وہ ان لوگوں کو سزا نہ دے جو اس دلیری کے ساتھ اللہ کے نام پر جعلی کرنسی چلاتے ہیں۔ اس میں اشارہ ہے کہ جو لوگ اللہ کے نام پر شریعت سازی کے کارخانے کھولتے ہیں اور بڑی بے باکی کے ساتھ خدا کے نام پر مسئلے گھڑ گھڑ کے بیان کرتے ہیں ان کا انجام خطرے سے خالی نہیں ہے۔ ہماری شریعت میں اسی کا نام بدعت ہے۔ علامہ شاطبی نے بدعت کی تعریف یہ کی ہے:

دین میں ایسا اختراع کیا ہوا طریقہ جو شریعت کے مشابہ ہو اور جس پر عمل سے اللہ کی عبادت میں مبالغہ مقصود ہو۔

حافظ ابن رجب حنبلی جامع العلوم والحکم میں لکھتے ہیں:

جس نے بھی کوئی چیز ایجاد کی اور اس کو دین کی طرف منسوب کیا جبکہ اس کی دین میں کوئی اصل نہیں ہے پس وہ گمراہی ہے اور اللہ کا دین اس سے بری ہے، خواہ وہ ایجاد کردہ چیز اعتقادات سے ہو۔ یا اعمال یا اقوال ظاہرہ و باطنہ سے۔

دین میں اختراع کرنے والوں کا انجام

۱۸۲ بلاشبہ وہ لوگ تباہ برباد ہو گئے جنہوں نے اپنی اولاد کو جہالت اور نادانی سے قتل کیا اور اللہ کے دیے ہوئے رزق کو اللہ پر افتراء پردازی کر کے حرام ٹھہرایا یقیناً وہ لوگ بھٹک گئے اور ہرگز وہ سیدھی راہ پر نہ تھے۔ اس سے بڑی خرابی اور نقصان و خسران کیا ہو گا کہ بیٹھے بٹھائے بلاوجہ دنیا میں اپنی اولاد سے محروم ہو گئے اور سنگدلی، بداخلاقی و جہالت میں مشہور ہو گئے اور آخرت کا دردناک عذاب سر رکھا نہ عقل سے کام لیا نہ شریعت کو پہچانا، سیدھی راہ پر آنے تو کیسے آتے[1] مطلب یہ ہے کہ اگرچہ وہ لوگ جنہوں نے یہ رسم و رواج گھڑے تھے تمہارے باپ دادا تھے، تمہارے مذہبی بزرگ تھے، تمہارے پیشوا اور سردار تھے لیکن حقیقت بہرحال حقیقت ہے ان کے ایجاد کیے ہوئے غلط طریقے صرف اس لیے صحیح اور مقدس نہیں ہو سکتے کہ وہ تمہارے اسلاف اور بزرگ تھے۔ جن ظالموں نے قتل اولاد جیسے وحشیانہ فعل کو رسم بنایا ہو جنہوں نے خدا کے دیے ہوئے رزق کو خواہ مخواہ خدا کے بندوں پر حرام کیا ہو۔ جنہوں نے دین میں اپنی طرف سے نئی نئی باتیں شامل کر کے خدا کی طرف منسوب کی ہوں

[1] افادات شیخ الاسلام

وہ آخر فلاح یاب اور راست رو کیسے ہو سکتے ہیں چاہے وہ تمہارے اسلاف اور بزرگ ہی کیوں نہ ہوں، بہرحال تھے وہ گمراہ اور اپنی اس گمراہی کا بُرا انجام بھی وہ دیکھ کر رہیں گے ؎۱

اس آیت میں ان کے دو سنگین جرم بتاتے ہیں ایک قتلِ اولاد، دوسرے تحریم رزق، قتل اولاد کے کردار کی علت حماقت اور جہالت بتائی ہے۔ یعنی یہ ایک ایسا قبیح اور بدترین عمل ہے جس کا ارتکاب کوئی عقل و ہوش والا آدمی اور کوئی باخبر شخص نہیں کر سکتا ہے یہ ایک طرف اگر جہل و کوری کی علامت ہے تو دوسری طرف احمق اور عقل سے بیگانہ ہونے کی نشانی ہے۔ شاید اسی بنا پر حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمایا ہے اگر تم عرب کی جہالت کا مرقع دیکھنا چاہتے ہو تو قرآن عزیز کی یہ آیت قد خسر الذین قتلوا اولادھم پڑھو۔ اللہ اکبر کیا انقلابِ حال ہے ایک بات جو کل تک عرب بدو کہتا تھا جہالت تھی اور وہ ہی جب یورپ کا ڈاکٹر ضبطِ تولید کے خوشنما اور پرشوکت نام سے پیش کرتا ہے تو عقلمندی اور دانائی بن گئی دوسری بات یعنی تحریم رزق کی علت یہ بتائی ہے کہ اللہ کے بندوں پر رزق خداوندی کے لیے تحریم کا قانون بنانا اور اسے دین کے نام پر پیش کرنا یہ خدا پر سب سے بڑا بہتان ہے۔ ان دونوں باتوں کے نتیجے میں وہ سرتاسر دُنیا اور آخرت میں نقصان اور گھاٹے میں رہیں گے یہاں پہنچ کر یکبارگی ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ کیسے؟ جواب میں بطور استیناف بیان فرمایا قد ضلوا وما کانوا مھتدین۔ یہ لوگ راہِ حق سے بھٹک گئے ہیں اور اللہ نے اپنے رسول کے ذریعہ جو ہدایت دے کر روانہ کیا ہے اس سے کوئی فائدہ نہ اٹھا سکے۔

؎۱ تفہیم القرآن

وَهُوَ الَّذِيْٓ اَنْشَاَ جَنّٰتٍ مَّعْرُوْشٰتٍ وَّغَيْرَ مَعْرُوْشٰتٍ وَّ
النَّخْلَ وَالزَّرْعَ مُخْتَلِفًا اُكُلُهٗ وَالزَّيْتُوْنَ وَالرُّمَّانَ مُتَشَابِهًا
وَّغَيْرَ مُتَشَابِهٍ ؕ كُلُوْا مِنْ ثَمَرِهٖٓ اِذَآ اَثْمَرَ وَاٰتُوْا حَقَّهٗ
يَوْمَ حَصَادِهٖ ۖ وَلَا تُسْرِفُوْا ؕ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿١٤١﴾
وَمِنَ الْاَنْعَامِ حَمُوْلَةً وَّفَرْشًا ؕ كُلُوْا مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ وَ
لَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّيْطٰنِ ؕ اِنَّهٗ لَكُمْ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿١٤٢﴾
ثَمٰنِيَةَ اَزْوَاجٍ ۚ مِنَ الضَّاْنِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْمَعْزِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ
ءٰٓالذَّكَرَيْنِ حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ
الْاُنْثَيَيْنِ ؕ نَبِّئُوْنِيْ بِعِلْمٍ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿١٤٣﴾ وَ
مِنَ الْاِبِلِ اثْنَيْنِ وَمِنَ الْبَقَرِ اثْنَيْنِ ؕ قُلْ ءٰٓالذَّكَرَيْنِ
حَرَّمَ اَمِ الْاُنْثَيَيْنِ اَمَّا اشْتَمَلَتْ عَلَيْهِ اَرْحَامُ الْاُنْثَيَيْنِ ؕ
اَمْ كُنْتُمْ شُهَدَآءَ اِذْ وَصّٰىكُمُ اللّٰهُ بِهٰذَا ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ

افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا لِّيُضِلَّ النَّاسَ بِغَيْرِ عِلْمٍ ۗ اِنَّ اللّٰهَ

لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۴﴾

اور دیکھو وہ خدا ہی ہے جس نے باغ پیدا کر دیے ٹٹیوں پر چڑھائے اور بغیر اس کے[۱۸۳] - اور کھجور کے درخت اور کھیتیاں جن کے پھل مختلف قسموں کے ہوتے ہیں، نیز زیتون اور انار کے درخت صورت و شکل میں ایک دوسرے سے ملتے ہوتے اور ایک دوسرے سے الگ[۱۸۴]۔ خدا کی اس پیداوار کو شوق سے کھاؤ جب اس میں پھل لگ جائیں اور چاہیے کہ جس دن فصل کاٹو اس کا حق بھی دے دیا کرو، اور اسراف نہ کرو، خدا انہیں دوست نہیں رکھتا جو اسراف کرنے والے ہیں[۱۸۵]۔ اور دیکھو اسی خدا نے چارپایوں میں سے کچھ تو بوجھ اٹھانے والے پیدا کر دیے اور کچھ زمین سے لگے ہوتے، بس جو کچھ خدا نے تمہاری روزی کے لیے پیدا کر دیا ہے اسے کھاؤ اور شیطان

کے قدم بقدم نہ چلو وہ بلاشبہ تمہارا کھلا دشمن ہے[۱۸۶]۔ چار پایوں میں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے آٹھ قسمیں پیدا کی ہیں، بھیڑ میں سے دو قسم نر اور مادہ اور بکری کی دو قسمیں نر و مادہ، اے پیغمبر ان لوگوں سے دریافت کرو خدا نے ان جانوروں میں سے کس جانور کو حرام کیا ہے؟ دونوں قسم کے نروں کو یا مادہ کو یا پھر اس بچہ کو جسے دونوں قسم کی مادہ اپنے پیٹ میں لیے ہوتے ہے اگر تم سچے ہو تو مجھے علم کے ساتھ بتاؤ[۱۸۷]۔ اور دیکھو اسی طرح اونٹ میں سے دو قسمیں ہیں اور گائے میں سے دو قسمیں ہیں تم ان سے پوچھو کیا ان میں سے نر کو حرام کر دیا ہے یا مادہ کو یا اس کو جو دونوں کی مادہ اپنے پیٹ میں لیے ہوتی ہے کیا تم اس وقت حاضر تھے جب خدا نے اس بارے میں حکم دیا تھا بتاؤ تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو خدا پر افترا پردازی کرے تاکہ لوگوں کو بغیر علم کے گمراہ کرے، بلاشبہ

اللہ ظلم کار لوگوں کے لیے ہدایت کا سامان نہیں کرتا ہے۔ ۱۸۸

معانی مفردات

انشأ، انشاء سے ماضی ہے مادہ نشأ ہے۔ اس کے معنے نشو و نما دینا اور تربیت کرنا ہیں۔ ایسی تمام چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے جن کی تربیت اور نشو و نما میں تدریج ہو جیسے باغات، بادل، علم و فن کی کتابیں۔ اسی سے مضمون نگاری کو انشا کہتے ہیں۔ جنات، جنت کی جمع ہے جن سے مشتق ہے درختوں والا ہر وہ باغ جس کے درخت زمین کو چھپالیں جنت کہلاتا ہے۔ جنت کو جنت یا تو دنیوی باغات سے تشبیہ دے کر کہا گیا، اگرچہ دونوں میں یوں بعید ہے۔ معروشات، عرش مصدر سے اسم مفعول کی جمع مونث ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں عرش اصل میں مسقف چیز کو کہتے ہیں اور اس کی جمع عروش آتی ہے۔ ارشاد ہے و ھی خاویۃ علیٰ عروشہا اور اسی سے عرشت الکرم کے معنے انگور کی بیلوں کے لیے ٹٹیاں اور چھتریاں لگانے کے آتے ہیں۔ معروشات اسی سے ہے۔ حصاد، یہ مصدر ہے اس کا باب نصر ہے اس کے معنے کھیتی کاٹنے کے ہیں لیکن اس میں باغات میں پھلوں کا چننا بھی داخل ہے۔ حمولۃ، حمل مصدر ہے اس کے معنے بوجھ اٹھانے والا چوپایہ، یہ صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ فرشا، وہ جانور جو ذبح کے وقت لٹاتے جاتے ہیں۔ بعض حمولہ بڑے جانور کو اور فرش چھوٹے چھوٹے جانوروں کو کہتے ہیں۔ ازواج، زوج کی جمع ہے، جوڑا، قسم قسم، طرح طرح، المصباح المنیر میں ہے زوج وہ شکل ہے جس کی کوئی نظیر ہو جیسے اصناف والوان، یعنی مختلف قسمیں اور رنگ اور یا اس کی کوئی نقیض ہو جیسے خشک و تر، نر و مادہ، شب و روز، شیریں و تلخ۔ ابن درید کہتے ہیں زوج ہر دو کو کہتے ہیں فرد کی ضد ہے۔ الضان، بھیڑ، دنبہ جس پر اون ہوتی ہے ضائن کی جمع ہے جیسے رکب راکب کی، ضائن، میش نر یعنی نر دنبہ یا نر بھیڑ کو کہتے ہیں جو معز کی ضد ہے یعنی بکری کی۔

مشرکانہ میلانات کی تردید

دور سے شرک فی العبادات اور شرک فی الطاعت کی تردید ہو رہی ہے اور اسی پر بھرپور تبصرہ ہو رہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ساری باتیں انتہائی جہالت اور حماقت کی ہیں۔ اصل یہ ہے کہ خدا نے نباتات و حیوانات میں سے جتنی اچھی چیزیں پیدا کی ہیں سب انسان کے استعمال کے لیے ہیں۔ قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ جو کچھ بھی تمہارے سامنے ہے سب کچھ تمہارا ہے اسی لیے کہ جس حد تک اپنی اکتسابی قوتوں کو بیدار کر کے تم ان سے استفادہ کرنا چاہو استفادہ کر سکتے ہو۔ ان سے فائدہ اٹھاؤ، خدا کا شکر ادا کرو۔ قرآن کے اس رجائی صلائے عام اور حوصلہ پرور ندائے دوام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس افسردہ قنوطی پیغام میں کوئی ادنیٰ مناسبت بھی ہو سکتی ہے جس میں انسان کو باور کرایا جاتا ہے کہ جو کچھ تمہارے سامنے ہے اس میں کچھ بھی تمہارا نہیں انسانیت کا کمالی ارتقاء اسی گریز و فرار کے ساتھ وابستہ ہے جو دنیا میں خدا کی پیدا کی ہوئی نعمتوں کے متعلق اختیار کیا جائے۔ کتنوں پر کھانے بند کیے گئے، ان کے منہ سے لقمے چھینے گئے۔ جانوروں سے محروم کیا گیا۔ زمین کی پیداوار اور مال مویشی پر قدغن قائم کی گئی ہے۔ قرآن بتا رہا ہے کہ یہ باغ اور کھیت اور یہ جانور جو تم کو حاصل ہیں یہ سب اللہ کے بخشے ہوئے ہیں۔ کسی دوسرے کا اس دین میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ اس لیے بخشش کے شکریے میں بھی کسی کا کوئی حصہ نہیں ہے۔ پھر یہ کہ جب یہ سب کچھ اللہ کا عطا کردہ ہے تو ان کے استعمال میں اللہ ہی کے حکم کی پیروی ہونی چاہیے کسی دوسرے کو حق نہیں پہنچتا کہ ان کے استعمال پر اپنی طرف سے کوئی پابندی لگائے اور اس کے لیے حدود مقرر کرے۔ اللہ کے سوا کسی اور کی مقرر کردہ رسموں اور قوانین کی پابندی کرنا اور اللہ کے سوا کسی اور کے آگے شکرِ نعمت کی نذر پیش کرنا اور اللہ کے سوا اور کے آگے شکرِ نعمت کی نذر پیش کرنا حد سے گزرنا ہے۔ اور یہی شیطان کی پیروی ہے۔ مزید برآں یہ کہ یہ سب چیزیں اللہ نے انسان کے کھانے کے لیے اور استعمال کے لیے پیدا کی ہیں اس لیے پیدا نہیں کی ہیں کہ ان کو خواہ مخواہ حرام کر لیا جائے اپنے اوہام اور خیالات کی بنا پر جو پابندیاں لوگوں نے خدا کے رزق اور اس کی بخشی ہوئی چیزوں کے استعمال پر عائد کر لی ہیں وہ سب منشائے الٰہی کے خلاف ہیں۔

۱۴۳۔ اور دیکھو وہ خدا ہی ہے جس نے باغ پیدا کیے ہیں۔ ٹٹیوں پر چڑھائے ہوتے اور بغیر ٹٹیوں پر چڑھائے ہوتے۔ جو ٹٹیوں پر چڑھائے جاتے ہیں مثلاً انگور وغیرہ اور جو ایسے نہیں مثلاً کھجور، آم وغیرہ ثمردار درخت یا خربوزہ، تربوز، وغیرہ جن کی بیل بغیر کسی سہارے کے زمین پر پھیلتی

ہے[1] اس آیت میں وھوالذی انشاء کے زور پر غور کرو، انسان کتنا ہی غافل ہو جاتے اور کتنا ہی اعراض کرے لیکن حق کی وسعت اور ہمہ گیری کا عالم یہ ہے کہ کسی حال میں بھی اس سے اوجھل نہیں ہو سکتیں ایک انسان تمام دُنیا کی طرف سے آنکھیں بند کرلے لیکن بہرحال اپنے شب و روز کے مشاہدے کی طرف سے آنکھیں نہیں بند کر سکتا جو باغات اس کے سامنے ہیں ان پر نظر ڈالے یہ کیا ہیں۔ایک انگور کا دانہ اپنے ہاتھ میں لے لو اور اس کی پیدائش سے لے کر اس کی پختگی و تکمیل تک کے تمام احوال و ظروف پر غور کرو کیا یہ وجود میں آسکتا تھا، اگر تمام کارخانۂ ہستی اس کی بناوٹ میں سرگرم نہ ہوتا، اگر دُنیا میں یہ نظام موجود ہے تو کیا یہ ہو سکتا ہے کہ اللہ کے علاوہ یا اللہ کے ساتھ کوئی اور ربوبیت رکھنے والے شرکاء موجود ہوں۔جب یہ باغات پیدا کیے ہوئے تو خدا کے ہیں تو ان میں تم نے دوسرے دیویوں اور دیوتاؤں کو کیوں شریک بنا رکھا ہے۔ جنات کہنے کے بعد خاص طور پر معروشات اور غیر معروشات کہہ کر انگور کے باغوں کا ذکر اور اس عموم کے ساتھ کہ کچھ انگور وہ ہیں جن کی بیلیں ٹٹیوں پر چڑھائی جاتی ہیں اور کچھ وہ ہیں جو ٹٹیوں پر نہیں چڑھائی جاتی ہیں بلکہ زمین پر پھیلتی ہیں۔کچھ انگوروں کی بہتات بتانے کے لیے کیا ہے۔تاریخوں میں لکھا ہے کہ مشہور صحابی حضرت عمرو بن العاص فاتح مصر کا طائف میں وہط نامی تاکستان تھا اس میں انگور کی بیلوں کے دس لاکھ ڈنڈے تھے جن پر بیلیں چڑھی ہوتی تھیں اور امیر شکیب ارسلان ہی نے حاضر العالم الاسلامی میں نقل کیا ہے کہ جب طرابلس فتح ہوا اور جبل اخضر پر حضرت عمرو بن العاص کی نظر پڑی تو فرمایا وہط میں باغبانی کا انتظام کر چکا ہوں ورنہ یہاں باغبانی کرتا۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ وہاں انگوروں کا کیا حال تھا۔ یہ تو طائف کا ذکر ہے اسی حجاز میں خیبر بھی ہے آج بھی جن لوگوں نے اس کا معائنہ کیا ہے لکھا ہے کہ بہتی ہوئی سات ندیاں اور نخلستانوں کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے وادی القریٰ کا بھی یہی حال ہے اور اگر غیر معروشات سے انگور کے علاوہ دوسری بیلیں مراد ہوں، مثلاً خربوزے، تربوز، ککڑیاں، کھیرے وغیرہ تو اس میں سبزیاں بھی داخل ہو جائیں گی۔ قرآن میں سورہ عبس میں ان دونوں کا یکجا ذکر بھی آیا ہے عنباً و قضباً انگور میں چونکہ تینوں صلاحیتیں موجود ہیں، میوہ بھی ہے غذا بھی ہے اور پینے کے لیے فرحت زا مشروب بھی ہے۔خود قرآن میں انگور کے بارے میں اس کی تصریح ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

باغوں اور کھیتوں کی بوقلمونی

۱۸۴۔ اور کھجور اور کھیتیاں جن کے پھل مختلف قسم کے ہوتے ہیں۔ نیز زیتون اور انار صورت و شکل میں ایک دوسرے سے ملتے جلتے اور ایک دوسرے سے مختلف۔ یعنی صورت و شکل میں ملتے جلتے مزہ میں جدا جدا[1]

انگوروں کے بعد پہلے کھجوروں کا ذکر ہے، کھجور کے بعد زرعی پیداوار کا اور زیتون اور انار کا، کھجور بھی انگوروں کی طرح باغات سے تعلق رکھتی ہے لیکن ان باغات سے تعلق رکھتی ہے جو تنے والے ہوتے ہیں۔ انگور ہو یا کھجور اور زیتون ہو یا انار اور یا پھر کھیتیاں ہوں۔ ان کی گوناگونی اور بوقلمونی ان کی پیداوار کے تنوع اور ان کے انواع و اقسام کے اختلاف کو یہاں خاص طور پر نمایاں کیا ہے جس سے مقصود یہ جتانا ہے کہ جس نے یہ سب کچھ پیدا کیا ہے وہ بڑا ہی کریم و فیاض اور مہربان و سخی ہے۔ اس نے بندوں میں رزق کی احتیاج رکھی ہے۔ احتیاج کے پورا کرنے کے لیے قسم قسم کی نعمتوں کے انبار لگا دیے، باغ اگاتے تو گوناگوں اقسام کے غلّے پیدا کیے تو بے شمار اقسام کے زیتون و انار اور دوسرے پھل پیدا کیے تو طرح طرح کے انواع کے۔ سوچنے کی بات ہے کہ زندگی باقی رکھنے کے لیے تو یہ تنوعات یہ بوقلمونیاں ناگزیر نہ تھیں لیکن اللہ سبحانہٗ نے بغیر اس کے کہ اس کی کوئی ضرورت ہم سے وابستہ ہو ہمارے لیے اتنا وسیع دسترخوان بچھایا کہ ہم اس کے لذائذ کے انواع و اقسام گننا چاہیں تو گن نہیں سکتے یہ سب کچھ اس لیے ہے کہ انسان یہ جانے کہ وہ اس کا شکر گزار بنے۔ شکر گزاری کا بھی احساس اللہ کی عبادت اور طاعت کی بنیاد ہے۔

قرآن اور زراعت و باغبانی

یہاں خصوصی طور پر باغات اور زراعت کا ذکر کیا ہے حالانکہ قرآن نے اپنے خطاب کا آغاز جس قوم اور ملک سے شروع کیا ہے خصوصاً قریش مکہ، ظاہر ہے کہ ان کا ماحول زراعت وغیرہ سے گویا بے تعلق تھا اور ان کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ قرآن اس راہ سے مسلمانوں میں انسانی معاش کے ان دو بابوں باغبانی اور زراعت سے ایک گونہ زیادہ مناسبت پیدا کرنا چاہتا ہے۔ باغبانی و زراعت پر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اسلام کا کتنا زور ہے۔ وہ اس کی اہمیت پر کس حد تک کتنا اصرار کرنا چاہتا ہے اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ باغبانی اور زراعت کا ذکر کرنے کے بعد اس پر یہ حکم مرتب کیا ہے کلوا من ثمرہٖ اذا اثمر وا آتوا حقہ یوم حصادہٖ اس کے پیداوار کو استعمال کرو اور کٹائی کے دن اس کا حق ادا کرو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کے اسی اشارے سے متاثر ہو کر فرمایا ہے۔

اگر قیامت بھی قائم ہو جاتے اور تم میں سے کسی کے ہاتھ میں کوئی پودا ہو اگر اس کے بس میں ہو کر کھڑا نہ ہو جب تک اس کو لگائے تو چاہیے کہ اس پودے کو لگا دے۔ (کنز العمال بحوالہ مسند احمد)

یہ تو حضرت عائشہ کی روایت ہے اور خالص باغبانی کے متعلق ہے لیکن اس موضوع پر صرف یہی ایک روایت نہیں بلکہ تقریباً مشہور و مستفیض روایتوں کی صورت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات بھی ہیں جن میں آپ نے صرف کاشتکاری اور باغبانی کو نہیں جس سے کاشتکار اور باغبان کو فائدہ ہو رہا ہے بلکہ اس میں جس سے وہ نفع اندوز بھی نہ ہو اس کے متعلق بھی مختلف پیرایوں میں آخرت کے ثواب کی بشارت سناتے ہوتے فرمایا ہے۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے نہیں ہے کوئی مسلمان جس نے کھیتی کی ہو یا درخت لگایا ہو پھر اس کھیتی یا درخت سے پرند کھائے یا آدمی یا جانور مگر یہ کہ ہو گا وہ اس کی طرف سے صدقہ۔ (صحیح بخاری)

وجہ ظاہر ہے کہ اس کھیت یا باغ لگانے والوں کو اگر نفع نہ پہنچا تو کیا ہوا اس نے تو اپنا فرض ادا کر دیا اور جس نے خدا کے فرض کو ادا کیا وہ ثواب کا ضرور مستحق ہے۔ اسی ارشاد میں یہ بھی اشارہ ہے کہ کاشتکار اور باغبان نے خدا کی دی ہوئی قوتوں سے کام لے کر اس چیز کو جو معدوم تھی وجود کے لباس میں جلوہ گر ہونے کا موقع دیا۔ اس سے اگر فرد کو نفع اٹھانے کا موقع نہیں ملا تو نہ ملے لیکن جماعت کی خدمت کا فرض تو وہ بجا لایا اور جماعت ہی نہیں بلکہ خدا کی دوسری مخلوقات مثلاً پرند چرند اگر اس سے مستفید ہوتے تو قصداً نہ سہی ضمناً اپنے وجود اور توانائیوں کو اس نے مفید ثابت کیا اور قرآن یہی چاہتا ہے کہ خدا کی عطا کی ہوئی قوتوں کو بیکار اور ضائع ہونے سے بچایا جاتے۔ بات طویل ہو جاتے گی مگر زبان قلم پر آگئی کہہ دیتا ہوں۔ مشہور صوفی و بزرگ شیخ ابو المکارم علاء الدولہ سمنانی رح جو تصوف اور حقائق کے ایک خاص مکتب خیال کے پیشوا ہیں۔ مولانا جامی نے نفحات الانس میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ،

حق تعالیٰ نے زمین اور کھیتوں کو حکمت سے پیدا کیا ہے اور خدا چاہتا ہے کہ یہ زمین آباد رہے اور اس سے مخلوق کو نفع پہنچے۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جائے کہ زمین کی آباد کاری جس سے فائدہ اور آمدنی مقصود ہو۔ اس میں کتنا ثواب ہے اگر لوگوں کو اس کا صحیح علم ہو جائے تو ہرگز زمین کی آباد کاری نہ چھوڑیں۔

اور فرماتے ہیں:

اسی طرح اگر لوگوں کو پتہ ہو جائے کہ آباد کاری کا کام چھوڑنے اور زمین کے بیکار پڑا رہنے میں کتنا گناہ ہے تو ہرگز وہ یہ نہ کریں کہ آبادی کے جو ذرائع ہیں ان کو چھوڑ دیں۔

اس کے بعد تمثیل سے اس قرآنی نظریہ کی تشریح بایں الفاظ کرتے ہیں:۔

جو کوئی زمین کا ایک ایسا قطعہ رکھتا ہے کہ اس سے ہزار من غلہ سالانہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر اس کی کوتاہی اور کاہلی و سستی سے تو سو من غلہ اس زمین سے حاصل ہوا اور اس کی وجہ سے سو من غلہ سے مخلوق محروم ہو گئی تو قیامت کے روز اس کاشتکار سے سو من غلہ کے بارے میں باز پرس ہو گی۔ (نفحات الانس)

یہ اسلام ہی ہے کہ ثواب آخرت کو حصول دنیا اور معاشی کاروبار کی گرم بازاری کے لیے استعمال کرتا ہے اور بغیر کسی دغدغہ کے یہ فیصلہ کرتا ہے کہ اس کی خلاف ورزی کرنے والوں بلکہ دنیا کے کاروبار میں پوری توجہ اور انہماک سے نہ کام کرتے والوں کو باز پرس کی دھمکی دے رہا ہے۔

آج پاکستان کے ان کاشتکاروں کو جنہوں نے محض اپنی قدامت پرستی کے تحت کشاورزی کے جدید آلات اور طریقوں کو ترک کر کے اس ملک کی پیداوار کو تقریباً سارے جہان کی پیداوار کے مقابلے میں انتہائی پستی کی حالت میں ڈال رکھا ہے۔ یورپ اور امریکہ کے کسان زمین کے جس رقبہ سے سو سو من غلہ نکالتے ہیں پاکستانی کسان اپنے باپ دادوں کے تقلیدی اسیب کا مارا ہوا اسی رقبہ سے بمشکل دس من غلہ نکالنے میں دشواری محسوس کرتا ہے۔ اسلام کے سوا کون سا دین ہے جو پاکستانی کسانوں کے اس طرز عمل کو مذہبی گناہ اور دینی جرم بتا کر ان کی عملی قوتوں میں بیداری پیدا کر سکتا ہے۔

قرآن نے زمین کی آباد کاری کو بھی ان فرائض میں داخل کیا ہے جن کی بجا آوری پر جنت کی آبادی کے وعدے کیے گئے۔ آخرت کو آباد کرنے کے لیے دنیا کو آباد کرو۔ اس کی دعوت قرآن کے سوا کس نے دی ہے۔ اپنی توانائیوں کو تعطل اور بے کاری سے مفلوج کر کے فقیرانہ زندگی بسر کرنے والے خدا جانے کیا سوچتے ہیں لیکن اسلام کی پکار تو یہی ہے جسے شیخ سمنانی نے

ان الفاظ میں پیش کیا ہے :-

جو شخص اپنی کاہلی سے زمین کی آبادکاری چھوڑ بیٹھے اور اس کا نام ترکِ دُنیا اور زُہد رکھے تو یہ شیطان کی پیروی کے سوا کچھ نہیں ہے ۔
اور قرآنی حکم سے اعراض کر کے جو دوسری مخالف راہ اختیار کرے گا اگر وہ شیطان کی پیروی نہیں تو اور کیا ہے ۔

پیداوار کی زکوٰۃ

۱۸۵ - سو غذا کی اس پیداوار کو شوق سے کھاؤ جب اس میں پھل لگ جائیں اور چاہیے کہ جس روز فصل کاٹو اس کا حق بھی دے دو اور اسراف نہ کرو خدا انہیں دوست نہیں رکھتا جو اسراف کرنے والے ہیں ۔ یعنی جو غلے اور پھل حق تعالیٰ نے پیدا فرماتے ہیں ان کے کھانے سے بدون سند کے نہ رکو ہاں دو باتوں کا خیال رکھو، ایک یہ کہ کاٹنے اور اتارنے کے ساتھ ہی جو اللہ کا حق ہے وہ ادا کر دو، دوسرے فضول اور بے موقع خرچ مت کرو ۔ اللہ کے حق سے کیا مراد ہے ۔ اس میں علمائے سلف کے مختلف اقوال ہیں ۔ ابن کثیر کی رائے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ابتداءً مکہ معظمہ میں کھیتی اور باغ کی پیداوار میں سے کچھ حصہ نکالنا واجب تھا جو مساکین و فقراء پر تقسیم کیا جاتے ۔ مدینہ طیبہ پہنچ کر ۲ھ ہجری میں اس کی مقدار وغیرہ کی تعیین و تفصیل کر دی گئی یعنی بارانی زمین کی پیداوار میں بشرطیکہ خراجی نہ ہو دسواں حصہ اور جس میں پانی دیا جائے بیسواں حصہ واجب ہے[1]

اس میں تین اہم باتوں پر زور دیا گیا ہے ایک یہ کہ جو کچھ پیداوار ہو اسے بغیر خطرے کے اپنے استعمال میں لاؤ، دوسرے یہ کہ پیداوار میں فصل کاٹنے اور باغات کا پھل حاصل کرنے کے وقت اللہ کا حق ادا کرو ۔ تیسری یہ کہ حد سے نہ گزرو حد سے گزر جانے والے اللہ کو پسند نہیں ہیں، چونکہ تینوں باتیں اپنی جگہ خصوصی اہمیت رکھتی ہیں اس لیے ضروری ہے کہ تینوں پر الگ الگ تبصرہ کیا جائے ۔

پیداوار کو استعمال کرنے کے لیے اصل میں تعبیر یہ اختیار کی ہے کہ کلوا من ثمرہ کھاؤ ان کی پیداوار کو، اگرچہ بتانے والوں نے یہی بتایا ہے کہ یہاں امر اباحت کے لیے ہے اور ہے بھی یہ حقیقت لیکن سوال یہ ہے کہ ایک مباح کام کے لیے یہ ایجابی اندازِ تعبیر کیوں اختیار کیا گیا ہے ۔ بتانا صرف یہ ہے کہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کسی کو یہ حق نہیں ہے کہ اللہ کی حلال کردہ چیزوں کو حرام کرے۔ کیونکہ تحریم صرف اللہ سبحانہٗ کا قانونی حق ہے۔ اگر کوئی اس خدائی حق کو اپنے لیے استعمال کرتا ہے وہ اپنے کو خدا کے قانونی حق میں شریک گردان رہا ہے اور جو شخص خدا کے علاوہ کسی اور کے لیے حق تسلیم کر کے اس کی اطاعت کرتا ہے وہ شرک فی الطاعت کا سنگین جرم کر رہا ہے۔ یاد رہے کہ گفتگو صرف تعبدی قانون میں ہے اگر کوئی شخص آپ کو گوشت کھانے سے تعبداً روکتا ہے تو یہ شخص شرک فی الحکم کر رہا ہے۔ اور اگر آپ اس کی طاعت کرتے ہیں تو یہ مشرکانہ طاعت ہے۔ اس سے یہ بات بھی خود نکل آئی کہ اگر آپ کو ڈاکٹر نے بیماری کی وجہ سے پھل کھانے سے روک دیا یا اگر سرکار نے ہیضہ کے اندیشے سے پھلوں پر پابندی لگا دی تو یہ ہرگز ہرگز وہ تحریم نہیں ہے جس میں اشراک کی روح کار فرما ہو۔ یہ تحریم تشریعی نہیں بلکہ یہ صیانۃ مصالح اور دفع مفاسد کے قبیل سے ہے۔ ایسے ہی اگر سرکار کسی وقت لوگوں کے مصالح کے پیش نظر خاص حالات میں پرندوں کے شکار پر پابندی عائد کر دے تو یہ تحریم شرعی نہیں ہے۔

دوسری بات کہ پھل کاٹنے کے وقت اللہ کا حق ادا کرو۔ اگرچہ اذا اثمر اس سے پہلے کلوا کے بعد آیا ہے لیکن اس کا تعلق کلوا اور اتوا حقہ، دونوں سے ہے یعنی جس طرح پیداوار سے انتفاع منحصر ہے پیداوار حاصل ہونے پر ایسے ہی اس کے حق شرعی کی ادائیگی واجب ہے اس کے پیدا ہونے اور کھیت سے کھلیان تک پہنچنے پر۔ اس آیت میں حقہ، کی ضمیر کا مرجع اللہ بھی ہو سکتا ہے اور پھل بھی دونوں صورتوں میں فرق کوئی نہ ہو گا۔ اس حق سے کیا مراد ہے؟ عبداللہ ابن عباس، جابر بن زید، محمد بن الحنفیہ، الحسن البصری، سعید بن المسیب، طاؤس، زید بن اسلم، قتادہ اور ضحاک کہتے ہیں کہ اس حق سے مراد پیداوار کی زکوٰۃ ہے۔ اور کچھ کی رائے میں اس حق سے مراد عام صدقہ ہے اور پیداوار کی حدیث سے یہ آیت منسوخ ہے۔ اس پر تو اتفاق ہے کہ پیداوار میں زکوٰۃ ہے لیکن اختلاف اس میں ہے کہ اس آیت سے ثابت ہے یا ارشاد نبوت سے۔ جو لوگ ارشاد نبوت سے پیداوار کی زکات کو ثابت کرتے ہیں وہ اسے منسوخ کہتے ہیں اور شاید یہ کشمکش اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ سورہ انعام مکی ہے اور زکوٰۃ کی قانونی تشکیل مدینے میں ہوتی ہے۔ حافظ ابن کثیر کی یہ بات واقعی جی کو لگتی ہے کہ حکم مکی زندگی میں ہوا ہے اور مقدار کی قانونی تشکیل مدینے میں ہوتی ہے آخر زکوٰۃ کی فرضیت بھی تو مکی زندگی میں ہوئی تھی۔ بعثت کے پانچویں سال جب حضرت جعفر وغیرہ ہجرت کر کے حبشہ گئے تھے۔ اور نجاشی نے اپنے دربار میں بلا کر ان سے اسلام کی حقیقت دریافت کی ہے اور حضرت جعفر نے اس کے جواب میں جو تقریر کی ہے اس میں ہے کہ اور وہ پیغمبر ہم کو یہ سکھاتا ہے کہ ہم نماز پڑھیں روزے رکھیں، زکوٰۃ دیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام زکوٰۃ یا مالی خیرات کا آغاز اسلام کی ابتداء ہی میں ہو

چکا تھا۔ اور وفد عبدالقیس جو تقریباً ۵ھ میں آیا تھا اس کے سوال کے جواب میں آپ نے جن احکام کی تعلیم دی ان میں ایک زکوٰۃ بھی تھی[1] ۶ھ میں جب نجاشی نے نامہ مبارک پہنچنے کے بعد ابو سفیان سے جو اس وقت تک کافر تھے اسلام کی تعلیمات دریافت کیں تو انہوں نے دوسری چیزوں کے ساتھ زکوٰۃ اور صدقہ کا بھی تذکرہ کیا[2] ان واقعات سے بخوبی واضح ہے کہ ۲ھ سے پہلے بلکہ ہجرت سے پہلے بھی بعثت کے بعد ہی نماز کے ساتھ زکوٰۃ کی تعلیم بھی موجود تھی۔ لیکن چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ تعلیم صرف نظریات کا پیش کرنا نہ تھا بلکہ اُمت کو عملاً اسلام کی تعلیمات پر کاربند کرنا بھی تھا۔ اس لیے حالات کے اقتضا اور مناسبت کے ساتھ ساتھ تعلیمات کے تفصیلی اجزاء اور ان کے متعلقہ احکام کی تشریح آہستہ آہستہ تکمیل کو پہنچائی گئی۔ مکہ مکرمہ میں مسلمانوں کی پریشانی پراگندگی، شکستہ حالی اور غربت و مسکینی کی جو کیفیت تھی اس کی بنا پر اتنا ہی ان کے لیے کافی تھا کہ وہ کسی یتیم و مسکین اور بھوکے کو کھانا کھلائیں۔ چنانچہ اس زمانہ میں اسی قسم کی تعلیم دی گئی۔

فک رقبۃ او اطعام فی یوم ذی مسغبۃ یتیماً ذا مقربۃ او مسکیناً
ذا متربۃ کسی قرض دار یا قیدی غلام کی گردن چھڑا دینا۔ بھوک کے دن میں رشتہ کے کسی یتیم بچہ کو یا خاک میں پڑے ہوئے کسی محتاج کو کھانا کھلانا۔

مدینہ منورہ میں آکر جب مسلمانوں کو کسی قدر اطمینان ہوا اور انہوں نے اپنا کچھ کاروبار شروع کیا تو روزے کے ساتھ ساتھ ۲ھ میں صدقۃ الفطر واجب ہوا۔ اس کے بعد مسلمانوں کو صدقہ و خیرات کی تاکید کی گئی۔ انہوں نے دریافت کیا یا رسول اللہ ماذا ینفقون؟ کیا خیرات کریں، ارشاد ہوا العفو تمہاری ضرورت سے جو کچھ زیادہ ہو۔ یہ زکوٰۃ کی تعیین میں اسلام کا پہلا قدم ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کا قول نقل کیا ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کی مقدار و نصاب کے احکام نازل ہونے سے پہلے مسلمانوں کو حکم تھا کہ جو کچھ بچے وہ خدا کی راہ میں دے دو آئندہ کے لیے کچھ بچا کر نہ رکھیں۔ اس وقت اسلام اور مسلمانوں کی حالت اسی کی مقتضی تھی۔ کچھ دنوں کے بعد جب مسلمانوں کو فتوحات نصیب ہوئیں زمینیں اور جاگیریں ہاتھ آئیں، تجارت کی آمدنی شروع ہوئی تو حکم ہوا۔

انفقوا من طیبات ما کسبتم ومما اخرجنا لکم من الارض
اپنی کمائی میں سے کچھ اچھی چیزیں اور جو کچھ تمہارے لیے زمین پیدا کرے اس میں سے کچھ خیرات کرو۔

[1] [2] صحیح بخاری کتاب الزکوٰۃ

الجصاص کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ جیسے اٰتوا الزکوٰۃ مکی ہے اور مدینہ کی زندگی میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد فی مائتی درھم خمسۃ دراھم دوسو درہم میں پانچ درہم زکوٰۃ ہے۔ اٰتوا الزکوٰۃ کے لیے بیان ہو کر آیا ہے ٹھیک اسی طرح اٰتوا حقہ یوم حصادہ مکی ہے اور مدینہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد:

فیما سقت السماء والعیون العشر و فیما سقی بالنضح نصف العشر

بارش اور چشمے سے سیراب ہونے والی زمینوں میں دسواں حصہ اور پرسہ وغیرہ سے سیراب ہونے والی زمینوں میں بیسواں حصہ ہے۔

اس کا بیان ہو کر آیا ہے۔ الجصاص نے آخر میں لکھا ہے کہ اس آیت میں حق سے مراد وہ عشر اور نصف عشر ہی ہے جو حضور انور کے بیان سے ثابت ہے اس لیے یہ آیت قرآنی مسلمانوں سے پیداوار کی زکوٰۃ کا مطالبہ کر رہی ہے اس لیے حافظ ابن کثیر کی یہ بات بالکل برمحل ہے کہ عشر کا وجوب تو مکہ میں ہو چکا تھا لیکن مدینے میں حضور انور نے اس کی تفصیل بیان فرمائی اس کی مقدار متعین کی اور یہ سب کچھ ۲ھ ہجری میں ہوا ان کے الفاظ یہ ہیں قد کان شیئاً واجبا فی الاصل ثم انہ فصل بیانہ و بین مقدار المخرج وکمیتہ قالوا کان ھذا فی السنۃ الثانیۃ من الھجرۃ۔

دراصل محنت اور سرمایہ سے خود دولت پیدا ہوتی ہے اس میں سب سے پہلی چیز اس کی پیداوار ہے تورات نے ہر قسم کی زمین کی پیداوار پر عشر یعنی دسواں حصہ مقرر کیا تھا۔ اسلام نے نہایت نکتہ سنجی سے پیداوار کی مختلف قسموں پر مختلف شرح زکوٰۃ کی تفصیل کی۔ سب سے پہلے پیداوار کے ان اصناف پر زکوٰۃ مقرر ہوئی جو کچھ زمانے تک محفوظ رہ سکتے ہیں تاکہ ان سے حسب منشا خانگی، تجارتی فائدہ اٹھایا جا سکے اور نقصان کا اندیشہ نہ ہو۔ اسی طرح اس مالیت پر جس میں نشوونما اور ترقی کی صلاحیت نہیں مثلاً آلات، مکان، لباس، سامان، اسباب سواری ان پر زکوٰۃ نہیں رکھی گئی۔

کچھ دنوں تک رہنے والی اور نشوونما پانے والی چار چیزیں ہیں۔ پیداوار زمین جانور، سونا، چاندی، یا ان کے سکے اور تجارتی مال، چنانچہ ان چاروں چیزوں پر زکوٰۃ مقرر ہوئی۔

زمین کی دو قسمیں کی گئیں ایک وہ جس کے جوتنے اور بونے کی محنت اور مزدوری کا خرچ گو کاشتکار کرتا ہے مگر موسمی اور اقلیمی خصوصیت کی وجہ سے ان کے سیراب کرنے میں کاشت کار کی کسی بڑی محنت اور مزدوری کو دخل نہیں ہوتا بلکہ وہ بارش یا نہر کے پانی یا زمین کی نمی اور شبنم سے آپ سیراب ہوتی ہے اس پر بلا محنت والی اتفاقی دولت سے آدھی زکوٰۃ یعنی عشر مقرر کیا گیا یعنی مال غنیمت کے مقابلہ میں

اور دفینہ کے مقابلہ میں جو کسی کو بلا محنت اتفاقاً مل جاتا ہے اس میں پانچواں حصہ زکوٰۃ ہے۔

زمین کی دوسری قسم یعنی وہ جس کی سیرابی کاشتکار کی خاصی محنت اور مزدوری سے ہو مثلاً کنویں سے پانی نکال کر لانا یا نہر بنا کر پانی لانا تو اس میں قسم اول سے بھی نصف یعنی بیسواں حصہ مقرر ہوا۔ نقدی سرمایہ میں جس کی ترقی و حفاظت، نشوونما اور افزائش میں انسان کو شب و روز سخت محنت کرنی پڑتی ہے اور جس کی افزائش کے لیے بڑے سرمایے کی ضرورت ہوتی ہے اور جس میں ہر قدم پر چوری، گم شدگی، لوٹ اور نقصان کا اندیشہ رہتا ہے۔ زمین کی دوسری قسم کا بھی آدھا یعنی چالیسواں حصہ مقرر ہوا۔

زمینی پیداوار اور نقد سرمایہ میں شرح زکوٰۃ کی کمی بیشی کی ایک دقیق اقتصادی علت اور بھی ہے انسان کی اصلی ضرورت جس پر اس کا چلنا منحصر ہے صرف غذا ہے۔ زمین کے مالکوں کو یہ چیز براہ راست خود اپنی محنت سے حاصل ہوتی ہے اور زندگی کی سب سے بڑی ضرورت ہے وہ بے پروا ہو جاتے ہیں۔ لیکن سونے اور چاندی کے مالکوں اور تاجروں کی جو دولت ہے وہ براہِ راست ان کی زندگی کی اصل ضرورت میں کام نہیں آتی بلکہ مبادلہ اور خرید و فروخت کے ذریعہ سے وہ اس کو حاصل کرتے ہیں۔ وہ کاشت کاروں کی پیداوار کو خرید کر ان کو نقد روپیہ دیتے ہیں جس سے ان کی دوسری ضرورتیں پوری ہوتی ہیں۔ پھر وہ اس پیداوار کو لے کر گاؤں گاؤں، شہر شہر اور ملک بملک پھرتے ہیں اور اس کی بھی اجرت ادا کرتے ہیں۔ نیز جو محنت زمین کی پیداوار حاصل کرنے میں صرف ہوتی ہے اس سے بدرجہا زیادہ نقد کے حصول میں صرف کرنی پڑتی ہے۔ سونا چاندی صدیوں کے فطری انقلابات کے بعد کہیں پیدا ہوتی ہے اور غلہ سال اور سال کی ہر فصل میں انسان کی کوشش سے پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے سونا چاندی کی قیمت کا معیار غلہ سے گراں تر ہے۔ ایک اور بات یہ ہے کہ کاشت کار اور زمینوں کے مالک عموماً دیہاتوں میں رہتے ہیں اور شہروں سے دور ہوتے ہیں۔ نیز وہ عموماً سونا چاندی اور سکوں سے بھی محروم رہتے ہیں اس لیے نسبتہً وہ قومی ضروریات دینی کی مالی خدمات اور مستحقین کی امداد میں اس خیرات کی گرفت سے آزاد رہتے ہیں جن کو عموماً نقد صورت میں دولت کے مالک اور تاجر پورا کیا کرتے ہیں اس وجہ سے بھی سخت ضرورت تھی کہ ان کے لیے قانون خیرات کی شرح اہل زمین سے مختلف رکھی جاتے۔

بہرحال اسلام میں عشر اور نصف عشر زمینی پیداوار کا نصاب زکوٰۃ ہے اور عشر یعنی پیداوار کا دسواں حصہ مسلمانوں کی اس زمین سے لیا جائے گا۔ جو بارش کے پانی سے سیراب ہوتی ہوں یا جن کی سینچائی تالاب، چشمہ، دریا، نہر کے ذریعہ اس طور پر کی گئی ہو کر کاشت کار کو اس پر نہ تو قابلِ

لحاظ مصارف اٹھانے پڑتے ہوں اور نہ کوئی خاص محنت کرنی پڑتی ہو مثلاً صرف اُسے اتنا کرنا پڑا ہو کہ دریا یا نہر سے ایک گول کے ذریعے پانی اپنے کھیت میں لے آئے۔ خلفائے راشدین کے زمانہ میں جب آبپاشی کے لیے نہریں تعمیر کرائی گئیں تو ان سے پانی حاصل کرنے پر کوئی محصول مہلیں وصول کیا گیا اس لیے ایسی نہروں سے سینچی جانے والی زمینوں کی پیداوار پر بھی عشر عاید کیا گیا۔ ان تمام صورتوں میں پیداوار کی زکوٰۃ کل پیداوار کا دسواں حصہ ہوگی اور یہ زکوٰۃ فصل کٹنے پر وصول کی جاتی تھی کیونکہ قرآن کی آیت واٰتوا حقہ یوم حصادہ میں حق کا اصل تعلق پیداوار سے ہے نہ کہ زمین سے۔

اور جب پیدا کنندہ نے زمین کو اپنی محنت سے سینچا ہو تو زکوٰۃ کی شرح ۵ فی صد ہوگی۔ یعنی کل پیداوار کا بیسواں حصہ نصف عشر وصول کیا جاتا ہے۔ کنویں سے پانی کھینچ کر سینچائی کرنے یا اپنے مصارف سے ٹیوب ویل تعمیر کرکے سینچائی کرنے کی شکل میں نصف عشر واجب ہوگا۔ قیاس چاہتا ہے کہ اگر سینچائی نہر کے پانی سے ہوتی ہو اور کاشت کار نے اس کے حاصل کرنے کے لیے آبیانہ کے طور پر ایک قابل لحاظ رقم دی ہو تو اس سے بھی نصف عشر۔ مولانا محمد تقی ـــ نے اسلام کے زرعی نظام میں یہی رائے ظاہر کی ہے۔ ہماری رائے میں شریعت کے اصولوں اور عملی مصالح دونوں کے اعتبار سے بہتر یہ ہوگا کہ اسلامی ریاست سینچائی کے لیے نہریں تعمیر کرائے لیکن پانی کا محصول وصول نہ کرے۔ اگر ریاست آبیانہ وصول کرتی ہے تو اسے نصف عشر وصول کرنا چاہیے۔ اور اگر نہروں کا پانی مفت دیا جاتا ہو تو پیداوار کا دسواں حصہ وصول کرنا چاہیے۔

زرعی پیداوار کی زکوٰۃ سے متعلق مذکورہ بالا بنیادی امور سنت نبوی، خلفائے راشدین کے تعامل کی روشنی میں واضح طور پر ثابت ہیں اور ان پر تمام فقہا کا اتفاق ہے۔

اختلاف صرف تین باتوں میں ہے اور تینوں اپنی جگہ اہم ہیں، اوّل یہ کہ عشر ہر مسلمان کی پیداوار پر واجب ہے یا ان زمینوں کی پیداوار اس سے مستثنیٰ ہیں جو اصلاً خراجی ہیں۔ قانون میں زمین کو دو قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے ایک عشری اور دوسری خراجی۔ عشری زمینیں وہ ہیں جن کے مالک ان پر قابض رہتے ہوئے اسلام لاتے ہوں بغیر جنگ کے یا جن کو امام نے غنیمت میں حصہ کے طور پر کسی فرد کی ملکیت میں دیا ہو یا جو پہلے افتادہ رہی ہوں مگر اب احیاء کے ذریعے یا امام کے بطور جاگیر عطا کرنے پر کوئی شخص ان کا مالک ہوا ہو ان زمینوں کو عشری کہتے ہیں۔

خراجی زمینیں وہ ہیں جن کے غیر مسلم مالکوں سے صلح کرلی گئی ہو یا جن کو بزور قوت فتح کرنے کے بعد امام نے ان کے سابق مالکوں کے قبضہ میں رہنے دیا ہو ان زمینوں پر ان شرطوں کے مطابق

محصول وصول کیا جاتے گا جو از روے معاہدہ طے پاتی ہوں یا جو سرکار نے مقرر کی ہو۔ یہ تفصیل کتاب الاموال ابی عبید اور کتاب الخراج قاضی ابویوسف میں موجود ہے، دوم یہ کہ زکوٰۃ ہر طرح کی پیداوار۔ غلہ جات پھل پھول، میوہ جات، سبزیاں کپاس وغیرہ پر واجب ہے یا کچھ اس سے مستثنیٰ ہیں۔

سوم یہ کہ وجوب زکوٰۃ کے لیے زرعی پیداوار میں بھی کسی مقدار نصاب کا لحاظ کیا جاتے جس سے کم پر زکوٰۃ واجب نہیں ہے یا زکوٰۃ بلا لحاظ مقدار پیداوار پر واجب ہے۔

اب تینوں پر تفصیلی تبصرہ بھی پڑھ لیجئے:۔

عشر ہر مسلمان کی پیداوار پر واجب ہے

یہ مسئلہ کہ عشر ہر مسلمان کی پیداوار میں واجب ہے قدرے اختلافی ہے۔ احناف کا مسلک اس موضوع پر تفصیل کے ساتھ ابوبکر الجصاص رازی نے احکام القرآن کی جلد سوم میں بیان کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ عشر اور خراج جمع نہیں ہو سکتے۔ یہی امام ابوحنیفہ، امام ابویوسف اور امام محمد اور امام زفر کا مسلک ہے۔ اس مسلک کی تائید الجصاص نے حضرت فاروق اعظم کے اس عمل سے کی ہے کہ عراقی زمینوں پر آپ نے خراج لگایا تھا اور پیداوار سے کوئی عشر نہیں لیا اور حضرت عمر نے یہ کام صحابہ کے مشورے سے کیا تھا۔ اس طرح اس میں ایک نوع کی اجماعی فیصلہ کی قوت رکھیے۔ اگر عشر و خراج دونوں کا اجتماع جائز ہوتا تو حضرت عمر ایسے ضرور کرتے۔ اس لیے احناف کے یہاں یہ بات اصول کے طور پر تسلیم کر لی گئی لا یجتمع العشر والخراج عشر اور خراج جمع نہیں ہوتے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عشری زمین سے سرکار نے خراج لے لیا تو عشر کی ذمہ داری ختم ہو گئی بلکہ مطلب یہ ہے کہ خراجی زمین سے عشر نہ لیا جائے گا اور عشری زمین سے خراج نہ لیا جائے گا۔ اگر عشری زمین سے خراج لے لیا گیا تو عشر اپنی جگہ ہے وہ ہر حال میں دینا ہی پڑے گا۔ اس کے برعکس امام شافعی، امام مالک، امام احمد، امام اوزاعی، امام لیث اور امام ابویعلیٰ کا مسلک یہ ہے کہ عشر اور نصف عشر ہر مسلمان کی پیداوار پر واجب ہے قطع نظر اس سے کہ اس کی زمین خراجی ہو یا عشری، جیسا کہ امام ابوعبید نے کتاب الاموال میں لکھا ہے۔ قرآن کی آیت اتوا حقہ یوم حصادہ کے عموم اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد فیما سقت السماء والعیون العشر وفیما سقی بالنضح نصف العشر کے عموم سے یہی ثابت ہے کہ ہر مسلمان کو اپنی زرعی پیداوار کی زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔ خلفائے راشدین اور حضرت عمر بن عبدالعزیز نے اسی اصول پر عمل کیا ہے۔ اسی پر عمل میں

انتظامی سہولتیں بھی ہیں اور یہی قابل ترجیح ہے۔ اللہ سبحانہٗ اپنی رحمتوں کی برکھا برسائے حضرت مفتی محمد شفیع پر وہ یہ فرما کر پاکستان کے مسلمانوں کے لیے عشر کے مسئلہ کو حل فرما گئے۔

۱۔ غیر مسلموں کی متروکہ زمینیں جو حکومت پاکستان نے مسلم مہاجرین میں تقسیم کی ہیں یہ سب زمینیں عشری ہیں۔ پاکستان بننے سے پہلے خواہ ان کی حیثیت کچھ ہو کیونکہ بنابر پاکستان اور دونوں حکومتوں کے معاہدہ تبادلہ جائداد ختم ہو جانے کے بعد یہ سب اراضی بیت المال کے حکم میں داخل ہو کر حکومت کی تقسیم کے ذریعے مسلمانوں کی ملک ابتدائی بن گئیں اور مسلمانوں کی زمینوں میں پیداوار پر عشر ہی لگایا جانا چاہیے، اس لیے یہ سب پاکستانی زمینیں عشری ہیں۔

۲۔ ایسے ہی وہ زمینیں جو پاکستان بننے سے پہلے غیر آباد تھیں اور کسی کی شخصی ملکیت نہ تھیں انگریز حکومت نے ان میں آب رسانی کے ذرائع مہیا کر کے لوگوں میں مالکانہ انداز پر تقسیم کر دیں۔ ان میں جو زمینیں مسلمانوں کو ملی ہیں وہ عشری ہیں اور جو غیر مسلموں کو ملی ہیں وہ خراجی ہیں۔ اسی طرح جن زمینوں کی حکومت پاکستان نے پانی کی بہم رسانی کا سامان کر کے آباد کیا ہے۔ اور مسلمانوں کو دے دی ہیں۔ مثلاً پنجاب میں تھل کا علاقہ اور سندھ میں کوٹری کا علاقہ یہ سب عشری ہیں۔

۳۔ وہ زمینیں جو پاکستان بننے سے پہلے مسلمانوں کی ملک ہیں ان کے عشری ہونے کا مدار اس پر ہے کہ اگر یہ ثابت ہو جائے مثلاً کہ ہندوستان کی ابتدائی فتوحات میں یہ زمینیں کسی مسلمان کو مالکانہ طور پر دے دی گئی ہیں تو یہ بھی عشری ہیں۔ یہاں قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے حنفی ہونے کے باوجود بڑی اچھی اور فیصلہ کن بات ارشاد فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں:

> یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ عشر واجب ہے ہر زمین کی پیداوار پر، کیونکہ آیت قرآنی مطلق ہے اس میں کسی قسم کی کوئی قید نہیں ہے۔ اگر مسلمان کسی خراجی زمین کا مالک ہوتا ہے تو دو ہی صورتیں ہیں اول یہ کہ اس سے خراج ختم ہو جائے اور عشر واجب ہو جائے یا یہ کہ دونوں جمع ہوں خراج زمین میں واجب اور عشر پیداوار میں ہو۔ یہ جمہور کا مذہب ہے کیونکہ خراج زمین کا ٹیکس ہے اور عشر پیداوار کی زکوٰۃ ہے نہ کہ زمین کی اسی لیے پیداوار میں نصاب شرط ہے۔ امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ خراج خراجی زمین سے کبھی ختم نہ ہوگا اور ایک زمین پر عشر اور خراج جمع نہیں ہوتے کیونکہ ان کے خیال میں عشر زمین کی زکوٰۃ ہے پیداوار کی نہیں ہے اسی لیے پیداوار میں ان کے خیال میں کوئی نصاب نہیں۔ خراج کے ساقط ہونے نہ ہونے کے موضوع کا عشر سے کوئی تعلق نہیں ہے باقی رہا

عشر و خراج کے جمع نہ ہونے کی بات تو امام ابوحنیفہ نے اس دعوے کی کوئی دلیل پیش نہیں فرمائی ہے باقی وہ حدیث جس کی ابن عدی نے کامل میں بحوالہ عبداللہ ابن مسعود تصریح کی ہے کہ حضور انور کا ارشاد ہے کہ مسلمان پر خراج اور عشر جمع نہیں ہوتا۔ یہ روایتی طور پر نہ صرف یہ کہ ثابت نہیں بلکہ باطل ہے۔ ابوحاتم کہتے ہیں کہ یہ ارشادِ نبوت نہیں ہے۔ اس کا واضع یحییٰ بن عینیہ واضع حدیث دجال ہے۔ امام ابوحنیفہ کے نام سے جھوٹی احادیث بنانے میں مشہور ہے اور خود ابن عدی کا کہنا کہ سارے دفتر حدیث میں یحییٰ بن عینیہ کے سوا اس حدیث کو بیان کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ ارشادِ نبوت نہیں بلکہ ابراہیم نخعی کا قول ہے صاحب ہدایہ نے امام ابوحنیفہ کے موقف پر اجماع سے بھی استدلال کیا ہے لیکن اجماع کا دعویٰ صحیح نہیں ہے کیونکہ ابن المنذر نے عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ انہوں نے عشر اور خراج دونوں وصول کیے ہیں اور معلوم ہے کہ عمر بن عبدالعزیز سے زیادہ فاروق اعظم پر چلنے والا کون ہے؟ اگر مسئلہ اجماعی ہوتا تو عمر بن عبدالعزیز کی نگاہوں سے ہرگز اوجھل نہ ہوتا۔

بہرحال اس موضوع پر قابلِ ترجیح رائے یہی ہے کہ عشر ہر مسلمان کی پیداوار پر واجب ہے خواہ اس کی زمین عشری ہو یا خراجی۔

کیا ہر قسم کی پیداوار پر عشر ہے؟

زکوٰۃ ہر قسم کی پیداوار پر واجب ہے یا کچھ پیداواریں اس سے مستثنیٰ ہیں۔ احناف کے نزدیک گھاس پھونس اور نرکل کے سوا زمین سے پیدا ہونے والی تمام کارآمد چیزوں، غلے، جوٹ اور کپاس پھل پھول اور سبزیوں گنے زعفران سب پر زکوٰۃ واجب ہے۔ قرآن کی آیت کا عموم اسی کا مقتضی ہے اور ارشادِ نبوت کے عموم کا بھی یہی مدلول ہے اور قرآن کی یہ آیت جس موقع و محل میں آئی ہے کہ پہلے جنات پھر معروشات وہ بیلیں جو ٹٹیوں پر چڑھتی ہیں جیسے انگور غیر معروشات وہ بیلیں جو زمین پر پھیلتی ہیں، اس میں کدو، خربوزے، کھیرے، تربوز، ککڑی اور ساری سبزیاں داخل ہیں۔ والنخل نخلستان، والزرع اس میں ہر قسم کی کھیتیاں داخل ہیں، زیتون رمان اور اس جیسے تمام پھل دار درخت۔ یہ فرمانے کے بعد ارشاد ہوا ہے "اٰتوا حقہ یوم حصادہ" تو سب کا حکم یہی ہے کہ ان میں عشر ہے۔ امام مالک کے نزدیک بھی قابلِ زکوٰۃ اجناس کی فہرست تقریباً اتنی

ہی طویل ہے۔ حنابلہ کے نزدیک ہر قابلِ ذخیرہ زرعی پیداوار قابلِ زکوٰۃ ہے لیکن شوافع کے نزدیک صرف وہ قابلِ ذخیرہ اجناس قابلِ زکوٰۃ ہیں جو غذائی اغراض کے لیے استعمال کی جاتی ہوں۔ اس کی پوری تفصیلات علامہ عبدالرحمان الجزیری نے الفقہ علی المذاہب الاربعہ میں فراہم کر دی ہیں۔

نصابِ زکوٰۃ کی تعیین

احناف کے نزدیک زرعی پیداوار کا کوئی نصاب نہیں ہے پیداوار کم ہو یا زیادہ اس میں سے زکوٰۃ وصول کی جائے گی بقیہ سارے اماموں کے نزدیک زرعی پیداوار کا نصاب ۵ وسق ہے ایک وسق وہ بوجھ ہے جس کو عادۃً ایک اونٹ اٹھا سکتا ہو جو ہمارے وزن کے اعتبار سے تقریباً ۱۹ من کے برابر ہوتا ہے۔ اور ابن المنذر نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ امام ابوحنیفہ کو چھوڑ کر پوری اُمت کا اجماع ہے کہ پیداوار میں ۵ وسق سے کم میں زکوٰۃ نہیں ہے۔ الجصاص نے امام ابوحنیفہ سے جوابات بھی دیے ہیں لیکن قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اشتراط نصاب پر جمہور کے مذہب کی تائید میں بخاری و مسلم کی حدیث ابی سعید خدری کو بطور حجت پیش کیا ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ پیداوار ۵ وسق سے کم ہو تو اس پر زکوٰۃ واجب نہیں ہوتی۔ احناف نے اس آیت اور ان احادیث سے استدلال کیا ہے جن میں بالکل عام انداز میں تمام پیداوار کا ذکر آیا ہے۔ ہماری رائے میں عقل اور نقل دونوں کا تقاضا ہے کہ زرعی پیداوار پر زکوٰۃ عائد کرنے کے سلسلے میں ایک قدر نصاب ملحوظ رکھی جائے کیونکہ شریعت نے دوسرے اموال میں زکوٰۃ عائد کرنے میں نصاب کا لحاظ رکھا ہے۔ اور یہ صرف قیاس ہی نہیں کیونکہ صراحتہً حدیث میں نصاب کی تعیین آچکی ہے۔ اس کی ایک مصلحت یہ ہے کہ نصاب سے کم مال کا مالک خود اس مال کا اتنا ضرورت مند ہوتا ہے کہ اس سے اس کا ایک حصہ دوسرے ضرورت مندوں کے لیے لینا مناسب نہ ہوگا۔ اُصولی طور پر زکوٰۃ اغنیاء سے لی جاتی ہے اور نصاب سے کم مال کا مالک غنی نہیں ہوتا ہے۔ جس کاشت کار کی مجموعی پیداوار ۱۹ من سے بھی کم ہو وہ نہ تو غنی ہے نہ یہ پیداوار اس کی ضرورت سے زائد ہے جیسا کہ ابن رُشد نے لکھا ہے اگرچہ اس موضوع پر احناف کا موقف دلائل کے لحاظ سے زیادہ طاقتور نہیں ہے۔ لیکن ابن العربی مالکی نے احناف کے مسلک کو مساکین کی معاشی ضروریات کے خاطر زیادہ طاقتور اور عملی اعتبار سے زیادہ محتاط قرار دیا ہے۔ یہ بات شوکانی نے ابن العربی کے حوالہ سے پیش کی ہے۔

وجوب عشر کی شرطیں

پہلی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ مسلمان ہو۔ غیر مسلم سے عشر کا مطالبہ نہ ہوگا کیونکہ عشر میں ایک حیثیت عبادت کی ہے اور کافر عبادت کا اہل نہیں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ اگر کسی مسلمان کی عشری زمین کو کوئی کافر خرید لے تو اس زمین پر بجائے عشر کے خراج لیا جائے گا کیونکہ عشر ایک اسلامی عبادت ہے کافر میں اس کی اہلیت نہیں ہے۔

دوسری شرط زمین سے پیداوار کا حاصل ہونا ہے اگر کسی وجہ سے پیداوار نہ ہو عشر واجب نہ ہوگا کیونکہ عشر زمین پر نہیں بلکہ پیداوار پر ہے۔ اٰتُوا حقہٗ یوم حصادہ کا مفہوم یہی ہے۔ اوّل اس لیے کہ حقہٗ کی ضمیر کا مرجع اگر پیداوار ہے تو پھر پیداوار نہ ہونے کی صورت میں حق کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ دوسرے یہ یوم حصادہ کا مفہوم یہ ہے کہ کٹائی کے دن زکوٰۃ دی جائے۔ پیداوار نہ ہونے کی صورت میں شرط ہی موجود نہیں ہے اس لیے عشر کا موقعہ ہی نہیں ہے۔

تیسری شرط یہ ہے کہ پیداوار ایسی چیز ہو جس کو اُگانے اور بونے کا عادۃً رواج ہو اور عادۃً اس کی کاشت کر کے اس سے استفادہ کیا جاتا ہو، خودرو گھاس یا خودرو درخت اگر کسی زمین میں ہو جائیں تو ان میں عشر نہیں ہے۔

ان تینوں شرطوں کے ساتھ عشر واجب ہوتا ہے۔ عاقل ہونا، بالغ اور زمین کا مالک ہونا عشر کے وجوب کی شرط نہیں ہے۔ مالک اگرچہ نابالغ بچہ ہو یا پاگل اور مجنوں ہو لیکن اگر زمین سے پیداوار ہو رہی ہے تو اس پر عشر واجب ہے۔ اسی طرح ملکیتِ زمین بھی وجوب عشر کے لیے شرط نہیں۔ وقف کی زمین جس کا کوئی مالک نہیں ہوتا۔ اس کی پیداوار پر بھی عشر واجب ہے۔ زمین اگر عاریۃً لی ہو یا کرایہ پر لی ہو اور اس میں زراعت کی تو پیداوار پر عشر واجب ہے اور اس شخص کے ذمہ ہے جو پیداوار حاصل کر رہا ہے۔ اگر زمین دوسرے شخص کو زراعت پر دی ہے یعنی بٹائی پر کہ پیداوار میں نصف نصف یا ایک تہائی یا دو تہائی پر دونوں میں معاملہ ہو گیا تو اس صورت میں عشر دونوں پر اپنے پیداواری حصہ کے مطابق لازم ہوگا۔

سرکاری مالگذاری اور عشر

جب یہ بات اٰتوا حقہٗ یوم حصادہ کے مطالبہ سے واضح ہو کر سامنے آگئی کہ عشر زکوٰۃ کی طرح

ایک عبادت ہے تو اس سے یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ کوئی حکومت خواہ وہ مسلمانوں کی ہو یا غیر مسلموں کی۔ اگر زمینداروں اور کاشت کاروں سے سرکاری ٹیکس وصول کرتی ہے تو اس ٹیکس کی ادائیگی سے عشر ادا نہ ہوگا بلکہ مسلمانوں کے ذمہ ضروری ہوگا کہ وہ بطورِ خود عشر نکالیں اور اس کو اس کے مصرف میں لگائیں۔ جیسے انکم ٹیکس کی ادائیگی سے اموالِ تجارت اور نقد میں زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی ایسے ہی زمین یا اس کی پیداوار پر کسی قسم کے ٹیکس کی ادائیگی سے عشر کی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہوتا۔ غیر مسلم حکومت میں تو معاملہ بالکل واضح اور صاف ہے ہاں البتہ اگر حکومت اسلامی ہو اور وہ مسلمانوں سے زکوٰۃ کے اصول کے مطابق زکوٰۃ کہہ کر وصول کرے اور زکوٰۃ کو اس کے مصارف پر خرچ کرنے کی پابندی کا اعلان کرے تو پھر زکوٰۃ یا عشر جو حکومت کو دیا جائے گا وہ شرعاً زکوٰۃ اور عشر ہی میں شمار ہوگا اور مسلمان ادائیگی کے بعد زکوٰۃ و عشر کے مطالبہ سے سبکدوش ہو جائیں گے۔

قرآن نے زکوٰۃ و عشر کا معاملہ ایک خاص نظام سے متعلق کیا ہے اس نظام کا تقاضا ہے کہ حکومت اپنے وسائل سے ہر شخص سے زکوٰۃ و عشر وصول کر کے جمع کرے۔ اگر صدقات کی ادائیگی کے لیے حکومت ضروری نہ ہوتی تو قرآن مصارف صدقات میں والعاملین کی مد کا ہرگز ذکر نہ کرتا۔ اصل یہی ہے کہ زکوٰۃ ہو یا عشر اس کی ادائیگی کے لیے تنظیم ہو۔ اس نظام کی پہلی اینٹ خدا جانے کن اسباب کے تحت اپنی جگہ سے سرک گئی۔ کہتے ہیں کہ حضرت عثمانؓ نے صدقات کی اور تمام مدوں کی شکل میں جو وصول ہوتی تھی ان کو تو باقی رکھا لیکن نقد کی صورت میں جو سرمایہ تھا اس کی زکوٰۃ کو بجائے حکومت کو دینے کے انفرادی طور پر دینے کی اجازت دے دی۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ گیارہویں پارے میں آئے گی۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ عشر ہو یا زکوٰۃ اس کی تنظیم حکومتِ اسلامی کے فرائض میں ہے ان کو دینے کے بعد مسلمانوں کی ذمہ داری ختم ہو جاتی ہے۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ عشر یا نصف عشر کا حساب لگاتے وقت پیداوار پر آنے والے مصارف مثلاً بیج کی قیمت، زمین کا لگان، فصل کی حفاظت اور کٹائی و لوائی وغیرہ پر آنے والے مصارف مزدوروں کی مزدوری وغیرہ کو منہا نہیں کیا جائے گا بلکہ پوری پیداوار کا دسواں یا بیسواں حصہ لیا جائے گا۔

کیا محصول اور چُنگی بھی عشر ہے؟

یہی عشر جس کی تفصیل آپ پہلے سن چکے ہیں مسلمانوں سے دوسری چیزوں یعنی مویشی و کاشت

سے صدقات کی مد کا محصول بنام زکوٰۃ و عشر لیا جاتا تھا، اسی طرح سے تجارتی اموال سے زکوٰۃ بحساب چالیس فی صد وصول کی جاتی تھی پھر کبھی یہ زکوٰۃ دکانوں سے وصول کی جاتی تھی اور کبھی بحری و بری گزرگاہوں سے جب کوئی تجارتی مال گزرتا تھا اس سے چالیسواں حصہ لیا جاتا تھا اور پھر سال بھر تک اس مال سے کوئی جدید محصول وصول کرنا ناجائز تھا۔ اسی طرح غیر مسلموں کے دکانوں کے تجارتی اموال تو محصول سے مستثنیٰ تھے لیکن باہر سے جب وہ اسلامی ملک میں مال لاتے تھے تو ان سے بجائے زکوٰۃ کے چالیس فی صدی کے اعتبار سے خراج کے طور پر وصول کیا جاتا تھا۔ اسی طرح غیر ممالک کے غیر مسلم تجار جب اسلامی علاقہ میں تجارتی مال لے کر آتے تھے تو قاعدہ یہ مقرر تھا کہ جس ملک کے وہ باشندے ہوتے تھے اس ملک کی حکومت مسلمانوں کے تجارتی مال پر جتنا محصول عائد کرتی تھی اسی قدر اسلامی حکومت بھی ان سے وصول کرتی تھی۔ اگر مسلمانوں کے تجارتی مال کو محصول سے مستثنیٰ کر دیا جاتا تو اس ملک والوں سے اسلامی حکومت بھی کچھ نہ لیتی تھی۔ البتہ اگر ان کی حکومت کا طرز عمل معلوم نہ ہوتا تھا مثلاً وہاں مسلمان کبھی تجارت کے لیے نہ گئے ہوں تو ان کے تجارتی اموال سے خواہ وہ کسی نوعیت کے ہوں دس فی صدی کے حساب سے محصول لیا جاتا تھا۔ اسی کو العشور کہا جاتا تھا اور اس پر کام کرنے والے سرکاری افسر کو العاشر کے نام سے پکارا جاتا۔ یہ آمدنی اگر غیر مسلموں سے ہوتی تو اسے سرکاری خزانے میں "خراج" کے فنڈ میں جمع کیا جاتا تھا۔ اور اگر یہ آمدنی مسلمانوں سے ہوتی تو خزانے میں الصدقات کی مد میں جمع ہوتی تھی کیونکہ دراصل یہ ان کے تجارتی مال کی زکوٰۃ میں ملتی تھی۔ قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں لکھتے ہیں :-

> مسلمانوں سے العشور کے نام سے جو محصول وصول کیا جاتا ہے اس کا شمار زکوٰۃ کی مد میں ہو گا اور اسلامی حکومت کی غیر مسلم رعایا کے مال سے العشور جو وصول کیا جاتا ہے یا جو غیر اسلامی حکومت کی غیر مسلم آبادی سے العشور وصول ہو ان سب کا شمار خراج میں ہو گا۔
>
> (کتاب الخراج ص ۷۸)

خلاصہ یہ ہے کہ تجارتی سامان اسلامی مملکت میں کسی راہ سے آئے بری سے یا بحری سے ان سے وہی عشر والی مد کا محصول سال بھر میں ایک دفعہ وصول کیا جاتا۔ اس محصول کا آغاز فاروق اعظم نے کیا تھا۔ جب آپ کو یہ بتایا گیا کہ جو مسلمان تاجر غیر مسلم علاقوں میں تجارت کا

مال لے کر جاتے ہیں ان سے وہاں کی حکومت چنگی لیتی ہے تو آپ نے بھی باہر سے مال لے کر آنے والے غیر مسلموں سے چنگی وصول کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اس محصول سے مسلمان تاجروں اور غیر مسلم تاجروں کے درمیان ایک گونہ عدل قائم ہو گیا کیونکہ مسلمان تاجر بہر صورت اپنے مالِ تجارت پر زکوٰۃ ادا کرنے کے ذمہ دار تھے۔ جب کہ عشور کا نظام قائم ہونے سے پہلے غیر مسلم تاجروں سے اس قسم کا کوئی محصول نہیں لیا جاتا تھا اور انہیں تجارتی مسابقت میں مسلمان تاجروں کے مقابلے میں ایک سہولت حاصل تھی۔ یہ تھا محصول جو ہر تاجر سے وصول کیا جاتا تھا مگر مسلمان تاجروں کے لیے یہ نیا نہ تھا بلکہ یہ ان کے لیے مالِ تجارت کی زکوٰۃ تھی جو سال میں ایک بار وصول کی جاتی تھی اس کی شرح بھی ڈھائی فی صد تھی، البتہ غیر مسلم تاجروں کے لیے یہ ایک نیا محصول تھا جس کی شرحیں مختلف تھیں عشور کی عام شرح حربی کے لیے دس فیصدی تھی اور اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہری اور مستامن کے لیے پانچ فی صد تھی۔ لیکن بعض مقامات پر اجتماعی مصالح کے پیشِ نظر چنگی کی شرح کم رکھی گئی ابو عبید کی کتاب الاموال میں ہے کہ حضرت عمرؓ نبطی تاجروں سے زیتون کے تیل اور گیہوں پانچ فیصد وصول کرتے تھے تاکہ مدینہ میں درآمد زیادہ ہو۔ مشہور ہے کہ ایک عیسائی تاجر سے عاشر نے دو دفعہ محصول وصول کر لیا۔ عیسائی حضرت عمرؓ کے پاس گیا آپ اس وقت بتقریب حج مکہ میں تھے۔ اس نے شکایت کی۔ اسی وقت حضرت عمرؓ نے عاشر کو ڈانٹ کہلا بھیجی اور اس کا مال واپس دلایا گیا۔ عرصہ کے بعد بھی عیسائی حضرت عمرؓ کی خدمت میں پھر آیا اور اپنا تعارف کراتے ہوئے بولا انا الشیخ النصرانی الذی کلمتک فی زیاد میں وہی بوڑھا عیسائی ہوں جس نے آپ سے زیاد عاشر کے بارے بات کی تھی۔ حضرت عمرؓ نے اسی لہجے میں جواب دیا وانا الشیخ الحنیف الذی قضیت حاجتک میں بھی وہی بوڑھا حنیف ہوں جس نے تیری ضرورت پوری کی تھی۔ قاضی ابو یوسف کی کتاب الخراج کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ غیر ملکیوں نے حضرت عمرؓ سے درخواست کی کہ ان کو تجارت کے لیے دارالاسلام میں آنے کی اجازت دی جائے اور اس اجازت کے عوض ان سے چنگی وصول کی جائے تو آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ انہوں نے آپ کو یہ درخواست منظور کرنے کا مشورہ دیا چنانچہ آپ نے چنگی عائد کرنے کا طریقہ اختیار کیا[1] جرجی زیدان نے لکھا ہے کہ:

یمن کے عاشر اس محصول کو ان جہازوں سے وصول کرتے جو ان کے

[1] کتاب الخراج

ساحلوں پر ہندوستان سے آتے ہوئے گزرتے تھے جن پر خوشبودار لکڑیاں مختلف قسم کی مشک کافور، عنبر، صندل، چینی وغیرہ ہوتے۔
خلاصہ یہ کہ اسلامی ممالک میں امن و امان اور عام خوش حالی کی وجہ سے ہر قسم کے اموال کی طلب کا یہ نتیجہ تھا کہ بکثرت غیر ممالک کے تاجر اسلامی مملکت میں تجارت کے لیے آتے جاتے رہتے تھے اور اس سلسلے میں حکومت کو کافی آمدنی ہوتی تھی۔ جرجی زیدان کا بیان ہے:
واثق باللہ کے زمانے میں جہازوں سے عشور کی آمدنی بہت زیادہ ہو گئی تھی
بلکہ زیدان ہی کا خیال ہے کہ یورپین ممالک میں آبنائے جبل الطارق پر لوگ بکثرت محصول ادا کرنے کے اتنے عادی ہو گئے تھے کہ موجودہ زمانے میں انگریزی میں جو TAREF کا لفظ محصول کے لیے استعمال ہوتا تھا۔ عربی کے لفظ طریف سے جو جبل الطارق پر عشور کی چوکی کا نام تھا بگڑا ہوا ہے یا پھر تعریفہ سے ٹیرف بنا ہے۔ پھر عشور اور عشر کی لفظی مناسبت سے میں نے عشور کے متعلق یہ بات یہاں لکھ دی ہے ورنہ اس کی اصل جگہ موضوع خراج ہے، اور خراج پر تفصیلی بحث انشاء اللہ اٹھائیسویں پارے فیٔ کے ضمن میں آئے گی۔ اور اسی جگہ خراج اور عشر کا تقابلی مطالعہ بھی بتایا جائے گا۔
آخر میں ارشاد ہوا ہے لا تسرفوا ان اللہ لا یحب المسرفین اسراف مت کرو بے شک اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ شارحین قرآن کا اس میں اختلاف ہے کہ اس فقرے کا تعلق کس سے ہے۔ پہلے آیت میں بتایا گیا ہے کلوا من ثمرہٖ پیداوار سے فائدہ اٹھاؤ اور پھر فرمایا کہ اتوا حقہ، کہ ادا کرو حق کر دو یعنی پیداوار کا صدقہ نکالو۔ اس حکم لا تسرفوا، اسراف نہ کرو کا تعلق اگر کلوا سے ہے تو مطلب یہ ہے کہ پیداوار کو استعمال کرو، لیکن استعمال میں اسراف نہ کرو اور اگر اتوا حقہ، سے ہے تو مطلب یہ ہے کہ راہ خدا میں خیرات کرو لیکن خیرات میں اسراف نہ کرو اور اگر دونوں سے ہے تو مطلب یہ ہے کہ پیداوار میں سے کھاؤ اور راہ خدا میں دو لیکن اسراف نہ کرو۔ اور اگر اس آیت کا تعلق کسی سے نہیں تو یہ ایک مستقل دفعہ ہے اور اس کا پوری زندگی سے تعلق ہے مطلب یہ ہے کہ زندگی کے کسی گوشہ میں بھی حد سے تجاوز نہ کرو اور اسراف نہ کرو۔ اس طرح یہ ایک حکیمانہ قانون ہے جو زندگی کے تمام شعبوں پر یکساں حاوی ہے۔ انسان اگر اسی پر عمل کرے تو اخلاق معاملات، سیاسیات معاشرت انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ساری شاخوں کی مشکلات حل ہو سکتی ہیں اور بڑے

بڑے پتھر پانی ہوکر رہ سکتے ہیں۔ ابن جریر اور ابن کثیر کا خیال یہی ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں، یہ آیت اپنے موقعہ کے لحاظ سے بالکل ویسی ہی ہدایت پر مشتمل ہے جیسے سورہ بنی اسرائیل میں ہے لا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک ولا تبسطها کل البسط،

اپنا ہاتھ نہ اتنا سکیڑ گویا گردن میں بندھ جائے اور نہ بالکل پھیلا ہی دے۔

لیکن امام بغوی نے عبداللہ ابن عباس کے حوالہ سے بتایا ہے کہ ثابت بن قیس نے پانچ سو کھجوروں کا پھل اتارا اور ایک ہی روز میں سارا خیرات کر دیا، گھر والوں کے لیے بالکل نہ چھوڑا، اس پر یہ آیت نازل ہوئی، لیکن اس پر شرح صدر نہیں ہے کیونکہ سورہ انعام مکی ہے اور مکی زندگی میں مسلمانوں میں اتنا تمول ہی نہ تھا اور پھر روایت بھی بحوالہ کلبی آئی ہے جس کے بارے میں آپ کو پانچویں جلد میں ہم بتا چکے ہیں۔ امام بغوی ہی نے سدی کے حوالہ سے لکھا ہے، وہ فرماتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ سارا سرمایہ راہِ خدا میں نہ دو کہ خود محتاج ہوکر رہ جاؤ۔ علامہ آلوسی نے بھی اوّلیت اسی کو دی کہ راہِ خدا میں دینے میں ہاتھ اتنا کھلا نہ رکھو کہ بس حد سے باہر ہو جاؤ۔ اور دل کا پتہ نہیں مگر میں اس فقرے کا مطلب یہاں یہی سمجھتا ہوں کہ صدقہ و خیرات میں اسراف نہ کرو۔

ایک شخص حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور اس نے سونے کی ڈلی یہ کہتے ہوئے پیش کی کہ یہ میری طرف سے صدقہ ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کی طرف سے منہ پھیر لیا۔ اس نے پھر توجہ دلائی، بار بار وہ توجہ دلاتا تھا اور آپ بے رُخی فرماتے تھے تا آنکہ جب اس کا اصرار حد سے گزر گیا۔ تب مجبوراً حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سونے کی ڈلی کو ہاتھ میں لیا اور اس کے بعد اس زور سے اس شخص کی طرف دے مارا کہ راوی کے لفظوں میں کہ "اگر اس کے لگ جاتی تو ٹیک کھل جاتی۔" اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ تم میں ایک شخص اپنا سارا مال اٹھا کر لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے۔ اس کے بعد خالی ہاتھ ہوکر گھر میں بیٹھ جاتا ہے پھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا:

خیر الصدقۃ ما کان عن ظھر غنی

سب سے اچھا صدقہ وہ ہے جو تونگری کی پشت پناہی میں ہو۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنا سارا مال خرچ کر ڈالیں اور دراصل یہی وہ مسئلہ ہے جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہو رہا ہے۔ مشہور شارح حدیث امام خطابی نے اس حدیث خیر الصدقۃ ما کان عن ظھر غنی کی تشریح

کرتے ہوئے ظہر غنی کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ

یعنی ایسی تونگری جس پر بھروسہ کرسکتا ہو اور جس کی پشت پناہی حاصل کر سکتا ہو اس وقت جب مصائب اور حوادث کا وہ شکار ہو۔

(معالم السنن)

امام خطابی نے اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے اپنی تائید میں دوسری حدیث پیش کی ہے جس میں ارشاد ہے:

خیر الصدقۃ ما ابقت غنی"

بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی کی تونگری باقی رکھے۔

جس کا صاف اور کھلا مطلب یہی ہوا کہ صدقہ کرتے ہوئے اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اتنا سرمایہ آدمی کے پاس رہ جائے جس سے وہ آئندہ آمدنی پیدا کرے یا اخراجات میں مدد لے سکے خطابی کے الفاظ یستظھر بہ کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ یہ ہے اس آیت میں اسراف کا مطلب، باقی کھانے پینے میں اسراف کی ممانعت تو وہ پہلے گزر چکی ہے اور اگلے پارے میں ان شاء اللہ سورۂ اعراف کی آیت نمبر ۳۱ میں آ رہی ہے۔ وہاں اس پر تبصرہ کریں گے۔ یہاں جس سیاق و سباق میں یہ آیت آئی ہے اس کا تقاضا یہی ہے جو ہم نے ہدیۂ ناظرین کر دیا ہے۔

حیوانات بھی اللہ کی نعمت ہیں

۱۸۶۔ اور دیکھو اسی خدا نے چار پایوں میں سے کچھ بوجھ اٹھانے والے پیدا کر دیے ہیں اور کچھ زمین سے لگے ہوتے، پس جو کچھ خدا نے تمہاری روزی کے لیے پیدا کر دیا ہے اس میں سے کھاؤ اور شیطان کے قدم بقدم نہ چلو وہ بلاشبہ تمہارا کھلا دشمن ہے۔ بوجھ اٹھانے والے جیسے اونٹ وغیرہ اور زمین سے لگے ہوتے چھوٹے قد و قامت کے جانور جیسے بھیڑ بکری، یہ اللہ کی نعمتیں ہیں ان سے منتفع ہونا چاہیے شیطان کے قدموں پر چلنا یہ ہے کہ ان کو خواہی نخواہی بدون حجت شرعی کے حرام کر لیا جائے یا شرک و بت پرستی کا ذریعہ بنا لیا جائے شیطان کی اس سے زیادہ کھلی ہوئی دشمنی کیا ہوگی کہ ان نعمتوں سے تم کو دنیا میں محروم رکھا اور آخرت کا عذاب الگ رہا[1] حمولہ سے مراد وہ چوپائے ہیں جو سواری اور باربرداری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے کام آتے ہیں مثلاً اونٹ وغیرہ، رکوبہ اور حلوبہ کی طرح ہے۔ اہلِ عرب اونٹ کے لیے زیادہ بولتے ہیں فرشاً سے مراد وہ چھوٹے جانور ہیں جو سواری اور باربرداری کے لیے موزوں نہیں صرف ذبح یا دوسری ضروریات کے کام آتے ہیں۔ فرش اس زمین کو بھی کہتے ہیں جہاں نباتات کی کثرت ہو۔ اس کھیتی کو بھی کہتے ہیں جو ابھی ڈنٹھلوں پر کھڑی نہ ہوئی ہو۔ یہاں جانوروں کے لیے اس لیے بولا گیا ہے کہ وہ چھوٹے قد کے ہوتے ہیں اور زمین سے لگے چلتے ہیں یا اس لیے کہ وہ ذبح کے لیے زمین پر لٹائے جاتے ہیں اور علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ اس لیے کہ ان کی کھالوں اور اُون سے فرش بنائے جاتے ہیں جیسے قالین وغیرہ لیکن چونکہ یہاں فرش کا لفظ حمولہ کے مقابلے پر آیا ہے اس وجہ سے بلاشبہ چھوٹے جانور ہی مراد ہیں۔ نباتات کے تذکرے میں معروشات غیر معروشات آیا تھا اس لیے یہاں حیوانات کے تذکرے میں حمولہ و فرشا بولا ہے۔ حمولہ سے معروشات کا اور فرش سے غیر معروشات کا تقابل دلا دیا ہے اس لفظی تجانس نے زبان کا ذوق رکھنے والوں کے لیے کلام میں حسن فراہم کر دیا ہے۔

خدا کی نعمتوں سے انتفاع کا حکم

کلوا مما رزقکم اللہ۔ اللہ کی بخشش کی ہوئی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ۔ اس فقرے کا جہاں یہ منطوق ہے کہ اللہ کی نعمتوں کو استعمال کرو اکل برتنے اور فائدہ اٹھانے کے معنے میں ہے اور رزق اللہ کی بخشش کی ایک جامع تعبیر ہے وہاں ایسے ہی اس کے مفہوم میں یہ داخل ہے کہ اللہ کی ان نعمتوں کو حاصل کرنے کے لیے وسائل اختیار کرو۔ اور اس کا مدلول یہ بھی ہے کہ انسان خدا کی نعمت اور بخشش کو اپنی دینی زندگی کے لیے قابلِ اجتناب نہ سمجھے۔ مادے کو اپنی روح کا قفس نہ گمان کرے۔ اپنی جبلی ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کو خدا پرستی کی راہ کی آفت نہ خیال کرے دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسائل زندگی سے کنارہ کش ہو بیٹھنے، دُنیا چھوڑ دینے کو خدارسی کا ذریعہ نہ سمجھے جسے رہبانیت کہتے ہیں بلکہ اسے چاہیے کہ زندگی کے مسائل سے پوری طرح وابستہ رہے۔ متاہل اور متمدن زندگی گزارے۔ اپنی ایک ایک فطری قوت کو زندہ و کارفرما رکھے۔ غرض آبادی سے جنگلوں کی طرف نہیں بلکہ جنگلوں سے آبادی کی طرف آئے اور یہ سب کچھ خدا کا حکم اور دین کا مطالبہ سمجھ کر کرے۔ اور اس یقین کے ساتھ کرے کہ اس کے خلاف طرزِ عمل اختیار کرنے میں دینداری کا نقص کمالِ بندگی سے محرومی ہے جس طرح نباتات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کلوا مما رزقکم اللہ اللہ نے یہ نعمتیں تمہیں دی ہیں جن جن پہلوؤں سے تمہارے لیے نافع ہیں ان سے فائدے اٹھاؤ ان کا گوشت کھاؤ، ان کو سواری کے لیے استعمال کرو ان سے باربرداری کا

کام لو، ان کا دودھ پیو، دودھ سے انواع واقسام کی نعمتیں بناؤ، ان کی خلاف کپڑے بناؤ۔ لیجئے۔ یہ سب باتیں کلوا کا مدلول ہیں اور دینداری کے نام پر ان نعمتوں پر ہرگز کوئی قدغن قائم نہ کرو یا کہو کہ یہ حرام ہے اور اس کی دی ہوئی نعمتوں کو اللہ کے سوا کبھی کسی کی عبادت کے کام میں نہ لاؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو یہ اتباع رحمان نہیں بلکہ اتباع شیطان ہے۔ اسی لیے لا تتبعوا خطوات الشیطان انہ لکم عدو مبین اللہ کی حلال کردہ چیزوں میں سے کسی بھی چیز کو حرام کرنا شیطان کے نقشِ قدم کو اپنانا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ کی جائز کی ہوئی چیزوں کو حرام قرار دینا شیطان کی پیروی ہے۔ یہ حکم تو ہر شیطانی روش کے لیے عام ہے لیکن یہاں خصوصیت کے ساتھ تعلق اللہ کی حلال کردہ غذاؤں سے ہے خواہ ان کا تعلق نباتات سے ہو یا حیوانات سے — تحلیل و تحریم کا منصب خدا ہی کو سمجھتا ہے اس میں کسی کی شرکت کی گنجائش نہیں ہے۔ اور تو اور خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے متعدد بار اپنی یہ پوزیشن واضح فرمائی ہے کہ تحلیل و تحریم میرا کام نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ سبحانہ کا منصب ہے۔ مثلاً

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو نباتات میں سے لہسن کھا کر مسجد میں آنے سے منع فرمایا اس پر بعض لوگوں کو شبہ ہوا کہ شاید لہسن حرام ہے جب آپ کو یہ خبر ہوئی تو آپ نے لوگوں کو واضح طور پر سمجھایا کہ

لوگو! جو چیز اللہ نے میرے لیے حلال کی ہے مجھے اس کے حرام کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے لیکن میں لہسن کی بو کو پسند نہیں کرتا ہوں [1]

ایک روایت میں اس طرح آیا ہے :

لوگو! خدا کی قسم جو چیز اللہ نے حلال کی ہے مجھے اس کے حرام کرنے کا کوئی حق نہیں ہے لیکن میں لہسن کی بو کو پسند نہیں کرتا ہوں [2]

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الموت میں آخری نماز مسجد نبوی میں با جماعت پڑھی تو اس کے بعد آپ حجرہ کے پہلو میں تشریف فرما ہو گئے اور لوگوں کو فتنوں سے آگاہ کرتے رہے۔ آپ نے یہ بھی فرمایا کہ بخدا میری طرف حلال و حرام کی نسبت نہ کی جائے۔ خبردار میں حلال نہیں کرتا مگر صرف اس چیز کو جس کو اللہ نے حلال کیا ہے اور میں حرام نہیں کرتا مگر صرف اس چیز کو جس کو اللہ نے حرام کیا ہے۔ (مسند امام شافعی)

---

[1] صحیح مسلم [2] صحیح ابو عوانہ ج ا ص ۱۲۴

ضرورت تو نہیں کہ قرآن و حدیث کی واضح ہدایات کے بعد کسی اور کا بھی ذکر کیا جائے لیکن شاید کوئی یہ سمجھ لے کہ اس موضوع پر کسی نے کچھ نہیں کہا اس لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مسلم علمائے امت اور فقہائے ملت کے چند حوالے بھی عرض کر دیے جائیں ۔

امام عبدالوہاب الشعرانی الیواقیت والجواہر میں شیخ اکبر قدس اللہ سرہ العزیز کے حوالہ سے لکھتے ہیں :

ہم یقیناً جانتے ہیں کہ شارع صرف اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے ۔ باقی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے احکام کے مبلغ ہیں ۔ آپ کبھی اپنی طرف سے کوئی بات نہ فرماتے تھے اور نہ آپ ان احکام کو بھولتے تھے جن کے پہنچانے کا آپ کو اللہ نے حکم دیا ہے ۔

حافظ ابن الہمام اپنی مشہور کتاب التحریر میں فرماتے ہیں :

اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حکم دینے والا صرف اللہ سبحانہ ہے

محدثین میں حافظ بدرالدین عینی فرماتے ہیں :

کسی چیز کا حلال کرنا اور حرام کرنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے ۔ کسی انسان کا اس میں کوئی تعلق نہیں ہے ۔

اشعۃ اللمعات میں شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں :

ان ابراھیم حرم مکۃ میں حرام کرنے کی نسبت حضرت ابراہیم کی طرف اس لیے ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کا حکم پہنچایا کیونکہ شرائع اور احکام کا فیصلہ کرنے والا اللہ تعالیٰ ہے اور اس کا حکم قدیم ہے اور انبیاء اس کے احکام کے مبلغ ہیں ۔

حضرت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں :

اس کا راز یہ ہے کہ تحلیل و تحریم دراصل اس تکوینی آئین کا نام ہے جو عالم ملکوت میں نافذ ہے کہ فلاں چیز پر مواخذہ ہوگا یا نہ ہوگا یہی تکوینی مواخذے کا باعث ہے اور یہ تکوین اللہ کی صفات میں سے ایک صفت ہے ۔ باقی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف تحلیل و تحریم کی نسبت تو اس لیے ہے کہ اس عالم میں آپ کا ارشاد اس بات کی کھلی نشانی ہے کہ اسے اللہ نے حلال کیا ہے یا حرام کیا ہے اور ائمہ مجتہدین کی طرف حلال و حرام کی نسبت اس لیے ہے کہ وہ اس کو شارع کے بیان سے روایت کرتے ہیں یا شارع کے کلام سے استنباط کرتے ہیں ۔

اس تفصیل سے یہ بات الم نشرح ہو کر سامنے آگئی کہ تحلیل و تحریم اللہ کی صفت ہے اور نصوص قطعیہ

سے یہ عقیدہ ثابت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی کسی صفت میں غیر کو شریک کرنا شرک ہے اور جب قرآن و اسلام میں پیغمبر کا یہ مقام ہے تو دوسروں کا تو سوال ہی نہیں ہے۔ نباتات ہوں یا حیوانات ان کی تحلیل و تحریم کا اختیار صرف اللہ کو ہے۔ مشرکانہ بدعات جو ہر دور کے شیاطین جن و انس نے باہمی گٹھ جوڑ سے ایجاد کی ہیں پھر ان پر شریعت کا لیبل لگا کر ان کو رواج دیا ہے ان کی پیروی ہرگز نہ کرو یہ سب خطوات شیطان ہیں اور یہ سب گمراہی ہے۔

تحریم پر نقلی و عقلی دلیل کا مطالبہ

۱۸۷۔ چوپایوں میں جن کا گوشت کھایا جاتا ہے اللہ نے آٹھ قسمیں پیدا کی ہیں، بھیڑ میں سے دو قسم نر اور مادہ اور بکری کی دو قسمیں نر اور مادہ، اے پیغمبر ان لوگوں سے دریافت کرو کہ اللہ نے ان جانوروں میں سے کون سے جانور کو حرام کیا ہے۔ دونوں قسم کے نروں یا مادؤں کو یا پھر اس بچہ کو جس نے دونوں قسم کی مادہ اپنے پیٹ میں لیے ہوئے ہے اگر تم سچے ہو تو مجھے علم کے ساتھ بتاؤ۔ ایک نر ایک مادہ اس طرح ہر نوع دو زوج ہوتے اور مجموعہ آٹھ ہو گیا۔ یعنی کسی چیز کو حلال و حرام کہنا صرف اللہ کے حکم سے ہو سکتا ہے۔ پھر ان میں سے نر کو یا مادہ کو یا بچہ کو جو مادہ کے پیٹ میں ہے اگر تم سب آدمیوں کے یا بعض کے حق میں حرام کہتے ہو جیسا کہ پچھلی آیات میں گزرا ہے اس کی سند تمہارے پاس کیا ہے جب خدائی حکم ہونے کی کوئی سند نہیں رکھتے ہو تو محض آزادانہ خدا کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو حلال یا حرام قرار دینا اس کا مترادف ہے کہ خدائی کا منصب تم اپنے لیے تجویز کرتے ہو یا خدا پر جان بوجھ کر افترا کر رہے ہو، دونوں صورتیں تباہ کن اور مہلک ہیں[1]

محققین کی رائے میں ثمانیۃ ازواج منصوب ہے کیونکہ یہ حمولۃ و فرشا سے بدل ہے۔ زوج کا لفظ عربی میں جیسے جوڑے کے لیے آتا ہے ایسے جوڑے کے ایک فرد کے لیے بھی آتا ہے۔ دونوں کو ملا کر زوجین کہتے ہیں انہ خلق الزوجین الذکر والانثیٰ پہلے بتایا تھا کہ چوپائے دو قسم کے ہیں ایک حمولہ بار برداری اور سواری والے اور دوسرے فرشا چھوٹے جانور زمین سے لگے ہوئے حمولہ اونٹ اور گائے اور فرش بھیڑ اور بکری، اب بتاتے ہیں کہ ان کی آٹھ قسمیں ہیں۔ ان چاروں میں سے یا مذکر ہیں یا مونث، پہلے اس آیت میں چار کو بیان کیا ہے۔ ضان میں مینڈھا، دنبی، معز میں بکرا بکری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ چاروں گویا فرشا کی قسمیں ہوتی ہیں۔ اے پیغمبر ان سے دریافت کرو کہ علم کی نپی تلی ترازو رکھ کر مجھے بتاؤ کہ ان چاروں میں سے اللہ نے کس کو حرام کیا ہے۔ علمی دلیل دو قسم کی ہوتی ہیں نقلی و عقلی۔ دلیل نقلی یہ کہ دین ابراہیم کی کوئی قابل اعتماد سند پیش کرو۔ یا پھر کوئی عقلی و فطری دلیل یا قرینہ پیش کرو جس سے تمہارے دعوے کی صحت پر اعتماد کیا جاسکے اگر اس طرح کی کوئی چیز نہیں تو صرف واہمہ پر یا رواج کی بنا پر جانوروں کو حرام کر دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کے نزدیک علم نام ہے دو قسم کی دلیلوں کا۔ نقلی اور عقلی، اسی کی طرف سورہ ملک میں لوکنا نسمع او نعقل کہہ کر اشارہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں ذرہ برابر بھی صداقت رکھتے ہو کہ فلاں چیز یا فلاں جانور فلاں کے لیے حرام ہے تو اس کی دلیل پیش کرو۔ اگر پیش نہیں کرسکتے تو کیوں اللہ پر جھوٹا بہتان اٹھاتے ہو اور اس کی سزا انتہائی سنگین ہے۔ باپ دادا کا کسی رسم کو اپنا لینا کسی چیز کے حلال یا حرام ہونے کی کوئی دلیل نہیں ہے۔ آخر یہ کیسے یقین کیا جائے کہ باپ دادا جو کچھ کرتے ہیں وہ کسی علمی سہارے کے تحت کرتے تھے۔

تحلیل و تحریم خدا کے حکم سے ہوتی ہے

۱۸۸۔ اور دیکھو اسی طرح اونٹ میں سے دو قسمیں ہیں اور گائے میں سے دو قسمیں ہیں۔ تم ان سے پوچھو کیا ان میں سے نر کو حرام کر دیا ہے یا مادہ کو یا اس کو جو ان دونوں کی مادہ اپنے پیٹ میں لیے ہوتی ہے کیا تم اس وقت حاضر تھے جب خدا نے اس مادہ میں حکم دیا تھا۔ تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا؟ جو خدا پر افتراء پردازی کرے تاکہ لوگوں کو بغیر علم گمراہ کرے۔ بلاشبہ اللہ ظلم کار لوگوں کو ہدایت نہیں دیتا ہے۔ اشیاء کی تحلیل و تحریم محض خدا کے حکم سے ہوسکتی ہے اور خدا کا حکم بالواسطہ انبیاء پر ہوتا ہے یا بلاواسطہ اللہ کسی کو مخاطب فرماتے تو اس کو علم ہو۔ یہاں دونوں صورتیں منفی ہیں۔ پہلی شق کے انتفاء پر نبئونی بعلم میں اور دوسری کی نفی پر ام کنتم شہداء میں متنبہ فرمایا ہے۔ پھر مشرکین کے دعاوی میں افتراء و اضلال کے سوا اور کیا چیز باقی رہ گئی۔ بلاشبہ اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو خدا پر بہتان باندھے اور علم و تحقیق سے تہی دست ہونے کے باوجود لوگوں کو باطل اور غلط مسائل بیان کر کے گمراہ کرتا پھرے جس شخص نے اس قدر ڈھٹائی اختیار کر لی اور ایسے ظلم عظیم پر کمر باندھ لی، اس کی ہدایت پانے کی توقع رکھنا عبث ہے[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ اونٹ اور گائے میں بھی دو دو ہیں۔ اونٹ میں اونٹ اونٹنی اور گائے میں سے بیل اور گائے، بتاؤ ان میں سے کون سا حرام ہے۔ مشرکین مکہ چوپاؤں میں سے کچھ کو حرام کہتے تھے قرآن نے ان کے اس طرزِ عمل پر یہاں پُرزور احتجاج کیا ہے اور ان کے اس طرزِ عمل کی غیر معقولیت واضح کی ہے یہ بات کہ ایک ہی جانور کا نر حلال ہو اور مادہ حرام ہو یا مادہ حلال ہو اور نر حرام ہو۔ یا پھر جانور خود حلال ہو اور اس کے پیٹ کا بچہ حرام ہو، یہ اس قدر کھلی حماقت ہے کہ عقل اسے ماننے سے انکار کرتی ہے اور کوئی ذی ہوش شخص یہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ خدا نے ایسا حکم دیا ہو۔ علامہ آلوسی نے اس کی اچھوتے انداز میں توضیح فرمائی ہے۔ بہرحال جس انداز سے قرآن نے ان کی لغویت کو بیان کیا ہے یہ قرآن ہی کا حصہ ہے۔

عرب میں بُت پرستی کی تاریخ

آخر میں فرمایا ہے فمن اظلم ممن افترىٰ على اللّٰہ كذبا ليضل الناس بغير علم اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹ کا بہتان باندھے اور اس لیے یہ طوفان اٹھائے کہ لوگوں کو گمراہ کرے۔ مطلب یہ ہے کہ جب صورتِ حال یہ ہے کہ تم پر تمہارے ان توہمات کی غیر معقولیت واضح کردی گئی تو پھر اس شخص سے زیادہ ظلم کار انسان کون ہو سکتا ہے جو علم و بصیرت سے تہی دامن ہو کر انسانی زندگی کی بے راہ روی کی خاطر خدا پر جھوٹ بولے اور یہ بہتان اٹھائے کہ فلاں جانور یا فلاں پیداوار حرام ہے یا فلاں جانور کا بچہ مردوں کے لیے حلال اور عورتوں کے لیے حرام ہے، استفہام انکاری ہے یعنی ایسے شخص سے زیادہ کوئی ظالم نہیں جو بغیر علم کے لوگوں کو اپنی فکری آوارگی سے گمراہ کرے۔

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ عرب تاریخ میں بنی اسماعیل کی گمراہی کا قائد عمرو بن لحی ہوا ہے جس نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ اور حام کی مشرکانہ بدعت نکالی تھی اور ابراہیمی و اسماعیلی دین کا ستیاناس کر ڈالا تھا۔ مسند احمد، صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں بحوالہ حضرت ابوہریرہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کان اول من سیب السوائب اور حضور انور ہی نے اس کا پورا نام عمرو بن لحی بن قمعہ بن خندق اور اس کی کنیت ابو خزاعہ بتائی ہے جیسا کہ امام بخاری نے کتاب المناقب میں ابوہریرہ کے حوالہ سے لکھا۔ ارباب روایت بیان کرتے ہیں کہ حضرت اسماعیل کے بعد ان کی اولاد دینِ ابراہیمی پر قائم تھی، ان میں رفتہ رفتہ بُت پرستی کا شیوع اس طرح ہوا کہ خانہ کعبہ جو پتھروں سے بنا تھا،

ان کے نزدیک مقدس تھا جب وہاں سے کسی اور مقام پر چلنے لگتے تو اس کا ایک پتھر تبرکاً اٹھا لیتے، بعد کو خانہ کعبہ کا امتیاز بھی اٹھ گیا جو پتھر اچھا سا چکنا پڑا مل جاتا اسی کو اٹھا لیتے اور اس کو اپنے گھر کا دیوتا بنا لیتے ہیں[1]

قدیم تحریری شہادتوں کے سب سے پہلے بابل کے کتبات میں ہم کو ۶۴۵ ق م میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ بنو قیدار اور انباط استنار یعنی زمرد کو پوجتے تھے۔ اشور منی پال شاہ نینوی شاہان عرب شمالی کی مفتوحی کی داستان میں کہتا ہے :

عادیر ملک عرب عم العدی شاہ قیدار میں مفتوح ہوتے اور گرفتار کر کے نینوی لائے گئے اور ایک دوسرے شہزادہ یوتع بن بیرودا کے بے شمار جنگجو لوگ تباہ برباد کیے گئے اور ان کے خیمے جلاتے گئے اور ایک تیسرا سردار ابی یاتی کو مع اس کے ساتھیوں کے یعنی یوقیع ابن خرابل ناتان شاہ انباط اور استنار کے پوجنے والوں کے شکست دی گئی۔ (تاریخ مورخین عالم)

ہیرو ڈوٹس ۴۵۰ ق م میں شہادت دیتا ہے کہ اہلِ عرب دو دیوتاؤں کو پوجتے تھے جن کے نام 'البلات' اور 'ادرتل' ہیں۔ البلات تو صاف لات ہے اور ادرتل نہ معلوم کیا ہے۔

اسماعیلی قبائل کے بارہ سلسلوں میں صرف تین کی نسبت ہم کو کچھ حالات معلوم ہیں۔ قیدار، اصحاب الرس، نبایوط، اصحاب الحجر، اور قیدار۔ اصحاب الرس کی مذہبی تاریخ کی قرآن نے کوئی تفصیل نہیں بتائی۔ صرف مجرم قوموں کی فہرست میں ان کا نام لیا ہے۔ دوسرے تاریخی ذرائع سے ان کے بارے میں کچھ معلوم نہیں ہوا۔ پہلی صدی عیسوی کے اوائل کا مورخ اسٹرابو جو اس قوم کا معاصر تھا کہتا ہے کہ :

مذہباً یہ سبا والوں کے دیوتا آفتاب کی پوجا کرتے ہیں اور اس دیوتا کا ہیکل یا قربانگاہ مکانات کی چھتوں پر بناتے اور اس پر شراب چڑھاتے ہیں اور اندر ہر روز بخور جلاتے ہیں۔

حجر کے نبطی کتبوں جو عموماً قبروں کی لوحیں ہیں ان کے دیوتاؤں کے نام بھی ملتے ہیں مثلاً ذوالشریٰ، لات، منوت، ہبل، قیس، عمی ند، شریش۔ ان آخر دو ناموں کے علاوہ بقیہ اور دیوتا

---

[1] سیرت ابن ہشام

زمانہ اسلام تک عرب کے شمالی علاقہ کے قبائل میں پوجے جاتے تھے۔ ذوالشریٰ اوس کا دیوتا تھا۔ لات ثقیف میں پوجا جاتا تھا اور منوت یعنی مناۃ اوس و خزرج کا معبود تھا۔ قیش جو عربی میں قیس ہے گو اس نام کے بُت کے تصریح نہیں ملی لیکن عرب ناموں میں عبد القیس، امرا القیس ملتے ہیں اور چونکہ اہلِ عرب اپنے دیوتاؤں کے نسبت سے نام رکھتے تھے اس لیے یہ خیال کیا جا سکتا ہے کہ عبد القیس کا قبیلہ قیس کے پرستاروں میں ہو۔

ہومل اسلام کی انسائیکلو پیڈیا میں لکھتا ہے کہ اہلِ یمن کی طرح انباط میں بھی چاند گھٹنے اور بڑھنے کی حالت میں دو توام دیوتا سمجھا جاتا تھا۔

اوس و خزرج ازد اور غسان کی شاخ تھے۔ اس بنا پر مذہبی حیثیت سے بھی ان میں اتحاد پایا جاتا تھا۔ چنانچہ مناۃ دیگر قبائل ازد اور غسان کا معبود بھی تھا اس کے علاوہ ان قبائل اور ان کی شاخوں میں اور بھی چند دیوتا تھے۔ مثلاً۔

نام	مقام	پرستار
اقیصر	حدودِ شام	قضاعہ، لخم، جذام وغیرہ
عائم	"	ازد، السراۃ
فلس	جبس	طی
ذوالشریٰ	"	دوس ازد
ذوالکفین	"	دوس
باجر	"	ازد
ودّ	"	کلب
یغوث	"	انعم

ان قبائل میں ستارہ پرستی بھی تھی۔ لخم اور جذام ستارہ مشتری کو پوجتے تھے اور طے سہیل کے پرستار تھے۔ اس لیے ممکن ہے فلس کا ہیکل سہیل کے نام سے ہوا اور اقیصر مشتری ہو۔

بنو قیدار ابتداءً اپنے باپ دادا حضرت اسماعیل حضرت ابراہیم کے مذہب پر تھے۔ خانہ کعبہ کا رسم ابراہیمی کے مطابق حج کیا کرتے تھے۔ رفتہ رفتہ مسکر حج کی غلط فہمی سے ان میں سنگ پرستی کا آغاز ہوا۔ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ مکہ اور حجاز میں بت پرستی کا بانی ایک شخص عمرو بن لحی ہے اس کے ملک شام سے تعلقات تھے۔ وہیں سے بت لا کر اس نے خانہ کعبہ اور اطرافِ مکہ میں پھیلا

دیے تھے۔ عدنانی قبائل کا سب سے بڑا بت، دیوتا ہبل تھا جو خانہ کعبہ میں نصب تھا۔ لات کا ہیکل شہر طائف میں تھا۔ مکہ سے چند میل دور عزیٰ نام ایک دیوی کا مسکن تھا۔ عدنانی قبائل کے یہ تین سب سے بڑے دیوتا تھے۔ ان پر چڑھاوے چڑھائے جاتے تھے۔ قربانیاں ہوتی تھیں، ان کی نذریں مانی جاتی تھیں۔

یہ صرف عرب میں بت پرستی کی رُوداد ہے۔ یہ بت پرستی کس پس منظر میں کی جاتی تھی اس کے عابدوں کے تصورات کیا تھے اسے ہم یہاں نظر انداز کرتے ہیں، انشاء اللہ نویں پارے میں اس پر بلسوط بحث آئے گی۔

قُلْ لَّآ اَجِدُ فِيْ مَآ اُوْحِيَ اِلَيَّ مُحَرَّمًا عَلٰى طَاعِمٍ يَّطْعَمُهٗٓ اِلَّآ
اَنْ يَّكُوْنَ مَيْتَةً اَوْ دَمًا مَّسْفُوْحًا اَوْ لَحْمَ خِنْزِيْرٍ فَاِنَّهٗ رِجْسٌ
اَوْ فِسْقًا اُهِلَّ لِغَيْرِ اللّٰهِ بِهٖ ۚ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَّلَا عَادٍ فَاِنَّ
رَبَّكَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴۵﴾ وَعَلَى الَّذِيْنَ هَادُوْا حَرَّمْنَا كُلَّ ذِيْ
ظُفُرٍ ۚ وَمِنَ الْبَقَرِ وَالْغَنَمِ حَرَّمْنَا عَلَيْهِمْ شُحُوْمَهُمَآ اِلَّا مَا حَمَلَتْ
ظُهُوْرُهُمَآ اَوِ الْحَوَايَآ اَوْ مَا اخْتَلَطَ بِعَظْمٍ ۭ ذٰلِكَ جَزَيْنٰهُمْ بِبَغْيِهِمْ ڮ
وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿۱۴۶﴾ فَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ رَّبُّكُمْ ذُوْ رَحْمَةٍ وَّاسِعَةٍ ۚ
وَلَا يُرَدُّ بَاْسُهٗ عَنِ الْقَوْمِ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۴۷﴾

آپ ان سے کہہ دیجئے کہ جو وحی میرے پاس آتی ہے اس میں تو
میں کوئی چیز ایسی نہیں پاتا ہوں جو کھانے والے پر اس کا کھانا حرام ہو
بجز اس کے کہ مُردار ہو، یا بہتا خُون یا سُور کا گوشت کہ یہ بلاشبہ
گندگی ہے یا پھر وہ چیز جو گناہ کا موجب ہو کہ اس پر نام پکارا

جائے اللہ کے سوا کسی اور کا، پھر جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور اس کا مقصد نافرمانی نہ ہو اور نہ حدِ ضرورت سے تجاوز کرنے والا ہو، تو تیرا رب بخشنے والا مہربان ہے[189]۔ اور یہودیوں پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیے اور گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی تھی ہاں وہ چربی ہم نے حرام نہیں کی تھی جو ان کی پیٹھ کو لگی ہو یا انتڑیوں سے جمی ہو یا ہڈی سے پیوست ہو، یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا دی تھی اور ہم بالکل سچ بتا رہے ہیں[190]۔ اس کے باوجود اگر وہ آپ کی تکذیب کریں تو آپ ان سے کہہ دیجئے کہ تمہارا رب بڑی ہی وسیع رحمت والا ہے اور مجرموں سے اس کا عذاب ٹلنے والا نہیں ہے[191]۔

معانی مفردات

مسفوحؔ سفح سے اسم مفعول ہے۔ سفح کے معنے ہیں بہتا ہوا خون حرام ہے خون بستہ

حرام نہیں ہے۔ رجس: ناپاک، پلید، گندا، سزا، بلا جمع ارجاس ہے۔ رجس کی چار صورتیں ہیں۔ ۱۔ باعتبارِ طبیعت، ۲۔ باعتبارِ عقل، ۳۔ باعتبارِ شریعت، ۴۔ تینوں حیثیت سے رجس شرعی جوا اور شراب، رجس عقلی شرک اور لحم خنزیر تینوں کا مجموعہ مردار، اللہ تعالیٰ نے سب کے لیے رجس استعمال فرمایا ہے۔ فسق: کے اصل معنے نکل جانا ہیں اسی لیے یہ لفظ معروف سے منکر اور طاعت سے نافرمانی کی طرف نکل جانے کے لیے استعمال ہوا۔ قرآن میں یہ لفظ عام منکرات سے لے کر کفر و بغاوت تک سب کے لیے استعمال ہوا ہے ائمہ لغت کہتے ہیں کہ لفظ فاسق ان معنی میں عربی میں اسلام سے پہلے عہد جاہلی میں استعمال نہیں ہوا۔ فسق بحیثیت فعل بے جان چیزوں کے لیے ضرور استعمال ہوا ہے۔ لیکن بحیثیتِ اسم فاسق کا استعمال انسان کے لیے کلام عربی میں نہیں۔ اس معنے میں اس کا استعمال تمام تر قرآنی ہے۔ زبیدی کہتے ہیں لا یعرف اطلاقہ علیٰ ھذا المعنی قبل الاسلام۔ اُهل: اہلال سے ماضی مجہول ہے۔ اہلال کے معنے آواز بلند کرنے کے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں۔ چاند دیکھتے وقت جو آواز بلند کی جاتی ہے۔ اس کو اہلال کہتے ہیں، پھر یہ مطلقاً ہر آواز کے لیے استعمال ہونے لگا اور اسی سے بچہ کی پیدائش کے وقت بچہ کے رونے کی آواز کو اہلال کہتے ہیں۔ اور ما اُھل بہ لغیر اللہ کے معنے یہ ہیں کہ جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو۔ یعنی غیر اللہ کے لیے نام زد کرنا اور شہرت دینا اہلال ہے۔ اضطر: اضطرار سے ماضی مجہول ہے اور اضطرار ضرورت سے باب افتعال بنا ہے۔ اسلامی قانون میں نظریہ ضرورت کا یہی ماخذ ہے۔ الحوایا، حویۃ کی جمع ہے جیسے بلیۃ کی جمع بلایا، عطیہ کی جمع عطایا ہے۔ اس کے معنے آنت اور انتڑی کے ہیں۔ باس: لڑائی، دبدبہ، سختی، آفت، جنگ کی شدت اصل میں اس کے معنے سختی کے ہیں اور آفت کے ہیں۔ مگر لڑائی اور غلبہ کے معنے میں اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ بغی: سرکشی، زیادتی، ضد، مصدر ہے جہاں میانہ روی چاہیے وہاں میانہ روی سے بڑھنے کو بغی کہتے ہیں۔ بغی کا استعمال کمیت اور کیفیت دونوں میں ہوتا ہے۔

شریعتِ ابراہیمی کے محرمات

مشرکین کی حرام کردہ چیزوں کو جب قرآن نے حلال کر دیا تو مشرکین نے یہ پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ مسلمانوں نے ان چیزوں کو بھی حلال کر دیا ہے جو حضرت ابراہیم و اسماعیل کے زمانے سے حرام چلی آرہی تھیں۔ چونکہ اس قسم کے معاملات میں طبیعتیں حساس ہوجاتی ہیں اس وجہ سے مسلمانوں پر اس پروپیگنڈے کا کچھ اثر ہوا۔ قرآن نے اس پروپیگنڈے کی واضح لفظوں میں تردید کی اور آیت ۱۱۸ سے ۱۲۱ تک سمجھایا۔ اس کے بعد قرآن نے مشرکین کو مخاطب کر کے کہا کہ تم کس علم کے برتے پر ان جانوروں کو حرام کرتے ہو کوئی نقلی یا عقلی دلیل پیش کرو۔ اب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا جا رہا ہے کہ آپ ان کو ان چیزوں کی فہرست بتا دیجیے جو اصلاً ملتِ ابراہیم میں حرام تھیں۔ اس سے مقصود مشرکین کی تردید ہے کہ انھوں نے اپنے مشرکانہ توہمات کے تحت کچھ چوپایوں کو حرام قرار دے دیا ہے یہ بالکل بے سند بات ہے۔ ملتِ ابراہیمی میں جو چیزیں حرام تھیں وہ صرف یہ ہیں۔ مردار، خون، سور کا گوشت اور غیر اللہ کی نذر و نیاز۔ قل لا اجد کے سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر غور کیجیے تو صاف معلوم ہوگا کہ حضور کو مشرکین کے سامنے اس امر کی وضاحت کا حکم ہو رہا ہے کہ تم نے جو بعض چوپایوں کی حرمت کو ملتِ ابراہیمی کی طرف منسوب کر رکھا ہے یہ بالکل بے سند بات ہے مجھ پر ملتِ ابراہیمی کے حلت و حرمت متعلق جو بات وحی کی گئی ہے وہ صرف یہ ہے کہ میتہ، خون، لحم خنزیر اور ما اُھل بہ لغیر اللہ کے سوا چوپایوں میں سے کوئی چیز بھی ملتِ ابراہیم میں حرام نہیں ہے۔ اور چونکہ یہودیوں میں بھی کچھ پابندیاں لگی تھیں۔ قرآن نے یہاں موقعہ کی مناسبت سے ان پابندیوں کا تاریخی پس منظر بھی پیش کر دیا اور بتا دیا کہ ان پر یہ پابندیاں سزاءً عائد کی گئی تھیں ورنہ اصل میں ان پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ بہر حال ان آیات کا مطالعہ اسی پس منظر میں کرنا چاہیے جن لوگوں نے ان آیات کا مطالعہ اس سے ہٹ کر کیا ہے وہ اسلام میں محرمات کے موضوع پر بے حد الجھنوں کے شکار ہو گئے ہیں۔ سید رشید رضا اسی پریشانی میں بہت دور جا نکلے ہیں۔

۱۸۹- آپ ان سے کہہ دیجیے کہ جو وحی میرے پاس آتی ہے اس میں تو میں کوئی ایسی بات نہیں پاتا ہوں کہ کھانے والے پر اس کا کھانا حرام ہو بجز اس کے کہ مردار ہو یا بہتا خون یا سور کا گوشت کہ یہ بلاشبہ گندگی ہے یا پھر وہ چیز جو گناہ کا موجب ہو کہ اس پر نام پکارا جائے اللہ کے سوا کسی اور کا۔ پھر جو شخص مجبوری کی حالت میں ہو اور اس کا مقصد نافرمانی نہ ہو اور نہ حدِ ضرورت سے زیادہ تجاوز کرنے والا ہو تو تیرا رب بخشنے والا مہربان ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں، یعنی جن جانوروں کے کھانے

کا دستور ہے ان میں سے یہی حرام ہے۔ اس آیت میں کفار کو یہی بتلانا ہے کہ جو چیزیں اوپر مذکور ہوئیں حلال تھیں جن کو تم نے حرام بنالیا ہے اب وہ چیزیں بتلائی جاتی ہیں جو واقعی حرام ہیں اور تم ان کو حلال سمجھتے ہو باقی مضمون آیت کی تفسیر و توضیح سورۃ مائدہ میں گزر چکی ہے۔ یعنی حرمت علیکم المیتۃ والدم الخ کے تحت وہاں ملاحظہ کرلیا جائے [1]

یہاں سب سے اہم بات سمجھنے کی یہ ہے کہ اس آیت میں جو کچھ بیان کیا جارہا ہے اس کا بنیادی مقصد کیا ہے کیا اس میں اسلام کا ضابطہ، حلت و حرمت بیان ہورہا ہے؟ یا اس میں ملتِ ابراہیمی میں جانوروں کی حلت و حرمت کا پیمانہ بتایا جارہا ہے؟ عام شارحین قرآن نے چونکہ اس آیت کو جانوروں کے موضوع پر اسلام کا ضابطہ حلت و حرام سمجھ لیا ہے اس لیے ان کو یہاں اس آیت کی تشریح میں پریشانیوں سے دوچار ہونا پڑا اور انہوں نے اسی روشنی میں آیت کے قصر کا مطالعہ کیا ہے اور اس کے نتیجہ میں انہوں نے فیصلہ کر دیا کہ حیوانی غذاؤں میں صرف یہی چار چیزیں حرام ہیں ان کے سوا ہر چیز جائز ہے لیکن قرآن کے سیاق و سباق کی روشنی میں یہ بات درست معلوم نہیں ہوتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہاں مشرکین مکہ کو بتایا جارہا ہے کہ تم نے اپنے مشرکانہ توہمات سے حیوانی غذاؤں میں جو چیزیں حرام قرار دے رکھی ہیں، یہ بے سند بات ہے۔ ملتِ ابراہیمی میں تو صرف یہ چار چیزیں حرام ہیں۔ اس آیت کے سیاق و سباق کو سامنے رکھ کر اس پر غور کیجئے تو صاف معلوم ہوگا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جانب سے مشرکین کے سامنے یہ وضاحت ہورہی ہے کہ تم نے جو بعض چوپاؤں کی حرمت کو ملتِ ابراہیم کی طرف نسبت دے رکھی ہے یہ بالکل بے سند بات ہے۔ مجھ پر ملتِ ابراہیم کے ضابطہ حرمت و حلت سے متعلق جو وحی آئی ہے وہ تو یہ ہے کہ ان چار چیزوں کے سوا ملتِ ابراہیم میں کچھ بھی حرام نہیں ہے۔ مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے افادات میں شاہ عبدالقادر کی جانب سے جو بات نقل کی ہے اس سے حضرت شاہ صاحب کا میلان بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جن جانوروں کا کھانا دستور ہے ان میں سے یہی چار چیزیں حرام ہیں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ اس آیت میں کہ اللہ کے نزدیک صرف یہ چار چیزیں حرام ہیں اور جن چیزوں کو مشرکین نے اپنی رائے سے حرام ٹھہرالیا ہے وہ حرام نہیں ہیں۔ حافظ ابن کثیر کا میلان بھی اسی طرف ہے وہ فرماتے ہیں:

قرآن کی اس آیت کا منشا ان مشرکین کی تردید ہے جنہوں نے بحیرہ، سائبہ، وصیلہ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اور حام کی ملت ابراہیمی میں بدعات نکال لی تھیں۔ اللہ سبحانہٗ نے اپنے رسول کو حکم دیا ہے کہ اعلان کر دو کہ اس موضوع پر میرے پاس جو وحی آئی ہے اس میں ان کی حرمت کا کوئی ذکر نہیں ہے حرام تو صرف یہ چار چیزیں ہیں مردار، خنزیر، بہتا خون اور غیر خدا کے نام پر پکاری ہوئی چیز، ان کے علاوہ کوئی حرام نہیں تم کیسے خیال کرتے ہو کہ فلاں چیز حرام ہے، تم کہاں سے حرام کرتے ہو۔

ضرورت ہے کہ آیت کا اسی پس منظر میں مطالعہ کیا جائے۔ جن لوگوں نے آیت کو سیاق و سباق سے ہٹا کر سمجھنے کی کوشش کی ہے اور انہوں نے اس آیت کو اسلام کا ضابطہ حلال و حرام سمجھ لیا ہے ان کو اس آیت کے سمجھنے میں بے حد دشواریوں کا سامنا کرنا پڑا۔ کیونکہ اسلام میں صرف وہی چیزیں حرام نہیں ہیں جو آیت میں مذکور ہیں بلکہ ان کے علاوہ بھی بہت سی چیزیں حرام ہیں۔ قاضی بیضاوی نے الی الغایۃ ابھی تک قید لگا کر اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ آیت تو اسلام کا ضابطہ حلت و حرمت ہی بتا رہی ہے مگر مطلب یہ ہے کہ وحی الٰہی نے ابھی تک تو بس یہ چار چیزیں ہی حرام کی ہیں۔ یہ مراد نہیں کہ کل محرمات یہی ہیں لیکن قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہ کہہ کر اسے رد کر دیا ہے کہ ھذا القول غیر صحیح عندی اور کچھ کہتے ہیں کہ آیت میں تو یہ ہی بتایا ہے کہ محرمات چار ہی ہیں مگر آیت میں احادیث کے ذریعے تخصیص پیدا کی جا سکتی ہے لیکن امام رازی نے اسے یہ کہہ کر رد کر دیا ہے کہ یہ تخصیص نہیں بلکہ تنسیخ ہے۔

اصل یہی ہے کہ یہ موقعہ محل سے ہٹا کر آیت کا مطلب ہے ورنہ آیت اپنے سیاق و سباق کے لحاظ سے اپنے مطلب میں بالکل واضح اور صاف ہے اور اس میں کوئی کھٹک نہیں کہ مشرکین نے جو چیزیں حرام ٹھہرا رکھی ہیں یہ محض من گھڑت ہیں، ملت ابراہیم میں چوپایوں کی حلت و حرمت سے متعلق جو وحی میرے پاس آئی ہے اس میں ان من گھڑت حرمتوں کا کوئی وجود نہیں ہے۔ وہ چیزیں حرام نہیں ہیں جو یہ لوگ بتاتے ہیں بلکہ ملت ابراہیم میں صرف چار ہی حرام ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ اسلام میں صرف چار حرام ہیں اسلامی محرمات کا یہاں ذکر نہیں ہے۔ اسلامی محرمات کا ذکر المائدہ میں ہے۔

طاوس یمانی کہتے ہیں کہ اہل جاہلیت کچھ چیزوں کو حلال اور کچھ کو حرام کہتے تھے اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول سے کہا کہ ان سے کہہ دو لا اجد فیما اوحی الی محرماً اور ابوبکر الجصاص کہتے ہیں کہ انداز خطاب بھی طاوس کا مؤید ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے پہلے آیات میں مشرکین کی تحریمات کا ذکر کیا ہے اور مشرکین کی اس بات پر مذمت کی ہے کہ وہ خدا کی حلال کردہ چیزوں کو حرام بتاتے ہیں۔ اس کو ان کی جہالت اور حماقت قرار دیا اور پھر ان سے اپنے موقف پر دلیل کا مطالبہ کیا۔ اس کے بعد

فرمایا قل لا اجد فیما اوحی الی محرماً یعنی جن کو تم حرام کہتے ہو وہ حرام نہیں حرام تو صرف چار ہیں۔

جہاں تک اسلام کے ضابطہ حلت وحرمت کا معاملہ ہے وہ سورہ مائدہ، سورہ بقرہ میں بیان ہو چکا ہے۔ المائدہ میں تکرار کے ساتھ احل لکم الطیبات کہہ کر کھلے لفظوں میں بتا دیا کہ اسلام میں حلت کی فطری بنیاد طیبات ہیں یعنی جو طیبات ہیں وہ حلال ہیں۔ طیبات کی ضد خبائث ہے۔ اس سے معلوم ہو گیا کہ خبائث حرام ہیں اور سورۃ اعراف میں نبوت کے مقاصد میں سے اہم مقصد یہی بتایا ہے یحل لھم الطیبات و یحرم علیھم الخبائث۔ یہ آیت مجمل ہے ارشادات نبوت اسی اجمال کی وضاحت ہیں۔ طیبات سے مراد ظاہر ہے کہ وہ چیزیں ہیں جو مزاج اور سرشت کے اعتبار سے پاکیزہ اور معتدل صحت بخش اور نافع ہوں۔ خبیثات سے مراد اس کے برعکس وہ چیزیں ہیں جو اپنے مزاج اپنی جبلت اور انسان کے مزاج وطبیعت پر اثر کے لحاظ سے مضر اور مفسد ہوں۔

اسلام میں حلت وحرمت کا اصل ضابطہ یہی ہے۔ اس ضابطہ کی موجودگی میں حلال وحرام کا معلوم کر لینا کچھ مشکل نہیں لیکن دنیا میں نہ چوپاؤں کی کوئی حد ہے نہ پرندوں کی اور نہ دریائی جانوروں کی اور طیبات وخبائث میں تفاوت درجات اور فرق مراتب ہے۔ کوئی چیز زیادہ طیب ہوتی ہے کوئی چیز کم۔ اسی طرح کوئی چیز زیادہ خبیث ہوتی ہے کوئی کم۔ اس فرق مراتب کا اثر لازماً اس سے متعلق حکم پر بھی پڑتا ہے مثلاً ایک چیز حرام کر دی جاتی ہے، دوسری چیز کراہت ہی کے درجے میں رہتی ہے۔ اسی طرح بعض علامات میں یہ بھی ہوتا ہے کہ ایک چیز کے اندر بجائے خود تو کوئی خرابی نہیں ہوتی لیکن کسی خارجی سبب سے اس کو کوئی خرابی لاحق ہو جاتی ہے اور وہ خبیث ہو جاتی ہے۔

اس بنا پر بہت سی چیزوں کے بارے میں اختلاف بھی ہو سکتا ہے۔ چنانچہ ہمارے فقہاء نے بہت سی چیزوں میں یہ اختلاف بھی کیا ہے اور معیار یہ بنا ہے کہ جس کی حلت کے بارے میں قانون اعلان کر دے وہ طیب ہے اور جس کو حرام کہہ دے وہ خبیث ہے۔ جن کے بارے میں شارع کی جانب سے قول کا حکم آ جائے یا اسے خبیث فاسق کہہ دیا جائے وہ بھی خبیث حرام ہے۔ اور جن چیزوں کے بارے قرآن وسنت میں کوئی وضاحت نہیں ان میں کسوٹی یہی ہے کہ ان کو صحت بخشی، نافعیت پاکیزگی اور اعتدال کو پیش نظر رکھ کر طیبات کی ترازو میں تول کر طیب اور ان کے اضرار، انحراف انگیزی اور افساد کے پیش نظر خبائث کے پیمانہ سے ناپ کر خبیث قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسی بنیاد پر درندہ جانوروں اور شکاری پرندوں، مردار خوار حیوانات کو امام ابو حنیفہ مطلقاً حرام قرار دیتے ہیں مگر

امام مالک اور امام اوزاعی کے نزدیک شکاری پرندے حلال ہیں۔ لیث کے نزدیک بلی حلال ہے۔ امام شافعی کے نزدیک صرف وہ درندے حرام ہیں جو انسان پر حملہ کرتے ہیں۔ جیسے شیر، بھیڑیا، چیتا وغیرہ، عکرمہ کے نزدیک کوا اور بجو دونوں حلال ہیں۔ اسی طرح امام ابوحنیفہ تمام حشرات الارض کو حرام قرار دیتے ہیں لیکن ابن ابی لیلے امام مالک اور اوزاعی کے نزدیک سانپ حلال ہے۔

میرے نزدیک اس موضوع پر احناف کا مسلک قرآن کے بیان کردہ ضابطہ حلت پر سب سے زیادہ پورا اترتا ہے۔ لیکن جیسے اجتہادی مسائل میں شریعت میں توسع ہے ایسے ہی ان کی وضاحت و بیان میں بھی اہل علم کے سینوں میں وسعت کی ضرورت ہے۔ اگر آپ کے نزدیک ایک چیز ناجائز ہے اور آپ حنفی ہیں لیکن ایک مالکی کو دیکھتے ہیں کہ وہ ہی چیز وہ کھا رہا ہے تو آپ کو یہ حق نہیں ہے کہ آپ اسے مرتکب حرام قرار دیں۔

آئیے اب ایک جامع نظر خود آیت قرآنی کے معانی پر بھی ڈال لیجئے۔

ارشاد ہے لا اجد فیما اوحی الی محرما "جو وحی میرے پاس آئی ہے میں اس میں کسی چیز کو ان چار چیزوں کے علاوہ نہیں پاتا۔ اس میں بتایا گیا ہے کہ مدار تحریم انسانی خیال، گمان، برادری کا رواج، ملک کا مفاد اور قومی مصالح نہیں بلکہ مدارِ تحریم صرف اللہ کی وحی ہے اور وحی عام ہے اس سے کہ متلو ہو یا غیر متلو۔

علی طاعم یطعمہ کسی کھانے والے جو اس کو کھائے۔ اس میں ایک طرف ان مشرکین کی تردید ہو رہی ہے جن کی تحریمات خالص توہمات کی تخلیق ہوتے ہیں۔ دوسری طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ لطیف استنباط بھی فرمایا کہ مردار کا کھانا حرام ہے لیکن اس کی کھال دباغت کے بعد پاک ہو سکتی ہے اور وہ استعمال میں آسکتی ہے۔ مسند احمد میں ہے۔

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ سودہ بنت زمعہ کی بکری مرگئی۔ انہوں نے یہ بات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کی۔ آپ نے فرمایا تم نے اس کی کھال کیوں نہ لے لی۔ سودہ نے کہا کیا مری ہوئی بکری کی کھال ہم لے لیں، فرمایا کہ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے علی طاعم یطعمہ تم اسے کھاؤ گے نہیں، دباغت کر لو اور پھر استعمال میں لاؤ۔ سودہ نے آدمی بھیج کر کھال اتروا لی۔ اسے دباغت کرائی۔ بعد ازیں اس کا مشکیزہ بنالیا۔

اس آیت میں چار چیزوں کی حرمت کا ذکر ہے مردار، لحم خنزیر، دم مسفوح اور غیر اللہ کے نام کیا ہوا۔ سورۂ مائدہ میں میتۃ کی ذرا تفصیل بتائی گئی ہے۔ یعنی وہ جانور جو گلا گھونٹ کر مر گیا ہو یا

یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا ٹکر کھا کر مرا ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ یہ دراصل میتہ کی تشریح ہے کہ مُردار وہ ہی نہیں جو اپنی موت آپ مرجائے بلکہ جو جانور اس طرح ہلاک ہو وہ بھی مردار ہے۔

سورہ بقرہ کی آیت اور سورہ مائدہ میں دم مطلق ہے۔ یہاں مسفوح کی قید ہے۔ یعنی ایسا خون جو کسی جانور کو زخمی کر کے یا ذبح کر کے نکالا گیا ہو۔ یہ بھی تشریح ہے۔

یہاں لحم خنزیر کے بعد فرمایا ہے فانہ رجس بلاشبہ وہ ناپاک ہے۔ خنزیر کے بارے میں خاص طور پر یہ کہنا یہ بتانے کے لیے کہ اس کی نجاست بالذات ہے اسی لیے سُور کے تمام اجزاء میں سے کسی حصہ کی خرید و فروخت جائز نہیں ہے۔ اگر مُردار بھی بالذات حرام ہوتا تو اس کی کھال دباغت کے بعد بھی انتفاع جائز نہ ہوتا، ایسے ہی اگر خون بالذات حرام ہوتا تو تلی اور کلیجی حلال نہ ہوتی سُور چونکہ بالذات قرآن کے نزدیک نجس ہے اس لیے اس سے کسی حال میں انتفاع جائز نہیں ہے آخری چیز کی حُرمت یعنی ما اُھل بہ لغیر اللہ کی حرمت مادی نجاست کی وجہ سے نہیں بلکہ معنوی نجاست کی وجہ سے ہے۔ غیر اللہ کے نام پر ذبح کرنا شرک ہے اور شرک معنوی نجاست ہے اس وجہ سے جس چیز کو شرک کی چھوت لگ جاتی ہے وہ بھی نجس ہو جاتی ہے۔ اس معنوی نجاست کو یہاں فسق کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی حرمت محض حکمی نہیں بلکہ فطری اور عقلی بھی ہے۔

قرآن کا نظریہ ضرورت

آیت کا آخری حصہ فمن اضطر غیر باغ ولا عاد فان ربک غفور رحیم۔ اضطرار ضر لفظ سے باب افتعال ہے۔ عربی زبان کے قاعدے کے مطابق ض کی مناسبت سے افتعال کی ت ط سے بدل گئی ہے۔ ضرہ الیہ کے معنے ہیں اس کو فلاں چیز کی طرف مجبور کر کے دھکیل دیا۔ اضطرہ الیہ کے معنے ہیں اس کو فلاں چیز کی طرف مجبور کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص بھوک یا پیاس سے مجبور ہو جائے تو وہ حرام کردہ چیزیں بھی جان بچانے کے لیے استعمال کر سکتا ہے لیکن یہ اضطرار واقعی ہو تو اس کے اندر حرام کی کسی چاہت کو دخل ہو اور نہ آدمی اس حد سے آگے بڑھے جس حد تک آگے بڑھنا جان بچانے کے لیے ناگزیر ہو۔ ان احتیاطوں کے ساتھ کسی واقعی مجبوری میں اگر کوئی شخص کسی حرام چیز سے فائدہ اٹھاتے تو فرمایا ہے کہ اللہ غفور رحیم ہے۔ ضرر اور ضرورت میں اگرچہ بنیادی فرق ہے اور ضرورت ضرر سے ہلکا درجہ ہے لیکن فقہائے اسی آیت سے نظریہ ضرورت بھی پیدا کر لیا ہے۔ حافظ ابن القیم نے دونوں میں باعتبارِ مرتبہ فرق رکھا ہے۔ ضرر کی حالت میں

اصل حرام اور وہ چیزیں جو بالذات حرام ہیں جائز ہو جاتی ہے لیکن ضرورت کی حالت میں صرف وہ چیزیں جائز ہوئی ہیں جو بالذات حرام نہیں ہیں بلکہ ذریعہ حرام ہونے کی وجہ سے حرام ہیں۔ اس کی بہترین مثال ابن القیم نے ربائے نسیئہ اور ربائے فضل سے دی ہے۔ ربائے نسیئہ کہ آپ کسی کو اُدھار دیں اور بڑھا چڑھا کر وصولیابی کریں یہ بالذات حرام ہے اور ربائے فضل یہ ہے کہ آپ اجناس میں سے ایک دُوسرے سے زیادتی یا کمی کیساتھ تبادلہ کریں۔ یہ ذریعہ حرام ہونے کی وجہ سے حرام ہے۔ فقہائے نے اسی سے یہ بھی استنباط کیا ہے کہ ضرر کا ازالہ ضروری ہے اور بڑے ضرر کے ازالہ کے لیے اگر ناگزیر ہو تو ایسے طریقے بھی اختیار کیے جا سکتے ہیں جو اس سے کمتر ضرر کے حامل ہوں۔ نیز یہ کہ اجتماعی ضرر انفرادی ضرر کے مقابلہ میں زیادہ وزنی اور قابلِ لحاظ ہے۔ اس کی روشنی میں بہت سے معاشی، اجتماعی مسائل حل کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً اسلامی ریاست انفرادی حقوقِ ملکیت میں ہر وہ مداخلت کر سکتی ہے جو ضررِ عام کے ازالہ اور اجتماعی مصالح کے تحفظ کے لیے ناگزیر ہو۔ عام حالات میں افراد کے وسیع مالکانہ حقوق میں کوئی مداخلت نہ کی جائے گی لیکن مخصوص حالات میں ریاست عام اصُول کے برخلاف انفرادی آزادی اور انفرادی حقوقِ ملکیت مداخلت کر سکتی ہے۔

ہماری رائے میں اسلامی ریاست کو اسی اصُول کی بنا پر یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ ضرر کے ازالہ کے لیے کسی کاروباری ادارے یا صنعت کو افراد کی ملکیت سے نکال کر قومی تحویل میں لے لے۔ البتہ ایسا کرتے وقت وہ متعلق افراد کو ضرر سے بچانے کے لیے ان کی ملکیت کا پورا معاوضہ دے گی اور ان کے ہونے والے نقصان کی ہر ممکن تلافی کرے گی۔

بہرحال یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔ ازالہ ضرر اور ضرورت کی بہت صورتیں ہیں۔ اضطرار اور اکراہ کا تقابلی مطالعہ ہم ان شاء اللہ چودھویں پارے میں کریں گے۔

یہود پر کچھ طیبات کی حُرمت

۱۹۰۔ اور یہودیوں پر ہم نے تمام ناخن والے جانور حرام کر دیے اور گائے اور بکری کی چربی بھی حرام کر دی تھی۔ ہاں وہ چربی ہم نے حرام نہیں کی تھی جو ان کی پیٹھ کو لگی ہو یا انتوں سے چمٹی ہوئی ہو یا ہڈی سے پیوستہ ہو۔ یہ ہم نے ان کی سرکشی کی سزا دی تھی اور ہم بالکل سچ بتا رہے ہیں۔ یعنی اصلی حرمت تو ان چیزوں میں ہے جو اوپر مذکور ہوئیں۔ البتہ وقتی مصلحت سے بعض چیزیں عارضی طور پر بعض اقوام پر پہلے حرام کی جا چکی ہیں۔ مثلاً یہود پر ان کی شرارت کی پاداش میں ہر ناخن، کھروالا جانور جس کی انگلیاں

پھیٹی نہ ہوں جیسے اونٹ، شتر مرغ، بطخ وغیرہ حرام کیا گیا تھا۔ نیز گائے، بکری کی جو چربی پشت یا انتڑیوں پر نہ لگی ہو یا ہڈی کے ساتھ نہ لگی ہو ان پر حرام کر دی گئی تھی جیسے گردہ کی چربی۔ بنی اسرائیل کا دعوی غلط ہے کہ یہ چیزیں ابراہیم و نوح علیہما السلام کے زمانہ ہی سے مستمر طور پر حرام چلی آتی ہیں۔ سچی بات یہ ہے کہ ان میں سے کوئی چیز بھی عہد ابراہیمی میں حرام نہ تھی۔ یہود کی نافرمانیوں اور شرارتوں کی وجہ سے یہ سب چیزیں حرام ہوئیں۔ جو کوئی اس کے خلاف دعویٰ کرے جھوٹا ہے جیسے چوتھے پارے کے آغاز میں قل فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا ان کنتم صادقین سے ان دعویٰ کرنے والوں کو چیلنج کیا گیا ہے۔[1]

جو بات یہاں آیت ۱۴۶ میں یہودیوں کے بارے میں کہی گئی ہے یہی بات چھٹی جلد آیت ۱۶۰ میں اور چوتھی جلد آیت ۹۳ میں آچکی ہے اور آئندہ چودھویں جلد میں آیت نمبر ۱۱۹ میں آرہی ہے۔ لیکن جو تفصیل یہاں پیش کی جا رہی ہے دوسری جگہ نہیں ہے۔ چوتھے پارے میں یہ بات اس طرح کہی گئی ہے

کل الطعام کان حلا لبنی اسرائیل الا ما حرم اسرائیل علیٰ نفسہٖ من قبل ان تنزل التوراۃ قل فاتوا بالتوراۃ فاتلوھا۔

کھانے کی یہ ساری چیزیں بنی اسرائیل کے لیے حلال تھیں ہاں کچھ چیزیں ایسی تھیں جن کو تورات کے نازل ہونے سے پہلے اسرائیل نے خود اپنے آپ پر حرام کر لی تھیں۔ ان سے کہو کہ اگر سچے ہو تو تورات لاؤ اور پڑھو۔

اس کے بعد سورۂ نساء کی آیت ۱۶۰ میں یہ بات اس طرح دہرائی گئی ہے۔

فبظلم من الذین ھادوا حرمنا علیھم طیبات احلت لھم

غرض یہودیوں کے اس ظالمانہ رویہ کی وجہ سے ہم نے ان پر بہت سی وہ پاک چیزیں حرام کر دی ہیں جو پہلے حلال تھیں۔

اور اب یہاں فرمایا جا رہا ہے کہ ہم نے ان پر ناخن والے جانور حرام کر دیے اور بکری اور گائے کی چربی بھی ان کے لیے حرام ٹھہرا دی اور یہ اس لیے ہوا کہ ہم نے ان کو ان کی سرکشیوں کی سزا دی ہے۔ ذالک جزینا ھم ببغیھم یعنی چربی کی اور ناخن والے جانوروں کی حرمت اس لیے نہ تھی کہ یہ چیزیں ذات میں کوئی ایسی علت رکھتی تھیں جس کی بنا پر ان کو حرام قرار دیا ہے بلکہ ان کے حرام ہونے کی اصلی علت خود بنی اسرائیل کے کردار میں تھی۔ ان کی حرمت میں اصل دخل ان کے فساد مزاج کو تھا۔ ان کے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اخلاقی فساد کو روکنے کے سزا کے طور پر بہت سی جائز چیزوں پر ان کے لیے پابندی لگادی گئی تھی۔ موجودہ تورات میں ان محرمات کا تذکرہ موجود ہے۔ پہلے چربی کی حرمت کا مسئلہ پڑھیے۔

اور خداوند نے موسیٰ سے کہا بنی اسرائیل سے کہہ کہ تم لوگ نہ تو بیل کی نہ بھیڑ کی اور نہ بکری کی کچھ چربی کھانا۔ جو جانور خود بخود مر گیا ہو اور جس کو درندوں نے پھاڑا ہو ان کی چربی اور کام میں لاؤ تو لاؤ پر تم کسی حال میں نہ کھانا کیونکہ جو کوئی ایسے چوپائے کی چربی کھاتے جسے لوگ آتشیں قربانی کے طور پر خداوند کے حضور چڑھاتے ہیں وہ کھانے والا آدمی اپنے لوگوں میں سے کاٹ ڈالا جائے۔

(احبار باب ۷، آیت ۲۲-۲۵)

دوسرے مقام پر چربی کی ان تمام قسموں کی تفصیل بھی بتائی گئی ہے۔

جس چربی سے انتڑیاں ڈھکی رہتی ہیں اور وہ سب چربی جو انتڑیوں پر لپٹی رہتی ہے اور دونوں گردے اور ان کے اوپر کی چربی جو کمر کے پاس رہتی ہے اور جگر پر کی جھلی گردوں سمیت ان سب کو وہ الگ کرے اور کاہن ان کو مذبح پر جلائے۔ یہ اس آتشیں قربانی کی غذا ہے جو راحت انگیز خوشبو کے لیے ہوتی ہے، ساری چربی خداوند کی ہے۔ یہ تمھاری سب سکونت گاہوں میں نسل در نسل ایک دائمی قانون رہے گا کہ تم چربی یا خون مطلق نہ کھاؤ۔

(احبار باب ۳)

آیتِ قرآنی تو صرف یہ بتا رہی ہے کہ جو چربی گوشت کے حصہ کی حیثیت رکھتی ہو، کمر یا ہڈیوں یا آنتوں میں اس طرح شامل ہو کہ اس کو آسانی سے الگ نہ کیا جا سکے اس کے سوا تمام چربی بنی اسرائیل پر حرام تھی۔ اور تورات کی یہ تصریحات بتا رہی ہیں کہ چربی بلا قید حرام تھی۔ قرآن کی بات قرینِ قیاس ہے۔ شاید یہ اضافہ یہودی علماء و فقہاء کا کارنامہ ہے۔

آیت میں کُلّ ذِی ظُفُر، سے کیا مراد ہے۔ ظفر ناخن کو کہتے ہیں۔ امام راغب نے تصریح کی ہے کہ ظفر کا استعمال انسان اور غیر انسان دونوں کے لیے ہوتا ہے۔ اور لسان العرب میں اس پر یہ اضافہ ہے کہ جو جانور شکار نہیں کرتے ان کے ناخنوں کو ظفر کہتے ہیں اور جو شکار کرتے ہیں ان کے پنجہ کو مخلب کہتے ہیں۔ تورات میں ان جانوروں کی احبار اور استثنا میں بہت بڑی تفصیل دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ صرف وہ جانور حلال ہیں جن کے پاؤں چرے ہوتے ہیں اور وہ جگالی بھی کرتے ہوں جن کے اندران میں سے کوئی شرط بھی مفقود ہو وہ ان کے ہاں حرام ہے۔ احبار میں ہے:

پھر خداوند نے موسیٰ اور ہارون سے کہا کہ تم بنی اسرائیل سے کہو کہ زمین کے سب

حیوانات میں سے جن جانوروں کو تم کھا سکتے ہو وہ یہ ہیں۔ جانوروں میں جن کے پاؤں چرے ہوتے ہیں وہ جگالی کرتے ہیں یا جن کے پاؤں الگ ہیں ان میں سے تم ان جانوروں کو نہ کھانا، یعنی اونٹ کو کیونکہ وہ جگالی کرتا ہے پھر اس کے پاؤں الگ نہیں وہ تمہارے لیے ناپاک ہے اور خرگوش کو کیونکہ وہ جگالی تو کرتا ہے پر اس کے پاؤں الگ نہیں وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے اور سُور کو کیونکہ اس کے پاؤں الگ اور چرے ہوتے ہیں اور وہ جگالی نہیں کرتا وہ بھی تمہارے لیے ناپاک ہے تم ان کا گوشت نہ کھانا اور ان کی لاشوں کو نہ چھونا وہ تمہارے لیے ناپاک ہیں۔ (احبار باب ۱۱ آیات ۱ تا ۸)

اس روشنی میں اگر ذی ظفر کا مفہوم متعین کیا جائے تو اس سے مراد وہ جانور ہوں گے جن کے پاؤں چرے ہوتے نہیں ہیں بلکہ سم کی شکل میں وہ بند اور ان کے سامنے کے حصہ پر ناخن ہیں۔ یہود پر اس طرح کے تمام جانور حرام تھے۔

قرآن نے پہلے حرمنا کہہ کر تصریح کی ہے کہ ہم نے یہود پر یہ چیزیں حرام کی تھیں۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ یہ بھی انکشاف فرمایا کہ ایسا ہم نے کیوں کیا فرمایا ذالک جزینا ھم ببغیھم ہم نے یہ کام ان کے باغیانہ کردار کی پاداش میں کیا۔ بغی کے معنے سرکشی کے آتے ہیں۔ بنی اسرائیل کی اس بغاوت کا ذکر خود تورات میں بھی موجود ہے اور قرآن میں بھی بغاوت کے واقعات بتائے گئے ہیں۔ ان کے اس باغیانہ مزاج کا اثر ان کی شریعت پر بھی پڑا۔ جس طرح کسی سرکش جانور کا مالک اس کو سخت بندھنوں کے اندر رکھنے پر مجبور ہوتا ہے یا سرکش رعایا کا حکمران سخت قوانین نافذ کرتا ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے ان سرکشوں کی نہایت سخت قوانین کے ذریعے گوشمالی کی ہے۔ یہ کہنا کہ یہ تحریم خدائی تحریم نہیں بلکہ یہودی احبار کی اپنی خود ساختہ و پرداختہ ہے۔ اور پھر یہ کہنا کہ خدائی تحریم کی ایک صورت یہ بھی ہوتی ہے کہ وہ اپنے باغی بندوں پر بناوٹی شارعوں اور جعلی قانون سازوں کو مسلط کر دے، پھس پھسی بات ہے۔ جب خود قرآن کہتا ہے کہ یہ تحریم خدا کی جانب سے ہوئی ہے اور ان کی باغیانہ زندگی کی پاداش میں ہوئی ہے تو پھر ان دور از کار موشگافیوں کی ضرورت کیا ہے؟ اس صورت میں آیت کے مطالب بالکل پیچیدہ ہو کر رہ جائیں گے۔ حالانکہ معاملہ بالکل واضح اور صاف ہے کہ یہ تحریم اللہ سبحانہ کی جانب سے ہوئی اور اس کی علت یہود کی سرکشی اور گردن کشی تھی۔ یعنی تحریم میں اصل دخل یہود کے فساد اخلاق کو تھا۔ جس طرح ایک طبیب بسا اوقات کسی مریض کو ایک جائز و طیب چیز کے استعمال سے بھی روک دیتا ہے کہ اس سے اس کی صحت جسمانی کو ضرر کا

اندیشہ ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے یہود کے اخلاقی فساد کی وجہ سے سزا کے طور پر بہت سی جائز چیزیں بھی ان پر حرام ٹھہرا دی تھیں۔

یہ سوال کہ یہودیوں کی وہ بغاوت کیا تھی جس کی پاداش میں اللہ نے ان پر یہ چیزیں حرام کی تھیں؟ اس کا جواب خود قرآن نے سورۃ نساء میں دیا ہے کہ ان کی سرکشی اور بغاوت یہ تھی۔ ان کی ظالمانہ روش راہ خدا میں قدم قدم پر رکاوٹیں سُود خواری اور حرام خواری، یہی چار باتیں اس تحریم خداوندی کی علت ہیں۔

اس آیت سے یہ نتیجہ نکالنا بھی بالکل بے معنی اور عبث ہے کہ علی الذین ھادوا چونکہ قصر کا فائدہ دے رہا ہے یعنی اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ چیزیں صرف یہود پر حرام ہوئی تھیں۔ اور آیت سے ظفر سے پنجہ مراد لینا اس لیے تمام درندے اور وہ تمام پرندے جو پنجہ دار ہیں صرف یہودیوں کے لیے حرام ہیں مسلمانوں کے لیے حرام نہیں ہیں۔ آیت میں اس مطلب کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ الجصاص نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ:

> اللہ تعالیٰ کی یہ تحریم ان کے حق میں زبانِ نبوت سے عمل میں آئی ہے۔ یہ تحریم ہماری شریعت میں معتبر ہو گی جب تک اس کا کوئی ناسخ نہ ہو۔ کتوں اور درندوں کی تحریم کا نسخ ثابت نہیں اس لیے وہ حرام ہی رہیں گے۔

حیرت ہے کہ کچھ شارحینِ قرآن نے صحیح احادیث کو رد کرنے میں بھی بڑی بے باکی کا مظاہرہ کیا ہے۔

مکذبین کو دھمکی

۱۹۱- اس کے باوجود اگر وہ آپ کی تکذیب کریں تو آپ ان سے کہہ دیجیے کہ تمہارا رب بڑا ہی وسیع رحمت والا ہے اور مجرموں سے اس کا عذاب ٹلنے والا نہیں ہے۔ اس میں دونوں کو دھمکی ہے قریش اور یہود کو یا صرف یہود کو۔ اکثر شارحینِ قرآن کہتے ہیں کہ یہود کو، لیکن ہماری رائے میں دونوں کو دھمکی ہے، اصل میں قریش مخاطب ہیں اور ضمناً یہود، قرآن بتا رہا ہے کہ اگر اس ساری وضاحت کے باوجود بھی اگر یہ آپ کی تکذیب کریں تو آپ ان کو بتا دیں کہ اللہ کے دو قانون ہیں ایک قانونِ امہال ہے اور دوسرا قانونِ اخذ ہے۔ قانونِ امہال اس کی رحمت کا تقاضا ہے اور قانونِ اخذ اس کے عدل کا تقاضا ہے۔ اللہ چونکہ بڑی رحمت والا ہے اس لیے وہ سرکشوں اور باغیوں کو ڈھیل پر ڈھیل اور مہلت پر مہلت دیتا ہے لیکن ڈھیل پر مغرور نہ ہونا چاہیے۔ اس سے اللہ کی پکڑ پیچھے تو ہٹ جاتی ہے لیکن اس سے اس کی سنت باطل نہیں ہوتی۔ اس نے جو قانون پکڑ کے لیے مقرر کر رکھا ہے،

جب اس کا نفاذ ہوگا تو کسی کے ٹالے ٹل نہیں سکتا۔ شاید کہنے والوں نے آمنا لصادقون سن کر کہا ہوگا اگر سچے ہو تو عذاب کیوں نہیں آتا۔ فرمایا اس لیے کہ اس کی وسیع رحمت کا تقاضا ہے کہ مہلت پر مہلت دے لیکن اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجرموں سے عذاب ٹل جائے گا۔ دیر تو ہے مگر اندھیر نہیں ہے۔

سَيَقُولُ الَّذِينَ أَشْرَكُوا لَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَشْرَكْنَا وَلَا آبَاؤُنَا
وَلَا حَرَّمْنَا مِن شَيْءٍ ۚ كَذَٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِينَ مِن قَبْلِهِمْ
حَتَّىٰ ذَاقُوا بَأْسَنَا ۗ قُلْ هَلْ عِندَكُم مِّنْ عِلْمٍ فَتُخْرِجُوهُ لَنَا ۖ
إِن تَتَّبِعُونَ إِلَّا الظَّنَّ وَإِنْ أَنتُمْ إِلَّا تَخْرُصُونَ ۝
قُلْ فَلِلَّهِ الْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ ۖ فَلَوْ شَاءَ لَهَدَاكُمْ أَجْمَعِينَ ۝
قُلْ هَلُمَّ شُهَدَاءَكُمُ الَّذِينَ يَشْهَدُونَ أَنَّ اللَّهَ حَرَّمَ
هَٰذَا ۖ فَإِن شَهِدُوا فَلَا تَشْهَدْ مَعَهُمْ ۚ وَلَا تَتَّبِعْ أَهْوَاءَ
الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَالَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِالْآخِرَةِ
١٨ ع ٦ ٥ وَهُم بِرَبِّهِمْ يَعْدِلُونَ ۝

یہ مشرک لوگ ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ
ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے ، اے پیغمبر بالکل
اسی طرح اُن لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے

ہیں تاآنکہ ان کو ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا[192] ۔ اے پیغمبر تم کہہ دو کیا تمہارے پاس کوئی علم کی روشنی ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو اگر ہے تو لاؤ، تم تو محض گمان و وہم پر چل رہے ہو اور تم تو صرف اٹکل اور اندازے کے تیر چلا رہے ہو، اے پیغمبر تم کہہ دو کہ لوگو حقیقت رس اور پکی دلیل تو اللہ ہی کی ہے اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت عطا کر دیتا[193] ۔ ان سے کہو کہ اپنے وہ گواہ پیش کرو جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے پھر اگر ان کے گواہ گواہی دے دیں تو آپ ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں اور آپ ان لوگوں کی خواہش کی پیروی نہ کریں جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے اور جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے ہیں اور وہ دوسری ہستیوں کو اپنے رب کے برابر ٹھہراتے ہیں[194] ۔

معانی مفردات

ذاقوا ذوق سے ماضی کا واحد مونث غائب ہے جس کے معنے چکھنا ہیں ۔

تخرصون، خرص سے مضارع کا جمع مذکر حاضر، تم اٹکلیں چلاتے ہو، تم تجویزیں کرتے ہو، تم جھوٹ بولتے ہو۔ اصل میں خرص پھلوں کا اندازہ لگانے کو کہتے ہیں اور اسی لیے ہر وہ بات جو ظن و تخمین کی بنا پر ہو خرص کہلاتی ہے خواہ وہ حقیقت کے مطابق ہو یا نہ ہو۔ حجۃ، کسی دعویٰ کی دلیل اور سند کو کہتے ہیں اور بالغہ کے معنے ہیں اپنی متانت، مضبوطی اور اثبات دعویٰ میں آخری حد کو پہنچی ہوئی ایمان بالغہ تاکید میں انتہا کو پہنچی ہوئی قسمیں۔ یہاں الحجۃ البالغۃ کے معنے ہیں مضبوطی اور پائداری میں انتہا کو پہنچی ہوئی دلیل۔ ھلمّ یہ اسمائے افعال میں سے حجاز والے اس کو اسی طرح بولتے ہیں اور بنی تمیم اس کی مونث تثنیہ اور جمع کی صورتیں بھی بنا لیتے۔ مثلاً ھلما، ھلمی اور ھلموا وغیرہ۔ لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے۔ یہاں متعدی ہے۔ یعدلون، عدل سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے۔ اس کے معنے برابر کرنا ہیں۔ انصاف کو عدل اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ حقوق میں برابری ہے۔

غلط کاری کے لیے مجرمین کا عذر لنگ

انسان کی سب سے بڑی کمزوری یہ ہے کہ وہ ارادے کی پوری قوت اور اپنے بدن کی ساری توانائیاں برائیوں کو پروان چڑھانے میں خرچ کرتا رہتا ہے۔ شرک کرتا ہے کفر کرتا ہے۔ سارے معاصی کا ارتکاب کرتا ہے لیکن جب اس سے برائیوں سے رکنے کا مطالبہ کیا جاتا ہے تو وہ یہ عذر لنگ پیش کر دیتا ہے کہ ہمارے حق میں اللہ کی مشیت یہی ہے۔ اگر خدا چاہتا کہ ہم ایسا نہ کریں تو کیونکر ممکن تھا کہ یہ کام ہم کرتے۔ قرآن نے جابجا مشرکوں کا یہ عذر لنگ نقل کیا ہے کہ شرک اگر کوئی برائی ہے تو خدا ہمیں کیوں برائی کرنے دیتا ہے اگر وہ چاہتا کہ ہم شرک نہ کریں تو کبھی ایسا نہ ہو سکتا کہ ہم اور ہمارے باپ دادا ایسی بات کر سکتے۔ اگر وہ چاہے تو اب بھی ہمیں روک سکتا ہے۔ قرآن نے ان کے اس عذر لنگ کا یہاں یہی جواب دیا ہے اور دوسرے مواقع پر بھی دیا ہے اور بتایا ہے کہ اپنی غلط کاری اور بد عملی کے لیے مشیتِ الٰہی کو معذرت بنا کر پیش کرنا اور اسے بہانہ بنا کر صحیح رہنمائی کو قبول کرنے سے انکار کرنا مجرموں کا ہمیشہ سے وطیرہ رہا ہے اور اس کا انجام یہ ہوا ہے کہ وہ تباہ ہو گئے۔ یہ معذرت دراصل حقیقت آگاہی پر مبنی نہیں بلکہ ان کے محض گمان اور تخمینہ کی تخلیق ہے۔ انہوں نے خدا کی مشیت کو کہیں سن لیا ہے اور اس پر اپنے گمانوں سے خیالات کا ایک محل بنا لیا۔ ان کو یہ پتہ ہی نہیں ہے کہ انسان کے حق میں فی الواقع اللہ کی مشیت کیا ہے۔

انہوں نے خدا کی مشیت کا مطلب یہ سمجھا ہے کہ چور اگر مشیتِ الٰہی کے تحت چوری کر رہا ہے تو وہ مجرم نہیں ہے حالانکہ دراصل انسان کے حق میں خدا کی مشیت یہ ہے کہ وہ شکر و کفر ہدایت اور ضلالت طاعت اور معصیت میں سے جو راہ بھی اپنے لیے منتخب کرے گا خدا وہی راہ اس کے لیے کھول دے گا۔

دراصل یہاں دو صداقتیں ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دُنیا اور اس کے ذرے ذرے پر قدرت رکھتا ہے۔ آسمان، زمین اور بحر و بر میں کوئی چیز نہیں جو اس کی مشیت اور ارادے کے بغیر حرکت کر سکے اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اسی کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا گیا ہے۔ اگر یہ اختیار تسلیم نہ کیا جائے اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور فرض کیا جائے جس طرح دوسری مخلوقات ہے تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیاء کی بعثت یہ تمام چیزیں بے کار ہو کر رہ جائیں۔ ظلم و انصاف دُنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے۔ الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت ہر جزو کل پر حاوی ہے۔ دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ قرآن نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ پیش کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے۔

۱۹۲- یہ لوگ ضرور کہیں گے کہ اگر اللہ چاہتا تو ہم شرک نہ کرتے اور نہ ہمارے باپ دادا اور نہ ہم کسی چیز کو حرام ٹھہراتے۔ اے پیغمبر بالکل اسی طرح ان لوگوں نے بھی حق کو جھٹلایا تھا جو ان سے پہلے گزر چکے ہیں تا آنکہ ان کو ہمارے عذاب کا مزہ چکھنا پڑا۔ گزشتہ رکوع میں مشرکین سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جن حلال و طیب چیزوں کو تم نے حرام ٹھہرا لیا ہے اور اس تحریم کو خدا کی طرف منسوب کرتے ہو۔ اس کی سند اور دلیل پیش کرو۔ یہاں ان کی جانب سے یہ دلیل پیش کی گئی ہے کہ اگر اللہ چاہتا تو اس کو قدرت تھی کہ ہم کو اور ہمارے اسلاف کو اس تحریم سے بلکہ تمام مشرکانہ افعال و اقوال سے روک دیتا جب نہ روکا اور یوں ہی ہوتا رہا تو معلوم ہوا کہ اس کے نزدیک ہماری یہ کارروائیاں پسندیدہ ہیں، ناپسند ہوتیں تو ان کے کرنے میں ہم کو اب تک آزاد کیوں چھوڑتا؟

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ ایک نیک نام مدبر گورنمنٹ کسی باغیانہ تحریک میں حصہ لینے والوں کو باوجود یقینی اطلاع اور کافی قدرت کے پہلے ہی دن پکڑ کر پھانسی نہیں دے دیتی۔ وہ اس کی حرکات

کی نگرانی رکھتی ہے۔ کبھی رویہ درست رکھنے کی ہدایت کرتی ہے اور موقع دیتی ہے کہ آدمی ایسی حرکات کا انجام سوچ کر خود سنبھل جائے۔ کبھی اصلاح سے مایوس ہو کر ڈھیل چھوڑتی ہے کہ اس کی بغاوت کا ایسا باضابطہ اور مکمل مواد فراہم ہو جائے جس کے بعد اس کی انتہائی مجرمانہ غداری قانونی حیثیت سے علی رؤس الاشہاد ثابت کی جا سکے۔ ان تمام صورتوں میں مجرم کی باگ ڈھیلی چھوڑ دینے اور فوراً سزا نہ دینے سے کیا یہ ثابت ہوگا کہ گورنمنٹ کی نظر میں وہ کارروائی جرم و بغاوت نہیں ہے۔ گورنمنٹ کی نگاہ میں ان افعال کا جرم ہونا اوّل تو اس کے شائع کیے ہوئے قانون سے ظاہر ہے۔ دوسرے یہ کہ جب یہ مجرم مہلت پوری ہونے پر عدالت کے کٹہرے میں لایا جائے گا اور باضابطہ اثبات و اظہار جرم کے بعد پھانسی یا حبس دوام کی سزا بھگتے گا تب برای العین مشاہدہ ہو جائے گا کہ گورنمنٹ کی نظر میں یہ کتنا بڑا جرم تھا۔

بہرحال گورنمنٹ کا کسی جرم پر باوجود علم و قدرت کے کسی مصلحت سے فوری سزا نہ دینا اس کی ہرگز دلیل نہیں ہے کہ وہ جرم کو جرم ہی تصور نہیں کرتی۔ اسی پر قیاس کر لیجئے کہ وہ احکم الحاکمین ابتدائے آفرینش سے آج تک بتوسط اپنے صادق القول اور پاکباز نائبین کے ہر قسم کے قوانین و احکام سے بندوں کو مطلع فرماتا رہا اور کھول کھول کر بتلا دیا کہ کونسی بات اسے پسندیدہ ہے اور کونسی ناپسندیدہ۔ کبھی پے درپے کبھی تھوڑے وقفہ کے بعد ان احکام و ہدایات کی یاددہانی بھی ہوتی رہی۔ اس دوران میں خلاف ورزی کرنے والوں سے مسامحت اور درگذر کی حد تک درگزر اور چشم پوشی کی گئی۔ معمولی تنبیہات کی ضرورت ہوئی تو وقتاً فوقتاً انہیں بھی کام میں لایا گیا اور جن کی شقاوت کا پیمانہ لبریز ہونے والا تھا اس کو ڈھیل دی گئی کہ وہ صاف اور علانیہ طور پر اپنے خدا کی سزا کے مستحق ٹھہر کر کیفر کردار کو پہنچیں۔ چنانچہ بہت سی قومیں اپنے جرائم کی پاداش کا دنیا ہی میں تھوڑا تھوڑا مزہ چکھ چکی ہیں۔ پھر ان حالات کی موجودگی میں کسی قوم کے چند روز جرائم میں مبتلا رہنے اور فوراً نہ پکڑے جانے سے کیسے استدلال کیا جا سکتا ہے کہ معاذ اللہ وہ جرائم خدا کے نزدیک پسندیدہ ہیں ورنہ خدا انہیں ایک گھنٹہ کی بھی مہلت نہ دیتا۔

ایک اہم سوال اور اس کا جواب

رہا یہ سوال کہ خدا نے انسان کی ساخت ہی ایسی کیوں نہ بنا دی کہ وہ برائی کی طرف قطعاً جا ہی نہیں سکتا۔ اور اس طرح فطرۃً اسے مجبور کر دیا جاتا کہ نیکی اور بھلائی کے سوا کوئی چیز اختیار ہی نہ کر سکے۔

اگر ذرا غور کیا جاتے تو اس سوال کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو ایسا کیوں نہ پیدا کیا گیا کہ وہ انسان نہ ہوتا اینٹ پتھر ہوتا جو ادراک و شعور اور کسب و اختیار سے یکسر خالی ہے یا گدھے گھوڑے وغیرہ جانوروں کی طرح جزئی احساس و ارادہ رکھنے والا حیوان ہوتا جو ازل سے ابد تک اپنے مخصوص و متشابہ افعال و احوال کے محدود دائرے میں چکر لگاتا ہے اور یا بہت عزت دی جاتی تو فرشتوں کی صف میں بٹھلایا جاتا جو محض طاعت و عبادت کے اختیار کرنے پر مجبول و مفطور ہیں۔ الحاصل یہ کلی ادراکات اور عظیم الشان کسبی تصرفات رکھنے والی ترقی پذیر نوع ہی صفحہ ہستی پر نہ لائی جاتی۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ کوئی انسان اپنے شرف و مجد کا بلند بانگ دعویٰ رکھتے ہوتے اس قسم کی یاوہ گوئی نہ کرے گا کہ سرے سے اپنی نوع کے وجود کا ہی مخالف ہو جاتے۔ پھر اگر نوع انسانی کا اس کی عقلی و عملی قوتوں اور کسب و اختیار کی موجودہ آزادی کے ساتھ پیدا کرنا نظام عالم کی تکمیل کے لیے ناگزیر ہے تو اس نظام تکوینی کے آثار و نتائج کا قبول کرنا بھی ضروری ہے۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ مادی اور معاشی زندگی کے شعبوں میں تو انسانوں کی عقلی و کسبی آزادی کی بدولت بے شمار انواع و اقسام کے مختلف مظاہر سامنے آئیں لیکن معادی و روحانی میدانوں میں وہی دل و دماغ اور کسب و اختیار کی قوتیں رکھنے والا ترقی پذیر انسان سب کے سب ایک ہی پگڈنڈی پر چلنے کے لیے مجبور ہو جائیں اور کوئی قدم اِدھر اُدھر ہٹانے کی قدرت نہ رکھے۔ لہٰذا اگر نوعِ انسانی کا اس انداز وجود کے ساتھ اس مجموعہ عالم میں پایا جانا ضروری ہے تو نیک و بد کا اختلاف بھی ناگزیر ہے اور یہ اختلاف ہی اس بات کی نشانی ہے کہ ہر وہ فعل جو یہاں وجود میں آتے ضروری نہیں کہ خدا کے نزدیک پسندیدہ ہو ورنہ ماننا پڑے گا کہ افعال کے اس اختلافی ہجوم میں مختلف افعال خدا کو پسند ہوں۔ مثلاً خوش اخلاقی بھی خدا کو پسند ہو اور بداخلاقی بھی ایمان لانا بھی پسند ہو اور ایمان نہ لانا بھی جس کا بطلان بالکل نمایاں ہے۔

یہ درست ہے کہ اگر خدا چاہتا تو انسان کی ساخت ایسی بنا سکتا تھا کہ سب ایک ہی راستہ پر چلنے کے لیے مجبور ہو جاتے لیکن ایسا نہیں ہوا اور خدا کی مشیت یہ نہیں ہے تو یہ خدا کی حجت بالغہ ان لوگوں پر ہے جو لو شاء اللہ ما اشرکنا، کہہ کر مشیت اور رضائے الٰہی میں تلازم ثابت کرنا چاہتے ہیں کیونکہ اس قدر شدید اختلافات کی موجودگی میں ان کے اصول کے موافق ماننا پڑے گا کہ توحید خالص بھی اللہ کے نزدیک صحیح اور مرضی ہو اور اس کی نقیض شرک جلی بھی وقس علی ھذا ان دلائل سے ثابت ہوا کہ مشرکین کا یہ استدلال لو شاء اللہ ما اشرکنا محض لغو اور باد ہوا ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ دراصل نبوت کے مقابلہ میں آخری حربہ ہے جو مشرکین نے اپنایا ہے۔ مشرکین جب ہر طرف سے منہ کی کھا چکے اور ان کو دلیل اور علم کے میدان میں کوئی کامیابی نہ ہوئی تو آخر الحیل کے طور پر نبوت کے مقابلے میں یہ بات کہی کہ اگر ہم جو کچھ کر رہے ہیں غلط ہے تو خدا کے اختیار میں ہے وہ ہمیں روک دے اگر وہ نہیں روکتا تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہم جو کچھ کر رہے ہیں یہی اس کی مرضی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ جہالت اور حماقت کا ایک شاہکار ہے۔ انسان کو کرنے کے لیے کسی کام کی آزادی ملنا اس بات کی ہرگز دلیل نہیں ہے کہ یہ اللہ کی مرضی پر پورا اترتا ہے۔ اگر اس دلیل میں کوئی جان ہے تو یہ دلیل تو ہر احمق اپنی حماقت اور ہر ظالم اپنے ظلم کے جواز کے لیے پیش کر سکتا ہے۔ بالکل یہی روش ان کے پچھلے ہم مشربوں نے اختیار کی یہاں تک کہ وہ خدا کے عذاب سے دوچار ہوتے۔ یہی انجام ان کے ساتھ ہونا ہے۔

قریش سے علمی دلیل کا مطالبہ

۱۴۷- اے پیغمبر تم کہہ دو کیا تمہارے پاس کوئی علم کی روشنی ہے جسے ہمارے سامنے پیش کر سکو۔ اگر ہے تو لاؤ تم تو محض گمان و وہم پر چل رہے ہو اور تم تو صرف اٹکل کے تیر چلا رہے ہو اے پیغمبر کہہ دو کہ لوگو حقیقت رس اور پکی دلیل تو اللہ ہی کی ہے اگر وہ چاہتا تو تم سب کو ہدایت عطا کر دیتا۔ کوئی علمی اصول تمہارے پاس نہیں ہے جسے عقلمندوں کے سامنے پیش کر سکو، تمہارے پاس محض اٹکل کے تیر اور تخمینی باتیں ہیں جن کو خدا کی حجت بالغہ رد کرتی ہے جس کی طرف فلو شاء لھداکم اجمعین میں اشارہ فرمایا ہے یعنی انسان کی فطرت ایسی نہیں بنائی گئی کہ سب کے سب راہِ ہدایت پر چل پڑیں۔ اس کو کسب و اختیار کی آزادی اللہ سبحانہ نے عطا فرمائی ہے جس کا عطا کیا جانا کسی مخلوق کے لیے ممکن تھا اس لیے ضروری ہے کہ اس آزادی کے استعمال کے وقت راہیں مختلف ہو جائیں۔ کوئی نیکی کو اختیار کرے کوئی بدی کو۔ کوئی حق تعالیٰ کی رضا و رحمت کا مظہر بن جائے کوئی غضب کا اس طرح وہ آخری مقصد جو خالقِ کائنات نے آفرینش عالم سے ارادہ کیا ہے یعنی اپنی تمام صفات جلال و جمال کا اظہار ہو بھرپور طریقہ پر پورا ہو لیبلوکم ایکم احسن عملاً ورنہ اگر تمام عالم ایک ہی حال پر فرض کر لیا جائے تو بعض صفاتِ الٰہیہ کا ظہور ممکن ہوگا اور دوسری بعض کے ظہور کے لیے کوئی محل نہ ملے گا۔

یہاں تک جو کچھ ہم نے کہا وہ اس تقدیر پر تھا کہ مشرکین کے قول لوشاء اللہ ما اشرکنا سے یہ غرض ہو کہ وہ اپنی خرافات و کفریات کا استحسان ثابت کرنا چاہتے تھے جیسا کہ ان کے احوال سے ظاہر ہے اور اگر لوشاء اللہ ما اشرکنا سے ان کا مقصود صرف معذرت ہو کہ جو کچھ خدا چاہتا ہے وہ ہم سے کراتا

ہے اچھا ہو یا برا بہر حال اس کی مشیت سے ہے۔ پھر مشیت الٰہی کے مقابلے میں انبیاء ورسل ہم سے کیوں مزاحمت کرتے ہیں اور عذاب الٰہی کی دھمکیاں کیوں دیتے ہیں تو اس کا جواب یہ ہے کہ جس خدا کی مشیت سے تم ان افعال شنیعہ کا کسب کرتے ہو اسی کی مشیت سے انبیاء ورسل تمہاری مزاحمت کرتے ہیں اور وہ ہی مشیت تمہارے کسب پر مناسب عذاب بھیجتی ہے جس طرح قدرت نے سانپ کو پیدا کیا اور وہ ہی مارگزیدہ کے حق میں ہلاکت کا اثر مرتب کرتی ہے خواہ سانپ کے کاٹنے میں مارگزیدہ کے فعل واختیار کو کچھ دخل ہو یا نہ ہو، اسی طرح تمہارے کفر وشرک میں ہلاکت دائمی کی اور ایمان وعمل صالح میں نجات ابدی کی تاثیرات رکھ دینا اسی کی قدرت اور مشیت کا کام ہے جس سے تمام سلسلہ اسباب و مسببات کی تخلیق وجود میں آتی ہے۔ لہٰذا اگر تم اپنے مشرکانہ اطوار سے باز نہ آنے میں مشیت کے عموم سے استدلال کر سکتے ہو تو ارسال رسل اور انزال عذاب وغیرہ امور کو بھی اسی کی مشیت کی کارفرمائی کا نتیجہ سمجھ کر خدا کی حجت بالغہ کو تمام سمجھو۔ بے شک خدا چاہتا تو سب کو راہ ہدایت پر لگا دیتا، لیکن اس نے تمہاری سوء استعداد کی وجہ سے ایسا نہیں چاہا۔ آخر تمہارے سوء اختیار سے جو افعال صادر ہوئے ان کا طبعی اثر عذاب کی صورت میں مرتب ہو کر رہا والعیاذ باللہ۔[1]

اصل ارشاد میں هل عندكم من علم کہہ کر مخاطبوں سے ان کے موقف پر علمی دلیل کا مطالبہ کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم اپنے اس موقف پر کوئی علمی دلیل پیش کرو یا خدا نے تمہیں اس کا حکم دیا ہے یا کوئی عقل کی شہادت ہو اس قسم کی کوئی چیز تو تمہارے پاس ہے نہیں۔ محض اٹکل کے تیروں اور قیاس کے بے لگام گھوڑے دوڑانے سے مسئلہ حل نہیں ہوتا کیونکہ تمہاری وہمی تخلیقات کا نام علم نہیں ہے خلاصہ ان کے استدلال کا یہ ہے کہ خدا جب ہر چیز پر قادر ہے اور باوجود قدرت اس نے ہمیں شرک وتحریم سے روکا نہیں تو یہ شرک وتحریم خدا کی جناب میں پسندیدہ ہونے کی علامت ہے اور مغالطہ اس استدلال میں یہ ہے کہ مشیت تکوینی اور رضائے تشریعی کو مرادف سمجھ لیا گیا ہے۔ حالانکہ رضائے الٰہی تشریعی کا قانون الگ ہے اور مشیت تکوینی کا قانون جدا۔ دونوں اپنی اپنی جگہ کارفرما ہیں۔ دونوں کے درمیان کوئی تصادم وتزاحم نہیں ہے قانون مشیت نے انسان کو ہر طرح کی آزادی دی ہوئی ہے۔ انسان اپنے طریق عمل کے انتخاب میں آزاد ہے وہ اپنے ارادے کا مالک ومختار ہے اچھی اور بری جو راہ چاہے اپنی پسند وقصد سے اختیار کرے لیکن رضائے الٰہی کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تشریعی قانون کا حکم یہ ہے کہ وہ بدی کی راہ سے بچے اور نیکی کی راہ پر چلے۔ بحیثیت قادر مطلق سب کچھ اس کی مخلوق ہے لیکن بحیثیت حاکم اس کا حکم یہی ہے کہ بیماری کا علاج کیا جائے اور زہر کا توڑ تریاق سے کیا جائے جو کج فہم خدا کی قدرت اور اپنی بے دینی اور بدکرداری کے لیے حیلہ بناتے ہیں وہ آخر بیماری میں اپنا علاج کیوں کرتے ہیں اور روحانیات کی طرح جسمانیات میں اپنے کو معذور و مجبور کیوں نہیں سمجھتے؟

ہدایت وضلالت میں اللہ کا قانون

آخر میں فللہ الحجۃ البالغۃ میں ہدایت وضلالت کے بارے میں اللہ کا جو قانون ہے اس کو واشگاف انداز میں پیش فرمادیا اور بتا دیا کہ اللہ کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اپنی مشیت کے زور سے جسے چاہے ہدایت دے۔ اگر وہ ایسا کرنا چاہتا تو اسے کوئی روک نہیں سکتا تھا لیکن اس معاملے میں اس نے جبر کو پسند نہیں کیا بلکہ دلیل وحجت کے ذریعے وہ رہنمائی کرتا ہے اور لوگوں کو اس نے اختیار دیا ہے کہ وہ چاہیں تو اس رہنمائی کو قبول کریں اور چاہیں تو رد کر دیں۔ فرمایا کہ اگر خدا تم سب کو ہدایت دے دیتا یعنی خود خدا ان کو زبردستی حق کے قبول کرنے پر مجبور کر دیتا اور فرشتوں کی طرح پیدائشی طور پر راست رو بناتا لیکن نوع انسانی کے بارے میں اس طرح نیک و بد بنا دینا اللہ تعالیٰ کی سنت کے خلاف ہے اس کی یہ سنت نہیں ہے کہ وہ بندے کے ارادے اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے۔ اگر انسان کے حق میں اللہ کی مشیت یہ ہوتی تو وہ ضرور ایسا کر سکتا تھا۔ لیکن یہ اس کی مشیت نہیں ہے کہ زور سے کسی کو ہدایت دے یہ تو حجت و دلیل اور عقل کا سودا ہے فمن شاء فلیؤ من ومن شاء فلیکفر، حجت بالغہ تو اللہ کا حکم ہے جس چیز کا وہ حکم کرے وہ پسندیدہ ہے اور جس سے روک دے وہ بُری اور ناپسندیدہ ہے۔

اخلاق وافعال اور افکار میں حسن وقبح کا معیار اس کا امر و نہی ہے جس فکر جس عمل کا وہ حکم کرے وہ خدا کے نزدیک مستحسن اور پسندیدہ ہے اور جس سے رد کرے وہ قبیح اور ناپسندیدہ ہے۔ خدا تعالیٰ کی قدرت ومشیت اعمال واخلاق اور افکار کے حسن وقبح کے لیے کسوٹی نہیں ہے اس لیے کہ کائنات میں جو کچھ بھی ہے وہ مقدور الٰہی ہے اور سب کچھ اس کی مشیت سے ہے۔ اس کی قدرت اور مشیت تمام اضداد کو حاوی ہے۔ عطر وگلاب ہو یا پاخانہ وپیشاب، طہارت ونجاست، نور وظلمت ایمان وکفر اور ہدایت وضلالت جو کچھ بھی ہے سب اس کی قدرت اور مشیت سے ہے۔ دیکھئے

کی چیز اللہ کی مشیت نہیں بلکہ اللہ کا حکم اور اس کی ممانعت ہے۔ یہی امر و نہی انبیاء کے وساطت سے آیا ہے۔ اللہ چاہتا ہے کہ لوگ اپنے ارادہ و اختیار سے راہ راست پر آئیں اس طرح اللہ کی حجت لوگوں پر پوری ہو گئی ہے لئلا یکون للناس علی اللّٰہ حجۃ بعد الرسل یعنی تمام پیغمبروں کے روانہ کرنے کی غرض یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ نوع انسانی پر اتمام حجت کرنا چاہتا ہے تاکہ آخری عدالت کے موقعہ پر کوئی گمراہ مجرم یہ عذر پیش نہ کر سکے کہ ہم ناواقف تھے۔ آپ نے ہمیں حقیقتِ حال سے آگاہ کرنے کا کوئی انتظام نہ کیا تھا۔ اسی مقصد کی خاطر خدا نے دُنیا کے مختلف گوشوں میں پیغمبر روانہ کیے اور کتابیں روانہ کی ہیں۔ اب حجت بالغہ اللہ کے پاس ہے لوگوں کے پاس نہیں۔

تحریم کے لیے شہادت کا مطالبہ

۱۹۴- ان سے کہو کر اپنے وہ گواہ پیش کرو جو اس بات کی شہادت دیں کہ اللہ نے ان چیزوں کو حرام کیا ہے پھر اگر ان کے گواہ گواہی دیں تو آپ ان کی ہاں میں ہاں نہ ملائیں اور آپ ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کریں جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی ہے اور جو آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور وہ دوسری ہستیوں کو اللہ کے برابر ٹھہراتے ہیں۔ یعنی دلیل عقلی کا حال تو اوپر معلوم ہو چکا ہے۔ اب اگر اس من گھڑت تحریم پر کوئی دلیل نقلی ہے تو وہ لاؤ۔ کیا تمہارے پاس ایسے گواہ موجود ہیں جو یہ بیان کریں کہ ہاں ان کے روبرو اللہ تعالیٰ نے ان چیزوں کو حرام کیا تھا۔ ظاہر ہے کہ ایسے واقعی گواہ کہاں دستیاب ہو سکتے ہیں۔ اگر دو چار گستاخ جھوٹے بیچیا بر گواہی دینے کو کھڑے ہو جائیں تو ایسوں کی بات پر آپ کان نہ دھریں اور نہ ان کی پروا کریں[1] مطلب یہ ہے کہ محض اٹکل اور خیال سے بات نہ کرو بلکہ علم کی روشنی میں سمجھاؤ اور بتاؤ کہ جو چیزیں تم نے حرام قرار دے رکھی ہیں کیا فی الواقع اللہ نے حرام کی ہیں تو لاؤ شہادت پیش کرو۔ واضح رہے کہ تحریم کے لیے گواہی کی بنیاد صرف دو چیزیں ہوتی ہیں۔ نبوت کا لایا ہوا علم اور نبوت کا عمل۔ یہاں قرآن نے ان دونوں قسم کی گواہیوں کا مطالبہ کیا ہے۔ مشرکین اپنے کو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل سے منسوب کرتے تھے۔ منشا یہ ہے کہ اگر دونوں کے علم و عمل میں اس قسم کی کوئی گواہی ہے تو اس کو پیش کرو ورنہ اس حجت کو قبول کرو جو قرآن تمہارے سامنے پیش کر رہا ہے۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے فان شھدوا فلا تشھد معھم اگر یہ لوگ شہادت کی ذمہ داری محسوس کیے بغیر اتنی بے باکی پر اتر آئیں

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کہ خدا کا نام لے کر جھوٹی شہادت دینے میں بھی تامل نہ کریں تو ان کے اس جھوٹ میں تم ان کے ساتھی نہ بنو کیونکہ ان سے یہ شہادت اس لیے طلب نہیں کی جا رہی ہے کہ اگر یہ شہادت دے دیں تو آپ ان کی بات مان لیں گے بلکہ اس کی غرض صرف یہ ہے کہ ان میں سے جن لوگوں میں تھوڑی بھی راستی موجود ہے۔ ان کے سامنے یہ لوگ ننگے ہو جائیں اور ان کو معلوم ہو جائے کہ ان چیزوں کے حرام ہونے کی نبوت کے علم و عمل میں کوئی شہادت نہیں ورنہ خدا تو جانتا ہی ہے کہ ایسی کوئی شہادت نہیں ہے۔

اس کے بعد نبوت کو ہدایت ہے کہ آپ ان کی ہمنوائی نہ کریں اور کسی حال میں ان کی خواہشات پر مبنی بدعات کی پیروی نہ کریں۔ یہ بدعات کن لوگوں کی ایجاد کردہ ہیں۔ یہاں قرآن نے ان کے تین اوصاف بیان کیے ہیں ایک یہ کہ اللہ کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں دوسری یہ کہ آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ تیسری یہ کہ اپنے رب کے ہمسر بناتے ہیں۔

یہ دراصل ان شہداء کے اوصاف ہیں جن سے عام شہری حلال و حرام کی حد تک علمی استفادہ کرتے تھے اور جنہوں نے بغیر علم کے شہریوں کو گمراہ کر رکھا تھا۔

قُلْ تَعَالَوْا أَتْلُ مَا حَرَّمَ رَبُّكُمْ عَلَيْكُمْ أَلَّا تُشْرِكُوا بِهِ
شَيْئًا وَبِالْوَالِدَيْنِ إِحْسَانًا ۖ وَلَا تَقْتُلُوا أَوْلَادَكُمْ مِنْ إِمْلَاقٍ ۖ
نَحْنُ نَرْزُقُكُمْ وَإِيَّاهُمْ ۖ وَلَا تَقْرَبُوا الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ
مِنْهَا وَمَا بَطَنَ ۖ وَلَا تَقْتُلُوا النَّفْسَ الَّتِي حَرَّمَ اللَّهُ إِلَّا بِالْحَقِّ ۚ
ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ﴿١٥١﴾ وَلَا تَقْرَبُوا مَالَ
الْيَتِيمِ إِلَّا بِالَّتِي هِيَ أَحْسَنُ حَتَّىٰ يَبْلُغَ أَشُدَّهُ ۖ وَأَوْفُوا الْكَيْلَ
وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا ۖ وَإِذَا قُلْتُمْ
فَاعْدِلُوا وَلَوْ كَانَ ذَا قُرْبَىٰ ۖ وَبِعَهْدِ اللَّهِ أَوْفُوا ۚ ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ
بِهِ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُونَ ﴿١٥٢﴾ وَأَنَّ هَٰذَا صِرَاطِي مُسْتَقِيمًا
فَاتَّبِعُوهُ ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا السُّبُلَ فَتَفَرَّقَ بِكُمْ عَنْ سَبِيلِهِ ۚ
ذَٰلِكُمْ وَصَّاكُمْ بِهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٥٣﴾

اے اللہ کے رسول ان سے فرما دیجئے کہ آؤ میں تمہارے سامنے بیان

کروں جو کچھ اللہ نے تم پر حرام کیا ہے[195]۔ یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو[196]۔ اور والدین کے ساتھ نیک سلوک کرو[197]۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشہ سے قتل نہ کرو ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی[198]۔ اور بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ کھلے طور پر ہوں یا چھپی ہوں[199]۔ اور کسی جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے ہاں یہ کہ کسی حق کی بنا پر قتل کرنا پڑے[200]۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمہیں وصیت کی ہے تاکہ تم سوجھ بوجھ سے کام لو[201]۔ اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ لیکن ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے[202]۔ اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو ہم کسی پر اس کی مقدور سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے[203]۔ اور جب بات کہو تو پورے انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ داری کا کیوں نہ ہو[204]۔ اور اللہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہے اُسے پورا کرو[205]۔ ان

باتوں کی اللہ نے ہدایت کی ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو[۲۰۶]، اور یہ کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ خدا کے راستہ سے ہٹا کر تمہیں تتر بتر کر دیں گے، یہ بات ہے جس کا خدا نے حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ[۲۰۷]۔

معانی مفردات

تعالوا تم آؤ۔ مصدر تعالی ہے جس کے معنے بلند ہونے اور آنے کے ہیں۔ امر کا جمع مذکر حاضر ہے اصل میں تعالِ کا مطلب یہ ہے کہ انسان کو بلند مقام کی طرف بلایا جاتے، پھر ہر جگہ بلانے کے لیے استعمال ہونے لگا۔ بعض علماء نے تصریح کی ہے کہ یہ علو سے بنا ہے جس کے معنے رفعت منزلت کے ہیں۔ گویا تعالوا میں بلند مقام اور ارتقاء منزل کی دعوت ہے۔ قرآن حکیم میں جہاں تعالوا استعمال ہوا ہے وہاں یہ چیز موجود ہے۔ املاق۔ باب افعال کا مصدر ہے اس کے معنے ہیں تنگ دست ہونا اور تنگ دستی۔ الفواحش فاحشہ کی جمع ہے۔ اس کی ایک صورت فحشاء بھی ہے۔ یہ لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے اصلی معنے حد سے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے لازمی معنے قبح یعنی برائی کے ہیں کیونکہ جس چیز کی حد خالقِ فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا برائی ہے یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جاتے وہ فاحشہ ہے اور وسعت کے ساتھ اس کا اطلاق ہر فحش گوئی اور فحش کاری پر ہوتا ہے۔ لا نکلّف، ہم تکلیف نہیں دیتے ہیں، جمع متکلم مضارع معروف، مصدر تکلیف ہے۔ اس کے معنے کسی شخص سے ایسی چیز کی خواہش کرنے کے ہیں کہ جس میں رنج و محنت ہو۔

راست بازی کی بنیادی سچائیاں

اس سے پہلے ان محرمات کی بھرپور تردید کی گئی ہے جن کو مشرکین نے اپنے اوہام و خرافات سے حرام سمجھ

رکھا ہے اور وہ یہ سوچے ہوتے ہیں کہ بس سارا دین اب یہاں بتایا جا رہا ہے کہ جن چیزوں کو تم حرام کہتے ہو وہ حرام نہیں۔ حرام تو وہ اعمال اشیائے ہیں جو حقیقت اور راستی کے خلاف ہیں اور جن سے خدا کے تمام پیغمبروں نے متفقہ طور پر نوع انسانی کو روکا ہے۔ اس کے بعد ان برائیوں کا ذکر کیا ہے جو انسانی شقاوت کی بنیادی برائیاں ہیں اور ان اچھائیوں کی دعوت دی ہے جو راست بازی کی بنیادی سچائیاں ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ تمہارے رب کی عائد کردہ پابندیاں وہ نہیں ہیں جن میں تم گرفتار ہو بلکہ اصلی پابندیاں یہ ہیں جو اللہ نے انسانی زندگی کو منضبط کرنے کے لیے عاید کی ہیں اور جو ہمیشہ سے شرائع الٰہیہ کی اصل الاصول رہی ہیں بنی نوع انسانی کے لیے خدا کا ٹھہرایا ہوا دین ہے۔ یہی الدین القیم ہے۔ یعنی سیدھا اور درست دین جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں ہے۔ یہی دین حنیف ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیم نے دی تھی۔ ان اعمال و افکار کی اچھائی اور برائی پر نوع انسانی کے تمام عہدوں اور تمام نبیوں کا عالمگیر اتفاق رہا ہے۔

ان آیات میں دسویں دفعہ وان ھذا صراطی مستقیما، کہہ کر کس خوبی کے ساتھ اس حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ ایک ہی دین ہے جو نوح کو ابراہیم کو موسیٰ کو اور محمد رسول اللہ کو دیا گیا ہے۔ اور سب نے اپنے اپنے وقت پر ان باتوں پر اتفاق کیا ہے جن کا ذکر ان آیات میں ہے۔ اگر دُنیا آج بھی ان باتوں پر ایکا کرے تو دُنیا کی ساری مشکلات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ اس میں اخلاقی تعلیمات ہیں حقوق فضائل، رذائل کی طرف رہنمائی کیا ہے۔ آپ غور فرمائیں اگر اپنے فکر و عمل میں توحید کا علمبردار ہو، والدین کا فرمانبردار ہو، بچوں کی پرورش کرتا ہو۔ خلوت و جلوت کی تمام برائیوں سے بے داغ ہو، کسی فوجداری جُرم کا مرتکب نہ ہو، دیانت کا یہ حال ہو کہ مال یتیم کی طرف نگاہ بھی نہ اُٹھاتا ہو، لین دین میں عدل و انصاف کا دامن تھامے ہوتے ہو، زبان سے کبھی کوئی بات عدل و انصاف کے خلاف نہ کہتا ہو، اللہ کے تمام عہدوں کا پکا وفادار ہو۔ آپ بتائیں کہ اس مثالی انسان میں کہاں کمی ہے اور انسانی زندگی اگر ایسے افراد کا مجموعہ بن جائے تو دنیا امن کا گہوارہ کیسے نہ بنے۔ اس پر انسانیت کی خیر و برکت اور تمدن کی تعمیر و ترقی کا دارومدار ہے۔ اسی لیے عبداللہ ابن عباس نے ان آیات کے بارے میں فرمایا ہے کہ یہ محکمات ہیں ان میں کچھ بھی منسوخ نہیں ہے۔ اس میں جو کچھ ہے وہ تمام نبیوں کی شریعتوں کا مشترکہ سرمایہ ہے۔ یہ کتاب الٰہی کی جان ہے۔ ان پر عمل پیرا ہونے والا جنتی ہے اور ان کا تارک دوزخی ہے۔ اور اسی لیے حضرت عبادہ ابن الصامت فرماتے ہیں:

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان کیا لوگو! تم میں سے کون ہے جو ان تین آیتوں پر میرے سے بیعت کرے۔ پھر حضور نے یہ تین آیات تلاوت فرمائیں۔ تلاوت سے

فراغت ہوئی تو فرمایا جو شخص وفاداری کرے گا یعنی ان مطالبات کی پابجائی کرے گا اس کو اللہ اجر دے گا اور جو کوتاہی اور کمی کرے گا اس کی اگر دُنیا میں پکڑ ہو گئی تو وہ سزا ہو گی اور اگر اس کے معاملہ کو اللہ نے آخرت پر ڈال دیا تو پھر اس کا معاملہ اسی کے سپرد ہے چاہے تو عذاب دے اور چاہے تو معاف کر دے۔ (ابن کثیر)

۱۹۵۔ اے اللہ کے رسُول ان سے فرما دیجئے کہ آؤ میں تمہارے روبرو بیان کر دوں کہ جو کچھ تمہارے رب نے تم پر حرام کیا ہے۔ یہاں تک ان چیزوں کا بیان تھا جنہیں مشرکین نے محض اپنی رائے و ہوا سے حرام ٹھہرا رکھا تھا۔ پھر اس تحریم کے لیے حیلے اور باطل عذر کرتے تھے اب وہ چیزیں بیان کی جاتی ہیں جنہیں خدا نے حرام کیا ہے اور ہمیشہ سے حرام رہی ہیں اور یہ مشرکین ان میں مبتلا ہیں[1] اصل موضوع چونکہ تحریم ہے اس لیے آغاز اسی سے کیا ہے اور رب کی طرف تحریم کی نسبت کر کے اشارہ کر دیا کہ بندوں کے لیے کسی چیز کو حرام کرنا صرف ان کے رب کا حق ہے۔ رب کے سوا دوسرے کا یہ حق نہیں ہے کہ وہ بندوں پر کوئی چیز حرام کرے۔ مشرکین چونکہ شرک تحریم میں مبتلا تھے اس لیے خاص طور پر یہاں اس پر تنبیہ فرما دیا اور لفظ رب لا کر جتا دیا کہ اللہ کے لیے ہی تحریم کا حق اس کی ربوبیت کا تقاضا ہے۔ گویا تحریم اگر دعویٰ ہے تو ربکم اس دعویٰ کی دلیل ہے اور پیشانی پر تعالوا لگا کر نبوت کی زبان سے بتا دیا کہ میں جس چیز کی دعوت دے رہا ہوں یہ وہ بے بہا دولت ہے جس پر انسانیت کی خیر و برکت اور تمدن کی تعمیر و ترقی موقوف ہے اور وہ قیمتی سرمایہ جس میں انسانی ارتقاء کی بھرپور ضمانت ہے۔ یہی راست بازی کی وہ بنیادی سچائیاں ہیں کہ انسانی تاریخ میں جب بھی ان سے بے رُخی برتی گئی انسانوں کی فطرت میں تغیر رونما ہوا اور ان میں ارتقاء کی جگہ پستی کے آثار ظاہر ہوئے۔ اور جب بھی ان کو اپنایا گیا تو اس کے نتیجہ میں انسانیت سے عاری حیوانوں میں ایسے نیک نفس لوگ پیدا ہوئے جن کے انفاس سے دُنیا معطر ہو گئی، جن کے حُسن و جمال سے انسانیت کی تاریخ میں دل کشی اور رعنائی آگئی جو رفعت و منزلت میں فرشتوں سے آگے نکل گئے۔ انہیں برگزیدہ مثالی اور قابلِ تقلید نفوس کی برکت سے تباہ و برباد ہونے والی انسانیت کو نئی زندگی مل گئی عدل و انصاف کا دور دورہ ہو گیا، کمزوروں میں طاقت والوں سے اپنا حق وصول کرنے کی ہمت و طاقت پیدا ہوئی۔ فضاؤں میں رحم و کرم کی خنکی چھا گئی۔ عفت و پارسائی کی خوشبو پھیل گئی۔ سعادت کا بازار گرم ہو گیا۔ راست بازی کی یہ بنیادی سچائیاں کیا ہیں؟ قرآن کہتا ہے کہ یہ ہیں:

---

[1] افادات شیخ الاسلام

راست بازی کی اولین اساس توحید

۱۹۶ - یہ کہ اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔ مثبت انداز میں راست بازی کی اولین بنیاد توحید ہے بقول شاہ ولی اللہ یہی اصل اصول البر اور عمدۃ انواع البر ہے۔ اسی کے ذریعے انسان کا اپنے مالک و خالق سے رشتہ عبادت استوار ہوتا ہے۔ اس کی حیثیت ساری نیکیوں میں قلب کی ہے۔ قلب صحیح ہے تو ساری روحانی زندگی درست ہے۔ توحید کے مخالف تصور کا نام شرک ہے۔ یہاں دو وجہ سے توحید کے اس مخالف تصور کو پیش کیا گیا ہے۔ ایک یہ کہ مخاطبوں کے احوال و ظروف کا تقاضا یہی تھا۔ ان کا اللہ سے عبادت و طاعت میں رشتہ ٹوٹ چکا تھا۔ دوسرے یہ کہ ذہنوں میں کوئی تصور اسی وقت واضح ہوتا ہے جب کہ اس کے مخالف تصور کو بھی بیان کیا جائے۔ اسی لیے توحید کی تعلیم میں الا اللہ سے پہلے لا الہٰ لایا گیا ہے۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توحید کا بے آمیز تصور پیدا نہیں ہو سکتا جب تک شرک کی پوری طرح پہلے وضاحت نہ ہو جائے۔

شرک کے معنے ساجھے پن کے ہیں اور اصطلاحی زبان میں شرک نام ہے اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساجھی بنانے کا گویا شرک کی تین قسمیں ہیں:

ایک وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہوتا ہے

دوسرا وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی صفات سے ہوتا ہے

تیسرا وہ شرک جس کا تعلق اس کی صفتوں کے لوازم سے ہوتا ہے

پہلے شرک کی عملی صورتیں یہ ہیں۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہم جنس قرار دیا جائے۔ اسے اس کا باپ یا اس کی اولاد سمجھ لیا جائے۔ یہ مان لیا جائے کہ وہ کسی اور ہستی کے ساتھ مل کر ایک قالب ہو گیا ہے۔ یہ تصور کر لیا جائے کہ وہ کسی مخلوق کی شکل اختیار کر کے نمودار ہوا کرتا ہے۔ یعنی کوئی مخلوق اس کا اوتار ہو سکتی مثلاً اہل عرب فرشتوں کو اللہ تعالیٰ کی بیٹیاں اور جنوں کو اس کی ذات برادری سمجھتے تھے۔ اسی طرح عیسائی حضرت مسیح علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ کا اکلوتا بیٹا اور اس کا اوتار قرار دیتے تھے۔ یہ سب کا سب شرک فی الذات تھا۔

دوسری قسم کے شرک کی عملی صورت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن صفتوں سے موصوف ہے ان میں سے کوئی صفت کسی اور میں مان لی جائے اور اسی معنے و مفہوم میں مانی جائے جس معنے و مفہوم میں کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اندر پائی جاتی ہے۔ مثلاً علم اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھلی اور چھپی بات کو خود بخود جانتا ہے۔ اس کے لیے غائب بھی حاضر ہے اور گزرا ہوا یا آنے والا زمانہ بھی حال کا زمانہ

ہے۔ اب اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ فلاں مخلوق بھی اسی طرح ہر بات کو جانتی ہے تو شرک فی الصفات ہوگا۔ اسی طرح نفع یا نقصان پہنچانا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے مسرت اور راحت کا سامان عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ خیال رکھے کہ فلاں پیر، فرشتہ یا جن یا بزرگ انسان بھی ہماری بگڑی بنا سکتا ہے یا ہمیں تکلیف یا نقصان پہنچا سکتا ہے تو وہ اللہ تعالیٰ کی ایک صفت میں اسے ساجھی ٹھہرا رہا ہوگا اور اس کے اس کام کو شرک فی الصفات کہا جائے گا۔

تیسرے قسم کے شرک کی صورت یہ ہے کہ صفات الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں۔ انہیں اور ان سب کو اللہ ہی کے لیے خاص نہ سمجھا جائے بلکہ انہیں یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے لیے بھی ثابت اور موجود مان لیا جائے۔ مثلاً صفات الٰہی کا ایک تقاضا یہ ہے کہ حقیقی عبادت اور محبت صرف اللہ کا حق ہے اب اگر کوئی شخص کسی اور سے بھی ایسی محبت رکھے یا اسی طرح کی عبادت کا اس کو مستحق قرار دے تو صفات الٰہی کے تقاضوں میں غیر اللہ کو شریک کرنا ہوگا۔ اسی طرح ان صفات کا ایک اور تقاضا یہ بھی ہے کہ اقتدار اعلیٰ صرف اللہ کے ہاتھ میں ہے اور حکم دینے اور قانون بنانے کا حق اصلاً اسی کو پہنچتا ہے۔ اس لیے اگر کسی اور کو بھی یہ حیثیت دے دی جائے خواہ وہ ایک فرد ہو یا بہت سے افراد کا مجموعہ ہو تو یہ شرک ہوگا۔

ان تینوں قسموں میں سے خواہ کسی قسم کا بھی شرک ہو اس کی موجودگی میں توحید کا اسلامی عقیدہ باقی نہیں رہ جاتا اور جہاں توحید باقی نہ رہ گئی ہو ممکن نہیں کہ وہاں ایمان موجود ہو۔ اسی لیے شرک کو قرآن نے سب سے بڑا ظلم قرار دیا ہے ان الشرك لظلم عظيم اور فرمایا ہے کہ خدا کے یہاں ہر گناہ کی معافی ہے مگر شرک کی معافی نہیں آخر جہاں بیج ہی نہ ہو وہاں درخت کیسے وجود میں آسکتا ہے!

لا تشركوا به شيئاً کا مثبت مطالبہ یہ اور صرف یہ ہے کہ یگانہ خدا کی عبادت اور اسی کی اطاعت کرو۔ جیسا کہ اس نے اپنے رسول کے ذریعے تمہارے لیے ہدایات دی ہیں نہ اپنی اہواء اور خواہش پر مبنی شریعت بناؤ اور نہ کسی اور کی۔ یہی وہ بنیادی مقصد ہے جسے نبوت نے دی ہے۔ شرک کی ممانعت کا یہ لازمہ ہے۔

راست بازی کی دوسری دفعہ والدین سے حُسنِ سلوک

۱۹۷- اور والدین سے حسنِ سلوک کرو۔ یعنی دوسری بات جو میں تمہارے سامنے پیش کرتا ہوں

یہ ہے کہ والدین کے ساتھ نیکی کرو۔ اس میں ادب، تعظیم، اطاعت، رضاجوئی، خدمت، مہربانی، نرمی سب داخل ہیں۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں اس میں والدین کو سخت جواب دینے، ان کو غصہ آمیز نگاہوں سے دیکھنے، ان کے سامنے اونچی آواز کرنے کی ممانعت بھی ہے۔ قرآن نے متعدد آیات میں توحید کے بعد والدین کی خدمت کا حکم دیا ہے۔ اللہ کی ذات اگر انسان کے وجود میں موثر حقیقی ہے تو والدین اسی کے لیے موثر ظاہری ہیں۔ بات ذرا لمبی ہو جائے گی مگر جی چاہتا ہے کہ حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم نے حقوقِ والدین کو جس مؤثر انداز میں پیش کیا ہے اس کی ایک جھلک آپ بھی دیکھ لیں۔

ایک شخص نے خدمتِ اقدس میں آکر دریافت کیا کہ یارسول اللہ سب سے زیادہ میرے حسنِ سلوک کا کون مستحق ہے۔ فرمایا تیری ماں، پوچھا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں، اس نے عرض کیا پھر کون؟ فرمایا تیری ماں۔ تین بار آپ نے یہی جواب دیا۔ چوتھی بار پوچھنے پر ارشاد ہوا تیرا باپ۔ ایک روز حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم نے چار بڑے گناہوں کا ذکر کیا۔ اور سرِفہرست ماں کی نافرمانی کو قرار دیا اور فرمایا کہ تمہارے خدا نے ماؤں کی نافرمانی تم پر حرام کی ہے۔

اس سے اندازہ ہوگا کہ حضورانور صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم میں مخلوقاتِ انسانی میں جنس لطیف ہی کی ایک صنف کو سب سے برتری حاصل ہے اور یہ برتری بالکل فطری ہے۔ انسان اپنے وجود میں جن کا ممنون ہے اور جو اس کی تخلیق کی مادی علت ہیں وہ خالق اکبر کی ذات علت فاعلہ کے بعد ماں اور باپ ہیں لیکن باپ کی حد تک مادی علیت چند لمحوں اور اپنے جسم کے چند قطروں سے زیادہ نہیں مگر ماں وہ ہستی ہے جس نے اسے اپنا خون پلا پلا کر بڑھایا اور نو مہینے تک اس کی مشکل سہہ کر اور سختی اٹھا کر اپنے پیٹ میں رکھا۔ پھر اس کے جننے کی ناقابل برداشت تکلیف کو ہنسی خوشی برداشت کیا۔ پھر اس نو پیدا مضغہ گوشت کو اپنی چھاتیوں سے لگا کر اپنا خون پانی کر کے پلایا اور اس کی پرورش اور غور و پرداخت میں اپنی ہر راحت قربان، اپنا ہر آرام ترک اور اپنی ہر خوشی نثار کر دی۔ ایسی حالت میں کیا ماں سے بڑھ کر انسان اپنے وجود میں مخلوقات میں کسی اور کا محتاج ہے۔ اس لیے حضورانور نے جا بجا اپنی تعلیم میں جو بلند سے بلند مرتبہ اس کو عنایت کیا ہے وہ اس کی مستحق ہے۔

ماں کے ساتھ جو دوسری ہستی بچّہ کی تولید میں شریک ہے وہ باپ ہے اور شک نہیں کہ اس کی نشوونما اور تربیت میں ماں کے بعد باپ ہی کی جسمانی و مالی کوششیں شامل ہیں اس لیے جب بچّہ ان کی محنتوں اور کوششوں سے قوت کو پہنچے تو اس پر فرض ہے کہ اپنی اس ماں باپ کی کوششوں سے حاصل کی ہوئی قوت کا شکرانہ ماں باپ کی خدمت کی صورت میں ادا کرے۔ چنانچہ اسلام نے نہ صرف پہلے مذاہب کی طرح ان کی عزت کرنے ان سے ڈرتے رہنے کے وعظ پر اکتفا کی بلکہ ان کی خدمت ان کی

اطاعت، ان کی امداد اور ان کی دلداری ہر چیز فرض قرار دی بلکہ یہاں تک تاکید کی کہ ان کو کسی بات پر اُف نہ کہا جائے ان کے سامنے باادب رہو ان کی دعاؤں کو اپنے حق میں قبول سمجھو۔ ان کی خدمت انسان کا سب سے بڑا جہاد ہے بلکہ ان کی خوشنودی خدا کی خوشنودی ہے۔ قرآن حکیم میں والدین کے ساتھ حسنِ سلوک، نیکی اور خدمت کی تاکید ۱۲ مختلف آیتوں میں بیان ہوئی ہے۔ اور اکثر موقعوں پر یہ تعلیم توحید اور خدا پرستی کی تعلیم کے بعد آئی ہے کہ پہلی تخلیق انسانی کی علت فاعلی اور دوسری علت مادی ہے۔ خدا کی دائمی اور غیر متبدل شریعت میں شرک سے زیادہ بری چیز کوئی نہیں قرار دی گئی۔ اس پر بھی اگر کسی کے ماں باپ مشرک ہوں تو اس حالت میں بھی ان کی خدمت سے دست کش ہونا روا نہیں ہے بجز اس کے کہ اگر وہ شرک کی دعوت دیں تو ان کا اس بات کو قبول نہ کیا جائے لیکن ان کی دنیوی خدمت اور حسنِ سلوک میں کوئی فرق نہ آنے پائے۔

راست بازی کی تیسری دفعہ حقوقِ اولاد

۱۹۸ ۔ اور اپنی اولاد کو مفلسی کے اندیشے سے قتل نہ کرو ہم تمہیں بھی روزی دیتے ہیں اور ان کو بھی۔ عرب مفلسی کی وجہ سے بعض اوقات اولاد کو قتل کر دیتے تھے کہ خود ہی کھانے کو نہیں اولاد کو کہاں سے کھلائیں گے۔ اسی لیے فرمایا کہ رزق دینے والا تو خدا ہے۔ تم کو بھی اور تمہاری اولاد کو بھی۔ دوسری جگہ من املاق کی جگہ خشیۃ املاق فرمایا ہے یعنی مفلسی کے اندیشہ سے قتل کرتے تھے۔ یہاں ان کا ذکر ہے جو فی الحال مفلس نہیں مگر ڈرتے ہیں کہ جب عیال زیادہ ہو گی تو کہاں سے کھلائیں گے چونکہ پہلے طبقہ کو عیال سے پہلے اپنی روٹی کی فکر ستا رہی تھی اور دوسرے کو زیادہ عیال کی فکر نے پریشان کر رکھا تھا، شاید اسی لیے یہاں نرزقکم وایاھم فرمایا اور خشیۃ املاق والی آیت میں نرزقھم وایاکم ارشاد فرمایا[1]

اصل میں ارشاد ہوا ہے لا تقتلوا اولادکم من املاق مطلب یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہ نے تمہیں اولاد کی زندگی کا واسطہ بنایا ہے تو بالقصد اولاد کے نقشِ زندگی کے مٹانے کا سبب نہ بنو بلکہ اس کی حیات کی تکمیل اور اس کے نشوونما کی ترقی کے وہ تمام وسائل اختیار کرو جو قوت اور استطاعت میں ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلام نے بالقصد حمل کے ضائع کرنے کو گناہ قرار دیا ہے اور پیدا ہونے کے بعد اس کے مار ڈالنے کی جاہلانہ رسم کو اس حکم کے ذریعہ جڑ سے اکھاڑنے کی کوشش کی ہے۔

عرب کے سفاکانہ مراسم میں سب سے زیادہ بے رحمی اور سنگدلی کا کام معصوم بچوں کو مار ڈالنا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تھا۔ یہ بے رحمی کا کام والدین خود اپنی خوشی اور مرضی سے کرتے تھے۔ اس رسم کے جاری ہونے کے متعدد اسباب تھے

ایک تو وہ ہی مذہبی تھا جس کا پہلے وکذالک زین لکثیر من المشرکین قتل اولادھم میں ذکر ہو چکا یعنی والدین اپنے بچوں کو اپنے دیوتاؤں کی خوشنودی کے لیے ذبح کرکے ان پر چڑھاوا چڑھاتے، منت مانتے تھے کہ فلاں کام ہو گا تو اپنے بچہ کی قربانی کریں گے۔ یہ قابلِ نفرت رسم نہ صرف عرب میں بلکہ بہت سی بُت پرست قوموں میں رائج تھی۔ رومۃ الکبریٰ کے عظیم الشان متمدن قانون میں اولاد کو مار ڈالنے کا باپ کے لیے حق تسلیم کیا گیا تھا اور اولاد کشی کا کثرت سے رواج تھا۔ ہندوستان کے راجپوتوں میں یہ دردناک منظر لڑکیوں کی شادی کی شرم و عار سے بچنے اور بیواؤں کی ستی کی صورت میں رائج تھا۔

اس ہولناک گناہ کا دوسرا سبب اہلِ عرب کا عام فقر و فاقہ تھا۔ وہ سمجھتے تھے کہ اولاد ہو گی تو اس کے کھانے پینے کا سامان کرنا ہو گا۔ اس لیے وہ اس کے خون سے اپنا ہاتھ رنگ کر اس فرض سے سبکدوش ہوتے تھے۔ قرآن نے ان کو بتایا کہ ہر بچہ اپنا رزق اور اپنی قسمت ساتھ لے کر آتا ہے۔ ایک انسان دوسرے انسان کو نہیں کھلاتا بلکہ وہ خدا ہی ہے جو سب کو کھلاتا ہے اور وہی ہر جاندار کی روزی کا سر سامان ہے۔ ان کو بتایا گیا کہ نحن نرزقکم وایاھم۔

صحیح بخاری میں ہے کہ ایک بار ایک صحابی نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے فرمایا۔ شرک، پوچھا اس کے بعد فرمایا، والدین کی نافرمانی، پھر عرض کی کہ اس کے بعد، فرمایا، کہ تم اپنی اولاد کو اس ڈر سے مار ڈالو کہ وہ تمہارے ساتھ کھائے گی۔ یہ جواب حقیقت میں اسی آیت کی تفسیر ہے۔ ان ہی تعلیمات نے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا تھا کہ رازق اللہ ہے۔ اسی کے ہاتھ میں رزق کی کُنجی ہے۔ ہر بچہ اپنے رزق کا آپ سامان لے کر آتا ہے۔ اس ایمان و یقین نے اس جرم کا خاتمہ کر دیا تھا۔

قرآن کی اس آیت کی روشنی میں وہ معاشی نظریہ بہت ہی پامال اور فرسودہ ہے جو نسل کو گھٹانے اور محدود کرنے کی تدابیر بتاتا ہے۔ آیت میں املاق کا اضافہ ہی یہ بتانے کے لیے ہے کہ فلاسفہ اور منکرین جاہلیت اپنے معاشی نظریہ کی فلاسفی بھی بیان کرتے ہیں۔ چنانچہ یورپ میں جو تحریک منع حمل کی صورت میں اٹھی ہے اس کا محرک بھی خوف افلاس ہے۔ افراد تو افراد اب تو حکومتیں اپنے دائرۂ اختیار میں اسی پر مبنی قانون سازی کر رہی ہیں اور سوچ رہی ہیں کہ اتنے عرصہ میں ہم آتنا غلہ پیدا کریں گے اور اسی حساب سے اتنے بچے پیدا ہونے دیں گے اور اگر کوئی بغیر پرمٹ کے آئے گا تو ہم سائنسی ہتھیاروں سے مسلح ہو کر اس کا مقابلہ کریں گے۔

سوچیے جس غلط فہمی کے شکار عرب کے جاہل تھے کہ رہنے کے لیے جگہ کھانے کے لیے روٹی

اور پہننے کے لیے کپڑا نہیں ہے۔ یا اب تو ہے لیکن اگر تعداد کمانے والوں کی زیادہ ہو گئی تو کمی آجائے گی اس لیے آنے والوں کو ختم کر دیا جائے گا۔ ٹھیک یہی حربہ اسی ذہن کے ساتھ اس زمانہ کی متمدن حکومتیں استعمال کر رہی ہیں۔ چیز ایک ہے اور دونوں جگہ روح ایک ہے صرف قالب بدلے ہوئے ہیں۔ عرب ان پڑھ اور جاہل تھے اس وجہ سے قتل کی بھیمانہ صورت اختیار کی۔ موجودہ زمانہ کا انسان مہذب اور تعلیم یافتہ ہے اس نے اس کے لیے خوبصورت عنوان اختیار کیا ہے۔ ذہن دونوں کا ایک ہے۔ انہوں نے بھی رزاق اپنے کو سمجھا اور یہ بھی رزاق اپنے کو ہی سمجھ بیٹھے ہیں۔ قرآن نے لاتقتلوا کے بعد نحن نرزقکم دیا ہے کہہ کر عربوں کو سمجھا دیا اور وہ بات سمجھ گئے مان بھی گئے۔ لیکن اس زمانے کے پڑھے لکھے بدو کی سمجھ میں یہ بات نہیں آتی ہے فانا للہ والی اللہ المشتکی۔

راست بازی کی چوتھی دفعہ فواحش سے بچنا

۱۹۹۔ اور بے حیائی کی باتوں کے قریب بھی نہ جاؤ کھلے طور پر ہوں یا چھپی ہوں۔ قریب نہ جاؤ سے شاید یہ مراد ہو کہ ایسے کاموں کے مبادی اور وسائل سے بھی بچنا چاہیے۔ مثلاً زنا کی طرح نظر بد سے بھی اجتناب لازم ہے[1]۔ اصل ارشاد میں فواحش آیا ہے اس کے معنے میں بہت وسعت ہے صرف زنا ہی اس کے معنے نہیں ہیں۔ بدکاری، بے حیائی، فحاشی کی تمام صورتیں اس میں داخل ہیں۔ اس پر اور اضافہ یہ کہ لاتقربوا فرمایا یعنی قریب نہ پھٹکو اور پھر ما ظھر منھا و ما بطن لاکر تعمیم کو بہت ہی وسیع کر دیا اس میں بے حجابی، لباس میں بے ستری وغیرہ کی تمام صورتیں خواہ پبلک میں ہوں یا پرائیویٹ سب حرام ہو گئیں۔

یہ ممانعت جس انداز میں کی گئی ہے وہ بلاغت کی جان ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ قرآن جس طرح بدکاری سے بچنے کو شرافت گردانتا ہے اسی طرح اس کی تقریب اور تمہید کے کاموں سے بھی بچنے کو شرافت کا اقتضا قرار دیتا ہے۔ اسی وجہ سے اسلام کا قانون فوجداری اپنی سیاسی طاقت سے ایک طرف تو فواحش کو زبردستی روکتا ہے اور دوسری طرف شریف ارکان کو بدنیت لوگوں کی بدزبانی سے بھی محفوظ کرتا ہے مطلب یہ ہے کہ قرآن کی اخلاقی تعلیم انسان کو اندر سے درست کرتی ہے تاکہ اس میں بدی اور فواحش کی طرف رجحان ہی نہ ہو اور اس کا تعزیری قانون اس کو باہر سے درست کرتا ہے تاکہ اخلاقی تربیت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے ناقص رہ جانے سے اگر اس قسم کے رجحانات پیدا ہو جائیں اور وہ قوت سے فعل میں آنے لگیں تو ان کو بجبر روک دیا جائے۔ آیت میں خلوت و جلوت میں فواحش پر قدغن قائم کر کے اصلاح باطن کی اخلاقی تعلیم دی گئی ہے۔ اس تعلیم سے نظام معاشرت کو اس طرح درست کیا گیا ہے کہ اخلاقی تربیت کے نقائص سے جو کمزوریاں افراد جماعت میں باقی رہ جائیں ان کو ترقی کرنے اور قوت سے فعل میں آنے کا موقع ہی نہ مل سکے۔ سوسائٹی میں ایک ایسا ماحول پیدا ہو جائے جس میں بُرے میلانات کو نشو و نما دینے والی آب و ہوا مفقود ہو، ہیجان انگیز تحریکات ناپید ہوں، جنسی انتشار کے اسباب امکانی حد تک کم ہو جائیں اور ایسی تمام صورتوں کا سدباب ہو جائے جن سے نظام تمدن میں برہمی پیدا ہونے کا امکان ہو۔

راست بازی کی پانچویں دفعہ انسانی جان کا احترام

۲۰۰۔ اور کسی جان کو قتل نہ کرو جسے اللہ نے حرام ٹھہرایا ہے ہاں یہ کہ کسی حق کی بنا پر قتل کرنا پڑے اصل ارشاد میں الا بالحق آیا ہے یہ استثنا ضروری تھا جس میں قاتل عمد، زانی، محصن اور مرتد عن الاسلام کا قتل داخل ہے جیسا کہ احادیث صحیحہ میں اس کی تصریح وارد ہو چکی ہے اور ائمہ مجتہدین کا اس پر اجماع ہے[1]

مطلب یہ ہے کہ جس جان کے قتل کرنے کو اللہ نے اسلام کی وجہ سے یا اسلامی نظام کے تحت شہری ہونے کی وجہ سے یا معاہد ہونے کی وجہ سے یا سیاسی پناہ لینے کی وجہ سے حرام کر دیا ہے۔ اس کو مت قتل کرو۔ آیت کے عموم میں یہ سب داخل ہیں ہاں اگر ان پر حق کی بنا پر موجبات قتل میں سے کوئی سبب پایا جاتے اس کی قرآن و سنت میں پانچ صورتیں بتائی گئی ہیں۔

ایک یہ کہ انسان دوسرے انسان کے قتل عمد کا مجرم ہو اور اس پر فرد جرم لگ گئی ہو تو پھر قصاص میں اس کو قتل کیا جا سکتا ہے۔

دوسرے یہ کہ میدان جنگ میں ہو اور اللہ کے دین کے قیام کی راہ میں مزاحم ہو۔ اور اس سے جنگ کے بغیر کوئی چارہ نہ ہو۔

تیسرے یہ کہ دارالاسلام کی حدود میں بدامنی پھیلائے، اسلامی نظام حکومت کو تہ و بالا کرنے کی کوشش کرے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چوتھے یہ کہ شادی شدہ ہونے کے باوجود زنا کرے۔

پانچویں یہ کہ اسلام کو چھوڑ کر مرتد ہو جائے۔

ان پانچ صورتوں کے سوا کسی صورت میں انسان کا قتل انسان کے لیے حلال نہیں ہے خواہ وہ مومن ہو، یا ذمی ہو یا معاہد، ہو یا مستامن ہو یا عام کافر ہو۔ الغرض اس قسم کے حق شرعی و قانونی کے بغیر کسی کو قتل کرنا جائز نہیں۔

ان رذائل کا مرتکب عقل سے محروم ہے

۱۰۲ ۔ یہ وہ باتیں ہیں جن کی خدا نے تمہیں وصیت کی ہے تاکہ تم سوجھ بوجھ سے کام لو۔ اس آیت سے ان چیزوں کا حرام ہونا ثابت ہوا، شرک باللہ، والدین کے ساتھ بدسلوکی، قتل اولاد، سب بے حیائی کے کام مثلاً زنا وغیرہ۔ کسی شخص کو ناحق قتل کرنا[1] یعنی اس آیت میں بیان شدہ رذائل وہ اخلاق ذمیمہ ہیں جن سے بچنے کی اللہ نے ہدایت کی ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہ گار ٹھہرتے ہیں، جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا اور مانتا ہے اور جن کی بدولت انسانی افراد اور جماعتوں کو روحانی اور مادی نقصانات پہنچتے ہیں اور ان کی معاشرت تباہ ہو جاتی ہے بلکہ جب وہ کسی میں عام ہو جاتے ہیں تو پوری قوم کی تباہی بربادی کا سبب بن جاتے ہیں۔ یعنی اس کی دینی و دنیوی ترقیوں کی راہیں مسدود، سعادت اور اقبال کا دروازہ بند ہو جاتا ہے اور اس میں مخاطبوں کے طرز عمل پر طنز ہے کہ تم جن چیزوں کو حرام قرار دیے رہے ہو اس کے پیچھے کوئی عقلیت نہیں ہے اور خدا نے جن سے بچنے کا حکم اپنے بندوں کو دیا ہے اس میں سراسر عقلیت ہے کیونکہ ان رذائل سے بچ کر ہی انسان فضائل کا گہوارہ بن سکتا ہے۔ شرک سے بچ کر انسان توحید سے وابستہ ہوتا ہے اور یہ بالکل ٹھیٹھ عقلی بات ہے کہ بندگی کے تعلقات اس ذات سے قائم کرنا جو ازلی ہے ابدی ہے اور واجب الوجود ہے جو سب کو نعمت وجود عطا کرتا ہے جو سب کی پروردگاری کرتا ہے جو مالک ہے حاکم ہے جو علیم و حکیم ہے، جو عزیز اور عادل ہے، جو اس بات کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے۔ اس سے ہٹ کر کسی بھی مخلوق سے بندگی کے تعلقات بالکل بے عقلی اور حماقت ہے۔ ایسے ہی والدین سے حسن سلوک اخلاقی فضائل کی اساس ہے۔ معاشرتی نیکیوں کی بنیاد ہے۔ والدین کی بے حرمتی ان کی تذلیل، ان سے بے رخی تقاضائے عقل کے خلاف ہے۔ اولاد کشی کی جگہ اولاد کی تربیت، تعلیم، ان کی نگہداشت وہ اخلاقی فضیلت

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے جس پر صحت مند معاشرے کا دار و مدار ہے - والدین کا احترام اور اولاد سے شفقت یہ وہ اصول ہے جس پر معاشرے کی صحت کی عمارت اٹھتی ہے - یہی حال منع فواحش کا ہے - معاشرے کی برتری کا سب سے اونچا معیار یہی ہے - دنیا میں سارے فساد کا سرچشمہ فواحش ہیں آخر میں انسانی زندگی کے احترام کی دفعہ ہے - ان میں سے ہر بات میزان عقل پر پوری اترتی ہے - بلاشبہ جس معاشرے میں شرک کی نجاست والدین سے بدسلوکی، اولاد کشی، فواحش کی گرم بازاری اور انسانی خون کی ارزانی ہوگی - وہ معاشرہ عقل و خرد سے محروم ہوگا اور اس پر انسانی ترقی کی ساری راہیں مسدود ہوں گی - یہ ایسی برائیاں ہیں جسے عقل انسانی کبھی گوارا نہیں کرتی ہے قرآن کی اصطلاح میں ایسی تمام برائیاں جن کی برائی ہر عقل کے لیے کھلی ہوتی ہو منکر کہلاتی ہے اس پر کسی دلیل کی ضرورت نہیں ہے -

راست بازی کی چھٹی دفعہ مال یتیم سے پرہیز

۲۰۲ - اور یہ کہ یتیم کے مال کے قریب نہ جاؤ لیکن ایسے طریقہ سے جو بہترین ہو یہاں تک کہ وہ اپنے سن رشد کو پہنچ جائے - یتیم کے مال میں بے جا تصرف کرنا حرام ہے - ہاں بہتر و مشروع طریقہ سے احتیاط کے ساتھ اس میں ولی یتیم تصرف کر سکتا ہے - جب یتیم جوان ہو جائے اور اپنے فرائض کو سنبھال سکے تو اس کے حوالے کر دیا جائے[1] مطلب یہ ہے کہ جب تمہیں کسی یتیم کا ولی بننے کا موقعہ ملے یا کاروبار میں یتیم کے مال پر مشتمل یتیم کے ولی یا وصی کی وساطت سے معاملہ کرنا پڑے تو یتیم کے مال میں بہت بڑی احتیاط کا مظاہرہ کرو اس طریقہ سے معاملہ کرو جو زیادہ سے زیادہ بے غرضی، نیک نیتی اور یتیم خیر خواہی پر مبنی ہو اور جس پر خدا اور خلق کسی کی طرف سے بھی تم اعتراض کے مستحق نہ ہو - یعنی سوائے بہتری کی نیت اور اصلاح کے خیال کے صاحب جائداد یتیموں کی جائداد کے پاس بھی کسی اور غرض سے نہ جائے اور دیانتداری سے ہمیشہ اپنا دامن بچائے رکھے - ہم اس موضوع پر سیر حاصل بحث سورۃ نساء میں کر چکے ہیں - یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ قرآن نے یہاں یتیموں کے ولیوں کو یہ ہدایت کی ہے کہ ان کے مالوں کے جب تک تم نگران ہو یہ بات تمہارے فرائض میں ہے کہ ہر وقت یتیموں کی بہتری کا خیال رکھو اور اس میں صرف اس طرح تصرف کرو کہ تمہارا تصرف یتیم کے حق میں مفید ہے - اور یہ یتیم کے مال کی نگرانی کا فرض تم اس وقت تک ادا کرو کہ یتیم اپنی طاقت کی عمر کو پہنچ جائے - اصل ارشاد میں حتی یبلغ اشدہٗ ہے - اس کے معنے طاقتور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہونا، جوان ہونا ہیں - دوسری آیت میں اسی کو رشد کہا ہے فان آنستم منھم رشداً یعنی اگر ان میں صلاحیت دیکھو۔ دونوں کو ملا کر نتیجہ یہ نکلا کہ عمر کے اعتبار سے بالغ ہو اور شعور بھی بالغ ہو۔ جب یتیم بالغ ہونے کے بعد طاقتور اور جوان ہو جاتے تو وہ یتیمی کے دائرے سے نکل جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں آج کے مادہ پرستوں کی طرح صرف طاقت کا لوہا مانتے تھے اور حق کی حقیقت کا قوت و طاقت سے الگ ہو کر کبھی اعتراف نہ کرتے تھے اسی لیے قرآن میں ان دو کمزوروں یتیم اور عورت کی ہمدردی کی زیادہ وصیت کی ہے۔ اس دور میں اپنی جان، مال اور آبرو کی حفاظت صرف جسمانی اور عقلی قوت سے ہوتی تھی اس لیے قرآن نے یتیم کے بارے میں دونوں باتوں کو ملحوظ رکھا ہے جسم کی قوت کو بھی اور عقل کے بلوغ کو بھی۔

راست بازی کی ساتویں دفعہ دیانتداری

۲۰۳ - اور ناپ تول میں پورا انصاف کرو ہم کسی پر اس کی مقدور سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے۔ یعنی طاقت کے موافق ان احکام کی بجا آوری میں کوشش کرو اسی کے تم مکلف ہو خدا کسی کو اس کی مقدرت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا[1]

ناپ تول میں کمی و بیشی کرنا فی الواقع دوسرے کے حق پر چھاپہ مارنا ہے جو کوئی لینے میں تول کو بڑھاتا اور دینے میں گھٹاتا ہے وہ دوسرے کی چیز پر بے ایمانی سے قبضہ کرتا ہے۔ اور یہ بھی چوری ہے۔ اسی لیے قرآن میں اس سے بچنے کی خاص طور پر تاکید آئی ہے۔ حضرت شعیب کی قوم سوداگری کرتی تھی اسی لیے ان کی دعوت میں ناپ تول میں ایمانداری کی تاکید بار بار آتی ہے۔ مثبت انداز میں اور منفی انداز میں دونوں طرح سے سمجھایا ہے۔ منفی انداز میں ارشاد ہوا ولا تنقصوا المکیال والمیزان انی اراکم بخیر ناپ تول میں کمی نہ کرو۔ اس میں مجھے تمہاری خیر نظر آتی ہے۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ ناپ تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے اور ظاہری نظر سے دیکھئے تو یوں کہیے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی بیشی کرتے ہیں ساکھ جاتی رہتی ہے اور یہ بالآخر ان کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھائیں۔ مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہوتی ہے۔

اس بداخلاقی کے پیدا ہونے کا اصلی سبب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دلوں سے یہ یقین جاتا رہتا ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ ان کے اس چھپے ہوئے کرتوت کو دیکھنے والی آنکھ ہر وقت کھلی رہتی ہے اور ایک دن آئے گا جب ان کو خدا کے سامنے حاضر ہو کر اپنے ہر کام کا حساب دینا ہو گا۔

آخر میں فرمایا کہ لا نکلف نفساً الا وسعھا ہم ہر شخص پر اس کی مقدور کے مطابق ذمہ داری کا بوجھ ڈالتے ہیں۔ یعنی اللہ سبحانہٗ لوگوں پر ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا ہے۔ یہ بطور استیناف بیانی ایک اٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے کہ انصاف کے مطابق بالکل پورا دینا کہ ماشہ اور رتی کا فرق نہ رہے بے حد دشوار ہے۔ میوہ، غلہ اور سبزیوں میں اس قسم کا نقطہ عدل قائم کرنا زندگی کو ایک بہت آزمائش میں ڈال سکتا ہے۔ جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ لوگوں پر ان کی برداشت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا مقصد یہ ہے کہ ہر شخص اپنی حد تک ناپ تول اور لین دین کے معاملات میں عرف کے مطابق راستی و انصاف سے کام لینے کی کوشش کرے وہ اپنی ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے۔ بھول چوک نادانستہ کمی بیشی ہو جائے اس سے بازپرس نہ ہو گی۔ اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ احکام جو دیے انسان کی فطرت اور اس کی صلاحیتوں کو تول کر دیے ہیں۔ ان میں کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جو اس کے تحمل سے باہر ہو۔ مطلوب جو کچھ ہے وہ یہ ہے کہ ہر شخص پوری دیانت و صداقت کے ساتھ ان احکام کی تعمیل کرے۔ اگر بلا ارادہ کسی پہلو میں کوئی بھول چوک ہو جاتے تو اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر کوئی گرفت نہیں ہے۔

بہرحال ناپ تول کی درستگی اور یہ اصل کہ خرید و فروخت میں جو جس کا حق ہو اسے پورا ملنا چاہیے انسانی معیشت کی وہ بنیادی صداقت ہے جس کی سب نبیوں نے تلقین کی ہے۔ سید رشید رضا نے بالکل درست لکھا ہے کہ اگر مسلمان اس وصیتِ خداوندی پر عمل کر لیں تو ان کے سارے معاملات میں استقامت آجاتے اور باہم اعتماد کی فضا بحال ہو جاتے اور دنیا میں مفسدین کے لیے حجت بن کر رونما ہو جائیں۔

راست بازی کی آٹھویں دفعہ حق و عدل کا اہتمام

۲۰۴۔ اور جب بات کہو تو پورے انصاف کی کہو خواہ معاملہ اپنے رشتہ دار ہی کا کیوں نہ ہو یعنی حق و انصاف کی بات کہنے میں کسی کی قرابت و محبت مانع نہ ہونی چاہیے[1] یوں تو زندگی کے ہر گوشہ میں عدل کا مطالبہ ہے لیکن شہادت یا فیصلہ کے وقت میں دو حالتوں میں اکثر لوگوں کا ایمان ڈگمگاتا ہے۔ ایک تو یہ کہ فریق مقدمہ اپنا قرابت دار ہو یا اس سے گواہ یا حاکم کو عداوت ہو لیکن قرآن کی اخلاقی تعلیم اس حالت

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

میں بھی عدل وانصاف سے تجاوز کرنے کی اجازت نہیں دیتی اور حکم ہے کہ گواہی دینی ہو یا فیصلہ کرنا ہو جب بات کہو زبان دہن سے ہو یا زبان قلم سے انصاف کا پاس کرو خواہ رشتہ دار ہی کیوں نہ ہو۔ عدل وانصاف کی راہ میں سب سے زیادہ کٹھن منزل وہ ہے کہ اپنے نفس کے مقابلے میں بھی عدل وانصاف کا سررشتہ ہاتھ سے نہ چھوٹنے پائے۔ قرآن نے اس کٹھن منزل کی طرف بھی یہ کہہ کر رہنمائی کی ہے ولو علی انفسکم خواہ تمہارے اپنے خلاف ہو، انصاف کی بات کہو۔ اس آیت کے عموم نے عدل کے خلاف ایک ایک ریشہ کو زندگی سے نکال دیا ہے کہا گیا ہے اذا قلتم فاعدلوا کہ ہر حال میں عدل وانصاف کی حمایت تمہارا مقصد ہو جو کچھ کہو اور جب کہو خدا لگتی کہو اور خدا کے واسطے کہو اور دوسری جگہ بات کھول کر بتائی ہے کہ ولو علی انفسکم او الوالدین والاقربین ان یکن غنیا او فقیرا، نہ تو اپنے نفس کا خیال بیچ میں آئے نہ عزیزوں اور قرابت داروں کا نہ دولت مند کی طرفداری کا، نہ محتاج پر رحم کا۔ پھر فیصلہ ہو یا گواہی ان میں کوئی بات لگی لپٹی نہ کہی جائے نہ حق کا کوئی پہلو جان بوجھ کر بچایا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ فیصلہ یا گواہی میں دولت مند کی خاطر نہ کرو اور نہ محتاج پر ترس کھاؤ اور نہ قرابت کو دیکھو جو حق ہو وہ کہو، پھر حق کہنے میں کوئی توڑ مروڑ نہ کرو کہ سننے والا شبہ میں پڑ جائے یا پوری بات نہ کہو کچھ چھپا لو یہ سب باتیں عدل وانصاف کے خلاف ہیں۔ کسی غریب کی غربت پر ترس کھا کر عدل وانصاف میں رد وبدل کر دینا بظاہر نیکی کا کام معلوم ہوتا ہے مگر فی الواقع یہ ایک مقدس فریب ہے۔ فیصلہ میں ترس کھا کر بے ایمانی کرنا بھی ویسا ہی ہے جیسا کسی کی خاطر بے ایمانی کرنا ہے۔ غرض یہ ہے کہ عدل وانصاف کی راہ میں کوئی اچھا یا برا جذبہ حاکم کے لیے ٹھوکر کا باعث نہ بنے۔

لوگ عدل وانصاف کے فیصلہ یا گواہی میں اس لیے غلط بیانی کرتے ہیں کہ جس فریق کی طرفداری مقصود ہے اس کو فائدہ پہنچ جائے تو ارشاد ہوا کہ فاللہ اولی بھما اللہ اپنے امیر اور غریب دونوں بندوں کے حق میں تم سے زیادہ خیر خواہ ہے۔ تمہاری کم بین نظر اس پاس تک جا کر رہ جاتی ہے اور اللہ کی نظر میں سب کچھ ہے وہ سب کچھ دیکھ کر اور سب کچھ جان کر اپنے بندوں کے ساتھ وہ کرتا ہے جس میں ان کی بھلائی ہے۔ غور فرمائیے ان لفظوں میں عدل وانصاف کا فلسفہ کس خوبی سے ادا کیا گیا ہے کہ ایسا کرنے والا اس طرح فی الواقع سچائی کا خون کر کے نظم عالم کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہا ہے اور دنیا میں ظلم کی بنیادیں استوار کر رہا ہے جس سے عالم کے امن وامان کے درہم برہم ہونے کا خطرہ ہے۔ غلط گو انسان کی محدود نگاہ میں صرف ایک جزئی واقعہ کے نفع ونقصان کا خیال ہے اور اللہ تعالیٰ کے عدل وانصاف کے حکم میں سارے عالم کی خیر خواہی کا بھید چھپا ہوا ہے جس کا ایک فرد وہ خاص

انسان بھی ہے۔

راست بازی کی نویں دفعہ ایفائے عہد

۲۰۵۔ اور اللہ کے ساتھ جو عہد و پیمان کیا ہے اُسے پورا کرو یعنی اس کے اوامر اور نواہی پر پابندی سے عمل کرو۔ خدا کے لیے جو نذر مانو یا قسم کھاؤ بشرطیکہ غیر مشروع بات کی نہ ہو اسے پورا کرنا چاہیے [1]

عام طور پر لوگ عہد کے معنے صرف قول و اقرار کے سمجھتے ہیں لیکن قرآن کی نگاہ میں اس کی حقیقت بہت وسیع ہے وہ اخلاق، معاشرت، مذہب اور معاملات کی ان تمام صورتوں پر مشتمل ہے جن کی پابندی انسان پر عقلاً، شرعاً، قانوناً اور اخلاقاً فرض ہے اور اس لحاظ سے یہ مختصر فقرہ انسان کے بہت سے عقلی، شرعی، قانونی، اخلاقی اور معاشرتی فضائل کا مجموعہ ہے اسی لیے اللہ سبحانہٗ نے قرآن میں اس کا بتکرار ذکر کیا ہے اور مختلف حیثیتوں سے کیا ہے۔ تمام عہدوں میں سب سے پہلے اس عہد کو پورا کرنا واجب ہے جو اللہ سبحانہٗ اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ یہ عہد ایک تو وہ فطری معاہدہ ہے جو روزِ الست کو بندوں نے اپنے رب سے باندھا اور جس کا پورا کرنا ان کی زندگی کا پہلا فرض ہے اور دوسرا وہ عہد ہے جو خدا کا نام لے کر کسی بیعت اور اقرار کی صورت میں کیا گیا ہے اور تیسرا وہ عہد ہے جو عام طور سے قول و قرار کی صورت میں باہم ہوا کرتا ہے اور چوتھا وہ عہد ہے جو اہلِ حقوق کے درمیان فطرۃً قائم ہے اور جن کے ادا کرنے کا خدا نے حکم دیا ہے۔ اسی طرح عہدِ الٰہی میں خدا کے وہ احکام بھی داخل ہیں جن کے بجالانے کا ایمان کی صورت میں تم نے اقرار کیا ہے گویا کہ اللہ کے سارے اوامر و نواہی کی پابجائی کا عہدِ ایمان کی صورت میں ایک مسلمان اللہ سے کرتا ہے۔ اسی طرح یہ مختصر جملہ نذر، منت اور قسم کو مشتمل ہے جس کو خدا کے مقدس نام سے تم نے مانا ہے۔

قرآن راست بازی کی جو روح انسانوں میں پیدا کرنی چاہتا ہے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی بدعہدی کی بداخلاقی گوارا نہیں کرتا۔ اس نے وفائے عہد اور احترام مواثیق کا جو معیار قائم کیا ہے وہ اس درجہ قطعی، بے لچک اور عالمگیر ہے کہ انسانی اعمال کا کوئی گوشہ بھی اس سے باہر نہیں رہ سکتا۔ فرد ہو یا جماعت ذاتی معاملات ہوں یا سیاسی، عزیز ہو یا اجنبی، ہم قوم و مذہب ہو یا غیر قوم و مذہب، دوست ہو یا دشمن، امن کی حالت ہو یا جنگ کی، کسی حال میں عہد شکنی جائز نہیں ہے، وہ ہر حال میں جرم ہے معصیت ہے۔ اللہ کے

[1] افادات شیخ الاسلام

ساتھ عہد کرکے اسے توڑ دیتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ راست بازی کی یہ نویں دفعہ نہایت جامع ہے۔ پوری زندگی کے ہر گوشہ کو اپنے اندر سمیٹے ہوتے ہے۔ ہر عہد کی عنداللہ ذمہ داری ہے اس وجہ سے ہر عہد اللہ کا عہد ہے اگر وہ خدا کی حدود میں ہے۔

احکام کی غرض تذکیر ہے

۲۰۶ - ان باتوں کی اللہ نے تم کو ہدایت کی ہے تاکہ تم نصیحت قبول کرو۔ اصل ارشاد میں تذکرون آیا ہے یہ ذکر سے بنا ہے۔ ذکر کے اصلی معنے کسی چیز کا ذہن میں آنا ہے۔ اسی کو ذکر قلبی کہتے ہیں اور یہی زبان پر آجائے تو ذکر لسانی ہے۔ اور مجازاً لفظ ذکر شہرت کے معنے میں بھی آتا ہے اور ذکر بول کر علم بھی مراد لیتے ہیں۔ قرآن کو اسی معنے میں ذکر کہا ہے۔ تذکیر کے معنے کسی چیز کو دل میں یاد رکھنے کے لیے کچھ تکلف کرنا اور اس میں فکر ہونا اور اسی لحاظ سے وعظ اور نصیحت کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں تذکیر کے معنے نصیحت یاب ہونا اور نصیحت قبول کرنا ہیں۔ جمال الدین قاسمی رقمطراز ہیں کہ شرک، حقوق والدین، مفلسی کے اندیشہ سے قتلِ اولاد، فواحش کا ارتکاب، خونریزی، ان سب کا پسِ منظر جہالت اور قوتِ غضب کی پیروی ہے۔ اور یہ صراحتہً عقل کے خلاف ہیں اس لیے ان کو بیان کرنے کے بعد لعلکم تعقلون فرمایا اور مالِ یتیم کا کھانا، ناپ تول میں کمی کرنا، غلط فیصلہ یا جھوٹی گواہی کا پسِ منظر حرص ہے اور شہوات کا غلبہ ہے اس لیے ان کے ذکر کے لیے لعلکم تذکرون فرمایا۔ اور علامہ نسفی فرماتے ہیں کہ پہلے عقلیت اور پھر تذکیر اس لیے لاتے ہیں کہ اولاً سن کر غور کرے گا، غور کے بعد نصیحت قبول کرے گا اور نصیحت قبول کرنے کے بعد زندگی میں محتاط ہوکر رہے گا۔ دوسرے علماء نے اس کے سوا اور بھی نکتہ آفرینی فرمائی ہے۔ مثلاً آلوسی لکھتے ہیں جن کاموں کے بعد عقل کو مخاطب کیا ہے ان میں صیغہ نہی لاکر کاموں سے منع کیا گیا ہے اور جن کاموں کے بعد تذکر آیا ہے ان میں صیغہ امر آیا ہے گویا نواہی کے بعد عقل لاکر اشارہ کیا ہے کہ ان کی برائی عقلی ہے اور اس کے خلاف اقدام خالص بے عقلی ہے اور اوامر کے بعد تذکیر لاکر اشارہ کیا ہے کہ ان میں تمہاری صلاح مضمر ہے بشرطیکہ تمہیں یاد رہے اور تم باہم یاد کراتے رہو۔ تعقل اور تذکیر میں بڑا گہرا معنوی ربط بھی ہے انسان جب سنجیدگی سے ایک بات پر غور کرنے کا عزم کرتا ہے تو یہ تعقل ہے۔ اس تعقل سے وہ حقائق آشکارا ہوتے ہیں جو فطرتِ انسانی کے اندر ودیعت ہیں لیکن انسان کی غفلت کی وجہ سے ان پر ذہول کا پردہ پڑا ہوا ہوتا ہے ان حقائق کا آشکارا ہونا تذکر ہے۔

راست بازی کی دسویں دفعہ راہِ نبوت پر چلنا ہے

۲۰۷ - اور یہ کہ یہی میرا سیدھا راستہ ہے لہٰذا تم اسی پر چلو اور دوسرے راستوں پر نہ چلو کہ وہ خدا کے راستہ سے ہٹا کر تمہیں تتر بتر کر دیں گے - یہ بات جس کا خدا نے حکم دیا ہے تاکہ تم پرہیزگار ہو جاؤ - یعنی احکام مذکورہ بالا کی پابندی اور خدا کے عہد کو اعتقاداً و عملاً پورا کرنا بھی صراطِ مستقیم ہے جس کی طلب کی سورۂ فاتحہ میں تلقین کی گئی تھی - یہ راہ تم کو دکھلا دی گئی ہے اب چلنا تمہارا کام ہے جو کوئی اس کے سوا دوسرے راستہ پر چلا وہ خدا کے راستہ سے بھٹکا[1]

یہاں صراط سے اشارہ اس دعوت کی طرف ہے جسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کرتے ہیں اسی کے بارے میں دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے ھٰذہٖ سبیلی ادعو الی اللہ یعنی یہ سیدھی راہ جو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں بس اسی کی پیروی کرو - خدا کی بتائی راہ یہی ہے - یہی حضرت ابراہیم کو دی ہوئی راہ ہے جس پر چلنے کی انہوں نے اپنی اولاد کو وصیت کی تھی - اس کے مخالف جس قدر راہیں ہیں، ان سے بچ کر رہو اور یہ بہت زیادہ ہیں - ان پر پڑ کر ہر شخص اس سیدھی راہ سے بھٹک جائے گا - حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ صراطِ مستقیم کے لیے واحد کی تعبیر اور غلط راہوں کے لیے جمع کی تعبیر یہ بتانے کے لیے اختیار کی گئی ہے کہ حق ایک ہے اور باطل ایک سے زیادہ اور متعدد ہے جیسے نور ایک ہے اور تاریکیاں ایک سے زیادہ ہیں لہٰذا اگر تم کجی کے مقابلے میں راستی اور استقامت کے خواہاں ہو اور ضلالت کے مقابلے میں ہدایت کے طالب ہو تو میرے راستہ پر چلو اور دوسری راہوں پر نہ چلو - کیونکہ اس کے مقابلے میں ہر دوسرے راستہ کی پیروی انسان کو اس راہ سے ہٹا دے گی جو خدا کے قرب اور اس کی رضا تک پہنچنے کی ایک ہی راہ ہے اور اس راہ سے ہٹتے ہی بے شمار پگڈنڈیاں ہیں جن میں بھٹک کر پوری نوعِ انسانی پراگندہ ہو جاتی ہے اور اس پراگندگی کے نتیجہ میں نوعِ انسانی کا ارتقائے مطلوب ایک پریشان خواب ہو کر رہ جاتا ہے -

نبوت کا یہی راستہ ایک راستہ ہے جس میں روح کو حقیقی اطمینان حاصل ہو سکتا ہے - اس کے ماسوا جس قدر راہیں ہیں وہ تذبذب کی راہیں ہیں، وہ تفرق کی راہیں ہیں اور تردد کی راہیں ہیں، نہ روح کے لیے ان میں کچھ تسلی ہے نہ نفس کو کچھ تشفی -

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ثُمَّ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ تَمَامًا عَلَى الَّذِيْٓ اَحْسَنَ وَتَفْصِيْلًا
لِّكُلِّ شَيْءٍ وَّهُدًى وَّرَحْمَةً لَّعَلَّهُمْ بِلِقَآءِ رَبِّهِمْ
يُؤْمِنُوْنَ ۝154 وَهٰذَا كِتٰبٌ اَنْزَلْنٰهُ مُبٰرَكٌ فَاتَّبِعُوْهُ وَ
اتَّقُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝155 اَنْ تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اُنْزِلَ الْكِتٰبُ
عَلٰى طَآئِفَتَيْنِ مِنْ قَبْلِنَا ۠ وَاِنْ كُنَّا عَنْ دِرَاسَتِهِمْ
لَغٰفِلِيْنَ ۝156 اَوْ تَقُوْلُوْا لَوْ اَنَّآ اُنْزِلَ عَلَيْنَا الْكِتٰبُ لَكُنَّآ
اَهْدٰى مِنْهُمْ ۚ فَقَدْ جَآءَكُمْ بَيِّنَةٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَهُدًى وَّ
رَحْمَةٌ ۚ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ وَصَدَفَ عَنْهَا ۭ
سَنَجْزِي الَّذِيْنَ يَصْدِفُوْنَ عَنْ اٰيٰتِنَا سُوْٓءَ الْعَذَابِ بِمَا
كَانُوْا يَصْدِفُوْنَ ۝157

پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی حسن کاری کرنے والے پر اپنی نعمت پوری
کرنے کے لیے اور ہر بات کو کھول کر بیان کرنے کے لیے اور اس لیے

کہ لوگوں پر ہدایت و رحمت ہو تاکہ وہ اپنے پروردگار کی ملاقات پر ایمان لائیں[۲۰۸] اور یہ کتاب جسے ہم نے اتارا ہے سراپا برکت والی ہے لہٰذا بس اس کی پیروی کرو اور نافرمانی سے بچو تاکہ تم پر رحمت کی جائے[۲۰۹]۔ یہ کتاب ہم نے اس لیے نازل کی کہ تم یہ نہ کہو کہ خدا کی کتاب تو صرف ہم سے پہلے دو جماعتوں پر اتاری گئی ہے اور ہمیں تو ان کے پڑھنے اور پڑھانے کی خبر بھی نہ تھی[۲۱۰]۔ یا تم یہ کہو کہ اگر کتاب ہم پر نازل ہوتی تو ہم ان جماعتوں سے زیادہ ہدایت والے ہوتے لہٰذا تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک دلیل، ہدایت اور رحمت تمہارے پاس آچکی ہے[۲۱۱]۔ اب اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیات کی تکذیب کرے اور ان سے کنی کترائے، یاد رکھو کہ جو لوگ ہماری آیات سے کنی کتراتے ہیں ہم ان کو اس کنی کترانے کی پاداش میں ضرور سنگین سزا دیں گے[۲۱۲]۔

معانی مفردات

ثم پھر حرف عطف ہے۔ ماقبل سے مابعد کے متاخر ہونے پر دلالت کرتا ہے خواہ یہ متاخر ہونا بالذات ہو یا باعتبار مرتبہ کے یا وضع کے لحاظ سے ہو۔ یہاں اس بارے میں شارحین کا کچھ اختلاف ہے کہ اس جملہ کا ثم کے ذریعے کس پر عطف ہے؟ ابن جریر تو یہ فرماتے ہیں کہ یہاں قل محذوف ہے اور اصل میں عبارت ثم قل اور اس کا عطف قل تعالوا اتل ما حرم ربکم پر ہے۔ اور کشاف میں زمخشری نے لکھا ہے کہ اس کا عطف وصاکم پر ہے اور ثم تراخی کے لیے ہے۔ حافظ ابن کثیر نے ابن جریر پر یہاں تنقید کی ہے اور بتایا ہے کہ یہاں خبر کا عطف خبر پر ہے۔ پہلے اللہ سبحانہ نے ان ھذا صراطی مستقیما فرما کر قرآن کے بارے میں خبر دی تھی اب اس آیت میں ثم لا کر تورات کی تعریف ہو رہی ہے۔ اس کے علاوہ بھی شارحین قرآن نے داد تحقیق دی ہے۔ مبارک۔ برکت سے بنا ہے مصدر مبارکۃ آتا ہے اس کے معنے ہیں برکت دیا گیا یا برکت۔ یہ تورات کے مقابلے میں قرآن کی صفت بیان کی گئی ہے۔ دراستہ۔ یہ مصدر ہے اس کے معنے پڑھنے اور پڑھانے کے آتے ہیں۔ ان تقولوا یہاں ان سے پہلے لام اور ان کے بعد لا محذوف ہے۔ پوری تعبیر یوں ہے لئلا تقولوا عربی زبان میں یہ انداز بیان قانونی اور عام ہے۔ صدف، ماضی ہے اس کا مصدر صدف اور صدوف آتا ہے۔ اس کے معنے کترانے، منہ موڑنے کے ہیں۔ اصل میں صدف کے معنے سخت روگردانی کرنے کے ہیں۔ لازم اور متعدی دونوں آتے ہیں۔

ملت ابراہیم اور ملت موسیٰ کا چہرہ

پہلی آیت میں اللہ سبحانہ کے عالمگیر دین کی حقیقت ظاہر کرنے کے لیے صراط مستقیم کی تعبیر اختیار کی گئی، ان ھذا صراطی مستقیما یہی میری راہ ہے سیدھی۔ کسی مقام تک پہنچنے کے لیے خواہ آپ کتنی راہیں نکال لیں لیکن ان میں سیدھی راہ ہمیشہ ایک ہو گی اور اسی پر چل کر ہر مسافر منزل مقصود تک پہنچ جائے گا۔ علاوہ ازیں سیدھی راہ ہی ہمیشہ شاہراہ عام کی حیثیت اختیار کر لیتی ہے۔ تمام مسافر خواہ کسی گوشہ کے رہنے

والے ہوں لیکن سب مل جل کر وہی اختیار کریں گے ٹھیک اسی طرح دین کی سیدھی راہ بھی ایک ہے اور وہ اول دن سے موجود ہے۔ ہر عہد، ہر قوم، ہر ملک اسی پر چل کر منزلِ مقصود تک پہنچا ہے۔ بعد کو پیروان مذاہب نے ایسا کیا کہ اپنے میلانِ نفس اور رجحانِ طبع سے بہت سی راہیں نکال لی ہیں۔ چنانچہ یہ حقیقت بالکل واضح ہو جاتی ہے جب صراطِ مستقیم کی اس تفسیر پر نظر ڈالی جائے جو خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے پیش فرمائی ہے۔

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی انگلی سے ایک لکیر کھینچی اور فرمایا کہ یوں سمجھو کہ یہ اللہ کا ٹھہرایا ہوا راستہ ہے، بالکل سیدھا، اس کے بعد اس لکیر کے دونوں طرف بہت سی ترچھی لکیریں کھینچ دیں اور فرمایا یہ طرح طرح کے راستے ہیں جو بنا لیے گئے ہیں اور ان میں کوئی راستہ نہیں جس کی طرف بلانے والا ایک شیطان موجود نہ ہو۔ پھر یہ آیت پڑھی۔ ان ھذا صراطی مستقیما الخ

اس سے معلوم ہوا کہ تمام ادھر اُدھر کے ٹیڑھے راستے سبل متفرقہ ہیں جو انسانوں کو مجتمع کرنے کی جگہ متفرق کر دیتے ہیں۔

نبوت کی راہ کا سیدھا ہونا اور سبل متفرقہ کا پرپیچ اور خم ہونا ایک ایسی حقیقت ہے جسے ہر انسان بغیر کسی عقلی کاوش کے سمجھ سکتا ہے۔ خدا کا دین اگر انسان کی ہدایت کے لیے ہے تو ضروری ہے کہ خدا کے تمام قوانین کی طرح یہ بھی صاف اور واضح ہو۔ اس میں کوئی راز نہ ہو۔ کوئی پیچیدگی نہ ہو، ناقابل فہم تو نہ ہو، اعتقاد میں سہل ہو اور عمل میں ہلکا ہر عقل اسے بوجھ لے اور ہر طبیعت اس پر مطمئن ہو جائے۔ غور فرمایئے حضرت ابراہیم سے لے کر حضرت موسیٰ تک دین کے نام پر جن احکام کا یہاں حوالہ دیا گیا ہے وہ تعداد میں نو یا دس ہیں یہی احکام درحقیقت دُنیا کے تمام خیر و شر کی بنیاد ہیں کوئی اخلاق کی تفصیل پر دفتر کے دفتر سیاہ کر ڈالے تاہم ان احکام عشرہ کے حلقہ سے باہر نہ نکل سکے گا۔ مختصر اور سادہ عبارت میں یہ احکام حسب ذیل ہیں۔

۱۔ اللہ سبحانہٗ کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو۔
۲۔ والدین کے ساتھ حسنِ سلوک کرو
۳۔ اپنی اولاد کو فقر اور تنگدستی کے خیال سے قتل نہ کرو
۴۔ بے حیائیوں کے قریب بھی نہ جاؤ خواہ وہ ظاہر ہوں یا پوشیدہ۔
۵۔ کسی کا ناحق خون نہ کرو۔
۶۔ یتیموں کے مال میں ناحق تصرف نہ کرو۔

۷- ناپ تول میں کمی نہ کرو۔

۸- ناانصافی کی بات نہ کہو،

۹- اللہ کے عہد کو پورا کرو

۱۰- صراطِ مستقیم کا اتباع کرو۔

اب بتایا جارہا ہے کہ آدم سے لے کر حضرت موسیٰ تک ہم نے یہی ہدایت نامہ انسانی زندگی کی راہنمائی کے لیے جاری رکھا۔ اس کے بعد پھر ہم نے حضرت موسیٰ کو تورات دی اور دوسرے احکام و قوانین بتائے پہلے گویا ملتِ ابراہیم تھی اور اب یہ ملتِ موسیٰ کا ذکر ہو رہا ہے۔ حضرت موسیٰ کو جو کتاب دی گئی اس کی اساس بھی یہی احکامِ عشرہ ہیں۔ انشاء اللہ ہم پندرھویں جلد میں تورات سے اس کا تقابلی مطالعہ بھی پیش کریں گے۔

۲۰۸- اور پھر ہم نے موسیٰ کو کتاب دی حسن کاری کرنے والے پر اپنی نعمت پوری کرنے کے لیے اور ہر بات کو کھول کر بیان کرنے کے لیے اور اس لیے کہ لوگوں پر ہدایت و رحمت ہو تاکہ وہ اپنے پروردگار کی ملاقات پر ایمان لائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو احکام اوپر قل تعالوا اتل ماحرم علیکم ربکم سے پڑھ کر سنائے گئے یہ ہمیشہ سے جاری تھے۔ تمام انبیاء اور شرائع کا ان پر اتفاق تھا۔ بعدہٗ حق تعالیٰ نے حضرت موسیٰ پر تورات اتاری جس میں احکامِ شرع کی مزید تفصیل تھی۔ تورات عطا فرما کر اس زمانے کے نیک کام کرنے والے لوگوں پر خدا نے اپنی نعمت پوری کر دی۔ ہر ضروری چیز کو شرح و بسط سے بیان فرمادیا اور ہدایت و رحمت کے دروازے کھول دیے تاکہ اسے سمجھ کر لوگ اپنے پروردگار سے ملنے کا یقین حاصل کریں[۱]

جیسے پہلے بتایا جا چکا ہے کہ ثم حرفِ عطف کے ذریعے اس آیت کو ماقبل کے ساتھ مربوط کرنے میں شارحینِ قرآن کا اختلاف ہے لیکن ہمیں زمخشری کی رائے قابلِ ترجیح معلوم ہوتی ہے کہ اس کا عطف ذالکم وصاکم بہ لعلکم تتقون فعل وصاکم پر ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ وصاکم کا خطاب پوری انسانیت سے از آدم تا ایندم ہے اور ثم واقعی تراخی کے لیے اور مطلب یہ ہے کہ اے انسانو! ہم نے تم کو آغازِ آفرینش سے ان احکام کی پابجائی کی وصیت کی تھی اور تمام انبیاء کی شریعتوں میں یہی احکام رہے ہیں۔ یعنی یہی احکام تمام پیغمبروں کے ادیان کا مشترکہ سرمایہ رہے ہیں، تا آنکہ موسیٰ علیہ السلام کو ہم نے کتاب دی۔ حضرت موسیٰ کو جو کتاب دی گئی اس میں بھی بنیادی احکام یہی تھے۔ آپ کو سب سے پہلے جو احکام لکھ کر دیے گئے احکامِ عشرہ کے نام سے مشہور ہیں۔ اس کے بعد قرآن نے حضرت

---

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

موسیٰ کو کتاب دینے کی وجوہات سے بحث کی ہے۔

پہلی وجہ یہ بتائی ہے تماما علی الذی احسن یعنی نیکوکاری کی روش پر چلنے والے انسان پر اتمامِ نعمت کی خاطر ہم نے یہ کتاب نازل کی ہے۔ اس سے مراد ایک شخص ہے یا جماعت، قاضی بیضاوی نے دونوں لکھے ہیں لیکن ہماری رائے میں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی رائے قابلِ ترجیح ہے کہ الذی احسن سے مراد خود حضرت موسیٰ کی ذات گرامی ہے۔ حضرت موسیٰ کے لیے یہاں یہ صفت اسی طرح آئی ہے جیسے سورہ نجم میں حضرت ابراہیم کے تعارف میں الذی وفی آیا ہے۔ مقصد یہ بتانا ہے کہ حضرت موسیٰ کی ذات گرامی میں اس اتمامِ نعمت کو قبول کرنے کی پوری پوری صلاحیت تھی یعنی اللہ نے ان کو اس نعمت سے اس لیے نوازا ہے کہ وہ زندگی کے تمام گوشوں میں حسن کار تھے۔ احسان کے معنے حسن کاری کرنے کے ہیں۔ اللہ نے ان کے ظاہر و باطن میں جو کچھ ان کو بخشا اس کا حق انہوں نے پہچانا اور ہر معاملہ میں صرف کرنے کا نہیں بلکہ حسن کاری کا مظاہرہ کیا۔ اسی محنت و مشقت اور جانفشانی کی بنیاد پر یقیناً وہ اس کے مستحق تھے کہ اللہ کی نعمتوں کا اتمام ہو۔ کیونکہ ان کی پوری زندگی خالق و مخلوق کے باہمی تعلقات کی تصحیح میں حسن کارانہ مجاہدوں کے ساتھ بسر ہوئی ہے۔ اور جب وہ کسی کو منصب نبوت کے انتخاب کرنا چاہتا ہے تو وہ ایسے ہی حسن کار کو منتخب کرتا ہے جو علوم کو حالات اور حالات سے مقامات کی حد تک پہنچا دیتا ہے۔

دوسری وجہ یہ بتائی ہے کہ تفصیلا لکل شیئ، موسیٰ علیہ السلام کو کتاب اس لیے دی گئی ہے کہ ان اصول و مبادی کی جو پہلے سے انبیاء کی شریعت میں موجود تھے جو ملت ابراہیمی کا سرمایہ تھے ان میں سے ہر چیز کی ان کے زمانہ کی استعداد کے مطابق مثلاً عبادات تمدنی معاملات تعزیری قوانین اور دفاعی ضوابط کی تفصیل کر دی جاتے اور دین کی زندگی میں انسانوں کو جس چیز کی ضرورت ہو اسے کھول کر بیان کر دیا جاتے۔

تیسری وجہ یہ بتائی ہے وھدیً یعنی یہ کتاب حضرت موسیٰ اس لیے دی گئی تھی کہ انسانوں کو زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ بتاتے جو اللہ کی رضا پر پورا اترے اور ان کو فلاح و سعادت کی راہ چلا۔ ے بدعملیوں سے روکتی رہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس صراط مستقیم کی رہنما بن کر رہے جس پر چلنے کا تمام انبیاء نے مطالبہ کیا ہے۔ ہدایت ہی کتاب الٰہی کا بنیادی مقصد ہوتا ہے۔

آخری وجہ یہ بتائی ہے ورحمۃ یعنی ہم نے حضرت موسیٰ کو تورات اس لیے دی ہے کہ وہ آخرت میں اور دنیا میں خدا کے بندوں کو خدا کی رحمت کا سزاوار بناتے اور اپنے انجام کے اعتبار سے ان کے لیے رحمت ہو یعنی ظلم و قساوت اور بغض و تنفر سے اپنے ماننے والوں اور برتنے والوں کو بچاتے اور رحم و محبت اور امن و عافیت کی روح سے ان کو معمور کرے۔

بالکل آخر میں بتایا کہ ان اوصاف پر مشتمل یہ کتاب ہم نے اس بنیادی مقصد کی خاطر دی ہے کہ لوگ اللہ کی ملاقات پر ایمان لائیں اور اسے مقصد زندگی بنا کر زندگی گزاریں۔ رب کی ملاقات پر ایمان لانے سے مراد یہ ہے کہ ہر شخص اپنے آپ کو اللہ کے سامنے جواب دہ سمجھ کر ذمہ دارانہ زندگی گزارے۔

قرآن آخری اور مکمل کتاب ہے

۲۰۹ - اور یہ کتاب جسے ہم نے اتارا ہے سراپا برکت والی ہے لہٰذا بس اس کی پیروی کرو اور نافرمانی سے بچو تاکہ تم پر رحمت کی جائے۔ یعنی تورات تو جیسی بھی جیسی کچھ تھی لیکن ایک یہ کتاب ہے قرآن کریم جو اپنے درخشاں اور ظاہر و باہر حسن و جمال کے ساتھ تمہارے سامنے ہے اس کی خوبصورتی اور کمال کا کیا کہنا۔ ؎

آفتاب آمد دلیل آفتاب

اس کی ظاہری و باطنی برکات اور صوری و معنوی برکات و کمالات کو دیکھ کر بے اختیار کہنا پڑتا ہے۔

بہار عالم حسنش دل و جاں تازہ مے دارد
برنگ اصحاب صورت را بہ بو ارباب معنیٰ را

اب دائیں اور بائیں دیکھنے کی ضرورت نہیں۔ اگر خدا کی رحمت سے حظ وافر لینا چاہتے ہو تو اس آخری اور مکمل کتاب پر چل پڑو اور خدا سے ڈرتے رہو کہ اس کتاب کے کسی حصہ کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے[1] پہلے تورات کا ذکر تھا اب یہاں اس کے مقابلے میں قرآن کا ذکر کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ قرآن بسا اوقات قرآن اور تورات کا تقابلی مطالعہ پیش کرتا ہے۔ مثلاً سورہ ہود میں ہے۔

و من قبلہ کتاب موسیٰ اماما و رحمۃ و ھذا کتاب مصدق

سورہ انعام میں آیت ۹۱ اور ۹۲ میں بھی تقابلی مطالعہ پیش ہو چکا ہے۔

یہاں قرآن کا جوہری وصف مبارک پیش کیا ہے۔ قرآن کا یہ وصف تورات کے مقابلے میں دو وجہ سے اہمیت رکھتا ہے اور اس کی اہمیت کی شان جملہ اسمیہ ہونے کی وجہ سے دو بالا ہو گئی۔ مبارک ہونے کی پہلی وجہ یہ ہے کہ یہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں پر مشتمل ہے اس لیے جو کوئی اس کو قبول کرتا ہے وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیموں کو قبول کر لیتا ہے یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسری کتاب کو حاصل نہیں ہے۔ اسی اعتبار سے قرآن کو مہیمن کہا گیا ہے۔ قرآن کے مبارک ہونے کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن سے پہلے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کوئی کتاب الٰہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر محفوظ نہیں رہی۔ لاکھوں پیغمبروں میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دُنیا میں باقی نہیں اور جو باقی ہے وہ فنا ہو ہو کر نئے نئے قالب میں بدلتا رہا ہے۔ تورات جل جل کر خاک ہوئی۔ پھر ان سوختہ اوراق سے تحریر کی گئی اور تراجم کی تحریفات سے اپنی اصل کھو بیٹھی۔ انجیل میں تحریف و جعل تو اسی زمانے میں شروع ہو چکا تھا۔ پھر مترجموں کی کثرت یوت نے حقیقت بالکل مشتبہ کر دی۔ زردشت کا صحیفہ سکندر کی نذر ہوا۔ ان کتابوں کا یہ حال اس لیے ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو دائمی مبارک اور آخری کتابیں بنا کر نہیں بھیجا تھا۔ قرآن کو مبارک دائمی اور آخری کتاب بنا کر روانہ کیا۔ اس کی بقا و حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ نے اپنے ذمہ لی اور اعلان کیا د انالہ لحافظون بیگانے تو بیگانے اب بیگانے بھی اعتراف کر رہے ہیں مستشرقین اور یورپی محققین جو قرآن کو الہامی کتاب نہیں مانتے وہ بھی اس سے متفق ہیں۔ ہم یہاں کچھ مسیحی محققین کے خیالات درج کرتے ہیں۔ سر ولیم میور جو اسلام اور پیغمبر اسلام کے متعلق اپنے تعصب میں مشہور ہیں وہ اپنی کتاب لائف آف محمد میں لکھتے ہیں :

> حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے ربع صدی بعد کے اندر ہی ایسے شدید مناقشات اور فرقہ بندیاں پیدا ہو گئیں جس کے نتیجے میں حضرت عثمان شہید ہو گئے اور یہ اختلافات آج بھی باقی ہیں لیکن ان سب فرقوں میں قرآن ایک ہی ہے۔ ہر زمانہ میں تواتر کے ساتھ ان سب فرقوں کا ایک ہی قرآن پڑھنا اس بات کا ناقابل تردید ثبوت ہے کہ آج ہمارے سامنے وہی صحیفہ ہے جو اس بدقسمت خلیفہ کے حکم سے تیار کیا گیا تھا۔ شاید پوری دُنیا میں کوئی دوسری کتاب ایسی نہیں جس کی عبارت بارہ صدیوں تک اس طرح بغیر تبدیلی کے باقی رہی ہو۔ قرآن میں قرأت کے اختلافات بھی حیرت انگیز طور پر بہت کم تعداد میں ہیں اور یہ بھی ان اعراب کی وجہ سے جو بہت بعد کے زمانے میں لگائے گئے۔

دھیری اپنی تفسیر قرآن میں لکھتا ہے کہ تمام قدیم صحیفوں میں قرآن سب سے زیادہ غیر محفوظ اور خالص ہے۔ قرآن کا مشہور انگریزی مترجم پامر لکھتا ہے کہ حضرت عثمان کا ترتیب دیا ہوا قرآن کا متن اس وقت سے آج تک طے شدہ اور مسلمہ صحیفہ رہا ہے۔

لین پول کہتا ہے :

> قرآن کی بڑی خوبی یہ ہے کہ اس کی اصلیت میں کوئی شبہ نہیں ہے۔ ہر حرف جو ہم آج پڑھتے ہیں اس پر بہ اعتماد کر سکتے ہیں کہ تقریباً تیرہ صدیوں سے غیر مبدل رہا ہے[1]

[1] یہ شہادتیں مولانا ابوالحسن کے خطبات (منصب نبوت) سے ماخوذ ہیں۔

آیت میں لفظ مبارک صیغہ صفت ہونے کی وجہ سے برکت کے اسی دوام کو بتلا رہا ہے۔ مبارک ہی کی تعبیر قرآن نے خانۂ کعبہ کے لیے اختیار کی ہے ان اول بیت وضع للناس للذی ببکۃ مبارکاً و ھدی للعالمین جیسے خانۂ کعبہ سے برکات کا جدا ہونا ممکن نہیں اور اس میں دوام ہے ایسے ہی قرآن سے برکات کا جدا ہونا ممکن نہیں ہے۔ لفظ مبارک اس بارش کے لیے قرآن میں آیا ہے جو زمین کی سیرابی روئیدگی، سرسبزی کا ذریعہ بنتی ہے اس کے خزانوں، اس کی برکتوں کو ابھارتی ہے اور اس کے مردہ اور بے آب و گیاہ ہونے کے بعد اس کو از سر نو حیاتِ تازہ بخشتی ہے۔ جیسے قرآن کے لیے اس لفظ کے استعمال میں یہ استعارہ ہے کہ یہ بھی دنیا کو اس کی روحانی موت کے بعد از سر نو حیاتِ تازہ بخشنے کے لیے نازل ہوا ہے ایسے ہی اس لفظ کو صفت کا صیغہ بنا کر لانے میں اس کے دوام کی طرف بھی اشارہ ہے۔

قرآن کا یہ جوہری وصف بیان کرنے کے بعد پوری انسانی زندگی سے اللہ سبحانہٗ نے دو مطالبے کیے ہیں ایک یہ کہ اسی کا اتباع کرو، دوسرے یہ کہ اس کی نافرمانی سے بچو۔ اگر یہ دو کام تم نے کر لیے تو پھر تم اس لائق ہو کہ تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ اتباع یہ کہ اس کے اوامر کی پابجائی کی جائے اور اتقا یہ کہ اس کے نواہی سے بچا جائے۔ بالفاظِ دیگر فرائض کی ادائیگی کرو اور محرمات سے دامن بچا کر رکھو۔ اگر فکرِ صحیح کے ساتھ ان دو باتوں کو اپنا لوگے تو خدا کی رحمت تمہاری طرف متوجہ ہو جائے گی۔

نزولِ قرآن سے معذرت کا خاتمہ

۲۱۰ - یہ کتاب ہم نے اس لیے نازل کی کہ تم یہ نہ کہو کہ خدا کی کتاب تو صرف ہم سے پہلے دو جماعتوں پر اتاری گئی ہے اور ہمیں تو ان کے پڑھنے اور پڑھانے کی خبر بھی نہ تھی۔ یعنی اس مبارک کتاب قرآن حکیم کے نزول کے بعد عرب کے امیین کے لیے یہ کہنے کا موقعہ نہیں چھوڑا گیا کہ بیشتر جو آسمانی کتابیں شرائع الٰہیہ کو لے کر اتریں وہ تو ہمارے علم کے موافق ان ہی دو فرقوں یہود و نصاریٰ پر اتریں بے شک وہ لوگ آپس میں اسے پڑھتے پڑھاتے تھے اور بعضے اس کا ترجمہ بھی عربی میں کرتے تھے۔ مثلاً ورقہ بن نوفل وغیرہ، اور بہت سے مدت تک اس دھن میں لگے رہے کہ عرب کو یہودی یا نصرانی بنالیں لیکن ہمیں ان کی تعلیم و تدریس سے کوئی سروکار نہ تھا۔ اس سے بحث نہیں کہ یہود و نصاریٰ جو کچھ پڑھتے پڑھاتے تھے وہ چیز کہاں تک اپنی اصلی مادی صورت میں محفوظ تھی۔ مطلب صرف اس قدر ہے کہ ان شرائع اور کتب کی اصلی مخاطب فقط قوم بنی اسرائیل تھی خواہ وہ اس تعلیم کے بعض اجزاء مثلاً توحید اور اصولِ دینیہ کی دعوت کو وسعت دے کر بنی اسرائیل کے سوا دوسری اقوام کے حق میں بھی عام کر دیا گیا ہو تاہم جو شریعت اور کتابِ سماوی

بحیثیتِ مجموعی کسی خاص قوم پر اسی کے مخصوص فائدے کے لیے اتری ہو۔ اس کے درس و تدریس سے اگر دوسری اقوام خصوصاً عرب جیسی غیور قوم کو دلچسپی اور لگاؤ نہ ہو تو کچھ مستبعد نہیں۔ بنابریں وہ کہہ سکتے تھے کہ کوئی آسمانی کتاب و شریعت ہماری طرف نہیں آئی اور جو کسی مخصوص قوم کے لیے تھی اس سے ہم نے چنداں واسطہ نہیں رکھا۔ پھر ہم ترکِ شرائع پر کیوں ماخوذ ہوں گے مگر آج ان کے لیے اس طرح کے حیلے حوالوں کا موقع نہیں رہا[1] مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تم پر یہ رحمت اس لیے نازل فرمائی کہ مبادا کل کو تم خدا کے سامنے یہ عذر کرو کہ جس طرح بنی اسرائیل کو کتاب ملی آخر بنی اسماعیل کو اسی طرح کی کتاب کیوں نہیں ملی۔ ہمیں ان کے علوم سے کیا واسطہ۔ دراصل پہلے قرآن کو مبارک فرما کر اس عالمگیر برکت کی طرف اشارہ کیا ہے جس کی بشارت عرب کے بارے میں حضرت ابراہیم کو دی گئی تھی۔ پیدائش باب ۲۲ میں ہے:

خداوند فرماتا ہے اس لیے کہ تو نے ایسا کام کیا اپنا بیٹا اور اپنا اکلوتا بیٹا دریغ نہ رکھا میں نے قسم کھائی کہ میں تجھے برکت پر برکت دوں گا اور تیری نسل سے زمین کی ساری قومیں برکت پائیں گی کیونکہ تو نے میری بات مانی۔

اس برکت کے پورا ہونے اور ان کا حقیقی مصداق بننے کے لیے نسلِ ابراہیم کی ضرورت تھی اس لیے اللہ نے بنی اسماعیل میں حضورِ انور روانہ فرماتے اور آپ پر قرآن نازل کیا۔ اب اہلِ عرب یہ نہیں کہہ سکیں گے کہ ہم نسلِ ابراہیم ہونے کے باوجود برکات سے محروم رہے اور فقرہ "وان کنا عن دراستھم" کا مطلب یہ ہے کہ وہ ان تمام اثرات سے محفوظ رہے جو قوموں کے عادات و اخلاق کو بدل دیتے ہیں۔ مثلاً باوجود اس کے کہ وہ ہر چہار طرف سے مختلف بڑے بڑے مذہبوں سے ٹکرا رہے تھے مگر کوئی مذہب ان کو فتح نہیں کر سکا۔ یہودیت یمن اور حجاز کی تجارت گاہوں پر قابض تھی، عیسائیت اپنی فوج و لشکر اور راہبوں اور قسیسوں کے دل یمن سے لے کر شام کی حدود تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور بعض افراد اور بعض قبیلوں کو وہ برائے نام عیسائی بھی بنا چکے تھے مگر پورا عرب بدستور اپنی خالص حالت پر تھا۔ عرب میں جو نیک طبع ہوتے وہ یہودی یا نصرانی ہونے کے بجائے اپنے کو دینِ ابراہیمی کا پیرو کہتے تھے اور اسی لیے اپنے مذہب کا نام دینِ حنیفی رکھتے تھے۔ یہ سب اس لیے ہو رہا تھا کہ ان کے ذریعے دینِ ابراہیمی کی دعوت و تجدید کا راستہ کھلا رہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

قرآن خدا کی عظیم بینہ ہے

۲۱۹ - یا تم یہ کہو کہ اگر کتاب ہم پر نازل ہوتی تو ہم ان جماعتوں سے زیادہ ہدایت والے ہوتے لہٰذا تمہارے پروردگار کی جانب سے ایک دلیل ہدایت رحمت تمہارے پاس آچکی ہے۔ یعنی پہلی اُمتوں کا حال سن کر تم کو رشک ہوتی اور دل میں ولولہ اٹھتا کہ ہمارے پاس خدا کی کتاب آتی تو ہم دوسروں سے بڑھ کر عمل کر کے دکھلاتے سو تم کو ان سے بہتر کتاب دی گئی۔ خدا کی حجت اس کی روشن کتاب اور ہدایت و رحمت عامہ کی بارش خاص تمہارے گھر میں اتاری گئی تاکہ وہ اولاً اس سے مستفید ہوں، پھر اس امانتِ الٰہیہ کو تمام احمر و اسود اور مشرق و مغرب کے باشندوں تک حفاظت و احتیاط کے ساتھ پہنچا دیں کیونکہ یہ کتاب کسی قوم کے لیے نہیں اتاری گئی، اس کا مخاطب تو سارا جہان ہے۔ چنانچہ خدا کے فضل و کرم سے عرب کے ذریعہ سے خدا کا یہ عام پیغام آج دُنیا کے گوشہ گوشہ میں پہنچ گیا۔ الحمد للہ علی ذالک[1]

قرآن کے لیے یہاں ہدایت و رحمت کے ساتھ بینہ کا لفظ بولا ہے۔ بینہ کے معنے روشن دلیل اور حجت قاطعہ کے ہیں۔ قرآن کی حیثیت صرف کتاب کی نہیں بلکہ نبوتِ محمدیہ کے لیے ایک علمی اعجاز کی ہے اس لیے اسے بینہ کہا ہے۔ بینہ وہ ہے جس کے ذریعے حق کا اظہار ہو۔ قرآن عقائد کو دلائل کے ساتھ اور فضائل و آداب، اصُولِ قانون کو انسانی زندگی کے اجتماعی تقاضے کے مطابق پیش کرتا ہے۔

قرآن کے بینہ ہونے کے لیے ذرا اس پر غور فرمائیے کہ ایک اُمی محض جو اُمیوں کی گود میں پلا ہوا، پل کر جوان ہوا، اس نے ہوش سنبھالا تو گرد و پیش تاریکیوں اور ظلمتوں کے سوا کچھ نظر نہیں آیا۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن ایک عاری ملک عاری شہر اور عاری خاندان کے اندر نشو و نما پاتی، جہاں اہلِ فکر اور اربابِ علم کا وجود نہ تھا وہ خود اس کا خاندان اور اس کا وطن نوشت و خواند کے نقوش و حروف سے ناآشنا تھا۔ گزشتہ صحفِ انبیاء اور افکارِ عالیہ کا ایک حرف اس کے کان میں کبھی نہ پڑا تھا اور دانشوروں کی صحبت اس نے نہیں اٹھائی تھی۔ اصُولِ قانون، مبادی اخلاق، محاسنِ علم و عمل کی کوئی ظاہری تعلیم اس کو نہیں ملی بلکہ مدرسہ علم و حکمت کے سایۂ دیوار تک کبھی اس کا گزر بھی نہیں ہوا اور اسی طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس دورے پورے کرتا ہے کہ دفعتہً غارِ حرا کے ایک دہانے سے اجالا ہوتا ہے۔ علوم و فنون اور تہذیب و تمدن کا سرچشمہ اُبلتا ہے۔ ظاہری نوشت و خواند کے نقوش و حروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے، صحفِ انبیاء اور

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

افکارِ عالیہ کے ادراق اس کی زبان پر جاری ہوجاتے ہیں اس کے پرتوِ صحبت سے اُمّی اور جاہل علمائے دہر اور دانشورانِ روزگار بن کر نکلنے لگتے ہیں۔ اصولِ قانون مبادی اخلاق اور محاسنِ علم و عمل کی تعلیم کا غلغلہ اس کی بزمِ فیض کے گوشہ گوشہ سے بلند ہوتا ہے۔ کلامِ ربانی کے پردے سے علم و حکمت کے پوشیدہ اسرار فاش ہونے لگتے ہیں۔ اس سے بڑھکر قرآن حکیم کے بیمثل ہونے کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے۔

تورات قانون شریعت ہے لیکن اخلاق اور موعظت نہیں انجیل اخلاق و موعظت ہے لیکن قانون و شریعت نہیں۔ زبور مخاطباتِ قلبی اور دعاؤں کا مجموعہ ہے لیکن دیگر صفات سے خالی۔ مسیح کے صحیفے میں خطابت کی ہنگامہ آرائیاں ہیں مگر استدلال اور فکر و نظر کی دعوت نہیں۔ صحفِ بنی اسرائیل پیشین گوئیوں سے لبریز ہیں مگر دقائق حکمت اور اسرارِ ایمان و عمل سے خالی ہیں۔ دُنیا میں ایک ہی کتابِ الٰہی ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اور اخلاقِ موعظت بھی، مخاطباتِ قلبی اور دُعاؤں کا گنجینہ بھی ہے۔ اور دیگر کتبِ الٰہیہ کی مجموعی صفتوں کی حامل بھی، خطابت بھی ہے اور استدلال و فکر بھی، اظہارِ غیب اور پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے۔ اور دقائق حکمت و اسرارِ ایمان و عمل سے معمور بھی اور ان سب کے ساتھ عین اس وقت جب اور کتبِ الٰہی تحریف اور تغیر اور تراجم و تغیر سے اپنی اصلی زبان اور اصلی الفاظ کھو چکی ہیں۔ اس کی بقا اور حفاظت کی یہ ذمہ داری کہ تیرہ برس کے بعد بھی اس کے ایک لفظ ایک حرف ایک نقطہ میں تغیر و تبدل نے راہ نہیں پائی۔ وہ اپنی زندگی جاوید کے لیے کاغذ کے نقوش و حروف کی محتاج نہیں کہ لاکھوں انسانوں کے سینے اس خزانے کے صندوق ہیں اور وہ اسی زبان اور انہی الفاظ اور انہی حروف کے قالب میں اب تک جلوہ گر ہے جس میں دستِ قدرت نے اسے ڈھالا تھا اور جبریل امین نے اسے اتارا تھا۔ اور محمد عربی نے اس کو اُمت کے ہاتھوں سونپا تھا کیا یہ بیّنہ نہیں ہے۔

قرآن سے روگردانی کا انجام

۲۱۲- اب اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہے جو اللہ کی آیات کی تکذیب کرے اور ان سے کنی کترائے، یاد رکھو کہ جو لوگ ہماری آیات سے کنی کتراتے ہیں ہم ان کو کنی کترانے کی پاداش میں ضرور سنگین سزا دیں گے۔ یعنی اب ایسی بے مثال روشن کتاب آنے کے بعد اگر اس کی آیتوں کو کوئی جھٹلائے اور اس کے احکام کو قبول کرنے سے کترائے یا دوسروں کو روکے اس سے بڑا ظالم کون ہوگا۔ صدف عنہا کے دونوں معنے سلف سے منقول ہیں روکنا اور اعراض کرنا حضرت شیخ الہند نے دوسرے معنے لے کر کترائے ترجمہ کیا ہے [1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

صدف لازم اور متعدی دونوں آتا ہے یعنی اعراض کرنا اور منہ پھیرنے کے معنے میں بھی اور کسی کو اس سے پھیرنے اور موڑنے کے معنے میں بھی۔ جن لوگوں نے اسے متعدی کے معنے میں لیا ہے ان کی بات قوی معلوم ہوتی ہے۔ اس سے پہلے کذب بآیات اللہ ہے جس کے اندر اعراض اور روگردانی کا مفہوم ہے۔ اس کے بعد موزوں بات یہی معلوم ہوتی ہے کہ اس کو متعدی معنے ہی میں لیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جنہوں نے آیات الٰہی کی تکذیب کی اور دوسروں کو اس کے سننے سے روکا۔ چنانچہ کبرائے قریش تکذیب کرتے تھے اور عرب کے عام شہریوں کو حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے سے روکتے تھے اور اس لیے روکتے تھے کہ وہ قرآن نہ سن سکیں کہ اس کے نتیجہ میں حلقہ بگوش اسلام ہو جائیں۔ متعدی فعل کی صورت میں ان کا جرم صرف ضلال نہیں بلکہ اضلال بھی ہوگا۔ استفہام انکاری ہے یعنی ایسے شخص سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہے جو اللہ کی آیات کی تکذیب کرتا ہے اور خود اس سے روگرداں ہوتا ہے اور اسی پر اکتفا نہیں کرتا بلکہ لوگوں کو اس سے روکتا ہے۔ ان کی سزا کیا ہے؟ اس کو یہاں بتایا ہے کہ اس کردار رکھنے والے ظالموں کو ان کی اس روگردانی سے روکنے کی پاداش میں بدترین سزا ملے گی۔ اس میں عذاب ملنے کا سبب علیحدہ بتایا ہے حالانکہ الذین یصدفون میں بیان ہو چکا تھا لیکن پھر تصریح فرمائی بما کانوا یصدفون۔ اسی طرح کی تعبیر سورہ نحل میں بھی آئی ہے۔

الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ زدناھم عذاباً فوق العذاب بما کانوا یفسدون

جن لوگوں نے خود کفر کی راہ اختیار کی اور دوسروں کو اللہ کی راہ سے روکا انہیں عذاب پر عذاب دیں گے اس فساد کے بدلے جو وہ دنیا میں کرتے تھے۔

یعنی ایک عذاب خود کفر کرنے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو راہ خدا سے روکنے کا۔ یہاں بھی یوں ہی سمجھو کہ مطلق عذاب تو ہوگا آیات سے خود روگردانی کا اور بدترین عذاب ہوگا لوگوں کو اللہ کی آیات سے روکنے کا۔ اس طرح ایک ہی آیت میں صدف لازم اور متعدی دونوں طرح آیا ہے۔ جیسے یہاں اس دھمکی سے پہلے قرآن کے بینہ، ہدایت اور رحمت ہونے کا ذکر ہے اسی طرح سورہ نحل میں عذاب کی دھمکی کے بعد قرآن کے بیان، ہدایت، رحمت اور اہل ایمان کے لیے بشارت ہونے کا ذکر ہے۔

ونزلنا علیک الکتاب تبیاناً لکل شیءٍ وھدی ورحمۃ وبشری للمسلمین۔

ہم نے یہ کتاب تم پر نازل کی ہے جو ہر چیز کو صاف صاف وضاحت سے بیان کرنے والی ہدایت رحمت اور ان کے لیے بشارت ہے جنہوں نے سر طاعت خم کر دیا ہے۔

یعنی جو لوگ آج اس کو مان لیں گے اور اطاعت کی راہ اختیار کر لیں گے ان کو یہ زندگی کے ہر معاملہ میں صحیح رہنمائی دے گی اور اس کی پیروی کی وجہ سے ان پر اللہ کی رحمتیں ہوں گی اور انہیں یہ کتاب خوشخبری دینے گی کہ

فیصلے کے دن اللہ کی عدالت میں وہ کامیاب ہوں گے، برخلاف اس کے کہ جو لوگ اس کو نہ مانیں گے وہ صرف یہی نہیں کہ ہدایت و رحمت سے محروم رہیں گے بلکہ قیامت کے روز جب خدا کے پیغمبر ان کے مقابلے میں گواہی دینے کھڑے ہوں گے تو یہی دستاویز ان کے خلاف ایک زبردست حجت ہوگی ۔

هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّآ اَنْ تَاْتِيَهُمُ الْمَلٰٓئِكَةُ اَوْ يَاْتِيَ رَبُّكَ اَوْ يَاْتِيَ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ ؕ يَوْمَ يَاْتِيْ بَعْضُ اٰيٰتِ رَبِّكَ لَا يَنْفَعُ نَفْسًا اِيْمَانُهَا لَمْ تَكُنْ اٰمَنَتْ مِنْ قَبْلُ اَوْ كَسَبَتْ فِيْۤ اِيْمَانِهَا خَيْرًا ؕ قُلِ انْتَظِرُوْۤا اِنَّا مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۵۸﴾

کیا پھر یہ لوگ اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ آسمان سے ان کے پاس فرشتے آجائیں یا خود آپ کا پروردگار آجائے یا پھر آپ کے پروردگار کی کچھ نشانیاں نمودار ہو جائیں جس روز آپ کے پروردگار کی کچھ نشانیاں نمودار ہوں گی اس روز کسی انسان کو جو پہلے سے ایمان نہ لا چکا ہو یا اپنے ایمان میں نیکی نہ کمائی ہو ایمان لانا سودمند نہ ہو گا، اے پیغمبر آپ کہہ دیجئے تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔

معانی مفردات

الملائکۃ یہ لفظ جمع ہے اس کا واحد ملک، ملاک اور مالک تین طرح سے استعمال ہوتا ہے

اس کے لغوی معنے قاصد اور رسول کے ہیں۔ ان سے مراد وہ غیر مادی مخلوق نیک ہستیاں یا ارواح ہیں جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق عالم اور اس کے اسباب و علل کے کاروبار کو چلا رہی ہیں۔ آیات، آیت کی جمع ہے اس کے معنے نشانی اور علامت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم و احساس کے جو ذرائع عطا کیے ہیں وہ حقیقت میں صرف آیات و علامات کی شناخت اور یاد ہے۔ دنیا میں جس قدر چیزیں ہیں تم ان کو کس طرح جانتے ہو۔ صرف آیات و علامت سے۔ کلیات سے لے کر جزئیات تک جو کچھ ہم کو خارج سے علم حاصل ہوا ہے وہ محض نشانیوں کو دیکھ کر ہم جانتے ہیں خدا شناسی کی آیات، نبی شناسی کی آیات اور قیامت شناسی کی آیات کو اسی لیے آیات کہا جاتا ہے۔ آیات دو قسم کی ہیں تکوینی اور تشریعی۔ یہاں آیات رب سے قیامت کی علامات مراد ہیں۔ ایمان، یہ امن سے بنا ہے۔ اس کے لغوی معنے ماننے کے ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ رح فرماتے ہیں کہ ایمان لغت میں اگرچہ تصدیق کے لیے ہی استعمال ہوا ہے مگر شارع نے اس لفظ کو جب استعمال کیا ہے تو ایک خاص نوع کی تصدیق کے لیے استعمال کیا ہے اس لیے قرآن و سنت میں اس لفظ سے وہی تصدیق مراد ہو گی جو اس کے تکرار سے متعین ہو چکی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان صرف تصدیق نہیں ہے بلکہ انقیاد قلبی اور التزام طاعت بھی اس کا اہم حصہ ہے۔ اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہد وفاداری نہیں کرتا وہ مومن نہیں کہلا سکتا اور اسی طرح اگر فرمانبرداری کے لیے تو آمادہ ہے مگر قلب و زبان سے تصدیق نہیں کرتا تو وہ بھی مومن نہیں ہے۔ ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور شریعت پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی پکا ہو۔ گویا شرعی تصدیق اسی کا نام ہے۔

ایمان صرف اختیاری معتبر ہے

یہاں تک آداب و فضائل کی حد تک اصول دین بیان ہو چکے ہیں۔ آخر میں ان کی فرسودہ معذرت کو بھی بتا دیا ہے۔ اب ان سے کہا جا رہا ہے کہ ان تنبیہات و تہدیدات کے بعد بھی جو لوگ جادۂ مستقیم پر ہموار نہ ہو سکے بلکہ شیطان کے پیچھے بھٹکتے رہ گئے اب بھی اگر وہ کسی چیز کے منتظر ہیں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ اس کے خواہش مند ہیں کہ غیبی نشانی کے ذریعے ان کو ایمان پر مجبور کر دیا جائے اور اختیاری طور پر ایمان نہیں بلکہ اضطراری طور پر راہ ایمان کو اپنائیں۔ لیکن اضطراری ایمان کی کوئی قدر و قیمت نہیں۔ ایمان ارادی و اختیاری

ہی معتبر ہے۔ اس دُنیا میں انسان کی ساری آزمائش صرف اس بات میں ہے کہ وہ حقیقت کو دیکھے بغیر مانتا ہے یا نہیں اور ماننے کے بعد اتنی اخلاقی طاقت رکھتا ہے یا نہیں کہ نافرمانی کا اختیار رکھنے کے باوجود فرمانبرداری اختیار کرے چنانچہ اللہ سبحانہٗ نے انبیاء کی بعثت میں کتابوں کی تنزیل میں حتیٰ کہ معجزات تک میں عقل کے امتحان اور اخلاقی قوت کی آزمائش کا ضرور لحاظ رکھا ہے اور کبھی حقیقت کو اس طرح بے پردہ نہیں کر دیا ہے کہ آدمی کے لیے مانے بغیر چارہ نہ رہے کیونکہ اس کے بعد تو آزمائش بالکل بے معنی ہو جاتی ہے اور امتحان میں کامیابی و ناکامی کا کوئی مفہوم ہی باقی نہیں رہتا۔ اسی لیے یہاں فرمایا ہے کہ اس وقت کا انتظار نہ کرو کہ جب اللہ اور اس کی سلطنت کے کارکن فرشتے خود سامنے آجائیں گے کیونکہ پھر تو فیصلہ ہی کر ڈالا جائے گا۔ ایمان لانے اور اطاعت میں سر جھکا دینے کی ساری قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک حقیقت تمہارے حواس سے پوشیدہ ہے اور تم محض دلیل سے اس کو تسلیم کر کے اپنی دانشمندی کا اور محض فہمائش سے اس کی پیروی و اطاعت اختیار کر کے اپنی اخلاقی طاقت کا ثبوت دیتے ہو ورنہ جب حقیقت بے نقاب سامنے آجائے اور تم بچشم سر دیکھ لو کہ یہ خدا اپنے تختِ جلال پر متمکن ہے اور یہ ساری کائنات کی سلطنت اس کے فرمان پر چل رہی ہے اور یہ فرشتے زمین و آسمان میں لگے ہوئے ہیں اور یہ تمہاری ہستی اس کے قبضۂ قدرت میں پوری بے بسی کے ساتھ جکڑی ہوئی ہے اس وقت تم ایمان لائے اور اطاعت کی تو اس ایمان و طاعت کی قیمت و قدر ہے باقی اس وقت جب پردہ ہٹ جائے گا تو کٹے سے کٹا کافر اور بدسے بدتر مجرم بھی انکار و سرکشی کی جرأت نہیں کر سکتا۔ ایمان لانے اور اطاعت قبول کرنے کی مہلت بھی اسی وقت تک ہے جب تک پردہ کشائی کی وہ ساعت نہیں آتی، جب وہ ساعت آگئی تو پھر نہ آزمائش ہے نہ مہلت بلکہ وہ فیصلہ کا وقت ہے۔ اس وقت کا ایمان و عمل کوئی معتبر نہیں ہے۔

یہ ایک ہی آیت ہے اس لیے اس کا تشریحی نوٹ بھی ایک ہی ہے۔ پہلے شیخ الاسلام کی زبانی سنیے فرماتے ہیں۔ یعنی اللہ کی طرف سے ہدایت کی جو حد تھی وہ پوری ہو چکی، انبیاء تشریف لاتے، شریعتیں اتریں، کتابیں آئیں، حتیٰ کہ اللہ کی آخری کتاب بھی آچکی تب بھی نہیں مانتے تو شاید اب اس کے منتظر ہیں کہ اللہ آپ آئے یا فرشتے آئیں یا قدرت کا کوئی بڑا نشان۔ مثلاً قیامت کی کوئی بڑی علامت ظاہر ہو تو یاد رہے کہ قیامت کے نشانوں میں سے ایک نشان وہ بھی ہے جس کے ظاہر ہونے کے بعد نہ کافر کا ایمان لانا معتبر ہوگا نہ عاصی کی توبہ۔ صحیحین کی احادیث بتلاتی ہیں کہ یہ نشان آفتاب کا مغرب سے طلوع کرنا ہے۔ یعنی جب خدا کا ارادہ ہوگا کہ دُنیا کو ختم کرے اور عالم کا موجودہ نظام درہم برہم کرے تو موجودہ قوانین طبیعیہ کے خلاف بہت سی عظیم الشان خوارق وقوع میں آئیں گے۔ ان میں ایک یہ ہے کہ آفتاب مشرق کے بجائے

مغرب سے طلوع ہوگا۔ غالباً اس حرکت مقلوبی اور رجعت قہقری سے اس طرف اشارہ کرنا مقصود ہے کہ جو قوانین قدرت اور نوامیس طبیعیہ دُنیا کے موجودہ نظم و نسق میں کارفرما تھے ان کی میعاد ختم ہونے اور نظام شمسی کے الٹ پلٹ ہوجانے کا وقت آپہنچا ہے گویا اس وقت سے عالم کبیر کے نزع اور جانکنی کا وقت شروع ہوتا ہے اور جس طرح عالم صغیر یعنی انسان کی جانکنی کے وقت کا ایمان معتبر اور توبہ مقبول نہیں کیونکہ وہ حقیقت میں اختیاری نہیں ہوتا اسی طرح طلوع شمس از مغرب کے بعد مجموعہ عالم کے حق میں یہی حکم ہوگا کہ کسی کا ایمان و توبہ معتبر نہ ہو۔ بعض روایات میں طلوع شمس از مغرب کے ساتھ چند دوسرے نشانات بھی بیان ہوئے۔ مثلاً خروج دجال، خروج دابہ وغیرہ۔ ان روایات کی مراد یہ معلوم ہوتی ہے کہ جب ان سب نشانات کا مجموعہ متحقق ہوگا اور وہ جب ہی ہوسکتا ہے کہ طلوع الشمس من المغرب بھی متحقق ہو تو دروازہ توبہ کا بند کردیا جائے گا۔ الگ الگ ہر انسان پر یہ حکم متفرع نہیں ہے۔ ہمارے زمانہ میں بعض ملحدین جو ہر غیر معمولی واقعہ کو استعارہ کا رنگ دینے کے خوگر ہیں وہ طلوع شمس من المغرب کو بھی استعارہ بنانے کی فکر میں ہیں۔ غالباً ان کے نزدیک قیامت کا آنا بھی ایک طرح کا استعارہ ہوگا۔[1]

مطلب تو بالکل واضح اور صاف ہے کہ ان تمام حیلے اور بہانوں کو دلائل کی قوت سے ختم کردیے گئے اور ان پر حجت قائم کردی گئی ہے۔ اس کے باوجود اگر نہیں مانتے ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ یہ اس بات کی انتظار میں ہیں کہ ان کے پاس فرشتے آئیں یا خدا خود ان کے لیے جلوہ نمائی کرے جیسا کہ ان کا مطالبہ ہے یہ نہیں تو قیامت کی نشانیوں میں سے کوئی نشانی ظاہر ہوجائے یا عذابِ الٰہی کی نشانیوں میں سے کوئی فیصلہ کن نشانی ظاہر ہو۔ عام شارحینِ قرآن یہی کہتے ہیں کہ بعض آیات سے قیامت کی نشانی مراد ہے اور وجہ اس کی یہ ہے کہ امام بخاری نے صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

> قیامت بپا نہ ہوگی تاآنکہ سورج مغرب سے طلوع نہ ہوگا جب سورج مغرب سے طلوع ہوگا تو سب لوگ اس کا مشاہدہ کرلیں گے تو یہی وہ وقت ہوگا کہ کسی کو اس کا ایمان کچھ فائدہ نہ دے گا جو پہلے ایمان نہ لایا ہو یا جس نے اپنے ایمان میں کوئی بھلائی نہ کمائی ہو۔

اس ارشاد کی روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ یہ لوگ ایمان لانے کے لیے اپنی موت کا

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

انتظار کر رہے ہیں یا پورے عالم کی موت کا انتظار کر رہے ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں وقتوں کا ایمان معتبر نہ ہو گا۔ کیونکہ یہ ایمان ارادی اور اختیاری نہ ہو گا اور ایمان کے معتبر ہونے کے لیے ارادی اور اختیاری ہونا ضروری۔ ایمان معتبر صرف وہ ہے جو آنکھ کان، دل و دماغ اور عقل کی صلاحیتوں کو استعمال کر کے لایا جائے نہ موت کا ڈنڈا دیکھ کر خواہ یہ شخصی موت ہو یا کائنات کی موت ہو۔ موت کے وقت غرغرہ کی حالت میں کسی کا ایمان کچھ سودمند نہیں ہے۔ سودمند ایمان وہی ہو گا جو پہلے لایا جاتے اور اس میں کچھ عمل صالح کی کمائی کر لی جائے۔ واقعی اس آیت کی تفسیر جو روایات مذکور ہیں۔ اس سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ اس آیت میں پروردگار کی بعض نشانیوں سے مراد آفتاب کا مغرب سے طلوع ہونا ہے اور عقلاً بھی ایسے حادثہ کا ظہور کم از کم موجودہ علمائے ہیئت کے نزدیک ناممکن نہیں ہے اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ زمین کی روزانہ کی حرکت ہی تبدیل ہو جاتے مشرق مغرب ہو جاتے اور مغرب مشرق ہو جاتے۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہو گا کہ موجودہ قوانین طبعی کی میعاد ختم ہو رہی ہے اور نظام شمسی کے درہم برہم ہونے کا وقت آگیا ہے۔ کعب احبار کے ایک بیان سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جسے امام بخاری نے تاریخ میں اور حافظ ابن عساکر نے نقل کیا ہے۔

> اللہ جب یہ ارادہ فرمائے گا کہ سورج مغرب سے طلوع ہو تو زمین کے محور کو پھیر دے گا مشرق کو مغرب اور مغرب کو مشرق بنا دے گا۔

جس حدیث کا شارحین قرآن نے اس آیت کی تفسیر میں سہارا لیا ہے اور جسے ہم ابوہریرہ کے حوالہ سے نقل کر آئے ہیں۔ یہ امام بخاری نے کتاب الرقاق میں نقل کی ہے۔ اور کتاب التفسیر میں بھی اس کا تذکرہ کیا ہے اور کتاب الفتن میں اسی مضمون کو طویل کر کے پیش کیا ہے۔ جس میں اس نشانی کے ساتھ دوسری علامات قیامت کا بھی ذکر ہے مثلاً،

> تین باتیں ایسی ہیں جب وہ ظاہر ہو جائیں گی تو کسی شخص کو ایمان لانا سودمند نہ ہو گا اوّل سورج کا مغرب سے نکلنا دوسرے دجال کا ظہور تیسرے دابۃ الارض۔

یہ حدیث ان احادیث کے خلاف ہے جن میں خروج دجال کے بعد نزول ابن مریم کا ذکر ہے اور یہ بھی بتایا گیا ہے کہ لوگ آپ پر ایمان لائیں گے۔ اگر ایسا ہے تو پھر ایمان کے سودمند نہ ہونے کا مسئلہ سنگین اور پیچیدہ ہو کر رہ جاتا ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ علامات قیامت کے متعلق جو احادیث آئی ہیں ان میں اس سے زیادہ پیچیدہ اشکالات ہیں۔ مثلاً اکثر احادیث میں قیامت کی علامات کبریٰ کی جو ترتیب مذکور ہے۔ بعض حدیثوں میں وہ ترتیب مختلف ہے۔ پھر ان روایات میں تعارض بھی موجود ہے اس

علاوہ جو حدیثیں سند کے لحاظ سے صحیح ہیں ان کے متن میں اضطراب ہے۔ ان حدیثوں میں باہم اختلاف کا بڑا سبب یہ ہے کہ اکثر احادیث کی روایت بالمعنیٰ ہے اور چونکہ یہ باتیں عالم غیب سے تعلق رکھتی ہیں اس لیے راویوں کے فہم اور سمجھ کے اختلاف کے اعتبار سے ان کی تعبیر میں اختلاف ہوا ہے اسی لیے ان آیات کی ترتیب میں اختلاف ہوا ہے۔ بلا شبہ طلوع شمس من المغرب آخری علامات ہے اور اس کے بعد ایمان مقبول نہیں ہے۔ چنانچہ علامہ آلوسی نے روح المعانی نے یہی موقف اختیار کیا ہے کہ مغرب کی طرف سے آفتاب طلوع ہونے کا واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تشریف آوری کے کافی زمانہ بعد ہوگا۔ شارحین قرآن نے یہاں علامات قیامت تو بیان کی ہیں مگر ان کی ترتیب کی طرف کسی نے کوئی توجہ نہیں فرمائی۔ انشاء اللہ اس پر تفصیلی بحث جلد ۲۶ میں آئے گی۔

آیئے اب اسی روشنی میں شارحین قرآن کی زبانی آیت کی تشریح بھی سن لیجئے۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں۔

> آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو کافر آفتاب کے مغرب کی طرف سے نکلنے سے پہلے ایمان نہیں لایا تھا اسے طلوع آفتاب کے بعد ایمان لانا سود مند نہ ہوگا اور جس مومن نے طلوع آفتاب سے پہلے عمل صالح نہیں کیا تھا اسے طلوع آفتاب کے بعد کوئی عمل فائدہ نہ دے گا۔ کیونکہ اس وقت ایمان اور عمل کا معاملہ بالکل ایسا ہوگا جیسے قرب موت میں ایمان لائے یا عمل کرے جیسے اس وقت کوئی ایمان و عمل مفید نہیں ایسا ہی مغرب سے طلوع آفتاب کے بعد ایمان و عمل معتبر نہ ہوگا۔ قرآن میں ہے فلم یک ینفعھم ایمانھم لما راوا باسنا عذاب کی رونمائی کے بعد ایمان مفید نہیں ہے اور حدیث صحیح میں ہے ان اللہ یقبل توبۃ العبد ما لم یغرغر اللہ تعالیٰ غرغرہ کی حالت میں کسی کو توبہ قبول نہیں فرماتا۔

مطلب یہ ہے کافر کو ایمان اور فاسق کو توبہ اس عظیم نشانی کے ظاہر ہونے کے بعد کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گی۔ کیونکہ یہ زمانہ زمانہ تکلیف نہ ہوگا اور حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

> مغرب سے آفتاب طلوع ہونے کے بعد کافر ایمان لائے گا یا جو شخص طلوع آفتاب سے پہلے مومن تھا اگر اس کی زندگی ہی صالح تھی تو وہ بہار بہار میں ہے۔ لیکن اگر زندگی عاصیانہ تھی اور وہ اب طلوع آفتاب کے بعد توبہ کرکے زندگی صالح بنائے گا تو دونوں کا ایمان اور عمل قبول نہ ہوگا اور کسبت فی ایمانھا خیرا کا یہی مطلب ہے کہ مومن کا عمل صالح قبول نہ ہوگا جب کہ پہلے وہ عمل صالح نہیں کر رہا تھا۔

اور کچھ علماء نے اس آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اس آیت میں حضور کے مخاطبوں کو حالات کے

مطابق بتایا جا رہا ہے کہ کیا یہ لوگ عذاب استیصال کا انتظار کر رہے ہیں۔ مولانا اصلاحی کا میلان بھی یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ فرماتے ہیں:

سنتِ الٰہی کے مطابق اب ایک ہی چیز باقی رہ گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ حق و باطل کے درمیان فیصلہ فرمادے باطل نابود اور حق کا بول بالا ہو۔

لیکن دوسرے علماء نے وہی مطلب بتایا ہے کہ بعض آیات سے مراد آثار قیامت ہیں اور یہی زیادہ راجح ہے

ایک سنگین شبہ اور اس کا ازالہ

آیت کی اس تشریح پر شارحین قرآن نے ایک شبہ نقل کیا ہے اور اس کے متعدد جوابات دیے ہیں۔ آیت لم تکن امنت من قبل او کسبت فی ایمانها خیرا" میں او حرف تخییر کے ذریعے جو بات بتائی گئی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ کسی شخص کو جیسے قیامت کی نشانی دیکھنے کے بعد ایمان لانا کام نہ دے گا ایسے ہی جو مومن پہلے سے ہوگا اسے قیامت کی نشانی دیکھنے کے بعد اپنی ایمانی زندگی کے لیے خیر بھی کام نہ دے گا۔ بالفاظ دیگر بغیر عمل صالح کے ایمان بھی سودمند نہ ہوگا۔ اگر ایک شخص ایمان نہیں رکھتا ہے وہ بلا شبہ عمل صالح بھی نہیں کر سکتا کیونکہ عمل کے صالح ہونے کے لیے ایمان کی زمین میں ہونا شرط ہے۔ اگر او حرف تخییر ہے اور اپنے معنے میں ہے تو او کسبت فی ایمانها خیرا" محض تکرار ہوگا۔ اور پھر ایمان نہ رکھنا خلود فی النار کے لیے مستقل سبب ہے۔ اس کے بعد او کسبت فی ایمانها خیرا" کا اضافہ زائد ہے۔ ایسے ہی ایمان عمل صالح کے ساتھ جنتی ہونے اور آگ سے بچنے کا اگر سبب ہے تو پہلے امنت میں کوئی معنویت نہیں ہے۔ او حرف تخییر کی وجہ سے یہ پیچیدگی پیدا ہوتی ہے۔ کیونکہ اگر کوئی یہ کہے کہ سوار ہونے کے بعد کسی کو سامان فائدہ نہ دے گا جس کے پاس سوار ہونے سے پہلے سامان نہ ہو، یا جس کے سامان میں روپے نہ ہوں اسے اس کا سامان فائدہ نہ دے گا۔ ظاہر ہے کہ اس کا صاف لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ سامان سے استفادے کے لیے سامان میں روپے کا ہونا ضروری ہے۔ ایسے ہی یہاں بھی کچھ لیجیے کہ ایمان سے استفادے کے لیے عمل صالح کا ہونا ضروری ہے۔ یہاں قرآن نے ایمان کو ظرف قرار دیا ہے۔ معتزلہ نے اس تعبیر سے فائدہ اٹھایا ہے۔ اور اپنے اس موقف کے لیے کہ عمل کے بغیر ایمان سودمند نہیں ہے۔ اس سے استدلال کیا ہے۔ علماء اہل السنۃ نے اس کے مختلف جوابات دیے۔ ان میں سب سے بہتر جواب وہ ہے جو مولانا شبیر احمد عثمانی نے نہایت اختصار کے ساتھ پیش فرمایا ہے:

اور جملہ او کسبت فی ایمانها خیرا" کا عطف امنت من قبل پر ہے۔ تقدیر عبارت کی ابن المنیر وغیرہ محققین نے یہ بتائی ہے لا ینفع نفسا ایمانها او کسبها خیرا" لم تکن

امنت من قبل او لسم تکن کسبت فی ایمانھا خیرا" یعنی جو پہلے سے ایمان نہیں لایا اس وقت اس کا ایمان نافع نہ ہوگا اور جس نے پہلے سے کسبِ خیر نہیں کیا اس کا کسبِ خیر نافع نہ ہوگا یعنی توبہ قبول نہ ہوگی۔[1]

علامہ ابن المنیر نے الانتصاف میں لکھا ہے کہ اس آیت میں از روئے بلاغت لف کا انداز تعبیر اختیار کیا ہے یہ علم بدائع کی محسنات معنویہ میں سے ہے۔ علامہ زمخشری نے کشاف میں ومن ایاتہ منامکم باللیل والنھار وابتغاؤکم من فضلہ میں بھی لف قرار دیا ہے۔ اصل میں پوری بات اس طرح تھی کہ جس روز تیرے رب کی کچھ نشانیاں ظاہر ہوں گی اس روز کسی ایسے شخص کو جو پہلے ایمان نہ لایا ہو ایمان لانا سودمند نہ ہوگا اور نہ کسی ایسے شخص کو جس نے کوئی کارِ خیر پہلے نہ کیا ہو خیر کا نافع نہ دے گا۔ دونوں باتوں کو اختصار کی خاطر ایک بات بنا دیا ہے۔ بات بالکل واضح اور صاف ہے کہ نشانیاں ظاہر ہونے کے بعد اکتسابِ خیر تو فائدہ نہ دے گا لیکن نشانیاں ظاہر ہونے سے پہلے کا ایمان عدم خلودِ نار کے لیے نافع ہوگا۔

ابن الحاجب نے امالی میں یہی مطلب بتایا ہے اور علامہ طیبی نے اس موضوع پر ائمہ فن کی تصریحات پیش کی ہیں اور لکھا ہے کہ

اللہ تعالیٰ نے مخالفین کو یہ کہہ کر مخاطب کیا تھا ھذا کتاب انزلناہ پر نزولِ قرآن کی یہ وجہ بتائی کہ ان تقولوا تم یہ نہ کہہ سکو کہ جیسے یہود و نصاریٰ کو کتابیں مل چکیں ہمیں نہیں ملی تھیں، اس کے بعد ان کو جتایا کہ فقد جاءکم بینۃ تو تمہارے پاس بھی اللہ کی واضح دلیل آچکی ہے اب تمہارے پاس نہ ماننے کا کوئی عذر نہیں ہے۔ اب بھی اگر کوئی نہیں مانتا تو فمن اظلم اس سے بڑھ کر محروم القسمۃ کون ہوگا جس کے پاس ایسی کتاب ہو جو ان کے لیے حجت و برہان ہو جو ابرِ رحمت بن کر برسے جو رہنمائی کے لیے روشنی کا مینار ہو اور نصرت میں خدا کی رحمت کی ضامن ہو اس کے بعد ارشاد ہوا ھل ینظرون یعنی یہ لوگ ماننے کے لیے اب صرف عذابِ الٰہی کا انتظار کر رہے ہیں یہ عذابِ الٰہی دنیا میں یا تو فرشتوں کے ذریعے گرے اور یا یہ عذابِ الٰہی آخرت کا پورے نظامِ عالم کو تباہ کرکے آئے۔ اس وقت ان کے پاس فرصت کے یہ موجودہ لمحات نہ ہوں گے جس میں ایمان سودمند ہے اور جس ایمان کی زمین میں عمل صالح فائدہ بخش ہے بلکہ وہ وقت جب اللہ کی نشانی کا ظہور ہوگا کسی کو نہ تو ایمان فائدہ دے گا اور نہ ایمان کی زمین

[1] افادات شیخ الاسلام

میں عمل صالح فائدہ دے گا، جب تک وہ اس وقت سے پہلے ایمان نہ لاچکا ہوگا یا ایمان کی زمین پر عمل صالح نہ کرچکا ہوگا۔ لہٰذا آیت میں فی الواقع لف ہے۔ دو باتوں میں سے ایک کو نشر کے تعاون سے حذف کر دیا گیا ہے۔

اس کے بعد علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ اسی پارے میں قرآن کی ایک اور آیت بھی اسی کے ہم معنیٰ آرہی ہے علامہ کی مراد سورہ اعراف کی آیت ۵۲، ۵۳ ہے۔ انشاء اللہ ہم اسی جلد میں وہاں تبصرہ کریں گے۔

إِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ ۚ
إِنَّمَا أَمْرُهُمْ إِلَى اللَّهِ ثُمَّ يُنَبِّئُهُم بِمَا كَانُوا يَفْعَلُونَ ﴿١٥٩﴾ مَن جَاءَ
بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ أَمْثَالِهَا ۖ وَمَن جَاءَ بِالسَّيِّئَةِ فَلَا يُجْزَىٰ
إِلَّا مِثْلَهَا وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿١٦٠﴾

اے پیغمبر بلاشبہ جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور فرقے ہو گئے آپ کا ان سے کوئی سروکار نہیں ہے ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے پھر وہی بتلائے گا جو کچھ وہ کرتے رہے ہیں[۲۱۳]۔ جو کوئی نیکی کی پیش کش کرے گا تو اس کے بدلہ میں اس کو دس گنا ہے اور جو کوئی برائی لے کر آئے گا تو برائی کا بدلہ برائی کے برابر دیا جائے گا اور لوگوں کے ساتھ ناانصافی بالکل نہ ہو گی[۲۱۴]۔

معانی مفردات

دینؔ عربی میں دین کے معنے بدلہ اور مکافات کے ہیں خواہ اچھائی کا ہو خواہ برائی کا۔ دین کے معنے جزا[۱]

۱

اطاعت، شریعت، بدلہ، اطاعت کرنا اور شریعت کی پابندی کے معنے میں ہوتا ہے۔ دان یدین کا مصدر ہے۔ جمع اس کی ادیان ہے۔ شیعٌ، شیعۃ کی جمع ہے۔ فرقہ، گروہ، اصل میں شیاع کے معنے انتشار اور تقویت کے ہیں۔ جن سے انسان کو تقویت ہو اور جو اس سے نکلے اور پھیلے ہوں۔ وہ اس انسان کے شیعہ یعنی اس کا فرقہ اور پارٹی ہیں شیعہ کا اطلاق واحد تثنیہ جمع، مذکر مونث سب پر ہوتا ہے۔ شیع اور اشیاع جمع ہے۔ حسنۃ، خوبی، بھلائی، نیکی نعمت ہر وہ نعمت جو انسان کو اس کی جان یا بدن یا حالات میں حاصل ہو کر اس کے لیے مسرت کا سبب بنے حسنہ کہلاتی ہے، سیئہ اس کی ضد ہے۔ یہ دونوں اسم جنس ہیں جن کے تحت مختلف انواع داخل ہیں چنانچہ ارشاد ہے وان تصبهم حسنة يقولوا هذه من عند الله یہاں حسنہ سے مراد خوش حالی اور فصل کی عمدگی ہے۔ حسن، حسنۃ اور حسنیٰ میں فرق یہ ہے کہ حسن ذوات اور اشخاص اور معاملات و حالات دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے، اسی طرح حسنہ صفت ہو کر دونوں کے لیے بولی جاتی ہے اور اسم ہو کر صرف واقعات اور حالات کے لیے آتی ہے لیکن حسنیٰ کا استعمال صرف واقعات کے لیے ہوتا ہے۔ ذوات و اشخاص کے لیے نہیں ہوتا۔ سیئۃ برائی گناہ حسنہ کی ضد ہے۔ ساء یسوء سے صفت کا صیغہ ہے۔ اس کا مذکر سیئی آتا ہے۔ اور اس کی جمع سیئات آتی ہے۔

نجات ہدایت سے ہٹنے میں نہیں

وصایائے عشر کا خاتمہ اس وصیت پر کیا تھا کہ وان هذا صراطي مستقيما فاتبعوه ولا تتبعوا السبل فتفرق بكم عن سبيله جو کچھ میں پیش کر رہا ہوں یہ صراطِ مستقیم ہے اس پر چلو طرح طرح کی راہوں پر نہ چلو، وہ تمہیں خدا کی راہ سے ہٹا کر تتر بتر کر دیں گی۔ اس عظیم وصیت کے بعد شریعت موسیٰ اور شریعت محمد رسول اللہ کا تقابلی مطالعہ پیش کیا اور بتایا کہ شریعتِ موسیٰ بھی اپنے وقت میں ہدایت اور رحمت تھی لیکن شریعتِ محمدیہ ہدایت و رحمت ہونے کیساتھ مبارک بھی ہے اور بہتر بھی ہے۔ اب یہی کامل ہدایت ہے اسی کی پیروی کرو اور بقیہ مذاہب اپنی موجودہ حالت میں کامل نہیں ہیں یعنی وہ ابدی کامل ہدایت جو اپنے اپنے وقتوں میں سب نبی لے کر آتے رہے ہیں چونکہ ان کے پیرو اپنی تاویلات، تحریفات، تصرفات اور اختلافات سے برباد کر چکے ہیں۔ اسی لیے قرآن اسی کو لے کر آخری بار آیا ہے۔ اب یہ ہدایت، رحمت یا برکت ہے۔ اور

دلائل کے جلو میں آنے کی وجہ سے بہتر ہے اس لیے کامل ہے اور کامل ہی ہمیشہ رہے گی کبھی ناقص نہ ہو گی۔
صراطی مستقیما کہہ کر اس حقیقت کے چہرے سے پردہ اٹھایا تھا کہ صراط مستقیم ایک ہے جو میں لے کر آیا ہوں یہی نوح، ابراہیم اور موسیٰ کو عطا کی گئی تھی۔ اگلوں کے بعد پچھلوں نے اپنی ذہنی تحریفات اور دستی تصرفات سے اس میں تفرقے پیدا کیے اور اس کی ضد اور تعصبات سے فرقہ داری کی الگ الگ راہیں نکالی ہیں۔ المقدسیؒ نے البدء والتاریخ میں لکھا ہے کہ قرآن کے اولین مخاطب مختلف فرقوں میں بٹے ہوتے تھے۔ قبیلہ تمیم میں مزدکیہ اور مجوسیت تھی۔ غسان میں یہودیت اور نصرانیت تھی اور شرک سب میں مشترک تھا۔ اور صراطِ مستقیم ان کے نرغے میں گم ہو کر رہ گئی تھی اور سب اصل دین سے ہٹ گئے تھے یا سب نے دین میں تفرقہ ڈال دیا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے صراط مستقیم پھر دنیا کے لیے کھولی۔

۲۱۳۔ اے پیغمبر بلاشبہ جن لوگوں نے اپنے دین میں تفرقہ ڈالا اور فرقے ہو گئے آپ کو ان سے کوئی سروکار نہیں ہے ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے پھر وہی بتلائے گا جو کچھ وہ کرتے رہتے ہیں۔
پچھلے رکوع میں قل تعالوا اتل ما حرم ربکم علیکم سے بہت سے احکام بیان فرما کر ارشاد ہوا تھا

وان ھذا صراطی مستقیما فاتبعوہ ولا تتبعوا السبل فتفرق بکم عن سبیلہ۔

یعنی صراط مستقیم دین کی سیدھی راہ ہمیشہ سے ایک رہی ہے اس سے ہٹ کر گمراہی کے راستے بہت ہیں تمام انبیاءؑ و مرسلین اصولی حیثیت سے اسی ایک راہ پر چلے اور لوگوں کو بلاتے رہے۔ ارشاد ہے۔

شرع لکم من الدین ما وصی بہ نوحاً والذی اوحینا الیک وما وصینا بہ
ابراھیم وموسیٰ وعیسیٰ ان اقیموا الدین ولا تتفرقوا فیہ (شوریٰ)

اصول دین میں ان میں باہم کوئی تفریق نہیں ہے۔ زمان و مکان اور خارجی احوال کے اختلاف سے فروع شرعیہ میں جو تفاوت ہوا وہ تفرق نہیں بلکہ ہر وقت کے مناسب رنگ میں ایک ہی مشترک مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع کا تنوع ہے۔ جو دین انبیائے سابقین لے کر آتے۔ موسیٰ علیہ السلام کی کتاب بھی اس کی مخالفت کے لیے نہیں بلکہ اس کی تفصیل کی غرض سے اتاری گئی۔ سب کے آخر میں قرآن آیا ہے جو تمام کتب سابقہ کی تتمیم و تصدیق اور ان کے علوم و معارف کی حفاظت کرنے والا ہے درمیان میں ان کتب و شرائع سے اعراض کرنے والوں کا حال بیان کر کے ان الذین فرقوا دینھم سے پھر اصل مطلب کی طرف عود کیا گیا۔ یعنی دین الٰہی کا راستہ صراطِ مستقیم ایک ہے جو لوگ اصل دین میں پھوٹ ڈال کر جدا جدا راہیں نکالنے اور فرقہ بندی کی لعنت میں گرفتار ہوتے ہیں خواہ وہ یہود ہوں یا نصاریٰ یا وہ مدعیان اسلام جو مستقبل میں عقائد دینیہ کی چادر کو پھاڑ کر پارہ پارہ کرنے والے تھے، ان لوگوں سے آپ کو

کچھ واسطہ اور سروکار نہیں۔ یہ سب فتفرق بکم عن سبیلہ میں داخل ہیں۔ آپ ان سے بیزاری اور برأت کا اظہار کر کے خدا کے اسی ایک راستہ صراط مستقیم پر جمے رہیے اور ان کا انجام اللہ کے حوالے کیجئے وہ ان کو دنیا و آخرت میں جتلائے گا جو کچھ دین میں گڑبڑی کرتے تھے۔ حضرت شاہ صاحب فرقوا دینھم کی تشریح کرتے ہوتے فرماتے ہیں جو باتیں یقین لانے کی ہیں اصول دین ہیں ان میں فرق نہ چاہیے اور جو کرنے کی ہیں فروع دین ہیں ان کے طریقے کئی ہوں تو بُرا نہیں لے

اس آیت میں فرقوا آیا ہے۔ یہ جمہور کی قرأت ہے لیکن امام حمزہ اور کسائی نے فارقوا پڑھا ہے فرقوا تفریق سے بنا ہے تفریق کے معنے ایک چیز کو اجزاء میں تقسیم کرنا اور الگ الگ کر دینا ہیں۔ فارقوا مفارقہ سے بنا ہے اس کے معنے علیحدہ ہو جانا اور چھوڑ دینا ہیں۔ فرقوا قرأت کے لحاظ سے معنے یہ ہوتے کہ انہوں نے دین کے ٹکڑے کر دیے تھے۔ دین کی کچھ باتوں کو مانتے تھے اور کچھ کو نہیں مانتے تھے۔ یعنی کتاب الٰہی کے کچھ حصے کو مانتے تھے اور کچھ کو نہیں مانتے تھے۔ قرآن کی یہ آیت اس کی موید ہے۔

ا فتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض

کیا تم کچھ کتاب الٰہی کو مانتے ہو اور کچھ کو نہیں مانتے ہو۔

اور اس کی مثال تفریق بین الرسل بھی ہے۔ تفریق بین الرسل کے معنے یہ ہیں کہ خدا کے رسولوں میں باعتبار تصدیق تفرقہ و امتیاز کرنا اور کہنا کہ نومن ببعض ونکفر ببعض ہم کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے۔ تفریق خواہ کتاب سے متعلق ہو اور یا رسولوں سے متعلق ہو دونوں صورتوں میں دین کی تفریق اور اس کے حصے بخرے کر دینے کے مترادف ہے۔ جس طرح کتاب الٰہی کے کچھ حصہ کو نہ ماننا کفر ہے ٹھیک اسی طرح انبیاء میں سے کسی ایک کا انکار بھی کفر ہے۔ اور تفریق بین الاحکام اور تفریق بین الرسل کا لازمی نتیجہ دین سے علیحدگی اور مفارقت ہے۔ کیونکہ دین کے اجزائے ترکیبی دو ہی ہیں۔ اللہ کے رسول اور ان کی لائی ہوئی کتابیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ جو شخص یا جو جماعت خدا کی کتاب سے یا خدا کے رسول سے ایمان کی حدود میں یا عمل کی حدود میں علیحدگی اختیار کرے وہ قرآن کی نظر میں تفرق ہے۔ اس نظر سے جب اس آیت کا مطالعہ کیا جائے تو جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ آیت کا مصداق اہل کتاب ہیں اور جن لوگوں نے یہ کہا کہ آیت کا مصداق فرق اسلامیہ ہیں دونوں صحیح ہیں۔ فرق ہے تو صرف یہ کہ اہل کتاب کے فرقے آیت کا منطوق ہیں اور اسلامی فرقے اس آیت کا مدلول ہیں۔ اور اگرچہ اصلاً اہل کتاب ہی کے فرقے مراد ہیں لیکن

لے افادات شیخ الاسلام

چونکہ قرآن نے مسلمانوں کو خاص طور پر اس معاملہ میں اہل کتاب کی کاپی کرنے سے منع کیا ہے اس لیے آیت میں اسلامی فرقے بھی مراد ہیں۔ ارشاد ہے :

لا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ماجاءھم البینات اولئک لھم عذاب عظیم۔

اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جو فرقہ فرقہ ہو گئے اور اختلاف کر بیٹھے باوجودیکہ ان کے پاس اللہ کی واضح دلیلیں آچکی تھیں ان کے لیے عذاب عظیم ہے۔

روایات سے دونوں کی تائید ہوتی ہے۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ حضور انور کی تشریف آوری سے یہود و نصاریٰ اختلافات کا شکار ہوتے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا ان الذین فرقوا دینھم الخ اور حضرت ابوہریرہ فرماتے ہیں کہ یہ آیت اس امت کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے علاوہ بھی دوسری روایات ہیں لیکن ان کی روایتی صحت زیادہ وزنی نہیں ہے۔

اس موضوع پر علامہ شاطبی نے الاعتصام میں بڑی فکر انگیز بات لکھی ہے :

ابن عطیہ کہتے ہیں کہ یہ آیت اپنے عموم کی وجہ سے سب کو اپنے دامن میں لیے ہوتے ہے۔ اہل اہوا و بدعت اور فروع ہیں اور کلامی مسائل میں اہل تعمق، یہ سب صراط مستقیم سے ہٹے ہوتے ہیں۔ شاطبی کہتے ہیں فروع میں اہل تعمق سے مراد وہ لوگ ہیں جن کا ذکر ابن عبدالبر نے رائے کی مذمت کے سلسلے میں کیا ہے۔ ابن بطال نے شرح بخاری میں امام ابوحنیفہ کا یہ واقعہ قلم بند کیا ہے کہ آپ جب عطا۔ ابن ابی رباح سے ملنے گئے۔ امام ابوحنیفہ نے ان سے کوئی سوال کیا۔ حضرت عطاء نے سوال سنتے ہی دریافت کیا کہ کہاں کے رہنے والے ہو فرمایا کہ کوفہ کا رہنے والا ہوں، فرمایا کیا اس بستی سے تعلق رکھتے ہو جہاں کے باشندوں نے دین کے ٹکڑے کر دیے اور فرقے بن گئے۔ امام ابوحنیفہ نے جواباً فرمایا جی ہاں عطاء نے دریافت کیا تم کن سے تعلق رکھتے ہو فرمایا میں ان لوگوں سے تعلق رکھتا ہوں جو سلف کو برا نہیں کہتے تقدیر پر ایمان رکھتے ہیں اور کسی مسلمان کو گناہ کی وجہ سے کافر نہیں بناتے یعنی نہ میں شیعہ ہوں نہ قدری ہوں اور نہ خارجی ہوں۔ حضرت عطاء نے فرمایا سمجھ گیا۔ یہاں رہو۔ حضرت الحسن کہتے ہیں۔ ایک روز حضرت عثمان تقریر کے لیے تشریف لاتے اثنا تقریر میں لوگوں نے ہنگامہ کر دیا اور ہنگامہ بھی ایسا کہ آسمان سے باتیں کر رہا تھا۔ اسی شور میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیویوں کے حجروں سے ایک آواز آئی۔ شور ہوا سنو ام المومنین

کی آواز ہے ۔ راوی کہتا ہے کہ میں نے خود سنا فرما رہی تھیں لوگو آگاہ رہو تمہارا پیغمبر ایسے تمام لوگوں سے بیزار ہے جو اپنی دین میں پارٹیاں بنا لیتے ہیں اور قرآن کی یہی آیت تلاوت فرمائی ان الذین فرقوا دینھم قاضی اسماعیل کہتے ہیں کہ میرا خیال ہے کہ یہ ام المومنین حضرت ام سلمہ ہوں گی اور بعض روایات میں اس کی تصریح بھی ہے کیونکہ حضرت عائشہ تو اس موقعہ پر حج کو گئی ہوئی تھیں ۔ ابوہریرہ بھی کہتے ہیں کہ یہ آیت اسی امت کے بارے میں نازل ہوئی ہے اور ابو امامہ کہتے ہیں کہ یہ آیت خارجیوں کے متعلق ہے ۔ قاضی اسماعیل کی رائے ہے کہ ظاہر قرآن یہی کہتا ہے کہ دین میں ہر مبتدع خواہ خارجی ہو یا کوئی اور اس آیت میں داخل ہے کیونکہ بدعت کا نتیجہ جدال باہمی ہے اور جدال کا انجام باہم پارٹی بازی ہوتی ہے ۔

قاضی اسماعیل کی یہ بات بالکل برمحل ہے کہ آیت قرآنی اپنے مطالب کے اعتبار سے بالکل عام ہے بہرحال ان الذین فرقوا دینھم کا بنیادی طور پر مصداق وہ لوگ ہیں جنہوں نے دین میں تفریق پیدا کی یعنی کچھ کتابوں کو مانا اور کچھ کو نہ مانا یا کچھ رسولوں کو مانا اور کچھ کو نہیں مانا ۔ اس کا مصداق یقیناً اور بلاشبہ یہود و نصاریٰ ہیں کیونکہ یہود نے تورات کو مان کر انجیل اور قرآن کو نہیں مانا اور نصاریٰ نے انجیل کو مان کر قرآن کا انکار کیا ۔ اسی طرح یہود نے حضرت موسیٰ کو مان کر حضرت عیسیٰ اور محمد رسول اللہ کا انکار کیا اور نصاریٰ نے حضرت عیسیٰ کو مان کر محمد رسول اللہ کا انکار کیا ۔ اصلاً یہی فرقوا دینھم کا مصداق ہیں لیکن قاضی ثناء اللہ پانی پتی کو اس سے اختلاف ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ آیت کی مراد یہ نہیں ہے بلکہ مقصود یہ بتانا ہے کہ انہوں نے دین میں ان چیزوں کی ملاوٹ کر دی جن کا دین سے کوئی تعلق نہ تھا ۔ اور یہ سب کچھ اپنے میلان طبع اور خواہشوں کو سامنے رکھ کر کیا ۔ اس معنے کے اعتبار سے آیت قرآنی عام ہے ان تمام متبدعین کے لیے جو دین میں دین کے نام پر نت نئے افکار ، نت نئے اعمال کے پیمانے بناتے رہتے ہیں ۔ چاہے دین کے نام پر دین میں یہ بگاڑ پیدا کرنے والے پہلی امتوں میں سے ہوں یا اس امت میں سے ۔ بہرحال کوئی ہو سب کو یہ آیت مشتمل ہے اور یہی بھی یہ بات قابل ترجیح ، آیت میں مخاطب اگرچہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں ۔ لیکن آپ کے واسطہ سے دین حق کے تمام پیرو اس کے مخاطب ہیں ۔ بتانا یہ ہے کہ اصل دین ہمیشہ یہی رہا ہے اور اب بھی یہی ہے کہ علم و عمل میں خدا کی کتاب اور خدا کے رسول کی مرکزی حیثیت تسلیم کی جاتے اور ان وسیع اصول و کلیات کے مطابق زندگی بسر کی جاتے جن کی تعلیم اللہ نے اپنے رسول اور کتاب کے ذریعہ دی ہے ۔ یہی دین تمام انسانوں کو آغاز آفرینش

سے دیا گیا تھا۔ بعد میں جتنے مختلف مذاہب بنے وہ سب کے سب اس طرح بنے کہ مختلف زمانوں میں لوگوں نے اپنے ذہن کی غلط اپروچ سے یا خواہشاتِ نفس کے غلبے سے یا عقیدت کے غلو سے اس دین کو بدلا اور اس میں نئی نئی باتیں ملائیں۔ اس کے عقائد میں اپنے اوہام سے کمی بیشی اور تحریف کی، اس کے احکام میں بدعات کے اضافے کیے۔ خود ساختہ قوانین بنائے، جزئیات میں موشگافیاں کیں۔ فروعی اختلافات میں مبالغہ کیا۔ اہم کو غیر اہم بنایا۔ اس طرح بے شمار مذاہب اور فرقے بنتے چلے گئے۔

نبوت کی نظر میں بدعت کا مقام

اسی بنا پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کے نام پر قرآن و سنت یعنی نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے ہٹ کر نت نئی ایجادات سے منع کیا ہے۔ حضرت جابر بن عبداللہ روایت کرتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے خطبہ میں جبکہ ہزاروں کا مجمع تھا، پُرزور اور بلند آواز سے فرمایا۔

اما بعد فان خیر الحدیث کتاب اللّٰہ وخیر الھدی ھدی محمد صلی اللّٰہ علیہ وسلم وشر الامور محدثاتھا وکل بدعۃ ضلالۃ۔

اما بعد بہترین بات اللہ کی کتاب ہے اور بہترین نمونہ اور سیرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت ہے اور بُرے کام وہ ہیں جو نئے گھڑے جائیں اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ (مسلم ج ۱)

اس ارشاد میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے کتاب اللہ اور اپنی سیرت کا بدعت سے تقابل کر کے یہ بات واضح کر دی ہے کہ قرآن و سنت کے خلاف جو کچھ ایجاد کیا جائے گا وہ سب بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ ہر ایجاد بری نہیں بلکہ صرف وہ احداث و ایجاد بُری ہے جو قرآن و سنت کے خلاف ہو۔ لہٰذا جو چیز کتاب و سنت کی روش کے خلاف نہ ہو گی وہ بدعت گمراہی نہ ہو گی اور گمراہی کو مٹانے کے لیے اللہ سبحانہٗ نے انبیاء روانہ فرمائے ہیں اور ان پر کتابیں نازل کیں۔ امام نسائی نے اس روایت میں یہ الفاظ بھی بتائے ہیں وکل ضلالۃ فی النار، اور ہر گمراہی دوزخ میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اہلِ بدعت کو تمام کائنات کی لعنت کا مستحق قرار دیا ہے۔ اور ان کی تعظیم و توقیر سے منع فرمایا ہے اور ان کی تمام عبادات کو رائیگاں قرار دیا ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے روایت کرتے ہیں کہ :

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مدینہ منورہ مقام عیر سے لے کر مقام ثور تک حرم ہے جس نے اس میں کوئی بدعت ایجاد کی یا کسی بدعتی کو پناہ دی تو اس پر اللہ تعالیٰ اور

فرشتوں اور تمام انسانوں کی لعنت ہو نہ اس کی فرضی عبادت قبول کی جائے گی اور نہ نفلی۔

اس ارشاد میں حدود حرم کی قید محض قباحت اور شناعت کے اظہار کے لیے ہے یہ قید احترازی نہیں کہ حرم مدینہ میں تو بدعت بُری ہے اور خارج از حرم وہ بُری نہ ہو۔ جو چیز بدعت اور بُری ہے وہ ہر جگہ اور ہر وقت بدعت اور بُری ہی ہوگی، ہاں البتہ شرفِ مکان یا فضیلتِ زمان کی وجہ سے اس کی بُرائی اور قباحت اور بڑھ جاتی ہے۔ بدعت اور بدعتی کی تردید اور مذمت کے لیے اس سے بڑھ کر اور سخت الفاظ کیا ہو سکتے ہیں جو جناب رؤف و رحیم اور رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے نکلے ہیں۔ بدعت کی تردید کے لیے یہ ارشادِ نبوت کافی ہے لیکن بطورِ شہادت و اعتبار چند ارشادات اور بھی پڑھ لیجئے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے بدعتی کے عمل کو قبول کرنے سے انکار کر دیا ہے تاوقتیکہ وہ اپنی بدعت کو نہ چھوڑے۔

اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کسی بدعتی کا نہ روزہ قبول کرتا ہے نہ نماز نہ صدقہ، نہ حج، نہ عمرہ، نہ جہاد، نہ فرضی عبادت نہ نفلی۔ بدعتی اسلام سے ایسا خارج ہو جاتا ہے جیسے آٹے سے بال۔

اور حضرت ابراہیم بن میسرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے بدعتی کی تعظیم و تکریم کی اس نے اسلام کے گرانے پر اس کی مدد کی۔

یہی وجہ تھی کہ صحابہ کرام کو بدعت اور اہلِ بدعت سے انتہائی نفرت تھی۔ چنانچہ حضرت عبداللہ کے پاس ایک شخص کسی کا سلام لایا تو حضرت ابن عمر نے فرمایا کہ:

مجھے سلام بھیجنے والے کی یہ شکایت معلوم ہوئی ہے کہ اس نے کوئی بدعت ایجاد کی ہے اگر واقعی اس نے کوئی بدعت ایجاد کی ہے تو میرا سلام اس کو نہ دینا۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے:

من احدث فی امرنا هذا ما لیس منه فهو ردّ

جس نے ہمارے اس معاملہ میں کوئی نئی بات نکالی وہ مردود ہے۔

اصل ارشاد فی امرنا هذا کی تعبیر آئی ہے۔ اس سے مقصود اللہ کا وہ دین ہے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم

ے کراتے ہیں۔ حافظ ابن رجب فرماتے ہیں :

جس نے دین میں کوئی ایسی چیز ایجاد کی جس کی اجازت اللہ ورسول نے نہیں دی ہے تو اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

حافظ صاحب موصوف یہ بات واضح کرنا چاہتے ہیں کہ ہر احداث مردود نہیں ہے بلکہ جو احداث فی الدین ہو وہ مردود ہے۔ نیز لکھتے ہیں کہ اس حدیث کے بعض الفاظ میں صراحۃً فی امرنا ھذا کی جگہ فی دیننا کا لفظ آیا ہے۔ جب خود زبانِ نبوت ہی فی امرنا کی جگہ فی دیننا بولے تو اس سے بڑھ کر اور کیا تفسیر ہو سکتی ہے۔

بہرحال یہاں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کی رائے ہی قابلِ ترجیح ہے کہ فرقوا سے مراد وہ لوگ جو اپنی اہواء کے ذریعے اللہ کے دین کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیں۔ خواہ یہ پہلی اُمتوں میں سے ہوں یا اُمتِ اسلامیہ میں سے ہوں۔

حدیث افتراقِ اُمت

یہاں قاضی صاحب نے علامہ شاطبی نے اور عام شارحینِ قرآن نے حدیث افتراق پیش کی ہے اور اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتارنے کی کوشش کی ہے کہ گویا یہ روایت اس آیت میں آئی ہوئی تفریق کی شرح کر رہی ہے۔ آیئے پہلے وہ روایت گوش گزار فرمالیجئے :

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تفرقت الیھود علی احدی وسبعین او ثنتین وسبعین فرقۃ والنصاری مثل ذالک وتفترق امتی علی ثلاث وسبعین فرقۃ ۔ (ترمذی)

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ یہود اکہتر یا بہتر فرقوں میں منقسم ہوئے اور نصاریٰ بھی اتنے ہی فرقوں میں بٹ گئے تھے اور میری اُمت تہتر فرقوں میں تقسیم ہوگی۔

امام ترمذی نے حدیث افتراقِ اُمت روایت کرنے والوں میں چار صحابہ کا ذکر کیا ہے جن میں حضرت ابوہریرہؓ اور عبداللہ بن عمرو کی روایت تفصیل کے ساتھ پیش کی ہے اور حضرت سعد اور حضرت عوف بن مالک کا صرف حوالہ دے کر چھوڑ دیا ہے۔ پھر اول الذکر صحابی کی حدیث پر صحت کا حکم لگایا اور ثانی الذکر کی حدیث کو غریب قرار دیا ہے۔

حافظ سخاوی نے بھی مقاصد حسنہ میں اس حدیث کی صحت کو تسلیم کیا ہے اور شیخ محمد طاہر نے تذکرۃ الموضوعات میں اسے نقل فرما کر کوئی اختلاف رائے ظاہر نہیں کیا۔ امام شاطبی نے کتاب الاعتصام میں ابوہریرہ

کی روایت پر کئی جگہ صحت کا حکم لگایا ہے۔

حدیث ابی ہریرہ کو نہ صرف ترمذی نے صحیح کہا ہے بلکہ دوسرے محدثین نے بھی اس کی صحت کو تسلیم کیا ہے لیکن اس کے علاوہ اس موضوع پر وہ تمام حدیثیں جو اس زیادت کے ساتھ آتی ہیں۔

کلھم فی النار الا ملۃ واحدۃ قالوا من ھی یا رسول اللہ قال ما انا علیہ واصحابی

میری اُمت میں تہتر فرقے ہوں گے سب دوزخی ہوں گے سوائے ایک کے، صحابہ نے دریافت کیا وہ کون ہے فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں۔

امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ ابن عمر کی حدیث اس تفسیر کے ساتھ غریب ہے اور غرابت کی وجہ علماء نے یہ قرار دی ہے کہ اس میں عبدالرحمان بن زیاد افریقی ہے اور ان کے بارے میں محدثین کی رائے اچھی نہیں ہے اس زیادتی کے بغیر علامہ زاہد کوثری نے بھی ابو داؤد اور ترمذی کی ابو ہریرہ کی روایت کو صحیح مانا ہے۔ اس زیادتی والی تمام روایات کی صحت میں محدثین کو کلام ہے۔ حافظ نورالدین ہیثمی نے اس زیادت والی حدیث کے تمام طرق پر مبسوط کلام کیا ہے۔ اور سب سے زیادہ مبسوط بحث علامہ زیلعی نے احادیث کشاف کی تخریج کی ہے۔ علامہ کوثری فرماتے ہیں۔

ھو اوسع من تکلم فی طرق ھذا الحدیث۔

امام زیلعی نے اس حدیث کے طرق پر مبسوط کلام کیا ہے۔

حافظ ابن حزم، حافظ محمد بن ابراہیم اور علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے جس کے بارے میں صحیح نہ ہونے اور ثابت نہ ہونے کا فیصلہ دیا ہے وہ یہی زیادت والی حدیث ہے ورنہ ابو ہریرہ کی حدیث کے بارے میں ان کا یہ فیصلہ نہیں ہے جیسا کہ مولانا بدر عالم نے ترجمان السنہ کے مقدمہ میں اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حزم رقمطراز ہیں:

ابو محمد کہتے ہیں یہ دونوں حدیثیں باعتبار سند قطعاً صحیح نہیں ہیں۔

کون سی دو حدیثیں ہیں جن کو وہ کہہ رہے ہیں کہ صحیح نہیں ہیں یہ بھی ان کی زبانی سنیے:

لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر کے ایک تو یہ حدیث بیان کی ہے کہ قدریہ اور مرجئہ اس اُمت کے مجوسی ہیں اور دوسری یہ کہ یہ اُمت ستر سے زیادہ فرقوں میں بٹ جائے گی۔ اور ایک کے سوا سب جہنمی ہوں گے۔

(الفصل فی الملل والنحل)

حافظ محمد ابن ابراہیم الوزیر نے بھی صراحۃً یہ بات لکھی ہے۔ چنانچہ العواصم والقواصم میں رقمطراز ہیں:

خبردار اس زیادتی سے دھوکہ میں نہ پڑجانا کہ ایک کے سوا سب جہنمی ہوں گے۔ حدیث میں یہ زیادتی غلط ہے بلکہ یہ بات بعید نہیں کہ یہ ملاحدہ کے ہاتھ کی صفائی ہو۔ ابن حزم نے کہا ہے کہ یہ صحیح نہیں ہے۔

ہمیں علامہ زاہد کوثری کا یہ فیصلہ پسند ہے۔

اُمت کے تہتّر فرقوں میں بٹ جانے کے موضوع پر حدیثیں آتی ہیں۔ کچھ ایسی ہیں جن میں ہلاک ہونے والوں کا کوئی ذکر نہیں ہے، کچھ ایسی ہیں جن میں ایک کے نجات یافتہ ہونے اور باقی کے ہلاک ہونے کا ذکر ہے۔ اور کچھ ایسی ہیں جن میں ایک کے سوا سب کے نجات یافتہ ہونے کا ذکر ہے۔ جیسے اہل علم کا ان حدیثوں کے ثبوت اور عدم ثبوت میں کلاً یا بعضاً اختلاف ہے ایسے ہی اس میں بھی اختلاف ہے کہ ۷۳ کے عدد سے تحدید مراد ہے یا تکثیر اور اس میں بھی اختلاف ہے کہ اُمت سے اُمتِ دعوت مراد ہے یا اُمت اجابت۔

بہرحال ابو ہریرہ کی صحیح حدیث میں اس اُمت میں ۷۳ فرقوں کے ہونے کی زبانِ نبوت نے خبر دی ہے اور دوسری ضعیف روایات میں ایک کے ناجی ہونے اور باقی کے ناری ہونے کی خبر دی ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ ناجی کون ہے خواہ اس کی روایتی حیثیت کچھ ہو اور خواہ اس حدیث کے راویوں کی تعداد بقول مولانا بدرعالم ۱۵ تک پہنچ گئی ہو۔ علماء نے ان دونوں کے منطوق پر بہت کچھ کام کیا ہے۔ متعدد علماء نے ۷۳ کی تفصیل اور تعیین پر کتابیں لکھی ہیں۔ اس موضوع پر ابوالحسین الملطی متوفی ۳۷۷ھ نے ردالاہواء والابتداع میں، ابومنصور عبدالقاہر بن طاہر بغدادی متوفی ۴۲۹ھ نے الفرق بین الفرق میں، ابوالمظفر السفرائنی متوفی ۴۷۱ھ نے التبصیر میں، ابوالفتح محمد بن عبدالکریم الشہرستانی متوفی ۵۴۸ھ نے الملل والنحل میں، ان کے بعد غنیۃ الطالبین شرح المواقف خطط المقریزی، نشر الطوالع جیسی بے شمار کتابوں میں اس کی تفصیلات موجود ہیں۔ شارحین حدیث میں سے حافظ ابوبکر ابن العربی نے عارضۃ الاحوذی میں اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔

کچھ ہو اس حدیث کا مطالعہ بتا رہا ہے کہ ۷۳ فرقوں میں ایک ناجی ہے اور ناجی وہ ہے جو اس شاہراہ پر ہو جس پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام تھے۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا رہا ہے کہ امت افتراق کا شکار ہوتی ہے۔ اور یہ بات اپنی جگہ فیصلہ شدہ ہے کہ حق میں تعدد نہیں ہے۔ اس کے باوجود یہ تحقیق طلب ہے کہ ناجی کون ہے۔ اسلامی فرقوں میں ہر گروہ کا خیال ہے کہ وہ ہی فرقہ ناجیہ ہے اور وہ ہی اس شاہراہ پر گامزن ہے جس پر حضور انور اور صحابہ کرام تھے۔ میر باقر داماد نے تو کمال ہی کر دیا۔ فرماتے ہیں کہ حدیث میں ۷۳ فرقوں سے شیعوں کے فرقے مراد ہیں اور ان میں فرقہ ناجیہ امامیہ ہیں۔ ایسے ہی دوسرے تمام فرقوں میں

ہر فرقہ کا دعویٰ یہی ہے کہ وہی ناجیہ ہے۔ اگر بیرونی اور تاریخی حقائق سے الگ ہو کر صرف اس حدیث کی روشنی میں فرقہ ناجیہ کی تعیین کرنی ہے تو پھر ہماری رائے میں قاری محمد طیب کی تحقیق قابلِ ترجیح ہے کہ اہل السنہ والجماعۃ کا نام اس ارشادِ نبوت کی عکاسی کر رہا ہے۔ ما انا علیہ واصحابی کی رد سے معیارِ حق اگر ان دونوں کا مجموعہ ہے تو انا سے السنہ اور اصحابی سے الجماعۃ ہے۔ اس لحاظ سے اسلامی فرقوں میں صرف اہل السنہ والجماعۃ کو یہ فخر یا شرف حاصل ہے کہ ان کا لقب خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا تجویز فرمودہ ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ برحق وہی ہوگا جس میں یہ دونوں بنیادی اجزاء موجود ہوں۔ غور کیا جائے تو یہی لقب اس بنیادی حقیقت کو ظاہر بھی کر سکتا تھا جو اہل السنہ والجماعۃ میں ما اور انا کے امتزاج سے نمایاں ہوئی۔ مثلاً اگر اہل السنہ والجماعۃ کا اہلِ قرآن، اہل حدیث، اہلِ فقہ، اہل تصوف، اہل کلام اور اہلِ اصول نام ہوتا تو اس سے ما کا مصداق یعنی شخصیتوں کا تصور نہ آسکتا۔ اس لیے لقب اکہرا اور ناتمام ہوتا اور اس کا لقب اہل جماعۃ یا متبعین صحابہ یا اصحاب محدثین و مجتہدین یا اتباعِ فقہاء یا محبین اہلِ بیت ہوتا تو اس سے بلاشبہ انا کے مفہوم پر تو روشنی پڑتی لیکن ما کے کلمہ کا حق ادا نہ ہوتا اور یہ معلوم ہوتا کہ یہ فرقہ شخصیت پرست یا طبقہ پرست ہے جس کے پاس شخصیتوں کے سوا کوئی اصول نہیں کہ جس کی یہ پیروی کرے۔ اس لیے لقب اہل السنہ والجماعۃ رکھا گیا تاکہ اس کے مسلک کے یہ دو بنیادی اصولیت اور شخصیت، بادل و ہلہ نام ہی سے ظاہر ہو جائیں۔ مطلب یہ ہے کہ اہل السنہ والجماعۃ کا یہ مرکب دو اجزاء سے مل کر بنا ہے ایک السنہ اور دوسرے الجماعۃ۔ السنہ کے لفظ سے اصول قانون اور دستور نمایاں ہے اور الجماعۃ کے لفظ سے ذوات، شخصیات اور فقہاء طریق نمایاں ہیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس مسلک میں اصول و قوانین بغیر ذوات کے اور ذوات بغیر اصول و قوانین کے معتبر نہیں۔ قوانین ذوات کے راستہ سے آئے ہیں اور ذوات کو قوانین کے ذریعے پہچانا گیا ہے۔ ان دونوں میں ماخذ اور ماخوذ کی نسبت ہے۔ ماخذ کو لینا ماخوذ کو چھوڑ دینا یا ماخوذ کو لینا اور ماخذ کو چھوڑ دینا دانشمندی نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس امت کو قرآن ہی نہیں دیا بلکہ ذات پیغمبر بھی دی ہے۔ ایسے ہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف قرآنی قانون ہی نہیں دیا بلکہ قانون دان ذوات و شخصیات بھی دی ہیں۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ دین اور دینی ہدایت اور تربیت کے لیے صرف کتاب یا صرف شخصیت کافی نہیں بلکہ قانون کے ساتھ معلمین قانون اور دستور کے ساتھ مربیانِ دستور کا بھی ناگزیر ضرورت ہے تاکہ صرف قانون ہی کا علم نہ ہو بلکہ ذوات سے وابستہ ہو کر اس کا رنگ بھی آئے اور اس کی حقیقی و معنوی کیفیات بھی قلوب میں راسخ ہوں۔ اس لیے مسلک اہل السنہ والجماعۃ میں حسب روشِ نبوت یہی دو بنیادیں ذوات اور قانون بطور رکن اختیار کی گئیں۔ حدیث میں ما سے نبوت کی روش کی طرف اشارہ ہے جو دین کا دستور و آئین ہے اور انا و اصحابی سے برگزیدہ شخصیتوں کی

طرف اشارہ ہے جو ذات پیغمبر سے شروع ہوئی اور بعد میں دینی شعبوں میں سے کسی نہ کسی شعبہ میں حذاقت اور مہارت سے بنتی رہی ہیں۔ اس لیے اہل السنۃ والجماعۃ نے اپنے مسلک کی جامع حقیقت جس جامع لقب سے ظاہر کی وہ حقیقت پر مبنی ہے اور یہ لقب اسی ارشادِ نبوت سے لیا گیا ہے بلکہ ابوداؤد کی معاویہ والی روایت میں تو صراحۃً "انا واصحابی" کی جگہ الجماعۃ موجود ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ بشرط زندگی جلد ۲۱ میں آئے گی۔ وہاں ہم بتائیں گے کہ تاریخی لحاظ سے اُمت میں تفرق کے اسباب کیا ہیں۔

علامہ شاطبی نے الاعتصام میں حقیقت افتراق سے بحث کرتے ہوئے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ جو چیز ممنوع ہے وہ مطلق افتراق نہیں بلکہ افتراق مقید ہے۔ یعنی دین میں ایسی پارٹی بازی کہ باہم الفت، اخوت اور ہمدردی نہ رہے۔ افتراق کی ضد اجتماع ہے۔ قرآن کا اُمت سے مطالبہ اجتماع و ایتلاف کا ہے اور مقصود وہ حالت ہے جب مختلف کارکن قوتیں کسی ایک مقام، ایک مرکز ایک سلسلے ایک وجود ایک طاقت اور ایک فردِ واحد میں اپنی مناسب قدرتی ترکیب و ترتیب کے ساتھ اکٹھی ہو جاتی ہیں اور تمام مواد، قویٰ، اعمال اور افراد پر ایک اجتماعی و انضمامی دور طاری ہو جاتا ہے۔ اس طرح کہ ہر قوت اکٹھی، ہر عمل باہم جڑا ہوا، ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی، ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد و متصل ہو جاتا ہے، کسی چیز کسی گوشہ کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ انتشار اور فرد فرد ہو کر رہنے والی حالت نہیں ہوتی۔ مادے میں جب یہ انضمام و اجتماع پیدا ہوتا ہے تو اسی سے تخلیق و تکوین کے تمام مراتب کی نمائش ہوتی ہے۔ لہٰذا زندگی نام ہے اجتماع و ایتلاف کا اور موت کہتے ہیں افتراق و انتشار کو، یہی حالت جب افعال و اعمال پر طاری ہوتی ہے تو علمائے اخلاق اس کو خیر کہتے ہیں اور شریعت کی زبان میں اسی کا نام عمل صالح ہے اور جب جسم انسانی پر طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح میں تندرستی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ اور پھر یہی حالت جب قومی و جماعتی زندگی کی قوتوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا نام حیاتِ قومی و اجتماعی ہوتا ہے۔ اور اس کا ظہور قومی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط کی شکل میں دنیا دیکھتی ہے۔ اس حالت کی ضد افتراق و انتشار ہے افتراق و انتشار سے مقصود وہ حالت ہے جب اجتماع و ایتلاف کی جگہ الگ الگ ہو جاتے، متفرق اور پراگندہ ہوتے اور باہمدگر علیحدگی و بیگانگی کی حالت طاری ہو جاتے۔ مواد میں قویٰ میں، اعمال میں، افراد میں ہر بات میں پہلی حالت سے بالکل متضاد حالت پیدا ہو جاتے۔ یہ حالت جب مادے پر طاری ہو جاتی ہے تو اس کا نام بیماری، اور پھر موت ہے، اعمال پر طاری ہوتی ہے تو عصیان و عدوان ہے اور جب قوموں اور اُمتوں کی اجتماعی زندگی پر طاری ہوتی ہے تو اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عظمت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی ہوتی ہے۔ یہی تفرق و افتراق ہے جس سے قرآن نے لا تفرقوا، فتفرق بکم عن سبیلہ

اسی تفرق کا عمل متعدی تفریق ہے جس کا قرآن نے یہاں دوسروں کی طرف نسبت کرکے ذکر کیا ہے اور یہ تفریق مطلق نہیں بلکہ وہ تفریق ہے جس کا تعلق دین سے ہے۔ آیت کی مراد بقول امام رازی یہ ہے کہ اہل اسلام کو ہدایت کی جارہی ہے کہ مسلمانوں کی بات ایک ہو، دین میں تفرق نہ ہو اور نت نئی بدعات کے ذریعے مختلف راہیں نہ پیدا کی جائیں۔ لست منهم فی شیئ کا مطلب یہ ہے کہ آپ کا ان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ ان سے قطعاً بری ہیں۔

آخر میں فرمایا ہے انما امرهم الی اللہ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے وہی ان کو تفریق کی یا دین سے مفارقت کرکے گروہ در گروہ بننے اور اُمت کی وحدت کو پارہ پارہ کرنے کی سزا دے گا۔ دُنیا میں بھی اور آخرت میں بھی اور آپ کو ان سے کچھ سروکار نہیں ہے۔ آپ اپنا فرض ادا کر چکے ہیں۔ ان کا معاملہ اللہ کے حوالے ہے۔ وہی ان کو ان کے کردار سے آگاہ کرے گا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آیت اپنے ظاہر کے اعتبار سے عام ہے اور ہر اس شخص کے خلاف چیلنج ہے جو اللہ کے دین سے مفارقت کرے اور اس کا مخالف ہو کیونکہ اللہ سبحانہٗ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو الہدیٰ اور دین الحق دے کر روانہ کیا ہے تاکہ تمام ادیان پر اس کا غلبہ ہو۔ آپ کا قانون ایک ہے اس میں کوئی اختلاف اور افتراق نہیں ہے۔ اب اگر کوئی اس میں راہ اختلاف نکالتا ہے اور پارٹی در پارٹی بناتا ہے جیسے اہل اہواء اور گمراہ پیشہ لوگ کرتے ہیں تو اللہ نے اپنے رسول کو اس سے بری قرار دیا ہے۔

جزا و سزا کا خدائی قانون

۲۱۴۔ جو کوئی نیکی کی پیش کش کرے گا تو اس کے بدلے میں اس کو دس گنا ہے اور جو کوئی برائی لے کر آئے گا تو برائی کا بدلہ برائی کے برابر دیا جائے گا اور لوگوں کے ساتھ ناانصافی بالکل نہ ہوگی ثم ینبئهم بما کانوا یفعلون میں ان کے افعال شنیعہ کی مجازات پر متنبہ کیا گیا تھا۔ ساتھ ہی ہر نیک و بد کی مجازات کا قانون عام بتا دیا گیا کہ بھلائی کا بدلہ کم از کم دس گنا ہے اور برائی کا زائد از زائد اس کے برابر، یعنی جس نے ایک نیکی کمائی تو کم از کم دس نیکیوں کا ثواب ملے گا زائد کی حد نہیں واللہ یضاعف لمن یشاء اور جو ایک بدی کا مرتکب ہوا تو ویسی ایک بدی کا جس قدر سزا مقرر ہے اس سے آگے نہ بڑھیں گے تخفیف کر دیں یا بالکل معاف کر دینے کا اختیار ہے پھر جہاں وفور رحمت کی یہ کیفیت ہو وہاں ظلم کا کیا امکان ہے[۱] گویا جماعت کی بقا و فنا کا ضابطہ بیان فرمانے کے بعد کہ اُمتوں میں اجتماعی زندگی او دین سے وابستگی ادبار کی جگہ اقبال تسفل کی جگہ عروج تنزل

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کی جگہ ترقی اور ذلت کی جگہ عزت لاتی ہے اور اُمتوں میں افتراق اور دین سے مفارقت اور اس میں تفریق کا عمل اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل اور عظمت کی جگہ ذلت لاتا ہے۔ اب یہاں بتایا جارہا ہے کہ افراد کی تندرستی اور صحت، بیماری اور موت کا معیار کیا ہے۔ فرمایا افراد میں حسنہ کی حالت صحت اور تندرستی ہے اور سیئہ کی کیفیت بیماری اور موت ہے۔ اگرچہ قرآن نے نیکی اور بدی کے لیے جیار کی تعبیر اختیار فرمائی ہے مگر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے تحدث اور وہم تک عام فرمادیا۔ یعنی دل میں خیال کرنے اور ارادہ کرنے کو بھی اس میں داخل فرمادیا۔ صحیح بخاری اور مسلم میں بحوالہ حضرت ابوہریرہ کا یہ ارشاد آیا ہے۔

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے کہ میرا بندہ جب اپنے دل میں نیکی کرنے کا خیال کرتا ہے تو صرف اس خیال پر میں ایک نیکی لکھ دیتا ہوں جب تک وہ اسے کرتا نہیں اور جب وہ یہ نیکی کرلیتا ہے تو اب اس کو دس گنا لکھتا ہوں اور جب دل میں وہ کسی برائی کا خیال کرتا ہے تو اسے معاف کردیتا ہوں اور اگر کرلیتا ہے تو صرف ایک برائی لکھتا ہوں۔

صحیح مسلم میں اسرار کی ایک روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ ایک نیکی پر دس گنا ملنے کا ضابطہ ان خصوصی انعامات میں داخل ہے جو معراج کی پُراسرار شب میں آپ کو دیے گئے تھے۔ اللہ اکبر جس اُمت کو تھوڑی مدت میں دوسری اُمتوں پر بلند و بالا اور فائق کرنا منظور تھا۔ اس کی صورت یہی ہوسکتی تھی کہ اس کے قلیل عمل کے لیے تضعیف کا قانون بنایا جاتے تاکہ اس جدید قانون کے ماتحت اس کے تھوڑے عمل بھی دوسری اُمتوں کے طویل مدتوں کے عمل سے زیادہ ہوجائیں اور اس پیرایہ سے عمل کی بازی جس اُمت کو جتانی منظور تھی وہ جیت بھی جاتے اور قانون عدل و فضل دونوں کا اقتضا بھی پورا ہوجائے۔

کسی نیک کام یا بدکام کے عملی جامہ پہنانے کی چار صورتیں ہیں۔ اول نیکی کا ارادہ کرے اور اس پہ عمل بھی کرے۔ دوم نیکی کا صرف ارادہ کرے اور اس پر عمل نہ کرے۔ بدی کی بھی یہی دو صورتیں ہیں۔ اس طرح یہ چار صورتیں ہوئیں۔ پہلی صورت میں ایک نیکی دس گنا۔ دوسری صورت میں صرف ارادے پر ایک نیکی لکھ دی جاتی ہے لیکن بدی کا یہ حکم نہیں۔ یہاں عمل کی صورت میں صرف ایک بدی لکھی جاتی ہے۔

بدی کا ارادہ کے بعد نہ کرنے پر نیکی

صحیح بخاری اور مسلم کی سابقہ حدیث میں یہ ارشاد بھی نقل ہوا ہے کہ

> حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی فرمایا کہ فرشتے عرض کرتے ہیں خداوندا یہ تیرا بندہ

بری کرنے کا ارادہ کر رہا ہے حالانکہ خوب جانتا ہے ارشاد ہوتا ہے ابھی انتظار کرو اگر کرے تو
صرف ایک برائی لکھ لو۔ اور اگر چھوڑ دے تو اب اس کے حق میں اسے بھی ایک نیکی لکھ لو کر
اس نے میرے ہی خوف سے اس برائی کو چھوڑا ہے۔

عزم معصیت کے بعد اس پر عمل نہ کرنے پر نیکی صرف اس صورت میں لکھی جاتی ہے جبکہ اس معصیت کا نہ کرنا خدا کے خوف پر مبنی ہو۔ اگر حالات کی ناسازگاری کی وجہ سے ارادہ کے باوجود یہ معصیت وجود میں نہ آ سکی یا سہو و نسیان کی بنا پر ذہن سے نکل گئی تو اس قسم کی صورت میں گناہ نہ کرنے سے وہ نیکی کا حقدار نہ ہوگا۔ صحیح مسلم میں اسی روایت میں ابن عباس سے حدیث النفس کی بجائے ھـمّ کا لفظ آیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہاں صرف خطرہ کا درجہ مراد نہیں بلکہ ارادہ کا وہ مرتبہ مراد ہے جس کے بعد عمل کے لیے دل میں فکر پیدا ہو جاتی ہے اسی کا نام ھـمّ ہے۔ حزیم بن فاتک کے الفاظ سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عزم مراد ہے صرف وسوسہ و خیال مراد نہیں۔ ارشاد ہے :

جس نے کسی نیکی کا ارادہ کیا اور اللہ تعالیٰ پر یہ بات ثابت کر دی کہ وہ اس کا برابر احساس
کر رہا ہے اور اس کو عمل میں لانے کے لیے حریص ہے۔ پھر ان مراحل کے بعد بھی اگر اس کو نہ
کیا تو بے شک اب اس کے لیے نیکی ہے۔

صرف حسنہ کے ارادے پر ایک نیکی لکھے جانے پر تو کوئی تفصیل نہیں ہے لیکن سیئۃ کے ارادے کر لینے کے بعد نہ کرنے پر ایک حسنہ ملنے پر قدرے تفصیل کی حاجت ہے۔

عزم علی المعصیت کی وہ صورت جس سے مقصود شریعت کا استخفاف و استہزاء ہو یہاں زیر بحث نہیں یہ تو کھلا کفر ہے۔ اسی طرح وہ صورت بھی زیر بحث نہیں ہے جہاں ایک شخص صرف اپنی خواہش نفس کی بنا پر کسی معصیت کا عزم کر لیتا ہے لیکن اس کے بعد خدا کے خوف سے وہ اس معصیت کا ارتکاب نہیں کرتا۔ یہاں بلاشبہ اس کے خوف و خشیت کی وجہ سے اسے ایک نیکی کا ثواب ملنا چاہیے جیسا کہ صورت مذکورہ میں اگر ترک معصیت کا داعیہ مخلوق کا خوف یا محض ریاکاری ہو تو اس کی گرفت ہونی چاہیے۔ غور طلب صورت صرف یہ ہے کہ اگر ایک شخص عزم کر لینے کے بعد خود بخود اپنے ارادے میں سست پڑ جاتا ہے اور اس لیے عمل کی نوبت ہی نہیں آتی ہے تو کیا اس طرح کا عزم بھی معصیت شمار ہوگا۔ یا جب کہ عمل کی حد تک نہ پہنچنے کی وجہ سے قابل درگزر ہوگا۔ فقہاء، متکلمین اور محدثین کا مختار یہ ہے کہ چونکہ اس نے پختہ ارادہ کر لیا تھا اس لیے اس کی گرفت ہوگی چاہے یہ گرفت اصل جرم کے لحاظ سے ہلکی ہو۔

امام عبداللہ بن المبارک اور امام سفیان ثوری سے دریافت کیا گیا کہ کیا آدمی کا ارادہ بھی قابل گرفت ہے

فرمایا ہاں جب ارادہ پختہ ہو جاتے۔ امام شافعی فرماتے ہیں کہ صرف ارادے پر کوئی گرفت نہیں جب تک منہ پر نہ لائے یا اس پر عمل نہ کرے۔ یہ تمام تفصیل ان معاصی کے ارادے میں تھی جن کا تعلق جوارح سے ہے جیسے چوری زنا وغیرہ باقی رہے وہ اعمال جن کو اعمالِ قلبیہ کہا جاتا ہے مثلاً کفر حسد وغیرہ تو یہاں صرف عزم بلکہ ہم پر گرفت ہوگی۔

فقہاء و متکلمین اور امام شافعی کے درمیان زیر اختلاف شق اب بھی تشنہ ہے۔ ہمارے نزدیک جامع العلوم والحکم میں حافظ ابن رجب حنبلی کی تفصیل یہاں بے حد پسندیدہ اور دلآویز ہے۔ ان کے بیان کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر ایک شخص کسی معصیت کا پہلی ہی مرتبہ ارادہ کرتا ہے یعنی ابھی اس نافرمانی کی عمر بھر میں کبھی نوبت ہی نہ آئی تھی تو پہلی مرتبہ عزم پر اس کی گرفت نہ ہوگی۔ لیکن اگر وہ اس معصیت کا ذائقہ کبھی پہلے چکھ چکا ہے اور اب پھر اس کا عزم کر رہا ہے تو اس کے اس عزم پر بھی مواخذہ ہونا چاہیے کیونکہ اب اسے صرف عزم نہیں کہا جا سکتا بلکہ یہ اصرار کی تعریف میں آتا ہے یہ قابلِ اغماض نہیں ہے جیسے کہ وہ شخص جو عزم کے بعد اپنی جانب سے تو اس عمل کے تمام مقدمات پورے کر چکا ہو۔ پھر کچھ آسمانی اسباب ایسے رونما ہو جائیں جو اس کو عملی جامہ پہنانے میں حائل ہو جائیں وہ بھی اس قدرتی معذوری کی بنا پر معذور نہیں کہا جا سکتا۔ اسی لیے جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے قاتل و مقتول کے بارے میں وعید سنائی تو سامعین نے دریافت کیا کہ بے چارہ مقتول جہنم میں کیوں گیا آپ نے فرمایا انہ کان حریصاً علیٰ قتل صاحبہ وہ بھی تو اپنے بھائی کے قتل کی فکر میں تھا۔ یہ دوسری بات ہے کہ کسی سبب سے وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قاتل و مقتول دونوں گناہ میں برابر ہیں بلکہ منشا یہ ہے کہ جو پورے عزم کے بعد عمل کے لیے قدم اٹھا چکا ہے۔ اگرچہ کسی سبب سے کامیاب نہ ہو سکا لیکن وہ اپنی اس غیر اختیاری ناکامی سے اپنے اس اختیاری عزم اور اس کو پورا کرنے کے اختیاری سعی کے جرم سے بری نہیں ہو سکتا۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح عزم کے بعد عمل کے لیے سعی کرنا قابلِ مواخذہ ہو سکتا ہے اسی طرح کسی معصیت کے بعد اس کا پھر ارادہ کرنا بھی قابلِ مواخذہ ہے کیونکہ یہ صرف عزم نہیں بلکہ عمل کی ابتدائی کڑی ہے۔

جزا میں قانونِ تضعیف

اگرچہ جزا میں عام قانون تو یہی ہے کہ ایک نیکی کے بدلے میں دس گنا ثواب ملے گا لیکن ایک ارشادِ نبوت سے معلوم ہوتا ہے اور قرآن کی دوسری آیات بھی اس کی مؤید ہیں کہ اسلامی زندگی میں اگر حسن کاری کو اپنا لیا جائے تو عام حسنات دس گنا سے ترقی کر کے سات سو گنا تک پہنچ جاتی ہیں۔ ارشاد ہے:

ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے جب تم میں سے

کوئی اپنے اسلام میں حسن کار بن جاتا ہے تو پھر جو نیکی کرتا ہے وہ اس کے نامۂ اعمال میں دس گنا سے سات گنا تک لکھی جاتی ہے ۔

راجح یہی ہے کہ یہ تضعیف بھی عام ہے لیکن حسنات میں تضعیف کی ابتداء اس وقت ہوتی ہے جب ایمان و اسلام سے گزر کر صفتِ احسان میں قدم رکھا جاتے ۔ حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ ایک نیکی پر اس کا دس گنا تو اس اُمت کے حق میں عام ضابطہ ہے لیکن خدا کی رحمت اپنا دروازہ اس حد پر پہنچ کر بند نہیں کرتی بلکہ سات سو اور اس سے بھی زیادہ دینے کے لیے کھلا رکھتی ہے ۔ جیسے یہ صفتِ احسان کامل ہوتی جاتے گی یعنی عبادت میں جتنا خلوص اور اللہ تعالیٰ کی رویت کا جتنا تصور غالب ہوتا جاتے گا اتنا ہی ایک نیکی کا ثواب بڑھتا جائے گا ۔ اسی طرح بعض اوقات خود عمل کی برتری وفضیلت اور وقت کے تقاضے کا احساس بھی ایک نیکی کو بے شمار نیکیاں بنا دیتا ہے ۔ ابن عمر سے دریافت کیا گیا کہ من جاء بالحسنة فله عشر امثالها تو عام مسلمانوں کے بارے میں ہے فرمایئے مہاجرین کے لیے کیا قانون ہے ۔ انہوں نے جواب دیا اس سے اور زیادہ اور یہ آیت تلاوت کی ۔

وان تك حسنة يضاعفها ويوت من لدنه اجراً عظيماً

اور اگر نیکی ہو تو اس کو بڑھاتا ہے اور اپنے پاس سے بڑا اجر عطا فرماتا ہے ۔

ابوہریرہ سے روایت ہے کہ ایک نیکی پر بیس لاکھ نیکیاں بھی لکھ دیتا ہے ۔

بہرحال نیکیوں کی تضعیف اور زیادتی کا ضابطہ سات سو گنا ہی پر ختم نہیں ہوتا اس سے بھی کہیں زیادہ پہنچتا ہے بے شک جس کی رحمت بے پایاں ہو اس کے انعامات بھی بے پایاں ہونے چاہئیں لیکن یہ یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی یہ بے حساب داد و دہش اسلام کے اس اعلیٰ مرتبہ سے شروع ہوتی ہے جس کا نام احسان ہے ۔

یہاں حسنات و سیئات کے اس جزائی قانون پر قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے ایک سوال کے ذریعے خوب نکتہ آفرینی کی ہے کہ نیکیاں ہوں یا برائیاں ان کے بدلہ کا اندازہ اللہ کا اپنا مقرر فرمودہ ہے ۔ اس میں عقل انسانی کی دسترس نہیں ہے کیونکہ عمل اور جزا میں کوئی مماثلت نہیں ہے ۔ حسنہ کی جزا وہ ہے جو اللہ نے اس کے لیے مقرر فرمائی ہے ۔ اس بنا پر یہ بات ذہنِ انسانی کی گرفت میں نہیں کی ہے کہ جو ایک کرے گا اس کو دس گنا ملے گا ۔ اگر ہر نیکی کرنے والے کو دس گنا ہی ملے گا پھر تقابل کہاں رہا ۔ ایک شخص کو اگر آپ دیکھ کام میں ایک درہم دیں اور دوسرے کو دس دیں تو یہ تو دس گنا ہے کیونکہ تقابل ہے لیکن اگر آپ سب کو ہی دس دے رہے ہیں تو دس گنا کہاں ہے ۔ قاضی صاحب نے ہی جواب یہ دیا ہے کہ دراصل

نیکی کی جزاء علمِ الٰہی میں ایک مقرر ہے۔ کچھ کو یہ مقررہ ملے گی اور کچھ کو اخلاص کی قوت سے دس گنا اور اس سے زیادہ ملے گی۔ اور اگر یوں کہا جائے کہ جزا کا جو پیمانہ عام اُمتوں کے لیے اللہ نے مقرر کیا ہے اس کے مقابلے میں اُمت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دس گنا جزا ملے گی اور اس پر قرب و اخلاص کی بناپر تضعیف ہوگی۔

قُلْ اِنَّنِیْ هَدٰىنِیْ رَبِّیْۤ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِیْمٍ ۚ۬ دِیْنًا قِیَمًا مِّلَّةَ

اِبْرٰهِیْمَ حَنِیْفًا ۚ وَمَا كَانَ مِنَ الْمُشْرِكِیْنَ ﴿۱۶۱﴾ قُلْ اِنَّ صَلَاتِیْ وَنُسُكِیْ

وَمَحْیَایَ وَمَمَاتِیْ لِلّٰهِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۶۲﴾ لَا شَرِیْكَ لَهٗ ۚ وَبِذٰلِكَ

اُمِرْتُ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُسْلِمِیْنَ ﴿۱۶۳﴾ قُلْ اَغَیْرَ اللّٰهِ اَبْغِیْ رَبًّا وَّ

هُوَ رَبُّ كُلِّ شَیْءٍ ؕ وَلَا تَكْسِبُ كُلُّ نَفْسٍ اِلَّا عَلَیْهَا ۚ وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ

وِّزْرَ اُخْرٰى ۚ ثُمَّ اِلٰى رَبِّكُمْ مَّرْجِعُكُمْ فَیُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ

فِیْهِ تَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۶۴﴾ وَهُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ وَ

رَفَعَ بَعْضَكُمْ فَوْقَ بَعْضٍ دَرَجٰتٍ لِّیَبْلُوَكُمْ فِیْ مَاۤ اٰتٰىكُمْ ؕ

اِنَّ رَبَّكَ سَرِیْعُ الْعِقَابِ ۖ وَاِنَّهٗ لَغَفُوْرٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۶۵﴾ ع

اے پیغمبر کہہ دو کہ مجھے میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھایا ہے

وہی درست اور صاف دین ہے ابراہیم کا طریقہ جو ایک خدا کا

ہو کر رہا اور ابراہیم مشرکوں میں سے نہ تھا[۲۱۵]۔ کہہ دو میری نماز

میرا حج میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے
جہانوں کا مالک ہے، اس کا کوئی شریک نہیں ہے[۲۱۶]۔ مجھے اسی
بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں مسلموں میں سے سب سے پہلے فرمانبردار
ہوں[۲۱۷]۔ آپ ان لوگوں سے دریافت کریں کہ کیا میں خدا کے سوا
کوئی دوسرا رب تلاش کروں حالانکہ وہ ہی ہر چیز کا رب ہے[۲۱۸]۔
اور دیکھو ہر آدمی اپنے کردار سے جو کچھ کماتا ہے اس کی ذمہ داری
اسی پر ہے۔ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھاتا
پھر بالآخر تم سب کو اپنے رب کے حضور میں پیش ہونا ہے
وہ بتلائے گا جن باتوں میں تم اختلاف کرتے تھے[۲۱۹]۔ اور وہی
ہے جس نے تمہیں ایک دوسرے کا زمین میں جانشیں بنایا اور
تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی[۲۲۰]، تاکہ جو کچھ تمہیں
دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے بلاشبہ تمہارا پروردگار جلد سزا

دینے والا اور بلاشبہ وہ بخشنے والا رحمت والا ہے۔ ۲۲۱

معانی مفردات

قیماً: اسے دو طرح پڑھا گیا ہے ایک تو یہی جو قرآن میں لکھا ہے دوسرے یا مشدد سے قیّماً۔ پہلا مصدر ہے۔ صغر اور کبر کے انداز پر۔ اصل میں قوَم تھا جیسے عوض اور حول، لیکن صرف اس لیے کہ اس کے فعل میں تعلیل ہوتی ہے۔ اس میں بھی واؤ کو یا سے تبدیل کر دیا گیا ہے۔ بطور مبالغہ اسے دین کی صفت بنایا گیا ہے۔ یعنی سیدھا جس میں کوئی کجی نہیں ہے۔ اور اگر یہ تشدید کے ساتھ ہو تو یہ فیعل کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے۔ قام یقوم سے قیّم جیسے ساد یسود سے سیّد۔ ملّۃ، امام راغب نے دین اور ملت میں یہ فرق بتایا ہے کہ لفظ ملت کی اضافت صرف انبیاؑ کی طرف ہوتی ہے نہ کسی غیر نبی کی طرف ہوتی ہے اور نہ اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ اسی سے ملتی، ملۃ زید اور ملۃ اللہ نہیں بولا جاتا۔ ہاں دین کا استعمال عام ہے۔ دین اللہ، دین الانبیاؑ اور دین زید صحیح ہے۔ یہ فرق اس نظریہ پر مبنی ہے کہ ملت صرف اس دستور الٰہی کا نام ہے جو انبیاؑ کی وساطت سے روانہ کیا جاتا ہے۔ ملۃ املت الکتاب سے ماخوذ ہے۔ گویا اللہ کی جاری کردہ یا تحریر کردہ چیز ملت ہوتی اور دین کے معنے ہیں طاعت اور یہ ایک اضافی چیز ہے۔ اطاعت کرنے والا بھی ہونا چاہیے اور جس کی اطاعت کی جائے اس کا ہونا بھی ضروری ہے اس لیے دین کی اضافت مطیع اور مطاع دونوں کی طرف ہو جاتی ہے۔ خلآئف، خلیفہ کی جمع ہے۔ اس کے معنے جانشین کے ہیں۔ خلف سے صفت کا صیغہ ہے۔ مصدر خلافت ہے جس کے معنے جانشین ہونے کے ہیں۔ نسک، عبادت پرستش قربانی، اسی سے ناسک عابد، اسی سے مناسک عبادت کے طریقے قربانی کی جگہ، دین کا راستہ اسی سے تنسک عبادت کرنا۔

[صراطِ م]ستقیم کا واقعی چہرہ

پہلے دعوٰی کیا تھا کہ ھذا صراطی مستقیماً یہ میرا سیدھا راستہ ہے اور مطالبہ کیا کہ اس پر چلو، دوسری

راہوں پر نہ چلو ان میں تمہاری سرتاسر پراگندگی ہے۔ اب بتایا جارہا ہے کہ اس صراط مستقیم کی واقعاتی اور تاریخی حیثیت کیا ہے؟ فرمایا یہ میری خود ساختہ نہیں بلکہ میرے رب کی بتائی ہوئی ہے کیونکہ انسان اپنی کمزوری کی وجہ سے اس پورے عرصہ حیات پر بیک وقت ایک متوازن نظر ڈال نہیں سکتا۔ اس بنا پر انسان اپنے لیے خود زندگی کا راستہ بھی ایسا نہیں بنا سکتا جس میں اس کی ساری قوتوں کے ساتھ انصاف ہو۔ اس کی تمام خواہشوں کا ٹھیک ٹھیک حق ادا ہو جاتے۔ اس کے سارے جذبات و رجحانات میں توازن قائم رہے۔ اس کے سب اندرونی و بیرونی تقاضے تناسب کے ساتھ پورے ہوں۔ اس کے اجتماعی زندگی کے تمام مسائل کی مناسب رعایت ہو اور ان سب کا ایک ہموار اور متناسب حل نکل آتے۔ اور مادی اشیا کو بھی شخصی اور تمدنی زندگی میں عدل و انصاف کے ساتھ استعمال کیا جا سکے۔ جب انسان خود اپنا شارع بنتا ہے تو حقیقت کے مختلف پہلوؤں میں سے ایک پہلو زندگی کی ضرورتوں میں سے، کوئی ایک ضرورت حل طلب مسئلوں میں سے، کوئی ایک مسئلہ اس کے دماغ پر اس طرح مسلط ہو جاتا ہے کہ دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ وہ بالارادہ بے انصافی کرنے لگتا ہے۔ اور اس کی اس رائے کے زبردستی نافذ کیے جانے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ زندگی کا توازن بگڑ جاتا ہے اور وہ بے اعتدالی کی کسی ایک انتہا کی طرف ٹیڑھی چلنے لگتی ہے۔ پھر جب یہ ٹیڑھی چال اپنے آخری حدود پر پہنچتے پہنچتے انسان کے لیے ناقابل برداشت ہو جاتی ہے تو وہ پہلو اور وہ ضروریات اور وہ مسائل جن کے ساتھ بے انصافی ہوتی تھی بغاوت شروع کر دیتے ہیں اور زور لگانا شروع کر دیتے ہیں کہ ان کے ساتھ انصاف ہو مگر پھر بھی انصاف نہیں ہوتا، کیونکہ پھر وہی عمل رونما ہوتا ہے کہ ان میں سے ایک جو سابق بے اعتدالی کی بدولت سب سے زیادہ دبایا گیا تھا انسانی دماغ پر حاوی ہو جاتا ہے اور اسے اپنے مخصوص مقتضا کے مطابق ایک خاص رُخ پر بہائے جاتا ہے جس میں پھر دوسرے پہلوؤں اور ضرورتوں اور مسئلوں کے ساتھ بے انصافی ہونے لگتی ہے۔ اس طرح انسانی زندگی کو کبھی سیدھا چلنا نصیب نہیں ہوتا ہمیشہ وہ ہچکولے ہی کھاتی رہتی ہے اور تباہی کے ایک کنارے سے دوسرے کنارے کی طرف ڈھلکتی رہتی ہے۔ تمام وہ راستے جو انسان نے خود بنائے ہیں غلط سمت سے چلتے ہیں اور غلط سمت پر ختم ہوتے ہیں۔ ان تمام غلط راستوں کے درمیان ایک ایسی راہ جو بالکل وسط میں واقع ہو جس میں انسان کی تمام قوتوں اور خواہشوں کے ساتھ اس کے تمام جذبات و رجحانات کے ساتھ اس کی روح اور جسم کے تمام مطالبوں اور تقاضوں کے ساتھ پورا پورا انصاف کیا گیا ہو جس کے اندر کوئی ٹیڑھ، کوئی کجی، کسی پہلو کی بے رعایتی اور کسی دوسرے پہلو کے ساتھ ظلم اور بے انصافی نہ ہو۔ انسانی زندگی کے صحیح ارتقا اور اس کی کامیابی کے لیے ناگزیر ہے۔ اس کی طرف صرف خدا ہی راہ نمائی کر سکتا ہے اور خدا نے اپنے رسول اسی لیے روانہ کیے

کہ اس راہ راست کی طرف انسانوں کی رہنمائی کریں، اسی کا چہرہ انتی ھذانی ربی الی صراط مستقیم میں پیش فرمایا ہے۔

۱۶۱۔ اے پیغمبر کہدو مجھے میرے پروردگار نے سیدھا راستہ دکھا دیا ہے وہی درست اور صاف دین ہے ابراہیم کا طریقہ جو ایک خدا کا ہو کر رہا اور مشرکوں میں سے نہ تھا۔ یعنی تم دین میں جتنی چاہے راہیں نکالو اور جس قدر معبود چاہو ٹھہرالو۔ مجھ کو میرا پروردگار صراط مستقیم بتلا چکا ہے اور وہی خالص توحید اور کامل تفویض و توکل کا راستہ ہے جس پر موحد اعظم ابراہیم خلیل اللہ بڑے زور شور سے چلے جن کا نام آج بھی تمام عرب اور کل ادیان سماویہ غایت عظمت و احترام سے لیتے ہیں[۱] تمام انبیائیں سے خاص طور پر حضرت ابراہیم کا نام نامی اور اسم گرامی شاید اس لیے لیا گیا ہے کہ حضور انور کے مخاطب مشرکین، یہودی اور عیسائی سب کے لیے حضرت ابراہیم کی ذات گرامی عظمت و احترام کا مشترکہ سرمایہ تھی اگرچہ یہی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسٰی کا بھی طریقہ تھا لیکن یہودیوں نے حضرت موسیٰ کو یہودیت اور عیسائیوں نے حضرت عیسٰی کو مسیحیت کا پیشوا بنا کر لوگوں کے سامنے پیش کیا تھا۔ یہودیت اور عیسائیت دونوں بعد کی پیداوار ہیں۔ یہودیت اپنے اس نام اور مذہبی خصوصیات اور رسوم و قواعد کے ساتھ تیسری چوتھی صدی قبل مسیح میں پیدا ہوئی اور عیسائیت جن عقائد اور مخصوص تصورات کا نام ہے وہ تو حضرت مسیح کے بھی ایک مدت بعد وجود میں آتے ہیں۔ اس لیے حضرت ابراہیم کا طریقہ فرمایا۔

یہاں صراط مستقیم کا چہرہ پیش کرتے ہوتے دو باتیں بنیادی طور پر فرمائی ہیں۔ ایک یہ کہ یہی دین قیم ہے دوسرے یہ کہ یہی ملت ابراہیم ہے۔ قیم اور قیّم دونوں ہم معنے ہیں۔ یعنی سیدھا اور فطری دین جس میں کوئی کجی اور انحراف نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کے علاوہ جس قدر ادیان ہیں وہ سیدھے نہیں بلکہ کج ہیں اور ان میں انحراف ہے۔ اور اس کے تعارف میں سب سے پہلے یہ فرمایا کہ ھذانی ربی یہ کسی انسانی دماغ کی تراشیدہ نہیں بلکہ رب العالمین کی بنائی ہوئی ہے۔ اس مکمل تعارف کو پورے طور پر سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ آپ اپنے ذہن میں یہ بات اتارلیں کہ ہم جب کائنات اور اس کے مظاہر پر اس نقطہ نظر سے غور کرتے ہیں کہ ہماری عقلی قوتیں ان کے فہم و ادراک میں کہاں تک مدد دے سکتی ہیں تو ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے فکر کے دو مختلف میدان ہیں جو اپنی نوعیت اور فطرت میں ایک دوسرے سے بالکل جداگانہ ہیں۔ ایک عالم مادی، دوسرا عالم انسانی۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

عالمِ مادی اور عالمِ انسانی کا فرق

عالمِ مادی بے جان اشیاء کے مجموعہ سے عبارت ہے جو ارادے کی صفت سے محروم اور آزادی عمل سے ناآشنا ہیں۔ یہ عالم اپنے معین قوانین رکھتا ہے جنہیں تجربے، مشاہدے اور قیاس سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس عالمِ انسانی کے قوانین اتنے پیچیدہ، مبہم اور غیر معین ہیں کہ تجربے اور مشاہدے کی گرفت میں مشکل سے آتے ہیں۔ اور آتے بھی ہیں تو ان پر وثوق و اعتماد نہیں کیا جا سکتا۔ جو عالمِ مادہ کے قوانین کی نسبت عام طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے مادی دنیا کے مظاہر کی صحیح توجیہہ ممکن ہے لیکن انسانی امور و معاملات اور تمدنی مظاہر کی توجیہہ صحت کے ساتھ بہت دشوار ہے۔ عالمِ مادی اور عالمِ انسانی میں سب سے زیادہ نمایاں فرق یہ ہے کہ عالمِ مادی میں انسان شاہد کی حیثیت رکھتا ہے اور عالمِ مادہ کی حیثیت مشہود کی ہے برعکس اس کے عالمِ انسانی میں انسان خود ہی شاہد ہے اور خود ہی مشہود۔ اس فرق کی وجہ سے عالمِ مادی کے مشاہدات اور تجربات اور نظریات و عقائد میں خالص معروضی نقطہ نظر اختیار کیا جا سکتا ہے اور نتائج کے استنباط میں عقل اپنی غیر جانبداری قائم رکھ سکتی ہے لیکن انسانی امور و معاملات اور تمدنی مسائل میں یہ معروضیت ناممکن ہے جہاں انسان خود اپنی زندگی کے مسائل پر غور کرنا شروع کرتا ہے وہیں اس کی شخصی اور جماعتی زندگی جذبات و میلانات سے متاثر ہوتی ہے۔

عالمِ مادی اور عالمِ انسانی کا یہ فرق معلوم کرنے کے بعد کوئی دیانتدار شخص اس بات سے انکار نہیں کرے گا کہ مادی دنیا میں صحت و صداقت کی تلاش اور اتفاق رائے کا حصول جس قدر آسان ہے عالمِ انسانی اور تمدنی مسائل میں اتنا ہی دشوار اور ناممکن ہے۔ تمدنی زندگی کے بنیادی مسائل محض عقل کی وساطت سے حل نہیں ہو سکتے کیونکہ اس میدان میں عقلی استدلال نتائج کی صحت تک رہنمائی نہیں کر سکتا۔ حضرت شیخ احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے مکتوبات میں اس مضمون کو بار بار دہرایا ہے۔ فلسفہ، اشراق اور مذاہب کی تاریخ بھی اس کی پوری طرح تائید کرتی ہے۔ قرآن کا دعویٰ یہ ہے کہ انسانی معاملات اور تمدنی مسائل کے حل کے لیے درج آئی ہے۔ یہ کسی انسان کی ساختہ و پرداختہ نہیں ہے۔ بلکہ اس کا صدور ایک ایسی ذات سے ہوا ہے جو ہمہ تن حق و صداقت ہے۔ جس کی عقل کائنات کے ہر گوشہ پر حاوی اور جس کی ہمہ بین آنکھ زمین و آسمان کی ہر شے کو محیط ہے۔ مجدد الف ثانی اسی حقیقت کی ترجمانی کرتے ہوئے اپنے مکتوبات میں لکھتے ہیں:

> انبیاء بہترین موجودات ہیں اور بہترین دولت ان کے سپرد کی گئی ہے۔ اولیاء کی انتہاء انبیاء کی ابتداء ہے نہ کہ عکس نبوت کی پیروی میں قرب بالفرض حاصل ہوتا ہے۔

کمالات ولایت کمالات نبوت کے مقابلہ میں کوئی حیثیت نہیں رکھتے وہ نسبت بھی نہیں جو قطرہ کو سمندر سے ہوتی ہے۔

اور ایک جگہ فرماتے ہیں:

ولایت میں سینہ کی تنگی کی وجہ سے مخلوق کی طرف پوری توجہ نہیں ہوتی اور نبوت میں سینہ کی انتہائی فراخی کی وجہ سے نہ توجہ حق توجہ مخلوق سے مانع ہوتی ہے اور نہ توجہ خلق حق میں حائل ہوتی ہے۔

بہرحال امورِ انسانی کو اللہ کی جانب سے بواسطہ وحی نبوت حل کرتی ہے۔ اسی کو یہاں ھدانی ربی کہہ کر پیش کیا گیا ہے اور یہی وہ صراطِ مستقیم ہے جس کے اجزاءِ ترکیبی نبوت کا لایا ہوا علم و عمل ہے۔ اسی کو سورۃ فاتحہ میں صراط الذین انعمت علیھم سے تعبیر کیا ہے، انعام یافتہ ذوات انبیاء، صدیقین، شہداء اور صالحین ہیں۔ کتاب الٰہی علمِ نبوت ہے اور ان ذوات کا کردار عملِ نبوت ہے۔

یہاں اس صراطِ مستقیم کے تعارف میں دینا قیماً ملۃ ابراھیم فرمایا ہے یعنی صراطِ مستقیم ہی جس کی مجھے اللہ نے ہدایت دی ہے سیدھا اور صاف نظامِ زندگی ہے۔ یہی راہِ عمل نوعِ انسانی کے لیے خدا کا ٹھہرایا ہوا فطری دین ہے۔ یہی الدین القیم یعنی سیدھا اور درست دین جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں۔ یہی دین حنیف ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیم نے دی تھی۔ اس میں نہ تو بوجھل عقیدے ہیں نہ ناقابلِ فہم عقیدے اور نہ ناقابلِ برداشت عملوں کی ایک طول طویل فہرست ہے۔ یہ اتنا واضح اتنا سہل اتنا مختصر ہے کہ عقائد و اعمال کی پوری فہرست صرف دو فقروں میں ختم کی جا سکتی ہے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ۔ حافظ ابن تیمیہ الرد علی البکری میں فرماتے ہیں:

دین اسلام کے دو اصول ہیں جو شخص ان میں سے ایک کو چھوڑ دے نہ اس کا دین معتبر ہے نہ کوئی عمل، ایک یہ کہ ہم ایک اللہ کی عبادت کریں دوسرے یہ کہ اس طریقہ کے مطابق کریں، جو شریعت کے مقرر کردہ ہوں نو ایجاد نہ ہوں یہی لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ کی حقیقت ہے۔

اس میں عقائد کے لیے کوئی بوجھ نہیں، اعمال میں طبیعت کے لیے کوئی سختی نہیں، ہر طرح کے پیچ و خم سے پاک ہر معنے میں اعتقاد و عمل کے لیے سیدھی سیدھی بات ہے۔ مسند احمد میں حضرت عباس نے روایت کیا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

دینوں میں سب سے زیادہ پیارا دین حنیفیہ اور محمدیہ ہے۔

حضرت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں الحنیفیہ وہ دین ہے جو ملت ابراہیمی کی طرح شعائر اللہ کے احکام اور

شعائرِ شرک کے استیصال اور رسومِ فاسدہ، اور عقائدِ باطلہ کے ابطال پر مبنی ہو اور سمحۃ وہ ہے جس کی تعلیم میں رہبانیت اور ناقابلِ برداشت مجاہدات نہ ہوں۔ بہرحال صراط دین قیم اور ملت حنیف ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اے پیغمبر تم واضح الفاظ میں کہہ دو کہ مجھے تو میرے پروردگار نے صراطِ مستقیم دینِ قیم ملتِ ابراہیم کی ہدایت بخشی ہے، میں تو انسانی زندگی کے مسائل اس کے ذریعے حل کرتا ہوں اور یہی ایک راہ سیدھی راہ ہے۔

توحیدِ عبادت کا اعلان

۲۱۶۔ کہہ دو میری نماز میرا حج میرا جینا اور میرا مرنا سب کچھ اللہ ہی کے لیے ہے جو سارے جہانوں کا مالک ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اس آیت میں توحید و تفویض کے اونچے مقام کا پتہ دیا گیا ہے جس پر ہمارے آقا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فائز ہوتے، نماز اور قربانی کا خصوصیت سے ذکر کرنے میں مشرکین پر جو بدنی عبادت اور قربانی غیر اللہ کے لیے کرتے تھے تعریضاً رد ہو گیا[۱] اس آیت میں توحید عبادت کا عملی نقشہ پیش کیا ہے۔ صلاۃ کا لفظ عربی میں نماز کے لیے ہے۔ لغت عربی میں صلاۃ کے معنے دعا کے ہیں اس لیے نماز کی لفظی حقیقت خدا سے درخواست و التجا ہے اور اس کی معنوی حقیقت بھی یہی ہے۔ قرآن ہی میں حضرت موسیٰ کے قصہ کے ضمن میں نماز کی حقیقت صرف ایک لفظ میں ظاہر کی گئی ہے یعنی خدا کی یاد اقم الصلاۃ لذکری انسان کو اپنی روحانی تڑپ، دل بے چینی، قلبی اضطراب اور ذہنی شورش کے عالم میں جب دنیا اور دنیا کی ہر چیز فانی، عقل کی ہر تدبیر درماندہ، جسم کی ہر قوت عاجز اور سلامتی کا ہر راستہ بند نظر آتا ہے تو سکون و اطمینان کی راحت اس کو صرف ایک قادرِ مطلق کی پکار اور التجا میں ملتی ہے۔ وحی الٰہی نے اس نکتہ کو اس طرح پیش کیا ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب، یہاں صلاۃ سے مراد ہر قسم کی فرض و نفل نماز ہے اور اگر اس کی حقیقت ملحوظ ہو تو ہر قسم کی دعا و طلب گاری، استعانت رکوع، سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام نیاز مندانہ اعمال مراد ہیں۔ نماز بھی دینِ ابراہیمی میں موجود ہے۔ عرب کا ایک جاہلی شاعر جران العود کہتا ہے۔

وادرکن اعجازا من اللیل بعد ما
اقام الصلاۃ العابد المتحنف

اور ان سواریوں نے رات کے پچھلے حصہ میں اس وقت کے بعد جب عبادت گزار حنیفی نماز پڑھ

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

چکا تھا، بلکہ اگر یہ کہا جائے کہ نماز مذہب ان اصولوں میں سے ہے جن پر دُنیا کے تمام مذاہب متفق ہیں تو یہ کوئی مبالغہ نہیں۔ قرآن کی تصریح کے مطابق دُنیا میں کوئی پیغمبر ایسا نہیں آیا جس نے اپنی اُمت کو نماز کی تعلیم نہ دی ہو اور اس کی تاکید نہ کی ہو۔ خصوصاً ملت ابراہیمی میں اس کی حیثیت سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ حضرت ابراہیم جب اپنے صاحبزادے حضرت اسماعیل کو مکہ میں آباد کیا تو اس کی غرض یہ بتائی کہ ربنا لیقیموا الصلاۃ حضرت ابراہیم اپنی اور اپنی نسل کے لیے دُعا کرتے ہیں رب اجعلنی مقیم الصلاۃ ومن ذریتی حضرت اسماعیل کے بارے میں قرآن کا انکشاف ہے وکان یامر اھلہ بالصلاۃ، حضرت شعیب کو ان کی قوم طعنہ دیتی ہے ۔

اصلاتک تامرک ان نترک ما یعبد اباءنا۔

کیا تمہاری نماز تم کو حکم دیتی ہے کہ اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں ۔

حضرت لوط، حضرت اسحاق، حضرت یعقوب سب کے بارے میں قرآن نے بتایا ہے

اوحینا الیھم فعل الخیرات و اقام الصلاۃ

ہم نے ان کو نیک کاموں کے کرنے اور نماز قائم کرنے کی وحی کی تھی ۔

بہرحال نماز ملتِ ابراہیمی میں موجود تھی۔ لیکن سب نماز کو بھلا بیٹھے تھے۔ یہودیوں میں نماز صرف چند رسوم کا مجموعہ بن کر رہ گئی تھی۔ عیسائیوں نے خدا کی نماز کے ساتھ انسانوں کی نمازیں بھی شروع کر دی تھی۔ حضرت عیسٰی حضرت مریم کے علاوہ اور بھی سینکڑوں ولیوں اور شہیدوں کی عبادت میں مصروف ہو گئے تھے۔

دین ابراہیمی کی پیروی کے مدعی صرف اپنے قیاس سے کچھ ارکان ادا کر لیتے تھے۔ الغرض آپ کی بعثت سے پہلے نماز کی خالص اور موحدانہ حقیقت دنیا سے گم ہو گئی تھی اور جو کچھ تھی اس میں مشرکانہ رسوم کی آمیزش تھی۔

نسکی عام شارحین قرآن نے اس کے معنے قربانی کیے ہیں کچھ نے حج مراد لیا ہے اور کچھ نے اس کے معنے عبادت کیے ہیں۔ ان میں کوئی تعارض نہیں ہے۔ اگر حج مراد ہو تو اس میں قربانی بھی ہے اور وہ عبادت بھی ہے اور اگر قربانی مراد ہو تو وہ بھی حج کا حصہ ہے اور عبادت بھی ہے۔ قرآن سے یہ بات ثابت ہے کہ ملتِ ابراہیمی کی اصل بنیاد قربانی ہے اور یہی قربانی حضرت ابراہیم کی پیغمبرانہ اور روحانی زندگی کی اصل خصوصیت تھی اور اسی امتحان میں پورے اترنے کی وجہ سے وہ ان کی اولاد ہر قسم کی برکتوں اور نعمتوں سے مالامال کی گئی لیکن یہ قربانی کیا تھی؟ یہ محض خون اور گوشت کی قربانی نہ تھی بلکہ روح اور دل کی قربانی تھی۔ احساسات اور جذبات کی قربانی تھی۔ یہ ماسوی اللہ اور غیر کی محبت کی قربانی خدا کی راہ میں تھی۔ یہ اپنی عزیز ترین متاع کو خدا کے حضور میں پیش کر دینے کی نذر تھی۔ یہ خدا کی اطاعت بندگی کا بے مثال منظر تھا۔ یہ تسلیم و رضا اور صبر و شکر کا وہ

امتحان تھا جس کو پُر کیے بغیر دُنیا کی پیشوائی اور آخرت کی سرفرازی نہیں مل سکتی۔ یہ باپ کا اپنے اکلوتے بیٹے کے خون سے زمین کو رنگین کر دینا نہ تھا بلکہ خدا کے سامنے اپنے تمام جذبات اور خواہشوں، تمناؤں اور آرزوؤں کی قربانی تھی۔ اور خدا کے سامنے اپنے ہر قسم کے ارادے اور مرضی کو معدوم کر دینا تھا اور جانور کی ظاہری قربانی اس اندرونی نقش کا ظاہری عکس اور اس خورشید حقیقت کا ظل مجاز تھا۔

یہاں تک ایک گونہ تخصیص تھی۔ اس کے بعد محیای و مماتی فرما کر پوری تعمیم کر دی اور بتا دیا کہ صرف نظام تشریع نہیں بلکہ نظام تکوین میں بھی میرے سارے اعمال میری ساری طاعات اللہ کے لیے ہیں۔ اور اس لیے ہے کہ اللہ کی ذات تمام کائنات کی پروردگار، مالک، کارساز اور حاجت روا ہے اور جیسے اس کی ربوبیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اسی طرح عبادت میں بھی اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ یہ خدمت کی آمادگی کا ترانہ اور یہ توحید کی صدا ہے جو محمد رسول اللہ بلند کر رہے ہیں اور یہی حضرت ابراہیم نے بلند کی تھی۔

اسلام قربانی کا نام ہے

۲۱۷۔ مجھے اسی بات کا حکم دیا گیا ہے اور میں مسلموں میں سب سے پہلے فرمانبردار ہوں۔ مفسرین عموماً اول المسلمین کا مطلب یہ لیتے ہیں کہ اس اُمت محمدیہ کے اعتبار سے آپ اول المسلمین ہیں لیکن جب ترمذی کی حدیث کنت نبیا و آدم بین الروح والجسد کے موافق آپ اول الانبیاءؑ ہیں تو آپ کے اوّل المسلمین ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ اس کے علاوہ ممکن ہے کہ یہاں اولیت زمانی مراد نہ ہو بلکہ تقدم رتبی مراد ہو۔ یعنی سارے جہان کے فرمانبرداروں کی صفِ اوّل میں نمبر اوّل اور سب سے آگے میں ہوں۔ شاید حضرت شیخ الہند نے ترجمہ میں سب سے پہلا فرمانبردار ہوں کی جگہ سب سے پہلے فرمانبردار ہوں کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا ہو۔ کیونکہ محاورات کے اعتبار سے یہ تعبیر اولیت رتبی کے ادا کرنے میں زیادہ واضح ہو[1]۔

آیت میں دو باتیں ارشاد ہوئی ہیں ایک بذالک امرت اور دوسری انا اول المسلمین اور اسی کی مجھے ہدایت ہوئی۔ یعنی توحید میں اسی تجرید اور شرک جلی اور خفی سے اس کھلی برأت کی مجھے ہدایت ملی ہے۔ یعنی یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں کہ میری ہر قسم کی عبادت، عجز و نیاز، زندگی اور موت کے سارے کوائف بلا شرکت اللہ رب العالمین کے لیے ہیں، اسی کا مجھے حکم ہوا ہے۔ اسی توحید کے لیے میں اللہ کی جانب سے مامور ہوں اور چونکہ مامور ہوں اس لیے وہی کچھ کہتا ہوں جس کے کہنے کا مجھے حکم ہوا ہے۔ اسی وجہ سے میں نے سب سے آگے بڑھ کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کو اپنا لیا ہے - اوّل دو معنے میں آتا ہے ایک عددی یعنی اوّلیت دوسری رتبی یعنی اولویت - اس امّت میں اس کام میں اوّلیت کا شرف بھی مجھے حاصل ہے اور اس کام میں باعتبار علو درجہ و مرتبہ اولویت بھی میرے لیے ہے یعنی اللہ سبحانہ نے تمام نبیوں میں جو درجہ اور مرتبہ مجھے دیا ہے - اس کے اعتبار سے خدا کے اوامر اور نواہی پر بھرپور اذعان و یقین میرا ہی حصہ ہے - اسلام کے لفظی معنے اپنے کو کسی دوسرے کو سپرد کر دینے اطاعت اور بندگی کے لیے گردن جھکا دینے کے ہیں - الغرض دعوتِ محمدی کی حقیقت یہی ہے کہ اپنے آپ کو خدا کے ہاتھ میں سونپ دیا اور اس آستانہ پر اپنا سر جھکا دیا یہی اسلام کی حقیقت ہے -

توحیدِ طاعت کا اعلان

۲۱۸ - آپ ان لوگوں سے دریافت کریں کہ کیا میں خدا کے سوا کوئی رب تلاش کروں حالانکہ وہ ہی ہر چیز کا رب ہے - پہلے توحید فی الالوہیت کا ذکر تھا اب توحید فی الربوبیت کی تصریح فرمائی - یعنی جس طرح معبود اس کے سوا کوئی نہیں ہے مستعان بھی اس کے سوا کوئی نہیں ہو سکتا کیونکہ استعانت ربوبیت عامہ پر متفرع ہے ایاک نعبد و ایاک نستعین[1]

اس سے پہلی آیت میں پرستش کے بارے میں اعلان ہوا تھا - اب یہاں بندگی کے بارے میں اعلان ہوا ہے - آپ چاہیں تو یوں کہہ دیں کہ پہلے توحید عبادت کو بتایا گیا ہے اب توحید طاعت کو بتایا جا رہا ہے یعنی جیسے میری عابدانہ نیاز مندیوں کا مستحق اللہ کے سوا کوئی نہیں اور میں صرف اسی کی عبادت کرتا ہوں ، ٹھیک اسی طرح اس شعوری اور اختیاری زندگی میں میری طاعتوں کا مرکز اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے - جب کائنات کی ساری چیزوں کا رب تو اللہ ہے اور ہر چیز غیر اختیاری اور غیر ارادی طور پر اللہ کی اطاعت کر رہی ہے تو میرا رب کوئی اور کیسے ہو سکتا ہے - یہ بات تو عقل باور ہی نہیں کر سکتی کہ پوری کائنات تو اللہ کے قانون کی اطاعت کے نظام پر چل رہی ہو اور کائنات کا ایک جزو ہونے کی حیثیت سے میرا اپنا وجود بھی اضطراراً اسی نظام پر عامل ہو مگر میں اپنی شعوری اور اختیاری زندگی کے لیے کوئی اور رب تلاش کروں - کیا پوری کائنات کے خلاف میں اکیلا ایک دوسرے رُخ پر چل پڑوں - خالق بھی وہی ہے اور آمر بھی وہی ہے - گویا اسلام کا مل نام ہے توحید عبادت اور توحید طاعت کا - پوری سورت کا موضوع بھی دو توحیدیں ہیں - منشا یہ ہے کہ جب اللہ ہی ہر چیز کا رب ہے تو میں آخر کس طرح اس کے سوا کسی اور کو رب بناؤں اور اپنی زندگی میں

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کسی اور کی شرکت تسلیم کروں، عقلاً جو معبود ہے وہی مطاع ہونا چاہیے۔ حضرت ابراہیم نے بھی اسلام کا یہی تصور پیش فرمایا تھا۔ پجاریوں سے الوہیت کے موضوع پر مناظرہ اور نمرود سے ربوبیت کے موضوع پر محاجہ قرآن میں آیا ہے۔ پتہ نہیں لوگ اتنی واضح اور صاف حقیقت کیوں نہیں سمجھتے ہیں اور توحید کے دائرے کو پوری زندگی سے سمیٹ کر مسجد کی چہار دیواری میں کیوں محدود کرتے ہیں۔

قانونِ الٰہی کے تین اہم اصول

۲۱۹۔ اور دیکھو ہر آدمی اپنے کردار سے جو کچھ کماتا ہے۔ اس کی ذمہ داری اس پر ہے کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا پھر بالآخر تم سب کو اپنے رب کے حضور پیش ہونا ہے۔ وہ بتلائے گا جن باتوں میں تم اختلاف رکھتے تھے۔ کفار مسلمانوں سے توحید وغیرہ میں جھگڑتے تھے اور کہتے تھے کہ تم توحید کی راہ چھوڑ کر ہمارے راستہ پر آجاؤ اگر اس میں کوئی گناہ ہو تو وہ ہمارے سر۔

وقال الذین کفروا للذین آمنوا اتبعوا سبیلنا ولنحمل خطایاکم

کافر اہل ایمان سے کہتے ہیں کہ تم ہماری راہ پر چلو ہم تمہارا بوجھ اٹھا لیں گے۔

یہاں اس کا جواب دے دیا کہ ہر ایک کا گناہ اسی کے سر ہے کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا۔ باقی تمہارے جھگڑے اور اختلافات خدا کے یہاں سب جاکر سب طے ہو جائیں گے۔ یہ دنیا فیصلہ کی جگہ نہیں ہے امتحان و آزمائش گاہ ہے جیسا کہ اگلی آیت میں بیان فرمایا[1] پہلی آیت میں توحید طاعت کے چہرے سے نقاب اٹھایا تھا۔ اس آیت میں ان لوگوں کو جو اس زندگی میں اللہ کے سوا دوسروں کی طاعت کر رہے ہیں اور ان لوگوں کو جن کی اطاعت کی جا رہی ہے کھول کر بتایا ہے کہ بنیادی طور پر یہ سنگین غلط فہمی ہے کہ جن کی اطاعت کی جا رہی ہے وہ ہمارے کام آجائیں گے۔ فرمایا کہ مطیع ہوں یا مطاع ہر شخص اپنے عمل کا ذمہ دار ہے۔ اس سے اس کے اعمال کے بارے میں دریافت کیا جائے گا۔ اس میں یہ حقیقت واضح کی ہے کہ انسان اپنے ہی عمل کے نتائج سے بندھا ہوا ہے اور جو برائی بھی اسے پیش آتی ہے خود اسی کے اعمال کی پیداوار ہے۔ اسی قانون کو قرآن نے ان لفظوں میں بھی پیش کیا ہے لہا ما کسبت و علیہا ما اکتسبت ہر شخص نے جو نیکی کمائی ہے اس کا پھل اس کو ملے گا اور جو برائی کی ہے اس کا وبال اسی کو بھگتنا ہے۔ یہ اللہ کے قانون مجازات کا قاعدہ کلیہ ہے کہ انسان کی جزا و سزا خود انسان ہی کی کمائی ہے جیسی کسی کی کمائی ہوگی ویسا ہی نتیجہ

[1] افادات شیخ الاسلام

پیش آئے گا۔ اگر ایک انسان نے اچھے کام کر کے اچھی کمائی کی ہے تو اس کے لیے اچھائی ہے۔ اگر کسی نے برائی کر کے برائی کمائی تو اس کے لیے برائی ہے کل امرء بما کسب رھین میں بھی یہی قانون بتایا ہے۔ اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی نسبت بھی یہی عام قانون بتایا ہے تلك امة قد خلت لها ما کسبت ولکم ما کسبتم
ایک مشہور حدیث قدسی میں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یہ حدیث طویل ہے آخر میں فرمایا ہے:

اے میرے بندو یاد رکھو یہ تمہارے اعمال ہی ہیں جن کی میں تمہارے لیے انضباط اور نگرانی رکھتا ہوں اور پھر ان ہی کے نتائج بغیر کمی و بیشی کے تمہیں واپس دے دیتا ہوں لہٰذا جو کوئی تم میں اچھائی پائے چاہیے کہ اللہ کی حمد و ثنا کرے اور جس کسی کو برائی پیش آئے چاہیے کہ اپنے سوا کسی کو ملامت کا نشانہ نہ بنائے۔

الغرض اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے۔ اسی طرح اس نے ہر عالم کے لیے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے۔ اگرچہ اس آیت کو عام شارحین قرآن نے آخرت کی جزا و سزا سے متعلق بتایا ہے لیکن کچھ شارحین کی رائے میں اس کا تعلق جس طرح اخروی معاملات اور نتائج سے ہے اسی طرح یہ قانون دنیوی کاروبار پر بھی چسپاں ہے جیسے آخرت میں ہر شخص اسی کے پانے کا حقدار ہو گا جو اس نے کمایا ہے اور اس کے سامنے اس کی کمائی ہی نتیجے کی شکل میں پیش ہو گی۔ ٹھیک اسی طرح معاشی زندگی میں بھی ہر ایک کا نصیب اور حصہ اس کی محنت اور مشقت کی مناسبت پر مبنی ہے وہ جتنی محنت جانفشانی کرتا ہے اسی حساب سے وہ حصہ بھی پاتا ہے یعنی اجرت بمقدار محنت معاشیات میں قرآن کا اصول ہے بلکہ ابو بکر الجصاص نے اسی سے دوسرے کے املاک میں مالک کی اجازت کے بغیر تصرف کو ناجائز قرار دیا اور دلیل یہی دی ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے ہر شخص کو اپنے افعال کا ذمہ دار قرار دیا ہے اور اسی سے یہ قانونی نکتہ بھی حل کیا ہے کہ بالغہ لڑکی کا نکاح اس کی اجازت کے بغیر جائز نہیں ہے۔ بہر حال قرآن نے ہمیں یہ اصول بتایا ہے کہ ہر شخص اپنے اعمال کا خود ذمہ دار ہے اور اللہ کی عدالت میں جوابدہ ہے۔ اس آیت سے تین اہم اصول مستنبط ہوتے ہیں۔ ایک یہ کہ ہر شخص اپنے فعل کا ذمہ دار ہے دوسرے یہ کہ ایک شخص کے فعل کی ذمہ داری دوسرے پر نہیں ڈالی جا سکتی ہاں یہ کہ اس فعل کے صدور میں اس کا اپنا کوئی حصہ ہو۔ تیسرے یہ کہ کوئی شخص اگر چاہے بھی تو کسی دوسرے شخص کے فعل کی ذمہ داری کو اپنے سر نہیں لے سکتا۔

لیکن اس سے یہ نتیجہ نکالنا کہ کوئی شخص دنیا میں اپنی محنت کی کمائی کے سوا کسی چیز کا مالک نہیں ہو سکتا۔ اور آخرت میں کوئی شخص دوسرے کے عمل سے مستفید نہیں ہو سکتا علی الاطلاق درست نہیں ہے۔ اول

اس لیے کہ زکوٰۃ اور صدقات میں لینے والے کی محنت بالکل نہیں ہوتی ہے لیکن ان سے استفادہ از روئے قرآن جائز ہے اجرت بمقدار محنت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہدایا تحف، ترکہ، صدقات و خیرات سے کوئی مستفید نہیں ہو سکتا حقداری اور چیز ہے اور فضل و احسان اور ہے جب کہ خیرات بندوں کی جانب سے احسان ہے۔ وراثت انتقال ملکیت کی قانونی شکل ہے اور یہ اللہ کے قانون کے تحت ہے۔

باقی رہا آخرت سے متعلق جس کو ہماری زبان میں ایصال ثواب کہتے ہیں تو اس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ عامل عمل کرتا ہے اور عمل کے بعد خدا کی جناب میں درخواست کرتا ہے کہ اس کا ثواب فلاں کو میری جانب سے دے دیا جائے۔ مردوں کے لیے دعا کا نافع ہونا قرآن سے ثابت ہے۔

ربنا اغفرلنا و لاخواننا الذین سبقونا بالایمان

اور دعا کے سودمند ہونے کا کوئی منکر نہیں ہے انشاء اللہ اس کی تفصیلات ہم ۲۷ جلد میں پیش کریں گے

اس آیت میں دوسرا اہم اصول یہ بتایا گیا ہے لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے ایک کی گناہ کی پاداش میں کسی دوسرے کو نہ پکڑا جائے گا الا یہ کہ اس گناہ میں اس کا کوئی حصہ ہو۔ قرآن میں یہ قانون ایک سے زیادہ مقامات پر پیش کیا گیا ہے۔ سورہ اسرا میں گمراہیوں کے تذکرے میں فرمایا گیا ہے۔

و من ضل فانما یضل علیھا و لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ

اور جو کوئی بھٹک گیا تو بھٹکنے کا خمیازہ اسی کو ہوگا کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھاتا۔

اور سورہ فاطر میں اسی طرح ہے۔

و لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ و ان تدع مثقلۃ الی حملھا لا یحمل منہ شیئ و لو کان ذا قربیٰ

اور کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور اگر کوئی بوجھ والا اپنا بوجھ اٹھانے کے لیے کسی کو پکارے گا تو اس کے بار کا کچھ حصہ بھی کوئی نہ اٹھائے گا چاہے وہ رشتہ دار ہی ہو۔

اور سورہ زمر میں ہے۔

و ان تشکروا یرضہ لکم و لا تزر وازرۃ وزر اخریٰ

اور اگر تم شکر کروگے تو وہ اس کو تمہارے لیے پسند کرتا ہے اور کوئی بوجھ اٹھانے والا

کسی دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔
اور اسی کا حضرت ابراہیم کی تعلیمات کا خلاصہ بیان کرتے ہوئے سورہ نجم میں اس طرح ذکر کیا ہے۔

وابراهيم الذي وفى ان لا تزر وازرة وزر اخرى وان ليس للانسان الا ما سعى وان سعيه سوف يرى ،

اور ابراہیم جس نے وفاداری کا حق ادا کر دیا یہ کہ کوئی بوجھ اٹھانے والا دوسرے کا بوجھ نہ اٹھائے گا اور یہ کہ انسان کے لیے کچھ نہیں ہے مگر وہ جس کی اس نے کوشش کی اور یہ کہ اس کی کوشش عنقریب دیکھی جائے گی۔

ان سب مقامات کا گہری نظر سے مطالعہ کرو سب کی روح یہ ہے کہ کوئی شخص دوسرے کے گناہ کا بوجھ نہ اٹھائے گا۔ یہ بات ان لوگوں کو سنائی جا رہی ہے جو اہل ایمان سے کہتے تھے کہ اس دُنیا کی زندگی میں اطاعت نبوت کی ذکر و بلکہ ہماری کرو۔ ہم تمہارے گناہوں کے ذمّہ دار ہیں۔ مطیعون اور مطاعوں کو بتایا جا رہا ہے کہ ایک کا بوجھ دوسرا نہیں اٹھائے گا اور جو آج بوجھ اٹھانے کا نعرہ لگا رہے ہیں یہ خود دوہرے بوجھ سے اس روز لدے ہوں گے ایک بوجھ ان پر خود گمراہ ہونے کا ہو گا اور دوسرا بوجھ دوسروں کو گمراہ کرنے کا بھی ان پر لادا جائے گا۔ اس بات کو یوں سمجھئے کہ ایک شخص خود بھی چوری کرتا ہے اور اس کے ساتھ کسی دوسرے شخص سے یہی کہتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ چوری کے کام میں حصہ لے۔ اب اگر وہ دوسرا شخص اس کے کہنے سے چوری کرے گا تو کوئی عدالت اسے اس بنا پر ہرگز نہ چھوڑے گی کہ اس نے دوسرے کے کہنے سے جرم کیا ہے چوری کی سزا تو بہر حال اسے ملے گی اور کسی اصُول انصاف کی رُو سے بھی یہ درست نہ ہو گا کہ اسے چھوڑ کر اس کے بدلے کی سزا اس پہلے چور کو دے دی جائے جس نے اسے بہکا کر چوری کے راستے پر ڈالا تھا۔ لیکن چوری کی ہدایت کرنے والا اپنے جرم کے ساتھ اس جرم کی سزا بھی پائے گا کہ اس نے چوری میں دوسرے کی رہنمائی کی۔ قرآن میں دوسرے مقام میں گمراہوں کے ساتھ گمراہ کرنے والوں کی یہ سزا بتائی گئی ہے۔

ليحملوا اوزارهم كاملة يوم القيامة ومن اوزار الذين يضلونهم بغير علم۔

تاکہ وہ قیامت کے روز اپنے بوجھ پورے اٹھائیں اور ان لوگوں کے بوجھ بھی اٹھائیں جن کو بغیر علم دُنیا میں گمراہ کرتے تھے۔

بلکہ جن کے بارے میں خود اطاعت کرنے والے کہیں گے:

ربنا انا اطعنا سادتنا وكبراءنا فاضلونا السبيلا ربنا اتهم ضعفين من العذاب

والعنھم لعناً کبیراً

اے ہمارے رب ہم نے اپنے سرداروں اور اپنے بڑوں کی اطاعت کی انھوں نے ہمیں گمراہ کیا خداوندا تو ان کو ڈبل عذاب دے اور ان پر بڑی لعنت کر۔

جن کو اس آیت میں سادہ اور کبرار کہا ہے ان کو ہی اس سورت میں اکابر مجرمین کہہ کر پکارا ہے اور ان کو قرآن نے اسی سورت میں الشیاطین کہا ہے۔ یہی اسلام کے نظام حیات کے مقابلے میں اپنے خود ساختہ نظام حیات کی دعوت دیتے تھے اور یہی اہل ایمان سے اس موضوع پر مجادلہ کرتے تھے اور ان کے ہی بارے میں قرآن نے اہل ایمان کو ہدایت کی تھی کہ وان اطعتموھم انکم لمشرکون مسلمانو! اگر تم نے ان کی اطاعت کی تو یقیناً تم مشرک ہو۔ روز قیامت ان کی اطاعت کرنے والے کہیں گے۔

یا لیتنا اطعنا اللہ واطعنا الرسولا

اے کاش ہم اللہ کی اطاعت کرتے اور اللہ کے رسول کی اطاعت کرتے۔

اس آیت میں تیسرا اہم اصول یہ بتایا گیا ہے کہ ثم الی ربکم مرجعکم تم سب کو اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ یہی تصور ایمانی زندگی کا اصل اصول ہے اور یہی اسلام اور کفر کے درمیان حد فاصل ہے۔ کفر بے قیدی اور بے راہ روی ہے۔ وہ ایک ایسی زندگی ہے جس میں افراد اور جماعتوں کے ارادوں پر کوئی بالاتر ضابطہ حیات اور اعلیٰ ترایتین زندگی حکمران نہیں ہوتا۔ کفار کا ارادہ بے قید اور ان کا نفس بے لگام ہوتا ہے اور انسان سے بالاتر کسی اور اقتدار کے آگے جھکنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ کبھی تو وہ عجز و درماندگی کی آخری حد تک پہنچ جاتے ہیں اور بے جان اشیا تک کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں اور کبھی وہ غرور اور فرعونیت کے نشہ میں اس قدر سرشار ہوتے ہیں کہ انسان سے بالاتر کسی ہستی کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی اور چاکری انہیں گوارا ہے لیکن قانون الٰہی کی اطاعت سے انہیں بیر ہے۔ ان کو خدا کی جناب میں پیش ہونے اور اپنے اعمال کا حساب دینے کا کوئی اندیشہ نہیں۔ عدالت الٰہی میں پیش ہونے کا یقین انسان میں ذمہ داری کا احساس پیدا کرتا ہے اور اس کے بارے میں بے یقینی انسان کو حیوانات کی صف میں لے جا کر کھڑا کر دیتی ہے۔ خدا کی عدالت میں پیش ہونے کا یقین ہی انسان کو اتباع ہوا سے بچاتا ہے عادلانہ زندگی میں سب سے بڑی رکاوٹ یہی ہے۔ اسی لیے آخر میں فینبئکم بما کنتم فیہ تختلفون یعنی جب خدا کے حضور میں پیش ہو گے تو وہ تمہارے سامنے تمہارے اختلافات کی حقیقت کھول دے گا یعنی تمہارے اس اختلاف کی حقیقت کھل کر سامنے آجائے گی کہ مطاع کون ہے وہ ہے جن کی تم اطاعت کرتے رہے ہو یا وہ اللہ ہے جو تمہارا خالق و مالک ہے۔ یہاں اپنی شعوری زندگی میں اپنے من مطاع بناتے

ہوسکے ہو اور دن رات اپنے ہی جیسے انسانوں کی چاکری میں لگے ہوئے ہو۔ یا خدا کو چھوڑ کر اوروں کی عبادت کرتے ہو۔ عبادت ہو یا طاعت قرآن کی دعوت یہی ہے کہ اللہ کی ہونی چاہیے جبکہ کفر کی دعوت یہ ہے کہ اتبعوا سبیلنا ہماری اتباع کرو۔ قرآن کا عبادت اور اطاعت کی حد تک یہی مطالبہ ہے کہ غیر اللہ کے سامنے عجز و نیاز پر مشتمل کوئی پیمانہ نہ اختیار کیا جائے اور بس۔

زمین میں انسان کا مرتبہ

۲۰۲۔ اور وہی ہے جس نے زمین میں تمہیں ایک دوسرے کا جانشین بنایا ہے اور تم میں سے بعض کو بعض پر فضیلت دی ہے۔ یعنی خدا نے زمین میں تم کو اپنا نائب بنایا کہ تم اس کے دیے ہوئے اختیارات سے کام لے کر کیسے کیسے حاکمانہ تصرفات کرتے ہو یا تم کو باہم ایک دوسرے کا خلیفہ بنایا ایک قوم جاتی ہے تو دوسری قوم اس کی جانشین ہوتی ہے اور تمہارے[1] باہم بے حد فرق مدارج رکھا چنانچہ شکل وصورت میں رنگت، لہجہ اخلاق اور ملکات، محاسن و مساوی، رزق و دولت، عزت و جاہ وغیرہ میں افراد انسانی کے لیے بے شمار درجات ہیں[1]

اس ارشاد میں دو اہم اور بنیادی باتیں بتائی گئی ہیں۔ پہلے یہ بتایا گیا کہ اس کائنات مالک و آقا یگانہ خدا اور مخلوقات کی تمام عبادتوں اور طاعتوں کا وہی مستحق ہے۔ اس کے سوا کوئی نہیں۔ اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ اولاً اس کائنات میں انسان کی حیثیت خلائف کی ہے۔ خلائف جمع خلیفہ کی ہے۔ خلیفہ وہ ہوتا ہے جو کسی کی ملک میں اس کے تفویض کردہ اختیارات اس کے نائب کی حیثیت سے استعمال کرے۔ خلیفہ مالک نہیں ہوتا بلکہ اصل مالک کا نائب ہوتا ہے۔ اس کے اختیارات ذاتی نہیں ہوتے بلکہ مالک کے عطا کردہ ہوتے ہیں۔ وہ اپنے منشا کے مطابق کام کرنے کا حق نہیں رکھتا بلکہ اس کا کام مالک کے منشا کو پورا کرنا ہوتا ہے۔ اگر وہ خود اپنے آپ کو مالک سمجھ بیٹھے اور تفویض کردہ اختیارات کو من مانے طریقے سے استعمال کرنے لگے یا اصل مالک کے سوا کسی اور کو مالک تسلیم کرکے اس کے منشا کی پیروی اور اس کے احکام کی تعمیل کرنے لگے تو یہ سب غداری اور بغاوت کے افعال ہوں گے۔

یہ بات کن سے کہی جا رہی ہے۔ پوری انسانیت سے یا خاص طور پر اہل ایمان سے۔ اگر پوری انسانیت مخاطب ہے تو مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تم کو حضرت آدم کی تبعیت میں زمین کا خلیفہ بنایا یا یہ کہ پہلے لوگوں کے جانے کے بعد خلیفہ بنایا۔ اور اگر خطاب اہل ایمان سے ہے تو مطلب یہ ہے کہ اللہ تم کو اب خلافت عطا فرمائے گا

[1] افادات شیخ الاسلام

ہمارے راستے میں مخاطب قریش مکہ ہیں ماضی کے صیغے اس کا صاف قرینہ ہیں اور مطلب یہ ہے کہ حکمران ہونے کی حیثیت میں اس دنیا میں تم پہلی قوم نہیں ہو تم سے پہلے کتنی قومیں یہاں آئیں اور غائب ہو گئیں یہاں تک کہ خدا نے تم کو ان کی جگہ دی تم نے بجائے نیابت کے اپنی انانیت کا ڈنکا بجایا اور یہاں خدا کی بغاوت کی۔ خدا کی اطاعت کی جگہ اپنی اطاعت کی طرف لوگوں کو بلانے لگے۔ تم اللہ کی زمین میں بنائے ہوئے نائب ہو۔ نائب ہونے کی حیثیت میں تمہارا کام یہ اور صرف یہ ہے کہ عبادت اور طاعت ہیں توحید الٰہی کے علمبردار بن کر رہو لیکن تم بتوں کو پوجتے ہو، پتھروں کو سجدہ کرتے ہو، درختوں کے آگے جھکتے ہو، جانوروں کو دیوتا بناتے ہو۔ جنات اور ارواح خبیثہ کے نام کی دہائی دیتے ہو انسانوں کو ارباب مانتے ہو۔ ان کی غلامی اور بندگی کرتے ہو۔ تم حقیقت میں انسان کے درجہ اور مرتبہ سے نا واقف ہو۔ مطیع اور مطاع دونوں سے کہا جارہا ہے۔ مطیعون سے کہا جارہا ہے کہ تم خدا کے نائب ہو، تمہارا فرض تھا کہ نائب ہونے کی حیثیت میں اللہ کی اطاعت کرتے اور کر یہ رہے ہو کہ خدا کو چھوڑ کر اپنے ہی جیسے انسانوں کی طاعت کر رہے ہو جن کی اطاعت کا خدا کی جانب سے تمہارے پاس کوئی پروانہ نہیں ہے اور مطاعوں سے کہا جارہا ہے کہ تم خدا کے نائب ہو کر اپنی اطاعت کرا رہے ہو حالانکہ تم اس لیے آئے تھے کہ لوگوں سے اللہ کی اطاعت کراؤ۔ اور عابدوں سے کہا جارہا ہے کہ تم خلافت کا سر پر تاج رکھ کر اپنی جیسی مخلوق کی عبادت کر رہے ہو حالانکہ تم کو یہ رتبہ بلند اس لیے ملا تھا کہ ساری مخلوقات سے برتر بن کر رہو۔ اور معبودوں سے کہا جارہا ہے کہ تم نے عہدۂ خلافت لے کر غداری کی ہے تمہیں بھیجا اس لیے گیا تھا کہ ہماری عبادت ساری مخلوق سے کراؤ اور تم اپنی عبادت کرا رہے ہو۔

دوسری بات خلافت کے ساتھ یہ جتائی گئی ہے کہ و رفع بعضکم فوق بعض درجات مطلب یہ ہے کہ یوں تماشہ گاہ عالم کی بنیاد ہی صفات کے تفاوت پر مبنی ہے۔ جمادات میں وہ صفات نہیں پائے جاتے جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے نباتات ان صفات سے مفلس ہیں جن سے حیوانات سرفراز ہیں۔ حیوانوں کو ان کمالات سے بہرہ نہیں ملا ہے جن پر انسان کی انسانیت کی بنیاد قائم ہے اور صفات، کمالات کے تفاوت کا یہ قصہ اتنا دراز ہے کہ کہنے والوں نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ گلاب کی دو پنکھڑیاں باہم یکساں نہیں ہیں۔ صوفیائے کرام نے اسی کو تجلیات میں تکرار نہیں کے عنوان سے تعبیر کیا ہے۔ غالب مرحوم نے اس مصرعہ میں اسی واقعہ کو دہرایا ہے۔

لوح جہاں پہ حرف مکرر نہیں ہوں میں

آیت میں اعلان کیا گیا ہے کہ تفاوت صفات کی وجہ سے افراد انسانی میں مدارج و مراتب کا جو فرق پیدا ہوا ہے یہ کسی دوسرے کا نہیں بلکہ اللہ کا قائم کردہ ہے یعنی کسی کو ایسی صفت دی گئی جو نتیجے کے لحاظ سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی ہے اور کسی کو ایسا کمال عطا کیا گیا جو اپنے ثمرات کے لحاظ سے انمول و قیمتی ہے ایک کا درجہ

دوسرے سے بلند ہوگیا۔ تو یہ اللہ کی دین کا نتیجہ ہے کہ کوئی حاکم ہے کوئی محکوم، کوئی فقیر ہے کوئی غنی کوئی جاہل ہے کوئی عالم کوئی بیوقوف ہے کوئی عقل مند، کوئی ضعیف ہے کوئی قوی۔ یہ خلق اور اخلاق میں معاملات میں تفاوت اس لیے نہیں کہ تم سرکش ہو جاؤ اور اپنی آقائی کا ڈنکا پیٹنے لگو بلکہ یہ تو صرف اس لیے ہے۔

فرق مراتب کا منشا ابتلا و آزمائش ہے

۲۲۴۔ تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے اس میں تمہیں آزمائے، بلاشبہ تمہارا پروردگار جلد سزا دینے والا ہے اور بلاشبہ وہ بخشنے والا رحمت ہے۔ یعنی ظاہر ہو جائے کہ ان حالات میں کون کہاں تک خدا کا حکم مانتا ہے۔ حافظ ابن کثیر نے فیما اتاکم سے وہ مختلف احوال و درجات مراد لیے ہیں جن میں حسب استعداد و لیاقت ان کو رکھا جاتا ہے اس تقدیر پر آزمائش کا حاصل یہ ہوگا کہ مثلاً غنی حالت غنی میں رہ کر کہاں تک شکر ادا کرتا ہے اور فقیر حالت فقر میں کس حد تک صبر کا ثبوت دیتا ہے وقس علی ہذا۔ بہرحال اس آزمائش میں جو بالکل نالائق ثابت ہوں گے حق تعالیٰ ان کے حق میں سریع الحساب ہے اور جس سے قدرے کوتاہی رہ گئی اس کے حق میں غفور اور جو پورا اترا اس کے حق میں رحیم ہے[1] مطلب یہ ہے کہ یہ پوری زندگی اپنی بوقلموں نعمتوں کے ساتھ ایک امتحان گاہ ہے اور جس کو جو کچھ بھی خدا نے دیا ہے اسی میں اس کا امتحان ہے کہ اس نے کس طرح خدا کی امانت میں تصرف کیا کہاں تک امانت کی ذمہ داری کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا اور کس حد تک اپنی قابلیت اور نا قابلیت کا ثبوت دیا۔ اسی امتحان کے نتیجے پر زندگی کے دوسرے مرحلہ انسان کے درجہ کا تعین منحصر ہے[2] منشا یہ جتانا ہے کہ جو کچھ تمہیں ملا ہے تمہاری خوبیوں اور قابلیتوں کا ثمرہ نہیں ہے بلکہ اللہ کی طرف سے تمہارا امتحان ہے کہ تم شکر گزار بنتے ہو یا ناشکرے۔ نیکیوں اور بدیوں کی جزا کا دن آگے آنے والا ہے یہ نہ سمجھو کہ وہ بہت دور ہے وہ جلد آنے والا ہے۔ اس دن ہر شخص اپنی نیکی اور بدی دیکھ لے گا۔

یہاں ابتلاء و بلا کا جو فعل اللہ سبحانہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے۔ وہ اس امتحان سے جو ایک مخلوق دوسری مخلوق کا لیتی ہے قطعاً مختلف ہے۔ قرآن میں ایک جگہ نہیں متعدد جگہ یہ بتایا گیا ہے کہ انسان کی پوری کی پوری زندگی ابتلاء و امتحان ہی کی زندگی ہے۔ مطلب یہی ہے کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو نہیں بلکہ پوری زندگی امتحان ہے۔ تمام کائنات کے مقابلے میں بشری فطرت میں دوراہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی گئی ہے درحقیقت فطرت کے اسی اقتضا

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی ابتلائی ہے۔ یعنی انسانی فطرت میں اقتدار واختیار، انتخاب وترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے اسی قوت کے صحیح کے مطالبہ کا نام ابتلا وامتحان ہے۔

الحمدللہ سورہ انعام کی تفسیر دارالعلوم الشہابیہ میں ختم ہوتی ہے۔

دوشنبہ ۷ بج کر ۵۴ منٹ صبح

۲۸ ربیع الاول ۱۳۹۹ھ

۲۶ فروری ۱۹۷۹ء

مَعَالِمُ الْعُرْفَانِ

سُورۃ اعراف مکّی

رکوع ——— ۲۴

آیات ——— ۲۰۶

نام

اس سُورت کا نام اعراف ہے ۔ یہ نام اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس سُورت میں اعراف کا ذکر ہے ۔

موضوع

اس سُورت کا اصلی موضوع رسالت ہے ۔ رسالت کا اثبات ، رسالت کی دعوت ، اس معنے کے اعتبار سے یہ سُورت پہلی سورت کا مثنیٰ ہے گویا پہلی سُورت کا موضوع اگر لا الٰہ الا اللہ ہے تو اس سورت کا موضوع محمد رسُول اللہ ہے ۔ پوری سُورت کے مضامین اسی موضوع کے اردگرد چکر لگاتے ہیں اور مخاطبوں کو رسالت کی پیروی اختیار کرنے کی دعوت دی جارہی ہے ۔ اس دعوت میں تبشیر کی جگہ انذار کا پہلو غالب ہے ۔ اس میں ، قریش کو دھمکی دی جارہی ہے کہ اگر تم نے اپنی روش نہ بدلی تو خدا کا عذاب آرہا ہے ۔ پہلے ان کے جرم کی سنگینی بتائی گئی اس کے بعد تفصیل کے ساتھ گزشتہ ان قوموں کی تاریخی کہانی سنائی جو اس ملک میں برسرِاقتدار رہی ہیں ۔ اسی کے ساتھ یہود کو بھی لے لیا ہے اور ان کو بھی تنبیہہ فرمائی ۔

زمانۂ نزول

عبداللہ بن عباس اور عبداللہ بن الزبیر ہی نہیں بلکہ سب کا اس پر اجماع ہے کہ اس سُورت کا زمانۂ نزول حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی ہے ۔ ظاہر یہی ہے کہ اس سورت کا نزول یکبارگی ہوا ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ یہ سُورت سورۂ انعام سے پہلے نازل ہوئی ہے کیونکہ سورۂ انعام مکی دور کے آخری زمانہ میں نازل ہوئی ہے ۔ اگرچہ مکی سُورتوں کے متعلق ہمارے پاس ایسی کوئی تاریخی دستاویز نہیں ہے جس کی مدد سے ہم زمانۂ نزول اور موقع نزول کے بارے میں کوئی حتمی فیصلہ کرسکیں کیونکہ اس زمانہ کی تاریخ اس قدر جزئی تفصیلات کے ساتھ مرتب نہیں ہوئی ہے ۔ مکی سورتوں کے بارے میں ہم کو تاریخی شہادتوں کی جگہ زیادہ تر ان اندرونی شہادتوں پر اعتماد کرنا پڑتا ہے جو مختلف سُورتوں کے موضوع ، مضمون اور اندازِ بیان میں پائی جاتی ہیں ۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ کہا جاسکتا ہے وہ صرف یہی ہے کہ ایک طرف ہم مکی سورتوں کی اندرونی شہادتوں کو رکھیں اور دوسری طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی مکی زندگی کو رکھیں اور پھر دونوں کا تقابل کرکے یہ رائے قائم کریں کہ کون سی سورت کس زمانہ سے تعلق رکھتی ہے ، اندازِ بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ نبوت کا بے حد پُرآشوب زمانہ ہے یہ آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے لیے انتہائی سختی اور مصیبت کا زمانہ تھا ۔ مکہ میں آپ کے لیے زندگی دوبھر ہوگئی تھی ۔ آپ طائف تشریف

لے گئے وہاں بھی پناہ نہ ملی۔ حج کے موقعہ پر آپ ایک ایک قبیلے سے اپیل کرتے رہے کہ آپ کی آواز پر لبیک کہیں اور آپ کا ساتھ دیں لیکن ہر طرف سے صاف جواب تھا۔ ادھر اہلِ مکہ بار بار یہ مشورہ کرتے کہ آپ کو قتل کر دیں یا قید کر دیں یا اپنی بستی سے نکال دیں۔ سورت کے آغاز ہی میں لا یکن فی صدرک حرج حالات کی سنگینی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں۔ یعنی یہ فرمانا کہ بغیر کسی جھجک کے لوگوں تک پہنچا دو۔ بتا رہے ہیں کہ مخالفتوں اور مزاحمتوں کا طوفان کس قدر زیادہ تھا۔

شانِ نزول

اس سورت کے نزول کا پس منظر بھی سورت کے مضامین ہی سے مقرر ہو سکتا ہے۔ اصلی پس منظر وہ افکار اعمال اور اخلاق ہیں جن پر اس میں ضرب لگائی جا رہی ہے۔ رسالت سے ان کا انکار، ان کی سرکشی اس کا پس منظر ہے۔ کیونکہ لوگوں سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت تسلیم کرانا اور ان کو اس بات پر آمادہ کرنا کہ وہ عقائد و عبادات کی زندگی کے ہر شعبے تک تمام معاملات میں آپ کی مکمل اطاعت و پیروی قبول کر لیں۔ یہ دعوتِ اسلام کا دوسرا بنیادی نکتہ ہے۔ اس کی اہمیت یہ ہے کہ اس کے بغیر دین عملاً قائم نہیں ہو سکتا۔ رسول پر ایمان اور بالفعل اس کی اطاعت کے بغیر صرف توحید کو مان لینا لاحاصل ہے۔ اور اگر ذرا بنظرِ عمیق دیکھا جائے تو اس بات کو معلوم کر لینا کچھ دشوار نہیں ہے کہ اللہ کی توحید کا اقرار مخاطبوں کے لیے جس قدر دشوار تھا اس سے کہیں زیادہ مشکل آپ کی رسالت کو ماننا تھا۔ اول تو یہی بات ان کے لیے کچھ آسان نہ تھی کہ جو شخص چالیس برس تک ان کے معاشرے میں عام انسانی زندگی گزار رہا تھا یکایک اس کے متعلق یہ باور کر لیں کہ وہ اللہ کا رسول ہے۔ ثانیاً جو لوگ صدیوں سے بے لگام آزادی کے عادی تھے ان کے لیے اب ایک شخص کی بے چون و چرا اطاعت اور اپنی پوری زندگی اس کے پیش کردہ قانون کی پیروی کو قبول کر لینا بھی آسان نہ تھا۔ ثالثاً بڑی دشواری ان رہنمایانِ قوم اور فرمانرواؤں کے لیے تھی جو اب تک اپنے اپنے قبیلوں اور گروہوں کے صاحبِ امر تھے۔ اور ان مذہبی پیشواؤں کے لیے جو ملک بھر میں شرک کے بڑے بڑے مراکز کا کاروبار چلا رہے تھے، ان کاہنوں کے لیے تھی جو غیب دانی کے مدعی تھے۔ ان میں سے ہر ایک کے لیے یہ رسالت گویا کھلا کھلا پیغامِ موت تھی جسے قبول کرنا تو درکنار ٹھنڈے دل سے سننا بھی ان کے لیے ممکن نہ تھا۔ قرآن نے رسالت ہی کو منوانے کے لیے رسالت کی پوری تاریخ اس سورت میں پیش کی ہے۔ از آدم تا موسیٰ علیہما السلام کا ذکر کیا اور بتایا کہ جو روش تم نے اپنے پیغمبر کے مقابلے میں اختیار کی ہے ایسی ہی روش تم سے پہلی قومیں اختیار کر چکی ہیں اور اس کا انجام دیکھ چکی ہیں۔

مضامین کا موضوع سے تعلق

سورت کے موضوع کے تعلق سے اس میں جو مضامین بیان ہوتے ہیں ان پر ایک سرسری نگاہ ڈالنے سے معلوم ہوتا ہے کہ

اولاً، اس میں جو باتیں پیش کی گئی ہیں وہ دعوتِ اسلامی کے اس دور سے تعلق رکھتی ہیں جب اسلامی زندگی میں اجتماعیت نہ تھی بلکہ افراد منتشر تھے۔ بالخصوص نبوت کی ذات کے لیے یہ مرحلہ بہت زیادہ صبر آزما تھا۔ ظاہر ہے کہ عفو و درگزر کے لیے سب سے زیادہ موزوں یہی وقت ہو سکتا ہے۔

ثانیاً، اس کے مضامین میں انذار کا پہلو غالب ہے۔ یہ اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ مخاطبوں میں انکار اپنی شدت کے اعتبار سے آخری مرحلوں میں تھا۔

ثالثاً، اس سورت میں یہودیوں کی عبادت اور طاعت میں بے راہ روی کو کھول کر بتایا گیا ہے۔

(اٰیَاتُهَا ۲۰۶) (۷) سُوْرَةُ الْاَعْرَافِ مَكِّيَّةٌ (۳۹) (رُكُوْعَاتُهَا ۲۴)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓمّٓصٓ ﴿۱﴾ كِتٰبٌ اُنْزِلَ اِلَيْكَ فَلَا يَكُنْ فِيْ صَدْرِكَ
حَرَجٌ مِّنْهُ لِتُنْذِرَ بِهٖ وَذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۲﴾ اِتَّبِعُوْا
مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكُمْ مِّنْ رَّبِّكُمْ وَلَا تَتَّبِعُوْا مِنْ دُوْنِهٖٓ اَوْلِيَآءَ
قَلِيْلًا مَّا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۳﴾ وَكَمْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَهْلَكْنٰهَا فَجَآءَهَا
بَاْسُنَا بَيَاتًا اَوْ هُمْ قَآئِلُوْنَ ﴿۴﴾ فَمَا كَانَ دَعْوٰىهُمْ اِذْ
جَآءَهُمْ بَاْسُنَآ اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اِنَّا كُنَّا ظٰلِمِيْنَ ﴿۵﴾

الف، لام، میم، صاد، اے پیغمبر یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے اس لیے کہ اس کے ذریعے تم لوگوں کو آگاہ کردو اور اس لیے کہ اہل ایمان کے لیے نصیحت ہو لہٰذا اس بارے میں تمہارے اندر کسی طرح کی تنگی راہ نہ پائے۔ لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی جانب

سے تمہاری طرف نازل ہوا ہے اسی کی پیروی کرو، اور خدا کے سوا اپنے مددگاروں کی پیروی نہ کرو تم بہت ہی کم نصیحت قبول کرتے ہو۔[۲] اور دیکھو کتنی ہی بستیاں ہیں جن کو ہم نے تہس نہس کر ڈالا بس ایسا ہوا کہ لوگ رات کو سو رہے تھے یا دن کو قیلولہ کر رہے تھے کہ ہماری گرفت آ گئی جب ان پر عذاب آیا اس وقت ان کی پکار اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ بلاشبہ ہم ظلم کرنے والے تھے۔[۳]

معانی مفردات

المص، لکھنے میں یہ مرکب ایک لفظ معلوم ہوتا ہے لیکن پڑھنے میں یہ الگ الگ بولے جاتے ہیں جیسے الف لام میم صاد۔ اگرچہ حروف ہونے کی وجہ سے ان میں معنویت نہیں ہے لیکن بہت سے علماء نے اسے حروف تنبیہہ قرار دیا ہے۔ اتحاف السادہ میں ہے کہ حربی کی رائے ہے کہ ان کو حروف تنبیہہ قرار دینا زیادہ قرین صواب ہے۔ ان کے خیال میں حضور انور کے لیے یہ تنبیہہ ہوتی ہے۔ لیکن ہماری رائے میں تنبیہہ سامعین کے لیے ہے مکہ میں مشرکین مدینہ میں اہل کتاب، ویسے عربی میں الا اور ہلا وغیرہ حروف تنبیہہ ہیں لیکن یہ قرآن کا اعجاز بلاغت ہے کہ اس نے تنبیہہ کے لیے ان حروف کو اپنایا ہے۔ ان کو سنتے ہی مخاطب چونک جاتے اور سننے کے لیے متوجہ ہو جاتے

حرج، تنگی مضائقہ، گناہ، تنگ، اصل میں تو حرج کے معنے کسی چیز کے مجتمع ہونے کی جگہ کے ہیں۔ درختوں کا ایسا جھرمٹ کہ راہ گیر کو راستہ ہی نہ ملے حرج کہلاتا ہے اور ایک جگہ جمع ہونے میں چونکہ تنگی کا تصور ہے اس لیے تنگی اور گناہ کو حرج کہا جاتا ہے مقصود دل

کی تنگی ہے۔ ذکریٰ، نصیحت کرنا، ذکر کرنا، یاد کرنا، پند و موعظت، مصدر ہے، کثرت ذکر کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہ ذکر سے زیادہ بلیغ ہے۔ ترکیب میں منصوب ہے اس کا فعل محذوف ہے تذکر اصل میں لتذکر ذکریٰ ہے۔ اس کا عطف لتنذر بہ پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کفار کو ڈرانے اور اہل ایمان کو نصیحت کرنے کے لیے یہ کتاب نازل ہوئی ہے۔ باسنا، لڑائی، دبدبہ، سختی، آفت جنگ کی شدت، اصل میں اس کے معنی سختی اور آفت کے ہیں۔ لڑائی اور غلبہ کے معنے میں اس کا استعمال زیادہ ہوتا ہے۔ یہاں مراد عذاب ہے۔ بیاتا، اصل میں بات یبیت کا مصدر ہے۔ راغب نے اس کے معنے رات کو دشمن پر حملہ کرنے کے لکھے ہیں۔ لیث نے اس کے معنے رات میں داخل ہونے کے بتلائے۔ یہ مصدر فاعل معنے میں ہو کر حال ہے یعنی بائتین قائلون یہ قال یقیل سے اسم فاعل ہے اس کا مصدر قیلولہ ہے۔ اس کے معنے دوپہر میں آرام کرنے کے ہیں خواہ نیند آوے یا نہ آوے۔ یہاں بیاتا کے مقابلہ میں ہونے کی وجہ سے دوپہر میں سونا مراد ہے۔ یہ اجوف یائی ہے۔ باع یبیع کی طرح اور اجوف واوی قال یقول ہے۔ اس کے معنے کہنے کے ہیں مصدر قول ہے اسم فاعل دونوں کا قائل آتا ہے۔

اسلام کی غربت اور بے چارگی

یہ ہم پہلے بتا آئے ہیں کہ یہ پوری سورت ایک بار نازل ہوئی ہے۔ اس میں اسلام کی غربت اور بے چارگی کے زمانہ میں نبوت کو اولاً اور پیروان دعوت کو ثانیاً تسلی دی گئی۔ یہ حقیقت ان کے دلوں میں نقش کی گئی کہ ظاہری اسباب کتنے ہی مخالف ہو جائیں بالآخر دعوت حق کی کامیابی یقینی ہے۔ مخالف جماعتیں جس قدر اپنی سرگرمی میں بڑھتی جائیں گی، اتنا ہی زیادہ ان کی تباہی کا وقت قریب آتا جائے گا۔ آئیے اب واقعات کی روشنی میں اسلام کی غربت کا مطالعہ کیجئے۔ خواجہ ابو طالب اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی وفات ہو چکی ہے۔ ان دونوں حادثوں کے بعد ایک طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر غم کا پہاڑ ٹوٹا اور دوسری طرف یکایک قریش یہ دیکھ کر کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا اب پشتیبان کوئی نہیں رہا آپ کے مقابلے میں بہت دلیر ہو گئے ہیں۔ ابو طالب کی زندگی میں جو اذیتیں آپ کو نہیں پہنچا سکتے تھے۔ وہ اب پہنچانے لگے ہیں۔ ابن اسحاق نے قریش کی بڑھتی ہوئی جرأتوں کی ایک مثال اسی زمانہ کی عروہ ابن الزبیر کے حوالہ سے بیان کی ہے کہ ایک روز قریش کے ایک اوباش نے سر بازار حضور انور کے سر مبارک پر مٹی ڈال دی۔ آپ اسی حال میں گھر تشریف لے گئے۔

صاحبزادیوں میں سے ایک آپ کا سر مبارک دھوتی جاتی تھیں اور روتی جاتی تھیں اور حضور ان کو تسلی کی خاطر یہ فرمایہ تھے رو نہیں میری بیٹی اللہ تیرے باپ کا حامی ہے۔

امام بخاری نے کتاب الطہارت، کتاب الصلاۃ، کتاب الجزیہ، کتاب الجہاد و رکتاب المغازی میں یہ روایت حضرت عبداللہ بن مسعود کی زبانی نقل کی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک روز کعبہ کے پاس نماز پڑھ رہے تھے اور قریش کے لوگ اپنی اپنی مجلسوں میں بیٹھے ہوتے تھے۔ ان میں سے ایک شخص نے کہا تم میں سے کون ہے جو فلاں جگہ سے ذبح شدہ اونٹنی کے پیٹ کی الائش لاکر اس شخص کی پیٹھ پر سجدے کی حالت میں رکھ دے۔ اس پر عقبہ ابن معیط اٹھا اور یہ گندگی لاکر اس نے سجدے کی حالت میں حضور انور کی پیٹھ پر رکھ دی۔ قریش کے لوگ یہ منظر دیکھ کر ہنستے رہے، اتنے میں جاکر کسی نے یہ خبر آپ کے گھر پہنچا دی۔ حضرت فاطمہؓ دوڑی ہوئی آئیں اور انہوں نے یہ گندگی کا انبار ہٹایا۔ نماز ختم کرنے کے بعد آپ نے فرمایا کہ خدایا قریش سے نمٹ لے۔

اگرچہ اس حدیث میں زمانے کی تعیین نہیں لیکن حضرت فاطمہ کا آنا اور الائش کو ہٹانا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ حضرت فاطمہ کی عمر اس وقت کم و بیش ۹، ۱۰ سال کی ہے۔ حافظ ابن عبدالبر نے لکھا ہے کہ حضرت فاطمہ کی ولادت اس وقت ہوئی تھی جب آپ کی عمر ۴۱ سال کی تھی۔ اس سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت فاطمہ کی عمر اس وقت نو سال کی ہوگی۔

ان واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ دعوت میں مزاحمتوں اور مخالفتوں کا اس وقت کیسا طوفان تھا۔ اسی لیے سورت کا آغاز یہ کہہ کر کیا گیا ہے کہ حالات کی ساری سنگینی کے باوجود دعوت و تبلیغ میں کسی طرح کی دل تنگی محسوس نہ کریں۔ آپ کا کام انکار و بدعملی کے نتائج سے خبردار کرنا ہے اور بس۔

المص الف، لام، میم، صاد، اے پیغمبر یہ کتاب ہے جو تمہاری طرف اتاری گئی ہے۔ اس لیے کہ اس کے ذریعے تم لوگوں کو آگاہ کر دو اور اس لیے کہ اہل ایمان کے لیے نصیحت ہو۔ لہٰذا اس بارے میں تمہارے اندر کسی طرح کی دل تنگی راہ نہ پاتے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے حرج کی تفسیر شک سے کی ہے۔ گویا فلا یکن فی صدرک حرج کے معنے اور فلا تکونن من الممترین کے معنے ایک ہیں۔ یعنی پیغمبر جس پر خدا نے کتاب اتاری ہے اس کی شان یہ نہیں ہے کہ ذرا سا بھی کھٹکا یا شبہ کتاب کے احکام و اخبار کے متعلق اس کے دل میں راہ پاتے۔ دوسرے مفسرین نے الفاظ کو ظاہری پر رکھا جیسا کہ حضرت شیخ الہند نے اختیار فرمایا کہ تیرا جی تنگ نہ ہو۔ یعنی تمام خلائق میں سے چن کر جس پر خدا نے اپنی کتاب اتاری ہے لائق نہیں کہ احمقوں اور معاندین کے طعن و تشنیع یا بیہودہ سوالات سے گھبرا کر اس کتاب کے کسی حصہ کی تبلیغ سے منقبض اور دل تنگ ہو۔

فعلك تارك بعض ما يوحى اليك وضائق به صدرك ان يقولوا لولا انزل اليه كنز او جاء معه ملك

اے پیغمبر کیا تو ایسا کرے گا کہ جو کچھ تجھ پر وحی کیا جاتا ہے اس میں سے کچھ باتیں چھوڑ دے گا اور اس کی وجہ سے دل تنگ رہے گا اور یہ اس لیے کہ لوگ کہیں گے کہ اس پر کوئی خزانہ آسمان سے کیوں نہیں اتارا گیا، یا ایسا کیوں نہیں ہوا کہ اس کے ساتھ ایک فرشتہ آتا۔

اگر بالفرض خود پیغمبر کے دل میں کتاب اور اس کے مستقبل کی طرف سے کامل وثوق وانشراح حاصل نہ ہو تو وہ اپنے فرض انذار و تذکیر کو کس طرح قوت و جرأت کے ساتھ ادا کر سکے گا۔ اسی لیے واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ کتاب کے اتارنے سے غرض یہ ہے کہ تم ساری دنیا کو اس کے مستقبل سے آگاہ کر دو اور بدی کے انجام سے ڈراؤ اور ایمان لانے والوں کے حق میں خاص طور پر یہ ایک مؤثر پیغام نصیحت ثابت ہو۔[1]

اس آیت میں تین باتیں ارشاد ہوئی ہیں۔ ایک یہ کہ یہ دعوت انسانی نہیں بلکہ دعوتِ الہٰی ہے اور سرتاسر حق ہے۔ اس میں ملاوٹ کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ نزولِ قرآن کا مقصد تذکیر اور انذار ہے۔ تیسری یہ کہ راہِ دعوت میں حالات خواہ کیسے سنگین سے سنگین تر ہو جائیں۔ عزم و استقلال اور صبر و ثبات کا دامن چھوڑ کر پیش پا افتادہ حالات کی بنا پر مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھنا چاہیے اور مطمئن رہنا چاہیے کہ خواہ کتنی ہی مشکلیں آئیں لیکن بالآخر حق کی فتح مندی اٹل ہے۔ لہٰذا مشکلات کے ہجوم سے دل تنگ اور افسردہ خاطر نہ ہو۔

پہلی بات کے لیے اصل ارشاد میں تعبیر کتاب انزل الیک کی آئی ہے۔ مبتدا محذوف کی خبر ہے اور کتاب کی تنکیر تعظیم اور تفخیم کے لیے ہے یعنی یہ وہ عظیم الشان کتاب ہے جو تمہاری طرف نازل کی گئی ہے یعنی کتاب بھی قدر و منزلت والی ہے اور جس پر اتاری گئی ہے وہ ذات بھی بے حد قدر و منزلت والی ہے اسی لیے وہ رات بھی لیلۃ القدر ہے جس میں کتاب کے نزول کا آغاز ہوا اور چونکہ اس کتاب کا نزول عرشِ بریں سے ہوا ہے اس لیے نازل کرنے والے کی ذات ہر قسم کے تعارف سے بے نیاز ہے۔ ایجاز کی خاطر فعل مجہول آیا ہے۔

دوسری بات یہ بتائی ہے کہ نزولِ قرآن کا مقصد انذار اور تذکیر ہے۔ انذار یعنی انکار و بدعملی کے نتائج سے آگاہ کرنا اور تذکیر یعنی پند و موعظت کے ذریعے بیدار کرنا، اس کے لیے اصل ارشاد میں لتنذر بہ و ذکریٰ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

للمومنین کی تعبیر آئی ہے۔ انذار و تذکیر دونوں دعوت کے اہم پہلو ہیں۔ انذار بیگانوں میں اور تذکیر یگانوں میں ہوتی ہے۔ نبی کا سب سے پہلا اور اہم کام دعوت و تبلیغ ہے یعنی جو سچائی اسے خدا کی جانب سے ملی ہے اس کو دوسروں تک پہنچائے اور جو علم اس کو عطا ہوا ہے اس سے اوروں کو بہرہ ور کرے۔ خدا کا جو پیغام اس تک پہنچا ہے وہ لوگوں کو سنائے اللہ نے اسے جس صداقت سے آگاہ کیا ہے اس سے اپنے ہم جنسوں کو باخبر کرنا۔ جو مالی، جانی، زبانی، دماغی، روحانی اور اخلاقی طاقتیں اس کو بخشی گئی ہیں ان کو اس راہ میں صرف کرنا اور اس کو سمجھانے بجھانے اور راہِ راست پر لانے میں صداقت کی ہر تاثیر سے کام لینا۔ اس اعلان و دعوت میں جو تکلیف درپیش آئے اس کو راحت جاننا، جو مصیبت بھی درپیش ہو اس کو آرام سمجھنا، جو کانٹے بھی اس وادی میں اس کے تلوؤں میں چبھیں ان کو رگِ گل سمجھنا۔ یہ ہے نبوت کے انذار و تذکیر کا مفہوم۔ دنیا میں جس قدر پیغمبر آئے انہوں نے اپنے فرض کو ایثار اور قربانی کے ساتھ انجام دیا۔ نبوت کی دعوت میں تذکیر و انذار دونوں ہوتے ہیں۔ وہ خیر خواہی سے مشفقانہ اور مربیانہ انداز میں نصیحت کرتا ہے اور ساتھ ہی نہ ماننے والوں کو خدا کے جلال سے ڈراتا عذابِ الٰہی سے خوف دلاتا ہے اور لوگوں کو ان کے انجامِ بد سے آگاہ کرتا ہے اور یہ انذار و تذکیر قرآن کے ذریعے ہوتی تھی۔ یہاں بہ کا لفظ یہی بتانے کے لیے ہے کہ اسلامی تبلیغ کا درس اولین قرآن اور صرف قرآن تھا۔ قرآن حکیم اسلام کے دعویٰ اور دلیل دونوں کا مجموعہ ہے۔
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے صحابہ تبلیغ و دعوت میں صرف قرآن کی سورتیں پڑھ کر سناتے تھے اور جہاں ان کو اس کا موقعہ مل جاتا وہاں اس کی تاثیر اپنا کام کر جاتی تھی اور یہ فرض خود قرآن نے آپ کا یہ کہہ کر قرار دیا تھا لتنذر بہ۔ قرآن کی دعوت کے لیے جہاد کی ضرورت تھی مگر اس جہاد کا ہتھیار لوہے کی تلوار نہیں بلکہ قرآن کی تلوار تھی جس کی ضرب کی روک خود اور سپر سے بھی ممکن نہ تھی۔ اللہ تعالیٰ نے مکی زندگی میں اپنے پیغمبر کو اس تلوار سے جہاد کرنے کا حکم دیا فرمایا جاھدھم بہ جھادا کبیرا " قرآن کے ذریعے ان سے بڑا جہاد کرو۔ اس پیغامِ الٰہی کے اترنے کی غرض ہی یہ تھی کہ وہ خدا ترس لوگوں کو ان کا عہد یاد دلاتے فرمایا فذکر بالقرآن من یخاف وعید یہی قرآن اسلام کی طاقت اور نبوت کا اصلی ہتھیار تھا جس کی کاٹ نے کبھی خطا نہیں ہے۔

یہاں اس فقرے میں یعنی لتنذر بہ وذکریٰ للمومنین میں پہلے فعل کے دونوں مفعول حذف کرکے اشارہ کر دیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کسی خاص ملک اور قوم کے لیے نہیں بلکہ تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ اس کی تفصیل آگے آ رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کا فرض یہ ہے کہ اس کتابِ الٰہی کے ذریعے سے لوگوں کو تکذیبِ رسول کے نتائج اور قیامت کے احوال سے اچھی طرح آگاہ کر دیں۔ ذکریٰ للمومنین کا عطف

تو لتنذر بہ ہی پر ہے لیکن یہاں اس کے فعل کو محذوف کر دیا گیا ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ جہاں تک انذار کا تعلق ہے وہ تو آپ ان کفار کو کر دیں لیکن اس سے یاددہانی کا فائدہ صرف اہل ایمان کو ہوگا۔

تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ راہ دعوت میں حالات خواہ کیسے سنگین در پیش آئیں آپ عزم و استقلال اور صبر و ثبات کا مثالی پیکر بن کر رہیں۔ اس کے لیے تعبیر فلا یکن فی صدرک حرج کی اختیار کی گئی ہے۔ لفظ حرج کے معنے حضرت عبداللہ بن عباس اور امام مجاہد نے شک کے کیے ہیں اور اس کا مطلب عام شارحین قرآن نے یہ بتایا ہے کہ نبوت کی شان یہ نہیں ہے کہ ذرا سا بھی شک و شبہ کتاب کے احکام کے بارے میں اپنے دل میں لائے لیکن ہماری رائے میں ان بزرگوں کا منشاء یہ بتانا ہے کہ حالات میں خواہ کتنی سنگینی ہو حق کی کامیابی اور فتح مندی کے بارے میں آپ کو مستقبل کو شک کی نگاہوں سے نہ دیکھنا چاہیے۔ قرآن جب کہتا ہے کہ فلا تکونن من الممترین تو اس کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہوتا کہ معاذ اللہ قلب نبوت میں احکام الٰہی کے بارے میں کوئی شک ہو رہا ہے بلکہ مصائب کے ہجوم اور تکذیب کے طوفان میں نتائج کے لیے دل پریشان ہوتا ہے اسی موقعہ پر قرآن آپ کو تسکین و تسلی دیتا ہے کہ آپ مخالفوں کی مخالفتوں سے پریشان نہ ہوں کامیابی بہرحال آپ کی ہے۔ یہ سارا ہنگامہ وقتی ہے اور دوسرے شارحین قرآن نے لفظ حرج کو اپنے لغوی معنے میں لیا ہے دل میں حرج ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ایسا نہ ہو کہ مخالفتوں اور مزاحمتوں کے طوفان میں اپنا راستہ صاف نہ پا کر آپ کا دل آگے بڑھنے سے رک جائے۔ آپ پورے شرح صدر کے ساتھ کام کرتے جائیں اور حالات کی پروا نہ کریں۔ اور بھی اس کا مطلب بتایا گیا ہے کہ اس وقت کفار و مشرکین کی دشمنی حد کمال کو پہنچ چکی تھی، آیات الٰہی کی تکذیب، احکام شرعی کا مذاق، مسلمانوں پر جور و جفا اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ظلم و ستم ان کا مقصد حیات بن کر رہ گیا تھا۔ انہیں راہ راست پر لانے کے لیے بظاہر ساری کوششیں بے اثر معلوم ہو رہی تھیں جس سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سخت صدمہ تھا اس لیے یہاں فرمایا کہ آپ ان کفار کے معاندانہ رویہ سے دل تنگ نہ ہوں بلکہ اپنا فرض ادا کرتے جائیں اور تبلیغ میں سرگرم رہیں۔

یہ سب باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں لیکن اصل بات یہ ہے کہ دین حق کی علمبرداری یعنی اس کی اطاعت اور اقامت ہے اور وہ بھی مقامی اور علاقائی نہیں، قومی اور ملکی نہیں بلکہ بین الاقوامی اور پورے عالم میں اس کی اقامت اور تمام ادیان پر اس کا غلبہ ایک ایسا نصب العین ہے جس کی مشکلات کی بے پایانی اور جس کی ذمہ داریوں کی گراں باری اپنا کوئی نظیر نہیں رکھتی ہے۔ دوست، دشمن، موافق اور مخالف، مومن اور منکر سب اس امر واقعی کا یکساں اعتراف کرتے ہیں۔ غیر اس کا اظہار اس نصب العین کی خاطر تگ و دو کرنے والوں کو علانیہ فریب خوردہ بلکہ مجنون کہہ کر کرتے ہیں۔ بہرحال جہاں تک کام کی دشواری کا تعلق ہے

سائے اہلِ جہاں یک زباں ہو کر پکارتے ہیں کہ اس وادیٔ جنون میں قدم رکھنا ہر شخص کا کام نہیں۔ ظاہر ہے کہ اس نظریہ کی
صداقت سے نہ تو اس کو انکار ہے جس نے یہ عظیم الشان ذمہ داری اپنے بندوں پر ڈالی ہے اور نہ انہیں جن کو اس کار
اعظم کی سربراہی دے کر اس دنیا میں روانہ کیا گیا ہے صلی اللہ علیہ وسلّم۔ ان الفاظ کو پیشِ نظر رکھیے جو اس نصب العین
کے آخری تذکیر اور دینِ حق کے آخری علمبردار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو اس منصب پر سرفراز کرتے وقت فرمائے
گئے انا سنلقی علیك قولاً ثقیلاً، یہ قولِ ثقیل کس چیز کو کہا گیا ہے۔ واقعات شاہد ہیں۔ بعد میں نازل ہونے والے
احکام بتلاتے ہیں اور خود آیت کا سیاق و سباق بتاتا ہے کہ اس سے مراد اللہ کی وہی کتاب تھی۔ جس کے نزول کا
آغاز ہو چکا تھا اور جس میں بتدریج نوعِ انسانی کے لیے آخری اور مکمل ضابطہ حیات ہونے کے باعث ایک ایک
شعبۂ زندگی سے متعلق ہدایات آنے والی تھیں اس لیے نبی پر نت نئی ذمہ داریوں کا بارِ گراں پڑنے والا تھا۔
قرآن کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ اس کی آیات کا بڑا حصہ اصلاً صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کو تسلّی کی
خاطر نازل ہوتا رہا ہے۔ آیات ہی نہیں بلکہ پوری پوری سورتیں اسی مقصد کو لے کر اتریں۔ جب بھی ایسا ہوا
اور ایسا ہونا کسی صبح بھی غیر متوقع نہ تھا کہ حالات کی ناسازگاریاں قلبِ مبارک پر شاق گزرتیں تو فوراً رحمتِ حق
حرکت میں آتی اور الفاظِ قرآن کے لباس میں جلوہ گر ہو کر ٹوٹتے ہوئے دل کو سنبھالتی، ڈھارس بندھاتی اور ایک نئے
جوش اور ایک تازہ عزیمت کی توانائیوں سے معمور کر دیتی تاکہ اسی استقلال کے ساتھ اقامتِ حق کا کام پیہم
جاری رہے کہیں ارشاد ہوتا۔

ولقد نعلم انك یضیق صدرك بما یقولون

ہم اس سے خوب باخبر ہیں کہ لوگوں کی باتوں سے تمہارا دل رُکنے لگتا ہے۔

یعنی لوگ دعوتِ حق کے بارے میں باتیں کرتے ہیں اس سے تمہیں پریشانی لاحق ہوتی ہے کہ جن لوگوں کی
ہٹ دھرمی اور ضد کا حال یہ ہے آخر ان کو ہدایت پر کیسے لایا جائے گا اور کبھی ارشاد ہوتا

واصبر وما صبرك الا باللہ ولا تحزن علیھم ولا تك فی ضیق مما یمکرون

اے پیغمبر صبر کر اور تیرا صبر اللہ کی مدد سے ہے اور ان لوگوں کے حال پر غمگین نہ ہو اور نہ ان کی
مخالفانہ تدبیروں سے دل تنگ ہو۔

یہ بات خالص دعوت کے موقعہ پر فرمائی ہے اور کہیں فرمایا ہے۔

فلعلك تارك بعض ما یوحی الیك وضائق بہ صدرك

اے پیغمبر کیا تو ایسا کرے گا کہ جو کچھ تجھ پر وحی کیا جاتا ہے اس میں سے کچھ باتیں چھوڑ دو گے
یا اس وجہ سے دل تنگ ہو جاؤ گے۔

ظاہر ہے کہ ایک شخص ایک مطمئن اور خوش و خرم قوم کے سامنے کھڑے ہو کر اچانک اعلان کرتا ہے کہ تمہاری زندگی سرتاسر غلط ہے، عبادت غلط اور طاعت غلط اگر باز نہ آئے تو تباہ ہو جاؤ گے۔ یہ کتنا بڑا اور عجیب اعلان ہے کتنی عظیم اس کی ذمہ داری ہے اور کس درجہ ما فوق انسانیت صبر و تحمل کی ضرورت ہے کہ وہ سب کچھ برداشت کیا جاتے جو یہ اعلان سن کر لوگوں کی زبانوں سے نکلے گا۔ یہی مرحلہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو درپیش تھا اسی لیے وحی الٰہی جا بجا اس پر زور دیتی ہے کہ لوگوں کی باتوں سے دل تنگ نہ ہو اور اعلان حق میں ذرا بھی تامل نہ کرو۔ ان حالات میں دل تنگی ایک امر طبعی ہے۔ اسی امر طبعی سے یہاں روکا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ نہ تو پیش پا افتادہ حالات سے پریشان ہوں اور نہ لوگوں کی تکذیب و انکار سے دل گیر ہوں اور دعوت کے مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھیں۔ انذار و تذکیر رسول ہونے کی حیثیت میں آپ کا کام ہے نتائج پیدا کرنا اور دعوت حق کو کامیاب بنانا اللہ کا کام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعوت کا کام کرنے والوں کا کام یہ ہے کہ نگاہ فرائض پر رکھیں نہ کہ نتائج پر۔

انکار نبوت پر کفار کو دھمکی

۲۔ لوگو! جو کچھ تمہارے رب کی جانب سے تمہاری طرف اتارا گیا ہے اس کی پیروی کرو اور خدا کے سوا اپنے مددگاروں کی پیروی نہ کرو تم بہت ہی کم نصیحت قبول کرتے ہو۔ آدمی اگر حق تعالیٰ کی تربیت عظیم اپنے آغاز و انجام اور طاعت و معصیت کے نتائج پر پوری طرح دھیان کرے تو کبھی اس کو جرأت نہ ہو کہ اپنے رب کریم کی اتاری ہوئی ہدایات کو چھوڑ کر شیاطین الانس والجن کی رفاقت میں ان ہی کے پیچھے چلنا شروع کر دے گزشتہ اقوام میں سے جنہوں نے خدا کی کتابوں اور پیغمبروں کے مقابلہ میں ایسا رویہ اختیار کیا ان کو جو ذہنی سزا ملی وہ آگے ہے[1]

سمجھ یہ لیا گیا ہے کہ آیت کی مخاطب امت اجابت ہے اور اس مفروضہ کی بنا پر منکرین حدیث اور منکرین فقہ دونوں نے اس سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی ہے۔ ہماری رائے میں مخاطب پوری انسانیت ہے اور آیت میں انذار عام ہے۔ اصل میں پوری بات اس طرح ہے قل یا ایھا الناس اتبعوا اے پیغمبر کہہ دو اے لوگو اس ضابطہ حیات کی پیروی کرو جو تمہارے پروردگار کی جانب سے اتارا گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کو دنیا میں زندگی گزارنے کے لیے جس ہدایت کی ضرورت ہے اپنی اور کائنات کی حقیقت سمجھنے کے لیے جو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علم اسے درکار ہے اور اپنے اخلاق اور تہذیب معاشرت اور تمدّن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اصولوں کا وہ محتاج ہے ان سب کے لیے اسے صرف اللہ سبحانہٗ کو اپنا ہادی سمجھنا چاہیے اور صرف اسی کی ہدایت کی پیروی کرنی چاہیے جو اللہ نے اپنے رسُولوں کے ذریعے بھیجی ہے۔

یہ مثبت انداز ہے اس کے بعد منفی انداز فرمایا ہے لا تتبعوا من دونه اولیاء اللہ کے سوا اپنے میں سے اور جنات میں سے اولیاء نہ بناؤ۔ یعنی اللہ کو چھوڑ کر کسی دوسرے کی طرف ہدایت کے لیے رجوع کرنا اور اپنے آپ کو اس کی رہنمائی کے حوالے کر دینا انسان کے لیے بنیادی طور پر غلط کاری ہے۔ اس کا نتیجہ ہمیشہ تباہی کی صورت میں نکلا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ

نبوّت جو کچھ خدا کی جانب سے لے کر آئی ہے اس کو چھوڑ کر کسی اور سے تعلق پیدا نہ کرو اگر تم نے ایسا کیا تو تم حکم الٰہی سے ہٹ گئے اور غیر کے ہو گئے۔

اور زمخشری نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے:

شیاطین الانس والجن میں سے کسی سے ولایت کے روابط نہ رکھو وہ تم میں خواہشوں اور بدعتوں کی انگیخت کریں گے۔

اور علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ

اپنے اس رب کو چھوڑ کر جس نے آسمان سے تمہارے لیے ہدایت نامہ روانہ کیا ہے شیاطین اور کاہنوں کی باتوں کو قبول نہ کرو وہ تم کو جادۂ حق سے ہٹا دیں گے اور بدعات و اہواء میں ڈال دیں گے۔

اس آیت میں قرآن نے اللہ اور انسان دونوں کی حیثیت متعین کر دی ہے۔ اللہ کی حیثیت رب ہونے کی ہے یعنی وہ صرف خالقیت، رزاقیت، حکمت و رحمت، رافت و محبت، عطا و بخشش اور عفو و درگزر جیسے کمالات ہی کا پیکر نہیں بلکہ ساتھ ہی وہ مدبر کائنات اور مالک الملک بھی ہے۔ مقتدر اعلیٰ اور شہنشاہ بھی ہے، ہادی اور قانون ساز بھی ہے۔ آمر و حاکم بھی ہے۔ اور انسان کی حیثیت مخلوق و مرزوق، مرحوم، مملوک، محکوم اور مامور کی ہے۔ یعنی مکمل با وفا، غلام، حقیقی فرمانبردار اور طاعت گزار رعیت ہی کی ہو سکتی ہے اور جب یہ دونوں حیثیتیں کھل کر اس آیت کے ذریعے سامنے آگئیں تو یہ بات خود بخود معلوم ہو گئی کہ اسلام اس دین کا نام ہے اللہ رب العالمین کی مکمل اور والہانہ اتباع و اطاعت کا اور اس کا لازمی اور بنیادی تقاضا یہ ہے کہ وہ طرزِ فکر وہ طرزِ عمل وہ ضابطہ زندگی مسائل حیات کے وہ حل اللہ تعالیٰ کی یاد اور پرستش کے وہ طریقے نیکی و خدا ترسی کے وہ تصوّرات اور فلاح و نجات کے وہ ذرائع جنہیں انسان کو اختیار کرنا ہے سب کے سب

اللہ تعالیٰ کی طرف سے واضح متعین اور منضبط شکل میں موجود ہوں کیونکہ طاعت کا تصور حکم کے تصور کو لازم ہے حکم کے بغیر اطاعت کا فعل وجود میں آنہیں سکتا اس لیے بالبداہت ضروری ہے کہ اطاعت کا مطالبہ کرنے سے پہلے مطالبہ کرنے والے نے اپنے احکام بھی دیئے ہوں۔ اور چونکہ یہاں اتباع کا حکم ہے اور اتباع نام ہے قدم بقدم چلنے کا اس لیے ناگزیر ہے کہ حکم کے ساتھ اس پر عمل کا نمونہ بھی موجود ہو کیونکہ اگر نمونہ کوئی نہ ہو تو حکم اطاعت تو ہو سکتا ہے لیکن اتباع کا مطالبہ نہیں ہو سکتا۔ شاید حافظ ابن کثیر نے اسی وجہ سے آیت کی تشریح یہ فرمائی ہے

ا قتفوا آثار النبی الامی الذی جاءکم بکتاب انزل الیکم من رب کل شیئ و ملیکہ

اس نبی امی کے نقشِ قدم پر چلو جو تمہاری طرف ہر چیز کے مالک اور بادشاہ کی جانب سے دستور لے کر آیا ہے۔

اگر قرآن کا مطالبہ اللہ کی کامل اتباع و طاعت ہے تو اس کا واضح مطلب یہ ہے کہ انسان کے سامنے اس کے وہ احکام بھی لازماً پوری تفصیل سے موجود ہوں جن کی اسے اطاعت کرنی ہے۔ اسی کو قرآن نے یہاں ما انزل فرمایا ہے یعنی وہ احکام و قوانین جو نبی خدا کی جانب سے لے کر آیا ہے۔ اسی تقاضے کے تحت قرآن نے یہاں یہ مطالبہ کیا ہے اور ساری انسانیت سے کیا ہے اتبعوا ما انزل الیکم من ربکم اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ ولا تتبعوا من دونہ اولیاء یعنی اللہ کو چھوڑ کر کسی کی پیروی نہ کرو۔ یہاں قاضی ثناء اللہ پانی پتی بہت گہری بات لکھ گئے کہ من دونہ کی قید احترازی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو ولایت کا پروانہ اللہ کی جانب سے نہیں ملا ہے ان کی اطاعت نہ کرو اور جن کو ولایت کا پروانہ اللہ کی جانب سے ملا ہوا ہے جیسے انبیاء اور علماء ان کی اطاعت میں کوئی قباحت نہیں ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ولایت کا پروانہ کیا ہے۔ قرآن نے خود ولایت کا پروانہ انذار و تذکیر کو قرار دیا ہے۔ انبیاء انذار و تذکیر کرتے ہیں اس لیے ان کی اطاعت کی جاتی ہے اور اس کے بعد اُمت میں وہ تمام طبقے جو نبوت کی نیابت میں اُمت میں انذار کا کام کرتے ہیں ان کی طاعت کی جاتی ہے ارشاد ہے:

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین ولینذروا قومھم اذا رجعوا الیھم لعلھم یحذرون۔

ایسا کیوں نہ کیا گیا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آتی ہوتی کہ دین میں فہم و دانش پیدا کرے اور جب تعلیم و تربیت کے بعد اپنے گروہ میں واپس جاتی اور لوگوں میں انذار کا کام کرتی تاکہ لوگ برائیوں سے بچیں۔

اگر انذار ہو اور منذرین کی طاعت نہ ہو تو انذار میں کوئی معنویت نہیں رہتی ہے۔ حیرت ہے کہ لوگ

نے من دونہٖ کی ضمیر کا مرجع ما انزل اللہ قرار دے کر نبوت کے عمل سے گریز کی راہ تلاش کی ہے۔ ان کے اشتباہ کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں تشریع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیے تسلیم کیا گیا ہے کہ وہی اصل شارع ہے۔ اب اگر رسول کے لیے بھی ما انزل اللہ سے الگ شرع بنانے کا حق تسلیم کیا جائے تو خدا کے سوا ایک اور شارع تسلیم کرنا ہوگا۔ پہلا جواب تو یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع نہیں مانتے بلکہ کتاب الٰہی کا شارح مانتے ہیں، کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج جب حکومت کے قانون کی توضیح و تشریح کرتا ہے تو وہ اپنے عمل سے سلطان وقت بن کر واضع قانون کا منصب اختیار کر لیتا ہے یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے۔ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے جس کو ہم نبی اور رسول کہتے ہیں قرآن کی اس آیت کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ ما انزل اللہ کی نبوت کی بتائی ہوئی تشریح، تعلیم اور تبیین پر عمل نہ کرو۔ ایسا کہنا قرآن کا انکار اور عقل و فہم کا ماتم ہے۔

یہاں یہ نکتہ لحاظ کے قابل ہے کہ جو لوگ ہنوز نبوت کے منکر ہوں ان سے رسول کا تعلق صرف تبلیغ و نصیحت پند و موعظت اور سمجھانے کا ہوتا ہے لیکن جو خوش قسمت اقرار نبوت کی سعادت حاصل کر لیں تو پھر ان کا تعلق رسول سے اُمتی کا ہو جاتا ہے۔ اب رسول اس کے لیے حاکم، قاضی، مطاع، متبوع، معلم، مبین، مذکر، مبشر، محلل، محرم، آمر، ناہی، داعی، شاہد اور ہادی ہوتا ہے۔ کوئی حکومت دوسرے ملک کے کسی باشندے کو زبردستی اپنی رعایا نہیں بناتی لیکن اگر کوئی از خود اس کی حکومت کا شہری بن جاتے تو پھر اس کو اس کے قانون کی پیروی پر بزور مجبور کیا جائے گا اور کہا جائے گا۔

ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ

منکرین سے متعلق مخاطبات قرآنی میں مومنین کے واجبات تلاش کرنا بہت بڑی زیادتی اور روح خطاب سے بے خبری ہے۔

اور اس سے زیادہ حیرت ان پر ہے جنہوں نے اس آیت قرآنی سے ائمہ اربعہ کی تقلید کے حرام ہونے اور قیاس و اجتہاد کے باطل ہونے پر استدلال کیا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں حافظ ابن حزم کا یہ دعویٰ نقل کیا ہے کہ تقلید حرام ہے اور ان کی زبانی اس دعویٰ کے لیے اس آیت کو دلیل بنا کر پیش کیا ہے۔ حالانکہ اس ارشاد گرامی کا اس دعویٰ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے دراصل ان بزرگوں پر عبادت اور طاعت کے بارے میں قرآن کا نقطہ نظر واضح نہیں ہے۔ یہ دونوں کو ایک سمجھ بیٹھے ہیں حالانکہ از روئے قرآن دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔ عبادت تقاضائے محبت ہے محبت میں نیابت نہیں ہے اس لیے عبادت خدا کے علاوہ نہ رسول کی ہو سکتی ہے اور نہ کسی اور کی برخلاف طاعت کے کہ وہ تقاضائے حاکمیت ہے اور سب جانتے اور مانتے ہیں کہ حاکمیت میں خلافت ہے۔ نبی کو براہ راست خلافت ملتی ہے اس لیے

نبی کی طاعت کی جاتی ہے اور ارباب علم النبوت کی پیروی کی وجہ سے خلافت ملتی ہے اس لیے ان کی مشروط طاعت کی جاتی ہے۔ پورا قرآن پڑھ جائیے آپ کو یہ بات کہیں نہ ملے گی۔ اعبدوا اللہ و رسولہ لیکن یہ بات آپ کو قدم قدم پر ملے گی اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول بلکہ اس سے بھی آگے یہ بات بھی آپ قرآن میں پڑھیں گے اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم قانون کی حدود میں علماء کے اجتہاد و قیاس کی حیثیت مثبت کی نہیں بلکہ مظہر کی ہے یعنی یہ منشاء الٰہی کو ظاہر کرتے ہیں اور بس۔

آخر میں فرمایا ہے قلیلا ما تذکرون اس کے دو معنے ہیں تم بہت تھوڑی نصیحت قبول کرتے ہو یا یہ کہ بہت تھوڑے وقت کے لیے مانتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ تم میں اکثریت نصیحت قبول نہ کرنے والوں کی ہے حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس آیت میں یہی بتایا گیا ہے کہ اکثریت دنیا میں باطل پرستوں کی ہے اور اس کی حیثیت وہی ہے جو قرآن میں ان آیات کی ہے وما اکثر الناس ولو حرصت بمومنین دنیا میں لوگوں کی اکثریت ایمان سے خالی خواہ کیسے ہی ان کے ایمان خواہش کریں۔ یہ بھی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ خطاب کفارِ قریش سے ہے۔

انذار کے لیے تاریخ کی گواہی

۴۔ اور دیکھو کتنی بستیاں ہیں جن کو ہم نے تہس نہس کر دیا۔ پھر ایسا ہوا کہ لوگ رات کو سوئے تھے یا دن کو قیلولہ کر رہے تھے کہ ہماری گرفت آ گئی، جب ان پر عذاب آیا اس وقت ان کی پکار اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ بلاشبہ ہم ظلم کرنے والے تھے۔ یعنی جب ان کے ظلم و عصیان اور کفر و عدوان کی حد ہو چکی تو دنیا کی لذات و شہوات میں منہمک اور عذابِ الٰہی سے بالکل بے فکر ہو کر خوابِ استراحت کے مزے لینے لگے کہ یکایک ہمارے عذاب نے آ دبوچا۔ پھر ہلاکت آفرینیوں کے اس دہشتناک منظر اور ہنگامہ دار و گیر میں سارے طمطراق بھول گئے۔ چاروں طرف سے اناکنا ظالمین کی چیخ و پکار کے سوا کچھ سنائی نہ دیتا تھا۔ گویا اس وقت انہیں واضح ہوا اور اقرار کرنا پڑا کہ خدا کسی پر ظلم نہیں کرتا ہم خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں۔ فجاءھا باسنا کی فاء میں مفسرین کے کئی قول ہیں۔ غالباً حضرت شیخ الہند نے اپنے ترجمہ میں اس کو اھلکناھا کی تفسیر و تفصیل قرار دیا ہے جیسے کہا جاتے توضاء فغسل وجھہ وذراعیہ فلاں شخص نے وضو کیا تو چہرہ اور ہاتھ دھوئے۔ اس مثال میں منہ ہاتھ اور ہاتھ دھونا وضو کرنے کی تفصیل و تفسیر ہے۔ اسی طرح یہاں ہلاک کرنے کی تفسیر و تفصیل کیفیتِ عذاب کے بیان سے ہوتی ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں اس انذار کے لیے جس کا ذکر نبوت کے مقاصد میں پہلے ہوا ہے ایک تاریخی شہادت پیش کی گئی ہے اور آگاہ کیا گیا ہے کہ آج بھی یہ تاریخ دہرائی جا سکتی ہے۔ آیت میں لفظ قریہ لایا گیا ہے۔ اس کا اطلاق بستی پر بھی ہوتا ہے اور بستی والوں پر بھی اور لفظ کم خبریہ بہات کے معنے بتانے کے لیے آیا ہے یعنی بہت سی بستیاں ہیں جن کو ہم نے انبیاء کی تکذیب کی پاداش میں ہلاک کر دیا۔ یعنی تمہاری عبرت کے لیے ان قوموں کی مثالیں موجود ہیں جو نبوت کی تکذیب کر کے انسانوں اور شیطانوں کی قیادت میں چلتی رہی ہیں اور اس قدر بگڑیں کہ زمین پر ان کا وجود ناقابل برداشت لعنت ہو گیا اور خدا کے عذاب نے ان کو تباہ کر دیا۔ اور خدا کا یہ عذاب دو طرح سے آیا ایک تو یہ کہ رات کے وقت میں آیا جیسے قوم لوط پر آیا، دوسرے یہ کہ دوپہر کو آیا جیسے قوم شعیب پر آیا، یہ دونوں وقت آرام و استراحت کے ہیں پہلے کے لیے بیاتا اور دوسرے کے لیے قائلون کی تعبیر آئی ہے اس میں اشارا ہے کہ عقلمند کو رات کے سکون اور دن کے آرام میں غافل نہ ہونا چاہیے۔ ان اوقات کے بیان کرنے سے عذاب کے اوقات بتانا مقصود نہیں ہے بلکہ یہ ظاہر کرنا ہے کہ خدا کا عذاب شب کی تاریکیوں میں چپ چپاتے اور دن میں ڈنکے کی چوٹ آجاتا ہے نہ اس کو کوئی روک سکتا ہے اور نہ کوئی اس سے بچ سکتا ہے صرف وہ بچتا ہے جس کو اللہ بچائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے بھی نبوت کی پیروی نہ کی تو یہی حشر تمہارا بھی ہونا ہے۔

اس میں اشارا ہو گیا تلافی کا وقت گزر جانے کے بعد ہوش میں آنا اور اپنی غلطی کا اعتراف کرنا بیکار ہے سخت نادان ہے وہ شخص اور وہ قوم جو خدا کی دی ہوئی مہلت کو غفلتوں اور سرشاریوں میں ضائع کر دے اور داعیان حق کی آواز کو بہرے کانوں سے سنے جائے اور ہوش میں صرف اس وقت آئے جب اللہ کی گرفت کا مضبوط ہاتھ اس پر پڑ جائے۔

اور اس میں مخاطبوں کو یہ تنبیہہ بھی ہے کہ افراد کی زندگیوں میں بھی اور اقوام کی زندگیوں میں بھی ایک دو نہیں بے شمار واقعات تمہارے سامنے گزر چکے ہیں کہ جب کسی کی غلط کاریوں کا پیمانہ لبریز ہو جاتا ہے اور وہ اتنی مہلت کی حد تک پہنچ جاتا ہے تو پھر خدا کی گرفت اچانک آجاتی ہے اور ایک بار پکڑ میں آنے کے بعد چھٹکارے کی کوئی سبیل نہیں ملتی۔ پھر جب تاریخ کے دوران ایک بار نہیں سینکڑوں اور ہزاروں بار بھی کچھ ہو چکا ہے تو آخر کیا ضروری ہے کہ انسان اسی غلطی کا بار بار اعادہ کیے چلا جائے اور ہوش میں آنے کے لیے اس آخری ساعت کا انتظار کرتا رہے جب ہوش میں آنے کا کوئی فائدہ حسرت و اندوہ کے سوا نہیں ہوتا۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فَلَنَسۡـَٔلَنَّ الَّذِيۡنَ اُرۡسِلَ اِلَيۡهِمۡ وَلَنَسۡـَٔلَنَّ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ﴿۶﴾
فَلَنَقُصَّنَّ عَلَيۡهِمۡ بِعِلۡمٍ وَّمَا كُنَّا غَآئِبِيۡنَ ﴿۷﴾ وَالۡوَزۡنُ يَوۡمَئِذِ
الۡحَقُّ ۚ فَمَنۡ ثَقُلَتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡمُفۡلِحُوۡنَ ﴿۸﴾
وَمَنۡ خَفَّتۡ مَوَازِيۡنُهٗ فَاُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ خَسِرُوۡۤا اَنۡفُسَهُمۡ
بِمَا كَانُوۡا بِاٰيٰتِنَا يَظۡلِمُوۡنَ ﴿۹﴾

پس ضرور بالضرور ہم ان لوگوں سے دریافت کریں گے جن کی طرف خدا کی جانب سے رسول روانہ کیے گئے اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے[۶]۔ پھر یقیناً ہم ساری سرگزشت پورے علم کے ساتھ ان کو سنائیں گے اور ہم غائب نہ تھے[۷]۔ اور اس دن اعمال کا وزن برحق ہے پھر جس کی نیکیوں کا پلّہ بھاری ہوگا تو کامیابی ان کی ہی ہوگی، اور جن کا پلّہ ہلکا ہوگا تو یہ وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا کیونکہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ برتاؤ کرتے تھے۔

معانی مفردات

لَنَقُصَّنَّ قص یقص مضارع بانون تاکید کا جمع متکلم ہے۔ قصص مصدر ہے اگر اس کے بعد علیٰ آئے تو واقعہ بیان کرنے کے معنے ہوں گے جیسے یہاں ہے ورنہ اس کے معنی نقش قدم پر چلنا اور پیروی کرنا ہیں۔ اسی سے قصاص اس بدلہ کو کہتے ہیں جو اصل جرم کے برابر ہو یعنی اصل جرم کا نقشِ قدم ہو۔ علم، علم، دانش، جاننا، یہ علم یعلم کا مصدر ہے۔ علم حق سبحانہٗ کی ایک صفت قدیم ہے جو ازل سے ذاتِ الٰہی کے ساتھ قائم ہے لہٰذا جہل کا ہونا اس کے حق میں محال ہے۔ ثَقُلَتْ، ثقل سے ماضی ہے جس کے معنے گرانبار ہونے کے ہیں۔ اسی سے ثقیل گراں اور بھاری کو کہتے ہیں اسی کی جمع ثقال آتی ہے۔ موازین میزان کی یا موزون کی جمع ہے ترازو یا وزن کیے جانے والے اعمال۔ اس کا مصدر وزن آتا ہے اس کے معنے تولنے کے ہیں کسی چیز کی مقدار کی پہچان عوام کے نزدیک کسی چیز کو ترازو سے تولنے کو وزن کرنا کہتے ہیں (راغب) خفت، اس کا مصدر خفۃ ہے اس کے معنے ہلکا ہونا ہے اسی سے صفت کا صیغہ خفیف ہے اس کی جمع خفاف آتی ہے۔

آخرت کی باز پرس اور جزاء

قرآن نے حقائق کی دو قسمیں کی ہیں ایک وہ جن کا تعلق عالم غیب سے ہے اور دوسرے وہ جن کا تعلق عالم شہادت سے۔ اس عالم طبیعت سے پہلے اور عالم طبیعت کے بعد جو کچھ ہے اس کا تعلق عالم غیب سے ہے یہ ہمارے محسوسات کی سرحد سے باہر ہے۔ یہاں سے قرآن نے مابعد الطبیعت کا تعارف پیش کیا ہے، اس کے بعد دوسرے رکوع میں مافوق الطبیعت کے چہرے سے نقاب اٹھائے گا ما قبل الطبیعت ہو یا مابعد الطبیعت دونوں کا تعلق عالم غیب سے ہے، جسے ہم آخرت کہتے ہیں۔ اس کا تعلق مابعد الطبیعت سے ہے۔ اس عالم میں جو کچھ ہوگا وہ اگرچہ ہمارے ادراک سے بالا ہے تاہم چونکہ فہم انسانی کی مجبوری کی وجہ سے وہ اسی زبان و محاورات میں ادا کیا گیا ہے، جو اس مادی عالم کے ساتھ مخصوص ہیں اس لیے یہ الفاظ جن مادی خصائص کو مستلزم ہیں باہم ان کے دیکھنے اور سننے کے اس دنیا میں عادی ہو گئے ہیں۔ ان لفظوں کو سن کر بعینہٖ وہی سمجھنا چاہتے ہیں جو اس دنیا میں ان لفظوں سے سمجھتے رہے ہیں اسی وجہ سے بعض کم فہم وہاں کے

وقائع واحوال کا بیان سن کر ان میں سے بعض کو محال اور ناممکن کہہ اٹھتے ہیں اور بعض ان کی تشریح وتاویل اس طرح کرتے ہیں کہ لفظ ومعنے میں ادنیٰ اشتراک بھی باقی نہیں رہتا۔ یہ دونوں راستے سخت خطرناک ہیں۔ اسی لیے قرآن عزیز نے ان نازک و دقیق عالم غیب سے تعلق رکھنے والے اسرار کے بیان میں انسانی فطرت کی کمزوریوں کا پورا لحاظ کیا ہے۔ اس نے نہ تو یہودیوں کی طرح ان واقعات کو سرتاپا مادی کہہ کر عالم آخرت کو عالم آب وگل بنادیا ہے اور نہ عقل وخرد کے بعض نادان مدعیوں کی طرح ان کو مادے سے اتنا بلند وبرتر کردیا ہے کہ ان کا وجود ہی موہوم اور فرضی ہوگیا ہے بلکہ انسانی عقلوں کے اختلاف مراتب کا لحاظ کرکے بزم کے اہل نظر اور تماشائی دونوں کو تشفی اور تسکین کا سامان کیا ہے۔

۴۔ پس ضرور بالضرور ہم ان لوگوں سے دریافت کریں گے جن کی طرف خدا کی جانب سے رسول روانہ کیے اور پیغمبروں سے بھی پوچھیں گے۔ یعنی جن امتوں کی طرف پیغمبر مبعوث ہوتے ان سے سوال ہوگا ماذا اجبتم المرسلین تم نے ہمارے پیغمبروں کی دعوت کو کہاں تک قبول کیا تھا اور خود پیغمبروں سے پوچھیں گے ماذا اجبتم تم کو امت کی طرف سے کیا جواب ملا تھا[1]

یہی اس سورت کا مرکزی موضوع ہے۔ اصل دعوت جو اس سورت میں دی گئی ہے وہ یہی ہے کہ انسان کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے نبوت کی ضرورت ہے جو علم اسے درکار ہے اور اخلاق، تہذیب، معاشرت، اور تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اصولوں کا وہ محتاج ہے ان سب کے لیے اسے نبوت سے استفادہ کرنا چاہیے اور صرف اسی کی رہنمائی کو قبول کرنا چاہیے۔ اسی کی روز قیامت باز پرس ہوگی۔ نون تاکید کے ساتھ بات اس لیے کہی کہ عرب کے مخاطب اول دعوت میں نبوت کے ایسے ہی منکر تھے جیسے وہ قیامت کے منکر تھے۔ تمام امتوں کے ہر فرد سے دریافت کیا جائے گا کہ رسول کی دعوت پر کہاں تک عمل کیا۔ دوسری آیات میں اس اجمال کی تفصیل آئی ہے۔ سورۃ انعام میں اسی جلد میں گزر چکا ہے کہ پوچھا جائے گا الم یاتکم رسل منکم یقصون علیکم آیاتی و ینذرونکم لقاء یومکم کیا تمہارے پاس خود تم میں سے وہ پیغمبر نہیں آئے تھے جو تم کو میری آیات سناتے تھے اور اس دن کے انجام سے ڈراتے تھے۔ اور سورہ قصص میں ہے کہ ویوم ینادیھم فیقول ماذا اجبتم المرسلین اور جس روز خدا ان کو پکارے گا اور پوچھے گا کہ جو رسول بھیجے گئے تھے انہیں تم نے کیا جواب دیا تھا۔ یعنی خدا نے جو رسول تمہاری ہدایت کے لیے بھیجے تھے ان کی دعوت کا تم نے کیا جواب دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال امت سے جرم کی سنگینی ظاہر کرنے کے لیے ہوگا کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اللہ سبحانہ نے تمہاری ہدایت کا یہ سامان کیا کہ اپنے رسول بھیجے کہ ہر پہلو سے تم پر حق واضح ہو جائے بتاؤ تم نے اس اہتمام کی کیا قدر کی۔ اور صرف یہی سوال نہ ہوگا بلکہ قرآن و سنت کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف نوعیتوں کے سوالات ہوں گے اگرچہ تفصیلات اپنے موقعہ پر آئیں گی لیکن سر دست اجمالی بات سن لیجیے۔ سورۃ نحل میں ہے تاللہ لتسئلن عما کنتم تفترون بخدا تم سے اس بارے میں ضرور باز پرس ہوگی کہ تم حقیقت کے خلاف کیسے افترا پردازیاں کرتے رہے۔ یہی بات سورہ عنکبوت میں دہرائی ہے ولیسئلن یوم القیامۃ عما کانوا یفترون؟ ان سے ان کی افترا پردازیوں کے بارے میں ضرور پوچھا جائے گا۔ یعنی ان بدعتوں کے بارے میں دریافت کیا جائے گا جو انہوں نے ایجاد کیں لیکن ان کو منسوب اللہ کی طرف کیا اور ان کی حمایت میں اتنا غلو کیا کہ ان کو ہی مدار نجات بنا دیا۔ یہ بزرگوں کی نذریں، قبروں کے چڑھاوے، ان پر سالانہ میلے، ان کے نام کے بکرے اور چوپائے جو قبوری کرتے ہیں۔ اور سورۃ نحل ہی میں تعمیم کے ساتھ ذکر ہے لتسئلن عما کنتم تعملون اور سورہ حجر میں ہے کہ فوربک لنسئلنھم اجمعین تیرا پروردگار شاہد ہے کہ ان سب سے ضرور ان کے اعمال کے بارے میں باز پرس ہوگی۔ احادیث میں اس موضوع پر بہت بڑی تفصیلات آئی ہیں۔ مثلاً عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ :

> تم سب نگران ہو سب سے اس کی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا سربراہِ مملکت سے شہریوں کے بارے میں، مرد سے اہل و عیال کے بارے میں، بیوی سے شوہر کے گھر کے بارے، غلام سے آقا کے مال کے بارے میں۔

طبرانی میں حضرت انس بن مالک کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

> تم سب راعی ہو سب سے اپنی رعیت کے بارے میں سوال ہوگا لہٰذا سوالات کے لیے جواب کی تیاری کرو، صحابہ نے عرض کی یا رسول اللہ جواب کیا ہے فرمایا نیک کام اور نیکیاں۔

طبرانی نے کبیر میں حضرت مقداد کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ

> جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ قوم کا ہر سربراہ روز قیامت اس طرح پیش ہوگا کہ ہاتھ میں جھنڈا لوگ اس کے پیچھے ہوں گے سربراہ سے لوگوں کے بارے میں اور لوگوں سے سربراہ کے بارے میں سوال ہوگا۔

طبرانی نے اوسط میں حضرت انس کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ حضور انور کا ارشاد ہے :

> روزِ قیامت سب سے پہلا سوال بندے سے نماز کے بارے میں ہوگا۔

امام مسلم نے عبداللہ بن مسعود کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضور انور نے فرمایا :

روزِ قیامت سب سے پہلے فوجداری معاملات کا فیصلہ کیا جائے گا۔

یعنی قیامت کے دن سب سے پہلے جس معاملہ کا فیصلہ کیا جائے گا وہ انسان کا خون ہے۔ نماز کے بارے میں سب سے پہلے سوال اور انسانی خون کے بارے میں سب سے پہلے فیصلہ دونوں میں کوئی تعارض نہیں جن کاموں میں محاسبہ ہوگا ان میں اولیت نماز کو دی جائے گی اور جن کاموں کا فیصلہ کیا جائے گا ان میں اولیت انسانی خون کی ہوگی۔ محاسبہ اور قضا میں جوہری فرق ہے۔ امام ترمذی نے حضرت ابو برزہ الاسلمی کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

کوئی شخص اس وقت تک اپنی جگہ سے نہ ہٹے گا جب تک چار سوالوں کے جواب نہ دے چکے گا، اول عمر کو کس چیز میں گنوایا، دوسرے علم پر کس قدر عمل کیا، تیسرے مال کی آمدنی اور خرچ کی مدات، چوتھے جسم کے بارے میں کاہے میں لگایا۔

ایک طرف امتوں سے سوال ہوگا۔ امتِ دعوت سے بھی اور امتِ اجابت سے بھی۔ امتِ دعوت سے سوال ہوگا کہ رسولوں کی دعوت کو کہاں تک قبول کیا اور امتِ اجابت سے سوال ہوگا کہ قبول کر لینے کے بعد ایمان کے تقاضے کہاں تک پورے کیے اور پھر اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ کے سامنے جہاں ایک ایک فرد کو اپنی انفرادی ذمہ داریوں کے بارے میں جوابدہی کرنی ہوگی وہاں پوری امت کو ایک امت کی حیثیت سے بھی اپنی اجتماعی جوابدہی کرنی پڑے گی۔ پھر یہ بھی معلوم رہنا چاہیے کہ یہ جوابدہی کوئی معمولی جوابدہی نہ ہوگی بلکہ کچھ اس طرح کی ہوگی جس طرح انبیاء علیہم السلام کی ان کی اپنی اپنی پیغمبرانہ حیثیتوں میں ہوگی کیونکہ امتِ محمدیہ اگرچہ اصطلاحی طور پر پیغمبر نہیں مگر پیغمبری کا فریضہ ضرور رکھتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جس طرح عام لوگوں سے ان کے اپنے فرض کے بارے میں پوچھا جائے گا کہ انہوں نے انبیاء کی دعوت کا کیا جواب دیا تھا اسی طرح خود انبیاء سے بھی پوچھا جائے گا کہ انہوں نے اللہ کا دین لوگوں تک کس طرح پہنچایا تھا اور اس کا انہیں کیا جواب ملا تھا۔ امتِ مسلمہ ایک پیغمبر کی سی ذمہ داریاں رکھتی ہے تو اس اصولی اعلان کا کھلا تقاضا یہ ہے کہ وہ سوال اس سے بھی ہو جو پیغمبروں سے ہونے والا ہے اور اس سے پوچھا جائے کہ ہمارے بندوں کے سامنے تو نے ہمارے دین کی شہادت کس طرح دی تھی اور انہوں نے اس کا کیا جواب دیا تھا۔

ایک سوال کا جواب

ممکن ہے کہ آپ یہاں اپنے ذہنوں میں یہ خلش محسوس کریں کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ لوگوں سے عام سوال ہو گا لیکن قرآن کی دوسری آیات بتاتی ہیں کہ مجرموں سے ان کے گناہوں کے بارے میں سوال نہ ہوگا۔ سورہ رحمان

یں ہے فیومئذٍ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جان۔ شارحین قرآن نے اس کے متعدد جواب دیے ہیں۔ مثلاً یہ کہ قیامت میں مختلف مواقف اور مناظر ہوں گے مثلاً یہ کہ قبر سے اُٹھتے وقت سوال نہ ہوگا بعد میں ہونا اس کے منافی نہیں یا یہ کہ معلومات حاصل کرنے کے لیے سوال نہ ہوگا ہاں بطور توبیخ ضابطہ کا سوال ہوگا لیکن اصل یہ ہے کہ جس آیت میں سوال نہ کرنے کا ذکر ہے یعنی سورہ رحمان کی آیت فیومئذ لا یسئل وہ اپنی جگہ بے غبار ہے کیونکہ وہاں خود قرآن نے اس سوال کا جواب دے دیا ہے کہ سوال کیوں نہ ہوگا فرمایا اس لیے کہ یعرف المجرمون بسیماھم یہ استیناف بیانی ہے یعنی اس لیے نہ ہوگا کہ مجرم وہاں اپنے چہروں سے پہچانے جائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ اس عظیم الشان مجمع میں جہاں تمام اوّلین و آخرین جمع ہوں گے یہ پوچھنے کی ضرورت نہ ہوگی کہ کون لوگ مجرم ہیں نہ کسی شخص سے یہ دریافت کرنے کی ضرورت ہوگی کہ وہ مجرم ہے یا نہیں۔ مجرموں کے سیاہ چہرے ان کی خوفزدہ آنکھیں، ان کی پست آوازیں اور ان کے چھوٹتے ہوئے پسینے خود ہی یہ راز فاش کرنے کے لیے کافی ہوں گے کہ یہ مجرم ہیں۔

اس آیت میں سوال کے لیے اُمتوں اور رسُولوں کا تقابلی مطالعہ اس لیے پیش کیا گیا ہے کہ معلوم ہو جائے کہ آخرت کی باز پرس کا مرکزی نقطہ رسالت ہی ہوگا۔ ایک طرف انبیاؑ سے دریافت کیا جائے گا کہ تم نے نوعِ انسانی کو خدا کا پیغام پہنچانے کے لیے کیا کچھ کیا دوسری طرف جن لوگوں تک خدا کے رسُولوں کا پیغام پہنچا ان سے سوال ہوگا کہ اس پیغام کے سامنے تم نے کیا برتاؤ کیا۔ جس شخص یا جن انسانی گروہوں تک انبیاؑ کا پیغام نہیں پہنچا ان کے بارے میں تو قرآن ہمیں کچھ نہیں بتاتا کہ ان کے مقدمہ کا کیا فیصلہ کیا جائے گا۔ اس معاملہ میں اللہ تعالیٰ نے اپنا فیصلہ محفوظ رکھا ہے لیکن اُمتِ مسلمہ کی دوسری اُمتوں کے مقابلے میں قرآن نے خود ذمہ داریاں بتائی ہیں کہ:

هو اجتباكم وماجعل عليكم في الدين من حرج ملة ابيكم ابراهيم هو سماكم المسلمين من قبل وفي هذا ليكون الرسول شهيداً عليكم وتكونوا شهداء على الناس۔

اس نے تمہیں چن لیا ہے تمہارے لیے دین میں کسی طرح کی تنگی نہیں رکھی، وہی طریقہ اپناؤ جو تمہارے باپ ابراہیم کا تھا۔ اس نے تمہارا نام مسلم رکھا پچھلے وقتوں میں بھی اور اس قرآن میں بھی تاکہ رسُول تمہارے سامنے حق کی گواہی دینے والا ہو اور تم تمام انسانوں کے سامنے حق کی گواہی دینے والے ہو جاؤ۔

اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ قرآن کی چیختی ہوئی صدا یہی ہے کہ اس

اُمت کو نبوت کا کام سونپا گیا ہے تو اس کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں تک انبیاؑ کا پیغام نہیں پہنچا ہے ان کے بارے میں اس اُمت سے پوچھا جائے گا کہ ان کو پیغام کیوں نہیں پہنچایا تم نے اپنے فرض میں کیوں کوتاہیاں کی ہیں۔ آج دُنیا میں ساری انسانیت کا بوجھ اس اُمت کے کاندھوں پر ہے۔ غور کیجئے اگر اُمت نے اپنے اس فرض کو ادا نہ کیا تو کتنی سخت ہو گی اس کے لیے وہ گھڑی اور کتنی مشکل ہو گی جوابدہی۔

علمِ کامل اور علمِ صادق پر مبنی اطلاع

۵۔ پھر ہم یقیناً ساری سرگزشت پورے علم کے ساتھ ان کو سنا دیں گے اور ہم غائب نہ تھے۔ یعنی تمہارا کوئی جلیل و حقیر اور قلیل و کثیر عمل یا ظاہری و باطنی حال ہمارے علم سے غائب نہیں۔ ہم بلا توسط غیرے ذرہ ذرہ سے خبردار ہیں۔ اپنے اس علم ازلی محیط کے موافق سب اگلے پچھلے احوال تمہارے سامنے کھول کر رکھ دیں گے ملائکہ اللہ کے لکھے ہوئے اعمال نامے بھی علمِ الٰہی کے سر مو خلاف نہیں ہو سکتے۔ ان کے ذریعہ سے اطلاع دینا محض ضابطہ کی مراعات اور نظامِ حکومت کا مظاہرہ ہے ورنہ خدا اپنے علم میں ان ذرائع کا معاذ اللہ محتاج نہیں ہو سکتا[1]

قرآن میں بتایا گیا ہے کہ جب اُمتوں سے یہ سوال ہوگا کہ ماذا اجبتم المرسلین؟ تم نے انبیاؑ کی دعوت کہاں تک قبول کی تو اس وقت انہیں کوئی جواب نہ آئے گا فعمیت علیھم الانباء یومئذ اور باہم بھی کچھ پوچھ نہ سکیں گے ولا یتساءلون لیکن جب انبیاؑ سے دریافت کیا جائے گا ماذا اجبتم کہ تمہاری دعوت کو ان لوگوں نے کہاں تک شرفِ قبول بخشا تو انبیاؑ جواب میں فرمائیں گے لا علم لنا انک انت علام الغیوب یعنی آپ کے علمِ کامل و محیط کے سامنے ہمارا علم ہیچ ہے جو کچھ ہمیں علم ہے وہ بھی اپنی زندگی تک کا ہے اور زندگی میں ان کے ظاہر کا۔ آپ کی ذات گرامی تو علام الغیوب ہے۔ آپ تو ہمارے بعد کے حالات سے اور ان کے باطنی احوال سے واقف ہیں بلکہ جو کچھ ہمیں علم ہے اس کا بھی آپ کو علم ہے۔ اسی موقعہ پر اللہ سبحانہٗ نے ان کو ان کے تمام اعمال بتائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم رسولوں اور ان کی اُمتوں کو ساری گزری ہوئی رُوداد پورے علم و خبر کے ساتھ سنائیں گے کہ ہمارے رسولوں نے کس طرح حق تبلیغ ادا کیا اور ان کی تکذیب کرنے والوں نے جان بوجھ کر تکذیب کی۔ فرمایا کہ ہم ایک لمحہ کے لیے ان حالات سے بے تعلق یا بے خبر نہ تھے جو کچھ ہوا ہے ہمارے سامنے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس سے معلوم ہوا کہ قیامت میں سوال اس لیے نہ ہوگا کہ معلومات فراہم کی جائیں بلکہ اس لیے ہوگا کہ ان کو جتایا اور بتایا جائے۔ یعنی سوال استعلام کے لیے نہیں بلکہ اعلام کے لیے ہوگا۔ علاوہ کے بعد ماکنا غائبین کا اضافہ یہ بتانے کے لیے کہ علم الٰہی براہ راست ہوتا ہے اپنے ہونے کے لیے دلائل وسائل قرائن اور ذرائع کا محتاج نہیں ہوتا۔ اور جس کا علم بالذات ہو وہ ہر آن ہر لمحہ حاضر ناظر ہی ہوتا ہے وہاں غائب ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا وھو معکم اینما کنتم اللہ کے سوا سب کے علوم وسائل اور ذرائع کے ذریعے ہوتے ہیں انبیاء کا علم وحی کے ذریعے اولیاء کا علم الہام کے ذریعے، فقہا کا علم اجتہاد کے ذریعے محدثین کا علم روایت کے ذریعے اور فلاسفر کا علم دلائل کے ذریعے ہوتا ہے۔ بالفاظِ دیگر حاضر ناظر صرف وہ ذات ہے جس کا علم خود بخود ہو اور یہ اسی کا ہو سکتا ہے جس کی ذات خود بخود ہو۔ اب آپ ہی انصاف فرمائیں کہ خود بخود اللہ کے سوا کون ہے؟ اس لیے ماکنا غائبین یعنی حاضر ناظر ہونا بھی اس کی شان ہے باقی سب مخلوق میں چاہے ملائکہ ہوں یا انبیاء، کوئی بھی حاضر ناظر نہیں ہے۔ عیسائیوں کا یہ عقیدہ ہے کہ اے میرے یسوع میں ایمان رکھتا ہوں کہ تو ہر جگہ حاضر موجود ہے[1] اس کی تشریح میں پادری عماد الدین فرماتے ہیں یعنی یسوع ہر جگہ حاضر و ناظر ہیں[2] افسوس کہ مسلمانوں میں سے شیعوں نے بھی اپنے ائمہ کے بارے میں یہی عقیدہ بنا لیا ہے ورنہ اہل اسلام کی رائے عامہ نے کبھی اس کو قبول نہیں۔ انشاء اللہ اس پر تفصیلی بحث معالم القرآن جلد ۲۲ میں آرہی ہے

اعمال کے وزن کے لیے اللہ کی میزان

۶ ۔ اور اس روز اعمال کا وزن برحق ہے لہٰذا جن کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہوگا تو کامیابی ان کی ہی ہوگی اور جن کا پلہ ہلکا ہوگا تو یہی وہ لوگ ہوں گے جنہوں نے اپنے ہاتھوں اپنا نقصان کیا کیونکہ وہ ہماری آیات کے ساتھ ظالمانہ سلوک کرتے تھے۔ یعنی قیامت کے دن سب لوگوں کے اعمال کا وزن دیکھا جائے گا۔ جن کے اعمال قلبیہ اور اعمال جوارح وزنی ہوں گے وہ کامیاب ہیں اور جن کا وزن ہلکا ہوگا وہ خسارے میں رہے حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ہر شخص کے عمل وزن کے مطابق لکھے جاتے ہیں ایک ہی کام ہے اگر اخلاص ومحبت سے حکم شرعی کے موافق کیا اور بر محل کیا تو اس کا وزن بڑھ گیا اور اگر دکھاوے کو اور ریس کو کیا یا موافق حکم نہ کیا یا ٹھکانے پر نہ کیا تو وزن گھٹ گیا۔ آخرت میں وہ کاغذ ملیں گے جس کے نیک کام بھاری ہوتے تو برائیوں سے درگزر ہوا اور ہلکے ہوتے تو پکڑا گیا۔ بعض علماء کا خیال ہے کہ اعمال جو اس وقت

[1] کیتھولک عبادت کی کتاب ص ۶۰ [2] تفتیش الاولیاء ص ۱۰۸

اعراض ہیں وہاں اعیان کی صورت میں مجسد ہو جائیں گے اور خود ان اعمال ہی کو تولا جائے گا۔ کہا جاتا ہے کہ ہمارے اعمال تو غیر قار الذات اعراض ہیں جن کا ہر جزو وقوع میں آنے کے ساتھ ہی ساتھ معدوم ہو جاتا ہے۔ پھر ان کا جمع ہونا اور تلنا کیا معنے رکھتا ہے۔ میں کہتا ہوں کہ گراموفون میں آج کل لمبی چوڑی تقریریں بند کر دی جاتی ہیں کیا وہ تقریریں اعراض میں نہیں؟ جن کا ایک حرف ہماری زبان سے اس وقت ادا ہو سکتا ہے جب اس سے پہلا حرف نکل کر فنا ہو جاتے پھر یہ تقریر کا سارا مجموعہ گراموفون میں کیسے جمع ہو گیا۔ اسی سے سمجھ لو کہ جو خدا گراموفون کے موجد کا بھی موجد ہے اس کی قدرت سے کیا بعید ہے کہ ہمارے کل اعمال کے مکمل ریکارڈ تیار رکھے جس میں سے ایک شوشہ اور ذرہ بھی غائب نہ ہو۔ باقی رہا ان کا وزن کیا جانا تو نصوص سے ہمیں اس قدر معلوم ہو چکا ہے کہ وزن ایسی میزان کے ذریعہ ہوگا جس میں کفتین دو پلڑے اور لسان وغیرہ موجود ہیں لیکن وہ میزان اور ان کے دونوں پلڑے کس نوعیت و کیفیت کے ہوں گے اور اس سے وزن معلوم کرنے کا طریقہ کیا ہوگا۔ ان باتوں کا احاطہ کرنا ہماری عقول و افہام کے احاطہ سے باہر ہے۔ اسی لیے ان کے جاننے کی ہمیں تکلیف نہیں دی گئی۔ ایک میزان کیا عالم غیب کی جتنی چیزیں بھی ہیں بجز اس کے کہ ان کے نام سن لیں اور ان کا کچھ اجمالی سا مفہوم جو قرآن و سنت نے بیان کر دیا ہو عقیدہ میں رکھیں اس سے زیادہ تفصیلات پر مطلع ہونا ہماری حد پرواز سے باہر ہے کیونکہ جن نوامیس و قوانین کے تحت اس عالم کا وجود اور نظم و نسق ہوگا ان پر ہم اس عالم میں رہتے ہوتے کچھ دسترس نہیں پا سکتے۔ اسی دنیا کی میزانوں کو دیکھ لو کتنی قسم کی ہیں۔ ایک میزان وہ ہے جس سے سونا چاندی اور موتی تلتے ہیں ایک میزان سے غلہ اور سوختہ وزن کیا جاتا ہے۔ ایک میزان عام ریلوے سٹیشنوں پر ہوتی ہے جس سے مسافروں کا سامان تولتے ہیں۔ ان کے سوا مقیاس الحرارۃ اور مقیاس ہوا وغیرہ بھی ایک طرح کی میزان ہیں جن سے حرارت اور ہوا کے درجات معلوم ہوتے ہیں۔ تھرما میٹر ہمارے بدن کی اندرونی حرارت کو جو اعراض میں سے ہے تول کر بتلاتا ہے کہ اس وقت ہمارے جسم میں اتنی ڈگری حرارت پائی جاتی ہے جب دنیا میں بیسیوں قسم کی میزانیں ہم مشاہدہ کرتے ہیں جن سے اعیان و اعراض کے اوزان و درجات کا تفاوت معلوم ہوتا ہے تو اس قادر مطلق کے لیے کیا مشکل ہے کہ ایک ایسی حسی میزان قائم کر دے جس سے ہمارے اعمال کے اوزان و درجات کا تفاوت صورۃ وحساً ظاہر ہوتا ہو۔[1]

عالم آخرت کے حالات سمجھنے میں اشکالات اور اعتراضات اس لیے در پیش آتے ہیں کہ ہم وجود اور اس کے تمام موجودہ قوانینِ فطرت کو اس طرح لازم و ملزوم سمجھتے ہیں کہ جب کسی چیز کا تذکرہ کیا جائے تو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

معاً اس کی وہی خصوصیات و لوازم سامنے آئیں گے جن کے دیکھنے کے ہم اس دُنیا میں عادی ہیں۔ حالانکہ ارباب عقل نے یہ طے کر دیا ہے کہ اس موجودہ دُنیا کے معلولات و مسببات اور ان کے موجودہ علل و اسباب میں جو لزوم ہے وہ محض عادی ہے۔ یعنی اس لیے ایسا ہے کہ ہم ایسا دیکھتے ہیں یہ نہیں کہ اس لیے ایسا ہے کہ ایسا ہی ہونا چاہیے اس بنا پر اگر صرف اتنی سی بات ذہن نشین کر لی جائے کہ موجودہ مادی دُنیا میں جو قوانینِ فطرت اور علل و اسباب اور ان کے نتائج کارفرما ہیں وہ صرف اسی عالم اور موجودہ دُنیا کے قوانین ہیں۔ اگر خدا تعالیٰ کوئی نئی دُنیا بنائے یا نیا عالم خلق کرے تو ضروری نہیں کہ یہی موجودہ قوانینِ فطرت وہاں بھی کارفرما ہوں بلکہ بالکل ممکن ہے کہ اس نئے عالم میں نئے قوانین پر عمل ہو۔ نئی خصوصیات کے جسم ہوں، نئی قسم کی زندگیاں، نئی قسم کی آگ ہو، نئے قسم کے باغ اور ان کے پھل ہوں، نئی قسم کی موجودات و مخلوقات ہوں۔ نئے علل و اسباب ہوں اور نئے قوانین فطرت ہوں۔ قرآن نے اس نئے عالم کے متعلق کہا ہے یوم تبدل الارض غیر الارض والسماوات" اب کون کہہ سکتا ہے کہ اس نئے زمین اور نئے آسمان میں بھی وہی مادی قانون جاری ہوں گے جو اس موجودہ زمین و آسمان میں جاری ہیں۔ اس بنا پر جسمانیت و مادیت کے وہ تمام اعتراضات اور آئندہ حیات کے متعلق وہ تمام اشکالات جو اس دُنیا اور اس کے قوانین کی بنا پر پیدا ہوتے ہیں بے بنیاد اور بے حقیقت ہیں۔ اس ضروری تمہید کے بعد آیات کی تشریح گوش گزار فرمائیے۔ ارشاد ہے والوزن یومئذ الحق وزن کے معنے تولنے اور کسی چیز کی مقدار معلوم کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس روز اللہ سبحانہٗ انبیاء اور ان کی اُمتوں سے دریافت کرے گا اور اُمتوں کو جواب نہ آئے گا اور انبیاء لا علم لنا کا اعتراف کریں گے۔ اس روز وزن صرف حق کا ہوگا۔ ظاہر یہی ہے کہ الوزن الحق مبتدا و خبر ہے اور تعریف طرفین قصر کا فائدہ دے رہی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ روزِ قیامت جو وزن ہے وہ حق ہے اور جو حق ہے اسی کا وزن ہوگا۔ قیامت کے دن جو ترازو نصب ہوگی وہ حق کی مقیاس ہوگی۔ وہ بتلائے گی کہ کسی عمل میں حق کا حصہ کتنا ہے گویا یہ ترازو اعمال میں حق معلوم کرنے کا آلہ ہوگی یہاں امام غزالی نے المضنون میں یہ بات خوب لکھی ہے۔

بدن کا روح سے تعلق یہاں کشف حقائق کے لیے ایک حجاب ہے۔ موت کے ساتھ یہ حجاب ہٹ جائے گا اور ہر شخص پر یہ بات عیاں ہو جائے گی کہ اعمال میں قرب و بعدِ الٰہی کے لحاظ سے کس قدر تاثیر ہے۔ اعمال کی یہ تاثیر ہی مقدار بھی روزِ قیامت معلوم ہوگی۔ اللہ کی قدرت سے یہ بعید نہیں ہے کہ وہ کوئی ایسا آلہ ایجاد کر دے کہ پل جھپکنے میں مقادیر اعمال معلوم ہو جائیں۔ میزان تو نام ہی اس آلہ کا ہے جس کے ذریعہ کمی زیادتی معلوم ہو۔ اس عالم میں یہ میزانیں مختلف ہیں۔ ایک میزان وہ ہے جس سے آپ اشیا کا وزن کرتے ہیں۔ ایک اصطرلاب بھی میزان ہے جس سے افلاک کی حرکات اور اوقات معلوم ہوتے ہیں۔ ایک میزان مسطر بھی

ہے جس سے خطوط کا اندازہ ہوتا ہے ایک میزان عروض بھی ہے جس سے آوازوں کی حرکات معلوم ہوتی ہیں۔ اگر حقیقت میزان بھی کہ اس سے مقادیر معلوم ہوں۔ بوجھ کی مقدار، حرکت کی مقدار، مسافت کی مقدار، حرارت کی مقدار، ہوا کی مقدار، روزِ قیامت اللہ سبحانہٗ ایک ایسی میزان تخلیق فرمائیں گے جس سے حق کی مقدار معلوم ہوگی یعنی یہ بتاتے گی کہ کس عمل میں حق کتنا ہے۔ جس میں جتنا ہوگا اتنا ہی وہ عمل وزن دار ہوگا اور فیصلہ جو کچھ بھی ہوگا وزن کے لحاظ سے ہوگا جن کے اعمال میں حق کی مقدار زیادہ ہوگی وہ کامیاب ہوں گے اور جن کے پلڑے مقدار حق سے ہلکے ہوں گے وہ خسارے میں ہوں گے۔

ان آیات میں اعمال کے اعتبار سے دو قسمیں بتائی ہیں ایک مفلحین دوسرے خاسرین۔ دونوں سے کون مراد ہیں۔ کچھ تو یہ کہتے ہیں کہ دونوں اہلِ ایمان ہیں کیونکہ کافروں کے اعمال کا وزن ہی نہ ہوگا۔ ارشاد ہے: لا نقیم لھم یوم القیامۃ وزنا" ہم قیامت کے روز ان کے لیے کوئی وزن قائم نہ کریں گے۔ حافظ ابن تیمیہ کا بھی یہی خیال ہے کہ ان الکفار لا یحاسبون کافروں کا کوئی حساب نہ ہوگا۔ علامہ آلوسی نے اسی کو اکثر کا مذہب بتایا ہے۔ اور کچھ کا خیال ہے کہ سب کے اعمال کا وزن ہوگا۔ دونوں صورتوں میں سے کوئی صورت ہو قرآن نے یہاں ان لوگوں کا ذکر نہیں کیا جن کی نیکیاں اور برائیاں برابر ہوں گی۔ ان کا بھرپور چرچہ اسی پارے میں اصحاب الاعراف کے نام سے آگے آرہا ہے۔ اگر آیت میں یہ تقسیم فرمانبردار اور نافرمان پر مشتمل ہے اور مطلب یہ ہے کہ اہلِ ایمان گنہ گار اور نیکوکار کے اعمال کا وزن ہوگا۔ اور اگر آیت میں یہ تقسیم کافر اور مومن پر مشتمل ہے تو دونوں صورتوں میں بما کانوا بآیاتنا یظلمون کا متعلق بحکم محذوف ہوگا پہلی تقسیم کی صورت میں کفر سے کفرِ عملی مراد ہوگا اور دوسری تقسیم میں کفر سے کفر واقعی مراد ہوگا۔

ایک اہم سوال

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ وزن سے مراد کیا ہے۔ اس کے جواب میں علماء نے دو راہیں اختیار کی ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ وزن سے مراد عدل تام ہے اور کچھ فرماتے ہیں کہ وزن سے مقصود واقعی تولنا اور مقدار حق معلوم کرنا ہے۔ حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے:

> جمہور کا مذہب یہی ہے کہ واقعی وزنِ اعمال ہوگا لیکن کچھ یہ کہتے ہیں کہ وزن سے مقصود عدل ہے لیکن راجح مذہب جمہور ہے۔

اور جمہور جو وزن کے واقعی اور حقیقی ہونے کے قائل ہیں ان میں بھی کچھ اختلاف ہے۔ کچھ کہتے ہیں اعمال کا وزن ہوگا، کچھ کہتے ہیں نامہائے اعمال کا وزن ہوگا اور کچھ کہتے ہیں کہ اربابِ عمل کا وزن ہوگا۔

اس میں بھی جمہور کا مذہب یہی ہے کہ نفس اعمال کا وزن ہوگا۔ اعمال اگرچہ اعراض ہیں اور قائم بالذات نہیں ہیں مگر روزِ قیامت اللہ تعالیٰ ان کو جسمانی لباس عطا فرماتے گا۔ امام محی الدین بغوی معالم التنزیل میں رقمطراز ہیں کہ:

حضرت عبداللہ بن عباس سے یہی مروی ہے کہ وزن اعمال کا ہوگا اور حدیث صحیح سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ارشاد ہے کہ روزِ قیامت سورہ بقرہ اور آلِ عمران دو بادل یا دو چھتریوں یا دو پرندوں کی طرح آویں گی اور ارشاد ہے کہ مومن کے پاس قبر میں ایک خوبصورت اور خوش رنگ خوشبودار جوان سامنے آتے گا تو مومن پوچھے گا کہ تو کون ہے وہ کہے گا کہ میں تیرا عمل صالح ہوں۔ اور ارشاد ہے کہ روز قیامت قرآن ایک نوجوان کی صورت میں آتے گا دریافت کیا جاتے گا کہ کون ہے؟ جواب ملے گا، میں وہ قرآن ہوں جو تجھے رات کو بیدار رکھتا اور دن کو پیاسا رکھتا تھا۔

جمال الدین قاسمی لکھتے ہیں کہ عناصر کی اس دُنیا میں جو اعمالِ اعراض ہیں وہ روزِ قیامت جواہر کے لباس میں ملبوس ہوکر آئیں گے۔ اور یہی موزوں ہوں گے۔

بعض کی رائے ہے کہ اعمال نہیں تولے جائیں گے بلکہ نامہاتے عمل کا وزن ہوگا۔ اس کی تائید ترمذی اور مسند احمد میں اس ارشادِ نبوت سے ہوتی ہے جو حضرت عبداللہ بن عمرو کے حوالہ سے آیا ہے کہ:

قیامت کے روز ایک شخص لایا جاتے گا جس کے ننانوے نامۂ اعمال کے طومار میزان کے ایک پلڑے میں رکھے جائیں گے اور طومار حد بصر تک ہوگا۔ اس کے بعد ایک کارڈ لایا جاتے گا جس میں لا الٰہ الا اللہ لکھا ہوگا۔ وہ شخص کہے گا کہ اے پروردگار ان طوماروں میں یہ کارڈ کیا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ فرماتے گا، تجھ پر ظلم نہ ہوگا، پھر اس کارڈ کو ترازو کے دوسرے پلڑے میں رکھا جاتے گا اور وزن کیا جاتے گا تو گناہوں کے طومار والا پلڑا ہلکا ہو جاتے گا اور کارڈ والا پلڑا بھاری ہو جاتے گا۔

اس سے صاف طور پر معلوم ہوتا ہے کہ عمل نہیں بلکہ نامۂ عمل کا وزن ہوگا۔

کچھ علما یہ کہتے ہیں کہ نہ عمل کا وزن ہوگا اور نہ نامۂ عمل کا بلکہ وزن خود صاحبِ عمل کا ہوگا۔ اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ صحیح بخاری میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے ارشادِ نبوت آتا ہے کہ،

روزِ قیامت ایک بھاری بھرکم موٹا آدمی پیش ہوگا مگر تول میں اللہ کے پاس ایک مچھر کے پَر سے زیادہ نہ ہوگا۔

مسند امام احمد میں حضرت عبداللہ بن مسعود کے مناقب میں حضور کا یہ ارشاد ہے کہ،

کیا تم عبداللہ بن مسعود کی باریک ٹانگوں پر حیران ہو بخدا یہ تو روز قیامت میزان میں اُحد پہاڑ سے زیادہ وزنی ہوں گی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ روز قیامت میزان میں، صاحب عمل کا وزن ہوگا۔

حافظ ابن کثیر نے ان تینوں میں اس طرح مفاہمت کرائی ہے کہ حدیثوں میں تینوں کی مؤید ہے اس لیے تینوں باتیں درست ہیں کبھی نفس عمل کا وزن ہوگا کبھی نامۂ اعمال کو اور کبھی صاحب عمل کا وزن ہوگا۔

بہرحال جمہور کا مذہب یہی ہے۔ اس کے مقابلہ میں دوسرے لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اکثر انسانوں کے اچھے یا بُرے دونوں قسم کے اعمال ہوتے ہیں۔ ایک قسم کا عمل کم ہوگا اور دوسرا زیادہ یا دونوں برابر۔ دو مادی چیزوں کے تفاضل اور گھٹ بڑھ کا علم ہم کو تولنے یا گننے سے ہوتا ہے اس لیے وزن سے عموماً عدل وانصاف حق اور ٹھیک ٹھیک کا مفہوم ادا کیا جاتا ہے۔ اعمالِ انسانی کے متعلق خدا نے فرمایا ہے کہ انسان کو اس کے عمل کے مطابق پورا پورا بدلہ ملے گا۔ جزاءً وفاقاً، اس برابری اور کمال عدل وانصاف کے مفہوم کو ترازو کی ناپ اور عدالت کی میزان کے استعارہ سے ادا کیا ہے۔ اس مفہوم میں یہ استعارہ قرآن میں بکثرت استعمال ہوا ہے۔ ایک جگہ ہے:

اللہ الذی انزل الکتاب بالحق والمیزان

وہ اللہ جس نے کتاب کو حق کے ساتھ اتارا اور میزان کو۔

یعنی کتاب الٰہی حق کے ساتھ اتری ہے اور اسی کے ساتھ میزان بھی، جس سے مراد عدل ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ نے اپنے نظام کائنات کی ہر چیز میں جو اعتدال کامل رکھا اس کو بھی میزان کے لفظ سے تعبیر فرمایا ہے۔ ووضع المیزان۔

ان آراء میں سب سے زیادہ قابل ترجیح جمہور کی رائے ہے کہ نفس اعمال کو تولا جائے گا اور سلف صالحین کی اکثریت اسی کی قائل ہے اور اعمال اگرچہ بظاہر اس وقت اعراض ہیں روزِ قیامت ان کو اعیان اور اجسام کی صورت میں مجسم بنا دیا جائے گا اور خود نفس عمل کو میزان الٰہی میں رکھ کر تولا جائے گا۔

احادیث سے یہ ثابت ہے کہ قیامت کے روز ایک میزان ہوگی جس میں کفتیں دو پلڑے اور ایک زبان ہوگی۔ رہی یہ بات کہ اس میزان کے دو پلوں کی نوعیت اور کیفیت کیا ہوگی یا اس میں وزن معلوم کرنے کا طریقہ کیا ہوگا تو یہ چیزیں ہمارے احاطہ عقل اور سرحد ادراک سے بالا ہیں۔ عالم غیب سے متعلق باتوں کے ہم جاننے کے نہیں ماننے کے مکلف ہیں۔

کچھ بھی ہو قیامت میں جو فیصلہ بھی ہوگا وزن کے لحاظ سے ہوگا کسی دوسری چیز کا ذرہ برابر لحاظ نہ کیا

جاتے گا۔ وزنی کیفیت نیکیوں میں ہوگی اور بے وزنی برائیوں میں ہوگی اور اس میزان کے ذریعے قیامت میں انسانی زندگی کے سارے کارنامے دو حصوں میں تقسیم ہو جائیں گے با وزن اور بے وزن۔ باوزن صرف حق کو ماننا جانا اور حق کی پیروی میں حق ہی کی خاطر کام کرنا ہوگا۔ آخرت میں صرف یہی چیز وزنی اور قیمتی ہوگی۔ اس کے برعکس حق سے غافل ہو کر یا حق سے منحرف ہو کر انسان جو کچھ بھی اپنی خواہش نفس یا دوسرے انسانوں اور شیطانوں کی پیروی کرتے ہوتے کرتا ہے۔ وہ سب بے وزن ہوں گے۔ لہٰذا آخرت میں انسان کی فلاح اور کامرانی کا تمام تر انحصار اس پر ہوگا کہ اس کے کارنامۂ زندگی کے وزن دار اعمال اس کے بے وزن اعمال پر غالب ہوں۔ وہ شخص جس کے بے وزن اعمال اس کے تمام وزن دار کو دبالیں تو اس کا حال اس دیوالیہ تاجر کا سا ہوگا جس کی ساری پونجی خساروں کا بھگتان پورا کرنے میں صرف ہو جاتے اور پھر بھی کچھ نہ کچھ تقاضے باقی رہ جائیں۔ اس تقابلی مطالعہ سے حضرت مولانا تھانوی نے یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ اس مادی عالم میں جن لوگوں کی غالب حالت صلاح کی ہو انہیں صالح ہی سمجھا جائے گا۔

قرآن کی ان دو آیتوں کی رہنمائی یہ ہے کہ ہر فرد اور جماعت کو ویسے ہی نتائج ملیں گے جیسے کچھ اس کے ہوں گے۔ کامیاب انسان وہ ہوں گے جن کی بھلائیاں برائیوں سے زیادہ ہوں گی۔ نامراد وہ ہوں گے جن کی برائیوں کے وزن سے بھلائیاں دب جائیں گی۔ دُنیا میں اشیاء کے موازنہ کے لیے ترازو کام دیا کرتا ہے۔ اسی طرح اعمال کے موازنہ کے لیے بھی اللہ سبحانہٗ نے ایک میزان مقرر کر دی ہے جس کی تول میں کبھی غلطی نہ ہوگی۔

وَلَقَدْ مَكَّنَّٰكُمْ فِي الْأَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيهَا مَعَايِشَ قَلِيلًا
مَّا تَشْكُرُونَ ﴿١٠﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَٰكُمْ ثُمَّ صَوَّرْنَٰكُمْ ثُمَّ قُلْنَا
لِلْمَلَٰٓئِكَةِ اسْجُدُوا لِآدَمَ فَسَجَدُوٓا إِلَّآ إِبْلِيسَ لَمْ يَكُن
مِّنَ السَّٰجِدِينَ ﴿١١﴾ قَالَ مَا مَنَعَكَ أَلَّا تَسْجُدَ إِذْ أَمَرْتُكَ قَالَ
أَنَا خَيْرٌ مِّنْهُ خَلَقْتَنِي مِن نَّارٍ وَخَلَقْتَهُ مِن طِينٍ ﴿١٢﴾
قَالَ فَاهْبِطْ مِنْهَا فَمَا يَكُونُ لَكَ أَن تَتَكَبَّرَ فِيهَا فَاخْرُجْ إِنَّكَ
مِنَ الصَّٰغِرِينَ ﴿١٣﴾ قَالَ أَنظِرْنِيٓ إِلَىٰ يَوْمِ يُبْعَثُونَ ﴿١٤﴾ قَالَ
إِنَّكَ مِنَ الْمُنظَرِينَ ﴿١٥﴾ قَالَ فَبِمَآ أَغْوَيْتَنِي لَأَقْعُدَنَّ لَهُمْ صِرَٰطَكَ
الْمُسْتَقِيمَ ﴿١٦﴾ ثُمَّ لَآتِيَنَّهُم مِّنۢ بَيْنِ أَيْدِيهِمْ وَمِنْ خَلْفِهِمْ وَعَنْ
أَيْمَٰنِهِمْ وَعَن شَمَآئِلِهِمْ وَلَا تَجِدُ أَكْثَرَهُمْ شَٰكِرِينَ ﴿١٧﴾ قَالَ
اخْرُجْ مِنْهَا مَذْءُومًا مَّدْحُورًا لَّمَن تَبِعَكَ مِنْهُمْ لَأَمْلَأَنَّ
جَهَنَّمَ مِنكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿١٨﴾ وَيَٰٓآدَمُ اسْكُنْ أَنتَ وَزَوْجُكَ الْجَنَّةَ

فَكُلَا مِنْ حَيْثُ شِئْتُمَا وَلَا تَقْرَبَا هٰذِهِ الشَّجَرَةَ فَتَكُوْنَا مِنَ
الظّٰلِمِيْنَ ۝۱۹ فَوَسْوَسَ لَهُمَا الشَّيْطٰنُ لِيُبْدِيَ لَهُمَا مَا وٗرِيَ
عَنْهُمَا مِنْ سَوْاٰتِهِمَا وَقَالَ مَا نَهٰىكُمَا رَبُّكُمَا عَنْ هٰذِهِ
الشَّجَرَةِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَا مَلَكَيْنِ اَوْ تَكُوْنَا مِنَ الْخٰلِدِيْنَ ۝۲۰ وَ
قَاسَمَهُمَآ اِنِّيْ لَكُمَا لَمِنَ النّٰصِحِيْنَ ۝۲۱ فَدَلّٰىهُمَا بِغُرُوْرٍ ۚ فَلَمَّا
ذَاقَا الشَّجَرَةَ بَدَتْ لَهُمَا سَوْاٰتُهُمَا وَطَفِقَا يَخْصِفٰنِ عَلَيْهِمَا مِنْ وَّرَقِ
الْجَنَّةِ ؕ وَنَادٰىهُمَا رَبُّهُمَآ اَلَمْ اَنْهَكُمَا عَنْ تِلْكُمَا الشَّجَرَةِ وَاَقُلْ
لَّكُمَآ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لَكُمَا عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ۝۲۲ قَالَا رَبَّنَا ظَلَمْنَآ
اَنْفُسَنَا ٚ وَاِنْ لَّمْ تَغْفِرْ لَنَا وَتَرْحَمْنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ
الْخٰسِرِيْنَ ۝۲۳ قَالَ اهْبِطُوْا بَعْضُكُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ ۚ وَلَكُمْ فِي
الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِيْنٍ ۝۲۴ قَالَ فِيْهَا تَحْيَوْنَ وَ
فِيْهَا تَمُوْتُوْنَ وَمِنْهَا تُخْرَجُوْنَ ۝۲۵

ع ۲ ۱۵ ۹

اور بلاشبہ ہم نے ہی تمہیں زمین میں جگہ دی ہے اور زندگی کے
سروسامان مہیا کیے تم بہت ہی کم شکر گزاری کرتے ہو۔ اور
ہم نے ہی تمہیں پیدا کیا ہے پھر تمہاری شکل وصورت بنائی پھر
ہم نے فرشتوں سے کہا سجدہ کرو آدم کو سب نے سجدہ کیا
مگر ابلیس کہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ تھا، اللہ نے ابلیس
سے کہا کس بات نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا جبکہ میں نے
حکم دیا تھا، اس نے کہا اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں
تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور تو نے اسے مٹی سے پیدا کیا ہے،
فرمایا اتر جا یہاں سے تیری یہ ہستی نہیں کہ یہاں رہ کر سرکشی کرے
یہاں سے نکل دور ہو یقیناً تو ان میں سے ہے جو ذلیل وخوار ہیں۔
ابلیس نے کہا کہ مجھے اس وقت تک کے لیے مہلت دے جب
لوگوں کو اٹھایا جائے گا فرمایا، تجھے مہلت ہے۔ ابلیس نے

کہا کہ چونکہ تو نے مجھ پر راہ بند کردی ہے تو اب میں بھی ایسا کروں گا
کہ تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لیے بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں
سامنے سے، پیچھے سے، داہنے سے بائیں سے ان پر آؤں گا
اور تو ان میں سے اکثروں کو شکرگزار نہ پائے گا[۱۱]۔ خدا نے
فرمایا کہ یہاں سے نکل جا ذلیل اور ٹھکرایا ہوا، بنی آدم میں
سے جو کوئی تیری پیروی کرے گا تو میں ضرور ایسا کروں گا کہ
تم سب سے جہنم بھردوں گا[۱۲]۔ اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت
میں رہو اور جس جگہ سے جو چیز پسند ہو شوق سے کھاؤ مگر دیکھو
اس درخت کے قریب بھی نہ جانا اگر گئے تو یاد رکھو کہ زیادتی
کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے[۱۳]۔ پھر شیطان نے ان دونوں
کو بہکایا تاکہ ان کے ستر جو ان سے چھپے تھے ان پر کھول دے
اس نے کہا کہ تمہارے پروردگار نے اس درخت سے جو تمہیں

روکا ہے تو صرف اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو تم فرشتے بن جاؤ یا دائمی
زندگی تمہیں مل جائے، اس نے قسمیں کھا کھا کر یقین دلایا کہ میں تم
دونوں کی خیر خواہی سے نیک بات سمجھانے والا ہوں، بہرحال وہ
ان کو فریب میں لے آیا[14]۔ پھر جونہی انہوں نے درخت چکھا تو اُن
کے ستر اُن پر کھل گئے[15]۔ اور باغ کے پتے اُوپر تلے رکھ کر اپنے
جسم پر چپکانے لگے[16]۔ اس وقت ان کے پروردگار نے کہا کیا میں
نے تمہیں اس درخت سے نہیں روک دیا تھا اور کیا میں نے تم
سے نہ کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، ان دونوں نے
عرض کیا پروردگار ہم نے اپنا نقصان کیا اگر تو نے ہمارا قصور نہ بخشا
اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہمارے لیے بربادی کے سوا کچھ نہیں[17]۔
فرمایا یہاں سے نکل جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو، اب تمہارے
لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور یہ ایک خاص وقت تک وہاں سامان

زندگی سے نفع اٹھانا ہے اور فرمایا کہ تم اسی میں زندہ رہو گے اسی میں مروگے اسی میں مرنے کے بعد نکالے جاؤ گے[۱۸]

معانی مفردات

مکنّا، جمع متکلم، ماضی معروف تمکین مصدر، ہم نے تم کو جماؤ عطا کیا۔ ہم نے تم کو اقتدار دیا۔ مکنہ اشیاء نہ ممکنات جمع ہے مکنۃ مکانۃ حاکم کے پاس عزت پائی مرتبہ حاصل کیا۔ تمکین جماؤ عطا کرنا، توانا اور با اقتدار بنا دینا۔ تمکن با اقتدار ہونا۔ کبھی لام کے ساتھ آتا ہے اور کبھی بغیر لام کے، بغیر لام کے ہو تو معنے اقتدار عطا کرنا اور لام کے ساتھ ہو تو اقتدار کے وسائل بہم پہنچا دینا۔ **معایش**، اس کا واحد معیشت ہے سامان زندگی، معاش وقت، زندگی اور ہمیشہ زندگانی اور گزران کو کہتے ہیں یہ عاش یعیش سے بنا ہے جو باب ضرب سے آتا ہے اور جس کے معنے جینے کے ہیں۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ عیش اس زندگی کو کہتے ہیں۔ جو حیوان کے ساتھ مخصوص ہے اور یہ حیاۃ سے اخص ہے کیونکہ حیاۃ کا استعمال عام ہے۔ جاندار، باری تعالیٰ، اور فرشتہ سب کے لیے ہوتا ہے۔ **خلقنا**، ہم نے پیدا کیا، اصل میں خلق کے معنے صحیح اندازہ ٹھہرانے کے ہیں اور اس کا استعمال بغیر نمونہ کے پیدا کرنے اور ایجاد کرنے کے معنے میں بھی ہوتا ہے یہاں معنے ہیں ہم نے تم کو پیدا کیا، بنایا۔ **اھبط**، ہبوط سے امر کا صیغہ ہے۔ شیطان مخاطب ہے۔ ہبوط کے معنے بلندی سے پستی میں اترنے کے ہیں۔ اس کے معنے اونچے درجہ سے نچلے درجہ پر لانے کے ہی ہیں۔ اس لحاظ سے ہبوط کی دو قسمیں ہیں ایک حسی دوسرے معنوی۔ یہاں دونوں ہی مراد ہو سکتے ہیں۔ ان تتکبر یہ کہ تو تکبر کرے۔ تکبر کے معنی بڑائی مارنے اور گھمنڈ کرنے کے ہیں۔ تکبر دو طرح کا ہوتا ہے۔ ۱۔ فی نفسہ کسی میں خوبیاں اور صفات حسنہ سب سے زیادہ ہوں۔ ۲۔ واقع میں تو صفات حسنہ سے خالی ہو اور مدعی ہو کمال صفات کا اول محمود ہے اور دوسرا مذموم ہے اس لیے اول معنے کا لحاظ کرتے ہوئے متکبر اللہ کی صفت ہے۔ اور دوسرے معنے کے لحاظ سے شیطان یا کافر یا مغرور انسان پر بولا جاتا ہے اور یہ مذموم ہے۔ تکبر کی بدترین قسم یہ ہے کہ آدمی اللہ

کی طاعت اور فرمانبرداری سے سرکشی کرے اور خود سر بن جائے۔ مفردات القرآن۔ الصاغرین، ذلیل وخوار، صاغر کی جمع ہے۔ صغار سے بنا ہے۔ صغر یصغر باب کرم سے آتا ہے جس کے معنے ذلیل ہونے کے ہیں۔ اسی سے تصغیر صفت آتی ہے۔ اس کے معنے چھوٹے کے ہیں۔ انظرنی، تو مجھے مہلت دے انظار مصدر ہے باب افعال سے آتا ہے اس کے معنے ڈھیل دینے اور مہلت دینے کے ہیں۔ اغویتنی، تو نے مجھے بے راہ کیا۔ اغوار سے ہے اس کے معنے غوایۃ میں ڈالنا، غوایت رشاد کی ضد ہے۔ اصل لغت میں خراب ہونے کے معنے میں اونٹ کا بچہ دودھ زیادہ پی لے اور اس کے نتیجہ میں اس کا پیٹ خراب ہو جائے اس وقت کہتے ہیں غوی الفصیل اسی سے بہک جانے بے راہ ہو جانے کے معنے پیدا ہوئے ہیں جیسا کہ مجد الدین فیروزآبادی نے قاموس میں لکھا ہے یا ناداں ہو جانا جیسا کہ مفردات میں امام راغب نے لکھا ہے یا ناکام ہو جانا۔ جیسا کہ مرتضیٰ زبیدی اور منظور افریقی نے تاج العروس اور لسان العرب میں لکھا ہے مذءوماً اسم مفعول مذمت کیا ہوا عیب دار اور اس کے مصدر دو بتائے گئے ہیں ذأم اور ذیم ذأم یذأم اور ذام یذیم دونوں کے معنے ایک ہیں استعمال دونوں طرح ہوتا ہے۔ مدحوراً یہ بھی دحر سے اسم مفعول ہے۔ اسی کا مصدر دحور آتا ہے۔ اس کے معنے بھگانا، ہانکنا، دھتکارنا اور دور کرنا یہاں معنے میں رحمت سے دور کیا ہوا، ہنکایا ہوا اور نکالا ہوا۔ ووری، یہ موارات سے ماضی مجہول ہے چھپایا گیا ہے۔ یہ ورار مصدر سے بنا ہے جو بطور ظرف استعمال ہوتا ہے جس کے معنے آڑ، حد، فاصل، کسی چیز کا آگے پیچھے ہونا۔ موارات کسی چیز کے پیچھے ہو کر چھپانا۔ اس کا مجرد باب فتح سے آتا ہے۔ سواتہما، سوآت سوأۃ کی جمع ہے، ان دونوں کی شرم گاہیں۔ سوأۃ کے معنے لاش، عیب، فضیحت کے آتے ہیں۔ علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ سوآۃ کے معنے فضیحت کے ہیں کیونکہ اس میں برائی ہوتی ہے۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ سوآۃ شرم گاہ کے لیے کنایہ ہے اور ابن الاثیر کا بیان ہے کہ اصل میں سوآۃ کے معنے شرمگاہ کے ہیں۔ بعد میں اسے ہر اس شے کے معنے میں نقل کر لیا گیا کہ جب وہ ظاہر ہو تو اس سے حیا آئے۔

مخلوقات میں انسان کا مرتبہ

مرکزی موضوع سورت کا یہ ہے کہ انسان کو دنیا میں زندگی بسر کرنے کے لیے نبوت کی ہدایت اور رہنمائی کی

ضرورت ہے۔ اپنے اخلاق، تہذیب، معاشرت اور تمدن کو صحیح بنیادوں پر قائم کرنے کے لیے جن اصولوں کا وہ محتاج ہے ان سب کے لیے اسے صرف نبوت کو رہنما تسلیم کرنا چاہیے اور صرف اسی ہدایت کی پیروی کرنی چاہیے جو خدا کی جانب سے اللہ کا رسول لے کر آیا ہے۔ رسول کو چھوڑ کر کسی دوسرے رہنما کی طرف ہدایت کے لیے رجوع کرنا خواہ وہ فرد ہو یا جماعت انسان کے لیے بنیادی طور پر غلط ہے یہ غیر الٰہی طاعت ہے اس کا نتیجہ شرف و مجد کی تباہی ہے۔ یہی توحید طاعت ہے۔ اب یہاں ان آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ اس عالم خلق میں انسان کی حیثیت اور درجہ کیا ہے اور نبوت کا ان سے مطالبہ کیا ہے۔ قرآن نے انسانوں کو وحی کی زبان سے یہ بات سمجھائی کہ انسان اس عالم خلق میں تمام مخلوقات میں اشرف، احسن اور اکرم ہے اور وہ اس دنیا میں خدا کی نیابت کا فرض انجام دینے آیا ہے۔ حضرت آدم کا قصہ محض داستان نہیں بلکہ انسان کی اصلی حیثیت کو عیاں اور نمایاں کرنے والی تعلیم کا اولین دیباچہ ہے۔ اس کو فرشتوں کا مسجود بنانا گویا تمام کائنات کا مسجود بنانا تھا اس کو تمام اسماء کا علم عطا کرنا گویا تمام اشیا کو اس کے تصرف میں دینا تھا۔ وہ انی جاعل فی الارض خلیفہ کی رو سے اس عالم میں خدا کا نائب ہے اور اس کا سر خلافت الٰہیہ کے تاج سے ممتاز ہے۔ کروڑوں مخلوقات الٰہی میں خدا کی امانت کا حامل ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ قرآن کہہ رہا ہے تو اب انسان عالم کائنات میں خدا کے سوا کس کی عبادت کرے۔ روئے زمین کی تمام چیزیں تو اس کے لیے بنی ہیں اور اب روئے زمین کی کس ہستی کی اطاعت کرے۔ مشرک عبادت میں بت ستارہ قوائے فطرت اور آثار کے آگے جھک کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ ان کے لیے نہیں بلکہ وہ چاند سورج کے لیے بنے ہیں اور طاعت میں نمرود، فرعون، ہامان، شداد اور قارون کے اشاروں، حکموں، دستوروں اور قانون پر چل کر یہ ثبوت دیتے ہیں کہ وہ خدا کی مخلوقات میں اشرف نہیں بلکہ اشرف نمرود، فرعون ہیں جن کی زبانوں کو انسانی خون کی چاٹ لگی ہوئی ہے۔ قرآن بتاتا ہے کہ کائنات کی ہر چیز انسان کے لیے بنی ہے اور انسان اللہ کی عبادت اور طاعت کے لیے بنا ہے۔ اور انسانی تخلیق کے سلسلے میں آخر میں نبوت کی تاریخ بھی بتا دی ہے۔ اور اشارہ کر دیا ہے کہ نبوت کا تعلق انسان کی خلافت سے ہے۔

۱۰۔ اور بلاشبہ ہم نے ہی تمہیں زمین میں جگہ دی ہے اور زندگی کے لیے سروسامان مہیا کیے ہیں تم بہت ہی کم شکر گزاری کرتے ہو۔

یہاں سے بعض آیات آفاقیہ و انفسیہ کا بیان شروع کیا ہے جس سے ایک طرف حق تعالیٰ کے وجود پر کارخانۂ عالم کے حکیمانہ نظم و نسق سے استدلال اور احسانات و انعامات الٰہیہ کا تذکرہ فرما کر اس کی شکر گزاری کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور دوسری طرف نبوت کی ضرورت انبیاء علیہم السلام کی آمد، ان کی سیرت، ان کے

متبعین و مخالفین کا انجام جو اس سورت کا اصلی موضوع معلوم ہوتا ہے اس کے بیان کے لیے یہ آیات بطور توطئہ اور تمہید کے مقدم کی گئی ہیں[1] اصل ارشاد میں مکنّاکم فی الارض و جعلنا لکم فیھا معایش کی تعبیر آئی ہے اس میں اللہ سبحانہ نے اپنے انعامات اور احسانات میں سے دو کا ذکر کیا ہے۔ ایک یہ انعام ہے کہ اللہ نے نوعِ انسانی کو اس زمین کے گول کرے میں قدرت و اختیار کے ساتھ بسا دیا۔ لفظ تمکین میں قرار، ملک، اقتدار اور تصرف و اختیار سب آ گئے۔ بات کو سادہ طریق پر کہنے کے بجائے لام اور قد کے ذریعہ مؤکد بنا کر کہا گیا ہے تاکہ ان لوگوں کو چوکنا کر دیا جائے جن کو اس انعام کا احساس نہیں ہے۔ علامہ آلوسی نے اس اندازِ تعبیر کو نبوت کی دعوت کی پذیرائی کیلئے ترغیب قرار دیا ہے لیکن علامہ طیبی نے اس کو بھی ترہیبی انداز بتایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ بھی انذار کی ایک قسم ہے اور اپنے مضمون کے لحاظ سے یہ بھی اتبعوا ما انزل الیکم سے مربوط ہے۔ پوری بات یوں ہے کہ کہہ دو تم بخدا ہم نے ہی زمین کو تمہارے لیے جائے قرار بنایا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طیبی کی رائے میں یہ قریش کو دھمکی ہے تو اس صورت میں تمکین فی الارض سے زمین میں اقتدار و اختیار بخشنا ہے اور زمین سے مراد سرزمینِ حرم ہے جس میں قریش کو اقتدار حاصل تھا۔ سورہ قصص میں بھی اس کی طرف اشارہ ہے اولم نمکن لھم حرماً اٰمناً" کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ ہم نے پر امن حرم کو ان کے لیے جائے قرار بنایا ہے دوسرے یہ کہ ہم نے اس میں تمہارے لیے معاش کی راہیں کھول ہیں۔ اگر قریش ہی مخاطب ہیں تو اس سے اشارہ ان معاشی سہولتوں کی طرف معلوم ہوتا ہے جو ایک وادی غیر ذی زرع میں حضرت ابراہیم کی دعا اور بیت اللہ کی برکت سے اہلِ عرب کو عموماً اور قریش کو خصوصاً حاصل ہوئیں۔ قرآن میں ان معاشی برکتوں کا بار بار ذکر ہوا ہے۔ سورہ قصص میں ہے یجبیٰ الیہ ثمرات کل شیئٍ جس کی طرف ہر چیز کے پھل کھنچے چلے آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ حرم جس کے امن و امان اور جس کی مرکزیت کی بدولت تم اس قابل ہوئے ہو کہ دُنیا بھر کا مالِ تجارت اس وادی غیر ذی زرع میں کھنچا چلا آ رہا ہے۔ اس کی یہ معاشی خوش حالی تمہاری کسی تدبیر کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اللہ کا بنایا ہوا ہے۔ اب کیا تم یہ سمجھتے ہو کہ جس خدا نے تمہیں یہ نعمت دی اس کے رسول سے منحرف اور باغی ہو کر تم پھلو پھولو گے اور اگر نوعِ انسانی سے خطاب ہے تو پھر الارض سے مراد کرۂ ارض ہے اور تمکین فی الارض سے زمین کو جائے قرار بنانا اور معاش سے مراد معاشی وسائل ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ وہ ذات پاک جس نے اے انسانو تمہیں اس کرۂ ارض پر آباد کیا اور مزید برآں اس میں تمہاری معیشت کے وہ تمام وسائل جو زندگی کے لیے ضروری تھے سب مہیا کر دیے۔ لفظ معایش بے قید لا کر اشارہ کر دیا کہ نسلِ انسانی کے رزقی و معاشی نظام

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

میں جو غیر محدود فراخی اور بے پناہ کشادگی پیدا کی ہے اگر اس کو پیش نظر رکھا جائے تو قرآن کے نقطہ نظر سے یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ کائنات کا سارا نظام جعلنا لکم فیھا معایش کا نظام ہے یعنی اللہ سبحانہٗ نے اس نظام کو اس لیے قائم فرمایا ہے تاکہ انسان اپنی معاشی سہولتوں کے لیے بالواسطہ یا بلا واسطہ اس سے استفادہ کرے نفع اٹھائے۔ پھر معایش کے اس عظیم کارخانے کو قرآن کا انسان کے سامنے یہ رکھنا اور زمین کے اندر غذائی مواد کا جو ذخیرہ محفوظ کیا گیا ہے اس کی طرف زمین کی طرف تخلیق کے سلسلہ میں یہ کہہ کر قدر فیھا اقواتھا انسانوں کو متوجہ کرنا اور پھر ان سب غذائی اور معاشی وسائل کے بارے میں سواءً للسائلین کا صلائے عام اور ان تمام معایش یعنی معاشی پیداواروں کو فضل اللہ کے احترامی نام سے موسوم کرکے جدوجہد کی توانائیوں کو وابتغوا من فضل اللہ کے تشریعی حکم سے بیدار کرنا اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ ان معاشی ذرائع یعنی معایش سے استفادہ کرنا نسل انسانی کا بلاتمیز حق ہے زمین میں تمہارے لیے ہم نے زندگی و معیشت کے سارے سروسامان مہیا کر دیئے۔ جعلنا لکم معایش لیکن کس طرح مہیا کیے؟ اس طرح کہ اگرچہ ہر چیز کے ہمارے پاس ذخیرے ہیں لیکن ان کی بخشش ایک مقررہ اندازے کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایسا نہیں ہوتا کہ بغیر کسی اندازے کے تمام چیزیں بکھیر دی ہوں۔

آخر میں قلیلاً ما تشکرون، فرما کر مرکزی موضوع کی طرف اشارہ کر دیا کہ اگر زمین میں آباد کاری اور معاشی وسائل کی بہم رسانی ہم کر رہے ہیں اور تم ان سے دن رات استفادہ کر رہے ہو تو تمہیں تو ہمارا شکر گزار ہونا چاہیے تھا اور اس شکر گزاری میں ہمارے کہے پر چلنا چاہیے تھا لیکن ہو یہ رہا ہے کہ تم میں شکر گزاری کم سے کم تر ہے دونوں معنے ہو سکتے ہیں تمہاری شکر گزاری بہت کم ہے اور تمہارے شکر گزاری کے اوقات بہت کم ہیں مطلب یہ ہے کہ تم اپنے منعم کے شکر گزار نہیں ہو۔ اس سے ایک نکتہ یہ بھی سمجھ میں آیا کہ دنیا اور اس کی مادی نعمتیں قرآن کی نظر میں بری نہیں ہیں اگر اللہ کی شکر گزاری کے ساتھ ہوں۔ دراصل شکر نام ہے حقائق و واقعات کے مطابق اپنے علم کی تصحیح کا واقعہ جب یہ ہے کہ نعمتوں کی شکل میں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ موجود ہے وہ جعلنا لکم فیھا معایش کا مظاہرہ ہے گویا اس فقرے میں سارا عالم سمٹ کر آگیا۔ اب اگر آپ کا علم اسی واقعہ سے مطابقت پیدا کرے۔ یعنی جیسا کچھ ہو رہا ہے ویسا ہی کچھ آپ کا علم بھی ہو تو اس کا منطقی نتیجہ یہ ہوگا کہ خدا کی چیزوں کے ساتھ خدا کی مرضی کے مطابق طریقہ عمل اختیار کرے گا۔ اسی علم کو مستحکم اور مضبوط بنانے کے لیے اسلام میں حکم دیا گیا ہے کہ زبان سے ظاہری اعضا سے بھی شکر کرنا چاہیے کیونکہ عموماً آدمی کا باطن ظاہر سے متاثر ہوتا ہے۔ بخاری میں ہے:

> جب کوئی پانی پیتا ہے کھانا کھاتا ہے تو خدا پسند کرتا ہے کہ کھانے والے پینے والے اس کے گن گائیں اور تعریف کریں۔

کھانے پینے پہننے الغرض نعمتوں کے حصول کے وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جن دعائی موزوں کو مسلمانوں کے لیے چھوڑا ہے سب کا مطلب یہی ہے کہ جہاں تک ممکن ہو مسلمان اپنے اندر نعمتوں کے بارے میں صحیح علم اور اس کے احساس کو زندہ اور بیدار رکھنے کی کوشش کریں۔ کیونکہ عمل کو آسان کرنے کا یہی ایک نفسیاتی طریقہ ہے۔ مختصراً اس سارے کاروبار کا نام خواہ عملی صورت میں ہو یا علمی۔ زبان سے ہو یا جوارح سے سب کا نام شکر ہے۔ قرآن یہاں انعامات سے فائدہ اٹھانے والوں سے اسی کی قلت کی شکایت کر رہا ہے۔ قرآن میں یہ اعلان بھی ہے لئن شکرتم لازیدنکم اگر شکر کرو گے تو میں ضرور زیادہ دوں گا اور اس کے ساتھ ہی دھمکی بھی ہے لئن کفرتم ان عذابی لشدید اگر ناشکری کرو گے تو یاد رکھو میرا عذاب سخت ہے۔

سعادت وشقاوت کی ابتدائی سرگزشت

۸۔ اور ہم نے ہی تم کو پیدا کیا ہے پھر تمہاری شکل وصورت بنائی۔ پھر ہم نے فرشتوں سے کہا کہ سجدہ کرو سب نے سجدہ کیا مگر ابلیس کہ سجدہ کرنے والوں میں سے نہ تھا۔ اللہ نے ابلیس سے کہا کہ کس بات نے تجھے سجدہ کرنے سے روکا جب کہ میں نے حکم دیا تھا۔ اس نے کہا کہ اس بات نے کہ میں آدم سے بہتر ہوں تو نے مجھے آگ سے پیدا کیا اور اس کو تو نے مٹی سے پیدا کیا ہے۔ یعنی تمہاری تخلیق سے پہلے رہنے سہنے اور کھانے پینے کا سامان کر دیا۔ پھر تمہارا مادہ پیدا فرمایا۔ پھر اس مادے کو ایسا دلکش نقشہ اور حسین وجمیل صورت عطا کی جو کسی دوسری مخلوق کو عطا نہیں کی گئی تھی۔ پھر اس تصویر خاکی کو وہ روح اور حقیقت عطا فرمائی جس کی بدولت تمہارے باپ آدم علیہ السلام جن کا وجود تمام افراد انسانی کے وجود پر اجمالاً مشتمل تھا۔ خلیفۃ اللہ اور مسجود ملائکہ بنایا پھر جس نے اس وقت سجود تعظیمی سے سرتابی کی وہ مردود ازلی ٹھہرا کیونکہ وہ سجود خلافت الٰہیہ کے نشان کے طور پر تھا۔ ملائکۃ اللہ جو بحث وتمحیص اور صریح امتحان کے بعد آدم کی علمی فضیلت پر اور روحانی کمالات پر مطلع ہو چکے تھے حکم الٰہی سنتے ہی سجدے میں گر پڑے اور اس طرح خلیفۃ اللہ کے روبرو اپنے پروردگار حقیقی کی کامل وفاشعاری اور اطاعت پذیری کا ثبوت دیا اور ابلیس جو ناری الاصل ہے مگر کثرت عبادت کی وجہ سے زمرۂ ملائکہ میں شامل ہو گیا تھا آخر کار اپنی اصل کی طرف لوٹا۔ اس کی نظر آدم کی مادی ساخت سے نفخت فیہ من روحی کے راز تک نہ تجاوز کر سکی۔ اس لیے صریح حکم الٰہی کے مقابلہ میں انا خیر منہ خلقتنی من نار وخلقتہ من طین کا دعویٰ کرنے لگا۔ آخر اسی استکبار اور نص صریح قاطع کو محض رائے اور ہوا سے رد کر دینے اور خدا سے بحث ومناظرہ کی ٹھان لینے کی پاداش میں ہمیشہ کے لیے مرتبہ قرب سے نیچے گرا دیا اور رحمت الٰہیہ سے بہت دور پھینک دیا گیا۔ فی الحقیقت جس چیز پر اسے بڑا فخر تھا کہ وہ آگ

سے پیدا ہوا ہے وہی اس کی ہلاکت ابدی کا سبب ہوئی۔ آگ کا خاصہ خفت وصوت، سرعت وطیش اور علو در فساد ہے۔ بخلاف مٹی کے کہ اس میں مستقل مزاجی، متانت اور متواضعانہ حلم وتثبت پایا جاتا ہے۔ ابلیس جو ناری الاصل تھا سجدہ کا حکم سن کر آگ بگولا ہوگیا اور رائے قائم کرنے میں تیزی اور جلدبازی دکھائی۔ آخر تکبر وتعلی کی راہ سے آتش حسد میں گر کر دوزخ کی آگ میں جاگرا برخلاف اس کے آدم علیہ السلام سے جب غلطی ہوئی تو عنصر خاکی نے خدا کے آگے فروتنی، خاکساری اور انقیاد واستکانت کی راہ دکھلائی۔ چنانچہ ان کی استقامت وانابت نے ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ وھدی کا نتیجہ پیدا کیا۔ اسی لیے کہا جا سکتا ہے کہ ابلیس لعین نے مادی و عنصری لحاظ سے بھی اپنی تفضیل کے دعوے میں ٹھوکر کھائی۔ چنانچہ حافظ ابن القیم نے بدائع الفوائد میں پندرہ وجوہ سے مٹی کا آگ سے افضل ہونا ثابت کیا ہے [1]

پہلے یہ بتایا کہ ہم نے تمہیں زمین میں بسایا اور ہم نے تمہارے لیے زمین میں وسائل معیشت فراہم کیے اس کے بعد فرمایا ہے کہ ہم نے تمہاری تخلیق کی۔ اس سے اشارہ ہوگیا کہ مکین سے پہلے مکان بن چکا تھا۔ اس آیت کی تشریح میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے اگرچہ تین روایات آئی ہیں لیکن سب سے زیادہ صحیح وہ روایت ہے جس میں بتایا گیا ہے کہ تخلیق مردوں کی پیٹھوں میں ہوئی اور تصویر ماؤں کے پیٹوں میں ہوئی۔ لیکن حافظ ابن کثیر نے اس کو اور اس قسم کی دوسری روایات کو یہ کہہ کر رد کردیا ہے کہ اس کے بعد ثم قلنا للملائکۃ اسجدوا اس لیے لازماً مراد حضرت آدم ہیں اور پوری انسانیت کو خطاب کی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم ابوالبشر ہیں۔ خواہ کچھ ہو ذکر اولین پیدائش کا ہے۔ اصل ارشاد یہ ہے ولقد خلقناکم ثم صورناکم ثم قلنا للملائکۃ بے شک ہم نے تمہاری تخلیق کا منصوبہ بنایا اور تمہارا مادۂ آفرینش تیار کیا پھر اس مادے کو انسانی صورت عطا کی پھر جب آدم کی صورت میں ایک زندہ ہستی وجود میں آگئی تو اسے سجدہ کرنے کے لیے فرشتوں کو حکم دیا۔ سوال یہ ہے کہ تخلیق انسانی کے آغاز کی تفصیلی صورت کیا تھی۔ کیا یہ تخلیق بتدریج اس طرح ہوئی ہے کہ کائنات ایک ابتدائی حالت سے ترقی کرتی ہوئی چلی آرہی تھی اور نوعِ انسانی ایک اور نوعِ حیوانی کی ترقی یافتہ صورت ہے جو اپنے جسم دماغ اور نظامِ عصبی کی ساخت میں انسان سے کمتر درجہ کی تھی اور یہ نوعِ حیوانی اس سے بھی کم تر درجہ کی ایک نوع سے پیدا ہوئی تھی۔ وھلم جرا، یہاں تک کہ ہم اس ایک خلیہ کے حیوان کی نوع تک پہنچ جاتے ہیں جو سب سے پہلے ظہور میں آیا تھا۔ یہ بات ان لوگوں نے کہی ہے جو ڈاروِن کے نظریہ ارتقاء کے دلدادے ہیں۔ ہمارے معاصرین میں ڈاکٹر محمد رفیع اس فکر کے سب سے بڑے علمبردار ہیں۔ لیکن سچی بات یہ ہے کہ یہ قرآن کی

[1] افادات شیخ الاسلام

روح سے قطعاً ہم آہنگ نہیں ہے۔ قرآن کے بیان کے مطابق انسان اول کی پیدائش صرف حق تعالیٰ کے تکوینی ارادے کے تحت ہوتی ہے۔ حضرت آدم کی تخلیق کے متعلق قرآن کے تفصیلی بیانات اور مسئلہ ارتقاء پر نظر کرنے کے بعد دونوں میں ہم آہنگی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ اس قسم کی کوشش ان لوگوں نے کی ہے جو قرآن کریم میں بے محل تاویلات کی اہمیت نہیں سمجھتے۔ فلسفہ قدیم کے افلاک تسعہ اور عقول عشرہ کو بھلا اسلامی افلاک سبعہ اور ملائکہ سے کیا نسبت ہے مگر یہاں بھی بے جوڑ تطبیق کی کوشش کی گئی تھی اور اب قرآن کی بیان کردہ تخلیق اور نظریۂ ڈارون میں تطبیق کی کوشش کی جارہی ہے وہ بھی خلاف واقع تھا اور یہ بھی خلاف واقع ہے اور یہ کچھ مرعوبیت کے نتائج ہیں۔ پہلے فلسفہ قدیم سے دنیا مرعوب تھی اور اب فلسفہ جدید سے متاثر ہے۔ مرحوم ڈاکٹر رفیع الدین تو یہاں تک کہہ گئے۔

> حقیقت ارتقاء کا تصور دنیا کے علمی مسلمات میں ہی داخل نہیں بلکہ قرآن پر غور و فکر کے بعد ہم نہایت آسانی سے اس نتیجہ پر پہنچ جاتے ہیں کہ یہ تصور روح قرآنی کے عین مطابق ہے اور صحیح ہے اور اس تصور کے بارے میں قرآن کا موقف وہی ہے جو حکماء نے اختیار کر رکھا ہے یعنی ارتقاء کائنات کے حیاتیاتی مرحلہ کا ارتقاء یا اس کے کسی ایک مرحلہ کا ارتقاء نہیں ہے بلکہ کائنات کا مجموعی ارتقاء ہے جس میں ہر چیز اپنی بساط کے مطابق ارتقاء کر کے اپنا حصہ لیتی ہے۔ قرآن میں پہلے انسان کے یکایک پیدا ہو جانے کا کوئی ذکر نہیں ہے۔

ہمیں یہاں مولانا آزاد مرحوم کی یہ بات بے حد پسند آئی ہے کہ موجودہ زمانے میں اجرام سماویہ کی ابتدائی تخلیق اور کرہ ارضی کی ابتدائی نشوونما کے جو نظریے تسلیم کر لیے گئے ہیں۔ قرآنی اشارات بظاہر ان کی تائید کرتے ہیں اور اگر ہم چاہیں تو ان بنیادوں پر شرح و تفصیل کی پوری عمارت کھڑی کر سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا صحیح نہ ہوگا۔ یہ نظریے کتنے ہی مستند تسلیم کر لیے گئے ہوں لیکن پھر نظریے ہیں اور نظریات جزم و یقین کے ساتھ حقیقت کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ پھر اس کا کیا فائدہ کہ ان کی روشنی میں قرآن کے مجمل اور محتمل اشارات کی تفسیر کی جاتے۔ فرض کرو آج ہم نے دخان اور دخان کے انقسام کا مطلب اسی روشنی میں آراستہ کر دیا جو وقت کے نظریوں میں تسلیم کیا جاتا ہے۔ کل کو کیا کریں گے اگر ان نظریوں کی جگہ دوسرے نظریے پیدا ہو گئے صاف بات یہ ہے کہ یہ معاملہ عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے جس کی حقیقت ہم اپنے علم و ادراک کے ذریعے معلوم نہیں کر سکتے۔ قرآن کا مقصود ان اشارات سے تخلیق عالم کی شرح و تحقیق نہیں ہے خدا کی قدرت و حکمت کی طرف انسان کو توجہ دلانا ہے[1]

---

[1] ترجمان القرآن

دراصل نوعِ انسانی کے بارے میں یہ دو مختلف نظریے ہیں۔ ایک وہ جسے قرآن پیش کرتا ہے۔ یعنی جو کچھ ہوا اللہ سبحانہ کے ارادہ تکوینی کے تحت ہوا ہے۔ دوسرا وہ جو موجودہ زمانہ میں ڈاروِن کے نام سے پیش کیا جاتا ہے یعنی یہ کہ انسان غیر انسانی حالت کے مختلف مدارج سے ترقی کرتا ہوا مرتبہ انسانیت پر پہنچا ہے۔ مولانا مودودی کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ

انسانیت کی تاریخ کے متعلق یہ دو مختلف نظریے ہیں اور ان سے انسانیت کے دو مختلف تصور پیدا ہوتے ہیں۔ ایک تصور کو اختیار کیجئے تو آپ کو انسان اصل حیوانی کی ایک فرع نظر آئے گا۔ اس کی زندگی کے جملہ قوانین حتیٰ کہ اخلاقی قوانین کے لیے بھی آپ بنیادی اصول ان قوانین میں تلاش کریں گے جن کے تحت حیوانی زندگی چل رہی ہے اس کے لیے حیوانات کا سا طرزِ عمل آپ کو بالکل ایک فطری عمل معلوم ہوگا۔ زیادہ سے زیادہ جو فرق انسانی طرزِ عمل اور حیوانی طرزِ عمل میں آپ دیکھنا چاہیں گے وہ بس اتنا ہی ہوگا کہ حیوانات جو کچھ آلات صنائع اور تمدنی آرائشوں اور تہذیبی نقش و نگار کے بغیر کرتے ہیں۔ انسان وہی سب کچھ ان چیزوں کے ساتھ کرے۔ اس کے برعکس دوسرا تصور اختیار کرتے ہی آپ انسان کو جانور کے بجائے انسان ہونے کی حیثیت سے دیکھیں۔ آپ کی نگاہ میں وہ حیوانِ ناطق یا متمدن جانور نہیں ہوگا بلکہ زمین میں خدا کا خلیفہ ہوگا۔ آپ کے نزدیک وہ چیز جو اسے دوسرے جانوروں سے ممتاز کرتی ہے اس کا نطق یا اس کی اجتماعیت نہ ہوگی بلکہ اس کی اخلاقی ذمہ داری اور اختیارات کی وہ امانت ہوگی جسے خدا نے اس کے سپرد کیا ہے اور جس کی بنا پر وہ خدا کے سامنے جوابدہ ہے اس طرح انسانیت اور اس کے جملہ متعلقات پر آپ کی نظر پہلے زاویہ نظر سے یکسر مختلف ہو جائے گی۔ اب انسان کے لیے ایک دوسرا ہی فلسفہ حیات اور ایک دوسرا ہی نظام اخلاق و تمدن و قانون طلب کرنے لگیں گے اور اس فلسفے اور اس نظام کے اصول و مبادی تلاش کرنے کے لیے آپ کی نگاہ خود بخود عالم اسفل کے بجائے عالم بالا کی طرف اٹھنے لگے گی[1]

قرآن نے یہاں انسان کے مرتبہ کے اظہار کے لیے صرف یہ کہنے پر اکتفا نہیں کیا ہم نے پیدا کیا اور ہم نے اس میں نقاشی کی بلکہ فرمایا ثم قلنا للملائکۃ اسجدوا یعنی پیدا کرنے، صورت گری، علم عطا فرمانے اور خلیفہ بنانے کے بعد ہم نے ملائکہ سے کہا کہ آدم کو سجدہ کرو۔ ابلیس کے سوا سب نے سجدہ کر لیا۔ اللہ اکبر! ایک مٹی سے بنی ہوئی ہستی کو یہ تکریم اور اس کے درجہ کی یہ بلندی کہ اسے مسجودِ ملائکہ بنا دیا اور دنیا کی تمام قوتیں اس کے اختیار و تصرف میں دے دی گئیں۔ سجدے کے لفظی معنے محض تواضع اور تذلل کے ہیں۔ سجدہ نماز کو

[1] تفہیم القرآن

بھی سجدہ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ تواضع و تذلل کا بہترین مظہر ہے۔ خود محاورہ قرآن میں سجود کا اس معنے میں استعمال عام ہے۔ اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ یہ سجدہ عالم غیب کا ہے عالم شہادت کا نہیں یا یوں کہہ دیجئے کہ عالم ارواح میں ہوا ہے اس عالم مادی اور ناسوت میں نہیں ہے۔ اور تکلیفات شرعیہ کا تعلق اسی عالم شہادت سے ہے۔ عالم ارواح عالم غیب ہے اور عالم غیب کے حالات کے بارے میں ہم اپنی رائے سے کچھ نہیں کہہ سکتے۔ ہم مانتے ہیں کہ فرشتوں سے حضرت آدم کو سجدہ کرایا گیا لیکن سوال یہ ہے کہ سجدہ کی نوعیت کیا تھی یہ کس قسم کا سجدہ تھا۔ وہ بات جو حضرت شیخ الہند نے فرمائی کہ حضرت آدم کو سجدہ عبادت نہیں بلکہ سجدہ خلافت تھا۔ مجمل اور مختصر ہے۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نے اسے تفصیل کے ساتھ پیش فرمایا ہے اور قبلہ نما میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے فرماتے ہیں کہ جب حضرت آدم خلیفہ ہوتے تو جیسے جانشینان شاہی کے لیے جانشینی کے بعد آداب شاہی بجالانا ضروری ہوتے ہیں۔ بالخصوص ان کے ذمے جن کو اس معاملہ میں مشتبہ نگاہوں سے دیکھا جاتا ہو۔ فرشتوں نے خواہ کسی وجہ سے یہ بات کہی تھی لیکن خلافت آدم کے اعلان پر یہ بات ضرور کہی تھی اتجعل فیھا من یفسد فیھا ویسفک الدماء آپ ایسی ہستی کو خلیفہ بنائیں گے جو زمین کو فساد اور خونریزی کا گہوارہ بنادے گی۔ اب خلافت کی تاجپوشی کے وقت میں ان ہی کو مخاطب کرکے کہا گیا اسجدوا لآدم یہ ان کا آدم علیہ السلام کی خلافت میں نیک نیتی پر مبنی شبہ تھا۔ اس لیے ضروری ہوا کہ فرشتے حضرت آدم کو سجدہ خلافت کریں تاکہ انکار عملاً اقرار بن جاتے اور یہ بھی معلوم ہو جاتے کہ اگرچہ فرشتے معصوم ہیں، اور انسان سراپا گناہ ہیں لیکن چونکہ فرشتے مظہر قدرت ہیں اور انسان مظہر علم ہے اور قدرت علم کے توابع میں سے ہے اس لیے فرشتوں کا فرض ہے کہ وہ انسان کے فرمانبردار بن کر رہیں۔ الغرض مسجودیت آدم حق خلافت خداوندی ہے اور خلافت خداوندی علم کا نتیجہ ہے۔

ایک خلش اور اس کا جواب

شاید آپ یہاں یہ خلش محسوس کریں کہ اگر بنائے خلافت علم ہے تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس بنیاد پر مسجود ملائکہ ہی نہیں بلکہ مسجود کائنات ہونا چاہیے کیونکہ آپ کی ذات گرامی منبع العلوم ہے اور آپ کو قرآن نے علمک مالم تکن تعلم کے خطاب سے نوازا ہے۔ واقعی آپ کو مسجود ملائکہ اور مسجود خلائق ہونا چاہیے لیکن ایسا نہیں ہوا کیونکہ حضرت آدم کی خلافت میں ملائکہ اور جنات کو کلام تھا، حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی علم و کمال میں چونکہ کوئی اپوزیشن نہ تھی اس لیے سجدہ خلافت کی ضرورت ہی پیش نہیں آئی۔ مولانا محمد قاسم کی تعبیر یہاں بھی بے حد دلآویز ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور دوسرے انبیا اور ملائکہ میں وہی فرق ہے جو بادشاہ اور اس کے خادموں میں ہوتا ہے جیسے خادموں کو بادشاہ کی ہمسری کا خیال نہیں آتا۔ ایسے ہی بمقابلہ رسولِ عربی اگر گزشتہ انبیا موجود بھی ہوتے تو ان کو اس کا وسوسہ تک نہ آتا۔ اور یہ ممکن ہی کیوں کر ہے۔ قمر اور کواکب میں آفتابِ عالم تاب کی ہمسری کا یارا کب ہے۔ حضور انور کے سوا جو مخلوق بھی ہے فرشتے ہوں یا جنات یا پھر اولادِ آدم سب کے سب کمالات علمی و عملی میں حضور انور کے دروازے کے دریوزہ گر ہیں۔

اور اس بات کی دلیل کہ یہ سجدہ تکریم اور سجدۂ خلافت تھا اور اس طرح اللہ سبحانہ نے عالم غیب میں فرشتوں کی طاعت اور بندگی کا امتحان لیا تھا۔ خود ابلیس کا اقرار ہے ارایتک ھذا الذی کرمت علی کیا تیرا یہی فیصلہ ہوا کہ اس ہستی کو مجھ پر بڑائی دی۔ ظاہر ہے کہ آدم کے سر پر خلافت کا تاج ہے اور فرشتوں سے آدم کو سجدہ کرا کے تکریم کرائی جا رہی ہے۔ اسی تکریم پر ابلیس میں حسد کی آگ بھڑکی تھی۔

ابلیس کے کردار پر بازپرس

آگے قرآن نے بتایا ہے کہ ابلیس کے اس کردار اور اس سرکشی پر اللہ نے اس سے بازپرس کی کہ تجھے کس چیز نے سجدہ سے روکا جب کہ میں نے تجھے حکم دیا تھا۔ اصل ارشاد میں تعبیر ما منعک ان لا تسجد اذ امرتک کی آئی ہے۔ یہاں بازپرس کی اساس اذ امرتک ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مقصود آدم نہیں بلکہ میرے حکم کی پابجائی ہے۔ اس حکم عدولی کی وجہ کیا ہے۔ یعنی اگر خدا سجدہ کرنے کا حکم نہ دیتا تو خود آدم سزاوارِ سجدہ نہ تھے وہ خدا کے حکم کی بنا پر سجدہ کے سزاوار ہوتے۔ ابلیس کا جواب یہ تھا کہ میں اس سے اچھا ہوں کیونکہ میری تخلیق نار سے ہوئی ہے جبکہ آدم کی تخلیق خاک سے ہوئی ہے۔ اصل ارشاد یہ ہے خلقتنی من نار و خلقتہ من طین، یعنی اپنے انکار کی توجیہ کرتے ہوئے ابلیس نے کہا کہ میں آتش زادہ ہوں اس لیے اس خاک زادے سے افضل ہوں اور افضل اپنے سے کمتر کو سجدہ کیونکر کر سکتا ہے یعنی ابلیس آدم کو نہ پہچان سکا اور ظاہری حالت سے دھوکہ کھا کر خاک زادہ قرار دیتے ہوئے آدم کا جو مقام تھا اس کو گرا دینا چاہا دوسرے الفاظ میں گویا آپ کہہ سکتے ہیں کہ انسانیت کے متعلق مختلف قوموں کو جو مغالطہ لگنے والا تھا آغازِ کار ہی میں اس مغالطہ کے ازالہ کا سامان کر دیا گیا۔ سوچئے آج جو لوگ انسانوں کو یہ سبق پڑھا رہے ہیں کہ انسان بجائے آدم زادہ ہونے کے حیوان زادہ ہے۔ ان کی اس بات اور ابلیس کے اس دعویٰ میں کہ آدم کیا ہے صرف خاک زادہ ہے کیا فرق ہے۔ دونوں میں انسان کو اس کے مرتبہ انسانیت سے

گرانے میں ہم آہنگی ہے۔ نظریات دونوں میں ایک انسان کو طینی کہتا ہے اور دوسرا بوزینی۔ بتائیے فرق کیا ہے
مولانا گیلانی نے اس موقعہ پر کیا خوب کہا ہے۔

اس نے طینی کہہ دیا اور اس نے بوزینی کہا سچ تو یہ ہے کہ ڈارون ابلیس سے
کچھ کم نہ تھا[1]

قرآن کو ہمیشہ سے اس پر اصرار رہا ہے اور ہے کہ آدمی بہر حال آدمی ہے وہ جب دنیا میں پیدا کیا جاتا ہے تو اس وقت بھی وہ انسان اور آدمی بن کر پیدا ہوتا ہے جب تک زمین کے اس کرے پہ جیتا ہے تو آدمی ہی بن کر جیتا ہے۔ حتیٰ کہ مرنے کے بعد بھی دوسری زندگی کو لے کر جب وہ میدانِ قیامت آئے گا تو اس وقت بھی وہ آدمی ہی رہے گا۔ اور جزاء و سزا کے فیصلوں کے بعد جو جنت میں جائیں گے وہ بھی آدمی ہونے کے سوا اور کچھ نہ ہوں گے۔ برناڈ شا نے نظریہ ارتقاء کے بارے میں صحیح کہا تھا۔

ہم اس نئے انکشاف کی لذت میں ایسے مدہوش ہوئے کہ فوراً شیطان کے ہمسفر
ہو گئے۔

بہر حال بات ہو رہی تھی شیطان کے اس ادعا کی کہ میں ناری ہوں اور آدم پر اس کی کہ یہ طینی ہے میں ناری ہو کر کیسے جھک سکتا ہوں۔ آپ اس جواب کو پڑھ کر آگے نہ چلیں۔ ذرا اس کے اندر جھانک کر دیکھئے کہ خدا کے روبرو اس جواب میں ہمارے لیے کتنے اسباق ہیں۔

اس میں سب سے پہلا سبق یہ ہے کہ خدا کی بات پر اپنے میلانِ طبع اور رجحانِ نفس کے خلاف ہونے کی وجہ سے اعتراض صراحتاً کفر ہے۔ اسی میں وہ شخص بھی داخل ہے جو خدا کی بات کو خلافِ عقل کہہ کر رد کر دیتا ہے۔ قرآن نے سمجھایا ہے کہ اگر ایک طرف ہمارے شخصی مفادات، عقلی تقاضے، ذاتی ولولے ہوں اور دوسری طرف حکم الٰہی ہو تو حکم الٰہی کی پیروی ضروری ہے۔

دوسرا سبق یہ بھی ملتا ہے کہ خدا کے حکم کے سامنے حجتیں پیش کر کے اعتراض کرنا شیوہ بندگی نہیں ہے۔

تیسرا سبق یہ بھی ہے کہ حکم الٰہی کی بجا آوری کو اپنی خواہش، رائے، بصیرت کے موافق ہونے کی شرط کرنا طاعت سے سرتاسر انحراف ہے بلکہ اپنے کو مقام بندگی سے نکال کر خدا کے مدِ مقابل بنانا ہے۔ اگر ہر ادارے کے ملازمین یہی فیصلہ کر لیں کہ رئیس ادارے کی صرف ان باتوں میں اطاعت کی جائے گی جن میں ان کی ہوائے نفس کی ترجمانی ہو گی تو بتائیے اس ادارے کی تباہی میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ مولانا اشرف علی تھانوی کی

یہ نکتہ آفرینی یہاں برمحل ہے کہ ہر ایسا شخص شیطان کا وارث ہے جو اپنی رائے اور دیت کو چاہے وہ کشف پر مبنی ہو یا وجدان و ذوق پر شریعت کے مقابلہ میں ترجیح دیتا ہے۔ (ماجدی)

ابلیس کے اس استدلال میں کہ میں نار زادہ ہونے کی وجہ سے خاک زادہ سے افضل اور اچھا ہوں اس بات کی بھی نشاندہی ہے کہ شرف و عزت کا تعلق نسل و نسب سے ہے اور اس اعتبار سے وہ انسان سے اشرف ہے کہ وہ آگ سے پیدا ہوا ہے آدم مٹی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور آگ مٹی سے افضل ہے۔ ابلیس کا یہ استدلال قطعاً غلط ہے آگ مٹی سے افضل نہیں مٹی آگ سے افضل ہے۔ قرآن نے یہاں رہنمائی دی ہے کہ شرف و عزت کو نسل و نسب سے متعلق سمجھنے کا فلسفہ ابلیس کی ایجادات میں سے ہے اور جہاں کہیں بھی یہ موجود ہے اسی کی وراثت کی حیثیت سے موجود ہے۔ اللہ کے یہاں جو چیز عزت و سرخروئی کا سبب ہے وہ صرف اللہ کے حکم کی اطاعت ہے۔ اس کے سوا کوئی چیز بھی خدا کے یہاں عزت پانے کا ذریعہ نہیں ہے۔

بہرحال ابلیس حضرت آدم کی ظاہری شکل و صورت میں کھو گیا اس کو بس یاد رہا کہ آدم کی تخلیق خاک سے ہوئی ہے اور اس کی آگ سے اور آگ افضل ہے خاک سے، اس اعلیٰ کو کب زیب دیتا ہے کہ ادنیٰ کو سجدہ کرے اس نادان کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ آدم کے سر پہ تاجِ خلافت ہے۔ اس کا دل وہ آئینہ ہے جس میں حقیقت کا حسن و جمال ہے نفخت فیہ من روحی اس کو یہ نظر نہ آیا کہ آدم کو خلقت بیدی کا شرف حاصل ہے اور اس پر یہ بھی خیال نہیں کیا۔ جب نوری مخلوق سجدہ کناں ہے تو نار کی حقیقت ہی کیا ہے اور یہ بھی اس کی کج نظری تھی کہ خاک کے مقابلہ میں آگ افضل ہے۔ اپنی صفات و خصوصیات کے لحاظ سے جو مقام خاک کا ہے وہ آگ کو حاصل نہیں۔ آگ کا خاصہ تباہی و بربادی ہے اس کی طبیعت میں خفت حدت اور تیزی ہے جبکہ خاک میں متانت، وقار، حلم، صبر اور سکون و ثبات ہے۔ مٹی انسان اور حیوان کی غذاؤں کا خزانہ اور لباس و آرائش، وسائل معاش کا ذریعہ ہے، خاک سامانِ برکت ہے۔ غرور، ارتفاع اور بڑائی آگ کے لوازم ہیں جب کہ خاکساری، نیازمندی خاک کی خصوصیت ہے۔ آگ کی حیثیت حروف کی ہے کہ قائم بالذات نہیں ہوتے بلکہ اپنے مطالب کے لیے اسم اور فعل کے محتاج ہوتے ہیں۔ آگ بھی اپنے وجود کے لیے دوسرے کی محتاج ہوتی ہے۔ اس کا اپنا وجود ذاتی نہیں ہے۔ اس کے برعکس خاک کی اپنی ہستی ہے یہ اپنے ہونے کے لیے کسی کی محتاج نہیں ہے۔ آگ خاک کی محتاج ہے خاک آگ کی محتاج نہیں ہے بہرحال خاک کے مقابلہ میں آگ ہیچ در ہیچ ہے اس لیے یہ ابلیس کی کج فہمی تھی کہ اس نے آگ کو خاک سے برتر سمجھا۔

ابلیس اور قیاس

یہاں مفسرین نے امام الحسن البصری کے حوالہ سے یہ روایت درج کی ہے کہ سب سے پہلا قیاس کرنے والا ابلیس ہے۔ ابن کثیر نے اس کی سند کو صحیح بتایا ہے۔ اس کی مدد سے کچھ لوگوں نے ابلیس کے اس استدلال سے قیاس شرعی کے وجود کا انکار کر دیا ہے حالانکہ ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ یہاں ابلیس نے رائے کے ذریعے امر الٰہی کا مقابلہ کیا ہے۔ یعنی اپنی خود بینی اور رائے سے نص کو رد کیا ہے اور یہی منشا ہے اذا امرتك کا۔ ایسا قیاس سب کے نزدیک ناجائز ہے جس میں رائے کے زور سے اصول کو رد کر دیا جائے جس قیاس کو حجت شرعیہ کی حیثیت سے اسلامی قانون میں مصدر مانا گیا ہے وہ صرف دو ہیں ایک یہ کہ کسی حکم کو جو کسی خاص امر سے متعلق ہے کسی دوسرے امر پر منطبق کیا جائے بشرطیکہ ان دونوں امور کے مابین کوئی علت مشترک ہو۔ اس طرح جب دو امور میں کوئی مشابہت پائی جائے اور ان میں کسی ایک کی نسبت شریعت کا کوئی حکم موجود ہو تو دوسرے کے متعلق یہ مان لیا جاتا ہے کہ اس کا بھی حکم یہی ہے، کیونکہ دونوں کی علت مشترک ہے گویا حکم بھی موجود ہوا اور حکم کی علت بھی موجود ہو اس پر قیاس کر کے کسی ایسے معاملہ کا فیصلہ کیا جائے جس میں علت مشترک ہو مثلاً قرآن میں ہے:

يسئلونك عن المحيض قل هو اذى فاعتزلوا النساء

دیکھئے یہاں حکم بھی موجود ہے کہ زمانہ حیض میں عورتوں کے قریب جانا منع ہے اور علت بھی موجود ہے کہ حیض گندگی اور نجاست ہے۔ اب حیض کے علاوہ جہاں یہ علت پائی جائے گی حکم بھی موجود ہوگا نفاس کو بھی اسی پر قیاس کیا جائے گا۔ قیاس کی دوسری صورت یہ ہے کہ قیاس حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا پیش کردہ ہو۔ مثلاً حضور انور نے خالہ، بھانجی اور پھوپھی بھتیجی کو نکاح میں جمع کرنے سے منع فرمایا اور علت یہ بتائی کہ قطعتم ارحامکم ایسا کرنے سے تم قطع رحمی کا ارتکاب کرو گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ نے اسے ان تجمعوا بین الاختین پر قیاس کیا ہے۔ ان دو قیاسوں کے حجت شرعی ہونے پر امت اسلامیہ کی اکثریت متفق ہے۔ اس لیے قیاس ممنوع یہ ہے۔ گمان اور رائے کے زور سے اصول کو رد کر دیا جائے یہاں ابلیس نے رائے کے زور سے اصل علم کو رد کر دیا ہے اسی لیے توبیخ میں اذ امرتك، فرمایا ہے قرآن کی اس آیت کا قیاس شرعی سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے اور ہو بھی کیسے سکتا ہے اس پر سب کا اتفاق ہے کہ احکام متناہی ہیں اور حوادث و واقعات جو روزانہ نت نئے پیش آ رہے ہیں وہ ان گنت ہیں۔ الشہرستانی رقمطراز ہیں۔

ہمیں اس کا قطعاً علم ہے کہ حوادث و واقعات خواہ ان کا تعلق عبادات سے ہو یا معاملات سے سب بے حساب اور بے شمار ہیں اور یہ بھی ہمیں پتہ ہے کہ ہر ہر واقعہ اور حادثہ کے بارے میں صاف اور صریح حکم نہیں ہے اور ایسا ممکن بھی نہیں ہے۔ جب صورتِ حال یہ ہے کہ حوادث و واقعات ان گنت ہیں اور احکام مقرر ہیں تو اس کا نتیجہ لازماً یہ ہے کہ لامتناہی متناہی کی گرفت میں نہیں آسکتا اس لیے یہ بات حتمی اور قطعی ہے کہ اسلام میں قیاس کا خاص مقام ہے تاکہ ہر پیش پا افتادہ حالت کے لیے قیاس کے ذریعہ راستہ معلوم کیا جا سکے[1]

قرآن نے ان حوادث کے لیے اعتبار و استنباط اور نبوت نے اجتہاد کا اُمت کو پیمانہ دیا ہے کہ ایک طرف اسلامی قانون کو بازیچۂ اطفال بننے سے محفوظ کر دیا اور دوسری طرف اسلامی معاشرے کو بے راہ روی آوارگی اور بے قید زندگی کی برائیوں سے بچا لیا۔ اس بنا پر گنتی کے چند لوگوں کو چھوڑ کر پوری اُمت نے قیاس کی قانونی حیثیت کو مانا ہے۔

امام شافعی کے مشہور شاگرد امام مزنی قیاس پر گفتگو کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وقت سے لے کر آج تک دینی معاملات میں فقہا قیاس سے برابر کام لیتے رہے ہیں۔ ان کا اس پر اجماع ہے کہ حق کی نظیر حق ہے اور باطل کی نظیر باطل ہے لہٰذا قیاس کا انکار درست نہیں ہے کیونکہ وہ مماثل اشیاء پر مماثل احکام کا نام ہے[2]

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پیش آنے والے حوادث میں اجتہاد سے کام لیتے تھے اور بعض احکام کو بعض احکام پر قیاس کرتے تھے اور ایک نظیر سے دوسری نظیر قائم کرتے تھے[3]

امام ابوبکر شمس الائمہ سرخسی نے اس موضوع پر مفید بحث کی ہے وہ فرماتے ہیں:

قیاس سے شریعت میں کام لینا صحابہ اور ان کے بعد تابعین اور ائمہ دین کا مذہب ہے۔ سب سے پہلا شخص جس نے قیاس کے جواز کا انکار کیا ہے وہ ابراہیم نظام ہے۔ بغداد

---

[1] الملل والنحل [2] جامع بیان العلم [3] اصول سرخسی۔

کے کچھ متکلمین نے اس کی پیروی کی ہے۔ بعدازیں داؤد آئے اور انہوں نے متقدمین کے اس سے متعلق افکار معلوم کیے بغیر ہی قیاس پر عمل کے ابطال کا اعلان کر دیا اور لوگوں کو بتایا کہ شریعت میں قیاس حجت نہیں، ان کی پیروی میں وہ تمام ظاہریہ جو غور و فکر کی نعمت سے ان کی طرح محروم ہیں یہی کچھ کہنے لگے اور ان میں سے کچھ نے یہی بات قتادہ مسروق اور ابن سیرین کی طرف منسوب کی ہے۔ یہ ان بزرگوں پہ اتہام ہے۔ ان کا مقام اس سے کہیں بالا و بالا ہے کہ اس قسم کی بات کہیں[1]

حافظ ابن عبدالبر مغربی نے حافظ ابوالقاسم بغدادی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ

نظام سے پہلے قیاس کا منکر میرے علم میں کوئی نہیں ہے۔

اور اپنا یہ تاثر بھی ظاہر کیا ہے کہ

فقہاء اور تمام اہل السنت کا موقف یہ ہے کہ عقائد میں قیاس روا نہیں ہے۔ اور احکام میں درست ہے۔ داؤد نے احکام میں بھی انکار کیا ہے[2]

الغرض یہ مسئلہ اہل حق میں کوئی خاص اختلافی نہیں ہے۔

کبر کا نتیجہ ذلت و خواری ہے

۹۔ فرمایا اتر جا یہاں سے تیری یہ ہستی نہیں ہے کہ یہاں رہ کر سرکشی کرے۔ یہاں سے نکل دور ہو۔ یقیناً تو ان میں سے ہے جو ذلیل و خوار ہوں گے۔ یعنی جنت یا آسمانوں میں خدا کی وہ مخلوق رہ سکتی ہے جو خدا کی پوری مطیع و فرمانبردار ہو۔ نافرمان منکروں کے لیے وہاں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ بہرحال ابلیس لعین عزت کے اس مقام سے جس پر کثرت عبادت وغیرہ کی وجہ سے اب تک جائز تھا بڑا بول بولنے کی بدولت نیچے دھکیل دیا گیا۔ ابلیس کی مدت دراز تک زمرۂ ملائکہ میں شامل رکھنے سے متنبہ کر دیا کہ حق تعالیٰ نے مکلفین میں کسی کی فطرت ایسی نہیں بنائی ہے کہ وہ صرف بدی کی طرف جانے کے لیے مجبور و مضطر ہو جائے بلکہ خبیث سے خبیث ہستی بھی اصل فطرت کے اعتبار سے اس کی صلاحیت رکھتی ہے کہ اپنے کسب و اختیار سے نیکی اور پرہیزگاری میں انتہائی ترقی کر کے زمرۂ ملائکہ میں جا ملے[3] جانتے بوجھتے خدا کے حکم سے سرکشی تکبر ہے۔ حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین

[1،2] جامع بیان العلم [3] افادات شیخ الاسلام

میں لکھا ہے کہ خدا کی سب سے پہلی نافرمانی تکبر اور حرص کے ذریعے وجود میں آئی ہے۔ تکبر ابلیس کی معصیت ہے اور اس کا انجام معلوم ہے اور حرص حضرت آدم کا گناہ ہے اور اس کا انجام توبہ اور ہدایت ہے۔ تکبر کی معصیت نے ابلیس کو خدا کے مقابلے میں کٹ حجتی اور گناہ کے اصرار پر آمادہ کر دیا۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ متکبر مشرک سے بھی بدتر ہے کیونکہ مشرک تو غیر اللہ کی عبادت کرتا ہے لیکن متکبر تو اللہ کی عبادت سے سرکشی اختیار کرتا ہے۔ جو اس تکبر میں مبتلا ہوتا ہے وہ اپنے آپ کو خدا سے بڑا یا اس کا ہمسر ٹھہراتا ہے۔ کبریائی صرف خدا کے لیے زیبا ہے جو اس میں حصہ بٹانے کے مدعی بنتے ہیں ان پر خدا کی طرف سے ذلت کی مار پڑتی ہے۔ متکبر کے لیے خدا کی جنت میں کوئی جگہ نہیں۔ متکبرین کا مقام جہنم ہے۔ سورۃ زمر میں جہنم کے ذکر میں ہے فلبئس مثوی المتکبرین اور سورہ غافر میں ہے فلبئس مثوی المتکبرین۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

جس دل میں رائی برابر کبر ہوگا جنت میں داخل نہ ہوگا

اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کا اصل جرم تکبر تھا۔ جس کی پاداش میں اسے جنت سے نکالا گیا۔ اصل ارشاد میں تعبیر اس طرح ہے فاھبط منھا فما یکون لک ان تتکبر فیھا فاخرج انک من الصاغرین۔ ہبوط کے معنے اونچی جگہ سے نیچی جگہ آنے کے بھی ہیں اور درجہ اعلیٰ سے درجہ ادنیٰ میں ہونے کے بھی ہیں۔ اس لحاظ سے ہبوط مادی اور معنوی دونوں طرح کا ہوتا ہے۔ منہا کی ضمیر کا مرجع الجنۃ بھی ہو سکتا ہے اور وہ درجہ بھی ہو سکتا ہے جو ابلیس کو ملائکہ میں حاصل تھا۔ حافظ ابن کثیر نے اسے بھی ایک احتمال بتایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس سرکشی کی پاداش میں جنت سے اتر جا یا یہ کہ اس مرتبہ عالیہ سے نیچے ہو جا۔ حضرت مولانا اشرف علی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ کبر کی بنا پر درگاہ الٰہی سے نکالا جانا اس کی دلیل ہے کہ کبر وصول حق سے مانع ہے۔ یاد رہے کہ عمل کی دنیا میں کبر چار طرح کا ہوتا ہے ایک یہ کہ اللہ کے حکم کا مقابلہ فکر عقل سے کیا جاتا ہے، دوسرا یہ کہ اللہ کی وحی کا مقابلہ رائے اور قیاس سے کیا جاتا ہے، تیسرا یہ کہ اللہ کی وحی کا مقابلہ وجدان و ذوق سے کیا جاتا ہے، چوتھے یہ کہ اللہ کی وحی کا مقابلہ سیاست اور ملکی و قومی مصالح اور مفادات سے کیا جاتا ہے۔ پہلا کبر فلاسفہ اور مناطقہ کا، دوسرا کبر فکری آزادگی اور فکری صلاحیتوں سے محروم قانون دانوں کا، تیسرا کبر کشف وجد اور ذوق و شوق کی طرف مائل صوفیاء کا اور چوتھا کبر ان حکمرانوں اور فرمانرواؤں کا جو ہر قدم پر شریعت اور قانون الٰہی کے مقابلے میں اپنی سیاسی مصالح اور قومی مفادات کو ترجیح دیتے ہیں۔ کبر کی ہر نوع مذموم ہے خواہ کہیں ہو، کبر کا مآل ذلت و صغار ہے انک من الصاغرین میں یہی بات بتائی گئی ہے۔ صاغرین صاغر کی جمع ہے۔ اصل میں اس شخص کو کہتے ہیں جو ذلت و صغار اور چھوٹی حیثیت کو خود اختیار کرے۔ مطلب یہ ہے کہ بندہ اور مخلوق ہونے کے باوجود تیرا اپنی بڑائی

اور گھمنڈ میں مبتلا ہونا اور اپنے رب کے حکم سے اس بنا پر سرتابی کرنا کہ اپنی عزت و برتری کا جو تصور تو نے خود قائم کر لیا ہے اس کے لحاظ سے وہ حکم تجھے اپنے لیے موجبِ توہین نظر آتا ہے۔ یہ دراصل یہ معنے رکھتا ہے کہ تو خود اپنی ذلت چاہتا ہے۔ بڑائی کا جھوٹا پندار عزت کا بے بنیاد ادعا اور کسی ذاتی استحقاق کے بغیر اپنے آپ کو خواہ مخواہ بزرگی کے منصب پر فائز سمجھ بیٹھنا تجھے بڑا اور ذی عزت اور بزرگ نہیں بنا سکتا بلکہ یہ تجھے چھوٹا اور ذلیل ہی بنائے گا۔

قیامت تک حق و باطل کی آویزش

۴ - ابلیس نے کہا کہ مجھے اس وقت تک کے لیے مہلت دے دے جب لوگوں کو اٹھایا جائے گا۔ فرمایا، تجھے مہلت ہے۔ یعنی جب تو نے یہ درخواست کی تو سمجھ لے کہ یہ پہلے سے علم الٰہی میں طے شدہ ہے کہ تجھ کو مہلت دی جائے جب حکمت الٰہی مقتضی ہوئی کہ حق تعالیٰ اپنی صفات کمالیہ و شہنشاہانہ عظمت و جبروت کا مظاہرہ کرے تو اس نے عالم کو پیدا فرمایا اللہ الذی خلق سبع سماوات و من الارض مثلھن یتنزل الامر بینھن لتعلموا ان اللہ علی کل شیئ قدیر و ان اللہ قد احاط بکل شیئ علما، یعنی زمین و آسمان کی تخلیق اور ان کے کل نظم و نسق سے مقصود یہ ہے کہ خدا کی قدرتِ کاملہ اور علم محیط وغیرہ صفات کی معرفت لوگوں کو حاصل ہو۔ اسی معرفتِ الٰہیہ کو آیت و ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون میں بعض سلف کی تفسیر کے مطابق عبادت سے تعبیر فرمایا ہے اور ظاہر ہے کہ تخلیق عالم سے یہ غرض بوجہ اتم جب ہی پوری ہو سکتی ہے کہ مخلوقات میں اس کی ہر قسم کی صفات و کمالات کا اظہار ہو اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ عالم میں مطیع و فرمانبردار اور باغی و مجرم ہر قسم کی مخلوق موجود ہو۔ نیز اعداء اللہ کو پوری زور آزمائی اور ان کے پیدائشی اختیار و قوت کے تمام وسائل استعمال کرنے کی آخری حد تک مہلت و آزادی دی جائے۔ پھر انجام کار حکومتِ الٰہیہ کا لشکر غالب ہو۔ دشمن اپنے کیفر کردار کو پہنچیں اور بعد امتحان آخری کامیابی دوستوں کے ہاتھ رہے۔ اس کے بغیر تمام صفاتِ کمالیہ کے ظاہر ہونے کی کوئی صورت نہیں۔ پس خیر و شر اور منبع خیر و شر کا پیدا کرنا اسی حکمت سے ہے کہ جو غرض تخلیق عالم کی ہے یعنی صفات کمالیہ کا مظاہرہ وہ بغیر اس کے پوری نہ ہو سکتی تھی و لو شاء ربک لجعل الناس امۃ واحدۃ و لا یزالون مختلفین الا من رحم ربک و لذالک خلقھم (ہود رکوع ۱۰) اسی لیے ضروری ہوا کہ عدو اکبر ابلیس لعین کو جو منبع شر ہے پوری مہلت دی جائے کہ وہ تا قیام قیامت اپنے قوی و وسائل کو جی کھول کر استعمال کرے لیکن یہ چیز ظاہر ہے کہ

براہ راست اس محیط کل اور قادر مطلق کے مقابلہ پر ممکن نہ تھی۔ اس لیے ضرور ہوا کہ خدا کی طرف سے بطور نیابت و خلافت ایک ایسی مخلوق مقابلہ پر لائی جائے جس سے ابلیس لعین کو آزادی کے ساتھ جنگ آزمائی کا موقعہ مل سکے، قرآن میں ہے :

واجلب علیھم بخیلک ورجلک وشارکھم فی الاموال والاولاد وعدھم ومایعدھم الشیطان الا غرورا[1]،

اور ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لے مال اور اولاد میں ان کے ساتھ ساجھا لگا اور ان کو وعدوں کے جال میں پھنسا لے اور شیطان کے وعدے ایک دھوکہ کے سوا اور کچھ ہی نہیں۔

اور پھر جب تک وہ مخلوق حق نیابت اور وظیفہ خلافت ادا کرتی رہے خاص شاہی فوج (ملائکہ) سے اس کو کمک پہنچائی جائے اور باوجود ضعف و قلت کے اپنے فضل و رحمت سے انجام کار دشمنوں کے مقابلہ میں مظفر و منصور کیا جائے۔ بس خوب سمجھ لو کہ یہ زمین ابلیس اور آدم کا میدان جنگ ہے۔ اور چونکہ پوری طرح جان توڑ مقابلہ اسی وقت ہو سکتا تھا کہ دونوں حریف ایک دوسرے سے خار کھاتے ہوں اس لیے تکوینًا دو صورتیں ایسی پیش آگئیں جن سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی دشمنی جاگزین ہو جائے ابلیس آدم کو سجدہ نہ کرنے کی بنا پر نیچے گرایا گیا اور آدم علیہ السلام کو ابلیس کی وسوسہ اندازی کی بدولت جنت سے علیحدہ ہونا پڑا۔ ان واقعات سے ہر ایک کے دل میں دوسرے کی عداوت کی جڑ قائم ہو کر معرکہ کارزار گرم ہو گیا۔ والحرب سجال وانما العبرۃ للخواتیم۔ ابلیس کو چونکہ ذلت کے ساتھ جنت سے یا مرتبہ بالا سے ہٹایا گیا تھا۔ اس وجہ سے اس کو خیال ہوا کہ اب اس کے لیے سعی و عمل کی کوئی مہلت نہیں دی۔ اس پر اس نے خدا سے درخواست کی کہ مجھے مہلت عطا کی جائے کہ میں ثابت کر سکوں کہ انسان فی الواقع اس شرف کا سزاوار نہیں ہے جو اسے بخشا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کو یہ مہلت دی۔ یہی وہ موڑ ہے جہاں سے انسان کی تکلیفی زندگی ابتلائی بنتی ہے۔ یعنی شیطان کو اپنا پورا زور اس پر لگانا ہے کہ وہ انسان کو نالائق ثابت کرے اور انسان کی سعادت یہ ہے کہ وہ یہ ثابت کرے کہ وہ فی الواقع اس شرف کا جو خلافت کی صورت میں اسے ملا ہے اہل ہے۔

امر واقعہ یہ ہے کہ پیدا کرنے والے نے انسان کو جس نصب العین کی تکمیل کے لیے پیدا کیا ہے جو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جتنا اس نصب العین سے ہٹتا ہے شیطان کی صورت میں قدرت کا انتقامی تازیانہ اس پر برستا رہتا ہے۔ ٹھیک جیسے بل سے نکلنے والے چوہے کو بلی دبوچ لیتی ہے اپنے نصب العین سے ہٹنے والے انسانوں کو الشیطان بھی اسی طرح دبوچ لیتا ہے۔

سعی و عمل کی مہلت چونکہ انسان کو موت تک حاصل ہے اس لیے شیطان کو بھی ورغلانے اور بہکانے کا موقعہ صرف انسان کی موت تک ملا ہے۔ مرجانے کے بعد جس طرح انسان پر سعی و عمل کا دروازہ بند ہوجاتا ہے اسی طرح شیطان کے لیے اس زور آزمائی کی راہ بھی مسدود ہو جاتی ہے لیکن یہ فیصلہ کہ کون جیتا ہے اور کون ہارا، قیامت کے دن ہونا ہے۔ اسی لیے ابلیس نے مہلت الی یوم یبعثون مانگی جس کے معنے یہ ہوتے کہ اس نے اپنی یہ درخواست منظور کرا کے انسان کے شرف و عزت کے اظہار کا فیصلہ قیامت پر ملتوی کرادیا۔ اب وہیں یہ فیصلہ ہوگا کہ انسان تاجِ زریں کا سزاوار ہے۔

ابلیس کا چیلنج

۱۱۔ ابلیس نے کہا کہ چونکہ تو نے مجھ پر راہ بند کردی ہے تو اب میں بھی ایسا کروں گا کہ تیری سیدھی راہ سے بھٹکانے کے لیے بنی آدم کی تاک میں بیٹھوں گا سامنے سے پیچھے سے داہنے سے بائیں سے ان پر آؤں گا اور تو ان میں سے اکثروں کو شکرگزار نہ پائے گا۔ یعنی رہزنوں کی طرح ان کے ایمانوں پر ڈاکہ ماروں گا جن کے سبب یہ روزِ بد دیکھنا پڑا۔ اور میں ہر طرف سے ان پر حملہ آور ہوں گا۔ جہاتِ اربعہ کا ذکر تعمیم جہات کی طرف اشارہ کرنے کے لیے ہے اور اکثر کے ناشکرگزار ہونے کا تخمینہ خود ابلیس کا تھا جو صحیح نکلا ولقد صدق ابلیس ظنہ فاتبعوہ (السبا۔ رکوع ۲) اصل ارشاد میں فبما اغویتنی آیا ہے۔ اس کے معنی غوایۃ میں ڈالا ہیں۔ باسببیت کے لیے ہے۔ معنی یہ ہیں کہ اس وجہ سے کہ تو نے مجھے آدم کی خاطر بے راہ بنادیا ہے میں ضرور اولادِ آدم کی راہ ماروں گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ شیطان اپنی نافرمانی کا کل ذمہ داری حق سبحانہٗ پر ڈال رہا ہے کہ تو نے مجھے گمراہی میں مبتلا کیا۔ گویا اسے شکایت ہے کہ آدم کے آگے سجدہ کا حکم دے کر تو نے مجھے فتنہ میں ڈالا اور میرے نفس کے تکبر کو ٹھیس لگا کر مجھے اس حالت میں مبتلا کردیا کہ میں نے تیری نافرمانی کی۔ گویا اس احمق کی خواہش یہ تھی کہ اس کے نفس کی چوری پکڑی نہ جاتی بلکہ جس پندار غلط اور جس سرکشی کو اس نے اپنے اندر چھپا رکھا تھا اس پر پردہ ہی پڑا رہنے دیا جاتا۔ یہ ایک کھلی ہوئی سفیہانہ بات تھی جس کا جواب دینے

لہ افادات شیخ الاسلام

کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے سرے سے اس کا کوئی نوٹس ہی نہیں لیا۔ صراط مستقیم نبوت کے ذریعے خدا کی جانب سے آئی ہوئی علم و عمل کی وہ راہ ہے جس کا تعارف سورہ فاتحہ میں صراط الذین انعمت علیھم غیر المغضوب علیھم ولا الضالین ہے جب تک انسان اس راہ پر قائم رہتا ہے اس وقت تک وہ سست رو اور آبلہ پا ہو کر رو بمنزل رہتا ہے۔ اس وجہ سے دیر سویر منزل پر پہنچ ہی جاتا ہے۔ برعکس اس کے اگر وہ نبوت سے ہٹ جائے تو اصل منزل سے روگرداں ہو جاتا ہے اور پھر جتنے قدم بھی وہ آگے بڑھتا ہے اس کا ہر قدم ایک نئی ضلالت کو دعوت دیتا ہے۔ یہ رمز ہے جس کی وجہ سے شیطان کو انسان پر پوری فتح کا اس وقت تک پورا موقع نہیں ملتا جب تک وہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے علماً و عملاً وابستہ رہتا ہے۔ اور جونہی نبوت کی شاہراہ سے ہٹتا ہے شیطان کے ہتھے چڑھ جاتا ہے۔ چنانچہ شیطان نے اپنے چیلنج میں یہاں صاف کہہ دیا کہ انسان کی گھات میں نبوت کی صراط مستقیم پر بیٹھے گا اور اس راہ سے اس کو بے راہ کرنے کی کوشش کرے گا اور صرف کوشش ہی نہیں کرتا بلکہ ہر جہت حملہ آور ہوتا ہے۔ اسی چیلنج میں یہ بھی ہے کہ ثم لاٰتینھم من بین ایدیھم ومن خلفھم وعن ایمانھم وعن شمائلھم اس میں شیطان کے حملہ کی قوت وسعت اور ہمہ گیری کا خود اس کی زبان سے وہ ہر جہت ہر سمت ہر پہلو سے انسان پر حملہ کرے گا۔ وہ اس کے مشاہدات، احساسات، جذبات، خواہشات ہر منفذ سے اس کے اندر گھسنے کی کوشش کرے گا۔ وہ اس کے فکر، فلسفہ، علم ادراک ہر چیز کو مسموم کرے گا۔ وہ اس کی تحقیق، تنقید، تصنیف و تالیف ادب آرٹ لٹریچر ہر چیز میں زہر گھولے گا۔ وہ اس کی تہذیب، تمدن، معیشت، معاشرت، فیشن، کلچر، سیاست اور مذہب ہر چیز کے اندر فساد پیدا کرے گا۔ یہی اس کا کام ہے۔ قرآن میں مختلف مقامات میں

ان عبادی لیس لک علیھم سلطان

میرے بندوں پر تجھے قابو حاصل نہیں ہے

کے اعلان کے ساتھ اس کو حکم دیا گیا ہے

واستفزز من استطعت منھم بصوتک واجلب علیھم بخیلک ورجلک وشارکھم فی الاموال والاولاد وعدھم وما یعدھم الشیطان الا غروراً۔

تو جس جس کو اپنی دعوت سے پھسلا سکتا ہے پھسلا لے، ان پر اپنے سوار اور پیادے چڑھا لا مال اور اولاد میں ساجھا لگا اور ان کو وعدوں کے جال میں پھانس اور شیطان کے وعدے دھوکہ اور فریب کے سوا کچھ نہیں۔

نبوت کی راہ سے انحراف زندگی رکھنے والے جو چھپتے چلاتے بھی جانے ہیں چلتے بھی جاتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ بڑھتے بھی جاتے ہیں تو فی الواقع وہ خود نہیں بڑھتے بلکہ یہ شیطان ہی ان کو بڑھاتا اور چڑھاتا جاتا ہے۔ اسی موقع پر شیطان کی زبانی یہ الفاظ نقل کیے گئے کہ اس نے آدم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

لاحتنکن ذریته الاّ قلیلاً

تھوڑوں کے سوا میں اس کی اولاد کو ڈھاتی لگاؤں گا۔

کبھی گدھوں اور گھوڑوں کے منہ پر بجائے لگام کے لوگ رسی باندھ کر کھینچ لے جاتے ہیں۔ اسی کو اردو میں ڈھاتی لگانا اور عربی میں احتناک کہتے ہیں۔ یعنی جیسے گدھوں اور گھوڑوں کو ڈھاتی لگانا ان کی تذلیل ہے شیطان نے دعویٰ کیا ہے کہ میں لوگوں کو گھسیٹوں گا اور ذلت کے ساتھ گھسیٹوں گا۔ گھسٹنے والوں کا یہ تماشا کتنا دردناک ہے۔ اس کا کام ہی یہ ہے کہ جس چیز میں درحقیقت غنا بخشی کی قوت نہیں وہ باور کراتا ہے کہ یہی آدمی کو غنی بناتی ہے۔ خلود بخشی کی خاصیت سے جو واقع میں محروم ہے دھوکہ دیتا ہے کہ وہی خلود بخش ہے جن اعمال و افعال کا بالآخر کوئی نتیجہ نہیں شیطان باور کراتا رہتا ہے کہ وہی نتیجہ خیز ہیں۔ جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا سکھاتا رہتا ہے کہ سب کچھ اسی راہ میں ملتا ہے۔ الغرض جو ہے شیطان کی تسلیط کے بعد یہ نظر آتا ہے کہ وہی نہیں ہے اور جو نہیں ہے وہی نظر آتا ہے کہ ہے۔ یہی مطلب ہے کہ و مایعدھم الشیطان الا غرورا" کا۔ اس آیت سے شیطان کے پروپیگنڈے کے زور اور اس کی وسعت کا بھی پتہ چلتا ہے اور یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ وہ اپنے منصوبے کو بروئے کار لانے کے لیے سیاسی ہتھکنڈے بھی استعمال کرے گا۔ البتہ ایک پہلو اس میں تسلی کا ہے ان عبادی لیس لک علیھم سلطان میرے بندوں پر تجھے اقتدار نہ ہوگا۔ وہ صرف اس بات کا مجاز ہوگا کہ ان کو غلط فہمیوں میں ڈالے، جھوٹی امیدیں دلائے بدی اور گمراہی کو ان کے سامنے خوشنما بنا کر پیش کرے۔ لذتوں اور فائدوں کے سبز باغ دکھا کر غلط راستوں کی دعوت دے لیکن اسے یہ طاقت نہیں ہے کہ خدا کے بندوں کا ہاتھ پکڑ کر زبردستی اپنے راستے پر کھینچ لے۔ اگر وہ خود راہ راست پر چلنا چاہیں تو انہیں چلنے نہ دے۔ آخر میں فرمایا ہے ولا تجد اکثرھم شاکرین اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ انسانوں کی اکثریت نبوت کے علم و عمل کی نعمت سے بیگانہ رہے گی اور اس نعمت کا شکر ادا نہ کرے گی اور اپنی زندگی کے مسائل میں عبادت اور طاعت کے لیے تیرے سوا اپنی توجہات کا مرکز اوروں کو بنائے گی۔ عبداللہ ابن عباس کے لفظوں میں شاکرین کی تفسیر موحدین سے کرد۔ اور الحسن البصری کی زبان میں مطیعین سے کر دحاصل دونوں کا ایک ہے۔ مطلب یہی ہے کہ تیری عبادت اور طاعت نہ کریں گے۔ تیرے سے ہٹ کر اوروں کے ہو جائیں گے۔

خدا کی فیصلہ کن بات

۱۲- خدا نے فرمایا کہ یہاں سے نکل جا ذلیل اور ٹھکرایا ہوا، اولادِ آدم میں سے جو بھی تیری پیروی کرے گا تو میں ضرور ایسا کروں گا تم سب سے جہنم بھردوں گا۔ یعنی اکثر آدمی ناشکرے ہوں گے تو ہمارا کیا بگاڑیں گے انجام کار ان ہی تھوڑے وفاداروں کے لیے کامیابی و فلاح ہوگی اور ناشکروں کی کثرت دوزخ کی نذر ہو جائیں گی۔ گویا اس طرح واضح کر دیا جائے گا کہ جنودِ الشیطان کی اس کثرت کے باوجود بھی خلیفۃ اللہ کی قلیل التعداد لشکر کو مغلوب و مقہور نہیں کر سکی لیے شیطان کو سزا مانگی مہلت تو مل گئی لیکن ساتھ ہی ذلیل و خوار ہو کر جنت سے بھی نکالا گیا اور ہمیشہ کے لیے نکالا گیا کیونکہ جنت منکرین اور سرکشوں کا مقام نہیں ہے اور ساتھ ہی ان لوگوں کا انجام بھی بتا دیا جو انسانوں میں سے اس کی پیروی کریں گے فرمایا لمن تبعك منهم لاملئن جهنم منكم اجمعين ان میں سے جو بھی تیری پیروی کریں ان سے تیرے سمیت جہنم کو بھردوں گا۔ جواب پر غور کیجئے اس میں کیسی شانِ بے نیازی ہے اور کس قدر جبروت کا اظہار ہے۔ آیت میں جہنم کی تنگنائی کی طرف بھی اشارہ ہے۔ جہنم مظہرِ غضب ہے اور جنت مظہرِ رحمت ہے۔ مظہرِ رحمت مظہرِ غضب کے مقابلے میں وسیع سے وسیع تر ہے۔ اور منهم لاکر یہ بھی بتایا ہے کہ جہنم سب سے نہیں کچھ سے بھری جائے گی۔ اگر سب سے جہنم بھری جاتی تو تعبیر لاملئن جهنم بكم اجمعين ہوتی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ مومنین و موحدین میں سے کچھ گناہوں میں شیطان کے پیروکار ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ ان کو معاف کردے گا۔

آدم کی زندگی کا دورِ اوّل

۱۳- اے آدم تو اور تیری بیوی دونوں جنت میں رہو اور جس جگہ سے جو چیز پسند ہو شوق سے کھاؤ، مگر دیکھو اس درخت کے قریب بھی نہ جانا اگر گئے تو یاد رکھو کر زیادتی کرنے والوں میں سے ہو جاؤ گے۔ یعنی آدم اور حوا کو اجازت تھی کہ بلا روک ٹوک جو چاہیں کھائیں پیئیں بجز ایک معین درخت کے جس کا کھانا ان کی بہشتی زندگی اور استعداد کے مناسب نہ تھا لے فرمادیا کہ اس کے پاس نہ جاؤ ورنہ نقصان اٹھاؤ گے۔ میرے نزدیک یہاں فتکونا من الظالمین کا ترجمہ اگر یوں کیا جاتا تو زیادہ موزوں ہوتا تو پھر ہو جاؤ گے تم نقصان اٹھانے والے،

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

ظلم کے معنے نقصان اور کمی و کوتاہی کے آتے ہیں جیسے ولم تظلم منہ شیأ کہف میں ہے[1]

اس آیت میں الجنۃ سے کیا مراد ہے۔ اس کا ذکر پہلی جلد میں ہو چکا ہے لیکن یہاں اتنی بات ضرور سمجھ لیجئے کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنے فضل سے جس جنت میں جگہ دی تھی وہ پہلے ان کو اور ان کی نسل کو ہمیشہ کے لیے دے دی گئی تھی مگر چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لیے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیے گئے مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ آدم علیہ السلام کا زمین میں آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے مقدر ہو چکا تھا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق سے پہلے ہی فرشتوں پر ظاہر کر دیا تھا انی جاعل فی الارض خلیفۃ حضرت آدم کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکون پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے مگر زمین میں بھیجنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجا، یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم اور ان کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنت ہے مگر اس سے دوری ان کے گناہ کی وجہ سے ہے اور اس کا حصول خدا کی اطاعت کے ذریعہ ہوگا۔ اسی لیے جنت کو قرآن میں وراثت کہا ہے تلک الجنۃ التی اورثتموھا وہی جنت ہے جس کا تمہیں وارث بنا دیا ہے لیکن وراثت انسان کو اپنے اعمال خیر ہی کے ذریعے ملے گی بہرحال وراثت کے اشارے سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کی یہ جنت جس میں آدم کو زمین میں آنے سے پہلے رکھا گیا تھا اولاد آدم کو وراثت میں ملے گی اور جس جنت میں آدم زمین میں آنے سے پہلے تھے خود قرآن نے اس کا چہرہ یہ پیش کیا ہے۔

ان لک ان لا تجوع فیھا ولا تعری و انک لا تظمأ ولا تضحیٰ

اس جنت کا تعارف یہ ہے کہ اس میں تو بھوکا نہ ہوگا ننگا اور پیاسا نہ ہوگا اور دھوپ کی تپش نہ اٹھائے گا۔

آدم اس جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی ننگے بھی ہوئے، پیاس بھی معلوم ہوتی اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوتی اور زمین میں آ کر ان کو ان ہی چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہونا پڑا۔ روٹی پانی، کپڑا اور مکان یہی چار انسان کی مختصر ضروریات ہیں۔ ان ہی کو اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالم بنا لیا جس کے مہیا کرنے میں ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ مصروف کر کے اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوتی اور جائز اکل و شرب جائز لباس اور جائز مسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں سے احتراز کا حکم ہوا

[1] افادات شیخ الاسلام

اسی سے شریعت کے اصول، معاملات اور اخلاقِ انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوتی ہیں اور پھر اس لیے تاکہ اس حیاتِ فانی میں پھنس کر حیاتِ غیر فانی کی طلب کو وہ بھول نہ جائے۔ عرفانِ الٰہی اور عبادتِ الٰہی و اطاعتِ الٰہی کی تلقین ہوتی جو جنت کی اصل غذا اور روزی ہے۔

آیت میں اسکن انت و زوجك الجنة فرما کر اشارہ کر دیا کہ عورت رہائش اور معیشت میں مرد کے تابع ہے اور فکلا من حیث شئتما میں ایک طرف جنت کی بہتات اور وسعتیں بتادی ہیں اور دوسری طرف معاشی ذخائر کے لامحدود ہونے کی طرف اشارہ کر دیا۔ اس زندگی میں انسان کی خواہشیں لامحدود ہیں اور نعمتیں محدود ہیں۔ اور جنت میں خواہشیں بھی لامحدود ہوں گی اور نعمتیں بھی لامحدود ہوں گی من حیث شئتما میں دونوں آگئے۔

آخر میں فرمایا کہ لا تقربا هذه الشجرة اس درخت کے دونوں قریب نہ جاؤ۔ اس پر تبصرہ ہم پہلی جلد میں کر چکے ہیں۔ یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ الشجرہ پر الف لام داخل ہے جس سے یہ بات تو واضح ہوتی ہے کہ مخاطبوں کی حد تک یہ درخت مقرر اور معیّن ہے رہا یہ سوال کہ یہ درخت کس چیز کا تھا تو اس سوال کا جواب نہ قرآن نے صراحتاً دیا ہے اور نہ کسی صحیح حدیث ہی میں اس کا جواب موجود ہے۔ ہمارے نزدیک صحیح مسلک حافظ ابن جریر کا ہے وہ فرماتے ہیں کہ ہم تعین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ درخت کس چیز کا ہے۔ کیونکہ اس تعیین کے لیے کوئی دلیل نہ تو ہمیں قرآن ہی میں ملتی ہے نہ حدیث ہی میں۔ اور علامہ آلوسی نے بھی حافظ ابن جریر کی ہمنوائی کی ہے۔

ناصح کے انداز میں شیطان کی فریب کاری

۱۴۔ پھر شیطان نے ان دونوں کو بہکایا تاکہ ان کے ستر جو ان پر چھپے تھے ان پر کھول دے، اس نے کہا کہ تمہارے پروردگار نے اس درخت سے جو تمہیں منع کیا ہے تو صرف اس لیے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ تم فرشتے بن جاؤ یا دائمی زندگی تمہیں مل جائے، اس نے قسمیں کھا کر یقین دلایا کہ میں تم دونوں کی خیر خواہی میں نیک بات سمجھانے والا ہوں۔ بہر حال وہ دونوں کو فریب میں لے آیا۔ آدم و حوا شیطان کی قسموں سے متاثر ہوئے کہ خدا کا نام لے کر کون جھوٹ بولنے کی جرأت کر سکتا ہے۔ شاید وہ سمجھے کہ واقعی اس کے کھانے سے ہم فرشتے بن جائیں گے یا پھر کبھی فنا نہ ہوں گے اور حق تعالیٰ نے جو نہی فرمائی تھی اس کی تعلیل یا تاویل کر لی ہوگی لیکن غالباً فتکونا من الظالمین اور ان هذا عدو لك ولزوجك فلا يخرجنكما من الجنة فتشقىٰ (طٰہٰ) سے نسیان ہوا اور یہ بھی خیال نہ رہا کہ جب وہ مسجودِ ملائکہ بنائے جا چکے پھر ملک بننے کی کیا ضرورت

رہی فنسی ولم نجد لہ عزماً (طٰہٰ رکوع ۶) واضح ہو کہ امر و نہی کبھی تو تشریعاً ہوتے ہیں اور کبھی شفقۃً۔ اس کو یوں سمجھو کہ مثلاً ایک نوٹ ریل میں بدون ٹکٹ سفر کرنے کی ممانعت ہے یہ تو قانونی حیثیت رکھتی ہے جس کا اثر کمپنی کے حقوق پر پڑتا ہے اور ایک جو گاڑی میں لکھا ہوا ہے کہ مت تھوکو اس سے بیماری پھیلتی ہے" یہ نہی شفقۃ ہوتی ہے جیسا کہ بیماری پھیلنے کی تعلیل سے ظاہر ہے۔ اسی طرح خدا کے اوامر و نواہی بعض تشریعی ہیں جن کی خلاف ورزی کرنے والا قانونی مجرم سمجھا جاتا ہے اور جن کا ارتکاب کرنا ان حقوق کے منافی ہے جن کی حفاظت کرنا تشریع کا منشا تھا۔ دوسرے وہ اوامر و نواہی ہیں جن کا منشا تشریع نہیں ہے محض شفقت ہے۔ جیسا کہ طب نبوی کی بہت سی احادیث میں علماء نے تصریح کی ہے۔ شاید آدم علیہ السلام نے اکل شجرہ کی نہی کو نہی شفقت سمجھا۔ اسی لیے شیطان کی وسوسہ اندازی کے بعد اس کی خلاف ورزی کرنے کو زیادہ بھاری نہیں سمجھا مگر چونکہ انبیاء علیہم السلام کی چھوٹی سی لغزش بھی ان کے مرتبہ قرب کے لحاظ سے زیادہ ثقیل اور عظیم بن جاتی ہے اس لیے اپنی غلطی کا ظاہری نقصان اٹھانے کے علاوہ مدت دراز تک توبہ و استغفار میں مشغول رہ کر روتے رہے۔ آخر کار ثم اجتباہ ربہ فتاب علیہ و ھدی کے نتیجہ پر پہنچ گئے۔

بود آدم دیدہ نور قدیم
موئے در دیدہ بود کوہ عظیم[1]

اصل ارشاد میں فوسوس لھما الشیطان آیا ہے۔ وسوسہ کے معنی عربی میں کسی بری چیز کا دل میں پیدا کرنا اندرونی اغواء کے ہیں اور شکاری کی ہلکی آواز کو بھی کہتے ہیں۔ ہوا کے جھونکے سے ہوا کی ہلکی سی سرسراہٹ بھی وسوسہ کہلاتی ہے۔ شیطان نے آدم و حوا پر وسوسہ اندازی کی۔ وسوسہ کی نسبت شیطان کی طرف کر کے اشارہ کر دیا کہ گناہ آدم کی جبلت اور طبیعت نہیں ہے۔ یعنی انسان میں اللہ کی نافرمانی فطری اور حقیقی نہیں ہے بلکہ اضافی ہے۔ اس میں طنز ہے ان لوگوں پر جو گناہ کو انسان کی فطرت بتاتے ہیں۔ تورات میں اغواء آدم کے سلسلے میں شیطان کا نہیں بلکہ سانپ کا ذکر ہے اور شاید ہمارے تفسیری ذخیرے میں شیطان کے سانپ میں حلول کر کے جنت میں داخل ہونے کی روایت کا ماخذ تورات ہی ہو۔ ورنہ ارباب تحقیق نے اس روایت کو لغو اور مہمل قرار دیا ہے۔ امام رازی نے اس کی رکاکت کا اعلان کیا ہے۔ یہاں تثنیہ کی ضمیر لھما لا کر قرآن نے بائبل کی یہ غلطی بھی واضح کر دی کہ شیطان نے حضرت حوا کو بہکایا تھا۔ قرآن نے بتا دیا کہ دونوں پر ذمہ داری یکساں ہے۔ بائبل میں ہے:

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور عورت نے جوں دیکھا کہ یہ درخت کھانے میں اچھا ہے اور دیکھنے میں خوشنما اور عقل بخشنے میں خوب ہے تو اس کے پھل میں سے لیا اور کھایا اور اپنے خصم کو بھی کھلایا۔ (پیدائش ۳-۶)

لیبدی لھما میں لام عاقبت ہے یعنی شیطان کی اس وسوسہ اندازی کا انجام یہ ہوا کہ آدم و حوا جنت کی پوشاک سے محروم ہو جائیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کی پہلی چال جو اس نے انسان کو فطرتِ انسانی کی سیدھی راہ سے ہٹانے کے لیے چلی یہ تھی کہ اس کے اس جذبہ شرم و حیا پر ضرب لگائے اور برہنگی کے راستہ سے اس کے لیے فواحش کا دروازہ کھولے اور اس کو جنسی معاملات میں بدراہ کرے۔ بالفاظِ دیگر اپنے حریف کے محاذ میں ضعیف ترین مقام جو اس نے حملہ کا تلاش کیا وہ اس کی زندگی کا جنسی پہلو تھا اور پہلی ضرب جو اس نے لگائی وہ اس محافظ فصیل پر لگائی جو شرم و حیا کی صورت میں اللہ تعالیٰ نے انسانی فطرت میں رکھی تھی۔ ہمارے فقہا نے آیت کے اشارے سے یہ قانونی نکتہ دریافت کیا ہے کہ ستر کا کھولنا اہم ممنوعات میں سے ہے۔ نسفی نے مدارک میں اور قرطبی نے الجامع الاحکام القرآن میں تصریح کی ہے۔

آگے شیطان کی بات ہے وقال ما نھاکما ربکما عن ھذہ الشجرۃ یہاں شیطان نے حضرت آدم کو یہ سبز باغ دکھایا کہ اس درخت کا پھل کھانے سے یا تو وہ فرشتوں کے مرتبے میں آجائیں گے اور یا انہیں ابدی زندگی حاصل ہو جائے گی۔ گویا دو باتوں کا حضرت آدم کو علم تھا ایک تو یہ کہ مسجودِ ملائکہ ہونے کے باوجود وہ فرشتوں کے ہم پلہ نہیں ہیں دوسرے یہ کہ زندگی ان کو حاصل ہوتی ہے اس میں ابدیت نہیں ہے۔ اگر آدم کا یہ ذہن نہ ہوتا تو ابلیس ان کے ورغلانے میں کامیاب نہ ہوتا۔

تورات میں ہے کہ جنت میں دو درخت تھے۔ ایک نیک و بد کی پہچان کا اور دوسرا حیاتِ جاوداں کا تورات کی رُو سے اسی نیک و بد کی پہچان کے درخت کا پھل کھانے سے منع کیا گیا تھا لیکن آدم نے اس کو کھا لیا اور اس کی وجہ سے سب سے پہلے ان کو برہنگی کا احساس ہوا۔ قرآن پاک میں اس درخت کا نام جس کا پھل کھانے سے روکا گیا تھا تصریحاً مذکور نہیں اور کسی صحیح ارشادِ نبوت میں بھی اس کی کوئی نشاندہی نہیں کی گئی ہے لیکن قرآن کی ایک آیت سے اشارۃً معلوم ہوتا ہے کہ وہ نیک و بد کی شناخت کا درخت تھا۔ شیطان نے یہ کہہ کر ان کو کھلایا کہ یہ حیاتِ جاوید اور ملکِ جاوداں کا درخت ہے مگر اس کے کھانے کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو برہنگی کا علم ہو گیا جو نیک و بد کی تمیز کا نتیجہ ہے۔ قرآن میں دوسری جگہ شیطان کا مقولہ نقل کیا گیا ہے۔ ھل ادلک علی شجرۃ الخلد و ملک لا یبلیٰ، سوال یہ ہے کہ حیاتِ جاوداں سے مقصود کیا ہے ظاہر ہے کہ جنت ہے۔ شیطان کا منشا یہ تھا کہ اس جنت میں جس میں اب تم ہو یہ ہے دردِ سر ہمیشہ رہنے کا تم کو نسخہ بتاتا ہوں۔ حضرت آدم نے خواہش کی تو اس نے نیک و بد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا۔ یہ بھی

ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ نیک و بد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مواخذہ کا دار و مدار ہے۔ یہ مولانا سید سلیمان کا یہاں لطیف استنباط ہے اور اس سے بھی لطیف وہ استنباط ہے جو مولانا مناظر حسن گیلانی نے پیش کیا ہے۔ لیجئے ان کی زبانی سنیے۔ فرماتے ہیں۔ اگر حضرت آدم کے اس قصے کو صرف قصہ کی حیثیت سے نہ پڑھا جائے بلکہ اولاد آدم کی موجودہ زندگی میں اس قصہ کے اجزاء سے فائدہ اٹھانے کا ارادہ کیا جائے تو دوسرے اجزاء سے قطع نظر کرتے ہوئے میں الشجرہ کے متعلق یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ قرآن ہی میں جب یہ موجود ہے کہ شیطان نے حضرت آدم کو کہا ھل ادلك علیٰ شجرۃ الخلد اور اس جگہ اسی کی شرح شیطان کی زبان سے اس طرح پیش کی گئی ہے کہ اس نے آدم و حوا کو یہ سمجھایا تھا کہ خدا نے اس الشجرہ سے تم دونوں کو اس لیے روکا ہے کہ اس کے استعمال کے بعد تم دونوں کو خلود حاصل ہو جاتے گا یعنی تکونا من الخالدین۔

اب ایک طرف اس مسئلہ کو سامنے رکھ لیجئے اور دوسری طرف سورہ ھمزہ کے اس مضمون پر غور کیجئے کہ آدمی مال اور سرمایہ کے متعلق یہ خیال کرتا ہے کہ اس میں خلود بخشی کی طاقت پائی جاتی ہے۔ اس سے اگر یہ سمجھا جاتے کہ حضرت آدم جس عالم میں اس وقت تھے اس وقت ان کے سامنے خواہ کسی شکل میں پیش ہوئی ہو لیکن آدم کی اولاد کے سامنے وہی چیز مال اور سرمایہ کی صورت میں جلوہ گر ہوتی ہے۔ تو جہاں تک قرآن کا اقتضا ہے یہ خیال چنداں بعید نہیں ہے ذرا ان امور پر غور کیجئے۔

اولاً حضرت آدم اور ان کی بیوی کو حکم دیا گیا تھا کلا منہا رغداً حیث شئتما ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین۔ آج بھی دیکھا جاتا ہے کہ اولادِ آدم کے سوا زندگی کی تمام ضرورتوں کی محتاج ہستیاں لاکھوں اور کروڑوں کی تعداد میں اس طور پر زندگی گزار رہی ہیں کہ صبح سے شام تک خوب کھاتی ہیں لیکن ان میں کوئی بھی اپنی ضرورتوں کے متعلق خلود اور دوام کی ضمانت میں سرگرداں نہیں ہے۔ ایک آدم زاد جو آج کی ضرورتوں کی تکمیل کے بعد کل کے متعلق ہمیشہ غیر مطمئن رہتا ہے۔ عدم اطمینان کی اسی کیفیت کے ازالہ کے لیے وہ اس چیز کی تلاش میں سرگرداں رہتا ہے جس کے متعلق خلود بخشی کا خیال اس میں پیدا ہو گیا ہے۔ یعنی یحسب ان مالہ اخلدہ مال اور سرمایہ جو آج مل رہا ہے کل وہی ملتا رہے سمجھا جاتا ہے کہ اس کی ضمانت مال اور سرمایے میں مستور ہے۔

ثانیاً حضرت آدم کے قصہ میں ہے کہ شجرۃ الخلد کے چکھنے کے ساتھ ہی ان کی سوآۃ چھپانے کی چیزیں کھل گئیں۔ آدم کی اولاد میں بھی یہی سمجھا جاتا ہے بلکہ قرآن ہی نے ہمیں بتایا ہے کہ مال کی محبت میں جب بخل کی راہ اختیار کی جاتی ہے تو الحسنیٰ یعنی اچھی باتوں کی تکذیب شروع کر دیتا ہے۔ گویا اس طرح مال اور سرمایے کی محبت اس کے عیوب کھول دیتی ہے۔

(واما من بخل واستغنیٰ وکذب بالحسنیٰ)

ثالثاً، اسی الشجرہ کے چکھنے کا نتیجہ حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ اس صورت میں ظاہر ہوا کہ ان کو ہبوطاً اتر جانے کا حکم دیا گیا۔ حق تعالیٰ کی بارگاہ میں قرب کا جو مقام ان کو حاصل تھا اسی سے وہ اتار دیے گئے آدم کی اولاد میں بھی یہی دیکھا جاتا ہے کہ مال اور سرمایہ پر اقتدار حاصل کرنے کے بعد اس کے سارے احتیاجی تعلقات اسی مال کے ساتھ قائم ہو جاتے ہیں۔ بندے اور خدا کے درمیان جو احتیاجی تعلق رہنا چاہیے وہ تعلق باقی نہیں رہتا۔ قرآن کی بالا آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔

رابعاً، مال میں جیسے غنا بخشی کی کیفیت بظاہر لوگوں کو محسوس ہوتی ہے گویا عدم احتیاج کا جو ایک پہلو فرشتوں میں پایا جاتا ہے۔ اسی ملکوتی پہلو کی تکمیل کی ایک شکل مال میں پائی جاتی ہے۔ حضرت آدم کو شیطان نے منجملہ اور باتوں کے یہ بھی کہا تھا کہ اس الشجرہ کے استعمال سے چونکہ فرشتے بن سکتے ہو اس لیے خدا نے تم کو اس سے روکا ہے۔

خامساً، شیطان نے اس شجرۃ الخلد کی ایک صفت یہ بھی بتائی ہے کہ ملک لا یبلیٰ یعنی یہ ایک ایسی چیز ہے جو پرانی اور کہنہ نہیں ہوتی۔ معاشیات کے ماہرین بتاتے ہیں کہ سونے اور چاندی کی یہی خصوصیت ہے کہ ان میں کہنگی اور فرسودگی نہیں آتی۔

سادساً، یہ بھی ہے کہ اسی شجرۃ الخلد کی سزا میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ تمہارے بعض بعض کے دشمن ہوں بعضکم لبعض عدو آدم کی اولاد میں جتنے جھگڑے ہیں عموماً اسی مال و دولت کے سبب ہوتے ہیں۔

بہرحال یہ میرا ذہنی انتقال ہے۔ میں نہیں کہہ سکتا کہ کہاں تک صحیح ہے۔ دماغ میں ایک بات آئی اس کا اظہار کر دیا۔ والعلم عند اللہ۔

مولانا گیلانی نے جو کچھ فرمایا ہے میرے خیال میں بھی اس کی حیثیت ایک علمی لطیفہ سے زیادہ نہیں۔ کچھ بھی ہو اس سے یہ اشارہ ضرور ملتا ہے کہ انسان کے اندر معالی امور مثلاً بشریت سے بالاتر مقام پر پہنچنے یا حیات جاوداں حاصل کرنے کی ایک فطری پیاس موجود ہے اور شیطان کو اسے فریب دینے میں پہلی کامیابی اسی ذریعہ سے ہوئی کہ اس نے انسان کی اس خواہش سے اپیل کی۔ شیطان کا سب سے چلتا ہوا حربہ یہ ہے کہ وہ آدمی کو بلندی پر لے جانے اور موجودہ حالت سے بہتر حالت پر پہنچا دینے کی امید دلاتا ہے اور پھر اس کے لیے وہ راستہ پیش کرتا ہے جو اسے الٹا پستی کی طرف لے جاتے۔

آخر میں فرمایا (وقاسمھما انی لکما لمن النٰصحین) لفظ قاسم باب مفاعلہ سے ہے اور مشارکت کے لیے آتا ہے۔ لیکن کبھی یہ تکثیر اور مبالغہ کے معنی بھی دیتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیطان کو آدم کو

ورغلانے کے لیے بہت زیادہ محنت کرنی پڑی، بار بار قسمیں کھا کر یقین دلانا پڑا کہ وہ جو کچھ کہہ رہا ہے محض بربنائے خیر خواہی کہہ رہا ہے۔ اس میں کسی بدنیتی کو قطعاً دخل نہیں ہے۔ اور اس ساری کارگزاری کا نتیجہ یہ نکلا فدلّٰہما بغرور غرض دونوں کو قرب سے نیچے لے آیا۔ دلی تدلیہ سے ماضی ہے اس کے معنے ہیں آہستہ آہستہ نیچے لے آنا۔ یعنی شیطان کو مقصد برآری میں کافی محنت کے ساتھ کافی وقت بھی صرف کرنا پڑا اور بڑی تگ و دو کے بعد آدم اور حوا کو اپنے ڈھب پر لایا۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں کو چکنی چپڑی باتوں اور دھوکہ فریب کے ساتھ بالائی مرتبہ سے نچلے مرتبہ میں یعنی مقام طاعت سے معصیت میں اتار لایا اور اس طرح شیطان اپنی سازش میں کامیاب ہو گیا۔

عصیان سے جنتی لباس اتر گیا

۱۵- پھر جونہی انہوں نے درخت چکھا تو ان کے ستر ان پر کھل گئے۔ یعنی عدول حکمی کرا کر لباس بہشتی ان پر سے اتروا دیا۔ کیونکہ جنتی لباس حقیقت میں لباس تقویٰ کی ایک محسوس صورت ہوتی ہے کسی ممنوع کے ارتکاب سے جس قدر لباس تقویٰ میں رخنہ پڑے گا اسی قدر جنتی لباس سے محرومی ہو گی۔ غرض شیطان نے کوشش کی کہ عصیان کرا کر آدم کے بدن سے بطریق مجازات جنت کا خلعت فاخرہ اتروا لے۔ یہ میرا خیال ہے لیکن حضرت شاہ صاحب نے نزع لباس کو اکل شجرہ کے ایک طبعی اثر کے طور پر لیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں کہ حاجت استنجا اور حاجت شہوت جنت میں نہ تھی۔ ان کے بدن پر کپڑے تھے جو کبھی اترتے نہ تھے کیونکہ اتارنے کی حاجت نہ ہوتی تھی۔ آدم و حوا اپنے اعضا سے واقف نہ تھے۔ جب یہ گناہ ہوا تو لوازم بشری پیدا ہوتے اپنی حاجت سے باخبر ہوئے اور اپنے اعضا دیکھے، گویا اس درخت کے کھانے سے جو پردہ انسانی کمزوریوں پر پڑا تھا وہ اٹھ گیا۔ سوآۃ کے لغوی معنے میں بہت وسعت ہے۔ قابیل و ہابیل کے قصہ میں سوآۃ اخیہ فرمایا اور حدیث میں ہے احدی سوأتک یا متدادا اب تک آدم کی نظر میں صرف اپنی سادگی اور معصومیت تھی اور ابلیس کی نظر میں صرف اس کی خلقی کمزوریاں تھیں لیکن اکل شجرہ کے بعد آدم کو اپنی کمزوریاں پیش نظر ہو گئیں اور جب اس غلطی کے بعد توبہ و انابت اختیار کی تو ابلیس لعین کو ان کے اعلیٰ کمال اور انتہائی نجابت و شرافت کا مشاہدہ ہو گیا۔ اس نے سمجھ لیا کہ یہ مخلوق لغزش کھا کر بھی میری مار کھانے والی نہیں ہے۔

ان عبادی لیس لک علیہم سلطان

شاید اسی لحاظ سے ابن قتیبہ صاحب معارف کی نقل کے مطابق اس درخت کو شجرۃ علم الخیر والشر سے موسوم کیا ہے[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

حاصل دونوں کا ایک ہے یعنی عصیان سے جنتی لباس اترا ہو یا درخت کے کھانے سے اترا ہو۔ اگر تعبیر فلما عصیا ربھما بدت لھما سوآتھما ہوتی تو لباس کے اترنے میں عصیان ہی علت مؤثرہ ہوتا لیکن تعبیر فلما ذاقا الشجرۃ بدت لھما آئی ہے اس لیے شجرہ ممنوعہ کا مزہ چکھنا ہی لباس اترنے کی علت ہے اور یہی منطوق قرآنی ہے۔ یہاں خبر نہیں مولانا مودودی نے یہ بات لکھنے کی ضرورت کیوں محسوس کی کہ

یہ گمان کرنے کی کوئی معقول وجہ نہیں کہ شجرہ ممنوعہ کا مزہ چکھتے ہی آدم و حوا کے ستر کا کھل جانا اس درخت کی خاصیت کا نتیجہ تھا۔ درحقیقت یہ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کے سوا کسی اور چیز کا نتیجہ نہ تھا۔

حالانکہ مال دونوں کا ایک ہے درخت کے قریب جانے سے اللہ نے ہی منع فرمایا تھا اور اگر بالفرض درخت میں یہ خاصیت بھی ہو تو یہ بھی خدا کی جانب سے مخفی مقصود تو انسانی زندگی کو ابتلائی بنانا ہے۔

برہنگی پر شرمندگی فطری ہے

۱۶۔ اور باغ کے پتے اوپر تلے رکھ کر چپکانے لگے۔ یعنی برہنہ ہو کر شرمائے اور بدن پتوں سے ڈھانپنے لگے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اگرچہ آدمی پیدائش کے وقت ننگا پیدا ہوتا ہے مگر فطری حیا مانع ہے کہ ننگا رہے[1] لباس کا بنیادی مقصد چونکہ ستر ہے اور اس سے اچانک محرومی کا اولین اثر انسان پر بے پردگی کے احساس کی شکل میں بطور ایک حادثہ کے پڑتا ہے۔ اسی صورت حال کو ظاہر کرنے کے لیے طفقا یخصفان علیھما من ورق الجنۃ کا انداز بیان اختیار فرمایا۔ یعنی آدم و حوا پر اس اچانک حادثہ سے ایسی گھبراہٹ طاری ہوئی کہ جوں ہی ان کو ننگے ہونے کا احساس ہوا تو اسے چھپانے کی فکر لاحق ہوئی اور جو کچھ دستیاب ہوا اسے ہی استعمال کرنے لگے۔ جب کوئی چیز نہ ملی تو باغ کے پتے ہی چپکانے لگے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے اندر شرم و حیا کا جذبہ فطری ہے اور اس کا اولین مظہر وہ شرم ہے جو اپنے جسم کے مخصوص حصوں کو دوسروں کے سامنے کھولنے میں آدمی کو فطرۃً محسوس ہوتی ہے۔ قرآن کی رہنمائی یہ ہے کہ یہ شرم انسان کے اندر تہذیب کے ارتقاء سے مصنوعی طور پر پیدا نہیں ہوئی ہے اور نہ یہ اکتسابی چیز ہے۔ جیسا کہ شیطان کے بعض شاگردوں نے قیاس کیا ہے بلکہ درحقیقت یہ وہ فطری چیز ہے جو اول روز سے انسان میں موجود تھی۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ یہ چیزیں محض عادت کی پیداوار ہیں ان کا یہ خیال قرآن کے خلاف ہے۔ جس طرح توحید فطرت ہے شرک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے۔ اسی طرح حیا فطرت ہے بے حیائی انسان مصنوعی طور پر اختیار کرتا ہے۔ امام رازی نے تفسیر کبیر میں کشف العورۃ قبیح من لدن آدم کہہ کر اس کو واضح کیا ہے۔ قاضی بیضاوی کی یہاں یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ ستر کھولنا خلوت میں اور بیوی کی موجودگی میں بغیر ضرورت کے برا ہے اور لطیف طبائع کے لیے ناقابل برداشت ہے۔

جناب الٰہی میں آدم و حوا کی توبہ

۲۲۔ اس وقت ان کے پروردگار نے فرمایا کیا میں نے تمہیں اس درخت سے نہیں روک دیا تھا اور کیا میں نے تم سے نہیں کہہ دیا تھا کہ شیطان تمہارا کھلا دشمن ہے، ان دونوں نے عرض کیا پروردگار ہم نے اپنا نقصان کیا اگر تو نے ہمارا قصور نہ بخشا اور ہم پر رحم نہ فرمایا تو ہمارے لیے بربادی کے سوا کچھ نہیں۔ یعنی اللہ سبحانہ نے حضرت آدم سے کہا کہ میں نے درخت سے تمہیں روکا تھا اور شیطان کی دشمنی اچھی طرح واضح کر دی تھی۔ اس کا اور اس کی پیروی کرنے والوں کا انجام بھی بتا دیا تھا۔ جب اللہ سبحانہ نے حضرت آدم سے یہ کہا تو حضرت آدم و حوا نے کیا جواب دیا قرآن کہتا ہے کہ دونوں کا جواب یہ تھا ربنا ظلمنا۔۔ الخ یعنی جب دونوں کو ان کے قصور پر تنبیہ کی گئی تو انہوں نے شیطان کی طرح سرکشی نہیں کی بلکہ اپنی غلطی کا احساس کرتے ہوئے وہ نادم ہو گئے اپنے قصور کا اعتراف کر کے معصیت سے طاعت کی طرف پلٹ آئے اور معافی مانگ کر اپنے رب کے دامانِ رحمت میں پناہ ڈھونڈنے لگے اور بول پڑے اے ہمارے رب ہم نے شیطان کے کہے میں لگ کر اور تیری نافرمانی کر کے اپنی جانوں پر ستم کیا۔ اب طاعات کی حدود میں اپنی کمزوری اور بیچارگی کا علم ہو گیا۔ اب اگر آپ نے ہم سے درگزر نہ فرمایا اور آئندہ کے لیے اپنی ہدایت و توفیق کا دروازہ کھول کر ہم پر رحم نہ کیا تو یقیناً ہم تباہ ہو جائیں گے۔ حضرت آدم نے گناہ کے بعد یہ دعا مانگ کر انسانی راہ اور شیطانی راہ میں ایک محسوس اور مرئی حد قائم کر دی۔ شیطانی راہ یہ ہے کہ بندگی و طاعت سے منہ موڑے، خدا کے مقابلے میں سرکشی اختیار کرے متنبہ کیے جانے کے باوجود پورے استکبار کے ساتھ اپنے باغیانہ طرز عمل پر اصرار کیے جاتے اور جو لوگ جادۂ طاعت کے راہرو ہوں ان کو بھی بہکاتے اور معصیت کی راہ پر لانے کی کوشش کرے برخلاف اس کے جو راہ آدم کے لائق وہ یہ ہے کہ اول تو وہ شیطانی اغواء کی مزاحمت کرے اور اپنے اس دشمن کی چالوں کو سمجھنے اور ان سے بچنے کے لیے ہر وقت چوکنا رہے لیکن اگر کبھی اس کا قدم بندگی و طاعت کی راہ سے ہٹ جاتے تو اپنی غلطی کا احساس ہوتے ہی ندامت و شرمساری کے ساتھ فوراً اپنے رب کی طرف پلٹے اور اس قصور کی تلافی کر دے جو اس سے سرزد ہو گیا ہے۔ یہی وہ اصل سبق ہے جو اللہ تعالیٰ اس قصہ سے یہاں دینا چاہتا ہے۔ ذہن نشین رہے

یہ کرانا مقصود ہے کہ جس راہ پر تم لوگ چل رہے ہو یہ شیطان کی راہ ہے۔ یہ تمہارا خدائی ہدایت سے بے نیاز ہو کر شیاطین جن وانس کو اپنا ولی و سرپرست بنانا دراصل خالص شیطانی رویہ ہے۔ تم اپنے ازلی دشمن کے جال میں گرفتار ہو گئے ہو اور اس سے شکست کھا رہے ہو۔ اس کا انجام وہی ہے جس سے شیطان خود دوچار ہونے والا ہے اگر تم حقیقت میں خود اپنے دشمن نہیں ہو گئے ہو تو سنبھلو اور ہوش میں آؤ۔

آدم علیہ السلام کی دوسری زندگی

۱۸۔ فرمایا یہاں سے نکل جاؤ تم ایک دوسرے کے دشمن ہو اب تمہارے لیے زمین میں ٹھکانا ہے اور ایک خاص وقت تک وہاں سامانِ زندگی سے فائدہ اٹھانا ہے اور فرمایا کہ تم اسی میں زندہ رہو گے، اسی میں مرو گے پھر اسی سے مرنے کے بعد نکالے جاؤ گے۔ مفسرین کے نزدیک یہ خطاب آدم و حوا اور ابلیس لعین سب کو ہے کیونکہ اصل عداوت آدم اور ابلیس کی ہے اور اس عداوت کا دنگل ہماری زمین بنائی گئی جس کی خلافت آدم کو سپرد ہوتی تھی[1] یہ خطاب حضرت عبداللہ بن عباس اور بعض دوسرے شارحین قرآن کے نزدیک حضرت آدم و حوا اور ابلیس سے ہے اور ابن زید کی رائے میں آدم اور حوا اور ان کی ذریت سے ہے۔ زیادہ صحیح حضرت عبداللہ بن عباس کا موقف ہے۔ اس کی ایک وجہ تو یہ ہے کہ یہاں پر جو فرمایا بعضکم لبعض عدو تو یہ دشمنی اپنی فطری بنیاد اگر رکھتی ہے تو آدم اور ابلیس ہی کے اندر رکھتی ہے۔ آدم و حوا کے مابین دشمنی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آدم و حوا کے درمیان تو فطری علاقہ الفت و محبت کا ہے۔ اسی طرح اولادِ آدم میں بھی فطری ربط و تعلق اخوت اور بھائی چارے کا ہے۔ ان میں اگر دشمنی اور عداوت ہوتی ہے تو اس کا باعث بھی شیطان ہے۔ شیطان اور آدم کی اس فطری عداوت کا قرآن میں بالتصریح بھی ذکر آیا ہے ارشاد ہے:

ان ھذا عدو لک و لزوجک

یہ ابلیس تمہارا اور تمہاری بیوی کا دشمن ہے

اس کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن حکیم اسی رکوع میں اس بات کی تصریح ہے کہ جس طرح آدم کو جنت سے نکلنے کا حکم ملا تھا اسی طرح ابلیس کو بھی قال فاھبط منھا فما یکون لک ان تتکبر فیھا فاخرج انک من الصاغرین۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ یہاں اس حکم کے ساتھ جمیعاً کا لفظ بطور تاکید آیا ہے۔ اگر یہ خطاب صرف آدم و حوا

[1] افادات شیخ الاسلام

سے مانا جائے تو "پھر جمیعاً" کا لفظ کچھ غیر ضروری ہو جاتا ہے اس لیے یہی صحیح ہے کہ مخاطب آدم و حوا کے ساتھ ابلیس ہے۔

بعضکم لبعض عدو جس مقابلہ کا ابلیس نے چیلنج دیا تھا اس کا میدان دُنیا کو بنا دیا گیا۔ حکمتِ الٰہی کا تقاضا یہی ہے کہ آدم و حوا جنت سے نکلیں اور اس دُنیا میں رہ کر وہ اور ان کی ذریت شیطان اور اس کی ذریت سے مقابلہ کریں۔ پھر اس میدان میں جو شیطان سے بازی لے جائیں وہ اسی جنت کے وارث ٹھہریں۔ گویا مقابلہ تو وہی رہا لیکن میدانِ مقابلہ جنت کی جگہ یہ دُنیا بنا دی گئی۔ اب اس میدان میں آدم و ابلیس کو اتارا ہی دو محارب فریق کی حیثیت سے گیا ہے۔ اس کے بعد ان مراحل کا ذکر کیا ہے جن سے اس دُنیا میں آدم اور اولادِ آدم کو گزرنا ہے فرمایا فیها تحیون و فیها تموتون و منها تخرجون یعنی تمہارا عود مسکن اصلی و معاد بھی زمین ہے اگر خرقِ عادت کے طور پر کوئی شخص کسی وقت ایک معین مدت کے لیے اس سے اوپر اٹھا لیا جائے مثلاً حضرت مسیح علیہ السلام تو وہ اس آیت کے منافی نہیں۔ کیا جو شخص چند روز یا چند گھنٹے کے لیے زمین سے جُدا ہو کر ہوائی جہاز میں مقیم رہا ہو یا فرض کیجیے وہیں مر جائے وہ فیها تحیون و فیها تموتون کے خلاف ہو گا کیونکہ وہ اس وقت زمین میں نہیں ہے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے منها خلقناکم و فیها نعیدکم الخ جو اموات زمین میں مدفون نہ ہوں ان کو فیها نعیدکم میں کیسے داخل کیا جائے گا۔ معلوم ہوا کہ اس قسم کے قضایا کلیہ کے رنگ میں استعمال نہیں ہوتے[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

يٰبَنِيٓ اٰدَمَ قَدْ اَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا يُّوَارِيْ سَوْاٰتِكُمْ وَرِيْشًا ؕ
وَ لِبَاسُ التَّقْوٰى ۙ ذٰلِكَ خَيْرٌ ؕ ذٰلِكَ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ لَعَلَّهُمْ
يَذَّكَّرُوْنَ ﴿۲۶﴾ يٰبَنِيٓ اٰدَمَ لَا يَفْتِنَنَّكُمُ الشَّيْطٰنُ كَمَآ اَخْرَجَ
اَبَوَيْكُمْ مِّنَ الْجَنَّةِ يَنْزِعُ عَنْهُمَا لِبَاسَهُمَا لِيُرِيَهُمَا سَوْاٰتِهِمَا ؕ
اِنَّهٗ يَرٰىكُمْ هُوَ وَقَبِيْلُهٗ مِنْ حَيْثُ لَا تَرَوْنَهُمْ ؕ اِنَّا جَعَلْنَا
الشَّيٰطِيْنَ اَوْلِيَآءَ لِلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۲۷﴾

اے اولادِ آدم ہم نے تمہارے لیے ایسا لباس مہیا کر دیا کہ جو جسم کی ستر پوشی کرتا ہے اور ایسی چیزیں بھی جو زیب و زینت کا ذریعہ ہیں[19]۔ نیز تمہیں پرہیز گاری کی راہ دکھا دی کہ تمام لباسوں میں بہترین لباس ہے[20]۔ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے تاکہ لوگ نصیحت پذیر ہوں[21]۔ اے اولادِ آدم کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اسی طرح بہکا دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو بہکا کر جنت سے نکلوا

دیا تھا اور اُن کے لباس اُتروا دیے تھے کہ اُن کے ستر اُن کو دکھا دے۔[22]

شیطان اور اُس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھتے ہو۔[23] یاد رکھو ہم نے شیطانوں کو ان کا رفیق و مددگار بنا دیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے ہیں۔[24]

انسانی زندگی میں لباس

لباس اور انسان میں فطری تعلق ہے، اور یہ تعلق آغازِ آفرینش سے ہے۔ یہ اپنی نوعیت اور کیفیت کے لحاظ سے مختلف مدارج طے کرتا رہا ہے لیکن نفس ستر پوشی انسانی فطرت کا ہمیشہ سے تقاضا رہا ہے۔ اب جو لباس مختلف قوموں اور ملکوں میں نظر آتا ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ابتدا بھی ایسا ہی ہو لیکن کوئی چیز ضرور تھی جو ستر پوشی اور آرائش کا کام دیتی تھی۔ اسی میں تمدن و تہذیب کی ترقی کے ساتھ ترقی ہوتی رہی ہے۔

ان آیات میں دو قسم کے لباسوں کا ذکر کیا ہے۔ ایک جسمانی اور مادی لباس جو جسم کی پوشش اور حفاظت کا کام کرتا ہے۔ دوسرا لباس تقویٰ جو رُوحِ انسانی اور اخلاقی حفاظت اور آرائش کا کام دیتا ہے۔ یہاں آغاز میں ہی لباس کا خصوصیت سے ذکر اس لیے کیا ہے کہ اس میں انسان کی عقلی زندگی کا سب سے بڑا مظاہرہ تھا جب وہ لباس پہننے لگا تو یہ گویا اس حقیقت کا اعلان ہوا کہ اس کا اخلاقی شعور اُبھر آیا ہے صنعت و اختراع کی راہوں سے آشنا ہو گیا ہے اور عام حیوانی زندگی کی جگہ انسانی زندگی کی خصوصیات نشو و نما پا رہی ہیں۔ لباس کا اوّلین مقصد تو ستر پوشی ہے لیکن زیب و زینت بھی اس کے مقاصد میں داخل ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے جو کچھ بھی پیدا فرمایا ہے اس میں مختلف پہلو رکھے ہیں اور یہ سارے ہی پہلو ہماری فطرت کے تقاضوں کے مطابق ہیں۔ ستر پوشی کے لیے تو لنگوٹی بھی کافی تھی لیکن اللہ سبحانہٗ نے اتمامِ نعمت کے طور پر ہمارے لیے ایسے لباس کا انتظام فرمایا جو ستر پوش بھی ہو، سردی اور گرمی سے بھی ہماری حفاظت کرے اور اس سے ہماری شخصیت، ہمارے وقار ہمارے حسن اور ہماری شان میں بھی اضافہ ہو۔ ان میں سے کوئی مقصد بھی بجائے خود معیوب نہیں ہے البتہ

افراط و تفریط سے جس طرح ہر چیز میں خرابی پیدا ہو جاتی ہے اسی طرح اس میں بھی خرابی پیدا ہو جاتی ہے۔ یہاں قرآن نے زینت کو مقاصد لباس میں داخل کر کے اس راہبانہ اور جوگیانہ تصور کی نفی کر دی جو لباس کو ایک آلائش اور عریانی یا نیم عریانی کو دینی تقدس کا درجہ دیتے ہیں۔

۱۹ ۔ اے اولاد آدم ہم نے تمہارے لیے ایسا لباس مہیا کر دیا کہ جو جسم کی ستر پوشی کرتا ہے اور ایسی چیزیں بھی جو زیب و زینت کا ذریعہ ہیں۔ اتارنے سے مراد اس کا مادہ وغیرہ مہیا کرنا اور اس کے تیار کرنے کی تدبیر بتلانا ہے۔ گو انزال یعنی اتارنے کا لفظ اکثر اس موقعہ پر بولتے ہیں جہاں ایک چیز کو اوپر سے نیچے لایا جاتے مگر بہت دفعہ اس سے مکانی فوق و تحت مراد نہیں ہوتا بلکہ جو مرتبہ کے اعتبار سے اونچا ہو اس کی طرف سے کوئی چیز نیچے والوں کو عطا کیے جانے پر بھی یہ لفظ اطلاق کیا جاتا ہے جیسے فرمایا وانزل لکم من الانعام ثمانیۃ ازواج یا ارشاد ہے وانزلنا الحدید فیہ باس شدید[۱]

یہاں قصہ آدم میں شیطان کی وسوسہ اندازی کے نتیجے میں آدم و حوا کے ستر کھل جانے کا ذکر ہوا ہے۔ جنت میں یہ ستر پوشی اللہ سبحانہ کے انتظام سے تھی بالکل ایسے ہی جیسے تمام مخلوقات کی تکوینی طور پر ہوتی ہے لیکن شیطان کے اغوا کے نتیجے میں خدا کی نافرمانی ہوئی تو تکوینی حالت ہٹ گئی اور تکلیفی حالت رونما ہوئی یعنی خدا کی تکوینی حفاظت ہٹا لی گئی اور تکلیفی حالت کے مطابق ان کے ارادہ و اختیار کے حوالے کر دیا گیا۔ اور عالم تکلیف میں سب سے پہلی جو ہدایت ہوئی وہ قابل شرم حصوں کی پردہ پوشی تھی۔ یعنی انسان کی عقلی زندگی کا سب سے پہلا مظاہرہ اس طرح ہوا کہ وہ لباس پہننے لگا۔ لباس نے گویا حیوانی زندگی سے انسانی زندگی کو سب سے پہلے امتیازی مقام دیا۔ اور اہل عرب انسانی زندگی سے گر کر عام حیوانی زندگی کی سطح پر اس طرح اُگئے تھے کہ اس بارے میں شرم و حیا کا وجود نہ رہا تھا۔ حج کعبہ میں لاکھوں آدمی جمع ہوتے لیکن قریش کے سوا باقی سب مادر زاد ننگے ہو کر کعبہ کا طواف کرتے۔ عورتیں جب ننگی ہو کر طواف کرتیں تو لوگوں سے کہتیں کہ کوئی ہم کو اتنا کپڑا دیتا کہ ستر عورت ہو جاتا، پھر یہ شعر پڑھتیں۔

الیوم یبدو بعضہ او کلہ
قد بدا منہ فلا احلہ

آج بدن کا کچھ حصہ یا سارا حصہ کھلے گا اور جو کچھ بھی کھلا ہے اس سے لطف حلال نہیں ہے
صحیح مسلم میں باب التفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس سے یہ روایت ہے کہ

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

نہاتے وقت اوٹ نہیں کرتے تھے کھلے میدان میں بے پردہ نہاتے ۔

ابوداؤد میں ہے کہ پیشاب پاخانہ کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے اور جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے ۔ اور یہ صرف عربوں ہی کی خصوصیت نہ تھی ، دُنیا کی اکثر قومیں اسی بے حیائی میں مبتلا رہی ہیں اور آج تک ہیں اس لیے آیت میں خطاب تمام انسانوں کے لیے عام ہے اور سارے انسانوں کو متنبہ کیا جارہا ہے کہ دیکھو یہ شیطانی اغوار کی ایک کھلی ہوئی علامت تمہاری زندگی میں موجود ہے ۔ گویا اس آیت میں جس بے حیائی کی طرف اشارہ کیا ہے وہ برہنگی ہے اور جس زینت کے اختیار کرنے کا حکم دیا گیا ہے وہ ستر پوشی ہے ۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ کپڑے سے مقصود ستر پوشی کے علاوہ زیب و زینت بھی ہے ۔ اس آیت کو پڑھ کر ایک لمحہ کے لیے بھی اس وسوسہ کی گنجائش نہیں کہ مغرب کے راہبانہ اور مشرق کے جوگیانہ میلانات کے لیے قرآنی تعلیمات میں کوئی گنجائش پیدا ہو سکتی ہے قد انزلنا علیکم لباسا یواری سوآتکم وریشا کی پکار بتا رہی ہے کہ انسانی زندگی میں لباس کے دو بنیادی مقصد ہیں ایک پوشش دوسرے آرائش، قرآن کے اس حوصلہ پرور ندائے عام سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ اس افسردہ قنوطی پیغام کو کیا مناسبت ہے جس میں غریب انسان کو یہ بتایا جاتا ہے کہ پوشاک اور آرائش تمہارے لیے نہیں ہے ۔ انسانیت کا کمال ارتقاء اسی گریز اور فرار کے ساتھ وابستہ ہے جو ان امور کے متعلق اختیار کیا جائے ۔ حتیٰ کہ اسی بنا پر صرف سُنا نہیں بلکہ دیکھا جارہا ہے کہ کتنوں کے بدن سے کپڑے اتروائے گئے بلکہ کبھی کبھی تو اس جنون نے اس حد تک ترقی کی ہے کہ اسی آدمی کو جو ہوا کے بغیر عام فطری حالت میں غالباً چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتا اسی بیچارے کو حبس دم کے نام سے ہوا میں سانس لینے کے حق سے محروم کر دیا ۔ سوچنے کی بات ہے کہ لباس تو بڑی چیز ہے زندگی کی ضرورت کے لحاظ سے جن کا درجہ اس سے برتر ہے مثلاً سونا چاندی ، نشان زدہ گھوڑے ، مویشی اور کھیتی کے متعلق قرآن کا اعلان ہے ؛

زین للناس حب الشهوات من النساء والبنین والقناطیر المقنطرة من الذهب
والفضة والخیل المسومة والانعام والحرث ۔

سنواری گئی آدمی کے لیے خواہشوں کی چاہ یعنی عورتوں کی اور بیٹوں کی ڈھیروں ڈھیر سونے
اور چاندی کی خوبصورت گھوڑوں کی اور مویشیوں اور کھیتوں کی ۔

یعنی جس قدرت نے انسان اور انسان کی فطرت بنائی ہے اسی نے آدمی کی جبلت میں ان امور کی آرائی پیدائشی طور پر پیدا کی ہے ۔ جیسا کہ لفظ " زین " کے مجہول صیغہ کا اقتضا ہے یعنی ان امور کی پسندیدگی اور ان کے حُب و میلان کو آدمی نے خود اپنے اختیار سے اپنے اندر نہیں پیدا کیا ہے بلکہ پیدا کرنے والے

آدمی کو ان امور کے میلان و حب کے ساتھ پیدا کیا ہے۔ قرآن نے یہاں لباس کے لیے انزال کا لفظ ہی بنانے کے لیے بولا ہے۔ انزلنا کا مادہ نزل ہے نزول کے معنی اترنا اور انزال کے معنے اتارنا ہیں۔ انزال سے مقصود یہاں اولادِ آدم کے لیے لباس کا مادہ روئی اون وغیرہ پیدا کرنا اور اس کی پیدائش کے لیے توہین واعضا اور لباس بنانے کے وسائل فراہم کرنا ہے۔

لباس کا یہ انعام آغازِ آفرینش میں جو کچھ تھا اس کی حیثیت تو بالکل ابتدائی تھی۔ اس دور میں اللہ کے انعامات اس سلسلے میں بے پایاں ہیں۔ اس بے پایانی کا ایک سرسری اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جرمنی میں کپڑے کی صنعت، مشینی آلات کے ذریعہ اتنی ترقی یافتہ ہو چکی ہے کہ ایک زمانے میں قیصر جرمنی کے سامنے ایک دنبہ پیش کیا گیا۔ قیصر کپڑے کا کارخانہ دیکھنے گیا تھا۔ سارے کارخانے کو دیکھ کر جب واپس ہونے لگا تو ایک سلا سلایا سوٹ پیش کیا گیا اور بتایا گیا کہ اسی دنبہ کی اون سے تیار ہوا ہے جو آغاز میں آپ کو دکھایا گیا تھا یعنی صرف دو گھنٹے میں اون اتاری گئی صاف کی گئی، کاتی گئی، کپڑا بنا گیا، سیا گیا اور سوٹ تیار ہو گیا۔ نعمتوں کی فراوانی کے لحاظ سے شکر کی فراوانی بھی ہونی چاہیے۔

تقویٰ انسان کا باطنی لباس ہے

۲۰ - نیز تمہیں پرہیزگاری کی راہ دکھا دی کہ یہ تمام لباسوں سے بہترین لباس ہے۔ یعنی اس ظاہری لباس کے علاوہ جس سے صرف بدن کا تستر یا تزئین ہوتا ہے ایک معنوی پوشاک بھی ہے جسے قرآن نے لباس التقویٰ فرمایا باطن کی زینت و آرائش کا ذریعہ بنتی ہے بلکہ اگر غور کیا جائے تو ظاہری بدنی لباس بھی اس باطنی لباس کو زیب تن کرنے کے لیے شرعاً مطلوب ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ دشمن نے جنت کے کپڑے تم سے اتروائے پھر ہم نے تم کو دنیا میں تدبیر لباس سکھا دی۔ اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیزگاری ہو یعنی مرد ریشمی لباس نہ پہنے اور دامن دراز نہ رکھے اور جو منع ہوا سو نہ کرے اور عورت باریک لباس نہ پہنے کہ لوگوں کو بدن نظر آتے اور اپنی زینت نہ دکھاتے[1] عام شارحین قرآن نے لباس تقویٰ سے معنوی اور مجازی لباس مراد لیا ہے۔ زید بن اسلم کہتے ہیں کہ اس سے مراد اسلام ہے۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ ایمان و عمل صالح ہے اور اس سلسلے میں حضرت عثمان کی ایک تقریر الحسن البصری کے حوالے سے پیش کی گئی ہے

حضرت عثمان نے برسرِ منبر فرمایا لوگو! خلوتوں اور تنہائیوں میں اللہ سبحانہٗ کی نافرمانی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سے بچو، میں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے آپ فرماتے تھے بخدا کوئی شخص کبھی کوئی
عمل خلوت میں نہیں کرتا۔ اللہ تعالیٰ جلوت میں اسی عمل کے مطابق اس کو پوشاک عطا کر دیتا ہے،
اگر خیر ہو تو خیر کی پوشاک دیتا ہے اور اگر شر ہو تو شر کی پوشاک دے دیتا ہے۔ اس کے بعد حضور
نے قرآن کی یہی آیت تلاوت فرمائی۔

اور کچھ نے لباس تقویٰ سے مادی لباس مراد لیا ہے۔ چنانچہ امام زید بن علی بن الحسین نے اس کی تفسیر جنگی لباس سے کی ہے۔ یعنی زرہ، خود اور وہ تمام آلات جو میدان جنگ سپاہی کی حفاظت کا سامان ہوں۔ اور ابو مسلم اصفہانی نے بھی لباس تقویٰ سے لباس مادی مراد لیا ہے۔ بہرحال لباس مجازی ہو یا لباس مادی۔ یہ حقیقت ہے کہ لباس انسان کے لیے کوئی مصنوعی چیز نہیں ہے بلکہ انسان کی فطرت کا ایک اہم مطالبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کے جسم پر حیوانات کی طرح کوئی لباس پیدائشی طور پر نہیں رکھا۔ اسی لیے انسان کو بشر کہا ہے انی خالق بشرا، یعنی انسان کو بشر اس لیے کہتے ہیں کہ دوسرے حیوانات میں تو کسی کی کھال اُون سے ڈھکی ہوتی ہے اور کسی کی بالوں سے مگر انسان کی کھال سب حیوانات کے برخلاف کھلی ہوتی ہے۔ انسان کے جسم پر حیوانات کی طرح پوشش کا کوئی سامان نہیں بلکہ حیا و شرم کا مادہ اس کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اس نے انسان کے اعضائے صنفی کو محض اعضائے صنفی نہیں بلکہ سوآۃ بنایا ہے جس کے معنی عربی زبان میں ایسی چیز کے ہیں جس کے اظہار کو آدمی معیوب سمجھے۔ اس فطری شرم کے تقاضے کو پورا کرنے کے لیے اللہ نے انسان کو لباس کا الہام فرمایا۔ اس لباس کا انسان کے لیے صرف ستر پوشی اور وسیلہ زینت ہونا ہی کافی نہیں ہے بلکہ فی الحقیقت اس معاملہ میں جس بھلائی تک انسان کو پہنچنا چاہیے وہ یہ ہے کہ اس کا لباس تقویٰ کا لباس ہو۔ یعنی پوری طرح ساتر بھی ہو زینت میں بھی حد سے بڑھا ہوا یا آدمی کی حیثیت سے گرا ہوا نہ ہو۔ فخر و غرور اور تکبر و ریا کی شان لیے ہوتے نہ ہو۔ یعنی وہ لباس پہننا چاہیے جو تقویٰ اور پرہیزگاری کا منشا ہو۔ اور جو لباس تقویٰ اور پرہیزگاری کا منشا ہے اس کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زندگی میں قولی اور عملی تفسیر سے ظاہر فرما دیا ہے۔ شاہ عبد القادر محدث دہلوی اس آیت پر ترجمہ قرآن کے حواشی میں لکھتے ہیں:

> اب وہی لباس پہنو جس میں پرہیزگاری ہو۔ مرد ریشمی لباس نہ پہنے اور دامن دراز نہ رکھے اور جو منع ہوا ہے سو نہ کرے اور عورت بہت باریک نہ پہنے کہ لوگوں کو نظر آوے اور اپنی زینت نہ دکھاوے۔

اسلام میں لباس و پوشاک کی حد بندی اس کے سوا کچھ نہیں کی گئی ہے۔ اس حد بندی کی تفصیل احادیث میں اس طرح آئی ہے۔ مردوں کو کسی ضرورت اور مجبوری کے بغیر خالص ریشم کا بنا ہوا کپڑا نہیں پہننا چاہیے

کیونکہ یہ ان ذہنی امراض کی غمازی کرتا ہے جن کی بنا پر مرد زنانہ پن اختیار کرتے ہیں اور وہ اس عیش و تنعم کی زندگی کی یاد تازہ کرتا ہے جو مردوں کی جدو جہد اور محنت کی زندگی کے خلاف ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں بحوالہ انس بن مالک ارشاد ہے کہ:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جو شخص دُنیا میں ریشمی لباس پہنے گا وہ آخرت میں ہرگز نہ پہنے گا۔

ضرورت اور مجبوری کی تشریح یہ ہے کہ جیسے لڑائی میں زرہ کے نیچے ریشمی کپڑے پہنتے ہیں تاکہ لوہے کی کڑیاں بدن پر اثر انداز نہ ہوں یا کسی کے بدن میں کھجلی ہو تو سوتی کپڑے کے کھردرے پن سے بدن کے چھل جانے کا اندیشہ ہوتا ہے اس لیے ان دونوں جگہوں میں ریشمی کپڑے پہن سکتے ہیں۔ محدثین کی ایک جماعت نے حضرت انس کے حوالہ سے یہ ارشادِ نبوت نقل کیا ہے:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عبدالرحمن بن عوف اور حضرت زبیر کو خارش کی وجہ سے ریشمی کپڑا پہننے کی اجازت دی۔

اور اگر کوئی دو چار انگل کی ریشم کی دھجی کپڑے میں لگالے تو اس کی بھی اجازت ہے۔ صحیح مسلم میں بحوالہ عمرؓ یہ اجازت حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے:

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انگشت تین یا چار انگشت کی مقدار سے زیادہ ریشمی کپڑے کے استعمال سے منع کیا ہے۔

اسی طرح مردوں کے لیے عورتوں کی سی پوشاک اور عورتوں کے لیے مردوں جیسی پوشاک پہننا جائز نہیں ہے کیونکہ اس سے دونوں کی اخلاقی تنگ دامانی کی کھلی شہادت ملتی ہے۔ مسند امام احمد اور سنن ابی داؤد میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ان عورتوں پر جو مردوں کے لباس کی مشابہت کریں اور ان مردوں پر جو عورتوں کے لباس کی نقالی کریں لعنت فرمائی ہے۔

عربوں میں لباس کا دامن اتنا لمبا یا تہبند اتنا نیچا ہوتا کہ وہ زمین پر گھسٹتا ہوا چلے بڑائی کی نشانی سمجھی جاتی تھی۔ ان کے بڑے بڑے امراء اور رئیس اتنے ہی لمبے دامن رکھتے تھے اور اتنا ہی نیچا ازار پہنتے تھے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے لباس التقویٰ کی رُوح کے خلاف سمجھ کر منع فرمایا۔ امام بخاری اور امام مسلم حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ:

جو کوئی اپنا ازار فخر و غرور اور بڑائی کے اظہار کے لیے گھسیٹ کر چلے گا اللہ تعالیٰ اس کی طرف قیامت کے دن نظر نہیں کرے گا۔

اسی لیے مرد کو پاجامہ کی مہریں اور تہبند کو اتنا نیچا نہیں کرنا چاہیے کہ ٹخنے چھپ جائیں بلکہ آپ نے پسند فرمایا ہے کہ پاتے جامہ اور ازار نصف ساق تک ورنہ کم از کم ٹخنوں سے اونچا رہے فرمایا ازار نیچے لٹکانا غرور کی نشانی ہے اور خدا غرور کو پسند نہیں کرتا۔ تکبر نہ ہونا اور تواضع اختیار کرنا ہی متقیانہ سیرت ہے۔

لباس تقویٰ ہی کے پیش نظر مرد اور عورت کو ایسا باریک کپڑا نہ پہننا چاہیے جس سے ستر دکھائی دے۔ عورتوں کے لیے خصوصیت سے آپ نے فرمایا،

بہت سی پہننے والیاں ننگی عورتوں کے حکم میں ہیں جو خود مائل ہوتی ہیں، دوسروں کو مائل کرتی ہیں ایسی عورتیں جنت میں داخل نہ ہوں گی اور نہ وہ جنت کی بو پائیں گی۔

ایسا کپڑا پہننا جس سے پوری ستر پوشی نہ ہو یعنی اس سے ستر کے پورے حدود نہ چھپیں جائز نہیں۔ ایک دفعہ حضرت عائشہ کی بڑی بہن حضرت اسماء کوئی ایسا ہی باریک کپڑا پہن کر حضور کے سامنے آئیں تو آپ نے فرمایا اے اسماء جب عورت جوان ہوجائے تو اس کو چہرہ اور ہتھیلیوں کی طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ ان کے سوا کھولنا جائز نہیں ہے۔

لباس تقویٰ ہی کی روح کو پیش نظر مردوں کے لیے شوخ رنگ خصوصاً سرخ رنگ کے کپڑے پہننے ناپسند فرماتے ہیں۔ صحیح مسلم میں ہے حضرت عبداللہ بن عمرو کہتے ہیں کہ حضور انور نے مجھے دو سرخ رنگ کے کپڑے پہنے دیکھا۔ آپ نے فرمایا کہ یہ کافروں کا پہناوا ہے یہ نہ پہنا کرو۔ اگرچہ علما نے اسے کراہت تنزیہی بتایا ہے۔ یہ بھی اس وقت جبکہ کپڑے سرخ ہوں لیکن سرخ دھاری والے ہوں تو جائز ہیں۔ سرخ دھاریوں کی چادر آپ نے خود پہنی ہے۔ زرد رنگ کے کپڑے پہنے جا سکتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم زرد رنگ کا پورا لباس کبھی پہنتے تھے۔ سبز رنگ کی چادر بھی آپ نے اوڑھی ہے اور اس رنگ کا تہبند بھی آپ نے باندھا ہے۔ سیاہ رنگ کا عمامہ بھی زیب سر فرمایا۔ البتہ زعفرانی رنگ کو آپ نے مردوں کے لیے پسند نہیں فرمایا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے سونے کی انگوٹھی، ریشمیں کپڑا پہننے سے، رکوع و سجود میں قرآن کی تلاوت سے اور زعفران کے رنگے ہوتے کپڑا پہننے سے منع فرمایا ہے۔

بہرحال ظاہری لباس کے ساتھ ایک باطنی لباس بھی انسان کو عطا ہوا ہے اور وہ تقویٰ کا لباس ہے۔ درحقیقت یہ تقویٰ کا لباس ہی ہے جو ظاہری لباس کی بھی حقیقی افادیت کو نمایاں کرتا ہے بلکہ سچ پوچھیے تو آدمی اس ظاہری لباس کو اختیار ہی اپنے اس باطنی لباس کی تحریک سے کرتا ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو آدمی کپڑے پہن کر بھی ننگا رہتا ہے۔ یہ لباس تقویٰ خشیت الٰہی اور احساس عبدیت سے بنتا ہے اور جس کی قامت پر اللہ اپنی مہربانی اور عنایت کی یہ پوشاک ڈال دیتا ہے دیکھنے کے قابل اسی کا وقار اور جمال ہوتا ہے یہ انسانوں کی صورت

ہیں مقدس فرشتہ ہوتا ہے جو بھی اسے دیکھتا ہے ما ھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم کا نعرہ لگاتا ہے۔

لباس بھی اللہ کی نشانیوں میں سے ہے

۲۱- یہ اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے تاکہ لوگ نصیحت یاب ہوں۔ یعنی ان نشانات میں غور کرکے حق تعالیٰ کے قادرانہ انعام واکرام کے معترف اور شکر گزار ہوں[1] ذالک کا مشار الیہ انزال لباس ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لباس کا معاملہ بھی اللہ کی ان بے شمار نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے۔ جو دُنیا میں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ اور حقیقت تک پہنچنے میں انسان کی مدد کرتی ہیں بشرطیکہ انسان خود ان سے سبق لینا چاہے۔ اوپر جن حقائق پر ہم نے اشارہ کیا ہے انہیں اگر تامل کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ بات بآسانی سمجھ میں آسکتی ہے کہ لباس کس حیثیت سے اللہ تعالیٰ کا ایک اہم نشان ہے۔

اس فقرے میں خاص طور پر قریش کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ لباس اللہ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہے ننگے ہو کر عبادت کرنا اور اسے بطور فیشن اپنانا اللہ کی نعمت کی بہت بڑی ناقدری ہے۔ علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ آدم وحوا کے کشف ستر اور پھر پتوں سے پردہ پوشی کے ذکر کے بعد یہ فقرہ یہ بتانے کے لیے آیا ہے کہ لباس کی تخلیق اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے اور جیسے ستر پوشی میں انسانی عظمت کا راز اور تقویٰ کا بلند مقام ہے ٹھیک اسی طرح بے پردگی اور عریانی میں انسانی شرف کی پامالی اور سیرت کی بہت بڑی رسوائی ہے۔ اور اس میں اشارہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے انسان کو جیسے دُنیاوی نعمتوں سے بھی مالا مال کیا ہے ایسے ہی دین کی نعمت سے بھی سرفراز کیا ہے۔ لباس مادی اگر کرتہ پاجامہ اور چادر ہے تو لباس تقویٰ ایمان اور عمل صالح ہے۔ دونوں نعمتوں میں ہم آہنگی پیدا کرکے بتا دیا ہے کہ انسان کی کامیابی کا راز دونوں کی یکجائی میں ہے۔

شیطان سے بچنے کی ہدایت

۲۲- اے اولادِ آدم کہیں ایسا نہ ہو کہ شیطان تمہیں اس طرح بہکا دے جس طرح تمہارے ماں باپ کو بہکا کر جنت سے نکلوا دیا تھا۔ اور ان کے لباس اتروا دیے تھے کہ ان کے ستر ان کو دکھا دے۔ اخراج ونزع کی اضافت ان کے سبب کی طرف کی گئی ہے۔ یعنی آدم وحوا کو جنت سے علیحدہ کرنے اور کپڑے اتارے جانے کا سبب وہ ہوا اب تم اس کے فریب میں مت آؤ اور اس کی مکاریوں سے ہوشیار رہو[2]

[1] افادات شیخ الاسلام

یا بنی آدم کا خطاب یہاں بتکرار آیا ہے۔ یہاں اس خطاب میں خاص معنویت ہے۔ اس میں بتا دیا ہے کہ آدم کا غیور و با وفا فرزند قرآن کی ان آیات کو سنے گا تو اس کی رگ رگ شیطان کے خلاف جوش حمیت و غیرت سے بھڑک اٹھے گی۔ یہ صرف بے غیرت ہی اولاد ہو سکتی ہے جو اس خطاب کے باوجود بھی ٹس سے مس نہ ہو گی۔

فتنہ کے معنے امتحان اور آزمائش کے آتے ہیں۔ سونار سونے اور چاندی کو کٹھالی میں رکھ کر کھوٹ معلوم کرتا ہے اس کو فتن الصائغ بولتے ہیں اسی سے اس کسوٹی کو فتانہ کہتے ہیں جس پر رگڑ کر سونے کا کھرا یا کھوٹا ہونا معلوم کیا جاتا ہے۔ لا یفتننکم کا مطلب یہ ہے کہ تم نہ اپنے سے غافل ہوا اور نہ شیطان کی وسوسہ اندازی سے بے خبر نہیں کس وقت اس کا داؤ تم پر چل جاتے اور وسوسہ اندازی کرکے تم کو جادۂ حق سے ہٹا دے جیسا کہ اس سے پہلے تمہارے والدین آدم و حوا کو ہٹا چکا ہے۔ اس کی وسوسہ اندازی ہی آدم و حوا کے جنت سے نکلنے کا سبب بنی۔ تمہیں خبردار رہنا چاہیے بلاشبہ وہ فتنہ جو مفتون کو دخول جنت سے محروم کرتا ہے اس فتنہ کے مقابلہ ہیچ اور معمولی ہے جو مفتون کو جنت سے نکالنے کا باعث بنا ہے۔

دراصل اس آیت میں قرآن نہایت بلیغ انداز میں اولادِ آدم کو بتا رہا ہے کہ اس جنت کو حاصل کرنے کی کوشش کرو جس میں اللہ نے تمہارے والدین کو جگہ دی تھی۔ عام طور پر یہ سمجھا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو جس جنت میں رکھا تھا وہ پہلے ان کو اور ان کی اولاد کو ہمیشہ کے لیے دے دی گئی تھی۔ مگر چونکہ ان سے اتفاقاً گناہ ہو گیا تھا اس لیے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیے گئے مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے۔ آدم کا زمین پر آنا ان کی پیدائش سے پہلے مقدر ہو چکا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تخلیق سے پہلے فرشتوں پر ظاہر کر دیا تھا انی جاعل فی الارض خلیفۃ حضرت آدم کا زمین میں خلیفہ ہونا ان کے زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیش گوئی ہے مگر زمین میں رکھنے سے پہلے ان کو جنت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں روانہ کرنا یہ اشارہ رکھتا ہے کہ آدم اور ان کی نسل کی اصلی جگہ یہی جنت ہے مگر اس سے دوری ان کے گناہ کی وجہ سے ہے اور اس گناہ کا سبب شیطان بنا ہے۔ اور اس جنت کا حصول شیطان کی فتنہ گری اور وسوسہ اندازی سے بچ کر خدا کی اطاعت کے ذریعہ ہو گا۔ یہاں قرآن نے صرف یہ ہی نہیں بتایا کہ شیطان کی وسوسہ اندازی نے آدم و حوا کو جنت سے نکلوایا بلکہ ان حالات کی تصویر بھی پیش کی جن میں دونوں کا جنت سے اخراج ہوا۔ فرمایا ینزع عنہما لباسہما لیریہما سوآتہما یعنی ان دونوں کو جنت سے اس حال میں نکالا کہ ان کا لباس اتار لیا تھا اور اس کے نتیجے میں ان کی برہنگی ظاہر ہو گئی تھی۔ سمجھ میں یوں ہی آتا ہے کہ زمین پر آنے کے بعد دونوں برہنگی کی حالت میں زندگی گزار رہے تھے حتیٰ کہ حضرت آدم کے بارے میں اللہ کی جانب سے ہدایت ہوتی۔ گویا یہ آدم کی مدنیت کا آغاز ہوا۔ جنت میں جن چار چیزوں کی ضمانت دی گئی تھی

وہ یہ تھیں:

ان لک الا تجوع فیھا	تو بھوکا نہ رہے گا
ولا تعری	تو ننگا نہ رہے گا
وانک لا تظمؤ فیھا	تو پیاسا نہ رہے گا
ولا تضحٰی	تو دھوپ میں نہ رہے گا۔

یعنی کھانے کے لیے روٹی، پہننے کے لیے کپڑا، پینے کے لیے پانی اور رہائش کے لیے مکان۔ آدم جنّت سے نکلے توان کو بھوک بھی لگی پیاس بھی معلوم ہوئی ننگے بھی ہوئے اور دھوپ کی تپش بھی ہوئی۔ یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں۔ ان ہی کو اس نے اپنی ہوا و ہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالم پیدا کر لیا۔ جس کے مہیا کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی موجودہ زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کر کے اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہیں سے شریعت کی تکلیف عائد ہوئی۔ بتانا یہ ہے کہ اب جبکہ تمہیں شیطان کی موروثی عداوت کا حال بخوبی معلوم ہو گیا ایسے اعمال ہرگز نہ کرنا جس کے نتیجے میں جنت کی وراثت سے محروم ہو جاؤ، آگے اس کی علت بتائی ہے۔

شیطان کی فتنہ سامانی

۲۷۔ شیطان اور اس کا گروہ تمہیں اس طرح دیکھتا ہے کہ تم اسے نہیں دیکھتے ہو یعنی جو دشمن ہم کو اس طرح دیکھ رہا ہو کہ ہماری نظر اس پر نہ پڑے اس کا حملہ سخت خطرناک اور مدافعت سخت دشوار ہوتی ہے۔ اس لیے تم کو بہت مستعد و بیدار رہنا چاہیے۔ ایسے دشمن کا علاج ہی یہ ہے کہ ہم کسی ایسی ہستی کی پناہ میں آئیں جو اسے دیکھتی ہے پر وہ اسے نہیں دیکھتا۔ لا تدرکہ الابصار وھو یدرک الابصار وھو اللطیف الخبیر۔[1]

انسان صرف روح یا صرف جسم نہیں بلکہ روح و جسم دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ جسم انسانی کے لیے بھی بیماریاں ہیں اور روح انسانی کے لیے بھی امراض ہیں۔ جسم انسانی کے امراض کی تولید اگر جراثیم سے ہوتی ہے تو روحِ انسانی کی بیماریاں شیاطین سے پروان چڑھتی ہیں۔ جیسے اجسامِ انسانی کو جراثیم خراب کرتے ہیں ایسے ہی روحِ انسانی کو شیاطین تباہ کرتے ہیں۔ اگر شیاطین بھی جراثیم کی طرح خوردبین کے ذریعے ایسے ہی نظر آجاتے جیسے اطبا کو جراثیم کا مشاہدہ ہو جاتا ہے تو انسان خود بغیر کسی وصیت کے ان سے بچ جاتے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

لیکن یہاں قرآن نے بتایا ہے کہ شیاطین عام انسانی نگاہ کی گرفت میں نہیں آتے اس لیے ان سے بچنا ناگزیر ہے جسم کی حد تک جیسے جراثیم سے محفوظ رہنے کے دو طریقے ہیں ایک یہ کہ ان اسباب کو اپنایا جائے جن سے جسم انسانی جراثیم سے محفوظ رہے دوسرے یہ کہ اچھی غذاؤں اور بدن کی صفائی کے ذریعے اتنی جسمانی طاقت فراہم کر لی جائے کہ خود مدافعت کر سکے۔ ٹھیک اسی طرح روح انسانی کو شیاطین کی دستبرد سے بچانے کے لیے اطباء روحانی کے ماہرین کی رائے پر عمل کیا جائے۔ ان سے بچنے کے بھی دو طریقے ہیں۔ ایک یہ کہ روح کو ایمان باللہ ایمان بصفات اللہ، عبادت مناجات اور اخلاص و انابت کے ذریعے اتنا طاقتور بنا دیا جائے کہ شیاطین کی مدافعت کر سکے، دوسرے یہ کہ ذکر الہٰی، توبہ و استغفار کے ذریعے شیاطین کا مداوا کیا جائے۔ خواطر اور ہواجس شیطانی کی مدافعت میں ذکر اللہ ایک بہت ہی موثر طاقت ہے۔ صحیح حدیث میں آیا ہے اذا ذکر اللّٰہ خنس آدمی جب اللہ کو یاد کرتا ہے تو شیطان پیچھے سرک جاتا ہے۔

کچھ علماء نے اس آیت سے استدلال کیا ہے کہ انسانوں کے لیے جنات کا دیکھنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن دوسرے علماء کو ان کے اس موقف سے اتفاق نہیں ہے۔ یہ علماء اہل السنہ ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے۔ مولانا عثمانی فرماتے ہیں:

> انہ یراکم ھو وقبیلہ من حیث لا ترونھم قضیہ مطلقہ ہے۔ دائمہ نہیں ہے۔ یعنی بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ وہ ہم کو دیکھتے ہیں اور ہم ان کو نہیں دیکھتے۔ اس کہنے سے یہ لازم نہیں آتا کہ کسی وقت بھی کوئی شخص کسی صورت میں ان کو نہ دیکھ سکے۔ پس آیت سے رویت جن کی بالکلیہ نفی پر استدلال کرنا کوتاہ نظری ہے۔

اور مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں:

> مطلب اس کا یہ ہے کہ انسان کا جنات کو دیکھنا عادت فاشیہ و شائعہ کے خلاف ہے اور دیکھنے کی قطعاً نفی نہیں ہے۔ بس بعض اوقات بعض انبیاء علیہم السلام کا یا غیر انبیاء کا خواص یا عوام سے جنات کو دیکھنا اس آیت کے خلاف نہیں ہے۔

قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی، علامہ قرطبی نے یہی موقف اختیار کیا ہے لہٰذا صحیح یہی ہے کہ جنوں کی رویت ممکن ہے۔ احادیث میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جنوں کو دیکھا ہے۔ اور زکوٰۃ رمضان کی نگرانی کے قصہ میں ہے کہ حضرت ابو ہریرہ نے ایک جن کو پکڑ لیا۔ اور صحیح مسلم میں ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ آج رات میری نماز قطع کرنے کے لیے میرے پاس ایک سرکش جن آگیا۔ اگر میرے بھائی سلیمان علیہ السلام کی دعا نہ ہوتی تو میں اسے پکڑ کر مسجد کے ستون سے باندھ دیتا اور صبح کو مدینے کے

بچے اس سے کھیلتے۔ نیز یہ بھی ثابت ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود نے نصیبین کے جنوں کو دیکھا ہے۔ اب رہا امام شافعی کا یہ فرمانا کہ جو شخص جنات کی رویت کا دعویٰ کرے اس کی شہادت مردود ہے تو اس سے امام شافعی کا مطلب یہ ہے کہ جو شخص ان کو اپنی اصلی شکل میں دیکھنے کا دعویٰ کرے۔

بے ایمانوں کے لیے شیاطین کی ولایت

۲۷۔ یاد رکھو ہم نے شیاطین کو ان لوگوں کا رفیق بنا دیا ہے جو ایمان نہیں رکھتے ہیں۔ یعنی جب انہوں نے اپنی بے ایمانی سے خود شیاطین کی رفاقت کو اپنے لیے پسند کر لیا جیسا کہ چند آیات کے بعد آ رہا ہے:

انھم اتخذوا الشیاطین اولیاء من دون اللہ ویحسبون انھم مھتدون۔

تو ہم نے بھی ان کے اس انتخاب میں کوئی مزاحمت نہیں کی جس کو انہوں نے اپنا رفیق بنانا چاہا اسی کو رفیق بنا دیا گیا[1]

آیت میں قانون یہ بتایا گیا ہے کہ شیاطین ان ہی لوگوں کے رفیق بنائے جاتے ہیں جو ایمان سے تہی دامن ہوتے ہیں۔ یعنی شیطانوں کو دست اندازی کا موقعہ وہاں ملتا ہے جہاں ایمان کا فقدان ہوتا ہے بے ایمانی اور کفر میں شیطان کی رفاقت قبول کرنے کی پوری پوری صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کی مثال مادی دنیا میں یہ ہے کہ جراثیم کا اثر بیماریوں کے لیے وہ جسم قبول کرتے ہیں جن میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو ان اسباب سے نہیں بچتے جو بیماریاں پھیلاتے ہیں، ایسے ہی شیاطین ان ہی روحوں پر دسترس رکھتے ہیں جو ایمان سے کورے ہوتے ہیں۔ ایمان سے کورے ہونے تہی دامن ہونے اور محروم ہونے کا مطلب یہ ہے جو انبیاءؑ کی رہنمائی کو قبول نہیں کرتے اور خدا پر یقین نہیں رکھتے۔ شیطان کی دستبرد سے محفوظ رہنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ نبوت کی رہنمائی قبول کی جائے اور زندگی میں اسی کی پیروی کی جائے۔ اگر ایسا ہوگا تو قرآن نے لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون کی ضمانت دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ شیاطین کو مسلط ہونے کا موقع انہی پر دیتا ہے جو خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے محروم ہوتے ہیں۔ ان کے دل خالی گھر کے مانند ہوتے ہیں اس وجہ سے شیطان ان میں ڈیرہ جما لیتا ہے۔

خانہ خالی را دیو مے گیرد

اس کے برعکس جن کے دل خدا اور اس کی ہدایت پر ایمان سے آباد ہوتے ہیں۔ ان کے اندر شیاطین

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کو گھسنے کا موقع نہیں ملتا - یہی بات دوسری جگہ اس انداز میں فرمائی ہے -

ومن یعش عن ذکر الرحمان نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین

اور جو آنکھیں چراتا ہے رحمان کی یاد سے تو ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں - پھر وہی اس کا ساتھی بن جاتا ہے -

یہ قانون سب کے لیے ہے اور ذکر الرحمان سے اعراض کی سزا شیطانی تسلط کی صورت میں سب کو بھگتنی پڑتی ہے دولت مند ہوں یا غریب حاکم ہوں یا محکوم اس جرم کا ارتکاب اگر غریبوں کی طرف سے یا عام شہریوں کی طرف سے ہوگا تو اس قدرتی تازیانے سے وہ بھی ایسے ہی محفوظ نہ ہوں جیسے امیر لوگ اور حکمران طبقہ - مطلب یہ ہے کہ نبوت اور ایمان کی راہ سے ہٹ کر جو بھی چلنا چاہے گا - دُکھ کے ساتھ اسے واپس ہونا پڑے گا - آج نہیں تو کل اسے پچھتانا پڑے گا - ایک کانٹا نکلے گا تو دس کانٹے چبھیں گے - اگر ایک گرہ کھلے گی تو کھل کر دہی بیسیوں گرہوں کی صورت اختیار کرے گی - عارف رومی نے اپنے تمثیلی بیان میں اسی مضمون کو کتنے اچھے پیرائے میں ادا فرمایا ہے -

کس بزیر دم خر خارے نہد　　　خر نداند دفع او برمی جہد

ایک شخص کسی گدھے کی دم کے نیچے کانٹا چبھا دیتا ہے گدھا کانٹا نکالنے کی تدبیر سے چونکہ ناواقف ہے اس لیے کودتا پھاندتا پھرتا ہے -

می جہد آں خار محکم تر زند　　　عاقلے باید کہ آں خارش کند

کودتا ہے اور کانٹا اور زیادہ چبھتا جاتا ہے - ضرورت کسی عقل والے کی ہے جو اس کانٹے کو اندر سے نکال دے -

خر ز بہر دفع خار از سوز و درد　　　جفتہ می انداخت صد جا زخم کرد

گدھا کانٹے کو نکالنے کے لیے جلن اور درد کے مارے رگڑوں پر رگڑے لگا کر سینکڑوں جگہ زخم پیدا کر لیتا ہے -

آج دُنیا اسی حال میں مبتلا ہے - پرستش کے معاملہ میں بھی اور بندگی کی راہ میں بھی شیاطین ان ہی دوراہوں پر شب خون مارتے ہیں -

وَإِذَا فَعَلُوا فَاحِشَةً قَالُوا وَجَدْنَا عَلَيْهَا آبَاءَنَا وَاللَّهُ أَمَرَنَا
بِهَا ۗ قُلْ إِنَّ اللَّهَ لَا يَأْمُرُ بِالْفَحْشَاءِ ۖ أَتَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٨﴾ قُلْ أَمَرَ رَبِّي بِالْقِسْطِ ۖ وَأَقِيمُوا
وُجُوهَكُمْ عِندَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَادْعُوهُ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ
كَمَا بَدَأَكُمْ تَعُودُونَ ﴿٢٩﴾ فَرِيقًا هَدَىٰ وَفَرِيقًا حَقَّ عَلَيْهِمُ
الضَّلَالَةُ ۗ إِنَّهُمُ اتَّخَذُوا الشَّيَاطِينَ أَوْلِيَاءَ مِن دُونِ اللَّهِ
وَيَحْسَبُونَ أَنَّهُم مُّهْتَدُونَ ﴿٣٠﴾

اور یہ لوگ جب کسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور خدا نے ہمیں ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے[۲۵]۔ اے پیغمبر فرما دیجئے کہ خدا کبھی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دیتا۔ کیا تم خدا کے نام پر ایسی بات کہنے کی جرأت کرتے ہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں

ہے[۲۶]۔ فرما دیجئے میرے پروردگار نے جو کچھ حکم دیا ہے وہ تو یہ ہے کہ ہر بات میں راہِ اعتدال کو اپناؤ[۲۷]۔ اپنی تمام عبادتوں میں خدا کی طرف توجہ ٹھیک رکھو اور حکم برداری میں اسی کے ہو کر اس کو پکارو[۲۸]۔ جب اس نے تم کو پہلی بار بنایا ہے اسی طرح دوسری بار بنو گے[۲۹]۔ دو گروہ ہیں ایک گروہ کو اس نے راہِ حق دکھائی اور ایک گروہ پر گمراہی و بے راہ روی ثابت ہو گئی کیونکہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیاطین کو اپنا رفیق بنا لیا اور سمجھتے ہیں کہ راہِ راست پر ہیں[۳۰]۔

گمراہی کا سب سے بڑا سرچشمہ

اس آیت میں خود ساختہ گمراہیوں کا اصلی سبب بتایا ہے اور متنبہ کیا کہ برائیوں کا سارا سرچشمہ اپنے بڑوں کی تقلید ہے۔ اگرچہ شارحینِ قرآن نے یہاں فاحشہ سے مراد مشرکین کا بیت اللہ کا ننگے طواف کرنا بتائی ہے۔ لفظ فاحشہ عام ہے۔ یہ لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے معنے حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے معنے لازمی قبح یعنی برائی کے ہیں کیونکہ جس چیز کی جو حد خالقِ فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا قبح یعنی برائی ہے یا یہ کہ جو برائی حد سے زیادہ ہو جاتے وہ فاحشہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حدیں مقرر کر دی ہیں اب جو ان حدوں سے آگے نکل جاتا ہے وہ فاحشہ کا مرتکب ہے۔ زنا کو بھی اسی لیے فاحشہ کہا گیا ہے اور وسعت سے اس کا اطلاق ہر فحش گوئی فحش کاری پر ہوتا ہے جس کی ہر نوع سے اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو باز رہنے کی تاکید کی ہے۔ قرآن فاحشہ کو نکرہ لے کر آیا ہے

یعنی کوئی بے حیائی کا کام، خواہ اس کا تعلق کسی سے ہو۔ یہاں یہ جتانا ہے کہ بُرائی کرنا اور بزرگوں کے نام سے کرنا اور پھر یہ کہنا کہ اللہ نے ہی ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ اس جُرم کی شناعت اور سنگینی کو دو بالا کرتا ہے۔ انسانی طبیعت کی یہ بہت بڑی کمزوری ہے کہ جب ایک برائی کرتی ہے اور اس کے پاس اس کے جواز کے لیے دلیل کی کوئی طاقت نہیں ہوتی ہے تو وہ ایسے موقعہ پر بزرگوں کا سہارا تلاش کرتا ہے اور بزرگوں کی عقیدت کا بوجھ اس قدر ہوتا ہے کہ اس کو امرالٰہی بتانے لگتا ہے۔ یہ ایک جاہلانہ حربہ ہے جسے لوگ حق کے خلاف استعمال کرتے ہیں قرآن نے ان آیات میں اسی جاہلانہ موقف پر ضرب کاری لگائی ہے۔ بزرگوں کی تقلید کا موقف اس قدر لچر اور بیہودہ ہے کہ قرآن نے یہاں صراحتاً اس کے متعلق کچھ کہنا بھی گوارا نہیں کیا بلکہ اس عمارت کو ڈھایا جو اس اساس پر کھڑی کی گئی تھی اور فرمایا ان اللّٰہ لا یامر بالفحشاء جو کام فحش ہے اور جسے تم خود بھی جانتے ہو کہ یہ فحش ہے اس کے متعلق یہ تصور کتنی بڑی دیدہ دلیری ہے کہ خدا نے اس کا حکم دیا ہوگا۔ کسی فحش کام خدا کی طرف سے ہرگز نہیں ہو سکتا۔

۲۵۔ اور یہ لوگ جب کسی بے حیائی کا ارتکاب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادوں کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے اور خدا نے ہمیں ایسا ہی کرنے کا حکم دیا ہے۔ یہاں فاحشہ سے مراد وہ عبادات ہیں جو انہوں نے از خود ایجاد کر رکھی تھیں۔ مثلاً ننگے ہو کر بیت اللہ کا طواف کرنا۔ اس آیت میں مشرکین کے اپنی بے حیائی اور بدکاری پر قائم رہنے کے لیے دو عذر بیان کیے گئے ہیں۔ ایک یہ کہ ہم نے اپنے بڑوں کو ایسا ہی کرتے پایا ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں اس کا حکم دیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مشرکین مکہ بیت اللہ کے طواف کو ننگا کرنے کے جواز اور وجوب کے لیے دو قسم کے سہارے پیش کرتے۔ ایک سہارا تو یہی تھا کہ باپ دادا کی ریت ہے اور دوسرا یہ کہ اسے حکم شریعت سمجھتے تھے۔ اگرچہ قریش خود تو اپنے آپ کو اس سے بالاتر رکھے ہوئے تھے لیکن دوسروں کے لیے مرد ہوں یا عورت انہوں نے اس عریانی کو عبادت قرار دے رکھا تھا۔ ان کا فتویٰ یہ تھا کہ قریش سے باہر کے عرب اپنے کپڑوں میں خانہ کعبہ کا طواف نہ کریں۔ یا تو وہ قریش سے اس کام کے لیے کپڑے مستعار لیں ورنہ ننگے طواف کریں۔ گویا دوسروں کے کپڑے آلائش دُنیا اور زینت دُنیا میں داخل ہیں جس سے اس عبادت کی حرمت کو بٹہ لگتا۔ اس بدعت کا نتیجہ یہ ہوا کہ طواف جیسی مقدس عبادت فساق و فجار کی نظر بازیوں اور شرارتوں کی جولانگاہ بن گئی۔ اور حرم میں نظر بازیوں کی لذیذ و رنگین داستانیں ان کی فاسقانہ شاعری میں بھی نمایاں ہوگئیں۔ اللہ اکبر عقل انسانی حیران رہ جاتی ہے کہ کس کامیابی کے ساتھ شیطان نے حرم میں گھسنے کے لیے کیسا مقدس مذہبی لبادہ اختیار کیا اور کس کامیابی کے ساتھ اس نے اللہ کی سب سے بڑی عبادت کو اپنی عبادت میں تبدیل کر دیا۔ یہ اسی طرح کی عیاشی اور نفس پروری کی ایک

مگر وہ شکل تھی جس کی بے شمار مثالیں مزارات پر آپ دیکھتے ہیں۔ عورتوں اور مردوں کا اختلاط، رقص و سرود کی محافل کا انعقاد وغیرہ وغیرہ۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی۔

حکمِ الٰہی کی پہچان کا معیار

۲۶ – اے پیغمبر فرما دیجئے کہ خدا کبھی بے حیائی کی باتوں کا حکم نہیں دیتا کیا تم خدا کے نام پر ایسی بات کہنے کی جرأت کرتے ہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے۔ پہلے سُن چکے ہو کہ مشرکین اپنی بے حیائی اور بدکاری کے جواز کے لیے دو عذر پیش کرتے تھے ایک آبائی تقلید دوسرے یہ کہ اللہ نے ان کو ایسا کرنے کا حکم دیا ہے۔ پہلا عذر چونکہ بطور واقعہ صحیح تھا اس لیے یہاں اس کی تردید نہیں کی۔ قاضی بیضاوی (از زمخشری) اور امام رازی نے لکھا ہے کہ اس عذر کا جواب اس لیے نہیں دیا کہ اس کا فساد جانا بوجھا ہے کیونکہ اگر تقلید آبائی کسی کام کے جواز کی دلیل ہو تو ادیان متناقضہ کا حق ہونا لازم آتا ہے اور یہ بالبداہت غلط ہے۔ اس موضوع پر قرآن نے اصولی بات یہ بتا دی ہے او لو کان آباؤھم لا یعقلون شیأ ولا یھتدون، دوسرا عذر چونکہ واقعۃً بھی غلط تھا اور بطورِ دلیل بھی، یعنی ان کا ایسا کہنا عقلاً اور نقلاً غلط ہے۔ عقلاً اس لیے کہ یہ کردار یعنی بیت اللہ کا ننگے طواف کرنا سب کے نزدیک برائی ہے اور اس کے برائی ہونے میں دو رائیں نہیں ہیں۔ اور معلوم ہے کہ اللہ کی ذات اپنے کمال مطلق کی وجہ سے اس سے بالا ہے کہ وہ اس فاحشہ کا حکم دے۔ اس کا حکم تو مجمع النقائص ہی دے سکتا ہے اور وہ شیطان ہے۔ قرآن میں ہے الشیطان یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء۔ اور نقلاً اس لیے کہ خدا کے اوامر اور نواہی محض دعوے سے ثابت نہیں ہوتے۔ بلکہ ضروری ہے کہ اس کی پشت پر وحی الٰہی کی طاقت ہو۔ اور معلوم ہے کہ وحی الٰہی نے یہ بات نہیں بتائی۔ اللہ کبھی بے حیائی اور بے شرمی کا حکم نہیں دیتا۔ خدا کے احکام، اس کی صفات اور انسانی فطرت کے تقاضوں کے مطابق، جب اس کی صفات میں کوئی صفت بھی ایسی نہیں جو اس بے حیائی کو گوارا کر سکے تو وہ اس کا حکم کیسے دے سکتا ہے۔ پھر جب اس نے انسان کی فطرت ایسی بنائی ہے کہ آغازِ شعور سے لے کر مرتے دم تک وہ کبھی پسند نہیں کرتا کہ دوسروں کے سامنے عریاں ہو تو وہ اسی انسان کو یہ کیسے حکم دے سکتا ہے کہ وہ علیٰ اس کے حرم میں ساری خدائی کے سامنے ننگا ہو جاتے اور ننگے ہو کر اس کے آگے پھیرے لگاتے۔ آخر خدا اور اس کی پاکیزہ صفات انسان اور اس کی سلیم فطرت کے ساتھ اس بیہودہ حرکت کا کیا جوڑ ہے۔ خدا پر ایسی بیہودہ تہمت کیوں لگاتے ہو؟

حضرت مولانا عثمانی نے اس آیت پر اپنے افادات میں جو تبصرہ کیا ہے وہ بہت زیادہ جامع ہے

فرماتے ہیں "بُرے اور بے حیائی کے کام مثلاً مرد و عورت کا برہنہ طواف کرنا جو ان آیات کی شان نزول ہے جن سے عقل سلیم اور فطرت صحیحہ نفرت کرتی ہے خدائے قدوس کی شان نہیں ہے کہ ان کی تعلیم دے۔ وہ تو پاکی اور حیا کا سرچشمہ ہے۔ گندے اور بے حیائی کے کاموں کا حکم کیسے دے سکتا ہے۔ اصل میں بے حیائی اور بُرائی کی تعلیم دینے والے وہ شیاطین ہیں جن کو انہوں نے اپنا رفیق بنا رکھا ہے۔ دیکھو تمہارے سب سے پہلے ماں باپ کو شیطان نے فریب دے کر برہنہ کرایا مگر وہ شرم و حیا کے مارے درختوں کے پتے بدن پر لپیٹنے لگے۔ معلوم ہوا کہ برہنگی شیطان کی جانب سے اور ستر کی کوشش تمہارے باپ کی طرف سے ہوتی۔ پھر برہنہ طواف کرنے پر باپ دادوں کی سند لانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ نیز بقول حضرت شاہ صاحب، سُن چکے ہو کہ پہلے باپ نے شیطان کا دھوکہ کھایا پھر باپ کی کیوں سند لاتے ہو۔ یہ کس قدر بے حیائی کی بات ہے کہ جو کام شیطان کے حکم سے ہو رہا ہے اسے کہا جاتا ہے کہ ہم کو خدا نے یہ حکم دیا ہے"[1]

دراصل اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے مشرکین مکہ کے جاہلانہ عقائد پر بہت بڑی ضرب لگائی ہے ایک طرف وہ عبادت میں برہنگی کو اختیار کرتے تھے لیکن اس کے باوجود وہ برہنگی کو ایک شرمناک حرکت بھی تصور کرتے تھے۔ اسے بے حیائی سمجھنے کے ساتھ ان کا یہ دعویٰ بھی تھا کہ طواف میں برہنگی کی رسم اللہ نے مقرر کی ہے۔ کیسی عجیب بات ہے کہ جس کام کو خود فاحشہ کہتے ہیں اور مانتے ہیں کہ فاحشہ ہے پھر اس کے متعلق یہ کیسے کہتے ہیں کہ اللہ نے اس کا حکم دیا ہے۔ کسی فاحشہ کے حکم کی نسبت خدا کی طرف ہرگز نہیں ہو سکتی۔ کسی بھی مذہب میں ایسے حکم کا پایا جانا اس بات کی صریح علامت ہے کہ یہ مذہب خدا کی جانب سے نہیں ہے۔

عمل میں اعتدال راہِ حق کی بنیاد ہے

۲۷۔ فرما دیجئے میرے پروردگار نے جو کچھ حکم دیا ہے وہ تو صرف یہ ہے کہ ہر بات میں راہِ اعتدال اپناؤ۔ روح المعانی میں ہے القسط علی ما قال غیر واحد العدل وھو الوسط من کل شیٔ المتجافی عن طرفی الافراط والتفریط آیت کا حاصل یہ ہوا کہ حق تعالیٰ نے ہر کام میں راہِ اعتدال پر رہنے اور افراط و تفریط سے بچنے کی ہدایت کی ہے پھر بھلا فواحش کا حکم کیسے دے سکتے ہیں[2]

شارحین قرآن نے قسط کے مفہوم میں وہ تمام چیزیں داخل کی ہیں جسے ہم عام بول چال میں عدل و

---

[1] افادات شیخ الاسلام

انصاف، راستی و حق، اچھے کام، اچھی بات، اچھے افکار، توحید، کلمۂ اخلاص کہتے ہیں۔ ابومسلم اصفہانی کی رائے میں ساری طاعات مراد ہیں اور حاکم نے اسی کو ترجیح دی ہے۔ اصل میں اس کے معنے عدل کے آتے ہیں۔ اس کی ضد ظلم اور جور ہے۔ فکر، عمل، قول، اخلاق، کردار، مظاہر اور اشکال غرض ظاہر و باطن کے ہر گوشے میں ایک نقطہ تو وہ ہے جو ہر چیز کے خالق و فاطر کی بنائی ہوئی فطرت اور اس کے مقرر کیے حدود و قیود کے اندر ہے۔ اسی کو نقطۂ اعتدال کہتے ہیں۔ اگر کسی گوشے میں اس نقطے سے شوشے کے برابر بھی انحراف واقع ہو جاتے، تو یہ بات عدل و قسط کے خلاف ہوگی۔ اعتبارات اور نسبتوں کی تبدیلی سے تعبیرات بدل جائیں گی۔ کسی دائرے میں ہم اس انحراف کو ظلم و جور سے تعبیر کریں گے۔ کسی گوشے میں بدصورتی سے۔ اسی طرح کسی پہلو میں اس اعتدال کو حق و عدل سے تعبیر کریں گے کسی عمل میں حسن و جمال سے لیکن اصل حقیقت ہر جگہ ایک ہی ہوگی۔ وہ یہ کہ ایک چیز اپنے اصل مقام سے ہٹ گئی تو بگاڑ پیدا ہو گیا اور اگر اپنے جوڑ سے پیوست ہو گئی تو بناؤ نمودار ہو گیا۔

جیسا کہ علامہ آلوسی نے بتایا ہے کہ اکثر مفسرین کے خیال میں قسط زندگی کے سارے گوشوں میں عدل و استقامت کا نام ہے۔ آلوسی کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کیونکہ اصل یہ ہے کہ اسلامی زندگی کا جہاں تک تعلق ہے اس کے متعلق بلا شائبۂ اختلاف اور بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا ہے کہ وہ اضداد کی کامل ترین وحدت اور ترکیب کا نام ہے اس لیے کہ یہ نظام جن افکار و تصورات کے مجموعہ سے عبارت ہے ان میں سے کسی ایک تصور پر غیر متوازن زور نہیں دیا گیا ہے۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کیا ہے کہ لا تغلوا فی دینکم اپنے دین میں غلو نہ کرو کیونکہ غلو کرنے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جس اصول یا پہلو میں غلو کیا جاتا ہے اسی کی نفی ہو جاتی ہے۔ مذہبی جزئیات و فروعات پر ایک حد مناسب سے زیادہ زور دیجیے لامحالہ کوئی نہ کوئی اصول باطل ہو جائے گا۔ خدا کی صفات میں سے کسی ایک صفت میں یک طرفہ مبالغہ کیجیے اس کی کوئی دوسری صفت مجروح ہو جائے گی۔ اسی لیے ہر اصول ہر قاعدے ہر حکم ہر اخلاقی ہدایت کی اسلام نے ایک خاص حد مقرر کی ہے اس کے آگے بڑھو گے تو نفع کی جگہ نقصان، ثواب کی جگہ گناہ اور خدا کی خوشنودی کی جگہ اس کی ناخوشی مول لو گے۔

دُنیا کے تمام نظاماتِ فکر و عمل اور سارے مذاہب وادیاں میل و انحراف اور افراط و تفریط میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ اگر ان کا تجزیہ کیا جاتے تو معلوم ہو گا کہ انھوں نے جن تصورات کو دُنیا کے سامنے پیش کیا ان پر اس بے اعتدالی کے ساتھ زور دیا کہ ان کی حقیقت باطل ہو گئی۔ غور کرو گے تو معلوم ہو جاتے گا کہ ہر مذہب غیر متوازن افکار و میلانات کا حامل اور بے اعتدالی کا شکار ہے۔ اس کے برخلاف اسلامی

نظام میں افراط وتفریط کے مابین ایک عجیب وغریب قسم عدل وتوازن پایا جاتا ہے ۔ قرآن نے دوسرے مقامات میں اسی حقیقت کو سمجھانے کے لیے میزان یعنی ترازو کی تعبیر اختیار کی ہے ۔ اور اس ترازو سے بہتر اس بات کو سمجھانے کے لیے کوئی عام فہم اور دل نشین تعبیر نہیں ہو سکتی ۔ سورۂ آل عمران کی مشہور آیت میں قائماً بالقسط کہہ کر اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ۔ یعنی کائنات میں اس کے تمام کام عدالت کے ساتھ قائم ہیں اور اس نے قیام ہستی کے لیے یہی قانون ٹھہرایا ہے ۔ جب عدالت کا قانون کائنات کے ہر گوشہ میں کارفرما ہے ۔ یہ کیونکر ممکن ہے کہ انسان کے افکار واعمال کے لیے بے اثر ہو جاتے ۔ یہاں بھی وہی عمل مقبول ہوتا ہے جو افراط وتفریط اور میل وانحراف کی جگہ فطرت کے عدل وقسط پر مبنی ہوتا ہے ۔ اسی کو قرآن کی زبان میں ایمان اور عمل صالح کہتے ہیں ۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کو دنیا میں قوامین بالقسط کے لقب سے سرفراز فرمایا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارا ہر قول وفعل اسی باٹ اور اسی ترازو سے تولا ہوا ہو اور تم اسی پر قائم رہنے والے اور اسی کو قائم کرنے والے ہو اور ساتھ ہی یہ بھی فرمایا کہ شہداء بالقسط یعنی صرف اس پر قائم رہنا ہی تمہاری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ تم دنیا کے سامنے اللہ کی طرف سے اسی قسط واعتدال کے داعی اور گواہ ہو اور یہی بات تمہارے فرائض میں داخل ہے ۔ بہرحال قسط ایک جامع حقیقت ہے جو تمام انسانی زندگی کی سمان ہے ۔ یعنی ہر چیز میں ٹھیک ٹھیک نقطہ عدل واعتدال کا اہتمام اس کا تعلق زندگی کے ایک ہی پہلو سے نہیں ہے بلکہ ہر پہلو سے ہے ۔ عقائد میں ، اعمال میں ، عبادات میں ، اخلاق میں معیشت میں ، معاشرت میں ، قانون میں ، سیاست میں غرض کہ ہر شعبۂ زندگی میں یہی وہ اصل الاصول ہے جس پر شریعت الٰہی مبنی ہے ۔ موقع ومحل کے اعتبار سے اس کی تعبیریں بدل جائیں گی لیکن اصل حقیقت اپنی جگہ قائم رہے گی ۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے کہ انسان اپنی زندگی کو عدل و راستی کی بنیاد پر قائم کرے ۔

عبادت میں توجہ فرمانبرداری میں اخلاص

۲۸ ۔ اپنی تمام عبادتوں میں خدا کی طرف توجہ ٹھیک رکھو اور حکم برداری میں اسی کے ہو کر اسی کو پکارو ۔ حضرت شیخ الہند نے مسجد کو غالباً مصدر میمی بمعنی سجدے کر تجوزاً اس کا ترجمہ نماز سے فرمایا ہے اور وجوہ کو اپنے ظاہر پر رکھا ہے ۔ یعنی نماز ادا کرنے کے وقت اپنا منہ سیدھا کعبہ کی طرف رکھو مگر دوسرے بعض مفسرین اقیموا وجوھکم سے مراد یہ لیتے ہیں کہ خدا کی عبادت کی طرف ہمیشہ استقامت کے ساتھ دل سے متوجہ رہو ۔ حافظ ابن کثیر کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ اپنی عبادات میں سیدھے رہو ۔ جو راستہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہے اس سے ٹیڑھے ترچھے نہ چلو ۔ عبادت کی مقبولیت دو ہی چیزوں پر موقوف ہے ۔ خالص خدا کے

لیے ہو جس کو آگے فرمایا وادعوہ مخلصین لہ الدین اور اس مشروع طریق کے موافق ہو جو انبیاء علیہم السلام نے تجویز فرمائی ہے۔ اس کو واقیموا وجوھکم میں ادا کیا گیا۔ بہرحال اس آیت میں اوامر شرعیہ کی تمام انواع کی طرف اشارہ کر دیا ہے جو بندوں کے معاملات سے متعلق ہیں وہ سب قسط میں آگئے اور جن کا تعلق خدا سے ہے اگر قالبی ہیں تو وہ واقیموا وجوھکم میں اور اگر قلبی ہیں تو وادعوہ مخلصین لہ الدین میں مندرج ہو گئے۔[1]

حضرت شاہ عبدالقادر نے اس آیت کا ترجمہ اس طرح فرمایا ہے:

اور سیدھے کرو اپنے منہ ہر نماز کے وقت اور پکارو اس کو نرے اس کے حکم بردار ہو کر۔

شاہ صاحب نے اس ترجمہ کے ذریعے آیت کی بہت گہری معنویت کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ بندوں کے اللہ سے محبوب ہونے کی وجہ سے پرستش کے اور حاکم ہونے کی وجہ سے بندگی کے تعلقات ہیں۔ انسان کی ہمیشہ سے کمزوری یہ رہی ہے کہ ان ہی دو تعلقات کو اس نے ملاوٹ کے ذریعے خراب کیا ہے۔ اگر اس نے اپنی دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی ہستی کو بھی شریک کر لیا تو گویا اس نے خدا کی پرستش میں شریک کر لیا دعا، استعانت، رکوع و سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اور نیازمندانہ اعمال وہ اعمال ہیں جو خدا اور اس کے بندوں کا پرستش میں باہمی رشتہ قائم کرتے ہیں۔ اگر ان اعمال میں کسی دوسری ہستی کو شریک کیا گیا تو خدا کے رشتہ پرستش کی یگانگت قائم نہ رہی۔

اسی طرح پوری کائنات کا جس کا ہماری یہ دنیا بھی ایک چھوٹا سا حصہ ہے مقتدر اعلیٰ اللہ ہے۔ حکم دینے اور منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا اصل مستحق صرف وہی ہے حقیقی اور واقعی قانون ساز بھی وہی ہے کسی مخلوق کا فریضہ متعین کرنے، اس کے معاملے میں فیصلہ کرنے اسے معاف کرنے یا سزا دینے کا اختیار بھی پورے کا پورا اسی کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی نہیں جو کسی کے لیے قانون بنانے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔ اب اگر کوئی شخص کسی اور کے لیے بھی حکم دینے اور قانون بنانے کا حق مانتا ہے اور اس کی اطاعت بھی اللہ کی اطاعت کی طرح کرتا ہے تو اللہ کے رشتہ بندگی میں دوسروں کو شریک کرتا ہے۔ یہ دونوں رشتے خالص خدا سے بغیر کسی ملاوٹ کے ہونے چاہئیں اس آیت میں یہی مطالبہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ خدا کی توحید کا یہ تصور نہ صرف انسان کی انفرادی زندگی کے لیے ضروری ہے بلکہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اجتماعی زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کا حصول بھی خدا کی پرستش اور بندگی کے صحیح تصور ہی سے وابستہ ہے اجتماعی زندگی ایسا ادارہ ہے جو افراد کی تکمیل ذات وارتقائے شخصیت کے وسائل مہیا کرتا ہے۔ اور شخصیت کی تکمیل عبارت ہے قابو یافتہ ارادے سے۔ ایسا ارادہ جس میں بے قیدی اور بے آئینی معدوم ہو چکی ہو اور اعلیٰ درجہ کا ضبط پایا جاتا ہو اور بس۔

بہرحال شاہ صاحب نے اپنی اس مختصر تعبیر میں قرآن کی بلیغ معنویت کی طرف اشارہ کیا ہے اور آیت میں دین کے معنے حکم برداری فرما کر بتا دیا کہ خدا کے سوا عابدانہ اعمال میں کسی اور کی پرستش کا شائبہ تک نہ ہو اور رہنمائی وتائید و نصرت کے لیے خدا ہی سے دُعا مانگے مگر شرط یہ ہے کہ دُعا مانگنے والا اور خدا کی پرستش کرنے والا اپنی حکم برداری اور طاعت یعنی بندگی کو خدا کے لیے خالص کرے یہ نہ ہو کہ زندگی کا سارا نظام تو کفر و شرک اور معصیت اور دوسروں کی بندگی پر چل رہا ہو اور پرستش کی حد تک صرف خدا سے رابطہ رکھے یہ عابدانہ زندگی کا تضاد ہے۔

کچھ شارحین قرآن نے آیت کا یہ مطلب بھی بتایا ہے کہ اقیموا وجوھکم انسان کے ظاہری افعال سے متعلق ہے اور وادعوہ مخلصین لہ الدین انسان کے قلب اور باطن سے تعلق رکھتا ہے۔ پہلے فقرے میں لفظ مسجد اکثر شارحین قرآن کے نزدیک بمعنے سجدہ آیا ہے اور معنی یہ ہیں کہ ہر عبادت اور نماز کے وقت اپنا رُخ سیدھا کرو رُخ سیدھا کرنے کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ قبلہ رو ہو کر نماز پڑھو اور یہ بھی کہ اپنے ہر قول و فعل اور ہر عمل میں اپنے کو اپنے رب کے حکم کے تابع رکھو اس سے اِدھر اُدھر نہ ہو اس معنے کے لحاظ سے یہ حکم پوری زندگی سے متعلق ہے اور دوسرے حکم کا منشا یہ ہے کہ عبادت میں اخلاص پیدا کرو۔ اس میں کسی کی شرکت کسی حیثیت سے نہ ہو یہاں تک کہ شرک خفی سے بھی پاک ہو۔ ان دونوں حکموں کی پیوندکاری میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ انسان پر لازم ہے کہ اپنے ظاہر وباطن کو احکام شریعت کے مطابق درست کرے۔ نہ صرف ظاہری اطاعت بغیر اخلاص کافی ہے اور نہ محض اخلاص باطنی بغیر ظاہری اتباع شریعت کے کافی ہو سکتا ہے بلکہ ہر شخص کی ذمہ داری ہے کہ اپنے ظاہر کو بھی شریعت کے مطابق کرے اور باطن کو بھی صرف اللہ تعالیٰ کے لیے خالص رکھے۔ اس سے ان لوگوں کی غلطی واضح ہو جاتی ہے جو شریعت اور طریقت کو مختلف راہیں سمجھتے ہیں اور یہ سمجھتے ہیں کہ طریقت کے مطابق باطن کو درست کر لینا کافی ہے خواہ شریعت کے خلاف کرتے رہیں۔ یہ کھلی گمراہی ہے۔

بہرحال آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ خدا کے حقوق میں کسی دوسرے کو شریک نہ کیا جائے۔ عبادت صرف

خدا کا حق ہے اور عبادت کا سزاوار نہیں ہے اس وجہ سے نہ کسی غیر اللہ کے لیے مسجدیں بن سکتی ہیں نہ کسی مسجد میں اللہ کے سوا کسی اور کی طرف رُخ کیا جا سکتا ہے۔ سجدہ خدا کے لیے زیبا ہے اس لیے مسجد اپنی فطرت کے اعتبار سے خدا ہی کے لیے خاص ہوتی ہے۔ اس وجہ سے اپنے رُخ اللہ ہی کی طرف کرو۔ اس آیت سے امام ابوبکر الجصاص نے یہ بات بھی سمجھی ہے کہ:

نماز مسجد میں پڑھی جائے اس سے پتہ چلا کہ فرض نماز باجماعت واجب ہے، کیونکہ مسجدیں قیام جماعت کے لیے بنائی گئی ہیں۔

اور صاحب تفسیرات احمدیہ ملا جیون کی یہ نکتہ آفرینی بھی خوب ہے کہ:

اس آیت سے نماز میں قیام کی فرضیت ثابت ہوتی اور یہ کہ نماز مسجد میں ادا کی جائے لیکن کسی خاص مسجد کی خصوصیت نہیں ہے۔

خدا کی پرستش اور بندگی کیوں؟

۲۹۔ جیسا کہ اس نے تمہیں پہلی بار بنایا ہے اسی طرح دوسری بار بنو گے یعنی انسان کو اعتدال، استقامت اور اخلاص کی راہوں پر چلنے کی اس لیے ضرورت ہے کہ موت کے بعد دوسری زندگی ملنے والی ہے جس میں موجودہ زندگی کے نتائج سامنے آئیں گے۔ اس کی فکر ابھی سے ہونی چاہیے ولتنظر نفس ما قدمت لغد[1]

یہ دراصل مضمون سابق کہ پرستش اور بندگی کے تعلقات بندوں کو اللہ ہی سے قائم کرنے چاہئیں۔ اللہ کے سوا کسی سے یہ تعلقات نہ ہونے چاہئیں۔ منشا یہ ہے کہ خدا ہی کی عبادت اور خدا ہی کی طاعت اس لیے کرو کہ جس خدا نے تم کو پیدا کیا ہے پھر اسی کی بارگاہ میں تمہیں پیش ہونا ہے اور جیسے تم اس دُنیا میں بے یار و مددگار تن تنہا آئے تھے اسی طرح بے یار و مددگار تنہا ہی اس کی طرف لوٹو گے۔ تمہارے مزعومہ شرکاء اور شفعاء میں سے کوئی بھی تمہارے ساتھ نہ ہو گا۔ قرآن کی بلاغت کے قربان جائیے کہ کل دو لفظ ہیں اور دو لفظوں میں اس نے آخرت اور توحید دونوں کا تعلق بھی واضح کر دیا۔ اور آخرت کی ایک نہایت واضح دلیل بھی بیان کر دی۔

لوگوں کو روزِ جزاء اور قیامت پر یقین کرنے سے جو وہم مانع تھا وہ یہ تھا کہ مرنے کے بعد پھر کوئی جیتا نہیں تو قیامت کے دن کیوں کر جلائے جائیں گے۔ یہ حقیقت میں استبعادی شبہ ہے یعنی چونکہ مر کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوبارہ جینا اب تک انسان کے تجربہ میں نہیں آیا اس لیے اس کو دوبارہ زندگی کا خیال مستبعد معلوم ہوتا ہے ورنہ اس کے آن ہونی اور محال ہونے پر کوئی عقلی دلیل نہیں ہے۔ قرآن نے اس گتھی کو اس طرح سلجھایا کہ کفار کے استبعاد کے وہم کو اس طرح دور کر دیا کہ ،

۱۔ مر کر جینے کے بعد تاریخی مثالیں پیش کیں جیسا کہ حضرت ابراہیم، حضرت عزیر اور اصحاب کہف کے قصوں میں مذکور ہیں اور ان سے استدلال کیا کہ چند آدمی یا پرند مر کر جی سکتے ہیں تو پوری دُنیا بھی مر کر جی سکتی ہے۔

۲۔ دوبارہ زندگی پر استبعاد اس لیے ہے کہ خدا کے دائرہ قدرت کی پوری وسعت سمجھ میں نہیں آتی، جس نے آسمان بنائے زمین بنائی، آسمان سے پانی برسایا۔ مردہ زمین سے کھیتیاں سبزہ اور درخت اُگائے اور پانی کے ایک قطرہ سے انسان بنایا کیا ان کے فنا کے بعد دوبارہ ان کی ایجاد پر قادر نہیں ہے۔

۳۔ زندگی کا یہ تمام کارخانہ پہلے نیست و معدوم تھا۔ خدا نے اس کو ہست و موجود کیا۔ پھر رفتہ رفتہ اس کو معدوم کر دیا تو جس نے پہلے بغیر کسی مثال سابق اس کارخانہ کو پیدا کیا وہ کیا دوبارہ اس کو پیدا نہیں کر سکتا۔ جس نے نقش اول بنایا کیا نقش ثانی کھینچنے پر اس کو قدرت نہیں۔

ہدایت وضلالت کی کشمکش

۳۰۔ دو گروہ ہیں ایک گروہ کو اس نے راہ حق دکھائی اور ایک گروہ پر گمراہی اور بے راہ روی ثابت ہو گئی۔ کیونکہ انہوں نے اللہ کو چھوڑ کر شیاطین کو اپنا رفیق بنا لیا اور سمجھتے ہیں کہ راہ راست پر ہیں۔ یعنی جن پر گمراہی مقرر ہو چکی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے خدا کو چھوڑ کر شیطانوں کو اپنا دوست اور رفیق بنا لیا ہے اور تماشا یہ ہے کہ اس صریح گمراہی کے باوجود سمجھتے یہ ہیں کہ ہم خوب ٹھیک چل رہے ہیں اور مذہبی حیثیت سے جو روش اور طرز عمل ہم نے اختیار کر لیا ہے وہ بھی درست ہے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے۔

الذین ضل سعیهم فی الحیاة الدنیا وهم یحسبون انهم یحسنون صنعاً

وہ لوگ جن کی ساری کوششیں دُنیا کی زندگی میں کھو گئیں اور وہ اس خیال میں مگن رہے کہ خوب کارنامہ کر رہے ہیں۔

آیت کے عموم سے ظاہر ہوا کہ کافر معاند کی طرح کافر مخطی بھی جو واقعی اپنی غلط فہمی سے باطل کو حق سمجھ رہا ہو فریقاً حق علیهم الضلالة میں داخل ہے۔ خواہ یہ غلط فہمی پوری طرح غور و فکر نہ کرنے کی وجہ سے ہو یا اس لیے کہ اگرچہ اس نے بظاہر پوری قوت غور و فکر میں صرف کر دی لیکن ایسے

صریح اور واضح حقائق تک نہ پہنچنا خود بتلاتا ہے کہ فی الواقع اس سے قوت فکر و استدلال کے استعمال میں کوتاہی ہوئی ہے۔ گویا جن چیزوں پر ایمان لانا مدار نجات ہے وہ اس قدر واضح اور روشن ہیں کہ ان کے انکار کی بجز عناد یا قصور فکر و تامل کے اور کوئی صورت نہیں۔ بہرحال کفر شرعی ایک ایسا سنکھیا زہر ہے جو جان بوجھ کر یا غلط فہمی سے کسی طرح بھی کھایا جائے۔ انسان کو ہلاک کرنے کے لیے کافی ہے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا مذہب یہی ہے۔ اور روح المعانی میں جو بعض کا اختلاف اس مسئلہ میں نقل کیا ہے اس بعض سے مراد جاحظ وغیرہ ہیں جو اہل السنۃ میں داخل نہیں بلکہ باوجود معتزلی کہلاتے جانے کے خود معتزلہ کو بھی ان کے اسلام میں کلام ہے۔ اسی لیے صاحب روح المعانی نے ان کا مذہب نقل کرنے کے بعد لکھ دیا ہے و للہ الحجۃ البالغۃ والتزام ان کل کافر معاند بعد البعثۃ و ظھور امر الحق کفلق علی علم ۔[1]

دراصل یہ فقرہ ترکیب میں حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ روز قیامت تم اللہ کی بارگاہ میں پیش ہوگے تو تمہارا حال یہ ہوگا کہ تم دو حصوں میں منقسم ہوگے۔ ایک فریق تو وہ ہوگا جس کو انبیاء کی رہنمائی میں دُنیا میں زندگی گزارنے کا موقعہ ملا ہوگا۔ اور دوسرا فریق وہ ہوگا جو انبیاء کی رہنمائی چھوڑ کر دُنیا میں راہِ حق سے ہٹ گیا ہوگا۔ یہ فریق راہِ حق سے کیوں ہٹا؟ اسی اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب دیا کہ انھم اتخذوا الشیاطین انہوں نے دُنیا میں رہنمائی کے لیے انبیاء کو چھوڑ کر شیاطین کی رہنمائی قبول کی تھی اور یہ اپنی جگہ خیال کر رہے تھے کہ ہم راہِ راست پر ہیں۔ شیاطین کو اولیاء بنانے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اپنی زندگی میں ان کی طاعت کرتے تھے۔

ایسے لوگوں کی تعداد دُنیا میں بہت تھوڑی رہی ہے جو حق کو حق سمجھ کر محض عناد اور کبر کی وجہ سے حق سے روگرداں رہے ہوں۔ بیشتر لوگ وہ ہی ہیں جو عقائد و افکار اور اعمال میں گمراہی کا شکار ہوئے ہیں اور یہ گمراہی شیاطین کی امامت اور قیادت کی وجہ سے یا پھر غلط نظریات اور لغو آراء کی وجہ سے ہوتی ہے پہلا طبقہ اگر معاند ہے تو دوسرا طبقہ خطاکار ہے۔ کفر میں خطاکاری کو اگر قابلِ قبول عذر قرار دیا جاتے تو ہر دور میں دُنیا میں بیشتر کفر پیشہ لوگ معذور ہوں گے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ قانون سے بے خبری اور ناواقفیت کوئی عذر نہیں ہے۔ ایک شخص اگر غلط راستہ کو صحیح سمجھ کر پورے اخلاص کے ساتھ اختیار کرتا ہے تو وہ اللہ کے نزدیک معذور نہیں ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے ہر شخص کو دانش و بینش سے اس لیے سرفراز فرمایا ہے کہ وہ اس سے کام لے کر کھرے کھوٹے اچھے اور بُرے میں امتیاز کرے اور پھر اس پر بس نہیں کی بلکہ انبیاء روانہ کیے ہیں جن کے ذریعے حق و باطل

[1] افادات شیخ الاسلام

اور صحیح و غلط کو خوب کھول کر واضح کر دیا ہے ۔

یہاں آیت میں حق قبول کرنے والوں کے لیے فریقاً ھدی اور ہدایت قبول نہ کرنے والوں کے لیے فریقاً حق علیھم الضلالۃ کی تعبیر اختیار فرمائی ہے لیکن پہلے جملہ کی علت نہیں بتائی اور دوسرے کی انھم اتخذوا سے علت بتائی ہے ۔ اس میں اشارہ ہے کہ حق کی پذیرائی اصل ہے اور ضلالت اضافی ہے۔ حالانکہ ہدایت ہو یا ضلالت دونوں کا وجود علمِ الٰہی کے تحت ہوتا ہے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ دُنیا میں ہدایت ہو یا ضلالت دونوں اسباب کے تحت ظہور پذیر ہوتی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جس گروہ پر گمراہی مسلط ہو گئی ہے ۔ اس نے شیاطین کو اپنا دوست بنا رکھا ہے اور یہ شیاطین ان کو اپنی گمراہیوں میں پھنساتے ہوتے ہیں اور اپنی شامتِ اعمال سے گمان یہ کیے ہوئے ہیں کہ وہ راہِ ہدایت پر ہیں۔ شیاطین کو دوست بنانے کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ ان کی زندگی کے معاملات میں اطاعت کرتے ہیں۔ خدا کو چھوڑ کر دوسروں کی یہی اطاعت تمام برائیوں کا سرچشمہ ہے ۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ خُذُوْا زِيْنَتَكُمْ عِنْدَ كُلِّ مَسْجِدٍ وَّكُلُوْا وَاشْرَبُوْا وَلَا
تُسْرِفُوْا ۚ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُسْرِفِيْنَ ﴿٣١﴾ قُلْ مَنْ حَرَّمَ زِيْنَةَ اللّٰهِ
الَّتِيْٓ اَخْرَجَ لِعِبَادِهٖ وَالطَّيِّبٰتِ مِنَ الرِّزْقِ ۭ قُلْ هِىَ لِلَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا فِي الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا خَالِصَةً يَّوْمَ الْقِيٰمَةِ ۭ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ
لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ﴿٣٢﴾

ہر نماز میں حاضری کے وقت اے اولادِ آدم آرائش کو اختیار کرو[۳۱]۔ اور
کھاؤ پیو البتہ اسراف نہ کرو، اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں
کرتا ہے[۳۲]۔ ان سے دریافت کرو کس نے حرام کیا ہے اللہ کی اس زینت
کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے اور کھانے کی صاف
ستھری چیزوں کو[۳۳]، کہدو کہ وہ دُنیا کی زندگی میں اہلِ ایمان کے لیے ہیں
قیامت کے دن صرف ان ہی کے لیے ہوں گی[۳۴]۔ اسی طرح ہم آیات
کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو اہلِ علم ہیں[۳۵]۔

معانی مفردات

زینۃ، زیبائش، آرائش، سنگھار، گہنا، اسم ہے - امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں "زینت حقیقی وہ ہے جو انسان کو کسی حال میں بھی معیوب نہ ہو نہ دُنیا میں نہ آخرت میں - لیکن جو چیز ایک حالت میں تو انسان کو رونق دے اور دوسری حالت میں نہ دے وہ ایک حیثیت سے معیوب ہے۔" مختصر الفاظ میں زینت کی تین قسمیں ہیں - زینتِ نفسی، جیسے علم اور صحیح عقائد، زینت بدنی، جیسے قوی اور بلند و بالا ہونا، زینت خارجی، جیسے مال و جاہ آیت کریمہ حبب الیکم الایمان و زینہ فی قلوبکم زینت نفسی سے متعلق ہے اور زیر تشریح کا زینت بدنی سے تعلق ہے۔ مسجد، ظرف مکان اور ظرف زمان دونوں ہو سکتا ہے - معنے جیسے سجدہ کی جگہ کے ہیں، سجدہ کے وقت کے بھی ہیں یہاں مراد دوسرے معنے لیے گئے ہیں - اور کچھ بزرگوں نے اسے مصدر میمی قرار دے کر اس سے مراد نماز لی ہے - لا تسرفوا، اسراف سے فعل نہی ہے - حدِ اعتدال سے تجاوز کرنے کو اسراف کہتے ہیں - الجصاص رقمطراز ہیں، اعتدال سے تجاوز کی دو صورتیں ہیں - ایک صورت یہ ہے کہ حلال سے حرام کی طرف بڑھنا، اور دوسری صورت یہ ہے کہ خرچ میں حد سے تجاوز کر جانا، لا تسرفوا کا تعلق آیت میں تینوں سے ہے زینت میں کھانے اور پینے میں حد سے تجاوز نہ کرو۔

اسلام میں رہبانیت نہیں ہے

رہبانیت کا رد اور اس اصل عظیم کا اعلان کہ دنیوی زندگی کی آسائشیں اور زینتیں اسلام کے خلاف نہیں ہیں بلکہ ان کو کام میں لانا عین منشائے اسلام کی تعمیل ہے - اسلام سے پہلے عام پیروان مذاہب کی المگیر گمراہی یہ تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ روحانی سعادت جب ہی مل سکتی ہے کہ دُنیا ترک کر دی جائے اور خدا پرستی کا مقتضا یہ ہے کہ زینتوں اور آرائشوں سے کنارہ ہو جائیں - فلاطینوس صاف لفظوں میں کہتا ہے "جب روح وجدان کی منزل میں پہنچتی ہے تو وہ عالم معقولات کا تصور کرتی ہے لیکن جب اسے خدا کا شعور حاصل ہوتا ہے تو وہ ہر چیز ترک کر دیتی ہے" (بحوالہ تاریخ تصوف قبل از اسلام) اور یہ کہ حقیقی سعادت و فلاح تو صرف ان بندشوں سے مکمل آزادی سے حاصل ہو سکتی ہے - ان میں تبدیلی سے نہیں - آپ زنجیر دل

کو نرم اور ملائم کر دیں لیکن زنجیروں کی ماہیت نہیں بدل سکتی۔

عرفانی حکما تو اس انداز فکر کے منطقی نتائج کی انتہا تک پہنچے تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ انسان کی روحانیت کی بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ اس مادی دُنیا سے مکمل بیزاری اور نفرت کا اظہار کرے۔

فلاطینوس کے شاگرد فرافوریس کا بیان ہے کہ اسے اپنے جسم سے ہمیشہ نفرت رہی۔ عیسائیوں کے ایک فرقہ کا جو ویلیسین کہلاتا تھا یہ عقیدہ تھا کہ نجات کے لیے آختہ ہونا ضروری ہے۔ اسی طرح ایک اور فرقہ جو اسکوپسی کہلاتا تھا اور جو غالباً ۱۷۵۰ء میں رُوس میں قائم ہوا تھا اپنے اراکین کے خصیے نکلوا دیتا تھا۔ یہ لوگ اپنے کو خدا کی جماعت کہتے تھے۔ تھرسٹن کا بیان ہے کہ ہندوستان میں برہمن روحانی زندگی کے لیے اپنے خصیے نکلوا دیا کرتے تھے۔ ہندوؤں کے یہاں سنیاس یعنی مکمل ترک دُنیا اور مکمل ترکِ خواہش کا سچی خدا پرستی کی شرط لازم قرار پانا تو ایک معروف حقیقت ہے۔ چنانچہ ان کی سب سے مشہور کتاب گیتا کہتی ہے کہ:

> دانشمند تو صرف وہی ہوگا جو پندار اور نادانی سے پاک ہو کر، دل پر فتح پا کر اپنی ذات میں ہمیشہ محو ہو کر خواہشوں سے کنارہ کر کے اور رنج وراحت دونوں سے بے تعلق ہو کر اس لازوال مقام پر پہنچ جاتا ہے جہاں سُورج چاند اور آگ کی روشنی کا دخل نہیں اور جہاں پہنچ کر بازگشت نہیں ہوتی۔ (باب ۱۵، منتر ۵، ۶)

تاریخ ادیان میں اس طرزِ فکر اور طرزِ عمل کی اتنی کثیر مثالیں موجود ہیں کہ کوئی صاحب نظر اس سے ناواقف نہیں ہو سکتا۔ اس لیے مزید حوالے بالکل غیر ضروری ہوں گے۔ یہ رہبانیت، یہ سنیاس، یہ جوگ، یہ برہم چاریہ اسی ترکِ زینت، ترکِ دُنیا کی عملی شکلیں ہیں۔ کوئی کامل، کوئی ناقص، کوئی کلی، کوئی جزئی، کوئی خالص، کوئی مخلوط۔

یہاں قرآن نے بتایا ہے کہ حقیقت اس کے بالکل برعکس ہے تم سمجھتے ہو کہ زندگی کی زینتیں اس لیے ہیں کہ ترک کر دی جائیں۔ حالانکہ وہ اس لیے ہیں کہ کام میں لائی جائیں۔ دُنیا اور دُنیا کی تمام نعمتوں کو ٹھیک طور پر کام میں لانا مشیتِ الٰہی کو پورا کرنا ہے۔ یہ آیت قرآن کا ایک انقلاب انگیز اعلان ہے جس نے انسان کی دینی ذہنیت کی بنیادیں الٹ دیں۔ وہ دُنیا جو نجات وسعادت کی طلب میں دُنیا ترک کر رہی تھی۔ اب اسی نجات وسعادت کی دُنیا تعمیر وترقی میں ڈھونڈنے لگی۔

۳۱۔ ہر نماز میں حاضری کے وقت لے اولادِ آدم آرائش کو اختیار کرو۔ پہلی آیت میں مساجد کے باطنی احترام کا حکم تھا اس آیت میں مسجد کے ظاہری احترام کا حکم فرمایا۔ باطن میں جس عقیدے نے جڑ پکڑ لی ظاہر میں اس کے برگ وبار پیدا ہونے ضروری ہیں۔ جس کی عزت ہم دل میں کریں گے یقینی طور پر عمل سے اس کو

ظاہر کرنے کی بھی کوشش کریں گے۔ یہی وجہ ہے کہ درجہ کمال میں ایمان و اسلام یکجا ہوتے ہیں۔ ایک طرف تصدیق بالجنان کا حکم ہے تو دوسری طرف عمل بالجوارح کا بھی مطالبہ موجود ہے تو جب قرآن نے مساجد کے باطنی احترام کا حکم فرمایا لہٰذا ساتھ ہی ظاہری اہتمام کو بھی نہ چھوڑا۔ مطلب یہ ہے کہ جب عرض و نیاز کے لیے مناجات سرگوشی کے لیے دربارِ الٰہی میں آؤ تو صاف ستھرا لباس زیب تن کر لیا کرو جو پاک و صاف اور شرعی حدود کے مطابق ہو۔ تم احکم الحاکمین کے سامنے اس کے دربار میں حاضری دے رہے ہو تو ظاہری آداب کا بھی پورا پورا لحاظ رکھو تاکہ ظاہری طور پر بھی کسی کو بے ادبی کا شبہ نہ ہو۔

یہ درست ہے کہ وہ پہلے دل کی گہرائی کو دیکھتا ہے مگر دل کی صفائی کا اثر جسم پر ہونا بھی ضروری ہے۔ اس میں ذرہ برابر شک نہیں کہ دل کی ویرانی کے ساتھ جو زیب و زینت ہوتی ہے وہ کسی درجہ میں مطلوب نہیں لیکن موجودہ دور میں دین کی رسمی محبت کی وجہ سے لباس میں جو بے پرواہی ہو گئی ہے وہ بھی کسی درجہ میں پسندیدہ نہیں ہے اس آیت سے مسجد کے لیے حسنِ ہیئت کا حکم بھی معلوم ہوتا ہے جو مساجد کی بزرگی و احترام کا ایک دلنشیں طریقہ ہے۔ حافظ ابن کثیر رقمطراز ہیں کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز کے وقت ہیئت اچھی سے اچھی ہونی چاہیے۔ صاحب تفسیرات احمدی لکھتے ہیں:

> سنت ہے کہ نماز کے لیے اچھی سے اچھی ہیئت اختیار کرے اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں ستر عورت واجب ہے۔

اس آیت میں لباس کو زینت اور زینت کو لباس قرار دینے میں بظاہر اس طرف اشارہ ہے کہ جس لباس سے بجائے سنورنے کے آدمی کی ہیئت اور بگڑ جائے اسے لباس ہی نہ قرار دینا چاہیے۔

نماز اور لباس و طہارت

یہ آیت بتا رہی ہے کہ نماز اگرچہ ایمان کا ذائقہ روح کی غذا اور دل کی تسکین کا سامان ہے مگر اس کے ساتھ وہ مسلمانوں کی اجتماعی، اخلاقی، تمدنی اور معاشرتی اصلاحات کا بھی ایک کارگر آلہ ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ سے اخلاق و تمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں، ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا۔ اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک ایسی بدوی قوم کو جس کو پہننے اور اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا۔ اور آج بھی اسلام جب افریقہ کے وحشی سے وحشی ملک میں پہنچ جاتا ہے تو وہ کسی بیرونی تعلیم کے بغیر صرف نماز کے اثر سے مہذب و متمدن ہو جاتا ہے۔ متمدن قوموں میں جب نماز پہنچتی ہے تو ان کے تخیل کو بلند سے بلند تر پاکیزہ سے پاکیزہ تر بنا

دیتی ہے۔ نماز کے ان معاشرتی فائدوں میں بالکل ابتدائی چیز لباس اور زیب و زینت کا خیال ہے۔ انسان کا شرم و حیا کی نگہداشت کے لیے اپنے جسم کے بعض حصوں کو چھپانا نہایت ضروری ہے۔ عرب کے بدو اس تہذیب سے ناواقف تھے بلکہ شہروں کے باشندے بھی اس سے بے پروا تھے۔ یہاں تک غیر قریشی عورتیں جب حج کے لیے آتی تھیں تو اپنے کپڑے اتار دیتی تھیں۔ اور اکثر ننگی ہو کر طواف کرتی تھیں۔ اسلام آیا تو اس نے ستر پوشی کو ضروری قرار دیا یہاں تک کہ بغیر اس ستر پوشی کے اس کے نزدیک نماز ہی درست نہیں۔ اس تعلیم نے جاہل بدو اور وحشی عربوں کو ستر عورت پر مجبور کر دیا اور نماز کی تاکید نے دن میں پانچ بار ان کو اس فرض سے آشنا کر کے ہمیشہ کے لیے ستر پوش بنا دیا۔ افریقہ اور ہندوستان میں مسلمانوں اور غیر مسلمانوں کے لباسوں پر ایک نظر ڈالنے سے یہ معلوم ہو سکتا ہے کہ اسلام نے تمدن کے اس ابتدائی سبق میں دنیا کی کتنی بڑی مدد کی ہے۔

نماز اور طواف کی درستگی کے لیے سترِ عورت کو سب ہی فقہاء ضروری قرار دیتے ہیں لیکن سترِ عورت کے ساتھ لباس میں تزئین و تجمل کو واجب تو نہیں مگر سنت سب ہی بتاتے ہیں۔ اور تعبیرِ آیت میں عند کل مسجد کی تعبیر بتا رہی ہے کہ یہ صرف مسجد حرام سے متعلق حکم نہیں بلکہ تمام مساجد کا یہی حکم ہے یہ اس جوگ اور رہبانیت کی کلی نفی ہے جو عریانی کو تقربِ الٰہی اور وصول الی اللہ کا ذریعہ سمجھتی ہے۔ حتیٰ کہ بعض بزرگوں نے زینت و جمال کی حد تک اس آیت سے یہ بات سمجھی ہے کہ نماز میں بہترین لباس زیبِ تن کیا جائے۔ حضرت الحسن علیہ السلام کے متعلق صاحبِ روح نے نقل کیا ہے کہ نماز کے لیے جاتے تو بہترین پوشاک زیبِ تن فرماتے کوئی دریافت کرتا تو فرماتے کہ اللہ سبحانہٗ جمیل ہیں جمال کو پسند کرتے ہیں اس لیے میں اپنے مولیٰ و مالک کے دربار میں بن ٹھن کر پیش ہوتا ہوں۔ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے۔ (خذوا زینتکم عند کل مسجد)، اور اسلام کا یہ جمالیاتی نقطہ صرف نماز ہی تک نہیں نماز سے آگے زندگی کے سارے گوشوں میں پھیلا ہوا ہے بلکہ زندگی کے دائرے سے بڑھ کر موت تک کو اپنی آغوش میں لیے ہوتے ہے۔ ترمذی کی مشہور حدیث ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا:

جب کوئی تم میں سے اپنے بھائی کو کفن پہنائے تو چاہیے کہ بہترین اور اچھا کفن پہنائے۔

قبر تک میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مبارک کسی بدہیئتی اور بھونڈے پن کو برداشت نہیں کرتی تھی۔ ایک دن کا واقعہ ہے کہ اتفاقاً کسی قبر میں کچھ رخنہ رہ گیا تھا پورے طور پر برابر نہ تھی۔ حضرت انس کا بیان ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اس رخنے کو دیکھ نہ سکے فرمایا کہ اس رخنہ کو بند کیا جائے۔ ایک صحابی نے کہا کہ حضرت اس بیچارے مُردے کو کیا نفع پہنچے گا۔ حضورؐ نے فرمایا

بے شک اسے نہ نقصان پہنچ سکتا ہے اور نہ نفع لیکن اس سے زندوں کی آنکھ کو ضرور ٹھنڈک پہنچتی ہے یعنی مُردے کو نہیں بلکہ زندوں کی آنکھیں اس سے خنکی حاصل کرتی ہیں۔ اللہ اکبر قبر تک میں جو دین آنکھوں کی خنکی تلاش کرتا ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ دُنیا کی دوسری چیزوں کے متعلق حسن کاری اور زینت میں اس کا پاکیزہ مذاق کتنا بلند اور ستھرا ہوگا۔

اسلام کے جمالیاتی نقطہ نظر کو سمجھانے کے لیے آج یہ بتانے کی کس میں جرأت ہے کہ مساجد میں جس اُلجھی ہوئی داڑھی، پریشان بال، بے تکے لباس کو دین کا پیمانہ بتایا جارہا ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نگاہ مبارک میں وہ ہک بے دینی کی علامت شمار ہوتی تھی۔ مجمع الفوائد میں امام مالک کی سند سے یہ حدیث مذکور ہے ؛

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد میں تھے، اتنے میں ایک شخص آیا جس کے سر اور داڑھی کے بال اُلجھے ہوئے اور پریشان تھے۔ حضور اقدس نے اس کی طرف کچھ اشارہ فرمایا گویا اسے حکم دے رہے ہیں کہ اپنے بال اور داڑھی کو دُرست کرے۔ اس شخص نے یہی کیا واپس پلٹ کر آیا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کیا یہ اچھا نہیں ہے اس بات سے کہ تم میں سے کوئی شخص اپنے سر کے بالوں کو پریشان کیے ہوئے ہو گویا وہ کوئی شیطان ہے۔

یہ کانہ شیطان کے آخری الفاظ ان کے لیے بہت زیادہ قابل توجہ ہیں جنہیں اپنی الجھی ہوئی داڑھی والی شکل پر ملکوتیت کا مغالطہ ہوا ہے۔ جن مسلمانوں کو اپنی پریشان داڑھی پر ناز ہے ان کو نبوت محمدیہ کے سب سے بڑے مذاق شناس فاروق اعظم کا یہ اثر یاد رکھنا چاہیے جسے بخاری کی شرح میں علامہ رالدین عینی نے نقل کیا ہے ؛

حضرت عمر نے ایک شخص کو دیکھا جس نے اپنی داڑھی اتنی چھوڑ رکھی ہے کہ وہ بہت ہی بڑھ گئی، حضرت عمر اسے پکڑ کر اپنی طرف کھینچ رہے ہیں اور فرما رہے ہیں کہ قینچی لاؤ قینچی منگائی اور ایک آدمی کو حکم دیا تو اس نے داڑھی کا جتنا حصہ ہاتھ کے نیچے تھا اسے چھوڑ کر چھانٹ دیا۔

فاروق اعظم نے اسی پر بس نہیں کی لکھتے ہیں کہ اس کام کو ختم کرنے کے بعد فرمایا ؛

تم میں سے کچھ اپنے آپ کو اس طرح چھوڑ دیتے ہو کہ گویا وہ درندوں میں سے ایک درندہ ہے۔

درندوں میں سے ایک درندہ بن جانا ایک بڑا معیار ہے ان لوگوں کے لیے جن کی سمجھ میں اب تک یہ نہیں آیا کہ انسانیت کی تکمیل اور اس میں حسن و جمال پیدا کرنے والا اسلام ان سے کیا چاہتا ہے؟

بقائے صحت کا راز

۲۱۳۔ اور کھاؤ، پیو البتہ اسراف نہ کرو۔ اللہ اسراف کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے۔ یہ آیات ان لوگوں کے حق میں نازل ہوئیں جو کعبہ کا طواف برہنہ ہو کر کرتے تھے اور اسے بڑی قربت اور پرہیزگاری سمجھتے تھے اور بعض اہل جاہلیت ایام حج میں سدرمق سے زیادہ کھانا اور گھی یا چکنائی وغیرہ کا استعمال چھوڑ دیتے تھے۔ بعضوں نے بکری کا گوشت اور دودھ سے پرہیز کر رکھا تھا۔ ان سب کو بتلا دیا کہ یہ کوئی نیکی اور تقویٰ کی باتیں نہیں ہیں۔ خدا کی دی ہوئی پوشاک جس سے تمہارے بدن کا ستر اور آرائش ہے اس کی عبادت کے وقت دوسرے اوقات سے بڑھ کر قابل استعمال ہے تاکہ بندہ اپنے پروردگار کے دربار میں اس کی نعمتوں کا اثر لے کر حاضر ہو۔ خدا نے جو کچھ پہننے اور کھانے پینے کو دیا ہے اس سے تمتع کرو۔ بس شرط یہ ہے کہ اسراف نہ ہونے پائے۔ اسراف کے معنے ہیں حد سے تجاوز کرنا جس کی کئی صورتیں ہیں مثلاً حلال کو حرام کرنے یا حلال سے گزر کر حرام سے بھی متمتع ہونے لگے یا اناپ شناپ بے تمیزی اور حرص سے کھانے پر گر پڑے یا بغیر اشتہا کھانے لگے یا بے وقت کھاتے یا اس قدر کھاتے جو صحت جسمانی اور قوت عمل کے باقی رکھنے کے لیے کافی نہ ہو یا مضر صحت چیزیں کھائے وغیر ذالک، لفظ اسراف ان سب امور کو شامل ہو سکتا ہے۔ بیجا خرچ بھی اس کی ایک فرد ہے۔ اسی تعمیم کے لحاظ سے بعض سلف نے فرمایا ہے جمع اللہ الطب کلہ فی نصف آیۃ خدا نے ساری طب کو آدھی آیت میں جمع کر دیا ہے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ جس طرح لباس تقویٰ اور دینداری کے خلاف نہیں ہے اسی طرح کھانا پینا اور اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا بھی دینداری کے خلاف نہیں ہے۔ دینداری اور تقویٰ کے خلاف جو چیز ہے وہ اسراف ہے۔ کیونکہ اسراف روح شریعت کے خلاف ہے جیسے قسط تمام اسلامی زندگی کی جان ہے اللہ مقسطین یعنی عدل و اعتدال پر قائم رہنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ ایسے ہی اسراف یعنی بے اعتدالی ساری اسلامی زندگی کے خلاف افراط و تفریط ہے اور یہ دونوں خدا کو ناپسندیدہ ہیں اور نہ وہ یہ پسند

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرتا ہے کہ آدمی کھانے پینے پہننے کو مقصود بنائے اور شب و روز اسی کی سرگرمیوں میں لگا رہے اور نہ وہ یہ پسند کرتا ہے کہ ان چیزوں پر راہبوں اور جوگیوں کی طرح لات مارے۔ افراط اور تفریط دونوں ہی شیطان کی نکالی ہوئی راہیں ہیں۔ خدا زندگی کے ہر پہلو میں عدل و اعتدال کو پسند کرتا ہے۔

پوری آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ نماز اور ادائے عبادت کے اوقات میں بن ٹھن کر، سج دھج کر اللہ کے حضور میں آؤ۔ اچھی اور ستھری چیزیں کھاؤ اور مفید مشروبات پیو مگر اسراف نہ کرو بلکہ دامنِ اعتدال تھامے رکھو۔ اللہ مسرفین کو پسند نہیں کرتا ہے بلکہ اسراف پر مفاسد اور مضرات کی نشو و نما کے اعتبار سے سزا دے گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ لاتسرفوا کے ذریعے جس بات سے روکا گیا ہے اس کا تعلق صرف کھانے پینے ہی سے نہیں بلکہ اختیارِ زینت سے بھی ہے یعنی ان تینوں میں اسراف نہ کرو۔ ان تینوں میں اسراف سے شخصی، خانگی اور قومی مفاسد کو نشو و نما پانے کا موقع ملتا ہے۔

یہ سوال کہ ان تینوں میں نقطۂ اعتدال کیا ہے اور حدِ اسراف کیا ہے اس کا جواب سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ یہ معلوم کر لیا جائے کہ اسلام نے قانوناً جن افعال و اعمال سے روکا ہے ان راہوں پر صرفِ دولت کا نام قرآن کی اصطلاح میں تبذیر ہے۔ قرآنی آیت "ولا تبذر تبذیرا" میں اسی بنیادی امتناعی قانون کا ذکر ہے۔ اگرچہ عام طور پر تبذیر اور اسراف کو شارحینِ قرآن ہم معنے خیال کر کے دونوں کا ترجمہ فضول خرچی کر دیتے ہیں لیکن جیسا کہ معلوم ہوگا کہ صرفِ دولت کی یہ دو مستقل دفعات ہیں۔ فضول خرچی کے تو معنی یہ ہیں کہ ضرورت سے زیادہ خرچ کیا جائے مثلاً اگر کسی کا پیٹ جو کی روٹی سے بھر سکتا ہے گیہوں کی روٹی اس کے لیے کھانا بایں معنی فضول خرچی ہوتی۔ پھر کیا قرآن کے نزدیک یہ جرم ہے بتایا جا چکا ہے کہ جب اسلام زیب و زینت اور آرائش تک کی ممانعت نہیں کرتا تو بھلا بجائے جو کے گیہوں کی روٹی جو کھاتا ہے اس کو وہ کیسے مبذر قرار دے سکتا ہے خصوصاً جب ہم اسی آیت کے تحت دیکھتے ہیں کہ قرآن بتا رہا ہے:

ان المبذرین کانوا اخوان الشیاطین۔

شیطان کا بھائی ہونا اور اس کی صفت کفوریت میں مبذرین کو شریک کرنا کیا یہ سزا قرآن اس شخص کی تجویز کر رہا ہے جو بجائے جو کے باوجود قدرت کے گیہوں کی روٹی کھا رہا ہے۔

اصل یہ ہے کہ تبذیر کا مادہ بذر ہے۔ بذر کے معنے تخم کے ہیں۔ تبذیر تخم چھڑکنے کو کہتے ہیں پھر جیسے اپنے کھیت میں دانے ڈالتا ہے اور بغیر اس خیال کے چھڑکتا جاتا ہے کہ دانے کہاں گریں گے کہاں نہ گریں گے۔ یہی حال اس شخص کا ہے جو اپنی دولت خرچ کرتا چلا جاتا ہے لیکن اس صرف میں اس کو اس کی پروا نہیں ہوتی کہ جائز خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے یا ان خواہشوں پر خرچ کر رہا ہے

جن کی تکمیل قانوناً جرم ہے۔ یہاں تک تو مبذر کسان کے مشابہ ہے لیکن آگے کسان کے دانے تو ایک سے ستو پیدا کرتے ہیں۔ اس معاملہ میں مبذر اس سے جدا ہو جاتا ہے بلکہ ٹھیک جو حال شیطان کا ہوتا ہے وہی حالت اس کی ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب شیطان اس قوت کا نام ہے جو بجائے خیر کے شر اور برائی پر صرف ہوتی ہے یہی حال مبذر کا ہے کہ خدا کی دی ہوئی مالی طاقت کو وہ بھی برائی اور شر کے حصول میں خرچ کرتا ہے۔ اسی لیے اس کا بھائی ہے اور جس طرح شیطان اپنی قوت کے غلط استعمال سے خدا کا ناشکرا ہوتا ہے یہی حال اس کی ناشکری کا ہے۔ خلاصہ یہ کہ تبذیر کے صحیح معنی جو خود قرآن سے معلوم ہوتے ہیں وہ یہی ہیں کہ مال جو انسان کو جائز خواہشوں کی تکمیل کے لیے دیا گیا ہے اسے ناجائز خواہشوں اور غیر قانونی اعمال و افعال پر خرچ کیا جائے۔ مثلاً قمار بازی، حرام کاری، شراب خوری وغیرہ قانونی جرائم پر جو دولت کو صرف کرتا ہے وہ مبذر ہے لہٰذا تبذیر کے حقیقی معنے یہی ہیں۔ باقی رہا اسراف وہ اس سے بالکل جداگانہ ہے جب تبذیر کی حقیقت واضح ہو گئی تو اب اس کا پتہ چلانا کہ مصارف کا کون سا سلسلہ تبذیر کے تحت داخل ہے اس کے لیے اسلامی جرائم کی فہرست اپنے سامنے رکھنی چاہیے اور سمجھ لینا چاہیے کہ ان جرائم میں سے ہر چیز پر دولت کا صرف کرنا تبذیر ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے تبذیر کی یہی تفسیر فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا ولو دانقا اگرچہ ایک پیسہ ہو۔

ظاہر ہے کہ جرائم پر ایک پیسہ بھی خرچ کرنا ایسا ہے جیسے کوئی ایک روپیہ خرچ کرے اور اس سے یہی معلوم ہوتا ہے کہ تبذیر کے معنی فضول خرچی کے نہیں ہیں ورنہ لازم آئے گا کہ ضرورت سے زیادہ ایک حبہ بھی خرچ کرنا شیطان کا بھائی بنتا ہے۔ الغرض باطل افکار کی اشاعت یا فحش باتوں کی اشاعت حرام ہے۔ ان کے لیے مال صرف کرنا تبذیر ہے۔ یہی حال دوسرے حرام کاموں کا ہے۔

تبذیر کے بعد صرفِ دولت کے متعلق اسلام میں دو امتناعی قانون اور بھی ہیں جن میں ایک کا نام اسراف ہے جس کا ذکر یہاں اس آیت میں ہو رہا ہے دوسرے کی تعبیر ریاء الناس ہے جس کا ذکر دسویں پارے میں آ رہا ہے۔

اسراف قرآن حکیم کی ایک جامع اصطلاح ہے اس کا اطلاق ہر ایسے طرزِ عمل پر ہوتا ہے جو صحیح انسانی اور اسلامی طرزِ عمل سے ہٹا ہوا ہو لیکن صرف مال اور استعمال ملکیت کے سلسلے میں اس کے معنے کچھ محدود ہیں جس غرض کی تکمیل مال و املاک کی ایک مخصوص مقدار صرف کر کے کی جا سکتی ہے اس پر دانستہ اور بلا مزید فائدے کے زائد مقدار میں صرف کرنا اسراف ہے۔

مال کے خرچ کرنے سے آدمی کی غرض ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے، سہولت اور آرام و سکون کی

خاطر بھی مال خرچ کیا جاتا ہے اور مال واملاک کے بعض استعمال زینت اور آرائش کے لیے بھی کیے جاتے ہیں جن سے انسان کے ذوق جمال کی تسکین ہوتی ہے۔ یہ تینوں قسم کی غرضیں اسلام کی نظر میں بجا اور مناسب ہیں۔ بشرطیکہ اعتدال اور اخلاقی حدود کو ملحوظ رکھا جائے اور جو فائدہ مطلوب ہے اس کے لیے اتنا ہی مال صرف کیا جائے جو کافی ہو۔

دراصل اسراف نام ہے ضروریات کی تکمیل کے لیے مقدار یا وضعی معیار کے اعتبار سے زائد از ضروریات مال صرف کرنے کا۔ یہاں ضرورت کو ایک وسیع مفہوم میں استعمال کیا گیا ہے نہ کہ ناگزیر حاجات کے معنی میں احتیاجات کا تعلق ناگزیر ضروریات، سہولت اور آرام کا ذریعہ بننے والی اشیاء اور زیب وزینت کے سامانوں سب سے ہو سکتا ہے۔ سہولت اور آرام یا زیب وزینت کے لیے مال صرف کرنا اسراف نہیں بشرطیکہ اعتدال ملحوظ رکھا جائے بلکہ یہ اسلام کی خصوصیت ہے کہ اس نے فقط ضرورت کی حد تک مصارف کو محدود کرنے کا حکم نہیں دیا ہے جیسا کہ عموماً دنیا کے تمام مذاہب کے رجحانات ہیں کہ جہاں تک ممکن ہو ضرورت میں بھی کمی کی جائے بلکہ ضرورت تو بہر حال ضرورت ہے اسلام زینت وآرائش کی حدود تک جانے والوں کو بھی مذہبی دائرے میں بلند سے بلند مقام عطا کرنے کے لیے تیار ہے۔ سلیمانی تخت پر ہی مذہبی مدارج کا سب سے بلند ترین درجہ یعنی نبوت تک ملی ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خلیفہ برحق حضرت عثمان رضی اللہ عنہ الغنی کے لقب کو اپنے لیے باعث فخر قرار دے سکتے ہیں اور یہ اسلام کی وہ خصوصیت ہے جس پر بحث کرنے کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔

اسراف کا اطلاق ہر ایسے طرز عمل پر ہوتا ہے جو صحیح انسانی اور اسلامی طرزِ عمل سے ہٹا ہوا ہو۔ لیکن صرف مال اور استعمال ملکیت کے سلسلہ میں اس کے معنے کچھ محدود ہیں جس غرض کی تکمیل مال واملاک کی ایک مخصوص مقدار صرف کر کے کی جا سکتی ہے اس پر دانستہ اور بلا مزید فائدے کے زائد مقدار میں صرف کرنا اسراف ہے۔ صرف مال سے آدمی کی غرض ضروریات کی تکمیل ہوتی ہے۔ سہولت اور آرام وسکون کی خاطر ہی مال صرف کیا جاتا ہے اور مال واملاک کے بعض استعمال زینت اور آرائش کے لیے بھی کیے جاتے ہیں جن سے انسان کے ذوقِ جمال کی تسکین ہوتی ہے۔ یہ تینوں قسم کی اغراض اسلام کی نظر میں بجا اور مناسب ہیں بشرطیکہ اعتدال اور اخلاقی حدود کو ملحوظ رکھا جائے اور جو فائدہ مطلوب ہے اس کے لیے اتنا ہی مال صرف کیا جائے جو کافی ہو۔

ضرورت سے زیادہ مقدارِ مال صرف کرنے کے مختلف محرکات ہو سکتے ہیں۔ نام ونمود اور اظہار ثروت وغیرہ غیر شرعی محرکات کے تحت ضرورت سے زیادہ مال صرف کرنا اسراف ہے لیکن حدِ ضرورت سے زیادہ مال

صرف کرنے کی دوسری صورتیں بھی ممکن ہیں مثلاً ایک صورت یہ ہو سکتی ہے کہ مالک کے پاس مال واملاک کی بہتات ہو اور یہ افراط اسے قدر اعتدال کو ملحوظ رکھنے سے غافل کر دے۔ یہ بھی ممکن ہے کہ وسائل کے محدود ہونے کے باوجود مالک ان کے استعمال میں دور بینی، عاقبت اندیشی اور ذمہ داری کا رویہ نہ اختیار کرے، اور لاپرواہی برتے۔

جو بات مقدار کے بارے میں کہی گئی وہی اگر اشیائے استعمال کے وصفی معیار کے بارے میں بھی سامنے رکھی جائے تو اسراف کا ایک دوسرا پہلو واضح ہوتا ہے۔ ایک حاجت کی تشفی اگر ایک مخصوص وصفی معیار کے حامل سامان سے اتنی ہی ہو سکتی ہے جتنی کہ اس سے برتر وصفی معیار سے تو اس حاجت کی تشفی کے لیے مطلوبہ سامان کے برتر وصفی معیار کی طلب ایک مسرفانہ طلب قرار دی جا سکتی ہے الا یہ کہ بہتر چیز کو زینت اور حسن و جمال کی خاطر پسند کیا گیا ہو۔

اب ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اسراف نام ہے ضروریات کی تکمیل کے لیے مقدار یا وصفی معیار کے اعتبار سے زائد از ضرورت مال صرف کرنے کا۔ یہاں ضرورت کو ایک وسیع معنے میں استعمال کیا گیا ہے کہ ناگزیر حاجت کے معنے ہیں۔ احتیاجات کا تعلق ناگزیر ضروریات سہولت و آرائش کا ذریعہ بننے والی اشیاء۔ زیب و زینت کے سامانوں سب سے ہو سکتا ہے۔ سہولت اور آرام یا زیب و زینت کے لیے مال صرف کرنا اسراف نہیں ہے بشرطیکہ دامان اعتدال ہاتھ سے نہ جانے دے۔

شاید اسی لیے آیت میں لا تسرفوا کا مفعول حذف کر دیا گیا ہے مطلب یہ ہے کہ زینت اور کھانے پینے میں اعتدال ملحوظ رکھو۔

احادیث میں اسراف کی ممانعت کے ساتھ اس کے تصور کی بھی وضاحت کی گئی ہے۔ صحیح بخاری کتاب اللباس میں ہے کہ:

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ کھاؤ پیو پہنو اور صدقہ کرو مگر اس میں اسراف اور گھمنڈ نہ ہو۔ عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اسراف اور گھمنڈ سے بچتے ہوئے جو جی چاہے کھاؤ پیو پہنو۔

قرآن کی آیت اور اس ارشاد نبوت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسراف کی ممانعت کا مقصد انسان کو صرف مال میں ایک معتدل اور متوازن روش پر قائم رکھنا ہے یہ اسی وقت ممکن ہے جب اشیاء صرف سامان استعمال کو مقدار اور وصف دونوں کے اعتبار سے ضرورت کے مطابق رکھا جائے۔ غفلت اور لاپرواہی کی وجہ سے یا دولت کے نشہ میں چور ہو کر یا غیر اسلامی محرکات کے تحت بلا لحاظ ضرورت و افادیت زیادہ

مقداروں یا بر تر اوصاف کی قابل اشیاء کے صرف سے پرہیز ضروری ہے۔ اسراف کی ممانعت کا بھی مقصد ہے

خدا کی نعمتوں پر خدا کی جانب سے کوئی پابندی نہیں

۳۲۔ ان سے دریافت کرو کہ کس نے حرام کیا ہے اللہ کی اس زینت کو جو اس نے اپنے بندوں کے لیے پیدا کی ہے اور کھانے کی صاف ستھری چیزوں کو یعنی اللہ کی جائز کی ہوئی نعمتوں کو حرام کر دینے کا حق کس مخلوق کو حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ کسی کو نہیں اور جو لوگ اس میں مبتلا ہیں وہ گناہ ہی میں پڑے ہوتے ہیں۔ من حرّم؟ میں استفہام انکاری ہے اور انکار میں زور تاکید ہے۔

آیت میں زینۃ اللہ ' اللہ کی زینت کہا گیا ہے۔ اللہ کی زینت سے کیا مراد ہے۔ لباس فاخرہ آیت میں سب کے نزدیک مراد ہے۔ جیسا کہ امام قرطبی نے لکھا ہے لیکن اکثر نے اسے وسعت دے کر جملہ سامان آرائش اس میں داخل کر دیے ہیں۔ زمخشری اور قاضی بیضاوی کا میلان اسی طرف ہے۔ امام رازی نے مزید دقت نظر سے کام لے کر اس کے اندر سواری زیور وغیرہ سارے مرغوبات بجز ان کے جو کسی نص سے حرام ہو چکے ہیں تمام انواع زینت کو آیت کا مصداق قرار دیا ہے۔ الطیبات من الرزق یعنی کھانے پینے اور استعمال کی جائز پاکیزہ اور لذیذ اشیاء علامہ قرطبی نے الطیبات کی تفسیر پر لذیذ کھانے سے کی ہے امام رازی نے اس کے مفہوم میں کھانے پینے کی تمام لذیذ اور پسندیدہ چیزوں کو داخل کیا ہے۔

آیت سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں کچھ چیزیں حلال ہیں اور کچھ ناجائز اور حرام ہیں۔ فقہا نے آیت سے عید اور دعوت کے موقعہ پر خوش لباسی کے استحباب پر بھی استدلال کیا ہے اور محققین نے یہ بھی لکھا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف لذت کی بنا پر کسی چیز سے کبھی لذیذ غذا سے احتراز نہیں کیا ہے۔ بہر حال آیت بتا رہی ہے کہ مطعومات، مشروبات، ملابس اور زیب و زینت کی ساری قسموں میں اصل اباحت ہے اور یہ آیت اس اصل عظیم کا بھی اعلان کر رہی ہے کہ دنیوی زندگی کی آسائشیں اور زینتیں تورع اور خدا پرستی کے خلاف نہیں ہیں بلکہ ان کو کام میں لانا عین منشاء خداوندی کی تعمیل ہے۔ قریش اور اہل کتاب کی یہ گمراہی تھی کہ سمجھتے تھے کہ روحانی سعادت جب ہی مل سکتی ہے کہ دنیا ترک کر دی جائے اور خدا پرستی کا تقاضا یہ ہے کہ زینتوں اور آسائشوں سے کنارہ کش ہو جائیں۔ قرآن نے بتایا ہے کہ حقیقت اس کے برعکس ہے تم سمجھتے ہو کہ زندگی کی زینتیں اس لیے ہیں کہ ان کو ترک کر دیا جائے حالانکہ وہ اس لیے ہیں کہ کام میں لائی جائیں۔ دنیا اور دنیا کی تمام نعمتوں کو ٹھیک طور پر کام میں لانا مشیت الٰہی کو پورا کرنا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی تخلیق اس طرح کی ہے کہ

اس میں اپنی آیات وسنن کو نمایاں کرنے کی بھرپور استعداد رکھی ہے۔ انسان میں فطری طور پر علم کی طرف میلان ہے اور صرف علم ہی نہیں بلکہ انسان کی طبیعت میں مجہولات کی بحث و تحقیق کا داعیہ ہے اور اس کے ہر انسان زینت کی چاہت اور طیبات کی رغبت زندگی میں نیرنگیوں اور بوقلمونیوں کا سامان ہے۔ اگر یہ نہ ہوتا تو انسان کی شخصی اور نوعی زندگی دوسرے جانداروں کی طرح کمالات سے محروم ہو کر رہ جاتی۔ اور علوم و فنون میں سے کسی چیز کا بھی ظہور نہ ہوتا، زینت کی چاہت میں درحقیقت زندگی کی ساری ترقیوں کا راز ہے۔ اور اسی راہ سے انسانی استعداد کو کائنات میں اللہ کی سنن کو معلوم کرنے کا موقعہ ملا ہے اس لیے زینت مذموم نہیں بلکہ اس میں اسراف مذموم ہے۔ یہاں حافظ ابن جریر نے یہ بات بہت خوب لکھی ہے کہ قرآن کی اس آیت کی روشنی میں وہ لوگ بلاشبہ خطا کار ہیں جو روئی اور کتان کے ملبوسات کو چھوڑ کر بال اور اون کے کپڑے پہنتے ہیں اور گیہوں کی روٹی گوشت کو چھوڑ کر سبزیوں کو ترجیح دیتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ عمدہ چیزوں کے چھوڑنے میں کوئی پرہیزگاری نہیں۔ لوگ زندگی کی جن زینتوں کو خدا پرستی کے خلاف سمجھتے ہیں قرآن ان کو ہی زینۃ اللہ سے تعبیر کرتا ہے۔

یہ آیت قرآن کا ایک انقلاب انگیز اعلان ہے جس نے انسان کی دینی ذہنیت کی بنیادیں اُلٹ دیں۔ وہ دُنیا جو نجات و سعادت کی طلب میں ترکِ دُنیا کر رہی تھی۔ اب اسی نجات و سعادت کو دُنیا کی تعمیر و ترقی میں ڈھونڈنے لگی۔ حد ہے کہ جن مشاغل اور پیشوں کو عام طور پر دُنیوی کاروبار میں شمار کیا جاتا ہے اسلام نے ان سب پر اُخروی اجر و ثواب مرتب کر کے ان کو وہی مقام عطا کر دیا ہے جو عام دینی فرائض و عبادات کا سمجھا جاتا ہے کہاں یہ نقطہ نظر کہ جو جس حد تک دُنیوی کاروبار سے الگ ہو کر زندگی بسر کرنے لگا۔ اسی حد تک خدا کے حضور میں بلندی حاصل کرے گا اور کہاں یہ عقیدہ کہ دُنیا کے مشغلوں میں انہماک اور ان کے ساتھ اشتغال ہی کو خدا کی خوشنودی اور نزدیکی کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ مذہب کے ان غیر فطری غلط رجحانات کے استیصال میں اسلام نے کہاں تک کام کیا ہے ضرورت ہے کہ اس پر ایک مستقل کتاب لکھی جاتے۔ بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے تو دُنیا کی ساری زینتیں اور پاکیزہ چیزیں بندوں ہی کے لیے پیدا کی ہیں۔ اس لیے اللہ کا منشا تو بہرحال یہ نہیں ہو سکتا کہ انہیں بندوں کے لیے حرام کر دے۔ اب اگر کوئی مذہب یا کوئی روحانی نظام ایسا ہے جو انہیں حرام یا قابل نفرت یا ارتقائے روحانی میں سدِّراہ قرار دیتا ہے تو اس کا یہ فعل خود ہی اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ وہ خدا کی طرف سے نہیں ہے۔ یہ بھی ان حجتوں میں سے ایک اہم حجت ہے جو قرآن نے مذاہبِ باطلہ کے رد میں پیش کی ہے۔

دُنیوی نعمتوں کے حقدار اہل ایمان ہیں

۳۴۔ کہہ دو کہ وہ دُنیا کی زندگی میں اہل ایمان کے لیے ہیں۔ قیامت کے دن صرف ان ہی کے لیے ہوں گی، عالم کی تمام چیزیں اس لیے پیدا کی گئی ہیں۔ کہ آدمی ان سے مناسب طریقہ پر منتفع ہو کر خالق جل و علا کی عبادت، وفاداری اور شکر گزاری میں مشغول ہو۔ اس اعتبار سے دُنیا کی ساری نعمتیں اصل میں مومنین و مطیعین ہی کے پیدا ہوئی ہیں۔ البتہ کافروں کو بھی ان چیزوں سے روکا نہیں گیا۔ وہ بھی اپنے اعمال و تدابیر سے دُنیوی مفاد حاصل کر سکتے ہیں، بلکہ جب اہل ایمان قوت ایمان و تقویٰ میں کمزور ہوں تو یہ عاصین اپنی عملی تگ و دو میں بظاہر زیادہ کامیاب معلوم ہوتے ہیں جسے کچھ تو کفار کے اعمال فانیہ کا ثمرہ سمجھنا چاہیے۔ اور کچھ مومنین کے حق میں تنبیہہ و توبیخ،

(من کان یرید الحیاۃ الدنیا و زینتھا نوف الیھم اعمالھم و ھم فیھا لا یبخسون اولئک الذین لیس لھم فی الاخرۃ الا النار و حبط ما صنعوا فیھا و باطل ما کانوا یعملون۔

اور جو کوئی دُنیا ہی کی زندگی اور اس کی رونق کو مدنظر رکھتا ہے تو ہم ان لوگوں کو ان کے اعمال کی جزاء اسی دُنیا میں پوری طرح دے دیتے ہیں اور ان کے لیے اس میں قطعاً کمی نہیں کرتے۔ یہی لوگ ہیں جن کے لیے آخرت میں آگ کے سوا کچھ نہیں ہے اور ان کی ساری کارگزاریاں آخرت میں بے کار اور سارے اعمال اکارت ہو کر رہ جائیں گے۔

(سورہ ہود، رکوع ۲)

رہی آخرت کی نعمتیں وہ خالص اہل ایمان کا حصہ ہیں۔ بعض علماء نے خالصۃ یوم القیامۃ کے معنی یہ لیے ہیں کہ دُنیوی نعمتیں خالص نہیں کیونکہ ان کے ساتھ بہت سے غم و فکر اور کلفتیں برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ آخرت کی نعمتیں ہر قسم کی کدورات سے خالی ہوں گی اور ابن عباس سے درمنثور میں آیت کے یہ معنے نقل کیے ہیں کہ دُنیوی نعمتیں اس شان سے کہ آخرت میں وبال نہ بنیں صرف مومنین کے لیے ہیں کفار کے حق میں یہاں کا تنعم ان کے کفر اور حق ناشناسی کی وجہ سے عذاب و وبال بن جائے گا[1] خلاصہ یہ ہے کہ واقعہ اور حقیقت کے اعتبار سے تو خدا کی پیدا کردہ ساری نعمتیں اس دُنیا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں بھی اہلِ ایمان ہی کے لیے ہیں لیکن دُنیا کا موجودہ نظام چونکہ ابتلاء اور امہال کے قانون پر قائم ہے اس لیے یہاں اکثر خدا کی نعمتیں بے ایمانوں اور کافروں کو بھی ملتی رہتی ہیں بلکہ بسا اوقات اہلِ ایمان سے زیادہ اہلِ کفر کو نعمتوں سے نوازا جاتا ہے۔ البتہ آخرت میں زندگی کی آرائشیں سب کی سب صرف اہلِ ایمان کے لیے مخصوص ہوں گی۔ اور اہلِ کفران میں سے کچھ نہ پا سکیں گے۔ جنہوں نے اپنے رزق پر پلنے کے بعد اپنے رب ہی کے خلاف سرکشی کی۔ مطلب یہ ہے کہ دُنیا کی ساری نعمتیں دُنیا میں اہلِ ایمان کا حصہ ہیں اور تبعاً اہلِ کفر بھی شریک ہیں اور آخرت میں تو خاص الخاص اہلِ ایمان ہی کے لیے ہوں گی۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس، ضحاک، الحسن، قتادہ، ابن جریج اور ابن زید سے یہی تفسیر منقول ہے۔ علامہ زمخشری فرماتے ہیں کہ پوری بات اس طرح تھی ھی للذین آمنوا ولغیرھم فی الحیاۃ الدنیا خالصۃ یوم القیامۃ دُنیوی نعمتیں دُنیا میں اہلِ ایمان اور اہلِ کفر سب کے لیے ہیں لیکن قیامت کے روز صرف اہلِ ایمان کا حق ہیں۔ لغیرھم کی تصریح نہ کرنے میں نکتہ بلاغت یہ ہے کہ اصالۃً تو ان نعمتوں کے حقدار اہلِ ایمان ہی ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے تبعاً اہلِ کفر کو بھی اس میں شامل کر دیا ہے۔ باقی آخرت میں سو فی صد اہلِ ایمان ہی کا حصہ ہوگا۔ کافروں کا ان میں کوئی حصہ نہ ہوگا۔ آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ اس دُنیا میں اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھانا اہلِ ایمان ہی کا کام ہے اور یہ بات دینداری کے ہرگز منافی نہیں ہے۔ جو لوگ اللہ کی نعمتوں کو مایا کا جال سمجھتے ہیں اور ان سے دستبرداری کو تقربِ الٰہی کی شرط ٹھہراتے ہیں اُن کا خیال صحیح نہیں ہے۔ صحیح یہ ہے کہ اللہ کی نعمتوں سے فائدہ اٹھاؤ، اللہ کے شکر گزار رہو۔ اعتدال اور میانہ روی اختیار کرو۔ امام ابوبکر الجصاص نے قرآن کی آیت انشاکم من الارض واستعمرکم فیھا کے خبری پیمانہ سے اگر یہ بات سمجھی ہے کہ

> یہ آیت بتاتی ہے کہ زمین کا آباد کرنا، کھیتی باغبانی اور عمارات کے ذریعے سے واجب ہے۔

تو یہ کوئی مبالغہ نہیں بلکہ ھی للذین آمنوا کا ناگزیر تقاضا ہے۔ ان کے خیال میں بات صرف جائز اور سنت کی نہیں بلکہ واجب اور فرض کی ہے۔ اگر جملہ فعلیہ سے ابوبکر الجصاص دُنیا کی آبادکاری کو واجب اور فرض بتاتے ہیں تو کوئی وجہ نہیں کہ جملہ اسمیہ ھی للذین آمنوا سے مسلمانوں کے لیے دُنیا کی نعمتوں سے استفادہ واجب اور فرض نہ ہو۔ شاید قرآن کے اسی طرزِ خطاب سے متاثر ہو کر مشہور صوفی بزرگ حضرت شیخ ابوالمکارم علاء الدولہ سمنانی نے یہ فیصلہ فرمایا ہے۔ مولانا جامی نے اپنی کتاب نفحات الانس میں ان کا یہ فیصلہ نقل کیا ہے:

> اللہ تعالیٰ نے زمین اور کھیتوں کو حکمت سے پیدا فرمایا ہے اور خدا چاہتا ہے کہ یہ آباد رہیں اور ان سے مخلوق کو نفع پہنچے۔ اگر لوگوں کو یہ معلوم ہو جاتے کہ دُنیا کی آبادکاری

جس سے فائدہ اور آمدنی مقصود ہو۔ فضول خرچی کے طور پر یہ آبادکاری نہ ہو اس میں کتنا ثواب ہے اگر لوگوں کو اس کا صحیح علم ہو تو ہرگز آبادکاری کا کام نہ چھوڑیں۔
آگے اس کی مزید توضیح فرماتے ہیں:

جو کوئی زمین کا ایسا قطعہ رکھتا ہے کہ اس سے ہزار من غلہ سالانہ حاصل ہو سکتا ہے۔ اگر اس کی کوتاہی اور کاہلی و سستی سے بجائے ہزار من کے نو سو من غلہ اس زمین سے حاصل ہوا اور اس کی وجہ سے سو من غلہ مخلوق کے حلق میں نہ پہنچ سکا تو قیامت کے دن اس سے اس سو من کی باز پرس ہو گی۔

آخر میں فرماتے ہیں:

اپنی کاہلی سے جو زمین کی آبادکاری چھوڑ بیٹھے اور اس کا نام ترک دنیا اور زہد رکھے تو یہ شیطان کی پیروی کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ظاہر ہے جو ھی للذین آمنوا فی الحیاۃ الدنیا کے حکم سے اعراض کر کے دوسری مخالف راہ اختیار کرے گا تو یہ شیطان کا پیروکار نہیں تو اور کیا ہے۔

اُمتِ محمدیہ اہلِ علم ہیں

۳۵۔ اسی طرح ہم آیات کو ان لوگوں کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں جو اہلِ علم ہیں۔ یعنی زینت اور طیبات من الرزق کے بارے میں یہ بات کھول کر ہم نے ان لوگوں کے لیے بیان کی ہے جو اس دُنیا کی زندگی میں اجتماعی قوانین سے واقف ہیں اور جن کو انسان کے طبعی تقاضوں اور مصلحتوں اور صالح تمدن کا علم ہے نزولِ قرآن سے پہلے انسانی زندگی اس موضوع پر مادیت اور رہبانیت کے دوراہے پر کھڑی تھی۔ قرآن نے انسانی سعادت کے اُصول بتائے۔ شارحینِ قرآن نے یہاں قلم کی کوتاہی کا مظاہرہ کیا ہے لیکن دوسرے عُلماء نے دادِ تحقیق دی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ مسلمان تمام علوم بشریہ میں کافروں سے زیادہ علم رکھتے ہیں اور مسلمان فرقوں میں اہل السنہ تمام اہلِ بدعت سے زیادہ علم والے ہیں۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ سارے عرب کو جاہلیت اور بداوت سے نکال کر اس نورِ علمی سے منور ہی قرآن و نبوت نے کیا ہے جس کے ذریعے وہ خود ٹھیک ہوتے اور پوری دُنیا کو صالح بنا دیا۔ دینی زندگی، علمی زندگی، فنی زندگی اور اخلاقی زندگی میں تمام عُلوم کے احیا کا صدرِ اوّل کے مسلمان باعث بنے۔
دین دراصل نام اس خدائی رہنمائی کا ہے جو اہلِ عقل و فہم کو ان کے ارادہ و اختیار کے ساتھ دُنیا کی زندگی

میں وہ وسائل فراہم کرتی ہے جس کے ذریعے اولاً دنیا میں اور آخراً آخرت میں انسانی زندگی کامیابی سے ہمدوش ہو یا یوں کہہ دیجئے کہ جس کے ذریعے سعادتِ دارین حاصل ہو۔ واضح بات ہے کہ جس دین کی بنیاد ہی فطرتِ انسانی پر ہو، جس کا کہنا یہ ہو کہ اللہ تعالیٰ نے جس مخلوق کو بھی پیدا کیا ہے اسے ٹھیک ان ہی صلاحیتوں، قوتوں کے ساتھ پیدا کیا ہے جو اس کے مقصد آفرینش کے لیے مطلوب اور ضروری تھیں۔ جو انسان کی خالص مادی خواہشوں کی تکمیل کو بھی ثواب کا کام اور دینداری قرار دیتا ہو۔ جس نے انسان کی پوری انفرادی اور اجتماعی زندگی کے بارے میں ایک جامع و ہمہ گیر نظام دے رکھا ہو، جس نے اپنے تمدنی اور سیاسی نوعیت کے احکام کو صراحتاً اللہ کی قائم کی ہوئی حدود اور دین فرمایا ہو اور ان کی خلاف ورزی پر عذاب کی دھمکی دے رکھی ہو، وہ دین اس بات کو کیسے گوارا کر سکتا ہے کہ اس کے پیروکار دنیا سے بے خبر، فقیر اور ضعیف بن کر رہیں اور اس طرح گویا اپنی زبانِ حال سے اس خیال کے فیصلے کا اعلان کریں کہ ان کے اندر جو گوناگوں قسم کی فطری قوتیں اور مختلف قسم کے جذبات و احساسات پائے جاتے ہیں، معاذاللہ اللہ سبحانہ نے فضول پیدا کیے ہیں۔ قرآن کے نزدیک یہ طرزِ فکر عالمانہ نہیں ہے انسان کے اپنے ذہن کی ایجاد ہے۔

قُلْ إِنَّمَا حَرَّمَ رَبِّيَ الْفَوَاحِشَ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ وَالْإِثْمَ وَالْبَغْيَ بِغَيْرِ الْحَقِّ وَأَنْ تُشْرِكُوا بِاللَّهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهِ سُلْطَانًا وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿٣٣﴾

اے پیغمبر کہہ دو کہ میرے رب نے صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں ، بے حیائی کی باتیں جو کھلے طور پر ہوں یا چھپا کر کی جائیں گناہ کی باتیں ناحق کی زیادتی ، یہ کہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہراؤ جس کی اس نے کوئی سند نہیں اتاری ہے اور یہ کہ خدا کے نام سے ایسی بات کہو جس کے لیے تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے ۔

معانی مفردات

حَرَّمَ ، اس نے حرام کیا ، اس نے منع کیا ، تحریم سے جس کے معنے حرام کر دینے اور سختی سے روک دینے کے ہیں ۔ صیغہ واحد مذکر ماضی معروف ، اسی سے حرام ہے حرمت والا اور ممنوع جمع حرم ، امام راغب لکھتے ہیں کہ جس چیز سے منع کیا جائے وہ حرام ہے خواہ بہ تسخیر الٰہی ممنوع ہو یا بہ منع قہری یا عقل کی رُو سے یا شرع و قانون کی راہ سے یا اس شخص کی وجہ سے جس کا حکم مانا جاتا ہے ۔ تسخیر الٰہی سے حرام ہونے کی مثال

ومن حرمنا علیہ المراضع (اور ہم نے دائیوں کا دودھ اس پر حرام کر دیا) ہے کہ اللہ نے اپنی تسخیر سے دائیوں کا دودھ پینے سے روک دیا۔ اور منع قہری سے حرمت کی مثال جیسے ان اللہ حرمہما علی الکافرین یعنی بزور قوت کافروں کو اس سے محروم کر دیا۔ باقی وجوہ حرمت کی مثالیں ظاہر ہیں۔ الفواحش جمع فاحشہ کی بے حیائی کے کام، کھلے گناہ، قاموس میں ہے حد سے بڑھی ہوئی بدی۔ مرزا ابوالفضل کہتے ہیں، ایسی بے حیائی جس کا اثر دوسروں پر پڑے۔ منتہی الارب میں ہے ہر وہ چیز جس کی اللہ نے ممانعت کر دی ہو بری بات یا برا کام، یہ لفظ فحش سے نکلا ہے جس کے اصلی معنے حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے لازمی معنے قبیح یعنی برائی کے ہیں۔ الاثم، گناہ اس کی جمع آثام آتی ہے اور آثام اثم کی جزا کے معنے میں آتا ہے جیسے ومن یفعل ذالک یلق اثاماً اور جو شخص یہ کرے گا وہ سزا پاوے گا۔ اثم کے اصلی معنے کوتاہی کے ہیں۔ آثمہ اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو تیز چل سکتی مگر جان کر سست چلے اسی سے اس لفظ میں گناہ کا مفہوم آیا ہے۔ البغی، یہ لفظ کسی پر زیادتی یا دست درازی کے معنے میں آیا ہے اور لغت میں حد سے تجاوز اور ایسی چیز کی تلاش جو اس کا حق نہ ہو۔ اسی سے زخم کے خراب ہونے کو بغی الجرح بولتے ہیں۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ بغی زیادہ تر حقوق العباد میں دست درازی پر بولا جاتا ہے اگر لفظ عدوان کے ساتھ ہو تو بغی کے معنے بالذات حرام کے ذریعے ظلم کاری کے آتے ہیں جیسے چوری، جھوٹ وغیرہ سوسائٹی کے حقوق میں بغی وعدوان کی وہی حیثیت ہے جو حقوق اللہ میں اثم و عدوان کی ہے۔ اللہ سبحانہ کا حق ہو یا بندوں کا یعنی ان دونوں میں حق سے تجاوز اور حق میں کوتاہی پر بولا جاتا ہے۔

خدا کی حرام کردہ اصل چیزیں

اس سے پہلی آیات میں بتایا تھا کہ انسانوں نے ازراہ تقدس لباس طیبات من الرزق اور زینت کو حرام قرار دے رکھا ہے۔ اب یہاں بتایا جاتا ہے کہ یہ چیزیں حرام نہیں ہیں۔ خدا کی حرام کردہ تو صرف یہ ہیں کردار میں فواحش یعنی برائی اور بے حیائی کے سارے کام خواہ خلوت میں ہوں یا جلوت میں۔ دوسرے گناہ کے کام اور تیسرے ناحق زیادتی، یہ تینوں اخلاقی رذائل ہیں اور ان کا تعلق انسان کے کردار سے ہے۔ دوسرے جس چیز کو حرام کیا ہے اس کا تعلق کردار سے اولاً افکار سے ہے یعنی شرک باللہ تیسرے جس چیز کو حرام کیا ہے اس کا تعلق گفتار سے ہے یعنی قول علی اللہ بغیر علم، یہی اصول محرمات ہیں۔

یہ گویا ایک اٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ حالات نے خود یہ سوال پیدا کر دیا کہ اگر یہ حرام نہیں تو پھر حرام کیا ہے۔ فرمایا اے پیغمبر کہہ دو کہ میرے رب نے صرف یہ چیزیں حرام کی ہیں۔ محرمات کی یہ انواع تمام ادیان اور ساری ملل میں حرام رہی ہیں۔ ان کی حرمت دائمی ہے۔ یہ کبھی حلال نہیں ہوئی ہیں۔ یہ سب انبیاء کی بتائی ہوئی اجتماعی برائیاں ہیں۔ ان برائیوں کی اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ درحقیقت برائی اور بے حیائی کے کام ہیں اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں۔ اگر ان کو جائز ٹھہرایا جاتے تو افراد کے باہمی حقوق سے امان اٹھ جائے گی اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے گی فواحش اثم اور بغی میں منطقی لحاظ سے مانعۃ الخلو ہے یعنی کسی بداخلاقی میں ان تینوں کا اجتماع تو ہو سکتا ہے مگر کوئی بداخلاقی ان تینوں میں سے کسی ایک سے خالی نہیں ہو سکتی یعنی ہر بداخلاقی میں تینوں کا یا تینوں میں سے ایک کا پایا جانا ضروری ہے۔

قرآن میں محرمات دو قسم کے ہیں۔ محرم بالذات اور محرم بالعرض۔ محرم بالذات وہ ہیں جن کا ارتکاب کسی حال میں بھی درست نہیں ہے۔ یہ چاروں اسی قسم سے تعلق رکھتے ہیں۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ آیت گرامی میں ان کی ترتیب میں خاص نکتہ بلاغت یہ ہے کہ ان میں جرم کے اعتبار سے جو زیادہ سنگین ہے وہ سب سے آخر میں ہے یعنی ترقی من الادنی الی الاعلیٰ کو ملحوظ رکھا گیا ہے پہلے فواحش کا ذکر کیا گیا پھر فواحش سے زیادہ سنگین جرائم اثم اور بغی بغیر الحق کو بیان کیا گیا ہے۔ پھر اثم اور بغی سے زیادہ سنگین جرم کو پیش کیا، یعنی شرک باللہ اور آخر میں سب سے زیادہ عظیم جرم قول علی اللہ بغیر علم کو بیان کیا ہے۔ یہ محرمات میں سب سے بڑا جرم ہے، یہی شرک کی جڑ ہے اسی سے کفر کو پلنے اور پھولنے کا موقعہ ملتا ہے بلکہ اگر یوں کہا جائے کہ دنیا کی ساری ضلالتوں کا شجرہ نسب بالواسطہ اور بلاواسطہ اسی سے ملتا ہے تو یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

۳۳۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ میرے رب نے یہ چیزیں حرام کی ہیں، بے حیائی کی باتیں جو کھلے طور پر ہوں یا چھپا کر کی جائیں اور گناہ کی باتیں۔ اثم سے مراد عام گناہ ہیں اور بعض مخصوص گناہوں کی مناسبت مقام یا اہمیت کی وجہ سے بیان فرمادیا اور بعض کے نزدیک اثم وہ گناہ ہے جس کا تعلق گناہ کرنے والے کے سوا دوسرے لوگوں سے نہ ہو[1]

اس آیت میں بطور استیناف یہ بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ نے کیا حرام کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن کو تم نے حرام قرار دے رکھا ہے وہ حرام نہیں حرام تو صرف یہ چیزیں ہیں۔ اور اللہ نے ان کو قطعی طور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پر نہیں بلکہ ساری کتابوں میں اور سارے نبیوں کی زبانی حرام کیا ہے - ان کی حرمت دائمی ہے - کسی حال میں کبھی حلال نہیں ہوئی ہیں - ان میں پہلی چیز فواحش ہیں ظاہر ہوں یا پوشیدہ - فواحش فاحشہ کی جمع ہے - صفت کا صیغہ ہے موصوف محذوف ہے یعنی ایسے افعال، ایسے اقوال، ایسے اخلاق جن کی برائی کو سلیم الفطرت اور عقل صحیح صاف صاف مانتی ہو - اہل عرب زنا، لواطت، بخل، بہتان اور یاوہ گوئی کو فاحشہ کہتے ہیں - بظاہر الفواحش مختصر سا لفظ ہے مگر درحقیقت اس میں اللہ سبحانہ نے ان لوگوں کے جاہلانہ عقائد کے خلاف ایک بہت بڑی دلیل پیش کی ہے - اس طرز استدلال کو سمجھنے کے لیے دو باتیں بطور مقدمہ کے پہلے سمجھ لینی چاہئیں - ایک یہ کہ اہل عرب اگرچہ اپنی بعض مذہبی رسموں میں برہنگی اختیار کرتے تھے اور اسے ایک مقدس مذہبی فعل سمجھتے تھے لیکن برہنگی کا بجائے خود ایک شرمناک فعل ہونا خود ان کے یہاں بھی مسلم تھا - دوسرے یہ کہ وہ لوگ برہنگی کو شرمناک جاننے کے باوجود ایک مذہبی رسم کی حیثیت سے اپنی عبادت کے موقع پر اختیار کرتے تھے اور چونکہ اپنے مذہب کو خدا کی طرف سے سمجھتے تھے - اس لیے ان کا دعویٰ تھا کہ یہ رسم بھی خدا کی طرف سے مقرر ہوئی ہے - اس پر قرآن نے بتایا ہے کہ فواحش ظاہر ہوں یا پوشیدہ، اللہ نے حرام کیے ہیں، قرآن میں زنا، عمل قوم لوط، برہنگی، جھوٹی تہمت اور باپ کی منکوحہ سے نکاح کرنے کو فحش افعال میں شمار کیا گیا ہے - حدیث میں چوری اور شراب نوشی اور بھیک مانگنے کو من جملہ فواحش کہا گیا ہے - اسی طرح دوسرے شرمناک افعال بھی فواحش میں داخل ہیں - اور ارشاد الٰہی یہ ہے کہ اس قسم کے افعال علانیہ اور پوشیدہ حرام ہیں - حضرت عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں کہ اہل جاہلیت اگرچہ علانیہ زنا کو ناجائز سمجھتے تھے لیکن چوری چھپے جائز سمجھتے تھے اور کہتے تھے کہ کھلم کھلا کرنا تو کمینہ پن ہے لیکن چھپ کر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے - بالکل اسی طرح جیسے آج کی جدید جاہلیت جبری زنا کو ناجائز کہتی ہے لیکن رضامندی سے زنا کیا جائے تو اس پر کوئی قانونی قدغن نہیں ہے -

عام طریقہ کے علاوہ نکاح کی اور چند قسمیں جاری تھیں جو حقیقت میں فواحش ہی کی قسمیں تھیں - مثلاً ایک یہ کہ کوئی بہادر شخص ہوتا تو اپنی عورت کو اس کے پاس بھیج دیتے تھے کہ اس سے ہم بستر ہو، بچہ پیدا ہوتا تھا تو سمجھتے تھے کہ اس میں بھی وہی جوہر آجائیں گے جس کا یہ نطفہ ہے - دوسرا طریقہ یہ تھا کہ چند آدمی جن کی تعداد ایک وقت میں دس ہوتی تھی کسی عورت کے پاس جاتے اور سب اس سے ہم صحبت ہوتے جب وہ حاملہ ہوتی اور بچہ جنتی تو سب کو بلا لیتی اور کسی ایک سے کہتی کہ یہ بچہ تمہارا ہے اس کو قبول کرنا پڑتا اور پھر وہ اس کا بیٹا سمجھا جاتا - تیسرا طریقہ یہ تھا کہ فاحشہ عورتیں جو بر سر بازار جھنڈیاں لگا کر بیٹھتی تھیں ان کے لڑکا پیدا ہوتا تو قیافہ شناس کو بلایا جاتا وہ صورت و شکل دیکھ کر بتاتا کہ فلاں شخص کا نطفہ ہے -

عورت اس کو بلا کر کہتی کہ یہ تمہارا بچہ ہے۔ صحیح بخاری کتاب النکاح میں یہ تینوں طریقے تفصیل سے مذکور ہیں۔
ایک اور قسم عارضی نکاح کی بھی اور وہ یہ تھی کہ کسی عورت سے مدت مقررہ کے لیے نکاح کر لیتے تھے اس مدت کے گزر جانے کے بعد اس کی اُجرت دے کر اس کو الگ کر دیتے اس کو متعہ کہتے تھے۔ اسلام نے شروع میں اس کو ضرورت سے چند دن باقی رکھا پھر ہمیشہ کے لیے اس کو حرام کر دیا۔
یہ تو پہلے سُن چکے ہو کہ حج میں مادرزاد ننگے ہو کر طواف کرتے۔ صحیح مسلم باب التفسیر میں حضرت عبداللہ ابن عباس سے یہ روایت نقل کی ہے کہ نہاتے وقت اوٹ نہ کرتے تھے کھلے میدان میں بے ستر ہو کر نہاتے تھے۔ ابوداؤد میں ہے کہ پاخانہ پیشاب کے وقت پردہ نہیں کرتے تھے۔ جلسوں میں بیٹھتے تو بیویوں سے ہم صحبتی کے تمام واقعات بیان کرتے۔ سوتیلی ماؤں پر دراشتہً قبضہ کر کے ان کو بیوی بنا لیتے۔ یہاں قرآن نے ان سب کو فواحش قرار دے کر حرام کیا ہے۔
دوسری چیز جو اس آیت میں محرمات میں شمار کی گئی ہے وہ اثم ہے۔ لغت میں اثم ہر ایسے کردار کو کہتے ہیں جو بُرا بھی ہو اور نقصان دہ بھی ہو۔ اس لیے لفظ اثم کی وسعتوں میں سارے گناہ آ جاتے ہیں خواہ کبائر ہوں یا صغائر۔ کبائر جیسے فواحش اور شراب اور صغائر جیسے اپنی بیوی کے علاوہ کسی عورت کو شہوت سے دیکھنا یا چھونا، اسی کو قرآن میں لمم کہا ہے۔ سورہ نجم میں اسی کا ذکر ہے۔

الذین یجتنبون کبائر الاثم والفواحش الا اللمم

جو لوگ بچتے ہیں بڑے گناہوں سے اور بدکاریوں سے مگر کچھ آلودگی۔

اس آیت میں فواحش کا عطف کبائر اثم پر ہے اثم پر نہیں ہے۔ یہ عطف خاص بر عام ہے۔
قرآن نے فواحش کی طرح اثم کے بارے میں یہ بات بتائی ہے کہ اثم کھلم کھلا ہو یا پوشیدہ دونوں کو چھوڑ دینا چاہیے۔ ارشاد ہے:

وذروا ظاھر الاثم وباطنہ

گناہ ظاہر ہو یا پوشیدہ دونوں کو چھوڑ دو۔

ہر گناہ کے دو پہلو ہوتے ہیں ایک اس کا باطنی پہلو دوسرا اس کا ظاہری پہلو۔ اس بات کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک تو اس کی حقیقت ہوتی ہے جس کا مقام انسان کا نفس اور اس کا دل ہوتا ہے۔ دوسرے اس کے وہ مظاہر و قوالب ہوتے ہیں جن میں انسانی زندگی کے اندر وہ نمایاں ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دونوں سے بچ کر رہو، شرک کے عقیدہ و تصور سے بھی بچو اور اس کے مظاہر اشکال سے بھی دور رہو۔

یہاں بعض شارحین نے اثم سے مراد شراب بتائی ہے۔ عبداللہ بن عباس اور الحسن البصری سے بھی یہی منقول ہے اور کچھ اہلِ لغت کا یہی میلان ہے لیکن ابن الانباری کو اس پر اصرار ہے کہ اہلِ عرب نے کبھی زمانہ جاہلیت میں اور زمانہ اسلام میں لفظ اثم بول کر شراب مراد نہیں لی۔ اور ابو حیان اندلسی نے یہ کہہ کر اس تفسیر و تشریح کی صحت ہی سے انکار کر دیا ہے کہ یہ سورت مکی ہے اور شراب غزوہ احد کے بعد مدینہ میں حرام ہوئی ہے۔

تیسری چیز آیت میں جو حرام کی گئی ہے وہ بغی ہے اس کے معنے کسی پر زیادتی یا دست درازی کرنا ہیں۔ قرآن میں ہے :

خصمان بغی بعضنا علی بعض دو جھگڑنے والے ہیں ہم میں سے ایک نے دوسرے پر زیادتی کی ہے۔

اصل لغت میں بغی کے معنے حد سے تجاوز کر جانے کے ہیں۔ زخم زیادہ خراب ہو جائے تو بغی الجرح بولتے ہیں۔ قرآن میں زمین میں بغاوت کرنا جن آیات میں آیا ہے اس سے مراد بھی حد سے تجاوز ہے۔ اور جب لفظ کا صلہ علی آئے تو اس کے معنے لوگوں کی جان، مال اور آبرو پر دست درازی کرنے کے ہیں۔ آیت میں جس بغی کو حرام کیا گیا ہے وہ گناہ ہے جس میں حق کی حدود سے تجاوز کیا جائے یا لوگوں کے حقوق پر دست درازی کی جائے۔ یہاں بغی چونکہ لغوی معنے میں آیا ہے اس لیے اس میں بغیر الحق کی قید لگائی ہے۔

حافظ ابن القیم فرماتے ہیں کہ اثم وہ ہے جس کی جنس حرام ہو اور عدوان وہ ہے جس کی مقدار حرام ہو۔ اس کے بعد لکھا ہے کہ بغی میں غالب استعمال یہ ہے کہ لوگوں کے حقوق میں دست درازی ہو اور اگر بغی عدوان کے ساتھ آئے تو مطلب یہ ہے کہ محرم الجنس کے ذریعے لوگوں پر ظلم ہو رہا ہے۔ مثلاً چوری کرے، جھوٹ بول کر، بہتان لگا کر یہ سب چیزیں بالذات حرام ہیں۔ بغی و عدوان کی حیثیت حقوق العباد میں بالکل وہی ہے جو اثم و عدوان کی حیثیت حدود اللہ میں ہے۔

آیت میں چوتھی چیز جسے حرام قرار دیا ہے یہ ہے ان تشرکوا باللہ مالم ینزل بہ سلطانا، سلطان کے معنے برہان اور دلیل کے ہیں۔ جہاں تک خدا کو ماننے کا تعلق ہے وہ تو عقل و فطرت کا ایک بدیہی تقاضا ہے اور مشرک بھی خدا کو مانتا ہے۔ رہی یہ بات کہ عبادت میں خدا کا کوئی شریک بھی ہے تو اس کا مشرک مدعی ہے اور مدعی کے ذمہ دلیل ہے لیکن مشرک کا دامن دلیل سے خالی ہے یہاں بتایا ہے کہ اللہ نے اس بات پر کہ عبادت میں اس کا کوئی بھی شریک ہے کوئی دلیل نہیں اتاری ہے۔ یعنی اس کائنات میں مشرک کے دعویٰ شرک پر کوئی دلیل نہیں ہے۔ ایک موقعہ پر اسی بات کو اس انداز میں پیش کیا ہے۔

من یدع مع اللہ الٰھا اخر لا برھان لہ بہ

جو کوئی اللہ کے ساتھ کسی معبود کو پکارتا ہے تو اس کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہے۔

ایک دوسرے موقعہ پر اللہ تعالیٰ کی صفت رزاقیت، خالقیت اور حاکمیت پیش فرمانے کے بعد مشرکوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اگر تم ان کا انتساب کسی اور کی طرف بھی کرتے ہو تو اپنے اس دعویٰ شرک پر کوئی دلیل بھی تو پیش کرو۔

قل ھاتوا برھانکم ان کنتم صادقین

سچے ہو تو دلیل پیش کرو۔

قرآن کا موقف یہ ہے کہ مشرک مدعی ہے اور دلیل پیش کرنا اس کی ذمہ داری ہے۔ بارِ ثبوت مدعی کے ذمہ ہوتا ہے لیکن اس کے ترکش میں دلیل کا کوئی تیر نہیں ہے۔ قرآن نے توحید کے موضوع پر بھی فطری دلیل پیش کی تھی۔ لیکن افسوس ہمارے متکلمین کا ایک گروہ بلا وجہ خود مدعی بن بیٹھا اور محض اس غلط طریقہ کار کی وجہ سے ان کو تمانع وغیرہ اختراعی دلائل پیش کرنے پڑے۔ اور تکلف یہ ہے کہ توڑ مروڑ کر قرآنی آیتوں کو بھی ان خود ساختہ دلائل پر منطبق کرنا پڑا۔ جس دلیل کا نام متکلمین نے "برہان تمانع" رکھا ہے اور قرآن کی جس آیت سے وہ اسے نکالنا چاہتے ہیں ہم انشاء اللہ پارہ سترہ میں اس پر تفصیلی بحث کریں گے۔

آخری چیز جو آیت میں حرام بتائی گئی ہے وہ قول علی اللہ بغیر علم ہے۔ یہ محرمات میں سب سے زیادہ سنگین ہے۔ حافظ ابن القیم نے لکھا ہے کہ اس آیت میں ترقی من الادنیٰ الی الاعلیٰ ہے۔ یعنی جو چیز سب سے آخر میں ہے وہ حرمت میں سب سے بڑھ کر ہے۔ دین میں تمام تحریفات اور ساری بدعات کی اصل و اساس یہی قول علی اللہ بغیر علم ہے۔ فکری بدعات ہوں یا عملی بدعات سب کا سرچشمہ یہی قول علی اللہ بغیر علم ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے شرک کے بعد جس طرح بدعت کی تردید فرمائی ہے شاید ہی کسی اور چیز کی تردید فرمائی ہو۔ اور حقیقت بھی یہی ہے کیونکہ بدعت سے دین کا اصلی حلیہ اور صحیح نقشہ بدل جاتا ہے اور اصل و نقل، حق و باطل میں کوئی تمیز باقی نہیں رہتی۔ قرآن نے صراحت سے بتایا ہے کہ دین کے بگڑ جانے اور مٹ جانے کا صرف ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے "قول علی اللہ بغیر علم" اس کے نتیجے میں اللہ کا دین لوگوں کی خواہشات اور آراء کا ایک کھلونا بن کر رہ جاتا ہے۔ جس کا جی چاہا کسی چیز کو اپنی مرضی سے دین بنا دیا اور جس کی خواہش ہوئی کسی چیز کو دین سے خارج کر دیا۔ علامہ جمال الدین قاسمی نے علامہ حشمی سے یہ بات بہت اچھی لکھی ہے کہ جیسے پہلی آیت من حرم زینۃ اللہ الخ، تمام

مباحات کے لیے جامع ہے ایسے ہی یہ آیت گرامی اپنے دامن میں تمام محرمات کو سمیٹے ہوئے ہے۔ فواحش اور اثم میں سارے گناہ صغیرہ وکبیرہ افعال قبیحہ غیر قانونی معاملات، بری باتیں، غلط افکار داخل ہیں ماظہر منھا و مابطن میں افعال جوارح، افعال قلوب، خیانات مکر، دھوکا سمیٹے ہوتے ہیں اور جیسے بغی یں ساری زیادتیاں، ساری دست درازیاں اور حکام کی ساری چیرہ دستیاں داخل ہیں ایسے ہی ان تشرکوا باللہ میں سارے شرک پر مبنی اعمال سارے مشرکانہ عقائد اور ساری مشرکانہ عبادات داخل ہیں۔ اور آخر میں ان تقولوا فرماکر ساری بدعات سارے قرآن وسنت سے بیگانہ فتاوی، ہر قسم کی جھوٹی شہادت پر قدغن قائم کردی ہے۔

حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں اس آیت پر بڑا ہی درد انگیز اور بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

آیت میں قول علی اللہ بغیر علم تمام محرمات میں باعتبار حرمت عظیم تر اور بلحاظ گناہ سب سے زیادہ سنگین ہے۔ اسی لیے آیت میں اس کا ذکر چوتھے درجہ میں کیا ہے۔ اس آیت میں جن محرمات کا ذکر کیا ہے۔ ظاہر وپوشیدہ فواحش، اثم، بغی، شرک اور قول علی اللہ بغیر علم، یہ تمام آسمانی شرائع اور الٰہی ادیان میں، ہمیشہ حرام رہے ہیں اور کبھی کسی حال میں بھی ان کی اباحت نہیں ہوئی۔ ان کی حیثیت مردار، خون، لحم، خنزیر کی نہیں ہے کہ حالت اختیار میں حرام اور حالت اضطرار میں حلال ہیں۔ محرمات دو قسم کے ہیں کچھ وہ ہیں جو بالذات حرام ہیں اور کسی حال میں حلال نہیں اور کچھ وہ ہیں کہ جن کی حرمت عارضی ہے ایک وقت حرام ہیں اور ایک وقت حرام نہیں۔ اس آیت میں ان محرمات کا چہرہ پیش کیا گیا ہے جو بالذات حرام ہیں۔ سب سے پہلے فواحش کا ذکر کیا بعد ازیں ان محرمات کا ذکر کیا جو فواحش سے بھی زیادہ حرام ہیں۔ یعنی اثم اور بغی بغیر الحق، پھر اس محرم کا بیان کیا جو فواحش، اثم اور بغی بغیر الحق سے بھی سنگین ہے یعنی شرک باللہ، اس کے بعد اس جرم کا تذکرہ کیا جو شرک سے بھی زیادہ سنگین جرم ہے۔ یعنی قول علی اللہ بغیر علم، یہ سب سے زیادہ سنگین جرم ہے اور اس کی سنگینی کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ایک طرف اللہ کے بارے جھوٹ اڑانا ہے اور خدا کی طرف ایسی بات کو منسوب کرنا ہے جو اس کے شایان شان نہیں ہے۔ دوسری طرف دین الٰہی کی تحریف و تبدیلی ہے۔ باطل کو حق کے نام پر اور حق کو باطل کے نام پر پیش کرنا ہے۔ اس لیے اللہ کے نزدیک اجناس محرمات میں سنگینی کے اعتبار سے اس سے زیادہ سنگین گناہ کوئی نہیں ہے۔ یہی دنیا میں شرک وکفر کی اساس ہے اور اسی پر بدعات وضلالات کی عمارت بنتی ہے۔ ہر ضلالت خیز بدعت کا نسب نامہ بواسطہ یا بلا واسطہ قول علی اللہ بغیر علم سے

وابستہ ہے۔

یہاں امام رازیؒ نے یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ یہ آیت سب سے طاقتور دلیل ہے۔ اس کی کہ بلا دلیل کچھ کہنا غلط ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دلیل و حجت کی ترازو پر تولے بغیر دین کی زندگی میں محض تقلیداً کچھ کہنا درست نہیں ہے۔ قاضی بیضاویؒ نے بات کو زیادہ کھول کر بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ جس دعویٰ کی پشت پر دلیل کی طاقت نہ ہو اس کی پیروی حرام ہے۔ یاد رہے کہ اسلام میں دلائل اور مصادر قانون کی حیثیت جیسے قرآن و سنت کو حاصل ہے ایسے ہی اجماع اور اجتہاد کو بھی حاصل ہے۔ یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے انشاء اللہ ہم اس موضوع پر تفصیلی تبصرہ پارہ ۱۴ میں کریں گے۔ یہاں صرف یہ بات نوٹ کر لیجئے کہ دلائل کا یہ تصور خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا ہے۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یمن کا گورنر بنا کر روانہ کیا تو آپ نے ان کو یہ ہدایت دی کہ :

> اے معاذ تو پیش پا افتادہ معاملات میں فیصلہ کیسے کرے گا۔ حضرت معاذؓ نے فرمایا کہ میں اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کروں گا۔ آپ نے فرمایا کہ تمہیں کتاب اللہ میں نہ ملے تو پھر کیا کرو گے بولے کہ میں اللہ کے رسول کی سنت کے مطابق فیصلہ کروں گا، ارشاد ہوا کہ اگر سنت میں بھی نہ ملے تو پھر کیا کرو گے بولے کہ میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، یہ سن کر آپ نے فرمایا الحمد للہ اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول کے قاصد کو اس کی توفیق عطا فرمائی جس پر اللہ تعالیٰ کا رسول راضی ہے۔

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ أَجَلٌ ۖ فَإِذَا جَاءَ أَجَلُهُمْ لَا يَسْتَأْخِرُونَ سَاعَةً ۖ وَلَا يَسْتَقْدِمُونَ ﴿٣٤﴾

اور ہر اُمّت کے لیے ایک مقررہ مدت ہے لہٰذا جب کسی اُمّت کا ٹھہرایا ہوا وقت آگیا تو پھر نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتی ہے، نہ ایک گھڑی آگے۔[۳۴]

معانی مفردات

اُمَّۃٌ، جماعت ام سے بنا ہے اس کی جمع امم آتی ہے۔ عربی میں اُمّ کا اطلاق تمام ایسی چیزوں پر ہوتا ہے جو ایک طرح کی جامعیت اور مرکزیت رکھتی ہوں یا بہت سی چیزوں میں مقدم اور نمایاں ہوں، پھر کوئی ایسی اوپر کی چیز ہو جس کے نیچے اس کے بہت سے توابع ہوں۔ سر کے درمیانی حصہ کو ام الراس کہتے ہیں کیونکہ وہ دماغ کا مرکز ہے۔ فوج کے جھنڈے کو ام کہتے ہیں، کیونکہ تمام فوج اسی کے نیچے جمع ہوتی ہے۔ مکہ کو ام القریٰ کہتے تھے کیونکہ مکہ عرب کی تمام آبادیوں کے جمع ہونے کی جگہ تھی۔ سُورہ فاتحہ کو ام القرآن کہتے ہیں کیونکہ قرآن کی ساری سورتیں اٹھ اٹھ کر اس کے پیچھے لگتی ہیں۔ امۃ اقوامِ دُنیا میں ایسی جماعت جس میں جامعیت اور مرکزیت ہو یا خود دُنیا کی تمام قوموں میں اپنی نمایاں اور مقدم جگہ رکھتی ہو۔ اجَلٌ، اس کے معنے مدت کے آتے ہیں۔ اجل افراد کی بھی ہوتی ہے اور اُمتوں کی بھی ہوتی ہے۔ ساعۃٌ لغت میں وقت کی کمترین مدت کو کہتے ہیں۔ اور علم النجوم کی اصطلاح میں ساعت دن اور رات کے تمام وقت میں سے $\frac{1}{24}$ کو کہتے ہیں۔

اقوامِ دنیا کے لیے قانونِ تاجیل

پچھلی سورت میں افراد کی اجل کا ذکر کیا گیا تھا، یہاں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہو رہا ہے کہ افراد کی طرح جماعتوں کی موت و حیات کے لیے بھی مقررہ قوانین ہیں، اور ان کے احکام اٹل ہیں۔ جب ایک جماعت کا شر و فساد اس حد تک پہنچ جاتا ہے جو جماعتوں کی ہلاکت کے لیے ٹھہرا دی گئی ہے تو پھر ظہورِ نتائج میں ایک لمحہ کی بھی تاخیر نہیں ہوتی۔

یہاں اس اشارے سے مقصود رؤسائے مکہ کی تنبیہ اور اہلِ ایمان کی تذکیر ہے کہ انقلابِ حال کا وقت آگیا ہے اور ضروری ہے کہ نتائج کا ظہور ہو۔

جس طرح مادیات میں ہر حالت میں بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے احکام مقرر ہیں اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشو و نما کے بعد ظہور میں آئے۔ مثلاً فطرت کا قانون یہ ہے کہ اگر پانی کو آگ پر رکھا جائے گا تو وہ گرم ہو کر کھولنے لگے گا لیکن پانی کے گرم ہونے اور کھولنے کے لیے حرارت کی ایک خاص مقدار ضروری ہے اور اس کی تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ایک مقررہ وقت تک انتظار کیا جائے۔

اس صورتِ حال سے تدریج و امہال کی حالت پیدا ہو گئی اور ظہورِ نتائج کے لیے تاجیل یعنی ایک مقررہ مدت کا قانون ضروری ہو گیا۔ نتائج ہمیشہ اپنے مقررہ وقت پر ظاہر ہوں گے۔ اس تاجیل کے لیے کوئی ایک ہی مقررہ مدت نہیں ہے۔ ہر حالت کا ایک خاصہ ہے اور ہر گرد و پیش اپنا ایک خاص تقاضا رکھتا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک خاص حالت کے لیے مقررہ مدت کی مقدار بہت تھوڑی ہو اور ہو سکتا ہے کہ بہت زیادہ ہو۔

۳۴۔ اور ہر امت کے لیے ایک مقررہ مدت ہے لہٰذا جب کسی امت کا ٹھہرایا ہوا وقت آگیا تو پھر نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتی ہے اور نہ ایک گھڑی آگے۔ بظاہر شبہ ہوتا ہے کہ جب وعدے کا وقت آپہنچا تو تاخیر کا تو امکان عقلی ہے اس لیے اس کی نفی ضروری ہوئی مگر تقدیم تو عقلاً ممکن ہی نہیں ہے اس کی نفی سے کیا فائدہ ہے۔ اسی شبہ کی وجہ سے بعض مفسرین نے لا یستقدمون کا عطف جملہ شرطیہ اذا جاء اجلهم پر مانا ہے اور بعض نے جاء اجلهم سے قرب دنو مراد لیا ہے۔ میرے نزدیک ان تکلفات کی حاجت نہیں ہے۔ محاورات میں کسی ایسی چیز کو جس کے مقابل طرفین ہوں۔ زور اور تاکید

سے تلافی کرنے کے لیے بسا اوقات ایک طرف کی جو محتمل الثبوت ہو نفی مقصوداً کی جاتی ہے اور دوسری طرف کی جو پہلے سے غیر محتمل ہو نفی کو محض مبالغہ تاکید اور تحسین کلام کے طور پر استطراداً ذکر کردیتے ہیں۔ ایک خریدار دکاندار سے کسی چیز کی قیمت معلوم کرکے کہتا ہے کچھ کم و بیش، دکاندار بھی کہہ دیتا ہے کہ کم و بیش نہیں ہو سکتا۔ دونوں جگہ کم کا ذکر مقصود ہے اور بیش کا لفظ محض تعیین قیمت کی تاکید و مبالغہ کے لیے محض استطراداً ذکر کیا گیا ہے۔ یہاں بھی غرض اصلی کلام سے یہ ہے کہ خدا کا وعدہ جب آپہنچے تو پھر اٹل ہے ایک منٹ کی تقدیم و تاخیر نہیں ہو سکتی۔ مقصود تاخیر کی نفی کرنا ہے۔ تقدیم جو پہلے سے ظاہر الانتفا ہے اس کی نفی کرنا محض وعدے کے اٹل ہونے پر زور ڈالنے کا ایک پیرایہ ہے۔ یعنی خدا پر افترا کرنے والے اور اس کی طرف نسبت کرکے حرام کو حلال بنانے والے خدا کی ڈھیل پر مغرور و بے فکر نہ ہوں۔ ہر امت اور ہر فرد کی خدا کے یہاں ایک معین مدت ہے۔ جب سزا کی گھڑی آجائے گی تو ٹل نہ سکے گی۔[1]

اس آیت کی واو کے ذریعہ پہلے سے پیوندکاری کی گئی ہے۔ اس کا معطوف علیہ پہلی آیت میں انما حرم ربی الفواحش ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر کہہ دو خدا کی حرام کردہ چیزیں وہ نہیں جن کو تم حرام بتاتے ہو حرام تو وہ ہیں جن کو اللہ نے حرام کیا ہے اور اے پیغمبر کہہ دو کہ ہر اُمت کی حیات اور بقاء کی علم الٰہی میں ایک مدت مقرر ہے جب وہ پوری ہو جاتی ہے تو نہ ایک گھڑی پیچھے ہوگی نہ آگے بڑھے گی۔ اسی مدت کو قرآن نے یہاں اجل کہا ہے۔

یہاں دو باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

ایک یہ کہ افراد اور اقوام کے بارے میں خدا نے اجل کے پیمانے الگ الگ رکھے۔ افراد کی اجل کا پیمانہ تو سالوں، مہینوں، دنوں، گھنٹوں اور منٹوں کے حساب سے پورا ہوتا ہے۔ جب وہ پورا ہو جاتا ہے فرد ختم ہو جاتا ہے۔ قوموں اور اُمتوں کا معاملہ اس سے ذرا مختلف ہے۔ ان کا حساب ان کے ایمانی، اخلاقی زوال سے ہوتا ہے۔ یعنی ہر قوم کو دُنیا میں جو کام کرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے اس کی ایک اخلاقی حد مقرر کردی جاتی ہے بایں معنے کہ اس کے اعمال میں خیر اور شر کا کم سے کم کتنا تناسب ہے۔ جب تک ایک قوم کی بُری صفات اس کی اچھی صفات کے مقابلہ میں تناسب کی اس آخری حد سے فروتر رہتی ہیں۔ اس وقت تک اسے اس کی تمام برائیوں کے باوجود مہلت دی جاتی رہتی ہے اور جب وہ اس حد سے گزر جاتی ہے تو پھر اس بدکار و بدصفات قوم کو مزید مہلت نہیں دی جاتی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسری یہ کہ قوموں اور اُمتوں کی حد تک اجل دو قسم کی ہے۔ ایک اس اُمت کی اجل جسے نبوت مخاطب کرتی ہے اور جس کی طرف نبی کی بعثت ہوتی ہے۔ نبوت کے مخاطب نبوت کی دعوت کو کبر و عناد کی وجہ سے رد کر دیتے ہیں۔ نبوت سے معجزات کا مطالبہ کرتے ہیں۔ نبوت ان کے مطالبہ پر ان کو معجزات دکھاتی ہے اور ساتھ ہی اُن کو آگاہ کر دیتی ہے کہ نہ ماننے کی صورت میں ہلاکت یقینی ہے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قریش کو تقریباً ۱۳ برس تک دعوت دی۔ اور ان تیرہ سالوں میں اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور آیاتِ ہدایت کے مختلف نمونے ان کو دکھاتے۔ بالآخر شق القمر کا معجزہ بھی ان کی نگاہوں کے سامنے سے گزرا اور آخر وہ وقت آیا جو اپنے اپنے پیغمبروں کے سامنے دوسری قوموں پر آچکا تھا یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افراد صالحہ جو بے خوف و خطر حق کو قبول کر سکتے تھے۔ انہوں نے حق کو قبول کیا اور صرف وہ رؤسائے قریش رہ گئے جو قبولِ حق کی مطلق صلاحیت نہ رکھتے تھے یا وہ ضعفاء تھے جو ان رؤسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی قوت نہیں رکھتے تھے اور اس لیے ضرورت ہوتی کہ ان رؤسا کے وجود سے ارضِ حرم کو پاک کیا جائے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے لیکن وہاں بھی کوئی حق سننے والا نہ تھا۔ بازار اور راستہ میں شریروں نے آپ کو پتھر مارے یہاں تک کہ قدم مبارک خون آلود ہو گئے۔

اس آیت میں قریش کو تنبیہہ کی گئی ہے کہ نبوت کی مخاطب قوموں کے لیے اللہ نے جو مدت مقرر کی ہوئی ہے اس سے تم بھی مستثنیٰ نہیں ہو یعنی یہ سنت اللہ جس طرح تمام سرکش و باغی قوموں کے باب میں پوری ہوتی ہے تم پر بھی لازماً پوری ہوگی۔ یہ مہلت جو تمہیں ملی ہے اس وجہ سے ملی ہے کہ اللہ نے ہر اُمت کی ہلاکت کے لیے ایک مدت مقرر کر رکھی ہے۔ اسی میں قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون اور قوم لوط تباہ ہوئی ہیں۔ ہلاکت کی یہ قسم نبیوں کی مخاطب قوموں کے ساتھ مخصوص ہے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے یہ قسم ختم ہو چکی ہے۔ اب رہتی دنیا تک نہ کوئی نبی آئے گا اور نہ نبیوں کی دعوت کی تکذیب کے نتیجے میں کوئی قوم ہلاک ہوگی۔ وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین۔

دوسری قسم کی اجل یہ ہے کہ اللہ نے اس دنیا میں ہر اُمت کی سعادت و شقاوت کا ایک پیمانہ مقرر کر رکھا ہے۔ اس کا تعلق اخلاقی و ایمانی زوال سے ہے۔ اخلاقی زوال، فساد کی ایک خاص حد مقرر ہے جو کسی قوم کے پیمانہ کے بھر جانے کی نشانی ہے۔ جب قوم گرتے گرتے اس حد کو پہنچ جاتی ہے۔ اس کا سفینہ غرق ہو جاتا ہے۔ دراصل یہاں صرف سعادت و شقاوت ہی نہیں بلکہ ہر حالت، ہر تاثیر، ہر انفعال کے ظہور کے لیے ایک خاص مدت مقرر کر دی گئی ہے اور ضروری ہے کہ بتدریج مختلف منزلیں پیش آئیں۔

پھر ہر منزل اپنے آثار و انداز رکھتی ہے اور آنے والے نتائج سے خبردار کرتی ہے۔ زندگی اور موت کے قوانین پر غور کرو۔ کس طرح زندگی بتدریج نشوونما پاتی اور کس طرح بتدریج مختلف منزلوں سے گزرتی ہے اور پھر کس طرح موت کمزوری و فساد کا ایک طول طویل سلسلہ ہے جو اپنے ابتدائی نقطوں سے شروع ہوتا اور یکے بعد دیگرے مختلف منزلوں سے گزرتا ہوا آخری نقطہ تک پہنچتا ہے۔ ہم بدپرہیزی کرتے ہیں تو یہ نہیں ہوتا کہ فوراً ہی ہلاک ہو جائیں بلکہ بتدریج موت کی طرف بڑھنے لگتے ہیں۔ اور بالآخر ایک خاص مدت کے اندر جو ہر صورتِ حال کے لیے یکساں نہیں ہوتی درجہ بدرجہ اترتے ہوئے موت کی آغوش میں جا گرتے ہیں۔ نباتات کو دیکھو درخت اگر آبیاری سے محروم ہو جاتے ہیں، یا نقصان و فساد کا کوئی دوسرا سبب عارض ہو جاتا ہے تو یہ نہیں کہ ایک ہی دفعہ مرجھا کر گر جاتے یا کھڑے کھڑے اچانک گر جاتے بلکہ بتدریج شادابی کی جگہ پژمردگی کی حالت طاری ہونا شروع ہوتی ہے اور پھر ایک خاص مدت کے اندر جو مقرر کی گئی ہے یا تو بالکل مرجھا کر رہ جاتے ہیں یا جڑ کھوکھلی ہو کر گر پڑتے ہیں۔

یہی حال کائنات کے تمام تغیرات و انفعالات کا ہے۔ کوئی تغیر ایسا نہیں جو اپنا تدریجی دور نہ رکھتا ہو۔ ہر چیز بتدریج بنتی ہے اور اسی طرح بتدریج بگڑتی ہے۔ بناؤ ہو یا بگاڑ ممکن نہیں کہ ایک خاص مدت گزرے بغیر کوئی حالت بھی اپنی کامل صورت میں ظاہر ہو سکے۔ یہ مدت جو ہر حالت کے ظہور کے لیے اس کی اجل ہے مختلف گوشوں میں مختلف مقدار رکھتی ہے۔

قرآن اس تدریجی رفتارِ عمل کو تمتع، تمہیل و امہال سے تعبیر کرتا ہے۔ اگر تدریج کی یہ فرصتیں نہ ہوتیں تو دنیا میں ایک وجود بھی فرصت حیات سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔ ہر غلطی، ہر کمزوری، ہر نقصان اچانک یک دفعہ بربادی اور ہلاکت کا باعث ہو جاتا۔

تدریج کا یہ عمل اور تاجیل قدرتی طور پر اچھائی اور برائی دونوں کے لیے ہے۔ اچھائی کے لیے اس لیے تاکہ زیادہ نشوونما پاتے، برائی کے لیے اس لیے تاکہ متنبہ اور خبردار ہو کر اصلاح و تلافی کا سامان کرے۔

اگر قوانینِ فطرت کی ان مہلت بخشیوں اور تاجیل سے فائدہ اٹھا کر نقصان و فساد کی اصلاح کر لی جائے۔ مثلاً آپ نے بدپرہیزی کی تھی اسے ترک کر دیں تو پھر یہ بھی سنت اللہ ہے کہ اصلاح و تلافی کی کوشش قبول کر لی جاتی ہے۔ اور نقصان و فساد کے جو نتائج نشوونما پانے لگتے تھے ان کی ترقی رک جاتی ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اگر اصلاح ہر وقت اور ٹھیک ٹھیک کی گئی ہے تو پچھلے مضر اثرات بھی زائل ہو جائیں گے لیکن اللہ کی مقرر کردہ مہلت بخشیوں سے فائدہ نہ اٹھایا تو بلاشبہ وہ آخری حد نمودار ہو جاتی ہے جہاں پہنچ کر اللہ کا آخری فیصلہ صادر ہو جاتا ہے اور پھر جب فیصلہ صادر ہو جاتا ہے تو اس

میں تاخیر و تقدیم نہیں ہو سکتی اسی کو یہاں اذا جاء اجلھم لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون،
سے تعبیر فرمایا ہے اگرچہ شارحین قرآن نے یستاخرون اور یستقدمون کو متاخرون اور متقدمون کا مرادف
قرار دیا ہے۔ لیکن اگر دستور کے مطابق استفعال کا سین طلب کے لیے ہے تو اس میں زیادہ معنویت ہے۔
طلب قول اور فعل دونوں سے ہو سکتی ہے۔ اگر ایک شخص کسی چیز کے اسباب فراہم کرتا ہے، وہ
بلا شبہ اس کا طالب ہے۔ لہٰذا وہ اُمت جو ہلاکت کے اسباب فراہم کر رہی ہے وہ زبان حال اور اپنے
کردار سے ہلاکت کی جویا اور متلاشی ہے۔ آیت میں شرط کی معنویت یہ ہے کہ ہر اُمت اجل آنے سے
پہلے ہلاکت کو مؤخر کر سکتی ہے اور اس کی صورت یہ ہے کہ گناہوں، بدکاریوں کے ارتکاب کو چھوڑ دے
ظلم و بغی سے بے رُخی اختیار کرے۔ فساد فی الارض اور زندگی میں اسراف اور ان تمام چیزوں سے بچ کر
رہے جس سے اُمت کا ایمانی و اخلاقی زوال رونما ہوتا ہے۔

اسی قانون تاجیل کی وجہ سے انبیا کی قوموں کے مطالبہ معجزات میں تاخیر کی جاتی ہے کیونکہ معجزات پر
ایمان نہ لانے کے بعد پیغمبر کو ہجرت کا حکم ہو جاتا ہے اور منکرین کا گروہ ہلاک کر دیا جاتا ہے چنانچہ اس
کی مثالیں قوم نوح، نمرود اور فرعون سے لے کر قریش تک کی تاریخ پیش کرتی ہیں۔ اور قرآن کریم اس
کو بتصریح بیان کر دیا ہے۔ حضرت صالح کی اُمت نے نشانی طلب کی خدا نے کہا کہ نشانی تمہیں دکھا دی
جائے گی لیکن اس کے بعد بھی ایمان نہ لائے تو تمہاری ہلاکت یقینی ہے لیکن جس طرح افراد کی موت و
حیات کا ایک زمانہ مقرر ہے اسی طرح قوموں کی ہلاکت و بربادی کی بھی ایک خاص مدت متعین ہے
اسی بنا پر اس قسم کے معجزات کے ظہور میں اس مدت متعینہ تک کے لیے تاخیر کی جاتی ہے اور پیغمبر اور
مخالفین پیغمبر دونوں اس کے منتظر ہوتے ہیں۔

انما الغیب للہ فانتظروا انی معکم من المنتظرین

غیب تو صرف خدا کے ساتھ خاص ہے تم لوگ اس کے ظہور کا انتظار کرو، میں بھی انتظار کر رہا ہوں۔
یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کفار کے مطالبات کی پرواہ نہیں کرتے تھے کیونکہ آپ جانتے
تھے کہ ان کے مطالبے اور تحدی کے مطابق معجزہ آنے کے بعد ان کو مہلت نہ ملے گی اور وہ برباد ہو جائیں گے۔

یہ بات بھی یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح افراد کی موت کا وقت اللہ کے سوا کسی کو معلوم نہیں اسی طرح
قوموں اور اُمتوں کے فنا ہونے کا صحیح وقت کا علم بھی اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے نہ یہ جانتا ہے کہ کب کوئی
قوم اپنے اخلاقی زوال کے اعتبار سے اس آخری حد پر پہنچ گئی کہ اب اس صفحۂ زمین پر باقی رہنا حکمت الٰہی کے
خلاف ہے۔

يٰبَنِيْٓ اٰدَمَ اِمَّا يَاْتِيَنَّكُمْ رُسُلٌ مِّنْكُمْ يَقُصُّوْنَ عَلَيْكُمْ اٰيٰتِيْ فَمَنِ اتَّقٰى وَاَصْلَحَ فَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُوْنَ ۝ وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَاسْتَكْبَرُوْا عَنْهَآ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝

اے اولادِ آدم اگر تمہارے پاس خود تم میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سنا رہے ہوں تو یاد رکھو جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنی اصلاح کرے گا اس کے لیے کسی خوف اور رنج کا کوئی موقع نہیں ہے[۳۸]۔ اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلہ میں سرکش بن کر رہیں گے وہی دوزخی ہیں ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے[۳۹]۔

معانی مفردات

رُسُل، رسول کی جمع ہے۔ رسول رسالت سے بنا ہے۔ رسالت کے معنے بھیجنے کے

آتے ہیں۔ رسُول فعول کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یہ مرسل بالفتح کا مبالغہ ہے لیکن فعول کا استعمال اس انداز سے بالکل نادر ہے۔ عام تحقیق تو یہی ہے کہ نبی و رسُول ہم معنے ہیں۔ جیساکہ المسائرہ میں ابن الہمام نے لکھا ہے لیکن محققین کو اس سے اتفاق نہیں ہے۔ النبوات میں حافظ ابن تیمیہ نے اس موضوع پر مبسوط کلام کیا ہے اور بتایا ہے کہ نبی وہ ہے جس کو اللہ تعالیٰ بتلاتا ہے اور جو کچھ اللہ اس کو بتاتا ہے اگر وہ اس کی تبلیغ ان کو کرتا ہے جن کی طرف وہ مبعوث ہوا ہے اور وہ لوگ اس کے مخالف ہیں تو وہ رسُول ہے لیکن اگر وہ کسی پہلی شریعت پر عامل ہو اور کسی کی طرف وہ بھیجا نہ گیا ہو تو وہ نبی ہے رسُول نہیں ہے۔ اور قاضی ناصرالدین عبداللہ بن عمر البیضاوی لکھتے ہیں۔ رسُول وہ ہے جسے اللہ نے شریعت جدیدہ دے کر مبعوث فرمایا ہو تاکہ وہ لوگوں کو اس کی طرف دعوت دے اور نبی اس کو بھی عام ہے اور اس کو بھی جس کو شرع سابق کو برقرار رکھنے کے لیے بھیجا ہو۔ مشہور محدث ملا علی قاری شرح الفقہ الاکبر میں فرماتے ہیں۔ زیادہ تر مشہور فرق جو ان دونوں میں منقول ہے یہ ہے کہ نبی رسُول سے اعم ہے کیونکہ رسُول وہ ہے جو تبلیغ پر مامور ہو اور نبی وہ ہے جس کی طرف وحی کی جاتے خواہ وہ تبلیغ پر مامور ہو یا نہ ہو۔

آیاتٌ، یہ آیت کی جمع مونث سالم ہے جمع تکسیر آی آتی ہے۔ بر تای سے ہے جس کے معنے ہیں کسی بات پر ثابت قدم ہونا۔ اور آیۃ کے معنے ظاہر نشان کے ہیں۔ اس لیے اونچی اور بلند عمارت کو بھی آیۃ کہتے ہیں (تبنون بکل ریع آیۃ الشعراء ۲۶، ۱۲۸) اور آیت پیغام الہیٰ کو بھی کہتے ہیں اور یہ دلیل اور معجزہ کے معنے میں بھی بولا جاتا ہے۔ یہی معنے آیت کے عموماً زیادہ موزوں ہیں، اس لیے آیات سے یہاں کچھ مفسرین نے کتب منزلہ مراد لی ہیں اور قرآن حکیم کے ہر جملہ کو جو کسی حکم پر دلالت کرتا ہے آیت کہا جاتا ہے خواہ وہ ایک سُورت ہو، خواہ وہ ایک فصل ہو یا اس کی کئی فصلیں ہوں۔ اور کچھ کی رائے میں آیت کہنے کی وجہ یہ ہے کہ آیت کے معنے جماعت کے ہیں اور ہر آیت میں الفاظ و حروف کی ایک جماعت ہوتی ہے اور یا یہ وجہ ہے کہ آیت کے معنے نشان کے ہیں اور قرآن حکیم کی آیات اعجازی نشان ہیں۔

اولادِ آدم کے لیے مدارِ نجات

یہ نسلِ انسانی کے حق میں ابتدائے آفرینش میں اللہ کا مستقل فرمان اور اولادِ آدم کے لیے ضابطہ نجات ہے۔ ارشاد میں یہ بات واضح کی گئی ہے کہ انسان کا کام خود راستہ تجویز کرنا نہیں ہے بلکہ بندہ ہونے کی حیثیت میں وہ اس پر مامور ہے کہ اس راستہ کی پیروی کرے جو اس کا رب اس کے لیے تجویز کرے۔ اور اس راستے کے معلوم ہونے کی دو ہی صورتیں ہیں۔ یا تو کسی انسان کے پاس براہِ راست اللہ کی طرف سے وحی آئے، یا پھر وہ اس انسان کا اتباع کرے جس کے پاس وحی آئی ہو۔ کوئی تیسری صورت یہ معلوم ہونے کی نہیں ہے کہ رب کی رضا کس راہ میں ہے۔ ان دو صورتوں کے ماسوا ہر صورت غلط ہے بلکہ غلط ہی نہیں سراسر بغاوت بھی ہے جس کی سزا جہنم کے سوا اور کچھ نہیں۔

قرآن حکیم میں آدم کی پیدائش اور نوعِ انسانی کی ابتداء کا یہ قصہ سات مقامات پر آیا ہے جن میں پہلا مقام السورۃ البقرہ میں ہے، پھر سورت الاعراف میں ہے۔ الحجر رکوع ۳، بنی اسرائیل رکوع ۷، الکہف رکوع ۷، طٰہٰ رکوع ۷، ص رکوع ۵۔

بائیبل کی کتاب مقدس باب اول دوم سوم میں بھی یہ قصہ بیان ہوا ہے لیکن دونوں کا مقابلہ کرنے سے ہر صاحبِ نظر محسوس کر سکتا ہے کہ دونوں قرآن اور بائیبل میں کیا فرق ہے۔ آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت اللہ اور فرشتوں کی گفتگو کا ذکر تلمود میں بھی آیا ہے مگر وہ بھی اس معنوی روح سے خالی ہے جو قرآن کے بیان کردہ قصے میں پائی جاتی ہے۔ حضرت آدم کے اس واقعہ میں ایسے راہنما حقائق موجود ہیں جن سے وہ سوالات حل ہوتے ہیں جن پر اسلامی فکر و فلسفہ اور اسلامی نظام کی بنیادیں استوار ہوتی ہیں مثلاً یہ کہ اس دنیا میں انسان کا مقام کیا ہے۔ انسان دنیا میں خود مختار و مطلق العنان ہے یا پابند و محکوم؛ مسئول ہے یا غیر مسئول؟ مجبور ہے یا باختیار؟ اس کو کسی نے اس دنیا میں بھیجا ہے یا وہ خود بخود اس میں آگیا ہے۔ اس کا وجود محض ایک انفرادی وجود ہے یا وہ اپنی اجتماعی ہستی بھی رکھتا ہے۔ اس کی رہنمائی کے لیے اس کی اپنی عقل کافی ہے یا اس کے علاوہ کسی اور مافوق رہنمائی کا بھی محتاج ہے اس کائنات کے دوسرے عناصر کے ساتھ اس کے ربط کی نوعیت کیا ہے۔ یہ اپنی فطرت کے لحاظ سے بدی کی مخلوق ہے یا نیکی کی غرض اس قسم کے بہت سے بنیادی سوالات جن کا جواب ان آیات کے اندر موجود ہے۔

۳۵۔ اے اولادِ آدم اگر تمہارے پاس خود تم میں سے ایسے رسول آئیں جو تمہیں میری آیات سناتے ہوں

تو یاد رکھو کہ جو کوئی نافرمانی سے بچے گا اور اپنی اصلاح کرے گا اس کے لیے کسی خوف و رنج کا کوئی موقع نہیں ہے۔ ابن جریر نے ابو یسار سلمی سے نقل کیا ہے کہ یہ خطاب یا بنی آدم اما یاتینکم ساری اولاد آدم کو عالم ارواح میں ہوا تھا جیسا کہ سورہ بقرہ کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے قلنا اھبطوا منھا جمیعاً فاما یاتینکم منی ھدیً اور بعض محققین کے نزدیک جو خطاب ہر زمانے میں ہر قوم کو ہوتا رہا یہ اس کی حکایت ہے۔ میرے نزدیک دو رکوع پہلے سے جو مضمون چلا آ رہا ہے اس کی ترتیب و تنسیق خود ظاہر کرتی ہے کہ جب آدم و حوا اپنے اصل مسکن جنت سے جہاں ان کو آزادی و فراخی کے ساتھ بلا روک زندگی بسر کرنے کا حکم دیا جا چکا تھا عارضی طور پر محروم کر دیے گئے تو ان کی مخلصانہ توبہ و انابت پر نظر کرتے ہوئے مناسب معلوم ہوا کہ اس حرمان کی تلافی اور تمام اولاد آدم کو اپنی آبائی میراث واپس دلانے کے لیے کچھ ہدایات کی جائیں۔ چنانچہ ہبوط آدم کا قصہ ختم کرنے کے بعد معاً یا بنی آدم قد انزلنا علیکم لباساً سے خطاب شروع فرما کر تین چار رکوع تک ان ہی ہدایات کا مسلسل بیان ہوا ہے۔ ان آیات میں کل اولاد آدم کو گویا یک وقت موجود تسلیم کر کے عام خطاب کیا گیا ہے کہ جنت سے نکلنے کے بعد ہم نے بہشتی لباس و طعام کی جگہ تمہارے لیے زمینی لباس و طعام کی تدبیر فرما دی۔ گو جنت کی خوشحالی اور بے فکری یہاں میسر نہیں۔ تاہم ہر قسم کی راحت و آسائش کے سامان سے منتفع ہونے کا تم کو موقع دیا تاکہ تم یہاں رہ کر اطمینان سے اپنا مسکن اصلی اور آبائی ترکہ واپس لینے کی تدبیر کر سکو۔ چاہیے کہ شیطان لعین کے مکر و فریب سے ہوشیار رہو۔ کہیں ہمیشہ کے لیے تم کو اس میراث سے محروم نہ کر دے۔ بے حیائی، اثم و عدوان سے بچو۔ اخلاص و عبودیت کا راستہ اختیار کرو۔ خدا کی نعمتوں سے تمتع کرو، مگر حدود و قیود مالک حقیقی نے عائد کر دی ہیں ان سے تجاوز نہ کرو پھر دیکھو ہر قوم اپنی مدت موعودہ پوری کر کے کس طرح اپنے ٹھکانے پر پہنچتی ہے۔ اس اثنا میں اگر خدا کسی وقت تم ہی میں سے اپنے پیغمبر مبعوث فرماتے جو خدا کی آیات پڑھ کر سنائیں جن سے تم کو اپنے باپ کی اصلی میراث جنت حاصل کرنے کی ترغیب و تذکیر ہو اور مالک حقیقی کی خوشنودی کی راہیں معلوم ہوں ان کی پیروی اور مدد کرو۔ خدا سے ڈر کر برے کاموں کو چھوڑ دو اور اعمال صالحہ اختیار کرو۔ پھر تمہارا مستقبل بلا خوف و خطر ہے۔ تم ایسے مقام پر پہنچ جاؤ گے جہاں سکھ اور امن و اطمینان کے سوا کوئی چیز نہیں۔ جو لوگ اس آیت سے ختم نبوت کی نصوص کے خلاف قیامت تک کے لیے انبیاء و رسل کی آمد کا دروازہ کھولنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس جگہ کوئی موقع مطلب برآری کا نہیں ہے[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ عالم کی ابتدا ہی میں جن باتوں کی اولادِ آدم کو بنیادی طور پر تعلیم دی گئی تھی ان میں ایک بعثتِ رسول دوسرے رسولوں کے انسان ہونے کا عقیدہ تھا۔ اسی عقیدے کے مطابق خدا کے بہت سے رسول آتے جن کی صحیح تعداد خدا ہی کو معلوم ہے مگر قرآن سے جو کچھ اجمالاً معلوم ہوسکا ہے یہ ہے کہ سب سے پہلے منصبِ نبوت کے لیے دو انسان منتخب ہوئے تھے۔ پھر افراد و اشخاص کی جگہ خاندانوں کا انتخاب کیا گیا۔ آخر میں بنی اسماعیل کا انتخاب عمل میں آیا اور آخری رسول جناب محمد رسول اللہ کو روانہ کرکے اس سلسلہ کو ختم کر دیا گیا۔ نبیوں میں بڑا نبی وہ ہوتا ہے جس کو اس پیغمبرانہ بعثت کے ساتھ ایک اور بعثت ملتی ہے اور وہ یہ کہ مرادِ الٰہی یہ ہوتی ہے کہ اس نبی کے ذریعہ سے اس کی قوم اور اس کی قوم کے ذریعے دوسری قومیں ظلمت سے نکل کر نور میں آئیں تو اس قوم کی بعثت کا نام اجتماعی بعثت ہوتا ہے۔ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم پر انفرادی بعثت کو ختم کرکے رہتی دُنیا تک کی ہدایت کے لیے اجتماعی بعثت قائم کر دی گئی۔ قرآن کی آیت کنتم خیر امۃ اخرجت للناس میں اسی اجتماعی بعثت کی طرف اشارہ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ان کی اُمّت کی طرف ہوئی ویسی ہی ان کی اُمت کی بعثت دُنیا کی دوسری قوموں کی طرف ہوئی۔ اسی لیے زمانہ نبوّت انفرادی کے خاتمہ پر وحیِ الٰہی نے یہ اعلان کیا الیوم اکملت لکم دینکم اسی تکمیل کا یہ اثر ہے کہ کسی بعد میں آنے والے پیغمبر کی پیشین گوئی نہیں نہ کسی نئے کلام کے نزول کی خبر دی نہ کسی نئی شریعت کا منتظر کیا کہ تکمیل کے بعد اب کسی نئے آنے والے، کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کا موقعہ کہاں اور اسی بنا پر قرآن نے ہر جگہ ما انزل من قبلک (جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم) سے پہلے نازل ہوا) پر ایمان لانے کی تاکید کی لیکن ما انزل من بعدک کے قبول کرنے کا کہیں اشارہ تک نہیں کیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ قرآن کو تمام کتابوں کا صرف مصدق نہیں بلکہ مہیمن بتایا یعنی وہ تمام اگلی کتابوں کی صداقتوں اور تعلیمات پر مشتمل اور ان کا محافظ ہے۔ یہ حیثیت قرآن کے سوا کسی دوسرے صحیفہ کو حاصل نہیں ہے۔ اور مصدق و مہیمن ہونے کے ساتھ قرآن کے تاقیامت محفوظ رہنے کی ضمانت دی گئی اور بتایا گیا کہ قرآن ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا۔ اس کی بقا اور حفاظت کی ذمہ داری خود اللہ تعالیٰ نے اپنے ذمہ لی اور فرمایا:

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون،

ہم نے ہی اس کتاب کو اتارا ہے اور بلاشبہ ہم ہی اس کے نگران ہیں۔

ان تمام باتوں کا نتیجہ اگرچہ خود یہ ہے کہ محمد رسول اللہ کے بعد کسی نبی کی قرآن کے بعد کسی صحیفہ کی اور اسلام کے بعد کسی دین کی ضرورت نہیں ہے لیکن اس کے باوجود قرآن نے ہر شک کے ازالہ کے

لیے یہ بات کھول کر بتادی ہے کہ نبوت ورسالت کا سلسلہ ختم ہوگیا ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی نبی کی حاجت نہیں ہے کیونکہ دین کامل ہو چکا اور صحیفہ الہٰی محفوظ ہو چکا ہے اور اُمت کی بعثت کی وجہ سے ہدایت ربانی کے دروازہ کے بند ہونے کا خطرہ دُور ہوگیا۔ چنانچہ خود تاریخ انسانی گواہ ہے کہ بعثت محمدی کے بعد سے دُنیا کی حالت بدل گئی۔ متفرق قومیں پیوستہ ہوگئیں۔ زمین کے کونے ایک دوسرے سے مل گئے۔ اور توحید کامل کا غلغلہ عرش سے فرش تک بلند ہوگیا اور خدا کے تمام رسُولوں کو سچا اور صادق ماننے کا ولولہ آہستہ آہستہ ترقی پانے لگا یہاں تک کہ اُن قوموں نے بھی جو مسلمان نہیں ہوئیں ان دونوں صداقتوں کو اصولاً تسلیم کرلیا۔

اس آیت سے یہ سمجھنے کی کوئی گنجائش نہیں کہ تا قیامت نبوت کا سلسلہ جاری رہے گا۔ یہ اس آیت کا منہ بگاڑنا ہے۔ کیونکہ آیت میں خطاب یا ایہا الذین آمنوا نہیں ہے بلکہ یا بنی آدم کہہ کر خطاب کیا ہے۔ یہ اندازِ خطاب کہہ رہا ہے کہ اولادِ آدم اس کی مخاطب اس وقت ہوئی تھی جب اس کی آفرینش ابھی عالمِ ناسوت میں بھی نہ ہوئی تھی اور ابھی وہ عالمِ ارواح ہی میں تھی۔ یہ کہنا بالکل بے محل اور بے موقعہ بات ہے کہ نبوت ایک نعمت ہے اس سے اُمتِ محمدیہ باوجود خیر الامم ہونے کے کیسے محروم رہ سکتی ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ ان کو ختمِ نبوت کا صحیح مفہوم سمجھنے ہی میں چند غلط فہمیاں ہوگئی ہیں۔ شاید اس کا مفہوم یہ سمجھا گیا ہے کہ نبوت پہلی اُمتوں کے لیے ولایت وصدیقیت کی طرح ایک ممکن الحصول کمال تھا۔ اب یہ اُمت دوسرے اور مراتب تو حاصل کر سکتی مگر کمالِ نبوت کو حاصل نہیں کر سکتی۔ یہ سخت غلط فہمی اور حقیقتِ نبوت سے قطعی جہالت کی دلیل ہے۔ نبوت ان کمالات ہی میں نہیں ہے جو ریاضیات اور مجاہدات کے صلے میں بطورِ انعام کسی وقت بھی بخشا گیا ہو بلکہ یہ ایک خدا کی جانب سے منصب ہے جس کا تعلق تشریعی، ضرورت اور براہِ راست اللہ تعالیٰ کی صفتِ اجتبا، اور اصطفا سے ہے۔ وہ جسے چاہتا ہے اس منصب کے لیے چن لیتا ہے۔ اگر نبوت ان کمالات میں سے ہوتی جو مجاہدات، ریاضات، پاکبازی وحسنِ نیت کے صلے میں انعامی طور پر ملتے ہیں تو یقیناً اس کے لیے سب سے موافق زمانہ خود نبی کی موجودگی کا زمانہ ہوتا کیونکہ جس قدر عملی جدوجہد، اتباعِ شریعت کا جذبہ خود زمانۂ نبوت میں ہوتا ہے اس کے بعد نہیں ہوتا۔ مگر نبوت کی تاریخ اس کے برعکس ہے۔ یعنی جب زمین شر وفساد، طغیان وسرکشی اور تکبر وتمرد سے بھر گئی۔ صلاح وتقویٰ عنقا ہو کر رہ گیا۔ رُشد وہدایت کے آثار ناپید ہوگئے۔ وہی انبیاؑ کی تشریف آوری کے لیے سب سے زیادہ موزوں زمانہ ہوا۔ بلاشبہ اس سے بآسانی یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ نبوت وہ انعام نہیں ہے جو ولایت و صدیقیت کی طرح اُمتوں میں تقسیم کیا جاتے بلکہ دُنیا کی انتہائی دورِ ضلالت میں اللہ تعالیٰ کی صفتِ ہدایت کا

ذاتی تقاضا ہے۔ ذاتی تقاضے کا مطلب یہ ہے کہ اس میں کسب واکتساب، ماحول کی موافقت ناموافقت کو کوئی دخل نہیں۔ نبوت کا ماحول تو چاہتا ہے کہ خدا کی رحمت کی جگہ خدا کا قہر وغضب نازل ہو مگر خدا کی صفت ہدایت کا تقاضا یہ ہے کہ جب ملک کا ملک اور قوم کی قوم اس کا راستہ گم کر دے اور بھولے سے نہیں بلکہ شرارت اور شیطنت کی بنا پر تو وہ اپنی طرف سے ان کی طرف ہدایت کا دروازہ کھول دے۔

ختم نبوت کے معنے یہ نہیں ہیں کہ کمالات ختم ہو گئے ہیں۔ نبوت کا ختم ہونا خدائی نعمت کے اتمام اور دین کے انتہائی ارتقاء وعروج کی دلیل ہے۔ ورنہ جہاں تک کمالات کا معاملہ ہے تو یہ روایات سے ثابت ہے کہ اُمت محمدیہ کے کمالات تمام اُمتوں سے زیادہ ہیں۔ اور اتنے زیادہ ہیں کہ حضرت موسیٰ جیسے نبی کو اس اُمت کے کمالات سن کر اس اُمت کا ایک فرد ہونے کی تمنا ہو سکتی ہے۔

علامہ خفاجی شفاء قاضی عیاض کی شرح میں حضرت انس سے ایک روایت نقل کرتے ہیں:

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام پر وحی روانہ کی۔ جو شخص احمد کا انکار کر کے میرے پاس آئے گا میں اسے دوزخ میں ڈالوں گا۔ عرض کیا کہ یہ احمد کون ہیں؟ ارشاد ہوا۔ یہ وہ ہیں جن سے زیادہ مجھے اپنی مخلوق میں کوئی عزیز نہیں۔ زمین و آسمان سے پہلے ہی میں نے ان کا نام اپنے نام کے ساتھ ساتھ عرش پر لکھ دیا تھا اور یہ بات طے کر دی تھی کہ جب تک وہ اور ان کی اُمت جنت میں نہ داخل ہو لیں کوئی اور جنت میں نہ داخل ہو سکے گا موسیٰ علیہ السلام نے اس اُمت کے اوصاف پوچھے، ارشاد ہوا کہ وہ اُمت ہر وقت ہماری تعریف کرے گی۔ بلندی پر چڑھے گی تو تعریف کرتی ہوئی پستی میں اُترے گی۔ غرض ہر حال میں ہماری حمد و ثنا کرے گی۔ اپنی کمریں باندھنے والی، اپنے اعضا دھونے والی، دن کی روشنی میں شیر کی طرح بہادر اور رات کی تاریکی میں درویش صفت ہو گی۔ ان کا تھوڑا سا عمل قبول کروں گا اور کلمہ شہادت پر جنت دوں گا۔ موسیٰ علیہ السلام نے عرض کیا کہ اے اللہ تو مجھے اس اُمت کا نبی بنا دے۔ ارشاد ہوا کہ اس کا نبی تو خود ان میں سے ہو گا۔ عرض کیا اچھا تو پھر اُس نبی کی اُمت ہی میں بنا دے، ارشاد ہوا کہ تم ان سے پہلے ہو وہ تمہارے بعد آئیں گے۔ البتہ میں اپنے دار جلال میں تمہیں ان کے ساتھ جمع کر دوں گا۔

مسند ابوداؤد طیالسی، مسند احمد اور مسند ابی یعلیٰ میں ہے:

کادت ھذہ الامۃ ان تکون انبیاء کلھا۔

یہ اُمت مجموعی لحاظ سے بلحاظ کمالات انبیاء ہونے کے قریب ہے۔

بشارات، الہام، تحدیث مع الملائکہ، اجتہاد، نظم ونسق اُمت، بدعت اور تحریف فی الدین کی اصلاح حتیٰ کہ خلافت حقہ کا قیام یہ سب اس اُمت کے مناصب وکمالات میں داخل ہیں۔ کتاب اللہ کی حفاظت دین کی تکمیل ایک ایسی مضبوط جماعت کا بقا۔ جو ہمیشہ جادہ حق پر مستقیم رہے اور حسب ضرورت ایسی جماعتوں کی بعثت جو پوری ذمہ داری کے ساتھ تحریفات کی اصلاح کرتی رہیں۔ ان سب اُمور کا اللہ سبحانہ نے اُمت کو مبعوث فرما کر خود تکفل فرما لیا ہے۔ آپ ہی سوچئے کہ اب اس کے بعد کون سا کمال باقی ہے جو پہلی اُمتوں میں تھا اس اُمت میں نہیں ہے اور جس کے لیے نبوت کی ضرورت ہے۔

بہرحال نبوت ایک عہدہ اور منصب ہے۔ اس کی حیثیت دوسرے کمالات کی نہیں جو جدوجہد، محنت و ریاضت سے حاصل ہو جاتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے اس غلط فہمی میں پڑ کر اس آیتِ قرآنی کو اجرائے نبوت کی دلیل بنایا ہے۔ یاد رکھو یہ قرآن میں صریح تحریف ہے۔

نبوت کا مقابلہ اور اس کی تکذیب

۳۹ ۔ اور جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلائیں گے اور ان کے مقابلہ میں سرکش بن کر رہیں گے وہی دوزخی ہیں ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ یعنی اگر ہماری آیات کو جھٹلایا اور تکبر کر کے ان پر عمل کرنے سے کترائے تو مسکن اصلی اور آبائی میراث جنت سے دائمی محرومی اور ابدی عذاب وہلاکت کے سوا کچھ نہ ملے گا[1]۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے رسول آیاتِ الٰہی سنانے آئیں گے تو جو لوگ ان کو جھٹلائیں گے اور متکبرانہ ان سے روگردانی اختیار کریں گے وہ دوزخ میں پڑیں گے۔ سورہ بقرہ میں کفروا وکذبوا کی تعبیر آئی ہے لیکن یہاں صرف کذبوا پر اکتفا فرمایا ہے۔ کفر کے معنے انکار کے ہیں اور تکذیب کے معنے جھٹلانے کے ہیں۔ چونکہ تکذیب کے لیے کفر لازم ہے اس لیے موقعہ کے لحاظ سے صرف تکذیب کا ذکر کیا ہے اور تکذیب کے زور کو ظاہر کرنے کے لیے واستکبروا عنھا کا اضافہ کیا ہے اور استکبار کے ساتھ عن لا کر اشارہ کر دیا کہ یہ لوگ صرف بڑائی کے نشہ میں تکذیب ہی نہیں کرتے بلکہ اللہ کی آیات سے اعراض بھی کر رہے ہیں۔ یعنی آیاتِ الٰہی کی متکبرانہ انداز میں تکذیب کرتے ہیں اور ان سے منہ موڑے ہوتے ہیں۔ آیات کا لفظ قرآن عزیز میں ان دلائل اور نشانیوں کے لیے استعمال ہوا ہے جو زمین وآسمان اور آفاق وانفس کے ہر گوشے میں موجود ہیں۔ اور جو خدا کی قدرت وحکمت، اس کی توحید اور اس کے قانونِ جزا و سزا کی گواہی دے رہے ہیں۔ ان معجزات کے لیے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

بھی استعمال ہوا جو نبوت کے ذریعے سے ظاہر ہوتے ہیں۔ قرآن کی ان آیتوں کے لیے بھی آیا ہے جن سے قرآن کی سورتیں مرکب ہیں۔ قرآن عزیز کی آیات کے لیے اس لفظ کا استعمال اس حقیقت پر دلیل ہے کہ ان کی حیثیت بے دلیل احکام کی نہیں ہے بلکہ ان میں سے ہر آیت ایک دلیل و شہادت اور ایک حجت و برہان کی حیثیت بھی رکھتی ہے۔

یہ آیات اللہ، خدا کے وجود اور اس کی صفات کمالیہ کی علامات ہیں۔ جس طرح دہ بہار کی عمارت معمار کے وجود کو۔ اور ایک زخمی کی مرہم پٹی اور اس کے آرام و آسائش کا اہتمام تیماردار کے رحم و کرم کے صفات کو ظاہر کرتا ہے اسی طرح آیات اللہ ایک خالق و صانع کے وجود کو بتاتی ہیں۔ کفران ہی کے دلوں میں پرورش پاتا ہے اور ان کی تکذیب وہی کرتے ہیں جو ان آیات الٰہی میں غور و فکر نہیں کرتے اور ان کی جلوہ گری سے حقیقی جلوہ آرا ہستی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے۔

جس طرح یہ آیات الٰہی عام بندہ اور خدا اور خالق و مخلوق کے تعلق اور رابطہ کو نمایاں کرتی ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی خاص بندے سے اپنے تعلق اور ربط کو اپنے مخصوص علامات و آیات کے ذریعہ نمایاں کرتا ہے۔ تبلیغ و دعوت میں دین الٰہی کی نصرت اور اشاعت میں مخالفین کی شکست اور ہزیمت میں صلحاء کو مزید ایمان اور تسکین کے حصول میں عجیب و غریب مافوق فہم نشانات ظہور پذیر ہوتے ہیں جن کو عرف عام میں معجزات کہتے ہیں۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ آیات دو قسم کی ہیں ایک ظاہری اور مادی اور دوسری باطنی اور روحانی۔ ظاہری اور مادی آیات تو وہ دلائل ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں۔ اور باطنی نشانات و آیات خود مدعی نبوت کی پیش کش، اس کی صداقت و معصومیت، تزکیہ، تاثیر، تعلیم ہدایت ارشاد فلاح اور تائید ہے۔ اہل نظر اور حقیقت شناسوں کے لیے یہی روحانی آثار و آیات نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں۔ باقی ظاہری نشانیاں اور معجزات صرف سطحی اور ظاہر بین نگاہوں کے لیے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری آنکھوں سے دیکھ کر پہچانتی ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو اللہ سبحانہ کی جانب سے معجزات عطا ہوتے ان میں سب سے بڑا معجزہ خود قرآن حکیم ہے۔ خود حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی زبان مبارک سے اسی کو سب سے بڑا معجزہ قرار دیا ہے۔ ارشاد ہے:

> پیغمبروں میں سے ہر پیغمبر کو اللہ تعالیٰ نے اس قدر معجزات عنایت کیے ہیں جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے لیکن جو معجزہ مجھے مرحمت ہوا ہے وہ قرآن ہے جسے اللہ تعالیٰ نے مجھ پر اتارا۔ اس لیے میں امید کرتا ہوں کہ قیامت کے دن میرے پیروؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہو گی۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اُولٰٓئِكَ
يَنَالُهُمْ نَصِيْبُهُمْ مِّنَ الْكِتٰبِ ؕ حَتّٰٓى اِذَا جَآءَتْهُمْ رُسُلُنَا
يَتَوَفَّوْنَهُمْ ۙ قَالُوْٓا اَيْنَ مَا كُنْتُمْ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ ؕ قَالُوْا
ضَلُّوْا عَنَّا وَشَهِدُوْا عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ اَنَّهُمْ كَانُوْا كٰفِرِيْنَ ﴿۳۷﴾ قَالَ
ادْخُلُوْا فِيْٓ اُمَمٍ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِكُمْ مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ
فِي النَّارِ ؕ كُلَّمَا دَخَلَتْ اُمَّةٌ لَّعَنَتْ اُخْتَهَا ؕ حَتّٰٓى اِذَا ادَّارَكُوْا فِيْهَا
جَمِيْعًا ۙ قَالَتْ اُخْرٰىهُمْ لِاُوْلٰىهُمْ رَبَّنَا هٰٓؤُلَآءِ اَضَلُّوْنَا فَاٰتِهِمْ عَذَابًا
ضِعْفًا مِّنَ النَّارِ ؕ قَالَ لِكُلٍّ ضِعْفٌ وَّلٰكِنْ لَّا تَعْلَمُوْنَ ﴿۳۸﴾
وَقَالَتْ اُوْلٰىهُمْ لِاُخْرٰىهُمْ فَمَا كَانَ لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍ فَذُوْقُوا
الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۳۹﴾

ع ۸

لہٰذا ان سے بڑا ظلم کار کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان اُٹھاتے اور اس سے
بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو خدا کی آیتیں جھٹلائے۔ ان ہی لوگوں کو کتاب میں

سے اپنا حصہ ملے گا[۴۱]۔ حتیٰ کہ جب وہ وقت آجائے گا کہ جب ہمارے
فرشتے ان کی روحیں قبض کرنے کے لیے ان کے پاس آئیں گے
وہ ان سے دریافت کریں گے بتاؤ اب تمہارے معبود کہاں ہیں جن کو
تم خدا کے سوا پکارتے تھے وہ جواب میں کہیں گے وہ تو ہم سے کھو
گئے اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ فی الواقع کافر تھے[۴۲]۔
اللہ فرمائے گا جاؤ تم بھی اسی جہنم میں جاؤ جس میں تم سے پہلے جن و
انس جا چکے ہیں[۴۳]۔ ہر گروہ جب جہنم میں داخل ہوگا تو اپنے پیش رو
گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہوگا[۴۴]۔ تا آنکہ جب سب اس میں گر چکیں گے
تو بعد والا گروہ پہلوں کے بارے میں کہے گا اے پروردگار ہماری گمراہی
کا سبب یہی لوگ ہیں لہٰذا ان کو جہنم کا دگنا عذاب دے، اللہ فرمائے
گا سب کو دوگنا ہی عذاب ہوگا لیکن تمہیں پتہ نہیں ہے[۴۵]۔ اور پہلا
گروہ دوسرے گروہ سے کہے گا کہ اس فیصلہ خداوندی کے بعد اب تمہیں

ہم پر کوئی فوقیت نہیں ہے لہٰذا سب اپنی کمائی کے بدلے میں سزا
کا مزہ چکھو۔[۴۶]

معانی مفردات

من دون اللہ عربی زبان میں سوا، ورے اور نیچے سب ہی آتے ہیں۔ من دون کے معنے غیر اور "سوا" کے دیکھ کر بعض لوگوں کو یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ مشرکین عرب اللہ کو بالکل چھوڑ کر غیروں کو پکارتے تھے لیکن یہ ان کی غلطی ہے قرآن کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مشرکین بندگان خدا کو محض سفارشی سمجھتے تھے اور اللہ تعالیٰ تک پہنچنے کا ان کو ذریعہ سمجھتے تھے۔ قرآن نے خود ان کی زبانی بندگانِ خدا کی تصویروں سے ان کے عابدانہ تعلقات کی یہ توجیہ پیش کی ہے ھؤلاء شفعاؤنا عنداللہ اور ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفیٰ، قرآن کی ایک سے زیادہ آیات میں من دون کے معنے ورے کے ہیں۔ حضرت موسیٰ مدین پہنچے تو تم وہاں ایک کنویں پر پہنچے تو لوگوں کی بھیڑ سے ورے دو عورتوں کو کھڑا پایا۔ ارشاد ہے و وجد من دونھم امراتین یہاں من دون کے معنے غیر اور سوا کے نہیں ورنہ معنے یہ ہوں گے کہ وہاں لوگ نہ تھے صرف یہ دو عورتیں تھیں۔ یہ قرآن کے مدعا کے خلاف ہے مطلب یہ ہے کہ مردوں کے ورے دو عورتیں کھڑی تھیں۔ اسی طرح قرآن کی دوسری آیات، احادیث اور اشعار عرب میں بھی یہ لفظ ورے کے معنے میں آیا ہے۔

ضلوا، وہ بھٹکے وہ گمراہ ہوتے وہ گم ہوتے وہ کھو گئے۔ ضلال اور ضلالۃ سے ماضی کا صیغہ جمع مذکر غائب ہے۔ علامہ جمال الدین قرشی لکھتے ہیں ضلال بالفتح ضائع ہونا، گم ہونا اور مغلوب ہونا، ضل الماء فی اللبن بولا جاتا ہے یعنی پانی اتنا مغلوب ہوا کہ دودھ میں اس کا اثر ظاہر نہیں ہوتا اور اسی سے اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی زبانی کہ ان ابانا لفی ضلال مبین کہ ہمارے ابا تو ان دونوں کی محبت میں مغلوب ہیں۔

ضعف، دوگنا، دونا، دوچند، امام راغب فرماتے ہیں۔ ضعف لفظ متضایفہ میں سے ہے کہ ان میں ایک کا وجود دوسرے کے وجود کا مقتضی ہے جیسے کہ نصف اور زوج۔ ضعف کے معنے دو مساوی قدروں کی ترکیب کے ہیں۔ اور یہ خاص طور پر عدد میں ہوتا ہے۔ کسی چیز کا ضعف وہ ہے جو اسے ڈبل کر دے اور جب اس کی اضافت کسی عدد کی طرف ہو تو وہ عدد اور اتنا ہی اور مراد ہو گا۔ اور جب بولا جاتے گا اعطہ ضعفی واحد تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ ایک اور اس کا دوچند اس کو دے دو یعنی سہ چند اور اگر یوں کہیں کہ اعطہ ضعفین تو مطلب یہ ہو گا کہ اسے دو چند دے دو۔

نیکی اور بدی میں تعدیہ ہے

ان آیات میں ان لوگوں کے مناقشہ کی تصویر کشی فرماتی ہے جو دنیا میں ایک دوسرے کے تابع اور متبوع، لیڈر اور پیرو، ساتھی اور مددگار بنے رہے۔ ایک دوسرے کے گن گاتے اور حق کی مخالفت کا جھنڈا اٹھائے پھرتے رہے۔ سلامیاں اور ایڈریس پیش کرتے تھے لیکن دوزخ میں داخل ہوتے ہی ہر گروہ دوسرے کو برا بھلا کہے گا۔ تابعین اپنے متبوعین سے کہیں گے کہ تم ملعون ہو تمہاری وجہ سے ہم تباہ و برباد ہوئے متبوعین کہیں گے کہ تم خود شامت زدہ تھے اس میں ہمارا کیا قصور ہے۔

دراصل نیکی ہو یا بدی دونوں ہی اپنی فطرت کے اعتبار سے متعدی چیزیں ہیں۔ یہ اپنے کرنے والوں ہی کی ذات تک محدود نہیں رہتی ہیں بلکہ ان کے اثرات دوسروں تک بھی منتقل ہوتے رہتے ہیں۔ یہاں تک کہ وراثت در وراثت ہو کر نیکی کا ایک ذرہ احد پہاڑ کے برابر ہو سکتا ہے اور بدی کا ایک تخم فساد ایک لق و دق جنگل کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔ ان آیات میں اس حقیقت کی طرف اشارہ ہے کہ جب کوئی جماعت برائی میں مبتلا ہوتی ہے تو خود بھی گمراہ ہوتی ہے اور دوسروں کے لیے گمراہی کی مثال قائم کر دیتی ہے۔ یہ برائی کا تعدیہ ہے۔ یہی اصول اس ارشادِ نبوت میں بیان ہوا ہے۔

جس نے اسلام میں کوئی اچھا طریقہ رائج کیا اس کے لیے اس کا اجر ہے اور ان لوگوں کے عمل کا اجر ہے جو اس کے بعد اس پر عمل کریں گے بغیر اس کے کہ ان کی مزدوریوں میں کوئی کمی آتے اور جس نے اسلام میں کوئی برا طریقہ رواج دیا تو اس پر اس کا گناہ ہے اور ان لوگوں کے عمل کا گناہ ہے جو اس پر عمل کریں گے بغیر اس کے کہ ان کے گناہ میں کوئی کمی

کی جاتے ۔

نیکی میں تعدیہ تو عام قانون ہے ۔ قرآن کی ایک سے زیادہ آیات میں اسے بتایا گیا ہے لیکن برائی میں تعدیہ مخصوص ہے ان لوگوں کے لیے جو اغواء اور اضلال کا کام کریں اور برائی میں قائد ہو کر کام کریں۔ ایک عذاب خود گمراہی اختیار کرنے کا اور دوسرا عذاب دوسروں کو گمراہ کرنے کا۔ ایک سزا اپنے جرائم کی اور دوسری سزا دوسروں کو جرائم پر آمادہ کرنے کی ۔

۴۰ ۔ لہٰذا ان سے بڑا ظالم کون ہوگا جو اللہ پر جھوٹا بہتان اٹھاتے اور اس سے بڑھ کر ظالم کون ہوگا جو اللہ کی آیتیں جھٹلاتے۔ یعنی ان سچے پیغمبروں کی تصدیق کرنا ضروری ہے جو واقعی خدا کی آیات سناتے ہیں۔ باقی جو شخص پیغمبری کا جھوٹا دعویٰ کرے اور جھوٹی آیات بنا کر خدا پر افتراء کرے یا کسی سچے پیغمبر کو اور اس کی لائی ہوئی آیات کو جھٹلاتے ۔ ان دونوں سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہے[1] شیخ الاسلام کے بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ اس آیت میں جھوٹے پیغمبر اور سچے پیغمبر کی تکذیب کرنے والوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے ۔ اگرچہ الفاظ میں اس کی گنجائش ہے لیکن سیاق قرآنی سے مناسب یہ ہے کہ آیت میں ان کا تقابلی مطالعہ پیش کیا جاتے ۔ ایک وہ جو اللہ پر جھوٹا طوفان اٹھائیں اور اللہ نے جو بات نہ فرمائی ہو وہ اللہ کا نام لے کر پیش کریں۔ مثلاً عبادات کے نقشے خود بنائیں اور محرمات خود تجویز کریں ۔ قانون خود بنائیں اور لوگوں کو بتائیں کہ یہ اللہ کا حکم ہے ، دوسری یہ کہ خدا کا حکم نبوت کی وساطت سے اس کی زبان سے اور برائی میں کردار سے اس کی تکذیب کریں ، اس کا مذاق کریں اس کے مقابلہ میں دوسرے قوانین کو ترجیح دیں ۔ مطلب یہ ہے کہ جب صورت حال یہ ہے کہ اللہ کی سنت یہ ہے کہ انبیاء انسانی زندگی میں رہنمائی کے لیے خدا کا پیغام لے کر آتے ہیں تو اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو نبوت کی موجودگی میں حلال و حرام کے پیمانے خود بناتے اور جھوٹی کر کسی خدا کے نام پر چلاتے یا نبوت کی جانب سے خدا کے احکام سن کر ان کو گفتار و کردار کے ذریعے جھٹلاتے ۔ اس معنے کے اعتبار سے آیت کی معنوی وسعتوں میں کفر، شرک اور بدعت سب آجاتے ہیں۔ افتراء علی اللہ یہی ہے کہ نبوت کی رہنمائی سے بے پروا ہو کر اپنے جی سے حلال و حرام ٹھہرانا ، اپنی خواہشوں کی پیروی میں بدعتیں ایجاد کرنا ۔ من مانے طور پر شریعتیں تصنیف کرنا اور ان ساری چیزوں کو خدا کی طرف منسوب کرنا کہ خدا نے ان کا حکم دیا ہے ۔ بدعت کا سرچشمہ ہی دین میں افتراء علی اللہ کذبا ہے ۔ اس لیے آیت کے مدلول میں وہ تمام بدعات رسوم جو دین کے نام پر قائم کی جائیں اور ان کا دین ہونا ثابت نہ ہو، داخل ہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

ایسے مکذب بآیاتہ میں وہ تمام افکار و نظریات اور سارے نظام ہائے حیات جو نبوت کے نظریے اور نظام کے مقابلے میں اپنائے جائیں داخل ہیں۔

کتابِ الٰہی میں اس کے مخاطبوں کا حصہ

۴۱۔ ان ہی لوگوں کو کتاب میں سے اپنا حصہ ملے گا۔ یعنی دنیا میں عمر، رزق وغیرہ جتنا مقدر ہے یا یہاں کی ذلت و رسوائی جو ان کے لیے لکھی ہے وہ پہنچے گی پھر مرنے کے وقت اور مرنے کے بعد جو گت بنے گی اس کا ذکر آگے آتا ہے اور اگر نصیبہم من الکتاب سے دنیا کا نہیں عذاب اُخروی مراد لیا جائے تو حتیٰ اذا جاءتہم سے اس پر تنبیہہ ہوگی کہ اس عذاب کے مبادی کا سلسلہ اسی دنیا کے آخری لمحات میں شروع ہو جاتا ہے[1]

آیت میں لفظ کتاب سے مراد کیا ہے۔ حضرت امام مجاہد فرماتے ہیں کہ اس سے وحی الٰہی پر مشتمل وہ کتابیں ہیں جو انبیاء لے کر آتے رہے ہیں۔ اس بنا پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ کتاب الٰہی میں ان لوگوں سے خیر و شر کا جو وعدہ بھی کیا گیا ہے وہ اس سے ضرور دوچار ہوں گے۔ اور عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ کتاب المقادیر ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس کی تقدیر میں جو کچھ لکھا ہوگا وہ اسے مل کر رہے گا۔ چونکہ مقادیر الٰہی میں سب کچھ ہے اس لیے ہر ایک نے اپنے اپنے ذوق کے مطابق اس کی تعیین فرمائی ہے۔ کسی نے خیر و شر، کسی نے سعادت و شقاوت، کسی نے رزق و عمل اور کسی نے عمر سے تعیین کی ہے۔ لیکن اگر الکتاب سے وحی الٰہی پر مشتمل کتاب مراد ہو اور اس کی تعیین قرآن سے کی جائے تو مطلب زیادہ واضح اور صاف ہو کر سامنے آجاتا ہے کہ جو لوگ اس دنیا میں قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں ان کے حصہ میں کتاب الٰہی کی تکذیب آئی ہے اور ان کو اپنا یہ حصہ مل رہا ہے جیسا کہ دوسرے موقعہ پر فرمایا ہے۔

وتجعلون رزقکم انکم تکذبون

علامہ طیبی نے اس کی تشریح اس طرح فرمائی ہے کہ تم نے تکذیب کو اپنا حصہ بنا رکھا ہے۔ شاہ عبدالقادر کا میلان بھی اسی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن سے قرآن کی تکذیب کا حصہ تمہیں ضرور مل کر رہے گا باقی رہے اس کے نتائج تو اس کا پتہ اس وقت لگے گا جب موت کے فرشتے آئیں گے اور زندگی کے یہ انفاس اور فرصت کے یہ لمحات ختم ہو جائیں گے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فیصلہ نتائج کریں گے

۳۷ - حتیٰ کہ جب وہ وقت آجائے گا کہ جب ہمارے فرستادے ان کی روحیں قبض کرنے کے لیے اُن کے پاس آئیں گے وہ اُن سے دریافت کریں گے بتاؤ کہ اب تمہارے معبود کہاں ہیں جن کو تم خدا کے سوا پکارتے تھے وہ جواب میں کہیں گے وہ تو ہم سے کھوئے گئے اور وہ خود اپنے خلاف گواہی دیں گے کہ وہ فی الواقع کافر تھے۔ یعنی جب فرشتے نہایت سختی سے ان کی رُوح قبض کر کے برے حال سے لے جاتے ہیں تو ان سے کہتے ہیں کہ خدا کے سوا جن کو تم پکارتے تھے وہ کہاں گئے جواب تمہارے کام نہیں آتے۔ انہیں بلاؤ تاکہ اس مصیبت سے تمہیں چھڑائیں۔ اس وقت کفار کو اقرار کرنا پڑتا ہے کہ ہم سخت غلطی میں پڑے تھے کہ ایسی چیزوں کو معبود و مستعان سمجھتے تھے جو اس کے مستحق نہ تھے۔ آج ہماری مصیبت میں ان کا کہیں پتہ نہیں ہے۔ لیکن بے نا وقت کا اقرار و ندامت کیا نفع دے سکتا ہے۔ حکم ہوگا کہ ادخلوا فی امم باقی بعض مواقع میں جو وارد ہوا ہے کہ وہ اپنے کفر و شرک سے انکار کریں گے۔ اس آیت کے منافی نہیں ہے کیونکہ قیامت میں مواقف اور احوال مختلف ہوں گے اور جماعتیں بھی بے شمار ہوں گی کہیں ایک موقف یا ایک جماعت کا ذکر ہے کہیں دوسری کا [1]

مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی میں نبوت کے وقتاً فوقتاً ظہور کی خبر آغاز ہی میں اولاد آدم کو دی گئی تھی اسی قانون کے مطابق حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں۔ ان کے مخاطبوں میں دو قسم کے آدمی ہیں۔ ایک وہ ہیں جو اپنے جی سے حرام و حلال کے پیمانے بنا رہے ہیں اور من مانے طور پر شریعت تصنیف کر رہے ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو پیغمبر کی پیش فرمودہ آیات کی تکذیب کر رہے ہیں۔ فیصلہ آنے والے نتائج کریں گے اور یہ اس وقت ہوگا جب موت کے فرشتے قبض رُوح کے لیے آئیں گے۔ احادیث صحیح میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مرنے کے بعد قبر میں فرشتے آتے ہیں اور وہ مردوں سے توحید و رسالت کے بارے میں سوال کریں گے۔ اس کی تصدیق قرآن پاک کی اس آیت سے ہوتی ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ سوال این ما کنتم تدعون من دون اللہ موت کے وقت میں ہوگا۔ مشرکین بُتوں کی عبادت جو کرتے ہیں اصل مقصود ان ارواح کی عبادت ہوتی ہے جن کے یہ مجسمے ہوتے ہیں جو بت کہلاتے ہیں۔ کبھی سوال بُتوں کے متعلق ہوگا اور کبھی ان شخصیتوں سے متعلق

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوگا جن کے بت تراش کر ان کی عبادت کرتے تھے یہاں چونکہ بتوں سے متعلق سوال ہے اس لیے این ما کر آتے یعنی کہاں ہے وہ چیز اور جب سوال شخصیتوں سے متعلق ہوگا تو پوچھا جائے گا این شرکاء کم کنتم تزعمون کہاں ہیں تمہارے وہ شرکا جن کے بارے میں تم خیال کرتے تھے کہ یہ اللہ کے شریک ہیں؟ مطلب یہ ہے کہ وہ شرکا کہاں ہیں جن کو دنیا کی زندگی میں قضائے حاجات اور دفع بلیات کے لیے دور دور سے پکارتے تھے جن کے ناموں کی دہائی دیتے تھے اور جن سے قضائے حاجات کے لیے درخواستیں کرتے تھے۔ ان کو بلاؤ پکارو کہ وہ تمہارے کام آئیں۔ وہ جواب دیں گے ضلوا عنا، وہ تو لاپتہ ہوگئے ہیں ان کا کہیں نام و نشان نہیں ہے۔ ہمیں ان کا کوئی پتہ نہیں ہے یہ ان کے اعتراف کی تعبیر ہے اور وہ اپنے اس اعتراف سے اپنے کفر کی شہادت خود اپنی زبان سے دے رہے ہیں۔ یعنی بتا رہے ہیں کہ واقعی ہم دنیا میں ان کی عبادت کرتے تھے جو کسی درجہ میں بھی عبادت کے مستحق نہ تھے۔ اس اقرار کے بعد اب مزید کسی گواہی کی ضرورت نہ ہوگی۔

کند ہم جنس باہم جنس پرواز

۴۳ ۔ اللہ فرمائے گا جاؤ تم بھی جہنم میں جاؤ جس میں تم سے پہلے جن و انس جا چکے ہیں۔ یعنی آگے پیچھے سب کفار کو جہنم ہی میں داخل ہونا ہے[1]

یہ وہ انجام بیان کیا جا رہا ہے جو ان لوگوں کے سامنے آئے گا جن کے اس دنیا میں غیر اللہ سے عابدانہ تعلقات تھے، قال کا فاعل اللہ تعالیٰ ہے یا فرشتوں میں سے کوئی ایک ہے ایسے مواقع پر فاعل کا ذکر نہ کرنا بے رخی اور بے اعتنائی کی خاطر ہے۔ یہاں دو ظرف آئے ہیں۔ فی امم اور فی النار، پہلا ظرف یہ بتا رہا ہے کہ تمہارے ساتھی کون لوگ ہوں گے فرمایا جاؤ ان لوگوں کے ساتھ رہو جو جنات اور انسانوں میں سے تم سے پہلے تمہارے جیسے افکار اور کردار کے مالک تھے۔ فی النار کے ذریعہ ان کے مستقر و مقام کا پتہ دیا ہے کہ تم سب کا ٹھکانا دوزخ ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے ساتھی بھی بدترین ہیں اور تمہارے رہنے کی جگہ بھی بدترین ہے۔ جنوں کا ذکر پہلے اس لیے کیا ہے کہ ان شیاطین ہی سے اغوا اور اضلال کا آغاز ہوا ہے وہ انسانوں اور جنوں دونوں کی گمراہی کا باعث بنے ہیں اس طرح گویا آگے پیچھے نئے پرانے ہر قسم کے کافر جہنم میں جمع ہو جائیں گے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

گمراہ تابع و متبوع کی دوستی صرف یہاں ہے

۴۴- ہر گروہ جب دوزخ میں داخل ہوگا تو اپنے پیش رو گروہ پر لعنت کرتا ہوا داخل ہوگا یعنی اس مصیبت میں باہم ہمدردی تو کیا ہوتی۔ دوزخی ایک دوسرے پر لعن طعن کریں گے۔ شاید اتباع اپنے سرداروں سے کہیں کہ تم پر خدا کی لعنت ہو تم اپنے ساتھ ہمیں بھی لے ڈوبے ہوا اور سردار اتباع سے کہیں کہ ملعونو اگر ہم گڑھے میں گر پڑے تھے تو تم کیوں اندھے بن گئے وغیر ذالک [1]

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن جب اصل حقیقت سامنے آئے گی تو تابع و متبوع ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے اور برا بھلا کہیں گے۔ یہ صورتِ حال اس وقت کی ہے جب تابعین اور متبوع بالکل آمنے سامنے ہوں گے یعنی جب کوئی جماعت دوزخ میں داخل ہوگی اور وہاں کی رسوائیاں اور ہولناکیاں دیکھے گی تو وہ ان لوگوں پر لعنت کے ڈونگرے برسائے گی جن کی پیروی و اقتداء میں کفر کی راہ پر گامزن ہوئی قرآن کے دوسرے موقعہ پر ہے:

ویوم القیامۃ یکفر بعضکم ببعض ویلعن بعضکم بعضا۔

قیامت کے روز تم ایک دوسرے کو کافر کہو گے اور باہم ایک دوسرے پر لعنت بھیجو گے۔

اس تذکرے سے یہاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں کو یہ بتانا ہے کہ جو لوگ دعوت کے اس دور میں اپنے زیر دستوں کو یہ اطمینان دلا رہے ہیں کہ وہ ان کے طریقے پر چلتے رہیں۔ قیامت کے دن وہ ان کی طرف سے جواب دہی کرلیں گے۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ اس روز اس قسم کے لیڈر اور اس قسم کے پیروکار سب ایک دوسرے پر لعنت بھیجیں گے۔ دوستی و وفاداری کے سارے دعوے اسی وقت تک ہیں جب تک اصل حقیقت سے پردہ نہیں اٹھتا۔ پردہ اٹھتے ہی سب پر یہ حقیقت واضح ہو جائے گی کہ اس طرح کے سارے لوگوں کا ٹھکانا جہنم ہے۔ ان میں سے کوئی بھی کسی کے کام آنے والا نہیں ہے۔

ہم رنگی اور ہم خیالی، کردار میں ہم آہنگی اور اعمال و اخلاق میں یکسانی کی وجہ سے ایک جماعت کو دوسری جماعت کی بہن کہا ہے۔ قاضی ثناء اللہ نے یہ نکتہ آفرینی خوب فرمائی ہے کہ یہ گمراہوں کی باہم دنیوی اُخوت ہے اور اشارہ ہے کہ گمراہی و ضلالت کی اساس پر بنا ہوا بھائی چارہ آخرت میں ایک دوسرے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لعنت کا سامان ہوگا۔ دُنیا میں تو یہ ایک دوسرے کے تابع اور متبوع لیڈر اور ساتھی بنے رہے۔ ایک دوسرے کے گن گاتے اور نعرے لگاتے تھے لیکن وہاں دوزخ میں آمنا سامنا ہوتے ہی باہم ایک دوسرے پر لعنت برسائیں گے۔ تابع متبوع سے کہیں گے کہ تم پر لعنت ہو تم نے ہمارا بیڑہ غرق کیا ہے اور وہ کہیں گے تم خود ہی بدبخت تھے تم خود ہمارے پیچھے چلے۔ اس میں ہمارا کیا قصور ہے[1]

پیروکاروں کا متفقہ مطالبہ

۴۵۔ تاآنکہ جب سب اس میں گر چکیں گے تو بعد والا گروہ پہلوں کے بارے میں کہے گا اے پروردگار ہماری گمراہی کا سبب یہی لوگ ہیں لہٰذا ان کو جہنم کا دُگنا عذاب دے۔ اللہ فرمائے گا سب کو دوگنا ہی عذاب ہوگا۔ لیکن تمہیں پتہ نہیں ہے یعنی ایک حساب سے پہلوں کا گناہ دُگنا کہ خود گمراہ ہوتے اور دوسرے آنے والوں کے لیے راہ ڈالی۔ اور ایک طرح سے پچھلوں کا دُگنا کہ خود بہکے اور پہلوں کا حال دیکھ کر عبرت حاصل نہ کی۔ یا چونکہ ہر دوزخی کا عذاب اپنے اپنے درجہ کے موافق وقتاً فوقتاً بڑھتا رہے گا اس لیے فرمایا کہ ہر ایک کا عذاب دُگنا ہوتا جائے گا۔ ابھی آغازِ تعذیب ہے تمہیں انجام کی خبر نہیں ہے یعنی پہلوں کا عذاب دُگنا کرنے سے تم پچھلوں کو کوئی شفا و راحت نصیب نہ ہوگی۔ یہ تقدیر اس صورت میں ہے کہ لکل ضعف سے دونوں فریق مراد ہوں لیکن ابن کثیرؒ کے نزدیک اس آیت میں پچھلوں کو مطلع کیا گیا ہے کہ بے شک ہم نے پہلوں میں سے ہر ایک کے لیے اس کے درجہ کے موافق دُگنا ہی عذاب رکھا ہے جیسا کہ دوسری جگہ خبر دی ہے الذین کفروا وصدوا عن سبیل اللہ زدناھم عذابا فوق العذاب۔ نحل رکوع ۱۲، ولیحملن اثقالھم واثقالا مع اثقالھم عنکبوت رکوع ۱۔ ومن اوزار الذین یضلونھم بغیر علم نحل رکوع ۳[2]

اس آیت کی تفسیر میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

اوّل یہ کہ اولیٰ اور اخریٰ سے کیا مراد ہے۔ کچھ کی رائے یہ ہے کہ اولیٰ سے وہ اُمتیں مراد ہیں جو زمانہ بعید میں گزر چکی ہیں اور اخریٰ سے وہ مراد ہیں جو ان کے بعد آئی ہیں۔ مولانا آزاد کا میلان اسی طرف ہے چنانچہ فرماتے ہیں اسی لیے پچھلی اُمتیں اپنے سے پہلی اُمتوں پر لعنت بھیجیں گی اور مولانا مودودی کا بھی خیال یہی معلوم ہوتا ہے چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

---

[1] تدبر قرآن [2] افاداتِ شیخ الاسلام

یعنی بہر حال تم میں سے ہر گروہ کسی کا خلف تھا تو کسی کا سلف بھی تھا۔ اگر کسی گروہ کے اسلاف نے اس کے لیے فکر و عمل کی گمراہیوں کا ورثہ چھوڑا تھا تو وہ خود بھی اپنے اخلاف کے لیے ویسا ہی ورثہ چھوڑ کر دُنیا سے رخصت ہوا۔

اس صورت میں یہ آیت مختلف زمانوں میں ہونے والی اُمتوں کے عذاب کا نقشہ پیش کر رہی ہے۔ یعنی سنہ ۱ھ کے لوگوں نے کچھ افکار و اعمال غلط اختیار کیے ہیں تو سنہ ۲۰۰ھ میں جو لوگ ان غلط افکار و اعمال کو اپنے بزرگوں کا ورثہ سمجھ کر اختیار کریں گے تو دونوں کے لیے دوہرا عذاب ہوگا لیکن اس صورت میں مورث کے لیے تو دوہرا عذاب ہونے کی بات سمجھ میں آتی ہے کہ ایک عذاب اپنے جرائم کی پاداش میں اور دوسرا عذاب دوسروں کے لیے جرائم کی میراث چھوڑ کر آنے کی پاداش میں۔ لیکن وارث کے لیے اس صورت میں ڈبل عذاب کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔ اور خود ان بزرگوں نے بھی اس کی توضیح نہیں فرمائی ہے شاید اسی اُلجھن سے بچنے کے لیے عام شارحین قرآن نے اولیٰ سے متبوع اور اخریٰ سے تابع مراد لیا ہے یا اولیٰ سے طاقتور گروہ اور اخریٰ سے کمزور مراد لیا ہے۔ قرآن میں یہ بات کئی جگہ بیان ہوئی ہے۔ کہیں سرداروں، آقاؤں اور تابعداروں کے درمیان مکالمہ ہے کہیں طاقتوروں اور کمزوروں کے درمیان گفتگو پیش ہوئی ہے اور کہیں تابع اور متبوع کے درمیان چپقلش ہے۔ حوالہ کے لیے دیکھئے پارہ دوم اور پارہ ۲۲ سورہ سبا اور احزاب۔ ابن کثیر نے اخریٰ کی تفسیر تابعین سے اور اولیٰ کی متبوعین سے کی ہے۔ آلوسی، قرطبی نے بھی اسی کو اپنایا ہے۔ ان کی تشریح کی بنا پر آیت کا مدعا یہ ہے کہ ایک ہی زمانے میں گمراہی کو اپنانے والے تابع اور متبوع کی صورت میں ہوتے ہیں۔ ان کا انجام روز قیامت یہ ہوگا کہ عام شہری اپنے زعماء سے رعیت اپنے بادشاہوں سے مقتدی اپنے اماموں سے، مرید اپنے پیروں سے، شاگرد اپنے اساتذہ کو مخاطب کر کے جناب الٰہی میں درخواست کریں گے ربنا ھؤلاء اضلونا اے ہمارے رب ہماری دُنیا میں بے راہروی کا باعث یہی لوگ بنے ہیں ان کو ڈبل عذاب دیجئے ایک خود گمراہی اختیار کرنے، دوسرا ہمیں گمراہ کرنے کا۔ ارشاد ہوگا۔ لکل ضعف سب کو ہی ڈبل ہے لیکن تمہیں پتہ نہیں ہے۔ ان کو ڈبل اس لیے کہ خود گمراہ ہوتے اور تمہیں گمراہ کیا اور تمہیں ڈبل اس لیے کہ خود گمراہ ہوتے اور گمراہوں کی پیروی کی۔ ان کی پیروی کرنا تمہارے اختیار تمیزی اور صوابدید سے ہوا۔ لکل ضعف کے ایک معنے یہ ہیں کہ ان میں سے ہر ایک کو جتنا تمہیں عذاب ہے اس سے دگنا ہے اور یہ معنے بھی بیان کیے گئے ہیں کہ ان میں سے اور تم میں سے ہر ایک کو اس سے دُگنا عذاب ہے جتنا کہ تم میں سے ایک دوسرے کو نظر آرہا ہے۔ کیونکہ عذاب کا ایک ظاہر ہے اور ایک باطن اور ہر ایک

دوسرے کے ظاہر کا تو ادراک کر لیتا ہے باطن کا نہیں کرتا اس لیے وہ دل میں یہ سمجھتا ہے کہ اس کو باطنی عذاب نہیں ہے۔ قاضی ثناء اللہ نے یہ لطیف مطلب بتایا ہے کہ تم میں سے ہر ایک کو اس کی گمراہی کے مطابق دوگنا عذاب ہوگا۔ رہنماؤں کو کفر اور کفر کی قیادت کی وجہ سے اور پیروکاروں کو کفر اور کفر میں اپنے رہنماؤں کی پیروی کی وجہ سے۔ گویا عذاب میں سب مبتلا ہیں لیکن عذاب کی کمیت و کیفیت کا ایک دوسرے کو پتہ نہیں ہے۔

متبوعین کا تابعین کو جواب

۴۶۔ اور پہلا گروہ دوسرے گروہ سے کہے گا کہ اس فیصلہ خداوندی کے بعد اب تمہیں ہم پر کوئی فوقیت نہیں ہے لہٰذا سب اپنی کمائی کے بدلے عذاب کے مزے چکھو۔ یعنی ہماری سزا میں تضعیف کا مطالبہ کر کے تمہیں کیا مل گیا؟ کیا تمہارے عذاب میں کچھ تخفیف ہوگئی، نہیں تمہیں بھی اپنی کرتوت کا مزہ چکھنا ہوگا[1] رہنماؤں کی جانب سے پیروکاروں کو جواب ہے کہ اگر صورتِ حال وہی ہے جو تم نے بتائی ہے کہ ہم نے تم کو گمراہ کیا ہے تو ہم پر تمہیں کوئی فوقیت نہیں ہے جس کی بنیاد پر تم ہمارے لیے ڈبل عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو۔ گناہ تو دونوں کا ایک ہے اور اس کا تمہیں اقرار بھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تم خود کب ہدایت کے طالب تھے؟ اگر ہم نے تمہیں دُنیا کا لالچ دے کر اپنا بندہ بنایا تو تم لالچی تھے جب ہی تو ہمارے دام میں گرفتار ہوتے۔ اگر ہم نے تمہیں خریدا تو تم خود بکنے کے لیے تیار تھے۔ جب ہی تو ہم خرید سکے۔ اگر ہم نے تمہیں مادہ پرستی، دُنیا پرستی، قوم پرستی اور ایسی ہی دوسری گمراہیوں اور بداعمالیوں میں مبتلا کیا تو تم خود خدا سے بیزار اور دُنیا کے پرستار تھے جب ہی تو تم نے خدا پرستی کی طرف بلانے والوں کو چھوڑ کر ہماری پکار پر لبیک کہی۔ اگر ہم نے تمہیں مذہبی قسم کے فریب دیے تو ان چیزوں کی مانگ تو تمہارے اندر ہی موجود تھی جنہیں ہم پیش کرتے تھے اور تم لپک لپک کر لیتے تھے تم خدا کے بجائے ایسے حاجت روا مانگتے تھے جو تم سے کسی اخلاقی قانون کی پابندی کا مطالبہ نہ کریں اور صرف تمہارے کام بناتے رہیں۔ ہم نے وہ حاجت روا تمہیں گھڑ گھڑ کر دے دیے تھے۔ تم کو ایسے سفارشیوں کی تلاش تھی کہ تم سے بے پروا ہو کر دُنیا کے کتے بنے رہو اور بخشوانے کا ذمہ وہ لے لیں ہم نے وہ سفارشی تصنیف کر کے تمہیں فراہم کر دیے۔ تم چاہتے تھے کہ خشک اور بے مزہ دینداری اور

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

پرہیزگاری اور قربانی اور سعی و عمل کے بغیر نجات کا کوئی اور راستہ بتایا جائے جس میں نفس کے لیے لذتیں ہی لذتیں ہوں اور خواہشات پر کوئی پابندی نہ ہو۔ ہم نے ایسے خوشنما مذاہب تمہارے لیے ایجاد کیے غرض یہ کہ ذمہ داری تنہا ہم پر نہیں ہے تم بھی برابر کے ذمہ دار ہو ہم اگر گمراہی فراہم کرنے والے ہوں تو تم اس کے خریدار تھے[1]

[1] تفہیم القرآن

إِنَّ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِآيَاتِنَا وَاسْتَكْبَرُوا عَنْهَا لَا تُفَتَّحُ لَهُمْ أَبْوَابُ
السَّمَاءِ وَلَا يَدْخُلُونَ الْجَنَّةَ حَتَّىٰ يَلِجَ الْجَمَلُ فِي سَمِّ
الْخِيَاطِ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الْمُجْرِمِينَ ﴿٤٠﴾ لَهُم مِّن جَهَنَّمَ
مِهَادٌ وَمِن فَوْقِهِمْ غَوَاشٍ ۚ وَكَذَٰلِكَ نَجْزِي الظَّالِمِينَ ﴿٤١﴾
وَالَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ لَا نُكَلِّفُ نَفْسًا إِلَّا
وُسْعَهَا أُولَٰئِكَ أَصْحَابُ الْجَنَّةِ ۖ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٤٢﴾ وَ
نَزَعْنَا مَا فِي صُدُورِهِم مِّنْ غِلٍّ تَجْرِي مِن تَحْتِهِمُ الْأَنْهَارُ ۖ
وَقَالُوا الْحَمْدُ لِلَّهِ الَّذِي هَدَانَا لِهَٰذَا وَمَا كُنَّا لِنَهْتَدِيَ
لَوْلَا أَنْ هَدَانَا اللَّهُ ۖ لَقَدْ جَاءَتْ رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۖ وَ
نُودُوا أَن تِلْكُمُ الْجَنَّةُ أُورِثْتُمُوهَا بِمَا كُنتُمْ تَعْمَلُونَ ﴿٤٣﴾

یقین مانو جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان کے مقابلے
۴۰
میں اکڑ گئے ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے

اُن کا جنت میں داخل ہونا ایسا ہی محال ہے جیسے سوئی کے ناکہ میں سے اُونٹ کا گزر جانا[۴۸]۔ اور جرم پیشہ لوگوں کو ہم ایسا ہی بدلہ دیں گے[۴۹]۔ ان کے لیے دوزخ کا بچھونا ہے اور اسی کا اوڑھنا ہے اور ظلم پیشہ لوگوں کو ہم ایسے ہی جزا دیں گے[۵۰]۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے، ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتے یہی لوگ جنتی ہیں اس میں وہ ہمیشہ رہیں گے[۵۱]۔ اور ان کے دلوں میں جو کچھ خفگی ہو گی اسے ہم نکال دیں گے ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی[۵۲]۔ اور وہ کہیں گے اس اللہ ہی کی تعریف ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچا دیا، ہم خود راہ یاب نہ ہوتے اگر اللہ ہماری رہنمائی نہ کرتا، ہمارے رب کے فرستادے واقعی حق لے کر آئے تھے[۵۳]۔ اور ان کو پکارا جائے گا کہ یہی وہ جنت ہے جس کا تمہیں تمہارے اعمال کی وجہ سے وارث بنایا گیا ہے[۵۴]۔

معانی مفردات

سم الخیاط، سوئی کا ناکہ، سم تنگ سوراخ کو کہتے ہیں جیسے سوئی کا ناکہ یا ناک اور کان میں جو چھید کیا جاتا ہے۔ اور سم زہر کو کہتے ہیں کیونکہ وہ اپنے لطف تاثیر سے بدن کے اندر داخل ہو جاتا ہے اور سموم تیز گرم ہوا کو کہتے ہیں جو زہر کا اثر رکھتی ہے۔ خیاط کے معنے سوئی کے۔ مھاد، مہد سے بنا ہے اس کے معنے بچھانے کی چیز کے آتے ہیں۔ بستر میں دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک بچھونا اور دوسرا اوپر لینے والی چیز جیسے لحاف، غواش، غاشیہ کی جمع ہے۔ ڈھانکنے والی چیز اس مصیبت کو بھی غاشیہ کہتے ہیں جو حواس پر پردہ ڈال دے اور قیامت کو بھی غاشیہ کہتے ہیں اس سے مراد لحاف ہیں۔ نکلف، مصدر تکلیف سے بنا ہے ہم حکم کا بار ڈالتے ہیں، ہم ذمہ دار بناتے ہیں۔ وسع، اس کے اصلی معنے سمائی کے ہیں اسی سے وسع ماضی ہے باب سمع سے۔ نزعنا، نزع سے بنا ہے جس کے معنے نکالنے اور کھینچنے کے ہیں۔ غل کے معنے کینہ اور عداوت کے ہیں۔

دوزخ میں دوزخیوں اور جنت میں جنتیوں کا چہرہ

یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول اور عمل و ردعمل کے جس اصول پر مبنی ہے۔ اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے۔ یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب رکھا گیا ہے۔ قرآن نے ان ہی دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے۔ عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے جس کے معنے پیچھے آنے کے ہیں اس لیے عقاب اس اثر کا نام ہے جو فعل کے کرنے کے بعد لازم آجاتا ہے اور ثواب کا لفظ توب سے بنا ہے جس کے معنے لوٹنے کے ہیں اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ اور جزاء کے معنے میں بولا گیا ہے۔

اسی ایک بات کو اگر سمجھ لیا جائے تو ہر صاحب عقل تسلیم کرے گا کہ صحیح اور مکمل انصاف اگر ہو سکتا ہے تو اس کی صورت صرف وہی ہے جو قرآن ان آیات میں پیش کر رہا ہے اور یہیں سے

ان لوگوں کی غلط فہمیاں بھی دُور ہو سکتی ہیں جنہوں نے جزا کے لیے اسی دُنیا کی موجودہ زندگی کو کافی سمجھ لیا ہے اور ان لوگوں کی غلط فہمیاں بھی جو یہ گمان کرتے ہیں کہ انسان کو اس کے اعمال کی پوری جزا تناسخ کی صورت میں مل سکتی ہے دراصل ان دونوں گروہوں نے نہ تو انسان کے اعمال اور ان کے اثرات و نتائج کی وسعتوں کو سمجھا ہے اور نہ منصفانہ جزا اور اس کے تقاضوں کو۔

قرآن نے بتایا ہے کہ جس طرح اس دُنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب جہان وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہونے ہیں۔ اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں۔ جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ غرور اور خاکساری، بخل اور فیاضی، انتقام اور عفو، شجاعت اور بزدلی، تقویٰ اور فسق، ایمان اور کفر ہر ایک کا ایک نہ ایک اثر ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے، جس طرح سنکھیا سے سمیت شکر سے مٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی۔ اور ان معنوی، روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی مادی اور طبیعیاتی اشیا میں ہے۔

۴۰۔ یقیناً جن لوگوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان کے مقابلے میں اکڑ گئے ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے۔ یعنی نہ زندگی میں ان کے اعمال کے لیے آسمانی قبول و رفعت حاصل ہے نہ موت کے بعد ان کی ارواح کو آسمان پر چڑھنے کی اجازت ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ بعد موت کافر کی روح کو آسمان کی جانب سے سجین کی طرف دھکے دیے جاتے ہیں اور مومن کی روح ساتویں آسمان تک صعود کرتی ہے۔ مفصل احوال کتب احادیث میں دیکھیے۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے دُنیا کی زندگی میں رہ کر نبوت کی راہ سے آئی ہوئی ہماری آیات اور ہمارے قوانین کی تکذیب کی اور صرف تکذیب نہیں کی بلکہ اس کے ساتھ معاندانہ رویہ اختیار کر کے ان کا مقابلہ کیا ان کے لیے آسمان کے دروازے نہ کھولے جائیں گے۔ دروازہ کھولنے کی تعبیر میں مفسرین قرآن نے دو تشریحیں پیش کی ہیں۔ ایک یہ کہ ان کے اعمال کو قطعاً شرف پذیرائی نہ ملے گا۔ اور عبداللہ بن عباس نے اسے اور زیادہ وسعت دے کر فرمایا ہے کہ ان کا کوئی عمل اور ان کی کوئی نیکی قبول نہ ہوگی۔ حضرت مجاہد اور سعید بن المسیب نے بھی اس تشریح کی تائید فرمائی ہے۔ دوسری تشریح یہ ہے کہ موت کے بعد ان کی روحوں کو آسمان میں باریابی حاصل نہ ہوگی۔ یہ بھی بحوالہ سدی عبداللہ بن عباس سے

لہ افادات شیخ الاسلام

منقول ہے گویا اہلِ ایمان کے مقابلہ میں ان کو طنز کیا ہے کہ مومنین کی ارواح کے لیے تو آسمان کے دروازے کھولے جائیں گے لیکن کافروں کی روحوں کو یہ شرف نہ ملے گا۔ مطلب یہ ہے کہ کافروں کا اہل ایمان کی طرح خیر مقدم نہیں ہوگا بلکہ وہ نہایت ذلت و فضیحت کے ساتھ اپنا انجام بد دیکھنے کے لیے مجرموں اور بدمعاشوں کی طرح لائے جائیں گے۔ حضرت شیخ الاسلام نے اپنے فوائد میں حافظ ابن جریر کی اتباع میں دونوں تشریحات کو اپنا لیا ہے یعنی نہ ان کی ارواح کو آسمان تک باریابی ہوگی اور نہ ان کے اعمال کو شرفِ پذیرائی ملے گا۔ اعمال کی عدم قبولیت اور ارواح کا باریاب نہ ہونا دونوں کی اس فقرہ میں گنجائش ہے۔ لیکن دونوں میں تھوڑا سا فرق ہے۔ پہلی بات قرآن کا منطوق ہے اور دوسری بات اس کا مدلول ہے۔ اور اس مدلول ہی کی احادیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے تشریح فرمائی ہے۔ ابوداؤد، نسائی، ابن ماجہ اور مسند امام احمد میں براء بن عازب کے حوالہ سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک مفصل ارشاد گرامی آیا ہے جس میں آپ نے کافر و مومن کی ارواح کو قبض کرنے کے بعد فرشتوں کے ان سے سلوک کی تصویر پیش فرمائی ہے اور اسی میں آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ہے۔

یہاں علامہ شہاب خفاجی نے حاشیہ انوار التنزیل قاضی بیضاوی میں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے کہ آسمانوں کے لیے دروازوں کا ہونا، اچھی اور نیک دعاؤں کے لیے ان کا کھلنا، اعمالِ صالحہ کا آسمانوں کی جانب چڑھنا اور ارواح کے لیے آسمانی دروازوں کا کھلنا، قرآنی نصوص اور ارشاداتِ نبوی میں صراحۃً آیا ہے اس میں تاویل کی چنداں حاجت نہیں ہے۔ پتہ نہیں صاحبِ تدبر قرآن کو یہاں اس تاویل کی کیوں ضرورت پیش آئی ہے۔

" قاعدہ ہے کہ جن کا اعزاز و اکرام مقصود ہوتا ہے ان کے لیے نہایت اہتمام سے پھاٹک کھولے جاتے ہیں۔ پھاٹک پر ان کے خیر مقدم کے لیے دو رویہ کھڑے ہوتے ہیں وہ اھلاً و سھلاً و مرحباً سلام و تحیت کے نعروں سے ان کا خیر مقدم کرتے ہیں برعکس اس کے جن کی تذلیل مد نظر ہوتی ہے وہ قیدیوں کی طرح جیل کے پھاٹک کی کھڑکی سے اس کے اندر ٹھونس دیے جاتے ہیں گویا لاتفتح لھم ابواب السماء سے مقصود نفس فعل کی نفی نہیں بلکہ اس کے لیے لازم کی نفی ہے جس کی مثالیں کلامِ عرب میں بہت ملتی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ دروازے کی تعبیر واقعاتی نہیں بلکہ فرضی ہے لیکن قرآن و سنت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ آسمان کے لیے دروازے کی تعبیر واقعاتی ہے جیسا کہ آپ الخفاجی کی زبانی سن آئے ہیں۔

ان کا جنت میں داخلہ محال ہے

۴۸ - ان کا جنت میں داخل ہونا ایسا ہی محال ہے جیسے سوئی کے ناکے میں سے اونٹ کا گزر جانا۔ یہ تعلیق بالمحال کے طور پر فرمایا۔ ہر زبان کے محاورات میں ایسی امثال موجود ہیں جن میں کسی چیز کے محال ہونے کی دوسری محال چیز پر معلق کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح یہ ناممکن ہے کہ اونٹ اپنی کلانی اور جسامت پر رہے اور سوئی کا ناکہ ایسا ہی تنگ اور چھوٹا ہو۔ اس کے باوجود اونٹ سوئی کے ناکہ میں داخل ہو جائے۔ اسی طرح ان مکذبین و مستکبرین کا جنت میں داخل ہونا محال ہے کیونکہ حق تعالیٰ جہنم میں ان کے خلود کی خبر دے چکا ہے اور علم الٰہی میں بھی سزا ان کے لیے ٹھہر چکی ہے۔ پھر خدا کے علم اور اخبار کے خلاف کیسے وقوع میں آسکتا ہے[1]

شیخ الاسلام نے مکذبین اور مستکبرین پر جنت کا دروازہ بند ہونے کی جو وجہ بتائی ہے وہ بلا ریب درست ہے کہ علم الٰہی میں یہی سزا ان کے لیے مقرر ہو چکی ہے لیکن سوال یہ ہے کہ علم الٰہی میں مقرر ہونے کی وجہ کیا ہے۔

آج کل علم نفسیات نے اس مسئلہ کو بداہتہً ثابت کر دیا ہے کہ انسان کی عملی اصلاح کے لیے قلبی اصلاح مقدم ہے اور انسان کے دل اور ارادے پر اگر کوئی چیز حکمران ہے تو وہ اس کا عقیدہ ہے۔ صحیح اور صالح عمل کے لیے ضروری یہ ہے کہ چند صحیح اصول و مقدمات کا ہم اس طرح تصور کریں کہ وہ دل کا غیر مشکوک یقین اور غیر متزلزل عقیدہ بن جائیں اور اسی صحیح یقین اور مستحکم عقیدے کے تحت ہم اپنے تمام کام انجام دیں۔ قرآن عزیز نے ایمان کا ذکر ہمیشہ عمل صالح سے پہلے کیا ہے اور ایمان کے بغیر کسی عمل کو قبول کے قابل نہیں سمجھا ہے کیونکہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادے اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادہ کا بھی عدم ہو جاتا ہے جس پر حسنِ عمل کا دار و مدار ہے۔

قرآن نے ان لوگوں کے کاموں کی مثال جو ایمان سے تہی دامن ہوں اس راکھ سے دی ہے جس کو ہوا کے جھونکے اڑا اڑا کر فنا کر دیتے ہیں اور ان کا کوئی وجود نہیں رہتا۔ اسی طرح اس شخص کے کام بھی جو اس ایمان سے محروم ہے بے بنیاد اور بے اصل ہے۔ الغرض ایمان تمام اعمال کی اساس ہے جس کے بغیر عمل بے بنیاد ہے۔

بعض کم فہم لوگ یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان گناہ تو تھوڑا عرصہ کرتا ہے پھر اس کی سزا خلود فی النار کیوں رکھی گئی ہے۔ یہ لوگ اگر دنیاوی واقعات پر غور کریں تو وہ ہی ان کی تسکین کے لیے کافی ہیں۔ دنیا کا ہر بڑے

[1] افادات شیخ الاسلام

سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پاتا ہے۔ چوری کا عمل ہو یا قتل کا جرم ہو اس کے کرنے میں کتنی دیر لگتی ہے مگر اس کے معاوضہ میں سالہا سال کی قید ہم خود انسانی عدالتوں میں تجویز کرتے ہیں اور اس کے خلاف عقل ہونے کا ہمیں وسوسہ بھی نہیں آتا۔

اس سے زیادہ واضح مثال یہ ہے کہ ذرا سی جسمانی بد پرہیزی اور اصولِ صحت کی معمولی غلطی کی پاداش میں وہ کبھی ہفتوں مہینوں سالہا سال تک بیمار رہتا ہے اور ایک مدت دراز میں ان غلطیوں کی تلافی کر پاتا ہے اور کبھی اس معمولی غلطی کی بدولت عمر بھر اس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے اور آخر میں جان دے دیتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت میں یکسانی نہیں ہوتی ہے بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلے میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزار ہا گنہ زیادہ ہوتی ہے۔ اسی لیے قرآن میں تصریح ہے کہ شرک و کفر کا گناہ کبھی معاف نہ ہوگا یعنی اس کے اخروی نتائج کی پاداش دائمی ہے۔

جرائم پیشہ لوگوں کو سزا

۴۹۔ اور مجرم پیشہ لوگوں کو ہم اسی طرح بدلہ دیں گے۔ یعنی جیسے ہم نے تکذیب و استکبار کے جرم کرنے والوں کی سزا بیان کی ہے۔ ایسے ہی ہم جرائم پیشہ لوگوں کو سزا دیں گے۔ مجرمین کی تعبیر بتا رہی ہے کہ ان لوگوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ جرائم جن کی صفت ہو۔ بحالتِ ایمان اکا دکا گناہ کی یہ سزا نہیں ہے۔ مومن اگر جرم کرتا ہے تو وہ اپنے ایمان کے تقاضے کے تحت طلبِ مغفرت کرتا ہے۔ اور مغفرت سے گناہ دھل جاتے ہیں۔ قرآن میں مجرمین کی تعبیر چھوٹے موٹے گناہوں کے لیے نہیں بلکہ سنگین گناہوں کے لیے آتی ہے اور ایسے تمام اعمال پر بولا جاتا ہے جس سے انسانی زندگی کا امن و سلام تباہ ہو جاتے اور انسانی زندگی کے لیے نقصان رساں ہو اسی لیے اس قسم کے لوگوں کو جو جرائم کی قیادت کرتے ہوں۔ قرآن میں اکابر مجرمین کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تکذیب و استکبار کرنے والوں کو جو ہم نے یہ سزا دی ہے کہ جنت میں داخل ہونا محال بنا دیا وجہ اس کی یہ ہے کہ وہ مجرم ہیں اور مجرموں کی سزا کے بارے میں ہمارا قانون یہی ہے اور جرم یہ ہے کہ احکام خداوندی کی تکذیب کی۔ منشا یہ ہے کہ ان کی تکذیب اور تکبر نے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ان پر جنت کا دروازہ بند کر دیا اور عذاب محیط کو ان پر اس طرح مسلط کر دیا۔

عذابِ دوزخ کی ہمہ گیری

۵۰۔ ان کے لیے دوزخ کا بچھونا ہے اور اسی کا اوڑھنا ہے اور ظلم پیشہ لوگوں کو ہم ایسی ہی

جزا دیں گے یعنی ہر طرف سے آگ محیط ہو گی کسی کروٹ چین نہ ملے گا۔[1] مہاد ایسا ہی اسم ہے جیسے لفظ امام اس کے معنے بچھونا ہیں۔ مہد گھوارے کو کہتے ہیں۔ اسی سے تمہید ہے بچھانا کام کو ہموار کرنا اور غواش غاشیہ کی جمع ہے۔ اصل میں غواشی تھا۔ مراد آگ کے پردے ہر طرف سے ڈھانک لینے والی آگ۔ یعنی جہنم میں بستر بھی آگ کا ہو گا اور لحاف بھی آگ ہی کا ہو گا اور مطلب یہ ہے کہ ہر طرف سے ان کو آگ گھیرے ہو گی کسی پہلوان کو چین نصیب نہ ہو گا۔ پہلی آیت میں مکذبین اور مستکبرین کے لیے جنت سے محرومی کا ذکر تھا اس آیت میں ان کے لیے جہنم میں عذاب بیان ہو رہا ہے جنت سے محرومی کو بیان کرنے کے بعد ان کو مجرم فرمایا اور جہنم کے عذاب کے سلسلے میں ان کا چہرہ ظالم کہہ کر پیش کیا۔ اس میں اشارہ ہے کہ نبوت کی تکذیب کرنے والے اور نبوت کا مقابلہ کرنے والے مجرم بھی ہوتے ہیں اور ظالم بھی ہوتے ہیں۔ اور جرائم اور ظلم کفر ایسے اوصاف ہیں اہلِ ایمان ان سے موصوف نہیں ہوتے۔

نیز اس آیت کی تعبیر سے یہ بھی اشارہ معلوم ہو رہا ہے کہ مکذبین و مستکبرین کو جہنم میں عذاب دائمی ہو گا جملہ اسمیہ کی تعبیر اسی دوام کو بتانے کے لیے لائی گئی۔ جمہور اہل سنت کا مذہب یہی ہے کہ جنت کی آسائش کی طرح دوزخ کا عذاب بھی دائمی ہے اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر اور تکذیب کے مرتکب ہوں گے کبھی دوزخ سے نجات نہ ملے گی۔ گنہ گاروں کی دو قسمیں ہیں ایک وہ جو گنہ گار ہیں مگر دل میں ایمان رکھتے ہیں ایسے لوگ عذاب کے بغیر یا عذاب کے بعد اللہ تعالیٰ کے عفو و کرم سے سرفراز ہوں گے۔ دوسرے وہ جو ہمیشہ تکذیب نبوت اور شرک و کفر میں مبتلا رہے۔ اس سے توبہ کیے اور ایمان لائے بغیر مر گئے۔ ایسے لوگوں کی بخشش کبھی نہ ہو گی وہ ہمیشہ کے لیے جہنم میں داخل کیے جائیں گے۔ ان کی گنہ گاری اس درجہ کی ہو گی کہ وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت کو اپنی طرف کسی طرح جذب نہ کر سکیں گے۔ یہ وہ زمین شور ہوں گے جس میں اس رحمت عام کی بارش بھی کوئی روئیدگی پیدا نہ کر سکے گی۔

جنت میں اہلِ ایمان کا مقام

۵۱۔ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انہوں نے اچھے اچھے کام کیے، ہم کسی پر اس کی طاقت سے زیادہ اس پر بوجھ نہیں ڈالتے یہی لوگ جنتی ہیں، جنت میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔ لا نکلف نفساً الا وسعہا جملہ معترضہ ہے جس سے درمیان میں تنبیہ فرما دیا کہ ایمان و عمل صالح جس پر اتنا عظیم الشان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

صلہ مرحمت ہوتا ہے کوئی ایسی مشکل چیز نہیں جو انسان کی طاقت سے باہر ہو یا یہ مطلب ہے کہ ہر آدمی سے عمل صالح اسی قدر مطلوب ہے جتنا اس کی مقدرت اور طاقت میں ہو۔ اس سے زائد کا مطالبہ نہیں کیا جارہا۔[1]

چونکہ اس آیت میں یہ بات کھول کر بتاتی ہے کہ مدارِ نجات صرف ایمان اور عمل صالح ہے اور بس۔ کوئی نسب کوئی نسبت وغیرہ پر نجات نہیں ہے اس لیے درمیان میں بطور جملہ معترضہ واضح کر دیا، کہ قانونِ الٰہی میں جس چیز کو مدارِ نجات قرار دیا گیا ہے اور جس کا انسان کو ذمہ دار بنایا گیا ہے۔ یہ ذمہ داری ایسی نہیں جسے انسان اٹھا نہ سکے بلکہ یہ ایک چیز ہے جسے اٹھالینا ہر شخص کے بس میں ہے۔ اور منشا یہ ہے کہ ایمان وعمل کی یہ ذمہ داری جو انسانوں پر ڈالی گئی ہے۔ ہے تو ایک بھاری ذمہ داری لیکن اس کے بھاری ہونے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی عنایت ورحمت کا یہ پہلو بھی یاد رکھنا چاہیے کہ اللہ بندوں پر ان کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔ ہر شخص بس اسی حد تک مکلف ہے جس حد تک اسے طاقت عطا ہوئی ہے جو چیز اس کے حدود واختیار سے باہر ہے اس پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ شریعت نے خود اپنے احکام و قوانین میں اس امر کو ملحوظ رکھا ہے اور مجبوریوں کی صورت میں اس پہلو سے بندوں کو رخصت دی ہے۔ اس وجہ سے نہ تو اللہ کو یہ پسند ہے کہ بندے اپنے آپ کو کسی تکلیف مالایطاق میں ڈالیں اور نہ کسی دوسرے کے لیے یہ جائز ہے کہ ان پر کوئی ایسا بوجھ ڈالے جسے وہ اٹھا نہ سکتے ہوں۔

باہمی کدورتوں سے پاک دل

۵۲ ۔ اور ان کے دلوں میں جو کچھ خفگی ہوگی اسے ہم نکال دیں گے ان کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔

نزعنا ما فی صدورھم من غل سے مراد یا تو یہ ہے کہ باہم جنتیوں میں نعماتے جنت سے متعلق کسی طرح کا رشک وحسد نہ ہوگا۔ ہر ایک اپنے کو اور دوسرے بھائی کو جس مقام میں ہے دیکھ کر خوش ہوگا بخلاف دوزخیوں کے کہ وہ مصیبت کے وقت ایک دوسرے کو لعن وطعن کریں گے جیسا کہ پہلے گزرا۔ اور یا یہ مراد ہے کہ صالحین کے درمیان جو دُنیا میں کسی بات پر خفگی ہو جاتی ہے اور ایک دوسرے کی طرف سے انقباض پیش آتا ہے وہ سب جنت میں داخل ہونے سے پیشتر دلوں سے نکال دیا جائے گا وہاں ایک دوسرے سے سلیم الصدر ہوں گے۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا کہ مجھے امید ہے کہ میں اور عثمان وطلحہ، زبیر رضی اللہ عنہم ان ہی لوگوں میں سے ہوں گے۔[2]

---

[1] [2] افادات شیخ الاسلام

دونوں صورتوں کا حاصل یہ ہے کہ یہ بات جنتیوں کو جنت میں حاصل ہوگی کہ جنت کی نعمتوں کے بارے میں باہم کوئی چشمک نہ ہوگی اور یا یہ کہ دنیا میں اگر کوئی ہوتی جنت میں پہنچنے کے بعد وہ نہ رہے گی۔ ان دونوں صورتوں میں نزعنا صیغہ ماضی کو مضارع کے معنے میں لینا پڑے گا۔ آیت قرآنی میں صیغہ ماضی استعمال ہوا ہے اور معنے یہ ہیں کہ جو لوگ ایمان و عمل صالح کی نعمت سے اس دنیا میں مالا مال ہوتے ہیں ہم نے ان کے دلوں میں سے جو کچھ کدورت تھی نکال دی۔ اور مضارع کے معنے یہ ہیں کہ ہم نکال دیں گے۔ اس لیے کچھ شارحین قرآن نے اسے ماضی کے معنے میں رکھ کر یہ مطلب بتایا ہے کہ ہم نے ایمان و عمل صالح والوں کے دلوں سے دنیا ہی میں کینہ اور بغض باہمی نکال دیا ہے۔ یعنی انہوں نے غل و غش، کینہ و عداوت سے پاک زندگی گزاری ہے اور ان کے دل بغض و عناد کی کدورتوں سے پاک ہو گئے کیونکہ ایمان و عمل کی پاکی کے ساتھ کینہ و عناد کی آلودگی جمع نہیں ہو سکتی۔ علامہ آلوسی نے صحیح فرمایا کہ اس کا مصداق صحابہ جیسے کامل الایمان حضرات ہیں کیونکہ یہی رحماء بینہم ہیں۔ لیکن اس صورت میں آیت اپنے مصداق کے لحاظ سے بہت محدود ہو کر رہ جائے گی۔ اور یہاں قرآن کی یہ آیت ہمارے سامنے یہ بات پیش کر رہی ہے کہ موجودہ دنیا خیر و شر کے متضاد عناصر سے بنی ہے۔ یہاں ثواب کے ساتھ گناہ رحم کے ساتھ سنگدلی محبت کے ساتھ کینہ ہے یہ گناہ کینہ و بغض وہ آگ ہے جس نے یہاں کے قلبی امن و امان کے خرمن میں آگ لگا دی ہے ہر شخص یہاں دوسروں کی اچھی حالت کو دیکھ کر جلتا ہے اور دوسروں پر غصہ کے جوش و خروش سے ابلتا ہے۔

جنت وہ عالم ہے جہاں اس آگ اور سیلاب کا وجود نہ ہوگا ہر قسم کے گناہ سنگدلی، عداوت اور بغض اور حسد کا خاتمہ ہوگا اور خالص محبت و الفت کے دریا موجزن ہوں گے۔ حدیث صحیح ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہاں نہ دلوں کا اختلاف ہوگا نہ باہم بغض و کینہ سب کے دل ایک دل کی طرح متحد ہوں گے (صحیح مسلم) مطلب یہ ہے کہ اہل ایمان جنت میں ایک دوسرے سے بڑے تپاک اور محبت سے ملیں گے۔ ایک دوسرے کا خیر مقدم کریں گے۔ آمنے سامنے بیٹھ کر باہم تبادلہ محبت و مہر کریں گے جیسا کہ قرآن میں علی سرر متقابلین سے معلوم ہو رہا ہے۔ قرآن نے یہاں نزعنا ما فی صدورہم من غل سے اہل جنت کی اسی حالت کا اظہار کیا ہے اور یہ بات ٹھیک دوزخیوں کی اس حالت کے مقابلے میں آئی ہے کہ وہ دوزخ میں ایک دوسرے پر لعنتیں برسائیں گے۔

ہاں اس آیت سے ہم یہ نتیجہ ضرور نکال سکتے ہیں کہ صالح انسانوں کے دامن پر اس دنیا کی زندگی میں جو داغ لگ جاتے ہیں اللہ تعالیٰ ان داغوں سمیت ان کو جنت میں نہ لے جائے گا بلکہ وہاں داخل کرنے سے پہلے اپنے فضل سے انہیں بالکل صاف کر دے گا۔

ایسا کیوں کر ہوگا۔ ابن جریر نے السدی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ جب اہل جنت جنت کی طرف رواں ہوں گے تو ان کو جنت کے دروازے پر ایک درخت ملے گا۔ درخت کی جڑ سے دو چشمے ابل رہے ہوں گے۔ ایک چشمہ کا پانی پئیں گے تو جس دل میں جو غل ہوگا وہ سب صاف ہو جائے گا۔ یہ شراب طہور ہے۔ اور دوسرے چشمہ سے غسل کریں گے تو جنت کی مہک والی ہوا آئے گی تو اس کے بعد ان پر کبھی میل وغیرہ نہ آئے گا۔ اللھم اجعلنی منھم، آمین۔

جنت محض فضل خداوندی ہے

۵۳۔ اور وہ کہیں گے اس اللہ کی تعریف ہے جس نے ہمیں یہاں تک پہنچایا ہم خود راہ یاب نہ ہوتے اگر اللہ ہماری رہنمائی نہ کرتا۔ ہمارے رب کے فرستادے واقعی سچی بات لے کر آئے تھے۔ یعنی خدا کی توفیق و دستگیری اور رسولوں کی رہنمائی سے اس اعلیٰ مقام پر پہنچنا نصیب ہوا ورنہ ہم کہاں اور یہ مرتبہ بلند کہاں[1]۔ اہل جنت اس بات پر نہ پھولیں گے کہ ہم نے کام ہی ایسے کیے تھے جن پر ہمیں جنت ملنی چاہیے تھی بلکہ وہ خدا کی حمد و ثنا اور شکر و احسان مندی میں رطب اللسان ہوں گے اور یہ سب ہمارے رب کا فضل ہے ورنہ ہم کس لائق تھے۔ یہی اعتراف اس زندگی میں بھی صحابہ سے منقول ہے۔

واللہ لولا اللہ ما اھتدینا، ولا تصدقنا ولا صلینا فانزلن سکینۃ علینا، ونحن عن فضلک ما استغنینا

بخدا اگر خدا نہ ہوتا تو ہم ہدایت یافتہ ہوتے نہ خیرات کرتے اور نہ نماز پڑھتے، خداوندا تو ہم پر سکون و اطمینان کی نعمت نازل فرما، ہم تیرے فضل سے کسی حال میں بھی بے نیاز نہیں ہیں۔

انداز بیان کہہ رہا ہے کہ یہ وہ شکر ہے جو کسی طویل اور مشکل سفر کے بعد منزل مقصود پر پہنچنے والا مسافر ادا کرتا ہے ھدانا لھذا میں اللہ تعالیٰ کی اس توفیق بخشی کی طرف بھی اشارہ ہے جو طالبین حق کو ہر قدم پر حاصل ہوتی ہے اور اس رہنمائی کی طرف بھی جو اللہ سبحانہ، انبیاء کے ذریعے لیا فرماتا ہے۔ یہ شان عبدیت کا اظہار ہے۔ وہاں پہنچ کر بھی اس کا اقرار کریں گے لیکن الزمخشری کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ یہ تقرب اور تعبد کا پیمانہ نہیں بلکہ سرور و نشاط کا اعلان ہے کیونکہ اہل جنت کو جو اللہ سبحانہ، کی جانب سے انعامات ملیں گے وہ ان کی توقعات اور امیدوں، ان کے قیاسات اور اندازوں

[1] افادات شیخ الاسلام

سے اتنی زیادہ ہوتی گئی کہ وہ اس کو خدا کا فضل ہی فضل سمجھیں گے اس میں اپنی سعی و تدبیر کے کسی دخل کا ان کو گمان بھی نہ ہوگا۔ الزمخشری نے یہ بھی لکھا ہے کہ یہی معاملہ دُنیا میں بھی خدا اور اس کے نیک بندوں کے درمیان ہے۔ ظالموں کو جو نعمت دُنیا میں ملتی ہے وہ اس پر فخر کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ ہماری قابلیت اور محنت کا نتیجہ ہے۔ اسی لیے وہ ہر نعمت کے حصول پر اور زیادہ متکبّر اور مفسد بنتے چلے جاتے ہیں۔ اس کے برعکس صالحین کو جو نعمت بھی ملتی ہے وہ اسے خدا کا فضل سمجھتے ہیں۔ شکر بجالاتے ہیں۔ جتنے نوازے جاتے ہیں اتنے ہی زیادہ متواضع، شفیق اور فیاض ہوتے چلے جاتے ہیں۔ آخرت میں بھی وہ اپنے حسن عمل پر غرّہ نہ کرتے ہیں۔ اپنے عمل کے بجائے خدا کے رحم و فضل سے اُمیدیں وابستہ رکھتے ہیں۔ بخاری و مسلم دونوں میں روایت موجود ہے۔ خوب جان لو کہ تم محض اپنے عمل کے بل بوتے پر جنّت میں نہ جاؤ گے۔ صحابہ نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا آپ بھی، فرمایا ہاں، میں بھی الا ان یتغمدنی اللہ برحمۃ الآیہ کہ خدا مجھے اپنی رحمت اور اپنے فضل سے ڈھانک لے۔

اعمال جنّت میں داخلہ کا سبب ہیں

۵۴۔ اور ان کو پکارا جائے گا کہ یہی وہ جنّت ہے جس کا تمہیں تمہارے اعمال کی وجہ سے وارث بنایا گیا ہے۔ یہ آواز دینے والا خدا کی جانب سے کوئی فرشتہ ہوگا۔ یعنی آج ساری عملی جدوجہد ٹھکانے لگ گئی اور تم نے کوشش کرکے خدا کے فضل سے اپنے باپ آدم کی میراث ہمیشہ کے لیے حاصل کر لی۔ حدیث میں ہے کسی شخص کا عمل ہرگز اس کو جنّت میں داخل نہ کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ عمل دخول جنّت کی علت نہیں فقط ظاہری سبب ہے دخول جنّت کی علت خدا کی رحمت کاملہ ہے جیسا کہ اسی حدیث میں الا ان یتغمدنی اللہ برحمتہ کے الفاظ سے ظاہر ہوتا ہے۔ ہاں بندے پر رحمت الٰہیہ کا نزول اسی قدر ہوتا ہے جس قدر عمل کی روح اس میں موجود ہو۔ حضرت شیخ الہند فرمایا کرتے تھے کہ گاڑی تو رحمت الٰہیہ کے زور سے چلتی ہے عمل وہ جھنڈی ہے جس کے اشارے پر چلاتے اور روکتے ہیں۔[1]

شیخ الاسلام دراصل ایک اٹھے ہوئے سوال کا جواب دے رہے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ ایک طرف کہا جاتا ہے عمل سے جنّت ملے گی اور پھر بتایا جاتا ہے کہ رحمت کے بغیر کوئی جنّت میں نہ جائے گا۔ جواب

[1] افادات شیخ الاسلام

میں بتایا ہے کہ بما کنتم تعملون - میں با مقابلہ نہیں بلکہ باء سببیہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اعمال جنت میں داخل ہونے کا سبب ضرور ہیں مگر جنت کی قیمت نہیں ہے اور رحمت جنت میں جانے کی اصلی اور واقعی علت ہے۔ کسی چیز کے سبب اور علت ہونے میں بہت بڑا فرق ہے۔ جنت ہی پر منحصر نہیں بلکہ اہل السنۃ والجماعۃ کے نقطہ نظر سے دُنیا اور آخرت کی پوری زندگی اسی نظریہ کے ارد گرد گھوم رہی ہے۔ جیسے پانی پیاس بجھانے کی کھانا پیٹ بھرنے کی، آگ جلانے کی علت نہیں بلکہ سبب اور بہانہ ہے۔ اسی طرح اعمال جنت میں پہنچنے کا سبب ہیں علت صرف اللہ سبحانہٗ کی رحمت ہے۔

جنّت انسان کی وراثت ہے

اس آیت میں جنت کو میراث کہا گیا ہے۔ شارحینِ قرآن جنت کے میراث ہونے پر مختلف الخیال ہیں۔ کچھ کی رائے ہے کہ جنّت کو میراث اس لیے کہا گیا ہے کہ وہ کسی چیز کا بدل نہیں بلکہ محض اللہ کے فضل وکرم سے ملے گی۔ اور کچھ کی رائے میں جنّت کے میراث ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس کا تم سے وعدہ کیا گیا تھا۔ المنار میں السید رشید رضا نے جنت کے میراث ہونے پر تبصرہ کیا ہے لیکن وہ میراث کا کوئی واضح تصور پیش نہ کر سکے۔ اس لیے ہم یہاں معالم القرآن کے ناظرین کے لیے ایک سرسری جائزہ پیش کرتے ہیں۔

امر واقعہ یہ ہے کہ حضرت آدم کا واقعہ جو قرآن عزیز میں آیا ہے وہ آغاز آفرینش کی محض تاریخ نہیں ہے بلکہ وہ حقیقتِ انسانی کی سچی اور حقیقی تصویر ہے۔ عام طور پر یہ سمجھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کو اپنی بے پایاں رحمت سے جس جنت میں جگہ دی وہ پہلے ان کو اور ان کی نسل کو ہمیشہ کے لیے دی گئی تھی لیکن چونکہ اتفاقاً ان سے گناہ سرزد ہوا اس لیے وہاں سے نکال کر زمین میں بھیج دیے گئے۔ مگر ایسا سمجھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ آدم علیہ السلام کا زمین پر آنا تو ان کی پیدائش سے پہلے ہی فرشتوں کو بتا چکا تھا، انی جاعل فی الارض خلیفہ،

حضرت آدم کا زمین میں خلیفہ ہونا زمین میں سکونت پذیر ہونے کی پیشین گوئی ہے مگر زمین میں روانہ کرنے سے پہلے ان کو جنّت میں رکھنا پھر گناہ کے بعد وہاں سے ان کو نکال کر زمین میں بھیجنا یہ بتاتا ہے کہ آدم اور ان کی اولاد کی اصلی جگہ ہی جنّت ہے مگر اس سے دوری ان کے گناہ کی وجہ سے ہوتی اور اس کا حصول ایمان وعمل صالح کے ذریعے ہوگا۔ اسی جنّت سے حضرت آدم کو شیطان نے نکلوایا تھا اور بتایا تھا کہ اس جنّت میں جس میں تم ہو بے درد سر ہمیشہ رہنے کا نسخہ تم کو بتاؤں۔ حضرت

آدم نے خواہش ظاہر کی تو نیک وبد کی تمیز کے درخت کا پھل بتا دیا اور یہ بتایا کہ

هل ادلك على شجرة الخلد وملك لا يبلى

کیا میں تجھے حیاتِ جاودانی اور حکومت غیر فانی کا درخت بتاؤں۔

یہ ایک واضح حقیقت ہے کہ نیک وبد کی تمیز ہی پر انسان کی شرعی تکلیف اور مواخذہ کا دارومدار ہے اسی خیر وشر کی معرفت کا لازمی نتیجہ شریعت کی تکلیف تھی چنانچہ وہ اس کے سر ڈالی گئی اور نسلِ آدم کو نیک و بد کی تمیز فطری الہام کے ذریعے عنایت ہوئی ہے فالهمها فجورها وتقواها، انسان نے جہول وظلوم ہونے کی اس تکلیفِ شرعی کی امانت کو اٹھالیا - یہی نیک وبد کی معرفت کا نتیجہ تھا اور اس تکلیف کا لازمی نتیجہ جزاء وسزا ہے - خدا کی رضامندی یہی تھی کہ اس کے سب بندے اس کی رحمت اور مغفرت کے مستحق ٹھہریں کہ اس رحمت وشفقت کا اقتضا یہی ہے کہ گنہ گاروں کو معاف کرے اور نیکوکاروں پر اپنی خاص رحمت نازل کرے لیکن اگر کاشت کار اپنے کھیتوں کو ابرِ رحمت سے مستفید ہونے کے قابل نہ بنائے تو وہ اس کی برکت سے مستفید نہ ہوگا۔ اسی طرح جو بندہ شرک ونفاق میں مبتلا ہو جانے سے اپنے آپ کو اس کی رحمت کے قابل نہ بنائے تو وہ بھی اس کی رحمت کی بارش سے سیراب نہ ہو سکے گا۔

غرض اس طرح وہ مصلحتِ الٰہی جو انسان کی پیدائش سے تھی پوری ہوئی اور وہ حیاتِ جاوید اور غیر فانی بادشاہی جس کا حصول قضائے الٰہی نے انسان کی محنت، جدوجہد اور سعی وعمل پر موقوف رکھا تھا اور جسے شیطان نے حضرت آدم کو بلا سعی ومحنت محض بخت سے دلانا چاہا تھا بالآخر اس کا ملنا تقدیرِ الٰہی جدوجہد، سعی وعمل اور نظامِ ربانی کے مطابق شریعت کی پیروی کے ذریعے سے مقرر ہوا۔

جب انسان کا اصل مقام وہی حیاتِ جاوید اور مملکتِ ابدی ہے تو اس کا حصول اس کی تمام کوششوں کا محور ہونا چاہیے اور اس حیاتِ جاویدا اور لازوال بادشاہی کی دولت کو اپنی اس فانی زندگی اور زوال پذیر بادشاہی کے تمام کاموں کے مزد ومعاوضہ میں حاصل کرنا چاہیے تاکہ وہ اپنے باپ کی اس آسمانی بادشاہی کو پالے۔ حضرت آدم اس جنت سے نکلے تو ان کو بھوک بھی لگی، ننگے بھی ہوتے، پیاس بھی معلوم ہوئی اور دھوپ کی تپش کی تکلیف بھی ہوئی۔ اور زمین میں آکر چار چیزوں کی مشقت میں گرفتار ہوئے۔ کھانا، پینا، پہننا اور رہنا - یہی انسان کی چار مختصر ضروریات ہیں۔ ان ہی کو اس نے اپنی ہوا وہوس سے پھیلا کر ضروریات کا ایک عالم پیدا کر دیا جس کے مہیا کرنے، ضرورت سے زیادہ حاصل کرنے اور عمدہ بنانے میں اپنی مختصر زندگی کی تمام تر توجہ کو مصروف کر کے اصل جنت کی طلب سے ہاتھ دھو بیٹھا۔ یہیں سے شریعت کی تکلیف کی باربرداری ہوئی اور جائز اکل وشرب، جائز لباس ومسکن کے حصول کے طریقوں کی تعلیم اور ناجائز طریقوں

سے احتراز کا حکم ہوا، اسی سے شریعت کے اصول، معاملات اور اخلاق انسانی کی ذمہ داریاں پیدا ہوئیں - اور پھر اس لیے تاکہ اس حیات فانی میں پھنس کر حیات جاوداں کو نہ بھول ، عرفان الہٰی اور عبادت وطاعت الہٰی کی تلقین ہوئی جو جنت کی اصل غذا ہے - اسی نسبت سے قرآن نے وراثت کہا ہے یہ وراثت انسان کو اپنے اعمال خیر کے ذریعے ملے گی - چنانچہ اہل جنت کو جنت میں داخلہ کے وقت یہ بشارت ملے گی -

تلکم الجنة اورثتموھا بما کنتم تعملون

صحیح مسلم میں حضرت ابو سعید خدری کے حوالے سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی آیا ہے کہ:

جب اہل جنت جنت میں داخل ہو جائیں گے تو ایک منادی اعلان کرے گا - اے جنتیو! اب تم ہمیشہ زندہ رہو گے موت سے دوچار نہ ہو گے، ہمیشہ تندرست اور صحت مند رہو گے، کبھی بیمار نہ ہو گے، ہمیشہ جوان رہو گے کبھی بڑھاپا نہ آئے گا - ہمیشہ آرام وراحت میں رہو گے - بدمزہ اور تلخ کام نہ ہو گے - اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی - ونودوا ان تلکم الجنة الخ

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْجَنَّةِ اَصْحٰبَ النَّارِ اَنْ قَدْ وَجَدْنَا مَا
وَعَدَنَا رَبُّنَا حَقًّا فَهَلْ وَجَدْتُّمْ مَّا وَعَدَ رَبُّكُمْ حَقًّا ۚ قَالُوْا
نَعَمْ ۚ فَاَذَّنَ مُؤَذِّنٌۢ بَيْنَهُمْ اَنْ لَّعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۴﴾
الَّذِيْنَ يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ۚ وَ
هُمْ بِالْاٰخِرَةِ كٰفِرُوْنَ ﴿۴۵﴾ وَبَيْنَهُمَا حِجَابٌ ۚ وَعَلَى الْاَعْرَافِ
رِجَالٌ يَّعْرِفُوْنَ كُلًّاۢ بِسِيْمٰىهُمْ ۚ وَنَادَوْا اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ سَلٰمٌ
عَلَيْكُمْ ۫ لَمْ يَدْخُلُوْهَا وَهُمْ يَطْمَعُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَاِذَا صُرِفَتْ
اَبْصَارُهُمْ تِلْقَآءَ اَصْحٰبِ النَّارِ ۙ قَالُوْا رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا مَعَ
الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۴۷﴾

ع ۵ ۸ ۱۲

اور جنت والے دوزخ والوں کو پکاریں گے، ہم نے ان سارے وعدوں
کو ٹھیک پالیا جو ہمارے رب نے ہم سے کیے تھے، کیا تم نے بھی
ان وعدوں کو ٹھیک پایا جو تمہارے رب نے کیے تھے؟ وہ جواب

دیں گے ہاں۵۵۔ تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکار کر کہے گا ان ظلم پیشہ لوگوں پر خدا کی لعنت ہو جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے، اور اس میں کجی تلاش کرتے تھے اور آخرت کی زندگی کو نہ مانتے تھے۵۶۔ اور ان دونوں کے درمیان ایک اوٹ ہوگی۵۷۔ اور اعراف پر کچھ اور لوگ ہوں گے یہ ہر ایک کو اس کی نشانی سے پہچان لیں گے اور جنتیوں سے سے پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو یہ لوگ جنت میں داخل تو نہ ہوتے ہوں گے مگر اس کے اُمیدوار ہوں گے۵۸۔ اور جب ان کی نگاہیں دوزخیوں کی طرف پھریں گی تو بول پڑیں گے اے ہمارے پروردگار ہمیں ظلم پیشہ لوگوں میں شامل نہ فرما۵۹۔

معانی مفردات

یصدّون، رکتے ہیں یا روکتے ہیں ۔ یہ لازم اور متعدی دونوں آتا ہے ۔ راغب لکھتے ہیں کہ صدود اور صد کے معنے پھرنے اور رکنے کے ہوتے ہیں جیسے یصدون عنک صدودا اور کبھی روکنے اور منع کرنے کے معنے میں آتا ہے جیسے فصدھم عن السبیل شیطان نے ان کو راہ ہدایت سے روک دیا ہے یہاں اس کا استعمال دوسرے معنے میں ہوا ہے ۔ یبغون، تلاش کرتے ہیں ۔ بغی سے بنا ہے،

اسی سے ابتغاء آتا ہے۔ عوج، کجی اور ٹیڑھا پن، یہ عاج یعوج سے ہے جس کا استعمال ٹیڑھا اور کج ہونے کے لیے آتے ہیں۔ یہ اسم ہے۔ ابوزید نے جو لغت کے امام ہیں تصریح کی ہے کہ جو کجی آنکھوں سے نظر آئے اس کے لیے عَوج بالفتح آتا ہے اور جو آنکھ سے نہیں بلکہ عقل و شعور سے سمجھ میں آئے اس کے لیے عِوج، بکسر العین آتا ہے۔ حجاب، پردہ اوٹ، ملنے سے روکنا، مصدر ہے۔ حُجب جمع ہے۔ آیت میں حجاب سے ایسا پردہ مراد نہیں جو دیکھنے سے روک دے بلکہ وہ آڑ مراد ہے جو جنت کی لذت و نعمت کو دوزخیوں تک پہنچنے سے مانع ہو۔ اور آیت دحی میں حجاب سے وہ پردہ مراد ہے جو دیکھنے سے مانع ہو۔ سیماھم، ان کی نشانی، سیما کے معنے چہرہ، نشانی اور علامت کے ہیں۔ یہ اصل میں وسمی ہے واو کو فا کلمہ کی بجائے عین کلمہ کی جگہ پر رکھا گیا جس طرح ما الطیبہ کو الیطبہ بولتے ہیں تو سومیٰ ہوا پھر داو کے ساکن اور ماقبل مکسور ہونے کی وجہ سے داو کو یا کر دیا گیا سیما ہو گیا۔ اعراف، عرف کی جمع ہے عرف گھوڑے کی پیشانی کی چوٹی اور مرغ کی کلغی کو کہتے ہیں۔ یہیں سے یہ لفظ کسی مینار یا برجی کے لیے استعمال ہوا جو کسی اونچی دیوار یا پہاڑی پر بنا دیا جاتے جہاں سے تمام اطراف و جوانب کا بیک نظر مشاہدہ ہو سکے۔ قرآن کے اسلوب سے معلوم ہوتا ہے کہ جنت و دوزخ کے درمیان جو دیوار کھڑی ہو گی یہ اعراف یعنی مینارے اور برجیاں اسی دیوار پر ہوں گے۔

اہلِ جنت، اہلِ دوزخ

ان آیات میں وہ سوال و جواب مذکور ہے جو جنتیوں اور دوزخیوں کے مابین ہو گا۔ پچھلی آیات میں جنت و دوزخ کا چہرہ پیش کیا تھا اب جنتیوں اور دوزخیوں کی گفتگو پیش ہو رہی ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ آخرت میں جنت و دوزخ کی تقسیم تو ایمان و کفر پر رکھی ہے مگر ان میں مراتب کی تقسیم اعمال کے واسطے سے کی ہے۔ اللہ سبحانہٗ جس کو مراتب علیا پر فائز کرنا چاہتے ہیں اس کو یوں ہی فائز نہیں کر دیتے بلکہ اس کے اعمالِ حسنہ کی رفتار تیز کر دیتے ہیں اور جس کو جنت سے محروم کرنے کا ارادہ فرماتے ہیں اس کو بھی دفعتہً محروم نہیں کرتے بلکہ اس سے نیکی کی توفیق سلب کر لیتے ہیں۔ یہ ہر دو راستے بتدریج طے ہوتے رہتے ہیں۔ بندہ راہِ ترقی پر گامزن ہو یا تنزل کی راہ پر جاتے دونوں جگہ اس کی حرکت تدریجی رہتی ہے اس لیے وہ اپنی منزلِ سفر کی یومیہ ترقی یا تنزل کا احساس نہیں کرتا۔ ایک نیک شخص کو یہ محسوس نہیں ہوتا کہ وہ کل کہاں پڑا ہوا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد کہاں جا پہنچا۔ نہ ایک

بد اطوار کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ کل تک وہ کس جگہ تھا اور آج کہاں ہے۔ ہوشمند وہ ہے جو ہر آن اپنی رفتار اور منازل سفر کو بغور دیکھتا ہے۔ گناہوں کی نوعیت سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ بعض قسم کے گناہوں سے سوء خاتمہ کا اندیشہ ہوتا ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے۔ جنت و دوزخ ایک دوسرے سے ملے ہوتے ہیں۔ صرف درمیان میں ایک دیوار ہے جس نے ایک کو دوسرے سے الگ کر دیا ہے۔ ایک قدم ادھر گئے تو دوزخ ہے آگے بڑھ گئے تو جنت ہے۔ چنانچہ سورہ حدید میں ہے کہ جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ایک دیوار ہے جس میں دروازہ ہے اندر جاؤ تو رحمت ہے باہر رہو تو عذاب ہے۔ اسی دیوار کو یہاں اعراف کہا ہے۔ اعراف کا اطلاق ہر ایسی چیز پر ہوتا ہے جو زمین سے بلند ہو۔

۵۵- اور جنت والے دوزخ والوں کو پکاریں گے کہ ہم نے ان سارے وعدوں کو ٹھیک پالیا جو ہم سے ہمارے رب نے کیے تھے تم نے بھی ان وعدوں کو ٹھیک پالیا ہے جو تم سے تمہارے رب نے کیے تھے وہ جواب دیں گے کہ ہاں۔ ان آیات میں ان مخاطبات و مکالمات کا ذکر ہے جو جنتیوں اور دوزخیوں یا ان دونوں اور اصحاب اعراف میں ہوں گے۔ پہلی اور آخری گفتگو جو اصحاب الجنۃ اور اصحاب النار میں ادھر سے یا ادھر سے ہوگی صاف ظاہر کرتی ہے کہ یہ مخاطبات جنت اور دوزخ میں داخل ہونے کے بعد کے ہیں اس لیے نظم کلام کا تقاضا یہ ہے کہ اصحاب اعراف کی آنے والی درمیانی گفتگو کو بھی اس کے بعد ہی مانا جاتے۔ بہر حال جنتی جنت میں پہنچ کر اپنے حال پر اظہار مسرت اور دوزخیوں کی تقریع و تبکیت کے لیے کہیں گے کہ جو کچھ وعدے حق تعالیٰ نے پیغمبروں کی زبانی ہم سے فرمائے تھے کہ ایمان لانے والوں کو نعیم دائم ملے گی ہم تو انہیں سچا پا رہے ہیں۔ اے اہل جہنم تم بولو کہ تمہارے کفر و عصیان پر جو دھمکیاں دی گئی تھیں تم نے بھی ان کو سچا پایا۔ ظاہر ہے جواب میں بجز نعم ہاں کے اور کیا کہہ سکتے ہیں [1]

جنت میں زندگی کی جو کیفیت ہوگی یہ آیت اس کا ایک اجمالی خاکہ پیش کرتی ہے۔ اس دنیا میں ہر کھانے پینے کے ساتھ بول و براز، پسینہ اور سوء ہضم کی علت لگی ہوتی ہے اور اس کے بغیر یہاں انسان زندہ نہیں رہ سکتا مگر وہاں یہ کچھ نہ ہوگا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اہل جنت کھائیں گے اور پئیں گے لیکن نہ تھوکیں گے نہ وہاں بول و براز کی حاجت ہوگی نہ وہاں ناک سے رطوبت نکلے گی نہ بلغم اور کھنگار جیسی کوئی چیز ہوگی۔ کھانا ایک ڈکار میں ہضم ہوگا وہاں کے پسینہ میں مشک کی خوشبو ہوگی جو بہشت میں داخل ہوگا اس کو وہ نعمت ملے گی کہ پھر کبھی تکلیف نہ ہوگی نہ ان کے کپڑے بوسیدہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوں گے اور نہ ان کی جوانی زائل ہوگی۔ غور کرو وہ جسمانی زندگی ہماری موجودہ زندگی سے کتنی مختلف ہوگی اس دنیا میں تو ہمارے سمع و بصر اور ادراک و ابلاغ کی قوتیں نہایت محدود ہیں لیکن عالم آخرت میں ہر چیز لامحدود ہوگی۔ جنت کے عالم سے جب چاہیں گے اہل جنت دوزخ والوں کو مخاطب کر کے سوال و جواب کریں گے۔ اس پر تعجب نہ کرنا چاہیے۔ انسان کبھی شکم مادر میں ایک بچہ کی صورت میں زندہ تھا مگر وہاں اس کی زندگی، اس کی غذا، اس کی سانس، اس کی سمع و بصر اور دوسری لوازم حیات بیرون شکم کے دنیاوی اصول حیات و قوانین زندگی سے بالکل مختلف تھے اور جس طرح شکم مادر میں بچہ کا اس بیرونی زندگی کی حکایات کو تعجب کے ساتھ سن کر آمادہ انکار ہونا دانشمندی نہ ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح اس مادی زندگی کے خوگر اس دوسری زندگی کے سمع و بصر اور لوازم حیات کو سن کر آمادہ انکار ہوں تو ان کا یہ فعل بھی دانشمندی کے خلاف ہوگا۔

اور بقول سید رشید رضا اس سائنسی دور میں یہ بات ذرا بھی حیرت افزا نہیں ہونی چاہیے کہ عالم جنت کے رہنے والے عالم دوزخ کے مکینوں سے باتیں کریں گے جب کہ ہم نے ٹیلویژن بنا لیے ہیں جن پر ایک ملک کے لوگ کسی دور دراز ملک کے کسی خطیب کو اپنے ملک کے کسی مجمع کے سامنے تقریر کرتے تالیاں بجاتے اور نعرے لگاتے دیکھ اور سن سکتے ہیں۔ آخر عالم آخرت کی باتوں پر حیران کیوں ہو جہاں یہ سارے نوامیس طبعی بدل جائیں گے اور اس زمین و آسمان کی جگہ نئے آسمان و زمین پیدا ہوں گے۔

ایک منادی کی پکار

۵۶۔ تب ایک پکارنے والا ان کے درمیان پکار کر کہے گا ان ظالم بیشہ لوگوں پر خدا کی لعنت ہو جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے اور اس میں کجی تلاش کرتے تھے اور آخرت کی زندگی کو نہ مانتے تھے۔ اس وقت خدا کا ایک منادی دونوں کے درمیان کھڑے ہو کر پکارے گا۔ یوں تو گنہگار بہت ہیں مگر خدا کی بڑی پھٹکار ان ظالموں پر ہے جو خود گمراہ ہوتے اور آخرت کے انجام سے بالکل بے فکر ہو کر دوسروں کو بھی راہ حق سے ہٹاتے رہے اور اپنی کج بحثیوں سے رات دن اسی فکر میں تھے کہ صاف اور سیدھے راستہ کو ٹیڑھا ثابت کریں[1]

یہ پکارنے والا کون ہوگا؟ اس کی تنکیر بتاتی ہے کہ کوئی ہوگا اس کا معلوم کرنا مقصود نہیں۔ ظاہر ہے کہ کوئی فرشتہ ہی ہوگا۔ جیسا کہ عبداللہ بن عباس سے مروی ہے۔ قرطبی، نسفی اور آلوسی کا بھی خیال ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ منادی کہے گا کہ ظلم پیشہ لوگوں پر خدا کی لعنت ہو۔ یہ ظلم پیشہ لوگ کون ہیں قرآن نے خود ہی ان کا یہ چہرہ پیش کیا ہے۔ جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے اور جو اللہ کے راستہ میں کجی تلاش کرتے تھے اللہ کے راستہ سے روکنا یہ ہے کہ لوگوں کو اس پر چلنے سے منع کرتے تھے۔ اس روکنے کی کوئی خاص ایک شکل نہیں ہے بلکہ احوال وظروف کے اختلاف اور زمان ومکان کی تبدیلی سے اس کی صورتیں مختلف رہی ہیں اور مختلف رہیں گی۔ قرآن کا بغور مطالعہ کرو کہ اللہ کے راستے سے لوگوں کو روکنے کی ایک صورت وہ تھی جو نمرود نے ابراہیم کے مقابلہ میں اختیار کی، ایک وہ تھی جو فرعون نے حضرت موسیٰ کے مقابلے میں اپنائی، ایک وہ تھی جو قوم شعیب کے سرمایہ داروں نے حضرت شعیب کے مقابلہ میں اختیار کی۔

اللہ کے راستہ میں کجی تلاش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں قسم قسم کے شکوک وشبہات پیدا کرنا، طرح طرح سے رخنے ڈالنا، اس کی بھی متعدد صورتیں ہیں مثلاً توحید میں شرک کی آمیزش کرکے اسے اسلام بتانا۔ السید رشید رضا نے المنار میں اس پر عمدہ بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ ایک ظلم مشرکانہ عمل ہے دوسرا ظلم مبتدعانہ زندگی ہے، تیسرا ظلم زندقہ اور نفاق کے ذریعے اسلام کے جادۂ مستقیم پر شکوک وشبہات کی یورش ہے، چوتھا ظلم احکام میں غیر اسلامی قوانین کی اسلامی قوانین کے مقابلے میں ترجیح ہے۔

جنت اور دوزخ کے درمیان دیوار

۵۷۔ اور ان دونوں کے درمیان ایک اوٹ ہوگی۔ حجاب کے معنے پردہ اور آڑ کے ہیں۔ یہاں پردے کی دیوار مراد ہے جس کی تصریح سورہ حدید میں ہے فضرب بینھم بسور لہ باب یہ دیوار جنت کی لذتوں کو دوزخ تک اور دوزخ کی کلفتوں کو جنت تک پہنچنے سے مانع ہوگی۔ اس کی تفصیلی کیفیت کا ہمیں علم نہیں ہے[1]

ایک ایسی دیوار کے طول وعرض کا اندازہ کون کرسکتا ہے جو پورے عالم جنت اور سارے عالم دوزخ کے درمیان حدِ فاصل کا کام دے گا جبکہ صرف جنت کی وسعتوں کی تمثیل قرآن نے آسمانوں اور زمین کی وسعتوں سے دی ہے۔ دونوں کے درمیان سے مراد جنت اور دوزخ بھی ہوسکتا ہے اور جنتی اور دوزخیوں کی دونوں جماعتیں بھی ہوسکتی ہیں۔ اور ہماری رائے میں یہی درست ہے، یہ بھی کہا جا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سکتا ہے کہ جنت اور دوزخ کے درمیان ایک دیوار ہے اور یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ جنتیوں اور دوزخیوں کے درمیان ایک دیوار ہے۔ یعنی یہ دونوں عالم الگ الگ ہیں۔ ایک دیوار نے ان کو جدا کر دیا ہے۔ یہ تو عالم آخرت کی بات ہے اگر حقیقت کے رمز شناس ہو تو پالو گے کہ زندگی کے ہر گوشہ میں جنت و دوزخ کی تقسیم کا یہی حال ہے۔ دونوں کی سرحدیں اس طرح ملی ہوئی ہیں کہ ایک قدم پیچھے رہ گئے اور جنت کی جگہ دوزخ میں پڑ گئے، بسا اوقات ایک قدم کی تیزی یا کوتاہی جنت سے دوزخ میں یا دوزخ سے جنت میں پہنچا دیتی ہے۔

یک لمحہ غافل بودم و صد سالہ راہم دور شد[1]

اصحاب اعراف اور ان کا مقام

۵۸ - اور اعراف پر کچھ لوگ ہوں گے وہ ہر ایک کو اس کی نشانی سے پہچان لیں گے اور جنتیوں سے پکار کر کہیں گے کہ تم پر سلامتی ہو یہ لوگ جنت میں داخل ہوتے نہ ہوں گے مگر اس کے اُمیدوار ہوں گے۔ اسی درمیانی بلندی پر جو مقام ہوگا اس کو اعراف کہتے ہیں۔ اصحاب اعراف کون لوگ ہیں؟ قرطبی نے اس میں بارہ قول نقل کیے ہیں۔ ہمارے نزدیک ان میں راجح وہ ہی قول ہے جو حضرت حذیفہ، ابن عباس، ابن مسعود رضی اللہ عنہم جیسے اکابر جلیل القدر صحابہ اور اکثر سلف و خلف سے منقول ہے۔ یعنی وزن اعمال کے بعد جن کے حسنات بھاری ہوں گی وہ جنتی ہیں اور جن کے سیئات غالب ہوئے وہ دوزخی۔ اور جن کے حسنات و سیئات بالکل مساوی ہوں گے وہ اصحاب اعراف ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ انجام کار اصحاب اعراف جنت میں چلے جائیں گے۔ اور یہ ویسے بھی ظاہر ہے کہ جب عصاۃ مومنین جن کے سیئات غالب تھے جہنم سے نکل کر بالآخر جنت میں داخل ہوں گے تو اصحاب اعراف جن کے حسنات و سیئات برابر ہیں وہ ان سے پہلے داخل ہونے چاہئیں۔ گویا اصحاب اعراف کو اصحاب الیمین کی ایک کمزور سی قسم سمجھنی چاہیے۔ جس طرح سابقین مقربین فی الحقیقۃ اصحاب یمین کی ایک ایسی قسم ہے جو اپنی اولوالعزمیوں کی بدولت عام اصحاب یمین سے آگے نکل گئے ہیں۔ اس کے بالمقابل اصحاب اعراف کی گری ہوئی قسم ہے جو اپنے اعمال کی کثافت کی وجہ سے عام اصحاب یمین سے کچھ پیچھے رہ گئے ہیں یہ لوگ اہل جہنم اور اہل جنت کے درمیان میں ہونے کی وجہ سے دونوں طبقوں کے لوگوں کو ان کی

---

[1] ترجمان القرآن

مخصوص نشانیوں سے پہچانتے ہوں گے۔ جنتیوں کو ان کے سفید اور نورانی چہروں سے اور دوزخیوں کو ان کی روسیاہی اور بدرونقی سے۔ بہرحال جنت والوں کو دیکھ کر سلام کریں گے جو بطور مبارکباد ہوگا اور چونکہ خود ابھی جنت میں داخل نہیں ہوں گے اس کی طمع اور آرزو کریں گے جو آخر کار پوری کر دی جائے گی[1] اعراف والوں کے بارے میں عام رائے یہی ہے جو شیخ الاسلام نے پیش فرمائی ہے اور شارحین قرآن نے کثیر روایات کی وجہ سے اسی کو اپنایا ہے اور اس رائے کو اس درجہ مقبولیت حاصل ہوئی ہے کہ "از دوزخیاں پرس کہ اعراف بہشت است" کا مصرعہ ضرب المثل کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ یہاں اصحاب اعراف کا چہرہ رجال یعرفون الخ کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ قرآن یہ انداز بیان نمایاں اور ممتاز حضرات کا چہرہ بیان کرنے کے لیے اختیار کرتا ہے۔ ایسے مواقع پر تنکیر تحقیر کے لیے نہیں بلکہ تعظیم کے لیے ہوتی ہے مثلاً رجال لا تلهيهم تجارة ولا بيع عن ذكر الله ایسے حضرات جن کو کاروبار اور لین دین یادِ الٰہی سے غافل نہیں بناتا ہے اور رجال صدقوا ما عاهدوا الله عليه ایسے مردان کار جنہوں نے اللہ کے عہد کو سچا کر دکھایا۔ یہ انداز بیان کہہ رہا ہے کہ یہ عظیم شخصیتوں کا تعارف ہے۔ اور پھر ان کے اعزاز کی نشاندہی اس سے بھی ہو رہی ہے کہ جنت و دوزخ کے تمام مناظر کا مشاہدہ کرانے کے لیے ان کو اعراف پر لے جایا جائے گا۔ اعراف اونچی دیوار پر وہ برجیاں وہ منارے جہاں سے جنت والوں اور دوزخ والوں کا مشاہدہ ہو سکے اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ امام مجاہد کی وہ بات جسے حافظ ابن جریر نے ان کا نام لے کر پیش کیا ہے، قرآنی سیاق کے زیادہ مطابق ہے۔ امام مجاہد فرماتے ہیں کہ اصحاب اعراف سے مراد علماء و صلحاء ہیں۔ یعنی وہ لوگ جو دنیا میں حق و باطل کی کشمکش میں استبداد اور جبر و قہر کے سامنے حق کے علمبردار رہے۔ خیر کے داعی اور منکر سے روکنے والے بن کر رہے جنہوں نے حق کی حمایت میں اہل باطل کے مظالم برداشت کیے اور جو مظلوموں کی حمایت میں سینہ سپر ہو کر کھڑے ہوتے ایسے علماء و فقہاء محدثین اور صوفیا وہ رجال امت ہیں جو بلاشبہ قیامت کے روز اس اعزاز کے سزاوار ہیں کہ اللہ تعالیٰ ان کو اعراف کی بلندیوں سے جنتیوں اور دوزخیوں کا مشاہدہ کرائے تاکہ وہ حق و باطل دونوں کا انجام اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں۔ القاسمی نے بالکل صحیح لکھا ہے السياق يدل على سمو قدرهم قرآنی انداز بتا رہا ہے کہ یہ بلند ترین شخصیتوں کا چہرہ پیش ہو رہا ہے۔ شارحین قرآن ان کے بارے میں مختلف خیالات رکھتے ہیں قرطبی وغیرہ نے ان کی تفصیلات پیش کی ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہمارے خیال میں حجاب دوزخیوں اور جنتیوں کے درمیان ہوگا اور اعراف والے اعراف کی بلندیوں سے سب سے پہلے جنتیوں کو سلام کریں گے لم یدخلوها و هم یطمعون میں ضمائر کا مرجع رجال نہیں بلکہ اصحاب الجنہ ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جنتی ابھی موقف میں ہوں گے جنت میں نہ گئے ہوں گے۔ جنت میں داخل ہونے کے امیدوار ضرور ہوں گے۔ جنتیوں کو جنت میں بھیجنے سے پہلے اہلِ اعراف کو ان کا مشاہدہ کرایا جائے گا۔ اہلِ اعراف جنتیوں کو سلام علیکم کہہ کر ان کو سلامتی اور عذاب سے محفوظ ہونے کی بشارت دیں گے۔ اس میں بھی اشارہ ہے کہ اہلِ اعراف کا اہل جنت میں سب سے اونچا مقام ہوگا۔ یہ سارا اعزاز و اکرام صاف شہادت دے رہا ہے کہ اللہ کے یہاں ان کا مرتبہ و مقام کیا ہے ؟

اہل جنت کے بارے میں یہ بات کہ و هم یطمعون اس طرف اشارہ کر رہی ہے کہ اہل جنت میدانِ حشر میں خوف و رجا کے بین بین ہوں گے۔ حلیۃ الاولیاء میں ابو نعیم اصفہانی کی یہ روایت اگر تاریخی طور پر صحیح ہے کہ حضرت عمر فرماتے ہیں کہ روز قیامت اعلان یہ ہو کہ سب جنت میں جاؤ لیکن ایک شخص نہ جائے تو مجھے اندیشہ ہے کہ وہ ایک میں ہی ہوں گا اور اگر یہ آواز آئے کہ سب دوزخ میں چلے جاؤ مگر ایک نہ جائے تو مجھے اُمید ہے کہ وہ ایک میں ہی ہوں۔ تو اس کا منشا بھی اسی خوف و رجاء کا اظہار ہے جس کی طرف آیتِ قرآنی اشارہ کر رہی ہے۔ بہرحال اصحابِ اعراف کو جنتیوں کا مشاہدہ کرایا جائے گا۔ تو ان کو امن و سلامتی کی بشارت دیں گے۔

درمیان میں اہلِ اعراف کے چہرہ کا بیان کرتے ہوتے یہ بات جو فرمائی ہے کہ یعرفون کلا بسیما هم کہ وہ جنتیوں اور دوزخیوں کو ان کی علامات سے پہچانیں گے۔ قرآن و حدیث دونوں میں اس بات کے اشارات موجود ہیں کہ قیامت میں اہلِ ایمان اور اہل کفر دونوں اپنے اپنے علامات سے ممتاز ہوں گے۔ قرآن میں ہے :

وجوه یومئذ مسفرة ضاحكة مستبشرة و وجوه یومئذ علیها غبرة ترهقها قترة

کچھ چہرے اس روز چمک رہے ہوں گے ہنس مکھ خوش و خرم اور کچھ اس روز ایسے ہوں گے جن پر سیاہی ہوگی اور کدورت والے ہوں گے۔

صحیح مسلم میں حدیث ہے کہ لوگوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ آپ کی اُمت میں سے جو لوگ آپ کے بعد ہوں گے آپ ان کو کیسے پہچانیں گے۔ آپ نے فرمایا کہ اگر ایک شخص کے پنج کلیان گھوڑے دوسرے گھوڑوں میں ملے ہوتے ہوں تو کیا وہ ان کو نہ پہچان لے گا۔ لوگوں نے کہا یہ بات تو ٹھیک ہے یا رسول اللہ آپ نے فرمایا کہ اسی طرح میری اُمت کے لوگ قیامت کے دن اپنے وضو کے آثار سے

اس طرح نمایاں ہوں گے کہ ان کی پیشانیاں اور ان کے ہاتھ پاؤں چمکتے ہوں گے۔ غرض اہل جنت ہوں یا اہل دوزخ دونوں گروہ اپنے اپنے محل میں اپنی نمایاں نشانیوں اور علامات کے ذریعے ممتاز ہوں گے اور اعراف والے ان علامات کے ذریعے اہل جنت کے صدیقین، شہداء اور صالحین و ابرار کو بھی پہچان لیں گے اور دوزخ والوں کے لیڈروں اور اشرار و مفسدین کو بھی۔

اعراف والوں کا دوسرا نظارہ

۵۹ - اور جب ان کی نگاہیں دوزخیوں کی طرف پڑیں گی تو بول پڑیں گے اے ہمارے پروردگار ہمیں ظلم پیشہ لوگوں میں شامل نہ فرما۔ جنت و دوزخ کے درمیان ہونے کی وجہ سے ان لوگوں کی حالت خوف و رجا کے بیچ میں ہوگی۔ اِدھر دیکھیں گے تو امید کریں گے اور اُدھر نظر پڑے گی تو خدا سے ڈر کر پناہ مانگیں گے کہ ہم کو ان دوزخیوں کے زمرے میں شامل نہ کرنا[1] علامہ عثمانی نے لکھا ہے کہ یہ فرمایا کہ جب ان کی نگاہیں دوزخیوں کی طرف پھیری جائیں گی کیونکہ دوزخیوں کی طرف ان کا دیکھنا محبت کی بنا پر بلکہ عداوت کی بنا پر ہوگا یا اس لیے کہ وہ اہل جنت کی کامرانیوں کے مشاہدے میں بالکل محو ہو جائیں گے تو اہل دوزخ کی طرف ان کو توجہ دلائی جائے گی۔ ان پر نظر پڑتے ہی ان کی زبان سے بے تحاشا یہ دعا نکلے گی ربنا لا تجعلنا مع القوم الظالمین۔ علامہ ابوالسعود کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ دعا میں درخواست اس عذاب سے بچنے کی نہیں ہے جس میں وہ مبتلا ہیں بلکہ اس کردار سے بچنے کی ہے جو اس عذاب کا سبب بنا ہے۔ اسی بنا پر علامہ عثمانی نے لکھا ہے کہ یہ آیت واضح طور پر اس بات کی دلیل ہے کہ دنیا کی زندگی میں ظالموں سے بچ کر رہنا واجبات دین میں سے ہے تاکہ آخرت میں ان کی رفاقت نہ ہو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَنَادٰۤى اَصْحٰبُ الْاَعْرَافِ رِجَالًا يَّعْرِفُوْنَهُمْ بِسِيْمٰىهُمْ قَالُوْا
مَاۤ اَغْنٰى عَنْكُمْ جَمْعُكُمْ وَمَا كُنْتُمْ تَسْتَكْبِرُوْنَ ﴿۴۸﴾ اَهٰۤؤُلَاۤءِ
الَّذِيْنَ اَقْسَمْتُمْ لَا يَنَالُهُمُ اللّٰهُ بِرَحْمَةٍ ؕ اُدْخُلُوا الْجَنَّةَ لَا خَوْفٌ
عَلَيْكُمْ وَلَاۤ اَنْتُمْ تَحْزَنُوْنَ ﴿۴۹﴾

اور اعراف والے دوزخیوں میں سے کچھ شخصوں کو ان کی علامات سے پہچان کر پکاریں گے[۶۰]۔ اور کہیں گے کہ آج تمہاری جمعیت اور وہ سازو سامان کیا کام آتے جس پر تم بڑا بنتے تھے[۶۱]۔ بتاؤ کیا یہ جنت والے وہی لوگ نہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ ان کو خدا اپنی رحمت سے کچھ نہ دے گا[۶۲]۔ آج ان ہی سے کہا جا رہا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ تمہارے لیے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ تمہیں کوئی غم ہوگا[۶۳]۔

اعراف والوں کا دوزخیوں سے خطاب

اعراف والوں کا یہ خطاب ظاہر ہے صرف دوزخیوں سے نہیں بلکہ دوزخیوں کے لیڈروں سے ہوگا۔ دوزخ میں یہ لوگ اپنے نمایاں نشانوں سے ممتاز ہوں گے اس وجہ سے اہلِ اعراف پہچانے جائیں گے کہ یہ ابولہب ہے یہ ابوجہل ہے یہ فلاں اور یہ فلاں۔ ان کو مخاطب کرکے اہلِ اعراف ان سے سوال ان کی رسوائی کے لیے کریں گے ہر دور کے ائمہ کفر الگ ہوتے ہیں۔ ابوجہل، ابولہب، ولید بن مغیرہ اور العاص بن وائل قریش مکہ کے وہ ائمہ کفر ہیں جنہوں نے مکہ میں اسلام کے خلاف محاذ بنایا اور اہلِ ایمان ان کے جبر و استبداد کا نشانہ بنے۔ اہلِ اعراف ان کو دیکھ کر ان کو پہچانیں گے اور ان سے دریافت کریں گے کہ وہ تمہاری جمعیت اور وہ حکومت و دولت اور سرمایہ یہاں کس کام آیا جس کے برتے پر دنیا میں تمہارا دعویٰ تھا نحن اکثر اموالًا و اولادًا و ما نحن بمعذبین۔ اس کے بل بوتے پر ہی تم لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے تھے اور اسی کی خاطر راہِ خدا پر چلنے والوں کو مشکوک نگاہوں سے دیکھتے تھے دراصل تم فکرِ آخرت سے بے پرواہ ہوکر زندگی گزار رہے تھے اور دنیا کی محبت نے تمہیں اندھا بہرا بنا دیا تھا۔

۶۰۔ اور اعراف والے دوزخیوں میں سے کچھ اشخاص کو ان کی علامات سے پہچان کر پکاریں گے۔ یعنی علاوہ دوزخ میں معذب ہونے کے ان کے چہروں سے دوزخی ہونے کی علامات ہویدا ہوں گی، یا یہ مطلب ہے کہ وہ ایسے لوگ ہوں گے جن کو اصحابِ اعراف نے دنیا میں دیکھا ہوگا۔ اس لیے وہاں صورت دیکھ کر پہچان لیں گے[1] رجالًا کی تنکیر یہاں بھی عظمت ظاہر کر رہی ہے۔ یعنی اہلِ ضلالۃ و کفران کے عظماء اور کبراء کو مخاطب کرکے اعراف والے یہ سوال کریں گے اور ان کو صورتیں متغیر ہونے کے باوجود ان کی علامات سے پہچان کر ان سے دریافت کریں گے۔

ان علامات کے ذریعے خاص اشخاص کی ان کو معرفت ہوگی ورنہ دوزخیوں کے دوزخی ہونے کی معرفت تو ان کو پہلے ہو چکی ہے اور یہ معرفت میدانِ قیامت میں دوزخ میں داخل ہونے سے پہلے ہوگی۔ دوزخ میں داخل ہونے کے بعد تو محض تحصیل حاصل ہے۔ پہلے جس معرفت کا ذکر کیا ہے وہ عمومی تھی اور یہ معرفت خصوصی ہے یعنی خاص افراد کو پہچان کر کہیں گے۔ عام جنتیوں اور دوزخیوں کی تو میدانِ قیامت میں معرفت چہروں کی سپیدی اور سیاہی کے ذریعے ہوگی لیکن ان خاص افراد کی معرفت کے لیے کیا علامات

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہوں گی۔ قرآن میں ابولہب کی بیوی کے متعلق تصریح ہے کہ قیامت کے دن اس کے گلے میں اسی طرح کی ایک رسی پڑی ہو گی جس طرح کی رسی ایندھن جمع کرنے والی لونڈیاں اپنے گلے میں ڈال کر لکڑیاں چننے کے لیے نکلا کرتی ہیں۔ اس نوع کے کچھ اشارات حدیث معراج میں بھی موجود ہیں۔ غرض اسی قسم کی علامات وہاں خاص افراد میں موجود ہوں گی جن کی مدد سے وہ ان لیڈروں اور کفر کے ان زعماء کو پہچان لیں گے جن کی طاغوتی قوتوں اور کافرانہ نظام کا یہاں مقابلہ کرتے رہے۔ ان سے کیا پوچھیں گے؟ اسی سوال کا جواب آگے ہے۔

اہلِ اعراف کا ائمہ کفر و فساد سے سوال

۶۱ - وہ کہیں گے کہ آج تمہاری جمعیت اور وہ ساز و سامان کیا کام آیا ہے جس پر تم اکڑتے تھے اور بڑا بنتے تھے۔ یعنی اس مصیبت کے وقت تمہاری وہ جماعتیں اور جتھے کہاں گئے اور دنیا میں جو بڑھ بڑھ کر شیخیاں مارتے تھے وہ اب کیا ہو گئیں[1] ما اغنی میں ما نافیہ ہے یا ما استفہامیہ، کچھ شارحین قرآن نے اسے ما نافیہ قرار دے کر یہ معنے کیے اور تمہاری جماعت اور وہ چیز جس پر تم تکبر کرتے تھے تمہارے کچھ کام نہ آیا۔ اور کچھ شارحینِ قرآن نے اسے ما استفہامیہ بتایا ہے۔ ہمارے نزدیک یہی سیاق قرآن کے زیادہ مناسب ہے اس میں زور بھی زیادہ اور قرآن کے نظائر سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں مطلب یہ ہے کہ تمہاری جماعت، خاندان اور حق کے خلاف جرأت اور بے باکی تمہارے کس کام آیا ہے ماکنتم تستکبرون میں ما مصدریہ ہے یعنی تمہاری اللہ کی راہ میں رکاوٹ ڈالنے کے لیے جمگھٹا اور سنگیں اور دعوت نبوت کے مقابلے میں تمہارا استکبار کیا کام آیا ہے۔ یہ سوال خود بتا رہا ہے کہ یہ دوزخیوں کے دوزخ میں جانے سے پہلے ہو رہا ہے۔ اور یہ بات ان سے ان کی رسوائی کے لیے پوچھی جا رہی ہے۔ بلاشبہ ہر دور کے ائمہ کفر کا اپنے مال و اسباب اور اپنی تعداد و جمعیت پر غرہ رہا ہے۔ یہ بات قرآن میں تفصیل سے مذکور ہے بلکہ قرآن نے ایک مقام پر اسے بطورِ ایک کلیہ پیش کیا ہے اور ایک سے زیادہ مقامات پر یہ بتایا ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا مقابلہ سب سے پہلے اور سب سے آگے بڑھ کر ان خوشحال طبقوں نے کیا ہے جو دولت و حشمت اور نفوذ و اقتدار کے مالک تھے۔ مثال کے طور پر حسب ذیل مقامات ملاحظہ ہوں الانعام ۱۲۳، الاعراف ۶۰، ۶۶، ۷۵، ۸۸، ۹۰ - ہود ۲۷ - بنی اسرائیل ۱۶، مومنون ۲۴، ۳۳ تا ۳۸، ۴۶، ۴۷، الزخرف ۲۳ -

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کمزور مسلمانوں کی طرف اشارہ کر کے سوال

۶۲- بتاؤ کیا یہ جنت والے وہی لوگ نہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ ان کو خدا اپنی رحمت سے کچھ نہ دے گا۔ یہ اہلِ جنت کی طرف اشارہ کر کے دوزخیوں سے کہیں گے کہ وہ ٹوٹے پھوٹے مساکین اور ضعیف الحال جن کو تم حقیر سمجھ کر کہا کرتے تھے کہ کیا خدا کی مہربانی سب کو چھوڑ کر ان جنتیوں پر ہو سکتی ہے اھؤلاء من اللہ علیہم من بیننا [1] میدانِ حشر میں کھڑے ہوئے ان کمزور جنتی اہلِ ایمان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے جو دُنیا میں جبابرہ اور فراعنہ کا ایمان کی پاداش میں تختہ مشق بنے ہوئے تھے دوزخیوں کے لیڈروں اور فراعنہ سے سوال کریں گے بتاؤ کیا یہ وہ لوگ نہیں جن کے بارے میں تم قسمیں کھا کر کہتے تھے کہ یہ لوگ کبھی خدائی عنایات اور انعامات کے لائق نہیں ہو سکتے۔ قرآن نے یہ بات خاص طور پر نمایاں کر کے پیش کی ہے کہ مکہ کی آبادی میں سے بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ دینے کے لیے جو لوگ آگے بڑھے تھے وہ قوم کے بڑے اور متمول لوگ نہ تھے بلکہ چند باہمت نادار نوجوان ہی تھے۔ وہ ابتدائی مسلمان جو ان آیات کے نزول کے وقت ساری قوم کی شدید مخالفت کے مقابلے میں صداقتِ اسلام کی حمایت کر رہے تھے اور ظلم و ستم کے اس طوفان میں جن کے سینے اسلام کے لیے سپر بنے ہوئے تھے ان میں عزت و حشمت اور جاہ و اقتدار والا کوئی نہ تھا۔ سب کے سب عام شہری تھے اور سارے نوجوان تھے علی ابن ابی طالب، جعفر طیار، زبیر، طلحہ، سعد بن ابی وقاص، عمر، مصعب بن عمیر، عبداللہ بن مسعود، عبدالرحمن بن عوف، بلال اور صہیب، ابو عبیدہ بن الجراح، ابوبکر الصدیق، زید بن حارثہ، عثمان بن عفان، جیسے حضرات تھے۔ وہ ان کو دیکھ کر کہتے تھے کہ مال و دولت اور خدم و حشم ہم رکھتے ہیں اور دنیا ہماری سرداری مان رہی ہے۔ یہ لوگ مساکین و فقراء ہیں۔ بھلا ان مسکینوں پر خدا کی رحمت کیسے ہو سکتی ہے۔ سادات قریش اسلام کے خلاف یہ ایک بڑی دلیل بنا کر لاتے تھے کہ اگر اسلام میں کوئی خیر کا پہلو ہوتا تو کیا اسلام کے پیرو بھی فقراء و مساکین ہوتے۔ خدا کی ساری نعمتوں کے حقدار تو ہم بنائے گئے پھر اسلام کے لیے ان مساکین کا انتخاب کیوں ہوا۔ اعراف والے ان کے اسی غرور پر ضرب کاری لگائیں گے اور کہیں گے بتاؤ جن کو تم کسی فضل و رحمت کا مستحق نہیں سمجھتے تھے وہ کہاں ہیں اور تم کہاں ہو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جنت میں داخلہ کا پروانہ

۶۳ - آج ان ہی سے کہا جا رہا ہے کہ جنت میں داخل ہو جاؤ تمہارے لیے نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ تمہیں کوئی غم ہوگا - یعنی ان کو تو آج کہہ دیا گیا کہ ادخلوا الجنۃ، حالانکہ تم اس عذاب میں مبتلا ہوئے[1]
اس میں شارحین قرآن کا اختلاف ہے کہ یہ بات جنتیوں سے اہل اعراف کہیں گے یا حق تعالیٰ شانہٗ فرمائیں گے - شیخ الاسلام کے انداز بیان سے معلوم ہو رہا ہے کہ یہ بات اہل اعراف کہیں گے - پہلا سوال تو اہل اعراف نے ائمہ کفر کو مخاطب کر کے کہا تھا - اھؤلاء الذین اقسمتم الخ اور یہ بات وہ اہل جنت کو مخاطب کر کے ان سے بطور تہنیت اور مبارکباد کہیں گے - اہل اعراف کا یہ کہنا بھی اس کی دلیل ہے کہ یہ ساری گفتگو موقف میں ہوگی جب کہ ابھی جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں نہ گئے ہوں گے - جن لوگوں نے اس کا تعلق جنتیوں کے جنت میں داخل ہونے کے بعد سے بتایا ہے ان کو یہاں تاویل کرنی پڑی ہے کہ عربی زبان میں فعل ہر جگہ اپنے ابتدائی معنے ہی پر دلیل نہیں ہوتا بلکہ بعض مواقع پر دوام و استمرار پر دلالت کرتا ہے - ہمارے نزدیک یہ تاویل بیکار ہے - یہاں اصحاب اعراف جنتیوں سے موقف میں کہہ رہے ہیں کہ مال و جاہ کے متوالے تو تمہیں حقیر و ذلیل سمجھتے رہے ہیں لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے علی الرغم تمہیں جنت کی سرفرازی بخشی ہے - اب تم اس میں داخل ہو جاؤ - اب نہ تمہارے لیے کوئی خوف ہے اور نہ کوئی غم - اور یہ اس بات کی طرف بھی اشارہ ہے کہ اہل اعراف موقف اور میدان حشر میں بلند ترین شخصیتیں ہیں جن کی سب پر برتری ظاہر کی جا رہی ہے - یہ نہ فرشتے ہیں نہ انبیاء اور نہ وہ ہیں جن کے گناہ اور نیکیاں برابر ہیں بلکہ یہ تو وہ مردان کار ہیں جنہوں نے دین کی سربلندی کے لیے قربانیاں دی ہیں - محض اعلاء کلمۃ اللہ اور دین کی سرسبزی کے لیے اپنے گھر اپنے مشاغل اپنے بیوی بچوں کو چھوڑ کر نکلے - راہ خدا میں مشقتیں اور محنتیں اٹھائیں - چین و آرام قربان کیا - کسی صاحب دل نے جنت کی یہ تعریف خوب کی ہے :

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد

دنیا میں کوئی بڑی سے بڑی مسرور زندگی بھی ایسی نہیں مل سکتی جس کے پہلو میں مسرت کے پھول کے ساتھ غم کا کوئی کانٹا نہ چبھ رہا ہو یا تو موجودہ مسرت کے آئندہ ختم ہو جانے کا خوف ہے اور یا گزشتہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ناکامی کا افسوس ہے۔ اس بنا پر یہاں کوئی خوشی بھی کامل نہیں مگر جنت وہ مقام ہوگا جہاں نہ ماضی و حال کا غم ہوگا اور نہ مستقبل کا خوف ہوگا لا خوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ کے ذریعے بار بار اسی کا اظہار ہو رہا ہے اور یہی بہشت کی سب سے بڑی نعمت ہوگی۔ اس میں جسمانی اور روحانی ہر قسم کی نعمتیں داخل ہیں۔

دُنیا میں کوئی انسان اس وقت تک گلے سے لقمہ نہیں اتار سکتا اور نہ کوئی چیتھڑا بدن پر رکھ سکتا ہے جب تک کہ اس کے سر کا پسینہ پاؤں تک نہ آئے۔ دُنیا کی تمام فانی مسرتیں ہماری فانی کوششوں کا نتیجہ ہیں مگر جنت کی خوشیاں بے غم و تکلیف ہماری گزشتہ فانی نیکیوں کا غیر فانی نتیجہ ہیں اور یہ محض اللہ کا فضل و کرم ہے کہ وہاں ہم کو ہماری آسائش کا تمام سامان اس قسم کی ادنیٰ زحمت و مشقت اٹھائے بغیر میسر آئے گا جس کے بغیر دُنیا میں کوئی انسان زندہ نہیں رہ سکتا اور جس کی کشمکش سے یہ دُنیا ہر انسان کے لیے دوزخ بنی ہے۔

وَنَادٰٓى اَصْحٰبُ النَّارِ اَصْحٰبَ الْجَنَّةِ اَنْ اَفِيْضُوْا عَلَيْنَا مِنَ
الْمَآءِ اَوْ مِمَّا رَزَقَكُمُ اللّٰهُ ۭ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ حَرَّمَهُمَا عَلَى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٥٠﴾
الَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا دِيْنَهُمْ لَهْوًا وَّ لَعِبًا وَّغَرَّتْهُمُ الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا ۚ
فَالْيَوْمَ نَنْسٰىهُمْ كَمَا نَسُوْا لِقَآءَ يَوْمِهِمْ هٰذَا ۙ وَمَا كَانُوْا بِاٰيٰتِنَا
يَجْحَدُوْنَ ﴿٥١﴾ وَلَقَدْ جِئْنٰهُمْ بِكِتٰبٍ فَصَّلْنٰهُ عَلٰى عِلْمٍ هُدًى
وَّرَحْمَةً لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ﴿٥٢﴾ هَلْ يَنْظُرُوْنَ اِلَّا تَاْوِيْلَهٗ ۭ
يَوْمَ يَاْتِيْ تَاْوِيْلُهٗ يَقُوْلُ الَّذِيْنَ نَسُوْهُ مِنْ قَبْلُ قَدْ جَاۗءَتْ
رُسُلُ رَبِّنَا بِالْحَقِّ ۚ فَهَلْ لَّنَا مِنْ شُفَعَاۗءَ فَيَشْفَعُوْا لَنَآ اَوْ نُرَدُّ
فَنَعْمَلَ غَيْرَ الَّذِيْ كُنَّا نَعْمَلُ ۭ قَدْ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ
عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿٥٣﴾ ع

ع ٦

اور دوزخی جنتیوں کو پکار کر کہیں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہمیں بھی دو
یا جو نعمتیں اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں ان میں سے کچھ دو[٦٤]۔ اہل جنت

جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں ان کافروں پر حرام کردی ہیں
جنہوں نے دُنیا کی زندگی میں اپنے دین کو تماشا اور کھیل بنا لیا تھا اور جن
کو دُنیاوی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا[۶۵]۔ لہٰذا آج ہم بھی
ان کو اسی طرح بھول جائیں گے جیسے وہ اپنے اس دن کی ملاقات
کو بھولے ہوئے تھے اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے رہے[۶۶]۔
اور بلاشبہ ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لائے ہیں جس
میں ہم نے علمی تفصیلات فراہم کی ہیں اور یہ کتاب اہلِ ایمان کے
لیے ہدایت و رحمت ہے[۶۷]۔ کیا یہ لوگ اعمال کے نتیجے آنکھوں سے
دیکھنا چاہتے ہیں جس روز نتائج ظاہر ہوں گے اس دن وہ لوگ
جو اسے پہلے سے طاق نسیان بنائے بیٹھے تھے کہیں گے بلاشبہ
ہمارے رب کے پیغمبر ہمارے پاس سچائی کا پیام لے کر آئے تھے[۶۸]۔
کاش ہمیں کچھ سفارشی ملیں کہ ہماری شفاعت کرسکیں یا کاش

پھر دُنیا میں لوٹ جائیں کہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کی جگہ اب دوسرے طریقے پر عمل کرلیں[۶۹]۔ بلاشبہ ان لوگوں نے اپنی تباہی کا سامان کیا اور ان کی افترا پردازیوں کا نام ونشان نہ رہا[۷۰]۔

معانی مفردات

حرّمَ، حرام کیا تحریم سے ماضی کا واحد مذکر غائب، جس چیز سے روک دیا جاتے وہ حرام ہے۔ خواہ یہ تسخیرِ الٰہی ممنوع ہو یا بذریعہ منع قہری یا عقل کی رو سے یا قانون کی طرف سے۔ اس آیت میں منع قہری سے حرمت ہے یعنی کافروں کو بزورِ قوت ان نعمتوں سے محروم کردیا۔ دینؔ، جزاء، طاعت، شریعت، بدلہ دینا، اطاعت کرنا، حکم ماننا، دین بمعنے ملت بھی آتا ہے مگر اس کا استعمال اطاعت اور شریعت کی پابندی کے معنے میں ہوتا ہے دان یدین کا مصدر ہے، جمع ادیان ہے۔ لھو و لعب، لہو اسم مصدر، سنجیدگی چھوڑکر مزاح کی طرف میلان اور جھکاؤ لہو کہلاتا ہے اور کسی ایسے غیر مفید کام میں مشغول ہونا جس کے باعث مفید کام ترک ہوجائے لعب ہے۔ (ابوالسعود) امام راغب نے اس کا عکس بتایا ہے۔ یجحدونؔ، جحود سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے وہ انکار کرتے ہیں۔ جحود کے اصلی معنے دل میں جس چیز کا ثبات ہو اس کا انکار اور جس کا انکار ہو اس کا اثبات کرنے کے ہیں۔ تاویلؔ، تعبیر بنانا، کل بٹھانا، بیان حقیقت، ٹھیک پڑنا، بروزن تفعیل مصدر ہے۔ اول سے بنا ہے جس کے معنے اصل کی طرف لوٹنے کے ہیں۔ اسی لیے مرجع اور بازگشت کو موئل کہتے ہیں کسی چیز کو خواہ وہ شی علم ہو یا فعل اس کی اصل کی طرف لوٹانے کا نام "تاویل" ہے علم کی مثال "وما یعلم تاویلہ الا اللہ" اور فعل کی مثال خود یہ آیت ہے جس کی یہاں تشریح پڑھ رہے ہو۔ شفعاءؔ، سفارشی، سفارش کرنے والے۔ شفیع کی جمع ہے۔ سارے قرآن میں اسی طرح لکھا گیا ہے مگر سورہ روم میں اس طرح مرقوم ہے۔ شفعٰوا، یعنی واو کے ساتھ لیکن واو پڑھنے میں نہیں آتا۔

اہلِ جنت اور اہلِ دوزخ کی گفتگو

جنت والوں اور دوزخ والوں کی اس گفتگو سے کسی حد تک اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ عالمِ آخرت میں انسانوں کی قوتوں کا پیمانہ کس قدر وسیع ہو جائے گا وہاں آنکھوں کی بینائی اس قدر وسیع پیمانے پر ہو گی کہ جنت و دوزخ کے لوگ جب چاہیں گے ایک دوسرے کو دیکھ سکیں گے وہاں آواز اور سماعت بھی اتنے بڑے پیمانے پر ہو گی کہ ان مختلف دنیاوں کے لوگ ایک دوسرے سے بآسانی گفتگو کر سکیں گے۔ یہ اور ایسے ہی دوسرے بیانات جو آخرت کے متعلق ہمیں قرآنی مطالعہ میں ملتے ہیں، اس بات کا تصور دلانے کے لیے کافی ہیں کہ وہاں زندگی کے قوانین ہماری موجودہ دنیا کے قوانینِ طبعی سے بالکل مختلف ہوں گے۔ اگرچہ ہماری شخصیتیں یہی رہیں گے جو یہاں ہیں۔

جن لوگوں کے دماغ اس عالمِ ناسوت کے حدود میں اس قدر مقید ہیں کہ موجودہ زندگی اور اس کے مختصر پیمانوں سے وسیع تر کسی چیز کا تصور ان میں نہیں سما سکتا وہ قرآن و حدیث کے ان بیانوں کو بڑے تعجب اور حیرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں اور بسا اوقات ان کا مذاق اڑا کر اپنی خفیف العقل ہونے کا ثبوت دیتے ہیں مگر حقیقت یہ ہے کہ ان بیچاروں کا جتنا دماغ تنگ ہے زندگی کے امکانات اتنے تنگ نہیں ہیں۔

۵۰ - اور دوزخی جنتیوں کو پکار کر کہیں گے کہ کچھ تھوڑا سا پانی ہمیں بھی دو یا جو نعمتیں اللہ نے تمہیں عطا کی ہیں ان میں سے کچھ دو۔ دوزخی بدحواس ہو کر اہلِ جنت کے سامنے دستِ سوال دراز کریں گے کہ ہم جلے جاتے ہیں تھوڑا سا پانی ہم پر بہاؤ یا جو نعمتیں خدا نے تمہیں دے رکھی ہیں کچھ ان سے ہمیں بھی فائدہ پہنچاؤ۔[1]

افیضوا افاضہ سے ہے افاضہ کے معنے گرانے اور بہانے کے ہیں اور اس کے معنے میں بہتات پائی جاتی ہے۔ رزق کا مقابلہ بطورِ عطف پانی سے کیا ہے۔ علامہ آلوسی نے اس تقابل سے یہ نکتہ پیدا کیا ہے کہ پانی دے دو یا پینے کی جو چیز اللہ نے تمہیں عطا کی ہے وہ دے دو۔ اس طرح معطوف اور معطوف علیہ میں فعل افیضوا سے مناسبت پیدا ہو گئی ہے اور اگر مما رزق کے لیے فعل علیحدہ ہو تو مطلب یہ ہو گا کہ پانی دے دو یا کھانے کی کوئی چیز جو اللہ نے تمہیں دی ہو وہ ہی دے دو۔ اس صورت میں یہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آیت اس بات کی دلیل ہے کہ دوزخ میں دوزخیوں کو بھوک اور پیاس کی شدت سے دوچار ہونا پڑے گا اور ان کا دوزخ کے اندر عذاب میں ابتلا اس سوال سے مانع نہ ہوگا - اور آیت سے اشارہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ جیسے جنت بلند اور اونچی جگہ پر ہوگی ایسے ہی دوزخ پست اور زیریں مقام پر ہوگی - الجشمی نے یہ بات آیت افیضوا سے سمجھی ہے - مطلب یہ ہے کہ دوزخ والے جنت والوں سے درخواست کریں گے کہ کھانے پینے کی جن نعمتوں سے وہ متمتع ہو رہے ہیں ان پر بھی ان کا کچھ فیضان کریں - حضرت عبداللہ بن عباس نے دوزخیوں کی اس درخواست کی تشریح اس طرح کی ہے کہ ایک دوزخی جنت کے مکین اپنے بھائی سے کہے گا بھائی میری مدد کر میں جل گیا ہوں کچھ تھوڑا سا پانی بہا، کھانے سے پہلے پانی کی درخواست اس لیے کی ہے کہ جہنم میں جلن، گرمی، تپش اور پیاس کی وجہ سے دوزخیوں کو پانی کی زیادہ ضرورت ہوگی - شائد اسی بنا پر دُنیا میں پانی کے صدقہ کی زیادہ فضیلت آئی ہے - بیہقی کی شعب الایمان میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ بزرگ ترین صدقہ کیا ہے - آپ نے فرمایا بہترین صدقہ پانی پلانا ہے اور فرمایا کیا تم نے دوزخیوں کی یہ درخواست نہیں سنی ہے افیضوا علینا من الماء - مسند احمد میں ہے کہ سعد بن عبادہ کی والدہ کا انتقال ہوا، انہوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے اپنی والدہ کے لیے صدقہ کرنے کے بارے میں دریافت کیا آپ نے ہاں کہہ کر سعد کی حوصلہ افزائی کی - سعد نے پوچھا کہ سب سے اچھا صدقہ کونسا ہے؟ آپ نے جواباً ارشاد فرمایا کہ پانی پلانا -

نعمائے جنت سے محرومی کی وجہ

۶۵ - اہلِ جنت جواب دیں گے کہ اللہ نے یہ دونوں چیزیں ان کافروں پر حرام کر دی ہیں جنہوں نے دُنیا کی زندگی میں اپنے دین کو تماشا اور کھیل بنا لیا تھا اور جن کو دنیاوی زندگی نے فریب میں مبتلا کر رکھا تھا - جواب ملے گا کہ کافروں کے لیے ان چیزوں کی بندش ہے یہ کافر وہی تو ہیں جو دین کو کھیل اور تماشا بناتے تھے اور دُنیا کے تنعم پر پھولے ہوتے تھے - حرمھا میں جس حرمت کا ذکر ہے یہ قانونی اور شرعی حرمت کے معنے میں نہیں بلکہ یہ اس معنے میں ہے کہ اللہ سبحانہ نے بقہر اہلِ دوزخ کو جنت کی ان نعمتوں سے محروم کر دیا ہے - اہلِ جنت کے جواب سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کو سوال کے پورا کرنے میں تو کوئی عذر نہیں ہے - ان کے پاس ہر نعمت کی فراوانی ہے لیکن اللہ تعالیٰ نے چونکہ اہلِ دوزخ کو ان نعمتوں سے محروم کر دیا ہے اس لیے نہ یہ ان کو پہنچ سکتی ہیں اور نہ وہ ان سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں -

اس کے بعد اس سوال کا جواب دیا ہے کہ اہلِ دوزخ کو ان نعمتوں سے اللہ نے کیوں محروم کیا ہے

فرمایا کہ اس محرومی کی وجہ یہ ہے کہ الذین اتخذوا دینھم لھوا و لعبا ، یعنی اللہ نے ان پر جو چیز دین کی حیثیت سے اتاری تھی اس کو انہوں نے لہو و لعب بنا لیا تھا۔ دین اس لیے آتا ہے کہ زندگی کے ہر پہلو میں صحیح نقطہ نظر متعین کرے تاکہ لوگ ہلاکت میں پڑنے کے بجائے فلاح و سعادت سے ہمدوش ہوں لیکن جب کسی عمل کا اصل محرک کمزور پڑ جاتا ہے اور وہ رسمی طور پر یا محض ضابطہ کی پابندی کے خیال سے کیا جائے تو اس کے مطلوبہ اثرات مرتب نہیں ہوتے۔ اعمال تو ہوتے ہیں مگر تزکیہ کی روح سے بیگانہ ہوتے ہیں ، دین کے نام پر جو کچھ بھی کرتے ہیں اس کا مقصد یا تو محض ہوائے نفس کا تقاضا پورا کرنا اور لذت گیری ہوتا ہے کہ اس میں لگ کر مفید اعمال سے زندگی خالی ہو جاتی ہے اور یا بلا مقصد فضول کاموں کو اپنا لیتے ہیں۔ پہلی حالت کا نام لہو ہے اور دوسری کو لعب کہتے ہیں۔ دین کو لہو و لعب بنا لینے کے بعد امتوں میں دین کا تصور یہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ وہ رواجی اعمال کا نام ہے زندگی سے اس کا تعلق ہے تو بس اتنا کہ انسان دین کو مان لے یا آج کی اصطلاحی زبان میں دین پسند ہو جائے اگر بے تعصبی اور انصاف کے ساتھ ہمارے عوام پر نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ ہمارے جذبہ دینی میں چند رسموں اور رواجوں سے زیادہ آگے بڑھنے کی قوت مفقود ہے۔ دین سے جو کچھ محبت باقی ہے وہ صرف چند رسوم کی حفاظت اور بقا کی خواہش تک محدود ہے اور اب گراوٹ اس درجے ہو چکی ہے کہ اگر ایک شخص یا علی مدد کا نعرہ لگا لیتا ہے یا ریڈیو ، ٹی وی پر الصلاۃ والسلام علیک یا رسول اللہ پڑھ دیا جاتا ہے یا عمل کی زندگی میں پرتپاک طور پر گیارہویں دلاتا ہے اور غمی اور خوشی کے موقعہ رسوم کی پابجائی کر لیتا ہے تو سمجھ لیتا ہے کہ دین باقی ہے۔ جہاں دین کا تصور یہ ہو وہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہو سکتا کہ وہ اپنے دینی اور اخلاقی تصورات کی قوت سے آنے والے نظام کی تعمیر میں حصہ لیں گے۔ جو لوگ شب و روز اپنے ذاتی اغراض خاندانی مفاد کی فکر میں منہمک ہوں انہیں اس سے کیا بحث کہ زندگی کے بارے میں دین کے مطالبات کیا ہیں اور دنیا کس منہج پہ چل رہی ہے اور نظام تمدن کس طرز پر تعمیر ہونے والا ہے جس جماعت کے افراد مقابر کی سالانہ حاضری اور چند یادگاریں منا کر نجات حاصل کر سکتے ہوں اسے میدان عمل میں آکر زندگی کی نئی قوتوں سے نبرد آزما ہونے کی کیا ضرورت ہے جہاں گھر بیٹھے اوراد و وظائف سے جنت حاصل ہو سکتی ہو وہاں قرآن و سنہ کو لے کر اسلام کی مخالف قوتوں کا مقابلہ کرنے اور ان پر اللہ کے دین کو غالب کرنے کا جذبہ کیوں کر پیدا ہو۔ دین کا یہی تصور دین کو تماشا اور کھیل بنانا ہے۔ لعب کھیل کود کا نام ہے۔ یعنی دین کے نام پہ ایسے اعمال و افعال کیے جائیں جو اپنے اندر کوئی نتیجہ نہیں رکھتے۔ لوگ یہی سمجھتے ہیں کہ بچپن میں بچے مٹی خاک کے گھروندے بنا بنا کر خوش ہوتے ہیں حالانکہ نہ ان گھروں میں کوئی رہ سکتا

ہے نہ ان سے اور کسی قسم کا کوئی فائدہ اٹھا سکتا ہے اس قسم کے اعمال دین کے نام پر کرنا بھی دین کو کھیل بنانا ہے۔ لہو کے معنے غفلت کے ہیں تماشے کے معنے دیتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ دینی اعمال کو ان کی روح اور مقاصد سے بیگانہ کر کے اپنانا یہ دین کو تماشا بناتا ہے یعنی دین اور اس کے اعمال یوں ہی بے نتیجہ اور لاحاصل ہو کر ختم ہو جاتے ہیں۔

قرآن دُنیا کی زندگی کو کھیل اور تماشا اسی لیے بتاتا ہے کہ منکرینِ آخرت کی زندگی یہاں بے نتیجہ اور بے روح ہو کر رہ جاتی ہے حالانکہ آخرت کے مقابلے میں دُنیا اس لیے ہے کہ دوسری زندگی میں اس کے اچھے نتائج برآمد ہوں۔ دُنیا ہی کی طرح جو لوگ دین کو بھی کھیل اور تماشا بنا لیں اور افکار و اعمال، تزکیہ سے بیگانہ کر دیں یا مفید کاموں سے ہٹ کر لذتوں والے کاموں میں لگ جائیں۔ دین کو لہو و لعب بنانے کے مترادف ہے۔

آخر میں اس سفیہانہ حرکت اور دین کی حد تک بے پرواطرزِ عمل کی وجہ بتاتی ہے غرتھم الحیاۃ الدنیا، یعنی وہ کیوں دین کی نہایت سنجیدہ حقیقتوں سے بے پروا بنے رہے فرمایا اس لیے کہ دُنیا کی زندگی نے ان کو دھوکہ میں رکھا ہوا ہے۔ دین جیسی اہم الاہم چیز سے جو خدا کی جانب سے اس لیے آئی کہ وہ زندگی کے ہر پہلو میں فلاح و سعادت کی راہ بتائے غافل بنا کر جس چیز نے آدمی کو اُلجھا رکھا ہے تو دہی سوچنا چاہیے کہ سرمایہ فریب اس کے سوا کیا ہے۔ یعنی دُنیا کی زندگی نے ان کو دھوکے میں رکھا انہوں نے دیکھا کہ وہ کھا رہے ہیں پی رہے ہیں، مزے اڑا رہے ہیں اور ان سے کوئی پوچھ گچھ نہیں ہو رہی ہے۔ اس سے وہ سمجھ بیٹھے کہ بس دُنیا اسی لیے پیدا ہوئی ہے اور اگر کسی اللہ کے بندے نے ان کو خبردار کیا تو اس کے پیچھے پڑ گئے کہ یہ قدامت پسند ہے ہماری ترقی میں رکاوٹ ڈال رہا ہے۔

آخرت فراموشی کا نتیجہ

۶۶۔ لہٰذا آج ہم بھی ان کو اس طرح بھول جائیں گے جیسے وہ اپنے اس دن کی ملاقات کو بھولے ہوئے تھے اور ہماری آیتوں کا انکار کرتے تھے۔ یعنی ان کو دنیا کے مزوں میں پڑ کر آخرت کا خیال نہ آیا تھا آج ہم بھی ان کا کچھ خیال نہ کریں گے اور جس طرح انہوں نے ہماری آیتوں کا انکار کیا تھا آج ہم بھی ان کی درخواست منظور کرنے سے انکار کر دیں گے۔

لہ افادات شیخ الاسلام

یہ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے آیت میں نسیان بھولنے کے معنے میں نہیں بلکہ نظرانداز کرنے کے مفہوم میں ہے اور کما یہاں تشبیہہ کے لیے نہیں بلکہ تعلیل کے لیے ہے یعنی چونکہ انہوں نے دُنیا میں زندگی آخرت فراموشانہ گزاری ہے اس لیے ہم بھی ان کے ساتھ ایسا معاملہ کریں گے۔

یہاں آخرت کے لیے لقاء یوم کی تعبیر آئی ہے دوسرے مواقع پر قرآن میں لقاء رب کی تعبیر بھی آئی ہے لقاء یومکم ہو یا لقاء رب ہو دونوں کا حاصل ہے کہ آخرت کی توقع۔ حاصل یہ ہے کہ انہوں نے اپنے اس دن کی ملاقات کو بھلائے رکھا۔ یعنی اس دن میں اپنے رب کی ملاقات کو بھلاتے رکھا۔ آج جزاء کے موقعہ پر ان کو طاق نسیان بنا دیا جائے گا اس کو جزاء من جنس العمل کہتے ہیں اسی کا نام مشاکلہ ہے۔

وما کانوا بآیتنا یجحدون، کا عطف کما نسوا پر ہے۔ یعنی چونکہ وہ ہماری آیات کا انکار کرتے تھے اس لیے بھی ہم ان کو اس روز جزاء کے موقعہ پر نظرانداز کر دیں گے۔ آیت میں نظرانداز کرنے کی دو وجہیں بتائی گئی ہیں ایک آخرت فراموشی، دوسرے اللہ کی آیات کا انکار۔ سنن ترمذی میں آخرت میں ان کو نظرانداز کرنے کی جناب رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو منظر کشی کی ہے وہ بھی گوش گزار فرمایئے۔

> ابو سعید خدری اور ابوہریرہ دونوں بیان کرتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ روزِ قیامت ایک شخص جنابِ الٰہی میں پیش ہوگا، اللہ سبحانہٗ ارشاد فرمائیں گے بتا تو کیا میں نے تمہیں بصارت، سماعت نہیں دی تھی اور مال و اولاد کی نعمت سے نہیں نوازا تھا کیا میں نے تمہارے لیے مویشیوں اور پیداوار کو مسخر نہیں کیا تھا۔ میں نے تجھے مکان بنانے اور ریاست کرنے کے لیے چھوڑ دیا تھا تو آج کے دن کی حاضری کو مانتا تھا وہ جواب دے گا نہیں اللہ سبحانہٗ فرماتے گا آج تو بھی طاق نسیان ہوگا جیسا کہ تو مجھے دُنیا میں بھولتا رہا ہے۔

قرآن میں ضروریاتِ زندگی کی تفصیل

۵۲ - اور بلاشبہ ہم ان لوگوں کے پاس ایک ایسی کتاب لاتے ہیں جس میں ہم نے علمی تفصیلات فراہم کی ہیں اور یہ کتاب اہلِ ایمان کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔ قرآن جیسی کتاب کی موجودگی میں جس میں تمام ضروریات کی عالمانہ تفصیل موجود ہے اور ہر بات کو پوری آگاہی کے ساتھ کھول کر بیان کیا ہے چنانچہ ایمان والے اس سے خوب منتفع ہو رہے ہیں غضب ہے کہ ان متکبر معاندوں نے کچھ بھی اپنے انجام پر غور نہیں کیا پھر اب پچھتانے سے کیا حاصل ۔[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں سے روئے سخن منکرینِ قرآن کی طرف ہو گیا ہے فرمایا کہ آدم کی اولاد کو ہدایت وحی کے وقتاً فوقتاً ظہور کی جو خبر دی گئی اس کے مطابق محمد رسول اللہ ایک جامع، کامل اور آخری کتاب لے کر آتے ہیں اس کتاب میں پوری تفصیل کے ساتھ بتا دیا گیا ہے کہ حقیقت کیا ہے اور انسان کے لیے دنیا کی زندگی میں کون سا رویہ درست ہے اور صحیح طرزِ زندگی کے بنیادی اصول کیا ہیں۔ پھر یہ تفصیلات قیاس، گمان یا وہم کی بنا پر نہیں بلکہ خالص علم کی بنیاد پر ہیں۔ یہاں لفظ علم کی تنکیر تفخیم شان کے لیے ہے یعنی یہ خدا کے عظیم و وسیع محیط علم پر مبنی ہے اور اس کتاب کا خاص وصف یہ ہے کہ جو مانتے ہیں ان کے لیے ہدایت اور رحمت ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اوّل تو اس کتاب کے مضامین اور اس کی تعلیمات ہی بجائے خود اس قدر صاف ہیں کہ آدمی اگر ان پر غور کرے تو اس کے سامنے راہِ حق واضح ہو سکتی ہے۔ پھر اس پر مزید یہ ہے کہ جو لوگ اس کو مانتے ہیں ان کی زندگی میں عملاً بھی اس حقیقت کا مشاہدہ کیا جا سکتا ہے کہ یہ انسانوں کی کیسی صحیح رہنمائی کرتی ہے اور کتنی بڑی رحمت ہے کہ اس کا اثر قبول کرتے ہی انسان کی ذہنیت اس کے اخلاق اور اس کی سیرت میں بہترین انقلاب شروع ہو جاتا ہے۔ یہ اشارہ ہے ان حیرت انگیز اثرات کی طرف جو اس کتاب پر ایمان لانے سے صحابہ کرام کی زندگی میں ظاہر ہو رہے تھے، جو کتاب ایسے سانچے لے کر آئی ہو، جس سے ایسے اعمال ڈھلتے ہوں جو ایسی زندگیاں بناتی ہو اگر وہ ہدایت و رحمت نہیں ہے تو اور کس نام سے اسے پکارا جا سکتا ہے۔

گویا قرآن اگر اپنی تفصیل علمی سے منکرین کے خلاف حجت ہے تو اسی حیثیت میں یہ اہلِ ایمان کے لیے ہدایت و رحمت ہے۔

تفصیل سے مراد یہاں تفصیل اصطلاحی نہیں ہے کہ مسائل کی ہر قسم کو علیحدہ علیحدہ بیان کیا جائے اور نہ یہ مطلب ہے کہ تمام جزئیات کا احاطہ کیا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ دین کی زندگی میں انسان کو جس چیز کی ضرورت ہے اور جس پر مدارِ نجات ہے وہ سب کچھ قرآن میں کھول کر بتا دیا گیا ہے۔ مثلاً انکار کی حد تک انسانی زندگی شرک کی آلودگی سے داغدار تھی اور عقلِ انسانی نے توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت میں تفریق پیدا کر رکھی تھی کہ خدا کو رب، خالق اور مدبرِ امور مانتے تھے اور ایمان رکھتے تھے کہ وہ اکیلا ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے لیکن یہ بات نہیں مانتے تھے کہ عبادت کا مستحق صرف اللہ ہی ہے۔ قرآن نے پوری تفصیل کے ساتھ کھول کر توحیدِ ربوبیت اور توحیدِ الوہیت کو سمجھایا اور توحیدِ ربوبیت سے توحیدِ الوہیت پر استدلال کیا ہے برادر اس قسم کے دوسرے مسائل پر قرآن نے بھرپور تبصرہ کیا ہے اور قدم قدم پر ان کے شکوک و شبہات کے تفصیلی جوابات دیے ہیں۔ بالخصوص نظریۂ آخرت پر جس کے قرآن کے اوّلین

مخاطب منکر تھے سیر حاصل بحث کی ہے۔ قیامت کے نام، قیامت کے اوصاف، قیامت کی حقیقت اور اس کے وقوع وامکان پر دلائل۔ جزا و سزا اور اس کے اصول، عدالت، شہادت، حساب، میزان اور جنت و دوزخ کے مناظر پیش کیے ہیں۔

ظہورِ نتائج کا دن اور منکرین

۵۳۔ کیا یہ لوگ اعمال کے نتیجے آنکھوں سے دیکھنا چاہتے ہیں جس روز نتائج ظاہر ہوں گے اس دن وہ لوگ جو اسے پہلے سے طاقِ نسیان بنا چکے تھے کہیں گے بلا شبہ ہمارے رب کے پیغمبر ہمارے پاس سچائی کا پیغام لیکر آئے تھے۔ کتاب اللہ میں جو دھمکیاں عذاب کی دی گئی ہیں کیا یہ اس کے منتظر ہیں کہ جب ان دھمکیوں کے مضمون کا مصداق سامنے آجاتے تب حق کو قبول کریں۔ حالانکہ وہ مضمون جب سامنے آئے گا یعنی عذابِ الٰہی میں گرفتار ہوں گے تو اس وقت کا قبول کرنا کچھ کام نہ دے گا۔[1] مطلب یہ ہے کہ اگر منکرینِ حق سرکشی سے باز نہیں آتے تو انہیں کس بات کا انتظار ہے کیا اس بات کا کہ انکار و بدعملی کے جن نتائج کی خبر دی گئی ہے ان کا ظہور اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں لیکن جس روز ان کا ظہور ہوگا اس دن ان کی مہلت ہی کب ملے گی کہ کوئی ایمان لاتے وہ تو اعمالِ انسانی کے آخری فیصلے کا دن ہوگا۔[2]

دوسرے الفاظ میں اس مضمون کو یوں سمجھیے کہ جس شخص کو صحیح اور غلط کا فرق نہایت معقول طریقہ سے صاف صاف بتایا جاتا ہے مگر وہ نہیں مانتا۔ پھر اس کے سامنے کچھ صحیح لوگ صحیح راستہ پر چل کر مشاہدہ بھی کرا دیتے ہیں کہ غلط روی کے زمانے میں وہ جیسے کچھ تھے اس کی بہ نسبت راست روی اختیار کرکے ان کی زندگی کتنی بہتر ہو گئی ہے مگر اس سے بھی وہ کوئی سبق نہیں لیتا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ وہ صرف اپنی غلط روی کی سزا پا کر ہی مانے گا کہ ہاں یہ غلط روی تھی جو شخص نہ حکیم کے عاقلانہ مشوروں کو قبول کرتا ہے اور نہ اپنے جیسے بکثرت بیماروں کو حکیم کی ہدایات پر عمل کرنے کی وجہ سے شفایاب ہوتے دیکھ کر ہی کوئی سبق لیتا ہے اب وہ بسترِ مرگ پر لیٹ جانے کے بعد ہی تسلیم کرے گا کہ جن طریقوں پر وہ زندگی بسر کر رہا تھا وہ اس کے لیے واقعی مہلک ہے۔[3]

ذرا غور فرمائیے کہ منکرینِ قرآن نے کون سی بات جھٹلائی تھی؟ یہ کہ ان ہی میں سے ایک آدمی پر اللہ کی وحی نازل ہوتی یہ بات انہیں عجیب معلوم ہوئی اس لیے فوراً تکذیب پر آمادہ ہو گئے۔ قرآن یہاں بتا

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن [3] تفہیم القرآن

رہا ہے کہ اس تکذیب کے نتائج کی نظریاتی طور پر ہم نے خبر دی ہے تم اسے نہیں مانتے ہو بلکہ اسے جھٹلاتے ہو۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ نتائج کے بارے میں ان نظریات کو اس وقت مانو گے جب اپنی آنکھوں سے ان کا پریکٹیکل اور عملی مصداق دیکھ لو گے۔ مصداق ظاہر ہونے کا دن کون سا ہے یہ روزِ قیامت ہے جہاں اعمال کے نتائج مجسم ہو کر سامنے آجائیں گے۔ ماننے والوں کا ایمان اور نہ ماننے والوں کا کفر عیاں ہو کر آئے گا۔ اس روز حقائق کی نمائش دیکھ کر دنیا میں منکرین بھی بول پڑیں گے کہ انبیاء نے جو کچھ کہا اور جس چیز کی خبر دی وہ ایک واقعہ اور حقیقت ہے۔ یعنی جب یہ باتیں نظریات سے ہٹ کر واقعات کی صورت میں ظاہر ہوں گی تب ان کی آنکھیں کھلیں گی اور پکار اٹھیں گے کہ ہمارے رب کے رسولوں نے جن باتوں سے ہم کو آگاہ کیا تھا وہ سب بلا شبہ حقیقت ثابت ہوئیں۔ اس کے بعد کیا ہو گا یہ آگے آرہا ہے۔

مشاہدے کے بعد ماننا معتبر نہیں

۶۹۔ کاش ہمیں کچھ سفارشی ملیں کہ ہماری سفارش کر سکیں یا کاش ہم پھر دنیا میں لوٹ جائیں کہ جو کچھ ہم پہلے کرتے تھے اس کی جگہ کچھ اور عمل کریں۔ اس وقت ان کو ایسے سفارشیوں کی تلاش ہو گی جو خدا کی سزا سفارش کر کے معاف کرا دیں اور چونکہ ایسا سفارشی کا فروں کو کوئی نہ ملے گا تو یہ تمنا کریں گے کہ ہمیں دنیا میں بھیج کر امتحان کر لیا جاتے کہ اس مرتبہ ہم اپنے جرائم کے خلاف کیسی نیکی اور پرہیز گاری کے کام کرتے ہیں لیکن اب اس تمنا سے کیا حاصل [1]

یہاں اہلِ کفر و تکذیب کے بارے میں دو باتیں ارشاد ہوتی ہیں ایک یہ تمنا کہ اس مصیبت میں کوئی شفاعت کرنے والا مل جاتے، دوسرے یہ تمنا کہ اگر ہمیں دنیا میں واپس بھیج دیا جاتے تو ہم ایمان و عمل کی پونجی لے کر آئیں۔ اور یہ تمنا اس وقت کریں گے جب انبیاء کے بتاتے ہوئے نظریات کو واقعات اور حقائق کی صورت میں آنکھوں سے دیکھ لیں گے۔ شفاعت کی تمنا اس غلط تصور کی وجہ سے کریں گے جو خدا اور بندوں کے تعلق کی نسبت ان کے ذہن میں دنیا میں قائم تھا۔ وہ اللہ سبحانہ اور بندوں کے درمیان وہی نسبت سمجھتے تھے جو ایک قاہر و جابر بادشاہ اور اس کی رعیت کے درمیان ہوتی ہے جس طرح بادشاہ کے دربار تک ایک عام اور عمومی رعایا کی رسائی دربار رس سفارشیوں اور مقربوں کے بغیر ممکن نہیں سمجھتے تھے اسی طرح وہ خدا کے دربار تک بھی بغیر سفارشیوں کے پہنچنا ممکن نہ سمجھتے تھے

[1] افادات شیخ الاسلام

اسی لیے وہ ان درمیانی ہستیوں کو خوش رکھنے کی ضرورت کے بھی معتقد تھے۔ چنانچہ وہ جن ہستیوں کی تصاویر بنا کر پوجتے تھے اسی نیت سے پوجتے تھے اور کہتے تھے ھؤلاء شفعاؤنا عند اللہ یہ اللہ کے ہاں ہمارے سفارشی ہیں۔ قرآن نے جب ان کی مشرکانہ عبادت پر ان کو ملامت کی تو انہوں نے صاف کہا ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ زلفی۔ ہم ان کو صرف اس لیے پوجتے ہیں کہ وہ ہم کو اللہ کے تقرب میں نزدیک کر دیں۔

جن کی وہ مشرکانہ عبادت کرتے تھے ان کے متعلق ان کا عقیدہ تھا کہ وہ خدا کی طرف سے دونوں عالم میں مختار ہیں۔ وہ یہاں دینے نہ دینے اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں۔ اس عقیدہ کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا۔

قرآن نے یہاں بتایا ہے کہ دنیا میں یہ تصور رکھنے والے لوگ حقائق و واقعات ظاہر ہو جانے کے بعد حسرت سے کہیں گے اور تمنا کریں گے کہ ہے کوئی شفاعت کرنے والا جو ہماری شفاعت کرے۔ اس حسرت و تمنا کا کیا بنے گا اس کا جواب آگے قد خسروا میں آرہا ہے۔

دوسری تمنا یہ کریں گے کہ ہے کوئی صورت کہ ہم دنیا میں واپس جائیں اور نیک عمل کی مایہ کر آئیں۔ یعنی دوبارہ اس دنیا میں آنے کی خواہش کریں گے اور کہیں گے کہ جس حقیقت کی ہمیں خبر دی گئی تھی اور اس وقت ہم نے نہ مانا تھا اب مشاہدہ کر لینے کے بعد ہم اس سے واقف ہو گئے ہیں لہٰذا اگر ہمیں دنیا میں پھر بھیج دیا جائے تو ہماری عملی زندگی وہ نہ ہوگی جو پہلی تھی۔ اس درخواست کا جواب آگے آرہا ہے۔

دونوں تمناؤں کا جواب

۷ بلاشبہ ان لوگوں نے اپنی تباہی کا سامان کیا اور ان کی افتراء پردازیوں کا نام و نشان نہ رہا۔ پہلے خود اپنے ہاتھوں تباہ ہو چکے ہیں اور جو جھوٹے خیالات پکار رکھے تھے وہ سب رفو چکر ہو گئے [1]

یہ ان دو تمناؤں کا جواب ہے۔ پہلی تمنا یہ ہے کہ وہ اس روز کہیں گے کہ کوئی سفارشی مل جاتے جو ہماری سفارش کر دے دوسری تمنا یہ ہوگی کہ کوئی صورت ایسی ہو کہ ہم دنیا میں پھر واپس جائیں۔

قرآن نے قد خسروا انفسھم میں ان کی دوسری تمنا کا جواب دیا ہے کہ زندگی کی جو مہلت ان کو ملی تھی اس میں انہوں نے شرک کی گندگی اور گناہوں کی آلودگی سے اپنے کو سر تا سر گھاٹے میں رکھا ہے اعمال کی قیمت ایمان بالغیب سے پڑتی ہے اسے رد کر کے انہوں نے اپنے کاروبار میں گھاٹا اور نقصان

[1] افادات شیخ الاسلام

اٹھایا ہے اب نقصان ہونے اور دیوالیہ ہونے کے بعد اب حقائق اور نتائج کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد دوبارہ واپسی کی تمنا بے معنے ہے۔ یہ لوگ آیاتِ الٰہی کی تکذیب کر کے سخت گھاٹے میں پڑ گئے۔ اب یہ چاہتے ہیں کہ واپس جا کر گھاٹا پورا کریں۔ اگر بالفرض ان کو واپسی کا موقعہ فراہم کر دیا جائے تو اس کی ضمانت کیا ہے کہ پھر وہی کچھ نہ کریں گے جو ماضی میں کر چکے ہیں۔

ولو ردوا لعادوا لما نهوا عنه وانهم لكاذبون۔

اور اگر یہ لوٹا دیے جائیں تو وہی کریں گے جس سے روکے گئے تھے یہ جھوٹے ہیں۔

پہلی تمنا کا یہ جواب دیا ہے کہ وہم و گمان اور خیالات کے زور سے جن جن کے بارے میں انہوں نے بطورِ خود شفاعت کا گھروندا تیار کر رکھا تھا وہ سارا خاکستر ہو کر رہ جائے گا۔ نجات کے بارے میں ساری افتراء پردازیاں بے جان ہو کر رہ جائیں گی ضَلَّ عنهم ما كانوا يفترون۔ میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان کے فرضی شفعاء اور شرکاء سب خواب و خیال ثابت ہوں گے کیونکہ ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہ تھی کہ انہوں نے اپنے جی سے گھڑ کے خدا کی طرف منسوب کر رکھا تھا کہ خدا نے ان کو شفیع بنایا ہے۔

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوَىٰ عَلَى الْعَرْشِ يُغْشِي اللَّيْلَ النَّهَارَ يَطْلُبُهُ حَثِيثًا وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ وَالنُّجُومَ مُسَخَّرَاتٍ بِأَمْرِهِ ۗ أَلَا لَهُ الْخَلْقُ وَالْأَمْرُ ۗ تَبَارَكَ اللَّهُ رَبُّ الْعَالَمِينَ ﴿٥٤﴾

بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا[۱]، پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا[۲]۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے، جس نے سورج اور چاند تارے پیدا کیے سب اس کے فرمان کے تابع ہیں[۳]۔ خبردار رہو اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے بڑا بابرکت ہے اللہ سارے جہانوں کا مالک و پروردگار ہے[۴]۔

معانی مفردات

یوم، لغت میں یوم کے معنے مطلق وقت کے ہیں اور عرف میں طلوع شمس سے غروب

آفتاب تک کے وقت کو یوم کہتے ہیں اور یوم شرعی تاج العروس میں طلوع صبح صادق سے غروب آفتاب تک بتایا ہے۔ استوی، یہ مشترک المعانی لفظ ہے۔ استقرار اور ٹھہرنے کے معنے میں آتا ہے جیسے حضرت نوح کی کشتی کے بارے میں ہے فاستوت علی الجودی، جودی پہاڑ پر ٹھہر گئی۔ ارادہ اور قصد کے معنے بھی دیتا ہے جیسے ثم استوی الی السماء ارادہ کیا متوجہ ہوا۔ قبضہ کرنے کے معنے میں بھی آتا ہے جیسے قد استوی بشر علی العراق بشر نے عراق پر غلبہ حاصل کر لیا اور قبضہ کر لیا۔ چڑھنے کے معنے بھی دیتا ہے جیسے استویت انت ومن معک علی الفلک جب تو اور تیرے کشتی پر چڑھ جائیں۔ عرش، تخت شاہی، امام ابوبکر عزیزی نزہتہ القلوب میں فرماتے ہیں عرش کے معنے تخت شاہی کے ہیں۔ چنانچہ آیات ذیل میں عرش سے یہی مراد ہے ورفع ابویہ علی العرش اور اونچا کیا ماں باپ کو تخت پر اور اھکذا عرشک کیا تیرا تخت بھی ایسا ہی ہے۔ اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں عرش اصل میں مسقف چیز کو کہتے ہیں اور اس کی جمع عروش ہے اور اسی لحاظ سے عرشت الکرم کے معنے انگور کی بیلوں کے لیے ٹٹیاں اور چھتریاں لگانے کے ہیں۔ اسی لیے قرآن میں معروشات ہے اور بادشاہ کے بیٹھنے کی جگہ کو بھی اسی اعتبار سے عرش کہتے ہیں کہ وہ بلند ہوتا ہے۔ اور کبھی عرش عزت، غلبہ اور سلطنت سے بھی کنایہ ہوتا ہے محاورہ ہے فلاں ثل عرشہ فلاں کی عزت خاک میں مل گئی۔

توحید ربوبیت سے توحید عبادت پر استدلال

ان آیات میں توحید ربوبیت سے توحید عبادت پر استدلال کیا گیا ہے۔ توحید عبادت یہ ہے کہ خدا کے سوا کوئی ہستی اس کی مستحق نہیں کہ اسے معبود بنایا جائے۔ توحید ربوبیت یہ کہ کائنات عدم سے وجود میں لانے والی اس کو چلانے والی ہستی صرف خدا ہی کی ہستی ہے۔ الا لہ الخلق والامر خلق بھی اس کی ہے اور اس کی مخلوق میں امر بھی اس کا ہے۔ عبادت بھی اس کی کی جاتی ہے اور طاعت بھی اس کی کی جاتی ہے۔ یہ نہیں کہ خالق اللہ کو مان لیا جاتے لیکن عبادت اور طاعت کسی اور کی کی جاتے۔

قرآن حکیم کے دلائل و براہین پر غور کرتے ہوتے یہ اصل ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیے کہ اس کے استدلال کا طریقہ منطقی بحث و تقریر کا نہیں ہے جس کے لیے چند در چند مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ اور

پھر اثبات مدعا کے لیے تشکیلیں ترتیب دینی پڑتی ہیں بلکہ وہ ہمیشہ براہِ راست تلقین کا قدرتی اور سیدھا سادہ طریقہ اختیار کرتا ہے عموماً اس کے دلائل اس کے اسلوب و بیان و خطاب میں مضمر ہوتے ہیں۔ وہ یا تو کسی مطلب کے لیے اسلوب خطاب ایسا اختیار کرتا ہے کہ اسی سے استدلال کی روشنی نمودار ہو جاتی ہے یا پھر کسی مطلب پر زور دیتے ہوتے کوئی ایک لفظ ایسا بول دیتا ہے کہ اس کی تعبیر میں اس کی دلیل بھی ہوتی ہے اور خود بخود مخاطب کا ذہن دلیل کی طرف پھر جاتا ہے۔ اس کی واضح مثال اس آیت میں صفت ربوبیت کا استعمال ہے یہاں آغاز ان ربکم سے کرکے انجام تبارک اللہ رب العالمین پر کیا ہے اور درمیان میں تخت شاہی اور لہ الخلق والامر لاکر اللہ کی شان حاکمیت کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ جیسے پرستش کی مستحق اللہ کی ذات ہے ایسے ہی بندگی بھی صرف اسی کی کرنی چاہیے۔ یہ واقعہ ہے کہ اللہ کی ربوبیت انسانی زندگی کو چاروں طرف سے گھیرے ہوئے ہے اللہ کی ذات رب ہے اور رب کے سوا کون ہو سکتا ہے جو بندگی و نیاز کا مستحق ہو پرستش کے لیے یہاں ادعوا اور بندگی کے لیے لاتفسدوا فی الارض کی تعبیر اختیار کی ہے۔ منشا یہ ہے کہ خلق وامر دونوں اللہ کی ذات سے ہیں یعنی وہی کائنات ہستی کا پیدا کرنے والا ہے اور وہی آمر ہے تمہاری حیثیت صرف اسی کی مخلوق اور مامور ہونے کی ہے یہ نہیں کہ مخلوق تو تم اللہ کی ہو اور امر اللہ کے سوا کوئی اور ہو۔ اسی لیے آیت میں تخت شاہی کا ذکر کیا ہے تاکہ لوگوں کو پتہ لگ جائے کہ سلطانی و حکمرانی کے سارے اختیارات جس ذات کے ہاتھ میں ہیں۔ عبادت و طاعت اور پرستش و بندگی کے تعلقات بھی اسے وابستہ ہونے چاہئیں۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ خدا اور مخلوق کے تعلقات کو واضح کرنے کے لیے انسانی زبان میں سے زیادہ تر وہ الفاظ، اصطلاحات، استعارات اور اندازِ بیان انتخاب کیے گئے ہیں جو سلطنت اور بادشاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ طرزِ بیان قرآن میں اس قدر نمایاں ہے کہ کوئی شخص جو سمجھ کر قرآن پڑھتا ہو اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہ سکتا۔ بعض کم فہم ناقدین کے معکوس دماغوں نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ کتاب جس عہد کی تصنیف ہے اس زمانے میں انسان کے ذہن پر شاہی نظام کا تسلط تھا اس لیے مصنف نے خدا کو بادشاہ کے رنگ میں پیش کیا۔ حالانکہ دراصل قرآن جس دائمی و ابدی حقیقت کو پیش کر رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے وہ حقیقت یہ ہے کہ زمین اور آسمانوں میں بادشاہی صرف ایک ذات کی ہے اور حاکمیت جس چیز کا نام ہے وہ اسی ذات کے لیے خاص ہے اور یہ نظامِ کائنات ایک کامل مرکزی نظام ہے۔ جس میں تمام اختیارات کو وہی ایک ذات استعمال کر رہی ہے لہٰذا اس نظام میں جو شخص یا گروہ اپنی یا کسی اور کی جزوی یا کلی حاکمیت کا مدعی ہے وہ محض فریب میں مبتلا ہے۔ نیز یہ کہ اس نظام میں رہتے ہوتے انسان کے

لیے اس کے سوا کوئی دوسرا اور یہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ اسی ذات کو واحد معبود مانا جاتے اور سیاسی معنوں میں واحد مطاع تسلیم کرے۔

قرآن میں بار بار ربوبیت کو عبادت کے لیے بطورِ دلیل پیش کیا ہے مثلاً یا ایھا الناس اعبدوا ربکم۔ اور اعبدوا اللہ ربی و ربکم۔ اور ان اللہ ربی و ربکم فاعبدوہ۔ عبادت صرف پرستش ہی کا نام نہیں بلکہ پرستش اور بندگی دونوں کے مجموعہ کو عبادت کہتے ہیں۔ عبادت کی اسی جامعیت کی وجہ سے اس کے اندر وہ تمام ظاہری اور باطنی اعمال اور اقوال داخل ہیں جو اللہ تعالیٰ کو پسند ہیں اور جو اس کی خوشنودی کا باعث بنتے ہیں۔

۵۴۔ بلاشبہ تمہارا رب اللہ ہی ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ دنوں میں پیدا کیا۔ گزشتہ آیات میں معاد کا ذکر تھا۔ اس آیت میں مبدا کی معرفت کا ذکر ہے۔ وہاں قد جاءت رسل ربنا بالحق کہہ کر بتلایا تھا کہ جو لوگ دُنیا میں انبیاءؑ و رسل سے منحرف رہتے تھے ان کو بھی قیامت کے دن پیغمبروں کی سچائی کی ناچار تصدیق کرنی پڑے گی۔ یہاں نہایت لطیف پیرایے میں خدا کی حکومت یاد دلاتے اور انبیاءؑ و رسل کی ضرورت کی طرف اشارہ کرنے کے بعد بعض مشہور پیغمبروں کے احوال و واقعات کا تذکرہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ ان کی تصدیق و تکذیب کرنے والوں کا آخرت سے پہلے ہی دُنیا میں کیا انجام ہوا۔ گویا یہ رکوع آنے والے کئی رکوعات کی تمہید ہے۔

آسمان و زمین کے چھ روز میں پیدا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اتنے وقت میں جو چھ دن کے برابر تھا پیدا کیا۔ کیونکہ یہ متعارف دن اور رات تو آفتاب کے طلوع و غروب سے وابستہ ہیں۔ جب اس وقت آفتاب ہی پیدا نہ ہوا تھا تو دن رات کہاں سے ہوتا۔ یا یہ کہا جائے کہ عالمِ شہادت کے دن رات مراد نہیں۔ عالمِ غیب کے دن رات مراد ہیں جیسے کسی عارف نے کہا ہے:

غیب را ابرے و آبے دیگر است
آسمان و آفتابے دیگر است

پہلی صورت میں پھر علماء کا اختلاف ہے کہ یہاں چھ دن سے ہمارے چھ دن کی مقدار مراد ہے یا ہزار برس کا ایک دن جیسے فرمایا و ان یوماً عند ربک کالف سنۃ مما تعدون ایک روز تیرے رب کے نزدیک تمہاری شمار سے ایک ہزار سال جیسا ہے۔ میرے نزدیک یہ آخری قول راجح ہے بہرحال مقصود یہ ہوا کہ آسمان و زمین دفعتہً بنا کر نہیں کھڑے کیے گئے۔ شاید اول ان کا مادہ پیدا فرمایا ہو پھر اس کی استعداد کے مطابق بتدریج مختلف اشکال و صورتیں منتقل ہوتے رہے ہوں حتیٰ کہ چھ دن (چھ ہزار سال) میں وہ بجمیع تعلقاتہا موجودہ مرتب شکل میں موجود ہوئے جیسا کہ آج بھی انسان اور کل حیوانات و

نباتات وغیرہ کی تولید و تخلیق کا سلسلہ تدریجی طور پر جاری ہے اور یہ اس کی شان کن فیکون کے منافی نہیں ہے کیونکہ کن فیکون کا مطلب یہ نہیں ہے کہ خدا کسی چیز کو وجود کے مختلف مدارج سے گزارنے کا ارادہ نہیں کرتا بلکہ ہر چیز کو بدون توسط اسباب و علل کے دفعتہً موجود کرتا ہے[1]

یہی بات کہ تمہارا رب وہ اللہ ہے جس نے آسمان و زمین چھ روز میں پیدا فرماتے قرآن میں کئی جگہ دہرائی گئی ہے تفصیل تو انشاء اللہ پارہ ۲۴ میں آئے گی۔ یہاں اجمالاً اتنی بات ضرور سمجھ لیجئے کہ یوم سے ہمارا وہ دن مراد نہیں ہے جو طلوع شمس سے شروع ہو کر غروب آفتاب پر ختم ہو جاتا ہے بلکہ جیسا کہ شیخ الاسلام نے فرمایا ہے کہ یہ عالم شہادت کا نہیں بلکہ عالم غیب کا دن ہے۔ عالم غیب کے اسی دن کے بارے میں قرآن نے یہ بتایا ہے۔

ان یوماً عند ربک کالف سنۃ مما تعدون

ایک دن تمہاری اوقات شماری کے پیمانہ سے تیرے رب کے نزدیک تمہارے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آسمان و زمین کی تخلیق چھ دوروں میں ہوئی۔

بعض شارحین قرآن نے ان چھ ایام سے ہماری دنیا کے چھ دن مراد لیے ہیں اور کچھ روایات ایسی نقل کر دی ہیں جن میں کارنامہ تخلیق کی دنوں کے اعتبار سے تفصیل بتائی گئی ہے مثلاً مسند احمد اور صحیح مسلم کی روایت ہے کہ حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اللہ نے مٹی ہفتہ کے روز، پہاڑ اتوار کے روز، درخت پیر کے روز، مکروہ منگل کے روز، روشنی بدھ کے روز، حیوانات جمعہ کے روز اور آدم علیہ السلام کو جمعہ کے دن عصر کے بعد پیدا فرمایا۔

محدثین نے اس حدیث کو اپنی تنقیدات کا نشانہ بنایا ہے اور بتایا ہے کہ روایتی طور پر اس کا ارشاد نبوت ہونا ثابت نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کائنات کی تخلیق سات روز میں ہوئی اور قرآن کی تصریح ہے کہ کائنات کی تخلیق چھ روز میں ہوئی۔ اسی لیے امام بخاری اور دوسرے محدثین نے اس حدیث پر کلام کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ ابوہریرہ کی کعب احبار سے روایت ہے حدیث مرفوع یعنی ارشاد نبوت نہیں ہے۔ غالباً روایت کے راوی حجاج بن الاعور کا یہ کارنامہ ہے کہ اس کی پیشانی پر قال رسول اللہ لگا دیا ہے ورنہ دراصل یہ کعب احبار کی بات ہے جس کا سرچشمہ یہودی روایات

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں۔ بہرحال چھ دنوں سے مراد چھ دور ہیں۔ دُنیا کا چھ ادوار میں پیدا ہونا تورات میں بھی مذکور ہے اور قرآن میں بھی بلکہ جہاں تک اس کے تدریجی ارتقا کا تعلق ہے فلسفہ جدید بھی بڑے شدومد سے اس کا مدعی ہے۔ اس وجہ سے بجائے خود اس کائنات کا ارتقاء قدیم و جدید میں نزاعی نہیں ہے۔ ڈاکٹر محمد رفیع نے قرآن اور علم جدید میں بتایا ہے کہ :

مختصر طور پر ان سائنس دانوں کا خیال یہ ہے کہ سب سے پہلے برقی قوت کی لہریں ایک خاص قسم کی روشنی کی صورت میں تھیں جن کو کائناتی شعاعیں کہا جاتا ہے۔ اس روشنی کی لہریں فضا میں پھیلی ہوئی تھیں اور خود بخود متحرک تھیں۔ یہ ایک ہم رنگ اور یکساں قسم کا مادہ تھا جس سے بعد میں تمام کائنات ظہور میں آئی۔ پھر ان لہروں میں جا بجا گرہیں بن گئیں جو مثبت اور منفی قسم کے برقی آحاد کی صورت میں تھیں اور جنہیں الکٹرون اور پروتان کہتے ہیں۔ پھر یہ برقی آحاد اپنی باہمی کشش سے ایک دوسرے کے ساتھ مل گئے اور اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے چھوٹے چھوٹے گروہ بن گئے جنہیں ہم سالمات کہتے ہیں۔ سالمات اپنے الکٹرانوں اور پروتانوں کی ترتیب اور تعداد کے لحاظ سے پورانیے مختلف قسموں میں بٹ گئے۔ ہر نمونہ کے سالمات آپس میں مل کر کیمیاوی عناصر کے ذرات بن گئے۔ بعض کیمیاوی ذرات میں سالمات کی تعداد کم ہے اور بعض میں کئی سو تک ہے۔

شروع میں مادے کے ذرات دھوئیں یا گیس کے ایک بہت بڑے گھومتے ہوئے بادل کی طرح تھے یہ بادل لتنے بڑے تھے کہ ان کی اندرونی کشش ثقل ان کو سالم نہیں رکھ سکتی تھی لہٰذا وہ مختلف ٹکڑوں میں بٹ گئے۔ ہر ٹکڑا اپنے محور کے گرد گھوم رہا تھا اور اتنا بڑا تھا کہ اس کی کشش ثقل اس کے اجزار کو بکھرنے نہیں دیتی تھی کیونکہ اگر اس کا حجم کم ہوتا تو کشش ثقل کی قلت کی وجہ سے اس کے اجزار بکھر جاتے اور اگر زیادہ ہوتا تو وہ خود بخود تقسیم ہو کر چھوٹے ٹکڑوں میں مل جاتے۔ ان بادلوں کے اجزاء آپس میں جڑے ہوئے نہ تھے بلکہ فقط ایک دھوئیں کی شکل میں تھے اور ایک دوسرے سے الگ تھلگ تھے لیکن بادل کی مجموعی کشش ثقل کی وجہ سے اس کے اندر رہتے۔

قرآن کے اشارات سے بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ ابتدار میں مادہ دخانی تھا پھر اس میں انقسام ہوا یعنی بہت سے ٹکڑے ہو گئے۔ پھر ہر ٹکڑے نے ایک کرے کی شکل اختیار کر لی۔ اس آیت کو ثم استوی الی السماء وھی دخان کو ان السماوات والارض کانتا رتقا ففتقنا ھما، ملا کر پڑھیے تو آپ اس نتیجہ پر پہنچیں گے کہ ابتدار میں مادہ دخانی تھا اور یہ مادہ دخانی ملا ہوا تھا الگ الگ نہ تھا۔ پھر اس کے مختلف حصے ایک دوسرے سے جدا کر دیے گئے۔ ہر ٹکڑا کرہ کی صورت میں تبدیل ہو گیا۔ اور اسی کے ایک ٹکڑے سے

زمین بنی۔ پھر زمین میں کوئی تبدیلی ہوئی کہ دخانیت نے مائیت کی شکل اختیار کرلی یعنی پانی پیدا ہوگیا۔ پھر خشکی کے قطعات درست ہوتے، پھر پہاڑوں کے سلسلے نمودار ہوتے۔ پھر زندگی کا نمو شروع ہوا اور نباتات ظہور میں آگئیں۔ موجودہ زمانے میں اجرام سماویہ کی ابتدائی تخلیق اور کرۂ ارضی کی ابتدائی نشوونما کے جو نظریات تسلیم کیے گئے ہیں یہ اشارات بظاہر اس کی تائید کرتے ہیں۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے کہ اس نے ان حقائق علمی کو جن کا قرآن کے مخاطبوں کو کوئی علم نہ تھا اس انداز میں پیش کر دیا کہ اس کے مخاطبوں کے لیے کوئی بوجھ نہ ہوا۔

عرش پر جلوہ فرمائی

۴۷۔ پھر اپنے تخت سلطنت پر جلوہ فرما ہوا۔ خدا تعالیٰ کی صفات و افعال کے متعلق یہ بات ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے کہ نصوص قرآن و حدیث میں جو الفاظ حق تعالیٰ کی صفات کے بیان کرنے کے لیے اختیار کیے گئے ہیں ان میں سے اکثر وہ ہیں جن کا مخلوق کی صفات پر بھی استعمال ہوا ہے۔ مثلاً خدا کو حیّ، سمیع، بصیر، متکلم کہا گیا اور انسان پر بھی یہ الفاظ بولے گئے تو ان دونوں مواقع میں استعمال کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے۔ کسی مخلوق کو سمیع و بصیر کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سننے والے کان موجود ہیں۔ اب اس میں دو چیزیں ہوئیں۔ ایک وہ آلہ جسے آنکھ کہتے ہیں اور جو دیکھنے کا مبدار اور ذریعہ بنتا ہے۔ دوسرا ، کا نتیجہ اور غرض و غایت (دیکھنا) یعنی وہ خاص علم جو رویت بصری سے حاصل ہوا۔ مخلوق کو جب بصیر کہا ، مبدار اور غایت دونوں چیزیں معتبر ہوئیں۔ اور دونوں کی کیفیات ہم نے معلوم کرلیں۔ لیکن یہی لفظ جب خدا کی نسبت استعمال کیا جاتا ہے تو یقیناً وہ کیفیاتِ جسمانیہ اور مبادی مراد نہیں ہو سکتے جو مخلوق کے خواص میں سے ہیں اور جن سے خداوند قدوس قطعاً منزہ ہے۔ البتہ یہ اعتقاد رکھنا ہوگا کہ ابصار دیکھنے کا مبدار اس کی ذات اقدس میں موجود ہے اور اس کا نتیجہ یعنی وہ علم جو رویت بصری سے حاصل ہو سکتا ہے اس کو بدرجہ کمال حاصل ہے۔ آگے یہ کہ وہ مبدار کیسا ہے اور دیکھنے کی کیفیت کیا ہے؟ تو بجز اس بات کے کہ اس کا دیکھنا مخلوق کی طرح نہیں ہے ہم اور کیا کہہ سکتے ہیں لیس کمثلہ شیئ و ھوالسمیع البصیر، نہ صرف سمع و بصر بلکہ اس کی تمام صفات کو اسی طرح سمجھنا چاہیے کہ صفت باعتبار اپنے اصل مبدار و غایت کے ثابت ہے مگر اس کی کوئی کیفیت بیان نہیں ہو سکتی اور نہ شرائع سماویہ نے اس کا مکلف بنایا ہے کہ آدمی اس طرح کی ماوراء عقل حقائق میں غور و خوض کرکے پریشان ہو۔ استواء علی العرش کو بھی اسی قاعدہ سے سمجھ لو۔ عرش کے معنے تخت اور بلند مقام کے ہیں۔ استواء کا ترجمہ اکثر محققین نے استقرار و تمکن سے کیا ہے گویا یہ لفظ تخت حکومت پر اس طرح قابض ہونے کو ظاہر کرتا ہے کہ اس کا کوئی حصہ اور گوشہ حیطہ نفوذ

اقتدار سے باہر نہ ہے اور نہ قبضہ و تسلط میں کسی قسم کی مزاحمت اور گڑبڑی پائی جاتی سب کام اور انتظام برابر ہو۔ اب دنیا میں بادشاہوں کی تخت نشینی کا ایک تو مبداء اور ظاہری صورت ہوتی ہے اور اب دنیا میں بادشاہوں کی تخت کا ایک تو مبداء اور ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت یا غرض یعنی ملک پر پورا تسلط و اقتدار اور نفوذ و تصرف کی قدرت حاصل ہونا حق تعالیٰ کے استواء علی العرش میں یہ حقیقت اور غرض و غایت بدرجہ کمال موجود ہے یعنی آسمان و زمین کل علویات و سفلیات کو پیدا کرنے کے بعد اُن پر کامل قبضہ و اقتدار ہر قسم کے مالکانہ و شہنشاہانہ تصرفات کا حق ہے۔ روک ٹوک اسی کو حاصل ہے جیسا کہ دوسری جگہ ثم استوی علی العرش کے بعد یدبر الامر وغیرہ الفاظ اور یہاں یغشی اللیل النھار سے اسی مضمون پر متنبہ فرمایا۔ رہا استوی علی العرش کا مبداء اور ظاہری صورت اس کے متعلق وہی عقیدہ رکھنا چاہیے جو ہم سمع و بصر وغیرہ صفات کے متعلق لکھ چکے ہیں کہ اس کی کوئی ایسی صورت نہیں ہو سکتی جس میں صفات مخلوقین اور سمات حدوث کا ذرا بھی شائبہ ہو۔ پھر کیسی ہے اس کا جواب یہ ہے :

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہرچہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم !
منزل تمام گشت و بپایاں رسید عمر
ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم !

لیس کمثلہ شیئ و ھو السمیع البصیر[1]

صفاتِ باری میں مسلک تفویض

استواء علی العرش کا مسئلہ بھی اللہ سبحانہٗ کی صفات سے متعلق ہے۔ جیسا کہ شیخ الاسلام کی افادات میں تمہید بتا رہی ہے۔ متکلمین کے وجود میں آنے کے بعد صفاتِ الٰہیہ کی تفہیم کے لیے دو راہیں ہو گئیں۔ ایک تفویض، دوسرے تاویل۔ تفویض یہ ہے کہ کسی صفت میں کوئی تاویل نہ کی جاتے۔ اصل بات کو مان کر اس کی کیفیت کو سپرد خدا کر دیا جاتے اور کہہ دیا جاتے کہ جو بھی اس کے شایان شان ہو اللہ سبحانہٗ کے لیے تمثیل و تشبیہہ کے تمام پردے ہٹا کر تنزیہہ کو مرتبہ کمال تک پہنچا دے لیکن تنزیہہ ایسی نہ ہو کہ تعطیل پیدا ہو جاتے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تنزیہہ اور تعطیل میں فرق ہے۔ تنزیہہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک انسانی عقل کی پہنچ ہے صفاتِ الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے۔ تعطیل کے معنے یہ ہیں کہ تنزیہہ میں نفی و نیستی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ انسانی تصور کے لیے کوئی بات ہی باقی نہ رہے۔ تفویض میں تنزیہہ کی تکمیل ہے تعطیل کی ابتداء نہیں۔ جس طرح اثبات صفات میں غلو تشبیہ و تمثیل کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی طرح نفی صفات میں غلو تعطیل تک پہنچا دیتا ہے اور دونوں غلط ہیں۔ اگر تشبیہہ انسانی تصور کو ناآشنائے حقیقت بناتا ہے تو تعطیل عقیدے کی روح سے محروم کر دیتی ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ افراط و تفریط دونوں سے بچ کر رہیں۔ تشبیہہ و تعطیل دونوں کے درمیان راہ نکالی جائے۔ اسی کا نام تفویض ہے۔ یہ دونوں راہوں کے درمیان ہے اور دونوں انتہائی سمتوں سے محفوظ ہے۔

اگر اللہ سبحانہ کی صفات کے لیے کوئی ایسی صورت باقی نہ رہے جو فکرِ انسانی کی پکڑ میں آسکتی ہے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تنزیہہ کے معنے نفی وجود کے ہو جائیں گے۔ ظاہر ہے کہ ایسی صورت میں فکرِ انسانی کے لیے کوئی سر رشتہ تصور باقی نہیں رہے گا کیونکہ صرف سلبی تصور کے ذریعے ہم ہستی کو نیستی سے جدا نہیں کر سکتے۔

غیر صفاتی تصور کو انسان پکڑ نہیں سکتا اور اسے طلب ایسے مطلوب کی ہے جو اس کی پکڑ میں آسکے وہ ایک ایسا جلوہ محبوبی چاہتا ہے جس کے عشق میں اس کا دل اٹک سکے۔ جس کے حسن گریزاں کے پیچھے وہ والہانہ دوڑ سکے جس کا دامن کبریائی پکڑنے کے لیے ہمیشہ اپنا دستِ عجز و نیاز بڑھاتا رہے جو اگرچہ عرش کی بلندی پر ہو لیکن پھر بھی اسے ہر دم جھانک لگائے تاک رہا ہو۔ اذا سألك عبادی عنی فانی قریب۔

اسی لیے تفویض کی راہ ایک طرف تو تنزیہہ کو اس کے درجہ کمال تک پہنچا دیتی ہے۔ دوسری طرف تعطیل سے بھی تصور کو بچا لیتی ہے۔ وہ فرداً فرداً تمام صفات و افعال کا اثبات کرتی ہے مگر ساتھ ہی تشبیہہ و تمثیل کی بھی قطعی نفی کر دیتی ہے۔ اسی راہ کی قرآن رہنمائی کرتا ہے وہ کہتا ہے کہ خدا حسن و جمال کی ان تمام صفتوں سے متصف ہے جو فکرِ انسانی میں آسکتی ہیں لیکن یہ بھی صاف صاف اور بے لچک لفظوں میں بتا دیتا ہے کہ اس سے مشابہ کوئی چیز نہیں ہے جو تمہارے تصور میں آسکے۔ وہ عدیم المثال ہے لیس کمثلہ شیئ تمہاری نگاہ اسے پا نہیں سکتی۔ لا تدرکہ الابصار۔

راہ کی نزاکت کا یہ عالم ہے کہ اگر تنزیہہ کی طرف زیادہ جھکتے ہیں تو تعطیل میں گر جاتے ہیں۔ اگر اثبات صفات کی صورت آرائیوں میں دور نکل جاتے ہیں تو تشبہ و تجسم میں کھوتے جاتے ہیں۔ اس لیے نجات

کی راہ صرف یہی ہے کہ دونوں کے درمیان قدم سنبھالے رکھیں۔ اثبات کا دامن بھی ہاتھ سے نہ چھوٹے تنزیہہ کی باگ بھی ڈھیلی نہ پڑنے پائے۔ اثبات سے اس کی صفات کا نقشہ سامنے آئے گا۔ تنزیہہ کے ذریعہ تشبہ سے بچاؤ ہوگا۔

علم کلام کے مختلف مدارس میں تاویل و توجیہ کی نظری کاوشیں پیدا ہوئیں اور صفات کا مسئلہ بحث و نظر کا ایک معرکۃ الاراء مسئلہ بن گیا۔ جہمیہ اور باطنیہ قطعی انکار کی طرف گئے معتزلہ نے انکار نہیں کیا مگر رُخ اسی طرف رہا۔

تمام صفات کی طرح اس موضوع یعنی استوار علی العرش میں بھی دو مسلک رونما ہوگئے۔ ایک ارباب تفویض کا اور دوسرا ارباب تاویل کا۔

امام بیہقی نے ابن وہب کے حوالہ سے بتایا ہے کہ میں امام مالک کی خدمت میں حاضر تھا کہ ایک شخص آیا اور اس نے امام موصوف سے دریافت کیا کہ اے ابو عبداللہ قرآن میں ہے الرحمان علی العرش استوی یہ بتائیے کہ اللہ عرش پر کیسے مستوی ہے۔ حضرت امام مالک نے سوال سن کر سر نیچے کر لیا اور خوف سے پسینہ پسینہ ہوگئے۔ بعدازیں سر اونچا کیا اور فرمایا کہ ایسا ہی ہے جیسے اللہ نے فرمایا کہ وہ عرش پر مستوی ہے۔ استوار معلوم ہے اور کیفیت استوار مجہول ہے اس پر ایمان لانا واجب ہے اور اس کے بارے میں سوال کرنا بدعت ہے۔

ملا علی قاری نے شرح فقہ اکبر اور شرح قصیدہ بدء الامالی میں حضرت امام ابو حنیفہ کا بھی یہی مسلک نقل کیا ہے۔ بلکہ حافظ ذہبی نے کتاب العلو میں تمام اہل السنہ کی طرف نسبت کرکے بتایا ہے کہ:

تمام اہل السنہ کی یہی رائے ہے کہ استوار کی کیفیت ہماری فکری دسترس سے بالا اور ہمارے لیے مجہول ہے لیکن نفس استوار معلوم ہے جیسا اس کی شایان شان ہو ہم اس معاملے میں تعمق سے کام نہیں لیتے اور نہ اس کے لوازم کی گہرائیوں میں جانا چاہتے ہیں بلکہ کیفیت کی حد تک ہم سکوت اختیار کرتے ہیں۔ یہی سلف کا مذہب ہے۔ اگر اس میں تاویل کی کوئی گنجائش ہوتی تو بلاشبہ صحابہ و تابعین سے منقول ہوتی۔ ہمارا اعتقاد ہے کہ اللہ سبحانہ، جیسے اپنی صفات میں عدیم المثال ہے ایسے ہی اپنے استوار میں بھی عدیم المثال ہے۔

امام ابوالحسن الاشعری اپنی مشہور کتاب الابانۃ فی اصول الدیانۃ میں رقمطراز ہیں:

اگر کوئی دریافت کرے کہ تم معتزلہ، قدریہ، جہمیہ، حروریہ، روافض اور مرجیۂ کی تردید کرتے ہو تم بتاؤ کہ استوار علی العرش کے بارے میں تم کیا کہتے ہو۔ ہمارا جواب یہ ہے کہ

ہم وہی کچھ کہتے ہیں جو اللہ کی کتاب اللہ کے رسول کی سنت، صحابہ، تابعین، ائمہ حدیث کہتے ہیں اور یہی ہمارا اعتقاد ہے۔

امام بیہقی نے امام ابوالحسن اشعری سے نقل کیا ہے کہ

اللہ سبحانہ نے عرش میں کوئی کام کیا ہے جس کا نام اس نے استواء رکھا ہے جیسے کہ اس کے دوسرے افعال ہیں۔ ان میں سے کچھ کا نام رزق اور نعمت ہے۔ کیونکہ ثم یہاں تراخی کے لیے ہے اور تراخی افعال میں ہوتی ہے نہ کہ صفات میں۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

لوگوں کے اس آیت کی تشریح میں مختلف خیالات ہیں۔ لیکن اپنانے کی چیز صرف سلف صالحین کا مسلک ہے یعنی امام مالک، امام اوزاعی، امام ثوری، امام لیث، امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق اور ان کے علاوہ قدیم اور جدید ائمہ اسلام کا اور وہ صرف یہ کہ تشبیہ اور تعطیل سے بچ کر اور کیفیت سے الگ ہو کر استواء علی العرش کو مانا جائے۔

علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ

اس قسم کے مواقع پر مذہب سلف تفویض ہے یعنی یہ کہا جائے کہ اللہ سبحانہ مستوی علی العرش ہے جیسے اس کے شایان شان ہے استقرار و تمکن سے وہ بالا ہے۔

امام ابوالحسن نے اس موضوع پر یہی راہ اختیار کی تھی لیکن ان کے پیروکاروں کی کاوشیں تاویل میں دور تک چلی گئیں۔ متکلمین نے تاویل کی راہ اختیار کی مثلاً یہ کہ آیت میں استوی کے معنے استولی کے ہیں۔ استیلا کے معنے غالب ہونے کے ہیں لیکن خدا کی مخلوقات میں کوئی مخلوق ایسی بھی ہے جس پر اللہ کا استیلا نہیں ہے اور کیا اس سے پہلے عرش پر اللہ سبحانہ کا استیلا نہ تھا۔ بالفاظ دیگر اس کا مطلب یہ ہے کہ کائنات کے مخلوق ہونے پر اللہ سبحانہ کا عرش اللہ کے استیلاء سے بے نیاز تھا۔ معاذاللہ، محققین نے اسے لغت کے اعتبار سے بھی بے معنے قرار دیا ہے استوی بمعنے استولی اس وقت بولا جاتا ہے جب مقابلہ پر کوئی ہو۔ یعنی دو میں سے ایک غالب آجائے تو کہا جاتا ہے استوی فلاں علی مصر، اور جناب الٰہی میں ایسی پوزیشن کا کوئی تصور ہی نہیں ہے۔ اسی وجہ سے علامہ آلوسی نے اس تاویل کو یہ کہہ کر ٹھکرا دیا ہے ان تفسیر الاستواء بالاستیلاء تفسیر مرذول، یعنی استواء کی تفسیر استیلا سے کرنے میں کوئی معقولیت نہیں ہے، تاویلات اگرچہ بہت ہیں لیکن۔

ان تاویلات میں سب سے اچھی تاویل وہ ہے جو قفال مروزی نے پیش کی ہے کہ استوی علی العرش

کے معنے یہ ہیں کہ آسمان و زمین پیدا کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ تمام کائنات کی تدبیر کی طرف متوجہ ہوگیا جیسا کہ سورہ یونس میں اسی مطلب کی وضاحت یدبر الامر سے ہوتی ہے۔ شیخ الاسلام نے بھی اپنے فوائد میں اس کو اپنایا ہے۔ مولانا آزاد نے ترجمان القرآن میں اسی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے "تخت پر متمکن ہوگیا" یعنی خدا کی بادشاہت کائنات ہستی میں نافذ ہوگئی کیونکہ وہی خالق ہے اور وہی مدبر بھی ہے تمام عالم ہستی اسی کے تخت جلال کے آگے جھکی ہوئی ہے۔

مولانا مودودی نے اسی بات کو اپنے انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔ خدا کے استواء علی العرش کی تفصیلی کیفیت کو سمجھنا ہمارے لیے مشکل ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ نے کائنات کی تخلیق کے بعد کسی مقام کو اپنی لامحدود سلطنت کا مرکز قرار دے کر اپنی تجلیات کو وہاں مرتکز فرما دیا ہو اور اس کا نام عرش ہو جہاں سے سارے عالم پر وجود اور قوت کا فیضان بھی ہو رہا ہے اور تدبیر امر بھی فرمائی جارہی ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ عرش سے مراد اقتدار فرمانروائی ہو اور اس پر جلوہ فرما ہونے سے مراد یہ کہ اللہ نے کائنات پیدا کر کے اس کی زمام سلطنت اپنے ہاتھ میں لی۔ بہر حال استواء علی العرش کا تفصیلی مفہوم خواہ کچھ ہو۔ قرآن میں اس کے ذکر کا اصل مقصد یہ ذہن نشین کرنا ہے کہ اللہ تعالیٰ محض خالق کائنات ہی نہیں بلکہ مدبر کائنات بھی ہے۔ وہ دنیا کو وجود میں لانے کے بعد اس سے بے تعلق ہو کر کہیں بیٹھ نہیں گیا ہے بلکہ عملاً وہی سارے جہان کے جزو کل پر فرمانروائی کر رہا ہے۔ سلطانی و حکمرانی کے تمام اختیارات بالفعل اس کے ہاتھ میں ہیں، ہر چیز اس کے امر کے تابع ہے۔ ذرہ ذرہ اس کے فرمان کا مطیع ہے اور موجودات کی قسمتیں دائماً اس کے حکم سے وابستہ ہیں۔ اس طرح قرآن عزیز اس غلط فہمی پر ضرب کاری لگاتی جس کی وجہ سے انسان کبھی شرک کی گمراہی میں مبتلا ہوا ہے اور کبھی خود مختاری و خود سری کی ضلالت میں۔ اللہ کو کائنات کے انتظام سے بے تعلق سمجھ لینے کا نتیجہ یہ ہے کہ آدمی یا تو اپنی قسمت کو دوسروں سے وابستہ کر لیتا ہے اور ان کے آگے سر جھکا دیتا ہے یا پھر اپنی قسمت کا مالک خود اپنے آپ کو سمجھ کر خود مختار بن بیٹھتا ہے۔

دراصل ثم استوی علی العرش میں پہلی آیت میں بیان کردہ مضمون کا ایک بدیہی نتیجہ پیش کیا ہے کہ جس نے یہ سارا کارخانہ اس تدریج و اہتمام کے ساتھ بنایا ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ وہ اس کو پیدا کر کے اس کی تدبیر و انتظام سے بالکل بے تعلق ہو کر کسی گوشے میں جا بیٹھے۔ اس خلق کا بدیہی تقاضا یہ ہے کہ وہ اس کو پیدا کرنے کے بعد اس کے تخت حکومت پر متمکن ہو کر اس کے تمام امور و معاملات کا انتظام بھی فرماتے۔ اسی حقیقت کو واضح کرنے کے لیے یہاں یغشی اللیل اور دوسرے

مواقع پر یہ جملہ اس آیا ہے۔

یہ مشرکین کے اس زعم باطل کی تردید ہے کہ خدا تعالیٰ خالق تو ہے مگر انتظام و انصرام اس نے اس مملکت کا اپنے دوسرے شرکاء کے سپرد کر رکھا ہے۔ ساتھ ہی ان فلاسفہ کی بھی تردید ہے جو خدا کو صرف ایک علۃ العلل کے درجہ میں مانتے ہیں۔ فرمایا کہ خدا کائنات کو پیدا کر کے عرش پر متمکن ہے اور ساری کائنات کا انتظام کر رہا ہے عرش اقتدار کی تعبیر ہے اور اس تعبیر کے ذریعے بتایا جا رہا ہے کہ اس کائنات کا انتظام اور تدبیر و تصرف صرف وہی کر رہا ہے اس لیے صرف اسی کی عبادت و طاعت کرنی چاہیے۔ عابدانہ تعلقات اللہ کے سوا کسی اور سے نہ رکھنے چاہئیں اسی لیے سورہ یونس میں اس کے بعد ما من شفیع کا اور سورہ سجدہ میں مالکم من دونہ من ولی ولا شفیع کا اضافہ فرمایا ہے۔ گویا توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال کیا ہے۔

پوری کائنات اللہ کی فرمانبردار ہے

۳۔ جو رات کو دن پر ڈھانک دیتا ہے اور پھر دن رات کے پیچھے دوڑا چلا آتا ہے جس نے سورج، چاند اور ستارے پیدا کیے سب اس کے فرمان کے تابع ہیں۔ یعنی رات کے اندھیرے کو دن کے اجالے سے یا دن کے اجالے کو رات کے اندھیرے سے ڈھانپتا ہے اس طرح کہ ایک دوسرے کا تعاقب کرتا ہوا تیزی سے چلا آتا ہے۔ ادھر رات ختم ہوئی ادھر دن آموجود ہوا یا دن تمام ہوا تو خود رات آگئی۔ درمیان میں ایک منٹ کا بھی وقفہ نہیں۔ شاید اس پر بھی تنبیہ فرمادی کہ اسی طرح کفر و ضلالت اور ظلم و عدوان کی شب دیجور جب عالم پر محیط ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ ایمان و عرفانی کے آفتاب سے ہر چہار طرف روشنی پھیلا دیتا ہے اور جب تک آفتاب عالم تاب کی روشنی نمودار نہ ہو نبوت کے چاند تارے رات کی تاریکی میں اجالا اور رہنمائی کرتے ہیں۔ کوئی سیارہ اللہ کے حکم کے بغیر حرکت نہیں کر سکتا[1] جیسے اس آیت میں نظام ربوبیت سے توحید عبادت پر استدلال ہے یعنی جو رب تمام کائنات پر حکومت کر رہا ہے اور تکوینی طور پر مخلوق اس کی فرمانبرداری کر رہی ہے مثلاً سورج کو اس کے اور اس پوری کائنات کے مالک کا حکم ہے کہ وہ ایک مقررہ وقت پر نکلے اور پھر ایک مقررہ وقت پر ڈوب جائے، ٹھیک اسی طرح انسانوں کو تشریعی طور پر حکم ہے کہ اللہ کے سوا بندگی و نیاز کا سر کسی کے سامنے نہ جھکایا جائے۔ اسی طرح اس آیت میں توحید ربوبیت

[1] افادات شیخ الاسلام

سے وحی و رسالت کی ضرورت پر بھی استدلال ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ جو اللہ تمہاری پروردگاری کے لیے ایسا نظام قائم کیے ہوتے ہے کیا ممکن ہے کہ اس نے تمہاری روحانی فلاح و سعادت کے لیے کوئی قانون، کوئی نظام، کوئی قاعدہ مقرر نہ کیا ہو۔ جس طرح تمہارے جسم کی ضرورتیں ہیں اسی طرح تمہاری روح کی بھی ضرورتیں ہیں۔ پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ جسم کی ضروریات کی بہم رسانی کے لیے تو سورج، ستارے، رات دن، چاند زمین بنا کے لیکن روح کی نشو و نما کے لیے کوئی انتظام نہ کرے۔

یغشی اللیل النہار سے وقت بیں اور نکتہ رس لوگوں نے زمین کی کرویت یعنی گول ہونے پر بھی استدلال کیا ہے۔ یہ زمین کے گول ہونے کا نتیجہ ہے کہ زمین کے ایک حصہ پر رات کی تاریکی اور دوسرے حصہ پر دن کی روشنی ہوتی ہے۔ آپ رات کے بارہ بجے پاکستان میں بیٹھ کر ٹیلیفون کے ذریعے نیویارک سے معلوم کر سکتے ہیں کہ وہاں دن کے بارہ بجے ہیں۔ فلاسفہ میں سے غزالیؒ اور رازیؒ اور ائمہ نقل میں سے ابن تیمیہؒ اور ابن القیمؒ زمین کی کرویت کے قائل ہیں۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس کائنات میں جو حرکت بھی ہو رہی ہے سب اس کے خالق اور مالک ہی کی تدبیر و انتظام سے ہو رہی ہے۔ وہی ہے جو رات کو دن پر ڈھانکتا ہے اور اسی کے حکم سے اس سرگرمی سے وہ اس کا تعاقب کر رہی ہے۔ والشمس والقمر والنجوم مسخرات بامرہٖ وہی ہے جس نے سورج اور چاند اور دوسرے تمام نجوم و کواکب پیدا کیے۔ مسخرات بامرہٖ یعنی وہ اپنے اپنے معینہ فرائض اور اپنے اپنے معینہ حدود و قیود کے تحت خدا کے حکم سے پابند ہیں اور پوری سرگرمی کے ساتھ شب و روز اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں مجال نہیں کہ پل کے لیے بھی غافل ہوں یا بال برابر بھی اپنی اپنی حدود سے متجاوز ہوں۔

تکوینی اور تشریعی احکام میں یکسانی

۴۷۔ خبردار رہو اسی کی خلق ہے اور اسی کا امر ہے بڑا بابرکت ہے اللہ جو سارے جہانوں کا پروردگار ہے۔ پیدا کرنا خلق ہے اور پیدا کرنے کے بعد تکوینی یا تشریعی احکام دینا یہ امر ہے اور دونوں اسی کے قبضے میں ہیں اس طرح وہی ساری خوبیوں اور برکتوں کا سرچشمہ ہوا[1]

یہ بیان واقعہ بھی ہے اور اظہارِ حق بھی اور پہلے مضمون کی مزید تشریح بھی ہے۔ جو استواء علی العرش کے الفاظ میں مجملاً بیان کیا گیا ہے یعنی یہ کہ اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی صرف خالق ہی نہیں بلکہ آمر اور حاکم بھی ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ذرہ ذرہ شب روز اسی کے احکام کی تعمیل میں پورے جوش و خروش کے ساتھ سرگرم کار ہے۔ اس نے خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالے کر دیا ہے کہ وہ اس پر حکم چلائیں اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصے کو خود مختار بنا دیا ہے کہ جیسے چاہے خود کام کرے بلکہ عملاً تمام کائنات کی تدبیر اللہ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ لفظ امر بول کر بتایا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے احکام دو طرح کے ہیں تکوینی اور تشریعی۔

تکوینی احکام ان حکموں کو کہتے ہیں جن کے مطابق عمل چار و ناچار کرنا ہی پڑتا ہے اور جن کی خلاف ورزی ناممکن ہوتی ہے کیونکہ مخلوق ان کی طاعت کرنے پر مجبور پیدا کی گئی ہے اور اسے پیدائشی طور پر اس کی آزادی نہیں ہے کہ چاہے تو ان پر عمل کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ مثال کے طور پر سورج کو اس کے اور اس پوری کائنات کے مالک کا حکم ہے کہ وہ ایک مقررہ وقت پر نکلے اور پھر ایک مقررہ وقت پر ڈوب جائے۔ زمین سے ایک مقررہ فاصلہ پر رہے اور اسے روشنی اور گرمی پہنچائے۔ سورج ان احکام پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہے۔ اسے یہ طاقت حاصل نہیں ہے کہ ان کی تعمیل سے کبھی انکار کرے۔ اسی طرح ہوا کو اس بات کا حکم ہے کہ وہ جانداروں کو زندہ رکھے۔ پانی کو حکم ہے کہ وہ پیاس بجھائے۔ آگ کو حکم ہے کہ جلائے اور انسان کو حکم ہے کہ زبان سے بولے، کان سے سنے، ناک سے سونگھے۔ اور یہ سب کے سب اس بات پر مجبور ہیں کہ ان حکموں کی پابندی کریں۔ کوئی دوسرا راستہ اختیار کرنا ان کے بس ہی میں نہیں ہے۔ اس طرح کے احکام کو تکوینی احکام، قوانینِ طبیعی اور قوانینِ قدرت بھی کہتے ہیں اور عام طور سے یہی نام زیادہ مشہور ہیں۔

تشریعی احکام اللہ سبحانہٗ کے ان حکموں کو کہتے ہیں جن کی پیروی پیدائشی مجبوری کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ ارادی اور اختیاری ہوتی ہے۔ مخلوق کو ان پر عمل کرنے کا اختیار بھی حاصل ہوتا ہے اور عمل نہ کرنے کا بھی۔ مثلاً انسان کو حکم ہے کہ وہ ایک خدا کی بندگی کرے لیکن وہ ایسا کرنے کے لیے پیدائشی طور پر مجبور نہیں ہے بلکہ اسے اس بات کا اختیار دیا گیا ہے کہ چاہے تو اسی ایک خدا کی بندگی کرے اور چاہے تو اس کے ساتھ ہزاروں کو خدا بنا لے اور چاہے تو سرے سے خدا اور خدائی ہی سے انکار کر بیٹھے۔ ان احکام کو شرعی احکام اور شرعی قوانین بھی کہتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کے احکام یکساں طور پر اللہ ہی کے احکام ہیں۔

آخر میں فرمایا تبارک اللہ رب العالمین برکت کے اصلی معنے ہیں نمو، افزائش اور بڑھوتری کے، اور اس کے ساتھ اس لفظ میں رفعت، عظمت کا پہلو بھی ہے اور ثبات و قرار کا بھی۔ پھر ان کے ساتھ خیر اور بھلائی کا تصور لازماً شامل ہے۔ لہٰذا اللہ کے بابرکت ہونے کا مطلب یہ ہوا کہ اس کی خوبیوں اور بھلائیوں کی حد نہیں ہے۔ بے حد و حساب خیرات اس کی ذات سے پھیل رہی ہیں اور وہ بہت بلند و برتر

ہستی ہے، کہیں جاکر اس کی بلندی ختم نہیں ہوتی اور اس کی یہ بھلائی و رفعت مستقل ہے عارضی نہیں ہے کہ کبھی اس کو زوال ہو۔[1]

دراصل یہ فقرہ اللہ سبحانہ کے بارے میں اس غلط فہمی کو دور کر رہا ہے جس میں مشرک قومیں عموماً مبتلا ہوتی ہیں۔ انہوں نے خدا تک رسائی کو ناممکن الحصول بنا کر پیش کیا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ بندوں کے لیے خدا سے براہ راست تعلق و توسل ناممکن سمجھ لیا گیا اور پھر ایسے وسائط و وسائل کی تلاش ہوئی جو خدا سے مقصد برآری کا ذریعہ بن سکیں۔ صفات الٰہی کے بارے میں یہ گمراہی شرک کے عوامل میں سے ایک بہت بڑا عامل ہے۔ مشرکین نے بہت سے فرضی معبودوں کی پرستش بالخصوص ملائکہ کی پرستش اسی وجہ سے کرنی شروع کی کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ہیں۔ یہ ہم سے راضی رہیں تو یہ اپنے باپ کو ہم سے راضی رکھیں گی۔ قرآن نے یہاں تبارک اللہ رب العالمین فرما کر اس حقیقت کی طرف توجہ دلائی ہے کہ یہ کائنات جس طرح اپنے خالق کی بے پایاں عظمت و جبروت پر شاہد ہے اسی طرح اس کی بے پایاں برکت و رحمت پر بھی گواہ ہے۔

حافظ ابن القیم نے برکت کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک وہ برکت ہے جو اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اس سے فعل بارک آتا ہے یہ کبھی بلا واسطہ متعدی ہوتا ہے اور کبھی علی اور فی کی وساطت سے۔ اسی سے اسم مفعول آتا ہے دوسری قسم وہ ہے جس میں برکت کی رحمت اور عزت کی طرح اللہ کی طرف اضافت کی جاتی ہے اس سے فعل تبارک آتا ہے۔ اسی لیے لفظ تبارک کا اطلاق اللہ کے علاوہ کسی پر نہیں۔ مبارک اللہ بھی ہے اور اللہ کا بندہ رسول بھی مبارک ہے۔ لیکن تبارک اللہ سے مخصوص ہے۔ اس میں تعالیٰ کی طرح مبالغہ ہے بے نہایت برتری اور درجہ کمال کی بلندی و عظمت کو ظاہر کرنے کے لیے یہ لفظ آتا ہے۔

---

[1] تفہیم القرآن

اُدْعُوْا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۭ اِنَّهٗ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِيْنَ ﴿۵۵﴾
وَلَا تُفْسِدُوْا فِي الْاَرْضِ بَعْدَ اِصْلَاحِهَا وَادْعُوْهُ خَوْفًا وَّطَمَعًا ۭ
اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِيْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۵۶﴾

تم اپنے رب کو گڑگڑاتے اور چپکے چپکے پکارو۔ بے شک وہ حدود سے بڑھ جانے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اور ملک میں اس کی درستگی کے بعد بگاڑ برپا نہ کرو اور اسی کو پکارو ڈرتے ہوئے اور اُمید رکھتے ہوئے یقیناً اللہ کی رحمت ان کے قریب ہے جو حسن کار ہیں۔

معانی مفردات

تضرّع، باب تفعل کا مصدر ہے ضرع سے بنا ہے اس کے معنے عاجزی، خوشامد، لجاجت اور تعلق کے ظاہر کرنے کے ہیں۔ یہ اظہار حرکات اور اداؤں سے بھی ہوتا ہے اور الفاظ و عبارات سے بھی،
خُفیۃ، یہ خفی یخفی کا مصدر ہے اس کے معنے چپکے اور رازدارانہ طرز پر کرنے کے ہیں۔ یہ علانیہ کی ضد ہے
معتدین اعتدا سے اسم فاعل ہے، اس کے معنے حد سے بڑھ جانے کے ہیں۔

توحید الوہیت کی تلقین

پہلی آیات میں بتایا تھا کہ جو خالق ہے وہی رب ہے یعنی جس نے یہ کائنات بنائی ہے وہی اس کائنات کو چلا رہا ہے۔ انتظام و انصرام اسی کا ہے اسی کی یہاں حکومت ہے، اسی کا امر و حکم یہاں چل رہا ہے۔ تکوینی اور تشریعی قوانین کا بنانا اللہ کے سوا کسی کا کام نہیں ہے۔ انسانوں کے پرستش اور بندگی کی حد تک صرف اللہ سے تعلقات ہونے چاہئیں۔ ان دونوں کے لیے نام قرآن کی زبان میں عبادت ہے۔ عبادت انسان کا مقصد رہا ہے اور اسی کی تلقین و ہدایت کے لیے انبیاء آتے رہے ہیں۔ یہی عقل کا صریح تقاضا ہے اور یہی قرآن کا فیصلہ ہے۔ عقل کا صریح تقاضا یہ اس لیے ہے کہ خدا انسانوں کا خالق اور مالک، رازق اور محسن سب کچھ ہے اسے پرستش اور بندگی دونوں کا حقدار ہونا چاہیے۔ قرآنی فیصلہ یہ اس طرح ہے کہ اس نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ پرستش اور بندگی دونوں اللہ کی کرنی چاہئیں اور ان میں کوئی تفریق نہ ہونی چاہیے قرآن جہاں یہ کہتا ہے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرو۔ اسی کے نام کی پاکی بیان کرو، اسی سے دعائیں مانگو، اسی کی بڑائی کا اعلان کرو، اسی کو مدد کے لیے پکارو اور اسی کے حضور اعترافِ نعمت کرو، اسی کا نام پرستش ہے، وہیں وہ یہ بھی کہتا ہے کہ اللہ ہی کو بے قید و شرط اطاعت کا مستحق اور حقیقی فرمانروا مانو۔ اسی کو مستقل بالذات قانون ساز تسلیم کرو زندگی کے ہر شعبے میں اسی کے احکام کی اطاعت کرو۔ اسی کے قوانین کے مطابق فیصلے کرو۔ اسی کے ضابطہ کو زندگی کے ضابطے بناؤ۔ اسی کے حلال کو حلال اور اسی کے حرام کو حرام سمجھو۔ اسی کا نام بندگی ہے۔ ان دونوں کے مجموعہ کا نام عبادت ہے۔ یہاں ان دونوں کی تلقین کے لیے دعا کرنے اور ملک میں فساد نہ کرنے کی تعبیر اختیار کی ہے۔ دعا اگر پرستش کا اعلان ہے تو فساد فی الارض نہ کرنا خدا کی بندگی کا عنوان ہے۔

۵۵۔ تم اپنے رب کو گڑگڑاتے اور چپکے چپکے پکارو، جب عالم خلق اور عالم امر کا مالک اور تمام برکات کا منبع وہ ہی ذات ہے تو اپنی دنیوی و اخروی حوائج میں اسی کو پکارنا چاہیے۔ الحاح و اخلاص اور خشوع کے ساتھ بدونِ ریاکاری کے آہستہ آہستہ۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعا میں اصل اخفا ہے اور یہی سلف کا معمول تھا۔ بعض مواقع پر جہر و اعلان کسی عارض کی وجہ سے ہوگا۔ جس کی تفصیل روح المعانی وغیرہ میں ہے[1] اس آیت میں دعا کا عنوان قائم کر کے بتایا گیا ہے کہ پرستش کے تعلقات اللہ سبحانہ سے

[1] افادات شیخ الاسلام

ہونے چاہئیں یعنی ضرورت اور شدت میں اللہ سے دعا کرنی چاہیے، اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارنا چاہیے۔ اور دعا میں دو چیزیں ضرور ہونی چاہئیں ایک تضرع و ابتہال اور دوسرے خفیہ و اسرار، دعا میں یہ دونوں قیدیں کہ اخلاص انکساری، عاجزی کے ساتھ ہو اور آہستہ اور چپکے چپکے ہو۔ تضرع کی سب سے زیادہ مؤثر شکل ہوتی ہے جب یہ الفاظ و حرکات دونوں میں کامل ہم آہنگی کے ساتھ ہو۔ اس کی بہترین شکل نماز میں ہے۔ خفیہ تضرع کے آداب میں ہے اس میں تضرع کے اخلاص کی بھی ضمانت ہوتی ہے اور اس کے وقار کی بھی۔ جو کام چپکے چپکے کیا جاتا ہے وہ ریا کے فتنہ سے محفوظ ہوتا ہے اور خدا چونکہ ہر چیز سنتا اور جانتا ہے اس لیے اس کو سنانے اور اس سے فریاد کرنے کے لیے چیخنے چلانے کی ضرورت نہیں ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود یہی بات ایک موقعہ پر بتائی ہے۔ فرمایا:

لوگو! اپنی جانوں پر نرمی کرو، تم اس ذات سے دعا نہیں مانگ رہے ہو جو بہری اور غائب ہو تم تو سمیع و قریب ذات سے دعا کر رہے ہو اور وہ تمہارے ساتھ ہے۔

(صحیح مسلم)

اس ارشادِ نبوت سے معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دعاؤں میں آہستگی کو پسند فرماتے تھے۔ اسلام کے قانون سازاداروں نے آیت سے یہی بات سمجھی ہے۔ امام نودی لکھتے ہیں کہ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے کہ دعا آہستہ کرنی چاہیے۔ حافظ ابن القیم نے بدائع الفوائد میں آہستہ دعا کے متعدد فوائد بتائے ہیں اور اس پر اچھی بحث کی ہے۔ مثلاً،

اولاً آہستہ دعا کرنا قوتِ ایمانی کی عظمت بتاتی ہے کیونکہ دعا مانگنے والے کو یقین کامل ہوتا ہے کہ آہستہ آہستہ دعا کو اللہ سبحانہٗ سن لیتا ہے۔ اس کی پوزیشن اس سے بے حد بلند ہے جو کہتا ہے کہ خدا بلند آواز کی دعا کو سنتا ہے آہستہ نہیں سنتا۔

ثانیاً آہستہ دعا کرنا ادب اور تعظیم کا خاص پیمانہ ہے۔ اسی بنا پر بادشاہوں کے دربار میں آہستہ بولنا ادب ہے اور بلند آواز کرنا بے ادبی ہے۔ اگر اللہ کی بارگاہ بادشاہوں سے اعلیٰ و ارفع ہے اور آپ جانتے ہیں کہ اللہ دعا خفی کو سن لیتا ہے تو پھر بلا وجہ دعا میں آواز کو بلند کرنا خلاف ادب ہے۔

ثالثاً، آہستہ دعا کرنا خشوع و خضوع اور انکسار و نیازمندی میں بے حد معین و مددگار ہے اور دعا میں خشوع و خضوع ہی مقصود دعا ہے۔ منکسر و نیازمند آدمی مسکینوں کی طرح عجز و انکسار سے بھیک مانگتا ہے۔ انکسار کی یہ حالت آواز کی بلندی سے حاصل نہیں ہوتی ہے۔

رابعاً، آہستہ دعا ریاکاری سے بہت دور اور اخلاص کی بہت بڑی ضمانت ہے۔ اخلاص ہی دعا

کی جان ہے۔ قرآن میں دعا کے ساتھ اخلاص کی قید آئی ہے۔

خامساً، دعا میں آواز کی پستی، دل کی جمعیت فراہم کرنے کا بہت بڑا ذریعہ ہے۔ آواز کی بلندی میں فکری انتشار اور قوت واہمہ میں نیرنگی پیدا ہوتی ہے۔

سادساً، آہستہ دعا کرنا داعی کے لیے اللہ سے قرب کی نشانی ہے گویا آہستہ دعا کرنے والا اس طرح اللہ سے مانگتا ہے جیسے کوئی پاس اور نزدیک والا نزدیک والے سے چپکے سے مانگا کرتا ہے نہ کہ اس طرح جیسے کوئی دور سے پکار کر مانگ رہا ہو۔ اسی بنا پر اللہ سبحانہ نے حضرت زکریا کی دعا کی تعریف فرمائی اذ نادی ربہ نداء خفیا، قلب میں جب بھی اللہ کے قریب ہونے کا استحضار ہوگا اور پتہ ہوگا کہ اللہ سبحانہ ہر قریب سے بھی قریب تر ہے تو اس تصور کے نتیجہ میں دعا میں اخفا ہوگا۔ اسی کا نام مناجات ہے۔ مناجات کے معنے سرگوشی کرنا ہیں۔

سابعاً آہستہ اور آواز کی پستی کے ساتھ دعا طلب اور سوال میں دوام کا بہترین ذریعہ ہے۔ اس طرح نہ زبان تھکتی اور نہ اعضا میں درماندگی ہوتی ہے۔ اس کے برعکس بآواز بلند دعا میں زبان بھی تھک جاتی ہے اور قوت اعضا بھی جواب دے جاتی ہے۔

ثامناً، دعا میں آواز کی پستی انسان کو فکری تشویشات سے اور وساوس سے محفوظ رکھتی ہے۔ آواز پست ہوگی تو کسی کو پتہ نہ ہوگا کہ دعا کر رہا ہے اس طرح ہر قسم کی تشویش سے محفوظ رہے گی۔

تاسعاً، عظیم ترین نعمت توجہ الی اللہ، اس کی عبادت، اس کا ہو رہنا ہے اور دعا میں یہ سب انعامات موجود ہیں، اس نعمت سے بڑھ کر کوئی نعمت نہیں ہے۔ ہر نعمت کے ساتھ حاسدوں کی چشمک ایک طبعی چیز ہے۔ اس چشمک سے حفاظت کا واحد ذریعہ کہ دعا میں اخفا کیا جائے۔

عاشراً، دعا نام ہے مدعو کو یاد کرنے کا اور یاد بھی اس طرح کہ اس میں اس کے اسماء و صفات کے ذریعے مدعو کی ثنا و تحمید ہو اور دست طلب بھی دراز ہو اس حیثیت سے دعا اضافی چیز کے ساتھ ذکر بھی ہے۔ ذکر میں طلب کی آمیزش ہو اسی کو دعا کہتے ہیں۔ حضور انور کا ارشاد ہے افضل الدعاء الحمد للہ حالانکہ حمد صرف ثنا ہے لیکن حمد کے دامن میں محمود کی محبت اس کی ثنا ہوتی ہے اس لیے حمد کو دعا فرمایا ہے۔ ذکر اور دعا دونوں ایک دوسرے کو متضمن ہوتے ہیں۔ شاید اسی لیے قرآن نے دونوں میں ہم آہنگی رکھی ہے۔ دعا کے بارے میں یہاں فرمایا کہ ادعوا ربکم تضرعا وخفیہ اور ذکر کے متعلق اسی سورت کے آخر میں آرہا ہے۔

واذکر ربک فی نفسک تضرعاً وخیفة ودون الجہر من القول۔

اسی ہم آہنگی کی وجہ سے فقہاء نے دونوں کا حکم ایک بتایا ہے۔ ان شاء اللہ اس پر تفصیلی تبصرہ نویں پارے

میں آئے گی۔

یہاں آیت کا منشاء یہ ہے کہ جب خدا ہی آسمان و زمین کا خالق ہے اسی کے حکم سے ستارے گردش کر رہے ہیں۔ خلق اور امر سب اس کے اختیار میں ہے تو تمہاری پرستش کا حقدار بھی وہ ہی ہے اپنے اسی رب کو پکارو اسی سے پرستاری کے تعلقات و روابط قائم رکھو اور بس۔

پرستش میں راہِ اعتدال

۵۵۔ بے شک وہ حدود سے بڑھ جانے کو پسند نہیں کرتا۔ یعنی دُعا میں حدِ ادب سے نہ بڑھے۔ مثلاً جو چیزیں عادتاً یا شرعاً محال ہیں وہ مانگنے لگے یا معاصی اور لغو چیزوں کی طلب کرے یا ایسا سوال کرے جو اس کی شان و حیثیت کے مناسب نہیں۔ یہ سب اعتدار فی الدعاء میں داخل ہے[1]

اس آیت کی تشریح میں سارے شارحینِ قرآن نے یہی ایک بات فرمائی ہے کہ دُعا میں حد سے تجاوز نہ کرنا چاہیے اور اس کی مختلف شکلوں کی نشاندہی بھی فرمائی ہے۔ مثلاً یہ کہ

اولاً، یہ کہ شرعاً جو چیزیں عادۃً محال ہیں ان کو نہ مانگے۔

ثانیاً، یہ کہ معاصی اور لغو چیزوں کو دُعا میں نہ مانگے۔

ثالثاً، یہ کہ غیر اللہ سے نہ مانگے۔

رابعاً، یہ کہ دُعا میں تکلف اور سجع سے کام نہ لے۔

حضرت عبداللہ بن عباس سے بھی اس آیت کی تشریح میں یہی بات نقل کی گئی ہے کہ اعتدار سے دُعا میں اعتدار مراد ہے۔ ان بزرگوں کا یہ کہنا بالکل بجا اور درست ہے لیکن جیسا کہ پہلے بتا چکا ہوں کہ قرآن انسانوں کے سامنے دو چیزیں پیش کرتا ہے ایک یہ کہ پرستش صرف اللہ کی کی جائے، دوسرے یہ کہ بندگی اللہ کی کی جائے۔ اسی کا نام توحیدِ الوہیت اور توحیدِ عبادت ہے اور یہی انبیاءؑ کی بعثت کا مقصد ہے۔ ان آیات میں توحیدِ ربوبیت سے توحیدِ الوہیت پر استدلال کیا گیا ہے۔ ادعوا ربکم توحیدِ الوہیت میں پرستش کا عنوان ہے اور لا تعتدوا توحیدِ الوہیت میں بندگی کے لیے عنوان ہے۔ یہاں پرستش کو دُعا کے نام سے پیش کر کے فرمایا ہے کہ لا تعتدوا اس میں حد سے تجاوز نہ کرنا کہ اسی کے ہو کر رہ جاؤ اور بندگی کو بالکل نظر انداز کر دو۔ مذاہب کی تاریخ بتاتی ہے کہ پرستش میں اعتدار ہی سے رہبانیت نے جنم لیا ہے اور اس کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نتیجہ میں دین کا یہ تصور قائم ہوگیا کہ دنیا انسان کے لیے ایک قید خانہ ہے اس کا جسم اس کی روح کے حق میں ایک پنجرے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اور اس کے اندر جو مادی خواہشیں پائی جاتی ہیں وہ اس پنجرے کی تیلیاں ہیں۔ انسان نجات اسی وقت پا سکتا ہے جب وہ اس قید خانہ کی دیواروں کو خود اپنے ہاتھوں سے توڑ ڈالے اور اس پنجرے سے اپنی روح کو آزاد کرائے یعنی وہ دنیا چھوڑ دے، بستیوں سے دور جا نکلے اور کسی گوشے میں اپنے خدا سے لو لگا کر بیٹھ جائے۔ اپنی خواہشوں کو دبا کر کچل ڈالے۔ صرف اسی صورت میں اس کی روح کے اوپر سے وہ پردہ ہٹ سکتا ہے جو اسے خدا کے جلووں کے دیکھ پانے اور اس کی جناب تک رسائی حاصل کرنے سے روکے ہوتے ہے۔ اس لیے انسان کا فرض ہے کہ وہ ریاضتیں کر کے مایا کے اس جال سے باہر نکل جائے۔

دین اور خدا پرستی کا یہی نظریہ ہے جسے رہبانیت کہا جاتا ہے اور یہی پرستش میں اعتداء و غلو ہے۔ قرآن میں اللہ کا تصور صرف ایک مطلوب حقیقی کا تصور نہیں ہے اور صرف اللہ کی پرستش کا انسانوں سے مطالبہ نہیں کرتا بلکہ پرستش کے ساتھ ساتھ وہ اللہ کی بندگی کا بھی مطالبہ کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ اللہ کی ذات انسانوں کے لیے مطلوب و محبوب ہونے کے ساتھ حقیقی فرمانروا اور حقیقی قانون ساز بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ ترک دنیا نفس کشی اور گیان دھیان کے ذریعے خدا تک پہنچ جانے کا نظریہ اسی وقت صحیح ہو سکتا ہے جب کہ وہ انسان کا صرف مطلوب اور مقصود ہو اور اس کے سوا کچھ اور نہ ہو۔ لیکن جب حقیقت یوں نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ وہ اس کا فرمانروا اور قانون ساز بھی ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس کے لیے اس کے کچھ احکام اور قوانین بھی ہوں جن کی اسے اطاعت کرنی چاہیے۔ اسی کا نام اللہ کی بندگی ہے۔ اس بنا پر انسان کا کام صرف یہ نہیں ہے کہ وہ اللہ کے ذکر و فکر میں مشغول رہے یعنی صرف پرستش کرے بلکہ یہ بھی ہے کہ زندگی کے میدان میں آئے اور ان احکام و قوانین کی اطاعت کر کے فرمانبردار رعیت ہونے کا ثبوت دے اسی کا نام بندگی ہے۔ یہاں پرستش کے لیے دُعا کا عنوان قائم کرنے کے بعد انہ لا یحب المعتدین فرما کر اس بات پر تنبیہہ فرمائی ہے کہ پرستش میں اتنا حد سے تجاوز نہ کرنا کہ بس اسی کے ہو کر رہ جاؤ اور زندگی میں بندگی کا رشتہ ہاتھ سے جاتا رہے۔ یہی بات قرآن نے چھٹے پارے میں رہبانیت کا چہرہ پیش فرمانے کے بعد ان الفاظ میں پیش کی تھی۔

یاایہا الذین آمنوا لا تحرموا طیبات ما احل اللہ لکم ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین۔

اے اہل ایمان اللہ نے جو پاکیزہ چیزیں تمہارے لیے حلال کی ہیں انہیں حرام نہ کرو اور حد سے نہ بڑھو اللہ حد سے بڑھنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔

اس کا صاف اور واضح مطلب یہی ہے کہ بندگی کو نظر انداز کر کے صرف پرستش میں غلو قرآن کا منشا نہیں بقول حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی اسے دربنداری یا روحانیت کا ہیضہ کہنا چاہیے جسے رہبانیت کہتے ہیں۔ پرستش میں یہ اعتداء انتہائی انفرادیت اور خلوت چاہتا ہے جبکہ اسلام کی تعمیر جن پانچ ستونوں پر ہوئی ہے اور جن کو رسوم پرستش اور شعائر عبادت کہا جاتا ہے ان میں سے اکثر نماز، زکوٰۃ، حج کی ٹھیک ٹھیک بجا آوری کے لیے کسی نہ کسی قسم کی اجتماعیت ضروری ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ خلوت اور تنہائی کے گوشے میں اجتماعیت کا کوئی وجود نہیں ہوتا۔ غور فرمائیے جہاں اسلام کی عملی بنیادیں بھی ٹھیک طور سے نہ اٹھائی جا سکتی ہوں وہاں پورے اسلام کی تعمیر کس طرح ممکن ہو سکتی ہے۔

پرستش کی طرح خدا کی بندگی بھی لازمی ہے

لے ۔ اور ملک میں اس کی درستگی کے بعد بگاڑ برپا کر دو اور اسی کو پکارو ڈرتے ہوتے اور امید رکھتے ہوئے، یقیناً اللہ کی رحمت ۔ ۔ ان کے قریب ہے جو حسن کار ہوں۔ پچھلی آیتوں میں ہر حاجت کے لیے خدا کو پکارنے کا طریقہ بتلایا تھا۔ اس آیت میں مخلوق و خالق دونوں کے حقوق کی رعایت سکھائی۔ یعنی جب دنیا میں معاملات کی سطح درست ہو تم اس میں گڑبڑی نہ ڈالو اور خوف و رجا کے ساتھ خدا کی عبادت کرو۔ نہ اس کی رحمت سے مایوس ہو نہ اس کے عذاب سے مامون اور بے فکر ہو کر گناہوں پر دلیر بنو۔ میرے نزدیک یہی راجح ہے کہ یہاں وادعوہ میں دعا سے عبادت مراد ہے۔ جیسا کہ صلوٰۃ تہجد کے بارے میں فرمایا تتجافی جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفاً و طمعاً۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اپنے رب سے انحراف اختیار کر کے اس زمین میں فساد نہ برپا کرو۔ قرآن میں مختلف طریقوں سے یہ بات بتائی گئی ہے کہ اگر آسمان و زمین میں اللہ کے سوا کچھ اور الٰہ ہوتے تو یہ درہم برہم ہو کر رہ جاتے۔ یہ تو قائم ہی اس بنا پر ہیں کہ ان کے اندر اللہ کے ارادے کے سوا کسی اور ارادے کی کار فرمائی نہیں ہے۔ اس تکوینی توحید کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ بندے اپنے دائرۂ اختیار میں بھی اسی اللہ وحدہٗ لا شریک لہٗ کی عبادت و اطاعت کریں۔ کسی اور کو اس عبادت و طاعت میں شریک نہ بنائیں ورنہ اس زمین کا سارا نظام عدل و قانون درہم برہم ہو کر رہ جائے گا۔ اس کائنات کے قیام و بقا کے لیے جس طرح تکوینی توحید ضروری ہے اسی طرح اس زمین کے عدل کے لیے خدا کی قانونی و تشریعی توحید بھی ناگزیر ہے۔ خدا کے ملک میں کسی اور کو حاکم و الٰہ بنانا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کے ملک میں فساد و بغاوت برپا کرنا ہے جس سے بڑا کوئی جرم نہیں ہے۔ اسی کے مرتکب قرآن کی زبان میں اکابر مجرمین کہلاتے ہیں۔

اصلاح اور فساد دونوں کو مقابلے میں پیش کیا ہے۔ انسان کا خدا کی بندگی سے نکل کر اپنے نفس یا دوسروں کی بندگی اختیار کرنا اور خدا کی ہدایت کو چھوڑ کر اپنے اخلاق معاشرت اور تمدن کو ایسے اصول و قوانین پر قائم کرنا جو خدا کے سوا کسی اور کی رہنمائی سے ماخوذ ہوں۔ خواہ یہ فرد ہو یا افراد کا مجموعہ ہو۔ یہی وہ بنیادی فساد ہے جس سے زمین کے انتظام میں خرابی کی بے شمار مثالیں رونما ہوتی ہیں اور اسی فساد کو روکنا قرآن کا مقصود ہے۔

قرآن نے انسان کو عالم غیب میں نجات اور عالم شہادت میں ہدایت کے لیے الگ الگ طریقے بتاتے ہیں۔ عالم غیب یعنی آخرت میں نجات کے لیے اللہ کی پرستش کو ضروری قرار دیا ہے اور عالم شہادت میں ہدایت کے لیے اللہ کی بندگی کو اختیاری نہیں ضروری قرار دیا ہے۔ اسلام کی گاڑی ان ہی دو پہیوں سے چلتی ہے یہ دونوں اگر امت میں قائم ہیں تو امت پورے اسلام میں داخل ہے۔ یا ایھا الذین آمنوا دخلوا فی السلم کافۃ۔ اگر ان دونوں میں سے ایک بھی غلط ہو آخرت میں نجات کے لیے پرستش غیر اللہ کی کی جاتے۔ ذکر و فکر، نذر و نیاز، سجدہ و رکوع کے لیے اللہ کے لیے دوسرے سہارے تلاش کر لیے جائیں یا اخلاق معاشرت اور تمدن کے قوانین خدا کے سوا دوسروں کو ہدایت و رہنمائی سے لیے جائیں یہی اتباع خطوات الشیطان ہے جس سے قرآن نے باربار روکا ہے ولا تتبعوا خطوات الشیطان۔ ان دونوں ہی کو قرآن نے مکمل طور پر دنیا میں نافذ کرنے کا مسلمانوں کو حکم دیا ہے۔ ان میں سے ایک بھی غلط ہو تو یہ زمین کا فتنہ ہے۔

وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ۔

نبوت کی ہدایت و رہنمائی میں انسانی جان کی قتل سے مال کی چوری و غصب، لوٹ مار، ایمان کی شرک و کفر سے نسب ناموس کی زنا سے اور عقل کی مسکرات سے حفاظت کو علماء نے اصلاح سے تعبیر کیا ہے۔

یہاں قرآن نے بعد اصلاحھا فرما کر یہ بلیغ اشارہ کیا ہے کہ دنیا میں اور اخلاق معاشرت اور تمدن میں اصل چیز فساد نہیں بلکہ صلاح ہے۔ یہ نہیں کہ فساد پر صلاح عارض ہوتی ہے بلکہ صلاح پر فساد عارض ہوا ہے۔ فساد محض انسان کی جہالت اور سرکشی کا نتیجہ ہوتا ہے بالفاظ دیگر انسانی زندگی کا آغاز جہالت و نادانی، شرک و کفر اور اخلاقی آوارگی سے نہیں ہوا ہے جس کو دور کرنے کے لیے بعد میں بتدریج اصلاحات کی گئی ہوں بلکہ فی الواقع انسانی زندگی کی ابتداء علم و دانش، عبادت و طاعت اور اخلاق صالحہ سے ہوتی ہے کان الناس امۃ واحدۃ۔ بعد میں اس درست نظام کو غلط کار انسان اپنی حماقتوں اور شرارتوں سے

خراب کرتے رہے ہیں۔ اسی فساد کو مٹانے کے لیے اللہ کی جانب سے انبیاء علیہم السلام آتے رہے ہیں اور انہوں نے ہر زمانے میں انسانوں کو دعوت دی ہے کہ زمین کا انتظام جس اصلاح پر قائم کیا گیا اس میں فساد برپا نہ کرو۔

اس معاملہ میں قرآن کا نقطہ نظر ان لوگوں کے نقطہ نظر سے بالکل مختلف ہے جنہوں نے ارتقاء کا ایک غلط تصور لے کر یہ نظریہ قائم کیا ہے کہ انسان ظلمت سے نکل کر بتدریج روشنی میں آیا ہے اور اس کی زندگی بگاڑ سے شروع ہو کر رفتہ رفتہ بنی اور بنتی جارہی ہے۔ اس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ خدا نے انسان کو پوری روشنی میں زمین پر بسایا تھا اور ایک صالح نظام سے اس کی زندگی کی ابتداء کی تھی۔ پھر انسان خود شیطانی رہنمائی قبول کر کے بار بار تاریکی میں جاتا رہا اور اس صالح نظام کو بگاڑتا رہا اور خدا بار بار اپنے پیغمبروں کو اس غرض کے لیے بھیجتا رہا کہ انسان کو تاریکی سے روشنی کی طرف آنے اور فساد سے باز رہنے کی دعوت دیں[1]

صلاح کی حد تک یوں تو ہر مذہب انسانی زندگی کو ایک اخلاقی سانچہ میں ڈھالتا رہا اور افرادِ انسانی سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ اپنا اخلاقی رویہ تبدیل کریں لیکن قرآن اس بارے میں دیگر دساتیر و قوانین پر نمایاں فوقیت رکھتا ہے کیونکہ اس نے کردار و عمل کی اس صلاح کو جس کا مطالبہ ہر نظام میں موجود ہے انسان کی خانگی، عائلی اور معاشرتی زندگی کے محدود دائرے سے وسیع کر کے ساری زندگی پر محیط کر دیا ہے نیز اس نے صلاح کے اصولوں اور دینی اقدار و غایات کو انسان کی حیاتِ اجتماعی پر بھی پھیلا دیا ہے۔ جس میں اس کی سیاسی اور معاشی زندگی بھی شامل ہے۔ حالانکہ دوسرے نظاموں اور مذاہب نے صلاح کا صرف انفرادی اور معاشرتی تصور پیش کیا اور اصلاحی اصولوں کو زیادہ سے زیادہ سماجی اور عائلی زندگی تک وسعت حاصل کرنے کا موقع دیا۔ اس کے برعکس قرآن اپنے پیروؤں کو عالمِ انسانیت کی اجتماعی صلاح کا ذمہ دار قرار دیتا ہے اور ان سے تقاضا کرتا ہے ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحها کہ اپنی اس ذمہ داری کو پورا کرنے کے لیے ہیئتِ اجتماعی میں وہ تبدیلیاں عمل میں لائیں جن سے یہ ثابت ہو جائے کہ فساد پورے عالم سے ہٹ گیا۔

غرض کہ قرآن اس معاملہ میں صرف ایک طرزِ فکر کا داعی نہیں ہے جو انسان کی اجتماعی فلاح اور اس کے نظامِ اجتماعی کی صلاح سے بالکل بے تعلق ہو بلکہ خصوصیت کے ساتھ وہ ایک طریقِ عمل ہے جس کے مطابق اپنے گرد و پیش اور اپنے اجتماعی ماحول کو بدلتا ہے۔ تبدیلی کی اسی کوشش کا نام قرآن کی زبان میں اصلاح ہے اور اصلاح اسلامی زندگی کا اصل اصول اور ایمان و عمل کا حقیقی جوہر ہے۔ اگر فریضۂ اصلاح

[1] تفہیم القرآن

کو اسلامی زندگی سے خارج کر دیا جاتے تو پھر اسلام بھی کائنات کا ایک بے جان نظریہ بن کر رہ جاتا ہے۔ اگر قرآن حیاتِ اجتماعی میں اصلاح کا داعی نہ ہوتا اور محض انفرادی صلاح کو کافی خیال کرتا تو وہ مزاحمت اور کشمکش کیسے پیدا ہوتی جس کا مقابلہ کرنے کے لیے اہلِ ایمان سے جان و مال کی قربانی کا مطالبہ کیا گیا۔ محض انفرادی صلاح سے وہ منظم مخالفت کبھی رونما ہوتی جس کے لیے مسلمانوں کو عسکری زندگی اختیار کرنی پڑی۔

بہرحال یہ آیت بتا رہی ہے کہ مذہب کا اسلامی تصوّر اس راہبانہ طرزِ فکر کے بالکل مغائر ہے جس میں محض پرستش، ریاضت اور کشف و مراقبہ سے انسان اپنی شخصی نجات حاصل کر لیتا ہے کیونکہ شخصی نجات کا یہ طریقہ انسان کو کائنات خارجی میں اصلاح کی جدوجہد سے بے نیاز کر دیتا ہے حالانکہ قرآن انفس و آفاق میں مرضی الٰہی کے مطابق صرف صلاح نہیں بلکہ اصلاح چاہتا ہے کیونکہ ظاہر و باطن کائنات خارجی اور نفس انسانی دونوں ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا ہے۔ انسان کے اخلاقی امراض اس کے نفس اور خارجی ماحول کے تعامل سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ ان میں سے کسی ایک سے اس لیے ایک کو چھیڑنے اور دوسرے سے تغافل برتنے سے بیماری کے اسباب کبھی دور نہیں ہو سکتے ہیں۔ جب کبھی انسان پرستش و ریاضت میں مشغول ہو کر خارجی ماحول میں اصلاح کی ضرورت سے بے خبر ہوتا ہے اس کی سوسائٹی میں بداخلاقی، بدعملی کی وبا پھوٹ پڑتی ہے جس سے وہ خود اپنا دامن محفوظ نہیں رکھ سکتا ہے خواہ راہبانہ اتقا اور زاہدانہ پارسائی کے لحاظ سے وہ کتنا ہی بلند ہو۔ اسی طرح وہ جب بندگی کے شوق میں وہ بیرونی دنیا پر نظر جما کر محض خارجی ماحول کی اصلاح میں معاشرتی امراض کی دوا ڈھونڈتا ہے اور پرستش سے غفلت برتتا ہے بدی کی قوتیں بالکل غیر محسوس طور پر اس کے نفس میں پرورش پاتی رہتی ہیں اور بالآخر اپنے پورے زور و طاقت کے ساتھ خارج پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ یہاں تک کہ اس کی معاشرت اس کی سیاست اور اس کی معیشت کا گوشہ گوشہ ان کے اثرات سے مغلوب ہو جاتا ہے۔

آیت میں لا تفسدوا کے بعد فرمایا ہے وادعوہ خوفاً و طمعاً اللہ کو ڈرتے اور اُمید رکھتے ہوئے پکارو۔ بندگی کے بعد پھر پرستش کی تلقین کی گئی ہے۔ شارحین نے اسے تکرار محسوس کیا ہے لیکن فی الواقع یہ تکرار نہیں ہے بلکہ لا تفسدوا فی الارض، یعنی بندگی کو دو پرستشوں کے درمیان لا کر ایک تاریخی گمراہی کی طرف اشارہ کیا ہے پہلی گمراہی تو رہبانیت کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ اور دوسری گمراہی یہ رہی ہے کہ دنیوی معاملات اور مسائل اور ربانی زندگی میں انسان آزاد ہے کیونکہ عبادت فرد کا کام ہے جماعت کا نہیں۔ اس لیے دین بھی انسان اور خدا کے درمیان کا ایک نجی معاملہ ہے جو دنیا کے عام اجتماعی مسائل اور معاملات سے کوئی تعرض نہیں کرتا ہے نہ اسے کوئی تعرض کرنا چاہیے ان مسائل میں انسان کو اختیار ہے جو راستہ چاہے اختیار کرے

اور زندگی کا جو نظام چاہے اپنائے خدا اور مذہب کو اس سے کوئی بحث نہیں ہے۔ عیسائی پہلی کا اور یہودی اس دوسری بیماری کا شکار تھے۔ مولانا شیخ الاسلام کے الفاظ میں یہود کا لذات و شہوات دنیا اور حرام خوری میں انہماک جو تفریق فی الدین کا سبب ہوا اور نصاریٰ کا دین میں غلو و افراط جو آخر کار رہبانیت کی صورت اختیار کر گیا۔ ان دونوں کی تردید مقصود تھی اس لیے لا تفسدوا فی الارض کو ادعوا ربکم تضرعاً الخ اور وادعوہ خوفاً و طمعاً کے درمیان لائے اور بتا دیا کہ پرستش ذاتی اور انفرادی اصلاح اگر بندگی اجتماعی اصلاح سے بیگانہ ہو راہبانہ تصور ہے اور بندگی یعنی اجتماعی اصلاح اگر پرستش ذاتی اصلاح سے بیگانہ ہو تو الحاد ہے۔ اس طرح سمجھا دیا کہ اسلام صرف ایک نظری عقیدہ و فلسفہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک عظیم الشان اصلاحی قوت ہے جو اگر ایک طرف باطن میں نفس انسانی کی شرارتوں اور انسانی خواہشات کی بے قیدیوں کا مقابلہ کرتی ہے تو دوسری طرف ظاہر میں اپنے خارجی ماحول اور اپنی معاشرتی سیاسی زندگی کے مفسدات سے آمادہ پیکار رہتی ہے۔ پہلی آیت ادعوا ربکم تضرعاً الخ میں اگر خدا کو پکارنے کی ہیئت بتائی گئی ہے تو اس آیت میں وادعوہ خوفاً و طمعاً، خدا کو پکارنے کا محرک واضح کر دیا۔ اس مجموعہ سے شرک کی ہر نوع کی خواہ وہ پرستش میں ہو یا بندگی میں جڑ کٹ گئی ہے۔ تضرع استکبار کی ضد ہے۔ استکبار خدا سے بے پرواکرتا ہے۔ اگر اس کا سر کچل دیا جائے تو انسان میں احتیاج و نیازمندی پیدا ہوتی ہے اور نیازمندی کے ذریعے انسان اپنے رب سے قریب ہوتا ہے۔ نیازمندی کے دو پہلو ہیں ایک خوف اور دوسرے طمع۔ انسان کے اندرونی داعیات بھی ان ہی دو قسموں میں منقسم ہیں۔ اور اس کے خارجی عوامل و محرکات کا تجزیہ بھی یہی ہے کہ ہم اگر کچھ اندیشے رکھتے ہیں تو ساتھ ہی کچھ ارمان بھی رکھتے ہیں۔ یہاں پوری زندگی اندیشوں اور ارمانوں کی زندگی ہے قرآن نے ان دونوں حالتوں کے لیے توحید کا تقاضا یہ بتایا ہے کہ انسان ارمانوں اور اندیشوں میں صرف اللہ کو اپنا مرجع بنائے جو کچھ چاہے اس کے لیے بھی اللہ سے رجوع کرے اور جن سے اندیشہ محسوس کرے اس سے بچنے کے لیے بھی خدا ہی کی پناہ ڈھونڈے کیونکہ دینے والا بھی وہی ہے اور روکنے والا بھی وہی ہے۔

اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ پہلے فقرے میں جس چیز کو فساد سے تعبیر کیا تھا وہ دراصل یہی ہے کہ انسان پرستش اور بندگی میں خدا کے بجائے کسی اور کو اپنا ولی و سرپرست اور کارساز کا اقرار دے کر مدد کے لیے پکارے اور اصلاح اس کے سوا کچھ نہیں کہ انسان کی ہر پکار کا مرجع اللہ کی ذات ہی ہو جائے۔

خوف اور طمع کے ساتھ پکارنے کا مطلب یہ ہے کہ تمہیں خوف بھی اللہ سے ہو اور تمہاری امیدیں بھی وابستہ ہوں تو صرف اللہ سے ہوں۔ اللہ کو پکارو تو اس احساس کے ساتھ پکارو کہ تمہاری قسمت بالکلیہ اس کی نظر عنایت پر منحصر ہے فلاح و سعادت مل سکتی ہے تو صرف اس کی مدد اور رہنمائی سے مل سکتی ہے ورنہ

جہاں تم اس کی اعانت و عنایت سے محروم ہوتے تو پھر تمہارے لیے تباہی و نامرادی کے سوا کوئی دوسرا انجام نہیں ہے۔
آیت میں کچھ علماء نے تضرعاً و خفیۃ خوفاً و طمعاً" کو مفعول لہٗ قرار دیا ہے لیکن کچھ علماء کے خیال یہ حال ہیں۔ حافظ ابوالقاسم السہیلی نے بھی اسی کو اپنایا ہے اور حافظ ابن القیم نے اسی کی صحت پر مہرِ تصدیق ثبت کی ہے مطلب یہ ہے کہ لوگو! اپنے رب کو پکارو گڑگڑا کر خوف اور امید کی حالت میں۔
آخر میں فرمایا، رحمۃ اللّٰہ قریب من المحسنین، اللہ کی رحمت حسن کاروں کے قریب ہے۔ علماء نے رحمت کی رعایت سے قریب بر خبر نہ لانے پر خوب دادِ تحقیق دی ہے۔ حافظ ابن القیم نے اس پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے لیکن ہم ناظرین کو اس خشک بحث میں الجھانا نہیں چاہتے ہیں بلکہ ہم چاہتے ہیں کہ آیت کا صحیح منطوق ہدیہ ناظرین کریں۔ ارشاد میں بتایا گیا ہے کہ اللہ کی رحمت خوب کار اور حسن کاروں سے بہت قریب ہوتی ہے۔ عام خیال تو یہی ہے کہ مقامِ احسان پر فائز ہونے کے لیے ضروری ہے کہ انسان بیم و رجا دونوں حالتوں میں اپنے رب کی طرف متوجہ ہو۔ لیکن اس صورت میں اس فقرہ کا تعلق صرف وادعوہ خوفاً و طمعاً" سے ہوگا۔ ہماری رائے میں اس فقرہ کا تعلق پوری آیت سے ہے اور بتایا یہ جارہا ہے کہ حسن کار وہ لوگ ہیں جن کے پرستش اور بندگی دونوں قسم کے تعلقات اللہ سے ہوں۔ اللہ کے سوا کسی سے نہ ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ پرستش و بندگی دونوں کا مجموعہ وہ خوب کاری ہے جس کا تم سے مطالبہ کیا جارہا ہے۔ اس کے جواب میں تمہارا مطلوب اللہ سے صرف اس کی رحمت ہے اور یہ واقعہ اور حقیقت ہے کہ اللہ کی رحمت ان خوب کاروں کے قریب ہوتی ہے جو ماموری بجا آوری کرتے ہیں۔ یہ آیت منطوق کے اعتبار سے بتارہی ہے کہ اللہ کی رحمت حسن کاروں کے قریب ہوتی ہے۔ اور مدلول کے اعتبار سے کہہ رہی ہے کہ رحمت کے قریب ہونے کی وجہ احسان ہے اور مفہوم کے اعتبار سے بتارہی ہے کہ جو محسن نہیں ہوتے وہ رحمت سے دور ہوتے ہیں۔ اور یہ بھی اشارہ ہو رہا ہے کہ قرآن کی دعوت کی راہ میں کتنی مشکلات پیش آئیں لیکن اس کی کامیابی اٹل ہے۔ اور اہلِ ایمان کو اس بارے میں تنگ دل نہ ہونا چاہیے کیونکہ خدا کی رحمت نیک کرداروں سے دور نہیں ہے۔

وَهُوَ الَّذِي يُرْسِلُ الرِّيٰحَ بُشْرًا بَيْنَ يَدَيْ رَحْمَتِهٖ حَتّٰٓى
إِذَآ أَقَلَّتْ سَحَابًا ثِقَالًا سُقْنٰهُ لِبَلَدٍ مَّيِّتٍ فَأَنْزَلْنَا بِهِ الْمَآءَ
فَأَخْرَجْنَا بِهٖ مِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۚ كَذٰلِكَ نُخْرِجُ الْمَوْتٰى لَعَلَّكُمْ
تَذَكَّرُوْنَ ۞ وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْرُجُ نَبَاتُهٗ بِإِذْنِ رَبِّهٖ ۚ وَالَّذِي
خَبُثَ لَا يَخْرُجُ إِلَّا نَكِدًا ۚ كَذٰلِكَ نُصَرِّفُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ
يَّشْكُرُوْنَ ۞

اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت کے آگے خوشخبری کی خاطر
روانہ کرتا ہے۔ پھر جب وہ ہوائیں پانی سے بھاری بھر کم بادلوں کو
اٹھا لیتی ہیں تو ہم انہیں کسی بستی کی طرف ہانک دیتے ہیں پھر بارش
برسا کر اس زمین سے قسم قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ اسی طرح ہم
روزِ قیامت مردوں کو قبروں سے نکال لیں گے شاید تم اس
نظارے سے نصیحت حاصل کر لو۔ جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ اپنے

رب کے حکم سے خوب سبزہ اُگاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا۔ اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کو ان لوگوں کے لیے بار بار پیش کرتے ہیں جو خدا کے شکر گزار ہیں۔[۵۸]

معانی مفردات

ریاح ، ہوائیں ریح کی جمع ، واضح رہے کہ قرآن مجید میں جہاں ارسال ریح کا تذکرہ ہے اگر بلفظ جمع ہے یعنی ریاح کا لفظ استعمال ہوا ہے وہاں عام طور پر رحمت کی ہوائیں مراد ہیں - اور اگر ریح یعنی واحد کا لفظ استعمال ہوا ہے تو عذاب کے معنے مراد ہیں - علامہ سیوطی ”اتقان فی علوم القرآن“ میں رقمطراز ہیں کہ :

اسی قاعدہ سے ریح ہے کہ وہ بصورت جمع بھی قرآن میں آئی ہے اور مفرد ہو کر بھی - جہاں وہ سیاق رحمت میں آئی ہے جمع ہو کر استعمال ہوئی ہے اور جہاں عذاب کا ذکر ہے وہاں مفرد آئی ہے - ابن ابی حاتم نے حضرت ابی بن کعب کے حوالہ سے بتایا ہے کہ قرآن میں ریاح سے ہر جگہ رحمت اور ریح سے ہر جگہ عذاب مراد ہے اسی لیے ارشاد نبوت ہے اللھم اجعلھا ریاحا ولا تجعلھا ریحا ”اے اللہ اسے ہوائیں بنا ہوا نہ بنا - اور اس کی حکمت یہ بتائی گئی ہے کہ رحمت کی ہواؤں کی صفات اور منفعتیں مختلف ہوتی ہیں جب بھی ان میں سے کوئی ہوا چلتی ہے تو اس کے مقابل سے ایسی چیز نمایاں ہو جاتی ہے جو اس کے زور کو توڑ دے اور پھر ان دونوں کے درمیان سے ایسی ہوائے لطیف اٹھتی ہے جو حیوان ، نباتات دونوں کو نفع دیتی ہے اس لیے رحمت تو کئی ہوائیں ہیں اور عذاب کے اندر ہوا ایک ہی رخ پر آتی ہے نہ ان کو روکنے والا کوئی ہوتا ہے نہ دفع کرنے والا - اقلت ، اقلال سے فعل ماضی کا واحد مونث ہے اس کے معنے کسی چیز کو اس طرح اٹھا لینا ہے گویا اس میں کوئی وزن نہیں ہے - اس معنے میں کہ ہواؤں نے اسے اٹھایا اور اپنی قوت کے لحاظ سے اسے قلیل پایا - اس کے استعمال میں اشارہ ہے کہ ہواؤں میں کس قدر

طاقت ہے جو لاکھوں کروڑوں من پانی کا بوجھ اٹھاتے پھرتی ہیں۔

ایک معنیٰ خیز تمثیل

پچھلی آیات میں استوار علی العرش کے فلکیات چاند سورج وغیرہ میں جو خدائی تصرفات ہیں ان کا بیان تھا درمیان میں بندوں کو کچھ ہدایات دی گئیں اب سفلیات اور کائنات الجو کے متعلق اپنے بعض تصرفات کا ذکر فرماتے ہیں تاکہ لوگ معلوم کرلیں کہ آسمان و زمین اور ان دونوں کے درمیانی حصہ کی کل حکومت صرف اسی رب العالمین کے قبضہ و قدرت میں ہے۔ ہوائیں چلانا، مینہ برسانا، قسم قسم کے پھول پھل پیدا کرنا، ہر زمین کی استعداد کے موافق کھیتی اور سبزہ اگانا یہ سب اسی کی قدرت کاملہ اور حکمت بالغہ کے نشان ہیں۔ اسی ذیل میں مردوں کا موت کے بعد جی اٹھنا اور قبروں سے نکلنا بھی سمجھادیا۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ایک تو مردوں کا نکلنا قیامت میں ہے ایک دنیا میں جاہل ادنیٰ لوگوں میں (جو جہالت و ذلت کی موت سے مرچکے تھے) عظیم الشان نبی بھیجا اور انہیں علم دیا اور دنیا کا سردار کیا۔ پھر ستھری استعداد والے کمال کو پہنچے اور جن کی استعداد خراب تھی ان کو بھی فائدہ پہنچ رہا ناقص سا۔ گویا اس پورے رکوع میں بتادیا کہ جب خدا اپنی رحمت و شفقت سے رات کی تاریکی میں ستارے چاند سورج سے روشنی کرتا ہے اور خشکی کے وقت زمین کو سرسبز و شاداب کرنے اور انسان و حیوان کی زندگی کا سامان مہیا فرمانے کے لیے اوپر سے بارش بھیجتا ہے یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ ایسا مہربان خدا اپنی مخلوق کو جہل و ظلم کی تاریکیوں سے نکالنے کے لیے کوئی چاند اور سورج پیدا نہ کرے۔ اور بنی آدم کی روحانی غذا تیار کرنے اور قلوب کی کھیتیوں کو سیراب کرنے کے لیے باران رحمت نازل نہ فرمائے۔ بلاشبہ اس نے ہر زمانے کی ضرورت اور اپنی حکمت کے موافق پیغمبروں کو بھیجا جن کے منور سینوں سے دنیا میں روحانی روشنی پھیلی اور وحی الٰہی کی لگاتار بارشیں ہوئیں۔ چنانچہ آئندہ کئی رکوعوں میں ان ہی پیغمبروں کے بھیجنے کا ذکر ہے اور جیساکہ بارش اور زمین کی مثال میں اشارہ کیا گیا کہ مختلف زمینیں اپنی اپنی استعداد کے مطابق بارش کا اثر قبول کرتی ہیں اسی طرح سمجھ لو کہ انبیاء علیہم السلام جو خیر و برکت لے کر آتے ہیں اس سے منتفع ہونا بھی حسن استعداد پر موقوف ہے۔ جو لوگ ان سے انتفاع نہیں کرتے یا پورا انتفاع نہیں کرتے انہیں اپنی سوء استعداد پر رونا چاہیے۔

باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید و در شور بوم خس

۵۷۔ اور وہی ہے جو ہواؤں کو اپنی رحمت سے آگے خوشخبری کی خاطر روانہ کرتا ہے۔ رحمت سے مراد یہاں بارش ہے۔ یہی عام شارحین قرآن کی رائے ہے۔ ریاح ریح کی جمع ہے ہوا کو کہتے ہیں۔ ہوا اللہ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے، اس کا ہونا ہر جاندار کی زندگی کی ناگزیر ضرورت ہے۔ اگر نہ ہو تو کوئی جاندار انسان ہو یا کوئی اور آنکھ جھپکنے میں موت کا نوالہ بن جائے۔ ہوا کی ساری افادیت اس کے متحرک ہونے پر ہے اہل عرب کے یہاں ہوائیں چار ہیں۔ شمال، جنوب، صبا اور دبور۔ اہل عرب کی روایتی تاریخ میں یہ بات مسلم ہے کہ بارش کے لیے ایک ہوا نہیں بلکہ چاروں ہوائیں مل کر کام کرتی ہیں۔ صبا کا کام ہے بادلوں کو بنانا شمال کا کام ہے ان کو جمع کرنا، جنوب کا کام ہے برسانا اور دبور کا کام ہے ان کو منتشر کر دینا۔ یاد رہے کہ یہ صرف عرب کا اپنا تجربہ ہے ورنہ مختلف ممالک میں ہواؤں کے کام میں اختلاف ہے عربی مذاق کی رعایت سے ریاح جمع لے کر آیا ہے اور چونکہ بارش کا سامان ہوا نہیں بلکہ ہوائیں کرتی ہیں اس لیے ریاح کو خوش آئند سمجھا گیا ہے۔ حضور انور اسی معنے کے اعتبار سے یہ دعا فرماتے ہیں:

اللّٰھم اجعلھا ریاحاً ولا تجعلھا ریحاً

بارش جس پر تمام دنیا کی زندگی کا انحصار ہے ممکن نہیں ہے کہ کوئی ایک قطرہ اس کا زمین پر ٹپکا دے یہ خدا ہی ہے جو پہلے مانسون لانے والی ہوائیں چلاتا ہے پھر کچھ ہوائیں بطور مقدمۃ الجیش آگے آگے ٹھنڈی بارش کی خوشخبری لے کر آتی ہیں۔ اور بقول حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ العزیز، اللہ سبحانہٗ کی عام عادت یہ ہے کہ بارش سے پہلے ایسی ٹھنڈی ہوائیں بھیجتے ہیں جن سے خود بھی انسان کو راحت و بشاشت ہوتی ہے اور وہ گویا آنے والی بارش کی خبر بھی پہلے دے دیتی ہیں اس لیے یہ ہوائیں دو نعمتوں کا مجموعہ ہیں۔ خود بھی انسان اور عام مخلوقات کے لیے نافع اور مفید ہیں اور بارش کے آنے سے پہلے بارش کی خبر بھی دے دیتی ہیں کیونکہ ایک لطیف اور نازک مخلوق ہے کہ اس کی بہت سی ضروریات بارش کی وجہ سے بند ہو جاتی ہیں۔ جب بارش کی اطلاع کچھ پہلے مل جاتی تو وہ اپنا انتظام کر لیتا ہے اس کے علاوہ خود اس کا وجود، اس کا سامان بارش کا متحمل نہیں وہ بارش کے آثار دیکھ کر پہلے ہی تیاری کر لیتا ہے۔

مُردہ زمین کی سیرابی

۵۸۔ پھر جب وہ ہوائیں پانی سے بھاری بھر کم بادلوں کو اٹھاتی ہیں تو ہم انہیں کسی مردہ بستی کی طرف ہانک دیتے ہیں پھر بارش برسا کر زمین سے قسم قسم کے پھل نکالتے ہیں۔ اقلال کے معنے

کسی چیز کو اٹھا لینا ہے۔ سحاب سحابہ کی جمع ہے۔ اس میں اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت اور حکمت بالغہ کی طرف توجہ دلائی ہے کہ دیکھو کس طرح ہوائیں بوجھل بادلوں کو اٹھا لیتی ہیں گویا وہ روئی کے گالے ہیں۔ اور پھر بوجھ بھی نہیں کہ جدھر چاہتے ہیں ان کو ہانک کرلے جاتے ہیں اور جس جگہ چاہتے ہیں جل تھل کر دیتے ہیں کسی کی طاقت نہیں کہ ان کو اپنے پسند کردہ رُخ پر موڑ سکے۔

اصل ارشاد میں بلد میت آیا ہے مرا ہوا شہر، مرے ہوئے شہر سے وہ بستی مراد ہے جو پانی نہ ہونے کی وجہ سے ویران ہوتی ہے۔ اور بجائے زمین کے خصوصیت سے بستی کا ذکر اس لیے ہوا ہے کہ اصل مقصد بارش اور اس سے زمین کی سیرابی کا انسانی ضروریات کی ہم رسانی ہے۔ ظاہر ہے کہ انسانوں کے رہنے کی جگہ شہر اور بستی ہے ورنہ جنگل کی سرسبزی خود کوئی مقصد نہیں ہے۔

یہ صحیح ہے کہ بارش زمین کی شادابی اور روئیدگی کا ذریعہ ہے اگر یہ نہ ہو تو زمین کی روئیدگی بھی نہ ہو لیکن بارش کیسی ہوتی ہے اور کس طرح مقررہ اندازوں اور پیمانوں کا ایک پورا انتظام کام کر رہا ہے۔ پہلے سمندر سے بھاپ اٹھتی ہے اور پانی کے ذروں سے باردار ہو کر بلندی کی طرف چڑھتی ہیں۔ پھر بلندی پر سحاب ابر کی چادریں بنتی ہیں اور چادریں فضا میں پھیل جاتی ہیں۔ پھر وہی چادریں بارش کے قطرے بن کر گرنے لگتی ہیں اور زمین کے ایک ایک کونہ کو شاداب کر دیتی ہیں۔ لوگ پانی کے ذخیرے جمع کر کے نہیں رکھتے لیکن آسمان ہمارے لیے جمع کرتا رہتا ہے اور پھر انسانی و حیوانی ضروریات کے مطابق بارش کا عطیہ اللہ کی جانب سے اتار دیتا ہے۔ یہ بات کہ ہوائیں پانی کا ذخیرہ بھاری بھرکم بادلوں کی صورت میں اٹھاتی ہیں استدلال کا اصلی نقطہ ہے کیونکہ تقدیر و تنظیم کی یہ حالت بغیر اس کے نہیں ہو سکتی کہ ربوبیت کا کوئی ارادہ پس پردہ کام کر رہا ہے۔

اس کے بعد فرمایا فانزلنا بہ الماء فاخرجنا بہ من کل الثمرات یعنی صرف اتنی بات نہیں کہ پانی کے وافر ذخیرے بادلوں کے ذریعے اٹھائے جاتے ہیں بلکہ یہ بھی ہو رہا ہے کہ ایک خاص انتظام ایک خاص ترتیب کے ساتھ تقسیم ہو رہا ہے اور اس کے ذریعے زندگی کی ضروریات فراہم ہو رہی ہیں۔ پانی جیسا جوہر حیات پیدا کرنا اگر اللہ کی رحمت ہے لیکن یہ اس کی ربوبیت ہے جو پانی کو ایک ایک بوند کر کے ٹپکاتی۔ زمین کے ایک ایک گوشہ تک پہنچاتی ایک خاص مقدار اور حالت میں تقسیم کرتی۔ ایک خاص موسم اور محل میں برساتی اور زمین کے ایک ایک تشنہ ذرے کو ڈھونڈ کر سیراب کر دیتی ہے۔

تذکیر بالیوم الآخر

۸۰۔ اسی طرح ہم مردوں کو قبروں سے نکال لیں گے شاید تم اس نظارے سے نصیحت حاصل کر لو۔ اصل

ارشاد میں کذالک آیا ہے ذالک اسم اشارہ ہے یعنی جیسے ہم زمین سے پیداوار کرتے ہیں ایسے ہی ہم زمین سے مُردوں کو نکال لیں گے یا جیسے ہم مردہ زمین میں زندگی پیدا کرتے ہیں ایسے ہی زمین میں دبے ہوئے مُردوں میں زندگی پیدا کر دیں گے۔ جس اللہ کی یہ نشانیں روزانہ تمہارے مشاہدے میں آ رہی ہیں مُردوں کو زندہ کرنا اس کی قدرت سے کیوں بعید سمجھتے ہو۔ ہم نے یہ نشانیاں زمین میں نمایاں ہی اس لیے کی ہیں کہ ان آثار سے تم آخرت کے لیے یاددہانی اور نصیحت حاصل کرو۔ مطلب یہ ہے کہ جب مُردہ زمین سے تم زندہ سبزیاں اُگتے دیکھ رہے ہو اور اس پر تمہیں کبھی حیرت نہیں ہوتی تو اس پر حیران کیوں ہو۔ نباتات کی زندگی اور جاندار کی زندگی میں فرق کیا ہے۔ دونوں جگہ اللہ سبحانہٗ کی قدرت کاملہ کام کر رہی ہے۔

آیات کی اس اجمالی تشریح کے بعد اس تمثیل کی معنویت کا بھی مطالعہ فرمالیجئے۔ سُورت کے آغاز سے یہاں تک تین مرکزی موضوع بیان ہوئے ہیں۔ ایک توحید دوسرے رسالت اور تیسرے آخرت۔ یہ آیت ان تینوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے اور اس آیت میں پیش کردہ تمثیل کے ذریعہ قرآن نے تینوں کو سمجھایا ہے۔

تمثیل سے توحید کی وضاحت

آیت میں توحید الٰہیت کو سمجھانے کے لیے بتایا ہے کہ خوف وطمع دونوں ہی حالتوں میں یگانہ خدا کی طرف رجوع کرنا چاہیے۔ کیونکہ رحمت ہمیشہ اللہ ہی کی طرف سے آتی ہے۔ بارش جس پر تمام دُنیا کی زندگی کا انحصار ہے۔ یہ خدا ہی کی کارفرمائی ہے جو پہلے مانسون لانے والی ہوائیں چلاتا ہے جو بوجھل بادلوں کو اپنے کاندھوں پر اٹھا لیتی ہیں پھر خدا ان کو بے آب وگیاہ علاقوں کی طرف ہانک دیتا ہے اور وہاں ان سے پانی برسا دیتا ہے جس سے ہر قسم کے پھل اور ہر قسم کی فصلیں پیدا ہوتی ہیں۔ اللہ کے سوا کون ہے جو ساری دُنیا کی پرورش کر رہا ہے اور جس نے پرورش کا یہ نظام بنایا۔ اس کے سوا کون اس کا مستحق ہے کہ بندگی و نیاز کا سر اس کے آگے جھکایا جائے۔

تمثیل سے رسالت کی وضاحت

اسی طرح اس تمثیل سے انسانی سعادت و شقاوت کے معنوی قوانین اور وحی و رسالت کی ضرورت کو بھی سمجھایا ہے۔ رسُول کی آمد اور خدائی تعلیم کے نزول کو بارانی ہواؤں کے چلنے اور ابر رحمت کے چھا جانے اور امرت بھری بوندوں کے برسنے سے تشبیہ دی گئی ہے۔ اگر اللہ کی ذات رب العالمین ہے

اور اس کی ربوبیت کا یہ حال ہے کہ ہر ذرہ کی سیرابی اور ہر چھوٹی سے چھوٹی شے کی کارسازی رکھتی ہے تو یہ کیوں کر ممکن ہے کہ انسان کی روحانی سعادت کے لیے اس کے پاس سیرابی کا کوئی سامان نہ ہو۔ اس کی پروردگاری اجسام کی پرورش کے لیے آسمان سے پانی برساتی ہے لیکن روحوں کی پرورش کے لیے ایک قطرہ فیض کا بھی انتظام نہیں کرتی۔ تم دیکھتے ہو کہ جب زمین شادابی سے محروم ہو کر مردہ ہو جاتی ہے تو یہ اس کا قانون ہے کہ باران رحمت نمودار ہوتی ہے اور زندگی کی برکتوں سے زمین کے ایک ایک ذرّے کو مالامال کر دیتی ہے۔ پھر کیا یہ ضروری نہیں ہے کہ جب عالم انسانیت ہدایت و سعادت کی شادابیوں سے محروم ہو جائے تو اس کی باران رحمت متوجہ ہو کر ایک ایک روح کو پیام زندگی پہنچائے۔ روحانی سعادت کی یہ بارش کیا ہے۔ یہ نبوت و رسالت اور وحی الٰہی ہے۔ تم اس منظر پر کبھی حیران نہیں ہوتے ہو کہ بارش ہوئی اور مردہ زمین زندہ ہو گئی۔ پھر اس بات پر کیوں چونکتے ہو کہ وحی الٰہی آئی اور مردہ روحوں میں زندگی کی جنبش آ گئی۔ اس آیت میں بارش کے ذریعہ سے مُردہ پڑ ہوئی زمین کے یکایک جی اُٹھنے اور اس کے بطن سے زندگی کے خزانے اُبل پڑنے کو نبوت و رسالت بطور مثال پیش کیا ہے جو نبی کی تعلیم و تربیت اور رہنمائی سے مردہ پڑی ہوئی انسانیت بال اُٹھنے اور اس کے سینے سے بھلائیوں کے خزانے ابل پڑنے کی صورت میں ظاہر ہو ہے۔ اور آیت میں لفظ رحمت کہہ کر اشارہ کر دیا ہے کہ جیسے بارش رحمت مادی ہے ایسے ہی نبوت و وحی رحمت معنوی ہے۔ معنوی ہدایت کے لیے نبوت کا خدا کی جانب سے ایسا ہی فیضان ہے جیسے جسمانی تربیت کے لیے خدا کی جانب سے باران رحمت کا فیضان ہے۔ بالفاظ دیگر خدا کی ربوبیت اور رحمت دونوں کا تقاضا ہے کہ انسان کی مادی اور جسمانی تربیت کی طرح انسان کی روحانی اور معنوی ہدایت کا سامان ہو۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے جا بجا نزول وحی، ترسیل کتب اور بعثت انبیاء کو رحمت سے تعبیر کیا ہے۔ خصوصیت کے ساتھ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں رحمت عالمین کہا ہے۔

تمثیل سے معاد کی وضاحت

اسی بارش کی تمثیل سے اس بات کی طرف توجہ دلائی ہے کہ جس طرح تم دیکھتے ہو کہ بارش بھیج کر ایک بالکل مردہ اور بے آب و گیاہ زمین کو ہم از سر نو زندہ کر دیتے ہیں اسی طرح ایک دن ہم تمام مُردوں کو زندہ کر دیں گے۔ گویا مُردہ زمین کی شادابی یقین دلا رہی ہے کہ موت کے بعد دوبارہ زندگی ہے۔ جس طرح بارش کی مقررہ گھڑی تمام اجسام نباتی کو موت کی حالت سے زندگی کی حالت میں لے آتی ہے ضروری ہے کہ

نوع انسانی کے لیے بھی ایک ایسی مقررہ گھڑی ہو۔ قرآن کی اس تمثیل سے معلوم ہوتا ہے کہ قیامت اور مُردوں کے دوبارہ زندہ ہونے کا معاملہ بھی موسموں کی تبدیلی کا سا معاملہ ہے۔ دنیا میں ہم دیکھتے ہیں خزاں بہار۔ خشک سالی و سیرابی، گرمی و سردی کے مختلف موسم آتے رہتے ہیں۔ اسی طرح تبدیل کائنات کا بھی ایک موسم ہے۔ اور ہمارے سال کی طرح اس کا بھی کوئی سال اور ہماری روز شماریوں کی طرح اس کی بھی کوئی روز شماری ہے لیکن ہم اپنی تقویم پر جو کائنات کے صرف ایک حقیر کرے کی سیر و گردش کا نتیجہ ہے اس کی تقویم کو قیاس نہیں کر سکتے اس کی مدت کوئی بڑی ہی طولانی مدت ہے اتنی طولانی کہ ہماری وقت شماری کا پچاس ہزار سال اور اس کا صرف ایک دن۔ سورج معارج میں ہے تعرج الملائکۃ فی یوم کان مقدارہ خمسین الف سنۃ، ہمارے سال کے موسموں کی طرح اس کا بھی ایک موسم ختم ہوتا اور دوسرا موسم شروع ہوتا ہے۔ یہاں جب حیاتِ ارضی کا موسم آیا تو اس کی محرک اول بارش ہوتی ہے۔ بارش گرتی ہے اور اموات نباتات کو زندگی مل جاتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح جب سال کائنات کا وہ مقررہ موسم آئے گا تو بارش ہی زندگی کی کوئی صورت ہوگی۔ فاذا نفخ فی الصور، اور بہ مجرد حکم تمام اموات انسانی اٹھ کھڑی ہوں گی۔ گویا بارش یہ یقین دہانی کرا رہی ہے کہ یہ کارخانہ حکمت بغیر کسی مصلحت و حکمت کے نہیں ہو سکتا اور ضروری ہے کہ انسان کی زندگی صرف اتنی نہ ہو کہ پیدا ہوا کھایا پیا اور فنا ہو گیا بلکہ اس کے بعد بھی کچھ نہ کچھ ہونے والا ہے۔

اللہ اکبر کیا بلاغت قرآنی ہے کہ صرف ایک بارش کی تمثیل سے توحید معاد اور رسالت کے حقائق آشکارا ہو گئے۔ گویا سورت کے آغاز سے یہاں تک جو مسائل زیر بحث آئے تھے اصولاً وہ سب ہی سامنے آگئے

فیض بقدرِ استعداد ہوتا ہے

۵۸۔ اور جو زمین اچھی ہوتی ہے وہ رب کے حکم سے خوب سبزہ اگاتی ہے اور جو زمین خراب ہوتی ہے اس سے ناقص پیداوار کے سوا کچھ نہیں نکلتا، اسی طرح ہم اپنی نشانیوں کو ان لوگوں کے لیے بار بار پیش کرتے ہیں جو خدا کے شکر گزار ہیں۔ اس آیت میں بارش ہی کو موضوع بنا کر اس اہم مادی قانون کی طرف توجہ دلائی ہے کہ بارش سے صرف وہی زمین فائدہ اٹھا سکتی ہے جس میں اس کی استعداد ہو۔ شور زمین پر کتنی ہی بارش ہو سرسبز نہ ہوگی۔ اسی طرح وحی و نبوت کی صورت میں جو رحمت اللہ کی جانب سے آتی ہے اس کا فیض بھی ہر شخص کو یکساں نہیں پہنچے گا بلکہ استعداد اور صلاحیت کے اعتبار سے پہنچے گا جن کی فطری صلاحیتیں زندہ ہیں وہ تو باغ و چمن کی طرح لہلہا اٹھیں گے لیکن جنہوں نے اپنی صلاحیتیں ضائع کر دی ہیں۔ ان سے عناد و عداوت کے خار و خس کے سوا اور کسی چیز کی توقع نہ رکھو مطلب یہ ہے

کہ جس طرح بارش کے نزول سے یہ ساری برکتیں صرف اسی زمین کو حاصل ہوتی ہیں جو حقیقت میں زرخیز ہوتی ہے اور محض پانی نہ ملنے کی وجہ سے جس کی صلاحیتیں دبی رہتی ہیں اسی طرح رسالت کی ان برکتوں سے بھی وہی لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں جو حقیقت میں صالح ہوتے ہیں اور جن کی صلاحیتوں کو محض رہنمائی نہ ملنے کی وجہ سے نمایاں ہونے اور برسرکار آنے کا موقعہ نہیں ملتا۔ رہے شرارت پسند اور خبیث قسم کے لوگ تو جس طرح شوریلی زمین باران رحمت سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتی بلکہ پانی پڑتے ہی اپنے پیٹ کے چھپے ہوئے زہر کو کانٹوں اور جھاڑیوں کی صورت میں اگل دیتی ہے۔ اسی طرح رسالت کے ظہور سے انہیں بھی کوئی فائدہ نہیں پہنچتا بلکہ اس کے برعکس ان کے اندر دبی ہوئی تمام خباثتیں ابھر کر پوری طرح برسرکار آجاتی ہیں۔

زمیں شورہ سنبل بر نیارد

درو تخم عمل ضائع مگردان

کتنی اہم حقیقت ہے جس کی وضاحت کے لیے ایک ایسی مثال بیان کی جو ہر انسان کے علم و مشاہدے میں آتی رہتی ہے۔ اللہ اکبر یہ بات کہ فیض بقدر استعداد حاصل ہوتا ہے فاعل کی قوت فاعلی سب کے لیے یکساں ہے لیکن مفعول میں قابلیت انفعال جدا جدا ہے۔ اس نازک اور دقیق حقیقت کے لیے کیسی صاف اور عام الورود مثال بیان فرمائی کہ جس کے معائنہ سے کوئی انسانی نگاہ بھی محروم نہیں فرمایا کہ جب پانی برستا ہے تم دیکھتے ہو کہ سب جگہ یکساں برستا ہے لیکن زمین کے کچھ حصے شاداب اور گل ریز ہو جاتے ہیں اور کچھ میں خار کے سوا کچھ نہیں اُگتا۔ پانی کی فاعلی قوت برابر ہے لیکن زمین کی انفعالی قابلیت یکساں نہیں ہے اسی طرح نبوت کے بادل سے وحی الٰہی کی بارش ہوتی ہے۔ کچھ قلوب تو موسم بہار کے پھول بن کر سامنے آتے ہیں اور کچھ عناد و عداوت کے خار و خس کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔

قرآن کی اس آیت میں اللہ سبحانہ نے جو بات اُمت دعوت کے بارے میں فرمائی ہے اور بتایا ہے کہ ایمان قبول کرنے اور نہ کرنے کا راز یہ ہے یہی بات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ارشاد میں اُمت اجابت کے بارے میں فرمائی ہے کہ ایمان قبول کرنے کے بعد اہل ایمان تین قسم کے ہیں۔ یہ بات کہ ارشاد کا تعلق اُمت اجابت سے ہے اُمت دعوت سے نہیں اس کی تائید اس سے ہوتی ہے کہ امام بخاری نے اس ارشاد کو اپنی صحیح میں کتاب العلم کے مشہور عنوان فضل من علم و علم میں بطور دلیل پیش کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ عالم ہونے اور عالم بنانے کی فضیلت کا مقام ایمان سے پہلے نہیں بلکہ ایمان کے بعد ہے پورا ارشاد سن لیجئے۔

حضرت ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ جناب صلی اللہ علیہ وسلم کا

ارشاد ہے کہ جو ہدایت اور دین اللہ نے مجھے دے کر روانہ فرمایا ہے اس کی مثال بارش کی سی ہے جو زمین پر برستی ہے۔ زمین کے ایک حصے نے جو بہت عمدہ تھا خوب پانی پیا، گھاس اور سبزہ اچھا اگایا اور ایک حصہ جو بنجر تھا اس نے پانی سمیٹ لیا۔ اس کے ذریعے اللہ سبحانہٗ نے دوسروں کو فائدہ پہنچایا خود پانی پیا دوسروں کو پلایا لیکن زمین کا ایک حصہ جو چٹیل تھا اس نے نہ پانی روکا اور نہ پیداوار کی۔ یہی مثال اس شخص کی ہے جس نے اللہ سبحانہٗ کے دین میں تفقہ پیدا کیا اور اللہ سبحانہٗ نے اسے دین سے فائدہ دیا اس نے خوب سیکھا اور دوسروں کو سکھایا اور اس شخص کی مثال ہے جس نے سر اٹھا کر ادھر نہیں دیکھا اور ہدایت کو نہیں اپنایا جسے مجھے دے کر اللہ نے روانہ کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب پانی برستا ہے تو زمین بارش کے پانی سے فائدہ اٹھانے میں تین حصوں میں منقسم ہو جاتی ہے۔

الف: پانی کو چوس کر پیداوار کرنے والی زمین

ب: پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین

ج: ناقابلِ کاشت اور ناقابلِ ذخیرہ

ٹھیک اسی طرح علم وہدایت کے لیے انسانی قلوب کی زمین بھی تین حصوں میں منقسم ہوتی ہے۔

الف: وہ جو قرآن وسنّت کا ذخیرہ رکھتے ہیں

ب: وہ جو قرآن وسنّت سے مسائل کا استخراج کرتے ہیں

ج: وہ جو نہ ذخیرہ رکھتے ہیں اور نہ استخراج کرتے ہیں

پانی کا ذخیرہ رکھنے والی زمین

جو لوگ قرآن وسنّت کا ذخیرہ رکھتے ہیں یعنی حفاظِ قرآن اور حفاظِ حدیث، یہ زمین کی وہ قسم ہے جسے زبانِ نبوّت نے

زمین کا وہ حصہ جو بنجر تھا اس نے پانی کو روکا اور اللہ نے اس سے لوگوں کو فائدہ پہنچایا لوگوں نے پانی پیا اور زمین سیراب کی۔

سے تعبیر کیا ہے۔ یہ قرآن وسنّت کی بالذات حفاظت کرنے والے اور ان کے الفاظ کو اپنے سینوں میں سمیٹے ہوتے ہیں آیات بینات فی صدور الذین اوتوا العلم یہ حفاظِ قرآن اور محدّثین ہیں۔ علامہ سندھی فرماتے ہیں،

یہ وہ قسم ہے جس میں بالذات علم ہی سے فائدہ ہوتا ہے جیسے اہل حفظ اور اہل روایت۔
اسی قسم کے بارے میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے ،
خوش و خرم رکھے اللہ اس شخص کو جس نے میری بات سنی اسے محفوظ رکھا اور پوری حفاظت سے آگے روانہ کیا۔ بہت سے سمجھ رکھنے والے بات کو اپنے سے زیادہ سمجھدار تک پہنچاتے ہیں ۔
امام شافعی نے اس حدیث پر یہ نوٹ لکھا ہے کہ بہت سے مسائل کے عالم مسائل کے حافظ ہوتے ہیں مگر فقیہ نہیں ہوتے۔ یعنی علماء دو قسم کے ہیں حفاظ اور فقہا۔ ہر حافظِ حدیث فقیہ نہیں ہوتا۔

پانی سے پیداوار کرنے والی زمین

کچھ لوگ صرف پانی کی حفاظت ہی کا کام نہیں کرتے بلکہ اس سے مسائل کے استخراج اور استنباط کا کام بھی کرتے ہیں۔ اس کے ثمرات سے رائے عامہ کو فائدہ پہنچاتے ہیں ، نتائج کو منظرِ عام پر لاتے ہیں یہ تمثیل میں زمین کی وہ قسم ہے جسے زبانِ نبوت نے
صاف زمین جس نے پانی کو چوس لیا اور پانی کے ذریعے گھاس اور زیادہ سے زیادہ سبزہ اگایا۔
سے تعبیر کیا ہے۔ یہ لوگ کتاب و سنت کے پانی سے اپنی قوتِ اجتہاد کے ذریعے مسائل کے موتی نکالنے والے اور پانی کو نہیں بلکہ پانی کے نتائج کو شاہراہ عام پر لانے والے ہیں۔ یہ ہیں اربابِ اجتہاد اور فقہائے کرام۔
علامہ سندھی فرماتے ہیں ؛
یہ وہ قسم ہے جس میں علم کے ثمرات اور نتائج سے فائدہ ہوتا ہے جیسے مجتہدین اور فقہاء۔
اسی قسم کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے۔
جس کے ساتھ اللہ سبحانہٗ خیر کا ارادہ فرماتے ہیں تو اسے دین میں فقاہت عطا فرما دیتے ہیں۔

صاف اور سنگلاخ زمین

جو لوگ نہ قرآن و سنت کا ذخیرہ رکھتے ہیں اور نہ قرآن و سنت سے مسائل کا استخراج کرتے ہوں اس ارشادِ نبوت میں زمین کی وہ قسم ہے جسے زبانِ نبوت میں
چٹیل صاف زمین جو نہ پانی کو جمع کرتی ہو اور نہ پیداوار کرتی ہو۔
سے تعبیر کیا ہے یعنی اُمت کا وہ طبقہ جو مسلمان ہونے کے باوجود علوم نبوت سے بہرہ ور نہیں۔ اُمتِ اسلامیہ

میں ان کی اکثریت ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن عزیز نے بارش کی تمثیل میں اُمت دعوت کا ذکر کیا ہے اور زمین کی دو قسمیں بتائی ہیں زمین صالح اور زمین شور۔ اسی طرح نبوت کے سامنے انسانی قلوب بھی دو طرح کے ہیں۔ ایک تو زمین صالح سے مشابہ ہیں جن میں قبولیتِ حق کی استعداد ہے یہ اہل ایمان ہیں۔ دوسرے زمین شور سے مشابہ ہیں جنہوں نے استعداد کھودی ہے ان کے حصے میں محرومی اور نامرادی کے سوا کچھ نہیں، یہ اہل کفر ہیں۔ اور ارشادِ نبوت میں بارش کی تمثیل میں اُمتِ دعوت کا نہیں بلکہ اُمتِ اجابت کا ذکر کیا ہے اور اس میں زمین کو تین قسموں میں منقسم کیا ہے۔ پانی کا ذخیرہ کرنے والی زمین، پانی سے پیداوار کرنے والی زمین اور نہ ذخیرہ کرنے والی نہ پیداکرنے والی زمین۔ ذخیرہ کرنے والے حفاظِ قرآن اور محدثینِ عظام اور پیداوار کرنے والے مجتہدین اور فقہائے کرام، یہ دونوں اسلام کا سرمایہ علمی ہیں۔ حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:

ایک قسم وہ حفاظ ہیں جن کا کام صرف روایات کو یاد رکھنا اور جیسی سنی ہے ویسی ہی آگے پہنچانا ہے ان کا کام مسائل معلوم کرنا اور استنباط کرنا نہیں ہے۔ دوسری قسم ان علماء کی ہے جن کا کام محفوظ سرمایہ سے مسائل نکالنا اور احکام مستنبط کرنا ہے۔ پہلی قسم جیسے حافظ ابو حاتم اور دوسری قسم جیسے امام مالک اور امام شافعی۔ خود صحابہ میں بھی حفظِ روایت اور استنباطِ مسائل کے لحاظ سے یہ تقسیم موجود تھی۔ عبداللہ بن عباس حبرالامت اور قرآن کے ترجمان ہیں مگر اس کے باوجود آپ کی حدیثوں کی تعداد بیس سے زیادہ نہیں ہے جن میں ذاتی شنید اور دید کی تصریح ہو۔ حافظ ابن حزم فرماتے ہیں کہ میں نے ابن عباس کے صرف فتاوی ضخیم جلدوں میں جمع کیے ہیں اور فرماتے ہیں کہ یہ بھی ان کے دریائے فقاہت کی ایک چلو ہے۔ ان کے مقابلے میں ابوہریرہ ہیں۔ حفظِ روایت میں علی الاطلاق حافظِ اُمت ہیں مگر تفقہ و استنباطِ مسائل میں ابن عباس کے پاسنگ بھی نہیں ہیں۔ (الوابل الصیب)

بہرحال دونوں اس ارشادِ نبوت کا منطوق ہیں۔ اصحاب روایت بھی اور اصحاب درایت بھی۔

آخر میں ارشاد ہے کذالک نصرف الایات لقوم یشکرون پہلی آیت کے آخر میں فرمایا تھا کہ لعلکم تذکرون تاکہ تم یاددہانی حاصل کرو اور غور و فکر کرو، اب ترقی کرکے فرمایا کہ یہ سب کچھ ان کے لیے ہے جو خدا کی نعمتوں کے قدردان ہیں۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں جو اللہ کی نعمتوں کو یاد کرے گا وہ ضرور حق شناس ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ جیسے ہم تکوینی آیات کو تمہارے سامنے پھیر رہے ہیں اور اس کے نتائج تم مشاہدہ کررہے ہو کہ کچھ زمینیں شادابی اور گل ریزی کا نمونہ ہیں ایسے ہی ہم آیاتِ تشریعی کو تمہارے سامنے

دہرا رہے ہیں دلائل پیش کر رہے ہیں، انبیاء روانہ کر رہے ہیں۔ بارش کی یہ نعمت عام ہے لیکن اس سے فائدہ وہی اٹھاتے ہیں جو نعمت کے قدردان ہیں اور جو نعمت کی قدر نہیں کرتے ان کے لیے ساری نعمتیں بیکار ہیں۔ شکر دراصل نام ہے نعمتوں کے متعلق جو صحیح علم ہے اس کے احساس کو زندہ اور بیدار رکھنے کی مسلسل کوشش کرتے رہنے کا۔ عمل کو آسان کرنے کی یہی نفسیاتی اور تجربی راہ ہے۔ قرآن میں انسانوں سے بار بار مختلف الفاظ میں اس کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اسی سے اس کی اہمیت ظاہر ہے۔ شکر کی ضد کفر ہے۔ اس کے لغوی معنے چھپانے کے ہیں اور محاورے میں کسی کام یا احسان پر پردہ ڈالنے اور زبان و دل اور عمل سے اس کے اظہار نہ کرنے کے ہیں۔ اسی سے ہماری زبان میں کفرانِ نعمت ہے۔ اس تقابل سے معلوم ہوا کہ اگر کفر اللہ تعالیٰ کے احسانوں اور نعمتوں کی ناقدری کرکے اس کی نافرمانی کا نام ہے تو اس کے مقابلے میں شکر کی حقیقت یہ ہوگی کہ اللہ تعالیٰ کے احسانات اور نعمتوں کی قدر جان کر اس کے احکام کی اطاعت اور دل سے فرمانبرداری کی جائے۔ مطلب یہ ہے کہ تصریف آیات بہت بڑا احسان ہے بشرطیکہ لوگ اس کے قدردان ہوں کیونکہ قدردانی پر ہر نعمت کی افادیت کا انحصار ہے۔ اگر یہ قدردانی موجود نہ ہو تو سب کچھ بیکار ہے۔

لَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰی قَوْمِهٖ فَقَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا اللّٰهَ مَا لَكُمْ
مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ اِنِّیْۤ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۵۹﴾
قَالَ الْمَلَاُ مِنْ قَوْمِهٖۤ اِنَّا لَنَرٰىكَ فِیْ ضَلٰلٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۰﴾
قَالَ يٰقَوْمِ لَيْسَ بِیْ ضَلٰلَةٌ وَّلٰكِنِّیْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ﴿۶۱﴾ اُبَلِّغُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّیْ وَاَنْصَحُ لَكُمْ وَاَعْلَمُ
مِنَ اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۲﴾ اَوَعَجِبْتُمْ اَنْ جَآءَكُمْ ذِكْرٌ
مِّنْ رَّبِّكُمْ عَلٰی رَجُلٍ مِّنْكُمْ لِيُنْذِرَكُمْ وَلِتَتَّقُوْا وَ
لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ﴿۶۳﴾ فَكَذَّبُوْهُ فَاَنْجَيْنٰهُ وَالَّذِيْنَ
مَعَهٗ فِی الْفُلْكِ وَاَغْرَقْنَا الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ؕ اِنَّهُمْ
كَانُوْا قَوْمًا عَمِيْنَ ﴿۶۴﴾

۸ ع ۱۵

بلاشبہ یقیناً ہم نے حضرت نوح کو اُن کی قوم کی طرف رسُول بنا کر
روانہ کیا تھا[۸۲]۔ انہوں نے کہا کہ اے میری قوم اللہ ہی کی بندگی کرو

اس کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے، مجھے اندیشہ ہے تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب کا[۸۳]۔ اس پر اُن کی قوم کے سربرآوردہ لوگوں نے کہا کہ ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ اے نوحؑ تم کھلے اور صریح گمراہی میں پڑ گئے ہو[۸۴]۔ حضرت نوحؑ نے فرمایا بھائیو! یہ بات نہیں کہ میں گمراہی میں پڑ گیا ہوں بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کا رسول ہوں[۸۵]۔ میں اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا رہا ہوں اور تمہارا خیر خواہ ہوں اور اللہ کی طرف سے وہ باتیں جانتا ہوں جن کا تمہیں پتہ نہیں ہے[۸۶]، فرمایا لوگو! کیا تمہیں اس بات پر حیرت ہو رہی ہے کہ تمہارے پروردگار کا پیغام ایک ایسا شخص لے کر آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے اور اس لیے آیا ہے تاکہ تمہیں برائیوں کے نتائج سے آگاہ کرے اور تاکہ تم برائیوں سے بچ کر رہو اور تاکہ تم رحمتِ الٰہی کے قابل ہو جاؤ[۸۷]۔ پھر یہ ہوا کہ لوگوں نے

حضرت نوح کی تکذیب کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے حضرت نوح اور اُن کے ساتھیوں کو کشتی میں سیلاب سے بچا لیا اور جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی انہیں غرق کر دیا بلاشبہ کہ وہ لوگ بالکل اندھے تھے۔

معانی مفردات

الملأ، یہ ملا یملاء سے ہے لغوی مفہوم بھرنا ہے۔ اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے یہ لفظ کسی قوم کے اشراف و اعیان اور اکابر و سادات کے لیے استعمال ہونے لگا۔ مطلق جماعت کے معنے میں نہیں بلکہ اہلِ حل و عقد یا اہل الرائے کی جماعت ہے۔ آلوسی لکھتے ہیں وجوھھم د اشرافھم قوم اشراف اپنی رائے کی خوبی اور طاقت کی نمائش سے لوگوں کی خواہش کو پھیر دیتے ہیں یا اپنی قوتِ انتظامی سے دلوں میں ہیبت بھر دیتے ہیں اس لیے ان کو ملاء کہتے ہیں اور علامہ ابوالسعود کہتے ہیں کہ جو لوگ زینتِ محفل ہوں دلوں کو ہیبت و عظمت سے اور آنکھوں کو ظاہری حسن و جمال سے بھر دیں ان کو ملاء کہتے ہیں۔ امام راغب کی رائے بھی ابوالسعود کی تائید میں ہے۔ راغب نے یہ بھی لکھا ہے اس کو ملاء العیون کہتے ہیں۔ عمین، عم کی جمع بحالتِ نصب و جر اور بحالتِ رفع عمون ہے۔ عم اصل میں عمی یعمی سے فعل کے وزن پر صفت مشبہ ہے یہ اصل میں عمی تھا چونکہ ناقص یائی میں صفت مشبہ کی یا حذف ہو جاتی ہے اس لیے گر گئی اور عم رہ گیا اس کے معنے کور دل، دل کے اندھے اور عقل کے اندھے۔

تاریخی شہادتیں

تاریخی دلائل اور شواہد سے واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح اللہ تعالیٰ نے ان کو اس سرزمین میں اقتدار

بخشا لیکن انہوں نے اقتدار پاکر ناشکری کی روش اختیار کی زمین میں اصلاح کے بعد فساد برپا کیا عدل وانصاف کو درہم برہم کیا بالآخر اللہ نے ان میں اپنا رسول بھیجا جس نے ان کو پرستش اور بندگی میں توحید کی دعوت دی کہ اللہ سبحانہ نے ایک خاص حد تک مہلت دینے کے بعد اس قوم کو تباہ کر دیا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ سارا قصہ صرف ایک دو صحبتوں میں ختم ہو گیا تھا بلکہ جن حقائق تاریخی کا یہاں مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے وہ ایک نہایت طویل مدت میں پیش آئے تھے۔ قرآن کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ واقعہ کو محض قصہ گوئی کی خاطر پیش نہیں کرتا۔ یہاں ان واقعات سے ایک طرف قریش کو یہ بتانا مقصود ہے کہ اب ان کا معاملہ بھی اسی عدالت میں ہے جس میں ان تمام قوموں کے مقدمے پیش ہو کر فیصل ہوتے اور اپنے کیفر کردار کو پہنچیں۔ کوئی وجہ نہیں کہ اگر انہوں نے بھی وہی روش اختیار کی جو ان قوموں نے اختیار کی تھی تو اس بے لاگ عدالت کا فیصلہ ان کے لیے کچھ مختلف ہو خدا کا قانون سب کے لیے یکساں ہے اور دوسری طرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کو سمجھایا ہے کہ اس انقلابِ حال پر متعجب نہ ہونا چاہیے کیونکہ ہمیشہ سے سنتِ الٰہی ایسی ہی رہی ہے اور ہمیشہ دعوتِ حق کی بے سروسامانیوں نے وقت کے تمام سروسامانوں پر فتح پائی ہے لیکن یہ منزل صبر آزمائیوں کی منزل ہے۔ چند سالوں کی تبلیغی سرگرمیوں کو نتیجہ خیز نہ دیکھ کر تنگدل نہ ہونا چاہیے فلا یکن فی صدرک حرج - ان انبیاء کی زندگیوں کا مطالعہ کریں جنہوں نے مدتہائے دراز تک نہایت حوصلہ شکن حالات میں دعوت دی اور ذرا ہمت نہ ہاری۔

یاد رہے کہ یہاں جن قوموں کی تاریخی داستانیں بیان ہو رہی ہیں اہل عرب ان سے واقف تھے لیکن یہ واقفیت اجمالی تھی۔ قرآن نے اس اجمال کا پردہ اٹھا کر تاریخ کو از سر نو زندہ کر دیا اور اہل عرب کو دعوت دی کہ ان تاریخی شہادتوں کو توجہ سے سنیں اور ان سے عبرت حاصل کریں۔ یہ دوسروں کی کہانیاں نہیں بلکہ خود اپنی داستان ہے۔ اسی لیے قرآن یہاں قصوں کے ان اجزاء کو پیش کر رہا ہے جو اس کے مقصد و مدعا سے تعلق رکھتے ہیں باقی تمام تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔

۸۲- بلاشبہ یقیناً ہم نے حضرت نوح کو ان کی قوم کی طرف رسول بنا کر روانہ کیا تھا۔ آدم علیہ السلام کا قصہ ابتدائے سورت میں گزر چکا ہے۔ ان کے بعد نوح علیہ السلام پہلے اولوالعزم اور مشہور رسول ہیں جو زمین والوں کی طرف مشرکین کے مقابلے میں بھیجے گئے۔ گو باعتبار اپنی خاص شریعت کے ان کی بعثت خاص اپنی قوم کی طرف مانی جائے تاہم ان اساسی اصول کے اعتبار سے جو تمام انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں مشترک ہیں کہا جا سکتا ہے کہ تمام انسان ہر نبی کے مخاطب ہوتے ہیں۔ مثلاً توحید اور اقرار معاد کی تعلیم پر سارے پیغمبر متفق اللسان ہیں تو ایسی چیزوں کی تکذیب

کرنا ہے۔[1]

مخاطب چونکہ اہلِ عرب ہیں اس لیے پہلے ان قوموں کا ذکر کیا ہے جو عرب کے شمال یا جنوب یا شمال مغرب میں نامور ہوئی ہے۔ ترتیب یہاں بالکل تاریخی ہے۔ اس وجہ سے حضرت نوح کا سب سے پہلے ذکر کیا ہے۔ حضرت نوح کی قوم اس سرزمین میں رہتی تھی جس کو ہم آج عراق کے نام سے جانتے ہیں یعنی دجلہ و فرات کا دوآبہ جو انسانی تمدن کا سب سے قدیم گہوارہ ہے۔ تاریخی لحاظ سے زمانے کی تعیین دشوار ہے بعض اندازوں کے مطابق ان کا زمانہ ۳۸۰۰ قبل مسیح تا ۲۸۵۰ ہے۔ یہ بات کہ حضرت نوح کا ظہور دجلہ و فرات کے دوآبہ میں ہوا۔ اس کی تصدیق بابل کے آثارِ قدیمہ میں بائبل سے۔ قدیم تر جو کتبات ملے ہیں ان سے بھی ہوتی ہے۔ ان میں تقریباً اسی قسم کا قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن کر رہا ہے۔ پھر جو روایات کردستان اور ارمنیہ میں قدیم ترین زمانے سے نسلاً بعد نسل چلی آ رہی ہیں ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح کی کشتی اسی علاقہ میں کسی جگہ ٹھہری تھی۔ حضرت نوح کے قصے سے ملتی جلتی روایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں۔ اور اس کے علاوہ برما، ملایا، جزائر شرق الہند، اسٹریلیا نیوگنی اور امریکہ یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی روایات قدیم زمانے سے چلی آ رہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسلِ آدم ایک ہی خطہ میں رہتی تھی اور پھر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں پھیلی۔ اس وجہ سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اگرچہ مرورِ ایام سے اس کی حقیقی تفصیلات انہوں نے فراموش کر دی ہیں۔[2]

قوم کو اللہ کی بندگی کی دعوت

۸۳۔ انہوں نے کہا اے میری قوم اللہ ہی کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں مجھے اندیشہ ہے تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب کا۔ نوح علیہ السلام نے توحید وغیرہ کی دعوت دی۔ کہتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کے بعد دس قرن ایسے گزرے کہ ساری اولادِ آدم کلمہ توحید پر قائم تھی۔ بت پرستی کی ابتداء ابن عباس کے بیان کے موافق یوں ہوئی کہ بعض صالحین کا انتقال ہو گیا جن کے نام

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

ود، سواع، یعوق، یغوث اور نسر تھے جو سورہ نوح میں مذکور ہیں۔ لوگوں نے ان کی تصویریں بنالیں تاکہ ان کے احوال اور عبادت وغیرہ کی یاد تازہ رہے۔ کچھ مدت کے بعد ان صورتوں کے موافق مجسمے تیار کیے حتیٰ کہ کچھ دنوں کے بعد ان کی پرستش ہونے لگی اور یہ بت ان ہی بزرگوں کے نام سے موسوم ہوگئے، جب بت پرستی کی وبا پھیل گئی تو حق تعالیٰ نے حضرت نوح کو بھیجا۔ انہوں نے طوفان سے پہلے اپنی قوم کو ساڑھے نوسو برس تک توحید و تقویٰ کی طرف بلایا اور دنیا و آخرت کے عذاب سے ڈرایا[1]

حضرت نوح کے بیان سے یہ صاف بات ٹپکتی ہے کہ ان کی قوم نہ تو اللہ کے وجود کی منکر تھی نہ اس سے ناواقف تھی، نہ اسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا ہوگئی تھی شرک کی گمراہی تھی یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو عبادت میں حصہ دار قرار دے لیا تھا اور عبادت کے شرک میں مبتلا ہونے کے معنے یہ ہیں کہ وہ نظریات وافکار اور اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر اعمال واخلاق ہر چیز میں جادۂ حق سے ہٹ گئی تھی۔ اس گمراہی سے بے شمار خرابیاں پوری قوم میں رونما ہوگئیں جو خود ساختہ معبود عبادت میں شریک بناتے تھے ان کی نمائندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک طبقہ پیدا ہوگیا جو تمام مذہبی، سیاسی اور معاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا تھا اور اس نے انسانوں میں اونچ نیچ کی تقسیم پیدا کر دی تھی۔ اجتماعی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر دیا تھا اور اخلاقی فسق و فجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کر دی تھیں۔

اس آیت میں لفظ عبادت، پرستش اور بندگی دونوں معنے میں ہو سکتا ہے اس لیے قرآن کے ترجمہ کرنے والوں میں سے کچھ نے اس کا ترجمہ اللہ کی پرستش کرو کیا ہے اور کچھ نے اللہ کی بندگی کرو۔ جنہوں نے اول الذکر ترجمہ کو اپنایا ہے۔ انہوں نے مالکم من الٰہ غیرہ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں اور جنہوں نے دوسرے ترجمہ کو اختیار کیا ہے انہوں نے مالکم من الٰہ غیرہ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے۔ دراصل جن لوگوں کی نگاہ حضرت نوح کے زمانہ کے اصنام پر ہے جن کا ذکر سورہ نوح میں ہے انہوں نے ترجمہ پرستش سے کیا ہے اور جن کی نظر اس پر ہے کہ آپ کا خطاب سربرآوردہ برسراقتدار لوگوں سے ہے انہوں نے ترجمہ بندگی سے کیا ہے۔ یہاں حضرت شاہ صاحب کی دقت نظر نے عجیب نکتہ آفرینی سے کام لیا ہے۔ شاہ صاحب نے انگریزوں کے اقتدار کا ابتدائی زمانہ دیکھا ہے اور اس دور میں ارباب اقتدار کو عوام صاحب بہادر کے لقب سے یاد کرتے تھے اس لیے شاہ صاحب نے زمانہ کے مذاق کی رعایت سے آیت کا یہ ترجمہ کیا ہے اے قوم بندگی کرو

[1] افادات شیخ الاسلام

اللہ کی، کوئی نہیں تمہارا صاحب اوس کے سوا۔ حضرت نوح کی دعوت ایک وقت دونوں سے تعلق رکھتی تھی۔ پرستش سے بھی کہ سب خدا کی پرستش میں ملاوٹ کر رہے تھے اور بندگی سے بھی کہ برائے عامہ اس میں ارباب اقتدار کے زیر اثر تھی۔ اور شرک کے جراثیم نے اجتماعی بندگی کے سارے گوشوں میں تباہ کاری مچا رکھی تھی۔ آخر میں فرمایا انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم مجھے تمہارے متعلق ایک بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے۔ بڑے دن سے یہاں مراد دنیوی عذاب کا ہولناک دن ہے یا روزِ قیامت۔ شارحین قرآن نے دونوں باتیں لکھی ہیں۔ انبیا اپنی قوموں کو دونوں عذابوں سے ڈراتے ہیں۔ ایک اس عذاب سے جو رسُول کی تکذیب کے نتیجے میں دُنیا میں آتا ہے اور دوسرے اُس عذاب سے جس سے جزا و سزا کے فیصلے کے دن آخرت میں لازماً دو چار ہونا پڑے گا۔ یہاں سیاق و سباق قرآنی بتا رہا ہے کہ عذاب دُنیا مراد ہے۔ اسے عذاب یوم عظیم اس لیے فرمایا کہ نبی کی تکذیب کے نتیجے میں جو عذاب آتا ہے وہ تذکیر و تنبیہ کی نوعیت کا نہیں ہوتا بلکہ عذاب استیصال ہوتا ہے جو قوم کی جڑ کاٹ دیتا ہے، اس کے بعد قومی حیثیت سے صفحہ ہستی سے اس کا نام و نشان ہی مٹ جاتا ہے۔

حضرت نوح کا قوم کو جواب

۸۴۔ اس پر ان کی قوم کے سر برآوردہ لوگوں نے کہا کہ ہمیں تو یہ نظر آتا ہے کہ اے نوح تم کھلے اور صریح گمراہی میں پڑ گئے ہو۔ یعنی لوگوں نے ان کی تضلیل و تجہیل کی اور ان کی کوئی بات نہ سُنی۔ [1] یہاں قوم کا اجمالی جواب نقل کیا گیا ہے۔ لیکن سورہ ہود میں یہ جواب مفصل ہے۔ یہاں مخاطبوں نے بات میں زور پیدا کرنے کے لیے تین قسم کی تاکیدیں استعمال کی ہیں انا لنرٰک فی ضلال مبین ہماری رائے میں تم بالکل جادہ حق سے ہٹ گئے ہو۔ تم ہمیں ان بزرگوں کی عبادت سے منع کرتے ہو یہ تو بارگاہِ الٰہی میں ہمارا وسیلہ ہے۔ ان کی برکت سے تو ہمارے لیے قبولیت کا دروازہ کھلا ہے اور ان کے صدقے تو ہمیں سب کچھ مل رہا ہے۔ اندازِ بیان بتا رہا ہے کہ حضرت نوح اپنی بات کس قوت، کس اعتماد، کس یقین سے کہہ رہے تھے جس کے جواب میں ان کے مخاطبوں کو اتنا زور لگانا پڑا ہے۔ حافظ ابن کثیر کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ فساق و فجور کا دستور یہی ہے کہ وہ نیکوکاروں پر ضلالت اور بے راہ روی کا فتویٰ لگاتے ہیں۔ اور یہ اس لیے کہ ان کو اس میں اپنے باپ دادا کے دین کی تحقیر نظر آتی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قوم کو حضرت نوح کا جواب

۸۵۔ حضرت نوح نے فرمایا بھائیو یہ بات نہیں کہ میں گمراہی میں پڑ گیا ہوں بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کا رسول ہوں۔ حضرت نوح نے جواب میں فرمایا کہ مجھے کوئی سر پھرا اور بھٹکا ہوا آدمی نہ سمجھو۔ میں تمام عالم کے رب کی طرف سے تمہارے پاس پیغمبر کی حیثیت سے آیا ہوں۔ رسول من رب العالمین فرما کر شرک کے پورے فلسفہ پر ضرب کاری لگا دی۔ مشرک نظام کائنات کو منتشر اور متفرق صورت میں دیکھنے کا عادی ہوتا ہے۔ وہ تو یہ سمجھ سکتا ہے کہ فلاں حضرت فلاں شعبے کے مالک مالک ہیں لیکن یہ اس کی سمجھ ہی میں نہیں آتا کہ کوئی مالک الملک سارے عالموں کا تاجدار اور پروردگار بھی ہے یہ کہہ کر حضرت نوح نے جتا دیا کہ میں دعوت واصلاح کا کام اللہ کی رہنمائی سے کر رہا ہوں اپنی ذاتی حیثیت سے نہیں بلکہ رب العالمین کے رسول کی حیثیت سے کام کر رہا ہوں۔ اس ایک فقرے میں دو دعوتیں ہیں۔ ایک اللہ پر ایمان لانے کی اور ایک حضرت نوح کی رسالت کو ماننے کی۔ حضرت نوح نے وقت کی جاہلانہ زندگی کی شہ رگ پر وار کیا جس سے آپ کے مخاطب تلملا اٹھے مگر حضرت نوح اپنی دعوت پر پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ مخالفت کے طوفان اٹھے۔ فتنہ کی آندھیاں آئیں مگر آپ نے اپنی جگہ سے ذرا جنبش نہ کی اور مسلسل توحید و رسالت اور آخرت پر یقین کی دعوت دیتے رہے۔ آپ نے اس کے لیے ذرا بھی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا نہ مخالفوں کی ادنیٰ رعایت کی نہ وقت کی مصلحت کے لیے اپنی دعوت میں لوچ اور لچک گوارا کی۔ توحید کی دعوت کو ہر مرض کی دوا اور ہر بند قفل کی کنجی بنا کر پیش کیا اور حالات کی ساری ناسازگاری کے باوجود بھی آپ کو اس کے بارے میں ادنیٰ تذبذب بھی نہیں ہوا۔ رسول من رب العالمین کہہ کر آپ نے بتا دیا کہ آپ اس لیے مبعوث فرمائے گئے ہیں کہ بندوں کو بندوں کی بندگی سے نکال کر صرف خدا کی بندگی میں داخل کریں۔ تمام لوگوں کو مادی زندگی کی کال کوٹھری سے نکال کر دنیا و آخرت کی وسعتوں میں پہنچا دیں۔

حضرت نوح کا مقام

۸۶۔ میں اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا رہا ہوں اور میں تمہارا خیر خواہ ہوں اور میں اللہ کی طرف سے وہ کچھ جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے ہو۔ یعنی میں تو ذرا بھی بھٹکا نہیں۔ ہاں تم بھٹک رہے ہو کہ خدا کے پیغمبر کو نہیں پہچانتے جو نہایت فصاحت سے خدائی پیغام تم کو پہنچا رہا ہے اور تمہاری بھلائی چا

ہے تم کو عمدہ نصیحتیں کرتا ہے اور خدا کے پاس سے وہ علوم ہدایت لے کر آیا ہے جن سے تم جاہل ہو۔[1] اس آیت میں حضرت نوح نے نبی ہونے کی حیثیت میں لوگوں کے سامنے اپنا مقام پیش کیا ہے جیسا کہ پہلی آیت میں رسول من رب العالمین کہہ کر اپنا منصب بتایا تھا۔ یہاں حضرت نوح نے جو اپنا مقام بتایا ہے وہ بھی ہر نبی کا اپنے مخاطبوں میں مقام ہوتا ہے فرمایا میرا کام یہ ہے کہ میں اپنے رب کے پیغامات تم تک پہنچا رہا ہوں۔ اور اس فرض کی ادائیگی میں میرا دامن ہر قسم کی غرض مندی سے بالکل پاک ہے بلکہ یہ کام میں تمہاری خیر خواہی کے جذبہ سے کر رہا ہوں۔ جذبۂ ہمدردی اور خیر خواہی کے سوا کسی اور جذبہ کا میری اس ساری تگ و دو میں کوئی شائبہ بھی نہیں ہے۔ مجھے یہ اندیشہ اور غم ہے کہ کہیں تم خدا کی پکڑ میں نہ آ جاؤ۔ اور یہ بات اپنے علم کی بنا پر کہتا ہوں کیونکہ میں خدا کی طرف سے وہ بات جانتا ہوں جو تم نہیں جانتے۔

ان تین باتوں میں سب سے اہم بات انصح لکم ہے یعنی میں تبلیغ حق میں تمہارا خیر خواہ ہوں۔ لغت میں نصحت العسل اس وقت بولا جاتا ہے جب شہد کو موم سے صاف کر لیا جائے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ نصح کے معنے کسی چیز کا کھوٹ نکالنے کے ہیں یہ معنے اسی محاورے سے ماخوذ ہیں۔ محکم میں ہے کہ نصح کھوٹ کی ضد ہے۔ ابن طریف لکھتا ہے کہ نصح قلب الانسان اس وقت بولتے ہیں جب دل میں کوئی کھوٹ باقی نہ رہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصل نصحت میں منصوح لہ کی درستگی اور صلاح پیش نظر ہوتی ہے نہ کہ ناصح کی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے،

> تمیم داری بیان کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تین بار فرمایا خیر خواہی کرنا ہی دین ہے۔ ہم نے عرض کیا کس کی؟ فرمایا اللہ کی اللہ کی کتاب کی، اس کے رسول کی، اسلامی حکومت کے سربراہوں کی اور سب مسلمانوں کی۔ (صحیح مسلم)

اللہ کی خیر خواہی کے معنے یہ ہیں کہ بندہ اپنے اور خدا کے درمیان کوئی کھوٹ نہ رکھے۔ سب سے بڑا کھوٹ یہ ہے کہ اس کی پرستش اور بندگی میں کسی کو اس کا شریک بنائے۔ اس کی صفات جلال و جمال کا پوری تنزیہہ کے ساتھ اعتراف نہ کرے اور اس کے اوامر و نواہی میں پوری مستعدی کا اظہار نہ کرے علماء نے لکھا ہے کہ اللہ کی خیر خواہی کا حاصل بالفاظ دیگر اپنے ہی نفس کی نصیحت اور خیر خواہی ہے۔

کتاب اللہ کی خیر خواہی کے معنے یہ ہیں کہ پورے آداب کے ساتھ اس کی تلاوت کی جائے، بدل و جان اس کے معانی کی تصدیق کی جائے۔ اس کے علوم کی نشر و اشاعت کی جائے۔ اس کی پیروی کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تمام عالم کو دعوت دی جائے اور اس کے ہر امر و نہی کے سامنے اعتراف و تسلیم کا سر خم کیا جائے۔

رسول کی خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی رسالت کی تصدیق کی جائے۔ جو دین وہ لے کر آیا ہے اس کا ایک ایک حرف مانا جائے۔ ہر موقع پر اس کی نصرت کے لیے تیار رہے۔ آپ کے اصحاب اور آپ کے اہل بیت کی محبت اور ان کا ادب پورے طور پر ملحوظ رہے۔

ائمہ مسلمین کی خیر خواہی یہ ہے کہ ہر حق معاملہ میں ان کی اعانت کی جائے۔ ان کے ساتھ جہاد میں شرکت کی جائے۔

عام مسلمانوں کی خیر خواہی کے معنے یہ ہیں کہ دنیوی اور اخروی سب مفید اور اچھی باتیں ان کو بتادی جائیں۔ ان کو ایذا نہ دی جائے۔ ان کے عیوب کی پردہ پوشی کی جائے۔ الغرض نصیحت اور خیر خواہی کرنا انبیاء علیہم السلام کی دعوت کا اہم جزء ہے۔ شفقت و خیر خواہی گو پیغمبر کے خمیر ہی میں داخل ہوتی ہے۔ اس کی بنیاد، اخلاق و شفقت ہی پر ہوتی ہے جس میں خود غرضی کا شائبہ تک نہیں ہوتا۔ اعلم کے ساتھ من اللہ کا اضافہ یہ بتانے کے لیے بھی ہے کہ پیغمبر کا علم اپنا کسب نہیں ہوتا اللہ کی طرف سے عطا کیا ہوا ہوتا ہے۔

انسان کے رسول ہونے پر حیرت

۷۸۔ فرمایا لوگو! کیا تمہیں اس پر حیرت ہے کہ تمہارے پروردگار کا پیغام ایک ایسا شخص لے کر آیا ہے جو تم ہی میں سے ہے اور اس لیے آیا ہے کہ تمہیں برائیوں کے نتائج سے آگاہ کرے تاکہ تم برائیوں سے بچ کر رہو اور تاکہ تم رحمت کے قابل ہو جاؤ۔ یعنی اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ تم ہی میں سے خدا کسی ایک فرد کو اپنی پیغام رسانی کے لیے چن لے آخر اس نے ساری مخلوق میں سے منصب خلافت کے لیے آدم علیہ السلام کو کسی مخصوص استعداد کی بنا پر چن لیا۔ تو کیوں نہیں ہو سکتا کہ اولادِ آدم میں سے بعض کامل الاستعداد لوگوں کو منصب نبوت و رسالت کے لیے انتخاب کر لیا جائے تاکہ وہ لوگ براہ راست خدا سے فیض پاکر دوسروں کو ان کے انجام سے آگاہ کریں اور یہ اس پر آگاہ ہو کر بدی سے بچ جائیں اور اس طرح خدا کے رحم و کرم کے مورد بنیں۔ یعنی کیا میری بات ماننے میں یہ چیز تمہیں مانع ہو رہی ہے کہ اللہ نے تمہیں میں سے ایک شخص کو اپنا رسول بنا کر روانہ کیا ہے۔ یہاں سوال کو اس انداز میں پیش فرمایا ہے جو حسرت و افسوس کی غمازی کر رہا ہے۔ اس اندازِ بیان ہی میں اس کا جواب ہے یعنی اگر تم ذرا غور کرو تو یہ بات تمہارے لیے حیرت افزا نہ ہے۔ تمہیں تو خدا کا شکر کرنا چاہیے کہ اس

نے تمہارے ہی اندر سے ایک شخص کو تمہاری نجات کی راہ دکھانے والا بناکر روانہ کیا۔ میں تمہارے لیے کوئی اجنبی نہیں میرا ماضی وحال اور میری سیرت وکردار یعنی پوری زندگی کی کتاب کا ورق ورق تمہارے سامنے کھلا ہوا ہے اس سے معلوم ہوا کہ حضرت نوح کی قوم کا آپ کی رسالت کے بارے میں شبہ یہ تھا کہ انسان خدا کا رسول کیوں کر ہو کر آیا بعینہ یہی شبہ مکہ میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کو بھی پیش آیا تھا ابعث اللہ بشرا رسولاً۔ جو پیغام حضرت نوح کا تھا وہ ہی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا تھا اور جو شبہات اہل مکہ کے سردار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں ظاہر کرتے تھے وہی شبہات ہزاروں سال پہلے سرداران قوم نے حضرت نوح کی رسالت میں کیے تھے۔ پھر ان کے جواب میں جو باتیں حضرت نوح کہتے ہیں بعینہ وہی باتیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر نبی کی قوم کا رد یہ اہل مکہ سے مشابہ ہے اس سے قرآن اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں یہ بات آتارنا چاہتا ہے کہ انسان کی گمراہی بنیادی طور پر ایک ہی ہے اور وہ یہ کہ انسان ہونے کی بنیاد پر رسول کی رسالت کا انکار۔ غور کرو تو معلوم ہو جائے گا کہ ہزاروں سال گزرنے پر آج بھی شیطان کی روح وہی کام کر رہی ہے۔ بیگانوں کو اس پر حیرت تھی کہ ایک انسان رسول کیسے ہو سکتا ہے اور یگانوں کو اس پر تعجب ہے کہ ایک رسول انسان کیسے ہو سکتا ہے۔ فانا للہ وانا الیہ المشتکی۔

تکذیب رسول کا انجام

۶۴۔ پھر یہ ہوا کہ لوگوں نے حضرت نوح کی تکذیب کی، نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کو ایک کشتی میں سیلاب سے بچالیا اور جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی انہیں غرق کر دیا بلاشبہ وہ لوگ بالکل اندھے تھے۔ یعنی حق وباطل اور نفع ونقصان کچھ نہ سوجھا اندھے ہو کر برابر سرکشی اور تکذیب وبغاوت پر قائم رہے اور بت پرستی وغیرہ حرکات سے باز نہ آئے تو ہم نے معدودے چند مومنین کو بچا کر جو نوح علیہ السلام کے ہمراہ کشتی میں سوار ہوتے تھے باقی سب مکذبین کا بیڑا غرق کر دیا۔ اب جس قدر انسان دنیا میں موجود ہیں وہ ان ہی اہل سفینہ بلکہ صرف نوح کی ذریت ہیں [1]

مطلب یہ ہے کہ وہ بات بالآخر ہو کر رہی جس سے حضرت نوح نے ڈرایا تھا جب قوم نے طویل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جد و جہد کے بعد بھی اپنے رویے کی اصلاح نہ کی تو ان لوگوں کے سوا جنہوں نے حضرت نوحؑ کے ساتھ کشتی میں پناہ لی سب کو اللہ تعالیٰ نے غرق کر دیا۔ طوفان کی نوعیت پر انشاء اللہ پوری بحث بارہویں جلد کے آغاز میں آرہی ہے یہاں صرف شیخ الاسلام مولانا عثمانی کی بات گوش گزار فرمائیے۔ "آخر طوفان کے عذاب نے سب کو گھیر لیا اور جیسا کہ حضرت نوحؑ نے دعا کی تھی رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا"، روئے زمین پر کوئی کافر عذاب الٰہی سے نہ بچا۔ بستانی نے دائرۃ المعارف میں یورپین محققین کے اقوال طوفان اور عموم طوفان کے بارے میں نقل کیے ہیں۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۗ قَالَ يَٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم
مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥٓ ۗ أَفَلَا تَتَّقُونَ ﴿٦٥﴾ قَالَ ٱلْمَلَأُ ٱلَّذِينَ كَفَرُوا۟
مِن قَوْمِهِۦٓ إِنَّا لَنَرَىٰكَ فِى سَفَاهَةٍ وَإِنَّا لَنَظُنُّكَ مِنَ ٱلْكَٰذِبِينَ ﴿٦٦﴾
قَالَ يَٰقَوْمِ لَيْسَ بِى سَفَاهَةٌ وَلَٰكِنِّى رَسُولٌ مِّن رَّبِّ ٱلْعَٰلَمِينَ ﴿٦٧﴾
أُبَلِّغُكُمْ رِسَٰلَٰتِ رَبِّى وَأَنَا۠ لَكُمْ نَاصِحٌ أَمِينٌ ﴿٦٨﴾ أَوَعَجِبْتُمْ
أَن جَآءَكُمْ ذِكْرٌ مِّن رَّبِّكُمْ عَلَىٰ رَجُلٍ مِّنكُمْ لِيُنذِرَكُمْ ۗ
وَٱذْكُرُوٓا۟ إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَآءَ مِنۢ بَعْدِ قَوْمِ نُوحٍ وَزَادَكُمْ فِى
ٱلْخَلْقِ بَصْۜطَةً ۚ فَٱذْكُرُوٓا۟ ءَالَآءَ ٱللَّهِ لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ ﴿٦٩﴾
قَالُوٓا۟ أَجِئْتَنَا لِنَعْبُدَ ٱللَّهَ وَحْدَهُۥ وَنَذَرَ مَا كَانَ يَعْبُدُ ءَابَآؤُنَا ۚ
فَأْتِنَا بِمَا تَعِدُنَآ إِن كُنتَ مِنَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿٧٠﴾ قَالَ قَدْ وَقَعَ
عَلَيْكُم مِّن رَّبِّكُمْ رِجْسٌ وَغَضَبٌ ۗ أَتُجَٰدِلُونَنِى فِىٓ أَسْمَآءٍ
سَمَّيْتُمُوهَآ أَنتُمْ وَءَابَآؤُكُم مَّا نَزَّلَ ٱللَّهُ بِهَا مِن سُلْطَٰنٍ ۗ

فَانْتَظِرُوْٓا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۷۱﴾ فَاَنْجَیْنٰهُ وَالَّذِیْنَ
مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَقَطَعْنَا دَابِرَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَمَا كَانُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۷۲﴾

وقف لازم

اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو رسول بنا کر روانہ کیا[۸۹]۔ انہوں نے کہا کہ اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو اللہ کے سوا تمہاری بندگی کے لائق کوئی نہیں ہے کیا تم اللہ کی نافرمانی سے نہ بچو گے[۹۰]؟ اس پر ان کی قوم کے ان سربرآوردہ لوگوں نے کہا جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کر رکھا تھا ہماری تو تمہارے بارے میں پختہ رائے یہ ہے کہ تم اپنی عقل کھو بیٹھے ہو اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو[۹۱]۔ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا بھائیو میں اپنی عقل نہیں کھو بیٹھا ہوں، بلکہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کی جانب سے رسول بن کر آیا ہوں۔ میرا کام تم تک اپنے رب کے پیغامات پہنچانا ہے

اور میں پوری امانت کے ساتھ تمہارا خیر خواہ ہوں[۹۲]۔ کیا اس بات پر حیرت ہوئی ہے کہ ایک ایسے شخص کے ذریعے تمہارے پروردگار کا پیغام تمہارے پاس آیا ہے جو خود تم میں سے ہے اور اس لیے آیا ہے کہ وہ تمہیں اعمالِ بد کے نتائج سے آگاہ کرے[۹۳]۔ خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ قومِ نوح کے بعد اس نے تمہیں ان کا جانشین بنایا اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت اور توانائی عطا فرمائی، لہٰذا تمہیں اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھنا چاہیے تاکہ تم کامیابی سے ہمدوش ہو[۹۴]۔ انہوں نے جواباً کہا کہ کیا تم ہمارے پاس اس لیے آئے ہو کہ ہم یگانہ اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کریں اور ان معبودوں سے عابدانہ تعلقات چھوڑ دیں جن سے ہمارے باپ دادوں کے عابدانہ تعلقات تھے، اگر تم اپنے دعویٰ رسالت میں سچے ہو تو جس چیز کی ہم کو دھمکی دے رہے ہو وہ لاؤ[۹۵]۔ حضرت ہودؑ نے فرمایا بلاشبہ تمہارے پروردگار

کی طرف سے تم پر عذاب اور غضب آچکا ہے، کیا تم مجھ سے ان ناموں کے بارے میں اُلجھ رہے ہو جو تم اور تمہارے آباؤ اجداد کے رکھے ہوئے ہیں جن کی خدا نے کوئی سند نازل نہیں فرمائی، اچھا تم بھی انتظار کرو اور میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں[٩٦] پھر ہم نے حضرت ہود اور اُن کے ساتھیوں کو اپنی مہربانی سے بچا لیا اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلایا تھا ان کی بیخ و بنیاد اکھاڑ دی۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔[٩٧]

معانی مفردات

سفاھۃ، یہ سفہ یسفہ باب کرم سے مصدر ہے بیوقوف بننا یہاں حاصل مصدر کے معنے میں ہے یعنی بے عقلی اور بے وقوفی۔ یہ باب سمع سے سفہ یسفہ بھی آتا ہے۔ لازم اور متعدی دونوں آتا ہے قرآن میں اسی سے الا من سفہ نفسہ آیا ہے اس کے معنے ہیں اس نے اپنے کو بیوقوف بنالیا۔ اور باب ضرب سے صرف متعدی آتا ہے بیوقوف بنانا۔ یہاں سفاہت کے معنے بے عقلی، بیوقوفی اور جہالت کے ہیں۔ الآءالی کی جمع ہے نعمت کے معنے ہیں۔ رجس، ناپاک، پلید، گندا عذاب، بلا، جمع ارجاس، رجس کی چار صورتیں ہیں طبعی، عقلی، شرعی اور ان تینوں کا مجموعہ۔ سلطان، زور قوت، حجت، برہان، سند اور حکومت۔ علامہ مرتضٰی زبیدی تاج العروس میں رقمطراز ہیں۔ سلطان کے معنے حجت و برہان کے ہیں۔ لا تنفذون الا بسلطان میں یہی مراد ہے۔ اور کبھی اس سے معجزہ بھی مراد

ہوتا ہے جیسے اذارسلنا الی فرعون بسلطان مبین۔ اور جب سلطان کے معنی حجت ہوں تو اس کی جمع نہیں آتی کیونکہ اس صورت میں وہ مصدر کے قائمقام ہوتا ہے۔ بصائر میں ہے کہ حجت کو سلطان اس لیے کہا گیا ہے کہ دلوں پر اس کا دباؤ ہوتا ہے۔ دابر، جڑ، بیخ، بنیاد دبور سے جس کے معنے پشت پھیرنے کے ہیں۔ اسم فاعل کا واحد مذکر ہے ہر ایک چیز کے آخر اور تابع کے معنے میں استعمال ہوتا ہے۔ راغب فرماتے ہیں کہ متاخر اور تابع کو دابر کہا جاتا ہے خواہ باعتبار زماں ہو یا باعتبار مکان ہو یا باعتبار مرتبہ ہو۔

تاریخ کی ایک اور شہادت

تاریخی بیان کی ابتداء حضرت نوح اور ان کی قوم سے کی گئی تھی کیونکہ قرآن کی رُو سے جس صالح نظام زندگی پر حضرت آدم اپنی اولاد کو چھوڑ گئے تھے اس میں سب سے پہلا بگاڑ حضرت نوح کے دور میں رونما ہوا۔ حضرت نوح کے بعد عاد عرب کی قدیم ترین قوم تھی۔ مورخین عرب نے عاد کو عوص بن ارم بن شام کا حقیقی فرزند لکھا ہے۔ اس لیے ان کا زمانہ تین ہزار سال قبل مسیح ہونا چاہیے۔ یہاں قرآن نے ان کو خلفاء من بعد قوم نوح کہا ہے اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ سرزمین شام کے دوبارہ آباد ہونے کے بعد شامی اقوام کی پہلی ترقی قوم عاد سے ہوتی ہے اس لیے اس آیت سے عاد کے زمانہ کی تعیین ہوتی ہے۔ انتہائے مدت کی تعیین کی صورت یہ ہے کہ ۱۵سو قبل مسیح میں یمن میں ایک دوسری قوت کا ظہور ہوتا ہے اور اس سے کچھ ہی پہلے حضرت موسیٰ کا زمانہ ہے۔ حضرت موسیٰ سے پہلے عاد کی تباہی عام ہو چکی تھی۔ قرآن عاد کا ذکر ہمیشہ حضرت موسیٰ سے پہلے کرتا ہے اس لیے عاد کی عظمت اور ترقی کا زمانہ ۲۲۰۰ ق م سے ۱۷۰۰ ق م تک ہے عاد کی مرکزی آبادی قرآن کی رُو سے احقاف کا علاقہ تھا جو حجاز و یمن اور یمامہ کے الربع الخالی کے جنوب مغرب میں واقع ہے۔ سید صاحب فرماتے ہیں عاد کی مرکزی آبادی عرب کے بہترین حصہ یعنی یمن اور حضرموت میں سواحل خلیج فارس سے حدود عراق تک تھی۔ دراصل حکومت کا مرکز ملک یمن تھا لیکن خلیج فارس کے کنارے کنارے وہ عراق تک وسیع تھی جس سے نہایت آسانی سے وہ راہ معلوم ہو سکتی ہے جدھر سے یہ قوم عرب سے عراق میں اور عراق سے دیگر ممالک میں پھیلی اور یہی جدید تحقیقات کی رُو سے بھی اہم سامیہ کا راستہ سمجھا جاتا ہے۔ عاد کا دور دراز ممالک میں جانا عربوں میں اس قدر مسلم تھا کہ وہ شعراء کے ہاں تمثیلوں میں آ گیا ہے۔ ایک جاہل شاعر کہتا ہے۔

حتی انتهى لمياه الجوف ظاهرة - مالم تر قبلهم عاد و لا ارم

وہ وسط صحرا کے تالاب پر آکر رکا، یہ وہ رفتار تھی جو اس سے پہلے عاد وارم بھی نہیں چلے۔ تاریخی حیثیت سے اس کے بارے میں مولانا سید سلیمان ندوی نے ارض القرآن میں تفصیلی بحث کی ہے اور بتایا ہے کہ تاریخ قدیم کے بعض یورپین مصنفین عاد کو صرف ایک فرضی اور مذہبی کہانی سمجھتے ہیں لیکن یہ انتہائی غلطی ہے تحقیقات جدیدہ نے فیصلہ کیا ہے کہ عرب کے قدیم باشندے ایک کثیر الافراد باعظمت جمعیت تھی جس نے بابل، مصر و شام میں بڑی بڑی حکومتیں قائم کیں۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ بارہویں جلد سورہ ہود میں آرہی ہے۔

۸۹۔ اور ہم نے قوم عاد کی طرف ان کے بھائی ہود کو رسول بنا کر روانہ کیا۔ عاد حضرت نوح علیہ السلام کے پوتے ارم کی اولاد میں ہیں۔ یہ قوم اسی کی طرف منسوب ہے۔ ان کی سکونت احقاف میں تھی۔ حضرت ہود علیہ السلام اسی قوم سے ہیں اس لحاظ سے وہ ان کے قومی اور وطنی بھائی ہوئے[1]

حضرت ہود عاد کی سب سے زیادہ معزز شاخ خلود کے ایک فرزند تھے۔ سرخ و سفید رنگ اور وجیہ تھے ان کی داڑھی بڑی تھی۔ ان کی قوم بھی قوم نوح کی طرح خدا کی منکر نہ تھی۔ خدا کو مانتی تھی، لیکن اس کی یگانہ عبادت نہ کرتی تھی بلکہ شرک فی العبادت کرتی تھی۔ تاریخ قدیم کے بعض ماہرین کہتے ہیں کہ ان کے معبودانِ باطل بھی قوم نوح کی طرح ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر ہی تھے۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک اثر مروی ہے۔ اس میں ہے کہ ان کے ایک صنم کا نام حمود اور ایک کا نام ہتار تھا۔

اخاھم کا لفظ بتا رہا ہے کہ اس دور میں قومیت کی اساس اسی طرح نسل اور خاندان تھی جیسے آج کل وطن اور زبان ہے۔ اسی سے نبی کی امت اور قوم کا فرق بھی معلوم ہو جاتا ہے۔ امت دعوت نبی کی قوم ہوتی ہے اس کا تعلق نبی کے خاندان وطن اور زبان سے ہوتا ہے جبکہ امتِ اجابت نبی کی امت ہوتی ہے۔ پوری قومِ عاد حضرت ہود کی قوم ہیں لیکن آپ کی امت نہیں۔ امت صرف وہ لوگ ہیں جو ایمان کی نعمت سے مالا مال ہوتے ہیں اور بس۔ اور یہ تعبیر بالکل ایسی ہے جیسے رسول منہم رسول کا اپنی قوم کے اندر سے ہونا اتمامِ حجت کے نقطہ نظر سے اللہ تعالیٰ کا احسان عظیم ہے۔ یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ لوگوں کے دوسرے احسانات کی طرح اس احسان کی بھی ناقدری کی ہے۔

حضرت ہود کی دعوتِ توحید

۹۰۔ انہوں نے کہا کہ اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو۔ اللہ کے سوا تمہاری بندگی کے لائق کوئی نہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے کیا پھر بھی تم اللہ کی نافرمانی سے نہ بچو گے۔ ان لوگوں میں بُت پرستی پھیل گئی تھی۔ روزی دینے، مینہ برسانے تندرست کرنے اور مختلف مطالب و حاجات کے لیے الگ الگ دیوتا تیار کیے تھے جن کی پرستش ہوتی تھی۔ ہود علیہ السلام نے اس سے روکا اور اس جرم عظیم کی سزا سے ان کو ڈرایا۔ [1]

تمام انبیاؑ انسانوں کی ہدایت کے لیے آتے تھے۔ یہ ایک جانی بوجھی حقیقت ہے کہ ان حضرات نے اگر لوگوں کو جس بات کی ہدایت کی واضح اور قطعی لفظوں میں یہ اور صرف یہ تھی کہ اعبدواللہ، اللہ کی عبادت کرو اور ظاہر ہے کہ یہی ہونا بھی چاہیے۔ اگر قرآن کی تصریح کے مطابق انسان اللہ کی عبادت ہی کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو یہ کیسے ممکن تھا کہ انبیاؑ کو جو پیغام ہدایت دے کر بھیجا جاتا وہ اس سے ذرہ برابر بھی مختلف ہوتا۔ جب یہ حقیقت ہے کہ انبیاء علیہم السلام کا مشن صرف خدائے واحد کی عبادت کا پیام دینا اور انسانوں کو اس کا عابد بنانا تھا تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ ان حضرات نے بحیثیت نبی جو کچھ بھی بتایا اور سکھایا وہ سارے کا سارا عبادت کا کام تھا۔ اس کا کوئی لفظ اور کوئی شوشہ بھی عبادت کے سوا کچھ اور نہ تھا۔ کیونکہ یہ بوالفضولی تو ایک عام انسان سے بھی کچھ خلاف توقع ہی سمجھی جاتی کہ اسے مامور تو ایک مشن پر کیا گیا ہو لیکن وہ اپنی اس ڈیوٹی پر رہتے ہوتے کچھ غیر متعلق باتیں بھی انجام دینے لگے۔ پھر ایک پیغمبر کے بارے میں اس قسم کے کسی رویہ کا کیسے گمان کیا جا سکتا ہے۔

پیغمبر تو وہ ہوتا ہے جو سر سے پاؤں تک اطاعت ہی اطاعت ہوتا ہے جس کی نگاہیں ہمیشہ اپنے فرض منصبی ہی پر جمی رہتی ہیں جو اللہ کے بندوں کو وہی کچھ سمجھاتا اور سکھاتا ہے جس کا اس کے رب کی طرف سے حکم دیا گیا ہو اور اپنی طرف سے ایک لفظ بھی نہیں بولتا اس لیے ماننا پڑے گا کہ نبی دین کے بنیادی عقائد سے لے کر تمدن و معاشرت کے جزئی معاملات تک کے بارے میں جو کچھ بھی بتاتا اور سکھاتا ہے۔ وہ کسی تقسیم یا کسی استثنا کے بغیر سب کا سب عبادت ہی کا کام ہوتا ہے ان احکام کی پیروی بھی عبادت ہوتی ہے جن میں اللہ کی بندگی کا حکم ہو یعنی انفرادی اجتماعی زندگی بسر کرنے کے ضابطے اور قوانین بتائے گئے دوسرے لفظوں میں یہ کہ پورے دین، پوری شریعت کا اتباع ہی وہ عبادت ہے جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا اور انبیاء کو بھیجا گیا ہے۔

آخر میں یہاں افلا تتقون فرمایا ہے۔ تقوی کی اصل وقایۃ ہے اس کے معنے بچنے کے ہیں۔ یہاں مراد برائیوں سے بچنا ہے خواہ وہ فکری ہوں، اخلاقی ہوں، معاشرتی ہوں، معاشی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوں، سیاسی ہوں اور یا روحانی اور قانونی ہوں یہ لفظ اپنے عموم کی وجہ سے ساری برائیوں کو حاوی ہے حضرت نوحؑ نے فرمایا تھا کہ انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم اور حضرت ہودؑ نے فرمایا افلا تتقون، دونوں میں باریک سا فرق ہے۔ حضرت نوحؑ کی قوم سے پہلے عذاب کی کوئی نمائش نہ ہوئی تھی اور حضرت ہودؑ کی قوم کے سامنے حضرت نوحؑ کی قوم کا ماضی میں عذاب ہو چکا تھا اس لیے دونوں کی بات میں تبلیغ تعبیری فرق ہوگیا۔ یہاں افلا تتقون فرمایا اور سورہ ہود میں افلا تعقلون ارشاد ہوا ہے۔ یہ قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے کہ ایک ہی واقعہ کے تکرار میں تنویع فوائد کے لیے نیرنگی پیدا کرتا ہے حضرت امام بخاری نے قرآن ہی کی اتباع میں احادیث مکررہ کے بیان میں یہ انداز بیان اپنایا ہے۔ حضرت ہودؑ کی قوم بھی حضرت نوحؑ کی قوم کی طرح اللہ تعالیٰ کے وجود کی منکر نہ تھی نہ اللہ سبحانہٗ سے ناواقف تھی اور نہ اللہ کی عبادت کی منکر تھی بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا ہوگئی تھی یہی تھا کہ انہوں نے اللہ کے ساتھ دوسروں کو بھی اس کی عبادت میں شریک بنالیا تھا۔

حضرت ہودؑ کو سر برآوردہ طبقہ کا جواب

۹۱۔ اس پر قوم کے ان سرداروں نے کہا جنہوں نے کفر کا شیوہ اختیار کر رکھا تھا کہ تم اپنی عقل کھو بیٹھے ہو اور ہمارا خیال یہ ہے کہ تم جھوٹ بولنے والوں میں سے ہو۔ یعنی معاذ اللہ تم بے عقل ہو کہ باپ دادا کی روش چھوڑ کر ساری برادری سے الگ ہوتے ہو اور جھوٹے بھی ہو کر اپنے اقوال کو خدا کی طرف منسوب کر کے خواہ مخواہ عذاب کا ڈراوا دیتے ہو[1] مطلب یہ ہے کہ یہ جو تم ہمیں قہر و عذاب سے ڈراتے ہو یہ محض تمہاری خود دیانتگی ہے۔ ہماری یہ ترقیاں ہمارے مستحق عذاب ہونے کی علامت ہیں یا ہمارے منظور نظر ہونے اور صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کی۔ وانا لنظنک من الکاذبین یعنی تم جو یہ وعدہ کر رہے ہو کہ خدا کے فرستادہ ہو اور ہمارے پاس تم کو پیغمبر بنا کر بھیجا ہے یہ محض تمہاری دھونس ہے اور ہم تم کو بالکل جھوٹا آدمی سمجھتے ہیں۔

جواب کا یہ پیمانہ بتا رہا ہے کہ حضرت ہودؑ کے مخاطبوں کو اپنی قوتِ بازو پر ناز تھا۔ اور اسی طرح ہر قوم جو مجرد تفوق پر قابض ہوتی ہے زندگی کے آخری دنوں میں بھی اپنی قوت پر مغرور رہتی ہے۔ ان کو نہ صرف اپنی فوجی و سیاسی قوت پر ناز تھا بلکہ اپنے افراد کی تعداد اور اپنی مواشی کی کثرت اور

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اپنے باغوں کی بہتات پر بھی ناز تھا جو اس عہد کی سب سے بڑی دولت تھی۔ قوم عاد کے اس جواب سے ان کا ظلم و جور بھی مترشح ہے۔ یہ حاکمانہ زندگی کے لیے سب سے زیادہ زہر قاتل ہے۔ عاد کی جباری و ستمگری کا ثبوت مصر کی مفتوح قوموں کی زبان سے بھی ملتا ہے۔

خدا ہم سے ناراض تھا اور ایک عجیب طریقے سے اطراف مشرق سے شریر الخلقت لوگ چلے آتے وہ اس قدر قوی تھے کہ ہمارے ملک میں گھس آئے اور بزور نہایت آسانی سے اس کو مسخر کر لیا۔ جب انھوں نے ہمارے سرداروں کو گرفتار کر لیا۔ ہمارے شہروں کو جلا دیا۔ ہمارے دیوتاؤں کے مندر گرا دیے۔ اور تمام باشندوں کے ساتھ وحشیانہ سلوک کیا اور نہ صرف یہ بلکہ کچھ کو ہتھیاروں سے مار ڈالا اور ان کی بیوی بچوں کو غلام بنایا۔

اور یہ بھی ان کے انداز جواب سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ اللہ کے ساتھ اپنے خود ساختہ معبودوں کی پرستش کرتے تھے اور صرف حضرت ہود کی دعویٰ نبوت میں تکذیب نہ کرتے تھے بلکہ ان سب کی تکذیب کرتے تھے جو حضرت ہود کی طرح نبوت کا مشن لے کر کھڑے ہوں۔ حضرت ہود نے ان کو اس طاقت سے بھرپور نشتر والی تقریر کا جو جواب دیا قرآن نے آگے اسی کو پیش کیا ہے۔

حضرت ہود کا مقام

۹۲ ۔ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا بھائیو! میں اپنی عقل نہیں کھو بیٹھا ہوں بلکہ میں تمام جہانوں کے پروردگار کی جانب سے رسول بن کر آیا ہوں۔ میرا کام تم تک اپنے رب کے پیغامات پہنچانا ہے اور میں پوری امانت کے ساتھ تمہارا خیر خواہ ہوں۔ یعنی میری کوئی بات بے عقلی کی نہیں۔ ہاں جو منصب رسالت مجھ کو خدا کی طرف سے تفویض ہوا ہے اس کا حق ادا کرتا ہوں۔ یہ تمہاری بے عقلی ہے کہ اپنے حقیقی خیر خواہوں کو جن کی امانت و دیانت پہلے سے لائق اطمینان ہے۔ بے عقل کہہ کر خود اپنا نقصان کرتے ہو[1]

جو شخص ان آیات کو پڑھتا ہے اس کی آنکھوں کے سامنے ایک ایسی ہستی کا تصور آجاتا ہے جو وقار اور متانت کا مکمل مجسمہ ہیں اور شرافت و نجابت چہرہ سے عیاں، جو کچھ فرماتے ہیں پہلے اس کو وزن کر لیتے ہیں کہ اس کا انجام کیا ہے اچھا ہے یا برا۔ قوم کی درشتی، تمسخر و استہزاء کا جواب

[1] افادات شیخ الاسلام

ضبط و صبر سے دیتے ہیں اور پھر بھی ان کی بھلائی کے جویاں نظر آتے ہیں۔ اخلاص اور حسن نیت ان کی پیشانی سے عیاں ہے قوم کہتی ہے انا لنرٰک فی سفاھۃ و انا لنظنک من الکاذبین۔ ہم آپ کو بیوقوف سمجھتے ہیں اور ہمارے خیال میں آپ جھوٹے ہیں مگر وہ ان کو یہ جواب دیتے ہیں لیس بی سفاھۃ ولکنی رسول من رب العالمین - یہ سوال و جواب ہمیں بتلاتے ہیں کہ اللہ کے برگزیدہ بندے جب کسی کی خیر خواہی کرتے اور کج رو انسانوں کی کج روی پر نصیحت کرتے ہیں تو کور چشموں، بدباطنوں کی ہرزہ سرائی تمسخر و تحقیر کی پرواہ نہیں کرتے۔ دلگیر و رنجیدہ ہوکر امرِ حق سے منہ نہیں موڑتے ناراض ہوکر خیر خواہی اور نصیحت کو نہیں چھوڑتے اور بلندی اخلاق، نرمی و مہربانی کے ساتھ روحانی مریضوں کے علاج میں مشغول رہتے ہیں۔

آیت بتا رہی ہے کہ تبلیغ و پیغام حق کی راہ میں بدی کا بدلہ بدی سے نہیں بلکہ نیکی سے اور تلخی کا جواب شیریں کلامی سے دیا جاتے۔ اسی کو قرآن نے جادلھم بالتی ھی احسن میں پیش کیا ہے۔ یعنی ان سے مجادلہ مباحثہ احسن طریقے پر کرو۔ یہی طریقہ لیس بی سفاھۃ کہہ کر حضرت ہود نے اختیار کیا ہے۔ ایسا اسلوب، ایسا طریق خطاب، ایسا لب و لہجہ اس طرح کے الفاظ اختیار نہیں فرماتے جو مخاطبوں کے دل کو دکھ پہنچاتے ہوں یا سننے والوں کی نظر میں ان کو ذلیل کرنے والے ہوں کیونکہ مقصد دعوت حق ہے اور دعوت نام ہے مخاطب کے دل کو نرمی و محبت سے حق کی طرف متوجہ کرنے کا نہ کہ ضد پر پہنچا نے ضد میں لانے اور جوش نفرت سے بھر دینے کا۔ کس قدر بلیغ اور پیارے انداز میں فرمایا ہے کہ انا لکم ناصح امین۔ دعوت کی راہ لین دین کی راہ نہیں ہوتی سچ کو سچ مان لینے کی راہ ہوتی ہے۔ نبوت کی راہ دعوت کی راہ ہے جدل کی راہ نہیں۔ اگر جدل کرنا ہی پڑے تو صرف اس حالت میں کیا جاسکتا ہے کہ احسن طریقہ پر ہو یعنی راست بازی، دیانت، شیریں زبانی اور شائستگی سے بات پیش کی جاتے۔ حضرت ہود نے ان کے اس الزام کا جواب کہ تم بے عقل ہو اور جھوٹ بول رہے ہو۔ انا لکم ناصح امین۔ سے دیا ہے۔ امانت و صداقت کے ساتھ تمہاری خیر خواہی میری سیرت کا لازمی حصہ ہے۔ ان اوصاف کے ساتھ بھلا میں عقل سے بیگانہ اور صداقت سے دور کیسے ہو سکتا ہوں۔

حضرت ہود کا مقام نبوت

۶۳ - کیا تمہیں اس بات پر حیرت ہوئی ہے کہ ایک ایسے شخص کے ذریعے تمہارے پروردگار کا پیغام تمہارے پاس آیا۔ ہے جو خود تم میں سے ہے اور اس لیے آیا ہے کہ وہ تمہیں اعمال بد کے نتائج

سے آگاہ کرے۔ دنیا کی یہ بیماری پرانی ہے کہ وہ سمجھتی ہے کہ روحانی ہدایت کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے جو صرف ایک انسان کے ذریعہ ظاہر نہیں ہو سکتا۔ ضروری ہے کہ انسان سے کوئی بالاتر ہستی ہو بقول مولانا آزاد اسی خیال نے دیوتاؤں کے ظہور اور ان کی عجائب آفرینیوں کا اعتقاد پیدا کیا۔ قرآن نے ان کے اسی خیال کو ما ھذا الا بشر مثلنا کی صورت میں پیش کیا ہے یعنی ہر داعیٔ حق کے منکروں نے یہ بات کہی کہ تم تو ہماری طرح کے انسان ہو۔ پھر تمہارا یہ دعویٰ رسول من رب العالمین کیسے مان لیں۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ رسولوں کی رسالت ماننے میں سب سے بڑی رکاوٹ رسولوں کا انسان ہونا ہے قرآن نے اس بات کو بڑے اصرار اور بڑے تکرار کے ساتھ زور دے کر واضح کیا ہے کہ انسانوں کی ہدایت انسان ہی کے ذریعے ہو سکتی ہے کہیں اس نے منکم کہیں منہم اور کہیں متکلم کہہ کر یہ بات بتائی ہے یہاں علی رجل منکم کا مقام وہی ہے جو فیکم رسولاً منکم اور فیھم رسولا من انفسھم کا ہے۔

قوم عاد کی زمین میں حکومت

۹۴ - خدا کا یہ احسان یاد کرو کہ قوم نوح کے بعد اس نے تمہیں ان کا جانشین بنایا اور تمہاری نسل کو زیادہ وسعت اور توانائی عطا فرمائی لہٰذا تمہیں اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھنا چاہیے تاکہ تم کامیابی سے ہمدوش ہو۔ یعنی قوم نوح کے بعد دنیا میں تمہاری حکومتیں قائم کیں اور اس کی جگہ تم کو آباد کیا شاید یہ احسان یاد دلا کر اس پر بھی متنبہ کرنا ہے کہ بت پرستی اور تکذیب رسول کی بدولت جو حشر ان لوگوں کا ہوا وہ کہیں تمہارا نہ ہو۔ ان انعامات میں سے یہ بھی ہے کہ جسمانی قوت اور ڈیل ڈول کے اعتبار سے یہ قوم مشہور تھی۔ یہ احسانات اور ان کے علاوہ دوسرے بے شمار احسانات یاد کر کے اس کا شکر گزار اور فرمانبردار بننا چاہیے نہ یہ کہ منعم حقیقی سے بغاوت کرنے لگو۔[1]

اس آیت سے نہ صرف قوم عاد کے زمانے کی تعیین ہوتی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ ارم سامیہ اور عاد ایک ہی چیز ہیں اسی لیے قرآن نے ان کو عاد اولیٰ کہا ہے وانہ اھلک عادا الاولیٰ مگر یہ ایک عجیب بات ہے کہ تاریخ قدیم کے بعض یورپین مصنفین عاد کو محض ایک فرضی اور مذہبی فسانہ خیال کرتے ہیں چنانچہ مشہور مستشرق نولدیکی نے جو یورپ کی سرزمین پر مشرقیات کا سب سے

[1] افادات شیخ الاسلام

بڑا فاضل سمجھا جاتا ہے۔ عاد اور عمالیق کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا ہے جس میں ثابت کیا ہے کہ یہ غیر تاریخی قومیں ہیں لیکن یہ کوئی نئی اپچ نہیں قدیم زمانہ میں بعض ایرانیوں کو ان کے وجود سے انکار تھا۔ چنانچہ ابن جریر طبری جو مشہور مورخ ہیں عاد کے حالات میں لکھا ہے کہ

بعض ایرانیوں نے عاد سے انکار کیا ہے حالانکہ اشعار جاہلیت میں ان کا نہایت کثرت سے ذکر ہے اگر خوف تطویل نہ ہوتا تو میں نقل کرتا۔

لیکن یہ ایک کھلی اور واضح غلطی ہے۔ عاد و ثمود کے واقعات عرب کے مشہور ترین واقعات ہیں جن کا علم خود ان کو ذاتی طور پر حاصل تھا کیونکہ عاد و ثمود کی کل آبادیاں خود ان کے اندرون ملک کی آبادیاں تھیں۔ اور ان کے حالات وواقعات خاندانی طور پر ان میں نقل ہوتے چلے آتے تھے۔ مشہور مورخ ابن ہشام کلبی نے جس کا مخصوص موضوع عرب جاہلیت کی تاریخ وروایت ہے۔ ان کے حالات میں تین مستقل کتابیں تصنیف کی ہیں۔ پہلی کتاب کا نام تفرق عاد ہے یعنی عاد کی قوم عرب سے نکل کر کہاں کہاں گئی اور دوسری کتاب کا نام ہے کتاب من نقل من عاد وثمود والعمالیق وجرھم وبنی اسرائیل من العرب یعنی عاد و ثمود، عمالیق، جرہم اور بنی اسرائیل جو عرب سے نکل کر باہر گئے ان کے حالات۔ تیسری کتاب کا نام ہے کتاب عاد الاولی والثانیہ۔

بطلیموس نے اپنے جغرافیہ میں جنوبی عرب کے قبائل میں عاد ریمیٹا اور عادیات کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ پہلا عاد ارم ہے اور دوسرا عاد ہے۔ جس کو یونانی تلفظ نے یہ صورت دے دی ہے۔ بطلیموس دوسری صدی عیسوی میں تھا۔ اس بنا پر عاد کا وجود اس زمانے تک مسلم ہے۔

حضرت امیر معاویہ کے زمانے میں عبدالرحمان مصر کے گورنر تھے۔ انہوں نے حضرموت کے منہدم شدہ قلعہ "حصن غراب" پر ایک کتبہ پایا تھا۔ یہ کتبہ علامہ نویری نے اپنی کتاب مسالک الابصار میں نقل کیا ہے۔ ۱۸۳۴ میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک مشن یمن بھیجا تھا اس کو یہی کتبہ اصل قدیم حمیری خط میں ملا۔ یہ کتبہ فارسٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق قوم عاد کا ہے اور عرب کے قدیم ترین کتبات میں سے ہے جس کا زمانہ حضرت عیسٰی سے اٹھارہ سو برس قبل کا ہے۔ یہ کتبہ ایک منہدم عمارت میں پتھر پر کندہ تھا۔ ایک انگریز افسر جس کا نام ولسٹڈ تھا اس کا مکتشف تھا اور یہ سب سے پہلا عربی کتبہ ہے جو یورپ نے عرب کی سرزمین میں دریافت کیا۔ اصل کتبہ اور اس کا حل اولاً ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں چھپا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کا پورا ترجمہ عاد ثانیہ کی تحقیق میں اپنی مشہور کتاب ارض القرآن میں درج کر دیا ہے فرماتے ہیں:

ہم مدت تک اس وسیع قصر میں رہے۔ ہماری حالت بدنصیبی اور ادبار سے دور تھی۔ ہماری نہروں میں دریا کا پانی اُمڈ آتا تھا۔ سمندر موجیں مارتا ہوا ہمارے قلعہ کی دیواروں سے غضب ناک ہو کر ٹکریں مارتا تھا۔ ہمارے چشمے خوش آئند آواز سے بہتے تھے۔ بلند کھجوروں کے اوپر جن کے باغبان خشک چھوہارے ہماری وادیوں کے چھوہاروں کی زمین میں لگاتے تھے اور خشک چاول بوتے تھے۔ ہم پہاڑی بکروں اور جوان خرگوشوں کا شکار بنجروں اور جالوں سے کرتے تھے اور مچھلیوں کو بہلا بہلا کر باہر نکال لیتے تھے اور ہم آہستہ آہستہ خراماں رنگ برنگ کے ریشم کے کپڑے اور کاہی سبز مختلف الالوان جامہ پہن کر چلا کرتے تھے اور ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے تھے جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے۔ یہود کی شریعت کے مطابق اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے اور ہم معجزات کا یقین رکھتے تھے قیامت کے روز اور نبیوں کے راز پر ایمان تھا۔ راہزن دشمن گھس آتے اور وہ ہمارے ساتھ کچھ جھگڑا کرتے مگر ہم نے گھوڑوں کو لوپر ڈال دیا اور ہمارے کریم نوجوان سخت اور نوکدار نیزوں کو لے کر آگے بڑھے۔ ہمارے خاندان کے معزز بہادر مرد اور عورتیں گھوڑوں پر لڑ رہی تھیں جن کی گردنیں لمبی تھیں اور جو چمکدار کمیت رنگ کے تھے۔ ہماری تلواریں بدستور دشمنوں کو زخمی کر رہی تھیں اور چھید رہی تھیں یہاں تک کہ ان کے قلب پر حملہ کر کے ان کو مفتوح اور بالکل پست کر دیا جو بدترین نوعِ انسان تھے۔

یہ کتبہ متعدد حیثیات سے قرآن عظیم کی تائید کرتا ہے۔

اوّلاً یہ کہ حضرت ہود علیہ السلام کی اس سے تاریخی شخصیت معلوم ہوتی ہے۔

ثانیاً یہ کہ بقایائے عاد صرف حضرت ہود علیہ السلام کے پیروکار تھے۔

ثالثاً یہ کہ عاد ذات العماد اور عمارتوں کے بانی تھے۔

رابعاً یہ کہ وہ حقیقت میں جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے بڑے بڑے باغ، چشموں، آل اولاد اور چوپایوں کے مالک تھے۔

بہرحال عاد کا انکار تاریخ کی ایک مسلمہ حقیقت کا انکار ہے۔ تاریخ اور اکتشافات عصریہ دونوں کا متفقہ فیصلہ ہے کہ عرب کے قدیم باشندے ایک کثیر التعداد اور باعظمت و جبروت قوم تھی

جن کا زمانہ حضرت نوح کے بعد اور حضرت ابراہیم سے پہلے ہے۔ عرب مورخین ان کو عرب عاریہ یعنی خالص عرب کہتے ہیں۔ یہ بہت سے قبائل تھے۔ ان کو امم بائدہ بھی کہا جاتا ہے یعنی برباد شدہ قومیں۔ کیونکہ زمانہ نے ان کا نام ونشان مٹا کر رکھ دیا۔ اشعار جاہلیت میں ان کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ قبیلہ عاد ان قبائل میں سب سے زیادہ کثیر الافراد باعظمت جمعیت تھی جو تمام عرب عاربہ میں شوکت وجبروت کے اعتبار سے ممتاز تھی اور نوح علیہ السلام کی قوم کی بربادی کے بعد خلافت ارضی اسی کے حصہ میں آئی یہی قوم تھی جو دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی۔ ان کے افراد کی فراوانی اور قوت وشوکت کی بہتات کی طرف وزادکم فی الخلق بصطۃ میں اشارہ کیا ہے بصطۃ سے مقصود زور و قوت ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے بدن میں زور و توانائی عطا فرمائی۔ قوم عاد کے متعلق عام طور سے نہایت لغو باتیں مشہور ہیں۔ مثلاً شداد کی جنت کا قصہ کہ اس میں سونے چاندی کی اینٹیں تھیں اور لعل وگوہر پچیکاری۔ اس کے سنگریزے جواہر کے تھے اور اس کی مٹی مشک وعنبر کی وغیرہ وغیرہ۔ شارحین قرآن کی ایک جماعت نے اس قصہ کو اپنی تفسیروں میں نقل کر ڈالا ہے اور ثعلبی وغیرہ نے تو یہاں تک لکھ دیا ہے کہ حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے زمانے میں عبداللہ بن قلابہ اس کی سیر بھی کر آئے اور تعجب یہ ہے کہ تفسیر قرطبی اور تفسیر عزیزی تک میں یہ قصہ جوں کا توں نقل کر دیا لیکن یہ محض افسانہ ہے جس کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔ چنانچہ قاضی محمد بن علی شوکانی اپنی مشہور تفسیر فتح القدیر میں فرماتے ہیں:

> یہ جھوٹ پر جھوٹ اور افترا پر افترا ہے اسلام اور اہل اسلام کو اس قسم کے جھوٹے دجالوں سے کہ جو کبھی بنی اسرائیل پر کبھی انبیاء پر اور کبھی صالحین پر اور کبھی خود رب العالمین پر دروغ بیانی کی جرأت کرتے ہیں سخت مصیبت عظیم نقصان اور بڑی پریشانی لاحق ہوئی۔ اور پھر ایسے لوگوں کی تصنیف اور کتاب اللہ کی تفسیر میں پیش پیش ہو جانے سے کہ جن کو صحیح، ضعیف اور موضوع روایات کا پتہ تک نہیں یہ برائی اور زیادہ ہو گئی۔ کیونکہ ان من گھڑت خرافات اور خود ساختہ فسانوں اور بنائے ہوئے قصوں کو کتاب اللہ کی تفسیر میں داخل کر کے بڑی تحریف اور تغیر و تبدل کر ڈالا۔

حیرت ہے کہ خود علامہ شوکانی نے اس بھرپور تردید کے باوجود اپنی تفسیر میں زادکم فی الخلق بصطۃ کی تشریح کرتے ہوئے عاد کے قد وقامت، ڈیل ڈول اور ان کی جسامت

کے بارے میں عجیب و غریب باتیں بے تکلف نقل کر ڈالی ہیں مثلاً وہ فرماتے ہیں کہ

ابن عساکر وہب سے راوی ہیں کہ عاد کا ہر شخص ان کے گز کے اعتبار سے ساٹھ گز کا ہوتا تھا اور اس کی کھوپڑی بڑے گنبد کے مانند ہوتی تھی اور آنکھ اور اسی طرح ان کی ناک اتنی بڑی ہوتی تھی کہ جس میں درندوں کے بچے پیدا ہو جائیں اور عبد بن حمید نے قتادہ سے روایت کی ہے کہ ان کی قامت کی درازی بارہ گز کی تھی اور حکیم ترمذی نے نوادر الاصول میں حضرت ابن عباس سے نقل کیا ہے کہ ان کا قد اسی ہاتھ لمبا اور گیہوں کا دانہ گائے کے گردے کے برابر تھا۔ اور انار اتنا بڑا ہوتا کہ جس کے چھلکے میں دس آدمی بیٹھ جائیں۔ اور عبداللہ بن احمد نے زوائد الزہد میں نیز ابن ابی حاتم نے حضرت ابوہریرہ سے روایت کی ہے کہ قوم عاد کا ایک شخص پتھر کے دروازے کا ایک پٹ اتنا بڑا بناتا تھا کہ اس امت کے پانچ سو آدمی مل کر اس کو اپنی جگہ سے نہیں ہلا سکتے۔

اب یہاں بجائے اس کے کہ قاضی صاحب ان واہی تباہی حکایات کی تردید کرتے یہ کہہ کر کہ

قوم عاد کے بڑے بڑے ڈیل ڈول ہونے میں سلف میں بہت قصے منقول ہیں۔

ان افسانوں پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔ اصل میں بات یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے ارشاد زادکم فی الخلق بصطۃ سے قاضی صاحب یہ سمجھے کہ یہ ان کے قد و قامت کی درازی اور ان کے ڈیل ڈول کی بڑائی کا بیان ہے، چنانچہ وہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یعنی خلقت میں درازی اور جثہ میں کلمۃ ان کے باپ دادا کے قد و قامت سے کہیں زیادہ تھی۔

حالانکہ بصطۃ سے مقصود زور و قوت کا بیان ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ نے تمہارے بدنوں میں زور و توانائی زیادہ عطا فرمائی اور لطف یہ کہ خود قاضی شوکانی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے بروایت ابن ابی حاتم و ابوالشیخ بصطۃ کی تفسیر شدۃ زور و طاقت سے نقل کی ہے۔ غور فرمائیے دوسری جگہ قرآن میں حضرت طالوت کے متعلق بھی یہی ارشاد ہے و زادہ بسطۃ فی العلم و الجسم۔ اب اس سے یہ کون سمجھے گا کہ طالوت بہت ہی قد آور تھے بلکہ یہ ان کے صرف صاحب زور و قوت ہونے کا بیان ہے۔

درحقیقت عاد کے طول قامت کے بارے میں جتنی بھی روایات ہیں سب اسرائیلی فسانے ہیں جو مسلمانوں میں پھیل گئے تھے۔ اسی لیے محتاط مفسرین نے جو نقد و نظر کے مالک تھے اس بارے میں ایک حرف بھی نقل نہیں کیا۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں و زادکم فی الخلق کی تفسیر میں اس سے زیادہ کچھ نہیں لکھا۔ ان کو اپنے اہل زمانہ میں شکل و صورت اور طاقت و گرفت میں سب سے زیادہ زور آور بنایا [1]

ظاہر ہے کہ اس موضوع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی ارشاد منقول نہیں ہے اور جو افسانے بتائے جاتے ہیں وہ ان کتابوں میں موجود نہیں جن کے مصنفین نے صحت کا التزام کیا ہے۔ پھر ایسے غیر معمولی واقعات کے لیے جب تک کثرت سے روایات نہ موجود ہوں ان کو صحیح کیسے باور کیا جا سکتا ہے اسی بنا پر علامہ قرطبی نے اپنی تفسیر جامع احکام القرآن میں جب ابن العربی کے حوالہ سے حضرت عبداللہ ابن عباس کا یہ بیان نقل کیا کہ عاد میں ہر شخص کا قد ستر گز کا تھا تو فرمایا:

یہ غلط ہے کیونکہ الصحیح میں موجود ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آدم کو پیدا کیا تو ان کا قد ساٹھ گز کا تھا پھر برابر نسل انسانی کا قد آج تک گھٹتا چلا آرہا ہے۔

حضرت آدم کے قد کے ساٹھ گز ہونے کی روایت صحیح بخاری کتاب الاستیذان میں موجود ہے لیکن اس کے متعلق حافظ عقیلی کتاب الضعفاء میں ابوالزناد کے تذکرے میں لکھتے ہیں۔

ابن القاسم کہتے ہیں میں نے امام مالک سے اس شخص کے بارے میں دریافت کیا تھا جو اس حدیث کو بیان کرتا ہے جس میں لوگوں نے ان اللّٰہ خلق آدم علی صورتہ کے متعلق پوچھا تو امام مالک نے اس روایت کا نہایت سختی سے انکار کیا اور منع کر دیا کہ کوئی اس کو بیان نہ کرے [2]

اور حافظ ابن حجر عسقلانی کہ جو سرآمد علمائے متاخرین ہیں لکھتے ہیں:

ساٹھ گز قد والی روایت پر یہ شبہ ہوتا ہے کہ اب جو گزشتہ قوموں کے آثار موجود ہیں جیسے ثمود کی آبادیاں۔ ان کے مکانات زبان حال سے کہہ رہے ہیں کہ ان کے قد اور ڈیل ڈول زیادہ لانبے نہ تھے۔ اس معیار کے مطابق جس کی ترتیب

[1] البدایہ والنہایہ [2] میزان الاعتدال

سابق مقتضی ہے حالانکہ اس میں شک نہیں کہ ان کا زمانہ قدیم ہے اور جو مدت کہ ان کے اور آدم علیہ السلام کے مابین ہے وہ اس مدت سے کم ہے کہ جو اس کے اوائل اور ان کے مابین تھی اور اب تک مجھے کوئی چیز ایسی معلوم نہیں ہو سکی جو اس اعتراض کو دور کر سکے۔

ہاں حضرت آدم کے قد کے بارے میں یہ توجیہ ممکن ہے کہ یہ واقعہ آسمان کا ہو اور دنیا میں آنے کے بعد وہی قد و قامت رہ گیا ہو جو نسلِ انسانی کا عام طور پر چلا آرہا ہے۔ جس طرح دن کا معاملہ ہے کہ عالمِ بالا کا ایک دن عالم سفلی کے ایک ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ اور جب اس عالم میں واپس جائیں گے تو پھر وہیں کے مناسب قد و قامت عطا کر دیا جائے گا۔ چنانچہ اہلِ جنت کا قد و قامت ساٹھ گز کا روایات میں موجود ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ آئیے ذرا قرآن کی روشنی میں عاد کے قد و قامت والی روایت پر نظر ڈال لیجئے۔ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے وعادا وثمودا وقد تبین لکم من مساکنھم عاد و ثمود، ان کے رہنے کی جگہیں تمہارے لیے کھلی ہوئی ہیں۔ یہ عاد و ثمود کے ان ہی مکانات کا ذکر ہے جو عہدِ نبوی میں موجود تھے اور آج بھی موجود ہیں اور جن کو مسلمان اس زمانے سے لے کر آج تک مساکن عاد و ثمود ہی مانتے ہیں۔ ورنہ ان مساکن کے مساکن عاد و ثمود ہونے میں اگر کچھ شبہ ہوتا تو قد تبین لکم من مساکنھم نہ فرمایا جاتا۔ اس لیے اس موضوع پر خود ان کی رہائش گاہوں سے بڑھ کر جو آنکھوں کی دیکھی کھلی شہادت ہے اور کون سی چیز فیصلہ کن ہو سکتی ہے۔ آخر میں فرمایا ہے واذکروا الاء اللہ لعلکم تفلحون۔ تمہیں اللہ کی نعمتوں کو یاد رکھنا چاہیے تاکہ تم کامیابی سے ہمدوش ہو۔ الاء جمع الی کی ہے اس کے معنے نعمت، انعام کرشمہ، شان کارنامہ کے ہیں۔ حضرت ہود کی یہ بات اپنے اندر امتنان اور تنبیہہ دونوں پہلو رکھتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے تمہیں جن جسمانی، عقلی، سیاسی، معاشی، افرادی قوتوں سے نوازا ہے ان کی قدر کرو، ان کا شکر کرو۔ ان کی وجہ سے فتنوں کا شکار نہ ہو۔ خدا کی نعمتوں، احسانوں، عظمتوں اور شانوں کو یاد رکھو۔ یہی فلاح و کامیابی کا راستہ ہے۔ اگر تم نے اکڑ دکھائی تو یاد رکھو خدا کی پکڑ بھی بڑی ہی سخت ہے۔

قبولِ حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ

۹۵- انہوں نے جواباً کہا کیا ہمارے پاس اس لیے آتے ہو کہ ہم یگانہ اللہ سے عابدانہ تعلقات

پیدا کریں اور ان معبودوں سے عابدانہ تعلقات چھوڑ دیں جن سے ہمارے باپ دادوں کے عابدانہ تعلقات تھے اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو جس چیز کی ہمیں دھمکی دے رہے ہو وہ لاؤ عاد نے جب حضرت ہود کا یہ اعلان سنا کہ وہ اللہ کے رسول ہیں اور ان کے پاس علم کا ذریعہ وحی ہے تو اس اعلان کے آگے سر تسلیم خم کرنے کی جگہ حیرت میں پڑ گئے اور ان کی سمجھ میں یہ بات نہیں آئی کہ ایک خدا کے سوا کسی بھی مخلوق سے بندوں کے عابدانہ تعلقات نہ ہونے چاہئیں۔ خدا کے سوا خدا کے بندوں سے عابدانہ تعلقات پیدا کرنے اور شرک کرنے کے لیے ان کے ترکش میں دلیل کا کوئی تیر نہ تھا اس لیے انہوں نے باپ دادا کی تقلید کا سہارا لیا اور بڑی حیرت سے بول پڑے اجئتنا لنعبد اللہ وحدہ و نذر ما کان یعبد آباؤنا، کیا تو اس لیے ہمارے پاس آیا ہے کہ ہم صرف ایک ہی خدا کی پر عبادت کریں اور ان معبودوں کو چھوڑ دیں جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ قبول حق کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ آباؤ اجداد کی اندھی تقلید اور گڑھی ہوئی بزرگیوں اور روایتی عظمتوں کی پرستش ہے۔ ابتداء جہل و فساد سے کوئی عقیدہ گڑھ لیا جاتا ہے۔ پھر جب ایک عرصہ کے اعتقاد سے اس میں شان تقدیس پیدا ہو جاتی ہے تو اسے شک و شبہ سے بالاتر سمجھنے لگتے ہیں۔ اور عقل و بصیرت کی کوئی دلیل بھی اس کے خلاف تسلیم نہیں کرتے۔ وہ نبوت کی توحید عبادت کی دعوت کو باپ دادا کی توہین سمجھتے ہیں۔ وہ غصہ میں آپے سے باہر ہو جاتے جب وہ دیکھتے ہیں کہ زبان نبوت ان کو مشرک کا ذکر رہی ہے۔ قوم عاد کے نزدیک حضرت ہود کی بات مان لینے میں ان کے ان معبودوں اور بزرگوں کی توہین تھی جن کو وہ خدائے قدوس کی بارگاہ میں اپنا وسیلہ اور شفیع سمجھتے تھے۔ آخر وہ شعلہ کی طرح بھڑک اٹھے اور حضرت ہود علیہ السلام سے بگڑ کر کہنے لگے فاتنا بما تعدنا اے ہود تو نے اپنے خدا کے عذاب کی دھمکی دی اور ہم کو اس سے یہ کہہ کر ڈرایا انی اخاف علیکم عذاب یوم عظیم اب ہم سے تیری روز روز کی نصیحتیں نہیں سنی جاتی ہیں۔ ہم ایسے ناصح مشفق سے باز آتے اگر تو واقعی سچا ہے تو وہ عذاب جلدی لا تاکہ ہمارا تیرا قصہ پاک ہو۔

قوم کو حضرت ہود علیہ السلام کا جواب

۹۶۔ حضرت ہود نے فرمایا بلاشبہ تمہارے پروردگار کی طرف سے تم پر عذاب و غضب آچکا ہے کیا مجھ سے ان ناموں کے بارے میں اُلجھ رہے ہو جو تمہارے اور تمہارے باپ دادا کے رکھے ہوتے ہیں۔ جن کی خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے۔ اچھا تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ

انتظار کر رہا ہوں۔ یعنی جب تمہاری سرکشی اور گستاخانہ بے حیائی اس حد تک پہنچ چکی ہے تو سمجھ لو کہ خدا کا عذاب اور غضب تم پر نازل ہی ہو چکا اس کے آنے میں اب کچھ دیر نہیں اور تم جو بتوں کو کہتے ہو کہ فلاں رزق دینے والا ہے اور فلاں مینہ برسانے والا اور فلاں بیٹا عطا کرنے والا و علی ہذا القیاس یہ محض نام ہی نام ہیں جن کے پیچھے کوئی حقیقت اور واقعیت نہیں۔ خدائی صفات پتھروں میں کہاں سے آئیں۔ پھر نام کے معبودوں کے پیچھے جن کی معبودیت کی کوئی عقلی یا نقلی سند نہیں بلکہ کل عقلی و نقلی دلائل جسے مردود ٹھہراتے ہیں تم دعویٰ توحید میں مجھ سے جھگڑتے اور بحثیں کرتے ہو۔ جب تمہارے جہل اور شقاوت و عناد کا پیمانہ اس قدر لبریز ہو چکا ہے تو انتظار کرو کہ خدا ہمارے تمہارے ان جھگڑوں کا فیصلہ کر دے میں بھی اسی فیصلہ کا منتظر ہوں[1] مطلب یہ ہے کہ عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو اب اس میں دیر نہیں ہے اس کو آیا ہی سمجھو اس لیے کہ جس ناپاکی اور غضب سے خدا کا غضب بھڑکتا ہے اس کی بہت بڑی کھیپ تم نے اپنے اوپر لاد لی ہے۔ رجس کا اتنا بڑا انبار جمع کر لینے کے بعد اب خدا کے صاعقہ عذاب کو دور نہ سمجھو اتجادلوننی بڑا ہی بلیغ فقرہ ہے یہ قوم کی اس بات کا جواب ہے کہ بھلا ہم اپنے ان معبودوں کو کس طرح چھوڑ سکتے ہیں جن کو باپ دادا کے زمانے سے پوجتے آ رہے ہیں۔ فرمایا کہ تمہاری تقلید آباء کی یہ حجت بالکل بے بنیاد ہے تم جن چیزوں کو پوجتے ہو ان کے نام تمہارے اپنے رکھے ہوتے ہیں لیکن ان ناموں کا کوئی مسمی موجود نہیں ہے یعنی تم کسی کو بارش کا اور کسی کو ہوا کا اور کسی کو بیماری کا رب کہتے ہو۔ حالانکہ ان میں سے کوئی بھی فی الحقیقت کسی چیز کا رب نہیں ہے۔ ان کے خدا کے شریک ہونے کی کوئی دلیل عقل و فطرت میں موجود نہیں ہے اور نہ خدا نے اپنے نبیوں اور رسولوں کے ذریعے سے کہیں یہ خبر دی ہے کہ اللہ نے ان کو اپنا شریک بنایا ہے۔ یہ صرف خیالی باتیں ہیں جن کا خارج میں کوئی واقعی مصداق نہیں ہے۔ اسی قسم کے اسماء وہ ہیں جو موجودہ زمانے میں لوگ بولتے ہیں مثلاً غوث، مشکل کشا، گنج بخش، داتا، غریب نواز یہ بھی صرف اسماء ہیں جن کا خارج میں کوئی مصداق نہیں ہے۔ پس درحقیقت ایسے سب نام محض نام ہی ہیں جن کے پیچھے کوئی مسمی نہیں ہے۔ جو ان کے لیے جھگڑتا ہے وہ دراصل چند ناموں کے لیے جھگڑتا ہے نہ کسی حقیقت کے لیے۔ صورتِ حال اگر یہ ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیا ہے تو پھر وہ کیا چیز ہے جس کی بنا پر تم ان کو معبود بناتے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

بیٹھے ہو اور ان کی حمایت میں مجھ سے لڑ رہے ہو۔ جہاں تک خدا کا تعلق ہے اس کو تو تم بھی مانتے ہو وہ نزاعی چیز نہیں ہے لہٰذا تمہارے یہ خیالی اسماء تو ان کے حق میں تمہارے پاس کیا دلیل ہے۔
آخر میں ارشاد ہوا ہے فانتظروا۔ مطلب یہ ہے کہ اب اگر عذاب دیکھنے ہی کا شوق ہے تو انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کر رہا ہوں۔ جہاں تک اسباب کا تعلق ہے وہ تو تم نے سارے فراہم کر دیے ہیں لیکن عذاب کا لانا میرا کام نہیں ہے خدا کا کام ہے تم بھی انتظار کرو میں بھی انتظار کر رہا ہوں۔

قوم عاد پر عذاب اور ان کا انجام

۹۷۔ پھر ہم نے حضرت ہود اور اُن کے ساتھیوں کو اپنی مہربانی سے بچا لیا اور جنہوں نے ہماری آیات کو جھٹلا دیا تھا ان کی بیخ و بنیاد اکھاڑ دی واقعہ یہ ہے کہ وہ ایمان لانے والے نہ تھے۔ یعنی ان پر سات رات اور آٹھ روز تک مسلسل آندھی کا طوفان آیا جس سے تمام کفار ٹکڑا ٹکڑا کر اور پٹک پٹک کر ہلاک کر دیے گئے یہ تو عاد اولیٰ کا انجام ہوا اور اسی قوم کی دوسری شاخ ثمود جسے عاد ثانیہ کہتے ہیں اس کا ذکر آگے آتا ہے[1] یہ اس سنتِ الٰہی کا بیان ہے جو رسول کے ذریعے سے قوم پر حجت تمام کر دینے کے بعد لازماً ظاہر ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ رسول اور اس کے ساتھیوں اپنے فضل خاص سے اپنی حفاظت میں لے کر علاقہ عذاب سے نکال دیتا ہے اور رسول کے تمام جھٹلانے والوں کی جڑ کاٹ دی جاتی ہے۔ یہ فیصلہ کن عذاب ہوتا ہے جو اس وقت آتا ہے جب مخاطب قوم اپنی ہٹ اور ضد سے یہ ثابت کر دیتی ہے کہ اس کے اندر صلاحیت ایمان کی کوئی رمق بھی باقی نہیں رہی ہے وما کانوا مومنین سے اسی طرف اشارہ ہے۔
قوم ہود پر عذاب کی بات خود اہلِ عرب کی تاریخی روایات سے بھی ثابت ہے اور موجودہ اثری اکتشافات بھی اس پر شہادت دیتے ہیں کہ عاد اولیٰ بالکل تباہ ہو گئے اور ان کی یادگاریں تک دنیا سے مٹ گئیں چنانچہ مورخین عرب انہیں امم بائدہ کہتے ہیں۔ پھر یہ بات بھی عرب کے تاریخی مسلمات میں سے ہے کہ عاد کا صرف وہ حصہ باقی رہا ہے جو حضرت ہود کا پیرو تھا انہیں بقایا تے عاد کا نام تاریخ میں عاد ثانیہ ہے اور حصن غراب کا وہ کتبہ جس کا ہم ابھی ابھی ذکر کر چکے ہیں انہی کی یادگاروں

[1] افادات شیخ الاسلام

یں سے ہے۔ اس کتبہ میں ماہرین آثار نے جو عبارت پڑھی ہے اس کے جملے پھر ذہن میں تازہ کر لیجئے۔
ہمارے حکمران ایسے بادشاہ تھے جو بُرے خیالات سے پاک اور اہل شر و فساد پر سخت تھے وہ ہم پر ہود کی شریعت کے مطابق حکومت کرتے تھے اور عمدہ فیصلے ایک کتاب میں درج کرتے جاتے تھے۔

یہ عبارت آج بھی قرآن کے اس بیان کی تصدیق کر رہی ہے کہ عاد کی عظمت و شوکت کے وارث آخر کار وہ لوگ ہوئے جو حضرت ہود پر ایمان لاتے۔ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت ہود اور ان پر ایمان لانے والوں کو اللہ نے عذاب سے محفوظ رکھا۔

یہ ہے عاد اولیٰ کی وہ داستان عبرت جو اپنے اندر چشم عبرت بین کے لیے بے شمار پند و نصائح رکھتی اور خدائے برتر کے احکام کی تعمیل اور تقویٰ و طہارت کی زندگی کی جانب دعوت دیتی ہے۔ شرارت، سرکشی اور خدا کے احکام سے بغاوت کے انجام بد سے آگاہ کرتی اور وقتی خوش عیشی پر گھمنڈ کر کے نتیجہ کی بدبختی پر مذاق اڑانے سے ڈراتی اور باز رکھتی ہے۔

وَإِلَىٰ ثَمُودَ أَخَاهُمْ صَالِحًا ۘ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا اللَّهَ مَا
لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ قَدْ جَاءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ هَٰذِهِ
نَاقَةُ اللَّهِ لَكُمْ آيَةً ۖ فَذَرُوهَا تَأْكُلْ فِي أَرْضِ اللَّهِ ۖ وَلَا
تَمَسُّوهَا بِسُوءٍ فَيَأْخُذَكُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ۝٧٣ وَاذْكُرُوا
إِذْ جَعَلَكُمْ خُلَفَاءَ مِن بَعْدِ عَادٍ وَبَوَّأَكُمْ فِي الْأَرْضِ
تَتَّخِذُونَ مِن سُهُولِهَا قُصُورًا وَتَنْحِتُونَ الْجِبَالَ بُيُوتًا ۖ
فَاذْكُرُوا آلَاءَ اللَّهِ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ۝٧٤
قَالَ الْمَلَأُ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا مِن قَوْمِهِ لِلَّذِينَ
اسْتُضْعِفُوا لِمَنْ آمَنَ مِنْهُمْ أَتَعْلَمُونَ أَنَّ صَالِحًا
مُّرْسَلٌ مِّن رَّبِّهِ ۚ قَالُوا إِنَّا بِمَا أُرْسِلَ بِهِ مُؤْمِنُونَ ۝٧٥
قَالَ الَّذِينَ اسْتَكْبَرُوا إِنَّا بِالَّذِي آمَنتُم بِهِ كَافِرُونَ ۝٧٦
فَعَقَرُوا النَّاقَةَ وَعَتَوْا عَنْ أَمْرِ رَبِّهِمْ وَقَالُوا يَا صَالِحُ ائْتِنَا

بِمَا تَعِدُنَآ اِنۡ كُنۡتَ مِنَ الۡمُرۡسَلِيۡنَ ۝ فَاَخَذَتۡهُمُ
الرَّجۡفَةُ فَاَصۡبَحُوۡا فِىۡ دَارِهِمۡ جٰثِمِيۡنَ ۝ فَتَوَلّٰى عَنۡهُمۡ
وَقَالَ يٰقَوۡمِ لَقَدۡ اَبۡلَغۡتُكُمۡ رِسَالَةَ رَبِّىۡ وَنَصَحۡتُ لَـكُمۡ
وَلٰـكِنۡ لَّا تُحِبُّوۡنَ النّٰصِحِيۡنَ ۝

اور قوم ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی حضرت صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر روانہ کیا[98]۔ حضرت صالح نے فرمایا اے میری قوم کے لوگو اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں[99]۔ دیکھو تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل تمہارے سامنے آچکی ہے یہ خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی تمہارے لیے ایک فیصلہ کن نشانی ہے پس اسے کھلا چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ کہ اس کی پاداش میں جانکاہ عذاب تمہیں پکڑے[100]۔ اور وہ وقت یاد کرو

کہ خدا نے تمہیں قوم عاد کے بعد اس کے جانشین بنایا اور اس سرزمین میں اس طرح بسایا کہ میدانوں سے محل بنانے کا کام لیتے ہو، اور پہاڑوں کو بھی تراش کر اپنا گھر بنا لیتے ہو، پس اللہ کی نعمتیں یاد کرو اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے خرابی نہ پھیلاؤ[101]۔ قوم کے جن سربرآوردہ لوگوں کو اپنی دولت و طاقت کا گھمنڈ تھا۔ انہوں نے مومنوں سے کہا اور یہ اُن لوگوں میں سے تھے جنہیں کمزور حقیر سمجھتے تھے۔ کیا تم نے سچ مچ معلوم کر لیا ہے کہ صالح خدا کا بھیجا ہوا ہے؟ انہوں نے کہا ہاں بے شک جس پیامِ حق کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے ہم اس پر پورا یقین رکھتے ہیں اس پر گھمنڈ کرنے والوں نے کہا تمہیں جس بات کا یقین ہے ہمیں اس سے انکار ہے[102]۔ غرض کہ انہوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی، انہوں نے کہا اے

صالح اگر تم واقعی پیغمبروں میں سے ہو تو اب وہ بات ہم پر لا دکھاؤ جس کا تم نے ہمیں خوف دلایا تھا ۔[۱۰۳] پھر ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آ لیا اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے ۔[۱۰۴] پھر صالح ان سے کنارہ کش ہو گئے اور فرمایا اے میری قوم کے لوگو میں نے اپنے پروردگار کا پیام تمہیں پہنچایا اور نصیحت کی مگر افسوس تم پر کہ تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہو ۔[۱۰۵]

معانی مفردات

عقروا، انہوں نے کونچیں کاٹ دیں ۔ عقر سے ماضی کا جمع مذکر غائب ۔ کونچیں کہتے ہیں پاؤں کے پٹھوں کو جو پیچھے کی طرف ایڑی کے پاس ہوتے ہیں ۔ عرب میں دستور تھا کہ اونٹ کو حلال کرنا ہوتا تو پہلے اس کی کونچیں کاٹتے تاکہ بھاگ نہ جاتے ۔ پھر اس کو نحر کرتے فیومی نے مصباح میں لکھا ہے کہ عقر کا استعمال صرف کونچیں کاٹنے کے لیے ہوتا ہے اور کبھی کبھی نحر کے معنے میں بھی آتا ہے ۔ ازہری نے اس کی وجہ بھی یہی لکھی ہے کہ چونکہ نحر عام طور پر عقر کے بعد ہی ہوا کرتا ہے ۔ اسی لیے اس سے نحر کرنا بھی مراد لے لیتے ہیں ۔ جاثمین، اوندھے منہ پڑنے والے زانو کے بل گرنے والے ۔ جثوم سے جس کے معنے سینہ کے بل اوندھے منہ زمین پر پڑنے کے ہیں ۔ اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر جاثم کی جمع ۔ رجفۃ، زلزلہ، بھونچال، کپکپی،

لرزش۔ اسم ہے۔ رسالۃ، پیغام ارسال ہے جس کے معنے بھیجنے کے ہیں اسم ہے۔ رسالت کی شرعی تعریف علامہ سعد الدین تفتازانی نے ان میں کی ہے۔

رسالت اللہ تعالیٰ اور اس کی ہوش مند مخلوق کے درمیان بندہ کی سفارت ہے تاکہ اس کے ذریعے ان کی ان بیماریوں کو زائل کر دیا جائے کہ جن میں ان کی عقلیں دُنیا و اُخرت کی مصلحتوں سے عاجز ہو چکی ہیں۔

تاریخ کی ایک اور شہادت

ثمود حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کا نام ہے لفظ ثمود کو بعض عجمی کہتے ہیں اور بعض عربی۔ اور چونکہ یہ قبیلہ کا نام ہے اس لیے غیر منصرف پڑھتے ہیں۔ عربی ہونے کی صورت میں یہ ثمد سے مشتق ہے ثمود بروزن فعول ہے۔ ثمد اس تھوڑے سے پانی کو کہتے ہیں جو گڑھے میں جمع ہو جاتا ہے۔ سردی میں باقی رہتا ہے اور گرمی میں سوکھ جاتا ہے۔ ابو عمرو بن العلاء نے جو لغت و عربیت کے امام ہیں تصریح کی ہے:۔

چونکہ اس قوم میں پانی کی کمی تھی۔ اس لیے وہ ثمود کے نام سے موسوم ہوئی۔ ثمد تھوڑے پانی کو کہتے ہیں ان کی آبادیاں حجر میں حجاز و شام کے درمیان وادی القریٰ تک واقع تھیں۔

قاضی بیضاوی ثمود کی وجہ تسمیہ یہ بیان کرتے ہیں:

اپنے مورث اعلیٰ ثمود بن عابر بن ارم بن سام بن نوح کے نام پر پوری قوم کا نام پڑ گیا ہے۔

مولانا سید سلیمان ندوی کی تحقیق اس موضوع پر بالکل منفرد ہے وہ فرماتے ہیں:

ثمود کی لفظی تحقیق شاید عربی میں صحیح نہ مل سکے۔ ثمد عربی زبان میں تھوڑے پانی کو کہتے ہیں لیکن اس سے کوئی مناسبت معلوم نہیں ہوتی ہے۔ عبری میں ایک لفظ تامید ہے جس کے معنے دائم اور خالد کے ہیں۔ عربی کی ث اور عبری کی ت ایک چیز ہے۔ عبری زبان میں ث نہیں ہے اس لیے اکثر وہ الفاظ جو عربی میں ث سے ہیں عبری میں ت سے ہیں۔ اس بنا پر ثمود کے معنے عام سامی زبان میں وہی

ہوں گے جو عربی میں خالد کے ہیں اور بہت قبائل عرب کے نام ہیں۔

(ارض القرآن)

قوم ثمود سامی اقوام ہی کی ایک شاخ ہے۔ سامی اقوام کو عرب مورخین امم بائدہ (ہلاک شدہ قومیں) کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ انقلابات و حوادث کی نذر ہو کر فنا ہو گئیں۔ اور عرب عاربہ بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ عرب کے خالص النسل باشندے تھے جن میں غیر قوموں کا پیوند نہیں لگا تھا۔ اور بعض یہودیوں کی غلط اتباع میں ان کو عمالقہ بھی کہتے ہیں۔ امم بائدہ یا عرب عاربہ کا سلسلہ نسب تمام مورخین کے بیان کے مطابق ارم بن سام بن نوح پر ختم ہوتا ہے۔

تحقیقات جدیدہ یعنی اکتشافات عصریہ اور قدیم تاریخ دونوں اس پر متفق ہیں کہ عرب کے قدیم باشندے یعنی امم سامیہ بڑی پرشکوہ اور باعظمت قومیں تھیں۔ جنہوں نے بابل اسیریا، مصر و شام اور قرطاجنہ میں بڑی بڑی متمدن حکومتیں قائم کیں۔ اور مدت دراز تک ان ممالک کو اپنے زیرنگیں رکھا۔ عرب مورخین ان ہی امم سامیہ کو عرب بائدہ یا عرب عاربہ اور ان کے مختلف قبیلوں کو عاد ثمود طسم وجدیس کہتے ہیں۔ اندرون عرب حضرموت سے سواحل خلیج فارس کے طول میں عراق تک عاد حجاز سے حدود سینا تک ثمود یمامہ میں طسم وجدیس اور یمن میں اہل معین حکمران تھے۔ ثمود کا دور کمال ہلاکت عاد اولیٰ کے بعد سے شروع ہوتا ہے۔

۹۸۔ اور قوم ثمود کی طرف ہم نے ان کے بھائی صالح علیہ السلام کو رسول بنا کر روانہ کیا۔ حضرت صالح علیہ السلام کی بعثت قوم ثمود کی طرف ہوئی۔ قوم ثمود کون ہے کہاں ہوتی ہے اور کس زمانے میں ہوتی ہے۔ پہلے سوال کا جواب آپ تمہید میں پڑھ چکے ہیں۔ دوسرے سوال یعنی یہ لوگ کہاں آباد تھے اور کس خطہ میں پھیلے ہوتے تھے۔ اس کے متعلق یہ طے شدہ امر ہے کہ ان کی آبادیاں حجر میں تھیں، حجاز اور شام کے درمیان وادی قریٰ تک جو میدان نظر آتا ہے یہ سب ان کا مقام سکونت ہے اور آج کل فج الناقہ کے نام سے مشہور ہے۔ ثمود کی بستیوں کے کھنڈرات اور آثار آج تک موجود ہیں اور اس زمانے میں بھی بعض مصری محققین نے ان کو اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے ان کا بیان ہے کہ وہ ایک ایسے مکان میں داخل ہوتے جو شاہی حویلی تھی۔ اس میں متعدد کمرے ہیں اور اس حویلی کے ساتھ ایک بہت بڑا حوض ہے اور یہ پورا مکان پہاڑ کاٹ کر بنایا گیا ہے۔

عرب کا مشہور مورخ مسعودی لکھتا ہے "جو شخص شام سے حجاز کو آتا ہے اس کی راہ میں ان کے مٹے نشانات اور بوسیدہ کھنڈرات پڑتے ہیں۔"

حجر کا یہ مقام موجودہ زمانے میں مدینہ اور تبوک کے درمیان حجاز ریلوے پر ایک سٹیشن پڑتا ہے جسے مدائن صالح کہتے ہیں یہی ثمود کا صدر مقام تھا اور زمانہ قدیم میں حجر کہلاتا تھا۔ اب تک وہاں ہزاروں ایکڑ کے رقبہ میں وہ سنگین عمارتیں موجود ہیں۔ نزول قرآن کے زمانے میں حجاز کے تجارتی قافلے ان آثار قدیمہ کے درمیان سے گزرتے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک کے موقعہ پر جب ادھر سے گزرے تو آپ نے مسلمانوں کو یہ آثار عبرت دکھاتے اور وہ سبق دیا جو ہر صاحب بصیرت انسان کو حاصل کرنا چاہیے ایک جگہ آپ نے ایک کنویں کی نشاندہی کرکے بتایا کہ یہی وہ کنواں ہے جس سے حضرت صالح کی اونٹنی پانی پیتی تھی۔ اور مسلمانوں کو ہدایت کی صرف اسی کنویں کا پانی لینا باقی کنوؤں کا پانی نہ پینا۔ ایک پہاڑی درے کو دکھا کر آپ نے بتایا کہ اسی درے سے وہ اونٹنی پانی پینے کے لیے آتی تھی۔ ان کھنڈروں میں جو مسلمان گھوم رہے تھے ان کو آپ نے جمع کیا اور بتایا کہ یہ اس قوم کا علاقہ ہے جس پر خدا کا عذاب نازل ہوا تھا لہٰذا یہاں سے جلدی گزر جاؤ یہ تفریح گاہ نہیں بلکہ عبرت کی جگہ ہے۔

رہا ثمود کے زمانہ کا سوال سو اس کے متعلق کوئی فیصلہ کن منضبط وقت نہیں بتایا جا سکتا اس لیے کہ تاریخ اس بارے میں غیر مطمئن ہے۔ البتہ یہ یقینی طور پر کہا جا سکتا ہے کہ ان کا زمانہ حضرت ابراہیم علیہ السلام سے پہلے کا زمانہ ہے۔ قوم عاد کے بعد یہ قوم ہوئی ہے۔ زمانہ جاہلیت کے اشعار اور خطبوں میں بکثرت ان کا ذکر ملتا ہے۔ اسیریا کے کتبات اور یونان اسکندریہ اور روم کے قدیم مورخین اور جغرافیہ نویس اس کا ذکر کرتے ہیں۔ مسیح علیہ السلام کی پیدائش سے کچھ عرصہ پہلے تک اس قوم کے کچھ بقایا موجود تھے چنانچہ مورخین کا بیان ہے کہ یہ لوگ رومن افواج میں بھرتی ہوئے اور نبطیوں کے خلاف لڑے۔

حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت

۹۹۔ حضرت صالح نے فرمایا اے میری قوم کے لوگو! اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ ثمود بھی اپنے پیشرو عاد کی طرح خدا کے منکر نہ تھے بلکہ خدا کو مان کر اس کی عبادت میں دوسرے معبودوں کو شریک کرتے تھے اور یہی ساری بیماریوں کی جڑ ہے اس لیے حضرت صالح نے اللہ کی توحید عبادت سے دعوت و اصلاح کا آغاز کیا۔ آپ نے قوم کی نبض پر ہاتھ رکھا اور ان کے لیے توحید عبادت کی دوا تجویز کی اور معبودان باطل کے انکار کی تلقین فرمائی اور طاغوت کی

نافرمانی کی ہدایت فرماتی لوگوں میں کھڑے ہو کر آپ نے بآواز بلند فرمایا اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ قوم نے اس دعوت اور اس کے مقاصد کے سمجھنے میں غلطی نہیں کی اور اس میں کچھ پیچیدگی محسوس نہیں ہوتی جیسے ہی آپ کی آواز سے سننے والوں کے کان آشنا ہوئے وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ یہ یگانہ خدا کی عبادت کی دعوت ایسا تیر ہے جو شرک کے نشانہ پر بیٹھ جائے گا اور جگر کے پار ہو جائے گا۔ خطرہ کے احساس سے شرک کی کڑھائی میں ابال آیا۔ مشرکانہ زندگی کے سورما آخری معرکہ کے لیے میدان میں طاقت کے نشہ میں مخمور ہو کر آگئے۔ اسی مشرکانہ زندگی کے ہر رکن نے محسوس کیا کہ مشرکانہ تہذیب کی عمارت متزلزل ہے اور پورا نظام زندگی خطرے میں ہے اس موقع پر جبر و ستم کے وہ واقعات پیش آئے جن کی طرف آگے قرآن اشارات کر رہا ہے۔ لیکن حضرت صالح اپنی دعوت پر پہاڑ کی طرح جمے رہے۔ مخالفت کے طوفان اٹھے، فتنہ کی آندھیاں آئیں مگر آپ نے اپنی جگہ سے ذرا جنبش نہ کی اور آپ کی یہی صدا آ رہی تھی اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ۔ آپ پوری صراحت کے ساتھ اللہ کی عبادت کی دعوت دیتے رہے اور مشرکانہ اطوار کی برملا تردید کرتے رہے۔ آپ نے اس کے لیے ذرا بھی ہیر پھیر کا راستہ اختیار نہیں کیا نہ مخالفوں کی ادنیٰ رعایت کی نہ وقت کی مصلحت کے لیے اپنی دعوت میں لوچ اور لچک گوارا کی۔ اسی دعوت کو ہر مرض کی دوا اور ہر بند قفل کی چابی سمجھا اور ایک لمحہ کے لیے بھی آپ کو اس کے بارے میں ادنیٰ تذبذب نہیں ہوا۔

دعوئی نبوت پر حضرت صالح کی دلیل

۱۰۰۔ دیکھو تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک واضح دلیل تمہارے سامنے آچکی ہے۔ یہ خدا کے نام پر چھوڑی ہوئی اونٹنی تمہارے لیے ایک فیصلہ کن نشانی ہے بس اسے کھلا چھوڑ دو کہ خدا کی زمین میں جہاں چاہے چرے، اسے کسی طرح کا نقصان نہ پہنچاؤ کہ اس کی پاداش میں جانکاہ عذاب تمہیں پکڑے۔ یعنی جو دلیل تم مانگ رہے تھے وہ آگئی۔ صالح علیہ السلام کی قوم نے ان سے قول و قرار کیا تھا کہ آپ پتھر کی ایک ٹھوس چٹان میں سے حاملہ اونٹنی نکال دیں تو ہم آپ پر ایمان لے آئیں گے۔ خدا نے حضرت صالح کی دعا سے ویسا ہی کر دیا، ان کو کہا جا رہا ہے کہ تمہارا فرمائشی معجزہ تو خدا نے دکھلا دیا اب ایمان لانے میں کیا تامل ہے۔ فرمایا کہ یہ اونٹنی خدا کی قدرت اور میری صداقت کی نشانی ہے جو میری دعا پر غیر معتاد طریقہ سے خدا نے

پیدا کی اس کے حقوق کی رعایت کرو۔ مثلاً خدا کی زمین مباح گھاس کھانے اور اس کی باری میں پانی پینے سے نہ روکو۔ غرض خدا کے اس نشان کے ساتھ جو تم نے خود مانگ کر حاصل کیا ہے برائی سے پیش مت آؤ ورنہ تمہاری بھی خیر نہیں ہے[1]

اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ یہ اونٹنی حضرت صالح علیہ السلام کی صداقت کا نشان بنا کر بطور اعجازی شاہکار پیش کی گئی اور سورہ شعراء کی آیت ۱۵۴ سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح کی قوم نے حضرت صالح سے خود ایک ایسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا جو ان کے خدا کا پیغمبر ہونے کی کھلی دلیل ہو۔ ارشاد ہے فات باية ان كنت من الصادقين قال هذه ناقة لها شرب ولكم شرب يوم معلوم۔ اگر سچے ہو تو کوئی نشانی پیش کرو۔ حضرت صالح نے فرمایا کہ اونٹنی ہے ایک اس کے پانی پینے کی باری ہے اور ایک روز میں تمہاری باری ہے۔ اس سے یہ بات تو بالکل بے غبار ہو کر سامنے آتی ہے کہ اونٹنی کا ظہور ہی اپنے اندر کوئی شان اعجاز رکھتا تھا۔ نیز یہ بات بھی اس اونٹنی کی اعجازی پیدائش کی نشاندہی کرتی ہے کہ حضرت صالح نے اسے پیش کر کے یہ دھمکی دی کہ اس اونٹنی کے ساتھ تمہاری زندگی وابستہ ہے ولا تمسوها بسوء فياخذكم عذاب اليم۔ اور پھر یہ بات کہ اونٹنی کے آزادانہ چرنے پھرنے اور باری کے ساتھ ایک دن پانی پینے کو بادل نخواستہ برداشت کرتے رہے اور آخر بڑے مشوروں اور سازشوں کے بعد انہوں نے اسے قتل کیا۔ حالانکہ حضرت صالح کے پاس کوئی طاقت نہ تھی جس کا انہیں کوئی خوف ہوتا۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ وہ لوگ اس اونٹنی سے خوفزدہ تھے اور جانتے تھے کہ ضرور اس کی پشت پر کوئی طاقت ہے۔ یہ سب باتیں اپنی جگہ درست ہیں مگر قرآن عزیز سے اس سلسلے میں صرف دو باتیں ثابت ہیں ایک کہ ثمود نے حضرت صالح سے ان کی صداقت کی نشانی مانگی اور حضرت صالح نے ناقہ کو بطور نشانی پیش فرمایا۔ دوسرے یہ کہ حضرت صالح نے قوم کو یہ ہدایت کی تھی کہ وہ اس کو ضرر نہ پہنچائیں اور پانی کی باری مقرر کر لیں۔ اگر اس کو نقصان ہوا تو یہی قوم کی ہلاکت کی نشانی ہوگی۔

اس سے زائد جو کچھ ہے اس کا مدار ان روایات پر ہے جو اخبار آحاد کے درجے میں شمار ہوتی ہیں اور یا پھر اسرائیلیات اور تاریخ قدیم کی روایات ہیں۔ اخبار آحاد کی حد تک ان میں سے محدثین کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نزدیک بعض صحیح روایات ہیں اور بعض ضعیف ہیں۔ اس موقعہ پر حافظ عمادالدین ابن کثیر نے ناقۃ اللہ کے وجود میں آنے کی روایات کو اسنادی اصول کے مطابق نقل نہیں فرمایا بلکہ ایک تاریخی واقعہ کی تحریر فرمایا ہے۔

واقعہ کی تفصیل یہ ہے کہ قوم ثمود جب حضرت صالح کی تبلیغ حق سے اکتا گئی تو اس کے سرخیل اور سرگردہ افراد نے قوم کی موجودگی میں مطالبہ کیا کہ اے صالح اگر تو واقعی خدا کا فرستادہ ہے تو کوئی نشانی دکھا تاکہ ہم تیری صداقت پر ایمان لے آئیں۔ حضرت صالح نے فرمایا کہ ایسا نہ ہو کہ نشان آنے کے بعد بھی انکار پر مصر اور سرکشی پر قائم رہو۔ قوم کے ان سرداروں نے بتاکید وعدہ کیا کہ ہم فوراً ایمان لے آئیں گے تب حضرت صالح نے ان ہی سے دریافت کیا کہ وہ کس قسم کا نشان چاہتے ہیں۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ سامنے والے پہاڑ میں سے یا بستی کے اس پتھر میں سے جو کنارہ پر نصب ہے ایک ایسی اونٹنی ظاہر کر کہ جو گابھن ہو اور فوراً بچہ دے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے درگاہ الٰہی میں دعا کی اور اسی وقت ان سب کے سامنے پہاڑ یا پتھر میں سے حاملہ اونٹنی ظاہر ہوئی اور اس نے بچہ دیا۔ یہ دیکھ کر ان سرداروں میں سے جندع بن عمرو تو اسی وقت مشرف باسلام ہو گیا۔ اور دوسرے سرداروں نے بھی جب اس کی ہمنوائی کا ارادہ کیا تو ان کے ہیاکل اور منادر کے مہنتوں نے ان کو اس سے روکا اور اس طرح باقی دوسروں کو قبول اسلام سے منع کیا۔ اب حضرت صالح نے قوم کے تمام افراد کو تنبیہہ کی کہ دیکھو یہ نشانی تمہارے مطالبہ پر آئی ہے۔ اللہ سبحانہٗ کا فیصلہ یہ ہے کہ پانی کی باری مقرر ہو۔ خبردار اسے کوئی آزار نہ پہنچے۔ اگر اسے کوئی آزار پہنچا تو تمہاری خیر نہیں ہے۔

لوگوں نے اس حیرت زا معجزے کو دیکھ کر اگرچہ ایمان قبول نہیں کیا لیکن دلوں کے اقرار نے اس کو آزار پہنچانے سے باز رکھا۔ اور یہ دستور جاری رہا کہ پانی کی باری ایک روز اونٹنی کی رہتی اور دوسرے روز قوم کی۔ لیکن آہستہ آہستہ یہ بات ان کو کھٹکنے لگی اور باہم صلاح و مشورے کرنے لگے کہ اس ناقہ کا کسی طرح کام تمام کر دیا جائے۔ مگر کسی کو اس کے قتل کرنے کی ہمت نہ ہوتی حتیٰ کہ ایک حسین و جمیل عورت صدوق نے خود کو ایک شخص مصدع کے سامنے اور ایک مالدار عورت نے اپنی ایک خوبصورت لڑکی کو قیدار کے سامنے یہ کہہ کر پیش کیا کہ اگر وہ ناقہ کو مار دیں تو یہ دونوں تمہاری ہیں۔ آخر قیدار اور مصدع اس کے لیے تیار ہو گئے اور طے پایا کہ راستہ میں چھپ کر بیٹھ جائیں۔ جب ناقہ چراگاہ جائے تو اس پر حملہ کر دیں۔

اس منصوبہ کے تحت ناقہ کو مار ڈالا اور پھر باہم ملکر قسمیں کھائیں کہ رات ہونے پر حضرت صالح اور ان کے اہل وعیال کو بھی مار دیں گے۔ اونٹنی کا بچہ بھاگ کر پہاڑ پر چڑھ گیا اور وہیں غائب ہوگیا۔ صالح علیہ السلام کو جب اس کی خبر ہوئی تو حسرت و افسوس کے ساتھ لوگوں سے کہا کہ آخر وہی ہوا جس کا مجھے خوف تھا۔ اب خدا کے عذاب کا انتظار کرو جو تین دن کے بعد تمہیں تباہ کردے گا۔

اس پوری تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ قرآن عزیز سے یہ تو یقین کے ساتھ ثابت ہے کہ ناقۃ اللہ خدا کی ایک نشانی تھی اور اپنے اندر ضرور کوئی ایسی خصوصیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے وہ ایسا نشان کہلا سکے جس کا ذکر قرآن عزیز اس اہمیت کے ساتھ کر رہا ہے هذه ناقة الله لكم آية یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے نشانی ہے۔ مزید یہ کہ پانی کی باری جس طرح ناقہ اور قوم ثمود کے درمیان تقسیم فرمائی وہ خود مستقل دلیل ہے اس بات کی ناقہ ضرور اپنے اندر کوئی ایسی حیثیت رکھتی تھی جس سے وہ نشانِ الٰہی کہلا سکے لیکن یہ بات کہ ناقہ کیسے وجود میں آئی۔ قرآن اس سے ساکت ہے۔ البتہ مختلف صحیح احادیث سے اس واقعہ پر ضرور روشنی پڑتی ہے مگر واقعہ کی تفصیل صراحت وضاحت احادیث صحیحہ میں بھی موجود نہیں ہے بلکہ کتب تفسیر میں اسرائیلی روایات کی مدد سے بیان ہوئی ہے یا اس کا ماخذ ضعیف روایات ہیں اس لیے واقعہ کے اجمال و تفصیل میں فرق مراتب کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔ واقعہ کے جن اجزاء کے بارے میں قرآنی تصریح موجود ہے۔ وہ بغیر کسی تاویل کے واجب الاعتقاد ہے اور جس قدر صحیح روایات سے اگرچہ وہ آحاد ہی کے درجہ کی ہیں۔ اس اجمال کی تفصیل سے پتہ چلتا ہے وہ اجمال کی تفصیل کی حیثیت سے قابلِ قبول ہیں اور اس سے زیادہ باقی تفصیلات کی حیثیت وہی ہے جو عام تاریخی وقائع اور اسرائیلی روایات کی ہے۔ یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ اگر قرآن کی تصریح ہے کہ یہ اللہ کی اونٹنی ہے تمہارے لیے معجزہ ہے تو پھر اونٹنی میں اعجازی شان کیا ہے۔ کچھ علماء کی رائے تو یہی ہے کہ اونٹنی کا حضرت صالح کی دعا سے پتھر کی چٹان سے پیدا ہونا معجزہ ہے۔ روایات کی حیثیت تاریخی کچھ ہو وہ اس خیال کی موید ہیں اور قرآن میں واقعہ کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس کے اشارات کا مقتضا بھی یہی ہے لیکن کچھ علماء اس اعجاز کو دوسری طرح بیان کرتے ہیں مثلاً

سید صاحب فرماتے ہیں:

> عام روایات میں ہے کہ یہ اونٹنی مع اپنے بچہ کے کفار کے مطالبہ پر حضرت صالح علیہ السلام کے معجزے سے ایک پہاڑ کی چٹان سے پیدا ہوئی تھی لیکن صحیح طریقہ

سے یہ روایتیں ثابت نہیں - قرآن مجید نے اپنی تمام تفصیل میں اس خاص طریقہ پیدائش کا ذکر نہیں کیا۔ اس بنا پر وہ غیر مسلم ہیں - قرآن مجید کے پڑھنے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ قوم جانوروں پر ظلم کرتی تھی۔ خدا نے ایک اونٹنی کو نشانی بنایا کہ جس دن تم نے اس کو ستایا وہی عذاب کا دن ہوگا۔ ثمود کی ایک پہاڑی کا نام عربوں میں فج الناقہ ہے۔ بطلیموس نے اس مقام کو یونانی تلفظ میں بنڈاناٹا لکھا ہے۔ اس تسمیہ سے نفس اونٹنی کے واقعہ کا ثبوت قرآن سے بہت پیشتر ملتا ہے۔

مولانا آزاد فرماتے ہیں :

پالتو جانوروں کو خدا کے نام پر چھوڑ دینے کا طریقہ بہت قدیم ہے۔ بابل اور ہندوستان میں اس کا سراغ ہزاروں برس پیشتر تک ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود کے لوگ بھی اپنے بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دیا کرتے تھے۔ حضرت صالح نے خدا کے نام پر ایک اونٹنی چھوڑ دی اور اسی معاملہ میں قوم کے لیے اتباع حق کی آزمائش ہو گئی۔ اگر وہ اونٹنی کو ضرر نہ پہنچاتے تو یہ اس بات کا ثبوت ہوتا کہ ان کے دل ہدایت کے آگے جھک گئے ہیں مگر ان کے اندر خدا پرستی کے خلاف ایسی ضد اور شرارت پیدا ہو گئی تھی کہ اتنی سی بات بھی نہ مان سکے اور اونٹنی کو زخمی کر کے ہلاک کر دیا۔

اور مولانا اصلاحی فرماتے ہیں ،

قرآن کے الفاظ سے یہ بات کہیں نہیں نکلتی کہ یہ اونٹنی اپنی خلقت کی اعجوبگی کے پہلو سے کوئی نشانی تھی بلکہ ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب الیم سے صاف واضح ہے کہ وہ گزند پہنچاتے جانے کے انجام اور نتیجہ کے اعتبار سے نشانی تھی۔ جہاں تک علم ہے اس اونٹنی کا کسی پہاڑ یا پہاڑی سے پیدا ہونا کسی صحیح حدیث میں بھی نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان تفسیری روایات کو زیادہ اہمیت دینے کی ضرورت نہیں ہے جن میں بیان ہوا ہے کہ یہ اونٹنی ایک پہاڑ سے پیدا ہوئی تھی۔ آیت کے معنے نشانی اور علامت کے ہیں۔ یہ اونٹنی قوم کے مطالبہ عذاب کے جواب میں جیسا کہ ہم نے عرض کیا ایک نشانی عذاب کی حیثیت سے نامزد کی گئی تھی۔ چنانچہ قرآن میں تصریح ہے کہ جب ثمود کے لیڈروں نے اس کی کونچیں کاٹ دیں تو اس کے تیسرے دن عذاب الٰہی آگیا۔ یہ واقعہ قرآن کے جستہ جستہ مختلف سورتوں میں بیان ہوا ہے۔

یہ ان بزرگوں کے خیالات ہیں۔ اس صورت میں اونٹنی صرف قوم ثمود کے لیے ایک آزمائشی پرچہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس میں حضرت صالح کی نبوت کے لیے اعجاز کا کوئی پہلو نہیں رہتا ہے۔ حالانکہ ثمود نے حضرت صالح سے ان کی صداقت کی دلیل طلب کی تھی فات بایۃ ان کنت من الصادقین اور اس مطالبہ کے جواب میں آپ نے فرمایا ھذہ ناقۃ اللہ لکم ایۃ اس سے یہ بات کھلے طور پر سامنے آتی ہے کہ اونٹنی کا ظہور بطور ایک اعجازی شاہکار کے ہوا ہے۔ اس میں اور دوسرے انبیاء کے معجزات کی نوعیت میں کوئی فرق نہیں ہے اور قرآن کی صراحت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت صالح نے اونٹنی کو پیش کرکے اپنے مخاطبوں کو یہ چیلنج بھی دیا ہے ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب الیم ظاہر ہے کہ چیلنج بھی اسی چیز کا دیا جا سکتا ہے جس کا خرق عادت ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو اور قرآن ہی سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ ایک کافی مدت تک لوگ اس کے آزادانہ چرنے چگنے کو اور اس بات کو کہ ایک دن وہ تنہا پانی پیئے اور دوسرے روز سب کے جانور پانی پئیں بادل ناخواستہ برداشت کرتے رہے۔ اور آخر بڑے مشوروں کے بعد انہوں نے اُسے قتل کیا۔ اگر اس کی تخلیق کوئی معجزانہ تخلیق نہ تھی تو اس میں اس اہتمام کے لیے کیا داعیہ تھا بلاشبہ تخلیقی اعجاز کی وجہ سے وہ اس اونٹنی سے خوفزدہ تھے اور جانتے تھے کہ اس کے پیچھے ضرور کوئی غیبی طاقت ہے۔ اگرچہ قرآن میں اس کی تصریح نہیں ہے کہ اس اونٹنی کی تخلیق کیسے ہوئی لیکن قرآن کے اشارات بتا رہے ہیں کہ اس کی تخلیق اعجازی ہے۔ بےشک اس موضوع پہ روایات جو آئی ہیں وہ محدثانہ اصول پر پوری نہیں اترتی ہیں لیکن یہ بات کہ اونٹنی حضرت صالح علیہ السلام کا اعجازی شاہکار ہے۔ قرآن سے ثابت ہے۔ اور تاریخ میں اہل عرب ثمود کی ایک پہاڑی کو فج الناقہ کے نام سے پکارتے ہیں اور بقول سید صاحب بطلیموس نے اس فج الناقہ کا اپنے جغرافیہ میں ذکر کیا ہے بلکہ بقول مولانا دریابادی انگریز مترجم ڈاکٹر سیل نے فرنگی سیاحوں کے مشاہدے کے حوالہ سے لکھا ہے کہ جس پہاڑی سے وہ اونٹنی بطور خرق عادت پیدا ہوئی تھی اس میں اب تک ایک سو ساٹھ فٹ کا شگاف موجود ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبی میں اس اونٹنی میں اعجاز کا پہلو یہ بھی بتایا ہے کہ اونٹنی تمام چشمہ یا کنویں کا پانی پی جاتی تھی۔ یعنی سارا پانی پی جانا گویا ایک اعجاز تھا چنانچہ وہ فرماتے ہیں:

> حضرت صالح کی اُمت نے حضرت صالح سے ایک نشانی طلب کی۔ انہوں نے کہا کہ میرا اونٹنی تمہاری نشانی ہے جو ایک دن میں ان کے چشمہ یا کنویں کا تمام پانی پی جاتی تھی اور دوسرے دن ان کے جانوروں کو پانی ملتا تھا۔ لیکن اس نشانی کو دیکھ کر کہ اونٹنی تمام

چشمہ یا کنویں کا پانی پی جاتی ہے انہیں تسکین نہ ہوئی اور اس اونٹنی کو مار ڈالا۔[1]

حالانکہ قرآن نے اونٹنی کے ایک روز پانی پینے کو بطورِ اعجاز پیش نہیں کیا۔ اگر اونٹنی کا پانی پینا معجزہ ہے تو پھر تاکل فی الارض کی وجہ سے اس کا آزادانہ چرنا بھی معجزہ ہوگا۔ یہ تو اس کے اوصاف ہیں اور یہ اوصاف اسی وقت متصور ہو سکتے ہیں جب اس کی تخلیق اعجاز ہو۔ اسی اعجاز کی بنا پر اس کے بارے میں یہ حکم ہوا ہے ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب الیم۔ بہرحال ہمیں قرآن کا مطالعہ نہ تو اس طرح کرنا چاہیے کہ اسے عجائب پرستیوں کی داستان بنانے کے خواہشمند ہوں نہ عجائب پرستی کے الزام سے بچنے کے لیے اس درجہ بے چین ہونا چاہیے کہ ہر بے محل سے بے محل توجیہ قبول کر لیں۔ قرآن عربی زبان میں ہے۔ تمام زبانوں کی طرح عربی میں بھی اسلوبِ بیان کے معین اور قطعی دلالات ہیں۔ اس لیے جو بات صاف اور واضح ہو اسے قبول کر لینا چاہیے۔ اگر بہ تکلف ایک مطلب آپ اس کے منہ میں ڈال دیں گے جسے خود اس کی زبان قبول نہیں کرتی تو یہ حقیقت نہ ہوگی۔

باقی رہا یہ سوال کہ یہ اور اس طرح کے دوسرے معاملات کیونکہ عقلاً تسلیم کیے جا سکتے ہیں تو ہم اس پر تفصیلی بحث ان شاء اللہ بارہویں جلد میں کریں گے۔ اور بتائیں گے کہ معجزہ کی اصلی حیثیت کیا ہے۔

ناقۃ اللہ میں ناقہ کی اضافت اللہ کی طرف ایسی ہے جیسے بیت اللہ میں بیت کی اضافت اللہ کی جانب یعنی تشریف و تعظیم اور تخصیص کے لیے ہے۔ جس طرح بیت اللہ کو ایک نشان قرار دیا گیا ہے کہ جو اسے برباد کرنا چاہے گا وہ خود برباد کر دیا جائے گا۔ ایسے ہی یہاں فرمایا ہے کہ جو کوئی اس سے تعرض کرے گا وہ عذابِ الٰہی کو دستک دے گا۔ اسی معنے کے لحاظ سے خانہ کعبہ کو قیاماً للناس، مبارک اور ہدی للعالمین فرمایا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ کعبہ کا وجود کل عالم کے قیام و بقاء کا باعث ہے دنیا کی آبادی اسی وقت تک ہے جب تک خانہ کعبہ اور اس کا احترام کرنے والی مخلوق موجود ہے جب تک اللہ سبحانہ کو اس دنیا کا نظام قائم رکھنا مقصود ہے کوئی طاقتور سے طاقتور قوم جس کا مقصد کعبہ کو منہدم کرنا ہو اپنے اس ارادے میں کامیاب نہیں ہو سکتی۔ بیت اللہ کی حیثیت پوری دنیا کے حق میں وہی ہے جو ناقۃ اللہ کی حیثیت قومِ ثمود کے حق میں تھی۔ اصحابِ فیل کا قصہ تو ہر شخص نے سنا ہے۔ ان کے بعد بھی ہر زمانے میں کتنی قوموں نے اور شخصوں نے ایسے منصوبے تیار کیے ہیں، لیکن ناکام رہے ہیں۔ یہ محض خدائی حفاظت اور اسلام کی صداقت کا عظیم الشان نشان ہے اور

[1] سیرۃ النبی جلد سوم

اس کا حکم بھی ناقۃ اللہ کا ہے لا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب الیم۔

قوم ثمود کی سیاسی اور معاشی حالت

۱۰۱۔ اور وہ وقت یاد کرو کہ خدا نے تمہیں قوم عاد کے بعد ان کا جانشین بنایا اور اس سرزمین میں اس طرح بسایا کہ میدانوں میں محل بنانے کا کام لیتے ہو اور پہاڑوں کو بھی تراش کر گھر بناتے ہو۔ اللہ کی نعمتوں کو یاد کرو اور ملک میں سرکشی کرتے ہوئے خرابی نہ پھیلاؤ۔ یعنی احسان فراموشی اور شرک اور کفر کر کے زمین میں خرابی نہ پھیلاؤ۔ مطلب یہ ہے کہ قوم عاد جیسی متمدن، سرسبز ترقی یافتہ قوم کے بعد تہذیب و تمدن کا تمہیں مالک بنایا یہ مطلب نہیں کہ انہی کا ملک تمہیں دیا۔ عاد و ثمود دونوں کے مرکز بالکل جدا گانہ تھے۔ عاد کا مستقر جنوب مشرقی عرب تھا اور ثمود کی جولانگاہ ترقی شمال مغربی عرب میں حجر کا علاقہ تھا۔ ان لوگوں کو وہاں بڑا عروج و اقتدار حاصل ہوا۔ ان کی بہت سی تعمیری یادگاریں آج بھی موجود ہیں۔ حضرت صالح نے ان کو جو عاد کی خلافت یاد دلائی اس کا مقصد ان کو اس پر متنبہ کرنا تھا کہ اپنے اقتدار کے نشہ میں خدا کے اقتدار کو نہ بھولو۔ اس نے جو معاملہ عاد کے ساتھ کیا وہی تمہارے ساتھ کرے گا وہ ایک ہی ترازو سے سب کے لیے تولتا ہے۔ یہ فقرہ ان کی سیاسی حالات کی غمازی کر رہا ہے۔ عاد کی طرح ان کی سیاسی قوت بے مثال تھی۔ قرآن نے سورہ نمل و مکن دا مکنا کہہ کر بھی اس کی طرف اشارہ کیا ہے اور یہ بھی قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا سیاسی نظام نو پارٹیوں پر مشتمل تھا اور سب اپنی سیاسی اور انتظامی حیثیت میں شہری زندگی میں بگاڑ ہی بگاڑ پیدا کر رہے تھے۔ ان سیاسی عیاروں کو قرآن نے سورہ الشعراء میں مسرفین کہا ہے۔

لا تطیعوا امر المسرفین الذین یفسدون فی الارض ولا یصلحون۔

ان بے لگام لوگوں کی اطاعت نہ کرو جو ملک میں فساد بپا کرتے ہیں اور کوئی اصلاح نہیں کرتے۔

اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اپنی سیاسی طاقت کے نشہ میں اخلاق کی ساری حدیں پھاند کر شتر بے مہار بن گئے تھے۔ قرآن نے یہاں اذ جعلکم خلفاء من بعد عاد و بوأکم فی الارض کہہ کر اس صورتِ حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اس کے بعد دوسرے فقرے میں ان کی مالیاتی اور معاشی

لے افادات شیخ الاسلام

حالت کو بتایا ہے ارشاد ہے تتخذون من سھولھا قصورا و تنحتون الجبال بیوتا۔ ان کی مالی اور معاشی برتری کا یہ حال تھا کہ میدانوں میں قصور و محلات ہی پر اکتفا نہ کرتے بلکہ پہاڑوں کو کاٹ کاٹ کر بھی مکان بناتے تھے۔ یہ عظمت تعمیر ان کی معاشی اور اقتصادی خوش حالی کی نشاندہی کر رہی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ معاشی اور مالی حیثیت سے اتنی خوش حال ہو وہ تمدنی اور تہذیبی اعتبار سے اپنے دور کی بہت بڑی ترقی یافتہ قوم ہوتی ہے۔ قرآن کی یہ معجزانہ بلاغت ہے کہ دو ہی فقروں میں پوری قوم کی مالی، معاشی، تہذیبی اور تمدنی ترقیوں کا سارا نقشہ پیش کیا۔ جس بات کو دو فقروں میں ادا کیا ہے دوسرے موقعہ پر قرآن میں اس سے زیادہ بلیغ لفظوں میں ایک ہی فقرے میں واستعمرکم کہہ کر سارے احوال و ظروف کی نقاشی کی ہے۔ لفظ استعمار میں وہ سب کچھ آگیا ہے جو یہاں بوّاکم فی الارض تتخذون من سھولھا قصورا و تنحتون الجبال بیوتا۔ کے اسلوب میں پیش کیا ہے۔

حضرت صالح نے ثمود کی سیاسی، تمدنی اور معاشی برتری کے دلولوں پر عین ان کے دور عروج میں ماتم کیا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے بیگانہ تمدن خواہ وہ کتنا ہی ترقی کی منزلوں سے گزر چکا ہو قوم کے عروج کی نہیں بلکہ تمدن کے فساد کی دلیل ہے۔ جس تمدن کی بنیاد نبوت کے علم سے منہ موڑ کر ناخدا شناسی بلکہ خدا کی کھلم کھلا بغاوت پر قائم ہوگی۔ اس کی فلک بوس عمارتیں بالآخر اس کے عروج و کمال کے مقبرے اور مدفن بنتی ہیں اور ایک روز زاغ و زغن ان میں اپنے آشیانے بناتے ہیں۔

آیت کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تمدنی اور تعمیری ترقیاں منشاء الٰہی کے خلاف ہیں۔ اگر ایسا ہوتا تو حضرت صالح ان کو اللہ کے انعامات کہہ کر یہ نہ فرماتے فاذکروا الاء اللہ، بلکہ مطلب یہ ہے کہ نبوت سے رشتہ توڑ کر تمدن و تہذیب کی ترقی دیر سے یا جلدی قوم کی تباہی کا سامان ہوتی ہے۔ اگر یہی ترقیاں نبوت سے رشتہ جوڑ کر ہوں خواہ مکانات شیش محل کیوں نہ ہوں یہ بھی اللہ کی رحمت ہیں۔ حضرت سلیمان ملکہ بلقیس سے فرماتے ہیں۔

ادخلی الصرح فلما راتہ حسبتہ لجۃ وکشفت عن ساقیھا قال انہ صرح ممرد من قواریر۔

داخل ہو جا تو محل میں اس نے جو دیکھا تو سمجھی کہ پانی کا حوض ہے اور اپنے پائنچے اونچے کر لیے حضرت سلیمان نے فرمایا کہ یہ شیشہ کا چکنا فرش ہے۔

مطلب یہ ہے کہ نبوت کی قیادت میں تمدن کی اتنی ترقی کہ شیش محل تیار کیے جائیں۔ فرش

کو دیکھ کر پانی ہونے کا دھوکہ ہو مذموم نہیں ہے اس سے معلوم ہوا کہ دنیوی علوم و فنون میں کمال بھی اللہ کی نعمتوں میں شمار ہوتا ہے اور انہیں مطلقاً" ناجائز سمجھ لینا بہت بڑی زیادتی ہے۔ الجصاص نے تو سورہ ہود میں واستعمرکم کے فقرے ثمود ہی کے واقعہ میں یہ نوٹ لکھ کر اس کی طرف رہنمائی کی ہے کہ

یہ آیت بتاتی ہے کہ زمین کی آبادکاری، کھیتی، باغبانی اور تعمیر کے ذریعے سے واجب ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ زمین کی عمارت یعنی آبادکاری خواہ زراعت کی صورت میں ہو یا باغبانی اور یا مکانوں کی تعمیر کی صورت میں ہو قرآن کی اس آیت کی بنیاد پر امام جصاص کے خیال میں صرف جائز یا سنت ہی نہیں بلکہ واجب اور فرضی عمل ہیں۔ گویا اس کام کی حیثیت وہی ہے جو نماز روزے کی ہے۔

میں نہیں سمجھتا کہ جو شخص عربی زبان کے طرزِ خطاب سے واقف ہے وہ الجصاص کے اس استدلال میں کوئی کمزوری نکال سکے۔

مذہب کے بارے میں آج کل جو خیالات پائے جاتے ہیں ان کو سامنے رکھ کر کون یقین کرے گا کہ اسلام نے مذاہب کی عام شاہراہ سے ہٹ کر انسان کو بتایا کہ جن مشاغل اور پیشوں کو عام طور پر دنیوی مشاغل میں شمار کیا جاتا ہے اسلام نے ان سب پر اخروی اجر و ثواب کو مرتب کرکے ان کو وہی مقام عطا کر دیا ہے جو عام دینی فرائض و عبادات کا سمجھا جاتا ہے۔ کہاں یہ نقطہ نظر کہ جو جس حد تک دنیوی کاروبار سے الگ ہو کر زندگی بسر کرے گا اسی حد تک خدا کے حضور میں بلندی حاصل کرے گا۔ اور کہاں یہ عقیدہ کہ دنیا کے مشغلوں میں انہماک اور ان کے ساتھ اشتغال ہی کو خدا کی خوشنودی اور قرب کا ذریعہ بنایا جاتا ہے۔ بہرحال یہ ایک دوسرا موضوع ہے۔ اس کے لیے یہ محل نہیں ہے۔

آخر میں فرمایا ولا تعثوا فی الارض مفسدین اس سے معلوم ہوا کہ ثمود نے ملک میں ہر قسم کا فساد پھیلا رکھا تھا اس میں فکری فساد سے لے کر اخلاقی آوارگی، مالی بددیانتی، سیاسی مظالم، عدالتی بے انصافیاں، معاشی بے اعتدالیاں اور معاشرتی ناہمواریاں سب داخل ہیں۔ یہ تھا وہ مختصر اصلاحی منشور جو حضرت صالح علیہ السلام نے اپنی قوم کے سامنے پیش کیا۔ اس میں صرف مذہبی تبلیغ ہی نہ تھی تمدنی، اخلاقی اصلاح اور سیاسی انقلاب کی دعوت بھی ساتھ ساتھ موجود تھی۔

نبوت کے منشور کا اقتدار کی جانب سے جواب

۱۰۲۔ قوم کے جن سربرآوردہ لوگوں کو اپنی طاقت و قوت کا گھمنڈ تھا انہوں نے مومنوں سے کہا اور یہ ان لوگوں میں سے تھے جنہیں سربرآوردہ لوگ حقیر اور کمزور سمجھتے تھے کہ کیا تم نے سچ مچ معلوم کر لیا ہے کہ صالح خدا کا بھیجا ہوا ہے۔ انہوں نے کہا ہاں بے شک جس پیامِ حق کے ساتھ وہ بھیجا گیا ہے ہم اس پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ اس پر گھمنڈ کرنے والوں نے کہا تمہیں جس بات کا یقین ہے ہمیں اس سے انکار ہے۔ قوم میں جو بڑے بڑے متکبر اور سردار اور معاندین تھے وہ غریب اور کمزور مسلمانوں سے استہزاءً کہتے تھے کہ بڑے آدمی تو آج تک نہ سمجھے مگر تمہیں معلوم ہو گیا کہ صالح خدا کا فرستادہ ہے۔ مسلمانوں نے جواب دیا کہ معلوم ہونے کے کیا معنے معلوم تو تم کو بھی ہے ہاں دل سے قبول کر کے ہم ان پر ایمان لا چکے ہیں متکبرین اس حکیمانہ جواب سے کھسیانے ہو کر بولے کہ جس چیز کو تم نے مان لیا ہے ہم ابھی تک اسے نہیں مانتے پھر بھلا تمہارے جیسے چند خستہ حال آدمیوں کا ایمان لے آنا کون سی بڑی کامیابی ہے۔[1]

انبیاء کی دعوت قبول کرنے میں پہل ہمیشہ غریبوں اور کمزوروں نے ہی کی ہے اس لیے کہ ان میں بڑائی اور کبر کی برائی نہیں ہوتی۔ کبر ہی وہ چیز ہے جو قبولِ حق میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اس کا شجرہ نسب ابلیس سے ملتا ہے بلکہ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے تصریح کی ہے کہ روئے زمین پر سب سے پہلی خدا کی نافرمانی کبر ہی سے ہوئی ہے۔ منکرینِ نبوت کے لیے تعبیر الذین استکبروا اور اہلِ ایمان کے لیے الذین استضعفوا اختیار کر کے یہ لطیف اشارہ کیا ہے کہ اربابِ اقتدار منکرین تو متکبر اور گھمنڈی تھے لیکن اہلِ ایمان بجائے خود ضعیف و حقیر نہ تھے بلکہ ان کو ضعیف و حقیر سمجھ لیا گیا تھا۔ تعبیر کے اس جوہری فرق نے بتا دیا کہ استکبار تو اربابِ اقتدار کا فعل ہے اور استضعاف مومنین کا فعل نہیں بلکہ یہ بھی ان اربابِ اقتدار کا کردار ہے۔ اس لیے حقیر ہونے کی برائی اہلِ ایمان میں نہیں بلکہ ان میں ہے جو ان کو حقیر سمجھ رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تکبر جیسے کفر و فسق کا مزاج ہے ایسے ہی مومنین کو حقیر سمجھنا بھی ان ہی کا شیوہ ہے۔ ان اربابِ اقتدار متکبرین نے اہلِ ایمان سے یہ سوال کیا کہ کیا تمہیں یقین ہے کہ حضرت صالح خدا کے فرستادے ہیں۔ انہوں نے صرف یہ جواب نہیں دیا کہ ہاں ان کو خدا کا فرستادہ مانتے ہیں بلکہ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ ان کا جواب

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

یہ تھا کہ ان کے رسول ہونے میں تو کوئی کلام ہی نہیں ہے۔ سوال تو صرف یہ ہے کہ ان کی دعوت پر لبیک کون کہتا ہے تو الحمدللہ ہمیں ان کی دعوت پر لبیک کہنے کی توفیق مل گئی ہے۔ اہل ایمان سے متکبرین کا یہ سوال استنکار کی نوعیت کا ہے اور اہل ایمان کا جواب ان کے سوال کے اصل جواب سے آگے کا ہے کیونکہ متکبرین کو اصل خطر حضرت صالح سے نہیں بلکہ ان کی دعوت اور ان کے پیغام ہی سے تھی۔ اہل ایمان کا جواب اینٹ کے مقابلہ میں پتھر تھا۔ جس نے ثابت کر دیا کہ اب تک جو لوگ دبے ہوئے یا دبائے ہوئے تھے۔ اب وہ اس حق کے معاملہ میں کسی سے دبنے والے نہیں ہیں۔

اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ انبیاء پر ایمان لانے میں جو چیز سب سے زیادہ موثر ہوتی ہے وہ نبی کی دعوت کی قوت و حجت ہوتی ہے نہ کہ معجزات اس کے برعکس جو لوگ اپنی بڑائی اور ذہانت و فطانت کے مدعی ہوتے ہیں وہ آخر تک نشانیوں اور معجزوں کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں یہاں تک کہ ان کی آنکھیں اس وقت کھلتی ہیں جب اللہ کا عذاب سامنے آجاتا ہے۔

اہل ایمان کے اس حوصلہ شکن جواب پر ارباب اقتدار نے کیا کہا وہ ہی کچھ کہا جو اقتدار جھنجھلاہٹ میں شرمندگی مٹانے کو کہا کرتا ہے یعنی تم نے حضرت صالح کو مان لیا ہے تو مان لو ہم تو اس شخص کو ہرگز ماننے والے نہیں ہم اس کا صاف انکار کرتے ہیں۔

تمرد کا آخری قدم

۱۰۳۔ غرض انہوں نے اونٹنی کو کاٹ ڈالا اور اپنے پروردگار کے حکم سے سرکشی کی۔ انہوں نے کہا کہ اے صالح اگر تم واقعی پیغمبر دل میں سے ہو تو اب وہ بات ہم کو لا دکھاؤ جس کا تم نے ہمیں خوف دلایا تھا کہتے ہیں کہ وہ اونٹنی اس قدر عظیم الجثہ اور ڈیل ڈول کی تھی کہ جس جنگل میں چرتی دوسرے مواشی ڈر کر بھاگ جاتے اور اپنی باری کے دن جس کنوئیں سے پانی پیتی کنواں خالی کر دیتی۔ گویا جیسے اس کی پیدائش غیر معمولی طریقہ سے ہوئی لوازم و آثار حیات بھی غیر معمولی تھے۔ آخر لوگوں نے غیظ و غضب میں آکر اس کے قتل پر اتفاق کر لیا اور بدبخت قیدار نے اس کی کونچیں کاٹ ڈالیں۔ بعدہ خود حضرت صالح کے قتل پر بھی آمادہ ہو گئے اور اس طرح خدا کے احکام کو جو صالح اور ناقہ کے متعلق تھے پس پشت ڈال دیے اور ناقہ کو ختم کر دینے کے بعد حضرت صالح کو یہ کہہ کر چیلنج دیا کہ اگر تو خدا کا رسول ہے تو وہ بات ہمیں دکھا جس کا تم نے خوف دلایا تھا۔ ایسے کلمات انسان کی زبان سے اس وقت نکلتے ہیں جب خدا کے قہر و غضب سے بالکل بے خوف ہو جاتا ہے۔ عاد اولیٰ کی طرح ثمود بھی اس مرتبہ پر پہنچ کر عذاب الٰہی کے

مورد بنے جس کا ذکر آگے آتا ہے[1]

اگرچہ مارا ایک شخص نے تھا جیساکہ سورہ قمر اور سورہ شمس میں ارشاد ہوا ہے لیکن چونکہ پوری قوم اُس مجرم کی پشت پر تھی اور وہ دراصل اس جُرم میں قوم کی مرضی کا آلہ کار تھا اس لیے الزام پوری قوم پر عائد کیا گیا ہے ہر وہ گناہ جو قوم کی خواہش کے مطابق کیا جائے یا جس کے ارتکاب کو قوم کی رضا اور پسندیدگی حاصل ہو ایک قومی گناہ ہے۔ خواہ اس کا ارتکاب کرنے والا ایک فردِ واحد ہو صرف یہی نہیں بلکہ قرآن کہتا ہے کہ جو گناہ قوم کے درمیان علی الاعلان کیا جائے اور قوم اسے گوارا کرے وہ بھی قومی گناہ ہے[2]

گویا یہ قوم کے متمردین کی طرف سے تمرد کا آخری قدم تھا۔ انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور حضرت صالح کو چیلنج کیا کہ لو ہم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں تم نے دھمکی دی تھی کہ اسے آزار پہنچاؤ گے تو عذاب میں پکڑے جاؤ گے اب لاؤ وہ عذاب اگر تم میں کوئی صداقت ہے۔ قرآن میں ہے کہ حضرت صالح نے ناقہ کے قتل کا واقعہ معلوم ہونے کے بعد قوم کو بحکم خداوندی بتا دیا تھا کہ اب تمہاری زندگی کے صرف تین روز باقی ہیں فتمتعوا فی دارکم ثلاثہ ایام ذالک وعد غیر مکذوب، تین دن مزے کر لو یہ وعدہ پکا ہے اس میں خلاف کا امکان نہیں ہے اس کا نتیجہ کیا ہوا آگے بتایا جا رہا ہے۔

قوم ثمود عذاب کی گرفت میں

۱۰۴ - پھر ایسا ہوا کہ لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آ لیا اور جب ان پر صبح ہوئی تو گھروں میں اوندھے منہ پڑے تھے۔ دوسری آیت میں ان کا صیحہ یعنی چیخ سے ہلاک ہونا بیان فرمایا ہے شاید نیچے سے زلزلہ اور اوپر سے ہولناک آواز آئی ہو[3] صرف صیحہ نہیں بلکہ قرآن عزیز نے اس ہلاکت خیزی کو ایک سے زیادہ تعبیرات میں پیش کیا ہے یہاں اس ہلاکت کے لیے لفظ رجفہ بولا ہے سورہ حاقہ میں اسی کو طاغیہ کہا ہے اور سورہ ص میں صیحہ فرمایا ہے اور سورہ سجدہ میں اسی کو صاعقہ کہہ کر پکارا ہے۔ یہ تمام تعبیرات ایک ہی حقیقت کے مختلف اوصاف ظاہر کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہیں تاکہ یہ معلوم ہو جائے کہ خدائے تعالیٰ کے اس عذاب کی ہولناکیاں کیسی گوناگوں

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن [3] افادات شیخ الاسلام

تھیں آپ ایک ایسی کوندنے والی بجلی کا تصور کریں جو بار بار اضطراب کے ساتھ چمکتی، کڑکتی اور گرجتی ہو اور اس طرح کوندرہی ہو کہ کبھی مشرق میں ہو تو کبھی مغرب میں اور جب ان تمام صفات کے چمکتی کوندتی گرجتی لرزتی لرزاتی ہوئی کسی مقام پر ایک ہولناک چیخ کے ساتھ گرے تو اس مقام اور اس کے نواح کا کیا حال ہوگا۔ یہ ایک معمولی سی جھلک ہے اس عذاب کی جو قوم ثمود پر نازل ہوئی اور ان کو اور ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کر کے سرکشوں کی سرکشی اور مغروروں کے غرور کا انجام ظاہر کرنے کے لیے آنے والی نسلوں کے سامنے عبرت پیش کر گیا۔

بعض شارحین قرآن نے یہاں رجفہ سے زلزلہ مراد لیا ہے اس لیے قرین قیاس ہے کہ یہ آتش فشاں زلزلہ ہو کیونکہ قدیم اور جدید جغرافیہ والوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ارض ثمود آتش فشاں مادے سے بھری ہوئی ہے ۔

حضرت صالح کی ہجرت

۱۰۵ - پھر صالح ان سے کنارہ کش ہو گئے اور فرمایا اے میری قوم کے لوگو میں نے اپنے پروردگار کا پیغام تمہیں پہنچایا اور تمہیں نصیحت کی مگر افسوس کہ تم نصیحت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتے ہو کہتے ہیں کہ حضرت صالح قوم کی ہلاکت کے بعد مکہ معظمہ یا ملک شام کی طرف چلے گئے اور جاتے ہوتے ان کی لاشوں کے انبار دیکھ کر یہ خطاب فرمایا۔ یا تو اسی طرح جیسے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مقتولین بدر کو فرمایا تھا اور یا محض بطور تحسر فرضی خطاب تھا جیسے شعراء دیار و اطلال (کھنڈرات) وغیرہ کو خطاب کرتے ہیں اور بعض نے کہا کہ یہ خطاب ہلاکت سے پہلے تھا۔ اس صورت میں بیان میں ترتیب واقعات نہیں ہے۔ بہرحال اس خطاب میں دوسروں کو سنانا تھا کہ جو اپنے معتبر خیر خواہوں کی قدر نہیں کرتا تو ایسا نتیجہ دیکھنا پڑتا ہے [1]

یہ قوم سے حضرت صالح کی علیحدگی کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت صالح نے قوم سے علیحدگی عذاب سے پہلے اختیار کی ہوگی۔ سورہ ہود میں بتلایا گیا ہے کہ اونٹنی کے ہلاک ہونے کے بعد حضرت صالح نے ان کو تین دن کی مہلت دی ہے تمتعوا فی دارکم ثلاثۃ ایام، اس مدت کے ختم ہونے پر عذاب آیا اور یہ بھی قرآن نے بتایا ہے کہ ہم نے صالح علیہ السلام اور ان کے صحابہ کرام کو اس

[1] افادات شیخ الاسلام

عذاب سے بچا لیا۔

فلما جاء امرنا نجینا صالحاً والذین آمنوا برحمۃ منا

جب ہمارا فیصلہ آگیا تو ہم نے صالح اور ان کے ساتھیوں کو اپنی رحمت سے بچا لیا۔

ظاہر ہے کہ صالح اور ان کے ساتھیوں کو بچانے کی صورت یہی ہوئی ہے کہ ان کو عذاب والی جگہ سے دور لے جایا گیا۔ یہاں قرآن کی تصریح و تولی عنھم اس کی طرف رہنمائی کر رہی ہے۔ یہاں سے ہٹ کر حضرت صالح کہاں تشریف لے گئے۔ مشہور یہی ہے کہ حضرت صالح جزیرہ نما سینا کی طرف چلے گئے۔ یا جیسا کہ مولانا عثمانی فرماتے ہیں کہ مکہ معظمہ یا شام چلے گئے۔ بہرحال کہیں گئے ہوں۔ قرآن سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت صالح نے ہجرت فرمائی۔ یہاں فتولی کی فا اگرچہ بعدیت اور تعقیب بتا رہی ہے لیکن عربی زبان میں ترتیب ضروری نہیں ہے۔ اگر واقعہ یہ ہے تو پھر حضرت صالح نے یہ بات یقیناً اس وقت فرمائی ہوگی جب تین دن کی مہلت کے بعد وہاں سے روانہ ہو رہے ہوں گے۔ اور یہاں واقعہ میں بہ تقدیم و تاخیر تقاضائے بلاغت سے ہوئی ہے۔ ارتکاب جرم اور اس کے نتیجہ کو فوری طور پر نمایاں کرنے کے بعد یہاں عذاب کو عقر ناقہ کے ساتھ بیان کر دیا ہے اور حضرت صالح کی ہجرت کے ذکر کو مؤخر کر دیا۔ یہاں عقر ناقہ کے ساتھ فاخذتھم الرجفۃ فرما دیا۔ فا کا تقاضا ہے کہ عقر ناقہ کے فوراً بعد عذاب آگیا۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے بلکہ تین دن کے بعد عذاب آیا ہے۔ یہ صحیح ہے کہ یہ بات بہت بڑی دلسوزی کے ساتھ حسرت اور افسوس کے انداز میں ان کی زندگی میں کہی جا رہی ہے کہ میں نے اپنے رب کا پیغام تمہیں پہنچا دیا ہے۔ یعنی میں نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا ہے لیکن یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ تمہیں اپنے خیر خواہ پسند نہیں ہیں۔ اس میں ایک میٹھی سی چوٹ ہے۔ قوم کے ان غداروں اور ان بدخواہ لیڈروں پر جو وہاں پوری قوم کی قیادت کر رہے تھے قوم کا مزاج جب فاسد ہوتا ہے تو وہ بدخواہوں کو خیر خواہ اور خیر خواہوں کو بدخواہ سمجھنے لگتی ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر لازماً قوم تباہی سے دوچار ہوتی ہے۔ اس کی وجہ بالکل ظاہر ہے کہ جب کسی مریض کا یہ حال ہو جاتے کہ اسے معالجوں سے دشمنی ہو جاتے اور صرف انہی کے مشورے اسے پسند آئیں جو اس کی بیماری میں اضافہ چاہتے ہوں تو موت کے سوا اس کے لیے اور کیا چیز باقی رہ گئی ہے۔

اگرچہ بعض شارحین قرآن نے حضرت صالح کی اس تقریر کا محل عذاب کے بعد تجویز کیا ہے اور اس کی نوعیت ایسی بتائی ہے جیسے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر میں مشرکین مکہ کے سرداروں کی ہلاکت کے بعد مردہ نعشوں کے گڑھے پر کھڑے ہو کر فرمایا:

اے فلاں ابن فلاں اور فلاں ابن فلاں کیا تم کو اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت پسند نہ آئی۔ بلاشبہ ہم نے وہ سب کچھ پالیا جو ہمارے رب نے ہم سے وعدہ کیا۔ کیا تم نے بھی وہ پایا ہے جو تمہارے رب نے تم سے وعدہ کیا تھا۔

حدیث کے راوی ابوطلحہ انصاری کہتے ہیں کہ حضرت عمر نے فرمایا کہ کیا یہ سن رہے ہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بخدا تم سے زیادہ میری بات سن رہے ہیں۔

اگر یہی نوعیت ہو تو اس قسم کے خطاب کے بارے میں علماء کی رائے ہے کہ

۱- اس نوع کا انبیاء کی خصوصیت سے تعلق ہے اس لیے کہ اللہ سبحانہٗ انبیاء کی بات کو بلاشبہ مردوں کو سنوا دیتا ہے اگرچہ وہ جواب دینے سے قاصر ہیں۔

۲- یہ طریق خطاب حزن و ملال کے اظہار کے لیے ہوتا ہے۔ مثلاً تم نے کسی سے کہا کہ اس جگہ نہ جانا سانپ بہت ہیں اندیشہ ہے کہ کاٹ لیں مگر وہ باغ میں چلا گیا اور سانپ نے کاٹ لیا، اس کی وفات ہو گئی۔ اب جب اس کی میت تمہارے سامنے آئی تو تم بے ساختہ کہتے ہو افسوس کیا میں نے روکا نہ تھا۔

۳- اس قسم کے خطاب کے اصل مخاطب وہ زندہ انسان ہوتے ہیں جو ان مردہ نعشوں کو دیکھ رہے ہیں تاکہ ان کو عبرت حاصل ہو۔

وَلُوْطًا اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖٓ اَتَاْتُوْنَ الْفَاحِشَةَ مَا سَبَقَكُمْ بِهَا مِنْ
اَحَدٍ مِّنَ الْعٰلَمِيْنَ ۝٨٠ اِنَّكُمْ لَتَاْتُوْنَ الرِّجَالَ شَهْوَةً مِّنْ دُوْنِ
النِّسَآءِ ؕ بَلْ اَنْتُمْ قَوْمٌ مُّسْرِفُوْنَ ۝٨١ وَمَا كَانَ جَوَابَ قَوْمِهٖٓ
اِلَّآ اَنْ قَالُوْٓا اَخْرِجُوْهُمْ مِّنْ قَرْيَتِكُمْ ۚ اِنَّهُمْ اُنَاسٌ يَّتَطَهَّرُوْنَ ۝٨٢
فَاَنْجَيْنٰهُ وَاَهْلَهٗٓ اِلَّا امْرَاَتَهٗ ۖ كَانَتْ مِنَ الْغٰبِرِيْنَ ۝٨٣ وَ
اَمْطَرْنَا عَلَيْهِمْ مَّطَرًا ؕ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُجْرِمِيْنَ ۝٨٤

اور ہم نے لُوطؑ کو روانہ کیا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کہ کیا تم
ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دُنیا میں کسی انسان
نے نہیں کیا۔[۱۰۶] تم عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہش سے مردوں پر
مائل ہوتے ہو۔ بلاشبہ تم ایسی قوم ہو گئے ہو جو بالکل چھوٹ اور
بے لگام ہو۔[۱۰۷] اور لُوطؑ کی قوم کے پاس اس کا کوئی جواب تھا تو
یہ تھا کہ آپس میں کہنے لگے ان کو اپنی بستی سے نکال باہر کر دیو

ایسے لوگ ہیں جو بڑے پاک بننا چاہتے ہیں[۱۰۸]۔ بس ہم نے حضرت لوطؑ اور ان کے گھر والوں کو بچا لیا مگر اس کی بیوی نہ بچی وہ بھی پیچھے رہ جانے والوں میں تھی، ہم نے پتھروں کی بارش کی دیکھو مجرموں کا انجام کیسا ہوا[۱۰۹]۔

معانی مفردات

دونَ ، ورے ، سوا ، چھوڑ کر ، آگے ۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ دنو ، کا مقلوب ہے جس کے معنے نزدیک کے ہیں ۔ امام سیوطی فرماتے ہیں دون ظرف ہو کر استعمال ہوتا ہے فوق کی نقیض ہے اور مذہب مشہور پر معرب نہیں ہوتا اور بعض کہتے ہیں کہ معرب ہوتا ہے چنانچہ د مثناً دون ذالک دونوں طرح پڑھا گیا ہے پیش کے ساتھ بھی اور زبر کے ساتھ بھی ۔ اور اسم بھی واقع ہوتا ہے بمعنے غیر کے جیسے اتخذوا من دونه آلهة ۔ زمخشری کہتے ہیں کہ اس کے معنے کسی چیز کے ورے کے ہیں اور حالت کا فرق بتانے کے لیے بھی اس کا استعمال ہوتا ہے جیسے زید دون عمر یعنی شرافت اور علم میں اس سے پیچھے ہے اور اس کے معنے میں وسعت سے کام لے کر اس کا استعمال حد سے بڑھ جانے کے لیے بھی ہوتا ہے جیسے اولیاء من دون المومنین ۔ عاقبةٌ ، انجام ، آخر ، یہ اصل میں عقب یعقب کا مصدر ہے جس کے معنے پیچھے آنے کے ہیں لیکن اس کا استعمال ہر شے کے آخر اور انجام کے لیے ہوتا ہے ۔ امام راغب نے تصریح کی ہے کہ اس کا استعمال ثواب کے لیے مخصوص ہے جیسے العاقبة للمتقین ، اور جب مرکب اضافی کی صورت میں آئے کبھی عقوبت کے لیے آتا ہے جیسے کیف کان عاقبة المجرمین ۔ اس کی جمع عواقب آتی ہے ۔

ایک اور واقعاتی شہادت

حضرت لوط حضرت ابراہیم کے برادرزادے تھے۔ ان کے والد کا نام ہاران تھا۔ حضرت لوط کا بچپن حضرت ابراہیم کے زیر سایہ گزرا۔ اسی لیے وہ اور حضرت سارہ ملت ابراہیمی کے السابقون الاولون میں داخل ہیں۔ یہ حضرت ابراہیم کی ہجرتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں اور جب حضرت ابراہیم مصر میں تھے تو اس وقت بھی یہ ہمسفر تھے۔ تورات میں ہے کہ مصر کے قیام میں چونکہ دونوں کے پاس کافی ساز و سامان تھا اور مویشیوں کے بڑے بڑے ریوڑ تھے اس لیے ان کے چرواہوں اور محافظوں کے درمیان بہت زیادہ کشمکش رہتی تھی۔ حضرت ابراہیم کے چرواہے چاہتے تھے کہ اس چراگاہ اور سبزہ زار سے پہلے ہمارے ریوڑ فائدہ اٹھائیں اور حضرت لوط کے چرواہوں کی خواہش ہوتی تھی کہ اول ہمارا حق سمجھا جائے۔ حضرت ابراہیم نے اس صورت حال کا اندازہ کر کے حضرت لوط سے مشورہ کیا اور دونوں کے مشورہ سے یہ طے پایا کہ باہمی تعلقات کی خوشگواری اور دائمی محبت و الفت کی بقا کے لیے ضروری ہے کہ حضرت لوط مصر سے ہجرت کر کے شرق اردن کے علاقہ سدوم اور عامورہ چلے جائیں اور وہاں رہ کر دین حنیف کی تبلیغ کریں۔ اور حضرت ابراہیم کی رسالت کا پیغام حق سناتے رہیں اور حضرت ابراہیم فلسطین چلے جائیں۔

اردن کی وہ جانب جہاں آج بحر میت یا بحر لوط واقع ہے یہی وہ جگہ ہے جس میں سدوم اور عامورہ کی بستیاں آباد تھیں اس کے قریب بسنے والوں کا یہ اعتقاد ہے کہ پہلے یہ تمام حصہ جو اب سمندر نظر آتا ہے کسی زمانہ میں خشک زمین تھی اور اس پر شہر آباد تھے۔ سدوم و عامورہ کی آبادیاں اسی مقام پر تھیں۔ یہ مقام شروع سے بحر نہ تھا۔ جب قوم لوط پر عذاب آیا اور اس سرزمین کا تختہ الٹ دیا گیا اور سخت زلزلے اور بھونچال آئے تب یہ زمین تقریباً چار سو میٹر سمندر سے نیچے چلی گئی اور پانی ابھر آیا اسی لیے اس کا نام بحر میت اور بحر لوط ہے[1]

یہ صحیح ہو یا غلط بہر حال یہ مسئلہ حقیقت رکھتا ہے کہ اسی بحر میت کے ساحل پر وہ حادثہ رونما ہوا جو قوم لوط کے عذاب سے موسوم ہے اور جو گزشتہ دو سال کی اثری تحقیق نے بحر میت کے ساحل پر لوط کی بستیوں کے بعض تباہ شدہ آثار ہویدا کر کے اس علم یقین کے سامنے

---

[1] بستانی

سرِ تسلیم خم کر دیا ہے جس کا اعلان ساڑھے تیرہ سو سال قبل قرآن عزیز نے کر دیا تھا۔
۱۰۶ — اور ہم نے لوط کو روانہ کیا جب کہ اس نے اپنی قوم سے کہا کیا تم ایسی بے حیائی کا کام کرتے ہو جو تم سے پہلے دُنیا میں کسی انسان نے نہیں کیا۔ لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم خلیل اللہ کے بھتیجے ہیں جو ان کے ساتھ عراق سے ہجرت کر کے ملک شام آتے اور خدا کی طرف سے سدوم اور اس کے گرد و نواح کی بستیوں کی طرف مبعوث ہوتے تاکہ ان کی اصلاح فرمائیں اور ان گندے خلافِ فطرت اور بے حیائی کے کاموں سے باز رکھیں جن میں وہاں کے لوگ مبتلا تھے نہ صرف مبتلا بلکہ اس بے حیائی کے موجد تھے۔ ان سے پیشتر عالم میں اس بیماری سے کوئی واقف نہ تھا۔ اولاً یہ ملعون حرکت شیطان نے سدوم والوں کو سجھائی اور وہیں سے دوسرے مقامات میں پھیلی۔ حضرت لوط علیہ السلام نے اس ملعون و شنیع حرکت کے عواقب پر متنبہ کیا اور گندگی کو دُنیا سے مٹانا چاہا۔ موجودہ بائیبل کے جمع کرنے والوں کی شرمناک جسارت پر ماتم کرنا پڑتا ہے کہ ایسے پاکباز و معصوم پیغمبر کی طرف جو دنیا کو گندگی اور بے حیائی سے پاک کرنے کے لیے آیا تھا ایسی سخت ناپاک حرکات منسوب کیں جن کے سننے سے حیادار آدمی کے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کبرت کلمۃ تخرج من افواھھم ان یقولون الا کذبا۔[1]

قرآن میں یہاں تعبیر ذرا بدل گئی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے تھا الی قوم لوط اخاھم لوطا جیسے سباق میں آرہا ہے الی عاد اخاھم ھودا" الی ثمود اخاھم صالحا"، حضرت لوط کا سدوم کے باشندوں سے نسبی تعلق نہ تھا لیکن جنسی اور وطنی تعلق ضرور تھا اس لیے یہاں یہ بتانے کے لیے کہ حضرت لوط کا سدوم سے نسلی اور نسبی تعلق نہ تھا تعبیر بدل دی اور بھائی ہونے کا ذکر نہیں کیا اور سورہ شعراء میں یہ بتانے کے لیے کہ حضرت لوط کا اہلِ سدوم سے وطنی اور جنسی تعلق تھا فرمایا کذبت قوم لوط المرسلین اذ قال لھم اخوھم لوط۔ گویا یہاں حذف کر کے بتا دیا کہ حضرت لوط کا ان سے نسبی تعلق نہ تھا اور وہاں تصریح کر کے بتا دیا کہ حضرت لوط کا اہلِ سدوم سے وطنی تعلق تھا۔ اس سے اشارۃً معلوم ہوا کہ قومیت جن عناصر سے ترکیب پاتی ہے ان میں نسب اور وطن کو بہت بڑا دخل ہے۔ آج کل بھی قومیں اوطان سے بنتی ہیں، زبان سے بنتی ہیں یا نسل اور نسب سے بنتی ہیں۔ اس کے برعکس اُمت صرف ایمان سے بنتی ہے۔ اُمت کا تصور زبان، وطن، اور

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نسل سے بالا ہے۔ پتہ نہیں مولانا دریا بادی نے یہاں قوم کو اُمت کے معنے میں کیوں لینے کی تکلیف فرمائی ہے حالانکہ تکذیب نبوت کے ساتھ اُمت کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ تعبیر کے ذرا سے فرق سے قرآن نے کیسی نازک تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ کر دیا ہے۔ حضرت لُوط نے ان سے فرمایا اتاتون الفاحشۃ کیا تم بدکاری کا ارتکاب کرتے ہو۔ سوالیہ اندازِ بیان اظہار نفرت و کراہت کے لیے ہے۔ فاحشہ کھلی ہوئی بدکاری اور بے حیائی کو کہتے ہیں۔ اس کی دوسری صورت فحشا آتی ہے یہ لفظ فحش سے بنا ہے جس کے اصلی معنے حد سے آگے بڑھ جانے کے ہیں اور اس کے دوسرے لازمی معنے قبیح یعنی بُرائی کے ہیں کیونکہ جس چیز کی جو حد خالق فطرت نے مقرر کر دی ہے اس سے آگے بڑھنا قبیح یعنی برائی ہے یا یہ کہ جو بُرائی حد سے زیادہ ہو جاتے وہ ہی فاحشہ کہلاتا ہے۔ مثال سے یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی قوتِ شہوانی کی تسکین کے لیے کچھ حد مقرر فرمائی ہے اب جو ان حدود سے آگے بڑھتا ہے وہ فاحشہ کا مرتکب ہوتا ہے۔

یہاں اس فاحشہ کا نام نہیں لیا بلکہ الف لام کے ذریعے بیان کیا ہے یہ اس بات کی نشانی ہے کہ یہ بے حیائی کا کام معاشرے میں اس درجہ تھا کہ نام لیے بغیر ہر شخص سمجھتا تھا۔ جب حضرت لُوط نے اپنے مخاطبوں سے یہ بات فرمائی اور بطور کراہت و انکار سوال کا پیمانہ پیش فرمایا تو مخاطبوں کے ذہنوں میں معاً سوال اُبھرا ہو گا کہ ہم یہ کام کیوں کریں۔ فرمایا اس لیے نہ کرو ماسبقکم بہا من احد من العالمین۔ تم سے پہلے یہ شنیع حرکت کسی ایک سے بھی صادر نہیں ہوئی یعنی اس کی برائی اس قدر عیاں اور کھلی ہے کہ تاریخ میں کبھی اس کا کسی نے ارتکاب ہی نہیں کیا ہے یعنی قوم لُوط سے پہلے اس کے وجود کا تاریخ سے بھی کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ اس طرح حضرت لُوط نے اپنی قوم کو دوہری ملامت کی۔ ایک تو یہ کہ ایسی شدید بدکاری کا ارتکاب کر رہے ہو، دوسرے یہ کہ اس کے موجد بھی تم ہو۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ حضرت لُوط نے قوم کو پہلے ارتکاب فاحشہ پر ڈانٹ دی اور پھر اس بدکاری کی ایجاد پر ملامت کی۔ اس سے معلوم ہوا کہ قوم لُوط صرف بُرائی کی مرتکب ہی نہ تھی بلکہ موجد بھی تھی اور اسی بنا پر اہل عرب نے اس عمل کا نام لواطت رکھ دیا ہے۔ اُردو میں بھی اس کو عمل قوم لوط کہتے ہیں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں پہنچ کر قرآن کے قاری کے ذہن میں یہ سوال ضرور ابھرتا ہے کہ اوپر جن رسولوں کا

ذکر ہوا ہے سب کی دعوتوں کا آغاز توحید عبادت سے ہوا ہے لیکن حضرت لوطؑ کی تقریر اس دعوت سے خالی ہے کیا اس کی وجہ یہ ہے کہ حضرت لوطؑ کی قوم پرستش اور بندگی میں اللہ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلق نہ رکھتی تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو اس پر رسولوں کی تکذیب کی فردِ جرم قرآن نہ لگاتا۔ ارشاد ہے کذبت قوم لوط المرسلین اگر ایسا نہیں ہے اور یقیناً نہیں تو پھر دعوتِ توحید کیوں نہیں دی گئی۔

اصل یہ ہے کہ برائی برائی میں فرق ہے ایک برائی تو وہ ہوتی ہے جو انسانوں میں پائی جاتی ہے یا پائی جاسکتی ہے خواہ کتنی سنگین ہو۔ دوسری برائی وہ ہے جس کا گھنونا پن اس قدر واضح ہو کہ کسی انسان کے اندر عادت کی حیثیت سے اور کسی سوسائٹی میں فیشن کی حیثیت سے اس کا پایا جانا بغیر اس کے ممکن نہیں ہے کہ اس انسان یا اس سوسائٹی کی فطرت بالکل مسخ ہوگئی جہاں اس طرح کے لوگوں سے سابقہ ہو وہاں اصل قابلِ توجہ چیز وہی برائی ہوتی ہے۔ دوسری باتیں خواہ کتنی ہی اہمیت رکھنے والی ہوں سب ثانوی درجے میں آجاتی ہیں۔ آپ ایک شخص کے پاس اس کی اصلاح کی غرض سے جائیں اور دیکھیں کہ وہ کھڑا ہوا غلیظ کھا رہا ہے تو کیا آپ اسے ایمان و اسلام کی تلقین کریں گے؟ حضرت لوطؑ کو اسی صورتِ حال سے سابقہ پڑا۔ ان کی قوم میں شرک، نبوت کی تکذیب کی برائی بھی موجود تھی اور دوسری تمام برائیاں بھی۔ جو شرک و کفر کے لوازم میں موجود ہیں لیکن جن کی فطرت اتنی اوندھی ہوگئی ہو کہ مرد مردوں ہی کو شہوت رانی کا محل بناتے ہوتے ہوں ان کو تو سب سے پہلے اس غلاظت کی دلدل سے نکالنے کی ضرورت تھی۔ ان سے کسی دوسری بات کے کہنے کا مرحلہ تو بہرحال اس کے بعد ہی آسکتا ہے۔ قرآن کی نظر میں اس سے عملِ قومِ لوط کی شناعت کا اندازہ ہو سکتا ہے۔ قرآن کی نگاہ میں اس گناہ کی سنگینی تو یہ ہے لیکن آج یہی بدکاری یورپی اور امریکی قوم کی تہذیب کا جزو لاینفک ہے اور رسالوں اور کتابوں کے ذریعے سے بتایا جا رہا ہے کہ اسے بجائے غیر طبعی کے ایک طبعی تحریک قرار دیا جائے انا للہ فالی اللہ المشتکی۔

قومِ لوط کی فطرت سے بغاوت

۱۰۷۔ تم عورتوں کو چھوڑ کر نفسانی خواہش سے مردوں پر مائل ہوتے ہو۔ بلاشبہ تم ایسی قوم ہو جو بالکل چھوٹ اور بے لگام ہو۔ یعنی صرف یہی نہیں کہ ایک گناہ کے تم مرتکب ہو رہے ہو بلکہ اس خلافِ فطرت فعل کا ارتکاب اس کی دلیل ہے کہ تم انسانیت کی حدود سے بھی باہر نکل چکے ہو[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

یہ قابلِ نفرت فعل جس کی بدولت اس قوم نے شہرتِ دوام حاصل کی اس کے ارتکاب سے تو بدکردار انسان کبھی باز نہیں آئے لیکن یہ فخر صرف یونان کو حاصل ہے کہ اس کے فلاسفہ نے اس گھناؤنے جُرم کو اخلاقی خوبی کے مرتبے تک اٹھانے کی کوشش کی اور اس کے بعد جو کسر باقی رہ گئی تھی، اسے جدید مغربی تہذیب نے پورا کیا کہ علانیہ اس کے حق میں زبردست پروپیگنڈا کیا گیا۔ یہاں تک کہ بعض ملکوں کی مجالسِ قانون ساز نے اسے باقاعدہ جائز ٹھہرا دیا حالانکہ یہ ایک بالکل صریح حقیقت ہے کہ مباشرتِ ہم جنس قطعی طور پر وضعِ فطرت کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام ذی حیات انواع نر و مادہ کا فرق محض تناسل اور بقائے نوع کے لیے رکھا ہے۔ اور نوعِ انسانی میں اس کی مزید غرض یہ بھی ہے کہ دونوں صنفوں کے افراد مل جل کر ایک خاندان وجود میں لائیں اور اس سے تمدن کی بنیاد پڑے۔ اسی مقصد کے لیے مرد و عورت کی دو الگ الگ صنفیں بنائی گئی ہیں۔ ان میں ایک دوسرے کے لیے صنفی کشش پیدا کی گئی ہے۔ ان کی جسمانی ساخت اور نفسیاتی ترکیب ایک دوسرے کے جواب میں مقاصدِ زوجیت کے لیے مناسب بنائی گئی ہے اور ان کے جذب و انجذاب میں وہ لذت رکھی گئی ہے جو فطرت کے منشا کو پورا کرنے کے لیے بیک وقت داعی محرک بھی ہے اور اس خدمت کا صلہ بھی۔ مگر جو شخص فطرت کی اس سکیم کے خلاف عمل کر کے اپنے ہم جنس سے شہوانی لذت حاصل کرتا ہے وہ ایک ہی وقت میں متعدد جرائم کا مرتکب ہوتا ہے۔

اولاً وہ اپنی اور اپنے معمول کی طبعی ساخت اور نفسیاتی ترکیب سے جنگ کرتا ہے اور اس میں خللِ عظیم برپا کرتا ہے جس سے دونوں کے جسم نفس اور اخلاق پر بہت بُرے اثرات مرتب ہوتے ہیں۔

ثانیاً، وہ فطرت کے ساتھ غداری و خیانت کرتا ہے کیونکہ فطرت نے جس لذت کو نوع اور تمدن کی خدمت کا صلہ بنایا تھا اور جس کے حصول کو فرائض اور ذمہ داریوں اور حقوق کے ساتھ وابستہ کیا تھا وہ اسے کسی خدمت کی بجا آوری اور کسی فرض اور حق کی ادائیگی اور کسی ذمہ داری کے التزام کے بغیر لیتا ہے۔

ثالثاً، وہ انسانی اجتماعی تمدن کے ساتھ کھلی بددیانتی کرتا ہے کہ جماعت کے قائم کیے ہوئے تمدنی اداروں سے فائدہ تو اٹھا لیتا ہے مگر جب اس کی اپنی باری آتی ہے تو حقوق اور فرائض اور ذمہ داریوں کا بوجھ اٹھانے کے بجائے اپنی قوتوں کو پوری خود غرضی کے ساتھ ایسے طریقہ پر استعمال کرتا ہے جو اجتماعی تمدن و اخلاق کے لیے صرف غیر مفید ہی نہیں بلکہ ایجاباً مضرت رساں ہے۔ وہ اپنے آپ کو نسل اور خاندان کی خدمت کے لیے نا اہل بناتا ہے۔ اپنے ساتھ کم از کم ایک مرد کو غیر طبعی زنانہ پن میں مبتلا

کر دیتا ہے اور کم از کم دو عورتوں کے بھی صنفی بے راہ روی اور اخلاقی پستی کا دروازہ کھولتا ہے [1]
آخر میں ارشاد ہوا ہے بل انتم قوم مسرفون یعنی تم صرف یہ بدکاری ہی یکے بعد دیگرے نہیں کرتے ہو بلکہ تم اس میں اور زندگی میں جادۂ اعتدال سے ہٹ کر فطرت سے بغاوت کر رہے ہو۔ سورہ عنکبوت میں مختلف اعمال کی نشاندہی کرتے ہوئے فرمایا ہے ائنکم لتاتون الرجال وتقطعون السبیل وتاتون فی ناديكم المنكر، یعنی تم اغلام باز ہو رہزن اور ڈاکو ہو اور تمہاری مجالس منکرات کا اڈہ ہیں۔ سورہ الشعراء میں ہے بل انتم قوم عادون۔ یعنی تم صرف بدکاری نہیں کرتے ہو بلکہ پوری زندگی میں حدودِ فطرت اور قوانینِ شریعت کی بغاوت کر رہے ہو اور سورہ نمل میں ہی کے بیسے بل انتم قوم تجھلون۔ کی تعبیر اختیار کی گئی ہے یعنی تم ایک بیوقوف اور ناعاقبت اندیش قوم ہو۔ بے عقلی یہ کہ نسل اور صحت اور اخلاق کے خلاف جو جرم کیا جا رہا ہے اس کو سمجھتے نہیں ہیں اور نہیں جانتے کہ اس کا انجام حرث اور نسل کی تباہی اور فطرت سے بغاوت ہے۔

اخلاقی پستی کی آخری حد

۱۰۸- اور لوط کی قوم کے پاس اس کا کوئی جواب تھا تو صرف یہی تھا کہ آپس میں کہنے لگے ان کو اپنی بستی سے نکال دو یہ ایسے لوگ ہیں جو بڑے پاک بن رہے ہیں۔ یعنی آخری بات انہوں نے یہ کہی کہ جب ہم سب کو یہ گندہ سمجھتے ہیں اور آپ پاک بننا چاہتے ہیں تو گندوں میں پاکوں کا کیا کام لہذا ان کو اپنی بستی سے نکال دینا چاہیے کہ یہ روز روز کی رکاوٹ ختم ہو [2]

اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ صرف بے حیا اور بدکردار اور بداخلاق ہی نہ تھے بلکہ اخلاقی پستی میں اس حد تک گر گئے تھے کہ انہیں اپنے درمیان چند نیک انسانوں اور نیکی کی طرف بلانے والوں اور بدی پر ٹوکنے والوں کا وجود تک گوارا نہ تھا۔ وہ گناہوں میں اس درجہ مستغرق تھے کہ اصلاح کی آواز کو بھی برداشت نہ کر سکتے تھے اور پاکی کے اس تھوڑے سے عنصر کو بھی نکال دینا چاہتے تھے جو ان کی گھناؤنی فضا میں باقی رہ گیا تھا۔ اسی حد کو پہنچنے کے بعد اللہ تعالیٰ کی طرف سے ان کے استیصال کا فیصلہ ہوا۔ کیونکہ جس قوم میں اجتماعی زندگی میں پاکیزگی کا ذرا سا عنصر بھی باقی نہ رہ سکے پھر اسے زمین پر زندہ رکھنے کی کوئی وجہ نہیں رہتی۔ سڑے ہوئے پھلوں کے

---

[1] تفہیم القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

ٹوکرے میں جب تک چند اچھے پھل موجود ہوں اس وقت تک تو ٹوکرے کو رکھا جاسکتا ہے مگر جب وہ پھل بھی اس میں سے نکل جائیں تو پھر اس ٹوکرے کا کوئی مصرف اس کے سوا کچھ نہیں رہتا کہ اسے کسی کوڑے پر الٹ دیا جائے۔[1]

یہ جو قوم لوط نے حضرت لوط اور ان کے ساتھیوں کے بارے میں کہا کہ ان کو بستی سے نکالو یہ بڑے پارسا بنتے ہیں۔ یہ کسی معاشرے کی بگاڑ کی آخری حد ہے۔ معاشرہ بگڑتے بگڑتے اس حد تک بگڑ جاتا ہے کہ ایک وقت آتا ہے جب سب اپنی ناک کٹوا دیتے اور نکٹا ہونا ہی فیشن اور تہذیب کا تقاضا بن جاتا ہے اس وقت ناک نہ ہونا عیب نہیں رہتا بلکہ اس کا ہونا ایک اعجوبہ گنا جاتا ہے اور ایسے کو اگر ظالموں کا بس چلتا ہے تو نکو بنا کر باہر نکال دیتے ہیں۔

یتطہرون کے لفظ سے یہ بات نکلتی ہے کہ وہ حضرت لوط اور ان کے ساتھیوں پر پاک ہونے کی پھبتی کس رہے تھے اور پاک ہونے پر ان کا مذاق اڑا رہے تھے۔ اور اپنی گندگی پر فخر کر رہے تھے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ یہاں قوم کا جواب اخرجوھم من قریتکم۔ اور سورہ عنکبوت میں قوم کا جواب یہ بتایا ہے۔

فما کان جواب قومہ الا ان قالوا ائتنا بعذاب اللہ ان کنت من الصادقین۔

قوم کا جواب صرف یہ تھا کہ اللہ کا عذاب لاؤ اگر تم سچے ہو۔

بظاہر دونوں جوابوں میں تعارض معلوم ہوتا ہے لیکن حقیقت میں دونوں میں کوئی تعارض نہیں۔ دونوں باتیں درست ہیں۔ ایک موقعہ پر انہوں نے حضرت لوط سے ایک بات کہی اور دوسرے وقت دوسری بات کہی۔ یہ ایک گھنٹے کی کہانی نہیں بلکہ پوری زندگی کی داستان ہے۔ حضرت لوط ان کو اکثر برائیوں پر ٹوکتے رہتے۔ اس موقعہ پر جب حضرت لوط نے تقریر کرتے ہوئے ان کی بدکاری پر ملامت کرتے ہوتے ان کو ٹوکا تو ان کا جواب یہی تھا کہ بڑے پارسا بنے پھرتے ہیں ان کو بستی سے نکالو۔ اور دوسرے موقعہ پر جب حضرت لوط نے اس برائی کے ساتھ دوسری برائیوں پر ان کو ٹوکا اور کہا۔ تم لوگ وہ بدکاری کرتے ہو جو تم سے پہلے کسی نے نہیں کی تم مردوں سے شہوت رانی کرتے ہو، ڈاکہ زنی کرتے ہو اور اپنی مجلسوں میں منکرات کرتے ہو۔ اس کے جواب میں لوگوں نے

---

[1] تفہیم القرآن

حضرت لُوطؑ سے کہا کہ اگر تم سچے ہو تو اللہ کا عذاب لاؤ۔ حضرت لوطؑ ہی نہیں ہر واعظ اور داعی مختلف مجالس اور مختلف اوقات میں دعوت کے نئے انداز اختیار کرتے ہیں اور مخاطبوں کا جواب بھی نیا ہوتا ہے اس لیے یہاں قرآن میں جو بات کہی گئی وہ اور ہے اور سورہ عنکبوت میں فرمائی گئی وہ اور ہے اور سورہ نمل میں جس انداز سے پیش کی گئی ہے وہ اور ہے۔ خطاب اور اس کے جواب کا یہ تنوع اوقات اور مجالس کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔

ممکن ہے کہ قاری کے ذہن میں یہاں یہ سوال بھی چٹکیاں لے کہ قوم کا جواب نقل کرنے میں قرآن نے یہ تنوع کیوں اختیار کیا ہے کہ کہیں و ما کان جواب قومہ ہے اور کہیں فما کان جواب قومہ آیا ہے۔ اس کی ایک وجہ تو اختلاف مجلس اور اختلاف اوقات ہی ہے لیکن مزید نکتہ بلاغت اس میں یہ ہے کہ جس تقریر میں حضرت لُوطؑ نے افعال کی نسبت قوم کی طرف کی ہے مثلاً سورہ نمل میں ہے بل انتم قوم تجھلون، سورہ عنکبوت میں ہے تاتون الرجال و تقطعون السبیل و تاتون فی نادیکم المنکر، وہاں فاء لے کر آئے ہیں اور فرمایا فما کان جواب یعنی اشارہ کیا ہے کہ ان افعال کی وجہ سے ان کا جواب یہ تھا۔ کیونکہ جملہ فعلیہ میں سبب بننے کی صلاحیت ہوتی ہے لیکن جہاں حضرت لُوطؑ نے تقریر میں فعل نہیں بلکہ جملہ اسمیہ استعمال کیا ہے وہاں اللہ سبحانہٗ واو لے کر آئے ہیں۔ و ما کان جواب قومہ کیونکہ جملہ اسمیہ میں سبب بننے کی صلاحیت نہیں ہوتی۔ تعبیر میں یہ دقیق رعایت قرآن پاک کے علاوہ کہیں نہیں پائی جاتی۔ علامہ آلوسی نے بھی اسی قسم کی اس تعبیری اختلاف میں نکتہ آفرینی فرمائی ہے۔

عذاب اور حضرت لُوطؑ کی نجات

۱۰۹۔ پس ہم نے حضرت لُوطؑ اور اُن کے گھر والوں کو بچا لیا مگر اس کی بیوی نہ بچی وہ بھی پیچھے رہ جانے والوں میں تھی۔ ہم نے پتھروں کی بارش کی دیکھو مجرموں کا انجام کیسا ہوا۔ حق تعالیٰ نے حضرت لُوطؑ اور اُن کے ساتھیوں کو عزّت و عافیت کے ساتھ صحیح و سالم ان بستیوں سے نکال لیا اور ان بستیوں پر عذاب مسلّط کر دیا جس کا ذکر آگے آتا ہے۔ لُوط علیہ السلام کے متعلقین میں سے صرف ان کی بیوی آپ سے علیحدہ رہی اور معذبین کے ساتھ ہلاک ہوئی کیونکہ اس کی سازباز اُن معذبین سے تھی۔ لُوط علیہ السلام کے یہاں جو مہمان وغیرہ آتے ان کی اطلاع بھی کرتی تھی اور ان کو بدکاری کی ترغیب دیتی تھی یا جیسا کہ بعض نے لکھا ہے کہ مردوں کی طرح عورتوں میں بھی "مساحقہ"

کارواج ہوگیا تھا۔ یہ عورت اس میں مبتلا تھی۔ بہرحال عذاب ان سب پر آیا جو اس مہلک بیماری میں مبتلا تھے اور نہایت ڈھٹائی کے ساتھ نبی کا مقابلہ اور تکذیب کرتے تھے یا جو کفر د فحش کے سسٹم میں ان کے معین و مددگار تھے[1]

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جن میں حضرت لوطؑ کے مخالفین انا س چند لوگ کہہ رہے تھے وہ ان کے متعلقین تھے جن کو قرآن نے یہاں اصلہ، کہا ہے۔ اس اہل میں حضرت لوطؑ کی بیوی اولاً داخل تھی۔ اسی لیے اللہ سبحانہ نے اس کو استثنا کے ذریعے خارج کیا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اہل کے مفہوم میں بیوی داخل نہ ہو تو پھر استثنا میں کوئی معنویت نہیں رہتی۔ مطلب یہ ہے کہ لوطؑ کی بیوی کو چھوڑ کر حضرت لوطؑ کے خاندان کو بچالیا اور اس بچانے کی قرآن نے دوسری صورت یہ بتائی ہے کہ حضرت لوطؑ سے فرشتوں نے کہا،

فاسر باھلک بقطع من اللیل ولا یلتفت منکم احد الا امراتک انہ مصیبھا ما اصابھم۔

بس تو کچھ رہے اپنے اہل و عیال لے کر یہاں سے نکل جا اور تم میں سے کوئی پیچھے پلٹ کر نہ دیکھے مگر تیری عورت ساتھ نہ جاتے اس پر وہی کچھ پڑے گا جو اوروں پر پڑے گا۔

واقعہ کی تفصیل انشاء اللہ بارہویں پارہ میں آرہی ہے۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ عذاب آیا اور ہم نے لوطؑ اور اُن کے اہل و عیال کو بچالیا لیکن ان کی بیوی عذاب سے نہ بچ سکی۔ دوسرے مقامات پر تصریح ہے کہ حضرت لوطؑ کی یہ بیوی جو غالباً اہل سدوم سے نسبی تعلق رکھتی تھی اپنے کا فرشتہ داروں کی ہمنوا رہی اور آخر وقت تک اس نے کا فروں کا ساتھ نہ چھوڑا۔

قرآن نے یہاں خاص طور پر بیوی کا ذکر اس حقیقت کو ظاہر کرنے کے لیے کیا ہے کہ نجات کا مدار صرف ایمان اور عمل صالح ہے۔ اس میں نسب اور نسبت کی قیمت نہیں ہے۔ قرآن میں حضرت نوحؑ کے بیٹے، حضرت ابراہیمؑ کے والد اور حضور انور کے چچا ابولہب کا ذکر پڑھو گے، بتایا گیا ہے کہ پیغمبر کی بیوی ہونا، پیغمبر کا بیٹا ہونا، پیغمبر کا باپ ہونا اور پیغمبر کا چچا ہونا کسی شخص کے لیے فائدہ مند نہیں ہے جب تک ایمان و عمل صالح کا مالک نہ ہو۔

آخر میں فرمایا و امطرنا علیھم مطرا" ہم نے ان پر پتھروں کی بارش کی، پتھروں کا اضافہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن میں دوسری جگہ تصریح ہے کیا امطرنا علیھم حجارۃ من سجیل الخ دراصل یہ بارش آگ اور پتھروں کی تھی جیسے کسی آتش فشاں پہاڑ کے پھٹنے کے وقت ہوتی ہے۔ عذاب کی کیفیت اور نوعیت پر تبصرہ توانشاء اللہ بارہویں جلد میں آرہا ہے۔ یہاں تو صرف یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ جرائم پیشہ قوموں کے ساتھ اللہ سبحانہٗ کا یہی معاملہ رہا ہے کہ اگر وہ اپنے پیغمبر کو کسی قوم کی ہدایت کے لیے روانہ کرے اور قوم اس کی ہدایت پر کان نہ دھرے تو معجزہ عذاب اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک آیاتِ ہدایت سے قوم کے تمام صالح اجزاء اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی نہیں ہو جاتی۔ یہی صورتِ حال حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت لوطؑ کی قوموں کی ہے انہوں نے ایک طویل زمانے تک اپنی قوم کو دعوت دی اور اس کے بعد ناامید ہو کر آخری معجزہ کی دعا مانگی۔ اس موقعہ پر پہنچ کر پیغمبر کو اپنے مومنین کی جماعت کو ساتھ لے کر ہجرت کرنے کا حکم ہوتا ہے۔ حضرت نوح کو مع رفقاء کے کشتی پر چڑھا کر کفار سے الگ کیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں۔ انی مهاجر الی ربی، حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلتے ہیں۔ حضرت ہود، حضرت صالح اور حضرت لوط سب نے اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر اپنی نافرمان قوموں سے علیحدگی اختیار کی اور جب تک یہ ہجرت نہیں ہو جاتی معجزہ عذاب کی نمائش نہیں ہوتی ہے۔ یہی صورتِ حال حضرت لوط کے یہاں بھی پیش آئی ہے۔

عملِ قومِ لوط اور اس کی سزا

اس پر تو پوری اُمت کا اتفاق ہے کہ لواطت کبائر معاصی میں سے ہے اور یہ زنا کی طرح انتہائی گھناؤنا اور اخلاق سوز عمل ہے۔ قومِ لوط اس بیماری میں مبتلا تھی تو اللہ تعالیٰ نے ان کی بستی ہی کو الٹ دیا۔ یہ تو قرآن کی رہنمائی ہے۔ عقل یہی کہتی ہے کہ یہ فعل سراسر فطرت کے خلاف ہے کیونکہ حکمتِ الٰہی کا تقاضا تو یہ ہے کہ مرد میں قوتِ فعل اور عورت میں قوتِ انفعال ہو لہٰذا مرد میں انفعال کا پیدا ہونا فطری اصول کے خلاف ہے۔ اور پھر یہ کہ جنسی اختلاط بالذات مقصود نہیں بلکہ اصل مقصد توالد و تناسل ہے اور لواطت اس مقصد سے بالکل تہی دامن ہے۔ نیز عورت اور مرد کے حلال جنسی تعلقات سے طرفین میں انس و محبت پیدا ہوتی ہے لیکن لواطت فاعل و مفعول کے درمیان شدید نفرت پیدا کرتی ہے۔ قدیم و جدید اطبا اس پر متفق ہیں کہ لواطت صحت کے لیے سخت مضر ہے اور اس میں مشغول ہونے والوں کا جسم دُبلا ہوتا ہے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوتی ہیں۔

چہرہ بے رونق اور دانت خراب ہوتے ہیں۔ سرخمیدہ جسم اور چہرے قبل از وقت بڑھاپے کے آثار، نگاہ کمزور، قوت فکر مختل، قوت ارادی ضعیف نامردی، احساس کمتری اور رعشہ وغیرہ عمل لواطت کے وہ انعامات ہیں جو زندگی بھر انسان کا ساتھ نہیں چھوڑتے۔

قرآن میں عملِ قوم لوط کو فاحشہ کہا ہے۔ اس عمل کے کرنے والوں کو مسرف، جاہل اور مجرم بتایا گیا ہے۔ احادیث میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی سے معلوم ہوا ہے کہ یہ ایک ایسا جرم ہے جس سے معاشرہ کو پاک رکھنے کی کوشش کرنا، حکومت اسلامی کے فرائض میں سے ہے اور یہ کہ اس جرم کے مرتکبین کو سنگین سزا ملنی چاہیے۔ ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے ہمیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ الفاظ ملتے ہیں۔ جس شخص کو تم قوم لوط کا عمل کرتے ہوئے پاؤ تو فاقتلوا الفاعل والمفعول بہ، فاعل اور مفعول بہ کو قتل کر دو۔ بیہقی میں حضرت ابوموسیٰ اشعری سے یہ روایت منقول ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اگر مرد مرد سے ہم جنسی کرے تو وہ دونوں زانی ہیں اور اگر عورت عورت سے ہم جنسی کرے تو وہ دونوں زانیہ ہیں۔ لیکن چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں ایسا کوئی مقدمہ پیش نہیں آیا اس لیے قطعی طور پر یہ متعین نہیں ہو سکا کہ اس کی سزا کس طرح دی جائے۔ صحابہ کرام میں سے حضرت علی کی رائے ہے کہ مجرم کو تلوار سے قتل کیا جائے اور دفن کرنے کے بجائے اس کی لاش کو جلایا جائے۔ اسی رائے سے حضرت ابوبکر نے اتفاق فرمایا ہے۔ حضرت عمر اور حضرت عثمان کی رائے یہ ہے کہ کسی بوسیدہ عمارت کے نیچے کھڑا کر کے وہ عمارت ان پر گرا دی جائے۔ حضرت عبداللہ ابن عباس کا فتویٰ یہ ہے کہ بستی کی سب سے اونچی عمارت پر سے ان کو سر کے بل گرا دیا جائے اور اوپر سے پتھر برسائیں جائیں۔

مذکورہ بالا روایات کی بنا پر امام شافعی، امام مالک، امام احمد، امام ابویوسف اور امام محمد لواطت کو زنا کے حکم میں مانتے ہیں لیکن حد لواطت کے تعیین میں ان کے درمیان اختلاف ہے۔ امام مالک فاعل اور مفعول بہ دونوں کے لیے رجم کی سزا تجویز کرتے ہیں خواہ وہ دونوں شادی شدہ ہوں یا غیر غیر شادی شدہ [1] امام شافعی اور امام احمد سے تین اقوال مروی ہیں ایک یہ کہ فاعل اور مفعول بہ پر زنا کا حکم جاری کر کے شادی شدہ کو رجم اور غیر شادی شدہ کو سو کوڑوں کی سزا دی جائے اور ایک سال کے لیے شہر بدر کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ فاعل کو رجم کر دیا جائے اور مفعول کو سو دُرّوں

---

[1] شرح الزرقانی۔

اور ایک سال شہر بدر کی سزا دی جائے تیسری یہ کہ دونوں کو قتل کر دیا جائے[1]

امام ابو یوسف اور امام محمد فرماتے ہیں کہ لواطت مثل زنا کے ہے اس لیے اس پر زنا کا حکم جاری ہوگا اور شادی شدہ کو رجم اور غیر شادی شدہ کو سو دُرّے لگاتے جائیں گے۔ سعید بن المسیب، عطا، حسن بصری، ابراہیم نخعی، سفیان ثوری اور اوزاعی کی بھی یہی رائے ہے۔ امام ابو حنیفہ کی رائے یہ ہے کہ لواطت زنا نہیں ہے اس لیے اس پر حد جاری نہیں کی جائے گی بلکہ تعزیر ہوگی اور اس کی صورت یہ ہے کہ فاعل و مفعول کو کسی گندی جگہ پر قید کر دیا جائے کہ وہ قید ہی میں مر جائیں یا پھر توبہ کر لیں۔ البتہ اگر کوئی شخص عادی لوطی ہو تو حاکم سزا کے طور پر اسے قتل کر سکتا ہے[2]

وہ تمام ائمہ جو لواطت کو مثل زنا مانتے ہیں ان کا استدلال روایات بالا سے ہے لیکن امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ لواطت نہ تو زنا ہے اور نہ زنا کے حکم میں ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام کے درمیان اس کی سزا کے بارے میں اختلاف ہوا۔ کچھ نے کہا کہ آگ میں جلا دیا جائے۔ کچھ نے بتایا کہ اس پر دیوار گرا دی جائے۔ کچھ کی رائے ہوئی کہ اسے کسی اونچی جگہ سے گرا دیا جائے۔ پھر اس پر پتھر برسائے جائیں اور کچھ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اسے قتل کر دیا جائے۔ صحابہ کرام اہلِ زبان تھے۔ اگر زنا اور لواطت ہم معنے الفاظ ہوتے تو ان کے درمیان اختلاف کیوں ہوتا۔

اس تمام تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ اختلاف صرف اس میں ہے کہ اس میں خدا کی بتائی ہوئی حد ہے یا نہیں۔ قانون کی اصطلاح میں حد نام ہے اس سزا کا جو اللہ تعالیٰ کے حق کی حیثیت سے واجب ہوتی ہے۔ اور یہ ظاہر ہے کہ قانون میں اس کی کوئی ایسی سزا تجویز نہیں ہوتی جسے حد کہہ سکیں۔ مطلب یہ ہے کہ اختلاف سزا میں نہیں نوعیتِ سزا میں ہے۔ امام ابو حنیفہ اس کی سزا کو تعزیر کہتے ہیں۔ تعزیر اس سزا کو کہتے ہیں جس کی مقدار شریعت نے مقرر نہیں کی بلکہ اس کا انحصار حاکمِ وقت کی رائے پر ہے کہ وہ جیسے حالات و ضروریات ہوں ان کے لحاظ سے کوئی عبرتناک سزا اس پر دے۔ گویا جیسے نفس سزا میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ ایسے ہی جرم کی سنگینی میں بھی کوئی اختلاف نہیں ہے۔ یہ جرم کی سنگینی تو ہے کہ احناف اس کے لیے زانی کی سزا سے زیادہ سنگین سزا تجویز کر رہے ہیں مثلاً وہ کہتے ہیں کہ فاعل و مفعول کو سخت گندی جگہ پر قید کر دیا جائے کہ وہ غلاظت کی وجہ سے ہلاک ہو جائیں[3] حد کی نسبت تعزیر میں زیادہ سنگینی ہے اور اس میں گنجائش ہے کہ

---

[1] التشریع الجنائی [2] فتح القدیر۔ [3] فتح القدیر۔

عدالت پیش پا افتادہ حالات کے مطابق چاہے تو اسے قتل کر دے جیسے حضرت علی کی رائے ہے۔ چاہے تو کسی اونچے مکان سے گرا کر ہلاک کر دے۔ بہرحال اسلامی حکومت اس موضوع پر جرم کی سنگینی کے مطابق تعزیری قوانین بنانے کی مجاز ہے۔

ہمارے زمانے میں جس تیزی سے یہ بیماری پھیل رہی ہے اس کے پیش نظر ضروری ہے کہ حکومت اس سلسلے میں قانون سازی کرے اور اگر حکومت اسے زنا کے حکم میں لے کر شادی شدہ کے لیے سو درّوں اور غیر شادی شدہ کے لیے سنگساری کی سزا کا قانون بنا دے تو اس کی بھی گنجائش ہے کیونکہ یہ بھی امام ابو یوسف اور امام محمد کا مسلک ہے۔

لواطت ان جرائم میں سے ہے جن پر قرآن نے نجاست اور خباثت کا فتویٰ لگایا ہے۔ قرآن نے سارے گناہوں میں سے شرک، زنا اور لواطت کو خبیث اور نجس کہا ہے۔ شرک کی نجاست دو قسم کی ہے نجاست مغلظہ اور نجاست مخففہ۔ مغلظہ شرک اکبر ہے اور مخففہ شرک اصغر ہے۔ زنا اور لواطت کی نجاست دوسرے گناہوں کی نجاست سے زیادہ ہے اس لیے اسلام میں ان جرائم کی سنگین سزا ہے۔ حافظ ابن القیم الجوزی نے اغاثۃ اللھفان میں اور ابن حجر مکی نے الزواجر میں اس پر اچھا تبصرہ کیا ہے۔

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۗ قَالَ يَٰقَوْمِ ٱعْبُدُوا۟ ٱللَّهَ مَا لَكُم
مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُۥ ۖ قَدْ جَآءَتْكُم بَيِّنَةٌ مِّن رَّبِّكُمْ ۖ فَأَوْفُوا۟ ٱلْكَيْلَ
وَٱلْمِيزَانَ وَلَا تَبْخَسُوا۟ ٱلنَّاسَ أَشْيَآءَهُمْ وَلَا تُفْسِدُوا۟ فِى
ٱلْأَرْضِ بَعْدَ إِصْلَٰحِهَا ۚ ذَٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۝
وَلَا تَقْعُدُوا۟ بِكُلِّ صِرَٰطٍ تُوعِدُونَ وَتَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ ٱللَّهِ
مَنْ ءَامَنَ بِهِۦ وَتَبْغُونَهَا عِوَجًا ۚ وَٱذْكُرُوٓا۟ إِذْ كُنتُمْ قَلِيلًا فَكَثَّرَكُمْ ۖ
وَٱنظُرُوا۟ كَيْفَ كَانَ عَٰقِبَةُ ٱلْمُفْسِدِينَ ۝ وَإِن كَانَ طَآئِفَةٌ
مِّنكُمْ ءَامَنُوا۟ بِٱلَّذِىٓ أُرْسِلْتُ بِهِۦ وَطَآئِفَةٌ لَّمْ يُؤْمِنُوا۟ فَٱصْبِرُوا۟ حَتَّىٰ
يَحْكُمَ ٱللَّهُ بَيْنَنَا ۚ وَهُوَ خَيْرُ ٱلْحَٰكِمِينَ ۝

اور مدین والوں کی طرف ہم نے اُن کے بھائی حضرت شعیب کو روانہ کیا۔[۱۱۱] انہوں نے فرمایا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو اللہ کے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں۔ تمہارے پاس تمہارے رب

کی طرف واضح دلیل آچکی ہے[111]۔ لہٰذا وزن اور پیمانہ پورا کرو اور
لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور ملک میں فساد بپا نہ کرو
جب کہ اس کی درستگی ہو چکی ہو، اسی میں تمہاری بھلائی ہے اگر
تم واقعی مومن ہو[111]۔ اور راستوں میں اہل ایمان کو دھمکانے اور خدا
کی راہ سے روکنے اور راہِ حق میں کجی تلاش کرنے کے لیے نہ
بیٹھو[113]۔ اللہ کا یہ احسان یاد کرو کہ تم بہت تھوڑے تھے اس
نے تمہاری تعداد زیادہ کر دی اور غور کرو کہ مفسدین کا انجام کیا
ہوا ہے[114]۔ اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر ایمان لے آیا
جسے مجھے دے کر روانہ کیا گیا ہے اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا
تو صبر کرو یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہ
بہترین فیصلہ کرنے والا ہے[115]۔

معانی مفردات

صراط، راہ، راستہ، سیدھے اور آسان راستہ کو صراط کہتے ہیں۔ واضح رہے کہ صراط اصل سراط ہے

اس میں س کا ص سے قلب ہے تاکہ اطباق میں ط کے مطابق ہو جائے۔ اس کی اصل سرطت الطعام سے ہے جس کا استعمال کھانے کے نگلنے کے لیے ہوتا ہے گویا سراط میں اس کا تصور ہے کہ رہرو راہ کو نگل لیتا ہے یا راستہ رہرو کو ہڑپ کرتا جاتا ہے۔ عربی کی مثل ہے قتل ارضاً عالمها و قتلت ارض جاھلھا زمین سے واقف نے زمین کو ختم کر دیا اور اس سے ناواقف کو زمین نے مار ڈالا۔ اس کی جمع سرطیا صرط ہے جیسے کتاب کی جمع کتب ہے۔ طائفۃ، گروہ، جماعت، کچھ لوگ، ایک اور ایک سے زیادہ۔ سب طائفہ کہلاتا ہے۔ طوف سے اسم فاعل کا واحد مونث۔ علامہ عینی عمدۃ القاری میں رقمطراز ہیں۔ لغت میں طائفہ کے معنے ہیں کسی چیز کے ایک ٹکڑے کے۔ عباب میں ہے الطائفۃ من الشئی القطعۃ، اور علامہ شہاب الدین خفاجی فرماتے ہیں۔ تحقیق یہ ہے کہ طائفہ اصل میں اسم فاعل ہے طوف سے جس کے معنے چکر لگانے کے ہیں۔ یہ یا تو نفس کی صفت ہے نفس طائفۃ، اس صورت میں ... ... بولا جاتا ہے یا جماعت کی صفت ہے اور ایک سے زیادہ کے لیے بولا جاتا ہے۔ تو گویا ... معانی میں مشترک ہے اور ہر مقام پر اس مقام کے مناسب معنے پر محمول ہوتا ہے اور علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں طائفہ سے جب جماعت مراد لی جاتی گی تو طائف کی جمع ہوگا اور جب اس سے واحد مراد ہوگا تو اس صورت میں اس کا جمع ہونا بھی صحیح ہے اور اس کے ذریعہ واحد سے کنایہ ہوگا اور یہ بھی صحیح ہے کہ اس کو راویۃ اور علامۃ وغیرہ کی طرح قرار دیا جاتے یعنی اس کی تا کو مبالغہ کی تا قرار دیا جائے نہ کہ تانیث کی۔ اس پر مزید تبصرہ انشاء اللہ گیارہویں جلد میں آرہا ہے۔

ایک اور واقعاتی شہادت

سامی قومیں عموماً اپنی آبادی اور قومیت کو اپنے بزرگوں کے نام سے موسوم کرتی ہیں۔ مدین قوم ہو یا آبادی اپنے خاندان کے بانی موسس مدین ابن ابراہیم کی طرف منسوب ہے۔

مدین نے اپنی آبادی اپنے ہی نام سے اپنے بھائی حضرت اسماعیل کے پہلو میں قائم کی۔ یہ ملک طولاً خلیج عقبہ کے سواحل پر دہانہ خلیج سے ساحل بحر احمر تک واقع تھا۔ قرآن پاک میں مدین کا ذکر دو سبب سے آتا ہے۔ اول حضرت شعیب، دوسرے حضرت موسیٰ کے تعلق سے۔ اہل مدین بڑے تجارت پیشہ لوگ تھے۔ قدیم زمانے میں جو تجارتی شاہراہ بحر احمر کے کنارے یمن سے مکہ اور ینبع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی اس پر اس قوم کی بستیاں تھیں۔ اسی بنا پر عام عرب مدین سے واقف تھے۔

مدین حضرت ابراہیم کی بیوی قطورا کے بطن سے تھے ان کی طرف نسبت کرکے آبادی کا نام مدین ہوا، اور ان کی ہی نسبت سے مدین قوم بنی۔ یعنی مدین کے علاقے کی ساری آبادی جو مدیان بن ابراہیم کے زیر اثر آئی بنی مدیان کہلائی۔ اور ان کے ملک کا نام بھی مدین یا مدیان مشہور ہوگیا۔ مدین کے قبائل ایک منتظم زندگی رکھتے تھے۔ شہر میں مذہبی رسوم و آداب کی تلقین و محافظت کے لیے کاہن مذہبی عہدہ دار ہوتے تھے۔ کاہن شہر کے قانونی حاکم ہوتے تھے۔ حضرت موسیٰ کے عہد میں جو کاہن تھا اس کا نام تورات میں کہیں راعویل کہیں ثیرد، کہیں حوباب مذکور ہے لیکن مسلمان مفسرین کے نزدیک یہ شعیب تھے جو لفظاً حوباب سے بہت قریب ہے۔ حضرت موسیٰ جب مصر سے ہجرت کرکے مدین پہنچے تو اُن کے یہاں بھی مہمان ہوئے اور ان کے یہاں بکریاں چرانے پر ملازم ہوگئے اور اس کے معاوضہ میں حضرت شعیب نے اپنی ایک بیٹی حضرت موسیٰ کی زوجیت میں دے دی۔ ۱۶۰۰ تا ۱۵۰۰ قبل مسیح تو حضرت موسیٰ کا عہد ہے مدین اس وقت پانچ شیوخ قبائل کے ماتحت تھا ان کے نام یہ ہیں۔ عوی۔ رقیم، صنور، حور اور ربع۔ یوسیفوس میں یہودی جو پہلی صدی مسیحی میں تھا اس کا بیان ہے کہ شہر رقیم اسی مدیانی بادشاہ رقیم کے نام سے آباد ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد قدیم میں مدین کی شمالی حد کہاں تک وسیع تھی۔ حضرت شعیب کا نسب نامہ ہمارے شارحین قرآن نے تفاسیر میں یوں لکھا ہے شعیب بن میکیل بن یشجر بن مدین ابن ابراہیم۔

۱۱۰۔ اور مدین والوں کی طرف ہم نے ان کے بھائی حضرت شعیب کو روانہ کیا۔ قرآن میں دوسری جگہ حضرت شعیب علیہ السلام کا اصحاب ایکہ کی طرف مبعوث ہونا مذکور ہے۔ اگر اصحاب مدین اور اہل ایکہ ایک ہی قوم ہیں تو نبہا و نعمت اور اگر دو جداگانہ قومیں ہیں تو دونوں کی طرف مبعوث ہوتے ہوں گے اور دونوں میں کم تولنے اور کم ناپنے کی بیماری ہوگی۔ بہر حال حضرت شعیب نے توحید کی دعوت عام کے ساتھ خاص معاشرتی معاملات کی اصلاح اور حقوق العباد کی حفاظت کی طرف بڑے زور سے توجہ دلائی جیسا کہ آئندہ آیات میں مذکور ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کو کمال فصاحت کی وجہ سے خطیب الانبیاء کہا جاتا ہے [1]

مفسرین اس بارے میں مختلف الخیال ہیں کہ مدین اور اصحاب ایکہ ایک ہی قبیلہ کے دو نام ہیں یا دو جدا جدا قبیلے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ دو جُدا جُدا قبیلے ہیں۔ مدین متمدن اور شہری قبیلہ تھا اور

[1] افادات شیخ الاسلام

اصحاب ایکہ دیہاتی اور بدوی قبیلہ جو جنگل اور بن میں رہتا تھا اس لیے اس کو بن والا کہا گیا اور دوسرے مفسرین نے دونوں کو ایک ہی قرار دیا ہے اور فرماتے ہیں کہ آب و ہوا کی لطافت نہروں اور آبشاروں کی کثرت نے اس مقام کو اس قدر شاداب و پرفضا بنا دیا تھا اور یہاں میووں، پھلوں اور خوشبودار پھولوں کے اس قدر باغات تھے کہ اگر ایک شخص آبادی سے باہر کھڑا ہو کر نظارہ کرتا ہے تو اس کو یہ معلوم ہوتا کہ یہ نہایت خوبصورت درختوں کا ایک بن ہے۔ ان مفسرین میں سے حافظ ابن کثیر کا یہ خیال ہے کہ یہاں ایکہ نام ایک درخت کا تھا۔ اہل قبیلہ چونکہ اس کی پرستش کرتے تھے لہٰذا اس کی نسبت سے مدین کو اصحاب ایکہ کہا گیا ہے۔ الغرض یہ بات بڑی پیچیدہ ہے کہ مدین اور اصحاب الایکہ کون ہیں۔ اس پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ ہم چودھویں جلد میں کریں گے۔ یہاں حضرت شعیب کو اہل مدین کا بھائی کہنا اس بات کی طرف کھلا اشارہ ہے کہ حضرت شعیب کا اہل مدین سے نسلی اور نسبی رشتہ ہے اور سورہ شعراء میں اصحاب الایکہ کے موضوع پر حضرت شعیب کی اخوت سے خاموشی اس بات کی دلیل ہے کہ اصحاب الایکہ سے حضرت شعیب کا نہ نسلی اور نسبی رشتہ ہے اور نہ جنسی وطنی۔

حضرت شعیب کی دعوتِ توحید

۱۱۱۔ انہوں نے فرمایا اے میری قوم اللہ کی بندگی کرو، اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے واضح دلیل آ چکی ہے۔ یعنی میری صداقت کی دلیل ظاہر ہو چکی اب جو نصیحت کی بات تم سے کہوں اسے قبول کرو اور جن خطرناک عواقب پر متنبہ کردں ان سے ہوشیار ہو جاؤ [1]

یہ اندازِ تعبیر بتا رہا ہے کہ حضرت شعیب کی قوم خدا کی منکر نہ تھی اور نہ خدا کی عبادت کا انکار کرتی تھی۔ لیکن اللہ تعالیٰ پر ان کا ایمان ایک تاریخی واقعیت سے زیادہ نہیں تھا۔ اللہ تعالیٰ کو پروردگار سمجھنا اس کو آسمان و زمین کا خالق ماننا اور اس کو معبود تسلیم کرنا ایسا ہی تھا جیسے تاریخ کے کسی طالب علم سے پوچھا جائے کہ یہ قدیم عمارت کس کی تعمیر ہے وہ جواب دے کہ فلاں بادشاہ کی۔ اس بادشاہ کے نام سے اس کے قلب پر خوف و ہراس کی کوئی لہر نہ دوڑے نہ اس کے دماغ پر کوئی اثر پڑے۔ ان لوگوں کے دل اللہ کے خوف اور تضرع سے خالی تھے۔ اللہ کی صفات سے بالکل

[1] افادات شیخ الاسلام

بے خبر تھے اس لیے ان کے دل میں اس کی محبت کا کوئی جذبہ اور اس کی عظمت و کبریائی کا کوئی نقش نہ تھا حضرت شعیب کے ظہور کے وقت ان کی حالت نبی کی بگڑی ہوئی اُمت کی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بعد مشرک قوموں میں رہتے رہتے یہ لوگ شرک سیکھ گئے تھے۔ تمدن کے جراثیم جن امراض کو پیدا کرتے ہیں وہ ایک ایک کر کے ان میں پیدا ہو چکے تھے۔ بتوں کی پرستش اور ان کے لیے قربانی ان کا مذہب تھا۔ تمام بُتوں کا سردار "بعل فزر" دیوتا تھا۔ اخلاقی حالت اس قدر پست تھی کہ شرفائے خاندان کی لڑکیاں انسانیت کا بدترین نمونہ تھیں۔ مردوں کا یہ حال تھا کہ ظلم و ستمگری ان کی زندگی کا معمولی پیشہ تھا۔ؔ حضرت شعیب نے سارے انبیاء کی طرح سب سے پہلے اُن کو یگانہ خدا کی عبادت کی دعوت دی اور ہر قسم کے شرک سے بچنے کی تلقین کی۔ اور دعوت و اصلاح کا کام اس صحیح راستہ سے شروع کیا جہاں سے اللہ کے سارے نبی شروع کرتے ہیں۔ آپ نے سب سے پہلے لوگوں کو یگانہ خدا کی عبادت کی دعوت دی اور معبودانِ باطل کے انکار کی تلقین کی۔ گویا آپ نے پوری قوم سے کہا کہ لوگو کہو لا الٰہ الا اللہ۔ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں۔ اور یہ فرمانے کے بعد آپ نے لوگوں کو بتایا کہ میرا یہ کہنا کسی لیڈر یا زعیم کا کہنا نہیں ہے۔ خدا کے رسُول کی حیثیت سے یہ بات کہہ رہا ہوں اور میرے دعویٰ رسالت کی صداقت پر صاف دلیل واضح حجت تم تک پہنچ چکی ہے قد جاءتکم بینۃ من ربکم جہاں بینۃ سے کیا مراد ہے قرآن نے کوئی تصریح نہیں کی۔ ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد کوئی حسی معجزہ ہو اور یہ بھی ہو سکتا ہے کہ اس سے مراد خود ان کی اپنی ذات اور اپنی دعوت ہو کیونکہ رسُول خود اپنی ذات میں ایک کامل بینہ اور کامل حجت ہوتا ہے۔ قرآن میں رسُول کو بینہ بتایا گیا ہے۔ ارشاد ہے:

لم یکن الذین کفروا من اھل الکتاب والمشرکین منفکین حتیٰ تاتیھم البینۃ رسول من اللہ یتلوا صحفا مطھرۃ۔

اہلِ کتاب اور مشرکین میں سے کفر پسند لوگ اپنے کفر سے باز آنے والے نہ تھے یہاں تک کہ ان کے پاس آ جاتے یعنی اللہ کا ایسا رسُول جو پاکیزہ کتاب پڑھتا ہو۔

یعنی وہ ہر پہلو سے حق کو اس طرح واضح اور مدلل کر دیتا ہے کہ ہٹ دھرم اور ضدی لوگوں کے سوا کسی کے لیے بھی اس سے روگردانی کی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ معجزہ نبوت نبوت کے شرائط میں سے نہیں بلکہ ضروریات اور توابع میں سے ہے: کوئی قوم اگر مطالبہ کرتی ہے تو اللہ تعالیٰ اگر چاہتا ہے

لہ ارض القرآن

اتمام حجت کے طور پر نبی کے ذریعے معجزہ ظاہر کر دیتا ہے۔ نبی کی اصل دعوت ان بینات پر مبنی ہوتی ہے جو اللہ کی طرف سے بصورتِ احکام اس کو ملتے ہیں اور اس کی زندگی ان بینات کا مظہر کامل ہوتی ہے وہ اپنی قوم کے اندر ایک چلتا پھرتا نور ہوتا ہے۔ اس کی زبان سے نکلا ہوا ہر کلمہ، اس کا ہر اشارہ، اس کا ہر عمل، اس کی صداقت، اس کی حکمت اور اس کے سفیر الٰہی ہونے کی ایسی گواہی ہوتا ہے کہ اس کی تکذیب صرف وہی لوگ کرتے ہیں جو حقیقت سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں۔

معاملات میں بد دیانتی اور سیاسی بگاڑ

۱۱۴ - لہٰذا وزن اور پیمانہ پورا کرو، اور لوگوں کو ان کی چیزوں میں گھاٹا نہ دو اور ملک میں فساد بپا نہ کرو جب اس کی درستگی ہو، اسی میں تمہاری بھلائی ہو اگر تم واقعی مومن ہو۔ بندوں کے حقوق کی رعایت اور معاملاتِ باہمی کی درستی جس کی طرف ہمارے زمانہ کے پرہیزگاروں کو بھی بہت کم توجہ ہوتی ہے۔ خدا کے نزدیک اس قدر اہم چیز ہے کہ اسے ایک جلیل القدر پیغمبر کا مخصوص وظیفہ قرار دیا گیا جس کی مخالفت میں ایک قوم تباہ ہو چکی۔ ان آیات میں حضرت شعیب کی زبانی آگاہ فرما دیا کہ لوگوں کو ادنیٰ ترین مالی نقصان پہنچانا اور ملک میں اصلاحی حالت قائم ہو چکنے کے بعد خرابی اور فساد پھیلانا خواہ کفر و شرک کر کے یا ناحق قتل و نہب وغیرہ یہ کسی ایماندار کا کام نہیں ہو سکتا [1]

بحرِ احمر کی جو شاخ عرب اور جزیرہ نمائے سینا کے درمیان سے گزرتی ہے اسی کے کنارے قوم مدین آباد تھی۔ چونکہ یہ جگہ شام، افریقہ اور عرب کے تجارتی قافلوں کا نقطہ اتصال تھی۔ اس لیے اشیاء تجارت کے مبادلہ کی بڑی منڈی بن گئی تھی اور لوگ خوشحال ہو گئے تھے۔ تجارت میں پیشہ ورانہ حیثیت سے غالباً دنیا کی تاریخ میں یہ پہلی قوم ہے۔ اس بنا پر اس میں یہ مذموم صفت پیدا ہو گئی جو حالات کے بالکل مناسب ہے۔ اس میں صرف خرید و فروخت کی کمی بیشی مراد نہیں ہے بلکہ سود سٹہ اور دیگر اصنافِ تجارت ممنوعہ مراد ہیں جن کے ذریعہ تاجر و صاحبِ معاملہ لوگوں کو ان کے جائز حق سے ہمیشہ کم مالیت دیتے ہیں۔ اسی بنا پر حضرت شعیب کی قوم نے حضرت شعیب سے کہا تھا:

او ان نفعل فی اموالنا ما نشاء ہم اپنے اموال میں جو چاہیں کریں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یعنی شعیب علیہ السلام سے دریافت کیا کر،

تمہاری یہ پوجا پاٹ نمازیں کیا اس سے بھی روکتی ہیں کہ ہم اپنے مالیاتی مسائل میں جو چاہیں کریں۔

گویا ان کا خیال یہی تھا کہ نماز دعا وغیرہ کو انسان کے معاشی کاروبار سے کیا تعلق ہے شاید وہ بھی یہی کہتے ہوں کہ اسلام محض ایک پرسنل اور شخصی مشغلہ کی حیثیت سے اگر زندہ رہنا چاہیے تو رہ سکتا ہے لیکن زندگی کے عمومی اور اجتماعی شعبوں میں اس کی دخل اندازیوں کو برداشت نہیں کیا جا سکتا دوسرے لفظوں میں یوں کہیے کہ وہ مسجد کو دنیاوی کاروبار سے علیحدہ رکھنا چاہتے تھے۔

اس رائے کی تائید مفسرین کی تشریحات سے بھی ہوتی ہے۔ مشہور مفسر قرآن امام بغوی فرماتے ہیں:

کہتے ہیں کہ حضرت شعیب نے ان کو درہم دینار میں بٹہ لینے سے منع کیا تھا اور کہا کہ یہ حرام ہے۔

محدث ابن جریر طبری اپنی تاریخ میں لکھتے ہیں:

زید بن اسلم کہتے ہیں کہ حضرت شعیب ان کو بٹہ لینے سے روکتے تھے محمد بن کعب القرظی کہتے ہیں کہ شعیب کی قوم کو بٹہ لینے کی پاداش میں عذاب ہوا۔

آیت میں خاص طور پر ناپ تول کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ تجارتی کاروبار اور لین دین میں عام طور پر اشیاء ناپی اور تولی جاتی ہیں ورنہ یہ کوئی قید احترازی نہیں۔ اصل مقصود معاملات میں دیانت اور راست بازی کی تعلیم ہے۔ ناپ تول میں کمی کرنا کوئی منفرد بیماری نہیں ہے بلکہ یہ نتیجہ ہے کسی قوم میں بہت سی اخلاقی، معاشرتی بیماریوں کا اخلاقی اعتبار سے ان میں بہت سی بیماریاں پیدا ہو گئی تھیں۔ ان میں سے کچھ کی قرآن یہاں نشاندہی کر رہا ہے۔ یہ لوگ چونکہ تجارت پیشہ تھے اس وجہ سے ان میں بھی اخلاقی بگاڑ ناپ تول میں خیانت کی صورت میں ظاہر ہوا لیکن یہ خیانت صرف ناپ تول تک ہی محدود نہ تھی بلکہ ان کا پورا نظام تمدن و تہذیب اس سے بگڑا ہوا تھا۔ اسی کی طرف قرآن نے یہاں لا تفسدوا فی الارض کہہ کر اس کی طرف اشارہ کیا ہے۔ یعنی ظالمانہ طرز عمل اختیار کر کے سیاسی نظام کو لوگوں کے اموال پر غاصبانہ قبضہ، لوٹ مار، چوری، اور رہزنی کر کے اور قتل و غارت گری کے ذریعے نظام میں عدل فواحش کا ارتکاب کر کے نظام اخلاق کو تباہ و برباد نہ کرو۔ فساد سے مراد صرف فساد افکار و عقائد نہیں بلکہ اخلاق، معیشت، معاش، سیاست، معاشرت اور قانون کا فساد بھی اس میں داخل ہے۔ شرک اور کفر کے ذریعے عقائد و اعمال میں جو فساد پھیلتا ہے وہ اس کا مدلول ہے

بعد اصلاحہا کی قید فساد کی شناعت بتانے کے لیے ہے یعنی ملک میں فساد پیدا کرنا بجائے خود سب سے بڑا جرم ہے لیکن یہ جرم سنگین سے سنگین تر ہو جاتا ہے جب یہ اصلاح کے بعد واقع ہو اس لیے کہ یہ بگڑی ہوئی چیز کو بگاڑنا نہیں بلکہ بنی ہوئی چیز کو بگاڑنا ہوا۔ مطلب یہ ہے کہ دینِ حق اور اخلاقِ صالحہ پر زندگی کا جو نظام انبیائے سابقین کی ہدایت و رہنمائی میں قائم ہو چکا تھا اب تم اسے اپنی اعتقادی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور قانونی گمراہیوں سے خراب نہ کرو۔ ہمیشہ لوگوں نے اپنی سرکشی کے سبب سے بار بار نظامِ اسلام کو درہم برہم کیا ہے اور قدرت کے ہاتھوں نے ہر بار اسے نبوت کے ذریعے درست کیا ہے۔ حضرت نوح سے لے کر حضرت شعیب تک ہر قوم ہر رسول کی تاریخ اس حقیقت کی شاہد ہے۔ اہلِ مدین کو بھی جو اقتدار حاصل ہوا تھا یہ لوگ دین و شریعت سے نا آشنا لوگ نہ تھے بلکہ حضرت ابراہیم کے خاندان سے نسبت رکھنے والے اور پچھلے نبیوں کی تعلیم کے حامل ہونے کے مدعی تھے۔ دوسری قوموں کی طرح انہوں نے بھی اس تعلیم کو اپنی خواہشاتِ نفس کے سانچے میں ڈھال لیا تھا۔ اسی بنیاد پر حضرت شعیب نے اُن سے کہا کہ ذالکم خیر لکم ان کنتم مومنین۔ اگر تمہیں ایمان کا دعویٰ ہے تو اس دعویٰ کی صداقت کے لیے ضروری ہے کہ اس فساد کی روش کو چھوڑ کر اصلاح کا وہ طریقہ اختیار کرو جس کی دعوت میں لے کر آیا ہوں۔ یہی طریقہ اس ایمان کا تقاضا ہے جس کے تم مدعی ہو۔ اس فقرے سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ لوگ خود مدعیٔ ایمان تھے۔ اعتقادی اور اخلاقی فساد میں مبتلا ہونے کے باوجود ان کے اندر نہ صرف ایمان کا دعویٰ باقی تھا بلکہ اس پر انہیں فخر بھی تھا۔ اسی لیے حضرت شعیب نے فرمایا کہ اگر تم مومن ہو تو تمہارے نزدیک خیر اور بھلائی راست بازی اور دیانت ہونی چاہیے اور تمہارا معیارِ خیر و شر ان دنیا پرستوں سے مختلف ہونا چاہیے جو خدا اور آخرت کو نہیں مانتے۔

قوم شعیب کی باغیانہ سرگرمیاں

۱۱۳۔ اور راستوں میں اہلِ ایمان کو دھمکانے اور خدا کی راہ سے روکنے اور راہِ حق میں کجی تلاش کرنے کے لیے نہ بیٹھو۔ راستوں میں بیٹھنا دو وجہ سے تھا۔ راہ گیروں کو ڈرا دھمکا کر ظلماً مال وصول کریں اور مومنین کو شعیب کے پاس جانے اور خدا کا دین اختیار کرنے سے روکیں اور خدائی مذہب کے متعلق نکتہ چینی اور عیب جوئی کی فکر میں رہیں[1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اس آیت میں دراصل قوم کے سرکشوں کی ان سرگرمیوں کی طرف اشارہ کیا ہے جو قوم مدین کے افراد اہل ایمان کو خوفزدہ کرنے اور راہ ایمان سے ہٹانے کے لیے اختیار کیے ہوئے تھے۔ یہ سرگرمیاں تین قسم کی تھیں ایک یہ کہ راستوں میں بیٹھ کر ان لوگوں کو ہراساں کرتے تھے جو حضرت شعیب کے پاس آتے تاکہ اس دعوت کا مطالعہ کریں جو حضرت شعیب پیش کر رہے ہیں۔ آنے والوں کو حضرت شعیب کی ملاقات اور ان کی زیارت کا موقعہ ہی نہ دیتے، ظاہر ہے کہ حضرت شعیب نے دعوت اولاً مقامی لوگوں کے سامنے پیش کی ہوگی بعد ازیں دور دور رہنے والوں تک اپنی بات پہنچائی ہوگی اور باہر کے لوگوں نے اس کا استقبال کیا ہوگا۔ یہ مقامی لوگ ان بیرونی لوگوں کو پریشان کرتے ہوں گے اور راستوں ہی میں ان کو دھمکیاں دے کر خوف دلا کر کوشش کرتے ہوں گے کہ حضرت شعیب کی ہمنوائی کا راستہ اختیار نہ کریں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس سے لا تقعدوا بکل صراط توعدون۔ کی تشریح اسی کے قریب قریب منقول ہے وہ فرماتے ہیں:

> وہ لوگ راستہ میں بیٹھ جاتے اور آنے والوں سے کہتے کہ شعیب جھوٹے ہیں وہ تمہیں تمہارے دین سے ہٹانا چاہتے ہیں۔

اور یہ بھی اس کے مفہوم میں داخل ہے کہ وہ راہ زنی کا کام کرتے تھے اور آنے والوں کو ڈرا دھمکا کر جو کچھ ان کے پاس ہوتا چھین لیتے۔ اور کچھ علماء نے یہ بھی تشریح کی ہے کہ شہر میں آنے والے راستوں پر لوگوں سے ان کے مالوں پر چنگی اور راہ گیری وصول کرتے تھے۔ توعدون کا مفعول محذوف ہے اس لیے سب باتوں کی اس میں گنجائش ہے۔

دوسرے یہ کہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستہ میں سے روکتے تھے۔ اللہ کے راستہ سے مراد وہ نظام حیات ہے جو حضرت شعیب اللہ کی طرف سے لے کر آتے اور جس کی دعوت دے رہے تھے یعنی چاہتے تھے کہ رائے عامہ اس دعوت کو قبول نہ کرے اور حضرت شعیب علیہ السلام کی ہمنوا نہ بنے۔ اس کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ اہل مدین نے حضرت شعیب کی دعوت اور اس کے مقاصد کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی اور اس میں ان کو کوئی پیچیدگی محسوس نہیں ہوئی جیسے ہی آپ کی آواز سے سننے والوں کے کان آشنا ہوئے وہ اچھی طرح سمجھ گئے کہ یہ دعوت ایسا تیر ہے جو ہمارے افکار و عقائد، ہمارے اخلاقیات، ہماری معاشیات، ہماری روحانی نظام کے گھروندے کے نشانہ پر بیٹھ جائے گا اور اسے پاش پاش کر دے گا۔ خطرہ کے اس احساس سے مدین کے تمدن و تہذیب اور اقتدار میں جوش پیدا ہوا۔ قوم کے سورما مقابلہ کے لیے میدان میں آکر پوری قوت سے حضرت شعیب

کے لائے ہوئے نظام کی راہ میں آہنی دیوار بن گئے۔ انہوں نے محسوس کر لیا کہ اہل مدین کی تہذیبی عمارت متزلزل ہے اور پورا نظام زندگی خطرے میں اس موقعہ پر سختی، دباؤ، ظلم و زیادتی کے جو لرزہ خیز واقعات پیش آتے ہوں گے قرآن کا یہ بلیغ فقرہ و تصدون عن سبیل اللّٰہ ان ہی کی عکاسی کر رہا ہے۔

تیسری یہ کہ اہل ایمان میں حضرت شعیب کے پیش کردہ نظام کے متعلق شکوک و شبہات کی تخم ریزی کی جاتے اور بتایا جاتے کہ تمدن کی اس ترقی اور تہذیب کے اس دور میں وہ نظام کیسے چل سکتا ہے جو سود پر قدغن قائم کرتا ہے۔ مالیاتی مسائل کیسے حل ہوں۔ معاشی مشکلات پر قابو کیسے پایا جائے گا وغیرہ وغیرہ وہ تمام شبہات جو ہر دور میں مخالفوں کی جانب سے پیش ہوتے رہے ہیں۔ توحید، رسالت، عبادات، معاملات، اخلاقیات، جزا و سزا سب پر شبہات کی ایسی بارش کر دی جاتے کہ اہل ایمان کی زمین حل کر رہ جاتے۔

اس آیت میں حضرت شعیب نے اپنے مخاطبوں کو ہدایت کی ہے کہ یہ تینوں کام چھوڑ دو۔ غور سے دیکھو ان تین باتوں کا شکار آج ہمارا معاشرہ بھی ہے کہیں دانشوروں اور فلاسفروں کی تقلید کے بہانہ اور کہیں آزادی رائے کے سہارے نبوت کے خلاف یہ تینوں ہتھیار استعمال ہو رہے ہیں۔ افسوس کہ تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔

اہل مدین کی مادی اور افرادی قوت

۱۱۴۔ اللہ کا یہ احسان یاد کرو کہ تم بہت تھوڑے سے تھے اس نے تمہاری تعداد زیادہ کر دی اور غور کرو کہ مفسدین کا انجام کیا ہوا ہے۔ یعنی تعداد اور دولت دونوں میں کم تھے۔ خدا نے دونوں طرف سے تم کو بڑھایا۔ مردم شماری بھی بڑھ گئی اور دولت مند بھی ہو گئے۔ خدا کے ان احسانات کا شکر کرو اور وہ جب ہی ادا ہو سکتا ہے کہ خدا کے اور بندوں کے حقوق پہچان کر عملی درستی اور اصلاح میں مشغول رہو اور ان نعمتوں پر مغرور نہ ہو بلکہ خرابی اور فساد مچانے والوں کا جو انجام ہو چکا ہے اسے پیش نظر رکھ کر خدا کی گرفت سے ڈرتے رہو[1] مطلب یہ ہے کہ تم چھوٹے خاندان کی شکل میں اس علاقہ میں آکر بسے تھے پھر اللہ سبحانہ نے تمہاری افرادی قوت میں اضافہ کر کے تم کو ایک طاقتور قوم بنا دیا۔ حضرت عبداللہ بن عباس نے تکثیر سے افرادی قوت کا اضافہ ہی مراد لیا ہے۔ حضرت

[1] افادات شیخ الاسلام

ابراہیم کا زمانہ سنہ ۲۱۰۰ تا سنہ ۲۲۰۰ قبل مسیح ہے۔ ان کے بیٹے مدین نے اپنی آبادی اپنے ہی نام سے آباد کی۔ ایک خاندان کو قوم کی حیثیت پیدا کرنے کے لیے کم از کم دو سو برس کی ضرورت ہوتی ہے۔ اسی لیے مدین تورات میں سب سے پہلے عہدِ یعقوب میں سنہ ۲۰۰۰ قبل مسیح سوداگران کے بھیس میں نظر آتے ہیں۔ حضرت یوسف کو جو کاروانِ تجارت کنعان سے مصر لے گیا تھا وہ بھی اہلِ مدین تھے۔ شارحین قرآن نے بھی یہی سمجھا ہے۔ یہ تجارت کی تاریخ کا سب سے پہلا صفحہ اور اسماعیلی اور مدیانی عربوں کی تجارت کا سب سے پہلا قافلہ اور مصر ان کی تاجرانہ رحلت کی اولین منزل ہے۔ اس واقعہ سے چار سو برس کے بعد جب حضرت موسیٰ کا ظہور ہوا اور دعوتِ حق کے جرم میں ان کو مصر سے ہجرت کرنی پڑی تو ان کا ملجا اسی قافلہ کی سرزمین تھی۔ جو ان کی قوم کو چار سو برس پہلے مصر پہنچا گئی تھی یعنی مدین اس عرصہ میں اہلِ مدین کی افرادی قوت میں کس قدر ترقی ہوئی تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ مدین حضرت موسیٰ کے زمانہ میں پانچ بادشاہوں کے تحت تھا۔ اس کا علاقہ طولاً خلیج عقبہ کے سواحل پر دہانہ خلیج سے ساحل بحرِ احمر ارضِ ثمود و حجاز تک اور شمال میں شام تک پھیلا تھا۔ بنی اسرائیل سے ایک لڑائی میں ایک لاکھ بیس ہزار اہلِ مدین مارے گئے تھے۔ بہرحال آیت میں تکثیر سے مراد عددی طاقت اور افرادی قوت کا اضافہ ہے۔ اور مشہور مفسرِ قرآن زجاج نے مادی طاقت کا اضافہ بھی مراد لیا ہے۔ ان الفاظ میں دونوں کی گنجائش ہے مطلب یہ ہے کہ تمہاری تعداد کی کثرت کے ساتھ ساتھ تمہارے اسبابِ معیشت و تمدن میں بھی اضافہ کیا یہاں تک کہ تم اسباب و وسائل کے اعتبار سے تم اس درجے کو پہنچے جو تمہیں آج حاصل ہے۔ اسی افرادی قوت تمول اور تمدن کی ترقی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے حضرت شعیب نے فرمایا کہ انی اراکم بخیر میں تمہیں خوشحال پاتا ہوں۔ یہ خوشحالی اللہ کا انعام ہے اور اس انعام کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ خدا کے شکرگزار بنو اور زندگی کی وہ روش اختیار کرو جو خدا کے شکرگزار بندے اختیار کیا کرتے ہیں اور جو خدا کو پسند ہے لیکن تم نے اس کے برخلاف کفرانِ نعمت اور سرکشی کی راہ اختیار کی اور خدا کی زمین میں اس کی اصلاح کے بعد فساد مچا رہے ہو تو مفسدین کے انجام کو نہ بھولو تمہارے دائیں بائیں قوم ثمود اور قوم لوط کے کھنڈرات آثارِ تباہی موجود ہیں، ان سے عبرت حاصل کرو۔

ایک شبہ کا جواب

۱۱۵- اگر تم میں سے ایک گروہ اس تعلیم پر ایمان لے آیا جسے مجھے دے کر روانہ کیا گیا ہے

اور ایک گروہ ایمان نہیں لایا تو صبر کرو۔ یہاں تک کہ اللہ ہمارے درمیان فیصلہ کر دے اور وہی بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ یعنی جو چیز میں لے کر آیا ہوں اگر تم متفقہ طور پر قبول نہیں کرتے بلکہ اختلاف ہی کی ٹھان رکھی ہے تو تھوڑا صبر کرو یہاں تک کہ آسمان ہی سے میرے تمہارے اختلافات کا فیصلہ ہو جائے[1]
دراصل اس میں لوگوں کے اس شبہ کا جواب ہے کہ حضرت شعیب کی دعوت کے ظہور کے بعد دو طبقے پیدا ہو گئے ہیں ایک طبقہ وہ ہے جس نے دعوتِ ایمان کو قبول کر لیا ہے اور اُمتِ اجابت بن گئی۔ اور دوسرا طبقہ اُمتِ دعوت کا ہے جس نے ابھی تک حضرت شعیب کی دعوت کو قبول نہیں کیا ہے۔ دُنیا کی زندگی میں مادی اعتبار سے دونوں میں کوئی فرق نہیں ہے۔ دونوں جماعتیں یکساں آرام و عیش میں ہیں۔ اگر نبوت سے روگردانی کوئی جرم ہوتا تو روگردانی کرنے والوں کو ضرور سزا ملتی۔ یہ سزا نہ ملنا اس بات کی دلیل ہے کہ دونوں جماعتیں یکساں ہیں۔ اسی بات کے جواب میں حضرت شعیب نے فرمایا فاصبروا جلد بازی سے کام نہ لو، اللہ سبحانہٗ اپنے حلم و کرم سے مجرموں کو مہلت دیتے ہیں۔ تمہارا بھی یہی حال ہے۔ اگر تم اپنے انکار سے باز نہ آئے تو عنقریب منکروں پر فیصلہ کن عذاب نازل ہو گا۔ مطلب یہ ہے کہ مفسدین کا یہ انجام تو یقینی ہے تمہیں جو مہلت مل رہی ہے اس سے یہ نہ سمجھو کہ میری بات درست نہیں ہے۔ اللہ کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے اب تک جو تمہیں مہلت دے رکھی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ تم میں سے ایک گروہ نے دعوتِ حق کو قبول کر لیا ہے۔ اللہ یہ چاہتا ہے کہ تم میں سے اور بھی جن میں قبول کی صلاحیت ہے وہ علیحدہ ہو جائیں۔ بس ان ہی کی خاطر تمہیں یہ مہلت مل رہی ہے۔ اس مہلت تک انتظار کرو۔ اس کے بعد اللہ سبحانہٗ ہمارے اور تمہارے درمیان فیصلہ فرما دے گا اور وہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔
الحمد للہ پارہ ہشتم کی تفسیر میں یہ آخری سطریں قلم بند ہوئیں اس میں جو باتیں اچھی آئی ہیں وہ اللہ کی جانب سے اور جو غلط اور نادرست ہیں وہ میری کم علمی اور بے خبری کا نتیجہ ہیں۔ اللہ سبحانہٗ مجھے معاف فرمائے اور کتاب کا مطالعہ کرنے والوں کو اس کے نقصان سے محفوظ رکھے۔
آج مورخہ ۱۰ محرم الحرام سنہ ۱۴۰۰ھ موافق یکم دسمبر سنہ ۱۹۷۹ء بروز شنبہ بوقت ۷ بج کر ۴۵ منٹ صبح پارہ ہشتم کی تفسیر ختم ہوئی۔ رب تقبل منی انک انت السمیع العلیم۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

معالم القرآن

جلد نہم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

علم و کتاب واٹس ایپ گروپ

ملکیت ———— ادارہ تعلیماتِ قرآن، سیالکوٹ
عناوین ———— ۳۵۰
آیات ———— ۱۱۹+۴۰ = ۱۵۹
طابع ———— شبیر احمد عثمانی
تزئین و آرائش ———— سید انور حسین، نفیس رقم
کتابت ———— محمود احمد، گوجرانوالہ
ناشر ———— قاری عبدالرحمٰن ایم اے
صفحات ———— ۸۹۶
تاریخ اشاعت ———— جنوری ۱۹۸۵ء
مطبع ————

ملنے کا پتہ

ادارہ تعلیماتِ قرآن

دارالعلوم الشہابیہ رنگ پورہ روڈ
سیالکوٹ

قیمت :- ———— ۱۰۰ روپے

انتساب

میں تفسیر معالم العرفان کی نویں جلد کو جس میں انسانیت کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتِ عمومی کی خوشخبری سنا کر رہتی دنیا تک آپ کی ذاتِ گرامی کو مدارِ ہدایت بنایا گیا ہے۔ اور پوری انسانی دنیا کو ایمان کی دعوت دی گئی ہے، قابلِ صد احترام فضیلت مآب جناب الحاج عبدالغنی صاحب سلمہٗ کے نام سے منسوب کرتا ہوں جن کی قرآن و سنت سے مخلصانہ وابستگی اور دریا دلی سے یہ جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو رہی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس جذبۂ خیر کو تا دیر سلامت رکھے اور ان کے لیے، ان کی اولاد کے لیے اور ان کے والدین کے لیے دنیا و آخرت میں کامیابی کا ذریعہ بنا دے، آمین!

قاری عبدالرحمٰن ایم۔ اے
ناظم ادارہ تعلیماتِ قرآن
دار العلوم الشہابیہ، سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

مقدّمہ

اس پارے میں ایک سے زیادہ مقام پر لعلھم آیا ہے کہیں لعلھم یفرعون، کسی جگہ لعلھم یذکرون، کسی مقام پر لعلکم تھتدون، کہیں لعلھم یتقون، دو جگہ لعلھم یرجعون، ایک جگہ لعلکم ترحمون اور ایک مقام پر لعلکم تشکرون آیا ہے۔

علامہ راغب اصفہانی نے لکھا ہے کہ قرآن کے بیشتر مقامات پر لعلّ تعلیل کے لیے آیا ہے۔ تعلیل کا مطلب ہے کہ پہلی بات کی علت بتائی جا رہی ہے لعلھم یفرعون کا منطوق یہ ہے کہ ہم نے نبیوں کی مخاطب قوموں کو سختیوں اور تنگیوں میں مبتلا کیا تاکہ ان میں سرکشی وغیرہ ختم ہو کر عاجزی اور نیازمندی نمایاں ہو یعنی ایسا کرنے میں ہماری حکمت اور مصلحت یہ تھی کہ لوگ انبیاء کی دعوت کی طرف متوجہ ہوں۔ فرعون اور فرعونیوں کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا کہ ہم نے فرعون کی قوم کو خشک سالی اور پیداوار کے نقصان میں مبتلا کیا تاکہ ان کو اپنی برائیوں پر تنبیہہ ہو اور وہ نصیحت یاب ہوں لعلھم یذکرون۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمومی کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ اس پیغمبر پر ایمان لاؤ لعلکم تھتدون تاکہ تم بے راہ روی اور گمراہی سے ہٹ کر ہدایت سے ہمدوش ہو جاؤ۔ بنی اسرائیل کی بے راہ روی پر علماء نے ان کو برائیوں سے باز رہنے کی تلقین کی لیکن کچھ لوگوں نے ان وعظ کرنے والوں سے کہا کہ تم ایسے لوگوں کو کیوں نصیحت کرتے ہو جن کو اللہ ہلاک کرنے والا ہے تو وعظ کہنے والے علماء نے ان کو جواب دیا کہ اس لیے کہ ہم اللہ کے حضور معذرت کر سکیں اور لعلھم یتقون تاکہ یہ لوگ خدا کی نافرمانی سے بچ جائیں۔

بنی اسرائیل ہی کو کتاب الٰہی کے بارے میں بتایا گیا کہ جو کتاب ہم نے تمہیں دی ہے اسے مضبوطی سے تھامے رہو اور جو کچھ اس میں ہے اسے یاد رکھو لعلکم تتقون تاکہ تم برائیوں سے بچ جاؤ۔ عام قانون بنایا گیا ہے کہ ضوابط اور احکام کو کھول کر بیان کرتے ہیں اور لعلھم یرجعون میں اس کی علت یہ بتائی گئی ہے تاکہ لوگ حق کی طرف لوٹ آئیں

قرآن کے بارے میں بتایا کہ یہ تمہارے رب کی جانب سے دلائل کا سرمایہ ہے۔ زندگی میں اللہ کی بندگی کے لیے راہنما اور پرستش کے لیے پیغام رحمت ہے۔ اس کا ادب یہ ہے کہ جب یہ پڑھا جائے تو خوب متوجہ ہو جاؤ اور خاموش رہو لعلکم ترحمون یہ اس لیے کہا جا رہا ہے تاکہ تم پر اللہ کی جانب سے رحمت ہو۔

مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ اللہ نے تمہیں مدینے میں ٹھکانا دیا۔ اپنی مدد سے قوت بخشی اور اچھی اچھی چیزوں کے رزق کا سامان کیا یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ تم اللہ کے شکر گزار بندے ہو۔

صرف لعل ہی تعلیل کے لیے نہیں آتا ہے لام بھی آتا ہے، کے بھی آتا ہے، مفعول لہ بھی آتا ہے۔ شفاء العلیل میں حافظ ابن القیم نے پوری تفصیل دی ہے۔ یہ تعبیرات اس بات کی واضح اور صاف دلیل ہیں بلکہ اس کے لیے واضح رہنما اصول ہیں کہ اسلامی قانون کے پس منظر میں مصالح حکم اور عواقب ہیں۔

عام خیال یہی ہے کہ اللہ سبحانہ نے اپنے منشور میں جو احکام بندوں کو دیے ہیں ان کی حیثیت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ جیسے آقا اپنے غلام کو کہے پتھر اٹھا کر لاؤ اور اس کے پس منظر میں غلام کی اطاعت کے امتحان کے سوا کوئی تصور کارفرما نہ ہو۔ اسلامی قانون کے بارے میں یہ بلاشبہ بقول حکیم الامت

ایسا غلط اور ناروا تصور ہے جس کی سنت اور خیر القرون کا اجماع تکذیب کرتے ہیں۔

شاہ صاحب کے اپنے الفاظ یہ ہیں،

ھذا ظن فاسد تکذبہ السنۃ واجماع القرون المشھود لھا بالخیر

یہ درست ہے کہ اللہ سبحانہ کے احکام معلل بالاغراض نہیں لیکن یہ کہنا غلط ہے، اللہ سبحانہ کے احکام معلل بالمصالح اور حکم نہیں۔ اغراض کا تعلق قانون ساز سے ہے

جب کہ مصالح اور حکم کا تعلق ان سے ہے جن کے لیے قوانین بنائے جا رہے ہیں۔ آج کی سیاسی زبان میں یوں کہہ دو کہ اغراض اقتدار سے تعلق رکھتی ہیں جب کہ مصالح کا عام شہریوں سے تعلق ہوتا ہے۔

قانون کے پس منظر میں مصالح اور حکمتیں ہوتی ہیں تو قانون عوامی اور ترقی پذیر ہوتا ہے۔ مصالح سے تہی دامن قانون استبدادی اور جامد ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

اسلامی قوانین کی مصالح اور حکم سے اگر کوئی شخص بے خبر ہے تو اس کے بارے میں سمجھ لینا چاہیے کہ علم کی اس کو ہوا بھی نہیں لگی۔ اس کے علم کی مقدار صرف اتنی ہے جتنا پانی میں ڈوبی سوئی پر پانی ہوتا ہے۔ اسے اپنے علم پر اعتماد کی بجائے رونا چاہیے۔

مصالح ہی قانون کا نظریاتی سرمایہ ہوتی ہیں، اور نظریاتی سرمایہ ہی مجتہد کے اجتہاد کی بنیاد ہوتا ہے۔ اسی لیے بتانے والوں نے بتایا ہے:

مجتہدین کی ذمہ داری یہ ہے کہ وہ ان مصالح کا پتہ لگائیں جو قانون میں قانون ساز کا مقصد ہیں اور اس علت کی چھان بین کریں جس سے حکم وابستہ ہے کیونکہ اسی راہ سے مصالح کا پتہ لگتا ہے۔

قانون میں قانون ساز کا مقصد و منشا اور مناطِ حکم معلوم کرنا ہی تخریجِ مناط ہے۔ پھر اسی مناطِ حکم کی بنیاد پر کسی معاملہ کا فیصلہ کرنا تحقیقِ مناط ہے۔

تمام اسلامی علوم میں یہ علم ضروری ہونے کے ساتھ بے حد نازک بھی ہے۔ ضرورت تو ظاہر ہے کہ اس پر قانون کے ارتقاء کا مدار ہے اور نزاکت یہ ہے کہ یہ ہر کہ و مہ کا کام نہیں ہے اس کے لیے وسیع علم اور وسیع تجربہ کی ضرورت ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ:

مجتہد کے لیے ضروری ہے کہ قرآن و سنت کے احکام سے متعلق جتنے علوم ہیں ان تمام علوم کی اسے پوری معرفت حاصل ہو۔ وہ خاص و عام، مجمل و مبین اور ناسخ و منسوخ کو جانتا ہو۔ اسی طرح وہ حدیث میں متواتر، غیر متواتر اور متصل و مرسل وغیرہ تمام اقسام حدیث کو پہچانتا ہو، نیز راویانِ حدیث کے قوت و ضعف سے واقف ہو، عربی زبان پر اسے پورا عبور ہو، صحابہ و تابعین کے اقوال اور ان کے اجماع و اختلاف سے باخبر ہو۔ مزید براں قیاس کی تمام قسموں سے واقف ہو۔

پارہ نہم ایک نظر میں

شرک

سیاسی قوانین

اجتماعی قوانین

دفاعی قوانین

اخلاقی قوانین

توحید عبادت

دلوں کو تھامنا اور قدموں کو جمانا اللہ کا کام ہے۔

دستوری قواعد

معاشرتی قوانین

رسالت و نبوت

صحابہ کرام کا چہرہ

ایمان واسلام

آخرت کی زندگی

قرآن کی دعائیں

قرآن کی تمثیلات

واقعاتِ قرآنی

حرفِ آغاز

باسمہٖ سبحانہٗ

معالم القرآن کی آٹھویں جلد رجب ۱۴۰۱ھ مئی ۱۹۸۱ء میں شائع ہوئی تھی۔ آج پورے تین سال چھ ماہ کے بعد اس کی نویں جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

بلاشبہ آپ کو ایک طویل عرصہ انتظار کرنا پڑا۔ اس طویل عرصہ میں میرے سامنے دو کام تھے ان کی بجا آوری بے حد ضروری تھی۔ اس وقت میری زندگی کے تین مقصد ہیں۔

۱۔ دارالعلوم میں جامع مسجد کی تعمیر

۲۔ دارالعلوم میں جدید نصاب کے تحت تعلیمی نظام

۳۔ معالم القرآن کی تکمیل

اللہ سبحانہٗ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس سیاہ کار کو جامع مسجد کی توفیق ارزانی فرمائی اور اس کے لیے غیر متوقع اسباب مہیا فرمائے۔ دارالعلوم میں پہلے مسجد ۴۰ + ۲۵ کے رقبہ میں تھی اب ۱۵۰ + ۱۰۰ کے طویل رقبہ میں ہے۔ مسجد کا ہال ۴۰ + ۵۰ کا ہے۔ ہال کے تین طرف برآمدہ ۱۵۸ فٹ لمبا ہے۔ آگے صحن ۳۰ + ۹۷ ہے۔ اس کے آگے وضوگاہ وغیرہ ۳۰ + ۵۰ میں ہے۔ وضوگاہ کے اوپر مسجد کے امام کی رہائش گاہ ہے اور وضوگاہ کے سامنے ۴۰ + ۴۰ میں دو منزلہ لائبریری کا ہال ہے۔ وضوگاہ اور لائبریری کے درمیان چمن ہے۔ اس سارے منصوبہ پر اب تک چودہ لاکھ روپے صرف ہوئے۔ آپ پوچھیں گے کہ یہ خطیر رقم کہاں سے آئی۔ ایک روز بھی میں اس کی خاطر دارالعلوم سے باہر نہیں گیا۔ ایک بار جمعہ کے روز صلوٰۃ الحاجہ پڑھ کر

دُعا کی اور خطبۂ جمعہ میں لوگوں سے اپیل کی۔ اللہ سبحانہٗ نے لوگوں کے قلوب کو اس انداز سے اس طرف متوجہ فرمایا کہ میں کہہ نہیں سکتا کہ پردۂ غیب سے کیسے ہُوا۔ حق سبحانہٗ کی اس بے پایاں عنایت پر شکر کرنا میری بساط سے باہر ہے۔ میرے بدن کے رونگٹیں رونگٹیں میں اگر ایک ایک زبان ہو اور ہر زبان شکر کے ترانے کے لیے زمزمہ سنج ہو پھر بھی مجھ سے اس کا شکر ادا نہیں ہو سکتا الحمدللہ مسجد کی تکمیل ہو گئی ہے اور اس پر پورے تین سال لگ گئے۔

دارالعلوم میں جدید نصاب کے تحت ۸۰ء سے کام شروع کیا تھا۔ ۸۰ء میں پرائمری پاس دس طلبہ کو داخل کیا۔ اس وقت اسی نصاب کے مطابق میں پانچ جماعتیں موجود ہیں، پورا نصاب تعلیم نوسالہ ہے عملی تکمیل میں ۴ سال باقی ہیں۔ یہ نصاب دینی مدرسوں اور سرکاری اسکولوں، دونوں سے ممتاز ہے۔ اس میں بقدر ضرورت سرکاری نصاب کا آمیزہ ہے لیکن اہم اور بنیادی چیز اسلامی علوم کی تعلیم ہے۔ ہفتہ بھر ۵۰ گھنٹیوں میں سے صرف ۱۵ گھنٹیاں سرکاری نصاب کو دی جاتی ہیں باقی ۳۵ گھنٹیاں اسلامی علوم کو دی جاتی ہیں۔ اس راہ میں اب تک جس قدر قدم اُٹھے ہیں الحمدللہ نتیجہ خیز اور کامیاب ہیں۔ ابھی منزل تک پہنچنے میں چار سال ہیں۔ تعلیم کے سلسلے میں ان پانچ سالوں میں میں خود ہمہ تن مصروف رہا۔ ایک طرف تعمیر مسجد، دوسری دارالعلوم میں تعلیمی اور انتظامی مصروفیتیں معالم القرآن کی چلتی گاڑی میں رکاوٹ بن گئیں۔ اب الحمدللہ کچھ سکون ہُوا ہے۔ مسجد کا کام پایۂ تکمیل کو پہنچ چکا ہے اور دارالعلوم میں تعلیم کے لیے اساتذہ کی ایک ٹیم دستیاب ہو گئی۔ اب انشاءاللہ اپنی زندگی کے تیسرے مقصد کی تکمیل کی طرف متوجہ ہو جاؤں گا۔ اس داستان کے سنانے کا منشا یہ ہے کہ میں معالم القرآن کی دیری کے لیے آپ کی جناب میں معذرت پیش کر دوں۔

گر قبول اُفتد زہے عزّ و شرف

اس جلد کی تالیف و ترتیب میں مجھے جن علمی چشموں سے اپنی تشنگی دور کرنے کا موقع ملا ہے وہ یہ ہیں:

ازالۃ الخفاء	حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ
لوارق الغیب	حضرت مولانا محمد منظور نعمانی
حاشیہ بر کشاف	حضرت علامہ میر سید شریف
اظہار الحق	حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی

ہدایۃ الحیاری	حضرت حافظ ابن القیم الجوزی
سیرۃ النبی	مولانا شبلی نعمانی
بشارۃ النبیین	حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی
الجواب الکافی	حافظ ابن القیم الجوزی
الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح	حافظ ابن تیمیہ
الفرقان بین اولیاء الرحمٰن والشیطان	" " "
بدائع الفوائد	حافظ ابن القیم
دلائل النبوۃ	مولانا نعیم الاصفہانی
جواب اہل الایمان	حافظ امام ابن تیمیہ
الکشاف	علامہ زمخشری

یہ اللہ سبحانہ کا بے پایاں انعام ہے کہ تفسیر کے لیے لوگوں میں طلب زیادہ ہے۔ اس کا اندازہ تفسیر پر کام کے خلا سے ہوا۔ اس عرصہ میں مختلف قسم کے خطوط آتے۔ ہر خط میں تفسیر کے لیے اپنے جذبات تھے۔ میں اللہ کی جناب میں دست بدعا ہوں کہ وہ باقی پاروں کی تشریح و تفسیر میں مجھے جادہ حق پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمائے اور میری قدم قدم پہ مدد فرمائے کہ میرا قلم راہِ حق پہ استوار رہے۔

میری دلی خواہش ہے کہ جن بزرگوں کے فیضان سے دین سمجھا ہے ان کے علوم کو نہاں خانوں سے نکال کر شاہراہ عام پہ لاؤں۔ اللہ سے دعا فرمائیے کہ وہ مجھے اس کوشش میں کامیابی عطا فرمائے۔ آمین

محمد علی الصدیقی
دار العلوم الشہابیہ
سیالکوٹ

اصطلاحات قرآنی

احیاء : مصدر ہے اس کے معنے زندہ کرنے اور جلانے کے ہیں۔ مجرد حیّ ہے جس کا مصدر حیاۃ ہے۔ حیاۃ کا استعمال مختلف معانی میں ہوتا ہے۔

۱۔ قوتِ نامیہ جو حیوانات اور نباتات میں ہوتی ہے
۲۔ قوتِ احساس جس کی وجہ سے حیوان کو حیوان کہا جاتا ہے ان الذی احیاھا لمحی الموتی میں زمین کی زندگی سے اس کی شادابی مراد ہے اور مردوں کو زندہ کرنے سے قوتِ احساس کا عطا کرنا مراد ہے۔
۳۔ عقل کی قوتِ کارکردگی او من کان میتا فاحییناہ میں زندگی سے مراد عقل کی قوتِ کار کا عطا کرنا ہے۔
۴۔ بقاء فہم کے ساتھ ساتھ لذت اندوزی ولا تحسبن الذین قتلوا فی سبیل اللہ امواتا بل احیاء میں زندگی سے مراد یہ ہے کہ ان میں فہم باقی ہے اور وہ اللہ کی نعمتوں سے لذت اندوز ہو رہے ہیں۔
۵۔ آخرت کی دائمی زندگی جیسے یا لیتنی قدمت لحیاتی میں حیات سے حیاتِ اُخروی مراد ہے۔
۶۔ حیات جب اللہ سبحانہ کی صفت بن کر آتی ہے تو حی سے مراد وہ ذاتِ اقدس ہے جس کے متعلق کبھی موت کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا۔
۷۔ ہلاکت سے نجات دینا ومن احیاھا فکانما احیا الناس جمیعا میں حیات سے ہلاکت سے بچانا مراد ہے۔

استجابت :- جوب سے باب استفعال بنا ہے جواب کا طلب کرنا یا اس کے

لیے تیار ہونا۔ مراد حکم کو ماننا اور قبول کرنا۔ بالعموم اس کے ساتھ لام آتا ہے کبھی جواب دینے کے معنے میں بھی آتا ہے۔

استغاثہ: یہ غوث سے استفعال ہے۔ اس کے معنے مدد مانگنے اور فریاد کرنے کے ہیں۔ اسی سے اغاثہ مدد کرنے کے معنے میں ہے۔ توحید عبادت میں اس کی بے حد اہمیت ہے۔ استغاثہ اللہ سے کرنا چاہیے، اللہ کے سوا کسی بھی مخلوق کو غوث، مغیث اور غیاث نہ کہنا چاہیے اور نہ سمجھنا چاہیے۔

استدراج: درج سے مصدر بنا ہے۔ درجہ مرتبہ اور بلندی کے اعتبار سے مقام کو کہتے ہیں۔ درجہ عام سے مکان کی منزلوں کو بھی کہتے ہیں۔ زینے کی سیڑھیوں کو بھی کہتے ہیں سیڑھی کے ڈنڈوں کو بھی کہتے ہیں۔ اونچے مرتبہ کو بھی درجہ بولا جاتا ہے۔ استدراج کے معنے درجہ بدرجہ لے جانا ہیں۔ مراد یہ ہے کہ وہ آہستہ آہستہ بتدریج اس نتیجہ سے دوچار ہو کر رہیں گے جو تکذیب و سرکشی کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن کی زبان میں امہال کے قانون کو استدراج کہتے ہیں۔ افراد میں اور جماعتوں میں اللہ کا قانونِ استدراج کام کرتا ہے۔ استدراج کے معنے کپڑے یا خط کو طے کر دینا بھی ہیں۔ یہاں مراد غافل بنا دینا ہیں۔

اُمّی: عربی میں اُمّی ایسے شخص کو کہتے ہیں جو اپنی پیدائشی حالت پر لکھنے پڑھنے اور علم و فن کی باتوں سے آشنا نہ ہو۔ اسی لیے عرب کے باشندے بھی اُمّی کہلاتے کیونکہ تعلیم و تربیت سے وہ آشنا نہ تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو الاُمّی فرمایا کیونکہ ظاہری تعلیم و تربیت کا آپ پر سایہ نہیں پڑا تھا۔ جو کچھ تھا سرچشمۂ وحی کا فیضان تھا۔ قرآن نے یہاں آپ کو الاُمّی فرما کر ایک طرف تو اپنے اعجاز کو ثابت کیا ہے اور دوسری طرف حضور کے اس معجزے کی طرف پوری انسانی دنیا کی توجہ دلائی ہے کہ باوجود اُمّی ہونے کے کمالِ علوم سے سرفراز ہیں۔ اور تیسری طرف چونکہ تورات کی بشارات حضور کے اس وصف کی طرف اشارہ ہے، اس لیے خصوصیت کے ساتھ اس وصف کے ساتھ آپ کا چہرہ پیش کیا۔ اس لحاظ سے لفظ اُمّی حضور کے حق میں صفت مدح ہے دوسروں کے حق میں نہیں جیسے تکبر صرف ذاتِ باری کے لیے صفت مدح ہے اور دوسروں کے لیے مذموم۔

الٰہ: بروزن فِعال ہے اِل سے بنا ہے جیسے ام سے امام بنا ہے بمعنی اسم مفعول مألوہ۔ ہر قوم کے نزدیک جس کی پرستش و بندگی کی جائے وہ الٰہ ہے چاہے معبودِ برحق ہو یا معبودِ باطل۔

الہ کے معنے میں علمائے لغت کے مختلف اقوال ہیں مگر سب سے زیادہ قوی بات یہ ہے کہ اس کی اصل الہ ہے اور الہ کے معنے تحیر اور درماندگی کے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ کے لیے یہ لفظ اس لیے بولا گیا ہے کہ انسان جو کچھ جانتا ہے یا جان سکتا ہے وہ عقل کے تحیر اور درماندگی کے سوا اور کچھ نہیں ہے۔

امت :- مدت طریقہ، دین، ہر وہ جماعت جس میں کسی قسم کا کوئی رابطہ اشتراک موجود ہو اُسے اُمت کہا جاتا ہے۔ اسلام نے رابطہ اشتراک کو ایمان قرار دیا ہے۔ اصل میں یہ ام سے مشتق ہے۔ اسی سے امام بنا ہے ام کے معنے میں ایک قسم کی اکثریت پائی جاتی ہے، ام القریٰ دار الخلافہ کو کہتے ہیں۔ ام القرآن سورۃ فاتحہ کو کہتے ہیں کیونکہ قرآن کی تمام سورتوں کے لیے اس معنے کے لحاظ سے مرکزیت ہے کہ نماز میں قرآن کی ساری سورتیں اس کے پیچھے لگتی ہیں اور یہ خود کسی کے پیچھے نہیں لگتی ہے۔ ام الکتاب لوح محفوظ کو کہتے ہیں کیونکہ وہ تمام علوم کا سرچشمہ ہے۔ قرآن میں آیات محکمات چونکہ قرآن کی ساری تعلیمات کی خبر اور مرکز ہیں اس لیے اُمت وہ جماعت ہے جو ایمان و عمل میں مرکزی حیثیت رکھتی ہو۔ قرآن میں جہاں اہل ایمان کو اُمت کہا گیا ہے وہاں اُمت کے کسی وصف کا ذکر کیا ہے۔ مثلاً اُمۃ وسطاً کہہ کر لتکونوا شہداء علی الناس فرمایا ہے۔ ایک جگہ اُمتہ کہہ کر یدعون الی الخیر کہا ہے۔ ایک مقام پر خیر امۃ کہہ کر اخرجت للناس تامرون بالمعروف الخ کہا ہے۔

باساء : بؤس سے مشتق ہے۔ بؤس کے معنے لڑائی، دبدبہ، سختی، آفت، جنگ کی شدت۔ اصل میں تو اس کے معنے سختی اور آفت کے ہیں مگر لڑائی اور غلبہ کے معنے میں اس کا استعمال بکثرت ہوتا ہے۔ اسی سے باساء اسم مونث ہے سختی اور فقر کے معنے ہیں۔ امام راغب نے دونوں میں تھوڑا سا فرق بتایا ہے۔ بؤس تنگدستی اور جنگ میں زیادہ استعمال ہوتا ہے اور باسا سزاؤں کی سنگینی میں بولا جاتا ہے۔

ضراء :- یہ ضر سے مشتق ہے اور نفع کے مقابلہ میں اس کے معنے بدحالی، تکلیف، سختی، تنگی، بیماری، مصیبت کے آتے ہیں۔ باساء اور ضراء دونوں مونث ہیں۔ ان کا مذکر نہیں آتا۔ ضر کے معنے بدحالی کے آتے ہیں چاہے اپنے اندر ہو، علم و فضل اور عفت کی کمی کی وجہ سے یا بدن میں کسی عضو نہ ہونے کی وجہ سے ہو۔

طبع : کسی چیز کسی صورت کے اتارنے کو طبع کہتے ہیں جیسے میں تصویر

یہ لفظ ختم سے عام ہے اور نقش سے خاص ہے اور اسی اعتبار سے نفس پر کسی صورت کے نقش کا نام طبیعت ہے اور طبع السیف کے معنی تلوار کے زنگ آلود ہونے کے ہیں محاورہ سے رجل طبع وہ شخص جس کے اخلاق پست ہوں کہ کسی بے حیائی سے نہ شرماتا ہو۔ چنانچہ بعض علماء نے یطبع اللہ علی قلوب الکافرین میں طبع کو اس معنے میں لیا ہے اور معنے یہ بتاتے ہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں کو زنگ آلود اور میلا کر دیا ہے۔ علامہ طاہر فتنی صاحب مجمع البحار میں فرماتے ہیں کہ طبع سکون کے ساتھ بمعنی ختم آتا ہے اور حرکت کے ساتھ زنگ آلود ہونے کے معنی میں ہے اور اصل میں یہ وہ میل ہے جو تلوار کو لگ جاتا ہے طبع السیف سے ماخوذ ہے۔ بعد ازیں گناہ اور برائیوں کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔ اصل میں یہ اللہ کے قانون اجتماعی کی طرف اشارہ ہے کہ انسان جب اعتقاد باطل اور ارتکاب حرام میں اس قدر جھوٹ اور بے لگام ہو جاتا ہے کہ کوئی تنبیہ اسے کارگر نہیں ہوتی اور کسی طرح اسے حق کی طرف توجہ نہیں ہوتی تو اس سے اس کی کچھ ایسی حالت ہو جاتی ہے کہ گناہوں کو اچھا سمجھنا اس کی طبیعت بن جاتی ہے اور گویا اس طرح اس دل پر مہر لگ جاتی ہے۔

طائف : وسوسہ خطرہ، پھر جانے والا۔ پھیرے والا پہلے معنے مجازی ہیں اور دوسرے حقیقی۔ طوف سے اسم فاعل ہے۔ طوف کے معنی کسی چیز کے گرد چکر کاٹنے کے ہیں۔ اسی لیے جو شخص گھروں کے اردگرد چکر کاٹتا رہتا ہے، طائف کہلاتا ہے اور اسی سے جن، خیال، حادثہ وغیرہ کو بطور استعارہ طائف بولتے ہیں اذا مسھم طائف من الشیطان یعنی شیطان انسان پر چکر کاٹتا رہتا ہے اور اس کو شکار کرنا چاہتا ہے اس کا وسوسہ اثر کر گیا۔

رشد : ہدایت، صلاحیت، راہ یابی بھلا، راستی ہوشیاری، حسن تدبیر، رَشَد یَرشُد کا مصدر ہے۔ اسی کے ہم معنے رَشَد بالفتح بھی آتا ہے لیکن دونوں میں فرق ہے امام راغب لکھتے ہیں۔ کچھ علماء کا خیال ہے کہ رُشد رَشَد سے خاص ہے۔ کیونکہ رُشد دنیوی اور اُخروی دونوں کے لیے آتا ہے۔ اور رشد صرف امور اخروی کے لیے بولا جاتا ہے اور راشد و رشید دنیا و آخرت دونوں کے لیے آتے ہیں۔ سیدھی راہ، بھلائی کے راستہ کو سبیل الرشد اور سبیل الرشاد کہتے ہیں۔ اللہ سبحانہ کا قانون یہ ہے کہ جو لوگ سمجھ بوجھ سے کام لینے کی اپنے بڑوں کی اندھی تقلید کرتے رہتے ہیں اور اسی پر اڑے رہتے ہیں۔ آہستہ آہستہ ان کی

عقلیں ماری جاتی ہیں۔ کتنی بھی صاف بات کہی جائے ان کی سمجھ میں نہیں آئے گی۔ کتنی ہی ان کی بھلائی چاہو وہ اور زیادہ مخالفت کریں گے۔ قرآن نے اس حالت کو یوں تعبیر کیا وان یروا سبیل الرشد لا یتخذوہ سبیلاً اگر وہ ہدایت کی سیدھی راہ دیکھتے ہیں تو اسے نہیں اپناتے ہیں وان یروا سبیل الغی یتخذوہ سبیلاً اور اگر گمراہی کی ٹیڑھی راہ ان کے سامنے ہو تو خود اس سے استقبال کریں۔

غی: یہ غوی یغوی کا اسم معنے ہے اس کا مصدر غوایۃ ہے۔ غوایۃ اور ضلالت میں باریک سا فرق ہے۔ ضلالت ہوتی ہے اعمال میں اور غوایت ہوتی ہے افکار میں۔ قرآن میں حضور اقدس سے دونوں کی نفی کی گئی ما ضل صاحبکم وما غوی۔ ضلالت کی ضد ہدایت ہے اور غوایت کی ضد رشاد ہے۔

سحر: جادو۔ ابو بکر الجصاص احکام القرآن میں رقمطراز ہیں کہ اہل لغت کا بیان ہے کہ سحر اصل میں اس چیز کو کہتے ہیں جس میں لطافت ہو اور جس کا سبب پوشیدہ ہو۔ اور سحر بالفتح بمعنے غذا ہے کیونکہ وہ مخفی ہوتی ہے اور اس کے مجاری لطیف ہوتے ہیں سحر پھیپھڑے کو بھی کہتے ہیں۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ سحر طرف حلقوم اور پھیپھڑے کو کہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسی سے سحر بھی مشتق ہے۔ سحر مختلف معنے میں آتا ہے۔ ۱۔ دھوکہ دینا اور بے حقیقت خیالات کی تخلیق جیسے شعبدہ باز کرتا ہے۔ ارشاد الٰہی سحروا اعین الناس اسی کے متعلق ہے۔ ۲۔ جنات و شیاطین سے کسی طرح کے تقرب کے ذریعے مدد لینا، لکن الشیاطین کفروا یعلمون الناس السحر میں بھی اسی کا ذکر ہے۔ ۳۔ تیسرے معنے وہ ہیں جو عقل سے بیگانہ لوگ بناتے ہیں کہ وہ ایسے فعل کا نام ہے جس کے متعلق ان کا کہنا ہے کہ اس کے ذریعے صورتوں اور طبیعتوں کو بدلا جا سکتا ہے اور انسان کو گدھا بنایا جا سکتا ہے لیکن اہل علم کے نزدیک اس کی کچھ حقیقت نہیں ہے اور کبھی سحر کی تعبیر حسن و خوبی کو ظاہر کرنے کے لیے ہوتی ہے جیسے ان من البیان لسحرا اور کلام کی باریکی اور لطافت بتانے کے لیے سحر بولتے ہیں جیسے حکما طبیعت کو ساحرہ اور غذا کو سحر کہتے ہیں کیونکہ بدن انسانی میں اس کا فعل دقیق اور اس کی تاثیر لطیف ہوتی ہے۔ سحر کی حقیقت کیا ہے یا اس موضوع پر حافظ ابو حیان اندلسی نے البحر المحیط میں، ابو بکر الجصاص نے احکام القرآن میں، اور امام فخر الدین رازی نے مفاتیح الغیب، علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں اور شاہ عبد العزیز نے

تفسیر فتح العزیز ہی میں بڑی سیر حاصل بحثیں کی ہیں ۔

روحانی اصطلاحات

توکل علی اللہ
ایمان باللہ
توحیدِ عبادت
تجلی پروردگار
اسمار حسنیٰ
اللہ کی ولایت
استعاذہ باللہ
قرأتِ قرآن
اللہ کی تسبیح
ذکر اللہ
اہل ایمان سے محبتِ خداوندی
القا اور اس کی طاقت
اللہ کی رفاقت اور کارسازی

علمی اصطلاحات

وراثتِ ارضی
خدا کی ہستی کا اعتقاد فطرتِ انسانی میں ہے
معرفت، کی دو راہیں فکر اور نظر
قانونِ امہال

سیاسی اصطلاحات

فتح

معانی اصطلاحات

قَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ اسْتَكْبَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَنُخْرِجَنَّكَ
يٰشُعَيْبُ وَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَكَ مِنْ قَرْيَتِنَآ اَوْ لَتَعُوْدُنَّ فِيْ
مِلَّتِنَا ۭ قَالَ اَوَلَوْ كُنَّا كٰرِهِيْنَ ﴿۸۸﴾ قَدِ افْتَرَيْنَا عَلَى اللّٰهِ
كَذِبًا اِنْ عُدْنَا فِيْ مِلَّتِكُمْ بَعْدَ اِذْ نَجّٰىنَا اللّٰهُ مِنْهَا ۭ وَمَا
يَكُوْنُ لَنَآ اَنْ نَّعُوْدَ فِيْهَآ اِلَّآ اَنْ يَّشَاۗءَ اللّٰهُ رَبُّنَا ۭ وَسِعَ رَبُّنَا
كُلَّ شَيْءٍ عِلْمًا ۭ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۭ رَبَّنَا افْتَحْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ
قَوْمِنَا بِالْحَقِّ وَاَنْتَ خَيْرُ الْفٰتِحِيْنَ ﴿۸۹﴾ وَقَالَ الْمَلَاُ
الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ لَىِٕنِ اتَّبَعْتُمْ شُعَيْبًا اِنَّكُمْ اِذًا
لَّخٰسِرُوْنَ ﴿۹۰﴾ فَاَخَذَتْهُمُ الرَّجْفَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دَارِهِمْ
جٰثِمِيْنَ ﴿۹۱﴾ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ۚ مع
اَلَّذِيْنَ كَذَّبُوْا شُعَيْبًا كَانُوْا هُمُ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۹۲﴾ فَتَوَلّٰى
عَنْهُمْ وَقَالَ يٰقَوْمِ لَقَدْ اَبْلَغْتُكُمْ رِسٰلٰتِ رَبِّيْ وَنَصَحْتُ
لَكُمْ ۚ فَكَيْفَ اٰسٰى عَلٰي قَوْمٍ كٰفِرِيْنَ ﴿۹۳﴾

قوم کے سرداروں نے جنہیں اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا حضرت شعیب
سے کہا اے شعیب تجھے اور تیرے ساتھیوں کو جو تیرے ساتھ ایمان
لاتے ہیں ہم اپنے شہر سے ضرور نکالیں گے یا پھر تمہیں ضرور ہماری
ملت میں واپس آنا ہوگا[۱۱۶] حضرت شعیب نے فرمایا اگر ہمیں تمہارے
دین میں واپسی ناپسند و ناگوار ہو تو کیا پھر بھی ہم واپس ہو جائیں[۱۱۷] - اگر
ہم تمہارے دین میں لوٹ جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک خدا
کے نام پر ہم نے جو کام کیا یہ جھوٹ بول کر ہم نے خدا پر بہتان
اٹھایا حالانکہ اللہ نے ہمیں تمہاری ملت سے بچایا ہے[۱۱۸]۔ تمہارے
دین میں واپس ہونا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے ہاں یہ کہ اللہ ہی
چاہے جو ہمارا پروردگار ہے تو وہ جو چاہتا ہے ہو کر رہتا ہے
ایسی کوئی چیز نہیں جو ہمارے رب کی علمی وسعتوں میں سمائی ہوئی
نہ ہو، ہمارا تمام تر بھروسہ اللہ پر ہے اے ہمارے مولیٰ و آقا تو

ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کا فیصلہ فرما دے اور تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے[۱۱۹]۔ حضرت شعیب کی نبوت کے منکر قوم کے سرداروں نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا لوگو اگر تم نے شعیب کی پیروی کر لی تو بس سمجھ لو کہ تمہارا مستقبل گھاٹے والا ہے[۱۲۰] بس آدبوچا اُن کو ایک لرزانے والی ہلاکت نے اور اس کے نتیجے میں وہ صبح کو اوندھے منہ پڑے تھے[۱۲۱]۔ جن لوگوں نے شعیب کو جھٹلایا اُن کا حال یہ تھا کہ گویا وہ ان بستیوں کے کبھی آباد کار نہ تھے، شعیب کی تکذیب کرنے والے ہی تباہ ہونے والے تھے[۱۲۲]۔

حضرت شعیب اُن سے الگ ہو گئے اور فرمایا میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی تھی اس لیے اب میں نہ ماننے والوں پر کیسے افسوس کروں[۱۲۳]۔

معانی مفردات

قریۃ واحد قریٰ جمع بستی اور بستی کے رہنے والے قریٰ جمع قانونی نہیں۔ سماعی ہے کیونکہ فعلۃ کی قیاسی جمع فعال آتی ہے جیسے ظبیۃ کی جمع ظباء کچھ علمائے لغت کی رائے ہے کہ یمن والے اس لفظ کو قریہ بولتے ہیں۔ اس کی جمع قری قیاسی ہے جیسے ذردۃ کی جمع ذری ہے۔ بہرحال قرآن میں قریہ آیا ہے اور یہی فصیح ہے۔ اس کے مقابلے میں یمنی استعمال فصیح نہیں ہے۔ لغت میں قریٰ کے معنے جمع کرنا ہیں۔ قریت الماء فی الحوض میں نے حوض میں پانی جمع کر دیا۔ بستی میں چونکہ آدمی جمع ہوتے ہیں اس لیے اس کو قریہ کہتے ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ دونوں معانی کے لیے مستعمل ہے۔ بستی اور بستی کے باشندے جہاں اہل یا اس کا ہم معنے موجود نہیں ہے وہاں قریہ یا قری سے مراد بستی ہے اور جہاں اہل کا لفظ موجود ہے وہاں قریہ یا قریٰ سے مراد بستی کے باشندے ہیں۔

ملۃ، امام راغب نے المفردات میں لکھا ہے کہ دین کی طرح ملت بھی اس دستورِ الٰہی کا نام ہے جو اللہ اپنے بندوں پر جاری فرماتا ہے تاکہ وہ اس پر چل کر قربِ خداوندی حاصل کر سکیں۔ اور یہ دستور انبیاؑ کی وساطت سے بندوں تک پہنچتا ہے لیکن قرآن مجید میں لفظ ملت کا اطلاق کئی جگہ مذہب پر بھی ہوا ہے جو خود انسانوں کا تراشیدہ تھا دستورِ الٰہی پر مبنی نہ تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل کے دونوں قیدیوں کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا تھا انی ترکت ملۃ قوم لایومنون باللہ، شاید امام راغب کی مراد یہ ہو کہ ملت تو اس دستورِ الٰہی کا ہی نام ہے جو انبیاؑ کی معرفت بھیجا جاتا ہے لیکن اگر انسانی دماغ اس میں خورد برد کر لیں اور بگاڑ دیں تب بھی بطورِ مجاز اس پر لفظ ملت کا اطلاق ہوتا ہے۔ امام راغب نے دین و ملت کا فرق ظاہر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ لفظ ملت کی اضافت صرف انبیاء کی طرف ہوتی ہے کسی غیر نبی کی طرف نہیں ہوتی اور نہ اللہ کی طرف ہوتی ہے اسی لیے ملۃ اللہ یا ملۃ زید یا ملتی نہیں بول سکتے ہاں دین کا استعمال عام دین اللہ، دین الانبیاء بولا جاتا ہے۔

اربابِ اقتدار کا حضرت شعیب کو چیلنج

پہلی آیت میں حضرت شعیب نے یہ کہہ کر حتی یحکم اللہ بیننا ایک سنتِ الٰہی کی طرف اشارہ

کیا ہے اس کی تفصیل یہ ہے کہ ایک شکل تو یہ ہوتی ہے کہ قوم کی غالب اکثریت رسول کی دعوت کا انکار کر دیتی ہے اور اس انکار پر اڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں یہ بات جلد واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ یہ قوم ایمان کی صلاحیت سے بالکل خالی ہے پھر اس کے لازمی نتیجہ کے طور پر عذاب بھی جلد آ جاتا ہے۔ دوسری صورت یہ ہوتی ہے کہ قوم کے اندر سے ایک گروہ ایمان لاتا ہے۔ دوسرا گروہ اس کی مخالفت کرتا ہے۔ یہ صورت اس بات کی قرینہ ہوتی ہے کہ اس قوم کے اندر کچھ صلاحیت ہوتی ہے ہو سکتا ہے کہ اس پر کچھ زیادہ محنت کی جائے تو اس میں سے کچھ افراد دعوتِ حق کو قبول کر لیں۔ اللہ سبحانہ کی ذات اپنے بندوں پر غایت درجہ پر مہربان ہے اس لیے وہ ایسی صورت میں قوم کو مہلت دیتا ہے تاکہ نبوت کو ان میں جی کھول کر کام کا موقعہ ملتا ہے نبوت کا کام پورا ہو جانے کے بعد اللہ سبحانہ اس قوم کا فیصلہ فرما دیتا ہے اس سے یہ اشارہ بھی ملتا ہے کہ قوم کو یہ مہلت ان صالحین کی برکت سے ملتی ہے جو اللہ کے رسول کی دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ حضرت شعیب نے اس قانون کو پیش کر کے اشارۃً بتا دیا کہ عذاب کی گھڑی آ رہی ہے دیر ہے اندھیر نہیں ہے اس لیے انتظار کرو یہ سن کر ان کے اقتداری حلقہ میں جوش آیا اور حضرت شعیب کو دھمکیاں دینے لگے۔ یہاں حضرت شعیب نے جب اس قانونِ الٰہی کا ذکر کر کے فرمایا فاصبروا انتظار کرو تو معاً ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ پھر قوم نے کیا کہا۔ ان آیات میں اسی سوال کا جواب ہے۔

۱۱۶ قوم کے سرداروں نے جنہیں اپنی طاقت کا گھمنڈ تھا حضرت شعیب سے کہا اے شعیب تجھے اور تیرے ساتھیوں کو جو تیرے ساتھ ایمان لائے ہیں ہم اپنے شہر سے ضرور نکال دیں گے یا پھر تمہیں ضرور ہماری ملت میں واپس آنا ہوگا۔ عود کے معنے کسی چیز سے نکل کر دوبارہ اس کی طرف چلنے کے ہیں۔ حضرت شعیب کے ساتھیوں کی نسبت تو یہ لفظ حقیقۃً صادق ہو سکتا ہے کیونکہ وہ لوگ کفر سے نکل کر اسلام میں داخل ہوتے تھے۔ باقی خود حضرت شعیب علیہ السلام کی نسبت یہ تصور نہیں ہو سکتا کہ وہ معاذاللہ پہلے ملت کفار میں داخل تھے پھر مسلمان ہوتے۔ لامحالہ یا تو ان کے اعتبار سے یہ خطاب تغلیباً ہوگا یعنی عام مومنین کے حق میں جو الفاظ استعمال ہوتے اکثریت غالبہ کو مرجح سمجھ کر حضرت شعیب کے لیے علیحدہ الفاظ اختیار نہیں کیے اور یا یہ لفظ ان کے حق میں کفار کے زعم کے موافق کہا گیا کیونکہ بعثت سے پہلے جب تک حضرت شعیب نے دعوت و تبلیغ شروع نہ کی تھی اہل مدین کے متعلق ان کی خاموشی دیکھ کر شاید وہ یہی گمان کرتے ہیں کہ یہ بھی ہمارے شامل حال اور ہمارے طور طریقے پر راضی ہیں اور یا عود کو مجازاً صیرورۃ مطلق کے معنے میں

لیا جاتے جیسا کہ بعض مفسرین کی رائے ہے [1]

شارحین قرآن کی رائے عامہ نے یہاں اس سوال کی اہمیت کو بے حد محسوس کیا ہے جس کی طرف شیخ الاسلام نے اختصار کے ساتھ اشارہ کیا ہے۔ یعنی دوبارہ ان کی ملت میں لوٹنے والی بات مومنین کی حد تک تو صحیح ہے مگر شعیب علیہ السلام کے حق میں یہ صحیح نہیں کیونکہ شعیب نبی تھے اور انبیاء سے کبھی کفر صادر نہیں ہوتا اس لیے حضرت شعیب کے متعلق او لتعودن فی ملتنا کہنا درست نہیں ہے۔ اس سوال کی گرفت سے بچنے کے لیے شارحین قرآن نے مختلف رائیں بتائی ہیں۔ قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی، شہاب خفاجی اور ابوحیان الاندلسی نے اسے تغلیب قرار دیا ہے۔ یعنی اصلی بات حضرت شعیب کے ساتھیوں کے بارے میں کہی گئی ہے لیکن سب کے ساتھ حضرت شعیب کو بھی تغلیبا داخل کر لیا گیا ہے۔ آلوسی لکھتے ہیں فاسنادہ الیہ علیہ السلام من باب التغلیب اور یہ ایسا ہی ہے جیسا کہ آغاز کلام میں لنخرجنك یا شعیب میں صرف حضرت شعیب کو مخاطب کیا لیکن تغلیبا ان کے پیروکار بھی مخاطب ہیں۔ الخفاجی نے اسی لیے لکھا ہے فی الایۃ تغلیبان اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ آیت میں لتعودن اپنے معنے میں نہیں ہے بلکہ لتصیرن کے معنے میں ہے اور مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے مذہب ہو جاؤ۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ یہ بات قوم شعیب نے اپنے خیال کے مطابق کہی ہے۔ ظاہر ہے کہ پیغمبر بعثت سے پہلے اپنے یہاں کے موروثی مذہب کی مخالفت نہیں کرتا ہے اور اس لیے لوگ قدرتاً اسے اپنا ہم مذہب سمجھتے ہیں اس لیے لوگوں نے اپنے اسی خیال کے مطابق حضرت شعیب سے یہ بات کہی ہے لیکن اصل یہ ہے کہ یہاں یہ سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔ یہ تو خواہ مخواہ اپیچ ہے۔ کہنے والے حضرت شعیب کی نبوت کو مانتے ہی نہیں اور نہ شعیب علیہ السلام نے نبی ہونے سے پہلے ان سے ایسی بات کہی ہے جس سے ان کا ان سے علیحدہ ہونا معلوم ہوتا بے شک ان کی برائیوں سے الگ تھلگ خاموش زندگی گزارتے تھے۔ منصب نبوت پر فائز ہونے کے بعد آپ نے موروثی افکار و اعمال کے خلاف آواز اٹھائی۔ اس سے پہلے عام شہریوں کی طرح لوگ ان کو بھی ایک شہری سمجھتے تھے اور ان کی خاموش زندگی کو اپنا حریف نہیں بلکہ حلیف تصور کرتے تھے اس لیے بات واضح ہے، اس میں تغلیب وغیرہ کی تاویل کی حاجت نہیں اور خود حضرت شعیب کا جواب بھی اس تاویل کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بے مزہ کر رہا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ قوم شعیب کے طاقتور طبقہ نے حضرت شعیب اور ان کے ساتھیوں کو آخری دھمکی دی کہ قسم کھا کر پورے زور سے کہتے ہیں کہ یا تو تم ہماری ملت میں واپس آجاؤ ورنہ ہم تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو اپنے ملک سے نکال دیں گے۔ اور استبداد کا دامن جب دلائل سے خالی ہو جاتا ہے وہ اسی قسم کی دھمکیوں پر اتر آتا ہے۔ یہاں تو صرف ملک بدر کرنے کی دھمکی دی ہے سورہ ہود میں قرآن نے ان کی یہ دھمکی بھی نقل کی ہے ولولا رھطک لرجمنٰک وما انت علینا بعزیز۔ اگر تمہارے ساتھ تمہاری برادری کے آدمی نہ ہوتے تو ہم تمہیں سنگسار کر دیتے تمہاری ہمارے سامنے کوئی ہستی نہیں ہے۔ یہ دونوں دھمکیاں حضرت شعیب کو قوم نے مختلف اوقات میں دی ہیں۔ اور آپ یہ سن کر حیران ہوں گے کہ بعینہٖ یہی صورتِ حال سورہ اعراف کے نزول کے وقت مکہ میں درپیش تھی۔ اس وقت قریش کے لوگ بھی اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے خون کے پیاسے تھے اور چاہتے تھے کہ آپ کی زندگی کا خاتمہ کر دیں لیکن اس وجہ سے آپ پر ہاتھ ڈالتے ہوتے ڈرتے تھے کہ بنی ہاشم آپ کی پشت پر تھے۔ اسی پارے کے آخر میں پڑھو گے۔

واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک،

وہ وقت یاد کرو جب منکرین سازشیں کر رہے تھے آپ کو قید کر دیں یا قتل کر ڈالیں یا جلاوطن کر دیں۔

بہرحال قوم نے حضرت شعیب کے سامنے دلیل کی قوت سے عاجز ہو کر طاقت کا سہارا لیا، اور ان سے کہا کہ اگر تمہیں یہاں رہنا ہے تو ہماری ملت اپنا کر رہو اور اگر ملت کو نہیں اپنانا ہے تو پھر یہاں سے بستر گول کرو۔ یعنی دونوں باتوں میں سے ایک کو قبول کرو۔ یہاں قاری کے ذہن میں پھر سوال ابھرتا ہے کہ اس کے جواب میں حضرت شعیب نے کیا کہا۔ قرآن نے آگے اسی کو نقل کیا ہے۔

وطنیت اور قومیت کا بت

۷۱۱- حضرت شعیب نے فرمایا اگر ہمیں تمہارے دین میں واپسی ناپسند و ناگوار ہو تو کیا پھر بھی ہم واپس ہو جائیں۔ یعنی دلائل و براہین کی روشنی میں تمہاری ان مہلک کفریات سے خواہ ہم کتنے ہی بیزار اور کارہ ہوں کیا تم پھر بھی یہ زہر کا پیالہ ہمیں زبردستی پلانا چاہتے ہو۔ مطلب یہ ہے کہ

کیا تم اپنی ملت میں لوٹنے پر ہماری خواہش اور ارادے کے خلاف ہمیں مجبور کر دگے - آیت میں استفہام انکاری اور لو وصلیہ ہے - یعنی کیا تم ہمیں اپنے دین میں لوٹ آنے کا حکم دے رہے ہو - اور شہر بدر کرنے کی دھمکی دے رہے ہو خواہ یہ دونوں باتیں ہمیں کیسی ناگوار ہوں - تم عجیب نادان ہو اور دین و ایمان کی حقیقت سے بے خبر ہو کر وطنیت اور قومیت سے اس کا مقابلہ کر رہے ہو اور اس نادانی میں تم ہم سے کہہ رہے ہو کہ وطن اور مذہب کے نام پر بنتے ہوئے قوم کے گھروندے کو دین و ایمان کے مقابلے میں اپنائیں اور دین حق کے مقابلے میں وطن اور قوم کو ترجیح دیں - قوم شعیب میں دین ایک موروثی رابطہ اور قومی عصبیت کا نام تھا - خواہ افراد قوم کا کردار کچھ ہو - نبوت جو دین لے کر آتی ہے اس کی حیثیت اس سے بالکل جدا ہوتی ہے - نبوت کے لاتے ہوتے دین کا جب بھی قومیت اور وطنیت سے مقابلہ ہوتا ہے تو نبوت رابطہ ایمان کو ترجیح دیتی ہے اور اس کے مقابلہ میں وطنیت اور قومیت کو قربان کر دیتی ہے - ایمان کے مقابلہ میں وطن و قوم کی قربانی انبیاء کا دستور رہا ہے - حضرت ابراہیم، حضرت لوط اور خود محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں اس کی مثالیں موجود ہیں -

کچھ شارحین قرآن نے اس فقرے کا یہ مطلب بتایا ہے کہ کیا تم شہر اور ہمارے وطن سے کسی ایسے جرم کے بغیر نکال دو گے جو وطن کا اخراج چاہتا ہے خواہ ہمیں اپنے وطن کی جدائی کیسی ناپسند ہو اور ہم وطن میں رہنے کو خواہ پسند کریں - اس مطلب میں نہ کوئی معنویت اور نہ یہ حضرت شعیب کے باقی جواب سے کوئی مناسبت رکھتا ہے - آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ حضرت شعیب نے وطن سے نکالے جانے کو قطعاً نظر انداز کر دیا لیکن ان کی دوسری دھمکی کا نوٹس لیا اور اس کا جواب بڑے واضح اور قطعی لفظوں میں دیا ہے -

ملت کفر سے انتہائی بیزاری

۱۱۸ - اگر ہم تمہارے دین میں لوٹ جائیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اب تک خدا کے نام پر ہم نے جو کام کیا یہ جھوٹ بول کر ہم نے خدا پر بہتان اٹھایا باوجودیکہ اللہ نے ہمیں تمہاری ملت سے بچایا ہے - باطل اور جھوٹے مذہب کو سچا کہنا ہی خدا پر افتراء کرنا اور بہتان باندھنا ہے - پھر بھلا ایک جلیل القدر نبی اور اس کے مخلص متبعین سے یہ کب ممکن ہے کہ وہ معاذ اللہ سچائی سے نکل کر جھوٹ کی طرف واپس جائیں اور جو سچے دعوے اپنی حقانیت یا مامور من اللہ ہونے کے کر رہے تھے - ان

سب کا بھی جھوٹ اور افتراء ہونا تسلیم کریں اور بعد اذ نجانا اللہ کا مطلب یہ ہے کہ باوجودیکہ ہم کو اللہ نے اس سے بچالیا کسی کو تو ابتداءً نجات دے چکا کہ اس میں داخل ہی نہ ہونے دیا جیسے حضرت شعیب اور بعضوں کو داخل ہونے کے بعد اس سے نکالا جیسے عام مومنین [1]

دراصل یہ جملہ انشائیہ ہے خبریہ نہیں۔ اگرچہ بصورت خبر ہے قسم کے ذریعے اس کو موکد کیا گیا ہے اس میں جن دو باتوں کی انھوں نے پیش کش کی تھی ان میں سے دوسری بات کو کہ ہمارے ملت میں لوٹ آؤ اس کا رد کیا ہے اور ملت کفر سے انتہائی بیزاری کا اعلان ہے جیسے بولتے ہیں اگر میں یہ کام کروں تو میں خدا کی رحمت سے دور رہوں یا ذمہ سے بری ہوں۔ یہ بھی قسم ہی کی ایک صورت ہے۔ قوم شعیب نے بھی حضرت شعیب کو قسم کھا کر لنخرجنك کی دھمکی دی تھی۔ حضرت نے بھی قسم کے جواب میں قسم کھا کر فرمایا قد افترینا علی اللہ کذباً اور قسم کو قد اور فعل ماضی لاکر زوردار بنایا۔ مطلب یہ ہے کہ اس کے باوجود کہ اللہ نے ہمیں تمہارے دین کے اس گھرندے سے بچالیا ہے اور ہمیں اپنی خاص رحمت سے صراط مستقیم پر چلنے کی توفیق ارزانی فرمادی ہے پھر بھی ہم اگر تمہاری ملت میں داخل ہوجائیں تو ہم سے زیادہ اللہ تعالیٰ پر جھوٹا بہتان طراز اور کون ہوگا۔ اوّل تو ہر کافر اللہ کے بارے میں بے پر کی اڑا کر مفتری علی اللہ کذباً ہے اور پھر ہم صراط مستقیم کو جان کر اگر راہ ارتداد اختیار کریں تو ہمارے جرم کی سنگینی تو اصل کافر سے بھی زیادہ ہوگی۔ یہ تو علم کے بعد انکارِ حق اور کفر جحود ہوگا۔ اور کفر کی تمام قسموں میں یہ بدترین قسم ہے۔ اسی بنا پر شریعت میں ارتداد کی سزا بہ نسبت کفر کے سنگین ہے۔ حضرت شعیب نے اوّل تو اس ملت کو افتراء علی اللہ کذباً قرار دیا گویا جھوٹ کا پلندہ جس کو بالکل بے سند خدا کی طرف منسوب کردیا دوسرے فرمایا کہ جب اللہ نے اپنے فضل وکرم سے اس لعنت سے ہمیں بچالیا تو پھر اس لعنت میں اگر ہم پڑجائیں تو پھر ہم سے بڑا مفتری علی اللہ کون ہوگا۔

اس کا ایک دوسرا مطلب یہ بھی بتایا گیا ہے کہ اگر ہم تمہاری ملت میں اس سے بچنے کے بعد واپس آجائیں تو اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ اب تک ہم نے اللہ کا نام لے کر جو کام کیا ہے وہ سب افتراء علی اللہ کذباً ہے اور فی الواقع ہم خدا کی جانب سے جو بات بتاتے ہیں وہ خدا کی نہیں بلکہ ہماری گھڑی ہوئی ہے معاذ اللہ ثم معاذ اللہ۔ شیخ الاسلام نے اسی کو اختیار کیا ہے۔ امام ثوری اور ابن جریر نے بھی یہی مطلب اختیار کیا ہے مگر ابو حیان اندلسی اور مشہور مفسر ابن عطیہ نے پہلے مطلب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کو راجح قرار دیا ہے اور دونوں صحیح ہیں۔

ایمان پر عزم کا اظہار اور تفویض الی اللہ

۱۱۹۔ تمہارے دین میں واپس ہونا ہمارے لیے ممکن نہیں ہے ہاں یہ کہ اللہ ہی چاہے جو ہمارا پروردگار ہے تو وہ جو چاہے ہو کر رہتا ہے۔ ایسی کوئی چیز نہیں جو ہمارے رب کی علمی وسعتوں میں سمائی ہوئی نہ ہو۔ ہمارا تمام تر بھروسہ اللہ پر ہے۔ اے ہمارے مولیٰ و آقا تو ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کا فیصلہ فرمائے تو بہترین فیصلہ فرمانے والا ہے۔ یعنی اپنے اختیار یا تمہارے احیا و اکراہ سے ممکن نہیں کہ ہم معاذاللہ کفر کی طرف جائیں۔ ہاں اگر فرض کرو خدا ہی کی مشیت ہم میں سے کسی کی نسبت ایسی ہو جاتے تو اس کے ارادے کو کون روک سکتا ہے۔ اگر اس کی حکمت اسی کو مقتضی ہو تو وہاں کوئی نہیں بول سکتا کیونکہ اسی کا علم تمام مصالح اور حکمتوں پر محیط ہے۔ بہرحال تمہاری دھمکیوں سے ہمیں کوئی خوف نہیں۔ کیونکہ ہمارا بالکلیہ اعتماد اور بھروسہ اپنے خدائے واحد پر ہے۔ کسی کے چاہنے سے کچھ نہیں ہوتا جو ہوگا اسی کی مشیت اور علم محیط کے تحت ہوگا۔ اسی لیے ہم اپنے اور تمہارے فیصلہ کے لیے بھی اسی سے دعا کرتے ہیں کیونکہ ایسے قادر اور علیم و حکیم سے بہتر کسی کا فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ حضرت شعیب کے ان الفاظ سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ انبیاء کے قلوب حق تعالیٰ کی عظمت و جبروت اور اپنی عبودیت و افتقار کے کس قدر عظیم و عمیق احساس سے معمور ہوتے ہیں اور کس طرح ہر آن ہر لمحہ اور ہر حال میں ان کا توکل و اعتماد تمام وسائط سے منقطع ہو کر اسی وحدہٗ لاشریک پر پہاڑ سے زیادہ مضبوط اور غیر متزلزل ہوتا ہے۔ [1]

اس فقرے کے ذریعے بھی حضرت شعیب علیہ السلام نے قوم کے مطالبہ پر ان کے مذہب میں واپسی کو بلیغ ترین انداز میں رد کیا ہے۔ اور رد بھی نفی فعل کے ذریعے نہیں بلکہ نفی شان کے ذریعے کیا ہے۔ اُردو میں اگر ہم یوں کہیں کہ میں یہ نہ کروں گا یہ نفی فعل ہے اور اگر یوں کہیں کہ ایسا کرنا میرے بس سے باہر ہے تو یہ پہلے فقرے سے انکار و نفی میں زیادہ بلیغ ہے۔ پہلے میں سادہ انکار ہے لیکن دوسرے میں انکار مدلل ہے، بس میں نہ ہو اس کی دلیل ہے۔ عربی میں اگر لا نعود کہیں گے تو یہ سادہ انکار ہوگا اور اگر مایکون لنا ان نعود فیها کہیں گے تو یہ انکار بلیغ اور مؤثر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ صاف سن لو کہ تمہاری ملت میں واپس آنے کا کوئی امکان نہیں یہ ہمارے بس سے باہر اور ہماری شان کے خلاف ہے اس لیے کسی حال میں بھی ایسا نہیں ہو سکتا۔ چونکہ اس میں اپنے لیے ایک قسم کا ادعا تھا اس لیے فوراً فرمایا الا ان یشاء اللہ ربنا لیکن ہاں اللہ کی مشیت سب پر غالب ہے اس کی آزمائشوں پر کامیاب اترنا اسی کی بخشی ہوئی توفیق پر منحصر ہے۔ یہ صرف اسی کو علم ہے کہ کس کا کیا مقدر ہے۔ اس کو ہر قسم کی قدرت ہے اس کے علاوہ کوئی قادر نہیں نہ تم قادر ہو نہ ہم قادر ہیں۔ ہمیں یقین کامل ہے کہ تمہاری ملت سرتاسر باطل ہے اور ہماری ملت سرتاسر حق ہے اور کوئی شخص اپنے یقین کو نہ بدل سکتا ہے اور نہ اسے ہٹا سکتا ہے۔ یہ کام تو صرف اللہ سبحانہ کا ہے وہ ہی مقلب القلوب ہے اور کائنات میں سب کچھ اسی کی مشیت کے تابع ہے۔ کیونکہ سب کا علم ناقص ہے اس کا علم ہر چیز کو اپنے احاطہ میں لیے ہوئے ہے یہ وہ ہی جانتا ہے کہ ایمان و کفر، ہدایت و ضلالت، صلاح و فساد کے اسباب کیا ہیں اور اس کی مشیت اس کے علم و حکمت کے مطابق ہوتی ہے۔ یہ استثنا انکار میں زور پیدا کرنے کے لیے لایا گیا ہے۔ بعینہٖ یہی بات سیدنا ابراہیم نے بھی فرمائی تھی۔ سورہ انعام میں گزر چکا ہے۔

لا اخاف ما تشرکون بہ الا ان یشاء ربی شیئاً،

میں ان چیزوں سے نہیں ڈرتا جن کو تم خدا کا شریک کرتے ہو مگر یہ کہ میرا رب ہی کوئی بات چاہے۔

آئیے اس موضوع پر دوسرے علماء کے افکار بھی پڑھ لیجئے:

مولانا ادریس فرماتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ جب ہم کفر کی قباحت اور شناعت اور اس کے انجام بد سے بخوبی واقف ہیں تو پھر کفر کیونکر اختیار کر سکتے ہیں ہاں اگر اللہ ہی کو ہماری ہدایت منظور نہ ہو اور اس نے ہماری قسمت میں کفر لکھ دیا ہو تو ہم مجبور ہیں۔ اشارہ اس طرف ہے کہ ہدایت اور گمراہی سب اللہ ہی کی طرف سے ہے اور اس کی مشیت انسان کے ارادے پر غالب ہے۔ انسان کی سعادت و شقاوت اس کے اختیار میں نہیں۔ دل جو تمام افعال انسانی کا محرک ہے وہ خدا ہی کے قبضہ میں ہے[1]

---

[1] معارف القرآن۔

مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں ،

حضرت شعیب علیہ السلام کے اس قول میں ایک قسم کا دعویٰ تھا کہ ہم اب تمہارے مذہب میں پھر واپس نہیں آ سکتے اور ایسا دعویٰ بظاہر عبدیت کے خلاف ہے جو مقربان بارگاہِ الٰہی اور اہلِ معرفت کی شایانِ شان نہیں اس لیے فرمایا الا ان یشاء اللہ ربنا اس میں اپنے عجز وضعف کا اظہار اور اللہ تعالیٰ پر توکل و تفویض ہے جو کمالاتِ نبوت میں سے ہے[1]

مولانا دریا بادی فرماتے ہیں :

عارف ہمیشہ تقدیر الٰہی کے سامنے لرزاں و ترساں رہتا ہے پہلے تو اپنا ارادہ مضبوطی کے ساتھ ظاہر کر دیا کہ ہم ہرگز کفر اختیار نہ کریں گے لیکن یہ ایک صورت دعویٰ اور اثبات خودی کی تھی اس لیے معاً یہ جز بھی اضافہ کر دیا۔ عام مومنین کے لیے تو اس کا دھڑکا اور احتمال ہر وقت ہی لگا رہتا ہے باقی خود پیغمبر کا اپنے لیے یہ کہنا اظہارِ عبدیت کے لیے ہے جو کمالاتِ نبوت کے لوازم میں سے ہے اور اکابر انبیاء سے ایسے ہی کلمات برابر منقول ہیں ۔[2]

مولانا مودودی فرماتے ہیں :

یہ فقرہ اسی معنے میں ہے جس میں ان شاء اللہ بولا جاتا ہے اور جس کے بارے میں سورہ کہف میں ہے کہ کسی چیز کے متعلق دعوے کے ساتھ یہ نہ کہہ دیا کرو کہ میں ایسا کر دوں گا بلکہ اس طرح کہا کرو کہ اگر اللہ چاہے گا تو ایسا کروں گا اس لیے کہ مومن جو اللہ تعالیٰ کی سلطانی و بادشاہی اور اپنی بندگی و تابعیت کا ٹھیک ٹھیک ادراک رکھتا ہے کبھی اپنے بل بوتے پر یہ دعویٰ نہیں کر سکتا کہ میں فلاں بات کر کے رہوں گا یا فلاں حرکت ہرگز نہ کر دوں گا بلکہ وہ جب کہے گا تو یوں کہے گا کہ میرا ارادہ ایسا کرنے یا نہ کرنے کا ہے لیکن میرے اس ارادے کا پورا ہونا میرے مالک کی مشیت پر موقوف ہے وہ توفیق بخشے گا۔ تو میں اس میں کامیاب ہوں گا ورنہ ناکام رہ جاؤں گا[3]

مولانا اصلاحی فرماتے ہیں :

اس فقرے کے پہلے ٹکڑے میں اپنے عزم کا اظہار اور دوسرے میں تفویض الی اللہ ہے۔ اور یہی عزم اور تفویض توحید کی حقیقت ہے ۔ ارشاد کا مدعا یہ ہے کہ جہاں تک ہمارا تعلق ہے یہ سن لو کہ اب تمہاری ملت میں واپس آنے کا کوئی امکان نہیں ہے لیکن اللہ کی مشیت ہر چیز پر غالب ہے۔

[1] معارف [2] ماجدی [3] تفہیم

اس کی آزمائشوں میں پورا اترنا اسی کی بخشی ہوئی توفیق پر منحصر ہے یہ صرف اسی کو علم ہے کہ کس کے لیے کیا مقدر ہے اور کس کا انجام کیا ہونا ہے۔[1]

پیر محمد کرم شاہ صاحب ایم اے سجادہ نشین بھیرہ فرماتے ہیں:

پہلے اپنا پختہ ارادہ اور عزم بتایا کہ ہم راہ راست کو کسی قیمت پر چھوڑنے کے لیے تیار نہیں ہیں اور اس کے لیے بڑی سے بڑی قربانی پیش کرنے کو تیار ہیں لیکن اس میں خودی کی بو آرہی تھی اس لیے فوراً اپنے عزم وارادے کی بے بسی کا اعتراف کیا اور ہر چیز اپنے مولائے حقیقی کے حوالہ کر دی۔ یعنی ہمارا اس پر ثابت قدم رہنا اسی وقت تک ہے جب تک اس کی نظر کرم اور توفیق شامل حال ہے ورنہ ہماری سمجھ، نیکی اور تقویٰ کسی کام نہیں آسکتے۔ سبحان اللہ کیا مقام ہے پیغمبر کا بارگاہ ربانی میں اتنی عزت اور توقیر کے باوجود دل ہر لمحے اپنے مالک کی بے نیازی سے لرزاں وترساں ہے۔ مومن کی کیفیت بھی ایسی ہونی چاہیے کہ اپنی ہر نیکی کو اپنے رب کا فضل تصور کرے اور اپنے علم، عمل اور تقویٰ پر غرور اور گھمنڈ نہ کرے اور ہر لغزش سے اس کی پناہ مانگتا رہے۔[2]

آئیے ذرا ان سے پیشتر شارحین قرآن کے تفسیری علوم سے استفادہ فرمائیے۔ مشہور مفسر قرآن واحدی فرماتے ہیں:

اس آیت میں اہل علم وسنت کا موقف یہ ہے کہ حضرت شعیب اور ان کے صحابہ کرام نے فرمایا کہ یہ جاننے کے بعد کہ تمہاری ملت سرتاسر ضلالت اور گمراہی ہے ہم تمہاری ملت میں واپس نہیں آسکتے الا یہ کہ اللہ ہی ہمارے ہلاک کرنے کا ارادہ فرمائے کیونکہ سارے امور کا مرجع اللہ کی ذات ہے۔ اس کی دسترس سے کوئی چیز باہر نہیں ہے وہ جسے چاہتا ہے طاعت کی توفیق دے کر صالح وسعید بنا دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے معصیت کے ذریعہ ہلاک کر دیتا ہے اور یہ شعیب علیہ السلام کی جانب سے اپنے لیے مشیت الٰہی کے لیے سپردگی ہے۔ سارے انبیاء اور اکابر ہمیشہ انجام سے لرزاں رہے ہیں۔ حضرت ابراہیم کی اس دعا کو دیکھو واجنبنی وبنی ان نعبد الاصنام حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیشتر یہ دعا ہوتی تھی اللھم مقلب القلوب ثبت قلبی علی دینک۔[3]

علامہ ناصر الدین الانتصاف میں فرماتے ہیں:

اس میں انجام کے بارے میں اپنے علم کی کوتاہی کا اقرار اور امور غائبہ کے متعلق بے خبری کا اعتراف

---

[1] تدبر قرآن [2] ضیاء القرآن [3] تفسیر کبیر۔

ہے۔ کیونکہ قدرت الٰہی میں یہ بات داخل ہے کہ کوئی کفر کی طرف پلٹ جائے۔ اگر ایسا ہو تو یہ اللہ کی قدرت اور مشیت سے ہو سکتا ہے اس لیے بندے کو ہر وقت چوکنا رہنا اور ڈرتے رہنا چاہیے۔ اسی کی مثال حضرت ابراہیم کا یہ ارشاد ہے لا اخاف ما تشرکون بہ الا ان یشاء ربی شیاً وسع ربی کل شیئ علما، چونکہ اللہ کی مشیت کا کسی کو پتہ نہیں اس لیے وسع ربی الخ فرما کر جتا دیا کہ مغیبات کے علم میں اس کی ذات منفرد ہے[1]

آخر میں فرمایا علی اللہ توکلنا یعنی ہمارا بھروسہ صرف اللہ ہی پر ہے۔ اسی نے ہماری اس راہ کی طرف رہنمائی کی ہے اور اسی سے ہمیں اُمید ہے کہ وہ ہمیں کامیابی سے ہمدوش کرے۔ اس کی ہدایت کے مطابق ہم اس میدان میں آتے ہیں۔ تمہاری دھمکیوں میں ہمیں وہ ہی کافی ہے۔ ہمیں اللہ کے سوا تمہاری ملت میں واپسی کے لیے کوئی مجبور نہیں کر سکتا۔ توکل نام ہے اسباب کی پابجائی کے بعد نتائج کے لیے اسباب پر نہیں اللہ پر بھروسہ کرنے کا۔ اگر اسباب کی پابجائی کے بغیر اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو اس کا نام توکل نہیں عجز ہے۔ ایسا کرنے والا متوکل منصور و ماجور نہیں بلکہ جاہل مغرور ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس شخص کو جس نے آپ سے دریافت کیا تھا کیا میں اپنی اونٹنی کو کھلا چھوڑ کر اونٹنی کی حفاظت کے لیے اللہ پر بھروسہ کر دوں فرمایا تھا کہ اعقلہا و توکل علی اللہ اونٹنی کو باندھ لے اور حفاظت کے لیے اللہ پر بھروسہ کر۔ قرآن میں کاروبار حکومت کے سلسلے میں حضور کو پہلے یہ ہدایت ہوئی کہ شاورھم فی الامر صحابہ کرام سے مشورہ کرو۔ مشورے کے بعد جب بات پختہ ہو جائے پھر فرمایا فاذا عزمت فتوکل علی اللہ یہ بات خالص جنگ کے موضوع پر آئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت شعیب نے استطاعت بھر تمام اسباب پر عمل کر لیا تھا اب نتائج کے ظہور کے لیے اللہ پر توکل کا اعلان کیا۔ اور اسباب ہی میں سے ایک قوی تر سبب اللہ کی جناب میں دُعا ہے۔ یعنی سارے مادی اسباب کی پابجائی کے بعد حضرت شعیب نے کامیابی کے لیے اس روحانی اور معنوی سبب سے بھی استفادہ کیا اور فرمایا:

ربنا افتح بیننا و بین قومنا بالحق و انت خیر الفاتحین۔

یعنی ہماری اسی سے یہ دُعا ہے کہ اے ہمارے رب ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان حق کے ساتھ فیصلہ فرما دے اور تو بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ یہاں یہ بات بہت زیادہ قابلِ غور ہے کہ

---

[1] حاشیہ کشاف

ایک طرف اسباب میں اتنا انہماک کہ اس عالم مادی میں ایمان پر غیر متزلزل عزم کا اظہار اور ملت کفر سے نئے نئے انداز میں انتہائی بیزاری کا اعلان ہو رہا ہے یعنی جن راہوں سے حق تعالیٰ دعوت میں کامیاب ہونے والوں کو کامیابی عطا فرماتے ہیں دعوت کے ان ضوابط و آئین کے اختیار کرنے میں حضرت شعیب نے کوئی دقیقہ نہیں اٹھا رکھا۔ ملت کفر سے ناگواری و بیزاری۔ ملت کفر کو افتراء علی اللہ۔ اس کی لعنت سے نجات کو خدا کا انعام۔ اس میں واپسی کو ناممکن اور امر محال سب کچھ کرنے کے بعد حضرت شعیب کامیابی کی اس کلی اور کلیدی تدبیر میں مشغول ہو گئے جس کا نام دعا ہے یعنی کامیابی کا حقیقی اختیار جس کے قبضے میں ہے اس سے مانگنے میں مشغول ہو گئے۔ یہ عقلی تدبیر اور دعائی تدبیر کی جامعیت کی کیسی شاندار مثال ہے۔ اعتدال کے نقطہ نظر سے جن طبیعتوں میں انحراف پیدا ہو گیا ہے اس موضوع پر ان کا مذاق کچھ ہو لیکن نبوت جو حق لے کر آتی ہے اس کا مزاج خالص فطری ہوتا ہے۔ نبوت حصول مقاصد کے لیے تدبیر کی اسی جامعیت کو لے کر آتی ہے یعنی جو پیدا کر رہا ہے اس سے ہی مانگا جائے اور جن راہوں سے چیزیں پیدا ہو رہی ہیں ان میں بھی تلاش کیا جائے تعلیم کی یہی جامعیت اسلام کی خصوصیت ہے۔

دعائی تدبیر اور عقلی تدبیر میں فرق

یہ بات بھی دھیان میں رہے کہ کامیابی عطا کرنے والا ایک ہے اور جن راہوں سے کامیابی آرہی ہے وہ بے شمار ہیں اس لیے دعائی تدبیر کا شعبہ عقلی تدبیر سے زیادہ آسان ہے۔ ایک سے تعلق رکھنا اور وہ بھی بھیک مانگنے، سوال کرنے کا تعلق رکھنا ایسا کام ہے کہ جس سے کچھ نہیں ہو سکتا وہ بھی بالآخر اس کام کو کر لیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تدبیر کے اس عقلی شعبہ کا مکلف ہر شخص اپنی اپنی عقل اور قوت عمل کے حساب سے ہے برخلاف دعائی تدبیر کے کہ وہ ایک کلی تدبیر ہے کامیابی کی راہوں سے نہیں بلکہ خود کامیاب کرنے والے سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو مانگتا ہے۔ مانگنا ایک ایسا کام ہے کہ دنیا میں جو کچھ نہیں کر سکتا مانگنے پر وہ بھی قادر ہے اور مانگ ہی اس کی آخری پناہ ہے۔ الحاصل تدبیر کے ان دونوں شعبوں کے یہی نمایاں امتیازات ہیں جس کی بنیاد پر مذہب میں تدبیر کے دعائی شعبہ کو زیادہ اہمیت دی گئی ہے ارشاد ہے:

وللہ غیب السماوات والارض الیہ یرجع الامر کلہ فاعبدہ وتوکل علیہ

اللہ ہی کے ہیں آسمان کی اور زمین کی پوشیدہ باتیں بڑی سے بات سب کی سب

اسی کی طرف توجہ کرو اور اسی پر ٹیک لگاؤ۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ عقل سے تم زیادہ سے زیادہ ان ہی آئین و قوانین کو دریافت کر سکتے ہو جو حواس و عقل کی گرفت میں ہوں لیکن آسمان و زمین کے قوانین کا وہ حصہ جو حواس و عقل سے غیب میں ہے۔ ان کے بارے میں چارہ کار یہی ہے کہ اللہ کو اپنا وکیل بناؤ۔ اسی سے مانگو۔ گویا عقل و حواس کی راہ سے جو معلومات حاصل ہو سکیں ان کا جو تقاضا ہو اس کو پورا کرنے کے بعد آخری پناہ اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ، کا یہی مطلب ہے کہ ایسا آدمی بے سہارا نہیں ہو سکتا۔

بہر حال حضرت شعیب نے عقلی تدبیر کے ساتھ اس دعائی تدبیر کو اختیار کیا اور فرمایا ربنا افتح بیننا و بین قومنا بالحق۔ عربی زبان میں فتح کے معنے کھولنے کے ہیں۔ کھولنا دو طرح کا ہوتا ہے ایک مادی جیسے آنکھ کھولنا، تالا کھولنا اور معنوی جیسے رزق کی راہیں کھولنا، مشکل مسائل کھولنا۔ مقابلہ کی بیابی کھولنا۔ قاضی کا مقدمہ میں حکم کھولنا۔ فیصلہ کو فتاحت کہتے ہیں۔ ایک عربی شاعر کہتا ہے۔

الا ابلغ بنی وھب رسولاً بانی عن فتاحتھم غنی

اولاد وھب کو میرا یہ پیغام پہنچا دو کہ مجھے ان کے فیصلے کی کوئی پروا نہیں۔

اسی سے قضا کو فتاحت کہتے ہیں دن الفتاحۃ کے معنے ہیں لسے قضا کا عہدہ مل گیا۔ خاص اس دعائی پیمانہ کے بارے میں قتادہ ابن دعامہ نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے نقل کیا ہے کہ،

عبداللہ فرماتے ہیں میں ربنا افتح بیننا کا مطلب نہ سمجھتا تھا ایک روز میں نے قبیلہ ذی یزن کی لڑکی سے سنا کہ وہ اپنے شوہر سے کہہ رہی ہے افاتحک یعنی تیرے سے فیصلہ کروں گی۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیت میں افتح کے معنے فیصلہ کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ رسولوں اور ان کی امتوں کے جھگڑے میں اپنی سنت کے مطابق ہمارے اور ہماری قوم کے درمیان فیصلہ فرما دے۔ آپ بہترین فیصلہ فرمانے والے ہیں، آپ کو جھگڑے کا بھرپور علم ہے۔ آپ کے فیصلے میں نہ ظلم کا شائبہ ہے اور نہ اتباع ہوئی کا خطرہ۔ آپ کا فیصلہ ہر پہلو سے بہتر اور اچھا ہی ہوگا۔ یعنی اب آپ عملی اور مشاہدہ کے طور پر حق کا حق ہونا اور باطل کا باطل ظاہر فرما دیجئے تاکہ ہمارے مخاطبوں کا باطل ہونا اور ہمارا برحق ہونا کھل کر سامنے آجائے۔

قوم شعیب کی اہل ایمان کو دھمکی

۱۲۰۔ حضرت شعیب کی نبوت کے منکر قوم کے سرداروں نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا لوگو اگر

تم نے حضرت شعیب کی پیروی کر لی تو بس سمجھ لو کہ تمہارا مستقبل گھاٹے والا ہے۔ یعنی باپ دادا کا مذہب چھوٹا، یہ تو دین کی خرابی ہوئی اور تجارت میں ناپ تول ٹھیک رکھی یہ دُنیا کا نقصان ہوا[1]۔ حضرت شعیب کا سخت جواب سن کر سرداران قوم نے روئے سخن حضرت شعیب سے ہٹا کر حضرت شعیب کے ساتھیوں کی طرف کر لیا۔ کیونکہ ان کا فیصلہ کن جواب سننے کے بعد اب ان سے تو ان متمردین کے لیے کچھ کہنے سننے کی گنجائش ہی نہیں رہی۔ ان غریب اہل ایمان سے انہوں نے وہی کچھ کہا جو ہمیشہ طاقتور دلائل سے تہی دامن ہو کر ناداروں اور کمزوروں سے کہا کرتا ہے یعنی تم اگر حضرت شعیب کی ہمنوائی سے دست کش نہ ہوئے تو تمہیں بہت بڑے خسارے سے دوچار ہونا پڑے گا۔ اس خسارے کی ان لوگوں نے کوئی وضاحت نہیں کی ہے۔ اس اجمال میں سب کچھ موجود ہے۔ سیاسی خسارہ، معاشی خسارہ، تجارتی خسارہ وغیرہ وغیرہ۔ اس چھوٹے سے فقرے میں وہ یہ بتا رہے تھے کہ حضرت شعیب جو نظام زندگی پیش کر رہے ہیں اور کاروباری زندگی میں جس ایمانداری اور راستبازی کی دعوت دے رہے ہیں اور اخلاق و دیانت کے جن مستقل اصولوں کی پابندی کرانا چاہتے ہیں۔ اگر ان کو مان لیا جائے تو ہم تباہ ہو جائیں گے۔ ہماری تجارت کیسے چل سکتی ہے۔ اگر ہم بالکل سچائی کے پابند ہو جائیں اور کھرے کھرے سودے کرنے لگیں۔ اور ہم جو دُنیا کی سب سے بڑی تجارتی شاہراہوں کے چوراہے پر بستے ہیں۔ اور مصر و عراق کی عظیم الشان متمدن حکومتوں کی سرحد پر آباد ہیں۔ اگر ہم قافلوں کو چھیڑنا چھوڑ دیں اور بے ضرر پُرامن لوگ ہی بن کر رہ جائیں تو جو معاشی اور سیاسی فوائد ہمیں اپنی موجودہ جغرافی پوزیشن سے حاصل ہو رہے ہیں وہ سب ختم ہو کر رہ جائیں گے اور اس پاس کی قوموں پر ہماری جو دھونس قائم ہے وہ باقی نہ رہے گی۔

یہ بات صرف قوم شعیب کے سرداروں تک ہی محدود نہیں ہے۔ ہر زمانے میں بگڑے ہوئے لوگوں نے حق اور راستی کی روش میں ایسے ہی خطرات محسوس کیے ہیں۔ ہر دور کے مفسدین کا یہی خیال رہا ہے کہ تجارت اور سیاست اور دوسرے دنیوی معاملات جھوٹ اور بے ایمانی اور بداخلاقی کے بغیر چل نہیں سکتے۔ ہر جگہ دعوت حق کے مقابلے میں جو زبردست عذرات پیش کیے گئے ان میں سے ایک یہ بھی رہا ہے کہ اگر دُنیا کی چلتی ہوئی راہوں سے ہٹ کر اس دعوت کی پیروی کی جائے گی تو قوم تباہ ہو جائے گی[2]۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

قوم مدین عذاب کی گرفت میں

۱۲۱ - پس آ دبوچا ان کو ایک لرزنے والی ہلاکت نے اور اس کے نتیجے میں وہ صبح کو اوندھے منہ پڑے تھے۔ متعدد آیات کے جمع کرنے سے ظاہر ہوتا ہے کہ ان پر ظلہ، صیحہ اور رجفہ تین طرح کے عذاب آئے۔ یعنی اوّل بادل نے سایہ کرلیا جس میں آگ کے شعلے اور چنگاریاں تھیں۔ پھر آسمان سے سخت ہولناک اور جگر پاش آواز ہوتی اور نیچے سے زلزلہ آیا[1] شیخ الاسلام کی تشریح ان شارحین قرآن کی ترجمانی کرتی ہے جو کہتے ہیں کہ اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ دونوں ایک ہی ہیں۔ ان کا قیاس ہے کہ ملک مدین کے پاس ایک جنگل تھا جہاں مدین کی قوم کبھی کبھی قیام کرتی تھی۔ اس لیے ان کو اصحاب الایکہ کہتے تھے۔ لیکن چونکہ اصحاب الایکہ کی تاریخ ہمارے مفسرین کے پیشِ نظر نہ تھی اس لیے انہوں نے یہ بات خود فرض کرلی کہ اصحاب الایکہ اور اصحابِ مدین ایک ہیں۔ حالانکہ صورتِ حال یہ نہیں ہے۔

مسلمان جغرافیہ نویس ان اطراف میں کسی جنگل کے ذکر سے خاموش ہیں۔ ان کی رائے ہے کہ شہر تبوک جو مدین کے مقابل مدین سے ۶ مرحلہ پر واقع ہے اس کا قدیم نام ایکہ تھا۔ اور خود اہل تبوک کو بھی اعتراف ہے کہ اس کا پہلا نام ایکہ ہے۔ قرآن کے اندازِ بیان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مدین اور ایکہ دو چیزیں ہیں کیونکہ ان دونوں قوموں کا حضرت شعیب سے سوال و جواب، طرزِ خطاب اور پھر آخر بربادی اور طریقہ بربادی مختلف ہے۔ اس بنا پر یہ کہنا درست نہیں کہ اصحابِ مدین اور اصحابِ ایکہ ایک ہیں۔ انشاء اللہ ہم اس پر سیر حاصل بحث جلد ۱۴ اور جلد ۱۹ میں کریں گے۔

اس لیے دونوں کے عذاب میں بھی فرق ہے۔ قوم مدین پر جو عذاب آیا اسے قرآن نے یہاں رجفہ اور سورۂ ہود میں صیحہ کہا ہے اور اصحاب الایکہ پر جو عذاب آیا اسے ظلہ کہا ہے۔ رجفہ رجف سے اسم مرہ ہے ہلنے اور کپکپی کو کہتے ہیں۔ رجفان الارض زمین کا ہلنا بھی ہوتا ہے اسی سے رجفہ بمعنے زلزلہ ہے اور رجفانِ قلب کے معنے خوف اور ہول کے ہیں۔ یہاں زلزلہ کے معنے ہیں اور سورہ ہود میں اسی کو صیحہ فرمایا ہے اس کے معنے چیخ اور کڑک کے ہیں۔ پہلے ایک آواز بلند ہوئی اور پھر زلزلہ آیا۔ اس کے نتیجہ میں جو تباہی آئی ہے یہاں قرآن نے اسی کا نقشہ پیش کیا ہے اور سورۃ الشعراء میں اصحاب الایکہ کا جو عذاب بیان کیا ہے اسے عذاب یوم الظلہ کہا ہے یعنی سائبان والے دن کا عذاب۔ جوہری نے ابوزید سے نقل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کیا ہے کہ پہلی بدلی جو سایہ فگن ہو وہ ظلہ ہے اور عذاب یوم الظلہ کے بارے میں جوہری نے لکھا ہے کہ ایک ابر تھا جس کے نیچے بادِ سموم چل رہی تھی۔ اور تہذیب اللغہ میں ہے کہ ایک بدلی ان کے سر پر سایہ فگن ہوگئی تھی جب لوگ نیچے تپش سے پناہ کے لیے جمع ہوتے تو وہ یکایک ان پر آگری اور سب وہیں ڈھیر ہوگئے۔ تفصیل انشاء اللہ معالم القرآن کی جلد ۱۹ میں ملے گی۔

قوم مدین پر عذاب کا نتیجہ

۱۲۲۔ جنہوں نے حضرت شعیب کی تکذیب کی ان کا حال یہ تھا کہ گویا وہ ان بستیوں میں کبھی آباد ہی نہیں ہوتے تھے۔ حضرت شعیب کی تکذیب کرنے والے ہی تباہ ہونے والے تھے۔ انہوں نے شعیب اور ان کے ہمراہیوں کو بستی سے نکالنے کی دھمکی دی تھی سو وہ ہی نہ رہے اور نہ ان کی بستیاں رہیں اور وہ جو کہتے تھے کہ شعیب یہ استیناف بیانی ہے جس نے پہلے یہ دو باتیں قوم مدین کی زبانی سُنی ہیں اے شعیب ہم تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی بستی سے نکال دیں گے اور یہ بات کہ لوگو اگر تم نے شعیب کی ہمنوائی کی تو تم خسارے میں رہو گے تو سامع کے ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ معاملہ کیسے ختم ہوا اور تنازع کا اونٹ کس کروٹ بیٹھا۔ قاری و سامع کے ذہن میں اسی اٹھتے ہوئے سوال کا جواب اس آیت میں دیا جا رہا ہے۔ پہلے سوال کا یہ جواب دیا ہے کہ جو لوگ حضرت شعیب اور ان کے ساتھیوں کو بستی سے نکالنے کی دھمکیاں دے رہے تھے اور ان کی اپوزیشن بن کر کھڑے ہوگئے ان پر ایسی تباہی آئی اور وہ اس طرح ہوگئے گویا اس بستی میں وہ کبھی آباد ہی نہ ہوتے تھے وہ بھی مٹ گئے اور ان کی بستی بھی صفحہ ہستی سے مٹ گئی۔ دوسرے سوال کا جواب یہ دیا کہ جو شعیب کی پیروی سے روکتے تھے اور حضرت شعیب کی تکذیب کرتے تھے وہ ہی اہلِ ایمان کے مقابلے میں گھاٹے میں رہے ان کی قومی ہستی مٹ گئی ان کا سرمایہ تباہ ہوگیا اُن کا وطن وطن نہیں رہا اس کے برعکس جنہوں نے حضرت شعیب کی اتباع کی وہ بامراد اور کامیاب رہے۔

علامہ طیبی نے اس میں یہ بھی نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ اللہ سبحانہ نے زلزلہ کے ذریعے جب ان پر عذاب کی گرفت کو بیان فرمایا اور بتایا کہ ان کو تکذیب و عناد کے نتیجہ میں بے دست و پا بنا کر رکھ دیا تو سننے والے کے ذہن میں یکبارگی یہ سوال ابھرا کہ گھروں میں اوندھے ہو جانے کا انجام کیا ہوا؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ کان لم یغنوا فیہا۔ ان کی اس طرح بیخ کنی کر رکھ دی گئی اور اُن کے مکانوں کو اس طرح تباہ کر دیا کہ دیکھنے والا محسوس کرتا ہے کہ یہاں کوئی آباد کبھی ہوا ہی نہیں ہے۔ یہاں پہنچ کر مخاطب کے ذہن میں

پھر اس سوال نے چٹکیاں لیں کہ کیا یہ معاملہ صرف ان ہی کے ساتھ ہوا یا کوئی اور بھی ان کا شریک تھا۔ فرمایا صرف ان کی ساتھ ہی ہوا ہے جنہوں نے حضرت شعیب کی تکذیب کی تھی۔ لیکن پہلی تشریح میں زیادہ معنویت ہے۔ اہل علم نے اس سے یہ بات بھی معلوم کی ہے کہ نبوت کی دعوت کے مقابلے میں وطنیت اور قومیت سے محبت کا نتیجہ دائمی محرومی ہے۔

حضرت شعیب کی ہجرت

۱۲۳۔ حضرت شعیب ان سے علیٰحدہ ہو گئے اور فرمایا کہ میں نے اپنے رب کے پیغامات تمہیں پہنچا دیے اور میں نے تمہاری خیر خواہی کی تھی اس لیے میں آپ کے نہ ماننے پر کیسے افسوس کروں۔ یعنی اب ہلاک ہوئے پیچھے ایسی قوم پر افسوس کرنے سے کیا حاصل جس کو ہر طرح سمجھایا جا چکا ہے، مؤثر نصیحتیں کی گئیں آنے والے عواقب و نتائج سے ڈرایا گیا۔ مگر انہوں نے کسی کی ایک نہ سنی بلکہ مخلص خیر خواہ ہوں سے اُلجھتے ہی رہے[1] یہ قوم سے حضرت شعیب کا آخری خطاب ہے کہ یہ انہوں نے عذاب آنے سے پہلے اس وقت فرمایا ہے جب ان کو اللہ کی طرف ہجرت کا حکم ملا ہے۔ اعلان برأت کر کے ہجرت فرماتی ہے۔ یہی رخصتی تقریر کر کے آپ نے ہجرت فرمائی۔ کیونکہ رسولوں کے بارے میں سنتِ الٰہی یہ ہے کہ عذاب آنے سے پہلے اللہ کے حکم سے وہ علاقہ عذاب سے ہجرت کر جاتے ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ترتیبِ بیان میں اس بات کو عذاب کے بعد کیوں ذکر کیا اس کا جواب یہ ہے کہ ترتیب میں یہ تقدیم و تاخیر تقاضائے بلاغت ہے۔ ارتکابِ جرم اور اس کے نتیجے کے فوری ظہور کو نمایاں کرنے کے لیے یہاں رجفہ کو قوم مدین کے چیلنج کے ساتھ بیان کر دیا اور حضرت شعیب کی ہجرت کو مؤخر کر دیا گویا جوں ہی اہلِ مدین نے لئن اتبعتم شعیبا انکم اذا لخاسرون کہا خدا کا عذاب آ گیا۔ اگر درمیان میں حضرت شعیب کی ہجرت اور ان کے آخری خطاب کو ذکر کیا جاتا تو عذاب کی یہ سبقت و مبادرت ظاہر نہ ہوتی۔ قرآن میں اس قسم کی مثالیں بہت ہیں اور اگر اسے عذاب کے بعد کا خطاب قرار دیا جائے تو فتولی عنھم میں کوئی معنویت نہیں رہے گی۔ مطلب یہ ہے کہ میں نے تمہیں خدا کا پیغام پہنچا دیا ہے اور تمہاری خیر خواہی میں اپنے آپ کو تج کر دیا۔ اس کے باوجود اگر تم اپنی تباہی پر تلے بیٹھے ہو تو اب میرے لیے تمہارے اس انجام پر ترس کھانے اور افسوس کرنے کا کیا موقع ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَمَآ أَرْسَلْنَا فِى قَرْيَةٍ مِّن نَّبِىٍّ إِلَّآ أَخَذْنَآ أَهْلَهَا بِالْبَأْسَآءِ
وَالضَّرَّآءِ لَعَلَّهُمْ يَضَّرَّعُونَ ﴿٩٤﴾ ثُمَّ بَدَّلْنَا مَكَانَ السَّيِّئَةِ
الْحَسَنَةَ حَتَّىٰ عَفَوا وَّقَالُوا قَدْ مَسَّ ءَابَآءَنَا الضَّرَّآءُ وَالسَّرَّآءُ
فَأَخَذْنَٰهُم بَغْتَةً وَهُمْ لَا يَشْعُرُونَ ﴿٩٥﴾ وَلَوْ أَنَّ أَهْلَ الْقُرَىٰٓ
ءَامَنُوا وَاتَّقَوْا لَفَتَحْنَا عَلَيْهِم بَرَكَٰتٍ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْأَرْضِ وَ
لَٰكِن كَذَّبُوا فَأَخَذْنَٰهُم بِمَا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٩٦﴾ أَفَأَمِنَ أَهْلُ
الْقُرَىٰٓ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا بَيَٰتًا وَهُمْ نَآئِمُونَ ﴿٩٧﴾ أَوَأَمِنَ
أَهْلُ الْقُرَىٰٓ أَن يَأْتِيَهُم بَأْسُنَا ضُحًى وَهُمْ يَلْعَبُونَ ﴿٩٨﴾ أَفَأَمِنُوا مَكْرَ
اللَّهِ فَلَا يَأْمَنُ مَكْرَ اللَّهِ إِلَّا الْقَوْمُ الْخَٰسِرُونَ ﴿٩٩﴾ أَوَلَمْ يَهْدِ لِلَّذِينَ
يَرِثُونَ الْأَرْضَ مِنۢ بَعْدِ أَهْلِهَآ أَن لَّوْ نَشَآءُ أَصَبْنَٰهُم بِذُنُوبِهِمْ
وَنَطْبَعُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿١٠٠﴾ تِلْكَ الْقُرَىٰ نَقُصُّ
عَلَيْكَ مِنْ أَنۢبَآئِهَا وَلَقَدْ جَآءَتْهُمْ رُسُلُهُم بِالْبَيِّنَٰتِ فَمَا

كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا مِنْ قَبْلُ ۚ كَذٰلِكَ يَطْبَعُ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِ
الْكٰفِرِيْنَ ﴿١٠١﴾ وَمَا وَجَدْنَا لِاَكْثَرِهِمْ مِّنْ عَهْدٍ ۚ وَاِنْ وَّجَدْنَآ
اَكْثَرَهُمْ لَفٰسِقِيْنَ ﴿١٠٢﴾

اور ہم نے جب کسی بستی میں کوئی نبی بھیجا تو ہمیشہ ایسا ہوا کہ اس کے باشندوں کو تنگ حالی اور بدحالی میں مبتلا کر دیا تاکہ نیازمندی اختیار کریں، پھر ہم نے بدحالی کو خوش حالی میں تبدیل کر دیا تا آنکہ وہ خوش حالی میں خوب ترقی کر گئے اور کہنے لگے ہمارے بزرگوں پر سختی کا دور بھی آیا اور راحت کا بھی تو اچانک ہمارے عذاب کی پکڑ میں آگئے اور وہ بالکل بے خبر تھے۔[۱۲۴] اور اگر ان بستیوں کے رہنے والے ایمان لاتے اور برائیوں سے بچتے تو ہم آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے ضرور ان پر کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا لہٰذا ہم نے ان کو اس کمائی کی وجہ سے جو انہوں نے حاصل

کی پکڑ لیا[۱۲۵]۔ کیا شہروں کے بسنے والوں کو اس بات سے امان کا پروانہ
مل گیا ہے کہ ہمارا عذاب راتوں رات آ نازل ہو اور وہ سوتے ہوں
یا انہیں اس بات سے امان مل گئی ہے کہ دن کی روشنی میں اُن
پر عذاب آ جاتے اور وہ کھیل کود میں مشغول ہوں[۱۲۶]۔ کیا ان کو خدا
کی مخفی تدبیروں سے امان مل گئی ہے یاد رکھو خدا کی مخفی تدبیروں سے
بے خوف وہی ہوتے ہیں جو تباہ ہونے والے ہوتے ہیں[۱۲۷]۔ کیا
جو لوگ ملک والوں کے ہلاک ہونے کے بعد ملک کے وارث ہوتے
ہیں یہ بات نہیں جانتے کہ اگر ہم چاہیں تو انہیں بھی گناہوں کی
پاداش میں مصیبتوں میں ڈال دیں اور اُن کے دلوں پر مُہر لگا دیں
کہ کوئی بات ہی نہ سُنیں[۱۲۸]۔ اے پیغمبر یہ آبادیاں جن کی داستانیں
ہم تمہیں بتاتے ہیں ان سب میں ان کے پیغمبر واضح اور روشن
دلیلوں کے ساتھ آئے مگر اُن کے بسنے والے اس بات پر ایمان نہ

لاسکے جن کو اُن کے پیشرو جھٹلا چکے تھے، اسی طرح اللہ ہٹ دھرمی سے انکار کرنے والوں کے دلوں پر مُہر لگا دیتا ہے[۱۲۹]۔ اور ان میں سے اکثر کو ہم نے ایسا پایا کہ اپنے عہد پر قائم نہ تھے اور اُن کے اکثر کو ہم نے بالکل نافرمان پایا ہے[۱۳۰]۔

معانی مفردات

البأساء، سختی، فقر اسم مونث ہے۔ بؤس سے مشتق ہے صفت نہیں ہے اور بعض کے خیال میں صفت ہے جو موصوف کے قائمقام ہے۔ الضراء، تکلیف، سختی، تنگی، مرض، بیماری، مصیبت اسم ہے۔ سراء اور نعماء کی ضد ہے۔ واضح رہے باساء اور ضراء دونوں مونث ہیں اور ان کا مذکر نہیں آتا۔ فراء کا خیال ہے کہ اگر ان دونوں کی جمع ابؤس اور اضر استعمال کی جاتے جس طرح کہ نعماء کی جمع انعم استعمال کی جاتی ہے تو جائز ہے۔ الصراح من الصحاح۔ السیئة، برائی، گناہ، فعل بد، حسنہ کی ضد ہے۔ سیئة اصل میں سیوأة ہے۔ واو کو ی سے بدل کر یا میں ادغام کر دیا۔ راغب لکھتے ہیں حسنہ اور سیئة دو قسم کے ہیں۔ ایک باعتبار عقل و شرع جیسے وہ کام جن کا ذکر من جاء بالحسنة فله عشر الخ میں ہے۔ دوسرے حسنہ اور سیئة باعتبار طبع کہ طبیعت پسند کرے یا ناپسند کرے جیسے فاذا جاءتهم الحسنة قالوا لنا هذه اور جیسے اس آیت میں عفوا وہ بڑھ گئے وہ زیادہ ہو گئے۔ عفو سے جس کے معنے زیادہ ہونے کے ہیں۔ علامہ عزیزی نزہۃ القلوب میں لکھتے ہیں۔ عفوا بمعنی کثروا ہے۔ جب کوئی چیز زیادہ اور گھنی ہو جاتی ہے تو بولتے ہیں عفا الشیئ نیز عفا الشیئ کے معنے بوسیدہ اور ختم ہونے کے آتے ہیں اور یہ اضداد میں سے ہے۔ علامہ قرطبی نے شرح صحیح مسلم میں بھی یہی لکھا ہے۔ عفا اضداد میں سے ہے۔ زیادہ ہونے کے معنے میں بھی آتا ہے اور کم ہونے کے معنے میں بھی۔ ظاہر ہونے کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے اور پوشیدہ ہونے کے لیے۔ سراء نعمت فراخی خوشی اصل میں حالت شادمانی کا نام سراء ہے برکات، برکت کی جمع جس کے

معنے کسی چیز میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے خوبی اور بھلائی کے ثابت ہونے کے ہیں اور چونکہ خدا کی طرف سے خیر و خوبی غیر محسوس طریقے پر صادر ہوتی ہے۔ اور بے حد و بے شمار طریقے پر پائی جاتی ہے۔ اسی لیے ہر چیز کو جس میں غیر محسوس طور پر زیادتی مشاہدہ میں آتے مبارک اور بابرکت کہتے ہیں۔ اصل میں برک اونٹ کے سینے کو کہتے ہیں۔ اونٹ چونکہ سینہ ٹیک کر بیٹھتا ہے اسی لیے اس کے معنے ٹیکنے، ٹھہرنے، ثابت رہنے اور ایک جگہ جمے رہنے کے استعمال ہونے لگے۔ چنانچہ حوض کو برکہ اسی لیے کہتے ہیں کہ پانی رکا ہوا ہوتا ہے اور جس طرح حوض میں پانی جمع رہتا ہے اسی طرح کسی چیز میں بھی خیر و خوبی کے اکٹھا ہونے کا نام برکت ہے۔

وقائع و قصص اور قوانین اجتماعی

قرآن نے تذکیر و موعظت کے لیے جو باتیں بطور دلائل کے اختیار کی ہیں اور جنہیں وہ جابجا، حجج، براہین، بینات اور بصائر سے تعبیر کرتا ہے۔ ان میں ایک نمایاں استدلال، واقعات تاریخی کا ہے۔ اس نے جہاں کہیں گزشتہ قوموں کے حالات بیان کیے ہیں وہاں یہ بات بھی واضح کر دی ہے کہ اس بیان سے اس کا مقصود کیا ہے۔ قرآن کا مقصد تورات کی طرح دنیا کی تاریخ بیان نہیں کرنا بلکہ کچھ باتیں ہیں جن کا وہ دلوں میں اذعان پیدا کرنا چاہتا ہے اور یہ واقعات اس کے لیے دلیلیں ہیں۔ ان آیات میں اسی طرف اشارات کیے گئے ہیں کہ یہ سرگزشتیں کیونکہ دلیل، حجت اور برہان ہیں۔ غور فرمائیے جتنے رسول پیدا ہوئے وہ کیسے وقتوں میں پیدا ہوتے اور کن لوگوں میں پیدا ہوئے ان کی دعوت کیا تھی اور دعوت کی نوعیت کیا تھی۔ ان کی دلیلیں کیا تھیں جن پر انہوں نے زور دیا۔ ان کا طریق کار کیا تھا جس پر وہ برابر کاربند رہے انہوں نے اپنے قدم جہاں ٹکائے تھے وہ جگہ کون سی تھی اور سہارے کے لیے جس کی طرف ہاتھ بڑھایا وہ کون تھا۔ پھر ان میں اور ان کی قوموں میں جو معاملات پیش آتے وہ کس قسم کے تھے اور ان معاملات میں ان کا جو قول و فعل رہا وہ کس قسم کا تھا۔ آپ غور کریں گے تو آپ کو معلوم ہو جاتے گا کہ ان ساری باتوں میں ہر رسول دوسرے رسول کی تصویر تھا اور ہر دعوت دوسری دعوت کا عکس تھی۔ کسی بات میں بھی آپ ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ سب اسی حال میں پیدا ہوئے کہ دنیوی طاقتوں اور حکمرانیوں میں سے کچھ نہیں رکھتے تھے۔ سب کا ظہور ایسے ہی وقتوں میں جب خدا پرستی اور نیک عملی کی روشنی بجھ چکی تھی۔ سب انہی قوموں میں پیدا ہوئے جن قوموں

کو انہوں نے مخاطب کیا تھا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی پکار نکلی، سب نے ایک ہی طرح لوگوں کو
بلایا سب نے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا کوئی معبود نہیں، سب نے کہا کہ ظلم و بدعملی سے باز
آجاؤ اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ سب نے کہا۔ ہماری جدوجہد ادائے فرض ہے۔ مزدوری کی طلب ہے
سب نے کہا کہ ہمارے پاس علم و یقین ہے۔ ہم تمہیں جہل و گمان سے بچانا چاہتے ہیں۔ سب نے
کہا ہمارا دعویٰ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایمان و نیک عملی کے نتائج کی بشارت دینے والے ہیں۔ انکار و
بدعملی کے نتائج سے آگاہ کرنے والے ہیں ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے سب نے کہا تمہارا بھروسہ
اپنی طاقتوں پر ہے ہمارا پروردگار عالم پر تم جو کچھ کر سکتے ہو کر دیکھو ہم اپنے کام سے باز آنے
والے نہیں۔ سب نے کہا کہ اگر مانتے نہیں تو کم از کم حق کے مقابلہ سرکشی کرنا چھوڑ دو۔ سرکشی کا نتیجہ
عذاب ہے۔ پھر ان قوموں پر نظر ڈالو جن پر ان تمام دعوتوں کا ظہور ہوا تھا۔ یہاں بھی ہر قوم کا اپنے
طرز عمل میں ٹھیک ٹھیک دوسری قوم کی شبیہ ہے اور کس طرح گمراہی کا چہرہ ہمیشہ ایک طرح رہا۔
کوئی بات بھی ایسی نہیں جس میں ظلم و فساد کی ایک نمود ظلم و فساد کی دوسری نمود سے ہم آہنگ نہ ہو۔
سب نے اپنی اپنی باری وہی سب کچھ کیا جو ان میں سے کسی ایک نے کیا تھا۔ سب نے دعوت سے
انکار کیا۔ سب نے مذاق اڑایا۔ سب سرکشی اور گھمنڈ سے پیش آتے سب نے جبر و تشدد سے راستہ
روکنا چاہا۔ سب نے موعظت و دلائل کا جواب ظلم و تعدی سے دیا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی
طرح کی صدائیں نکلیں۔ سب کے اعراض و انکار کا مزاج ایک طرح کا رہا۔ نتیجہ بھی ہمیشہ ایک ہی
رہا۔ ہمیشہ خدا کے فیصلہ کا انتظار کیا گیا اور ہمیشہ فیصلہ یہی ہوا کہ مومنوں کو نجات ملی سرکشوں کے
لیے ہلاکت ہوئی۔ یہ گویا اس معاملہ کا قدرتی خاصہ تھا اور خاصہ کبھی بدل نہیں سکتا۔ یہ آگ کے لیے
گرمی تھی۔ برف کے لیے ٹھنڈک تھی۔ سنکھیا کے لیے ہلاکت تھی۔ یعنی ہر جگہ ایک ہی قانون ایک
ہی طرح کام کر رہا ہے۔ بلاشبہ لباس مختلف ہیں قوالب الگ الگ ہیں اور ناموں میں اختلاف ہے
مگر حقیقت ایک ہی ہے۔ ان آیات میں قرآن نے خصوصیت کے ساتھ اسی کی طرف توجہ دلائی
ہے۔ یہ دعوتِ حق کے ظہور و احوال کی یکسانیت ہے۔ چنانچہ پہلی آیت میں فرمایا کہ ہمیشہ سنتِ
الٰہی ایسی ہی رہی ہے اور تلک القریٰ اور اس کے بعد والی آیت میں واضح کر دیا ہے کہ گزشتہ
وقائع کے ذکر سے مقصود اسی حقیقت کی تلقین ہے۔

۱۲۴ — اور ہم نے جب کسی بستی میں کوئی نبی بھیجا تو ہمیشہ ایسا ہوا کہ اس کے باشندوں کو تنگ
حالی اور بدحالی میں مبتلا کر دیا تاکہ نیازمندی اختیار کریں۔ پھر ہم نے بدحالی کو خوش حالی میں تبدیل کر

یا تا آنکہ وہ خوش حالی میں خوب ترقی کر گئے اور کہنے لگے کہ ہمارے بزرگوں پر سختی کا دور بھی آیا اور راحت کا بھی، تو اچانک ہمارے عذاب کی پکڑ میں آ گئے اور وہ بالکل بے خبر تھے۔ یعنی پیغمبروں کی بعثت کے وقت جب عموماً لوگ تکذیب و مقابلہ سے پیش آتے ہیں تو خدا کی طرف سے ابتدائی تنبیہ کے طور پر بیماری قحط اور مختلف قسم کی سختیاں اور تکلیفیں مسلط کر دی جاتی ہیں۔ تاکہ مکذبین مار کھا کر شرارتوں سے باز آ جائیں اور بارگاہِ الٰہی کی طرف جھکیں۔ جب ان تنبیہات کا اثر قبول نہیں کرتے تو سختیوں اور مصیبتوں کو ہٹا کر ان پر فراخی اور عیش و خوشحالی وغیرہ بھیجی جاتی ہے کہ احسانات سے متاثر ہو کر کچھ شرمائیں اور حضرت ربوبیت کی طرف متوجہ ہوں یا عیش و ثروت کے نشے میں چور ہو کر بالکل ہی غافل و بدمست بن جائیں۔ گویا جہاں تک صحت و اولاد اور دولت و حکومت بڑھتی جائے اسی کے ساتھ ان کی نخوت و غفلت میں بھی ترقی ہو حتیٰ کہ پچھلی سختیوں کو یہ کہہ کر فراموش کر دیں کہ تکلیف و راحت کا سلسلہ تو پہلے ہی سے چلا آتا ہے۔ ہمارے کفر و تکذیب کو اس میں کچھ دخل نہیں۔ ورنہ اب خوشحالی کیوں حاصل ہوتی۔ یہ سب زمانے کے اتفاقات ہیں جو ہمارے اسلاف کو بھی اسی طرح پیش آتے رہے ہیں۔ اس حد پر پہنچ کر ناگہاں خدا کا عذاب آ دباتا ہے جس کی اپنے عیش و آرام میں انہیں خبر ہی نہیں ہوتی۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ

بندہ کو دنیا میں گناہ کی سزا پہنچتی رہے تو امید ہے کہ توبہ کرے اور جب گناہ راست آگیا تو یہ اللہ کا بھلاوا ہے پھر ڈر ہے ہلاکت کا جیسے کسی نے زہر کھایا اگل دے تو امید ہے اور اگر پچ گیا تو کام آخر ہوا۔[1]

اس پر سب کا اتفاق ہے کہ انبیاء اور ان کی قوموں کی تاریخی داستان بیان فرمانے کے بعد وہ جامع ضابطہ اور قانون بیان ہو رہا ہے جو ان تاریخی واقعات کے موقع پر اللہ سبحانہٗ نے اختیار فرمایا ہے۔ ابن جریر لکھتے ہیں معرفة سننه في الامم التي قد خلت من قبل امتك، پہلی امتوں کے واقعات میں اللہ کے قوانین و ضوابط کی ان آیات میں نشاندہی کی گئی ہے۔ ابن کثیر نے حافظ ابن جریر کی ہمنوائی کی ہے۔ قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی، ابوحیان اندلسی وغیرہ نے یہی سمجھا ہے آیت کے آغاز میں واو عاطفہ کے ذریعہ پچھلے تمام تاریخی واقعات کے ساتھ ان قوانین و سنن کو مربوط کیا گیا ہے۔ یعنی انبیاء کے ان کی تباہ شدہ قوموں کے ساتھ احوال یہ تھے اور اس موضوع

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پر ہمارا قانون یہ ہے - آیت میں قریہ کے معنے اس مرکزی آبادی کے ہیں جس میں قومی لیڈر اور حکمرانوں کا ڈیرہ ہوتا ہے جسے عرف میں دارالخلافہ کہتے ہیں - انبیاءؑ کی بعثت مرکزی مقام پر ہی ہوتی ہے - پہلی آیت میں گزشتہ قوموں میں انبیاءؑ کی دعوت کے سلسلے میں یہ قانون بتایا گیا ہے کہ جب نبوت کسی قوم میں کام شروع کرتی ہے تو نبی کے روانہ کرنے کے بعد یا اس سے پہلے اس قوم کے خارجی ماحول کو قبولِ دعوت کے لیے نہایت سازگار بناتے ہیں - صورت یہ ہوتی ہے کہ ان کو مصائب و آفات میں مبتلا کیا گیا - قحط، وبا، تجارتی خسارہ، جنگی شکست یا اور اسی طرح کی تکلیفیں ان پر ڈالی گئیں تاکہ ان کا دل نرم پڑے - ان کی شیخی اور تکبر سے اکڑی ہوئی گردن ڈھیلی ہو - ان کا غرور، طاقت اور نشۂ دولت ٹوٹ جاتے اپنے ذرائع و وسائل اور اپنی قوتوں اور اپنی قابلیتوں پر ان کا اعتماد شکست ہو جاتے - ان کو محسوس ہو کہ اوپر کوئی طاقت ہے جس کے قبضہ میں ان کی قسمت کی باگیں ہیں - اور اس طرح ان کے کان نصیحت کے لیے کھل جائیں اور دیکھ لیں کہ اللہ سبحانہ، جب چاہے اور جہاں سے چاہے ان کو پکڑ سکتا ہے - اصل ارشاد میں ما ارسلنا فی قریۃ من نبی الا اخذنا اھلھا اس میں اخذنا اھلھا کی تعبیر میں بہت گہری معنویت ہے - اخذنا حال ہے اور ارسلنا کی ضمیر سے حال ہے - حال کے لیے عام قاعدہ تو یہی ہے کہ جملہ حال ہو کر آئے - تو واو یا قد کے ساتھ آتا ہے - لیکن ان دونوں صورتوں میں صرف یہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ حال مقارنہ ہے - اگر آیت میں حال مقارنہ قرار دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ ان پر باساء اور ضراء کی حالت انبیاءؑ آنے کے بعد طاری ہوئی - جن لوگوں نے ایسا سمجھا ہے انہوں نے کذبوا محذوف مانا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ انبیاءؑ آئے، لوگوں نے انبیاءؑ کی تکذیب کی - پھر باساء اور ضراء کی حالت اس لیے پیدا ہوئی کہ لوگوں میں انبیاءؑ کے لیے جذبہ تصدیق رونما ہو - یہ مسئلہ اپنی جگہ درست ہے لیکن عبدالقاہر جرجانی نے یہاں ایک مفید بات لکھی ہے کہ حال مفردہ مقارنت کا فائدہ دیتا ہے مگر جملہ حالیہ یہ بھی بتاتا ہے کہ یہ کام پہلے سے ہو رہا تھا اور اب بھی ہو رہا ہے - آیت کا یہی مدلول ہے کہ نبی کی تشریف آوری کے بعد اور پہلے اللہ کی جانب سے لوگوں کی پکڑ شروع ہو جاتی ہے تاکہ نبوت کی دعوت کے قبول کرنے کے لیے زمین ہموار ہو جائے - مطلب یہ ہے کہ ایک قانون تو اللہ کا یہ ہے تنگ حالی اور بدحالی کی بھٹی میں لوگوں کو ڈالا جاتا ہے تاکہ لوگوں کی تربیت ہو جائے - اور فساد سے ہٹ کر لوگوں میں صلاح کی طرف میلان نمایاں ہو - مومن تو مومن شدائد اور مصائب میں پاپی کافر کو بھی خدا یاد آجاتا ہے - باساء سے مالی آفتیں مثلاً قحط گرانی، کساد بازاری وغیرہ اور ضراء سے جسمانی آفتیں مثلاً بیماریاں وغیرہ مراد ہیں - یہ تجربہ ہے کہ زمانہ جنگ ہو، قحط سالی ہو یا ہیضہ اور طاعون پڑ

جائے تو عام لوگوں کا میلان مساجد اور معابد کی طرف ہو جاتا ہے۔ نبی کی آمد سے پہلے اور نبی کی تشریف آوری کے بعد اس لیے کیا جاتا ہے کہ نبی کی دعوت کی بازگشت تمام عناصر کائنات سے سنائی دے ورنہ یہ قانون امہال سب کے لیے ہے اور عام ہے اور اس کا مقصد لوگوں کو جھنجھوڑنا اور بیدار کرنا ہے یہ ایک عام قانون اجتماعی ہے۔ اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ لوگوں کو جھنجھوڑا جائے اور بیدار کیا جائے یہی قانون قرآن نے ساتویں پارے میں ان الفاظ میں پیش کیا ہے ۔

ولقد ارسلنا الی امم من قبلك فاخذناهم بالباساء والضراء لعلهم يتضرعون۔

ہم نے تم سے پہلے بھی بہت سی اُمتوں کی طرف انبیاء روانہ کیے پھر ان قوموں کو تنگ حالی اور بدحالی میں گرفتار کیا تاکہ وہ اللہ کے حضور میں عجز و نیاز کریں ۔

یہ خدائی قانون آزمائش ہے یگانوں بیگانوں دونوں کے لیے ہوتا ہے یگانوں میں اس لیے ہوتا ہے کہ پتہ لگ جائے کہ مومن ہونے کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ ایمان کا اقرار کر لیا جائے بلکہ ضروری ہے کہ ان تمام آزمائشوں میں استقامت کا مظاہرہ کیا جائے جو ایمان کی راہ میں مشکلات کی صورت میں پیش آتی ہیں۔ گویا یگانوں میں باساء اور ضراء کی حالت استقامت اور ثابت قدمی دیکھنے کے اور کھرے کھوٹے سے ممتاز کرنے کے لیے ہوتی ہے اور بیگانوں میں یہی حالت اس لیے ہوتی ہے کہ وہ اللہ کے حضور عجز و نیاز کریں اور بد عملیوں سے باز آجائیں ۔ شدائد کے ذریعے تربیت اللہ کا قانون اور اس کی سنت ہے۔ باساء اور ضراء کے ذریعے پکڑنے کا مطلب یہ ہے کہ ان دونوں کا وہ لوگ شکار ہوتے لیکن اس کے باوجود ان کی آنکھیں نہ کھلیں اور ان میں عجز و نیاز ظاہر نہ ہوا۔ آیت کے آخر میں لعلهم يتضرعون فرما کر اشارہ کر دیا کہ ان کو باساء و ضراء میں مبتلا کرنے کا منشا عذاب نہیں تھا بلکہ یہ اور صرف یہ تھا کہ مصیبت میں مبتلا ہو کر ہر شخص کو خدا یاد آجاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اللہ سبحانہ، کا انداز تربیت ہے اور یہ بھی ارشاد کے انداز بیان سے معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ سبحانہ کسی قوم پر دفعتہً اور یکبارگی عذاب نازل نہیں فرماتے بلکہ بطور تنبیہہ تھوڑی سزائیں نازل فرماتے ہیں ۔

خطرناک اور انتہائی خطرناک سزا

قانون آزمائش کے بعد قانون امہال کو بیان کیا ہے ۔ ارشاد ہے ثم بدلنا مكان السيئة الحسنة حتى عفوا، یہ دوسرا قانون اجتماعی ہے۔ پہلے یہ بتایا ہے کہ قوموں اور اُمتوں کو چونکانے کے لیے ان کو

باساء اور ضراء میں مبتلا کیا جاتا ہے لیکن اگر وہ متنبہ نہیں ہوتے اور اس سازگار ماحول میں بھی اس کا دل قبولِ حق کی طرف مائل نہیں ہوتا تو بدحالی اور تنگ حالی کی جگہ خوش حالی آجاتی ہے۔ دُنیوی اسباب و وسائل کے ہر گوشہ میں ترقی و فراخی کے آثار نمایاں ہوتے ہیں۔ آزمائشوں اور تکلیفوں کے دن ذہنوں سے نکل جاتے ہیں اور اس کے کج فہم رہنما اس کے ذہن میں تاریخ کا یہ احمقانہ تصور بٹھاتے ہیں کہ حالات کا بناؤ بگاڑ کسی حکیم کے انتظام میں اخلاقی بنیادوں پر نہیں ہو رہا ہے بلکہ ایک اندھی طبیعت بالکل غیر اخلاقی اسباب سے کبھی اچھے اور کبھی بُرے دن لاتی رہتی ہے۔ لہٰذا مصائب اور آفات کے نزول سے کوئی اخلاقی سبق لینا اور کسی ناصح کی نصیحت قبول کر کے خدا کے آگے تضرع و زاری کرنا بجز ایک طرح کی نفسی کمزوری کے اور کچھ نہیں ہے۔ خوش حالی میں سرکش لوگ چھکنا اور اہلِ حق کا مذاق اڑانا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ عقل کے کوتاہ لوگ پچھلے قحط اور سیلاب کو ہمارے اعمال و افکار کی خرابی کا نتیجہ بتاتے تھے حالانکہ ان باتوں کا ایمان و اخلاق سے کیا تعلق اس قسم کی گردشیں تاریخ میں ہوتی رہتی ہیں۔ ان حالات سے ہم ہی دوچار نہیں ہوتے ہمارے باپ دادوں پر بھی یہ دن گزرے ہیں۔ یہ تو زمانے کے اتفاقات ہیں کبھی تنگی ہے کبھی فراخی ہے کبھی کاروبار میں ترقی ہوئی کبھی ناکامی، کبھی فصل اچھی ہوئی اور کبھی ماری گئی۔ کبھی سیلاب آگیا اور کبھی قحط پڑ گیا۔ یہ تو بین الاقوامی حالات کا طبعی تقاضا ہے۔ اور یہ عجیب بات ہے کہ دنیوی زندگی کی یہی سہولتیں بھی آسانیاں جنہیں قرآن نے یہاں الحسنہ کہا ہے۔ زندگی کی یہی شکل قوموں اور افراد کے لیے عصیان و تمرد کا قدرتی انتقام بھی بن کر نمودار ہوتی ہے۔ دُور سے نظارہ کرنے والے کے لیے یہی انتقام صلہ اور جزا معلوم ہوتا ہے لیکن خود اللہ سبحانہ کا بیان ہے کہ درحقیقت وہ باطنی سزا کی خطرناک انتہائی خطرناک صورت ہوتی ہے۔ اقوام کے متعلق اسکا عجیب و غریب قانون کا ذکر کرتے ہوئے قرآن میں بتایا ہے کہ اس قسم کی تادیلی ذہنیتیں رکھنے والی قوموں کے ساتھ اللہ کا عام دستور یہ ہے کہ کچھ دن کے لیے ان کو ڈھیل دی جاتی ہے ڈھیل ہی نہیں بلکہ ان مواقع کی ایسی آیتیں مثلاً سورہ انعام میں پڑھ چکے ہو فلما نسوا ما ذکروا بہ فتحنا علیہم ابواب کل شیٔ جب وہ بھول گئے ان باتوں کو جن سے چونکائے گئے ہیں یا زیرِ تشریح والی آیت ثم بدلنا مکان السیئۃ الحسنۃ وغیرہ سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ حالات سے بھی زیادہ ان پر آسانیوں کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں اور کل شیٔ یعنی ہر قسم کی چیزوں کے اور زندگی کے تمام شعبوں کے دروازے ان پر کھل جاتے ہیں۔ السیئۃ برائیوں کو الحسنہ سے بدل دیا جاتا ہے۔ گویا مٹی ان کے ہاتھوں میں پہنچ کر ایسی حالت میں سونا بنتی جاتی ہے۔ وہ بڑھتے ہیں بڑھائے جاتے ہیں اور بڑھاتے چلے جاتے ہیں حتیٰ عفوا کے

یہی معنے ہیں کہ اس زمانہ میں ترقی و عروج، ارتقاء، اعتلاء کی انتہائی بلندیوں پر ان کو پہنچا دیا جاتا ہے اور اس کے بعد یہ فرمایا:

قالوا قد مس اباءنا الضراء والسراء فاخذنا هم بغتة وهم لا يشعرون

اور بولے کہ ہماری گزشتہ نسلوں کو بھی دکھ اور سکھ نے چھوا تھا بس ہم نے اُن کو اچانک آلیا اس طرح کہ ان کو پتہ بھی نہ تھا۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ ان ساری ترقیوں، اولوالعزمیوں کے بعد قدرت کا مخفی ہاتھ اچانک ان کو پکڑ لیتا ہے اور اس طرح پکڑتا ہے کہ ان کا سارا کیا کرایا برباد ہو کر رہ جاتا ہے۔ سرکش دماغی قوموں کے ساتھ اللہ سبحانہ' کا یہ انتقامی برتاؤ جو بظاہر سرفرازیوں کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے ان لوگوں کے لیے بڑا صبر آزما اور انتہائی خطرات کا سبب بن جاتا ہے جن کو انجام سے پہلے انتقام کے اس عجیب و غریب عبوری دور میں زندگی گزارنی پڑتی ہے۔ سب کچھ دیا جاتا ہے ان کو انتقاماً اور مجرمانہ غفلتوں پہ تازیانہ اور عبرت بنا کر تاکہ ان کی غفلتوں میں اضافہ ہو جائے۔ سیئہ کی جگہ اس حسنہ کی ٹوپی اڑھانے سے مقصد یہ اور صرف یہ ہوتا ہے کہ ان کو اندھا بنایا جائے اور خوش حالیوں، مرفہ الحالیوں اور ترقیوں کی ڈاٹیں ان کے کانوں میں اس طرح ٹھونسی جاتی ہیں کہ نیکی کی راہوں سے بیگانہ ہو جائیں لیکن وہ اپنی جگہ اس خوش فہمی میں مگن رہتے ہیں کہ ہم ہی اللہ کے پیارے ہیں اور ان لوگوں میں ہیں جن کو خدائی نعمتوں کے لیے اللہ نے چن لیا ہے۔ اسی مغالطی قالب کے بارے میں قرآن نے یہ تنبیہہ کی ہے:

فلا تعجبك اموالهم ولا اولادهم انما يريد الله ليعذبهم في الحياة الدنيا وتزهق انفسهم وهم كافرون۔

تو دیکھو یہ بات کہ لوگوں کے پاس مال و دولت ہے اور صاحبِ اولاد ہیں۔ تمہیں حیران نہ کرے یہ تو اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ نے مال و اولاد ہی کی راہ سے ان کو دُنیا میں عذاب دینا چاہا ہے اور ان کی جانیں اس حال میں نکلیں گی کہ ایمان سے محروم ہوں گے

اس میں بتایا گیا ہے کہ ان کا حال اہلِ ایمان کے ایمان کو نہ لرزا دے صاف لفظوں میں اعلان کر دیا گیا ہے کہ الاموال اور الاولاد کی یہ وہی قسم ہے جس کے ذریعے اللہ سبحانہ' ان لوگوں کو سزا دیتا ہے اور منشا یہی ہے کہ اسی ناشکری اور ایمان سے محرومی کی حالت میں ان کو موت اس طرح آئے کہ پھر نکلنے اور سنبھلنے کا ان کو موقعہ نہ ملے۔

قوموں کی حد تک تو شاید الحسنہ خوش حالی کا یہ سزائی قالب ایسا نہیں ہے جسے پہچاننے والے نہ

پہچان سکیں۔ دُنیا میں ایسی قومیں جن کی زندگی کا ہر شعبہ ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت پر مبنی ہے اور اس کے ساتھ ان کا ہر باغیانہ اقدام ان کے لیے اچھے سے اچھے دنوں کو فراہم کر رہا ہے۔ اپنی طغیانیوں میں جس قدر آگے ہوتے جاتے ہیں اسی قدر ابواب کل شیئ اور الحسنہ کے کھلنے کا سلسلہ بھی زیادہ سے زیادہ ہوتا جاتا ہے۔

اگر آپ خدا اور رسُول کو مانتے ہیں قرآن کو انسانی دماغ کا خود تراشیدہ نظام نہیں سمجھتے بلکہ نسل انسانی کے جینے اور مرنے کا قدرتی اور لاہوتی دستور تسلیم کرتے ہیں تو آپ کے لیے اس کے سوا اور راہ کون سی ہے جس کی اطلاع قرآن میں دی گئی ہے۔ ہر قرآن خوان اور قرآن دان قرآن سے یہی بات سمجھے گا اور اس کو اس کے سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہ آئے گی۔ قابلِ رحم تو وہ مسکین ہے جو ایک طرف تو خدا کو بھی مانتا ہے اس کے رسُول کو بھی سراہتا ہے لیکن اللہ کے باغیوں اور رسُول کے دشمنوں پر نعمتوں کی بارش دیکھ کر اور السیئۃ کی جگہ الحسنہ دیکھ کر اس انتقام کو انعام اور اس سزا کو وہ عمل کی جزا اوروں کے کرتوتوں کا صلہ ماننے لگے۔ ایک لیڈر تو اسی راہ میں بہک کر اہلِ یورپ کے بارے میں یہاں تک کہہ گئے۔

المغربیّون اولٰئک ھم المومنون حقاً

یورپ کے باشندے ہی سچے اور پکے مومن ہیں۔

اوروں کا پتہ نہیں کم از کم میں اپنے قرآنی مطالعہ کی روشنی میں اس قسم کے دماغوں کی ذہنی دستول کو سمجھنے سے قاصر ہوں۔ اگر خدا کی ان باغی قوموں کے ساتھ یہ مردم شماری کے مسلمان بھی قرآن سے خدا سے رسُول سے بغاوت کر دیتے اور اس وقت یہ بات کہتے تو اس کی کوئی گنجائش ہوتی لیکن جس تناقض اور تضاد کا شکار موجودہ حالات میں ان کا دماغ ہے اس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہیں آتی ہے۔

بہرحال ان دو آیتوں میں دو قانون بتائے گئے ایک کی اساس مصائب ہے جب کہ دوسرے کی عمارت معاصی پر کھڑی ہے۔ ظاہر ہے کہ مصیبت کا وزن معصیت سے ہلکا ہے۔ پہلا اگر اس لیے ہے کہ لوگوں میں توبہ و استغفار کی طرف میلان ہو تو دوسرا اس لیے ہے کہ ان کے لیے ہلاکت اور تباہی ہو۔ قومِ عاد، قومِ ثمود اور اصحابِ مدین کے واقعات میں اس کی تصویر پیش ہو چکی ہے۔ ان قوموں پر عذاب کے قوالب اگرچہ مختلف ہیں۔ عاد پر کسی طرح کا عذاب اترا، ثمود پر کسی اور طرح کا۔ اہلِ مدین پر کسی دوسری صورت میں مگر عذاب کی شکلیں اور صورتیں خواہ کتنی مختلف

ہوں وہ قانون جس کے تحت یہ عذاب نازل ہوا ہے ایک ہی ہے۔ قانون یہ اور صرف یہ ہے کہ جب کسی قوم کی خوشحالی بڑھ جاتی ہے تو وہ غلط کاری اور گمراہی کی طرف مائل ہو جاتی ہے اور خود بخود اس کی عملی قوتوں کا رُخ صلاح سے فساد کی طرف پھر جایا کرتا ہے۔

یہ عذابِ الٰہی کا قانون جس طرح پچھلی قوموں پر جاری ہوتا رہا ہے اسی طرح آج بھی اس کا عمل جاری ہے اور اگر بصیرت ہو تو آج آپ خود اپنی آنکھوں سے اس کے نفاذ کی کیفیت ملاحظہ کر سکتے ہیں۔ مغرب کی وہ عظیم الشان قومیں جن کی دولت مندی، خوشحالی، طاقت و جبروت، شان و شوکت، عقل و ہنر کو دیکھ کر نگاہیں خیرہ ہوتی جاتی ہیں اور جن پر ابواب کل شیئ کی پیہم بارشوں کے مشاہدے سے یہ دھوکا ہوتا ہے کہ شاید یہ خدا کے بڑے ہی مقبول اور چہیتے بندے اور خیر و صلاح کے مجسمے ہیں۔ ان کی اندرونی حالت پر ایک فائر نگاہ ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ وہ عذابِ الٰہی کے اسی قانون کی گرفت میں آچکے ہیں۔ وہی صنعت و حرفت کی فراوانی وہی تجارت کی گرم بازاری، وہی شعورِ سیاست کی کامیابی وہی علوم حکمیہ و عقلیہ کی ترقی، وہی نظامِ معاشرت کی سر بفلک بلندی جس نے ان قوموں کو دنیا پر غالب کیا اور روئے زمین پر ان کی دھاک بٹھائی۔ آج ایک ایسا خطرناک جال بن کر ان کو لپیٹ گئی ہے جس کے ہزاروں پھندے ہیں اور ہر پھندے میں ہزاروں مصیبتیں ہیں۔ وہ اپنی عقلی تدبیروں سے جس پھندے کو کاٹنے کی کوشش کرتے ہیں اس کا ہر تار کٹ کر ایک نیا پھندا بن جاتا ہے اور رہائی کی ہر تدبیر مزید گرفتاری کا سبب بن جاتی ہے۔ ان کی حیثیت ان قوموں سے قطعاً مختلف نہیں ہے جن کو ماضی میں اللہ کی نعمتوں پر شکر کی توفیق نہیں ہوئی اور جن کو اللہ کی گرفت خدا کی نافرمانی سے نہ بچا سکی۔ یہ اپنے علوم و فنون کی نعمتوں کو کمزوروں پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے استعمال کر رہے ہیں۔ دن رات اقتداری جنگ میں مصروف ہیں اور فسق و فجور میں بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہے ہیں اللھم اعذنا من شرور انفسھم و سیئات اعمالھم۔

ہمارے شارحینِ قرآن نے ان آیات میں بیان کردہ ضوابط کی افراد کی حد تک تو خوب وضاحت کی ہے لیکن اجتماع اور عمران کے موضوع پر وہ بالکل خاموش ہیں۔ حالانکہ یہاں قرآن کا روئے سخن اقوام ہیں افراد نہیں۔ افراد منطوق کے درجہ میں نہیں بلکہ مدلول کے درجہ میں ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام میں تصوف کی توجہات کا مرکز افراد کی اصلاح اور ذاتی تزکیہ ہے اور قرآن کی بیشتر تشریحات اسی دور کی تخلیقات ہیں۔

آسمان وزمین کی برکتیں اور ایمان وتقویٰ

۹۶ ۔ اور اگر ان بستیوں والے ایمان لاتے اور برائیوں سے بچتے تو ہم آسمان اور زمین کی برکتوں کے دروازے ان پر کھول دیتے لیکن انہوں نے جھٹلایا لہٰذا ہم نے ان کو ان کی کمائی کی وجہ سے جو انہوں نے حاصل کی پکڑ لیا ۔ یعنی ہم کو بندوں سے کوئی ضد نہیں جو لوگ عذاب الٰہی میں گرفتار ہوتے ہیں یہ انہی کی کرتوتوں کا نتیجہ ہے ۔ اگر یہ لوگ ہمارے پیغمبروں کو مانتے اور حق کے سامنے گردن جھکا دیتے اور کفر وتکذیب سے بچ کر تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو ہم ان کو آسمانی وزمینی برکتوں سے مالا مال کر دیتے ۔ امام رازی رحمہ اللہ نے فرمایا کہ برکت کا لفظ دو معنے میں استعمال ہوتا ہے ۔ کبھی تو خیر باقی ودائم کو برکت سے تعبیر کرتے ہیں اور کبھی کثرت آثار فاضلہ پر یہ لفظ اطلاق کیا جاتا ہے ۔ لہٰذا آیت کی مراد یہ ہوگی کہ ایمان وتقویٰ کے اختیار کرنے پر ان آسمانی وزمینی نعمتوں کے دروازے کھول دیئے جاتے جو دائمی اور غیر منقطع ہوں یا جن کے آثار فاضلہ بہت کثرت سے ہوں ایسی خوش حالی نہیں جو مکذبین کو چند روز کے لیے بطور امہال واستدراج حاصل ہوتی ہے اور انجام کار دنیا میں ورنہ آخرت میں تو ضروری وبال جان بنتی ہے [1]

آیت کا بغیر کسی توجیہ وتاویل کے صریح مطلب یہی ہے کہ آسمان وزمین کی برکتیں جو ہمارے معاشی فوائد ہی کی دوسری تعبیر ہے ہم ان کو ایمان و تقویٰ کی قوت سے بھی حاصل کر سکتے ہیں جیسے ایمان وتقویٰ کو فراموش کرکے دوسرے ناجائز ذرائع فسق وفجور وغیرہ سے دنیا کی مادی منفعتیں اہل دنیا حاصل کرتے ہیں ۔ اور جس کی طرف قرآن نے بدلنا مكان السيئة الحسنة ، میں اشارہ کیا ہے اور جس کی سورہ انعام کی اس صراحت سے

فلما نسوا ما ذكروا به فتحنا عليهم ابواب كل شيئ

جب ہماری تذکیر کو بھول جاتے ہیں تو ہم ہر چیز کے ان پر دروازے کھول دیتے ہیں ۔

پہلی صورت یعنی ایمان وتقویٰ کے نتیجہ میں جو کچھ ملے انعام واکرام کی ہے دوسری صورت یعنی معاصی کی موجودگی ، چیزوں کی فراوانی انتقام کی ہے ۔ ایمان وتقویٰ کی بنیاد پر جو برکات حاصل ہوتی ہیں ان برکات سے انسانی زندگی کتنی شگفتہ ، پاک اور صاف وستھری ہوتی ہے ۔ قرآن کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اصطلاح میں اسی کا نام حیاۃ طیبہ ہے ارشاد ہے :

من عمل صالحاً من ذکر او انثیٰ وھو مومن فلنحیینہ حیاۃ طیبۃ ،

مرد ہو یا عورت اگر ایمان و عمل صالح رکھتا ہے تو ہم ضرور اسے زندہ رکھیں گے ستھری زندگی کے ساتھ۔

آیت میں اھل القریٰ سے مراد وہی قومیں ہیں جن کی تکذیب کی داستان قرآن بیان کر چکا ہے فرمایا کہ لوگ ایمان لاتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے تو اللہ تعالیٰ ان سے یہ معاملہ نہ کرتا کہ ایک مہلت دینے کے بعد ان کو عذاب میں پکڑ لیتا بلکہ ان کے لیے آسمان و زمین دونوں طرف سے اپنی بے پایاں برکتوں کے دروازے کھول دیتا۔

دوسرے یہ کہ ایمان و تقویٰ کی زندگی جس طرح آخرت میں خدا کی رحمتوں کی ضامن ہے اسی طرح دنیا میں اگر کوئی قوم ایمان و تقویٰ کو اختیار کرے تو یہ زمین و آسمان کی برکتوں اور فیروز مندیوں کی کلید ہے بلکہ قرآن کی آیت

الذین امنوا وکانوا یتقون لھم البشریٰ فی الحیاۃ الدنیا و فی الاخرۃ ، لا تبدیل لکلمات اللہ ،

میں اسی ایمان و تقویٰ کو آخری نجات سے پہلے دنیوی کامیابیوں کی بشارت کا ذریعہ قرار دے کر اللہ سبحانہ نے اپنی ایسی بابت یا ایک ایسا قانون قرار دیا ہے جو کبھی بدل ہی نہیں سکتا یعنی ایسی اٹل بات ہے جو اپنے مقررہ نتیجے سے جدا نہیں ہو سکتی۔ مطلب یہی ہوا کہ ایمان و تقویٰ کسی میں پایا جائے اور اس کی زندگی ان نتائج سے محروم ہو ایسا کبھی ہو نہیں سکتا۔

بہرحال آیت میں اس اجتماعی قانون کی نشاندہی کی گئی ہے کہ ایمان و تقویٰ کو اپنانا دنیا میں انعامات و برکات کا ذریعہ ہے اور ایمان و تقویٰ والی جماعت اور قوم ان انعامات کی حقدار ہے۔ یہ قرآن کی آیت صاف اور کھلے طور پر بتا رہی ہے کہ اللہ سبحانہ ایمان و تقویٰ کا سرمایہ رکھنے والوں کو آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی بھی آسائش اور عزت و اقتدار بخشے گا۔ کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اور اہل اسلام کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ بدل جاتے۔ چنانچہ وہ نہیں بدلا، اور دنیوی فلاح کے بارے میں ٹھیک اسی طرح کا وعدہ اس امت سے بھی کیا گیا ہے جیسے پہلوں سے کیا جاتا رہا ہے اور ہر مرحلے میں کیا گیا۔ مکہ کے تاریک ماحول میں بھی کیا گیا اور مدینے کے پُر خطر دور میں بھی۔ انہیں بھی خطاب کیا گیا جو ابھی اسلام نہیں لاتے تھے اور انہیں بھی

جو اسلام لا چکے تھے۔ ایمان و تقویٰ کی شرطیں پوری کرنے کے نتیجے میں یہ قانون اہل اسلام کے حق میں کیسے پورا اترا اس سے دُنیا نا واقف نہیں ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اسلام نے مسلمان کو ایمان و تقویٰ کی بنیاد پر وہ سب کچھ دیا جو دُنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہو سکتا ہے۔ آج بھی قرآن کی چیختی ہوئی صدا یہی ہے کہ ایمان و تقویٰ یا ایمان و عمل صالح کی دولت فراہم کرو اور آسمانی و زمینی برکتوں کا آنکھوں سے مشاہدہ کرو۔

شاید آپ کے ذہنوں میں یہاں یہ سوال چٹکیاں لے کہ دین تو انسان کو آخرت کی طرف بھگاتا اور دُنیا سے بے پروا بناتا ہے پھر اسے ایمان و تقویٰ کی بنیاد کیسے مل سکتی ہے؟ اس سوال کا جواب معلوم کرنے اور اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے یہ دو اصولی باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

ایک تو یہ کہ یہ دولت یہ عزت یہ اقتدار حکومت جنہیں دُنیا کی فلاح کہا جاتا ہے یا جو برکات من السماء والارض ہے دین کی نگاہ میں بجائے خود معیوب نہیں ہیں۔ بلکہ اللہ سبحانہ کی نعمت اور اس کا فضل ہیں چنانچہ قرآن عزیز کی متعدد آیات میں یہ بات کھول کر سمجھائی گئی ہے۔

دوسری بات یہ کہ انسان اس دُنیا میں اللہ کا خلیفہ اور نائب بنا کر پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا منصب ہی یہ ہے کہ وہ اس زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھے اور اسے اپنے مالک کے احکام و مرضیات کے مطابق چلائے۔

یہ دونوں حقیقتیں اگر سامنے ہوں تو زیر بحث سوال اس حد تک بالکل حل ہو جاتا ہے کہ دُنیا کی عزت، دولت اور اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے تعلق رکھنا اور فائدہ اٹھانا دین و ایمان کے منافی ہو کیونکہ جو چیزیں اللہ کا فضل و احسان ہوں وہ اس کے حق شناس بندوں کے لیے ممنوع نہیں ہو سکتیں۔ اس طرح کی چیزوں کے بارے میں اللہ تعالیٰ کا تو ارشاد یہ ہے ھی للذین آمنوا فی الحیاۃ الدنیا خالصۃ یوم القیامہ، اس کے معنے یہ ہیں کہ ان چیزوں کے اصل حقدار اللہ کے فرمانبردار بندے ہی ہیں۔ اگر ان چیزوں کے حقدار اللہ تعالیٰ کے فرمان بردار بندے ہی ہیں تو وہ ان کے لیے ناپسندیدہ اور نامطلوب کسی طرح نہیں ہو سکتیں۔ خدا شناس بندے اس کی نعمتوں سے بھاگتے نہیں نعمتوں سے نہیں بھاگتے۔ یہ تو ہوا دنیوی عزت دولت کے نعمت و فضل ہونے کا تقاضا اب انسان کے پیدائشی منصب کو سامنے رکھ کر غور کیجئے کہ اس کا تقاضا کیا ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ نے انسان کو خلیفہ بنایا ہے اور چاہتا ہے کہ اس زمین پر وہ اس کے احکام کے مطابق اپنے اختیارات کو استعمال کرے تاکہ یہاں بھی اس کی مرضی پوری ہوتی رہے جس طرح کہ باقی کائنات میں پوری ہو رہی ہے

توجب تک یہاں ایسے لوگ موجود ہوں جو اپنے اس فرض منصبی کا پورا احساس رکھتے ہوں اس وقت تک یہ بات اللہ تعالیٰ کی حکمت، دانائی اور انصاف کے بالکل خلاف ہوگی کہ انہیں اس زمین کے اقتدار و اختیار سے محروم رکھے اور ان کے ہوتے ہوتے یہ اقتدار ان لوگوں کے سپرد کر دے جو اپنے اس فرض منصبی کے منکر ہوں اور اپنے بارے میں خلیفہ ہونے کی پوزیشن ہی کو نہ مانتے ہوں اور اس دنیا میں اپنی آزاد حاکمیت کے یا کسی اور حاکمیت کے مدعی ہوں۔ ان تمام پہلوؤں پر غور کیجئے تو آپ خود محسوس کریں گے کہ مسلمان آخروی فلاح ہی کا نہیں بلکہ دنیوی فلاح کا بھی حقدار اور طلبگار ہوتا ہے اور اس کے لیے ایسا ہونا اس کی سچی دینداری ہی کا تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچے اور صحیح الفکر مسلمان کی دعا اپنے خدا سے یہ ہوتی ہے ربنا اٰتنا فی الدنیا حسنة و فی الاخرة حسنة و قنا عذاب النار اور واجعلنا للمتقین اماماً، آخر میں اس حقیقت کا یاد دلانا بھی مناسب ہوگا کہ جس طرح سچا ایمان و تقویٰ آخرت کی فلاح کے لیے ضروری ہے اسی طرح دنیا کی فلاح کے لیے بھی ضروری ہے۔ یعنی دنیوی برکتوں کے دروازے مسلمانوں پر اس وقت کھولے جاتے ہیں جب وہ ایمان و تقویٰ کی شرط پوری کر دیتا ہے۔ غرض جہاں اللہ تعالیٰ کا یہ ایک عمومی وعدہ ہے کہ وہ اپنے دین کے ماننے والوں کو دنیوی فلاح سے بھی نوازتا ہے وہاں اس آیت کی رو سے اس کا یہ بھی ایک عمومی ضابطہ ہے کہ یہ ایمان و تقویٰ کی لازمی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان و تقویٰ کے بغیر صرف آخرت ہی کی نہیں دنیا کی فلاح بھی ہاتھ نہیں آسکتی۔ دین کے بغیر صحیح معنوں میں دنیا بھی نہیں مل سکتی۔ یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے۔ کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں۔ افراد کو بھی اپنی انفرادی زندگی کی دنیوی فلاح مثلاً امن و سکون، عزت و محبوبیت اور ضروریات زندگی وغیرہ اسی وقت ملے گی جب وہ اپنی حد تک ایسے خدا شناس اور آخرت پسند ہوں جیسا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی حقیقت کی وضاحت کی تھی جب آپ نے یہ فرمایا تھا۔

> جس نے اپنے کل کی فکر ایک ہی فکر اپنی آخرت کی فکر کو بنا لیا اللہ تعالیٰ اس کی دنیا کا انتظام کر دینے کے لیے کافی ہے اور جس کے ذہن کو بے شمار افکار نے منتشر کر رکھا ہو اللہ کو اس کی کوئی پروا نہیں کہ وہ اس دنیا کی کس گھاٹی میں ہلاک ہوتا ہے۔

اسی طرح امت کو بھی اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح، آزادی، دولت مندی، سربلندی، اقتدار اور بین الاقوامی احترام وغیرہ اسی وقت میسر آسکتی ہے جب وہ اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع امت ہو۔

بہر حال اس آیت میں بتایا ہے کہ دنیوی برکتوں کو ایمان و تقویٰ کے ذریعے حاصل کیا جا سکتا ہے اور ایمان و تقویٰ کے ذریعے جو برکات حاصل ہوتی ہیں وہ اللہ کا انعام ہیں جیسا کہ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ نافرمانیوں کے بحران میں جو چیزوں کی فراوانی ہوتی ہے وہ انعام نہیں بلکہ اللہ کی جانب سے سزا اور انتقام ہوتی ہے۔

خدا کی گرفت سے کوئی نہیں بچ سکتا

۱۲۶ - کیا شہروں کے بسنے والوں کو اس بات سے امان کا پروانہ مل گیا ہے کہ ہمارا عذاب راتوں رات آنازل ہو اور وہ سوتے ہوں یا انہیں اس بات سے امان مل گئی ہے کہ دن کی روشنی میں ان پر عذاب آجاتے اور وہ کھیل کود میں مشغول ہوں۔ یعنی جب عیش و آرام میں غافل پڑے سو رہے ہوں یا دنیا کے کاروبار اور لہو و لعب میں مشغول ہوں اس وقت خدا کا عذاب ان کو دفعتہً آگھیرے۔ اس بات سے یہ لوگ کیوں نڈر اور بے فکر ہو رہے ہیں۔ حالانکہ جن اسباب کی بنا پر گزشتہ اقوام پر عذاب آتے وہ ان میں بھی موجود ہیں۔ یعنی کفر و تکذیب اور سید الانبیاء کے ساتھ مقابلہ و محاربہ[1]

اس آیت میں بھی اشارہ ان ہی قوموں کی طرف ہے جن کا ذکر پہلے سے ہو رہا ہے یعنی قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود اور قوم مدین، ان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے مزہ آں گفتہ آید در حدیث دیگراں کے انداز پر قریش مکہ کو توجہ دلائی ہے کہ تمہارا معاملہ بھی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ وہی کچھ ہے جو ان قوموں کا اپنے پیغمبروں کے ساتھ تھا۔ وہ خدا کے عذاب کے مقابلہ میں کچھ نہ کر سکے۔ ان پر خدا کا عذاب رات کی تاریکی میں اس وقت بھی آیا جب وہ سو رہے اور دن کی کھلی روشنی میں اس وقت بھی جب وہ اپنی دلچسپیوں اور سرگرمیوں میں مصروف تھے اور یہ نتائج تھے ان کی بدکاریوں اور نافرمانیوں کے، جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے آثار و خواص بھی پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح اس دنیا میں انسانی اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو ان سے الگ نہیں ہو سکتے۔ کفر و شرک، فسق و فجور، بے ایمانی، غرور و ظلم کا ایک نہ ایک اثر و نتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص و لوازم ہیں جو اس سے اسی طرح الگ نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے سمیت اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی۔ اور ان معنوی، روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت و معلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی، مادی اور طبیعاتی اشیا میں ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو قوانین ہیں وہی جماعتوں، قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت پر بھی حاوی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہاں قوانین کی بے لاگ عدالت ہے۔ خدا کی تدبیر بے اماں ہے کسی کی طاقت نہیں کہ اس سے بچ سکے جس طرح ماضی میں قانون نے کسی کا لحاظ نہیں کیا حال اور مستقبل میں بھی وہ سب کے لیے یکساں ہے۔ ماضی کی داستان میں ایک فریق نبی ہے جس کی دعوت جس کی نصیحت و خیر خواہی اور جس کی ساری باتیں بعینہٖ وہی ہیں جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہیں اور دوسرا فریق حق سے روگرداں قوم ہے جس کی اعتقادی گمراہیاں جس کی اخلاقی خرابیاں جس کی جاہلانہ ہٹ دھرمیاں جس کے سرداروں کا استکبار جس کے منکروں کا اپنی ضلالت پر اصرار غرض سب کچھ وہی ہے جو قریش میں موجود ہے۔ اگر وہاں اعمال کے نتائج رات کی تاریکیوں اور دن کی روشنیوں میں اگر ان کو تباہ کر سکتے ہیں تو قریش کو کون بچا سکتا ہے۔ ان کو اگر خدا کے قوانین کا علم ہوتا تو وہ دن رات یوں اطمینان سے نہ گزارتے۔ کیونکہ نعمتوں کا ہونا۔ ان کے دوام کی دلیل نہیں ہے۔

خدائی قانون کی گرفت سے بے فکر قومیں

۱۲۷۔ کیا ان کو خدا کی مخفی تدبیروں سے اماں مل گئی ہے یاد رکھو خدا کی مخفی تدبیروں سے بے خوف وہی ہوتے ہیں جو تباہ ہونے والے ہوتے ہیں۔ دُنیوی خوشحالی اور عیش کے بعد جو خدا کی ناگہانی پکڑ ہے اسی کو مکر اللہ (خدا کا داؤ) فرمایا ہے۔ عیش و تنعم میں پڑ کر وہ بھی لوگ خدا کی ناگہانی گرفت سے بے فکر ہوتے ہیں جن کی شامتِ اعمال نے انہیں دھوکا دیا ہو۔ مومن کی شان یہ ہے کہ وہ کسی حال خدا کو نہ بھولے۔

ظفر اس کو آدمی نہ جانیے گا گو ہو کیسا ہی صاحب فہم و ذکا
جسے عیش میں یادِ خدا نہ رہی جسے طیش میں خوفِ خدا نہ رہا [1]

مکر کے معنے مخفی داؤ اور تدبیر کے ہیں۔ امام راغب نے لکھا ہے کہ اللہ کی خفیہ تدبیر کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ اپنے قوانین و ضوابط کے نفاذ میں ایسا طریقہ اختیار کرتا ہے جو لوگوں کی نگاہوں سے مخفی ہوتا ہے اور وہاں سے پکڑتا ہے جہاں سے پکڑے جانے کا گمان بھی نہیں ہوتا۔ اللہ کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

طاقتور اپنی قوت پر سرمایہ دار اپنے سرمایہ پر، عالم اپنے علم پر، عابد اپنی عبادت پر مغرور ہوتا ہے اور اسے دھوکہ ہوتا ہے کہ ملی ہوئی نعمت باقی رہے گی۔ اور نہیں جانتا کہ اللہ کے داؤ کیسے مخفی اور ناگہاں ہوتے ہیں زلزلے کے اسباب شب و روز نشوونما پاتے رہتے ہیں۔ سیلاب ایک لمحہ کی برف باری ہی کا نتیجہ نہیں ہوتا۔ آتش فشاں پہاڑوں کا لاوا برسوں تک کھولتا رہتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ چپکے چپکے یہ سب کام کرتا رہتا ہے لیکن ہم دن رات گزارتے رہتے ہیں اور ایک لمحہ کے لیے گمان بھی نہیں ہوتا کہ کوئی غیر معمولی بات ہونے والی ہے یہاں تک کہ اچانک اس کا داؤ نمودار ہو جاتا ہے اور ہم یک قلم غفلت و سرمستی میں سرشار ہوتے ہیں فلا یامن مکر اللہ الا القوم الخاسرون [1] مطلب یہ ہے کہ کیا انہوں نے اطمینان کر لیا ہے کہ ان کا سیاسی اقتدار ہمیشہ برقرار رہے گا اور کسی روز ان کی وجاہت و قوت پہ کوئی دھاوا نہ بولے گا۔ کیا ان کو یقین ہے کہ ان کی تندرستیاں اور صحتیں باقی رہیں گی اور کسی روز بیماری کے جراثیم ان کی بستیاں نہ دیکھیں گے۔ کیا انہوں نے اس کی کوئی ضمانت لے لی ہے کہ افرادی قوت ہمیشہ قائم رہے گی اور کوئی طاعون اور کوئی ہیضہ اور ایسے ہی دوسرے وبائی امراض سے کوئی مرض پھیل کر ان کی افرادی طاقت کو ختم نہ کر دے گا کیا وہ اس سے بے خوف ہو چکے ہیں کہ ایک دن یکایک ان کے گھروں، تنوروں، ان کے کنوؤں اور ندی نالوں سے کوئی ایسا ہی سیلاب نہ آ جائے گا جیسے قوم نوح پر آیا تھا۔ کیا ان کو اطمینان ہے کہ ان کے مکانوں، کارخانوں اور دکانوں پر قوم عاد کی طرح سات رات اور آٹھ دن تک مسلسل آندھی کا طوفان آکر تباہی و بربادی نہ مچا دے گا اور کیا ان کو یہ اندیشہ نہیں ہے کہ قوم ثمود کی طرح ان کی بلند بالا عمارات زلزلہ کی نذر نہ ہو جائیں گی۔ اور کیا ان کو اطمینان ہے کہ قوم لوط کی طرح ان پر پتھروں کی بارش نہ ہو گی اور کیا وہ حق کا مقابلہ کر کے اور نبوت کی تکذیب کر کے یہ خیال نہیں کرتے کہ قوم شعیب کی طرح ان پر آگ کے شعلے اور چنگاریاں برس کر ان کی ساری ترتیبوں کو ختم کر دیں گے۔ یقیناً یہ سب کچھ ہو سکتا ہے اور اللہ کی خفیہ تدبیر اس داؤ پر ہے لیکن فلا یامن مکر اللہ الا القوم الخاسرون۔ یاد رکھو اللہ نے فطرت کے تمام مظاہر کے لیے ایک خاص بھیس مقرر کیا ہے وہ جب کبھی آئے گی تو اسی بھیس میں آئے گی اس کا بھیس بدل نہیں سکتا لیکن اس کے ظہور کے مقاصد ہمیشہ یکساں نہیں ہوتے اور حقیقت حال انسانی علم کی دسترس سے باہر ہے۔ اس لیے

[1] ترجمان القرآن

عذاب کا ظہور اگرچہ قدرت کی عادی و جاری صورتوں میں ہوتا ہے لیکن اس لیے ہوتا ہے کہ انکار و کردار کے نتائج لوگوں کے سامنے آجائیں اور پیغمبروں نے ان کے ظہور کی پہلے سے خبر دے دی تھی۔

انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہلاکت

۱۲۸۔ کیا جو لوگ ملک والوں کے ہلاک ہونے کے بعد ملک کے وارث ہوتے ہیں یہ بات نہیں جانتے کہ اگر ہم چاہیں تو ان کو بھی گناہوں کی پاداش میں مصیبتوں میں ڈال دیں اور ان کے دلوں پر مہر کر دیں کہ کوئی بات ہی نہ سنیں۔ جیسے پہلوں کو پکڑ لیا تمہیں بھی پکڑ لیں گے

الذین یرثون الارض صیغہ حال ہے اور اس سے مراد قریش مکہ ہیں اور من بعد اھلہا سے ماضی کے حکمران مراد ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قریش مکہ جو اب ملک میں حکمرانی کر رہے ہیں پچھلے حکمرانوں کے حکومت میں وارث ہیں اور یہ پچھلے حکمران وہی ہیں جن کا قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط، قوم شعیب کے نام کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ سب عرب قومیں تھیں اور اسی ملک کے مختلف حصوں میں حکومت کرتی تھیں۔ اب ان کی ہی وراثت قریش مکہ کو ملی ہے۔ قریش کے لیے ان قوموں میں جن کے زوال کی داستانیں ابھی ابھی قرآن نے سنائیں کافی رہنمائی موجود ہے۔ قریش اگر دانائی سے کام لیں تو سمجھ سکتے ہیں کہ کچھ مدت پہلے جو لوگ یہاں دادِ عیش دے رہے تھے اور جن کی عظمت کا جھنڈا یہاں لہرا رہا تھا انہیں فکر و عمل کی غلطیوں نے برباد کیا اور یہ بھی محسوس کر سکتے ہیں کہ جس بالاتر اقتدار نے کل انہیں ان کی غلطیوں پر پکڑا تھا اور ان سے یہ جگہ خالی کرائی تھی وہ آج کہیں چلا نہیں گیا ہے۔ نہ اس سے کسی نے یہ طاقت و قوت سلب کر لی ہے قریش مکہ اگر وہی بد عنوانیاں کریں جو عاد و ثمود کرتے رہے ہیں تو وہ ان کو بھی اسی طرح اقتدار سے محروم نہ کر سکے جس طرح اس نے ان سے پہلوں کو محروم کیا تھا یعنی قریش کو اپنے مورخوں کی تاریخ سے عبرت حاصل کرنا چاہیے۔ فرمایا کہ اللہ سبحانہ نے جس قانون سے ان کو ہلاک کیا وہ اسی قانون سے قریش کو کیوں ہلاک نہ کرے قریش مکہ کیوں نہیں سوچتے کہ جس طرح ہم نے ان کو ان کے جرموں کی پاداش میں سزا دی۔ اسی طرح جب چاہیں قریش کو بھی ہلاک کر دیں گے۔

تاریخ کا فلسفہ قرآن میں

یہ اور اس قسم کی دوسری آیات میں اشارہ ہے کہ قرآن میں تاریخی واقعات کی حیثیت تاریخی داستان کی نہیں ہے بلکہ یہ کچھ باتیں ہیں جن کا وہ دلوں میں اذعان پیدا کرنا چاہتا ہے اور یہ تاریخی حقائق اس کے لیے دلیلیں ہیں حجتیں ہیں براہین ہیں۔ یہ بات کہ کیونکر یہ تاریخی حقائق بینات و دلائل ہیں۔ اس آیت میں اسی کی طرف اشارہ ہوا ہے اولم یھد للذین یرثون الارض من بعد اھلھا میں بتایا ہے کہ جس طرح ہر بات کے لیے خدائی قوانین موجود ہیں اسی طرح قوموں، جماعتوں کی سعادت و شقاوت اور حیات و ممات کا بھی ایک قانون ہے اور جس طرح اللہ سبحانہ کے سارے قوانین یکساں ہیں عالمگیر ہیں غیر مبدل ہیں۔ اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک طرح رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی۔ جس طرح سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہی ہے خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں کھائی جائے اسی طرح اس قانون کے احکام و نتائج بھی یکساں ہی ہوں گے خواہ وہ کسی ملک اور کسی عہد میں پیش آئیں یہ نہیں ہو سکتا کہ قوم عاد کے زمانے جو اعمال موجب ہلاکت تھے وہ اب زندگی کا سامان ہو جائیں۔

ایک اور اجتماعی قانون

اس آیت میں من اھلھا کے بعد اصبنا ھم بذنوبھم سے یہ قاعدہ بھی نکلتا ہے کہ ہلاکت و بربادی کا سبب انفرادی شر و فساد نہیں بلکہ قرآن کی نظر میں اجتماعی اور قومی شر و فساد ہے یعنی اعتقاد اور عمل کی خرابیاں اگر متفرق طور پر افراد میں پائی جاتی ہوں لیکن مجموعی طور پر قوم کا دینی و اخلاقی معیار اتنا بلند ہو کہ افراد کی برائیاں اس کے اثر سے دبی رہیں تو خواہ افراد علیحدہ علیحدہ کتنے ہی خراب ہوں قوم بحیثیت مجموعی سنبھلی رہتی ہے اور کوئی فتنہ عام برپا نہیں ہوتا جو پوری قوم کی بربادی کا موجب ہو مگر جب اعتقاد اور عمل کی خرابیاں افراد سے گزر کر پوری قوم میں پھیل جاتی ہیں اور قوم کا دینی احساس اور اخلاقی شعور اس درجہ ماؤف ہو جاتا ہے کہ اس میں خیر و صلاح کے بجائے شر و فساد کو پھیلنے اور اور پھولنے کا موقعہ ملنے لگے تو اس وقت اللہ تعالیٰ کی نظر عنایت ایسی قوم سے ہٹ جاتی ہے اور وہ عزت کے مقام سے ذلت کی طرف گرنے لگتی ہے یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آتا ہے کہ اللہ کا غضب اس پر بھڑک جاتا ہے اور اس کو بالکل تباہ و برباد کر دیا جاتا ہے۔ اس سورت میں جو واقعات

بیان ہوتے ہیں وہ اس کی ہی مثالیں ہیں۔

قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط اور قوم شعیب اہل مدین کے حالات کا قرآن میں بغور مطالعہ کرو تو محسوس ہوگا کہ ان کا بربادی کا الزام کن حالات میں ہیا؟ انشاء اللہ اس کی مزید توضیح اسی جلد کے آخر میں آرہی ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے ونطبع علی قلوبھم فھم لا یسمعون۔

دلوں پر قہر الہٰی کی تمہید ہے

یہ بھی اگرچہ قریش مکہ کو دھمکی ہے لیکن اصل میں قانون بتایا جارہا ہے کہ مغضوبیت اور خدا کے یہاں سے مردود ہونے کی نشانی یہ ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگ جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں وہ حق سننے سے محروم ہوتے ہیں۔ قرآن میں جہاں بھی اس قسم کی تعبیر آئی ہے وہاں پہلے یا بعد میں لوگوں کے گناہوں کا ذکر ضرور ہوتا ہے یہاں بھی پہلے اصبناھم بذنوبھم ہے مطلب یہ ہے کہ جن کو ہم حکومت دیتے ہیں اور جو لوگ حکومت کو اپنے مورثوں سے وراثت میں حاصل کرتے ہیں ان کے لیے ضروری ہے کہ دُنیا میں پھونک پھونک کر قدم اٹھائیں مفسد اور ظلم کار نہ بنیں اور نہ بدکار سرمایہ دار ہوں۔ اور یہ بات کان کھول کر سن لیں کہ سیئات کی پاداش میں امتوں پر عذاب آتا ہے۔ ماضی میں اس کی بہت مثالیں ہیں۔ اور یہ واقعات کوئی وقتی حادثہ نہیں بلکہ اللہ کے قانون کا ناگزیر تقاضا ہیں اس میں کسی کی کوئی رعایت نہیں۔ اس میں دو قسم کے لوگ ہیں ایک طبقہ وہ ہے جو گناہ کرتا ہے لیکن گناہ کے بعد ندامت محسوس کرکے توبہ کی طرف قدم اٹھا دیتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا طبقہ ہے جو گناہ کرتا ہے اور گناہ کیے ہی جاتا ہے۔ تا آنکہ گناہ اس کے دل پر کندہ ہو جاتا ہے۔ یعنی جب وہ تاریخ سے اور عبرتناک آثار کے مشاہدے سے سبق نہیں لیتے اور اپنے آپ کو خود بھلاوے میں ڈالتے ہیں تو پھر خدا کی طرف سے بھی ان کو سوچنے اور سمجھنے اور کسی ناصح کی بات سننے کی توفیق نہیں ملتی۔ خدا کا قانون فطرت یہی ہے کہ جو اپنی آنکھیں بند کر لیتا ہے اس کی بینائی تک آفتاب روشن کی کوئی کرن نہیں پہنچ سکتی اور جو خود سننا نہیں چاہتا اسے پھر کوئی کچھ سُنا نہیں سکتا۔ یہ نہ سننا اور نہ دیکھنا خود بخود نہیں بلکہ اس لیے ہوتا ہے کہ اللہ ان کے دلوں پر مُہر لگا دیتا ہے اور اللہ کا مہر لگانا ایک بلیغ استعارہ ہے اللہ کی جانب سے ضلالت کے فیضان کے لیے اس کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ ان کے دلوں پر مُہر لگا دیتے ہیں کہ سنتے نہیں جب کفر کا صدور ہوتا ہے تو خدا کی طرف سے مُہر لگ جاتی ہے۔ ارشاد ہے۔

بل طبع اللہ علیھا بکفرھم یہاں ان کا کفر خدا کی مُہر پر مقدم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے اور یہی خدا کی مُہر ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں خدا کی اس مہر کا یا کسی کو ہدایت نہ دیے جانے کا ذکر ہے وہاں اس کے ساتھ کفر و فسق کی علت ہمیشہ ذکر کی گئی ہے۔ ان آیتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ انسانوں کی بداعمالی مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے مہر لگنا فرمانا مؤخر ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے دلوں پر مہر لگنا علت اور انسانوں کا کفر معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے کہ کفر علت ہے اور مہر لگنا معلول ہے یعنی انسانوں کا کفر پہلے سے ہوتا ہے اور خدا کی طرف سے دل پر مہر بعد میں لگائی جاتی ہے اور یہی طبعی اصول بھی ہے کہ انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے تب آنسو کے قطرے ٹپک آتے ہیں۔ اگر کوئی اسے الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی نادانی ہوگی۔

یہاں نطبع کی تعبیر سے قریش کو دھمکی دی ہے کہ ابھی تو ہم نے ان کے دلوں پر مہر نہیں لگائی ہے لیکن یہ لوگ کفر کی جس روش پر بڑھتے جا رہے ہیں وہ وقت دور نہیں ہے کہ ہم ان کے دلوں پر مہر کر دیں اور یہ سننے سے بالکل رہ جائیں۔

قرآن کے قصص کا حجت ہونا

۱۲۹۔ اے پیغمبر یہ آبادیاں جن کی داستانیں ہم تمہیں بتا رہے ہیں ان سب میں ان کے پیغمبر واضح اور روشن دلیلوں کے ساتھ آتے مگر ان کے بسنے والے اس بات پر ایمان نہ لا سکے جن کو ان کے پیشرو جھٹلا چکے تھے۔ اسی طرح اللہ ہٹ دھرمی سے انکار کرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتا ہے۔ یعنی جس چیز کا ایک دفعہ انکار کر بیٹھے پھر کتنے ہی نشان دیکھیں دنیا اِدھر سے اُدھر ہو جائے ممکن نہیں کہ اس کا اقرار کر لیں جب حق تعالیٰ کے مقابلہ میں کسی قوم کی ضد اور ہٹ دھرمی اس درجہ تک پہنچ جاتی ہے تب اصلاحِ حال و قبولِ حق کا امکان باقی نہیں رہتا۔ یہ ہی صورت دلوں پر مُہر لگا دینے کا کیا مطلب ہے۔ فائدہ، ولقد جاءتھم رسلھم بالبینات سے معلوم ہو گیا کہ جو انبیاء علیہم السلام قوم نوح، عاد، ثمود، قوم لوط، اہل مدین کی بستیوں کی طرف مبعوث ہوتے وہ سب بینات واضح نشانات دے کر بھیجے گئے۔ پس ہود علیہ السلام کی قوم کا یہ کہنا یاھود ماجئتنا ببینۃ، محض لغت اور عناد کی راہ سے تھا۔

یہ آیت بھی مہمات معارف میں سے ہے اس میں چار حقائق پیش کیے گئے ہیں اول یہ کہ تلک القریٰ نقص علیک من انبائہا عام شارحین قرآن اس فقرہ کو ناقابل تشریح سمجھ کر چھوڑ دیتے ہیں ترجمہ یہ ہے کہ اے پیغمبر یہ ہیں آبادیاں جن کے حالات ہم تمہیں سناتے ہیں - یہ بات بطور استیناف کے اس طرح پیش کی گئی ہے کہ محسوس ہوتا ہے کہ اپنی جگہ بڑی غیر معمولی اور بے حد اہمیت کی حامل ہے یہاں بیان وقائع میں یہ بات ملحوظ رکھی گئی ہے کہ سرزمین عرب اور اس کے اطراف و جوانب ہی کے وقائع ہوں - البتہ اس آیت کے انداز سے یہ معلوم ہو رہا ہے کہ قرآن کے مخاطب ان واقعات کی تفصیلات سے ناآشنا تھے اور بعض وقائع ایسے تھے جن کی صرف کانوں میں بھنک پڑی تھی لیکن کوئی نہیں جانتا تھا کہ معاملہ کس طرح پیش آیا اور صحیح سرگزشت کیا ہے نہ صرف عرب میں بلکہ ان خطوں میں بھی جہاں وہ پیش آئے تھے جن وقائع کا ذکر تورات میں موجود تھا ان کی بھی بعض حقیقتیں عرف ہو گئی تھیں یا بھلا دی گئی تھیں - اور خود اہل کتاب کو بھی خبر نہ تھی کہ اصلیت کیا ہے؟ قرآن نے ان واقعات کی حقیقت ٹھیک ٹھیک بیان کر دی - ہر معاملہ اپنی صورت میں واضح ہو گیا - بعض وقائع کی نسبت تصریح کر دی کہ اس سے باشندگان عرب بالکل ناآشنا تھے یعنی نام تو سنا تھا مگر اس کی تفصیلات اور جزئیات کا کسی کو پتہ نہ تھا -

پھر قرآن نے جغرافیائی لحاظ سے یہاں جن خطوں کی اقوام کا ذکر کیا ہے - دنیا کو ان کی قدیم تاریخ بہت کم معلوم تھی - اور خود عرب اور عربی نسل کی ابتدائی سرگزشتیں بھی پردہ خفا میں مستور تھیں لیکن اٹھارہویں صدی سے آثار قدیمہ کی تحقیقات کا نیا سلسلہ شروع ہوا، اور پھر انیسویں صدی میں نئے نئے پردے اٹھے اور اب بیسویں صدی کے اکتشافات روز بروز ایک خاص رخ پر جا رہے ہیں ان سب سے عرب عراق، فلسطین، شام اور مصر کی قدیم قوموں اور تمدنوں کے جو حالات منکشف ہوئے ہیں انہوں نے ان خطوں کی قدیم تاریخ کو بالکل ایک نئی شکل دے دی ہے - سب سے زیادہ عجیب بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ عربی نسل اور عربی زبان کے صرف اتنے ہی معنے نہیں ہیں جتنے آج تک سمجھے گئے ہیں بلکہ یہ قوموں اور نسلوں کی ایک نہایت قدیم اور وسیع داستان ہے اور وہ دنیا کی ابتدائی تمدنوں میں عظیم حصہ لے چکے ہیں - اس سلسلے میں تین باتیں نمایاں طور پر سامنے آتی ہیں -

اولاً یہاں تلک القریٰ کہہ کر جن اقوام کی طرف اشارہ کیا گیا ہے ان کی خصوصیت اتنی ہی نہیں ہے کہ بعض سرزمین حجاز کے قرب و جوار میں گزر رہی تھیں اور بعض سے اہل کتاب واقف تھے بلکہ اس سے بھی زیادہ کوئی گہری بات ہے کیونکہ معلوم ہوتا ہے یہ تمام قومیں اصلاً ایک نسلی حلقہ

کی ہیں۔
ثانیاً، اس سے ایک اور مسئلہ بھی صاف ہوجاتا ہے۔ قرآن نے اس سورت میں ترتیب ظہور کے ساتھ دعوتوں کا ذکر کیا ہے۔ قوم نوح کے بعد قوم عاد اور عاد کے بعد ثمود نمایاں ہوتی ہے اور ان تینوں کو ایک دوسرے کا جانشین بتایا ہے۔ چونکہ ان تینوں کا جغرافیائی محل ایک دوسرے سے الگ تھا اس لیے یہ بات واضح نہیں تھی کہ اس کا صحیح مطلب کیا ہے لیکن اب بات بالکل واضح ہوگئی کہ یہ تمام قومیں ایک ہی نسلی حلقہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

بہرحال تلک القریٰ نقص علیک من انبائھا میں اس کی توضیح کی گئی ہے کہ قوم عاد، قوم نوح، قوم ثمود، قوم لوط، اور قوم شعیب کے واقعات ہم آپ کے گوش گزار اس لیے کر رہے ہیں تاکہ معلوم ہوجائے کہ تاریخ میں اور واقعات کی روشنی میں اللہ کا معاملہ منکر قوموں کے ساتھ کیا جارہا ہے۔

دوسری بات ان قوموں کے بارے میں یہ فرمائی ہے لقد جاءتھم رسلھم بالبینات اس میں بتایا ہے کہ ان قوموں کے پاس ان کے انبیاء روشن اور واضح دلائل اور براہین لے کر آئے یہ نبیوں کی صداقت کی دلیلیں تھیں اور وہ معجزات تھے جن کا ان کی قوموں نے انبیاء سے مطالبہ کیا تھا۔ بینات اصل میں صفت ہے اس کا موصوف محذوف ہے۔ الآیات البینات، یہاں جتنے انبیاء کا ذکر آیا ہے ان میں سب کو اللہ سبحانہ کی جانب سے اعجازی آیات عطا کی گئیں۔ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت لوط، اور حضرت شعیب سب کو ان کی نبوت کے دعویٰ کے لیے بطور دلیل معجزہ عطا ہوا ہے۔ انبیاء کرام میں غیر معمولی آیات و دلائل انہی انبیاء کو مرحمت ہوتے جن کو سخت و شدید معاندین اور منکرین کا سامنا کرنا پڑا ہے اور ضرورت بھی ان کو ہی تھی کہ ان کے عقائد و افکار کا وہ ان کے ذریعے سے جواب دے سکتے تھے اور ظاہر ہے کہ جن انبیاء کا یہاں ذکر ہوا ہے ان کا سابقہ ایسے ہی معاندین سے ہوا ہے۔ اس بحث کا یہاں موقعہ نہیں ہے کہ معجزہ دلیل ہے یا نہیں اور اگر ہے تو کیونکر۔ اس مسئلہ پر سب سے زیادہ سیر حاصل بحث ابن رشد نے کشف الادلہ میں کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہوسکتا کیونکہ منطقیانہ حیثیت سے دعویٰ اور دلیل میں مناسبت کا ہونا ضروری ہے۔ اور معجزہ اور نبوت میں کسی قسم کی مناسبت نہیں پائی جاتی لیکن ہمیں اس سے اتفاق نہیں ہے۔ دراصل نبوت علم و عمل کے مجموعہ کا نام ہے اور جو شخص نبوت کا دعویٰ کرتا ہے وہ فی الواقع دونوں میں کمال کا دعویٰ کرتا ہے اور اسی کمال کے اظہار

کے لیے اس سے معجزہ طلب کیا جاتا ہے اور انبیاء کے معجزات اگرچہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں تاہم ان کو صرف دو نوع میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اخبار بالغیب اور تصرف فی الکائنات اور ان دونوں کا نبوت کے ساتھ ربط و اتحاد ہے۔ اخبار بالغیب سے نبوت کے علمی کمال کا اور تصرف فی الکائنات سے اس کی عملی قوت ظاہر ہوتی ہے یہ کہنا کہ منطقیانہ حیثیت سے دعویٰ اور دلیل میں کوئی مناسبت نہیں بالکل درست ہے کیونکہ معجزے کے دلیل نبوت ہونے کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ نبوت کی منطقی دلیل ہے دلیل کا لفظ یہاں منطقی محاورہ میں نہیں بلکہ عام اور لفظی معنے میں استعمال ہوا ہے اس لیے جب معجزہ سرے سے دلیل منطقی ہی نہیں تو دعویٰ اور دلیل میں مناسبت تلاش کرنا بے محل ہے اور یہ تلاش بھی بے سود ہے کہ وہ انواع دلیل کی کس قسم میں داخل ہے بلکہ معجزہ کی دلالت نبوت پر عقلی نہیں بلکہ عادی ہے مطلب یہ ہے کہ معجزہ منطقی نہیں بلکہ نفسیاتی دلیل ہے۔ عادتِ انسانی یہ ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی غیر معمولی کارنامہ ظاہر ہوتا ہے تو لوگ اس کی عظمت و کبریائی کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں جب ایک شخص عام انسانی حالات سے بلند تر سطح میں ہو کر منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور خوارق عادات اس سے ظاہر ہوتے ہیں تو عام متاثرین خود اس دعویٰ کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

بہرحال اس فقرے کے ذریعے قرآن نے یہ بتایا ہے کہ ان قوموں کے سامنے پیغمبر ان قوموں کے پاس دعویٰ کی پشت پر دلیل کی طاقت لے کر آئے تھے۔

تیسری بات یہاں یہ ارشاد ہوئی فما کانوا لیومنوا بما کذبوا بہ من قبل وہاں کے بسنے والے ایسے نہ تھے کہ جو بات پہلے جھٹلا چکے تھے اسے مان لیں۔ یعنی ان لوگوں کی طبیعتیں انبیاء کے معجزے سے اثر پذیر نہیں ہوئی تھیں بلکہ انھوں نے عناد کورباطنی اور تعصب کا مظاہرہ کیا اور نتیجہ یہ نکلا کہ ان کے لیے یہ خوارق و معجزات قطعاً بے سود رہے کیونکہ ان کا عناد تعصب اور کور باطنی حسن ظن کے بجائے ان میں سوئے ظن کے جراثیم کی تخلیق کر رہا تھا وہ بڑے بڑے معجزے کو دیکھ کر یہی کہہ دیتے تھے کہ یہ سحر و جادو اور طلسم و نیرنگ ہے۔ اس آیت کی تفسیر میں شارحین قرآن نے دو مختلف زاویوں سے دادِ سخن دی ہے اوّل یہ کہ بما کذبوا ایمان کا صلہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ وہ ایسے نہ تھے کہ جس چیز کو پہلے جھٹلا چکے تھے اسے مان لیں۔ بیشتر شارحین قرآن نے یہی بات سمجھی ہے لیکن کچھ کے خیال میں بما کذبوا کی با ایمان کا صلہ نہیں بلکہ باسببیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان نہ لانے کا سبب یہ ہے کہ وہ پہلے سے خدا کی آیتوں کو جھٹلاتے رہتے تھے یعنی تکذیب حق کے چونکہ وہ عادی مجرم تھے اس لیے وہ ایمان نہیں لاتے۔ لیکن مرحوم السید رشید رضا نے اسے ذوق عربیت کے خلاف قرار

دیتے ہوتے لکھا تاویل واہ جداً یہ بہت ہی واہی تباہی توجیہ و تفسیر ہے کیونکہ اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ رسولوں کی تشریف آوری سے پہلے ہی زمانہ جاہلیت میں نبوت کی تکذیب کرتے تھے اس لیے انہوں نے بینات کی تکذیب کردی اس میں کوئی معنویت نہیں ہے اور پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ نبیوں کے آنے کے بعد وہ نبیوں کی تکذیب کر چکے تھے اس لیے جب انبیاء نے معجزات پیش کیے ان کی بھی انہوں نے تکذیب کردی ۔ بتانا یہ ہے کہ انبیاء کی تشریف آوری کے بعد سے لے کر پوری عمر وہ تکذیب ہی کرتے رہے ۔

جو نہی بات یہ فرمائی ہے کذالک یطبع اللّٰہ علی قلوب الکافرین ۔یعنی اس قسم کے لوگ جن کے اوصاف یہ ہوں کہ حق سے ان کو عناد ہو، ضلالت پر اصرار ہو، دلائل و بیّنات سے متاثر نہ ہوں اور کفران کی طبیعت بن جاتے ان کے دلوں پر اللہ مُہر لگاتا ہے ۔ یہ مُہر لگانا تعبیر ہے خدا کی طرف سے ضلالت آنے کی ۔گویا پچھلی آیت میں جو ارشاد ہوا و نطبع علی قلوبھم اس کی تشریح اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں فرمادی ۔ اس تشریح سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ دلوں پر مُہر لگنے سے مراد ذہن انسانی کا اس کے نفسیاتی قانون کی زد میں آجانا ہے جس کی رو سے ایک دفعہ جاہلی تعصبات یا نفسانی اغراض کی بناپر حق سے منہ موڑ لینے کے بعد پھر انسان اپنی ضد اور ہٹ دھرمی کے اُلجھاؤ میں اُلجھتا ہی چلا جاتا ہے اور کسی مشاہدے اور کسی تجربے سے اس کے دل کے دروازے قبول حق کے لیے نہیں کھلتے ۔

فطری شعور فطرتِ انسانی کا عہد ہے

۱۰۲ ۔ اور ان میں سے اکثر کو ہم نے ایسا پایا کہ اپنے عہد پر قائم نہ تھے اور ان کے اکثر کو ہم نے بالکل نافرمان پایا ہے ۔عہد سے ممکن ہے عام عہود مراد ہوں یا خاص الست مراد ہو یا وہ عہد جو مصائب اور سختیوں کے وقت کرتے تھے کہ فلاں سختی اٹھالی جاتے تو ہم ضرور ایمان لے آئیں گے جیسے فرعون نے کہا تھا،

لئن کشفت عنا الرجز لنؤمنن لک ولنرسلن معک بنی اسرائیل

فلما کشفنا عنھم الرجز الی اجل ھم بالغوہ اذا ھم ینکثون ۔

اگر تیری دُعا سے عذاب ٹل گیا تو ضرور ہم تیرے معتقد ہوجائیں گے اور بنی اسرائیل کو ہم چھوڑ دیں گے کہ تیرے ساتھ چلے جائیں لیکن پھر جب ایسا ہوا کہ ہم نے ایک خاص وقت تک کے لیے کہ انہیں اس تک پہنچنا عذاب ٹال دیا تو دیکھو وہ اچانک اپنی بات سے پھر گئے لے

اصل ارشاد میں لفظ عہد آیا ہے۔ عہد تین طرح کا ہوتا ہے۔ فطری، شرعی اور عرفی۔ ارشاد میں تینوں کی نفی ہے۔ عہد فطری سے وہ عہد مراد ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے تمام اولادِ آدم سے اپنی ربوبیت کا اقرار لیا ہے اور وہ اس طرح کہ اللہ نے ان سے سوال کیا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں سب نے اقرار کیا ہے کہ ہاں بے شک تو ہمارا رب ہے اور ہم اس کے گواہ ہیں۔ اس عہد کا ذکر قرآن نے ایک اہم واقعہ کی حیثیت سے کیا ہے اور روزِ اول کا وہ عہد و پیمان ہے جو خالص و مخلوق کے درمیان ہوا تھا اور یہ اسی عہد و پیمان کا احساس ہے جو انسان کے رگ و ریشے میں سرایت کیے ہوئے ہے کہ ہزار انکار کے بعد بھی کسی نہ کسی رنگ میں وہ اعتراف نمایاں ہو جاتا ہے۔ اس کی تفصیل اسی جلد میں آرہی ہے عہد شرعی وہ عہد و پیمان ہے جو ہر مومن نبوت سے ایمان کی صورت میں کرتا ہے۔ انقیادِ باطن، التزامِ طاعت، عہد وفاداری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق صرف علم ہی کا ایک مرتبہ رہتی ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ ایمان صرف تصدیق نہیں ہے بلکہ انقیادِ قلبی اور التزامِ طاعت اس کا اہم جزء ہے اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہدِ وفاداری نہیں کرتا تو وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔

عہدِ عرفی یہ کہ باہم لین دین میں انسان ایک دوسرے سے عہد کرتے ہیں جس سے انسانی قدریں اخلاقی قدریں پروان چڑھتی ہیں۔

قرآن نے ما وجدنا لاکثرھم من عہد کہہ کر اگر چہ ہر قسم کے عہد کی ان سے نفی کر دی ہے یعنی کسی قسم کے عہد کا بھی ان میں پاس نہیں ہے نہ اس فطری عہد کا پاس ہے جس میں پیدائشی طور پر ہر انسان خدا کا بندہ اور پروردہ ہونے کی حیثیت سے بندھا ہوا ہے نہ اس اجتماعی عہد کا پاس ہے جس میں ہر فرد بشر انسانی برادری کا ایک رکن ہونے کی حیثیت سے باندھتا ہے اور نہ اس ذاتی عہد کا پاس جو آدمی اپنی مصیبت اور پریشانی کے لمحوں میں یا کسی جذبۂ خیر کے موقعہ پر خدا سے بطور خود باندھا کرتا ہے ان ہی عہدوں کے توڑنے کو یہاں فسق کہا ہے۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْۢ بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى بِاٰيٰتِنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَظَلَمُوْا بِهَا ۚ
فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿١٠٣﴾ وَقَالَ مُوْسٰى يٰفِرْعَوْنُ
اِنِّيْ رَسُوْلٌ مِّنْ رَّبِّ الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٠٤﴾ حَقِيْقٌ عَلٰٓى اَنْ لَّآ اَقُوْلَ
عَلَى اللّٰهِ اِلَّا الْحَقَّ ۗ قَدْ جِئْتُكُمْ بِبَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّكُمْ فَاَرْسِلْ
مَعِيَ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿١٠٥﴾ قَالَ اِنْ كُنْتَ جِئْتَ بِاٰيَةٍ فَاْتِ بِهَآ
اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ﴿١٠٦﴾ فَاَلْقٰى عَصَاهُ فَاِذَا هِيَ ثُعْبَانٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٠٧﴾
ع ١٣ ٩ ٣ وَّنَزَعَ يَدَهٗ فَاِذَا هِيَ بَيْضَآءُ لِلنّٰظِرِيْنَ ﴿١٠٨﴾ قَالَ الْمَلَاُ مِنْ
قَوْمِ فِرْعَوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ عَلِيْمٌ ﴿١٠٩﴾ يُّرِيْدُ اَنْ يُّخْرِجَكُمْ
مِّنْ اَرْضِكُمْ ۚ فَمَاذَا تَاْمُرُوْنَ ﴿١١٠﴾ قَالُوْٓا اَرْجِهْ وَاَخَاهُ وَاَرْسِلْ
فِي الْمَدَآئِنِ حٰشِرِيْنَ ﴿١١١﴾ يَاْتُوْكَ بِكُلِّ سٰحِرٍ عَلِيْمٍ ﴿١١٢﴾

پھر ان قوموں کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیوں کے ساتھ
فرعون اور اُس کے درباریوں کے پاس روانہ کیا لیکن اُنھوں نے

ہماری واضح نشانیوں کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کیا تو دیکھو اُن
مُفسدوں کا انجام کیا ہوا[۱۳۱]۔ اور حضرت موسیٰ نے کہا اے فرعون
میں رب العالمین کا فرستادہ ہوں، میرا فرضِ منصبی یہی ہے
کہ اللہ کے بارے میں حق گوئی کو اپناؤں میں تمہارے پاس
تمہارے مالک و آقا کی جانب سے اپنی رسالت کی واضح دلیل
لے کر آیا ہوں[۱۳۲]۔ لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کر دے[۱۳۳]
فرعون نے کہا کہ اگر تو اپنی رسالت پر کوئی نشانی لے کر آیا ہے،
تو اگر تو سچوں میں سے ہے نشانی پیش کر، موسیٰ علیہ السلام
نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو اچانک وہ واضح طور پر ایک اژدہا
بن کر سامنے آگیا، اور اپنے جیب سے ہاتھ نکالا تو وہ بھی
یکایک سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا[۱۳۴]۔ قوم
فرعون کے سرداروں نے کہا کہ یہ تو فن کار جادوگر ہے[۱۳۵]۔

تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے بتاؤ تمہاری کیا
صلاح ہے۔[۱۳۶] پھر اُن سب نے (باہم مشورے کے بعد) فرعون
سے کہا کہ موسیٰ اور اس کے بھائی کو ڈھیل دے دو اور سارے
شہروں میں ہرکارے بھیج دو کہ تمام شہروں سے فن کار جادوگر
اکٹھے کرکے تیرے حضور لے آئیں۔[۱۳۷]

معانی مفردات

فرعون، اس کے معنے ہیں سورج دیوتا کی اولاد، قدیم اہل مصر سورج دیوتا کو جو ان کا مہا دیو یا رب اعلیٰ تھا رَع کہتے تھے اور فرعون اسی کی طرف منسوب تھا۔ اہل مصر کے اعتقاد کی رُو سے کسی فرمانروا کی حاکمیت کے لیے اس کے سوا کوئی بنیاد نہیں ہو سکتی تھی کہ وہ رَع کا جسمانی مظہر اور اس کا ارضی نمائندہ ہو۔ اسی لیے ہر شاہی خاندان جو مصر میں برسر اقتدار آتا تھا اپنے آپ کو سورج بنسی بنا کر پیش کرتا اور ہر فرمانروا جو تخت نشین ہوتا فرعون کا لقب اختیار کرکے باشندگان ملک کو یقین دلاتا کہ وہ تمہارا رب اعلیٰ یا مہا دیو ہے۔

حقیق، سزاوار، لائق ثابت حق سے بر وزن فعیل صفت مشبہ ہے۔ اور کچھ نے اس کے معنے حریص کے بتائے ہیں۔ یعنی حقیق میں حریص کی تضمین قرار دی ہے۔ اگر سزاوار اور لائق کے معنے میں ہو تو علیٰ معنے میں باکے ہے اور اگر حریص کے معنے ہوں تو علیٰ اپنے ہی معنے میں ہے۔ اور کچھ نے حقیق کے معنے فرض و واجب کے کیے ہیں۔ ثعبان، اسم ہے اژدہا کے معنے میں ہے۔ مذکر اور مونث دونوں کے لیے آتا ہے۔ قرآن میں کہیں جنہ بمعنے سانپ کہیں جان بمعنے سنپک اور یہاں ثعبان بمعنے اژدہا آیا ہے۔ یا تو واقعات کے اختلاف سے لاٹھی کئی شکلوں میں تبدیل ہوتی ہے اور یا اس کے جثہ کو بتانے کے لیے ثعبان اس کی پھرتیلے پن کو ظاہر کرنے کے لیے جان اور اس کی سمیت کو نمایاں کرنے کی خاطر حیہ کہہ دیا ہے۔ نزع، اس کے معنے

کھینچنے اور نکالنے کے ہیں ہاتھ گریبان کی راہ سے بغل میں دبا کر نکالا گیا تھا اس لیے یہاں یہ لفظ استعمال ہوا ہے۔ حاشرین۔ نقیب، اکٹھے کرنے والے، حشر سے اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ تامرون، امر سے ہے اس کے معنی مشورہ دینا، رائے دینا اور صلاح دینا ہیں۔ قرآن میں یہ لفظ ان معنے میں کئی جگہ آیا ہے عبداللہ بن عباس سے یہی تشریح منقول ہے۔

ایک اور تاریخی شہادت

فرعون شاہان مصر کا لقب ہے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے۔ تین ہزار قبل مسیح سے شروع ہو کر زمانہ اسکندر تک فراعنہ کے اکتیس خاندان مصر پر حکمران رہے ہیں۔ سب سے آخری خاندان فارس کی شہنشاہی کا تھا جو ۳۳۲ قبل مسیح سکندر کے ہاتھوں مفتوح ہوا۔ ان میں سے حضرت یوسف کا فرعون ہیکسس عمالقہ کے خاندان سے تھا جو دراصل عرب خاندانوں ہی کی ایک شاخ تھی۔

سوال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے عہد کا فرعون کون ہے اور کس خاندان سے تعلق رکھتا ہے۔ عام مورخین عرب اور مفسرین اس کو بھی عمالقہ ہی کے خاندان کا فرد بتاتے ہیں۔ مشہور مورخ ابن قتیبہ المعارف میں فرزندان سام بن نوح کی تقسیم و تفریق کے بعد لکھتا ہے "انہیں میں سے عمالیق ہیں۔ یہ متعدد قوموں کا مجموعہ تھے جو متفرق ہو کر ممالک میں پھیلے من جملہ ان کے مصر اور بابل کے بادشاہ ہیں" اور ابن خلدون کا بیان ہے "ان اقوام میں سے بہت بادشاہ گزرے ہیں اور ان کی عرب میں حکومتیں ہوتی ہیں جن کے چند قبائل کا سلسلہ حکومت مصر و شام تک وسیع ہو گیا تھا" اسی قسم کی تصریحات دوسرے مورخین عرب نے کی ہے۔ اس فرعون کا نام کوئی ولید بن مصعب بن ریان بتاتا ہے اور کوئی مصعب بن ریان بتاتا ہے۔ ان میں سے ارباب تحقیق کی رائے یہ ہے کہ اس کا نام ریان یا ریان تھا۔ حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اس کی کنیت ابو مرہ تھی۔ یہ سب آراء قدیم مورخین کی قائم کردہ ہیں مگر اب جدید مصری اثری تحقیقات اور حجری کتبات کے پیش نظر اس سلسلے میں دوسری رائے سامنے آئی ہے وہ یہ کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون رعمیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے جس کا دور حکومت ۱۲۹۲ ق م سے شروع ہو کر ۱۲۲۵ ق م پر ختم ہو جاتا ہے۔

اس تحقیقی روایت کے متعلق احمد یوسف آفندی نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے۔ یہ مصری دار الآثار کے مصور ہیں اور اثری و حجری تحقیق کے بہت بڑے عالم ہیں۔ ان کے اس مضمون کا خلاصہ قصص الانبیاء میں علامہ سنجار نے نقل کیا ہے۔ جس کا حاصل یہ ہے:

یہ بات پایہ تحقیق کو پہنچ چکی ہے کہ یوسف علیہ السلام جب مصر میں داخل ہوئے تو یہ فراعنہ کے سولہویں خاندان کا زمانہ تھا اور اس فرعون کا نام " ابالی الاول" تھا۔ بیں نے اس کی شہادت اس حجری کتبہ سے حاصل کی جو عزیز مصر " فوتی فارع" کے مقبرے میں پایا گیا۔ اور سترھویں خاندان کے بعض آثار سے یہ بھی ثابت ہو چکا ہے کہ اس خاندان سے قبل گمر قریب ہی زمانے میں مصر میں ہولناک قحط پڑا۔ لہٰذا ان تعینات کے بعد آسانی سے یہ نتیجہ نکالا جا سکتا ہے کہ حضرت یوسف کا داخلہ مصر ابابی الاول کے زمانے میں تقریباً ۱۶۰۰ ق م ہوا ہے اور حضرت یوسف کا عزیز مصر کے یہاں رہنا اور پھر قید خانہ کی زندگی بسر کرنا ان دونوں کی مدت کا اندازہ کر کے کہا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت یوسف سے تقریباً ستائیس سال بعد مصر اس نشان سے داخل ہوئے جس کا ذکر قرآن حکیم اور تورات میں کیا گیا ہے۔ ہم اگرچہ فراعنہ مصر کی حکومت اور شاہی خاندان کے متعلق اچھی طرح آگاہی پا چکے ہیں اور مصری آثار نے اس میں کافی مدد دی ہے مگر ابھی تک ان اثریات میں وہ تفصیلی تصریحات دستیاب نہیں ہوئیں جو فرعون اور بنی اسرائیل کی عداوت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت اور غرق فرعون و نجات بنی اسرائیل سے متعلق ہیں۔ تورات میں مذکور ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کے ساتھ عداوت کا معاملہ کیا اور ان کو سخت مصائب میں مبتلا رکھا اس نے بنی اسرائیل سے دو شہروں رعمیس اور فیثوم کی تعمیر کی خدمت بھی لی اور ان کو مزدور بنایا تو اثری حضریات (پرانے آثار کی کھدائی) میں ان دو شہروں کا پتہ تو لگ چکا ہے۔ ایک کے کتبہ سے معلوم ہوا ہے کہ اس کا نام "بر۔ توم" یا " فیثوم" ہے اس کا ترجمہ ہے " خدائے توم کا گھر" اور دوسرے کا نام "برر عمسیس" ہے جس کا ترجمہ " قصر رعمسیس" ہوتا ہے۔ اور مشرقی جانب میں جو مقام اب "تل مسخوطہ" کے نام سے مشہور ہے یہیں " فیثوم کی آبادی تھی۔ اور جس جگہ اب " قنیتر" یا قدیم مصری زبان کے اعتبار سے " خنت نفر" واقع ہے اس مقام پر " رعمسیس" آباد تھا۔ اس کو " رعمسیس ثانی" نے اس لیے آباد کیا تھا کہ یہ مصر کی بحری جانب کے سینٹر میں بہترین قلعہ کا کام دے اور فیثوم کی آبادی کا بھی یہی مقصد تھا۔ اس شہر کی چار دیواری کے جو کھنڈر معلوم ہوئے ہیں وہ بلا شبہ اس کی شہادت دیتے ہیں کہ یہ دونوں شہر مصر کے بہترین حفاظتی قلعے تھے نہ کہ تورات کے بیان کے مطابق غلوں کے گودام اس

تمام قیل وقال کا مطلب یہ ہے کہ جس فرعون نے بنی اسرائیل کو مصائب میں مبتلا کیا وہ یہی رعمیس دوم ہو سکتا ہے۔ یہ مصر کے حکمرانوں کا انیسواں خاندان تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس کے زمانہ میں پیدا ہوتے اور اسی کی آغوش میں پرورش پاتی، تاریخ اثریات سے پتہ چلتا ہے کہ "اسیویہ" قبائل جو مصر کے قریب آباد تھے ان کے اور فراعنہ کے اس خاندان کے درمیان پیہم نو سال تک سخت جنگ ہوتی رہی بدیں وجہ یہ قرین قیاس ہے کہ رعمیس دوم نے اس خوف سے کہ کہیں بنی اسرائیل کا یہ عظیم الشان قبیلہ جو لاکھوں نفوس پر مشتمل تھا اندرونی بغاوت پر آمادہ نہ ہو جائے بنی اسرائیل کو ان مصائب میں مبتلا کرنا ضروری سمجھا جن کا ذکر تورات اور قرآن حکیم میں کیا گیا ہے۔

رعمیس دوم اس زمانہ میں بہت مسن اور معمر ہو چکا تھا، اس لیے اس نے اپنی زندگی ہی میں اپنے بڑے بیٹے "منفتاح" کو شریک حکومت کر لیا تھا۔ رعمیس کی ڈیڑھ سو اولاد میں سے یہ تیرہواں لڑکا تھا لہٰذا منفتاح ہی وہ "فرعون" ہے جس کو موسیٰ وہارون علیہما السلام نے اسلام کی دعوت دی اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ کیا، اور اسی کے زمانے میں بنی اسرائیل مصر سے نکلے اور یہی غرق دریا ہوا۔ چونکہ اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنے گھر میں پرورش پاتے دیکھا تھا اس لیے جب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کو اسلام کا پیغام سنایا تو قرآن عزیز کے ارشاد کے مطابق اس نے یہ طعنہ دیا۔

الم نربك فينا وليدا ولبثت فينا من عمرك سنين۔ (شعراء)

کیا ہم نے اپنے یہاں تیرے بچپن میں تیری پرورش نہیں کی؟ اور تو اپنی عمر کے چند سال ہم میں بسر کر چکا ہے۔

تورات میں ہے کہ خروج سے پہلے مصر کے بادشاہ کا انتقال ہو گیا، اس سے مراد وہ ہی رعمیس دوم ہے جو منفتاح کا باپ تھا۔

علامہ فلانڈرس نے ایک حجری کتبہ دریافت کیا ہے جس پر سیاہ حروف کندہ ہیں اور وہ ۵۹۹ مصری میں لکھا گیا ہے۔ یہ دراصل ایک بہت بڑی چٹان ہے جس کی بلندی ۳ میٹر اور ۱۴۱ سم ہے۔ یہ کتبہ دو وجہ سے معرض تحریر میں آیا تھا، ایک یہ کہ ان تمام تفصیلات کو بیان کیا جائے جو اٹھارہویں خاندان کے بادشاہ "امنتحب" نے "معبد امون" کی خدمات کے متعلق انجام دی تھیں اور دوسرے یہ کہ انیسویں خاندان کے بادشاہ "منفتاح" بن رعمیس دوم کی تعریف میں کچھ لکھا جائے۔

اس لیے اس کتبہ کی عبارت شاعرانہ اسلوب پر لکھی گئی ہے اور منفتاح نے یوسین پر جو فتح حاصل کی تھی اس کا بڑے فخر و مباہات کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے اور عسقلان، جیزر، بانوعیم جو فلسطین کے علاقہ کے مشہور شہر تھے ان کے سقوط کی جانب اشارات کیے گئے ہیں۔

اسی کے ضمن میں بنی اسرائیل کے متعلق بھی مختصر عبارت میں اظہارِ خیال کیا گیا اور یہ سب سے پہلا اثری نقش اور حضریات مصری کا پہلا کتبہ ہے جس میں بنی اسرائیل کا صراحت کے ساتھ ذکر موجود ہے، اس کا ترجمہ یہ ہے:

لقد محق بنو اسرائیل ولم یبق لھم بذر

بنی اسرائیل تمام ہلاک ہو گئے اور اب ان کی نسل کا خاتمہ ہو گیا۔

ایک باریک بین اس عبارت کو دیکھ کر بآسانی یہ علم حاصل کر سکتا ہے کہ یہ تحریر منفتاح کے زمانے میں نہیں لکھی گئی ورنہ تو مصری دستور کے مطابق بنی اسرائیل جیسے عظیم الشان قبیلہ کی ہلاکت کے واقعہ کو اس معمولی اور مختصر الفاظ میں درج نہ کیا جاتا بلکہ منفتاح کی شان میں بڑے زبردست قصیدہ کے ساتھ اس دشمن پر کامیابی کا اظہار کیا جاتا اور جن واقعات پر اس کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے ان کی اہمیت اور عظمت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ یونہی ضمنی طور پر اور وہ بھی سابق بادشاہ کے حالات سے متعلق کتبہ پر درج نہ کر دیے جاتے بلکہ ان اہم واقعات کے لیے منفتاح کے زمانے میں مستقل الگ ایک کتبہ اسی غرض سے تحریر کیا جاتا۔

مگر ایسا کیوں نہ ہوا؟ سو بات بہت واضح ہے وہ یہ کہ مصری کاہنوں کو اس واقعہ ہائلہ کی ہرگز توقع نہ تھی جو موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں "غرقِ فرعون" کی شکل میں ظاہر ہوا اور وہ "منفتاح" کی موت کے لیے اس عجلت کے متوقع نہ تھے، اس زمانہ کی عمر طبعی کے لحاظ سے ابھی کافی زمانہ تھا کہ منفتاح کے کاہن، مصری دستور کے مطابق اس انیسویں خاندان کے بادشاہ کے ان حالات کو مرتب کر کے لوح پر محفوظ کر دیں تاکہ وہ بادشاہ کے مقبرہ پر کندہ ہو سکے۔ اب جب کہ یہ واقعہ ہائلہ پیش آ گیا تو اصل حقیقت کو چھپانے کی سعی کی گئی تاکہ آئندہ قبطی نسلیں اس ذلت و رسوائی کو معلوم نہ کر سکیں جو ان کے واجب الاحترام دینی عقائد پر خدا کی طرف سے سخت ضرب کا باعث بن چکی تھی۔

پس انہوں نے بیجا جسارت اور تاریخی بددیانتی کے ساتھ حالات کو منقلب کر کے معاملہ کو بالکل مخالف شکل میں تحریر کر دیا اور بنی اسرائیل کی کامیاب واپسیِ وطن کو ان مسطورۂ بالا الفاظ میں ظاہر کیا تاکہ "غرقِ فرعون" کا قصہ آئندہ مصریوں کے سامنے باقی ہی نہ رہے۔

اس نتیجہ کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ مصری دستور کے مطابق ہر ایک بادشاہ کا مقبرہ جُدا ہوتا تھا اور اس کے تمام حالات اور خصوصی نمایاں امتیازات کی تاریخ اور اس کے زمانہ کی بعض شاہی اشیاء اور جواہرات اس کی قبر کے ساتھ ہی محفوظ کر کے رکھے جاتے تھے۔

لیکن منفتاح کی اس شان کے باوجود جس کا مذکورہ بالا کتبہ میں اشارہ کیا گیا ہے نہ اس کا علیحدہ مقبرہ بنایا گیا اور نہ وہ تمام رسوم انجام پا سکیں جو ہمیشہ بادشاہوں کے لیے ضروری سمجھی جاتی تھیں بلکہ اس کو عجلت کے ساتھ "امنحب" کے مقبرہ ہی میں دفن کر دیا گیا اور اٹھارہویں خاندان کے بادشاہ، اور اُنیسویں خاندان کے بادشاہ کی نعشیں ایک ہی جگہ جمع کر دی گئیں[1]

اوّلاً، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کے دور میں دو فرعون گزرے ہیں ایک وہ جس کے زمانہ میں حضرت موسیٰ کی ولادت ہوئی اور جس کے گھر میں آپ نے پرورش پائی۔ دوسرا وہ جس کے پاس آپ اسلام کی دعوت لے کر تشریف لے گئے اور جس نے تکذیب کی اور بالآخر دریا بُرد ہوا۔ موجودہ زمانہ کے محققین کا عام میلان اس طرف ہے کہ پہلا فرعون رعمسیس دوم تھا اور دوسرا فرعون جس کا یہاں ذکر ہے۔ منفتاح تھا جو اپنے باپ رعمسیس دوم کی زندگی ہی میں شریکِ حکومت ہو چکا تھا اور اس کے مرنے کے بعد سلطنت کا مالک ہوا۔

ثانیاً، اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مصر کے تاریخی آثار میں حضرت موسیٰ کی سرگزشت کا کوئی سراغ کیوں نہیں ملتا حتیٰ کہ بنی اسرائیل کا توطن مصر اور خروج کا پورے واقعہ سے اثریات مصر کی تاریخ بالکل خاموش ہے۔

۱۳۱ ـ پھر ان قوموں کے بعد ہم نے موسیٰ کو اپنی نشانیاں دے کر فرعون اور اس کے درباریوں کے پاس روانہ کیا لیکن انہوں نے ہماری واضح نشانیوں کے ساتھ ظالمانہ رویہ اختیار کیا تو دیکھو ان مفسدوں کا انجام کیا ہوا۔ یعنی جن انبیاء کا پہلے ذکر ہوا، نوح، ہود، صالح، لوط، شعیب علیہم السلام۔ موسیٰ علیہ السلام ان سب کے بعد تشریف لاتے۔ ان پیغمبروں کا ذکر فرمانے کے بعد درمیان میں "سنت اللہ" بیان فرمائی تھی جو مکذبین کے متعلق جاری رہی ہے جس کے ضمن میں موجودہ جماعتِ کفار کو متنبہ کر دیا گیا۔ اس درمیانی مضمون سے فارغ ہو کر پھر سلسلہ بعثت رسل کی ایک عظیم الشان کڑی کا ذکر شروع کر دیتے ہیں[2]

---

[1] قصص القرآن جلد اول [2] افادات شیخ الاسلام

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا نسب چند واسطوں سے حضرت یعقوب علیہ السلام تک پہنچتا ہے۔ ان کے والد کا نام عمران ہے۔ اہل کتاب اسے عمرام کہتے ہیں۔ لفظ موسیٰ کے معنے ہیں وہ جو پانی سے بچا لیا گیا ہو حضرت عبداللہ بن عباس نے بھی موسیٰ کی وجہ تسمیہ یہی بتائی ہے۔ دراصل موقبطی زبان میں پانی اور اسی درخت کو کہتے ہیں۔ حضرت موسیٰ کی والدہ نے ولادت کے بعد حضرت موسیٰ کو الہام خداوندی کے مطابق صندوق میں رکھا اور دریائے نیل کی نذر کر دیا اور ساتھ ہی اپنی بڑی لڑکی حضرت موسیٰ کی ہمشیرہ کو کہا کہ وہ اس صندوق کے ساتھ کنارے کنارے چل کر صندوق کو نگاہ میں رکھے اور دیکھے کہ خدا اس کی حفاظت کا وعدہ کس طرح پورا کرتا ہے تا آنکہ آلِ فرعون نے اسے اٹھا لیا۔

قرآن عزیز میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ذکر بے شمار مقامات میں آیا ہے۔ چونکہ ان کے بیشتر حالات حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حالات سے بہت زیادہ مطابقت رکھتے ہیں اور ان واقعات میں غلامی اور آزادی کے باہم معرکہ آرائی اور حق و باطل کے مقابلہ کی بے نظیر داستان ودیعت ہے۔ نیز ان کے اندر بصائر و مواعظ کا نادر ذخیرہ جمع ہے اس لیے اللہ سبحانہ نے حسبِ ضرورت اور حسبِ موقع جگہ جگہ اس قصہ کے اجزاء کو مجمل اور مفصل طریقہ پر بیان کیا ہے۔

اس سے پہلے انبیاء کے جو تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں ان میں اور حضرت موسیٰ کی تاریخی داستان میں بہت بڑا فرق ہے۔ انبیاء کی تاریخی شہادتوں سے مقصود یہ ذہن نشین کرانا تھا کہ جو قوم خدا کا پیغام پانے کے بعد اسے رد کر دیتی ہے اسے ضرور ہلاکت سے دوچار ہونا پڑتا ہے۔ ان واقعات کی تاریخی شہادت کے بعد اب حضرت موسیٰ کی تاریخ کے دو مختلف پہلو پیش کیے جا رہے ہیں۔ ایک حضرت موسیٰ اور فرعون کی داستان، دوسرے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے وقائع گویا ایک وہ تاریخی شہادت ہے جس میں نبی اپنی اُمت دعوت سے مخاطب ہے۔ دوسرے وہ احوال و ظروف پیش کیے ہیں جن میں نبی کا روئے سخن اُمتِ اجابت کی طرف ہے۔

اُمتِ دعوت کے وقائع میں کفارِ مکہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دعوتِ حق کے ابتدائی مرحلوں میں حق و باطل کی قوتوں کا جو تناسب بظاہر نظر آتا ہے اس سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ حق کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ نبوت ایک نئی قوم بلکہ فی الدنیا کی اقلیت سے شروع ہوتی ہے اور بغیر کسی سروسامان کے اس باطل کے خلاف لڑائی چھیڑ دیتا ہے جس کی پشت پر بڑی بڑی قوموں اور سلطنتوں کی طاقت ہوتی ہے۔ پھر بھی آخر کار وہی غالب آ کر رہتا ہے۔ نیز اس قصے میں ان کو یہ بتایا گیا ہے کہ داعی حق کے مقابلہ میں جو چالیں چلی جاتی ہیں اور جن تدبیروں سے اُن کا

دعوت کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ کس طرح الٹی پڑتی ہیں اور یہ کہ اللہ تعالیٰ منکرین حق کی ہلاکت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ان کو کتنی کتنی طویل مدت تک سنبھلنے اور درست ہونے کے مواقع دیتا چلا جاتا ہے۔ اور جب، کسی تنبیہہ کسی سبق آموز واقع اور کسی روشن نشانی سے بھی وہ اثر نہیں لیتے تو پھر وہ انہیں کیسی عبرتناک سزا دیتا ہے۔

اُمتِ اجابت کو اس قصے میں دوہرا سبق دیا گیا ہے۔ پہلا سبق اس بات کا کہ اپنی قلت و کمزوری کو اور مخالفینِ حق کی کثرت و شوکت کو دیکھ کر ان کی ہمت نہ ٹوٹے۔ اور اللہ کی مدد آنے میں دیر ہوتے دیکھ کر وہ دل شکستہ نہ ہوں۔ دوسرا سبق اس بات کا کہ ایمان لانے کے بعد جو گروہ یہودیوں کی سی روش اختیار کرتا ہے وہ پھر یہودیوں ہی کی طرح خدا کی لعنت میں گرفتار بھی ہوتا ہے۔

ثم بعثنا من بعدھم کو حرف عطف کے ذریعے پہلے واقعات سے مربوط کیا ہے۔ آغاز لقد ارسلنا نوحاً سے کیا تھا اور اس پر والی عاد والی ثمود اور والی مدین کا بغیر فعل ارسلنا کے عطف سے کیا کیونکہ ان میں ہم آہنگی تھی، رسولوں کی تکذیب، ان سے عناد، ان کی ایذا رسانی اور بالآخر اس کی پاداش میں ہلاکت ان سب میں اشتراک تھا گویا یہ بتانا تھا کہ یہ سب ایک نوع تھے۔ یہاں عطف فعل کے ذریعے کیا اور فعل بھی ارسلنا کی جگہ بعثنا لاتے۔ یہ لفظ ارسال سے زیادہ بلیغ ہے۔ اور پھر تراخی کو بتانے کے لیے ثم سے کر آئے لیکن یہ ظاہر کرنے کے لیے یہ تراخی زمانی نہیں بلکہ نوعی ہے من بعدھم سے کر آئے۔ بعد اور من بعد میں جوہری فرق ہے قرأت القرآن بعد صلوٰۃ الفجر، وہاں بولا جائے گا جب نماز فجر کے بعد اذکار وغیرہ سے فراغت کے بعد قرآن کی تلاوت کی ہو اور قرات القرآن من بعد صلاۃ الفجر اس وقت بولا جائے گا جب نماز کے فوراً بلا فصل تلاوت قرآن کی ہو۔ یہاں حضرت موسیٰ اور شعیب میں کسی دوسرے پیغمبر کا فصل نہیں ہے اس لیے من بعد آیا ہے لیکن چونکہ دونوں کی دعوتوں کی نوعیت میں فرق ہے۔ حضرت شعیب کی دعوت دعوتِ عبادت ہے جبکہ حضرت موسیٰ کی دعوت فرعون کے سامنے بنی اسرائیل کی آزادی کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے ان انبیاء کے بعد حضرت موسیٰ کو اپنی آیات دے کر فرعون اور اس کی جماعت کی طرف روانہ کیا۔ جماعت سے مراد امراء اور حکومت کے کرتے دھرتے ہیں۔ کیونکہ بادشاہ اور امراء مملکت ہی بنی اسرائیل کو غلام بنائے ہوئے تھے اس لیے فرعون اور اس کی جماعت کی تعبیر اختیار کی۔ فرعون اور اس کی قوم نہیں فرمایا۔ آیات سے مراد معجزات بھی ہیں اور دلائل و براہین بھی ہیں۔ یعنی ایسی آیات جن سے حضرت موسیٰ کے دعویٰ کی صداقت معلوم ہو۔ آیات ہی نبوت شناسی کا پیمانہ ہیں۔

آیاتِ نبوت کی دو قسمیں

آیاتِ نبوت کی دو قسمیں ہیں ایک ظاہری اور مادی اور دوسری باطنی اور روحانی۔ ظاہری اور مادی آیات و دلائل تو وہ خوارق ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں مثلاً مردہ زندہ کرنا، عصا کا سانپ بن جانا، انگلیوں سے چشمہ کا ابلنا، بیمار کا اچھا کرنا وغیرہ، باطنی اور روحانی آیات و دلائل مدعیِ نبوت کی صداقت، معصومیت، تزکیہ، تاثیرِ تعلیم، ہدایت ارشاد فلاح اور تائید ہے۔ اہلِ نظر اور حقیقت شناسوں کے لیے یہی نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں۔ باقی ظاہری نشانیاں صرف سطحی اور ظاہر بین نگاہوں کے لیے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری آنکھوں ہی سے دیکھ کر پہچانتے ہیں۔ انشاء اللہ ہم اس موضوع پر تفصیلی بحث اسی جلد میں کسی دوسرے موقعہ پر کریں گے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے فظلموا بہا یعنی انہوں نے آیات کے ساتھ ظالمانہ اور بے انصافی کا رویہ اختیار کیا کہ کبر و جحود کی وجہ سے ان کا انکار کر دیا اور اس کے نتیجہ میں وہ اور اس کی قوم نعمتِ ایمان سے محروم ہو کر رہ گئی۔ موسیٰ علیہ السلام کی اصل بعثت بنی اسرائیل کی طرف اور فرعون کی طرف تبعاً تھی۔ یا یوں کہہ دیجیے کہ حضرت موسیٰ کی تشریف آوری کا بنیادی مقصد بنی اسرائیل تھے اور فرعون اور اس کی جماعت کی طرف تشریف آوری اس مقصد کو حاصل کرنے کا ذریعہ تھا۔ اور قاعدہ عقلی یہ ہے کہ مقاصد کی پاسبجائی کے لیے وسائل سے آغاز کیا جاتا ہے۔ ظلموا کے مفعول پر با کفر کے معنے کی تضمین پیدا کرنے کے لیے لائی گئی ہے اس لیے فقرہ ظلموا بہا ایک وقت میں دوہرے معنے دے رہا ہے۔ یعنی انہوں نے آیات کا کفر کر کے اور ان کی تکذیب کر کے ظلم کیا۔ اور کچھ لوگوں نے با کو سببیہ قرار دیا ہے یعنی انہوں نے لوگوں کو آیاتِ نبوت پر ایمان لانے سے روک کر اپنے آپ پر اور لوگوں پر ظلم کیا ہے۔ پہلی بات میں زیادہ معنویت ہے یعنی آیات پر ظلم کیا یعنی ان کو نہ مانا اور ان کو سحر قرار دیا۔ مولانا مودودی نے ان معنے کو اچھے انداز میں سمجھایا ہے کہ جس طرح ایسے شعر کو جو شعریت کا مکمل نمونہ ہو تک بندی سے تعبیر کرنا اور اس کا مذاق اڑانا نہ صرف اس شعر کے ساتھ بلکہ نفسِ شاعری اور ذوقِ شعری کے ساتھ بھی ظلم ہے۔ اسی طرح وہ نشانیاں جو خود اپنے من جانب اللہ ہونے پر صریح گواہی دے رہی ہوں۔ اور جن کے متعلق کوئی صاحبِ عقل آدمی یہ گمان تک نہ کر سکتا ہو کہ سحر کے زور سے بھی ایسی نشانیاں ظاہر ہو سکتی ہیں بلکہ جن کے متعلق خود فنِ سحر کے ماہرین نے شہادت دے دی ہو کہ وہ ان کے فن کی دسترس سے باہر ہے ان کو سحر

قرار دینا نہ صرف ان نشانیوں کے بلکہ عقل سلیم اور صداقت کے ساتھ بھی ظلم عظیم ہے۔
بہرحال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ فظلموا بہا کی ضمیر مجرور کا مرجع آیات میں معنے یہ ہیں کہ ان لوگوں نے ہماری آیات پر ظلم کیا اور ظلم سے مراد یہ ہے کہ ان لوگوں نے آیات الٰہیہ کی قدر نہ کی۔ اقرار کی جگہ ان کا انکار کیا۔ ایمان کے بجائے کفر اختیار کیا۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے فانظر کیف کان عاقبۃ المفسدین یعنی اس سے زیادہ مفسد کون ہو گا جو خدا کے سفراء کو جھٹلاتے۔ آیات اللہ کی تکذیب اور حق تلفی کرے مخلوق خدا سے اپنی پرستش کراتے آگے ضروری تفصیل بیان فرما کر اس انجام کی تفصیل کی گئی ہے ۔؎
انداز بیان میں خاص طور پر اسم ضمیر کی جگہ لفظ مفسدین لا کر اس طرف اشارہ کیا ہے کہ ظلم اور فساد لازم و ملزوم ہیں۔ جہاں ظلم ہو گا وہاں فساد ناگزیر ہے اور فانظر میں حرف فا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ جیسے ان کے ظلم کا نتیجہ یہ ہولناک انجام ہے ٹھیک اس واقعہ کو بیان کرنے کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ اس پر غور و فکر اور تدبر کیا جاتے گویا یہ فقرہ اس لیے آیا ہے کہ قرآن کے قاری کی توجہ اصل مقصد سے نہ ہٹنے پاتے۔ اس میں قریش کو تاریخ کی روشنی میں بتایا گیا ہے کہ تمہارے اندر ایک رسول کی بعثت ہوئی ہے اگر تم نے اس رسول کی تکذیب کر دی تو تم خدا کی زمین میں فساد برپا کرنے والے ٹھہرو گے اور تمہارا حشر بھی وہی ہو گا جو تم سے پہلے دوسرے مفسدین کا ہوا ہے۔ یاد رہے کہ صلاح و فلاح کا تمام سرچشمہ نبوت کی تعلیم و ہدایت ہوتی ہے۔ رسول جو نظام زندگی لے کر آتا ہے وہی نظام سب کی اصلاح کا ضامن ہوتا ہے۔ اس وجہ سے اس کی تکذیب اور مخالفت ہی خدا کی زمین میں فساد پیدا کرنے کے ہم معنے ہے۔ اور خاص طور پر فانظر فرما کر قرآن اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں علی سبیل التبادل یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ اس واقعہ کا انجام بہت فکر انگیز ہے۔ سوچنا چاہیے کہ موسیٰ علیہ السلام تن تنہا نہیں اور اس جماعت کے ایک فرد ہیں جس کے افراد کمزور ہیں اور فرعون کے جبر و استبداد کا تختہ مشق ہیں فرعون اور اس کی حکمران جماعت ملک کی بہت بڑی طاغوتی قوت ہے لیکن اللہ کی مدد سے مظلوم کامیاب ہو رہی ہے اور وقت کا حاکمانہ جبر و استبداد، اس کے فن کار اور دانشور ناکام ہو رہے ہیں۔ یہ اس بات کی کھلی اور واضح دلیل ہے کہ کامیابی مادی طاقت کو نہیں بلکہ معنوی اور روحانی

؎ افادات شیخ الاسلام

طاقت کو ہوتی ہے جیسا کہ آج بھی ظالم قوتوں کے دبدبے کو دیکھ کر لوگ کہتے ہیں۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی۔

موسیٰ علیہ السلام کی فرعون کو دعوت

۱۳۲۔ اور حضرت موسیٰ نے کہا اے فرعون میں رب العالمین کا فرستادہ ہوں میرا فرض منصبی ہے کہ اللہ کے بارے میں حق گوئی کو اپناؤں، میں تمہارے پاس تمہارے مالک و آقا کی جانب سے اپنی رسالت کی واضح دلیل لے کر آیا ہوں۔ اکثر مفسرین قرآن نے حقیق کے معنے جدیر (لائق) کے لیے ہیں اس لیے علیٰ کو بمعنی با لینا پڑا ہے یعنی میری شان کے یہی لائق ہے کہ خدا کی طرف سے کوئی ناحق اور غلط بات نہ کہوں۔ بعض نے حقیق کو بمعنی حریص لیا ہے لیکن حضرت شیخ الہند قدس اللہ سرہ العزیز نے حقیق کو قائم اور ثابت کے معنے میں لیا جس کا مطلب یہ ہے کہ میں بغیر ادنیٰ تزلزل اور تذبذب کے پوری مضبوطی اور استقلال کے ساتھ اس پر قائم ہوں کہ سچ کے سوا کوئی چیز زبان سے نہ نکالوں۔ خدا کا پیام بلا کم و کاست تم کو پہنچا دوں اور تمہاری تکذیب اور تخویف کی وجہ سے ذرا بھی نہ ڈگمگاؤں لے دو معنے کی تصریح تو حضرت شیخ الاسلام نے فرمادی ہے ایک یہ کہ حقیق جدیر لائق سزاوار کے معنے میں دوسرے لفظ حقیق حریص کے معنے میں ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی یہی دو معنے بتاتے ہیں۔ لیکن حریص کے معنے میں ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ یہ حقیق کا لغوی مدلول ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حقیق میں حریص کے معنے کی تضمین ہے اور تضمین کا مطلب یہ ہے کہ لفظ میں اصلی معنے اور وہ معنے جو تعدیہ کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں دونوں میں ہم آہنگی پیدا کی جاتی ہے۔ اس لحاظ سے فقرہ کا مطلب یہ ہوگا میں رب العالمین کا فرستادہ ہوں اور میرے شایان شان یہی ہے کہ میں اللہ کے بارے میں حق کے سوا کچھ نہ کہوں اور میں اسی کا حریص ہوں اس کو کبھی نظرانداز نہ ہونے دوں گا۔ ابو عبید نے حقیق کے معنے فرض واجب بھی بتاتے ہیں۔ یعنی رسول ہونے کی حیثیت میں میرا فرض یہ ہے کہ اللہ کے بارے میں حقیقت اور واقعیت سے ہٹ کر کچھ نہ کہوں۔ ان معنے کی تائید حضرت نافع کی اس قرأت سے بھی ہوتی ہے جس میں حقیق علیَّ ہے یعنی یہ میرا فرض ہے کہ میں اللہ کے نام سے صرف وہی کچھ پیش کروں جس میں حق و صداقت ہو۔

حضرت موسیٰ نے فرعون کو مخاطب کر کے یہ پیغام پہنچایا کہ میں اللہ رب العالمین کا رسول ہوں۔ اس میں حضرت موسیٰ نے دو باتیں فرعون کے گوش گزار کی ہیں۔ ایک اللہ کی توحید، دوسرے رسالت

رب العالمین کہہ کر جتادیا کہ اس کائنات کا مالک و آقا اللہ ہے نہ تو ہے اور نہ کوئی اور۔ بندگی صرف اللہ کی ہونی چاہیے نہ کہ تیری۔ اور میں اللہ کا رسول ہوں۔ رسول ہونے کی وجہ سے تبلیغ و ہدایت میں قطعاً ہر قسم کے گناہ سے پاک ہوں۔ فرعون نے حضرت موسیٰ سے اللہ سبحانہٗ کی ربوبیت پر مناقشہ کیا جیسا کہ آپ سورہ الشعراء میں پڑھیں گے اور سورہ طٰہٰ میں ایمان بالیوم الاٰخر کا بھی ذکر ہے۔ منشا یہ ہے کہ حضرت موسیٰ نے سب سے پہلے فرعون کو ایمان کے تینوں اصول توحید، رسالت اور بعثت و جزاء کی دعوت پیش کی۔

بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ

۱۳۴۔ لہٰذا تو بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کر دے۔ یوں تو حضرت موسیٰ نے کئی کئی طرح کی نصیحتیں کیں جیسا کہ دوسری آیات میں مذکور ہیں فقل ھل لک الی ان تزکی واھدیک الی ربک فتخشی۔ مگر ایک بڑی اہم چیز یہ تھی کہ بنی اسرائیل کو جو انبیائے کرام کی اولاد میں سے تھے اور جنہیں فرعونیوں نے ذلیل جانوروں کی طرح غلام بنا رکھا تھا۔ مظالم و شدائد سے نجات دلائیں اس موقعہ پر فرعون کو مخاطب کرتے ہوئے اسی چیز کی طرف متوجہ کرتے ہوئے فرمایا کہ بنی اسرائیل کو اپنی قید و بیگار سے نجات دے تاکہ وہ آزادی کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت میں مشغول ہوں اور میرے ساتھ اپنے وطن مالوف شام چلے جائیں کیونکہ ان کے جداعلیٰ حضرت ابراہیم خلیل اللہ نے عراق سے ہجرت کر کے شام ہی میں قیام فرمایا تھا۔ بعدہٗ حضرت یوسف علیہ السلام کی وجہ سے بنی اسرائیل مصر میں آباد ہوئے اب چونکہ یہاں قبطیوں نے ان پر طرح طرح کے مظالم کر رکھے ہیں ضرورت ہے کہ ان قبطیوں کی ذلیل غلامی سے آزادی دلا کر آبائی وطن کی طرف واپس کیا جائے۔[1]

پہلے شیخ الاسلام نے ایک ذہن میں اٹھتے ہوئے سوال کا جواب دیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا حضرت موسیٰ نے فرعون اور اس کے درباریوں کے سامنے کوئی دعوت پیش نہیں کی بس بلا تمہید یہ مطالبہ ہی ان کے سامنے رکھ دیا کہ بنی اسرائیل کو میرے ساتھ روانہ کر دو۔ اس کا جو جواب شیخ الاسلام نے اجمالاً دیا ہے اس کی توضیح یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی جو سرگزشت بیان ہوئی ہے وہ قرآن کی مختلف سورتوں میں سورتوں کے مضمون کے لحاظ سے الگ الگ کر کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بیان ہوتی ہیں۔ ہر سورت میں سرگزشت کا اتنا ہی حصہ بیان ہوا ہے جس قدر حصہ کے لیے سورۃ کے موضوع کا تقاضا تھا۔ یہ سورت چونکہ انبیاء کے مکذبین کے انجام کو ظاہر کر رہی ہے اس لیے اس میں سرگزشت کا صرف وہی حصہ بیان ہوا ہے جس کا سورت کے موضوع سے تعلق ہے باقی اجزاء دوسری سورتوں میں اپنے اپنے موقع پر آئے ہیں۔ سورہ الشعراء میں بات کا آغاز ہی تقویٰ سے کیا ہے۔

اذ نادی ربک موسیٰ ان ائت القوم الظالمین قوم فرعون الا یتقون۔

اور سورہ طٰہٰ میں تذکیر اور خشیت کی دعوت کا ذکر ہے اور سورہ نازعات میں تزکیہ کی خاص دعوت کا ذکر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حضرت موسیٰ نے فرعون کو اولاً عام انبیاء کی سنت کے مطابق ایمان باللہ، ایمان بالرسالۃ، ایمان بالیوم الآخر کی دعوت دی۔ بعد ازیں بنی اسرائیل کی آزادی کا مطالبہ کیا در اصل قرآن نے جستہ جستہ حضرت موسیٰ کی زندگی کے جو حصے بیان کیے ہیں ان میں قرآن نے واقعاتی ترتیب کو پیشِ نظر نہیں رکھا کیونکہ قرآن کی موعظت کا ایک دائرہ ہے وہ جو کچھ کہتا ہے اسی کے اندر رہ کر کہتا ہے۔ بس ضروری ہے کہ حضرت موسیٰ کی زندگی کے واقعات کو بھی اسی کے اندر رہ کر دیکھیں اس سے باہر جانے کی کوشش نہ کریں۔ قرآن کے اس اندازِ بیان نے اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخ کا استعمال کیا ہونا چاہیے۔ قرآن کے اس انداز سے معلوم ہو گیا کہ گزشتہ کا مطالعہ اس لیے کرنا چاہیے کہ آئندہ کے لیے عبرت حاصل ہو۔ ہم اگر چاہیں تو قرآن کی مدد سے حضرت موسیٰ کی زندگی تاریخی ترتیب کے ساتھ مرتب کر سکتے ہیں کیونکہ قرآن نے حضرت موسیٰ کی پیدائش سے لے کر ان کی وفات تک کے واقعات کو جستہ جستہ بیان کیا ہے۔ یہ بہت بڑی بے انصافی ہو گی اگر ہم یہ کہیں کہ حضرت موسیٰ نے پہلے ہی روز ارسل معی بنی اسرائیل کا مطالبہ فرعون کے سامنے پیش کر دیا تھا۔ حالانکہ یہ مطالبہ بالکل آخری مطالبہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنے دشمنوں کے درمیان زندگی بسر کی۔ آپ نے فرعون اور اس کے درباریوں کو ہر طرح سمجھایا مگر وہ ایمان نہ لاتے اور بالآخر موسیٰ علیہ السلام کو بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے ہجرت کرنی پڑی۔ آپ کو جس قدر معجزے عطا ہوتے تھے اس لیے عطا ہوئے تھے کہ ان کو دکھا کر فرعون کو حق کی دعوت دی جائے۔ جب ایک مدت کے بعد اہلِ مصر میں سے جس قدر لوگ ایمان لا سکتے تھے لے آتے تو حضرت موسیٰ کو شق بحر کا معجزہ ملا اور رود احمر کی لہریں فرعون کو اس کے ساز و سامان کو ہمیشہ کے لیے نگل گئیں اور اس کے بعد فرعون کی شامی مملکت پر بنی اسرائیل قابض ہو گئے۔ یاد رہے کہ فرعون کی حکومت شام سے لے کر لیبیا تک

اور بحر روم کے سواحل سے حبش تک پھیلی ہوئی تھی۔ اور اس عظیم الشان ملک کا مطلق العنان بادشاہ ہی نہیں بلکہ معبود بنا ہوا تھا۔

رسالت پر فرعون کا مطالبہ

۱۳۴ - فرعون نے کہا کہ اگر تو اپنی رسالت پر کوئی نشانی لے کر آیا ہے تو اگر تیرے دعویٰ میں صداقت ہے تو نشانی پیش کر۔ موسیٰ علیہ السلام نے اپنی لاٹھی ڈال دی تو اچانک وہ واضح طور پر ایک اژدہا بن کر سامنے آگیا اور آپ نے گریبان سے ہاتھ نکالا تو وہ بھی یکایک سب دیکھنے والوں کے سامنے چمک رہا تھا۔ اژدھا ہونے میں کسی طرح کا کوئی شک و شبہ کی گنجائش نہ تھی۔ کہتے ہیں کہ وہ اژدہا منہ کھول کر فرعون کی طرف لپکا۔ آخر فرعون نے بدحواس ہو کر موسیٰ علیہ السلام سے اس کے پکڑنے کی درخواست کی۔ موسیٰ علیہ السلام کا ہاتھ لگانا تھا کہ پھر عصا بن گیا۔ اور ہاتھ کے چمکنے کے لیے موسیٰ علیہ السلام نے ہاتھ گریبان میں ڈال کر اور بغل میں دبا کر نکالا تو لوگوں نے کھلی آنکھوں دیکھ لیا کہ غیر معمولی طور پر سفید اور چمکدار تھا۔ یہ روشنی اور چمک کسی مرض برص وغیرہ کی وجہ سے نہ تھی بلکہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قلب منور کی روشنی بطور اعجاز ہاتھ میں سرایت کر جاتی تھی۔[1]

یہ فرعون کا حضرت موسیٰ سے رسالت کے موضوع پر سب سے پہلا مناظرہ ہے۔ انداز بیان بتا رہا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کی فرعون سے پہلی گفتگو نہیں ہے بلکہ اس سے پہلے فرعون سے گفتگو ہو چکی ہے۔ اس گفتگو میں فرعون نے حضرت موسیٰ سے ان کے اس دعویٰ پر دلیل کا مطالبہ کیا کہ میں اللہ کا رسول ہوں۔ اس نے کہا کہ تمہارے اس دعوے میں صداقت ہے کہ تم خدا کے رسول ہو تو اپنے رسول ہونے کی کوئی نشانی پیش کرو۔ حضرت موسیٰ نے دو نشانیاں پیش کیں۔ ایک لاٹھی کے اژدہا بن جانے، دوسرا ہاتھ کے چمکیلا ہونے کا۔ یہ دو نشانیاں حضرت موسیٰ کو اس امر کے ثبوت میں مرحمت ہوئیں کہ وہ اس خدا کے نمائندے ہیں جو کائنات کا خالق اور فرمانروا ہے ان نشانیوں کو قرآن کی اصطلاح میں آیات اور براہین کہا جاتا ہے۔ یہاں ان دو نشانیوں کو آیت کہا گیا ہے اور سورہ قصص میں ان کو برہان کہا گیا ہے۔ اور ان ہی کو متکلمین کی زبان میں معجزات اور خوارق کہا جاتا ہے۔ امام بخاری نے صحیح میں ان کو علامات نبوت کہا ہے۔ اور جن مؤلفین نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس موضوع پر مستقل تصانیف فرمائی ہیں۔ انہوں نے اپنی تصانیف کا نام دلائل نبوت رکھا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ معجزات کا صحیح عنوان آیات و براہین ہے اور یہی عنوان قرآن کریم اور سلف صالحین نے اختیار کیا۔ ہے اور معجزہ کی صحیح حقیقت سمجھنے کے لیے یہی تعبیر بہت آسان ہے۔ معجزہ کے عنوان سے بہت سی الجھنیں پیدا ہو گئی ہیں جو بہت بڑی تفصیل کے بعد بھی قابو میں نہیں آتی ہیں۔ لمبی چوڑی بحثوں کے بعد ارباب تصانیف کا شاہوار قلم کسی ایک سلسلے پر قائم نہیں ہے۔ بہرحال معجزہ کی اصطلاح غلط ہے کیونکہ قرآن و سنت میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوا ہے بلکہ اس کی جگہ آیت اور برہان کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں جو اپنے مفہوم کو نہایت خوبی سے ادا کرتے ہیں۔ قدیم محدثین نے دلائل اور علامات کے الفاظ استعمال کیے ہیں جو الفاظِ قرآنی کے ہم معنے ہیں۔

معجزات اور عقلیت

آیات و براہین یا علامات و دلائل کے الفاظ کو سننے کے ساتھ ہی سب سے پہلے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا یہ ممکن بھی ہیں کیا عقل و خرد ان کے وقوع کو جائز بھی رکھتی ہے۔ دُنیا میں عقل و نقل اور فلسفہ و مذہب کا جب سے وجود ہے ان مباحث پر معرکہ آرا بحثیں ہوتی چلی آئی ہیں۔ لیکن فلسفہ قدیمہ ہو یا جدیدہ فلسفہ یونان ہو یا فلسفہ اسلام، مشرق کا فلسفہ ہو یا مغرب کا ان سب کا حاصل بحث یہ نکلتا ہے کہ اگر کچھ فرقے ان کو ممکن بلکہ واقع سمجھتے ہیں تو دوسرے ان کو محال قطعی تصور کرتے ہیں۔ عقل و فہم کا یہ اختلاف دُنیا میں ہمیشہ سے قائم تھا قائم ہے اور قائم رہے گا۔ لیکن جو لوگ ان کے امکان اور وقوع کے قائل ہیں وہ خود اپنے کج بحث دماغ اور بدگمان قلب کی تسکین اور رفع شک کے لیے اپنے اپنے فہم و ادراک کے موافق مختلف نظریے قائم کرتے ہیں تاکہ وہ اپنی راز جو طبیعت کی تشنہ لبی کو تسکین دے سکیں۔ ان تمام نظریات کا ماحصل یہ ہے کہ عقل و حواس سے مافوق ان حقائق کو اپنے دریافت کردہ معلوم و محسوس قواعد کے مطابق بنا سکیں لیکن کیا یہ ممکن ہے؟ کیا غیر محسوس و محسوس یا جسمانی و روحانی دنیا دونوں ایک ہی نظام پر چل رہی ہے کہ ایک عالم کے قیاس تمثیلی و استقرائی سے ہم دوسرے عالم کے ثبوت پر شہادتوں کا انبار لگانا چاہتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ جو جانا نہیں جا سکتا اس کو ہم جاننا چاہتے ہیں اور جو سمجھا نہیں جا سکتا اسے ہم سمجھنا چاہتے ہیں۔ جب ہماری عقل و فہم کی لنگ پائی محسوسات کے دائرے میں صاف نظر آتی ہے تو ماوراء محسوسات اس کی دوڑ دھوپ کہاں تک منزل مقصود

تک پہنچا سکتی ہے۔

معجزہ کی حقیقت

دوسری باتوں سے پہلے ہمیں اس پر غور کرنا چاہیے کہ خود معجزہ کیا ہے۔ اگرچہ اس پر علماء نے بہت کچھ لکھا ہے اور جدید و قدیم نے سیر حاصل دادِ تحقیق دی ہے لیکن ہم ادھر اُدھر سے ہٹ کر اپنے لفظوں میں معجزے کی حقیقت یہ سمجھتے ہیں۔ جس طرح زمین و آسمان، چاند و سورج، پھل اور پھول کے خاص خاص قوانین فطرت ہیں جن میں عموماً تغیر نہیں ہوتا۔ اسی طرح دُنیا کی رشد و ہدایت، عذاب و رحمت اور نبوّت و رسالت کے خاص خاص اُصول و قواعد ہیں جن میں تغیر راہ نہیں پاتا۔ انبیاء اپنے اپنے وقت پر مبعوث ہو کر قوموں کو دعوت دیتے ہیں۔ قومیں ان کی تصدیق یا تکذیب کرتی ہیں۔ منکرین ہلاک اور مومنین کامیاب ہوتے ہیں۔ اس روحانی جہاد میں انبیاء و رسل سے ہمارے علم و دانش سے بالاتر اعمال صادر ہوتے ہیں اور ان سے عجیب و غریب خوارق ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جس طرح ہمارا نفس اور ہماری رُوح یا ہمارے جسم کی پُراسرار مخفی ہمارے کالبد خاکی پر حکمران ہے اور ہمارے تمام اعضاء و جوارح اس کے ایک ایک اشارے پر حرکت کرتے ہیں۔ اسی طرح نبوّت کی روحِ اعظم اذنِ الٰہی سے سارے عالم جسمانی پر حکمران ہو جاتی ہے اور روحانی دنیا کے سنن و اصول عالمِ جسمانی کے قوانین پر غالب آجاتے ہیں اس لیے چشم زدن میں فرشِ زمین سے عرشِ بریں تک عروج کر جاتی ہے۔ سمندر اس کی ضرب سے تھم جاتا ہے۔ چاند اس کے اشارے سے دو ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اس کے ہاتھوں کی دی ہوئی چند خشک روٹیاں ایک عالم کو سیر کر دیتی ہیں۔ اس کی انگلیوں سے پانی کی نہریں نکلتی ہیں۔ اس کے پھینکنے سے لاٹھی اژدہا بن جاتی ہے۔ وہ ہاتھ گریبان سے نکالتا ہے آفتاب کی طرح روشن ہو جاتا ہے۔ اس کے نفسِ پاک سے بیمار تندرست ہو جاتے ہیں اور مُردے جی اُٹھتے ہیں۔ وہ تنہا مٹھی بھر خاک سے پوری فوج کو تہ و بالا کر دیتا ہے۔ کوہ و صحرا، بحر و بر، جاندار و بے جان بحکمِ الٰہی اس کے آگے سرنگوں ہو جاتے ہیں مگر بایں ہمہ وہ بندہ اور بشر ہوتا ہے اور اس سے یہ جو کچھ عجائباتِ قدرت ظاہر ہوتے ہیں وہ اس کا نہیں بلکہ اس کے رب کا فعل ہوتا ہے اور اسی کی مشیت اور قدرت سے پیغمبر کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے یا اللہ سبحانہٗ کی طرف سے اس کے لیے ظاہر کیے جاتے ہیں۔

لیکن جس طرح ہم کبھی یہ نہیں بتا سکتے کہ خاص خاص پھول خاص خاص درخت، خاص خاص ستارے، فلاں فلاں معین اوقات ہی پر کیوں جلوہ نما ہوتے ہیں۔ ستارے چمکتے کیوں ہیں، شہد میٹھا کیوں ہوتا ہے۔ چاند اور سورج چلتے کیوں ہیں؟ تخم، درخت، غذا، خون، گوشت کیوں کر بن جاتا ہے۔ اسی طرح اس کا جواب بھی نہیں دے سکتے کہ پیغمبروں کا ظہور اپنے اپنے وقت پر کیوں ہوتا ہے اور ان سے یہ مافوق العادۃ افعال و اعمال بحکم الٰہی کیوں کر صادر ہوتے ہیں۔ ہم صرف یہ جانتے ہیں کہ وہ ہوتے ہیں چنانچہ دُنیا کا ہر پیغمبر بلکہ روحانیت کا ہر حامل اپنی پُر اسرار زندگی کے اندر اس قسم کے حالات و کیفیات کی ایک دُنیا رکھتا ہے۔ عالم کی تاریخ آپ کے سامنے ہے جس میں اگر قوموں کے روحانی معلموں کے حالات غور سے پڑھیں تو آپ کو ہر جگہ نظر آئے گا کہ وہ وہ کچھ دیکھتے ہیں جو ہم نہیں دیکھتے وہ وہ کچھ سنتے ہیں جو ہم نہیں سنتے۔ وہ وہ کچھ جانتے تھے جو ہم نہیں جانتے اور ان سے وہ اعمال صادر ہوتے ہیں جو کسی اور سے نہیں ہو سکتے۔ یہ تاریخی واقعات ہیں جن کا انکار کسی طرح ممکن نہیں ہے۔

آئیے اب اسی موضوع پر عُلماء نے جو معجزہ کی تعریف بتاتے ہوئے اپنی تحقیقات زیبِ قرطاس فرمائی ہیں وہ بھی سن لیجئے:

حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری جلد ششم میں فرماتے ہیں:

معجزہ کو معجزہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ جن کے روبرو وہ ظاہر کیا جاتا ہے وہ اس کا سامنا کرنے سے عاجز آجاتے ہیں اور معجزہ میں تا تانیث کی نہیں، بلکہ علاقہ کی طرح مبالغہ کے لیے ہے یا معجزہ صفت ہے اور اس کا موصوف محذوف ہے۔ اصل میں آیۃ معجزہ ہے اس وقت تا تانیث کے لیے ہے۔

اور مشہور عالم حضرت ملا علی قاری مرقاۃ شرح مشکوٰۃ میں لکھتے ہیں:

معجزہ عجز سے مشتق ہے جو قدرت کی ضد ہے اور تحقیقی بات صرف یہ ہے کہ معجزہ وہ ہے جو غیر میں عجز کا فعل پیدا کرے۔

علامہ قاضی عیاض مالکی شفا میں رقمطراز ہیں:

جاننا چاہیے کہ جو خرق عادت چیز انبیاء کرام کے ہاتھ پر صادر ہوتی ہے اس کو اس لیے معجزہ کہتے ہیں کہ مخلوق اس کے کرنے سے عاجز ہوتی ہے۔

امام عبدالوہاب شعرانی سراج العقول کے حوالہ سے لکھتے ہیں،

معجزہ وہ فعل ہے جس کو اللہ تعالیٰ خرق عادت کے طور پر مدعیٔ نبوت کے ہاتھ پر
اس کے دعویٰ نبوت کی تائید میں صادر فرماتے۔

مولانا عبدالحی لکھنوی فتاویٰ میں لکھتے ہیں :

معجزہ اس خرقِ عادت کو کہا جاتا ہے جو منکرینِ نبوت کے مقابلہ میں مدعیٔ نبوت کے ہاتھ پر صادر ہو اور اس کی مثل لانے کی کسی کو قدرت نہ ہو۔

مشہور مفسرِ قرآن علامہ السید رشید رضا تفسیر المنار میں لکھتے ہیں :

معجزہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کو اپنے عادی نظام کے خلاف صرف اپنی قدرت سے ظاہر فرماتا ہے تاکہ یہ بات ثابت کر دے کہ نوامیس طبعیہ خود اس کے محکوم ہیں وہ ان کا محکوم نہیں ہے۔

حضرت مولانا اشرف علیؒ نے بوادر النوادر میں معجزہ کی حقیقت پر بڑا بصیرت افروز اور جامع تبصرہ فرمایا ہے۔ فرماتے ہیں :

معجزہ یہ ہے کہ اس کے صدور میں اسباب طبعیہ کو اصلاً دخل نہیں ہوتا نہ جلیہ کو نہ خفیہ کو۔ نہ صاحب معجزہ کی کسی قوت کو نہ خارجی قوت کو۔ وہ براہ راست حق تعالیٰ کی مشیت سے بلاتوسط اسباب عادیہ واقع ہوتا ہے جیساکہ صادر اول بلاکسی واسطہ کے صادر ہوا ہے یعنی فلاسفہ کے نزدیک۔ پھر قیامت تک بھی کوئی شخص اس میں سبب طبعی نہیں بتلا سکتا کیونکہ معدوم کو موجود کون ثابت کر سکتا ہے ورنہ اگر معجزہ سے کسی زمانہ خاص میں صاحبِ معجزہ کی تائید ہو جاتی تو دوسرے زمانہ میں اس کے سبب خفی بتلانے سے اس کی تکذیب ہو جاتی تو کسی نبی کی نبوت پر یقین نہیں ہو سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ معجزہ اس کے جنس کے ماہرین نے کوئی سبب خفی بتلا کر باقاعدہ شبہ نہیں کیا نہ اس کے مثل کو ظاہر کر کے مقاومت کر سکے۔ بالخصوص اگر نبی کی قوت اس کا سبب ہوتی تو موسیٰ علیہ السلام اپنے معجزے سے خود نہ ڈرتے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بعض فرمائشی معجزوں کی تمنا پر یہ نہ فرمایا جاتا فان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتیھم بآیۃ اور استناد الی الاسباب الخفیہ کے احتمال پر معجزہ و دیگر عجائب طبعیہ میں کوئی فرق واقعی نہ ہوتا۔ . . اور انضمام اخلاق و کمالات کے ساتھ جو اس کی دلیل کہا گیا ہے

تو ان اخلاق کی مخصوص نوعیت کو پہچاننے میں جتنی غلطی ہو سکتی ہے وہ معجزات کے متعلق غلطی ہونے سے کہیں زیادہ ہے۔

حضرت اقدس نے ان مختصر کلمات میں وہ سب کچھ فرما دیا ہے جو حال کے مؤلفین اوراق میں بھی نہیں کہہ سکتے۔ اس فقرے میں کہ انضمام اخلاق وکمالات ہیں اس کی پوری وضاحت کر دی ہے کہ کسی نبی کے اخلاق وکمالات میں اگرچہ اعجاز کی کتنی روح موجود ہو لیکن ان کا یہ اعجاز نظری ہوتا ہے لہٰذا ان کو معجزہ بنا کر پیش نہیں کیا جا سکتا۔

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اپنی مشہور کتاب حجۃ الاسلام میں فرماتے ہیں :

مدارِ نبوت تین باتوں پر ہے اوّل یہ کہ محبت واخلاص خداوندی اس قدر ہو کہ ارادۂ معصیت کی بھی گنجائش نہ ہو لہٰذا نبوت کے لیے عصمت ناگزیر ہے۔ دوسرے یہ کہ اخلاق حمیدہ وپسندیدہ ہوں اور اخلاق کا اچھا یا بُرا ہونا اس پر موقوف ہے کہ خدا تعالیٰ کے اخلاق کے موافق یا مخالف ہوں جو خدا تعالیٰ کے اخلاق کے موافق ہوگا وہ اچھا ہے اور جو مخالف ہوگا وہ بُرا ہے۔

تیسری بات عقل وفہم ہے۔۔

الغرض اصل نبوت اس کو مقتضی ہے کہ فہم سلیم اور اخلاق حمیدہ اس قدر ہوں رہے معجزات تو وہ نبوت کے بعد عطا کیے جاتے ہیں یہ نہیں ہوتا کہ جس نے اظہارِ معجزات کے امتحان میں نمبر اوّل حاصل کیا اس کو نبوت عطا ہو گئی ورنہ ناکام رہا۔

معجزات کی دو قسمیں علمی اور عملی

مولانا محمد قاسم نانوتوی نے معجزات کی دو قسمیں بتائی ہیں علمی اور عملی۔ معجزات عملی سے مراد یہ ہے کہ کوئی شخص دعوئ نبوت کر کے ایسا کام کر دکھائے کہ اور سب اس کام کے کرنے سے عاجز آجائیں اور معجزہ علمی یہ کہ کوئی شخص دعوئ نبوت کر کے ایسے علوم ظاہر کرے کہ دوسرے افراد اس کے مقابلہ میں عاجز آجائیں۔ اور حافظ ابن کثیر نے بھی البدایہ والنہایہ میں معجزہ کی دو قسمیں بتائی ہیں حسی اور معنوی معنوی معجزے سے مراد مدعئ نبوت کے وہ اوصاف و ملکات ہیں جو اللہ سبحانہٗ کسی کسب کے بغیر آغاز ہی سے ان میں ودیعت فرماتے ہیں۔ اس لیے ان کے من جانب اللہ ہونے کی نشانی خود ان کے سرتاپا وجود ہوتا ہے دیکھنے والوں کے لیے ان کی چشم و ابرو میں اور سننے والوں کے لیے ان کے

لہجہ و آواز ہیں اور سمجھنے والوں کے لیے ان کا پیام و دعوت میں اعجاز ہوتا ہے لیکن جو لوگ احساس حقیقت میں فروتر ہوتے ہیں ان کو اس سے تسکین نہیں ہوتی اور وہ مادی اور حسی نشانیوں کے طلبگار ہوتے ہیں جو بالآخر ان کو دی جاتی ہیں لیکن انبیائ کے متبعین میں سے سابقین، اوّلین اور صدیقین وصالحین نے اپنے اپنے پیغمبروں سے معجزہ طلب نہیں کیا۔ حضرت ہارون و یوشع نے حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھ کر ان کو پیغمبر تسلیم نہیں کیا تھا۔ حضرت عیسٰی کے حواریوں نے ان کا معجزہ دیکھ کر آسمانی دولت کا حصہ نہیں پایا۔ حضرت خدیجہ سب سے پہلے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائیں مگر چاند کے دو ٹکڑے ہوتے ہوتے دیکھ کر نہیں بلکہ یہ جان کر کہ آپ غریبوں کے دست و بازو ہیں، قرضداروں کی تسکین اور سہارا ہیں، مسافروں کے ملجا و ماویٰ ہیں۔ حضرت ابوبکر، عمر، عثمان اور علی رضی اللہ عنہم اور دیگر اصحاب کبار میں سے کسی ایک نے بھی آپ کی صداقت اور راستی کی حقیقت کو ظاہری آیات و معجزات کی روشنی میں تلاش نہیں کیا۔ ان کے لیے آپ کا سراپا وجود نفس دعوت حق اور پیام اخلاص ہی معجزہ تھا۔ انہوں نے اسی کو دیکھا اور اسی سے ایمان کی دولت پائی مگر فرعون، نمرود، ابوجہل اور ابولہب جو آتش خلیل، طوفان نیل، قحطِ مکہ اور انشقاقِ قمر کے معجزوں کے طالب تھے پھر بھی ایمان کی دولتِ عظمیٰ سے محروم رہے۔ لیکن بایں ہمہ ایک درمیانی طبقہ بھی دنیا میں موجود رہا ہے جس کے بصیرت کے آئینے پر غفلت کے زنگ کی کچھ کچھ چھائیاں پڑی ہوتی ہیں۔ جب حقیقت کا آفتاب طلوع ہوتا ہے اور اس کی معجزانہ کرنیں ان آئینوں پر پڑتی ہیں تو وہ چمک اٹھتے ہیں اور آمنا برب ھارون وموسیٰ، فرعون کے ساحروں نے حضرت موسیٰ کے معجزوں کو دیکھا تو موسیٰ و ہارون کے خدا کے آگے سجدہ میں گر پڑے۔ یہی طبقہ ہے جس کو حسی معجزات سے بقدرِ استعداد حصہ ملتا ہے اس کے علاوہ حسی معجزات کا بڑا حصہ مویدات یعنی تائید حق کے لیے غیر منتظر اور غیر متوقع حالات کا رونما ہونا ہے۔ مومنین و صادقین کو مشکلات کے عالم اور اضطراب کی گھڑیوں میں ان کے ذریعے سے تسکین دی جاتی ہے اور رسوخ ایمان اور ثباتِ قدم رحمت ہوتا ہے۔ ان بے سروسامانیوں اور بے نوائیوں کی مکافات ہوتی ہے اور اس سے ان کی دولتِ ایمان کا سرمایہ ترقی کرتا ہے۔

معجزہ کا سبب صرف ارادۂ الٰہی ہے۔

معجزہ کا سبب براہ راست اللہ کی مشیت اور اس کا ارادہ ہے۔ کبھی یہ مشیت وارادہ عاداتِ جاریہ اور ظاہری علل واسباب کے پردے میں ظاہر ہوتا ہے مثلاً قوم نوح کے لیے طوفان آنا،

قوم ہود کے کوہ و آتش فشاں کا پھوٹنا اور زلزلہ آنا۔ حضرت ایوب کا چشمہ کے پانی سے صحیح و تندرست ہو جانا، قوم صالح کے لیے آندھی آنا، مکہ میں قحط عظیم کا رونما ہونا۔ غزوۂ خندق میں آندھی چلنا۔ یہ تمام نشانیاں ظاہری اسباب اور عادات جاریہ کے خلاف نہیں لیکن ان اسباب کے ظاہر ہونے کا سبب جس میں حق کی فتح اور باطل کی شکست، نیکوکاروں کی نجات اور گنہگاروں کی ہلاکت ہوئی نہ بخت و اتفاق ہے بلکہ ارادۂ مشیت الٰہی نے خاص ان موقعوں کے لیے بطور نشان کے ان کو پیدا کیا اور کبھی یہ مشیت الٰہی عادات جاریہ اور اسباب ظاہری کا نقاب اوڑھ کر نہیں بلکہ بے پردہ نشان بن کر سامنے آتی ہے۔ مثلاً عصا کا سانپ بن جانا اور ہاتھ کا چمکیلا ہو جانا کہ ان کی تشریح موجودہ علم و اسباب و علل کی بنا پر نہیں کی جا سکتی۔ اور نہ ان کو عادات جاریہ کے مطابق کہا جا سکتا ہے اس لیے ان کی علت خدا کی مشیت اور ارادے کے سوا اور کوئی چیز نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے انبیاء نے یہ تصریح کی ہے کہ جو کچھ ان سے ظاہر ہوتا ہے وہ صرف خدا کی قدرت اور مشیت اور اذن سے ہوتا ہے کیونکہ اگر وہ ظاہری سبب و علت کے مطابق ہوں تو وہ پیغمبر اور خدا کے باہمی ربط و علاقہ کی دلیل کیوں کر بن سکتے ہیں۔ مخاطب ان کو دیکھ کر فوراً کہہ سکتے ہیں کہ یہ تو فلاں سبب سے ہوا ہے اس لیے خدائی نشان کیوں کر ہو سکتا ہے۔

معجزہ کا فاعل نبی نہیں اللہ ہے

عام لوگوں میں نبوت کے بارے میں یہ غلط عقیدہ پیدا ہو گیا تھا کہ جو نبوت کا خلعت لے کر آتا ہے وہ براہ راست عالم کائنات کے تصرف پر قادر ہے چنانچہ موجودہ انجیلوں کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسیٰ کے قبضہ و قدرت میں تھی اور وہ اس میں جیسے چاہتے تھے تصرف کرتے تھے یہی وہ بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے اپنے دین کی دیوار کج کھڑی کی تھی۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن نے نہایت شدت اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادہ سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔

یہ بڑے دکھ کی بات ہے کہ عیسائیوں کی دیکھا دیکھی کچھ نام نہاد مسلمانوں نے بھی ایسا ہی کہنا شروع کر دیا اور اسلام کے صاف چہرے کو گرد آلود بنانے کی کوشش کی انا للہ فالی اللہ المشتکی۔

قرآن نے یہ بات کھول کر سمجھائی ہے۔

قل انما الایات عند اللہ ۔ (انعام ۱۳-)

قل انما الایات عند اللہ ۔ (عنکبوت ۵-)

قل ان اللہ قادر علی ان ینزل ایۃ (انعام ۴)

وما کان لرسول ان یاتی بایۃ الا باذن اللہ۔

اور سینہ قرآن سے ابلی ہوئی ان ہی صداؤں سے اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے معلوم کرکے علمائے اہل السنہ نے اس موضوع پر اسلام کا یہ چہرہ پیش کیا ہے۔ اللہ سبحانہ جزائے خیر دے حضرت مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خاں صفدر صدر مدرسہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ کو کہ انہوں نے اس موضوع پر کتاب ہدایۃ المرتاب الی طریق الصواب، لکھ کر اسلام کا صحیح چہرہ عامہ کے سامنے کھول کر پیش کر دیا۔ وہ فرماتے ہیں:

رئیس الاحناف قاضی ابوبکر ابن الطیب الباقلانی لکھتے ہیں:

یہ ثابت ہو چکا ہے کہ معجزہ جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کی دلیل ہے اس کے بارے میں یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ بندوں کی قدرت کے تحت داخل ہے بلکہ معجزہ کی قدرت پر اللہ تعالیٰ ہی منفرد ہے۔ (اعجاز القرآن)

اس سے یہ بات واضح ہو گئی کہ معجزہ خواہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ہو یا کسی اور نبی کا بہرحال اس پر صرف اللہ سبحانہ قادر ہے اور یہ صرف اسی کا فعل ہے بندوں کا اس میں کوئی دخل نہیں ہے۔

علامہ قاضی عیاض مالکی لکھتے ہیں:

معجزات کا اللہ کے بغیر کسی اور سے ہونا ممکن نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کا فعل ہے جو نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے اور نبوت اسے بطور چیلنج مکذبین کے روبرو پیش کرتی ہے۔ (شفا)

اسی کی شرح میں ہے:

متکلمین کہتے ہیں کہ اعجاز کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے اور انسان کی قدرت سے بالا ہے۔ (فتح الصفا-)

یہ یہاں بھی اپنے مفہوم میں بالکل واضح ہے کہ معجزہ محض اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ امام محمد بن محمد الغزالی فرماتے ہیں:

معجزہ انبیائے کرام کی صداقت پر بایں طور دلالت کرتا ہے جب کہ اس کے ظاہر کرنے سے تمام انسان عاجز ہیں تو وہ صرف اللہ تعالیٰ کا فعل ہوگا۔ اور بس۔ اور جب یہ نبی کی تحدی سے مقرون ہوگا تو اس کا مطلب یہ ہوگا گویا کہ اللہ تعالیٰ نے تصدیق کر دی کہ تو دعویٰ رسالت میں سچا ہے۔ (احیاء العلوم)

مشہور صوفی شیخ اکبرؒ کے ترجمان شیخ عبدالوہاب الشعرانیؒ شیخ ابوطاہر القزوینی کی کتاب سراج العقول کے حوالہ سے لکھتے ہیں:

جاننا چاہیے کہ انبیاء کرام کی نبوت کے ثبوت پر واضح ترین دلیل صرف معجزات ہیں۔ اور معجزہ وہ فعل ہے جس کو خرق عادت کے طور پر اللہ تعالیٰ مدعیٔ نبوت کے ہاتھ پر اس کے دعویٰ نبوت کا اعتراف کرتے ہوئے صادر فرمائے اور یہ فعل اللہ تعالیٰ کے اس قول کے قائمقام ہے کہ تو اپنے دعویٰ رسالت میں بالکل صادق ہے۔

نیز شیخ ابوطاہر ہی کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ

بہ تحقیق یہ بات مخفی نہیں ہے کہ عاجز کرنے والا درحقیقت صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے کیونکہ وہ عجز و قدرت کا خالق ہے باقی رہا خرقِ عادت فعل کو معجزہ کہنا تو یہ بطورِ مجاز کے ہے فی الواقع یہ فعل معجز نہیں ہے اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص آسمان سے بجلی گرتے ہوئے دیکھے اور یہ کہے کہ خدا کی قدرت کو دیکھو حالانکہ وہ بجلی خدا کی قدرت نہیں بلکہ اس کی قدرت کا ایک اثر ہے اور یہ اس لیے کہ درحقیقت عجز اس چیز سے ہوتا ہے جو قدرت کے تحت ہو اور مثلاً مردے کا زندہ کرنا تو بشر کی قدرت میں داخل نہیں ہے حتیٰ کہ یہ کہا جائے کہ فلاں احیائے موتیٰ سے عاجز ہو گیا ہے۔

اس سے بھی صراحت کے ساتھ یہ معلوم ہو گیا کہ امر خارق للعادۃ کو معجزہ کہنا محض بطورِ مجاز ہے درحقیقت معجزہ عاجز کرنے والا وہ فعل نہیں جو نبی کے ہاتھ پر صادر ہوتا ہے بلکہ اللہ تعالیٰ کی پاک ہستی اور ذات اس فعل کے ذریعے مکذبین کو عاجز کرنے والی ہے جو حقیقی طور پر خالق عجز و قدرت ہے اور یہ فعل مخلوق کی طاقت سے بالکل خارج ہے اور ان کا اس پر کوئی دسترس نہیں ہے۔

الشیخ ابن الہمام لکھتے ہیں

معجزہ جب ایسی چیز ہے کہ اس کے صادر کرنے سے مخلوق عاجز ہے تو معجزہ صرف اللہ تعالیٰ ہی کا فعل ہوگا۔ (المائرہ)

یہ تصریحات واشگاف بتا رہی ہیں کہ معجزہ اللہ تعالیٰ کا فعل ہے اور بس ۔

معجزہ اور سحر میں فرق

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ معجزہ سے جس طرح عجیب و غریب امور صادر ہوتے ہیں سحر، طلسم، نیرنگ شعبدہ سے بھی اس قسم کی باتیں دکھائی جا سکتی ہیں ۔ سحر و طلسم کے الفاظ اگر اس بیسویں صدی میں مکروہ معلوم ہوں تو ان کے معنے مسمریزم اور ہپناٹزم کے سمجھ لیے جائیں ۔ ایسی صورت میں ایک پیغمبر اور ساحر شعبدہ باز اور مسمرائزر میں کیا فرق ہوگا ۔ اس سوال پر علم کلام میں طویل بحثیں ہیں ۔ معتزلہ اور ارباب ظواہر میں حافظ ابن حزم ظاہری کا یہ دعویٰ ہے کہ معجزہ کے علاوہ سحر و طلسم اور شعبدہ وغیرہ جو چیزیں ہیں وہ صرف فریب نظر ہیں لیکن معجزہ سے قلب حقیقت اور تبدیل ماہیت ہو جاتی ہے ۔ اشاعرہ سحر و طلسم کی حقیقت کو تسلیم کرتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ معجزہ سے جو عظیم الشان عجائبات سرزد ہوتے ہیں سحر و طلسم کے زور سے نہیں ہو سکتے ۔ حکمائے اسلام کا مسلک یہ ہے کہ معجزہ اور سحر میں فرق یہ ہے کہ صاحب معجزہ اپنی قوت کو خیر میں صرف کرتا ہے اور ساحر شر میں ۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ جوابات سے اشکال کی گرہ نہیں کھلتی ۔ ایک شخص اپنے دعویٰ کے ثبوت میں بظاہر ایک خارق عادت کرشمہ پیش کرتا ہے اب اس پر یہ بحث کہ یہ دھوکا یا نظر بندی ہے یا امر الٰہی ہے یا معمولی کام ہے یا عظیم الشان کارنامہ ہے نہایت مشکل ہے کیوں کہ ان اشیائے کے وقوع میں کوئی ظاہری امتیاز نہیں ہو سکتا ۔ نیز اس کا فیصلہ کہ یہ قوت خیر میں صرف ہوتی یا شر میں یا یہ ضروری ہے کہ یہ خوارق عادات محل خیر میں صرف ہوں یا محل شر میں ، اس کے علاوہ کوئی تیسری شکل نہیں ہو سکتی ۔ بہت کچھ قابل بحث ہے ۔ ایک مسمریزر اپنی قوت سے بعض بیماریوں کو دور کر دیتا ہے اور اس سے غریبوں کا علاج یہ تو خیر اور نیکی کی چیز ہے تو کیا آپ اسے معجزہ کہہ دیں گے ؟ ۔

اصل یہ ہے کہ معجزہ اور دیگر عجائبات میں دو عظیم الشان فرق ہیں ایک یہ کہ معجزہ براہ راست خدا کا فعل ہوتا ہے اور دوسرے عجائبات اسباب طبعی و نفسی کے نتائج ہوتے ہیں ۔ دوسرے یہ کہ معجزہ سے مقصود اعدائے دعوت حق کی ہلاکت یا صاحب رسالت کی تائید اور مومنین، صادقین کی حمایت و برکت ہوتی ہے ۔ محض کھیل تماشہ، شعبدہ بازی اور بازی گری اس کا مقصد نہیں ہوتی ۔ اور سب سے آخری شے جو ان دونوں کے درمیان حدِ فاصل بن جاتی ہے یہ ہے کہ ساحر اور بازی گر اور شعبدہ باز صرف تماشا کرتب اور عجائبات دکھاتے ہیں ۔ اس کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی پاکیزگی،

ارادوں کی یکتائی، دلوں کی طہارت اور صفائی، شریعتِ الٰہی کی تبلیغ، قلوب کے تزکیہ اور سیہ کاریوں کے قلع وقمع کے نہ وہ مدعی ہوتے ہیں اور نہ یہ کارنامے ان سے ظاہر ہوتے ہیں۔ لیکن نبوت کی معصوم زندگی پاک اخلاق، مقدس اعمال اور دیگر پیغمبرانہ خصائص وکیفیات خود ان کی نبوت کی منادی کرتے رہتے ہیں۔ قدم قدم پر اللہ سبحانہ' ان کی دعوت کی تائید کرتا ہے۔ ان کی صدائے حق جماعتوں، قوموں اور ملکوں میں روحانی انقلاب پیدا کرتی ہے۔ ان کی سچائی، راستی اور صداقت پر ان کے سوانح حیات کا حرف حرف گواہ ہوتا ہے۔ وہ سونے چاندی پر نہیں بلکہ دلوں پر اخلاص و ایثار اور صدق و صفا کی مہر لگاتے ہیں۔ ایک ساحر اور مسمریزر خواص اشیاء میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے مگر کافر کو مومن بدکار کو عفیف بے باک کو متقی بخیل کو فیاض، سخت کو نرم اور جاہل کو عالم نہیں بنا سکتا۔ وہ لوہے کو زرِ خالص کی صورت میں تبدیل کر سکتا ہے لیکن کسی زنگ آلود دل کو جلا نہیں دے سکتا۔

باقی رہا ظاہری اشتباہ اور التباس تو یہ صرف معجزہ اور سحر ہی میں نہیں ہے بلکہ دنیا کی ہر حقیقت اسی طرح اپنے مقابل سے مشتبہ اور ملی جلی ہوتی ہے۔ صبر اور بے یقینی، توکل اور کاہلی، بخل اور کفایت شعاری، سخاوت اور اسراف، حق گوئی اور گستاخی، شجاعت اور تہور ان کے ڈانڈے باہم اس قدر ملے ہوتے ہیں کہ انسان کی قوتِ عقل کبھی کبھی دھوکا کھا جاتی ہے لیکن اہلِ عقل ان دونوں حقیقتوں کے ظاہری تشابہ سے فریب نہیں کھاتے۔ ان دونوں کی ظاہری شکل وصورت اگرچہ ایک ہو مگر ان دونوں کے خصائص و آثار اس درجہ متفاوت اور متمائز ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے حدود اور فرق و امتیاز کو فوراً پہچان لیتے ہیں۔ جب پیغمبر اپنا معجزہ اور جادوگر اپنا کرتب دکھاتے ہیں تو ظاہری حیرت زائی کے لحاظ سے عوام کے نزدیک ایک لمحہ کے لیے گو دونوں ایک ہوں مگر جب حقیقت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو ایک اخلاق کا مجسمہ پاکیزگی کا فرشتہ شریعت کا حامل گنہ گاروں کا طبیب اور قلوب کا معالج ہوتا ہے اور دوسرا محض تماشاگر یا شعبدہ باز اور بناوٹی حیلہ گر اور نقال ہوتا ہے۔ ایک عطائی اور ایک طبیب حاذق، ایک معمولی سپاہی اور ایک بہادر جنرل، ایک حرف شناس اور ماہر علوم، ایک مکار اور زاہد، ایک مصنوعی اور حقیقی صوفی کے درمیان شاید کبھی عوام فرق نہ کر سکیں، مگر جب ان دونوں کے آثار و خصائص اور علامات و قرائن باہم ملائے جائیں تو ظلمت و نور کی طرح ان دونوں میں علانیہ فرق محسوس ہو جاتا ہے۔

اس پر مزید بحث انشاء اللہ سولھویں جلد میں آ رہی ہے۔ وہاں ہم اس موضوع پر حافظ ابنِ تیمیہ، حافظ ابن القیم، مولانا محمد قاسم نانوتوی اور علامہ سید سلیمان ندوی کے شہ پارے ہدیہ ناظرین

کریں گے۔

معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں

اس تقریر سے یہ بات اگرچہ کھل کر سامنے آگئی ہے کہ صرف معجزہ ہی نبی شناسی کا پیمانہ نہیں بلکہ یہاں اور بھی پیمانے ہیں۔ اس موضوع پر تو ہم انشاء اللہ اسی جلد میں حافظ ابن تیمیہ اور شاہ ولی اللہ کے حوالہ سے علیحدہ بحث کریں گے۔ یہاں ہم صرف اس مسئلہ کی طرف ناظرین کی توجہ مبذول کرنا چاہتے ہیں جس کی طرف ایک سرسری اشارہ پہلے ہی ہو چکا ہے۔ یعنی یہ کہ معجزہ دلیل نبوت ہے یا نہیں، اشاعرہ کا جواب اثبات میں اور معتزلہ کا جواب نفی میں ہے۔ مذہب اعتزال کی ترجمانی ابن رشد الکشف الادلہ میں بھرپور انداز میں کی ہے۔ اور ثابت کیا ہے کہ معجزہ دلیل نبوت نہیں ہو سکتا کیونکہ منطقی حیثیت سے دعویٰ اور دلیل میں مطابقت کا ہونا ضروری ہے اور معجزہ و نبوت میں کسی قسم کی مناسبت نہیں پائی جاتی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ نے دعویٰ کیا ہے کہ میں خدا کا رسول ہوں اور دلیل کے مطالبہ پر انہوں نے لاٹھی کو سانپ بنا دیا تو یہ بات کہ لاٹھی سانپ بن گئی اگرچہ اپنی جگہ عجیب سے عجیب تر ہے لیکن اس دلیل کو دعوے سے کیا مناسبت ہے؟

فرض کیجئے کہ ایک شخص دعویٰ کرتا ہے کہ وہ فلسفہ و ریاضی کا بہت بڑا ماہر ہے اور اس کے ثبوت میں انسان کو جانور اور جانور کو انسان بنا دیتا ہے تو واقعہ سے اس کے فلسفہ و ریاضی کا کمال کیوں کر ظاہر ہو سکتا ہے۔ اشاعرہ اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ نبوت علم و عمل کے مجموعہ کا نام ہے اور جو شخص دعویٰ نبوت کرتا ہے اس کی نسبت یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ وہ ان دونوں چیزوں میں کمال رکھتا ہے اور اس کمال کے اظہار کے لیے معجزہ طلب کیا جاتا ہے اور انبیاء کے معجزات اگرچہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں تاہم ان کو صرف دو نوع میں شمار کیا جا سکتا ہے۔ اخبار بالغیب اور تصرف فی الکائنات اور ان دونوں کو اجزائے نبوت کے ساتھ ربط و اتحاد ہے۔ اخبار بالغیب سے اس کے علمی کمال کا اظہار ہوتا ہے اور تصرف فی الکائنات سے اس کی عملی قوت ظاہر ہوتی ہے۔ ایک اور مناسبت یہ ہے کہ معجزہ خرق عادت کا نام ہے اس میں کوئی نزاع نہیں کہ اشیا اور حقائق کے خصائص اور علل خدا کے امر و حکم سے ہیں اب جو شخص ان خصائص و علل کو اپنے معجزے سے توڑتا ہے وہ گویا اس بات کا ثبوت دیتا ہے کہ جس برتر ذات نے ان اسباب و علل کو بنایا ہے وہی اس کو توڑ سکتی ہے اور یہ شکست و ریخت چونکہ اس کے واسطہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ اس کا رسول ہے۔ رسول کی مثال یہ

ہے کہ ایک بادشاہ اپنی رعایا کے پاس قاصد بھیجتا ہے۔ رعایا پوچھتی ہے کہ اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ تم بادشاہ کے قاصد ہو۔ وہ اس کے جواب میں بادشاہ کی مہر اور انگوٹھی پیش کرتا ہے۔ اگرچہ ظاہر ہے کہ قاصد کے دعویٰ پیامبری کو مہر اور انگوٹھی سے براہ راست کوئی مناسبت نہیں ہے لیکن یہ مناسبت یوں ظاہر ہوتی ہے کہ یہ مہر اور انگوٹھی بادشاہی کی نشانی ہے جو ایک معمولی قاصد کے ہاتھ میں نہیں ہو سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ بادشاہ کی طرف سے نشانی دے کر بھیجا گیا ہے۔

علم کلام کی کتابوں میں ایک مثال یہ دی جاتی ہے کہ ہر شخص کو معلوم ہے کہ شاہی دربار اور جلوس کے رسوم و آداب خاص ہوتے ہیں۔ بادشاہ دربار میں معمولی فرش پر نہیں بلکہ طلائی و نقرئی تخت پر بیٹھتا ہے۔ جلوس میں وہ پیادہ نہیں بلکہ سوار ہو کر نکلتا ہے۔ ایک شخص بادشاہ کی طرف سے قاصد بن کر مجمع عام میں آتا ہے۔ یہ مجمع اس کو شاہی پیامبر تسلیم کرنے سے انکار کرتا ہے۔ قاصد بادشاہ سے کہتا ہے کہ اے بادشاہ اگر میں حقیقتہً تیرا فرستادہ ہوں تو رسم و عادت کے خلاف فرش پر جلوس فرما اور پیادہ پا نکل۔ بادشاہ اس کے مطابق دربار میں فرش پر جلوس کرتا ہے اور پیادہ پا چلتا ہے۔ بادشاہ کا یہ عمل یقیناً اس بات کی تصدیق ہو گی کہ وہ شاہی قاصد ہے۔ اسی طرح دنیا کے اسباب و علل اس دنیا میں خدا کی بادشاہی کے رسوم و عادات ہیں۔ پیغمبر اس بات کا مدعی ہوتا ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے۔ کفار اس کے قاصد الٰہی ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ اے خدا اگر میں حقیقتہً تیرا فرستادہ ہوں تو اپنے رسوم و عادات کے خلاف معجزہ اور خرق عادت دکھا وہ دکھا دیتا ہے۔ یہ اس بات کی دلیل ہے کہ وہ خدا کی طرف سے آیا ہے۔

لیکن معجزہ اگر دلیل نبوت ہے تو منطقی حیثیت سے یہ کس قسم کا استدلال ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو برہان یقینی نہیں کہا جا سکتا تاہم دلیل کا انحصار صرف برہانیات میں نہیں ہے بلکہ اس کی بھی اور متعدد قسمیں ہیں اور معجزہ ان مقدمات میں داخل ہو سکتا ہے۔

ابن رشد نے کشف الادلہ میں معجزہ کو خطابیات میں داخل کیا ہے۔ یعنی معجزہ اگرچہ نبوت پر بالذات یقینی طور پر دلالت نہیں کرتا۔ تاہم جب کوئی پیغمبر سلسلۂ کائنات میں عجیب و غریب تصرف کرتا ہے تو اس کو دیکھ کر ہر شخص اس کے کمال روحانی کا اعتراف کرتا ہے اور سمجھتا ہے کہ جو شخص ان عظیم الشان تصرفات کی قدرت رکھتا ہے وہ ضرور اپنے دعوے میں صادق ہو گا۔ ان دونوں نتائج یعنی تصرف فی الکائنات اور اصلاح روحانی میں اگرچہ باہم کوئی تلازم نہیں ہے تاہم عوام کی دلفریبی کے لیے یہ کافی ہے اور اس سے زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ جدل ہے جس میں مسلمات خصم سے استدلال کیا

جاتا ہے۔ اور تاریخی حیثیت سے معجزات کو قیاس جدل کہنا زیادہ موزوں ہوگا۔ زمانہ قدیم سے یہ خیال چلا آتا ہے کہ جو لوگ پیغمبر ہوتے ہیں ان میں کوئی نہ کوئی مافوق الفطرت قوت ضرور ہوتی ہے اور وہی پیغمبر کو عام لوگوں سے ممتاز کرتی ہے۔ اس بنا پر تمام لوگ اس سے معجزہ طلب کرتے ہیں۔ اور پیغمبر کو مجبوراً دکھانا پڑتا ہے۔ یہ معجزہ اگرچہ ایک فلسفی کے لیے دلیل وحجت نہیں ہو سکتا تاہم جو لوگ یہ تسلیم کرتے ہیں کہ معجزہ دلیل نبوت ہے اور انہی کے طلب واصرار سے اس معجزہ کا ظہور ہوا ہے ان کو اس کے ذریعہ سے ساکت کیا جا سکتا ہے اور وہ ان کے لیے دلیل ہو سکتا ہے۔

اگر ذرا غور وفکر سے کام لیا جاتے تو آپ محسوس کریں گے کہ اشاعرہ اور معتزلہ کے مابین اس موضوع پر غلط مبحث ہو گیا ہے۔ اشاعرہ کا یہ کہنا کہ معجزہ دلیل نبوت ہے اس کے معنے یہ نہیں ہیں کہ وہ منطقی دلیل ہے اور معتزلہ کا اعتراض اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب اشاعرہ اس کو منطقی دلیل کہیں۔ دلیل کا لفظ یہاں منطقی محاورے ہیں نہیں بلکہ عام اور لفظی معنے میں استعمال ہوا ہے۔ اس بنا پر جب معجزہ سرے سے دلیل منطقی ہی نہیں تو یہ تلاش کہ وہ انواع دلیل کی کس قسم میں داخل ہے بے سود ہے۔ چنانچہ اشاعرہ خود کہتے ہیں کہ معجزہ کی دلالت نبوت پر عقلی نہیں بلکہ عادی ہے۔ شرح مواقف بحث معجزات میں ہے:۔

> معجزہ نبوت کی دلیل عقلی نہیں جیسے فعل فاعل کے وجود کی دلیل ہوتی ہے یا جیسے فعل کے استحکام ونظم کی دلالت فاعل کے علم پر عقلی ہے۔ کیونکہ دلائل عقلی اپنے مدلولات کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں اور یہ فرض ناممکن ہے کہ وہ اپنے مدلول پر دلیل نہ ہو اور معجزہ کی دلالت کی صورت ایسی نہیں ہے بلکہ معجزہ کی دلالت دلالت عادیہ ہے جیسا کہ مولف نے یہ کہہ کر کہ یہ دلالت ہمارے نزدیک اس بنا پر ہے کہ اللہ تعالیٰ کی عادت یہ ہے۔ اشارہ کیا ہے۔

آج کل کے محاورۂ علمی میں اشاعرہ کے اس قول کی تشریح کہ معجزہ دلیل عقلی نہیں بلکہ عادی ہے یہ ہے کہ معجزہ دلیل منطقی نہیں بلکہ نفسیاتی ہے۔ عادت انسانی یہ ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی غیر معمولی کارنامہ ظہور پذیر ہوتا ہے تو نفوس اس کی عظمت وکبریائی کے سامنے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ جب ایک شخص عام انسانی حالت سے بلند تر سطح میں آکر من جانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور خوارق عادات اس سے ظاہر ہوتے ہیں تو عام متاثر طبع فوراً اس کے دعوے کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

کیا صرف معجزہ ہی نبی شناسی کا پیمانہ ہے

یہاں سے یہ بات بھی خود بخود سمجھ میں آ رہی ہے کہ نبی شناسی کا صرف معجزہ ہی پیمانہ نہیں ہے جیسا کہ متکلمین بتاتے ہیں بلکہ نبی شناسی کے کچھ اور بھی پیمانے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ نبوت کا علم صرف معجزات ہی کے ذریعے ہوتا ہے۔

کیا معجزہ مافوق الاسباب کام ہے؟

اب تک گفتگو اس میں تھی کہ معجزہ اللہ کا فعل ہے اور معجزہ دلیل نبوت ہے کہ نہیں لیکن بات تشنۂ تکمیل رہ جائے گی اگر ہم یہ نہ بتائیں کہ کیا معجزات مافوق امور ہوتے ہیں یا ان کے لیے بھی غیر مادی، غیر ظاہری اور مخفی اسباب ہوتے ہیں۔

اشاعرہ یہ کہتے ہیں کہ خود اشیآ کی طبیعت کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جس کی بنا پر ایک علت و سبب اور دوسرا معلول و مسبب ہو۔ نفس آگ میں کوئی ایسی چیز نہیں جس کو ہم گرمی کا سبب قرار دے سکیں اور نہ نفس برف کے اندر ٹھنڈک طبیعت کے طور پر موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اشاعرہ کے خیال میں کوئی شے کسی چیز کی علت نہیں اور نہ اشیآ میں کوئی خاصیت اور تاثیر ہے۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے کتاب الرد علی المنطقیین میں جہاں اشاعرہ کے وہ مسائل گنائے ہیں جن میں وہ متفرد ہیں۔ ان میں اس مسئلہ کو بھی شمار کیا ہے بلکہ لکھا ہے کہ اس مسئلہ کا اصل بانی جہم ہے جس کے انتساب سے فرقہ جہمیہ قائم ہوا تھا اس کے بعد ابوالحسن اشعری نے اس کی پیروی کی۔ علامہ ابن تیمیہ نے اس مسئلہ کی تشریح اپنے الفاظ میں اس طرح کی ہے۔

> لیکن متکلمین میں جو لوگ اسباب و علل کے منکر ہیں جیسے جہم اور اس مسئلہ میں جہم کے جو موافق ہیں جیسے ابوالحسن اشعری اور ان کے پیرو۔ وہ یہ مانتے ہیں کہ ہم کو صرف یہ معلوم ہے کہ ایک چیز کا دوسری چیز کے ساتھ ایک لگاؤ اور علاقہ ہے اور یہ لگاؤ اور علاقہ صرف اسی قادر ذی ارادہ کی مشیت سے ہے۔ جہمیہ اور اشاعرہ کے سوا تمام عقلاً مسلم اور غیر مسلم اور مسلمانوں میں اہل السنہ خواہ متکلمین ہوں یا فقہاء

محدثین ہوں یا صوفیا - اور غیر اہل السنہ یعنی معتزلہ وغیرہ یہ سب کہتے ہیں کہ یہاں سلسلہ اسباب ہے اور بتاتے ہیں کہ جس طرح ہم کو یہ معلوم ہے کہ ایک کا دوسرے سے لگاؤ ہے، اسی طرح یہ بھی معلوم ہے کہ آگ میں ایک قوت ہے جو گرمی کو چاہتی ہے اور پانی میں ایک قوت ہے جو ٹھنڈک کو مقتضی ہے اور اسی طرح آنکھ میں ایک قوت ہے جو مزہ پیدا کرتی ہے۔ یہ لوگ طبیعت کو ثابت کرتے ہیں جس کا دوسرا نام فطرت، خلقت عادت وغیرہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اشاعرہ کے علاوہ باقی تمام اسلامی فرقے اس کے قائل ہیں کہ عالم میں جو کچھ ہوتا ہے وہ علت و معلول، سبب و مسبب، شرط و مشروط، مؤثر و موثر کے بغیر نہیں ہوتا۔ یہ بات ملحوظ خاطر رہے کہ یہ اسلامی فرقے فلاسفہ و حکماء کی طرح اللہ تعالیٰ کو علت موجبہ اور عالم کو معلول نہیں کہتے بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کو فاعل بالاختیار کہتے ہیں۔ ہاں اسباب و مسببات میں آپس میں ایک دوسرے کو علت و معلول اور سبب و مسبب وغیرہ مانتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اسی سلسلہ اور نظام کا نام فطرۃ سنت اللہ اور خلق اللہ ہے۔ اور وہ یہ کہتے ہیں کہ جب بھی کوئی واقعہ اللہ سبحانہ کی عادت جاریہ کے خلاف وقوع میں آتا ہے جس کو لوگ خرق عادت کہتے ہیں تو واقعہ اسباب ہی کی وجہ سے وقوع میں آتا ہے گویا وہ اسباب مخفی اور غیر معمولی ہوتے ہیں۔ چنانچہ حضرت امام غزالی فرماتے ہیں "کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے عجیب و غریب واقعات صادر ہوتے ہیں جن کا ہم مشاہدہ کرتے رہتے ہیں۔ ان کے امکان کا کسی طرح انکار مناسب نہیں ہے اور نہ ان کے محال ہونے کا فیصلہ درست ہے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ کی لاٹھی کا سانپ بنا دینا اسی طریقہ پر ممکن ہے کہ چونکہ مادہ ہر چیز کو قبول کر لیتا ہے۔ مثلاً مٹی اور جملہ دیگر عناصر نباتات کی صورت میں نمودار ہو جاتے ہیں اور ان ہی سبزیوں اور ترکاریوں کو جب جاندار کھاتے ہیں تو ان میں خون پیدا ہوتا ہے اور یہ نباتات خون کی صورت اختیار کر لیتی ہیں۔ پھر بھی خون مٹی کی صورت اختیار کر لیتا ہے اور یہ مٹی جب رحم میں پہنچتی ہے تو اس سے جاندار کی شکل تیار ہوتی ہے اور یہ تبدیلیاں عادۃ" کافی زمانہ میں پایہ تکمیل کو پہنچتی ہیں یہ لکھ کر امام غزالی نے خوارق کا انکار کرنے والوں سے دریافت کیا ہے۔

آخر اس کو محال کیوں کہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں یہ بات داخل ہو کہ وہ مادے کو ان مختلف حالات میں بہت ہی مختصر سے وقت میں اس قابل بنا دے کہ وہ اپنے مقررہ وقت سے کم ہیں۔ یہ تبدیلیاں قبول کرے اور جب اس سے کم

وقت میں ایسا ہونا ممکن ہے تو اقل کے لیے کوئی حد ہی نہیں ہے۔ لہٰذا جب یہ قوتیں بڑی عجلت سے اپنی کارروائی پایۂ تکمیل کو پہنچا دیں گی تو اس سے معجزہ حاصل ہو جاتے گا۔
(تہافۃ الفلاسفہ)

امام رازی نے المطالب العالیہ میں اسی کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے کہ فلاسفہ اگرچہ معجزات کو نہیں مانتے ہیں مگر وہ متعدد ایسے اصول مانتے ہیں جن کی بنا پر خرق عادت کا تسلیم کرنا ان کے لیے لازمی ہو جاتا ہے مثلاً وہ تولد ذاتی کے قائل ہیں یعنی یہ کہ جن جانداروں کی پیدائش ایک نظام خاص کے ساتھ ہوتی ہے۔ ایک قطرۂ آب سے خون، خون سے گوشت، پھر بتدریج مدت حمل کے اندر وہ شکم مادر میں پرورش پاتے رہتے ہیں۔ ایک متعین زمانہ کے بعد وضع حمل ہوتا ہے۔ پھر شیر خوارگی اور بچپن کے دور سے آہستہ آہستہ بڑھتے ہوتے ایک تنو مند قوی ہیکل ذی روح صورت میں ظاہر ہوتے ہیں وہ دفعتاً ان بیچ کے منازل کو طے کیے بغیر اس ہیکل اور صورت میں نمودار ہو جائیں۔ یہ فلاسفہ کہتے ہیں کہ قطرۂ آب کے زمانہ سے لے کر عہد شباب تک اس مجموعہ عناصر کو جو سالہا سال صرف کرنے پڑے اس کی وجہ یہ تھی کہ ان عناصر میں حیات کی قابلیت پیدا ہونے کے لیے ایک خاص قسم کی اعتدال ترکیب کی ضرورت تھی۔ جب ترکیب میں یہ اعتدال پیدا ہوا حیات نمودار ہو گئی۔ اس بنا پر اگر کسی مجموعہ عناصر میں اس قسم کا اعتدال پیدا ہو جاتے جس میں حیات انسانی کے قبول کی صلاحیت ہو تو بغیر نطفہ، حمل، خون، گوشت، وضع حمل، شیر خوارگی، بچپن وغیرہ درمیانی وسائط طبعی کے اچھا خاصہ ایک نوجوان مٹی کے پتلے سے بن کر کھڑا ہو سکتا ہے۔ جیسا کہ برسات میں اکثر کیڑے مکوڑے سڑی گلی مٹی میں ایک خاص اعتدالی کیفیت پیدا ہو جانے سے جاندار اور ذی روح بن جاتے ہیں اسی کا نام تولد ذاتی ہے۔

اس تفصیل کی بنا پر ان کے نزدیک یہ ثابت ہو گیا کہ جاندار کی پیدائش کے لیے دنیا میں جو سلسلہ اسباب عادۃً جاری ہے۔ اس کے خلاف ہو سکتا ہے تو پھر عصائے موسیٰ بھی سانپ ہو سکتا ہے لاٹھی کے سانپ بن جانے کی صورت یہ ہے کہ پہلے وہ سڑ گل کر مٹی ہو جاتا ہے وہ مٹی غذا کی شکل میں ایک سانپ کے اندر جاتی ہے اور پھر وہ غذا دوسری شکل میں بن کر سانپ کا بچہ بن جاتی ہے۔ تولد ذاتی کے اصول پر یہ ممکن ہے کہ بیچ کے وسائط کے بغیر عصا میں سانپ بننے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔

انداز اگرچہ امام غزالی اور امام رازی کے مختلف ہیں مگر مآل دونوں کا ایک ہے کہ معجزہ دراصل

مادہ اور علت و سبب سے وابستہ ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ عام طور پر جتنا وقت عادی امور کے لیے درکار ہوتا ہے وہ وقت خرق عادت اور معجزے کے لیے ضروری نہیں ہے اور وقت کی کوئی حد بندی نہیں ہو سکتی۔ امام غزالی نے اپنی دوسری کتابوں، احیاء العلوم، معارج القدس، المضنون بہ علی غیر اہلہ، اور المنقذ من الضلال میں بھی اس موضوع پر اچھی تفصیلی بحث کی ہے۔ علامہ ابن رشد اندلسی نے تہافت الفلاسفہ اور کشف الادلہ میں اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ ایک جگہ فرماتے ہیں۔

جس نے اسباب کو اڑا دیا تو اس نے عقل سے ہاتھ دھو لیے۔ فن منطق کی رُو سے یہ بات ثابت شدہ ہے کہ یہاں سلسلہ اسباب و مسببات موجود ہے۔

ہم اس بحث کو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی ایک جامع و مانع عبارت پر ختم کرتے ہیں شاہ صاحب فرماتے ہیں:

معجزات اور کرامات امور اسبابی ہیں لیکن چونکہ ان پر کمال غالب ہو گیا ہے اس لیے یہ دیگر امور اسبابی سے ممتاز ہو گئے ہیں[1]

حضرت شاہ صاحب کی عبارت سے واضح ہو گیا کہ تمام اشاعرہ معجزات کو علی الاطلاق مافوق الاسباب امور قرار نہیں دیتے۔ کیونکہ حضرت شاہ صاحب بھی اشاعرہ کا مسلک رکھتے ہیں مگر اس کے باوجود وہ معجزات کو امورِ اسبابی قرار دیتے ہیں۔

یہاں یہ بات یاد رہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ میں جو اختلاف ہے وہ نظریاتی فرق ہے۔ اس سے نفس خرق عادت اور معجزہ کے ثبوت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ یہ بات کہ اشیاء کے طبائع میں فی نفسہٖ خواص و آثار ودیعت ہیں یا اللہ تعالیٰ ان کو بروقت پیدا کر دیتا ہے ایک ایسا مسئلہ ہے جس کے کسی پہلو کے اثبات اور دوسرے کی نفی پر کوئی دلیل قائم نہیں کی جا سکتی اور معجزہ کے سلسلہ میں ہم کو اس کے چھیڑنے کی ضرورت نہیں اس کا کوئی پہلو بھی صحیح ہو بہرحال دونوں تسلیم کرتے ہیں کہ کبھی کبھی اشیاء کی عادت جاریہ کو اللہ تعالیٰ توڑ دیتا ہے اور بدل دیتا ہے۔

دراصل معجزات کے باب میں اصل فیصلہ کن سوال صرف یہ ہے کہ آیا اللہ نظام کائنات کو ایک قانون پر چلا دینے کے بعد معطل ہو چکا ہے اور اب اس چلتے ہوئے نظام میں کبھی کبھی موقع پر مداخلت نہیں کر سکتا یا وہ بالفعل اپنی سلطنت کی زمامِ تدبیر و انتظام اپنے ہاتھ میں رکھتا ہے اور ہر آن اس کے

---

[1] تفہیمات الٰہیہ۔

احکام اس سلطنت میں نافذ ہوتے ہیں اور اس کو ہر وقت اختیار ہے کہ اشیا کی تشکلوں اور واقعات کی عادی رفتار میں جزئی طور پر یا کلی طور پر جیسا چاہے اور جب چاہے تغیر کر دے ۔ جو لوگ اس سوال کے جواب میں پہلی بات کے قائل ہیں ان کے لیے معجزات کو تسلیم کرنا غیر ممکن ہے ۔ کیونکہ معجزہ نہ تو ان کے تصورِ خدا میل کھاتا ہے اور نہ تصورِ کائنات سے ۔ بخلاف اس شخص کے جو قرآن کے دلائل سے مطمئن ہو کر دوسرے تصور کو قبول کرے اس کے لیے معجزے کو سمجھنا اور تسلیم کرنا کچھ مشکل نہیں ہے ۔ ظاہر ہے کہ اگر آپ کا عقیدہ یہ ہو کہ بے جان مادے میں خدا کے حکم سے زندگی پیدا ہوتی ہے اور خدا جس مادے کو جیسے چاہے زندگی عطا کر سکتا ہے اس کے لیے خدا کے حکم سے لاٹھی کا اژدہا بننا اتنا ہی غیر عجیب واقعہ ہے جتنا اسی خدا کے حکم سے ڈنڈے کے اندر چند بے جان مادوں کا اژدہا بننا غیر عجیب ہے ۔ صرف یہ بات کہ ایک واقعہ ہمیشہ پیش آتا رہتا ہے اور دوسرا واقعہ صرف تین مرتبہ پیش آیا ۔ ایک کو غیر عجیب اور دوسرے کو عجیب بنا دینے کے لیے کافی نہیں ہے ۔

حضرت موسیٰ کے ان دونوں معجزوں پر انشاء اللہ معالم القرآن کی جلد ۱۶ میں تفصیلی تبصرہ کریں گے ۔

فرعون کے لیے یہ بات نہایت عجیب تھی کہ اس کی مملکت کا ایک عام شہری اس کے پاس خدا کا رسول بن کر آئے وہ آپ کو ربِ اعلیٰ کہتا تھا ۔ اس لیے اس نے حضرت موسیٰ سے سنتے ہی کہا کہ اگر تم اپنے دعویٰ میں سچے ہو کہ تم خدا کے رسول ہو تو اپنے رسول ہونے کی کوئی نشانی پیش کرو ۔ حضرت موسیٰ نے اس کے مطالبہ پر عصا اور ید بیضا کے معجزے دکھائے ۔ معجزات کے موضوع پر اللہ کا دستور یہ رہا ہے کہ وہ قوموں کے مذاق اور میلانات کے مطابق دیے جاتے ہیں تاکہ ان پر حجت ہو سکیں ۔ مصر کی تاریخوں سے پتہ چلتا ہے کہ اس دور میں سحر و شعبدہ کا بہت زور تھا اور شہری زندگی میں جادوگروں کو بہت اونچا مقام حاصل تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو ایسے معجزے دیے جن سے ساحروں کی جادوگری کو باطل کیا جا سکے ۔

یہاں ثعبان کے ساتھ مبین کی صفت آئی ہے جس سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ لاٹھی واقعی اور سچ مچ اژدہا بن گئی تھی ۔ ایسا کھلا اژدہا کہ کسی کے لیے ذرا شبہ کی گنجائش نہ تھی اور یہ حقیقت تھی جادو کی طرح صرف تخییل یا نظر کا فریب نہ تھا ۔ اسی طرح بیضاء للناظرین فرما کر اشارہ کیا ہے کہ ہاتھ میں جو چمک ظاہر ہوتی تھی وہ محض فریبِ نظر قسم کی چمک نہ تھی بلکہ دیکھنے والوں کو اس کی چمک اور تابانی بالکل اصلی اور حقیقی معلوم ہوتی تھی ۔

فرعون کو ارباب حکومت کا مشورہ

۱۳۵۔ قوم فرعون کے سرداروں نے کہا کہ یہ تو فن کار جادوگر ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے معجزات سے ہیبت زدہ ہو کر پبلک کو جمع کیا اور پہلے اس نے بذات خود کمال فی الشرار پھر اس کی طرف سے بڑے بڑے لیڈروں نے اس رائے کا اظہار کیا کہ موسیٰ علیہ السلام معاذ اللہ کوئی بڑے ماہر جادوگر معلوم ہوتے ہیں کیونکہ جو خوارق موسیٰ علیہ السلام سے ظاہر ہوتے ان کی حیات کے موافق جادو سے بہتر ان کی کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی تھی[1] یہاں جو بات قوم فرعون کے سرداروں کی طرف منسوب کی ہے۔ سورہ شعراء میں اسی بات کو فرعون کی طرف منسوب کیا ہے۔ ارشاد ہے:

قال للملاء حوله ان ھذا لساحر علیم

فرعون نے اپنے اردگرد سرداروں سے کہا کہ یہ فن کار جادوگر ہے۔

دراصل یہ مشاورت کی کہانی ہے۔ اصل بات فرعون نے کہی اور ان سے مشورہ کیا اور مشورے میں ان کی رائے پوچھی تو انہوں نے فرعون کے خیال سے اتفاق کرتے ہوئے اسی رائے کا اظہار کیا کہ ان ھذا لساحر علیم یعنی یہ شخص سحر کے تمام علوم کا بہت بڑا علامہ معلوم ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ مصری تمدن کی جو تاریخ پیش کرتا ہے اس میں یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے کہ مصری علوم و فنون میں سحر کو ایک مستقل علم و فن کی حیثیت حاصل تھی۔ اسی بنا پر ساحرین کا مصر میں بہت اونچا علمی مقام تھا حتیٰ کہ ان کو شاہی دربار میں بھی بہت رسوخ حاصل تھا اور جنگ و صلح، پیدائش و وفات کے نتیجے اور اہم سرکاری معاملات میں ان کی جانب رجوع کیا جاتا تھا اور ان کے فنی نتائج کو بڑی وقعت دی جاتی تھی۔ حتیٰ کہ مذہبی معاملات میں بھی ان کو اہم جگہ دی جاتی تھی۔ قدیم شاہی مقبروں میں ممی (حنوط شدہ نعشوں) کے ساتھ جو کاغذات و دستاویزیں برآمد ہوتی ہیں۔ اور ان حجروں میں جو تصاویر و نقوش پائے جاتے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

قدیم قوموں میں عام گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ وہ جادو پر ایک مذہبی حیثیت سے اعتقاد رکھتے تھے اور زندگی کے مسائل کو اس سے وابستہ رکھتے تھے اور اسی نظریہ کے تحت اس کے تعلیم و تعلم کو اپناتے تھے اور اس پر ہی ان کے ترقیاتی پروگرام کا دارومدار تھا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چنانچہ عراق، بابل، مصر، چین اور ہندوستان کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔
یہی وجہ ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان و ارکانِ حکومت نے حضرت موسیٰ کو جادوگر کہا اور صرف جادوگر نہیں بلکہ کہا کہ اپنے فن میں بہت بڑا علامہ ہے اور یہ فرعون اور اس کے ارکانِ حکومت کا متفقہ فیصلہ تھا۔

حکومت کی نظر میں حضرت موسیٰ کا مقصد

۱۳۶- تمہیں تمہاری زمین سے بے دخل کرنا چاہتا ہے بتاؤ کہ تمہاری کیا رائے ہے۔ یعنی عجیب و غریب ساحرانہ کرشمے دکھلا کر لوگوں کو اپنی طرف مائل کرے اور انجام کار ملک میں اقتدار پیدا کرکے اور بنی اسرائیل کی حمایت و آزادی کا نام لے کر قبطیوں کو جو یہاں کے اصل باشندے ہیں۔ ان کے ملک و وطن سے بے دخل کردے۔ ان حالات کو پیشِ نظر رکھ کر مشورہ دو کہ کیا کرنا چاہیے[1] ارکانِ حکومت نے حضرت کے بارے میں یہ بات کہی تھی کہ یہ علامہ قسم کا بہت بڑا جادوگر ہے۔ یہاں ذہن میں یہ سوال خود بخود پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ علامہ قسم کا جادوگر ہے تو اس کا مقصد کیا ہے؟ بتایا کہ یہ چاہتا ہے کہ تمہیں ہٹا کر زمینِ مصر کے اقتدار پر قبضہ کرلے۔ دونوں معجزوں کی عظمت کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ابھی ابھی ایک لمحہ پہلے فرعون اپنی رعیت ایک فرد کو یا تو کہہ رہا تھا فات بآیۃ ان کنت من الصادقین اور یا اب نشانیوں کو دیکھ کر فرعون اور اس کے اعیانِ حکومت پر ایسی بدحواسی طاری ہوتی ہے کہ لے اپنے ملک اور اقتدار چھننے کا خطرہ لاحق ہوگیا۔ بنی اسرائیل جیسی دبی ہوئی قوم کا ایک فرد وقت کے سب سے بڑے طاقتور بادشاہ کے سامنے کھڑا تھا۔ کوئی لاؤ لشکر اس کے ساتھ نہ تھا۔ قوم میں کوئی طاقت نہ تھی کسی بغاوت کا ملک میں نام و نشان تک نہ تھا۔ ملک سے باہر کسی دوسری حکومت کی طاقت بھی ان کی پشت پر نہ تھی۔ ان حالات میں صرف ایک لاٹھی کا اژدہا بنتے دیکھ کر اور ایک ہاتھ کو چمکتا دیکھ کر یکایک سارے اعیان حکومت کا فرعون سمیت یہ واویلا کرنا یہ بے سروسامان آدمی میری سلطنت کا تختہ الٹ دے گا اور پورے حکمران طبقہ کو اقتدار سے محروم کردے گا۔ آخر کیا معنے رکھتا ہے۔ فرعون اور اس کے اربابِ اقتدار کا یہ کہنا کہ یہ شخص جادو کے زور سے ایسا کر ڈالے گا، مزید بدحواسی کی دلیل ہے۔ جادو کے زور سے دنیا میں کبھی کوئی سیاسی انقلاب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں ہوا، کوئی ملک فتح نہیں ہوا، کوئی جنگ نہیں جیتی گئی۔ جادوگر تو اس کے اپنے ملک میں موجود تھے اور بڑے بڑے کرشمے دکھا سکتے تھے مگر وہ خود جانتا تھا کہ تماشا کر کے انعام پانے سے بڑھ کر ان کی اوقات کوئی نہیں ہے۔ حکومت تو کجا، وہ بے چارے تو حکومت کے کسی سپاہی کو بھی چیلنج کرنے کی ہمت نہ کر سکتے تھے۔ اس لیے یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان حکومت کو یہ خطرہ کیوں پیدا ہوا کہ ان یخرجکم من ارضکم تمہیں ملک بدر کر کے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے صرف یہی دعویٰ کیا تھا کہ یا فرعون انی رسول من رب العالمین۔ اور بنی اسرائیل کا مطالبہ پیش کیا تھا۔ اس کے علاوہ کسی قسم کی سیاسی گفتگو یہاں بتائی نہیں گئی اور ہوئی بھی نہ ہوگی۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ موسیٰ علیہ السلام نے صراحۃً ایسی کوئی بات نہیں فرمائی لیکن آپ کا دعویٰ رسالت اپنے اندر ہی یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ دراصل پورے نظام زندگی کو بحیثیت مجموعی تبدیل کرنا چاہتے ہیں جس میں لامحالہ ملک کا سیاسی نظام بھی داخل ہے۔ پیغمبر کا اپنے آپ کو رب العالمین کے نمائندے کی حیثیت سے پیش کرنا لازمی طور پر اس کو متضمن ہے کہ وہ انسانوں سے اپنی کلی اطاعت کا مطالبہ کرتا ہے کیونکہ رب العالمین کا نمائندہ کبھی کسی دوسرے نظام حیات کا مطیع اور کسی اور کی رعیت بن کر رہنے کے لیے نہیں آتا بلکہ دنیا میں مطاع اور راعی بننے کے لیے آتا ہے اور کسی کافر کے حق حکمرانی کو تسلیم کرنا اس کی حیثیت رسالت کے قطعاً منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی زبان سے انی رسول من رب العالمین کا دعویٰ سنتے ہی فرعون اور اس کے اعیان حکومت کے سامنے سیاسی، معاشی اور تمدنی انقلاب کا خطرہ نمودار ہو گیا۔ جو کچھ بحیثیت رسول حضرت موسیٰ کا پیش نہاد تھا وہی کچھ فرعون اور اس کے اعیان حکومت نے سمجھا سورہ یونس میں اسی چیز کی وضاحت دوسرے عنوان سے آئی ہے۔

اجئتنا لتلفتنا عما وجدنا علیہ آباءنا وتکون لکما الکبریاء فی الارض وما نحن لکما بمومنین۔

کیا تو ہمارے پاس اس لیے آیا ہے کہ جس راہ پر ہم نے اپنے باپ دادا کو چلتے دیکھا ہے اس سے ہمیں ہٹا دو اور ملک میں تم دونوں کے لیے سرداری ہو جائے۔ ہم تو تمہیں ماننے والے نہیں ہیں۔

یہاں فرعون اور اعیان حکومت کے اس قول یخرجکم من ارضکم کی یہ تاویل کرنا کہ:

یہ ضروری نہیں ہے کہ فی الواقع ان کے دل میں بھی وہی بات ہو جو زبان پر آئی۔

وہ حضرت موسیٰ و ہارون سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے ماضی و حاضر اور ان کے اخلاق اور کردار کو سامنے رکھ کر وہ آسانی سے فیصلہ کر سکتے تھے کہ حضرت موسیٰ نہ تو جادوگر ہو سکتے ہیں اور نہ اصلاح کے سوا ان کے سامنے کوئی اور مقصد ہو سکتا ہے لیکن ارباب اقتدار کا ہمیشہ یہ شیوہ رہا ہے کہ جب ان کے مقابل میں کوئی اصلاحی دعوت آئی ہے تو انہوں نے اپنی عوام کو اس سے برگشتہ کرنے کے لیے اس کے اندر کوئی نہ کوئی خطرناک سیاسی معنے و مفہوم پیدا کرنے کی مزدور کوشش کی ہے۔ یہی حرکت فرعون کے درباریوں نے کی۔

بالکل بے معنے ہے۔ گویا ان کے خیال مبارک میں نبوت کی اصلاحی دعوت کا دائرہ صرف رسوم اور رواجوں کی اصلاح تک محدود رہتا ہے اور وقت کی سیاسی، معاشی الجھنوں سے اسے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

ایک قرآن کے شارح فرماتے ہیں کہ

دُنیا پرستوں کی یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ کوئی اہل حق اغراضِ دنیوی سے پاک ہو کر خالصتہ اللہ بھی کام کر سکتا ہے۔

موسیٰ علیہ السلام کے طریق حق کو فرعون نے ایک باطل کی صورت میں ظاہر کیا۔

ان سب بزرگوں نے یہ فرض کر لیا ہے کہ حکومت پر قبضہ کرنا خالص دنیا داری اور دُنیا پرستی ہے اور نبوت کا دامن اس سے پاک ہوتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ کیا موسیٰ علیہ السلام صرف یہ چاہتے تھے کہ فرعون کی حکومت جس نوع کی ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت پر چل رہی ہے چلتی رہے اور بس۔ اگر حضرت موسیٰ اللہ کے پیغمبر ہیں تو بلا شبہ ہر پیغمبر کی اصلاحی دعوت کی اساس یہ ہے کہ ناخدا شناسی پر مبنی سب نشانیوں کو مٹاتے اور انسانوں کو مسرفین کی طاعت سے ہٹا کر اپنی طاعت کی دعوت دے۔ یہ دُنیا داری نہیں بلکہ عین دینداری ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو قرآن حضرت موسیٰ کی محنتوں اور مساعی کے نتائج یہ نہ بتاتا۔

فاخرجناھم من جنات و عیون و کنوز و مقام کریم کذالک و اورثنا بنی اسرائیل۔

اور اگر حضرت موسیٰ کی دعوت اصلاحی کا یہی مفہوم ہوتا تو حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو یہ تسلی نہ دیتے۔

عسٰی ربکم ان یھلک عدوکم و یستخلفکم فی الارض۔

سارے اعیانِ حکومت کا فیصلہ

۱۳۷ - پھر ان سب نے باہم مشورہ کے بعد فرعون سے کہا کہ موسیٰ اور اس کے بھائی کو ڈھیل دے دو اور سارے شہروں میں ہرکارے بھیج دو کہ تمام شہروں سے فن کار جادوگر اکٹھے کر کے تیرے حضور لے آئیں۔ مشاورت باہمی کے بعد یہ پاس ہوا کہ فرعون سے درخواست کی جائے کہ وہ ان دونوں موسیٰ اور ہارون کے معاملہ میں جلدی نہ کرے۔ ان کا بہترین توڑ اور مؤثر جواب یوں ہو سکتا ہے کہ چپراسی بھیج کر تمام قلمرو میں سے فنِ سحر کے جاننے والے جو ان سے بھی بڑھ کر اس فن کے ماہر (سحار) ہوں جمع کر لیے جائیں۔ ان سے ان کا مقابلہ کیا جائے۔ چنانچہ یوں ہوا[1] یہ مشورے کے بعد وہ فیصلہ ہے جو پورے اتفاق رائے کے ساتھ اعیانِ حکومت کی طرف سے فرعون کو پیش کیا گیا وہ یہ کہ موسیٰ اور ہارون کے بارے میں جلد بازی میں کوئی قدم اٹھانا خلافِ مصلحت ہے۔ تقاضائے سیاست یہ ہے کہ ابھی ان کو نظر انداز کر دیجئے اور پوری مملکت میں ہرکارے بھیج کر ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو جمع کیجئے تاکہ وہ کسی عوامی مجمع میں ان دونوں کو ایسی شکست دیں کہ ان کی شاہراہ عام پر سرکرکری ہو جائے۔

اعیانِ حکومت کے اس فیصلہ سے یہ بات صاف طور پر معلوم ہو رہی ہے کہ ان کو اعجاز اور سحر میں امتیازی فرق واضح طور پر معلوم تھا۔ وہ جانتے تھے کہ اعجاز ایک حقیقت ہے اور جادو محض نظر اور نفس کو متاثر کر کے اشیاء میں ایک خاص قسم کی تبدیلی محسوس کراتا ہے۔ اسی لیے انہوں نے حضرت موسیٰ کے دعویٰ رسالت کو رد کرنے کے لیے کہا کہ یہ شخص جادوگر ہے۔ یعنی عصا فی الواقع سانپ نہیں تھا کہ اسے خدائی نشان مانا جائے۔ بلکہ صرف ہمیں ایسا نظر آیا کہ وہ گویا سانپ تھا جیسا کہ ہر جادوگر کر لیتا ہے۔ پھر انہوں نے مشورہ دیا کہ تمام ملک کے ماہر جادوگروں کو بلایا جائے اور ان کے ذریعے سے لاٹھیوں اور رسیوں کو سانپوں میں تبدیل کر کے لوگوں کو دکھایا جائے تاکہ عامۃ الناس کے دلوں میں اس پیغمبرانہ معجزے سے جو ہیبت بیٹھ گئی ہے وہ اگر بالکلیہ دور نہ ہو تو کم از کم شک ہی میں تبدیل ہو جائے[2]

اصل ارشاد میں ڈھیل دینے کے لیے ارجہ آیا ہے۔ یہ اصل میں ارجئہ ہے۔ ہمزہ کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

تخفیف کی خاطر گرا دیا ہے ۔ اس کا مصدر ارجاء ہے ۔ اس کے معنے موخر کرنے ، دیر کرنے ، ڈھیل دینے ، کسی معاملہ کو دوسرے وقت پر ڈالنے کے ہیں ۔ تاخیر اور ڈھیل دینے کا اعیانِ حکومت کی جانب سے فرعون کو مشورہ دینا بتا رہا ہے کہ اس سے پہلے حضرت موسیٰ اور فرعون کے پاس کچھ معاملات ہو چکے ہیں ۔ ممکن ہے قید کی سزا اور قتل کی دھمکی فرعون نے حضرت موسیٰ کو دی ہو ۔ اس پر اعیانِ حکومت نے فرعون کو حضرت موسیٰ کے معاملہ میں تاخیر کا مشورہ دیا تاکہ رائے عامہ میں حکومت کی رسوائی نہ ہو ۔ اسی بنا پر پہلے رائے عامہ کو ہموار کرنے کا مشورہ دیا اور کہا کہ جادوگروں کو بلایا جائے اور وہ بھی ماہر قسم کے ہوں ۔ علامہ حبشی کا یہ کہنا بالکل درست ہے کہ یہ آیت جیسے بتا رہی ہے کہ حضرت موسیٰ کے اعجاز کی عظمت کو ظاہر کر رہی ہے ایسے ہی اس بات کی طرف بھی اشارہ کر رہی ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان کی نادانی کو بھی ظاہر کر رہی ہے کہ انہوں نے حضرت موسیٰ کو ساحر سمجھا ۔ یہ اعجاز کی عظمت اور اس کا دبدبہ ہے کہ فرعون اس کے جواب کے لیے تیاریوں میں معروف ہے ۔ جادو کا جواب جادو سے دینا معارضہ بالمثل کہلاتا ہے ۔ چونکہ فرعون نے اعجاز کو سحر کہا تھا اس لیے سحر کو توڑنے کے لیے ساحروں کو جمع کرنے کا حکم دیا ۔ آگے آ رہا ہے کہ اس مقابلہ میں فرعون اور اس کے اعیانِ حکومت کو شکست فاش ہوئی اور منہ کی کھانی پڑی ہے ۔ نبوّتِ موسیٰ کے لیے عصا اور یدِ بیضا اعجاز تھے اور نبوّت محمدیہ کے لیے قرآن عزیز اعجاز ہے ۔ اگر اہلِ عرب میں قرآن کے معارضہ کی طاقت ہوتی تو وہ بھی ضرور معارضہ کرتے ۔ اسی لیے قرآن نے ان کو چیلنج دیا تھا فاتوا بسورۃ من مثلہ فرعون اور اعیانِ حکومت کو اس معارضہ میں ناکامی ہوئی لیکن اقتدار ، جاہ ، مال اور دولت کی محبت دعوتِ موسیٰ کی راہ میں آڑ بن گئی ۔

وَجَآءَ السَّحَرَةُ فِرْعَوْنَ قَالُوْٓا اِنَّ لَنَا لَاَجْرًا اِنْ كُنَّا نَحْنُ
الْغٰلِبِيْنَ ﴿۱۱۳﴾ قَالَ نَعَمْ وَاِنَّكُمْ لَمِنَ الْمُقَرَّبِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ قَالُوْا
يٰمُوْسٰٓى اِمَّآ اَنْ تُلْقِيَ وَاِمَّآ اَنْ نَّكُوْنَ نَحْنُ الْمُلْقِيْنَ ﴿۱۱۵﴾
قَالَ اَلْقُوْا ۚ فَلَمَّآ اَلْقَوْا سَحَرُوْٓا اَعْيُنَ النَّاسِ وَاسْتَرْهَبُوْهُمْ
وَجَآءُوْ بِسِحْرٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۱۶﴾

اور جادوگر فرعون کے حضور میں آئے انہوں نے کہا کہ اگر ہم موسیٰ پر غالب آئے تو ہمیں اس خدمت کے صلہ میں انعام ملنا چاہیے[138] فرعون نے کہا ضرور ملے گا اور تم سب میری بارگاہ میں مقرب ہو گے۔[139] جادوگروں نے کہا اے موسیٰ یا تو تم پہلے ڈالو یا پھر ہمیں ہی پھینکنا ہے، موسیٰ نے کہا تم ہی پھینکو[140] پھر جادوگروں نے پھینکیں تو انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور لوگوں میں دہشت ڈال دی اور بہت بڑے جادو کی نمائش کی۔[141]

معانی مفردات

بسحرٍ عظیم، جادو، اور جادو کرنا۔ سحر یسحر کا مصدر اور اسم مصدر کے معنے میں بھی آتا ہے۔ علامہ آلوسی رقمطراز ہیں کہ یہ مصادر شاذہ میں ہے۔ علامہ ابن خالویہ لغوی نے کتاب لیس میں تصریح کی ہے کہ عربی زبان میں فعَل یفعَل فِعلا کے وزن پر سوائے سحر یسحر سحرا" اور کوئی مصدر نہیں ہے لیکن علامہ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ بجز سحر اور فعل کے اور کوئی مصدر بروزن فِعل باب فتح کا نہیں آتا۔ شیخ سمیں نے بھی یہی کہا ہے۔ ابوبکر الجصاص رازی احکام القرآن میں رقمطراز ہیں۔ اہلِ لغت ذکر کرتے ہیں کہ سحر کی اصل لغت میں اس چیز کے لیے ہے جو لطیف ہو اور جس کا سبب نہایت مخفی ہو اور سَحَر ان کے خیال میں بالفتح بمعنے غذا ہے کیونکہ وہ مخفی ہوتی ہے اور اس کے مجاری لطیف ہوتے ہیں۔ لبید کہتے ہیں۔

ارانا موضعین لامر غیب

ونسحر بالطعام وبالشراب

اس شعر میں نسحر کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ ہم سحر زدہ کی طرح مشغول و فریفتہ تھے۔ دوسرے یہ کہ ہم غذا حاصل کر رہے تھے بہر حال جو مطلب بھی ہو سحر کے معنے خفا کے ہوتے ہیں۔ ایک اور شاعر کہتا ہے،

فان تسئلینا فیم نحن فاننا

عصافیر من ھذا الانام المسحر

اس شعر کے معنے میں وہ ہی دو احتمال ہیں جو پہلے شعر میں ہیں اور یہ بھی احتمال ہے کہ مسحر سے ذو سحر مراد ہو یعنی پھیپھڑے والا۔ سحر پھیپھڑے کو اور جو حلق لگا ہو اسے کہتے ہیں۔ اسی سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کا یہ قول ہے توفی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ما بین سحری ونحری حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میرے پھیپھڑے اور سینے کے درمیان وفات پائی۔ یہ ہیں وہ معنے جو لغت میں سحر کے آتے ہیں۔ پھر یہ اسم منقول ہو کر ہر اس امر کے لیے استعمال ہونے لگا جس کا سبب مخفی ہو اور اپنی حقیقت کے خلاف اس کا تخیل ہونے لگے۔ نیز ملمع اور دھوکہ بازی کے قائمقام ہو۔ اور جب بھی یہ لفظ مطلق بلا کسی قید کے استعمال ہو گا اپنے فاعل کی مذمت کو سناتے گا ہاں قید کے ساتھ قابل مدح و ستائش کے بارے میں بھی استعمال ہوا ہے۔ ارشاد

ہے ان من البیان لسحرا "کچھ بیان تو جادو ہوتے ہیں ۔

جادوگروں کا اجتماع اور حضرت موسیٰ سے مقابلہ

چونکہ اعیان حکومت اور فرعون نے حضرت موسیٰ پر جادوگر ہونے کا الزام لگایا تھا اس لیے ضروری ہوا کہ اعجاز و سحر کا باہم مقابلہ ہوتا کہ عوام کے سامنے اعجاز اور سحر کا فرق ممتاز ہو جائے ۔ یہ حسنِ اتفاق ہے کہ موسیٰ پر جادوگر کا الزام لگانے والوں نے خود ہی فیصلہ کر لیا کہ ماہر جادوگروں کو اکٹھا کیا جائے اور ان سے حضرت موسیٰ کا مقابلہ کرایا جائے ۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی اس بات کا یہ سوچ کر خیر مقدم کیا کہ وہ اب تک جس قدر معجزات فرعون اور اس کی قوم کو دکھا چکے تھے ان کو وہ یہ کہہ کر رد کر چکے تھے کہ یہ جادو ہے۔ اب موقعہ ہے کہ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر سامنے آجائے ۔ اور ان کو صداقت کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا پڑے ۔ جادو اور شعبدہ بازی میں صرف دل لگی کے آنی اور وقتی تماشے ہوتے ہیں جبکہ معجزات قوموں اور جماعتوں کے صلاح و فساد، تعمیر اور تخریب، ترقی اور تنزل کے اسباب ہوتے ہیں ۔ جادوگر کا مقصد کسی غیر معمولی واقعہ کا صرف حیرت انگیز طریقہ سے اظہار ہوتا ہے ۔ تاکہ وہ دیکھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لیے متحیر کر دے لیکن نبوت کا مقصد اپنے ان حیرت انگیز اعمال سے دنیا کی اصلاح قوموں کی دعوت ، جماعتوں کی تہذیب اور دینِ الٰہی کی تقویت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا ، پیغمبر بشیر نذیر ہادی ہوتا ہے ۔ جادوگر ان تمام اوصاف سے خالی ہوتا ہے اور حیرت انگیز تماشاگری کے سوا کوئی اور ممتاز بات اس کے اندر نہیں ہوتی ۔ بس اسی حقیقت کو نمایاں کرنے کے لیے معجزہ کا سحر سے مقابلہ ہوا ۔ اور یہ مقابلہ بھی جیسا کہ قرآن ہی نے دوسری جگہ بتایا ہے کہ یوم الزینہ جشن کے روز ہوا ، منشا یہ تھا کہ عوام و خواص کے مجمع میں ساحر و جادوگر نبوت کی صداقت کا اقرار کر لیں تو پھر کسی کو یارائے انکار نہ رہے گا اور خدا کی حجت پوری ہو جائے گی ۔

۱۱۳ ۔ اور جادوگر فرعون کے پاس آئے ، انہوں نے کہا کہ اگر ہم موسیٰ پر غالب آئے تو ہمیں اس خدمت کے صلے میں انعام ضرور ملنا چاہیے ۔ ساحرینِ فرعون نے ان لنا لاجرا کہہ کر پہلے ہی قدم پر جتلا دیا کہ انبیاء علیہم السلام جن کا پہلا لفظ ما اسألکم علیہ من اجر ان اجری الا علی اللہ ہوتا ہے کوئی پیشہ ور لوگ نہیں ہوتے [1] قرآن نے یہاں سرگزشت کا غیر ضروری حصہ نظر انداز کر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دیا ہے۔ یعنی اعیانِ حکومت کے مشورے کے مطابق فرعون نے مملکت کے تمام شہروں میں پیادے دوڑا دیے وہ حکم کے مطابق گئے اور ہر جگہ سے ماہر اور فن کار جادوگروں کو جمع کر کے لاتے اور ان کو فرعون کے دربار میں حاضر کیا چونکہ یہ ساری بات سیاقِ کلام سے خود ٹپک رہی تھی اس لیے اسے چھوڑ کر اصل بات بیان کر دی کہ ساحروں نے آتے ہی پیشہ ورانہ انداز میں سودے بازی شروع کر دی کہ اگر ہم نے بازی جیت لی تو ہمیں انعام بھی ملے گا۔ قرآن نے یہاں خاص طور پر ساحروں کی سودے بازی کا ذکر کر کے اشارہ کر دیا کہ پیشہ وری اور دینداری میں کیا فرق ہے اور یہ بھی ظاہر کر دیا کہ شعبدہ بازی کی پیشہ ورانہ زندگی میں اخلاقی پستی اور دناءت کا کیا حال ہوتا ہے۔ اسی پر نقالوں، مسخروں، بھانڈوں، شاعروں، افسانہ نویسوں، جھاڑ پھونک کرنے والوں، تعویذ گنڈہ کرنے والوں کو قیاس کر لو۔

یہ فقرہ اس خیال کی تائید کرتا ہے کہ جن حاضرینِ دربار نے حضرت موسیٰ کا معجزہ دیکھا تھا اور باہر جن لوگوں تک اس کی خبر پہنچی تھی، ان کے عقیدے اپنے دینِ آبائی سے متزلزل ہو رہے ہیں اور اب ان کے دین کا دار و مدار اس پر رہ گیا تھا کہ کسی طرح جادوگر بھی وہ کام کر دکھائیں جو موسیٰ علیہ السلام نے کر دکھایا ہے۔ فرعون اور اس کے اعیانِ سلطنت اسے خود ایک فیصلہ کن مقابلہ سمجھ رہے ہیں، ان کے اپنے بھیجے ہوئے آدمی عوام الناس کے ذہن میں یہ بات بٹھاتے پھر رہے تھے کہ اگر جادوگر کامیاب ہو گئے تو موسیٰ کے دین میں جانے سے بچ جائیں گے ورنہ ہمارے دین و ایمان کی خیر نہیں ہے فرعون اور اعیانِ حکومت کا یقین بتایا ہے کہ ہمارے ہی جادوگروں کی پارٹی کامیاب ہو گی اور اسی کو صداقت و حقانیت کا معیار قرار دے کر اس نے پکار کرا دی تھی کہ سب لوگ اپنے ملکی اور سرکاری ماہرینِ فن کے کمالات کا مشاہدہ کرو اور مشاہدہ کے بعد اپنے اسی دینِ فرعونی کی صداقت پر اور زیادہ جم جاؤ، دوسری جگہ ارشاد ہے لعلنا نتبع السحرۃ ان کانوا ھم الغالبین ۔

خبر نہیں ہمارے شارحینِ قرآن بلا وجہ جادوگروں کی تعداد معلوم کرنے کے کیوں درپے ہیں۔ آلوسی، قرطبی، اندلسی، اور دوسرے شارحینِ قرآن نے کوشش کی ہے کہ جادوگروں کی تعداد معلوم کریں اور ۱۲ کی تعداد سے شروع ہو کر ۹ لاکھ تک بتاتی ہے کچھ نے جادوگروں کے اسماء کو بھی متعین کیا ہے اور کچھ نے ان کا فنی نسب نامہ بھی بتایا ہے لیکن ان میں سے کوئی بات قرآن نے نہیں بتائی ہے اور نہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس موضوع پر اُمت کی کوئی رہنمائی فرمائی ہے اور مزہ یہ ہے کہ تورات کے اوراق اس سے خالی ہیں۔ اس سے زیادہ مزہ دار بات یہ ہے کہ کچھ بزرگوں نے ان رسیوں اور لاٹھیوں کا وزن بھی معلوم کر لیا جو جادوگر لے کر آتے تھے لکھا ہے کہ ان کا وزن تین سو اونٹوں کے

باربرداری کے ہم وزن تھا، مگر افسوس یہ ہے کہ ان سب باتوں سے قرآن خاموش ہے۔

جادوگروں کو فرعون کا جواب

۱۳۹۔ فرعون نے کہا ضرور ملے گا اور تم سب میری بارگاہ میں مقرب ہو گے۔ یعنی مزدوری کیا چیز ہے وہ تو ملے گی اس سے بڑھ کر کہ تم ہمارے مقربین بارگاہ اور مصاحبین خاص میں داخل کر لیے جاؤ گے[1] فرعون نے ان کی حوصلہ افزائی کرتے ہوئے کہا، انعام تو جو ملنا ہے ملے گا تم پر مزید نوازش یہ ہو گی کہ تم خاص مقربین میں شامل کیے جاؤ گے۔ مطلب یہ ہے کہ روپیہ پیسہ ہی نہیں ملے گا دربار میں کرسی بھی ملے گی۔ اس طرح فرعون اور جادوگروں نے خود ہی نبی اور جادوگر کا عظیم اخلاقی فرق ظاہر کر دیا ہے۔ دونوں کا تقابلی مطالعہ فرمائیے۔ ایک طرف بنی اسرائیل جیسی پسی ہوئی قوم کا ایک فرد دس سال تک قتل کے الزام میں روپوش رہنے کے بعد فرعون کے دربار میں تشریف لایا، اور بڑے طنطنے کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ کہا کہ انی رسول من رب العالمین فرعون سے بات کرنے میں وہ ادنیٰ سے جھجک محسوس نہیں کرتا۔ اس کی دھمکیوں کی وہ پرکاہ برابر پرواہ نہیں کرتا۔ یہ روحانیت ہے اس کے مقابلے میں جادوگروں کی صورت میں خالص مادیت ہے۔ فرعون کے سرکاری دین اور اس کے جعلی نظام حیات کو بچانے کے لیے بلائے گئے ہیں۔ پھر بھی ہاتھ جوڑ کر کہتے ہیں کہ سرکار انعام ملنا چاہیے اور جواب میں یہ سن کر پھولے نہیں سماتے کہ پیسہ بھی ملے گا اور قرب شاہی سے بھی سرفراز کیے جائیں گے۔ یہ دو متقابل کے کردار آپ سے آپ ظاہر کر رہے تھے کہ نبی کس شان کا انسان ہوتا ہے اور اس کے مقابلہ میں آنے والوں کی کیا ہستی ہے۔ نبی خدا کا فرستادہ ہوتا ہے اور اس کا نعرہ لا اسالکم علیہ اجرا ہوتا ہے اور اس کے مدمقابل مادے کے فرستادے ہوتے ہیں اور ان کا نعرہ ان لنا لاجرا ان کنا نحن الغالبین ہوتا ہے۔ نبی نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد نبی کی ذات مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہوتی ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ جیسے جادوگروں کی زبان سے ان کنا نحن الغالبین سن کر فرعون کو کس قدر حوصلہ ہوا ہوگا ایسے ہی فرعون کی زبان سے نعم سن کر جادوگروں کو بھی تسلی ہوئی ہوگی کہ محنت رائیگاں نہ جائے گی، کیونکہ طالبانِ دنیا کی نظر مہارت اور کمال فن کے باوجود فوری نفع پر ہوتی

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے۔ یوں سمجھو کہ جشن کے میدان میں فرعون تمام شاہانہ کروفر کے ساتھ تخت نشین ہے۔ درباری بھی حسب مراتب قرینے سے بیٹھے ہیں اور لاکھوں انسان حق و باطل کے معرکہ کا مظاہرہ کرنے کو جمع ہیں ایک جانب مصر کے مشہور جادوگروں کا گروہ اپنے ساز و سامان سے لیس کھڑا ہے اور دوسری جانب خدا کے رسول سچائی اور راستی کے پیکر حضرت موسیٰ کھڑے ہیں۔ فرعون خوش ہے اور اس یقین پر ہے کہ جادوگر حضرت موسیٰ کو ضرور شکست دے دیں گے۔ جادوگروں کی حوصلہ افزائی کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے اگر تم نے اس کو شکست دے دی تو نہ صرف انعام و اکرام سے مالا مال کیے جاؤ گے بلکہ میرے دربار میں خاص مقام پاؤ گے۔ جادوگر بھی اپنی کامیابی کے یقین پر فرعون سے اپنے اعزاز و اکرام کا وعدہ لے رہے ہیں اور اس کے تصور سے بہت شاداں و فرحاں ہیں۔ مولانا روم نے کیا خوب فرمایا ہے:

سحر را با معجزہ کردہ قیاس ہر دو را بر مکر پندارد اساس
زر قلب و زر نیکو در عیار بے محک ہرگز نہ دانی ز اعتبار
ہر کرا در جان خدا بنہد محک ہر یقین را باز داند او ز شک

مقابلہ میں پہل کون کرے؟

۱۴۰۔ جادوگروں نے کہا کہ اے موسیٰ یا تو تم پہلے ڈالو یا پھر ہمیں ہی پھینکنا ہے، موسیٰ نے کہا کہ تم ہی پھینکو۔ جادوگروں نے یہ بات شاید اس لیے کہی کہ اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے روبرو عصا ڈال کر باذن اللہ اژدہا بنا چکے تھے۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ تم ہی ڈالو۔ یعنی جب تم کو یہ مقابلہ ہی منظور ہے اور اسی پر آخری فیصلہ کا انحصار کرتے ہو تو پہلے تم ہی ڈال کر پوری قوت آزمائی کر لو۔ کیونکہ باطل کی پوری نمائش اور زور آزمائی کے بعد جو حق کا غلبہ شاہد ہوگا وہ امید ہے کہ زیادہ مؤثر اور واقع فی النفوس ہو تو فی الحقیقت یہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے سحر کے ساتھ معجزہ کا مقابلہ کرنے کی اجازت نہ تھی بلکہ دو صورتوں میں سے ایک ایسی صورت کا انتخاب تھا جو باطل کے خمود اور حق کے غلبہ و وضوح کی مؤثر ترین صورت ہو سکتی تھی۔[1]

جادوگروں نے پیشہ ورانہ طور پر جب یہ اطمینان کر لیا کہ غلبہ کی صورت میں انعام سے نوازے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جائیں گے اور سرکار کے یہاں کرسی نشینی ملے گی تو اب حضرت موسیٰ کی طرف متوجہ ہوئے مگر پہلے اس سے کہ باہم سحر و اعجاز کا مقابلہ ہو قرآن ہی سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے آخری طور پر حق تبلیغ ادا کرتے ہو فرمایا ،

ویلکم لا تفتروا علی اللہ کذبا فیسحتکم بعذاب وقد خاب من افتری

افسوس تم پر تم کیا کر رہے ہو دیکھو اللہ پر جھوٹی تہمت نہ لگاؤ ایسا نہ ہو کہ وہ کوئی عذاب بھیج کر تمہاری بیخ مٹا دے۔

لوگوں نے حضرت موسیٰ سے یہ بات سنی تو آپس میں ردوکد شروع کر دی اور سرگوشیاں کرنے لگے۔ اعیانِ حکومت نے یہ صورت دیکھی تو جادوگروں سے کہا ان ھذان لساحران یریدان ان یخرجکم من ارضکم بسحرھما یہ دونوں حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون جادوگر ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہے کہ اپنے جادو کے زور سے ملک پر قبضہ کر لیں اور تمہیں نکال دیں۔ تم اپنا کام شروع کرو اور موسیٰ کے مقابلہ میں ڈٹ جاؤ۔ اس کے بعد جادوگروں نے آگے بڑھ کر موسیٰ علیہ السلام سے کہا کہ موسیٰ بتاؤ ابتدا تمہاری جانب سے ہو گی یا ہماری جانب سے۔ حضرت موسیٰ نے جب دیکھا کہ ان پر اس تنبیہہ کا بھی کوئی اثر نہیں ہوا تو فرمایا کہ ابتدا تم ہی کرو اور اپنے کمالِ فن کا مظاہرہ کرو۔

نظمِ قرآن بتا رہا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں جادوگروں کی خواہش یہی تھی کہ پہل ہم کریں ساحر اس وقت تک موسیٰ علیہ السلام کو اپنے ہی طرح کا ایک ماہر فن ساحر سمجھ کر گویا کہہ رہے ہیں کہ مقابلہ ہمارے تمہارے فن کا ہی ہو رہا ہے۔ اب یہ بتلاؤ شروع کون کرے گا ہم یا تم اور نحن پر زور دے کر اپنی رغبت ظاہر کر دی۔ حضرت موسیٰ نے پہلے ان ہی کو موقع دیا کہ وہ اپنا ہنر دکھائیں جو اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت موسیٰ کو پورا اعتماد تھا کہ انہیں خدا کی تائید حاصل ہے اس وجہ سے یہ ساحر کتنا ہی بڑا جادو دکھائیں لیکن اللہ تعالیٰ ان کے سحر کو باطل کر کے رہے گا۔ حضرت تھانوی نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کا مقصود اس سے خود اذن نہیں بلکہ اذن کو ان کے کفر کے ابطال اور اپنے معجزے کے اظہار کا ذریعہ بنایا تھا۔

جادو محض نگاہوں کا دھوکا ہے

۱۴۱۔ پھر جادوگروں نے پھینکیں تو انہوں نے لوگوں کی آنکھوں پر جادو کر دیا اور لوگوں میں

دہشت ڈال دی اور بہت بڑے جادو کی نمائش کی۔ یعنی جادو کے زور سے نظر بندی کر کے مجمع پر چھا گئے اور لوگوں کو مرعوب کر لیا۔ دوسری آیت میں ہے کہ انہوں نے اپنی رسیاں اور لاٹھیاں زمین پر پھینک دیں جس سے زمین پر سانپ ہی سانپ دوڑتے معلوم ہونے لگے۔ یخیل الیہ من سحرھم انہا تسعی - ان آیات سے معلوم ہوا کہ ساحرین فرعون نے جو شعبدہ دکھلایا تھا۔ اس میں فی الواقع قلب ماہیت نہیں ہوا بلکہ وہ محض تخییل و نظر بندی تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام اقسام سحر اسی میں منحصر ہوں۔ شاید انہوں نے یہ گمان کیا ہو کہ ہم اتنی ہی کارروائی سے موسیٰ علیہ السلام کو دبا لیں گے اور کچھ گنجائش ملتی تو ممکن تھا کہ اس سحر عظیم سے بھی بڑا کوئی سحر اعظم دکھلاتے مگر اعجاز موسوی نے سحر کو پہلے ہی مورچہ پر مایوس کن شکست دے دی آگے موقع ہی نہ رہا کہ مزید مقابلہ جاری رکھا جاتا۔[1]

انداز بیان سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جوں ہی حضرت موسیٰ کی زبان سے القوا کا لفظ نکلا۔ جادوگروں نے یکبارگی اپنی رسیاں اور لاٹھیاں ان کی طرف پھینک دیں۔ اور اچانک ان کو یہ نظر آیا کہ سینکڑوں سانپ دوڑتے ہوتے آرہے ہیں۔ یہاں صرف یہ بتایا ہے کہ جادوگروں نے لوگوں کی نگاہوں کو مسحور کر دیا اور ان کو دہشت زدہ کر دیا اور پارہ ۱۶ سورہ طٰہٰ میں یہ بتایا کہ یخیل الیہ من سحرھم انہا تسعی یہ اثر صرف لوگوں پر ہی نہیں ہوا تھا بلکہ حضرت موسیٰ بھی خود سحر کے اثر سے متاثر ہو گئے تھے۔ حضرت موسیٰ کی صرف آنکھوں نے یہ اثر محسوس نہیں کیا بلکہ ان کے خیال پر بھی یہ اثر پڑا کہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑ رہی ہیں۔ یہ اس بات کی تصدیق خود قرآن کر رہا ہے کہ عام انسانوں کی طرح پیغمبر بھی جادو سے متاثر ہو سکتا ہے۔ اگرچہ جادوگر کے جادو کا پیغمبر کی نبوت پر کوئی اثر نہیں ہو سکتا جیسے یہاں حضرت موسیٰ کے بارے میں قرآن بتا رہا ہے کہ یخیل الیہ من سحرھم انہا تسعی حضرت موسیٰ کو ان کے جادو کی وجہ سے ایسا دکھائی دیا کہ ان کی لاٹھیاں دوڑ رہی ہیں ٹھیک اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں احادیث میں آیا ہے کہ حضور فرماتے ہیں تخیل لی انی اقول الشیئ وا فعلہ ولم اقلہ ولم افعلہ) مجھے دکھا دیتا ہے کہ میں ایک بات کہتا ہوں یا ایک کام کرتا ہوں حالانکہ میں نے نہ کہی ہوتی ہے نہ کام کیا ہوتا ہے جیسے یہاں کہا گیا ہے کہ جادوگروں کی لاٹھیاں اور رسیاں سانپ نہیں بنی تھیں

[1] افادات شیخ الاسلام

بلکہ ان شعبدہ گری کی وجہ دیکھنے والا خیال کرنے لگا تھا سانپ کی طرح حرکت کر رہی ہیں اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بھی خیال کرتے تھے کہ میں نے یہ کام کر لیا ہے حالانکہ وہ کام کیا ہوا نہ ہوتا۔ اگرچہ ہم اس موضوع پر تفصیلی بحث پارہ ۱۶ میں کریں گے لیکن یہاں اشارات ہدیہ ناظرین ہیں۔

سحر کی حقیقت اور اسلام میں اس کا حکم

سحر کی حقیقت کچھ ہے یا محض نظر کا دھوکہ اور بے حقیقت شے ہے اس کے متعلق جمہور علمائے اہل السنہ کی یہ رائے ہے کہ سحر واقعی ایک حقیقت ہے اور مضرت رساں اثر رکھتا ہے اسی بنا پر شیخ الاسلام کو یہاں اس تاویل کی ضرورت پیش آئی۔ "اس میں فی الواقع قلب ماہیت نہیں ہوا بلکہ وہ محض تخییل اور نظر بندی تھی۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ تمام اقسام سحر اسی میں منحصر ہوں" قرآن حکیم میں سحر کے متعلق جس قدر بیانات آئے ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سحر کو تخییل اور نظر بندی سے زیادہ کوئی وقعت نہیں دیتا۔ اسی بنا پر امام ابو حنیفہ، ابوبکر الجصاص، ابو اسحاق اسفرائنی شافعی اور ظاہریہ میں سے حافظ ابن حزم اور معتزلہ کہتے ہیں کہ سحر کی حقیقت شعبدہ بازی، نظر بندی اور فریب خیال کے سوا کچھ نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ ایک باطل اور بے حقیقت چیز ہے۔ ابوبکر الجصاص کہتے ہیں:

> اور جب سحر کو مطلق استعمال کیا جائے گا تو وہ ایک ایسے امر کا نام ہے جو محض دھوکا اور باطل ہو کہ جس کی اس سے زیادہ کوئی حقیقت نہ ہوا اور نہ اس کو ثبات حاصل ہو۔ (احکام القرآن)

اور حافظ عماد الدین ابن کثیر لکھتے ہیں:

> اور وزیر ابو المظفر یحییٰ ابن محمد بن ہبیرہ نے اپنی کتاب الاشراف فی مذہب الاشراف میں ایک باب سحر کے متعلق بھی قائم کیا ہے۔ اس میں انہوں نے بتایا ہے کہ علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ سحر کی بھی ایک حقیقت ہے مگر امام ابو حنیفہ فرماتے ہیں کہ اس کی کوئی حقیقت نہیں۔ (تفسیر ابن کثیر)

> ابو عبد اللہ القرطبی کہتے ہیں کہ ہمارے نزدیک سحر حقیقت ہے اور ایک واقعی شے ہے اور اللہ تعالیٰ اس کے ذریعے سے جو چاہتا ہے پیدا کر دیتا ہے مگر معتزلہ اور شوافع میں سے ابو اسحاق اسفرائنی اس کے مخالف ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ سحر

محض فریبِ نظر اور خیال بندی کا نام ہے۔ (تفسیر ابن کثیر)

اور حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے:

سحر کے متعلق اختلاف ہے۔ بعض نے یہ کہا ہے کہ وہ فقط تخییل ہے اور اس کی کوئی حقیقت نہیں ہے یہ ابوجعفر شافعی، ابوبکر رازی حنفی اور ابن حزم الظاہری اور ایک چھوٹی جماعت کا خیال ہے اور نووی فرماتے ہیں کہ صحیح یہ ہے کہ سحر ایک حقیقت اور واقعہ ہے۔ جمہور کا یہی خیال ہے اور عام علماء کا یہی مسلک ہے۔

لیکن جو علماء سحر کو تخییل سے زیادہ واقعیت اور حقیقت کے معنے دیتے ہیں ان میں پھر اختلاف ہے کہ کیا سحر میں یہ تاثیر ہے کہ وہ حقائق و ماہیات میں انقلاب پیدا کر دے مثلاً آدمی کو کتا بنا دے یا لاٹھی کو فی الواقع سانپ بنا دے۔ یا صرف نقصان رساں ہے۔ ایک چھوٹے سے گروہ کا خیال یہ ہے کہ سحر میں انقلابِ ماہیت کی تاثیر بھی ہے مگر جمہور کو اس سے اتفاق نہیں وہ کہتے ہیں کہ سحر میں انقلابِ ماہیت کی تاثیر بالکل نہیں ہوتی اور سحر کے ذریعے قلبِ ماہیت نہیں ہوتا بلکہ دھوکہ نظر بندی اور قوتِ متخیلہ کی شعبدہ بازی کا نام ہے۔ حافظ ابنِ حجر عسقلانی نے فتح الباری میں فیصلہ کن بات لکھی ہے۔

محل نزاع یہ امر ہے کہ سحر سے ذات کا انقلاب ہوتا ہے یا نہیں۔ جو لوگ کہتے ہیں کہ سحر فریبِ نظر کا نام ہے۔ وہ انقلابِ نظر کو نہیں مانتے اور جو لوگ سحر کو ایک حقیقت مانتے ہیں وہ اس بارے میں پھر باہم مختلف ہیں کہ کیا سحر کا اثر صرف اس حد تک ہے کہ وہ مزاج میں ایک قسم کا تغیر پیدا کر دے جیسے دوسری بیماریوں میں ہوتا ہے یا اس کی تاثیر اس سے زیادہ ہے کہ ایک شے کی حقیقت کو بدل ڈالے مثلاً پتھر کو جانور بنا دے یا جانور کو پتھر بنا دے۔ جمہور پہلی بات کے قائل ہیں اور کچھ لوگ دوسری بات کے۔

سحر کے موضوع پر امام ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں امام فخرالدین رازی نے مفاتیح الغیب میں ابنِ خلدون نے مقدمہ میں اور شاہ عبدالعزیز نے تفسیر فتح العزیز میں بڑی سیر حاصل بحث کی ہے انشاء اللہ ہم معالم القرآن کی جلد ۱۶ میں ہدیہ ناظرین کریں گے۔

قرآن نے جادوگروں کے اس عمل کو اس جگہ سحر عظیم کہا ہے لیکن ہمارے شارحین قرآن کو اصرار ہے کہ یہ سحر نہیں بلکہ صنعت کاری تھی۔ لاٹھیوں اور رسیوں میں پارہ بھر دیا گیا تھا اور جس زمین پر یہ

مظاہرہ ہوا تھا اس کو کھوکھلا کرکے اس کے اندر آگ بھر دی گئی تھی۔ وقت مقررہ پر نیچے کی گرمی سے پارے میں حرکت پیدا ہوگئی اور وہ لاٹھیاں اور رسیاں سانپ کی طرح دوڑتی نظر آنے لگیں۔ یہ راہ تفسیر اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ پہلے اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لیا گیا ہے کہ سحر ایک حقیقت ہے اور قرآن اس فیصلہ کا ساتھ نہیں دیتا ہے۔ وہ سحر کو محض تمویہ اور تخییل کے درجہ کی چیز قرار دیتا ہے۔

دراصل جادو کا اعتقاد دُنیا کی قدیم اور عالمگیر گمراہیوں میں سے ہے اور نوعِ انسانی کے لیے بڑی مصیبتوں کا باعث ہو چکا ہے قرآن نے اس کے بے اصل ہونے کا اعلان کیا ہے لیکن افسوس کہ دُنیا متنبہ نہیں ہوئی اور ازمنہ وسطی کے مسیحی جہل و قساوت نے ہزاروں بے گناہ انسانوں کو زندہ جلا دیا[1]

---

[1] ترجمان القرآن

وَأَوْحَيْنَآ إِلَىٰ مُوسَىٰٓ أَنْ أَلْقِ عَصَاكَ ۖ فَإِذَا هِىَ تَلْقَفُ
مَا يَأْفِكُونَ ﴿۱۱۷﴾ فَوَقَعَ الْحَقُّ وَبَطَلَ مَا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿۱۱۸﴾
فَغُلِبُوا هُنَالِكَ وَانْقَلَبُوا صٰغِرِينَ ﴿۱۱۹﴾ وَأُلْقِىَ السَّحَرَةُ
سٰجِدِينَ ﴿۱۲۰﴾ قَالُوٓا اٰمَنَّا بِرَبِّ الْعٰلَمِينَ ﴿۱۲۱﴾ رَبِّ مُوسٰى
وَهٰرُونَ ﴿۱۲۲﴾ قَالَ فِرْعَوْنُ اٰمَنْتُمْ بِهٖ قَبْلَ أَنْ اٰذَنَ لَكُمْ ۚ
إِنَّ هٰذَا لَمَكْرٌ مَّكَرْتُمُوهُ فِى الْمَدِينَةِ لِتُخْرِجُوا مِنْهَآ أَهْلَهَا ۚ
فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ ﴿۱۲۳﴾ لَأُقَطِّعَنَّ أَيْدِيَكُمْ وَأَرْجُلَكُمْ مِّنْ
خِلَافٍ ثُمَّ لَأُصَلِّبَنَّكُمْ أَجْمَعِينَ ﴿۱۲۴﴾ قَالُوٓا إِنَّآ إِلٰى رَبِّنَا
مُنْقَلِبُونَ ﴿۱۲۵﴾ وَمَا تَنْقِمُ مِنَّآ إِلَّآ أَنْ اٰمَنَّا بِاٰيٰتِ رَبِّنَا لَمَّا جَآءَتْنَا ۭ
رَبَّنَآ أَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا وَّتَوَفَّنَا مُسْلِمِينَ ﴿۱۲۶﴾

اور ہم نے موسیٰ پر وحی کی کہ تم اپنی لاٹھی میدان میں ڈال دو جونہی
موسیٰ نے لاٹھی پھینکی تو اچانک جو کچھ جھوٹی نمائش جادوگروں نے

کہ رکھی تھی اس کو لاٹھی ہڑپ کر رہی تھی[۱۴۲]۔ بس سچائی ثابت ہو گئی اور
جو کچھ جادوگر کرتب کر رہے تھے سب ملیامیٹ ہو گئے[۱۴۳]۔ نتیجہ یہ ہوا
کہ موسیٰ کے مدِ مقابل سارے مغلوب ہو گئے اور فتح کی جگہ اُلٹے ذلیل
ہو گئے، سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر پڑے[۱۴۴]۔ انہوں نے
کہا ہم اس ذات پر ایمان لے آئے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے
جو موسیٰ اور ہارون کا پروردگار ہے[۱۴۵]۔ فرعون نے کہا مجھ سے
اجازت لیے بغیر تم موسیٰ پر ایمان لے آئے بلاشبہ یہ ایک سازش ہے
جو تم نے شہر میں مل کر کی ہے تاکہ شہر سے اس کے باشندوں کو
نکالو تمہیں عنقریب اس کے نتیجہ کا پتہ لگ جائے گا[۱۴۶]۔ میں ضرور
تمہارے ہاتھ اور پاؤں اُلٹے سیدھے کٹواؤں گا، پھر تمہیں سُولی
پر چڑھاؤں گا[۱۴۷]۔ انہوں نے جواب دیا ہمیں اپنے مالک کے حضور
میں پیش ہونا ہی ہے[۱۴۸]۔ ہمارا قصور اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ

جب ہمارے پروردگار کی نشانیاں ہمارے سامنے آگئیں تو ہم ان پر
ایمان لے آئے اے ہمارے آقا تو ہمیں صبر کی نعمت سے سرفراز
کر اور ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم تیرے فرمانبردار ہوں۔ ۱۲۹

معانی مفردات

تلقف ، وہ نگل جاتی ہے لقف یلقف باب سمع سے آتا ہے اس کے معنی کسی چیز کو تیزی اور پھرتی سے لے لینے کے ہیں چاہے منہ سے نگل کر ہو یا ہاتھ سے لے کر ہو یہ مضارع کا واحد مونث غائب ہے اسی سے لقف لقف اور لقیف آتا ہے ۔ لینے میں تیزی دکھانے والا، بات کو جلدی تاڑ جانے والا۔ یافکون ، افک سے مضارع کا جمع مذکر غائب ۔ اِفک اَفک افوک جھوٹ بولنا باب ضرب و سمع سے ارض مافوکہ وہ زمین جس پر بارش نہ ہو۔ افاک جھوٹا لپاتی ۔ اصل معنے ہٹ جانے کے ہیں۔ افکار میں حق سے ہٹ جاتے، گفتار سے راستی سے ہٹ جاتے۔ کردار میں اچھے کام سے ہٹ جاتے۔ غلبوا ، ماضی کا جمع مذکر غائب، مغلوب ہو گئے ۔ غلبہ اور غلب مصدر ہیں۔ اصلی لغت میں موٹی گردن والے آدمی اور شہر کو کہتے ہیں۔ اس لیے لغوی لحاظ سے غلبہ کے معنی کسی موٹی گردن کو اپنی گرفت میں لینا۔ عمرو بن معدی کرب کا شعر ہے ۔

یمشی بھا غلب الرقاب کانھم
بزل کسین من الکحیل جلا لا

ایسی موٹی گردنوں والے وہاں پھرتے ہیں جیسے تارکول کی جھولیں پہنے ہوئے موٹی گردنوں والے طاقتور اونٹ ، غالب اور قابو پانے کے معنی بھی اسی مناسبت سے لیے ہیں۔ صاغرین، ذلیل و خوار، صغار سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر ، صاغر کی جمع بحالت نصب۔ صغر یصغر باب کرم سے آتا ہے ۔

حق کا بول بالا اور باطل کا منہ کالا

جب جادوگر اپنی فن کاری میں مہارت کو منظر عام پر لے آئے اور ان کی لاٹھیاں اور رسیاں سانپ بن کر دوڑنے لگیں، عام نگاہیں مسحور ہو گئیں اور لوگوں میں انہوں نے دہشت پیدا کر دی۔ حضرت موسیٰ کی قوت خیال بھی اس درجہ متاثر ہو گئی کہ ان کو بھی لاٹھیاں اور رسیاں اپنی طرف دوڑتی ہوئی محسوس ہونے لگیں۔ بلکہ دوسرے موقعہ پر قرآن نے بتایا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اپنے اندر ہراس محسوس کیا کہ اس منظر سے لوگ متاثر نہ ہو جائیں فاوجس فی نفسہ خیفۃ موسیٰ قرآن نے یہاں اختصار سے کام لیا ہے دوسرے موقعہ پر تفصیل ہے کہ ہم نے کہا لا تخف انک انت الاعلیٰ۔ ڈرو مت بول بالا تمہارا ہوگا۔ قرآن تاریخ کی داستان نہیں قدم قدم پر ایک ایک فقرہ میں مخاطبوں کی فکری اصلاح کرتا ہے یہاں اوحینا الی موسیٰ، کی تصریح کر کے اشارہ فرمادیا کہ اعجاز نبی کا نہیں بلکہ اللہ کا کردار ہوتا ہے۔ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ اور یہی قرآن کی خصوصیت ہے کہ وہ اپنے متن میں تطہیر افکار کو اساسی حیثیت دیتا ہے وہ سب سے پہلے لوگوں کے دل و دماغ کا جائزہ لیتا ہے اور دیکھتا ہے کہ ان کے اندر باطل افکار کے کون سے جھاڑ جھنکاڑ موجود ہیں۔ انجیل میں حضرت عیسیٰؑ کے معجزات جس عبارت اور لب و لہجہ میں بیان ہوئے ہیں ان کا صاف منشا یہ ہے کہ گویا حضرت عیسیٰ کو تمام کائنات کی بادشاہی سپرد کر دی گئی ہے اس لیے وہ خاص اپنی طاقت اور قدرت سے جو چاہتے تھے کر دیتے تھے۔ قرآن عزیز یہ ایسا انداز اختیار نہیں کرتا۔ وہ انبیاءؑ کے معجزات بیان کرتا ہے مگر اس کے ساتھ اس عقیدہ باطلہ کی بھی اصلاح کرتا جاتا ہے اور نہایت تصریح کے ساتھ یہ ظاہر کرتا ہے کہ یہ جو کچھ تھا خدا کی قدرت سے تھا۔ نبی کے ارادے اور اختیار سے نہیں۔ اسی بیان میں اس منظر کا آغاز اوحینا الی موسیٰ سے کیا ہے۔

۱۱۷۔ اور ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ تم اپنی لاٹھی میدان میں ڈال دو جونہی موسیٰ نے لاٹھی پھینکی تو اچانک جھوٹی نمائش جو انہوں نے کر رکھی تھی سب کو لاٹھی ہڑپ کر رہی تھی۔ یعنی عصائے موسیٰ سانپ بن کر ان کی تمام لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل گیا اور سارا بنا بنایا کھیل ختم ہو گیا۔[1]

یہاں ما یافکون کہا ہے اور دوسرے موقعہ پر ما صنعوا آیا ہے۔ ہمارے شارحین قرآن لکھ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رہے ہیں کہ جادوگروں کے بناتے سانپوں کو حضرت موسیٰ کا اژدہا ہڑپ کر گیا۔ لیکن قرآن کے الفاظ مایا فکون اور ما صنعوا میں بہت گہری اور بلیغ معنویت ہے۔ ایک معنے تو یہی ہیں جو عام شارحین قرآن بتاتے ہیں اور جو عبداللہ بن عباس، قتادہ، الحسن وغیرہ سے منقول ہیں کہ حضرت موسیٰ کا اژدہا جادوگروں کی لاٹھیوں اور رسیوں کو نگل گیا۔ اس صورت میں مایا فکون میں ما موصولہ ہوگا لیکن دوسری صورت یہ ہے کہ ما کو مصدریہ قرار دیا جاتے اور معنے یہ کیے ہیں کہ حضرت موسیٰ کا اژدہا جادوگروں کی فریب کاری اور بناوٹ کو ہڑپ کر گیا۔ یعنی عصاتے موسیٰ نے فی الفور جادوگروں کی نظر بندی، تخیل اور فریب کو ختم کر دیا اور لاٹھیاں لاٹھیاں ہی نظر آنے لگیں۔ مطلب یہ ہے کہ عصاتے موسیٰ نے لاٹھیوں اور رسیوں کو نہیں نگلا بلکہ اس جادو کے اثر کو زائل کر دیا جس کی بدولت وہ سانپ نظر آرہی تھیں۔ السید رشید رضا نے الشیخ اکبرؒ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ حضرت موسیٰ کی لاٹھی نے جادوگروں کے جادو کو ملیامیٹ کیا ہے اور اس کی صورت یہی ہے کہ لاٹھی کے اژدہا بنتے ہی فوراً اس نے جدھر کا رُخ کیا سحر مٹ گیا اور وہ لاٹھیاں جو فریبِ نظر کی وجہ سے پہلے سانپ نظر آرہی تھیں ۔ لاٹھیاں ہی نظر آنے لگیں۔ اگر یہ کہا جائے کہ عصاتے موسیٰ ان لاٹھیوں اور رسیوں کو ہڑپ کر گیا تو دیکھنے والوں کے لیے معاملہ میں التباس ہوتا اور وہ یہ فیصلہ نہ کر سکتے کہ سحر کیا ہے اور اعجاز کیا ہے۔ دونوں میں غرابت دیکھ کر چھوٹے اور بڑے ہونے کا فیصلہ کرتے۔ لیکن جب ان کو جادو کا فریب منظرِ عام پر آوارہ نظر آیا اور لاٹھیاں اور رسیاں سانپ نہ رہیں اور موسیٰ کی لاٹھی سانپ بن کر میدان میں دندناتی رہی تو حق باطل سے ممتاز ہو گیا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ یہ آیت الٰہی اور اعجاز ہے اور وہ فریب کاری اور نظر بندی ہے۔

احقاقِ حق اور ابطالِ باطل

۱۴۳- پس سچائی ثابت ہو گئی اور جادوگر جو کچھ کرتب کر رہے تھے سب ملیامیٹ ہو گئے۔ یہ فقرہ بھی ان معنے کی مزید تائید کرتا ہے کہ عصاتے موسیٰ نے سانپ بن کر ان کے اس طلسمِ فریب کو ہڑپ کرنا شروع کر دیا جو انہوں نے تیار کیا تھا۔ اس کا صاف مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ عصاتے موسیٰ نے جدھر رُخ کیا وہاں سے جادو کا اثر مٹ گیا جس کی وجہ سے لاٹھیاں اور رسیاں سانپ نظر آرہی تھیں۔ سورہ یونس میں جادوگروں کے اسی عمل کے بارے میں فرمایا ہے ما جئتم به السحر جو کچھ تم نے کیا ہے وہ جادو ہے اور اللہ اسی کو مٹا دے گا ان اللہ سیبطلہ الحق "حقق"

سے ہے اور عربی میں حق کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے یعنی جو بات ثابت ہو، اٹل ہو، اس کو عربی میں حق کہتے ہیں اور باطل ٹھیک اس کی ضد ہے۔ یعنی ایسی بات جو مٹ جانے والی ہو اور باقی نہ رہنے والی ہو۔ قرآن سچائی کو حق سے اور انکار کو باطل سے تعبیر کرکے یہ بات واضح کر رہا ہے کہ سچائی کا خاصہ ثبوت و قیام ہے اور انکار و سرکشی کے لیے نہ ٹک سکنا اور مٹ جانا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس موقعہ پر سورہ یونس میں یحق اللہ الحق کی تعبیر آئی ہے۔ خدا حق کو حق کر دے گا اور باطل کو باطل یعنی حق ثابت و قائم رہ کر اپنی حقانیت آشکارا کرے گا اور باطل مٹ کر اپنے باطل ہونے کا ثبوت دے گا۔ قرآن نے قاعدہ بتایا ہے کہ حق و باطل کی نزاع میں کامیاب حق ہوتا ہے۔ یہاں اعجاز موسیٰ اور سحر ساحران میں نزاع کے موقعہ پر اسی قانون کے تحت اعجازِ موسیٰ کو کامیابی عطا فرمائی۔ کیونکہ اعجاز حق ہے اور جادو اس کے مقابلہ میں باطل ہے۔ باطل کے لیے مٹنا ہے۔ امر الٰہی اعجاز موسیٰ کی صورت میں ظاہر ہوا اور حق کا بول بالا ہو گیا۔ قرآن کی اصطلاح میں اسی کا نام قضا بالحق ہے ارشاد ہے۔ فاذا جاء امر اللہ قضی بالحق۔

جادوگروں کا ضمیر بیدار ہو گیا

۱۲۴۔ نتیجہ یہ ہوا کہ موسیٰ کے مدِ مقابل سارے مغلوب ہو گئے اور فتح کی جگہ الٹے ذلیل و رسوا ہو گئے اور سارے جادوگر بے اختیار سجدے میں گر گئے۔ ساحرین کو شبہ ہوا کہ یہ سحر سے بالاتر کوئی اور حقیقت ہے۔ آخر فرعون کے لوگ بھرے مجمع میں شکست کھا کر اور ذلیل ہو کر میدانِ مقابلہ سے لوٹے اور ساحرین خدائی نشان دیکھ کر بے اختیار سجدہ میں گر پڑے۔ کہتے ہیں کہ حضرت موسیٰ و ہارون نے ظہورِ حق پر سجدہ شکر ادا کیا۔ اسی وقت ساحرین بھی سر بسجود ہو گئے۔ القی السحرۃ کا انداز بتا رہا ہے کہ کوئی ایسا قوی حال ان پر طاری ہوا جس کے بعد بجز خضوع و استسلام کوئی چارہ نہیں رہا۔ رحمتِ الٰہیہ کا کیا کہنا کہ جو لوگ ابھی ابھی پیغمبر خدا سے نبرد آزمائی کر رہے تھے سجدے سے سر اٹھاتے ہی اولیاء اللہ اور عارف کامل بن گئے[1] جادوگر حضرت موسیٰ کے اعجاز کی قہرمانیت سے اتنے متاثر اور مرعوب ہوتے کہ بے تحاشا سجدے میں گر پڑے۔ القی مجہول کا صیغہ ہے دو باتوں کی طرف اشارہ کر رہا ہے ایک جادوگروں کے جذبہ تعظیم و اکرام کی طرف دوسرے قبولیتِ حق کے لیے ان

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

سے قلب کی کیفیت کی طرف، اُن کا کفر ساری زندگی کا کفر تھا اور ایمان چند لمحوں کا ایمان لیکن ایمانی لمحات کے ایک سجدے نے عمر بھر کا کفر محو کر دیا۔ اب اُن کا دل صدیقوں کا دل اور ان کی صدا شہدائے حق کی صدا ہو گئی۔ مصری شہنشاہی کا سارا قہر و جلال ایک پل کے لیے ان کی استقامت ایمانی پر غالب نہ آسکا۔ روحانیت اور مادیت میں جب مقابلہ ہوتا ہے تو روحانی طاقت کا یہی حال ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اُن کے سحر کو سرِ عام رُسوا ہونے اور اعجازِ موسیٰ کے ادراک نے ان کی عقلوں میں یقین اور اُن کے دلوں میں ایمان کی طاقت بھر دی۔ ایمان و یقین کی اسی استدلالی اور وجدانی طاقت سے بے قابو ہو کر وہ سجدہ ریز ہو گئے اور ان کے دلوں میں فرعون، اس کی حکومت کا کوئی مقام نہ رہا۔ جادوگر فن کار تھے جادو اُن کی فن کاری۔ حضرت موسیٰ کا اعجاز ان کی فن کاری کا مظاہرہ نہ تھا۔ جادوگروں نے موسیٰ کے چہرے پر خوف کے آثار دیکھ کر تاڑ لیا کہ یہ اس کا اپنا فن نہیں ہے۔ اس کے پیچھے یقیناً غیبی طاقت ہے اور یہ یقیناً اللہ کا رسول ہے۔

جادوگروں کا علی رؤس الاشہاد ایمان

۱۲۵۔ انہوں نے کہا کہ ہم اس ذات پر ایمان لے آئے جو تمام جہانوں کا پروردگار ہے جو موسیٰ اور ہارون کا رب ہے۔ چونکہ فرعون بھی اپنی نسبت انا ربکم الاعلیٰ۔ کہتا تھا اس لیے رب العلمین کے رب موسیٰ و ہارون کہنے کی ضرورت ہوئی۔ اس میں یہ بھی اشارہ ہو گیا کہ بے شک جہان کا پروردگار وہی ہو سکتا ہے جس نے موسیٰ و ہارون کو اپنی خاص ربوبیت سے بدون توسط اسباب ظاہرہ دُنیا کے متکبروں پر علی رؤس الاشہاد اس طرح غالب کر کے دکھلا دیا۔[1]

اس کے معنے یہ ہیں کہ وہاں سب کو معلوم تھا کہ یہ مقابلہ کس بنیاد پر ہو رہا ہے۔ پورے مجمع میں کوئی بھی اس غلط فہمی میں نہ تھا کہ مقابلہ موسیٰ اور جادوگروں کے کرتب کا ہو رہا ہے اور فیصلہ اس بات کا ہونا ہے کہ کس کا کرتب زبردست ہے۔ سب یہ جانتے تھے کہ ایک طرف موسیٰ علیہ السلام اپنے آپ کو اللہ تعالیٰ خالق زمین و آسمان کی حیثیت سے پیش کر رہے ہیں اور اپنی پیغمبری کے ثبوت میں یہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ ان کا عصا معجزے کے طور پر فی الواقع اژدہا بن جاتا ہے اور دوسری طرف جادوگروں کو برسرِ عام بلا کر فرعون یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ عصا سے اژدہا بن جانا معجزہ نہیں ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

بلکہ محض جادو کا کرتب ہے بالفاظِ دیگر وہاں فرعون اور جادوگر اور سارے تماشائی عوام و خواص معجزے اور جادو کے فرق سے واقف تھے۔ اور امتحان اس بات کا ہو رہا تھا کہ موسیٰ جو کچھ دکھا رہے ہیں یہ جادو کی قسم سے ہے یا اس معجزے کی قسم سے ہے جو اللہ سبحانہٗ کی قدرت کے کرشمے کے سوا اور کسی طاقت سے نہیں دکھا سکتا۔ یہی وجہ ہے کہ جادوگروں نے اپنے جادو کو مغلوب ہوتے دیکھ کر یہ نہیں کہا کہ ہم نے مان لیا کہ موسیٰ ہم سے زیادہ باکمال ہے بلکہ انہیں فوراً یقین آگیا کہ موسیٰ واقعی اللہ سبحانہٗ کے سچے پیغمبر ہیں اور وہ پکار اٹھے کہ ہم اس کو خدا مان گئے جس کے پیغمبر کی حیثیت سے موسیٰ اور ہارون آئے ہیں۔

اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ مجمع میں اس شکست کے کیا اثرات پڑے ہوں گے اور پورے ملک پر اس کا کتنا زبردست اثر ہوا ہوگا۔ فرعون نے ملک کے سب سے بڑے مرکزی مقام پر اور بہت بڑے جشن کے موقعہ پر یہ مقابلہ اس اُمید پر کرایا تھا کہ جب مصر کے ہر گوشہ سے آئے ہوتے لوگ اپنی آنکھوں سے دیکھ جائیں گے کہ لاٹھی سے سانپ بنا دینا موسیٰ کا کوئی کمال نہیں ہے ہر جادوگر یہ کرتب دکھا سکتا ہے تو موسیٰ کی ہوا اکھڑ جائے گی۔ لیکن اس کی یہ تدبیر اسی پر اُلٹ پڑی اور قریہ قریہ سے آئے ہوئے لوگوں کے سامنے خود جادوگروں ہی نے بالاتفاق اس بات کی تصدیق کر دی کہ موسیٰ جو کچھ دکھا رہے ہیں یہ ان کے فن کی چیز نہیں ہے۔ یہ فی الواقع معجزہ ہے جو صرف خدا کا پیغمبر ہی دکھا سکتا ہے۔

حضرت موسیٰ کی کامیابی پر فرعون کی بدحواسی

۱۲۶۔ فرعون نے کہا مجھ سے اجازت لیے بغیر تم موسیٰ پر ایمان لے آئے بلا شبہ یہ ایک سازش ہے جو تم نے شہر میں مل کر کی ہے تاکہ شہر سے اس کے باشندوں کو نکالو تمہیں عنقریب اس کے نتیجہ کا پتہ لگ جائے گا۔ یعنی یہ تم سب جادوگروں کی ملی بھگت ہے، غالباً موسیٰ تمہارا بڑا استاد ہوگا۔ اس کو آگے بھیج دیا پھر سب نے اپنی مغلوبیت کا اظہار کر دیا تاکہ عام لوگ متاثر ہو جائیں اس گہری سازش سے تمہارا مقصود یہ ہے کہ اس ملک کے اصلی باشندوں کو نکال باہر کرو اور خود مصر کی سلطنت پر قبضہ کر و یہ بات فرعون نے اپنی کھلی شکست پر پردہ ڈالنے اور لوگوں کو اُلو بنانے کے لیے کی تھی فاستخف قومه فاطاعوه مگر جس چیز سے فرعون اور اعیان حکومت ڈر رہے تھے آخر تقدیر الٰہی سے وہی پیش آئی۔ ونری فرعون وهامان وجنودهما

منہم ما کانوا یحذرون [1]

فرعون نے حضرت موسیٰ کی دعوت کو ختم کرنے کے لیے جو سیاسی کھیل تھا اللہ نے اس میں اسے بُری طرح ناکام کیا۔ کھیل یہ تھا کہ تمام ملک کے ماہر جادوگروں کو بلا کر منظرِ عام پر جادوگری کا مظاہرہ کرایا جاتے تاکہ عوام الناس کو حضرت موسیٰ کے جادوگر ہونے کا یقین ہو جاتے لیکن اس مقابلہ میں اسے کھلی شکست ہوئی کہ خود اپنے بلاتے ہوتے ماہرینِ فن نے بالاتفاق فیصلہ کر دیا کہ حضرت موسیٰ جو چیز پیش کر رہے ہیں وہ ہرگز جادو نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہ کی شانِ قدیری کا مظاہرہ ہے۔ ظاہر ہے جادو کو جادوگروں سے زیادہ کون جان سکتا ہے جب انہوں نے ہی عملی تجربے اور آزمائش کے بعد شہادت دے دی کہ یہ جادو نہیں تو پھر فرعون اور اس کے اعیانِ حکومت کا عصائے موسیٰ اژدہا اور یدِ بیضا کو دیکھ کر یہ دعویٰ کرنا ان ھذا لساحر علیم بالکل ایک کھوکھلا نعرہ ہے۔ اب فرعون اور اس کے اعیانِ حکومت کا یہ سیاسی اسٹنٹ ملک کے عوام کی نظروں میں بالکل بے معنے ہو کر رہ گیا۔ اب حالات کو آخری سنبھالا دینے کیلئے یہ سیاسی مہرہ چلا کہ اس سارے معاملہ کو حضرت موسیٰ اور جادوگروں کی سازش قرار دے دے۔ اس نے عوام کو سمجھایا کہ یہ سازش کے ذریعے اقتدار پر قبضہ کرنا چاہتے ہیں اور بتایا کہ انہوں نے پہلے سے مشورہ کر کے یہ طے کر رکھا تھا کہ ہم عین موقعہ پر اپنی شکست مان کر اپنے ایمان کا اعلان کر دیں گے اور اس طرح موجودہ برسرِ اقتدار گروہ کا اقتدار ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ چنانچہ فرعون نے ان پر سازش اور بغاوت کا الزام لگا کر پہلے ان کو دھمکی دی کہ فسوف تعلمون۔ تمہیں اپنی کرتوت کا پتہ لگ جاتے گا بلاشبہ یہ فرعون کا الزام ہے ورنہ جو کچھ ہوا وہ حق کی قوت اور جادوگروں کی حق پسندی سے ہوا ہے۔ یہاں تو صرف فرعون کی یہ بات نقل کی ان ھذا لمکر مکرتموہ فی المدینۃ لتخرجوا منہا اھلہا۔ یہ ایک سازش ہے جو تم نے مل کر شہر میں تیار کی ہے تاکہ اس کے مالکوں کو اقتدار سے محروم کر دو اور قرآن ہی میں دوسرے موقعہ پر یہ بتایا ہے کہ فرعون نے انہ لکبیرکم الذی علمکم السحر، یعنی صرف ملی بھگت نہیں بلکہ معلوم یہ ہوتا ہے کہ یہ موسیٰ تمہارا سرگروہ ہے۔ تم نے معجزے سے شکست نہیں کھائی ہے بلکہ اپنے استاد سے جادو میں شکست کھائی ہے اور تم آپس میں یہ طے کر کے آتے ہو کہ اپنے استاد کا غلبہ ثابت اور اسے اس کی پیغمبری کا ثبوت بنا کر یہاں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سیاسی انقلاب بپا کرد۔ فرعون نے جادوگروں پر اپنی شکست کو چھپانے کے لیے یہ الزام عائد کیا۔ حافظ ابن کثیر نے صحیح لکھا ہے۔

وہ خود بھی جانتا تھا اور ہر عقل والا جانتا ہے کہ فرعون جو کچھ کہہ رہا ہے سب سے بڑا جھوٹ ہے موسیٰ علیہ السلام نے مدین سے آتے ہی فرعون کو اللہ کی طرف بلایا اور معجزات دکھاتے۔ اسی وقت فرعون نے مقابلہ کا اعلان کرا دیا اور ملک میں جادوگروں کو بلانے کے لیے ہرکارے روانہ کر دیے۔

(تفسیر ابن کثیر)

پھر پتہ نہیں کہ ہمارے شارحین قرآن کو یہ کیسے پتہ لگ گیا ہے کہ

موسیٰ علیہ السلام اور جادوگروں کے امیر کی باہم ملاقات ہوئی۔ حضرت موسیٰ نے اس سے کہا تیری کیا رائے ہے کہ اگر بازی میں جیت گیا تو کیا تو مجھ پر ایمان لے آئے گا اور میری دعوت کی حقانیت کی گواہی دے گا۔ جادوگر نے کہا میں کل ایسے جادو کی نمائش کروں گا کہ اس پر کوئی جادو غالب نہیں ہو سکتا۔ بخدا اگر تم غالب آ گئے تو میں ضرور تم پر ایمان لے آؤں گا اور آپ کے برحق ہونے کی گواہی دوں گا اور فرعون ان کی طرف گفتگو کے وقت دیکھ رہا تھا اسی لیے فرعون نے یہ بات کہی ان ھذا لمکر مکرتموہ۔

روایت ابن جریر اور ابن کثیر دونوں نے لکھی اور عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود کے نام سے لکھی۔ لیکن یہ روایت جس راہ سے سفر کر کے ہم تک پہنچی ہے وہ سدی کبیر ہے اور ہمیں افسوس ہے کہ ہم تفسیر قرآن کے بارے میں ان سے حسن ظن نہیں رکھتے۔ قرآن اپنی تفسیر و تشریح میں اس افسانہ سے بے نیاز ہے۔

جادوگروں کی سزا کا اعلان

۱۲۷۔ میں ضرور تمہارے ہاتھ پاؤں اُلٹے سیدھے کٹوا دوں گا۔ پھر تمہیں سولی پر چڑھا دوں گا۔ فرعون نے پہلے جادوگروں پر سازش اور بغاوت کا الزام عاید کیا۔ اب اس نے اس سزا کا بھی اعلان کر دیا جو اس کے ملک میں حکومت کے باغیوں کے لیے ملکی قانون میں موجود تھی یعنی پہلے ان کے ہاتھ پاؤں بے ترتیب کاٹے جائیں پھر سرِ عام ان کو سولی دی جاتے۔

یہ خوفناک دھمکی فرعون نے اس نظریہ کو کامیاب بنانے کے لیے دی تھی کہ جادوگر دراصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ سازش کرکے آئے ہیں۔ اس کے پیش نظر یہ تھا کہ اس طرح یہ لوگ جان بچانے کی خاطر سازش کا اعتراف کرلیں گے اور وہ ڈرامائی اثر ختم ہو جائے گا جو شکست کھاتے ہی ان کے سجدے میں گر ایمان لے آنے سے ان لوگوں پر ہوا تھا جو خود اس کی دعوت پر جمع ہوئے تھے اور جنہیں خود اس کے روانہ کردہ لوگوں نے یہ خیال دلایا تھا کہ مصری قوم کا دین و ایمان بس ان جادوگروں کے ذریعے قائم ہے یہ کامیاب ہوں تو قوم اپنے دین آبائی پر قائم رہ سکے گی ورنہ موسیٰ کی دعوت کا سیلاب اسے اور اس کے فرعون کے اقتدار کو بھی بہا کرلے جائے گا۔ ظلم و استبداد ہمیشہ بے بس اور بے کس انسانوں میں اپنے جھوٹے وقار کو قائم رکھنے کے لیے اسی قسم کے ہتھکنڈے اختیار کیا کرتا ہے کہ ان کو باغی اور سازشی قرار دیتا ہے اور بغاوت کے جرم میں ان کو سنگین سزائیں دیتا ہے۔ خود ہمارا اپنا تجربہ ہے جب ہم نے ظلم کے خلاف آواز اٹھائی ہمیں سازشی اور غدار کہا گیا ہے اس طریقے سے ظلم و استبداد اپنی درازیٔ عمر کی تدبیر کرتا ہے لیکن ہوتا وہی ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔

بے کس اور بے بس جادوگروں نے فرعون کا یہ ظالمانہ اور جابرانہ اعلان سنا اور دونوں باتوں کا ایمان کی روشنی میں تقابلی مطالعہ کیا۔ ایک طرف دنیا اور اس کی وقتی تکلیفیں ہیں، دوسری طرف آخرت اور اس کی دائمی راحتیں ہیں۔ دنیا حاصل ہوتی ہے فرعون کی ربوبیت مان کر اور آخرت ملے گی اللہ کی ربوبیت مان کر۔ انہوں نے پوری سوچ بچار کے بعد دنیا کے مقابلے میں آخرت کو ترجیح دی۔ یہاں کی وقتی لذتوں کے مقابلے میں آخرت کی دائمی راحتوں کو قبول کیا اور سب کے سامنے فرعون کی اس دھمکی کا یہ جواب دیا۔

جادوگروں کا ایمان افروز جواب

۱۴۸۔ انہوں نے جواب دیا ہمیں اپنے مالک کے حضور میں پیش ہونا ہی ہے۔ جادوگر توحید اور تمنائے لقاء اللہ کے نشہ سے مخمور ہو چکے تھے۔ جنت و دوزخ گویا آنکھوں کے سامنے تھیں۔ وہ ان دھمکیوں کی کیا پروا کر سکتے تھے۔ انہوں نے صاف کہہ دیا کچھ مضائقہ نہیں جو کرنا ہو کر گزر۔ پھر ہم کو اپنے خدا کے پاس جانا تیرے سر ہو کر سہی۔ وہاں کے عذاب سے یہاں کی تکلیف آسان ہے اور اس کی رحمت و خوشنودی کی خاطر دنیا کی بڑی سے بڑی تکلیف و مصیبت کا برداشت کرلینا عاشقوں کے لیے سہل ہے۔

ھنیئاً لارباب النعیم نعیمھم
وللعاشق المسکین ما یتجرع

جادوگروں کی طبیعت کا یہ زبردست انقلاب انسانی تاریخ کا ایک انوکھا واقعہ ہے۔ یہ انقلاب عصائے موسیٰ سے زیادہ طاقتور اعجاز ہے۔ ایک وہ اعجاز ہے کہ حضرت موسیٰ کی لاٹھی سانپ بن گئی اور ایک اعجاز یہ ہے کہ جن کی دنائت اور پست ہمتی کا ابھی چند منٹ پہلے یہ حال تھا کہ اپنے کرتب دکھانے کے لیے فرعون کے سامنے حاضر ہوتے ہیں تو بھانڈوں، نقالوں اور بہروپوں کے انداز پر اپنے فن کے مظاہرہ پر بھرپور انعام کی التجا کرتے ہیں اور ایک یہ حال ہے کہ ایمان کی روشنی دل میں داخل ہوتے ہی ان کے باطن کا ہر گوشہ اس طرح منور ہو گیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ تاریکی کی کوئی پرچھائیں ان کے دلوں پر کبھی نہیں پڑی ہے اور یہ گوشت پوست کے انسان نہیں بلکہ عزیمت و استقامت کے پہاڑ ہیں۔ ان کی زندگی میں عظیم الشان انقلاب رونما ہو گیا۔ ابھی ابھی وہ دنیا کی حقیر مایہ کے لیے فرعون سے ان لنا لاجرا کی التجا کر رہے تھے اور اب وہی اسی فرعون سے سنگین دھمکی سن کر انا الیٰ ربنا منقلبون کہہ رہے ہیں۔ ایمان ان میں پیوست ہو گیا۔ یقین ان کے رگ و ریشہ میں سرایت کر گیا اور ان کے جسم میں خون اور روح کی طرح دوڑ گیا۔ فرعونی ربوبیت کے جراثیم ختم ہو گئے۔ اب وہ پہلے جادوگر نہ رہے۔ ان کا دل و دماغ ایمان کے فیضان سے معمور ہو گیا ہے۔ اب وہ ایمان کا تقاضا پورا کرنے کے لیے کہہ رہے ہیں کہ جو کچھ کرنا ہے کرے فاقض ما انت قاض ان کی اس حیرت انگیز تبدیلی پر عقل دنگ ہے اور فلسفہ و تاریخ اخلاق انگشت بدنداں ہے کہ اس کی کیا توجیہ کی جائے قوتِ ایمان کے سوا اس کی کوئی توجیہ نہیں۔ یہاں اجمال ہے لیکن سورہ طٰہٰ میں اس کی تفصیل ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ قوتِ ایمان نے ان کے دلوں میں زندگی کو ایسا حقیر بنا دیا تھا اور ان میں ایسی دلیری بھر دی تھی جو بالکل ایک معجزانہ شان رکھتی تھی۔ فرعون کی اسی بات لاقطعن ایدیکم الخ کے جواب میں انہوں نے علی رؤس الاشہاد فرعون سے کہا۔

لن نؤثرک علی ما جاءنا من البینات والذی فطرنا

قسم ہے اس ذات کی جس نے ہمیں پیدا کیا ہے یہ ہرگز نہیں ہو سکتا کہ ہم واضح نشانیاں آجانے کے باوجود تجھے ترجیح دیں۔

یہ قوتِ ایمان کا مظاہرہ، محبت و جاں نثاری کی یہ نمائش اپنی مثال آپ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم نے ہمارے ہاتھ پاؤں کاٹ کر ہمیں سولی پر لٹکایا تو ہم کہیں اور نہیں جائیں گے اپنے رب ہی

کے پاس جائیں گے۔ ہمیں اس کی پروا نہیں ہے۔ تو جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر گزر۔ تو زیادہ سے زیادہ یہی کرے گا کہ بس ہماری یہ دنیوی زندگی ختم کر دے گا اس سے زیادہ تو کر ہی کیا سکتا ہے۔ فی الواقع سچا ایمان اگرچہ ایک ہی لمحہ کا ہو ایسی روحانی طاقت پیدا کر دیتا ہے کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے مرعوب نہیں کر سکتی۔

آئندہ حالات میں صبر کی دُعا۔

۱۴۹۔ ہمارا قصور اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جب ہمارے پروردگار کی نشانیاں ہمارے سامنے آگئیں تو ہم ان پر ایمان لے آئے۔ اے ہمارے آقا ہمیں صبر کی نعمت سے سرفراز کر اور ہمیں اس حالت میں موت دے کہ ہم تیرے فرمانبردار ہوں۔ یعنی جس رب کی نشانیوں کو مان کر ہم تیری نگاہ میں مجرم ٹھہرے ہیں۔ اسی رب سے ہماری دُعا ہے کہ وہ تیری زیادتیوں اور سختیوں پر ہم کو صبر جمیل بخشے اور مرتے دم تک اسلام پر مستقیم رکھے۔ ایسا نہ ہو کہ گھبرا کر کوئی بات تسلیم و رضا کے خلاف کر گزریں۔[1]

مطلب یہ ہے کہ ہم نے کوئی سازش نہیں کی اور نہ ہماری باہم کوئی ملی بھگت ہے۔ ہمارا جرم اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ ہم نے اپنے رب کی نشانیوں کو مان لیا ہے اور ہم نے اپنے عملی تجربے اور آزمائش سے جان لیا کہ موسیٰ جو کچھ پیش کر رہا ہے یہ جادو نہیں بلکہ آیات رب ہیں۔ اور تیری نگاہ میں ہمارا یہی جرم ہے اور اسی کا تو ہم سے انتقام لینا چاہتا ہے۔ ہم تیری ہر قسم کی سزاؤں کا استقبال کریں گے۔ اور اس راہ میں ہماری اپنے مولیٰ سے دُعا یہ ہے کہ وہ ہمیں تیری چیرہ دستیوں اور ستم رانیوں کو برداشت کرنے کی قوت عطا فرمائے اور ہم کو دُنیا سے اس حال میں اُٹھائے کہ ہم اسی کے فرمانبردار اور تابعدار ہوں۔ پہلے ایمان کا دعویٰ کیا تھا اب ایمان کے تقاضے پورے کرنے کی اللہ سے دُعا کر رہے ہیں۔ ایمان کا اولین تقاضا یہ ہے کہ اپنی پوری زندگی ایمان کے سانچے میں ڈھال لے اور ایمان کی خاطر سر فروشی کے لیے تیار ہو جائے۔

جادوگروں کا کردار اس بات کی واضح اور کھلی دلیل ہے کہ سازش کا الزام سراسر جھوٹ ہے۔ جادوگر اپنے فن میں ماہر ہونے کی وجہ سے مان گئے تھے کہ یہ اعجاز ہے جادو نہیں ہے۔ ان کا ضمیر بیدار ہو گیا اور نعمتِ ایمان سے مالا مال ہو گئے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَقَالَ الْمَلَأُ مِنْ قَوْمِ فِرْعَوْنَ أَتَذَرُ مُوسَىٰ وَقَوْمَهُ لِيُفْسِدُوا
فِي الْأَرْضِ وَيَذَرَكَ وَآلِهَتَكَ ۚ قَالَ سَنُقَتِّلُ أَبْنَاءَهُمْ وَ
نَسْتَحْيِي نِسَاءَهُمْ وَإِنَّا فَوْقَهُمْ قَاهِرُونَ ﴿۱۲۷﴾ قَالَ مُوسَىٰ لِقَوْمِهِ
اسْتَعِينُوا بِاللَّهِ وَاصْبِرُوا ۖ إِنَّ الْأَرْضَ لِلَّهِ يُورِثُهَا مَنْ
يَشَاءُ مِنْ عِبَادِهِ ۖ وَالْعَاقِبَةُ لِلْمُتَّقِينَ ﴿۱۲۸﴾ قَالُوا أُوذِينَا مِنْ
قَبْلِ أَنْ تَأْتِيَنَا وَمِنْ بَعْدِ مَا جِئْتَنَا ۚ قَالَ عَسَىٰ رَبُّكُمْ أَنْ
يُهْلِكَ عَدُوَّكُمْ وَيَسْتَخْلِفَكُمْ فِي الْأَرْضِ فَيَنْظُرَ كَيْفَ
تَعْمَلُونَ ﴿۱۲۹﴾

اور قوم فرعون کے اعیانِ حکومت نے فرعون سے کہا، کیا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو اسی حال میں چھوڑ دے گا کہ وہ ملک میں فساد برپا رکھیں اور تیرا، اور تیرے معبودوں کا بائیکاٹ رکھیں[۱۵۰]۔ فرعون نے کہا ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ

رہنے دیں گے اور وہ تو ہماری طاقت سے دبے ہوئے ہیں [۱۵۱]
حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا اللہ سے مدد مانگو اور ڈٹے رہو
بلاشبہ زمین کا مالک اللہ ہے وہ اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا
ہے وارث بنا دیتا ہے اور انجام ان ہی کے لیے ہے جو متقی ہیں [۱۵۲]
انہوں نے کہا تمہارے آنے سے پہلے بھی ہمیں ستایا گیا ہے اور
اب تمہارے آنے کے بعد ہمیں ستایا جا رہا ہے [۱۵۳] - زمین اللہ کی ہے
اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے وارث بناتا ہے اور آخری
کامیابی ان کے لیے ہے جو متقی ہوتے ہیں [۱۵۴] - موسیٰ نے کہا قریب
ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور ملک میں
تمہیں اس کا جانشین بنا دے پھر وہ دیکھے کہ تمہارے کام کیسے
ہیں [۱۵۵] -

معانی مفردات

عسیٰ ، عنقریب ہے شتاب ہے ، ممکن ہے ، توقع ہے ، اندیشہ ہے - صاحب قاموس نے

لکھا ہے کہ عسیٰ مطلقاً فعل ہے اور یا مطلقاً حرف ہے۔ اس پر علامہ زبیدی نے اپنے شیخ ابو الطیب قاسمی سے نقل کیا ہے کہ یہ دونوں باتیں تشنہ ہیں بلکہ عسیٰ میں تفصیل ہے جب یہ ضمیر متصل پر داخل ہوتا ہے جیسے عساہ تو حرفیہ ہے اور جب اسم ظاہر پر داخل ہوتا ہے تو افعال مقاربہ میں سے ایک فعل ہے یہی مبرد اور اخفش کی رائے ہے اور دونوں طرح سے استعمال ہونے کے شرائط تسہیل اور اس کی شروح میں مذکور ہیں اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں رقمطراز ہیں کہ عسیٰ کے معنے طمع اور ترجی کے ہیں یعنی توقع ہے اور امید ہے۔ اور بہت سے مفسرین نے اس کی تفسیر لازم یعنی ضروری اور یقینی سے کی ہے وہ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ کے متعلق طمع اور رجا صحیح نہیں ہے لیکن یہ ان کی کوتاہ نظری ہے کیونکہ قرآن میں عسیٰ اس لیے آیا ہے کہ انسان اللہ سے توقع رکھے نہ اس لیے کہ خود اللہ سبحانہٗ توقع رکھے لہٰذا عسی ربکم ان یهلك عدوکم کے معنے یہ ہیں کہ تم اللہ سے اپنے دشمن کو ہلاک کرنے کی توقع رکھو۔ اور علامہ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں یہ بھی تصریح کی ہے کہ عسیٰ کا استعمال رجا میں زیادہ اور خوف میں کم ہے۔ حافظ سیوطی الاتقان فی علوم القرآن میں اس کی معنویت پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔

اعیانِ حکومت کی بوکھلاہٹ

فرعون حضرت موسیٰ کی روحانی طاقت سے مغلوب ہو کر یہ فیصلہ کرنا چاہتا تھا کہ حضرت موسیٰ کو ان کے حال پر چھوڑ دیا جائے۔ فرعون نے اس سے پہلے حضرت موسیٰ کو قتل کرنے کا ارادہ کیا تھا لیکن فرعون ہی کے ایک شخص نے جو اندر سے ایمان رکھتا تھا فرعون کو اس ارادہ سے باز رکھا۔ چنانچہ اس کی پوری داستان آپ پارہ ۲۴ میں پڑھیں گے۔ یہاں اس موقعہ پر قرآن نے فرعون اور اعیانِ حکومت کا یہ مکالمہ صرف یہ بتانے کے لیے پیش کیا ہے کہ فرعون اس مقابلہ کے بعد ایک تو حضرت موسیٰ کی روحانی طاقت سے مغلوب ہو چکا تھا اور دوسرے رائے عامہ کے خلاف ہونے کا اسے اندیشہ ستا رہا تھا کیونکہ جادوگروں سے مقابلہ ہونے اور جادوگروں کے سرِ عام دعوتِ موسیٰ کو اپنانے کا واضح مطلب یہ ہے کہ ملک کی رائے عامہ حضرت موسیٰ کا احترام کر رہی تھی۔ حالات کی نزاکت کا واضح تقاضا تھا کہ فرعون حضرت موسیٰ کو کچھ نہ کہے لیکن حکومت کے اربابِ بست و کشاد کو اب یہ اندیشہ ستا رہا تھا کہ اگر حضرت موسیٰ کو کھلا چھوڑ دیا گیا تو حضرت موسیٰ ملک میں بغاوت کرا دیں گے اور فرعون سے اور فرعون کے نظامِ حکومت سے تعلقاتِ بندگی منقطع کر لیں گے

یہی خدشہ اور خطرہ اس سے پہلے خود فرعون نے حضرت موسیٰ کے بارے میں ظاہر کیا تھا۔

انی اخاف ان یبدل دینکم او ان یظھر فی الارض الفساد

مجھے اندیشہ ہے کہ یہ تمہارا دین بدل دے گا یا ملک میں شورش برپا کر دے گا۔

یعنی مجھے حضرت موسیٰ سے دو باتوں کا اندیشہ ہے ایک مجھے اس سے انقلاب کا خطرہ ہے اگر انقلاب بپا نہ کر سکے تو کم از کم یہ خطرہ تو ضرور ہے کہ ملک میں فساد برپا کر دے۔ دونوں کی باتوں میں ہم آہنگی ہے۔ اب فرعون نے حالات کے تحت رائے بدل لی تھی اور حضرت موسیٰ کی روحانی طاقت سے مغلوب ہو کر اور رائے عامہ کے دھارے کو دیکھ کر وہ حضرت موسیٰ کو کھلا چھوڑ دینا چاہتا تھا کیونکہ جادوگروں سے سرعام حضرت موسیٰ کا مقابلہ ہونے کے بعد ملک کی رائے عامہ کے سامنے یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی تھی کہ فرعون کا بنایا ہوا سارا گھروندا پاش پاش ہو چکا تھا جو مقابلہ اس نے خود فیصلے کے لیے کرایا تھا اس میں موسیٰ علیہ السلام کی کھلی کھلی فتح کو سیدھی طرح مان لینے کے بجائے اس نے اب فوراً ایک جھوٹی سازش کا افسانہ گھڑا اور جادوگروں کو قتل و تعذیب کی دھمکی دے کر زبردستی اقرار کرانے کی کوشش کی۔ اس افسانے میں ذرہ برابر کوئی صداقت نہ تھی۔ اگر کوئی صداقت بھی ہوتی تو جادوگر ہر قسم کی سزا کا استقبال کرنے کے لیے یوں تیار نہ ہوتے اور سرعام یہ نہ کہتے فاقض ما انت قاض۔ حالات کے اسی دباؤ نے فرعون کو مجبور کیا کہ وہ براہ راست حضرت موسیٰ پر ہاتھ نہ ڈالے۔ لیکن اعیانِ حکومت مطالبہ کر رہے ہیں کہ حضرت موسیٰ سے خطرہ ہے۔ فرعون اس کے جواب میں ان کو تسلی دے رہا ہے کہ ڈرنے کی کیا بات ہے ہماری کرسی مضبوط ہے اور بنی اسرائیل ہماری مضبوط طاقت کے تلے دبے ہوئے ہیں۔

۱۵۰۔ اور قومِ فرعون کے اعیانِ حکومت نے فرعون سے کہا تو موسیٰ اور اس کی قوم کو اسی حال میں چھوڑ دے گا کہ وہ ملک میں فساد برپا رکھیں اور تیرا، تیرے معبودوں کا بائیکاٹ رکھیں۔ جب حق کے نشان دیکھ کر جادوگر سجدے میں گر پڑے اور بنی اسرائیل نے موسیٰ علیہ السلام کا ساتھ دینا شروع کر دیا بلکہ قبطیوں کا میلان بھی ان کی طرف ہونے لگا تو فرعونی لیڈر گھبرائے اور فرعون کو یہ کہہ کر تشدد پر آمادہ کرنے لگے کہ موسیٰ اور اس کی قوم بنی اسرائیل کو یہ موقعہ نہ دیا جائے کہ وہ آزاد رہ کر ادھم مچاتے پھریں اور عام لوگوں کو اپنی طرف مائل کر کے حکومت کے خلاف علم بغاوت بلند کر دیں اور آئندہ تیری، اور تیرے تجویز کیے ہوئے معبودوں کی پرستش ملک سے موقوف کرا دیں فرعون اپنے آپ کو رب اعلیٰ کہتا تھا غالباً اسی اعلیٰ کو نباہنے کے لیے کچھ ادنیٰ پروردگار بھی تجویز

کیسے ہوں گے ان کو یہاں الھتک کہا۔ بعض نے کہا کہ وہ گائے وغیرہ کی مجسم تصویریں تھیں۔ بعض نے سورج اور ستارے سے مراد لیے ہیں۔ بعض کے نزدیک خود فرعون نے اپنی تصویر کے مجسمے پرستش کے لیے تقسیم کر دیے تھے۔ کچھ یہی بڑا معبود اپنے ہی کو کہلاتا تھا اور ما علمت لکم من الٰہ غیری کہہ کر خدا کے وجود کی نفی کرتا تھا[1] مصری مختلف دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے۔ بڑا دیوتا سورج تھا جسے "رع" کہتے تھے اور چونکہ بادشاہ کو اس کا اوتار سمجھتے تھے اس لیے اس کا لقب فارع تھا۔ یہی فارع عبرانی میں فاراعو اور عربی میں فرعون ہو گیا[2]

شارحینِ قرآن نے الھتک کو دو طرح سے پیش کیا ہے ایک یہ کہ الٰہ کی جمع الٰھۃ ہے۔ دوسرے یہ کہ الاہت ہے۔ پہلی صورت میں معنے معبودوں کے ہیں اور دوسری صورت میں معنے عبادت کے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہ لفظ الٰھۃ ہی ہے اور الٰہ کی جمع ہے اور معبودوں ہی کے معنے میں ہے۔ اعیانِ حکومت فرعون سے یہ کہہ رہے ہیں کہ اب موسیٰ اور ان کی قوم کو زیادہ مہلت دینے کے ملکی حالات سازگار نہیں ہیں اگر ان کو مزید موقعہ دیا گیا تو ایک طرف ملک میں شورش برپا کریں گے اور دوسری طرف آپ کو اور آپ کے معبودوں کو چھوڑ دیں گے۔ کچھ لوگوں نے یہاں الٰھہ کو الٰہ کی جمع مان کر حاکم کے معنے میں لیا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ وہ آپ کو اور آپ کے حاکموں کو چھوڑ دیں گے اور متوازی حکومت قائم کر لیں گے۔

فرعون کی سفاکانہ تجویز

۱۵۱- فرعون نے کہا کہ ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے اور ان کی عورتوں کو زندہ رہنے دیں گے اور وہ تو ہماری طاقت سے دبے ہوئے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کی پیدائش سے پہلے بھی فرعون نے بنی اسرائیل پر ظلم کر رکھا تھا کہ لڑکوں کو قتل کر دیتا۔ اس خوف سے کہ کہیں یہ وہی اسرائیلی نہ ہو جس کے ہاتھ پر اس کی سلطنت کے زوال کی خبر منجمین نے دی تھی اور لڑکیوں کو خدمت وغیرہ کے لیے رکھ لیتا۔ اب موسیٰ علیہ السلام کا اثر دیکھ کر اندیشہ ہوا کہ کہیں اس کی تربیت و اعانت سے بنی اسرائیل زور نہ پکڑ جائیں اس لیے انہیں خوفزدہ اور عاجز کرنے کے لیے اپنی زور و قوت کے نشہ میں پھر اسی پرانی اسکیم پر عمل کرانے کی ٹھہرائی۔ بنی اسرائیل اس سفاکانہ تجویز کو سن کر طبعی طور پر پریشان اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن

متقین کے لیے ہے۔[1]

فرعون کی یہ بات سنتے ہی بلاشبہ بنی اسرائیل کے ہوش اُڑ گئے ہوں گے اس کے کہنے کا انداز بھی بڑا ہی مکروہ تھا۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ فرعون نے جب اعیانِ حکومت سے کہا سنقتل ابناءھم و نستحی نساءھم و انا فوقھم قاھرون۔ تو بنی اسرائیل نے اس سے مستقبل میں حالات کی سنگینی کی بُو سونگھ لی۔ اور حالات کے آئینے میں وہ مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگے۔ ماضی میں فرعون کے جبرو استبداد نے بنی اسرائیل کی ہمتیں سلب کر دی تھیں۔ اب اس نئے ظالمانہ قانون نے ان کو مستقبل کے بارے میں بالکل مایوس کر دیا۔ ان ہی پیش پا افتادہ حالات کے تحت حضرت موسیٰ نے ان سے کہا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھو۔ اللہ نے جو منصب تم کو عطا کیا ہے وہ بہت عظیم ہے۔ یہ منصب امامت ہے۔ حضرت موسیٰ نے اس منصب کے مناسب تمام دوسری باتوں سے بنی اسرائیل کو جس بات پر متنبہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ یہ کوئی پھولوں کا بستر نہیں ہے جس پر آپ حضرات کو لٹایا جا رہا ہے۔ یہ تو ایک عظیم الشان اور پُرخطر خدمت ہے جس کا بار اُٹھانے کے ساتھ ہی تم پر ہر قسم کے مصائب کی بارش ہو گی۔ سخت آزمائشوں میں ڈالے جاؤ گے۔ طرح طرح کے نقصانات اٹھانے پڑیں گے اور جب صبر و ثبات اور عزم و استقلال کے ساتھ ان تمام مشکلات کا مقابلہ کرتے ہوئے خدا کی راہ میں آگے بڑھتے جاؤ گے تب تم پر عنایات کی بارش ہو گی۔ اس بھاری خدمت کا بوجھ اٹھانے کے لیے جس طاقت کی ضرورت ہے وہ تمہیں دو چیزوں سے حاصل ہو گی ایک یہ استعانت باللہ سے اپنے آپ کو مضبوط کرو۔ یعنی اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو۔ اس سے مراد نماز ہے کیونکہ نماز ہی نبوت کے مشن میں اللہ سے استعانت کا اوّلین شاہکار ہے۔ دوسرے یہ کہ صبر کی صفت اپنے اندر پیدا کرو۔ یہ دونوں وہ کلید کامیابی ہیں جس کے بغیر کوئی شخص کسی مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتا۔ نبوت کی زندگی میں ایمان باللہ ایمان بالیوم اور ایمان بالرسالۃ کے بعد سب سے اہم چیز استعانت باللہ اور استعانت بالصبر ہے۔

استعانت باللہ

استعانت باللہ کا مقصود اللہ سبحانہ سے پرستش کے تعلقات کو استوار کرنا ہے۔ اس سے مراد

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دہشت زدہ ہوتے ہوں گے اس کا علاج موسیٰ علیہ السلام نے آئندہ آیت میں بتایا[1] گویا فرعون نے ان کو اطمینان دلایا کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے وہ ہمارے پنجہ اقتدار میں پوری طرح کسے ہوئے ہیں۔ ہماری گرفت سے باہر نہیں ہیں۔ ہم ان کی اجتماعی اور دفاعی قوت کو ختم کرنے کی تدبیر جانتے ہیں ہم ان کے لڑکوں کو قتل کر دیں گے ان کی لڑکیوں کو زندہ رکھیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا ان پر پورا قابو ہے۔

سورہ بقرہ میں لڑکوں کے قتل اور لڑکیوں کے زندہ رکھنے کی فرعون کی سفاکانہ تجویز کا ذکر ہو چکا ہے۔ اب یہاں پھر اسی تجویز کا ذکر ہو رہا ہے۔ دراصل حضرت موسیٰ کے دو دوروں کا ذکر ہے ایک دور فرعونی استبداد کا حضرت موسیٰ کی تشریف آوری سے پہلے ہے اور دوسرا دور حضرت موسیٰ کی تشریف آوری کے بعد ہے۔ پہلا دور رعمسیس ثانی کا ہے اور دوسرا دور اس کے بیٹے منفتاح کا ہے۔ دونوں میں یہ بات مشترک ہے کہ لڑکوں کو قتل کرو اور لڑکیوں کو زندہ رکھو۔ یہ اسکیم اس لیے اختیار کی گئی کہ بنی اسرائیل کی تعداد ملک میں اتنی زیادہ نہ ہو جائے کہ وہ فرعونی اقتدار کے لیے خطرہ بن جائے اور تاکہ بتدریج ان کی نسل کا خاتمہ ہو جائے اور یہ قوم دوسری قوموں میں گم ہو کر رہ جائے۔ فرعون یہاں بتانا چاہتا ہے کہ اطمینان رکھو کہ ہم ان کو کسی صورت میں اپنے لیے خطرہ نہیں بننے دیں گے ضرورت محسوس ہوئی تو ہم اس سکیم کو پوری شدت سے چلائیں گے۔ سید رشید رضا نے اس کتبہ کا حوالہ دیا ہے جس میں بھی حضرت موسیٰ کے زمانہ کا فرعون جس کا نام منفتاح ہے اپنے کارناموں کا ذکر کرنے کے بعد لکھتا ہے و الملک الاسرائیلیون فلا بذر لھم، اور بنی اسرائیل مٹ گئے ان کا بیج تک نہیں رہا۔

اہلِ ایمان کے لیے فلاحِ دُنیا کی لازمی شرط

۱۵۲- حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا کہ اللہ سے مدد مانگو اور ڈٹے رہو بلا شبہ زمین کا مالک اللہ ہے اور اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے اور انجام ان ہی کے لیے ہے جو متقی ہیں۔ یعنی گھبرانے کی کوئی بات نہیں ہے اللہ کے سامنے کسی کا زور نہیں چلتا ملک اسی کا ہے جس کو مناسب جانے عطا فرمائے لہٰذا ظالم کے مقابلے میں اسی سے مدد مانگو اسی پر نظر رکھو اسی سے ڈرو صبر و تقویٰ کی راہ اختیار کرو اور یقین رکھو کہ آخری کامیابی صرف

[1] افادات شیخ الاسلام

دُعا و نماز ہے۔ گیارہویں پارے میں اقیموا الصلوٰۃ کی تصریح آئی ہے۔ صلاۃ کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ کے حضور اپنی غلامانہ اور خادمانہ حیثیت کو ظاہر کیا جائے بالفاظِ دیگر صلاۃ نام ہے اللہ کی طرف ہمہ تن متوجہ ہو جانے کا۔ خود حضرت موسیٰ کو کوہ طور پر بتایا گیا تھا کہ اقیم الصلاۃ لذکری۔ اور یہی بات بنی اسرائیل سے کہی گئی تھی۔

والذین یمسکون بالکتاب واقاموا الصلوٰۃ انا لانضیع اجر المصلحین۔

اور بنی اسرائیل میں سے جو لوگ کتاب اللہ کو مضبوط پکڑے ہوتے ہیں اور نماز میں سرگرم ہیں تو ان کے لیے کوئی کھٹکا نہیں ہم کبھی مصلحین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔

اور نماز ہی کے بارے میں یہ بات بھی بنی اسرائیل سے کہی گئی تھی۔

لئن اقمتم الصلاۃ و اتیتم الزکوٰۃ و اٰمنتم برسلی وعزرتموھم واقرضتم اللہ قرضا حسنا لاکفرن عنکم سیاتکم ولادخلنکم جنات تجری من تحتها الانهار۔

اگر تم نے نماز قائم رکھی اور زکوٰۃ دی اور میرے رسولوں کو مانا اور ان کی مدد کی اور اپنے خدا کو اچھا قرض دیتے رہے تو یقین رکھو میں تمہاری برائیاں تمہارے سے دُور کر دوں گا۔

قرآن میں اس آیت استعینوا باللہ واصبروا کو اس آیت کے ساتھ پڑھیے۔ واستعینوا بالصبر والصلاۃ، دونوں ہی حکم بنی اسرائیل کو دیے گئے ہیں۔ دونوں کو ملا کر پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ دونوں میں ایک ہی بات کہی گئی ہے۔ صرف الفاظ کا فرق ہے اور فرق یہ ہے کہ پہلی آیت میں جس جگہ اللہ کا لفظ ہے دوسری آیت میں صلوٰۃ کا لفظ ہے۔ جو لوگ اس حقیقت سے واقف ہیں کہ قرآن محض الفاظ اور اسالیب کے ہلکے سے تغیر کے ذریعے بڑے بڑے اہم نکات حکمت بیان کر جاتا ہے وہ لفظوں کے اس اختلاف کو بلا وجہ قرار نہیں دے سکتے۔ وہ محسوس کریں گے کہ اس اختلاف میں حکمت صرف یہ ہے کہ نماز اللہ کی قربت اور معیت کا نام ہے اور یہی اللہ سے استعانت کا ذریعہ ہے۔ یہ آیت بتلاتی ہے کہ ان آلام و مصائب کا مقابلہ جن سے خدا پرستی اور طاعت واشاعتِ حق کے دلدادوں کا دوچار ہونا سنتِ الٰہی کے مطابق بہرحال ضروری ہے۔ صرف صبر اور نماز سے کیا جا سکتا ہے۔ صبر دراصل کوئی مستقل بالذات چیز نہیں بلکہ دراصل وہ نماز ہی کا فیضان ہے اس لیے عملاً استقامت علی الحق کا دارومدار صرف نماز پر آن ٹھہرتا ہے۔

یہ طاقت نماز میں کہاں سے اور کیوں کر آتی ہے؟ اس کا جواب اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے کہ جب نماز اللہ کی معیت کا نام ہے تو ظاہر ہے کہ جس کے ساتھ اللہ ہو اسے زیر کرنے کی راہ افکار و مصائب کیسے پا سکتے ہیں۔ اللہ کی معیت کے تو معنے ہی یہ ہیں کہ دل سکون و طمانیت سے مالامال ہو اور خوف و حزن کا دور تک نام و نشان نہ ہو۔ اس لیے استعانت باللہ دراصل استعانت بالصلوٰۃ ہی ہے۔ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو استعانت باللہ کے پیچھے دوسری بات جس کی تلقین کی وہ صبر ہے۔ صبر کے معنے لغت میں تین آتے ہیں۔ رکنا، ڈٹنا اور سہنا۔ رکنا یہ کہ نبوت جو نظام لے کر آئی ہے اپنی پوری زندگی میں اس کی خلاف ورزی سے رک کر رہے، محرمات سے رکے اور ان تمام احوال، اقوال اور افعال سے رکے جو نبوت کے مشن سے دور لے جاتے ہوں۔ اور ڈٹنا یہ کہ نبوت نے جو فرائض، واجبات، عبادات اور شعائر کا نقشہ پیش کیا ہے ان پر پوری زندگی کاربند رہے۔ اور سہنا یہ کہ نبوت کے نظام کو اپنانے، اسے پیش کرنے اور قائم کرنے کی راہ میں جو تکالیف اور مصائب آئیں ان کو خندہ پیشانی سے برداشت کرے۔ جیسے یہاں جب حضرت موسیٰ کے ساتھی حضرت موسیٰ پر ایمان لائے اور فرعونی اقتدار نے ان پر عرصہ حیات تنگ کیا تو حضرت موسیٰ نے ان سے فرمایا استعینوا باللہ واصبروا۔ حتیٰ کہ جب فرعونی مظالم کے آہنی پنجہ سے انہیں نجات ملتی ہے تو وہ بھی اسی صبر کے طفیل ملتی ہے ارشاد ہے:

وتمت کلمۃ ربک الحسنی علی بنی اسرائیل بما صبروا

صبر و استقامت کی ان سعادت بخشیوں کو صرف اسی دنیا کی زندگی تک محدود نہیں رکھا گیا۔ بلکہ آخرت کی حقیقی زندگی اور ابدی زندگی میں بھی خوش بخت وہی ہوں گے جو اپنے سابقہ صبر کا توشہ لے کر حاضر ہوتے ہوں۔ چنانچہ حق تعالیٰ نیکوکاروں کو اپنی مغفرت اور رحمت کا انعام عطا کرتے ہوئے فرمائے گا۔

انی جزیتھم الیوم بما صبروا

اور اس بخشش اور بنائے بخشش کا اعلان کچھ اسی دن یکایک نہیں ہوگا بلکہ اس کی اطلاع ہمیں یہاں دی جا چکی ہے اولئک یجزون الغرفۃ بما صبروا۔

نبوت کے لائے ہوئے نظام حیات میں صبر کو یہ غیر معمولی اہمیت کیوں حاصل ہے۔ آئیے اسے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ استعانت باللہ تو ایک مثبت حقیقت ہے۔ اس کی ایمانی نوعیت اس کی غیر معمولی عظمت کی دلیل ہے۔ لیکن صبر کچھ کرنے یا ہونے کا نام نہیں بلکہ کچھ نہ ہونے

یا نذ کرنے کا نام ہے اس کے باوجود اس کی بھی منفی حقیقت اپنے اندر ایک شان امتیاز بھی رکھتی ہے جو کسی اور میں نہیں پائی جاتی۔ استعانت باللہ ایسی چیز ہے جس میں غلط بیانی اور فریب کاری سے کام لیا جا سکتا ہے مگر صبر کے اندر اس کا کوئی امکان نہیں ہے۔ استعانت اور اس کے مظاہر نماز، دعا وغیرہ بناتے حق تو ضرور ہیں مگر ان کا اظہار نمائشی اور ریاکارانہ بھی ہو سکتا ہے مگر صبر کا مظاہرہ نمائشی نہیں ہو سکتا۔ پھر صرف اتنی بات نہیں کہ صبر کا کھوٹا سکہ چلایا نہیں جا سکتا بلکہ استعانت باللہ کا کھرا پن بھی اس سے معلوم ہوتا ہے۔

صبر کے مقامات

یوں تو دنیا کا کوئی کام اور مقصد نہیں جو بغیر کسی جدوجہد کے محض زبانی دعووں سے پورا ہو جاتے مگر وہ مقصد جو اپنی عظمت میں آپ اپنی نظیر ہو اس کے لیے سعی و جہد کی کوئی معمولی مقدار کافی نہیں ہے۔ اللہ پر ایمان، اس کی بندگی، اس کے دین کی پیروی اور پھر اسے دنیا میں بپا کرنے کا مقصد وہ مقصد ہے جس کے لیے بڑی ہی پختہ عزیمت کی ضرورت ہے۔ حضرت موسیٰ فرعون کے مقابلہ میں یہی مقصد لے کر آئے ہیں۔ اس کی راہ میں مشکلات، مصائب اور رکاوٹوں کا ہونا یقینی ہے حضرت موسیٰ نے اسی کی طرف یہاں استعینوا باللہ واصبروا فرما کر اجمالی اشارہ کیا ہے اور دوسرے موقعہ پر حضرت موسیٰ نے یہی بات کھول کر سمجھائی ہے۔

ان كنتم امنتم بالله فعليه توكلوا ان كنتم مسلمين

اگر تم فی الواقع فرعون کے مقابلہ میں اللہ پر ایمان لے آئے اور اس کی فرمانبرداری کرنا چاہتے ہو تو فرعون کی طاقت سے نہ ڈرو اللہ پر بھروسہ کرو۔

اس راہ میں عوام فریب، پروپیگنڈا، طنز وافترا، جان ومال کا نقصان اور محبوب رجحانات کی قربانی سے سب کو دو چار ہونا پڑتا ہے۔ تمہیں بھی اس میدان سے گزرنا ہوگا۔ جو مقصد حضرت موسیٰ لے کر آئے ہیں وہ اتنا عظیم ہے جس کی راہ میں دور دور تک بھاری چٹانوں، گہرے غاروں، سنگلاخ وادیوں کے سوا اور کچھ نظر نہیں آتا۔ کسی اور چیز کا نام لیجئے ایک طرف سے مخالفت کی ہمت شکن صدا بلند ہوگی تو تین طرف سے حوصلہ افزائی کی آوازیں بھی آئیں گی۔ مگر استبداد کے مقابلہ میں نبوت کے علم وعمل اور اس کے نظام حیات کا نام لیجئے تو دیکھ لیجئے ہر طرف سے مشکلوں اور مخالفتوں کا طوفان آپ کا استقبال کرے گا۔ کہیں نفس کی لذت کہیں

شہرت کی ہوس، کہیں خاندان کی حمایت، کہیں قوم کی عقیدت اور کہیں وطن کی محبت آپ کے راستہ میں سنگ گراں بن کر آجاتے گی۔ وطن کی زمین آپ کے لیے تنگ ہو جاتے گی۔ قوم غداری کے القاب سے آپ کو نوازے گی۔ ملت طعنوں اور افترا پردازیوں سے آپ کا استقبال کرے گی خاندان آپ کو برداشت کرنے سے انکار کر دے گا۔ یہی حالات فرعون کے استبداد میں بنی اسرائیل کو یہ تلقین کر رہے ہیں استعینوا باللہ واصبروا۔ مطلب یہ ہے فرعون کی اس دھمکی سنقتل ابناءھم سے پریشان نہ ہو۔ اللہ سے عابدانہ تعلقات کو استوار کرو اور صبر کا دامن ہاتھ سے نہ دو۔ فتنوں اور آزمائشوں کی منزل صبر و استقامت ہی سے سر ہوتی ہے۔ یہ کام اللہ کی مدد کے بغیر ممکن نہیں ہے۔

بنی اسرائیل کی شکایت

۱۵۳۔ انہوں نے کہا تمہارے آنے سے پہلے بھی ہمیں ستایا گیا ہے اور اب تمہارے آنے کے بعد ہمیں ستایا جا رہا ہے۔ یعنی ہم تو ہمیشہ مصیبت میں رہے۔ تمہاری تشریف آوری سے قبل ہم سے ذلیل بیگار لی جاتی تھی اور ہمارے لڑکے قتل کیے جاتے تھے۔ تمہارے آنے کے بعد طرح طرح کی سختیاں کی جا رہی ہیں اور قتل ابناء کے مشورے ہو رہے ہیں۔ دیکھئے ہماری مصیبتوں کا کب خاتمہ ہو۔[۱]

محکومانہ زندگی کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ عزم و ہمت کی روح پژمردہ ہو جاتی ہے۔ لوگ غلامی کی ذلت آمیز امن پر قانع ہو جاتے ہیں اور طلب و سعی کی مشکلوں سے جی چرانے لگتے ہیں۔ یہی حال بنی اسرائیل کا ہوا تھا۔ عرصہ تک مصریوں کی غلامی میں رہتے رہتے اس درجہ مسخ ہو گئے تھے کہ ان کی سمجھ میں نہ آتا تھا، آزادی و کامرانی کی طلب میں ان حقیر راحتوں سے کیوں ہاتھ دھو بیٹھیں جو غلامی کی حالت میں میسر آ رہی ہیں۔ حضرت موسیٰ نے جب صبر و استقامت کی تلقین کی تو شکر گزار ہونے کی جگہ الٹی شکایت کرنے لگے وہ ان کی نجات اور کامرانی کے لیے فرعون کا مقابلہ کر رہے تھے۔ انہیں شکایت تھی کہ تمہاری اس جد و جہد نے فرعون کو اور زیادہ ہمارا مخالف بنا دیا۔ تم فائدہ پہنچانے کی جگہ الٹے وبال جان ہو گئے۔[۲] مطلب یہ ہے کہ جب حالات و واقعات

---

[۱] افادات شیخ الاسلام [۲] ترجمان القرآن

یہ ہیں جو پیش ہو رہے ہیں، پیش آرہے ہیں تو تمہارے ان وعدوں اور تمہاری ان طفل تسلیوں پر وقت کون گزار سکتا ہے تم تو ہمارے لیے رحمت کے بجائے زحمت ہی زحمت بنتے جارہے ہو۔ توراۃ میں اس دور بنی اسرائیل کے مصائب کا جو نقشہ پیش کیا گیا ہے وہ بھی گوش گزار فرما لیجئے۔

اسی دن فرعون نے بیگار لینے والوں اور سرداروں کو جو لوگوں پر تھے حکم دیا کہ اب آئندہ ان لوگوں کو اینٹیں بنانے کے لیے بھس نہ دینا جیسے اب تک دیتے رہے ہو وہ خود ہی اپنے لیے بھس مہیا کریں۔ اور ان سے اتنی ہی اینٹیں بنوانا جتنی وہ اب تک بناتے آتے ہیں۔ تم اس میں سے کچھ نہ گھٹانا کیونکہ وہ کاہل ہو گئے ہیں۔ اس لیے چلا چلا کر کہتے ہیں کہ ہم کو جانے دو کہ ہم اپنے خدا کے لیے قربانی کریں۔ لہٰذا ان سے زیادہ سخت محنت لی جائے تاکہ کام میں مشغول رہیں اور جھوٹی باتوں سے دل نہ لگائیں۔ تب بیگار لینے والوں اور سرداروں نے جو لوگوں پر تھے جا کر ان سے کہا کہ فرعون کہتا ہے میں تم کو بھس نہیں دوں گا۔ تم خود ہی جاکر اور جہاں کہیں بھس ملے وہاں سے لاؤ کیونکہ تمہارا کام کچھ بھی گھٹایا نہیں جائے گا۔ چنانچہ وہ تمام لوگ ملک مصر میں مارے مارے پھرنے لگے کہ بھس کے عوض کھونٹی جمع کریں۔ اور بیگار لینے والے یہ کہہ کر جلدی کراتے تھے کہ تم اپنا روز کا کام جیسے بھس لے کر کرتے تھے اب بھی کرو۔

(خروج فصل پنجم)

اس طرح عذاب کی وہ سنگینی جو پہلے ہی زیادہ تھی حضرت موسیٰ کی تشریف آوری کے بعد اس میں اور اضافہ ہو گیا۔

حکومت کے حصول کا طریق

۱۵۴- زمین اللہ کی ہے اپنے بندوں میں سے جسے چاہتا ہے وارث بناتا ہے اور آخری کامیابی ان کے لیے جو متقی ہیں۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا خدا جسے چاہتا ہے زمین کا وارث بنا دیتا ہے۔ بس اس سے مدد مانگو اور اسی راہ میں جمے رہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو جماعت دنیوی بے سروسامانی سے ہراساں ہو کر بے ہمت نہیں ہوتی بلکہ خدا کی مدد پر بھروسہ کرتی اور مشکلات و موانع کے مقابلے میں جمی رہتی ہے وہی ملک کی وارثت کی مستحق ہوتی ہے یعنی استعانت باللہ اور صبر اس راہ میں اصل الاصول ہے۔

یہ فرعون کے اس غرور کا جواب ہے جو اس نے انا فوقھم قاھرون کے الفاظ سے ظاہر کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اپنے منہ سے اپنے متعلق جو چاہے کرسی کے مضبوط ہونے کا دعویٰ کرے لیکن اقتدار کا اصل مالک تو اللہ ہے وہی اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے اس کا وارث بناتا ہے۔ آخر میں فرمایا والعاقبۃ للمتقین یعنی جو جماعت برائیوں سے بچنے والی اور عمل میں پکی ہوگی بالآخر کامیابی اسی کے لیے ہے۔ جو برائیوں سے بچتا ہے یعنی خدا کا مقررہ قانون یہ ہے کہ زمین کے وارث متقی ہوتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جماعتوں اور قوموں کے لیے یہ قانون الٰہی ہے کہ ان ہی لوگوں کے حصہ میں ملک کی فرماں روائی آتی ہے جو متقی ہوتے ہیں۔ متقی وقایہ سے بنا ہے وقایہ کے معنے بچنے کے ہیں متقی وہ لوگ ہیں جو برائیوں سے بچتے ہوں۔ ان کے دامن پر فساد کے داغ نہ ہوں خود سنورے ہوئے ہوں اور دوسروں کو سنوارنے کا جذبہ رکھتے ہوں لہٰذا قانون یہ ہوا کہ زمین کی وراثت برائیوں سے بچنے والوں کی وراثت میں آتی ہے ان کی وراثت میں نہیں آتی جو فکر و عمل کی برائیوں میں مبتلا ہوں اور سنوارنے کی جگہ بگاڑنے والے ہوں۔

قرآن نے زمین کی وراثت کی ترکیب جا بجا استعمال کی ہے۔ یہ ترکیب صورت حال کی کتنی سچی اور قطعی تعبیر ہے۔ حکومتوں میں ایک طرح کی بدلتی ہوئی میراث کا سلسلہ برابر جاری ہے یعنی ایک فرد ایک گروہ طاقت و اقتدار حاصل کرتا ہے پھر وہ چلا جاتا ہے اور دوسرا گروہ اس کی ساری چیزوں، اس کی حکومت کا وارث ہو جاتا ہے۔ حکومتیں کیا ہیں؟ محض ایک ورثہ ہیں جو ایک گروہ سے نکلتا ہے اور دوسرے کے حصہ میں آجاتا ہے۔ اگر کوئی ملک سامنے رکھو اور جس وقت سے اس کی تاریخ روشنی میں آئی ہے اس کے حالات کی جستجو کرو اس کی پوری تاریخ اس حقیقت کے سوا کچھ نہیں کہ وارث و میراث کی ایک مسلسل داستان ہے۔ ایک قوم قابض ہوئی پھر مٹ گئی۔ دوسری اس کی وارث ہوگئی پھر وہ بھی مٹی، تیسری وارث ہوگئی، سلسلہ جاری رہتا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ زمین کی وراثت تمہیں ملے گی بشرطیکہ تم متقی ہو۔ اس کے قانون کو نافذ کرو۔ صورت حال وہ نہیں ہے جو تمہارے اور فرعون کے خیال میں ہے کہ طاقتور طاقتور ہی رہے گا اور کمزور کمزور۔

حضرت موسیٰ کی بنی اسرائیل کو تسلی

۱۵۵۔ موسیٰ نے کہا قریب ہے کہ تمہارا پروردگار تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے اور ملک

تمہیں اس کا جانشین بنا دے پھر وہ دیکھے کہ تمہارے کام کیسے ہیں۔ حضرت موسیٰ نے تسلی دی کہ زیادہ مت گھبراؤ خدا کی مدد قریب آگئی ہے تم دیکھ لوگے کہ تمہارا دشمن ہلاک کردیا جاتے گا اور تمہیں ان کے اموال و املاک کا مالک بنا دیا جاتے گا تاکہ جس طرح آج سختی و غلامی میں تمہارا امتحان ہو رہا ہے اس وقت خوشحالی اور آزادی دے کر آزمایا جاتے کہ کہاں تک اس کی نعمتوں کی قدر اور احسانات کی شکر گزاری کرتے ہو۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ یہ کلام مسلمانوں کے سنانے کو فرمایا ہے یہ سورت مکی ہے اس وقت مسلمان بھی ایسے ہی مظلوم تھے۔ گفتہ آید در حدیث دیگراں کے رنگ میں یہ بشارت ان کو سنائی ہے[1]

اس آیت میں حضرت موسیٰ کی تین باتیں اللہ سبحانہٗ نے نقل فرمائی ہیں۔ اول یہ کہ عسی ربکم ان یہلک عدوکم اللہ سبحانہٗ تمہارے دشمن کو ہلاک کرے گا۔ بنی اسرائیل نے پیش پا افتادہ حالات کے تحت جس مایوسی اور بے دلی کو ظاہر کیا تھا اسے دور کرنے کے لیے حضرت موسیٰ نے ان کو پھر تسلی دی کہ مایوسی اور دل برداشتہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اللہ تمہارے دشمنوں کو ضرور ہلاک کرے گا۔ آیت میں دشمن کی ہلاکت کو توقع سے پیش کیا ہے یعنی یہ فرمایا ہے کہ توقع اور امید ہے کہ تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے۔ یہ نہیں فرمایا کہ یقیناً تمہارا رب تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے گا۔ یعنی عربی میں اندازِ تعبیر عسی ربکم الخ اختیار فرمایا یہ نہیں فرمایا ان ربکم یہلک عدوکم اس کی دو وجہ ہیں۔ ایک یہ کہ یہ انداز اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ بے عملی کا شکار نہ ہو جائیں اور اس راہ میں جس قدر محنت و ریاضت کی ضرورت ہے وعدہ پر اعتماد کرکے اس سے غافل نہ ہو جائیں۔ دوسرے اس لیے کہ مدتوں کی غلامی میں رہ کر مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے دیکھنے کے عادی ہو چکے ہیں۔ اور فرعون کی قوت و عظمت سے حد درجہ مرعوب ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ حتمی وعدے کو سن کر حالات کے تحت تکذیب کر دیں۔ تورات سے بھی اس وعدے کی تائید ہوتی ہے۔

تب موسیٰ خداوند کے پاس گیا اور کہا اے خداوند تو نے ان لوگوں کو کیوں دکھ میں ڈالا اور مجھے کیوں بھیجا۔ کیونکہ جب سے فرعون کے پاس میں تیرے نام کی باتیں کرنے گیا اس نے ان لوگوں سے برائی ہی برائی کی اور تو نے اپنے لوگوں کو ذرا بھی رہائی نہ بخشی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تورات خروج کے باب ششم کے آغاز میں ہے :

تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اب تو دیکھے گا کہ میں فرعون کے ساتھ کیا کرتا ہوں۔ تب وہ زور آور ہاتھ کے سبب سے ان کو جانے دے گا اور زور آور ہاتھ کے سبب ہی سے وہ ان کو اپنے ملک سے نکال دے گا۔ پھر خدا نے موسیٰ سے کہا میں خداوند ہوں۔ اور میں ابراہام و اسحاق اور یعقوب کو خدائے قادرِ مطلق کے طور پر دکھائی دیا لیکن اپنے یہوواہ نام سے ان پر ظاہر نہ ہوا۔ اور میں نے ان کے ساتھ اپنا عہد بھی باندھا ہے کہ ملک کنعان جو ان کی مسافرت کا ملک تھا اور جس میں وہ پردیسی تھے ان کو دوں گا اور میں نے بنی اسرائیل کے کراہنے کو بھی سن کر جن کو مصریوں نے غلامی میں رکھ چھوڑا ہے اپنے اس عہد کو یاد کیا ہے سو تو بنی اسرائیل کو کہہ کہ میں خداوند ہوں اور میں تم کو مصریوں کے بوجھ کے نیچے سے نکال لوں گا اور میں تم کو ان کی غلامی سے آزاد کروں گا اور میں ہاتھ بڑھا کر اور ان کو بڑی بڑی سزائیں دے کر تم کو رہائی دوں گا اور میں تم کو لے لوں گا۔ میری قوم بن جاؤ اور میں تمہارا خدا ہوں گا اور تم جان لوگے کہ میں تمہارا خداوند خدا ہوں۔ جو تم کو مصریوں کے بوجھوں کے تلے سے نکالتا ہوں اور جس ملک کو ابراہام اسحاق اور یعقوب کو دینے کی قسم کھائی تھی۔ اس میں تم کو پہنچا کر اسے تمہاری میراث دوں گا۔ خداوند میں ہوں۔ (خروج باب ششم)

دوسری بات حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل سے یہ فرمائی و یستخلفکم فی الارض ملک میں اللہ تم کو حکومت عطا فرماتے گا۔ یہاں ملک سے سرزمینِ مصر نہیں بلکہ سرزمین کنعان و فلسطین مراد ہے۔ فرعون کی سلطنت کی جغرافیائی حدود شام سے لے کر لیبیا تک اور بحرِ روم کے سواحل سے لے کر حبشہ تک پھیلی ہوئی تھیں۔ حضرت موسیٰ کی مہم یہ تھی کہ شام و فلسطین کو فرعون کے جبر و استبداد سے آزاد کرایا جائے۔ یہاں اس آیت میں فلسطین و کنعان ہی کی حکومت مراد ہے جیسا کہ اس پر انشاء اللہ تبصرہ آنے والے رکوع میں کریں گے۔ قرآن کی اس آیت سے ایک عظیم حقیقت کا انکشاف ہو رہا ہے اور وہ یہ کہ انبیاء علیہم السلام جس مشن پر مامور ہوتے تھے وہ اپنی آخری عملی صورت کے لحاظ سے ایک دینی اور اسلامی ریاست کا قیام ہی ہوتا تھا کیونکہ اقتدار کے بغیر اسلام اسلام نہیں رہ جاتا اور اللہ کے دین پر پورا عمل نہیں ہو سکتا۔ یہ دوسری بات ہے کہ انبیاء میں سے بہتوں کے ساتھ حالات نے سازگاری نہ کی ہو۔ اور اس لیے ان کی دعوتی جدوجہد کے نتائج اس حدِ کمال کو نہ پہنچ سکے ہوں۔ لیکن ظاہر ہے کہ

کسی دعوت کا اس حدِ کمال تک نہ پہنچنا اور بات ہے اور اس چیز کا حدِ کمال نہ ہونا بالکل دوسری بات ہے۔ انبیائی دعوتوں کی جو تاریخ ہمارے سامنے موجود ہے اس میں اس بات کا تذکرہ تو ضرور ملتا ہے کہ ان میں سے اکثر اپنا سیاسی نظام قائم نہ کر سکے مگر اس بات کا ثبوت نہیں ملتا کہ وہ ایسا چاہتے بھی نہ تھے۔ بلاشبہ ہر نبی کی دعوت کا اساسی کلمہ لا الٰہ الا اللہ ہی تھا لا حاکم الا اللہ نہیں تھا مگر اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ لا الٰہ الا اللہ کے مفہوم میں لا حاکم الا اللہ بھی شامل ہے۔ اور الوہیت کا ایک جزو حاکمیت بھی ہے یعنی یہ بات کہ اللہ کے سوا کوئی الٰہ نہیں، یہ معنے بھی رکھتا ہے کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ الٰہ کو صرف حاکم سمجھنا ضرور غلط ہے مگر اس سے زیادہ غلط بات یہ ہے کہ الٰہ کے اصل مفہوم میں حاکمیت کا تصور بھی نہ مانا جاتے۔

مشہور مترجم قرآن شاہ عبدالقادر نے الٰہ کے معنے میں دونوں کی رعایت کی ہے انہوں نے مالکم من الٰہ غیرہ کا ترجمہ سورہ اعراف میں صاحب سے اور سورہ ہود میں اگر حاکم سے کیا تو قصہ ابراہیم میں ا انت فعلت هذا با لهتنا یا ابراهیم میں الٰہ کے معنے ٹھاکر کے کیے ہیں۔ بہر حال اس آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت موسیٰ جس مشن پہ مامور ہو کر آتے تھے اس کی آخری عملی شکل ایک اسلامی ریاست کا قیام تھا۔

تیسری بات یہ فرمائی ینظر کیف تعملون اس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی قوم کو عروج و ترقی عطا فرماتا ہے تو صرف یہ دیکھنے کے لیے دیتا ہے کہ اقتدار کی وراثت پاکر یہ قوم کیا رویہ اختیار کرتی ہے۔ فساد برپا کرتی ہے یا ملک میں صلاح کی راہ اختیار کرتی ہے یہ حکومت پرچہ امتحان ہوتا ہے اس کے ذریعے اعمال کی جانچ کی جاتی ہے۔

وَلَقَدْ اَخَذْنَآ اٰلَ فِرْعَوْنَ بِالسِّنِيْنَ وَنَقْصٍ مِّنَ الثَّمَرٰتِ
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُوْنَ ﴿١٣٠﴾ فَاِذَا جَآءَتْهُمُ الْحَسَنَةُ قَالُوْا لَنَا هٰذِهٖ ۚ وَاِنْ
تُصِبْهُمْ سَيِّئَةٌ يَّطَّيَّرُوْا بِمُوْسٰى وَمَنْ مَّعَهٗ ۗ اَلَآ اِنَّمَا طٰٓئِرُهُمْ
عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿١٣١﴾ وَقَالُوْا مَهْمَا تَاْتِنَا
بِهٖ مِنْ اٰيَةٍ لِّتَسْحَرَنَا بِهَا ۙ فَمَا نَحْنُ لَكَ بِمُؤْمِنِيْنَ ﴿١٣٢﴾ فَاَرْسَلْنَا
عَلَيْهِمُ الطُّوْفَانَ وَالْجَرَادَ وَالْقُمَّلَ وَالضَّفَادِعَ وَالدَّمَ اٰيٰتٍ
مُّفَصَّلٰتٍ ۫ فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ﴿١٣٣﴾ وَلَمَّا وَقَعَ
عَلَيْهِمُ الرِّجْزُ قَالُوْا يٰمُوْسَى ادْعُ لَنَا رَبَّكَ بِمَا عَهِدَ عِنْدَكَ ۚ لَئِنْ
كَشَفْتَ عَنَّا الرِّجْزَ لَنُؤْمِنَنَّ لَكَ وَلَنُرْسِلَنَّ مَعَكَ بَنِيْٓ
اِسْرَآءِيْلَ ﴿١٣٤﴾ فَلَمَّا كَشَفْنَا عَنْهُمُ الرِّجْزَ اِلٰٓى اَجَلٍ هُمْ بٰلِغُوْهُ
اِذَا هُمْ يَنْكُثُوْنَ ﴿١٣٥﴾ فَانْتَقَمْنَا مِنْهُمْ فَاَغْرَقْنٰهُمْ فِي الْيَمِّ بِاَنَّهُمْ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا وَكَانُوْا عَنْهَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٣٦﴾

اور بلاشبہ یقیناً ہم نے فرعونیوں کو خشک سالی کے برسوں اور پیداوار کے نقصان میں مبتلا کیا تھا تاکہ وہ متنبہ ہوں[۱۵۶]۔ بس جب کبھی ایسا ہوتا کہ اُن پر خوشحالی آتی تو کہتے یہ ہماری وجہ سے ہے اور اگر ایسا ہوتا کہ سختی پیش آتی تو کہتے یہ موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست ہے سُن لو! کہ ان کی نحوست اللہ کے یہاں تھی لیکن بہتوں کو یہ بات معلوم نہیں ہے[۱۵۷]۔ اور فرعونیوں نے کہا اے موسیٰ تو ہم پر جادو چلانے کے لیے کتنی ہی نشانیاں پیش کرے ہم تجھے ماننے والے نہیں ہیں[۱۵۸]۔ لہٰذا ہم نے اُن پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل، اور جوئیں اور مینڈک اور لہو یہ سب جُدا جُدا نشانیاں تھیں ۔ اس پر بھی انھوں نے سرکشی کی اور اُن کا گروہ مجرموں کا گروہ تھا[۱۵۹]۔ اور جب بھی ان پر عذاب کی سختی آتی تو کہنے لگتے اے موسیٰ تیرے پروردگار نے تجھ سے جو عہد کیا ہے تو اُس کے

مطابق ہمارے لیے دُعا کر، اگر تو نے اپنی دُعا سے ہم سے عذاب
ہٹا دیا تو ہم ضرور تیری بات مان لیں گے اور تیرے ساتھ
بنی اسرائیل کو روانہ کر دیں گے۔[۱۶۰] لیکن پھر جب ایسا ہوا کہ ہم نے
ایک خاص وقت تک کے لیے کہ انہیں اس تک پہنچنا تھا
عذاب ٹال دیا تو اچانک وہ اپنی بات سے پھر گئے۔[۱۶۱] بالآخر
ہم نے انہیں سزا دی بس ان کو سمندر میں غرق کر دیا' اس
جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی
اور وہ ان سے غافل تھے۔[۱۶۲]

معانی مفردات

الحسنۃ، خوبی، بھلائی، نیکی، نعمت، ہر وہ نعمت جو انسان کو اس کی جان بدن یا حالات میں حاصل ہو کر اس کے لیے مسرّت کا سبب بنے حسنہ کہلاتی ہے سیئۃ اس کی ضد ہے۔ یہ دونوں اسم جنس ہیں جن کے تحت مختلف انواع داخل ہیں جیسا کہ وان تصبھم حسنۃ یقولوا ھذا من عنداللہ یہاں حسنہ سے مراد فضل کی عمدگی اور فراخی و کامیابی ہے اور وان تصبھم سیئۃ میں سیئۃ سے مراد تنگی اور ناکامی ہے۔ حسن، حسنۃ اور حسنی میں فرق یہ ہے کہ حسن اعیان اور احداث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح حسنہ جب کہ صفت

ہو کر آئے تو دونوں کے لیے بولی جاتی ہے اور اسم ہو کر آئے تو صرف احداث میں استعمال ہوتی ہے۔ اور حسنی کا استعمال صرف احداث میں ہوتا ہے اعیان میں نہیں ہوتا۔ طائرھم ان کی فال بد، ان کا شگون بد، ان کی بُری قسمت، ان کی نحوست، ان کی نامبارکی۔ اصل میں تو طائر کے معنے اڑنے والے ہی کے ہیں چنانچہ طار یطیر طیرانا کا استعمال اسی معنے میں ہوتا ہے مگر عرب جاہلیت کا معمول تھا کہ جب وہ کسی اہم کام کا ارادہ کرتے تو پرندوں کو للکارتے اور ان سے فال لیتے اگر وہ داہنے سے بائیں کو نکل جاتے تو بُرا سمجھتے اور منحوس جانتے۔ اور پھر اس کام کو نہ کرتے چنانچہ اس طرح اس کا استعمال پرندوں سے بُرے شگون لینے کے بارے میں ہونے لگا۔ اور پھر ہر اس شے کے لیے کہ جس سے بدفالی لی جاتے یا اسے منحوس سمجھا جاتے استعمال کرنے لگے۔ غرض عرب چونکہ پرندہ کو شوم و نحوست کی دلیل و علامت سمجھتے تھے اس لیے مدلول کو دلیل کا نام دے کر خود طائر اور طیر کو شوم سے موسوم کر دیا گیا۔ نیز طائر کے معنے حصہ کے بھی ہیں۔ چنانچہ امام رازی ابو عبید سے تفسیر کبیر میں نقل کیا ہے۔ کبھی طائر کا استعمال حصہ اور نصیب کے معنے میں بھی کرتے ہیں۔ خواہ بھلا ہو یا بُرا۔ حتیٰ کہ یہ بیان کیا گیا ہے کہ تطیر اصل ہی لوگوں میں مال کو متفرق کر دینا اور اڑا دینا ہے تاکہ ہر ایک کے لیے اس کا حصہ بھلا ہو یا بُرا اڑ جائے پھر شر میں اس کا استعمال غالب ہو گیا۔

آیتِ ہدایت اور آیتِ ہلاکت

کفار پر نتائج کی حیثیت سے آیاتِ نبوت کی دو قسمیں ہیں آیاتِ ہدایت اور آیاتِ ہلاکت۔ نبوت پہلے کفار کو ہدایت کی نشانیاں دکھاتی ہے اور ان کو حق کی دعوت دیتی ہے۔ کفار کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزاء ہوتے ہیں وہ اس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ وقت آتا ہے جب مادہ فاسد کے علاوہ کفار کی جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہتا یعنی اس کثیف ملبے سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیفہ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور ڈھیر میں پھونس کے سوا کچھ نہیں رہتا تو اس وقت آیتِ ہلاکت آسمان کی بجلی، فضا کی آندھی، زمین کا سیلاب، سمندر کی موجیں بن کر رونما ہوتی ہے اور سطح خاکی کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کو متعدد معجزے عطا ہوتے تھے مگر وہ اس لیے تھے کہ ان کو دکھا

کو فرعون کو حق کی طرف دعوت دی جاتی۔ جب ایک مدت کے بعد اہلِ مصر میں سے جو لوگ ایمان لا سکتے ہیں ہوئے آتے تو حضرت موسیٰ کو شق بحر کی آیتِ ہلاکت عنایت ہوئی۔ یہاں آیت ہلاکت سے پہلے متعدد آیات ہدایت کا ذکر ہوا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرعونیوں کی ہدایت کے لیے کس قدر اہتمام فرمایا ہے۔ یہاں اسی بات کو ظاہر کرنے کے لیے لعلهم یذکرون، فرمایا ہے یعنی یہ آیات ہدایت ہیں۔ آخر میں فانتقمنا منھم میں آیت ہلاکت کو بیان کیا ہے آیتِ ہلاکت اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتی جب تک آیات ہدایت کے ذریعے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی نہیں ہو جاتا۔ حضرت نوح نے ایک طویل زمانے تک اپنی قوم کو دعوت دی اور اس کے بعد ناامید ہو کر انہوں نے آخری معجزہ ہلاکت کی رب لا تذر کہہ کر دعا مانگی۔ حضرت موسیٰ کو جب فرعون سے پوری مایوسی ہو گئی تو انہوں نے دعا کی ربنا اطمس علی اموالھم و اشدد علی قلوبھم فلا یومنوا حتی یروا العذاب الالیم۔

۱۵۶۔ اور بلا شبہ یقیناً ہم نے فرعونیوں کو خشک سالی کے برسوں اور پیداوار کے نقصان میں مبتلا کیا تھا تاکہ وہ متنبہ ہوں۔ گزشتہ آیت میں فرمایا تھا کہ قریب ہے کہ خدا تمہارے دشمن کو ہلاک کر دے۔ یہاں سے اسی اہلاک موعود کے بعض مبادی اور مقدمات کی تفصیل شروع کر گئی ہے یعنی اس سنت اللہ کے موافق جو اسی پارے کے شروع میں آیت وما ارسلنا فی قریۃ من نبی الا اخذنا بالباساء والضراء الخ کے تحت میں گزر چکا۔ خدا تعالیٰ نے فرعونیوں کو ابتدائی تنبیہ کے طور پر قحط و خشک سالی وغیرہ معمولی تکالیف اور سختیوں میں مبتلا کیا تاکہ وہ خوابِ غفلت سے چونکیں اور موسیٰ علیہ السلام کی پیغمبرانہ نصیحتوں کو قبول کریں مگر وہ الٹے کا ہے کو چھتے انہوں نے ان تنبیہات کی کچھ پرواہ نہ کی بلکہ پہلے سے زیادہ ڈھیٹ اور سخت ہو گئے [1]

اصل ارشاد میں لفظ سنین آیا ہے۔ سنت کی جمع ہے۔ اس کے معنے سالوں کے ہیں۔ لیکن امام راغب فرماتے ہیں کہ اس کا بسا اوقات استعمال قحط والے سال کے لیے ہوتا، یہاں سال سے سالہائے قحط مراد ہیں۔ علامہ تقی نے تاج العروس میں تصریح کی ہے کہ یہ اس کے مجازی معنے ہیں۔ اور نقص من الثمرات سے پیداوار کی کمی مراد ہے۔

آخر میں فرمایا ہے لعلھم یذکرون، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کو نصیحت ہو اور ان کو

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

عبرت ہو اور اپنے حالات کو تبدیل کریں ۔

فرعونیوں کا ردِ عمل

۱۵۷۔ پس جب کبھی ایسا ہوتا کہ ان پر خوشحالی آتی تو کہتے یہ ہماری وجہ سے ہے اور اگر ایسا ہوتا کہ سختی پیش آتی تو کہتے یہ موسیٰ اور اس کے ساتھیوں کی نحوست ہے ۔ سن لو کہ ان کی نحوست اللہ کے یہاں تھی لیکن بہتوں کو یہ بات معلوم نہیں ہے ۔ جب ثم بدلنا مکان السیئۃ الحسنۃ کے قاعدہ کے مطابق قحط وغیرہ دور ہو کر ارزانی اور خوشحالی حاصل ہوتی تو کہنے لگتے کہ دیکھو خوش طالعی اور اقبال مندی کے لائق تو یہ حالات ہیں ۔ پھر اگر درمیان میں کبھی کسی ناخوشگواری سے دوچار ہونا پڑ جاتا تو کہتے کہ یہ سب معاذ اللہ موسیٰ اور اس کے رفقاء کی شومی تقدیر اور نحوست ہے ۔ حق تعالیٰ نے اسی کا جواب دیا ہے الا انما طائرھم عند اللہ یعنی بدبختی اور نحوست کو مقبول بندوں کی طرف کیوں نسبت کرتے ہو ۔ تمہاری اس نحوست کا واقعی سبب تو خدا کے علم میں ہے اور وہ تمہارا ظلم و عدوان اور بغاوت و شرارت ہے ۔ اسی سبب کی بنا پر خدا کے یہاں سے کچھ حصہ نحوست کا وقتی سزا اور تنبیہہ کے طور پر تم کو پہنچ رہا ہے ۔ باقی تمہارے ظلم و کفر کی اصلی شومی و نحوست یعنی پوری پوری سزا تو وہ ابھی اللہ کے پاس محفوظ ہے جو دنیا میں یا آخرت میں اپنے وقت پر تم کو پہنچ کر رہے گی جس کی ابھی اکثر لوگوں کو خبر نہیں ہے[1]

یہ بتایا جا رہا ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنی جو آزمائشیں فرعونیوں کو جھنجھوڑنے اور بیدار کرنے کے لیے روانہ کیں کہ وہ حضرت موسیٰ کی دعوت کی طرف متوجہ ہوں انھوں نے ان آیات میں حضرت موسیٰ کی نحوست کا نتیجہ قرار دیا ۔ ان کا خیال تھا کہ ملک میں جو خوشحالی رفاہیت رزق میں فراوانی معاشی برتری ہوتی ہے وہ تو اس لیے ہے کہ ہماری حکومت کے تدبر، فکر و غور اور منصوبہ بندی کا نتیجہ ہے ۔ اور ملک میں جو قحط سالی، معاشی خرابی، بازار کی گرانی، پیداوار کی کمی اور باقی امراض پھیل رہے ہیں یہ حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی روز کی شورشوں اور شہری زندگی کے امن، سکون اور حکومت کو پریشان کرنے کی وجہ سے ہے ۔ فرعون ہی نہیں بلکہ ہر مستبد اپنے عوام کے ساتھ یہی معاملہ کرتا ہے وہ ملک کی خوشحالی کو اپنے سیاسی تدبر اور منصوبہ بندی کا نتیجہ اور بدحالی کو زعماء کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سر ہو رہا ہے ۔ قرآن نے یہاں اس کا جواب یہ دیا ہے کہ ملک کی خوشحالی تمہارے حسن تدبر کا نتیجہ نہیں ہے اور نہ بدحالی حضرت موسیٰ اور ان کے ساتھیوں کی نحوست کا نتیجہ ہے بلکہ یہ اللہ کے اس قانون کا نتیجہ ہے جس نے اچھے برے اعمال کے لیے ایک قانون مقرر کیا ہے اور اسی کے مطابق نتائج پیش آتے ہیں۔ یہ تمہارے اعمال کی نحوست ہے جو اللہ کے پاس ہے کسی اور کے پاس نہیں اور اسی کے مطابق یہ نتائج ہیں ۔

فرعونیوں کا حضرت موسیٰ کو آخری جواب

۱۵۸- اور فرعونیوں نے کہا کہ اے موسیٰ تو ہم پر جادو چلانے کے لیے کتنی ہی نشانیاں پیش کرے ہم تجھے ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ موسیٰ علیہ السلام کے معجزات دیکھ کر کہتے تھے کہ خواہ کتنا ہی جادو آپ ہم پر چلائیں اور اپنے خیال کے موافق کتنے ہی نشان دکھلائیں ہم کسی طرح تمہاری بات ماننے والے نہیں جب انہوں نے یہ آخری فیصلہ سنا دیا اور قبول حق کے سارے دروازے اپنے اوپر بند کر لیے تب خدا نے ان پر چند قسم کی عظیم الشان بلائیں یکے بعد دیگرے مسلط کر دیں جن کی تفصیل آئندہ آیت میں آتی ہے[1]

یہاں فرعونیوں کی ہٹ دھرمی انتہا کو پہنچ گئی اس چیز کو بھی جادو قرار دے رہے ہیں یعنی قحط سالی اور پیداوار کی کمی کو جس کے متعلق ان کو خود بھی پتہ تھا کہ یہ جادو کا نتیجہ نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر قرآن میں دوسرے موقعہ پر بتایا ہے کہ جب ان کے پاس ہماری کھلی نشانیاں آئیں تو انہوں نے کہا کہ ھذا سحر مبین کہ یہ کھلا جادو ہے ۔ قرآن نے بتایا ہے کہ آیات کے بارے میں یہ انکاری رویہ سراسر ظلم اور غرور کی وجہ سے تھا ورنہ ان کے دل یقین کر چکے تھے ۔ کیونکہ یہ بات کسی طرح تصور میں نہیں آ سکتی ہے کہ ایک پورا قحط اور چیزوں کی نایابی کی لپیٹ میں اگر آ جاتے تو جادو کا کرشمہ ہو۔ یہ دونوں کھلی آیات ہدایت تھیں جن کو دیکھ کر ایک بیوقوف آدمی بھی یہ سمجھ سکتا ہے کہ پیغمبر کی دعا کے نتیجے میں ملک گیر بلاؤں کا آنا اور پھر اس کی دعا سے ہٹ جانا صرف اللہ رب العالمین ہی کے تصرف کا نتیجہ ہے ۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰ کو مخاطب کر کے صاف صاف کہہ دیا تھا ما انزل ھولاء الا رب السماوات والارض بصائر یہ بصیرت افروز نشانیاں اللہ کے سوا کسی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نے نازل نہیں فرمائی ہیں لیکن جس وجہ سے فرعونیوں نے ان آیات کے بارے میں کفر جحود کا رویہ اختیار کیا وہ صرف یہ تھی انؤمن لبشرین مثلنا وقومھما لنا عابدون کیا ہم اپنے ہی جیسے دو انسانوں کی بات مان لیں حالانکہ ان کی قوم ہماری بندگی کر رہی ہے۔ اس مرحلہ پر اگر آیات ہدایت ختم ہوتی ہیں کیونکہ انہوں نے حضرت موسیٰ سے کہہ دیا ہے وما نحن لک بمومنین ان کے اس فیصلے کے بعد آیت ہلاکت کے مقدمات اور مبادی شروع ہوتے اسی لیے اس کے بعد والی آیت فارسلنا کے شروع میں فاء نتیجہ کے کر آتے یعنی ان کے اس کہنے کا نتیجہ یہ ہوا۔

فرعونیوں کی ہلاکت کے مقدمات

۱۵۹- لہٰذا ہم نے ان فرعونیوں پر طوفان بھیجا، ٹڈی دل اور جوئیں، مینڈک اور لہو۔ یہ سب نشانیاں کھول دی گئی تھیں پھر بھی انہوں نے سرکشی کی اور ان کا گروہ مجرموں کا گروہ تھا۔ بارش اور سیلاب کا طوفان یا طوفان کی وجہ سے موت کا طوفان علی اختلاف الاقوال۔ قمل سے مراد چیچڑیاں ہیں جیساکہ حضرت شیخ الہند نے اختیار کیا یا جوئیں یا گیہوں وغیرہ غلہ میں جو کیڑا لگ جاتا ہے جس سے غلہ خراب ہو جاتا ہے۔ یعنی بدن اور کپڑوں میں چیچڑیاں اور جوئیں پڑ گئیں، غلہ میں گھن لگ گیا۔ تھوڑے تھوڑے وقفہ کے بعد یہ سب آیات دکھلائی گئیں مگر وہ کچھ ایسے متکبر، جرائم پیشہ اور گنہ گار تھے کہ کسی طرح مان کر نہ دیئے۔ سعید بن جبیر سے منقول ہے کہ جب فرعون نے موسیٰ علیہ السلام کے مطالبہ بنی اسرائیل کی آزادی کو تسلیم نہ کیا تو حق تعالیٰ نے بارش کا طوفان بھیجا۔ جس سے کھیتوں وغیرہ کی تباہی کا اندیشہ پیدا ہو گیا۔ آخر گھبرا کر حضرت موسیٰ سے درخواست کی کہ تم اپنے خدا سے کہہ کر یہ بلاء طوفان دور کرا دو تو ہم بنی اسرائیل کو آزادی دے کر تمہارے ساتھ روانہ کر دیں گے۔ موسیٰ علیہ السلام کی دعا سے بارش بند ہو گئی اور بجائے نقصان کے پیداوار بہت کثرت سے ہوئی۔ فرعونی عذاب سے بے فکر ہو کر اپنے عہد پر قائم نہ رہے تب اللہ تعالیٰ نے تیار کھیتوں پر ٹڈی دل بھیج دیا جسے دیکھ کر پھر گھبرائے کہ یہ نئی آفت کہاں سے آگئی پھر موسیٰ علیہ السلام سے دعا کی درخواست کی اور سخت وعدے کیے کہ اگر یہ عذاب ٹل گیا تو ہم ضرور بنی اسرائیل کو آزاد کر دیں گے۔ جب یہ عذاب بھی اٹھا لیا گیا تو پھر مطمئن ہو گئے اور سب وعدے فراموش کر دیئے۔ آخر جس وقت غلہ اٹھا کر مکانوں میں بھر لیا تو خدا کے حکم سے غلہ میں گھن لگ گیا۔ پھر موسیٰ سے دعا کرائی اور بڑے پکے عہد و پیمان کیے لیکن جہاں وہ حالت ختم ہوتی بدستور

سابق سرکشی اور بدعہدی کرنے لگے تو خدا نے ان کا کھانا اور پینا بے لطف کر دیا۔ مینڈک اس کثرت سے پیدا کر دیے گئے کہ ہر کھانے اور برتن میں مینڈک نظر آتا تھا جب بولنے اور کھانے کے لیے منہ کھولتے مینڈک جست کر کے منہ میں پہنچتا تھا اور ویسے بھی اس جانور کی کثرت نے رہنا سہنا مشکل کر دیا۔ ادھر پینے کے لیے جو پانی لینا چاہتے تھے وہی خدا کے حکم سے برتنوں میں یا منہ میں پہنچ کر خون بن جاتا۔ غرض کھانے پینے تک سے عاجز ہو گئے۔ اس پر بھی شیخی اور اکڑفوں وہ ہی رہی۔[1]

اس سے پہلے آیاتِ ہدایت آتی رہیں اور فرعونی ان کو سحر بتاتے رہے اور بالآخر انہوں نے اپنا دوٹوک فیصلہ کر دیا ما نحن لك بمؤمنين اے موسیٰ ہم تیری بات نہیں مانیں گے۔ اس کے بعد آیتِ ہلاکت آجانی چاہیے تھی لیکن حق تعالیٰ کے یہاں رحمت کا غلبہ ہے اس لیے اصل آیتِ ہلاکت سے پہلے بطورِ مقدمات آیات یکے بعد دیگرے ظاہر ہوئیں۔ قرآن کے اندازِ بیان سے ظاہر ہو رہا ہے کہ یہ مقدمات ان کے سابقہ کردار کا نتیجہ بن کر ظاہر ہوتے۔ یہاں قرآن نے پانچ نشانیاں بتائی ہیں ایک طوفان، دوسرے جراد، تیسرے قمل، چوتھے ضفادع اور پانچویں دم۔ اور ان پانچوں کا اجمالی چہرہ آیات مفصلات سے پیش کیا ہے۔ عام شارحینِ قرآن نے تو مفصلات کے معنے یہی بتاتے ہیں کہ یہ آیات ایسی واضح اور کھلی تھیں جن کے معجزہ ہونے میں کوئی ہوش مند شبہ نہیں کر سکتا۔ اور ایک مطلب یہ بھی لکھا ہے کہ یہ سب نشانیاں الگ الگ اور جدا جدا تھیں یکبارگی نہیں آئیں۔ اور امام مجاہد نے مفصلات کو معلومات کے معنے میں لیا ہے۔ یعنی سب کی جانی بوجھی ہیں۔ جانی بوجھی کا مطلب صرف یہی ہو سکتا ہے کہ اہلِ کتاب کے علم میں ہے چنانچہ موجودہ تورات میں اس کی تفصیل موجود ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اس کے ساتھ کچھ اور معجزات بھی بیان ہوتے ہیں۔ قرآن میں صرف اشارہ ہے۔ موجودہ تورات کی روشنی میں ان پانچوں معجزات کی تفصیل یہ ہے:

طوفان کی تفصیل تورات میں اس طرح بتائی گئی ہے کہ

خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ اپنا ہاتھ آسمان کی طرف بڑھا تاکہ سب ملک مصر میں انسان اور حیوان اور کھیت کی سبزی پر جو ملک مصر میں ہے اولے گریں۔ اور موسیٰ

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نے اپنی لاٹھی آسمان کی طرف اٹھائی اور خداوند نے رعد اور اولے بھیجے اور آگ زمین تک آنے لگی اور خداوند نے ملک مصر پر اولے برسائے پس اولے گرے اور اولوں کے ساتھ آگ ملی ہوئی تھی اور وہ اولے ایسے بھاری تھے کہ جب سے مصری قوم آباد ہوئی ایسے اولے ملک میں کبھی نہیں پڑے تھے اور اولوں نے سارے ملک مصر میں ان کو جو میدان میں تھے کیا انسان کیا حیوان سب کو مارا اور کھیتوں کی ساری سبزی کو بھی اولے مار گئے۔ اور میدانوں کے درختوں کو توڑ ڈالا مگر جشن کے علاقہ میں جہاں بنی اسرائیل رہتے تھے اولے نہیں پڑے۔ (خروج باب ۹)

اس سے معلوم ہوا کہ یہ طوفان بارش، ہواؤں کڑک، گرج اور ژالہ باری کا طوفان تھا۔ اس میں آگ کا جو ذکر ہے وہ بجلی والی آگ ہے جو اس طوفان میں ہوتی ہے۔

جراد عربی زبان میں ٹڈی کو کہتے ہیں اس کی تفصیل تورات میں اس طرح آتی ہے:

تب خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ملک مصر پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ ٹڈیاں ملک مصر میں آئیں اور ہر قسم کی سبزی کو جو اس ملک میں اولوں سے بچ رہی ہے چٹ کر جائیں۔ پس موسیٰ نے ملک مصر پر اپنی لاٹھی بڑھائی اور خداوند نے اس سارے دن اور ساری رات پر آندھی چلائی اور صبح ہوتے ہوتے پروا آندھی ٹڈیاں لے آئی اور ٹڈیاں سارے ملک پر چھا گئیں اور وہیں مصر کی حدود میں بسیرا کیا اور ان کا دل ایسا بھاری تھا کہ نہ تو ان سے پہلے ایسی ٹڈیاں کبھی آئیں اور نہ ان کے بعد پھر آئیں گی کیونکہ انہوں نے تمام روئے زمین کو ڈھانک لیا۔ ایسا کہ ملک میں اندھیرا ہو گیا اور انہوں نے اس ملک کی ایک ایک سبزی کو اور درختوں کے میووں کو جو اولوں سے بچ گئے تھے چٹ کر لیا اور ملک مصر میں نہ تو کسی درخت کی نہ کھیت کی کسی سبزی کی ہریالی باقی رہی۔ (خروج باب ۱۰- ۱۱- ۱۵)

قمل کے معنے عربی میں ایک سے زیادہ آتے ہیں۔ چیچڑی، سرسری، جوئیں چھوٹی مکھی، مچھر وغیرہ ہمارے خیال میں جانوروں میں چیچڑیاں، آدمیوں میں جوئیں اور غلہ میں سرسری پیدا ہو گئی مگر تورات میں جوئیں کا ذکر ہے اس لیے ہم نے بھی ترجمہ میں جوئیں کو رکھا ہے۔ اس عذاب سے ایک طرف آدمی اور جانور سخت پریشان ہوئے اور دوسری طرف غلوں کے گودام تباہ ہو گئے۔ تورات میں اسے اس طرح بیان کیا ہے:

تب خداوند نے موسیٰ سے کہا ہارون سے کہہ کہ اپنی لاٹھی بڑھا کر زمین کے گرد کو مار
تاکہ تمام ملک مصر میں جوئیں بن جائیں۔ انہوں نے ایسا ہی کیا اور ہارون نے اپنی لاٹھی
لے کر اپنا ہاتھ بڑھایا اور زمین کے گرد مار اور انسان و حیوان پر جوئیں ہو گئیں۔ اور
تمام ملک مصر میں زمین کی ساری گرد جوئیں بن گئی۔ (خروج باب ۸)

الضفادع ضفدع کی جمع ہے۔ اس کے معنے مینڈک کے ہیں۔ مینڈکوں کے عذاب کی تفصیل بائبل کے آٹھویں باب میں اس طرح بیان کی ہے۔

پھر خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ فرعون کے پاس جا اور اس سے کہہ کہ خداوند یوں
فرماتا ہے کہ میرے لوگوں کو جانے دو کہ میری عبادت کریں اور اگر تو ان کو جانے نہ
دے گا تو دیکھ میں تیرے ملک کو مینڈکوں سے ماروں گا اور دریا بے شمار مینڈکوں
سے بھر جائے گا اور وہ آکر تیرے گھر میں تیری آرام گاہ میں اور تیرے پلنگ پر اور
تیرے ملازموں کے گھروں میں اور تیری رعیت پر اور تیرے تنوروں اور تیرے
آٹا گوندھنے کے لگنوں میں بھی گھستے پھریں گے۔ اور تجھ پر اور تیری رعیت اور
تیرے نوکروں پر چڑھ جائیں گے۔ اور خداوند نے موسیٰ کو فرمایا کہ ہارون سے کہہ
اپنی لاٹھی لے کر اپنا ہاتھ دریاؤں اور نہروں اور جھیلوں پر چڑھا اور مینڈکوں کو
ملک مصر پر چڑھا لا۔ چنانچہ جتنا پانی مصر میں تھا اس پر ہارون نے اپنا ہاتھ بڑھایا
اور مینڈک چڑھ آئے اور ملک مصر کو ڈھانک لیا۔

(خروج باب ہشتم)

دم کے معنے خون کے ہیں۔ یہ عذاب اس طرح آیا کہ تمام نہروں، کنوؤں، چشموں اور تالابوں کا پانی خون میں تبدیل ہو گیا۔ مچھلیاں مر گئیں، ہر جگہ پانی میں عفونت پیدا ہو گئی اور پورے ایک ہفتہ تک مصر کے لوگ صاف پانی سے ترس گئے۔ بائبل کے باب ہفتم میں اس عذاب کا نقشہ اس طرح بتایا گیا ہے۔

اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ ہارون سے کہہ کہ اپنی لاٹھی لے اور مصر میں
جتنا پانی ہے یعنی دریاؤں اور نہروں، جھیلوں اور تالابوں پر اپنا ہاتھ بڑھا تاکہ وہ
خون بن جائیں۔ اور سارے ملک مصر میں پتھر لکڑی کے برتنوں میں بھی خون ہو گا
اور موسیٰ و ہارون نے حکم کے مطابق کیا اس نے لاٹھی اٹھا کر اسے فرعون اور اس

کے فامون کے سامنے دریا کے پانی پر مار دیا اور دریا کا پانی سب خون ہوگیا۔ اور دریا کی مچھلیاں سب مرگئیں اور دریا سے تعفن اٹھنے لگا اور مصری دریا کا پانی نہ پی سکے اور تمام ملک مصر میں خون ہی خون ہوگیا۔ (خروج ۷)

ایک اہم اور ضروری توضیح

بائیبل کی کتاب خروج میں ان عذابوں کی مفصل رُوداد درج ہے لیکن اس میں حقیقت اور ملاوٹ دونوں ہیں۔ اس میں کہا گیا ہے کہ جب خون کا عذاب آیا تو جادوگروں نے بھی ایسا ہی لا کر دکھایا مگر جب جوؤں کا عذاب آیا تو جادوگر جواب میں جوئیں پیدا نہ کر سکے اور انہوں نے کہا کہ یہ خدا کا کام ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ دلچسپ بات یہ ہے کہ جب مینڈکوں کا سیلاب اٹھا تو جادوگر بھی جواب میں مینڈک چڑھا لائے لیکن اس کے باوجود فرعون نے حضرت موسیٰ ہی سے یہ درخواست کی کہ اللہ سے دعا کر کے اس عذاب کو دفع کراتے۔ سوال یہ ہے کہ جب جادوگر مینڈک چڑھا لانے پر قادر ہے تو فرعون نے انہی کے ذریعہ سے یہ عذاب دور کیوں نہ کرالیا اور آخر یہ کیسے معلوم ہوا کہ مینڈکوں کی اس فوج میں اللہ کے مینڈک کون سے اور جادوگروں کے کون سے تھے؟ یہی سوال خون کے بارے میں بھی پیدا ہوتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کی تنبیہ کے مطابق ہر طرف پانی کے ذخیرے خون میں تبدیل ہو چکے تھے تو جادوگروں نے کس پانی کو خون بنایا اور کیسے معلوم ہوا کہ فلاں جگہ کا پانی جادوگروں کے کرتب سے خون بنا ہے۔ ایسی باتوں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موجودہ بائیبل خالص کلامِ الٰہی پر مشتمل نہیں ہے بلکہ یوں کہنا بجا ہے کہ موجودہ بائیبل جن لوگوں نے اپنی طرف سے بہت کچھ ملایا ہے وہ واجبی سی عقل کے لوگ بھی نہ تھے جنہیں بات گھڑنے کا بھی سلیقہ نہ تھا لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

آخر میں فرمایا ہے فاستکبروا وکانوا قوماً مجرمین۔ پھر بھی انہوں نے سرکشی کی اور ان کا گروہ مجرموں کا گروہ تھا۔ فرعونیوں کی سرکشی کا اندازہ اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ان واقعات و حقائق کے باوجود حضرت موسیٰ کی نبوت کو نہیں مانتے تھے اور اسے جادو ہی سمجھتے تھے۔ حالانکہ وہ جادو کی حقیقت سے واقف تھے اور ان سے یہ بات چھپی ہوئی نہ تھی کہ یہ کرشمے کسی جادو سے رونما نہیں ہو سکتے۔ ایک جادوگر زیادہ سے زیادہ جو کچھ کر سکتا ہے وہ یہ ہے کہ ایک محدود رقبہ میں جو لوگ اس کے سامنے موجود ہوں۔ ان کے ذہن پر ایسا اثر ڈالے جس سے وہ یہ محسوس کرنے لگیں

کہ پانی خون بن گیا ہے یا مینڈک نکل رہے ہیں یا ٹڈی دل چڑھ رہا ہے اور اس محدود رقبہ کے اندر بھی کوئی پانی حقیقت میں خون نہ بن جائے گا بلکہ اس دائرے سے نکلتے ہی پانی کا پانی رہ جائے گا۔ کوئی مینڈک فی الواقع پیدا نہ ہوگا بلکہ اسے پکڑ کر آپ اس دائرے سے باہر لے جائیں گے تو آپ کے ہاتھ میں مینڈک کے بجائے صرف ہوا ہوگی۔ ٹڈی دل بھی محض خیالی دل ہوگا کسی کھیت کو وہ چاٹ نہ سکے گا۔ رہی یہ بات کہ ایک پورے ملک میں قحط برپا ہوجائے یا تمام ملک کی نہریں، چشمے اور کنویں خون سے بھر جائیں یا ہزارہا میل کے رقبے پر ٹڈی دل ٹوٹ پڑے اور وہ لاکھوں ایکڑ کے کھیت صاف کر جائے۔ یہ کام آج تک نہ جادو کرسکا ہے اور نہ جادو کے زور سے ہوسکتا ہے اس کے باوجود بھی اگر کوئی نہیں مانتا ہے تو اس کا منشا استکبار نہیں تو اور کیا ہے۔ یعنی راج ہٹ اور شاہی طنطنہ کے سوا اور کیا ہے۔

فرعونیوں کی حضرت موسیٰ سے درخواست دُعا

۱۶۰۔ اور جب بھی ان پر عذاب کی سختی آتی تو کہنے لگتے اے موسیٰ تیرے پروردگار نے تجھ سے جو عہد کیا ہے تو اس کے مطابق ہمارے لیے دُعا کر، اگر تو نے اپنی دُعا سے ہم پر عذاب ہٹا دیا تو ہم ضرور تیری بات مانیں گے اور تیری ساتھ بنی اسرائیل کو روانہ کر دیں گے۔ یعنی اس نے دُعا کا جو موثر طریقہ سجھ کو بتلا رکھا ہے۔ اسی طرح دُعا کرو۔ بما عہد عندک کا یہ مطلب ہے کہ نبی اللہ ہونے کی حیثیت سے دُعا فرمایئے گویا عہد کا اطلاق نبوت پر ہوا کیونکہ خدا اور نبی کے درمیان ایک طرح کا معاہدہ ہوتا ہے کہ خدا نبی کو خلعت اکرام و اعانت سے سرفراز فرمائے گا اور نبی اس کی پیغام رسانی میں کوئی کوتاہی نہیں کرے گا اور ممکن ہے بما عہد عندک سے وہ عہد مراد ہو جو بتوسط انبیاء علیہم السلام اقوام سے کیا جاتا ہے کہ اگر تم کفر و تکذیب سے باز آگئے تو عذاب الٰہی اٹھا لیا جائے گا۔[1]

یہاں تو قرآن نے فرعونیوں کی حضرت موسیٰ سے درخواست کا ذکر یا موسیٰ سے کیا ہے لیکن ۲۵ پارہ میں الفاظ یہ رکھے ہیں یا ایہا الساحر ادع لنا ربک بما عہد عندک اے ساحر تجھے اپنے رب کی طرف جو منصب حاصل ہے اس کی بنا پر ہمارے لیے اپنے رب سے دُعا کر۔ یہاں عام شارحین

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن کو یہ الجھن درپیش آتی ہے کہ جب عذاب سے نجات پانے کے لیے فرعونیوں نے حضرت موسیٰ سے درخواست کی تو ان کو اسے ساحر کہہ کر کیوں پکارا۔ مبتلا تو خوشامد کیا کرتا ہے نہ کہ مذمت۔ اس وجہ سے انہوں نے یہ تاویل کی ساحر اس دور میں بڑا وقیع اور علمی مقام رکھتا تھا وہ گویا حضرت موسیٰ کو اپنے زمانہ کے عرف کے مطابق اسے عالم کہہ رہے تھے لیکن یہ تاویل اس بنا پر غلط ہے کہ قرآن حکیم میں دوسرے مقامات پر جہاں جہاں بھی فرعون کے وہ اقوال نقل کیے گئے جن میں اس نے حضرت موسیٰ کو جادوگر اور ان کے پیش کردہ معجزات کو جادو کہا ہے۔ وہاں مذمت اور تحقیر کا انداز صاف ظاہر ہوتا ہے اور صریحاً یہ نظر آتا ہے کہ اس کے نزدیک جادو ایک چھوٹی چیز تھی جس کا الزام وہ حضرت موسیٰ پر رکھ کر آپ کی دعویٰ نبوت میں تکذیب کرتا تھا۔

رہا یہ سوال کہ جب دعا کی درخواست کرتے وقت بھی فرعون علانیہ حضرت موسیٰ کی تکذیب کرتا تھا تو آپ اس کی درخواست ہی کیوں قبول کرتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے پیش نظر اللہ کے حکم سے ان لوگوں پر حجت تمام کرتا تھا۔ عذاب ٹالنے کے لیے اُن کا آپ سے دعا کی درخواست کرنا خود یہ ثابت کر رہا تھا کہ اپنے دلوں میں وہ جان چکے تھے کہ یہ عذاب کیوں آرہے ہیں اور کون انہیں ٹال سکتا ہے اس کے باوجود جب وہ ہٹ دھرمی اور دیدہ دلیری سے آپ کو ساحر کہتے تھے اور عذاب کے ٹل جانے کے بعد راہِ راست قبول کرنے کے وعدے سے پھر جاتے تھے تو درحقیقت وہ اللہ کے نبی کا کچھ نہ بگاڑتے تھے بلکہ اپنے خلاف اس مقدمہ کو اور زیادہ مضبوط کرتے جاتے تھے جس کا فیصلہ اللہ تعالیٰ نے ان کے کلی استیصال کی شکل میں آخر کر دیا۔

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب بھی وہ عذاب کی گرفت میں آتے حضرت موسیٰ کی منت سماجت کرنے لگتے کہ خدا سے جو تمہیں قرب و تعلق ہے اس کی بنا پر ہمارے لیے دعا کرو اور سفارش کرو کہ یہ عذاب ٹل جائے اگر تم نے ٹال دیا تو ہم ضرور تمہاری بات مان لیں گے تورات میں بھی اس کا ذکر آیتوں میں ملتا ہے۔ مثلاً،

> تب فرعون نے موسیٰ و ہارون کو بلایا اور کہا کہ خداوند سے شفاعت کرو کہ مینڈکوں کو مجھ سے اور میری رعیت سے دفع کرے اور میں ان لوگوں کو جانے دوں گا تاکہ وہ خداوند کے لیے قربانی کریں۔ (خروج ۸-۸)
>
> تب فرعون نے موسیٰ و ہارون کو بلوایا اور ان سے کہا کہ اس دفعہ میں نے گناہ کیا ہے۔ خداوند عادل ہے۔ میں اور میری قوم گنہگار ہیں۔ خداوند

سے شفاعت کرو کہ بس کر آئے کو اس طرح سے نہ گرجے اور اولے نہ گریں۔ تب میں
تمہیں جانے دوں گا اور تم اس سے آگے نہیں رہو گے

(خروج باب نہم ۲۷-۲۸)

تب فرعون نے موسیٰ و ہارون کو جلد بلایا اور کہا کہ میں خداوند تمہارے
خدا کا اور تمہارا گنہگار ہوں سو میں اب تمہاری منت کرتا ہوں فقط اس مرتبہ میرا گناہ
بخشو اور خداوند اپنے خدا سے شفاعت کرو کہ فقط اسی موت کو مجھ سے دور کرے

(خروج ۱۰)

بار بار اُن کی عہد شکنی

۱۶۱۔ لیکن پھر جب ایسا ہوا کہ ہم نے ایک خاص وقت کے لیے کہ انہیں اس تک پہنچنا تھا عذاب ٹال دیا تو اچانک وہ اپنی بات سے پھر گئے۔ اس مدت سے یا تو موت اور غرق ہونے تک کی مدت مراد ہے یا ممکن ہے ایک بلا کے بعد دوسری بلا کے آنے تک کا وقت مراد ہو[۱] اصل ارشاد میں الرجز آیا ہے۔ امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں کہ رجز کی اصل اضطراب خوب ہلنا ہے اسی سے رجز البعیر ہے۔ اور علامہ زمخشری اساس میں لکھتے ہیں ا/ تجذ الرعد اس وقت کڑک کے لیے بولتے ہیں جب کپکپی جیسی آواز ہو یعنی ایسی جنبش جس میں ہلنا ہو۔ اشعار میں رجز بھی آواز کے اضطراب سے ہوتا ہے۔ یہاں رجز سے عذاب مراد ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس اور سعید بن جبیر نے یہاں رجز سے طاعون مراد لیا ہے۔ قرآن کے سیاق سے معلوم ہوتا ہے کہ رجز سے ایسا عذاب مراد ہے جس سے پوری زندگی ہل کر رہ جاتے اس لیے رجز کی آغوش میں وہ تمام نوازل اور حوادث جو اللہ سبحانہ نے قوم فرعون پر نازل کیے ان ہی میں سے یہ پانچ بھی ہیں جن کا یہاں ذکر ہوا ہے۔ اور اگر تورات میں بیان کردہ عذاب کی ساری صورتوں کو صحیح مان لیا جاتے تو پھر رجز کا مدلول وہ سب ہوں گے۔ قرآن میں لما کا استعمال کچھ اس طرف اشارہ بھی کر رہا ہے کہ اس قسم کے واقعات بہت ہوتے ہیں اور فرعون ہر حادثہ کے موقع پر حضرت موسیٰ سے دعا کی درخواست کرتا اور وعدہ کرتا کہ بنی اسرائیل کے جانے میں مزاحمت ختم کر

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

دے گا لیکن ہر بار مکر جاتا اذا ھم ینکثون عمل کے اسی تکرار کو ظاہر کر رہا ہے۔

درمیان میں ارشاد ہوا ہے کہ الی اجل ھم بالغوہ ایک خاص وقت تک کے لیے کہ انہیں اس تک پہنچنا تھا۔ یعنی ایک آنے والا وقت تھا جس کی طرف وہ اپنے اعمال کے ذریعے بڑھ رہے تھے اور بالآخر پہنچنے والے تھے۔ یہ آنے والا وقت کون سا تھا؟ ان کے ظلم و فساد کا آخری نتیجہ کہ اللہ سبحانہ کے قانون جزا نے اس طرح کے نتیجے کے لیے جتنی مقدار فساد عمل کی ٹھہرا دی ہے جب وہ مہیا ہو گئی تو نتیجہ رونما ہو گیا۔ یہی ظہور نتائج کا وقت ہے جسے قرآن نے امتوں کی اجل سے تعبیر کیا ہے جیسا کہ اسی سورت کی ابتدا میں لکل امۃ اجل فرما کر ذکر کیا ہے۔ یہاں اسی قانون ناجیل کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ہر جماعت اپنے اعمال کے ذریعے ایک خاص نتیجے تک پہنچتی رہتی ہے جو اس کی مقررہ اجل ہے۔ اگر اعمال نیک ہوتے ہیں تو یہ اجل فلاح کی ہوتی ہے بُرے ہوتے ہیں تو ہلاکت کی ہوتی ہے[1]

فرعون کی ہلاکت

۱۶۲۔ اور بالآخر ہم نے انہیں سزا دی بس ان کو سمندر میں غرق کر دیا۔ اس جرم کی پاداش میں کہ انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور وہ ان سے غافل رہے۔ رجز سے بعض مفسرین کے نزدیک طاعون مراد ہے جیسا کہ بعض احادیث میں یہ لفظ طاعون پر اطلاق کیا گیا ہے۔ لیکن اکثر مفسرین ان آیات کو پچھلی آیات ہی کا بیان قرار دیتے ہیں۔ موضح القرآن میں ہے کہ یہ سب بلائیں ان پر آئیں ایک ایک ہفتہ کے فرق سے۔ اول حضرت موسیٰ فرعون کو کہہ آتے کہ اللہ تم پر یہ بلا بھیجے گا وہ ہی بلا آتی۔ پھر مضطر ہوتے۔ حضرت موسیٰ کی خوشامد کرتے، ان کی دعا سے دفع ہوتی پھر منکر ہو جاتے۔ آخر کو وبا پڑی۔ نصف شب کو سارے شہر میں ہر شخص کا پہلا بیٹا مر گیا۔ وہ لگے مُردوں کے غم میں حضرت موسیٰ اپنی قوم کو لے کر شہر سے نکل گئے۔ پھر کئی روز کے بعد فرعون نے پیچھا کیا۔ دریائے قلزم پر جا پکڑا وہاں یہ قوم بسلامت گزر گئی اور فرعون ساری فوج سمیت غرق ہوا[2]

---

[1] ترجمان القرآن [2] افادات شیخ الاسلام

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے آخر کار ایک رات مقرر فرما دی جس میں تمام بنی اسرائیل اور غیر اسرائیل مسلمانوں کو مصر کے ہر حصے سے ہجرت کے لیے نکلنا تھا۔ یہ سب لوگ ایک طے شدہ پروگرام کے تحت مقررہ مقام پر جمع ہو کر ایک قافلے کی صورت میں روانہ ہو گئے۔

دراصل مصر سے فلسطین یا سرزمین کنعان جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک خشکی کا راستہ ہے اور وہ قریب ہے اور دوسرا بحر احمر (قلزم) کا راستہ یعنی اس کو عبور کر کے بیابان سور اور سینا کی راہ ہے اور یہ دور کی راہ ہے مگر خدا تعالیٰ کی مصلحت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ خشکی کی راہ چھوڑ کر دور کی راہ اختیار کریں اور قلزم کو پار کر کے جائیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ اس راستہ کو اللہ تعالیٰ نے اس لیے ترجیح دی کہ خشکی کے راستہ سے گزرنے میں فرعون اور اس کی فوج سے ضرور جنگ ہو جاتی کیونکہ انہوں نے بنی اسرائیل کو قریب ہی سے آلیا تھا اور اگر دریا کا معجزہ پیش نہ آتا تو فرعون بنی اسرائیل کو واپس مصر لے جانے میں کامیاب ہو جاتا اور چونکہ صدیوں کی غلامی نے بنی اسرائیل کو بزدل اور پست ہمت بنا دیا تھا اس لیے وہ خوف اور رعب کی وجہ سے کسی طرح فرعون کے ساتھ جنگ پر آمادہ نہ ہوتے۔ تورات سے بھی اس توجیہ کی تائید ہوتی ہے۔

اور جب فرعون نے ان لوگوں کو جانے کی اجازت دے دی تو خدا ان کو فلسطینیوں کے ملک کے راستہ سے نہیں لے گیا۔ اگرچہ ادھر سے نزدیک پڑتا کیونکہ خدا نے کہا کہ ایسا نہ ہو کہ یہ لوگ لڑائی بھڑائی دیکھ کر پچھتانے لگیں اور مصر کو لوٹ جائیں بلکہ خداوند ان کو چکر کھلا کر بحر قلزم کے بیابان کے راستہ لے گیا۔

(خروج ۱۳)

نیز فرعون اور آل فرعون کو ان کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش اور عظیم الشان اعجاز کے ذریعے ظالم و قاہر اقتدار سے مظلوم قوم کی نجات کا عدیم النظیر مظاہرہ کرنا بھی مقصود تھا اسی لیے یہ راستہ تجویز ہوا۔ بہرحال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات بحر احمر کی راہ پر ہو گئے اور روانہ ہونے سے پہلے مصری عورتوں کے زیورات اور قیمتی پارچات جو ایک تقریب کی خاطر مستعار لیے تھے وہ بھی واپس نہ کر سکے کہ کہیں مصریوں کو ہماری روانگی کا علم نہ ہو جائے۔ ادھر پرچہ نویسوں نے فرعون کو اطلاع کی کہ بنی اسرائیل مصر سے فرار ہونے کے لیے شہروں سے نکل گئے ہیں۔ فرعون نے اسی وقت فوج کو ساتھ لیا اور ان کا تعاقب کیا۔ بنی اسرائیل کی تعداد تورات کی تصریح کے مطابق علاوہ بچوں اور جانوروں کے

چھ لاکھ تھی۔ فرعون کے تعاقب میں آتے دیکھ کر بنی اسرائیل گھبرا گئے اور کہنے لگے۔

کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کے لیے بیاباں میں لے آیا ہے تو نے ہم سے یہ کیا کیا ؟ کہ ہم کو مصر سے نکال لایا ، کیا ہم تجھ سے مصر میں نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں کیوں ہمارے لیے مصریوں کی خدمت کرنا بیابان میں مرنے سے بہتر۔ (خروج ۱۴)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تسلی دی اور فرمایا خوف نہ کرو خدا کا وعدہ سچا ہے وہ تم کو نجات دے گا اور تم ہی کامیاب ہوگے اور پھر درگاہ الٰہی میں دست بدعا ہوئے۔ وحی الٰہی نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ اپنی لاٹھی کو پانی پر مارو چنانچہ موسیٰ علیہ السلام نے ایسا ہی کیا جب انہوں نے قلزم پر اپنا عصا مارا تو پانی پھٹ کر دونوں جانب دو پہاڑوں کی طرح کھڑا ہو گیا اور درمیان میں راستہ بن گیا۔ اور حضرت موسیٰ کے حکم سے تمام بنی اسرائیل اس میں سے اتر کر پار ہو گئے۔ فرعون نے یہ دیکھا تو اپنا تمام لشکر لے کر اسی راستہ پر چل دیا۔ جب بنی اسرائیل کا ہر فرد دوسرے کنارے پر سلامتی کے ساتھ پہنچ گیا تو پانی بحکم الٰہی پھر اپنی اصلی حالت پر آگیا اور فرعون اور اس کا تمام لشکر غرق ہو گیا۔

قرآن عزیز نے بنی اسرائیل کی روانگی اور فرعون کے غرق اور بنی اسرائیل کی نجات کے واقعہ کو بہت اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے اور اس کے صرف ضروری اجزاء ہی کا ذکر کیا ہے لیکن واقعہ سے متعلق عبرت و بصیرت اور موعظت کے معاملہ کو ذرا کھول کر مختلف مقامات پر پیش کیا۔ مگر تورات میں بیان کردہ واقعات کے علاوہ اور بھی بہت کچھ تفصیلات بتاتی ہیں۔ اور بنی اسرائیل کے کوچ اور پڑاؤ کے اکثر مقامات کے نام بھی بتائے ہیں جو دنیا کے لیے نامعلوم ہیں۔

بدقسمتی سے مسلمانوں میں کچھ ایسی نامور شخصیتیں بھی ہیں جو علم کے نام سے اسلام کے ہر مسئلہ کو ادبیات ہی تک محدود دیکھتے ہیں۔ اس لیے وہ معجزات کو نہیں مانتے ہیں۔ انہوں نے غرق فرعون کے معاملہ کو بھی روحانی اعجاز سے نکال کر ایک مادی اور عادی واقعہ بنانے کی کوشش کی ہے۔ وہ لوگوں کو باور کرانا چاہتے ہیں کہ غرق فرعون مادی علل و اسباب کے تحت ظہور پذیر ہوا ہے۔

صاحب تفسیر احمدی نے اس کی یہ تشریح فرمائی ہے کہ غرق فرعون اور بنی اسرائیل کی نجات کا یہ واقعہ معجزہ نہ تھا بلکہ عام دنیوی اسباب و علل کے ماتحت سمندر کے مد و جزر جوار بھاٹا سے تعلق رکھتا ہے یعنی صورت حال یہ پیش آئی کہ جس وقت بنی اسرائیل نے قلزم کو عبور کیا تھا اس وقت اس کا پانی سمٹا ہوا تھا اور پیچھے کو ہٹ کر اس نے جزر اختیار کر لیا تھا۔ فرعون نے

جب بنی اسرائیل کو اس آسانی سے پار ہوتے دیکھا تو اس نے بھی اپنے لشکر کو داخل ہونے کا حکم دے دیا مگر بنی اسرائیل پار ہو چکے تھے اور فرعونی لشکر ابھی دریا کی خشکی پر چل رہا تھا کہ سمندر کے مد اور آگے بڑھنے کا وقت پہنچ گیا اور فرعون اور اس کے لشکر کو اتنی مہلت بھی نہیں ملی کہ وہ آگے بڑھ سکے یا پیچھے ہٹ سکے اور سب غرق ہو گئے۔

ان صاحب نے اپنے اس مزعومہ خیال کے مطابق بنی اسرائیل کے عبور کے متعلق ایک نقشہ بھی دیا ہے جس میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ بنی اسرائیل نے قلزم کے شمالی دہانہ پر جاکر اس کو عبور کیا ہے، مگر افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ قرآن عزیز کی تصریحات اس کا قطعی انکار کرتی ہیں۔

قرآن اور تورات دونوں کی تصریحات سے یہ قطعی طور پر متعین کیا جا سکتا ہے کہ بنی اسرائیل نے بحرِ قلزم کے کسی کنارے اور دہانہ سے عبور کیا یا درمیان سے اس پر ہم ان شاء اللہ تفصیلی تبصرہ جلد ۱۶ میں کریں گے۔

بعض مغرب زدہ حضرات نے یہاں ایک نئی اپج کا مظاہرہ کیا ہے، جب ان کو اس کا زکار اعجاز سے کسی طرح فرار کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو تورات کے اس فقرے کا سہارا لیا۔

> اور خداوند نے رات بھر پوربی آندھی چلا کر اور سمندر کو پیچھے ہٹا کر اسے خشک زمین بنایا اور پانی دو حصے ہو گیا اور بنی اسرائیل سمندر میں سے خشک زمین پر چل کر نکل گئے۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر یہ تسلیم کر لیا جائے کہ یہ خشک زمین دریا کے بیچ میں نکل آئی تھی پھر بھی یہ معجزہ نہ تھا بلکہ رات بھر خشک ہوا کے چلنے سے دونوں جانب پانی بستہ برف کی طرح ہو گیا تھا اور بیچ میں خشک راستہ بن گیا تھا مگر جب فرعون کی باری آئی تو آفتاب کی تمازت نے بستہ برف کو پگھلا دیا اور پانی اصل حالت پر آگیا اور مصری غرق ہو گئے۔

یہاں عبدالوہاب نجار مصری نے یہ خوب لکھا ہے کہ اگر بالفرض ان کی اس باطل تاویل کو تسلیم بھی کر لیا جائے پھر بھی یہ اعجاز ہی ہے کیونکہ سمندروں کی تاریخ بتاتی ہے کہ کبھی ہوا چل کر ان کے درمیان خشک راستہ نہیں بناتی علمِ تاریخ و جغرافیہ اس قسم کے واقعہ سے خالی ہیں۔ لہٰذا اگر عام مادی علل و اسباب سے جدا ہو کر ہوا کا یہ عمل صرف حضرت موسیٰ کی خاطر ہوا تو پھر بھی یہ حضرت موسیٰ کا معجزہ ہے۔

آخر میں اس انتقام کی جولان سے غرق کی صورت میں لیا گیا وجہ یہ بتائی ہے کہ بانہم کذبوا بایاتنا وکانوا عنہا غٰفلین یعنی اول تو وہ اللہ کی آیات سے غافل رہے اور جب کھلے ہوئے چیلنج کے ساتھ ان کی رونمائی ہوئی تو انہوں نے اس کی تکذیب کر دی کہ یہ خدا کی طرف سے نہیں بلکہ سحر و شعبدہ ہے یہ انتہائی ہٹ دھرمی اور سخن پروری تھی کہ فرعونی اس چیز کو بھی جادو قرار دے رہے تھے جس کے متعلق وہ خود بھی جانتے تھے کہ یہ جادو نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر قرآن حکیم کہتا ہے وجحدوا بہا واستیقنتہا انفسہم ظلماً وعلواً اُن کے دل اندر سے مان چکے تھے مگر انہوں نے ظلم و سرکشی کی راہ سے انکار کیا۔

وَاَوْرَثْنَا الْقَوْمَ الَّذِيْنَ كَانُوْا يُسْتَضْعَفُوْنَ مَشَارِقَ الْاَرْضِ وَمَغَارِبَهَا الَّتِيْ بٰرَكْنَا فِيْهَا ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ۙ۬ بِمَا صَبَرُوْا ؕ وَدَمَّرْنَا مَا كَانَ يَصْنَعُ فِرْعَوْنُ وَقَوْمُهٗ وَمَا كَانُوْا يَعْرِشُوْنَ ﴿۱۳۷﴾

اور ہم نے وارث بنا دیا اُن لوگوں کو جن کو حقیر اور کمزور سمجھا جاتا تھا اس ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا جو ہماری بخشی ہوئی برکت سے مالا مال ہے[۱۶۳]۔ اور اس طرح تیرے رب کا پسندیدہ فرمان بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کیونکہ وہ ہمت و ثبات کے ساتھ جمے رہے[۱۶۴]۔ اور فرعون اور اُس کی قوم جو کچھ بناتے رہے تھے اور جو بلندیاں اٹھاتے رہے تھے سب درہم برہم کر دیں[۱۶۵]۔

معانی مفردات

تمّت : پوری ہوگئی تمام سے ہے پورا کرنا، پورا ہونا، کسی چیز کے پورا ہونے یا کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس حد تک پہنچ چکی ہے کہ اب کسی خارجی شے کی اس کو احتیاج نہیں رہی اور ناقص وہ ہے جو کسی خارجی چیز کا محتاج ہو۔ یعنی جو چیز اجزاء کے اعتبار سے آہستہ آہستہ انتہا کو پہنچے۔ حضرت ابراہیم سے اللہ کا وعدہ تھا کہ تمہیں ارض مقدس کا وارث بنایا جائے گا۔ یہ وعدہ بنی اسرائیل کے لیے آہستہ آہستہ پورا ہوا۔ دمّرنا : تدمیر سے ماضی کا جمع متکلم ہے ہم نے ہلاک کر دیا، تباہ کر دیا، اکھیڑ دیا۔ یعرشون : جمع مذکر غائب مضارع ضرب و نصر اونچا کرنا، چھتریاں بنانا، اونچے اونچے مکان بنانا۔ مصدر عرش ہے۔ لازم و متعدی دونوں آتا ہے۔ لازم کے معنے حیران و سرگرداں ہونا، عرش بالمکان قیام کرنا، تعریش البیت مکان کی چھت بنانا۔ تعریش الامر کام میں دیر کرنا، تعرش بالبلد شہر میں قیام کیا، اعتراش چھتری بنا، عریش جھونپڑی کو کہتے ہیں۔ ابو عبیدہ نے یہاں اس کے معنے یبنون سے کیے ہیں۔ یعنی اونچی اور بلند عمارات بناتے تھے۔

بنی اسرائیل کی وراثت ارض

نبوت نے یہ کبھی دعویٰ نہیں کیا کہ چونکہ اس کا پیش کردہ نظام زندگی سب سے بہتر اور اس کے اصول اور طریقہائے کار حقیقت پر مبنی ہیں لہذا وہ تاریخی واقعات کی ناگزیر رفتار سے خود بخود دنیا کے دیگر ادیان پر غالب آجائے گا گویا کہ اس کی کامیابی تاریخ انسانی کے ارتقائی عمل کا ناگزیر نتیجہ یا ایک تاریخی وجوب ہے۔ نبوت کے نقطہ نظر سے انسان کے افعال انفرادی اور اعمال اجتماعی میں جبر کا کوئی پہلو نہیں وہ کائنات کو سعی و عمل کا ایک وسیع میدان قرار دیتی ہے اور یہاں کی کامیابی کو سعی و تدبیر کی شرط سے مشروط کرتی ہے۔

دنیا میں ہر گروہ کے لیے، ہر فرد کے لیے اور ہر عقیدے کے لیے خواہ وہ حق ہو یا باطل کامیابی کی راہیں کھلی ہوئی ہیں یہاں تک کہ جو شخص گمراہی اور فساد کی راہ اختیار کرتا ہے وہ بھی اپنی سعی و عمل کے مطابق کامیابی حاصل کر سکتا ہے اور کائنات کی کوئی قوت اس کی راہ میں مزاحم نہیں ہوتی کیونکہ اس کی تخلیق کچھ ایسی ہوئی ہے کہ اس کی وسیع گود میں ہر سعی کے لیے راہ ہموار ہو جاتی ہے اور

ہر عمل کا راستہ آسان ہو جاتا ہے خواہ وہ سعی بجائے خود سعی غلط اور وہ عمل عمل غیر صالح ہو غرضیکہ کائنات میں کسی حرکت اور کسی عمل کے لیے مزاحمت نہیں پائی جاتی ہے۔ عدم مزاحمت اس کا بنیادی قانون ہے۔ کسی فرد یا گروہ کو جو خود قدم اٹھاتے کائنات آپ ہی کامیابی عطا نہیں کرتی ہے۔ محض خلوص نیت دعائیں اور آرزوئیں خواہ وہ مومن کی ہوں یا کافر کی اسے کامیاب نہیں کر سکتی ہیں جب تک عمل کی طاقت اس کی پشت پناہ نہ ہو لیکن اہل ایمان اور صالحین کے لیے خالق کائنات نے یہ گنجائش رکھی ہے کہ اگر وہ سعی و عمل کے قانون کے مطابق کام کریں اور اپنے مقصد کے لیے ابتدائی قدم اٹھائیں تو کائنات کی تمام قوتیں ان کی مساعدت کرنے لگتی ہیں۔ مگر یہ مساعدت حرکت و اقدام اور سعی و عمل کے ساتھ مشروط ہے یعنی ایسا نہیں ہو سکتا کہ کوئی صالح گروہ زمین پر حق کے لیے جد وجہد نہ کر رہا ہو پھر بھی کائنات کی قوتیں محض اس لیے اس کا ساتھ دیں کہ وہ صالح ہے بلکہ جد وجہد کی ابتدار اہل ایمان کی جانب سے ہونی چاہیے۔ پھر قوائے فطرت اس کے لیے سامان امداد بہم پہنچاتی ہیں۔ فطرت کائنات اس کی مقتضی ہے کہ کوئی گروہ قیام حق کے لیے کھڑا ہو اور جب ایسا کوئی گروہ نمودار ہوتا ہے تو قدرت اس کے لیے سروسامان کامیابی بہم پہنچاتی ہے۔ یہی صورت حال فرعون کے مقابلہ میں بنی اسرائیل اور حضرت موسیٰ کے لیے رونما ہوئی بما صبروا اسی کی طرف اشارہ ہوا ہے۔

۱۶۳- اور وارث بنا دیا ہم نے ان لوگوں کو جن کو کمزور سمجھا جاتا تھا اس ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا جو ہماری بخشی ہوئی برکتوں سے مالا مال ہے۔ یعنی بنی اسرائیل کو اکثر مفسرین کے نزدیک اس زمین سے مراد ملک شام ہے جس میں حق تعالیٰ نے بہت سی ظاہری و باطنی برکات ودیعت کی ہیں۔ ظاہری تو یہی ہے کہ نہایت سرسبز و شاداب سیر حاصل خوشش منظر اور زرخیز ملک ہے۔ اور باطنی اس لیے کہ بہت سے انبیاء علیہم السلام کا مدفن ہے۔ بنی اسرائیل مصر سے نکل کر ایک عرصہ تک صحرائے تیہ میں سرگرداں پھرتے رہے جیسا کہ پہلے گزر چکا بعدہ حضرت یوشع کے ساتھ ہو کر عمالقہ سے جہاد کیا اور اپنے آبائی وطن یک شام کے وارث بنے۔ بعض مفسرین نے اس زمین سے مصر مراد لیا ہے یعنی فرعونیوں کو غرق کر کے ہم نے بنی اسرائیل کو مصر کی دولت کا وارث بنا دیا کہ آزادی کے ساتھ اس سے متمتع ہوں۔

کم ترکوا من جنات وعیون و زروع و مقام کریم و نعمۃ کانوا فیھا فاکھین کذالک واورثناھا قوما آخرین۔

کتنے ہی باغ اور چشمے اور کھیت اور شاندار محل جو وہ چھوڑ گئے اور کتنے عیش کے

سرو سامان جن میں وہ مزے کرتے تھے ان کے پیچھے رہ گئے یہ ہوا ان کا انجام اور ہم نے دوسروں کو ان کا وارث بنا دیا۔ (سورہ الدخان رکوع نمبر ۱)

و نرید ان نمن علی الذین استضعفوا فی الارض و نجعلھم ائمۃ و نجعلھم الوارثین و نمکن لھم فی الارض و نری فرعون و ھامان و جنودھما منھم ما کانوا یحذرون۔

اور ہم یہ ارادہ رکھتے تھے کہ مہربانی کریں ان لوگوں پر جو زمین میں ذلیل کر کے رکھے گئے تھے اور انہیں پیشوا بنا دیں اور ان ہی کو وارث بنا دیں اور زمین میں ان کو اقتدار بخشیں اور ان فرعون اور ہامان کے لشکر کو وہ کچھ دکھائیں جس کا انہیں اندیشہ تھا۔

اس صورت میں مصر کی ظاہری برکات تو ظاہر ہیں۔ باطنی اس حیثیت سے ہوں گی کہ حضرت یوسف علیہ السلام وہیں مدفون ہوتے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام وہاں تشریف لے گئے اور آخر میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بچپن سے لے کر بڑی عمر تک طویل مدت اسی ملک میں گزاری۔ امام بغوی نے مفسرین کے دونوں قول جمع کر کے اس جگہ مصر و شام دونوں مراد لیے ہیں۔[1]

اس آیت میں تین اہم باتیں کہی گئی ہیں

ایک یہ کہ بنی اسرائیل کو حقیر و کمزور سمجھا جاتا تھا

دوسرے یہ کہ ہم نے بنی اسرائیل کو ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا وارث بنا دیا۔

تیسرے یہ کہ جس سرزمین کی بنی اسرائیل کو وراثت ملی تھی اس کو سرزمین کو ہم نے برکتوں سے مالا مال کیا تھا۔

پہلی بات تو بے غبار ہے کہ فرعونیوں کی نظر میں بنی اسرائیل حقیر و کمزور تھے اور غلامی نے ان میں عزم و ہمت کو بالکل نہ چھوڑا تھا۔ وہ اس قدر بے بس تھے کہ کسی حکومت کا مقابلہ کرنے کی ان میں تاب نہ تھی۔ ان حالات میں ان کے بارے میں وہم بھی نہ ہو سکتا تھا کہ منصب حکمرانی پر فائز ہوں گے۔

دوسری بات کہ ہم نے بنی اسرائیل کو ملک کے مشرقی اور مغربی حصوں کا وارث بنا دیا۔ اس

[1] افادات شیخ الاسلام

ملک سے جس کا بنی اسرائیل کو وارث بنایا کون سا مراد ہے۔ اس موضوع پر شارحین قرآن کے صرف دو ہی نہیں بلکہ تین خیال ہیں۔

ایک یہ کہ شام و فلسطین مراد ہے یہ حضرت قتادہ، الحسن البصری، زید بن اسلم کی رائے ہے۔

دوسرا خیال یہ ہے کہ اس سے مراد سرزمین مصر ہے اور تیسری رائے یہ ہے کہ دونوں مراد ہیں۔

پہلی رائے کو عام شارحین کے یہاں شرف پذیرائی حاصل ہے کیونکہ تاریخ اور قرآن دونوں اس کے موید ہیں۔ تاریخ سے یہ ثابت نہیں ہے کہ بنی اسرائیل ہجرت کے بعد پھر مصر واپس گئے ہوں اور خود قرآن کی دوسری تصریحات سے بھی اسی کی تائید ہوتی ہے۔ سورہ بقرہ، مائدہ، اعراف اور سورہ طٰہٰ میں جو حالات بیان کیے گئے ہیں۔ ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ فرعون کی غرقابی کے بعد بنی اسرائیل مصر کی طرف پلٹنے کے بجائے اپنی منزل مقصود فلسطین کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور پھر حضرت داؤد کے زمانے تک ان کی تاریخ میں جو واقعات بھی پیش آئے وہ پیش آئے جو آج جزیرہ نما سینا، شمالی عرب، شرق اردن اور فلسطین کے ناموں سے موسوم ہے اس لیے یہاں مشارق الارض و مغاربہا کا صحیح مفہوم یہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ملک مصر بنی اسرائیل کو بخش دیا بلکہ اس کا مفہوم یہ۔ ہے کہ فلسطین اور شام کا ملک جو مصر کے مشرق میں واقع ہے اور اس کے مغربی حصوں کا ملک یعنی جزیرہ نما سینا جو فلسطین کے مغرب میں ہے ہم نے ان کو دے دیا۔ یہ تمام علاقہ اس وقت مصری شاہنشاہی کا حصہ تھا کیونکہ اس وقت فرعون کی حکومت شام سے لیبیا اور بحر روم کے سواحل سے حبش تک تھی۔

اور یہاں بارکنا فیہا کی قید بھی بتا رہی ہے کہ اس ملک سے شام، فلسطین کا علاقہ مراد ہے کیونکہ یہ استعارہ عموماً قرآن میں فلسطین ہی کے لیے استعمال ہوا ہے اور کسی علاقہ کا نام لیے بغیر جب اس کی یہ صفت بیان کی جاتی ہے تو اس سے یہی علاقہ مراد ہوتا ہے۔ مثلاً سورہ بنی اسرائیل میں ہے۔ الی المسجد الاقصی الذی بارکنا حولہ اور سورہ انبیاء میں ارشاد ہوا ہے و نجینٰہ و لوطاً الی الارض التی بارکنا فیہا للعالمین اور عاصفۃ تجری بامرہ الی الارض التی بارکنا فیہا اسی طرح سورہ سبا میں ہے القری التی بارکنا فیہا، کے الفاظ سرزمین شام و فلسطین ہی کی بستیوں کے متعلق استعمال ہوتے ہیں۔ اس بنا پر راجح یہی ہے کہ آیت میں الارض سے مراد سرزمین فلسطین و شام ہے اور اس سرزمین میں چونکہ پہلے فرعون کی ہی حکومت تھی اس لیے یہاں اورثنا کی تعبیر اختیار فرمائی اور سورہ الشعراء میں جہاں فرعونیوں کے باغوں، چشموں، خزانوں اور

بہترین قیام گاہوں سے محرومی کا ذکر ہے وہاں بھی مصر کے نہیں بلکہ فلسطین و شام کے باغات، چشمے اور خزانے مراد ہیں۔

حضرت لیث بن سعد کی رائے میں اس سرزمین سے سرزمین مصر ہی مراد ہے۔ ان کے خیال میں فرعون کے اموال املاک کا بنی اسرائیل کو اللہ نے وارث بنایا تھا لیکن تاریخ سے اس کی تائید نہیں ہوتی ہے۔

بنی اسرائیل کی ہمت و استقامت

۱۶۴۔ اس طرح تیرے رب کا پسندیدہ فرمان بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوا کیونکہ وہ ہمت و ثبات کے ساتھ جمے رہے۔ یعنی بنی اسرائیل نے جب فرعونیوں کے سخت تباہ کن شدائد پر صبر کیا۔ موسیٰ علیہ السلام کی ہدایت کے موافق خدا سے استعانت اور خدا کے رسول کا ساتھ دیا تو اللہ سبحانہ نے جو نیک وعدہ ان سے کیا تھا عسیٰ ربکم ان یہلک عدوکم اور نرید ان نمن علی الذین استضعفوا وہ پورا کر دکھایا۔[1]

اس میں قرآن نے پہلے اس وعدے کی طرف اشارہ کیا ہے جس کا ذکر پہلے عسیٰ ربکم ان یہلک میں ہو چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو وعدہ اللہ سبحانہ نے بنی اسرائیل کے آباؤ اجداد سے کیا تھا اور جس کی تجدید بالآخر حضرت موسیٰ نے فرمائی وہ وعدہ بالآخر ہلاکت فرعون سے پورا ہوا۔ پورا ہونے کا مطلب بالکل واضح اور صاف یہ ہے کہ اب اس کا حصہ باقی نہیں رہا۔ اور دوسری بات اس میں جو ارشاد فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ یہ وعدہ اس طرح پورا ہوا کہ اس کے حصول کے لیے بنی اسرائیل نے صبر کا مثالی کردار پیش کیا۔ یہ بات نہیں کہ مجرد خاندان و نسب کسی کو خدا کا چہیتا بنا دیتا ہے۔ لفظ صبر میں بہت بڑی اور گہری معنویت ہے۔ صبر کے تین معنے یہاں بھی ملحوظ ہیں۔ رکنا، سہنا، اور ڈٹنا۔ رکنا یہ کہ وہ اللہ کی نافرمانیوں سے زندگی کے ہر شعبے میں رک گئے۔ اور سہنا یہ کہ اس راہ میں فرعون کی جانب سے جو شدائد اور تکلیفیں آئیں ان کو برداشت کیا۔ اور ڈٹنا یہ کہ اللہ کی جانب سے ان پر جو فرائض عاید ہوتے ان پر پوری طرح کاربند رہے۔ یہی جہاد ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو جاتی ہے۔ اپنے ایمان کا امتحان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرنا چاہتے ہو تو دیکھو خدا کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی خواہش تم میں کتنی ہے۔ کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ قرآن کی یہ آیت ہمارے لیے درسِ عبرت ہے۔ غور کیجئے آج کتنے مسلمان ہیں جن کے قلوب جہاد فی سبیل اللہ کی خواہش سے معمور ہیں۔ جو لوگ ہم میں سب سے اچھے ہیں انہیں کے دلوں کا جائزہ لیجئے کیا ان میں سرفروشی اور جاں نثاری کی آرزو کہیں جھلکتی نظر آتی ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کی خواہش تو اسی صورت میں پیدا ہو سکتی جب ہم بنی اسرائیل کی طرح غیر اسلامی ماحول اور کافرانہ نظامِ تمدن سے غیر مطمئن ہوں اور اسے بدلنے کی آرزو رکھتے ہوں اور کہتے ہوں ربنا لا تجعلنا فتنۃ للقوم الظالمین و نجنا برحمتک من القوم الکافرین۔ وہ لوگ جہاد کی تمنا کیوں کرنے لگے جو موجودہ ماحول کی آسائشوں اور نعمتوں اور کافرانہ نظامات کے منافع سے استفادہ کر رہے ہوں اور نہ اس استفادہ کو برا سمجھتے ہوں اور نہ ان نظامات سے باہر نکلنا چاہتے ہوں، جو لوگ غیر اسلامی نظامات اور باطل افکار و اقدار کی خدمت کرنے اور ان سے نفع حاصل کرنے کے بعد محض رسوم و شعائر عبادت کی ادائیگی کی بنا پر اپنے تئیں نجات کا مستحق سمجھتے ہوں انہیں کیا پڑی ہے کہ حق کے قیام کی خاطر جان و مال کی قربانی دیں اور صداقت کی تبلیغ اور اشاعت کے لیے تکلیفیں اور مصیبتیں برداشت کریں۔ خدا کا کلمہ بلند کرنے کی خواہش اور اس کے لیے ایثار و قربانی کا جذبہ تو اس جماعت میں پیدا ہو سکتا ہے جو بنی اسرائیل کی طرح فرعونی تہذیب سے بیزار اور اس کی جگہ اسلامی تہذیب کے قیام کی آرزو مند ہو۔ اس کے برعکس غیر اسلامی نظاموں سے ہماری وابستگی اس قدر پختہ ہو گئی ہے کہ نہ صرف ان نظاموں سے باہر نکلنے کی خواہش ہم میں باقی نہیں رہی ہے بلکہ جب کبھی ان نظاموں کو خطرہ لاحق ہوتا ہے ہماری تمام کوششیں ان نظاموں کی حفاظت و بقا میں مصروف ہو جاتی ہیں۔ ہم میں سے جو لوگ فی الجملہ دیندار ہیں انہوں نے بھی عبادات و ریاضیات اور معاشرتی فرائض کی ادائیگی کو پورا اسلام سمجھ رکھا ہے حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کی داستان میں ان کے لیے سرمۂ چشم بصیرت ہے۔ ان کا حال یہ ہے کہ چند عبادات کو ادا کر لینے کے بعد وہ غیر اسلامی تہذیب و تمدن کی جگہ اسلامی تہذیب و تمدن کے قیام کی نہ ان میں آرزو باقی رہ گئی ہے اور نہ اس کے لیے وہ کسی قسم کی جد و جہد کرنے پر آمادہ ہیں۔ اگر اس آیتِ قرآنی کی روشنی میں ہم اپنے آپ کا جائزہ لیں تو معلوم ہوگا کہ ہم میں سے ننانوے فی صد بلکہ اس سے زیادہ اشخاص نظامِ کفر کے مقابلہ میں ماصبروا کی عملی تفسیر سے تہی دامن ہیں۔ جب تک مسلمان عملاً اس کا نمونہ بنیں گے یہ ساری سیاست بازی اور نمائشی تنظیم

کچھ کام نہ آسکے گی اور ذلت و رسوائی کا داغ ہماری قومی پیشانی پر اسی طرح لگا رہے گا۔ خواہ ہم میں سے ہر شخص سال کی ساری راتوں اور دنوں میں دوازدہ تسبیحات کا ورد کرتا رہے اور ہمارا ہر نوجوان علوم دینی میں کامل اور ماہر بن کر آسمانِ شہرت پر چمکنے لگے۔ یہ آیت ہم سے مطالبہ کرتی ہے کہ ہم بنی اسرائیل کی طرح فرعون کے کافرانہ نظام کو مٹانے اور اسلامی نظامِ تمدن کے قیام اور دینِ حق کے غلبہ کی خاطر خدا کی راہ میں صعوبتیں برداشت کی جائیں اور اللہ کا کلمہ بلند کرنے کے لیے ایثار و جاں فروشی کی جائے چونکہ ہم اسلام کے معمولی فرائض و واجبات پر قانع ہو گئے ہیں اور فضیلت کے اعلیٰ مقام تک پہنچنے کی آرزو سے ہمارے دل خالی ہو چکے ہیں اسی لیے ہم پر پستی اور دوں ہمتی طاری ہے۔ نیکی یہ ہے کہ وہ خدا کی راہ میں قربانیاں اور نبوت کا لایا ہوا نظامِ علم و عمل قائم کرنے کے لیے محنت کرے لیکن ان دونوں نیکیوں میں عظیم الشان فرق ہے۔ جو لوگ صرف ادنیٰ نیکیوں پر قناعت کر لیتے ہیں انہیں دنیا میں ترقی اور سربلندی کی خواہش سے بھی دستبردار ہونا پڑتا ہے۔ رفعت و سربلندی صرف ان قوموں کے لیے ہے جو اعلیٰ ترین نیکیوں اور بلند ترین درجات کے لیے کوشاں رہتی ہیں۔ انسان کی کامیابیاں اور مسرتیں اس کے تخیل کی رفعت کے اعتبار سے کم یا زیادہ ہوتی ہیں۔ اگر تخیل بلند ہے تو کامیابیاں اور مسرتیں بھی بلند ہوں گی۔ ہم نے اسلام کا پست تصور قائم کر رکھا ہے اس لیے ہماری کامیابیوں کا دائرہ محدود اور مسرتوں کی سطح پست ہے۔

حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو جو اسلام کا تصور دیا تھا وہ صرف بنی اسرائیل کی نجات کا تصور تھا۔ قرآن نے مسلمانوں کو جو اسلام کا تصور دیا ہے وہ صرف شخصی نجات کا نہیں بلکہ پورے عالم کی نجات کا تصور ہے۔ ظاہر ہے کہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے اور اس کے نتیجہ میں ان کوششوں اور محنتوں میں بھی فرق ہوگا جو اسلام کی خاطر بنی اسرائیل نے کیں اور جو مسلمانوں کو کرنی چاہئیں۔ ان کا مقابلہ اگر فرعونِ مصر سے ہوا تو مسلمانوں کا مقابلہ پورے عالم کے فراعنہ سے ہوگا۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن نے مسلمانوں سے کہا ہے کہ اپنی نجات چاہتے ہو تو دنیا بھر کی نجات کی فکر لے کر اٹھ کھڑے ہو۔ اسی وجہ سے مسلمانوں کو صرف اپنے اعمال کی اصلاح کا حکم نہیں دیا گیا ہے بلکہ ایک قدم بڑھ کر تمام انسانوں کی بھلائی اور برائی کا ذمہ دار قرار دیا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر اس حکم کی مصلحت یہ ہے کہ جو شخص اپنے آپ کو دوسرے کی بھلائی اور برائی کا ذمہ دار سمجھے گا وہ لازماً اپنے اعمال کی اصلاح کے لیے بھی کوشاں رہے گا ورنہ سوسائٹی خود اسے ملامت کرے گی کہ دوسروں کو نصیحت کرنے سے

پہلے اسے اپنے اعمال درست کرنے چاہئیں۔ نیز اس فرض کی انجام دہی میں اس کا اس سے احتساب کرتا رہے گا لیکن دوسروں کو نیکی کی طرف دعوت دینا اور برائی سے روکنا اس وقت ممکن ہے جب دوسرے لوگ اس کی بتائی ہوئی نیکی کو نیکی خیال کریں اور جس بات کو وہ برا خیال کرے اسے برا سمجھیں بالفاظِ دیگر اصلاحِ اعمال کی کوشش اسی وقت کامیاب ہو سکتی ہے جب خیر و شر کا وہ تصور اور حق و باطل کا وہ معیار عملاً کارفرما ہو جس کی طرف ہمیں دنیا کو دعوت دینی ہے۔ جہاں فرعونی نظام نے غلبہ پا کر انسان کے معیارِ ترک و اختیار اور اقدارِ حیات کو الٹ کر رکھ دیا ہو وہاں نیکی کی طرف دعوت دینا اور برائی سے روکنا ایک فعل عبث ہے کیونکہ جب تک نیکی اور بدی کا معیار پھر سے قائم نہ ہو جائے لوگ آپ کی دعوت کو جنون یا دقیانوسیت پر محمول کر کے حق سے اعراض کریں گے الناس علی دین ملوکھم ایک تلخ حقیقت ہے جس سے آپ منہ نہیں موڑ سکتے۔ جو نظام تمدن دنیا پر غالب ہوگا اور جس قوم کی تہذیبی برتری عملاً قائم ہوگی اس کے اقدار و غایات دوسرے تمام انسانوں کے اقدار و غایات کا ماخذ ہوں گے اور اسی کا معیار خیر و شر دنیا میں رائج ہوگا۔ صرف غیر مسلم ہی نہیں بلکہ مسلمان بھی شعوری یا غیر شعوری طور پر انہی خیالات و نظریات کا دم بھریں گے جو حکمران تہذیب اپنے ساتھ لاتی ہے پوری تاریخ اس حقیقت پر شاہد ہے۔ یہی راز ہے حضرت موسیٰ کے اس مطالبہ کا کہ ان ارسل معنا بنی اسرائیل کیونکہ اگر اپنے آپ کو نیک بنانا ہے تو پہلے باطل نظامات کے پیدا کیے ہوئے نظریات و افکار کو توڑنا ہوگا اور اسلامی معیار خیر و شر کو قائم کرنا ہوگا۔

فرعونی تہذیب و تمدن کی تباہی

۱۳۷۔ اور فرعون اور اس کی قوم جو بناتے رہے تھے اور جو بلندیاں اٹھاتے رہے تھے ہم نے سب درہم برہم کر دیے۔ یعنی فرعون اور اس کی قوم نے اپنے کبر و نخوت کے اظہار کے لیے جو ڈھونگ بنا رکھا تھا وہ سب تباہ و برباد ہو گیا اور ان کی اونچی اونچی عمارتیں تہ و بالا کر دی گئیں[1] مطلب یہ ہے کہ نظامِ باطل جس نظامِ تمدن و تہذیب کی تخلیق کی تھی اس کو تباہ برباد کر دیا گیا۔ لیکن یہ تباہی کیوں کر ہوئی، اس وقت ہوئی جب اسلامی نظامِ عدل و حق کو قائم کرنے کا مقصد

۱؎ افادات شیخ الاسلام

بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی قیادت میں لے کر کھڑے ہو گئے۔ جماعت ہو یا فرد مقاصد کی کشش، اس کی جدوجہد کا اصلی محرک ہے۔ اسلام ایک نظام حیات ہے۔ یہ پورا نظام اعلاء کلمۃ اللہ اور دین حق کے قیام کی سعی و طلب پر استوار ہے۔ روزہ، نماز، عبادات و فرائض اور اوامر و نواہی سب کے سب بالآخر اس غایت اصلی کے تابع ہیں کہ خدا کی زمین پر بس اس کی بندگی کی جائے اور معبودانِ باطل کو ہر جگہ سے نکال دیا جائے۔ خواہ یہ معبود ہوائے نفس کی شکل میں ہو یا دیوتاؤں اور بتوں کی، طبقاتی اور قومی مفاد کی صورت میں ظاہر ہوں یا آمروں لیڈروں اور فرعون جیسے بادشاہوں کا بھیس بدل کر آئیں۔ فرعونی نظام تہذیب و تمدن کی تباہی کا راز اور اس حیرت انگیز انقلاب کی وجہ بس اور صرف یہ تھی کہ بنی اسرائیل میں حضرت موسیٰ کی تعلیم کی برکت سے اعلاء کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دے کر اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی طلب و آرزو پیدا ہو گئی تھی۔ ان میں اسلام کے اخلاقی اقدار اور نبوت کے معیارِ خیر و شر کو فرعون کے معیارِ خیر و شر پر حکمران بنا کر اپنے اللہ کو راضی کرنے کی خواہش تھی اور بس ہمیں بھی بنی اسرائیل کے آئینے میں اپنا چہرہ دیکھنا چاہیے۔ قرآن نے اس کو ہمارے لیے یہ کہہ کر آئینہ بنایا۔

انا ارسلنا الیکم رسولاً شاھداً علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولاً

بلاشبہ ہم نے تمہاری طرف ایسا ہی عظیم المرتبت پیغامبر روانہ کیا شاہد بنا کر جیسا کہ ہم نے فرعون کی طرف رسول بھیجا۔

عہدِ رسالت کے مسلمانوں کو آج کل کے مسلمانوں سے یہی چیز ممیز کرتی ہے کہ ان میں اس مقصد کی لگن اور اس کا صحیح شعور تھا۔ ان کو احساس تھا کہ اللہ نے اس لیے ان کو مبعوث کیا ہے کہ وہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔ انسانوں کی بندگی چھڑا کر اللہ کی بندگی پر آمادہ کریں۔ اور انہیں دُنیا کی تنگی سے نکال کر کشادگی کی طرف لائیں اور مذاہب کی کجروی اور بے اعتدالی سے نکال کر اسلام کی صراطِ مستقیم پر لگائیں۔ وہ اس تخیل کے داعی تھے اور اس سے ان کو اتنی شدید محبت تھی کہ اس کے لیے کوئی قربانی نہ تھی جسے انہوں نے گوارا نہ کیا ہو اور کوئی مشقت نہ تھی جو انہوں نے سہی نہ ہو۔

بہر حال حضرت موسیٰ، بنی اسرائیل کی داستان میں ہمارے لیے بہت بڑی عبرت کی باتیں ہیں یہی وجہ ہے کہ قرآن میں حضرت موسیٰ کے واقعات کو تفصیل اور تکرار سے پیش کیا گیا ہے۔

یہ آیت واشگاف طور پر بتا رہی ہے کہ اللہ کا وعدۂ نصرت ان ہی کے حق میں پورا ہوتا ہے جو اس کی شرط کو پورا کریں۔ یعنی راہِ عمل میں جمے رہیں اگر بنی اسرائیل یہ شرط پوری نہ کرتے تو کامیابی سے محروم رہتے ۞

وَجٰوَزْنَا بِبَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ الْبَحْرَ فَاَتَوْا عَلٰي قَوْمٍ يَّعْكُفُوْنَ عَلٰٓي
اَصْنَامٍ لَّهُمْ ۚ قَالُوْا يٰمُوْسَى اجْعَلْ لَّنَآ اِلٰهًا كَمَا لَهُمْ اٰلِهَةٌ ۭ قَالَ
اِنَّكُمْ قَوْمٌ تَجْهَلُوْنَ ﴿١٣٨﴾ اِنَّ هٰٓؤُلَاۗءِ مُتَبَّرٌ مَّا هُمْ فِيْهِ وَبٰطِلٌ مَّا
كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿١٣٩﴾ قَالَ اَغَيْرَ اللّٰهِ اَبْغِيْكُمْ اِلٰهًا وَّهُوَ فَضَّلَكُمْ
عَلَي الْعٰلَمِيْنَ ﴿١٤٠﴾ وَاِذْ اَنْجَيْنٰكُمْ مِّنْ اٰلِ فِرْعَوْنَ يَسُوْمُوْنَكُمْ
سُوْۗءَ الْعَذَابِ ۚ يُقَتِّلُوْنَ اَبْنَاۗءَكُمْ وَيَسْتَحْيُوْنَ نِسَاۗءَكُمْ ۭ وَفِيْ
ذٰلِكُمْ بَلَاۗءٌ مِّنْ رَّبِّكُمْ عَظِيْمٌ ﴿١٤١﴾

اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا، اُن کا گزر ایسے لوگوں پر ہوا جو اپنے کچھ بتوں پر مجاور بنے بیٹھے تھے[166]۔ بنی اسرائیل نے کہا اے موسیٰ ہمارے لیے بھی کوئی ایسا ہی معبود بنا دے جیسے ان لوگوں کے معبود ہیں، موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بلاشبہ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ یہ لوگ جس طریقہ پر چل رہے ہیں

وہ تو تباہی کا راستہ ہے اور انہوں نے جو عمل اختیار کیا ہے وہ بالکل غلط ہے[۱۶۸]۔ کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی اور معبود تلاش کر دوں، حالانکہ یہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے تمہیں دُنیا کی قوموں پر بزرگی عطا فرمائی ہے[۱۶۹]۔ اور اللہ فرماتا ہے کہ اے بنی اسرائیل وہ وقت یاد کرو کہ ہم نے تمہیں فرعون کی قوم سے نجات دی وہ تمہیں سنگین سزا دیتا تھا تمہارے لڑکوں کو قتل کرتا اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتا تھا اور اس میں تمہارے رب کی جانب سے بڑی ہی آزمائش تھی[۱۷۰]۔

معانی مفردات

یعکفون، عکوف سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔ عکوف کے معنے ہیں تعظیم کے طور پر کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا اور اس کو لازم پکڑ لینا۔ تاج المصادر میں اس کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں۔ روکا جانا، کسی چیز کی طرف متوجہ ہونا، کسی چیز کے گرد جمع ہونا۔ کسی جگہ میں مقیم ہونا ارشاد باری العاکف فیہ والباد کے متعلق ابوبکر الجصاص فرماتے ہیں کہ سلف کی ایک جماعت سے مروی ہے کہ عاکف سے مراد اہل حرم اور الباد سے مراد غیر اہل حرم ہیں اور ظلت علیہ عاکفاً میں عاکف بمعنی مجاور ہے کیونکہ جب عکوف کا صلہ علیٰ آتا ہے جیسے

یہاں یکفون علی اصنام لہم تو اس کے معنے ہوتے ہیں کسی چیز کی طرف اس طرح لگنا کہ منہ ہی نہ موڑے۔ تاج العروس میں ہے عکف علیہ اقبل علیہ مواظبا لا یصرف وجہہ عنہ یعنی اس کی طرف اس اہتمام سے متوجہ ہوا کہ ادھر سے کہ منہ ہی نہیں ہٹاتا سوء العذاب علامہ سید مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے کہ یہ آفات وامراض کا ایک جامع نام ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ سوء ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں ڈال دے خواہ دنیوی امور میں سے یا اخروی امور سے احوال نفسیہ سے ہو یا احوال بدنیہ سے یا ان حالات میں سے ہو جو جاہ و مال کے چھوٹ جانے سے اور دوست کے بچھڑ جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ قرآن میں اس کا استعمال چند معانی میں ہوا ہے۔ علامہ جلال الدین السیوطی نے ان کو الاتقان فی علوم القرآن میں تفصیل سے بیان کیا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سوء کس طرح پر استعمال ہوتا ہے۔ شدت کے لیے جیسے یسومونکم سوء العذاب کونچیں کاٹنے کے لیے جیسے لا تمسوھا بسوء، زنا کے لیے من اراد باھلک سوء برص کے لیے بیضاء من غیر سوء عذاب کے لیے السوء علی الکافرین شرک کے لیے ماکنا نعمل من سوء، گالی گلوچ اور یاوہ گوئی کے لیے لا یحب اللّٰہ الجھر بالسوء گناہ کے لیے ویعملون السوء بجھالۃ ضرر کے لیے و یکشف السوء قتل و ہزیمت کے لیے لم یمسسھم سوء بلاء، آزمائش مصدر ہے جب اس کی ماضی باب سمع سے آتی ہے تو اس کے معنے بوسیدہ ہونے کے آتے ہیں اور جب باب نصر سے آتی ہے تو امتحان و آزمائش کے معنے ہوتے ہیں۔ غم کو بھی بلاء اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ جسم کو گھلا دیتا ہے۔ تکلیف کو بھی بلا اسی لیے کہتے ہیں کہ جتنی تکلیفیں ہیں سب بدن پر گراں ہیں۔ قرآن کی آیت ولنبلونکم حتیٰ نعلم المجاھدین منکم والصابرین سے ظاہر ہے کہ تکالیف آزمائش کے لیے ہوتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ کبھی تو بندوں کو فراخی دے کر آزماتا ہے اور کبھی تنگی کے ذریعے آزماتا ہے ارشاد ہے ونبلوکم بالشر والخیر فتنۃ بہ نسبت شکر کے صبر کے حقوق کی بجاآوری زیادہ آسان ہے اسی لیے نعمت سے بہ نسبت محنت و مشقت کے زیادہ آزمائش ہے۔ حضرت عمر فرماتے ہیں بلینا بالضراء فصبرنا و بلینا بالسراء فلم نصبر اس آیت فی ذالکم بلاء من ربکم عظیم میں نعمت و مشقت دونوں طرح کی آزمائش مذکور ہے۔ فرعون سے نجات دینا نعمت ہے اور بچوں کا قتل اور عورتوں کا زندہ رکھنا مشقت ہے۔

وادیٔ سینا کے مندر اور بنی اسرائیل

دُنیا کی تاریخ میں یہ بڑی حیرت زا اور عجیب بات ہے کہ بنی اسرائیل تقریباً ساڑھے چار سو سال سے مصر کے قاہر و جابر بادشاہوں اور مصری قوم کے ہاتھوں میں غلام اور مظلوم اور غالب قوم کے سخت سے سخت مصائب و مظالم کا شکار بن رہی ہے کہ اچانک اسی مردہ قوم میں سے بجلی کی کڑک اور آفتاب کی چمک کی طرح ایک برگزیدہ ہستی سامنے آتی ہے اور اس کی صدائے حق اور اعلانِ ہدایت سے تمام باطل کی قوتیں لرزہ براندام ہو جاتی ہیں۔ اور ایوانِ ظلم و کفر میں زلزلہ آجاتا ہے۔ رسُول ہونے کی حیثیت میں حضرت موسیٰ دُنیا کی ایک زبردست متمدن طاقت کے مقابلہ میں خدا کے رسُول ہونے کا اعلان کرتا ہے اور فرعون کو مخاطب کر کے کہتا ہے میں تجھ کو ہدایت کی پیروی اور مظلوموں کی آزادی کا پیغام سنانے آیا ہوں۔ فرعونی طاقت اپنے تمام مادی اسباب کے ساتھ ان کا مقابلہ کرتی ہے مگر ہر بار شکست کھاتی ہے۔ اور آخری بازی میں حق کی کامیابی اور باطل کی ہلاکت کا ایسا حیرت زا نقشہ سامنے آتا ہے کہ مادی طاقت قلزم میں غرق ہو جاتی ہے اور غلام و مظلوم قوم اور دُنیوی اسباب سے محروم قوم آزادی کی فضا میں سانس لیتی ہے۔ صورتِ حال کیسی عجیب ہے کہ فرعون ختم ہو چکا ہے بنی اسرائیل جشنِ مسرت منا رہے ہیں۔ اور اس شادمانی میں حضرت موسیٰ سے سینا کے بُت کدوں میں بُتوں کی پوجا پاٹ کو دیکھ کر یہ مطالبہ کر رہے ہیں کہ ہمیں بھی ایسے ہی معبود بنا دو۔ اِنّا للّٰہ فالی اللّٰہ المشتکی۔

۱۶۶۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو سمندر سے پار کر دیا، ان کا گزر کچھ ایسے لوگوں پر ہوا جو اپنے کچھ بتوں پر مجاور بنے بیٹھے تھے۔ بعض نے کہا کہ یہ قبیلہ لخم کے لوگ تھے اور بعض نے کنعانی عمالقہ کو اس کا مصداق قرار دیا ہے کہتے ہیں کہ ان کے بُت گائے کی شکل پر تھے۔ واللّٰہ اعلم[1]

یہاں جس قوم کا ذکر ہے اس سے کون مراد ہیں۔ ظاہری یہی ہے کہ بنی اسرائیل مصر سے نکل کر سرزمینِ عرب میں داخل ہو رہے ہیں تو اس سے مراد کوئی عرب قوم ہی ہے۔ حضرت قتادہ کا انکشاف یہ ہے کہ اس سے مراد قبیلہ لخم ہے۔ اور دوسرے کہتے ہیں کہ لخم و جذام ہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور علامہ آلوسی نے مجہول کے صیغہ کی تعبیر میں ان کو کنعانی عمالقہ کہا ہے - اور ہماری رائے میں یہی زیادہ قرین قیاس ہے - ابن قتیبہ نے لکھا ہے کہ اہل عرب میں سے عمالقہ میں یہ متعدد قومیں جو ملکوں میں منتشر ہو گئی تھیں اور ان ہی میں مصر کے فراعنہ اور جبابرہ ہیں - مورخ یعقوبی نے بھی اسی قسم کی تصریح کی ہے بلکہ یاقوت نے تو معجم البلدان میں صاف لکھا ہے کہ مصر کے فرعون عمالقہ میں سے تھے - ان ہی میں حضرت ابراہیم کا فرعون اور حضرت یوسف کا فرعون اور حضرت موسیٰ کا فرعون ہے - مورخ ابن خلدون کی تحقیق ہے کہ قدیم باشندگان مصر کے بعض بادشاہوں نے اپنے زمانہ کے عمالقہ سے مدد مانگی وہ آیا اور مصر پر قبضہ کر لیا - ان ہی کے بقایا سینا میں آباد تھے - جب اہل مصر نے ان عمالقہ کو مصر سے نکال دیا اور ان کی حکومت کا مصر میں خاتمہ ہو گیا تو بنی اسرائیل جو سام بن نوح کی اولاد کی شاخ تھے اور عمالقہ کے دور میں طاقتور ہو گئے تھے اب مصریوں نے اپنی حکومت قائم کر لی تھی - انہوں نے چاہا کہ بنی اسرائیل کو کمزور کیا جائے - تورات میں ہے :

> اسرائیل کی اولاد برومند ہوئی اور بہت بڑھی اور فراواں ہوئی اور بہت زور پیدا کیا اور وہ زمین ان سے معمور ہوئی تب مصر میں ایک نیا بادشاہ جو یوسف کو نہ جانتا تھا پیدا ہوا اور اس نے اپنے لوگوں سے کہا دیکھو کہ بنی اسرائیل کے لوگ ہم سے زیادہ اور قوی تر ہیں - ہم ان کے ساتھ دانشمندانہ تدبیر کریں تا نہ ہووے کہ جب وہ اور زیادہ ہو جاویں اور جنگ پڑے تو ہمارے سے مل جائیں اور ہم سے لڑیں اور ہم کو نکال دیں -

ان الفاظ سے صاف ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل کا مصر میں معاملہ بالکل سیاسی نوعیت کا تھا - قرآن عزیز سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے - جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں یریدان یخرجکم بسحرہما یا ان ھذان لساحران یریدان ان یخرجاکم من ارضکم تورات کے اس فقرہ کا کہ تب مصر میں ایک نیا بادشاہ ہوا جو یوسف کو نہ جانتا تھا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ اب نئی حکومت آگئی جو بنی اسرائیل سے نفرت کرتی تھی - جن عمالقہ کی حضرت موسیٰ سے پہلے حکومت ختم ہوئی تھی ان ہی کا بقایا وادی سینا میں موجود تھا اور بت پرستی کر رہا تھا - یہاں مشہور مفسر قرآن ابن جریر کا یہ انکشاف بے حد وزنی ہے کہ یہ بت بچھڑے کے تھے - گائے بیل اور بچھڑے کی تقدیس کا خیال سمریوں میں بھی تھا اور مصریوں میں بھی - مصری اپنے دیوتا جو اس کا بت گائے

کی شکل کا بناتے تھے۔

بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ سے مطالبہ

۱۶۷۔ بنی اسرائیل نے کہا اے موسیٰ ہمارے لیے بھی کوئی ایسا معبود بنا دے جیسا کہ ان لوگوں کے لیے معبود ہیں موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بلاشبہ بڑی نادانی کی باتیں کرتے ہو۔ یعنی حق تعالیٰ کی عظمت، شان اور تنزیہہ و تقدیس سے تم بالکل جاہل معلوم ہوتے ہو۔ واقعہ یہ ہے کہ مدت دراز تک مصری بت پرستوں کے زیر سایہ رہنے کی وجہ سے بنی اسرائیل کا میلان بار بار اس طرح کے افعال اور رسوم شرکیہ کی طرف ہوتا تھا۔ یہ بیہودہ جاہلانہ درخواست بھی مصر کی آب و ہوا اور وہاں کے بت پرستوں کی صحبت کے تاثرات کو ظاہر کرتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ جاہل آدمی نرے بے صورت معبود کی عبادت سے تسکین نہیں پاتا جب تک سامنے ایک صورت نہ ہو وہ قوم دیکھی کہ ایک گائے کی صورت پوجتی تھی ان کو بھی یہ ہوس آئی آخر سونے کا بچھڑا بنایا اور پوجا۔[1]

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ مصر کی طویل غلامی نے بنی اسرائیل کی ذہنی و اخلاقی سطح اس حد تک پست کر دی تھی کہ حضرت موسیٰ کی صحبت میں خدا کے جمال و جلال کی اتنی شانیں دیکھنے کے بعد بھی وہ گویا ابھی مصر کی مشرکانہ تاریکیوں میں تھے اور توحید کے بارے میں ان کا مبلغ علم بے حد کمزور اور سطحی تھا۔ اسی بنا پر حضرت موسیٰ نے ان کو تجھلون کہہ کر مخاطب کیا ہے یعنی تم آیات عظیمہ دیکھنے کے باوجود اللہ سبحانہ کی عظمت سے قطعاً نابلد اور بے خبر ہو اور صرف بے خبر اور ناواقف نہیں بلکہ بیوقوف بھی ہو۔ اس سے معلوم ہوا کہ امتوں میں اللہ سے عابدانہ تعلقات ٹوٹنے کا ایک اہم سبب بے خبری اور ناواقفیت ہے۔ جس قدر مبلغ علمی ترقی کرے گا اسی قدر خدا کی معرفت زیادہ ہو گی اور جس قدر خداشناسی بڑھتی جائے گی اسی نسبت سے اللہ سے تعلقات عبادت قائم ہوتے جائیں گے۔ یہ سوال بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے اسلام کی حقیقت سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے کیا ہے۔ اگر ان کو پتہ ہوتا کہ اسلام یہ ہے تو وہ کبھی یہ سوال نہ کرتے۔ بت پرستوں میں رہ کر شرک بنی اسرائیل کی عادت میں داخل ہو گیا تھا۔ خود ہم پر بھی ہندوؤں کا اثر ہوا ہے یہاں تک کہ قبر پرستی کی صورت میں طرح طرح کے مشرکانہ عمل ہم کر رہے ہیں۔ اس کا بنیادی سبب دین

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نا آشنائی کے سوا کچھ نہیں ۔ اس آیت میں علماء کے لیے بہت بڑی عبرت ہے کہ حضرت موسیٰ خالص اس مشرکانہ ذہن رکھنے والوں پر کوئی فتویٰ نہیں لگاتے ہیں بلکہ سمجھائے ہیں کہ تم نادان اور بے خبر ہو عوامی زندگی جو اعمال نادانی اور بے خبری میں کرتی ہے اس کا بہترین علاج پہلے بے خبری کو دور کرنا ہے۔

نبی کے مخاطب دو طرح کے ہوتے ہیں ایک وہ جو نبوت کو نہیں مانتے اور دوسرے وہ جو مانتے ہیں۔ پہلے لوگوں کو اُمتِ دعوت کہتے ہیں اور دوسروں کو اُمتِ اجابت کہتے ہیں۔ فرعون اور مصر کے شہری حضرت موسیٰ کے لیے اُمتِ دعوت ہیں جبکہ بنی اسرائیل اُمت اجابت ہیں۔ اب تک جو سرگزشت بیان ہوئی ہے اس کا تعلق حضرت موسیٰ اور ان کی اُمتِ دعوت سے ہے۔ اور یہاں سے سرگزشت کا وہ حصہ شروع ہوا ہے جس کا تعلق حضرت موسیٰ اور اُمتِ اجابت سے ہے۔ پہلے حصہ میں یہ حقیقت واضح کی گئی کہ دعوتِ حق کی مخالفت ہمیشہ طاقتور جماعتوں نے کی ہے اور ہمیشہ ناکام رہی ہیں۔ اس حصہ میں یہ حقیقت واضح کی جا رہی ہے کہ نبی کی اُمت کو راہِ عمل میں کیسی کیسی لغزشیں پیش آسکتی ہیں تاکہ اہلِ ایمان اس سے آگاہ رہیں۔ غور فرمائیے کہ شرک سے بڑا کونسا گناہ اور کون سا ہو سکتا ہے خود علمبرداران توحید بھی اس راہ میں ٹھوکر کھا جاتے ہیں لیکن اس کا سبب خدا کی بغاوت نہیں بلکہ خدا نا آشنائی ہوتی ہے۔ اُمت میں یہ بیماری اصلاح طلب ضرور ہوتی ہے مگر مایوس کن نہیں ہوتی ہے۔ اس کا علاج مدعیانہ انداز میں یہ ہرگز نہیں کہ کفر کا میگزین کھول دیا جائے۔ یہ ان کی جہالت اور بے خبری سے ناجائز فائدہ اٹھانا ہے بلکہ اس کا علاج داعیانہ طریق پر یہ ہے کہ ان سے دین نا آشنائی کو دور کیا جائے۔ افسوس کہ ہم یہ سبق بھول چکے ہیں اور اس کے نتیجہ میں اُمت المناک حالات سے دوچار ہے۔ یہاں پہلے حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو اسلام نا آشنائی کا الزام دیا ہے اور بتایا ہے کہ تمہارا یہ مطالبہ علمی زمین، علمی اصولوں اور علمی حقائق پر مبنی نہیں ہے بلکہ سرتاسر جہل و نادانی پر مبنی ہے۔

شرک باطل کا گھروندا ہے

۱۶۸۔ یہ لوگ جس طریقہ پر چل رہے ہیں وہ تو تباہی کا راستہ ہے اور انہوں نے جو عمل اختیار کیا ہے وہ بالکل غلط ہے۔ یعنی ان کا بت پرستی کا مذہب میرے اور اہلِ حق کے ہاتھوں سے تباہ ہونے والا ہے اور جو کچھ سوانگ یہ اب تک بناتے رہے ہیں وہ محض باطل اور بالکل غلط بیکار اور بے حقیقت ہے۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اصل ارشاد میں متبر آیا ہے یہ تبار سے بنا ہے اس کے معنی تباہ ہونے کے ہیں اور تتبیر کے معنے تباہ کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ یعنی اصنام پرست ان کی تباہی اور بربادی کا فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب ان کا دور ختم ہو رہا ہے یہاں شرک کو سرنگوں ہونا ہے اور توحید کا جھنڈا بلند ہونا ہے اور یہ لوگ جو اعمال کر رہے ہیں خس و خاشاک کی طرح اڑ جائیں گے۔ ان کی زندگی کا کوئی سامان نہیں ہے کیونکہ باطل کی زندگی اسی وقت تک ہوتی ہے جب تک اس کے مقابلہ میں حق نہیں آتا۔ اب چونکہ نبوت حق کی علمبردار بن کر بصورت موسیٰ و ہارون آ چکی ہے اس لیے اب ان کی زندگی کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ گویا حضرت موسیٰ مستقبل کے متعلق پیشین گوئی فرماتے ہیں کہ ان ملکوں میں وثنیت اور بت پرستی کا مستقبل تاریک ہے اور تاریخ کہتی ہے کہ ہوا بھی ایسا ہی ہے۔

علامہ محی الدین بغوی یہاں یہودیوں کے اس مطالبہ پر کہ اجعل لنا الٰھا کما لھم آلھۃ پر یہ خوب لکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ بنی اسرائیل کی حضرت موسیٰ سے یہ درخواست اس بنا پر نہ تھی کہ بنی اسرائیل اللہ کی وحدانیت کے قائل نہ تھے یا ان کو خدا کی وحدانیت میں شک تھا بلکہ اس درخواست سے ان کا منشا صرف یہ تھا کہ ہمیں ایسا کوئی الٰہ مہیا کر دیجئے جس کی ہم تعظیم کریں اور اس تعظیم کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کریں۔ ان کے خیال میں اس طرز عمل سے ان کی دینداری میں کوئی خطرہ نہ تھا۔ یہی ان کی جہالت تھی۔

امام رازی نے یہاں ایک قدم اور آگے بڑھا کر یہ بات فرمائی ہے۔ یہ بات قطعاً محال ہے کہ ایک عقل مند آدمی حضرت موسیٰ سے یہ کہے اجعل لنا الٰھا ہمارے لیے خالق و مدبر بنا دیجئے کیونکہ حضرت موسیٰ کے بنانے اور ان کی تدبیر سے کوئی چیز کائنات کی خالق و مدبر نہیں ہو سکتی۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے یہ مطالبہ کیا کہ ان کے لیے کچھ بت یا تصاویر ایسی مقرر کر دیجئے جن سے عابدانہ تعلق قائم کر کے اللہ کا قرب حاصل کریں۔

حیرت ہے امام رازی نے لفظ الٰہ کے لغوی مدلول کو چھوڑ کر آیت میں اس کے کلامی مفہوم پر محمول کیا ہے۔ عربی لغت میں الٰہ کے معنے مطلق معبود کے ہیں۔ خالق و مدبر کے نہیں ہیں اور سب جانتے اور مانتے ہیں کہ دنیا کے شرک نے اللہ کی عبادت میں دوسروں کو شریک کیا ہے قرآن کی بے شمار آیتیں اس کی تائید میں پیش کی جا سکتی ہیں۔ خود اہل عرب بھی اپنے بتوں کو الٰہ کہتے تھے اور کوئی بھی اس کا معتقد نہ تھا کہ لات و عزیٰ اور منات وغیرہ کائنات کے خالق ہیں۔ وہ مانتے تھے کہ کائنات کا خالق اللہ ہے۔ ان کا شرک عبادت میں تھا۔ اللہ کے ساتھ ان کی عبادت

کرتے تھے۔ ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل بھی حضرت موسیٰ سے عبادت ہی میں شریک کی اجازت مانگ رہے تھے اور حضرت موسیٰ ان کے اسی فکر کو جاہلانہ فکر قرار دے رہے تھے۔ اس بات میں حضرت مرزا ان کو سمجھا رہے ہیں کہ جن کو تم بتوں کی عبادت کرتے دیکھ رہے ہو وہ دعوتِ توحید عبادت کے سیلاب میں خس و خاشاک کی طرح بہ جائیں گے۔ ان کا نام و نشان نہ رہے گا اور ان کے یہ بت بھی تباہ برباد ہو جائیں گے اور یہاں توحید عبادت کا پرچم لہرائے گا۔ اُمتوں میں علم کی کمی سے اس قسم کی اجتماعی کمزوریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور جس قدر نبوت کا لایا ہوا علم و عمل عام ہو تا جاتا ہے یہ کمزوریاں اس کی روشنی میں ختم ہو جاتی ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ اتنے تو نہیں گرے لیکن ایک موقعہ پر جب انہوں نے دیکھا کہ مشرکین نے ایک درخت مقرر کر رکھا ہے جس پر وہ اپنے ہتھیار لٹکا دیتے ہیں اور اسی مناسبت سے اس کو ذات انواط کہتے ہیں تو وہ بھی بے ساختہ یہ درخواست کرنے پر مجبور ہو گئے کہ یا رسول اللہ ہمارے لیے ذات انواط جیسا ایک درخت مقرر فرما دیجئے ہم بھی اس پر اپنے ہتھیار لٹکایا کریں گے۔ ذرا سوچئے اس میں شرک کی کیا بات تھی لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اتنی بات کو بھی نہایت اہمیت دی اور بہت تشدد آمیز لہجے میں اس طرح تنبیہہ فرمائی کہ تمہاری یہ فرمائش ٹھیک ایسی ہی ہے جیسے حضرت موسیٰ سے بنی اسرائیل نے کی تھی۔ اجعل لنا الٰہا کما لھم الٰھۃ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے شرک فی العبادۃ کی اجازت مانگی تھی۔ خدا کے علاوہ کسی اور کے خالق ہونے کا دہاں تصور بھی نہ تھا۔ امام رازی کے اندازِ بیان سے معلوم ہو رہا ہے کہ وہ اس سے شرک فی الذات مراد لے رہے ہیں۔ علم کلام کی حد تک تو شاید یہ بات درست ہو لیکن قرآن و سنت جس چیز کی بھرپور تردید کر رہا ہے وہ شرک فی الذات نہیں بلکہ شرک فی العبادت ہے بلکہ بقول حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ انبیاء کے مخاطب شرک فی الذات کے قائل ہی نہ تھے وہ صرف شرک فی العبادت کرتے تھے۔

بنی اسرائیل کی مخصوص ذمہ داری

۱۶۹- کیا تم چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے اللہ کے سوا کوئی اور معبود تلاش کر دوں حالانکہ یہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے تمہیں دُنیا کی قوموں پر فضیلت و بزرگی عطا فرمائی ہے۔ یعنی خدا کے انعامات عظیمہ کی شکر گزاری اور حق شناسی کیا یہی ہو سکتی ہے کہ غیر اللہ کی پرستش کر کے اللہ سے

بغاوت کی جاتے - پھر بڑی شرم کا مقام ہے کہ جس مخلوق کو خدا نے سارے جہان پر فضیلت دی ہے، وہ اپنے ہاتھ سے بنائی ہوئی مورتیوں کے سامنے سربسجود ہو جاتے کیا مفضول افضل کا معبود بن سکتا ہے۔[1] حضرت شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہا کیا اللہ کے سوا لا دوں تم کو کوئی معبود اور اس نے تم کو بزرگی دی سب جہانوں پر۔ مطلب یہ ہے کہ کیا میں اللہ رب العالمین خالق السماوات والارض کے علاوہ کوئی اور معبود تمہارے لیے تلاش کر دوں۔ یعنی معبود والہ تو صرف اللہ کی ذات ہی ہو سکتی ہے۔ اللہ کے علاوہ، اللہ کے ساتھ اور اللہ سے ورے کوئی تمہارا معبود نہیں ہو سکتا جس سے تم عابدانہ تعلقات قائم کرو۔ الٰہ کے معنی عربی زبان میں معبود کے ہیں۔ یعنی جس سے عابدانہ تعلقات وابستہ کیے جائیں وہ الٰہ ہے خواہ کوئی ہو۔ فرمایا کہ تمہارے عابدانہ تعلقات اللہ کے علاوہ کسی اور سے کیوں کر ہو سکتے ہیں یہ تو تمہارے اس منصب کے خلاف ہے جو اللہ نے تم کو عطا فرمایا ہے۔ اللہ نے ملت ابراہیم اور سنت انبیاء کے مطابق تمہیں دنیا میں توحید اور ہدایت کا علمبردار بنایا ہے۔ یہ تمہاری مخصوص ذمہ داری ہے کہ اللہ کی توحید عبادت کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا کام کرو۔ توحید کو دوسروں تک پہنچانے کا مطلب محض تبلیغ نہیں بلکہ ایسی تبلیغ ہے جس کی شہادت خود تمہاری زندگی میں ہو۔ شہادت دینا یہ ہے کہ توحید کو پہنچانے کا کام اسی طرح کیا جائے جس طرح حضرت موسیٰ و ہارون کر رہے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ عام امتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی تھیں اور وہ یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کرتی رہیں تو بنی اسرائیل اس عام ذمہ داری کے ساتھ ساتھ ایک ذمہ داری اور بھی رکھتی ہیں اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے توحید فی العبادت کو اس طرح پیش کریں جس طرح پیش کرنے کا حق ہے اور جس کا عملی نمونہ حضرت موسیٰ نے ان کے سامنے رکھا ہے۔

اس دور میں سب سے زیادہ ترقی یافتہ دنیا کی قوموں میں فرعون اور اس کی قوم تھی۔ علم و قوت تمدن و تہذیب، اقتدار اور بالادستی میں سب سے پیش پیش تھے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ و ہارون کو نبی بنا کر اس وقت کی ساری متمدن اور مہذب دنیا پر بنی اسرائیل کو فضیلت دی۔ منشا یہ ہے کہ اس مقام رفیع پر گامزن ہو کر تم عابدانہ تعلقات غیر اللہ سے قائم کرنا چاہتے ہو اغیر اللہ ابغیکم الٰھاً میں لفظ غیر اللہ بے حد عام ہے کمزور سے کمزور تر مخلوق سے لے کر طاقتور سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

طاقتور ترین مخلوق اس کا مصداق ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ مخلوق کی کوئی نوع کوئی جنس اور نوع کی کوئی فرد بھی یہ حق نہیں رکھتی کہ اس کی عبادت کی جاتے۔ بنی اسرائیل کی درخواست پر حضرت موسیٰ نے ان کو جاہل صرف اس لیے نہیں کہا کہ اصنام ایک کمتر ین چیز ہیں اور ان کی عبادت کمتری کی وجہ سے قائم ہے بلکہ ان کو جاہل اس لیے کہا ہے کہ عبادت غیر اللہ کا حق ہی نہیں خواہ یہ غیر اللہ عابد کے خیال میں کتنا ہی معزز و مکرم ہو اس میں کوئی تفریق نہیں ہے خواہ عبادت ملائکہ کی جاتے، عبادت انبیاً اور اولیاً کی کی جاتے۔ جو بھی اللہ کے سوا جس کی بھی عبادت کرتا ہے وہ قطعاً جہالت کا شکار ہے۔ اور ایک مومن کا نعرہ صرف ایاک نعبد ہونا چاہیے۔ یہ واضح کرنے کے بعد حضرت موسیٰ نے بتایا کہ جس بناوٹ کی بنیاد تمہارا جہل ہے اس کے لیے مجھے واسطہ بنانا چاہتے ہو یعنی تمہارا میرے سے یہ مطالبہ کرنا ایک طرف اگر تمہارے مقام الوہیت سے ناواقف ہونے کی علامت ہے تو دوسری طرف مقام نبوت سے ناآشنا ہونے کی نشانی ہے۔ میں الٰہ بنانے نہیں بلکہ بتانے آیا ہوں نبوت بناتی کچھ نہیں صرف راہ بتاتی ہے۔ بتانے کی حد تک میں اللہ کی الوہیت تمہیں بتا چکا ہوں تمہارا فرض ہے کہ اللہ سے اپنے عابدانہ تعلقات قائم کرو اور بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ تمہاری فضیلت تمہاری بزرگی اور شرف و مجد کا معیار ہی پوری دنیا میں یہ ہے کہ تم اللہ کی توحید کے علمبردار بنائے گئے۔ فضیلت سے مراد قوموں کی ہدایت و رہنمائی کا وہ منصب ہے جس کے لیے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کو ایک خاص منتخب فرمایا تھا۔ جو فضیلت کسی منصب کی ذمہ داریوں کے ساتھ وابستہ ہوتی ہے وہ ایک مشروط فضیلت ہوتی ہے۔ اگر صاحب منصب قوم اس ذمہ داری سے عہدہ برا ہوتی ہے تو یہ فضیلت اس کو حاصل رہتی ہے اور اگر اس کو چھوڑ بیٹھتی ہے تو صرف اس فضیلت ہی سے محروم نہیں ہوتی بلکہ کفران نعمت کی پاداش میں اس کو مزید براں ذلت نصیب ہوتی ہے۔ یہاں حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو یہ بات یاد دلاتی ہے کہ جو فضیلت تمہیں اللہ کی جانب سے ملی ہے یہ مطالبہ اس کے سرتا سر خلاف ہے۔ اگر اس کو باقی رکھنا چاہتے ہو تو اس کا حق ادا کرو۔ خدا سے عابدانہ تعلق توڑ کر تم اس فضیلت کو قائم نہیں رکھ سکتے۔ قوموں کی ہدایت و رہنمائی کے لیے بنی اسرائیل کے منتخب کیے جانے کا ذکر قرآن میں دوسرے انداز میں بھی آیا ہے مثلاً،

ولقد اخترناھم علی علم علی العالمین

ہم نے ان کو دنیا والوں کی رہنمائی کے لیے منتخب کیا ہے دیکھ بھال کر

بنی اسرائیل کی فضیلت کیوں ؟

۱۷۰ - اور اللہ فرماتا ہے اے بنی اسرائیل وہ وقت یاد کرو کہ ہم نے تمہیں فرعونیوں سے نجات دی وہ تمہیں سنگین سزا دیتے تھے، تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے اور اس میں تمہارے رب کی جانب سے بڑی آزمائش تھی۔ یعنی جس خدا نے ابھی ابھی تم پر ایسا عظیم الشان احسان فرمایا ہے کیا تم اسے چھوڑ کر لکڑیوں اور پتھروں کے سامنے جھکتے ہو۔ لہ

آل فرعون یعنی قوم فرعون۔ آل سے مراد کسی شخص کی اولاد ہی نہیں ہوتی بلکہ یہ لفظ اولاد اتباع قوم قبیلہ اور انصار و اعوان سب پر حاوی ہوتا ہے۔ یہیں سے علماء نے یہ نکتہ آفرینی کی کہ آل النبی سے مراد آپ کے پیروکار اور متبعین ہیں۔ آل کا مضاف نہ نکرہ ہوتا ہے اور نہ زمان و مکان ہوتا ہے اور نہ آل خیاط بولا جاتا ہے بلکہ اس کا مضاف الیہ افضل اور اشرف ہوتا ہے جیسے آل سلطان۔ آل النبی کے بارے میں علماء نے تحقیق کی ہے کہ امت کا وہ طبقہ جو علم وعمل کی دولت سے مالا مال ہے وہ آل النبی ہے اور وہ لوگ جو علم و عمل سے تہی دامن ہیں ان کو امۃ النبی کہا جاتا ہے۔ لہٰذا نبی کی آل تو امت ہے لیکن ہر امتی آل نہیں ہے۔ بہر حال آل صرف اولاد کے لیے نہیں بلکہ اعوان وانصار کے لیے آتا ہے۔ نابغہ کا شعر ہے

من آل میہ رائح اد مغتدی

عجلٰن ذا زاد و غیر مذود

آل میہ میں سے کچھ لوگ صبح روانہ ہوتے اور کچھ شام کو کچھ زاد راہ کے ساتھ اور کچھ بغیر زاد راہ کے۔

سورہ مومن میں و حاق بآل فرعون سوء العذاب۔ اور ابھی ابھی پڑھ آئے ہو ولقد اخذنا آل فرعون بالسنین ان آیات میں جس عذاب کا ذکر ہے ظاہر ہے کہ وہ فرعون اور اس کی ساری قوم ہی پر آیا نہ کہ صرف اس کی اولاد پر۔ اس کی اولاد کا تو کہیں ذکر ہی نہیں ہے بلکہ جہاں تک دلائل کا تعلق ہے وہ فرعون کا بے اولاد ہونا ثابت کرتے ہیں۔ تورات میں یہ ذکر مذکور ہے کہ حضرت موسیٰ کو بچپن میں دریا سے جس نے نکلوایا تھا وہ فرعون کی صاحبزادی تھی

لہ افادات شیخ الاسلام

لیکن قرآن نے اس غلطی کی تصحیح کر دی کہ یہ اس کی لڑکی نہیں بلکہ اس کی بیوی تھی۔

وقالت امرأت فرعون قرت عین لی ولک

فرعون کی بیوی نے کہا کہ یہ میری اور تیری آنکھوں کی ٹھنڈک ہوگا۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ کے اس فضل کو دھیان میں لاؤ کہ تم کو فرعونی استبداد سے اپنا رسول روانہ کر کے نجات دلائی۔ وہ فرعونی استبداد جو تمہیں بدترین اور سنگین سزاؤں میں پیس رہا تھا اصل ارشاد میں یسومونکم آیا ہے۔ سوم کے معنے کسی پر کوئی بوجھ بار بار ڈالنے کے ہیں یعنی ہیں سامہ ظلماً اس کو ظلم کا مزہ چکھایا یعنی بے نوروں کی طرح وہ تم سے اپنے کام لیتا تھا۔ یقتلون ابناءکم ویستحیون نساءکم وہ تمہارے بیٹوں کو قتل کرتے اور تمہاری عورتوں کو زندہ رکھتے تھے یہ اس عذاب عظیم و ذلت کی تفصیل ہے جس میں فرعونیوں کے ہاتھوں بنی اسرائیل مبتلا ہوئے اگرچہ مصر میں بنی اسرائیل پر طرح طرح کے ظلم توڑے جاتے تھے اور بے شمار قسم کی ذلتوں سے آپ کو سابقہ پڑا تھا جن کی تفصیل ان کی تاریخ میں موجود ہے لیکن یہاں ذکر صرف دو ہی باتوں کا بطور نمونہ فرمایا ہے۔ ان نمونوں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ بنی اسرائیل وہاں کس شکنجہ میں تھے۔ بیٹوں کے قتل کی تفصیل تو کسی موزوں مقام پر آئے گی۔ یہاں البتہ بلاغت کا ایک نکتہ یاد رکھنا چاہیے وہ یہ کہ لڑکوں کے ذبح کا ذکر جو کیا ہے تو ابناءکم کے لفظ سے کیا ہے تاکہ شفقت پدری کا جذبہ ابھرے اور لڑکیوں کے ذکر میں بنات نہیں فرمایا بلکہ نساءکم فرمایا ہے یعنی تمہاری عورتوں کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس لیے کہ غیرت کو حرکت میں لانے کے لیے یہ تعبیر زیادہ موثر تھی۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے وفی ذالکم بلاء من ربکم عظیم آزمائش اس بات کی کہ اس بھٹی سے تم خالص سونا بن کر نکلتے ہو یا نری کھوٹ بن کر رہ جاتے ہو اور آزمائش اس امر کی کہ اتنی بڑی مصیبت سے اس معجزانہ طریقہ پر نجات پانے کے بعد بھی تم اللہ کے شکر گزار بندے بنتے ہو یا نہیں۔ اس آزمائش کے کٹھن ہونے کی طرف یہاں اشارہ اس لیے فرمایا کہ اس نجات کی اہمیت کا ان کو کچھ اندازہ ہو سکے جو انہیں حاصل ہوئی کہ کیسا عظیم ابتلا تھا جس سے ان کے رب نے ان کو چھڑایا تھا اگر وہ نہ چھڑاتا تو کوئی دوسری طاقت ان کو نہیں چھڑا سکتی تھی۔

یہ گویا دلیل ہوئی بنی اسرائیل کی فضیلت اور بزرگی کی کہ اللہ کے یہاں ان کی کتنی اہمیت ہے اور یہ اہمیت بلا وجہ نہیں ہے۔ وجہ صرف یہی ہے کہ ان سے دنیا کی قوموں میں ہدایت کا کام لینا تھا۔ مطلب یہ ہے کہ اس فضل و انعام کے باوجود بھی میرے علاوہ یا میرے ساتھ یا میرے سے ورے کسی اللہ

اور معبود کی تلاش میں ہو۔ حضرت موسیٰ نے فرمایا تھا کہ یہ کام تم مجھ سے لینا چاہتے ہو کہ میں تمہارے لیے الٰہ بناؤں یہ نہیں فرمایا کہ اس کے باوجود تم اللہ کے علاوہ الٰہ تلاش کرتے ہو سبحان اللہ کیا بلاغت ہے۔

حیرت ہے کہ علامہ خفاجی نے اسے دلیل خطابی قرار دیا ہے یعنی یہ بُرہان عقلی نہیں ہے اور موسیٰ علیہ السلام کی جانب سے دلیل عقلی پیش نہ کرنے کی وجہ یہ بتاتی ہے کہ بنی اسرائیل کی عوامی ذہنیت اسے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتی ہے۔ دلیل عقلی سے مراد علامہ موصوف کی وہ دلیل ہے جس کو علمائے کلام کی زبان میں برہان تمانع کہا جاتا ہے لیکن علامہ موصوف کو یہاں ذہول ہو گیا برہان تمانع وہاں استعمال ہوتا ہے جہاں مشرکین خدا کی ربوبیت میں شرک کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ایک نہیں کائنات کا کاروبار دو چلا رہے ہیں لیکن یہاں مخاطب شرک فی الربوبیت کا نہیں بلکہ شرک فی العبادت کی درخواست کر رہے ہیں۔ یہ موقع برہان تمانع کا نہیں بلکہ برہان خطابی کا ہے یعنی ان خطابیات کے ذریعہ سے یقین پیدا کیا جائے جن کو لوگ عام بول چال اور عمل کاروبار میں استعمال کرتے ہیں اور عادۃً ان کو صحیح سمجھتے ہیں۔ اگر طبع انسانی میں خاص طور سے اس مسئلہ کی طرف غیر معمولی انکار یا شدید تعصب نہ ہو اور سامع میں تشکیک مناظرہ اور خواہ مخواہ کہ بیداد نہ حجت کی عادت نہ ہو اور اس کی طرف فطرت صالحہ سادہ اور صاف ہو تو اس طریقہ سے اکثر انسانی افراد کو یقین کی دولت ہاتھ آتی ہے اور اسی لیے قرآن نے اسی طرز استدلال سے اکثر کام لیا ہے علامہ آلوسی نے بھی علامہ خفاجی کے اس موقف کو مخدوش قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں:

ان بت پرستوں کے مقابلہ میں برہان تمانع کو لانا جو ما نعبدھم الا لیقربونا الی اللہ کہتے اور جو کائنات کا اللہ کو خالق و مالک مانتے ہیں مشکل ہے بلکہ یہ ان کے مقابلے میں پیش کی جاتی ہے جو عالم کے چلانے میں دوئی کے قائل ہیں۔

حضرت موسیٰ یہاں ثنویت کی تردید فرما رہے ہیں اور علامہ خفاجی اس میں ثنویت کی بُو سونگھ رہے ہیں۔

وَوٰعَدْنَا مُوْسٰى ثَلٰثِيْنَ لَيْلَةً وَّاَتْمَمْنٰهَا بِعَشْرٍ فَتَمَّ مِيْقَاتُ
رَبِّهٖٓ اَرْبَعِيْنَ لَيْلَةً ۚ وَقَالَ مُوْسٰى لِاَخِيْهِ هٰرُوْنَ اخْلُفْنِىْ
فِىْ قَوْمِىْ وَاَصْلِحْ وَلَا تَتَّبِعْ سَبِيْلَ الْمُفْسِدِيْنَ ﴿۱۴۲﴾ وَلَمَّا جَآءَ
مُوْسٰى لِمِيْقَاتِنَا وَكَلَّمَهٗ رَبُّهٗ ۙ قَالَ رَبِّ اَرِنِىْٓ اَنْظُرْ اِلَيْكَ ۭ
قَالَ لَنْ تَرٰىنِىْ وَلٰكِنِ انْظُرْ اِلَى الْجَبَلِ فَاِنِ اسْتَقَرَّ مَكَانَهٗ
فَسَوْفَ تَرٰىنِىْ ۚ فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا وَّخَرَّ مُوْسٰى
صَعِقًا ۚ فَلَمَّآ اَفَاقَ قَالَ سُبْحٰنَكَ تُبْتُ اِلَيْكَ وَاَنَا اَوَّلُ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۴۳﴾
قَالَ يٰمُوْسٰٓى اِنِّى اصْطَفَيْتُكَ عَلَى النَّاسِ بِرِسٰلٰتِىْ وَبِكَلَامِىْ ۡ
فَخُذْ مَآ اٰتَيْتُكَ وَكُنْ مِّنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿۱۴۴﴾ وَكَتَبْنَا لَهٗ فِى
الْاَلْوَاحِ مِنْ كُلِّ شَىْءٍ مَّوْعِظَةً وَّتَفْصِيْلًا لِّكُلِّ شَىْءٍ ۚ
فَخُذْهَا بِقُوَّةٍ وَّاْمُرْ قَوْمَكَ يَاْخُذُوْا بِاَحْسَنِهَا ۭ سَاُورِيْكُمْ
دَارَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۱۴۵﴾

اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا پھر دس راتوں کے
اضافہ سے ہم نے اسے پورا چلہ کر دیا اس طرح پروردگار کے حضور
میں آنے کی مقررہ میعاد چالیس راتوں کی مقدار ہو گئی[۱۸۱]۔ موسیٰ نے
اپنے بھائی ہارون سے کہا تم میرے بعد قوم میں میرے جانشین بن کر
رہو اور دیکھو سارے کام ٹھیک کرنا خرابی ڈالنے والوں کی راہ نہ
چلنا[۱۸۲]۔ اور جب موسیٰ آیا کہ ہمارے مقررہ وقت میں حاضری
دے اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا[۱۸۳]۔ تو بول پڑا
اے رب دکھا تو مجھے میں تیری طرف دیکھوں حکم ہوا مجھے تو ہرگز
نہ دیکھے گا[۱۸۴]۔ ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھ اگر یہ اپنی جگہ ٹکا رہا تو
تو مجھے دیکھ پائے گا[۱۸۵]۔ پھر جب اس کے پروردگار کی پہاڑ پر
تجلی ہوئی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہو گیا اور موسی بے ہوش ہو گئے[۱۸۶]۔
جب موسیٰ ہوش میں آتے تو بول پڑے خدایا تیرے لیے ہر

طرح کی تقدیس ہو، میں اپنی جسارت سے تیرے حضور توبہ کرتا ہوں
میں ان میں پہلا شخص ہوں گا جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔[۱۷۷] خدا نے
فرمایا اے موسیٰ میں نے تجھے اپنی پیغمبری اور ہم کلامی سے لوگوں
پر برتری دی ہے لہٰذا جو کچھ میں نے تجھے عطا کیا ہے اسے لے
اور شکر بجا لا۔[۱۷۸] اور ہم نے موسیٰ کے لیے ان تختیوں میں ہر قسم
کی باتیں لکھ دی تھیں تاکہ زندگی کے ہر معاملہ کے لیے اس میں
نصیحت ہو اور ہر بات الگ الگ واضح ہو جاتے۔[۱۷۹] اسے
مضبوطی سے پکڑ لے اور اپنی قوم کو حکم دے کہ اس کے
پسندیدہ حکموں پر کاربند ہوں میں ضرور بدکاروں کی جگہ
تمہیں دکھاؤں گا۔[۱۸۰]

معانی مفردات

میقات، وہ وقت جس میں مقررہ کام کیا جائے۔ اسی کی جمع مواقیت آتی ہے۔ وقت سے اسم آلہ ہے۔ وقت سے اسم آلہ بھی آتا ہے مگر دونوں کے املا میں اور معنی میں فرق ہے۔

میعات بھی تاء سے لکھا جاتا ہے کیونکہ یہ تا اصلی ہے اور اس کا وزن مفعال ہے اور دقایۃ میقاۃ گول تاء سے لکھا جاتا ہے یہ تا تانیث ہے اور مفعلۃ کے وزن پر ہے ۔ اُخْلُفْنِیْ ، اخلف امر ہے جانشین ہو تو مرا اس معنے کے اعتبار سے اس کا مصدر خلافت ہے اور اگر معنے پیچھے آنے کے ہوں تو اس اعتبار سے اس کا مصدر خلف ہے جس کے معنے پیچھے آنے کے ہیں۔ اسی سے خلف ہے امام بغوی لکھتے ہیں خلف اس قرن کو کہتے ہیں جو دوسرے قرن کے بعد آتا ہے۔ ابوحاتم کا بیان ہے کہ خلف لام کے سکون کے ساتھ یعنے اولاد ہے ۔ واحد اور جمع دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور خلف لام کے زبر کے ساتھ یعنے بدل آتا ہے خواہ اولاد یا کوئی اجنبی، ابن الاعرابی کا کہنا ہے کہ خلف زبر کے ساتھ نیک کے لیے آتا ہے اور جزم کے ساتھ بد کے لیے۔ نضر بن شمیل کہتے ہیں کہ خلف لام کی حرکت کے ساتھ اچھی نسل کے لیے اور لام کے سکون کے ساتھ بُری نسل کے لیے آتا ہے ۔
محمد بن جریر نے تصریح کی ہے کہ اکثر مدح میں تو لام کا زبر آتا ہے اور مذمت میں لام کا سکون اور کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ اس کا عکس ہوتا ہے ۔ تجلّی ، جلو سے بنا ہے اسی سے اُردو میں جلوہ بولتے ہیں ۔
پوشیدگی کے بعد ظہور کو کہتے ہیں ۔ جلا الامر بات کھل گئی بولا جاتا ہے ۔ اسی طرح انجلی ، تجلی آتے ہیں۔ اسی سے متعدی جلاہ آتا ہے اس نے اسے واضح کر دیا۔ دکاً ، ریزہ ریزہ کرنا، ڈھا کر برابر کرنا ، کوٹ کر ہموار کرنا ۔ دک یدکّ کا مصدر ہے اصل میں دک نرم اور ہموار زمین کو کہتے ہیں اور چونکہ نرم اور ہموار زمین ریزہ ریزہ ہوتی ہے اسی مناسبت سے اس کے مصدر کے معنے مقرر ہوئے۔ خرّ ، باب ضرب سے خر مصدر ہے اس کے معنے کسی چیز کے اوپر سے گرنے کے ہیں یخرون للاذقان ۔ صعقاً ، صفت مشبہ کا صیغہ ہے جس کے معنے بے ہوش ہو جانے کے ہیں ۔
اسی سے صاعقہ بجلی کی کڑک کے معنے میں ہے ۔ صاعقہ اور صاقعہ دونوں قریب قریب ہیں دونوں کے معنے سخت گڑگڑاہٹ کے ہیں مگر صقع اجسام ارضیہ کے لیے بولا جاتا ہے اور صعق اجسام علویہ کے لیے۔ بعض اہل لغت کا خیال ہے کہ صعق تین طرح پر آتا ہے۔ موت کے معنے میں ہے جیسے فصعق من فی السماوات اور فاخذتھم الصاعقۃ دوسرے عذاب کے معنے میں انذرتکم صاعقۃ مثل صاعقۃ عاد و ثمود ، تیسرے آگ کے معنے میں جیسے یرسل الصواعق ، یہاں صعق صفت کا صیغہ ہے ۔

کوہِ طور پر اعتکاف

مصر سے نکلنے کے بعد جب بنی اسرائیل کی غلامانہ پابندیاں ختم ہوگئیں اور انہیں ایک خود مختار قوم کی حیثیت حاصل ہوگئی تو حکم خداوندی کے تحت حضرت موسیٰ کوہِ طور پر طلب کیے گئے تاکہ انہیں بنی اسرائیل کے لیے قانون عطا فرمایا جائے چنانچہ یہ طلبی جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے اس سلسلے کی پہلی طلبی تھی اور اس کے لیے چالیس دن کی میعاد اس لیے مقرر کی گئی تھی کہ حضرت موسیٰ ایک پورا چلہ یہاں گزاریں اور روزے رکھ کر شب و روز عبادت اور تفکر و تدبر کرکے اور دل و دماغ کو یکسو کرکے اس قول ثقیل کے اخذ کرنے کی استعداد اپنے اندر پیدا کریں جو ان پر نازل کیا جانے والا تھا۔

حضرت موسیٰ نے اس ارشاد کی تعمیل میں کوہِ سینا جاتے وقت بنی اسرائیل کو اس مقام پر چھوڑا تھا جو وادی الشیخ کے نام سے آجکل مشہور ہے۔ اس وادی کا وہ حصہ جہاں بنی اسرائیل نے پڑاؤ کیا تھا آج کل میدان الراحۃ کہلاتا ہے وادی کے ایک سرے پر وہ پہاڑی واقع ہے جہاں مقامی روایت کے بموجب حضرت صالح علیہ السلام ثمود کے علاقہ سے ہجرت کرکے تشریف لے آئے تھے آج وہاں ان کی یادگار میں ایک مسجد بنی ہوئی ہے۔ دوسری طرف ایک اور پہاڑی جبل ہارون نامی ہے جہاں کہا جاتا ہے کہ حضرت ہارون بنی اسرائیل کی گوسالہ پرستی سے ناراض ہوکر جا بیٹھے۔ تیسری طرف سینا کا بلند پہاڑ ہے جس کا بالائی حصہ اکثر برف باریوں سے ڈھکا رہتا ہے اور جس کی بلندی ۷۳۵۹ فٹ ہے۔ اس پہاڑ کی چوٹی پر وہ کھوہ زیارت گاہ عام بنی ہوئی ہے جہاں حضرت موسیٰ نے چلہ کیا تھا۔ اس کے قریب مسلمانوں کی ایک مسجد اور عیسائیوں کا گرجا موجود ہے اور پہاڑ کے دامن میں رومی قیصر جسٹنین کے زمانہ کی ایک خانقاہ آج تک موجود ہے۔

۱۷۱۔ اور ہم نے موسیٰ سے تیس راتوں کا وعدہ کیا تھا پھر دس راتوں کے اضافہ سے ہم نے اسے پورا چلہ کر دیا اس طرح پروردگار کے حضور میں آنے کی مقررہ میعاد چالیس راتوں کی مقدار ہوگئی۔ جب بنی اسرائیل کو طرح طرح کی پریشانیوں سے اطمینان نصیب ہوا تو انہوں نے موسیٰ علیہ السلام سے درخواست کی کہ اب ہمارے لیے کوئی آسمانی شریعت جس پر ہم دلجمعی کے ساتھ عمل کرکے دکھلائیں۔ موسیٰ علیہ السلام نے ان کا معروضہ بارگاہِ الٰہی میں پیش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے ان سے کم از کم تیس دن اور زیادہ از زیادہ چالیس دن کا وعدہ فرمایا کہ جب اتنی مدت تم پے در پے روزے رکھو گے اور کوہِ طور پر معتکف رہو گے تو تم کو تورات شریعت عنایت کی جائے گی۔ دو مدتیں کم اور زیادہ ٹھہرانے کا

شاید یہ مطلب تھا اگر اثنائے ریاضت میں وظائف عبودیت اور آداب تقرب ادا کرنے کے اعتبار سے کسی قسم کی کوتاہی اور تقصیر ظاہر نہ کی تو اقل مدت تیس دن کافی ہوں گے ورنہ اکثر الاجلین چالیس روز پورے کرنے پڑیں گے یا شروع سے تیس دن ضروری و لازمی میعاد کے طور پر ہوں اور چالیس دن پورے کرنا احتیاطی و استحبابی حیثیت سے اصل میعاد کی تکمیل و تتمیم کے طور پر رکھے گئے ہوں جیسے شعیب علیہ السلام نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنی بیٹی دیتے وقت فرمایا تھا علی ان تاجرنی ثمانی حجج فان اتممت عشراً فمن عندک وما ارید ان اشق علیک (القصص رکوع ۳) اور ہمارے زمانہ کے بعض مصنفین نے یہ کہا ہے کہ اصلی میعاد چالیس ہی دن کی تھی جیسا کہ سورہ بقرہ میں مذکور ہے اور یہاں بھی فتم میقات ربہ، اشارہ کیا گیا ہے۔ یہ اس چالیس دن کے بیان کا ایک پیرایہ ہے کہ ہم نے تیس دن کا وعدہ کیا تھا جن کا تتمہ دس دن اور تھے تاکہ اشارہ ہو جائے کہ ایک مہینہ سالم ذی قعدہ پورا کرکے دوسرے مہینہ ذی الحجہ سے دس دن اور بڑھائے گئے۔ اس طرح یکم ذی قعدہ سے شروع ہو کر ۱۰ ذی الحجہ کو چلہ پورا ہوا جیسا کہ اکثر سلف سے منقول ہے واللہ اعلم، موضح القرآن میں ہے کہ حق تعالیٰ نے وعدہ دیا حضرت موسیٰ کو کہ پہاڑ پر تیس رات خلوت کرو کہ تمہاری قوم کو توارت دوں۔ اس مدت میں انہوں نے ایک دن مسواک کی۔ فرشتوں کو ان کے منہ کے بو سے خوشی تھی وہ جاتی رہی اس کے بدلے اور بڑھا مدت پوری کردی[1] حضرت موسیٰ جب اپنی قوم کو فرعونی حکومت کے پنجہ استبداد سے نکال لائے اور اللہ سبحانہٗ نے ان کو آزادی دے دی تو اب اللہ کا فیصلہ یہ ہوا کہ اس قوم کو ایک پورا نظام قانون اور دستور زندگی عطا ہو تاکہ بنی اسرائیل جو اب تک فرعون کے نظام بندگی میں زندگی گزار رہے تھے اللہ کے نظام بندگی میں اپنی زندگی گزاردیں۔ یاد رہے کہ بنی اسرائیل پرستش تو پہلے بھی اللہ کی کر رہے تھے جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے کہ ان کو اپنے گھروں میں قبلہ رو ہو کر نماز پڑھنے کا حکم تھا۔

اوحینا الیٰ موسیٰ واخیہ ان تبوأ لقومکما بمصر بیوتا واجعلوا بیوتکم قبلۃ واقیموا الصلوٰۃ وبشر المومنین۔

ہم نے موسیٰ اور ان کے بھائی ہارون کو وحی کی کہ اپنی قوم کے لیے مصر میں مکان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بناؤ اور اپنے مکانوں کو قبلہ رُخ بناؤ اور ان میں نماز قائم کرو اور اہل ایمان کو خوشخبری دو۔
حضرت موسیٰ کو نظامِ زندگی کے قائم کرنے کی خاطر شریعت اور قانون دینے کے لیے
اللہ سبحانہ نے کوہِ طور پر چالیس روز کے اعتکاف کا حکم دیا۔ گویا وحی نبوت کا
آغاز تو اس وقت ہوا تھا جب حضرت موسیٰ مدین سے آرہے تھے اور اب حضرت
موسیٰ کے لیے وحی شریعت و قانون کے آغاز کی داستان سنائی جا رہی ہے۔

تورات میں بھی یہ واقعہ مذکور ہے:

اور خداوند نے کہا کہ پہاڑ پر میرے پاس آ اور وہیں ٹھہرا رہ اور میں تجھے
پتھر کی لوحیں اور شریعت اور احکام جو میں نے لکھے ہیں دوں گا تاکہ تو ان کو
سکھائے۔ (خروج باب ۲۴-۱۲-۱۳)

اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ تو یہ باتیں لکھ کیونکہ ان ہی باتوں کے مفہوم
کے مطابق میں تجھ سے اور اسرائیل سے عہد باندھتا ہوں سو وہ چالیس دن اور
چالیس رات وہیں خداوند کے پاس رہا اور نہ روٹی کھائی نہ پانی پیا اور اس نے
ان لوحوں پر اس عہد کی باتوں کو لکھا۔

آیت کی واضح تشریح تو ختم ہو چکی ہے لیکن چند امور تشریح طلب ہیں۔

اولاً سورہ بقرہ و واعدنا موسیٰ اربعین لیلۃ ہے یہاں اس اربعین کی تفصیل ہے۔
سورہ اعراف مکی ہے اور البقرہ مدنی ہے۔ یہ چالیس دن کی مدت اس قلبی اور روحانی تیاری
کے لیے تھی جو کتاب الٰہی کے بارِ عظیم کے متحمل ہونے کے لیے ضروری تھی۔

ابتداء تیس دنوں کا اور پھر دس روز کا اضافہ اس کی علماء نے مختلف توجیہات کی ہیں ایک
خیال تو وہ ہے جو آپ حضرت شاہ عبدالقادر کی زبانی سُن آئے ہیں کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام
نے تیس روزے رکھنے کے بعد آخری روزے میں مسواک کر لی تو حضرت موسیٰ کو حکم ہوا کہ
دس روزے اور رکھو۔ شارحینِ قرآن نے مسند فردوس دیلمی کے حوالہ سے یہاں عبد اللہ
ابن عباس کی ایک مرفوع روایت بھی نقل کی ہے لیکن یہ روایت تاریخی حیثیت سے مستند نہیں
ہے۔ دوسرا خیال یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام وقت مقررہ سے پہلے پہنچ گئے تھے ان کی
اس جلدی کے سبب سے حکمتِ الٰہی اس کو مقتضی ہوئی کہ یہ مدت تیس دنوں سے بڑھا کر چالیس
روز کر دی جائے۔ سورہ بقرہ میں پوری مدت ذکر کر دی گئی اور یہاں سورہ اعراف میں اس کی

تفصیل بتا دی گئی۔ اور عبداللہ بن عباس کے حوالے سے تیسری بات یہ بتائی گئی ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بنی اسرائیل سے کہا کہ اللہ نے میرے سے تیس راتوں کا وعدہ کیا ہے میں جا رہا ہوں اور ہارون کو جانشین بنا رہا ہوں جب حضرت موسیٰ کوہ طور پر پہنچے تو اللہ نے دس روز اور اضافہ کر دیئے ان ہی دس دنوں میں گوسالہ پرستی کے فتنے نے سر اٹھایا۔

ثانیاً، آیت میں بجائے ثلاثین یوماً کے ثلاثین لیلۃ آیا ہے۔ اس سے علماء نے دو وجہیں بنائی ہیں۔ رات کی تخصیص اس لیے فرمائی کہ رات کی عبادت میں مجاہدہ زیادہ ہے۔

ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطاً واقوم قیلاً،

نیز اللہ سبحانہٗ کا نزول اجلال آسمان دنیا پر رات ہی کو ہوتا ہے جیسا کہ صحیحین میں ہے اور برکتیں بھی اکثر رات ہی میں نازل ہوتی ہیں۔ قرآن میں لیلۃ مبارکہ کی تصریح ہے۔ قرب الٰہی حاصل کرنے کے لیے رات سے بہتر کوئی وقت نہیں ہے۔ جیسا کہ ترمذی نے سنن میں یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

> عمرو بن عبسہ رضی اللہ عنہٗ فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوتے سنا ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ بندے کے سب سے قریب وسط شب میں ہوتے لہٰذا اگر تجھ سے یہ ہو سکے کہ اس وقت میں اللہ کو یاد کرنے والوں میں سے ہو سکے تو ہو جا۔ (سنن ترمذی)

یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن میں قیام لیل کا حکم آیا یا ایھا المزمل قم اللیل اور رات ہی میں تہجد کا حکم ہوا۔ اور رات ہی میں آپ کو آسمانوں کی سیر کرائی گئی سبحان الذی اسریٰ بعبدہ لیلاً۔ اہل عرب جب سفر کرتے تو رات کو چلتے اور دن کو ٹھہرتے اس لیے رات میں مسافت جلدی طے ہوتی ہے۔ اسی طرح سیر الی اللہ کے لیے رات کو خاص کیا گیا تاکہ رہ روِ سلوک جلد منزلِ مقصود کو پہنچ جائے۔

نیز لیلہ کی تعبیر سے علماء نے یہ بات بھی معلوم کی ہے کہ قمری مہینوں میں تاریخ کا حساب رات سے ہوتا ہے۔ تیس راتوں کے ذکر سے اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ کا یہ اعتکاف قمری ماہ میں تھا۔ کیونکہ قمری ماہ کا آغاز رات ہی سے اور اس کی تاریخ غروب سے شروع ہوتی ہے۔ عبادات میں قمری ماہ و سال معتبر ہیں۔ قرطبی نے ابن عربی کے حوالے سے لکھا ہے کہ شمسی ماہ و سال کا حساب کاروباری زندگی کے لیے ہے اور قمری ماہ و سال عابدانہ زندگی کی خاطر ہیں۔ یہ تیس

راتیں حضرت عبداللہ بن عباس کی تصریح کے مطابق پورا ماہ ذی قعدہ اور پھر ان پر ذی الحجہ کے دس دنوں کا اور اضافہ ہوا۔ اس کا خلاصہ یہ ہوا کہ حضرت موسیٰ کو تورات اللہ کی جانب سے ذی الحجہ کی ۹ تاریخ کو ملی۔ یہ حسن اتفاق ہے جیسا کہ مستند روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر بھی دین کی تکمیل کا اعلان اسی تاریخ میں ہوا۔

ثالثاً چالیس راتوں کی تخصیص کی وجہ شارحین قرآن نے یہ بتائی ہے کہ اعداد کے مختلف درجات میں ایک درجہ اعداد میں اکائیوں کا ہے دوسرا درجہ دہائیوں کا ہے تیسرا درجہ سینکڑوں کا ہے اور چوتھا درجہ ہزاروں کا ہے۔ عربی زبان میں ہزار سے آگے اعداد کی کوئی درجہ بندی نہیں ہے دس کا عدد اکائیوں کا خاتمہ ہونے کی وجہ سے ایک تکمیلی عدد ہے۔ جب کسی چیز کی خاص طور پر تکمیل مقصود ہوتی ہے تو اسی عدد کو چار گونہ کر دیا جاتا ہے۔ چنانچہ حضرت آدم کی مٹی کا خمیر چالیس روز تک کیا گیا اور حدیث میں ہے کہ شکم مادر میں چالیس روز تک نطفہ رہتا ہے پھر چالیس روز تک علقہ پھر چالیس روز تک مضغہ اس کے بعد روح پھونکی جاتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس عدد کو عروج اور ترقی سے کوئی خاص مناسبت ہے۔ بس جس طرح جسمانی عروج اور ترقی کے لیے چالیس کا عدد منتخب ہوا اسی طرح اللہ سبحانہٗ نے اپنی اس قدیم سنت کے مطابق حضرت موسیٰ علیہ السلام کے باطنی اور روحانی عروج و ترقی کے لیے چالیس کا عدد مقرر فرمایا۔ علامہ منذری نے الترغیب والترہیب میں بحوالہ عبداللہ بن عباس حضور انور کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ،

> جو چالیس روز تک عمل خالص اللہ کے لیے کرے تو علم و حکمت کے چشمے
> اس کے قلب سے نکل کر اس کی زبان پر جاری ہو جائیں گے۔

نبوت کے لیے بھی چالیس سال کی عمر کو خاص کیا گیا ہے کیونکہ اصل عمر انسان کی چالیس سال ہے اس میں انسانی قوتوں کا کمال ہوتا ہے۔ اس کے بعد زوال و انحطاط شروع ہو جاتا ہے۔

یہیں سے صوفیائے کرام نے مجاہدہ و ریاضت کے لیے چلہ استنباط کیا ہے حافظ شیرازی کہتے ہیں:

شنیدم رہروے در سر زمینے
ہمی گفت ایں معما با قرینے
کہ اے صوفی شراب آنگہ شود صاف
کہ در شیشہ بماند اربعینے!

اگرچہ ہمیں اس قسم کے استنباط سے اصولی اختلاف ہے۔ فقہی اجتہاد و استنباط پر اسے قیاس کرنا قیاس مع الفارق ہے۔ فقہی مسائل میں اجتہاد کی ضرورت عقل سے اور اس کی اجازت بلکہ حکم نقل سے بالکل واضح طور پر ثابت ہے لیکن کیا تزکیہ نفس اور مسئلہ باطن کا بھی معاملہ ایسا ہی ہے کیا اس کے لیے اجتہاد کی واقعی ضرورت ہے اور اس ضرورت پر عقلی اور نقلی دلائل موجود ہیں۔ اس کا جواب اثبات میں دینا سخت دشوار ہے۔

عقلی پہلو سے دیکھئے تو قلوب انسانی کے بنیادی حقائق رفتارِ زمانہ کے ساتھ بدلنے والے نہیں وہ جیسے کل تھے ویسے ہی آج کل ہیں اور ہزار برس کے بعد بھی ویسے ہی رہیں گے۔ انسان کی باطنی بیماریوں میں ماضی، حال اور مستقبل کا فرق کوئی جوہری فرق نہیں۔ جو بیماریاں زمانہ رسالت میں دلوں کو بیمار بنایا کرتی تھیں وہی آج بھی انہیں لاحق ہوا کرتی ہیں۔ اگر تزکیہ نفس کا مدعا یہی ہے کہ نفس انسانی کو کفر و شرک، نفاق، دُنیا پرستی، غفلت، آخرت فراموشی اور اتباع خواہش کے روگوں سے پاک کر کے اللہ کا سچا پرستار بنایا جاتے تو یقین کرنا چاہیے کہ عہد رسالت میں بھی یہی روگ اسی طرح دلوں کو لاگو ہوتے تھے جس طرح آج۔ اگر ایسا ہے تو یقین کرنا کہ ان بیماریوں کے علاج کے لیے کسی نئے نسخے کی ہرگز ضرورت نہیں۔ اللہ اور اس کے رسول نے جو نسخہ تجویز فرمایا ہے وہ بالکل کافی ہے۔ اسی میں شفا ہے۔ ایسی شفا جو قلب و روح کو ان کی فطری تندرستی اور توانائی بخشنے والی ہے۔

حضرت ہارون کی خلافت

۱۴۲۔ موسیٰ نے اپنے بھائی ہارون سے کہا تم میرے بعد قوم میں میرے جانشین بن کر رہو اور سب کام درستگی سے کرنا اور خرابی ڈالنے والوں کی راہ نہ چلنا۔ یعنی میری غیبت میں میرے حصہ کا کام بھی تم ہی کرو۔ گویا حکومت و ریاست کے جو اختیارات موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ مخصوص تھے وہ ہارون علیہ السلام کو تفویض کر دیے گئے اور چونکہ بنی اسرائیل کی تلون مزاجی اور سست اعتقادی کا پورا تجربہ رکھتے تھے اس لیے بڑی تصریح و تاکید سے ہارون علیہ السلام کو متنبہ کر دیا کہ اگر میرے پیچھے یہ لوگ کچھ گڑبڑ کریں تو تم اصلاح کرنا اور میرے طریق کار پر کاربند رہنا۔ مفسدہ پردازوں کی راہ پر نہ چلنا۔ خدا کی مشیت کہ موسیٰ علیہ السلام یہ وصیت کر کے اُدھر گئے اِدھر بنی اسرائیل نے گوسالہ پرستی شروع کر دی مگر ہارون علیہ السلام نے موجود

بائیبل نویسوں کے علی الرغم یاقوم انما فتنتم بہ وان ربکم الرحمان فاتبعونی واطیعوا امری کہہ کر ان کی گمراہی اور اپنی بیزاری کا صاف اعلان کر دیا اور وصیت موسوی کے مطابق اصلاح حال کی امکانی کوشش کی۔[1]

نبوت کی حد تک تو حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں نبی تھے اس لیے نبوت میں نیابت کا یہاں سوال ہی نہیں ہے۔ لیکن بنی اسرائیل میں حکومت اور قیادت کا منصب حضرت موسیٰ کو حاصل تھا اس لیے اخلفنی کا منشا یہ ہے کہ فرمانروائی اور حکمرانی کا جو کام حضرت موسیٰ کے سپرد تھا وہ ان ایام میں حضرت ہارون کریں۔ یعنی حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون کو اپنی غیر حاضری کے زمانے کے لیے اپنا خلیفہ بنایا۔ یہ وقتی خلافت تھی کیونکہ حضرت ہارون کی وفات حضرت موسیٰ سے پہلے ہوئی وہ حضرت موسیٰ سے تین سال بڑے تھے۔ اسی قسم کی خلافت مختلف سفروں میں مختلف صحابہ کے لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی قائم فرمائی۔ غزوۂ تبوک میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مدینہ میں اسی نوع کی خلافت سے سرفراز فرمایا تھا۔ چنانچہ صحیحین میں ہے:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی کو مخاطب کر کے فرمایا، کیا تو اس بات سے خوش نہیں کہ میرے لیے ایسا ہی ہو جیسے حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے لیے تھے۔

کچھ لوگوں نے اسی کو دستاویزِ خلافت بنا کر یہ نعرہ لگا دیا کہ خلافت اصل میں حضرت علی کا حق ہے اور حضور کی آپ کے بارے میں وصیت ہے۔ ایسا سمجھنا تاریخ سے بہت بڑی بے انصافی ہے حضور انور ہمیشہ ہی غزوات میں جاتے وقت مدینہ میں اپنا خلیفہ بناتے تھے اور یہ بات حضور انور نے حضرت علی کو مخاطب کر کے اس وقت فرمائی تھی جب حضرت علی نے حضور کی زبان مبارک سے اپنے بارے میں مدینہ میں رہنے کا حکم سن کر کہا کہ کیا آپ مجھے بچوں اور عورتوں میں اپنا جانشین بنا کر جا رہے ہیں حضور نے حضرت علی کو یہ کہہ کر کہ کیا تو راضی نہیں ہے کہ تو میرے لیے ویسا ہی ہو جیسے ہارون موسیٰ کے لیے، مسندِ احمد میں ہے کہ حضرت علی نے یہ بات سن کر فرمایا رضیت رضیت میں راضی ہوں میں راضی ہوں۔

بہرحال اس آیت میں حضرت موسیٰ حضرت ہارون کو اپنے سفرِ طور کے موقعہ پر اپنی غیر حاضری

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کے وقت اپنا خلیفہ بنا رہے ہیں اور ان کو یہ ہدایت دے رہے ہیں کہ تم قوم کے اندر کوئی خرابی کوئی بگاڑ اور کوئی بدعت وضلالت نہ پیدا ہونے دینا۔ اگر اس طرح کی کوئی چیز رونما ہو تو اس کی اصلاح کرنا اور ہرگز ہرگز بگاڑ پیدا کرنے والوں کی راہ نہ چلنا۔ قرآن میں المفسدین کی تعبیری انداز بتا رہا ہے کہ حضرت موسیٰ فسادی عناصر سے پہلے سے واقف تھے اور ان کی طرف سے ان کو اندیشہ بھی تھا اس لیے انہوں نے حضرت ہارون کو خاص طور پر تاکید کی کہ اگر یہ عناصر کوئی فتنہ اٹھانے کی کوشش کریں تو اس کو چلنے نہ دینا۔

اصل ارشاد میں اخلفنی آیا ہے اسی کا مصدر خلافت ہے اس کا مادہ خلف اور اسی سے خلیفہ بنا ہے۔ خلافت کے معنے نیابت اور جانشینی کے ہیں۔ ابن فارس کہتے ہیں کہ یہ خلف فلان فلانا فی ہذا الامر سے بنا ہے یعنی اگر ایک شخص کسی دوسرے شخص کا قائمقام ہوا تو یہ خلافت ہوئی اور لغت میں اس کو خلیفہ کہیں گے خواہ یہ نیابت سابق کی موت وعزل کی وجہ سے ہو یا غلبیت کی وجہ سے ہو یا اپنا اختیار ومنصب سپرد کرنے کی وجہ سے ہو۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں:

خلافت دوسرے کی نیابت کا نام ہے چاہے منوب عنہ کی غیر حاضری کی وجہ سے ہو، یا موت کی وجہ سے یا کام سے رہ جانے کی وجہ سے۔

یہ لفظ بھی قرآن حکیم کے اختیارات لغویہ میں سے ہے یعنی عربی زبان کے ان الفاظ میں سے ہے جن کو لغت میں عام معانی کے لیے استعمال کیا جاتا ہے مگر قرآن نے اپنے خاص قانونی اصطلاحی معنے کے لیے اختیار کیا ہے۔ قرآن کی زبان میں خلافت اور استخلاف فی الارض اور وراثت اور تمکن فی الارض سے مقصود حکومت وریاست ہے۔ قرآن حکیم اس کو سب سے بڑی نعمت قرار دیتا ہے جو یقین اور اچھے کاموں کے بدلے دنیا میں مل سکتی ہے۔ قرآن کے نزدیک اس خلافت کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ دنیا میں نوع انسان کی ہدایت وسعادت کے لیے ایک خاص ذمہ دار حکومت قائم ہو وہ عدل ربانی کو دنیا میں نافذ کرے۔ ظلم وجور اور ضلالت وطغیان سے اس کی زمین پاک ہو جائے۔ اور اللہ کا وہ ہمہ گیر قانون عدل جو تمام کائنات میں سورج سے لے کر زمین کے ذرات تک تکوینًا نافذ وقائم ہے۔ زمین کے گوشہ گوشہ اور چپے چپے میں تشریعًا جاری ہو کر کرۂ ارضی کو ہدایت وسعادت کی بہشت زار بنا دے۔ یہی خدا کا قانون عدل تشریعی نبوت لے کر آتی ہے۔ اسی کا دنیا میں قائم کرنا اس کا اولین مقصد ہوتا ہے۔ یہاں حضرت ہارون حضرت موسیٰ کے اسی لحاظ سے خلیفہ ہیں۔ اور اسی لحاظ سے حضرت آدم اللہ سبحانہ کے خلیفہ ہیں۔ لغت کے اعتبار سے یہ اطلاق اس

یہ ہوا کہ سب سے پہلے جو شخص خلیفہ ہوا وہ اللہ کی عدالت قائم رکھنے میں زمین پر اللہ کی نیابت رکھتا تھا اور ہر خلیفہ سابق کا قائمقام ہوتا تھا۔ ظہورِ اسلام کے بعد جب ارضی خلافت کے وارث مسلمان ہوئے تو اس سلسلے کا پہلا خلیفۃ اللہ خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے اور پھر آپ کے بعد جن لوگوں کے ہاتھ اسلام کی مرکزی حکومت آتی وہ آپ کے نائب اور قائمقام ہوتے اس لیے ان پر خلیفہ کا اطلاق ہوا اور اب تک ہو رہا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ معالم القرآن کی جلد ۵ میں آئے گی۔

حضرت موسیٰ کو شرف ہم کلامی

۱۴۳۔ اور موسیٰ آیا کہ ہمارے مقررہ وقت میں حاضری دے اور اس کے پروردگار نے اس سے کلام کیا۔ چالیس دن کی میعاد پوری ہو چکنے پر حق تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو کسی مخصوص و ممتاز رنگ میں مکالمہ کا شرف بخشا۔ انبیاء کی خصوصیتوں میں سب سے بڑی خصوصیت مکالمہ الٰہی ہے۔ قرآن عزیز میں بار بار پیغمبروں کے مخاطبہ ربانی اور مکالمہ الٰہی کی تصریح ہے اور مجموعہ تورات میں ہر پیغمبر کے متعلق اس کی شہادتیں موجود ہیں۔

اللہ انبیاء سے کلام کیوں کر کرتا ہے۔ قرآن کی ایک آیت میں اس کی حسب ذیل صورتیں بتائیں۔

وما کان لبشر ان یکلمہ اللہ الا وحیا او من وراء حجاب او یرسل رسولاً فیوحی باذنہ مایشاء انہ علی حکیم۔

اور کسی بشر کی یہ تاب نہیں کہ خدا اس سے دو بدو کلام کرے لیکن وحی کے ذریعے سے یا پردہ کی آڑ سے یا یہ کہ وہ قاصد کو بھیجے جو اس کے حکم سے جو کچھ وہ چاہتا ہے پہنچا دیتا ہے۔

اس آیت میں مکالمہ الٰہی کی تین صورتیں بیان ہوئی ہیں۔ کلام بالوحی، کلام پس پردہ اور کلام بذریعہ قاصد۔ ان تینوں قسموں میں سے ہر پیغمبر کو کسی نہ کسی طریق کلام سے مشرف کیا گیا ہے۔ بعض پیغمبروں کو خصوصیت کے ساتھ کلام پس پردہ کے شرف سے ممتاز کیا گیا ہے۔ اسی لیے ان کے فضائل میں تکلم الٰہی کی فضیلت کو مستقل حیثیت دی گئی ہے۔ مثلاً یہاں حضرت موسیٰ کی شان میں فرمایا ہے کلمہ ربہ کی تصریح ہے سورہ بقرہ میں اس خاص طریقہ کلام کے دائرہ کو اور بھی وسعت دی گئی ہے چنانچہ انبیاء کے تذکرے میں فرمایا منھم من کلم اللہ اس آیت میں

نام کی تصریح نہیں ہے اس لیے اس شرف خاص میں حضرت موسیٰ کے ساتھ دوسرے انبیاء بھی شریک ہو سکتے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو مکالمہ الٰہی کے تینوں مذکورہ بالا طریقوں سے خدا کی ہمکلامی کا شرف حاصل ہوا ہے بلکہ واقعہ معراج میں وہ مرتبہ بھی پیش آیا ہے جہاں حبیب و محبوب کے درمیان قاصد و پیغمبر سرے سے بیگانہ تھے۔ جہاں زمان و مکان اور جلوہ ذنگاہ کی شرکت بھی مخل تنہائی تھی۔ جہاں نہ کوہ سینا تھا نہ برق طور، دشت ایمن تھا نہ نخل وادی، صوت سرمدی سامعہ نواز تھی اور حقیقت محمدی گوش ساع۔

قرآن نے تو صرف اتنی بات فرمائی ہے کہ کلّمہ ربّہٗ یہاں کلام کے قرآن کے مخاطبوں نے وہی معنے سمجھے جو عربی زبان میں اس کے معنے ہیں لیکن متکلمین آفرین طبائع نے اس پر قناعت نہیں کی۔ انہوں نے اس کے لیے تاویل کا جامہ تراش لیا اور بنایا کہ کلام جو خدا کی صفت ہے وہ حروف اور آواز سے مرکب نہیں بلکہ وہ ایک صفت ہے جو اس کی ذات پاک سے قائم ہے اس کو کلام نفسی کہتے ہیں۔ نفسی خدا کی صفت ہے لفظی صفت نہیں ہے۔ نفسی مخلوق نہیں ہے لفظی مخلوق ہے قرآن کی صورت میں جو کچھ موجود ہے کلام نفسی نہیں بلکہ کلام لفظی ہے مگر قرآن مخلوق نہیں ہے کیونکہ یہ اللہ کا کلام ہے باین معنے کہ یہ خدا کی صفت کلام کے لیے نشان راہ ہے۔ یہ بات لوگوں نے مختلف انداز میں سمجھائی ہے مثلاً مولانا حقانی فرماتے ہیں۔

کلام خدا کے دو معنے ہیں ایک کلام نفسی جو قدیم ہے پس یہ صفت ازل سے ابد تک اس کو حاصل ہے اس کے سبب سے جس سے چاہتا ہے کلام کرتا ہے جیسے کہ ہم کو صفت کلام حاصل ہے اور ہر وقت ہمارے ساتھ ہے گو کہ ہم کسی سے کلام نہ کریں یہ صفت کلام بالاتفاق ازلی ہے اور اس کے ساتھ قائم ہے سو یہ کلام الٰہی اس سبب سے ہے کہ اس کی صفت ہے دوسرے یہ الفاظ اور عبارت قرآن کی اس کو کلام الٰہی اس وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ سوائے خدا کے اور کسی کی تالیف نہیں ہے بلکہ ان کو خاص اللہ تعالیٰ نے نازل کیا اس معنے سے الفاظ اور عبارت قرآن مجید بھی کلام الٰہی ہے۔

مولانا محمد ادریس نے اسی بات کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے۔

"کلام الٰہی کا اطلاق دو معنی پر ہوتا ہے اوّل یہ کہ کلام اللہ سبحانہٗ کی صفت قدیمہ ہے جو اس کی ذات کے ساتھ قائم ہے اور بسیط ہے۔ دوم کلمات جن کا حق سبحانہٗ نے تکلم فرمایا۔ قرآن کو اسی معنے میں کلام اللہ کہا جاتا ہے۔ یہ کلمات بھی قدیم اور مجرد عن المادہ ہیں کیونکہ اللہ سبحانہٗ

سے ان کا ظہور ا ور صدور ہوا ہے اور جو شی قدیم سے ظاہر اور صادر ہوگی وہ بھی قدیم ہوگی ہمارے الفاظ اور حروف اور ہماری آواز ان کلمات الٰہیہ کے لیے بمنزلہ آئینہ کے ایک مظہر اور تجلی گاہ ہیں۔ اگر کسی شے کا عکس آئینے میں پڑے تو اصل شئے کو عکس کے عوارض سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔ اسی طرح ہماری قرأت اور تلاوت میں جو حدوث کے لوازم پائے جاتے ہیں کلمات الٰہیہ کو ان سے کوئی تعلق نہ ہوگا قدیم اپنے قدیم پر رہے گا حادث اپنے حدوث پر رہے گا حدوث اور امکان کے سارے عوارض بندے کی طرف متوجہ ہوں گے اور خدا اور اس کا کلام ان سب سے منزّہ ہوگا ادھر تنزیہہ و تقدیس ہوگی ادھر تشبیہہ و تمثیل ہوگی۔ ادھر وجوب و قدم ہوگا ادھر حدوث اور امکان ہوگا۔

دوسرے عنوان سے اس کو یوں سمجھو کہ الفاظ اور عبارات معانی کے لیے بمنزلہ آئینہ کے ہیں۔ معانی الفاظ میں حلول نہیں ہوتے اور نہ الفاظ معانی کے لیے محل اور ظرف ہوتے ہیں بلکہ الفاظ معانی کے لیے مظہر اور تجلی گاہ اور ایک آئینہ ہوتے ہیں۔ الفاظ و معانی میں ظاہر اور مظہر کا علاقہ ہوتا ہے حال اور محل ظرف اور مظروف کا علاقہ نہیں ہوتا۔ کوئی شخص یہ نہیں سمجھا سکتا کہ معانی الفاظ کے آئینے میں کس طرح عکس فگن اور جلوہ گر ہیں۔ فقط اجمالاً اتنا جاننا ہے کہ الفاظ اور عبارات کی صفات اور کیفیات سے معانی کو کوئی تعلق نہیں۔ اسی طرح ہماری زبانیں اور ہمارے کتابی نقوش کلمات قدسیہ کے لیے ایک آئینہ ہیں۔ حدوث و امکان کے تمام عوارض ہماری زبان اور کتاب کی طرف متوجہ ہوں گے اور اس کا کلام پاک ان تمام عوارض سے پاک ہوگا۔ [1]

دوسرے علماء نے بھی اللہ سبحانہٗ کی صفت کلام کی تفہیم اسی کے قریب قریب کی ہے۔ دراصل یہ تفہیم کے لیے تقریب نہیں بلکہ تاویل ہے مگر اس تاویلی دلدل میں کلام نفسی ایک ایسی بجھارت ہے جس کے سمجھنے سے بڑے بڑے قاصر رہے ہیں۔ اوروں کا حال تو کتابوں میں ہے لیکن شاہ ولی اللہ محدث دہلوی جن کی اس قسم کے مسائل میں ژرف نگاہی مشہور ہے ان کا اقرار ہے لا ادری ما الذی یسمونہ کلاماً نفسیاً، مجھے پتہ نہیں کہ متکلمین نے کلام نفسی کس چیز کا نام رکھا ہے۔ اس تاویل کے مقابلہ میں وہ تفویض کو ترجیح دیتے ہیں۔ یعنی یہ کہ اللہ سبحانہٗ کلام فرماتا

---

[1] علم الکلام

ہے جیسے اس کے شایانِ شان ہے اور جو اس کی عظمت اور کبریائی کے لائق ہے۔ اللہ کی ذات قادر ہے اور قادر کلام کے لیے ذرائع کا محتاج نہیں ہوتا۔ اسی بنا پر کہا جا سکتا ہے کہ خدا کے کلام کی قرأت اپنی تلاوت کے اعتبار سے حادث ہے کیونکہ قرأت قاری کا وصف ہے نہ کہ خدائے تعالیٰ کا۔ ابن قتیبہ کہتے ہیں کہ :

جو شخص یہ کہتا ہے کہ قرأت غیر مخلوق ہے وہ گویا یہ کہتا ہے کہ انسان کے اعمال غیر مخلوق ہیں۔ (اختلاف اللفظ)

حافظ ابن تیمیہ نے مسلک تفویض کی جو عقلی توضیح فرمائی ہے اس سے ارباب تاویل کا سارا گھروندا پاش پاش ہو گیا۔ انہوں نے اس بنیاد کو منہدم کر دیا جس پر معتزلہ کا اعتراض قائم ہے اور جس کے لیے متکلمین نے کلام نفسی کا کمزور سہارا تلاش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ قرآن اگر غیر مخلوق ہے تو اس کے یہ معنے نہیں ہیں کہ وہ قدیم بھی ہے۔ ابن تیمیہ نے یہ بھی لکھا ہے کہ امام احمد نے یہ دعویٰ کبھی نہیں کیا کہ قرآن قدیم ہے اسے غیر مخلوق کہنے کی حد سے انہوں نے کبھی تجاوز نہیں کیا اور قدیم اور غیر مخلوق ہونے میں کوئی تلازم نہیں۔ یہ لازم نہیں کہ جو چیز غیر مخلوق ہو وہ قدیم بھی ہو، کیونکہ ہر وہ چیز جو ذاتِ خداوندی کے ساتھ قائم ہو، ضروری نہیں کہ وہ اس کی طرح قدیم بھی ہو۔ سب افعال و احداث ذاتِ الٰہی سے "دب" ہیں اور اس سے صادر ہوتے ہیں۔ اپنے وقت حدوث میں وہ اللہ کے ساتھ قائم ہوتے ہیں اور سب احداث اپنے حدوث موضوع کے اعتبار سے حادث ہیں لہٰذا اللہ تعالیٰ خالق ہے اور مخلوق حادث اور نفس خلق و ایجاد اپنے مصدری معنوں میں اپنے حدوث سے موضوع کے لحاظ سے حادث ضرور ہیں لیکن خلق و ایجاد کے لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ مخلوق ہیں کیونکہ صفت موصوف کا مفعول نہیں ہوتی نہ انہیں قدیم کہا جا سکتا ہے۔ کیونکہ وہ موجود بعد العدم ہیں۔ یہ تو فلاسفہ کی خواہ مخواہ کی دھینگا مشتی ہے کہ قدیم و غیر مخلوق میں بتاتے ہیں اور اس کی عمارت ایسے عقلی مفروضوں پر اٹھاتی ہے جنہیں سلف نے کبھی درخورِ التفات نہیں سمجھا۔ چونکہ یہ ظنیات ہیں اس لیے ان کے نتائج بھی ظنی ہیں۔ ابن تیمیہ الرسائل والمسائل میں رقمطراز ہیں :

سلف کا اس امر پر اتفاق ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کلام غیر مخلوق ہے۔ اس سے بعض لوگوں نے یہ سمجھ لیا کہ وہ اس کو قدیم العین سمجھتے ہیں۔ اسی طرح ایک فرقہ نے یہ بات بنائی کہ قرآن درحقیقت معنی واحد کلام نفسی ہے جو مختلف شکلیں

اختیار کرلیتا ہے۔ وہی کبھی امر ہوجاتا ہے کبھی نہی کبھی خبر کبھی مخبر عنہ، وغیرہ اللہ نے اگر اسے عربی میں بولا تو وہ قرآن ہوگیا۔ عبرانی میں بولا تو وہ توراۃ کہلایا۔ سریانی میں بولا ہے تو وہ انجیل ہے۔ لیکن یہ بات بھی عقل اور شریعت دونوں کے بالکل خلاف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قدم ذات کے اعتبار سے صفت کلام قدیم ہے لیکن خود تکلم قدیم نہیں ہے لہٰذا قرآن نہ قدیم ہے اور نہ مخلوق ہے۔ متکلمین یہ بات سمجھانا چاہتے ہیں کہ قرآن کو کلام نفسی کے اعتبار سے غیر مخلوق کہنا چاہیے اور کلام نفسی کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے معانی اللہ تعالیٰ کے ہیں لیکن الفاظ وحروف کی غذائی نہیں ہے لیکن حافظ ابن تیمیہ نے تقریباً سوا اعتراضات متکلمین کے اس نظریہ پر کیے ہیں۔

اس موضوع پر یہ یقیناً غلو ہے کہ کلام کے ساتھ تلاوتِ کلام کو بھی غیر مخلوق کہا جاتے ظاہر ہے کہ کلام اللہ کی صفت ہے جب کلام اللہ کی تلاوت بندہ کا فعل ہے اور افعال بندگان کے مخلوق ہونے کو سب مانتے ہیں۔ کچھ لوگوں نے تو اسے بدعت ہونے کی وجہ سے ناپسند کیا اور کچھ نے کلام اللہ کو مخلوق کہنے کے اندیشہ سے اس پر قدغن قائم کیا۔ ائمہ حدیث میں مشہور امام حدیث علی ابن المدینی کو اس مسئلہ میں اس درجہ غلو تھا کہ تلفظ بالقرآن کے مسئلہ پر ان کو امام بخاری سے سخت اختلاف ہوگیا تھا۔ اصل بات یہ ہے کہ جیسے امام بخاری کو الایمان قول وعمل کے مسئلہ میں اس درجہ غلو تھا کہ جو شخص اس مسئلہ کا قائل نہ ہوتا اس سے حدیث نہ لیتے تھے چنانچہ خود ان کا بیان ہے۔ میں نے کسی ایسے شخص سے حدیث نہیں لکھی جس کا قول یہ نہ تھا کہ الایمان قول وعمل۔ اسی طرح امام ذہلی کو قرآن کے غیر مخلوق ہونے کے باب میں اس درجہ شدت تھی کہ جو شخص تلفظ بالقرآن کو بھی مخلوق کہتا وہ اسے بھی بدعتی سمجھتے تھے۔ یہ واقعہ ہے کہ جب امام بخاری نیشاپور تشریف لائے تو امام ذہلی نے بنظرِ احتیاط پہلے ہی لوگوں سے کہہ دیا کہ امام بخاری کی قیام گاہ پر بہت بڑا ہجوم تھا اس پر ہجوم نشست میں ایک شخص نے امام بخاری سے سوال کیا کہ تلفظ بالقرآن کے بارے میں آپ کیا کہتے ہیں۔ امام موصوف نے جواب دیا افعالنا مخلوقۃ و الفاظنا من افعالنا، ہمارے افعال مخلوق ہیں اور ہمارے الفاظ بھی ہمارے افعال میں داخل ہیں۔ یہ کہنے کے ساتھ حاضرین میں اختلاف ہوگیا اور اختلاف نے تھوڑی دیر میں ہنگامہ کی صورت اختیار کرلی۔ امام ذہلی کو اس واقعہ کی اطلاع ہوئی تو سخت برہم ہوتے۔ ان ہی دنوں بغداد کے محدثین نے بھی امام ذہلی کو لکھ بھیجا کہ امام بخاری نے یہاں بھی تلفظ بالقرآن کے مسئلہ پر کلام کیا۔ اب امام ذہلی سے دیانہ

گیا اور انہوں نے اعلان کر دیا۔

قرآن اللہ کا کلام ہے اور غیر مخلوق ہے اور جو شخص یہ دعویٰ کرے کہ جو الفاظ قرآنی میرے منہ سے نکلتے ہیں وہ مخلوق ہیں وہ بدعتی ہے نہ اس کے پاس بیٹھنا چاہیے نہ اس سے بات کرنی چاہیے اور اس اعلان کے بعد جو امام بخاری کے پاس جائے وہ مشکوک ہے۔

امام ذہلی کا یہ اعلان کرنا کہ سوائے امام مسلم اور احمد بن مسلمہ کے سب لوگوں نے امام بخاری سے قطع تعلق کر لیا۔ خیر یہ داستان طویل ہے۔ اصل بات یہ تھی کہ امام بخاری اس مسئلہ میں تلاوت اور متلو میں فرق کرتے تھے کہ متلو جو اللہ کا کلام ہے غیر مخلوق ہے اور تلاوت جو بندہ کا فعل ہے مخلوق ہے اور یہی سب کا مسلک ہے لیکن امام ذہلی اس تفصیل میں پڑنا ہی نہیں چاہتے تھے۔ وہ خلق قرآن کے مسئلہ میں اس قدر ڈرے ہوئے تھے کہ سرے سے ان مسائل کلامیہ میں گفتگو کرنا ہی پسند نہ کرتے تھے کہ مبادا کسی نئے فتنہ کا دروازہ نہ کھل جائے اور محدثین کی اپوزیشن معتزلہ کی تقویت کا سامان ہو۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ امام بخاری اس بات کو سننے کے روا دار نہ تھے کہ ایمان و عمل جدا جدا ہیں اور ہر ایک کا حکم مختلف ہے وہ اس مسئلہ کی تفصیل میں نہ جاتے تھے۔ صرف یہ دیکھ کر کہ ایمان و عمل کو جدا جدا سمجھنا مرجئہ کا مذہب ہے اس کی سختی سے تردید کرتے تھے حالانکہ اس موضوع پر امام بخاری کا مذہب یہ ہے کہ ایک عصیان شعار اور گنہ گار مسلمان کا معاملہ اللہ کے اختیار میں ہے وہ چاہے تو اپنے قانون عدل کے مطابق اس پر عذاب کرے اور چاہے تو اپنے فضل سے اس کو معاف کر دے مگر اس مسئلہ کی تفصیل میں نہ جانے سے امام بخاری کو اس مسئلہ میں اسی قدر شدت ہو گئی تھی جس قدر امام ذہلی کو تلفظ بالقرآن کے مسئلہ میں تھی۔

بہر حال کلام متکلم کا ایک وصف ہوتا ہے جو کسی ذات کا کمال سمجھا جاتا ہے لہٰذا کلمہ ربہ میں اگر اللہ سبحانہ، کو متکلم کہا گیا ہے تو یہ وصف اس کی ذات مقدسہ کے ساتھ قائم ہے۔ کلام اس سے صادر ہوتا ہے۔ پھر یہ ایک اعلیٰ وصف ہے جو مخلوق میں اس نے پیدا کیا ہے کوئی وجہ نہیں کہ اس اعلیٰ وصف سے اللہ تعالیٰ کو موصوف نہ مانا جائے لیکن جس طرح صفت موصوف کی مفعول نہیں ہوتی اسی طرح خالق کا وصف اس کی مخلوق نہیں بلکہ اس سے متصل ہے۔

یہاں علامہ آلوسی نے امام ابوالحسن اشعری کی طرف منسوب یہ بات کی کہ موسیٰ علیہ السلام نے

کلام نفسی سنا لکھ کر بتایا ہے کہ اگر امام ابوالحسن کی طرف اس کی نسبت درست بھی ہو پھر بھی یہی درست ہے کہ امام ابوالحسن نے اس سے رجوع کر لیا ہے اور اُن کا مذہب سلف کے مطابق ہے۔ علامہ آلوسی نے اپنی کتاب روح المعانی کے مقدمہ میں کھلے لفظوں میں بتایا ہے کہ،

اب حضرت موسیٰ اللہ کی بات سننے کے بارے میں بات سنو۔ میرا کہنا یہ ہے کہ ائمہ دین جس آخری نتیجہ پر پوری ردوکد کے بعد پہنچے ہیں جیسے امام ماتریدی اور امام ابوالحسن اشعری اور دوسرے محققین وہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کا کلام حروف و آواز کے ساتھ سنا جیسا ان تصریحات کا تقاضا جو بہتات میں آئی ہیں کہ ان کی کوئی تاویل مناسب نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ کا اشتیاقِ دید

۱۴۳۔ تو بول پڑا اے میرے رب دکھا تو مجھے میں تیری طرف دیکھوں حکم ہوا مجھے تو ہرگز نہ دیکھے گا۔ اس وقت حضرت موسیٰ کو بلا واسطہ کلامِ الٰہی سننے کی لذت بے پایاں حاصل ہوئی تو کمالِ اشتیاق سے متکلم کے دیدار کی آرزو کرنے لگے اور بے ساختہ درخواست کر دی رب ارنی انظر الیك اے پروردگار میرے اور اپنے درمیان سے حجاب اور موانع اٹھا دیجئے اور وجہ انور بے حجاب سامنے کر دیجئے کہ ایک نظر دیکھ سکوں۔ فرمایا لن ترانی یعنی دُنیا میں کسی مخلوق کا یہ فانی وجود اور فانی قوی اُس: ذوالجلال والاکرام لم یزل ولا یزال کے دیدار کا تحمل نہیں کر سکتے۔ اس سے ثابت ہوا کہ دُنیا میں کسی کو موت سے پہلے دیدارِ خداوندی کا شرف حاصل ہونا شرعاً ممتنع ہے۔ گو عقلاً ممکن ہو کیونکہ اگر امکان عقلی بھی نہ مانا جائے تو موسیٰ علیہ السلام جیسے جلیل القدر پیغمبر کی نسبت یہ خیال نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ایک محال عقلی کی درخواست کرے۔ اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی مذہب ہے کہ رویت باری دُنیا میں عقلاً ممکن شرعاً ممتنع الوقوع ہے۔ اور آخرت میں اس کا وقوع نصوص قطعیہ سے ثابت ہے۔ رہی رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رویت شب معراج میں وہ اختلافی مسئلہ ہے جس کا ذکر انشاء اللہ سورہ نجم میں آئے گا۔[1]

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ کلام سے مشرف ہونے کے بعد حضرت موسیٰ کو شوق ہوا۔ یعنی جب جنب سے ندائے حق سنی تو جوش طلب میں بے خود ہوگئے اور لذت سماع کی محویت میں لذتِ مشاہدہ کے حصول کا ولولہ پیدا ہوگیا۔ چنانچہ انہوں نے نہایت ادب سے درخواست کی رب ارنی انظر الیك میرے سامنے آجا کہ ایک نگاہ دیکھ لوں۔ یہ شوق ایک فطری شوق ہے اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو اس پر ملامت نہیں کی بلکہ یہ فرمایا کہ لن ترانی انسان ان ناسوتی آنکھوں سے خدا کی ذات کو نہیں دیکھ سکتا۔ صرف اس کی صفات کے مظاہر کو دیکھ سکتا ہے آفتاب انسان کی زندگی کی ایک ناگزیر ضرورت ہے مگر اس کی روشنی اور حرارت اسی وقت تک اس کے لیے حیات بخش ہے جب تک وہ نہایت طویل فاصلے سے نہ معلوم کتنے فضائی پردوں کی اوٹ سے اور کتنی چھلنیوں سے گزر کر اپنی روشنی اور حرارت انسان تک پہنچاتا ہے تو جب اس کائنات کی مخلوق کے مقابلہ میں انسان کی قوت برداشت اتنی ناتواں ہے تو وہ خدا کی ذاتِ اقدس کی تاب کس طرح لاسکتا ہے۔

مسند احمد میں حضرت ابوموسیٰ اشعری کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے

> اللہ سبحانہ، نہ سوتا ہے اور نہ سونا اس کی شان ہے، میزان عدل کو پست کرتا ہے اور بلند کرتا ہے۔ اس کے اور اس کی مخلوق کے درمیان خود اس کا نور اس کا حجاب ہے اگر وہ یہ حجاب اٹھا دے تو اس کی ذات کے انوار جہاں تک نظر ہو سب کو پھونک ڈالیں۔

اصل روایت میں حجابہ النار ہے اور صحیح مسلم میں اس کی جگہ حجابہ النور آیا ہے چونکہ حقیقت کے لحاظ سے نور اور نار میں کوئی فرق نہیں ہے اس لیے ہم نے اس کا عام فہم ترجمہ نور ہی کر دیا ہے۔ ابوعبیدہ نے لفظ نار کی مناسبت سے یہاں قرآن کی آیت فلما جاءھا نودی ان بورك من فی النار تلاوت کی ہے یعنی جب حضرت موسیٰ کو صورت نار میں تجلی ہوئی تو معلوم ہوا کہ ذات پاک کا حجاب نار تھا جس کے پس پردہ اس کی تجلی ہو رہی تھی۔ اس بابرکت نار اور بابرکت ماحول سے کسی نافہم کو یہ دھوکا نہ لگے کہ معاذاللہ خدا کی ذات آگ میں حلول کر آئی تھی۔ اس لیے فرمایا سبحان اللہ رب العالمین یعنی وہ اس آگ اور سارے جہان کا پالنے والا ہے۔ وہ جسم و جہت، حدوث و حلول کے آثار سے پاک و برتر ہے۔ ارشادِ نبوت کا خلاصہ یہ ہے کہ خالق کا حجاب مخلوق کی طرح باہر سے نہیں یہاں خود اس کے عظمت و جلال

کے انوار ہی اس کا حجاب ہیں جس طرح کہ خود آفتاب کی کرنیں اور حسین کا حسن کبھی کبھی اس کے دیدار کے لیے حجاب بن جاتا ہے۔ اسی طرح یہاں خود اس کی عظمت و جلال کے انوار ہی اس کا حجاب بن رہے ہیں۔ عقولِ انسانی نے بارہا شوخی کی اور چاہا کہ بے حجاب نظارہ کریں مگر ہمیشہ حیران اور سرگرداں ہو کر ناکام واپس آگئیں۔ اب اس عالم میں بے حجاب دیدار کی صورت صرف یہ ہے کہ وہ خود اس حجاب کو اٹھا دے تو اس پر اس کو تو قدرت ہے مگر مخلوق میں اتنی طاقت نہیں کہ اس کی تاب لا سکے۔ اربابِ عقول کا حصہ یہاں صرف اعتقادِ عظمت ہے اور اربابِ کشف کا ذوق و وجدان۔

اس آیت سے معتزلہ نے استدلال کیا ہے کہ اللہ کی رویت اور اس کا دیدار اس دارِ دُنیا میں اور دارِ آخرت میں عقلاً ناممکن اور محال ہے اس لیے کہ رویت کا تقاضا جسمیت ہے یعنی دیکھی وہ ہی چیز جاتی ہے جو مجسم ہو۔ لیکن اہل السنۃ کے دونوں طبقے اربابِ تاویل اور اصحابِ تفویض نے معتزلہ سے اختلاف کیا ہے۔ وہ اس کے تو قائل ہیں کہ اس ناسوتی زندگی میں انسان اللہ کا دیدار نہیں کر سکتا لیکن آخرت میں وہ اللہ کے دیدار کے قائل ہیں۔ اور دُنیا کی زندگی میں وہ اپنی مادی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکتا مگر یہ نہ دیکھ سکنا امتناعِ عقلی کی بنا پر نہیں بلکہ امتناعِ شرعی کی بنا پر ہے اور یہ آیت اسی امتناعِ شرعی کی دلیل ہے۔ اگر دیدارِ خداوندی امرِ محال ہوتا تو خود حضرت موسیٰ علیہ السلام اللہ سبحانہٗ سے اس کی رب ارنی فرما کر اس کی درخواست نہ فرماتے۔ یہ ناممکن ہے کہ اللہ کے پیغمبر کو یہ علم نہ ہو کہ کون سی چیز بارگاہِ خداوندی میں ممکن ہے اور کون سی محال۔ نیز یہاں خود اس درخواست کا جواب لن ترانی بھی اس امکانِ عقلی کا مؤید ہے کیونکہ جواب میں یہ فرمایا لن ترانی تم ہرگز نہ دیکھو گے۔ یہ نہیں فرمایا لن ارٰی یعنی میں ہرگز نہ دیکھا جاؤں گا یعنی میرا دیدار ممکن نہیں ہے۔ لن ترانی کا مطلب یہ ہے کہ اگرچہ میں اس قابل ہوں کہ دیکھا جاؤں۔ میری طرف سے کوئی حجاب نہیں ہے مگر تم میں دیدار کے تحمل کی قوت نہیں اس لیے تم مجھے دُنیا میں نہ دیکھ سکو گے۔ ہاں آخرت میں قوتِ تحمل عطا کر دی جائے گی اس لیے وہاں دیکھ سکیں گے۔ دنیا دارِ فنا ہے اور آخرت دارِ بقاء ہے۔ آخرت میں پہنچ جانے کے بعد نہ کسی کو موت آئے گی اور نہ کوئی بیمار ہو گا اور نہ کسی کو ضعف لاحق ہو گا۔

قرآن و سنت اور اجماعِ صحابہ اور تابعین سے یہ بات ثابت ہے کہ اہلِ ایمان جنت میں دیدارِ خداوندی سے مشرف اور سرفراز ہوں گے۔ جس طرح خداوندِ ذوالجلال بندوں کو دیکھتا ہے

اور خود مکان و جہت سے پاک اور منزہ ہے اور بندے مکان اور جہت میں ہیں۔ اسی طرح عقلاً یہ بھی ممکن ہے کہ بندے اس خداوند ذوالجلال کو اس طرح دیکھیں کہ بندے تو کسی خاص سمت میں ہوں اور اللہ مکان و جہت اور سمت سے پاک ہو۔ دیکھنے کے لیے یہ ضروری نہیں کہ جس شے کو دیکھا جائے وہ جسم ہی ہو اور کسی خاص سمت اور مکان میں ہو۔ یہ تمام باتیں رویت کی شرائط عادیہ میں عقلاً جائز ہیں کہ رویت کی تمام شرطیں موجود ہوں۔ آج بھی اللہ سبحانہٗ کو دل کی آنکھوں سے بے کیف دیکھتے ہیں۔ قیامت کے دن سر کی آنکھوں سے بے کیف دیکھیں گے یہ ہے اہل تاویل کا موقف۔ اہل تفویض قیامت کے دن دیدار الٰہی کے عقیدے پر کامل ایمان رکھتے ہیں اس لیے کہ یہ بات نصوص سے ثابت ہے لیکن وہ اس ادھیڑ بن میں نہیں پڑتے کہ یہ رویت کس طرح ہوگی۔ نہ معتزلہ کی طرح یہ سوچتے ہیں کہ رویت کے لیے جسم کا ہونا ضروری ہے وہ اس بات پر ایمان رکھتے ہیں کہ خدا کی رویت ہوگی اور اس طرح ہوگی کہ وہ فانی چیزوں سے متشابہ نہ ہوگی لیکن رویت کی حقیقت اور کیفیت یہ وہ مباحث ہیں کہ جن پر غور و فکر غیر ضروری ہے۔ ان کے خیال میں آخرت میں دیدار الٰہی کا عقیدہ تنزیہہ کے قطعاً منافی نہیں۔ جہت اور مکان وغیرہ کے لزوم کی حیثیت خود ساختہ اصطلاحات کا گورکھ دھندا ہے۔ تنزیہہ کے مفہوم میں جہت و مکان کے عموم کے داخل ہونے پر نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی، سینکڑوں براہین سے اللہ سبحانہٗ کا علو ثابت ہے اور آخرت میں اس کا دیدار بھی۔ اب جو لازم آتا ہے آجائے۔ اس سے رویت کے ثبوت پر کچھ اثر نہیں پڑتا۔ بلکہ یہ ایک مضحکہ خیز بات ہے کہ رویت کو تسلیم کر کے جہت سے فرار کیا جائے چنانچہ ایک متکلم امام ابن فورک سلطان محمود غزنوی کے سامنے لاجواب ہو گئے۔ جب انہوں نے دریافت کیا کہ رویت بلا جہت کیا ہوتی ہے۔ علامہ ابن رشد نے بھی اس کو اشعریوں کا تناقض قرار دیا ہے دیکھو الکشف عن مناہج الادلہ۔ حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں اس موضوع پر بڑی تفصیل سے بحث کی ہے اور اہل تاویل کے سارے استدلالوں کا مدلل رد فرمایا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ الرد علی المنطق میں لکھتے ہیں:

خدا کا ممکن الرویۃ ہونا دلائل عقلیہ سے ثابت ہے لیکن وہ دلیل نہیں جو ابوالحسن اشعری وغیرہ نے قائم کی ہے۔

ابن قتیبہ نے اختلاف اللفظ میں پوری بات کو کھول کر سمجھایا ہے کہ:

لا تدرکہ الابصار کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا میں خدا کو دیکھا نہیں جا سکتا۔ اسی طرح لن ترانی میں جو فرمایا کہ تم مجھے ہرگز نہ دیکھو گے۔ یہ بھی دنیا کے لیے ہے۔ لیکن یوم حساب و جزا، قصاص کے دن وہ اپنی تجلی سے لوگوں کو شادکام کرے گا اور وہ اسے دیکھیں گے جس طرح چاندنی رات میں چاند کو دیکھتے ہیں۔ حدیث رسول کتاب اللہ کی مفسر اور شارح ہے۔ رویت کی حدیث کی صحت سے کوئی جاہل ہی انکار کر سکتا ہے۔ کیونکہ ثقہ راویوں کی یہ حدیثیں جہات کثیرہ سے ثابت ہیں پس اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد میں کہ لا تدرکہ الابصار اور حدیث رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تصریح میں کہ تم قیامت کے روز اللہ کو دیکھو گے ایک صاحب نظر کے لیے صرف وقت کا فرق ہے۔

انشاء اللہ رویت باری پر پوری تفصیلی بحث معالم القرآن کی تائیسویں جلد میں آئے گی بشرطیکہ قفس عنصری میں انفاس حیات رواں رہے یہاں صرف اتنی بات یاد رکھ لیجئے کہ جنت کی سب سے آخری اور سب سے بڑی نعمت اللہ سبحانہ کی تجلی کا نظارہ ہے۔ کون ہے جو اس مطلع انوار کے دیدار کی تاب لا سکے۔ تاہم یا تو یہ آنکھیں کچھ اور ہوں گی یا وہ نور مطلق وہاں کسی شان میں نمایاں ہوگا۔ اس وقت یہ عالم ہوگا کہ وہ نور کا مرکز بن کر نمودار ہوگا اور جنت کی مشتاق نگاہیں اس کی طرف اٹھی ہوں گی۔

وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ

حافظ ابن حجر عسقلانی نے صحیح بخاری کی شرح فتح الباری میں لکھا ہے:

مثبتین رویت کا رویت کے مفہوم میں اختلاف ہے۔ کچھ کی رائے ہے کہ دیکھنے والے کے لیے اللہ سبحانہ کا علم عینی ہوگا جیسا کہ دوسری مرئیات میں ہوتا ہے یہ بات کما تردن القمر کے مطابق ہے لیکن اللہ کی ذات جہت اور کیفیات سے منزہ ہے اور کچھ کے خیال میں رویت سے علم ہی مراد ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں اللہ کی نسبت ایسی حالت پیدا ہو جائے گی جیسے آنکھ کی مرئیات سے حاصل ہوتی ہے اور کچھ کہتے ہیں انسان کا اللہ کو دیکھنا دراصل ایک قسم کا کشف و علم ہے لیکن یہ علم سے زیادہ واضح اور تام ہوگا اور یہ پہلی رائے کی نسبت زیادہ اقرب الی الصواب ہے۔

۱۷۵- ہاں اس پہاڑ کی طرف دیکھو اگر یہ اپنی جگہ ٹکا رہا تو مجھے دیکھ پاؤ گے۔ یعنی تم پہاڑ کی طرف دیکھتے رہو ہم اپنے جمال مبارک کی ایک ذرا سی جھلک اس پر ڈالتے ہیں۔ اگر پہاڑ جیسی سخت اور مضبوط چیز اس کو برداشت کر سکی تو ممکن ہے تم کو بھی اس کا تحمل کرا دیا جائے ورنہ سمجھ لیجئے کہ جس چیز کا تحمل پہاڑ سے نہ ہو سکے کسی انسان کی مادی ترکیب اور جسمانی آنکھیں اسے کیسے برداشت کر سکتی ہیں۔ اگرچہ قلبی و روحانی طاقت کے اعتبار سے زمین آسمان پہاڑ سب چیزوں سے انسان فائق ہو اور اسی لیے موسیٰ علیہ السلام جس وحی الٰہی کے حامل تھے بلکہ دوسرے انبیاء بھی جس امانتِ عظیمہ کے حامل ہیں پہاڑ وغیرہ اس کے اٹھانے پر قادر نہیں۔ فابین ان یحملنہا واشفقن منہا وحملہا الانسان اور لو انزلنا ھذا القرآن علی جبل لرایتہ خاشعا متصدعا من خشیۃ اللہ تاہم جس چیز کا تعلق ظاہری آنکھوں یا بدن کی مادی قوت سے ہو اس میں انسان دوسری عظیم الخلقت چیزوں سے بہت کمزور واقع ہوا ہے لخلق السماوات والارض اکبر من خلق الناس ولکن اکثر الناس لا یعلمون اور وخلق الانسان ضعیفا" اس جگہ موسیٰ علیہ السلام کو انسانی وجود کی اسی کمزوری کی طرف توجہ دلاتی ہے [1]

یہ مشاہدہ حضرت موسیٰ کی تسلی اور اطمینانِ خاطر کے لیے کرایا گیا کہ اللہ سبحانہٗ کی تجلی ذات کی تاب تو کوہ و جبل بھی نہیں لا سکتے جو جمود اور سختی میں انسان سے کہیں زیادہ ہیں تو انسان ضعیف البنیان ہو کر تم کس طرح لا سکو گے۔ انسان کی قوتِ برداشت محدود ہے۔ اس کی نگاہیں روشنی کو دیکھتی ہیں لیکن یہ روشنی ایک خاص حد سے بڑھ جائے تو آنکھیں جواب دے جاتی ہیں تو جب اس کائنات کی مخلوق کے مقابلے میں انسان کی قوت اتنی ناتواں ہے تو خدا کے جمالِ مطلق کی تاب کس طرح لا سکتی ہے۔ جو نورِ مطلق اور تمام چون و چگون سے ماورا اور بالاتر ہے فرمایا کہ تم مجھے نہیں دیکھ سکتے البتہ تم سامنے کے پہاڑ کی طرف دیکھو میں اس پر اپنی تجلی ڈالتا ہوں اور وہ تجلی بھی کتنی۔ مسند احمد اور سنن ترمذی میں حضرت انس بن مالک کے حوالہ سے بتایا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے دو انگلیوں کے اشارے سے بتایا کہ بس اتنی سی تجلی پہاڑ پر ہوئی۔ اگر اس پر پہاڑ اپنی جگہ رہ جاتے تو تم سمجھ لینا کہ تم مجھے دیکھ سکتے ہو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں بھی متکلمین اور معتزلہ نے اپنی اپنی جولانی طبع کا مظاہرہ کیا ہے اور کھینچا تانی کی ہے حالانکہ دنیا میں رویت باری کی حد تک دونوں تھوڑے سے فرق کی حد تک محال بتاتے ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ معتزلہ دنیا میں اللہ کے دیدار کو محال عقلی کہتے ہیں اور متکلمین اسے محال شرعی کہتے ہیں باقی آخرت میں اللہ کی رویت تو اس کا آیت سے دُور کا واسطہ نہیں ہے۔

پہاڑ پر اللہ کی تجلی

۱۷۶- پھر جب اس کے پروردگار کی پہاڑ پر تجلی ہوئی تو پہاڑ ریزہ ریزہ ہوگیا اور موسیٰ بیہوش ہوگئے۔ حق تعالیٰ کی تجلیات بہت طرح کی ہیں اور یہ خدا کا ارادی فعل ہے کہ جس چیز پر جس طرح چاہے تجلی فرماتے۔ پہاڑ پر جو تجلی ہوئی اس نے معاً پہاڑ کے خاص حصہ کو ریزہ ریزہ کر ڈالا۔ اور موسیٰ علیہ السلام چونکہ محل تجلی سے بعتے ان پر اس قرب محل اور پہاڑ کے ہیبتناک منظر دیکھنے کا یہ اثر ہوا کہ بیہوش ہوکر گر پڑے۔ بلاتشبیہ یوں سمجھ لیجئے کہ بجلی جس چیز پر گرتی ہے اسے جلا کر ایک آن میں کس طرح خاک سیاہ کر دیتی ہے اور جو لوگ اس مقام کے قریب ہوتے ہیں بسا اوقات انہیں بھی کم و بیش صدمہ پہنچ جاتا ہے[۱]

تجلی کیا ہے اور اس کی نوعیت و کیفیت کیا ہوتی ہے۔ اس پر شارحین قرآن نے کوئی خاص تبصرہ نہیں کیا ہے لیکن حضرت مولانا اسماعیل شہید نے اپنی مشہور کتاب عبقات میں اس موضوع پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔

تجلیات الٰہی کی تاویل کرنے والے دو گروہ

انبیاء علیہم السلام اور وہ سارا طبقہ جس نے تجلیات کی بنی آدم کو دعوت دی ہے ان کے کلام میں جو بات پائی جاتی ہے یعنی تجلیات میں منشاؤں کے قیام کی وجہ سے بالفاظ دیگر معنے مصدری کے منشا کا حق تعالیٰ میں بلکہ تجلیات الٰہی میں قیام کی وجہ سے خود حق تعالیٰ پر ان سے مشتق شدہ الفاظ کا جو اطلاق کیا گیا ہے اسی طرح ان مصادر سے جو افعال بنتے ہیں ان افعال کو بھی حق تعالیٰ کی طرف جو منسوب کیا گیا ہے اس کی جن لوگوں نے تاویلیں کی ہیں وہ دو گروہوں میں

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

منقسم ہیں۔ ایک گروہ تو ان لوگوں کا ہے جو قائل ہے کہ ان مصدری معانی کے مناشی واقع میں پائے تو جاتے ہیں لیکن ان کی وجہ سے حق تعالیٰ پر ان سے مشتق شدہ الفاظ کا اطلاق مجازی ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ چونکہ تجلی کی حقیقت متجلی کے سامنے بے حقیقت ہوتی ہے اس لیے اس واقعہ کی تہ تک ان بیچاروں کی رسائی حاصل نہیں ہوئی۔ ان کی اسی نارسائی نے سچ پوچھو تو ان لوگوں کو تاویل پر مجبور کیا ہے۔ انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ ثبوت احکام کے لیے اور مشتق الفاظ کے اطلاق کے لیے تجلی صرف ایک شرط ہے۔ نہ یہ کہ ان احکام کو تجلی ثابت کرتی ہے یا ان مشتق الفاظ کی وہ مصداق ہے۔

دوسرا گروہ جو پیغمبروں اور ہادیوں کے کلام کے اس حصہ کی تاویل کرتا ہے یہ وہ لوگ ہیں جو تجلی کے معنے کا انکار کرتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ ان مشتق اسماء اور افعال جن کو خدا کی طرف منسوب کیا گیا ہے واقع میں ان کا منشا پایا ہی نہیں جاتا بلکہ یہ ایک مجازی تعبیر ہے اور اور معانی غیر محسوسہ یا معقولہ کو محسوس کا قالب عطا کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ایک واضح اور صاف بات ہے کہ جو کچھ یہ حضرات کہتے ہیں اور جن تاویلوں کا یہ سہارا تلاش کرتے ہیں ان کی بنیاد ایسے کمزور علاقوں پر قائم ہے جو مجاز کی بنیاد نہیں ہو سکتے اور اہل زبان اس قسم کی بے بنیاد و مجازی تعبیروں کو کبھی جائز قرار نہیں دے سکتے۔

کیسی عجیب بات ہے کہ انبیاء علیہم السلام نے ایک قرینہ بھی اپنے کلام میں ایسا نہیں چھوڑا ہے جسے بنیاد بنا کر ظاہر مطلب سے ان کے کلام کو ہٹا کر ان خود ساختہ مطالب پر چسپاں کیا جا سکے۔ ان بزرگوں میں سے کسی نے اپنی ساری زندگی میں اپنے مخلص ترین رفقاء سے خلوت یا جلوت میں کبھی ایسی بات نہیں کی جس سے اندازہ ہو سکے کہ ان کے کلام سے جو بات بظاہر سمجھ میں آرہی ہے وہ مقصود نہیں ہے اور انہوں نے یہ کبھی نہیں بتایا کہ جن باتوں کو وہ خدا کی طرف منسوب کر رہے ہیں ان سے اللہ سبحانہ کی ذات گرامی پاک اور منزہ ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کسی صحیح یا ضعیف حدیث ایسی کوئی بات ثابت نہیں ہوتی جس سے ان لوگوں کے تاویلی خیالات کی تائید کسی طرح بھی ہوتی ہو۔ یعنی جن احکام و امور کی ذات حق سبحانہ سے وہ نفی کرتے ہیں اپنی اس نفی کی تائید میں ان بزرگوں کی کوئی تصریح پیش نہیں کرتے بلکہ ان کا جو طریق کار ہے اس سے تو گویا نعوذ باللہ یہ اندازہ ہوتا ہے کہ انبیاء کے بارے میں اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانا چاہتے ہیں کہ دنیا کو ان بزرگوں نے گمراہی میں مبتلا کیا ہے اور اس سے

آگے یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ خود اللہ سبحانہٗ نے اپنے بندوں کی رہنمائی کے لیے اس قسم کے افراد منتخب کیے جن پر الٰہیات کے اسرار ہی نہ کھلے تھے اسی لیے ان بزرگوں نے لوگوں کو ایسی باتیں سکھائی ہیں جن کا واقعات سے کوئی ربط نہ تھا۔ اللہ کی ذات اس قسم کی بدگمانیوں سے پاک ہے۔ یہ بہت بڑا بہتان اور عظیم افترا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے شریعت کے طوق کو اپنے گلوں سے نکال پھینکا ہے اسی لیے ان کا شمار کسی حیثیت سے بھی اہل السنہ میں نہیں ہو سکتا۔

فی الواقع صحیح معنوں میں اہل السنہ کہلانے کے مستحق صحابہ کرام اور بزرگان دین کا وہ طبقہ ہے جنہوں نے صحابہ کی پیروی کی۔ بہر حال ہمارے لیے یہ کس طرح جائز نہیں کہ پہلوں کی راہ سے ہٹ جائیں۔ جب ہم سن چکے ہیں الرحمان علی العرش استوی اور تجلی للجبل جعلہ دکا۔ ہمیں کہنا چاہیے

ربنا امنا بما انزلت و اتبعنا الرسول فاکتبنا مع الشاھدین۔

یہاں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ معنی مصدری کے منشاؤں کے قیام اور تحقق کی جو نوعیت تجلی اور متجلی کے سلسلے میں ہے وہ مناشی کے اس تحقق اور قیام سے مختلف ہے جو عام طور پر مناشی کے قیام سے سمجھا جاتا ہے اور یہی مطلب ان حضرات کا ہے جنہوں نے اس قسم کی صفات کے متعلق یہ فیصلہ کیا ہے کہ کیفیت کو مجہول قرار دے کر ان پر ایمان لانا چاہیے۔ درحقیقت ان کے خیال کی بنیاد اسی پر قائم ہے کہ منشا کے قیام کی نوعیت جو ہوتی ہے وہ منشا کے اس قیام سے مختلف ہے۔ جو تجلی اور متجلی کے سلسلے میں ہے۔ یہی حال ان دونوں سلسلوں میں احکام کے اختلاف کا بھی ہے۔ بہر حال ان دونوں سلسلوں میں اختلاف کی جو شکلیں ہیں ان میں بعض یہ ہیں۔ مثلاً یہ کہ تجلی کی راہ سے جو احکام متجلی کے لیے ثابت کیے جاتے ہیں ان احکام سے متجلی کی ذات پاک اور منزہ بھی ہوتی ہے اور پھر ان احکام سے متجلی کی ذات موصوف بھی ہوتی ہے اور یہ دونوں باتیں ایک ہی وقت میں ثابت ہوتی ہیں یعنی ٹھیک تجلی کرنے کا جو زمانہ ہوتا ہے اس وقت یہ دونوں باتیں صادق ہوتی ہیں اور یہ جو میں نے کہا کہ ان احکام سے متجلی کی ذات منزہ ہونے کے باوجود ان ہی سے موصوف بھی ہوتی ہے تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ معروض اپنی ذات کے مرتبہ میں عوارض سے پاک ہوتا ہے اور عوارض کے مرتبہ میں ان سے موصوف ہوتا ہے۔ بہر حال عوارض و معروضات کے سلسلے میں جو یہ بات کہی جاتی ہے اور معروضات کی تنزیہیہ مرتبہ ذات میں عوارض سے جو کرتے ہیں تو ظاہر ہے کہ یہ کوئی واقعہ نہیں ہے بلکہ آدمی کے ذہن کا ایک تخلیقی کارنامہ ہے اور صرف ذہنی فن کاری کا نتیجہ ہے

برخلاف اس پاکی و تقدس کے جو متجلی کی ذات کے لیے ثابت کی جاتی ہے کہ یہ ایک واقعہ ہے۔
من جملہ اختلاف اور مغایرت کے وجوہ کے ایک وجہ یہ بھی ہے کہ متجلی کی اپنے مرتبہ ذات میں اس کی گنجائش ہی نہیں رکھتی کہ نو پیدا حوادث کی محل بن کر تغیر و انقلاب کی آماجگاہ بن جائے لیکن باوجود اس کے نو بہ نو احکام جو تدریجی طور پر پیدا ہوتے رہتے ہیں یعنی احکام متجددہ کا ثبوت اور نت نئے پیدا ہونے والے امور حادثہ کا صدور تجلی کی راہ سے متجلی کی ذات کی طرف منسوب ہوتا ہے اور اس کی مثال گویا ایسی ہے کہ آدمی جب گفتگو کرتا ہے تو اس وقت ظاہر ہے کہ اس نفس ناطقہ کے لیے گفتگو کرنے کی صفت ثابت ہوتی ہے۔ یعنی اس کے متعلق کہا جائے گا کہ اس وقت وہی بول رہا ہے اسی طرح بولنے کے نتائج و احکام بھی اس کی ذات کو ثابت ہوں گے۔ یعنی یہ بات کہ ایسے گہرے مطالب اور دقیق مضامین جو پوشیدہ تھے ان کا اظہار نفس نے کیا۔ نیز موسیقی کا کمال اور فصاحت و بلاغت کا ظہور اس سے ہوا اور یہ کہ جاہل کے علم میں اس کی گفتگو کی وجہ سے اضافہ ہوا، ناقص کی تکمیل ہوئی۔ الغرض کلام کرنے کے یہ سارے آثار و نتائج نفس ناطقہ ہی کی طرف منسوب ہوں گے لیکن ظاہر ہے کہ بولنے اور تکلم کا سرچشمہ اس آواز کے سوا اور کیا ہے جس کے قیام کا تعلق زبان سے ہے یا حلق سے مگر باایں ہمہ نفس ناطقہ کے متعلق یہ کہنا درست نہ ہوگا کہ نو بہ نو پیدا ہونے والے صفات کا اس میں اضافہ ہوا زیادہ سے زیادہ اسی کو نفس کی طرف منسوب کرنے کی گنجائش یہاں پیدا ہوتی ہے۔ گویا اس کی مثال ایسی ہوئی کہ سرخ رنگ کا شیشہ فرض کیجئے کہ آفتاب اور زمین کے درمیان حائل ہو جائے اور اس کی وجہ سے آفتاب جس کی شعاعیں پہلے سرخ نہ تھیں وہ سرخ ہو گئیں۔ اب کھلی ہوئی بات ہے کہ لال رنگ کی یہ کرنیں شیشہ کی نہیں بلکہ آفتاب ہی کی کرنیں سمجھی جائیں گی مگر اس کو سب جانتے ہیں کہ آفتاب اپنی چمک دمک میں اور اس باب میں کہ اس کی شعاعیں سفید رنگ رکھتی ہیں اپنے حال پر قائم رہتا ہے، جیسے اس سرخ شیشہ کے حائل ہونے سے پہلے بھی اس کا حال تھا یعنی اس شیشے کے حائل ہونے کی وجہ سے آفتاب میں کسی جدید صفت کا یا نئے حکم کا اضافہ قطعاً نہیں ہوا۔ یا یوں سمجھو کہ آفتاب اور کسی سیاہ جسم کے درمیان کسی آتشیں شیشہ کو رکھ دیا جائے اور اس عمل کی وجہ سے سیاہ جسم میں آگ لگ گئی اور وہ جل اٹھا تو ظاہر ہے کہ اس سیاہ جسم کو جلانے والا شیشہ نہیں بلکہ آفتاب ہی ہے مگر کیا آفتاب کی ذات میں اس کی وجہ سے کسی ایسی جدید صفت کا اضافہ ہوا جسے جلانے کے اس عمل کا منشا قرار دیا جائے۔

افضل المحققین نے اپنی کتاب لمعات کے مبادی میں جو یہ لکھا ہے کہ اول یعنی واجب تعالیٰ کے لیے تجلی کے جو احکام ثابت ہوتے ہیں تو وہ تجلی کی شرط کے ساتھ مشروط ہیں۔

اس کا یہی مطلب ہے وہ یہ بیان کرنا چاہتے ہیں کہ تجلی کے احکام سے متجلی کی ذات باوجودیکہ منزہ اور پاک ہوتی ہے لیکن ٹھیک اسی وقت اس کی طرف پھر یہ احکام بھی منسوب ہوتے ہیں۔ اس کا راز کیا ہے؟ یہ دونوں باتیں ایک ساتھ واقعیت کا رنگ کیسے اختیار کر سکتی ہیں۔ کیونکہ ابھی جیسا کہ بتایا جا چکا ہے کہ یہ وہ صورت نہیں جو عوارض اور معروضات کے درمیان ہوتی ہے یعنی معروضات کے متعلق بھی کہا جاتا ہے کہ اپنے مرتبہ ذات میں وہ عوارض سے پاک اور منزہ ہوتے ہیں۔ بتا چکا ہوں کہ یہ تو صرف ایک ذہنی کارستانی کا نتیجہ ہے۔
بہرحال تجلی کی حقیقت کا صحیح علم اور یہ کہ متجلی کی ذات ایک ہی وقت میں تجلی کے احکام سے منزہ و پاک بھی ہے اور اسی وقت ان احکام سے موصوف بھی ہے جو اس راز کی اصل حقیقت کو پانا چاہتا ہے۔ اس کو چاہیے کہ تشبیہ اور تنزیہ کے دونوں نظریوں میں مطابقت پیدا کرے اور سمجھے کہ واقعہ یہ بھی ہے اور وہ بھی ہے یعنی تشبیہ و تنزیہ کے مابین مسلک کو اختیار کرے جس کی طرف حضرات انبیاء علیہم السلام نے دعوت دی ہے۔
باقی بعض اکابر صوفیہ کے کلام سے بظاہر جو یہ سمجھا جاتا ہے کہ تنزیہ و تشبیہ کے اجتماع کا مطلب یہ ہے کہ لاہوت کی ایسی معرفت حاصل کی جائے جس کی وجہ سے لاہوت کے متعلق یہ کہنا عالم کا وہ عین ہے یا غیر یہ دونوں باتیں درست ہو جائیں تو ظاہر ہے کہ ہمارے مقابلے میں اس قسم کے مسائل کے زیادہ تر جاننے والے یہی حضرات ہیں مگر اگر مجھ سے دریافت کیا جائے تو میں یہی کہوں گا کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کیونکہ حضرات انبیاء علیہم السلام نے لوگوں کو تجلی ہی کی طرف دعوت دی ہے۔ تجلیات سے اوپر جو مراتب ہیں ان سے ان کی دعوت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جن لوگوں نے حضرات انبیاء کے پیغام کا مطالعہ کیا ہے وہ اس سے بخوبی واقف ہیں۔
تنزیہ و تشبیہ دونوں میں ہم آہنگی پیدا کر کے اس کو اپنا مسلک بنانا ہر آدمی کے بس کی بات نہ تھی اس لیے تنزیہ کے موضوع پر تو نبوت نے اشارات اور اجمال سے کام لیا ہے۔ فرمایا لیس کمثلہ شئی۔ اور تشبیہ کے موضوع کی انہوں نے اہمیت محسوس کی۔ حق تک رسائی حاصل

کرنے کی طبعی راہ بھی ہو سکتی ہے۔[1]

تنزیہہ کی تکمیل

غور فرمائیے تجلی ربہ للجبل میں قرآن نے تنزیہہ کی ایسی تکمیل کی ہے جس کی کوئی نمود نزول قرآن کے زمانہ میں دنیا میں موجود نہ تھی۔ قرآن سے پہلے تنزیہہ کا بڑے سے بڑا مرتبہ جس کا ذہن انسانی متحمل ہو سکتا تھا یہ تھا کہ اصنام پرستی کی جگہ ایک ان دیکھے خدا کی پرستش کی جاتے لیکن جہاں تک صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا۔

یہ مقام قرآن و تورات کا مشترک ہے۔ دقتِ نظر کے ساتھ دونوں کا مطالعہ کرو۔ تورات میں جہاں کہیں براہِ راست خدا کی نمود کا ذکر کیا گیا ہے قرآن نے وہاں خدا کی تجلی کا ذکر کیا ہے۔ تورات میں جہاں یہ پاؤ گے کہ خدا متشکل ہو کر اترا۔ قرآن اُس موقع کی یوں تعبیر کرے گا کہ خدا کا فرشتہ متشکل ہو کر اترا۔ قرآن اس موقع کی یوں تعبیر کرے گا کہ خدا کا فرشتہ متشکل ہو کر نمودار ہوا۔ بطورِ مثال صرف اسی مقام کو دیکھئے تورات میں ہے۔

خداوند نے کہا اے موسیٰ دیکھ یہ جگہ میرے پاس ہے تو اس چٹان پر کھڑا رہ، اور یوں ہوگا کہ جب میرے جلال کا گزر ہوگا تو میں تجھے اس چٹان کی دراز میں رکھوں گا اور جب تک نہ گزر دل گا تجھے اپنی ہتھیلی سے ڈھانپے رہوں گا پھر ایسا ہوگا کہ میں اپنی ہتھیلی اٹھالوں گا اور تو میرا پیچھا دیکھے گا لیکن تو میرا چہرہ نہیں دیکھ سکتا۔ (خروج)

تب خداوند بدلی کے ستون میں ہو کر اترا اور خیمہ کے دروازے پر کھڑا رہا....
اس نے کہا کہ میرا بندہ موسیٰ اپنے خداوند کی شبیہہ دیکھے گا۔ (گنتی)

اسی بات کو قرآن نے یہاں اس بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔ تجلی ربہ للجبل۔
یہاں حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز نے لطیف انداز میں جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ بھی گوش گزار فرما لیجئے فرماتے ہیں۔

---

[1] عبقات

پہاڑ پر تجلی ہونے کے معنے یہ ہیں کہ حق تعالیٰ کا نور خاص بارادہ خداوندی خلائق سے محجوب ہے اور اس محجوب ہونے کے جو وسائط ہیں وہ حجب اور موانع ہیں۔ ان کی تعیین کا اللہ ہی کو علم ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان حجابات میں سے بعض حجاب ہٹا دیے گئے ہوں اور چونکہ ہٹائے ہوئے حجابات تھوڑے تھے اس لیے ترمذی کی حدیث میں تمثیلاً ان کی قلت کو انما خنصر سے تشبیہ دی گئی ہے ورنہ صفات الٰہی تجزیہ اور مقدار سے منزہ ہیں۔ اور چونکہ افعال اللہ تعالیٰ کے اختیاری ہیں اس لیے ممکن ہے کہ وہ حجابات پہاڑ کے اعتبار سے اٹھائے گئے ہوں اور موسیٰ علیہ السلام اور دیگر مخلوقات کے لحاظ سے نہ اٹھائے گئے ہوں اور چونکہ حجابات کے اٹھا دینے کی خصوصیت احراق ہے جیسا کہ ارشاد ہے لاحرقت سبحات النور ما انتھی الیہ بصرہ۔ اس لیے پہاڑ کی یہ حالت ہوئی اور یہ بھی ضروری نہیں کہ سارے پہاڑ کی یہ حالت ہوتی ہو کیونکہ تجلی فرمانا باختیار خود کسی خاص قطعہ پر ممکن ہے۔ موسیٰ علیہ السلام پر بے ہوشی موسیٰ پر تجلی کی وجہ سے نہ تھی یہ تجلی کے خلاف ہے بلکہ ایسا ہوا کہ پہاڑ کی یہ حالت دیکھ کر اور ایک گونہ محل تجلی سے تلبس و تعلق کی وجہ سے آپ بے ہوش ہو گئے۔ آیت قرآنی فان استقر مکانہ فسوف ترانی سے استقرار کی صورت میں دیدار کا ہونا اور استقرار نہ ہونے کی صورت میں دیدار نہ ہونا معلوم ہوتا ہے لیکن اس موضوع پر یہ بات پہلے قابل تحقیق ہے کہ ان دونوں میں علاقہ کیا ہے۔ عدم استقرار اور دیدار نہ ہونے میں تو علاقہ یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ کی نگاہ ترکیب عنصری میں پہاڑ سے زیادہ ضعیف اور زیادہ لطیف ہے۔ جب زیادہ قوی اور اشد متحمل نہیں ہوا تو اضعف کیسے متحمل ہوگا۔ لیکن اس صورت میں استقرار مستلزم تحمل بصر موسوی عقلاً نہ ہوگا مگر اس کو وعدہ پر محمول کرنے سے اشکال رفع ہو جائے گا۔ یعنی باوجود دونوں میں برابری نہ ہونے کے ہم تبرعاً وعدہ کرتے ہیں کہ پہاڑ متحمل ہو گیا تو تمہارے حاسہ بصریہ کو بھی متحمل کر دیا جائے گا۔ یہ بھی خیال رہے کہ وقوع تجلی سے وقوع رویت نہیں ہوتی کیونکہ دونوں میں نہ تو ترادف ہے اور نہ تلازم۔ تجلی کے معنے کسی چیز کا ظاہر ہونا ہے۔ اگرچہ دوسرے کو اس کا ادراک نہ ہو۔ بس تجلی کا رویت سے انفکاک ممکن ہے جیسے آفتاب کو متجلی کہہ سکتے ہیں لیکن خفاش کو رائی اور مدرک کہنا لازم نہیں ہے ممکن ہے کہ تجلی کے مبادی کی وجہ سے چشم خفاش بے نور ہو کر رہ جاتے۔ آیت لن ترانی میں رائی کی انفعالیت کی نفی ہے مرئی کی فاعلیت کی نفی نہیں ہے۔

خدائی عظمت و جلال کا یقین

۱۷۱۔ جب موسیٰ ہوش میں آئے تو بول پڑے خدایا تیرے لیے ہر طرح کی تقدیس ہے۔ میں

اپنی جسارت پر تیرے حضور توبہ کرتا ہوں، میں ان میں پہلا شخص ہوں گا جو اس پر یقین رکھتے ہیں۔ یعنی پاک ہے اس سے کہ کسی مخلوق کے مشابہ ہو اور یہ فانی آنکھیں اس کے دیدار کا تحمل کر سکیں۔ تیری پاکی اور برتری کا اقتضاء یہ ہے کہ کسی چیز کی طلب تیری اجازت کے بغیر نہ کی جاتے۔ میں توبہ کرتا ہوں کہ فرطِ اشتیاق میں بدون اجازت کے ایک نازیبا درخواست کر گزرا۔ میں زمانہ کے سب لوگوں سے پہلے تیری عظمت و جلال کا یقین رکھتا ہوں اور پہلا وہ شخص ہوں جسے ذوقی و عیانی طریق پر منکشف ہوا کہ خداوند قدوس کی رویت دُنیا میں ان ظاہری آنکھوں سے واقع نہیں ہو سکتی۔ لہ

اصل ارشاد میں افاق آیا ہے۔ افاق افاقہ سے ماضی ہے۔ اس تعبیر میں حضرت عبداللہ بن عباس کے اس موقف کی تائید ہوتی ہے کہ صعق کے معنے بے ہوش ہونے کے ہیں۔ بے ہوشی سے ہوش میں آنے کو افاقہ کہتے ہیں۔ مرنے کے بعد زندہ ہونے کو افاقہ نہیں کہتے جیسا کہ حضرت قتادہ نے صعق کے معنے مرنے کے بتاتے ہیں۔ اگر قتادہ والی بات ہوتی کہ موسیٰ علیہ السلام تجلی سے گر کر مر جاتے ہیں تو تعبیر افاق نہیں بلکہ بعث ہوتی جیسا کہ خود بنی اسرائیل کے بارے میں ہے۔ ثم بعثناکم من بعد موتکم۔

آیت میں موسیٰ علیہ السلام کی تسبیح کے معنے علماء نے یہ بتاتے ہیں کہ آپ کی ذات گرامی اس چیز سے بالا اور برتر ہے جس کی درخواست میں نے آپ سے کی۔ یا یہ مطلب ہے کہ آپ کی ذات اس سے پاک ہے کہ آپ کو دُنیا میں کوئی دیکھ سکے یا یہ کہ تو اس سے ارفع اور منزہ ہے کہ تجھے ان ناسوتی آنکھوں سے دیکھا جاتے۔ میں نے یہ جسارت کی کہ تجھے دیکھنے کی خواہش کی۔ میں اس سے توبہ کرتا ہوں اور معافی کا خواستگار ہوں اور میں سب سے پہلے اس بات پر ایمان لانے والا ہوں۔ کہ تیری ذات ہماری آنکھوں کے مشاہدے سے بالاتر ہے۔ یہ خیال رہے کہ توبہ ہمیشہ معصیت ہی سے نہیں ہوتی۔ نامناسب درخواست سے بھی ہو سکتی ہے اور وہی یہاں مراد ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ کو حق تعالیٰ نے بزرگی دی کہ فرشتہ کے بغیر خود کلام کیا۔ ان کو شوق ہوا کہ دیدار بھی کروں اس کی برداشت نہ ہوتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ حق تعالیٰ کو دیکھنا ممکن ہے کیونکہ پہاڑ پر تجلی ہوتی لیکن دُنیا میں اس کی قابلیت نہ تھی آخرت میں اس کی قابلیت ہوگی وہاں دیکھنا یقینی ہے۔

لہ افادات شیخ الاسلام

بہر حال یہ موضوع اہل السنہ اور اہل اعتزال کے مابین معرکۃ الآرا ہے۔ اس پر اگرچہ دونوں متفق ہیں کہ دنیا میں خدا کا دیدار نہیں ہو سکتا لیکن اسے عقلاً ناممکن بتاتے ہیں اور اہل السنہ اسے عقلاً نہیں بلکہ شرعاً ممتنع کہتے ہیں۔ ہاں آخرت میں دیدارِ خداوندی کے بارے میں دونوں ایک دوسرے کی اپوزیشن ہیں۔ اہل السنۃ کہتے ہیں کہ آخرت میں اہلِ ایمان کو دیدارِ الٰہی ہوگا اور معتزلہ کہتے ہیں کہ نہیں ہوگا۔ معتزلہ کی قیادت علامہ زمخشری کرتے ہیں اور اس موضوع پر اہل السنہ کو توہین آمیز انداز میں مخاطب کرتے ہوئے کہتے ہیں :

لجماعة سمّوا هواهم سنة
وجماعة حمرٌ لعمري مُوكَفَه

ایک جماعت نے اپنی خواہشوں اور دلولوں کا نام سنت و جماعت رکھ لیا۔ یہ حقیقت میں بخدا بوجھ سے لدے ہوتے گدھے ہیں۔

قد شبهوه بخلقه وتخوّفوا
شنع الورى وتستّروا بالبلكفه

انہوں نے خدا کو مخلوق سے جا ملایا اور پھر مخلوق کی برائی کے اندیشہ سے بلاکیف کے پردے کا سہارا لیا۔

زمخشری کی یہ بات اہل السنہ کے لیے نشتر کا کام کر گئی۔ انہوں نے اس کی چبھن کو بری طرح محسوس کیا۔ سب سے پہلے الانتصاف میں ابن المنیر نے اہل السنہ کی مدافعت کرتے ہوئے جواباً کہا :

وجماعة كفروا برؤية ربهم حقا ووعد الله ما لن يخلفه

اور ایک جماعت نے اللہ کی رویت کا صاف انکار کر دیا ہے حالانکہ اللہ کا وعدہ ہی وہ وعدہ ہے جس کی وہ ہرگز خلاف ورزی نہ کرے گا۔

وتلقبوا عدلية، قلنا اجل عدلوا بربهم فحسبهم سفه

اور انہوں نے اپنے کو لوگوں میں عدلیہ کہہ کر روشناس کرایا۔ ہم نے کہا ٹھیک ہے مگر یہ عدلیہ عدل (انصاف اعتدال) سے نہیں ہے بلکہ عدول (ہٹنا) سے ہے یہ اپنے رب سے ہٹ گئے ہیں۔ ان کو یہ حماقت ہی سجتی ہے یعنی رب سے روگردانی کی حماقت

وتلقبوا الناجين، كلا إنهم ان لم يكونوا في لظى فعلى شفه

اور اپنے کو انہوں نے نجات یافتہ بتایا ہرگز نہیں امرِ واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ دوزخ کی آگ میں نہیں تو آگ

بھی نہ ہوں گے تو دوزخ کے کنارے پر ضرور ہوں گے۔

علامہ ابوحیان اندلسی نے بھی اہل السنہ کی مدافعت کی اور کہا

شبّہت جہلاً صدر امۃ احمد

وذوی البصائر بالحمیر الموکفہ

تو نے حماقت سے حضور انور کی اُمت کے اس صدر اول کو جو ارباب بصیرت ہیں بوجھ والے گدھوں سے تشبیہہ دی ہے۔

وجب الخسار علیک فانظر منصفاً

فی آیۃ الاعراف فھی المنصفہ

تُو تو سر تاسر خسارے کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ آیت اعراف بنظر انصاف مطالعہ کر۔ یہ آیت ہی پورے کیس میں فیصلہ کن ہے۔ شاعر کا مقصود یہ آیت ہے یعنی رب ارنی انظر الیک

اتری الکلیم اتی بجھل ما اتی

واتی شیوخ ما اتوا عن معرفہ

کیا تیرے خیال میں حضرت موسیٰ نے جو درخواست کی تھی اس کا مبنی نادانی تھا اور تیری اساتذہ کی رائے علم و معرفت کی اساس پر قائم ہے۔

ان الوجوہ الیہ ناظرۃ، بذا

جاء الکتاب فقلتم ہذا سفہ

قرآن کا ناطق فیصلہ تو یہی ہے کہ روز قیامت اللہ کا دیدار ہوگا آپ کہہ دیجئے کہ یہ سفاہت ہے اور سوچئے کہ آپ کی چوٹ کہاں پہنچ رہی ہے۔

نطق الکتاب وانت منطق بالھوی

فھوی الھوی بک فی المھاوی المتلفہ

اللہ کی کتاب نے تو فیصلہ دے دیا ہے۔ آپ کی بات ہوائے نفس اور ہوا جس کے سوا کیا ہے اسی ہوائے نفس نے آپ کو ہلاکت خیز گڑھوں میں گرا دیا ہے۔

خیر یہ تو معالم القرآن کے ناظرین کی خدمت میں محض منہ کا مزہ درست کرنے کے لیے چند اشعار کے نمونے پیش کیے ہیں ارباب ذوق اگر مزید مزہ لینا چاہیں تو علامہ السبکی کا طبقات الشافعیہ الکبریٰ جلد نہم کا مطالعہ کریں۔

حضرت موسیٰ کا خصوصی شرف و امتیاز

۱۴۸ ۔ خدا نے فرمایا اے موسیٰ میں نے تجھے اپنی پیغمبری اور ہمکلامی سے لوگوں پر برتری دی ہے لہٰذا جو کچھ میں نے تجھے عطا کیا ہے اسے لے اور شکر بجا لا۔ یعنی دیدار نہ ہو سکا نہ سہی، یہ شرف و امتیاز کیا تھوڑا ہے کہ ہم نے تجھ کو پیغمبر بنایا اور تورات عطا کی اور بلا واسطہ کلام فرمایا لہٰذا جس قدر بخشش ہماری طرف سے ہوئی اسے پلے باندھو اور ان بندوں میں سے ہو جاؤ جنہیں خدا نے شاکرین کے امتیازی لقب سے ملقب فرمایا ہے[1] مطلب یہ ہے کہ میں نے اپنے پیغام اور کلام سے تم کو لوگوں پر جو برگزیدگی بخشی ہے۔ تمہارے شرف کے لیے یہی بس ہے۔ یعنی جو تعلیم و ہدایت کی ذمہ داری تم پر ڈالی ہے اس کو مضبوطی سے اپناؤ اور برابر میرے شکر گزار رہو یعنی اس کا حق ادا کرو خود بھی دل و جان سے اس کی قدر کرو اور دوسروں کو بھی یہ بتاؤ۔ انداز کلام سے یہ بات ٹپک رہی ہے کہ جو عطا ہوا ہے تمہارے لیے یہی بہت ہے اسی پر قناعت کرو میرے دیدار کی تگ و دو نہ کرو۔ اتنی بات تو قرآن سے واضح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے بلا واسطہ کلام فرمایا۔ پھر اس کلام میں بھی ایک تو وہ ہے جو اوّل عطائے نبوت کے وقت ہوا تھا۔ دوسرا کلام یہ ہے جو عطائے تورات کے وقت ہوا اور جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اس دوسرے کلام کو بہ نسبت پہلے کے کچھ مزید خصوصیت حاصل تھی لیکن یہ بات کہ اس کلام کی حقیقت و نوعیت کیا تھی؟ اس کا علم اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو نہیں اس میں انسانی عقل جس قدر بھی غور کر سکتی ہے اور اس غور کے نتیجے میں جتنے عقلی احتمالات پیدا کر سکتی ہے سب کی گنجائش ہے بشرطیکہ وہ کسی شرعی حکم سے متصادم نہ ہو مگر ان میں کسی بھی احتمال کی بلا دلیل تعیین درست نہیں ہے اور سلف صالحین ہی کا مسلک تفویض یہاں اسلم ہے۔

اصل یہ ہے کہ ہمیں اس معاملہ میں دو بنیادوں پر اعتماد کرنا چاہیے۔

ایک یہ کہ قرآن و سنت میں جو وارد ہوا ہے بغیر کسی تاویل کے اور ظاہری معنی سے ہٹائے بغیر ماننا چاہیے۔ اسے بالکل اہمیت نہ دینی چاہیے کہ ظاہری معنے میں عقلی استحالہ ہے۔ دوسرے یہ کہ قرآن سے جو کچھ خدا کے لیے ثابت ہوتا ہے وہ اس جنس سے نہیں ہے جو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مخلوق میں ہے بلکہ یہ اوصاف واحوال ذات باری کے شایان شان ہیں اور اس کی تنزیہہ کے مطابق ہیں کیونکہ رسمی مشابہت حقیقی مشابہت کی مقتضی نہیں ہوتی ہے۔ یہاں حافظ ابن تیمیہ الکلیل میں یہ بات بڑے پتے کی فرما گئے ہیں:

راہ صواب وہ ہے جس پر ائمہ ہدایت گامزن تھے اور وہ یہ ہے کہ خدا کو ان صفات سے موصوف مانا جائے جو خود خدا نے اپنے لیے بیان فرمائے ہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جن اوصاف الٰہی کا تذکرہ فرمایا ہے اس سلسلے میں قرآن وحدیث سے سرمو انحراف نہ کرنا چاہیے۔ اور سلف کے راستہ کی پیروی کرنی چاہیے۔ جو اہل علم و ایمان ہے۔ اور قرآن وسنت سے جو معانی سمجھے جاتے ہیں وہ شبہات و اوہام کی بنا پر رد نہیں کیے جا سکتے کیونکہ یہ قرآن میں ایک طرح کی تحریف ہے۔

کوہ طور پر حضرت موسیٰ کو تورات ملی

۱۷۹۔ اور ہم نے موسیٰ کے لیے ان تختیوں میں ہر قسم کی باتیں لکھ دی تھیں تاکہ زندگی کے ہر معاملہ کے لیے اس میں نصیحت ہو اور ہر بات الگ الگ واضح ہو جائے۔ بعض کہتے ہیں کہ تورات شریف ان تختیوں پر لکھی ہوئی تھی اور بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ تختیاں تورات کے علاوہ تھیں جو نزول تورات سے پہلے مرحمت ہوئیں۔ بہرحال دیدار نہ ہو سکنے سے جو شکستگی موسیٰ علیہ السلام کو ہوئی اس کی تلافی اور جبر مافات کے طور پر الواح عطا کی گئیں جن میں ہر قسم کی نصیحتیں اور تمام ضروری احکام کی تفصیل تھی۔ ابن کثیر[1]

یہاں یہ بات تشریح طلب ہے کہ طور کے اس واقعہ میں موسیٰ علیہ السلام کو جو لکھی ہوئی تختیاں ملی تھیں ان میں کیا لکھا ہوا تھا تورات یا کچھ اور؟

ایک رائے یہ ہے کہ طور کے واقعہ میں جن احکام کا نزول ہوا وہ تورات ہے۔ یہ زیادہ تر شارحین قرآن کی رائے ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ اس سے مراد وہ دس احکام ہیں جو مذہب موسوی میں شریعت یا احکام عہد کے نام سے موسوم ہیں۔ یہ بیشتر شارحین عہد جدید کا خیال ہے اور ہمارے بعض شارحین قرآن کا ہمارے زمانے میں بھی کچھ ایسا ہی خیال ہے لیکن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ دوسری رائے خود قرآن اور تورات دونوں کی شہادت کے خلاف ہے۔ پہلی رائے کو قرآن عزیز کی تائید حاصل ہے کیونکہ قرآن عزیز نے سورہ بقرہ میں حضرت موسیٰ کے چلہ کا ذکر کرتے ہوئے جب نزول احکام کا تذکرہ کیا تو اس کا جو کتاب اور فرقان کے عنوان سے پیش کیا اور یہ دونوں صفات قرآن نے تورات کے لیے بولی ہیں نہ کہ احکام عہد کے لیے۔ اور اگرچہ تورات کے سفر خروج استثنا اور کتاب یسوع میں موسیٰ علیہ السلام کے چلہ کے بعد احکام عہد یا شریعت کا لفظ پایا جاتا ہے لیکن مولانا رحمت اللہ کیرانوی نور اللہ مرقدہ نے اپنی شہرہ آفاق کتاب اظہار الحق میں فارسی، عربی اور اُردو کے قدیم تراجم کے حوالے سے یہ ثابت کیا ہے کہ تورات کے ان نسخوں میں ان ہر دو الفاظ کی جگہ تورات لکھا ہے۔ چنانچہ مولانا عبدالحق حقانی نے بھی اپنی تفسیر حقانی میں اُردو فارسی بائیبل مطبوعہ ۱۸۴۵ء ۱۸۳۹ء سے حسب ذیل حوالے نقل کیے ہیں:

براں سنگہا تمامی کلمات این تورات را بخط روشن بنویس

(استثنا باب ۲۷ آیت ۲۸)

بنی اسرائیل نے بموجب حکم موسیٰ کے ایک مذبح بنایا اور اس کے پتھروں سے تورات کو لکھ دیا۔ (یسوع باب ۸ آیت ۱۵)

ان سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کو جو الواح کوہ طور پر چلہ کے بعد دی گئی تھیں وہ تورات کی الواح تھیں۔ اور انگریزی نسخہ میں LAW اور عربی اُردو نسخوں میں شریعت کو بھی صحیح مان لیا جائے تو یہ لفظ بھی اپنی معنوی وسعت کے لحاظ سے تورات پر صادق آتا ہے اور تورات، شریعت قانون سب کا مصداق ایک ہی ہے اور قدیم عیسائی دُنیا بھی یہی سمجھتی رہی ہے اور احکام عہد اسی کا جزو ہیں اور احکام عہد کو مستقل قرار دینا بعد کی تخلیق ہے خیر یہ ایک ضمنی بات تھی آئیے آیت پر غور کریں۔ ارشاد ہوا ہے وکتبنا لہ فی الالواح سے تختیوں پر اللہ تعالیٰ نے خود لکھا یا اللہ کی ہدایت کے مطابق حضرت موسیٰ نے لکھا۔ تورات سے دونوں باتیں نکلتی ہیں۔ چنانچہ خروج باب ۲۴ آیت ۳، ۴ میں ہے۔

اور موسیٰ نے لوگوں کے پاس جا کر خداوند کی سب باتیں اور احکام ان کو بتا دیئے اور سب لوگوں نے ہم آواز ہو کر جواب دیا کہ جتنی باتیں خداوند نے فرمائی ہیں ہم ان سب کو مانیں گے اور موسیٰ نے خداوند کی سب باتیں لکھ لی ہیں۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ تختیاں حضرت موسیٰ کی لکھی ہوئی تھیں لیکن خروج ہی میں

دوسرے مقام پہ یہ بھی لکھا ہوا ہے ۔ باب ۳۲ آیت ۱۵، ۱۶ میں ہے ۔

اور موسیٰ شہادت کی دونوں لوحیں لیے ہوئے الٹا پھرا اور پہاڑ سے نیچے اترا اور وہ لوحیں ادھر سے اور ادھر سے دونوں طرف سے لکھی ہوئی تھیں اور وہ لوحیں خدا ہی کی بنائی ہوئی تھیں اور جو لکھا ہوا وہ بھی خدا ہی کا لکھا اور ان پر کندہ کیا ہوا تھا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ تختیاں قدرتِ الٰہی سے لکھی ہوئی حضرت موسیٰ کو ملی تھیں۔ قرآن کے الفاظ دونوں معنوں کا احتمال رکھتے ہیں۔ یہ بھی احتمال ہے کہ قدرتِ الٰہی سے لکھی ہوئی ہوں اور وکتبنا فی الالواح میں کتابت کی اسناد حقیقی ہو اور یہ بھی احتمال ہے کہ حضرت موسیٰ نے لکھی ہوں اور اسناد مجازی ہو۔ دونوں میں کوئی خاص فرق نہیں ہے۔ جب حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کی ہدایت کے تحت لکھا تو یہ اللہ تعالیٰ نے لکھا۔ قرآن کی تمام حفاظت کا اہتمام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کے ہاتھوں عمل میں آیا لیکن چونکہ اللہ تعالیٰ کی ہدایات کے تحت عمل میں آیا اس وجہ سے ارشاد ہوا ہے انا لہ لحافظون۔

یہاں کتبنا لہ کے الفاظ یہ نشاندہی کر رہے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ نے بھی بنی اسرائیل کو قانون دینے میں خاص اہتمام فرمایا ہے کیونکہ حضرت موسیٰ سے پہلے جو انبیاء آئے انہوں نے اپنی اپنی امتوں کو زبانی تعلیم دی لیکن بنی اسرائیل کے لیے اللہ سبحانہٗ نے لکھی ہوئی دستاویز دینے کا اہتمام فرمایا۔ حضرت موسیٰ نے صرف کردار و گفتار ہی کے ذریعے ان کو تعلیم نہیں دی بلکہ ان کے لیے سب کچھ قلم بند کر دیا کہ اللہ کا قانون ان کو سب سے زیادہ محفوظ و مامون شکل میں ملے۔ اور تورات ہی کا چہرہ پیش کرتے ہوئے جو یہ ارشاد ہوا ہے من کل شیئ موعظۃ وتفصیلا لکل شیئ، یعنی ان الواح میں ہر قسم کی ضروری ہدایات بھی تھیں اور تمام ضروری تفصیلات بھی من کل شیئ اور لکل شیئ کا مطلب یہ نہیں ہے کہ دنیا جہان کی ہر بات تشریح و تطویل کے ساتھ لکھ دی گئی تھی بلکہ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی ہدایت کے لیے جن جن حکموں کی ضرورت تھی وہ سب ان تختیوں کے احکام میں موجود تھے۔

یہاں شارحین قرآن نے ان تختیوں کے مشتملات کی وسعت کو بتاتے ہوئے کچھ روایات درج کی ہیں۔ حافظ سیوطی نے درمنثور میں ان روایات کی تلخیص پیش کی ہے لیکن ابن جریر اور ابن کثیر نے اس کی طرف اشارہ بھی نہیں کیا ہے۔ ان کا سرچشمہ وہ اسرائیلی تراجم ہیں جو کعب احبار اور وہب بن منبہ کی وساطت سے ہمارے تفسیری علم کی زینت بن گئے ہیں۔

بنی اسرائیل سے تورات پر عمل کا مطالبہ

۱۸۰۔ اسے مضبوطی سے پکڑے اور اپنی قوم کو حکم دے کہ اس کے پسندیدہ حکموں پر کاربند رہیں۔ میں ضرور بدکاروں کی جگہ تمہیں دکھاؤں گا۔ یعنی خود بھی ان الواح کو مضبوطی اور احتیاط سے پکڑے رہو کہیں ہاتھ سے نہ چھوٹ جائیں اور اپنی قوم کو سمجھائیں کہ وہ الواح کی بہترین ہدایات پر پختگی سے عمل کرتے رہیں اور ایسی اچھی چیز کو ہاتھ سے نہ دیں۔ لفظ احسنہا سے یا تو اس پر متنبہ فرمایا ہے کہ ان میں احسن کے سوا کچھ نہیں ہے یا یہ مطلب ہے کہ جو احکام دیے گئے ہیں یوں تو سب فی حد ذاتہٖ حسن ہیں مگر بعض بعض سے احسن ہوتے ہیں مثلاً ظالم سے بدلہ لینا حسن ہے لیکن صبر کر دینا اور معاف کر دینا عزیمت اور احسن ہے۔ گویا بنی اسرائیل کو اس پر آمادہ کرنا تھا کہ عزائم و مندوبات کے اکتساب میں سعی کریں اور خدا کے کامل فرمانبردار بنیں۔ اگر نافرمانی کریں گے تو انہیں نافرمانوں کا گھر دکھلا دیا جائے گا یعنی آخرت میں دوزخ اور دنیا میں تباہی و رسوائی اعاذنا اللہ منہما ابن کثیر و بغوی اور بعض نے نافرمانوں کے گھر سے شام و مصر مراد لیا ہے جو نافرمان عمالقہ یا فرعونیوں کا ملک تھا۔ اس صورت میں یہ آیت بنی اسرائیل کے لیے بشارت ہوگی کہ اگر پوری طرح فرمانبرداری کرو گے تو نافرمانوں کے ملک تم کو دے دیے جائیں گے والراجح ہو الاول کما رجحہ ابن کثیر۔[1]

اس فقرے میں تین باتیں بتائی گئی ہیں۔

ایک یہ کہ ہم نے حضرت موسیٰ سے کہا کہ یہ زندگی کا دستور ہے تم اسے عزم و ہمت سے لو۔ یعنی اس کے ذریعے امت کی تکوین تمہارا کام ہے۔ قانون یہ ہے لیکن اس کے ذریعے بنی اسرائیل کی تربیت کرنا تمہاری ہمت پر موقوف ہے۔ ایک طرف اگر ان کی نشو و نما ذلت و صغار میں ہوئی ہے تو دوسری طرف چار سو سالہ فرعون کی غلامی میں یہ پھلے اور پھولے ہیں۔ اس کے نتیجے میں رسوم شرک ان کے رگ و ریشے میں سماتے ہوتے ہیں۔ اس دستور حیات کے ذریعے آپ کو دوہری مشقت کرنی ہوگی ایک طرف ان میں سے مفاسد اور رذائل کو ختم کرنا ہوگا دوسری طرف فضائل کو ان میں پیدا کرنا ہوگا اس لیے فرمایا خذھا بقوۃ یعنی عزم و جزم کے ساتھ اس کو اختیار کرو اور ہر طرح کے حالات میں خواہ نرم ہوں یا گرم اس کی ہدایات پر جمے رہو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسری بات یہ فرمائی وامر قومک یاخذوا باحسنھا اپنی قوم کو ہدایت کرو کہ دوسرے نظاموں کے مقابلہ میں اس نظام کو اپنائیں جو اس تورات میں پیش کیا گیا ہے یہ ان سب میں بہتر زیادہ اچھا ہے یہاں احسن سے مراد وہ تقابل نہیں جو تورات کی مختلف ہدایات میں ہے کیونکہ وہ تو ساری کی ساری احسن ہیں اور سب بلا استثنا اپنانے کے لیے ہیں بلکہ یہ حسن ان نظاموں کے مقابلے میں ہے جن سے بنی اسرائیل کو سابقہ پیش آرہا تھا اور جن سے وہ ایک درجہ میں متاثر بھی تھے۔ قرآن میں لفظ احسن ایسے ہی تقابلی موقعہ پر خود قرآن کے بارے میں استعمال ہوا ہے اتبعوا احسن ما انزل الیکم من ربکم ولا تتبعوا من دونہ اولیاء اور یا مطلب یہ ہے کہ تورات کے احکام پر حسین طریقہ پر عمل پیرا ہوں یعنی احکام الٰہی کا وہ صاف اور سیدھا مفہوم لیں جو واقعیت پر مبنی ہو اور جسے ہر وہ شخص سمجھ لے جس کی نیت میں فساد یا جس کے دل میں کجی نہ ہو۔ یہ قید اس لیے لگائی کہ جو لوگ احکام کے سیدھے سادے الفاظ میں سے فانی اینچ پینچ اور حیلوں کے راستہ اور فتنوں کی گنجائشیں نکالتے ہیں کہیں ان کی موشگافیوں کو کتاب اللہ کی پیروی نہ سمجھ لیا جائے مطلب یہ ہے کہ اس اسلامی نظام کے مقابلے میں جو دوسرے نظام موجود ہیں ان کو نہ دیکھیں بلکہ اس پاکیزہ، اعلیٰ اور احسن نظام کو اپنائیں جو حضرت موسیٰ کوہ طور سے لے کر آتے ہیں۔ یہی تفضیل کا صیغہ قرآن میں دوسرے موقعہ پر بھی ان معنوں میں استعمال ہوا ہے۔

تیسری بات یہ فرمائی گئی ہے کہ ساُریکم دار الفاسقین اس کا ایک مطلب تو وہی ہے جو شیخ الاسلام نے بتایا ہے لیکن شارحین قرآن نے اس کا دوسرے انداز سے بھی مطالعہ فرمایا ہے مثلاً کچھ کی رائے میں دار فاسقین سے مراد عاد و ثمود کے کھنڈر ہیں، کچھ کہتے ہیں کہ مصر مراد ہے کہ بنی اسرائیل دوبارہ اس میں داخل ہوں گے۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ اس سے شام کی مقدس سرزمین مراد ہے جہاں اس زمانہ میں عمالقہ کے جابر بادشاہوں کی حکومت تھی اور جہاں بنی اسرائیل کو داخل ہونا تھا۔ عبدالوہاب النجار نے قصص القرآن میں اس کو ترجیح دی ہے۔ مولانا حفظ الرحمان، سیوہاری بھی اس کو صحیح کہا ہے۔ باقی اس پر یہ شبہ کہ حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے بوڑھے ان بستیوں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کہ حضرت موسیٰ کا انتقال ارض مقدس میں داخل ہونے سے پہلے ہی ہو گیا تھا اور اسی طرح بنی اسرائیل کے بوڑھوں پر بھی آنے والی تفصیل کے مطابق اس کا داخلہ حرام کر دیا گیا تھا۔ لہٰذا اس آیت کا مطلب یا تو یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے نوجوانوں کا داخلہ جن کی اکثریت تھی سب کا داخلہ ہے اور اس طرح کا استعمال شائع ہے اور یا یہ امر مراد کہ حضرت موسیٰ نے یوشع بن نون اور کالب

بن یوفنہ اور چند بنی اسرائیل کے بہادروں کو ارض مقدس میں اس لیے بھیجا تھا کہ وہ وہاں کے مفصل حالات معلوم کر کے آئیں کہ ہم کس طرح ان کو شکست دے کر پاک سرزمین میں داخل ہو سکتے ہیں اور انہوں نے آ کر تمام حالات بنی اسرائیل اور موسیٰ علیہ السلام کے سامنے بیان کیے تھے تو گویا ان معدودے چند افراد کا ارض مقدس میں داخل ہو کر اس کو دیکھ آنا اور پھر سب کو وہاں کے حالات سے آگاہ کرنا آیت میں اسی معاملہ کی جانب اشارہ ہے۔ قتادہ کے قول کے مقابلہ میں پہلا قول اس لیے مرجوح ہے کہ اس واقعہ کے بعد بنی اسرائیل کبھی قومی اور جماعتی حیثیت سے مصر میں داخل نہیں ہوتے اور دوسرا قول اس لیے قابل اعتنا نہیں ہے کہ اگرچہ ثمود کے آثار وادی سینا کے قریب تھے مگر عاد کے آثار تو عرب کے مغربی حصہ میں واقع تھے جو وادی سینا سے مہینوں کی راہ تھی تو ایسی کوئی وجہ سمجھ میں نہیں آتی کہ بنی اسرائیل کو صرف ان محو شدہ آثار و کھنڈرات کو دکھانے کے لیے بھیجا جاتا اور اس کے لیے خدا کا وعدہ اس شان کے ساتھ بیان ہوتا۔

پھر یہ آگے کے مراحل کی طرف اشارہ ہے کہ ان تعلیمات و ہدایات کو مضبوطی سے پکڑنا تمہارے اور تمہاری قوم کے لیے اس واسطے بھی ضروری ہے کہ آگے تمہیں کفار و فساق کے علاقوں سے گزرنا اور ان سے سابقہ پیش آتا ہے۔ کفر و فساد کے ان علاقوں میں یہی چیزیں تمہارے لیے بدرقہ اور زادِ راہ کا کام دیں گے اور انہی کے ذریعے سے تم غالب اور فتح مند ہو گے۔ ان سے مسلح ہوئے بغیر تمہاری قوم کے ہر قدم پر فتنہ میں مبتلا ہو جانے کا اندیشہ ہے۔[1]

---

[1] تدبرِ قرآن۔

سَاَصْرِفُ عَنْ اٰیٰتِیَ الَّذِیْنَ یَتَكَبَّرُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ ؕ
وَ اِنْ یَّرَوْا كُلَّ اٰیَةٍ لَّا یُؤْمِنُوْا بِهَا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ
الرُّشْدِ لَا یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ۚ وَ اِنْ یَّرَوْا سَبِیْلَ الْغَیِّ
یَتَّخِذُوْهُ سَبِیْلًا ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ كَانُوْا عَنْهَا
غٰفِلِیْنَ ۝ وَ الَّذِیْنَ كَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا وَ لِقَآءِ الْاٰخِرَةِ حَبِطَتْ
اَعْمَالُهُمْ ؕ هَلْ یُجْزَوْنَ اِلَّا مَا كَانُوْا یَعْمَلُوْنَ ۝

ع ۱۷ ۶ ۷

میں ضرور ایسے لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ رکھوں گا جو دنیا میں تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں[181]۔ اور اگر تمام دنیا بھر کی نشانیاں بھی وہ دیکھ لیں ان پر ایمان نہ لائیں اور اگر وہ دیکھیں کہ حق کی راہ سیدھی سامنے ہے تو اس پر کبھی نہ چلیں اور اگر دیکھیں کہ گمراہی کی راہ سامنے ہے تو فوراً چل پڑیں ان کی یہ حالت اس لیے ہو جاتی ہے کہ ہماری نشانیاں جھٹلاتے

رہے اور ان کی طرف سے غافل رہے[۱۸۲] ۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی اور آخرت کی زندگی کی تکذیب کی تو ان کے سارے کام اکارت ہو گئے ، ان کو ان کے ان کرتوتوں کی ضرور سزا ملے گی ، جو وہ کرتے رہے ۔

معانی مفردات

الرشد ، ہدایت ، صلاحیت ، راہ یابی ، بھلائی ، راستی ہوشیاری ، حسن تدبیر ، رشد یرشد کا مصدر ہے ہدایت کی جگہ استعمال ہوتا ہے ۔ یہ دو طرح قرآن میں آیا ہے رُشد اور رَشد دونوں مصدر ہیں ۔ دونوں میں فرق ہے ۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ بعض علماء کا بیان ہے کہ رشد بالفتح رشد بالضم سے اخص ہے کیونکہ رُشد دنیوی اور اُخروی دونوں اُمور میں استعمال ہوتا ہے اور رشد بالفتح صرف اخروی اُمور پر بولا جاتا ہے اور رُشد اور رشید دونوں کے لیے آتا ہے ۔ الغیّ اسم فعل گمراہی ، بدراہی ، مصدری معنے ناکام ہونا ، بہک جانا اور بے راہ ہونا ہیں ۔ پہلے معنے کی تائید میں امام راغب نے کسی شاعر کا یہ مصرع لکھا ہے ؛

و من یغو لا یعدم علی الغیّ لائما

ناکام ہونے والے کو ناکامی پر ملامت کرنے والا بھی ضرور ملتا ہے یعنی ایک تو ناکامی دوسرے ناکامی پر ملامت دوہری تکلیف ہوتی ہے ۔ مطلب یہ گمراہی کا راستہ ، ناکامی کا راستہ ، بدراہی کا راستہ ۔

اللہ کی بندگی سے محرومی کا قانون

قرآن کا عام اسلوب بیان یہ ہے کہ خدا کے ٹھہرائے ہوئے قوانین و اسباب سے جو نتائج پیدا ہونے ہیں ان کو براہ راست خدا کی طرف [illegible] لوگ سمجھ بوجھ

سے کام لینے کی جگہ اپنے بڑے بوڑھوں کی اندھی تقلید کرتے ہیں اور اسی پر اڑے رہتے ہیں۔ رفتہ رفتہ ان کی عقلیں ماری جاتی ہیں اور سمجھ بالکل الٹی ہو جاتی ہے کتنی ہی صاف بات کہی جاتے ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ کتنی ہی ان کی بھلائی چاہو وہ اور زیادہ مخالفت کریں گے۔ قرآن اس حالت کو یوں تعبیر کرے گا کہ خدا نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی پس وہ سمجھتے نہیں یعنی یہ صورت حال خدا کے ٹھہرائے ہوئے قانون کا قدرتی نتیجہ ہے۔ جب کبھی کوئی یہ چال چلتا ہے۔ خدا کا مقررہ قانون مؤثر ہو کر اسے اس حالت میں پہنچا دیتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح یہاں فرمایا جو لوگ ناحق ملک میں بڑے بنتے ہیں۔ بڑا بننا یہ کہ خدا کے حکم کے مقابلہ میں اپنا حکم منواتے ہیں، ناحق اس لیے کہا کہ ان کو اس کا کوئی حق نہیں ہے فرمایا میں ان کو اپنے احکام سے ہٹا دوں گا۔ یعنی جان بوجھ کر جو کوئی تکبر کرے تو خدا کا قانون یہی ہے کہ وہ دلیلوں، روشنیوں سے متاثر ہونے کی استعداد کھو دیتا ہے۔ پھر واضح کیا ہے کہ یہ حالت اس لیے پیش آتی ہے کہ وہ خدا کی آیات کی تکذیب کرتے ہیں اور ان سے غافل رہتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ جو کوئی تکذیب کو اپناتا ہے اور غفلت سے باز نہیں آتا وہ طاعت اور قبول حق سے محروم رہتا ہے۔ یہی مطلب ان کو احکام سے ہٹا دینے کا ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ خدا کسی آدمی کو بے عقلی اور گمراہی پر مجبور کر دیتا ہے۔

یتکبرون فی الارض بغیر الحق میں گہری معنویت ہے یعنی وہ لوگ جو اپنے اپنے زمانوں میں ملکی تہذیب و ثقافت، قومی ذہانت اور علمی ایجادات میں بلند ترین معیار پر پہنچے ہوتے ہیں۔ وہ انبیاء کی تعلیمات کے مقابلے اپنے کو بڑا بناتے ہیں اور علمی کامیابیوں اور تمدنی ترقیوں کے نشہ میں نبوت کے لائے ہوئے علم کو رد کرتے ہیں، ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ میرا قانون یہ ہے کہ میں ایسے لوگوں کو اپنے دستور و قانون سے برگشتہ ہی رکھتا ہوں۔ متعدد ترقی یافتہ قومیں جو علم و ادب کے بیش بہا خزانوں سے اس دنیا میں مالا مال تھیں اور ذکاوت و عبقریت میں جن کی مثال دی جاتی تھی اسی تکبر، غرور، خود پرستی اور اپنے علوم و فنون پر فخر کا شکار ہو چکی ہیں اپنے زمانہ کے نبی کی تعلیمات کو انہوں نے حقارت و نفرت کی نظر سے دیکھا۔ اس سے بے نیازی برتی۔ اپنے قوانین کے مقابلے میں اس کو بے کار اور بے قیمت سمجھا تو وہ اسی غرور کی نذر ہو گئیں۔

۱۸۱۔ میں صرور ان لوگوں کو اپنے احکام سے برگشتہ رکھوں گا جو ملک میں تکبر کرتے ہیں جس کا ان کو کوئی حق حاصل نہیں ہے۔ جو لوگ خدا اور پیغمبروں کے مقابلے میں ناحق تکبر کرتے اور نخوت و غرور اجازت نہیں دیتا کہ احکام الٰہی کو قبول کریں ہم بھی ان کے دل اپنی آیات کی

طرف سے پھیر دیں گے کہ آئندہ ان سے منتفع ہونے کی توفیق نہ ہوگی۔[1]

قرآن کی یہ آیت اہمات معارف میں سے ہے۔

سب سے پہلے یہ بات سمجھنے کی ہے کہ آیت میں بغیر الحق کی حیثیت کیا ہے اگر یہ یتکبرون کے متعلق ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ملک میں ناحق بڑے بنتے ہوتے ہیں۔ یعنی ان کو بڑے بننے کا کوئی حق نہیں ہے کیونکہ اپنے کو بڑا سمجھنا اس کا حق ہے جو واقع میں بڑا ہو وہ صرف اللہ کی ذات ہے اور یا بغیر حق یتکبرون کی ضمیر فاعل سے حال ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ خلاف حق اور باطل پرست ہو کر بڑے بن رہے ہیں۔ بڑے بننے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے مقابلہ میں اپنے آپ کو بندگی سے بالاتر سمجھے اور خدا کے احکام کی کوئی پروا نہ کرے اور ایسا طرز عمل اختیار کرے گویا کہ وہ نہ خدا کا بندہ ہے اور نہ خدا اس کا رب ہے۔

اس آیت کا تعلق یا دار الفاسقین سے یا خود بنی اسرائیل سے ہے۔ اگر فاسقین سے ہے تو مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں سے آگے چل کر تم کو سابقہ پڑنا ہے ان کے اس نظام حق سے جو نبوت سے کہ آئی ہے محروم ہونے کی وجہ یہ اور صرف یہ ہے کہ وہ ملک میں ناحق بڑے بنتے ہوتے ہیں اور اس بڑائی میں انہوں نے خدا کی بندگی اور نبوت کے نظام سے منہ موڑا ہوا ہے۔ اور میرا قانون یہ ہے کہ میں متکبرین کو حق کی پذیرائی سے محروم کرتا ہوں۔ یعنی کبر کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ وہ حق کی پذیرائی اور اس کے اتباع سے محروم ہوتا ہے۔ وہ حق کے نمایاں ہونے کے باوجود حق سے روگرداں رہتا ہے۔ یہ بات چونکہ اللہ کے قانون کے تحت ہوتی ہے اس لیے ساصرف میں پھیرنے کی نسبت براہ راست اللہ کی طرف ہوتی ہے۔ اور اگر آیت کا روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہے جیسا کہ سیاق و سباق کا تقاضا ہے تو بنی اسرائیل کو خبردار کیا جا رہا ہے کہ اگر دستور زندگی آنے کے باوجود تم نے قانون سازی میں اللہ کا مقابلہ کیا اور اپنے کو بڑا سمجھا جیسا کہ زعمائے قوم، بادشاہان مملکت اور گمراہ لیڈروں کا شیوہ ہے تو پھر تمہیں یہ بات کان کھول کر سن لینی چاہیے کہ ایسے لوگوں کو جو خدا کے مقابلے میں بڑے بنیں انسانوں سے بجائے خدا کے اپنی بندگی کرائیں۔ قبول حق کے بعد بھی اتباع حق سے محروم کر دیتا ہوں۔ اسلام زمان و مکان کی قید سے بالا ہے۔ اس کی ہر دور اور ہر جگہ دعوت یہ رہی کہ اللہ کے بندوں کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

انسانوں کی بندگی سے نکال کر خدا کی بندگی میں داخل کیا جائے خدا کی بندگی سرتاسر نور ہے جب کہ انسانوں کی بندگی ظلمتوں اور تاریکیوں کا انبار ہے۔

آیت میں اگر روئے سخن فاسقین کی طرف ہے تو آیات سے مراد معجزات، دلائل اور براہین ہیں اور اگر روئے سخن بنی اسرائیل کی طرف ہے تو آیات سے مراد احکام و قوانین خداوندی ہیں۔ بہرحال حضرت موسیٰ کو تورات دی گئی اور ساتھ ہی یہ بتا دیا گیا کہ ہمارا قانون یہ ہے کہ جب کوئی اُمت ہدایت پالینے اور اس کی صداقت پر دلائل آجانے کے باوجود بھی ہمارے قوانین کے مقابلے میں اپنے بنائے ہوئے قوانین پر یا باپ دادا کی رسوم یا دُنیا کے دانشوروں کے احکام پر قائم رہتی ہے اور اس پر اصرار کرتی ہے تو پھر ہم اس سے اتباعِ حق کی توفیق سلب کر لیتے ہیں اور توفیق سلب ہونے کے بعد ان کا حال کیا ہوتا ہے؟ یہ آگے ارشاد ہو رہا ہے۔

اللہ کی بندگی سے اعراض کے نتائج

۱۴۲- اور اگر تمام دنیا بھر کی نشانیاں بھی وہ دیکھ لیں تو ان پر ایمان نہ لائیں اور اگر وہ دیکھیں کہ حق کی راہ سیدھی سامنے ہے تو اس پر کبھی نہ چلیں اور اگر دیکھیں کہ گمراہی کی راہ سامنے ہے تو فوراً چل پڑیں، ان کی یہ حالت اس لیے ہے کہ کہ ہماری نشانیاں جھٹلاتے رہے اور ان کی طرف سے غافل رہے۔ ایسے لوگوں کی یہ کیفیت ہوتی ہے کہ خواہ کتنے ہی نشان دیکھیں اور کتنی ہی آیتیں سنیں ٹس سے مس نہ ہوں۔ ہدایت کی سڑک کیسی ہی صاف اور کشادہ ہو، پر نہ چلیں۔ ہاں گمراہی کے راستہ پر نفسانی خواہشات کی پیروی میں دوڑے چلے جائیں۔ تکذیب کی عادت اور غفلت کی بیماری سے جب دل مسخ ہو جاتا ہے اس وقت آدمی اس حالت کو پہنچتا ہے[1] اس میں اس سرکشی کے آثار و نتائج بتائے گئے ہیں اور فرمایا ہے کہ اللہ سے اس مقابلہ کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کے سامنے اللہ کے کتنے ہی احکام واضح اور صاف پیش کیے جائیں وہ اپنے غرور کی سرشاریوں میں نہ سننے کو تیار ہوتے ہیں اور نہ دیکھنے کو۔ یہاں آیت سے مراد احکام منزلہ ہیں اور ان کو نہ ماننے کا مطلب یہ ہے کہ ان کو اپنی عملی زندگی میں شرف پذیرائی نہیں دیتے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ اگر رشد و ہدایت اور کامیابی کی راہ کو دیکھتے ہیں تو اس پر ایک قدم بھی چلنے کو

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

تیار نہیں ہوتے بلکہ اس کی طرف دھیان بھی نہیں دیتے۔ سبیل الرشد سے مراد انبیاء کی بتائی ہوئی راہ ہے اسی لیے راہ نبوت کو زندگی میں اپنانے والوں کو راشدین کہا ہے ۔

اولئک ھم الراشدون فضلا من اللہ و نعمۃ

یہی لوگ جن کے دلوں میں ایمان کا جال گھر کیے ہوتے ہے اور جو کفر و فسق اور عصیان کے ہر شائبہ سے بیزار و نفور ہیں ۔ درحقیقت رشد و ہدایت پر ہیں۔ ان کا ہی راستہ سبیل الرشد ہے اس میں ضلالت کی جگہ ہدایت ہے، فساد کی جگہ صلاح ہے۔ فسق و فجور کی جگہ تقویٰ و عبادت ہے۔ اس پر وہ ہی چلتا ہے جو خدا کو مطاع مطلق مان کر اپنے ارادے اور اپنی مرضی سے اس کے احکام پر چلتا ہے ۔ وہ شیطان، بت حکمران، سردار، قومی لیڈر اور مذہبی پیشوا جو خوف خدا سے بے بہرہ اور ہدایتِ الٰہی سے بے نیاز ہوں اور اپنی رائے اور مرضی ہی کو وقت کا قانون سمجھتے ہوں ان خدا بیزار قوتوں سے وہ زندگی کے کسی موڑ پر بھی مصالحت نہیں کرتا ہے ۔ بہرحال سبیل الرشد سے مراد راشدین کی راہ ہے ۔ وہ اس کی جگہ ان لوگوں کی راہ پر چلتے ہیں جو ضلالت و غوایت، فسق و فجور اور فساد کے داعی ہیں۔

یہ بات کہ وہ رشد و ہدایت سے گریزاں اور غوایت و ضلالت کے بے دام غلام ہیں ان میں کہاں سے آئی ہے یہ بات نہیں کہ اللہ نے ان کی تخلیق ہی ایسی فرمائی ہے بلکہ اصلی وجہ یہ ہے بانھم کذبوا بآیتنا و کانوا عنھا غافلین انہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور ان پر غور کرنے سے غافل رہے ۔یہ سب کچھ انہوں نے اپنے ارادہ و اختیار سے کیا ہے جیسے اُمتوں کا تعلق نبوت کے علم و عمل سے ٹوٹ جاتا ہے تو بالکل یہی صورتِ حال پیدا ہو جاتی ہے ۔ ایسے لوگوں میں خیر اور ہدایت کی رغبت مردہ ہو جاتی ہے ۔ اس وجہ سے اگر ان کو ہدایت کی راہ دکھائی جاتے تو وہ اس سے بھاگتے ہیں اور اگر گمراہی کی دعوت دی جاتے تو وہ اس پر چل پڑتے ہیں ۔

اللہ کی بندگی سے اعراض کی اُخروی سزا

۱۸۳۔ اور جن لوگوں نے ہماری آیات کی اور آخرت کی زندگی کی تکذیب کی تو اُن کے سارے کام اکارت ہوگئے ان کو ان کے ان کرتوتوں کی ضرور سزا ملے گی جو وہ کرتے رہے ہیں۔ یعنی احکام الٰہیہ پر چلنے کی توفیق نہ ہوگی اور جو کچھ کام اپنی عقل سے کریں گے وہ خدا کے یہاں قبول نہ ہوگا۔ جیسا کریں گے ویسا بھگتیں گے۔ باقی ان کی بے جان اور مردہ نیکیوں کا جو بدلہ ملنا ہوگا دُنیا میں

ل رہے گا۔[1] مطلب یہ ہے کہ آیاتِ الٰہی کی تکذیب اور آخرت کی زندگی میں حساب وجوابدہی سے روگردانی کرنے والے لوگ جو اعمال بھی کرتے ہیں خواہ وہ کتنے بڑے کارنامے ہوں۔ بہرحال وہ دُنیا کے خاتمہ کے ساتھ ہی ختم ہوجائیں گے۔ ان کے قصر و محلات ان کی یونیورسٹیاں اور لائبریریاں ان کے کارخانے اور فیکٹریاں ان کی سڑکیں اور راہیں، ان کی ایجادیں اور صنعتیں۔ ان کے علوم و فنون اور ان کی آرٹ گیلریاں اور دوسری وہ چیزیں جن پر وہ فخر کرتے تھے ان میں سے کوئی چیز بھی اپنے ساتھ لیے ہوئے خدا کے ہاں نہ پہنچیں گے کہ خدا کی ترازو میں اس کو رکھ سکیں وہاں جو چیز باقی رہنے والی ہے وہ صرف ایمان بآیات اللہ اور ایمان بالیوم الآخر اور ان کی بنیاد پر اُٹھے ہوئے اعمال و اخلاق۔ اب اگر ایمان سے ہٹ کر زندگی کے سارے مقاصد کو دُنیا ہی میں محدود رکھتا ہے اور نتائج بھی اس کو دنیا ہی میں مطلوب ہیں اور دُنیا کی زندگی میں وہ نتیجہ عمل دیکھ بھی چکا ہے تو اس کا سب کیا کرایا دُنیائے فانی کے ساتھ فنا ہوگیا۔ اور سب کچھ ضائع ہوگیا کیونکہ خدا کے ہاں انسانی سعی وعمل کے بار آور ہونے کا انحصار دو باتوں پر ہے ایک یہ کہ وہ سعی و عمل خدا کے قانونِ شرعی کی پابندی میں ہو دوسرے یہ کہ اس تگ و دو میں دُنیا کے بجائے آخرت میں کامیابی پیشِ نظر ہو۔ یہ دو شرطیں جہاں نہ ہوں گی وہاں لازماً حبطِ عمل ہوگا۔ جس نے خدا سے ہدایت لیے بغیر بلکہ اس سے منہ موڑ کر باغیانہ انداز پہ دُنیا میں کام کیا ظاہر ہے کہ وہ خدا سے اجر کی توقع رکھنے کا کسی طرح حقدار نہیں ہوسکتا اور جس نے سب کچھ دُنیا ہی کے لیے کیا اور آخرت کے لیے کچھ نہ کیا کھلی بات ہے کہ آخرت میں اسے کوئی ثمرہ پانے کی اُمید نہ رکھنی چاہیے اور کوئی وجہ نہیں کہ وہ وہاں کسی قسم کا ثمرہ پائے۔ اگر میری مملوکہ زمین میں کوئی شخص میرے منشا کے خلاف تصرف کرتا رہا ہے تو وہ مجھ سے سزا پانے کے سوا آخر اور کیا پانے کا حقدار ہوسکتا ہے؟[2]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

وَاتَّخَذَ قَوْمُ مُوْسٰی مِنْۢ بَعْدِهٖ مِنْ حُلِيِّهِمْ عِجْلًا جَسَدًا لَّهٗ
خُوَارٌ ۭ اَلَمْ يَرَوْا اَنَّهٗ لَا يُكَلِّمُهُمْ وَلَا يَهْدِيْهِمْ سَبِيْلًا ۘ
اِتَّخَذُوْهُ وَكَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ﴿۱۴۸﴾ وَلَمَّا سُقِطَ فِيْٓ اَيْدِيْهِمْ وَرَاَوْا
اَنَّهُمْ قَدْ ضَلُّوْا ۙ قَالُوْا لَئِنْ لَّمْ يَرْحَمْنَا رَبُّنَا وَيَغْفِرْ لَنَا لَنَكُوْنَنَّ مِنَ
الْخٰسِرِيْنَ ﴿۱۴۹﴾ وَلَمَّا رَجَعَ مُوْسٰٓى اِلٰى قَوْمِهٖ غَضْبَانَ اَسِفًا ۙ قَالَ
بِئْسَمَا خَلَفْتُمُوْنِيْ مِنْۢ بَعْدِيْ ۚ اَعَجِلْتُمْ اَمْرَ رَبِّكُمْ ۚ وَ
اَلْقَى الْاَلْوَاحَ وَاَخَذَ بِرَاْسِ اَخِيْهِ يَجُرُّهٗٓ اِلَيْهِ ۭ قَالَ ابْنَ اُمَّ
اِنَّ الْقَوْمَ اسْتَضْعَفُوْنِيْ وَكَادُوْا يَقْتُلُوْنَنِيْ ڮ فَلَا تُشْمِتْ بِيَ
الْاَعْدَاۗءَ وَلَا تَجْعَلْنِيْ مَعَ الْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۵۰﴾ قَالَ رَبِّ
اغْفِرْ لِيْ وَلِاَخِيْ وَاَدْخِلْنَا فِيْ رَحْمَتِكَ ڮ وَاَنْتَ اَرْحَمُ الرّٰحِمِيْنَ ﴿۱۵۱﴾

اور موسٰی کی قوم نے موسٰی کے بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑا
کو یعنی ایک قالب جس میں گائے جیسی آواز تھی اپنا معبود بنالیا ۱۴۸

کیا اُن کی عقل میں یہ بات نہیں آئی کہ وہ ان سے بات تک
نہیں کرتا ہے اور نہ ان کی رہنمائی کرتا ہے انھوں نے اس کو معبود
بنالیا وہ اپنے کردار میں بڑے سب بے ڈھنگے تھے۔[۱۸۵] اور جب ندامت
سے ہاتھ ملنے لگے اور ان کی یہ بات سمجھ میں آگئی کہ وہ راہِ حق
سے بھٹک گئے تو پکار اُٹھے اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم
نہ کیا اور ہمیں معاف نہ کیا تو ہم ضرور تباہی کا شکار ہوجائیں گے[۱۸۶]
اور جب موسیٰ علیہ السلام کوہِ طور سے خشمناک اور افسوس کی حالت
میں واپس آئے تو موسیٰ نے کہا افسوس تم نے کس بُرے طریقہ
پر میری جانشینی کی کیا تم نے اپنے رب کے حکم آنے سے پہلے
ہی ایسی جلد بازی کی ہے[۱۸۷]۔ اور موسیٰ نے تختیاں پھینک
دیں اور ہارون کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے[۱۸۸]۔
ہارون نے کہا کہ اے میرے ماں جاتے بھائی لوگوں نے

مجھے بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ قتل کر ڈالیں میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو کہ جس سے دشمن ہنسیں اور نہ مجھے ان ظالموں کے ساتھ شمار کر[۱۸۹] موسیٰ نے کہا پروردگار میرا قصور بخش دے اور میرے بھائی کا بھی اور ہمیں اپنی رحمت کے سایہ میں داخل کر لے تیرے سے بڑھ کر کون ہے جو رحم کرنے والا ہو۔

معانی مفردات

حلیّ حلی کی جمع ہے جیسے ثُدیّ ثدی کی جمع ہے حلی کے معنے زیور اور گہنے کے ہیں۔ عجل، بچھڑا، گوسالہ، گائے کا بچہ، علامہ مطرزی نے المغرب میں تصریح کی ہے کہ گائے کا بچہ وقتِ ولادت سے لے کر ایک ماہ تک عجل کہلاتا ہے۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں عجل بچہ گاؤ کو کہتے ہیں کیونکہ اس کے متعلق عجلت کا وہ تصور پایا جاتا ہے کہ جو ثور بیل ہو جانے کی حالت میں معدوم ہو جاتا ہے اس کی مونث عجلہ اور جمع عجول ہے۔ امام ابو منصور ثعالبی نے فقہ اللغہ میں گائے بیل کی عمر کے لحاظ سے حسب ذیل تین الفاظ مقرر فرماتے ہیں۔ بچہ کے لیے عجل جوان کے لیے شبوب اور عمر رسیدہ کے لیے فارض۔ جسد، دھڑ بدن، جسد کے معنے جسم ہی کے ہیں مگر یہ اس سے خاص ہے کیونکہ جسد وہ ہے جس میں رنگ ہو اور جسم کا استعمال اس کے لیے بھی ہوتا ہے جس کا رنگ ظاہر نہ ہو جیسے پانی ہوا جمع اجساد آتی ہے۔ خوار، گائے کی آواز اصل میں تو یہ لفظ گائے کی آواز ہی کے لیے خاص ہے مگر کبھی کبھی بطور استعارہ اونٹ بکری ہرن یا تیروں کی آوازوں کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے سقط فی ایدیھم وہ گرا دیا گیا سقوط جس کے معنے گر پڑنے کے ہیں۔ امام ابو جعفر احمد بن علی مقری بیہقی اپنی کتاب تاج المصادر میں لکھتے ہیں لما سقط فی ایدیھم یعنی وہ نادم

ہوتے اس کے معنے ہوتے ہیں سقط الندم فی ایدیہم ندامت ان کے ہاتھوں میں گر پڑی ندامت کو حذف کر دیا ہے اور بعض کہتے ہیں کہ سقط مجہول ہے اور نائب فاعل پر آیا ہے جیسے مرغب فی فلاں بولا جاتا ہے لیکن سقطت نہیں بولا جاتا جس طرح رغبت نہیں بولا جاتا بلکہ کہا جاتا ہے رُغِبَ فلاں اور سقط فی یدہ بمعنے ندم، سقط فی ایدیہم کی طرح اسقط فی ایدیہم بھی بولا جاتا ہے مگر سُقط کا استعمال زیادہ بھی اور فصیح بھی اور کچھ نے اسقط کا انکار کیا ہے اور یہ طرز استعمال عربی زبان میں قرآن سے پہلے نہ تھا اور اہلِ عرب اس سے واقف نہ تھے اور یہ ترکیب کسی چیز کے اوپر سے نیچے کی طرف آنے اور اس کے زمین پر گرنے کو بتاتی ہے۔ پھر اس کے معنے میں وسعت کی گئی چنانچہ غلط بات کو سقط (گری پڑی چیز) کہا جانے لگا کیونکہ یہ بے ضرورت چیز کے مشابہ ہے اور ہاتھ کا ذکر اس لیے کیا گیا کہ ندامت دل میں پیدا ہوتی ہے اور اس کا اثر ہاتھوں میں ظاہر ہوتا ہے جیسے اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے فاصبح یقلب کفیہ بسا اوقات ہاتھوں کی طرف اس فعل کی بھی نسبت کر دی جاتی ہے جو اس سے سرزد نہیں ہوتا جیسے ذالک بما قدمت یداک۔

بنی اسرائیل کی باغیانہ سرکشی کی داستان

اب تک تصویر کا ایک رُخ بیان ہوا ہے کہ اللہ سبحانہ نے بنی اسرائیل پر کس قدر انعامات کی بارشیں کی ہیں۔ اب یہاں سے تصویر کا دوسرا رُخ بیان ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل نے ان انعامات کا مقابلہ کس طرح کیا۔ شکر سے یا کفر سے۔ یہاں اس داستان میں ان کی اس مشرکانہ ذہنیت اور مشرکانہ طرزِ عمل کو کھولا جا رہا ہے جو انہوں نے اختیار کیا تھا۔ بنی اسرائیل مصر کی بت پرستی سے اس درجہ مالوف ہو چکے تھے کہ رہ رہ کر انہیں اس کا شوق ہوتا۔ جونہی حضرت موسیٰ چالیس دن کے لیے الگ ہوتے انہوں نے گائے کے بچھڑے کی طلائی مورتی بنا کر اس کی پوجا شروع کر دی۔ عجائب پرستوں کا قاعدہ ہے کہ جہاں کوئی ذراسی عجیب بات نظر آئی فوراً معتقد ہو گئے اور سمجھ بوجھ کو خیر باد کہہ دیا۔ سامری مصر کے مندروں کے بھیدوں سے واقف تھا وہاں اس ترکیب سے مورتیاں بنائی جاتی تھیں کہ جونہی ہوا ان کے اندر جاتی طرح طرح کی آوازیں نکالنے لگتیں۔ آج کل یہ صنعت باجوں اور کھلونوں میں استعمال کی جاتی ہے۔ اس زمانہ میں معبدوں

کا معجزہ تھا۔ چنانچہ اس نے بچھڑے کی مورتی میں بھی یہی کاریگری رکھی۔ بنی اسرائیل اتنی سی بات دیکھ کر معتقد ہو گئے۔ ہندوستان کی طرح مصر میں بھی بیل اور گائے کی عظمت کا تصور پیدا ہو گیا۔ اگر کالڈیا کے تمدن کی قدامت تسلیم کر لی جائے تو وہیں سے یہ خیال دوسرے ملکوں میں پھیلا ہو گا۔ یہ دراصل اس مصریت زدگی کا دور ظہور تھا جسے لیے ہوئے بنی اسرائیل مصر سے نکلے تھے۔ مصر میں گائے کی پرستش اور تقدیس کا جو رواج تھا اس سے بنی اسرائیل اتنی شدت سے متاثر تھے کہ قرآن نے ان کا اس موضوع پر چہرہ پیش کرتے ہوئے بتایا ہے واشربوا فی قلوبھم العجل یعنی ان کے دلوں میں بچھڑا رچ بس گیا تھا۔

سب سے زیادہ حیرت کا مقام یہ ہے کہ ابھی مصر سے نکلے ہوئے ان کو صرف تین مہینے ہی گزرے تھے، سمندر کا پھٹنا، فرعون کی غرقابی، ان لوگوں کا بخیریت اس بند غلامی سے نکل آنا، جس کے ٹوٹنے کی کوئی امید نہ تھی اور اس سلسلے کے دوسرے واقعات ابھی بالکل تازہ تھے۔ اور انہیں خوب معلوم تھا کہ یہ جو کچھ ہوا محض اللہ کی قدرت سے ہوا ہے کسی دوسرے کی طاقت و تصرف کا اس میں کوئی دخل نہ تھا لیکن اس پر بھی پہلے تو انہوں نے حضرت موسیٰ سے ایک مصنوعی معبود کا مطالبہ کیا اور پھر پیغمبر کی غیر حاضری میں خود ہی ایک مصنوعی معبود بنا لیا۔ یہی وہ حرکت ہے جس پر انبیاء میں سے کچھ نے بنی اسرائیل کو اس بدکار عورت سے تشبیہ دی ہے جو اپنے شوہر کے سوا دوسرے مرد سے جی لگاتی ہو اور جو شب اول میں بھی بیوفائی سے نہ چوکی ہو۔ [1]

۱۴۸۔ اور موسیٰ کی قوم نے موسیٰ کے بعد اپنے زیورات سے ایک بچھڑے کو یعنی ایک قالب جس میں گائے جیسی آواز تھی اپنا معبود بنا لیا۔ یہ زیور جسے گلا کر اور ڈھال کر بچھڑا بنایا اصل میں فرعون کی قوم قبطیوں کا تھا۔ ان کے پاس سے بنی اسرائیل کے قبضہ میں آیا جیسا کہ سورہ طٰہٰ میں ہے حملنا اوزارا من زینۃ القوم [2] قرآن نے تو ان زیورات کے بارے میں جن سے بنی اسرائیل نے پوجنے کے لیے بچھڑا بنایا تھا صرف یہی بتایا ہے کہ ہم لوگوں کے زیورات کے بوجھ سے لدے ہوئے تھے۔ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ ہمارے مردوں اور عورتوں نے مصری رسم کے مطابق جو بھاری بھاری زیورات پہن رکھے تھے وہ اس صحرانوردی میں ہم پر بار ہو گئے تھے۔ اور ہم پریشان تھے کہ اس بوجھ کو کہاں تک لادے پھریں۔ یہاں من حلیھم اور سورہ طٰہٰ میں من زینۃ القوم کی

---

[1] ترجمان و تفہیم۔ [2] افادات شیخ الاسلام

تعبیر سے معلوم ہوتا ہے کہ سفر کی آبادھاپی میں ضائع ہونے کے خطرے سے محفوظ رکھنے کے لیے اپنے قیمتی زیورات بہت سے لوگوں نے سرداروں کے پاس امانت جمع کرا دیے تھے اور انہوں نے ایک خدمت سمجھ کر مجبوراً یہ ذمہ داری اپنے سر لے لی تھی ۔

یہ زیورات بنی اسرائیل کے تھے یا قبطیوں کے ؟ قرآن یہاں تو من حلیھم سے یہی اشارہ کر رہا ہے کہ یہ زیورات بنی اسرائیل کے تھے ۔ اور سورہ طٰہٰ میں بھی من زینۃ القوم سے بنی اسرائیل مراد ہیں کیونکہ یہ سرداران قوم کا مقولہ ہے اور ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ سرداروں سے ہی مخاطب ہیں لیکن تورات کی روایات اس موضوع پر مختلف ہیں ۔ کتاب خروج کے باب ۳۵ سے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ زیورات بنی اسرائیل کے تھے ۔ لیکن اسی کتاب کی دوسری روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے ملک چھوڑتے وقت سونے اور چاندی کے بہت سے زیورات اور برتن مصریوں سے مستعار لیے تھے اور ہمارے شارحین قرآن کے یہاں اسی روایت کو شرف پذیرائی حاصل ہے لیکن یہ بات بالکل خلاف قیاس معلوم ہوتی ہے انشاء اللہ اس پر تفصیلی بحث معالم القرآن کی جلد شانزدہم میں آپ پڑھیں گے ۔ بہرحال ان زیورات سے بچھڑے کی ایک مورت بنائی گئی اور معلوم ہوتا ہے کہ ہاتھ کی صفائی یہ دکھائی گئی ہے کہ اس میں سے جب ہوا گزرتی تو جیسے بچھڑا ڈکراتا ہے ایسی آواز اس سے نکلتی ۔ خوار عربی میں بیل کی آواز کو کہتے ہیں ۔ قرآن یہ داستان بنی اسرائیل کی بلادت عقلی بے مائیگی اور ان کی ناسپاسی اور ناقدری ظاہر کرنے کے لیے سنا رہا ہے ۔ اللہ اکبر جس ذات اکبر نے ان کو اپنے جلال و جمال کی وہ نشانیاں دکھائیں جن کی تفصیل پہلے بیان ہو چکی ہے اس کی شکر گزاری انہوں نے اس طرح کی کہ اسے چھوڑ کر عابدانہ تعلقات ایک ایسی مورتی سے قائم کر لیے جو اپنے ہی زیور سے بنائی اور اس کے متعلق یہ باور کریں کہ یہ ہماری عابدانہ نیازمندیوں کا مستحق ہے ۔ اس طرح بنی اسرائیل نے اپنا وہ شوق پورا کر لیا جس کا اظہار انہوں نے حضرت موسیٰ کے کوہ طور پر جانے سے پہلے کیا تھا اور جس پر حضرت موسیٰ نے ان کو ڈانٹ پلائی تھی ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نبی کی امت اگر نبوت کے علم و عمل سے نادان بے خبر اور بیگانہ ہو تو شرک جیسی سنگین برائی میں بھی مبتلا ہو جاتی ہے ۔

بنی اسرائیل کی حماقت پر تنبیہ

۱۸۵ ۔ کیا ان کی عقل میں یہ بات نہیں آتی کہ وہ ان سے بات تک نہیں کرتا اور نہ ان کی

رہنمائی کرتا ہے انہوں نے اس کو معبود بنالیا وہ اپنے کردار میں بڑے بے ڈھنگے تھے۔ سورۃ طٰہٰ میں اس بچھڑے کا مفصل تذکرہ آئے گا۔ یہاں ان کی حماقت و سفاہت پر متنبہ فرمایا ہے کہ ایک خود ساختہ ڈھانچہ میں سے گائے کی آواز سن لینے پر مفتون ہو گئے اور بچھڑے کو خدا سمجھ بیٹھے۔ حالانکہ اس کی بے معنے آواز میں نہ کوئی کلام و خطاب تھا نہ دینی و دنیوی رہنمائی اس سے ہوتی تھی۔ اس طرح کی صورت محض تو کسی چیز کو انسانیت کے درجہ تک ہی نہیں پہنچا سکتی، چہ جائے کہ خالق جل و علا پر پہنچا دے۔ یہ کتنا بڑا ظلم اور بے موقع کام ہے کہ ایک معمولی جانور کی صورت کو خدا کہہ دیا جائے بات یہ ہے کہ اس قوم کو پہلے ہی سے ایسی بے موقع باتیں کرنے کی عادت تھی چنانچہ پیشتر اجعل لنا الٰھا کما لھم الٰھۃ کی درخواست کر چکے تھے۔ ؎

معبود بنالینے کی تفصیل تورات میں اس طرح بیان ہوئی ہے کہ

انہوں نے کہا کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں ملک مصر سے نکال لایا۔ (خروج ۲۲ - ۴۱)

انہوں نے اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لیے قربانی ذبح کر کے کہا کہ اے اسرائیل یہ تمہارا معبود ہے جو تمہیں ملک مصر سے چھڑا لایا۔ (خروج ۳۲ - ۸)

اصل بات اتخذوہ وکانوا ظالمین ہے یعنی وہ بچھڑے کو معبود بنا بیٹھے اور اس طرح اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ ظلم کی اصل حقیقت حق تلفی کرنا ہے۔ شرک فی العبادۃ کا ارتکاب کر کے انسان اپنی تحقیر کرتا ہے کیونکہ وہ کائنات میں خدا کا خلیفہ اور تمام مخلوقات میں اشرف ہونے کے باوجود اپنی ہی جیسی یا اپنے سے بھی کسی گھٹیا چیز کو اپنا معبود بنا بیٹھتا ہے۔ اپنے نفس کی اس سے بڑی حق تلفی کیا ہو سکتی ہے وکانوا ظالمین اگرچہ معنے کے اعتبار سے وکانوا مشرکین کے معنے میں ہے۔ قرآن میں شرک کو متعدد مقامات میں ظلم کے لفظ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن یہ قرآن کی غایت درجہ احتیاط ہے کہ وہ نبی کی امت اور نبی کی قوم میں فرق کرتا ہے۔ ایک نبی کی نبوت کو نہ مانتے ہوئے یہ عمل کیا جائے تو قرآن اس پر کھلے طور پر مشرک ہونے کا فتویٰ لگاتا ہے لیکن اگر نبی کو مانتے ہوئے بے علمی کی بنا پر اس قسم کا طرز عمل اختیار کیا جائے تو قرآن اسے

؎ افادات شیخ الاسلام

ظلم کہتا ہے۔ قرآن میں جہاں بھی یہ واقعہ آیا ہے قرآن نے ظلم ہی کی تعبیر اختیار کی ہے مثلاً ثم اتخذتم العجل من بعدہ وانتم ظالمون اور انکم ظلمتم انفسکم باتخاذکم العجل اسی بنا پر الم یروا انہ لا یکلمھم ولا یھدیھم سبیلا ، جملہ معترضہ لاکر ان کی حماقت پر تنبیہ کی ہے کہ انہوں نے یہ بھی نہ سوچا کہ جو چیز بات بھی نہیں کرتی خالی ٹیں ٹیں کر رہی ہے اور کسی قسم کی کوئی رہنمائی بھی جس میں موجود نہیں اس کی عبادت کرنے لگے۔ اس سے اشارہ معلوم ہو رہا ہے کہ بنی اسرائیل الوہیت کے موضوع پر بالکل ان پڑھ تھے اور ان کا مبلغ علم عجائبات کے سوا کچھ نہ تھا اس فقرہ کا یہ منشا نہیں ہے کہ معبود وہ ہوتا ہے جو بات کرے اور راہ بتائے بلکہ مقصد یہ سمجھانا ہے کہ کچھ تو عقل کے ناخن لینے چاہئیں۔ آخر معبود ہونے کا کوئی معیار ہونا چاہیے۔ ایک مورت کو صرف بھاں بھاں کرتے دیکھ کر عبادت کرنا کہاں کی دانشمندی ہے۔ یہاں حضرت مولانا تھانوی کا یہ استنباط بہت لطیف ہے کہ خوارق سے دھوکا نہ کھانا چاہیے۔ خوارق خواہ کیسے ہوں لیکن دلیل شرعی کے سامنے اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔ اگر کہیں بطور خرق عادت ایسا ہو بھی جائے کہ کسی بنی ہوئی مورتی سے آواز آجائے یا بات کرنے لگے یا کسی قبر سے کوئی آواز آئے یا کوئی روشنی محسوس ہو یا مردہ باتیں کرنے لگے پھر بھی اس کی عبادت حرام ہوگی کیونکہ دلیل شرعی سے غیر اللہ کی عبادت حرام ہو چکی ہے۔

بنی اسرائیل کی اپنے کردار پر ندامت

۱۴۹۔ اور جب ندامت سے ہاتھ ملنے لگے اور ان کی یہ بات سمجھ میں آگئی کہ وہ راہِ حق سے بھٹک گئے تو پکار اٹھے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ کیا اور ہمیں معاف نہ کیا تو ہم ضرور تباہی کا شکار ہو جائیں گے۔ اپنی بدعقلی اور کج روی سے انہوں نے ایسا بے ڈھنگا اور بھونڈا کام کیا تھا کہ موسیٰ علیہ السلام کی تنبیہ کے بعد جب باطل کا جوش ٹھنڈا ہوا اور عقل و ہوش کچھ ٹھکانے آئے تو خود بھی اپنی حرکت پر بہت شرمائے گویا مارے ندامت کے ہاتھ کاٹنے لگے اور خوف و ہراس کی وجہ سے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے، گھبرا کر کہنے لگے اب کیسے بنے گی اگر خدا نے ہم پر رحم فرما کر توبہ اور مغفرت کی کوئی صورت نہ نکالی تو یقیناً ہم ابدی خسران اور دائمی ہلاکت میں جا پڑیں گے۔[1] یہ ان کی اپنے کردار پر ندامت کی تصویر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی رائے عامہ نے جو کچھ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کیا بے خبری اور لاعلمی میں کیا لیکن جرم بہرحال جرم ہے خواہ بے خبری میں کیا جاتے۔ بے خبری جُرم کے جواز کے لیے عذر نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ سامری اور اس کے ساتھیوں کے پروپیگنڈے سے مسحور ہو کر بنی اسرائیل یہ حماقت کر نے کو کر بیٹھے لیکن سامنے جب بھاں بھاں کرتا ہوا بچھڑا نظر آیا اور معلوم ہوا کہ یہ بنی اسرائیل کا معبود ہے تو ان کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ ان کو اپنی حماقت اپنی آنکھوں کے سامنے نظر آئی اور اپنی گمراہی کا احساس ہوا اور بولے کہ اگر ہمارے رب نے ہم پر رحم نہ فرمایا اور ہمارے اس جرم کو معاف نہ کیا تو ہم نامراد ہوتے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ ان میں یہ احساس کب بیدار ہوا ہے۔ جب کہ اس کردار پر حضرت ہارون کی توبیخ پر ان کا جواب یہ تھا کان نبرح علیہ عاکفین حتی یرجع الینا موسٰی جب تک موسٰی ہمارے پاس نہ آتے ہم اس کی پرستش پر جمے رہیں گے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہ احساس ان کو اس وقت ہوا جب موسٰی علیہ السلام کوہ طور سے واپس ہوتے اور ان کو اس جہالت و حماقت پر ملامت کی تو ان کے ہوش ٹھکانے آتے اور گھبرا کر کہنے لگے اور یہ احساس بھی صرف ان لوگوں کو جن کے اندر کچھ سوجھ بوجھ تھی۔ عوامی جوش کے بحران میں تو وہ صحیح حال کا اندازہ نہ کر سکے لیکن جب نتیجہ سامنے آگیا تو ان کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے دیکھا کہ ہم تو راہِ حق سے ہٹ گئے ہیں۔

اجتماعی زندگی میں اس قسم کے مواقع بڑی ہی آزمائش کے اور بڑے ہی خطرناک ہوتے ہیں کوئی ایک گمراہی لے کر اٹھتا ہے اور جذباتی عوام کی بھیڑ اپنے اردگرد جمع کر کے کوئی ایسا فتنہ اٹھا دیتا ہے جس سے پوری جماعت کا شیرازہ منتشر ہو جاتا ہے اور بسا اوقات سمجھدار اور ذمہ دار لوگ بھی اس وقت بیدار ہوتے ہیں جب پانی سر سے گزر جاتا ہے۔

ظاہر یہی ہے کہ ندامت اور افسوس کے لیے ان کے ضمیر کی بیداری خود اپنے علم و یقین کی بنا پر نہیں بلکہ حضرت موسٰی کی تہدید و توبیخ کی وجہ سے پیدا ہوئی اس کی اہمیت کے پیش نظر اسے پہلے بیان کر دیا گیا ہے۔ قرآن نے ان کے کردار کے ساتھ ان کی گفتار بھی بتا دی تاکہ پتہ لگ جاتے کہ وہ بنی اسرائیل کا اگر کردار ہے تو یہ ان کی گفتار ہے۔

حضرت موسٰی کی ناراضگی

۱۸۷-۱۰ر جب موسٰی علیہ السلام کوہ طور سے واپس ہوتے خشمناک اور افسوس کی حالت میں

تو موسیٰ نے کہا افسوس تم نے کس برے طریقے پر میری جانشینی کی کیا تم نے اپنے رب کے حکم آنے سے پہلے ہی ایسی جلد بازی کی ہے؟ ۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو طور پر ہی اطلاع دے دی تھی کہ سامری نے تیری قوم کو گمراہ کر دیا ہے یہ سن کر موسیٰ علیہ السلام سخت متاسف اور غضبناک تھے آتے اور آکر گوسالہ پرستوں کو مخاطب کر کے کہا میرے پیچھے تم نے میری خوب قائمقامی کی۔ جس بات پر میں سب سے زیادہ زور دیتا تھا خدا کی توحید اس کی جگہ تم نے بچھڑے کی پوجا، یہ کہہ کر کھڑی کر دی کہ ھذا الٰھکم والٰہ موسیٰ اور ممکن ہے کہ خطاب حضرت ہارون سے بھی ہو کہ تم نے میری نیابت کا حق جو اخلفنی فی قومی کہہ کر سپرد کر گئے تھے اچھی طرح ادا نہ کیا کہ ان کو روکتے اور مضبوطی سے اس فتنہ کا مقابلہ کرتے جیسا کہ سورہ طٰہ میں مفصل آئے گا۔ اور فرمایا کہ اعجلتم امر ربکم یعنی میں پروردگار سے تمہارے لیے احکام ہی لینے تو گیا تھا اور چالیس روز کی میعاد بھی خدا نے مقرر کر دی تھی۔ تم نے خدا کی مقرر کی ہوئی مدت پوری ہونے اور اس کے احکام کے آنے کا بھی انتظار نہ کیا۔ کچھ بہت زیادہ زمانہ تو نہیں گزر گیا جو تم نے گھبرا کر اس قدر جلد خدا کے قہر و غضب کو اپنی طرف آنے کی دعوت افطال علیکم العھد ام اردتم ان یحل علیکم غضب من ربکم فاخلفتم موعدی[1]

تورات اور قرآن دونوں ہی سے یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ حضرت موسیٰ کو اس حادثہ کی اللہ سبحانہٗ نے کوہ طور پر اطلاع دے دی تھی۔ سورہ طٰہ میں ہے ۔

فانا قد فتنا قومك من بعدك واضلهم السامری

ہم نے تیری قوم کی تیرے پیچھے آزمائش کی اور ان کو سامری نے بہلا دیا۔

تورات کی کتاب خروج باب ۳۲ میں ہے ،

تب خداوند نے موسیٰ کو کہا نیچے جا، کیونکہ تیرے لوگ جن کو تو مصر سے نکال لایا بگڑ گئے تھے ۔ وہ اس راہ سے جس کا میں نے ان کو حکم دیا تھا بہت جلد پھر گئے ہیں۔ انہوں نے اپنے لیے ڈھالا ہوا بچھڑا بنایا اور اسے پوجا اور اس کے لیے قربانی چڑھا کر یہ بھی کہا کہ اے اسرائیل یہ تیرا وہ دیوتا ہے جو تجھ کو ملک مصر سے نکال کر لایا اور خداوند نے موسیٰ سے کہا کہ میں اس قوم کو دیکھتا ہوں کہ یہ گردن کش قوم ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

چنانچہ حضرت موسیٰ جب کوہ طور سے واپس آئے تو نہایت غم و غصہ کی حالت میں تھے۔ غصہ ان کو ان مفسدین کی شرارت پر تھا اور غم اپنی قوم کی نادانی و جہالت پر، آتے ہی انہوں نے سب سے پہلے ان لوگوں کی خبر لی جن پر ان کی غیر موجودگی میں قوم کی دیکھ بھال کی ذمہ داری عائد ہوتی تھی فرمایا کہ تم لوگوں نے میرے بعد میری بہت بُری جانشینی کی کہ قوم کو اس بُرے راستے پر ڈال دیا۔ سورہ طٰہٰ میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ یہ تم کیا کر بیٹھے ہو۔ کیا تم سے اللہ سبحانہ نے نہایت مبارک وعدہ کتاب و شریعت دینے کا نہیں فرمایا تھا۔ کیا اس وعدہ کے پورا ہونے میں اتنی دیر ہو گئی کہ تم صبر نہ کر سکے کیا تم صبر نہ کر سکے کیا تم نے یہ چاہا کہ تم پر خدا کا غضب نازل ہو تم اس عہد کو توڑ بیٹھے ہو جو میں تم سے لے کر گیا تھا۔

اعجلتم امر ربکم یعنی قبل اس کے خدا یہ بتلانے کہ اس کی عبادت کا طریقہ کیا ہے اور یہی بتانے کے لیے اس نے مجھے کوہ طور پر بلایا۔ تم نے آگے بڑھ کر خود ہی عبادت کا طریقہ ایجاد کر لیا حالانکہ یہ چیز تمہارے ایجاد کرنے کی نہیں بلکہ خدا ہی کے بتانے کی ہے۔ گویا توبیخ دو باتوں پر کی جا رہی ہے ایک یہ کہ غیر اللہ سے عابدانہ تعلقات استوار کیے جا رہے ہیں اور دوسرے یہ کہ عبادت کے پیمانے بطور خود بنائے ہیں۔ دونوں باتیں ممنوع ہیں اور دونوں افترا علی اللہ کذبا ہیں۔ بہرحال مطلب یہ ہے کہ میں پرستش اور بندگی کا ضابطہ ہی لینے گیا تھا کم از کم میرا انتظار ہی کر لیتے۔ اتنی جلد بازی کی کیا ضرورت تھی۔ اس عجلت کا پس منظر شرارت اور جہالت تھا۔ اسی لیے حضرت موسیٰ پر دو ملی جلی کیفیات ظاہر ہوئیں ایک غصہ، دوسرے غم، غصہ و غم کے ملے جلے جذبات کا اظہار ان دو جملوں میں فرمایا بئسما خلفتمونی من بعدی میں غم کا اظہار ہے اور اعجلتم امر ربکم میں غضب کا اور غم و غصہ کی اسی حالت میں۔

حضرت ہارون پر حضرت موسیٰ کا غصہ

۱۸۸۔ اور موسیٰ نے تختیاں پھینک دیں اور ہارون کو بالوں سے پکڑ کر اپنی طرف کھینچنے لگے حضرت موسیٰ علیہ السلام اس مشرکانہ ڈھونگ کو دیکھ کر اور ہارون علیہ السلام کی نرمی و تساہل کا گمان کر کے اس قدر برافروختہ اور دینی حمیت کے جوش سے اس قدر بے قابو ہو رہے تھے کہ ہارون علیہ السلام کی طرف لپکے اور حرارت ایمانی کے بے اندازہ جوش میں ان کی داڑھی اور سر کے بال پکڑ لیے۔ معاذ اللہ ہارون کی اہانت کی نیت سے نہیں کیونکہ ہارون خود مستقل نبی اور عمر میں موسیٰ علیہ السلام

سے تین سال بڑے تھے۔ پھر ذی علم پیغمبر سے یہ کیسے ممکن تھا کہ دوسرے نبی کی جو اس کا بڑا بھائی ہو ذرہ برابر توہین کا ارادہ کرے، نہیں بلکہ موسیٰ علیہ السلام کی طرف سے یہ معاملہ اس وقت ہوا جب کہ وہ قوم کی سخت بدعنوانی کی بنا پر بغض فی اللہ اور غصہ سے بے اختیار ہو رہے تھے۔ حضرت ہارون کی نسبت یہ خیال گزر رہا تھا کہ شاید انہوں نے اصلاحِ حال کی پوری کوشش نہیں کی۔ حالانکہ ان کو اصلاح کی بھی تاکید کر گئے تھے۔ بے شک ہارون نبی اور عمر میں بڑے تھے۔ اور سیاسی و انتظامی حیثیت سے ہارون کو ان کا وزیر اور تابع بنایا گیا تھا۔ اس موقع پر موسیٰ علیہ السلام کی شان سیادت و حکومت کا ظہور ہوا۔ گویا ان کی طرف سے یہ داروگیر اور سخت بازپرس حضرت ہارون کی تقصیر مظنون پر ایک قسم کی فعلی ملامت تھی جس سے قوم کو بھی پوری طرح متنبہ کر دیا گیا کہ پیغمبر کا قلب نشہ توحید سے اس قدر سرشار اور وسیسہ شرک و کفر سے کس قدر نفور و بیزار ہوتا ہے کہ اس معاملہ میں ادنیٰ ترین تساہل یا خاموشی کو بھی برداشت نہیں کر سکتے حتیٰ کہ ایک نبی کی نسبت اگر ایسا وہم ہو جاتے کہ اس نے شرک کے مقابلہ میں آواز بلند کرنے میں ذرا سی کوتاہی کی ہے تو اس کی بزرگی اور وجاہت عنداللہ بھی ایسی سخت بازپرس سے ان کو نہیں روک سکتی۔ بہرحال موسیٰ علیہ السلام اس حالت میں شرعاً معذور تھے۔ اسی فرطِ غضب میں اور ہنگامہ دارو گیر میں الواح وہ تختیاں جو خدا کی طرف سے مرحمت ہوئی تھیں ان کے ہاتھ سے چھوٹ گئیں جسے عدم تحفظ کی وجہ سے تغلیظاً القا سے تعبیر فرمایا کیونکہ بظاہر خذها بقوة کا امتثال نہ کر سکے یا جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے ہارون کی طرف بڑھتے وقت ہاتھ خالی کرنے کے لیے بہت تیزی اور عجلت کے ساتھ تختیاں ایک طرف رکھ دیں۔ مگر چونکہ ان دونوں معاملات کی سطح جو ہارون یا الواح کے متعلق ظہور میں آتے صورۃً پسندیدہ نہ تھے۔ گو موسیٰ علیہ السلام نیتہً معذور تھے اس لیے آئندہ رب اغفر لی الخ کہہ کر حق تعالیٰ سے عفو کی درخواست کی واللہ سبحانہٗ اعلم[1]

والقی الالواح میں جو کچھ بتایا گیا ہے اس کی سیر حاصل تشریح تو حضرت مولانا عثمانی قدس اللہ سرہ العزیز کی زبان سے آپ سن چکے ہیں اور یہ بھی معلوم کر چکے ہیں کہ اس کا پس منظر غلبہ حال اور جوش حمیت ہے۔ اللہ کے معاملہ میں جوش و جذبہ، غیرت اور حضرت ہارون کے ساتھ قلبی محبت کے تقاضے سے دب کر حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون سے دریافت کیا کہ تم نے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس فتنہ کو سر کیوں اٹھانے دیا۔ سورہ طہٰ میں ہے ما منعك اذ رأيتهم ضلوا الا تتبعن افعصيت امری، تم نے جب دیکھا کہ یہ گمراہ ہو رہے ہیں تو کس چیز نے تجھے روکا کہ تو میری پیروی نہ کرے کیا تو نے میرے حکم کی خلاف ورزی کی۔ حکم سے مراد وہ حکم ہے جو پہاڑ پر جاتے وقت حضرت ہارون کو بنی اسرائیل کی قیادت سونپتے ہوئے حضرت موسیٰ نے دیا تھا۔ یعنی اصلح و لا تتبع سبيل المفسدين چونکہ اس حکم کی رو سے اصل ذمہ داری حضرت ہارون پر ہی تھی۔ اور ان پر پورا پورا اعتماد بھی تھا اس وجہ سے حضرت موسیٰ نے ان پر عتاب فرمایا۔ بہر حال حضرت موسیٰ کا یہ سارا کردار غیرت توحید کے جوش اور بے خودی میں رونما ہوا اس لیے اس کردار پر نہ کوئی گرفت کی جا سکتی ہے اور نہ یہ کردار دوسروں کے لیے سند کا کام دے سکتا ہے۔ بعض نادان صوفیا نے موسوی کردار کو اپنے لیے حالت وجد میں کپڑے پھاڑنے کے لیے سند بنایا ہے۔ قرطبی نے صاف لکھ دیا ہے کہ یہ قیاس مع الفارق سر تا سر لغو ہے۔ یہاں حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز کا یہ استنباط بڑا ہی لطیف ہے کہ:

> حضرت موسیٰ نے یہ معاملہ حضرت ہارون سے اپنے اس اجتہاد کی بنا پر کیا کہ حضرت ہارون سے کوتاہی واقع ہوئی۔ حالانکہ کوتاہی نہ ہوئی تھی تو جب پیغمبر برحق کے اجتہاد کا مطابق واقع ہونا ضروری نہیں ہے تو مشائخ غیر معصومین سے غلطی کا صدور کیوں ممکن نہیں۔

پس منظر تو تختیاں پھینکنے کا بھی ہے جو آپ سن چکے ہیں کہ مشہور مفسر قرآن امام محمد بن جریر طبری نے اس القائے الواح کا پس منظر بتاتے ہوئے حضرت قتادہ کے حوالہ سے یہ عجیب و غریب انکشاف فرمایا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے غصہ اور تختیوں کے پھینکنے کا پس منظر یہ تھا کہ ان تختیوں میں ان کی امت کی مدح و ستائش نہ تھی بلکہ امت محمدی کی تعریف و توصیف تھی۔ اس قسم کی بات ایک معمولی صالح متقی انسان کے منہ پر بھی نہیں پھبتی چہ جائے کہ حضرت موسیٰ جیسا عظیم پیغمبر یہ بات کہے۔ خدا کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے حافظ ابن کثیر کو، انہوں نے اس روایت کے بارے میں ہمیں یہ بتا دیا کہ:

> ابن جریر نے اس موضوع پر قتادہ سے جو روایت نقل کی ہے اس کی سند بھی صحیح نہیں ہے۔ ابن عطیہ اور دوسرے علماء نے اسے مردود قرار دیا ہے اور وہ اسی قابل ہے کہ اسے مردود کہا جائے عجب نہیں قتادہ کو یہ روایت اہل کتاب سے

پہنچی ہو جن میں بڑے کذاب روایت سازی کے فن کار اور چھوٹے لپاٹی ہیں۔

حضرت ہارون کی معذرت

۱۸۹۔ ہارون نے کہا کہ اے میری ماں جائے بھائی لوگوں نے مجھے بے حقیقت سمجھا اور قریب تھا کہ قتل کر ڈالیں، میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کر کہ جس سے دشمن ہنسیں اور نہ مجھے ان ظالموں کے ساتھ شمار کر۔ اگرچہ ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ کے عینی بھائی ہیں مگر ماں کا حوالہ دینے سے ان کے جذبۂ شفقت کو ابھارنا ہے اس لیے ابن ام فرمایا۔ اس آیت میں حضرت ہارون کی معذرت کا بیان ہے۔ حاصل یہ ہے کہ میں اپنے مقدور کے موافق ان کو سمجھا چکا ہوں لیکن انہوں نے میری کچھ حقیقت نہ سمجھی اُلٹے مجھے قتل کرنے پر آمادہ ہو گئے۔ اب آپ ایسا معاملہ کر کے ان کو مجھ پر ہنسنے کا موقع نہ دیجئے اور عتاب و غصہ کا اظہار کرتے وقت مجھ کو ظالموں میں شامل نہ کیجئے[1]

یہ حضرت ہارون نے اپنی صفائی پیش فرمائی ہے اور بیان کا طریق بے حد دل بہلانے والا ہے۔ آپ نے اپنی صفائی میں کہا ابن اُم اے میری ماں جاتے بھائی، اس سے پیار اور رہا تھ دلوں چیزیں نمایاں ہو رہی ہیں۔ آپ نے بتایا کہ قوم نے مجھے بے بس کر دیا تھا اور قریب تھا کہ میری جان سے کھیل جائیں۔ جتا دیا کہ میں نے نہ صرف یہ کہ لوگوں کو اس مشرکانہ عمل سے روکا بلکہ اس کے لیے میں نے آپ کو بھی خطرہ میں ڈال دیا لیکن لائے عامہ کی اکثریت سامری کے پیچھے لگ گئی تھی اور میرے ساتھ اتنی تھوڑی تعداد رہ گئی کہ طاقت کے زور سے اس کو روکنا میرے بس سے باہر ہو گیا اس لیے میں نے مصلحت اسی میں دیکھی کہ آپ کی واپسی کا انتظار کروں مبادا میرا کوئی اقدام کسی مزید فتنہ کا سامان نہ ہو جاتے اور یہ بنی اسرائیل میں تفریق کا فتنہ ہے۔ سورہ طٰہٰ میں تصریح ہے:

خشیت ان تقول فرقت بین بنی اسرائیل

مجھے اندیشہ ہوا کہ تم کہو گے کہ تو نے بنی اسرائیل میں پھوٹ ڈال دی۔

یہ سارا ان شیاطین کا بپا کردہ ہے میرا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ آپ مجھ پر ناراضگی کا اظہار فرما کر ان شیاطین کو خوشی منانے کا موقعہ نہ دیں۔ ڈرامہ کی ساری ذمہ داری ان پر ہے۔ میں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس سے بالکل بری ہوں۔
یہاں قرآن عزیز نے ایک بڑے الزام سے حضرت ہارون کی برأت ثابت کی ہے۔ جو یہودیوں نے زبردستی ان پر چسپاں کر رکھا تھا۔ بائیبل بچھڑے کی پرستش کا واقعہ اس طرح بیان کرتا ہے کہ جب حضرت موسیٰ کو پہاڑ سے اترنے میں دیر لگی تو بنی اسرائیل نے بے صبر ہو کر حضرت ہارون سے کہا کہ ہمارے لیے ایک معبود بنا دو۔ اور حضرت ہارون نے ان کی فرمائش کے مطابق سونے کا ایک بچھڑا بنا دیا جسے دیکھتے ہی بنی اسرائیل پکار اٹھے کہ اے اسرائیل یہی تیرا دیوتا ہے جو تجھے ملک مصر سے نکال لایا۔ پھر حضرت ہارون نے اس کے لیے ایک قربان گاہ بنائی اور اعلان کر کے دوسرے روز تمام بنی اسرائیل کو جمع کیا اور اس کے لیے قربانیاں چڑھائیں۔
(خروج باب ۳۲ آیت ۱-۶)

قرآن عزیز کے متعدد مقامات پر بصراحت اس غلط بیانی کی تردید کی گئی ہے اور حقیقت واقعہ یہ بتائی گئی ہے کہ اس جرم عظیم کا مرتکب اللہ کے نبی حضرت ہارون نہیں بلکہ اس کا بانی سامری تھا۔
یہ مقام قرآن کے ان مقامات میں سے ایک ہے جس میں قرآن نے اپنے مہیمن ہونے کا فرض انجام دیا ہے اور تورات کی اغلاط کی تصحیح کی ہے اور یہ ان لوگوں کے لیے سرمہ چشم ہے جو یہ کہتے رہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا خود ساختہ ہے اور آپ نے تورات و انجیل کی معلومات سے اس میں استفادہ کیا ہے۔ اگر آپ کی معلومات تورات کا فیضان ہوتیں تو آپ کی معلومات بلاشبہ تورات کے موافق ہوتیں۔ حیرت کی بات ہے کہ ایک شخص جو اُمّی ہے جس نے کبھی کسی کے سامنے زانوئے ادب طے نہیں کیا اس کے بارے میں یہ سوچا جاتا ہے؟ انا للہ والی اللہ المشتکی۔

ہارون کی بے گناہی کا اعتراف

۱۹۰۔ موسیٰ علیہ السلام نے کہا پروردگار میرا قصور بخش دے اور میرے بھائی کا بھی اور ہمیں اپنی رحمت کے سایے میں داخل کر لے تیرے سے بڑھ کر کون ہے جو رحم کرنے والا ہو۔ یعنی شدت غضب میں جو بے اعتدالی یا اجتہادی غلطی مجھ سے ہوئی خواہ میں اس میں کتنا ہی نیک نیت ہوں آپ معاف فرما دیجئے اور میرے بھائی ہارون سے اگر ان کے درجہ اور شان کو ملحوظ رکھتے ہوئے کسی طرح کی کوتاہی قوم کی اصلاح میں ہوئی اس سے بھی درگزر فرمائیے۔ [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

حضرت موسیٰ کو حضرت ہارون پر یہ شبہ ہوا تو کسی طرح ہو سکتا ہی نہیں تھا کہ خدانخواستہ وہ اس فتنہ کے بانی ہوں گے۔ البتہ جیسا کہ قرآن سے ہی معلوم ہو رہا ہے۔ یہ شبہ حضرت موسیٰ کو ہوا ہو گا کہ انہوں نے اس کے روکنے کے لیے اپنی ذمہ داری کما حقہ پوری نہیں کی۔ حضرت ہارون کے مذکورہ بالا جواب سے یہ شبہ دور ہو گیا۔ صورت حال واضح ہو جانے کے بعد حضرت موسیٰ نے اپنے اور اپنے بھائی کے لیے مغفرت مانگی۔

قرآن کے بیان کا مرتبین تورات کے اس بیان کے ساتھ تقابلی مطالعہ کیجئے جو حضرت ہارون کے بارے میں انہوں نے پیش کیا ہے۔ بظاہر یہ بات بڑی حیرت انگیز معلوم ہوتی ہے کہ مرتبین تورات جن لوگوں کو خدا کا پیغمبر مانتے ہیں ان میں سے کسی کی سیرت کو انہوں نے داغدار بنائے بغیر نہیں چھوڑا ہے اور داغ بھی ایسے لگاتے ہیں جو اخلاق و شریعت کی نگاہ میں بدترین جرائم شمار ہوتے ہیں مثلاً شرک جادوگری زنا، جھوٹ، دغا بازی اور ایسے ہی دوسرے شدید معاصی جن سے آلودہ ہونا پیغمبر تو درکنار ایک معمولی مومن اور شریف انسان کے لیے بھی سخت شرمناک ہے۔ یہ بات بجائے خود عجیب ہے لیکن بنی اسرائیل کی اخلاقی تاریخ پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الحقیقت اس قوم کے معاملہ میں یہ کوئی تعجب کی بات نہیں۔ یہ قوم جب اخلاقی و مذہبی انحطاط میں مبتلا ہوئی اور عوام سے گزر کر ان کے خواص تک کو حتیٰ کہ علماء و مشائخ اور دینی منصب رکھنے والوں کو بھی گمراہیوں اور بداخلاقیوں کا سیلاب بہا کر لے گیا تو ان کے مجرم ضمیر نے اپنی اس حالت کے لیے عذرات تراشنے شروع کیے اور اسی سلسلے میں انہوں نے وہ تمام جرائم جو یہ خود کرتے تھے۔ انبیاء علیہم السلام کی طرف منسوب کر ڈالے تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب نبی تک ان چیزوں سے نہ بچ سکے تو بھلا اور کون بچ سکتا ہے۔ اس معاملہ میں یہودیوں کا حال ہندوؤں سے ملتا جلتا ہے۔ ہندوؤں میں بھی جب بداخلاقی انتہا کو پہنچ گئی تو وہ لٹریچر تیار ہوا جس میں دیوتاؤں کی رشیوں، منیوں اور اوتاروں کی غرض جو بلند ترین آئیڈیل قوم کے سامنے ہو سکتے تھے ان سب کی زندگیاں بداخلاقی کے تارکول سے سیاہ کر ڈالی گئیں تاکہ یہ کہا جا سکے کہ جب ایسی عظیم الشان ہستیاں ان قبائح میں مبتلا ہو سکتی ہیں تو بھلا ہم کیا ہیں؟۔

اِنَّ الَّذِیۡنَ اتَّخَذُوا الۡعِجۡلَ سَیَنَالُہُمۡ غَضَبٌ مِّنۡ رَّبِّہِمۡ وَ ذِلَّۃٌ
فِی الۡحَیٰوۃِ الدُّنۡیَا ؕ وَ کَذٰلِکَ نَجۡزِی الۡمُفۡتَرِیۡنَ ﴿۱۵۲﴾ وَ الَّذِیۡنَ
عَمِلُوا السَّیِّاٰتِ ثُمَّ تَابُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِہَا وَ اٰمَنُوۡۤا ۫ اِنَّ رَبَّکَ مِنۡۢ بَعۡدِہَا
لَغَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ﴿۱۵۳﴾ وَ لَمَّا سَکَتَ عَنۡ مُّوۡسَی الۡغَضَبُ اَخَذَ
الۡاَلۡوَاحَ ۚۖ وَ فِیۡ نُسۡخَتِہَا ہُدًی وَّ رَحۡمَۃٌ لِّلَّذِیۡنَ ہُمۡ لِرَبِّہِمۡ یَرۡہَبُوۡنَ ﴿۱۵۴﴾

بلاشبہ جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا اُن کے حصہ میں اُن کے
پروردگار کا غضب ضرور آئے گا اور دُنیا کی زندگی میں بھی ذلّت
اور رُسوائی ہوگی، ہم افتراء پردازوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں۔[۱۹۱]
ہاں جن لوگوں نے برائیوں کے ارتکاب کے بعد توبہ کرلی اور ایمان
لے آئے تو بلاشبہ تمہارا پروردگار توبہ کے بعد بخش دینے والا رحمت
والا ہے۔[۱۹۲] اور جب موسیٰ کا غصہ فرو ہوا تو اُس نے تختیاں
اُٹھالیں اُن کی لکھائی میں اُن لوگوں کے لیے ہدایت اور رحمت

ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔[۱۹۳]

معانی مفردات

المفترین، مفتری کی جمع ہے افتراء سے اسم فاعل ہے فری سے باب افتعال ہے۔ فری کے معنے درست کرنے کے لیے چمڑے کو تراشنا ہیں، افتراء افتعال کے وزن پر ہو تو اس کے معنے چمڑے کو تراشنا خواہ درست کرنے کے لیے یا بگاڑنے کے لیے، موخر الذکر زیادہ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن کی زبان میں دین کا اپنی جانب سے دین کلام پر بگاڑ ہو افترآ کہلاتا ہے اس لیے شرک اور بدعت دونوں پر بولا جاتا ہے۔ سکت، وہ تھم گیا اس نے خاموشی اختیار کی۔ سکوت سے جس کے معنے خاموش ہوجانے کے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں سکوت ترک کلام کے ساتھ مخصوص ہے اور چونکہ سکوت بھی سکون کی ہی ایک قسم ہے اس لیے ارشادِ الٰہی سکت موسی الغضبُ میں سکوت بطورِ استعارہ سکون ہی کے معنے میں استعمال ہوا یعنی جب موسیٰ کا غصہ فرو ہوگیا۔ نسختھا، کتاب لکھی ہوئی تحریر مراد وہ مضامین جن پر تحریر دلالت کرتی ہے اصل میں نسخہ وہ کتاب ہے جس سے نقل کیا جاتے نسخ مصدر ہے اس کے معنے مٹا دینا، بدل دینا، بے کار کردینا، ایک چیز کو دوسری چیز کی جگہ قائم کرنا، لکھنا، استنساخ ایک تحریر سے دوسری تحریر نقل کرنا، تناسخ زمانہ کا قرن در قرن اور نوبت بر نوبت گزرنا۔

عملِ شرک کی سنگینی

نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل میں شرک سنگین جرم ہے۔ توحید کی طرح شرک کے بھی چار درجے ہیں۔ ایک شرک یہ ہے کہ دو خدا مانے جائیں اور دو کا وجود اصلی اور حقیقی تسلیم کیا جائے دوسرا یہ ہے کہ اس کائنات کو بنانے والے دو مانے جائیں اور دونوں مستقل ہوں۔ تیسرے یہ کہ اس کائنات کو چلانے والے دو مانے جائیں۔ چوتھے یہ کہ اللہ کے ساتھ اوروں کو اس کی عبادت میں شریک کیا جائے اللہ کے ساتھ عبادت میں جسے شریک کیا جاتا ہے اور جس کی عبادت کی جاتی

ہے۔ اس کو معبود، الٰہ اور دیوتا کہتے ہیں۔ نبوت کے مخاطب اسی شرک کی بیماری میں مبتلا تھے۔ بنی اسرائیل نے بھی بچھڑے کو عبادت کے لیے دیوتا بنایا ہے اور نبوت کی اصلی ضرب اسی پر ہے اور یہی نبی کی قوم اور نبی کی اُمت کی بیماری ہے۔ یہ تمام گناہوں میں اتنا بڑا ہے کہ اس کا ارتکاب اگر توبہ کے بغیر مرجائے آدمی کو ہمیشہ کے لیے مغفرت سے محروم کر دیتا ہے۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں ایک عنوان میں شرک کی اسی سنگینی کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے المعاصی من امر الجاهلیة لا یکفر صاحبها بارتکابها الا بالشرك یعنی گناہوں میں صرف شرک ایک ایسا گناہ ہے جس کے ارتکاب سے ایک مسلمان ایمان سے ہاتھ دھو بیٹھتا ہے گناہ تو اور بھی ہیں مگر کسی گناہ کے ارتکاب سے کوئی مسلمان کافر نہیں ہوتا جب تک اس کو حلال نہ سمجھے اگر آپ زانی ہیں تو زنا کے ارتکاب سے آپ ایمان سے محروم نہ ہوں گے لیکن اگر آپ نے زنا کو حلال ہی سمجھ لیا تو اب آپ ایمان سے محروم ہو گئے۔ اس کے برعکس شرک ایسا گناہ ہے کہ جس کے صرف ارتکاب سے مسلمان ایمان کھو بیٹھتا ہے۔ آپ ذرا اسی واقعہ میں شرک کی سنگینی کو دیکھئے کہ صرف اس خیال پر کہ حضرت ہارون کے سامنے یہ مشرکانہ عمل ہوا اور انہوں نے روکا نہیں حضرت موسیٰ نے حضرت ہارون کی ساری جلالتِ شان کے اعتراف کے باوجود حضرت ہارون کے ساتھ اس ناگوار طرزِ عمل کا مظاہرہ کیا کہ اخذ براس اخیه یجره الیه اللہ سے عابدانہ تعلقات یعنی توحید عبادت نبوت کے مشن کی جان ہے۔

۱۹۱۔ بلاشبہ جن لوگوں نے بچھڑے کو معبود بنایا ان کے حصہ میں ان کے پروردگار کا غضب ضرور آئے گا اور دُنیا کی زندگی میں بھی ذلت و رسوائی ہوگی۔ ہم افتراء پردازوں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں یہ غضب وہی ہے جس کا ذکر سورہ بقرہ میں گزر چکا۔ یعنی گوسالہ پرستوں کو وہ لوگ قتل کریں جنہوں نے یہ حرکت نہیں کی اور دوسروں کو روکنے میں حصہ بھی نہیں لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ مرتد کی سزا دُنیا میں قتل ہے لہ

دراصل بنی اسرائیل کے تین گروہ تھے ایک وہ جنہوں نے گوسالہ پرستی نہ کی اور دوسروں کو بھی روکا۔ دوسرے وہ جنہوں نے گوسالہ پرستی کی، تیسرے وہ جنہوں نے خود گوسالہ پرستی نہیں کی لیکن دوسروں کو بھی نہ روکا۔ دوسرے فریق کو حکم ہوا کہ مقتول ہو جاؤ، تیسرے فریق کو حکم ہوا کہ ان کو قتل کرو تا کہ ان کے سکوت کرنے کی توبہ ہو جائے۔ پہلا فریق اس توبہ میں شریک

لہ افادات شیخ الاسلام

ہوا کیونکہ ان کو توبہ کی ضرورت تھی۔

اس سے دو باتیں معلوم ہوتی ہیں ایک تو یہ کہ شرک کی یہ قسم قانونِ اسرائیلی میں ایک فوجداری سنگین جرم تھا۔ اسلام میں جرم کی سنگینی تو موجود ہے مگر اس سنگینی کا تعلق آخرت سے ہے۔ دنیا میں اس کو فوجداری جرم قرار نہیں دیا گیا۔ اور اگر مولانا عثمانی کا تجزیہ صحیح ہے کہ اس قتل کا سبب ارتداد ہے تو اسلام میں یہ سنگینی موجود ہے۔ اسلام میں بھی ارتداد کی سزا قتل ہے۔ دونوں میں جوہری فرق ہے ایک یہ کہ شرک کی سزا دنیا میں قتل ہے اور دوسرے یہ کہ ارتداد کی سزا قتل ہے۔ یہاں ظاہر یہی ہے کہ یہ ارتکاب شرک کی سزا ہے کیونکہ البقرۃ میں تصریح ہے کہ بنی اسرائیل کی توبہ کے قبول ہونے کی یہی شرط ہے توبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم مرتد کا حکم تو یہ ہے کہ اس کے سامنے حق کو پیش کیا جاتے اگر وہ توبہ کرے تو پھر کوئی سزا نہیں ہے اگر توبہ نہ کرے تو سزا قتل ہے۔ یہاں نوعیت بالکل الگ ہے۔ حکم یہ دیا جارہا ہے کہ ہر قبیلہ میں سے جو لوگ اس فتنۂ گوسالہ پرستی سے الگ رہے ہیں اپنے اپنے قبیلہ کے ان لوگوں کی گردنیں اپنے ہاتھوں سے ماریں جنہوں نے قوم کے لیے اس فتنۂ شرک کی راہ کھولی ہے یہ حکم دینے میں چند عظیم مصلحتیں ہیں۔

ایک یہ کہ اس طرح اس توبہ نے ایک اجتماعی توبہ کی شکل اختیار کرلی۔ گویا بنی اسرائیل کے اجتماعی ضمیر نے ان لوگوں کو اپنے اندر سے کاٹ دیا جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے عہد توحیدِ عبادت کی توہین کی ہے۔

دوسرے یہ کہ اس سے توحید کی حقیقی عظمت اور شرک کی حقیقی کراہیت پورے طور پر واضح ہوگئی گویا شرک ایسی برائی ہے کہ آدمی کا بایاں ہاتھ اس کا ارتکاب کرے تو اس کے دائیں ہاتھ کا فرض ہے اپنے بائیں ہاتھ کو کاٹ کر پھینک دے۔ اس معاملہ میں نہ کسی مداہنت اور روا داری کو دخیل ہونے دے اور نہ کسی قرابت اور رشتہ داری کا لحاظ کرے۔

تیسری یہ کہ ہر قبیلہ کے اخیار اگر اپنے اپنے قبیلہ کے اشرار پر تلوار اٹھائیں گے تو اس سے خاندانی عصبیت نہیں ابھرے گی بلکہ کسی نئے فتنہ کے اندیشہ سے بنی اسرائیل کی تطہیر ہو جائے گی۔

تورات کے مطالعہ سے بھی قریب قریب یہی بات نکلتی ہے۔ چنانچہ تورات کی کتاب خروج میں ہے،

جب موسیٰ نے دیکھا کہ لوگ بے قابو ہوگئے۔ کیونکہ ہارونؑ[1] نے ان کو بے لگام چھوڑ کر ان کو ان کے دشمنوں کے درمیان ذلیل کر دیا تو موسیٰ نے لشکر گاہ کے دروازے پر کھڑے ہو کر کہا کہ جو خداوند کی طرف سے ہے وہ میرے پاس آجائے۔ تب سب بنی لاوی اس کے پاس جمع ہوگئے اور اس نے ان سے کہا کہ خداوند اسرائیل کا خدا یوں فرماتا ہے کہ تم اپنی اپنی ران سے تلوار لگا کر پھاٹک پھاٹک گھوم کر سارے لشکر گاہ میں اپنے اپنے بھائیوں اور اپنے اپنے ساتھیوں اور اپنے اپنے پڑوسیوں کو قتل کرتے پھرو اور بنی لاوی نے موسیٰ کے کہنے کے موافق عمل کیا۔ چنانچہ اس دن لوگوں میں سے تین ہزار مرد کھیت آئے اور موسیٰ نے کہا کہ آج خداوند کے لیے اپنے آپ کو مخصوص کرو بلکہ ہر شخص اپنے ہی بیٹے اور اپنے ہی بھائی کے خلاف ہو تاکہ وہ تم کو آج ہی برکت دے۔ (باب ۳۲ آیات ۲۵ تا ۳۰)

یہ تو سینا لہم غضب من ربھم کی عملی تفسیر ہوئی باقی ذلۃ فی الحیاۃ الدنیا کی عملی تفسیر شارحین قرآن نے یہ بتائی ہے کہ ان کے معبود اُن کی آنکھوں کے سامنے نذر آتش کیا گیا۔ اس کے بعد فرمایا کہ یہ ان ہی کی خصوصیت نہیں ہے بلکہ ہر مفتری کی سزا یہی ہے۔ اللہ کے ساتھ جو بھی کسی کو خدا کی عبادت میں شریک کرتا ہے وہ اس حیثیت سے یقیناً مفتری ہے کہ بغیر کسی خدائی حکم کے بطور خود یہ کام کر رہا ہے۔ یہی قول علی اللہ بغیر علم ہے۔ اور اسی معنیٰ کے لحاظ سے علماء نے مبتدع کو بھی مفتری قرار دیا ہے۔ چنانچہ حضرت امام مالک فرماتے ہیں کہ ہر مبتدع اپنی جگہ ذلت محسوس کرتا ہے اور آپ نے یہ تلاوت فرمائی۔ یہی بات امام سفیان بن عیینہ نے بھی فرمائی ہے کہ روئے زمین میں ہر مبتدع رُسوا و ذلیل ہوتا ہے فرمایا کہ یہ کتاب الٰہی کا فیصلہ ہے۔ لوگوں نے دریافت کیا کہ قرآن میں کہا ہے فرمایا ان الذین اتخذوا العجل سینالہم الخ لوگوں نے کہا کہ یہ تو گوسالہ پرستوں کے بارے میں ہے فرمایا آگے پڑھو وکذالک نجزی المفترین یہ قیامت تک کے لیے ہر مبتدع کے بارے میں ہے۔ مبتدع بھی اس حیثیت سے مفتری ہوتا ہے کہ دین میں ایک بات دین کے نام سے پیش کرتا ہے

---

[1] حضرت ہارون کی نسبت اس قسم کی جو باتیں مرتبین تورات نے اضافہ کی ہیں۔ ان کی تردید ہم اس سے پہلے کر چکے ہیں اور بتا چکے ہیں کہ یہودی اخلاق کا انتہائی انحطاط کا نمونہ ہے۔

حالانکہ نبوت کی جانب سے اس کی کوئی علمی اور عملی رہنمائی نہیں ہوتی ہے ۔

گناہوں سے توبہ کا قانون

۱۹۲ - ہاں جن لوگوں نے برائیوں کے ارتکاب کے بعد توبہ کر لی اور ایمان لے آتے تو بلاشبہ تمہارا پروردگار توبہ کے بعد بخشش دینے والا اور رحمت والا ہے ۔ یعنی برا کام حتیٰ کہ شرک وکفر کر کے پھر توبہ کر لے اور ایمان لے آئے تو غفور رحیم کے یہاں رحمت اور معافی کی کچھ کمی نہیں ۔ یہ معافی وغیرہ آخرت سے متعلق ہے ۔ گویا اشارہ فرما دیا کہ گوسالہ پرستوں کو جو سزا تے قتل دی گئی وہ ان کے حق میں توبہ سمجھ لی گئی فتوبوا الی بارئکم فاقتلوا انفسکم اب ان پر اخروی مواخذہ باقی نہیں رہا ۔ دنیوی سزا کے بعد اخروی حالت کا بیان اس جگہ ایسا ہی ہے جیسے دوسری جگہ السارق والسارقۃ فاقطعوا ایدیھما کے بعد فمن تاب من ظلمہ واصلح الخ فرما دیا گیا [1]

عام شارحین قرآن نے اس آیت کی پہلی آیت سے پیوند کاری کی ہے اور مطلب یہی بنایا ہے کہ جن لوگوں نے بچھڑے کی پرستش کا ارتکاب کر کے شرک کا سنگین جرم کیا ہے انہوں نے اس کے بعد اگر توبہ کر لی اور ایمان لے آئے تو اللہ بخشنہار ہے لیکن اس پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جن لوگوں نے یہ جرم کیا ہے ان کو تو قتل کی سزا مل چکی ہے ۔ ان کی توبہ کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ۔

حضرت مولانا عثمانی اس کا جواب یہ دے رہے ہیں کہ گوسالہ پرستوں کو جو سزا تے قتل دی گئی وہ ان کے حق میں بشرط قبول توبہ سمجھی گئی اب ان پر آخرت میں کوئی مواخذہ نہیں ہے لیکن ہمیں حافظ ابن کثیر کی رائے سے اتفاق ہے کہ اس میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم مخاطب ہیں ۔ پہلی آیت کے آخر میں چونکہ قیامت تک کے لیے یہ ضابطہ بنایا گیا تھا وکذالک نجزی المفترین اس لیے اس آیت میں اسی قانون عام کی وضاحت کی گئی ہے کہ ضابطہ تو یہی ہے کہ افترا کرنے والوں کو ہم سزا دیں گے لیکن اس کے ساتھ یہ بھی قانون ہے کہ جو لوگ سیئات کا ارتکاب کریں خواہ ان کی نوعیت کچھ بھی ہو اور پھر اس کے بعد توبہ کر لیں

[1] افادات شیخ الاسلام

اور اپنی زندگی میں ایمان کے تقاضے پورے کریں تو اللہ کی مغفرت و رحمت ان کا استقبال کرنے کو تیار ہے
دراصل انسان کے تمام کاروبار میں اصل چیز اس کا دل ہے۔ انسان اسی سے پاک ہوتا ہے۔ اور
اسی سے ناپاک۔ انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت خدا کی طرف رجوع کرے اور اپنی
تقصیروں اور فروگزاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اپنی پچھلی زندگی سے بیزار
ہو کر آئندہ کے لیے نیکوکاری کا خدا سے مستحکم عہد کرے اسی کا نام توبہ ہے۔ یہ تو گنہگار سے
گنہگار تر انسان کو بھی خدا کی آغوشِ محبت میں لاکر ڈال دیتے ہیں۔

یہاں افتراء علی اللہ کرنے والوں کے لیے قانونِ عام کا ذکر کرنے کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم
کو نبی الرحمۃ اور نبی التوبہ ہونے کی حیثیت میں یہ دوسرا قانون بتایا جارہا ہے کہ کرنے والا خواہ کتنی سنگین
برائی کا ارتکاب کرے لیکن اس کے بعد اگر توبہ کرے اور توبہ کے ساتھ آئندہ زندگی ایمان کے
تقاضوں کے تحت گزارے تو اللہ سبحانہٗ اس کے گناہ کو معاف کر دے گا۔ اس طرح یہ گویا درمیان
میں عفوِ عام کے قانون کو بیان کرنے کے بعد جملہ معترضہ لایا گیا ہے۔ جن لوگوں نے اس کو پہلے
جملہ کے ساتھ مربوط کیا ہے ان کو بڑی مشکلات سے دوچار ہونا پڑا ہے۔

تورات ہدایت و رحمت ہے

۱۹۳۔ اور جب موسیٰ کا غصہ فرو ہوا تو اس نے تختیاں اٹھا لیں ان کی لکھائی میں ان لوگوں کے لیے
ہدایت و رحمت ہے جو اللہ سے ڈرتے ہیں۔ یعنی جب موسیٰ خاموش ہوئے اور ان کا غصہ دور ہوا تو
انہوں نے وہ تختیاں جو ایک طرف رکھ دی تھیں پھر اٹھا لیں۔ یہاں اخذ الالواح کی تعبیر ہے۔
اس افسانہ کی تردید ہو رہی ہے جو مرتبینِ تورات نے لکھا ہے کہ:

تب موسیٰ کا غضب بھڑکا اور اس نے ان لوحوں کو اپنے ہاتھوں سے پٹک
دیا اور ان کو پہاڑ کے نیچے توڑ ڈالا۔ (خروج باب ۳۱، آیت ۱۹)

اور ان شارحینِ قرآن کی بھی یہ الفاظ بھرپور تردید کر رہے ہیں جو کہتے ہیں۔ سات تختیاں
تھیں جب آپ نے انہیں غصہ سے رکھا تو وہ ٹوٹ گئیں۔ چھ تختیاں جن میں احکام کی تفصیل تھی
اٹھا لی گئیں اور ایک تختی جس میں موعظت و ہدایت تھی باقی رہ گئی۔

قرآن عزیز کی یہ تصریح دونوں کے علی الرغم کہہ رہی ہے کہ حضرت موسیٰ نے جو چیز پھینکی
تھی جیسے وہ پھینکنے کے وقت الواح تھیں ایسے ہی اٹھانے کے وقت بھی وہ الواح ہی تھیں۔

ان میں کوئی بھی نہ ٹوٹی تھی اور نہ ان میں سے کوئی آسمان پر اٹھائی گئی تھی۔ اصل تورات چونکہ ان الواح ہی کی نقل تھی اس لیے تورات کو ان کے نسخہ سے تعبیر فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا کہ اس میں ہدایت اور رحمت ہے۔ یہ بعینہٖ وہ بات ہے جو قرآن کے بارے میں فرمائی گئی ہے یعنی دنیا کی زندگی میں یہ ہدایت ہے اور آخرت میں یہ رحمت ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ آغاز میں ہدایت اور انجام میں رحمت ہے۔

وَاخْتَارَ مُوْسٰى قَوْمَهٗ سَبْعِيْنَ رَجُلًا لِّمِيْقَاتِنَا ۚ فَلَمَّآ اَخَذَتْهُمُ
الرَّجْفَةُ قَالَ رَبِّ لَوْ شِئْتَ اَهْلَكْتَهُمْ مِّنْ قَبْلُ وَاِيَّايَ ۭ اَتُهْلِكُنَا
بِمَا فَعَلَ السُّفَهَاۗءُ مِنَّا ۚ اِنْ هِيَ اِلَّا فِتْنَتُكَ ۭ تُضِلُّ بِهَا مَنْ
تَشَاۗءُ وَتَهْدِيْ مَنْ تَشَاۗءُ ۭ اَنْتَ وَلِيُّنَا فَاغْفِرْ لَنَا وَارْحَمْنَا وَاَنْتَ
خَيْرُ الْغٰفِرِيْنَ ۝ وَاكْتُبْ لَنَا فِيْ هٰذِهِ الدُّنْيَا حَسَنَةً وَّفِي
الْاٰخِرَةِ اِنَّا هُدْنَآ اِلَيْكَ ۭ قَالَ عَذَابِيْٓ اُصِيْبُ بِهٖ مَنْ اَشَاۗءُ ۚ وَ
رَحْمَتِيْ وَسِعَتْ كُلَّ شَيْءٍ ۭ فَسَاَكْتُبُهَا لِلَّذِيْنَ يَتَّقُوْنَ وَيُؤْتُوْنَ
الزَّكٰوةَ وَالَّذِيْنَ هُمْ بِاٰيٰتِنَا يُؤْمِنُوْنَ ۝

اور موسیٰ نے ہمارے ٹھہرائے ہوئے وقت پر حاضری کے لیے اپنی قوم میں سے ستر آدمی چنے۔[194] پھر جب لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آلیا،[195] تو موسیٰ نے عرض کیا پروردگار اگر تو چاہتا تو ان سب کو پہلے ہی ہلاک کر ڈالتا اور خود میری زندگی بھی ختم کر دیتا

پھر کیا ایک ایسی بات کے لیے جو ہم میں چند بے وقوف کر بیٹھے ہیں تو ہم سب کو ہلاک کر ڈالے گا یہ اس کے سوا کیا ہے کہ تیری طرف سے ایک آزمائش ہے تو جسے چاہے اس میں بھٹکا دے جسے چاہے راہ دکھا دے خدایا تو ہی ہمارا کارساز ہے ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر تجھ سے بہتر بخشنے والا کوئی نہیں[196]۔ اور خدایا اس دُنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لیے اچھائی لکھ دے اور آخرت کی زندگی میں ہمارے لیے اچھائی کر ہم تیری طرف لوٹ آتے[197]۔ خدا نے فرمایا میرے عذاب کا حال یہ ہے کہ جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں اور رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوتی ہے پس میں ان لوگوں کے لیے ضرور رحمت لکھوں گا جو بُرائیوں سے بچیں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور ان کے لیے جو میری نشانیوں پر ایمان لائیں گے[198]۔

معانی مفردات

اختار، منتخب کیا اختیار کیا ماضی ہے اور اختیار خیر سے افتعال ہے۔ اصل میں اختار موسیٰ من قومہ سبعین رجلاً تھا۔ حرف من کو یہاں یہ بتانے کیلئے حذف کیا کہ ساری قوم میں خیار ہی تھے یہ بات نہیں کہ اچھے اور بہتر اور بھی تھے اور یہ ستر اچھوں میں سے منتخب ہوتے تھے۔ رجفۃ کپکپی، زلزلہ رجف یرجف سے اسم ہے یوم ترجف الراجفہ۔ فتنتک، فعلۃ کے وزن پر ہے۔ فتن یفتن سے ہے اس کے اصلی معنے ہونے کو کٹھالی میں ڈال کر تپا کر کھوٹ نکالنے کے ہیں۔ اسی سے اس کے معنے آزمائش اور امتحان کے ہوگئے ہیں۔ عذاب، عذاب، سخت، سزا، دکھ کی مار۔ علامہ فیومی المصباح المنیر میں لکھتے ہیں کہ "عذاب تعذب سے ہے اسم ہے۔ اصل میں عربی زبان میں اس کے معنے مارنے کے ہیں۔ بعد میں ہر دردناک سزا کے لیے استعمال کیا جانے لگا اور استعارہ کے طور پر امور شاقہ کو بھی عذاب کہنے لگے چنانچہ محاورہ ہے السفر قطعۃ من العذاب" اور امام راغب رقمطراز ہیں۔ عذاب کے معنے سخت دکھ کے ہیں اور اس میں اختلاف ہے کہ اس کی اصل کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ عذب الرجل فہو عاذب و عذوب سے بنا ہے جس کا استعمال کھانا اور سونا چھوڑ دینے کے لیے ہوتا ہے لہٰذا تعذب کے معنے اصل میں یہ ہوتے کہ انسان کو بھوکا رہنے اور جاگنے پر مجبور کیا جاتے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی اصل عذب شیرینی اور گوارائی ہے لہٰذا عذبتہ کے معنے میں میں نے اس کی زندگی کی شیرینی اور گوارائی کو زائل کر دیا۔ اس میں سلب ماخذ ہے اور بعض کہتے ہیں کہ تعذب کے اصل معنے کثرت سے عذبۃ لسوط یعنی کوڑے کے پھندے سے مارنے کے ہیں اور کچھ اہل لغت کا بیان ہے کہ تعذب کے معنے خود مارنے کے ہیں اور کچھ کہتے ہیں کہ ماء عذب سے بنا ہے ماء عذب اس پانی کو کہتے ہیں کہ جس میں کوڑا کرکٹ ہو۔ اس صورت میں عذبتہ کے معنے ہوں گے میں نے اس کی زندگی مکدر کر دی۔ اور علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں فرماتے ہیں۔ ہمارے شیخ ابو الطیب فاسی اہل اشتقاق سے ناقل ہیں کہ عذاب کلام عرب میں عذاب سے ماخوذ ہے جس کے معنے روکنے کے ہیں عذبتہ عنہ کے معنے ہیں میں نے اس کو اس سے روک دیا اور عذب عذوباً کے معنے ہیں وہ رک گیا اور آب شیریں کو عذب اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ پیاس کو روک دیتا ہے اور عذاب کو بھی عذاب اس لیے کہا جاتا ہے کہ سزا یافتہ کو دوبارہ اس قسم کے جرم کا ارتکاب کرنے سے روک دیتا ہے اور نہ صرف یہ بلکہ اوروں

کو بھی اس کے کرنے سے باز رکھتا ہے۔ علامہ زبیدی نے یہ نقل کر کے لکھا ہے وھو کلام حسن یہ عمدہ بات ہے۔

توبہ کے لیے کوہ طور پر حاضری

جب بنی اسرائیل کا گوسالہ پرستی کا جرم معاف ہو گیا اب حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان سے کہا کہ میرے پاس جو یہ تورات کی تختیاں ہیں ۔ ایک کتاب ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہاری ہدایت اور دینی دنیوی زندگی کی فلاح کے لیے مجھ کو عطا فرمائی ہے۔ تمہارا فرض ہے کہ اس پر ایمان لاؤ اور اس کے احکام پر عمل کرو۔ بنی اسرائیل شک کے ایسے مریض تھے کہ انہیں کسی طرح یہ یقین ہی نہیں آتا تھا کہ فی الواقع اللہ تعالیٰ موسیٰ علیہ السلام سے کلام بھی کرتا ہے۔ اس وجہ سے جب موسیٰ علیہ السلام ان سے کہتے کہ خداوند تمہیں یہ حکم دیتا ہے تو وہ کہتے کہ خدا جب آپ سے کلام کرتا ہے تو وہ ہم سے بھی کلام کرے اور ہم اس کو آنکھوں سے دیکھیں۔ اس کے بغیر ہم تمہاری بات کو درست کیسے تسلیم کریں۔

جہاں تک اللہ تعالیٰ کو دیکھنے کی خواہش کا تعلق ہے۔ یہ خواہش کوئی قابل ملامت خواہش نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے بھی یہ خواہش کی تھی لیکن بڑا فرق ہے اس بات میں کہ یہ خواہش شرح صدر اور اطمینان قلب حاصل کرنے کے لیے ہو۔ اور اس بات میں کہ اس کو انکار اور تکذیب کا بہانہ بنایا جائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی یہ خواہش اسی طرح کی تھی جس طرح حضرت ابراہیم نے یہ دیکھنا چاہا تھا کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو کس طرح زندہ کرتا ہے تاکہ آخرت کے باب میں انہیں پورا پورا شرح صدر حاصل ہو جائے۔ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ کو ملامت نہیں فرمائی بلکہ صرف یہ فرمایا کہ تم ان ناسوتی آنکھوں سے میری ذات کو نہیں دیکھ سکتے صرف میری صفات کو ہی دیکھ سکتے ہو۔ اس کے برعکس بنی اسرائیل کا مطالبہ محض ان کی بے یقینی اور شک پرستانہ ذہنیت کا ایک مظاہرہ تھا اور یہ مظاہرہ وہ اللہ تعالیٰ کی کھلی کھلی نشانیاں دیکھنے کے باوجود قدم قدم پر کرتے رہتے تھے۔ راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ میقات اس میقات کے علاوہ ہے جو یہ حضرت موسیٰ کے دوبارہ کوہ طور پر جانے کا ذکر ہے جب وہ گوسالہ پرستی کے بعد کوہ طور پر گئے ہیں۔ تورات کے راویوں نے اس واقعہ کو پہلے واقعہ میں خلط ملط کر دیا ہے اس وجہ سے معاملہ کچھ الجھ سا گیا ہے۔

قرآن نے ان دونوں واقعات کو الگ الگ بیان کر دیا ہے کیونکہ یہ واقعہ بجائے خود بنی اسرائیل کی تاریخ میں بڑی اہمیت رکھنے والا ہے اس کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص وقت مقرر فرمایا۔

۱۹۴- اور موسیٰ نے ہمارے ٹھہراتے ہوتے وقت پر حاضری کے لیے اپنی قوم میں ستر آدمی چنے۔ راجح یہی معلوم ہوتا ہے کہ یہ میقات اس میقات کے علاوہ ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو تورات عطا فرمانے کے لیے مقرر کیا تھا۔ نیز آیات حاضرہ کی ترتیب سے بظاہر معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ گوسالہ پرستی اور سزا یابی کے بعد پیش آیا لیکن سورہ نساء کی آیت فقالوا ارنا اللہ جهرۃ فاخذتهم الصاعقة ثم اتخذوا العجل زیادہ صفائی سے بتلاتی ہے کہ گوسالہ پرستی اس واقعہ کے بعد ہوئی واللہ اعلم بالصواب[1]

یہ مولانا عثمانی کی رائے ہے بیشتر شارحین قرآن یہی کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کی جانب سے خدا کو دیکھنے کا مطالبہ گوسالہ پرستی کے حادثہ کے بعد ہوا ہے۔ سورہ نساء میں واقعات کی ترتیب نہیں صرف تعدید ہے اور سورہ بقرہ میں ترتیب اور تعدید دونوں ہیں۔ سورہ نساء کی آیت ثم اتخذوا العجل میں ثم ترتیب زمانی کے لیے نہیں بلکہ مرتبہ و مقام کو ظاہر کرنے کے لیے ہے یعنی ادنیٰ سے اعلیٰ کو بتانا مقصود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بے محابا اللہ کے دیکھنے کی درخواست اگرچہ جرم عظیم ہے مگر اس سے بڑھ کر جرم یہ ہے کہ انھوں نے گوسالہ پرستی کی۔ یہ اس درجہ شنیع ہے کہ جس کی کوئی حد نہیں ہے کیونکہ اپنے ہاتھوں سے بنا کر معبود بنا لینا عقل کا انتہائی بودا پن اور بیوقوفی ہے۔

دراصل گوسالہ پرستی کے حادثہ سے توبہ کرانے کے لیے حضرت موسیٰ نے ستر آدمی منتخب فرمائے تاکہ جس نوعیت کا اجتماعی جرم ہوا اسی نوعیت کی اجتماعی توبہ بھی ہو۔ نیز جو کچھ پیش آئے وہ قوم کے تمام ممتاز آدمیوں کے سامنے پیش آئے کہ وہ قوم کے سامنے اس کی گواہی دیں اس حیثیت سے یہ میقات توبہ و معذرت ہے جب یہ لوگ کوہ طور پر پہنچے تو ایک ابر نمودار ہوا جس نے سارے پہاڑ کو ڈھانک دیا۔ سب سے پہلے اس ابر میں موسیٰ علیہ السلام داخل ہوئے اور قوم سے کہا کہ قریب آجاؤ۔ اس وقت اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام سے کلام کیا۔ جب موسیٰ علیہ السلام نے اللہ کے کلام اور پیغام سے ان کو خبردار کیا تو کہنے لگے اے موسیٰ ہم کو تو یقین نہیں آتا کہ واقع میں اللہ سبحانہٗ تم سے باتیں کر رہا ہے۔ ہم اس وقت تک تیرا یقین نہ کریں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

گے جب تک اللہ کو کھلم کھلا نہ دیکھ لیں کہ اللہ ہی تم سے باتیں کر رہا ہے۔ اس کہنے پر ان پر ایک بجلی گری جس سے سب مر گئے۔ موسیٰ علیہ السلام نے جب یہ دیکھا کہ یہ عذابِ الٰہی میں پکڑے گئے تو نہایت عاجزی سے ان کی رہائی کی دعا کی اس پر اللہ تعالیٰ نے ان کو دوبارہ زندگی دی۔ خلاصہ کلام یہ کہ یہ میقات اس میقات کے علاوہ ہے جو من جانب اللہ عطاء تورات کے لیے مقرر ہوئی تھی۔ اور یہاں آیات قرآنی ترتیب سے بھی پتہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ گوسالہ پرستی کے بعد پیش آیا۔ اور یہ میقات گوسالہ پرستی سے معذرت کے لیے مقرر ہوا اس لیے اللہ تعالیٰ نے اولاً میقات کلام کا ذکر فرمایا بعدازیں واقعہ اتخاذ عجل کا تذکرہ۔ اس کے بعد یہ واقعہ میقات پیش کیا۔ اسی ترتیب کے ساتھ یہ واقعہ قرآن کی دوسری سورتوں میں بھی موجود ہے چونکہ یہ میقات عبادت عجل سے معذرت کے لیے مقرر ہوا اس لیے مناسب یہی ہے کہ اس میقات کو میقات التوبہ والمعذرت کہا جاتے اور پہلی میقات کو میقاتِ کلام و مناجات کہا جاتے۔ اس طرح دونوں میں فرق واضح ہو کر سامنے آجاتا ہے۔

رجفہ اور صاعقہ کی تعبیر

۱۹۵۔ پھر جب لرزا دینے والی ہولناکی نے انہیں آلیا۔ بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ علیہ السلام سے کہا تھا کہ تمہاری باتیں اس وقت تسلیم کر سکتے ہیں جب خدا تعالیٰ سے خود سن لیں۔ حضرت موسیٰ ان میں ستر آدمیوں کو جو سردار تھے منتخب کرکے طور پر لے گئے۔ آخر انہوں نے حق تعالیٰ کا کلام سن لیا کہنے لگے کہ جب تک خدا کو ہم اپنی آنکھوں سے بے حجاب نہ دیکھ لیں ہم کو یقین نہیں ہو سکتا۔ اس گستاخی پر سخت بھونچال آیا، اوپر سے بجلی کڑکی آخر کانپ کر مر گئے یا مردوں کی سی حالت کو پہنچ گئے[1] یہاں قرآن نے جسے رجفہ کہا ہے اسی کو دوسرے مواقع پر قرآن نے صاعقہ کہا ہے۔ رجفہ کے معنے کپکپی، زلزلہ کے ہیں اور صاعقہ بجلی کی کڑک کو کہتے ہیں زلزلہ بھی آیا اور بجلی بھی کڑکی۔ اس صاعقہ اور رجفہ سے ان ستر آدمیوں پر جو اس موقع پر حضرت موسیٰ کے ساتھ طور پر گئے تھے جو حالت طاری ہوئی قرآن نے البقرہ میں اسے موت سے تعبیر کیا ہے۔ اس موت سے موت بھی مراد ہو سکتی ہے اور بطورِ استعارہ بے ہوشی بھی

[1] افادات شیخ الاسلام

عربی زبان میں موت کا لفظ استعارہ کے طور پر نیند اور بے ہوشی کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔ سو کر اٹھنے کے بعد جو دُعا احادیث میں آئی ہے اس کے الفاظ یہ ہیں :

الحمد للہ الذی احیانا بعد ما اماتنا والیہ النشور

اگرچہ بنی اسرائیل اپنی سرکشی کی وجہ سے اسی کے لائق ہے کہ ان کو دوبارہ اٹھنا نصیب نہ ہوتا لیکن اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص فضل سے ان کو مزید مہلت بخشی اور حضرت موسیٰ نے بھی ان کے لیے بڑی دلسوزی سے دُعا کی جو اللہ تعالیٰ نے قبول فرمائی۔

حضرت موسیٰ کی دُعا

۱۹۶- تو موسیٰ نے عرض کیا پروردگار اگر تو چاہتا تو ان سب کو پہلے ہی ہلاک کر دیتا اور خود میری زندگی بھی ختم کر دیتا۔ پھر کیا ایک ایسی بات کے لیے جو ہم میں چند بے وقوف کر بیٹھے ہیں تو ہم سب کو ہلاک کر ڈالے گا یہ اس کے سوا کیا ہے کہ تیری طرف سے ایک آزمائش ہے تو جسے چاہے اس میں بھٹکا دے جسے چاہے راہ دکھا دے خدایا تو ہی ہمارا کارساز ہے تو ہمیں بخش دے اور ہم پر رحم کر تجھ سے بہتر بخشنے والا کوئی نہیں۔ حضرت موسیٰ نے اپنے رب کو ان سے نہایت مؤثر انداز میں دُعا کی جس کا حاصل یہ تھا کہ خداوندا اگر تو ہلاک ہی کرنا چاہتا تو ان سب کو بلکہ ان کے ساتھ مجھ کو بھی کہ میں ہی ان کو لے کر آیا ہوں یہاں بلانے اور کلام سنانے سے پہلے ہی ہلاک کر دیتا۔ کس کی مجال تھی کہ آپ کی مشیت کو روک سکتا۔ جب آپ نے ایسا نہیں چاہا بلکہ مجھے لانے کی اور ان کو کلام سننے کے لیے یہاں آنے کی اجازت دی تو یہ کیسے گمان کیا جا سکتا ہے کہ آپ نے یہاں بلا کر محض بعض بے وقوفوں کی حماقت کی سزا میں ہم سب کو ہلاک کر دینا چاہیں۔ یقیناً یہ رجفہ اور صاعقہ کا منظر سب آپ کی طرف سے ہماری آزمائش و امتحان ہے۔ اس قسم کے خطرناک اور زلزلہ انداز مواقع میں آپ ہی ہمارے تھامنے والے اور دستگیری کرنے والے ہیں۔ اور صرف آپ کی ذات منبع الخیرات سے یہ اُمید ہو سکتی ہے کہ ہم سب کی گزشتہ تقصیرات اور بے اعتدالیوں سے درگزر فرمائیں۔ اور آئندہ اپنی رحمت سے ایسی خطاؤں اور غلطیوں کا شکار نہ ہونے دیں۔ حضرت موسیٰ کی دُعا پر وہ لوگ بخشے گئے اور خدا نے ان کو از سرِ نو زندگی مرحمت فرمائی کما قال ثم بعثناکم من بعد موتکم [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ حضرت موسیٰ کی گریہ وزاری اور ان کی دعا و فریاد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ جلال تیرے غضب کا مظہر ہے اور تو نے ان کو اور مجھے ہلاک کرنے کا فیصلہ فرمالیا ہے تو یہ کام اگر تو چاہتا تو اس سے پہلے ہی کر لیتا لیکن اب جبکہ تو نے ہمیں باریابی کا موقع عنایت فرمایا اور ہم یہاں حاضر ہو بھی گئے تو یہ تیری رحمت سے بعید ہے کہ تو ہمیں ہلاک کر دے۔ حافظ ابن القیم نے اغاثۃ اللہفان میں لکھا ہے کہ یہ حضرت موسیٰ کی جانب سے اللہ کی جناب میں درخواست ہے اور ماضی کے عفو عام کو وسیلہ بنا کر اللہ سے دعا فرماتے ہیں کہ ان کا ماضی ایسے سنگین گناہوں کا پشتارہ رکھتا ہے جو ان کی ہلاکت کا مقتضی ہے۔ اس کے باوجود آپ کے عفو و مغفرت نے اب تک ان کو اپنی آغوش میں رکھا ہے اور اپنے گناہوں کی سنگینی کے باوجود ان کو ہلاک نہیں فرمایا۔ آج بھی آپ سے اسی عفو و مغفرت کی امید ہے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے کوئی آقا اپنے نوکر پر کسی جرم کی بنا پر مواخذہ کرے اور نوکر آقا سے کہے قبلہ مجھ سے اس سے پہلے سنگین جرائم ہو چکے ہیں اگر آپ چاہتے تو پہلے بھی مواخذہ فرما لیتے لیکن جیسے پہلے آپ معاف کر چکے ہیں آج بھی معاف فرما دیجئے۔ اس کے بعد فرمایا اتھلکنا بما فعل السفھاء منا، سفہاء سے کون مراد ہیں۔ حضرت موسیٰ سے خدا کی دید کا مطالبہ کرنے والے یا گوسالہ پرستی کرنے والے۔ اگر آخر الذکر مراد ہیں تو اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کے عقلاء نے گوسالہ پرستی نہیں کی بلکہ ان کے بیوقوف طبقہ نے کی اور ان کی اکثریت تھی۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کو دیکھنے کا مطالبہ یا گوسالہ پرستی کا جرم بیوقوفوں نے کیا ہے۔ کہیں یہ تصور ہو سکتا کہ اس کی پاداش میں ہم سب کو ہلاک کر دیا جائے۔ یہ آپ کی رحمت سے بعید ہے کہ نادانوں کے جرم کی پاداش میں سب کو ہلاک کر دیں۔ یہ استفہام استعظام ہے۔ مفہوم یہ ہے کہ آپ اب ایسا تو ہرگز نہ کریں گے۔ مبرد اور ابن الانباری نے یہاں بھی نکتہ آفرینی فرمائی ہے۔ اس کے بعد فرمایا ان ھی الا فتنتک مطلب یہ ہے کہ ہر آزمائش کا موقع انسانوں کے درمیان فیصلہ کن ہوتا ہے۔ وہ چھاج کی طرح ایک مخلوط گروہ میں سے کارآمد آدمیوں اور ناکارہ آدمیوں کو پٹک کر الگ کر دیتا ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی عین حکمت کا تقاضا ہے کہ ایسے مواقع وقتاً فوقتاً آتے ہیں۔ ان مواقع پر جو کامیابی کی راہ پاتا ہے وہ اللہ کی توفیق اور رہنمائی سے پاتا ہے اور جو ناکام ہوتا ہے وہ اس کی توفیق و رہنمائی سے محروم ہونے کے باعث ہی ناکام ہوتا ہے۔ اگرچہ اللہ کی جانب سے توفیق و رہنمائی ملنے اور نہ ملنے کے لیے بھی ایک ضابطہ ہے جو سراسر حکمت اور عدل پر مبنی ہے۔ لیکن بہر حال یہ حقیقت اپنی جگہ ثابت ہے کہ آدمی کا آزمائش کے مواقع پر کامیابی کی راہ پانا نہ پانا اللہ کی توفیق و ہدایت پر منحصر ہے۔

اس فقرے کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو تیری ایک آزمائش تھی اور تیری آزمائش سے عہدہ برآ تو وہ ہوتا ہے جس کو تیری توفیق معین و مددگار ہو۔ جن کو توفیق عطا کرتا ہے امتحان میں کامیابی ان کا ہی حصہ ہے اور جن کو تو توفیق سے محروم کر دیتا ہے ناکامی ان کا ہی مقدر ہے۔ گویا حضرت موسیٰ نے نہایت ادب کے ساتھ اور نہایت لطیف انداز میں معاملے کی نزاکت کی طرف اشارہ کر دیا کہ تیرے امتحان میں پورا اترنا کوئی آسان کام نہیں ہے۔ یہ تیرے ہی فضل پر موقوف ہے۔

حضرت موسیٰ کی دُعا کا تتمہ

۱۹۷- اور خدایا اس دنیا کی زندگی میں بھی ہمارے لیے اچھائی لکھ دے اور آخرت کی زندگی میں ہمارے لیے اچھائی کر، ہم تیری طرف لوٹ آتے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں شاید حضرت موسیٰ نے اپنی اُمت کے حق میں دُنیا و آخرت کی جو بھلائی مانگی مراد یہ تھی کہ سب اُمتوں پر مقدم اور فائق رہیں دُنیا و آخرت میں۔[1]

یہ موسیٰ علیہ السلام کی دُعا کا تتمہ ہے اصل دُعا دفع مضرت اور دفع معیبت کے لیے تھی اور یہ تتمہ تحصیل منفعت کے لیے ہے جس میں دُنیا و آخرت کی بھلائی کا ذکر ہے اکتب لنا کے معنے یہ نہیں کہ قید کتابت میں سے آیا ہمارے لیے تحریر کر دے بلکہ یہ ہیں کہ ہمارے حق میں لازم و مقرر کر دے۔ محاورہ عرب میں کتابت کے یہ معنے عام ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ کتابت بول کر اثبات، تقدیر، ایجاب اور فرض مراد لیا جاتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اس دُنیا میں بھی ہمارے لیے بھلائی لازم کر دے اور آخرت میں بھی۔ آخرت کے ساتھ لفظ حسنہ حذف کر دیا کیونکہ پہلا حسنہ خود دلیل ہے آخر میں فرمایا انا ھدنا الیک ہم تیری طرف لوٹ آتے اور ہم نے توبہ کر لی ہے ھاد یھود ھودا کے معنے رجوع کرنے اور توبہ کرنے کے ہیں۔ پھر ھاد اور تھود یہودی ہونے کے معنے میں استعمال ہوتے اور یہ استعمال عربی زبان کے عام قاعدے کے مطابق ہے جس طرح تنصر نصرانی ہونے کے معنے میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارے بیوقوفوں نے جو بچھڑے کی عبادت کی اور ہمارے اچھے لوگوں کی جانب سے ان کے اس کردار پر گرفت نہ کرنے کی یا دیدار الٰہی کا مطالبہ کرنے کی جو کوتاہی ہوئی ہے اس سے ہم باز آ گئے اور آپ کی جانب طلب مغفرت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے لیے لوٹ آتے ہیں لہٰذا آپ ہمیں معاف فرما دیجئے اور ہمارے لیے دُنیا و آخرت کی سعادتوں کے دروازے کھول دیجئے۔ حضرت موسیٰ کی اس دُعا کا اللہ سبحانہ نے کیا جواب دیا؟

حضرت موسیٰ کی دُعا کا جواب

۱۹۸- خدا نے فرمایا میرے عذاب کا حال یہ ہے کہ جسے چاہتا ہوں دیتا ہوں اور رحمت کا حال یہ ہے کہ ہر چیز پر چھائی ہوتی ہے لہٰذا میں ان لوگوں کے لیے رحمت ضرور لکھوں گا جو برائیوں سے بچیں گے اور زکوٰۃ دیں گے اور جو میری آیات پر ایمان لائیں گے۔ جواباً خدا تعالیٰ نے فرمایا کہ میرا عذاب اور رحمت کسی فرقہ کے لیے مخصوص نہیں ہے۔ عذاب تو اسی پر ہے جس کو اللہ چاہے اور رحمت عامہ سب مخلوق کو شامل ہے لیکن وہ رحمت جو تم طلب کر رہے ہو ان کے حصہ میں آئے گی جو اللہ کا ڈر رکھتے ہیں اور اموال میں زکوٰۃ ادا کرتے ہیں یا نفس کا تزکیہ کرتے ہیں اور خدا کی ساری باتوں پر یقین کامل رکھتے ہیں یعنی آخری اُمت کہ سب کتابوں پر ایمان لاتے گی لہٰذا حضرت موسیٰ کی اُمت میں سے جو کوئی آخری کتاب پر یقین لائے وہ اس نعمت کا مستحق ہو اور حضرت موسیٰ کی دُعا کا مصداق ہو[1]

حضرت موسیٰ کی دُعا مطلق تھی اور قوم کے ساتھ ان کو جو محبت تھی اس کا تقاضا بھی تھا کہ وہ اسی تعمیم کے ساتھ قوم کے لیے دُنیا و آخرت دونوں کی بھلائی کی دُعائیں مانگیں۔ تورات میں بھی اس موقع کی دُعا اسی تعمیم کے ساتھ مذکور ہے۔ اس دُعا کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اپنے عذاب و رحمت کا ضابطہ بیان فرما دیا۔ فرمایا کہ جہاں تک میرے عذاب کا تعلق ہے وہ تو میں انہی پر نازل کرتا ہوں جن پر چاہتا ہوں۔ خدا کا ہر چاہنا اس کی حکمت اور اس کے عدل کے تحت ہے اس لیے اس کا مطلب یہ ہوا کہ میں اپنا عذاب صرف ان پر نازل کرتا ہوں جو میرے قانونِ عدل کے تحت اس کے سزاوار ٹھہرتے ہیں۔ رہی میری رحمت تو وہ اس دُنیا میں تو ہر چیز کو عام ہے جس کو بھی وجود کی نعمت ملی ہے میرے ہی فضل سے ملی ہے جس کو بھی رزق پہنچ رہا ہے میرے ہی خوانِ کرم سے پہنچ رہا ہے۔ امیر و غریب، شاہ و گدا اور کافر و مومن جس کے پاس جو کچھ بھی ہے سب میرا ہی عطا کردہ ہے لیکن وہ رحمت جو آخرت سے متعلق ہے اس کو میں ان لوگوں کے لیے خاص

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رکھوں گا جو اس دنیا کی زندگی میں مجھ سے ڈرتے رہیں گے زکوٰۃ ادا کرتے رہیں گے اور خاص کر ان لوگوں کے لیے جو ہماری آیات پر ایمان لائیں گے۔

اُمتِ محمدیہ کے ظہور کی طرف اشارہ

دُعا کے جواب کے آخر میں والذین ھم بآیاتنا یومنون کہہ کر اُمتِ محمدیہ کے ظہور کی طرف لطیف اشارہ فرمایا ہے۔ خاص طور پر اسم موصول کے تکرار کے ساتھ ارشاد ہوا ہے والذین ھم بآیاتنا یومنون یعنی وہ لوگ جو ہماری آیات پر ایمان رکھتے ہیں یعنی ساری آیات پر ایمان رکھتے ہیں یہ نہیں کہ کچھ کو مانتے ہیں اور کچھ کو نہیں مانتے۔ عیسائی اور یہودی خدا کی تمام آیات کو نہیں مانتے، اُمتِ محمدیہ اللہ کی تمام آیات کو مانتی ہے بآیاتنا کی تقدیم قصر کا فائدہ دے رہی ہے۔ یہود تورات کے سوا کچھ نہیں مانتے۔ عیسائی تورات کے احکام نہیں مانتے۔ لیکن اس کی اخلاقی نصیحتوں کو قبول کرتے ہیں۔ لیکن قرآن پر ایمان لانے والا مجبور ہے کہ صحیفہ ابراہیم، تورات، زبور اور انجیل کو خدا کی کتابیں تعلیم کرے اور دوسری اگلی آسمانی کتابوں کی جن میں آسمانی تعلیمات کی خصوصیتیں پائی جاتی ہوں تکذیب نہ کرے۔

یہ بات سب آسمانی کتابوں کو مانا جاتے۔ اُمتِ محمدیہ کی ان خصوصیات میں سے ہے جس کا وجود کسی دوسری اُمت میں نہیں ہے۔ یہ رواداری بے تعصبی اور عام انسانی اخوت کی سب سے بڑی تعلیم ہے۔ یہودی اپنی کتاب کے سوا دوسری تمام آسمانی کتابوں کا انکار کر کے بھی نجات کا منتظر رہ سکتا ہے عیسائی تورات اور تمام دوسرے صحیفوں کا انکار کر کے بھی آسمانی بادشاہوں کا متوقع ہو سکتا ہے۔ پارسی اوستا کے سوا دوسری ربانی کتابوں کو باطل مان کر بھی جنت کا استحقاق پیدا کر سکتا ہے ہندو اپنے ویدوں کے سوا دُنیا کی ہر آسمانی کتاب کو دجل و فریب مان کر بھی اواگون سے نجات حاصل کر سکتا ہے مگر مسلمان جب تک قرآن کے ساتھ تمام آسمانی کتابوں کو من جانب اللہ تسلیم نہ کرے جنت کا مستحق نہیں ہو سکتا۔ اسی بنا پر عبدالقادر نے یہاں یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے -

> لیکن وہ رحمت خاص لکھی ہے ان کے نصیب میں ہے جو اللہ کی ساری باتیں یقین کریں گے یعنی آخری اُمت کہ سب کتابوں پر ایمان لاویں گے۔ سو حضرت موسیٰ کی اُمت میں سے جو کوئی آخری کتاب پر یقین لاتے وہ پہنچے اس نعمت کو اور حضرت موسیٰ دُعا ان کو لگی۔ (موضح القرآن)

الَّذِينَ يَتَّبِعُونَ الرَّسُولَ النَّبِيَّ الْأُمِّيَّ الَّذِي يَجِدُونَهُ
مَكْتُوبًا عِنْدَهُمْ فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنْجِيلِ يَأْمُرُهُمْ بِالْمَعْرُوفِ
وَيَنْهَاهُمْ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُحِلُّ لَهُمُ الطَّيِّبَاتِ وَيُحَرِّمُ عَلَيْهِمُ
الْخَبَائِثَ وَيَضَعُ عَنْهُمْ إِصْرَهُمْ وَالْأَغْلَالَ الَّتِي كَانَتْ عَلَيْهِمْ ۚ
فَالَّذِينَ آمَنُوا بِهِ وَعَزَّرُوهُ وَنَصَرُوهُ وَاتَّبَعُوا النُّورَ الَّذِي أُنْزِلَ
مَعَهُ ۙ أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿۱۵۷﴾ قُلْ يَا أَيُّهَا النَّاسُ إِنِّي رَسُولُ
اللَّهِ إِلَيْكُمْ جَمِيعًا الَّذِي لَهُ مُلْكُ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ لَا إِلَٰهَ إِلَّا
هُوَ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۖ فَآمِنُوا بِاللَّهِ وَرَسُولِهِ النَّبِيِّ الْأُمِّيِّ الَّذِي
يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَكَلِمَاتِهِ وَاتَّبِعُوهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ ﴿۱۵۸﴾

جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی اُمی ہوگا[۱۹۹] ۔ اور اس کے
ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات و انجیل میں لکھی پائیں گے[۲۰۰] ۔
وہ انہیں نیکی کا حکم دے گا برائی سے روکے گا[۲۰۱]، پسندیدہ چیزیں

حلال کرے گا گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا اس بوجھ سے نجات
دلائے گا جس کے تلے دبے ہوئے ہیں ان پھندوں سے نکالے
گا جن میں گرفتار ہو گئے۔[۲۰۲] تو جو لوگ اس پر ایمان لائے، اس
کی حمایت کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیرو کار
ہو گئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے بس یہی لوگ کامیاب
ہونے والے ہیں۔[۲۰۳] اے پیغمبر تم لوگوں سے کہہ دو اے افرادِ نسلِ
انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا بھیجا ہوا آیا ہوں وہ خدا کہ
آسمانوں کی اور زمین کی ساری بادشاہت اسی کے لیے ہے کسی
کی بندگی نہیں مگر اسی کی ذات کی وہی جلاتا ہے وہی مارتا ہے
بس اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول نبی اُمّی پر کہ اللہ اور
اس پر کلمات پر ایمان رکھتا ہے اس کی پیروی کرو تاکہ کامیابی
کی راہ تم پر کھل جائے۔[۲۰۴]

معانی مفردات

الامی ، ام کی طرف اسم نسبت ہے ۔ مدرسی و کتابی تعلیم و تعلم سے ناآشنا کو امی کہتے ہیں۔ امیین کا لفظ اسماعیلی عربوں کے لیے بطور لقب استعمال ہوا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ مدرسی اور رسمی تعلیم و کتابت سے ناآشنا اپنی بدویانہ سادگی پر قائم تھے اور اس طرح بنی اسرائیل کے مقابلے میں ان کو امیین کہا جاتا ہے ۔ اور کچھ کی رائے میں یہ ام القریٰ کی طرف نسبت ہے ۔ یعنی مکہ مکرمہ کے رہنے والے ۔ پہلی رائے زیادہ وزنی ہے ۔ لفظ امی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے یہاں بطور مدح آیا ہے کیونکہ امی ہونے کے باوجود کمال علم آپ کا معجزہ ہے ۔ صاحب قصیدہ بردہ نے کیا اچھی بات فرمائی ہے کفاک بالعلم فی الامی معجزة ۔ الطیبات ، طیبہ کی جمع ہے ۔ ستھری چیزیں ، نفیس اشیاء ، پاک چیزیں ، پاکیزہ چیزیں ، عمدہ چیزیں ۔ علامہ خفاجی نے بیضاوی کے حاشیہ میں لکھا ہے کہ طیبٰت کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ طبیعت کو اچھے لگے دوسرے یہ کہ قانون میں اچھی اور بھلی ہو ۔ اگر پہلے معنے ہوں تو اس کے معنے یہ ہیں کہ وہ تمام چیزیں جو طبیعت سلیمہ کو اچھی لگیں وہ حلال ہیں اور اگر دوسرے معنے ہوں تو اس کا مفہوم یہ ہے کہ اصل میں ہر چیز میں حرمت ہے ہاں جن کی قانون نے اجازت دی ہو وہ حلال ہے لیکن یہ ایک فضول سی بحث ہے کیونکہ حل و حرمت کا تعلق قانون و شریعت سے ہے نہ کہ طبیعت کے میلان اور عقل کی پسندیدگی الخبائث ، خبیثہ کی جمع ہے گندے کام اور ناپاک چیزیں ، ہر وہ چیز جو گندی اور ردی ہونے کی وجہ سے بری معلوم ہو خبیث کہلاتی ہے خواہ وہ محسوس ہو یا امر معقول ہو ۔ اس اعتبار سے اعتقاد باطل ، گفتگوئے دروغ ، افعال قبیحہ کو بھی خبیث کہتے ہیں ۔ یہاں خبیث شرعی مراد ہے ۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ

پہلی آیت میں والذین هم بایاتنا یؤمنون فرما کر ضمناً اس عہد و پیمان کی طرف اشارہ کیا تھا جو بنی اسرائیل سے آئندہ آنے والے پیغمبروں پر ایمان لانے کے بارے میں لیا گیا تھا ۔ میری مراد سورہ مائدہ کی یہ آیت ہے لئن اقمتم الصلوٰة وآتیتم الزکوٰة وآمنتم برسلی ۔ یہ عہد یوں تو ان تمام نبیوں پر مشتمل تھا جو حضرت موسیٰ کے بعد آتے لیکن اس میں خاص اشارہ اس نبی امی

کی طرف تھا جن کی تشریف آوری کی بشارت خود حضرت موسیٰ نے ہی عہد و میثاق سے جس کی طرف والذین ھم بایاتنا یومنون کے الفاظ میں اشارہ ہے یعنی اللہ سبحانہ، حضرت موسیٰ کی دعا کے جواب میں یہ تصریح فرمادی تھی کہ میری رحمت کے سزاوار صرف وہ لوگ ٹھہریں گے جو میرے عہد پر قائم رہیں گے جن کو میرے آخری رسول کی بعثت نصیب ہوگی وہ اس پر ایمان لائیں گے اور اس کے رفیق و مددگار بنیں گے۔ جب بات یہاں تک پہنچی تو جو بات اب تک اشاروں میں سمجھائی جا رہی تھی اسی کی یہاں تفصیل بیان ہو رہی ہے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حضرت موسیٰ کی دعا کا جواب والذین ھم بایاتنا یومنون پر ختم ہو گیا ہے اس کے بعد اب موقع کی مناسبت سے فوراً بنی اسرائیل کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی دعوت دی گئی ہے۔ تقریر کا مدعا یہ ہے کہ تم پر خدا کی رحمت نازل ہونے کے جو شرائط موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں عائد کی گئی تھیں کہ نماز قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، رسولوں پر ایمان لانا اور ان کی حمایت کرنا وہی آج تک قائم ہیں اور در اصل یہ انہی شرائط کا تقاضا ہے جو خدا کی نافرمانی سے بچ کر رہیں تو آج سب سے بڑی بنیادی نافرمانی یہ ہے کہ جس پیغمبر کو خدا نے مامور کیا ہے اس کی رہنمائی تسلیم کرنے سے انکار کیا جاتے لہٰذا جب تک اس نافرمانی سے پرہیز نہ کرو گے تقویٰ کی جڑ ہی سرے سے قائم نہ ہو گی خواہ جزئیات و فروعات میں تم کتنے متقی بنو۔ تم سے کہا گیا تھا کہ رحمت الٰہی سے حصہ پانے کے لیے زکوٰۃ بھی ایک شرط ہے تو آج کسی انفاق مال پر اس وقت تک زکوٰۃ کی تعریف صادق نہیں آسکتی جب تک اقامت دین حق کی اس جدّ و جہد کا ساتھ نہ دیا جائے جو اس پیغمبر کی قیادت میں ہو رہی ہے لہٰذا جب تک اس راہ میں مال صرف نہ کیا جائے زکوٰۃ کی بنیاد ہی استوار نہ ہو گی۔ تم سے کہا گیا تھا کہ اللہ نے اپنی رحمت صرف ان لوگوں کے لیے لکھی ہے جو اللہ کی آیات پر ایمان لے آئیں تو آج جو آیات قرآن کی صورت میں اس پیغمبر پر نازل ہو رہی ہیں ان کا انکار کر کے تم کسی طرح بھی آیات الٰہی کے ماننے والے قرار پا نہیں سکتے لہٰذا جب تک ان پر ایمان نہ لاؤ گے یہ آخری شرط بھی پوری نہ ہو گی خواہ تورات پر ایمان رکھنے کا تم کتنا ہی دعویٰ کرو۔

۱۹۹- جو الرسول کی پیروی کریں گے کہ نبی اُمی ہو گا۔ اُمی یا تو اُم کی طرف منسوب ہے جس طرح بچہ ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے اور کسی کا شاگرد نہیں ہوتا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر کسی مخلوق کے سامنے زانوئے تلمذ نہیں کیا۔ اس پر کمال یہ ہے کہ جن علوم و معارف اور حقائق و اسرار کا آپ نے افاضہ فرمایا کسی مخلوق کا حوصلہ نہیں کہ اس کا عشر عشیر بھی پیش کر سکے

بس نبی اُمی کا لقب اس حیثیت سے آپ کے لیے مایۂ صد افتخار ہے یا اُمی میں نسبت ام القریٰ کی طرف ہے جو مکہ معظمہ کا لقب ہے جو آپ کا مولد شریف تھا۔[1]

قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ پیش کرتے ہوئے حضور کے یہ اوصاف بتائے ہیں۔

۱۔ النبی، ۲۔ الامی۔ ۳۔ الذی یجدونہ مکتوبا عندھم فی التوراۃ والانجیل ۴۔ یامرھم بالمعروف۔ ۵۔ و ینھاھم عن المنکر، ۶۔ و یحل لھم الطیبات، ۷۔ و یحرم علیھم الخبائث۔ ۸۔ و یضع عنھم اصرھم والاغلال التی کانت علیھم۔ ۹۔ النور الذی انزل معہ۔ ۱۰۔ انی رسول اللہ الیکم جمیعا۔ تلک عشرۃ کاملۃ۔

حضور اقدس کا وصف النبی "وہ نبی"

یہاں قرآن نے خاص طور پر حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ پیش کرتے ہوئے الرسول بعد النبی کیوں کہا۔ یہ بات عام شارحین قرآن کی نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئی اور وہ دور دراز وادیوں میں نکل گئے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں۔

آپ کو رسول اس لیے کہا کہ آپ اللہ کے احکام لے کر آتے اور نبی اس لیے کہا کہ آپ یہ پیغام بندوں تک پہنچاتے ہیں۔

اسی طرح دوسرے شارحین رسول اور نبی کے بارے میں لغوی اور کلامی بحثوں میں چلے گئے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں الرسول کے تعارف میں النبی صرف اس لیے کہا گیا ہے کہ اہل کتاب النبی کے عنوان سے آنے والے پیغمبر سے حضرت موسیٰ کے ذریعے متعارف تھے اور اس کے منتظر تھے۔ حضرت یحییٰ علیہ السلام جب ظاہر ہوتے ہیں تو لوگ ان سے پوچھتے ہیں کہ تین آنے والے پیغمبروں میں سے تم کون ہو۔

یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو بھیجا کہ اس سے پوچھیں کہ تو کون ہے اور اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں ہوں۔ تب انہوں نے اس سے پوچھا تو اور کون ہے؟ کیا تو الیاس ہے۔ اس

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نے کہا میں نہیں ہوں پس آیا تو " وہ نبی " ہے ؟ اس نے جواب دیا نہیں . . . .
اور انہوں نے اس سے سوال کیا اور کہا اگر تو نہ مسیح ہے نہ یہ الیاس اور نہ
" وہ نبی " تو کیوں بپتسمہ دیتا ہے ۔ (یوحنا ۱-۱۹)

اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ تورات کی پیشین گوئی کے مطابق یہود کو تین پیغمبروں کا انتظار تھا جن میں سے دو کے نام الیاس اور مسیح تھے لیکن تیسرے کا نام صرف " وہ نبی " لیا گیا تھا ۔ قرآن نے آپ کا تعارف اس آیت میں آپ کا چہرہ اسی لفظ کے ذریعے پیش کیا ہے ۔ النبی یعنی وہ نبی ، اس کا مصداق آپ کے سوا کوئی نہیں ۔

" وہ نبی جس کا یہود و نصاریٰ انتظار کر رہے تھے اس کی پیش گوئی حضرت موسیٰ نے فرمائی ہے ۔ . . . کتاب استثنا باب ۱۸ آیت ۱۷ میں ہے ۔
اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ وہ جو کچھ کہتے ہیں سو ٹھیک کہتے ہیں ۔ میں ان کے لیے انہی کے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اس کے منہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اسے حکم دوں گا وہی ان سے کہے گا ۔ الخ

کاہن اور لاوی جو علمائے یہود میں سے تھے اور اپنی کتابوں سے خوب واقف بھی تھے ۔ اور ان کو یحییٰ علیہ السلام کی نسبت یقینی طور پر معلوم تھا کہ وہ نبی ہیں مگر پھر بھی انہوں نے شک کیا کہ وہ مسیح ہیں یا ایلیاہ ہیں اور یا وہ مخصوص نبی جس کی اطلاع موسیٰ علیہ السلام نے دی عیسائی علماء تسلیم کرتے ہیں کہ یوحنا ۱-۲۱ میں لفظ " وہ نبی " استعمال کیا گیا ہے ۔ اس سے مراد وہی نبی ہیں جن کا ذکر حضرت موسیٰ نے کیا تھا ۔ بہرحال جو علمائے یہود مسیح کے معاصر تھے انہوں نے یحییٰ علیہ السلام سے سوال کیا کہ آپ مسیح ہیں ۔ جب انہوں نے انکار کیا تو پھر پوچھا کہ کیا آپ ایلیاہ ہیں ۔ جب انہوں نے اس کا بھی انکار کیا تو پوچھا کہ کیا آپ وہی مخصوص نبی ہیں جن کی خبر موسیٰ علیہ السلام دے گئے ہیں ۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ مسیح اور ایلیا کی اس نبی کا بھی انتظار کر رہے تھے بلکہ وہ ان کے درمیان اس قدر مشہور تھا کہ اس کا نام لینے کی بھی ضرورت نہ ہوتی تھی بلکہ اس کی طرف اشارہ ہی کافی تھا ۔ انجیل یوحنا کے باب ۷ آیت ۴۰ میں عیسیٰ علیہ السلام کا قول نقل کرنے کے بعد یوں کہا گیا ہے کہ :

بس بھیڑ میں سے بعض نے یہ باتیں سن کر کہا بے شک یہی وہ نبی ہے،
اوروں نے کہا کہ یہ مسیح ہے۔
اس سے یہ بات بھی واضح ہو گئی کہ جو نبی ان کے ذہنوں میں معہود اور معین تھا وہ مسیح کے علاوہ کوئی دوسرا ہے۔ اس لیے اس کو مسیح کے مقابلہ میں ذکر کیا۔ بہرحال قرآن میں النبی کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ یہی ہے "وہ نبی" ہے جس کا یہود و نصاریٰ دونوں کو انتظار تھا۔ یہی بلاغت قرآنی کے زیادہ مطابق ہے اور اس میں زیادہ معنویت ہے۔ بر مقابلہ اس کے کہ یہ کہا جاتے کہ ان دونوں میں لغوی معنے ملحوظ ہیں۔ اسی لیے مسلمان حضور انور کو آنحضرت کہتے ہیں۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمیت

دوسرا وصف یہاں قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا الامی بتایا ہے۔ اُمی کے لغوی معنے آپ سن چکے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری تعلیم اور نوشت و خواند کے داغ سے پاک تھے قرآن عزیز نے متعدد مواقع پر اس واقعہ کا اظہار کیا ہے۔ ارشاد ہے:

وما کنت تتلوا من قبلہ من الکتاب ولا تخطہ بیمینک اذا لارتاب المبطلون

اے نبی تم اس سے پہلے کوئی نہ پڑھتے تھے اور نہ اپنے ہاتھ سے لکھتے تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو غلط کار لوگ شک میں پڑ سکتے تھے۔

اس آیت سے استدلال کی بنیاد یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ظاہری تعلیم کے داغ سے پاک تھے۔ آپ کے اہل وطن اور رشتہ و برادری کے لوگ جن کے درمیان روز پیدائش سے سن کہولت کو پہنچنے تک آپ کی ساری زندگی بسر ہوئی تھی اس بات سے خوب واقف تھے کہ آپ نے عمر بھر نہ کبھی کوئی کتاب پڑھی نہ کبھی قلم ہاتھ میں لیا۔ یہ اس بات کا کھلا ثبوت ہے کہ کتب آسمانی کی تعلیمات انبیاء سابقین کے حالات، مذاہب و ادیان کے عقائد، قدیم قوموں کی تاریخ اور تمدن و معیشت کے اہم مسائل پر جس وسیع اور گہرے علم کا اظہار اس اُمی کی زبان سے ہو رہا ہے یہ اس کو وحی کے سوا کسی ذریعے سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اگر اس کو نوشت و خواند کا علم ہوتا اور لوگوں نے اسے کبھی کتابیں پڑھتے اور مطالعہ و تحقیق کرتے دیکھا ہوتا تو باطل پرستوں کے لیے یہ شک کرنے کی کچھ بنیاد بھی ہو سکتی تھی کہ یہ علم وحی نہیں بلکہ اخذ و اکتساب سے حاصل کیا گیا ہے لیکن اس کی اُمیت نے تو ایسے کسی شک کے لیے برائے نام بھی کوئی بنیاد باقی نہیں چھوڑی ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ آپ کا انسانی تعلیم سے پاک ہونا بھی مصلحتِ الٰہی کا ایک خاص منشا تھا، اسی لیے اس کے بعد ارشاد ہوا ہے۔

بل هو ایات بینٰت فی صدور الذین اوتوا العلم

دراصل یہ روشن نشانیاں ہیں ان لوگوں کے دلوں میں جنہیں علم بخشا گیا ہے۔

یعنی ایک اُمی کا قرآن جیسی کتاب پیش کرنا اور یکایک ان غیر معمولی کمالات کا مظاہرہ کرنا جن کے لیے کسی سابقہ تیاری کے آثار کبھی کسی کے مشاہدے میں نہیں آئے۔ یہی دانش و بینش رکھنے والے حضرات کی نگاہ میں اس کی پیغمبری پر دلالت کرنے والی روشن ترین نشانیاں ہیں۔ دُنیا کی تاریخی ہستیوں میں سے جس کے حالات کا بھی جائزہ لیا جائے آدمی اس کے اپنے ماحول میں ان اسباب کا پتہ دے سکتا ہے جو اس کی شخصیت بنانے اور اس سے ظاہر ہونے والے کمالات کے لیے اس کو تیار کرنے میں کارفرما تھے۔ اس کے ماحول اور اس کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی میں ایک ملکی مناسبت پائی جاتی ہے لیکن حضور انور کی شخصیت جن حیرت انگیز کمالات کی مظہر تھی ان کا کوئی ماخذ آپ کے ماحول میں تلاش نہیں کیا جا سکتا۔ یہاں نہ وقت کے عربی معاشرے میں اور نہ گرد و پیش کے جن ممالک عرب کے تعلقات تھے ان کے معاشرے میں کہیں دور دراز سے بھی وہ عناصر ڈھونڈ کر نہیں نکالے جا سکتے جو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کے اجزائے ترکیبی سے کوئی مناسبت رکھتے ہوں یہی حقیقت ہے جس کی بنا پر بیان فرمایا گیا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ایک نشانی نہیں بلکہ بہت سی نشانیوں کا مجموعہ ہے۔ جاہل آدمی کو اس میں کوئی نشانی نظر نہ آتی ہو تو نہ آئے مگر جو لوگ علم رکھنے والے ہیں وہ ان نشانیوں کو دیکھ کر اپنے دلوں میں قائل ہو گئے ہیں کہ یہ شان ایک پیغمبر ہی کی ہو سکتی ہے۔

قرآن نے آپ کو بار بار اُمی کہا ہے لیکن آپ اُمی ہو کر اُمیوں میں رہ کر کتبِ سابقہ کی ظاہری تعلیم سے ناآشنا ہو کر بھی سب کچھ جانتے تھے اور یہ آپ کا شاہکار اعجاز تھا۔ مشرکین مکہ کو مخاطب کر کے قرآن کہتا ہے کہ حضور کی صداقت کی کیا دلیل کافی نہیں ہے کہ وہ ناآشنائے تعلیم سی ہو کر بھی وہ کچھ جانتا ہے جس کی علمائے بنی اسرائیل کے سوا اور کسی کو خبر نہیں۔

او لم یکن لہم آیۃ ان یعلمہ علماء بنی اسرائیل

کیا ان کے لیے یہ نشانی نہیں کہ ان باتوں کو جو ایک اُمی کی زبان سے ادا ہو رہی ہے بنی اسرائیل کے عالم جانتے ہیں۔

تورات و انجیل میں حضور کی بشارتیں

۲۰۰۔ اور اس کے ظہور کی خبر اپنے یہاں تورات و انجیل میں لکھی پاتے ہیں۔ یعنی آپ کی تشریف آوری کی بشارات اور نعوت و صفات کتب سابقہ سماویہ میں مذکور ہیں۔ حتیٰ کہ اس وقت سے لے کر آج تک ساڑھے تیرہ سو برس کی کانٹ چھانٹ کے بعد بھی موجودہ بائیبل میں بہت سی بشارات اشارات پائے جاتے ہیں جن کو ہر زمانہ کے علماء بحوالہ کتب دکھلاتے چلے آتے ہیں۔ و للہ الحمد علیٰ ذالک[1]

اس موضوع پر سب سے سیر حاصل بحث حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہ العزیز نے اظہار الحق میں کی ہے۔ سید رشید رضا نے بھی اپنی مشہور تفسیر المنار میں ان کے ہی علمی فیضان کی خوشہ چینی کی ہے۔ حضرت مولانا محمد ادریس شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ قدس اللہ سرہ العزیز نے اس موضوع پر اظہار الحق، ازالۃ الاوہام اور الجواب الفسیح کی مدد سے جو کتابچہ بشائر النبیین کے نام سے مرتب کیا ہے وہ بھی بڑا قیمتی علمی سرمایہ ہے۔ ہم یہاں انہی کی علوم سے استفادہ کرتے ہیں:

بشارت اوّل

از تورات سفر استثناء باب ۱۸، آیت ۱۸۔

۱۸۔ اور خداوند نے مجھ سے کہا کہ انہوں نے جو کچھ کہا اچھا کہا، میں اُن کے لیے ان کے بھائیوں میں سے تجھ سا نبی برپا کروں گا اور اپنا کلام اُس کے مُنہ میں ڈالوں گا اور جو کچھ میں اُسے فرماؤں گا وہ سب اُن سے کہے گا۔ ۱۹۔ اور ایسا ہوگا کہ جو کوئی میری باتوں کو جنہیں وہ میرا نام لے کر کہے گا نہ سُنے گا تو میں اُس کا حساب اُس سے لوں گا۔ ۲۰۔ لیکن وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے کہ کوئی بات میرے نام سے کہے جس کے کہنے کا میں نے اُسے حکم نہیں دیا اور معبودوں کے نام سے کہے تو وہ نبی قتل کیا جاتے ۲۱۔ اور اگر تو اپنے دل میں کہے کہ میں کیونکہ جانوں کہ یہ بات خدا وند کی کہی ہوئی نہیں تو جان رکھ کہ جب نبی خدا وند کے نام سے کچھ کہے اور وہ جو اُس نے کہا ہے واقع نہ ہو

[1] افادات شیخ الاسلام

تو وہ بات خداوند نے نہیں کہی" انتہی۔

اہل اسلام یہ کہتے ہیں کہ یہ بشارت خاص سرور عالم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے ہے اور یہود کا یہ خیال ہے کہ یہ بشارت یوشع علیہ السلام کے لیے ہے اور نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے لیے لیکن حق یہ ہے کہ اس بشارت کا مصداق بجز خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے کوئی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ یہ بشارت اُس نبی کے ظہور کی ہے کہ جو موسیٰ علیہ السلام کے مماثل یعنی مانند ہو اور بنی اسرائیل میں سے نہ ہو بلکہ بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے ہو اور پھر اُس بشارت میں اُس آنے والے نبی کی صفات کا ذکر ہے اس لیے اہل اسلام کہتے ہیں کہ یہ خاص آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت ہے بچند وجوہ

اول: یہ کہ اس بشارت میں یہ مذکور ہے کہ میں اُن کے یعنی بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ یہ نبی، بنی اسرائیل میں سے نہ ہوگا اس لیے کہ یہ خطابات ایک دو شخص کے ساتھ مخصوص نہ تھے بلکہ بنی اسرائیل کے تمام اسباط اور گروہوں کو تھے لہٰذا اس خطاب کی مخاطب مجموع قوم بنی اسرائیل ہوگی اور مطلب یہ ہوگا کہ اس پوری قوم بنی اسرائیل کے بھائیوں میں سے تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا جو اس امر کی صاف دلیل ہے کہ یہ نبی بنی اسرائیل میں نہ ہوگا اس لیے کہ اگر یہ نبی بنی اسرائیل میں سے ہوتا تو یہ فرماتے کہ خود تم میں سے ایک نبی پیدا ہوگا کما قال تعالیٰ لقد منّ اللہ علی المومنین اذ بعث فیھم رسولاً من انفسھم اور نیز فرماتے کہ تمہارے بھائیوں میں سے وہ نبی ظاہر ہوگا کما قال تعالیٰ خطاباً لبنی اسرائیل وجعل فیکم انبیاء۔

غرض یہ کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا تمام بنی اسرائیل کو بلا کسی تخصیص کے یہ خطاب فرمانا کہ وہ نبی موعود تمہارے بھائیوں میں سے ہوگا اس امر کی صاف دلیل ہے کہ وہ نبی موعود بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا کیونکہ بنی اسماعیل بنی اسرائیل کے بھائی ہیں۔ نصاریٰ کہتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے بھائیوں سے خود بنی اسرائیل ہی مراد ہیں مگر یہ بالکل غلط ہے اور سراسر خلاف عقل ہے اور ساری دنیا کے لغت کے خلاف ہے جب یہ کہا جاتے کہ زید کے بھائی تو زید ان بھائیوں میں داخل نہ ہوگا بلکہ بھائیوں کے علاوہ ہوگا کیونکہ مضاف الیہ باتفاق عقلاً مضاف سے خارج ہوتا ہے نیز کسی شخص اور اس کی اولاد کو دنیا کے کسی محاورہ میں بطریق حقیقت یہ نہیں کہا جا سکتا کہ یہ اُس کے بھائی ہیں پس بنی اسرائیل کے بھائیوں سے بنی اسرائیل کی اولاد مراد لینا ہے

سراسر نادانی اور جہالت ہے محاورہ میں یہ تو کہا جاسکتا ہے کہ زید بنی تمیم کا بھائی ہے اور ہود قوم عاد کے بھائی ہیں اور صالح قوم ثمود کے بھائی ہیں یعنی اس قوم کے ایک فرد ہیں لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ قوم عاد قوم عاد کے بھائی ہیں اور ثمود ثمود کے بھائی ہیں اور بنو تمیم بنو تمیم کے بھائی ہیں اور بنو ہاشم بنو ہاشم کے بھائی ہیں۔

اسی طرح یہ کہنا کہ بنی اسرائیل بنی اسرائیل کے بھائی ہیں صریح نادانی اور جہالت ہے اور یہ کہنا بنی اسرائیل کے بھائیوں سے اُن کی نسل اور اولاد مراد ہے کھلی ہوئی حماقت ہے۔

نیز کتاب پیدائش کے سولھویں باب درس تیرہ میں۔ بنی اسرائیل کے مقابلہ میں حضرت اسماعیل اور اُن کی اولاد کا اس طرح ذکر ہے۔

۱۳- وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بود و باش اختیار کرے گا۔ اھ

اور توراۃ سفر پیدائش کے پچیسویں باب درس ۱۸ میں ہے :۔

کہ اسماعیل اپنے سب بھائیوں کے سامنے مرگیا۔ الخ

پس ان دونوں جگہ بنی اسمٰعیل کے بھائیوں سے بالاتفاق بنی عیص اور بنی اسرائیل مراد ہیں اور یہ امر باتفاق یہود و نصاریٰ ثابت ہے کہ خالص بنی عیص میں سے کوئی صاحب نبوت نہیں ہوا اور یہ امر بھی فریقین میں مسلم ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے جو اولاد قطورہ سے ہوئی اُن سے بھی اللہ تعالیٰ نے نبوت اور برکت کا کوئی وعدہ نہیں فرمایا البتہ حضرت اسمٰعیل کے حق میں برکت کا وعدہ فرمایا۔

اہلِ کتاب کی ایک تحریف کا ذکر

علماءِ اہلِ کتاب نے اس بشارت میں ایک لفظ یہ اضافہ کر دیا ہے خدا تیرے ہی درمیان سے تیرے بھائیوں میں سے تیری مانند ایک پیغمبر قائم کرے گا (دیکھو اسی باب کا درس ۱۵) تاکہ یہ بشارت نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم پر صادق نہ آئے سوچنا چاہیے کہ یہ لفظ تیرے ہی درمیان سے بعد میں بڑھایا گیا ہے۔ دلیل اس تحریف کی یہ ہے کہ توریت سفر استثناء باب ۱۸ اور درس ۱۸ میں خدا تعالیٰ کی طرف سے موسیٰ علیہ السلام کو خطاب میں الفاظ یہ ہیں میں ان کے لیے اُن کے بھائیوں میں سے تجھ سا ایک نبی برپا کروں گا۔ اھ

اس میں تیرے ہی درمیان سے، کا لفظ مذکور نہیں اور عجیب بات ہے کہ کتاب الاعمال باب ۳

آیت ۲۲ میں اس خبر کا ذکر آیا ہے مگر تیرے درمیان کا لفظ مذکور نہیں۔
نیز حضرت مسیح کے حواریین نے جہاں کہیں بھی اس کلام کو نقل کیا ہے اس میں یہ جملہ یعنی کہ تیرے ہی درمیان سے کبھی ذکر نہیں کیا معلوم ہوا کہ یہ جملہ الحاقی ہے۔
اور اگر بالفرض والتقدیر تھوڑی دیر کے لیے یہ تسلیم کرلیا جاتے کہ یہ جملہ الحاقی نہیں تو ہوسکتا ہے کہ اس کی مراد یہ ہو کہ تیرے درمیان سے یعنی خدا پرستوں کی نسل سے مطلب یہ کہ وہ حضرت ابراہیم حنیف کی نسل سے ہوگا۔

خلاصہ کلام یہ کہ

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا بنی اسرائیل کے بارہ اسباط کو مخاطب بنا کر یہ فرمانا کہ ان کے بھائیوں میں سے حق تعالیٰ ایک نبی برپا کرے گا اس امر کی صریح دلیل ہے کہ وہ بنی اسرائیل نہ ہوگا ورنہ اگر کسی اسرائیلی نبی کی خبر دینا منظور ہوتا تو یہ فرماتے کہ ان میں سے یا ان کی اولاد میں سے وہ نبی برپا ہوگا ایسی صورت میں بھائیوں کا لفظ بڑھانا محض لغو اور فضول ہوگا۔ بھائیوں کا لفظ باآواز بلند پکار رہا ہے کہ اس نبی موعود کو ان لوگوں کے ساتھ علاقہ صلبی یا بطنی نہ ہوگا یعنی وہ نبی بنی اسرائیل کی نسل سے نہ ہوگا۔
اور ظاہر ہے کہ حضرت یوشع علیہ السلام اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام دونوں بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ بنی اسرائیل کے بھائیوں یعنی بنی اسمٰعیل میں سے نہیں لہٰذا یہ دونوں نبی اس بشارت کا مصداق نہیں بن سکتے۔ اس بشارت کا مصداق صرف وہی نبی ہوسکتا ہے کہ جو بنی اسمٰعیل میں سے ہوا بنیامہ بنی اسرائیل میں سے کوئی پیغمبر اس بشارت کا مصداق نہیں ہوسکتا۔
دوم:۔ یہ کہ اس بشارت میں یہ مذکور ہے کہ تیرے مانند ایک نبی برپا کروں گا۔ اور ظاہر ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے مانند نہ یوشع علیہ السلام ہیں اور نہ عیسیٰ علیہ السلام اس لیے کہ یہ دونوں حضرات بنی اسرائیل میں سے ہیں اور توراۃ سفر استثنا باب ۳۴ درس ۱۰ میں ہے کہ بنی اسرائیل میں موسیٰ کے مانند کوئی نبی نہیں اٹھا جس سے خداوند آمنے سامنے آشنائی کرتا۔ انتہی۔
علاوہ ازیں حضرت یوشع علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے تلمیذ (شاگرد) تھے اور تابع اور متبوع مماثل نہیں ہوتے۔ نیز حضرت یوشع اس وقت موجود تھے اور اس بشارت میں یہ مذکور ہے کہ ایک نبی برپا کروں گا جس سے صاف ظاہر ہے کہ اس نبی کا وجود زمانہ مستقبل میں ہوگا۔

اور یوشع علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی کے زمانہ میں نبی ہو چکے تھے پس وہ اس بشارت کا جس میں آئندہ نبی کی خبر دی گئی ہے کیسے مصداق ہو سکتے ہیں۔

علیٰ ھذا حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام بھی حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے مماثل نہیں اس لیے کہ نصاریٰ کے نزدیک تو وہ ابن اللہ یا خود خدا ہیں اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ اللہ نہ ابن اللہ بلکہ خدا کے ایک بندے ہیں پس بندے اور خدا میں کیا مماثلت۔

نیز حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام بہ اعتقاد نصاریٰ مقتول و مصلوب ہو کر اپنی اُمت کے لیے کفّارہ ہوتے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نہ مقتول و مصلوب ہوئے اور نہ کفارہ ہوئے۔

نیز حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی شریعت حدود و قصاص، زواجر و تعزیرات غسل و طہارت کے احکام سے ساکت ہے۔ بخلاف شریعت موسویہ کے وہ ان تمام امور پر مشتمل ہے۔ ہاں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں مماثلت ہے جس طرح حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام صاحب شریعت مستقلہ تھے اسی طرح ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت غرّا بھی مستقل اور کامل اور علی وجہ الاتم حدود و تعزیرات، جہاد و قصاص، حلال و حرام کے احکام کو جامع ہے اور ظاہری احکام کی طرح باطنی احکام یعنی اخلاق بھی جامع ہے۔

جس طرح موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بنی اسرائیل کو فرعون کے پنجہ سے نکال کر عزّت دی اس سے بدرجہا زائد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے عرب کو روم اور فارس کی قید سے چھڑا کر اللہ کا کلمہ پڑھایا اور قیصر و کسریٰ کے خزائن کی کنجیاں اُن کے سپرد کیں۔ نیز جس طرح حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے نکاح کیا اسی طرح ہمارے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی انبیاء سابقین کی سنّت نکاح پر عمل فرمایا اور اسی مماثلت کی طرف قرآن کریم کی اس آیت میں اشارہ ہے:

انا ارسلنا الیکم رسولاً شاھداً علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولاً

ہم نے تمہاری طرف ایک رسُول بھیجا تم پر گواہی دینے والا جیسے ہم نے فرعون کی طرف ایک رسول بھیجا۔

نیز حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور حضرت یوشع علیہ الصلوٰۃ والسلام نے کبھی اس مماثلت کا دعویٰ بھی نہیں فرمایا۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ مماثلت سے یہ مراد ہے کہ وہ نبی موعود موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرح بنی اسرائیل میں سے ہوگا تو اس صورت میں حضرت عیسٰی اور حضرت یوشع علیہما الصلوٰۃ والسلام کی کیا تخصیص ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں ہزاروں نبی پیدا ہوئے۔

اس لحاظ سے ہر نبی انبیاء بنی اسرائیل میں سے اس بشارت کا مصداق بن سکتا ہے اور اگر حضرت عیسیٰ اور حضرت یوشع علیہما الصلوٰۃ والسلام کے لیے کسی درجہ میں مماثلت تسلیم کر لی جائے تو اس مماثلت کو اُس مماثلت سے کہ جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت موسیٰ علیہ السلام سے حاصل ہے کوئی نسبت نہیں۔

سوم یہ کہ اس بشارت میں یہ بھی مذکور ہے کہ میں اپنا کلام اُس کے منہ میں ڈالوں گا۔اھ۔ یعنی اُس نبی پر الواح تورات وزبور کی طرح لکھی ہوئی کتاب نازل نہ ہوگی بلکہ فرشتہ اللہ کی وحی لے کر نازل ہوگا اور وہ نبی اُمّی ہوگا۔ فرشتہ سے سُن کر اللہ کا کلام یاد کرے گا اور اپنے مُنہ سے پڑھ کر اُمت کو سنائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ بات بجز نبی اُمّی فداہ نفسی وابی وامی کسی پر صادق نہیں آتی۔ کما قال تعالیٰ وما ينطق عن الهوى ان هو الا وحى يوحى آپ اپنی خواہش سے کوئی بات نہیں کہتے مگر وہ وحی ہوتی ہے جو اللہ کی طرف سے بھیجی جاتی ہے۔

چہارم یہ کہ اس بشارت میں اس امر کی بھی تصریح ہے کہ جو اُس نبی موعود کے حکم کو نہ مانے گا میں اس کو سزا دوں گا اور ظاہر ہے کہ اس سزا سے اُخروی عذاب مراد نہیں اس لیے کہ اس میں اُس موعود کے نہ ماننے والے کی کیا خصوصیت۔ اُخروی عذاب ہر نبی کے نہ ماننے والے کے لیے ہے بلکہ اس سے دنیوی سزا یعنی جہاد وقتال اور حدود وقصاص کا جاری کرنا مراد ہے۔ اور یہ بات نہ عیسیٰ علیہ السلام کو حاصل ہوئی اور نہ یوشع علیہ الصلوٰۃ والسلام کو۔ البتہ خاتم الانبیاء سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو علی وجہ الاتم حاصل ہوئی لہٰذا وہی اس بشارت کا مصداق ہو سکتے ہیں۔

پنجم یہ کہ اس بشارت میں یہ بھی تصریح ہے کہ اگر وہ نبی عیاذاً باللہ افترا کرے گا اور خدا کی طرف غلط بات منسوب کرے گا تو وہ نبی قتل کیا جائے گا۔ اور ظاہر ہے کہ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بعد دعوائے نبوت قتل نہیں کیے گئے۔ دشمنوں نے ہر طرح کی کوشش اور تدبیر کی مگر سب برباد گئی۔

کما قال اللہ تبارک وتعالیٰ واذ يمكر بك الذين كفروا ليثبتوك او يقتلوك او يخرجوك ويمكرون ويمكر الله والله خير الماكرين۔

اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اُس نعمت کو یاد کیجئے کہ کافر جب آپ کے ساتھ مکر کرتے ہیں کہ آپ کو قید کر لیں یا مار ڈالیں یا نکال دیں وہ اپنی تدبیر کرتے ہیں اور اللہ اپنی تدبیر فرماتا ہے اور اللہ ہی بہترین تدبیر فرمانے والا ہے۔

اور حسب وعدۂ الٰہی واللہ یعصمک من الناس آپ بالکل محفوظ اور مامون رہے اور بجائے اس کے کہ کسی قسم کا حادثہ فاجعہ پیش آتا آپ کی شان و شوکت بلند ہوتی گئی۔ پس آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اگر وہ نبی موعود نہ ہوتے تو ضرور قتل کیے جاتے۔ ہاں حسب زعم نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام مقتول و مصلوب ہوئے۔ پس اگر حضرت مسیح بن مریم علیہ السلام کو اس بشارت کا مصداق قرار دیا جائے تو علیٰ زعم النصاریٰ عیاذاً باللہ ان کا کاذب ہونا لازم آتا ہے اور قرآن عزیز میں بھی اس طرف اشارہ ہے کما قال اللہ تعالیٰ شانہ،

ولولا ان ثبتنٰک لقد کدت ترکن الیھم شیئاً قلیلا اذاً لاذقنٰک ضعف الحیٰوۃ وضعف الممات ثم لا تجدلک علینا نصیراً، و لو تقول علینا بعض الاقاویل لاخذنا منہ بالیمین ثم لقطعنا منہ الوتین،

اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو آپ قریب تھے کہ ان کی جانب اقل قلیل مائل ہو جاتے۔ اس وقت ہم آپ کو زندگی اور موت کا دو چند عذاب چکھاتے پھر آپ ہمارے مقابلے میں کسی کو مددگار نہ پاتے۔ اگر محمدؐ ہم پر کچھ افترا کرتے تو ہم اُن کا داہنا پکڑ لیتے اور ان کی شہ رگ کو کاٹ دیتے۔

ایک ضروری تنبیہ

بیسویں درس میں جو یہ مذکور ہے کہ وہ نبی اگر مجھ پر جھوٹ باندھے تو مار ڈالا جائے گا، سو جاننا چاہیے کہ نہ قتل ہونا علی الاطلاق صادق ہونے کی دلیل نہیں ورنہ اُن انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کی صداقت کہ جو دشمنوں کے ہاتھ سے قتل کیے گئے زیر تامل ہوگی کما قال اللہ تعالیٰ و یقتلون النبیین بغیر الحق، خصوصاً نصاریٰ کو اپنے عقیدہ فاسدہ کی بنا پر حضرت عیسیٰ السلام کی صداقت ثابت کرنا بہت دشوار ہو جائے گی۔

بلکہ خاص اس نبی موعود کا قتل نہ ہونا اُس کے صادق ہونے کی علامت ہے جیسا کہ تورات کی اس عبارت سے ظاہر ہے " وہ نبی جو ایسی گستاخی کرے گا الخ " وہ قتل کیا جائے گا۔ ان دونوں جملوں میں وہ کی ضمیر خاص اُس نبیِ موعود کی طرف راجع ہے۔ اگر یہ حکم مطلق نبی کے حق میں ہو تو معاذاللہ حضرت زکریا اور حضرت یحییٰ جھوٹے نبی ٹھہرتے ہیں۔ اور نصاریٰ کے عقیدہ کی بنا پر چونکہ حضرت عیسیٰ مقتول اور مصلوب ہوئے تو وہ بھی معاذاللہ جھوٹے ٹھہرتے ہیں۔ پس معلوم ہوا کہ

یہ خبر خاص اس نبی موعود کے حق میں ہے کہ جس کی یہ بشارت دی گئی ہے اگر اس خبر کو مطلق نبی کے حق میں مانا جائے تو یہود بے بہبود جو حضرت عیسٰی کو نبی نہیں مانتے ان کو اپنے کفر کے لیے ایک دلیل ہاتھ آجائے گی۔

ششم یہ کہ اس بشارت میں یہ بھی مصرح ہے کہ اُس نبی موعود کے صادق ہونے کی علامت یہ ہے کہ اُس کا کہا پورا ہوگا یعنی اس کی تمام پیشین گوئیاں صادق ہوں گی، سو الحمد للہ کہ اُس صادق مصدوق کی کوئی پیشین گوئی آج تک ذرہ برابر بھی غلط ثابت نہیں ہوئی۔ اور ہم پورے دعوے کے ساتھ بہ بانگ دہل اعلان کرتے ہیں کہ قیامت تک بھی کوئی حاسد اُس صادق مصدوق کی کسی پیشین گوئی کو غلط ثابت نہیں کر سکتا۔

اور یہ وصف تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم میں ایسا نمایاں اور اجلیٰ تھا کہ آپ کے دشمنوں اور حاسدوں کو بھی بجز صادق امین کہنے کے کوئی چارہ نظر نہ آتا تھا۔

کوئی مانے یا نہ مانے

یہ گنہگار اُمت تو اُس نبی امی فداہ نفسی وابی وامی کے صادق مصدوق ہونے پر طلوع شمس اور وجود نہار سے بدرجہا زائد یقین رکھتا ہے اور اُس خدائے واحدہٗ لاشریک لہٗ کی قسم کھا کر اور اُس کو اور اُس کے تمام ملائکہ کو گواہ بنا کر صمیم قلب اور خلوص اعتقاد سے یہ تصدیق اور اقرار کرتا ہے کہ بے شک و شبہ آپ صادق مصدوق اصدق الاولین والآخرین ہیں۔ اللھم ثبتنا علیٰ ذالک آمین۔

ہفتم یہ کہ کتاب الاعمال باب سوم آیت ہفدہم کے پڑھنے سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نبی منتظر حضرت عیسٰی اور ایلیا علیہما السلام بلکہ تمام انبیاء کرام کے علاوہ ہے۔ وہ عبارت یہ ہے:

> اب اے بھائیو میں جانتا ہوں کہ تم نے یہ نادانی سے کیا جیسے تمہارے سرداروں نے بھی۔ پر جن باتوں کی خدا نے اپنے سب نبیوں کی زبان سے آگے سے خبر دی تھی کہ مسیح دکھ اٹھائے گا سو پوری کیں۔ ۱۹۔ پس توبہ کرو اور متوجہ ہو کہ تمہارے گناہ مٹائے جائیں تاکہ خداوند حضور تازگی بخش ایام آویں۔ ۲۰۔ اور یسوع مسیح کو پھر بھیجے جس کی منادی تم لوگوں کے درمیان آگے سے ہوئی۔ ۲۱۔ ضرور ہے کہ آسمان

اُسی لیے رہے اس وقت تک کہ سب چیزیں جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آ دیں۔ ۲۲۔ کیونکہ موسیٰ نے باپ دادوں سے کہا کہ خداوند جو تمہارا خدا ہے تمہارے بھائیوں میں سے تمہارے لیے ایک نبی تیری مانند اٹھا دے گا جو کچھ وہ تمہیں کہے اُس کی سب سنو۔ ۲۳۔ اور ایسا ہوگا کہ ہر نفس کہ جو اُس نبی کی نہ سنے وہ قوم سے نیست کیا جائے گا۔ ۲۴۔ بلکہ سب نبیوں نے سموایل سے لے کر پچھلوں تک جتنوں نے کلام کیا ان دونوں کی خبر دی ہے ۲۵۔ تم نبیوں کی اولاد اور اس عہد کے ہو جو خدا نے باپ دادوں سے باندھا ہے۔ جب ابرہام سے کہا کہ تیری اولاد سے دُنیا کے سارے گھرانے برکت پادیں۔ آہ

اس عبارت میں اوّل حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشارت اور ان کی اس تکلیف کا جوان کو علی زعمہم یہود لعنہم اللہ سے پیش آئی ذکر ہے۔ اور اُن کے نزول من السماء کا تذکرہ ہے۔ اس کے بعد اس نبی کی بشارت کا ذکر ہے کہ جس کے متعلق حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بنی اسرائیل سے مخاطب ہوکر فرمایا تھا۔

خداوند عالم تمہارے بھائیوں یعنی بنی اسماعیل میں سے ایک نبی بھیجنے والا ہے۔ اور علاوہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے تمام نبیوں نے اس نبی موعود کے آنے کی خبر دی ہے۔ اور جب تک یہ دعدہ ظہور میں نہ آئے گا اس وقت تک یہ زمین و آسمان ضرور قائم رہیں گے اور اُسی زمانہ میں خدا کا وہ عہد بھی پورا ہوگا کہ جو اُس نے ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کیا تھا کہ تجھ سے دُنیا کے سارے گھرانے برکت پادیں گے۔

الحاصل حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بشارت کو ذکر کرکے یہ کہنا (سولوی کیں) اور جس نبی کی موسیٰ اور ابراہیم علیہما السلام اور تمام انبیاء کرام علیہم الف الف صلوٰۃ والف الف سلام نے بشارت دی ہے اس کے انتظار کو ان الفاظ سے ظاہر کرنا کہ "ضرور ہے کہ آسمان اس کے لیے رہے کہ اس وقت کہ سب چیزیں کہ جن کا ذکر خدا نے اپنے سب پاک نبیوں کی زبانی شروع سے کیا اپنی حالت پر آدیں" اھ

اس امر کی صاف دلیل ہے کہ یہ نبی مبشر اور رسول منتظر اُن تمام انبیاء ورسل کے علاوہ ہے کہ جو حضرت موسیٰ سے لے کر حضرت عیسیٰ علیہما الصلوٰۃ والسلام تک گزرے۔ لہٰذا اس بشارت کا

مصداق حضرت موسیٰ سے حضرت عیسیٰ کے زمانہ تک کوئی نبی نہیں ہو سکتا" پس حضرت یوشع یا حضرت مسیح بن مریم علیہما السلام کو اس بشارت کا مصداق قرار دینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔

ہشتم یہ کہ انجیل یوحنا باب اول آیت انیسویں میں ہے:

جب یہودیوں نے یروشلم سے کاہنوں اور لاویوں کو بھیجا کہ اس کو پوچھیں کہ تو کون ہے اور اس نے اقرار کیا اور انکار نہ کیا بلکہ اقرار کیا کہ میں مسیح نہیں۔ تب انہوں نے اس سے پوچھا تو اور کون ہے تو الیاس ہے اس نے کہا میں نہیں ہوں، پس آیا تو وہ نبی ہے اس نے جواب دیا نہیں" اھ۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ اُن کو حضرت مسیح اور ایلیا علیہما الصلوٰۃ والسلام کے سوا بھی ایک نبی کا انتظار تھا اور وہ نبی اُن کے نزدیک ایسا معروف و معہود تھا کہ اس کے نام کے ذکر کرنے کی بھی حضرت مسیح اور حضرت ایلیاء کے نام کی طرح حاجت نہ تھی۔ بلکہ فقط "وہ نبی" کا اشارہ ہی اُس کے لیے کافی تھا۔

پس اگر حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام ہی اس بشارت کا مصداق تھے تو پھر اُن کو انتظار کس کا تھا۔

وہ نبی جس کا کہ اُن کو انتظار تھا وہ ہمارے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور اسی وجہ سے کہ اہل کتاب نبی اکرم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے " وہ نبی" کا لفظ استعمال کرتے تھے۔ اسی لیے ہمیشہ سے اہل اسلام نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو آنحضرت (جو بعینہٖ وہ نبی کا ترجمہ ہے) بولتے ہیں۔

نہم یہ کہ انجیل یوحنا باب ہفتم کی آیت چہلم سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے کہ نبی موعود حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ ہے چنانچہ انجیل میں ہے:

۴۰۔ تب اُن لوگوں میں سے بہتیروں نے یہ سُن کر فی الحقیقت یہی وہ نبی ہے۔ اوروں نے کہا یہ مسیح ہے اھ۔

نبی معہود کو حضرت مسیح کے مقابلہ میں ذکر کرنا اس کی کھلی ہوئی دلیل ہے کہ وہ نبی معہود حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے علاوہ ہے۔ پس اگر "وہ نبی" سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراد نہ ہوں تو پھر وہ کون نبی ہے کہ جس کا انتظار تھا۔

دہم، آپ کے عہدِ نبوت میں بہت سے علماءِ یہود و نصاریٰ نے اس امر کا اعتراف کیا کہ

آپ وہی نبی برحق ہیں جن کی موسیٰ علیہ السلام نے بشارت دی ہے اور آپ ہی اس بشارت کے مصداق ہیں بعدازاں ان میں سے بہت سے اسلام لائے جیسے مخیریق یہودی اور ضغاطر رومی عیسائی اور بہت سوں نے اقرار کیا مگر اسلام نہیں لائے جیسے ہرقل شاہ روم اور عبداللہ بن صوریا یہودی وغیرہما نے اقرار کیا کہ آپ وہی نبی برحق ہیں جن کی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ نے بشارت دی ہے مگر اسلام نہیں لائے۔

بشارت دوم

از تورات کتاب پیدائش باب ۱۷، آیت بستم[20]

اسمٰعیل کے حق میں میں نے تیری سُنی، دیکھ میں اُسے برکت دوں گا اور اُسے برومند کروں گا۔ اور اُسے بہت بڑھاؤں گا اور اُس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے اور میں اُس سے بڑی قوم بناؤں گا اور اسی باب کی آٹھویں آیت میں ہے۔

اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے دیتا ہوں اھ۔

اور کتاب پیدائش کے باب ۱۶ آیت ۱۱ میں ہے۔

خداوند کے فرشتہ نے اُسے (ہاجرہ) کہا کہ تو حاملہ ہے اور ایک بیٹا جنے گی اس کا نام اسمٰعیل رکھنا خدا نے تیرا دکھ سن لیا وہ وحشی آدمی ہوگا اس کا ہاتھ سب سے (اوپر ہوگا) اور سب کے ہاتھ اس کے برخلاف ہوں گے اور وہ اپنے سب بھائیوں کے سامنے بود و باش کرے گا۔ انتہی

اور باب ۲۵ آیت ۱۱ میں ہے۔

آپ کے فرزند اسحاق کو اللہ نے برکت دی اھ

الحاصل حق تعالیٰ شانہ نے حضرت ابراہیم سے حضرت اسحاق اور حضرت اسمٰعیل علیہم الصلوٰۃ والسلام کی بابت وعدہ فرمایا کہ ان کو برکت دوں گا چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ اوّل حضرت اسحاق کی اولاد نے برکت حاصل کی اور تقریباً کئی ہزار سال تک سلسلۂ نبوّت و رسالت آپ کی اولاد میں جاری رہا اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام تک برابر حضرت اسحاق کی اولاد میں انبیاء و رسل ہوتے رہے۔ بعدازاں جب دوسرے وعدہ کا وقت آگیا تو شرف نبوّت و رسالت یکسر بنی اسرائیل

سے بنی اسمٰعیل کی جانب منتقل ہوگیا اور دعائے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ظہور فاران کی چوٹیوں سے اور سینا اور ساعیر کا نور فاران پر جگمگانے لگا۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاءُ واللہ ذوالفضل العظیم۔

تورات سفرِ پیدائش باب ۲۱ سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کو حجاز میں لے کر آئے اور وادیٔ فاران میں مکہ مکرمہ کے قریب چھوڑ کر واپس ہو گئے۔

حضرت سارہ کے وصال کے بعد حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم پھر اُسی وادیٔ فاران میں واپس تشریف لائے۔ اس عرصہ میں حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام جوان ہو چکے تھے۔ دونوں نے مل کر کعبۃ اللہ کی تعمیر شروع کی کما قال تعالیٰ تبارک وتعالیٰ۔

واذ یرفع ابراھیم القواعد من البیت واسمٰعیل۔ ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم، ربنا واجعلنا مسلمین لک ومن ذریتنا اُمۃ مسلمۃ لک۔

اس وقت کو یاد کر جب حضرت ابراہیم اور حضرت اسمٰعیل علیہما السلام بیت اللہ کی بنیادیں اُٹھا رہے تھے اور یہ دُعا مانگتے تھے کہ اے پروردگار یہ خدمت تو ہم سے قبول فرما تو بے شک سننے والا اور جاننے والا ہے اور اے پروردگار ہم کو اور ہماری ذریت سے ایک جماعت کو اپنا فرمانبردار بنا۔

ناظرین غور فرمائیں کہ اس مقام پر کس کی ذریت مراد ہے۔ ظاہر ہے کہ حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ذریت مراد ہے جو کہ وادیٔ فاران اور حرم الٰہی اور کعبۃ اللہ کے آس پاس مقیم ہے۔ اسی ذریت کے لیے حضرت ابراہیم نے اوّل یہ دُعا فرمائی ربنا واجعلنا الخ اور دوسری دُعا یہ فرمائی۔

ربنا وابعث فیھم فی ھذہ الذریۃ ذریۃ ھاجرہ واسمٰعیل علیہما الصلوٰۃ والسلام رسولا منھم یتلو علیھم ایتک ویعلمھم الکتب والحکمۃ ویزکیھم انک انت العزیز الحکیم۔

اے پروردگار ہاجرہ اور اسمٰعیل کی ذریت میں ایک ایسا رسول بھیج جو تیری کتاب کی تلاوت کرے اور لوگوں کو کتاب وحکمت کی تعلیم دے اور ان کو کفر اور شرک سے پاک کرے بے شک تو ہی غالب اور حکیم ہے۔

حق تعالیٰ نے جس طرح قرآن کریم میں اس دعائے ابراہیمی کا ذکر فرمایا ہے اسی طرح اس کی اجابت کا بھی تذکرہ فرمایا ہے۔

ھوالذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا علیھم ایتہ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلل مبین۔

اللہ ہی نے بے پڑھوں میں ان ہی میں کا ایک رسول بھیجا جو ان پر خدا کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور اُن کو پاک کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور وہ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں مبتلا تھے۔

خلاصہ

یہ کہ قارئین کرام اس پر غور کریں کہ اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم سے زائد کون بابرکت اور بردمند ہوا اور کنعان کی زمین کس کی وراثت میں آئی اور حضور پرنور کے سوا کون ہے کہ جس کا ہاتھ سب کے اوپر ہوا ہو اور زمین کے خزانوں کی کنجیاں اس کے ہاتھ میں دی گئی ہوں۔

اور بارہ سرداروں سے بارہ خلفا مراد ہیں کما قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم:

یدور رحی الاسلام الی اثنی عشر خلیفۃ کلھم من قریش

اسلام کا رحیٰ (چکی) بارہ۱۲ خلفاء پر گھومے گا جو سب کے سب قریش سے ہوں گے۔

فائدہ جلیلہ

اس علیم و حکیم نے اپنی حکمت بالغہ سے اسحٰق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد کو اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد پر برکت دینے میں اس وجہ سے مقدم رکھا کہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں خاتم النبیین سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیدا ہونے والے تھے پس اگر حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وعدہ کو مقدم کر دیا جاتا تو پھر اسحٰق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد سے سلسلۂ نبوت و رسالت منقطع ہو جاتا اس لیے خاتم الانبیاء والمرسلین کے بعد کوئی نبی و رسول نہیں بنایا جا سکتا۔

اور اسی وجہ سے کہ اسحاق علیہ الصلوٰۃ والسلام کی اولاد میں بکثرت نبی ہوں گے تو بنی اسرائیل کو اس انعام کی تذکیر ان الفاظ سے کی گئی۔

اذ جعل فیکم انبیاء　 تم میں سے حق تعالیٰ نے بہت نبی پیدا کیے،
اور حضرت ابراہیم نے جو حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کے لیے دُعا فرمائی تو یہ فرمایا
"ربنا وابعث فیھم رسولاً یعنی اے پروردگار ان میں ایک عظیم الشان رسول بھیج"
اور یہ نہیں فرمایا ربنا وابعث فیھم رسلاً یعنی اے اللہ ان میں بہت سے رسول اور نبی بھیج۔"
جس سے صاف یہی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام بنی اسمٰعیل میں سے صرف ایک ایسے رسول کے مبعوث ہونے کی دُعا فرماتے تھے کہ جس کے آنے کے بعد کسی نبی اور رسول کی حاجت نہ رہے۔ صیغہ مفرد کے ساتھ ذکر فرمایا رُسلاً صیغہ جمع کے ساتھ نہیں ذکر فرمایا۔

وعن ابی العالیہ فی قولہ تعالیٰ ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم یعنی امۃ محمد صلی اللہ علیہ وسلم فقیل لہ قد استجیب لک وھو کائن فی اٰخر الزمان وکذا قال السدی وقتادہ (تفسیر ابن کثیر ص ۱۳۱ ج ۱)
ابوالعالیہ سے مروی ہے کہ جب حضرت ابراہیم نے یہ دعا فرمائی ربنا وابعث فیھم رسولاً منھم تو اللہ کی جانب سے یہ کہا گیا کہ تمہاری دُعا قبول ہوئی۔ یہ پیغمبر اخیر زمانہ میں ہوگا ایسا ہی سدی اور قتادہ سے مروی ہے۔

ھو کائن فی اٰخر الزمان سے خاتم النبیین ہونا مراد ہے اور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد انا دعوۃ ابی ابراھیم یعنی میں اپنے باپ ابراہیم کی دُعا ہوں" اسی طرف مشیر ہے۔
اور اسی وجہ سے کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی یہ دُعا اُمت محمدیہ پر عظیم الشان احسان ہے۔ اللھم صلی علیٰ محمد کے بعد کما صلیت علیٰ ابراھیم وعلیٰ اٰل ابراھیم کا پڑھنا اس احسان کے شکر میں اُمت پر لازم ہوگیا۔
یا یہ کہا جائے کہ تمام انبیاء و رسل میں سے حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو صلوٰۃ والسلام کے لیے مخصوص کرنا اُن کی اس دُعا کی اجابت ہے "رب ھب لی حکماً والحقنی بالصالحین واجعل لی لسان صدق فی الاٰخرین۔ چنانچہ حق تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو علم و حکمت بھی عطا فرمائی اور صالحین میں بھی داخل فرمایا اور آخر میں یعنی اس آخری اُمت میں کما صلیت علیٰ ابراھیم کے ذریعہ سے اُن کا ذکر خیر جاری فرمایا۔ اور ان شاء اللہ العزیز الیٰ یوم القیامۃ اسی طرح جاری

رہے گا اللّٰھم صلّ علیٰ محمد و علیٰ اٰل محمد کما صلیت علیٰ ابراھیم و علیٰ اٰل ابراھیم انک حمید مجید۔

اور چونکہ حضرت ابراہیم سے برکت دینے کا وعدہ تھا اس لیے کما بارکت کا اور اضافہ کر دیا گیا۔

اور عجب نہیں کہ آن بارہ سرداروں سے کہ جن سے خلفاء مراد لیے گئے ختم نبوت کی طرف اشارہ ہو یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد نبوت و رسالت کا سلسلہ جاری نہ رہے گا بلکہ خلافت و نیابت کا سلسلہ جاری ہو گا اور اسی وجہ سے حق تعالیٰ نے اُمت سے صرف خلافت کے جاری رکھنے کا وعدہ فرمایا۔ نبوت و رسالت کا کسی درجہ میں بھی وعدہ نہیں فرمایا کما قال تعالیٰ،

وعد اللہ الذین اٰمنوا منکم و عملوا الصلحٰت لیستخلفنکم فی الارض

وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم خلافۃ النبوۃ بعدی ثلاثون عاما

و قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانت بنو اسرائیل تسوسھم الانبیاء کلما ھلک نبیٌّ خلفہ نبیٌّ و انہٗ لا نبیَّ بعدی سیکون خلفاء رواہ البخاری۔

جو لوگ ایمان لا چکے اور جنہوں نے عمل صالح کیے اُن سے اللہ تعالیٰ نے خلافت دینے کا وعدہ فرمایا ہے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نبوت کی خلافت میرے بعد تیس سال رہے گی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ بنی اسرائیل کا انتظام ان کے نبی کیا کرتے تھے جب کوئی نبی گزر جاتا تو دوسرا نبی اُس کے قائمقام ہو جاتا تھا لیکن میرے بعد کوئی نبی نہیں البتہ خلفاء ہوں گے۔ (بخاری)

بشارت سوم

از توراۃ سفر استثناء باب ۳۳ آیت ۲

جاء الرب من سیناء و اشرق لھم من ساعیر و تلالأ من جبال فاران و اتی من ربوات القدس و عن یمینہ نار شریعۃ اھ

اور الجواب الفسیح میں بعض نسخ توراۃ سے اس طرح نقل کیا ہے۔

جاء الرب من سیناء و اشرق لنا من ساعیر و استعلن من جبال فاران اھ

اور اُردو نسخہ میں اس طرح ہے۔ اور اُس نے (یعنی موسیٰ علیہ السلام) نے کہا کہ خداوند سینا

سے آیا اور سعیر سے اُن پر طلوع ہوا۔ فاران ہی کے پہاڑ سے وہ جلوہ گر ہوا۔ دس ہزار قدسیوں کے ساتھ آیا اور اُس کے داہنے ہاتھ میں ایک آتشی شریعت اُن کے لیے تھی اھ

اس آیت میں

تین بشارتیں مذکور ہیں ۱۔ طور سینا پر حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات کا عطا ہوا مراد ہے۔ ۲۔ اور ساعیر ایک پہاڑی کا نام ہے کہ جو شہر ناصرہ مولد عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام میں واقع ہے اس سے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت اور نزول انجیل کی طرف اشارہ ہے۔ ۳۔ اور فاران سے مکہ کے پہاڑ مراد ہیں۔ اس سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت اور نزول قرآن کی جانب اشارہ ہے۔

غار حرا اسی فاران پہاڑ میں واقع ہے جس میں سب سے پہلے اقرا باسم ربک کی ابتدائی پانچ آیتیں آپ پر نازل ہوئیں توریت کتاب پیدائش کے اکیسویں باب ورس ۲۰ میں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کے ذکر میں ہے۔

۲۰۔ اور خدا اس لڑکے کے ساتھ تھا اور وہ بڑھا اور بیابان میں رہا کیا اور تیر انداز ہو گیا۔

۲۱۔ اور وہ فاران کے بیابان میں رہا۔ انتہی

اور حضرت اسمٰعیل کی سکونت کا مکہ مکرمہ میں ہونا سب کو مسلم ہے۔ معلوم ہوا کہ توریت کی اس آیت میں اُس نبوت کی بشارت ہے جو فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہو گی اور کوہ ودشت کو اپنے نور سے بھر دے گی اب ناظرین خود دیکھ لیں کہ سوائے نبوت محمدیہ کے وہ کون سی نبوت ہے کہ جو فاران سے ظاہر ہوئی اور اس نے تمام عالم کو انوار ہدایت سے منور کر دیا۔ فاران کی نبوت بلاشبہ سینا اور ساعیر کی نبوت سے کہیں زیادہ روشن تھی۔ اور آتشی شریعت سے بھی قرآن کریم مراد ہے اس لیے کہ وہ احکام جہاد اور احکام حدود و قصاص پر مشتمل ہے اور دس ہزار قدوسیوں سے لشکر ملائک مراد ہے۔ یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا فتح مکہ کے وقت دس ہزار صحابہ کے ساتھ مکہ پر حملہ کرنا مراد ہے۔ اور حضرت مسیح کے ساتھ بقول نصاریٰ صرف بارہ حواری تھے اور وہ بھی سب جان بچا کر بھاگ گئے اور ایک خاص حواری یہودا نے تیس درم رشوت لے کر اپنے خداوند کو گرفتار کرا دیا تھا۔

اور اس بشارت کی حسن ترتیب اور حسن بیان قابل غور ہے۔ اوّل یہ فرمایا جاء الرب

من سیناء خداوند سینا سے آیا اور اس کے بعد یہ فرمایا ؛ اشرق من ساعیر ، سعیر سے طلوع ہوا اور اخیر میں یہ فرمایا واستعلن من جبال فاران فاران کے پہاڑ سے جلوہ گر ہوا۔ جس سے مقصد یہ ہے کہ نزول تورات بمنزلہ طلوع فجر کے ہے اور نزول انجیل بمنزلہ طلوعِ شمس کے ہے اور نزول قرآن بمنزلہ استوار شمس فی نصف النہار ہے۔

چنانچہ ایسا ہی ہوا کہ کفر کی تاریک شب کا خاتمہ اور پہلی پھٹ کر ایمان و ہدایت کی صبح صادق کا ظہور حضرت موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں ہوا اور فرعون اور قارون اور ہامان جیسے ائمۃ الکفر عذاب الٰہی سے ہلاک ہوتے۔

اور جب حضرت مسیح بن مریم علیہما الصلوٰۃ والسلام کا ظہور ہوا تو آفتاب ہدایت بھی افق مشرق پر ظاہر ہوا۔ اور جب نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور ہوا تو آفتاب ہدایت ٹھیک نصف النہار پر آگیا اور کوئی چپہ زمین کا ایسا باقی نہ رہا کہ جہاں اس آفتاب کی روشنی نہ پہنچی ہو اور قرآن عزیز میں بھی اس بشارت کی طرف اشارہ ہے۔

والتین والزیتون و طور سینین و ھذا البلد الامین

تین اور زیتون چونکہ ارض مقدس میں پیدا ہوتے ہیں جس جگہ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پیدا ہوتے اس لیے اس سے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی رسالت کی جانب اشارہ ہے اور بلد امین سے مراد مکہ مکرمہ مراد ہے کہ جس سے آفتاب نبوت و رسالت کا طلوع ہوا۔

حق تعالیٰ شانہٗ نے مکہ کی صفت الامین ذکر فرمائی ہے جس سے اشارہ اس امر کی طرف ہے کہ سرورِ عالم سیدنا محمد صلی اللہ علیہ وسلم خزانۂ الٰہی کے دُرِّ یتیم ہیں کہ بطورِ امانت اس بلد امین کے سپرد کیے گئے ہیں۔ بلد امین نے ترپن سال تک اس دُرِّ یتیم اور امانت الٰہی کی حفاظت کی مگر جب وقت بہت ہی نازک ہو گیا تو اس وقت بلد امین نے بادلِ خواستہ یہ امانت مدینہ طیبہ کے سپرد کر دی، کذا فی ھدایۃ الحیاریٰ۔

الحاصل

اس کلام میں تین پیغمبروں کی بشارتیں دی گئیں اور بشارت کا اختتام خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک پر ہوا تاکہ ختم نبوت کی طرف اشارہ ہو جائے۔

مخالفین کہتے ہیں کہ فاران سیناء کے ایک علاقہ کا نام ہے۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ

اس علاقہ میں ظاہر نہیں ہوتے اس لیے یہ بشارت اُن کے حق میں نہیں ہو سکتی۔ جواب یہ ہے کہ تورات کتاب پیدائش باب اکیسواں از ورس ۱۳ تا ورس ۲۱ میں لکھا ہے کہ بی بی ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل بی بی سارہ کے ناراض ہو جانے سے ارض مقدس کو چھوڑ کر دشت فاران میں سکونت پذیر ہوئے جس کی بنا پر فاران وہی مقام ہوگا جو حضرت اسمٰعیل اور ان کی اولاد کا سکونت گاہ ثابت ہوا۔ اور یہ امر روایات متواترہ سے ثابت ہے کہ بی بی ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل وادی حجاز کے اُس میدان میں مقیم ہوتے جہاں اس وقت مکہ آباد ہے اور یہیں آپ کی اولاد بھی قیام پذیر ہوئی معلوم ہوا کہ فاران علاقہ سینا کے کسی پہاڑ کا نام نہیں بلکہ مکہ مکرمہ کے پہاڑ کا نام ہے۔ جہاں حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل کی سکونت تھی۔

سامری تورات کے عربی ترجمہ میں جس کو علمائے جرمن نے ۱۸۵۱ء میں بمقام گاٹنگن چھپوایا ہے حضرت اسمٰعیل کی سکونت گاہ کے متعلق تحریر ہے وسکن فی بریۃ فاران (ای الحجاز) واخذت لہ امرأۃ من ارض مصر (کون الدنیا ۲۱-۲۲)

حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام سموئیل نبی کی وفات کے بعد دشت فاران میں تشریف لے گئے اور وہاں آپ نے ایک زبور تصنیف کیا جس میں نہایت افسوس کے ساتھ فرماتے ہیں کہ میں قیدار کے قیام گاہ میں سکونت پذیر ہوں دیکھو سموئیل نبی کی پہلی کتاب باب ۲۵ ورس یکم اور دیکھو زبور ۱۲۰ ورس پنجم۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ قیدار فاران میں رہتا تھا۔ قیدار حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے دوسرے فرزند ہیں۔ اشعیاء پیغمبر کے صحیفہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ اور اس کی اولاد مغربی ملک میں رہتی تھی۔ بطلیموس نے حجاز کا وسطی علاقہ اُس کی جائے سکونت بتلاتا ہے۔ اس بنا پر یہ امر ثابت ہے وادی حجاز اور فاران دونوں ایک ہی مقام ہیں جناب رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور مکہ میں ہوا جو حجاز کا مشہور شہر ہے کذا فی البشارات الاحمدیۃ[1] اور آتشی شریعت سے مراد یہ ہے کہ وہ شریعت احکام جہاد و قصاص و حدود و تعزیرات پر مشتمل ہوگی اور اس کی نبوت دنیاوی بادشاہت ساتھ لیے ہوگی اور حضرت عیسٰی کی نبوت دنیاوی بادشاہت کو ساتھ لیے ہوئے نہ تھی اور نہ وہ مجرمین سے انتقام پر قادر تھے۔

---

[1] یہ رسالہ جناب حکیم سید محمد شمس اللہ صاحب قادری حیدرآبادی کی تصنیف ہے رسالہ کل (۳۲) صفحہ کا ہے اور مفید و مختصر ہے۔

بشارت چہارم

از تورات سفر استثنار باب ۳۲ آیت ۲۱

انہوں نے اس کے سبب سے جو خدا نہیں مجھے غیرت دلائی اور اپنی واہیات باتوں سے مجھے غصہ دلایا، سو میں بھی انہیں اُس سے جو گروہ نہیں غیرت میں ڈالوں گا اور ایک بے عقل قوم سے انہیں خفا کروں گا۔ اھ

اس بشارت میں بے عقل قوم سے جہلائے عرب مراد ہیں کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے قبل جہالت اور گمراہی میں مبتلا تھے۔

علوم عقلیہ و شرعیہ سے واقفیت تو درکنار اُن کو تو سوائے بت پرستی کے اور کسی شئ کا علم نہ تھا۔ یہود و نصاریٰ اُن کو بہت حقیر جانتے تھے۔ اُن کو جاہل اور اپنے کو عالم کہتے تھے۔

لیکن جب یہود و نصاریٰ نے تورات و انجیل کی اصلی تعلیم کو بھلا دیا اور بجائے توحید کے شرک میں مبتلا ہو گئے کما قال تعالیٰ شانہ، وقالت الیھود عزیر ابن اللہ وقالت النصاریٰ المسیح ابن اللہ

یہود نے عزیر علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اور نصاریٰ نے عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو خدا اور خدا کا بیٹا بنالیا۔ اُس وقت غیور مطلق حق جل جلالہ کی غیرت جوش میں آئی اور حسب وعدہ انہیں جہلاء اور امیین میں سے ایک نبی اُمی۔ فداہ نفسی ابی و امی کو مبعوث فرمایا۔ جس کے ہاتوں اپنے دین کو عزت دی اور یہود بے بہبود کو اُن کے ہاتوں قتل کرایا اور مصر و شام پر ان کا قبضہ کرایا کما قال تعالیٰ،

یُسَبِّحُ لِلّٰہِ ما فی السمٰوٰت وما فی الارض الملک القدوس العزیز الحکیم، ھو الذی بعث فی الامیین رسولاً منھم یتلوا علیھم اٰیتہٖ ویزکیھم ویعلمھم الکتب والحکمۃ وان کانوا من قبل لفی ضلال مبین ۔

تمام آسمان اور زمین کی چیزیں خدائے بادشاہ پاک زبردست حکمت والے ہی کی تسبیح و تقدیس پڑھتی ہیں۔ اُسی خداوند قدوس نے ناخواندوں میں سے ایک رسول کو مبعوث فرمایا جو اُن پر اللہ کی آیتوں کی تلاوت کرتا ہے اور کتاب و حکمت کی تعلیم دیتا ہے اور بے شک وہ لوگ اس سے پہلے کھلی گمراہی میں تھے۔

امیین سے عربوں کی جاہل قوم مراد ہے اور عیسیٰ علیہ السلام اور یوشع علیہ السلام کی قوم جاہل اور حقیر نہ تھی اور نہ بنی اسرائیل کو ان سے غیرت دلائی گئی ہے۔ پس یہ بشارت سوائے قوم

عرب سے کسی قوم پر صادق نہیں آتی۔
باقی بے عقل قوم اور شعب[1] جاہل سے یونانیین مراد لینا کہ پولوس کے رسالہ رومیہ سے مترشح ہوتا ہے صحیح نہیں اس لیے کہ یونانیین تو اُس زمانہ میں علوم و فنون کے اعتبار سے تمام عالم پر فائق تھے وہ شعب جاہل اور بے عقل قوم کا کیسے مصداق ہو سکتے ہیں۔ سقراط، بقراط، فیساغورس، افلاطون جالینوس، ارسطاطالیس، ارشمیدس، بلیناس، اقلیدس یہ سب کے سب حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تشریف آوری اور بعثت سے کئی صدی قبل تمام علوم و فنون کے ماہر اور احکام توراۃ کے پورے عالم تھے۔

بشارت پنجم

از توراۃ سفر پیدائش باب ۴۹
۱۔ اور یعقوب نے اپنے بیٹوں کو بلایا اور کہا کہ اپنے کو جمع کرو تاکہ میں اس کی جو پچھلے دنوں تم پر بیتنے گا تمہیں خبر دوں۔ ۲۔ اے یعقوب کے بیٹو اپنے کو اکٹھا کرو اور سنو اور اپنے باپ اسرائیل کی سنو اور پھر آیت دہم میں ہے۔
یہوداہ سے ریاست کا عصا جدا نہ ہوگا اور نہ حاکم اُس کے پاؤں کے درمیان سے جاتا رہے گا جب تک کہ شیلا نہ آدے اور قومیں اُس کے پاس اکٹھی ہوں گی انتہا
آیات مسطورہ میں اس امر کی خبر دی گئی ہے کہ جب تک کہ اخیر زمانہ میں شیلا کا ظہور نہ ہو اس وقت تک یہوداہ کی نسل سے حکومت و ریاست منقطع نہ ہوگی۔
اہل اسلام کے نزدیک شیلا، آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا لقب ہے۔ نصاریٰ حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا لقب قرار دیتے ہیں مگر نصاریٰ کا یہ خیال صحیح نہیں اس لیے کہ اس عبارت کا سیاق اس کو مقتضی ہے کہ شیلا کو نسل یہوداہ سے خارج مانا جائے اس لیے کہ شیلا کے ظہور سے نسل یہوداہ کی حکومت و ریاست کا انقطاع جب ہی مقصود ہو سکتا ہے کہ جب شیلا نسل یہوداہ سے نہ ہو ورنہ اگر شیلا نسل یہوداہ سے ہو تو اس کا ظہور تو بقائے حکومت یہوداہ کا باعث ہوگا نہ کہ انقطاع حکومت یہوداہ کا۔

---

[1] یہ لفظ عربی نسخوں میں ہے ۱۲ منہ

اور بائیبل کے ابواب بلکہ انجیل متی کے پہلے ہی صفحہ پر ذرا غور کرنے سے یہ بات بخوبی منکشف ہو سکتی ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام نسل یہوداہ سے خارج نہیں اس لیے کہ آپ حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسل سے ہیں اور حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام بالاجماع یہوداہ کی نسل سے ہیں۔

لہٰذا شیلا کا مصداق وہی نبی ہو سکتا ہے جو نسل یہوداہ سے خارج ہو اور اس کا ظہور آخیر زمانہ میں ہو جیسا کہ آیت اوّل کے اس جملے سے ظاہر ہے۔

"تاکہ میں اُس کی جو پچھلے دنوں میں تم پر بیتے گا تمہیں خبر دوں"

اور یہ دونوں امر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر صادق آسکتے ہیں کہ آپ یہوداہ کی نسل سے بھی نہ تھے بلکہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کی نسل سے تھے اور آپ کا ظہور بھی خاتم النبیین ہونے کی وجہ سے اخیر زمانہ میں ہوا۔

اور آپ کی بعثت کے بعد سے یہودا کی نسل میں جو کچھ حکومت و ریاست تھی وہ سب جاتی رہی قریظہ۔ بنی نضیر اور خیبر سب آپ ہی کے زمانہ میں فتح ہو گئے اور اس جملہ میں کہ

"قومیں اس کے پاس اکٹھی ہوں گی"

عموم بعثت کی طرف اشارہ ہے کما قال اللہ تعالیٰ شانہ،

قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً،

اے نبی کہہ دیجئے کہ اے لوگو میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔"

بخلاف حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے کہ آن کی بعثت صرف بنی اسرائیل کے لیے تھی۔ کما قال تعالیٰ شانہ ورسولاً الی بنی اسرائیل۔ نیز مختلف قومیں اور مختلف لوگ حضور پُر نور ہی کے پاس اکٹھے ہوتے اور آپ کے دین میں فوج فوج اور جوق جوق داخل ہوتے۔ یہ بات حضرت عیسٰی علیہ السلام کو حاصل نہیں ہوئی۔ اور گیارھویں آیت میں ہے:

"وہ اپنا گدھا انگور کے درخت سے باندھے گا۔"

سو مدارج النبوۃ میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر فتح فرمایا تو وہاں ایک سیاہ حمار دیکھا۔ آپ نے اس سے کلام فرمایا اور اس کا نام دریافت فرمایا اس نے جواب دیا کہ میرا نام یزید بن شہاب ہے۔ حق تعالیٰ نے میری دادی کی نسل سے ساٹھ حمار پیدا کیے جس پر سوائے نبی کے کسی نے سواری نہیں کی اور مجھ کو اُمید ہے کہ آپ مجھ پر سواری فرمائیں گے میری دادی کی نسل سے میرے سوا اب کوئی باقی نہیں رہا اور انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام میں سے آپ کے، سوا کوئی باقی

نہیں رہا۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس پر سواری فرمائی اور وہ حمار آپ کی وفات کے بعد صدمہ زدہ حال سے ایک کنویں میں گر کر مر گیا۔

اور اسی گیارھویں آیت میں ہے:

"وہ اپنا لباس مئے میں اور اپنی پوشاک آب انگور میں دھوئے گا۔"

اس آیت میں اصل عبرانی سے ترجمہ کرنے میں کچھ تصرف کیا گیا ہے۔

"وہ اپنا لباس مئے سے اور اپنی پوشاک آب انگور سے دھوئے گا۔"

یعنی اُس نبی آخر الزماں کی شریعت میں شراب حرام کی جائے گی اور جس طرح دیگر نجاست سے کپڑوں کے دھونے کا حکم دیا جاتا ہے اسی طرح شراب سے بھی کپڑوں کے پاک رکھنے اور دھونے کا حکم دیا جائے گا۔

اور عجب نہیں کہ اس سے محبت الٰہی کی شراب میں استغراق مراد ہو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو بہت ارفع ہے۔ آپ تو سید الاولین والآخرین بلا فخر ہیں۔ آپ کی اُمت میں ہزارہا بلکہ لاکھوں ایسے گزر گئے کہ عشق الٰہی اور محبت ربانی میں کوئی اُمت اُن کی ہمسری نہیں کر سکتی۔"

اور پھر بارہویں آیت میں ہے:

"اس کی آنکھیں مئے سے لال ہوں گی اور اس کے دانت دودھ سے سفید ہوں گے"

اس آیت میں اُسی نبی مبشر کے حلیہ مبارک کی طرف اشارہ ہے کہ اُس کی آنکھیں سُرخ اور دانت سفید ہوں گے۔ چنانچہ زرقانی شرح مواہب میں ہے کہ جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم تجارت کے لیے بُصریٰ تشریف لے گئے تو ایک سایہ دار درخت کے قریب قیام فرمایا جہاں نسطورا راہب کا تکیہ تھا۔ نسطورا راہب نے میسرہ غلام سے جو آپ کے ہمراہ تھا یہ دریافت کیا کہ آپ کی آنکھوں میں سُرخی ہے۔ میسرہ نے یہ جواب دیا کہ آپ کی آنکھوں میں ہمیشہ سُرخی رہتی ہے کبھی جُدا نہیں ہوتی۔ اس وقت نسطورا راہب نے یہ کہا کہ یہ آخری پیغمبر ہیں۔ کاش میں اُن کی بعثت کا زمانہ پاؤں۔

شیخ جلال الدین سیوطی رحمہ اللہ تعالیٰ نے تاریخ مصر میں لکھا ہے کہ جب حضرت حاطب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا والا نامہ سلطان مقوقس شاہ مصر کے نام لے کر گئے تو شاہ مصر نے نبی آخر الزمان کی علامات بیان کرتے ہوتے یہ کہا کہ سُرخی اُن کی آنکھوں سے جُدا نہیں ہوتی۔ حضرت حاطب نے فرمایا کہ بے شک آپ کی چشمان مبارک سے سُرخی کبھی جُدا نہیں ہوتی۔ چنانچہ آپ کے شمائل میں

اشکل العینین کا لفظ آیا ہے۔ اَشکَل ایسی آنکھ والے کو کہتے ہیں کہ جس کی سفیدی میں سُرخ ڈورے ہوں۔ اور بعض روایات میں اَدعَج کا لفظ آیا ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ جس کی آنکھ میں سیاہی ہو۔ سو دونوں روایتوں میں کوئی تعارض نہیں حسن جمال کے لیے سُرخی اور سیاہی دونوں درکار ہیں۔ محض سُرخی اور محض سیاہی سے اتنا حسن پیدا نہیں ہوتا جتنا کہ سُرخی اور سیاہی سے مل کر پیدا ہوتا ہے۔

بشارت ششم

از زبور سیدنا داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام باب ۴۵

میرے دل میں اچھا مضمون جوش مارتا ہے میں اُن چیزوں کو جو میں نے بادشاہ کے حق میں بنائی ہیں بیان کرتا ہوں۔ میری زبان ماہر لکھنے والے کا قلم ہے ۔۲۔ تو حسن میں بنی آدم سے کہیں زیادہ ہے۔ تیرے ہونٹوں میں لطف بٹایا گیا ہے اسی لیے خدا نے تجھ کو ابد تک مبارک کیا۔ ۳۔ اے پہلوان اپنی تلوار کو جو تیری حشمت اور بزرگواری ہے حمایل کر کے اپنی ران پر لٹکا۔ ۴۔ اور اپنی بزرگواری سے سوار ہو اور سچائی اور ملائمت اور صداقت کے واسطے اقبال مندی کے لیے آگے بڑھ۔ اور تیرا داہنا ہاتھ تجھ کو مہیب کام سکھلائے گا۔ ۵۔ تیرے تیر تیز ہیں، لوگ تیرے نیچے گرے پڑتے ہیں۔ وہ بادشاہ کے دشمنوں کے دل میں لگ جاتے ہیں۔ ۶۔ تیرا تخت اے خدا ابدالآباد ہے۔ تیری سلطنت کا عصا۔ راستی کا عصا ہے۔ ۷۔ تو صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہے۔ اس سبب سے تیرے خدا نے تجھ کو خوشی کے تیل سے تیرے مصاحبوں سے زیادہ مسیح کیا۔ ۸۔ تیرے سارے لباس سے مُر اور عود اور تج کی خوشبو آتی ہے کہ جن سے ہاتھی دانت کے محلوں کے درمیان تجھ کو خوش کیا ہے ۹۔ بادشاہوں کی بیٹیاں تیری عزت والیوں میں ہیں، ملکہ اوفیر کے سونے سے آراستہ ہوکے تیرے داہنے ہاتھ کھڑی ہے۔"

اور بارہویں آیت میں ہے ۔

"اور صور کی بیٹی ہدیے لاوے گی۔ قوم کے دولت مند تیری خوشامد کریں گے"

اور سولھویں آیت میں ہے ۔

۱۶۔ تیرے بیٹے باپ دادوں کے قائمقام ہوں گے تو انہیں تمام زمین کا

سردار مقرر کرے گا۔ ۱۷۔ میں ساری پشتوں کو تیرا نام یاد دلاؤں گا اور سارے لوگ ابدالآباد تک تیری ستائش کریں گے انتہیٰ۔ تمام اہل کتاب کے نزدیک یہ امر مسلّم ہے۔

کہ اس زبور میں حضرت سیدنا داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام ایک عظیم الشان والشوکت رسول کی بشارت دے رہے ہیں اور فرطِ محبت میں اُس کو مخاطب بنا کر اس کے اوصاف بیان فرما رہے ہیں اور یہ بتلا رہے ہیں کہ وہ نبی جب ظاہر ہو گا تو ان صفات کے ساتھ موصوف ہو گا۔ وہ اوصاف حسبِ ذیل ہیں :

۱۔ بادشاہ یعنی سب سے اعلیٰ اور افضل ہونا۔ ۲۔ حسین ہونا۔ ۳۔ ہونٹوں میں لُطف کا ہونا یعنی شیریں زبان اور فصیح اللسان ہونا۔ ۴۔ مبارک الی الدہر ہونا۔ ۵۔ پہلوان یعنی قوی ہونا۔ ۶۔ شمشیر بند ہونا۔ ۷۔ صاحب حق وصداقت ہونا۔ ۸۔ اقبال مند ہونا۔ ۹۔ اُس کے دائیں ہاتھ سے کسی عجیب و غریب کرشمہ کا ظاہر ہونا۔ ۱۰۔ تیرانداز ہونا۔ ۱۱۔ لوگوں کا اس کے نیچے گر پڑنا یعنی خلق اللہ کا اُس کے تابع ہونا۔ ۱۲۔ تخت کا ابدالآباد تک رہنا یعنی اس کی شریعت اور حکومتِ اسلام کا تا قیامِ قیامت باقی رہنا ۱۳۔ عصائے سلطنت کا عصائے راستی ہونا۔ ۱۴۔ صداقت کا دوست اور شرارت کا دشمن ہونا۔ ۱۵۔ اُس کے کپڑوں سے خوشبو کا آنا۔ ۱۶۔ اُس کے گھرانہ میں بادشاہوں کی بیٹیوں کا آنا۔ ۱۷۔ ہدایا اور تحائف کا آنا۔ ۱۸۔ اولاد کا بجائے باپ کے سردار اور حاکم ہونا۔ ۱۹۔ تمام پشتوں میں قرناً بعد قرن اور نسلاً بعد نسلٍ اس کا ذکر باقی رہنا۔ ۲۰۔ ابدالآباد تک لوگوں کا اُس کی ستائش کرنا۔

اہلِ اسلام کے نزدیک اس بشارت کا مصداق صادق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ یہود کے نزدیک داؤد علیہ السلام کے بعد سے اب تک کوئی نبی ان صفات کے ساتھ موصوف ہو کر ظاہر نہیں ہوا اور نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ اس بشارت سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام مراد ہیں مگر اہلِ اسلام کا دعویٰ کہ اس بشارت سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی مراد ہیں یہی حق ہے اس لیے کہ جو اوصاف اس بشارت میں مذکور ہیں وہ صرف نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ہی پر صادق ہیں۔

۱۔ بادشاہت کا ثبوت آنحضرت کے لیے شمس فی نصف النہار سے زائد اجلیٰ اور روشن ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ کو دین و دُنیا دونوں کی بادشاہی عطا فرمائی۔ احکامِ خداوندی کو بادشاہوں

کی طرح جاری فرمایا۔ جس طرح نصاریٰ کے زعم میں حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام یہود لعنہم اللہ تعالیٰ سے مقہور و مجبور تھے۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم مجبور نہ تھے۔ آپ نے تو یہود کو ان کے قلعوں سے نکال باہر کیا۔

الحاصل نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم دین و دنیا کے بادشاہ تھے۔ تمام انبیاء و رسل سے افضل اور برتر تھے نہ کسی رسول کو قرآن کریم جیسی معجز کتاب عطا کی گئی اور نہ کسی کو آپ جیسی کامل و مکمل شریعت عطا کی گئی کہ فلاح دارین اور نجات اور بہبودی کی پوری پوری کفیل ہو۔ جس نے عقائد و اعمال کی سنگین غلطیوں پر متنبہ کیا ہو۔ خدا تک پہنچنے کے لیے راستہ ایسا صاف کر دیا ہو کہ چلنے والوں کے لیے کوئی روڑا اٹکا نہ رکھا ہو۔ تہذیب، اخلاق اور تدبیر منزل سیاست ملکیہ و مدنیہ کے لحاظ سے بھی نہایت کامل و مکمل ہو۔ غرض یہ کہ اس میں جامعیت کبریٰ کا وصف نمایاں ہو۔ ان تمام محاسن اور خوبیوں کا جامع صرف دین اسلام ہے جس کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم خدا کے پاس سے لائے۔

ان الدین عند اللہ الاسلام۔ بے شک دین اللہ کے نزدیک اسلام ہی ہے۔

یہی وہ کامل و مکمل دین ہے کہ اس کے طلوع ہوتے ہی سب ادیان و مذاہب کے چراغ گل ہو گئے ؎

رات محفل میں ہر اک مہ پارہ گرم لاف تھا ۔۔۔ صبح کو خورشید جو نکلا تو مطلع صاف تھا

پس جس نبی کی کتاب تمام کتب الٰہیہ اور صحف سماویہ سے افضل ہو اور اس کی شریعت تمام شرائع اور ادیان سے بدرجہا برتر اور کامل اور اکمل ہو اور اس کے معجزات بھی تمام انبیاء کرام علیہم الصلوٰۃ والسلام کے معجزات سے بڑھے ہوئے ہوں اور اس کی امت بھی تمام امتوں سے علم اور عمل، اعتقادات، اخلاق، مکارم و شمائل، تہذیب و تمدن، سیاست ملکیہ اور مدنیہ کے لحاظ سے فائق اور برتر ہو تو اس نبی کے سید الاولین والآخرین اور بادشاہ دو جہاں ہونے میں کیا کلام اور شبہ ہو سکتا ہے۔

۲۔ حسن و جمال میں آپ کا یہ حال تھا کہ ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زائد کسی کو حسین اور خوبصورت نہیں دیکھا۔ گویا کہ آفتاب آپ کے چہرہ مبارک میں گھومتا ہے اور جب تبسم فرماتے تو دندان مبارک کی چمک دیواروں پر پڑتی تھی۔

حسان بن ثابت رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں ؎

واحسن منک لم تر قط عینی ۔۔۔ واجمل منک لم تلد النساء

میری آنکھ نے آپ سے زائد حسین نہیں دیکھا ۔۔۔ اور آپ سے زائد جمیل اور خوبصورت عورتوں نے نہیں جنا

خلقت مبرءً من کل عیب کانک قد خلقت کما تشاءُ

آپ ہر عیب سے پاک پیدا کیے گئے ہیں گویا کہ آپ حسب منشا پیدا کیے گئے

۳- اور آپ کا خوش بیان اور شیریں زبان اور فصیح اللسان ہونا سب کو تسلیم ہے۔ آپ کے انفاس قدسیہ اور کلمات طیبات اس وقت تک باسانید صحیح و جیدہ محفوظ ہیں جن سے آپ کی فصاحت و بلاغت اور شیریں زبانی کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔

۴- اور آپ مبارک الی الدہر بھی ہیں جیسا کہ بشارت دوم میں گزرا۔ مشرق و مغرب، شمال و جنوب میں کروڑ ہا مسلمان نمازمیں اور نماز کے بعد اور مختلف اوقات میں

اللّٰھم بارک علی محمد و علی آل محمد کما بارکت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انک حمید مجید،

اے اللہ برکت نازل فرما محمدؐ پر اور محمدؐ کی آل پر جیسے آپ نے ابراہیم اور اُن کی آل پر برکت نازل فرمائی بلاشبہ آپ ستائش اور بڑی بزرگی والے ہیں۔

پڑھتے ہیں۔ اس سے زائد اور کیا مبارک الی الدہر ہونے کی دلیل ہو سکتی ہے جس کے لیے دُنیا کے ہر گوشہ میں برکت کی دعا مانگی جاتی ہے۔

۵- قوت میں آپ کا یہ حال تھا کہ رکانہ پہلوان کو کہ جو قوت میں اپنی نظیر نہ رکھتا تھا ایک روز آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے جنگل میں مل گیا اور یہ کہا کہ اگر آپ مجھ کو پچھاڑ دیں تو میں آپ کو نبی برحق جانوں۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس کو پچھاڑ دیا۔ اُس نے دوبارہ لڑنے کے لیے کہا۔ آپ نے اُس کو دوبارہ بھی پچھاڑ دیا۔ اُس کو بہت تعجب ہوا۔ آپ نے یہ ارشاد فرمایا اگر تو اللہ سے ڈرے اور میرا اتباع کرے تو اس سے زائد عجیب چیز دکھلاؤں۔ اُس نے پوچھا کہ اس سے زائد کیا عجیب ہے۔ آپ نے ایک درخت کو بلایا آپ کے بلاتے ہی آپ کے سامنے آ کر کھڑا ہو گیا۔ بعد ازاں یہ فرمایا کہ لوٹ جا سو وہ درخت یہ سن کر اپنی جگہ لوٹ گیا۔

۶- اور آپ کا شمشیر بند اور صاحب جہاد ہونا بھی مسلّم ہے اور حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نہ شمشیر بند تھے اور نہ صاحب جہاد۔ اور بقول نصاریٰ اُن میں اتنی قوت بھی نہ تھی کہ وہ اپنے آپ کو یہود سے بچا سکے۔

۷- اور آپ صاحب حق و صداقت بھی تھے۔ کما قال تعالیٰ شانہ

ھو الذی ارسل رسولہ بالھدیٰ و دین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ

ولو کرہ المشرکون بل جاء بالحق وصدق المرسلین (صافات)

والذی جاء بالصدق وصدق بہ اولئک ھم المتقون (سورہ زمر)

خدا ہی نے اپنے رسول کو ہدایت اور دین حق دے کر بھیجا ہے تاکہ اس کو تمام دینوں پر غالب کردے اگرچہ مشرکین کو ناگوار گزرے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم شاعر و مجنون نہیں بلکہ حق لے کر آئے ہیں اور پیغمبروں کی تصدیق کی ہے اور جو سچی بات لے کر آیا اور جس نے اس کی تصدیق کی یہی پرہیز گار ہیں۔

ایک مرتبہ نضر بن الحارث نے قریش کو مخاطب بنا کر یہ کہا:

قد کان محمد فیکم غلاما حدثا ارضاکم فیکم واصدقکم حدیثا واعظمکم امانۃ، حتیٰ اذا رأیتم فی صدغیہ الشیب وجاءکم بما جاءکم قلتم انہ ساحر لا واللہ ما ھو بساحر

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں نوجوان تھے سب سے زائد پسندیدہ سب سے زائد سچے، سب سے زائد امین، لیکن جب تم نے اُن کے جانبین راس میں بڑھاپا دیکھا اور وہ تمہارے پاس یہ دین حق لے کر آئے تو تم اُن کو ساحر اور جادوگر کہنے لگے، ہرگز نہیں، خدا کی قسم وہ ساحر نہیں۔

اور ہرقل شاہ روم نے جب ابوسفیان سے نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے متعلق یہ دریافت کیا کہ تم نے کبھی اُس کو متہم بالکذب کیا ہے تو اس پر ابوسفیان نے یہ جواب دیا کہ ہم نے اُن سے کبھی کوئی کذب نہیں دیکھا۔

۸- اور اقبال مند ہونا بھی ظاہر ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے جیسا آپ کو اقبال عطا فرمایا ایسا اقبال آج تک کسی کو نصیب نہیں ہوا اور نہ ہوگا۔

۹- اور دائیں ہاتھ سے مہیب کام اور عجیب و غریب کرشمہ ظاہر ہونے سے معجزہ شق قمر کی طرف اشارہ ہے ؎

چو دستش برآہیخت شمشیر بیم
بر معجز میان قمر زد دو نیم

اور علیٰ ہذا جنگ بدر اور جنگ حنین میں ایک مٹھی خاک سے تمام مشرکین کو خیرہ کر دینا یہ بھی آپ کے دائیں ہاتھ کا مہیب کام تھا۔

۱۰- تیرانداز ہونا بنی اسمٰعیل کا مشہور شعار ہے چنانچہ حدیث میں ہے۔

ارموا بنی اسمٰعیل فان اباکم کان رامیا۔

اے بنی اسمٰعیل تیراندازی کیا کرو اس لیے کہ تمہارا باپ تیرانداز تھا۔

اور دوسری حدیث میں ہے

من تعلم الرمی ثم ترک۔ فلیس منا

جو تیراندازی سیکھ کر چھوڑ دے وہ ہم میں سے نہیں۔

۱۱۔ اور لوگوں کا آپ کے نیچے گرنا، یعنی خلق اللہ کا آپ کے تابع ہونا، یہ بھی اظہر من الشمس ہے چند ہی روز میں ہزاراں ہزار اسلام کے حلقہ بگوش بن گئے کما قال اللہ تعالیٰ شانہ،

اذا جاء نصر اللّٰہ والفتح ورایت الناس یدخلون فی دین اللّٰہ افواجاً

فسبح بحمد ربک واستغفرہ، انہ کان توابا۔

جب اللہ کی نصرت اور فتح آچکی اور آپ نے لوگوں کو اللہ کے دین میں جوق در جوق داخل ہوتے ہوئے دیکھ لیا تو اپنے رب کی تسبیح و تحمید کیجئے اور استغفار پڑھیے بے شک خدا بہت توبہ قبول فرمانے والا ہے۔

۱۲، ۱۳۔ اور آپ کی شریعت ابد الآباد تک رہے گی چنانچہ قرآن کریم حسب وعدہ الٰہی انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون، بے شک ہم نے قرآن کو نازل کیا اور ہم ہی اس کے محافظ ہیں۔ تیرہ صدی سے بالکل محفوظ چلا آتا ہے بحمد للہ اب تک اس کے ایک نقطہ اور ایک شوشہ میں بھی سرِ مو تفاوت نہیں آیا اور انشاء اللہ تعالیٰ تا قیام قیامت اسی طرح رہے گا اور یہود و نصاریٰ کو اپنی توراۃ و انجیل کا حال خوب معلوم ہے لکھنے کی حاجت نہیں۔ اور آپ کی سلطنت کا عصا راستی اور صداقت کا عصا ہے ہمیشہ اس سے احقاق حق اور ابطال باطل ہوتا رہتا ہے۔

۱۴۔ اور آپ صداقت کے دوست اور شرارت کے دشمن تھے کما قال اللہ جل جلالہ،

لقد جاءکم رسول من انفسکم عزیز علیہ ما عنتم حریص علیکم بالمومنین رؤف رحیم ۝ یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم۔

بے شک تمہارے پاس تم میں سے ایسے رسول آگئے ہیں کہ جن پر تمہاری تکلیف شاق ہے تمہاری بھلائی کے لیے حریص ہیں مومنین پر نہایت شفیق اور مہربان ہیں۔ اے نبی کریم کفار و منافقین سے جنگ کیجیے اور ان پر سختی کیجئے۔

اور آپ کی امت کے یہ اوصاف ہیں ۔

اشداء علی الکفار رحماء بینھم اذلۃ علی المومنین اعزۃ علی الکافرین
یجاھدون فی سبیل اللہ ولا یخافون لومۃ لائم ط۔

کافروں پر بہت سخت اور آپس میں مہربان مومنوں پر نرم اور کافروں پر سخت ۔ اللہ کے راستہ میں جہاد کریں گے اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی بالکل پروا نہ کریں گے اور عجب نہیں کہ شرارت سے ابوجہل مراد ہو کہ جو سرتاپا شرارت تھا اور صداقت سے ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مراد ہوں جو کہ سرتاپا صدق و صداقت تھے اور بے شک ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس کے اہل تھے کہ ان کو خلیل و صدیق یعنی دوست بنایا جاتے ۔

۱۵- اور آپ کے کپڑوں سے خوشبو بھی آیا کرتی تھی حتیٰ کہ ایک عورت نے آپ کا پسینہ مبارک اس لیے جمع کیا تاکہ دلہن کے کپڑوں کو اس سے معطر کرے ۔

۱۶- اور قرن اول میں بہت سی شہزادیاں مسلمانوں کی خادم بنی ہیں چنانچہ شہربانو یزدجرد شاہ کسریٰ کی بیٹی امام حسین رضی اللہ عنہ کے گھر میں تھی ۔

۱۷- نجاشی شاہ حبشہ اور منذر بن ساویٰ شاہ بحرین اور شاہ عمان اور بہت سے امیر و کبیر آپ پر ایمان لائے اور آپ کے حلقہ بگوش بنے ۔ اور آپ کی خدمت میں سلاطین و امراء نے ہدایا بھیج کر فخر و سرفرازی حاصل کی ۔ چنانچہ مقوقس شاہ قبط نے آپ کی خدمت میں تین باندیاں اور ایک حبشی غلام اور ایک سفید خچر اور ایک سفید حمار اور ایک گھوڑا اور کچھ کپڑے بطور ہدیہ ارسال کیے ۔

۱۸- اور آپ کے بعد قریش میں خلافت رہی ۔ آپ کی اولاد میں امام حسن رضی اللہ عنہ خلیفہ ہوتے اور امام حسن رضی اللہ عنہ کی اولاد میں صدہا خلیفہ اور حکمران ہوتے ۔ حجاز و یمن، مصر و شام وغیرہ میں حکومت و سلطنت پر فائز رہے ۔ اور قیامت کے قریب امام مہدی کا ظہور ہو گا جو امام حسن کی اولاد سے ہوں گے اور تمام روئے زمین کے خلیفہ ہوں گے ۔

۱۹، ۲۰- اور آپ کی ستائش و ذکر خیر بھی ابدالآباد تک رہے گا ۔ ہر اذان میں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کے ساتھ بلند آواز سے اشھد ان محمد رسول اللہ روزانہ پانچ مرتبہ کروڑہا مسلمان پکارتے ہیں ۔ کوئی وعظ اور خطبہ ایسا نہیں کہ جس میں آپ کا نام پاک محمد صلی اللہ علیہ وسلم نہ لیا جاتا ہو ۔ محمد اور احمد کے معنے ستودہ کے ہیں ۔ اس بشارت کے شروع میں یا احمد کا لفظ صراحتاً مذکور تھا مگر حسد کی وجہ سے نکال دیا گیا مگر تاہم یہ اوصاف تو سوائے

محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی پر صادق نہیں آتے۔

نصاریٰ کے زعم و اعتقاد پر تو حضرت مسیح بن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کسی طرح اس بشارت کا مصداق نہیں ہو سکتے اس لیے کہ نصاریٰ صحیفہ شعیاہ علیہ السلام کے ترپنویں[۵۳] باب کو حضرت مسیح علیہ السلام کی بشارت قرار دیتے ہیں اور وہ یہ ہے،

ہمارے پیغام پر کون اعتقاد لایا اور خداوند کا ہاتھ کس پر ظاہر ہوا۔ اس کے ڈیل ڈول کی کچھ خوبی نہ تھی اور نہ کچھ رونق کہ ہم اس پر نگاہ کریں اور کوئی نمائش بھی نہیں کہ ہم اس کے مشتاق ہوں وہ آدمیوں میں نہایت ذلیل و حقیر تھا۔ اھ۔

اور پھر آیت پنجم میں ہے:

"وہ ہمارے گناہوں کے سبب گھایل کیا گیا اور ہماری بدکاریوں کے باعث کچلا گیا"۔ اھ

معاذ اللہ ثم معاذ اللہ جب نصاریٰ کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام ایسے تھے تو وہ اوصاف زبور کا جو بالکل اس کی ضد ہیں کیسے مصداق ہو سکتے ہیں۔

ہمارے اعتقاد میں منجملہ دیگر تحریفات کے صحیفہ یسعیاہ علیہ السلام کا ترپنواں[۵۳] باب قطعاً و یقیناً الحاقی اور اختراعی ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام حاشا ثم حاشا ہرگز ایسے نہ تھے۔ وہ تو دنیا و آخرت میں وجیہ (آبرو اور عزت والے) اور خدا کے مقربین میں سے تھے لیکن بایں ہمہ اس بشارت کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں اس لیے کہ نہ آپ شمشیر بند اور تیر انداز تھے اور نہ مجاہد تھے اور نہ آپ کی شریعت دائمی ہے۔ اور نہ آپ کی بعثت عام تھی اور نہ آپ کے گھرانہ میں کوئی شہزادی آئی کہ جو آپ کی بیوی یا لونڈی ہوتی اس لیے کہ آپ نے کوئی نکاح ہی نہیں فرمایا۔ نیز آپ کے کوئی باپ دادا نہ تھا۔ آپ تو بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

بشارت ہفتم

از زبور سیدنا داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام باب ۱۴۹۔

۱۔ خداوند کی ستائش کرو، خداوند کا ایک نیا گیت گاؤ۔ اور اس کی مدح پاک لوگوں کی جماعت میں، ۲۔ اسرائیل اپنے بنانے والے سے شادمان ہوتے۔ بنی صیہون اپنے بادشاہ کے سبب خوشی کریں۔ ۳۔ وہ اس کے نام کی ستائش کرتے ہوئے ناچیں۔ وہ طبلہ

اور بربط بجاتے ہوئے اس کی ثنا خوانی کریں۔ ۴۔ کیونکہ خداوند اپنے لوگوں سے خوش ہوتا ہے، وہ حلیموں کو نجات کی زینت بخشتا ہے۔ ۵۔ پاک لوگ اپنی بزرگواری پر فخر کریں اور اپنے بستروں پر پڑے ہوئے بلند آواز سے گایا کریں۔ ۶۔ خدا کی ستائش اُن کی زبانوں پر ہو دیں اور ایک دو دھاری تلوار اُن کے ہاتھوں میں ہو۔ ۷۔ تاکہ غیر اُمتوں سے انتقام لیویں اور لوگوں کو سزا دیویں۔ ۸۔ اُن کے بادشاہوں کو زنجیروں سے اور اُن کے امیروں کو لوہے کی بیڑیوں سے جکڑیں۔ ۹۔ تاکہ اُن پر وہ فتویٰ جو لکھا ہوا ہے جاری کریں کہ اس کے پاپ لوگوں کی یہی شوکت ہے کہ خداوند کی ستائش کرو۔ اھ

اس بشارت میں نبی مُبَشَّر کو بادشاہ کے لفظ سے اور اس کے مطیعین کو صالحین اور پاک لوگوں سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی وہ نبی موعود بادشاہ ہوگا اور اُس کی شمشیر زنی موافق خوشنودی حق اور بمقتضائے غضب الٰہی کافروں کے حق میں ہوگی اور اس کے اصحاب اور احباب اس کے ساتھ ہو کر کافروں سے جہاد و قتال کریں گے۔

بعد ازاں مطیعین کے کچھ اوصاف ذکر کیے گئے ہیں جو من اولہا الی اخرہا اُمت محمدیہ پر پورے منطبق ہیں یہی وہ اُمت ہے کہ جو اپنے بستروں پر بھی اللہ کو یاد کرتی ہے کما قال اللہ تعالیٰ

یذکرون اللہ قیاماً و قعوداً و علیٰ جنوبہم

وہ اللہ کو کھڑے اور بیٹھے اور کروٹ پر لیٹے ہوئے یاد کرتے ہیں۔

اور یہی وہ اُمت ہے کہ نماز میں اور جہاد میں اور ہر اذان میں اور عید الفطر اور عید النحر اور ایام تشریق اور ایام حج اور منیٰ اور مزدلفہ اور عرفات میں اللہ کو بلند آواز سے پکارتی ہے، بخلاف یہود و نصاریٰ کے کہ یہود تو بوق اور نصاریٰ ناقوس بجاتے ہیں بلند آواز ہی سے اللہ اکبر کہنا اور اللہ کو یاد کرنا صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کا شعار ہے۔

اور مہاجرین و انصار رضی اللہ تعالیٰ عنہم ہی کی دو دھاری تلواروں نے روم و شام و دیگر ممالک کو فتح کیا اور بڑے بڑے بادشاہوں اور امیروں کو قید کیا ہے اور اہل کتاب کے نزدیک اس بشارت کا مصداق نہ سلیمان علیہ السلام ہو سکتے ہیں اخیر عمر میں مرتد اور بت پرست ہو گئے تھے۔

اور نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام ان کے اعتقاد کے مطابق اس بشارت کا مصداق ہو سکتے ہیں اس لیے کہ اُن کے نزدیک تو حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام خود ہی مقتول و مصلوب ہوتے۔

اور علیٰ ہذا آپ کے اکثر حواریین گرفتار کیے گئے وہ دوسرے بادشاہوں اور امیروں کو کہاں قید کرتے اور بشارت میں یہ مذکور ہے کہ وہ شخص موعود بادشاہ ہوگا اور ظاہر ہے کہ عیسیٰ علیہ السلام بادشاہ نہ تھے اور معنوی بادشاہت ہر نبی کو حاصل رہی اس میں حضرت عیسیٰ کی کیا خصوصیت،

رہا کافروں سے قتال و جہاد کرنا اور ان کو گرفتار کرنا سو یہ عین عبادت ہے نہ کہ قابل اعتراض جیسا کہ موسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام اور موسیٰ علیہ السلام کے بعد یوشع بن نون علیہ السلام کا جہاد کرنا، اور علیٰ ہذا سلیمان علیہ السلام اور ان کے صحابہ کا جہاد فرمانا تمام یہود و نصاریٰ کے نزدیک مسلّم ہے خلاصۂ کلام یہ کہ اس جز کا مصداق حضرت مسیح نہیں ہو سکتے اس لیے کہ زبور مذکور کا مضمون بآواز بلند یہ کہہ رہا ہے کہ آنے والا نبی بادشاہ ہوگا اور اپنے اصحاب کے ساتھ سلاطین کفار سے جہاد و قتال کرے گا اور بڑے بڑے جبارین اور متکبرین مقتول اور اسیر اور گرفتار ہوں گے اور آپ کے اصحاب تکبیر کہتے ہوئے آپ کے ساتھ ہوں گے ؎

بتکبیر مرداں شمشیر زن   کہ مرد وغا را شمارند زن

اور یہ تمام امور آں حضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر ظاہر ہوئے۔

بشارت ہشتم

از زبور باب ۷۲ درس اول

۱۔ اے خدا بادشاہ کو اپنی عدالتیں عطا کر اور بادشاہ کے بیٹے کو اپنی صداقت دے۔

۲۔ وہ تیرے لوگوں میں صداقت سے حکم کرے گا اور تیرے مسکینوں میں عدالت سے

۳۔ پہاڑ لوگوں کے لیے سلامتی ظاہر کریں گے اور ٹیلے بھی صداقت سے

۴۔ وہ قوم کے مسکینوں کا انصاف کرے گا اور محتاجوں کے فرزندوں کو بچائے گا اور ظالم کے ٹکڑے ٹکڑے کرے گا۔

۵۔ جب تک کہ سورج اور چاند باقی رہیں گے ساری پشتوں کے لوگ تجھ سے ڈرا کریں گے۔

۶۔ وہ بارش کے مانند جو کاٹے ہوئے گھاس پر پڑے نازل ہوگا اور پھوہی کے مینہ کی طرح جو زمین کو سیراب کرتا ہے۔

۷۔ اس کے عصر میں جب تک کہ چاند باقی رہے گا صادق چلیں گے اور سلامتی فراواں ہوگی۔

۸۔ سمندر سے سمندر تک اور دریا سے انتہاء زمین تک اس کا حکم جاری ہوگا۔

۹- وہ جو بیابان کے باشندے ہیں اس کے سامنے جھکیں گے اور اس کے دشمن ماٹی چاٹیں گے۔
۱۰- ترسیس اور جزیروں کے سلاطین نذریں لائیں گے اور سبا اور سیبا کے بادشاہ ہدیے گزرانیں گے۔
۱۱- سارے بادشاہ اس کے حضور سجدہ کریں گے ساری گروہیں اس کی بندگی کریں گی۔
۱۲- کیونکہ وہ دہائی دینے والے محتاج کو اور مسکین کو اور اس کو جس کا کوئی مددگار نہ ہو گا چھڑائے گا۔
۱۳- وہ مسکین اور محتاج پر ترس کھائے گا اور محتاجوں کی جان بچائے گا۔
۱۴- وہ اُن کی جانوں کو ظلم اور غضب سے بچائے گا ان کا خون اس کی نظر میں بیش قیمت ہو گا۔
۱۵- وہ جیتا رہے گا اور سبا کا سونا اس کو دیا جائے گا اُس کے حق میں سدا دعا ہو گی ہر روز اُس کو مبارکباد کہی جاتی گی۔
۱۶- اناج کی کثرت سرزمین میں پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہو گی اُس کا پھل لبنان کے درخت کی طرح جھڑ جھڑائے گا اور شہر کے لوگ میدان کے گھاس کے مانند سرسبز ہوں گے۔
۱۷- اس کا نام ابد تک باقی رہے گا جب تک کہ آفتاب رہے گا اُس کے نام کا رواج ہو گا لوگ اس کے باعث اپنے تئیں مبارک کہیں گے ساری قومیں اُسے مبارکباد دیں گی۔
۱۸- خداوند خدا اسرائیل کا جو اکیلا ہی عجائب کام کرتا ہے مبارک ہے۔
۱۹- اس کا جلیل نام ابد تک مبارک ہے سارا جہان اس کے جلال سے معمور ہو آمین آمین۔
۲۰- داؤد بن یسی کی دعائیں تمام ہوئیں (بہترواں زبور ختم ہوا)

جاننا چاہیے کہ اس زبور میں ایسے پیغمبر کے ظہور کی خبر دی گئی ہے کہ جس کو نبوت و رسالت کے ساتھ من جانب اللہ بادشاہت اور حکومت بھی حاصل ہو گی اور اُس کا دائرہ سلطنت اتنا وسیع ہو گا کہ بر و بحر کو شامل ہو گا۔ اور عدالت اور صداقت کے ساتھ اس کی عدالتیں جاری ہوں گی۔ مسکینوں اور محتاجوں کو ان کا حق دلائے گا۔ اور ظالموں کے ٹکڑے ٹکڑے کرے گا۔ اور اس کے دشمن لرزاں اور ترساں ہوں گے اور سلاطین عالم اس کے لیے ہدیے اور تحفے لائیں گے۔ اور تمام قبائل اُس کے مطیع اور فرمانبردار ہوں گے۔ ہر طرف سے ہر روز ساری قومیں اس کے حق میں دعا اور مبارکباد کہیں گے۔ اور ابد تک اس کا نام باقی رہے گا جب تک آفتاب رہے گا اس کے نام کا رواج رہے گا۔

اہل حقل ایک سرسری نظر سے سمجھ سکتے ہیں کہ یہ اوصاف مذکورہ حضرت مسیح علیہ السلام میں

نہ تھے بلکہ رسالتمآب خاتمیت جناب سرور عالم محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تھے کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت کے ساتھ سلیمان اور ذوالقرنین جیسی حکومت عطا فرمائی کہ جس میں قوموں کے درمیان ایسی عدالت اور صداقت جاری ہوئی کہ دنیا نے نہ ایسی صداقت اور عدالت دیکھی اور نہ سنی ظالموں سے مظلوموں کا بدلہ لیا گیا اور زمین کو ظلم اور غضب سے پاک کر دیا۔ برّ اور بحر اور صحرا و بیابان میں آپ کی حکومت پھیلی اور دشمن آپ سے تھرا اٹھتے اور بڑے بڑے سلاطین آپ کے حضور سجدہ میں گرے اور ہدیے اور تحفے آپ کی بارگاہ میں بھیجے اور آپ نے صداقت اور عدالت کے جاری کرنے کے لیے جہادات اور غزوات کیے اور آپ کی جاری کردہ صداقت اور عدالت کو صدیق اکبر اور فاروق اعظم جیسے صداقت اور عدالت کے علمبرداروں نے حد کمال کو پہنچایا۔
اور ابد تک جب تک کہ چاند اور سورج قائم ہیں آپ کا نام مبارک ہر اذان اور نماز اور ہر دعا اور ہر منبر و محراب میں لیا جاتے گا بلکہ خطبوں میں آپ کے نام مبارک کے ساتھ آپ کے خلفائے راشدین کا نام بھی لیا جاتے گا جنہوں نے دنیا میں صداقت و عدالت کا علم بلند کیا۔
اے علمائِ یہود و نصاریٰ یہ ناچیز تم کو صداقت اور عدالت کا واسطہ دے کر پوچھتا ہے کہ جس صداقت اور عدالت کے جاری کرنے کا ذکر اس زبور میں ہے خدا را یہ بتلاؤ کہ سوائے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کہاں ظہور ہوا۔ اوصاف مذکورہ کا حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور ان کے حواریین پر انطباق کسی صورت سے ممکن نظر نہیں آتا۔

بشارت نہم

از صحیفہ ملاکی علیہ الصلوٰۃ والسلام باب سوم آیت اوّل

دیکھو میں اپنے رسول کو بھیجوں گا اور وہ میرے آگے میری راہ کو درست کرے گا اور وہ خداوند جس کی تلاش میں تم ہو۔ ہاں ختنہ کا رسول جس سے تم خوش ہو وہ اپنی ہیکل میں ناگہاں آدے گا۔ دیکھو وہ یقیناً آدے گا۔ رب الافواج فرماتا ہے پر اس کے آنے کے دن کون ٹھہر سکے گا اور جب وہ نمود ہوگا کون ہے جو کھڑا رہے گا۔ اھ

اس بشارت میں ایسے رسول کی آمد و ظہور کا ذکر ہے کہ جو صاحب ختان ہوگا۔ اور اسی وجہ سے آپ کی بعثت سے قبل یہود و نصاریٰ کو رسول الختان کا انتظار رہتا اور قیصر روم بھی اسی پیشین گوئی کے مطابق رسول ختان کے ظہور کا منتظر تھا جیسا کہ صحیح بخاری کی حدیث ہرقل میں

مذکور ہے مگر آج کل نسخوں میں بجائے ختنہ کے رسول کے عہد کا رسول مذکور ہے۔
لیکن اس صورت میں بھی عہد سے ختنہ ہی کا عہد مراد ہے جیسا کہ سفر پیدائش کے باب ہفدہم کی آیت دہم سے معلوم ہوتا ہے۔

اور میرا عہد جو میرے اور تمہارے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ہے جسے تم یاد رکھو سو یہ ہے کہ تم میں سے ہر ایک فرزند نرینہ کا ختنہ کیا جائے۔ اور تم اپنے بدن کی کھلڑی کا ختنہ کرو۔ اور یہ اس عہد کا نشان ہوگا جو میرے اور تمہارے درمیان ہے اھ

بشارت دہم

از صحیفہ حبقوق علیہ الصلوٰۃ والسلام باب سوم آیت ۳

خدا تیمان سے۔ اور وہ جو قدوس ہے کوہ فاران سے آیا۔ اس کی شوکت سے آسمان چھپ گیا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہوئی۔ اس کی جگمگاہٹ نور کی مانند تھی اس کے ہاتھ سے کرنیں نکلیں۔ انتہی

یہ بشارت سرور عالم محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں نہایت ہی ظاہر ہے سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کون پیغمبر فاران سے مبعوث ہوا اور زمین اس کی حمد سے معمور ہوئی ہو چنانچہ ہر دوست اور دشمن کی زبان پر آپ کا نام محمدؐ اور احمدؐ ہے اور ایک قدیم عربی نسخہ میں یہ لفظ ہیں:

وامتلأت الارض من تحميد احمد

یعنی تمام زمین احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی حمد سے بھر گئی
مگر حاسدین نے اس جملہ کا رہنا گوارا نہ کیا اور بعد کی اشاعت میں اس جملہ کو صحیفہ مذکورہ سے علیحدہ کر دیا اور علیٰ ہذا سارا عالم بھی آپ کے نور ہدایت سے جگمگا اٹھا۔

بشارت یازدہم

از صحیفہ یسعیاہ علیہ الصلوٰۃ والسلام باب ۲۱ آیت ۶، ۷۔

خداوند نے مجھے یوں فرمایا جا نگہبان بٹھلا جو کچھ دیکھے سو بتلائے۔ اس نے سوار دیکھے گھڑ چڑھوں کے جو دو دو آتے تھے اور گدھوں پر بھی سوار اور اونٹوں پر بھی سوار اھ

اس بشارت میں حضرت شعیاہ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دو نبیوں کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔
اول حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی طرف گدھے کی سواری سے ان ہی کی طرف اشارہ ہے
چنانچہ جناب مسیح علیہ السلام گدھے پر سوار ہوکر یروشلم (بیت المقدس) داخل ہوتے تھے۔
دوم نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اونٹ کی سواری سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی کی طرف اشارہ ہے جو عرب کی خاص اور مشہور سواری ہے۔
چنانچہ آپ جب مدینہ طیبہ تشریف لے گئے تو اس وقت اونٹ پر سوار تھے اور پھر آیت نہم میں بابل کے سقوط یعنی اس کے گرنے کا ذکر ہے اور ظاہر ہے کہ بابل کا سقوط خلفاء راشدین کے زمانہ میں ہوا حضرت مسیح اور حواریین کے زمانہ میں بابل کا سقوط نہیں ہوا۔

بشارت دوازدہم

از صحیفہ یسعیاہ علیہ الصلوٰۃ والسلام باب ۲۱ آیت ۱۶، ۱۷

اس باب میں عرب کی بابت الہامی کلام کا ذکر ہے چنانچہ آیت ۱۶ میں ہے۔
خداوند نے مجھ کو یوں فرمایا ہنوز ایک برس ہاں مزدور کی سی ایک ٹھیک برس میں قیدار کی ساری حشمت جاتی رہے گی۔ ۱۷۔ اور تیر اندازوں کے جو باقی رہے قیدار کے بہادر لوگ گھٹ جائیں گے کہ خداوند اسرائیل کے خدا نے یوں فرمایا۔ اھ
چنانچہ ٹھیک ہجرت کے ایک سال بعد جنگ بدر میں بنی قیدار یعنی قریش کی ساری حشمت جاتی رہی ستر سردار مارے گئے اور ستر قید ہوئے اور بہت سے زخمی ہوئے۔ اور بنی قیدار کا بنی اسمٰعیل سے ہونا توریت وغیرہ اور تواریخ سے ثابت ہے اور علماء نصاریٰ کے نزدیک مسلّم ہے۔

بشارت سیزدہم

از صحیفہ یسعیاہ علیہ الصلوٰۃ والسلام باب ۲۴ آیت ۲۳

اور چاند مضطرب ہوگا اور سورج شرمندہ کہ جس وقت رب الافواج کوہ صیہون پر اور یروشلم میں اپنے بزرگوں کے گروہ کے آگے حشمت کے ساتھ سلطنت کرے گا۔
چنانچہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے نہایت حشمت کے ساتھ سلطنت فرمائی اور چاند مضطرب یعنی اپنی اصلی حالت سے متغیر ہوا اور اس کے دو ٹکڑے ہوگئے کما قال تعالیٰ شانہ،

اقتربت الساعۃ و انشق القمر قیامت قریب آگئی اور چاند دو ٹکڑے ہوگیا۔
اور سورج بھی شرمندہ ہوا چنانچہ غزوۂ خیبر میں اس کو حرکتِ معکوس کرنا پڑی۔

بشارت چہاردہم

ازصحیفہ یسعیاہ علیہ الصلوٰۃ والسلام باب ۲۸ آیت ۱۳
سو خداوند کا کلام اُن سے یہ ہوگا حکم پر حکم، حکم پر حکم، قانون پر قانون، تھوڑا یہاں تھوڑا وہاں۔

چنانچہ قرآن عزیز اسی طرح نجماً نجماً نازل ہوا۔ رہی انجیل سو وہ علماء مسیحین کے نزدیک منزل من اللہ ہی نہیں بلکہ وہ حواریین کی تصنیف ہے اور صحیفہ مذکورہ کی عبارت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ کتاب موصوف کا منزل من اللہ ہونا ضروری ہے۔

اور ہمارے نزدیک جو انجیل حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کو دی گئی وہ تمام کتاب ایک ہی مرتبہ نازل ہوئی۔ قرآن کریم کی طرح نجماً نجماً نازل نہیں ہوئی۔ قال تعالیٰ شانہ
وقرآناً فرقناہ لتقرأہ علی الناس علی مکث و نزلناہ تنزیلاً ط
قرآن کو ہم نے متفرق کرکے نازل کیا تاکہ آپ لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پڑھیں
و قال الذین کفروا لولا نزل علیہ القرآن جملۃ واحدۃ کذالک لنثبت بہ فؤادک و رتلناہ ترتیلاً ہ
اور ہم نے قرآن کو تھوڑا تھوڑا نازل کیا کافر کہتے ہیں کہ قرآن ایک ہی بار کیوں نہ نازل کیا گیا۔ کہہ دو کہ ہم نے اسی طرح نازل کیا تاکہ آپ کے دل کو مضبوط رکھیں اس لیے ہم نے ٹھہر ٹھہر پڑھ سنایا۔

بشارت پانزدہم

ازصحیفہ یسعیاہ علیہ الصلوٰۃ والسلام باب ۴۲ آیت اوّل
دیکھو میرا بندہ جسے میں سنبھالتا میرا برگزیدہ جس سے میرا جی راضی ہے میں نے اپنی روح اس پر رکھی وہ قوموں کے درمیان عدالت جاری کرائے گا۔
یہ بشارت بھی نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے لیے صریح ہے اس لیے کہ میرا بندہ یہ ترجمہ عبداللہ کا

ہے اور عبداللہ بھی آپ کے ناموں میں سے ایک نام ہے جیسا کہ قرآن عزیز میں ہے
لما قام عبد اللہ — جب عبداللہ کھڑا ہوا۔
اور قرآن عزیز میں بکثرت عبداللہ کے لقب سے آپ کا ذکر کیا گیا ہے کما قال تعالیٰ
سبحٰن الذی اسریٰ بعبدہ و قال تعالیٰ مما نزلنا علی عبدنا
پاک ہے وہ ذات جو اپنے بندہ کو لے گیا اس چیز سے جو ہم نے اپنے بندے پر اتاری
نصاریٰ کہتے ہیں کہ یہ بشارت حضرت عیسٰی علیہ السلام کے حق میں ہے
لیکن حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام نصاریٰ کے اعتقاد میں خدا کے بندے نہیں بلکہ خدا اور معبود ہیں لہٰذا وہ اس کے مصداق نہیں ہو سکتے۔ اور برگزیدہ بعینہٖ ترجمہ مصطفیٰ کا ہے کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا مشہور و معروف نام ہے اور جس سے میرا جی راضی ہے یہ ترجمہ مرتضیٰ کا ہے کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک نام پاک ہے۔
اور بزعم نصاریٰ اس جملہ کا مصداق یعنی جس سے میرا جی راضی ہے حضرت عیسٰی علیہ السلام نہیں ہو سکتے اس لیے کہ وہ اُن کے زعم میں مصلوب و مقتول ہوئے۔ اور جو مقتول و مصلوب ہو جاتے وہ نصاریٰ کے نزدیک ملعون ہے جیسا کہ گلیتوں کے تیسرے خط کے تیرہویں درس سے معلوم ہوتا ہے۔
مسیح جو ہمارے لیے لعنتی بنا اس نے ہمیں مول لے کر شریعت کی لعنت سے چھڑایا کیونکہ لکھا ہے کہ جو کوئی لکڑی پر لٹکایا گیا وہ لعنتی ہے۔ آہ
اس عبارت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ حضرت عیسٰی علیہ السلام سے نصاریٰ کے اس زعم باطل کی بنا پر معاذاللہ خدا ان سے راضی نہیں۔

الحاصل

محمد مصطفیٰ احمد مرتضیٰ صلی اللہ علیہ وسلم بے شبہ خدا کے برگزیدہ بندہ اور رسول ہیں جن سے خدا راضی ہے۔
اور کتب سیر میں آپ کے اسماء مبارکہ میں آپ کا نام نامی مرتضیٰ اور رضی بھی لکھا ہے اور اسی وجہ سے رضی اللہ تعالیٰ تو آپ کے صحابہ کرام کا خاص شعار ہے کما قال تعالیٰ شانہٗ
لقد رضی اللہ عن المومنین اذ یبایعونک تحت الشجرۃ

البتہ تحقیق اللہ تعالیٰ مومنین سے راضی ہوا جبکہ وہ اس درخت کے نیچے آپ سے بیعت کر رہے تھے۔

محمد رسول اللہ والذین معہ اشداء علی الکفار رحماء بینھم تراھم رکعاً سجداً یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا ط سیماھم فی وجوھھم من اثر السجود ط ذالک مثلھم فی التوراۃ۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں اور جو آپ کے ساتھ ہیں وہ کافروں پر سخت اور آپس میں مہربان ہیں۔ آپ اُن کو رکوع و سجود کرتے اللہ کا فضل اور اللہ کی رضا طلب کرتے دیکھیں گے۔ صلاح اور تقویٰ کی نشانی اُن کے چہروں پر سجدہ کے اثر سے نمایاں ہے یہ ہے اُن کی شان کہ جو توراۃ میں مذکور ہے۔

۴۔ اور روح سے مراد وحی الٰہی ہے کہ جس پر ارواح و قلوب کی حیات کا دارومدار ہے کما قال تعالیٰ شانہٗ

وکذالک اوحینا الیک روحاً من امرنا،

اسی طرح ہم نے آپ کی طرف وحی بھیجی اپنے حکم سے

سو الحمد للہ کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے آپ پر مردہ قلوب کی حیات اور زندگی کے لیے ایک رُوح یعنی قرآن عظیم کو اتارا جس نے نازل ہو کر مردہ قلوب کو حیات اور بے شمار مریض دلوں کو شفا بخشی کما قال تعالیٰ شانہٗ

و ننزل من القرآن ما ھو شفاء و رحمۃ للمومنین ۔

اور اتارتے ہیں ہم ایسا قرآن کہ جو مومنین کے لیے سراسر شفاء اور رحمت ہے۔

۵۔ اور مبعوث ہو کر آپ نے باذن الٰہی عدالت کو بھی جاری فرمایا کما قال اللہ جل جلالہٗ وعم نوالہٗ

فلذالک فادع واستقم کما امرت ولا تتبع اھواءھم و قل امنت بما انزل اللہ من کتاب و امرت لاعدل بینکم

پس اسی طرف بلائیے اور اسی پر قائم رہیے جیسا کہ آپ کو حکم کیا گیا ہے اور ان کی خواہشوں کی پیروی نہ فرمائیے اور یہ کہیے کہ میں ایمان لایا اللہ کی اتاری ہوئی کتاب پر اور حکم کیا گیا ہوں کہ تمہارے درمیان عدل و انصاف کروں۔

اور چونکہ عدالت کا جاری کرنا شوکت کو مقتضی ہے اس لیے یہ وصف بھی علی زعم نصاریٰ

حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام پر صادق نہیں اس لیے کہ نصاریٰ کے نزدیک تو حضرت عیسیٰ علیہ السلام میں تو اتنی قوت بھی نہ تھی کہ جو اپنے کو قتل وصلب سے بچا سکتے شوکت تو درکنار

۶- پھر باب مذکور کی دوسری آیت میں ہے

کہ وہ نہ چلائے گا اور اپنی صدا بلند نہ کرے گا اور اپنی آواز بازاروں میں نہ سنائے گا۔

یہ جملہ بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر پوری طرح صادق آتا ہے چنانچہ صحیح بخاری کے باب کراہیۃ الصخب فی الاسواق میں عطاء بن یسار سے روایت ہے کہ میں نے عبداللہ ابن عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مل کر یہ دریافت کیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ اوصاف جو تورات میں مذکور ہیں بیان فرمایئے جواب میں عبداللہ بن عمرو بن العاص نے بہت سے اوصاف ذکر فرمائے منجملہ اُن کے یہ فرمایا:

لیس بفظ ولا غلیظ ولا سخاب بالاسواق

۷- اور باب مذکور کی تیسری آیت میں ہے:

وہ عدالت کو جاری کرائے گا کہ دائم رہے۔ یعنی وہ نبی صاحب حکومت اور صاحب عدالت ہوگا اور حضرت عیسیٰ کے یہاں حکومت کا نام بھی نہ تھا نہ کافروں سے جہاد کیا اور نہ مجرموں پر کوئی عدالت جاری کی۔ اس کا مصداق تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہو سکتے ہیں اور دائم رہنے سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت غراء کا الی یوم القیامۃ باقی رہنا مراد ہے۔ جس طرح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت اب تک برابر محفوظ ہے اور ان شاء اللہ ثم ان شاء اللہ ہمیشہ رہے گی کوئی اُمت اس بارہ میں اُمت محمدیہ کی ہمسری نہیں کر سکتی کسی اُمت نے بھی اپنے نبی کی شریعت اور اس نبی کے اقوال و افعال کی حفاظت اُمت محمدیہ کے مقابلہ میں عشر عشیر بھی نہیں کی۔ اور شریعت کے دائم ہونے سے خاتم الانبیاء ہونے کی طرف اشارہ ہے اس لیے شریعت کا دوام اور بقاء الی یوم القیامہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ اس نبی کے بعد اور کوئی نبی نہ بنایا جائے ورنہ اگر اس کے بعد کوئی اور نبی بنایا جاتے تو شریعت سابقہ شریعت لاحقہ سے منسوخ ہو جانے کی وجہ سے دائمی نہ رہے گی۔

۸- اور باب مذکور کی چوتھی آیت میں ہے:

اس کا زوال نہ ہوگا اور نہ مسلا جائے گا جب تک راستی کو زمین پر قائم نہ کرے۔

چنانچہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال جب ہوا کہ جب راستی زمین پر قائم ہو گئی اور

اللہ تعالیٰ کی طرف سے

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت لکم الاسلام دیناً"

آج کے دن تمہارے لیے تمہارے دین کو میں نے کامل کر دیا اور میں نے تم پر اپنا انعام تمام کر دیا اور میں نے اسلام کو تمہارے دین بننے کے لیے پسند کر لیا۔

کی بشارت نازل ہو گئی اور

انا فتحنا لک فتحاً مبیناً" بے شک ہم نے آپ کو ایک کھلم کھلا فتح دی۔

اور اذا جاء نصر اللہ والفتح جب خدا کی مدد اور فتح آپہنچی

کا وعدہ پورا ہو گیا اور عجب نہیں کہ راستی قائم کرنے سے خلافتِ صدیقیہ کی جانب اشارہ ہو جیسا کہ بعض علماء کی رائے ہے کہ راستی ترجمہ صدق کا ہے اور صدق کا اطلاق صدیق پر ایسا ہی ہے جیسا کہ عدل کا اطلاق زید پر۔ چنانچہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الوفات میں صدیق اکبر کو امام بنا کر اس طرف اشارہ فرما دیا کہ میرے بعد صدیق اکبر خلیفہ ہونے چاہئیں تاکہ صدق اور راستی قائم ہو۔

۹- اور چھٹی آیت میں ہے :

تیرا ہاتھ پکڑوں گا اور تیری حفاظت کروں گا۔

یہ جملہ بھی سوائے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے کسی اور پر صادق نہیں آتا اس لیے کہ اللہ نے آپ سے وعدہ فرمایا تھا۔

واللہ یعصمک من الناس اللہ آپ کو لوگوں سے محفوظ رکھے گا۔

چنانچہ یہ وعدہ اللہ کا پورا ہوا، اللہ تعالیٰ نے آپ کی دستگیری کی اور حفاظت فرمائی لیکن بزعم نصاریٰ عیسیٰ علیہ السلام کی حفاظت نہیں ہوئی۔

۱۰- اور پھر چھٹی آیت میں جو نور کا ذکر ہے کہ لوگوں کے عہد اور قوموں کے نور کے لیے تجھے دوں گا اس سے نورِ ہدایت اور نورِ شریعت کا دینا مراد ہے جیسا کہ قرآن عزیز میں متعدد جگہ اس کا ذکر ہے۔

یا ایہا الناس قد جاءکم برھان من ربکم و انزلنا الیکم نوراً مبیناً"

اے لوگو بے شک تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک برہان آچکی ہے اور ہم نے

تمہاری طرف ایک نور (قرآن کریم) نازل کیا۔

فالذین آمنوا بہ وعزروہ ونصروہ واتبعوا النور الذی انزل معہ اولئک ھم المفلحون (سورہ اعراف)

پس جو لوگ آپ پر ایمان لاتے اور آپ کی مدد کی اور اسی نور کا اتباع کیا کہ جو آپ کے ساتھ نازل کیا گیا یہی لوگ فلاح والے ہیں۔

یا ایھا النبی انا ارسلنٰک شاھداً و مبشراً و نذیراً و داعیاً الی اللہ باذنہ و سراجاً منیراً۔ (سورہ احزاب)

اے نبی ہم نے تمہیں بشارت دینے والا اور ڈرانے والا اور خدا کی طرف خدا کے حکم سے بلانے والا اور ہدایت کا روشن چراغ بنا کر بھیجا ہے۔

یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ ولو کرہ الکافرون

کافر اپنی موہنوں کی پھونک سے اللہ کے نور کو بجھانا چاہتے ہیں حالانکہ اللہ اپنے نور کو ضرور پورا فرمائیں گے اگرچہ کافروں کو ناگوار ہو۔

۱۱۔ اور آیت ہشتم میں ہے:

اور اپنی شوکت دوسرے کو نہ دوں گا

یہ جملہ بھی حرف بحرف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاد کے مطابق ہے۔

اعطیت مالم یعط احد من الانبیاء قبلی

مجھ کو من جانب اللہ وہ چیزیں عطا کی گئیں کہ جو انبیاء سابقین میں سے کسی کو نہیں دی گئیں۔

مثلاً ختم نبوت ورسالت، عموم بعثت و دعوت، مقام محمود، شفاعت کبریٰ، معراج سبع سموٰت ان فضائل و مزایا سے سوائے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کسی نبی کو سرفراز نہیں کیا گیا۔ یہ حشمت و شوکت آپ کے سوا کسی کو نہیں دی گئی۔

اور اسی طرح حق تعالیٰ شانہ نے آپ کو وہ آیات بینات، محاسن اخلاق، فضائل و شمائل، علوم و معارف عطا فرمائے کہ جو کسی نبی اور رسول کو نہیں عطا فرمائے۔ خصوصاً قرآن حکیم کا معجزہ تو ایسا روشن معجزہ ہے کہ جس کے سامنے موافق و مخالف سب ہی کی گردنیں خم ہیں۔

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔

یہ خدا کا فضل ہے وہ فضل جس کو چاہتا ہے دے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے۔

۱۲۔ اور گیارھویں آیت میں ہے :

بیابان عرب اور اس کی بستیاں قیدار کے آباد دیہات اپنی آواز بلند کریں گے۔ سلع کے بسنے والے ایک گیت گائیں گے۔ پہاڑوں کی چوٹیوں پر سے للکاریں گے۔ وہ خداوند کا جلال ظاہر کریں گے۔ آہ

قیدار حضرت اسمٰعیل علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ایک صاحبزادہ کا نام ہے جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے اجداد میں سے ہیں اور اس بیابان سے فاران کا بیابان مراد ہے جہاں حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت ہاجرہ اور حضرت اسمٰعیل علیہ السلام کو چھوڑ آئے تھے جیسا کہ کتاب پیدائش باب کی اکیسویں آیت سے ظاہر ہے اور یہ وہی جگہ ہے کہ جہاں اس وقت مکہ معظمہ آباد ہے اور قیدار کے آباد دیہات سے یہی مکہ مراد ہے۔ اسی جگہ حضرت اسمٰعیل کی اولاد آباد ہوئی۔ الحاصل اس جملہ میں آپ کے مولد یعنی جائے ولادت کی طرف اشارہ ہے یعنی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مکہ معظمہ میں پیدا ہوں گے اور آپ کی امت اس بیابان میں لا الٰہ الا اللہ اور اللہ اکبر اور لبیک اللھم لبیک کے نعروں سے اللہ کے جلال کو ظاہر کرے گی۔ سفر اور حضر میں اللہ کی تکبیر کہنا یہ خاص امت محمدیہ کا شعار ہے۔ اذان اور تکبیر کے ساتھ نماز ادا کرتے ہیں اور نصاریٰ میں گھنٹہ اور ناقوس بجا کر نماز پڑھی جاتی ہے اور بجائے تکبیر و توحید کے تثلیث اور تجسیم کا نعرہ لگاتے ہیں کہ خدا نے مریم کے پیٹ میں جسم پکڑا اور بندوں کی نجات کے لیے صلیب پر لٹکا۔

اور اس بشارت میں اس طرف بھی اشارہ ہے کہ وہ نبی مبشر قیدار بنی اسمٰعیل کی اولاد سے ہوگا لہٰذا اس بشارت کا مصداق انبیاء اسرائیل میں سے کوئی نبی نہیں ہو سکتا اس لیے کہ وہ سب حضرت اسرائیل کی اولاد سے ہیں نہ کہ قیدار بن اسمٰعیل کی اولاد سے۔ اور سلع مدینہ طیبہ کے ایک پہاڑ کا نام ہے۔ اس سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام ہجرت کی طرف اشارہ ہے واللہ سبحانہ وتعالیٰ اعلم۔

خلاصۂ کلام

یہ کہ یہ کلام معرفت التیام از اول تا آخر بآواز بلند یہ کہہ رہا ہے کہ وہ شخص موعود خدا تعالیٰ کا

خاص برگزیدہ اور پسندیدہ بندہ ہوگا اور عامۂ خلائق کی پیشوائی اور سارے جہان کی بادشاہی اور رہنمائی کا منصب اس کو عنایت ہوگا اور شخص موعود بنی قیدار یعنی بنی اسمٰعیل میں سے ہوگا نہ کہ بنی اسرائیل میں سے کیونکہ قیدار بالاتفاق حضرت اسمٰعیل کے بیٹے کا نام ہے۔

پس اس خبر کا مصداق حضرت عیسیٰ علیہ السلام نہیں ہوسکتے کیونکہ وہ بنی اسرائیل میں سے ہیں۔ بنی قیدار یعنی بنی اسمٰعیل میں سے نہیں

اور سارے جہان کی پیشوائی اور رہنمائی کا منصب بھی اُن کو حاصل نہیں ہوا اس لیے کہ انجیل میں ہے کہ حضرت عیسیٰ صرف بنی اسرائیل کے گمراہ بھیڑوں کے طرف بھیجے گئے یعنی ان کی بعثت عام نہ تھی اور نہ حضرت عیسیٰ نے کوئی حکومت کی اور نہ قوموں میں کوئی عدالت جاری کی پس اس خبر سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کیسے مراد ہوسکتے ہیں۔ اس خبر میں جس قدر اوصاف مذکور ہیں وہ سب سیدنا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق اور منطبق ہیں لہٰذا وہی مراد ہوسکتے ہیں۔

بشارت شانزدہم

از صحیفہ یسعیاہ علیہ السلام باب ۵۲ درس ۱۳

۱۳۔ دیکھو میرا بندہ اقبال مند ہوگا وہ بالا اور ستودہ ہوگا اور نہایت بلند ہوگا۔ ۱۴۔ جس طرح بہتیرے تجھے دیکھ کے دنگ ہوگئے کہ اس کا چہرہ ہر ایک بشر سے زائد اور اس کی ہیکل بنی آدم سے زیادہ بگڑ گئی۔ ۱۵۔ اُسی طرح وہ بہت سی قوموں پر چھڑکے گا اور بادشاہ اس کے آگے اپنا منہ بند کریں گے کیونکہ وہ کچھ دیکھیں گے جو ان سے کہا نہ گیا تھا اور جو کچھ انھوں نے نہ سنا تھا وہ دریافت کریں گے (ختم ہوا)

اس بشارت میں میرے بندہ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ستودہ صفات مراد ہے جس کے اقبال مند اور بالا اور ستودہ ہونے میں ذرہ برابر شک نہیں اور لفظ ستودہ ٹھیک لفظ محمد کا ترجمہ ہے۔

ع محمد ستودہ متین استوار

اور حق تعالیٰ نے حضور پر نور کو وہ بلندی اور رفعت عطا کی کہ جو نہ کسی نے کبھی سُنی اور نہ دیکھی۔

حضرات نصاریٰ غور کریں کہ کیا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو یہ بلندی اور اقبال مندی بھی حاصل ہوئی نصاریٰ کے زعم فاسد کی بنا پر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اقبال مندی اور نہایت بلندی تو کہاں سے حاصل ہوتی نصاریٰ کے عقیدہ صلیب کی بنا پر تو حضرت مسیح علیہ السلام کو وہ ذلت اور اہانت حاصل ہوئی کہ جو دُنیا میں کبھی بھی کسی برگزیدۂ حق کو نہیں ہوئی اہل اسلام تو اس توہین و تذلیل سے بری اور بیزار ہیں جو نصاریٰ اپنے مزعوم خدا کے لیے تجویز کرتے ہیں اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ حضرت عیسیٰ حق تعالیٰ کے برگزیدہ بندے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو زندہ آسمان پر اٹھایا اور اُن کے دشمنوں کو ناکام کیا۔

بشارت ہفدہم

از صحیفۂ یسعیاہ علیہ السلام باب ۶۰ درس ۱
دربارۂ مکہ مکرمہ و مدینہ منورہ

۱۔ اٹھ روشن ہو والے سرزمین مکہ) کہ تیری روشنی آئی اور خداوند کے جلال نے تجھ پر طلوع کیا ہے۔ ۲۔ کہ دیکھ تاریکی زمین پر چھا جائے گی اور تیرگی قوموں پر لیکن خداوند تجھ پر طالع ہوگا اور اس کا جلال تجھ پر نمودار ہوگا۔ ۳۔ اور قومیں تیری روشنی میں اور شاہان تیرے طلوع کی تجلی میں چلیں گے۔ اب یہاں سے زمین مدینہ کو خطاب ہے ۴۔ اپنی آنکھیں اٹھا کر چاروں طرف نگاہ کر وہ سب (لوگ) اکٹھے ہوتے ہیں وہ تجھ پاس ہوتے ہیں تیرے بیٹے دور سے آئیں گے اور تیری بیٹیاں گود میں اٹھائی جائیں گی۔ ۵۔ تب تو دیکھے گی اور روشن ہوگی ہاں تیرا دل اچھلے گا اور کشادہ ہوگا کیونکہ سمندر کی فراوانی تیری طرف پھرے گی اور قوموں کی دولت تیرے پاس فراہم ہوگی۔ ۶۔ اونٹوں کی قطاریں اور مدیان اور عیفہ کی سانڈنیاں آکے تیرے گرد بے شمار ہوں گی وہ سب جو سبا کے ہیں آئیں گے وہ سونا اور لبان لائیں گے اور خدا کی تعریفوں کی بشارتیں سنائیں گے۔ ۷۔ قیدار کی ساری بھیڑیں تیرے پاس جمع ہوں گی نبیط کے مینڈھے تیری خدمت میں حاضر ہوں گے وہ میری منظوری کے واسطے میرے مذبح پر چڑھائے جائیں گے اور میں اپنی شوکت کے گھر کو بزرگی دوں گا۔ ۸۔ یہ کون ہیں جو بدلی کی طرح اڑتے آتے ہیں اور کبوتروں کی مانند اپنی کابک کی طرف۔ ۹۔ یقیناً "بحری ممالک میری راہ تکیں گے اور ترسیس (حلب) کے جہاز پہلے آئیں گے تیرے بیٹوں کو اُن

کے روپے اور سونے سمیت دور سے خداوند تیرا خدا اور اسرائیل کے قدوس کے نام کے لیے لائیں
کیونکہ اس نے تجھے بزرگی دی ہے۔ ۱۰۔ اور اجنبیوں کے بیٹے تیری دیواریں اٹھائیں گے
اور اُن کے بادشاہ تیری خدمت گزاری کریں گے اگرچہ میں نے اپنے قہر سے تجھے مارا پر اپنی مہربانی
سے تجھ پر رحم کروں گا۔ ۱۱۔ اور تیری پھاٹکیں نت کھلی رہیں گی وہ دن رات کبھی بند نہ ہوویں گی
تاکہ قوموں کی دولت کو تیرے پاس لائیں اور اُن کے بادشاہوں کو دھوم دھام سے ساتھ۔ ۱۲۔ کہ
وہ قوم اور وہ مملکت جو تیری خدمت گزاری نہ کرے گی برباد ہو جائے گی ہاں وہ قومیں یک لخت
ہلاک ہو جائیں گی۔ ۱۳۔ لبنان کا جلال تجھ پاس آئے گا سرو اور صنوبر اور دیوار ایک ساتھ تاکہ
میں اپنی مقدس مکان کو آراستہ کروں اور اپنے پاؤں کی کرسی کو رونق بخشوں۔ ۱۴۔ اور تیرے
غارت گروں کے بیٹے بھی تیرے آگے مطھرے ہوتے آئیں گے یا وہ سب جنہوں نے تیری
تحقیر کی تیرے پاؤں پر پڑیں گے اور خداوند کا شہر اسرائیل کے قدوس کا صیہون تیرا نام رکھیں
گے، ۱۵۔ اس کے بدلے کہ تو ترک کی گئی اور تجھ سے نفرت ہوتی ایسا کہ کسی آدمی نے تیری
طرف گزر بھی نہ کیا میں تجھے شرافت دائمی اور پشت در پشت لوگوں کا سرور بناؤں گی۔ ۱۶۔ تو
قوموں کا دودھ بھی چوس لے گی ہاں بادشاہوں کی چھاتی چوسے گی اور تو جانے گی کہ میں خداوند تیرا
بچانے والا اور میں یعقوب کا قادر تیرا چھڑانے والا ہوں۔ ۱۷۔ میں پیتل کے بدلے سونا لاؤں
گا اور لوہے کے بدلے رُوپا اور لکڑی کے بدلے پیتل اور پتھروں کے بدلے لوہا اور میں
تیرے حاکموں کو سلامتی اور تیرے عاملوں کو صداقت بناؤں گا۔ ۱۸۔ آگے کو کبھی تیری سرزمین
میں ظلم کی آواز نہیں سنی جائے گی اور نہ کہ تیری سرحدوں میں خرابی یا بربادی کی تو اپنی دیواروں
کا نام نجات اور اپنے دروازوں کا نام ستودگی رکھے گی۔ ۱۹۔ آگے تیری روشنی دن کو سورج سے
اور رات کو تیری چاندنی چاند سے نہ ہو گی بلکہ خداوند تیرا ابدی نور اور تیرا خدا تیرا جلال ہوگا۔ ۲۰۔ تیرا
سورج پھر کبھی نہیں ڈھلے گا اور تیرے چاند کا زوال نہ ہوگا کیونکہ خداوند تیرا ابدی نور ہوگا اور
تیرے ماتم کے دن آخر ہو جائیں گے۔ ۲۱۔ اور تیرے لوگ سب راستباز ہوں گے وہ ابد تک
سرزمین کے وارث اور میری لگائی ہوئی ٹہنی اور میرے ہاتھ کی کاریگری ٹھہریں گے تاکہ
میری بزرگی ظاہر ہو۔ ۲۲۔ ایک چھوٹے سے ایک ہزار ہوں گے اور ایک حقیر سے ایک
قوی گروہ ہو گی میں خداوند اس کے وقت میں یہ سب کچھ جلد کروں گا۔ باب ۶۰ ختم ہوا۔
اس باب کی پہلی آیت میں مکہ معظمہ کو خطاب ہے اور اس کو روشن اور منور ہونے کی

بشارت ہے۔ اور نور اور روشنی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا نور یا قرآن کا نور مراد ہے قرآن کریم میں آپ کو اور قرآن کریم کو نور مبین کہا گیا ہے۔

۲- صدہا سال سے جو زمین پر کفر اور شرک اور گمراہی کی ظلمت اور تاریکی چھائی ہوئی وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت اور نور قرآن سے زائل ہو گئی۔

۳- امیر و غریب اور بادشاہ اُس نور کے طلوع کی تجلی میں چلنے لگے۔

۴- اور رفتہ رفتہ وہ نور زمین کے چاروں طرف پھیلنے لگا اور مختلف قبائل اُس نور کے گرد اکٹھے ہونے لگے اور تیس برس کے اندر وہ نور دیار روم اور دیار مغرب اور دیار مشرق فارس اور کاشغر اور ختن اور ہند سندھ وغیرہ میں پہنچ گیا۔

۵- اور لاکھوں مسلمان پیادہ اور سوار امیر اور غریب حج بیت اللہ کے لیے مکہ مکرمہ میں جمع ہونے لگے اور بے شمار اونٹوں اور سانڈنیوں کی قطاریں مکہ معظمہ پہنچنے لگیں اور اونٹوں کی افراد جس قدر عرب اور مکہ معظمہ کے اطراف اور نواحی میں ہے وہ زمین کے کسی خطہ میں نہیں۔

۶- اور خداوند ذوالجلال کی حمد و ثنا اور تعریف کرنے والوں کے غول کے غول خانہ کعبہ کے گرد جمع ہونے لگے۔

۷- اور روئے زمین کے سلاطین اہل اسلام خانہ کعبہ اور اہل مکہ کے لیے لاکھوں درہم و دینار کے ہدایا بھیجنے لگے۔

۸- اور مدیان حضرت ابراہیم کے بیٹے کا نام ہے جو بطن قطورا سے ہے اور شہر مداین انہی کا آباد کیا ہوا ہے اور قیدار حضرت اسمٰعیل کے دوسرے بیٹے کا نام ہے جیسا کہ تورات کے کتاب پیدائش کے پچیسویں باب میں صراحۃً مذکور ہے اور اہل مداین اور نواحی سبا سب حضرت اسمٰعیل کی اولاد میں سے ہیں جو مشرف با اسلام ہوئے اور ہر سال اونٹوں اور سانڈنیوں پر سوار ہو کر حج بیت اللہ کے لیے حاضر ہوتے ہیں اور جن کی حمد و ثنا اور لبیک اللھم لبیک لا شریک لبیک کی آوازوں سے دشت و بیابان گونجنے لگتے ہیں اور قیدار کی ساری بھیڑیں وہاں جمع ہو جاتی ہیں اور نبیط سے عرب مشرقی و شمالی کے قبائل مراد ہیں[1] اور مطلب یہ ہے کہ سبا یعنی یمن کے قبائل اور قیدار کی بھیڑیں یعنی قریش کے وحشی لوگ

---

[1] نبیط حضرت اسمٰعیل کے ایک فرزند کا نام ہے۔

اور نبیط کے مینڈھے یعنی موٹے اور فربہ آدمی۔ ہر طرف سے خدا کی تسبیح و تہلیل اور تحمید و تکبیر کے نعرے لگاتے ہوئے آپ کی خدمت میں حاضر ہوں گے۔

۹۔ اور کبوتروں کے مانند لوگ خانہ کعبہ کی طرف اڑ کر پہنچے گے اور اس کا طواف کریں گے۔

۱۰۔ اور اس وقت جو فخر اور جلال لبنان کو حاصل ہے وہ اُس وقت مکہ معظمہ کو حاصل ہوگا اور اس وقت ملک شام کو جو انبیاء بنی اسرائیل کے مسکن ہونے کا فخر اور شرف ہے وہ شرف اُس وقت مکہ مکرمہ کی طرف منتقل ہو جاتے گا جو خاتم الانبیاء اور سید الاصفیاء کا مولد اور مسکن ہوگا اور اس کے اصحاب انبیاء بنی اسرائیل کا نمونہ ہوں گے۔

۱۱۔ اور جو غارتگر خانہ کعبہ کا رُخ کرے گا وہ یک لخت ہلاک ہوگا جیسا کہ اصحاب فیل کا قصہ مشہور ہے۔

۱۲۔ اور خدا کا مقدس مکان یعنی خانہ کعبہ آراستہ اور پیراستہ ہوگا ہر سال اس پر زریں غلاف چڑھاتے جائیں گے۔

۱۳۔ اور اس بلدۂ مقدسہ کا نام صیہون ہوگا اس لیے کہ صیہون جس طرح یروشلم کے ایک پہاڑ کا نام ہے اسی طرح صیہون مکہ مکرمہ کا بھی نام ہے جیسے شیخ عبدالحق دہلوی نے مدارج النبوۃ باب چہارم قسم اول میں لکھا ہے۔ دیکھو ازالۃ الاوہام ص ۵۰۴۔

۱۴۔ اور آپ کے بعد جو خلیفہ اور حاکم ہوتے وہ عین سلامتی ہوتے اور آپ کی شریعت کے عالم عین صداقت بنے۔

۱۵۔ اور سرزمین عالم صداقت اور عدالت اور سلامتی سے ایسی معمور ہوئی کہ کسی جگہ بھی ظلم کی آواز نہ سنی گئی۔

۱۶۔ اور اُمت کو ایسی شریعت کا وارث بنا کر دُنیا سے رخصت ہوتے کہ جس کا نور اور روشنی ابد تک چمکتا رہے گا۔

۱۷۔ اور اس کا نور اور جلال ابدی ہوگا۔

۱۸۔ جو نہ کبھی ڈھلے گا اور نہ زوال پذیر ہوگا۔

۱۹۔ اور اُس نبی کے تمام صحابہ راستباز ہوں گے۔

۲۰۔ اور ایک چھوٹے سے ہزار اور ایک حقیر سے قوی گروہ ہو جائیں گے۔ وللہ الحمد والمنۃ،

گزارش

حضرات اہل علم سے گزارش ہے کہ وہ کتاب یسعیاہ کا باب ۵۴ اور باب ۶۵ بھی ضرور ملاحظہ فرمالیں اس میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ کرام کے اوصاف کا تذکرہ ہے۔

اور اس کی تشریح اور تطبیق کے لیے ازالۃ الاوہام ص ۴۹۴ وص ۵۰۵ بزبان فارسی و اظہار الحق ص ۱۴۵ ج ۲ بزبان عربی وص ۱۴۷ ج ۲۔

ہر دو مصنفہ حضرت مولانا رحمۃ اللہ کیرانوی ملاحظہ فرمالیں تطویل کے اندیشہ سے اس کو ترک کر دیا ہے۔

بشارت ہشت دہم

از کتاب دانیال علیہ السلام باب دوم

کتاب دانیال کے باب دوم میں ایک طویل قصہ مذکور ہے جس کا خلاصہ ہم ہدیہ ناظرین کرتے ہیں۔

بخت نصر شاہ بابل نے ایک پریشان کن خواب دیکھا اور خواب دیکھ کر بھول گیا۔ اس سے اور بھی زیادہ پریشان ہوا۔ بادشاہ نے یہ ماجرا دانیال علیہ السلام سے ذکر کیا دانیال علیہ السلام نے وحی کے ذریعہ وہ خواب بھی بتلایا اور پھر اس کی تعبیر بھی بتلائی۔

۳۱۔ بادشاہ نے خواب میں دیکھا کہ ایک مورت ہے جو نہایت خوبصورت بھی ہے اور ہیبت ناک بھی ہے اور بادشاہ کے سامنے کھڑی ہے۔

۳۲۔ جس کا سر خالص سونے کا ہے اور اس کا سینہ اور بازو چاندی کے ہیں اور اس کا شکم اور رانیں تانبے کی ہیں اور اس کی پنڈلیاں لوہے کی ہیں اور اس کے پاؤں کچھ لوہے کے اور کچھ مٹی کے ہیں۔ بادشاہ اس عجیب و غریب مورت کو دیکھ رہا ہے۔

۳۴۔ کہ یکایک ایک پتھر نکلا بغیر اس کے کہ کوئی ہاتھ سے کاٹ کر نکالے خود بخود نکلا اور اس مورت کے پاؤں پر لگا کہ جو لوہے اور مٹی کے تھے اور اسے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔

۳۵۔ اور لوہا اور مٹی اور تانبا چاندی اور سونا (جس سے وہ مورت بنی ہوئی تھی) ٹکڑے ٹکڑے کیے گئے اور بستانی کھلیان کے بھوسے کے مانند ہو گئے اور ہوا انہیں اڑا کر لے گئی یہاں تک ان کا پتہ نہ ملا اور وہ پتھر جس نے اس مورت کو مارا ایک بڑا پہاڑ بن گیا اور

تمام زمین کو بھر دیا۔ (خواب ختم ہوا)

بادشاہ نے یہ خواب دیکھا تھا مگر بھول گیا تھا۔ دانیال علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتلایا گیا کہ بادشاہ نے یہ خواب دیکھا ہے دانیال علیہ السلام نے حسب وحی خداوندی خواب بیان کر کے بادشاہ کو اس کی تعبیر بتلائی کہ اس خواب میں یکے بعد دیگرے پانچ سلطنتوں کی طرف اشارہ ہے۔ سونے کے سر سے بابل کا بادشاہ مراد ہے اور تیری سلطنت سونے کی مانند ہے اور تیرے بعد ایک اور سلطنت آئے گی جو چاندی کے مانند ہوگی اور تیری سلطنت سے کمتر ہوگی۔ اس کے بعد ایک تیسری سلطنت آئے گی جو تانبے کی مانند ہوگی پھر ایک چوتھی سلطنت آئے گی جو لوہے کی مانند مضبوط ہوگی پھر ایک پانچویں سلطنت آئے گی جس کے پاؤں کچھ لوہے کے اور کچھ مٹی کے ہوں گے۔ یعنی اس سلطنت میں کچھ ضعف اور اضطراب ہوگا۔ لوہا اور مٹی ملا جلا ہوگا یعنی وہ سلطنت قوت اور ضعف کا مجموعہ ہوگی۔ کبھی اس میں قوت ہوگی اور کبھی ضعف۔ اس پانچویں سلطنت کے زمانہ میں یکایک عالم غیب سے ایک پتھر نمودار ہوگا جو کسی کے ہاتھ سے کاٹ کر نکالا ہوا نہ ہوگا بلکہ من جانب اللہ خود بخود بلا سبب ظاہری کے آسمان سے اترے گا اور اس آخری سلطنت کے پاؤں پر گرے گا اور اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا تا آنکہ اس کو بستانی کھلیان کے بھوسہ کے مانند بنادے گا اور ہوا اس کو اڑا کر لے جائے گی یہاں تک کہ اس کا نام و نشان نہ رہے گا اور رفتہ رفتہ وہ پتھر پہاڑ بن کر تمام زمین کو بھر دے گا۔ جاننا چاہیے کہ اس تعبیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور آپ کی نبوت و رسالت اور آپ کی آسمانی بادشاہت کو ایک پتھر سے تشبیہ دی گئی ہے اور یہ بتلایا گیا ہے کہ وہ پتھر بہت جلد پہاڑ کی شکل میں تبدیل ہو جائے گا یعنی اول اول وہ چھوٹی سی سلطنت ہوگی اور بعد میں تمام دنیا پر چھا جائے گی چنانچہ عہد فاروقی میں قیصر و کسریٰ کی شوکت کا خاتمہ ہو گیا اور اس طرح هو الذی ارسل رسوله بالهدی ودین الحق لیظهره علی الدین کله کا وعدہ پورا ہوا اور هلک کسریٰ فلا کسریٰ بعدہ و هلک قیصر فلا قیصر بعدہ کی تصدیق ہو گئی آسمانی بادشاہت کا پتھر زمین پر ایسا گرا کہ دنیا کی بڑی بڑی سلطنتوں کو پیس کر رکھ دیا اور جو شریعت آپ پر آسمان سے نازل ہوئی وہ قیامت تک باقی رہے گی۔ تفصیل کے لیے اظہار الحق ص ۱۴۸ ج ۲ بزبان عربی اور ازالۃ الاوہام ص ۵۰۷ بزبان فارسی ہر دو مصنفہ حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہ کو دیکھئے اور ہدایۃ الحیاری ص ۷۹ مصنفہ حافظ ابن القیم بھی دیکھیے۔

عاتکہ بنت عبدالمطلب کا خواب

اس موقع پر مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عاتکہ بنت عبدالمطلب کا ایک خواب ذکر کریں جو سیرت کی تمام صحیح اور معتبر کتابوں میں مذکور ہے تاکہ ناظرین کو اس بشارت ربانیہ کے سمجھنے میں مدد دے۔ وہ خواب حسب ذیل ہے۔

ابوجہل کی سرکردگی میں قریش کا ایک ہزار کا قافلہ سات سو اونٹ اور سو سواروں اور دیگر سامان حرب کے ساتھ جنگ بدر کے لیے روانہ ہونے لگا تو قبل از روانگی عاتکہ بنت عبدالمطلب نے یہ خواب دیکھا کہ ایک شتر سوار مکہ میں آیا اور مقام ابطح میں اونٹ بٹھلا کر باواز بلند یہ کہہ رہا ہے:

الا انفروا یا آل غدر لمصارعکم فی ثلاث

اے اہل غدر یعنی غدارو تم بہت جلد اپنی مقتل اور پچھڑنے کی جگہ کی طرف تین دن میں نکل جاؤ۔

اور پھر وہ شتر سوار مسجد الحرام میں گیا اور خانہ کعبہ کی چھت پر چڑھ کر بھی اسی طرح اعلان کیا۔ اس کے بعد وہ سوار جبل ابو قبیس پر چڑھا اور وہی آواز دی اور پھر اوپر سے ایک پتھر اٹھا کر نیچے پھینکا وہ پتھر نیچے پہنچ کر چور چور ہو گیا اور مکہ کا کوئی گھر ایسا نہ رہا کہ جس میں اس کا کوئی ٹکڑا جا کر نہ گرا ہو۔ عاتکہ نے یہ خواب حضرت عباس سے بیان کیا جو اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے انہوں نے یہ خواب سن کر اپنے مخصوص دوستوں سے بیان کر دیا اور سمجھ گئے کہ قوم پر کوئی مصیبت آنے والی ہے شدہ شدہ اس خواب کی اطلاع ابوجہل کو بھی ہو گئی۔ ابوجہل نے جب حضرت عباس کو مسجد حرام میں آتے دیکھا تو کہنے لگا اے ابوالفضل (حضرت عباس کی کنیت ہے) تمہارے مرد تو مدعی نبوت تھے ہی اب تمہاری عورتیں بھی نبوت کا دعویٰ کرنے لگیں۔ حضرت عباس نے کہا کیا بات ہے ابوجہل نے عاتکہ کے خواب کا ذکر کیا۔ خواب بیان ہی کیا جا رہا تھا کہ یکایک ضمضم غفاری ابوسفیان کا پیام لے کر اس شان سے مکہ میں پہنچا کہ پیراہن چاک ہے اور اونٹ کی ناک کٹی ہوئی ہے اور یہ آوازہ لگا رہا ہے اے گروہ قریش اپنے کاروان تجارت کی خبر لو اور جلد از جلد ابوسفیان کے قافلہ کی مدد کو پہنچو۔ یہ خبر سنتے ہی قریش پورے ساز و سامان کے ساتھ مکہ سے نکل کھڑے ہوئے اور بدر کے میدان میں پہنچ کر اس خواب کی تعبیر بحالت بیداری اپنی آنکھوں سے دیکھ لی۔

اور اس واقعہ پر بھی غور کرو کہ جو احادیث صحیحہ میں آیا ہے کہ غزوۂ خندق میں خندق کھودتے وقت جب ایک سخت پتھر نکل آیا تو اس پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے تین مرتبہ کدال ماری جس سے وہ پتھر ٹوٹ گیا اور اس سے روشنی نمودار ہوئی اور اس میں شام اور فارس اور یمن کے شہر نظر آتے اشارہ اس طرف تھا کہ یہ تمام ممالک اسلام کے مفتوح ہوں گے۔

بشارت نوزدہم

از انجیل متی باب سوم آیت اوّل

اُن دنوں میں یوحنا یہودیہ کے بیابان میں ظاہر ہو کے منادی کرنے اور یہ کہنے لگا کہ توبہ کرو آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے۔ انتہی۔

اور اسی انجیل کے باب چہارم کے سترہویں آیت میں ہے " اسی وقت سے یسوع نے منادی کرنی اور یہ کہنا شروع کر دیا کہ توبہ کرو کیونکہ آسمان کی بادشاہت نزدیک آگئی ہے " انتہی۔

آسمانی بادشاہت سے یہ مراد ہے کہ کوئی کتاب آسمان سے نازل ہو اور اس میں ہر طرح کے احکام مذکور ہوں گے اور نہایت شوکت اور حاکمانہ طور سے اس کی نشر و اشاعت کی جائے گی۔ خدا کے سرکشوں اور نافرمانوں پر تہدیدی احکام نافذ ہوں گے غرض یہ کہ نہ تو فقط دنیوی بادشاہت ہو جیسا کہ سلاطین دنیا کو حاصل ہوتی ہے اور نہ یہ ہو کہ فقط احکام خداوندی کی اشاعت نہایت مسکنت سے مقہور اور مغلوب ہو کر بلا کسی شوکت اور حکومت کے کی جاتے بلکہ احکام آسمانی بھی ہوں اور اس کے ساتھ شوکت اور حکومت زمینی بھی ہو۔ احکام خداوندی سے سرتابی کرنے والوں کو سزا بھی دی جاتی ہو۔ حکومت الٰہی کے باغیوں سے جہاد بھی کیا جاتا ہو اور یہ دونوں باتیں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء کے عہد میں کما حقہ ظہور میں آئیں۔

احکام خداوندی اور شریعت آسمانی بھی نازل ہوئی اور نہایت شوکت اور قوت سے اس کو نافذ کیا گیا۔ قیصر و کسریٰ کے تخت کو اُلٹ کر رکھ دیا۔ خدا کے دشمنوں سے جہاد بھی کیا۔ چوروں اور راہزنوں پر حد بھی قائم کی، زناکاروں کو رجم اور سنگسار کیا۔ شراب خواروں کے کوڑے لگوائے۔ آنکھ کھول کر دیکھئے کہ آسمانی بادشاہت اس کو کہتے ہیں اور خدارا یہ بھی آسمانی بادشاہت نہیں تو وہ بادشاہت تم بتلاؤ کہ جس کو آسمانی کہا جا سکے ان فی ذالک لذکریٰ لمن کان لہ قلب و القی السمع و ھو شہید "۔

بشارت بستم

از انجیل متی باب ۲۱ آیت ۴۲۔
یسوع نے انہیں کہا کیا تم نے نوشتوں میں کبھی نہیں پڑھا کہ جس پتھر کو راج گیروں نے ناپسند کیا وہی کونے کا سرا ہوا۔

یہ خدا کی طرف سے ہوا اور ہماری نظروں میں عجیب۔ اس لیے میں تمہیں کہتا ہوں کہ خدا کی بادشاہت تم سے لے لی جائے گی اور ایک قوم کو جو اس کے میوہ لائے دی جائے گی جو اس پتھر پر گرے گا چور ہو جائے گا۔ پر جس پر وہ گرے اُسے پیس ڈالے گا۔ انتہی۔ راج گیر اور معماروں سے بنی اسرائیل مراد ہیں اور کونے کے پتھر سے ہمارے نبی اکرم خاتم النبیین محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں کیونکہ آپ بنی اسرائیل کی نظر میں ایک ناپسند پتھر کے مشابہ تھے۔ بنی اسرائیل نے ہر چند آپ کو رد کرنا چاہا مگر آپ تائید الٰہی سے کونے کا سرا یعنی خاتم النبیین ہو کر رہے۔ اور پتھر کے سر زاویہ ہونے کے معنی یہ ہیں کہ جو کونا عمارت کی بلندی کی طرف خالی تھا وہ اس سے بھر جائے گا۔ اسی طرح قصر نبوت میں جو زاویہ خالی تھا وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے پُر ہو گیا۔ اس طرح قصر نبوت کی عمارت پوری ہو گئی۔

کما روی ابو ھریرۃ رضی اللہ تعالیٰ عنہ ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال ان مثلی و مثل الانبیاء من قبلی کمثل رجل بنی بیتاً فاحسنہ واجملہ الاموضع لبنۃ من زاویۃ فجعل الناس یطوفون بہ و یعجبون لہ ویقولون ھلا وضعت اللبنۃ و انا خاتم النبیین۔ رواہ البخاری فی کتاب الانبیاء و فی روایتہ انا سددت موضع اللبنۃ و ختم بی البنیان و ختم بی الرسل۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا میری اور انبیاء سابقین کی ایسی مثال ہے کہ کسی نے ایک محل نہایت عمدہ تیار کیا مگر ایک اینٹ کی جگہ چھوڑ دی لوگ اس محل کا چکر لگاتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ یہ ایک اینٹ کیوں چھوڑ دی گئی۔ میں ہی خاتم النبیین ہوں۔ یعنی میں نے ہی اس اینٹ کی جگہ کو پُر کیا ہے اور میرے ہی سے یہ تعمیر ختم ہوئی اور مجھ ہی پر انبیاء و رسل کا سلسلہ ختم ہوا۔

پھر آپ پر جو گرا وہ بھی چور چور ہوا اور جس پر آپ گرے وہ چورا چورا ہوا۔ چنانچہ جنگ بدر میں قریش آپ پر گرے اور وہ خدا کے فضل سے چور چور ہوتے اور فتح مکہ کے وقت آپ ان پر گرے، تب بھی وہی چور چور ہوتے۔ اور آپ کے بعد صحابہ کرام ایران، شام و روم وغیرہ وغیرہ پر گرے اور سب کو چور کیا اور پھل اور میوہ لانے والی قوم بنی اسمٰعیل ہیں کہ جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت سے پھل لائی اور حکومت اور سلطنت کے مالک ہوتے اور یہ آسمانی بادشاہت اُن کے حصہ میں آئی۔

لہٰذا اس بشارت کا مصداق بجز خاتم النبیین سید الاولین والآخرین محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اور کوئی نہیں ہو سکتا۔ رہے حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام سو وہ حضرت داؤد علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نسل سے تھے، بنی اسرائیل میں بہت محترم تھے وہ ناپسند پتھر کے کیسے مشابہ ہو سکتے ہیں۔
دوم یہ کہ وہ خاتم النبیین نہیں جیسا کہ ماسبق میں معلوم ہو چکا ہے کہ اہل کتاب علاوہ عیسٰی علیہ السلام کے ایک اور نبی کے منتظر تھے۔ نیز ماسبق میں یہ بھی گزر چکا ہے کہ جب یحیٰی علیہ السلام مبعوث ہوئے تو یہودیوں نے اُن سے دریافت کیا۔ الخ
سوم یہ کہ حضرت مسیح خود تو کبھی کسی پر نہ گرے اور یہود جب اُن پر گرے تو بقول نصاریٰ حضرت مسیح چور چور ہوتے واللہ اعلم۔
اور حضرت عیسٰی علیہ السلام نے کبھی بھی یہ نہیں فرمایا کہ میں خاتم النبیین ہوں میرے آسمان پر چلے جانے کے بعد کوئی سچا نبی نہیں آئے گا۔

بشارت بست دیکم

از انجیل یوحنا باب چہاردہم آیت ۱۵۔
۱۵۔ اگر تم مجھ سے محبت رکھتے ہو تو میرے حکموں پر عمل کرو گے۔ ۱۶۔ اور میں باپ سے درخواست کروں گا کہ وہ تمہیں دوسرا مددگار بخشے گا کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے۔ ۲۶۔ وہ تسلی دینے والا جو روح القدس ہے جسے باپ میرے نام سے بھیجے گا وہی تمہیں سب چیزیں سکھائے گا اور سب باتیں جو کچھ کہ میں نے تمہیں کہی ہیں تمہیں یاد دلائے گا۔ ۲۹۔ اور اب میں نے تمہیں اس کے واقع ہونے سے پیشتر کہا تاکہ جب وہ وقوع میں آئے تو تم ایمان لاؤ۔ ۳۰۔ بعد اس کے میں تم سے بہت کلام نہ کروں گا اس لیے کہ اس جہان کا سردار آتا ہے اور مجھ میں اس کی کوئی

چیز نہیں۔
اور باب ۱۵ آیت ۲۷ میں ہے۔
جب وہ مددگار آئے گا جس کو میں تمہارے پاس باپ کی طرف سے بھیجوں گا یعنی سچائی کی روح تو وہ میری گواہی دے گا۔ انتہیٰ۔
اور باب ۱۶ آیت ۷ میں ہے :
۷۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں تمہارے لیے میرا جانا ہی فائدہ مند ہے کیونکہ اگر میں نہ جاؤں تو وہ مددگار تمہارے پاس نہ آئے لیکن اگر جاؤں گا تو اسے تمہارے پاس بھیج دوں گا۔ ۸۔ اور وہ آکر دنیا کو گناہ اور راستبازی اور عدالت سے قصوروار ٹھہرائے گا۔ ۹۔ گناہ کے بارہ میں اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے۔ ۱۰۔ راستبازی کے بارہ میں اس لیے کہ میں اپنے باپ کے پاس جاتا ہوں اور تم مجھے پھر نہ دیکھو گے۔ ۱۱۔ عدالت کے بارہ میں اس لیے کہ اس جہان کے سردار پر حکم کیا گیا ہے۔ ۱۲۔ میری اور بھی بہت سی باتیں ہیں کہ میں تمہیں اب کہوں پر اب تم ان کی برداشت نہیں کر سکتے۔ ۱۳۔ لیکن جب وہ روح حق آئے گا تو تم کو تمام سچائی کی راہ دکھائے گا اس لیے کہ وہ اپنی طرف سے نہ کہے گا لیکن جو کچھ سنے گا وہی کہے گا اور تمہیں آئندہ کی خبریں دے گا۔
۱۴۔ وہ میری بزرگی اور جلال کو ظاہر کرے گا۔ انتہیٰ۔
اور انجیل متی باب ۳ آیت ۱۱ میں ہے "میں تو توبہ کے لیے پانی سے بپتسمہ دیتا ہوں لیکن جو میرے بعد آتا ہے مجھ سے زور آور ہے اور میں اس کے جوتے اٹھانے کے لائق نہیں۔ انتہیٰ۔
یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا کلام ہے کہ جو آپ نے رفع الی السماء سے پہلے حواریین کی تسلی کے لیے فرمایا کہ تم یہود بے بہبود کی سازشوں اور قتل کے تدبیروں سے ہرگز نہ گھبراؤ اور میری تکلیف سے رنجیدہ اور غمگین نہ ہو میں عنقریب اس دنیا سے نکل کر ایسی جگہ چلا جاؤں گا کہ جہاں کسی کی رسائی نہیں ہوگی یعنی آسمان پر چلا جاؤں گا۔ خدا کے یہاں بہت مکان ہیں اور قیامت کے قریب پھر آسمان سے نازل ہوں گا اور بعد ازاں ایک آنے والی فارقلیط کی بشارت دی کہ ایک زمانہ آئے گا کہ میرے علاوہ ایک دوسرا فارقلیط (رسول) ظاہر ہوگا اور وہ آکر میری بزرگی بیان کرے گا اور میرے نہ ماننے والوں یعنی یہود بے بہبود کو خوب سزا دے گا اور وہ دین و دنیا کا سردار ہوگا اور وہ اس قدر بلند مرتبہ ہوگا کہ مجھ میں اس کی کوئی بات نہیں حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن میں اس بشارت کا ذکر فرمایا ہے کما قال تعالیٰ ،

وَاِذْ قَالَ عِیْسَی ابْنُ مَرْیَمَ یٰبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ اِنِّیْ رَسُوْلُ اللّٰهِ اِلَیْكُمْ مُّصَدِّقًا لِّمَا بَیْنَ یَدَیَّ مِنَ التَّوْرٰىةِ وَ مُبَشِّرًۢا بِرَسُوْلٍ یَّاْتِیْ مِنْۢ بَعْدِی اسْمُهٗۤ اَحْمَدُؕ

اس وقت کو یاد کرو کہ جب عیسیٰ بن مریم نے کہا کہ اے بنی اسرائیل میں تمہاری طرف اللہ کا رسول ہوں اور توریت کی تصدیق کرنے والا ہوں اور بشارت دینے والا ہوں ایک عظیم الشان رسول کی جو میرے بعد آئے گا اور اس کا نام احمد ہوگا۔

اصل بشارت میں لفظ احمد موجود تھا اور جیسا کہ انجیل برناباس میں اب بھی موجود ہے لیکن جب انجیل کا عبرانی زبان سے یونانی زبان میں ترجمہ ہوا تو یونانیوں نے اپنی عادت کی بنا پر کہ وہ ترجمہ کرتے ناموں کا بھی ترجمہ کر دیا کرتے تھے آنحضرت کے نام مبارک (احمد) کا ترجمہ بھی پیرکلوطوس سے کر دیا اور پھر جب یونانی نسخہ کا ترجمہ عربی زبان میں ہوا تو پیرکلوس کا معرب فارقلیط کر لیا گیا ایک عرصہ تک اردو اور فارسی اور عربی نسخوں میں فارقلیط کا لفظ رہا اس کے بعد اس کا ترجمہ روح القدس سے کیا گیا اور مسیحیین روح القدس کے لفظ کو بطور تفسیر خطوط وحدانی میں لکھتے رہے رفتہ رفتہ فارقلیط کے لفظ کو بالکل حذف کر دیا پھ کسی نے فارقلیط کی جگہ روح القدس کا لفظ اور کسی نے روح حق کا لفظ اور کسی نے مددگار اور تسلی دینے والے کا لفظ رکھ دیا اور فارقلیط کے لفظ کو انجیل کے نسخوں سے بالکل حذف کر دیا۔

لفظ فارقلیط کی تحقیق

لفظ فارقلیط اصل میں یونانی زبان سے معرب کیا گیا ہے اور یہ لفظ یونانی زبان میں کئی معنی میں مشترک ہے اور وہ سب معنی احمد مجتبیٰ محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتے ہیں۔ علماء نصاریٰ نے فارقلیط کے مختلف معنی بیان کیے ہیں۔

۱- کسی نے کہا کہ فارقلیط کے معنی تسلی دینے والے کے ہیں جس کا عربی ترجمہ معزّی ہے ۲- کسی نے کہا کہ اس کے معنی معین اور مددگار کے ہیں، ۳- کسی نے کہا کہ اس کے معنی شافع یعنی شفاعت کرنے والے کے ہیں، ۴- کسی نے کہا کہ اس کے معنی وکیل یعنی وکالت کرنے والے کے ہیں۔ ۵- کسی نے کہا کہ اس کے معنی بڑا سراہنے والا جس کا فارسی ترجمہ ستائندہ اور عربی ترجمہ حماد اور احمد بصیغۂ اسم تفضیل بمعنی فاعل ہے، ۶- اور کسی نے کہا کہ اس کے معنی بڑا سراہا گیا یعنی بڑا ستودہ کے ہیں جس کا عربی ترجمہ محمد ہے اور احمد اسم تفضیل بمعنی مفعول ہے

ایک مکان میں جمع تھے تو وہ روح ان پر نازل ہوئی اور اس کے روح کے نزول سے حواریین تھوڑی دیر کے لیے مختلف زبانیں بولنے لگے۔

نصاریٰ کا یہ خیال سراسر خیال خام ہے یہ بشارت کسی مقدس اور برگزیدہ انسان کے حق میں ہے جو خدا کی طرف سے الہام پاتے گا اور خدا کی طرف سے اس کو جو القاء ہوگا وہی کہے گا اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا۔ اس بشارت کو روح القدس یعنی جبرئیل امین کے نزول سے کوئی واسطہ نہیں اور کسی فرشتہ سے اس بشارت کا کوئی تعلق نہیں۔ فارقلیط کی آمد سے ایک رسول عظیم کی بعثت مراد ہے جو حق اور باطل کے درمیان فرق کرے گا۔

حضرت مولانا عبدالحق صاحب حقانی صاحب تفسیر حقانی عقائد الاسلام ص ۶۸ میں لکھتے ہیں:

ایک پادری صاحب اپنے ایک رسالہ میں جو لفظ فارقلیط کی تحقیق میں انہوں نے لکھا ہے اور ۱۲۶۸ ہجری میں کلکتہ میں چھپا تھا لکھتے ہیں کہ یہ لفظ فارقلیط یونانی زبان سے معرب کیا گیا ہے پس اگر اس کی یونانی میں پاراکلی طوس اصل قرار دی جاتے تو اس کے معنی معین اور وکیل کے ہیں اور اگر کہیں اصل پیرکلوطوس ہے تو اس کے معنی محمد یا احمد کے قریب ہیں پس جس عالم میں اہل اسلام نے اس بشارت سے استدلال کیا تو وہ اصل پیرکلوطوس سمجھا کیونکہ اس کے معنی محمد یا احمد کے قریب ہیں۔ پس اس نے دعویٰ کیا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے محمد یا احمد کی خبر دی لیکن اصل پاراکلی طوس ہے فقط ہم کہتے ہیں کہ اصل پیرکلوطوس ہے یونانی خط میں بہت تشابہ ہے اس کو پاراکلی طوس غلطی سے پڑھ لیا۔ انتہیٰ کلامہ۔

اور دیکھو اظہار الحق ص ۱۵۵ ج ۲ مصنفہ فاضل محقق مولانا محمد رحمت اللہ کیرانوی قدس اللہ سرہ یہ مضمون اظہار الحق ہی کی عبارت کا ترجمہ ہے جو عربی میں ہے۔

اور یونانی زبان میں پیرکلوطوس ہونے کی ایک بڑی دلیل ہے کہ سینٹ جیروم نے جب انجیل کا ترجمہ لاطینی زبان میں لکھنا شروع کیا تو پیرکلوطوس کی جگہ پاراکلوطوس لکھ دیا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جس کتاب سے نقل کیا تھا پیرکلوطوس تھا۔ (تفسیر حقانی ص ۱۰۹ تفسیر سورہ الصف)

اور اگر ہم اس تحقیق سے قطع نظر بھی کر لیں تو تب بھی ہمارا مدعا ثابت ہے کیونکہ اس بشارت میں اس آنے والے فارقلیط کے بہت سے اوصاف بیان کیے ہیں جو بہ تمام وکمال سیدنا و مولانا محمد مصطفیٰ واحمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق اور منطبق ہیں۔

اول یہ کہ جب تک میں نہ جاؤں گا وہ نہ آئے گا دوم یہ کہ وہ میری گواہی دے گا۔ سوم یہ کہ

وہ گناہ اور راستی اور عدالت سے تقصیروار ٹھہراتے گا۔ چہارم یہ کہ مجھ پر نہ ایمان لانے والوں کو سزا دے گا۔ پنجم، وہ سچائی کی راہ بتلا دے گا۔ ششم، یہ کہ وہ آئندہ کی خبریں دے گا، ہفتم یہ کہ وہ اپنی طرف سے کچھ نہ کہے گا بلکہ جو اللہ سے سنے گا وہی کہے گا۔ ہشتم یہ کہ وہ جہان کا سردار ہوگا۔ نہم یہ کہ وہ میری تمام باتیں تم کو یاد دلاتے گا۔ دہم یہ کہ جو امور تم اس وقت برداشت نہیں کر سکتے وہ نبی اس وقت آکر تم کو بتلاتے گا اور جو باتیں غیر مکمل ہیں ان کی تکمیل کرے گا اور یہ تمام باتیں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر صادق آتی ہیں۔ ۱- آپ کا تشریف لانا حضرت عیسٰی علیہ السلام کے جانے پر اس لیے موقوف تھا کہ آپ خاتم الانبیاء ہیں اس لیے کہ کسی نبی کا آنا پہلے نبی کے جانے پر جب ہی موقوف ہو سکتا ہے جب دوسرا نبی خاتم الانبیاء ہو ورنہ اگر وہ نبی خاتم الانبیاء نہیں تو اس کے آنے سے پہلے نبی کا جانا شرط ہونا کوئی معنی نہیں رکھتا اس لیے کہ جب وہ نبی خاتم الانبیاء نہیں تو پہلے نبی کی موجودگی میں بھی وہ مبعوث ہو سکتا ہے۔

پہلے نبی کا جانا دوسرے کے آنے کے لیے جب ہی شرط ہو سکتا ہے کہ جب دوسرا نبی خاتم الانبیاءؑ ہو۔ الحاصل حضرت مسیح نے اس جملہ سے یہ ظاہر فرما دیا کہ وہ فارقلیطا اور روح حق خاتم الانبیاءؑ ہوگا کما قال اللہ تعالٰی۔

ما کان محمدٌ ابا احدٍ من رجالکم ولکن رسول اللّٰہ وخاتم النبیین۔

محمد صلی اللہ علیہ وسلم تمہارے مردوں میں سے کسی کے باپ نہیں لیکن اللہ کے رسول اور آخر النبیین ہیں۔

اور حضرت مسیح خاتم النبیین نہ تھے ورنہ علماء نصاریٰ و یہود حضرت مسیح کے بعد ایک نبی کے کس لیے منتظر تھے اور روح کا آنا حضرت عیسٰی علیہ السلام کے جانے پر موقوف نہ تھا۔ روح کا نزول تو حضرت عیسٰی کی موجودگی میں بھی ہوتا تھا۔

۲- اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عیسٰی علیہ السلام کی گواہی بھی دی۔

وما قتلوہ وما صلبوہ ولکن شبہ لہم وان الذین اختلفوا فیہ لفی شکٍ منہ، ما لہم بہ من علمٍ الا اتباع الظن وما قتلوہ یقیناً بل رفعہ اللّٰہ الیہ وکان اللّٰہ عزیزاً حکیماً،

اور انہوں نے نہ ان کو (عیسٰی علیہ السلام) کو قتل کیا اور نہ سولی دی لیکن اشتباہ میں

کیونکہ لفظ احمد صیغہ اسم تفضیل کا ہے جو کبھی بمعنی فاعل آتا ہے اور کبھی بمعنی مفعول پس اگر احمد اسم تفضیل بمعنی فاعل ہو تو اس کا ترجمہ یہ ہوگا بڑی حمد و ثنا کرنا یعنی خدا تعالیٰ کا بڑا سراہنے والا اور اگر احمد اسم تفضیل بمعنی مفعول ہو تو اس کا ترجمہ یہ ہوگا بڑا ستودہ یعنی جو خدا اور بندوں میں بڑا ہی ستودہ ہے کہ ہر جگہ اس کی تعریف کی جاتی ہے ۔۷۔ اور بعضوں نے فارقلیط کا ترجمہ امیدگاہ عوام سے کیا ہے ۸۔ اور بعض نسخوں میں رسول کا لفظ ہے ۔۹۔ اور بعض نے کہا کہ اس کے معنی روح حق کے ہیں ۔
۱۰۔ اور کسی نے کہا کہ اس کے معنی ثقہ اور معتبر کے ہیں ۔

پس اگر فارقلیط کی اصل یونانی زبان میں پاراکلی طوس قرار دی جائے تو اس کے معنی معین اور مددگار اور وکیل کے ہیں اور اگر یہ کہا جائے کہ اس کی اصل پیرکلوطوس ہے تو اس کے معنی محمد یا احمد یا حمّاد کے قریب قریب ہیں ۔

انجیل کے تمام قدیم نسخوں میں عربی اور فارسی اور اردو تمام نسخوں میں فارقلیط کا لفظ موجود تھا مگر اب موجودہ نسخوں میں لفظ فارقلیط کے بجائے زیادہ تر مددگار اور روح حق کا لفظ پایا جاتا ہے مگر باوجود ان تحریفات اور تغیرات و تبدلات کے پھر بھی مدعا حاصل ہے اس لیے کہ اس بشارت فارقلیط کے جو اوصاف ذکر کیے گئے ہیں وہ تمام کے تمام محمد مصطفیٰ اور احمد مجتبیٰ صلی اللہ علیہ وسلم پر علی وجہ الکمال والتمام صادق اور منطبق ہیں اور فارقلیط کے جو معنی بھی لیے جائیں وہ سب آپ پر صادق ہیں آپ خدا تعالیٰ کے وکیل اور سفیر بھی ہیں اور روح حق اور روح صدق اور روح راستی بھی ہیں یعنی روح خبیث نہیں جو جھوٹ بولے اور امت کے شافع بھی ہیں اور بشیر و نذیر بھی ہیں اور خدا کے ستودہ اور پسندیدہ بندہ بھی ہیں اور سب سے زیادہ خدا کی حمد و ثنا کرنے والے بھی ہیں بلکہ یہ تمام آپ کے اسماء ہیں یعنی آپ کے نام ہیں کوئی ان میں سے اسم صفت ہے جیسے وکیل اور شافع اور معین و مددگار اور روح الحق اور کوئی اسم علم ہے جیسے احمد اور محمد اور محمود اور حمّاد اور آپ کے ناموں سے ایک نام آپ کا حمد بھی ہے حمد اگرچہ مصدر ہے بمعنی ستودن مگر مبالغۃً آپ پر اطلاق کر دیا گیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم حق تعالیٰ کی مجسم حمد و ثنا ہیں ۔

فارقلیط کا سب سے زیادہ صحیح ترجمہ لفظ احمد ہے اور اسی وجہ سے قرآن کریم میں اس بشارت کا ذکر بلفظ احمد آیا ہے کما قال اللہ تعالیٰ، مبشرا برسول یاتی من بعدی اسمہ احمد ۔

یہ آیت قرآن مجید کی ہے اور قرآن مجید جس ملک میں نازل ہوا اس وقت اُس ملک میں بے شمار علماءِ یہود اور علماءِ نصاریٰ موجود تھے۔ اگر یہ بشارت اور خبر غلط ہوتی تو ہزارہا علماءِ یہود و نصاریٰ اس غلطی کو فاش کرتے اور برملا اس خبر کی تردید کرتے اور جو علماءِ یہود اور نصاریٰ اسلام میں داخل ہو گئے تھے وہ اس غلط بیانی کو دیکھ کر فوراً اسلام سے برگشتہ ہو جاتے اور بغیر شور و غل مچاتے خاموش نہ بیٹھتے۔ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پیشین گوئی کو علی الاعلان ظاہر فرمانا اور بیان کرنا اور علماءِ نصاریٰ کا خاموش رہنا یہ ان کے اعتراف اور تسلیم کی روشن دلیل ہے اور اگر کوئی یہ اعتراض کرے کہ اگر یہ بات سچی تھی تو اُس وقت کے تمام علماءِ یہود و نصاریٰ کیوں مسلمان نہ ہو گئے۔

جواب

یہ ہے کہ علماءِ نصاریٰ کے نزدیک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے ظہور کی پیشین گوئیاں توریت میں موجود ہیں مگر باوجود ان پیشین گوئیوں کے اور باوجود حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کے مشاہدہ کر لینے کے پھر بھی علماءِ یہود حضرت مسیح پر ایمان نہیں لاتے بلکہ اُن کے دشمن ہو گئے اور بوجہ سنگدلی اور بوجہ دنیاوی اغراض یا بوجہ حسد کے حضرت مسیح کی دعوت کو قبول نہیں کیا بلکہ صاف طور پر علماءِ یہود یہ کہتے ہیں کہ توریت میں حضرت مسیح کی کوئی بشارت نہیں اور نہ ان کا کوئی ذکر ہے اسی طرح بہت سے علماء نصاریٰ نے بوجہ سنگدلی اور بوجہ دنیاوی اغراض آپ کا پیرو ہونا قبول نہ کیا۔ حالانکہ ان کو یقین تھا کہ یہی وہ نبی ہیں جن کی مسیح بن مریم نے بشارت دی ہے جیسے ہرقل اور مقوقس نے صاف طور پر اس کا اقرار کیا کہ آپ وہی نبی ہیں جن کی انجیل میں بشارت دی گئی مگر اپنی سلطنت کی خاطر اسلام میں داخل نہیں ہوتے اور علماءِ نصاریٰ میں جو منصف اور حق پرست تھے جیسے نجاشی شاہ حبشہ اور ضغاطر رومی اور ابن الناطور وغیرہم یہ لوگ ایمان لاتے اور بہت سے علماءِ نصاریٰ نے دیدہ و دانستہ علماءِ یہود کی طرح صاف طور پر یہ کہہ دیا کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی توریت و انجیل میں کوئی بشارت نہیں۔ علمائے نصاریٰ کی یہ تکذیب ایسی ہے جیسا کہ علماءِ یہود اور دیگر یہود حضرت مسیح کی بشارتوں کے منکر اور مکذب ہیں۔ علماءِ نصاریٰ یہ کہتے ہیں کہ اس بشارت میں فارقلیط کی آمد سے روح القدس کا حواریین پر نازل ہونا مراد ہے۔ چنانچہ حضرت عیسیٰ کے رفع الی السماء کے بعد جب حواریین

شریعت کا کوئی علم نہیں کہ جس کی رُو سے وہ فتویٰ دے سکیں، ہاں نصاریٰ کے پاس صنعت و حرفت اور کاریگری کے علوم و فنون ہیں حکمرانی اور جہانبانی اور عدل عمرانی کے متعلق اُن کے پاس کوئی آسمانی قانون نہیں کہ جس کے رُو سے وہ دُنیا میں عدل و انصاف کے ساتھ حکومت کر سکیں۔ مغربی اقوام کے پاس جو دستور ہے وہ چند اہل فکر کے افکار اور خیالات کا نتیجہ ہے۔ شریعت اسلامیہ کی طرح آسمان سے نازل شدہ کوئی قانون اُن کے پاس نہیں۔

علماء مسیحیین اس بشارت کو روح القدس کے حق میں قرار دیتے ہیں جس کا نزول حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے رفع السماء کے ۷ ،۴ یوم بعد حواریین پر ہوا۔ لیکن یہ قول چند وجوہ سے باطل ہے۔ ۱۔ اس لیے کہ روح کا نازل ہونا حضرت مسیح کے جانے پر موقوف نہ تھا بلکہ وہ تو ہر وقت حضرت مسیح کے ساتھ رہتی تھی۔

۲۔ اور نہ روح نے کسی کو راستی اور عدالت سے ملزم ٹھہرایا اور نہ کسی یہودی کو حضرت مسیح پر نہ ایمان لانے کی وجہ سے کبھی سزا دی البتہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشرکین اور کافرین سے جہاد بھی کیا اور یہودیوں کو کافی سزا بھی دی اور ان کو ملزم ٹھہرایا اس لیے کہ اہلِ دُنیا کو الزام دینا اور ان کی سرزنش کرنا بغیر حکومت کے ممکن نہیں معلوم ہوا کہ آنے والا فارقلیط اور دوسرا مددگار دُنیا کا حاکم اور بادشاہ ہوگا جو مجرموں کی سرزنش کرے گا اور چودہویں باب کے درس ۳۰ میں جو دُنیا کے سردار آنے کا ذکر ہے اس سے یہی دنیا کا حاکم مراد ہے کہ جس کی حکومت اور توبیخ اور سرزنش کا ذکر ہو چکا ہے۔

۳۔ نیز حضرت مسیح کا اس پر ایمان لانے کی تاکید فرمانا بالکل بے محل ہے اس لیے کہ حواریین پیشتر ہی سے روح القدس پر ایمان رکھتے تھے اس کے فرمانے کی کیا حاجت تھی کہ "جب وہ آتے تب تم ایمان لاؤ"، حضرت مسیح کا اس قدر اہتمام فرمانا اور اس پر ایمان لانے کی وصیت کرنا خود اس کو بتلا رہا ہے کہ وہ آنے والی شئے کچھ ایسی ہوگی جس کا انکار تم سے بعید نہ ہوگا۔

پس اگر فارقلیط سے روح مراد ہوتی تو اس کے لیے چنداں اہتمام اور تاکید کی ضرورت نہ تھی اس لیے کہ جس کے قلب پر روح کا نزول ہوگا اس سے روح کا انکار ہونا بالکل ناممکن ہے۔ روح القدس کا نزول بالبداہت مفید یقین ہے جس طرح روح القدس کے نزول سے بالبداہت پیغمبر کو اپنی نبوت کا یقین آ جاتا ہے۔ پیش آنے والی چیز سے انسان کو ایسا یقین کامل ہو جاتا ہے کہ قوتِ خیالیہ بھی اس کو دفع نہیں کر سکتی انسان پر جب کوئی حالت طاری ہوتی تو

اس کا انکار ممکن نہیں ہوتا۔

۴- نیز اس بشارت کا سیاق اس بات کو بتلا رہا ہے کہ وہ آنے والا فارقلیط حضرت عیسٰی کا مغایر ہے جیسا کہ سولھویں آیت کا یہ لفظ دوسرا مددگار بخشے گا۔ صاف مغایرت پر دلالت کرتا ہے کہ وہ علیحدہ صورت میں ظاہر اور نمودار ہوگا۔

پس اگر فارقلیط سے روح القدس مراد لی جاتے تو وہ حضرت عیسٰی کے کسی طرح مغائر نہیں کیونکہ نصاریٰ کے نزدیک ابن اور روح القدس میں حقیقی اتحاد ہے اور روح القدس جو حواریین پر ظاہر ہوگی وہ کسی علیحدہ صورت میں ظاہر نہیں ہوئی جس طرح کسی شخص پر جن مسلط ہو جاتا ہے سو جن کی باتیں وہی ہوتی ہیں جو اس شخص کے منہ سے نکلتی ہیں علیحدہ صورت میں اس کا ظہور نہیں ہوتا۔

۵- نیز اس بشارت میں یہ بھی مذکور ہے کہ جو کچھ میں نے تمہیں کہا، یاد دلاتے گا۔ حالانکہ کسی کتاب سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ حواری حضرت عیسٰی کے ارشادات فراموش کر چکے تھے۔ روح القدس نے ان کو علیحدہ صورت میں ظاہر ہو کر یاد دلاتے ہوں۔

۶- نیز اس بشارت میں یہ بھی مذکور ہے کہ "وہ میرے لیے گواہی دے گا" سو یہ وصف صرف نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم پر ہی صادق آ سکتا ہے کہ آپ ہی نے آکر مشرکین اور یہود کے سامنے حضرت مسیح کی گواہی دی اور اُن لوگوں کے سامنے کہ جو حضرت مسیح سے منکر یا بے خبر تھے آپ ہی نے حضرت مسیح کی رسالت کا اعلان کیا۔

بخلاف روح القدس کے وہ حضرت عیسٰی کے حواریین پر نازل ہوئی اور حواریین پہلے ہی سے حضرت مسیح کو رسول جانتے تھے اُن کے سامنے گواہی دینے کی کوئی حاجت نہ تھی۔

گواہی کی ضرورت تو منکرین کے سامنے تھی نہ کہ مومنین کے سامنے بخلاف آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے، آپ نے یہود کے سامنے جو حضرت عیسٰی علیہ السلام کے منکر اور دشمن تھے۔ علی الاعلان حضرت عیسٰی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی نبوت و رسالت کی گواہی دی۔ اور ان کے دعوائے قتل و صلب کی تردید کی اور رفع الی السماء کو ثابت کیا۔

۷- نیز حضرت مسیح اس فارقلیط کی نسبت یہ ارشاد فرماتے ہیں کہ "مجھ میں اُس کی کوئی چیز نہیں" سو یہ جملہ آنحضرت ہی پر صادق آ سکتا ہے کہ مجھ میں اس کی کوئی چیز نہیں۔ روح القدس اور مسیح تو ایک ہی چیز ہیں۔

ڈال دیے گئے اور جن لوگوں نے عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختلاف کیا وہ یقیناً شک میں ہیں خود ان کو اس کا یقین نہیں محض گمان کی پیروی ہے یقیناً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو اپنی طرف اٹھا لیا وہی غالب و حکیم ہے۔

۳- اور راستی اور عدالت سے ملزم بھی کیا - ۴- اور حضرت مسیح کے نہ ماننے والوں کو پوری پوری سزا بھی دی کسی سے قتال اور جہاد کیا اور کسی کو جلا وطن کیا جیسا کہ یہود خیبر اور یہود بنو نضیر اور اور یہود بنو قینقاع کے واقعات سے ظاہر ہے اور روح نے نہ کسی کو ملزم ٹھہرایا اور نہ کسی کی سرزنش کی اور سرزنش کرنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ فارقلیط ظاہر ہونے کے بعد حکومت کے ساتھ لوگوں کو توبیخ اور سرزنش کرے گا اور ظاہر ہے کہ روح القدس کا ظاہر ہو کر عام لوگوں پر حکومت کرنا کہیں ثابت نہیں اور نہ حواریین کا یہ منصب تھا۔ حواریین نے حکومت کے طور پر کسی کی توبیخ نہیں کی بلکہ واعظانہ طور پر لوگوں کو سمجھاتے تھے جن میں حکومت کا زور نہ تھا غرض یہ کہ کسی طرح بھی روح القدس کو فارقلیط کا مصداق نہیں قرار دیا جا سکتا۔

اور آیت دہم میں سرزنش کی یہ وجہ بیان فرمانا اس لیے کہ وہ مجھ پر ایمان نہیں لاتے اس پر دلالت کرتا ہے کہ اس فارقلیط اور مددگار اور وکیل و شفیع کا ظہور منکرین عیسیٰ علیہ السلام کے سامنے ہوگا۔ بخلاف روح کے کہ اس کا ظہور تو آپ کے نزدیک حواریین پر ہوا کہ جو منکرین عیسیٰ علیہ السلام نہ تھے اور نہ حواریین نے کسی کو سزا دی وہ خود ہی مسکین اور عاجز تھے کسی منکر کو کیسے سزا دے سکتے تھے۔ ۵- اور آنحضرت نے صدق اور راستی کی وہ راہیں بتائیں کہ جو نہ کسی نے دیکھی اور نہ سنی، آپ کی شریعت غراء اور ملت بیضاء اس کی شاہد ہے۔ ۶- اور آئندہ واقعات کے متعلق آپ نے اتنی خبریں دیں کہ جن کا کوئی شمار نہیں اور ایسی صحیح خبریں دیں کہ جو ہو بہو ظاہر ہوئیں اور ان کا ایک حرف بھی خلاف واقعہ نہ نکلا اور تا قیامت اسی طرح ظاہر ہوتی رہے گی۔ ۷- اس لیے کہ آپ نے اپنی طرف سے کچھ نہیں فرمایا کما قال تعالیٰ وما ینطق عن الھویٰ ان ھو الا وحی یوحی ۸- اور رہا ابن ہمہ جہان کے سردار اور بادشاہ بھی ہوتے اور جہان اور دنیا کی سرداری سے اس طرف اشارہ ہے کہ آپ کی نبوت تمام عالم کے لیے ہوگی کسی قوم کے ساتھ مخصوص نہ ہوگی۔ ۹- اور نصاریٰ نے حضرت مسیح کی صحیح تعلیمات کو محو کر دیا تھا ان کو بھی یاد دلایا جن میں توحید و تثلیث کا مسئلہ بھی ہے اس کو خوب یاد دلایا اور حضرت مسیح کے قتل و صلب کی نفی اور رفع الی السماء کا اثبات فرمایا۔

قل یا اھل الکتاب تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم الا نعبد الا
اللہ ولا نشرک بہ شیئاً ولا یتخذ بعضنا بعضاً اربابا من دون اللہ
آپ فرما دیجئے کہ اے اہل کتاب ایک ایسے امر کی طرف آؤ کہ جو ہم میں اور تم میں
مسلم ہے وہ یہ کہ خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں اور اس کے ساتھ کسی کو
شریک نہ کریں اور ایک دوسرے کو اللہ کے سوا رب نہ بنائیں۔
و قال المسیح یٰبنی اسرائیل اعبدوا اللہ ربی و ربکم انہ من یشرک
باللہ فقد حرم اللہ علیہ الجنۃ و ماوٰہ النار و ما للظٰلمین من انصار۔
اور فرمایا حضرت مسیح بن مریم نے اے بنی اسرائیل بندگی کرو صرف ایک اللہ کی جو
میرا اور تمہارا پروردگار ہے۔ تحقیق جو اللہ کے ساتھ شریک کرے گا تو اللہ
تعالیٰ نے اُس پر جنت کو حرام کیا ہے اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور ظالموں کا
کوئی مددگار نہیں۔

۱۰۔ آپؐ نے مبعوث ہونے کے بعد وہ باتیں بھی بتلائیں کہ جو حضرت مسیح علیہ الصلوٰۃ والسلام کے زمانہ میں بنی اسرائیل کے تحمل سے باہر تھیں یعنی ذات وصفات، شریعت وطریقت، حشر و نشر، جنت و جہنم کے متعلق وہ علوم و معارف کے دریا بہاتے کہ جن سے تمام عالم دنگ ہے اور کسی کتاب میں ان علوم کا نام و نشان نہیں اور جو اُمور غیر تکمیل شدہ تھے آپ کی شریعتِ کاملہ نے ان سب کی تکمیل بھی کر دی کما قال تعالیٰ،

الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی و رضیت
لکم الاسلام دیناً۔
آج میں نے تمہارے لیے تمہارا دین مکمل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کو پورا کر دیا
اور تمہارے لیے اسلام کو پسند کیا دین بنا کر۔

اور قیامت تک کے لیے دُنیا کو ایک ایسا کامل اور مکمل دستور (یعنی شریعت) دے گئے جو اُن کے دین اور دُنیا کی صلاح اور فلاح کا کفیل ہے اور اس کے حقائق اور دقائق اور اسرار و حکم کو دیکھ کر دُنیا حیران ہے قیامت تک پیش آنے والے واقعات کا حکم شریعت محمدیہ سے معلوم ہو سکتا ہے علماء یہود و نصاریٰ کے پاس کوئی شریعت ہی نہیں جس کو سامنے رکھ کر علماء اُمت اور فقہاء ملت کی طرح فتویٰ دے سکیں۔ اس وقت کے نصاریٰ کے پاس

۸- نیز یہ بھی قابلِ غور ہے کہ اس روح نے کون سی آئندہ کی خبریں بتلائیں کہ جس سے اس روح کو اس بشارت کا مصداق کہا جاتے۔

۹- نیز اس بشارت کا تمام سیاق و سباق دلالت کرتا ہے کہ آنے والا دوسرا فارقلیط اور دوسرا مددگار لباسِ بشری اور پیکرِ انسانی میں ظہور کرے گا اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی طرح لباسِ بشری میں دعوتِ حق اور لوگوں کی تسلی کے لیے آوے گا پس فارقلیط کا مصداق اُس روح کو سمجھنا کہ جو آدمیوں پر جن کی طرح نازل ہوا اور ان میں حلول کرے بالکل غلط ہے۔

۱۰- نیز حضرت عیسیٰ کے رفع الی السماء کے بعد سے عامۂ نصاریٰ فارقلیط کے منتظر رہے اور یہ سمجھتے تھے کہ کوئی عظیم الشان نبی مبعوث ہوگا۔ چنانچہ منتس عیسائی نے دوسری صدی عیسوی میں یہ دعویٰ کیا کہ میں وہی فارقلیط ہوں کہ جس کی حضرت مسیح نے خبر دی ہے۔ بہت سے لوگ اس پر ایمان لے آئے جس کا مفصل تذکرہ ولیم میور مسیحی نے اپنی تاریخ کے تیسرے باب میں لکھا ہے۔ اور یہ کتاب ۱۸۴۸ء میں طبع ہوئی۔ معلوم ہوا کہ علماء یہود اور نصاریٰ یہی سمجھتے تھے کہ فارقلیط سے کوئی انسان مراد ہے نہ کہ روح القدس۔

اور لب التواریخ کا مصنف جو کہ ایک مسیحی عالم ہے لکھتا ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے قبل یہود و نصاریٰ ایک نبی کے منتظر تھے اور اسی وجہ سے نجاشی شاہ حبشہ جعفر طیار رضی اللہ عنہ سے آپ کا حال سن کر ایمان لایا اور کہا کہ بلاشک یہی وہ نبی ہیں کہ جن کی حضرت مسیح نے انجیل میں خبر دی ہے حالانکہ نجاشی انجیل کا عالم ہونے کے علاوہ بادشاہ بھی تھا۔ کسی قسم کا اُس کو خوف و خطر بھی نہ تھا۔

اور مقوقس شاہ قبط نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے والا نامہ کے جواب میں یہ لکھا:

سلام علیک اما بعد فقد قرأت کتابک و فهمت ماذکرت فیه وما تدعوالیه و قد علمت ان نبیا قد بقی و قد کنت اظنّ انه یخرج بالشام و قد اکرمت رسولک

سلام ہو آپ پر، اما بعد میں نے آپ کے والا نامہ کو پڑھا اور جو کچھ آپ نے اس میں ذکر فرمایا ہے اور جس کی طرف دعوت دی ہے اس کو سمجھا، مجھ کو خوب اچھی طرح معلوم ہے کہ اب صرف ایک نبی باقی رہ گیا ہے۔ میرا گمان یہ تھا کہ وہ نبی شام میں ظاہر ہوگا۔ اور میں نے آپ کے قاصد کا اکرام کیا۔

مقوقس اگرچہ اسلام نہ لایا مگر تنا اقرار ضرور کیا کہ ایک نبی کا آنا باقی رہ گیا ہے۔

اور جارود بن علاء جو اپنی قوم میں بہت بڑے عالم تھے جب اپنی قوم کے ساتھ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف باسلام ہوتے تو یہ کہا:

واللہ لقد جئت بالحق و نطقت بالصدق لقد وجدت وصفک فی الانجیل و بشر بک ابن البتول۔ فطول التحیۃ لک والشکر لمن اکرمک لا اثر بعد عین ولا شک بعد یقین مد یدک اشھد ان لا الٰہ الا اللہ وانک محمد رسول اللہ

خدا کی قسم آپ حق لے کر آتے ہیں اور آپ نے سچ فرمایا البتہ تحقیق میں نے آپ کی صفت انجیل میں پائی ہے اور مسیح بن مریم نے آپ کی بشارت دی ہے۔ آپ کے لیے طویل و عریض تحیۂ تکریم پیش کرتا ہوں۔ اور شکر ہے اس کے لیے جو آپ کا اکرام کرے ذات کے بعد نشان کی اور یقین کے بعد شک کی ضرورت نہیں۔ اپنا دست مبارک بڑھائیے میں شہادت دیتا ہوں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور یقیناً آپ محمد رسول اللہ ہیں۔

اور علی ہذا ہرقل شاہ روم اور دوسرے ذی شوکت علماء تورات و انجیل نے آپ کی نبوت و رسالت کا اقرار کیا پس ثابت ہوا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بشارت اور آپ کا نام انجیل میں لکھا ہوا تھا جس کو دیکھ کر لوگ آپ پر ایمان لاتے اور آپ کی آمد سے پہلے وہ آپ کے منتظر تھے جن کو خدا تعالیٰ نے توفیق دی اور کسی دُنیوی طمع نے ان کو نہ گھیرا وہ اس دولت سے متمتع ہوتے ے

ایں سعادت بزور بازو نیست
تا نہ بخشد خدائے بخشندہ

ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء واللہ ذو الفضل العظیم۔ والحمد للہ الذی ھدانا لھذا وما کنا لنھتدی لولا ان ھدانا اللہ۔

۱۱۔ اور سولھویں آیت کا یہ جملہ "کہ ابد تک تمہارے ساتھ رہے گا" اس کا یہ مطلب نہیں کہ وہ فارقلیط خود بذاتہٖ ہمیشہ تمہارے ساتھ رہے گا اس لیے کہ فارقلیط بمعنی روح جس کے نصاریٰ قائل ہیں وہ بھی ہمیشہ اُن کے ساتھ نہ رہا۔

بلکہ مراد یہ ہے کہ اُس کی شریعت اور دین ابد تک رہے گا اور اس کے بعد کوئی دین نہ آئے گا جو اس کے لیے ناسخ ہو۔

۱۲- اور باب چہاردہم کی سترھویں آیت کا یہ جملہ یعنی سچائی کی روح جسے دُنیا حاصل نہیں کر سکتی کیونکہ نہ اسے دیکھتی ہے اور نہ جانتی ہے۔ اھ

اس کا یہ مطلب ہے کہ دُنیا اس کے مرتبہ کو نہیں جانتی وہ تمام کائنات میں سب سے بہتر اور برتر ہوگا۔

نصاریٰ کے چند شبہات و اوہام اور اُن کا ازالہ

شبہ اوّل:- روح الحق اور روح القدس سے اقنوم ثالث مراد ہے لہٰذا روح القدس اور روح الحق سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم مراد لینا کیسے صحیح ہو سکتا ہے؟

جواب:- عہد قدیم اور عہد جدید میں روح کا لفظ اقنوم ثالث کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ صالح اور طالح، ہادی اور مضل کے معنی میں بھی مستعمل ہوتا ہے۔

چنانچہ یوحنا کے پہلے خط کے باب چہارم میں ہے:

۱- اے عزیزو! ہر ایک روح کا یقین نہ کرو بلکہ روح کو آزماؤ کہ وہ خدا کی طرف سے ہیں یا نہیں ۲- خدا کی روح کو تم اس طرح پہچان سکتے ہو کہ جو کوئی روح اقرار کرے کہ یسوع مسیح مجسم ہو کر آیا ہے وہ خدا کی طرف سے ہے۔ ۳- اور جو کوئی روح یسوع کا اقرار نہ کرے وہ خدا کی طرف سے نہیں اور آیت ششم میں ہے "اسی سے ہم حق کی روح اور گمراہی کی روح کو پہچان لیتے ہیں" اھ

اس مقام پر روح سے واعظِ صادق اور واعظِ مضل مراد ہے۔ اقنوم ثالث کسی کے نزدیک مراد نہیں۔

شبہ ثانیہ:- اس بشارت میں خطاب حواریین کو ہے لہٰذا روح کا نزول و ظہور حواریین کی موجودگی اور حیات میں ہونا چاہیے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ظہور حواریین کے صدہا سال کے بعد ہوا ہے۔

جواب:- حواریین کو خطاب اس لیے کیا گیا کہ اُس وقت وہی حاضر تھے باقی وہ مقصود بالخطاب نہیں، چنانچہ انجیل متی کے چھبیسویں باب ۲۶ آیت ۶۴ میں ہے۔ "میں تم سے یہ کہتا ہوں کہ اس کے بعد تم ابن آدم کو آسمان کے بادلوں پر آتے دیکھو گے" اھ

اب ان مخاطبین کو مرے ہوتے ۱۹ سو سال ہو گئے اور مخاطبین میں سے کسی نے بھی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان سے آتے نہیں دیکھا۔

پس جس طرح اس مقام پر مقصود بالخطاب وہ لوگ ہیں کہ جو نزول من السماء کے وقت موجود ہوں گے اسی طرح اس بشارت میں وہ لوگ مقصود بالخطاب ہیں کہ جو روح حق اور فارقلیط کے ظہور کے وقت موجود ہوں گے۔

شبہہ ثالثہ:۔ انجیل یوحنا باب چہاردہم آیت تیسویں میں جو سردار کا لفظ آیا ہے اس پر بعض شدید التعصب نصاریٰ مضحکہ کرتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ سردار سے اس جگہ شیطان مراد ہے۔

جواب:۔ سردار سے شیطان مراد لینا سراسر جہالت ہے اور محض تعصب اور حسد پر مبنی ہے اس لیے کہ سردار عالم بول کر شیطان مراد لینا نہ کسی لغت سے ثابت ہے اور نہ کسی عرف سے اور سراسر سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہے اس لیے کہ از اوّل تا آخر روح حق یعنی فارقلیط کا اور اس کے اوصاف کا تذکرہ ہے۔ جس وقت اس فارقلیط کا ظہور ہو اس وقت اس پر ایمان لانے کی تاکید کید ہے اور پھر اس کی علت بایں الفاظ ذکر فرمانا:

"کیونکہ دنیا کا سردار آتا ہے"

یہ جب ہی صحیح ہو سکتا ہے کہ سردارِ جہاں سے سید العالمین اور سردار انبیاء والمرسلین مراد ہوں۔ ورنہ معاذاللہ اگر اس مقام پر سردار سے شیطان مراد ہو تو شیطان کا آنا امور متذکرۂ بالا کی علت کیسے ہو سکتا ہے؟ معلوم ہوا کہ دنیا کے سردار سے وہی فارقلیط اور روح حق مراد ہے کہ جس کے ہاتھوں سے گناہ اور جرم پر دنیا میں شاہانہ اور حاکمانہ سزائیں دی جائیں گی اور انجیل یوحنا کے سولھویں باب درس ۱۱ میں جو یہ آیا ہے کہ دنیا کا سردار مجرم ٹھہرایا گیا یہ قطعاً غلط ہے اور بلاشبہ تحریف ہے جو سیاق و سباق کے بالکل خلاف ہے۔ ایک طرف تو فارقلیط کی صفات فاضلہ کا بیان ہو اور ایک طرف اس سے شیطان مراد ہو یہ کیسے ممکن ہے اور پھر اس سے بڑھ کر یہ کہ علماء نصاریٰ کے نزدیک کبھی اس سے روح القدس مراد ہو کیا یہ صریح نادانی اور وسوسۂ شیطانی نہیں۔ دوم یہ کہ حضرت مسیح کا یہ فرمانا کہ وہ سردارِ جہان آنے والا ہے اس امر کی صریح دلیل ہے کہ وہ شخص ابھی تک دنیا میں نہیں آیا اور شیطان باتفاق یہود و نصاریٰ اور اہل اسلام ابتداء آفرینش افراد بشری سے دنیا میں موجود ہے اور لوگوں میں مختلط ہے۔ شیطان مردود لوگوں کے ساتھ ہے۔

وہ شیطان کہاں چلا گیا ہے کہ جس کی نسبت یہ کہا جا رہا ہے کہ وہ اب آتا ہے کیا وہ پہلے سے موجود نہ تھا؟

سوم یہ کہ سردار کا اطلاق انجیل متی کے باب دوم کی آیت ششم میں حضرت مسیح بن مریم علیہ الصلوٰۃ والسلام پر کیا گیا۔

عبارت انجیل حسب ذیل ہے:

"اے بیت لحم یہوداہ کے علاقے تو یہوداہ کے حاکموں میں ہرگز سب سے چھوٹا نہیں۔ کیونکہ تجھ میں سے ایک سردار نکلے گا جو میری اُمت اسرائیل کی گلہ بانی کرے گا" اھ

اس عبارت میں سردار سے حضرت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام مراد ہیں جیسا کہ آیت ہشتم سے آیت دوازدہم تک پڑھنے سے بخوبی معلوم ہو سکتا ہے بلکہ کتب سماویہ میں سردار اور حاکم کا اطلاق حق تعالیٰ پر بھی آیا ہے معلوم ہوا کہ سردار سے شیطان مراد لینا بالکل غلط ہے۔

بشارت بست و دوم

از انجیل متی باب ۱۳، آیت ۳۱

"اس نے ایک اور تمثیل ان کے سامنے پیش کر کے کہا کہ آسمان کی بادشاہت اس رائی کے دانہ کے مانند ہے جسے کسی آدمی نے لے کر اپنے کھیت میں بو دیا۔ ۳۲۔ وہ سب بیجوں سے چھوٹا تو ہے مگر جب بڑھ جاتا ہے تو سب ترکاریوں سے بڑا ہوتا ہے اور ایسا درخت ہو جاتا ہے کہ ہوا کے پرندے آکر اس کی ڈالیوں پر بسیرا کرتے ہیں" انتہی

آسمانی بادشاہت سے شریعت اسلامیہ مراد ہے کہ جو ابتداء میں رائی کے دانے کے برابر تھی لیکن چند ہی روز میں اس قدر بڑھی کہ شرق سے غرب تک اور شمال سے جنوب تک پہنچ گئی۔

اور قرآن کریم کی اس آیت شریفہ میں اسی بشارت کی طرف اشارہ ہے،

ومثلھم فی الانجیل کزرع اخرج شطأہ فآزرہ فاستغلظ فاستویٰ علیٰ سوقہ یعجب الزراع لیغیظ بھم الکفار ط

اور ان کی صفت انجیل میں ہے کہ جیسے کھیتی کہ اس نے اپنا پٹھا زمین سے نکالا پس اس کو قوی کیا تو وہ موٹا ہو گیا اور اپنی نال پر سیدھا کھڑا ہو گیا اور اپنی روز افزوں ترقی سے کسانوں کو خوش کرنے لگا۔ اللہ نے مسلمانوں کو ایسی ترقی اس لیے دی کہ کافروں

کو اس وجہ سے غصہ میں لائے -
اور عجب نہیں کہ اسی مناسبت سے کلمہ طیبہ کو شجرۃ طیبہ کے ساتھ تشبیہہ دی گئی ہو. کما قال
الم تر کیف ضرب اللہ مثلاً کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلها ثابت و
فرعها فی السماء تؤتی اکلها کل حین باذن ربها و یضرب اللہ الامثال
للناس لعلهم یتذکرون -
اے نبی کریم آپ نے کیا دیکھا نہیں کہ اللہ نے ایک مثال بیان فرمائی ہے کہ کلمہ طیبہ مثل
ایک پاکیزہ درخت کے ہے کہ جس کی جڑ مضبوط اور شاخیں آسمان میں ہیں - ہر وقت
اپنے میوے اللہ کے حکم سے دیتا رہتا ہے حق تعالیٰ شانہٗ لوگوں کے لیے مثالیں
بیان فرماتے رہتے ہیں کیا عجب ہے کہ نصیحت قبول کریں -

بشارت بست وسوم

انجیل متی، باب بستم - آیت اوّل
آسمان کی بادشاہت اس گھر کے مالک کے مانند ہے جو سویرے نکلا کہ اپنے انگوری باغ
میں مزدور لگائے -۲- اور اس نے مزدوروں سے ایک دینار روز ٹھہرا کر انہیں باغ میں بھیج
دیا - پھر وہ دن چڑھنے کے قریب نکل کر اس نے اوروں کو بازار میں بے کار کھڑے دیکھا اور
اُن سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ، جو واجب ہے تمہیں دوں گا - پس وہ چلے گئے - پھر اس نے
دوپہر اور تیسرے پہر کے قریب نکل کر ویسا ہی کیا اور کوئی ایک گھنٹہ دن رہے پھر نکل کر
اوروں کو کھڑا پایا اور اُن سے کہا تم کیوں یہاں تمام دن بے کار کھڑے رہے - انہوں نے اس سے
کہا اس لیے کہ کسی نے ہم کو مزدوری پر نہیں لگایا - اس نے اُن سے کہا تم بھی باغ میں چلے جاؤ -
جب شام ہوئی تو باغ کے مالک نے اپنے کارندے سے کہا کہ مزدوروں کو بلا اور پچھلوں
سے لے کر پہلوں تک انہیں مزدوری دے دے - جب وہ آئے جو گھنٹہ بھر دن رہے لگائے
گئے تھے تو انہیں ایک دینار ملا تو گھر کے مالک سے یہ کہہ کر شکایت کرنے لگے - ان پچھلوں
نے ایک ہی گھنٹہ کام کیا ہے اور تو نے انہیں ہمارے برابر کر دیا جنہوں نے دن بھر کا بوجھ اٹھایا اور سخت
دھوپ سہی - اس نے جواب دے کر ان میں سے ایک سے کہا میاں میں تیرے ساتھ بے انصافی نہیں
کرتا - کیا تیرا مجھ سے ایک دینار نہیں ٹھہرا تھا جو تیرا ہی اٹھا لے چلا جا - میری مرضی یہ ہے کہ

جتنا تجھے دیتا ہوں اُس پچھلے کو بھی اتنا ہی دوں۔ کیا مجھے روا نہیں کہ اپنے مال کو جو چاہوں سو کروں۔ یا تو اس لیے کہ میں نیک ہوں بُری نظر سے دیکھتا ہے۔ اسی طرح آخر اول ہو جائیں گے۔ اور اول آخر۔ انتہیٰ)

گھر کے مالک سے رب العزت مراد ہیں اور انگور کے باغ سے دین الٰہی مراد ہے اور مزدوروں سے اُمتیں مراد ہیں۔ اور مزدوروں کی وہ جماعت کہ جس نے سب سے آخر میں ایک گھنٹہ کام کیا ہے یہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہے جو سب سے اخیر میں تھی اور سب سے اول ہو گئی۔

چنانچہ صحیح بخاری میں ہے:

عن ابن شہاب عن سالم بن عبداللہ عن ابیہ انہ اخبرہ انہ سمع رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یقول انما بقاءکم فیما سلف قبلکم من الامم کما بین الصلوٰۃ العصر الی غروب الشمس اوتی اھل التوراۃ التوراۃ فعملوا حتیٰ اذا انتصف النہار عجزوا فاعطوا قیراطاً قیراطاً ثم اوتی اھل الانجیل الانجیل فعملوا الی صلوٰۃ العصر ثم عجزوا فاعطوا قیراطاً قیراطاً۔ ثم اوتینا القرآن فعملنا الی غروب الشمس فاعطینا قیراطین قیراطین فقال اھل الکتابین ای ربنا اعطیت ھؤلاء قیراطین قیراطین واعطیتنا قیراطاً قیراطاً و نحن اکثر عملاً قال اللہ عزوجل ھل ظلمتکم من اجرکم من شیئ قالوا لا قال فھو فضلی اوتیہ من اشاء

(صحیح بخاری باب المواقیت ص ۷۹ ج ۱)

ابن شہاب نے سالم سے اور سالم نے عبداللہ بن عمر سے روایت کیا ہے کہ عبداللہ بن عمر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ارشاد فرماتے ہوئے سنا کہ تمہارا دُنیا میں رہنا بمقابلہ امم گزشتہ ایسا ہے جیسا نماز عصر سے غروب شمس تک، تورات والوں کو تورات دی گئی کام کرنا شروع کیا، جب دوپہر ہوئی تو تھک گئے اور کام پورا نہ کر سکے ایک ایک قیراط اُن کو دیا گیا۔ پھر انجیل والوں کو انجیل دی گئی، نماز عصر تک کام کیا، پھر تھک گئے۔ ان کو بھی ایک ایک قیراط دے دیا گیا۔ پھر ہم کو قرآن کریم دیا گیا۔ ہم نے غروب آفتاب تک کام کیا۔ ہم کو

دو دو قیراط دیے گئے تو توریت اور انجیل والوں نے یہ کہا کہ اے پروردگار آپ نے ان کو دو دو قیراط دیے اور ہم کو ایک ایک حالانکہ ہمارا عمل زیادہ ہے۔ اللہ عزوجل نے یہ ارشاد فرمایا کہ میں نے تمہاری اجرت میں کچھ کمی کی ہے؟ کہا نہیں، پس فرمایا۔ رب العزت نے یہ میرا فضل ہے جس کو چاہوں دوں۔

اور انجیل متی کی سولھویں آیت کا یہ جملہ کہ "اسی طرح آخر اول ہو جائیں اور اول آخر" بعینہٖ صحیح بخاری کی اس حدیث کے مطابق ہے؛

حدثنا ابو هریرة رضی الله تعالیٰ عنه عن رسول الله صلی الله علیه وسلم قال نحن الاٰخرون السابقون۔ (بخاری شریف ص ۱۰۴۲ ج ۲)

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ نحن الاخرون السابقون۔

یعنی زمانہ کے لحاظ سے ہم سب سے اخیر میں ہیں مگر دخولِ جنت میں حق تعالیٰ شانہٗ کے فضل سے سب سے مقدم ہیں۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

۲۰۱- وہ ان کو نیکی کا حکم دے گا اور ان کو برائی سے روکے گا۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ معروف سے مراد مکارمِ اخلاق اور صلہ رحمی ہے اور منکر سے مراد بتوں کی عبادت اور قطع رحمی ہے۔ مقاتل کہتے ہیں کہ معروف ایمان و توحید ہے جب کہ منکر شرک ہے۔ اگر عبداللہ ابن عباس کی تشریح کو اپنایا جاتے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن نے ان لفظوں میں نبی شناسی کا وہی اخلاقی پیمانہ پیش کیا ہے جس کی مدد سے آغازِ نبوت میں حضرت خدیجۃ الکبریٰ نے آپ کو نبی مانا تھا۔ یہ نبی شناسی کا اخلاقی پیمانہ ہے۔ امام بخاری نے اس پیمانے کا ذکر حدیث عائشہ میں کیا ہے اور حضرت خدیجہ کی زبانی اس اخلاقی پیمانہ کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے۔ آغازِ وحی میں جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجہ سے عالمِ مادی میں غارِ حرا کے روحانی مشاہدات کا تذکرہ کیا تو وہ ایمان لے آئیں۔ مگر کس پیمانہ سے اس کی توضیح اس سے ہوتی ہے کہ جب اپنے ان سے اپنے اس احساس کا تذکرہ کیا کہ خشیت علی نفسی تو حضرت خدیجہ

نے فرمایا،

خدا کی قسم خدا آپ کو رُسوا نہ کرے گا۔ آپ صلہ رحمی کرتے ہیں قرض داروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں۔ مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ حق کی خاطر مصیبتوں میں لوگوں کی مدد کرتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ نیکی کا حکم دینا اور برائی کا روکنا دعوتِ نبوت کی خصوصیات میں ہے۔ تورات میں جو صفات مذکور ہیں اس کا بہت بڑا عنصر آپ کی اخلاقیات سے متعلق ہے۔ احادیث سے بھی یہی پتہ لگتا ہے کہ آپ کی تشریف آوری کا مقصد مکارمِ اخلاق کی تکمیل ہے۔ جو انسان انسانوں کے ساتھ اخلاق میں فیل ہو وہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ اسلام میں انسانی بلندی کا معیار اخلاق کی بلندی پر رکھا گیا ہے اس لیے خواص کو اخلاقیات میں عوام سے اونچا ہونا چاہیے۔ نبی کو اپنے اُمتی سے اونچا ہونا چاہیے اور اسی لیے انبیاء علیہم السلام میں سب سے بڑے نبی ہیں وہ اخلاقیات میں سب سے بڑھ کر اور آگے ہیں وہ اخلاقیات میں بھی سب سے آگے تھے حتیٰ کہ ان کی نبوت کا معیار ہی ان کی اخلاقی آزمائش تھی۔ یہاں حافظ ابن کثیر نے یہ بات بڑے نکتہ کی لکھی ہے کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی چہرہ پہلی کتابوں میں آیا ہے اور آپ کی پوری زندگی اسی کی عملی تفسیر تھی۔ آپ ہمیشہ خیر کے داعی اور برائی سے روکنے والے بن کر رہے۔ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں قرآن میں جب بھی اللہ سبحانہٗ یاایھا الذین آمنوا کہہ کر مخاطب کریں تو پورے دھیان سے سنو۔ کسی خیر کا حکم ہوگا اور یا پھر کسی شر سے ممانعت ہوگی۔ سب سے بڑا معروف یگانہ خدا کی عبادت کا حکم ہے اور سب سے بڑا منکر خدا کے سوا اور کسی کی عبادت ہے۔ سارے نبیوں کی دعوت کا یہی خلاصہ ہے لقد بعثنا فی کل امۃ رسولاً ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔

سیدھا سادا دینِ نبوت کی دعوت ہے

۲۰۲۔ پسندیدہ چیزیں حلال کرے گا گندی چیزیں حرام ٹھہرائے گا، اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے لوگ دبے ہوتے ہیں، ان پھندوں سے نکالے گا جن میں لوگ گرفتار ہیں۔

یعنی یہود پر جو سخت احکام تھے اور کھانے کی چیزوں میں ان کی شرارتوں کی وجہ سے تنگی تھی فبظلم من الذین هادوا حرمنا علیهم طیبات احلت لهم (نساء رکوع ۲۲) اس دین میں وہ سب چیزیں آسان ہو گئیں۔ اور جو ناپاک چیزیں مثلاً لحم خنزیر یا گندی باتیں مثلاً سود خوری وغیرہ۔ انہوں نے حلال کر رکھی تھیں۔ ان کی حرمت اس پیغمبر نے ظاہر فرمائی۔ غرض ان سے بہت سے بوجھ ہلکے کر دیے اور بہت سی قیدیں اٹھا دی گئیں جیسا کہ حدیث میں فرمایا بعثت بالحنیفة السمحة[1]

اس میں دو باتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پسندیدہ چیزوں کو جائز ٹھہراتے ہیں ناپسندیدہ چیزوں کے استعمال سے روکتے ہیں۔ قرآن نے اس معنے میں طیبات اور خبائث کا لفظ اختیار کیا ہے۔ لفظ طیب اور خبیث میں اس قدر عموم ہے کہ اموال، احوال، اقوال اعمال اور اشیاء سب ہی اس کے دائرہ میں آجاتے ہیں۔ اشیاء میں یہ دونوں لفظ بولے جائیں تو صاف ستھری چیز طیب، گندی اور ناپاک چیز خبیث ہوتی ہے۔ اموال میں یہ لفظ استعمال ہو تو مال حلال طیب اور مال حرام خبیث کہلاتا ہے۔ احوال میں یہ فضائل کے لیے طیب اور رذائل کے لیے خبیث بولا جاتا ہے۔ اقوال میں اچھی باتوں کو طیب اور بری باتوں کو خبیث کہتے ہیں اس لیے آیت قرآنی کا صرف یہی منشا نہیں ہے کہ کھانے پینے کی چیزوں میں یہ پیغمبر اچھی اور ستھری چیزوں کو حرام قرار دیتا ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ یہ نبوت اشیاء، اموال، احوال، اقوال اور اعمال میں ہر اس چیز کی حوصلہ افزائی کرتی ہے جو اچھی ہو ستھری ہو اور ہر اس چیز پر قدغن قائم کرتی ہے جو پلید اور گندی ہو۔ ان دو لفظوں میں جامعیت پر غور کرو گے تو آپ کو اس میں پورا دین سمٹا ہوا نظر آئے گا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حلت و حرمت کا مدار طیب اور خبیث ہوتا ہے۔ خواہ اس کا تعلق اموال سے ہو یا اشیاء سے۔ قرآن میں اموال سے لے کر گفتار و کردار تک ہر چیز پر طیب اور خبیث بولا ہے۔ چونکہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کسی خاص قوم یا زمانے تک محدود نہیں اس لیے آپ کو اخلاقی تعلیمات کا جو صحیفہ عنایت ہوا اس کو صرف اشیاء تک محدود نہیں رکھا گیا بلکہ اقوال، افعال اور احوال تک وسیع کر دیا گیا۔ اس لیے زندگی کے تمام گوشوں میں جو برائیاں پائی جانے والی تھیں ان سب سے منع کیا گیا۔ تمام انسانی اچھائیوں کو بھی کھول کر بیان کیا اور ان کے حصول کی تاکید کی۔ آئیے اس نظر سے قرآن کا مطالعہ فرمائیے اور غور فرمائیے کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

طیبات کی تعلیم اور خبائث کی ممانعت کیسے کی ہے۔

شاید یہاں آپ کے ذہن میں یہ خلش محسوس ہو کہ اس آیت میں امر، نہی اور تحلیل و تحریم کی نسبت بجائے اللہ سبحانہٗ کے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کی گئی ہے۔ حالانکہ اصول فقہ کی عام کتابوں میں یہ بات واشگاف طور پر بتائی گئی ہے الحاکم لاخلاف فی انہ اللہ رب العالمین اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حکم دینے والا صرف اللہ تعالیٰ ہی ہے اور لاحکم الا من اللہ حکم صرف اللہ تعالیٰ کی جانب سے ہے۔ یہی عبارت کم و بیش اصول فقہ کی مشہور کتاب التوضیح والتلویح میں بھی ہے اور اسی مضمون کو علامہ ابن امیر الحاج نے شرح تحریر الاصول میں اور علامہ اسنوی شافعی نے شرح منہاج الاصول میں نہایت شرح و بسط کے ساتھ ذکر کیا ہے کہ حکم تشریعی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے ہوتا ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس عقدہ کو حجۃ اللہ البالغہ میں اس طرح حل فرمایا ہے:

> تحلیل و تحریم اس تکوین کا نام ہے جو عالم ملکوت میں نافذ ہوتی ہے کہ فلاں شے پر مواخذہ ہوگا یا نہیں پس یہی تکوین اللہ تعالیٰ کی صفات میں سے ہے۔ رہی تحلیل و تحریم کی نسبت حضور انور کی طرف تو وہ اس معنے میں کہ رسول ہونے کی وجہ سے آپ کا قول قطعی نشانی ہے اللہ تعالیٰ کے حلال اور حرام کرنے کی۔

مطلب یہ ہے کہ احکام شرعی امور تکوینی کی طرف راجع ہیں اور تکوین اللہ تعالیٰ کی صفات میں داخل ہے اور اس صفت میں دیگر صفات کی طرح اس کا کوئی بھی شریک نہیں۔ شرعی امور میں حلت کی نسبت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف اس معنے میں ہے کہ آپ اللہ تعالیٰ کے رسول ہیں اور آپ کا کسی چیز کو حلال و حرام کہنا اس بات کی قطعی نشانی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حلال یا حرام فرمایا ہے نہ یہ کہ آپ کو حلال یا حرام کرنے کا کوئی اختیار حاصل تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کئی مرتبہ اپنا منصب صاف الفاظ میں بیان فرمایا ہے۔ ایک مرتبہ حضرت علی نے ابوجہل کی لڑکی حضرت جویریہ سے نکاح کرنے کا ارادہ کیا۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اطلاع ہوئی تو آپ نے ایک بلیغ خطبہ ارشاد فرمایا جس میں یہ بات خاص طور پر فرمائی۔ بلاشبہ میں حلال کو حرام اور حرام کو حلال نہیں کرتا لیکن بخدا رسول اللہ کی بیٹی اور دشمن خدا کی بیٹی دونوں کبھی یکجا نہیں ہو سکتیں۔ حضرت شاہ عبدالحق محدث دہلوی اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

> گفت من حرام نمی گردانم حلال را و حلال نمی گردانم حرام را ولیکن ہرگز جمع نہ شود

دخترِ دوست خدا و دخترِ دشمنِ خدا دریک جا۔

دوسری بات جو اس آیت میں بیان کی گئی ہے کہ اس بوجھ سے نجات دلائے گا جس کے تلے لوگ دبے ہوتے ہیں ان پھندوں سے نکالے گا جن میں لوگ گرفتار ہیں۔ یہود نے اپنے اوپر بہت سی خود ساختہ پابندیاں لادرکھی تھیں۔ اور بعض پابندیاں ان کی سرکشی کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بھی ان پر عائد کر دی گئی تھیں۔ یہ خود ساختہ پابندیاں کیا تھیں اور یہ پھندے کون سے تھے جن سے محمد رسول اللہ نے رہائی دلائی۔ قرآن نے دوسرے موقع پر اسے واضح کر دیا ہے۔ مذہبی احکام کی بے جا سختیاں مذہبی زندگی کی ناقابلِ پابندیاں، ناقابلِ فہم عقیدوں کا بوجھ، وہم پرستیوں کا انبار، علماء کی عقیدتوں کی زنجیریں اور مشائخ کے تعبد کی بیڑیاں۔ یہ بوجھل رکاوٹیں تھیں جنہوں نے یہودیوں اور عیسائیوں کے دل ودماغ مقید کر دیے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت نے ان سب سے نجات دلائی۔ اس نے سچائی کی ایسی سہل وآسان راہ دکھا دی جس میں عقل کے لیے کوئی بوجھ نہیں عمل کے لیے کوئی سختی نہیں۔ حضرت عبداللہ بن عباس کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا کہ سب دینوں میں اللہ تعالیٰ کو کون سا دین پیارا ہے فرمایا الحنیفیۃ السمحۃ دینِ حنیفی جو نہایت سہل تھا۔ مسند احمد میں حضور انور کا ارشاد ہے الدین یسر دین بہت آسان ہے اور مسند احمد ہی میں ایک روایت میں ہے سب دینوں میں بہتر وہ ہے جو سب سے آسان ہو۔ یہ نرمی اور سہولت ملتِ ابراہیمی کی بنیاد اور اساس ہے اور اس کی اسی بنیاد پر شریعتِ محمدیہ کی پوری عمارت اٹھائی گئی ہے اگر اس پر تفصیلی بحث کی جائے تو تمام شریعت پر ایک اجمالی نظر ڈالنا ہوگی اور اس اجمال میں پھر اتنی تفصیل ہو جائے گی۔ جس کے لیے معالم القرآن کے صفحات متحمل نہیں ہو سکتے اس لیے ہم یہاں صرف وہ اصُولِ تیسیر پیش کرنے پر اکتفا کرتے ہیں جو حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے تحریر فرماتے ہیں۔ ان کی روشنی میں آپ تمام شریعت کا جائزہ لے کر بآسانی یہ فیصلہ کر سکیں گے کہ اس شریعت میں دوسرے ادیان کی نسبت سے کتنی سہولت کی رعایت رکھی گئی ہے۔ شاہ صاحب تحریر فرماتے ہیں کہ دین میں یسر و سہولت کے لیے حسبِ ذیل امور کا لحاظ ضروری ہے۔

۱۔ کبھی عبادت کے لیے ایسی چیز کو رکن و شرط کی حیثیت نہ دی جائے جس کی ادائیگی میں دشواری ہو۔ شریعتِ محمدیہ میں ہر نماز کے ساتھ مسواک کرنا اسی لیے لازم قرار نہیں دیا گیا۔

لو لا ان اشق علی امتی لامرتھم بالسواك عند كل صلاة کا یہی مفہوم ہے۔

۲- اگر کسی دشوار چیز کا حکم دیا جاتے تو اس میں تدریج کا خیال رکھا جاتے تاکہ اس میں ایک گونہ سہولت پیدا ہو جاتے۔ شراب کی حرمت کا مسئلہ بالخصوص اہل عرب کے لیے ایک سنگین مسئلہ تھا۔ اس کی حرمت یکبار گی نہیں بلکہ بتدریج آئی۔

۳- طبعی میلان کو پیش نظر رکھا جاتے تاکہ دعوت کو عقل میں قبول کرنے کے لیے آمادگی ہو۔ اور تعمیل حکم میں ایک ہی وقت عقل اور طبیعت دونوں کی رغبت پیدا ہو جاتے۔ مساجد کو صاف کرنا ان میں خوشبو کرنا، جمعہ کے دن غسل کرنا، خوشبو لگانا، اذان میں خوش گلوتی اور قرآن خوانی میں آواز کی تزئین اسی لیے ہے۔

۴- طبعی اور طبیعت کی نفرت کو بھی ملحوظ رکھا جاتے اور لوگوں سے ناقابل برداشت ناگواری کا مطالبہ نہ کیا جاتے۔ اسی بنا پر اسلام میں غلام نابینا مجہول النسب شخص کی امامت کو پسند نہیں کیا گیا کہ بہت سے حالات میں ان کی امامت تنفر کا موجب ہو سکتی ہے۔ اسی طرح امام یا کسی مقتدی و بزرگ کی موجودگی میں ان کی امامت کی طرف طبعی میلان ہوتا ہے اسی لیے ان کی موجودگی میں دوسروں کی امامت ناپسندیدہ قرار دی گئی۔

۵- انسان کی فطرت میں مسرت و غم کے موقعہ پر کچھ رسوم بھی منانا داخل ہے جن کی ادائیگی وہ اپنی زندگی کا ایک ناگزیر تقاضا سمجھتا ہے اس کے اس تقاضے کی بھی رعایت کی جاتے۔ عیدین اور جمعہ کی مشروعیت اسی تقاضے کو پورا کرنے کے لیے ہے۔

۶- عوام کے جذبات کی تابحدِ امکان رعایت کی جاتے۔ خانہ کعبہ میں دو دروازے قائم کرنے کا ارادہ آپ نے اسی لیے فسخ کر دیا کہ اس میں قریش کے جذبات کو صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ مبادا وہ یہ خیال کر لیں کہ آپ نے ان کے بزرگوں کی یادگار کی بھی کوئی پرواہ کی اور ان کی قدیم بنا کو توڑ کر نئی تعمیر کر ڈالی جہاں اسی مفسدہ کی خاطر اس مصلحت کو ترک کر دیا گیا۔

۷- ارکان و شرائط کی تحدید و تعیین کی جاتے مگر نہ اتنی کہ بجاتے سہولت کے اور مصیبت بن جاتے۔ ایک حد تک ان کو متعین بھی کر دیا جاتے اور ایک حد تک معاملہ مخاطبوں کی عقل و فراست کے سپرد کر دیا جاتے۔ مثلاً سورہ فاتحہ کا پڑھنا نماز کے لیے ضروری قرار دیا گیا مگر مخارج حروف کی ادائیگی اور طرزِ قرأت کو معروف طریقہ پر چھوڑ دیا گیا۔ نماز کے لیے استقبالِ قبلہ کو ضروری قرار دیا گیا مگر تعیینِ سمت قبلہ کے لیے براہین ہندسیہ طول و عرض بلد کا شرط قرار نہیں دیا گیا۔ رمضان

روزوں کے لیے ماہِ رمضان شرط قرار دیا گیا مگر یہاں بھی زائچہ اور جنتری کا مکلف نہیں بنایا گیا بلکہ صرف چاند کے طلوع پر مدار کیا گیا ہے اور ابر و غبار کی صورت میں تیس دن پورے کر لینا کافی سمجھ لیا گیا۔

بہرحال حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی آیت میں یہ صفت بیان ہوتی ہے کہ آپ یہودیوں سے ان کا بوجھ اتاریں گے اور ان پھندوں کو ہٹائیں گے جن میں وہ گرفتار ہیں۔ یعنی ان کو منسوخ کر کے ان کی جگہ آسان احکام دیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ آپ کی لائی ہوئی شریعت آسان ہوگی۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے ازالۃ الخفا میں اس پوری آیت پر جامع تبصرہ کیا ہے وہ بھی گوش گزار فرمائیے۔

ان آیات کا بالاختصار مطلب یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام نے بارگاہِ الٰہی میں دعا کی کہ اے پروردگار ملاءِ اعلیٰ میں میری امت کے لیے دنیا اور آخرت کی نیکی مقدر کر دے۔ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے جواب ملا یہود ایک حال پر نہ رہیں گے بلکہ ان میں سے بعض کو میرا عذاب پہنچے گا اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے وقضینا الی بنی اسرائیل فی الکتاب لتفسدن فی الارض مرتین اور کچھ پر رحمتِ الٰہی ہوگی اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی نسبت اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء و جعلکم ملوکا و آتاکم ما لم یؤت احدا من العالمین۔ پھر فرمایا فساکتبھا للذین یتقون ویؤتون الزکوٰۃ والذین ھم بآیاتنا یؤمنون۔ یعنی ان لوگوں کے لیے دنیا اور آخرت کی نیکی لکھ دوں گا جن کا تعارف یہ ہے کہ وہ متقی ہوں گے زکوٰۃ دیں گے اور اللہ کی آیات پر ایمان رکھیں گے۔ ان آیات سے معلوم ہوا کہ آئندہ زمانے میں ایک امت ایسی پیدا ہوگی جو ان اوصاف سے موصوف ہوگی اور اللہ تعالیٰ ان کو دو قسم کی خوشحالیاں عطا فرمائے گا۔ ایک دنیا کی خوشحالی اور دوسری آخرت کی خوشحالی۔ دنیا کی خوشحالی یہ کہ ان کو دنیا میں ملکی فتوحات، سیاسی غلبہ اور معاشی فراوانی کے ذریعے ایسا طاقتور بنائے گا کہ دوسری قومیں ان کی باجگذار اور محکوم بن کر رہیں گی اور آخرت کی خوشحالی یہ کہ وہ آخرت والی زندگی میں نجات یافتہ، مغفور اور رفیع درجات سے ہمدوش ہوں گے۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ نے بتایا ہے کہ یہ امت نبی امی کے پیروکار ہوگی اور دنیا و آخرت کی خوشحالیوں سے یہ ہمدوش ہوگی۔ یعنی ملکوت میں ہم نے یہ فیصلہ کر دیا ہے کہ جو لوگ نبی امی کی پیروی کریں گے اس پر ایمان لائیں گے اس کی حمایت کریں گے اس کے مددگار بنیں گے اور اس روشنی کی اتباع کریں گے جو نبی لے کر آئے گا۔ یہی لوگ کامیاب ہوں گے۔ اس نبی امی کا تعارف یہ ہے کہ اس کا ذکر تورات و انجیل میں ہوگا۔ چونکہ

اس جلیل القدر پیغمبر کا ذکر عظیم المرتبت انبیاؑ کی زبانوں پر ہوگا اس لیے پوری انسانیت پر اس کا ماننا ضروری ہے جو نہ مانیں گے وہ معذور نہ ہوں گے۔ اور انبیاؑ نے تورات و انجیل میں اس نبی اُمی کا جو تعارف کرایا ہے یہ ہے کہ وہ پسندیدہ باتوں اور کاموں کا حکم دے گا اور ناپسندیدہ باتوں، کاموں سے روکے گا۔ پاکیزہ چیزوں کو ان کے لیے حلال کرے گا ناپاک چیزوں کو حرام قرار دے گا اور جن اضافوں اور سختیوں تلے انسانوں کو دبا رکھا ہے ان کو ہٹائے گا یعنی قوانین کی سختیاں ہٹا کر ملت حنیفہ سہلہ اور سمحہ پیش کرے گا لہٰذا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت و رسالت اللہ سبحانہٗ کی بھرپور رحمت اور کمال رافت ہوگی۔

صحابہ کرام کا چہرہ

۲۰۳۔ تو جو لوگ اس پر ایمان لے آئے اس کی حمایت کی اور اس کی مدد کی اور اس روشنی کے پیروکار ہو گئے جو اس کے ساتھ بھیجی گئی ہے۔ پس یہی لوگ کامیاب ہونے والے ہیں۔ نور سے مراد وحی ہے متلو ہو یا غیر متلو یعنی قرآن و سنت[1] پہلی آیت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تعارف تھا اس آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین کا بھرپور چہرہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ جن حضرات نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان، آپ کی رفاقت اختیار کی، آپ کی مدد کی اور اس روشنی کی پیروی کی جو آپ کے ساتھ اتاری گئی ہے یہی لوگ کامیاب و بامراد ہیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

ان آیات میں اللہ سبحانہٗ نے منطوقاً صحابہ کے لیے فلاح کو ثابت کیا ہے اور مفہوماً بتایا ہے کہ دُنیا و آخرت کی دونوں خوشحالیاں ان کے لیے ہوں گے اور یہ بے غبار حقیقت ہے کہ خلفاء راشدین ایمان کی نعمت سے مالا مال ہوتے اور انہوں نے حضور کی زندگی میں اور حضور کے وصال کے بعد آپ کی مدد کی۔ بزرگی کا یہ مقام کہ جس سے بالا کسی مقام کا تصور بھی ممکن نہیں صحابہ کرام کو حاصل ہوا ہے

آیت کے الفاظ پر غور کرو ایمان، تعزیر، نصرت اور اتباع کے الفاظ میں بڑی معنویت ہے۔ اس میں حضور انور پر ایمان کے ساتھ صحابہ کے تین وصف بیان کیے گئے ہیں ایک تعزیر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسرے نصرت اور تیسرے اتباع۔

تعزیر عزر سے ہے عزر کے معنے لغت میں مدافعت کرنے اور روکنے کے آتے ہیں۔ عزروہ کے معنے یہ ہیں کہ انہوں نے اس کی مدد کی بایں طور کہ ان کے دشمنوں کی اس سے مدافعت کی۔ اور جب نصرت واجب ہوئی تو تعظیم بھی اس میں آگئی کیونکہ نبوت کے نصرت کے معنے یہ ہیں کہ اس کی طرف سے مدافعت کی جائے اور ان کے دین کی حمایت کی جائے اور خود ان کی تعظیم توقیر ہو چنانچہ عربی میں تعزیر کے معنے توقیر کرنے اور تلوار کے ذریعے مدد کرنے کے آتے ہیں۔
حدیث بعث میں ورقہ ابن نوفل کا یہ مقولہ نقل ہوا ہے ان بعث و انا حی فاعززہ وانصرہ اگر میری زندگی میں آپ مبعوث ہوتے تو میں ان کی توقیر کروں گا اور مدد کروں گا۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے اس کے معنے تعظیم و توقیر کے منقول ہوئے۔ صحابہ کرام سے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی توقیر کے تاریخ میں ابواب نقل ہو کر آتے ہیں۔ اس میں ادب رسول، خدمت رسول، محبت رسول، شوق دیدار رسول، شوق محبت رسول، اطاعت رسول، ہیبت رسول، رضامندی رسول نعت رسول جیسے ابواب ہیں۔ یعنی توقیر رسول کا کوئی گوشہ نہیں جو صحابہ کرام میں موجود نہ ہو۔ صحابہ کرام میں جو خاص وصف ان کی پوری جماعت میں عام تھا اور جس کو ہم ایمان کے بعد ان کی پوری دینی زندگی کی روح حیات کہہ سکتے ہیں وہ یہ تھا کہ رسول کی محبت ان کو ہر چیز سے زیادہ تھی۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کسی نے پوچھا تھا کہ آپ لوگوں کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کتنی محبت تھی تو آپ نے فرمایا خدا کی قسم حضور ہم لوگوں کو اپنی جانوں سے زیادہ محبوب تھے۔
حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کے عشق و محبت کا جو حال تھا صلح حدیبیہ کی گفتگو قریش مکہ کے سفیر عروہ بن مسعود ثقفی نے اس کا جو منظر دیکھا اور جو اس نے کفار مکہ کی مجلس میں جاکر بیان کیا وہ آج تک صحیح بخاری اور دوسری حدیث کی کتابوں میں محفوظ ہے اس نے بتایا؛

اے میری قوم کے لوگو میں نے بڑے بڑے بادشاہوں کے دربار دیکھے ہیں قیصر و کسریٰ اور نجاشی کے درباروں کا منظر بھی میری آنکھوں نے دیکھا ہے۔ میں نے نہیں دیکھا کہ کسی بادشاہ کی رعیت اپنے بادشاہ کے ساتھ عظمت و توقیر کا وہ معاملہ کرتی ہو جو محمد کے اصحاب ان کے ساتھ کرتے ہیں۔ وہ جب تھوکتے ہیں تو ان کے فدائی تھوک کو ہاتھ میں لے لیتے ہیں اور اپنے منہ اور بدن پر مل لیتے ہیں اور جب وہ کسی کام کو کہتے ہیں تو ہر ایک دوسرے سے پہلے اور آگے بڑھ کر اس کو کرنا چاہتا

ہے اور جب وہ وضو کرتے ہیں تو پروانہ وار آپ کے وضو کا پانی اپنے ہاتھوں میں لینا چاہتے ہیں اور اس کے لیے ایک دوسرے پر گرتے ہیں اور جب وہ بات کرتے ہیں تو ان کی آوازیں ادب سے نہایت پست ہو جاتی ہیں اور احترام و وقار کی وجہ سے آنکھ بھر کے ان کی طرف نہیں دیکھتے ہیں۔ (صحیح بخاری)

یہ حال جو بیان کیا جا رہا ہے مخصوص افراد کا نہیں بلکہ پوری جماعت کا ہے اور یہ بیان بھی کسی دوست اور معتقد کا نہیں ہے بلکہ دشمنوں کے سفیر اور نمائندہ کا ہے جو اس نے اپنے لوگوں کے سامنے دیا ہے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صحابہ کے عشق و محبت کا کیا حال تھا۔

دین کے لیے محنت و قربانی

دوسرا وصف اس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ انہوں نے حضور کی مدد کی۔ حضور کی مدد کا مطلب یہ ہے کہ جو دینِ حق آپ لے کر آئے ہیں اس کے فروغ کے لیے محنت اور حضور انور کی لائی ہوئی ہدایت و دعوت کا حلقہ وسیع کرنے اور غافل و خدا فراموش انسانوں کو اللہ کی بندگی کے صحیح راستہ پر لگانے کے واسطے محنت و مشقت برداشت کرنا اور اس راہ میں اپنا وقت اپنا چین و آرام اور اپنے جان و مال کی قربانی بھی صحابہ کرام کا عمومی وصف تھا۔ جس دین کو انہوں نے قبول کیا اور جس پر انہوں نے اپنی زندگی کی بنیاد دین استوار کی تھیں۔ وہ ایک جاندار انقلاب انگیز اور متحرک نظامِ فکر و عمل تھا جس کا خمیر عشق و محبت کی ولولہ انگیزیوں اور جنون نوازیوں سے تیار ہوا تھا جس میں ایثار و قربانی اور سرفروشیوں کی ایک دنیا آباد تھی اور جس میں محض افراد کی شخصی نجات کا نہیں بلکہ پورے عالم کی نجات کا تصور اور جذبہ کار فرما تھا۔ صحابہ کرام ایک نظامِ تمدن اور طرزِ زندگی کے داعی تھے۔ ایک عالمگیر نصب العین کے نمائندے تھے اور ایک جہانی مقصد کے علمبردار تھے۔ چنانچہ ان کے اعمال و عبادات کی قدر و قیمت اسی نسبت سے متعین کی جاتی تھی جس نسبت سے وہ اس نصب العین کی تقویت کا باعث ہوتے تھے۔ اللہ کے دین کی مدد ان کے اخلاص و اتقاء کا پیمانہ تھا اور خدا کے ہاں ان کا اجر بھی اسی پیمانہ سے تقسیم ہوتا تھا۔ دین کی نصرت کے بارے میں قرآن کا مطالبہ صحابہ سے اس قدر انتہا پسندانہ تھا کہ جب انصار کی ایک جماعت نے کئی برس تک متواتر اس جد و جہد میں مشغول رہنے اور اس راہ میں ہر طرح

کی جانی و مالی قربانیاں کرنے کے بعد کچھ مدت کے لیے اپنے کاروبار اپنی کھیتی باڑی اور باغات کی اصلاح و خبر گیری کے لیے دین کی محنت سے رخصت چاہی تو یہ آیت نازل ہوئی۔ لا تلقوا بایدیکم الی التھلکۃ، گویا انفرادی فرائض پوری طرح ادا کرتے ہوئے بھی دین کی خدمت و نصرت اور اعلاء کلمۃ اللہ کی جد و جہد سے سبکدوش ہو کر صرف کاروباری زندگی گزارنے کو خودکشی قرار دیا گیا۔

ایمان باللہ کا حقیقی امتحان صرف اللہ کے دین کی مدد میں ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے اور کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے بلکہ اگر یوں کہیں کہ اللہ کے دین کی نصرت ہی ایمان کا اولین تقاضا ہے تو یہ کوئی مبالغہ نہیں ہے۔

ایمان کے ساتھ یہاں صحابہ کی چوتھی خصوصیت زیادہ نمایاں کرکے بیان کی گئی ہے وہ ہے اتباع ما انزل معہ وہ چیز جو پیغمبر کے ساتھ اتاری گئی ہے اس کا اتباع کرتے ہیں۔ بجائے ما انزل الیہ یا ما انزل علیہ کہنے کے ما انزل معہ کی تعبیر شاید یہ بتانے کے لیے اختیار کی گئی ہے کہ صحابہ کی اتباع کا دائرہ وحی کتابی ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ وہ ان تمام چیزوں میں نبوت کی پیروی کرتے ہیں جو وہ رسول ہونے کی حیثیت میں پیش کرتے ہیں کیونکہ نبی کی ذات نبوت اور وحی سے سرفراز ہونے کے بعد مجسم ہدایت و رہنمائی اور امامت و پیشوائی کے لیے خاص ہو جاتی ہے۔ ان کی بعثت اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ لوگوں کی رہنمائی کریں۔ ان کو ضلالت و گمراہی سے بچائیں جس امت میں وہ مبعوث ہوتے ہیں اس کے سامنے وہ ہدایت و رہنمائی کے دو چراغ روشن ہوتے ہیں۔ ان دونوں کی روشنی مل کر ایک ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ مسلمانوں کو جنہیں یہود اپنی شرارت اور سازش سے گمراہ بنانا چاہتے تھے خطاب کرکے فرماتا ہے۔

یا ایھا الذین اٰمنوا ان تطیعوا فریقاً من الذین اوتوا الکتاب یردوکم بعد ایمانکم کافرین وکیف تکفرون وانتم تتلیٰ علیکم آیات اللہ و فیکم رسولہ،

اے مسلمانو! اگر تم اہل کتاب میں سے کسی گروہ کا کہا مانو گے تو وہ تمہیں مومن ہونے کے بعد کافر بنا دیں گے اور تم کفر کیوں کر کرو گے جب کہ تم کو اللہ کی آیتیں سنائی جاتی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

آیت کے آخری ٹکڑے سے ثابت ہوا کہ کفر سے بچانے والی دو مستقل چیزیں مسلمانوں

کے پاس تھیں۔ ایک تو آیاتِ الٰہی جو ان کو سنائی جاتی تھیں اور دوسری خود رسولؐ کا وجود جو اپنی تعلیم و تلقین، فیضِ صحبت اور اثر سے ان کو بھٹکنے نہ دیتا اور ضلالت سے مانع آتا تھا۔ اگر صرف کتابِ الٰہی اس کام کو انجام دے سکتی تو رسولؐ کے ذکر کی حاجت بلکہ خود بعثت کی ہی ضرورت کیا تھی اس سے یہ واضح ہوا کہ اللہ کی کتاب صامت قرآن اور اس کی کتابِ ناطق رسولؐ سے مل کر اپنے فریضہ کو انجام دیتی ہے۔ اور غالباً اس حدیثِ صحیح کے بھی معنے یہی ہیں جس کا اعلان آپ نے حجۃ الوداع سے واپسی میں اپنی وفات سے کچھ مہینوں پہلے کیا۔

انی تارکٌ فیکم الثقلین کتاب اللہ و سنتی

ان دونوں کے درمیان نور ہونے کا ربط ہے۔ اسی بنا پر قرآن میں ایک جگہ قرآن کو نور کہا ہے اور دوسری جگہ خود حضورِ انور کو نور کہا ہے گویا قرآن آفتاب ہے تو حضور اس کی روشنی ہیں اور حضورؐ آفتاب ہیں تو قرآن اس کی روشنی ہے۔ اگر آفتاب سے اس کی روشنی کو جدا نہیں کر سکتے تو پھر قرآن سے سنت کو اور سنت سے قرآن کو بھی جدا نہیں کر سکتے۔ اسی بنا پر یہاں دونوں کو النور الذی معہ سے تعبیر کیا ہے۔

غور کا مقام ہے یہ وہی وحشی عرب بت پرست عرب وہی بداخلاق ہیں۔ ان میں یہ انقلاب کیوں اور کیسے ہوا، ایک اُمّی نبی پر ایمان، اس کی توقیر، اس کے دین کی نصرت اور اس نور کی پیروی نے جو اس کے ساتھ اتارا گیا تھا ان کو عاقل روشن دل، روشن دماغ اور متقین کیوں کر بنا گئی۔ ایک نہتے پیغمبر کا ولولہ تبلیغ کس مپرس عربوں کو سپہ سالار اور بہادر بنا کر نئے زور و قوت کا خزانہ کیسے عطا کر گیا جو خدا کے نام سے بھی آشنا نہ تھے وہ ایسے شب زندہ دار، عابد و متقی اور طاعت گزار کیوں کر ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات انسانی کمالات اور صفات حسنہ کا ایک کامل مجموعہ تھی اور یہ سب ان ہی کی جامعیت اور نیرنگیاں اور جلوہ آرائیاں تھیں جو کبھی صدیق و فاروق ہو کر چمکتی تھیں کبھی ذوالنورین اور مرتضیٰ ہو کر نمایاں ہوتی تھیں۔ کبھی خالد اور ابو عبیدہ اور کبھی سعد و جعفر ہو کر سامنے آتی تھیں۔ کبھی ابن عمر اور ابوذر اور سلمان اور ابو درداء ہو کر مسجد و محراب میں میں نظر آتی تھیں، کبھی ابن عباس اور ابی بن کعب، زید بن ثابت اور عبداللہ بن مسعود کی صورت میں علم و فن کی درسگاہ اور عقل و حکمت کی دبستان بن جاتی تھیں اور کبھی بلال و صہیب اور عمار و خبیب کی امتحان گاہوں میں تسلی کی روح اور تسکین کا پیام پہنچاتی تھیں۔ گویا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک ایک آفتاب عالم تاب تھا اور صحابہ کرام اسی آفتاب کی کرنیں تھیں یا ابر باران

تھا اور صحابہ کرام اسی ابرِ باراں سے اپنی اپنی استعداد کے مطابق سیراب ہو کر قسم قسم کے درخت اور رنگا رنگ پھول اور پتے بنے ہوتے تھے۔ ان نیرنگیوں کے ساتھ ایک چیز تھی جو سب میں مشترک تھی وہ ایک بجلی تھی جو سب میں کوندر رہی تھی ایک روح تھی جو سب میں تڑپ رہی تھی۔ ایمان کا نور، اخلاص کی روح، توقیر کا جذبہ، قربانی کا ولولہ ہر کام میں نبوت کی پیروی کا جوش اور ہر قدم پر اللہ کی رضا طلبی کا ولولہ سب میں کام کر رہا تھا۔ اس کے نتیجہ میں وہ دنیا و آخرت کی سعادتوں سے ہمدوش اور زندگی کے ہر گوشہ میں کامیاب و بامراد تھے اولئک ھم المفلحون وہ جو کچھ بھی ہوں جہاں بھی ہوں اور جو کچھ بھی کر رہے ہوں یہ فیضان حق سب میں یکساں تھا۔ راستوں، رنگتوں اور مذاقوں کا اختلاف تھا مگر خدا ایک تھا قرآن ایک تھا رسول ایک تھا اور قبلہ ایک تھا۔ ہر رنگ ہر راستہ اور ہر کام سے مقصود دنیا کی درستی، خلق کی ہمدردی، خدا کے نام کی اونچائی اور حق کی ترقی تھی، رضی اللہ عنہم۔ خلاصہ کلام یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کی اس دعا کا مصداق حضرات صحابہ کرام ہیں جن کو دنیا کی خوشحالی اور آخرت کی خوش حالی سے اللہ نے مالا مال کیا۔ اس طرح پہلی آیت میں حضور انور کا اور اس آیت میں آپ کے صحابہ کرام کا بھرپور چہرہ اللہ سبحانہ نے پیش فرما دیا اور اہل کتاب کو آگاہ کر دیا کہ وہ اس پیغمبر پر ایمان لائیں۔ لوگوں میں اس کا تعارف کرائیں مخالفوں کے مقابل میں اس کی حمایت کریں اور اس روشنی کی پیروی کریں جو اللہ کی طرف سے نازل کی گئی ہے۔ جو لوگ یہ کام کریں گے وہ ہی کامیاب ہیں فلاح پانے والے ہیں باقی سب محروم اور نامراد ہوں گے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عامہ

۲۰۴۔ اے پیغمبر تم لوگوں سے کہہ دو اے افرادِ انسانی میں تم سب کی طرف خدا کا رسول بن کر آیا ہوں۔ وہ خدا کہ آسمانوں اور زمین کی ساری بادشاہت اسی کے لیے ہے کوئی بندگی نہیں مگر اسی کی ذات کی وہی جلاتا ہے وہی مارتا ہے لہٰذا اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسول امی پر جو کہ اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور اسی کی پیروی کرو تاکہ کامیابی کی راہ تم پر کھل جائے یعنی آپ کی بعثت تمام دنیا کے لوگوں کو عام ہے۔ عرب کے امیین یا یہود و نصاریٰ تک محدود نہیں ہے جس طرح خداوند تعالیٰ شہنشاہ مطلق ہے آپ اس کے رسول مطلق ہیں اب ہدایت و کامیابی کی صورت بجز اس کے کچھ نہیں ہے کہ اس جامع ترین عالمگیر صداقت کی پیروی کی جائے جو آپ لے کر آئے ہیں۔ یہ ہی پیغمبر ہے جس پر ایمان لانا تمام انبیاء و مرسلین اور تمام کتب سماویہ

پر ایمان لانے کے مترادف ہے [1]

یہ آیت جوامع آیات میں سے ہے جس نے دعوتِ اسلام کی پوری حقیقت واضح کر دی۔ یہ دعوت یکساں طور پر تمام نوعِ انسانی کے لیے ہے۔ یہ ایک خدا کے آگے سب کے سروں کو جھکا ہوا دیکھنا چاہتی ہے جس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔ ایمان باللہ و کلماتہ اس کا شعار ہے یعنی خدا پر اور اس کے تمام کلماتِ وحی پر ایمان۔ [2]

دراصل اس آیت میں بنیادی طور پر حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالتِ عامہ کو ماننے کی پوری انسانی دُنیا کو دعوت دی گئی ہے۔ "انی رسول اللّٰہ الیکم جمیعاً" میں بتایا گیا ہے کہ آپ عالمگیر پیغمبر بنا کر مبعوث کیے گئے ہیں اس لیے ہدایتِ تامہ نبوت، عمومی نجاتِ کامل اور فلاحِ عام اب صرف محمد رسول اللہ کی دعوت میں محدود ہے۔ اسی میں وہ دین ازلی ہے جو ہر مذہب کا جوہر تھا اور جو اس کے پیرودں کی تحریف و تصرف سے برباد ہو گیا تھا۔ اسی کو دعوتِ محمدی لے کر آئی ہے اب وہ ہمیشہ محفوظ رہے گا کیونکہ اس کا نبی عمومِ رسالت کا حامل اور خاتم النبیین ہے اس کا دین کامل اور اس کا صحیفہ تمام صحفِ الٰہی پر مہیمن اور حاوی ہے اور قیامت تک خدا کی طرف سے اس کی پوری حفاظت اور بقاء کا وعدہ کیا گیا ہے۔ یہ چاروں دعوے یعنی تکمیلِ دین، قرآن کا مہیمن ہونا قیامت تک اس کا محفوظ و باقی رہنا اور ختمِ نبوت یاایھا الناس انی رسول اللّٰہ الیکم جمیعاً" کے منطوق، مدلول اور مفہوم میں موجود ہیں۔ جب یہ فرمایا کہ میں سب کی طرف خدا کا رسول بن کر آیا ہوں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ جو دین اب تک مختلف وقتوں اور مختلف قوموں میں مختلف پیغمبر لاتے رہے ہیں وہ اپنے نقطہ کمال کو پہنچ گیا ہے۔ حضرت آدم سے لے کر تمام شریعتوں پر نظر ڈالیے تو آپ کو معلوم ہوگا کہ تمام نبوتیں کسی ایک کمال کی جانب متحرک ہیں۔ ہر پچھلی شریعت پہلی سے نسبتہً "ارتقائی" شکل میں نظر آتی ہے اس لیے اس طبعی اصول کے مطابق ضروری ہے کہ یہ حرکت بھی کسی نقطہ پر جا کر ختم ہو جس کو اس کا کمال کہا جاتے لیکن جب خود نبوت ہماری سرحدِ ادراک سے باہر ہے تو اس کے آخری نقطہ کمال کا ادراک بدرجہ اولیٰ ہماری پرواز سے باہر ہونا چاہیے اس لیے ضروری ہوا کہ اللہ سبحانہ خود ہی اس کی ذمہ داری لے اور بتاتے کہ نبوت کا ارتقاء جہاں درجہ کمال کو پہنچا ہے وہ مرکزی اور کامل ہستی حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہے۔ قرآن

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام [2] ترجمان القرآن

سے ثابت ہے کہ نبوت اب اپنے ارتقائی کمال کو پہنچ چکی ہے الیوم اکملت لکم دینکم و اتممت علیکم نعمتی یعنی تمہارا دین کمال کو پہنچ چکا ہے اب ناقص نہ ہوگا۔ خدا کی نعمت پوری ہو چکی اب اس میں اضافہ نہ ہوگا۔ اسی بنا پر قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو خاتم النبیین بتایا ہے یعنی نبوت کے سلسلے کو بند کرنے والے ہیں۔ قرآن نے اپنے صحیفہ میں کسی آیت میں کسی بعد میں آنے والے پیغمبر کے لیے کوئی جگہ نہیں چھوڑی بلکہ الی الناس جمیعاً کہہ کر بتا دیا کہ صرف وہی پیغام ربانی جو محمد رسول اللہ کے ذریعے دُنیا میں آیا خدا کا آخری اور دائمی پیغام ہے اور اسی لیے وانا لہ لحافظون کے وعدے اللہ سبحانہٗ نے اس کی حفاظت کی ذمہ داری خود لے لی ہے۔

انی رسول اللہ الیکم جمیعاً سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور انور کی نبوت خدا کی پہلی اور آخری ناتندگی ہے جو کالے گورے، عرب و عجم، ترک و تاتار، ہندی و چینی، زنگ و فرنگ سب کے لیے عام ہے جس طرح اس کا خدا تمام دُنیا کا خدا ہے، تمام دنیا کا پروردگار ہے اسی طرح اس کا رسول تمام دنیا کا رسول ہے، تمام دُنیا کے لیے رحمت ہے اور اس کا پیغام بھی تمام دُنیا کے لیے پیغام ہے۔ جہاں تک خدا کی سلطنت ہے وہاں تک آپ کی پیغامبری کی وسعت ہے لہ ملک السماوات والارض

سارے نبیوں میں صرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے دائمی، آخری اور کامل اور عالمگیر ہونے کا دعویٰ کیا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ آپ نے فرمایا،

مجھ سے پہلے تمام انبیاء صرف اپنی قوم کی طرف بھیجے گئے اور میں تمام قوموں کی طرف بھیجا گیا ہوں۔

الغرض کہنا یہ ہے کہ رسالت محمدی اسی طرح کامل دائمی اور عالمگیر ہے جس طرح اللہ سبحانہٗ کی فرمانروائی اور حکومت کامل دائمی اور عالمگیر ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کامل دائمی اور عالمگیر نبوت کا آخری، دائمی اور عالمگیر پیغام کیا ہے؟ یہاں قرآن نے اس کا یہ جواب دیا ہے کہ اس کا آخری دائمی اور عالمگیر پیغام لاالہ الا ہو ہے یہی وحدانیت اس کی دلیل ہے۔ نادان انسانوں نے خود ایک دوسرے کو بھی اللہ بنایا تھا وہ اوتار بن کر آتے ہوں یا تخت جبروت پر قدم رکھ کر فرعون نمرود شہنشاہ بنے ہوں یا تقدس کا لبادہ اوڑھ کر راہب و قسیس کہلاتے ہوں یا عالم و حبر بن کر اپنے کو الٰہ بنانا چاہا ہو یہ انسانیت کی تحقیر تھی۔ پیغام محمدی نے اس کو جڑ سے کاٹ کر رکھ دیا، ولا یتخذ بعضنا بعضا اربابا من دون اللہ یہاں تک کہ نبیوں کو بھی روا نہیں ہے کہ وہ کہیں کونوا عبادا لی من دون اللہ۔

آنکھوں سے پوشیدہ ہستیوں میں فرشتے اور آنکھوں کے سامنے کی ہستیوں میں انبیاء سب سے بلند ہیں مگر وہ بھی انسانوں کے معبود نہیں ہو سکتے۔

ولا یامرکم ان تتخذوا الملائکۃ والنبیین اربابا ،

اس پیغام محمدی کو سامنے رکھ کر ذرا توحید کے مسئلہ کو سمجھو تو معلوم ہوگا کہ توحید کی حقیقت کو کس طرح داشگاف کیا ہے یہاں اللہ کے ساتھ کوئی الہ نہیں ہے۔ انسان کی پیشانی سوائے ایک اللہ کے کسی کے سامنے نہیں جھک سکتی اور اس کے ہاتھ اس ایک کے سوا کسی اور کے آگے نہیں پھیل سکتے جس سے وہ لینا چاہے اس کو کوئی دے نہیں سکتا اور جس کو وہ دینا چاہے اس سے کوئی لے نہیں سکتا۔ یہاں خدا کے ساتھ کوئی قیصر نہیں ہے جو کچھ ہے اسی خدا کا ہے قیصر کا کچھ نہیں اسی کی حکومت ہے، اسی کی سلطنت ہے اور اسی کی فرمانروائی ہے، اسی کا ایک حکم ہے جو فرش سے عرش تک اور زمین سے آسمان تک جاری ہے۔

نبی شناسی کے پیمانے

اس آیت میں ورسولہ النبی الامی الذی یومن باللہ وکلماتہ فرما کر اشارہ کر دیا کہ معجزات ہی صرف نبی شناسی کا پیمانہ نہیں ہیں بلکہ اس کے یہاں کچھ اور بھی پیمانے ہیں۔ معجزات تو نبوت شناسی کے لیے ظاہری نشانیاں ہیں لیکن نبی شناسی کی کچھ باطنی نشانیاں بھی ہیں۔ حقیقت شناس صرف باطنی نشانیوں کے طلبگار ہوتے ہیں۔ زمانۂ نبوت میں جو لوگ اہل نظر تھے وہ ان ہی علامات کو تلاش کرتے تھے۔ اس عہد کے ان یہودیوں، عیسائیوں کو دیکھو جنہوں نے کسی سبب سے علی الاعلان حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی ہونے کی تصدیق کی جرأت نہیں کی مگر وہ اندرونی طور سے متاثر تھے۔ یہودی خدمت اقدس میں آتے امتحانات لیتے مگر ان کا امتحان کیا تھا یہ تھا کہ وہ آپ کے اخلاق کی آزمائش کرتے تھے۔ صحف انبیائے بنی اسرائیل کے سوالات دریافت کرتے آپ کی تعلیمات کا گہرا مطالعہ کرتے۔ ان میں سے کسی نے اگر آپ سے خارق عادت معجزہ کا مطالبہ نہیں کیا۔ کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ خوارق نبوت کی اندرونی اور باطنی علامات نہیں ہیں آنے والے نبی کی بشارات اور صفات تورات وانجیل میں مذکور تھیں لیکن ان میں سے کسی میں بھی صاحب خوارق ہونا اس کی صفت نہیں بتائی گئی تھی بلکہ تورات میں اس کے اوصاف یہ بتلائے گئے تھے کہ وہ فاران پر طلوع ہوگا دس ہزار قدسیوں کے ساتھ اس کے ہاتھ میں آتشیں شریعت ہوگی۔

وہ غریبوں اور مسکینوں کا مددگار ہوگا اور بدکاروں کو جنگلی مرد کی طرح ہلاک کرے گا وہ عبادت گزار اور خدا کے احکام کا مطیع ہوگا۔ انجیل نے بتایا ہے کہ وہ تسلی کی روح ہوگا وہ مسیح کی نامکمل تعلیم کی تکمیل کرے گا۔ خدا کی زبان اس کے منہ میں ہوگی۔ قرآن نے یہاں الذی یومن باللہ وکلماتہ فرما کر نبوت کی ان ہی باطنی علامات کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اگرچہ علم کلام میں یہی بتایا گیا ہے کہ نبی شناسی کا پیمانہ صرف معجزہ ہے۔ لیکن یہ ان کا ذاتی خیال ہے۔ سچی بات وہ ہے جو حافظ ابن تیمیہ نے شرح العقیدہ الاصفہانیہ میں لکھی ہے کہ العلم بالنبوۃ یحصل لطرق متعددۃ، نبی شناسی کے ایک سے زیادہ پیمانے ہیں۔ امام بخاری نے اپنی کتاب الجامع الصحیح المسند الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فی ایامہ وسنۃ کے مقدمہ میں نبوت کی تعریف، نبوت کی ضرورت اور نبی شناسی کے ایک سے زیادہ پیمانوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ بدء الوحی کے عنوان میں الی رسول اللہ کے اضافہ سے نبوت کی تعریف کی ہے۔ تعریف کو مدلل کرنے کے لیے آیات وحی میں سے سورہ مائدہ کی آیت انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوح۔الخ تلاوت کی ہے اور آیات وحی میں سے اس آیت کا انتخاب صرف یہ بتانے کے لیے نہیں کیا کہ وحی ایک مشترک المعانی لفظ ہے بلکہ یہ سمجھانے کے لیے کیا ہے کہ انبیاء دو طرح کے ہوتے ہیں ایک انبیاء مرسلین، دوسرے انبیائے مجددین۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کا تعلق اول الذکر قسم سے ہے۔ نبوت کی تعریف کے بعد نبوت کی ضرورت بتانے کے لیے مشہور حدیث انما الاعمال بالنیات لاتے ہیں۔ سمجھایا ہے کہ انسانی قدریں ہوں یا اخلاقی قدریں، اعمال ہوں یا اقوال ان کی قدر و قیمت اور افادیت کا دارومدار صرف دو چیزیں ہیں ایک روح دوسرے ڈھانچہ۔ روح عمل کو مصادر اور عمل کے ڈھانچے کو مظاہر کہتے ہیں۔ لہٰذا جیسے اعمال و اخلاق کے لیے مصادر میں اللہ کی رضا شرط ہے ایسے ہی مظاہر میں اللہ کی وحی کے مطابق ہونا ضروری ہے۔ اس کے بعد سمجھانا چاہتے ہیں کہ وحی کیا ہوتی ہے مگر ارادۃً اسے چھوڑ کر وحی کی کیفیت والی حدیث لے کر آتے ہیں۔ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ وحی وہ معلوماتی ذریعہ ہے جو ہمارے ادراک کی گرفت میں نہیں آسکتا ہے یہ اللہ کی دین، محنت اور ریاضت سے حاصل نہیں ہوتی ہم جو کچھ جان سکتے ہیں وہ وحی نہیں بلکہ وحی کی آمد کی کیفیت ہے اور وہ بھی صرف تمثیل کے درجے میں۔ اس کے بعد دو حدیثوں کے ذریعے نبی شناسی کے چار پیمانے پیش فرمائے ایک شخصی پیمانہ دوسرا نوعی پیمانہ، تیسرا اخلاقی پیمانہ،

اور چوتھا علمی پیمانہ۔

نبی شناسی کا شخصی پیمانہ

شخصی پیمانہ کو بتانے کے لیے دربار بادشاہ روم کی طویل حدیث ذکر فرمائی جس میں حضور انور کی شخصی حیثیت سے بھرپور عکاسی کی گئی ہے لیجئے آپ بھی چند سوال و جواب پڑھ لیجئے قیصر روم کے دربار میں جب قاصد نبوی پہنچا تو ابوسفیان کو بلوا کر قیصر نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق سوالات کیے وہ حسب ذیل ہیں۔

قیصر: مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟

ابوسفیان: شریف ہے۔

قیصر: اس خاندان میں کسی اور نے بھی دعویٰ نبوت کیا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: اس خاندان میں کوئی بادشاہ گزرا ہے؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: جن لوگوں نے اس مذہب کو قبول کیا ہے وہ کمزور ہیں یا صاحب اثر؟

ابوسفیان: کمزور لوگ ہیں۔

قیصر: اس کے پیرو گھٹ رہے ہیں یا بڑھ رہے ہیں؟

ابوسفیان: بڑھتے جاتے ہیں۔

قیصر: کبھی تم لوگوں نے اس کے بارے میں جھوٹ کا تجربہ کیا ہے یا نہیں؟

ابوسفیان: نہیں۔

قیصر: وہ کبھی عہد و اقرار کی خلاف ورزی بھی کرتا ہے؟

ابوسفیان: ابھی تک تو نہیں کی لیکن اب جو معاہدہ ہے دیکھیں وہ اس پر قائم رہتا ہے یا نہیں۔

قیصر: تم لوگوں نے اس سے جنگ کی ہے؟

ابوسفیان: ہاں۔

قیصر: نتیجہ جنگ کیا رہا؟

ابوسفیان: کبھی ہم غالب رہے اور کبھی وہ

قیصر: اس کی تعلیمات کیا ہیں؟

ابوسفیان: وہ کہتا ہے کہ ایک خدا کی عبادت کرو، کسی اور کو خدا کا شریک نہ کرو، نماز پڑھو، پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلہ رحمی اختیار کرو۔

اس گفتگو کے بعد قیصر نے کہا تم نے اس کو شریف النسب بتایا پیغمبر ہمیشہ اچھے خاندانوں سے تعلق رکھتے ہیں۔ تم نے کہا کہ اس کے خاندان میں کسی اور نے دعویٰ نبوت نہیں کیا اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ یہ خاندانی خیال کا اثر ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس کے خاندان میں کوئی بادشاہ نہیں ہوا اگر ایسا ہوتا تو میں سمجھتا کہ اس کو بادشاہت کی ہوس ہے۔ تم مانتے ہو کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ جو شخص آدمیوں سے جھوٹ نہیں بولتا وہ خدا پر کیوں کر جھوٹ باندھ سکتا ہے۔ تم کہتے ہو کہ کمزوروں نے اس کی پیروی کی ہے۔ انبیاء کے ابتدائی پیرو ہمیشہ غریب ہی لوگ ہوتے ہیں۔ تم نے تسلیم کیا کہ اس کا مذہب ترقی کرتا جاتا ہے سچے مذہب کا یہی حال ہے۔ تم نے بتایا ہے کہ اس نے کسی کو فریب نہیں دیا پیغمبر کبھی فریب نہیں دیتے۔ غور فرمائیے اور امام بخاری کے ذوق کی داد دیجئے کہ کس طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کی صداقت کو جانچنے کے لیے حضور کے شخصی چہرہ کو پیش کر دیا ہے اور اپنے مخاطبوں کو بتا دیا ہے کہ نبی کا ایک پیمانہ شخصی ہوتا ہے اور یہ سب سے پہلا پیمانہ ہے۔

نبی شناسی کا اخلاقی پیمانہ

یہ نبی شناسی کا دوسرا پیمانہ ہے۔ امام بخاری نے اس پیمانہ کا حدیث عائشہ میں ذکر کیا ہے۔ اور حضرت خدیجۃ الکبریٰ کی زبانی اس پیمانہ کی تصویر ان الفاظ میں پیش کی ہے۔ آغاز وحی ہی میں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خدیجۃ الکبریٰ سے غار حرا کے روحانی مشاہدات کا تذکرہ کیا تو وہ ایمان لے آئیں مگر کس پیمانہ سے اس کی توضیح اس سے ہوتی ہے کہ جب آپ نے بتقاضائے بشریت ان سے اپنی خوف جاں کا تذکرہ کیا اور فرمایا کہ خشیت علی نفسی تو حضرت خدیجہ نے فرمایا:

خدا کی قسم خدا آپ کو رسوا نہ کرے گا، آپ صلہ رحمی کرتے ہیں، قرض داروں کا بوجھ اٹھاتے ہیں، غریبوں کی مدد کرتے ہیں، مہمانوں کو کھانا کھلاتے ہیں۔ حق کی

مصیبتوں پر لوگوں کی اعانت کرتے ہیں۔

امام بخاری نے خدیجۃ الکبریٰ کے اس بیان کو اپنی صحیح میں لاکر بتادیا کہ نبی شناسی کا ایک پیمانہ اخلاقی قدریں بھی ہیں اور حضرت خدیجہ نے اسی پیمانہ کی مدد سے آپ کے نبی ہونے کی صداقت کا فیصلہ فرمایا تھا۔

نبی شناسی کا نوعی پیمانہ

حضرت امام بخاری حضرت عائشہ کی یہ حدیث پیش فرماکر نبی شناسی کے نوعی پیمانے کی طرف بھی اشارہ کیا ہے۔ اسی حدیث میں امام بخاری نے جو یہ ٹکڑا پیش کیا ہے کہ

حضرت خدیجہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو لے کر ورقہ ابن نوفل کے پاس گئیں اور ورقہ زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہوگئے اور عبرانی زبان میں کتابیں لکھتے انجیل عبرانی میں لکھتے تھے بعد میں زیادہ عمر کے ہوکر نابینا ہوگئے تھے۔ حضرت خدیجہ نے ان سے کہا کہ اپنے برادر زادے کی سنیے۔ ورقہ نے حضور کو مخاطب کرکے کہا فرمائیے کیا بات ہے حضور نے غار حرا کی ساری داستان سنادی۔ ورقہ ابن نوفل نے سن کر کہا کہ یہ تو وہ ہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ پہ نازل ہوا تھا۔

اس آخری فقرے کہ ھذا ھو الناموس الذی نزل اللہ علی موسیٰ یہ تو وہی ناموس ہے جو اللہ نے حضرت موسیٰ پر نازل فرمایا ان الفاظ کے ذریعے امام بخاری اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ معجزات ہی نبی شناسی کا پیمانہ نہیں ہے بلکہ ایک پیمانہ یہ بھی ہے کہ نبی کو نبیوں کی ترازو میں رکھ کر تولا جاتے خود قرآن نے بھی جابجا اسی پیمانہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ سلسلہ نبوت جو آدم علیہ السلام سے قائم ہے اس کی آپ آخری کڑی ہیں اور خود آیت بالا انا اوحینا الیک کما اوحینا کا تشبیہی پیمانہ بھی اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کہیں فرمایا ہے ماکنت بدعا من الرسل میں کوئی انوکھا رسول نہیں ہوں۔ یعنی ہمیشہ سے انبیاء آتے رہے ہیں میں بھی ان ہی میں سے اللہ کا ایک رسول ہوں، اسی کا نام نوعی پیمانہ ہے۔

نبی شناسی کا علمی پیمانہ

امام بخاری نے عائشہ کی اس حدیث اور پہلی حدیث سے اس بات کی طرف اشارہ کیا ہے کہ نبی شنا

کا علمی پیمانہ کیا ہے۔ نبی کے علوم کا ماخذ انسانی فکر نہیں، کسب و اکتساب، محنت و ریاضت بلکہ نبی میں علم کی تخلیق اور تکوین ہوتی ہے اور اس تکوین علم کا ذریعہ حضرت جبریل ہیں، یہی روح الامین ہیں۔ ایک امی ہیں اگر غار حرا میں علم کی تخلیق ہوتی ہے تو وہ بلاشبہ اللہ کا رسول ہے۔ چنانچہ اسی حقیقت کو بیان کرنے کے لیے امام صاحب حضرت عائشہ کی وہ حدیث لائے ہیں جس میں جبریل کے ذریعے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم میں تخلیق علم کی داستان بیان ہوتی ہے ارشاد ہے،

حرا میں آپ کے پاس فرشتہ آیا اور اس نے کہا کہ پڑھو آپ نے فرمایا کہ میں پڑھا ہوا نہیں۔ فرشتہ نے مجھے پکڑا اور دبایا اور مجھے چھوڑ کر پھر کہا کہ پڑھو میں نے پھر وہی بات دہرائی کہ میں پڑھا ہوا نہیں۔ فرشتہ نے دوبارہ ایسا ہی کیا اور اور تیسری بار چھوڑ کر کہا کہ اقراء باسم ربک الذی خلق، خلق الانسان من علق،

یہی سینۂ نبوت میں علم کی تخلیق ہے۔ علامہ کرمانی نے یہاں بڑی مفید بات لکھی ہے۔

اس میں اس خیال کی تردید ہے کہ علم صرف تعلیم ہی کے ذریعہ حاصل ہوتا ہے۔ بلکہ جیسا تعلیم کے ذریعے علم آتا ہے ایسے ہی کبھی بغیر ذریعے کے بھی علم محض فضل الٰہی سے حاصل ہو جاتا ہے۔

بہرحال اس حدیث کے ذریعے نبوت کے علمی پیمانہ کی طرف امام بخاری نے اشارا کر دیا۔ یہاں سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر صرف معجزہ ہی دلیل نبوت ہوتا تو کم از کم ورقہ ابن نوفل اور سربراہ روم ضرور اس کی جستجو کرتے کہ آپ کا کوئی معجزہ بھی ہے۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ سربراہ روم نے بھی ابو سفیان سے یہ دریافت نہیں کیا کہ اس پیغمبر نے کوئی معجزہ بھی پیش کیا ہے یا نہیں۔ بہرحال نبی شناسی کا پیمانہ صرف معجزہ نہیں ہے بلکہ اعجاز کے ساتھ یہاں دوسرے پیمانے بھی ہیں۔ دوسرے علماء نے بھی یہی بات اپنے اپنے انداز میں لکھی ہے۔ امام غزالی نے المنقذ من الضلال میں، حافظ ابن تیمیہ نے شرح العقیدہ الاصفہانیہ اور النبوات میں، اور امام رازی نے المطالب العالیہ میں اس موضوع پر مفید باتیں لکھی ہیں۔ اور صوفیائیں حضرت مولانا روم نے مثنوی میں اس کو بہت پیارے اور انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔ آئیے ہم بھی سب کچھ نہیں تو کچھ تو ان بزرگوں کے علمی فیضان سے استفادہ کرلیں۔

نبی شناسی اور امام غزالی

نبوت کے کچھ آثار و خواص ہیں۔ اگر کسی شخص کی نسبت یہ سوال ہو کہ یہ پیغمبر ہے یا نہیں تو اس کا صرف اس کے احوال کی معرفت سے ہو سکتا ہے یہ معرفت یا تو ذاتی مشاہدے سے ہو جیسے صحابہ کو تھی یا خبر متواتر سے سن کر ہو جیسے آپ لوگوں کو ہے۔ نبوت کے آثار و کیفیات کی ذوق شناسی جس میں ہوتی ہے وہی آمادہ تصدیق ہوتا ہے۔ مثلاً اگر فن طب اور قانون سے کچھ واقفیت ہے اور ان کا ذوق رکھتے ہو تو جو شخص طبیب یا قانون دان اور فقیہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے تم اس کے احوال دیکھ کر اور اس کی باتیں سن کر فوراً یہ فیصلہ کر سکتے ہو کہ یہ طبیب یا فقیہ ہے یا نہیں اور اس طرح تم امام شافعی کی فقاہت اور جالینوس کی طبابت کی تصدیق تقلید سے نہیں بلکہ اپنی ذاتی تحقیق سے کر سکتے ہو اگرچہ آج امام شافعی اور جالینوس کا وجود نہیں ہے مگر ان کے سوانح اور تصانیف پڑھ کر اب بھی تم کہہ سکتے ہو کہ امام شافعی فقیہ کامل اور جالینوس طبیب حاذق تھے۔ اسی طرح حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے واتبعوہ لعلکم تھتدون ، اس میں پوری انسانی دنیا کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کرنے پر ہدایت تامہ کی بشارت دی گئی ہے۔ یہی بات قرآن میں دوسرے موقعہ پر دوسرے عنوان سے کہی گئی ہے۔

قل للذین اوتوا الکتاب والامیین اسلمتم فان اسلموا فقد اھتدوا۔

اے پیغمبر اہل کتاب اور امیین عرب سے کہہ دو کہ کیا تم نے اسلام قبول کر لیا اگر کر لیا تو وہ ہدایت یافتہ ہو گئے۔

ایسے ہی دوسری آیت فان امنوا بمثل ما امنتم بہ فقد اھتدوا، اگر وہ بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جیسے تم ایمان لاتے ہو تو انھوں نے سیدھی راہ پالی۔

اس سے معلوم ہوا کہ جس چیز کو ان آیتوں میں اسلام اور ایمان سے تعبیر کیا گیا ہے اسی کو یہاں اتباع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کہا ہے۔ تعبیرات مختلف ہیں حاصل سب کا ایک ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام ہدایت تامہ ہے۔ یہی دین ہے جس کو یہود و نصاریٰ اور تمام اہل مذاہب نے کھو دیا تھا اور اب جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آتے ہیں اس لیے جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی اور محمد رسول اللہ جو لے کر آتے وہ کامل ہے۔ نیز یہ معلوم ہوا کہ جن

آیتوں میں یہ کہا گیا ہے " جو ایمان لائے جو یہودی ہوتے اور نصرانی اور صابئی جو بھی خدا اور یوم آخر پر ایمان لایا اور اس نے نیک کام کیا اس کو خوف و غم نہ ہوگا ان میں خدا پر ایمان لانے سے مقصود اتباع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہے اور اس کا یہ منشا ہرگز نہیں کہ یہود و نصاریٰ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے باوجود نجات کے مستحق ہیں۔ یہود و نصاریٰ کیا خود مسلمان بھی اتباع محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بغیر نجات کے مستحق نہیں ہیں جب تک مسلمانوں کا ایمان و عمل صالح ٹھیک اس علم و عمل کے مطابق نہ ہو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔ یہ اصول ہر ایک کے لیے ہے خواہ مسلمان ہو یا یہودی، عیسائی ہو یا صابئی، غرض کوئی ہو۔

مسند احمد اور صحیح مسلم میں اس ارشادِ نبوت سے اس کی مزید توضیح ہوتی ہے جو حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے آیا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے اس ذات کی قسم جس کے قبضے میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے اس امت میں کوئی یہودی ایسا نہیں ہے اور نہ کوئی نصرانی جو میری خبر پاتے پھر اس دعوت پر ایمان نہ لاتے جو میں دے کر بھیجا گیا ہوں اور اسی حال میں مرجائے مگر وہ دوزخیوں میں ہوگا۔

اس جگہ واتبعوہ میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کا مطالبہ کیا ہے۔ یہی بات قرآن کے بارے میں پہلے ارشاد ہوئی ہے۔ واتبعوا النور الذی انزل معہ، مگر دونوں میں فرق ہے۔ پہلی بات قرآن کے بارے میں خاص ہے اور یہ بات حضور انور کے بارے میں عام ہے۔ اتباع کے معنے محض صفات میں ہمرنگ ہونے کے نہیں ہیں بلکہ طرزِ فکر، معیار اقدار، اصول و نظریات، اخلاق و معاملات اور سیرت و کردار میں پیروی کرنا بھی لازماً اس میں شامل ہے اور سب سے زیادہ یہ کہ جہاں حضور نے رسول کی حیثیت سے دین کے کسی حصہ پر عمل کرکے بتایا ہو وہاں امتی کی طرح اس عمل میں آپ کی پیروی کرنا ہمارے لیے ضروری ہے۔ اسی لیے علماء نے سنن کی دو قسمیں کی ہیں سنن ہدیٰ اور سنن عادیہ۔ اتباع کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ جس تراش و خراش کا لباس آپ پہنتے ہیں وہی ہم پہنیں۔ جس طرز کے کھانے آپ کھاتے تھے وہی ہم کھائیں۔ جس قسم کی سواریاں آپ استعمال کرتے تھے ان ہی پر ہم بیٹھیں۔ یا جس اسلحہ سے آپ جنگ کرتے تھے اس کے سوا ہم کوئی ہتھیار استعمال نہ کریں بلکہ اتباع کا مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے قول و فعل سے اسلامی اندازِ فکر اور دین کے اصول و احکام کی جو تشریح

فرماتی ہے اس میں ہم آپ کی پیروی کریں۔
یہاں قرآن نے دو اتباعوں کا ذکر کیا ہے ایک قرآن کی واتبعوا النور الذی انزل معہ اور دوسرے حضور کی واتبعوہ لعلکم تھتدون، اس سے معلوم ہوا کہ مدارِ ہدایت دو چیزیں ہیں ایک قرآن دوسرے سنت۔ واتبعوہ میں اسی ہدایت کے دوسرے حصہ کا مطالبہ ہوا ہے، اسی کا نام قرآن کی زبان میں حکمت ہے انزل اللہ علیک الکتاب والحکمۃ اور ان کے ذریعے دین کی تکمیل ہوتی ہے۔ ملا علی قاری نے یہ بات آب زر سے لکھنے کے قابل فرمائی ہے:

الیوم اکملت لکم دینکم کے بعد ہمیں دین کی تکمیل میں کسی ایسے امر کی حاجت نہیں جو کتاب و سنت سے باہر ہو۔ (شرح فقہ اکبر)

بہرحال ان آیات میں اللہ سبحانہ نے نبوت کی حقیقت، نبی شناسی کے پیمانے اور نبوت کے فرائض کی نشاندہی فرماکر نبوت محمدیہ کو ثابت کیا ہے اور بتایا ہے کہ رہتی دنیا تک فلاح ان لوگوں میں محدود ہوکر رہ گئی ہے جو نبوتِ محمدیہ کی پیروی کریں گے اور اس نظامِ فکر و عمل کو لے کر دنیا میں زندگی گزاریں گے جو محمد رسول اللہ لے کر آئے ہیں۔ آپ کی نبوت عالمی ہے اور عالمی ہونے کے ساتھ آپ آخری پیغمبر ہیں۔ اب تا قیامِ قیامت کوئی اور نبی نہ آئے گا۔
حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے تک جس قدر انبیا آئے وہ خاص خاص قوموں اور قبیلوں کے پیغمبر تھے۔ ان کی دعوت عام نہ تھی۔ یہاں تک کہ حضرت عیسٰی نے بھی اپنے کو بنی اسرائیل کی کھوئی ہوئی بھیڑوں کی جگہ بانی تک محدود رکھا لیکن آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت روئے زمین کی تمام قوموں اور تمام اجناس کی طرف ہوتی کالے گورے، رومی حبشی، عرب و عجم، ترک و تاتار، چینی و ہندی سب آپ میں برابر کے حقدار ہیں۔ اسی لیے فرمایا ہے:

یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعاً،

صحیحین میں ہے کہ مجھ سے پہلے نبی خاص قوم میں بھیجا جاتا تھا اور میں تمام دنیا کے لیے بھیجا گیا ہوں اس موضوع پر بکثرت احادیث حدیث کی کتابوں میں آئی ہے۔ اس کی عملی دلیل یہ ہے کہ تمام پیغمبروں کے حالات پڑھ جاؤ سب کے پیروؤں کو اس کی زندگی میں خود اسی کے قوم و ملک کے اندر محدود پاؤ گے لیکن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے حلقہ بگوشوں میں خود آپ کی زندگی میں عرب کے علاوہ مسلمان عجمی صہیب رومی، بلال حبشی سب کو پاؤ گے، سلاطینِ عالم کے نام آپ کا دعوت نامہ بھی اسی تعلیم دعوت کی مستحکم عملی دلیل ہے۔

وَمِنْ قَوْمِ مُوْسٰى اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿۱۵۹﴾
وَقَطَّعْنٰهُمُ اثْنَتَیْ عَشْرَةَ اَسْبَاطًا اُمَمًا ۭ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى مُوْسٰٓى
اِذِ اسْتَسْقٰىهُ قَوْمُهٗٓ اَنِ اضْرِبْ بِّعَصَاكَ الْحَجَرَ ۚ فَانْۢبَجَسَتْ
مِنْهُ اثْنَتَا عَشْرَةَ عَيْنًا ۭ قَدْ عَلِمَ كُلُّ اُنَاسٍ مَّشْرَبَهُمْ ۭ وَظَلَّلْنَا
عَلَيْهِمُ الْغَمَامَ وَاَنْزَلْنَا عَلَيْهِمُ الْمَنَّ وَالسَّلْوٰى ۭ كُلُوْا مِنْ طَيِّبٰتِ
مَا رَزَقْنٰكُمْ ۭ وَمَا ظَلَمُوْنَا وَلٰكِنْ كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۰﴾
وَاِذْ قِيْلَ لَهُمُ اسْكُنُوْا هٰذِهِ الْقَرْيَةَ وَكُلُوْا مِنْهَا حَيْثُ شِئْتُمْ وَ
قُوْلُوْا حِطَّةٌ وَّادْخُلُوا الْبَابَ سُجَّدًا نَّغْفِرْ لَكُمْ خَطِيْۗـٰٔتِكُمْ ۭ سَنَزِيْدُ
الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۶۱﴾ فَبَدَّلَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ قَوْلًا غَيْرَ الَّذِيْ
قِيْلَ لَهُمْ فَاَرْسَلْنَا عَلَيْهِمْ رِجْزًا مِّنَ السَّمَاۗءِ بِمَا كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۶۲﴾

وقف لازم

اور موسیٰ کی قوم میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کے مطابق لوگوں
کی رہنمائی کا فرض انجام دیتی ہے اور اسی کے موافق انصاف کرتی

ہیں۔[۲۰۵] اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انہیں مستقل جماعتوں کی شکل دے دی تھی۔[۲۰۶] اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اس پتھر پر اپنی لاٹھی مارو چنانچہ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی۔[۲۰۷] ہم نے اُن پر بادل کا سایہ کیا اور اُن پر من و سلویٰ اُتارا (اور کہا) کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں مگر اس کے بعد جو کچھ انہوں نے کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے آپ پر وہ ظلم کرتے رہے۔[۲۰۸] اور اس وقت کو یاد کرو جب اُن سے کہا گیا تھا کہ اس بستی میں جا کر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے اپنے حسب منشا روزی حاصل کرو اور تمہاری زبانوں پر حطۃ کا کلمہ جاری ہو، اور شہر کے دروازے میں سجدہ ریز ہو کر داخل ہو جاؤ، ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور نیکو کاری کرنے والوں کو مزید نوازیں گے۔[۲۰۹] لیکن اُن

پس جو لوگ ظلم پیشہ تھے انہوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی بدل ڈالا ایسی بات سے جو ان سے نہیں کہی گئی تھی پس نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں ان پر آسمان سے عذاب بھیج دیا۔[۲۱]

معانی مفردات

المن :- اسم شبنمی گوند جو وادی تیہ میں اسرائیلیوں کے کھانے کے لیے اللہ سبحانہ روزانہ درختوں کے پتوں پر جما دیتا تھا۔ یہ ایک سفید چیز ہوتی تھی، مزے میں میٹھی ہوتی تھی۔ ابتدا میں پھوار کی طرح برستی تھی بعد میں گوند کی طرح جمع ہو جاتی تھی۔ بیشتر شارحین قرآن نے اسے ترنجبین کا نام دیا ہے۔ السلوی :- ایک پرندہ ہے جس کو بٹیر کہتے ہیں۔ قاموس میں اس کا واحد سلواۃ لکھا ہے اور صحاح میں اخفش سے منقول ہے کہ میں نے اس کا واحد نہیں سنا۔ ان کا بیان ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ اس کا واحد جمع ہی کی طرح ہے (تاج العروس)، حطۃ :- ہم بخشش مانگتے ہیں تو ہمارے گناہ جھاڑ، گناہ اتار۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں اس کلمہ کے معنے میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں یہ اترنے کی ہیئت کا نام ہے یعنی اتار کا حط سے مشتق ہے جس کے معنے بلندی سے کسی چیز کے نیچے اترنے کے ہیں جیسے جلسۃ بیٹھک ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کے معنے توبہ کے ہیں۔ چنانچہ شاعر کہتا ہے،

فاز بالحطۃ التی صیر اللہ بہا ذنب عبدہ مغفورا

وہ اس توبہ پر فائز ہوا جس کے ذریعہ اللہ نے اپنے بندے کے گناہ کو بخش دیا۔

اور بعض کا قول ہے کہ اس کے معنے معلوم نہیں محض امتثال مقصود تھا۔ اور ابن ابی حضرت عبداللہ بن عباس روایت کرتے ہیں کہ ان سے کہا گیا تھا کہ تم مغفرت مانگو۔ رجزا :- عقوبت، بلا، عذاب، قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ رجز اصل میں وہ چیز ہے جس سے گھن آتے اور رجس بھی اسی کی

طرح ہے۔ لیکن علامہ زمخشری الفائق فی غریب الحدیث میں رقمطراز ہیں رجز اور رجس کے معنے عذاب کے ہیں۔ ابوتراب کا بیان ہے کہ میں نے ابوالسمیدع حصینی سے سنا وہ کہتے تھے کہ رجز اور رجس وہ سخت مصیبت ہے جو لوگوں پر نازل ہو۔ یہ اہلِ عرب کے محاورہ ارتجزت السماء بالرعد وارتجست (آسمان بجلی کی کڑک سے کانپ اٹھا اور لرز گیا اور رعد ترتجز و ترتجس (کپکپا دینے اور لرزا دینے والی گرج سے ماخوذ ہے اور وہ ایسی جنبش ہے جس کے ساتھ شور ہو۔ کیونکہ جو عذاب کہ اترتا ہے اس میں ضروری ہے کہ جن پر اترے وہ ہل جائیں اور چیخ اٹھیں۔ اور امام راغب فرماتے ہیں:

رجز کی اصل اضطراب یعنی خوب ہلنا اور جنبش کرنا ہے اور اسی سے رجز البعیر رجزاً فہو ارجز وناقۃ رجزاء آتا ہے جب کہ اونٹ یا اونٹنی کے قدم قریب قریب پڑنے اور ضعف کے سبب ڈگمگانے لگیں۔

بنی اسرائیل پر ماضی میں انعامات کی بارش

اصل سلسلہ کلام بنی اسرائیل کے متعلق آرہا تھا۔ یہاں موقع کی مناسبت سے رسالتِ محمدی پر ایمان لانے کی دعوت بطورِ جملہ معترضہ آگئی تھی۔ اب پھر تفسیر کا رُخ اسی مضمون کی پھر رہا ہے اور بتایا جارہا ہے کہ یہ وہی دین ہے جو تمہارے انبیاء کرتے آئے تھے۔ اصُول دین میں سے کوئی چیز بھی ایسی نہیں ہے جس میں قرآن کی تعلیم تورات کی تعلیم سے مختلف ہو۔ ان پر ثابت کیا جارہا ہے کہ جو ہدایت تمہیں دی گئی تھی اس کی پیروی کرنے میں اور جو رہنمائی کا منصب تمہیں دیا گیا تھا اس کا حق ادا کرنے میں تم بُری طرح ناکام ہوگئے ہو اس کے ثبوت میں ایسے واقعات سے استشہاد کیا گیا ہے جن کی وہ تردید نہ کر سکتے تھے پھر جس طرح حق کو حق جاننے کے باوجود وہ اس کی مخالفت میں سازشوں، وسوسہ اندازیوں، کج بحثیوں اور مکاریوں سے کام لے رہے تھے اور جن ترکیبوں سے وہ کوشش کر رہے تھے کہ کسی طرح محمد رسول اللہ کا مشن کامیاب نہ ہونے پائے۔ ان سب کی پردہ دری کی جارہی ہے جس سے یہ بات عیاں ہو جاتی ہے کہ ان کی ظاہری مذہبیت محض ایک ڈھونگ ہے جس کے نتیجے میں دیانت اور حق پرستی کے بجائے ہٹ دھرمی، جاہلانہ عصبیت اور نفس پرستی کام کر رہی ہے اور حقیقت میں وہ یہ چاہتے ہی نہیں کہ نیکی کا کوئی کام پھل اور پھول سکے۔ اس طرح اتمامِ حجت کرنے کا فائدہ یہ ہوا کہ ایک طرف خود اس قوم میں جو صالح عنصر تھا اس کی آنکھیں کھل گئیں اور یہاں قرآن نے ومن قوم موسیٰ کہہ کر

اس صالح عنصر کی طرف اشارہ کیا ہے اور بتا دیا ہے کہ اس گئے گزرے زمانہ میں بھی ایسا طبقہ موجود ہے جو کھلے دل سے حق کو قبول کرنے کے لیے تیار ہے۔

۲۰۵۔ اور موسٰی کی قوم میں ایک جماعت ایسی بھی ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیتی ہے اور اسی کے موافق انصاف کرتے ہیں۔ گو اکثر یہود سرکشی اور ناانصافی کی راہ اختیار کرتے ہیں تاہم کچھ ایسی سعید روحیں بھی ہیں جو دوسروں کو حق کی طرف دعوت دیتی ہیں اور بذات خود حق و انصاف کے راستوں پر گامزن ہیں مثلاً عبداللہ بن سلام وغیرہ[1]

اُمتہ کی تنکیر تقلیل کے لیے ہے اور بتایا جارہا ہے کہ اہل کتاب میں ایک چھوٹی سی جماعت ایسی موجود ہے جو حق و عدل پر قائم ہے اور حق پر مبنی لوگوں کی رہنمائی کا فرض انجام دیتی ہے اور زندگی کے معاملات میں ظلم و جور سے کام نہیں لیتی ہے بلکہ عدل و انصاف کو شیوہ بناتے ہوتے ہے۔ یہدون اور یعدلون کے الفاظ استمرار کو ظاہر کر رہے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ان اہل کتاب میں ایک مٹھی بھر جماعت ایسے لوگوں کی بھی ہے جو حق کے مطابق لوگوں کی رہنمائی اور عدل کے مطابق لوگوں کے معاملات کے فیصلے کرتے رہے ہے۔ اسی طرح کا ایک گروہ قلیل تعداد میں سہی ان آیات کے نزول کے زمانے میں بھی موجود تھا اور یہی لوگ تھے۔ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لائے۔ قرآن نے ان لوگوں کا ذکر کئی جگہ مختلف عنوانوں سے کیا ہے ایک جگہ ان کی عبادت کا تذکرہ اس طرح کیا ہے۔

من اھل الکتاب امۃ قائمۃ یتلون آیات اللہ آناء اللیل وھم یسجدون۔

اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو راتوں کو کھڑے ہو کر خدا کی آیتیں پڑھتے ہیں اور وہ سجدہ کرتے ہیں۔

احادیث میں بھی یہودیوں اور عیسائیوں کے تذکرے ہیں۔ مثلاً آپ نے فرمایا کہ جب نماز پڑھو تو تہ بند باندھ لو یا چادر اوڑھ لو، یہودیوں کی طرح ننگے نہ پڑھو۔ تم یہودیوں کی طرح صرف اوپر سے نماز میں چادر نہ ڈالو بلکہ اس کو باندھ لیا کرو۔ نماز میں یہودیوں کی طرح مت جھومو۔ تم یہودیوں کے برخلاف نماز میں کپڑے اور جوتے پہنا کرو۔ میری اُمت میں اس وقت تک دین کا کچھ نہ کچھ اثر ضرور رہے گا جب تک لوگ یہودیوں کی تقلید میں مغرب کی نماز میں ستاروں کے نکلنے کا اور عیسائیوں

[1] افادات شیخ الاسلام

کی طرح نماز میں ستاروں کے ڈوبنے کا انتظار نہ کریں گے ۔ یہ سب حدیثیں ہم نے کنزالعمال جلد چہارم سے نقل کی ہیں ۔ ان سے یہ ثابت ہوتا ہے کہ عرب کے یہود و نصاریٰ میں کچھ لوگ ایسے تھے جو نماز پڑھتے تھے ۔

قرآن نے ایک موقعہ پر اسی گروہ کی معاملاتی دیانت وانصاف کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے

منهم من ان تامنه بقنطار يوده اليك

اہل کتاب میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ اگر تم اس کے اعتماد پر مال و دولت کا ایک ڈھیر بھی دے دو تو وہ تمہارا مال تمہیں دے دیں گے ۔

یہاں قرآن نے ان کے اس کردار کی داد دی ہے تاکہ ان کی حوصلہ افزائی ہو اور وہ اس میدان میں اور آگے بڑھنے کی کوشش کریں ۔ یہی لوگ تھے جو بعد میں اسلام کی نعمت سے بہرہ ور ہوتے ۔

بہر حال اس آیت گرامی کا مصداق وہ لوگ ہیں جو اہل کتاب میں سے نعمت ایمان سے مالا مال ہوتے ہیں اور جو پہلے سے شریعت موسیٰ کے مطابق حق وانصاف کے علمبردار اور عبادت کی سرشاریوں سے ہمدوش اور امانت و دیانت سے مالامال تھے ۔ ان ہی کا چہرہ قرآن نے ایک سے زیادہ آیات میں پیش کیا ہے اور یہ قرآن کا بہت بڑا انصاف ہے کہ وہ اہل کتاب میں اچھوں کو اچھا اور بُروں کو بُرا کہتا ہے ۔

اور یہ بڑے افسوس کی بات ہے کہ یہاں شارحین قرآن نے اس آیت کا مصداق مقرر کرنے کے لیے ایک ایسی بے سروپا اور غیر مستند کہانی درج کر دی ہے جسے زبانِ قلم پر لاتے ہوتے بھی دکھ ہوتا ہے ۔ خدا بھلا کرے مفسر قرآن قرطبی کا کہ انہوں نے اس کے بارے میں لکھ دیا ہے کہ تاریخی طور پر یہ داستان صحیح نہیں ہے اور علامہ آلوسی نے ساری کہانی نقل کرنے کے بعد لکھا ہے ۔ میرے خیال میں یہ کہانی کچھ نہیں ہے ۔ اس کی کوئی قابل اعتبار سند نہیں ۔ زمین میں سرنگ لگا کر یا آسمان میں سیڑھی لگا کر بھی اس کی کوئی سند نہیں مل سکتی ۔

بنی اسرائیل کا تنظیمی ڈھانچہ

۲۰۶ ۔ اور ہم نے بنی اسرائیل کو بارہ گھرانوں میں تقسیم کر کے انہیں مستقل جماعتوں کی شکل دے دی تھی ۔ یعنی اصلاح و انتظام کے لیے ان کی بارہ جماعتیں جو بارہ دادوں کی اولادتھی الگ الگ کر دی گئی تھیں ۔ پھر ہر ایک جماعت کا ایک نقیب مقرر فرما دیا جو اس کی نگرانی اور اصلاح

کا خیال رکھے وبعثنا منھم اثنی عشر نقیباً [1] یہ بات بعینہٖ معمولی تغیرِ الفاظ کے ساتھ سورہ مائدہ میں گزر چکی ہے۔ اس میں بنی اسرائیل کے تنظیمی ڈھانچہ کی طرف اشارا ہوا ہے۔ اس سے پتہ لگتا ہے کہ حضرت موسیٰ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے کوہ سینا کے بیابان میں بنی اسرائیل کی مردم شماری کرائی پھر ان کے بارہ گرانوں کو جو حضرت یعقوب کے دس بیٹوں اور حضرت یوسف کے دو بیٹوں کی نسل سے تھے۔ الگ الگ گروہوں کی صورت میں منظم کیا اور ہر گروہ پر ایک ایک سردار مقرر کیا تاکہ وہ ان کے اندر اخلاقی، مذہبی، تمدنی و معاشرتی اور فوجی حیثیت سے نظم قائم رکھے اور احکامِ شریعت کا اجرا کرتا رہے۔ نیز حضرت یعقوب کے بارھویں بیٹے لاوی کی اولاد کو جس کی نسل سے حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون تھے ایک الگ جماعت کی شکل میں منظم کیا تاکہ وہ ان سب قبیلوں کے درمیان شمع حق روشن رکھنے کی خدمت سرانجام دیتی رہے قرآن نے اس تنظیم کے بارہ سربراہوں کے لیے نقیب کا لفظ بولا ہے وبعثنا منھم اثنی عشر نقیباً بائیبل کی کتاب گنتی میں سرداروں کا ذکر موجود ہے مگر ان کی وہ حیثیت جو یہاں لفظ نقیب سے قرآن میں بیان کی گئی ہے بائیبل کے بیان سے ظاہر نہیں ہوتی۔ بائیبل انہیں صرف رئیسوں اور سرداروں کی حیثیت سے پیش کرتی ہے اور قرآن ان کی حیثیت اخلاقی و دینی نگران کار کی قرار دیتا ہے۔ تورات کی کتاب خروج کے حوالہ سے سید سلیمان ندوی نے یہ انکشاف بھی کیا ہے کہ

حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر جب مصر سے حدودِ عرب میں داخل ہوئے تو مدین کے کاہن نے ان کا استقبال کیا۔ بنی اسرائیل غلامی کے عہد سے ابھی نکلے تھے۔ نظامِ تربیت سے بالکل آگاہ نہ تھے بھیڑ کی طرح روز و شب پیغمبر کو گھیرے رہتے تھے اور ذرا ذرا سی بات کے لیے انہیں کے پاس دوڑے آتے تھے۔ مدین کے کاہن نے بتایا کہ ایک قوم پر کیوں کر حکومت کرنی چاہیے۔ اور اس کی تربیت و تنظیم کے اصول کیا ہیں۔ اول ہزار ہزار پر افسر ہوں پھر ہر سو پر اور پھر ہر دس پر۔ صرف افسروں کے اختلاف رائے کے موقعہ پر حضرت موسیٰ کی عدالت کی طرف رجوع کیا جائے۔ بہرحال قرآن کی تصریح کے مطابق قبائل کی گنتی کے نقیبوں کی تعداد بارہ تھی۔

بیابانی علاقہ میں پانی کی بہم رسانی

۲۰۷۔ اور جب موسیٰ سے اس کی قوم نے پانی مانگا تو ہم نے موسیٰ کو وحی کی کہ اس پتھر پر اپنی

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

لاٹھی مارو۔ چنانچہ اس چٹان سے یکایک بارہ چشمے پھوٹ پڑے اور ہر گروہ نے اپنے پانی لینے کی جگہ معلوم کر لی۔

اب تنظیم کا ذکر کرنے کے بعد مزید تین انعامات کا ذکر کرتے ہیں۔ ان میں سے ایک یہ کہ جزیرہ نما سینا کے علاقہ میں ان کے لیے پانی کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام کیا گیا۔ بنی اسرائیل فلسطین سے دور اور مصر سے الگ دونوں کے درمیان معلق جزیرہ نما سینا کے لق و دق بیابان و ریگستان میں اپنے خیموں کے ساتھ کوچ در کوچ ایک مقام سے دوسرے مقام اور ایک منزل سے دوسری منزل کو منتقل ہو رہے ہیں۔ قدیم گلہ بان قوموں میں یہ دستور عام تھا اور آج بھی خانہ بدوش قوموں میں عام ہے۔ خشک ملک اور پھر مقامی جغرافیہ سے ناواقفیت چلتے چلتے ایسی جگہ پہنچے جہاں پانی نایاب تھا اور ساتھ کا ذخیرہ ختم ہو چکا تھا۔ صورتِ حال کا ذرا تصور کیجیے۔ پیاس سے بے حال اور بے دم ہو رہے تھے کہ مرنے مارنے پر بھی آمادہ ہو گئے اور اپنا غصہ حضرت موسیٰ پر نکالنے لگے۔ توراۃ میں ہے: "تب سارے بنی اسرائیل کی جماعت نے اپنے سفروں میں خداوند کے فرمان کے مطابق سین کے بیابان سے کوچ کیا اور رفیدیم میں ڈیرہ لگایا۔ وہاں لوگوں کے پینے کو پانی نہ تھا، سو لوگ حضرت موسیٰ سے جھگڑنے لگے اور کہا کہ ہم کو پانی دے کہ پئیں۔ موسیٰ نے خداوند سے فریاد کر کے کہا کہ میں ان لوگوں سے کیا کروں وہ سب تو مجھے سنگسار کرنے کو تیار ہیں[1] اور قدیم ترین یہودی جوزیفس کی تاریخ "آثار یہود" میں ہے۔" وہ مقام رفیدیم میں پہنچے جہاں پیاس کی شدت سے بے تاب ہو رہے تھے۔ یہاں کی سرزمین میں پانی کا ایک قطرہ نہ پایا اس پر یہ لوگ غصہ میں بھر کر پھر حضرت موسیٰ پر ٹوٹ پڑے۔ لیکن وہ خدا کے آگے دعا میں زاری کے ساتھ مشغول ہو گیا (باب ۳ فصل ۲) جب تلاش کے بعد مایوسی ہو چکی تو بجز دعا اور مناجات کے اور کیا کرتے۔ خود توراۃ ہی میں ایک دوسری جگہ مقام کا نام بجائے رفیدیم کے قدیش درج ہے اور تفصیلات تقریباً وہی ہیں۔ اس بنا پر علماء اہل کتاب میں اس موضوع پر سخت اختلاف ہے کہ جہاں یہ واقعہ پیش آیا وہ جگہ کون سی تھی۔ بہر حال مقام اور جگہ کوئی ہو خود واقعہ میں کوئی اختلاف نہیں بلکہ یہ اسرائیلی تاریخ کے مسلمات میں سے ہے۔ استسقیٰ کے معنی ہیں پانی مانگا، پانی تلاش کیا لیکن مراد یہ ہے پانی کے لیے دعا مانگی اسی پر شارحینِ قرآن کا اتفاق ہے۔

---

[1] خروج ۱۷-۱-۴

اس دعا کے جواب میں حضرت موسیٰ کو اللہ سبحانہ کی جانب سے حکم ہوا اضرب بعصاک الحجر۔
الحجر سے مراد کوئی خاص چٹان ہے۔ امام رازی اور قاضی بیضاوی نے الحجر پر الف لام تعریف کا ہی
سے یہی سمجھا ہے۔ اگر یہ خاص ہے تو کون سی ہے۔ تورات میں ہے کہ یہ چٹان جبل حوریب میں تھی
(خروج ۱۷-۶) حوریب سے مقصود وہ سلسلہ کوہ ہے جو وادی سینا میں واقع ہے۔

خداوند نے موسیٰ سے فرمایا کہ لوگوں کے آگے جا اور بنی اسرائیل کے بزرگوں کو اپنے ساتھ لے اور اپنا عصا جو تو نے دریا پر مارا تھا اپنے ہاتھ میں لے اور جا۔ دیکھ میں وہاں قریب کے چٹان پر تیرے آگے کھڑا ہوں گا تو اس چٹان کو ماریو، اس سے پانی نکلے گا تاکہ لوگ پئیں۔ چنانچہ بنی اسرائیل کے بزرگوں کے سامنے موسیٰ نے یہی کیا۔
(خروج ۱۷-۵-۶)

یہ چٹان اب تک جزیرہ نمائے سینا میں موجود ہے۔ سیاح اسے جا کر دیکھتے ہیں اور چشموں کے شگاف اب بھی اس میں پائے جاتے ہیں۔

آگے ارشاد ہوا ہے فانبجست منہ اثنتا عشرۃ عینا، بارہ چشمے اس سے پھوٹ نکلے یعنی اس پہاڑی چشمے سے بارہ دھاریں الگ الگ جاری ہوگئیں۔ یہ بارہ چشمے بنی اسرائیل کے بارہ قبیلوں کے مطابق تھے۔ تورات میں بارہ کی تصریح نہیں لیکن جارج سیل جو انگریزی میں قرآن کا قدیم مترجم ہے آیت کے حاشیہ پر لکھتا ہے:

ایک مسیحی سیاح جو وہاں ہو آیا ہے بتصریح بیان کرتا ہے کہ جہاں سے بارہ مقامات سے پانی نکلتا تھا۔ اور ایک دوسرے مسیحی سیاح کا مشاہدہ بیان کرتا ہے کہ چٹان میں اس وقت ۲۴ سوراخ موجود ہیں جو بآسانی شمار کیے جا سکتے ہیں۔ ۱۲ ایک طرف اور بارہ ان کے مقابل جانب۔

پادری ڈین اسٹینلی نے جو انیسویں صدی میں مسیحیت کے ایک ممتاز رکن ہوتے ہیں۔ صدی کے وسط میں بائیبل کے مقامات مقدسہ کی جغرافی تحقیق کے لیے بنفس نفیس فلسطین اور اس کے ملحقات کا سفر کیا اور اپنے مشاہدات و تحقیقات پر ایک مستقل تصنیف "سینا اور فلسطین" کے نام سے شائع کی۔ اس میں اس چٹان کا ذکر کر کے لکھتے ہیں۔

یہ چٹان دس اور پندرہ فٹ کے درمیان بلند ہے آگے کی طرف ذرا خمیدہ ہے اور راس سفیفہ کے قریب لجا کی وسیع وادی میں واقع ہے۔ شگاف اور دراڑ جا بجا

پڑے ہوتے ہیں۔ کچھ مٹے ہوتے ہیں، کچھ بڑے ہیں کچھ چھوٹے۔ گنتی میں اگر سب کو لیا جاتے تو بیس ہوتے ہیں۔ اور اگر بعض کو چھوڑ دیا جائے تو دس سب سے پہلے قرآن نے حتمی طور پر بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کے لیے بارہ چشموں کی تعداد بیان کی ہے۔ یہ اشارہ انہیں شگافوں کی طرف ہے [1]

رہائش اور خوراک کا غیبی سامان

۲۰۸ - ہم نے ان پر بادل کا سایہ کیا، اور ان پر من و سلویٰ اتارا اور کہا کھاؤ وہ پاک چیزیں جو ہم نے تم کو دی ہیں مگر اس کے بعد جو کچھ انہوں نے کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے آپ پر وہ ظلم کرتے رہے۔ پہلی آیت میں پینے کا انتظام کیا گیا اس آیت میں خوراک اور رہائش کے دو انعامات کا ذکر ہو رہا ہے۔ ایک یہ کہ دھوپ کی تپش سے بچانے کے لیے آسمان پر بادل تان دیا گیا۔ دوسرے یہ کہ ان کے لیے خوراک کی بہم رسانی کا غیر معمولی انتظام من و سلویٰ نازل فرما کر کیا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ان ضروریاتِ زندگی کا بندوبست نہ کیا جاتا تو یہ قوم جس کی تعداد کئی لاکھ تک پہنچی ہوئی تھی۔ اس علاقہ میں بھوک، پیاس اور تپش سے بالکل ختم ہو جاتی۔ آج بھی کوئی شخص وہاں جاتے تو یہ دیکھ کر حیران رہ جائے گا اگر پندرہ بیس لاکھ آدمیوں کا ایک عظیم الشان قافلہ یکایک آٹھہرے تو اس کے لیے پانی، خوراک اور سائے کا آخر کیا انتظام ہو سکتا ہے۔ موجودہ زمانے میں پورے جزیرہ نما کی آبادی ۵۵ ہزار سے زیادہ نہیں ہے اور آج اس بیسویں صدی میں بھی اگر کوئی سلطنت وہاں ۵-۶ لاکھ فوج لے جانا چاہے تو اس کے مدبروں کو رسد کے انتظام کی فکر میں دردِ سر لاحق ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ موجودہ زمانے کے بہت سے محققین جو نہ کتاب کو مانتے ہیں اور نہ معجزات کو تسلیم کرتے ہیں۔ یہ ماننے سے انکار کر دیا ہے کہ بنی اسرائیل جزیرہ نما سینا کے اس حصہ سے گزرے ہوں گے جس کا ذکر بائیبل اور قرآن میں ہے۔ ان کا گمان ہے کہ شاید یہ واقعات فلسطین کے جنوبی اور عرب کے شمالی حصہ میں پیش آئے ہوں گے۔ جزیرہ نما سینا کے طبعی اور معاشی جغرافیہ کو دیکھتے ہوئے وہ اس بات کو بالکل ناقابلِ تصور سمجھتے ہیں کہ اتنی بڑی قوم یہاں برسوں ایک ایک جگہ پڑاؤ کرتی ہوئی گزر سکی تھی خصوصاً جب کہ مصر کی جانب سے اس کی رسد کا بھی راستہ

[1] تفسیر ماجدی

منقطع ہو گیا تھا اور دوسری طرف خود اس جزیرہ نما کے مشرق اور شمال میں عمالقہ کے قبیلے اس کی مزاحمت پر آمادہ تھے۔ ان امور کو پیش نظر رکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان چند مختصر آیتوں میں اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل پر اپنے جن احسانات کا ذکر کیا ہے وہ درحقیقت کتنے بڑے احسانات تھے اور اس کے بعد یہ کتنی بڑی احسان فراموشی تھی کہ اللہ کے فضل و کرم کی ایسی صریح نشانیاں دیکھ لینے پر یہ قوم مسلسل ان نافرمانیوں اور غداریوں کی مرتکب ہوتی رہی جن سے اس کی تاریخ بھری پڑی ہے بلکہ

اصل ارشاد میں من و سلویٰ کے اتارنے کا ذکر ہے۔ اتارنے سے لازمی طور پر یہ مراد نہیں ہوتی کہ وہ چیز کسی غیر طبعی معجزانہ طریق پر اتاری گئی ہو۔ پانی لوہا کھانے کا سامان وغیرہ جو اپنے معمول اور طبعی طریقوں پر انسان کے کام کے لیے پیدا ہوتے رہے ہیں ان سب کے لیے قرآن کی زبان میں اتارنے ہی کا لفظ آیا ہے۔ من اہل لغت کی تحقیق میں ایک میٹھی میٹھی رطوبت تھی جو درختوں پر گرا کرتی تھی۔ عربی میں اسم جنس ہے اس کے معنے متعدد ہیں میٹھا گوند، شہد، شربت وغیرہ لیکن اکثر کا خیال ہے کہ یہ ترنجبین کے مرادف ہے اور ترنجبین کے متعلق قدیم کتب طب میں درج ہے کہ شہد کی طرح جمی ہوئی اور لذیذ آسمان سے گرنے والی شبنم کی قسم کی چیز ہے۔ بہرحال اتنا یقینی ہے کہ کوئی قدرتی غذا تھی جو بنی اسرائیل کو مسلسل مسافرت کے زمانے میں بلا مشقت و تعب مل جاتی تھی۔ تورات کی تصریحات اس موضوع پر حسب ذیل ہیں :

صبح کو لشکر کے پاس اوس پڑی۔ اور جب اوس پڑ چکی تو کیا دیکھتے ہیں کہ بیابان میں ایک ایک چھوٹی چھوٹی گول چیز ایسی سفید جیسے برف کا چھوٹا ٹکڑا زمین پر پڑی ہے اور بنی اسرائیل نے آپس میں دیکھ کر کہا کہ من ہے کیونکہ انہوں نے نہ جانا کہ وہ کیا ہے۔ تب موسیٰ نے انہیں کہا کہ یہ روٹی ہے جو خداوند نے تمہیں کھانے کو دی ہے[2]

اسرائیل کے گھرانے نے اس کا نام من رکھا اور وہ دھنیے کے بیج کی طرح سپید تھی اور مزہ اس کا شہد میں ملی ہوئی پھلوری کا تھا[3]

اور من سوکھے دھنیے کے مانند تھا اور اس کا رنگ موتی کے دانے کے مانند تھا۔ لوگ ادھر ادھر جا کر اسے جمع کرتے اور چکی میں پیستے تھے اور ہاونوں پر

---

[1] تفہیم القرآن [2] [3] خروج ج ۱۶-۱۴، ۱۵، ۱۶-۳۱-

پکاتے تھے اور پھلکیاں بناتے تھے اس کا مزہ تیل کا سا تھا اور رات کو جب خیموں پر اوس پڑتی تو من بھی ان پر پڑتا تھا۔[1]

سلویٰ ایک قسم کا بٹیر ہے۔ بٹیر جزیرہ نما سینا کا خاص جانور ہے۔ بڑی کثرت سے پایا جاتا ہے۔ گرمی میں شمال کی طرف چلا جاتا ہے۔ جاڑے میں جنوب کی طرف پھر آجاتا ہے۔ اڑتا اونچا نہیں بہت نیچا رہتا ہے۔ تھک بہت جلد جاتا ہے اور شکار بڑی آسانی سے ہو جاتا ہے (جیوز انسائیکلو پیڈیا) اس کا شمالی سفر مصر سے فلسطین کی طرف عموماً مارچ میں ہوتا ہے اور جنوبی فلسطین سے مصر کی طرف عموماً نومبر میں۔ یہ اسرائیلی بٹیر وہ تھے جو مارچ اپریل میں رات کے وقت اپنی شمالی پرواز میں ہوتے ہیں۔ بحر قلزم شمال میں جہاں دو حصوں میں تقسیم ہوا ہے وہاں تک یہ اپنی سالانہ اڑان میں آتے ہیں اور وہاں سے جزیرہ نما سینا کا راستہ اختیار کرتے ہیں۔ تھکاوٹی ہوا ان کی بے شمار تعداد بآسانی اسرائیلیوں کے ڈیروں تک لے آتی تھی (ڈکشنری آف دی بائیبل) ان کا گوشت چربی دار ہوتا ہے اور رکھنے سے بہت جلد خراب ہو جاتا ہے۔

واضح رہے کہ ذکر بنی اسرائیل کے اللہ سبحانہ سے معاملات کا ہے اور ان معاملات کو اللہ سبحانہ نے بطور اپنے انعامات اور احسانات کے گنایا ہے۔ ضروری نہیں کہ یہ ساری معاملات اپنے عام طبعی اسباب سے ہٹ کر بصورت معجزات ہی پیش آئے ہوں۔ اصل مقصود یہاں احسانات اور انعامات خداوندی کو یاد دلانا ہے چاہے وہ عام حالات میں ہوں یا بطور خرق عادت۔ شارحین قرآن نے عموماً ابر کی سایہ افگنی، من و سلویٰ کے نزول اور چٹان سے چشمہ کی روانی سب کو معجزات میں شمار کیا ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کلوا من طیبات ما رزقناکم جو کچھ ہم نے دیا ہے اسے کام میں لاؤ۔ یعنی ان چیزوں کا ذخیرہ نہ کرو، روز کا روز خرچ کرتے رہو۔ بنی اسرائیل کو حکم یہ ملا تھا کہ بلا ضرورت ان غذاؤں کا ذخیرہ نہ کرنا۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ یہود میں ذخیرہ اندوزی کی تاریخ بہت قدیم ہے۔ انہوں نے اس حکم خداوندی کی خلاف ورزی کی۔ چنانچہ ارشاد ہے وما ظلمونا ولکن کانوا انفسھم یظلمون انہوں نے جو کچھ کیا تو ہم پر ظلم نہیں کیا بلکہ اپنے آپ پر ہی ظلم کرتے تھے۔ اس سے حضرت مولانا اشرف علی نے یہ بات بڑی معنی خیز معلوم کی ہے کہ باوجود معاصی کے انعامات کی بارش استدراج ہے اور اس میں جاہل صوفیوں کو سخت دھوکا ہوا ہے چنانچہ وہ کثرت مال و جاہ کو مقبولیت کی علامت

---

[1] گنتی ۱۱ـ ۸، ۱۱۔

سمجھتے ہیں۔ حرص میں مبتلا، توکل سے ناآشنا اور نافرمانی کے خوگر بنی اسرائیل سے اتنے معمولی حکم کی بھی تعمیل نہ ہوئی۔ وہ ان غذاؤں کا ذخیرہ فراہم کرنے میں لگ گئے اور لطیف غذائیں باسی ہو کر سڑنے لگیں۔ تورات میں ہے۔ اور باوجودیکہ موسیٰ نے کہا کہ کوئی اس میں سے صبح تک باقی نہ چھوڑے۔ وہ اس کے سننے والے نہ ہوتے اور بعضوں نے صبح تک کچھ رہنے دیا۔ اس میں کیڑے پڑ گئے اور سڑ گیا۔ (خروج)

بنی اسرائیل کا شہر میں فاتحانہ داخلہ

۲۰۹۔ اور اس وقت کو یاد کرو جب اُن سے کہا گیا تھا کہ اس بستی میں جاکر بس جاؤ اور اس کی پیداوار سے اپنی حسبِ منشا روزی حاصل کرو اور تمہاری زبانوں پر حطہ کلمہ جاری ہو اور شہر کے دروازے میں سجدہ ریز ہو کر داخل ہو جاؤ، ہم تمہاری خطائیں معاف کر دیں گے اور نیکوکاری کرنے والوں کو ہم زیادہ نوازیں گے۔ ظاہر ہے کہ یہ بات بنی اسرائیل سے براہِ راست نہیں کہی گئی تھی بلکہ پیغمبر کے واسطہ سے کہی گئی تھی۔ یہ واقعہ اگر حضرت موسیٰ کے زمانہ کا ہے تو وہی مراد ہیں اور اگر اُن کے بعد کا ہے تو ان کے جانشین حضرت یوشع علیہ السلام مراد ہیں۔ یہ واقعہ تاریخ اسرائیل کا ایک مسلم واقعہ ہے زمانہ تاریخی اس کا کچھ بھی ہو۔ یہ بستی کون سی تھی؟ ممکن ہے کہ فلسطین کا مشہور شہر اریحا ہو۔ یہ بحرِ مردار کے شمالی ساحل سے پانچ میل کے فاصلہ پر واقع ہے۔ اسے اسرائیلیوں نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے بعد حضرت یوشع علیہ السلام کے حکم سے فتح کیا تھا۔ ہمارے قدیم شارحینِ قرآن بیت المقدس کے بعد زیادہ تر اسی کی طرف میلان رکھتے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی متعدد شہروں اور مقامات کے نام لیے گئے ہیں۔ بعض شہروں کے نام تک اب بدل گئے ہیں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مراد شہر سطیم ہو۔ یہ علاقہ موآب میں واقع ہے جو بحرِ مردار کے مشرق میں   شہر دریائے یردن کے بائیں کنارہ پر واقع ہے بنی اسرائیل کی دشت پیمائی کے زمانہ میں یہ شہر ان کا سرحدی مقام تھا۔ بعض مفسرین نے جو دردوں کا نام لیا ہے اس سے یہی مراد معلوم ہوتا ہے۔

یہ واقعہ البقرہ میں بھی گزر چکا ہے مگر دونوں جگہ کچھ فرق ہے مثلاً البقرہ میں واقعہ کا آغاز واذقلنا سے ہوا ہے اور یہاں واذا قیل سے ہے۔ سورہ بقرہ سلسلۂ کلام کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں اس لیے واقعہ میں اُن کو ہی مخاطب بنایا ہے اور یہاں اصل خطاب بنی اسرائیل سے نہیں بلکہ اہلِ مکہ سے ہے اس لیے واقعہ کو بجائے خطاب کے صیغۂ غائب سے پیش کیا اور قیل کے بعد لہم کا اضافہ کیا۔ یہاں اسکنوا ھذہ القریہ فرمایا اور سورہ بقرہ میں ادخلو فرمایا۔ لفظ سکون یہاں دخول سے زیادہ

بلیغ ہے کیونکہ سکونت کے لیے دخول لازم ہے لیکن دخول کے لیے سکونت لازم نہیں ہے۔

یہاں فرمایا و کلوا منها حیث شئتم اور سورہ بقرہ میں فکلوا منها حیث شئتم رغدا۔ سورہ بقرہ میں فاء لے کر آتے ہیں کیونکہ مکان میں داخل ہونے کے بعد سب سے پہلے کھانے سے تواضع ہوتی ہے برخلاف سکونت کے کہ وہ ایک طویل عمل ہے۔ کھانا سکونت کے دوران ہوتا ہے سکونت کے بعد نہیں ہوتا۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ شہر خوب وسیع اور بارونق تھا۔

یہاں فرمایا و قولوا حطة وادخلوا الباب سجدا" یعنی بطور عجز و نیاز و عبودیت کے کہ یہی شان مخلص اہل ایمان کی ہے۔ الباب سے مراد شہر کا پھاٹک ہے۔ قدیم شہروں کے ارد گرد ایک بلند چہار دیواری شہر پناہ کے نام سے مشہور ہوتی تھی۔ شہر میں داخل ہوتے وقت اسی شہر پناہ کے پھاٹک سے گزر کر جانا ہوتا تھا۔ سجداً یہاں اپنے لغوی معنے میں ہے یعنی عاجزی سے فروتنی کے ساتھ۔ تورات اس اہم خبر سے خالی ہے اور حطۃ کہتے ہوتے یہ کلمہ استغفار ہے یعنی خدایا گناہوں سے پاک کر دے۔ گویا زبان بھی قلب و اعضا کی طرح اظہار تذلل کرتی رہے۔ سورہ بقرہ میں پہلے سجدے اور پھر استغفار کا ذکر ہے اور یہاں پہلے استغفار اور پھر سجدے کا ذکر ہے۔ تعبیر کا یہ اختلاف یہ بتانے کے لیے ہے کہ دونوں مطلوب ضرور ہیں مگر ترتیب مطلوب نہیں پہلے سرنگوں ہو جائے اور پھر زبان سے حطۃ کہے یا پہلے حطۃ کہے اور پھر سرنگوں ہو جائے دونوں درست ہیں۔

یہاں ارشاد ہوا ہے سنزید المحسنین اور البقرہ میں واؤ کا اضافہ ہے یعنی ان لوگوں کو جو نیکوکاری میں اخلاص کامل سے لگے ہوتے ہیں۔ عفو و مغفرت کا وعدہ تو سب ہی توبہ کرنے والوں سے ہے اس کے بعد ان کو مزید فضل و انعام سے نوازا جائے گا۔ یہاں واو ہٹا کر اشارہ فرما دیا کہ یہ زیادت محض اللہ کی جانب سے فضل و انعام ہے یہ خضوع و سجود اور توبہ کے نتیجے میں مغفرت کا حصہ نہیں ہے۔ اس طرح سنزید المحسنین کا فقرہ یہاں بطور استیناف بیانی آیا ہے یعنی ایک اٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے گویا دریافت کرنے والے نے دریافت کیا کہ مغفرت کے بعد کیا ہوگا۔ فرمایا کہ ہم ان کو مزید نوازیں گے۔

بنی اسرائیل کی مجرمانہ بیباکی

۱۰ ۲ - لیکن ان میں جو لوگ ظلم پیشہ تھے انہوں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی ایسی بات سے بدل ڈالا جو ان سے نہیں کہی گئی تھی۔ پس نتیجہ یہ ہوا کہ ہم نے ان کے ظلم کی پاداش میں آسمان سے

ان پر عذاب بھیج دیا۔ حکم یہ تھا کہ جابر و ظالم فاتحوں کی طرح اکڑتے ہوئے شہر میں داخل نہ ہونا بلکہ خدا ترسوں کی طرح منکسرانہ شان سے داخل ہونا جیسے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے موقع پر داخل ہوئے تھے لیکن جو کچھ ان سے کہا گیا تھا اس کے خلاف کیا۔ یعنی دعا کے لیے جو لفظ ان کو تلقین کیا گیا تھا اس کو انہوں نے بالکل مختلف مفہوم رکھنے والے لفظ سے بدل دیا۔ بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ یہاں مراد الفاظ کی تبدیلی نہیں ہے بلکہ رویہ کی تبدیلی ہے۔ قدیم شارحین قرآن میں سے ابو مسلم اصفہانی کا یہی خیال ہے لیکن قرآن کے الفاظ سے اس خیال کی تائید نہیں ہوتی۔ بدل کا لفظ جب اپنے دو مفعولوں کے ساتھ آتا ہے تو اس کے معنے یہی ہوتے ہیں کہ ایک چیز کی جگہ دوسری چیز رکھ دی۔ پھر جب واضح میں یہاں یہ بات کہی گئی ہے کہ ظالموں نے اس بات کو جو ان سے کہی گئی تھی ایک ایسی بات سے بدل دیا جو ان سے نہیں کہی گئی تھی اس لیے اس سے صرف رویہ اور عمل کی تبدیلی مراد لینا الفاظ قرآن سے صریح انحراف ہے۔ قرآن کے الفاظ بتاتے ہیں کہ بنی اسرائیل کے کچھ بدبختوں نے حطۃ کے لفظ کو اس سے بالکل مختلف معنے رکھنے والے لفظ سے بدل دیا تھا۔ رہا یہ سوال کہ انہوں نے کس لفظ سے اس کو بدلا تھا تو قرآن میں اس کی کوئی صراحت نہیں ہے البتہ شارحین نے ان کی کچھ نشاندہی کی ہے۔ اگرچہ ان کی آراء مختلف ہیں مگر ماحصل سب کا ایک ہے کہ بجائے توبہ و انابت کے انہوں نے تمسخر و استہزاء شروع کر دیا۔ اور جیسا کہ حضرت ابوہریرہ نے مرفوعاً، موقوفاً انکشاف فرمایا ہے کہ بجائے حطۃ کے حنطۃ کہنے لگے۔ ابوحیان اندلسی رقمطراز ہیں کہ:

انہوں نے توبہ و استغفار پر لفظوں کے پیمانے سے ہٹ کر تمسخر و استہزاء پر مشتمل پیمانہ اپنا لیا۔

بتانا یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے مذکورہ بالا احسانات کا جواب یہ لوگ کیسی کیسی مجرمانہ بے باکیوں سے دے رہے تھے۔

اس مجرمانہ بیباکی کا نتیجہ یہ ہوا کہ فارسلنا علیھم رجزاً من السماء بما کانوا یظلمون۔ ان کی ظلم کاریوں کی پاداش میں ہم نے ان پر آسمان سے رجز روانہ کیا۔ رجز اور رجس دونوں ایک ہی لفظ کی دو شکلیں ہیں۔ ان کا اصل مفہوم اضطراب ارتعاش ہے۔ یہیں سے یہ گندگی اور نجاست کے لیے استعمال ہوتے کیونکہ گندگی اور نجاست کو دیکھ کر طبیعت میں ایک قسم کا اضطراب اور بے چینی پیدا ہو جاتی ہے۔ پھر یہ عذاب کے لیے استعمال ہوتے کیونکہ عذاب بھی دلوں میں ایک اضطراب اور کپکپی پیدا کر دیتا ہے۔ اول لفظ کی تنوین ہی عذاب کی شدت و ہیبت کے اظہار کے

یسے کافی تھی اور پھر اس پر من السماء کا اضافہ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے کہ اس حادثہ کی نوعیت عام حوادث کی سے بالکل مختلف نوعیت کی تھی۔ اس میں قدرت کی غضبناکی کا پہلو بہت نمایاں تھا۔

رہا یہ سوال کہ یہ عذاب کیا تھا۔ اکثر ہمارے شارحین قرآن نے طاعون کی روایات نقل کی ہیں۔ تاریخ بنی اسرائیل میں آتا ہے کہ طاعون اس قوم پر بار بار آیا۔ تورات میں اس کا ذکر بار بار آیا ہے۔ اس آیت میں اگر بستی سے مراد یروشلیم لیا جائے تو تورات میں اس کے طاعون کا مفصل ذکر موجود ہے۔

سو اسرائیل شطیم میں مقیم ہوتے اور ان لوگوں نے موابیوں کی بیٹیوں سے حرامکاری شروع کی۔ انہوں نے اپنے معبودوں کی قربانیوں پر لوگوں کی دعوت کی۔ لوگوں نے کھایا اور ان کے معبودوں کو سجدہ کیا اور اسرائیل بعل فغور سے ملے۔ تب خداوند کا قہر بنی اسرائیل پر بھڑکا۔ (گنتی ۲۵ - ۲ - ۴)

اور یہ بھی لکھا ہے کہ:

وہ جو اس وبا میں مرے چوبیس ہزار تھے (گنتی ۲۵ - ۹)

کتاب گنتی کے باب ۳۳ میں یہ بات بھی بیان ہوئی ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مواب کے میدانوں میں بنی اسرائیل کو ہدایت کی تھی کہ جب تم یردن کو عبور کر کے ملک کنعان میں داخل ہو تو یہاں کے سب مشرکوں کو نکال دینا۔ ان کے شبیہ دار پتھروں اور ان کے ڈھالے ہوئے بتوں کو توڑ ڈالنا اور ان کے اونچے مقامات کو مسمار کر دینا۔ اگر تم نے اس کی خلاف ورزی کی تو یاد رکھو جیسا میں نے تمہیں ان کے ساتھ کرنے کے لیے کہا ہے ویسا ہی میں تمہارے ساتھ کروں گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل نے اپنی عادت کے مطابق پیغمبر کے اس حکم کی بھی خلاف ورزی کی جس کی پاداش میں ان پر اسی قسم کی کوئی وبا آئی جس قسم کی وبا ان پر شطیم میں آئی تھی۔

یہاں بھی تعبیر میں فرق ہے۔ البقرہ میں ہے فانزلنا علی الذین ظلموا رجزاً من السماء بما کانوا یفسقون۔ اور یہاں فارسلنا علیھم رجزاً من السماء بما کانوا یظلمون۔ سورہ بقرہ میں چونکہ یہ بتانا مقصود تھا کہ ان کے اللہ سے اور اللہ کے بندوں سے تعلقات ہیں فساد آ چکا تھا اس لیے ظلم اور فسق دو لفظ لے کر آتے اور یہاں اس کا اجمالی نقشہ پیش کر دیا۔

اصل مقصد یہ بتانا ہے کہ اللہ تعالیٰ دنیا میں بھی امتوں کو گناہوں کی پاداش میں عذاب میں گرفتار کرتا ہے جیسا کہ آخرت میں نافرمانیوں کی پاداش میں عذاب دے گا اس لیے ہمیں حتی الوسع

اپنی زندگی کے مختلف گوشوں میں ظلم اور فسق سے بچ کر رہنا چاہیے۔ کسی اُمت کے فضائل اور فرمایا، گناہوں کے نتائج کو ٹال نہیں سکتے۔ زہر تو زہر ہے خواہ اس کے کھانے والا کوئی ہو۔ بنی اسرائیل اولادِ انبیاء ہونے کے باوجود اس دُنیا میں ہی پکڑے گئے۔

وَسْـَٔلْهُمْ عَنِ الْقَرْيَةِ الَّتِىْ كَانَتْ حَاضِرَةَ الْبَحْرِ ۘ اِذْ يَعْدُوْنَ
فِى السَّبْتِ اِذْ تَاْتِيْهِمْ حِيْتَانُهُمْ يَوْمَ سَبْتِهِمْ شُرَّعًا وَّيَوْمَ لَا
يَسْبِتُوْنَ ۙ لَا تَاْتِيْهِمْ ۚۛ كَذٰلِكَ ۚۛ نَبْلُوْهُمْ بِمَا كَانُوْا يَفْسُقُوْنَ ﴿١٦٣﴾
وَاِذْ قَالَتْ اُمَّةٌ مِّنْهُمْ لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۙ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ
مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ قَالُوْا مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ وَلَعَلَّهُمْ
يَتَّقُوْنَ ﴿١٦٤﴾ فَلَمَّا نَسُوْا مَا ذُكِّرُوْا بِهٖۤ اَنْجَيْنَا الَّذِيْنَ يَنْهَوْنَ
عَنِ السُّوْٓءِ وَاَخَذْنَا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا بِعَذَابٍۭ بَـِٔيْسٍۭ بِمَا كَانُوْا
يَفْسُقُوْنَ ﴿١٦٥﴾ فَلَمَّا عَتَوْا عَنْ مَّا نُهُوْا عَنْهُ قُلْنَا لَهُمْ كُوْنُوْا
قِرَدَةً خٰسِـِٕيْنَ ﴿١٦٦﴾

اور اے پیغمبر بنی اسرائیل سے اس شہر کے بارے میں پوچھو جو سمندر کے کنارے واقع تھا[٢١١]، اور جہاں سبت کے دن لوگ خدا کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر ہو جاتے تھے، سبت کے دن ان کی

مسطور یہ مچھلیاں پانی پر تیرتی ہوئی ان کے پاس آجاتیں مگر جس دن سبت نہ مناتے نہ آتیں۔ اس طرح ہم انہیں آزمائش میں ڈالتے تھے، بہ سبب اس نافرمانی کے جو وہ کرتے تھے [۲۱۲]۔ اور جب اس شہر کے باشندوں میں سے ایک طبقہ نے کہا تم ایسے لوگوں کو نصیحت کیوں کرتے ہو جنہیں یا تو خدا ہلاک کر دے گا یا نہایت سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا [۲۱۳]۔ انہوں نے کہا اس لیے کرتے ہیں تاکہ تمہارے پروردگار کے حضور معذرت کر سکیں اور اس لیے بھی کہ شاید لوگ باز آجائیں [۲۱۴]۔ پھر جب ایسا ہوا کہ ان لوگوں نے وہ تمام نصیحتیں بھلا دیں جو انہیں کی گئی تھیں تو ہمارا مواخذہ نمودار ہو گیا۔ ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے مگر شرارت کرنے والوں کو ایک ایسے عذاب میں ڈالا کہ محرومی اور نامرادی میں مبتلا کرنے والا عذاب تھا، بہ سبب ان نافرمانیوں کے

جو وہ کیا کرتے تھے[215] - پھر جب وہ اس بات میں حد سے زیادہ سرکش ہو گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا تو ہم نے کہا بندر ہو جاؤ ذلت و خواری سے ٹھکرائے ہوئے۔[216]

معانی مفردات

حاضرۃ البحر :- لب دریا، سمندر کے کنارے، حاضرہ حضور سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث ہے۔ یعدون :- مضارع معروف کا جمع مذکر غائب ہے مصدر عدو اور عدوان ہے اس کے معنے حد سے گزر جانے کے ہیں، اسی سے صفت کا صیغہ فعول کے وزن پر عدو ہے۔ شرعاً :- پانی کے اوپر ظاہر ہونے والے شارع کی جمع جو شرع سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مذکر ہے۔ شرع کے معنی ظاہر ہونے اور پانی کے اندر بھی آتے ہیں۔ جب یہ لفظ نیزوں کے لیے بولا جاتا ہے تو اس سے مراد سیدھے اٹھائے ہوئے نیزے ہوتے ہیں۔ یہاں یہ لفظ مچھلیوں کے لیے آیا ہے تو اس سے منہ اٹھائے ہوئے مچھلیاں مراد ہیں۔ پلی ہوئی مچھلیوں کے تالاب کے کنارے ان کے ابھرنے کے اوقات میں کھڑے ہو جایئے تو یہ دلکش منظر نظر آئے گا کہ مچھلیاں اپنے سر سطح پر اس طرح ابھارے ہوئے نظر آئیں گی گویا وہ اپنے نیزے سیدھے کیے ہوتے ہیں سمندروں کے کنارے جو شکارگاہیں ہوتی ہیں ان میں یہ منظر اور بھی دلفریب اور طمع انگیز ہوتا ہوگا۔ بئیس :- باس سے بھی ہو سکتا ہے جس کے معنے شدت کے ہیں اور بوس سے بھی جس کے معنے فقر و فاقہ کے ہیں، ہم نے دوسرے معنے کو ترجیح دی ہے کیونکہ آگے چل کر خاسئین کا لفظ آیا ہے اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ عذاب کی نوعیت ایسی تھی کہ ذلیل و خوار کرنے والا تھا۔

خدائی احکام میں حیلہ سازی

بنی اسرائیل کی یہ گمراہی کہ دین کے حکموں پر سچائی کے ساتھ عمل نہیں کرتے تھے۔ اور قانونی

حیلے نکال کر ان کی تعمیل سے بچنا چاہتے تھے ان کو حکم دیا گیا تھا کہ سبت کا مقدس دن تعطیل کا دن ہے۔ اس کو آرام اور عبادت کے لیے مخصوص رکھیں - اس روز کسی قسم کا دنیوی کام حتیٰ کہ کھانے اور پکانے کا کام بھی نہ خود کریں۔ نہ اپنے خادموں سے لیں۔ اس باب میں یہاں تک تاکیدی احکام تھے کہ جو شخص اس مقدس دن کی حرمت توڑے وہ واجب القتل ہے۔ دیکھو توراۃ میں خروج باب ۳۱ آیت ۱۲، ۱۷۔ لیکن جب بنی اسرائیل پر اخلاقی انحطاط کا دور آیا تو وہ علی الاعلان سبت کی بے حرمتی کرنے لگے۔ حتیٰ کہ ان کے شہروں میں کھلے بندوں سبت کے روز تجارت ہونے لگی۔

یہاں جو واقعہ بیان کیا جا رہا ہے وہ کس بستی کا ہے۔ قرآن نے اس بستی کا اس سے زیادہ تعارف نہیں کرایا کہ وہ سمندر کے کنارے تھا۔ محققین کا غالب میلان اس طرف ہے کہ یہ مقام ایلہ، ایلات یا ایلوت تھا۔ جہاں اب بنی اسرائیل کی یہودی ریاست ہے اسی نام کی ایک بندرگاہ بنائی ہے اور جس کے قریب ہی اُردن کی مشہور بندرگاہ عقبہ ہے۔ اس کی جائے وقوع بحرِ قلزم کی اس شاخ کے انتہائی سرے پر ہے جو جزیرہ نما سینا کے مشرقی اور عرب کے مغربی ساحل کے درمیان ایک لمبی خلیج کی صورت میں نظر آتی ہے۔ بنی اسرائیل کے زمانہ عروج میں یہ بڑا اہم تجارتی مرکز تھا۔ حضرت سلیمان نے اپنے بحرِ قلزم کے جنگی، تجارتی بیڑے کا صدر مقام اسی شہر کو بنایا تھا۔ جس واقعہ کی طرف یہاں اشارہ کیا گیا ہے اس کے متعلق یہودیوں کے کتبِ مقدسہ میں کوئی ذکر نہیں ملتا اور ان کی تاریخی روایات بھی اس موضوع پر خاموش ہیں لیکن قرآن عزیز نے جس انداز سے اس واقعہ کو یہاں اور سورہ بقرہ میں پیش کیا ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ زمانۂ نزول قرآن کے یہودی اپنی تاریخ کی ایک مشہور روایت کی حیثیت سے اسے جانتے تھے چنانچہ سورہ بقرہ میں اس واقعہ کا ذکر اس طرح ہوا ہے کہ گویا قرآن کے مخاطب یہودیوں کی جانی بوجھی بات ہے ولقد علمتم الذین اعتدوا منکم فی السبت اور ان کو تم جانتے ہی ہو جنہوں نے تم میں سے سبت کے معاملے میں حدود سے تجاوز کیا۔ ظاہر ہے کہ یہودیوں کو مخاطب کر کے اس انداز میں وہی بات کہی جا سکتی ہے جو نہ صرف یہ کہ ان کے مسلمات میں سے ہو بلکہ جو ان کے درمیان بھرپور شہرت رکھتی ہو ورنہ وہ قرآن کی اس بات کی ضرور تردید کرتے۔

۱۶۳۔ اور اے پیغمبر بنی اسرائیل سے اس شہر کے بارے میں جو سمندر کے کنارے واقع تھا۔ یعنی اپنے زمانہ کے یہود سے بطور تنبیہ و توبیخ اس بستی میں رہنے والے یہود کا قصہ دریافت کیجئے جو داؤد علیہ السلام کے عہد میں پیش آیا۔ اکثر مفسرین نے اس بستی سے شہر ایلہ مراد لیا ہے

جو بحرِ قلزم کے کنارے مدین اور طور کے درمیان واقع ہے وہاں کے لوگ دریا کے قرب کی وجہ سے مچھلی کے شکار کی عادت رکھتے تھے[1] روایات میں آتا ہے کہ حضرت داؤد کے زمانے میں یہود کی ایک بڑی آبادی مقام ایلہ میں تھی۔ یہ ذکر انہیں کا ہے۔ حضرت داؤد کا زمانہ حکومت ۱۰۱۳ قبل مسیح تا ۹۷۳ قبل مسیح ہے۔ مقام ایلہ اگر وہ ہی ہے جس کا ذکر تورات میں ایلات کے نام سے آتا ہے تو یہ فلسطین کے جنوب میں عرب کے عین شمالی قدیم علاقہ ادوم بحرِ قلزم کی مشرقی خلیج میں اب ساحل واقع ہے۔ ایلہ کے یہودی اپنے قانون کی مسلسل خلاف ورزی کرتے مچھلی کا شکار کرتے اور ایک خاص چالاکی کے ساتھ اسے ظاہری صورتِ جواز دے کر کرتے۔

سبت کی عظمت کے خلاف

۲۱۲۔ اور جہاں سبت کے دن لوگ خدا کی ٹھہرائی ہوئی حد سے باہر ہو جاتے تھے، سبت کے دن ان کی مطلوبہ مچھلیاں پانی پر تیرتی ہوئی اُن کے پاس آتیں مگر جس دن سبت نہ مناتے نہ آتیں، اس طرح ہم انہیں آزمائش میں ڈالتے تھے بہ سبب اس نافرمانی کے جو وہ کرتے تھے۔ سبت اس کے معنے کام کاج سے قطع تعلق، ہفتہ کی تعظیم کرنا، سینچر کا دن یوم سبتہ اوّل معنے کے اعتبار سے لفظ سبت مصدر ہے اور دوسرے معنے کے اعتبار سے اسم جس کی جمع اسبت اور سبوت آتی ہے۔ علامہ زمخشری نے پہلے معنی اختیار کیے ہیں اور علامہ ابوحیان اندلسی نے دوسرے چنانچہ زمخشری کشاف میں لکھتے ہیں:۔

سبت مصدر ہے سبتت الیھود کے معنے ہیں یہود نے شنبہ کے دن کی تعظیم کی۔

اور ابوحیان البحر المحیط میں رقمطراز ہیں:۔

السبت یوم معلوم روز شنبہ کا نام ہے اور یہ سبت سے ماخوذ ہے جس کے معنے قطع کرنے کے ہیں یا سبات سے ہے جس کے معنی آسائش وراحت کے ہیں۔ اور ابوالفرج بن الجوزی نے کہا ہے کہ یہ خطا ہے کلام عرب میں سبت بمعنے استراح مشہور ہیں۔ ابن جریج کا بیان ہے کہ یوم السبت اس لیے نام پڑا کہ وہ وقت کا ایک ٹکڑا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علامہ مرتضٰی زبیدی تاج العروس شرح القاموس میں فرماتے ہیں :-

السبت ہفتہ کا ایک مشہور دن ہے اور وہ ہفتہ کا ساتواں دن ہے اور اس کا سبت اس لیے نام پڑا کہ اللہ تعالیٰ نے اس روز پیدائش کی ابتداء فرمائی اور زمین کے ایک حصہ کو اسی دن میں قطع یعنی تمام کیا۔ اور محکم میں ہے کہ سبت اس لیے نام رکھا گیا ہے کہ پیدائش کی ابتداء اتوار کے روز سے ہوئی جمعہ کے روز تک جاری رہی اور شنبہ کو کسی چیز کی پیدائش عمل میں نہیں آئی۔ اہل لغت نے کہا ہے لہٰذا یوم السبت مسبتہ ہوا یعنی تمام شدہ بایں طور کہ اس دن میں عمل منقطع ہو گیا۔

علامہ موصوف نے سبت کی وجہ تسمیہ کے سلسلے میں تین توجیہیں ذکر فرمائی ہیں جن میں پہلی توجیہ یقیناً پوچ ہے کیونکہ اولاً تو اس میں اختلاف ہے کہ ہفتہ کے دن کسی چیز کی پیدائش عمل میں بھی آئی یا نہیں اور بتقدیر صحت ہفتہ کو ہی سبت سے موسوم کرنا کیا معنے جبکہ بقیہ چھ دنوں میں سے ہر ایک دن میں کسی نہ کسی چیز کی تخلیق تکمیل کو پہنچی ہے۔ البتہ دوسری توجیہ قابل قبول ہے۔ لیکن اصل میں سبت کی وجہ وہی ہے جو علامہ موصوف نے امام اللغت ابن سیدہ کی کتاب المحکم سے نقل کی ہے۔ ائمہ لغت کی تصریحات اسی کی تائید میں ہیں۔ ابو عبید کہتے ہیں :-

سبت اس لیے نام رکھا گیا کہ اس میں ہر شئے کی پیدائش کا کام قطع ہو گیا۔

امام راغب مفردات میں لکھتے ہیں :

حق تعالیٰ نے زمین و آسمان کی پیدائش کی ابتداء یوم الاحد یعنی یک شنبہ کے دن سے فرمائی اور جیسا کہ ارشاد ہے چھ دن میں ان کو خلق فرما کر ہفتہ کو اپنا کام ختم فرما دیا۔ لہٰذا اس دن کا نام یوم السبت پڑ گیا۔

امام جوہری صحاح میں لکھتے ہیں :

چونکہ دن اس پر ختم ہو جاتے ہیں اس لیے اس کا نام یوم السبت قرار پایا۔

غرض چونکہ آفرینش عالم کی ابتداء اتوار کے دن سے عمل میں آئی اس لیے وہ عالم کا پہلا دن یعنی یوم الاحد قرار پایا اور ہفتہ کے دن چونکہ پیدائش کا کام منقطع ہو گیا ہے اس لیے انقطاع کے دن یعنی یوم السبت سے موسوم ہوا۔ یہود و نصاریٰ دونوں فرقوں نے اپنی اپنی سمجھ کے مطابق ہفتہ کے ایک دن کو عید قرار دیا۔ یہود نے سنیچر کو پسند کیا اور عیسائیوں نے اتوار کو اور حق تعالیٰ نے مسلمانوں کے لیے جمعہ کو مقرر فرمایا۔ صحیحین میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ

کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہم پچھلے ہیں قیامت کے اگلے۔ بس کتاب ان یہود و نصاریٰ کو پہلے مل گئی اور یہ یعنی جمعہ ان کا دن ہے جو ان پر مقرر کیا گیا تھا تو انہوں نے اختلاف کیا اور اللہ نے ہمیں اس کی ہدایت دی۔ اب لوگ اس میں ہمارے پیچھے ہیں یہودی کل اور عیسائی پرسوں۔ اور صحیح مسلم میں حضرت ابو ہریرہ اور حضرت حذیفہ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جمعہ سے اللہ نے اگلوں کو بے خبر رکھا۔ یہودیوں کے لیے تو سینچر ہوا اور عیسائیوں کے لیے اتوار اور اللہ ہمیں لایا تو ہمیں جمعہ کی دن کی ہدایت فرمائی اور جمعہ، سینچر اور اتوار مقرر ہوتے۔ اور اسی طرح وہ لوگ قیامت کے دن ہمارے پیچھے ہوں گے۔ ہم دنیا والوں میں آخری ہیں اور قیامت کے دن اول کہ خلائق سے پہلے ہمارا فیصلہ ہوگا۔

سینچر، اتوار کے مقابلہ میں جمعہ کی فضیلت

امام رازی تفسیر کبیر میں فرماتے ہیں کہ۔ اگر کوئی کہے کہ جمعہ کا روز ہفتہ کے دن سے افضل کیوں ہے جبکہ تمام مذاہب کا اس پر اتفاق ہے کہ اللہ سبحانہ نے عالم کی تخلیق چھ روز میں فرمائی۔ یکشنبہ سے پیدائش و آفرینش کا آغاز فرمایا اور جمعہ کے روز تکمیل ہوئی۔ ہفتہ کا روز فراغت کا دن ہوا۔ یہود تو ہفتہ کی تقریب کی یہ توجیہ کرتے ہیں کہ ہم ترک اعمال میں اپنے پروردگار کی موافقت کرتے ہیں اور عیسائی یہ کہتے ہیں کہ خلق و تکوین کی ابتدا تو یکشنبہ سے ہوئی ہے اس لیے ہم اس دن کو عید قرار دیتے ہیں۔ یہ دونوں وجہیں معقول ہیں۔ جمعہ کے تقریب ہونے کی عقلی توجیہ کیا ہے جواب یہ ہے کہ جمعہ کا دن کام کے تمام اور کمال کا دن ہے اور تمام و کمال ہی فرح و سرور کا ایک بنیادی اور معقول سبب ہے لہٰذا اس بنا پر جمعہ کے دن کو تقریب قرار دینا تقاضائے عقل کے مطابق ہے اور یہی اولیٰ ہے۔

آفرینش عالم کی ابتداء میں اختلاف

اس میں علماء کا اختلاف ہے کہ آفرینش عالم کی ابتداء کس دن عمل میں آئی۔ بعض شنبہ بتاتے ہیں اور بعض یکشنبہ اور اس کی وجہ اختلاف روایات ہے۔ حافظ ابن کثیر البدایہ والنہایہ میں فرماتے ہیں:۔

ابن جریر نے اول ایام کے بارے میں تین اقوال نقل کیے ہیں اور محمد بن اسحاق

سے ان کا بیان روایت کیا ہے کہ اہل تورات کہتے ہیں کہ اللہ نے تخلیق کا آغاز اتوار سے کیا اور اہل انجیل کہتے ہیں دوشنبہ کو اللہ نے تخلیق شروع کی اور ہم مسلمان جیسا کہ ہم کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا ہے یوں کہتے ہیں کہ اللہ نے شنبہ کو تخلیق کا آغاز فرمایا۔ اور یہ قول جس کی ابن اسحاق نے مسلمانوں کی طرف نسبت کی ہے فقہائے شافعیہ کی ایک جماعت کا بھی مسلک ہے اور اس موضوع پر ابوہریرہ کی حدیث خلق الله التربة يوم السبت آنے والی ہے اور یک شنبہ کے قول کو ابن جریر نے بروایت سدی ابو مالک اور بروایت ابی صالح ابن عباس اور بروایت مرہ ابن مسعود اور صحابہ کی ایک جماعت نیز عبداللہ بن سلام سے بھی روایت کیا ہے اور اسی کو ابن جریر نے اختیار کیا ہے اور یہی تورات کی تصریح ہے اور اسی کی طرف فقہاء کا دوسرا گروہ مائل ہے اور یہی لفظ احد سے زیادہ مشابہ ہے اور اسی بنا پر چھ دن میں پیدائش کی تکمیل ہوئی اور جمعہ ان کا آخری دن ہوا اور مسلمانوں نے ہفتہ میں اسے اپنے لیے عید کا دن مقرر فرمایا۔[1]

حدیث مذکور جس کی طرف حافظ ابن کثیر نے اشارہ کیا ہے۔ مسند احمد، صحیح مسلم اور نسائی میں حضرت ابوہریرہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میرا ہاتھ پکڑ کر فرمایا کہ اللہ نے مٹی کو شنبہ کے دن پیدا فرمایا اور پہاڑوں کو یک شنبہ کے دن اور درختوں کو دوشنبہ کے دن اور مکروہ کو سہ شنبہ کے دن اور نور کو چہار شنبہ کے دن پیدا فرمایا اور پنجشنبہ کے دن جانوروں کو منتشر فرمایا اور روز جمعہ بعد نماز عصر حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا جو آخری مخلوق ہیں ۔ اور جمعہ کی آخری ساعت میں عصر سے لے کر رات کے درمیان ان کی تخلیق عمل میں آئی۔ یہ روایت ان تینوں کتابوں میں بروایت ابن جریج باین اسناد مروی ہیں۔

ابن جريج اخبرني اسماعيل ابن اميه عن ايوب بن خالد عن عبدالله بن رافع مولى ام سلمة

نیز امام نسائی نے تفسیر میں بروایت ابن جریج عن عطاء ابن ابی رباح عن ابی ہریرہ روایت کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر اس روایت کے متعلق لکھتے ہیں :

ابن جریج کی اس حدیث میں اختلاف ہے۔ علی ابن المدینی، بخاری اور بیہقی

---

[1] البدایہ والنہایہ ۱۵

وغیرہ حفاظ نے اس حدیث میں کلام کیا ہے۔ بخاری نے تاریخ میں کہا ہے کہ بعض نے اس کو کعب سے بیان کیا ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ یعنی یہ حدیث ان روایتوں میں سے ہے جن کو ابوہریرہ نے کعب سے سُنا اور ان سے لیا ہے کیونکہ وہ دونوں حدیث کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے اور اُٹھتے بیٹھتے تھے۔ یہ تو انہیں اپنے صحیفوں سے بتاتے اور وہ انہیں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ ارشادات سناتے جو اس کی تصدیق میں ہوتے۔ لہٰذا یہ حدیث وہ ہے جس کو حضرت ابوہریرہ نے کعب سے اسے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک مرفوع کر دیا اور یہ کہہ کر رسُول اللہ نے میرا ہاتھ پکڑا اس کے رفع کی اور تاکید کر دی۔ نیز اس کے متن میں سخت غرابت ہے من جملہ اس کے یہ کہ اس میں آسمانوں کے پیدا کرنے کا ذکر تک نہیں اور زمین اور زمین میں جو کچھ ہے سات روز میں اس کے پیدا ہونے کو بیان کیا ہے اور یہ روایت قرآن مجید کے خلاف ہے کیونکہ زمین چار دن میں پیدا ہوئی ہے پھر دو دن میں آسمانوں کو دھوئیں سے پیدا کیا گیا۔

اور دوسرے قول یعنی یک شنبہ کو آغازِ آفرینش ہونے کے بارے میں وہ حدیث ہے جو مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ یہود نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آکر آسمانوں اور زمین کی پیدائش کے متعلق سوال کیا تو آپ نے فرمایا کہ اللہ نے زمین کو یک شنبہ اور دوشنبہ کے دن پیدا فرمایا اور پہاڑوں نیز ان منافع کو جو پہاڑوں میں ہیں سہ شنبہ کے روز بنایا اور درخت، پانی، شہر، آبادی اور ویرانہ کی چہار شنبہ کے روز تخلیق فرمائی۔ یہ چار روز ہوتے۔ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے:

قل ائنکم لتکفرون بالذی خلق الارض فی یومین وتجعلون لہ انداداً ذالک رب العالمین وجعل فیھا رواسی من فوقھا وبارک فیھا وقدر فیھا اقواتھا فی اربعۃ ایام سواء للسائلین۔

کہہ دو کیا تم منکر ہو اس ذات کے جس نے زمین بنائی دو روز میں اور اس کے برابر کرتے ہو اوروں کو وہ رب ہے جہانوں کا اور رکھے اس میں پہاڑ بھاری اوپر سے اور برکت رکھی اس کے اندر اور ٹھہرائیں اس میں خوراکیں اس کی چار دن میں پورا ہوا پوچھنے والوں کو اور پنجشنبہ کے دن آسمان پیدا کیا اور جمعہ کے ستارے آفتاب و ماہتاب اور فرشتے پیدا کیے روایت طویل ہے۔ حاکم نے اس روایت کے بارے میں لکھا ہے یہ حدیث صحیح الاسناد ہے مگر بخاری و مسلم نے اس کو روایت نہیں کیا اور حاکم کی تصحیح میں اہلِ فن کو کلام ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ اس حدیث

میں غرابت ہے۔ اس حدیث کا ایک راوی ابوسفیان بقال ہے۔ اس کے متعلق حافظ ذہبی تلخیص المستدرک میں ابن معین سے جو فن جرح و تعدیل کے امام ہیں ناقل ہیں کہ اس کی حدیث نہ لکھی جائے۔

غرض افرینشِ عالم کے متعلق دلوں کی ترتیب و تعیین میں کوئی حدیث صحیح موجود نہیں ہے۔

بہرحال سبت ہفتہ کے دن کو کہتے ہیں۔ یہ دن بنی اسرائیل کے لیے مقدس قرار دیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے اسے اپنے اور اولادِ اسرائیل کے درمیان پشت در پشت تک دائمی عہد کا نشان قرار دیتے ہوئے تاکید کی تھی کہ اس روز کوئی دنیوی کام نہ کیا جائے۔ گھروں میں آگ تک نہ جلائی جائے۔ جانوروں اور لونڈی غلام تک سے کام نہ لیا جائے اور یہ کہ جو شخص اس ضابطہ کی خلاف ورزی کرے گا اسے قتل کر دیا جائے لیکن بنی اسرائیل نے آگے چل کر اس قانون کی علانیہ خلاف ورزی کی اور یہ حیلہ نکالا کہ سمندر کے کنارے گڑھے کھود لیتے جب جوار کے بعد پانی اتر جاتا تو گڑھے کے اندر مچھلیاں پکڑ لیتے اور کہتے کہ یہ مچھلیاں خود بخود آگئیں، شکار نہیں کی گئیں۔ یرمیاہ نبی کے زمانہ میں جو ۶۲۸ اور ۵۸۶ قبل مسیح کے درمیان گزرے ہیں خاص یروشلم کے پھاٹکوں سے لوگ سبت کے دن مال واسباب لے کر گزرتے تھے۔ اس پر نبی موصوف نے خدا کی طرف سے یہودیوں کو دھمکی دی کہ اگر تم لوگ شریعت کی اس کھلم کھلا خلاف ورزی سے باز نہ آئے تو یروشلم نذرِ آتش کر دیا جائے گا۔ اسی کی شکایت حزقی ایل بھی کرتے تھے جن کا دور ۵۹۵ ق م ہے۔ چنانچہ ان کی کتاب میں سبت کی بے حرمتی کو یہودیوں کے قومی جرائم میں سے ایک بڑا جرم قرار دیا ہے۔ ان حوالوں سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں کہ یہ واقعہ بھی لازماً اسی زمانے میں ہوا ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہود کی شریعت میں سبت یعنی ہفتہ کے روز کام کاج اور سیر و شکار وغیرہ کی ممانعت تھی لیکن وہ صبر نہ کر سکے۔ انہوں نے سبت کے دن مچھلیوں کے شکار کے لیے مختلف قسم کے حیلے ایجاد کیے۔ سنتِ الٰہی یہ ہے کہ جب کوئی قوم کسی نافرمانی میں اصرار کی حد تک بڑھ جاتی ہے اور اچھوں کے سمجھانے سے باز نہیں آتی تو اس معاملہ میں اس کی آزمائش سخت سے سخت تر ہو جاتی ہے تاکہ وہ اپنا پیمانہ اچھی طرح بھرے چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہی صورتِ حال بنی اسرائیل کے لیے پیدا کر دی۔ عام دنوں میں تو یہ مچھلیاں نظر نہ آئیں یا بہت ہی کم نظر آئیں لیکن سبت کے دن معلوم ہوتا کہ ان کے ہاں بارات اتری ہوئی ہے۔ یہ چیز ان کی آتشِ حرص کو اور بھڑکا دیتی۔ قاعدہ ہے کہ آدمی جس چیز سے روک دیا جاتا ہے اس کی خواہش اور زیادہ ہو جاتی ہے الانسان حریص فیما منع اور حرص وہ بلا ہے کہ اس کے اثر سے بسا اوقات آدمی کی نگاہ بھی بدل جاتی ہے۔ خواہش نہ ہونے کی

حالت میں جو چیز ناشتہ نظر آتی ہے خواہش کے غلبہ میں وہ بھی کیلو نظر آنے لگتی ہے کذالک نبلوھم بما کانوا یفسقون کا مطلب یہی ہے کہ ان کو سخت آزمائش میں اس لیے ڈالا گیا کہ وہ پہلے نافرمانیوں پر اصرار کرتے تھے۔ آزمائشیں حق سبحانہٗ کے یہاں سے تو فرمانبرداروں اور نافرمانوں دونوں کی ہوتی ہیں لیکن جیسا کہ شارحین قرآن نے لکھا ہے کہ اہل طاعت کی آزمائش لطف اور تائید اور توفیق کی خاطر ہوتی ہے۔ آزمائش کا جس کی علت یہاں نافرمانیوں پر اصرار بتایا گیا اس آزمائش سے تقابلی مطالعہ فرمائیے جو اہلِ طاعت کے لیے حالتِ احرام میں خشکی کے شکار کی ممانعت سے ہوتی ہے۔ فرمایا:

یاایھا الذین اٰمنوا لیبلونکم اللہ بشیءٍ من الصید تنالہ ایدیکم ورماحکم لیعلم اللہ من یخافہ بالغیب۔

اے ایمان والو! اللہ تم کو کسی ایسے شکار سے ضرور آزمائے گا جو تمہارے ہاتھوں اور نیزوں کی دسترس میں ہوں تاکہ ان لوگوں کو ممتاز کر دے جو اس سے غیب میں ڈرتے ہیں۔

کیسا مشفقانہ انداز ہے آزمائشیں دونوں ہیں ایک کی علت بما کانوا یفسقون ہے اور ایک کی وجہ لیعلم اللہ من یخافہ بالغیب ہے۔ پہلا اگر حاکمانہ تہدید و توبیخ ہے تو دوسرا قطعاً محبوبانہ انداز ہے جو عشق اور فسق میں فرق ہے وہی دونوں آزمائشوں میں فرق ہے۔

آئیے اس آیت پر مولانا عثمانی کا بھی نوٹ ملاحظہ فرما لیجئے، فرماتے ہیں:

حق تعالیٰ نے یہود پر ہفتہ کے دن شکار کرنا حرام کیا تھا باشندگان ایلہ کو عدول حکمی اور نافرمانی کی عادت تھی۔ خدا کی طرف سے سخت آزمائشیں ہونے لگیں کہ ہفتہ کے دن دریا میں مچھلیوں کی بے حد کثرت ہوتی جو سطح دریا کے اوپر تیرتی تھیں باقی دنوں میں غائب رہتیں۔ ان لوگوں سے صبر نہ ہو سکا۔ صریح حکم الٰہی کے خلاف حیلے کرنے لگے دریا کا پانی کاٹ لاتے۔ جب ہفتہ کے دن مچھلیاں ان کے بناتے ہوئے حوض میں آجاتیں تو نکلنے کا راستہ بند کر دیتے اور اگلے دن اتوار کو جا کر پکڑ لاتے تاکہ ہفتہ کے دن شکار کرنا صادق نہ آئے۔ گویا اس حرکت سے معاذاللہ خدا کو دھوکہ دینا چاہتے تھے آخر دنیا میں اس کی سزا بھگتنی پڑی کہ مسخ کر کے ذلیل بندر بنا دیے گئے۔ اس سے ظاہر ہوا کہ حیلہ سازی اور مکاری خدا کے پیش نہیں جاتی۔ [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آخری حد تک دعوت کا کام ہونا چاہیے

۲۱۳ - اور جب اس شہر کے باشندوں میں سے ایک طبقہ نے کہا تم ایسے لوگوں کو نصیحت کیوں کرتے ہو جن کو یا تو خدا ہلاک کر دے گا یا نہایت سخت عذاب میں مبتلا کر دے گا۔ معلوم ہوتا ہے کہ جب انہوں نے حکم الٰہی کے خلاف حیلہ سازی شروع کی تو شہر کے باشندے کئی قسموں میں منقسم ہو گئے جیسا کہ عموماً ایسے حالات میں ہوا کرتا ہے۔ ایک وہ لوگ جنہوں نے اس حیلہ کی آڑ میں صریح حکم الٰہی کی خلاف ورزی کی۔ دوسرے نصیحت کرنے والے جو اخیر تک فہمائش کرتے رہے، تیسرے جنہوں نے ایک آدھ مرتبہ نصیحت کی پھر مایوس ہو کر اور ان کی سرکشی سے تھک کر چھوڑ دی۔ چوتھے وہ ہوں گے جو نہ اس عمل تشنیع میں شریک ہوتے اور نہ منع کرنے کے لیے زبان کھولی بالکل علیحدہ اور خاموش رہے۔ مؤخر الذکر دو جماعتوں نے ان تھک نصیحت کرنے والوں سے کہا ہو گا کہ ان متمردین کے ساتھ کیوں مغز زنی کر کے اپنا دماغ کھپاتے ہو جن سے کوئی توقع قبول حق کی نہیں۔ ان کی نسبت تو دو باتوں میں سے ضرور ایک بات پیش آنے والی ہے یا خدا ان کو بالکل تباہ کر دے گا اور یا کسی سخت ترین عذاب میں مبتلا کر دے کیونکہ یہ لوگ اب کسی کی نصیحت پر کان دھرنے والے نہیں ہیں [1]

اس سے پتہ چلتا ہے کہ اس بستی کے لوگوں نے شقاوت کی یہ راہ سمجھانے اور سمجھانے کے باوجود اختیار کی۔ یہ بات نہ تھی کہ ان کو کوئی آگاہ کرنے والا نہ تھا۔ اللہ کے ایسے بندے وہاں تھے جنہوں نے ان کو نہ صرف اس جرم سے روکنے کی کوشش کی مگر ان کے اپنے ساتھیوں میں سے ایک جماعت نے اب مزید سمجھانے کو بالکل غیر مفید سمجھا اور یہ کہا کہ ایسے لوگوں کو سمجھانے سے کیا حاصل ہو جو اب یا تو ہلاک ہونے والے ہیں یا کم از کم کسی شدید عذاب کی پکڑ میں آنے والے ہیں۔

فرض دعوت کی غرض و غایت

۲۱۴ - انہوں نے کہا اس لیے کرتے ہیں تاکہ تمہارے پروردگار کے حضور معذرت کر سکیں، اور اس لیے بھی کہ شاید لوگ باز آجائیں۔ یعنی شاید سمجھاتے رہنے سے کچھ ڈر جائیں اور اپنی حرکاتِ شنیعہ سے باز آجائیں ورنہ کم از کم ہم پروردگار کے سامنے عذر تو پیش کر سکتے ہیں کہ خدایا ہم نے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

آخری دم تک نصیحت و فہمائش میں کوتاہی نہیں کی یہ نہ مانے تو اب ہم پر کیا الزام ہے گویا یہ ناصحین اول تو بالکلیہ مایوس نہ تھے دوسرے عزیمت پر عمل کر رہے تھے کہ مایوسی کے باوجود بھی ان کا تعاقب نہیں چھوڑتے تھے [1]

مطلب یہ ہے کہ اللہ کے ان بندوں نے اس نقطہ نظر کو تسلیم نہیں کیا بلکہ ان کو یہ جواب دیا کہ ہمارا سمجھانے کا کام جاری رہنا چاہیے۔ اگر یہ لوگ نہ مانے تو ہم اللہ کے ہاں اپنے فرض سے سبکدوش ہو جائیں گے اور کیا عجب مان ہی جائیں سو اگر مان گئے تو یہی مقصود ہے۔

اس سے اس ذمہ داری کی حد معین ہوتی ہے جو ہر مومن پر دوسروں کو برائی سے روکنے اور بھلائی کی دعوت دینے کی عائد ہوتی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس میں کوئی ایسا مرحلہ نہیں آتا ہے۔ جب داعی یہ فرض کرے کہ اب دعوت کا فرض ادا ہو گیا۔ اس لیے نہ ماننے والوں کو عذاب الٰہی کے لیے چھوڑ دینا چاہیے بلکہ یہ کام زندگی کے آخری لمحے تک کرتے رہنا چاہیے۔ اگرچہ ایک شخص بھی نصیحت کی قدر کرنے والا نہ ہو۔ عنداللہ ایسے ہی لوگ اپنے فرض سے سبکدوش قرار پائیں گے۔ وہ اللہ کے ہاں بری نہ ہوں گے جو خود اگرچہ برائی میں مبتلا نہ ہوں لیکن دوسروں کے خیر و شر سے بالکل بے تعلق ہو کر زندگی گزاریں۔ الغرض گمراہوں کی جانب سے کتنی ہی مایوسی ہو لیکن اہل حق کا فرض ہے کہ موعظت سے باز نہ رہیں کیونکہ اوّل تو یہ ایک فرض ہے اور ادائے فرض میں نتیجہ کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا، ثانیاً، کون کہہ سکتا ہے کہ ہدایت قطعاً مؤثر نہ ہوگی۔ ہو سکتا ہے کسی کے دل میں کوئی بات اتر جائے۔ اسی لیے فرمایا معذرۃ الیٰ ربکم ولعلہم یتقون۔ سبحان اللہ قرآن کی کیا معجزانہ بلاغت ہے۔ پانچ چھ لفظوں میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو اس بارے میں کہا جا سکتا ہے۔

اس سے معلوم ہوا ہے کہ جس بستی میں علانیہ احکام الٰہی کی خلاف ورزی ہو رہی ہو وہ ساری کی ساری آبادی قابل مواخذہ ہوتی ہے اور اس کا کوئی باشندہ محض اس بنا پر مواخذہ سے بری نہیں ہو سکتا کہ اس نے خود خلاف ورزی نہیں کی بلکہ اسے خدا کے سامنے اپنی صفائی پیش کرنے کے لیے لازماً اس کا ثبوت فراہم کرنا ہوگا کہ وہ اپنی حد استطاعت تک اصلاح اور اعلاءِ حق کی کوشش کرتا رہا تھا۔ قرآن و حدیث کے دوسرے ارشادات سے بھی ایسا ہی معلوم ہوتا ہے کہ اجتماعی جرائم کے باب میں اللہ کا قانون یہی ہے چنانچہ قرآن میں دوسری جگہ ارشاد ہے:

[1] افادات شیخ الاسلام

واتقوا فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ

اس آزمائش سے بچ کر رہو جس کے وبال میں خصوصیت کے ساتھ صرف وہی لوگ گرفتار نہ ہوں گے جنہوں نے تم میں سے ظلم کیا ہو۔

اور اس کی تشریح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح فرمائی ہے:

اللہ سبحانہٗ خاص لوگوں کے جرائم پر عام لوگوں کو سزا نہیں دیتا جب تک عامۃ الناس کی حالت یہ نہ ہو جائے کہ وہ اپنی آنکھوں کے سامنے بُرے کام ہوتے دیکھیں اور وہ ان کاموں کے خلاف اظہار ناراضی کرنے پر قادر ہوں اور پھر کوئی اظہار ناراضی نہ کریں۔ پس جب لوگوں کا حال یہ ہو جاتا ہے تو اللہ تعالیٰ خاص وعام سب کو عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے۔

عذاب کی ہمہ گیری سے بچنے والے

۲۱۵ ۔ پھر جب ایسا ہوا کہ ان لوگوں نے وہ تمام نصیحتیں بھلا دیں جو انہیں کی گئی تھیں تو ہمارا مواخذہ نمودار ہو گیا۔ ہم نے ان لوگوں کو بچا لیا جو برائی سے روکتے تھے مگر شرارت کرنے والوں کو ایک ایسے عذاب میں ڈالا کہ محرومی اور نامرادی میں مبتلا کرنے والا عذاب تھا۔ بسبب ان کی نافرمانیوں کے جو وہ کیا کرتے تھے۔ یعنی جب ان نالائقوں نے تمام نصیحتوں کو بالکل ایسا بھلا دیا گویا سنا ہی نہیں ہے تو ہم نے ناصحین کو بچا کر ظالمین کو سخت عذاب میں گرفتار کر دیا الذین ینھون عن السوء کا عموم الفاظ دلالت کرتا ہے کہ جو نصیحت سے تھک کر لم تعظون قوما کہہ رہے تھے اور جنہوں نے آخر تک وعظ ونصیحت کا سلسلہ جاری رکھا ان دونوں کو نجات ملی۔ صرف ظالم پکڑے گئے۔ یہ ہی عکرمہ سے منقول ہے اور حضرت عبداللہ بن عباس نے ان کو قرآن فہمی کی داد دی۔ باقی جو لوگ اول سے آخر تک ساکت رہے۔ خدا نے بھی ان کے ذکر سے سکوت فرمایا۔ ابن کثیر نے خوب لکھا ہے:

فنص علی نجاۃ الناھین وھلاک الظالمین وسکت عن الساکتین لان الجزاء من جنس العمل فھم لا یستحقون مدحاً فیمدحوا ولا ارتکبوا عظیما فیذموا۔

قرآن نے بتایا ہے کہ روکنے والے نجات یافتہ ہیں اور ظالم ہلاکت کا شکار ہیں۔ لیکن قرآن نے خاموش رہنے والوں کے بارے میں خاموشی اختیار کی۔ کیونکہ جزا عمل جیسی ہوتی ہے اس لیے وہ کسی مدح کے مستحق ہیں اور چونکہ انہوں نے کسی جرم کا ارتکاب نہیں کیا

اس لیے قابلِ مذمت نہیں ۔

ابن کثیر نے حضرت عکرمہ کی تشریح کو ترجیح دی ہے[1]

دراصل بستی میں تین قسم کے آدمی تھے ایک وہ جو کھلم کھلا خدائی احکام کی خلاف ورزی کرتے تھے دوسرے وہ جو خود تو خلاف ورزی نہیں کرتے تھے مگر اس خلاف ورزی کو خاموشی کے ساتھ بیٹھے دیکھ رہے تھے اور ناصحوں سے کہہ رہے تھے کہ ان کم بختوں کو نصیحت کرنے سے کیا حاصل ہے ۔ تیسرے وہ جن کی غیرت ایمانی حدود اللہ کی اس کھلم کھلا بے حرمتی کو برداشت نہ کر سکتی تھی ۔ اور وہ اس خیال سے نیکی کا حکم کرنے اور بدی سے روکنے میں سرگرم تھے کہ شاید وہ مجرم لوگ ان کی نصیحت سے راہ راست پر آجائیں ۔ اور اگر وہ راہِ راست اختیار نہ کریں تب بھی ہم اپنی حد تک تو اپنا فرض ادا کر کے خدا کے سامنے اپنی برأت کا ثبوت پیش کر ہی دیں ۔ اس صورتِ حال میں جب اس بستی پر اللہ کا عذاب آیا ۔ تو قرآن کہتا ہے کہ ان تینوں گروہوں میں سے صرف تیسرا گروہ اس سے محفوظ رہا کیونکہ اسی نے خدا کے حضور معذرت پیش کرنے کی فکر کی تھی اور وہی تھا جس نے اپنی برأت کا ثبوت فراہم کیا تھا باقی دونوں گروہوں کا شمار ظالموں میں ہوا اور وہ اپنے جرم کی حد تک مبتلائے عذاب ہوئے ۔

حضرت عکرمہ نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پہلے گروہ کو مبتلائے عذاب ہونے کی اور تیسرے گروہ کے نجات یافتہ ہونے کی تصریح کی ہے لیکن دوسرے گروہ کے بارے میں سکوت اختیار فرمایا ہے لہٰذا اس کے متعلق یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ نجات پانے والوں میں سے تھا یا مبتلائے عذاب ہونے والوں میں سے ۔ ایک روایت میں عبداللہ بن عباس سے یہ بھی مروی ہے کہ دوسرا گروہ عذاب میں مبتلا ہونے والوں میں سے تھا ۔ بعد میں ان کے شاگرد حضرت عکرمہ نے ان کو مطمئن کر دیا کہ دوسرا گروہ نجات پانے والوں میں شامل تھا ۔ لیکن ظاہر قرآن وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس کا پہلا خیال ہے اور جسے ابن کثیر نے باسناد جید پیش کیا ہے ۔ عام شارحین قرآن آلوسی ، ابن کثیر ، زمخشری وغیرہ نے عکرمہ کی رائے کو راجح قرار دیا ہے ۔ امام الحسن البصری ، اور یمان بن رباب کہتے ہیں کہ بچنے والے دو گروہ تھے ۔ ایک وعظ کہنے والے اور دوسرے خاموش رہنے والے اور ہلاک ہونے والا گروہ صرف جرائم پیشہ طبقہ تھا لیکن ابن زید کہتے تھے کہ بچنے والا گروہ صرف وہ ہے جو ان کو روک رہا تھا باقی خاموش اور جرائم پیشہ ہلاک ہو گئے ۔ اس کی تائید ظاہر قرآن سے ہوتی ہے ۔ قرآن کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تصریح ہے کہ بچنے والا گروہ صرف وہ تھا جو ان کو روک رہا تھا انجینا الذین ینھون عن السوء ظاہر ہے کہ جو گروہ روک نہیں رہا تھا وہ اس میں داخل نہیں ہے۔ اسی لیے ابن زید نے اس آیت کے بارے میں اپنا یہ تاثر پیش کیا ہے کہ قرآن کی یہ آیت نہی عن المنکر کو چھوڑ دینے کے موضوع پر سب سے زیادہ سنگین ہے۔ زمخشری کا یہ کہنا کہ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ برائی پر روک ٹوک کا کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ ایسے موقع پر نہی عن المنکر کا فرض ساقط ہو جاتا ہے کوئی وزنی نہیں ہے۔ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی کا مدار خوش آئند نتائج ہیں۔ یہ بات روحِ اسلام کے خلاف ہے۔ داعی کا کام فرض کی ادائیگی ہے۔ اسی بنا پر ارشادِ نبوت ہے سب سے اونچا جہاد ظالم فرمانروا کے سامنے کلمہ حق کہنا ہے۔ یہ تو ایمان کے کمزور ترین درجہ کی علامت ہے۔ اگر نتائج کو پیش نظر رکھ کر فرائض کی حیثیت متعین کی جائے تو ادائے فرض کے لیے برائیوں کے ہجوم میں کوئی موقعہ نہ رہے گا۔ اس لیے علامہ زمخشری کی یہ رائے زیادہ وزنی نہیں۔ آیت کی تشریح میں روحِ اسلام اور نہی عن المنکر کے فرض سے زیادہ قریب عبداللہ بن عباس کی پہلی رائے ہے۔

بہرحال آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب وہ تنبیہات جو ان کو کی گئی تھیں وہ بھلا بیٹھے اور کسی طرح سوچنے اور سمجھنے پر راضی نہ ہوتے تو اللہ نے ان پر اس نافرمانی اور عہد شکنی کی پاداش میں ایک سخت عذاب بھیجا جس سے وہ لوگ محفوظ رہے جو لوگوں کو برائی سے روکتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس طرح کی اجتماعی نافرمانیوں کے نتیجے میں جب اللہ کا فیصلہ کن عذاب آتا ہے تو اس کی پکڑ سے صرف وہی لوگ محفوظ رہتے ہیں جو برائی سے روکنے والے ہوتے ہیں۔

سرکشی و نافرمانی کا عبرتناک انجام

۱۶۶- پھر جب وہ اس بات میں حد سے زیادہ سرکش ہو گئے جس سے انہیں روکا گیا تھا۔ تو ہم نے کہا بندر ہو جاؤ ذلت و خواری سے ٹھکرائے ہوتے۔

شاید پہلے کچھ عذاب اور آیا ہوگا جب بالکل حد سے گزر گئے تب ذلیل بندر بنا دیے گئے یا فلما عتوا کو گزشتہ آیت فلما نسوا ما ذکروا بہ کی تفسیر قرار دیا۔ یعنی وہ عذاب بئیس بھی بندر بنا دینا تھا۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ منع کرنے والوں نے شکار والوں سے ملنا چھوڑ دیا اور بیچ میں دیوار اٹھائی ایک دن صبح کو اٹھے تو دوسروں کی آواز نہ سنی۔ دیوار پر سے دیکھا ہر گھر میں بندر تھے۔ وہ آدمیوں کو پہچان کر اپنے قرابت والوں کے پاؤں پر سر رکھنے لگے اور رونے لگے۔

آخر یہ بے حال تین دن میں مر گئے۔ [1]

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اس بستی پر خدا کا عذاب دو قسطوں میں نازل ہوا تھا۔ پہلی قسط وہ جسے عذاب بئیس کہا گیا ہے، دوسری قسط وہ جس میں نافرمانی اصرار کی پاداش میں ان کو بندر بنا دیا گیا۔ مسلسل نافرمانی پر ان مجرموں کو یہ سزا یقیناً ملی باقی کیسے ملی؟ جمہور شارحین قرآن کا خیال بھی ہے کہ یہ سزا اسی طرح ملی جیسی ظاہر قرآن کے الفاظ سے ظاہر ہو رہی ہے یعنی وہ انسان بندر بنے اور پھر تین دن کے بعد ہلاک ہو گئے۔ اس تفسیر پر عقلاً کوئی اعتراض نہیں ہوتا جو لوگ اللہ کے قانون تشریعی کے توڑنے میں اتنے جری و بے باک ہوں ان کے حق میں خالق کائنات اپنے قانون تکوینی کو کسی حد تک اگر بدل دے اور بجائے ارتقاء کے اگر کبھی ارتقاء معکوس ہو جائے تو اس میں عدم امکان تو بہت دور کی بات ہے استبعاد بھی نہیں ہے لیکن تفسیری روایات خود اس نتیجہ پر متفق نہیں ہیں بلکہ یہ بات بھی قدیم شارحین قرآن نقل کر رہے ہیں کہ مسخ صرف معنوی ہوا تھا حقیقی اور صوری نہ تھا یعنی ان کے اخلاق و عادات بندروں کی طرح کر دیے گئے تھے اور بندر کا اطلاق ان پر مجازاً ہوا ورنہ وہ واقع میں بندروں کے جسم و قالب میں تبدیل نہ ہوئے تھے۔ امام مجاہد سے اسی قسم کی تشریح حافظ ابن جریر نے نقل کی ہے۔ امام راغب اصفہانی نے مفردات القرآن میں بھی اسی قسم کی بات لکھی ہے لیکن جمہور مفسرین کا خیال یہ ہے کہ یہ تشریح غریب اور ظاہر سیاق قرآنی کے خلاف ہے۔ ابن کثیر فرماتے ہیں یہ بات غریب اور اس موقعہ پر ظاہر قرآن کے خلاف ہے۔ اور علامہ آلوسی لکھتے ہیں ظاہر قرآن یہی ہے کہ مسخ واقعی ہوا تھا۔ یہی شارحین قرآن کی رائے عامہ ہے۔ سزا کی تفصیلی نوعیت کچھ بھی ہو بہر حال تھی وہ کوئی بہت سخت اور عبرتناک سزا۔ قرآن حکیم کا مقصد اس سزا کی تفصیل پیش کرنا نہیں بلکہ اس کی عبرت انگیزی اور موعظت آموزی کے پہلو کو واضح کرنا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَإِذْ تَأَذَّنَ رَبُّكَ لَيَبْعَثَنَّ عَلَيْهِمْ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ مَن يَسُومُهُمْ سُوءَ
الْعَذَابِ ۗ إِنَّ رَبَّكَ لَسَرِيعُ الْعِقَابِ ۖ وَإِنَّهُ لَغَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٦٧﴾
وَقَطَّعْنَاهُمْ فِي الْأَرْضِ أُمَمًا ۖ مِّنْهُمُ الصَّالِحُونَ وَمِنْهُمْ دُونَ
ذَٰلِكَ ۖ وَبَلَوْنَاهُم بِالْحَسَنَاتِ وَالسَّيِّئَاتِ لَعَلَّهُمْ يَرْجِعُونَ ﴿١٦٨﴾
فَخَلَفَ مِن بَعْدِهِمْ خَلْفٌ وَرِثُوا الْكِتَابَ يَأْخُذُونَ عَرَضَ
هَٰذَا الْأَدْنَىٰ وَيَقُولُونَ سَيُغْفَرُ لَنَا ۖ وَإِن يَأْتِهِمْ عَرَضٌ
مِّثْلُهُ يَأْخُذُوهُ ۚ أَلَمْ يُؤْخَذْ عَلَيْهِم مِّيثَاقُ الْكِتَابِ أَن لَّا يَقُولُوا
عَلَى اللَّهِ إِلَّا الْحَقَّ وَدَرَسُوا مَا فِيهِ ۗ وَالدَّارُ الْآخِرَةُ خَيْرٌ
لِّلَّذِينَ يَتَّقُونَ ۗ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿١٦٩﴾ وَالَّذِينَ يُمَسِّكُونَ بِالْكِتَابِ
وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ إِنَّا لَا نُضِيعُ أَجْرَ الْمُصْلِحِينَ ﴿١٧٠﴾ وَإِذْ نَتَقْنَا
الْجَبَلَ فَوْقَهُمْ كَأَنَّهُ ظُلَّةٌ وَظَنُّوا أَنَّهُ وَاقِعٌ بِهِمْ خُذُوا مَا آتَيْنَاكُم
بِقُوَّةٍ وَاذْكُرُوا مَا فِيهِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿١٧١﴾ ع

اور دیکھو جب کہ تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ وہ قیامت تک ایسے
لوگ بنی اسرائیل پر مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے[217]
یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز ہے اور یقیناً وہ بخشش دینے والا
اور رحم کار ہے۔[218] ہم نے ان کو زمین پر ٹکڑے ٹکڑے کر کے
بہت سی قوموں میں تقسیم کر دیا۔[219] کچھ لوگ ان میں نیک تھے اور
کچھ اس سے مختلف، اور ہم ان کو اچھے بُرے حالات سے آزمائش
میں مبتلا کرتے رہے کہ شاید یہ پلٹ جائیں۔[220] پھر اگلی نسلوں کے
بعد ایسے ناہنجار لوگ ان کے جانشین ہوتے جو کتاب الٰہی کے وارث
ہو کر اسی دُنیائے کمترین کے فوائد سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ
توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جاتے اور اگر وہی متاعِ دُنیا پھر
سامنے آتا ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں۔[221] کیا ان سے کتاب
کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی بات کہیں جو

حق ہو اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہے، آخرت والا
گھرانہ اہلِ تقویٰ کے لیے بہتر ہے کیا تمہاری سمجھ میں اتنی بات
بھی نہیں آتی ہے[۲۲۲]۔ اور جو لوگ کتابِ الٰہی کو تھامے رکھتے ہیں اور
نماز قائم کرتے ہیں یقیناً ہم ایسے اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع
نہیں کریں گے[۲۲۳]۔ اور ان کو وہ وقت بھی یاد دلاؤ جب کہ ہم نے
پہاڑ کو ان پر اس طرح ہلایا تھا کہ گویا وہ ایک سائبان ہے اور ان
کو اس کے اپنے اوپر گرنے کا گمان ہو رہا تھا، اس وقت ہم نے ان
سے کہا تھا کہ جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی سے لے
لو اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے یاد رکھو، توقع ہے کہ تم غلط روی
سے بچے رہو گے[۲۲۴]۔

معانی مفردات

درسوا :- یہ لفظ درس سے بنا ہے درس کے معنے پڑھنے پڑھانے کے ہیں۔ اسی کا دوسرا مصدر دراستہ آتا ہے ۔ یمسکون ، اصل مادہ مسک ہے۔ اسی سے امساک اور استمساک اور تمسک آتا ہے اور یہاں تمسیک آیا ہے۔ تمسک اور تمسیک دونوں کے ایک معنی ہیں یعنی کسی چیز کو مضبوطی

سے تھامنا ہے۔ نتقنا:۔ نتق سے ہے اس کے معنے ہلانے کے ہیں۔ مشکیزہ میں گھی ہو تو اسے ہلایا جاتا ہے تاکہ گھی نکل آئے اس وقت بولتے ہیں نتق السقاء اسی سے علماء نے اس کے معنے زلزلہ کے کیے ہیں۔ اور چونکہ قرآن میں دوسرے موقعہ پر اسی واقعہ میں نتقنا کی جگہ رفعنا آیا ہے۔ اس لیے کچھ علماء نے اس کے معنے اٹھانے کے کیے ہیں۔ ظلۃ لغت میں اس کے معنے سایہ کرنے والی چیز کے ہیں چاہے وہ گھر کی چھت ہو یا چھتری ہو یا سائبان ہو۔

اُمتوں اور قوموں کے بارے میں قانون

ان آیات میں اس قانونِ الٰہی کی طرف اشارہ ہے کہ جب کوئی جماعت بد عملی و فساد میں مبتلا ہوتی ہے تو اس کا مہلک نتیجہ فوراً ظاہر نہیں ہو جاتا بلکہ تدریج و امہال کی وجہ سے بگڑنے کے بعد بھی مہلتیں ملتی رہتی ہیں کہ اصلاح حال پر آمادہ ہو جائے۔ یہاں بتایا ہے کہ ہم نے ان کو الگ الگ گروہوں میں متفرق کر دیا۔ یعنی بنی اسرائیل کی قومی وحدت باقی نہیں رہی۔ چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منتشر ہو گئے۔ یہ تباہی کی ابتدا تھی۔ تاہم ابھی نیک جماعتیں بالکل معدوم نہیں ہو گئی تھیں لیکن اس دور کے بعد جو نسلیں پیدا ہوئیں وہ عمل و حقیقت سے یکسر محروم ہو گئیں۔ چنانچہ علماء یہود کا یہ حال ہو گیا ہے کہ دنیا کے حقیر فوائد کے لیے دین فروشی کرتے۔ ناجائز باتوں کو جائز بنا لیتے اور سمجھتے کہ ہمارے لیے کوئی کھٹکا نہیں ہے خدا ہمیں بخش دے گا۔ جب کسی قوم میں عمل اور حقیقت کی روح باقی نہیں رہتی تو معاصی کے ارتکاب میں وہ چھوٹ اور بے لگام ہو جاتی ہے اور عمل کی جگہ محض خوش اعتقادی کے خود ساختہ سہاروں پر اعتماد کرنے لگتی ہے۔ چنانچہ یہی حال یہودیوں کا ہوا جو سمجھتے تھے کہ ہم خدا کی پسندیدہ امت ہیں۔ آتش دوزخ ہم پر حرام کر دی گئی ہے اور یہی حال اب مسلمانوں کا ہو گیا ہے جو سمجھتے ہیں کہ ہم امتِ مرحومہ ہیں۔ آتش دوزخ ہم پر حرام کر دی گئی ہے اگر کچھ مواخذہ ہوگا بھی تو کسی پیر کی مریدی یا کسی وظیفہ کا ورد یا کسی خاص نفل نماز کی مداومت یا مجالس میلاد کا انعقاد اور عرسوں کی شرکت بخشش و نجات کے لیے کافی ہے [1]

۲۱۷۔ اور دیکھو تمہارے رب نے اعلان کر دیا کہ وہ قیامت تک ایسے لوگ بنی اسرائیل پر مسلط

---

[1] ترجمان القرآن

کرتا رہے گا جو ان کو بدترین عذاب دیں گے۔ یعنی خدا کی طرف سے پختہ اعلان کر دیا گیا تھا کہ یہود اگر احکام تورات پر عمل کرنا چھوڑ دیں گے تو حق تعالیٰ قرب قیامت تک وقتاً فوقتاً ان پر ایسے لوگوں کو مسلط کرتا رہے گا جو ان کو بُرے عذاب میں مبتلا رکھیں۔ پہلا عذاب یہاں محکومانہ زندگی کو فرمایا چنانچہ قوم یہود کبھی یونانی اور کلدانی بادشاہوں کے زیر حکومت رہی۔ کبھی "بخت نصر" وغیرہ کے شدائد کا تختہ مشق بنی۔ آخر میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک مجوسیوں کی باجگزار رہی۔ پھر مسلمان حکمرانوں کو ان پر مسلط کر دیا۔ غرض اس وقت سے آج تک ان کو من حیث القوم عزت و آزادی کی زندگی نصیب ہوئی نہیں بلکہ جہاں کہیں رہے اکثر ملوک و حکام کی طرف سے سخت ذلت اور خطرناک تکلیفیں اٹھاتے رہے۔ ان کا مال و دولت وغیرہ کوئی چیز اس غلامی و محکومی کی لعنت سے نجات نہ دے سکی اور نہ قیامت تک دے سکے گی۔ آخر میں جب یہ لوگ دجال کے مددگار ہو کر تکلیفیں دیں گے تو حضرت مسیح علیہ السلام کے مسلمان رفقاء کے ہاتھوں سے تہ تیغ کیے جائیں گے۔ کما ورد فی الحدیث [1]

اس آیت سے معلوم ہوا کہ کسی قوم پر ظالم و مستبد حکمرانوں کا مسلط رہنا بھی اللہ سبحانہٗ کا ایک عذاب ہے جو پاداش عمل میں ظاہر ہوتا ہے۔

اصل میں لفظ "تاذن" آیا ہے اس کا صحیح مفہوم کسی فیصلے سے آگاہ کرنا ہے۔ اس نے سنا دیا اس نے پکار دیا، اس نے اعلان کر دیا، اس نے بتلا دیا، اس نے خبردار کر دیا۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ نے بنی اسرائیل کی اس قسم کی نافرمانیوں اور بدعہدیوں کی بنا پر ان کے نبیوں کے ذریعہ سے آگاہ کر دیا تھا کہ وہ ان پر ایسے لوگوں کو قیامت تک مسلط کرتا رہے گا جو ان کو نہایت سخت عذابوں میں مبتلا کرتے رہیں گے۔ اس طرح کی تنبیہہ حضرت موسیٰ نے بار بار فرمائی اور بعد کے نبیوں نے بھی نہایت آشکارا لفظوں میں اس سے آگاہ کیا۔ احبار میں ہے۔ اگر تم میرے سننے والے نہ ہو اور ان سب حکموں پر عمل نہ کرو۔۔۔۔ اور مجھ سے عہد شکنی کرو تو میں بھی تم سے ایسا ہی کروں گا۔۔۔۔ اور میرا چہرہ تمہارے برخلاف ہو گا اور تم دشمنوں کے سامنے قتل کیے جاؤ گے اور جو تمہارا کینہ رکھتے ہیں تم پر حکومت کریں گے (احبار باب ۲۶ آیت ۱۴، ۱۷)

اسی طرح کتاب استثنا میں ہے تیرے بیٹے اور عزیز بیٹیاں دوسری قوم کو دی جائیں گی اور تیری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آنکھیں دیکھیں گی اور سارے دن ان کی راہ تکتے تکتے تھک جائیں گی اور تیرے ہاتھ میں کچھ زور نہ ہوگا (استثناء باب ۲۸)

یہی تنبیہ حضرت یسعیاہ اور یرمیاہ نے کی پھر یہی تنبیہ حضرت مسیح علیہ السلام نے انہیں کی، جیساکہ اناجیل میں ان کی متعدد تقریروں سے ظاہر ہے۔ آخر میں قرآن نے اس کی توثیق کی۔ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی عملی تصدیق تاریخ کے صفحات میں مرقوم ہے۔ اس کے لیے بخت نصر اور رٹیس سے لے کر جرمنی کے ہٹلر تک کی تاریخ پڑھ جائیے۔ ہر دور میں آپ کو اس قوم کی ذلت و بربادی کی نہایت لرزہ خیز داستان ملے گی۔ یہ بات خیال میں رہے کہ کبھی کبھار مہلت کا کوئی وقفہ مل جانے سے اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ کی نفی نہیں ہوتی۔ قرآن کا اندازِ بیان خود گواہ ہے کہ ان کو اس قسم کے وقفے ملتے رہیں گے لیکن ہر وقفہ ان کے لیے ایک تازہ مصیبت کا پیش خیمہ ہوگا۔ آج سرزمین قدس میں ان کا جو اجتماع ہو رہا ہے یہ بھی ایک نئی طوفان کی دعوت ہے جس کے بعد ان کی پوری اجتماعی قوت کا شیرازہ انشاءاللہ بکھر جائے گا۔ سورہ بنی اسرائیل میں ان کی دو بربادیوں کا ذکر ہے لتفسدن فی الارض مرتین و لتعلن علوا کبیرا۔ پہلی بربادی بابل کے بادشاہ بخت نصر کے حملہ سے ہوئی اور دوسری رومیوں کے حملہ سے ہوئی۔ بابل کے حملے نے صرف یہود کی آبادیوں ہی کو پامال نہیں کیا تھا بلکہ بنی اسرائیل کی نسل و قومیت بھی ہلاک و منتشر ہو گئی تھی۔ لیکن ایک صدی کے بعد حالات نے پھر پلٹا کھایا اور اللہ سبحانہٗ نے وقت کی سب سے بڑی فاتح قوت کو ان کی مدد کے لیے تیار کر دیا مگر وہ پھر بھی ٹھیک نہ ہوئے اس کے بعد دوسری ہلاکت کا وقت آیا۔ رومیوں نے حملہ کیا۔ یہ بنی اسرائیل کی آخری بربادی تھی، اس کے بعد پھر سنبھل نہ سکے اور قرآن کا یہ اعلان کی ایک حقیقت بن گیا۔

ضربت علیھم الذلۃ اینما ثقفوا الا بحبل من اللہ وحبل من الناس۔
ان پر ذلت کی مار پڑی جہاں کہیں بھی یہ پائے گئے ہاں یہ کہ خدا کے عہد سے یا انسانوں کے عہد سے کہیں پناہ مل گئی۔

اللہ کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں

۲۱۸- یقیناً تمہارا رب سزا دینے میں تیز ہے اور یقیناً وہ بخش دینے والا اور رحم کار ہے۔
یعنی جو شرارت سے باز نہ آتے بعض اوقات اس پر جلدی ہی دنیا میں عذاب بھیجنا شروع کر دیتا

ہے اور کیسا ہی کٹر مجرم توبہ کرے اور نادم ہو کر خدا کی طرف رجوع کرے تو اس کی بخشش و رحمت بھی بے پایاں ہے۔ معاف کرتے ہوئے بھی دیر نہیں لگتی ہے[1] قوموں کی زندگی و موت کے لیے اللہ سبحانہ، کا کیا قانون و ضابطہ ہے۔ اسی کو یہاں اللہ سبحانہ، کی صفات سریع العقاب اور غفور رحیم کے الفاظ میں پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ کوئی خدا کو اس دنیا کے معاملات سے بے تعلق یا الگ تھلگ نہ خیال کرے جو لوگ اس کی راہ سے بے راہ ہوتے ہیں ان کو وہ سزا بھی بڑی ہی سخت دیتا ہے اور جو اس کی طرف رجوع کرتے ہیں ان کے لیے وہ بڑا بخشنے والا اور رحم فرمانے والا ہے عقاب کے ساتھ سریع کی صفت ان لوگوں کی بلادت پر ضرب لگانے کے لیے ہے جو خدا کی دیر کو اندھیر سمجھ بیٹھتے ہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ کوئی اس کی بخشی ہوئی مہلت سے غلط فہمی میں مبتلا نہ ہو۔ وہ جب پکڑتا ہے آناً فاناً پکڑتا ہے اور جن کو پکڑتا ہے وہ بھی محسوس کرتے ہیں کہ صبح کی شام بھی ہونے نہیں پائی کہ دھر لیے گئے۔

مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ، ان امتوں اور قوموں کے لیے جو اس کی نافرمانی پر کمر کس لیتی ہیں اور زمین کو اپنے مفسدانہ اعمال کا گہوارہ بنا لیتے ہیں اپنے عذاب میں دیر نہیں کرتا جیسا کہ افراد کے بارے کبھی کبھار دیر کر دیتا ہے۔ بلکہ امتیں اپنے اعمال کے نتائج سے ضرور ہمدوش ہوتی ہیں اور جو برائی ان کو پیش آتی ہے خود ان کے اعمال کی پیداوار ہے۔ اس میں کبھی تخلف نہیں ہوتا۔ سریع العقاب کا یہی مطلب ہے لیکن اگر نافرمانیوں کے بعد کوئی امت توبہ کرتی ہے اور اصلاح حال کر لیتی ہے تو اللہ سبحانہ، کی ذات غفور رحیم ہے۔

بنی اسرائیل میں ذلت کا نقطہ آغاز

۲۱۹- ہم نے ان کو زمین میں ٹکڑے ٹکڑے کر کے بہت سی قوموں میں تقسیم کر دیا یعنی یہود کی دولت برہم ہوئی تو آپس کی مخالفت سے ہر طرف نکل گئے۔ کوئی اجتماعی قوت و شوکت نہ رہی اور مذاہب مختلف پیدا ہو گئے۔ یہ احوال اس امت کو عبرت کے لیے سناتے گئے ہیں[2] مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل کی ذلت اور بربادی کا نقطہ آغاز اس طرح ہوا کہ ان کی قومی وحدت باقی نہ رہی چھوٹے چھوٹے گروہوں میں منتشر ہو گئے۔ یہ تباہی کی ابتدا تھی۔ یہاں جو بات اہل ایمان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سے اشارے میں کہی گئی ہے۔ دوسرے موقعہ پر یہی بات صراحۃً فرمائی گئی ہے۔

ولا تکونوا کالذین تفرقوا واختلفوا من بعد ما جاءھم البینات اولٰئک لھم عذاب عظیم۔

اور دیکھو ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو فرقہ فرقہ ہو گئے اور کتاب اللہ کی واضح دلیلوں کے باوجود اختلاف کر بیٹھے یہی لوگ ہیں جن کے لیے دردناک عذاب ہے۔

اہل کتاب کی سب سے بڑی گمراہی یہ تھی کہ دین حق کے علم اور کتاب اللہ کے حصول کے بعد باہمی اختلافات میں پڑ گئے اور دین کی وحدت ضائع کر کے الگ الگ ٹولیاں بنالیں۔ مسلمانوں سے کھول کر کہا جا رہا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ تم بھی اسی گمراہی میں مبتلا ہو جاؤ۔ اور ایک دین پر جمع رہنے کی جگہ الگ الگ فرقوں میں بٹ جاؤ۔ منشا یہ ہے کہ تفرق و اختلاف نے پچھلی اُمتوں کو تباہ کر دیا ان سے عبرت حاصل کرو اور اپنے میں یہ مرض پیدا نہ ہونے دو۔ یاد رکھو افتراق و اختلاف ہی سے تنزل و ادبار کا آغاز ہوتا ہے۔ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے کہ اجتماعیت سے جدا ہو کر سب کچھ رکھنے کے باوجود سب کچھ کھو بیٹھے۔ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عزت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی اور بالآخر زندگی کی جگہ موت ان پر چھا گئی۔

آزمائشوں کے تنوع کی غرض و غایت

۲۲۰ - کچھ لوگ ان میں نیک تھے اور کچھ اس سے مختلف اور ہم نے ان کو اچھے بُرے حالات سے آزمائش میں مبتلا کرتے رہے کہ شاید پلٹ جائیں۔ یعنی کچھ افراد ان میں نیک بھی تھے لیکن اکثریت کافروں اور فاسقوں کی تھی۔ ان اکثروں کے لیے بھی ہم رجوع و انابت الی اللہ کے مواقع بہم پہنچاتے رہے۔ کبھی ان کو عیش و تنعم میں رکھا کبھی سختی اور تکلیف میں مبتلا کیا کہ ممکن ہے کہ احسان مان کر یا سختیوں سے ڈر کر توبہ کریں اور خدا کی طرف رجوع کریں[1]

اگرچہ اس آیت سے یہ بات واضح ہے کہ ایمان کی راہ میں قدم رکھنے والوں کو صرف آزمائش سے نہیں بلکہ آزمائشوں سے گزرنا لازمی ہے اور ایک نظری انسان کو تو اتنی روشنی بس کرتی ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

لیکن ایک عملی انسان کو ایسے انسان کو جو اس حقیقت کا علم صرف برائے علم نہ حاصل کرنا چاہتا ہو بلکہ عمل چاہتا ہو اس سے زیادہ تیز روشنی کی ضرورت ہے وہ چونکہ دور کا تماشائی نہیں بلکہ بذاتِ خود اس راہ کا راہرو ہے اس لیے وہ اس کے ایک ایک نشیب و فراز کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا چاہے گا وہ بس اتنا جان کر خاموش اور بے فکر نہ ہوسکے گا۔ یہاں صراط مستقیم ابتلاؤں سے گھری ہوتی ہے بلکہ اسے تجسس ہوگا کہ یہ ابتلاءات کس طرح کی ہوں تاکہ ان کے لیے وہ پہلے سے اپنے دل و دماغ کو تیار اور ان کا سامنا ہو جانے پر انتشار فکر و عمل کا شکار نہ ہو جائے اس لیے ہم ان بلاؤں کا ذرا تفصیلی جائزہ لیں گے اور یہ معلوم کریں گے کہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون کن کن شکلوں میں ظاہر ہوتا ہے اور کن کن طریقوں سے علم بردارانِ حق کو آزمایا جاتا ہے اور سچ تو یہ ہے کہ اس کے بغیر زندگی کی آسائشوں اور سختیوں کا نظری طور پر بھی صحیح اندازہ نہیں ہوسکتا۔

قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کی پوری زندگی ہی ابتلاء و امتحان کی زندگی ہے انسان کا نام لے کر قرآن میں یہ قانون بتایا ہے۔

فاما الانسان اذا ما ابتلاہ ربہ فاکرمہ ونعمہ فیقول ربی اکرمن۔ واما اذا ما ابتلاہ فقدر علیہ رزقہ فیقول ربی اھانن۔

انسان کو جب اللہ عزت و نعمت کی بارش کے ذریعے جانچتا ہے تو انسان کہتا ہے کہ میرے مالک نے میری عزت بڑھائی اور جب اللہ انسان کو نپی تلی روزی دے کر جانچتا ہے تو کہتا ہے کہ اللہ نے مجھے ذلیل و خوار کر دیا۔

قرآن کی اس قسم کی متعدد آیات ہیں جن میں بتایا گیا ہے کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو کوئی خاص رخ ہی نہیں بلکہ پوری زندگی ہی امتحان و ابتلا کی زندگی ہے اور یہ کیا ہے تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں بشری فطرت میں خواہ وہ کسی رنگ میں ہو۔ دوراہوں میں سے ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے ایک پہلو کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی گئی ہے درحقیقت فطرت کے اسی اقتضا کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ انسان کی پوری زندگی ابتلا و امتحان کی زندگی ہے۔ اور خدا کے امتحان لینے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ جن باتوں کو خدا نہیں جانتا ان کو جاننا چاہتا ہے بلکہ انسانی فطرت میں اقتدار و اختیار، انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے اسی قوت کے صحیح مطالبہ کا نام ابتلا و امتحان ہے۔

یہاں قرآن نے دو قسم کے ابتلاؤں کا ذکر کیا ہے۔ ایک حسنات کے ذریعے دوسرے سیئات کے

ذریعے۔ حسنات کے معنے خوشحالیاں یعنی زندگی کے ہر پہلو میں خوشحالی مثلاً قوم معزز ہو، دولت مند ہو، صحیح اور تندرست ہو اور سیئات کے معنے جماعتی بدحالیاں یعنی زندگی کے ہر پہلو میں بدحالی ہو۔ مثلاً قوم محکوم ماتحت ہو ذلیل وضعیف ہو مفلس و تنگ دست ہو۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ فرقہ فرقہ بن جانے کے بعد ان میں دو قسم کے لوگ پیدا ہو گئے تھے ایک صالحین جیسے وہ لوگ جنہوں نے سبت کے دن حیلہ سازوں کو حیلہ سازی اور خدا کی نافرمانی سے منع کیا اور وہ لوگ جو حضرت موسیٰ کے بعد زمانہ عیسیٰ تک تمام نبیوں پر ایمان رکھتے تھے اور وہ لوگ جو حضرت محمد کریم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان لاتے اور کچھ لوگ ان صالحین سے کمتر تھے یعنی جن میں صلاحیت کا وصف نہ تھا کچھ کفر وفسق میں چھوٹ اور بے لگام تھے جیسے وہ جو انبیاء کے قاتل تھے۔ کچھ بے ایمان، جھوٹے اور حرام خور تھے۔ ان سب کے بارے قرآن نے بتایا ہے کہ ہم نے ان کو اس امید پر کہ شاید یہ اللہ کے بتاتے ہوئے راستہ پر چلنے کیلئے کمربستہ ہو جائیں۔ خوشحالیاں اور بدحالیاں دے کر آزمایا، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی سنت کے مطابق ان کو اچھے اور بُرے ہر طرح کے حالات سے آزمایا تاکہ وہ اپنے رب کی طرف رجوع کریں۔ لیکن ان کی خواہشیں اس طرح ان پر غالب آگئی تھیں کہ ان کے آگے ان کی قوتِ ارادی بالکل مفلوج ہو کر رہ گئی تھی۔ وہ یہ احساس رکھتے ہوئے بھی کہ وہ جو کچھ کر رہے ہیں غلط ہے وہی کام کیے جاتے اور اپنے ضمیر کو یہ دھوکا دیتے کہ ہم خدا کے لاڈلوں اور محبوبوں کی اولاد ہیں خدا ہمیں معاف ہی کر دے گا۔

بنی اسرائیل کا تدریجی زوال

۱۶۹۔ پھر اگلی نسلوں کے بعد ایسے ناہنجار لوگ ان کے جانشین ہوتے جو کتاب الٰہی کے وارث ہو کر اسی دنیائے کمترین کے فوائد سمیٹتے ہیں اور کہہ دیتے ہیں کہ توقع ہے ہمیں معاف کر دیا جائے گا اور اگر وہی سامان دُنیا پھر سامنے آتا ہے تو پھر لپک کر اسے لے لیتے ہیں۔ یعنی اگلوں میں تو کچھ صالحین بھی تھے۔ پچھلے ایسے ناخلف ہوئے کہ جس کتاب تورات شریف کے وارث و حامل بنے تھے۔ دُنیا کا تھوڑا سا سامان لے کر اس کی آیات میں تحریف وکتمان کرنے لگے اور رشوتیں لے کر احکام تورات کے خلاف فیصلے دینے لگے۔ پھر اس پر ستم ظریفی یہ دیکھئے کہ ایسی نالائق اور باچھانہ حرکات کا ارتکاب کرتے ہوئے یہ عقیدہ اور دعویٰ رکھتے ہیں کہ ان باتوں سے ہم کو مضرت کا کوئی اندیشہ نہیں۔ ہم تو خدا کی اولاد اور اس کے محبوب ہیں۔ کچھ بھی کریں وہ ہماری بے اعتدالیوں سے ضرور درگزر کرے گا۔ اسی

عقیدے کی بنا پر تیار رہتے ہیں کہ آئندہ جب موقع ہو پھر رشوت سے کر اسی طرح کی بے ایمانی کا اعادہ کریں گے۔ گویا بجائے اس کے کہ گزشتہ حرکات پر نادم ہوتے اور آئندہ کے لیے عزم رکھتے کہ ایسی حرکات کا اعادہ نہ کریں گے مگر اللہ سے نڈر ہو کر ان ہی شرارتوں اور بے ایمانیوں کے اعادے کا عزم رکھتے ہیں اس سے زیادہ حماقت اور بے وقوفی اور کیا ہوگی [1]

مطلب یہ ہے کہ گناہ کرتے ہیں اور جانتے ہیں کہ یہ گناہ ہے مگر اس بھروسہ پر اس کا ارتکاب کرتے ہیں کہ ہماری تو کسی نہ کسی طرح بخشش ہو ہی جائے گی کیونکہ ہم خدا کے چہیتے ہیں اور ہم خواہ کچھ ہی کریں بہر حال ہماری مغفرت تو ضروری ہے۔ اسی غلط فہمی کا نتیجہ ہے کہ گناہ کرنے کے بعد وہ نہ شرمندہ ہوتے ہیں نہ توبہ کرتے ہیں بلکہ جب پھر ویسے ہی گناہ کا موقعہ سامنے آتا ہے تو پھر اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ بدنصیب اس کتاب کے وارث ہوئے جو ان کو دنیا میں امام بنانے والی تھی مگر ان کی کم ظرفی اور پست خیالی نے اس نسخہ کیمیا کو لے کر دنیا کی متاع حقیر کمانے سے زیادہ بلند کسی چیز کا حوصلہ نہ کیا اور بجائے اس کے کہ دنیا میں عدل وراستی کے علمبردار اور خیر وصلاح کے رہنما بنتے محض دنیا کے کتے بن کر رہ گئے [2]

گویا اس ارشاد گرامی میں یہود کے تدریجی زوال کی نشاندہی فرمائی ہے کہ روز بروز ان کی اخلاقی زندگی بد سے بدتر ہوتی گئی حتیٰ کہ ایسے برے لوگ کتاب الٰہی کے وارث ہوگئے جو ایک طرف کتاب کی وراثت کا دعویٰ رکھتے تھے اور دوسری طرف پست ہمتی اور دنائت کا یہ حال کہ جو لقمہ حرام بھی ملتا نظر آتا اس کو چھوڑنے کا حوصلہ نہ رکھتے تھے۔ کتاب الٰہی کے نام لیوا ہونے کی وجہ سے اگر دل میں کوئی خلش پیدا ہوتی تو ان جھوٹے دلولوں سے اپنا دل بہلا لیتے کہ ہم برگزیدہ اُمت ہیں۔ ابراہیم، اسحاق اور یعقوب جیسے انبیاء کی اولاد ہیں۔ دوزخ کی آگ ہم پر حرام ہے اپنے محبوب بندوں کے صدقے اللہ ہمیں معاف کر دے گا۔ اس طرح انہوں نے اپنے ایمان کو ایسا زنگ آلود بنا دیا تھا کہ ایک بار حرام خوری کے بعد دوسری بار حرام کا موقعہ پیش آتا تو اس سے بھی نہ چوکتے۔

علامہ آلوسی بغدادی نے اسی آئینے میں اس اُمت کا بھی چہرہ دیکھ لیا۔ انہوں نے مسلمانوں کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ اس قابل ہے کہ عبرت کے لیے پڑھا جائے۔

"یہی حال ہمارے زمانے کے بکثرت صوفیا کا ہے۔ شہوات ولذات وغیرہ یہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تفہیم القرآن

پروانوں کی طرح گرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہم کو نقصان نہیں دیتا کیونکہ ہم خدارسیدہ ہیں اور کچھ کی بابت یہ بھی سنا گیا ہے کہ وہ خالص حرام کھاتا تھا اور کہتا تھا کہ نفی و اثبات کا ذکر اس کے نقصان کی تلافی کر دیتا ہے۔

لاحول ولا قوۃ الا باللہ

نجات کا غیر مشروط پروانہ کسی کے لیے نہیں

۲۲۲- کیا ان سے کتاب کا عہد نہیں لیا جا چکا ہے کہ اللہ کے نام پر وہی کچھ کہیں جو حق ہو اور یہ خود پڑھ چکے ہیں جو کتاب میں لکھا ہوا ہے۔ آخرت والا گھر اہل تقویٰ کے لیے ہے کیا تمہاری سمجھ میں اتنی بات بھی نہیں آتی ہے۔ یعنی تورات میں جو عہد لیا گیا تھا کہ خدا کی طرف سچ کے سوا کسی چیز کی نسبت نہ کریں۔ کیا وہ انہیں معلوم نہیں جو اس کی کتاب اور احکام میں قطع و برید کر کے اس پر افترا کرنے لگے۔ حالانکہ کتاب اللہ تورات کو یہ لوگ پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ پھر کیسے کہا جا سکتا ہے کہ اس کا مضمون انہیں معلوم نہیں یا یاد نہیں رہا۔ حقیقت وہی ہے کہ دنیا کی فانی متاع کے بدلے انہوں نے دین و ایمان بیچ ڈالا اور آخرت کی تکلیف و راحت سے آنکھیں بند کر لیں۔ اتنا نہ سمجھے کہ جو لوگ خدا سے ڈرتے اور تقویٰ کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کے لیے آخرت کا گھر اور وہاں کا عیش و تنعم دنیا کی خوشحالی سے کہیں بہتر اور فائق ہے۔ کاش کہ اب بھی انہیں عقل آجائے۔[1]

مطلب یہ ہے کہ ان کو اس بات کا خوب علم ہے کہ حضرت موسیٰ کی لائی ہوئی کتاب کہیں بھی نجات کے غیر مشروط پروانے کا ذکر نہیں ہے نہ اللہ سبحانہٗ نے ان سے کبھی یہ بات فرمائی ہے اور نہ ہی اسرائیلی انبیاءؑ نے کہیں اس کی نشاندہی کی ہے کہ تم جو چاہو کرو بہرحال تمہیں مغفرت کا پروانہ مل جائے گا۔ پھر ان کو کیا حق ہے کہ خدا کی طرف وہ بات منسوب کریں جو خدا نے خود نہیں فرمائی حالانکہ ان سے اللہ نے یہ عہد لیا تھا کہ خدا کے نام سے کبھی کوئی بات حق کے خلاف نہ کہیں گے۔

یہ بات کہ کتاب الٰہی میں ان سے اللہ کے نام پر خلاف حق نہ کہنے کا عہد لیا گیا ہے۔ موجودہ تورات میں ساری تحریفات اور ناجائز تصرفات کے باوجود بار بار ذکر ہوا ہے اس کے چند حوالے ملاحظہ ہوں "تم ہر ایک بات پر جس کا حکم میں تمہیں دیتا ہوں دھیان رکھ کے عمل کیجیو تو اس سے زیادہ نہ کرنا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور نہ اس سے کم کرنا۔ (استثنا ۱۴، ۳۲) ایک اور مقام پر ہے "تم اس کلام میں جس کا حکم میں تمہیں دیتا ہوں کچھ زیادہ نہ کیجیو اور نہ اس میں کم کیجیو (استثنا ۴-۲) ایک اور جگہ ہے "فقط تو مضبوط ہو اور خوب دلاوری کرتا تاکہ تو اس شریعت کے موافق جس کا میرے بندے موسیٰ نے تجھ کو حکم کیا کہ دھیان کر کے عمل کرے اس سے داہنے یا بائیں ہاتھ کو نہ پھیر تاکہ تو ہر جگہ جہاں تو جاتا ہے کامیاب ہو (یشوع ۱-۷) مقصد یہ ہے کہ اگر کتاب الٰہی کی یہ حیثیت ہوتی صدا موجود ہے اور تم اس کے درس و تدریس کا مشغلہ کرتے رہتے ہو تو پھر تم نے حرام خوری اور حرام کاری کی راہ کہاں سے اور کیسے نکالی ہے اس کے حق میں قانون کی سند کہاں سے حاصل کی ہے۔

یہاں ہمارے پنجاب کے مشہور عالم اور شیخ طریقت پیر محمد کرم شاہ ایم اے بہت مفید اور کام کی نصیحت مسلمانوں کو کر گئے، فرماتے ہیں:

یہ آیت جہاں یہود کے اس طریق کار اور اخلاقی پستی کی مذمت کر رہی ہے وہاں مسلمان مشائخ اور علماء کے لیے بھی اس میں درس عبرت ہے۔ وہ چیز جو علماء اور مشائخ بنی اسرائیل کے لیے شرمناک تھی کیا وہ اللہ تعالیٰ کے محبوب ترین اور کامل ترین بندے اور سید الانبیاء والمرسلین کی امت جسے خیر الامم کے لقب سے نوازا گیا ہے کے علماء و مشائخ کے لیے قابل برداشت ہو سکتی ہے۔ اگر آخری نبی کی آخری شریعت اور آخری کتاب کے امین اپنی ذمہ داریوں کو ادا نہیں کریں گے اور شریعت کے احکام بھی دولت کمانے کا ذریعہ بن کر رہ جائیں گے تو پھر اس چشمہ صافی سے دنیا کے پیاسے کیوں کر سیراب ہوں گے[1]

مطلب یہ ہے کہ یہ سرگزشت تو بنی اسرائیل کی ہے جن کو تورات نے مخاطب کیا تھا۔ لیکن خود مسلمانوں کا کیا حال ہوا جنہیں قرآن کی دعوت سپرد کی گئی تھی۔ افسوس ہے کہ یہ علماء مشائخ بھی اس گمراہی سے بچ نہ سکے انہوں نے بھی دینی و روحانی زندگی کو کاروباری زندگی بنالیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تمام مفاسد ظہور میں آگئے جن کا دروازہ قرآن نے بند کرنا چاہا تھا اور سب سے بڑا فساد یہ پیدا ہوا کہ ان کی روحانی ترقی یک قلم رک گئی اور رسوم و رواج کی تقلید نے علم و بصیرت کی راہوں سے انہیں دور کر دیا۔ فانا للہ و الی اللہ المشتکی۔

---

[1] ضیاء القرآن

مصلحین کی حوصلہ افزائی

۲۲۳ - اور جو لوگ کتاب الٰہی کو تھامے رکھتے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں یقیناً ہم ایسے اصلاح کرنے والوں کا اجر ضائع نہیں کریں گے۔ یعنی توبہ اور اصلاح کا دروازہ اب بھی کھلا ہے۔ جو لوگ شر پیروں کی راہ چھوڑ کر تورات کی اصلی ہدایات کو تھامے رہیں اور اسی کی ہدایت دہ پیشین گوئی کے موافق اس وقت قرآن کریم کا دامن مضبوط پکڑے رہیں اور خدا کی بندگی نماز وغیرہ کا حق ٹھیک ٹھیک ادا کریں۔ غرض اپنی اور دوسروں کی اصلاح پر متوجہ ہوں خدا ان کی محنت ضائع نہیں کرے گا وہ بلاشبہ اپنی محنت کا میٹھا پھل چکھیں گے [1]

آیت کا مطلب اوپر کی آیت کی روشنی میں یہ ہے کہ بدقسمت لوگ تو اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر اپنی خواہشات کے پیچھے چل پڑے ہیں۔ حالانکہ جو لوگ اللہ کی کتاب کو مضبوطی سے اور نماز کا اہتمام کرتے ہیں وہ لوگ مخلوق خدا کی اصلاح کا کام کرتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اصلاح و دعوت کے اہم ترین اجزاء یہ دو ہیں کہ داعی اور مصلح کتاب الٰہی کے احکام کی تعمیل کرے اور نماز کی پابندی کرے پہلی بات کو مضارع کے صیغے اور دوسری بات کو ماضی کے صیغے میں پیش کرتے ہیں تعبیری تعنن شاید اس لیے رکھا ہے کہ تمسک بالکتاب بلا قید زمان مطلوب ہے اور نماز اوقات خاصہ میں ہی پڑھی جاتی ہے یعنی اللہ کی کتاب کو زندگی کے سارے گوشوں میں تھامے رہے اور نماز کی اوقات مخصوصہ میں ادائیگی کرے۔ آیت میں ایجاز سے کام لیا گیا ہے پوری بات یوں ہے کہ جو لوگ کتاب کو مضبوطی سے تھامے ہوئے ہیں اور نماز قائم کرتے ہیں وہی اصلاح کرنے والے ہیں اور بلاشبہ ہم مصلحین کا اجر ضائع نہیں کرتے۔ امام مجاہد اور امام ابن زید فرماتے ہیں کہ اس سے مراد وہ اہل ایمان ہیں جو اہل کتاب میں سے مسلمان ہوئے گویا تمام یہودیوں کو سمجھا دیا گیا کہ اگر تم آج بھی احکام الٰہی کے کاربند ہو اور نماز پڑھو تو تمہارے آباؤ اجداد کے اعمال بد کی وجہ سے تمہاری پکڑ نہ ہوگی بلکہ تمہیں تمہارے اعمال کا اجر ملے گا۔ اس سے پہلے بھی اہل کتاب میں ان لوگوں کا ذکر ومن قوم موسیٰ امۃ میں کیا تھا یہاں فرمایا الذین یمسکون بالکتاب دونوں جگہ یہ صراحت اس لیے کی کہ واضح ہو جائے کہ جن لوگوں نے کتاب الٰہی کو تھام رکھا ہے اور کتاب کے مطالبات پورے کر رہے ہیں۔ ان کی سعادت سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

انکار نہیں ہے۔ تمسک بالکتاب یہ ہے کہ ہر راست باز انسان جو سچے دین پر چلنا چاہتا ہے۔ فرض ہے کہ بلا کسی امتیاز کے تمام رسولوں پر، تمام کتابوں، تمام دعوتوں پر ایمان لائے اور کسی ایک کا بھی انکار نہ کرے۔ بہر حال آیت کا مصداق وہ لوگ ہیں جو قوم کے عام بگاڑ کے باوجود حق پر قائم رہے اور بالآخر مشرف باسلام ہوئے۔

بنی اسرائیل سے اسلامی زندگی کا عہد

۲۲۴- اور ان کو وہ وقت بھی یاد دلاؤ جب کہ ہم نے پہاڑ کو ان پر اس طرح ہلا دیا تھا کہ گویا وہ ایک سائبان ہے اور ان کو اس کے اپنے اوپر گرنے کا گمان ہو رہا تھا اس وقت ہم نے ان سے کہا تھا کہ جو کتاب ہم تمہیں دے رہے ہیں اسے مضبوطی سے لو۔ اور جو کچھ اس میں لکھا ہے اسے یاد رکھو توقع ہے کہ تم غلط روی سے بچے رہوگے۔ یعنی جو میثاق الکتاب، عہد و اقرار انہیں یاد دلایا جا رہا ہے وہ ایسے اہتمام سے لیا گیا تھا کہ پہاڑ اٹھا کر ان کے سروں پر لٹکا دیا گیا اور کہا گیا کہ جو کچھ تم کو دیا جا رہا ہے اسے پوری مضبوطی اور عزم سے تھامو اور جو نصیحتیں کی گئیں انہیں ہمیشہ یاد رکھو ورنہ بصورت انکار سمجھ لو کہ خدا تم پر یہ پہاڑ گرا کر ہلاک کر سکتا ہے۔ اس قدر اہتمام اور تخویف و تاکید سے جو قول و قرار لیا گیا تھا افسوس ہے کہ وہ بالکل فراموش کر دیا گیا۔[1]

یہ واقعہ الٓمٓ البقرہ میں گزر چکا ہے۔ یہاں الجبل پہاڑ آیا ہے وہاں اسی پہاڑ کا نام الطور آیا ہے یہ جزیرہ نمائے سینا کے ایک مخصوص پہاڑ کا نام ہے۔ جدید جغرافیہ نویس کہتے ہیں کہ طور کا اطلاق جزیرہ نمائے سینا کے متعدد پہاڑوں پر ہوتا ہے لیکن حضرت موسیٰ اور بنی اسرائیل کے سلسلے میں جبل طور سے مراد جبل سینا ہوتا ہے لیکن خود جبل سینا کی ایک چوٹی نہیں متعدد چوٹیاں ہیں۔ انہیں میں سے کسی کا نام طور ہے۔ پہاڑ کے ہلانے یا بلند کرنے سے کیا مراد ہے؟ تورات میں اس کی اجمالی تصویر پیش کی گئی ہے۔

> وہ پہاڑ کے نیچے آ کھڑے ہوئے اور کوہ سینا پر زیر و بالا دھواں تھا، کیونکہ خداوند شعلہ میں ہو کر اترا اور رستور کا سا دھواں اس پر اٹھا اور پہاڑ سراسر ہل گیا۔
> (خروج ۱۹-۱۷-۱۸)

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور تالمود جو تورات کی مشہور مستند اور نہایت ضخیم شرح یہود کے ہاں موجود ہے اس میں اس اجمال کی شرح اس طرح کی گئی ہے ،

حق تبارک و تعالیٰ نے ان کے اوپر کوہ سینا کو اُلٹ دیا جس طرح کوئی بڑا برتن الٹا جاتا ہے اور کہا کہ اگر تم تورات قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ سب یہیں دفن ہو کر رہ جاؤ گے ۔
(جیوز انسائیکلو پیڈیا)

اسی میں ہے کہ :

خدا نے پہاڑ کو ان لوگوں پر اُلٹ کر اوندھا کر دیا اور ان سے کہا کہ تورات کو اگر قبول کرتے ہو جب تو خیر ورنہ یہیں تمہارا مدفن بن کر رہے گا ۔
(جیوز انسائیکلو پیڈیا)

اس طرح اللہ سبحانہ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا اور عہد لیتے ہوئے خارج میں ایسا ماحول پیدا کر دیا جس سے انہیں خدا کے جلال اور اس کی عظمت و برتری اور اللہ سے عہد کی اہمیت کا پورا پورا احساس ہو اور وہ اس شہنشاہ کائنات کے ساتھ عہد استوار کرنے کو کوئی معمولی سی بات نہ سمجھیں ۔
ہمارے شارحین قرآن نے جو آثار صحابہ و تابعین سے نقل کیے ہیں ان میں بھی تورات و تالمود سے ملتی جلتی روایات ہیں ۔
یہاں اس سوال کی اہمیت کو بہت زیادہ محسوس کیا گیا ہے کہ یہ انداز عہد قرآن کے مشہور نظریہ لااکراہ فی الدین کے خلاف ہے اس کے اہل علم نے قرآن کی تشریح کرتے ہوئے مفید جوابات دیے ہیں ۔

حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں :

اور کسی کو یہاں یہ شبہ نہ ہو کہ دین میں اکراہ نہیں ہے یہاں اکراہ کیسے کیا گیا ہے جواب نہایت واضح ہے کہ دین میں اکراہ نہ ہونے کے معنے یہ ہیں کہ ابتداءً قبول اسلام میں اکراہ نہیں یعنی عام کافروں پر یہ اکراہ نہ کریں گے کہ تو مسلمان ہو ورنہ تجھ کو مار ڈالیں گے ۔ اسی لیے جہاد میں ایک جزء یہ بھی ہے کہ اس کے قبول کرنے سے جہاد رک جاتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ مقصود بالجہاد قبول اسلام نہیں ہے بلکہ ایک مشترک بین الاسلام والجزیہ ہے اور وہ اطاعت قانون عدل شرعی ہے ۔ جو مومنین اور کفار کے حق میں عام ہے ۔ یہاں بنی اسرائیل پہلے بطوع و رغبت ایمان لا چکے تھے ایسے شخص کو ثبات علی الایمان اور بجا آوری احکام پر ضرور کہا جاتے گا جس کی نفی پر کوئی دلیل عقلی و نقلی قائم نہیں [1]

[1] بیان القرآن

مولانا مودودی فرماتے ہیں،

اس سے یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ وہ خدا کے ساتھ میثاق باندھنے پر آمادہ نہ تھے اور انہیں زبردستی خوفزدہ کر کے اس پر آمادہ کیا گیا۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ سب کے سب اہل ایمان تھے اور دامن کوہ میں میثاق باندھنے کے لیے گئے تھے مگر اللہ تعالیٰ نے معمولی طور پر ان سے عہد و قرار لینے کے بجائے مناسب جانا کہ اس عہد و اقرار کی اہمیت ان کو اچھی طرح محسوس کرا دی جائے تاکہ اقرار کرتے وقت انہیں یہ احساس رہے کہ وہ کس قادر مطلق ہستی سے اقرار کر رہے ہیں [1]

مزید تفصیل کے لیے جلد اول معالم العرفان کا نوٹ نمبر ۱۴، ملاحظہ فرمائیے۔

---

[1] تفہیم القرآن

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْۢ بَنِيْٓ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَ
اَشْهَدَهُمْ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ ۚ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ ۗ قَالُوْا بَلٰى ۛ شَهِدْنَا ۛ
اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ ﴿١٧٢﴾ اَوْ
تَقُوْلُوْٓا اِنَّمَآ اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْۢ
بَعْدِهِمْ ۚ اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ ﴿١٧٣﴾ وَكَذٰلِكَ
نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ ﴿١٧٤﴾

اور اے پیغمبر لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نسل کو نکالا تھا[۲۲۵]۔ اور انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوتے پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، انہوں نے کہا ضرور آپ ہی ہمارے رب ہیں، ہم اس پر گواہی دیتے ہیں[۲۲۶]۔ یہ ہم نے اس لیے کیا کہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہہ دو کہ ہم تو اس بات سے بے خبر تھے یا یہ کہو کہ شرک

کی ابتدا۔ تو ہمارے باپ دادا نے ہم سے پہلے کی تھی اور ہم بعد کو ان کی نسل میں پیدا ہوئے پھر کیا ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہو جو غلط کار لوگوں نے کیا تھا، دیکھو ایسے ہی ہم کھول کر نشانیاں پیش کرتے ہیں۔[۲۲۸]

معانی مفردات

من ظھورھم: ترکیب میں بنی آدم سے بدل واقع ہے اور اس کے بدل لانے سے یہ جتانا مقصود ہے کہ بنی آدم سے متعلق جو علمی حقیقت یہاں بیان ہو رہی ہے وہ خاص دور کے بنی آدم سے متعلق نہیں بلکہ قیامت آنے تک پیدا ہونے والے انسانوں سے ہے۔ یہاں بنی آدم کی پشتوں سے بنی آدم کی اولاد کا نکالنا ذکر کیا ہے اور حضرت آدم کا ذکر نہیں کیا۔ کیونکہ یہ بات سب کو معلوم ہے کہ آدم علیہ السلام سب کے باپ ہیں اور سب ان ہی کی پشت سے نکلے ہیں۔ مسند احمد، نسائی، اور مستدرک حاکم میں عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی ذریت کو اور سامنے بکھیر دیا جیسے چیونٹیاں اور پھر ان سے کلام کیا الست بربکم؟ سب نے جواب میں بلیٰ کہا (ابن کثیر ج ۲ ص ۲۶۱)

ذریتھم:۔ اولاد، اصل میں چھوٹے چھوٹے بچوں کا نام ذریت ہے مگر عرف میں چھوٹی بڑی اولاد کے لیے یہ لفظ استعمال ہوتا ہے اور اگرچہ اصل میں یہ لفظ جمع ہے مگر واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے۔ شھدنا:۔ ہم نے اقرار کیا، ہم نے بیان کیا ہم موجود تھے، ہم نے دیکھا شہود اور شہادت سے ماضی کا صیغہ ہے۔ راغب نے لکھا ہے کہ کبھی شہادت سے اقرار کرنا بھی مراد ہوتا ہے۔ بلیٰ:۔ ہاں، الف اس میں اصلی ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ زائد ہے۔ کچھ کہتے ہیں تانیث کے لیے ہے۔ بلیٰ کا استعمال دو طرح ہوتا ہے ایک تو نفی ما قبل کی تردید کے لیے جیسے "بلیٰ وربی لتبعثن"، دوسرے یہ کہ اس استفہام کے جواب میں جو نفی پر مشتمل ہو جیسے "الیس زید لقائم"

جواب میں کہا جائے گا بلی یا استفہام توبیخی جیسے ایحسب الانسان ان نجمع عظامہ بلی قادرین علی ان نسوی بنانہ ؟ اور یا استفہام تقریری ہو جیسے الست بربکم قالوا بلی و شہدنا - بلی اور نعم میں یہ فرق ہے کہ نعم استفہام مجرد کے جواب میں آتا ہے اور بلی بالاتفاق ایجاب کے جواب میں نہیں آتا بلکہ اس استفہام کے جواب میں آتا ہے جو متقرنی بنفی ہو، نیز بلی ابطال نفی کے لیے آتا ہے اور نعم تصدیق ماقبل کے لیے ان تقولوا میں ان سے پہلے کراہتہ یا اس کے ہم معنے کوئی لفظ محذوف ہے اس وجہ سے اس کا ترجمہ یہ ہوگا کہ تم یہ نہ کہو یا مبادا تم قیامت کے دن عذر کرو۔ اس سے یہ بات مترشح ہوتی ہے کہ توحید کے بارے میں روزِ قیامت مواخذہ ہر شخص سے صرف اس اقرار کی بنا پر ہوگا جو آیت میں مذکور ہے چاہے اس کو نبوت کی دعوت پہنچی یا نہیں ۔

ازل میں پوری اولادِ آدم کا اقرار

بنی اسرائیل کے خصوصی میثاق کے بعد اس عہدِ فطرت کی یاددہانی کی ہے جو تمام بنی آدم سے اللہ سبحانہ اپنی توحیدِ ربوبیت کا لیا ہے ۔ اس طرح روئے سخن بنی اسرائیل سے ہٹ کر عام انسانوں کی طرف ہو گیا ہے ۔ بتایا جا رہا ہے کہ بنی اسرائیل کی خصوصیت نہیں بلکہ فی الواقع تم سب اپنے خالق کے ساتھ ایک میثاق میں بندھے ہوئے ہو اور تمہیں ایک روز جوابدہی کرنی ہے کہ تم نے اس میثاق کی کہاں تک پابندی کی ہے ۔ جیساکہ متعدد احادیث سے معلوم ہوا ہے کہ یہ معاملہ تخلیقِ آدم کے موقعہ پر پیش آیا تھا ۔ اُس وقت جس طرح فرشتوں کو جمع کر کے انسان اول کو سجدہ کرایا گیا تھا اور زمین پر انسان کی خلافت کا اعلان کیا گیا تھا ۔ اسی طرح پوری نسلِ آدم کو بھی جو قیامت تک پیدا ہونے والی تھی ۔ اللہ تعالیٰ نے بیک وقت وجود اور شعور عطا فرما کر اپنے سامنے حاضر کیا تھا اور ان سے اپنی ربوبیت کی شہادت لی تھی ۔ حافظ ابن کثیر نے اس واقعہ کی تشریح میں عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن عمرو، عمر بن الخطاب، ابوہریرہ، ہشام بن حکیم، ابوامامہ، ابی بن کعب سے متعدد روایات نقل کی ہیں لیکن اس واقعہ کی تشریح میں حضرت ابی بن کعب نے جو کچھ بیان کیا ہے وہ اس موضوع کی جان ہے ۔ وہ فرماتے ہیں کہ ۔ اللہ تعالیٰ نے سب کو جمع کیا اور لوگوں کو الگ الگ گروہوں کی شکل میں مرتب کر کے انہیں انسانی صورت میں گویائی کی طاقت دی ۔ پھر ان سے عہد و میثاق لیا اور انہیں آپ اپنے پر گواہ بناتے ہوئے پوچھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں ؟ انہوں نے عرض کیا

کہ بے شک آپ ہمارے رب ہیں تب اللہ سبحانہ نے فرمایا میں تم پر زمین و آسمان سب کو اور خود تمہارے باپ آدم کو گواہ ٹھہراتا ہوں تاکہ تم قیامت کے روز یہ نہ کہو کہ ہم کو اس کا علم نہ تھا۔ خوب جان لو کہ میرے سوا کوئی مستحق عبادت نہیں ہے اور میرے سوا کوئی رب نہیں ہے تم میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرانا، میں تمہارے پاس اپنے پیغمبر روانہ کروں گا جو تم کو یہ عہد و میثاق جو تم میرے ساتھ باندھ رہے ہو یاد دلائیں گے اور تم پر اپنی کتابیں بھی نازل کروں گا۔ اس پر سب انسانوں نے کہا کہ ہم گواہ ہوئے۔ آپ ہی ہمارے رب اور آپ ہی ہمارے معبود ہیں آپ کے سوا نہ کوئی ہمارا رب ہے نہ کوئی معبود۔

اس واقعہ کو کچھ لوگ واقعہ نہیں بلکہ محض تمثیل کہتے ہیں۔ ان کا خیال یہ ہے کہ دراصل اللہ سبحانہٗ ان آیات میں یہ بات ذہن نشین کرانا چاہتا ہے کہ اگر انسان اپنی فطرت اور اپنی تخلیق کے عجائب اور اپنی صفت کے عراتب پر نظر کرے جو خود اس کے اندر موجود ہیں تو اس کو معلوم ہو جاتے کہ یہ سب چیزیں خدا تعالیٰ کی ربوبیت اور وحدانیت پر گواہ ہیں۔ یہ تشریح معتزلہ اور مدعیان عقل نے کی پیش کی ہے لیکن یہ تاویل درست نہیں۔ قرآن و حدیث اور صحابہ کرام اسے بالکل ایک واقعہ کی حیثیت سے پیش کرتے ہیں اور صرف واقعہ ہی بیان نہیں کیا بلکہ یہ بھی اللہ سبحانہٗ نے بتایا کہ روز قیامت بنی آدم پر حجت قائم کرتے ہوئے اس ازلی عہد و اقرار کو سند میں پیش کیا جائے گا۔ لہٰذا اس خیال کی جو معتزلہ پیش کرتے ہیں، قرآن و حدیث، اجماع صحابہ و تابعین کے مقابلہ میں کوئی حقیقت نہیں ہے۔ آیات کی تشریح سے پہلے واقعہ کے بارے میں حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی کا مفید اور جامع تبصرہ گوش گزار فرما لیجئے:

میثاق خاص کے بعد یہاں سے میثاق عام کا ذکر کرتے ہیں۔ تمام عقائد حقہ اور ادیان سماویہ کا بنیادی پتھر یہ ہے کہ انسان خدا کی ہستی اور ربوبیت عامہ پر اعتقاد رکھے مذہب کی ساری عمارت اسی سنگ بنیاد پر کھڑی ہے جب تک یہ اعتقاد نہ ہو مذہبی میدان میں عقل و فکر کی رہنمائی اور انبیاء و مرسلین کی ہدایات کچھ نفع نہیں پہنچا سکتیں۔ اگر پورے غور و تامل سے دیکھا جائے تو آسمانی مذہب کے تمام اصول و فروع بالآخر خدا کی ربوبیت عامہ تو اسی عقیدے پر منتہی ہوتے بلکہ اسی کی تہ میں چھپے ہوتے ہیں۔ عقل سلیم اور وحی و الہام اسی اجمال کی شرح کرتے ہیں لہٰذا ضروری تھا کہ یہ تخم ہدایت جسے کل آسمانی تعلیمات کا مبداء و منتہی اور تمام ہدایات ربانیہ کا وجود مجمل کہنا چاہیے عام فیاضی کے ساتھ نوع انسانی کے تمام افراد میں بکھیر دیا جائے تاکہ ہر آدمی عقل و فہم اور وحی و الہام کی آبیاری سے اس تخم کو شجر ایمان و توحید کے درجہ تک پہنچا سکے۔ اگر قدرت کی طرف سے قلوب

بنی آدم میں ابتداءً یہ تخم ریزی نہ ہوتی اور اس سب سے زیادہ اساسی وجوہری عقیدہ کا حل ناخن عقل وفکر کے سپرد کر دیا جاتا تو یقیناً یہ مسئلہ بھی منطقی استدلال کی بھول بھلیاں میں پھنس کر ایک نظری مسئلہ بن جاتا، جس پر سب تو کیا اکثر آدمی بھی متفق نہ ہو سکتے جیسا کہ تجربہ بتلاتا ہے کہ فکر واستدلال کی ہنگامہ آرائیاں اکثر اتفاق سے زیادہ اختلاف آراء پر منتج ہوتی ہیں اس لیے قدرت نے جہاں غور وفکر کی قوت اور نور وحی والہام کے قبول کرنے کی استعداد بنی آدم میں ودیعت فرمائی دیں اس اساسی عقیدے کی تعلیم سے ان کو فطرۃً بہرہ ور کیا جس کے اجمال میں کل آسمانی ہدایات کی تفصیلات منطوی اور مندمج تھی اور جس کے بغیر مذہب کی عمارت کا کوئی ستون کھڑا نہیں رہ سکتا۔ یہ اس ازلی اور خدائی تعلیم کا اثر ہے کہ آدم کی اولاد ہر قرن میں اور ہر جگہ حق تعالیٰ کی ربوبیت عامہ کے عقیدے پر کسی نہ کسی حد تک متفق رہی ہے اور جن معدود افراد نے کسی عقلی وروحی بیماری کی وجہ سے اس عام فطری احساس کے خلاف آواز اٹھائی ہے وہ انجام کار دنیا کے سامنے بلکہ خود اپنی نظر میں بھی، اسی طرح جھوٹے ثابت ہوتے جیسے ایک بخار وغیرہ کا مریض لذیذ اور خوشگوار غذاؤں کو تلخ وبدمزہ بتلانے میں جھوٹا ثابت ہوتا ہے۔ بہر حال ابتدائے آفرینش سے آج تک ہر درجہ اور طبقہ کے انسانوں کا خدا کی ربوبیت کبریٰ پر عام اتفاق واجماع اس کی زبردست دلیل ہے کہ یہ عقیدہ عقول وافکار کی دوادوش سے پہلے ہی فاطر السماوات کی طرف سے اولاد آدم کو بلا واسطہ تلقین فرما دیا گیا، ورنہ فکر واستدلال کے راستہ سے ایسا اتفاق پیدا ہونا تقریباً ناممکن تھا۔ قرآن حکیم کی یہ امتیازی خصوصیت ہے کہ اس نے ان آیات میں عقیدہ کی اس فطری یکسانیت کے اصلی راز پر روشنی ڈالی ہے[1]

۲۲۵۔ اور اے پیغمبر لوگوں کو یاد دلاؤ وہ وقت جبکہ تمہارے رب نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کو نکالا تھا۔ عربی زبان میں اذ کے ذریعے کسی ایسے امر واقعی کی یاد دہانی کرائی جاتی ہے جو متکلم کے نزدیک ایک حقیقت ہو۔ اس بنا پر یہ حقیقت ہے کہ جس واقعہ کا یہاں ذکر ہو رہا ہے وہ بالکل اسی طرح پیش آیا تھا جس طرح عالم خارجی میں واقعات پیش آیا کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فی الواقع ان تمام انسانوں کو جنہیں قیامت تک پیدا کرنے والا تھا بیک وقت زندگی اور شعور دے کر اپنے سامنے حاضر کیا اور فی الواقع انہیں اس حقیقت سے آگاہ کیا کہ ان کا کوئی رب اللہ کے سوا نہیں۔ اس اجتماع کو اگر کوئی بعید از عقل سمجھتا ہے تو یہ محض اس کے دائرۂ فکر کی تنگی ہے ورنہ حقیقت میں تو نسل انسانی کی

[1] افادات شیخ الاسلام

موجودہ تدریجی پیدائش جتنی قریب از امکان ہے، اتنا ہی ازل میں ان کا مجموعی ظہور اور ابد میں ان کا مجموعی حشر و نشر بھی قریب از امکان ہے۔ پھر یہ بات نہایت معقول معلوم ہوتی ہے کہ انسان جیسی صاحبِ عقل و شعور اور صاحبِ تصرف و اختیارات مخلوق کو زمین پر بحیثیت خلیفہ مامور کرتے وقت اللہ تعالیٰ اسے حقیقت بخشے اور اس سے اپنی وفاداری کا اقرار لے۔ اس معاملہ کا پیش آنا قابلِ تعجب نہیں، البتہ اگر یہ واقعہ پیش نہ آتا تو ضرور حیرت ہوتی۔

اس سے پہلے بنی اسرائیل کے میثاق کا ذکر تھا اس پر یہ سوال ہو سکتا تھا کہ اسرائیلی میثاق دُنیا کی غیر اسرائیلی آبادی کے لیے کیوں کر حجت ہو سکتا ہے۔ اب یہ بیان ہو رہا ہے کہ توحید کا عہد تو ساری نسلِ انسانی سے لیا جا چکا ہے اور توحید شناسی، توحید پرستی انسان کی فطرت میں راسخ ہو چکی ہے اور بشر کی سرشت میں رچی جا چکی ہے۔ فطرت اگر مسخ ہو چکی ہے تو ایک خالق و رازق و مربی کا اعتراف ہر فطرتِ سلیم کا جزو ہے۔

اللہ کی ربوبیّت کا عہد

۲۲۶ - انہیں خود ان کے اوپر گواہ بناتے ہوتے پوچھا تھا کہ کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، انہوں نے کہا کہ ضرور تو ہمارا رب ہے ہم اس پر گواہ ہیں۔ اس میں اس حقیقت کا اعلان ہے کہ خدا کی ہستی کا اعتقاد انسان کی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے اور فطرتِ انسانی کی اصلی آواز ہے یعنی تصدیق ہے انکار نہیں ہے۔ یہ اقرار صرف اس بات کا نہیں لیا گیا کہ وہ اللہ ہے بلکہ اس بات کا لیا گیا ہے کہ اللہ ہی رب ہے یہ بات دھیان میں رکھنی اس لیے ضروری ہے کہ اہلِ عرب کو اللہ کے اللہ ہونے سے انکار نہیں تھا لیکن رب انہوں نے اللہ کے سوا اور بھی بنا لیے تھے حالانکہ عہد الست میں صرف اللہ کی ربوبیّت کا اقرار ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اس کی تشریح اس طرح فرمائی ہے:

> اللہ تعالیٰ بتا رہا ہے کہ اللہ نے اولادِ آدم کی تمام ذریّت کو ان کی پیٹھوں سے نکال کر ان سے عہد لیا اور اقرار کرایا کہ اللہ ہی ان کا رب اور ان کا بادشاہ ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جیسا کہ اللہ تعالیٰ نے بھی بات ان کی فطرت میں ودیعت کی ہے۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر یہ واقعہ اور حقیقت ہے کہ کیا عالمِ غیب کے کسی ایسے واقعہ کی یادداشت

انسانی ذہن میں محفوظ ہے اگر نہیں ہے تو یہ کیسے باور کیا جائے کہ انسان نے اس طرح کا کوئی اقرار کیا ہے یا اس قسم کا کوئی واقعہ ہوا ہے۔

شارحین قرآن نے اس کے متعدد جوابات دیے ہیں۔ مثلاً حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی فرماتے ہیں :

بلا شبہ ہم کو یاد نہیں کہ اس بنیاد کی تعلیم کب اور کہاں اور کس ماحول میں دی گئی ہے تاہم جس طرح ایک لیکچرار اور انشاء پرداز کو یقین ہے کہ ضرور اس کو ابتدائے عمر میں کسی نے الفاظ بولنے سکھائے جس سے ترقی کر کے آج اس رتبہ کو پہنچا گو پہلا لفظ سکھلانے والا اور سکھلانے کا وقت مکان اور دیگر خصوصیات مکانی بلکہ نفس سکھلانا بھی یاد نہیں۔ تاہم اس کے موجودہ آثار سے یقین ہے کہ ایسا واقعہ ضرور ہوا ہے۔ اسی طرح بنی نوع انسان کا علی اختلاف الاقوام والاجیال "عقیدہ ربوبیت" پر متفق ہونا اس کی کھلی شہادت ہے کہ یہ چیز بدفطرت میں کسی معلم کے ذریعے ان تک پہنچی ہے باقی تعلیمی خصوصیات و احوال کا محفوظ نہ رہ سکنا اس کی تسلیم میں خلل انداز نہیں ہو سکتا۔ اسی ازلی فطری تعلیم نے جس کا نمایاں اثر آج تک انسانی سرشت میں موجود چلا آتا ہے ہر انسان کو خدا کی حجت کے سامنے ملزم کر دیا ہے جو شخص اپنے الحاد و شرک کو حق بجانب قرار دینے کے لیے غفلت و بے خبری یا آباؤ اجداد کی کورانہ تقلید کا عذر کرتا ہے اس کے مقابلے پر خدا کی یہی حجت قاطعہ جس میں اصل فطرت انسانی کی طرف توجہ دلائی گئی ہے بطور فیصلہ کن جواب کے پیش کی جا سکتی ہے۔[1]

حضرت مولانا محمد ادریس فرماتے ہیں کہ :

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ وہ عہد تو یاد نہیں ہے تو پھر کیا حاصل تو اس کو یوں سمجھئے کہ وہ عہد اگرچہ یاد نہیں رہا مگر اس کا نشان تو ہر دل میں موجود ہے۔ انسان کے دل میں قدرتی طور پر حق تعالیٰ کی طرف ایک میلان پایا جاتا ہے جب کبھی کوئی پریشانی پیش آتی ہے تو دل خدا کی طرف دوڑتا ہے اور اس سے اس مصیبت کے دفعیہ کا طلبگار اور امیدوار ہوتا ہے۔ انسان کا دل خود اندر سے گواہی دیتا ہے کہ کوئی میرا پروردگار ضرور ہے۔ بہر حال یہ میلان تمام طبیعتوں میں پایا جاتا ہے، کسی میں کم اور کسی میں زیادہ، خواہ وہ اس میلان کے منشا کو سمجھے یا نہ سمجھے اور اس کے تقاضے پر عمل پیرا ہو یا نہ ہو۔ رہی یہ بات کہ اس طبعی اور فطری میلان کا سرچشمہ اور منشا کیا ہے؟ سو معلوم یوں ہوتا ہے کہ اس پیدائش سے پہلے انسان کو جناب باری تعالیٰ کی کسی قسم کی تجلی ضرور

[1] افادات شیخ الاسلام

میسر آئی ہے جس کے نتیجہ میں انسان کے دل میں خدا کی محبت اس قدر جاگزین ہو گئی ہے کہ صدہا تکالیف کے باوجود خدا ہی کی طرف جھکتا ہے۔ یہ طبعی میلان میثاق کی ایک ظاہری علامت ہے۔ تمام افراد انسانی کا اقرار ربوبیت پر متفق ہونا اور یقین کے ساتھ اتفاق کرنا کہ ہمارا کوئی پروردگار ہے۔ اسی پرانے میثاق کا دھندلا سا خاکہ ہے جو ایک لمحہ یا ایک گھڑی کے لیے پیش آیا۔ لمحہ میں ہونے والا واقعہ اور زمانہ اور انتقال مکان سے کوزہ ذہن سے اتر جائے یہ کوئی مستبعد بات نہیں ہے۔ الغرض تمام عالمِ انسانی کا اس میلان پر متفق ہونا اس بات کی علامت ہے کہ کبھی نہ کبھی یہ بات کان میں پڑی ہے۔ مکان اور زمان اگرچہ یاد نہیں مگر اس کا نشان موجود ہے، مرور زمانہ کی وجہ سے یہ وقت یاد نہیں رہا کیونکہ اس وقت چھوٹے چھوٹے ذرات کی صورت میں تھی اس وقت سے لے کر توالد و تناسل میں ایک طویل عرصہ گزرا اور ذرات مختلف اطوار اور ادوار سے گزرتے رہے یہاں تک کہ اس عالم فانی میں داخل ہوئے۔[1]

مولانا اصلاحی فرماتے ہیں کہ :

جہاں تک اس اقرار کا تعلق ہے وہ ہر انسان کی فطرت کے اندر موجود ہے۔ رہا اس کا موقع و محل اور اس کی تاریخ تو وہ اگر یاد نہیں رہی تو اس سے نفس اقرار کی صحت و صداقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ زیادہ سے زیادہ کوئی شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اقرار تو مجھے یاد ہے البتہ اس کا موقع و محل یاد نہیں ہے سو اللہ تعالیٰ نے اس کا موقعہ و محل بتا دیا کہ یہ اقرار انسان کے وجود میں آنے سے پہلے ہی عالم غیب میں خدا نے انسان سے لیا ہے اور یہ بات خدا ہی بتا سکتا تھا اس لیے کہ غیب کا علم صرف اسی کے پاس ہے۔ انسان پر حجت قائم ہونے کے لیے یہ امر کافی ہے کہ اس اقرار کی یادداشت اس کے اندر موجود ہے۔[2]

اس کا جواب یہ ہے کہ اگر اس میثاق کا نقش انسان کے شعور اور حافظہ میں تازہ رہنے دیا جاتا تو انسان کا دنیا کی موجودہ امتحان گاہ میں بھیجا جانا سرے سے فضول ہو جاتا، کیونکہ اس کے بعد تو اس آزمائش اور امتحان کے کوئی معنی ہی باقی نہ رہ جاتے، لہٰذا اس نقش کو شعور و حافظہ میں تو تازہ نہیں رکھا گیا لیکن وہ تحت الشعور اور وجدان میں یقیناً محفوظ ہے، اس کا حال وہی ہے جو ہمارے تمام دوسرے تحت الشعوری اور وجدانی علوم کا حال ہے، تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاملات کے تمام شعبوں

---

[1] معارف م [2] تدبر قرآن

میں انسان سے آج تک جو کچھ بھی ظہور میں آیا وہ سب درحقیقت انسان کے اندر بالقوۃ موجود تھا۔ خارجی محرکات اور داخلی تحریکات نے مل جل کر اگر کچھ کیا ہے تو صرف اتنا کہ جو کچھ بالقوۃ تھا اُسے بالفعل کر دیا۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ کوئی تعلیم، کوئی تربیت، کوئی ماحولی تاثیر، اور کوئی داخلی تحریک، انسان کے اندر کوئی چیز بھی، جو اس کے اندر بالقوۃ موجود نہ ہو، ہرگز پیدا نہیں کر سکتی، اور اسی طرح یہ سب مؤثرات اگر اپنا تمام زور بھی صرف کر دیں تو ان میں یہ طاقت نہیں ہے کہ اُن چیزوں میں سے جو انسان کے اندر بالقوۃ موجود ہیں، کسی چیز کو قطعی محو کر دیں۔ زیادہ سے زیادہ جو کچھ وہ کر سکتے ہیں وہ صرف یہ ہے کہ اُسے اصل فطرت سے منحرف کر دیں۔ لیکن وہ چیز تمام تحریفات و تمسیخات کے باوجود اندر موجود رہے گی، ظہور میں آنے کے لیے زور لگاتی رہے گی، اور خارجی اپیل کا جواب دینے کے لیے مستعد رہے گی، یہ معاملہ جیسا کہ ہم نے ابھی بیان کیا، ہمارے تمام تحت الشعوری اور وجدانی علوم کے ساتھ عام ہے۔ وہ سب ہمارے اندر بالقوۃ موجود ہیں، اور ان کے موجود ہونے کا یقینی ثبوت اُن چیزوں سے ہمیں ملتا ہے جو بالفعل ہم سے ظاہر ہوتی ہیں۔

ان سب کے ظہور میں آنے کے لیے خارجی تذکیر (یاد دہانی) تعلیم و تربیت اور تشکیل کی ضرورت ہوتی ہے اور جو کچھ ہم سے ظاہر ہوتا ہے وہ گویا درحقیقت خارجی اپیل کا وہ جواب ہے جو ہمارے اندر کی بالقوۃ موجودات کی طرف سے ملتا ہے۔ ان سب کو اندر کی غلط خواہشات اور باہر کی غلط تاثیرات دبا کر یا پردہ ڈال کر منحرف اور مسخ کر کے کالعدم کر سکتی ہیں مگر بالکل معدوم نہیں کر سکتیں، اور اسی لیے اندرونی احساس اور بیرونی سعی دونوں سے اصلاح اور تبدیلی ممکن ہوتی ہے۔

ٹھیک ٹھیک یہی کیفیت اس وجدانی علم کی بھی ہے جو ہمیں کائنات میں اپنی حقیقی حیثیت اور خالق کائنات کے ساتھ اپنے تعلق کے بارے میں حاصل ہے۔

اس کے موجود ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ وہ انسانی زندگی کے ہر دور میں، زمین کے ہر خطہ میں، ہر بستی میں، ہر پشت اور ہر نسل میں اُبھرتا رہا ہے اور کبھی دُنیا کی کوئی طاقت اُسے محو کر دینے میں کامیاب نہیں ہو سکی ہے۔ اس کے مطابق حقیقت ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ جب کبھی وہ اُبھر کر بالفعل ہماری زندگی میں کارفرما ہوا ہے اس نے صالح اور مفید نتائج ہی پیدا کیے ہیں۔

اس کو اُبھرنے اور ظہور میں آنے اور عملی صورت اختیار کرنے کے لیے ایک خارجی اپیل کی ہمیشہ ضرورت رہی ہے۔ چنانچہ انبیاء علیہم السلام اور کتب آسمانی اور ان کی پیروی کرنے والے داعیانِ حق سب کے سب یہی خدمت انجام دیتے رہے ہیں، اسی لیے اس کو قرآن میں مذکر (یاد دلانے والے) ذکر (یاد) تذکرہ (یادداشت) اور ان کے کام کو تذکیر (یاد دہانی) کے الفاظ سے تعبیر کیا گیا ہے جس کے معنی

یہ ہیں کہ انبیاء اور کتابیں اور داعیانِ حق انسان کے اندر کوئی نئی چیز پیدا نہیں کرتے بلکہ اُسی چیز کو اُبھارتے اور تازہ کرتے ہیں، جو ان کے اندر پہلے سے موجود تھی۔

نفسِ انسانی کی طرف سے ہر زمانہ میں اس تذکیر کا جواب بصورت لبیک ملنا اس بات کا مزید ایک ثبوت ہے کہ اندر فی الواقع کوئی علم چھپا ہوا تھا جو اپنے پکارنے والے کی آواز پہچان کر جواب دینے کے لیے اُبھر آیا، پھر اُسے جہالت اور جاہلیت اور خواہشاتِ نفس اور تعصبات اور شیاطین جن وانس کی گمراہ کن تعلیمات وترغیبات نے ہمیشہ دبانے اور چھپانے اور منحرف اور مسخ کرنے کی کوشش کی ہے جس کے نتیجے میں شرک، دہریت، الحاد، زندقہ اور اخلاقی اور عملی فساد رونما ہوتا رہا ہے لیکن ضلالت کی ان ساری طاقتوں کے متحدہ عمل کے باوجود اس علم کا پیدائشی نقش انسان کی لوحِ دل پر کسی نہ کسی حد تک موجود رہا ہے اور اسی لیے تذکیر وتجدید کی کوشش اُسے اُبھارنے میں کامیاب ہوتی رہی ہیں۔

بلاشبہ دُنیا کی موجودہ زندگی میں جو لوگ حق اور حقیقت کے انکار پر مصر ہیں وہ اپنی حجت بازیوں سے اس پیدائشی نقش کے وجود کا انکار تو کر سکتے ہیں یا کم از کم اسے مشتبہ ثابت کر سکتے ہیں۔ لیکن جس روز یوم الحساب برپا ہوگا اس روز ان کا خالق ان کے شعور وحافظہ میں روزِ ازل کے اُس اجتماع کی یاد تازہ کر دے گا جبکہ انہوں نے اس کو اپنا واحد معبود اور واحد رب تسلیم کیا تھا۔ پھر وہ اس بات کا ثبوت بھی ان کے اپنے نفس ہی سے فراہم کر دے گا کہ اس میثاق کا نقش ان کے نفس میں برابر موجود رہا۔ اور یہ بھی وہ ان کی اپنی زندگی ہی کے ریکارڈ سے علی رؤس الاشہاد دکھا دے گا کہ انہوں نے کس کس طرح اس نقش کو دبایا، کب کب اور کن کن مواقع پر ان کے قلب سے تصدیق کی آوازیں اُٹھیں، اپنی اور اپنے گرد وپیش کی گمراہیوں پر ان کے وجدان نے کہاں کہاں اور کس کس وقت صدائے انکار بلند کی، داعیانِ حق کی دعوت کا جواب دینے کے لیے ان کے اندر کا چھپا ہوا علم کتنی کتنی مرتبہ اور کس کس جگہ اُبھرنے پر آمادہ ہوا، اور پھر وہ اپنے تعصبات اور اپنی خواہشاتِ نفس کی بنا پر کیسے کیسے حیلوں اور بہانوں سے اس کو فریب دیتے اور خاموش کرتے رہے۔ وہ وقت جبکہ یہ سارے راز فاش ہوں گے، حجت بازیوں کا نہ ہوگا بلکہ صاف صاف اقرارِ جرم کا ہوگا، اسی لیے قرآن مجید کہتا ہے کہ اس وقت مجرمین یہ نہیں کہیں گے کہ ہم جاہل تھے، بلکہ یہ کہنے پر مجبور ہوں گے کہ ہم کافر تھے، یعنی ہم نے جان بوجھ کر حق کا انکار کیا۔

وشھدوا علی انفسھم انھم کانوا کافرین (الانعام ۱۳۰)

آیت کی دو تشریحیں

شارحین قرآن نے اس آیت کی دو طرح تشریح کی ہے۔ ایک تفسیر دوسرے تاویل۔ تفسیر یہ ہے یہ واقعہ مبنی بر حقیقت ہے۔ فی الواقع اللہ سبحانہٗ نے ذریتِ آدم علیہ السلام سے یہ عہد لیا ہے۔ ابن الانباری رقمطراز ہیں کہ یہ اکابر اہل سنت کی بیان کردہ تفسیر ہے۔ تاویل یہ کہ آیت میں مجازی معنے مراد ہیں اور کلام بطریقِ تمثیل ہے۔ یہ بات علامہ زمخشری نے کشاف میں لکھی ہے لیکن اہل السنۃ میں سے حافظ ابن کثیر، قاضی بیضاوی، نسفی اور رازی کا میلان بھی اس طرف ہے۔ تفسیر تو واضح ہے اس میں کوئی پیچیدگی نہیں لیکن تاویل ذرا وضاحت طلب ہے اس لیے ہم کسی قدر تاویل کی وضاحت کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ ذریت کے نکالنے سے ازل میں نکالنا مراد نہیں بلکہ یہی تدریجی یکے بعد دیگرے پیدائش مراد ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی ذریات کو اس طرح پیدا کیا کہ آباء کی پشت میں نطفہ بنایا۔ نطفہ نے ماؤں کے رحم میں قرار پکڑا پھر تدریجی ترقی سے انسان عالمِ شہادت میں آیا۔ اقرارِ ربوبیت اور شہادت سے مراد شہادت حال اور اقرار عقل ہے۔ انسان کی تخلیق اس طور پر ہوئی کہ اس کی فطرت اللہ کی ربوبیت کی بزبانِ حال شاہد ہے۔ قول سے مراد زبان فطرت اور دلالتِ حال ہے۔

آیت کا تفسیری مطلب جسے اکابر اہل السنہ نے پیش کیا ہے یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے آدم کی پشت سے تمام اولاد کو نکالا جو چیونٹیوں کی طرح نکل پڑے پھر ان کو عقل و گویائی عطا کر کے فرمایا الست بربکم ؟ سب نے جواب دیا ہاں آپ ہمارے رب ہیں ہم اس کا اقرار کرتے ہیں۔

آیت کا تاویلی مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی آدم کی پشتوں سے ان کی ذریت اس طرح نکالی کہ پہلے وہ آباء کی پشت میں بشکل نطفہ تھے، پھر ماؤں کے رحم میں آتے، پھر علقہ بنے پھر مضغہ ہوتے پھر مکمل انسان ہوتے۔ پھر ان کو عقل و ہوش عطا ہوا جس کی وجہ سے وہ اللہ کی مصنوعات میں غور و فکر کر کے اس کی وحدانیت پر دلائل پیش کرنے کے قابل ہوتے تو یہ تخلیق اور دلائل خدا کی طرف سے ایک عہد ہیں اور اس باب پر شہادت ہیں کہ اللہ کے سوا کوئی خالق و رب اور معبود نہیں ہے اور لوگوں کی حالت احتیاج و حدوث گویا اس عہد فطری کو قبول کرنا اور مان لینا ہے۔ خدا تعالیٰ کا دلائل پیدا کرنا گویا اقرار لینا ہے اور انسان کو موجودہ میں خلق کرنا گویا زبانِ حال سے اقرار لینا اور گواہ بنانا ہے۔ اس عہد کی رُو سے ہر عاقل توحید پر قائم رہنے کے لیے مامور ہے۔

اہل تاویل کے اعتراضات

۱۔ من ظہورھم بدل ہے بنی آدم سے۔ اس صورت میں معنے یہ ہوتے کہ اولادِ آدم کی پشتوں سے ان کی ذریت کو نکالا۔ ان سے عہد لیا نہ کہ آدم کی پشت سے نکال کر۔ اگر آدم کی پشت سے ذریت آدم کو نکالنا بتانا ہوتا تو تعبیر من ظہورھم نہیں بلکہ من ظہرہ کی ہوتی۔ کیونکہ آدم تنہا تھے۔ ان کی پشتیں نہیں بلکہ صرف ایک پشت تھی۔ اس کا جواب یہ دیا گیا ہے کہ مراد یہ ہے کہ سلسلہ وار تمام اولادِ آدم کی پشت سے ان کی ذریات کو نکالا جو قیامت تک پیدا ہونے والے تھے۔ مثلاً رشید عمر کی پشت سے عمر، حمید کی پشت سے مجید کو رفیق کی پشت سے اس طرح یہ سلسلہ حضرت آدم تک پہنچا کیونکہ سب کا مبدا حضرت آدم ہیں۔

۲۔ یہ بھی اعتراض کیا گیا ہے کہ عہد عاقل اور سمجھدار سے لیا جاتا ہے ظاہر ہے کہ اس عہد کے وقت اولادِ آدم کو ذی شعور اور عقل مند ہونا چاہیے مگر یہ خلافِ واقعہ ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ انسان فی الواقع نفس ناطقہ یا روح ہے۔ روح اگرچہ حادث ہے مگر تخلیقِ جسم سے بہت پہلی چیز ہے اور اس عالمِ محسوسات میں اس کا ادراک محسوسات کے ذریعہ سے ہوتا ہے لیکن عالمِ غیب میں آلات حسیہ کی چنداں ضرورت نہیں۔ تمام ارواح جواہر باقیہ ہیں اگر تمام اولادِ آدم کی روحیں ایک ہی وقت میں پیدا ہوئیں مگر دُنیا میں ترتیبی ظہور کے اعتبار سے آدم سب کا پیش خیمہ ہیں۔ اللہ نے جب آدم کو دُنیا میں بھیجا تو اُن کے ذریعے سے تمام نفوس و ارواح کو جو دُنیا میں ظاہر ہونے والے تھے۔ ان کی پشت سے ترتیب وار نکالا اور اس وقت ان کو عقل بھی عطا کی بلکہ اب تک وہ ذی عقل ہیں۔

۳۔ یہ بھی کہا گیا ہے کہ اولادِ آدم لامحدود ہیں پھر اس قدر اولادِ آدم اگر چیونٹی کیا ذرہ سے کم فرض کیا جاتے میں تب بھی آدم کی پشت سے نہیں نکل سکتے کیونکہ ان کے اجسام کا مجموعہ ایک پہاڑ ہونا چاہیے اور جو انسانی زندگی عالمِ مادی میں ہے اسے اگر ان ذرات کا عین قرار دیا جائے پھر بھی ممکن نہیں ہے کیونکہ عین ہونا تو بجائے خود رہا جزو ہونا بھی ممکن نہیں ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ چیونٹیوں کے مشابہ ہونے سے مراد ارواح کی تشبیہ بہ لحاظ اس حالت اجمالیہ کے ہے جو اس وقت ارواح کی تھی تفصیل مراد نہیں ہے اسی لیے یہ بھی آیا ہے کہ ان میں کچھ نورانی اور کچھ ظلماتی تھے۔ یعنی اہلِ سعادت کی روحیں روشن اور اہلِ شقاوت کی روحیں تاریک تھیں۔ اس ذریت آدم اجسام عنصریہ نہ تھی جن کا مجموعہ پہاڑ کے برابر ہو۔ نہ روح کوئی مادی عنصری چیز ہے بلکہ یہ محض ایک تشبیہ ہے۔

اور حالتِ اجمالیہ کا بیان مقصود ہے۔

اس موضوع پر حضرت مولانا اشرف علی نے بڑا بصیرت افروز تبصرہ کیا ہے، لیجئے وہ بھی گوش گزار فرمالیجئے۔ فرماتے ہیں :

ان آیتوں کی بھی تفسیر حدیثوں میں آئی اور یہی تمام اکابر سلف اہلِ حق سے منقول ہے اور اس میں جو اشکال عقلی و نقلی کیے گئے ہیں وہ سب لاشئی محض ہیں۔ ان میں سے جو ظاہر شبہ میں ڈال سکتے ہیں ان کو مع جواب کے ذکر کرتا ہوں۔

شبہ اول قرآن مجید میں من بنی آدم من ظهورهم آیا ہے اگر تفسیر مذکور مراد ہوتی تو من آدم من ظهره کا ہوتا جواب حدیث مرفوع میں مصرح ہے اخرج من صلبه كل ذرية ذرا ها فنثرها من يديه كالذر وكلمهم قبلا قال الست بربکم اخرجہ احمد والنسائی والحاکم وصححہ وغیرہم عن ابن عباس مرفوعاً بس حدیث سے تو اخراج من ظہر آدم اور قرآن سے اخراج من ظہور بنی آدم معلوم ہوا دونوں میں کوئی تعارض نہیں جیسا کہ آیت کی تفسیر میں دونوں کو جمع کر دیا ہے - اور اس وجہ سے جمع کی تائید دوسری روایات سے بھی آتی ہے۔ چنانچہ عبداللہ بن عمرو سے مروی ہے اخذ من ظهره اخرجہ ابن ابی شیبہ وعبد بن حمید وابن جریر وغیرہم، اور ابن عباس سے مروی ہے فهو ردهم فی اصلاب آباءهم حتی اخرجهم قرنا بعد قرن اخرجہ ابوالشیخ بلکہ روایت ثانیہ ہی اس باب میں کافی ہے کیونکہ رد کہتے ہیں عود الی الحالۃ الاولیٰ کو۔ معلوم ہوا کہ اخراج بھی اصلاب آباء سے ہوا تھا بس حدیث میں تو دونوں صورتیں مذکور ہوگئیں۔ رہا یہ کہ قرآن میں ایک ہی صورت کا کیوں ذکر ہے سو یا تو بنا بر غایت ظہور کے چھوڑ دیا کیونکہ جب یقیناً معلوم ہے کہ تمام ذریت نسل آدم سے ہے ہی بس خروج من صلبہ امر جلی و مشہور تھا اس لیے ذکر کی ضرورت نہ ہوئی جو جزو مخفی وغیرہ معلوم تھا اس کو بیان فرما دیا یا بنا پر اس کے کہ اخراج الذریۃ من ظہور بنی آدم مستلزم ہے اخراج ذریۂ آدم من ظہر آدم کو کیونکہ یہ ذریت بنی آدم بھی تو ظہر آدم ہی میں تھی۔ جب بنی آدم سے ذریت کا کسی بقعہ میں اخراج ہوا تو ظہر آدم سے خود ذریتِ آدم کا بھی تو لازمی طور پر اخراج ہوا، جیسے صندوق میں تھیلی ہو اور تھیلی میں روپیہ تو جب روپیہ تھیلی میں سے اس طرح نکالیں کہ نکلتے ہی بقعہ خارج عن الصندوق میں آجاتے اور ایسا خروج عن الصرہ مستلزم ہوگا خروج الصرہ عن الصندوق کو بھی اور قرآن میں لفظ اخذ کے ماضی ہونے سے اور حدیث شیخین میں ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کے اس لفظ سے قد اردت منك اهون من ذالك قد اخذت عليك فی ظهر ابيك آدم ان لا تشرك بی فابيت الا ان تشرك بی شيئاً ہے

اور بعض اہل باطن کے اس دعویٰ سے کہ ہم کو وہ یاد ہے جیسا کہ روح المعانی میں حضرت ذوالنون مصری رحمہ اللہ کا یہ قول کانہ الان فی اذنی کسی شخص کے اس سوال کے جواب میں ھل تذکرہ منقول ہے اسی تفسیر کی تائید ہوتی ہے۔ یہ روایات درمنثور میں مذکور ہیں۔

شبہ ثانی کہ اتنے آدمی کھڑے کہاں ہوتے ہوں گے جواب حدیث میں آیا ہے کہ بہت سی ننھی ننھی چیونٹیوں کی طرح تھے۔ پس کوئی شبہ نہیں۔ شبہ ثالث ان میں عقل کہاں تھی۔ جواب ان کو عقل دے دی گئی تھی۔ شبہ رابع اتنے ننھے جسم میں عقل کیسے ہوگی جواب جیسے چیونٹی کو ضروریات کی سمجھ ہوتی ہے۔ شبہ خامس اس عہد سے کیا فائدہ ہوا، جواب ہم اللہ تعالیٰ کی حکمتوں کا دعویٰ نہیں کرتے اس لیے اس کی تعیین ہمارے ذمہ نہیں ہے اور یہ بھی ممکن ہے کہ اب جو عقل کے نزدیک توحید ایک امر فطری ہے کہ ذرا انصاف سے غور کیا جائے تو سمجھ میں آجاتی ہے ممکن ہے کہ عہد کا اثر ہو۔ اگر وہ عہد نہ ہوتا تو شاید ایسی سہولت نہ ہوتی جیسے کسی کو حساب سکھا دیا جائے پھر گو وہ بھول جائے لیکن اگر اس کو تعلیم دیں تو بہ نسبت اوروں کے سہولت سے سیکھ لیتا ہے[1]

امام رازی فرماتے ہیں کہ بدن انسانی میں دو قسم کے اجزا ہیں۔ ایک اجزائے اصلیہ اور کچھ زائدہ۔ جو اجزا اوّل عمر سے آخر عمر تک باقی رہتے ہیں وہ اجزائے اصلیہ ہیں اور جن اجزائے بدن میں کمی زیادتی ہوتی رہتی ہے وہ اجزائے زائدہ ہیں لہٰذا اس آیت اور احادیث میں بنی آدم کی پشتوں سے ان کی نکالنا آیا ہے سو وہ اجزائے اصلیہ کا نکالنا مراد ہے اور اصلی او حقیقی انسان بھی اجزائے اصلیہ ہیں اور روح کا تعلق ان ہی اجزائے اصلیہ کے ساتھ ہوتا ہے۔ لہٰذا حقیقی انسان جو احکام شرعیہ کا مخاطب اور مکلف ہے وہ بھی ذرات ہیں جن کے ساتھ روح متعلق ہیں۔ اور قیامت کے دن درحقیقت ان ہی اجزائے اصلیہ کو دوبارہ زندہ کیا جائے اور ان ہی اجزائے اصلیہ کے ساتھ روح متعلق کر کے حساب و کتاب اور عذاب و ثواب دیا جائے گا۔ جس طرح دنیوی زندگی میں روح کا اصل تعلق انہی اجزائے اصلیہ کے ساتھ تھا۔ اسی طرح بعث بعدالموت کے وقت روح انہی اجزائے اصلیہ کی طرف لوٹا دی جائے گی اور جس طرح دنیوی زندگی میں اجزائے اصلیہ کے ساتھ اجزائے زائدہ ملا دیے گئے تھے اسی طرح بعث بعدالموت کے وقت بھی زائد اجزاء ان کے ساتھ ملا دیے جائیں گے۔

---

[1] بیان القرآن

میثاق کی فلاسفی

۲۲۷- کہیں تم روزِ قیامت یہ نہ کہہ دو کہ ہمیں اس بات کی خبر نہ تھی یا یہ نہ کہہ دو کہ شرک کا آغاز تو ہمارے باپ دادا نے پہلے کیا تھا ہم تو ان کے بعد ان کی اولاد تھے کیا آپ ہمیں اس قصور میں پکڑتے ہیں جو غلط کار لوگوں نے کیا۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم کی پشت سے ان کی اولاد اور ان سے ان کی اولاد نکالی۔ سب سے اقرار کرایا اپنی خدائی کا پھر پشت میں داخل کیا۔ اس سے مدعا یہ ہے کہ خدا کے رب مطلق ماننے میں ہر کوئی آپ کفایت کرتا ہے۔ باپ کی تقلید نہ چاہیے اگر باپ شرک کرے تو بیٹے کو چاہیے کہ ایمان لے آئے۔ [۱]

گویا اس آیت گرامی میں وہ غرض بتائی گئی ہے جس کے لیے ازل میں پوری نسل انسانی سے عہد لیا گیا تھا اور وہ یہ ہے کہ انسانوں میں سے جو لوگ اپنے خدا سے بغاوت کریں وہ اپنے اس جرم کے پوری طرح ذمہ دار قرار پائیں۔ انہیں اپنی صفائی میں نہ تو لاعلمی کا عذر پیش کرنے کا موقع ملے اور نہ وہ سابق نسلوں پر اپنی گمراہی کی ذمہ داری ڈال کر خود بری الذمہ ہو سکیں۔ بالفاظِ دیگر اللہ تعالیٰ اس ازلی عہد و میثاق کو اس بات پر دلیل قرار دیتا ہے کہ نوعِ انسانی میں سے ہر شخص انفرادی طور پر اللہ کے الٰہ واحد اور ربِ واحد ہونے کی شہادت اپنے اندر لیے ہوئے ہے اور اس بنا پر یہ کہنا غلط ہے کہ کوئی شخص کامل بے خبری کے سبب سے یا ایک گمراہ ماحول میں پرورش پانے کے سبب سے اپنی گمراہی کی ذمہ داری سے بالکل بری ہو سکتا ہے۔

ایک بے حد اہم سوال

یہاں یہ سوال بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اگر انسان کے اندر ابتدا ہی سے یہ اقرار موجود ہے تو اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ انسان وجود میں آنے کے بعد دین کا آغاز خالص خدا پرستی اور توحید سے کرتا لیکن ہمارے نئے فلسفی تو یہ بیان کرتے ہیں کہ انسان نے دین کا آغاز شرک سے کیا ہے۔ دنیا میں گوناں گوں حوادث کے ظہور نے اس کے اندر مختلف ان دیکھی طاقتوں کا خوف پیدا کیا۔ اس خوف نے اس کے اندر ان دیکھی طاقتوں کی پرستش کا خیال پیدا کیا، چنانچہ اس نے ان کی پرستش شروع کر دی۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے علم میں جتنی ترقی ہوتی گئی ان وہمی معبودوں سے چھوٹ کر وہ اقرارِ توحید کی منزل تک پہنچا۔ ہماری

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

میرا تیرا میں یہ تقریر بالکل غیر منطقی ہے۔ خوف نام ہے کسی ایسی چیز کے چھن جانے کے اندیشہ کا جو انسان کو حاصل بھی ہو اور جو عزیز و محبوب بھی ہو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نعمت منعم اور اس کی شکرگزاری کا شعور اور جذبہ خوف کے جذبے اور اس کے عوامل پر مقدم ہے اس لیے انسان نے دین کا آغاز خوف سے نہیں بلکہ اپنے منعم پروردگار کی شکر گزاری اور اس کی عبادت سے کیا لیکن پھر مختلف اسباب کے تحت وہ اس جادہ مستقیم سے ہٹ کر مختلف راہوں میں بٹ گئے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ناواقف لوگ جب اپنے قیاس و گمان کی بنیاد پر "مذہب" کی تاریخ مرتب کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انسان نے اپنی زندگی کی ابتداء شرک کی تاریکیوں سے کی پھر تدریجی ارتقاء کے ساتھ ساتھ یہ تاریکی چھٹتی گئی اور روشنی بڑھتی گئی یہاں تک کہ آدمی توحید کے مقام پر پہنچا۔ یہاں اس آیت میں قرآن اس کے برعکس یہ بتاتا ہے کہ دنیا میں انسان کی زندگی کا آغاز پوری روشنی میں ہوا ہے۔ اللہ نے سب سے پہلے عالم غیب میں انسانوں کو یہ بتا دیا تھا کہ حقیقت کیا ہے اور صحیح راستہ کیا ہے۔ اس کے بعد ایک مدت تک نسل انسانی راہ راست پر قائم رہی اور ایک امت بنی رہی۔ پھر لوگوں نے نئے نئے راستے نکالے اور مختلف طریقے ایجاد کیے اس لیے نہیں کہ ان کو حقیقت نہیں بتائی گئی تھی بلکہ اس لیے کہ حق کو جاننے کے باوجود بعض لوگ اپنے جائز حق سے بڑھ کر امتیازات، فوائد اور منافع حاصل کرنا چاہتے تھے۔ اسی خرابی کو دور کرنے کے لیے اللہ سبحانہ نے انبیاء روانہ کیے۔

قرآن کا سارا فلسفہ فی الواقع انسان کی فطرت پر مبنی ہے۔ اس کا دعویٰ یہ ہے کہ وہ جن عقائد و اعمال کی تعلیم دیتا ہے ان میں سے کوئی چیز بھی اس کے خارج سے اس پر مسلط نہیں کی گئی بلکہ اس کو ان ہی باتوں کی یاد دہانی کرائی جا رہی ہے جو روز اول اس کے خمیر میں رکھ دی گئی ہیں۔ لیکن اس نے لذات عاجلہ کے پیچھے پڑ کر ان کو نظر انداز کر دیا ہے۔ قرآن اسی وجہ سے اپنے آپ کو ذکر اور ذکریٰ کہتا ہے جس کے معنے فراموش کردہ حقائق کو یاد دلانے کے ہیں۔

اس آیت میں قرآن نے بتایا ہے کہ اللہ کی توحید کے موضوع پر روز قیامت بے خبری اور تقلید کا عذر مسموع نہ ہوگا۔ یہ اللہ کا فضل و انعام ہے کہ اس نے انبیاءؑ کو روانہ کر کے ایک مزید حجت قائم کر دی ورنہ جہاں تک اللہ کی توحید کا تعلق ہے اس کے باب میں قیامت کے دن ہر شخص سے مواخذہ مجرد اس اقرار کی بنا پر جو بلی شهدنا میں مذکور ہے یہ کہنا کہ ہمیں پتہ نہ تھا یا یہ کہنا کہ ہمارا گرد و پیش اور ماحول صحیح نہ تھا قطعاً قابل پذیرائی نہ ہوگا۔

آیت کی تفہیم میں راہ اعتدال

آیات کی تشریح کے سلسلے میں تفسیر اور تاویل دونوں آپ پڑھ چکے ہیں۔ معتزلہ کے اعتراضات تو تفسیر پر بالکل غلط اور بے معنے ہیں۔ عالم مادی پر عالم غیب کو قیاس کرنا لغو اور مہمل بات ہے، آیت کی تشریح تفسیر کی حد تک جو پیش کی گئی ہے وہ عقل و درایت کے خلاف نہیں ہے۔ اگر تفسیر صحیح روایات سے ثابت ہو جاتے تو مان لینا عین ایمان ہے اور اگر صحیح روایات کی مہر کا بائی نہ ہو تو پھر فکر و غور اور سوچ و بچار سے کام لینا ناگزیر ہے۔ اس موضوع پر جس قدر احادیث آئی ہیں ان میں اجمال ہے اور صراحۃً تفسیر کی ہمنوائی نہیں کرتی ہیں۔ اہل تفسیر کو بھی آخری درجہ میں آیت کی تشریح کرتے ہوئے تمثیل و تشبیہ کا سہارا لینا پڑا۔ حافظ ابن کثیر، امام رازی، قاضی بیضاوی جیسے شارحین قرآن کا میلان بھی آیت کی تشریح میں تاویل کی طرف ہے اس لیے اس آیت کے موضوع پر تفسیر پر اتنا اصرار درست نہیں ہے کہ اس کو اہل السنۃ کا مختار اور تاویل کو معتزلہ کا مسلک قرار دیا جاتے جبکہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ بیشتر اہل السنۃ بھی کہہ رہے ہیں کہ شاہد بنانے سے مراد شاہد فطرت ہے یعنی ہر شخص اپنی فطرت پر پیدا ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ہے فطرۃ اللّٰہ التی فطر الناس علیہا۔ صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کی مرفوع روایت ہے کہ ہر بچہ فطرت پر پیدا ہوتا ہے پھر اس کے والدین اس کو یہودی یا عیسائی کر ڈالتے ہیں۔ عیاض بن حماز مجاشعی سے مرفوعاً مروی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کو حنیف یعنی مائل بحق پیدا کیا پھر شیطان نے آکر ان کو ان کے دین سے بہکا دیا اور جس شے کو ان پر حلال کیا تھا اس کو حرام کر ڈالا (رواہ مسلم)

اسود بن سریع سندی کہتے ہیں میں نے رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ہمراہی میں چار جہاد کیے۔ مسلمانوں نے ایک بار حربی کفار کو قتل کر کے ان کے بچوں کو قتل کرنا شروع کیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اطلاع ہوئی تو آپ کو سخت ناگوار ہوا اور فرمایا بعض لوگ کیوں بچوں پر دست درازی کرتے ہیں۔ ایک شخص نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا یہ مشرکین کی اولاد نہیں ہیں۔ فرمایا تم میں جو بڑے نیکوکار ہیں وہ بھی تو مشرکوں کی اولاد ہیں۔ خوب سن لو ہر شخص فطرت پر پیدا ہوتا ہے اور برابر اسی حالت پر رہتا ہے یہاں تک کہ اس کی زبان کھلنے پر اس کے والدین اس کو یہودی، نصرانی وغیرہ کا دین سکھاتے ہیں۔ ان احادیث کا منشا یہی ہے کہ خدا تعالیٰ نے تمام ارواح کو جب خاکی عنصر کا لباس پہنایا اور سب کو عالم شہود میں لایا تو سب کو دین فطرت یعنی اقرار نبوت اور شہادت توحید پر پیدا کیا۔ آیت میں اقرار، شہادت و عہد سے یہی فطری اقرار مراد ہے۔

آیات کی غرض دعوتِ حق کو سمجھانا ہے

۲۲۸ ۔ دیکھو اس طرح ہم نشانیاں واضح طور پر پیش کرتے ہیں اور اس لیے کرتے ہیں کہ لوگ حق کو قبول کرلیں ۔ موضح القرآن میں ہے یہ قصہ یہود کو سنایا کہ وہ بھی عہد سے پھرے ہوتے ہیں جیسے مشرک پھرتے ہیں لیے اصل میں ولعلھم یرجعون کا معطوف علیہ محذوف ہے اگر اس کو ظاہر کر دیا جائے تو مطلب یہ ہوگا کہ اس طرح ہم اپنی آیات کی تفصیل اس لیے کرتے ہیں تاکہ ہم لوگوں پر اپنی حجت قائم کریں کہ ان کے لیے کوئی ادنیٰ عذر بھی باقی نہ رہے اور تاکہ اس وضاحت کے بعد ان میں سے جو شرک سے ہو کر اپنے رب کی طرف رجوع کرنا چاہیں وہ رجوع کرلیں ۔ مطلب یہ ہوا کہ انسان سے مذکورہ عہد لینے کے بعد یہ اللہ تعالیٰ کا مزید فضل و احسان ہے کہ اس نے اس عہد و میثاق کی پوری تفصیل بھی سنا دی تاکہ جو اپنی غلطی سے توبہ کرنا چاہیں وہ توبہ کرلیں اور جو اپنی ضد پر اڑے رہیں وہ اس کے نتائج کا ذمہ دار اپنے ہی کو سمجھیں کسی اور کا گردن پر اس کا بار ڈالنے کی کوشش نہ کریں ۔

گویا بتایا گیا ہے کہ اس بلیغ انداز پر ہم دلائل کو کھول کر اس لیے بیان کر رہے ہیں تاکہ لوگ ان کو سمجھیں اور تاکہ لوگ جہالت اور کورانہ تقلید سے ہٹ کر علم و بصیرت کی راہ اختیار کریں ۔ قرآن کی یہ آیت بتا رہا ہے کہ جن لوگوں تک رسُول کی دعوت نہیں پہنچی وہ شرک کے موضوع پر روزِ قیامت معذور نہ ہوں گے اور یہ بھی اس میں داخل ہے کہ یہ آیات معرفتِ حق کی صاف اور واضح نشانیوں کی نشاندہی کر رہی ہیں اور اس لیے پیش کی جا رہی ہیں تاکہ لوگ بغاوت و انحراف کی راہ چھوڑ کر بندگی و طاعت کے رویہ کی طرف واپس آئیں ۔

فیصلہ کُن بات

جیسا کہ پہلے بھی بتایا جا چکا ہے کہ یہ آیت قرآنی تاویل کے پہلو سے نہیں بلکہ تفسیر کے پہلو سے اس موضوع پر فیصلہ کن ہے کہ نسل انسانی کا اصل اور ابتدائی دین توحید ہے اور شرک بہت بعد کی پیداوار ہے ۔ اس موضوع پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ گیارہویں جلد میں آ رہا ہے

لے افادات شیخ الاسلام

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ الَّذِيْٓ اٰتَيْنٰهُ اٰيٰتِنَا فَانْسَلَخَ مِنْهَا فَاَتْبَعَهُ
الشَّيْطٰنُ فَكَانَ مِنَ الْغٰوِيْنَ ﴿۱۷۵﴾ وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَ
لٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ
الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ۭ ذٰلِكَ
مَثَلُ الْقَوْمِ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَاقْصُصِ الْقَصَصَ
لَعَلَّهُمْ يَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۱۷۶﴾ سَاۗءَ مَثَلَا ۨ الْقَوْمُ الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا
بِاٰيٰتِنَا وَاَنْفُسَهُمْ كَانُوْا يَظْلِمُوْنَ ﴿۱۷۷﴾

اور اے پیغمبر ان کو اس شخص کو حال سنائیے جسے ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں[۲۲۹]، لیکن پھر ایسا ہوا کہ ان کو وہ چھوڑ بیٹھا، بس شیطان نے اس کا پیچھا کیا، نتیجہ یہ نکلا کہ وہ گمراہوں میں سے ہو گیا[۲۳۰]۔ اگر ہم چاہتے تو ہم ان نشانیوں کے ذریعے اس کا درجہ بلند کر دیتے مگر وہ پستی کا ہو رہا اور ہوائے نفس کا پیروکار بنا[۲۳۱]، تو اس کی

مثال کتے کی سی ہے مشقت میں ڈالو جب بھی ہانپے، چھوڑ دو پھر بھی ہانپے ایسی ہی مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی لہٰذا اے پیغمبر یہ کہانیاں ان لوگوں کو سنا تاکہ وہ ان میں غور و فکر کریں[۲۳۲] - ان لوگوں کی مثال بری ہے جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور اپنے ہاتھوں خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے[۲۳۳]۔

معانی مفردات

انسلخ ماضی ہے مصدر انسلاخ ہے مادہ سلخ ہے۔ ثلاثی مزید ہے اور مزید مطاوع کی حیثیت سے لازم ہے سلخت الجلد من الشاۃ فانسلخت میں نے بکری کی کھال اتار دی وہ اتر گئی سانپ کے اپنی پرانی کینچلی اتار دینے کو عربی میں انسلخت الحیۃ من جلد ھا بولتے ہیں مقصد یہ ہے کہ جس طرح سانپ اپنی پہلی کینچلی کو اتار دیتا ہے اسی طرح اس شخص نے بھی آیات الٰہیہ کو اتار پھینکا اور اس کی جگہ غوایت کا لبادہ پہن لیا۔ الغاوین جمع ہے اور اسم فاعل ہے غوایت سے بنا ہے اس کے معنے بہکنے اور بھٹکنے کے ہیں اس کا متعدی اغواء آتا ہے۔ یہاں گمراہی میں کمال مراد ہے۔ یلھث، مضارع کا واحد مذکر غائب ہے لہث سے بنا ہے، ہانپتے ہوئے زبان نکالنا۔

غلط کار عالم کی مثال

ان آیات میں جس واقعہ کی طرف اشارہ ہوا اس کی شخصیت کے بارے میں شارحین قرآن کا اختلاف ہے کوئی کہتا ہے بلعم باعوراء ہے کوئی اُمیہ ابن الصلت کا نام لیتا ہے اور کوئی صیفی بن الراہب کا ذکر کرتا ہے۔ مولانا عثمانی فرماتے ہیں، اکثر مفسرین کے نزدیک یہ آیات بلعم بن باعوراء کے حق میں نازل ہوئیں جو ایک عالم اور صاحبِ تصرف درویش تھا۔ بعدہٗ اللہ تعالیٰ کی ہدایات و آیات کو چھوڑ کر عورت کے اغواء اور دولت کے لالچ سے حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں اپنے تصرفات چلانے اور ناپاک تدبیریں بتلانے کے لیے تیار ہوگیا۔ آخر موسیٰ علیہ السلام کا تو کچھ بگاڑ نہ سکا خود مردود ابدی بنا۔ آیات اللہ کا جو علم بلعم کو دیا گیا تھا اگر خدا چاہتا تو اس کے ذریعے سے بہت بلند مراتب پر اسے فائز کر دیتا۔ اور یہ جب ہی ہو سکتا ہے کہ اسے اپنے علم پر چلنے اور آیات اللہ کا اتباع کرنے کی توفیق ہوتی، لیکن ایسا نہ ہوا کیونکہ وہ خدا آسمانی برکات و آیات سے منہ موڑ کر زمینی شہوات و لذات کی طرف جھک پڑا۔ وہ نفسانی خواہشات کے پیچھے چل رہا تھا اور شیطان اس کا تعاقب کرتا جا رہا تھا حتیٰ کہ پکے کج رووں اور گمراہوں کی قطار میں داخل ہوا، اس وقت اس کا حال کتے کی طرح ہوگیا جس کی زبان باہر لٹکی ہو اور برابر ہانپ رہا ہو۔ اگر فرض کر و اس پر بوجھ لاد دیں یا ڈانٹ بتلائیں یا کچھ نہ کہیں آزاد چھوڑ دیں بہر صورت ہانپتا اور زبان لٹکائے رہتا ہے کیونکہ طبعی طور پر دل کی کمزوری کی وجہ سے گرم ہوا باہر پھینکنے اور سرد و تازہ ہوا کے اندر کھینچنے پر بسہولت قادر نہیں ہے اسی طرح سفلی خواہشات میں منہ مارنے والے کتے کا حال ہوا کہ اخلاقی کمزوری کی وجہ سے "آیات اللہ" کا دیا جانا یا نہ دیا جانا، تنبیہ کرنا یا نہ کرنا دونوں حالتیں اس کے حق میں برابر ہوگئیں۔ سواء علیھم ءانذرتھم ام لم تنذرھم لا یومنون، حرصِ دنیا سے اس کی زبان باہر لٹک پڑی اور ترک کی نحوست سے بدحواسی اور پریشانی خاطر کا نقشہ برابر ہانپتے رہنے کی مثال میں ظاہر ہوا۔ ممکن ہے کہ بلعم کی باطنی و معنوی کیفیت ظاہر کرنے کے لیے صرف ایک مثال کے طور پر یہ مضمون ان تحمل علیہ یلھث او تترکہ یلھث ذکر کیا گیا ہو اور ہو سکتا ہے کہ دنیا و آخرت میں اس کے لیے یہ سزا تجویز کی گئی ہو کہ ظاہری و حسی طور پر کتے کی طرح زبان باہر نکل پڑے اور ہمیشہ پریشان و بدحواس اور خوفزدہ آدمی کی طرح ہانپتا رہے۔ العیاذ باللہ آیات کی شانِ نزول کچھ ہو بہر حال یہاں اہواء پرستوں کا انجام بتلایا گیا ہے جو حق کے قبول کرنے یا پوری طرح سمجھ لینے کے بعد محض دنیوی طمع اور سفلی خواہشات کی پیروی میں احکامِ الٰہیہ چھوڑ کر شیطان کے اشاروں پر

چلنے لگیں اور خدا کے عہد و میثاق کی کوئی پروا نہ کریں۔ گویا یہود کو بھی متنبہ فرما دیا کہ صرف کتاب کا علم کچھ نافع نہیں ہو سکتا جب تک صحیح معنے میں اس کا اتباع نہ ہو مثل الذین حملوا التوراۃ ثم لم یحملوھا کمثل الحمار یحمل اسفارا۔ علمائے سُوء کے لیے ان آیات میں بڑا عبرتناک سبق ہے۔

۲۲۹- اور اے پیغمبر ان کو اس شخص کا حال سنا دیجیے جسے ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں۔ ایسا کوئی شخص فی الواقع تاریخ میں گزر چکا ہے۔ کون تھا اور کہاں تھا اور کب تھا، یہ متعین نہیں اور قرآن اس میں ساکت ہے۔ اور شاید سکوت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کا قاعدہ یہ ہے کہ وہ جب کسی برائی کو مثال میں پیش کرتے ہیں تو بالعموم اس کے نام کی تصریح نہیں کرتے بلکہ اس کی شخصیت پر پردہ ڈال کر صرف اس کی بری مثال کا ذکر کر دیتے ہیں تاکہ اس کی ذاتی رسوائی کے بغیر اصل مقصد حاصل ہو جائے۔ شارحین قرآن میں ایک گروہ کا خیال ہے کہ عرب جاہلیت کے ایک حکیم شاعر امیہ ابن عبداللہ ابن الصلت ثقفی کی طرف اشارہ ہے۔ یہ غیر معمولی استعداد و ذکاوت کا آدمی تھا اور اہل کتاب کی صحبت میں رہ کر خدا پرستی و دینداری کے خیالات سے آشنا ہو گیا تھا۔ قدرتی طور پر ایسا شخص سب سے زیادہ مستحق تھا کہ اتباع حق کی اس سے توقع کی جاتی لیکن جب اسلام کا ظہور ہوا تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی فضیلت اس پر گراں گزری اور اس طمع میں پڑ گیا کہ خود ہی عرب کا پیغمبر کیوں نہ ہوا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ادراک حق کی جو توفیق ملی تھی ضائع ہو گئی اور ہوائے نفس کی پیروی نے محروم و نامراد کر دیا۔ اس صورت میں یہ تمثیل ہے اس شخص کی جو حق آشنا ہونے کے باوجود حق قبول نہیں کرتا ہے۔ اور کچھ شارحین قرآن کی رائے میں اشارہ زمانہ بنی اسرائیل کے مشہور زاہد بلعم باعورا۔ کنعانی کی طرف ہے۔ اس کا ذکر تورات میں بھی ہے۔ اس صورت میں یہ تمثیل ہے اس کی جو حق کو قبول کر کے پھر پھر گیا۔ بہرحال جس فرد متعین کی طرف بھی ہو اہل التحقیق کا اس پر اتفاق ہے کہ تمثیل عام ہے اور ہر اس شخص پر صادق آتی ہے جو دین حق کی نعمت پا لینے کے بعد پھر اس کا تارک ہو گیا ہو۔ جسے ہم نے اپنی نشانیاں دی تھیں۔ اصل ارشاد الذی اتینٰہ آیاتنا یعنی اسے ہم نے اپنے احکام کے علم کی نعمت عطا کی تھی۔

کچھ لوگوں کا خیال یہ ہے کہ یہ کوئی مقرر اور معین شخصیت نہیں ہے مگر اس پر شبہ یہ کیا گیا ہے کہ اگر ایسا ہوتا تو تعبیر میں الذی استعمال نہ ہوتا کیونکہ یہ لفظ اصلاً معرفہ کے لیے آتا ہے۔ اس کا جواب یہ دیا جاتا ہے کہ تمثیلات میں یہ ضروری نہیں کہ اس سے کوئی معین ہی شخص مراد ہو۔ جس کا وجود خارجی بھی ہو بلکہ متکلم جس کی تمثیل پیش کرنا چاہتا ہے اس کو نگاہ میں رکھ کر اس کا ایک ایسا سراپا آراستہ کر دیتا ہے جو اس پر پوری طرح منطبق ہو جاتا ہے۔ چونکہ پیش نظر صرف واقعہ کی تصویر کشی ہوتی ہے اس وجہ سے تقاضائے بلاغت یہ ہوتا ہے کہ اس کو نکرہ کے بجائے معرفہ کے لفظوں میں ذکر

کیا جائے تاکہ تمثیل ایک خاص شخص کی صورت میں متمثل ہوکر اس طرح سامع کے سامنے آجائے کہ گویا اس نے اس کی سرگزشت صرف سنی ہی نہیں بلکہ خود اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہے۔

ہماری رائے یہاں الّذی سے اشارہ بنی اسرائیل کے مشہور زاہد بلعم بن باعوراء کنعانی کی طرف ہے اس کو خدا نے اپنے علم آیات کی نعمت عطا فرمائی۔ اس میں بتانا یہ ہے کہ حق کو قبول کرکے اس کے خلاف سرکشی اور بغاوت کا انجام کیا ہوتا ہے اور یہ انجام سب کے لیے یکساں ہے خواہ کرنے والا کوئی عام شہری ہو یا کرنے والا بہت بڑا علامہ اور خدا رسیدہ ولی ہو۔ اور خواہ فرد ہو اور یا پوری قوم ہو۔ ذکر اگرچہ یہاں فرد واحد کا ہے لیکن ایک پوری قوم کے لیے پیش کی گئی ہے۔

علم کے باوجود گمراہی

۲۳۰- لیکن پھر ایسا ہوا کہ ان کو وہ چھوڑ بیٹھا۔ پس شیطان نے اس کا پیچھا کیا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ گمراہوں میں سے ہوگیا۔ پہلے بتایا تھا کہ ہم نے اسے اپنی آیتوں سے نوازا تھا، اب بتایا جارہا ہے کہ اس نے ہماری اس نوازش کی قدر نہ کی بلکہ علم کی جو پوشاک ہم نے اس کو پہنائی تھی اسے اتار دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ خدا نے بھی اپنے قانون کے مطابق اس سے معاملہ کیا خدا کا قانون یہ ہے:

من یعش عن ذکر الرحمان نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین

جو خدائے رحمان کی یاد سے منہ پھیرتا ہے ہم اس پر ایک شیطان مسلط کر دیتے ہیں وہ ہی اس کا رفیق ہوتا ہے۔

شیطان اس کے پیچھے لگ گیا اور وہ گمراہ ہوگیا۔ مطلب یہ ہے کہ وہ آیات الٰہی کا علم رکھتا تھا یعنی حقیقت سے آگاہ تھا۔ اس علم کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ اس رویہ سے بچتا جس کو وہ غلط جانتا تھا اور وہ طرز عمل اختیار کرتا جو اسے معلوم تھا کہ یہ صحیح ہے۔ یہاں حضرت مولانا اشرف علیؒ نے یہ لطیف بات ارشاد فرمائی ہے۔ ترتیب کا تقاضا بظاہر یہ ہے کہ تعبیر یوں ہو اتبعہ الشیطان فکان من الغاوین فانسلخ منھا۔ کیونکہ شیطان پہلے تعاقب کرتا ہے پھر اس سے غوایت شروع ہوتی ہے۔ پھر وہ بڑھ کر انسلاخ ہو جاتا ہے لیکن یہاں اتبعہ الشیطان سے لزوم و دوام تعاقب مراد ہے۔ مطلق تعاقب نہیں اور وہ انسلاخ سے متوخر ہے اور غوایت سے مراد بھی لزوم و دوام غوایت وختم علی الکفر اور وہ بھی انسلاخ سے مؤخر ہے اور انسلاخ پر اتبعہ الشیطان کے مقدم کرنے میں اشارہ ہے کہ مطلق معصیت سے شیطان کا کامل تسلط نہیں ہوسکتا۔ جب اس کے تسلط غیر تام انسلاخ اختیار

کرلیتا ہے کہ مخالفت عمل بھی ہو انکار اعتقادی بھی ہو تب اس کا تسلط تام ہوتا ہے پس آدمی اپنے ہاتھوں بگڑتا ہے [1]

ہدایت وضلالت میں قانونِ الٰہی

۲۳۱ ۔ اور اگر ہم چاہتے تو ہم ان نشانیوں کے ذریعے اس کا درجہ بلند کردیتے مگر وہ پستی کا ہورہا اور ہوائے نفس کا پیروکار بن گیا ۔ یہ اس سنتِ الٰہی کا ذکر ہے جو اس نے ہدایت وضلالت کے معاملے میں پسند فرمائی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ جن کو اپنی آیات سے نوازتا ہے ، اگر وہ ان کی قدر کرتے ہیں تو وہ ان کے ذریعے سے ان کو دین و دُنیا میں سرفرازی عطا کرتا ہے ۔ ان کی عقل کو ان سے رفعت اور ان کی روح کو ان سے معراج حاصل ہوتی ہے لیکن جو لوگ ان آیات کے پانے کے بعد بھی اپنی خواہشوں کے پیچھے پڑے رہتے ہیں تو اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو ان کی خواہشوں ہی کے حوالے کر دیتا ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ جو شخص علم کے باوجود دُنیا کے فائدوں ، لذتوں اور آرائشوں کی طرف جھک جاتے ۔ خواہشاتِ نفس کا مقابلہ کرنے کے بجائے وہ ان کے آگے سپر ڈال دے معالی امور کی طلب میں دُنیا کی حرص وطمع سے بالاتر ہونے کے بجائے وہ اس حرص وطمع سے ایسا مغلوب ہو جاتے کہ سب اُونچے ارادوں اور اپنی عقلی و اخلاقی ترقی کے سارے امکانات کو بالائے طاق رکھ دے اور ان تمام حدود کو توڑ کر نکل بھاگے جن کی نگہداشت کا تقاضا خود اس کا علم کررہا تھا پھر جب وہ محض اپنی اخلاقی کمزوری کی بنا پر جانتے بوجھتے حق سے روگرداں ہو کر بھاگ جاتے تو شیطان جو قریب ہی اس کی گھات میں لگا ہوا ، اس کے پیچھے لگ جاتے اور برابر ایک پستی سے دوسری پستی میں لے جاتا ہے یہاں تک کہ ظالم نے اسے ایسے زمرے میں داخل کرکے دم لیا جو اس کے جال میں پھنس کر پوری طرح متاعِ عقل و ہوش گم کر بیٹھا ۔

قاضی بیضاوی نے یہ بات بڑی لطیف لکھی ہے کہ اس آیت میں بندے کے رفع درجات کو اولاً اپنی مشیت پر معلق کیا ہے پھر بندے کے کردار سے اس کا استدراک کیا یہ اشارہ ہے اس بات کی طرف کہ اللہ کی مشیت بندے کے اس فعل کا سبب ہے جس کے ذریعہ بندہ رفع درجات کرتا ہے ۔ حقیقی سبب اللہ کی مشیت ہے ۔ مولانا اشرف علی فرماتے ہیں چونکہ مشیت سبب ہے عمل کا ، اس لیے

---

[1] بیان القرآن

مجازاً اس طرح تعبیر کر دیا۔ اب لکنہ اخلد الی الارض کا مقابلہ واضح ہو گیا۔ بہرحال یہ تو علمی نکتہ آفرینیاں ہیں اصل بات یہ ہے کہ اگر ہماری مشیت تکوینی یہی ہوتی کہ ہم بندے کے ارادے میں دخل دے کر اسے بہ جبر سیدھی راہ پر ڈال دیا کرتے تو ان دلائل کی روشنی میں اسے مجبور کر دیتے کہ راہِ حق میں طوعاً و کرہاً قدم اٹھاتا جاتے لیکن ایسی جبری مداخلت ہماری حکمت کے منافی ہے۔ ہم نے طاعت و معصیت کو بندے کے لیے ارادی اور اختیاری بنایا ہے جو شخص اپنے ارادے اور اختیار سے پستی کی طرف جاتا ہے اسے اس کا شوق پورا کرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے ۔ آیت میں لو شرطیہ اور لکن استدراکیہ دونوں آتے ہیں۔ تعلیق اور استدراک کا حاصل یہ ہے کہ جس شخص کو اللہ سبحانہٗ علم کی دولت عطا فرماتے ہیں اس کا تقاضا یہ ہے کہ وہ درجہ کمال حاصل کرے کیونکہ علمِ دین سرتاسر ہدایت، ارشاد اور ذکر ہے اور اس کے ذریعے درجہ کمال صرف وہ شخص حاصل کر سکتا ہے جو علمِ دین کو اس ارادے اور نیت سے حاصل کرے لیکن جو شخص یہ ارادہ ہی نہ کرے اور اس نیت سے دین کا علم حاصل نہ کرے بلکہ اسے کسبِ مال اور حصول جاہ کا ذریعہ بنائے تو اس کے سامنے راستہ کھلا ہوا ہے کسی کو جبراً نیک بنانا ہمارا قانون نہیں ہے۔ اس کے بعد اس کو مثال سے اور زیادہ واضح کیا ہے ۔

گمراہ عالم کی تمثیل کتے سے

۲۳۲۔ تو اس کی مثال کتے کی سی ہے، مشقت میں ڈالو جب بھی ہانپے چھوڑ دو پھر بھی ہانپے۔ ایسی ہی مثال ان لوگوں کی ہے جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی لہٰذا اے پیغمبر ان کو سنا تاکہ وہ ان میں غور و فکر کریں۔ اب علم کی موجودگی میں بدعملی کی زندگی اپنانے اور آیات کا علم حاصل کرنے کے بعد بھی اپنی خواہشوں کے پیچھے چلنے والے کی حالت کو ایک تمثیل سے واضح کیا جا رہا ہے۔ امام مجاہد فرماتے ہیں یہ اس شخص کی مثال ہے جو قرآن پڑھتا ہے اور اس پر عمل نہیں کرتا ہے۔ دیکھیے پستی کی طرف نکلنے اور خواہشات کے پیچھے چلنے کی عالم ہو کر کیسی دلنشیں اور مطابق واقعہ تمثیل ہے ۔ اس کتے سے اس شخص کی حالت کو تشبیہ دی ہے جس کی ہر وقت لٹکی ہوئی زبان اور ٹپکتی ہوئی رال ایک نہ بجھنے والی آتش حرص اور کبھی نہ سیر ہونے والی نیت کا پتہ دیتی ہے بناتے تشبیہ وہی ہے جس کی وجہ سے ہم اپنی اُردو زبان میں ایسے شخص کو جو دُنیا کی حرص میں اندھا ہو رہا ہو دُنیا کا کتا کہتے ہیں۔ کتے کی جبلت کیا ہے۔ حرص عدا ز چلتے پھرتے اس کی ناک زمین سونگھنے ہی میں لگی رہتی ہے کہ شاید کہیں سے بوئے طعام آ جائے اسے پتھر ماریے تب بھی اس کی یہ توقع دور نہیں ہوتی کہ شاید یہ چیز جو پھینکی گئی ہے کوئی ہڈی یا روٹی کا ٹکڑا

ہو۔ پیٹ کا پُجاری ایک دفعہ تو لپک کر اس کو بھی دانتوں سے پکڑ ہی لیتا ہے۔ اس سے بے التفاتی کیجئے تب بھی وہ لالچ کا مارا تو قعات کی ایک دُنیا دل میں لیے زبان لٹکائے ہانپتا کانپتا کھڑا ہی رہے گا۔ ساری دُنیا کو وہ بس پیٹ ہی کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ کہیں کوئی بڑی سی لاش پڑی ہو جو کئی کتوں کے کھانے کو کافی ہو تو ایک کتا اس میں سے صرف اپنا حصہ لینے پر اکتفا نہ کرے گا بلکہ اسے صرف اپنے ہی لیے مخصوص رکھنا چاہے گا اور کسی دوسرے کتے کو اپنے پاس پھٹکنے نہ دے گا۔ اس شہوتِ شکم کے بعد اگر کوئی چیز اس پر غالب ہے تو وہ شہوتِ فرج ہے۔ اپنے سارے جسم میں سے صرف ایک شرمگاہ ہی وہ چیز ہے جس سے وہ دلچسپی رکھتا ہے اور اسی کو سونگھنے چاٹنے میں مشغول رہتا ہے۔ تشبیہہ کا مقصد یہ ہے کہ دُنیا پرست آدمی جب علم اور ایمان کی رسی تڑا کر بھاگتا ہے اور نفس کی اندھی خواہشات کے ہاتھ میں اپنی باگیں دے دیتا ہے تو پھر کتے کی حالت کو پہنچے بغیر نہیں رہتا۔ ہمہ تن پیٹ اور ہمہ تن شہوت۔

اگر آپ غور کریں گے تو یہی یہود کی بھی تمثیل ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے ان کو اپنے انعامات اور تنبیہات سے آزمایا لیکن یہ اپنی خواہشوں کے ہاتھوں اتنے بے بس رہے کہ نہ انعامات سے ذرا متاثر ہوئے نہ تنبیہات سے بلکہ ہر طمع ان کی ٹھوکروں کا ذریعہ بنی اور ہر خواہش کے آگے انہوں نے گھٹنے ٹیک دیے۔ ان کی اسی حالت کی تمثیل کتے سے دی ہے۔ کتا کبھی بخطِ مستقیم نہیں چلتا بلکہ ہمیشہ زمین کو سونگھتا ہوا اور ہر پاک و ناپاک چیز کا اپنی ناک سے جائزہ لیتا ہوا چلتا ہے کہ شاید کوئی چیز مل جائے۔ اس کی رہنما اس کی آنکھ نہیں ناک ہوتی ہے۔ بالکل یہی حال یہودیوں کا ہے۔ ان کو اپنے نفس پر ذرا قابو نہیں۔ ان کی قوتِ ارادی بالکل معطل ہو چکی ہے۔ اب یہ خواہشوں کے غلام اور اپنی حرص کے بندے ہیں اور حرص و دنائت ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی ہے۔ ان کی شکلیں آدمیوں کی ہیں لیکن ان کی فطرت بالکل کتوں کی جبلت کے سانچے میں ڈھل چکی ہے۔

آخر میں ذالک مثل القوم الخ ہے۔ آیت بتا رہی ہے کہ یہ مثال صرف شخصی نہیں بلکہ اجتماعی ہے یعنی جیسے بگڑا ہوا شخص اس کا مصداق ہے ایسے ہی بگڑی ہوئی قوم بھی اس کا مصداق ہے۔ فرد ہو یا جماعت جو بھی علم و ہدایت پاکر اس پر نہ چلے اور زندگی اس کی ضد پر بنائے۔ توحید کا جام پہن کر اسے اتار پھینکے شرک کے جال میں پھنس جائے، ایمان اختیار کر کے اسے چھوڑ دے اور کفر کی زندگی اپنا لے۔ راہِ سنت اپنا کر اسے چھوڑ دے، راہِ بدعت اختیار کرے۔ راہِ نبوت کو مان کر اسے چھوڑ دے اور اس کے مقابل کی راہوں پر چلے۔ سب اس آیت گرامی کا مصداق ہیں۔ اسی لیے آخر میں فرمایا ہے لعلھم یتفکرون یعنی آپ یہ حالات بیان فرمائیے تاکہ اس پر غور و فکر سے کام لیں۔ یعنی مقصد کسی فردِ متعین کی تاریخ سنانا

نہیں ہے بلکہ کل منکرین، مکذبین، ملحدین، مشرکین اور مبتدعین کی حالت پر آگاہ کرنا اور اس سے عبرت دلانا ہے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہدایت ہوئی کہ سب کو آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرنے والی قوم کا حال سُنا دو کہ جن کو اللہ تعالیٰ اپنی آیات سے نوازتا ہے ان کو وہ اپنی آیات کے ذریعہ سے زمین و آسمان کی سرفرازیاں عطا فرمانا چاہتا ہے بشرطیکہ وہ ان کی قدر کریں، ان کو اپنائیں اور زندگی میں ان سے رہنمائی حاصل کریں اگر وہ قدر نہیں کرتے بلکہ اپنے میلانِ نفس اور خواہشوں ہی کے غلام بنے رہتے ہیں تو ان کا حال بھی وہی ہوتا ہے جو اس شخص کا ہوا جس کی مثال دی گئی۔ حقائق کا جو علم اسے عطا کیا گیا تھا۔ اگر وہ اس پر عمل پیرا ہوتا تو مقربین بارگاہِ الٰہی میں شمار ہوتا اور مناصب رفیعہ اور مراتب عالیہ پر فائز ہوتا لیکن اس بدبخت نے نفسانی خواہشات کی ایسی پیروی کی اور حرص و لالچ کا اس پر ایسا غلبہ ہوا کہ ایسا محسوس ہونے لگا کہ اس نے ذلت سے چمٹے رہنے کا پختہ عزم کر لیا اور وہ کسی طرح بھی انہیں چھوڑ کر ہدایت کی بلندی کی طرف ایک قدم بھی اٹھانے کو تیار نہیں۔ فاناللہ والی اللہ المشتکی۔

مکذبین آیات کی بدترین مثال

۲۳۳- ان لوگوں کی مثال بُری ہے جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی اور وہ اپنے ہاتھوں خود اپنا ہی نقصان کرتے رہے۔ مشرکین وغیرہم کے رد میں جا بجا قرآن نے عنکبوت، ذباب، مکڑی، مکھی وغیرہ کی مثالیں بیان کی ہیں مگر ان لوگوں کی مثال ایسی بری ہے کہ کوئی غیرت مند آدمی حتی المقدور اس کو اپنے اوپر چسپاں نہیں ہونے دے گا اور جو بے حیا غدار اپنے احوال پر چسپاں ہونے دیتا ہے وہ صرف اپنا ہی نقصان کرتا ہے[1] اس ارشادِ گرامی کے ذریعے قرآن اپنے مخاطبوں کے گوشۂ ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ آیاتِ الٰہی کی تکذیب کرنے والے اور یہ تکذیب خواہ انکار کی صورت میں ہو یا مان کر ناقدری کی صورت میں ہو جو لوگ تکذیب کی یا ناقدری کی راہ اختیار کرتے ہیں ان کی مثال بدترین ہے یعنی مثالوں میں ان کی مثال بدترین ہے اور احوال و صفات میں ان کے حالات و صفات بد سے بدتر ہیں۔ ان صفات کے لوگوں اور اس بدترین مثال مصداق لوگوں نے قرآن کے ساتھ اعراض و انحراف کا جو رویہ اختیار کر رکھا ہے اس سے وہ کسی پر نہیں بلکہ ہدایت سے محروم رہ کر اپنے پر ظلم کر رہے ہیں گویا آیاتِ الٰہی سے اعراض کر کے شامت زدہ انسان نقصان کسی اور کا نہیں خود اپنا ہی کرتا ہے۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

یہاں ان آیات کے مطالعہ کے بعد علامہ طیبی کا یہ تاثر بڑا برمحل ہے فرماتے ہیں :

جو شخص اس مثال کا اور ان تمام مثالوں کا جو قرآن میں مشرکین اور بتوں کے بارے میں دی گئی ہیں بنظرِ غائر مطالعہ کرے گا وہ ضرور اس نتیجہ پر پہنچے گا کہ علماءِ سوء ان سے بھی زیادہ برے ہیں۔ یہ لوگ مال وجاہ کے پیچھے پڑ کر ہلاکت کا شکار ہیں۔

صاحبِ معارف القرآن مفتی محمد شفیع صاحب نے اس تمام واقعہ سے اچھی اور کارآمد باتیں بطور نتیجہ پیش کی ہیں :

اول یہ کہ کسی شخص کو اپنے علم وفضل اور زہد وعبادت پر ناز نہیں کرنا چاہیے۔ حالات میں تبدیلی ہونے کا ہر وقت احتمال ہے۔ طاعت وعبادت کے ساتھ اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر اور استقامت کی دعا اور اللہ تعالیٰ پر توکل کرنا چاہیے۔

دوسرے یہ کہ ایسے مواقع اور ان کے مقدمات سے بھی آدمی کو پرہیز کرنا چاہیے جہاں اسے اپنے دین کی خرابی کا اندیشہ ہو خصوصاً مال اور اہل وعیال کی محبت میں اس انجامِ بد کو ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے۔

تیسرے یہ کہ مفسد اور گمراہ لوگوں کے ساتھ تعلق اور ان کا ہدیہ یا دعوت وغیرہ قبول کرنے سے پرہیز کرنا چاہیے۔

چوتھے یہ کہ بے حیائی اور حرام کاری پوری قوم کے لیے تباہی اور بربادی کا سامان ہوتی ہے۔ جو قوم اپنے آپ کو بلاؤں اور آفتوں سے محفوظ رکھنا چاہیے اس کا فرض ہے کہ قوم کے افراد کو بے حیائی کے کاموں سے پورے اہتمام سے روکے۔

پانچویں یہ کہ جسے اللہ سبحانہٗ نے دین کی نعمت سے سرفراز کیا ہو وہ اس کی قدر کرے اور اپنی اصلاح سے کسی وقت بھی بے فکر نہ ہو۔

مَنْ يَّهْدِ اللّٰهُ فَهُوَ الْمُهْتَدِيْ ۚ وَمَنْ يُّضْلِلْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ
الْخٰسِرُوْنَ ۝ وَلَقَدْ ذَرَاْنَا لِجَهَنَّمَ كَثِيْرًا مِّنَ الْجِنِّ وَالْاِنْسِ ۖ
لَهُمْ قُلُوْبٌ لَّا يَفْقَهُوْنَ بِهَا ۡ وَلَهُمْ اَعْيُنٌ لَّا يُبْصِرُوْنَ بِهَا ۡ وَ
لَهُمْ اٰذَانٌ لَّا يَسْمَعُوْنَ بِهَا ۭ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ
اَضَلُّ ۭ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْغٰفِلُوْنَ ۝

جس پر اللہ کامیابی کی راہ کھول دے وہی راہ پر ہے اور جس پر کامیابی کی راہ گم کر دے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو گھاٹے میں ہیں[۲۳۴]۔ اور کتنے ہی جن اور انسان ہیں جن کو ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے[۲۳۵]۔ ان کے پاس عقل ہے مگر وہ اس سے سوچتے نہیں اور اُن کے پاس آنکھیں ہیں مگر وہ ان سے دیکھتے نہیں، کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے یعنی وہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے زیادہ گئے گزرے، ایسے ہی یکقلم غفلت میں ڈوبے ہوتے ہیں[۲۳۶]۔

معانی مفردات

ذرأنا: ذرا سے بنا ہے لغت میں اس کے معنے پیدا کرنا ہیں، خلق اس سے مختلف ہے۔ خلق کے معنے کسی چیز کو نظام و تقدیر کے ساتھ پیدا کرنا ہیں۔ قلب:۔ کے معنے دل کے ہیں لیکن کبھی عقل کو بھی کہتے ہیں۔ لفظ قلب ان معنے میں زیادہ استعمال ہوا ہے۔ لا یفقھون، فقہ سے بنا ہے۔ فقہ کے معنے کسی چیز کو جاننا اور اسے سمجھ جانا ہیں۔ امام راغب نے فقہ کی حقیقت بڑی جامع بتائی ہے۔ یعنی موجود علم کی مدد سے غیر موجود علم تک رسائی ہو جانا، قرآن میں یہ لفظ بایک بینی اور علم میں گہرائی کے معنے میں بھی آیا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث ہم انشاءاللہ معالم القرآن کی گیارہویں جلد میں کریں گے۔ ناظرین اس کا انتظار کریں۔

عقل و حواس کی روشنی کب بیکار ہو جاتی ہے

ان آیات میں ہدایت و ضلالت کے چہرے سے نقاب ہٹائی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ ہدایت کیسے نصیب ہوتی ہے اور ضلالت کیسے آتی ہے۔

اللہ سبحانہٗ کا کام یہ ہے کہ نیکوں کو آہستہ آہستہ نیکی کے مزید راستے دکھائے اور نیکی کے متلاشی کو نیکی کی راہ بتائے۔ اسی کو ہدایت کہتے ہیں اور بُروں کو اس توفیق کے نہ ملنے کا نام ضلالت ہے۔ ان دونوں میں سے ایک کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش سے ہے۔

اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے۔ بچہ چلنا اور بولنا کیونکر سیکھتا ہے۔ وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کوشش کرتا ہے تو اس کے والدین اس کو بولنا اور چلنا سکھاتے ہیں، بچہ پاؤں اٹھاتا ہے اور والدین اس کے ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا سیکھتا ہے وہ پہلے زبان ہلاتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے تو والدین اس کو با معنے الفاظ کی تلقین کرتے ہیں۔ اس طرح دونوں کی کوشش مل کر بارآور ہوتی ہے۔ اسی طرح ہدایت الٰہی اور ارادۂ انسانی مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں۔ ہدایت و ضلالت اللہ سبحانہٗ کا وہ فیضان ہے جو انسان کے اچھے یا بُرے ارادے اور کام کے جواب میں خدا کی طرف سے ہوتا ہے۔ انسان کی جانب سے کفر کا صدور پہلے ہوتا ہے پھر خدا کی جانب سے ضلالت کا فیضان ہوتا ہے وما یضل بہ الا الفاسقین میں یہی بات قصر کے ساتھ پیش کی گئی ہے۔ اسی اضلال کو تشبیہاً ختم اور طبع سے تعبیر کیا ہے بل طبع اللہ بکفرھم

ان کا کفر خدا کی مہر پر مقدم ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہتا ہے تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو جاتا ہے۔ اس کے برعکس اگر لوگ کانوں سے پیغام حق سننے، آنکھوں سے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی ہدایت سے سرفراز فرماتے ہیں۔ قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ ہدایت و سعادت کی راہ عقل و تفکر کی راہ ہے اور گمراہی و شقاوت کا سرچشمہ ہے جہل و کوری اور حواس و تفکر کو بیکار کر دیتا ہے۔ جو لوگ خدا کی دی ہوئی نعمت عقل سے کام نہیں لیتے یا ہوائے نفس سے اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ذہن و ادراک کی قوتیں بیکار ہو جاتی ہیں وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتے۔ یہاں ان آیات میں انسان کی دماغی شقاوت کی اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے۔

۲۳۴۔ جس پر اللہ کامیابی کی راہ کھول دے وہی راہ پر ہے اور جس پر کامیابی کی راہ گم کر دے تو ایسے ہی لوگ ہیں جو گھاٹے میں ہیں۔ علم و فضل بھی انسان کو جب ہی کام دیتا ہے کہ خدا کی ہدایت و دستگیری سے علم صحیح کے موافق چلنے کی توفیق ہو جسے وہ سیدھے راستہ پر چلنے کی توفیق نہ دے، وہ کتنی ہی بڑی علمی فضیلت و قابلیت رکھتا ہو، سمجھ لو کہ خسارے اور ٹوٹے کے سوا کچھ نہیں۔ اس لیے انسان اپنے علم پر مغرور نہ ہو بلکہ دائماً خدا سے ہدایت و توفیق کا طلبگار رہے۔[1]

اس آیت میں دراصل نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی اور ساتھ ہی قریش کو دھمکی بھی، مطلب یہ ہے کہ ہدایت وہی پائیں گے جن کو خدا ہدایت کی توفیق بخشے گا اور خدا توفیق ان کو ہی دیتا ہے جو ہدایت کے طالب ہوں اور خدا کی عطا کردہ صلاحیتوں کو استعمال کریں۔ اگر ایک شخص علم و فضل کے باوجود اپنی آنکھوں اور اپنے دل و دماغ پر خواہشات کی پٹی باندھ کر زندگی گزارتا ہے۔ خدا اسے گمراہی کے لیے چھوڑتا ہے۔ وہ انسان جو اندھا اور بہرا بنتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے۔ خدا اس کو اندھا بہرا بنا کر پھر اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا (فانت تھدی العمی ولو کانوا لا یبصرون۔ میں اسی حالت کی طرف اشارا ہے جو جا بجا قرآن میں بیان کی گئی ہے یعنی جہل و فساد اور تعصب و تقلید کے جمود سے ایسی حالت کا پیدا ہو جانا انسان کی عقل و بصیرت کو یک قلم معطل کر دیتی ہے، اور حواس قابل نہیں رہتا کہ سچائی اور حقیقت کا ادراک کر سکے۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ یہ حالت اس لیے پیش نہیں آتی کہ خدا نے کسی کو اس پر مجبور کر دیا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ ظلم ہوتا اور خدا کا یہ قانون نہیں کہ کسی پر ظلم ہو۔ یہ تو خود انسان کا کرتوت ہی ہے جو خدا کی دی ہوئی روشنی ضائع

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کر کے اندھا، بہرا بن جاتا ہے، چنانچہ آگے آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ کن لوگوں کو ہدایت کے فیضان سے محروم کیا جاتا ہے۔

ہدایت وضلالت کی کشمکش

۲۳۵- اور کتنے ہی انسان اور جن ہیں جن کو ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔ یہ آیت بظاہر آیت وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون کے خلاف معلوم ہوتی ہے۔ اس لیے بعض مفسرین نے وہاں لیعبدون میں لام غایت اور یہاں لجہنم میں لام عاقبت مراد لیا ہے۔ یعنی سب کے پیدا کرنے سے تو مطلوب اصلی تو عبادت ہے لیکن بہت سے جن وانس چونکہ اس مطلب کو پورا نہ کریں گے اور انجام کار دوزخ میں بھیجے جائیں گے۔ اس انجام کے لحاظ سے کہہ سکتے ہیں کہ گویا وہ دوزخ ہی کے لیے پیدا ہوئے ہیں کما فی قولہ تعالیٰ فالتقطہ آل فرعون لیکون لھم عدواً وحزناً باقی محققین کے نزدیک اس تکلیف کی ضرورت نہیں وہ دونوں جگہ لام غایت ہی بتاتے ہیں، مگر لیعبدون میں غایت تشریعی ہے اور یہاں لجہنم میں غایت تکوینی ہے [1]

عموماً یہاں لوگ جبر وقدر کے مسئلہ کو چھیڑتے ہیں یعنی انسان اپنے عمل میں آزاد وخود مختار ہے یا مجبور؟ حالانکہ یہ سر رشتہ کائنات کا وہ عقدہ ہے جس کا حل نہ صرف کسی مذہب کے ناخن سے نہیں ہوتا بلکہ عقل کے ناخن سے بھی نہیں ہو سکتا جیسی اہل مذہب ارادۂ الٰہی اور ارادۂ انسانی کی باہمی تطبیق میں حیران ہیں اسی طرح فلسفہ الٰہیات کے معلم علم الٰہی اور انسان کی عملی آزادی کے درمیان اور فلسفہ اخلاق والے انسان کی آزادیٔ عمل اور اس کے موروثی اثرات، فطری جذبات، اور ماحول کی تاثیرات کی مجبوریوں کے درمیان جو تصادم ہے اس کو بمشکل ہی بچا سکتے ہیں۔

دُنیا کے عام مذاہب کا یہی حال تھا۔ پھر دھاگہ میں گرہ اسی طرح پڑی ہوتی تھی اور اس کے حل کی دو ہی صورتیں انہوں نے نکالی تھیں۔ یا تو سرے سے اس سے خاموشی برتی جائے اور دبے پاؤں اس راستہ سے گزر جائیں بالکل سری تو حری کی طرف ان کا میلان نمایاں تھا۔ یہ جبری ہے جس کے نتیجے میں ہندو مذہب میں تناسخ اور لوگوں کی اور عیسائی مذہب میں کفارہ کی اور یہودی مذہب میں نسلی شرافت کے مسائل اور مذاہب پیدا ہو گئے۔ دوسری طرف مجوسی تھے جنہوں نے

[1] افادات شیخ الاسلام

انسانی اختیارات و آزادی کو یہاں تک بڑھا دیا تھا کہ خود خدا بھی اس کے آگے مجبور تھا۔ خدا کو نہ صرف انسانوں کے بلکہ فرشتوں کے کاموں پر کوئی قابو حاصل نہ تھا۔ غرض حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے مذاہب نے بھی دو راہیں اختیار کی تھیں۔ تمام انبیاء میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت وہ نمایاں شخصیت ہے جس کے ذریعے سے اللہ تعالیٰ اپنے اس دیرینہ راز کو نمایاں کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہاں دو صداقتیں ہیں، اور دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں۔ ایک یہ کہ اللہ تعالیٰ تمام دنیا اور اس کے ذرّے ذرّے پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے۔ آسمان و زمین، بحر و بر میں کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے ارادے اور مشیت کے بغیر حرکت کر سکے۔ اس طرح انسان اور اس کے تمام اعمال بھی اسی کی قدرت اور مشیت کے تحت ہیں۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی اور خصوصاً اسلام کی جان ہے۔ اگر یہ نہ ہو تو مذہب کی قوت بے اثر ہو کر رہ جاتی اور ایک ایسا خدا ماننا لازم آجاتا جس کے اختیارات محدود اور جس کی قدرتیں ناقص اور جس کی شہنشاہی ناتمام ہو۔

دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے کہ دوسری مخلوقات کو نہ سہی مگر انسان کو اپنے اعمال کے کرنے نہ کرنے کا کسی نہ کسی طرح اختیار ضرور بخشا ہے۔ اگر یہ اختیار تسلیم نہ کیا جاتا اور انسان کو اسی طرح سراپا مجبور مان لیا جاتا جس طرح دوسری مخلوقات ہے تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز، جزا و سزا، شریعت، کتاب، تعلیم اور انبیاء کی بعثت یہ تمام چیزیں بیکار محض ہو جاتیں۔ ظلم و انصاف نام کی دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہتی۔ انسان کا اپنے کسی فعل پر قابلِ مدح یا قابلِ ملامت ہونا بے معنے ہو جاتا، کسی اچھے کام پر خدا کا اس کو انعام اور برے کام پہ عذاب سراسر ظلم بن جاتا بلکہ اس دنیا کی عدالت میں بھی وہ اپنے کسی فعل کا ذمّہ دار نہ ٹھہرے۔

الغرض یہ دونوں صداقتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ایک یہ کہ خدا کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت و ارادہ ہر جزو کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمّہ دار بنتا ہے۔ نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ہے۔

قرآن نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ ساتھ اپنی اپنی جگہ پر تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے۔ ایک طرف قرآن کہتا ہے خدا کی اجازت کے بغیر کوئی پتہ نہیں ہلتا۔

ما تسقط من ورقة الا يعلمها ولا حبة فى ظلمات الارض ولا رطب و
لا يابس الا فى كتاب مبين ۔

اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گروہ ہے،

کلُّ نفسٍ بما کسبت رھینۃ

یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیارات اور ناقابلِ رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادے کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی ہے۔ ارادہ و اختیار کے مطابق عمل کرنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری کا تکلیف، بازپرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے۔ اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے اس لیے انسان پر اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً نہیں۔ جو اس کے ارادے اور نیت سے صادر نہ ہوئی بلکہ اس کے کرنے نہ کرنے میں وہ بے اختیار و مجبور رہا۔ اس تطبیق سے نہ تو خدائے پاک کی قدرت و اختیار کی وسعت اور پہنائیوں میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمامتر مجبور ہونا لازم آتا ہے۔ خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیے ہوتے اختیار کو چھین لے لیکن وہ ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون اور فرمائے ہوئے وعدے کے مطابق وہ اس کو اس اختیار و قدرت سے محروم نہیں کرتا، اس لیے ہر انسان اپنی جہنم اور اپنی جنت آپ بناتا۔

اس روشنی میں آیت کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے ایسے لوگ پیدا کیے ہیں۔ جو قصد و ارادہ سے طلبِ ہدایت نہ کریں گے ان کو ہدایت نصیب نہ ہوگی اس لیے لامحالہ ان کا ٹھکانا جہنم ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی طرف اس کا انتساب محض تکوینی حیثیت سے یعنی بطور علۃ العلل کے ہے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم نے ان کو پیدا ہی اس غرض کے لیے کیا تھا کہ وہ جہنم میں جائیں گے اور ان کو وجود میں لاتے وقت ہی یہ ارادہ کر لیا تھا کہ ان کو دوزخ کا ایندھن بنانا ہے بلکہ صحیح مطلب یہ ہے کہ ہم نے تو ان کو پیدا کیا تھا دل و دماغ، آنکھیں اور کان دے کر مگر ظالموں نے ان سے کوئی کام نہیں لیا اور اپنی غلط کاریوں کی بدولت آخر کار جہنم کا ایندھن بن گئے۔ اسی کو کچھ شارحینِ قرآن نے اس طرح پیش کیا ہے لجہنم لامِ عاقبت ہے یعنی ان کی غرض آفرینش ان کو جہنم میں ڈالنا نہیں لیکن وہ اعمال ایسے کریں گے جس کا نتیجہ یہ ہو کر رہے گا۔ اس توضیح کی روشنی میں اس آیت کا و ماخلقت الجن والانس الا لیعبدون سے کوئی تعارض نہیں یعنی انسانوں اور جنوں کی حقیقی غرض وغایت ہی یہ ہے کہ اللہ کی عبادت کریں اس قسم کے دوسرے مواقع پر شارحینِ قرآن نے لامِ عاقبت بتایا ہے مثلاً

انا عرضنا الامانۃ علی السماوات والارض والجبال فابین ان یحملنھا و حملھا الانسان انہ کان ظلوماً جھولا لیعذب اللہ

المنافقین والمنافقات والمشرکین والمشرکات و یتوب اللہ علی المومنین والمومنات وکان اللہ غفوراً رحیماً۔

میں لام کو لام عافیت ہی قرار دیا ہے۔

علامہ آلوسی نے اس پر طویل بحث کی ہے۔ امام رازی اور ابن الجوزی نے بھی لام عافیت ہی کو راجح قرار دیا ہے۔ خبر نہیں حضرت مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی صاحب تفسیر مظہری کو اس میں بوئے اعتزال کیسے آگئی۔

ہدایت سے محروم رہنے والے

۲۳۶۔ ان کے پاس عقل ہے مگر وہ اس سے سوچتے نہیں اور اُن کے پاس آنکھیں ہیں مگر دیکھتے نہیں کان ہیں مگر ان سے سننے کا کام نہیں لیتے، وہ چوپاؤں کی طرح ہیں بلکہ ان سے زیادہ گئے گزرے ایسے ہی لوگ یک قلم غفلت میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ یعنی دل، کان، آنکھ سب کچھ موجود ہیں لیکن نہ دل سے آیات اللہ میں غور کرتے ہیں، نہ قدرت کے نشانات کا بنظر تعمق و اعتبار مطالعہ کرتے ہیں اور نہ خدائی باتوں کو بسمع قبول سنتے ہیں۔ جس طرح چوپائے جانوروں کے تمام ادراکات صرف کھانے پینے اور بہیمی جذبات کے دائرے میں محدود ہوتے ہیں۔ یہی حال ان کا ہے کہ دل و دماغ، ہاتھ پاؤں، کان، آنکھ غرض خدا کی دی ہوئی سب قوتیں محض دنیوی لذائذ اور مادی خواہشات کی تحصیل و تکمیل کے لیے وقف ہیں۔ انسانی کمالات اور ملکوتی خصال کے اکتساب سے کوئی سروکار نہیں بلکہ غور کیا جائے تو ان کا حال ایک طرح چوپائے جانوروں سے بھی بدتر ہے۔ جانور مالک کے بلانے پر چلا آتا ہے، اس کے ڈانٹنے سے رک جاتا ہے۔ یہ کبھی مالک کی آواز پر کان نہیں دھرتے پھر جانور اپنے فطری قویٰ سے وہ ہی کام لیتے ہیں جو قدرت نے ان کے لیے مقرر کردیا ہے زیادہ کی اُن میں استعداد ہی نہیں لیکن ان لوگوں میں روحانی و عرفانی ترقیات کی جو فطری قوت و استعداد ودیعت کی گئی تھی اسے مہلک، غفلت اور بے راہ روی سے خود اپنے ہاتھوں ضائع اور معطل کردیا گیا۔ ؎

یہاں یہ بتایا ہے کہ ہدایت سے محروم کون لوگ ہوتے ہیں گویا لھم قلوب لا یفقھون بہا

؎ افادات شیخ الاسلام

استیناف بیانی ہے یعنی مخاطبوں کے ذہن میں یہ سوال اٹھتا ہے کہ ان کا انجام جہنم کیوں ہے ؟ یا یہ جہنم کے لیے کیوں مخلوق ہوتے ہیں۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا ہے کہ اس لیے ہوتے ہیں کہ ان کو خدا نے دل و دماغ تو دیے ہیں لیکن وہ ان سے سمجھنے کا کام نہیں لیتے، ان کو آنکھیں عطا کی ہیں لیکن وہ ان سے دیکھنے کا کام نہیں لیتے، ان کو کان تو عنایت فرمائے ہیں مگر وہ ان سے سننے کا کام نہیں لیتے۔ یعنی اپنی عقلوں میں یہ بات نہیں سوچتے کہ ان کو نیک بنانے والی اور ان میں تزکیہ پیدا کرنے والی چیز کیا ہے۔ توحید الٰہی جس کے ذریعے انسان اپنے فکر میں خرافات و اوہام سے نجات پاتا ہے اور ذلت و حقارت سے محفوظ ہوتا ہے۔ اس پر غور نہیں کرتے۔ کیونکہ ایمان و یقین کے ساتھ اللہ سبحانہٗ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرے گا۔ اس کی ذات میں رفعت اور بلندی آئے گی۔ اپنے کو در بدر کا بھکاری بنا کر رسوائیوں کا نشانہ نہ بنائے گا۔ اللہ کے سوا نہ کسی کو پکارے گا نہ اللہ کے سوا کسی سے ڈرے گا نہ کسی کو اپنے اعتماد اور بھروسہ کا جائے پناہ بنائے گا بلکہ اپنی تمام حاجتوں، تمام ضرورتوں میں اللہ کو پکارے گا۔ اگر عالم مادی میں اسباب کی زنجیر پر قدرت ہوگی تو اسباب کی راہ سے تلاش کرے گا اور اگر اسباب کا علم نہ ہوگا تو اللہ سے علم اسباب کی درخواست کرے گا۔ بیماری کا علاج حکماء سے کرائے گا۔ مسائل علمیہ میں علماء راسخین سے دریافت کرے گا۔ مطلب یہ ہے کہ سمجھنے، دیکھنے اور سننے کی جو قوتیں اللہ نے دے رکھی ہیں ان سے قطعاً کام نہیں لیتے۔ اپنی ساری صلاحیتیں بس اپنی ہوائے نفس کی تابع کر رکھی ہیں۔ ان سے ہٹ کر کسی چیز کو سننے، سمجھنے اور اس کو اختیار کرنے کا ان میں داعیہ نہیں پایا جاتا۔ فرمایا کہ یہ لوگ چوپایوں کی طرح بلکہ ان سے بھی زیادہ بے عقل ہیں۔ چوپایوں کی مانند اس لیے ہیں کہ جس طرح چوپایوں کی طلب و جستجو بس اپنے پیٹ اور تن کی مطلوبات ہی تک محدود ہوتی ہے۔ اسی طرح ان کی تگ و دو بھی اپنی مادی ضروریات و خواہشات ہی تک محدود ہے اور چوپایوں سے زیادہ بے عقل اس لیے ہیں کہ چوپائے بہرحال اپنی جبلت کی تمام صلاحیتوں سے فائدہ اٹھاتے ہیں اس میں وہ کوئی کمی نہیں کرتے لیکن انسان کی فطرت کے اندر قدرت نے جو اعلیٰ صلاحیتیں رکھی ہیں ان سے نہ صرف یہ کہ وہ حقیقی فائدہ نہیں اٹھاتا بلکہ بسا اوقات اس سے ایسی حرکتیں صادر ہوتی ہیں جو کہ بیل اور گدھے سے بھی نہیں ہوتی ہیں۔ مثلاً انسان انسان ہو کر اتنا بے عقل اور کج فہم بن جاتا ہے کہ درختوں پتھروں اور جانوروں کی پرستش شروع کر دیتا ہے لیکن ایک گدھا یا بیل ایسی بے عقلی کبھی نہیں کر سکتا۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ یہ جو فرمایا کہ ہم نے جہنم کے لیے پیدا کیا تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو ماؤں کے پیٹوں سے جہنم کے لیے پیدا کیا ہے۔ ماں کے پیٹ سے تو اللہ تعالیٰ نے دل، سمع، بصر کی صلاحیتیں دے کر پیدا کیا ہے۔ لیکن قانون یہ ہے کہ جو ان صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں گے اللہ تعالیٰ ان کی رہنمائی جنت کی طرف کرے گا۔ اور جو فائدہ نہیں اٹھائیں گے ان کا انجام بہرحال جہنم ہے۔

وَلِلّٰهِ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى فَادْعُوْهُ بِهَا ۖ وَذَرُوا الَّذِيْنَ يُلْحِدُوْنَ فِيْٓ اَسْمَآئِهٖ ۭ سَيُجْزَوْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸۰﴾

اللہ ہی اچھے ناموں کا مستحق ہے لہٰذا تم اللہ کو اچھے ناموں سے پکارو[237]۔ اور جو لوگ اس کے ناموں میں کج روی اختیار کیے ہوتے ہیں اُن کو چھوڑ دو، وہ وقت دُور نہیں کہ اُن کو اپنے کرتوتوں کا ضرور بدلہ ملے گا[238]۔

معانی مفردات

یلحدون: مضارع معروف الحاد سے بنا ہے مادہ لحد ہے اس کے معنے ہٹنا اور ٹیڑھا ہونا ہیں۔ اسی سے میت کے لیے قبر میں اس گڑھے کو جو درمیان سے جانب قبلہ ہی ہٹا ہوتا ہے لحد کہتے ہیں اور اگر درمیان قبر میں ہو تو اسے شق کہتے ہیں۔ لحد افضل ہے لحد القبر اور الحد القبر دونوں بولا جاتا ہے یعنی قبر میں لحد بنائی۔ اسی سے الحد السهم الهدف تیر نشانہ سے ہٹ گیا۔ چونکہ وسط خیر الامور ہوتا ہے اس لیے درمیان سے ہٹنا برا ہوتا ہے اور اسی لحاظ سے حرم کی بے حرمتی کرنے پر فلان الحد فی الحرم بولا جاتا ہے،

اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات

سورت قریب ختم ہے اس لیے خاتمہ کلام کو نصیحت اور ملامت کا آمیزہ بنا کر پیش کیا ہے۔ یہاں اہل

ایمان کو متنبہ کیا ہے کہ تم غفلت اختیار نہ کرنا یا یوں کہہ دیجیے کہ پہلی آیت میں غافلوں کا ذکر کیا تھا اور اب اس غفلت کا علاج بتایا جا رہا ہے۔ اس کا علاج یہ ہے کہ اللہ کو اس کے اچھے ناموں سے پکارو۔ انسان اپنی زبان میں اشیا کے جو نام رکھتا ہے وہ دراصل اس تصور پر مبنی ہوتے ہیں جو اس کے ذہن میں ان اشیا کے متعلق ہوا کرتا ہے۔ تصور کا نقص نام کے نقص کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے اور نام کا نقص تصور کے نقص پر دلالت کرتا ہے۔ پھر اشیا کے ساتھ انسان کا تعلق اور معاملہ بھی لازماً اس تصور ہی پر مبنی ہوتا ہے جو وہ اپنے ذہن میں اس کے متعلق رکھتا ہے۔ تصور کی خرابی تعلق کی خرابی میں رونما ہوتی ہے اور تصور کی صحت و درستگی، تعلق کی صحت و درستگی میں نمایاں ہو کر رہتی ہے اگر یہ حقیقت دنیا کی تمام چیزوں کے معاملے میں صحیح ہے تو اسی طرح اللہ تعالیٰ کے معاملے میں بھی صحیح ہے۔ اللہ تعالیٰ کے لیے خواہ وہ اسماء ذات ہوں یا اسماء صفات تجویز کرنے میں انسان جو غلطیاں کرتا ہے وہ دراصل اللہ کی ذات و صفات کے متعلق اس کے عقیدے کی غلطی کا نتیجہ ہوتی ہے۔ پھر اللہ سبحانہ کے اپنے تصور و عقیدے میں انسان جتنی اور جیسی غلطی کرتا ہے اتنی ہی اور ویسی ہی غلطی اس سے اپنی زندگی کے پورے اخلاقی رویہ کی تشکیل میں بھی ہوتی ہے کیونکہ انسان کے اخلاقی رویہ کی تشکیل تمام تر منحصر ہے۔ اس تصور پر جو اس نے خدا کے بارے میں اور خدا کے ساتھ اپنے اور کائنات کے تعلق کے بارے میں قائم کیا ہو، اسی لیے فرمایا کہ خدا کے لیے اچھے نام ہی موزوں ہیں اسے اچھے ناموں سے یاد کرنا چاہیے۔ اس کے نام تجویز کرنے میں الحاد بدترین چیز ہے۔

۲۳۷۔ اللہ ہی اچھے ناموں کا مستحق ہے لہٰذا تم اللہ کو اچھے ناموں سے پکارو۔ غافلین کا حال ذکر فرما کر مومنین کو متنبہ فرمایا ہے کہ تم غفلت اختیار نہ کرنا، غفلت دور کرنے والی چیز خدا کی یاد ہے سو تم ہمیشہ اسے اچھے ناموں سے پکارو اور اچھی صفات سے یاد کرو۔ [1]

قرآن نے اللہ سبحانہ کی صفات کا جو تصور ہم میں پیدا کرنا چاہا ہے وہ سرتاسر حسن و خوبی کا تصور ہے چنانچہ وہ خدا کی تمام صفتوں کو حسنیٰ قرار دیتا ہے یعنی خوبی و کمال کی صفتیں، یہ صفتیں کیا ہیں، قرآن نے جا بجا بیان کی ہیں اور شمار کی گئیں تو ۹۹ نکلی ہیں۔ ان تمام صفتوں کے معانی پر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ قرآن کا تصور کس درجہ بلند اور کامل ہے۔ صرف ان صفات کے معانی پر تدبر کر کے ہم کائنات ہستی کے بے شمار اسرار و دقائق کی معرفت حاصل کر سکتے ہیں کیونکہ یہاں جو کچھ ہے انہی صفات کا ظہور ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء صفات کا مسئلہ قرآن کی ان اہم اصلاحات میں سے ہے جن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے بلکہ دُنیا کے بڑے بڑے مذاہب بھی ان کے متعلق غلطیوں میں مبتلا تھے۔ یہودیوں کے اسفار اور صحیفوں میں خدائے برحق کا اصلی نام یہودا تھا مگر کبھی عام یہودیوں کو اس مقدس نام کے زبان پر لانے کی اجازت نہ تھی۔ دوسرا عام نام "ایلیم" ہے جو ہر موقع پر استعمال ہوتا ہے۔ ان دو کے علاوہ خدا کے بیسیوں نام اور اسماء جو درحقیقت اس کے اوصاف ذاتی اور اعمال ربانی کے ترجمان ہیں۔ تورات کا دفتر ان کے ذکر سے بالکل خالی ہے۔ صفاتِ الٰہی میں سے جو صفت یہودی صحیفوں میں سب سے زیادہ نمایاں ہے۔ وہ فوجوں والا خدا یعنی رب الافواج ہے جو صرف خدا کی صفاتِ جلالی کا مظہر ہے۔ عیسائیوں کی انجیل اور مذہبی کتابوں میں باپ کا لفظ خدا کے لیے استعمال ہوا ہے۔ اس لفظ کی حقیقت اور خدا پر اس کے اطلاق سے مقصود کیا ہے۔ گوشت پوست اور مادیت سے بھرے ہوئے لفظ کا خدا پر مجازاً اطلاق بھی کہاں تک جائز ہے اور اس سے اس مذہب میں کہاں تک غلطیاں پھیلیں۔ ان باتوں کو چھوڑ کر بھی دیکھئے تو یہ صرف خدا کی حبابی صفات کی ناقص اور مادی تعبیر ہے۔ عیسائیت میں فلسفہ کی آمیزش نے تثلیث کے اختراعی عقیدہ کو اسی مسئلہ صفات کے پردے میں چھپا لیا۔

ہندوؤں میں اللہ تعالیٰ کے اسماء و صفات کی نیرنگی نظر آتی ہے لیکن ہر ہر صفت نے ان کے ہاں ایک مستقل وجود حاصل کر لیا ہے اور خود خدا ہر قسم کی صفات سے خالی اور مجرد رہ گیا ہے۔

اس سے آپ کو اندازہ ہو گا کہ اس مسئلہ کی غلط تعبیر نے دُنیا میں کتنی گمراہیاں پیدا کی ہیں۔

قرآن نے انسانوں کے ان تمام فاسد خیالات کو باطل ٹھہرایا ہے، ان کے غلط عقیدوں کی تصحیح کی اور ربانی ہدایت کے نور سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سراج رسالت منیر بن کر جس طرح حقیقت کو روشن کیا وہ نبوتِ محمدی کے عظیم کارناموں میں ہے۔

آپ نے بتایا کہ اللہ تعالیٰ کی صفات کا ملہ گنتی اور شمار کی حد سے باہر ہیں۔ اور اس کی باتوں کی کوئی انتہا نہیں۔ آپ نے یہ دُعا سکھائی۔

اللھم انی اسالک بکل اسم ھو لک سمیت بہ نفسک او انزلتہ فی کتابک او علمتہ احداً من خلقک او استاثرت فی علم الغیب عندک۔

اے اللہ تیرے ہر اس نام کے وسیلہ سے جو تو نے اپنا رکھا یا کتاب میں اتارا یا کسی مخلوق کو سکھایا یا اپنے لیے اپنے علم غیب میں اس کو چھپا یا کیا میں تجھ سے مانگتا ہوں۔

قرآن اللہ تعالیٰ کے تمام اوصافِ حمیدہ اور اسمائے حسنہ سے بھرا ہوا ہے بلکہ اس کا صفحہ صفحہ

اللہ سبحانہ کے اسماء صفات کی جلوہ گریوں سے معمور ہے۔ قرآن کا کوئی رکوع ہوگا جس کا خاتمہ خدا کی توصیف اور حمد پر نہ ہو۔ اور یہ تمام اوصاف اور نام اس عشق و محبت کو نمایاں کرتے ہیں جو اس محبوب ازل اور نور عالم کے ساتھ ہر پیرو کے دل میں ہونا چاہیے۔

قرآن پاک اور احادیث میں اللہ سبحانہ کے سو سے زیادہ نام اور اوصاف آئے ہیں۔ صحیح احادیث میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ کے ننانوے نام ہیں۔ جو ان کو محفوظ رکھے یا نگاہ میں رکھے وہ جنت میں داخل ہوگا۔ اللہ سبحانہ، طاق ہے وہ طاق عدد کو پسند کرتا ہے۔ آخری فقرہ اس علت کو ظاہر کرتا ہے کہ ۹۹ نام کیوں ہیں ۱۰۰ کیوں مقرر نہیں کیے گئے۔ یہ اس لیے کہ اگر پورے ۱۰۰ ہوتے تو عدد طاق نہ رہتا اور اس سے توحید کی نشاندہی نہ ہوتی۔

صحیح احادیث میں صرف اسی قدر ہے یعنی صرف ۹۹ کی تعداد بتائی گئی ہے۔ ۹۹ کی تفصیل سے بحث نہیں کی گئی۔ لیکن ترمذی اور حدیث کی دوسرے درجہ کی کتابوں میں ان ناموں کی تفصیل بھی پیش کی گئی ہے مگر محدثین نے عموماً یہاں تک کہ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں بھی لکھا ہے کہ یہ تفصیل والی روایات ضعیف ہیں۔ پھر ان روایتوں میں بعض ناموں کا رد و بدل بھی ہے اور کچھ ایسے نام بھی ہیں جو قرآن میں مذکور نہیں ہیں۔ اور بعض قرآن میں ذکر کردہ نام ان حدیثوں میں مذکور نہیں ہیں۔ اسی لیے محققین کا فیصلہ یہ ہے کہ ان روایتوں میں ناموں کا انتخاب راویوں نے خود اپنی تلاش و جستجو سے کیا ہے۔ اس بنا پر ان روایتوں سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ اسماء الٰہی صرف ننانوے میں منحصر ہیں۔ بڑے بڑے ائمہ اور محدثین مثلاً عبدالعزیز یحییٰ، ابو بکر بن عربی، امام نووی، حافظ ابن حجر، علامہ خطابی، حافظ ابن تیمیہ اور علامہ قرطبی نے تصریح کی ہے کہ اسماء الٰہی ننانوے میں محصور نہیں ہیں۔ اور یہ بھی تصریح ملتی ہے کہ اسماء و صفات الٰہی محدود نہیں ہیں اور اس پر محدثین نے حضرت عبداللہ بن مسعود کی ان احادیث سے جن میں تصریح ہے کہ بکل اسم ھو لک سمیت بہ نفسک استدلال کیا ہے۔ ابن کثیر اسی حدیث کو دلیل بنا کر لکھتے ہیں کہ اسماء حسنیٰ ۹۹ میں منحصر نہیں ہیں۔

بہر حال قرآن حکیم اور احادیث کے تتبع سے اہل علم نے ۹۹ ناموں کا پتہ چلایا ہے اور ان کو الگ الگ ایک ایک کرکے گنایا ہے یہ تمام نام وہ ہیں جو بطور علم اور بطور صفت قرآن حکیم میں آئے ہیں یا افعال کی حیثیت سے خدا کی طرف منسوب ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دعاؤں میں ان کی تعلیم دی ہے۔ ہم ذیل میں بہ ترتیب ایک ایک نام لکھتے ہیں اور اس کی مختصر لغوی تشریح کرتے ہیں تاکہ معلوم ہو سکے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خدا کا جو تخیل اور عقیدہ مسلمانوں کو سکھایا وہ کتنا

وسیع، کتنا بلند، کتنا منزّہ اور پاکیزہ ہے۔ علماء نے ان ناموں کو یا ان صفات کو مختلف معنوی مناسبتوں سے ترتیب دیا ہے لیکن ہم نے ان کے صرف تین مرتبے قرار دیے ہیں۔

ایک وہ جن سے اس کے رحم و کرم عفو و درگزر یعنی صفات جمالی ظہور پر ہوتی ہیں۔ دوسرے وہ جن سے اس کی شہنشاہی جلال و جبروت اور حکومت و استیلاء کا اظہار ہوتا ہے اور ہم ان کو جلالی صفات کہتے ہیں۔ تیسرے وہ اسماء و صفات جن کی اس کی تنزیہہ، بلندی کمالات کی جامعیت اور ہر قسم کے اوصاف حسنہ اور محامد عالیہ کا ثبوت ملتا ہے اور ان کو ہم صفات کمال کہتے ہیں۔ الغرض اللہ سبحانہ، کے اسماء و صفات تین قسم کے، صفاتِ جمال، صفاتِ جلال اور صفاتِ کمال ہیں۔

اللہ سبحانہ، کی صفاتِ جمال

وہ اسماء و صفات جن سے اللہ سبحانہ، کے رحم و کرم اور شفقت و محبت کا اظہار ہوتا ہے۔

اللہ :- یہ خدا کا وہ نام ہے جو قرآن پاک میں بطورِ علم ہر جگہ استعمال کیا گیا ہے اور اسلام سے پہلے بھی یہ عرب میں خدائے برحق کے لیے استعمال ہوتا تھا بلکہ محققین کی رائے ہیں ساری زبانوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ حروف و اصوات کی ایک خاص ترکیب ہے جو معبودیت کے معنے میں استعمال رہی ہے اور عبرانی، سریانی، کلدانی، حمیری، عربی وغیرہ تمام زبانوں میں اس کا یہ لغوی خاصہ پایا جاتا ہے۔ یہ الف لام اور ہ کا مادہ ہے اور مختلف شکلوں میں مشتق ہوا ہے کلدانی، و سریانی کا الاہیا، عبرانی کا الوہ اور عربی کا الٰہ اسے ہے۔ بلاشبہ یہی الٰہ تعریف کے بعد اللہ ہوگیا ہے اور تعریف نے اسے خالق کائنات کا علم بنا دیا۔

الرحمان : بے حد مہربان

الرحیم : نہایت رحم والا

الرب : پرورش کرنے والا، ہر لحظہ مخلوق کی نشوونما اور ترقی کا ذمہ دار

اللطیف : لطیف والا، مہربان

العفو : معاف کرنے والا، درگزر کرنے والا۔

الودود : محبوب، محبت کرنے والا، پیار کرنے والا

السلام : امن و سلامتی، صلح و آشتی، ہر عیب سے پاک و صاف

المحبُّ : محبت والا، پیار والا، چاہنے والا۔

المومن : امان دینے والا، امن بخشنے والا، ہر خوف سے بچانے والا
الشکور : اپنے بندوں کے نیک عمل کو قبول کرنے والا اور پسند کرنے والا
الغفور، الغفار } معاف کرنے والا، گناہ بخشنے والا، درگزر کرنے والا
الحفیظ الحافظ : حفاظت کرنے والا، نگہبان، بچانے والا
الوہاب : دینے والا، عطا کرنے والا، بخشنے والا
الرازق والرزاق : روزی دینے والا، نشوونما کا سامان بہم پہنچانے والا
الولی : دوست، حمائتی، طرفدار
الرؤف : مہربان، نرمی، اور شفقت کرنے والا
المقسط : انصاف والا، عادل
الہادی : راہ دکھانے والا، رہنما
الکافی : اپنے بندوں کی ہر ضرورت کے لیے کافی
المجیب : قبول کرنے والا، دعاؤں کا سننے والا
الحلیم : بردبار، بندوں کی برائیوں سے چشم پوشی کرنے والا
التواب، قابل التوب } توبہ قبول کرنے والا، گنہگاروں کے گناہوں سے درگزر کرنے والا
الحنان : ماں کی طرح بچوں پر شفقت کرنے والا
المنان : احسان کرنے والا
النصیر :- مدد کرنے والا
ذوالطول : کرم والا
ذوالفضل : فضل والا
الکفیل : بندوں کی کفالت کرنے والا
الوکیل : بندوں کی ضرورتوں کا ذمہ لینے والا
المقیت : روزی پہنچانے والا
المغیث : فریاد کو پہنچنے والا، فریادرس

المجیر: پناہ دینے والا
المغنی: بندوں کو اپنے سوا ہر چیز سے بے نیاز کرنے والا

اللہ سبحانہٗ کی جلالی صفات

وہ اسماء جن سے خدا کی بڑائی، کبریائی، شہنشاہی اور ملوکیت کا اظہار ہوتا ہے۔
الملک والملیک: بادشاہ، فرمانروا
الحکم: فیصلہ کرنے والا
المقتدر: اقتدار والا، جس کے سامنے کوئی چون و چرا نہ کرے۔
العلی: برتر، جس کے سامنے سب کمتر ہوں
العظیم: بزرگتر، جس کے سامنے سب ہیچ ہوں
الکبیر: بڑا۔
العزیز: غالب، جس پر کوئی دسترس نہ پائے
القاھر: جس کے حکم سے کوئی باہر نہ ہو
القہار: سب کو دبا کر اپنے قابو میں رکھنے والا
المنتقم: سزا دینے والا۔
الجبار: جبروت والا جس کے سامنے کوئی دم نہ مار سکے
المہیمن: سب کا نگران اور سب پر شاہد
المتکبر: کبریائی والا، اپنی بڑائی دکھانے والا
شدید العقاب: سخت، سزا دینے والا
شدید البطش: بڑی گرفت والا
المدبر: تدبیر کرنے والا
مالک الملک: سلطنت کا مالک جس کے سامنے کسی کی کوئی حکومت نہیں
المحی: زندہ کرنے والا
الممیت: مارنے والا
المعز: عزت دینے والا

المذل : ذلت دینے والا

الخافض : پست کرنے والا

الرافع : اونچا کرنے والا

المعطی : دینے والا

المانع : رد کرنے والا

النافع : نفع پہنچانے والا

الضار : نقصان دینے والا

اللہ سبحانہ کی صفاتِ کمال

وہ اسماء وصفات جن سے خدا کی خوبی، بڑائی، بزرگی اور ہر وصف میں اس کا کامل ہونا ظاہر ہوتا ہے اس طرح کے اسماء وصفات پانچ قسم کے ہیں۔ ایک وہ جو اس کی واحدنیت سے متعلق ہیں، دوسرے وہ جو وجود سے تعلق رکھتے ہیں، تیسرے اس کے علم سے، چوتھے اس کی قدرت سے اور پانچویں اس کی تنزیہ سے

صفاتِ واحدانیت

وہ صفتیں جو خدا کی یکتائی اور بے مثالی کو ظاہر کرتی ہیں اور وہ یہ ہیں :

الواحد : ایک

الاحد : ایک

الوتر : طاق جس کا کوئی جوڑ نہیں

صفاتِ وجودی

یعنی وہ صفتیں جن سے اس کا وجود بقاء دوام ازلیت اور بے زوالی ظاہر ہوتی ہے۔

الموجود : وجود والا، ہست

الحی : ہمیشہ زندہ، غیر فانی

القدیم : وہ جس سے پہلے کوئی دوسرا موجود نہیں جو ہمیشہ سے ہے۔

القیوم : جو اپنے سہارے تمام کائنات کو سنبھالے ہوتے ہے۔

الباقی : جس کو ہمیشہ بقا ہے
الدائم : ہمیشہ رہنے والا
الاوّل : وہ پہلا جس کے پہلے کوئی نہیں
الآخر : وہ پچھلا جو سب کے فانی ہونے کے بعد بھی ہمیشہ باقی رہے گا۔
المقدم : جو سب سے آگے سے ہے
المؤخر : جو سب سے پیچھے رہ جائے گا
الظاہر : جس کا وجود کھلا اور نمایاں ہے
الباطن : جو چھپا اور مخفی ہے۔

علم کی صفات

وہ صفات جو اس کے ہر چیز سے باخبر اور آگاہ ہونے کو ظاہر کرتی ہیں۔
الخبیر : خبر رکھنے والا
العلیم : جاننے والا
علام الغیوب : جو باتیں سب سے پوشیدہ ہیں ان کو جاننے والا
علیمٌ بذات الصدور : دلوں کے چھپے ہوئے بھید کو جاننے والا۔
السمیع : سننے والا
البصیر : دیکھنے والا۔
المتکلم : بولنے والا اپنے علم اور ارادے کو ظاہر کرنے والا
الواجد : پانے والا، جس کے علم سے کوئی چیز گم نہیں۔
الشہید : حاضر جس کے سامنے سے کوئی چیز غائب نہیں
الحسیب : حساب کرنے والا، یعنی جس چیز کا علم حساب کے ذریعے کیا جاتا ہے۔
المحصی : گننے والا یعنی جن چیزوں کا علم گن کر حاصل کیا جاتا ہے
الحکیم : حکمت و عقل والا، سب کاموں کو مصلحت سے کرنے والا
المرید : ارادہ کرنے والا، مشیت والا
القریب : نزدیک جو اپنے علم کے اعتبار سے گویا سب کے پاس ہے۔

اللہ سبحانہ کی شان قدیری

اللہ کی وہ صفتیں جن سے اس کی قدرت کی وسعت کا اظہار ہوتا ہے

الفاتح : ہر مشکل کو کھولنے والا

الفتاح : ہر مشکل کو خوب کھولنے والا

القدیر : قدرت والا

القادر : قدرت والا

القوی : زبردست جس کے سامنے کسی کا بس نہیں چلتا۔

المتین : مضبوط جس میں کوئی کمزوری نہیں

الجامع : جمع کرنے والا، متفرق اور پراگندہ چیزوں کو اکٹھا کرنے والا

الباعث : اٹھانے والا، مُردوں کو قبروں سے اٹھانے والا

البدیع : نئی نئی چیزیں ایجاد کرنے والا

الواسع : سمانے والا جو ہر چیز کو سمائے ہوئے ہے

المحیط : احاطہ کرنے والا

القابض : سمیٹنے والا

الباسط : پھیلانے والا

المبدئ : جو چیز پہلے سے موجود نہ ہو اس کو وجود میں لانے والا

المعید : جو ہو کر فنا کر دی گئی ہو اس کو پھر دوبارہ وجود میں لانے والا

اللہ سبحانہ کی تنزیہی صفات

وہ صفات جو اس کی پاکی اور نیکی اور ہر عیب و نقصان سے اس کی برأت کو ظاہر کرتی ہیں۔

الرفیع : بلند

الجلیل : بزرگ

الکریم : شریف

الغنی : بے نیاز

الصادق : سچا

الماجد : عزت والا

الحمید : تعریف والا

القدوس : پاک

الحق : سچا اور اصلی یعنی یہ کہ اس کے سوا سب باطل ہیں

الجمیل : اچھا

البر : نیک

العدل : عادل

سبوح : ہر عیب سے پاک

الصمد : بزرگی کی ہر صفت میں کامل

الرشید : سیدھی راہ چلنے والا نہ بھٹکنے والا۔

قرآن نے صفات و اسماء کے تصورِ الٰہی کا جو آئینہ ہمارے سامنے پیش کیا ہے اسے پڑھ کر آپ محسوس کریں گے کہ تصورِ الٰہی کی تمام تصویروں میں اس کی تصویر جامع اور بلند تر ہے۔ تنزیہہ کی حد تک قرآن کا تصورِ تنزیہہ ایسا مکمل ہے جس کی نظیر دنیا کے فلسفہ و کلام میں موجود نہیں۔ قرآن سے پہلے جہاں تک صفاتِ الٰہی کا تعلق ہے انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت اور جسم و ہیئت کے تمثل سے کوئی تصور بھی خالی نہ تھا۔ یہودی تصور جو توحید کا سب سے بڑا علمبردار تھا وہ بھی تشبیہہ اور تمثیل سے یکسر آلودہ ہے حضرت ابراہیم کا خدا کو مرے کے جوطوں میں دیکھنا۔ خدا کا حضرت یعقوب سے کشتی لڑنا، کوہ طور پر شعلوں کے اندر نمودار ہونا۔ حضرت موسیٰ کا خدا کو پیچھے سے دیکھنا۔ خدا کا جوشِ غضب میں آکر کوئی کام کر بیٹھنا، اور پھر پچھتانا، بنی اسرائیل کو اپنی چہیتی بیوی بنانا اور پھر اس کی بدچلنی پر ماتم کرنا۔ ہیکل کی تباہی پر اس کا نوحہ، اس کی انتڑیوں میں درد کا اٹھنا اور کلیجے میں سوراخ پڑ جانا، تورات کا عام اسلوب ہے لیکن اس کے بعد جب ہم قرآن کے پیش کردہ خدا کے اسماء پر غور کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ گویا اچانک فکر و تصور کی ایک بالکل نئی دنیا سامنے آگئی۔ یہاں تشبیہہ کے تمام پردے یک دفعہ اٹھ جاتے ہیں۔ انسانی اوصاف و جذبات کی مشابہت مفقود ہو جاتی ہے۔ ہر گوشہ میں مجاز کی جگہ حقیقت کا جلوہ نمایاں ہو جاتا ہے اور تجسم کا شائبہ تک باقی نہیں رہتا، تنزیہہ اس مرتبہ کمال تک پہنچ جاتی ہے کہ القدوس، سبوح، الجمیل، الصمد کہہ کر تشبیہہ و تمثیل کے سارے تصورات کافور ہو جاتے ہیں فلاسفہ

متکلمین کی تنزیہہ کا میدان جہاں جا کر ختم ہوا وہ یہ تصور تھا کہ خدا یہ نہیں، یہ نہیں، یہ بھی نہیں، مگر پھر ہے کیا، اس راہ میں غلو نے تنزیہہ کو تعطیل کا لبادہ پہنا دیا۔ تنزیہہ سے مقصود یہ ہے کہ جہاں تک عقل بشری کی رسائی ہے صفاتِ الٰہی کو مخلوقات کی مشابہت سے پاک اور بلند رکھا جائے۔ تعطیل کے معنے یہ ہیں کہ تنزیہہ کے منع ونفی کو اس حد تک پہنچا دیا جائے کہ فکرِ انسانی کے تصور کے لیے کوئی بات باقی نہ رہے۔

جس طرح اثبات صفات میں غلو تشبیہ کی طرف لے جاتا ہے اسی طرح نفی صفات میں غلو تعطیل تک پہنچا دیتا ہے اور دونوں میں انسانی تصور کے لیے ٹھوکر ہے اگر تشبیہ اسے حقیقت سے نا آشنا کر دیتا ہے تو تعطل اسے عقیدہ کی روح سے محروم کر دیتا ہے۔ ضروری ہے کہ افراط و تفریط دونوں سے قدم روکے جائیں اور تشبیہ و تعطیل دونوں کے درمیان راہ نکالی جائے۔

اسمائے الٰہیہ اور دعا

اس آیت میں یہ بات بتانے کے بعد کہ حسن وجمال والے سارے نام اللہ ہی کے لیے ہیں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ اسمائے حسنیٰ کے ذریعے اللہ سے مانگو اور ان کے ذریعے اللہ کو پکارو۔ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مشرکین برکت کی امید پر اپنے معبودوں کے ناموں کی تلاوت کرتے تھے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ اپنے معبودوں کے ناموں کی جگہ اللہ سبحانہٗ کے اچھے ناموں کے ذریعے اللہ کو یاد کرو اور ان ناموں کے ذریعے دعائیں مانگو۔ ذکر اور دعا دونوں ایمان کی غذا ہیں۔ اور ان کے ذریعے قلب میں اللہ کی محبت اللہ کے لیے خشوع اور اللہ کی طرف رغبت زیادہ ہوتی ہے دنیا سے بے رغبتی اور دنیا کی زندگی میں مصائب کی حقارت اور دنیا کی چیزوں کے نہ ہونے پر بے غمی یادِ الٰہی کا خاصہ ہے۔ حدیث صحیح میں ہے۔

جس پر غم آجائے یا پریشانی کا شکار ہو جائے یا کوئی اہم معاملہ درپیش آجائے تو اس طرح کہے۔

لا الٰہ الا اللہ العظیم الحلیم، لا الٰہ الا اللہ رب العرش العظیم، لا الٰہ الا اللہ رب السماوات والارض ورب العرش الکریم۔

سنن ترمذی میں حدیث ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک شخص کو دعا میں یہ کہتے ہوئے سنا، یا ذا الجلال والاکرام آپ نے فرمایا مانگ تجھے شرف قبولیت ہو گئی۔ مستدرک حاکم میں حضرت انس کے حوالہ سے ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت فاطمہ سے فرمایا میری اس وصیت سننے سے تمہیں

کیا چیز مانع ہے کہ تم ہر صبح اور ہر شام یہ دعا کیا کرو

یاحی یا قیوم برحمتک استغیث ، اصلح لی شانی کلہ ولا تکلنی الی نفسی طرفۃ عین

اسمائے الہیہ پر مشتمل دعاؤں کا کافی ذخیرہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اور علامہ جزری کی الحصن الحصین اور علامہ نووی کی کتاب الاذکار میں موجود ہے ۔

اسلوب قرآنی اور اسماء الٰہی

قرآن حکیم کا اسلوب و انداز بیان یہ ہے کہ وہ جا بجا اسمائے الہیہ لاتا ہے پھر اپنے ماقبل و مابعد میں ان اسماء کے مظاہر بطریق استشہاد پیش کرتا ہے تاکہ پہلے ان اسماء کی عظمت ذہن نشین ہو اور انسانی ادراک کے قصور اور الفاظ کی کوتاہ دامنی کی وجہ سے ان کے بلند حقائق کو سمجھنے میں جو کوتاہی باقی رہ جاتے وہ ان کے مظاہر دیکھ کر پوری ہوتی ہے ۔ اگر قرآن اللہ سبحانہ کی شان عزیزی و قہاری کا تذکرہ کرتا ہے تو بتلا دیتا ہے کہ یہ وہ عزت و قہر نہیں جس کی اس کے تصور میں سمائی ہو۔ اگر اللہ کے جود و رحمت کا ذکر کرتا ہے تو اس کے ساتھ ہی سمجھا دیتا ہے کہ یہ اس نوع کی جود و رحمت نہیں کہ وہاں تک عقل کی رسائی ہو ۔ اسماء اصل مقاصد نہیں بلکہ ذات حق کی معرفت کا ایک راستہ ہے جس سے گزر کر ذات پاک تک رسائی ہوتی ہے ۔ اگر ان اسماء کا توسط نہ ہوتا تو داغ مہجوری عالم امکان کے لیے ہمیشہ نقد وقت رہتا ۔ ذات پاک اپنی بے نیازی میں اور ممکن اپنے ادراک کے عجز و قصور میں ہمیشہ سرگرداں نظر آتا ۔ یہ ذات اقدس کی بڑی فیاضی ہے کہ اس نے اپنی معرفت کے لیے حجاب اسماء ڈال دیا ہے کہ جو مشتاق اس ذات مستجمع جمیع کمالات کا نظارہ کرنا چاہے وہ ان اسماء میں آج بھی نظارہ کر سکتا ہے ۔

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل
ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

سورۂ ملک کو پڑھیے ، اس کی ابتداء تبارک الذی بیدہ الملک سے ہوتی ہے اس میں خدائی مملکت کا نقشہ پیش کیا گیا ہے اور اس کی وسعت کے وہ حدود بتلاتے گئے جو انسانی دسترس سے وراء الوراء ہیں ۔ اس ضمن میں ایک ملک والے کے لیے جو اسماء درکار ہیں ان کو موقعہ بموقعہ ایسا چسپاں کیا کہ گویا وہ آیت اسی اسم کی تشریح کے لیے اتری ہے ۔ اسی لیے علماء معانی نے ایجاز و آیات

کو قرآن کا ایک اعجاز قرار دیا ہے۔ اگر اس استحضار کے ساتھ آپ سورۃ ملک پڑھیں تو ابھی آپ سورت کو ختم نہیں کریں گے کہ الٰہی جبروت و ملکوت کا ایک قاہرانہ تسلط آپ کے دل و دماغ پر مستولی ہو جائے گا، استواء علی العرش اور سبع سماوات والارض، عرش و کرسی کا تذکرہ بھی اس لیے نہیں ہے کہ اللہ سبحانہ کے لیے کسی بڑے مکان کا تصور قائم کیا جائے بلکہ اس لیے ہے کہ ایک عاجز مخلوق کو ایک نادیدہ ذات کا شاہانہ تعارف ہو تو کیسے ہو اس لیے اس کی پرواز کے اعلیٰ سے اعلیٰ اور بلند سے بلند تخیل کو اس کے سامنے رکھا گیا ہے تاکہ وہ خدائی عظمت و جلال کی بلند سے بلند رفعتوں کو عبور کرنے کے قابل ہو جائے یہ گمان نہ کرنا چاہیے کہ یہ الفاظ بے مصداق ہیں یہ تو فکر اعتزال ہے ہرگز نہیں قرآن شاعرانہ تخیل سے بہت بلند ہے اسی لیے وہ شعر کی مذمت کرتا ہے کہ اس میں حقیقت نہیں ہوتی اور یہاں صرف حقیقت ہی حقیقت ہے بلکہ اللہ سبحانہ نے ان اشیاء کو پیدا فرمایا ہے اور ان کی حقیقتیں اپنی اپنی جگہ موجود ہیں مگر اس کے ساتھ یہ بھی ہے کہ ذات پاک کا تصور اس سے بھی وراء الوراء ہے یہاں شیخ اکبر کے الفاظ کس قدر قیمتی ہیں۔

معتقدات اور معقولات صورتوں، خدائی تجلیات اس لیے ہوتی ہیں کہ علم انسانی کی رسائی کے لیے ایک گزرگاہ بن سکیں جن سے عبور کر کے یہ علم حاصل ہو جائے کہ ان تجلیات کے پس پردہ کوئی ایسی باکمال ذات موجود ہے جو ہمارے احاطہ علم و مشاہدہ سے بالا ہے بس ہم اتنا ہی جان سکتے ہیں کہ اسے جان نہیں سکتے۔

(الیواقیت والجواہر)

کیف الوصول الی سعاد ودونہا

قلل الجبال ودونہن حتوف

سعاد محبوبہ ہی تک رسائی ہو تو کیسے ہو کہ اس سے پہلے بلند پہاڑیاں ہیں اور ان سے پہلے ایک موت نہیں بلکہ بہت ہی موتیں ہیں۔

اسماء الٰہیہ میں الحاد

۲۳۸- اور جو لوگ اس کے ناموں میں کج روی اختیار کرتے ہیں ان کو چھوڑ دو، وہ وقت دور نہیں کہ ان کو اپنے کرتوتوں کا ضرور بدلہ ملے گا۔ خدا کے ناموں اور صفتوں میں کج روی یہ ہے کہ خدا پر ایسے نام یا صفت کا اطلاق کرے جس کی شریعت نے اجازت نہیں دی اور جو حق کی تعظیم واجلال کے

لائق نہیں یا اس کے مخصوص نام اور صفت کا اطلاق غیر اللہ پر ہے یا ان کے معانی بیان کرنے میں بے اصول تاویل اور کھینچ تان کرے یا ان کو معصیت مثلاً سحر وغیرہ کے مواقع میں استعمال کرنے لگے یہ سب کج روی ہے ۔ ؎

الحاد کے شارحین قرآن نے ایک سے زیادہ مصداق بتاتے ہیں ۔

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اس کا مصداق تکذیب ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اللہ سے لات اور اعز سے عزیٰ بنالینا بھی الحاد ہے ۔ امام اعمش فرماتے ہیں کہ الحاد یہ ہے کہ خدا کے ناموں میں وہ نام داخل کرتے ہیں جو خدا کے نام نہیں ہیں اور قتادہ سے الحاد کے دو مصداق منقول ہیں ایک شرک کرنا دوسرے اسماء میں تکذیب ۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ناموں میں الحاد یہ ہے کہ اسماء الٰہیہ کی تکذیب کی جاتے ۔ ان کے معانی کا انکار کیا جاتے ، ان میں تاویل کے ذریعے تحریف کی جائے اور اللہ سبحانہٗ کے لیے ایسے نام بولے جائیں جو قرآن و سنت میں نہیں آتے اور جو اس کے شایان شان نہیں خدا کے ناموں میں غیر اللہ کو شریک کر دینا ۔ گویا خدا کو ایسے نام دیے جائیں جو اس کے مرتبے سے فروتر ہوں ، جو اس کے ادب کے منافی ہوں ۔ جن سے عیوب اور نقائص اس کی طرف منسوب ہوتے ہوں یا جن سے اس کی ذات اقدس کے متعلق غلط عقیدے کا اظہار ہوتا ہو ۔ نیز یہ بھی الحاد ہے کہ مخلوقات میں سے کسی کے لیے ایسا نام رکھا جاتے جو صرف خدا ہی کے لیے موزوں ہو ۔

الحاد کی عام صورتیں یہ ہیں :

اولاً یہ کہ اللہ سبحانہٗ کے لیے اسماء تجویز کرنا جو قرآن و سنت سے ثابت نہیں ہیں ۔ اہل حق کا اس پر اتفاق ہے کہ اسماتے الٰہیہ توقیفی ہیں ۔ صوفیا میں سے شیخ اکبر نے بھی اس پر تنبیہ فرمائی ہے کہ اسماتے الٰہیہ توقیفی ہیں ۔ جو نام جس طرح شریعت میں استعمال کیا گیا ہے اس سے تجاوز کرنا درست نہیں ہے اس لیے اللہ سبحانہٗ کو حی کہا جائے گا مگر ذو حیاۃ نہیں کہا جائے گا ۔ اسی طرح جہاں کسی صفت کی نسبت بطریق فعل وارد ہے اس کو بھی بدلہ نہیں جاسکتا جیسا کہ اللہ یستھزئ بھم سے اللہ سبحانہٗ پر مستھزئ کا اطلاق جائز نہ ہوگا ۔ اسی طرح و ھو خادعھم کی وجہ سے اللہ سبحانہٗ کو خادع نہیں کہا جاسکتا ۔ مفسرین نے تو اس کے جوابات اور دیے ہیں مگر شیخ اکبر فرماتے ہیں کہ ان آیات کو تلاوت کرتے ہوتے چاہیے کہ انسان بحر ندامت میں غرق ہو جائے کیونکہ یہاں ہماری تفہیم

؎ افادات شیخ الاسلام

فہمائش کے لیے قرآن حکیم نے تنزل کے طور پر بارگاہ صمدیت میں ایسے الفاظ استعمال کر لیے ہیں جو اس کی شایان شان تھے کیونکہ عالم انسانیت اپنے قصور و نقصان کی بنا پر عالم غیب کے بہت سے مخاطبات کی صلاحیت ہی نہیں رکھتا اس لیے جب ناقص رتبہ کمال تک نہیں پہنچ سکتا تو پھر کامل ہی کو کچھ تنزل اختیار کرنا چاہیے - جاہل ان الفاظ کو پڑھتا ہے اور اعراض کرتا ہے اور عاقل فرط ندامت سے گڑ جاتا ہے۔ جاہل کا اعتقاد یہ سن کر ڈگمگا جاتا ہے اور عاقل کی عقیدت میں اضافہ ہوتا ہے۔

(الیواقیت والجواہر)

شیخ اکبر نے یہ تنبیہ بھی فرمائی ہے کہ اگرچہ بلحاظ نعمت بعض اسماء الٰہیہ کا اطلاق انسانوں پر بھی ہو سکتا ہے جیسا کہ نافع، دکیل، نور مگر شرعاً و عقلاً لبطریق اسم اعظم ممنوع قرار دیا جائے گا اور اگر بالفرض کہیں اطلاق ہوگا تو اس کے اصل معنے سے ذہول ضروری ہوگا - مثلاً مومن ایماندار ہونے کی جہت سے درست ہو سکتا ہے مگر جس لحاظ سے خدا پر مومن کا اطلاق کیا گیا ہے وہ قطعاً حرام ہے۔ اس لیے جو اسماء خدا تعالیٰ کی بارگاہ کے لیے عرف عام یا خاص میں مشہور ہو چکے ہیں ان کا استعمال دائرہ انسانی میں ممنوع ہے۔

ثانیاً، اللہ کے ناموں میں تبدیلی کر کے غیر اللہ کے لیے بولنا جیسے اللہ سے لات اور اعز سے عزیٰ بنا کر بتوں کے لیے استعمال کرنا۔

ثالثاً، جن اسماء کو قرآن و سنت میں اللہ سبحانہ، کے لیے بولا گیا ہے یا جن افعال کی اللہ کی طرف نسبت کی گئی ہے ان کو چھوڑ دینا اور یہ خیال کرنا کہ یہ اسماء اللہ سبحانہ، کے شایان شان نہیں ہے۔ یہ بھی الحاد ہے گویا یہ ملحدین خدا کی شان کو اللہ اور اس کے رسول سے زیادہ جانتے ہیں۔

رابعاً، اللہ سبحانہ کے اسماء میں تاویل کے ذریعے تحریف کر دینا اور اس طرح تشبیہہ یا تعطیل کی راہ اختیار کر لینا۔ سمع، بصر، کلام وجہ ید کے الفاظ دیکھ کر اللہ تعالیٰ کو مخلوق پر قیاس کرنا یا ان میں ایسی تاویل کرنا کہ یہ سب اسماء و صفات کالعدم ہو کر رہ جاتیں۔

خامساً، اللہ سبحانہ، جن صفتوں سے موصوف ہے ان میں سے کوئی صفت کسی اور میں مان لی جاتے اور اسی معنے و مفہوم میں موجود مانی جائے۔ جس معنی و مفہوم میں وہ اللہ تعالیٰ میں پائی جاتی ہے۔ مثلاً علم اللہ تعالیٰ کی صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھلی اور چھپی ہر بات کو جانتا ہے۔ اس کے لیے غائب بھی حاضر ہے اور گزرا ہوا یا آنے والا زمانہ بھی حال کا زمانہ ہے۔ اب اگر کوئی یہ سمجھ بیٹھے کہ فلاں مخلوق بھی اسی طرح ہر بات کو جانتی ہے تو یہ الحاد فی الاسماء ہوگا یہی طرح ضار و نافع یعنی نفع و نقصان پہنچانا

اللہ کی صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے مسرت و راحت کا سامان عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ خیال کرے کہ فلاں مخلوق بھی ہماری بگڑی بنا سکتی ہے تو یہ بھی الحاد فی الاسماء ہے۔

سادساً، اسماءِ الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں انہیں اور ان سب کو اللہ کے لیے خاص نہ سمجھا جائے بلکہ انہیں یا ان میں سے بعض کو کچھ دوسری ہستیوں کے لیے ثابت اور موجود مانا جائے اور ان اسماء کو ان معانی کے اعتبار سے ان کے لیے بھی استعمال کرے یہ بھی الحاد فی الاسماء ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی نے اس آیت کی جو مختصر تشریح فرمائی اس میں بہت گہری معنویت ہے لیجئے آپ بھی استفادہ کر لیجئے :

اور اچھے اچھے مخصوص نام اللہ ہی کے لیے خاص ہیں لہٰذا ان ناموں سے اللہ ہی کو موسوم کیا کرو، اور دوسروں پر ان ناموں کا اطلاق نہ کیا کرو، بلکہ ایسے لوگوں سے تعلق بھی نہ رکھو جو اس کے ناموں میں کج روی کرتے ہیں۔ اس طرح سے کہ غیر اللہ پر اس کا اطلاق کرتے ہیں۔ ان لوگوں کو ان کے کیے کی ضرور سزا ملے گی مخصوص ناموں سے مراد وہ جن کا خاص ہونا اللہ تعالیٰ کے لیے دلیل شرعی سے ثابت ہے۔

وَمِمَّنْ خَلَقْنَآ اُمَّةٌ يَّهْدُوْنَ بِالْحَقِّ وَبِهٖ يَعْدِلُوْنَ ﴿١٨١﴾
وَالَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا
يَعْلَمُوْنَ ﴿١٨٢﴾ وَاُمْلِيْ لَهُمْ ۭ اِنَّ كَيْدِيْ مَتِيْنٌ ﴿١٨٣﴾ اَوَلَمْ
يَتَفَكَّرُوْا ٚ مَا بِصَاحِبِهِمْ مِّنْ جِنَّةٍ ۭ اِنْ هُوَ اِلَّا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ﴿١٨٤﴾
اَوَلَمْ يَنْظُرُوْا فِيْ مَلَكُوْتِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا خَلَقَ
اللّٰهُ مِنْ شَيْءٍ ۙ وَّاَنْ عَسٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ قَدِ اقْتَرَبَ اَجَلُهُمْ ۚ فَبِاَيِّ
حَدِيْثٍۢ بَعْدَهٗ يُؤْمِنُوْنَ ﴿١٨٥﴾ مَنْ يُّضْلِلِ اللّٰهُ فَلَا هَادِيَ لَهٗ ۭ
وَيَذَرُهُمْ فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿١٨٦﴾

اور جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ان میں سے ایک اُمت ایسی بھی ہے جو لوگوں کو حق کی راہ دکھاتی ہے اور حق ہی کے مطابق لوگوں میں عدل و انصاف کرتی ہے۔[239] اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلا دیا ہم انہیں آہستہ آہستہ آخری نتیجہ تک پہنچا دیں گے

اس طرح کہ انہیں خبر بھی نہ ہو گی، میں ان کو ڈھیل دوں گا بلاشبہ میری مخفی تدبیر بڑی ہی مضبوط ہے[۲۴۰]۔ کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے رفیق کو کسی قسم کا جنون نہیں ہے وہ تو صرف اللہ کی جانب سے کھلے طور پر ڈر سنانے والا ہے[۲۴۱]۔ پھر کیا وہ آسمان و زمین کی بادشاہی اور جو کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے اس کا مطالعہ نہیں کرتے اور اس بات پر کہ ہو سکتا ہے کہ ان کا مقررہ وقت قریب آ گیا ہو، اگر ان باتوں پر وہ غور نہیں کرتے تو اس کے بعد وہ کون سی بات ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے[۲۴۲]۔ جس پر کامیابی کی راہ خدا گم کر دے تو پھر اس کے لیے کوئی راہ دکھانے والا نہیں، اللہ ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتا چھوڑ دیتا ہے[۲۴۳]۔

معانی مفردات

سنستدرج :۔ اس کا مصدر استدراج ہے۔ یہ یا تو درج الکتاب اور درج الثوب سے جس کے معنے طے کرنے اور لپیٹنے کے ہیں اور یا یہ درجہ سے جس کے معنے سیڑھی کے ڈنڈے کے ہیں۔ استدراج

کے معنے ہیں آہستہ آہستہ گرفت میں لینا اور چکمہ دینا۔ املی، املاء سے بنا ہے اس کے معنے مہلت دینا ملوہ ملاوہ یعنے وقت کو کہتے ہیں اور ملوان دن، رات کو کہتے ہیں۔ الجنۃ جنوں کی ایک قسم کو کہتے ہیں ملکوت، بڑے ملک کو کہتے ہیں، آسمان و زمین کی مملکت مراد ہے۔ حدیث، بات مراد قرآن عزیز ہے۔

اللہ کا قانون استدراج

پہلے یہ بتایا تھا کہ ایسے لوگ نبوت کے لاتے ہوتے علم وعمل سے کوئی استفادہ نہیں کرتے جو عقل کے ہوتے ہوتے عقل سے سماع کی قوت کے ہوتے ہوتے کانوں سے اور بینائی کی موجودگی میں آنکھوں سے کام نہیں لیتے۔ ان کی زندگیاں قطعاً حیوانی بلکہ اس سے بھی بدتر ہیں۔ اب ارشاد ہو رہا ہے کہ ان کے مقابلہ میں اللہ کی مخلوق میں ایسے لوگ بھی ہیں جو اپنی عقل سے کام لیتے ہیں۔ فکر و دماغ کی ساری قوتیں کو حق کی جستجو میں صرف کرتے ہیں۔ قوت سماع قوت بصارت کو حق کے لیے استعمال کرتے ہیں، حق کو سمجھ کر حق کو سُن کر اور حق کو دیکھ کر صرف حق کی روشنی میں زندگیاں نہیں گزارتے بلکہ اسی کے مطابق لوگوں کی رہنمائی کرتے ہیں اور معاملات کے فیصلے کرتے ہیں۔ یہ گویا ان پہلے لوگوں کے مقابلہ میں واقعی انسانی زندگیاں ہیں۔ اس کے ساتھ ہی اس بات کو بھی صاف کر دیا کہ جو لوگ عقل اور دید و شنید کی قوت کے باوجود نبوت کی تکذیب کر رہے ہیں اور دندناتے پھر رہے ہیں وہ ہرگز یہ نہ سمجھیں کہ خدا کی گرفت سے باہر ہو چکے ان کے لیے یہاں ہمارا قانون استدراج کام کر رہا ہے۔ یہ فائدہ اٹھانے کا موقع دینے ڈھیل دینے، عفو و درگزر سے اور ایک خاص مدت تک فرصت حیات بخشنے کا قانون ہے اور یہ اس لیے ہے کہ اللہ سبحانہٗ فضل و رحمت والا ہے۔ فضل و رحمت کا تقاضا ہے کہ ہر غلطی کو درست کرنے پر نقصان کی تلافی کے لیے ہر لغزش کو سنبھل جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مہلت ملتی رہے اور اس کا دروازہ کسی پر بند نہ ہو۔ اگر تدریج و امہال کی یہ فرصتیں نہ ہوتیں تو دُنیا میں ایک وجود فرصت حیات سے فائدہ اٹھاتا۔ ان کو چاہیے کہ فکر و نظر سے کام لیں، فکر یہ کہ خدا کی دی ہوئی عقل سے کام لیں اور نظر یہ کہ کارخانہ ہستی کے عجائب و دقائق کا مشاہدہ کریں اور اس سے بصیرت حاصل کریں۔ یہ مکذبین نہ تو فکر سے کام لیتے ہیں اور نہ مشاہدہ و نظر سے، اگر فکر سے کام لیں تو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی ان کے لیے سچائی کی سب سے بڑی دلیل ہے، اگر نظر سے کام لیں تو آسمان و زمین کا ایک ایک ذرہ خدا کی توحید اور اس کے مقررہ قوانین کی شہادت دے رہا ہے۔

۲۳۹- اور جن لوگوں کو ہم نے پیدا کیا ہے ان میں سے ایک اُمت ایسی ہے جو لوگوں کو راہ حق دکھاتی ہے اور حق ہی کے مطابق لوگوں میں انصاف کرتی ہے۔ یہ جماعت اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلوٰۃ والسلام ہے جس نے ہر قسم کی افراط و تفریط اور کج روی سے علیحدہ ہو کر سچائی اور انصاف و اعتدال کا طریقہ اختیار کیا اور اسی کی طرف دوسروں کو دعوت دیتی ہے لے

شارحین قرآن کہتے ہیں کہ اس آیت میں اُمت سے مراد اُمت محمدیہ ہے۔ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اس موضوع پر آتے ہوئے آثار سے ثابت ہوتا ہے کہ آیت میں اُمت سے مراد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت ہے۔ علامہ بغوی نے حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت قتادہ سے یہی بات نقل کی ہے۔ لیکن شارحین قرآن نے اس کی معنویت کی طرف کوئی اشارہ نہیں کیا۔ دراصل یہ بات بتانے کے بعد کہ انسانوں کی کثیر تعداد بصیرت و بصارت اور عقل و فکر سے محروم ہو کر حیوانی بلکہ حیوانوں سے بدتر زندگی گزار رہی ہے اور یہ لوگ خدا کے ناموں میں الحاد کر رہے ہیں۔ یہ تو انبوہ ہیں، بھیڑ ہیں، تعداد میں کثیر ہیں لیکن اس کے مقابلہ پر ایک عظیم الشان اُمت ہے۔ ان کو اُمت اس لیے کہا کہ ان کے افکار و اعمال کے لیے ایک مرکز ہے اور وہ نبوت ہے۔ ضلالت، الحاد اور غفلت کے اس انبوہ میں ایک عظیم الشان جماعت بھی موجود ہے، اور یہی تعبیر ممن خلقنا امۃ اس اُمت کے دوام کو ظاہر کرنے کے لیے اختیار کی ہے۔ اس اُمت کے کام دُنیا میں دو ہیں ایک ہدایت اور دوسرے عدالت۔

اگر یہ حقیقت ہے کہ اسلام دین کامل ہے اور سارے انسانوں کے لیے ہے، آخری دین ہے اور نجات کے لیے اسی کی پیروی ضروری ہے۔ بلاشبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم پوری دُنیا کے پیغمبر ہیں اور قیامت تک کے لیے پیغمبر ہیں جیسا کہ پہلے انی رسول اللہ الیکم جمیعا، یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے جب تک آپ دُنیا میں موجود تھے بلاشبہ اپنے بہترین طریقہ سے رسالت کا حق ادا کیا لیکن آپ کے دُنیا سے روانہ ہونے کے بعد یہ حق اپنے ادا کیے جانے کا مطالبہ اور قیامت تک رہے گا۔ اگر یہ حقیقت ہے تو ضروری ہے کہ نبوت کی آواز دُنیا کے گوشہ گوشہ تک پہنچے۔ یہ ایک عظیم اہمیت کا مسئلہ ہے جس کا کوئی نہ کوئی عملی حل ہونا چاہیے۔ زیر تشریح آیت میں اس مسئلہ کا حل بڑے اہتمام سے کیا گیا ہے اور جتنا عظیم الشان یہ مسئلہ تھا اتنا ہی عظیم الشان اس کا حل بھی فرمایا گیا ہے۔

لے افادات شیخ الاسلام

اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد سے اس حل کی عملی صورت یہ قرار پائی ہے۔

۱۔ اسلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کا جو کام رسول اپنی زندگی میں کرتا رہا ہے اس کی تشریف بری کے بعد وہ اس کے پیروؤں کے ذمہ ہو گیا ہے اور اب یہ لوگ اس وقت تک کے لیے اس کام کے ذمہ دار ہیں جب تک وہ اس زمین پر موجود ہیں۔

۲۔ اسلام کو دوسروں تک پہنچانے کا مطلب محض تبلیغ نہیں ہے بلکہ ایسی دعوت ہے جسے ہدایت بالحق کہہ سکیں۔

۳۔ ہدایت بالحق کا بھی ایک متعین مفہوم ہے جس کا تعین دو پہلوؤں کرتا ہے، یعنی گفتار کی حد تک ان کی بات دعوت ہدایت بالحق کی ہو تو کردار کی حد تک ان کی ذات عدل و انصاف کی حامل ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ پچھلی امتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی تھیں تو امت مسلمہ دوہری ذمہ داری رکھتی ہے ایک یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کرے دوسرے یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے حق کی ہادی اور رہنما بن کر جاتے۔

دراصل اس معاملہ میں صورت واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے نبی تھے لیکن اس عالمگیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی عملی شکل اللہ تعالیٰ نے یہ متعین فرمائی ہے کہ آپ اپنا قائمقام ایک ایسا گروہ تیار کریں جو اپنی سیرت، اپنے کردار اور اپنے افکار میں اتنا معتدل اور معیاری ہو کہ وہ آپ کے بعد آپ کی طرح ہدایت حق کا کام کر سکے اور پھر یہ گروہ اپنے بعد کی نسل کو اس کام کے لیے تیار کرے۔ آیت میں جملہ اسمیہ کی تعبیر اسی دوام کو بتا رہی ہے۔ امت مسلمہ کی یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ البقرہ سورت میں اسی ذمہ داری کو نمایاں کرنے کے لیے کھلے لفظوں میں اس طرح بیان کیا ہے۔

کذالک جعلناکم امۃ وسطاً لتکونوا شھداء علی الناس و یکون الرسول علیکم شھیداً ؕ

گویا مکی سورت میں جس بات کو اجمالاً بتایا گیا ہے اسی کی توضیح مدنی سورت میں کر دی گئی ہے معروف ہے آیت کی اس تشریح میں کہ اس سے مراد امت محمدیہ ہے یا اس سے مراد مہاجرین و انصار ہیں یا اس سے مراد امت محمدیہ کے علماء اور دعاۃ ہیں۔ یہ اور اس قسم کی تمام تفسیری تعبیرات اسی بات کی طرف اشارہ کر رہی ہیں۔ چونکہ امت کے کام اور منصب کا ذکر یہاں ہوا اس لیے آگے نبوت اور آیات الٰہیہ کی تکذیب کرنے والوں یعنی امت محمدیہ کی اپوزیشن کے بارے میں یہ خصوصی وضاحت فرما دی۔

خدا کی ڈھیل کو اپنی جیت نہ سمجھو

۲۴۰۔ اور جن لوگوں نے ہماری نشانیوں کو جھٹلا دیا ہم انہیں آہستہ آہستہ آخری نتیجہ تک پہنچائیں گے اس طرح کہ انہیں خبر بھی نہ ہوگی اور میں ان کو ڈھیل دوں گا بلا شبہ میری مخفی تدبیر بڑی مضبوط ہے۔ جھٹلانے والے مجرموں کو بسا اوقات فوراً سزا نہیں ملتی بلکہ دنیوی فراخی کے دروازے کھول دیے جاتے ہیں۔ حتیٰ کہ خدائی سزا سے بے فکر ہو کر ارتکاب جرائم پر اور دلیر بن جاتے ہیں۔ اس طرح جو انتہائی سزا ان پر جاری کرنی ہے۔ رفتہ رفتہ اپنے کو علانیہ اور کامل طور پر اس کا مستحق ثابت کر دیتے ہیں۔ یہ ہی خدا کی ڈھیل اور استدراج ہے۔ وہ حماقت اور بے حیائی سے سمجھتے ہیں کہ ہم پر مہربانی ہو رہی ہے اور حقیقت میں انتہائی عذاب کے لیے تیار کیا جا رہا ہے۔ خدا کا کید، داؤ یا خفیہ تدبیر اسی کو کہا کہ ایسی تدبیر کی جائے جس کا ظاہر رحمت اور باطن قہر و عذاب ہو بے شک خدا کی تدبیر بڑی مضبوط اور پختہ ہے جس کی کسی حیلہ اور تدبیر مدافعت نہیں ہو سکتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے احکام مقرر ہیں۔ اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشو و نما کے بعد ظہور میں آتے۔ مثلاً اللہ سبحانہٗ کا یہ قانون ہے کہ اگر پانی آگ پر رکھا جائے گا تو وہ گرم ہو کر کھولنے لگے گا لیکن پانی کے گرم ہونے اور بالآخر کھولنے کے لیے حرارت کی ایک خاص مقدار ضروری ہے اور اس کے ظہور و تکمیل کے لیے ضروری ہے کہ ایک مقررہ وقت تک انتظار کیا جائے۔ ایسا نہیں ہو سکتا کہ تم پانی چولہے پر رکھو اور فوراً کھولنے لگے وہ یقیناً کھولنے لگے گا لیکن اس وقت جب حرارت کی مقررہ مقدار بتدریج تکمیل تک پہنچ جائے گی۔ ٹھیک اسی طرح اعمالِ انسانی کے نتائج بھی اپنی مقررہ اوقات میں ظہور پذیر ہوتے ہیں اور ضروری ہے کہ جب تک اعمال کے اثرات ایک خاص مقررہ مقدار تک نہ پہنچ جائیں نتائج کے ظہور کا انتظار کیا جائے۔ اس صورتِ حال سے تدریج و امہال کی حالت پیدا ہو گئی۔

یہ آیت قریشِ مکہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ مسلمانوں کو تسلی دی جا رہی ہے اور ان کو دھمکی دی جا رہی ہے کہ جو لوگ ہماری آیات کو جھٹلانے کے باوجود دندنا رہے ہیں وہ یہ نہ سمجھیں کہ خدا کی گرفت

لہ افادات شیخ الاسلام

سے باہر ہیں۔ ہم ان کو آہستہ آہستہ وہاں لے جاتے ہیں جہاں ان کو کسی خطرہ کا گمان بھی نہیں ہے۔ وہ ہماری اس ڈھیل کو اپنی جیت سمجھ رہے ہیں۔ اُن کو یہ ڈھیل اس لیے دی جا رہی ہے کہ ان کے گناہوں کا پیمانہ خوب لبریز ہو جائے۔ یہی خدا کی تدبیر ہے۔ اس کی تدبیر نہایت محکم اور اس کی گرفت نہایت شدید ہوتی ہے۔ کوئی اس کے احاطہ سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس وجہ سے وہ لوگوں کو ان کی سرکشی کے باوجود ڈھیل پر ڈھیل دیتا ہے۔ اس ڈھیل کو سرکش اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ قرآن بتا رہا ہے کہ جزائے عمل کا قانون ان کی جانب سے غافل نہیں ہے۔ وہ بتدریج اس نتیجہ تک پہنچ کر رہیں گے جو انکار و سرکشی کا لازمی نتیجہ ہے۔

قرآن کی دعوتِ تفکر

۱۸۴۔ کیا ان لوگوں نے غور نہیں کیا کہ ان کے رفیق کو کسی قسم کا جنون نہیں ہے وہ تو اللہ کی جانب سے کھلے طور پر ڈر سنانے والا ہے۔ یعنی آخر آیات اللہ کو جھٹلانے اور اس کے بد انجام سے غافل ہو جانے کا سبب کیا ہے۔ ان آیات کا لانے والا معاذ اللہ کوئی بے عقل و مجنون نہیں ہے۔ وہ ساری عمر تمہارے پاس رہا ہے۔ اس کی عقل و دانش اور امانت و دیانت پہلے سے مسلّم و معروف ہے؂۔

آیت میں صاحب سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ آپ انہی لوگوں میں پیدا ہوئے جو آپ کے اولین مخاطب ہیں۔ ان میں رہ کر بچے سے جوان اور جوان سے بوڑھے ہوئے۔ نبی ہونے سے پہلے پوری قوم آپ کی سلامت طبع اور صحتِ دماغ اور امین و متدین کی حیثیت سے جانتی اور مانتی تھی۔ اور جب آپ نے نبوت کا دعویٰ کیا اور خدا کا پیغام سنانا شروع کیا تو یکایک آپ کے مخاطب آپ کو مجنون کہنے لگے۔

اس آیت میں صداقت نبوت کی ایک سب سے بڑی وجدانی دلیل پیش کی جا رہی ہے۔ فرمایا کہ ساری باتیں چھوڑ دو صرف اس ایک بات پر غور کرو کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر تمہارے اندر رہے ہیں۔ ان کے تمام احوال سے تم خوب واقف ہو۔ ان کی عقل و دانش کو تم پہلے سے خود مانتے ہو اگر پوری عمر تم ان کو نہایت سلیم الطبع اور صحیح الدماغ آدمی کی حیثیت سے مانتے اور جانتے رہے ہو تو اب نبی ہونے کے بعد ان میں جنون کہاں سے آگیا۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو شخص ہمیشہ اپنی سلامت روی، اپنی صداقت شعاری، اپنی بے غرضی، اپنی پاکبازی، اپنی فکر و رائے کی اصابت اور اپنی دانش و بینش کی پختگی کے اعتبار سے ساری قوم میں ایک مثالی شخصیت رہا ہے اب وہ دیوانہ کیسے ہو گیا۔

؂ افاداتِ شیخ الاسلام

یہ دیوانے نہیں بلکہ خطرے سے آگاہ کرنے والے ہیں۔

دراصل حضور کے مخاطب یہاں جس چیز کو جنون قرار دے رہے ہیں وہ صرف یہ نہیں کہ آپ دعوتِ حق پیش کر رہے ہیں بلکہ دعوتِ حق کے پیش کرنے میں ان کو حضور میں جو بے چینی اور بے قراری نظر آرہی ہے اس کو وہ جنون سے تعبیر کر رہے ہیں۔ قرآن جواب دے رہا ہے کہ ان کے اندر تمہیں ہوشیار و بیدار کرنے کے لیے جو بے قراری اور بے چینی نظر آرہی ہے اور جو انہوں نے تمہارے پیچھے اپنے دن رات ایک کر رکھے ہیں تو اس کی وجہ یہ نہیں ہے کہ ان کو جنون ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ اس عظیم خطرہ کو اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں جو تمہارے سروں پر منڈلا رہا ہے اور جو تمہیں اپنی کور چشمی کی وجہ سے نظر نہیں آرہا ہے یہ جنون نہیں بلکہ حقیقت کا سچا احساس اور اپنی قوم کی محبت کا بے پایاں جذبہ ہے۔ نبوت کی شب و روز کی لگن اور تن دہی کو قوم کے اشرار جنون کہتے ہیں۔

آفاق کی شہادت

۲۴۲۔ پھر کیا وہ آسمان و زمین کی بادشاہی اور جو کچھ اللہ نے پیدا کیا ہے اس کا مطالعہ نہیں کرتے اور اس بات پر کہ ہوسکتا ہے کہ ان کا وقت مقررہ قریب آگیا ہو۔ اگر ان باتوں پر وہ غور نہیں کرتے تو اس کے بعد وہ کون سی بات ہے جس پر وہ ایمان لائیں گے۔ یعنی یہ پیغمبر جس کے پاس سے پیغام لایا ہے وہ تمام جہان کا مالک شہنشاہ مطلق اور ہر چیز کا پیدا کرنے والا اس کے نہایت ہی محکم و مضبوط نظامِ سلطنت بلکہ ہر چھوٹی بڑی چیز میں جو اس نے پیدا کی ہے غور کرو تو یہ آیات تکوینیہ آیات تنزیلیہ کی تصدیق کریں گی۔ پھر آیات اللہ کی تسلیم میں کیا عذر ہے۔ انہیں سمجھنا چاہیے کہ شاید ان کی موت و ہلاکت کا وقت قریب آگیا ہو۔ لہٰذا بعد الموت کے لیے جو تیاری کرنی ہے جلد کرنی چاہیے۔ اگر آیاتِ قرآنیہ پر ایمان نہ لاتے تو دنیا میں اور کون سی بات ہے اور کون سا کلام ہے جس پر ایمان لانے کی امید کی جاسکتی ہے۔ سمجھ لو کہ ان بدبختوں کے لیے ایمان مقدر ہی نہیں ہے[1]

پہلے فکر کی دعوت دی گئی تھی۔ اب مشاہدہ کی دعوت دی جارہی ہے۔ یعنی اگر یہ لوگ آسمان و زمین کے سارے نظام اور اللہ سبحانہٗ کی تخلیقات کا مشاہدہ کرتے تو ان پر یہ حقیقت واضح ہو جاتی کہ پیغمبر ان کو جو عذاب سے اور قیامت سے ڈرا رہا ہے یہ دیوانگی نہیں بلکہ بھرپور عقلیت ہے۔ حضور انور جو کچھ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

فرماتے ہیں اس کی شہادت آسمان و زمین کا ایک ایک ذرہ اور اس کے مقرر کردہ قوانین تخلیق دے رہے ہیں جو شخص بھی اس کائنات کے نظام پر غور کرے گا وہ پکار اٹھے گا ربنا ما خلقت ھذا باطلا یہ کائنات بے مقصد نہیں بلکہ ایک روز جزا و سزا ہونے والی ہے۔ یہ اس کائنات کے مجموعی نظام کی ایک ایسی شہادت ہے جس کو صرف وہی لوگ جھٹلا سکتے ہیں، جو عقل و شعور سے قطعی بیگانہ ہوں۔

گویا اس ارشاد کے ذریعے اللہ سبحانہ نے کائنات کے تکوینی اسلام کو تشریعی اسلام کے لیے بطور دلیل استعمال کیا ہے۔ تکوینی احکام ان حکموں کو کہتے ہیں جن کے مطابق عمل چارہ و ناچار کرنا ہی پڑتا ہے اور جن کی خلاف ورزی ناممکن ہوتی ہے کیونکہ تمام کائنات ان کی اطاعت کرنے پر مجبور پیدا کی گئی ہے اور اسے پیدائشی طور پر اس بات کی بالکل آزادی نہیں دی گئی کہ چاہے تو ان پر عمل کرے اور چاہے تو نہ کرے۔ مثال کے طور پر سورج کو اللہ کا حکم ہے کہ ایک وقت مقرر پر نکلے اور پھر ایک وقت مقررہ پر ڈوب جائے۔ زمین سے ایک مقررہ فاصلہ پر رہے اور اسے روشنی اور گرمی پہنچائے۔ سورج ان احکام پر عمل کرنے کے لیے مجبور ہے۔ اس طرح کے احکام کو قوانین طبعی اور قوانین قدرت بھی کہتے ہیں۔ تشریعی احکام اللہ تعالیٰ کے ان حکموں کو جن کی پیروی پیدائشی مجبوری کے ساتھ نہیں ہوتی بلکہ آزاد مرضی کے ساتھ ہوتی ہے۔ مخلوق کو ان پر عمل کرنے کا بھی اختیار ہوتا ہے اور عمل نہ کرنے کا بھی مثلاً انسان کو حکم ہے کہ وہ خدا کی بندگی کرے لیکن وہ ایسا کرنے پر پیدائشی طور پر مجبور نہیں ہے ان احکام کو شرعی احکام یا شرعی قوانین بھی کہتے ہیں۔

یہ دونوں قسم کے احکام یکساں طور پر اللہ ہی کے احکام ہیں۔ دوسری طرف چونکہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہی کا نام اسلام ہے اس لیے ان میں سے ہر ایک کی طاعت اسلام ہوگی۔ پھر چونکہ جمادات سے لے کر انسانوں اور فرشتوں تک کوئی مخلوق بھی ایسی نہیں ہے جو اپنے خالق کی محکوم نہ ہو اور جسے تکوینی یا تشریعی احکام نہ دیے گئے اس لیے پوری کائنات اللہ کی بندگی کر رہی ہے۔ یہ بات قرآن نے بڑی قوت اور زور سے پیش کی ہے۔

افغیر دین اللہ یبغون ولہ اسلم من فی السماوات والارض

اس سے صاف پتہ چلتا ہے کہ تکوینی طور پر ساری مخلوق اللہ کے احکام پر چل رہی ہے۔ نبوت یہ مقصد لے کر آتی ہے کہ انسان کی اختیاری زندگی بھی اللہ کے قوانین انسان کے ارادے و اختیار سے چلیں۔ نبوت کے مخالفوں کو نبوت سے اس معاملہ میں شدید اختلاف ہوتا ہے۔ نبوت ان کو سمجھانے کے لیے تکوینی احکام کا ذکر کرتی ہے اور تشریعی احکام کے لیے اسے بطور دلیل استعمال کرتی ہے

یہاں بھی استدلال کیا گیا ہے اور ساتھ ہی یہ بتا دیا ہے کہ اگر یہ لوگ زمین و آسمان کے نظام اور مخلوقات الٰہی کی حکمتوں پر غور کرتے تو ان پر یہ حقیقت کھل جاتی جیسے یہ کائنات بے مقصد نہیں بنائی گئی ہے خود انسان بھی بے مقصد نہیں پیدا کیا گیا ہے۔ اور یہ راز بھی ان پر کھل جاتا کہ کیا عجب ان کی وہ اجل قریب آگئی ہو جس سے پیغمبر ان کو آگاہ کر رہا ہے۔

اسی بنا پر آخر میں ارشاد ہوا ہے فبای حدیث بعدہ یومنون ؟ بعدہ کے مرجع کے بارے میں اگرچہ اختلاف ہے لیکن محققین نے اس کا مرجع حدیث کو قرار دیا ہے۔ قرآن کی دوسری آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ سورہ جاثیہ میں ہے فبای حدیث بعد اللہ و آیاتہ یومنون مطلب یہ ہے کہ اس کامل ترین کتاب کے بعد اور کون سے کلام پر وہ ایمان لائیں گے۔

اللہ کا قانون ہدایت وضلالت

۲۴۳- جس پر خدا کامیابی کی راہ گم کر دے تو پھر اس کو راہ دکھانے والا کوئی نہیں۔ اللہ ان کو ان کی سرکشی میں بھٹکتا چھوڑ دیتا ہے۔ ہدایت وضلالت ہر چیز خدا کے قبضے میں ہے وہ نہ چاہے تو سارے سامان ہدایت کے رکھے جائیں آدمی کہیں سے بھی منتفع نہ ہو۔ ہاں عادۃً وہ جب ہی ہدایت کی توفیق دیتا ہے جب بندہ خود اپنے کسب و اختیار سے اس راستہ پر چلنا چاہے باقی جو دیدہ و دانستہ بدی اور شرارت ہی کی ٹھان لے تو خدا بھی راستہ دکھانے کے بعد اسی حال میں چھوڑ دیتا ہے [1]

مطلب یہ ہے کہ جو روش پیغمبر کے مخاطبوں نے اختیار کی ہے۔ یہ گمراہی کی روش ہے اللہ کے رسول اس لیے نہیں آتے کہ لوگوں سے برائی کرنے کی طاقت سلب کرلیں اور آپ کو ایسا بنا دیں کہ برائی کر ہی نہ سکیں۔ وہ تو پیغام حق پہنچانے والے ہیں۔ پیام پہنچانے والے کا کام صرف یہ ہے کہ صاف صاف اور روشن طریقہ پر پیام پہنچا دے۔ اب اسے ماننا یا نہ ماننا یہ سننے والوں کا کام ہے پیام پہنچانے والا اس کا ذمہ دار نہیں ہے۔ یہاں اللہ کا قانون ہدایت وضلالت کارفرما ہے۔ اللہ کے قانون ہدایت یہ ہے کہ بندے کے ارادے اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت نہیں دیتا۔ زبردستی ہدایت دینا اللہ تعالیٰ کے جاری قانون کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ

[1] افادات شیخ الاسلام

نے اپنی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور ناقابلِ ردّ مشیت کے باوجود اپنے اختیار، اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا استعمال کرنے کی مشروط طاقت بخشی ہے۔ یہی ارادہ اور اعضا کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود قدرت اس کی ذمہ داری، تکلیف، بازپرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے۔ اور اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ ہدایت کا فیضان ان پر ہوتا ہے جو ہدایت کی طلب کا ارادہ کرتے ہیں اور ضلالت وہاں آتی ہے جہاں طلب اور ارادہ نہیں ہوتا۔ اگر لوگ کانوں سے حق کا پیغام سننے اور آنکھوں سے دیکھنے اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ تعالیٰ اپنی توفیق وہدایت سے سرفراز فرماتے۔ ارشاد ہے:

ان الذین آمنوا و عملوا الصالحات یھدیھم ربھم بایمانھم

اور

والذین اھتدوا زادھم ھدیً

جیسے ہدایت کے آنے کے لیے اللہ کا قانون ہے ایسے ہی گمراہی کے لیے بھی قانون ہے۔

يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسٰهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا عِلْمُهَا عِنْدَ رَبِّيْ ۚ
لَا يُجَلِّيْهَا لِوَقْتِهَآ اِلَّا هُوَ ؔۘ ثَقُلَتْ فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
لَا تَاْتِيْكُمْ اِلَّا بَغْتَةً ؕ يَسْـَٔلُوْنَكَ كَاَنَّكَ حَفِيٌّ عَنْهَا ؕ قُلْ اِنَّمَا
عِلْمُهَا عِنْدَ اللّٰهِ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝ قُلْ لَّآ
اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ نَفْعًا وَّلَا ضَرًّا اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ وَلَوْ كُنْتُ اَعْلَمُ
الْغَيْبَ لَاسْتَكْثَرْتُ مِنَ الْخَيْرِ ۛۚ وَمَا مَسَّنِيَ السُّوْٓءُ ۚۛ
اِنْ اَنَا اِلَّا نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ کب آئے گی؟
تم کہہ دو کہ اس کا علم تو صرف میرے رب کو ہے وہی ہے جو اسے
اپنے وقت پر ظاہر کرے گا وہ آسمانوں، زمینوں میں بڑا حادثہ ہوگا
وہ تمہارا اچانک استقبال کرے گی، اے پیغمبر یہ لوگ تم سے قیامت
کے بارے میں اس طرح سوال کر رہے ہیں کہ گویا تم اس کی جستجو

میں لگے ہو، کہہ دو کہ اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن لوگوں کی اکثریت اس حقیقت سے بے خبر ہے[۲۴۴]۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع و نقصان پر کوئی اختیار نہیں رکھتا ہوں صرف وہ ہی کچھ ہو کر رہتا ہے جو اللہ چاہتا ہے، اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے فراہم کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا، میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لیے بشیر و نذیر بن کر آیا ہوں[۲۴۵]۔

معانی مفردات

ساعۃ: لغت میں وقت کے غیر معین قلیل حصہ کو کہتے ہیں۔ اور اہل ہیئت کے یہاں دن رات کو برابر ۲۴ پر تقسیم کر کے ۱/۲۴ کو کہتے ہیں۔ اہلِ عرب بھی علمارِ ہیئت کی اس تقسیم سے واقف تھے۔ حدیث میں ہے، یوم الجمعۃ اثنتا عشرۃ ساعۃ۔ موجود وقت کو بھی ساعت کہتے ہیں۔ اور اس وقت کو بھی ساعۃ کہتے ہیں جس میں قیامت قائم ہوگی۔ قرآن میں لفظ ساعۃ بغیر الف لام کے وقت کے معنے میں آتا ہے اور الف لام کے ساتھ قیامت کے معنے میں ہوتا ہے۔ مُرسَا۔ مصدر میمی ہے اس کے معنے ٹھہرنے اور ہونے کے ہیں۔ رَسَا یَرسُو کے معنے ٹھہرنے کے ہیں۔ اسی سے پانی کے جہازوں کے ٹھہرنے کی جگہ کو بندرگاہ کہتے ہیں۔ اسی سے بسم اللہ مجرٖاھا و مرساھاؕ۔ زندگی کی کشتی چلتے چلتے جہاں ٹھہر جائے گی وہ مرسی ہے۔ حفیّ، بحث کرنے والا، متلاشی۔ کسی چیز سے پورے طور پر باخبر حفادۃ سے جس کے معنے

تلاش کے ساتھ کسی کا حال پوچھنے اور کسی کام میں مہربان ہونے کے ہیں۔

اشتراکی تصور پر بھرپور قدغن

جہاں تک توحید و اشتراک کا تعلق ہے قرآن کا تصور اس درجہ کامل ہے اور بے لچک ہے کہ اس کی کوئی
نظیر پچھلے تصورات میں نہیں مل سکتی۔
اگر خدا اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ وہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو۔ کیونکہ اس کی
توحید کی عظمت قائم نہیں رہ سکتی۔ اگر کوئی ہستی اس کی صفات میں شریک مان لی جائے۔ قرآن سے
پہلے توحید کے ایجابی پہلو پر تو مذاہب نے زور دیا تھا لیکن سلبی پہلو نمایاں نہیں ہوسکا تھا۔ ایجابی پہلو
یہ ہے کہ خدا ایک ہے۔ سلبی یہ ہے کہ اس کی طرح کوئی نہیں اور جب اس کی طرح کوئی نہیں تو ضروری
ہے کہ جو صفتیں اس کے لیے ٹھہرا دی گئی ہیں ان میں کوئی دوسری ہستی شریک نہ ہو۔ پہلی بات توحید
فی الذات ہے اور دوسری توحید فی الصفات سے تعبیر کی گئی ہے۔ قرآن سے پہلے اقوام عالم کی استعداد
اس درجہ بلند نہیں ہوئی تھی کہ توحید فی الصفات کی نزاکتوں اور بندشوں کی متحمل ہوسکتی۔ اس لیے مذاہب
نے توحید فی الذات ہی پر زور دیا۔ توحید فی الصفات اپنی ابتدائی اور سادہ حالت میں چھوڑ دی گئی۔
اس بارے میں سب سے زیادہ نازک معاملہ پیغمبر کی شخصیت کا تھا یہ ظاہر ہے کہ کوئی تعلیم عظمت و
رفعت حاصل نہیں کرسکتی جب تک نبی کی شخصیت میں بھی عظمت کی شان نہ پیدا ہوجائے لیکن نبی کی
شخصیت کی عظمت کے حدود کیا ہیں۔ یہیں آکر سب کے قدموں نے ٹھوکر کھائی وہ اس کی ٹھیک
ٹھیک حد بندی نہ کرسکے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ کبھی شخصیت کو خدا کا اوتار بنا دیا کبھی ابن اللہ سمجھ لیا، کبھی
شریک وسہیم ٹھہرا دیا اور اگر یہ نہیں تو کم ازکم اس کی تعظیم میں بندگی و نیاز کی سی شان پیدا کر دی۔
یہودیوں نے اپنے ابتدائی عہد کی گمراہیوں کے بعد کبھی ایسا نہیں کیا کہ پتھر کے بت تراش کر ان کی
پوجا کی ہو لیکن اس بات سے وہ بھی بچ نہیں سکے کہ اپنے نبیوں کی قبروں پر ہیکل تعمیر کرکے انہیں
عبادت گاہوں کی شان تقدیس دے دیتے تھے۔ اسی طرح ہمیں معلوم ہے کہ مسیحیت کی حقیقی تعلیم
سرتاسر توحید کی تعلیم کی تھی لیکن ابھی اس کے ظہور پر پورے سو برس بھی گزرے تھے کہ الوہیت مسیح
کا عقیدہ نشو ونما پا چکا تھا۔ ان آیات کا اسی پس منظر میں مطالعہ فرمائیے۔ کہ وہ کب آئے گی؟ تم کہہ دو کہ اس کا

۲۴۴۔ لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں پوچھتے ہیں

علم تو صرف میرے رب کو ہے وہی اسے اپنے وقت پر ظاہر کرے گا وہ آسمانوں زمینوں میں بڑا حادثہ ہوگا وہ تمہارا اچانک استقبال کرے گی اے پیغمبر یہ لوگ تم سے قیامت کے بارے میں اس طرح سوال کرتے ہیں کہ گویا تم اس کی جستجو میں لگے ہو کہہ دو کہ اس کا علم تو اللہ ہی کو ہے لیکن اکثریت لوگوں کی اس حقیقت سے بے خبر ہے۔ پہلے عسیٰ ان یکون قد اقترب اجلھم میں خاص اس قوم کی اجل موت کا ذکر تھا کہ انہیں کچھ معلوم نہیں کب آجاتے یہاں تمام دُنیا کی اجل قیامت کے متعلق متنبہ فرمایا کہ جب کسی کو خاص اپنی موت کا علم نہیں کب آئے، پھر کل دُنیا کی موت کو کون بتلا سکتا ہے کہ فلاں تاریخ اور فلاں سنہ میں آئے گی۔ اس کی تعیین کا علم بجز خدائے علام الغیوب کسی کے پاس نہیں وہ ہی وقت معین و مقدر پر اسے واقع کر کے ظاہر کر دے گا کہ خدا کے علم میں اس کا یہ وقت تھا۔ آسمان و زمین میں وہ بڑا بھاری واقعہ ہوگا اور اس کا علم بھی بہت بھاری ہے جو خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں گو اس واقعہ کی امارات بہت سی نشانیاں انبیاء علیہم السلام خصوصاً ہمارے پیغمبر آخر الزماں صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہیں۔ تاہم ان سب علامات کے بعد بھی جب قیامت کا وقوع ہوگا تو بالکل بے خبری میں اچانک اور دفعتہً ہوگا جیسا کہ بخاری وغیرہ کی احادیث میں تفصیلاً مذکور ہے کانک حفی کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے آنے کے بارے میں دریافت کیا تھا ان کے طرز سوال سے ظاہر ہوتا ہے کہ گویا وہ آپ کی نسبت یہ سوچتے ہیں کہ آپ بھی اس مسئلہ کی تحقیق و تفتیش اور کھوج لگانے میں مشغول رہے ہیں اور تلاش کے بعد اس کے علم تک رسائی حاصل کر چکے ہیں۔ حالانکہ یہ علم حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ انبیاء علیہم السلام اس چیز کے پیچھے نہیں پڑتے جس سے خدا نے اپنی مصلحت کی بنا پر روک دیا ہو نہ ان کے اختیار میں ہے کہ جو چاہیں کوشش کر کے ضرور معلوم کر لیا کریں۔ ان کا منصب یہ ہے کہ جن بے شمار علوم و کمالات کا خدا کی طرف سے افاضہ ہو نہایت شکرگزاری اور قدرشناسی کے ساتھ قبول کرتے رہیں مگر ان باتوں کو اکثر عوام کالانعام کیا سمجھیں [1]

آیت زیر تشریح اس لحاظ سے خاص اہمیت رکھتی ہے کہ اس میں قیامت کے وقت خاص کے علم کو اللہ سبحانہٗ کی خصوصیت قرار دیا ہے۔ قیامت کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ بظاہر اس دعوے پر یہ آیت ایک دلیل معلوم ہوتی ہے مگر فی الحقیقت یہ ایک دلیل نہیں بلکہ دلائل کا مجموعہ ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

انما علمہا عند ربی میں صرف قصر لاکر بتایا ہے کہ قیامت کے آنے کا علم صرف اللہ کو ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو نہیں یہ قصر کا ایک طریقہ ہے۔

لا یجلیہا لوقتہا الا ھو، اس میں قصر کا دوسرا طریق لاکر بتایا ہے کہ خدا ہی قیامت کو اپنے وقت پر ظاہر کرے گا اور اس کے آنے سے پہلے یہ خفا مستمر رہے گا یعنی کسی کو پتہ نہ ہوگا۔

ثقلت فی السماوات والارض یہ انداز بیان بھی یہی ظاہر کر رہا ہے کہ قیامت کے آنے کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں اکثر مفسرین نے ثقلت کی تفسیر خفیت سے کی۔

لا تاتیکم الا بغتۃ کا مطلب بھی اسی کی تائید کرتا ہے قیامت اچانک آئے گی یعنی کسی مخلوق کو پہلے سے اس کی اطلاع نہ ہوگی۔

کانک حفی عنہا، بھی اسی کا موید ہے گویا اس کے متلاشی ہیں۔ کان کا استعمال بتا رہا ہے کہ حضور کو اس کا علم نہ تھا۔

انما علمہا عند ربی، یہں بھی مکرر وہی بات کہی گئی ہے کہ اللہ کے سوا قیامت کا علم کسی کو نہیں ہے۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اس آیت میں چھ بار مختلف انداز اور مختلف پیرایوں میں اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ قیامت کے وقت کا علم حق تعالیٰ کے ساتھ خاص ہے اور کسی آسمانی یا زمینی مخلوق کو اس کا علم نہیں۔ اس کے باوجود کچھ بزرگوں کی رائے یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے آنے کا علم تھا۔ اور ان بزرگوں نے قرآن کی اس آیت اور اس قسم کی دوسری آیات کی کچھ تاویلیں کی ہیں۔ اصولی طور پر ان کی تاویلیں صرف تین ہیں۔

۱۔ ایک یہ کہ اس قسم کی آیات میں غیر اللہ سے عموماً یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے خصوصاً صرف علم ذاتی کی نفی کی گئی ہے نہ کہ علم عطائی کی۔

۲۔ دوسرے یہ کہ ان آیات کے نزول کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ علم عطا فرما دیا گیا تھا۔

۳۔ تیسرے یہ کہ جن آیات میں علم ساعت کو اللہ سبحانہ کے ساتھ خاص بتایا گیا ہے ان سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ کسی دوسرے کو اس کا علم نہیں بلکہ اس کا مفاد صرف یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو ان کا علم ہے۔ رہا دوسروں کو اس کا علم ہونا نہ ہونا اس سے وہ آیات ساکت ہیں۔

بہرحال یہ بزرگ یہی تاویلات کرتے ہیں لیکن فی الحقیقت یہ تاویلات اتنی رکیک ہیں کہ کسی

علمی شخصیت کی طرف سے ان کا پیش کیا جانا ان کی عالمانہ حیثیت پر بدنما داغ ہے۔ ہم معالم القرآن کے ناظرین سے تھوڑی سی معذرت کے ساتھ زیرِ نظر آیت کے بارے میں اپنی عام شاہراہ سے ہٹ کر شارحینِ قرآن کی تشریحات ہدیہ ناظرین کرتے ہیں تاکہ وہ خود غور کر لیں اور ملاحظہ فرمالیں کہ ان تاویلات کے لیے وہاں کوئی معمولی سی گنجائش بھی ہے۔

امام الحدیث والتفسیر ابن جریر طبری اسی آیت کے ذیل میں حبرامت ترجمانِ قرآن حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اپنی سند سے بیان کرتے ہیں کہ:

جب لوگوں نے حضور سے قیامت کے متعلق سوال کیا تو اس طرح سوال کیا گیا گویا کہ حضور ان کے ساتھ بڑے مہربان ہیں۔ بس خدا کی طرف سے آپ پر وحی آئی کہ قیامت کا علم بس خدا ہی کو ہے۔ اس نے اپنے ہی لیے اس کے علم کو خاص کر لیا ہے۔ اسی لیے نہ کسی فرشتہ کو اس کی اطلاع دی ہے نہ کسی رسول کو۔

اور یہی امام ابن جریر اسی آیت کے ذیل میں اپنی سند سے حضرت قتادہ تابعی سے روایت کرتے ہیں۔

انما علمها عند ربی الخ کا مطلب یہ ہے کہ قیامت کے وقت خاص کا علم بس خدا ہی کے پاس ہے۔ وہی اس کو اس کے وقت پر ظاہر کرے گا۔ اس کو خدا کے سوا کوئی نہیں جانتا۔

طبقہ صحابہ وتابعین کے ان تفسیری کلمات کے بعد دیگر ائمہ تفسیر کی تصریحات بھی ملاحظہ ہوں۔ امام ابوجعفر ابن جریر طبری فرماتے ہیں۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ جو لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں آپ ان کو یہ جواب دیں کہ اس کے وقت خاص کا علم اللہ سبحانہ عالم الغیب کے سوا کسی کو نہیں اور وہی اس کو اس کے وقت پر ظاہر کرے گا، دوسروں کو اس کی کچھ خبر نہیں۔

پھر آیت کریمہ کے آخری حصہ کی تفسیر فرماتے ہوئے اس سے زیادہ وضاحت کے ساتھ اسی مضمون کو اس طرح پیش فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہ کے اس ارشاد قل انما علمها عند ربی کا مطلب یہ ہے کہ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ وقت قیامت کے متعلق سوال کرنے والی اس جماعت سے کہہ دیجئے

کہ مجھ کو اس کا علم نہیں اور اس کو اس خدائے علیم کے سوا کوئی نہیں جانتا جو زمین و آسمان کے تمام غیبوں کو جانتا ہے لیکن بہت سے لوگ اس بات سے ناواقف ہیں کہ اس کا علم صرف خدا ہی کو ہے اور وہ گمان کرتے ہیں کہ اللہ کی کچھ مخلوق کو بھی قیامت کے وقت خاص کی خبر ہے۔

تفسیر ابن جریر ص۵۸

عماد المفسرین، امام المحدثین حافظ ابن کثیر دمشقی اس آیت کریمہ کی تفسیر احادیث و آثار سے فرمانے کے بعد لکھتے ہیں اور کس قدر زور سے فرماتے ہیں۔

لہٰذا یہ نبی امی صلی اللہ علیہ وسلم اور خاتم النبیین ہیں جو نبی الرحمۃ نبی التوبہ اور نبی الملحمہ ہیں۔ اور جو خدا کے سب سے آخری اور پچھلے نبی ہیں۔ جن کے قدموں پر لوگوں کا حشر ہوگا وہ باوجود ان خصائص اور فضائل عظیمہ کے اور باوجود اس قرب قیامت کے کہ آپ خود ارشاد فرماتے ہیں کہ میں اور قیامت اس طرح قریب ہیں جیسے یہ انگشت شہادت اور قریب والی انگلی جیسا کہ صحیح بخاری میں حضرت انس اور حضرت سہیل بن سعد سے مروی ہے۔ غرض بایں ہمہ حق تعالیٰ آپ کو حکم دیتا ہے کہ قیامت کے وقت کے بارے میں جب آپ سے یہ سوال کیا جائے تو ہمیشہ آپ اس کو خدا ہی کے حوالے کریں چنانچہ فرمایا قل انما علمہا عند اللہ ولکن اکثر الناس لا یعلمون۔

(تفسیر ابن کثیر)

اور علامہ علی بن محمد بن خازن آیت کی شان نزول نقل فرمانے کے بعد اس آیت کی تفسیر اس طرح فرماتے ہیں:

لوگ آپ سے قیامت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ وہ کب آئے گی۔ اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم آپ ان سے فرما دیجئے کہ اس کا علم بس میرے پروردگار کے پاس ہے یعنی اس کے وقت خاص کو سوائے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ خدا نے اس کے علم کو اپنے لیے خاص کر لیا ہے۔ اسی لیے کسی کو اس کی اطلاع نہیں دی ہے۔ بس خدا ہی ہر وقت اس پردے کو ہٹائے گا۔ یعنی جب اس کا وقت آئے گا اس کو قائم کرے گا وہ بھاری ہے آسمانوں اور زمین میں یعنی اس کا معاملہ گراں ہے اور اس کا علم مخفی ہے آسمان و زمین کی تمام مخلوقات سے، وہ قیامت تم پر اچانک آئے گی یعنی بے خبری ہی میں آجائے گی۔ یہ لوگ آپ سے قیامت کا اس

طرح سوال کرتے ہیں گویا کہ آپ ان کے ساتھ بڑے مہربان ہیں۔ اے محمدؐ آپ ان
سے فرما دیجئے کہ اس کا علم بس خدا ہی کو ہے یعنی اللہ نے اس کا علم اپنے لیے خاص
کر لیا ہے بس اس کے سوا کوئی نہیں جانتا کہ کب آئے گی۔ لیکن بہت سے اس
سے ناواقف ہیں یعنی وہ نہیں جانتے کہ اس کا بس خدا ہی کو علم ہے اور اس
نے اپنے ہی لیے اس کو خاص کر لیا ہے تاکہ لوگ اس کے متعلق دریافت نہ کریں۔
(تفسیر خازن)

اور قریب قریب امام بغوی نے معالم التنزیل میں سپرد قلم فرمایا ہے اور خطیب شربینی اپنی تفسیر میں شان نزول ذکر فرمانے کے بعد لکھتے ہیں:۔

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں۔ آپ ان سے فرما دیجئے کہ انما علمها عند ربی اس کا علم بس میرے پروردگار کے پاس ہے یعنی اس کے سوا کوئی اس وقت مخصوص کو نہیں جانتا جس میں قیامت آئے گی اس نے اپنے ہی لیے اس کو مخصوص کر رکھا ہے۔ اسی لیے اپنی مخلوق میں سے کسی کو اس کی اطلاع نہیں دی ہے اور یہی وجہ تھی کہ جب حضرت جبریل نے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ بتلائیے کہ قیامت کب ہوگی تو حضور نے فرمایا کہ اس بارے میں میرا علم تم سے زیادہ نہیں ہے ورنہ اگر آپ کو اس کا علم ہوتا تو آپ ضرور بتلا دیتے جس طرح اسی مجلس کے باقی سوالات کا آپ نے حضرت جبریل کو صاف صاف جواب دیا تھا۔ اس سوال کا بھی صاف صاف جواب دے دیتے کہ فلاں وقت ہوگی۔ (تفسیر سراج منیر)

مشہور مفسر قرآن امام رازی ماقبل سے ربط اور شان نزول بیان فرمانے کے بعد آیت کی تفسیر میں رقمطراز ہیں:

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ آپ ان سے فرما دیجئے کہ جس خاص گھڑی میں قیامت ہوگی اس کا علم حق سبحانہ کے سوا کسی کو نہیں ہے اور اسی جیسا ان آیات کا مضمون ہے ان اللہ عندہ علم الساعۃ ان الساعۃ اٰتیۃ لا ریب فیہا۔ ان الساعۃ اٰتیۃ اکاد اخفیہا۔ اور جب حضرت جبریل نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ قیامت

کب ہوگی تو آپ نے فرمایا کہ اس کے متعلق میرا علم تم سے زیادہ نہیں ہے۔
(مفاتیح الغیب)

اور علامہ نسفی حنفی مدارک التنزیل میں فرماتے ہیں :

یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں قیامت کے بارے میں یعنی اس کے ہونے کے وقت کا۔ ان سے کہہ دیجئے کہ اس کا علم بس خدا ہی کے پاس ہے۔ اس کو اس نے اپنے ہی لیے خاص کر رکھا ہے نہ کسی مقرب فرشتے کو اس کی اطلاع دی ہے اور نہ کسی نبی مرسل کو تاکہ یہ چیز طاعت کے لیے زیادہ داعی اور گناہوں سے زیادہ روکنے والی ہو جیسا کہ اسی مصلحت سے خدا نے ہر شخص کی موت کو بھی مخفی رکھا ہے تاکہ ہر وقت وہ ڈرتا رہے اور کسی وقت بے خوف و نڈر نہ ہو۔ بہر حال قیامت کا علم بس خدا ہی کو ہے، ظاہر نہیں کرے گا اس کے معاملہ کو اور نہیں کھولے گا اس کے خفا کو مگر وہی خدا۔ وہ آسمانوں اور زمین میں بھاری ہے یعنی قیامت کے معاملہ نے زمین و آسمان کی تمام مخلوق یعنی ملائکہ اور انس و جن کو غرض سب ہی کو مبتلائے فکر کر رکھا ہے اور ہر ایک اس کا متمنی ہے کہ کسی طرح اس کو اس کا وقت معلوم ہو جاتے اور اس کا مخفی رہنا ہر ایک پر شاق ہے یا یہ کہ وہ قیامت خود بھاری ہے زمین و آسمان میں، اس لیے کائنات سماوی و ارضی اس کی سختیوں اور ہولناکیوں سے خائف ہے۔ وہ قیامت تمہارے پاس اچانک آئے گی وہ لوگ قیامت کے بارے میں اس طرح سوال کرتے ہیں گویا آپ نے اس کو معلوم ہی کر لیا ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم بس خدا ہی کے پاس ہے لیکن بہت سے اس بات کو جانتے نہیں ہیں کہ اس کا علم صرف خدا ہی کو ہے۔ (مدارک التنزیل)

اور قاضی بیضاوی اپنی تفسیر انوار التنزیل میں فرماتے ہیں :

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ کب اس کا وقوع ہوگا آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم بس میرے رب ہی کو ہے اس کو اس نے اپنے لیے خاص کر لیا ہے نہ کسی مقرب فرشتے کو اس کی اطلاع دی ہے نہ کسی نبی مرسل کو وہی اس کے وقت پر اسے ظاہر کرے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کے سوا دوسروں پر اس کا پوشیدہ رہنا اس کے آنے تک مستمر رہے گا وہ آسمانوں اور زمین پر گراں ہے یعنی زمین و آسمان کی ساری کائنات پر بھاری اور شاق ہے۔ شاید یہ اس کے

اخفاء کی حکمت کی طرف اشارہ ہے بہرحال وہ تمہارے پاس اچانک ہی آئے گی۔ یہ لوگ آپ سے اس کے متعلق ایسے سوالات کرتے ہیں گویا کہ آپ اس سے باخبر ہی ہو گئے ہیں۔ آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم بس خدا ہی کو ہے لیکن بہت سے لوگ نہیں جانتے کہ صرف خدا ہی اس کا جاننے والا ہے۔ اور وہ اسی کے ساتھ خاص ہے۔ (تفسیر بیضاوی)

اور تفسیر جلالین میں اس آیت کی تفسیر اس طرح کی گئی ہے:

لوگ آپ سے قیامت کے بارے میں سوال کرتے ہیں کہ اس کا وقوع کب ہوگا آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم بس میرے رب ہی کو ہے۔ نہیں ظاہر کرے گا اس کو اس کے وقت پر خدا کے سوا، یعنی خدا ہی اس کو اپنے وقت پر ظاہر کرے گا۔ بھاری ہے وہ آسمانوں اور زمین میں یعنی قیامت اپنی ہولناکی کی وجہ سے زمین و آسمان والوں پر بہت شاق ہے اور وہ تم پر اچانک اور بے خبری ہی میں آئے گی۔ وہ لوگ آپ سے ایسے سوال کرتے ہیں گویا کہ آپ اس کے بہت ہی متلاشی ہیں اور آپ نے تحقیق و تفتیش کر کے گویا اس کو معلوم ہی کر لیا ہے۔ آپ ان سے فرما دیجئے کہ اس کا علم بس خدا ہی کو ہے لیکن بہت سے حقیقت ناآشنا اس سے بے خبر ہیں۔

اور علامہ ابوالسعود انما علمها عند ربی کی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

علم قیامت کے صرف خدا ہی پاس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اس نے اپنے ہی واسطے اس کو خاص کر رکھا ہے اس طور پر کہ کسی ملک مقرب اور نبی مرسل کو بھی اس کی خبر نہیں دی ہے۔

پھر لا یجلیها لوقتها الا ھو کی تفسیر فرماتے ہیں کہ:

حق تعالیٰ بذات خود قیامت کے معاملہ کو ظاہر کرے گا۔ اس طرح پر کہ جب اس کا وقت مقرر آ جائے گا تو اس کو قائم کر کے مشاہدہ کرا دے گا تو اسی وقت مخلوقات کو معلوم ہو جائے گا یہ وہی وقت موعود ہے ایسا نہیں ہوگا کہ اس کے قائم ہونے سے پہلے حق تعالیٰ اپنے کسی خاص بندے کو اس کی اطلاع دے دیں اور پھر وہ دوسروں کو بتلا دے۔ بہرحال عام مخلوقات کو قیامت کے وقت کا علم اسی وقت ہوگا جب وہ آ جائے گی اور بذریعہ مشاہدہ نہ کہ بذریعہ اخبار اور یہ بات لا یجلیها کے لفظ سے معلوم ہوتی ہے کیونکہ تجلیہ انکشاف تام کو چاہتا ہے جس کے بعد کوئی ابہام نہ ہے اور یہ چیز

مشاہدہ ہی سے حاصل ہوتی ہے اور لو قتھا کی تقدیم سے بھی اسی پر تنبیہہ کرنی مقصود ہے کہ یہ انکشاف بذریعہ اخبار نہیں ہوگا بلکہ عین وقت پر بذریعہ مشاہدہ میں ہوگا۔

پھر آیت کے آخری حصہ حیث نک کانک حفی عنھا کی تفسیر میں فرماتے ہیں :

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ آپ سے قیامت کے متعلق اس طرح سوال کرتے ہیں کہ گویا اس سوال سے آپ کو خوشی ہوتی ہے اور گویا آپ کو اس سوال سے خوشی ہوتی ہے اور گویا آپ چاہتے ہیں کہ یہ سوال کیا جاتے حالانکہ آپ کو یہ سوال سخت ناگوار ہے کیونکہ اس میں اللہ عزوجل کے اس غیب کے پردے سے چھیڑ چھاڑ ہے جس کو اس نے اپنے ہی لیے خاص کر لیا ہے آپ صاف فرما دیجئے کہ اس کا بس خدا ہی کو علم ہے لیکن بہت لوگ نہیں جانتے یعنی ان کو اس کی خبر نہیں کہ یہ علم مخصوصات باری تعالیٰ سے ہے۔ چنانچہ ان میں سے بعض جاہل تو سرے سے قیامت ہی کے منکر ہیں اور بعض وہ ہیں جو یہ تو جانتے ہیں کہ قیامت آئے گی مگر اس کے باوجود از راہ جہالت یہ بھی گمان کرتے ہیں کہ آپ کو اس کے وقت خاص کا پتہ ہے اسی لیے وہ آپ سے سوال کرتے ہیں۔

مشہور مفسر ابوالفرج جمال الدین عبدالرحمان بن علی الجوزی اپنی تفسیر زاد المسیر فی علم التفسیر میں انما علمھا عند اللہ کی تفسیر کرتے ہیں :

یعنی اللہ کے سوا قیامت کا کسی کو علم نہیں ہے لیکن لوگوں کی اکثریت اس سے نادان ہے۔ امام مقاتل کہتے ہیں کہ لوگ سے مراد یہاں اہل مکہ ہیں اور لا یعلمون کی تشریح دو طرح ہے۔ ایک یہ کہ وہ قیامت کو نہیں مانتے ہیں یہ امام مقاتل کی رائے ہے۔ دوسرے یہ کہ ان کو اس بات کا پتہ نہیں کہ قیامت کے آنے کا علم اللہ سبحانہ کے مخصوصات میں سے ہے۔ یہ سلیمان دمشقی کی رائے ہے۔

(زاد المسیر فی علم التفسیر)

علامہ آلوسی بغدادی اپنی تفسیر روح المعانی میں رقمطراز ہیں :

انما علمھا عند ربی میں قیامت کا علم خدا کے پاس ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ علم خاصۃ اللہ سبحانہ ہے اللہ نے اس کی کسی کو خبر نہیں دی ہے نہ فرشتہ مقرب کو اور نہ نبی مرسل کو۔

اس کے بعد لا یجلیھا لوقتھا کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

اس میں اس کا بیان ہے کہ اس کا پوشیدہ ہونا تا قیام قیامت مستمر ہے اور اور اس کی خبر دینے کے بارے میں بھر پور مایوسی پیدا کی گئی ہے۔

اس کے بعد قل انما علمہا عند ربی ولکن اکثر الناس لا یعلمون کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

لا یعلمون کا مفعول محذوف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو اس علم کے مخصوص الٰہی ہونے کی خبر نہیں ہے۔ کچھ تو قیامت ہی کے منکر ہیں ان کی جانب سے تو یہ سوال محض تلاعب ہے اور کچھ قیامت کو تو مانتے ہیں مگر ان کا گمان یہ ہے کہ حضور انور کو قیامت کے وقت کا علم ہے اس لیے نادانی اور بے خبری سے یہ سوال کرتے ہیں۔ اور کچھ یہ سمجھتے ہیں کہ قیامت کا علم ہونا رسالت کا تقاضا ہے۔ اس لیے بطور اعتراض دریافت کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ نے قیامت کے معاملہ کو حکمت تشریعی کی بنا پر پوشیدہ رکھا ہے کیونکہ اس کا فائدہ یہ ہے کہ اس سے بندوں میں ایک طرف طاعت کا داعیہ ہوگا اور دوسری طرف گناہوں سے رکنے کا ذریعہ ہوگا۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے انسان کی عمر کا اخفا انسان میں طاعت کا داعیہ اور گناہ سے بچنے کا ذریعہ ہے۔ اور اگر یہ کہا جائے کہ صرف حکمتِ تشریعی کا نہیں بلکہ حکمتِ تکوینی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ قیامت کے معاملہ کو چھپایا جائے تو یہ بھی درست ہے۔ آیاتِ قرآنی کھلے طور پر بتا رہی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے آنے کے وقت کا علم نہ تھا، ہاں آپ کو اجمالاً قیامت کا قرب ہونا معلوم تھا جیسا کہ ترمذی میں حضرت انس کی حدیث میں تصریح ہے کہ آپ نے فرمایا کہ میں اور قیامت اس طرح ہیں اور آپ نے انگشت شہادت اور درمیانی انگلی سے اشارہ کر کے بتایا۔

(روح المعانی)

درمنثور میں بحوالہ ابن اسحاق و ابن جریر و ابوالشیخ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ بعض یہود نے از راہِ شرارت آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے قیامت کے وقت کے متعلق سوال کیا تو اسی موقع پر یہ آیت نازل ہوئی نیز اسی درمنثور میں ہے بحوالہ ابن جریر حضرت قتادہ سے مروی ہے کہ یہی سوال قریشِ مکہ کی جانب سے کیا گیا تھا۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی۔

بہرحال سوال خواہ کسی کی جانب سے ہو لیکن اتنا متفق علیہ ہے کہ قیامت کے متعلق آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا گیا تھا کہ وہ کب آئے گی۔ اس کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی جس میں بکمال د مرات اس حقیقت کا اظہار کیا گیا ہے کہ قیامت کے وقت خاص کا علم مخصوصات باری تعالیٰ سے ہے اور بس اسی کو معلوم ہے کہ قیامت کب آئے گی۔

اگرچہ مفسرین کی تشریحات کے بعد اب ہمیں آیت کی مزید تشریح کی ضرورت نہیں ہے مگر بات کی تکمیل کی خاطر چند جدید مفسرین کی تشریحات بھی ہدیۂ ناظرین کرتے ہیں تاکہ ناظرین کو معلوم ہو سکے کہ پوری علمی دنیا کیا کہہ رہی ہے اور ہمارے بزرگ یہ کہہ کر کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت آنے کا علم تھا ہمیں کدھر لے جا رہے ہیں۔

علامہ السید رضا مصر کے مشہور عالم ہیں انہوں نے تفسیر المنار کے نام سے تفسیر لکھی ہے جو صرف ۱۱ پارے تک ہے۔ آپ مفتی عبدہٗ مصری کے شاگرد ہیں۔ وہ انما علمها عند ربی کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

اے ڈر سنانے والے کہہ دو کہ قیامت کا علم صرف میرے رب کے پاس ہے نہ میرے پاس ہے اور نہ کسی اور کے، یہ معنے آیت کے انما کے آنے سے ہوئے ہیں۔

لا یجلیها لوقتها الا هو کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ قیامت کے چہرے سے پردہ ہٹانا اور اسے اپنے وقت پر ظاہر کرنا صرف اللہ کا کام ہے۔ قیامت کے ظاہر کرنے اور اس کے وقت بتانے میں کوئی وساطت نہیں ہے۔

ولکن اکثر الناس لا یعلمون کی تفسیر فرماتے ہوئے لکھتے ہیں،

لوگوں کو یہ پتہ نہیں ہے کہ قیامت کی آمد کا علم صرف اللہ سبحانہٗ کو ہے۔ اور نہ لوگوں کو اس کی حکمت کا پتہ ہے اور نہ پوچھنے والوں کو سوال کا سلیقہ ہے۔

۲ استاذ الشریعہ الاسلامیہ جناب احمد مصطفیٰ المراغی اپنی تفسیر المراغی میں رقمطراز ہیں:

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ قیامت کا علم صرف میرے رب کے پاس ہے، نہ میرے پاس ہے اور نہ ہی مخلوقات میں سے کسی اور کے پاس ہے۔ اسی کے ہم معنے قرآن کی یہ آیت ہے۔ الیه یرد علم الساعة اور فیم انت من ذکراها الی ربک منتهاها۔

اور ولکن اکثر الناس لا یعلمون کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

یعنی لوگوں کو پتہ نہیں ہے کہ قیامت کا علم مخصوص الٰہی ہے اور نہ لوگوں کو اس کی حکمت کا پتہ ہے اور نہ اس موضوع پر ان کو ادب سوال آتا ہے۔ سوال کا ادب صرف اہل ایمان کو آتا ہے۔

اور علامہ الشام محمد جمال الدین القاسمی اپنی تفسیر محاسن التاویل میں اس آیت کی تشریح فرماتے ہوئے لکھتے ہیں:

لوگ آپ سے قیامت کے ہونے اور اس کے وقت کے بارے میں دریافت کرتے ہیں آپ فرما دیجئے کہ اس کا علم میرے رب کے پاس ہے وہ ہی اسے اپنے وقت میں ظاہر کرے گا۔ ولکن اکثر الناس لا یعلمون یعنی لوگوں کو یہ پتہ نہیں کہ قیامت کے وقت کا علم اللہ کو ہے اور مخلوقات میں سے یہ علم کسی کو نہیں دیا گیا ہے۔

اسی قسم کی آیت کی تشریح محمد عزہ دروزہ نے اپنی مشہور تفسیر التفسیر الحدیث میں کی ہے۔ دیکھئے التفسیر الحدیث ج ۲ ص ۱۹۱۔

ظاہر ہے ان تشریحات کے مطالعہ کے بعد مذکورہ بالا تینوں تاویلوں میں سے اس آیت کی تفسیر میں کسی کی بھی گنجائش نہیں ہے۔ نہ یہاں ذاتی اور عطائی کی بحث ہی چل سکتی ہے اور نہ ہی احتمال ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو وقت قیامت کا علم دے دیا گیا ہوگا۔ لا یجلیہا لوقتہا الا ھو کے الفاظ ان تینوں تاویلوں کی بیخ کنی کر رہے ہیں کیونکہ حسب تصریحات مفسرین اس کا مطلب یہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ خود قیامت کو اس وقت ہی پر ظاہر کرے گا۔ اس سے پہلے کسی کو اس کی اطلاع نہ دے گا دیکھو قاضی بیضاوی اور علامہ ابوالسعود کی تشریحات۔

علاوہ ازیں یہ آیت بلکہ اکثر وہ آیتیں جن میں علم قیامت کی غیر اللہ سے نفی کی گئی ہے۔ کفار کے سوال کے جواب میں نازل ہوئیں وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بار بار کہتے کہ۔ اگر آپ خدا کے رسول ہیں تو بتایئے قیامت کب آئے گی؟ ان کے اس ناروا سوال کے جواب میں بعنوانات مختلفہ یہ فرمایا گیا ہے کہ اس کا علم بس خدا ہی کو ہے۔ ان آیات کو مسخ کرنے کے مترادف ہے۔ کیونکہ کفار کا سوال علم ذاتی کے متعلق نہیں تھا بلکہ اس علم عطائی کے بارے میں تھا جو بحیثیت رسول ہونے کے اللہ کی جانب سے ان کو عطا ہوا تھا۔ اب ان کے جواب میں یہ کہنا کہ مجھے اس کا علم ذاتی نہیں بلکہ خدا ہی کو ہے معاذ اللہ سوال از آسمان جواب از ریسمان کا مصداق ہوگا۔

اور اسے قرآن اور حضور انور کے بارے میں ایک مومن کا ایمان قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔
نیز اگر بفرض غلط ان آیات کا یہی مطلب ہوتا تو ضروری تھا کہ وہ سوال کرنے والے کفار بھی یہی سمجھتے اور اس صورت میں ان کی طرف سے لامحالہ یہ کہا جاتا کہ حضرت ہم کو آپ کے ذاتی ازعطائی علم سے بحث نہیں ہم تو صرف یہ معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ قیامت کب آئے گی؟ اگر آپ کو پتہ ہے تو بتا دیجئے لیکن ان کی طرف سے یہ نہیں کہا گیا جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل زبان نے بھی اس کو علم ذاتی کی نفی پر محمول نہیں کیا بلکہ انہوں نے بھی اس کا مطلب یہی سمجھا کہ اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو بھی وقت قیامت کا مطلقاً علم نہیں اور اس کی خبر بس خدا ہی کو ہے اس نے کسی کو بھی اس کی اطلاع نہیں دی اور یہی مطلب حضرات صحابہ و تابعین اور ائمہ تفسیر نے سمجھا چنانچہ ان کی تشریحی اقوال میں کہیں استاثر اللہ بعلمہ اور یطلع علیہ اور کہیں لم یطلع علیہ اور کہیں لم یطلع علیہا احدا ملکا ولا رسولا اور کہیں لم یطلع علیہ احدا من خلقہ اور کہیں لم یطلع علیہ غیرہ اور کہیں لم یخبر بہ احد من ملک مقرب و نبی مرسل۔ اور ان کے ہم معنے الفاظ مختلف تفاسیر میں آتے ہیں جن سے اس خیال کی قطعی تردید ہو جاتی ہے کہ ان آیات میں غیر اللہ سے صرف علم ذاتی کی نفی کی گئی ہے نہ علم عطائی کی۔ اور علیٰ ہذا ان آیات کے متعلق یہ کہنا کہ ان کے نزول کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے وقت کا علم دے دیا گیا ہوگا محض بے دلیل بات ہے اور عقائد میں اس قسم کی باتوں کی کوئی قیمت نہیں ہوتی۔

بلاغت کا قابل غور نکتہ

اس کے علاوہ ارباب بصیرت کے لیے یہاں ایک چیز یہ بھی قابل غور ہے کہ عربی زبان میں قصر اور حصر کے جتنے پیمانے ہیں وہ قرآن میں علم قیامت کو حق تعالیٰ کے ساتھ مخصوص کرنے کے لیے استعمال کیے گئے ہیں اور ہر جگہ انداز بیان میں اس تفرد و اختصاص کا زیادہ سے زیادہ لحاظ رکھا گیا ہے۔
بیشتر آیات میں لفظ انما لایا گیا ہے جیسے انما علمہا عند ربی بعض جگہ نفی و استثنا سے اس اختصاص کو ظاہر کیا گیا ہے لا یجلیہا لوقتہا الا ھو۔
اور کہیں ظرف کو مقدم کر کے یہ بات ظاہر کی گئی ہے جیسے الیہ یرد علم الساعۃ اور عندہ علم الساعۃ۔
عربی زبان میں قصر کے یہی معروف طریقے ہیں۔ ان کا مفاد یہی ہے کہ قیامت کے وقت کا

علم اللہ سبحانہ کے ساتھ مخصوص ہے اور اسی اختصاص کو شارحین قرآن نے استاثر اللہ بعلمہٖ اور تفرد بعلمہٖ کے الفاظ سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا منشا یہی ہے کہ قیامت کے آنے سے پہلے کسی وقت بھی حق تعالیٰ کے سوا کسی دوسرے کو اس کا علم نہ ہو ورنہ تفرد باقی نہ رہے گا۔

قرآن کا یہ قصری انداز بیان اس خیال کی کھلی تردید کر رہا ہے کہ ان آیات کے نازل ہونے کے بعد حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے آنے کا وقت بتا دیا گیا تھا۔ اور یہ قصری انداز اس بات کو بھی غلط قرار دیتا ہے کہ ان آیات میں علم قیامت کو صرف اللہ کی طرف رد کیا گیا ہے۔ دوسروں سے اس کی نفی نہیں کی گئی۔ دوسروں کے متعلق یہ آیات ساکت ہیں۔ ان آیات میں کلمہ حصر استعمال ہوا ہے اور حصر کی حقیقت یہی ہے کہ ایک کے لیے اثبات ہو اور ماسوا سے نفی ہو، خود شارحین قرآن نے اس کو پوری قوت سے واضح کیا ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ ان آیات میں علم قیامت کو حق تعالیٰ کے لیے ثابت کیا گیا ہے دوسروں سے اس کی نفی نہیں کی گئی اور ماسوائے اللہ کے علم اور عدم علم سے یہ آیات ساکت ہیں افسوسناک بے خبری ہے۔

بہر حال علم قیامت کے مخصوص بحق تعالیٰ ہونے کے متعلق قرآن کی یہ آیت برہان قاطع ہے۔ اس میں کسی تاویل کی کوئی گنجائش نہیں ہے اور اس سے روز روشن کی طرح ثابت ہے کہ وقت قیامت کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنے لیے خاص کر رکھا ہے اور اپنی کسی مخلوق حتیٰ کہ کسی مقرب فرشتہ اور کسی برگزیدہ پیغمبر کو بھی اس کی اطلاع نہیں دی ہے اور نہ اس کی آمد سے پہلے کسی کو اس کی اطلاع دی جائے گی۔ اس میں مولانا احمد رضا خاں صاحب اور مولوی نعیم الدین مراد آبادی کی پیش کردہ ان تاویلات کی، کہ اس میں علم ذاتی کی نفی کی گئی ہے نہ کہ علم عطائی کی اور یہ کہ حضور کو اس آیت کے نازل ہونے کے بعد قیامت کا وقت بتا دیا گیا تھا یا یہ کہ اس آیت میں علم ساعت کے اللہ تعالیٰ کے پاس ہونے سے یہ ثابت نہیں کہ کسی دوسرے کو اس کا علم نہیں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ ان بزرگوں کی پیش کردہ تاویلات کی علمی حیثیت کوئی نہیں بلکہ میرے جیسے بے علم کو بھی یہ تاویلات پڑھ کر یقین نہیں آتا کہ یہ باتیں کوئی علمی شخصیت کہہ سکتی ہے۔

ہاں اس دور آخر میں کچھ نے اپنی تفسیر میں اس موضوع پر ایک جدید موقف اختیار کیا ہے۔ آیئے سرراہے وہ بھی سن لیجئے انہوں نے پہلے کھلے دل کے ساتھ یہ بات مان لی ہے کہ،

قرآن حکیم میں یہاں بھی اور اس کے علاوہ متعدد مقامات پر قیامت کے وقوع کے علم کو علم الٰہی کی طرف تفویض کیا گیا ہے۔ اس آیت میں ایک مرتبہ

فرمایا انما علمہا عند ربی اس کا علم تو میرے رب کے پاس ہے دوسری مرتبہ فرمایا انما علمہا عند اللہ اس کا علم تو اللہ کے پاس ہے۔ ان ہی آیات طیبہ کے پیش نظر اکثر مفسرین نے علم وقوع قیامت کے متعلق تصریح فرمائی ہے ان اللہ قد استاثر بعلمہا یعنی قیامت کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے ساتھ مخصوص فرما لیا ہے۔

یہ صحیح بات فرمانے کے بعد اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں یہ بات بھی اتاری ہے کہ علامہ بیضاوی نے اسے ان متشابہات میں شمار کیا ہے جن کا علم ذاتِ الٰہی سے مختص ہے وہ سورۂ آل عمران کی آیت وما یعلم تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ اس آیت میں جن علماء نے الا اللہ پر وقف کیا ہے انہوں نے متشابہات سے وہ اشیاء مراد لی ہیں جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے مخصوص کیا ہے۔

اس کے بعد لوگوں کو سمجھایا کہ:

ان عبارات سے یہ وہم پیدا ہو سکتا تھا کہ شاید ان امور کے متعلق دوسرے عام لوگوں کی طرح حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم ناواقف اور بے خبر ہوں۔ اس وہم کا ازالہ حضرت علامہ محمود آلوسی نے فرمایا۔

اس کے بعد روح المعانی سے ایک عربی عبارت کا ٹکڑا درج کر کے اس کا یہ ترجمہ کیا ہے:

یعنی جنہوں نے متشابہ کی یہ تعریف کی ہے کہ وہ امور جن کا علم اللہ تعالیٰ نے اپنی ذات کے لیے مختص فرما لیا ہے وہ بھی اس کا انکار نہیں کرتے کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے محبوب کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بذریعہ وحی یہ امور مفصلاً سکھا دیے ہوں یا ولی کامل کے دل میں القا فرما دیا ہو لیکن یہ تفصیل بھی اللہ تعالیٰ کے علم محیط کے درجہ تک نہیں پہنچ سکتی یا تفصیلاً نہیں تو اجمالاً، جس شخص کو بھی سید المرسلین کی شانِ رفیع کا علم ہے اور حضور پُر نور کی امت کے اولیاء کاملین کے رتبہ کو جانتا ہے وہ یہ کہنے کی جرأت نہیں کر سکتا۔

اس کا لب لباب یہ ہے کہ بے شک قیامت کے آنے کا علم مخصوص باری ہے اور قرآن کی تعبیرات خصوصی بتا رہی ہیں اور مفسرین قرآن کا بھی یہی فیصلہ ہے لیکن علامہ آلوسی کا انکشاف

یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے نہ صرف حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم بلکہ آپ کی اُمت کے اولیاء کاملین کو وحی اور الہام کے ذریعے تفصیلاً قیامت کے آنے کی تاریخ بتا دی ہے۔ اس سے قطع نظر کہ علامہ آلوسی اس عبارت کے ذریعے کیا سمجھا رہے ہیں۔ ہم تھوڑی دیر کے لیے مان لیتے ہیں کہ وہ ہی کچھ سمجھا رہے ہیں جو حضرت پیر صاحب قبلہ نے سمجھا ہے کہ اللہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے بتا دیا ہے کہ قیامت کب آنے والی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وحی کی دو ہی قسمیں ہیں متلو اور غیر متلو، یا قرآن اور سنت، بتایا جائے، قرآن کی کون سی آیت میں حضور انور کو بتایا گیا ہے یا کون سی حدیث ہے جس میں حضور نے فرمایا ہو کہ مجھے میرے رب نے بتا دیا ہے۔ ہم نے تو صحیح حدیث میں حضرت جبریل اور حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مکالمہ میں حضرت جبریل کے اس سوال پر کہ قیامت کب آئے گی حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ما المسئول عنھا باعلم من السائل اس بارے میں میرا علم تم سے زیادہ نہیں ہے۔ اس واقعہ کے بعض طرق میں یہ بھی تصریح ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اور حضرت جبریل کی یہ گفتگو حضور کی عمر شریف کے آخری حصہ میں ہوئی تھی۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں رقمطراز ہیں:

> اس حدیث جبریل کو ابن مندہ نے کتاب الایمان میں اپنی سند سے جو علی شرط مسلم صحیح ہے بطریق سلیمان تیمی بروایت حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہٗ نے روایت کیا ہے اور اس کے ابتدائی الفاظ یہ ہیں کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر شریف کے آخر میں ایک شخص یعنی جبریل علیہ السلام حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ اس کے بعد پوری گفتگو کا ذکر ہے۔

یہ مسئلہ عقائد سے تعلق رکھتا ہے اور عقائد کے اثبات کے لیے جس قسم کی دلیل کی قوت ضروری ہے اس کے لیے علامہ آلوسی کا انکشاف کوئی قانونی حیثیت نہیں رکھتا۔ ہمارا استدلال آیات قرآنیہ سے ہے اور اس کے مقابلہ میں علامہ آلوسی کا انکشاف فرما رہے ہیں۔ اس تقابل کی نزاکت آپ بھی سمجھ ہی جانتے ہیں۔ علماء محققین تو قرآن کی صریح آیات کے مقابلہ میں اخبار آحاد کو پیش کرنا بھی گوارا نہیں کرتے۔ خود مولانا احمد رضا خاں صاحب الفیوض الملکیہ علی الدولۃ المکیہ میں اسی علم غیب کی بحث میں فرماتے ہیں:

ان نصوص القرآن لا تعارض بالاحاد

اخبار آحاد نصوص قرآن کے مقابلہ میں پیش نہیں کی جا سکتی ہیں۔

نیز اپنے دوسرے رسالہ انباء المصطفیٰ میں فرماتے ہیں،
عموم آیات قرآنیہ کی مخالفت میں اخبار آحاد سے استناد محض ہرزہ باقی۔
بہر حال قرآن کی نصوص قطعیہ کے مقابلہ میں علامہ آلوسی کے انکشاف کا سہارا لینا عالمانہ شان کے منافی ہے اور بہت ہی کمزور تنکے کا سہارا ہے۔

رہی یہ بات کہ علامہ آلوسی اپنے مخاطبوں کو کیا سمجھانا چاہتے ہیں تو اس کے متعلق گزارش ہے کہ علامہ آلوسی نے ما یعلمہ تاویلہ الا اللہ والراسخون فی العلم کے وقف پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ بیشتر شوافع الراسخون فی العلم پر وقف کرتے ہیں اور وہ متشابہ کی تعریف یہ کرتے ہیں کہ جس کے معنے واضح اور صاف نہ ہوں۔ اور بیشتر احناف الا اللہ پر وقف کرتے ہیں اور احناف متشابہ کی تعریف یہ کرتے ہیں جس کے علم کو اللہ نے اپنے ہی لیے خاص کر لیا ہو۔ شوافع نے اپنے موقف کی ترجیح میں آٹھ دلیلیں پیش کی ہیں۔ علامہ آلوسی نے احناف کی ترجمانی کرتے ہوئے شوافع کی پیش کردہ دلائل ترجیح کا جواب دیا ہے۔ ان دلائل میں سے شوافع نے والراسخون فی العلم پر وقف کی تائید میں آٹھویں دلیل یہ پیش کی تھی کہ اگر الا اللہ پر وقف کیا جائے گا تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ اللہ سبحانہٗ اپنے بندوں کو ایسی باتوں کا مخاطبہ بنائے گا جن کی معرفت اور علم کا بندوں کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ علامہ آلوسی نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ اگر اللہ سبحانہٗ اپنے بندوں کو ایسی باتوں کا مخاطب بناتا ہے جن کے علم کا بندوں کے پاس کوئی ذریعہ نہیں۔ اس میں اہمال نہیں بلکہ یہ اللہ کی جانب سے ابتلاء ہے اور یہ ابتلا بھی ایسا ہی ابتلا ہے جیسے بندوں کو مکلف بنا کر اور بیشتر عبادات کے ذریعے مکلف بنایا گیا ہے۔ حالانکہ بندوں کو ان کی حقیقت کا علم نہیں ہے۔ اور اس ابتلا میں راز یہ ہے کہ عقل انسانی اور فکر انسانی کو بے دست و پا بنا کر قلب انسانی کی توجہات کا مرکز عبودیت کو بنایا جاتا ہے اور اس مرحلہ پر قصور معرفت کا اعتراف کرتا ہے اور اپنی بے چارگی محسوس کرتا ہے۔ یہ انسان کی بہترین تربیت اور آخری نیز خواہی ہے۔ یہ اس وقت ہے جبکہ مخصوص الٰہی سے مراد یہ ہو کہ ان باتوں تک انسانی فکر کی رسائی نہیں ہو سکتی اور مخصوص الٰہی علم سے مراد یہ ہو کہ کسی طرح بھی اس تک رسائی نہیں ہو سکتی نہ وحی کے ذریعے اور نہ الہام کے ذریعے تو قرآن کا مخاطب ایسا کوئی نہیں ہے۔ اور غالباً جو شخص متشابہ کی یہ تعریف کرتا ہے کہ مخصوص علم باری کا نام ہے وہ اس علم الٰہی کو وحی کے ذریعے تعلیم پر کوئی قدغن نہیں لگاتا بلکہ اس کے خیال میں دل کامل کو الہام کے ذریعے اس

میں حصّہ مل سکتا ہے لیکن نبی اور ولی کے اس علم کو اللہ سبحانہٗ کے علم محیط سے کوئی نسبت نہیں ہے لیکن کیا قرآن میں یہی فرماتے ہیں فرماتے ہیں کہ ظاہر کلام میں اس ارادہ کا واہمہ بھی نہیں ہے۔ اس لیے ارادوں کا یہ تجزیہ بہت دور کی بات ہے۔

یہ ہے وہ بیان جو علامہ آلوسی نے روح المعانی میں لکھا ہے اور اسی کے قریب قریب قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے۔ ان بزرگوں کا منشا صرف یہ بتانا ہے کہ حضور انور وحی کے ذریعے قیامت کا جو علم عطا کیا گیا ہے یعنی آپ نے جو قیامت کی علامات بتائی ہیں اس قدر علم کا ہونا بھی کلام کا مخاطب ہونے کے لیے کافی ہے۔ اس سے یہ اعتراض ہٹ جاتا ہے کہ خدا اپنے بندوں کو ان باتوں سے مخاطب کرتا ہے جن کے علم کا بندوں کے پاس کوئی ذریعہ نہیں ہے۔ اور یہ بات بھی علی سبیل التنزیل فرمائی گئی ہے ورنہ اصل یہی ہے کہ یہ ابتلائی بات ہے۔ اس سے یہ سمجھنا کہ علامہ آلوسی یہ بتاتے ہیں کہ حضور کو قیامت کے آنے کی تاریخ کا علم تھا سینہ زوری ہے۔ اگر آپ کو علم ہوتا تو آپ حضرت جبریل سے کبھی نہ یہ فرماتے کہ لیس المسئول عنها باعلم من السائل۔

اور اس بات کی دلیل کہ آلوسی کا مقصد یہی بتانا ہے۔ خود تفسیر میں آلوسی کی تصریحات ہیں:
آلوسی عندہٗ علم الساعۃ کی تفسیر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

> عندہٗ علم الساعۃ فی تقدیم الخبر اشارۃ الی استبدادہ تعالٰی بعلم ذالک خبر کو مقدم کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ اللہ تعالٰی نے علم قیامت کو اپنے ہی لیے خاص کر لیا ہے۔

یہی آلوسی الیہ یرد علم الساعۃ کی تفسیر کرتے ہوئے فرماتے ہیں:

> یعنی جب قیامت کے بارے میں سوال کیا جاتے تو جواب یہ دیا جائے کہ اللہ تعالٰی ہی جانتا ہے یا اللہ کے سوا اسے کوئی نہیں جانتا ہے۔ اس فقرہ کا مقصد مومنین کو بتانا ہے کہ اس سوال سے گلو خلاصی کیسے کرائی جائے۔ جواب خواہ کوئی ہو حاصل یہی ہے کہ قیامت کی تاریخ کا علم اللہ سبحانہٗ کی خصوصیت ہے یعنی اللہ کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ دوسرے جواب پر یہ خصوصیت ظاہر ہے لیکن پہلے جواب میں کہ اللہ ہی جانتا ہے، بتانے والا اسی اختصاص کو جتا رہا ہے جب آپ سے کوئی مسئلہ دریافت کیا جاتے اور جواباً کہیں کہ فلاں جانتا ہے تو کنایۃً آپ پہلے

تب علم ہوا کہ جبریل تھے۔ یہ واقعہ بتصریح محدثین بالکل آخر عمر کا ہے۔ اس میں قیامت کے سوال پر ما المسئول عنھا باعلم من السائل ارشاد فرمایا ہے۔ گویا بتلا دیا گیا کہ علم محیط خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اور علم غیب تو درکنار محسوسات و مبصرات کا پورا علم بھی خدا ہی کے عطا کرنے سے حاصل ہوتا ہے وہ کسی وقت نہ چاہے تو ہم محسوسات کا بھی ادراک نہیں کر سکتے۔ بہرحال اس آیت میں کھول کر بتا دیا گیا کہ اختیار یا علم محیط نبوت کے لوازم میں سے نہیں جیسا کہ بعض جہلاء سمجھتے ہیں۔ ہاں شرعیات کا علم جو انبیاء علیہم السلام کے منصب سے متعلق ہے کامل ہونا چاہیے۔ اور تکوینیات کا علم اللہ تعالیٰ جس کو جس قدر مناسب جانے عطا فرماتا ہے۔ اس نوع میں ہمارے حضور صلی اللہ علیہ وسلم تمام اولین و آخرین سے فائق ہیں۔ آپ کو اتنے بے شمار علوم و معارف حق تعالیٰ نے مرحمت فرمائے ہیں جن کا احصا کسی مخلوق کی طاقت میں نہیں[1]

اس آیت گرامی میں اصولی طور پر دو باتیں بیان کی گئی ہیں۔ ایک تمام اختیار کل کا مسئلہ اور دوسرے علم محیط کا مسئلہ۔

لا املك لنفسی نفعاً و لا ضراً الا ما شاء اللہ میں اللہ سبحانہ کے مختار کل ہونے کا اعلان ہے اور اس بات کو بیان کرنے کے لیے اللہ سبحانہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا ہے کہ آپ اعلان کر دیجئے کہ میں اپنے لیے کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ جو کچھ اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی کچھ ہوتا ہے۔ حقیقتہً اور مافوق الاسباب طریق سے نفع اور نقصان پہنچانا صرف اللہ کا خاصہ اور شان ہے۔ یہ موضوع امت میں کوئی اختلافی نہیں ہے۔ سب مانتے اور جانتے ہیں کہ نفع و نقصان پہنچانا اللہ کا کام ہے۔ یہ مسئلہ صرف ایک مسئلہ نہیں بلکہ ایک بنیادی عقیدہ ہے کہ کائنات کے اندر تصرف اور تدبیر کرنے والا صرف اکیلا خداوند عزیز ہے نہ تو اس کا کوئی شریک ہے اور نہ مشیر دوزیر ہے۔ وہ ہر لحاظ سے اس میں منفرد ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے مشرکین مکہ کے مشرکانہ کردار کی نقاب کشائی کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ان کا شرک یہ تھا کہ بعض بندوں کے بارے میں یہ خیال کرتے تھے کہ وہ کچھ مخصوص کام کر سکتے ہیں اور ان مشرکوں کا یہ خیال تھا کہ علی الاطلاق تو بادشاہ اللہ ہی ہے لیکن وہ اپنے بعض بندوں کو الوہیت کی خلعت سے مشرف کر دیتا ہے اور

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اپنے سے علم کی نفی کریں گے اور اپنے مخاطب کو آگاہ کریں گے کہ یہ سوال میرے سے نہیں فلاں سے ہونا چاہیے۔

یہی آلوسی زیرِ تشریح آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

قرآن کی ظاہر آیات یہی بتا رہی ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے وقت کا علم نہ تھا۔ ہاں آپ کو اجمالاً قیامت کا قریب ہونا معلوم تھا اور آپ نے قربِ قیامت کی احادیث میں اُمت کو خبر بھی دی ہے۔

ان تصریحات کی موجودگی میں یہ کہنا کہ آلوسی اپنے مخاطبوں کو یہ بتا رہے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو قیامت کے وقت کا علم تھا، یہ علم سے بہت بڑی ناانصافی ہے۔

اختیارِ مستقل اور علمِ محیط

۲۴۵۔ اے پیغمبر کہہ دو کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع اور نقصان پر کوئی قدرت نہیں رکھتا ہوں صرف وہی کچھ ہو کر رہتا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت سے فائدے اپنے لیے فراہم کر لیتا اور مجھے کبھی کوئی نقصان نہ پہنچتا، میں اس کے سوا کیا ہوں کہ ماننے والوں کے لیے بشیر و نذیر بن کر آیا ہوں۔ اس آیت میں بتلایا گیا ہے کہ کوئی بندہ خواہ کتنا ہی بڑا ہو نہ اپنے اندر اختیارِ مستقل رکھتا ہے نہ علمِ محیط۔ سیدالانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم جو علوم اولین وآخرین کے حامل اور خزائن ارضی کی کنجیوں کے امین بنائے گئے تھے اُن کو یہ اعلان کرنے کا حکم ہوا ہے کہ میں دوسروں کو کیا خود اپنی جان کو بھی کوئی نفع نہیں پہنچا سکتا نہ کسی نقصان سے بچا سکتا ہوں۔ مگر جس قدر اللہ چاہے اتنے ہی پر میرا قابو ہے۔ اور اگر میں غیب کی ہر بات جان لیا کرتا تو بہت سی وہ بھلائیاں اور کامیابیاں بھی حاصل کر لیتا جو علمِ غیب نہ ہونے کی وجہ سے کسی وقت فوت ہو جاتی ہیں نیز کبھی کوئی ناخوشگوار حالت مجھے درپیش نہ آتی۔ مثلاً افک کے واقعہ میں کتنے دنوں تک حضور کو وحی نہ آنے کی وجہ سے اضطراب وقلق رہا۔ حجۃ الوداع میں تو صاف ہی فرما دیا "اگر میں پہلے اس چیز کو جانتا جو بعد میں پیش آئی تو ہرگز ہدی کا جانور اپنے ساتھ نہ لاتا" اس قسم کے بیسیوں واقعات ہیں جن کی روک تھام علمِ محیط رکھنے کی صورت میں نہایت آسانی سے ممکن تھی۔ ان سب سے بڑھ کر عجیب تر واقعہ یہ ہے کہ حدیثِ جبرئیل کی بعض روایات میں آپ نے تصریحاً فرما دیا کہ یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے جبرئیل کو واپسی کے وقت تک نہیں پہچانا جب وہ اٹھ کر چلے گئے

ان کی رضا اور ناراضگی کو سب بندوں پر ترجیح دیتا ہے جس طرح ایک بڑی شان والا بادشاہ اپنے مخصوص غلاموں کو اطراف مملکت میں بھیجتا ہے اور ان کو جزوی معاملات میں تصرف کا اختیار دے دیتا ہے تاآنکہ بادشاہ سے اس کے خلاف کوئی حکم صادر ہو سو بادشاہ ان جزوی امور کی طرف متوجہ نہیں ہوتا اور سب لوگوں کے معاملات ان غلاموں کے سپرد کر دیتا ہے اور ان لوگوں کے بارے میں ان کی سفارش قبول کرتا ہے جو ان کی خدمت میں مشغول رہتے ہیں اور اس انداز سے ان کا توسل چاہتے ہیں۔

(الفوز الکبیر)

اسی ذہن نے تاریخ ادیان میں انبیاء، اولیاء اور صالحین کو مافوق الاسباب میں تصرف و اختیار کا مختار کل سمجھا ہے۔ اور اس مشرکانہ ذہن نے ہمیشہ عطائی کی آڑلی ہے۔ حضرت عیسٰی کے بارے میں عیسائیوں کا خیال ہے۔ یہ عطائی کا نظریہ عیسائیوں سے ماخوذ ہے جو پادریوں کی کارستانیوں سے انجیل کی زینت بنا ہوا ہے۔ انجیل متی میں ہے،

میرے باپ کی طرف سے سب کچھ مجھے سونپا گیا ہے

اور دوسرے مقام پر ہے:

یسوع نے پاس آکر ان سے باتیں کیں اور کہا کہ آسمان و زمین کا کل اختیار مجھے دیا گیا ہے۔ (انجیل متی)

اسی مشرکانہ ذہن کی اصلاح کے لیے اللہ سبحانہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ آپ منصب رسالت پر کھڑے ہو کر اپنے بارے میں صاف صاف کہہ دیجئے لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً الا ما شاء اللہ۔ اس میں استثنا منفصل ہے۔ اور بات کو کھول کر کہنے کی وجہ یہ ہے کہ پہلی امتوں میں گمراہی انبیاء کے بارے میں اسی قسم کے تصورات سے آئی تھی۔ اسی بنا پر علماء نے یہ بات کھول کر بیان کی ہے۔ حافظ ابن کثیر ایک موقعہ پر لکھتے ہیں،

وہی ضرر اور نفع کا مالک ہے اور وہی اپنی مخلوق میں جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ (ابن کثیر ج ۲)

ایک اور جگہ لکھتے ہیں:

سب ملک اور تصرف صرف اللہ تعالٰی ہی کے قبضہ قدرت میں ہے۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی ایک مقام پر ارشاد فرماتے ہیں،

اور یہ سب کچھ ایک فاعل کے فعل اور ایک مدبر کی تدبیر کا نتیجہ ہے اور وہ فاعل و مدبر اللہ تعالیٰ ہے۔ (فتوح الغیب ص ۱۵)

تصرف و اختیار کی چند صورتیں

اس موضوع پر اگر غور کیا جائے اور ہم اس کا پورا پورا تجزیہ کریں تو اللہ کے سوا مخلوق کے اختیار و تصرف کی چند صورتیں ہو سکتی ہیں۔

پہلی صورت یہ ہے کہ کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ جس طرح اللہ تبارک و تعالیٰ کو کائنات میں تصرف کی کن فیکونی قدرت از خود حاصل ہے اور وہ صرف اپنے ارادے اور مشیت سے بغیر اسباب و آلات کے جو چاہے کر سکتا ہے اور کرتا ہے اسی طرح تصرف کی یہ قدرت اللہ تعالیٰ کے سوا فلاں ہستی کو بھی از خود یعنی اللہ تعالیٰ کے عطا کیے بغیر حاصل ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ عقیدہ اس درجہ کا شرک ہے جو ابوجہل اور ابولہب وغیرہ مشرکین عرب میں بھی نہ تھا۔ یہ بات قرآن کی روشنی میں واضح ہے کہ مشرکین عرب اپنے معبودوں اور دیوتاؤں کو خدا تعالیٰ کی مخلوق اور مملوک سمجھتے تھے اور ان میں تصرف و اختیار کل کی جو صفات مانتے تھے ان کی خدا کی عطا کہتے تھے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ کسی نبی ولی، پیر یا شہید یا اللہ تعالیٰ کے سوا کسی بھی واقعی یا فرضی یا وہمی ہستی کے بارے میں یہ عقیدہ رکھا جائے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے ایسے پیارے، چہیتے اور مقرب ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے ان کو ایک درجہ میں کن فیکونی تصرف کی قدرت دے دی ہے۔ یعنی اب وہ صرف اپنے ارادہ و حکم سے تصرف کر سکتے ہیں۔ کسی کا کام بنا اور بگاڑ سکتے ہیں۔ ہماری حاجتیں پوری کر سکتے ہیں اور یہ ان کے اختیار میں ہے۔ یہ بعینہٖ وہ عقیدہ ہے جو مشرکین عرب اپنے معبودوں اور دیوتاؤں کے بارے میں رکھتے ہیں اور دُنیا کی اکثر قوموں میں یہی شرک رہا ہے اس سلسلے میں حضرت شاہ ولی اللہ نے اپنی کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں تفصیلی نوٹ لکھا ہے اور ابھی ابھی آپ الفوز الکبیر کا حوالہ پڑھ چکے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب نے اس کی بھی وضاحت کی ہے کہ مشرکین عرب اپنے معبودوں کے لیے اللہ تعالیٰ کا عطا کیا ہوا محدود اختیار اور تصرف کی محدود قدرت مانتے تھے لیکن عقیدہ رکھتے تھے کہ اس محدود دائرے میں وہ ارادے اور اختیار سے جو چاہیں کر سکتے ہیں اور کرتے ہیں۔ یہی ان کا شرک تھا۔ بہر حال اللہ تبارک و تعالیٰ کے سوا کسی ہستی کے لیے اس طرح کن فیکونی اختیار و تصرف کا عقیدہ رکھنا بلا شبہ شرک ہے، اگرچہ اس کو

خدا کی عطا سے ماننے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے ارشاد الطالبین میں اس موضوع پر مفید بات لکھی ہے۔

تیسری صورت تصرف کے عقیدے کی یہ ہے کہ کسی نبی ولی کے لیے پہلی اور دوسری صورت اختیاری کن فیکونی تصرف کی قدرت کا عقیدہ تو نہ رکھے لیکن یہ اعتقاد رکھے کہ خود اللہ تعالیٰ جب چاہتا ہے اپنی قدرت اور اپنے حکم سے بطور معجزہ نبی اور بطور کرامت ولی کے ہاتھ سے عالم کون میں تصرف کرا دیتا ہے۔ وہ تصرف اگرچہ ان کے ہاتھ سے ہوتا ہے لیکن دراصل وہ اللہ تعالیٰ کا فعل اور تصرف ہوتا ہے جو ان کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ان کا اس طرح کا اختیاری فعل نہیں ہوتا جس طرح ان کے دوسرے عام اختیاری افعال ہوتے ہیں۔ پھر بھی چونکہ وہ ان کے ہاتھ سے ظاہر ہوتا ہے اس لیے اس کی نسبت ان کی طرف کی جاتی ہے اور اس کو ان کا معجزہ اور ان کی کرامت کہا جاتا ہے تو یہ عقیدہ برحق ہے۔

اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور اولیائے کرام کے بارے میں یہ عقیدہ بھی برحق ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے مقبول اور مستجاب الدعوات بندے ہیں جب وہ کسی معاملہ میں قلب کی پوری توجہ اور الحاح کے ساتھ اللہ تعالیٰ سے دعا کریں تو اکثر ایسا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کی دعا قبول فرما لیتا ہے، اپنی کن فیکونی قدرت سے وہ کام کر دیتا ہے اگرچہ وہ کام اللہ تعالیٰ کا فعل اور تصرف ہوتا ہے لیکن چونکہ اس کا سبب اس مقبول بندے کی دعا ہوتی ہے اس لیے اس کام کی نسبت اس مقبول بندے کی طرف بھی کر دی جاتی ہے۔ بہرحال تصرف کی یہ دونوں صورتیں برحق ہیں۔

تصرف کی ایک صورت اور اس کا ایک درجہ وہ ہے جس کی صلاحیت اللہ تعالیٰ نے کم و بیش سب بندوں کو عطا فرمائی ہے اور وہ ہے خداداد قوت و صلاحیت سے اس عالم اسباب میں پیدا کیے ہوئے اسباب و آلات کے ذریعے یا جادو و مسمریزم جیسے کسی فن اور باطنی توجہ جیسے کسی عمل کے ذریعے اس عالم اشیاء میں تصرف کرنا۔ یہ تصرف جیسا کہ ہم سب کا تجربہ ہے ہم بندے اپنے ارادے اور اختیار سے اور اپنی خداداد قدرت سے کرتے ہیں اور یہ ہمارا فعل ہوتا ہے۔ ہم اس کے بارے میں مسئول اور اس کے گناہ یا ثواب کے مستحق ہوتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ تصرف کی اس چوتھی قسم کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔

نکتہ اختلاف کی تعیین

اس آیت قرآنی میں الا ما شاء اللہ کا استثناء ہے۔ یہ استثناء کون سا ہے منقطع یا متصل۔

شارحین قرآن کی اس موضوع پر آراء مختلف ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ استثناء متصل ہے اور مطلب یہ ہے کہ میں اپنی ذات کے لیے کسی نفع ونقصان کا مالک نہیں ہوں مگر اس نفع اور نقصان کا ضرور مالک ہوں جسے اللہ چاہے اور مجھے مالک بنا دے۔ اس کا واضح لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ اللہ کے چاہنے سے میں اپنے لیے نفع ونقصان کا مالک ہوں۔ اسی سے کچھ لوگوں نے یہ سمجھا ہے ،

" لا املک کے لفظوں سے اپنے اختیار کامل کی نفی فرما دی اور الا ماشاء اللہ سے اس غلط فہمی کا ازالہ کر دیا کہ کوئی نادان یہ نہ سمجھے کہ حضور کو نفع وضرر کا کوئی اختیار ہی نہیں۔ فرمایا مجھے اختیار ہے اور یہ اختیار اتنا ہی ہے جتنا میرے رب کریم نے مجھے عطا فرمایا۔ اب رہی یہ بات کہ کونسا عطا فرمایا ہے تو انسانی عقل کا کوئی پیمانہ اور کوئی اندازہ اس کا احاطہ نہیں کر سکتا۔

اور اس کے نتیجے میں ان کا یہ خیال ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تکوینی اور تشریعی احکام اللہ تعالیٰ کی طرف سے سپرد کر دیے گئے ہیں اس لیے آپ جہان میں تصرف کرنے رزق تقسیم کرنے اور نفع وضرر دینے کے مجاز ہیں۔ "

ظاہر ہے کہ یہ بے بنیاد عقیدہ روح اسلام کے سراسر خلاف ہے اور عیسائیت کی ہو بہو نقل ہے اور توحید پر ضرب کاری ہے۔ شارحین قرآن نے جو استثناء کو متصل بتایا ہے ان کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے جو ان بزرگوں نے سمجھا ہے بلکہ اصل میں وہ تو یہ بتا رہے ہیں کہ ہر مخلوق میں اصل میں عجز ذاتی ہے۔ بندہ کسی چیز میں یہاں مستقل نہیں ہے نہ وہ بالذات کسی چیز کا مالک ہے بلکہ اس کو جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی کردار وعمل حاصل ہے اللہ کی مشیت سے ہے۔ اسی لیے یہاں علماء نے یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ بندہ کی قدرت اللہ کے حکم اور مشیت سے مؤثر ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ خدا کی مشیت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی نہیں ہل سکتا۔ لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ انسان کو دوسری مخلوقات کے مقابلے میں کسی نہ کسی طرح کا اختیار دیا گیا ہے یعنی خدا کی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور ناقابل رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار، خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادے کے مطابق کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی ہے۔ خدا جب چاہے انسان سے اپنے دیے ہوئے اختیار اور بخشی ہوئی قدرت کو چھین لے۔ علماء نے تصریح کی ہے کہ اگر امور تمام تر اللہ کی مشیت پر موقوف نہ ہوتے اور ہمارے افعال کی اس پر

تعلیق نہ ہوتی تو انشاءاللہ کا استثنا صحیح نہ ہوتا۔ آیت کا مفاد تو صرف یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہو رہا ہے کہ اعلان کردو کہ میں اپنے لیے نفع و نقصان کا مالک و مختار نہیں، جو کچھ اللہ کو منظور ہوتا ہے وہی ہوتا ہے۔ فی الواقع اور ما فوق الاسباب سے نفع اور نقصان پہنچانا صرف اللہ جل مجدہٗ کا خاصہ اور شان ہے۔ استثنا کے متصل ہونے سے یہ بات خبر نہیں کہاں سے سمجھ لی ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ما فوق الاسباب میں مختارِ کل ہیں، شرح قرآن کا یہ انداز قطعاً علمی نہیں ہو سکتا جس سے یہ آیتِ قرآنی اپنے مطالب کے اعتبار سے قرآن کے دوسرے بیانات سے متصادم ہو کر رہ جائے۔

اللہ تعالیٰ انسان کو مخاطب کر کے کہتا ہے:

ان یمسسك اللہ بضر فلا کاشف لہ الا ھو وان یمسسك بخیر فھو علی کل شیء قدیر

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے کھول کر بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ کے بغیر نہ تو کوئی نقصان پہنچا سکتا ہے اور نہ نفع بس کچھ محض اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہوتا ہے۔

چونکہ مشرکین عموماً اس خیال سے کہ فلاں سے مجھے ضرر پہنچے گا یا نفع اس کو اس عقیدے کے مطابق پکارتے تھے اس لئے اللہ تعالیٰ نے اس کی بھی صاف ممانعت کر دی۔

ولا تدع من دون اللہ ما لا ینفعك ولا یضرك۔

اس میں کوئی استثنا نہیں ہے نہ انبیا کا اور نہ اولیا کا، پوری قوت سے یہ بات بتائی گئی ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ورے اور اس کے سوا کسی کو پکارنا صحیح نہیں خواہ وہ حضرت ابراہیم ہوں یا کوئی اور۔ اگر کسی نے غیراللہ کو اس خیال سے پکارا کہ وہ میری تکلیف دور کر سکتا ہے یا مجھے کچھ دے سکتا ہے تو ایسا شخص قرآن کے نقطۂ نظر سے ظالم ہوگا کیونکہ اس نے اللہ کا حق غیر کو دیا۔

حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ میں ایک بار رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ سوار تھا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا اے پیارے اللہ کے حقوق کی پابندی کرو۔ اللہ تعالیٰ تمہاری حفاظت فرمائے گا جب بھی سوال کرنا ہو، تو اللہ تعالیٰ ہی سے کرو۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے تمہارے لیے دکھ مقصود ہے تو تمام کائنات مل کر بھی اس کو ٹال نہیں سکتی۔ اور اگر تیرے لیے آرام مقدر ہے تو تمام کائنات جمع ہو کر اس کو روک نہیں سکتی۔ قلم تقدیر

تیرے لیے جو کچھ لکھ چکا ہے وہی ہو گا اور تقدیر کے رجسٹر بھی خشک ہو چکے ہیں۔ امام ترمذی نے یہ حدیث روایت کی ہے اس سے بھی معلوم ہو رہا ہے کہ نافع اور ضار اللہ تعالیٰ کے بغیر اور کوئی نہیں۔ وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے اور کسی کا اس میں کوئی دخل نہیں۔ اگر الا ما شآء اللہ کا وہی مطلب ہوتا جو یہ بزرگ بتاتے ہیں تو حضور انورؐ اس موقعہ پر ضرور بتلاتے کہ مجھے پکار لینا میں اللہ کی عطائی قوت سے تمہارا کام کر دوں گا مگر دنیا جانتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ نہیں فرمایا۔ حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی اس حدیث کو نقل کر کے لکھتے ہیں۔

ہر مومن کو چاہیے کہ اس حدیث کو اپنے ظاہر و باطن اور کردار کا آئینہ بنالے۔ (فتوح الغیب)

ملا علی قاری اس حدیث کی شرح میں لکھتے ہیں:

اللہ تعالیٰ کے بغیر کسی سے مافوق الاسباب طور پر سوال نہ کرے کیونکہ غیر نہ تو دینے پر قادر ہے اور نہ منع کرنے پر اور نہ دفع ضرر پر اور نہ جلب نفع پر۔ کیونکہ وہ تو اپنی جان کے نفع اور ضرر کے مالک نہیں ہیں اور نہ موت و حیات اور دوبارہ زندگی ان کے اختیار میں ہے۔ (مرقات ج ۲)

قرآن عزیز نے اس بات کو صاف اور غیر مبہم الفاظ میں بیان کیا ہے کہ بے کس و بے بس مجبور اور لاچار کی آہ و پکار اور فریاد کو سننے والی ذات اور اس کی تکلیف کو رفع کرنے والی ذات صرف اللہ ہی کی ہے۔

امن یجیب المضطر ویکشف السوء ۔۔۔ االٰہ مع اللہ

کون ہے وہ ذات جو بے کس و بے بس کی آہ و پکار سنتی ہے اور اس کی تکلیف کو دور کرتی ہے ۔۔۔ کیا اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی الٰہ ہے۔

اس سے بھی صاف معلوم ہو رہا ہے کہ بے کس کی پکار سننا اور پھر اس کی تکلیف کو دور کرنا صرف اللہ کا کام ہے۔ جو لوگ الا ما شآء اللہ میں معنوی تحریف کر کے انبیاء اور اولیاء سے یہ حسن ظن رکھتے ہیں کہ وہ بھی تکلیف دور کر سکتے ہیں اور اس حسن ظن کی بنا پر ان کو دور دور سے پکارتے ہیں یا ان کی قبروں پر جا کر قریب سے کہتے ہیں تو وہ ان کو الٰہ بناتے ہیں اور یہی وہ بات ہے جس کی نفی روز اول ہی سے اسلام کرتا ہے لا الٰہ الا اللہ۔

بہر حال آیت میں الا ما شآء اللہ کا ہرگز وہ مطلب نہیں ہے جو یہ بزرگ استثنا سے

متصل کی اُڑے کہ اس کا بتائیے ہیں۔
ہمارے نزدیک آیت میں استثنائے متصل نہیں بلکہ منقطع ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ منصبِ نبوت کی وجہ سے میں اپنے لیے کسی نفع اور نقصان کا مالک نہیں ہوں۔ یہ تو منطوق ہے اور مفہوم کے لحاظ سے میں دوسرے کے لیے بھی مالک نہیں ہوں ان تمام کاموں میں جن میں تبقضائے بشریت سارے انسان عاجز ہوتے ہیں لیکن اللہ ہی جو چاہتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ گویا آیتِ قرآنی کا صاف اور بے غبار مطلب یہ ہے کہ میں اپنے لیے کسی نفع و نقصان کا مالک نہیں جو کچھ اللہ کو منظور ہوتا ہے وہ ہی ہوتا ہے۔
اس کے بعد اللہ سبحانہ نے فرمایا کہ اے پیغمبر یہ بھی فرما دیجئے کہ میں اپنی ذات کے لیے نفع و نقصان کا مالک کیسے ہو سکتا ہوں۔ اگر مجھے غیب کا علم ہوتا تو میں بہت منافع حاصل کر لیتا اور بہت زیادہ مال و دولت جمع کر لیتا اور مجھ کو کبھی کوئی تکلیف نہ ہوتی، نہ کبھی کوئی نقصان پہنچتا۔ یہ بات اس سوال کے جواب میں فرمائی ہے جیسا کہ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ مکہ والوں نے حضور انور سے یہ سوال کیا کہ اے محمد، کیا تمہارا پروردگار گرانی سے پہلے بازار میں نرخ کی ارزانی کی خبر نہیں دیتا ہے تا کہ آپ اسی ارزانی کے زمانہ میں خرید لیں اور گرانی کے وقت میں بیچ کر خاطر خواہ نفع حاصل کر لیں۔ اور کیا آپ کا رب آپ کو یہ بھی نہیں بتلاتا کہ فلاں ملک میں قحط ہونے والا ہے تا کہ وہاں سے کسی شاداب جگہ چلے جائیں۔ مکہ والوں کی جانب سے یہ سوال ہوا تو اسی کے جواب میں یہ آیت کریمہ نازل ہوئی۔
گویا اس آیت کریمہ میں عدم استکثارِ خیر اور مسِ سوء کو شاہد بنایا گیا ہے۔ عدم علم غیب پر اب صرف یہ چیز قابلِ غور ہے کہ یہاں خیر اور سوء سے کون سی بھلائی اور برائی مراد ہے اور غیب سے کون سا غیب مراد ہے اور پھر کس قسم کے علم کی نفی مراد ہے۔ ان تینوں چیزوں کی تنقیح کے بعد مطالب آیت کا مطلع بالکل صاف ہو جائے گا۔
کچھ لوگوں نے خیر اور سوء سے آخرت کی برائی اور بھلائی مراد لی ہے لیکن یہ کسی طرح درست نہیں ہے کیونکہ یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ آخرت کی بھلائیاں اور نیکیاں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے بھرپور حاصل کی ہیں اور آخرت کی برائیوں سے آپ بالکل مبرا ہیں۔ اسی لیے محققین نے اس کو رد کر دیا ہے۔ راجح یہی ہے کہ یہاں خیر و سوء سے دنیاوی نفع و نقصان مراد ہے۔ اور اسی کے متعلق اہلِ مکہ کا سوال تھا۔

ہمیں یہاں ابوحیان اندلسی کی یہ بات بے حد پسند آئی کہ اس فقرے کا مطلب پوری آیت سے الگ کر کے متعین نہ کرنا چاہیے بلکہ پوری آیت کو پیش نظر رکھ کر بات کی تہ تک پہنچنا چاہیے۔ آغاز آیت میں لا املک لنفسی نفعاً ولا ضراً آیا ہے۔ یہاں لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء آیا ہے۔ خیر نفع کے اور سوء ضر کے مقابلے میں آیا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر میں مختار کل اور دانائے غیب ہوتا تو نفع کی حد تک میں بے حد دنیوی منافع فراہم کر لیتا اور نقصان کی حد تک مجھے زندگی میں کوئی تکلیف ہی نہ ہوتی۔ آیت کے پہلے حصہ سے نظر ہٹا کر اگر اس فقرے کو مطلب کا جامہ پہنایا جائے تو آیت کی مراد آپ صحیح نہ سمجھ سکیں گے اور آپ یہ خدشہ محسوس کریں گے۔

اگر یہاں علم غیب سے مراد علم ذاتی جو قدرت ذاتی کو مستلزم ہے نہ لیا جائے تو یہ سبب نہیں بن سکتا کیونکہ علم خیر کثیر جمع کر لینے اور دفع ضرر کو دُور کرنے کا سبب نہیں ہوا کرتا۔

یہ خدشہ اسی لیے ذہن میں اُبھرا ہے کہ آیت میں فقرہ ولو کنت اعلم الغیب پہلے حصہ سے علیٰحدہ کر کے مطلب پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ اگر پوری آیت کا منطوق پیش نظر ہوتا کہ لوگو! اگر میں مختار کل اور دانائے غیب ہوتا تو نفع کی حد تک اپنے لیے استکثار خیر اور ضرر کی حد تک ہر قسم کے نقصان سے محفوظ ہوتا۔ مگر تم دیکھ رہے ہو کہ ایسا نہیں ہے۔ باقی ذاتی وغیرہ کی یہاں بحث بالکل بے محل ہے جس کا وجود بھی ذاتی نہیں ہے۔ اس کی ذاتی صفات رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا ہے۔

ہاں یہ بات تنقیح طلب ہے کہ غیب سے کیا مراد ہے تو اس میں تین احتمال ہیں ایک یہ کہ مطلق غیب مراد ہو۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ اگر مجھے غیب کی کسی بات کی خبر بھی ہوتی تو میں بہت کچھ منافع حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ ہوتی اور نہ کبھی کوئی نقصان پہنچتا۔ ظاہر ہے کہ یہ بات صحیح نہیں ہے کیونکہ اگر کسی شخص کو غیب کی بہت سی باتیں معلوم بھی ہو جائیں لیکن وہ ایسی نہ ہوں جن کا دُنیوی لیکن وہ ایسی منافع اور مضار سے کوئی خاص تعلق ہو

نہ ہوں جن کا دُنیوی منافع اور مضار سے کوئی خاص تعلق ہو تو صرف ان کے معلوم ہو جانے سے وہ شخص دُنیوی منافع کی تحصیل اور مضرات سے اجتناب میں کامیاب نہیں

ہو سکتا مثلاً ہر مسلمان کو اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول علیہ السلام کے ذریعے سے جنت کا علم ہے ۔ جنت کی بہت سی نعمتوں اور دوزخ کی بہت سی تکالیف کی خبر ہے اور یہ سب چیزیں عالم غیب کی ہیں ۔ لیکن صرف ان کے معلوم ہو جانے سے کوئی شخص دنیوی منافع کی تحصیل اور دنیوی مضرات سے بچنے میں کامیاب نہیں ہو سکتا ۔ کیونکہ ان امور کا دنیوی نفع و نقصان سے کوئی خاص تعلق بھی نہیں ہے ۔ بہر حال یہ بات بالکل بدیہی اور کھلی ہے کہ مطلق غیب کا علم میں اچھائی کو سمیٹنے اور برائی سے بچنے کی کوئی ضمانت نہیں ہے ۔

اس لیے اس آیت میں لفظ غیب سے مطلق غیب تو مراد ہو نہیں سکتا اور پھر کچھ غیوب کی اطلاع تو لازماً انبیا علیہم السلام کو شروع ہی سے ہوتی ہے مثلاً اللہ تعالیٰ کی صفات اور اس کے احکام اس لیے بھی مطلق غیب کے علم کی نفی انبیا کسی وقت بھی نہیں فرما سکتے ۔ ان وجوہ سے آیت میں غیب سے مطلق غیب کی نفی مراد نہیں ہو سکتی ۔

دوسرا احتمال یہ ہے کہ الف لام کو استغراق حقیقی کے لیے مانا جائے اور غیب سے سارے ہی غیر متناہی غیوب مراد ہوں ۔ اس صورت میں آیت کا مطلب یہ ہو گا کہ ' اگر مجھے تمام غیوب غیر متناہیہ کا بالاستیعاب علم ہوتا تو میں بہت سے دنیوی منافع حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی نقصان نہ پہنچتا ۔

لیکن یہ بات معلوم ہے کہ دنیوی فوائد کی فراہمی اور نقصانوں سے حفاظت تمام غیوب کے علم محیط پر موقوف نہیں ہے بلکہ اس کے لیے ان غیب کی باتوں کو جاننے کی ضرورت ہے جو عادۃً اس کے لیے سبب بن سکتے ہوں ۔ اور پھر یہ کہ اہل مکہ کا سوال سارے غیوب کے متعلق نہیں تھا کہ آپ اس موقعہ پر اس کو دلیل بنا کر پیش کریں جیسا کہ حرف لَو کا تقاضا ہے ۔

ان وجوہ سے اس آیت کریمہ میں لفظ غیب سے نہ مطلق غیب مراد ہو سکتا ہے اور نہ سارے غیوب بلکہ اس سے مراد خاص اس قسم کے غیب مراد ہیں جن سے عالم اسباب میں دنیوی منافع اور نقصانات وابستہ ہیں اور ان ہی کے بارے میں اہل مکہ کا سوال ہی تھا یہ درست ہے کہ بطور نتیجہ اس صورت میں کل غیوب کے علم محیط کی بھی نفی ہو جائے گی ۔

تیسری تنقیح طلب چیز یہ ہے کہ یہاں کس قسم کے علم کی نفی کی گئی ہے آیا ذاتی کی یا عطائی کی ۔ بعض حضرات اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہاں صرف

علم ذاتی کی نفی مقصود ہے اور آیت کا مطلب یہ ہے ۔
اگر مجھے ذاتی علم غیب ہوتا اور میں بلا خدا کے بتلائے غیب کی بات کو جان لیتا
تو بہت زیادہ منافع حاصل کر لیتا اور مجھے کوئی تکلیف نہ پہنچتی ۔
لیکن یہ تاویل شرح قرآن میں اس قدر مہمل اور بے معنی ہے کہ اس کی تردید کی بھی حاجت نہیں ہے ۔

اوّل تو جن اہل مکہ کے جواب میں یہ آیت نازل ہوئی ہے ان کا سوال خود علم ذاتی کے بارے میں نہ تھا بلکہ عطائی کے متعلق تھا ۔ انہوں نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ دریافت کیا تھا ۔

کیا آپ کا پروردگار آپ کو گرانی سے پہلے ارزانی کی خبر نہیں دیتا ۔ کیا آپ کو زمین میں قحط ہونے سے پہلے اس کی اطلاع نہیں ہو جاتی تاکہ آپ اس پر عمل کر کے نفع حاصل کر سکیں اور نقصانات سے بچ جایا کریں ۔

ظاہر ہے کہ یہ سوال اب سے علم عطائی کے بارے میں تھا ۔ اس کے جواب میں یہ کہنا کہ مجھ کو ذاتی علم ہوتا تو میں خیر کثیر جمع کر لیتا ۔ سوال از آسمان جواب از ریسمان کا مصداق ہے جس قرآن اور صاحبِ قرآن یقیناً پاک ہیں اور پھر ان مشرکین کو جب حضور کے ذاتی علم کے بارے میں کوئی شبہ ہی نہ تھا اور آپ نے کبھی ان کے سامنے علم ذاتی کا دعویٰ بھی نہیں کیا تھا ۔ آپ کا دعویٰ نبی ہونے کا تھا اور نبی کا سارا علم عطائی ہوتا ہے ۔ ان کا سوال بھی اسی علم عطائی کے بارے میں تھا ۔ ایسی حالت میں اصل سوال کے جواب میں خاموشی اختیار کرنا اور اپنی ذات سے علم ذاتی کی نفی کرنا بالکل بے محل اور بے جوڑ بات ہے ۔

دوسرے یہ کہ دُنیا کی زندگی میں منافع کی فراہمی اور نقصان سے بچنے کے لیے عالم اسباب میں صرف منفعت و مضرت کے اسباب کا معلوم ہونا ضروری ہے نہ کہ معلوم بہ علم ذاتی ہونا ۔ ایک سلیم الطبع اور صاحبِ عقل کو زہر کی مضرت سے بچنے کے لیے اتنا کافی ہے کہ اس کو یہ بات معلوم ہو کہ یہ زہر ہے اور اس کے کھانے کا نتیجہ ہلاکت ہے ۔ علیٰ ہٰذا جو شہد کے منافع حاصل کرنا چاہے اس کو صرف یہ معلوم کرنے کی ضرورت ہے کہ یہ شہد ہے اور اس کے منافع یہ ہیں ، اتنا معلوم ہو جانے کے بعد اگر وہ چاہے تو بتوفیقِ الٰہی شہد کھا کر نفع حاصل کر سکے گا اور زہر سے بچ سکے گا ۔ بہر حال اس کے لیے منافع اور مضرات

کا علم ذاتی ضروری نہیں بلکہ مطلق علم اس باب میں اس کی رہنمائی کرسکتا ہے لہٰذا یہ کہنا کہ اس آیت میں علم ذاتی مراد ہے محض مغالطہ یا مغالطہ ہے۔

بہرحال اس آیت میں صرف ذاتی کی نفی نہیں کی گئی بلکہ ان غیوب کے مطلق علم کی نفی مقصود ہے۔ اب آیت کا واضح اور صاف مطلب یہ ہے کہ

اے رسول آپ سے جو اہل مکہ یہ سوال کر رہے ہیں کہ کیا تمہارا پروردگار قحط اور گرانی کی خبر پہلے سے تمہیں نہیں دیتا کہ تم اس پر عمل کرکے خاطر خواہ منافع حاصل کرسکو اور نقصان سے بچ سکو۔ آپ فرما دیجئے کہ اگر مجھے ان تمام غیوب کی خبر ہوتی تو میں زیادہ منافع حاصل کرلیتا اور مجھے کبھی تکلیف نہ ہوتی۔ میرا کام جس پر میرے خدا نے مجھے لگایا ہے بس یہی کہ لوگوں کو اعمال نیک کے نتائج کی خوشخبری دوں اور اعمال بد کے نتائج سے آگاہ کروں۔ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے مجھے ان تمام باتوں کے معلوم ہونے کی ضرورت نہیں کہ غلہ کب ارزاں ہوتا ہے اور کب گراں ہوگا اور خشکی کب اور کہاں ہوگی۔ ان امور کا فرائض نبوت سے کوئی خاص تعلق نہیں۔ اس طرح یہاں قرآن نے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور ان باتوں میں کوئی تلازم نہیں۔ غیب کی خبریں، پیشین گوئیاں کرنا اور اس قسم کے دوسرے آثار و دلائل اصل نبوت سے خارج ہیں۔ نبوت کے اصل لوازم وحی، مخاطبۂ الٰہی تزکیہ، انذار و تبشیر، تعلیم اور ہدایت ہیں۔

آیت کا مطلب یہی ہے۔ اسی کو شارحین قرآن نے مختلف الفاظ اور عبارات میں ادا کیا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں،

اگر میں غیب کو جانتا تو بہت خیر کثیر جمع کرلیتا۔ یعنی اگر ایسا ہوتا تو جب کوئی چیز بغرض تجارت خریدتا تو مجھے انجام کا پتہ ہوجاتا اور ہر معاملہ میں مجھ کو نفع ہی ہوا کرتا اور نہ ناداری میرے پاس بھی نہ آتی۔ (تفسیر ابن کثیر)

اور کچھ تابعین نے اسی بات کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

اگر میں غیب کو جانتا ہوتا تو قحط کے سال کے لیے شادابی کے سال سے اور گرانی کے زمانہ کے لیے ارزانی کے موسم سے سامان تیار کرلیتا۔ (تفسیر ابن کثیر)

امام بغوی نے بھی معالم التنزیل میں قریب قریب یہی لکھا ہے:

اگر میں شادابی اور قحط کے زمانے کو جانتا تو قحط کے سال کے لیے بہت سا
مال و متاع پہلے سے جوڑ لیا کرتا اور مجھے تکلیف نہ ہوتی اور ناداری میرے پاس
نہ آتی۔ (معالم التنزیل)

علامہ خازن اور قاضی بیضاوی نے بھی اپنی تفاسیر میں اسی تشریح کو اولیت کا درجہ دیا ہے اور علامہ ابوالسعود نے اسی مضمون کو بڑی تفصیل سے لکھا ہے۔ آخر میں فرماتے ہیں:

میں تو اللہ کا ایک بندہ ہوں جو ہشیار کرنے اور بشارت سنانے کے
لیے بھیجا گیا ہوں۔ میرا کام ان دینی اور دُنیوی علوم کو حاصل کرنا ہے جن کو انذار و
تبشیر سے کوئی تعلق ہو۔ باقی غیب کی وہ باتیں جن کو احکام و شرائع سے کوئی
تعلق نہیں ان کو معلوم کرنا میری شان نہیں ہے۔ (تفسیر ابوالسعود)

شارحینِ قرآن کے ان تشریحی نوٹوں کا بنظرِ غائر مطالعہ فرمائیے۔ سب کا حاصل اور خلاصہ یہی ہے کہ حضورِ انور صلی اللہ علیہ وسلم غیب داں نہیں ہیں اور غیب دانی لازمہ نبوت نہیں ہے۔

قرآن کے مخاطبوں میں نبوت کے بارے میں یہ غلط فہمی تھی کہ نبی کے لیے ضروری ہے کہ وہ براہِ راست عالم کائنات کے تصرف پر قادر ہو۔ اور چونکہ تصرف علم کے بغیر ہو نہیں سکتا اس لیے ضروری ہے کہ وہ دانائے غیب ہو۔ چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات کو جس طریقہ سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسیٰ کے قبضہ و قدرت میں تھی اور وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کرتے تھے۔ اور قدرت کا تصور چونکہ علم کے بغیر ممکن نہیں اس لیے وہ حضرت عیسیٰ کو دانائے غیب مانتے تھے۔ یہی وہ بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے دینِ حق کی دیوارِ کج کھڑی کی اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن عزیز نے نہایت شدت اور اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ اللہ کا رسول دانائے غیب اور کائنات میں تصرف کا مالک نہیں۔ امام رازی نے اس آیت سے یہی بات سمجھی ہے فرماتے ہیں:

خوب سمجھ لو جب مخاطبوں نے غیوب کی خبریں بتانے اور اموالِ کثیرہ
دینے کا مطالبہ کیا تو اللہ سبحانہ نے بتا دیا کہ آپ کی قدرت اور آپ کا دونوں

محدود ہیں اور بتایا کہ جو شخص بندگی کا شرف سے مالا مال ہوگا اس کی شان بھی ہوگی، قدرتِ کاملہ اور علمِ محیط صرف اللہ سبحانہٗ کا خاصہ ہے۔ بندہ کو یہ قدرت اور یہ علم کیسے ہو سکتا ہے۔ (تفسیر کبیر)

اسی بنا پر اسلامی عقائد میں یہ بات بالکل واضح اور بے غبار حقیقت کے طور پر اہل السنۃ والجماعۃ نے پیش کی ہے کہ غیب کا علم خدا کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ خود قرآن نے بار بار حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کی ہدایت کی ہے۔ اور اہل السنۃ میں اس موضوع پر بھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ میں بالارادہ لفظ اہل السنۃ بول رہا ہوں کیونکہ اہل تشیع اس کے قائل ہیں کہ انبیاء اور ائمہ غیب داں ہوتے ہیں اور ان کو علم ما کان و ما یکون حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ ابو جعفر محمد بن یعقوب ابن اسحاق الکلینی الرازی نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب الاصول من الکافی میں ایک عنوان قائم کیا ہے۔

ان الائمۃ علیہم السلام یعلمون علم ما کان وما یکون وانہ لا یخفی علیہم الشیئ صلوات اللہ علیہم

ائمہ علیہم السلام ما کان و ما یکون یعنی جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ ہونے والا ہے اس کا علم رکھتے ہیں اور ان سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔

یہ عنوان قائم کرنے کے بعد سب سے پہلے سیف تمّار کے حوالہ سے یہ واقعہ نقل کیا ہے۔ سیف تمّار کہتے ہیں کہ ہم شیعہ کی جماعت ابو عبداللہ کے پاس خانہ کعبہ میں مقام حجر میں بیٹھے تھے۔ ابو عبداللہ نے فرمایا کہ ہماری کوئی جاسوس کر رہا ہے۔ ہم نے دائیں بائیں دیکھا۔ ہمیں کوئی جاسوس نظر نہیں آیا۔ ہم نے بتایا کہ حضرت یہاں کوئی جاسوس نہیں ہے۔ ابو عبداللہ نے کہا، رب کعبہ کی قسم اور اس عمارت کی قسم۔ تین بار قسم کھا کر فرمایا کہ اگر میں حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کے درمیان موجود ہوتا تو میں ان کو بتاتا کہ میں ان دونوں سے عالم ہوں اور ان کو وہ باتیں بتاتا جن کا ان کو پتہ نہیں ہے۔ کیونکہ حضرت موسیٰ اور حضرت خضر کو علم ما کان حاصل تھا یعنی جو کچھ ہو چکا ہے اس کو علم تھا لیکن علم ما یکون یعنی ہونے والا ہے اس کا ان کو علم نہ تھا اور ہمیں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے علم ما کان و ما یکون وراثت میں ملا ہے [1]

[1] الاصول من الکافی ج ۱

اسی کتاب میں یہ بھی لکھا ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو معراج کی رات میں ماکان
ومایکون کا علم مرحمت ہوا تھا۔

جب حضور انور ؐ کو معراج میں لے جایا گیا تو آپ اُس وقت تک نیچے
نہیں آئے جب تک اللہ تعالیٰ نے آپ کو تمام ماکان ومایکون کا علم عطا فرمایا۔

اور اسی کتاب کی شرح میں علامہ خلیل قزوینی مشہور عالم لکھتے ہیں:

بلا شبہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو جب معراج میں لے جایا گیا مسجد
حرام سے مسجد اقصیٰ اور وہاں سے آسمانوں پر۔ آپ وہاں سے اس وقت تک
نیچے تشریف نہیں لائے جب تک اللہ تعالیٰ نے وہ سب کچھ نہیں بتادیا جو
کچھ ہوچکا ہے اور جو کچھ ہوگا۔[1]

اس موضوع پر آپ عیسائیوں اور شیعوں کا مذہب سُن چکے ہیں۔ آئیے اب اہل السنۃ
والجماعۃ کا مذہب سُن لیجئے۔ اہل السنہ کا علمی سرمایہ چار سو پھیلا ہوا ہے۔ علم کلام، علم
فقہ، علم تفسیر، علم شرح الحدیث اور علم التصوف۔ ہم سب سے پہلے علم کلام کو لیتے
ہیں۔ علم کلام میں ہمارے پیش نظر قاضی بیضاوی کی مطالع الانظار شرح طوالع الانوار،
علامہ قاضی عضد الدین عبدالرحمٰن ابن احمد الایجی حنفی ۵۶ھ کی مواقف اور علامہ
میر سید شریف علی بن محمد الجرجانی حنفی ۸۱۶ھ کی شرح المواقف، سید الفلاسفہ امام
محمد بن محمد الغزالی الشافعی ۵۰۵ھ کی تہافت الفلاسفہ، علامہ ابن رشد الاندلسی المالکی
۵۹۵ھ کی تہافت الفلاسفہ، علامہ خواجہ زادہ ۸۹۳ھ کی تہافت الفلاسفہ اور امام فخر الدین
رازی ۶۰۶ھ کی مناظرات رازی ہیں، قاضی بیضاوی فرماتے ہیں۔

فلاسفہ کا مذہب یہ ہے کہ نبی تین صفات سے مختص ہوتا ہے۔ پہلی یہ
کہ وہ اپنے جوہر نفس کی صفائی اور مبادی عالیہ کے ساتھ شدت کی وجہ سے بغیر
کسی سابق کسب اور تعلیم وتعلم کے غیب پر مطلع ہوتا ہے مگر اس پر اعتراض
ہوا کہ فلاسفہ کی اطلاع علی الغیب سے کیا مراد ہے، اگر ان کی مراد یہ ہے کہ
نبی تمام مغیبات پر مطلع ہوتا ہے تو فریقین کا اس پر اتفاق ہے کہ نبی ہونے

---

[1] الصافی حصہ اوّل

کے لیے تمام غیوب پر مطلع ہونا ہرگز شرط نہیں ہے اور اگر ان کا مطلب یہ ہے کہ نبی کچھ مغیبات پر مطلع ہوتا ہے تو یہ نبی کی خصوصیت نہیں ہے کیونکہ یہ دوسروں کے لیے بھی ممکن ہے۔ نیز جب کل نفوس بشریہ بلحاظ نوع متحد ہیں تو ان کی حقیقت صفائی اور کدورت کی وجہ سے مختلف نہیں ہو سکتی۔ لہٰذا جو چیز کچھ کے لیے جائز ہے وہی دوسرے کچھ کے لیے ممکن ہے۔ پس بعض مغیبات پر اطلاع نبی کی خصوصیت نہ رہی۔

(مطالع الانظار شرح طوالع الانوار)

علامہ عضد الدین عبد الرحمٰن ابن احمد الایجی مواقف میں اور علامہ سید شریف علی بن محمد الجرجانی شرح مواقف میں اپنی فلاسفہ میں اس باطل نظریہ کی تردید کرتے ہوئے رقمطراز ہیں

ہم کہتے ہیں کہ جو کچھ تم کہتے ہو وہ چند وجوہ غلط ہے کیونکہ تمام مغیبات پر نبی کا مطلع ہونا واجب نہیں ہے اس پر ہمارا اور تمہارا اتفاق ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ سید الانبیاء نے فرمایا ہے' اور اگر میں غیب جانتا تو بہت سی بھلائی جمع کر لیتا اور مجھ کو کوئی تکلیف نہ پہنچتی اور بعض مغیبات پر نبی کا مطلع ہونا نبی کے ساتھ خاص نہیں ہے جیسا کہ تم بھی مانتے ہو کہ ریاضت والے، بیمار اور سونے والے بھی بعض مغیبات پر مطلع ہو جاتے ہیں لہٰذا نبی میں اس بنیاد پر کوئی امتیاز نہ ہو گا۔

یہ تینوں اکابر مدرسہ اہل السنہ والجماعۃ کے وکیل صرف محقق' عالم' محدث اور مفسر نہیں بلکہ علم کلام کے بلا مقابلہ امام تسلیم کیے جاتے ہیں۔ میری مراد قاضی بیضاوی، علامہ عضد الدین، اور سید شریف علی سے ہے۔ یہ تینوں اس امر کی تصریح کر رہے ہیں کہ تمام مغیبات پر مطلع ہونا نبی کے منصب میں داخل نہیں ہے۔ اور نبی وہ نہیں ہے جو اپنے نفس کی صفائی کی بنا پر مغیبات پر مطلع ہو بلکہ نبی وہ ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آئے۔

خوب سمجھ لیجئے کہ غیب دان ہونے اور غیب پر بذریعہ وحی مطلع ہونے میں جوہری فرق ہے۔ فلاسفہ کا موقف پہلا ہے جب کہ اہل السنہ والجماعۃ کا موقف دوسرا ہے غیب دان کے لیے عالم الغیب بول سکتے ہیں، کیونکہ اس کا علم خود بخود ہوتا ہے لیکن وحی کے ذریعے آمدہ علم کے حامل کو غیب دان نہیں کہہ سکتے۔ صاحب کشاف نے

لکھا ہے کہ الغیب سے مراد وہ علم ہے جس تک رسائی بغیر وسائل قرائن اور دلائل کے خود بخود ہو۔ اور یہ اللہ کے سوا کسی کا علم نہیں ہے۔ علامہ زمخشری کے اپنے الفاظ یہ ہیں،

المراد به الخفي الذي لا ينفذ فيه ابتداء الا علم اللطيف الخبير۔

غیب سے مراد وہ پوشیدہ ہے جس کی طرف رسائی ابتداء صرف اللہ کی ہے۔

اس کے بعد لکھا ہے کہ اس علم تک ہماری رسائی صرف اللہ کے بتانے اور دلائل کے ذریعے ہوتی ہے۔ اسی بنا پر مخلوقات میں سے کسی کو یہ نہیں کہا جاسکتا ہے کہ یعلم الغیب وہ جانتے غیب ہے۔ اس پر میر سید شریف فرماتے ہیں کہ غیر خدا کو عالم غیب کہنا اس لیے ناجائز ہے کہ ہر مخلوق کا علم کسی وسیلہ سے ہے۔ اگر وہ نبی ہے تو اس کا علم وحی کے ذریعے ہے اگر ولی ہے تو اس کا علم الہام کے ذریعے ہے، اگر وہ فلاسفر ہے تو اس کا علم دلائل کے ذریعے ہے۔ جب آپ نبی کو عالم الغیب کہیں گے تو گویا بیک وقت آپ دو دعویٰ کریں گے ایک یہ کہ نبی کا علم خود بخود ہے اور دوسرے یہ کہ اس کے علم کا ذریعہ وحی ہے اور یہ صریح تناقض ہے جو عالم غیب ہے وہ صاحب وحی نہیں ہے اور جو صاحب وحی ہے وہ عالم غیب نہیں ہے۔ فلاسفر کہتے ہیں کہ نبی اپنے باطن کی صفائی کی وجہ سے دانائے غیب ہوتا ہے اور اہل السنہ والجماعۃ کہتے ہیں کہ نبی غیب دان کو نہیں بلکہ صاحب وحی کو کہتے ہیں اہل السنہ والجماعۃ نے عقائد کی کتابوں میں اپنے اس نظریہ کی بھرپور توضیح کی ہے۔

بہرحال توحید کی نزاکت کے پیش نظر اس آیت میں مقام نبوت کو سمجھایا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ پیغمبر وہ ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آتی وہ نہیں جو غیب دان ہو۔ عیسائیوں کو اس بارے میں ٹھوکر لگ چکی ہے وہ حضرت عیسٰی کو غیب دان سمجھتے ہیں۔ اس بارے میں قرآن نے جس طرح صاف اور قطعی الفاظ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صاحب وحی ہونے اور غیب دان نہ ہونے پر زور دیا ہے وہ سب کو معلوم ہے۔ عالم غیب سے جو کچھ آتا ہے وہ وحی کے ذریعے آتا ہے اور نبی کے علوم کا ذریعہ اللہ کی وحی ہی ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام نے اس موقعہ پر نکتہ آفرینی خوب فرمائی ہے۔

انسان کی ایک عالمگیر گمراہی یہ رہی ہے کہ جب کوئی انسان روحانی عظمت کے ساتھ ظاہر ہوتا ہے تو لوگ چاہتے ہیں کہ اسے انسانیت اور بندگی کی سطح سے بلند کر کے دیکھیں۔ لیکن قرآن نے پیغمبر اسلام کی حیثیت ایسے صاف اور قطعی لفظوں میں واضح کر دی کہ ہمیشہ کے لیے اس

گمراہی کا ازالہ ہوگیا۔ صرف یہی ایک بات ان کی صداقت کے اثبات کے لیے کفایت کرتی ہے جو دنیا اپنے پیشواؤں کو خدا اور خدا کا بیٹا بنانے کی خواہش مند تھی۔ اسلام کے پیغمبر نے اس سے اتنا بھی نہ چاہا کہ کاہنوں کی طرح مجھے غیب دان تسلیم کرلو۔ زیادہ سے زیادہ بات جو اپنے متعلق سنائی وہ یہ تھی ان انا الا نذیر و بشیر۔

هُوَ الَّذِيْ خَلَقَكُمْ مِّنْ نَّفْسٍ وَّاحِدَةٍ وَّ جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا
لِيَسْكُنَ اِلَيْهَا ۚ فَلَمَّا تَغَشّٰىهَا حَمَلَتْ حَمْلًا خَفِيْفًا فَمَرَّتْ
بِهٖ ۚ فَلَمَّآ اَثْقَلَتْ دَّعَوَا اللّٰهَ رَبَّهُمَا لَئِنْ اٰتَيْتَنَا صَالِحًا لَّنَكُوْنَنَّ
مِنَ الشّٰكِرِيْنَ ﴿١٨٩﴾ فَلَمَّآ اٰتٰىهُمَا صَالِحًا جَعَلَا لَهٗ شُرَكَآءَ فِيْمَآ
اٰتٰىهُمَا ۚ فَتَعٰلَى اللّٰهُ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿١٩٠﴾ اَيُشْرِكُوْنَ مَا لَا يَخْلُقُ
شَيْئًا وَّهُمْ يُخْلَقُوْنَ ﴿١٩١﴾ وَلَا يَسْتَطِيْعُوْنَ لَهُمْ نَصْرًا وَّلَآ اَنْفُسَهُمْ
يَنْصُرُوْنَ ﴿١٩٢﴾ وَ اِنْ تَدْعُوْهُمْ اِلَى الْهُدٰى لَا يَتَّبِعُوْكُمْ ۚ سَوَآءٌ
عَلَيْكُمْ اَدَعَوْتُمُوْهُمْ اَمْ اَنْتُمْ صَامِتُوْنَ ﴿١٩٣﴾

وہی اللہ ہے جس نے اکیلی جان سے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی کی
جنس سے اس کی رفیقہ حیات کو بنایا، تاکہ وہ اس کی رفاقت میں سکون
پائے[۲۴۶]۔ پھر جب دونوں میں میاں بیوی کے تعلقات ہوتے
ہیں تو عورت کو حمل ہو جاتا ہے اول اول حمل ہلکا ہوتا ہے اس لیے

وہ چلتی پھرتی ہے پھر جب عورت بوجھل ہو جاتی ہے تو دونوں میاں بیوی اللہ کے حضور دعا مانگتے ہیں[۲۴۷]۔ خدایا اگر تو نے ہمیں اچھا بچہ دیا تو ہم ضرور تیرے شکر گزار ہوں گے، پھر جب اللہ ان کو تندرست بچہ عطا کر دیتا ہے تو وہ ناشکرے ہو کر اللہ کی دی ہوئی چیز میں دوسروں کو شریک بنا لیتے ہیں، لہٰذا یاد رکھو لوگوں کی شرک سازیوں سے اللہ سبحانہٗ بہت بلند ہے[۲۴۸]۔ کیا لوگ اللہ کے ساتھ ان کو شریک ٹھہراتے ہیں جو خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں نہ وہ شریک بنانے والوں کی مدد کر سکتے اور نہ اپنی[۲۴۹]۔ بلکہ اگر تم ان کو راستہ کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری پکار کے جواب میں ایک قدم بھی تمہارے پیچھے نہ چلیں گے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو۔ دونوں حالتوں میں تمہارے حق میں نتیجہ یکساں ہے[۲۵۰]۔

الفاظ کے معانی

لِیَسْکُنَ یہ لفظ سکون سے بنا ہے۔ اس کے معنے چین اور اطمینان کے ہیں۔ اسی سے

لفظ سکینت بنا ہے۔ اسی سے سکن ہے۔ تسکین، آرام، رحمت، برکت جس سے سکون حاصل ہو۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں ابن الکمال سے ناقل ہیں سکون جس میں حرکت کی صلاحیت ہو اس کے حرکت نہ کرنے کا نام ہے۔ جس میں حرکت کرنے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ اس سے حرکت نہ ہونا سکون نہیں ہے۔ تَغَشّٰا۔ تغشّی سے ماضی کا پہلا صیغہ ہے اس کے معنے ڈھانکنا ہیں۔ اسی سے غشاوہ ڈھکن کے معنے میں آتا ہے معنی یہ ہیں کہ جب مرد عورت کو ڈھانپ لیتا ہے۔ عربی زبان میں یہ کنائی تعبیر ہے۔ میاں بیوی کے خصوصی تعلقات کے لیے۔ یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ وہ میاں بیوی کے تعلقات کو صراحت کے ساتھ نہیں پیش کرتا۔ بلکہ کنائی زبان استعمال کرتا ہے۔ حملؔ، یہ دو مصدر ہیں ایک حَمل حا کے زبر کے ساتھ دوسرے حِمل حا کے زیر کے ساتھ۔ دونوں میں فرق یہ ہے کہ جو بوجھ ظاہر میں اُٹھایا جاتا ہے اسے حِمل زیر کے ساتھ بولتے ہیں اور جو بوجھ آنکھوں سے اوجھل ہوتا ہے اسے حَمل حا کے زبر کے ساتھ بولتے ہیں۔ بچہ پیٹ میں ہو تو حَمل ہے اور گٹھڑی سر پر ہو تو حِمل ہے۔ فعل دونوں سے ایک ہی آتا ہے۔ یہاں حَمل زبر کے ساتھ آیا ہے اس لیے اس کے معنے اس بوجھ کے ہیں جو ماں پیٹ میں اُٹھائے ہوتی ہے۔ اس کی جمع احمال آتی ہے۔

وا ولات الاحمال اجلهن ان يضعن حملهن

ربوبیت سے الوہیت پر استدلال

یہ استیناف بیانی ہے یعنی ذہنوں میں ایک اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ توحید الوہیت پر ساری تقریر سننے کے بعد یہ سوال خود بخود ذہنوں میں چٹکیاں لینے لگتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے علاوہ، اللہ سبحانہٗ کے ساتھ، اللہ سبحانہٗ سے ورے عابدانہ تعلقات کسی اور سے کیوں نہ ہونے چاہئیں۔ آخر دُنیا میں بھی تو بادشاہوں تک پہنچنے کے لیے ہمیں سیڑھیوں کی ضرورت ہے۔ جواب میں ارشاد ہوتا ہے جب تم مانتے ہو کہ تمہارا پیدا کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے تو پھر تدبیر و انتظامِ عالم کے بہت سے تختِ اقتدار تم نے کیوں بنا رکھے ہیں اور کیوں انہیں بندگی کا نیاز کا مستحق سمجھتے ہو، جیسے یہ بات ہے کہ تمہارا پیدا کرنے والا اس کے سوا کوئی نہیں اسی طرح پیدا کرنے کے بعد تمہارے بقاء و وجود کا سامان کرنے والا بھی کوئی نہیں۔ اس میں نہ تو کسی سفارشی کی سفارش کو دخل ہے نہ کسی مقرب کے

تقرب کو۔ سورت کا آغاز بھی اسی استدلال سے ہوا تھا کہ تمہیں اللہ کے قانون کی پابندی اس لیے کرنی چاہیے کہ تمہیں اللہ نے پیدا کیا ہے۔ تمہاری تصویر اسی کی بنائی ہوئی ہے۔ ولقد خلقنکم ثم صورنا کم قرآن نے بے شمار مواقع پر ربوبیت سے الوہیت پر استدلال کیا ہے۔ یہاں اسی استدلال کو اس انداز سے پیش کیا ہے جس سے مخاطبوں کی عقل کی فرسودگی ہی کھل کر سامنے آگئی۔ فرمایا یہ کہاں کی عقلیت ہے کہ احتیاجوں و مصیبتوں میں اللہ سبحانہ سے التجائیں کرتے ہو لیکن جب مطلب حاصل ہو جاتا ہے تو اسے ان آستانوں کی بخشش سمجھنے لگتے ہو جو تم نے ٹھہرا رکھے ہیں۔ چنانچہ مشرکین عرب کا طرز عمل یہی تھا کہ مصیبتوں میں اللہ سبحانہ کو پکارتے اور جب مصیبت ٹل جاتی تو اپنے بنائے ہوئے آستانوں پر نذریں چڑھاتے اور اپنی اولاد کو ان کی طرف منسوب کرتے اور کہتے کہ یہ ان کی بخشش ہے کہ ہمیں اولاد ملی ہے، حالانکہ وہ جانتے ہیں کہ عورت کے رحم میں نطفہ کو ٹھہرانا اور حمل کو پرورش کر کے ایک زندہ بچے کی صورت دینا اور پھر اس بچے کے اندر طرح طرح کی قوتیں رکھنا یہ سب اللہ سبحانہ کے قبضے میں ہے۔

انسانی مساوات کا تخلیقی اعلان

۱۸۹ ۲۔ وہی اللہ ہے جس نے ایک جان سے تمہیں پیدا کیا ہے اور اسی کی جنس سے اس کا رفیق بنایا تاکہ اس کی رفاقت میں وہ سکون پائے۔

یعنی خدا نے سب انسانوں کو آدم سے پیدا کیا۔ آدم کے انس اور سکون و قرار حاصل کرنے کے لیے اسی کے اندر سے اس کا جوڑا حوا بنایا۔ پھر دونوں سے نسل چلی[1]

عام شارحین قرآن نے یہاں نفس واحدہ سے حضرت آدم کو مراد لیا ہے۔ اور علامہ آلوسی نے اسی کو فقہاء اور محدثین کی طرف منسوب کیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ساری نسل انسانی ایک ہی آدم کا گھرانہ ہے۔ نسل آدم ہونے کے اعتبار سے سب برابر ہیں۔ اس پہلو سے عربی عجمی، احمر و اسود، افریقی و ایشیائی میں کوئی فرق نہیں، سب خدا کی مخلوق اور آدم کی اولاد ہیں۔ خدا اور رحم کا رشتہ سب کے درمیان مشترک ہے، اس کا لازمی تقاضا یہ ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ سب ایک خدا کی بندگی کرنے والے اور ایک مشترک گھرانے کے افراد کی طرح آپس میں حق و انصاف اور مہر و محبت کے تعلقات رکھنے والے بن کر زندگی بسر کریں۔

اسلام سے پہلے خدا کی مخلوق جیسے خدا کی حد تک مختلف معبودوں سے رشتہ استوار کر بیٹھی تھی ایسے ہی اولادِ آدم کی حد تک رنگ و نسل، ملک و وطن، دولت و جاہت اور پیشوں کے اعتبار سے اعلیٰ اور ادنیٰ طبقوں میں بٹ گئی تھی۔ جو طبقہ جس دائرے سے تعلق رکھتا تھا اس سے کبھی نہیں نکل سکتا تھا۔ ادنیٰ طبقوں پر ترقی کے دروازے ہمیشہ کے لیے بند تھے۔ ان کا مقصدِ زندگی اعلیٰ طبقوں کی خدمت تھا۔ قرآن نے خلقکم من نفس واحدۃ کے اعلان سے ان سارے امتیازات کو ختم کر کے حسنِ عمل اور اخلاق و کردار کو عزت و شرف کا معیار قرار دیا ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم۔ خاندانوں اور قبیلوں کی تقسیم محض تعارف کی خاطر ہے ورنہ عزت و شرف کا قرآن کے نزدیک اصل معیار حسنِ عمل ہے

انسانی مساوات کا مسئلہ اسلام کی نظر میں اس قدر اہم تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ نے اپنے آخری خطبہ میں جن بنیادی باتوں کی طرف خاص طور پر توجہ دلائی تھی۔ ان میں یہ بھی مسئلہ تھا۔ اس خطبہ کے الفاظ یہ ہیں:-

> لوگو! تمہارا پروردگار ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے بنے تھے۔ اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تم میں سب سے پاکباز ہے۔ کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں مگر تقویٰ کی بنا پر۔ (العقد الفرید ج ۲ ص ۱۱۱)

ایک دوسری روایت میں ہے:

> کسی عربی کو عجمی پر فضیلت نہیں اور کسی عجمی کو عربی پر فضیلت نہیں ہے تم سب اولادِ آدم ہو اور آدم مٹی سے بنا ہے۔

ایک روایت میں تصریح کے ساتھ حسب و نسب پر فخر و امتیاز کی ممانعت کی گئی ہے:

> اللہ تعالیٰ نے جاہلیت کے غرور اور آباد اجداد پر فخر کو ختم کر دیا۔ انسان یا مومن و پاکباز ہے اور یا فاجر و شقی، تم سب اولادِ آدم ہو[1]

---

[1] ابوداؤد باب التفاخر بالاحساب

بہر حال آیت میں نفس واحدہ سے حضرت آدم علیہ السلام مراد ہیں۔ اور حضرت آدم کی پیدائش اللہ سبحانہ کے ایک تکوینی ارادے کے تحت ہوئی۔ اس کا تعلق ہمارے محسوسات سے نہیں بلکہ نوعِ انسانی کی ابتدائی و آفرینش کا معاملہ عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے کیونکہ ہم اپنے وسائل ذہن و ادراک سے کوئی یقینی روشنی اس موضوع پر حاصل نہیں کر سکتے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس موضوع پر قرآن نے جو کچھ بتایا ہے اس پر ایمان لائیں۔ مسئلہ ارتقاء سے متاثر ہو کر قرآن کی تاویل ظلم عظیم ہے۔

جَعَلَ مِنْهَا زَوْجَهَا کی تشریح

اسی کی جنس سے اللہ نے اس نفس واحدہ کی رفیقہ حیات کو بنایا تاکہ وہ اس کی رفاقت میں سکون پائے جسے یہاں جعل سے تعبیر کیا ہے۔ اسی لیے سورۂ نساء میں خَلَقَ کا انداز اختیار کیا۔ امام راغب نے جعل پر یہ نوٹ لکھا ہے۔

جعل ایسا لفظ ہے جو تمام کاموں کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہ صنع اور اس قسم کے تمام افعال سے عام ہے اس کا استعمال کئی طرح ہوتا ہے۔

۱۔ صار اور طفق ہو گیا اور لگا۔ کی جگہ آتا ہے جیسے جعل رشید یقرا رشید پڑھنے لگا۔ عربی شاعر کہتا ہے ؎

قد جعلت قلوص بنی سہیل
من الاکوار مرتعھا قریب

بنی سہیل کی اونٹنی ایسی ہو گئی کہ گلوں سے اس کی چراگاہ قریب ہے۔ . . .

۲۔ اوجد ایجاد کیا۔ اس نے پیدا کیا۔ کی جگہ آتا ہے جیسے جعل الظلمات والنور اس صورت میں اس کا ایک مفعول آتا ہے۔

۳۔ ایک چیز کو دوسری چیز سے پیدا کرنے اور بنانے کے معنے میں جیسے واللہ جعل لکم من انفسکم ازواجاً۔

یہاں لفظ جعل تیسرے معنے میں ہے۔ اس آیت میں حضرت حواء کی ولادت کا نہیں بلکہ تخلیق کا ذکر ہے۔ قرآن یہ نہیں کہتا کہ حضرت حواء کی ولادت حضرت آدم سے ہوئی بلکہ یہ کہہ رہا ہے کہ حضرت حواء کی تخلیق حضرت آدم سے ہوئی۔ یعنی جیسے آدم کو مٹی سے بنایا

گیا ایسے ہی حوا کو آدم سے بنایا گیا۔ انسان سے انسان کی تخلیق اتنی بعید نہیں جتنی انسان کی مٹی سے۔ اس آیت کا اگر سورۂ نسا کی اس آیت کی روشنی میں مطالعہ کیا جائے تو بات صاف ہو جاتی ہے۔ آیت یہ ہے :

یاایہا الناس اتقوا ربکم الذی خلقکم من نفس واحدۃ و خلق منہا زوجہا وبث منہما رجالا کثیرا و نساء۔

اے انسانو! تم اپنے پروردگار سے ڈرو جس نے تمہیں ایک جان سے پیدا کیا اور اسی سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور ان دونوں سے بکثرت مرد و عورت پھیلا دیے۔

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ انسانی کائنات صرف ایک وحدت سے پیدا نہیں کی گئی ہے اور نہ یہ کثرت براہِ راست وجود میں آئی ہے بلکہ صورت یہ ہوئی کہ پہلے ایک نفس یعنی حضرت آدم کی تخلیق ہوئی۔ پھر اسی نفس سے حضرت حوا کی تخلیق ہوئی۔ یہ سب کچھ ایک تدریجی عمل تخلیق کے ذریعے ہوا۔ پھر ان دونوں سے ولادت کے ذریعے انسانوں مردوں اور عورتوں کی یہ کثرت وجود میں آئی۔ حضرت آدم کی تخلیق میں قرآن نے تراب، طین سلالۃ من طین، صلصال اور حماٍ مسنون کے الفاظ بولے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آدم کی تخلیق مٹی سے ہوئی اور ایک لمبے تدریجی عمل کے ذریعے ہوئی۔ اگر حضرت حوا کی تخلیق بھی حضرت آدم کی طرح ہوئی تو بتایا جائے کہ حوا کا مادہ تخلیق کیا تھا قرآن کا انداز بیان کہہ رہا ہے کہ حوا کا مادہ تخلیق مٹی نہ تھا، بلکہ خود حضرت آدم تھے۔ اگرچہ قرآن نے حضرت آدم کی طرح تخلیق حوا کی تفصیلی کیفیت بیان نہیں کی۔ حدیث میں بھی اس کی صراحت نہیں ہے لیکن ضمناً اس کی طرف اشارہ موجود ہے۔ حدیث صحیح بخاری و مسلم میں ہے۔

حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عورتوں سے حسن سلوک کرو کیونکہ یہ پسلی کی مخلوق ہے اور پسلیوں میں سب سے زیادہ ٹیڑھی اوپر کی ہوتی ہے اگر تم اسے سیدھا کرو گے تو توڑ دو گے اور اگر چھوڑ دو گے تو ٹیڑھی رہے گی۔

یہ استعارے کی زبان ہے۔ اس میں اشارہ ہے کہ حوا کی تخلیق پسلی سے ہوئی ہے۔

حافظ عسقلانی لکھتے ہیں :

اس میں کچھ کے خیال کے مطابق اس بات کا اشارہ ہے کہ حوا، آدم کی پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔

گویا حافظ صاحب نے جن بزرگوں کا یہ خیال نقل کیا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں حوا کے آدم کی پسلی سے پیدا ہونے کی صراحت نہیں بلکہ صرف اشارہ ہے اور اس اشارے کو بھی حافظ عسقلانی جیسے وسیع النظر نے قیل کہا گیا بصیغہ مجہول نقل کیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ حافظ صاحب کو متقدمین میں سے اس اشارے کا کوئی ہمنوا معلوم نہیں ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ سوال پیدا ہو کہ اگر قرآن و حدیث دونوں میں اس کی صراحت نہیں تو پھر یہ پسلی کی کہانی کہاں سے آئی ہے۔

اصل تورات میں یہ بیان آیا ہے:

> خداوند نے آدم پر بھاری نیند بھیجی۔ وہ سو گیا۔ اور اس نے اس کی پسلیوں سے ایک پسلی اور اس کے بدلے گوشت بھر دیا اور خداوند نے اس پسلی سے جو اس نے آدم سے نکالی تھی ایک صورت بنا کر آدم کے پاس بھیجی
>
> (پیدائش ۲ ، ۲۲-۲۳)

بہرحال پسلی کی کہانی نہ قرآن میں ہے اور نہ حدیث میں، لیکن قرآن نے اجمالاً یہ ضرور بتایا ہے کہ حوا کی تخلیق آدم سے ہوئی ہے۔ کیسے ہوئی۔ اس سے قرآن نے بحث نہیں کی۔ معاملہ کا تعلق چونکہ عالم غیب سے ہے اس لیے اس کی تفصیلی کیفیت متعین کرنے میں وقت ضائع نہ کیا جائے۔ امام قرطبی فرماتے ہیں کہ عربی زبان میں عورت کو امراۃ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ المرء سے بنی ہے جس کے معنے مرد کے ہیں اور ان کا نام حوا بھی اس لیے رکھا گیا کہ وہ ایک حی زندہ ہستی سے بنائی گئی ہے۔ ہم نے اس موضوع پر تفصیلی بحث چوتھے پارے سورۂ نساء میں کی ہے

شادی کا بالاتر مقصد

اس آیت میں لیسکن الیہا فرما کر شادی اور نکاح کے اہم اور بنیادی مقصد کی طرف رہنمائی کی گئی ہے۔ دوسرے پارے میں نساءکم حرث لکم میں شادی کا مقصد صرف بقائے نسل بتایا تھا۔ اس میں حیوان اور انسان دونوں شریک ہیں۔ اب یہاں اس آیت

میں حیوان سے الگ کرکے انسان کی ازدواجی زندگی کی یہ خصوصیت بتائی گئی ہے کہ اس میں زوجیت کا ایک بالاتر مقصد بھی ہے اور وہ یہ کہ ان کا تعلق محض شہوانی تعلق نہ ہو بلکہ محبت اور اُنس کا تعلق ہو۔ دل کے لگاؤ اور روحوں کے اتصال کا تعلق ہو۔ وہ ایک دوسرے کے رازدار اور شریک رنج وراحت ہوں۔ ان کے درمیان ایسی معیت اور دائمی بستگی ہو کہ زندگی سکون کا گہوارہ بن جائے۔ دونوں کا یہی تعلق انسانی تمدن کی عمارت کا سنگ بنیاد ہے۔ اس کے ساتھ لیسکن الیہا سے اس طرف اشارہ کردیا گیا کہ عورت کی ذات مرد کے لیے سرمایہ سکون وراحت ہے اور عورت کی فطری خدمت یہی ہے کہ وہ اس جدوجہد اور ہنگامہ عمل کی مشقتوں بھری دُنیا میں سکون وراحت کا ایک گوشہ مہیا کرے۔ یہ انسان کی خانگی زندگی ہے جس کی اہمیت کو مادی منفعتوں کی خاطر مادہ پرستوں نے نظرانداز کردیا ہے حالانکہ تمدن وعمران کے شعبوں میں جو اہمیت دوسرے شعبوں کی ہے وہی اس شعبے کی ہے۔ اور تمدنی زندگی کے لیے یہ بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنے دوسرے شعبے ضروری ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن کے نقطہ نظر سے نکاح کے رشتہ سے جو پہلی چیز حاصل ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ میاں بیوی میں سے ہر ایک کو دوسرے سے تسکین خاطر اور اطمینان قلب میسّر ہو اور پھر ہر ایک دوسرے کی بے چینی میں سہارا ہو اور جب کبھی اور جس وقت اُمنگ وولولہ پیدا ہو اور جنسی اضطراب چھیڑے تو ایک جائز آئینی ذریعہ فطرت سے ان تقاضوں کی تکمیل کا ذریعہ سامنے موجود ہے۔ اسی مسئلہ کی طرف کتنے بلیغ اور پاکیزہ انداز میں قرآن نے اشارہ کیا ہے: فلما تغشٰھا

اس آیت سے یوں ہی نہ گزر جائیے بلکہ غور فرمائیے کہ قرآن کے اس احسان عظیم کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا جو اس نے جعل منها زوجها فرماکر عورت پر کیا ہے۔ انسانی تمدن کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ عورت کا وجود دُنیا میں ذلت اور شرم کا وجود تھا۔ بیٹی کی پیدائش باپ کے لیے سخت اور موجب ننگ تھی۔ سسرالی رشتے ذلیل سمجھے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ سسرے اور سالے کے الفاظ اسی جاہلی تخیل کے تحت آج تک گالی کے طور پر استعمال ہو رہے ہیں۔ بہت سی قوموں میں اسی ذلت سے بچنے کے لیے لڑکیوں کو قتل کردینے کا رواج ہو گیا تھا۔ جہلاء تو درکنار علماء اور پیشوایانِ مذاہب تک میں مدتوں یہ سوال زیرِ بحث رہا کہ آیا عورت انسان بھی ہے یا نہیں۔

اور خدا نے انہیں روح بخشی ہے یا نہیں۔ ہندو مذہب میں ویدوں کی تعلیم کا دروازہ عورت کے لیے بند تھا۔ بدھ مت میں عورت سے تعلق رکھنے والے کے لیے نروان کی کوئی صورت نہ تھی۔ مسیحیت اور یہودیت کی نگاہ میں عورت ہی انسان کے گناہ کی بانی مبانی اور ذمہ دار تھی۔ یونان میں گھر والیوں کے لیے نہ علم تھا اور نہ تہذیب و ثقافت اور نہ حقوقِ مدنیت۔ یہ چیزیں جس کو ملتی تھیں وہ زندی ہوتی تھی۔ روم ایران اور چین اور مصر اور تہذیب انسانی کے دوسرے مرکزوں کا حال بھی قریب قریب ایسا ہی تھا۔ صدیوں کی مظلومی و محکومی اور عالمگیر حقارت کے برتاؤ نے خود عورت کے ذہن سے بھی عزتِ نفس کا احساس مٹا دیا تھا وہ خود بھی اس امر کو بھول گئی تھی کہ دنیا میں کوئی حق لے کر پیدا ہوئی ہے یا اس کے لیے بھی کوئی عزت کا مقام ہے۔ مرد اس پر ظلم و ستم کرنا اپنا حق سمجھتا تھا اور وہ اس ظلم کو سہنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ غلامانہ ذہنیت اس حد تک پہنچ گئی تھی کہ وہ فخر کے ساتھ اپنے آپ کو شوہر کی "داسی" کہتی تھی۔ پتی ورتا اس کا دھرم تھا اور پتی ورتا کے معنی یہ تھے کہ شوہر اس کا معبود ہے۔

اس ماحول میں جس نے نہ صرف قانونی اور عملی حیثیت سے بلکہ ذہنی حیثیت سے بھی انقلابِ عظیم برپا کیا وہ قرآن ہے۔ قرآن نے ہی عورت اور مرد دونوں کی ذہنوں کو بدلا ہے۔ عورت کی عزت اور اس کے حق کا تخیل ہی انسان کے دماغ میں قرآن کا پیدا کیا ہوا ہے۔ آج حقوقِ نسواں اور تعلیم نسواں اور بیداری اناث کے جو الفاظ آپ سن رہے ہیں۔ یہ سب اسی انقلاب انگیز صدا کی بازگشت ہیں جو قرآن نے بلند کی تھی اور جس نے افکارِ انسانی کا رخ ہمیشہ کے لیے بدل دیا۔ یہ قرآن ہی ہے جس نے دنیا کو بتایا کہ عورت بھی ویسی ہی انسان ہے جیسا مرد ہے خلقکم من نفس واحدہ و جعل منھا زوجھا۔ ایمان اور عمل صالح کے ساتھ روحانی ترقی کے جو درجات مرد کو مل سکتے ہیں وہی عورت کے لیے بھی کھلے ہوتے ہیں۔ مرد اگر ابراہیم بن ادھم بن سکتا ہے تو عورت کو بھی رابعہ بصریہ بننے سے کوئی چیز نہیں روک سکتی۔

قانونِ زوجیت کے تین اصول

۲۶۷۔ پھر جب دونوں میں میاں بیوی کے تعلقات ہوتے ہیں تو عورت کو حمل ہو

جاتا ہے، اوّل اوّل حمل ہلکا ہوتا ہے اس لیے وہ چلتی پھرتی ہے، پھر جب عورت بوجھل ہوجاتی ہے تو دونوں میاں بیوی اللہ کے حضور دُعا مانگتے ہیں ۔

یعنی جب مرد نے عورت سے فطری خواہش پوری کی تو عورت حاملہ ہوئی ۔ حمل کی ابتدائی حالت میں کوئی گرانی نہ تھی، حسبِ معمول چلتی پھرتی اور اُٹھتی بیٹھتی رہی ۔ جب پیٹ بڑھ گیا اور یہ کون جان سکتا تھا کہ اس کے اندر کیا چیز پوشیدہ ہے، مرد و عورت دونوں نے حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا[1]

پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ میاں بیوی کے درمیان جس قسم کا تعلق انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے وہ یسکن الیھا ہے ۔ یعنی عورت کی ذات میں مرد کے لیے سرمایہ سکون وراحت ہے اور عورت کی فطری خدمت یہی ہے کہ وہ اس جدوجہد اور ہنگامہ عمل کی مشقتوں سے بھری دُنیا میں سکون وراحت کا ایک گوشہ مہیا کرے ۔ اب اس آیت میں بھی بتایا جارہا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کا جوڑا اس لیے بنایا ہے کہ ان کے صنفی تعلق سے انسانی نسل جاری ہو ۔ یہ انسان کی حیوانی فطرت کا مقتضا ہے جس کی رعایت ضروری ہے ۔ اللہ سبحانہٗ نے نوعِ انسانی کو اس لیے پیدا نہیں کیا کہ اس کے چند افراد زمین پر اپنے نفس کی پرورش کریں اور بس ختم ہوجائیں بلکہ اس کا ارادہ ایک مدت مقررہ تک اس کو باقی رکھنے کا ہے ۔ اور اس نے انسان کی حیوانی فطرت میں صنفی میلان اسی لیے رکھا ہے کہ اس کے زوجین باہم ملیں اور اللہ سبحانہٗ کی زمین کو آباد رکھنے کے لیے اپنی نسل جاری کریں ۔ آیت میں اس مقصد کی طرف اشارہ کرنے کے لیے قرآن نے یہاں تغشاھا کی بلیغ کنائی زبان استعمال کی ہے تغشی کا فاعل مرد ہے اور ھا کی ضمیر مونث ہے ۔ اس میں اشارہ ہے کہ زوجیت میں اصل یہ ہے کہ زوجین میں سے ایک فعل ہو اور دوسرے میں قبول و انفعال ہو ۔ ایک میں تاثیر ہو اور دوسرے میں تاثر، ایک میں عاقدیت ہو اور دوسرے میں انعقاد ۔ یہی عقد و انعقاد، فعل و انفعال، تاثیر و تاثر اور قابلیت و فاعلیت کا تعلق دو کے درمیان زوجیت کا تعلق ہے ۔ اسی تعلق سے تمام ترکیبات واقع ہوتی ہیں اور ان ہی ترکیبات سے انسانی زندگی کا سارا کارخانہ چل رہا ہے تغشاھا کا یہ مفہوم معین ہوجانے کے بعد اس سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قانونِ زوجیت کے تین ابتدائی اُصول مستنبط ہوتے ہیں ۔

۱۔ اللہ سبحانہ نے جس فارمولے پر تمام کائناتِ انسانی کی تخلیق فرمائی ہے اور جس طریقہ کو اپنے کارخانے کے چلنے کا ذریعہ بنایا ہے وہ ہرگز ناپاک اور ذلیل نہیں ہو سکتا ۔ بلکہ اپنی اصل کے اعتبار سے وہ پاک اور محترم ہی ہے اور ہونا چاہیے ۔

۲۔ فعل وانفعال دونوں اس کارخانے کو چلانے کے لیے یکساں ضروری ہیں ۔ فاعل اور منفعل کا وجود اس کارگاہ میں یکساں اہمیت رکھتا ہے نہ فاعل کی حیثیتِ فعلی میں کوئی عزت ہے اور نہ منفعل کی حیثیتِ انفعالی میں کوئی ذلت ۔ فاعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں قوتِ فعل اور کیفیاتِ فاعلیہ پائی جائیں تاکہ وہ زوجیت کے فعلی پہلو کا کام بخوبی انجام دے سکے اور منفعل کا کمال یہی ہے کہ اس میں انفعال اور کیفیاتِ انفعالیہ بدرجہ اتم موجود ہوں تاکہ وہ زوجیت کے انفعالی اور قبولی پہلو کی خدمت انجام دے سکے ۔

۳۔ فعل اپنی ذات میں قبول وانفعال پر بہر حال ایک طرح کی فضیلت رکھتا ہے لیکن یہ فضیلت اس معنی میں نہیں ہے کہ فعل میں عزت ہو اور انفعال اس کے مقابلے میں ذلیل ہو ۔ بلکہ یہ فضیلت دراصل غلبہ اور قوت اور اثر کے معنی میں ہے جس طرح وقوعِ فعل کے لیے فاعل اور منفعل دونوں کا وجود یکساں ضروری ہے ۔ اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ فاعل میں غلبہ اور قوتِ تاثیر ہو اور منفعل میں مغلوبیت اور قبولِ اثر کی استعداد ۔ کیونکہ اگر دونوں قوت میں یکساں ہوں اور کسی کو کسی پر غلبہ نہ ہو تو ان میں سے کوئی کسی کا اثر قبول نہ کرے گا ۔ اور دوسرے سے فعل واقع ہی نہ ہو گا ۔ اگر ایک فاعل کے مقابلے میں ایک منفعل نہ ہو اور منفعل میں فاعل کے اثر سے مغلوب ہونے کی صلاحیت نہ ہو فعل وجود میں ہی نہیں آسکتا ۔ اس لیے زوجین میں سے زوجِ فاعل کی طبیعت کا تقاضا یہی ہے کہ اس میں غلبہ شدت اور تحکم ہو اسی لیے قرآن نے یہاں مرد کو فعل کا فاعل اور عورت کو مفعول بنا کر ظاہر کیا ہے **فلما تغشاھا** کہنا یہ چاہتا ہوں کہ مرد میں فعلی پرزے کی حیثیت سے اپنی خدمت بجالانے کے لیے غلبہ، شدت اور تحکم ضروری ہے ۔ اس کے برعکس زوجِ منفعل کی فطرت انفعالیہ کا تقاضا بھی ہے کہ اس میں نرمی اور نزاکت اور لطافت اور تاثر ہو ۔

اب ایک قدم اور آگے بڑھائیے اور آیت کی تشریح علامہ آلوسی کی اس بات پر غور کیجئے فیہ رمارالی ان تکثیرا لنوع علۃ المؤانسۃ کما ان الوحدۃ عدۃ الوحشۃ

آیت میں فلما تغشاھا پر فا لاکر یہ اشارہ فرمایا ہے کہ نوعِ انسانی کے بقا کی علت میاں بیوی کی باہمی موانست ہے یعنی ان کی موانست اور ہم آہنگی سے تناسل کا سلسلہ جاری ہوا۔ گویا بتا دیا کہ اللہ تعالیٰ نے تمام حیوانات کی طرح انسان کے جوڑے بھی اس مقصد کے لیے بنائے ہیں کہ ان کے صنفی تعلق سے انسانی نسل جاری ہو۔ اور یہ صنفی تعلق محض شہوانی تعلق نہ ہو بلکہ محبت اور انس کا تعلق دل کے لگاؤ اور روحوں کے اتصال کا تعلق ہو۔ وہ ایک دوسرے کے رازدار اور شریک رنج و راحت ہوں۔ ان کے درمیان ایسی معیت اور دائمی بستگی ہو جیسے غشادہ اور مغشی میں ہوتی ہے یا جیسے لباس اور جسم میں ہوتی ہے۔ اور یہ صنفی تعلق صرف زوجین کی باہمی محبت ہی کا مقتضی نہیں ہے بلکہ اس کا بھی مقتضی ہے کہ اس تعلق سے اولاد ہو۔ اور اولاد کے ساتھ بھی ایک گہرا روحانی تعلق ہو۔ حملت حملا کو قرآن میں فلما تغشاھا کا جواب بنا کر اسی طرف اشارہ کیا ہے۔

یہاں قرآن کی اس بلاغت پر غور کیجئے کہ حمل کے زمانے میں عورت پر جو حالات گزرتے ہیں ان کو کیسے لطیف انداز میں پیش کیا ہے حملت حملاً خفیفا فمرت بہ فلما اثقلت۔ قرآن جنین کے تمام تغیرات کو انقلابی تطور قرار دیتا ہے من نطفۃ ثم من علقۃ ثم من مضغۃ۔ ایک اور جگہ ہے ثم خلقنا النطفۃ علقۃ فخلقنا العلقۃ مضغۃ، یعنی تخلیق کی ایک حالت نطفہ کی ہوتی ہے پھر تخلیق کی دوسری حالت علقہ کی ہوتی ہے۔ پھر تخلیق کی تیسری حالت مضغہ کی ہوتی ہے۔ پہلی دو حالتوں میں عورت حملت حملا خفیفا، کی اور تیسری حالت میں عورت اثقلت کی تصویر ہوتی ہے۔ جو حالات عورت پر اس زمانہ میں گزرتے ہیں اگر غیر زمانہ حمل میں عورت پر گزریں تو قطعی بیماری کا حکم لگا دیا جائے۔ اس زمانہ میں اس کا نظام عصبی مختل ہو جاتا ہے۔ اس کا دماغی توازن بگڑ جاتا ہے۔ وہ مرض اور صحت کے درمیان معلق رہتی ہے۔ لیکن عورت یہ سب کچھ بڑی خندہ پیشانی سے برداشت کرتی ہے۔ کیوں؟ قرآن بتاتا ہے اس لیے کہ اسے اولاد کے ساتھ ایک گہرا روحانی تعلق ہوتا ہے اور اس کی رگ رگ اور ریشے ریشے میں اولاد کی محبت پیوست ہوتی ہے۔ دوسری جگہ حملتہ امہ وھنا علی وھن میں اسی کی تصویر پیش کی ہے۔ بچہ ابھی شکم مادر میں ہوتا ہے لیکن اولاد کے لیے والدین کا اضطراب ان کی زبان پر دعا بن کر ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ہاتھ پھیلا پھیلا کر اللہ سے بھیک مانگتے ہیں دعوا اللہ ربھما۔ یہ دعا کیا ہوتی ہے۔

شرک فی التسمیہ کی ممانعت

۲۴۸- خدایا! اگر تو نے ہمیں اچھا بچہ دیا تو ہم ضرور تیرے شکر گزار رہوں گے۔ پھر جب اللہ ان کو تندرست بچہ عطا کر دیتا ہے تو وہ ناشکرے ہو کر اللہ کی دی ہوئی چیز میں دوسروں کو شریک بنا لیتے ہیں لہٰذا یاد رکھو کہ لوگوں کی شرک سازیوں سے اللہ سبحانہٗ بلند و بالا ہے۔

یعنی مرد و عورت دونوں نے حق تعالیٰ کی جناب میں عرض کیا کہ اگر آپ اپنے فضل سے بھلا چنگا کارآمد بچہ عنایت فرمائیں گے تو ہم دونوں (بلکہ ہماری نسل بھی) تیرا شکر ادا کرتی رہے گی۔ خدا نے جب ان کی یہ تمنا پوری کر دی تو ہماری دی ہوئی چیز میں اوروں کے حصے لگانے شروع کر دیئے مثلاً کسی نے یہ عقیدہ جما لیا کہ یہ اولاد فلاں زندہ یا مردہ مخلوق نے ہم کو دی ہے۔ کسی نے اس عقیدے سے نہیں تو عملاً اس کی نذر و نیاز شروع کر دی یا بچہ کی پیشانی اس کے سامنے ٹیک دی یا بچہ کا نام ایسا رکھا جس سے شرک کا اظہار ہوتا ہے مثلاً عبدالعزیٰ یا عبدالشمس وغیرہ۔ غرض جو حق منعم حقیقی کا تھا وہ اعتقاداً و فعلاً یا قولاً دوسروں کو دے دیا گیا۔ خوب سمجھ لو کہ حق تعالیٰ تمام انواع شرک سے بالا و برتر ہے۔

ان آیات میں حسن بصری وغیرہ کی رائے کے موافق خاص آدم و حوا کا نقشہ نہیں بلکہ عام انسانوں کی حالت کا نقشہ کھینچا گیا ہے بے شک ابتداءً ھوالذی خلقکم من نفس واحدۃ وجعل منہا زوجہا میں بطور تمہید آدم و حوا کا ذکر تھا مگر اس کے بعد مطلق مرد و عورت کے ذکر کی طرف منتقل ہو گئے۔ اور ایسا بہت جگہ ہوتا ہے کہ شخص کے ذکر سے جنس کے ذکر کی طرف منتقل ہو جاتے ہیں جیسے ولقد زینا السماء الدنیا بمصابیح وجعلناھا رجوما للشیاطین میں یعنی سیاروں کو مصابیح فرمایا ہے وہ ٹوٹنے والے سیارے نہیں جن سے رجم شیاطین ہوتا ہے مگر شخص مصابیح سے جنس مصابیح کی طرف کلام کو منتقل کر دیا گیا۔ اس تفسیر کے مطابق جعلا لہ شرکاء میں کچھ اشکال نہیں ہے۔ مگر اکثر سلف سے یہی منقول ہے کہ ان آیات میں صرف آدم و حوا کا قصہ بیان فرمایا ہے کہتے ہیں کہ ابلیس ایک نیک مخلوق کی صورت میں حوا کے پاس آیا اور فریب دے کر ان سے وعدہ لے لیا کہ اگر لڑکا پیدا ہو تو اس کا نام عبدالحارث رکھیں۔ حوا نے آدم کو بھی راضی کر لیا۔ اور جب بچہ پیدا ہوا تو دونوں نے عبدالحارث نام رکھا۔ حارث ابلیس کا نام تھا جس سے وہ گروہ ملائکہ میں پکارا جاتا تھا۔

ظاہر ہے کہ اسمائے اعلام میں لغوی معنے معتبر نہیں ہوتے ہیں۔ اور یوں بھی تو عبد کی اضافت حارث کی طرف اس کو مستلزم نہیں کہ حارث کو معاذاللہ معبود سمجھ لیا جائے۔ ایک مہمان نواز آدمی کو عرب عبدالضیف کہہ دیتے ہیں یعنی مہمان کا خادم اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہوتا کہ گویا میزبان مہمان کی پوجا کر رہا ہے۔ پس اگر عبدالحارث نام رکھنے کا یہ واقعہ صحیح ہے تو نہیں کہا جا سکتا کہ آدم علیہ السلام نے معاذاللہ شرک کا ارتکاب کیا جو انبیاء کی شان عصمت کے خلاف ہے۔ ہاں بچہ کا ایسا غیر موزوں نام رکھنا جس سے شرک کی بو آتی ہو نبی معصوم کی شان رفیع اور جذبہ توحید کے مناسب نہ تھا۔ قرآن حکیم کی عام عادت ہے کہ انبیائے مقربین کی چھوٹی سی لغزش اور ادنیٰ ترین زلت کو حسنات الابرار سیئات المقربین کے مطابق اکثر سخت عنوان سے تعبیر کرتا ہے جیسے یونس علیہ السلام کے قصے میں فرمایا فظن ان لن نقدر علیہ یا فرمایا حتی اذا استیئس الرسل وظنوا انہم قد کذبوا علی توجیہ بعض المفسرین۔ اسی طرح یہاں بھی آدم علیہ السلام کے رتبہ کے لحاظ سے اس موہم شرک تسمیہ کو تغلیظاً ان الفاظ میں ادا فرمایا جعلا لہ شرکاء یعنی ان کی شان کے لائق نہ تھا کہ ایسا نام رکھیں جس کی سطح سے شرک کا وہم ہوتا ہے۔ گو حقیقۃً شرک نہیں۔ شاید اسی لیے فقد اشرکا وغیرہ مختصر عبارت چھوڑ کر یہ طویل عنوان جعلا لہ شرکاء فیما اتاھما اختیار فرمایا واللہ اعلم [1]

اس آیت گرامی کے سمجھنے میں عام شارحین قرآن ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں۔ انہوں نے آیت گرامی کا مصداق حضرت آدم و حوا کو قرار دے کر ایک قصہ بنا لیا۔ اور آیت کی تشریح اس طرح کی کہ نفس واحدہ سے آدم اور زوج سے حوا مراد ہیں۔ جب حضرت آدم اور حوا کے بچہ پیدا ہوا تو دونوں نے اس کا نام عبدالحارث رکھا اور اس طرح دونوں نے شرک کیا۔ اور اس تشریح کو پایہ دار اور مضبوط بنانے کے لیے محمد بن اسحاق نے حضرت عبداللہ ابن عباس کے حوالہ سے بتایا کہ حضرت حوا کے بچے ہو کر مر جاتے تھے۔ آخرکار ایک بچے کی پیدائش کے موقع پر شیطان نے ان کو بہکا کر اس بات پر راضی کر لیا کہ اس کا نام عبدالحارث (بندۂ شیطان) رکھا۔ صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کی تائید میں ایک مرفوع روایت بھی ترمذی کے حوالہ سے پیش کر دی کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حوا کے بچہ پیدا ہو کر مر جاتا تھا۔ ایک بار جب حوا کے بچہ ہوا تو ابلیس آیا اور اس نے حضرت حوا سے کہا کہ اس کا نام عبدالحارث رکھ لو اور بچہ زندہ رہا۔

حافظ ابن کثیر نے ابن عباس کی تشریح کے بارے میں لکھا ہے کہ ابن عباس نے یہ تشریح اہل کتاب سے لی ہے۔ اور ترمذی کی روایت کے بارے میں ابن کثیر ہی نے بتایا ہے کہ یہ حدیث تین وجہ سے معلول ہے۔ اول یہ کہ عمر بن ابراہیم بصری کی اگرچہ ابن معین نے توثیق کی ہے لیکن ابوحاتم الرازی اسے ناقابل استدلال بتاتے ہیں۔ دوسرے یہ کہ یہ روایت مرفوع نہیں بلکہ خود سمرہ کی بات ہے۔ تیسرے یہ کہ سمرہ سے روایت کرنے والے راویوں میں الحسن البصری ہی ہیں۔ اور حسن بصری سے اس آیت کی تفسیر اس سے بالکل مختلف ہے۔ اگر فی الواقع یہ روایت حسن بصری کو معلوم ہوتی تو اس کی موجودگی میں وہ کوئی اور تشریح نہ فرماتے۔ ابن عباس کی تشریح کی بنیاد پر جو سنگین اعتراض ہوتا ہے وہ یہ کہ حضرت آدم نے نبی ہو کر شرک کیا اور حوا جیسی مقدس عورت نے بھی۔ اور پھر یہ کہ آیت کے آخر میں تعالی اللہ عما یشرکون آ رہا ہے جو اس بات کی کھلے طور پر نشاندہی کر رہا ہے کہ شرک کرنے والے صرف دو یعنی آدم و حوا نہیں بلکہ جماعت ہے اور پھر یہ کہ اگر یہ افسانہ صحیح ہوتا تو تعبیر عما یشرکون نہ ہوتی بلکہ عمن یشرکون ہوتی ہے یعنی ما کی جگہ من آتا کیونکہ من ذوالعقول کے لیے آتا ہے جبکہ ما غیر ذوی العقول کے لیے آتا ہے۔ اور پھر یہ کہ آدم اللہ سبحانہ نے ہر چیز کے نام تعلیم فرمائے تھے۔ پھر کیا ممکن ہے کہ حضرت آدم کو یہ بھی معلوم نہ ہو کہ حارث شیطان کا نام ہے ان اعتراضات کے جوابات بہت ضعیف ہیں۔ کچھ کی طرف شیخ الاسلام نے چند اشارات کیے ہیں لیکن ان سب کی حیثیت ایک کمزور تاویل سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ مثلاً یہ کہ اعلام میں لغوی معنے مراد نہیں۔ یہ جواب بہت ہی ضعیف ہے۔ بے شک لوگوں کے استعمال میں اعلام میں معانی مراد نہیں ہوتے لیکن رکھنے والا جب نام رکھتا ہے تو اس کے پیش نظر یقیناً معانی ہوتے ہیں۔ اور تو اور بچہ کا نام خود ایک پیغمبر رکھ رہے ہیں۔ معنویت ہی کی وجہ سے عبدالعزیٰ جیسے اسماء ناجائز ہیں۔ یہاں لوگوں کے استعمال کا سہارا ایک بے جان سہارا ہے یا یہ کہنا کہ یہ شرک فی العبادت نہیں بلکہ شرک فی التسمیہ ہے۔ یہ جواب ہی لغو ہے کیونکہ شرک فی التسمیہ بھی حرام ہے۔ اور کوئی نبی حرام کا مرتکب نہیں ہو سکتا۔ ان اعتراضات سے بچنے کے لیے بعض لوگوں نے نفس واحدہ سے قصی مراد لیا ہے اور اس کی بیوی کو پیدا کرنے کا

مطلب یہ بتایا ہے کہ قصی کی نوع یعنی نوعِ انسانی اللہ تعالیٰ نے اس کی بیوی کو پیدا کیا تاکہ اس کی طبیعت کو سکون اور رُوح کو راحت حاصل ہو۔ لیکن جب قصی کی اولاد ہوئی تو اس نے اپنی اولاد کا نام بجائے عبداللہ، عبدالرحمان کے عبدمناف اور عبدالدار رکھ دیا۔ اور خدا کے ساتھ ایسی چیزوں کو شریک کیا جو خالق نہیں اور پھر اس کی اولاد نے بھی شرک کیا۔

لیکن یہ تاویل بھی درست نہیں ہے کیونکہ اس کی روایتی اور تاریخی حیثیت کچھ نہیں ہے۔ صحیح مطلب وہی ہے جو ابن کثیر، بیضاوی اور رازی نے بتایا ہے کہ جعل منہا میں مِن جزئیت کے لیے نہیں بلکہ حقیقت کے لیے ہے۔ اور نفس واحدہ سے مراد مرد ہے۔ یعنی سب کو اللہ نے ایک مرد کی جنس سے پیدا کیا۔ سب کو انسانی افراد بنایا۔ مرد کی بیوی کو بھی اس کی جنس سے پیدا کیا۔ جانور کو اس کا جوڑا نہیں بنایا تاکہ مرد کو سکونِ خاطر حاصل ہو۔ اسی سکون کے نتیجہ میں جب میاں بیوی ملتے ہیں تو بیوی کو حمل ہو جاتا ہے۔ زمانۂ حمل کی ابتدا میں عورت کو کچھ زیادہ بوجھ محسوس نہیں ہوتا لیکن جب حمل کو زیادہ زمانہ گزر جاتا ہے اور بوجھ محسوس ہونے لگتا ہے تو مرد و عورت دونوں اللہ سے دعا مانگتے ہیں کہ اگر تو نے ہمیں اچھا بچہ دے دیا تو ہم تیرے شکر گزار ہوں گے۔ پھر اللہ سبحانہٗ حسبِ مراد ان کو بچہ دے دیتا ہے تو وہ خدا کی دین میں خدا کے ساتھ اوروں کو بھی شریک کر لیتے ہیں۔ حالانکہ اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی ہر قسم کے شرک سے بالا و برتر ہے۔ اس تشریح کی تائید امام الحسن البصری کی اس تفسیر سے ہوتی ہے جو معمر کے طریق بسند صحیح مروی ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آیت سے آدم کی ذریت مراد ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ امام حسن سے یہ تفسیر بہترین تاریخی اور روایتی طریق سے مروی ہے۔ اور یہ تفسیر احسن التفاسیر یعنی تمام تفاسیر میں عمدہ ہے۔

دراصل آیت میں مشرکین کی مشرکانہ گمراہیوں کی نشاندہی کی گئی ہے۔ منشا یہ ہے کہ نوعِ انسانی کو ابتداءِ وجود کی نعمت عطا کرنے والا اللہ سبحانہٗ ہے پھر انسان کو بھی لبادہ وجود اللہ ہی نے عطا فرمایا ہے۔ عورت کے رحم میں نطفہ کو ٹھہرانا پھر اس ایک قطرے کو پرورش کر کے ایک زندہ بچہ کی صورت دینا پھر اس بچہ کے اندر طرح طرح کی قوتیں اور قابلیتیں ودیعت کرنا اور اس کو اچھا بچہ انسان بنا کر پیدا کرنا یہ سب اللہ سبحانہٗ کی شانِ تخلیق کا مظہر ہے۔ اس حقیقت سے مشرکین بھی اسی طرح آگاہ ہیں جیسے موحدین۔ یہی وجہ ہے کہ زمانہ حمل میں ساری امیدیں اللہ سے وابستہ کر لی جاتی ہیں

کردی صحیح وسالم بچہ پیدا کرے گا لیکن اس کے باوجود نادانی اور حماقت کا حال یہ ہے کہ جب اُمیدیں بھر آتی ہیں اور خوبصورت بچہ اللہ سبحانہٗ عطا فرما دیتے ہیں تو شکر یہ کے لیے اعمال نیاز کا قبلہ دیویوں، اوتاروں، ولیوں اور حضرتوں کو بنا لیا جاتا ہے اور بچہ کا ایسا نام رکھ دیا جاتا ہے۔ کہ گویا وہ خدا کی عنایت نہیں بلکہ کسی اور کی عنایت کا نتیجہ ہے، جیسے پیراں دتا، حسین بخش، میراں بخش، پیر بخش، عبدالعزیٰ، عبدالشمس وغیرہ۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہیے کہ اس آیت میں انسان کی اس کمزوری کو بھی بتایا گیا ہے کہ انسان اپنی اصل ضرورت اور اصل احتیاج کے وقت تو اپنے رب ہی کی طرف متوجہ ہوتا ہے لیکن جب وہ احتیاج پوری ہو جاتی ہے تو وہ اس کو دوسرے اسباب و وسائل کا کرشمہ قرار دیتا ہے۔ یہ ایک ایسی بدیہی حقیقت ہے کہ اس کا تجزیہ ہر شخص خود کر سکتا ہے۔

انسان کی عام حالت یہی ہے اور یہاں عام حالت ہی بیان ہوئی ہے۔ ممکن ہے کہ کچھ ایسے ہی ہوں جو کسی حال میں بھی اللہ سبحانہٗ کی طرف متوجہ نہ ہوتے ہوں لیکن قرآن نے بڑے سے بڑے باغی کا بھی یہی حال بیان کیا ہے۔ جیسے فرعون اسے بھی آڑے وقت خدا ہی یاد آیا۔ آدمی پر جب واقعی محتاجی اور نیازمندی کی حالت طاری ہوتی ہے تو وہ دل دل میں یا زبان اور دل دونوں ہی سے خدا کو پکارتا ہے اور یہ عہد بھی کرتا ہے کہ اگر اس بلا سے نکل گیا تو آئندہ وہ اپنے رب کا شکر گزار بندہ بن کر رہے گا لیکن جونہی وہ اس مرحلہ سے گزر جاتا ہے تو یک دم خدا فراموشی بلکہ خود فراموشی کا شکار ہو جاتا ہے۔

مخلوقیت احتیاج کی مظہر ہے

۲۴۹ — کیا لوگ اللہ کے ساتھ ان کو شریک ٹھہراتے ہیں جو خالق نہیں ہیں، مخلوق ہیں نہ وہ شریک بنانے والوں کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی۔ پہلے ایک طرح کے شرک کا ذکر تھا، اس کی مناسبت سے اس آیت میں بت پرستی کا رد فرماتے ہیں۔ یعنی جو کسی کو پیدا نہ کر سکے بلکہ خود تمہارا بنایا ہوا ہو وہ تمہارا خدا یا معبود کیسے بن سکتا ہے[1] قرآن کا عام

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اسلوب بیان یہ ہے کہ وہ توحید خالقیت سے توحید الوہیت سے استدلال کرتا ہے۔ اس استدلال کے لیے اس کے مختلف انداز ہیں۔ کبھی کہتا ہے کہ اللہ ہی تمہارا خالق ہے۔ اس لیے اس کے سوا تمہارا کوئی معبود نہیں۔ اور کبھی کہتا ہے جن کو تم عبادت میں نیازمندی میں اور عجز و نیاز کے اعمال میں اللہ کا شریک بناتے ہو وہ خالق نہیں مخلوق ہیں۔ اور مخلوق ہو کر کوئی بھی خالق کا ہمسر نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ یہاں بھی شرک فی التسمیہ کی شناخت بیان کرنے کے بعد فرمایا ایشرکون مالا یخلق شیأ وھم یخلقون وہ لوگ خدا کے ساتھ کن ہستیوں کو شریک ٹھہراتے ہیں ایسوں کو جو کسی چیز کے خالق نہیں ہیں بلکہ خود مخلوق ہیں۔ خالق اور مخلوق میں برابری ہو۔ یہ کوئی عقل انسانی باور نہیں کر سکتی۔ یعنی لوگوں کی حالت یہ ہے کہ جب حمل ہوتا ہے تو اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے ہیں۔ جب بچہ پیدا ہو جاتا ہے تو دوسروں کی طرف اس اولاد کو منسوب کر دیتے ہیں کہ فلاں بزرگ یا فلاں پیر یا فلاں دیوتا نے دیا ہے یا اس کا نام شرکیہ رکھتے ہیں یا غیروں کے در پر وہ بچہ سے ماتھا رکھوا تے کہ تم نے یہ اولاد دی ہے یہ سب باتیں شرک ہیں جو پیر یا دیوتا خود ہی پیدا ہونے میں اللہ کا محتاج ہے وہ کسی کو کیا پیدا کر سکتا ہے یا کسی کو کیا اولاد دے سکتا ہے۔ آپ اگر موٹر کا ہینڈل پکڑ کر موٹر سے یہ کہنا خلاف عقل سمجھتے ہیں کہ اے موٹر مجھے موٹر دے دے تو پھر کسی مخلوق سے بچہ مانگنا یا ہوئے بچہ کو اس کی داد و دہش قرار دینا کہاں کی دانشمندی ہے۔ قرآن کا یہ شکوہ بلاشبہ مشرکین سے ہے۔ لیکن یہ بڑے درد اور دکھ کی بات ہے کہ مسلمان بھی اس بیماری میں مبتلا ہو گئے، بلکہ سچ پوچھو تو آج کے مسلمان مشرکین کو بھی شرمات دے گئے۔ مشرکین تو بچہ پیدا ہونے پر اللہ کی اس دین میں دوسروں کو شکریہ کا مستحق گردانتے تھے۔ ان سے شکوہ صرف یہ تھا کہ وہ ناموں میں دوسروں کو شریک کرتے ہیں اور آج کے مدعیان توحید تو اولاد کی دعا بھی غیروں سے مانگتے ہیں۔ مزاروں پر جا کر اولاد مانگتے ہیں۔ حمل کے زمانے میں منتیں بھی غیروں کی مانتے ہیں اور بچہ پیدا ہونے کے بعد نیاز بھی ان کی دیتے ہیں۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی قرآن کا یہ انکشاف ہمارے لیے بڑا ہی عبرت انگیز ہے کہ لا یستطیعون لھم نصرا ولا انفسھم ینصرون۔ یعنی جن ہستیوں اور شخصیتوں کو وہ خدا کا شریک بناتے ہیں وہ نہ تو شریک بنانے والوں کی مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی مدد کر سکتے ہیں۔ یاد رہے کہ اس ارشاد کا مصداق بت نہیں بلکہ وہ شخصیتیں ہیں جن کے انہوں نے بت بنا رکھے تھے۔ گئے

قرآن نے ان شخصیتوں کی بے بسی، بے کسی اور بے چارگی کی جو تصویر پیش کی ہے وہ سننے کے لائق ہے۔ سادہ لوح لوگ ان آیات سے یہ کہہ کر گزر جاتے ہیں کہ یہ آیات بتوں کے بارے میں ہیں۔ یاد رکھو کہ ان آیات میں بتوں کا نہیں بلکہ ان کا ذکر ہے جن کے لوگوں نے بت بنا رکھے تھے۔

خالقیت سے توحید پر استدلال

۲۵۰۔ بلکہ اگر تم ان کو راستہ کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری پکار کے جواب میں ایک قدم بھی نہ اٹھائیں گے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ تم ان کو پکارو یا تم خاموش رہو دونوں حالتوں میں تمہارے حق میں نتیجہ برابر ہے۔ یعنی جن بتوں کو تم نے معبود ٹھہرایا ہے اور خدائی کا حق دیا ہے وہ تمہارے کام تو کیا آئیں گے وہ تو خود اپنی حفاظت پر بھی قادر نہیں ہیں اور باوجود مخلوق ہونے کے ان کے کمالات سے محروم ہیں جن سے کسی مخلوق کو دوسری مخلوق پر تفوق حاصل ہو سکتا ہے گو ان کے ظاہری ہاتھ پاؤں، آنکھ، کان سب کچھ تم بناتے ہو لیکن ان اعضا میں وہ قوت نہیں جن سے انہیں اعضا کہا جا سکے[1] اس آیت کا مصداق عام شارحین قرآن کی ہمنوائی میں شیخ الاسلام نے ہاتھوں کے بنائے ہوئے بتوں کو بتایا ہے۔ لیکن یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک اشخاص ہیں جن کو ہم بت یا اصنام کہتے ہیں۔ اور ایک وہ شخصیتیں جن کے بت بنائے جاتے ہیں۔ ہمارے نزدیک یہاں بت نہیں بلکہ وہ شخصیتیں مراد ہیں جن کے بت بنا کر لوگ پوجا کر رہے ہیں اس کی دلیل یہ ہے۔

۱۔ ان آیات میں وہ صیغے، الفاظ استعمال ہوئے ہیں جو عربی زبان میں ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتے ہیں اور یہ ایک کھلی اور واضح بات ہے کہ ذوی العقول وہ ہستیاں ہیں جن کے بت بنائے جاتے ہیں، وہ مورتیاں نہیں جن کو پوج رہے ہیں۔ یہاں دھم یخلقون، لا یستطیعون۔ انفسھم ینصرون۔ لا یتبعوا، ھم یہ ساری تعبیرات بتا رہی ہیں کہ ان سے وہ ہستیاں مراد ہیں جن کے بت بنا کر وہ پوج رہے ہیں۔

۲۔ قرآن نے ان کو جواب دیا ہے کہ جن کو تم شریک کر رہے ہو وہ تو خود مخلوق ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

خالق نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ خدا کی مخلوق وہ ہستیاں ہیں نہ کہ بُت۔

۳۔ آگے آیت میں ان کے بارے میں کھول کر بتایا ہے کہ عباد امثالکم وہ تمہارے جیسے بندے ہیں اور معلوم ہے کہ یہ تعبیر ان ہستیوں کے لیے ہے جن کے بُت بنائے گئے ہیں۔ عباد امثالکم کی تعبیر قرآن میں کہیں بُتوں کے لیے نہیں آئی۔ اس بنا پر اس آیت میں اصلاً قرآن کی تنقید کا رُخ بُت نہیں بلکہ وہ ہستیاں ہیں جن کے بُت بنائے گئے ہیں اور بُتوں پر تنقید اس آیت میں ضمناً ہے۔ قرآن کے مترجمین میں سے حضرت شاہ عبدالقادر اور حضرت شیخ الہند کی نگاہ اس باریک فرق پر گئی ہے۔ وہ آیت ایشرکون ما لا یخلق شیأ وھم یخلقون کا ترجمہ کرتے ہیں، کیا شریک بناتے ہیں ایسوں کو جو نہ پیدا کریں ایک چیز بھی اور وہ پیدا ہوئے ہیں۔ اور شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں، کن کو شریک بناتے ہیں جو پیدا نہ کریں ایک چیز اور آپ پیدا ہوئے ہیں۔ اور نئے مفسرین میں سے مولانا آزاد فرماتے ہیں یہ لوگ خدا کے ساتھ کن ہستیوں کو شریک ٹھہراتے ہیں ایسوں کو جو کوئی چیز پیدا نہیں کر سکتے اور خود کسی کے پیدا کیے ہوئے ہیں۔ قرآن کا عام استدلال یہی ہے کہ جن کو تم اللہ کا شریک اپنا شفیع کہتے ہو وہ خالق نہیں بلکہ مخلوق ہیں اور وہ خواہ کتنا ہی اُونچا ہو خالق کے ہمسر نہیں ہو سکتا۔ یہ قرآن کا نظام ربوبیت سے توحید پر استدلال ہے یعنی ایک طرف اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی ہے جو تمام کائنات کی خالق ہے اور جس کی تخلیق کا اعتراف تمہارے دل کے ایک ایک گوشہ میں ہے۔ اس کے سوا تمہاری پرستش اور بندگی کا مستحق کون ہو سکتا ہے ایشرکون ما لا یخلق شیأ وھم یخلقون۔ اور آیت کی یہ خاص بلاغت ہے کہ ایک ہی آیت میں دونوں پر ضرب کاری لگائی ہے۔ شروع میں مالا کہ شخصوں اور بُتوں پر اور باقی آیت میں جمع مذکر کے صیغے لا کر ان شخصیتوں اور ہستیوں پر جن کے بُت بنا کر پُوج رہے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ میں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اس کی نشاندہی کی ہے۔

آیت میں ان ہستیوں کے بارے میں پہلے یہ بتایا ہے کہ یہ خالق نہیں ہیں بلکہ مخلوق ہیں۔ دوسری بات یہ بتائی ہے کہ وہ تمہاری حاجت روائی کیا کریں گے وہ تو اپنی مدد ہی نہیں کر سکتے۔ پھر ان کی بے بسی اور بے کسی یہ کہہ کر جتائی ہے۔ اگر تم ان کو راہ بتانے کے پکارو تو تمہاری پکار پر کوئی قدم نہ اُٹھائیں۔ یعنی معبود سے عابد کی سب سے بڑی ضرورت

یہ ہوتی ہے کہ وہ ان کو زندگی کے ہر گوشہ میں اس کی رہنمائی کرتا ہے لیکن تمہارے معبودوں کا حال یہ ہے کہ اگر تم ان کو زندگی کے موڑ پر پکارو کہ آؤ ہماری رہنمائی کرو تو وہ تمہاری پکار سے بالکل بیگانہ رہیں اور نہ تمہاری رہنمائی کے لیے تمہارے ساتھ نہ ہوں لفظ اتباع پیچھے چلنا اور ساتھ ہونے کے معنے میں ہے۔ آگے اسی بات کو کھول کر بتایا ہے کہ تم ان کو پکارو یا خاموش رہو دونوں کا نتیجہ تمہارے حق میں برابر ہے ۔

إِنَّ الَّذِينَ تَدْعُونَ مِنْ دُونِ اللَّهِ عِبَادٌ أَمْثَالُكُمْ فَادْعُوهُمْ فَلْيَسْتَجِيبُوا لَكُمْ إِنْ كُنْتُمْ صَادِقِينَ ﴿۱۹۴﴾ أَلَهُمْ أَرْجُلٌ يَمْشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَيْدٍ يَبْطِشُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ أَعْيُنٌ يُبْصِرُونَ بِهَا ۖ أَمْ لَهُمْ آذَانٌ يَسْمَعُونَ بِهَا ۗ قُلِ ادْعُوا شُرَكَاءَكُمْ ثُمَّ كِيدُونِ فَلَا تُنْظِرُونِ ﴿۱۹۵﴾

بلاشبہ وہ ہستیاں جن کو تم خدا سے ورے ورے پکارتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے بندے ہیں، اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ان کو تمہاری پکار کا جواب دینا چاہیئے۔[۲۵۱] کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے وہ چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں، یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں۔[۲۵۲] اے اللہ کے پیغمبر ان لوگوں سے کہہ دو کہ تم اپنے خدا کی عبادت میں شریک ہونے والوں سے دُعا کرو اور

ان کو پکارو پھر میرے خلاف خفیہ تدبیریں کرو اور مجھے بالکل مہلت نہ دو۔ ۲۹۳

مفردات کے معانی

عباد، بندے، غلام، عبد کی جمع امام راغب لکھتے ہیں جو عبد بمعنی غلام کے ہے اس کی جمع عبید آتی ہے اور جو عبد بمعنی عابد ہے یعنی پرستار حق، اس کی جمع عباد ہے تاج العروس میں ہے عبد وہ ہے جو اپنے خالق کا پروردہ ہو۔ ابن حزم کا کہنا ہے کہ عبد کا لفظ مذکر و مونث دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ قاضی شوکانی فرماتے ہیں کہ عبد تعبد سے بنا ہے جس کے معنے فروتنی اور عاجزی کے ہیں اور امام بغوی فرماتے ہیں عبد کو عبد اس کی فروتنی اور عاجزی کی وجہ سے کہتے ہیں۔ ان معانی کا تقاضا ہے کہ آیت میں عباد سے بت نہیں۔ بلکہ وہ ہستیاں مراد ہیں جن کی نمائندگی اصنام یا تصاویر کرتی ہیں - شرکاء شریک کی جمع ہے جیسے فقیہ کی جمع فقہاء، ساتھی اور ساجھی کو کہتے ہیں۔ مشرکین اللہ کی عبادت میں جن کو شریک کرتے تھے ان کو ہی قرآن شرکاء کہتا ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مشرکین نے کچھ بزرگوں اور نیک لوگوں کے بارے میں یہ خیال کر لیا تھا کہ انہوں نے اللہ کی عبادت کر کے اللہ کا قرب حاصل کر لیا ہے اس کے نتیجہ میں اللہ نے ان کو الوہیت کا مقام دے دیا ہے۔ اس لیے یہ نیک لوگ ساری مخلوقات میں ہمارے نیازمندانہ اعمال کے مستحق ہیں۔ ان کو وہ دانائے غیب اور حاضر و ناظر سمجھتے تھے اور ان کا خیال تھا کہ یہ حلال مشکلات اور کشاف حاجات ہیں۔ ان ہی بزرگوں کی مورتیاں اور تصویریں بنا کر ان کی عبادت کرتے تھے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں مشرکین اپنی حاجتوں میں غیر اللہ سے استعانت کرتے تھے مثلاً بیمار کی شفا فقیر کی مالداری کی خاطر اور ان کی نذریں مانتے تھے اور نذروں کی راہ سے ان کو اپنے مقاصد پورے ہونے کی توقع ہوتی تھی - اور برکت کے لیے ان کے ناموں کا ورد کرتے تھے - اللہ تعالیٰ نے اسی لیے یہ ضروری قرار دیا کہ مسلمان یوں کہیں ایاک نعبد وایاک نستعین ۔

یہ ہستیاں بھی تمہاری طرح کے بندے ہیں

مشرکین کا عقیدہ تھا کہ جن مورتیوں کی وہ عبادت کرتے ہیں یہ بڑے بڑے عظیم الشان بزرگوں کی مورتیاں ہیں۔ ان کا موقف یہ تھا کہ جیسے ایک بادشاہ اپنے غلام کی حسن کاری سے خوش ہو کر اس کو حکومت کے اختیارات دے دیتا ہے اور مملکت میں اس کو اپنا شریک کار بنا لیتا ہے اسی طرح اللہ تعالیٰ نے بزرگوں کی عابدانہ سرشاریوں سے ہو کر ان کو اپنا شریک کار بنا لیا ہے۔ لہٰذا اب کوئی عبادت ان کی عبادت کی آمیزش کے بغیر قبول نہیں ہوتی ہے بلکہ اللہ کی ذات بالا و برتر ہے۔ تقرب کی خاطر اس کی عبادت سود مند نہیں ہے۔ اس کے تقرب کا صرف ایک راستہ ہے اور وہ یہ کہ ان بزرگوں کی عبادت کی جائے تاکہ یہ ہمیں اللہ کے قریب کر دیں۔ اس کی خاطر وہ ان بزرگوں کے لکڑی، پتھر، سونے چاندی اور لوہے کے مجسمے تیار کرتے ان کو وہ اصنام کہتے۔ امام راغب لکھتے ہیں الصنم جثۃ متخذہ من فضۃ او نحاس او خشب۔ اور اگر ان بزرگوں سے متعلق کوئی یادگاری مقام ہو تو وہاں کچھ پتھر رکھ دیے جاتے ہیں اور ان پتھروں کی پوجا کرتے۔ امام راغب لکھتے ہیں ھو حجارۃ کانت تعبد اردو میں اسے ستان یا تھان کہتے ہیں۔ ابوداؤد میں ایک حدیث آتی ہے ثابت بن الضحاک کہتے ہیں کہ ایک شخص نے زمانۂ نبوت میں یہ نذر مانی کہ بوانہ جا کر اونٹ ذبح کروں گا۔ اس نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کی خبر دی۔ حضور نے فرمایا کہ ھل کان فیھا وثن من اوثان الجاھلیۃ وہاں جاہلیت کے ستھانوں میں سے کوئی ستھان تو نہیں ہے۔ صحابہ نے کہا نہیں۔ پھر دریافت فرمایا کہ مشرکین کے میلوں میں سے وہاں کوئی میلہ تو نہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ وثن عربی میں وہی ہے جسے ہم اردو میں ستھان کہتے ہیں۔ اور کچھ بزرگوں کی وہ قلمی تصاویر بنا لیتے۔ راغب لکھتے ہیں کہ الشئ المصور ان کی بھی پوجا کرتے۔ ان کے پوجنے کی انواع بے شمار تھیں۔ حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہ کا اس موضوع پر وہ نوٹ بے حد قیمتی ہے جو انہوں نے الفوز الکبیر میں سپرد قلم کیا ہے۔ ہم ناظرین معالم القرآن کی ضیافت طبع کے لیے یہاں درج کرتے ہیں۔

شرک یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے علاوہ کسی اور کے لیے ان صفات میں سے کوئی چیز ثابت کی جائے جو اللہ تعالیٰ کے خاص ہیں مثلاً جہاں میں اس ارادے

سے تصرف کرنا جس کو کُنْ فیکون سے تعبیر کیا جاتا ہے یا علم ذاتی ثابت کیا جائے جو بغیر حواس اور عقلی دلیل اور خواب اور الہام وغیرہ کے حاصل کیا گیا ہو، یا بیمار کی بیماری کو دور کرنے کی صفت ثابت کی جائے یا کسی شخص پر ایسی پھٹکار اور ناراضگی ڈالی جائے کہ اس کی وجہ سے اس پر رزق تنگ ہو جائے یا کسی شخص پر رحمت کی جائے جس کی بنا پر اس پر رزق کی وسعت ہو اور اس کو صحت ہو جائے اور نیک بخت ہو جائے (یہ تمام صفات صرف اللہ سبحانہٗ کے لیے خاص ہیں) یہ مشرکین کارِ تخلیق میں یا بڑے بڑے کاموں کی تدبیر و تصرف میں کسی کو خدا کا شریک نہ گردانتے تھے اور کسی کے لیے یہ قدرت ثابت نہیں کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ جب کسی امر کا فیصلہ کر چکتا ہے تو وہ اس کو ٹال دیتے ہیں۔ ان کا شرک یہ تھا کہ بعض بندوں کے بارے میں یہ خیال کرتے تھے کہ وہ کچھ مخصوص کام کر سکتے ہیں اور اس بارے میں ان کی سوچ یہ تھی کہ علی الاطلاق بادشاہ تو اللہ تعالیٰ ہی ہے لیکن وہ اپنے بعض بندوں کو الوہیت کی خلعت سے مشرف کر دیتا ہے اور ان کی رضا اور ناراضگی کو سب بندوں پر ترجیح دیتا ہے۔ جیسے ایک بڑی شان والا بادشاہ اپنے خاص غلاموں کو اطرافِ مملکت میں روانہ کرتا ہے اور کچھ امورِ مملکت میں تصرف کے اختیارات دے دیتا ہے تا آنکہ بادشاہ سے اس کے خلاف کوئی حکم صادر ہو، سو بادشاہ ان جزوی اُمور کی طرف توجہ نہیں کرتا اور لوگوں کے معاملات غلاموں کے سپرد کر دیتا ہے اور لوگوں کے بارے میں ان کی سفارش قبول کرتا ہے جو اس کی خدمت میں مشغول رہتے ہیں اور اللہ ان کو وسیلہ بنا دیتا ہے۔ اس عقیدے کی وجہ سے مشرکین اللہ تعالیٰ کے ان خاص بندوں کا تقرب ضروری سمجھتے ہیں تاکہ ان کو بادشاہ مطلق کے یہاں آسانی سے شرف باریابی حاصل ہو۔ اور ضرورت کے موقعہ پر ان بندگانِ خاص کی سفارش ان کے بارے میں قبول ہو سکے۔ اسی لیے مشرکین ان بندگانِ خدا کو سجدہ کرنا جائز سمجھتے ہیں۔ ان کے نام کے جانور ذبح کرتے ہیں اور ان کے ناموں کی قسمیں کھاتے ہیں۔ ضروری معاملات میں ان کو شانِ کُن فیکون کا حامل سمجھ کر مدد مانگتے ہیں اور مشرکین ان خاص بندگان

خدا کے پتھر، لوہے اور پیتل کے مجسمے بنالئے اور ان کو قبلہ بنا کر ان بزرگوں کی ارواح سے استفادہ کرتے تھے۔ نادانوں نے بعد میں آہستہ آہستہ ان پتھروں کو معبود سمجھ لیا۔ اور اس کے نتیجہ میں سارا معاملہ خلط ملط ہو کر رہ گیا۔ قرآن نے آیت میں عباد امثالکم کہہ کر اس ساری داستان کو بیان کر دیا ہے۔

مخلوق کو پکارنا حماقت ہے

۲۵۱۔ بلاشبہ وہ ہستیاں جن کو تم خدا سے ورے ورے پکارتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے بندے ہیں۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ان کو پکارو ان کو تمہاری پکار کا جواب دینا چاہیے۔ یعنی تعجب ہے کہ جو چیزیں مملوک و مخلوق ہونے میں تم ہی جیسی عاجز و درماندہ بلکہ وجود و کمالات وجود میں تم سے بھی گئی گزری ہوں۔ ان کو معبود بنا لیا جائے اور جو انکار کرے اسے نقصان پہنچنے کی دھمکیاں دی جائیں۔ چنانچہ مشرکین مکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کہتے تھے کہ آپ ہمارے بتوں کی بے ادبی کرنا چھوڑ دیں ورنہ معلوم نہیں وہ کیا آفت تم پر نازل کر دیں یخوفونك بالذین من دونه (زمر رکوع ۴) اسی کا جواب قل ادعوا شرکاءکم الخ سے دے دیا۔ یعنی تم اپنے سب شرکاء کو پکارو اور میرے خلاف اپنے سارے منصوبے اور تدبیریں پوری کر لو۔ پھر مجھ کو ایک منٹ کی بھی مہلت نہ دو۔ دیکھو تم میرا کیا بگاڑو گے[1]

اس ساری تشریح کا مدار اس پر ہے کہ آیت میں بتوں کا ذکر ہو رہا ہے لیکن جیسا آپ سن چکے ہیں کہ قرآن کا روئے سخن مورتیوں اور بتوں کی طرف نہیں بلکہ ان شخصیتوں اور ہستیوں کی طرف ہے جن کی یہ تصاویر، مورتیاں اور بت بنائے گئے ہیں۔ مخاطبوں کا عقیدہ تھا کہ جن مورتیوں کی وہ پوجا کرتے ہیں، وہ مورتیاں بڑے بڑے عظیم الشان بزرگوں کی ہیں۔ ان کی تردید میں ارشاد ہوا ہے کہ تمہارے معبود کوئی بھی ہوں تمہاری ہی طرح وہ اللہ کے بندے ہیں۔ ان کو اپنے نفع و نقصان کا بھی کوئی اختیار نہیں تمہاری مدد کیا خاک کریں گے۔ اچھا اگر تمہارے خیال میں وہ تمہاری پکار سنتے ہیں اور تمہاری مشکلات میں تمہارے کام آتے ہیں تو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان کو پکار کر دیکھو۔ انہیں چاہیے کہ وہ تمہاری پکار کا جواب دیں اور تمہارا کہا مانیں۔ اگر تمہارا یہ دعویٰ صحیح ہے کہ وہ کچھ کر سکتے ہیں جو تم نہیں کر سکتے۔ نبوت کی جانب سے یہ مشرکین کو کھلا چیلنج ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اب تک تو تم نے ان خیالی معبودوں کو جو چاہا مانا اور جو چاہا منوایا۔ لیکن اب قرآن اور نبوت نے ان سب کی معبودیت کو چیلنج کیا ہے۔ اب وقت ہے کہ وہ تمہاری مدد کریں اور تم کو بھی اور اپنے آپ کو میری زد سے بچائیں۔ اگر انہوں نے اپنی معبودیت کو بچا لیا تو معلوم ہو جائے گا کہ تم سچے ہو۔ آیت قرآنی کا مفاد یہ ہے کہ جن ہستیوں کو تم معبود بنا کر ان کی عبادت کرتے ہو وہ تمہارے ہی جیسے اللہ سبحانہٗ کے بندے ہیں ان کو اگر تم پکارو گے ان سے اگر دعائیں کرو گے تو وہ تمہاری دعائیں کبھی قبول نہ کریں گے۔ دوسری جگہ ارشاد ہے:

ومن اضل ممن یدعون من دون اللہ من لا یستجیب لہ الی یوم القیامۃ وھم عن دعائھم غافلون۔

اس سے بڑھ کر کون گمراہ ہوگا جو اللہ کو چھوڑ کر ایسوں کو پکار رہا ہے جو قیامت تک بھی اس کی بات کا جواب نہ دے سکیں گے بلکہ ان کو اس کی دعا کی خبر ہی نہیں۔

یعنی مشرک پرلے درجے کے بے وقوف ہیں کہ خدا جیسے قدرت و علم والے کو چھوڑ کر دوسروں کو پکارتے ہیں جو نہ تو ان کی پکار سنتے ہیں اور نہ کسی بات کی ان میں قدرت ہے۔ اگر یہ قیامت تک بھی پکارتے رہیں تو وہ کچھ نہیں کر سکتے۔ معلوم ہوا کہ جو لوگ بزرگوں کو دور سے پکارتے ہیں اور انہیں پکار کر صرف یہی کہتے ہیں کہ یا حضرت آپ دعا فرما دیں کہ اللہ سبحانہٗ ہماری حاجت براری فرما دیں یہ بھی شرک ہے اگرچہ وہ اس بنا پر اسے شرک نہ سمجھیں کہ حاجت براری کی دعا تو اللہ ہی سے کی گئی ہے۔ لیکن شرک اس لیے ہے کہ ان کے بارے میں یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ دور سے اور نزدیک سے برابر سنتے ہیں حالانکہ یہ خدائی شان ہے۔ اسی لیے ارشادِ نبوت میں اسے سب سے بڑا گناہ بتایا گیا ہے ارشاد ہے:

عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ ایک شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ سب سے بڑا گناہ کون سا ہے فرمایا کہ تو کسی کو اللہ کا ہمسر بنا کر پکارے حالانکہ اللہ نے تجھے پیدا کیا ہے۔

یعنی جس طرح اللہ سبحانہٗ کو حاضر و ناظر سمجھا جاتا ہے اسی طرح غیر اللہ کو اسی صفت

سے متصف مان کر پکارنا سب سے بڑا گناہ ہے۔

معبودوں کی ظاہری کمال سے محرومی

۲۵۲۔ کیا ان کے پاؤں ہیں جن سے چلتے ہیں یا ان کے ہاتھ ہیں جن سے پکڑتے ہیں یا ان کی آنکھیں ہیں جن سے وہ دیکھتے ہیں یا ان کے کان ہیں جن سے وہ سنتے ہیں۔
اس آیت میں مشرکوں کی حماقت پر ایک اور ضرب کاری لگائی ہے مگر تفنن کے طور پر تعبیر کا انداز بدل دیا ہے۔ بُت پرستی کے اجزاء ترکیبی دو ہیں۔ ایک اصنام، اوثان اور تماثیل، دوسرے وہ ہستیاں جو فی الواقع ان کے خیالی معبود ہیں اور جن کی نمائندگی اصنام و اوثان کرتے ہیں۔ پہلے قرآن نے ہستیوں کے بارے میں ان کی حماقت کو ظاہر کیا کہ ان سے دُعائیں مانگتے ہو جو دُعا کو قبول ہی نہیں کر سکتے، جو تمہاری دُعاؤں کو سنتے ہی نہیں۔ اور جن کو تمہاری دُعاؤں کی خبر نہیں ہے۔ اب رُوئے سخن ان اصنام کی طرف کر دیا جو ان ہستیوں کی نمائندگی کرتے ہیں، فرمایا دیکھ لو اور غور کرو ان بُتوں کے جو پاؤں تم نے خود بنائے ہیں کیا وہ ان پیروں سے چلتے ہیں اور جو ہاتھ تم نے بنا رکھے ہیں وہ ہاتھوں کو گرفت کے لیے استعمال کرتے ہیں اور جن آنکھوں کو تم نے بنایا ہے کیا ان کو ان آنکھوں سے کچھ نظر آتا ہے۔ یہ اپنے چہرے سے مکھی نہیں ہٹا سکتے، اپنے پیروں سے چل نہیں سکتے۔ اپنی آنکھوں سے دیکھ نہیں سکتے۔ پھر یہ تمہاری کیا خاک مدد کریں گے۔ اور جب ان میں فاعلی قوتیں ہی نہیں ہیں تو ان سے کسی فعل کا صدور کیسے ہو سکتا ہے۔ اس سے زیادہ عقل کی یتیمی اور کیا ہوگی کہ آنکھوں والا اس کو اپنا رہبر کہے جو بینائی سے ہی محروم ہے، چلنے کی طاقت رکھنے والا اس سے پیروں میں توانائی کی دُعائیں مانگے جس کے پاس چلنے کی قوت نہیں۔ ایک بے حس اندھے بہرے ڈھانچہ سے توانائیوں کی درخواست کرے، یہ حماقت نہیں تو اور کیا ہے۔ کمہار اپنے بنائے ہوئے پیالہ سے کہے مجھے پیالہ بنا دے، یہ دیوانگی اور پاگل پن نہیں تو اور کیا ہے۔ اندھی عقیدت انسان کو اندھا اور بہرا بنا دیتی ہے۔ کوئی نہیں جانتا یہ سب کچھ عقل سے بیگانہ ہو کر محض توہمات کی بنیاد پر ہو رہا ہے۔ جیسا کہ آپ سن آئے ہیں کہ ان آباء اشخاص اور شخصیتوں دونوں کی طرف اشارہ کرنے کے لیے بلیغانہ تفنن ہے۔ اس تفنن کی طرف شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اشارہ کیا ہے فرماتے ہیں:

اسی لیے اللہ نے مشرکین کی تردید دو طرح سے کی ہے یہ کہہ کر ملک و اقتدار صرف اللہ کا ہے اس میں کوئی ہستی شریک نہیں ہے اور کبھی یہ کہہ کر کہ یہ بت جن کی تم پوجا کرتے ہو بے جان جمادات ہیں الھم ارجل یمشون بہا الخ۔

عام شارحین قرآن نے یہاں اصنام کی قید لگائی ہے۔ اس سے لوگوں نے اس کا مطلب سمجھنے میں سنگین غلطی کی ہے۔ ضروری ہے کہ یہاں اس غلط فہمی کو بھی دُور کر دیا جائے۔ اور کھول کر بتا دیا جائے کہ دُنیا میں کوئی قوم ایسی نہیں گزری جس نے محض لکڑی، پتھر اور اینٹ کی پوجا کی ہو اور بے جان مورت کو الٰہ بنایا ہو بلکہ بُت، تصویر اور مجسمہ جب بھی بنایا گیا ہے کسی جاندار مخلوق بلکہ بزرگوں اور پیغمبروں اور نیک بندوں کے نام اور شکل ہی پر بنایا گیا ہے اور بُتوں سے وہ ہی کام لیا جو نااہل لوگ تصور شیخ سے یا غالی لوگ تصویر سے لیتے ہیں کہ ان کے سامنے رکھنے سے صاحب تصویر کا خیال جمنے کی وجہ سے یکسوئی اور یک جہتی حاصل ہوتی ہے اور خیالات پراگندہ نہیں ہوتے۔

قرآن حکیم نے حضرت نوح کے زمانے کے جن پانچ الٰہوں کا ذکر کیا ہے اور جن کی پرستش کی جاتی تھی اور جن کے نام ود، سواع، یغوث، یعوق اور نسر ہیں۔ یہ حضرت نوح کے زمانے کے نیک اور صالح اشخاص تھے (بخاری ۲ ص ۷۳۲) اور شاہ عبدالعزیز نے اس پر یہ اضافہ کیا ہے کہ یہ پانچوں نام حضرت ادریس علیہ السلام کے صاحبزادوں کے ہیں، بہت نیک تھے۔ ابن کثیر نے بھی اسی کے قریب قریب لکھا ہے۔ جلال الدین السیوطی رقمطراز ہیں کہ قرآن میں بتوں کے ایسے نام جو انسانوں کے نام تھے یہ ہیں۔ ود، سواع، یغوث، یعوق، نسر۔ گویا نوح علیہ السلام کے زمانے کے پانچ پیر تھے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں یہ بھی انکشاف فرمایا ہے کہ:

> ان کے کافی پیر و کار تھے۔ جب ان کی وفات ہوئی تو ان کے عقیدتمندوں نے کہا کہ اگر ہم ان کا تصور پیش نظر رکھیں تو عبادت بڑی پُر کیف اور ذوق و شوق سے ہوگی اس طرح انہوں نے ان کی تصویریں بنالیں۔

اغاثۃ اللہفان میں حافظ ابن القیم الجوزی لکھتے ہیں:

> اکثر سلف کا بیان ہے کہ یہ پانچ حضرات جناب نوح علیہ السلام کی قوم کے نیک لوگ تھے جب وہ وفات پا گئے تو لوگوں نے ان کی قبروں کی

مجاوری کرلی۔ پھر ان کی تصویریں اور مجسمے بنا لیے۔ پھر جب کافی زمانہ گزر گیا تو ان کی عبادت شروع کر دی گئی۔

قرآن حکیم میں ایک بت نامی لات کا ذکر ہے۔ یہ کون تھا؟ یہ ایک نیک آدمی تھا جو حاجیوں کو ستو گھول گھول کر پلایا کرتا تھا جس کے نام پر یہ بت بنایا گیا تھا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ، حضرت مجاہدؒ، اور حضرت ربیع ابن انسؓ وغیرہ مفسرین قرآن کا بیان ہے کہ لات ایک آدمی کا نام تھا جو ایام جاہلیت میں حاجیوں کو ستو گھول کر پلاتا تھا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ جب اس کی وفات ہو گئی تو لوگوں نے اس کی قبر پر اجتماع شروع کر دیا اور اس کی عبادت ہونے لگی۔ یہ عبادت کیسی تھی۔ حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

اللہ تعالیٰ نے مشرکین مکہ کو کافر کہا کیونکہ انہوں نے ایک سخی انسان کو جو حاجیوں کو پانی میں ستو ملا کر پلاتا تھا منصب الوہیت دے دیا تھا اور تکالیف میں اس سے مدد مانگتے تھے۔

۸ھ میں فتح مکہ کے وقت کعبۃ اللہ میں تین سو ساٹھ بت نصب تھے۔ ان میں خصوصیت کے ساتھ صورۃ ابراھیم و اسماعیل فی ایدیھما من الازلام۔ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل کی تصویریں بھی تھیں جن کے ہاتھوں میں لاٹری کے تیر تھے (صحیح بخاری) مسند امام احمد میں ہے کہ ان تصویروں اور مجسموں میں حضرت مریم کی تصویر بھی تھی۔ (البدایہ والنہایہ)

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ عزّیٰ ایک پری تھی جن درختوں میں اس کا ظہور ہوا تھا۔ ان کو لوگوں نے متبرک سمجھ کر عبادت گاہ بنا لیا تھا (معجم البلدان)

حافظ ابن کثیر نے مشہور محدثین نسائی اور بیہقی کے حوالے سے لکھا ہے کہ جب ۸ھ میں مکہ فتح ہوا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد کو عزّیٰ کی بیخ کنی کے لیے روانہ کیا، وہ تشریف لے گئے اور کیکر کے تین درخت کاٹ کر اور ایک مکان کو گرا کر واپس آ گئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دریافت فرمایا، خالد! کیا کر آئے۔ انہوں نے سارا قصہ سنا دیا فرمایا تم نے کچھ بھی نہیں کیا۔ پھر جاؤ اور جا کر عزّیٰ کو ختم کر کے آؤ۔ چنانچہ جب وہاں پہنچے تو مجاور یہ کہہ رہے تھے یا عزّیٰ یا عزّیٰ! اتنے میں ایک عورت

نکلی جو بدن سے ننگی تھی، بال بکھرے ہوئے تھے۔ سر پر مٹی ڈال رہی تھی۔ حضرت خالد نے اسے قتل کر دیا۔ پھر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آئے۔ آپ نے فرمایا ہاں یہ عزیٰ ہی تھی جو قتل کر دی گئی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عزیٰ ایک عورت تھی جس کی پرستش کی جاتی تھی۔ لوگ اس کے رہنے کی جگہ کیکروں کا تو ذکر کرتے ہیں مگر عزیٰ کو نہیں بتاتے۔

عرب کے بتوں میں منات بھی انسان کا نام تھا۔ السیوطی لکھتے ہیں کہ قرآن میں بتوں کے ایسے نام جو انسانوں کے تھے یہ ہیں: لات، منات وغیرہ یہ قریش کے بتوں کے نام ہیں۔

(الاتقان فی علوم القرآن)

قرآن عزیز میں جو بعل کا ذکر آتا ہے۔ السیوطی لکھتے ہیں کہ بعل ایک عورت کا نام ہے جس کی اکثر لوگ عبادت کرتے تھے۔ بعل کے لغوی معنی قوت اور طاقت کے ہیں، مجدالدین فیروز آبادی نے بصائر ذوی التمییز میں لکھا ہے کہ چونکہ مرد میں عورت کے مقابلہ میں برتری کا ذہن ہے اس لیے شوہر کو قرآن میں بعل کہا ہے اور چونکہ مشرکین کے اعتقاد میں معبود کو برتری ہوتی ہے اس لیے اسے بعل کہا ہے اور اسی سے پست زمین کے مقابلہ میں بلند زمین کو بعل کہتے ہیں۔ بعلبک شہر کا نام سے اسی دیوتا کی طرف نسبت ہے۔ بک مخفف ہے بکہ کا۔ بکہ شہر کو کہتے ہیں۔

ان کے علاوہ عرب میں اساف اور نائلہ بھی نامی بت تھے۔ یہ امام ہشام کی کتاب الاصنام میں تصریح کے مطابق اساف قبیلہ جرہم کے ایک مرد کا یعنی اساف بن یعلی اور نائلہ قبیلہ جرہم کی زید کی بیٹی ہے۔ اساف نائلہ پر عاشق تھا۔ امام نووی نے بھی تصریح کی ہے کہ یہ دونوں انسان تھے۔ مرور زمانہ کی وجہ سے لوگوں نے ان کی عبادت شروع کر دی تھی (نووی)

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ حضرت ابن ابزی کا بیان ہے کہ جب مکہ فتح ہوا تو ادھیڑ عمر کی ایک عورت حبشی نما واویلا کرتی ہوئی جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئی۔ آپ نے فرمایا:

یہ نائلہ ہے یہ اس سے ناامید ہو چکی ہے کہ تمہارے اس شہر میں کسی بھی وقت اس کی پوجا ہو۔ (البدایہ)

اس سے بھی معلوم ہوا کہ نائلہ بھی عزیٰ کی طرح کوئی مونث جن اور پری تھی جس کی مشرکین پرستش کرتے تھے۔

بہرحال یہ بُت اگرچہ اشخاص تھے لیکن جن کے اشخاص تھے وہ شخصیتیں اصل میں معبود تھیں ورنہ دُنیا کا کوئی عقل مند انسان اس کو باور نہیں کر سکتا کہ کسی باہوش انسان نے کبھی محض اینٹ اور پتھر کی عبادت کی ہے۔ یہ جو کچھ بھی ہوا انبیاء، اولیاء، جنوں اور دیگر باعزت اور ذی رتبہ مخلوق کے نام پر ہی ہوا کسی کا مجسمہ قبلہ توجہ بنایا گیا تو کسی کا فوٹو، کسی کے اٹھنے بیٹھنے کی جگہ کو متبرک سمجھ کر اس کی پرستش کی گئی تو کسی کی قبر کو قاضی الحاجات سمجھا گیا۔ کسی نے پتھر کو پتھر سمجھ کر الوہیت کا درجہ کبھی نہیں دیا۔ ذرا غور فرمائیے ویسے تو عرب میں ہزاروں بلکہ لاکھوں درخت موجود تھے لیکن نہ تو کسی نے ان سے عقیدت وابستہ کی اور نہ حضرت فاروق اعظم کی دُور رس نگاہ نے ان کو کٹوانے کا حکم دیا۔ حضرت عمرؓ نے اگر کٹوایا ہے تو صرف وہ درخت جس کے نیچے امام الدنیا والآخرہ سید الانبیاء خاتم الانبیاء حضرت محمد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے دستِ مبارک پر تقریباً پندرہ سو صحابہ کرام نے بیعت کی تھی جیسا کہ حافظ ابن القیم نے اغاثۃ اللہفان میں تصریح کی ہے کیونکہ شرک کا آغاز بزرگوں اولیاء اللہ کی قبروں ان کی عبادت گاہوں اور نشست و برخاست کی جگہوں سے ہوا ہے یہ اندھی عقیدت ہی ہے جو لوگوں میں توحید کی فرزانگی کو ختم کر کے شرک کی دیوانگی پیدا کرتی ہے ورنہ دُنیا کا کوئی پاپی سے پاپی مشرک بھی نہ دو الٰہ دو واجب الوجود مانتا ہے اور نہ بُتوں میں صفات الوہیت کا قائل ہے۔

میر سید شریف جرجانی رقمطراز ہیں :

> بُت پرست دو واجب الوجود الٰہوں کے قائل نہیں اور نہ وہ اوثان کو صفاتِ الوہیت سے موصوف مانتے ہیں۔ اگرچہ وہ ان پر الٰہ کا اطلاق کرتے ہیں بلکہ انہوں نے تو انبیاء کرام یا اولیاء یا فرشتوں یا ستاروں کی تصویریں بنا کر عبادت کے طور پر ان کی تعظیم کرنا شروع کر دی تاکہ وہ اس طریقہ سے الٰہ حقیقی تک رسائی حاصل کریں ۔ لہ

امام فخرالدین رازی لکھتے ہیں :۔

> مشرکین نے اصنام و اوثان اپنے پیغمبروں اور بزرگوں کی صورتوں

لہ شرح مواقف

پر بناتے تھے اور انہوں نے یہ خیال کیا تھا کہ جب وہ ان کی مورتیوں کی عبادت میں مشغول ہوتے ہیں تو یہ اکابر اور بزرگ ان کے حق میں اللہ کی جناب میں سفارش کرتے ہیں اور اس کی نظیر اس زمانے میں یہ ہے کہ بہت سے لوگ بزرگوں کی قبروں کی اس اعتقاد سے سخت تعظیم کرتے ہیں کہ اس طریقہ سے وہ بزرگ اللہ کی جناب میں ان کی سفارش کرتے ہیں ۔ له

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے اسے خوب کھول کر بیان کیا ہے :-

مشرکین کا مسلمانوں کے ساتھ اس بات پر اتفاق رہا ہے کہ بڑے بڑے کاموں کی تدبیر صرف اللہ تعالیٰ ہی کرتا ہے اور ایسے ہی وہ کام ہیں جن کے بارے میں اللہ سبحانہ نے فیصلہ فرما دیا ہے کہ اس نے اور کسی کو اس میں اختیار نہیں دیا ہے لیکن ساری باتوں میں مشرکین اور مسلمانوں میں ہم آہنگی نہیں ہے۔ مشرکین کا مذہب یہ ہے کہ اب سے پہلے جو نیک بندے گزرے ہیں ۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی خوب عبادت کی ہے اور عبادت کی راہ سے انہی کا تقرب حاصل کیا ہے۔ ان کو اللہ تعالیٰ نے الوہیت اور حاجت روائی کا عہدہ دے دیا ہے لہٰذا وہ مخلوق کی عبادت کے مستحق ہیں ۔ نیز مشرکین کا یہ بھی کہنا ہے کہ وہ صالحین اب بھی سنتے اور دیکھتے ہیں اور اپنی عبادت کرنے والوں کی سفارش کرتے ہیں اور ان کے کاموں کی تدبیر اور ان کی نصرت کرتے ہیں۔ پھر ان صالحین کے ناموں پر انہوں نے پتھروں کے بت بنائے اور ان صالحین کی طرف توجہ کرتے وقت ان کے بتوں کو قبلہ توجہ بناتے ہیں۔

(حجۃ اللہ البالغہ)

بہر حال یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں الگ الگ ہیں۔ ایک وہ اشخاص ہیں جن کو اصنام اور بت کہا جاتا ہے اور دوسرے وہ شخصیتیں ہیں، جن کے یہ بت ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے قرآن حکیم میں دونوں کی تردید کی ہے ۔ اشخاص کی بھی اور شخصیتوں کی بھی۔ اشخاص یعنی بتوں کی یہ کہہ کر تردید کی ہے کہ یہ جمادات ہیں اور شخصیتوں کی یہ کہہ کر

له مفاتیح الغیب

تردید کی ہے کہ حکومت و اقتدار میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اشخاص یعنی بتوں کی تردید میں تعبیری انداز اور ہے اور شخصیتوں کی تردید میں انداز تعبیر اور ہے۔ یہاں اس آیت میں آیت کا آغاز الذین سے کیا ہے جو عربی زبان میں ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں صرف شخصیتیں مراد ہیں۔ قرآن یہاں اسی پر ضرب لگا رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ جن شخصیتوں کو تم پکارتے ہو اور جن کی مورتیوں کے سامنے تم دعائیں مانگتے ہو اور التجائیں کرتے ہو وہ تو تمہارے ہی جیسے اللہ کے بندے ہیں۔ ان میں تمہاری دعاؤں کو قبول کرنے کا یارا نہیں ہے۔ اگر تم اپنے دعوے میں سچے ہو تو ان کو پکار کر دیکھو۔ ان کو تمہاری پکار کا جواب دینا چاہیے۔ یہی بات قرآن نے شخصیتوں کے بارے میں دوسرے موقعہ پر اس طرح پیش کی ہے :

الذین تدعون من دونہ ما یملکون من قطمیر ان تدعوھم لا یسمعوا دعاءکم ولو سمعوا ما استجابوا لکم۔

اور وہ لوگ جن کو تم پکارتے ہو اللہ سے ورے وہ کھجور کی گٹھلی پر چھلکے کے بھی مالک نہیں ہیں۔ اگر تم ان کو پکارو گے تو وہ تمہاری پکار نہیں سنیں گے۔ اور اگر سن بھی لیں تو ان میں یارائے قبول نہیں ہے۔

ایک سنگین غلط فہمی

یہاں کچھ بزرگ ایک سنگین غلط فہمی کا شکار ہو گئے ہیں کہ آیت میں دعا مانگنے اور پکارنے کے معنے میں نہیں عبادت کے معنی میں ہے۔ ایک صاحب لکھتے ہیں کہ یہاں بلکہ ان جیسی تمام آیات میں تدعون بمعنے تعبدون ہے، کسی کو پکارنا شرک نہیں بلکہ پوجنا شرک ہے۔

لیکن ان کا یہ سمجھنا درست نہیں ہے۔ کیوں ؟

اس لیے کہ اگر اس مقام پر دعا اور عبادت دو الگ الگ ہیں تو اللہ سبحانہ سے زیادہ دعا کے موقع و محل کو کون زیادہ جان سکتا ہے۔ پھر عبادت پر دعا کا اطلاق کیسے صحیح ہو سکتا ہے جبکہ یہ دونوں جدا جدا چیزیں ہیں۔ اور اگر اس جگہ دونوں ایک ہی ہیں تو پھر

یہ منطق بالکل مہمل ہو کر رہ جاتی ہے کہ کسی کو پکارنا شرک نہیں بلکہ پوجنا شرک ہے۔

پھر قرآن حکیم ایسی کتاب نہیں ہے جو اپنی تشریح خود نہ کرتی ہو قرآن اکثر مقامات پر جہاں دُعا کے صیغے استعمال ہوتے ہیں وہاں اس کے ساتھ اجاب، استجاب، یجیب، اور سماع کے صیغے لاکر دُعا کو پکارنے کے معنے ہی میں متعین فرما دیا ہے مثلاً:

ان تدعوھم لا یسمعوا دعاءکم

اگر تم پکارو تو وہ تمہاری پکار نہ سُنیں گے۔

ایک دوسرے مقام پر ارشاد ہے:

امن یجیب المضطر اذا دعاہ ویکشف السوء

کون ہے جو بے قرار و بے کس کی دُعا قبول کرتا ہے اور بُرائی کو مٹاتا ہے۔

ایک اور جگہ ہے:

ومن اضل ممن یدعوا من دون اللّٰہ من لا یستجیب لہ الیٰ یوم القیامۃ وھم عن دعائھم غافلون۔

اس شخص سے زیادہ گمراہ کون ہوگا جو ان کو پکارتا ہے جو قیامت تک اس کی دُعا کو قبول نہ کر سکیں اور ان کو ان کی پکار کا پتہ بھی نہیں ہے۔

ان مقامات میں دُعا یدعوا کے بعد اجابت، استجابت اور سماع قرینہ ہے اس کا کہ یہاں دُعا کے معنے پکارنے کے ہیں۔ لُغت کی کتابوں میں اجاب، اور استجاب کے معنے یہی ہیں کہ اس نے اس کا سوال قبول کیا اور اجاب اللّٰہ دُعاءہ واستجاب، کے ایک ہی معنے ہیں۔ لہٰذا قرآن کے صریح اور لفظی قرینہ کے باوجود کوئی اور معنے بتانا خالص سینہ زوری ہے

حکیم الامت شاہ ولی اللّٰہ صاحب فرماتے ہیں کہ آیت قرآنی فلا تدع مع اللّٰہ احداً" میں دُعا سے مراد عبادت نہیں ہے جیسا کہ بعض مفسرین کا خیال ہے بلکہ دُعا سے مراد استعانت ہے کیونکہ اللّٰہ سبحانہ کا ارشاد ہے:

بل ایاہ تدعون فیکشف ما تدعون الیہ وتنسون ما تشرکون

بلکہ تم صرف اللّٰہ کو پکارتے ہو پھر مٹا دیتا ہے اس تکلیف کو جس کے لیے تم اس کو پکارتے ہو اور تم اپنے شرکاء کو بھول جاتے ہو۔

مخاطبوں کو نبوت کا کھلا چیلنج

۲۵۳۔ اے اللہ کے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم خدا کی عبادت میں شریکار سے دُعا کرو، اور ان کو پکارو، پھر میرے خلاف خفیہ تدبیریں کرو، مجھے بالکل مہلت نہ دو۔

یہاں تک تو ان لوگوں کو معقول دلائل اور دل کو لگنے والے نصائح کے ساتھ سمجھایا گیا تھا کہ ان کے عقائد اور خیالات اور طریقوں میں کیا غلطی ہے اور وہ کیوں غلط ہے اور اس کے مقابلے میں صحیح راہ کیا ہے اور وہ کیوں صحیح ہے۔ اب ان کے اس طرز عمل کی طرف توجہ منعطف ہوتی ہے جو وہ اس سیدھی سیدھی اور صاف صاف تفہیم و تلقین کے جواب میں اختیار کر رہے تھے۔ دس گیارہ سال سے ان کی روش یہ تھی کہ وہ بجائے اس کے کہ اس معقول تنقید اور صحیح رہنمائی پر غور کر کے اپنی گمراہیوں پر نظر ثانی کرتے اُلٹے اس شخص کی جان کے دشمن ہو گئے تھے جو ان باتوں کو اپنی کسی غرض کے لیے نہیں بلکہ انہی کے بھلے کے لیے پیش کر رہا تھا۔ وہ دلیلوں کا جواب پتھر دل سے اور نصیحتوں کا جواب گالیوں سے دیتے تھے۔ یہ طرز عمل جو انہوں نے اختیار کر رکھا تھا۔ اس پر کچھ اور فرمانے کے بجائے اللہ تعالیٰ اپنے نبی کو حکم دیتا ہے کہ تم ان کو چیلنج دے دو کہ میں اپنے کام سے باز نہ آؤں گا تم اپنے ٹھہرائے شریکوں کو بلا لو اور سب مل کر میرے خلاف تدبیر کرو اور مجھے مہلت نہ دو۔ تم میرا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے۔

إِنَّ وَلِـِّۧيَ ٱللَّهُ ٱلَّذِي نَزَّلَ ٱلْكِتَٰبَ ۖ وَهُوَ يَتَوَلَّى ٱلصَّٰلِحِينَ ﴿١٩٦﴾
وَٱلَّذِينَ تَدْعُونَ مِن دُونِهِۦ لَا يَسْتَطِيعُونَ نَصْرَكُمْ وَلَآ
أَنفُسَهُمْ يَنصُرُونَ ﴿١٩٧﴾ وَإِن تَدْعُوهُمْ إِلَى ٱلْهُدَىٰ لَا يَسْمَعُوا۟ ۖ
وَتَرَىٰهُمْ يَنظُرُونَ إِلَيْكَ وَهُمْ لَا يُبْصِرُونَ ﴿١٩٨﴾

بلاشبہ میرا حمایتی اللہ ہے جس نے کتاب نازل کی ہے اور وہی نیک بندوں کی حمایت کرتا ہے[۲۵۴] ۔ اور جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی مدد کے قابل ہیں[۲۵۵] ۔ اور اے پیغمبر اگر تم ان لوگوں کو سیدھے راستہ کی طرف بلاؤ تو وہ کبھی تمہاری دعوت کو نہ سنیں گے تم دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ دیکھتے نہیں ہیں[۲۵۶] ۔

عبادت کی طرح ولایت کا مستحق بھی اللہ ہے

عبادت یہ ہے کہ اپنے آپ کو انتہائی ذلیل اور کمزور سمجھے اور یہ تذلل چاہتا ہے کہ کمزور میں ضعف ہو اور دوسری جانب قوت ہو۔ کمزور میں احساس کمتری ہو اور دوسری طرف شرف وفضل ہو۔ اس معنے کے اعتبار سے اللہ کے سوا اپنے اندر شان معبودیت رکھتا ہو جو پوجے جانے کا مستحق ہو۔ جس کی رضا چاہی چاہیے کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں، نذریں پیش کی جائیں، اعتراف نعمت کیا جائے۔ ولایت ولی کا مصدر ہے اس کے معنے ہیں حاکم ہونا، مددگار ہونا اور حمایتی ہونا۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں جسے کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے اور جسے مدد کے لیے پکارا جائے، جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں۔ کوئی اور نہیں دل میں جس کا خوف اور تقویٰ رکھا جائے، جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں۔ کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا کوئی ذرہ بھی ہو جو بال برابر بھی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہو جو کسی کے لیے قانون بنائے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ مشرکوں کا مسلمانوں کے اس بات پر کلی اتفاق تھا کہ بڑے بڑے اور اٹل و محکم کاموں میں اللہ سبحانہ نے کسی کو کوئی اختیار نہیں دیا لیکن ان کا خیال تھا کہ اللہ تعالیٰ کے وہ نیک بندے جو ان سے پہلے اللہ سبحانہ کی عبادت اور تقرب کی وجہ سے اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں مقبول اور مقرب ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو جزوی طور پر حاجت روائی فریادرسی، مشکل کشائی، پناہ دہندگی، امداد و اعانت، خبرگیری و حفاظت کا کام سپرد کر دیا ہے۔ اسی کا نام ولایت ہے۔

قرآن کی یہ آیت مشرکین کی ان دھمکیوں کا جواب ہے جو وہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو دیتے تھے۔ وہ کہتے تھے کہ اگر تم ہمارے معبودوں کی مخالفت کرنے سے باز نہ آئے اور ان کی طرف سے تم لوگوں کے عقائد اسی طرح خراب کرتے رہے تو تم پر ان کا غضب آ پڑے گا۔

مفردات کے معانی

ولی: یہ صفت کا صیغہ ہے اس کی جمع اولیا ہے۔ اس کے دو مصدر آتے ہیں۔ ولی، اور ولایت۔ جب مصدر ولی آئے تو لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ لازم کے معنے قریب ہونے کے ہیں اور متعدی کے معنے ذمہ داری قبول کرنے کے ہیں۔ اسی سے یتیم کا ولی۔ اور نکاح میں لڑکی کا ولی ہے۔ مصدر جب ولایت ہو تو اس کے معنے حاکم ہونے کے ہیں، اسی سے والی ہے۔ ولایت کے معنے مددگار ہونا، حامی ہونا۔ اسی سے ولی اور مولی مددگار کے معنے میں آتا ہے۔ علامہ مجدالدین فیروز آبادی رقمطراز ہیں کہ مولی عربی میں ۱۹ معنے میں آتا ہے۔ آزاد کنندہ، مالک، غلام، ساتھی، مددگار، رشتہ دار، پڑوسی، ساتھی، بیٹا، چچا، پڑاؤ کرنے والا، شریک، بھانجہ، ذمہ دار، منعم، منعم علیہ، تابع، کارساز،

یتولی: یہ ولی سے باب تفعل بنا ہے۔ یہ بھی لازم اور متعدی دونوں معنی میں آتا ہے لازم جیسے فان تولوا۔ اور متعدی جیسے ومن یتولهم منکم۔ تولی جب متعدی بلا واسطہ ہوتا ہے تو اس کے معنے کسی سے دوستی رکھنے کسی کام کی ذمہ داری اٹھانے اور والی وحاکم ہونے کے آتے ہیں جیسے فهل عسیتم ان تولیتم اور جب عن کے ساتھ متعدی ہوتا ہے تو منہ پھیرنے نزدیکی چھوڑنے کے معنے ہوتے ہیں۔

کارساز اللہ کے سوا کوئی نہیں

۲۵۴۔ بلاشبہ میرا حامی اللہ ہے جس نے کتاب نازل کی ہے اور وہ ہی نیک بندوں کی حمایت کرتا ہے۔ اس آیت کے پہلے فقرے ہی تعریف طرفین کے ذریعہ ذہنوں میں یہ بات اتاری گئی ہے کہ حمایت ونصرت کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں، وہی کارساز ہے۔ وہی چارہ گر ہے، وہ ہی حاجت روا اور مشکل کشا ہے کوئی اور نہیں جو بال برابر بھی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہو۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نجران کے عیسائیوں کو ایک خط لکھوایا تھا جس میں آپ نے یہ لکھوایا کہ:

انی ادعوکم الی عبادۃ اللہ تعالیٰ من عبادۃ العباد

میں تمہیں بندوں کی بندگی کے بجائے اللہ کی بندگی کی دعوت دیتا ہوں۔

ایسے ہی یہ بھی ارشاد فرمایا کہ :

ادعوکم الی ولایۃ اللہ من ولایۃ العباد

میں تمہیں بندوں کی کارسازی کی جگہ اللہ کی کارسازی کی دعوت دیتا ہوں۔

مطلب یہ ہے کہ دونوں کا وزن برابر ہے۔ عبادت کی حد تک اللہ کے سوا پوجا کے لائق کوئی نہیں اور ولایت کی حد تک اللہ کے سوا حاجت روا اور کارساز کوئی نہیں ہے۔ عبادت اور ولایت خداوندی کے بنیادی تقاضوں پر اگر کوئی شخص کھلے دل کے ساتھ غور کرے تو وہ اس یقین پر مجبور ہوگا کہ جیسے اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر شانِ معبودیت رکھتا ہو، جو پوجے جانے کا مستحق ہو، جس کی رضا چاہی جائے۔ ایسے ہی اور کوئی نہیں جسے ولی، کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں۔

غزوہ اُحد میں جب مشرکین کی جانب سے یہ نعرہ لگایا گیا لنا العزی ولا عزی لکم ہمارا کارساز عزیٰ ہے تمہارا کوئی عزیٰ نہیں ہے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ سے فرمایا کہ تم بھی نعرہ لگاؤ۔ اللہ مولٰنا ولا مولی لکم اللہ ہمارا کارساز ہے تمہارا کارساز کوئی نہیں۔ یہاں بھی مولیٰ کارسازی کے معنے میں ہے۔ اس سے بھی عبادت اور ولایت دونوں کی اللہ سبحانہٗ کے لیے خصوصیت معلوم ہوتی ہے۔ عبادت اور ولایت کی جامعیت کا نام الوہیت ہے اور مشرکین کو جیسے عبادت میں ٹھوکر لگی تھی ایسے ہی وہ ولایت میں غلط روی کا شکار تھے۔ قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ روحانی اعتقاد کے ساتھ ایک بالاتر ہستی کو پکارنا بندگی و نیاز کا ایک ایسا عمل ہے جو صرف خدا کے لیے ہونا چاہیے۔ اگر کسی دوسری ہستی کے لیے کیا گیا تو یہ شرک ہوگا۔ یہی مقام ہے جہاں مختلف مذاہب والوں نے ٹھوکر کھائی۔ وہ توحید ربوبیت میں نہیں بلکہ توحید الوہیت میں گمراہیوں کے شکار ہو گئے۔ کیونکہ خالق و رب تو وہ خدا ہی کو مانتے تھے لیکن اپنی دعاؤں اور منتوں کے لیے انہوں نے بہت سے آستانے بنا رکھے تھے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں :

مشرکین مکہ کا شرک یہ تھا کہ وہ لوگ بیمار کی شفا یابی، فقیر کی مالداری وغیرہ کے لیے اپنی حاجتوں میں غیر اللہ سے مدد مانگتے تھے اور ان کی نذریں

دیتے تھے تاکہ ان کو اپنے مقاصد میں ان نذروں کی وجہ سے کامیابی ہو۔ نیز تحصیلِ برکت کے لیے ان کے ناموں کی تلاوت کرتے تھے۔

مخاطبوں کے اسی ذہن پر ضرب کاری لگانے کے لیے یہاں آیتِ قرآنی کا آغاز ان حرف تحقیق سے کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہ امرِ واقعہ اور حقیقت ہے اور اس میں قطعاً کوئی شک نہیں ہے کہ میرا کارساز، حاجت روا صرف اللہ ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

یہاں یہ نکتہ بھی قابلِ غور ہے کہ اللہ کی کارسازی بتانے کے لیے دو باتوں کو پیش کیا ہے ایک یہ کہ اللہ نے کتاب نازل فرمائی ہے دوسرے یہ کہ اللہ سبحانہ' نیک انسانوں کی کارسازی کرتا ہے۔

اللہ سبحانہ' کی ولایت وکارسازی کو بے نقاب کرنے کے لیے اولاً جس بات کو یہاں نزل الکتاب کہہ کر پیش کیا ہے۔ اسی کو قرآن میں دوسرے موقعہ پر ولایت خداوندی جتانے کے لیے یخرجھم من الظلمات الی النور کہہ کر پیش کیا ہے۔ یعنی اللہ سبحانہ' کی ولایت کا عملی مظاہرہ یہ ہے کہ وہ اس دُنیا کی زندگی میں اہلِ ایمان کو ایک روشنی عطا کرتا ہے۔ یہ روشنی قرآن کی روشنی ہے جس کے اُجالے میں اہلِ ایمان نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ زندگی کی مختلف منزلیں اور حالات کے مختلف مراحل طے کرتے ہیں۔ یہ قرآن کی تاثیر ہے کہ اہلِ ایمان میں نئی رُوح، نیا ولولہ، نئی زندگی رُونما ہوگئی تھی۔ ان کی تربیت اسی کے سائے میں ہوئی۔ ان کے ذہنوں میں قرآن کی برکت اور حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے نورانیت آگئی۔ اور اسی کی وجہ سے دُنیا ان کے لیے اور وہ دُنیا کے لیے بالکل بدل گئے اور ان کو احساس ہُوا کہ ان کو اللہ نے اس لیے مبعوث کیا ہے کہ وہ لوگوں کو تاریکیوں سے نکال کر روشنی میں لائیں۔ انسانوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کریں۔ اور مخلوق کی کارسازی سے نکال کر خالق کی کارسازی میں لے آئیں۔ انہیں دُنیا کی تنگی سے نکال کر کشادگی کی طرف لائیں۔ اور مذاہب کی کج روی اور بے اعتدالی سے اسلام کی صراطِ مستقیم پر لگائیں۔ اسی قرآن کے ذریعے وہ زندگی کے مختلف گوشوں، مسائلِ زندگی حل کرتے تھے۔ قرآن ہی نے ان میں یہ رُوح پیدا کر دی تھی کہ وہ اللہ کے دین کے فروغ کی جدوجہد اور عام انسانوں کی ہدایت

کے لیے مبعوث ہوتے ہیں اور قوموں کی اصلاح کا کام ان کے سپرد ہوا ہے اور یہ کہ اللہ ان کا مددگار اور ان کی کامیابی کا ذمہ دار ہے۔ اس کا ثبوت ان کے ہر قول و فعل سے ملتا تھا۔ ان کے دلوں میں اطمینان اور خود اعتمادی اس قرآن کا نتیجہ تھی۔ اسی قرآن کی برکت سے ان کی عقلوں میں اس قدر نورانیت آگئی تھی کہ تدبر و تفکر کے ذریعے وہ انسانی زندگی کے ہر شعبہ کے لیے ایسا اسلامی قانون بنانے میں کامیاب ہو گئے تھے جس میں زندگی کے تغیرات و تبدیل کا ساتھ دینے کی پوری صلاحیت تھی اور جس کی موجودگی میں کسی وضعی قانون کی پناہ لینے کی ضرورت نہ تھی۔ حافظ ابن حزم ظاہری نے بجا لکھا ہے:

> قانون کے تمام ابواب میں کوئی باب بھی ایسا نہیں ہے جس کی اصل قرآن میں موجود نہ ہو۔ خدا کا شکر ہے کہ ہم اس اصل کو خود بھی جانتے ہیں۔ ہاں ایک قراض کا باب ایسا ہے جس کی اصل ہمیں قرآن میں نہیں ملی۔ (الموافقات)

حافظ ابن القیم اور امام شاطبی نے اس کی اصل بھی ثابت کی ہے۔ دیکھو اعلام الموقعین اور الموافقات۔

یہی نکتہ ہے جس کی وجہ سے یہاں ولایت کا مظہر الذی نزل الکتاب لاکر پیش کیا ہے، ولایت خداوندی کو ظاہر کرنے کے لیے دوسرا فقرہ وھو یتولی الصالحین لائے ہیں۔ قرآن میں دوسرے موقعہ پر اسی کو ان لفظوں میں پیش کیا ہے اللہ ولی الذین امنوا۔ آیت میں یتولی آیا ہے۔ یہ ولی سے بنا ہے۔ ولی کے دو معنے ہیں۔ ایک معنی لگاؤ اور تعلق کے ہیں، دوسرے معنے مدد کرنا، حکومت کرنا، اور نگرانی کرنا ہیں۔ اہل ایمان کے اللہ سبحانہٗ سے دونوں قسم کے تعلقات میں محبت کے بھی اور حکومت کے بھی، یعنی اہل ایمان کے اللہ سبحانہٗ محبوب بھی ہیں اور حاکم بھی۔ اس آیت میں علماء نے دوسرے معنے کیے ہیں وھو یتولی الصالحین اللہ سبحانہٗ صالحین کی حمایت کرتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے اپنے ترجمہ میں اسی کو اپنایا ہے۔ قاضی بیضاوی، حافظ ابن کثیر، حافظ ابن جریر، علامہ آلوسی، علامہ ابوحیان، علامہ قرطبی، امام رازی سب یک زبان ہیں کہ یہاں تولی کے معنے مدد کرنے اور حمایت کرنے کے ہیں۔

جس ولایت کو یہاں صالحین کے لیے بیان کیا گیا ہے۔ یہ صرف اللہ کے لیے خاص ہے، یعنی اس کے مفہوم میں یہ بات داخل ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی ولایت نہیں۔ ان کا معینؔ و مددگار

ان کا کارساز و کارفرما، ان کا پشت پناہ اور مشکل کشا صرف اللہ سبحانہ ہے۔ جو بات یہاں مفہوماً معلوم ہو رہی ہے اس کو دوسرے موقعہ پر قرآن نے صراحتاً کلمہ حصر کے ساتھ بیان کیا ہے۔ ایک موقعہ پر ہے فاللہ ھوالولی اللہ ہی کارساز و مددگار ہے۔ دوسرے موقعہ پر ہے وھوالولی الحمید وہی حمد وستائش کے لائق کارساز ہے۔ اسی کو یہاں وھو یتولی الصالحین سے تعبیر کیا ہے۔

آیت کا مدعا یہ ہے کہ مجھے تمہارے بتوں سے کوئی اندیشہ نہیں ہے۔ میرا کارساز تو صرف اللہ ہے، اللہ کے سوا میرا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ حضرت نوح نے بھی یہی اعلان کیا تھا کہ تم میری مخالفت میں جو کچھ کر سکتے ہو کر گزرو۔ اگر میں صادق ہوں تو تمہاری کوئی کوشش میرے خلاف کامیاب نہیں ہو سکتی۔ فعلی اللہ توکلت فاجمعوا امرکم و شرکائکم۔ حضرت ہود علیہ السلام نے بھی اپنی قوم کو یہی جواب دیا تھا کیدونی جمیعاً ثم لا تنظرون انی توکلت علی اللہ ربی وربکم تم سب میرے خلاف مل کر جو تدبیر کر سکتے ہو کر لو اور مجھے بالکل مہلت نہ دو۔ ربی وربکم کہہ کر اشارہ کر دیا کہ مشرکوں کو اس بات سے انکار نہیں ہوتا کہ ایک خالق کی ہستی موجود ہے اور اصلی طاقت اسی کی طاقت ہے یعنی وہ توحید ربوبیت سے بے خبر نہ تھے لیکن ان کی ساری گمراہی تھی کہ وہ سمجھتے تھے کہ اس پروردگار ہستی کے ماتحت دوسری ہستیاں بھی ہیں جنہیں تصرف کا اختیار مل گیا ہے اور جو ہمارے احوال سے باخبر ہیں۔ اس لیے ہمیں ان کی نذریں دینی چاہئیں۔ دور دور سے ان کی دہائی دینی چاہیے۔ ان کے ناموں کو جپنا چاہیے۔ یہی بات یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں کہ کوئی میرا کیا بگاڑ سکتا ہے۔ اللہ میرا حافظ و ناصر ہے۔ ابن کثیر لکھتے ہیں اللہ حسبی وکافینی وھو نصیری وعلیہ متکلی والیہ الجاء وھو ولی فی الدنیا والاخرۃ وھو ولی کل صالح بعدی یعنی اللہ ہی مجھے کافی ہے وہی میرا مددگار ہے۔ اسی پر میرا بھروسہ ہے وہی میری پناہ، وہی دنیا و آخرت میں میرا کارساز ہے اور میرے بعد ہر نیک کا کارساز ہے۔

آیت میں اشارہ ہے کہ مومن کامل کو کسی شیطانی طاقت سے ڈرنا نہ چاہیے صالح بندوں کو کوئی چیز نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اللہ ہی پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور اسی کو اپنا کارساز حقیقی یقین رکھنا لازم ہے۔ سوائے خدا کے کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ نہ دکھ اور درد کو دور

کرسکتا ہے۔ جلب منفعت اور دفع مضرت صرف اللہ کرتا ہے۔
بہرحال عبادت ہو یا ولایت یہ دونوں خاصۂ خداوندی ہیں نہ معبود اللہ کے سوا کوئی اور ہے اور نہ کارساز اللہ کے سوا کوئی اور ہے۔ حضرت یونس نے جب مچھلی کے پیٹ میں دعا کی تو یہ فرمایا، لا الٰہ الا انت، کوئی الٰہ نہیں مگر تو۔ مطلب یہ ہے کہ اے اللہ نہ تیرے بغیر کوئی فریاد رس ہے اور نہ تکلیف دور کرنے والا ہے نہ کوئی حاجت روا ہے اور نہ مشکل کشا ہے۔

مشرکین کے معبودوں کی بے بسی

۲۵۵ - اور جن کو تم پکارتے ہو اللہ کے سوا وہ نہ تمہاری مدد کر سکتے ہیں اور نہ اپنی مدد کے قابل ہیں۔

یہاں بھی الذین استعمال ہوا جو اشخاص کے لیے نہیں، شخصیات کے لیے آتا ہے۔ بُت پرستی اشخاص اور شخصیتوں سے مرکب ہوتی ہے۔ ایک تو وہ شخصیتیں ہیں جن کو فی الواقع بت خدا کا شریک بناتا ہے دوسرے وہ اشخاص ہیں جو ان شخصیتوں کی شبیہوں، تصویروں پر مشتمل ہوتے ہیں اور جن کو مشرک اپنے ہاتھوں سے بناتا ہے ان کو صور، تماثیل اصنام کہتے ہیں۔ قرآن دونوں پر ضرب لگاتا ہے لیکن انداز تعبیر الگ الگ ہوتا ہے۔ اشخاص کے لیے مونث کے صیغے اور وہ الفاظ لاتا ہے جو غیر ذوی العقول کے لیے عربی میں استعمال ہوتے ہیں۔ اور شخصیتوں کے لیے جمع کے صیغے اور وہ الفاظ لاتا ہے جو ذوی العقول کے لیے استعمال ہوتے ہیں۔ قرآن کا رُخ یہاں اشخاص کی طرف نہیں بلکہ ان شخصیتوں کی طرف ہے جن کے یہ اصنام تماثیل ہیں۔ پہلی آیات میں اشخاص کو پیش نظر رکھ کر تردید کی تھی اب یہاں شخصیتوں کو پیش نظر رکھ کر تردید ہو رہی ہے۔ اللہ سبحانہ کی الوہیت میں یگانگت بیان فرمانے کے بعد اب روئے سخن ان ہستیوں کی طرف ہو گیا جن کو مشرکین شرکا سمجھے ہوئے ہیں۔ کیوں؟ اس لیے کہ ذہنوں میں کوئی تصور اسی طرح واضح ہو کر آتا ہے جب کہ اس کے مخالف تصور کو بھی ساتھ ہی بیان کیا جائے۔ اس لیے اہم اصول و نظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا ضرور اہتمام ہوتا ہے کہ ان کے مقابل اصولوں اور نظریوں کو ان کے بالمقابل رکھ دیا جائے۔ توحید الوہیت سے زیادہ اہمیت کس نظریے اور

عقیدے کو حاصل ہو سکتی ہے اس لیے ضروری ہے کہ اس کے مخالف نظریے یعنی شرک کی بھی وضاحت کی جائے۔ شاہ ولی اللہ نے حقیقت شرک یہ بتائی ہے ۔

شرک کی حقیقت یہ ہے کہ کوئی انسان انسانوں کی کسی بڑی ہستی میں عجیب و غریب کرامات دیکھے اور یہ اعتقاد کرے کہ یہ جو لوگ صفات کمال سے موصوف ہیں اور اس میں آثار اس لیے پائے گئے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو الوہیت کی خلعت سے نوازا ہے یا اس بزرگ نے فنا فی اللہ کا مقام حاصل کر لیا ہے اور اپنی ذات بالکل مٹا دی ہے۔ اب اس سے جو کچھ صادر ہوتا ہے گویا خدا کر رہا ہے اور اس قسم کی اور بہت سی خرافات اس معتقد کے ذہن میں آتی ہیں ۔

شاہ صاحب کی یہ تشریح کہہ رہی ہے کہ شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا صفات یا صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساجھی ٹھہرایا جائے۔ گویا شرک کی تین قسمیں ہوئیں ۔

ایک وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی ذات سے ہوتا ہے ۔
دوسرا وہ شرک جس کا تعلق اللہ کی صفات سے ہوتا ہے ۔
تیسرا وہ شرک جس کا تعلق اس کی صفتوں کے لوازم سے ہے ۔
پہلی قسم کے شرک کے عملی مظاہر یہ ہیں :
۱۔ کسی کو اللہ تعالیٰ کا ہم جنس قرار دینا ۔
۲۔ اسے کسی کا باپ یا بیٹا سمجھ لیا جائے ۔
۳۔ یہ مان لیا جائے کہ وہ کسی اور ہستی کے ساتھ مل کر ایک قالب ہو گیا ہے ۔
۴۔ یہ تصور کیا جائے کہ وہ کسی مخلوق کی شکل اختیار کر کے نمودار ہوتا ہے، دوسری شرک کی عملی صورت یہ ہے کہ اللہ سبحانہ، جن صفتوں سے موصوف ہے ان میں سے کوئی صفت کسی اور کے اندر بھی مانی جائے اور اسی مفہوم و معنی میں مانی جائے جس معنی و مفہوم میں وہ اللہ تعالیٰ کے اندر پائی جاتی ہے۔ مثلاً علم اللہ سبحانہ، کی ایک صفت ہے جس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ کھلی اور چھپی ہر بات کو جانتا ہے۔ اس کے لیے غائب بھی حاضر ہے اور گزرا ہوا یا آنے والا زمانہ بھی حال ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ اعتقاد رکھے کہ فلاں

شخص بھی اسی طرح ہر بات جانتا ہے تو یہ شرک فی الصفات ہے۔ اسی طرح نفع نقصان پہنچانا اللہ تعالیٰ کی ایک صفت ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ وہ جس کو چاہتا ہے مسرت و راحت کا سامان عطا کرتا ہے اور جس کو چاہتا ہے محروم کر دیتا ہے۔

تیسری قسم کے شرک کی صورت یہ ہے کہ صفاتِ الٰہی کے جو لازمی تقاضے ہیں انہیں اور ان سب کو اللہ ہی کے لیے خاص نہ جانتے بلکہ انہیں یا ان میں سے کسی کو بعض دوسری ہستیوں کے ثابت کرے۔

ان تینوں قسموں میں سے چاہے جس قسم کا بھی شرک ہو اس کی موجودگی میں توحید کا اسلامی عقیدہ باقی نہیں رہتا۔

مشرکین مکہ، عیسائی اور یہودی نزولِ قرآن کے وقت ان تینوں قسم کے شرکوں میں مبتلا تھے۔ وہ کچھ برگزیدہ ہستیوں کی مورتیوں کو پوجتے جن کی مورتیوں کو سجدے کرتے تھے ان کو دُور دُور سے پکارتے تھے۔ ان کو اپنا حامی و ناصر سمجھتے تھے۔ ان کو حلالِ مشکلات اور کشافِ حاجات سمجھتے تھے۔

قرآن یہاں بتا رہا ہے کہ جن ہستیوں سے تم کشافِ حاجات سمجھ کر دعائیں مانگتے ہو دُور دُور سے پکارتے ہو ان کے نام کی دہائیاں دیتے ہو یہ سب نہ صرف یہ کہ تمہاری مدد نہیں کر سکتے ہیں بلکہ اپنی بھی مدد نہیں کر سکتے۔ اسی معنے کی قرآن میں اور بھی آیات ہیں جن میں ان ہستیوں کی بے چارگی کو پورے زور سے ظاہر کیا گیا ہے اور ایسی آیات بھی ہیں جن میں بتوں کو ہدفِ تنقید بنایا گیا ہے۔

آئیے پہلے شخصیتوں کے بارے میں چند آیات پڑھ لیجئے:

ان الذین تدعون من دون اللّٰہ لن یخلقوا ذباباً ولو اجتمعوا لہ

بے شک وہ ہستیاں جن کو تم اللہ کے ورے پکارتے ہو وہ سب مل کر ایک مکھی بھی قطعاً نہ بنا سکیں گے۔

ایک اور آیت ہے:

والذین یدعون من دون اللّٰہ لا یخلقون شیئاً وھم یخلقون، اموات غیر احیاء

اور وہ ہستیاں جن کو وہ اللہ کے ورے پکارتے ہیں کسی چیز کے خالق نہیں

بلکہ خود مخلوق ہیں، مردے ہیں زندہ نہیں ہیں۔
ایک اور آیت ہے :

قل ادعوا الذین زعمتم من دون اللہ لا یملکون مثقال ذرۃ فی السماوات ولا فی الارض وما لھم فیھما من شرك وما لہ منھم من ظھیر۔

آپ کہہ دیجئے پکارو تم ان ہستیوں کو جن کو تم اللہ کے پیچھے خیال کرتے ہو وہ مالک نہیں ذرہ بھر کے آسمانوں اور زمین میں اور نہ ان کی ان دونوں میں کوئی شراکت ہے اور نہ ان تمہارے مزعومہ ہستیوں میں سے کوئی اللہ کا مددگار ہے۔

یہ تو وہ آیات ہیں جن میں براہ راست ان شخصیتوں کا ذکر ہے جن کی مورتیں، تصویریں اور بت وہ پوجتے تھے اور جن کو نفع و نقصان کا مالک تصور کر کے پکارتے تھے۔ آئیے سرا سے کچھ وہ آیات بھی پڑھ لیجئے جن میں شخصیتوں کا نہیں اشخاص کا ذکر ہے۔

قل افرایتم ما تدعون من دون اللہ ان ارادنی اللہ بضر ھل ھن کاشفات ضرہ او ارادنی برحمۃ ھل ھن ممسکات رحمتہ۔

فرما دیجئے، بتاؤ تمہارا ان بتوں کے بارے میں جن کو تم اللہ کے ورے پکارتے ہو کیا خیال ہے کہ اگر اللہ پاک مجھ کو نقصان پہنچانا چاہے تو کیا یہ اس نقصان کو ہٹا سکتے ہیں اور اگر اللہ مجھ پر رحمت کرنے کا ارادہ کرے تو کیا رحمت کو روک سکتے ہیں۔ (پ ۲۴-زمر)

ایک اور آیت ہے :

قل ارایتم ما تدعون من دون اللہ اروني ماذا خلقوا من الارض ام لھم شرك فی السموات۔

فرما دیجئے کیا خیال ہے تمہارا ان بتوں کے بارے میں جن کو تم اللہ سے ورے پکارتے ہو، دکھاؤ تم مجھے کیا انہوں نے زمین میں نہ کوئی چیز بنائی ہے یا ان کا آسمانوں میں شراکت ہے۔

ان میں اور اس قسم کی دوسری آیات میں بتوں کا ذکر ہے۔ دونوں کا تعبیری انداز قطعاً مختلف ہے۔ بتوں کے ذکر میں اگر ما موصولہ آیا ہے جو عربی میں بے جان چیزوں کے لیے استعمال ہوتا ہے اور مونث کے صیغے آئے ہیں تو ہستیوں کے ذکر میں الذین اسم موصول

کی جمع اور جمع مذکر کے صیغے آئے ہیں جو قطعاً ذوی العقول کے لیے عربی میں بولے جاتے ہیں اس فرق تعبیری کے باوجود اگر کوئی نادان یہ سمجھتا ہے کہ قرآن میں شخصیتوں کا کوئی ذکر نہیں تو اسے اپنی عقل و فہم کا ماتم کرنا چاہیے کہ قرآن کی بلیغ معجزانہ تعبیر کو سمجھ نہیں سکتا۔

پیش نظر آیت میں بھی الذین استعمال ہوا ہے اور ارشاد گرامی کا مقصود یہ ہے کہ اللہ کے سوا تم جن ہستیوں اور شخصیتوں کو پکارتے ہو اور جن سے اپنی مشکلات اور حاجت روائی میں امداد چاہتے ہو وہ تمہاری قطعاً مدد نہیں کر سکتے ہیں اور تمہاری تو درکنار اپنی بھی مدد ان کے بس کی بات نہیں ہے۔ جو کچھ بھی ہوتا ہے اللہ کے ارادے اور اس کی مشیت سے ہوتا ہے۔ یہ کچھ بھی نہیں کر سکتے ہیں نہ ہی کچھ بھی نہیں بگاڑ سکتے۔

چشم بصیرت سے محرومی

۲۵۶ - اور اے پیغمبر اگر تم ان کو سیدھے راستہ کی طرف بلاؤ تو وہ کبھی تمہاری دعوت کو نہ سنیں گے۔ تم دیکھو گے کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ وہ دیکھتے نہیں ہیں۔ اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن کا اختلاف ہے۔ حافظ ابن کثیر، حافظ ابن جریر، کے خیال میں اس آیت میں مشرکین کے معبودوں کی حالت بیان ہو رہی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر اگر آپ ان کے معبودوں کو کچھ بتلانے کے لیے پکارو تو آپ کی پکار پر لبیک کہنا تو درکنار آپ کی پکار سن بھی نہیں سکیں گے۔ آپ دیکھیں گے وہ آپ کی طرف دیکھ رہے ہیں لیکن واقع میں کچھ بھی نہیں دیکھتے ہیں۔ مراد اگرچہ اشخاص ہیں مگر تعبیر کی انداز شخصیتوں والا اختیار کیا گیا ہے۔ قاضی بیضاوی کی تعبیری انداز کے لیے یہ توجیہ شاندار اور لطیف ہے:۔

کیونکہ ان کی صورت اس انداز سے بنائی گئی کہ معلوم ہوتا ہے کہ سامنے والے کو دیکھ رہے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ ایسی بے بصر ہستیوں سے کیا توقع ہے کہ وہ آپ کا کچھ بھی بگاڑ سکیں۔ سننا، دیکھنا جب ناپید ہے تو نفع و نقصان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ اور مخاطبوں کو جتا دیا ہے کہ بیوقوفو تم تو یہ خیال کر رہے ہو کہ یہ کیڑے ٹکٹکی باندھے دیکھ رہے ہیں لیکن انہیں سوجھتا سجھاتا کچھ بھی نہیں ہے۔

کچھ شارحینِ قرآن یہ کہتے ہیں کہ اس آیت میں حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں کی حالت بیان کی گئی ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ کے پیغمبر اگر تم ان لوگوں کو خدا کا راستہ بتانے کے لیے دعوت دو گے تو یہ کبھی تمہاری پکار نہ سنیں گے، تم دیکھو گے کہ یہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں لیکن امرِ واقعہ اور حقیقت یہ ہے کہ یہ آپ کو نہیں دیکھتے ہیں۔

یہ دراصل ان لوگوں کے تعصب اور ضد کی تصویر ہے۔ یہ لوگ تعصب اور ضد میں اتنے کھوئے گئے ہیں کہ ان کو اس عصبیت اور ضد کی وجہ سے حق نظر نہیں آتا ہے۔ ہدایت و سعادت کی راہ عقل و تفکر کی راہ ہے اور گمراہی و شقاوت کا سرچشمہ جہل و کوری اور حواس و تفکر کو بیکار کرنا ہے۔ جو لوگ خدا کی دی ہوئی بصیرت سے کام نہیں لیتے یا ہوائے نفس اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ذہن و ادراک کی قوتیں بیکار ہو کر رہ جاتی ہیں وہ کبھی ہدایت نہیں پاتے۔ المخفا لکھتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ ان کی آنکھیں آپ کو دیکھ رہی ہیں لیکن اس دیکھنے سے ان کو کوئی فائدہ نہیں ہے۔ آنکھیں ہونے کے باوجود نابینا پن۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ دنیا میں جب کبھی سچائی کی دعوت ظاہر ہوتی ہے تو کچھ لوگ اسے قبول کر لیتے ہیں اور کچھ انکار کر دیتے ہیں لیکن کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جو اس دعوت کے خلاف طغیان و جحود اور ظلم و شرارت کی جتھا بندی کر لیتے ہیں۔ وہ صرف انکار ہی پر قناعت نہیں کرتے بلکہ ان کو نبوت کے خلاف ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی سخت سے سخت صورت اختیار کر لیتی ہے۔ اس طرح کا مخالف صرف یہی نہیں کرتا کہ نبوت سے اختلاف رکھتا ہے بلکہ اس کے اندر صاحبِ نبوت کے خلاف بغض و عناد کا ایک غیر محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے۔ وہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ بربادی اور ہلاکت کے درپے ہو جاتا ہے۔ صاحبِ نبوت کتنی ہی اچھی بات کہے وہ اسے جھٹلائے گا۔ کتنا ہی اچھا سلوک کرے وہ اذیت پہنچائے گا۔ یہی حالت ہے جسے قرآن انسانی فکر و بصیرت کے تعطل سے تعبیر کرتا ہے۔

امرِ واقعہ یہ ہے کہ جو لوگ خدا کی دی ہوئی عقل و بصیرت کو تاراج کر دیتے ہیں۔ اور اندھے بہرے ہو کر تاریکیوں میں گم ہو جاتے ہیں تو ان کے لیے کوئی دعوت بھی سودمند

نہیں ہے، کیونکہ جو آنکھیں دیکھتے ہوئے آنکھیں بند کیے ہوئے ہے اور دیکھتا نہیں تو اسے راستہ دکھانے کے لیے پکارو وہ دیکھتا ہی نہیں ہے۔ اس کو ہدایت کی صورت صرف یہ ہو سکتی ہے کہ کوئی جبراً اٹھا کر اسے راستہ پر لگا دے تو ہدایت ایسی چیز نہیں ہے جو جبراً کسی کے حلقوم میں ٹھونس دی جائے۔

اسی ہدایت کو قرآن نے یہاں اس آیت میں بیان کیا ہے۔ بہرحال تشریحیں دونوں ہیں اور دونوں شارحین قرآن کی پیش کردہ ہیں۔ اب یہ آپ کے اختیار، تمیز اور صوابدید پر موقوف ہے کہ آپ کون سی تشریح اختیار کرتے ہیں۔

خُذِ الْعَفْوَ وَأْمُرْ بِالْعُرْفِ وَأَعْرِضْ عَنِ الْجٰهِلِيْنَ ﴿۱۹۹﴾ وَإِمَّا
يَنْزَغَنَّكَ مِنَ الشَّيْطٰنِ نَزْغٌ فَاسْتَعِذْ بِاللّٰهِ ۚ إِنَّهٗ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ﴿۲۰۰﴾ إِنَّ الَّذِيْنَ اتَّقَوْا إِذَا مَسَّهُمْ طٰٓئِفٌ مِّنَ الشَّيْطٰنِ
تَذَكَّرُوْا فَإِذَا هُمْ مُّبْصِرُوْنَ ﴿۲۰۱﴾ وَإِخْوَانُهُمْ يَمُدُّوْنَهُمْ فِي
الْغَيِّ ثُمَّ لَا يُقْصِرُوْنَ ﴿۲۰۲﴾

اے اللہ کے رسول، نرمی اور درگزر کو اپناؤ[۲۵۷]، نیکی کی تلقین کرو،
اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو[۲۵۸]۔ اور اگر کبھی شیطان کی طرف
سے کوئی خلش محسوس ہو تو اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ بلاشبہ
اللہ ہی سننے والا اور جاننے والا ہے[۲۵۹]۔ بلاشبہ جو لوگ متقی
ہیں اگر انہیں کوئی کبھی شیطانی خیال آبھی جاتا ہے تو فوراً چونک
جاتے ہیں اور پھر اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں[۲۶۰]۔ باقی
رہے شیطان کے بھائی بند تو انہیں وہ گمراہی میں کھینچے لیے

جاتے ہیں اور پھر اس میں ذرا بھی کمی نہیں کرتے ہیں۔ [۲۰۱]

مفردات کے معانی

العفو اس کے معنے معاف کرنے، درگزر کرنے کے آتے ہیں۔ اس کا صلہ عن آتا ہے۔ عفا اللہ عنہ اور کبھی کبھار لام بھی آتا ہے جیسے عفالہ ذنبہ عفو اچھی اور بہترین چیز کو بھی کہتے ہیں۔ اسی لیے علی ابن طلحہ نے عبداللہ بن عباس سے اس کے معنے مال کے بتائے ہیں۔ عرف کے معنے نیکی کے ہیں۔ یہی معنے معروف کے ہیں۔ یہ معرفت سے ہے اس کے معنے پہچاننے کے ہیں۔ کسی چیز کی نشانیوں پر غور و فکر کے بعد اس چیز کے ادراک کا نام معرفت ہے۔ معروف اور عرف وہ بات ہے جو جانی پہچانی ہو۔ اس کی ضد منکر آتی ہے۔ یعنی ایسی بات جس کا عام طور پر انکار کیا گیا ہو۔ جاھلین۔ اس کے دو مصدر ہیں۔ جہل اور جہالت جہل کے معنے نہ جاننے کے، علم کی ضد ہے اور جہالت کے معنے بیوقوف ہونے اور نادان ہونے کے۔ یہاں یہی معنے مراد ہیں۔ نزغ، اس کے معنے چھیڑ خانی کرنے کے ہیں۔ علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے نزغ اور ہمز کو وسوسہ کے معنے میں لکھا ہے۔ نزغ کے معنے برانگیختہ کرنے کے ہیں۔ طائف وسوسہ، خطرہ۔ پھر جانے والا، گھومنے والا، طوف سے اسم فاعل کا واحد مذکر ہے۔ طوف کے معنے کسی چیز کے گرد چکر لگانے کے ہیں۔ اور اسی لیے جو شخص گھروں کے گرد ان کی حفاظت کے لیے چکر لگاتا رہتا ہے طائف کہلاتا ہے اور اسی سے جن خیال، حادثہ وغیرہ کو بطور استعارہ طائف بولتے ہیں۔ غی، جیسے طومی سے طی۔ غوی سے غی، اس کے معنے بھٹکنے کے ہیں۔ یہ دو بابوں ضرب او سمع سے آتا ہے۔ غوی یغوی، اور غوِی یغوٰی یہاں حاصل مصدر کے معنے ہیں گمراہی، بدراہی۔

دعوت میں کامیابی کے اصول

پہلے یہ بات واضح ہو چکی ہے کہ مخاطبوں کو اچھی بات بتائی جاتی ہے اور وہ نہیں مانتے۔ ان کے دعوے کی کمزوری ثابت کی جاتی ہے مگر وہ اپنی بات پر اڑے ہوتے ہیں۔ اور حق کا

جواب لایعنی گفتگو اور بُرا بھلا کہہ کر دیتے ہیں۔ ارشاد تھا وان تدعوھم الی الھدی الخ اور اگر تم ان کو راہِ راست کی طرف بلاؤ تو وہ تمہاری ایک نہ سنیں اور (بظاہر) وہ تم کو ایسے نظر آتے ہیں کہ وہ تمہاری طرف دیکھ رہے ہیں حالانکہ وہ دیکھتے نہیں ہیں۔ ضد اور کد کے اس پس منظر میں دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا تو تبلیغ و دعوت کا کام بند کر دیا جائے یا تبلیغ و دعوت کی راہ میں ان ناگواریوں اور ناخوشگواریوں کو خندہ پیشانی سے برداشت کیا جائے قرآن نے نبوت کی راہ سے اہلِ ایمان کو دوسری صورت اختیار کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ ان ناگواریوں کو برداشت کرو اور نیکی کا حکم دیتے رہو۔ صرف یہی نہیں بلکہ فرمایا کہ اس سلسلے میں بُرائی کا جواب بھلائی سے دو ادفع بالتی ھی احسن اگر تمہارے ساتھ بُرائی کرے تو بُرائی کا جواب ایسے برتاؤ سے دو جو بہت اچھا ہو۔ اس معنے کے اعتبار سے یہ آیت گرامی مہمات اصول میں سے ہے۔ چند لفظوں کے اندر زندگی کی اخلاقی مشکلات کا پورا حل اور فضیلت و کامرانی کے تمام طریقے واضح کر دیے۔ اخذ بالعفو، امر بالمعروف، اعراض عن الجاہلین یعنی ناسمجھوں کی ناسمجھی بخش دینی، جاہلوں کے پیچھے نہ پڑنا اور نیکی کی دعوت میں سرگرم رہنا۔ انفرادی اور اجتماعی زندگی کی ساری عملی مشکلات کا ان تین باتوں میں حل موجود ہے۔ امام جعفر صادق کا یہ ارشاد بالکل بجا ہے کہ قرآن میں مکارمِ اخلاق کے موضوع پر اس سے زیادہ جامع آیت کوئی نہیں ہے۔ ان آیات کا مقصود صرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تعلیم دینا نہیں بلکہ آپ کی وساطت سے آپ کی اُمت کو تعلیم دینا ہے۔

زید ابن اسلم کہتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے جس عفو و درگزر کا حکم مشرکین کے بارے میں دیا ہے وہ صرف دس سال کے لیے تھا۔ اس کے بعد سختی کا حکم آ گیا۔ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ مشہور مفسرِ قرآن ابن جریر کا بھی یہی خیال ہے۔ اس قسم کی آیتوں کے بارے میں جن میں کفار سے متعلق عفو و درگزر کا حکم ہے۔ عام شارحین قرآن کا نظریہ یہی ہے کہ یہ جہاد سے پہلے کی بات ہے۔ جہاد نے کفار کے حق میں عفو و درگزر کو منسوخ کر دیا لیکن مفسرین میں وہ بزرگ بھی ہیں جو جہاد کے حکم اور عفو و درگزر کی نصیحت میں کوئی منافات نہیں سمجھتے اور اس لیے ایک کو دوسرے سے منسوخ نہیں مانتے۔ امام رازی کئی موقعوں پر اس کی تصریح کی ہے۔ اس آیت پر لکھتے ہیں :

اس آیت میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا گیا ہے کہ جاہلوں کی بداخلاقی پر صبر کریں۔ اور ان کی بیہودہ باتوں اور کمینہ حرکتوں کا جواب اسی قسم کی باتوں اور حرکتوں سے نہ دیا جائے۔ اس میں جنگ سے باز رہنے کی کوئی ہدایت نہیں ہے کیونکہ جاہلوں سے اعراض برتنے اور مشرکین سے جنگ کرنے میں کوئی تضاد نہیں۔ اور جب دونوں باتوں میں ہم آہنگی ہو سکتی ہے تو نسخ ماننے کی ضرورت نہیں مگر ظاہر بین مفسرین بے ضرورت ناسخ و منسوخ آیتوں کی تعداد زیادہ کرنے کے عاشق ہیں۔

میرے نزدیک اس آیت سے صاف ظاہر ہے کہ آیت میں جن قصوروں کو معاف کرنے کا حکم دیا گیا ہے ان کا تعلق ان قصوروں سے ہے جن کے معاف کرنے کا حق بندوں کو ہے اور وہ حقوق عباد ہیں۔ اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیئے کہ اس سے کفر، شرک اور عصیان الٰہی کے قصوروں کی معافی لازم آتی ہے جن کے معاف کرنے کا سرے سے بندوں کو حق ہی حاصل نہیں ہے۔ اور قتال و جہاد حقوق الٰہی کے مقابلے میں مشروع ہوا ہے۔ اس لیے جہاد کی آیتیں اس مغفرت اور عفو و درگزر کے اخلاقی احکام میں خلل انداز نہیں ہیں۔

عفو و درگزر کا حکم

۲۵۷۔ اے اللہ کے رسول نرمی اور درگزر کو اپنا ؤ۔ خذالعفو، کے کئی معنے کئے گئے ہیں۔ اکثر کا حاصل یہ ہے کہ سخت گیری اور تند خوئی سے پرہیز کیا جائے۔ اسی کو مترجم محقق نے درگزر کی عادت سے تعبیر کیا ہے۔ گزشتہ آیات میں بت پرستوں کی جو تحمیق و تجہیل کی گئی تھی بہت ممکن تھا کہ مشرکین اس پر برہم ہو کر ناشائستہ حرکت کرتے یا کوئی برا لفظ زبان سے نکالتے اس لیے ہدایت فرمادی کہ عفو و درگزر کی عادت رکھو۔[1]

اس فقرے میں واضح کیا گیا ہے کہ داعی حق کے لیے جو صفات سب سے زیادہ ضروری ہیں۔ ان میں سے ایک یہ ہے کہ اسے نرم خو متحمل اور عالی ظرف ہونا چاہیے

[1] حاشیہ شیخ الہند

اس کو اپنے ساتھیوں کے لیے شفیق، عامۃ الناس کے لیے رحیم اور اپنے مخالفوں کے لیے حلیم ہونا چاہیے۔ اس کو اپنے رفقاء کی کمزوریوں کو برداشت کرنا چاہیے اور اپنے مخالفین کی سختیوں کو بھی۔ اسے شدید سے شدید اشتعال انگیز مواقع پر بھی اپنے مزاج کو ٹھنڈا رکھنا چاہیے۔ نہایت ناگوار باتوں کو عالی ظرفی کے ساتھ ٹال دینا چاہیے۔ مخالفوں کی جانب سے کبھی بھی سخت کلامی، بہتان تراشی، ایذا رسانی اور شریرانہ مزاحمت کا اظہار ہو، اس کو درگزر ہی سے کام لینا چاہیے۔ سخت گیری، درشت کلامی اور منتقمانہ اشتعالِ طبع اس کام کے لیے زہر کا حکم رکھتی ہے اور اس سے کام بگڑتا ہے بنتا نہیں۔ اسی چیز کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں بیان فرمایا ہے کہ میرے رب نے مجھے حکم دیا ہے کہ غضب اور رضا دونوں حالتوں میں انصاف کی بات کہوں۔ جو مجھ سے کٹتے ہیں اس سے ملوں اور جو مجھے میرے حق سے محروم کرے میں اسے اس کا حق دوں۔ جو میرے ساتھ ظلم کرے میں اس کو معاف کردوں۔

تبلیغ کے اصول

یہ نکتہ کہ لوگوں کو کس طرح کسی سچائی کو قبول کرنے کی دعوت دینی چاہیے۔ دنیا میں پہلی دفعہ قرآن عزیز نے بتایا ہے۔ وہ مذاہب بھی جو تبلیغی ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں یہ نہیں کہہ سکتے کہ ان کے صحیفوں نے ان کے لیے تبلیغ کے اہم اصولوں کی تشریح کی ہے لیکن قرآن نے نہایت جامعیت مگر پوری وضاحت کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ پیغامِ الٰہی لوگوں کو کیسے پہنچایا جاتے۔ اور ان کو حق قبول کرنے کی دعوت کیسے دی جائے۔ یہاں قرآن نے بتایا ہے کہ دعوت کی ضرورت یہ ہے کہ داعی نرمی اور خیر خواہی سے باتیں کرے کیونکہ سختی اور شدت کا طریق دل میں نفرت اور عداوت کے جذبات پیدا کرتا ہے اور کیسی بھی اچھی بات ہو لیکن اس قسم کے جذبات اس کے قبول کی استعداد اس سے سلب کردیتے ہیں اور سننے والے میں اپنی غلطی پر ضد اور ہٹ دھرمی پیدا کردیتے ہیں جس سے دعوت کا اثر زائل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے قرآن حکیم نے آپ کو دشمنوں کی یاوہ گوئیوں کے مقابلہ عفو و درگزر کو اپنانے کا حکم دیا۔ اور اس کے نتیجے میں آپ کے تمام محاسنِ اخلاق یعنی رفق، ملاطفت، عدم تشدد، عفو و درگزر وغیرہ کی جو تفصیل سیرت کی کتابوں میں بیان کی گئی ہے اس پر مجموعی نظر ڈالنے سے معلوم ہوسکتا ہے کہ وہ درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

کا ایک اعجازی شاہکار تھا اور یہ معجزہ آپ کو تسخیرِ قلوب کے لیے عطا ہوا تھا۔ قرآن عزیز نے اس نکتہ کو خود بتایا ہے:

ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک

اے اللہ کے رسول اگر تم تندخو اور سخت دل ہوتے تو لوگ تمہارے پاس سے چل دیتے۔

یہ عفو و درگزر کی آپ میں معجزانہ کشش تھی جو لوگوں کو کھینچ کھینچ کر دائرہ اسلام میں داخل کرتی تھی اور کفار کے جاہلانہ شکوک و اوہام کو دم کے دم میں مٹا دیتی تھی۔

ہندہ خاندانِ نبوت کی قدیم ترین دشمن تھی۔ جنگِ اُحد میں قوتِ بازوئے اسلام حضرت حمزہ کے جگر کو اسی نے چاک کیا تھا۔ اسی نے ان کا جگر نکال کر چبایا تھا جس کو نگل نہ سکی اور پھر اُگل دیا تھا اور اسی نے بعض شہیدوں کے ناک کان کاٹ کر گلے کا ہار بنایا تھا۔ وہ فتح مکہ میں بھیس بدل کر آپؐ کی خدمت میں اسلام لانے کے لیے حاضر ہوئی اور اب بھی گستاخی سے باز نہیں آئی۔ لیکن دربارِ رسالت میں پہنچ کر آپ کے عفو و درگزر سے اس قدر متاثر ہوئی کہ بے اختیار بول اُٹھی یا رسول اللہ سطحِ زمین پر آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھر مجھے مبغوض نہ تھا لیکن آج آپ کے گھرانے سے زیادہ کوئی گھر مجھے محبوب نہیں ہے۔ آپؐ نے یہ سن کر فرمایا کہ خدا کی قسم ہمارا بھی یہی حال تھا۔[1]

آپؐ پر ایک یہودی عالم کا قرض تھا۔ اس نے تقاضا کیا تو آپ نے فرمایا اس وقت میرے پاس کچھ نہیں ہے۔ اس نے کہا میں لے کے ہی ٹلوں گا۔ آپ نے فرمایا تو اب میں تمہارے ساتھ بیٹھا ہوں۔ چنانچہ آپ ظہر سے لے کر فجر تک اس کے ساتھ بیٹھے رہے۔ صحابہ نے اس کی اس گستاخی پر ناراضگی کا اظہار کیا اور خدمتِ اقدس میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ آپ کو ایک یہودی نے روک رکھا ہے۔ آپ نے فرمایا ہاں لیکن مجھے خدا نے اس سے منع کیا ہے کہ میں کسی ذمی یا اور کسی شخص پر ظلم کروں۔ دن چڑھا تو یہودی نے کلمہ پڑھا اور کہا کہ میرا نصف مال خدا کی راہ میں صدقہ ہے۔ میں نے یہ گستاخی صرف اس لیے کی کہ تورات میں جو پیغمبر کے اوصاف ہیں ان کا تجربہ کر دوں۔[2]

---

[1] صحیح مسلم جلد اوّل [2] مشکوٰۃ

وسارعوا الى مغفرة من ربكم وجنة عرضها السماوات والارض۔
اعدت للمتقين الذين ينفقون فى السراء والضراء والكاظمين الغيظ
والعافين عن الناس والله يحب المحسنين ۔

اور اپنے پروردگار کی بخشش اور اس جنت کی طرف لپکو جس کا پھیلاؤ اتنا بڑا ہے جیسے آسمان وزمین کا پھیلاؤ، سجی سجائی ان پرہیزگاروں کے لیے تیار ہے جو خوشحالی اور تنگدستی دونوں حالتوں میں خدا کے نام پر خرچ کرتے ہیں اور غصہ کو رد کتے ہیں اور لوگوں کے قصوروں سے درگزر کرتے ہیں۔ اور لوگوں کے ساتھ نیکی کرنے والوں کو اللہ دوست رکھتا ہے

اس آیت میں متقیوں کے دو وصف بتلائے ہیں۔ ایک ہر حال میں خدا کی راہ میں دینا۔ اور دوسرا لوگوں کو معاف کرنا اور درگزر کرنا۔ اور ان کے لیے دو جزائیں، ایک خدا کی مغفرت اور دوسری وسیع جنت بیان کی گئی ہیں۔ یہ اندازِ بیان کہہ رہا ہے کہ ہر حال میں خدا کی راہ میں دینے کا معاوضہ تو جنت ہے اور غصہ کو پینا اور لوگوں کو معاف کرنے کی جزا یہ ہوگی کہ خدا کی مغفرت ان کے شاملِ حال ہوگی اور اللہ سبحانہ ان کو بھی معافی کا پروانہ عطا فرمادے گا۔

عفو ودرگزر کی اس تعلیم میں اگر قدرت وطاقت کا حصہ نہ ہو تو وہ سراسر کمزوری ہو کر رہ جاتے۔ اسی لیے قرآن نے اس اخلاقی تعلیم کے درس میں اس نکتہ کو فراموش نہیں کیا ہے اور موجودہ انجیل کی اس اخلاقی تعلیم سے کہ اگر ایک شخص کسی کے ایک گال پر چپت مارے تو اس کے سامنے دوسرا گال کردو جو ذلت اور طبعی پستی پیدا ہوتی ہے اس کی اصلاح ہو جاتی ہے کیونکہ قرآن نے عفو ودرگزر کی ایسی معتدل تعلیم دی ہے جس کے ساتھ خودداری کی شان بھی باقی رہتی ہے۔

برائی کا بدلہ برائی جماعت کا قانون ہے اور عفو ودرگزر افراد کا اخلاقی کمال ہے جماعتی قانون کی قوت ہوتے ہوئے افراد کا اس میں عفو ودرگزر سے کام لینا ایک بلند اخلاقی مثال ہے۔

بہرحال زیرِ تشریح آیت کا مقصد مکارمِ اخلاق کی تعلیم ہے بروایت بخاری عبداللہ بن الزبیر فرماتے ہیں کہ یہ آیت لوگوں کے اخلاق کے متعلق نازل ہوئی۔

ثمامہ ابن اثال یمامہ کا رئیس تھا جو اسلام کا مجرم تھا۔ صحابہ کا ایک دستہ نجد کے اطراف روانہ کیا گیا۔ حسن اتفاق سے وہ راستہ میں مل گیا، گرفتار ہو کر مدینہ آیا۔ اور مسجد نبوی کے ایک ستون سے باندھ دیا گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نماز کے لیے تشریف لائے تو اس پر نظر پڑی۔ آپ نے دریافت کیا کہ ثمامہ تمہارے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے۔ اس نے کہا۔ کہ اگر قتل کرنا چاہیں تو ایک خونی مجرم کو آپ قتل کریں گے اور اگر معاف فرمادیں تو یہ احسان ایک احسان شناس کی گردن پر ہوگا۔ اگر مال کی خواہش ہے تو فرمائیے جو ارشاد ہوگا حاضر کیا جائے گا۔ یہ سن کر آپ اس کو اسی حالت میں چھوڑ کر چلے گئے۔ دوسرے روز پھر اسی قسم کا سوال و جواب ہوا۔ تیسرے دن پھر یہی گفتگو ہوئی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود دست مبارک سے اس کے بند گرہ کھولے اور رہا کر دیا۔ اس پر اس عفو و درگزر کا یہ اثر ہوا کہ مسجد سے نکل کر ایک کھجور کے درخت کی آڑ میں گیا اور وہاں غسل کیا۔ غسل سے فراغت کے بعد مسجد میں آیا اور کلمہ توحید پڑھ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف مخاطب ہو کر بولا۔ آپ کے چہرے سے زیادہ زمین پر مجھے کوئی چیز مبغوض نہ تھی لیکن آج وہ مجھ کو سب سے زیادہ محبوب ہے۔ مجھ کو آپ کے دین سے زیادہ کسی دین سے عداوت نہ تھی لیکن آج وہ میرے لیے سب سے زیادہ عزیز ہے۔ مجھے آپ کے شہر سے زیادہ کسی شہر سے عداوت نہ تھی لیکن وہ مجھ کو تمام شہروں سے زیادہ محبوب ہے۔[1]

قرآن کی اس گراں قدر آیت کا یہ اثر صرف آپ کی ذات تک محدود نہ تھا بلکہ صحابہ کی پوری جماعت اس کا عملی نمونہ تھی۔ قرآن کی شہادت ہے کہ صحابہ کرام غصہ کو پی جاتے اور لوگوں کو معاف کر دیتے تھے۔

والکاظمین الغیظ والعافین عن النّاس

غصہ کو پی جانے والے اور لوگوں کو معاف کرنے والے

یہ اخلاقی وصف انتہا درجہ کی کشادہ دلی سے پیدا ہوتا ہے اس لیے اللہ سبحانہ نے اس کا ذکر ان اخلاقی اوصاف کے ساتھ کیا ہے جو کشادہ دلی سے پیدا ہوتے ہیں اور اس کا صلہ بھی ایسا عطا فرمایا ہے جو انتہا درجہ کی وسعت رکھتا ہے۔ پوری آیت پڑھیے

دعوت کی کامیابی کا گُر

۲۵۸۔ اور نیکی کی تلقین کرو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔ نصیحت کرنے سے نہ رُکو، معقول بات کہتے رہو اور جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔ یعنی ان جہالت آمیز حرکتوں پر روز روز اُلجھنے کی ضرورت نہیں۔ جب وقت آئے گا ذرا سی دیر میں سارا حساب بے باقی ہو جائے گا۔[1]

اگرچہ اندازِ بیان انفرادی ہے لیکن چونکہ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر اُمت کو بتایا گیا ہے اس لیے اجتماعی ہے اس کا حاصل یہ ہے کہ اُمت کے افراد پر پوری انسانیت کی نگرانی بقدرِ قوت فرض ہے۔ دو چیزیں ہیں اور دونوں الگ ہیں۔ ایک یہ کہ جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت ہی کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ اس اخلاقی فرض کا نام امر بالمعروف ہے دوسرے یہ کہ اُمت کے افراد پر پوری انسانیت کی نگرانی فرض ہے۔ اس آیت میں دوسری بات کا ذکر ہے۔ یہ وہ تعلیم ہے جو تمام دُنیا کے مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اُصول کو نمایاں کرتی ہے۔ اور اُمتِ اسلامیہ کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ پوری انسانی زندگی کے مزاج اور قوام کی نگہبانی اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرے اسی کا نام دعوت الی اللہ ہے۔ تورات میں قابیل کا یہ فقرہ کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں"، عیسائی مذہب کا ایک اخلاقی اُصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اُصول نے اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام شخصی آزادی ہے۔ لیکن قرآن کے قانون میں اس کے برخلاف واقعی ہر مسلمان کو انسان کا رکھوالا بنایا گیا ہے۔ حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کلکم راع وکلکم مسئول عن رعیتہ تم میں ہر شخص نگران ہے اور ہر شخص سے اس کی نگرانی کے بارے میں پوچھا جائے گا۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگوں کو معروف یعنی ان سیدھی اور صاف بھلائیوں کی تلقین کی جائے جنہیں سارے انسان بالعموم بھلا اور اچھا جانتے ہیں یا جن کی اچھائی کو سمجھنے کے لیے وہ عقلِ عام کافی ہوتی ہے جو ہر انسان کو حاصل ہے۔ اس طرح داعیٔ حق کی دعوت

---

[1] حاشیہ شیخ الہند

عام اور خاص سب کو متاثر کرتی ہے اور ہر سامع کے کان سے دل تک پہنچنے کی راہ آپ نکال لیتی ہے۔ایسی معروف دعوت کے خلاف جو لوگ شورش برپا کرتے ہیں وہ خود اپنی ناکامی اور اس دعوت کی کامیابی کا سامان فراہم کرتے ہیں۔کیونکہ عام انسان خواہ وہ کیسے ہی تعصبات کا شکار ہوں۔جب یہ دیکھتے ہیں کہ ایک طرف ایک شریف النفس اور بلند اخلاق انسان ہے جو سیدھی سیدھی بھلائیوں کی دعوت دیتا ہے۔اور دوسری طرف بہت سے لوگ اس کی مخالفت میں ہر قسم کی اخلاق و انسانیت سے گری ہوئی تدبیریں استعمال کر دیتے ہیں۔ تو آہستہ آہستہ ان کے دل خود بخود مخالفین حق سے پھرتے اور داعیٔ حق کی طرف متوجہ ہوتے چلے جاتے ہیں۔یہاں تک کہ آخر کار میدانِ مقابلہ میں صرف وہ لوگ رہ جاتے ہیں۔ جن کے ذاتی مفاد نظامِ باطل سے ہی وابستہ رہتے ہیں۔یا جن کے دلوں میں تقلید قوم اور جاہلانہ تعصبات نے کسی روشنی کو قبول کرنے کی صلاحیت باقی ہی نہ چھوڑی ہو۔یہی وہ حکمت ہے جس کی بدولت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کامیابی حاصل ہوئی۔

اس آیت میں دوسری بات یہ ارشاد ہوئی ہے کہ جاہلوں سے کنارہ کش رہو۔جاہل سے مراد یہاں بیوقوف اور احمق ہیں بے خبر اور بے علم نہیں ہیں۔بیوقوف اور نادان بات بات میں اُلجھتے ہیں۔اور دعوت کی زندگی میں اُلجھاؤ دعوت کے لیے موت کا سامان ہے۔زندگی یہ ہے کہ اگر مخاطبوں کی جانب سے زیادتیاں ہوں تو ان کے ساتھ خیر خواہی اور ہمدردی کا معاملہ کریں اور نرمی کے ساتھ ان کو راہِ حق بتائیں۔حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ کنارہ کش ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کی بُرائی کا جواب بُرائی سے نہ دیں یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کو راہِ حق بتانا چھوڑ دیں۔کیونکہ دعوت کے کام میں یہ بات ضروری ہے کہ طالبینِ خیر کو معروف کی تلقین کی جاتے وہاں یہ بات ضروری ہے کہ داعی جاہلوں کے منہ نہ آئے۔منہ نہ آنے کی قاضی بیضاوی نے دو صورتیں بتائی ہیں۔ایک مماراۃ دوسرے مکافات۔مماراۃ یہ کہ اس سے اُلجھ جائے اور مکافات یہ کہ ویسی جوابی کارروائی کی جائے اور خواہ وہ اُلجھنے اور اُلجھانے کی کتنی ہی کوشش کریں۔داعی کو اس معاملہ میں بہت محتاط ہونا چاہیے کیونکہ اس کا خطاب صرف ان لوگوں سے ہے جو معقولیت کے ساتھ بات کو سمجھنے کے لیے تیار ہوں۔اور جب کوئی شخص جہالت پر اُتر آئے اور حجت بازی، جھگڑالوپن اور طعن و تشنیع شروع کر دے تو داعی کو اس کا حریف بننے سے انکار کر دینا چاہیے اس لیے کہ اس جھگڑے میں

اُلجھنے کا حاصل کچھ نہیں ہے اور نقصان یہ ہے کہ داعی کی جس قوت کو اشاعت دعوت اور اصلاح نفوس میں خرچ ہونی چاہیے وہ اس فضول کام میں ضائع ہوتی ہے۔

کچھ علما نے اس آیت کی جامعیت کو بہت سراہا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر نیکی اس کے دامن میں ہے اور ہر فضیلت کی یہ شارح ہے۔ خذ العفو میں لین دین اور معاملات میں نرمی اختیار کرنے کی اگر تلقین ہے تو امر بالمعروف مامورات اور محرمات کو اپنی گود میں لیے ہوئے ہے اعرض عن الجاھلین کے ذریعے درگزر کی تعلیم ہے۔

جو بات یہاں مشرکین کے بارے میں ارشاد ہوئی ہے کہ طالبین کو معروف کی تلقین کرو اور ان میں بیوقوف لوگ اگر حماقت سے درپیش آئیں تو ان میں اُلجھ کر یا ان کی جوابی کارروائی میں وقت ضائع نہ کرو بلکہ ان سے کنارہ کش اختیار کر لو۔ یہی بات ان منافقین کے بارے میں بھی کہی گئی ہے جو زندگی میں پورا اسلام نافذ نہیں کرنا چاہتے بلکہ اسلام کو حالات مفادات اور وقت کے تقاضوں کے مطابق اختیار کرنا چاہتے ہیں۔ ارشاد ہے:

اولٰئك الذين يعلم الله ما فی قلوبهم فاعرض عنهم و عظهم وقل لهم فی انفسهم قولا بليغا۔"

ان لوگوں کے دلوں کے اندر جو کچھ ہے اللہ اس سے خوب واقف ہے تو ان سے اعراض کرو، ان کو نصیحت کرو اور تم ان کو ایسی نصیحت کرو کہ ان کے دلوں میں اُتر جائے۔

دونوں آیتوں کا مفاد ایک ہے کہ معروف کی تلقین اور وعظ و نصیحت کسی حال میں نہ چھوڑا جائے اور بات کو دعوت کی حد تک خوب سمجھا دیا جائے لیکن ان میں اگر کوئی نادانی پر اُتر آئے تو اس کی ترا ترخا ئیوں سے اعراض کرنا چاہیے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ نرمی نرم خوئی تبلیغ کی کامیابی کی پہلی شرط ہے اور اسی لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو رحمتِ الٰہی نے خاص طور پر اس کا حصہ وافر عطا فرمایا تھا فبما رحمة من الله لنت لهم۔

اس لیے ایک پیغمبر کے لیے یہ وصف نہایت اہم ہے تاکہ لوگوں کو اس کی تعلیم و دعوت کی طرف میلان ہو اور وہ اس کے حلقۂ اطاعت سے باہر نہ ہونے پائیں اور اسی لیے رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک میں یہ وصف سب سے زیادہ نمایاں طور پر

ودیعت کیا گیا تھا اور اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر اس کو اپنی رحمت کا نتیجہ قرار دیا۔

حقیقت یہ ہے کہ حلم و بردباری، عفو و درگزر، چشم پوشی اور خوش خلقی غرض ان تمام اخلاق کے عطر کا نام ہے جن میں شانِ جمالی پائی جاتی ہے۔ یہی رفق و تلطف اور نرم دلی و نرم خوئی ہے۔ جس طرح حسنِ فطرت زینت و آرائش سے دوبالا ہو جاتا ہے۔ اسی طرح رفق و نرمی کی خو سے انسان کا اخلاقی حسن دو چند ہو جاتا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہی حقیقت حضرت عائشہ کو ان لفظوں میں سمجھائی تھی۔

نرمی جس چیز میں ہو اس کو زینت دیتی ہے اور جس چیز سے الگ کر لی جاتی ہے اس کو بدنما بنا دیتی ہے۔

جس چیز کا لفظ کتنا عام ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ ہر چیز میں نرمی کام کو بناتی ہے اور سختی بگاڑتی ہے۔ ہاں اگر قانون یا جماعت کی مصلحت سختی کا تقاضا کرتی ہو تو پھر سختی کی جائے۔ قانون جس سختی کا مطالبہ کرتا ہے اس کا موقعہ وہ ہے جب کوئی شخص حدودِ الٰہی میں سے کسی حد کو توڑے یا جماعت کو نقصان پہنچانے کے درپے ہو۔ چنانچہ کفار و منافقین جب سمجھانے سے نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے رہیں بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں تو اُن کے شر کو روکنے کے لیے ان پر پوری سختی کی جا سکتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مکارمِ اخلاق کے بارے میں جو بیان حضرت عائشہؓ سے مروی ہے اس میں بھی نرمی اور سختی کے مواقع میں یہی امتیاز کی حد قائم کی گئی ہے۔ اُم المومنین فرماتی ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ذاتی معاملہ میں کبھی کسی سے بدلہ نہیں لیا البتہ جب احکامِ الٰہی کی خلاف ورزی کی جاتی تو آپ اس کو سزا دیتے تھے۔ امام بخاری نے ایک خاص باب میں اس قسم کی متعدد حدیثیں جمع کی ہیں جن میں آپؐ نے مسلمانوں بلکہ ازواجِ مطہرات تک پر کسی کسی بات میں سختی ہوئی ہے۔ حافظ ابن حجر اس باب کی شرح میں لکھتے ہیں؛

گویا امام بخاری اس باب میں یہ اشارہ کرتے ہیں کہ جس حدیث میں یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تکلیفوں پر صبر کرتے تھے وہ آپ کے ذاتی حق سے متعلق ہیں، لیکن خدا کے حق میں آپؐ اس سختی سے کام لیتے تھے جس کا خدا نے حکم دیا تھا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اُن صحابہ کو جنہیں آپ دین کی خدمت کے لیے

روانہ کرتے تھے۔ فرماتے تھے یسرا ولا تعسرا آسانی کرو سختی نہ کرو۔ جہاں اس کا یہ مطلب ہے کہ بیگانوں میں دین کی دعوت لے کر جاؤ۔ تم ان کے لیے سہولت کا سامان بنو نہ کہ تنگی و سختی کا، ایسے ہی یہ مطلب بھی ہے کہ بیگانوں میں جب یہ کام کرو تو نوافل اور مستحباب میں سختی نہ کرو اور شریعت نے جس حد تک گنجائش رکھی ہے اس میں تنگی نہ کرو۔

راہِ حق میں وسوسوں کا مداوا

۲۵۹ - اور اگر کبھی شیطان کی جانب سے کوئی خلش محسوس ہو تو اللہ کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ بلاشبہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ یعنی اگر کسی وقت بتقاضائے بشریت ان کی کسی نالائق حرکت پر غصہ آجائے اور شیطان لعین چاہے کہ دور سے چھیڑ چھاڑ کر کے آپ کو ایسے معاملہ پر آمادہ کرے جو خلافِ مصلحت ہو یا آپ کے خُلقِ عظیم اور علم و متانت کے شایان نہ ہو تو آپ فوراً اللہ سے پناہ طلب کیجئے آپ کی عصمت و وجاہت کے سامنے اس کا کوئی کید نہیں چل سکے گا۔ کیونکہ خداوند قدیر جو ہر مستغیث کی بات سننے والا ہے اور ہر حالت کا جاننے والا ہے۔ اسی نے آپ کی صیانت کا تکفل فرمایا ہے [1]

آیت میں نزغ آیا ہے۔ اس کے معنے چرکا لگانا، کچھوکا لگانا، زخم لگانا۔ مطلب یہ ہے کہ اگر ان شیاطین جن و انس کی ہرزہ سرائیوں اور خاکبازیوں سے دل کو کوئی صدمہ پہنچے تو اپنے رب کی پناہ ڈھونڈو یعنی جب کبھی داعیٔ حق مخالفین کے ظلم اور ان کی شرارتوں اور ان کے جاہلانہ اعتراضوں اور الزاموں پر اپنی طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے فوراً سمجھ لینا چاہیے کہ یہ شیطانی وسوسہ ہے اور اسی وقت خدا کے ساتھ پناہ مانگنی چاہیے کہ اپنے بندے کو اس جوش میں بہ نکلنے سے بچائے اور ایسا بے قابو نہ ہونے دے کہ اس سے دعوتِ حق کو نقصان پہنچانے والی کوئی حرکت سرزد ہو جائے۔ دعوتِ حق کا کام بہرحال ٹھنڈے دل سے ہی ہو سکتا ہے اور وہی قدم صحیح اٹھ سکتا ہے جو جذبات سے مغلوب ہو کر نہیں بلکہ موقع و محل کو دیکھ کر خوب سوچ سمجھ کر اٹھایا جائے لیکن شیطان جو اس کام کو فروغ پاتے کبھی نہیں دیکھ سکتا ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں سے

---

[1] حاشیہ شیخ الاسلام

داعی حق پر حملے کرائے اور پھر ہر حملے پر داعی حق کو اُکسائے کہ اس حملے کا جواب تو ضرور ہونا چاہیے۔ یہ اپیل جو شیطان داعی کے نفس سے کرتا ہے ۔ اکثر بڑی بڑی پُر فریب تاویلوں اور خالص دینی اصطلاحوں کے غلافوں میں لپٹا ہوا ہوتا ہے لیکن اس کی تہ میں بجز نفسانیت کے اور کوئی چیز نہیں ہوتی ہے ۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر مخالفوں کے عناد نا موافق حالات کے ہجوم اور اپنی بے چارگی و بے نوائی کے تصور سے مایوس کن خیالات پیدا ہونے لگیں تو سمجھ جاؤ یہ شیطانی وسوسہ ہے اور اللہ کی یاد سے اس کا علاج کرو۔ آیت کے مخاطب اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں تو شیطانی وساوس سے آپ کی ذات مقام عصمت کی وجہ سے بالا ہے اس کے شارحین قرآن نے دو جواب دیے ہیں ۔ ایک یہ کہ حضورؐ کو واسطہ بنا کر اُمت مخاطب ہے دوسرے یہ کہ انداز بیان فرض و تقدیر کی صورت میں ہے یعنی اگر بالفرض ایسا ہو جائے تو پھر علاج یہ ہے ۔ لیکن اگر شیطان سے شیطان انس مراد ہو تو پھر مطلب بالکل واضح ہے کہ حالات کی ناسازگاری اور دشمنوں کی کھلی ریشہ دوانیوں سے یہ خیالات آنے لگیں کہ مصائب کے اس ہجوم اور واقعات کے اس نرغے میں کامیابی کیسے ہوگی تو ایسے موقعہ پر یاد الہٰی سے کام لیجئے اور سمجھ لیجئے کہ یہ شیطان کا وسوسہ ہے ۔

اس ارشاد گرامی سے اشارا پا کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے، کہ غصہ شیطان سے ہے اور شیطان آگ سے بنا ہے اور آگ کو پانی ٹھنڈا کرتا ہے تو جس کو غصہ آئے اس کو چاہیے وضو کرے۔ حضرت ابو ذر غفاری کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جس کو غصہ آئے وہ اگر کھڑا ہے تو چاہیے کہ بیٹھ جائے اور اگر اس سے کم نہ ہو تو چاہیے کہ لیٹ جائے ۔

صحیحین میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے دو شخصوں نے کچھ باتیں کیں ۔ ان میں سے ایک صاحب کو اتنا غصہ آیا کہ چہرہ غصہ سے لال ہو گیا اور رگیں پھول گئیں ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی طرف دیکھ کر فرمایا مجھے ایک ایسا کلمہ معلوم ہے کہ اگر وہ کہہ لے تو یہ غصہ جاتا رہے اور وہ کلمہ یہ ہے ، اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم یہ بھی اسی آیت کریمہ کا مدلول ہے ۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غصہ کے تین علاج بتائے ہیں ، ایک روحانی اور دو ظاہری ۔ روحانی تو وہ ہے جس کا ذکر قرآن کی اس آیت میں ہے فاستعذ باللہ یعنی جب

غصہ آئے تو فوراً دعا کرنی چاہیے کہ خداوندا میں شیطان سے بھاگ کر تیری پناہ چاہتا ہوں۔ اعوذ باللہ الخ کا مطلب یہی ہے اللہ سبحانہ' اس کی دعا کو شرف قبول عطا کرے گا۔ ظاہری طور سے بھی دیکھئے کہ جب کسی مسلمان کو دل سے یقین ہو گا کہ غصہ شیطانی حرکت ہے۔ تو خدا کا نام لینے کے ساتھ وہ اس سے دور ہو جائے گا۔

دو ظاہری علاجوں میں سے ایک تو یہ ہے کہ انسان کھڑا ہو تو بیٹھ جائے اور بیٹھا ہو تو لیٹ جائے۔ مقصود اس سے یہ ہے کہ تبدیل ہیئت سے طبیعت بٹ جائے گی اور غصہ کم ہو جائے گا۔ اور کچھ علماء نے لکھا ہے کہ آدمی خاک سے پیدا ہوا ہے اور شیطان آگ سے۔ آدمی جتنا خاک سے قریب ہو گا آگ کا اثر دور ہو جائے گا۔ دوسرا علاج یہ ہے کہ وضو کرے۔ اس سے مقصود یہ ہے کہ غصہ کی حالت میں گرمی سے خون کا دوران بڑھ جاتا ہے، آنکھیں لال ہو جاتی ہیں، چہرہ سرخ ہو جاتا ہے تو پانی پڑنے سے مزاج میں ٹھنڈک آئے گی اور غصہ کی گرمی دور ہو جائے گی۔ اور علماء نے یہ بھی بتایا ہے کہ وضو عبادت ہے اور شیطان کو عبادت سے نفرت ہے۔ انسان میں شان عبدیت آتی ہے تو شیطانی اثر زائل ہو جاتا ہے۔

تقویٰ سے انسانی ضمیر کی بیداری

۲۶۰۔ بلاشبہ جو لوگ متقی ہیں اگر انہیں کبھی شیطانی خیال آبھی جاتا ہے تو فوراً چونک جاتے ہیں۔ اور پھر اچانک ان کی آنکھیں کھل جاتی ہیں۔ پہلے تو تنہا حضورؐ کو خطاب تھا۔ گو حکم استعاذہ میں سب شامل تھے۔ اب عام متقین کا حال بیان فرماتے ہیں۔ یعنی عام متقین کے حق میں یہ محال نہیں ہے کہ شیطان کا گزر ان کی طرف ہو اور کوئی چرکہ لگا جائے، البتہ متقین کی شان یہ ہوتی ہے کہ شیطان کے اغواء سے ممتد غفلت میں نہیں پڑتے بلکہ ذرا غفلت ہوئی اور خدا کو یاد کر کے چونک پڑے۔ ٹھوکر لگی اور یکدم سنبھل گئے۔ سنبھلتے ہی آنکھیں کھل گئیں۔ غفلت کا پردہ اٹھ گیا۔ نیکی بدی کا انجام سامنے آنے لگا اور بہت جلد نازیبا کام سے رک گئے[1]
مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جہالت کے بجائے تقویٰ کی روش اختیار کرتے ہیں جب کبھی ان کو جاہلوں کی جہالت اور شیاطین کی شیطنت کا کوئی جھٹکا لگتا ہے تو وہ اپنے رب کو یاد کرتے ہیں جس سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فوراً ان کا باطن روشن ہو جاتا ہے اور اشرار و معاندین کی ساری خاکبازی کے باوجود ان کی راہ ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں ہونے پاتی۔ یہ گویا اس استفادے کا طریقہ اور فائدہ بتایا گیا جس کی اوپر والی آیت میں ہدایت ہوئی ہے کہ خدا کی پناہ میں داخل ہونے کا طریقہ یہ ہے کہ آدمی اپنے رب کو یاد کرے۔ یہ چیز دل کے اندر ایسی بصیرت اور ایسی قوت و ہمت پیدا کر دے گی کہ دفعتہً آنکھوں کے سامنے کا سارا غبار چھٹ جائے گا۔

آیتِ قرآنی یہ بتا رہی ہے کہ اربابِ تقویٰ اپنے نفس میں کسی شیطانی تحریک کا اثر اور کسی بُرے خیال کی کھٹک محسوس کرتے ہی فوراً چوکنے ہو جاتے ہیں اور پھر انہیں صاف نظر آجاتا ہے کہ اس موقعہ پر دعوتِ دین کا مفاد کس طرزِ عمل میں ہے اور حق پرستی کا تقاضا کیا ہے۔

بہرحال وساوس و خطرات سب کو گزرتے ہیں لیکن جو لوگ تقویٰ کی دولت سے مالامال ہیں ان کا ضمیر تقویٰ کی وجہ سے ایسا بیدار ہو جاتا ہے کہ جونہی کوئی وسوسہ گزرا یکدم چونک اُٹھے اور راستی و نیکی کی روشنی نمودار ہو گئی۔

یہاں حضرت تھانوی قدس اللہ سرہٗ العزیز کا مسائل السلوک میں استنباط بڑا ہی لطیف ہے کہ آیت میں اشارہ ہے کہ وسوسہ کاملین کو بھی ہو سکتا ہے اور یہ ان کے کمال کے منافی نہیں ہے۔ چونکہ کاملین میں اس کا امکان ہے۔ اسی لئے آیت میں اس کا علاج بتایا گیا ہے۔

شیاطین کے بھائی کون ہیں ؟

۲۶۱۔ باقی رہے شیطان کے بھائی تو وہ ان کو گمراہی میں کھینچے لئے جاتے ہیں۔ اور پھر اس میں ذرا بھی کمی نہیں کرتے ہیں۔ یعنی غیر متقین جن کے دل میں خدا کا ڈر نہ ہو اور جنہیں شیطان کی برادری کہنا چاہیے اُن کا حال یہ ہے کہ شیاطین ہمیشہ ان کو گمراہی میں کھینچے چلے جاتے ہیں اور رگیدنے میں ذرا کمی نہیں کرتے۔ اور یہ لوگ ان کی اقتدار و پیروی میں کوتاہی نہیں کرتے اور اس طرح ان شیاطین کے غرور و سرکشی کو اور زیادہ بڑھاتے رہتے ہیں۔ بہرحال متقی کی شان یہ ہے کہ شیطان دق کرے تو فوراً اللہ کی پناہ لے دیر نہ کرے ورنہ غفلت میں تمادی ہو کر رجوع الی اللہ کی توفیق ہی نہ رہے گی[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ حق کے کاموں میں نفسانیت ہوتی ہے اور اس وجہ سے ان کا شیاطین سے بھائی چارہ ہوتا ہے تو ایسے لوگ شیطانی تحریک کا مقابلہ نہیں کر سکتے اور اس سے مغلوب ہو کر غلط راہوں پر چل دیتے ہیں۔ پھر جہاں شیطان چاہتا ہے ان کو لے جاتا ہے۔ اور کبھی بھی ان کے قدم نہیں رکتے، گالی کا جواب گالی سے دیتے ہیں۔ اخوان الشیاطین سے ان جاہلین کے وہ ساتھی مراد ہیں جن کے اشاروں پر یہ کام کرتے ہیں خواہ وہ شیاطین انس ہوں یا شیاطین جن فرمایا کہ اہل ایمان کو تو خدا کی یاد سنبھال لیتی ہے لیکن جاہلین کو ان کے شیاطین گمراہی کی وادیوں میں بھٹکاتے بھٹکاتے آخری منزل پر پہنچا دیتے ہیں۔ ذرا بھی کسر نہیں اٹھا رکھتے کہ بازگشت کا کوئی امکان باقی رہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے شیاطین الانس کو اولیت دی ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ شیاطین الانس ہیں جو ان کے بھائی بند ہیں جن کے اوامر کی یہ لوگ پابجائی کر رہے ہیں وہ ان کی مدد کرتے ہیں۔

آیت میں دراصل یہ قانون بتایا گیا ہے کہ شیاطین کا بھائی چارہ ان ہی لوگوں سے ہوتا ہے جو ایمان سے خالی ہوتے ہیں۔ یعنی شیطان کو برادرانہ تعلقات قائم کرنے کا وہاں موقع ملتا ہے جہاں ایمان کا فقدان ہوتا ہے بے ایمانی اور کفر میں شیطان کی اخوت قبول کرنے کی پوری پوری صلاحیت ہوتی ہے۔ اس کی مثال مادی دنیا میں یہ ہے کہ جراثیم کا اثر بیماریوں کے لئے وہ جسم قبول کرتے ہیں جن میں اثر قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے جو ان اسباب سے نہیں بچتے جو بیماریاں پھیلاتے ہیں ایسے ہی شیاطین ان ہی روحوں پر دسترس رکھتے ہیں جو ایمان سے کورے ہوتے ہیں۔ ایمان سے کورے ہونے کا یہ مطلب ہے کہ انبیاء کی رہنمائی قبول نہیں کرتے اور خدا پر یقین نہیں رکھتے۔ شیاطین کی دستبرد سے محفوظ رہنے کی واحد تدبیر یہ ہے کہ نبوت کی رہنمائی قبول کی جائے اور زندگی میں اس کی پیروی کی جائے۔

یہ قانون سب کے لیے ہے، دولت مند ہوں یا غریب، حاکم ہوں یا محکوم۔ اس جرم کا ارتکاب اگر عام شہریوں کی جانب سے ہو گا تو اس قدرتی تازیانے سے وہ بھی ایسے ہی محفوظ نہ ہوں گے جیسے حکمراں۔ ان دو آیتوں پر غور کیا جائے تو یہ بات صاف معلوم ہو رہی ہے کہ جو لوگ اس دنیا میں متقیانہ زندگی بسر کرتے ہیں ان کی زندگی ان لوگوں سے قطعاً مختلف ہوتی ہے۔ جن میں تقویٰ نہیں ہوتا۔ جو لوگ فی الواقع خدا سے ڈرتے ہیں اور دل سے چاہتے ہیں کہ

بُرائی سے بچیں، ان کا حال یہ ہوتا ہے کہ بُرے خیال کا ایک ذرا سا غبار بھی اگر اُن کے دل کو چھو جاتا ہے تو انہیں ویسی ہی کھٹک محسوس ہوتی ہے جیسی کھٹک انگلی میں پھانس چُبھ جانے سے ہوتی ہے۔ چونکہ وہ بُرے خیالات، بُری خواہشات اور بُری نیتوں کے خوگر نہیں ہوتے اس وجہ سے یہ چیزیں ان کے لیے اسی طرح خلافِ مزاج ہوتی ہیں جس طرح انگلی کے لیے پھانس یا آنکھ کے لیے ذرّہ یا ایک نفیس طبع اور صفائی پسند آدمی کے لیے کپڑوں پر سیاہی کا ایک داغ یا گندگی کی ایک چھینٹ۔ پھر جب یہ کھٹک انہیں محسوس ہو جاتی ہے تو ان کی آنکھیں کھُل جاتی ہیں۔ اور ان کا ضمیر بیدار ہو کر اس غبارِ شر کو اپنے اوپر سے ہٹانے میں لگ جاتا ہے بخلاف اس کے جو لوگ نہ خدا سے ڈرتے ہیں نہ بدی سے بچنا چاہتے ہیں اور جن کی شیطان سے لاگ لگی ہوئی ہے اور ان کے نفس میں بُرے بُرے خیالات بُرے ارادے بُرے مقاصد پکتے رہتے ہیں اور وہ ان گندی چیزوں سے کوئی اجنبیت اپنے اندر محسوس نہیں کرتے۔ بالکل اسی طرح جیسے کسی دیگچی میں سوّر کا گوشت پک رہا ہو اور وہ بے خبر ہو کر اس کے اندر کیا پک رہا ہے یا جیسے کسی بھنگی کا جسم اور اس کے کپڑے غلاظت میں لتھڑے ہوتے ہوں اور کچھ احساس نہ ہو کہ وہ کن چیزوں میں آلودہ ہے۔[1]

---

[1] تفہیم القرآن

وَاِذَا لَمْ تَاْتِهِمْ بِاٰيَةٍ قَالُوْا لَوْلَا اجْتَبَيْتَهَا ۭ قُلْ اِنَّمَآ
اَتَّبِعُ مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ مِنْ رَّبِّيْ ۚ هٰذَا بَصَاۗىِٕرُ مِنْ رَّبِّكُمْ وَ
هُدًى وَّرَحْمَةٌ لِّقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝ وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ
فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا لَعَلَّكُمْ تُرْحَمُوْنَ ۝ وَاذْكُرْ
رَّبَّكَ فِيْ نَفْسِكَ تَضَرُّعًا وَّخِيْفَةً وَّدُوْنَ الْجَهْرِ مِنَ الْقَوْلِ
بِالْغُدُوِّ وَالْاٰصَالِ وَلَا تَكُنْ مِّنَ الْغٰفِلِيْنَ ۝ اِنَّ الَّذِيْنَ عِنْدَ
رَبِّكَ لَا يَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِهٖ وَيُسَبِّحُوْنَهٗ وَلَهٗ يَسْجُدُوْنَ ۝ السجدة ع ١٨

اور اے اللہ کے رسول جب تم ان کے سامنے کوئی معجزہ نہیں
پیش کرتے ہو تو وہ کہتے ہیں کیوں نہیں چن کر لایا تو نشانی۔[٢٦٢]
آپ فرما دیجئے حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ میرا کام
تو صرف اس وحی کی پیروی کرنا ہے جو میرے رب کی جانب
سے مجھ پر آتی ہے۔[٢٦٣] یہ قرآن تمہارے رب کی جانب سے

ایمان والوں کے لیے بصیرت کی باتیں ہیں اور ہدایت و رحمت ہے۔[٢٦٤] اور مسلمانو! جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔[٢٦٥] اور اے پیغمبر یاد کرتا رہ اپنے جی میں اپنے رب کو گڑگڑا کر اور ڈر کر اور زبان سے بھی آہستہ آہستہ بغیر آواز بلند کیے صبح اور شام اور مت ہو غفلت والوں میں سے، بلاشبہ جن لوگوں کو اللہ کا قرب حاصل ہے وہ اس کی بندگی سے بڑائی نہیں کرتے اور وہ اس کی تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور اسی کے حضور سجدہ کرتے رہتے ہیں۔[٢٦٦]

مفردات کے معانی

اجتبیت۔ اجتباء سے ماضی کا واحد مذکر حاضر ہے۔ اس کا مادہ جبی ہے۔ اس کے لغت میں اصل معنے مجموعہ میں سے کسی چیز کا انتخاب کر لینا اور چھانٹ لینا ہے۔ لیکن یہاں اس کے معنے گھڑنے اور بنانے کے ہیں۔ یہ بات مخالفوں نے آپ سے بطور طنز کہی تھی۔

بصائر بصیرۃ کی جمع ہے۔ بینائی، سمجھ، دلیل، بصیرۃ کا استعمال صرف اور صرف دل کی بینائی کے متعلق ہوتا ہے۔ آنکھ سے دیکھنے کو بصیرۃ نہیں کہتے بصیرۃ کے مختلف معنے آتے ہیں عقل سمجھ، عبرت، دلیل اور حجت۔

رحمۃ ، بخشش، مہربانی رَحِمَ یرحم کا مصدر ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں رحمت وہ رقت ہے جو مرحوم کی طرف احسان کی مقتضی ہو کبھی اس کا استعمال محض رقت کے معنے میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنے میں جو رقت سے خالی ہو جیسے رحم اللہ فلانا، جب یہ اللہ سبحانہٗ کی صفت ہوگی تو صرف احسان مراد ہوگا رقت مراد نہ ہوگی۔ اس لئے رحمت رقت اور احسان دو معنوں پر مشتمل ہے۔ رقت کو طبائع انسانی میں جگہ ملی ہے اور احسان اللہ سبحانہٗ کی صفت ہوتی۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے اردو میں رحمت کی بہترین تشریح کی ہے فرماتے ہیں عربی میں رحمت عواطف کی ایسی رقت کو کہتے ہیں، جس سے کسی دوسری ہستی کے لیے احسان و شفقت کا ارادہ جوش میں آجائے بس رحمت میں محبت، شفقت، فضل و احسان سب کا مفہوم داخل ہے اور محبت، لطف اور فضل سے زیادہ وسیع ہے لہ

استمعوا استماع سے امر ہے مادہ سمع ہے۔ سمع کے معنے سننا اور استماع کے معنے کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ قرأت سُنی جائے یا نہ سُنی جائے اس کی طرف توجہ کرے۔ امام نووی لکھتے ہیں الاستماع الاصغاء یعنی توجہ کرنا اور کان دھرنا۔ رازی لکھتے ہیں اسماع غیر والاستماع غیر سماع اور چیز ہے اور استماع اور۔ نواب صدیق حسن خاں بھوپالی رحمۃ اللہ نے اس فرق کو پیشِ نظر رکھ کر بدور الاہلہ میں یہ لطیف نکتہ آفرینی کی ہے کہ:

معتبر استماع است نہ سماع بس ہر کہ بانتہاء وقوف واقف شد و لمی شنود یا رحم باصوت خطیب صفی است د ے ہم چو سامع است۔

انصتوا انصات سے امر بنا ہے۔ صراح قاموس میں اس کے معنے سکوت یعنی خاموش ہونا بتاتے ہیں۔ نووی نے شرح مسلم میں انصات کے معنے سکوت بتلاتے ہیں۔ امام بیہقی کتاب القراۃ میں لکھتے ہیں اذلا فرق بین السکوت والانصات عند العرب اہل عرب کے یہاں سکوت اور انصات میں کوئی فرق نہیں ہے۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت جبریل علیہ السلام وحی لے کر آتے اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو قرآن پڑھاتے تو آپ بھی ہمیشہ آہستہ آہستہ ساتھ پڑھتے جاتے کہ مبادا حضرت جبریل علیہ السلام کے تشریف لے جانے کے بعد میں مجھول نہ جاؤں

اور کان یحرک شفیتہ آپ آہستہ آہستہ ہونٹ ہلاتے جاتے مگر اللہ تعالیٰ نے حکم نازل کیا، لا تحرک بہ لسانک آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیں فاستمع لہ، وانصت آپ توجہ کریں اور مکمل خاموشی اختیار کریں۔ اس سے معلوم ہوا کہ سامع کے لیے آہستہ پڑھنا، زبان کو حرکت دینا اور ہونٹ ہلانا استماع اور انصات کے بالکل منافی ہے۔

فی نفسک۔ اس کے تین معنے آتے ہیں۔ یہاں ذکر کے لیے استعمال ہوا ہے۔ ایک تدبر اور غور کرنا دوسرے اکیلے یاد کرنا، تیسرے آہستہ یاد کرنا۔ یہ تینوں معنے ائمہ لغت اور شارحین قرآن سے منقول ہیں۔ تفصیل انشاء اللہ تشریح میں آئے گی۔

تضرع، یہ لفظ عربی میں ضراعت سے بنا ہے جس کے معنے کمزور ہونا، ذلیل ہونا آتے ہیں۔ تضرع کے معنے ذلیل ہونا، گڑگڑانا ہے۔ بزدل مرد کو بھی ضرع کہا جاتا ہے۔

خیفۃ، خوف، ڈر، خاف یخاف کا مصدر ہے۔ راغب لکھتے ہیں خیفہ اس حالت کا نام ہے جو انسان کو خوف کی حالت میں ہوتی ہے۔

دعوت میں شیطانی رخنہ

پہلے یہ بتایا گیا تھا کہ جب کبھی حق کا داعی مخالفین کے ظلم اور ان کی شرارتوں سے اپنی طبیعت میں اشتعال محسوس کرے تو اسے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ یہ شیطانی حملہ ہے اور اسی وقت اللہ کو اپنا ملجا اور معاذ بنانا چاہیے کیونکہ شیطان اس کام کو فروغ پاتے ہوئے کبھی دیکھ نہیں سکتا وہ ہمیشہ اس کوشش میں لگا رہتا ہے کہ اپنے بھائی بندوں سے داعی حق پر طرح طرح کے حملے کرائے اور پھر ہر حملے پر داعی حق کو اکسائے کہ اس حملے کا جواب تو ضرور ہونا چاہیے۔ یہ اپیل جو شیطان داعی کے نفس سے کرتا ہے اکثر بڑی بڑی پُر فریب تاویل اور مذہبی اصطلاح کے غلاف میں لپیٹ کر کرتا ہے لیکن اس کی تہ میں نفسانیت کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔ یہ فرمانے کے بعد اب اس کو ایک مثال سے سمجھایا جارہا ہے کہ یہ شیاطین کس انداز سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پریشان کرتے ہیں بروایت ابن کثیر حضور کے مخاطبوں میں کچھ ایسے خبیث کافر بھی تھے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مقابلے کے لیے تیار ہوجاتے اور اپنی کج بحثی سے حضورؐ کو پریشان کرتے اور قسم قسم کی باتیں بناتے۔

۲۶۲ - اور اے اللہ کے رسول جب تم ان کے سامنے کوئی معجزہ نہیں پیش کرتے ہو تو وہ کہتے ہیں کیوں نہیں چن کر تو نشانی - یعنی جب کبھی وحی کے آنے میں تاخیر ہوتی تو کفار از راہِ تمسخر کہتے تھے کہ اب کوئی آیت کیوں گھڑ کر نہیں لے آتے آخر سارا قرآن تم نے بنایا ہی ہے - العیاذ باللہ - اسی طرح کبھی پریشان کرنے کی لیے بعض ایسے معجزات طلب کرتے جن کے دکھلانے کی حکمت الٰہی مقتضی نہ تھی - جب آپ دکھلانے سے انکار کرتے تو کہتے لولا اجتبیتھا یعنی اپنے خدا سے کہہ کر ہمارا مانگا ہوا نشان کیوں چھانٹ کر نہیں لے آئے۔ ؎

یہ دونوں باتیں الگ الگ بھی ہو سکتی ہیں - یعنی آیتِ قرآنی کا مطالبہ اور معجزے کی فرمائش ، اور یہ دونوں جمع بھی ہو سکتے ہیں - جمع کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ جب تم ان کے مطالبے پر ان کی خواہش کے مطابق معجزہ نہیں دکھاتے تو یہ لوگ تمہیں یہ طعنہ دیتے ہیں کہ یہ کہیں سے کیوں نہ چھانٹ لائے - اس سے ان کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ جہاں تک قرآن کا تعلق ہے اس کا معاملہ تو بہت آسان ہے - ادھر اُدھر سے جو باتیں اگلوں کے واقعات اور اہلِ کتاب کی روایات پر مشتمل کانوں میں پڑیں ان میں سے جو باتیں دل کو بھا گئیں ان میں پیوند کاری کر کے کچھ کلام بنالیا اور لاکر اس دعویٰ کے ساتھ پیش کر دیا کہ یہ اللہ نے وحی روانہ کی ہے لیکن اب ہم نے جو معجزہ کا مطالبہ کیا ہے تو تمہاری کچھ پیش نہیں جاتی ہے اس لیے ادھر اُدھر سے چھانٹ لینا اور چیز ہے معجزہ دکھانا اور چیز ہے - یہ چھانٹ لینے کی چیز نہیں تھی کہ کہیں سے چھانٹ لاتے اور ہمیں دکھا دیتے گویا اس طعنہ میں صرف معجزہ نہ دکھا سکنے کا ہی طعنہ نہیں ہے بلکہ اس سے زیادہ زہر آلود طعنہ اس کے اندر پوشیدہ ہے کہ معاذ اللہ قرآن ایک من گھڑت چیز ہے جو ادھر اُدھر سے چھانٹی کر کے بنالی گئی ہے ۔

اجتبار کے لغت میں معنے کسی چیز کو چن لینے کے ہیں یعنی بہت سی چیزوں میں سے ایک کا انتخاب - لیکن یہاں چونکہ طنز کے اسلوب میں آیا ہے اس لیے یہاں معنے گھڑ لینے کے ہیں - اسی وجہ سے مشہور نحوی فراء نے اس کے معنے اختلاق اور افترا کے بتائے ہیں یعنی گھڑ لینا - حضرت عبداللہ بن عباس اور حضرت عبدالرحمٰن بن زید نے لولا اجتبیتہا کا مطلب

؎ افاداتِ شیخ الاسلام

یہ بتایا ہے کہ اگر کافروں کی خواہش کے مطابق آپ معجزہ نہیں دکھاتے تو وہ کہتے ہیں کہ تم اپنی طرف سے بنا کر معجزہ کیوں نہیں لے آتے۔ ابن جریج نے اسی کو اختیار کیا ہے لیکن امام ضحاک نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ تم خود جا کر آسمان سے کیوں نہیں لے آتے۔ یعنی اگر وحی نہیں آتی تو خود جا کر لے آتے۔

مخالفوں کے طنز کا با وقار جواب

۲۶۳- آپ فرما دیجئے کہ حقیقت اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ میرا کام تو صرف اس وحی کی پیروی کرنا ہے جو میرے رب کی جانب سے مجھ پر آتی ہے یعنی ان سے کہہ دو کہ نبی کا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے خدائے قدوس پر افترا کرے یا لوگوں کے کہنے سننے پر اقدام کرکے خدا سے وہ چیز مانگے جس کا دینا اس کی حکمت کے منافی ہے یا جس کے طلب کرنے کی اجازت نہیں ہے اس کا وظیفہ صرف یہ ہے کہ خدا کی بھیجی ہوئی وحی قبول کرے اس پر عمل پیرا ہو اور دوسروں کو عمل پیرا ہونے کی دعوت دے[۱] مقصد یہ ہے کہ میرا منصب یہ نہیں ہے کہ جس چیز کی مانگ ہو یا جس کی میں ضرورت محسوس کروں اسے خود ایجاد یا تصنیف کر لوں میں تو ایک رسول ہوں اور میرا منصب صرف یہ ہے کہ جس نے مجھے روانہ کیا ہے اس کی ہدایت پر عمل کروں۔ حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ خلاصہ جواب یہ ہے کہ نبوت کی غایت اصلی اصلاح ہے اور معجزہ نبوت کی دلیل ہے اور دلیل دلیل سب برابر ہیں بس دلائل میں تعیین کی فرمائش بالکل لغو اور مہمل ہے۔ یہ تو ایک ضابطہ ہے کہ مدعی کے اختیار تمیزی اور صوابدید پر موقوف ہے کہ جس دلیل سے چاہے دعوی کو ثابت کرے۔ مدعا علیہ جب پیش کردہ دلیل پر کوئی جرح نہیں کرتا تو اس کو یہ حق نہیں ہے کہ فلاں دلیل پیش کرو لہٰذا اولاً معجزہ کی فرمائش ہی بے محل ہے اور پھر اس میں حق کی طلب نہیں[۲] مفتی محمد شفیع صاحب نے اسی کو دوسرے انداز میں پیش کیا ہے فرماتے ہیں:

پیغمبر کا معجزہ اس کی رسالت کی ایک شہادت ہوتا ہے اور جب مدعی کا دعویٰ کسی معتبر شہادت سے ثابت ہو جائے اور فریق مخالف نے اس پر کوئی جرح بھی نہیں کی ہو تو

---

[۱] افادات شیخ الاسلام [۲] بیان القرآن

اس کو دُنیا کی کسی عدالت میں یہ حق نہیں دیا جاتا کہ وہ مدعی سے اس کا مطالبہ کرے کہ فلاں فلاں شہادت پیش کرو۔ اس لیے واضح معجزات دیکھنے کے بعد مخالفین کا یہ کہنا کہ فلاں قسم کا معجزہ دکھاؤ ایک معاندانہ مطالبہ ہے جس کو کوئی عدالت صحیح تسلیم نہیں کر سکتی۔

بظاہر جواب اس آیت میں جو دیا گیا ہے سادہ ہے لیکن بادقار اور بھرپور جواب ہے فرمایا کہہ دو تم جو چاہو سمجھو اور جو چاہو کہو میں تو بس اسی وحی کی اتباع کرتا ہوں جو میرے اوپر میرے رب کی جانب سے اُتاری گئی ہے۔ اصل حقیقت نہایت سادہ مگر نہایت باعظمت اسلوب میں ظاہر کر دی۔

معجزہ دلیلِ نبوّت ہے یا نہیں

اس آیت میں دو باتیں اشارۃً ارشاد ہوئی ہیں۔

ایک یہ کہ معجزہ ماہیّتِ نبوّت میں داخل نہیں۔

دوسرے یہ کہ معجزہ دلیلِ نبوّت ہے۔ اگرچہ اس موضوع پر اشاعرہ اور معتزلہ کا اختلاف ہے۔ اشاعرہ کہتے ہیں کہ معجزہ دلیل ہے اور معتزلہ اس کا انکار کرتے ہیں۔ اس مسئلہ پر سب سے زیادہ سیر حاصل بحث ابن رُشد اندلسی نے کشف الادلہ میں کی ہے اور ثابت کیا ہے کہ معجزہ دلیلِ نبوت نہیں ہو سکتا کیونکہ منطقی طور پر دعویٰ اور دلیل میں مطابقت ہونا ضروری ہے اور معجزہ اور نبوت میں کوئی مطابقت نہیں ہے۔ اشاعرہ اس کا یہ جواب دیتے ہیں کہ نبوّت علم و عمل کے مجموعہ کا نام ہے اور جو شخص نبوّت کا دعویٰ کرتا ہے اس کی نسبت یہ تسلیم کر لیا جاتا ہے کہ وہ دونوں چیزوں میں کمال رکھتا ہے اور اسی کمال کے اظہار کے لیے معجزہ طلب کیا جاتا ہے۔ اور انبیاء کے معجزات اگرچہ مختلف قسم کے ہوتے ہیں تاہم ان کو صرف دو قسموں میں شمار کیا جاتا ہے۔ اخبار بالغیب اور تصرف فی الکائنات۔ اخبار بالغیب سے اس کے علمی کمال کا اظہار ہوتا ہے اور تصرف فی الکائنات سے اس کی قوّتِ عملی ظاہر ہوتی ہے۔ لیکن معجزہ اگر دلیلِ نبوّت ہے تو منطقی حیثیت سے یہ کس قسم کی دلیل ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کو بُرہان نہیں کہا جا سکتا، مگر دلیل کا انحصار برہانیات ہی میں نہیں ہے بلکہ اس کی اور بھی قسمیں ہیں اور معجزہ ان میں داخل ہو سکتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ اشاعرہ اور معتزلہ میں اس موضوع خلط مبحث ہو گیا ہے۔ اشاعرہ کا

یہ کہنا کہ معجزہ دلیلِ نبوت ہے بالکل صحیح ہے مگر اس کے یہ معنے نہیں کہ وہ منطقی دلیل ہے دلیل کا لفظ یہاں منطق کی اصطلاحی زبان میں نہیں ہے بلکہ عام اور لفظی معنے نشان میں استعمال ہوا ہے اس لیے جب معجزہ سرے سے دلیل منطقی ہی نہیں تو یہ تلاش کہ وہ دلیل کی کس قسم میں داخل ہے بے سود ہے چنانچہ اشاعرہ خود کہتے ہیں کہ معجزہ کی دلالت نبوت پر دلالت عقلی نہیں بلکہ عادی ہے۔ شرح مواقف بحث معجزات میں ہے :

معجزہ کی دلالت نبوت پر دلالت عقلی نہیں ہے جیسے فعل کی دلالت وجود فاعل پر ہوتی ہے یا فعل کے استحکام و نظم کی دلالت فاعل کے علم پر عقلی ہے۔ کیونکہ دلائل عقلی اپنے مدلولات کے ساتھ مربوط ہوتے ہیں اور یہ فرض ناممکن ہے کہ وہ اپنے مدلول پر دال نہ ہو۔ اور معجزہ کی دلالت کی صورت ایسی نہیں ہے بلکہ معجزہ کی دلالت دلالت عادیہ ہے جیسا کہ صاحب مواقف نے کہا ہے کہ یہ دلالت ہمارے نزدیک عادیہ ہے۔ اللہ کی عادت یہ ہے کہ جب معجزہ صادر ہوتا ہے تو صاحب معجزہ کی سچائی کا علم وہ لوگوں کے دلوں میں پیدا کر دیتا ہے۔

آج کل کے علمی محاورے میں اشاعرہ کے اس قول کی تشریح کہ معجزہ کی دلالت عقلی نہیں بلکہ عادی ہے یہ ہے کہ معجزہ منطقی نہیں بلکہ نفسیاتی دلیل ہے۔ عادتِ انسانی یہ ہے کہ جب کسی شخص سے کوئی غیر معمولی کارنامہ ظاہر ہوتا ہے تو نفوس اس کی عظمت و کبریائی کے سرنگوں ہو جاتے ہیں۔ جب ایک شخص عام انسانی حالت سے بلند تر سطح میں آکر منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور خوارقِ عادت اس سے ظاہر ہوتے ہیں تو عام متاثر طبع فوراً اس کے دعویٰ کو تسلیم کر لیتے ہیں۔

قرآن کا بصیرت، ہدایت اور رحمت ہونا

۲۶۴۔ یہ قرآن تمہارے رب کی جانب سے ایمان والوں کے لیے بصیرت کی باتیں ہیں اور ہدایت و رحمت ہے۔ یعنی باقی آیات تنزیلیہ یا تکوینیہ جو مجھ سے طلب کرتے ہو تو قرآن سے بڑھ کر کون سی آیات ہوں گی اور اس سے زیادہ عظیم الشان معجزہ کون سا ہو سکتا ہے جو سارے جہاں کے لیے بصیرت افروز حقائق و مواعظ کا خزانہ اور ایمان لانے والوں کے لیے خاص قسم کی ہدایت و رحمت کا ذخیرہ اپنے اندر رکھتا ہے اسی کو تم کب مانتے ہو جو فرمائشی

آیات تسلیم کر دوگے[1] مطلب یہ ہے کہ تم اس قرآن کو میری گھڑی ہوئی کتاب کہتے ہو، لیکن یہ تمہارے رب کی جانب سے آنکھوں اور دلوں کے پردے ہٹا دینے والی آیتیں اور تمہارے لیے ہدایت و رحمت ہیں۔ ہدایت اپنے آغاز کے اعتبار سے اور رحمت اپنے انجام کے لحاظ سے لیکن یہ ان کے لیے نافع ہے جو ایمان لائیں، لقوم یؤمنون، اس میں لطیف اشارا ہے کہ میں جو کچھ پیش کر رہا ہوں، اس میں کوئی کمی نہیں اصل خرابی تمہارے اپنے دلوں کے اندر ہے کہ تم راستی کو قبول کرنا نہیں چاہتے۔

دراصل اس آیت میں قرآن نے نبوت ایمان والوں کے درجات بتاتے ہیں۔ ایمان کے معنے یقین کے ہیں، اور یقین کے تین درجے ہیں۔ ایک یہ کہ اسے اس کے متعلق معلومات فراہم ہوں اور اس پر یقین آجائے۔ دوسرے یہ کہ اسے آنکھ سے دیکھ لیا جائے اور اس پر یقین آجائے۔ تیسرے یہ کہ یہ حال بن جائے اور اس پر یقین آجائے۔ مثلاً آپ کے سامنے شہد کا ذکر آتا ہے، شہد کے بارے میں آپ کو معلوم ہوتا ہے۔ یہ شہد کے بارے میں علم الیقین ہے۔ دوسرے یہ کہ شہد آپ کے سامنے آتا ہے آپ اسے آنکھوں سے دیکھتے ہیں یہ شہد کے بارے میں عین الیقین ہے۔ اور آخری درجہ یہ ہے کہ آپ شہد کو کھائیں یہ شہد کے بارے میں آپ کا حق الیقین ہے۔ قرآن کے ماننے والوں کے یقین میں بھی تین درجے ہیں۔ کچھ وہ ہیں جن کے علم میں یہ بات آئی ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور ان کو بتانے والے نے بتایا ہے کہ یہ اللہ کی کتاب ہے۔ اس معنے کے اعتبار سے قرآن بصیرت ہے۔ بصائر، بصرۃ کی جمع ہے اس کے معنے دیدہ، عقل اور دانش کے آتے ہیں جیسے ظاہری آنکھ کے لیے بصر اور جمع ابصار آتی ہے۔ یہاں بصائر سے مراد دلائل عقلی اور وہ وسائل ہیں جن سے ہر انسان حق کو معلوم کر سکتا ہے۔ اسی معنے میں یہ لفظ قرآن کی اس آیت میں آیا ہے قد جاءکم بصائر من ربکم فمن ابصر فلنفسہ ومن عمی فعلیہا۔ دیکھو لوگو تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس بصیرت کی روشنیاں آچکی ہیں اب جو بینائی سے کام لے گا اپنا ہی بھلا کرے گا اور جو اندھا بنے گا خود نقصان اٹھائے گا۔ مطلب یہ ہوا کہ لوگو تمہارے پاس حق بینی کے وسائل پہنچ چکے ہیں۔ حضور انور

[1] افادات شیخ الاسلام

صلی اللہ علیہ وسلم نبوت کی ظاہری و باطنی نشانیاں لے کر آگئے ہیں۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ:

انبیاؑ کو دو قسم کے معجزے دیے جاتے ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ وہ پاک نسب ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں پر وہ نور ہوتا ہے جو دلوں کو موہ لیتا ہے۔ ان کے اخلاق ایسے ہوتے ہیں جو قلوب کو مسخر کر لیتے ہیں۔ ان کی تقریر ایسی ہوتی ہے جس سے سننے والوں کی تشفی ہوتی ہے۔

اس کے بعد فرماتے ہیں کہ:

یہ حالات جب پائے جاتے ہیں تو صاحب بصیرۃ آدمی کو اور کسی معجزہ کی ضرورت نہیں رہتی ہے۔

امام غزالی نے المنقذ من الضلال میں جہاں نبوت پر بحث کی ہے لکھتے ہیں کہ جو شخص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات اور ارشادات پر بار بار غور کرے گا اس کو خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت پر یقین ہو جائے گا۔ پھر لکھتے ہیں:

اس طریق سے نبوت پر یقین لاؤ نہ اس سے کہ عصا سانپ ہو گیا یا چاند شق ہو گیا۔

یہی ھذا بصائر من ربکم ہے۔ یقین کا یہ درجہ خالص علمی ہے۔ اس کے بعد یقین کا دوسرا درجہ عینی ہے جسے قرآن نے یہاں ہُدیٰ کہا ہے۔ ہُدیٰ کے معنے راہ بتانے کے ہیں یعنی یہ قرآن لوگوں کو حق کا راستہ بتاتا ہے۔ جن لوگوں کو اس کے ذریعے حق کی رہنمائی ملتی ہے وہ ہی حق کو آنکھوں سے دیکھ لیے ہیں۔ ان کا یقین ہی آنکھوں دیکھا یقین ہے۔ آخر میں تیسرے درجہ کو بیان کیا ہے جن کو حق الیقین حاصل ہوتا ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں قرآن جن کا حال بن گیا ہے۔ چونکہ یہ نعمت محض نعمت خداوندی سے حاصل ہوتی ہے اس لیے اس کو رحمت کہا ہے۔ حق الیقین والا طبقہ سب سے اونچا ہے۔ قرآن نے اس طرح طلب وجہد کی ہر پیاس کے لیے درجہ بدرجہ سیرابی کا سامان کر دیا۔ عوام کے لیے علم کا مرتبہ کافی ہے یعنی علم الیقین کا اور خواص کے لیے دوسرا مرتبہ ضروری ہے یعنی عین الیقین کا اور اخص الخواص کے لیے تیسرا درجہ ہے یعنی حق الیقین کا۔ قرآن ایک ہے لیکن اس سے استفادے کے انداز الگ الگ ہیں۔ ہر طالب کے لیے اس کے

ظرف کے مطابق ایک جاتا ہے اور اس کی سرشاری کی کیفیتیں مہیا کرتا ہے۔ قربان جائیے قرآن کی بلاغت کے کہ ایک مختصر سے فقرے میں کتنے علوم کو پیش کر دیا۔

جن لوگوں نے اس آیت کو صوفیانہ انداز میں دیکھا انھوں نے علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین کی ترتیب اُلٹ دی ہے۔ انھوں نے اس کو اس انداز میں پیش کیا ہے۔

اہلِ ایمان کے تین درجے ہو سکتے ہیں۔ اس لیے متوسط، ادنیٰ جو لوگ توحید و معرفت کے تمام زینوں کو طے کر کے اس مقام پہ فائز ہوتے ہیں کہ کارخانہ زمین و آسمان کی علوی اور سفلی چیزیں مشاہدے کے طور پر ان کے سامنے آتی ہیں اور وہ عین الیقین تک پہنچ جاتے ہیں ایسے لوگ اصحابِ بصیرت کہلاتے ہیں اور جو لوگ نظر و استدلال سے کسی حقیقت تک پہنچنے کی اہلیت رکھتے ہیں وہ علم یقین کے درجہ تک پہنچ کر خود ان کا قدم ہدایت سے ایک اینچ نہیں ہٹتا اور وہ لوگوں کی ہدایت کا ذریعہ بنتے وہ ہادی اور مہدی کہلاتے ہیں اور جن کو نہ پہلا درجہ حاصل ہے اور نہ دوسرا وہ صرف یہی جانتے ہیں کہ حق تعالیٰ کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کرنا ہے وہ گروہ عامۃ المومنین کا ہے جن کو حق الیقین کا مرتبہ حاصل ہے لیکن اس میں درجات کی ترتیب طبعی قائم نہیں۔ طبعی ترتیب یہی ہے کہ علم الیقین، عین الیقین اور حق الیقین۔ اگر بصائر سب سے اونچا درجہ ہے تو قرآن مشرکوں اور کافروں کے لیے بصائر نہ ہوگا۔ کیونکہ کفار عین الیقین نہیں رکھتے۔ اس لیے ابوسعود نے جو تفسیر بیان کی ہے وہ زیادہ صحیح ہے یعنی قرآن کا بصائر ہونا تو سب کے لیے چاہے کافر ہوں یا مومن لیکن اس کا ہدایت و رحمت ہونا صرف اہلِ ایمان کے لیے ہے۔ شاید اس لیے بصائر کے بعد من ربکم فرمایا۔ اور ہُدًی وَّ رَحْمَۃٌ کو اس سے علیحدہ کر کے لقوم یؤمنون سے جوڑ دیا ہے۔ خازن نے اسے لطائف میں شمار کیا ہے لیکن آلوسی نے اسے خلافِ ظاہر کہہ کر رد کر دیا ہے۔ اصل یہ بتایا ہے کہ قرآن کی راہ علم و یقین کی راہ ہے۔ جہالت اور گمان کی راہ نہیں ہے۔ علم و یقین کا یہ راستہ تمہارے پروردگار کی جانب سے میرا بنایا ہوا نہیں ہے۔ بصیرۃ کا لفظ فرمایا۔ بصیرۃ کے معنے علم معرفت اور یقین کے ہیں اور اسی لیے دلیل و حجت کو بھی بصیرۃ کہتے ہیں۔ جمع اس لیے لائے ہیں کہ اس کی آیتوں اور سورتوں میں سے ایک ایک آیت علم و معرفت ہے یا علم و معرفت کا سامان ہے۔ پہلی صورت میں یہ تشبیہہ بلیغ ہے

اور دوسری صورت میں مجاز رسل ہے۔ قرآن کہتا ہے میں جس راہ کی طرف بلاتا ہوں اس کے لیے میرے سامنے علم و یقین ہے۔ اور جو لوگ اسے علم و یقین کی بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہیں ان کے لیے ہدایت اور رحمت ہوں۔ ہدایت و رحمت کے الفاظ نہایت حکیمانہ ترتیب کے ساتھ اس مقصد کو ظاہر کرتے ہیں جس کے لیے اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر کتاب اتارتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کتاب اس لیے اتارتا ہے کہ دُنیا میں زندگی بسر کرنے کا وہ طریقہ بتائے جو آخرت میں بندوں کو اس کی رحمت کا سزاوار بنا دے۔ اس پہلو سے کتاب اپنے مقصد کے اعتبار سے ہدایت اور نتائج کے لحاظ سے رحمت ہوتی ہے۔ زندگی کی اصلی غایت تو آخرت ہے۔ اس دُنیا کی زندگی تو فانی ہے اس لیے کتابِ الٰہی کا اصل مقصد یہ ہُوا کہ وہ اس دُنیا کی زندگی کو جلوہ دے کہ لوگ آخرت کی زندگی پر ایمان لے آئیں اور اسی کو نصب العین بنا کر زندگی کا سفر طے کریں' اسی کی طرف یومنون اشارا کر رہا ہے۔

قرآن سننے پر رحمت کا وعدہ

۲۰۶ ۵- اور مسلمانو! جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ جب قرآن ایسی دولت بے بہا اور علم و ہدایت کی کان ہے تو اس کی قرأت کا حق سامعین پر یہ ہے کہ پوری فکر و توجہ سے ادھر کان لگائیں' اس کی ہدایات کو سمع قبول سے سُنیں اور ہر قسم کی بات چیت، شور و شغب کو چھوڑ کر ادب کے ساتھ خاموش رہیں تاکہ خدا کی رحمت اور مہربانی کے مستحق ہوں۔ اگر کافر اس طرح قرآن سنیں تو کیا بعید ہے کہ خدا کی رحمت سے مشرف بایمان ہو جائے اور جو پہلے سے مسلمان ہے تو ولی بن جائے یا کم از کم اس عمل کے اجر و ثواب سے نوازا جائے۔

اس آیت سے بہت سے علماء نے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ نماز میں جب امام قرأت کرے تو مقتدی کو سننا اور خاموش رہنا چاہیے جیسا کہ ابو موسیٰ اشعری اور ابو ہریرہ کی حدیث میں حضور نے فرمایا واذا قرأ فانصتوا جب نماز میں امام قرأت کرے تو چُپ رہو۔ یہاں اس مسئلہ کی تفصیل کا موقعہ نہیں۔ صحیح مسلم کی شرح میں ہم نے نہایت شرح و بسط سے اس کے مالۂ وما علیہ پر بحث کی ہے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

آیت قرآن کا منطوق یہ ہے کہ جب قرآن کی تلاوت کی جائے تو اس کا ادب حکماً یہ ہے کہ اس کی طرف کان لگائے رہو اور چپ رہو تاکہ تم پر اللہ کی رحمت ہو۔ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ یہ قرآن اہلِ ایمان کے لیے رحمت ہے۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ قرآن کے رحمت ہونے کی شرط یہ ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اسے کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ سب سے پہلا سوال یہ ہے قرآن کے اس ادب کا دائرہ کہاں تک ہے۔ کیا یہ حکم قرآن کے ہر سننے والے کے لیے ہے کہ جب بھی قرآن کی تلاوت ہو خاموشی اختیار کر لی جائے۔ یا یہ حکمِ قرآنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تلاوت کے لیے ہے کہ جب آپ قرآن تلاوت کریں تو ہر مومن کا فرض ہے وہ آپ کی تلاوت کو دھیان سے سُننے اور خاموش رہے۔ اور یا پھر یہ حکم نماز کے لیے ہے کہ جب امام نماز میں قرآن تلاوت کرے تو مقتدی کا فرض ہے کہ وہ کان لگا کر سُنے اور خاموش رہے۔

پہلی بات کی حد تک ابن المنذر نے بقول علامہ رشید رضا اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ ہر قاری کی تلاوت کے وقت سننا اور خاموش رہنا واجب نہیں ہے۔ اب صرف دو صورتیں باقی ہیں۔

ایک یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دعوت و تبلیغ کے موقعہ پر تلاوت کریں تو ہر مومن کا فرض ہے کہ دھیان سے سُننے اور خاموش رہے۔ یہ بھی ایک بے غبار حقیقت ہے۔ اس موضوع پر اُمت میں کبھی کوئی اختلاف نہیں رہا۔ دوسری یہ کہ امام نماز میں قرآن تلاوت کرے تو مقتدی کے فرائض میں ہے کہ سُنے اور خاموش رہے۔ صحابہ کرام اور تابعین نے اس آیتِ گرامی کا عمل میں مصداق جو بتایا ہے۔ ہم پہلے ناظرین کی خدمت میں وہ پیش کرتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن مسعود کے بارے میں حافظ ابن جریر نے یہ انکشاف فرمایا ہے کہ:

حضرت عبداللہ بن مسعود نے نماز پڑھی اور کچھ لوگوں کو امام کے ساتھ قرأت کرتے سُنا۔ جب آپ نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کیا وقت ابھی نہیں آیا کہ سمجھ اور عقل سے کام لو اور جب قرآن کی تلاوت ہو تو اس کی طرف دھیان کرو اور خاموش رہو جیسا کہ تمہیں اللہ سبحانہ نے حکم دیا۔ (ابن جریر)

حضرت عبداللہ کا یہ ارشاد پوری قوت سے یہ بات بتا رہا ہے کہ اس آیت گرامی میں استماع اور انصات کا جو حکم ہو رہا ہے اس کا اصلی اور بنیادی تعلق نماز سے ہے۔ عبداللہ ابن مسعود کا اسی قسم کا بیان امام بیہقی نے بھی کتاب القرآۃ میں پیش کیا ہے

فرماتے ہیں :

حضرت عبداللہ فرماتے ہیں کہ نماز میں امام کے پیچھے خاموشی اختیار کرو جیساکہ تمہیں حکم ہے کیونکہ خود پڑھتے ہوئے امام کی قرآت سُن نہیں سکتا۔ امام کا پڑھنا تمہیں کافی ہے۔

کتاب القرآۃ ہی میں امام بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عباس کا یہ بیان بھی نقل کیا ہے کہ :

قرآن کی یہ آیت فرض نمازوں کے بارے میں نازل ہوئی اور اسی کتاب القرآت میں یہ بیان بھی حضرت عبداللہ بن عباس کا ہے وہ فرماتے ہیں :

آیت اذا قرئ القرآن کے پیشِ نظر مومن پر کوئی پابندی نہیں اس کو گنجائش ہے کہ سننے نہ سُنے مگر فرض نمازوں نماز جمعہ، عیدالفطر، عیدالاضحیٰ میں اس کے لیے کوئی گنجائش نہیں ہے۔

ان کے علاوہ امام بیہقی نے کتاب القرآت میں امام مجاہد سے حضرت سعید بن المسیب سے امام الحسن البصری سے حضرت ابوالعالیہ ریاحی سے حضرت امام زہری بالسند بیان کیا ہے کہ اس آیت گرامی کا تعلق نماز سے ہے اور آیت کا شانِ نزول نماز ہے۔ حافظ ابن جریر اور حافظ ابن کثیر نے حضرت عبید بن عمیر اور عطا بن ابی رباح سے نقل کیا ہے کہ آیت کا شانِ نزول نماز ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :

ضحاک، ابراہیم نخعی، قتادہ، شعبی، سدی اور عبدالرحمان بن زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ آیت کا شانِ نزول نماز ہے۔

آئیے اب اس موضوع پر کچھ قدیم شارحینِ قرآن کے ارشادات بھی گوش گزار فرمالیجئے۔ حافظ ابن جریر طبری آیت مذکورہ کی تفسیر کرتے ہوئے رقمطراز ہیں :

ان تمام اقوال میں سب سے زیادہ صحیح اور راجح قول یہ ہے کہ آیت اذا قرء القرآن کا شانِ نزول نماز اور خطبہ ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحیح حدیث سے یہ ثابت ہے کہ جب امام قرآت کرے تو تم خاموش رہو۔ اور تمام علماء کا اتفاق ہے کہ جن لوگوں پر جمعہ فرض ہے ان پر خطبہ کی حالت میں توجہ کرنا اور خاموش رہنا بھی ضروری ہے۔

امام محی الدین حسین بن مسعود بغوی اس آیت کی تشریح میں متعدد اقوال نقل کرتے ہیں

کہ کچھ لوگ اس کا شانِ نزول نماز بتاتے ہیں اور کچھ خطبہ اور بعض مطلقاً وعظ و تلاوت،
اس کے بعد اپنا فیصلہ یہ درج فرماتے ہیں :

ان تمام اقوال میں صحیح ترین قول پہلا ہے وہ یہ کہ آیت اِذَا قُرِیَ القُرآن کا شانِ نزول صرف نماز ہے کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور جمعہ مدینہ میں فرض ہوا ہے۔

قاضی بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

اس آیت کا شانِ نزول نماز ہے۔

حافظ ابن کثیر اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھتے ہیں :

احادیث سے تاکیدی طور پر خاموش رہنے کا حکم صرف امام کے پیچھے فرض نمازوں میں اقتدار کرنے والوں کے لیے معلوم ہوتا ہے۔

علامہ ابوالسعود اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

آیت کے ظاہری الفاظ اس کے مقتضی ہیں کہ نماز میں اور خارج نماز میں جہاں اور جس وقت قرآن کی تلاوت ہو خاموش رہنا چاہیے لیکن جمہور صحابہ کرام کا مسلک یہ ہے کہ وجوبی طور پر خاموش رہنا صرف مقتدی کے لیے ہے۔

سید محمود آلوسی بغدادی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ نماز میں یا بیرونِ نماز میں جب بھی قرآن کی تلاوت ہو خاموش رہنا چاہیے لیکن نماز سے باہر سننے اور نہ سننے کی گنجائش پر دلیل قائم ہو چکی ہے لیکن جہری نمازوں میں خاموشی بہر حال ضروری ہے اور اسی طرح سری نمازوں میں بھی کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ امام قرأت کر رہا ہے۔

حافظ ابن تیمیہ نے فتاویٰ میں امام احمد بن حنبل کے بارے میں یہ انکشاف فرمایا ہے کہ

امام احمد بن حنبل نے اس پر اجماع نقل کیا ہے کہ یہ آیت نماز کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ نیز اس پر بھی اتفاق نقل کیا ہے کہ جب امام جہر سے قرأت کرتا ہو تو مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے۔

اگرچہ یہ واقعہ ہے کہ اس آیت کا سبب نزول نماز ہے اور واقعہ نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ اس کی پشت پر تاریخ و روایت کی مضبوط ترین شہادت موجود ہے

تو پھر اس آیت کی رُو سے یہ حقیقت قطعاً بے غبار ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ نماز باجماعت میں امام کا کام قرآن کی تلاوت اور مقتدی کا فرض اس تلاوت کو سننا اور خاموش رہنا ہے اسی بنا پر ائمہ مجتہدین کا فیصلہ یہ ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی پر قرآت نہیں ہے امام ابوحنیفہ کا صاف اور واضح مسلک یہ ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی کو قرآت نہ کرنی چاہیے۔ امام محمد اور امام ابو یوسف کا بھی یہی مسلک ہے۔ مولانا مبارک پوری نے تحفۃ الاحوذی میں عبداللہ بن المبارک، امام مالک اور امام احمد بن حنبل کو بھی ان لوگوں میں شمار کیا ہے جو امام کے پیچھے قرآت کے وجوب کے قائل نہ تھے۔ علامہ ابن قدامہ نے المغنی میں امام احمد بن حنبل کا یہ زرّیں بیان نقل کیا ہے۔

> امام احمد نے فرمایا ہے ہم نے اہلِ اسلام میں سے کسی سے نہیں سنا جو یہ کہتا ہو کہ جب امام جہر سے قرآت کرتا ہو اور مقتدی اس کے پیچھے قرآت نہ کرے تو مقتدی کی نماز فاسد اور باطل ہو جاتی ہے۔ اور فرمایا یہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں اور یہ آپ کے صحابہ اور تابعین ہیں یہ امام مالک ہیں حجاز میں، یہ امام ثوری ہیں عراق میں، یہ امام اوزاعی ہیں شام میں اور یہ امام لیث بن سعد ہیں مصر میں، ان میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ جب کوئی شخص امام کے پیچھے نماز پڑھے اور اس میں قرآت نہ کرے تو اس کی نماز باطل ہوتی ہے۔

صرف یہی نہیں بلکہ امام ابراہیم نخعی، امام محمد بن شہاب زہری، امام سفیان ثوری، امام لیث بن سعد، امام عبداللہ بن المبارک، امام اوزاعی، امام اسحاق بن راہویہ اور امام سفیان بن عیینہ میں سے کوئی بھی جہری نماز میں امام کے پیچھے پڑھنے کا قائل نہیں ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے قرآن کی اس آیت کے زور سے متاثر ہو کر کھلے الفاظ میں کہہ دیا ہے۔

> امام کی قرآت سننے اور اس کے لیے چپ رہنے کا حکم قرآن کریم اور صحیح احادیث میں موجود ہے۔ اور اس پر تمام اُمت کا اجماع ہے کہ مقتدی پر سورۃ فاتحہ کے بعد کوئی قرآت نہیں ہے اور جمہور اور اکثر صحابہ کا مسلک یہ ہے کہ مقتدی پر نہ سورۃ فاتحہ کی قرآت ضروری ہے نہ کسی اور سورت کی۔ امام شافعی کا بھی ایک قول یہی ہے اور ان کے

متبعین میں فن کار اور محقق اہلِ علم کا بھی یہی مسلک ہے اور اسی کو انہوں نے پسند کیا ہے۔ کیونکہ جہرِ امام کے وقت مقتدی کا پڑھنا قرآن کریم اور سنت کے خلاف ہے۔

یہی حافظ ابن تیمیہ قرآن کی اسی آیت کے پیشِ نظر مسئلہ قرأۃ خلف الامام پر بحث کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

امام کے جہر کرنے کا مقصد ہی یہ ہے کہ وہ پڑھے اور مقتدی سُنیں یہی وجہ ہے کہ امام جہری نمازوں میں جب و لا الضالین کہتا ہے تو مقتدی آمین کہتے ہیں اور سری نمازوں میں چونکہ مقتدی سُنتے نہیں اس لیے وہ آمین بھی نہیں کہتے۔ اگر امام بھی قرأت کر رہا ہو اور مقتدی پڑھتے ہوں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ امام کو یہ حکم دیا جا رہا ہے کہ تم ایسے لوگوں کو سناؤ جو اسے سنتے نہیں اور ایسی قوم کے سامنے تقریر کرو جو توجہ نہیں کرتی یہ ایسی کھلی حماقت ہے جس سے شریعت کا دامن پاک ہے۔

تمام ائمہ میں صرف امام شافعی ایک امام ہیں جن کے بارے میں مشہور ہے کہ وہ جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت کے قائل ہیں لیکن ان کے بھی دو قول ہیں۔ ایک یہ کہ مقتدی کو نہ پڑھنا چاہیے اور دوسرے یہ کہ پڑھنا چاہیے۔ لیکن یہ فیصلہ کہ ان کا کون سا قول قدیم اور کون سا جدید، امام بیہقی اور حافظ ابن کثیر کی تفسیر میں رائے یہ ہے کہ سب نمازوں میں پڑھنا قولِ جدید ہے۔ بہرحال قولِ جدید ہو یا قدیم ایک نہ ایک درجہ میں امام شافعی بھی جمہور کے ساتھ ہیں۔

یہاں یہ سوال بھی اچھی خاصی دلچسپی پیدا کرتا ہے کہ جن کے نزدیک مقتدی پر قرأت ضروری ہے وہ یہ فیصلہ نہیں کر سکے کہ مقتدی کس وقت پڑھے۔ امیر یمانی لکھتے ہیں:

امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت کو واجب کہنے والے آپس میں مختلف ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ امام کے سکتات میں قرأت کرنی چاہیے اور دوسرا گروہ کہتا ہے کہ جب امام قرأت سے فارغ ہو جائے تو اس وقت مقتدی کو قرأت کرنی چاہیے۔ لیکن ان دونوں باتوں کا حدیث میں

کوئی ثبوت نہیں۔

شاید اسی لیے حافظ ابن تیمیہ یہ بتانے پر مجبور ہو گئے۔

امام پر سکتہ کرنا واجب نہیں تاکہ مقتدی قرأت کر لے۔ یہ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل اور جمہور اہلِ اسلام کا فیصلہ ہے۔

الغرض یہ آیتِ قرآنی اس موضوع پر اتنی واضح اور صاف ہے کہ ہر شخص کو اس کے سامنے گردن تسلیم خم کرنی پڑی ہے۔ جو قرأت خلف الامام کے قائل ہیں ان کو بھی سکتاتِ امام کا سہارا لینا پڑا ہے۔

تاریخ کی نپی تلی ترازو میں پائدار بات تو یہی ہے کہ آیت کا نزول نماز کے بارے میں ہوا ہے۔ لیکن کچھ اور خیالات بھی ہیں۔

کچھ کی رائے میں آیت کا نزول خطبہ سننے کے لیے ہوا ہے۔ اور کچھ کا خیال ہے کہ آیت کا نزول نماز میں باتیں ختم کرنے کے لیے ہوا ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ نماز میں لوگ امام کے پیچھے قرأت کے وقت ترغیب و ترہیب کی آیات پر اذکار کرتے تھے اسے بند کرنے کے لیے اس آیت کا نزول ہوا اور کچھ سمجھتے ہیں کہ آیت کا روئے سخن عام ہے۔ ہر قرآن سننے والے سے مطالبہ ہے خواہ نماز میں ہو یا نماز سے باہر ہو کہ وہ قرآن سنے۔ اور کچھ نے بتایا ہے کہ آیت کا نزول نماز اور خطبہ کے بارے میں ہوا ہے۔ اس اختلاف کے نتیجہ میں شارحینِ قرآن کی تشریحات مختلف ہو گئیں۔ امام رازی نے اس آیتِ قرآنی کا رخ اہلِ ایمان سے ہٹا کر اہلِ کفر کی طرف پھیر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ اس کے مخاطب مسلمان نہیں بلکہ کفار ہیں۔ اس کو انہوں نے اس طرح پیش کیا ہے کہ اس آیت سے پہلے اللہ سبحانہ نے مشرکین کے اس مطالبہ کو پیش کیا کہ خاص اعجازی کارنامہ دکھائیے۔ حضور انورؐ نے ان کی درخواست کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ اللہ پاک نے اپنے رسول کو حکم دیا کہ ان کے جواب میں کہو کہ معجزہ لانا میری دسترس میں نہیں ہے میں تو رسول ہوں میرا کام تو صرف یہ ہے کہ اللہ کی وحی کی پیروی کروں یعنی قرآن کی۔ اس کے بعد اللہ سبحانہ نے بتایا کہ حضور نے معجزہ کی مانگ سے ہٹ کر وحی کی بات اس لیے کی ہے کہ قرآن نبوت کو ثابت کرنے کے لیے عظیم معجزہ ہے قرآن جیسے اعجاز کے ہوتے ہوئے اور معجزہ کی درخواست حماقت ہے قرآن کی شانِ اعجاز کو ان الفاظ میں پیش کیا۔

هذا بصائر من ربكم وهدى ورحمة لقوم يؤمنون اب اگر ہم آیت کے منہ میں یہ مطلب ڈالیں کہ اس میں امام کے پیچھے مقتدی کو قرآن خوانی سے روکا گیا ہے تو اس آیت کا پہلی آیت سے کوئی جوڑ نہ رہے گا۔ نظم کلام غیر مربوط ہو کر رہ جائے گا۔ کلام میں ایسی بے ربطی سے اللہ کا کلام پاک ہے۔ حالانکہ بات بالکل صاف ہے کہ قرآن کا اعجاز ظاہر کرنے کے لیے قرآن کو بصیرت، ہدایت اور رحمت کہا ہے اور بتایا ہے کہ یہ آپ کی صداقت کا معجزہ ہے۔ جب یہ قرآن پڑھا جائے تو اسے توجہ سے سنو تاکہ تم پر اس کی شان اعجازی ظاہر ہو۔ اور تمہیں اسے قبول کرنے کی توفیق ہو اور اس سے تم رحمت کے مستحق ہو جاؤ۔ امام رازی نے اچھی اور عمدہ تشریح قرار دیا ہے اور اس کی ایک سے زیادہ وجوہ بیان کی ہیں۔ ان میں سب سے اہم دلیل یہ پیش کی ہے کہ اگر واقعی خطاب آیت میں اہل ایمان کو ہوتا تو لعلکم ترحمون نہ ہوتا کیونکہ یہ لفظ ترجی کے لیے آتا ہے اور مومن تو بہرحال رحمت خداوندی کا مستحق ہے۔

امام رازی کی اس انوکھی تشریح کا جواب بہتوں نے دیا ہے لیکن ان میں سب سے لطیف جواب وہ ہے جو مولانا عبدالحی لکھنوی نے امام الکلام میں دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں :

امام رازی کا مختار اور ان کی پسندیدہ تشریح بالکل بے جان ہے۔ اگرچہ بظاہر ان کا یہ تشریحی موقف لطیف ہے لیکن اس کا کوئی علمی نسب نامہ نہیں ہے۔ ائمہ تفسیر میں سے کسی سے منقول نہیں۔ باقی ربط و نظم قرآنی کا مسئلہ تو یہ آیت قرآنی کو اہل ایمان سے ہٹا کر کفار کی طرف موڑنے پر موقوف نہیں ہے۔ ہر فکر سلیم یہ بات سمجھ سکتا ہے کہ پہلی آیت میں نبوت کے مخاطبوں کی جانب سے خاص معجزہ کا مطالبہ تھا۔ اس کا قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ جواب بتایا کہ آپ فرما دیجئے کہ میرا کام تمہارے مطالبات کو جناب الٰہی پیش کرنا نہیں۔ میرا کام تو صرف اللہ کی جانب سے آئی ہوئی وحی کی پیروی کرنا ہے۔ یہ وحی ہی میری صداقت کی سب سے بڑی دلیل ہے۔ ہر ذی شعور اس پر غور کر کے میری نبوت کی تصدیق کرے گا۔ میری زبان سے نکلا ہوا بول اللہ کی وحی ہے۔ اس لیے تمہیں سوجھ بوجھ سے کام لے کر اس پر غور کرنا چاہیے۔ یہ اگر ایک طرف عقل انسانی کے لیے دانشمندی کا سامان ہے تو دوسری طرف انسان کی عملی زندگی صحیح رُخ مقرر کرنے والی ہے۔ اور جو اہل ایمان اس کی روشنی میں اپنے افکار صحیح کر لیں اور اس کی رہنمائی میں اپنی عملی زندگی سنوار لیں، ان کے لیے یہ سرتاسر رحمت ہے۔ اب جو بھی اس کتاب الٰہی پر ایمان لائے گا۔ یہ

کتاب الٰہی اس کے لیے رحمت، ہدایت اور بصیرت ہوگی۔ اے کافرو اگر تم اسے نہیں مانتے ہو تو تمہارے لیے یہ کتاب ہدایت و رحمت کیسے ہو سکتی ہے۔ چونکہ قرآن کا بصیرت، ہدایت اور رحمت ہونا کسی کے لیے بغیر فکر و غور، بغیر توجہ و تامل اور بغیر تدبر و تعمق کے ممکن نہیں۔ اس لیے اے مسلمانو! تم اس پر خوب غور و فکر سے کام لو اور جب اس کی تلاوت ہو تو کان لگا کر توجہ سے سنو اور خاموش رہو۔ اگر توجہ کرو گے اور خاموش رہو گے تو اس کا بصیرت ہونا، ہُدیٰ اور رحمت ہونا تم پر کھل کر سامنے آجائے گا اور اگر نہ سنو گے اور چپ نہ رہو گے تو تدبر و تفکر سے محروم رہو گے اور قرآن کے ذریعہ تمہیں نہ بصیرت ملے گی نہ ہدایت۔

اس نظر سے اگر اس آیتِ قرآنی کا مطالعہ کیا جائے تو یہ آیت اپنے سیاق و سباق سے بالکل مربوط معلوم ہوتی ہے۔ اس سے نہ لقوم یؤمنون کو نظر انداز کرنا پڑتا ہے اور نہ لعلکم ترحمون کے منہ میں نیا مطلب ڈالنا پڑتا ہے۔ باقی امام رازی کا یہ کہنا کہ اگر آیت میں اہلِ ایمان کو خطاب ہوتا تو قرآن یہاں لعلکم ترحمون نہ کہتا، اس لیے بے جان ہے کہ عربی زبان میں لعل صرف ترجی کے لیے نہیں آتا بلکہ تعلیل کے لیے بھی آتا ہے۔ صاحبِ قاموس علامہ مجد الدین نے بصائر ذوی التمییز فی لطائف الکتاب العزیز میں لکھا ہے کہ لعل کئی معنی میں آتا ہے ایک توقع و ترجی ہے اور دوسرا تعلیل ہے۔ اگر یہاں تعلیل کے لیے ہو تو معنے بالکل صاف ہیں۔ جب قرآن پڑھا جائے توجہ کرو، خاموش رہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے اور اگر ترجی کے لیے بھی ہو تو یہ ہماری نسبت سے ہے نہ کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی نسبت سے، الزمخشری لکھتے ہیں کہ بادشاہوں کی عادت ہے کہ جب کسی چیز کا وعدہ کرتے ہیں تو اپنی شان استغنا کو ملحوظ رکھ کر لعل اور عسٰی بولتے ہیں۔

بہرحال اس موضوع پر امام رازی کی یہ بات کہ اس آیت کے مخاطب اہلِ ایمان نہیں بلکہ اہلِ کفر ہیں۔ یعنی مسلمانوں سے یہ بات نہیں کہی جا رہی ہے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو کان لگاؤ اور خاموش رہو بلکہ کافروں سے کہی جا رہی ہے۔ حیرت ہے کہ کچھ بزرگوں نے امام کے پیچھے پڑھنے کے شوق میں امام رازی کو اس انداز سے پیش کیا ہے کہ گویا یہ قرآن کا منطوق ہے۔ حالانکہ امام رازی کی بات کی نہ لغتِ عرب تائید کرتا ہے، نہ محاورے کلام اور نہ اجماع۔ کیونکہ امام احمد کی زبانی سُن آئے ہو کہ آیت کا بالاجماع نزول نماز کے بارے میں ہوا ہے۔ اس آیتِ قرآنی کی ضرب سے بچنے کے لیے یہ تاویل کہ یہ

مشرکین کے لیے ہے اہلِ ایمان کے لیے نہیں بالکل ایسی ہے جیسے یہ کہہ دیا جائے کہ سورۃ فاتحہ قرآن نہیں بلکہ اُم القرآن ہے۔

کچھ نے آیتِ قرآنی سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ بھی راہ اختیار کی ہے کہ یہ قرآنی آیت یعنی اذا قری القرآن منسوخ ہے۔ ذرا اس جرأت کی داد دیجئے کہ ایک آیت کا مطالبہ ہے کہ قرآن پڑھا جائے تو کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ اور دوسری آیت فاقرءوا ماتیسر من القرآن کہتی ہے کہ قرآن جس قدر آسانی سے پڑھ سکتے ہو پڑھ لو۔ کیا اُمت میں سے آج تک کسی نے یہ بات کہی ہے کہ قرآن پڑھنے سے قرآن سننا اور چپ رہنا منسوخ ہو گیا۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی، نسخ کا مسئلہ بہت بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ گمان اور تخمین سے قرآن کی کوئی آیت منسوخ نہیں ہو سکتی اور صرف خیالی پلاد کے ذریعے اللہ کی کتاب بازیچۂ اطفال نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ ایک طرف تو لوگوں کو یہ سمجھائیں کہ آیت قرآنی ماتیسر من القرآن سے نماز میں قرأت قرآن کی فرضیت ثابت نہیں ہوتی ہے اور پھر اسی منہ سے یہ کہیں کہ اس آیت نے اذا قری القرآن کو منسوخ کر دیا ہے۔ لہٰذا ہر مقتدی پر سورۃ فاتحہ کا پڑھنا فرض ہے۔ قرآن کی وہی آیت جس سے قرأت کی فرضیت کا انکار کیا جا رہا تھا اسی سے سورۃ فاتحہ کی قرأت ثابت ہو گئی۔ کوئی پوچھے بھلا یہ کیسے۔

اور کچھ نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ صاحب اس آیت کا تو صرف یہی مطالبہ ہے کہ قرآن سنو اور خاموش رہو۔ یہ مطالبہ تو نہیں ہے کہ مقتدی قرأت نہ کرے۔ امام رازی نے اس کی کمزوری کو محسوس کر کے خود ہی جواب دیا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے آیت میں استماع کا حکم دیا ہے، سماع کا حکم نہیں دیا۔ سماع اگر سننے کو کہتے ہیں تو استماع نام ہے کلام مسموع کے لیے سراپا توجہ ہو جانے کا۔ ایک حدیث میں سماع اور استماع دونوں استعمال ہوئے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب بسلسلہ جہاد تشریف لے جاتے اور کسی مقام پر حملہ کرانا چاہتے تو

کان یستمع الاذان فان سمع اذانا امسک والا اغار

تو پہلے اذان کی طرف متوجہ فرماتے اگر اذان سنتے تو حملہ نہ فرماتے ورنہ حملہ کر دیتے۔

اگر استماع اور سماع ایک ہو تو اس حدیث کا مطلب بالکل مسخ ہو کر رہ جائے۔

استماع کے معنے ہیں پورے طور پر کلام مسموع کی طرف متوجہ ہونا۔ قرآن میں حضرت موسیٰ کو کہا گیا ہے۔

انا اخترتك فاستمع لما يوحىٰ

اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ مقتدی کا امام کے پیچھے قرأت میں مشغول ہونا فریضہ استماع میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ اور جو قرارت کرتا ہے وہ استماع نہیں کرتا۔ اس لیے منطوق قرآنی تو استماع ہے اور مدلول قرآنی سننے والے کے لیے قرأت کی ممانعت ہے۔ جو لوگ بحالت اقتدار امام کے پیچھے آہستہ قرأت کرتے ہیں وہ اس قرآنی مطالبہ کو پورا نہیں کرتے ہیں۔ صحیح حدیث میں آتا ہے کہ جب حضرت جبریل وحی لے کر آتے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی ساتھ ساتھ پڑھتے جاتے۔ الفاظ میں کان یحرک شفیتہ آپ ہونٹوں کو ہلاتے جاتے تھے لیکن حق سبحانہ نے آپ کو ہدایت فرمائی کہ لا تحرک بہ لسانك آپ اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ پھر آپ کیا کریں۔ ارشاد ہوا اذا قرأناه فاتبع قرانه جب ہم پڑھلیں تو تو پیچھے رہ پڑھنے کے۔ عبداللہ ابن عباس نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ:

فاستمع لہ وانصت آپ کان دھریں پوری توجہ کریں اور خاموشی اختیار کریں اس سے معلوم ہوا کہ آہستہ پڑھنا، ہونٹوں کو حرکت دینا، زبان کو ہلانا استماع اور انصات کے منافی ہے۔

بہرحال قرآن کی یہ آیت اس موضوع پر حجت قاطعہ ہے کہ نماز میں جب قرآن پڑھا جائے اس کی طرف پوری طرح توجہ کی جائے خاموش رہے اور کچھ نہ پڑھے۔ اور آیت قرآنی کے اس مطالبہ کی قوت کو پوری امت نے قبول کیا ہے۔ امام مالک، امام احمد، امام ابوحنیفہ اور ایک قول میں امام شافعی نے بھی فیصلہ کیا ہے کہ امام کی قرأت کے وقت میں مقتدی قرارت نہ کرے۔ امام شافعی کے دو قول ہیں ایک یہ کہ مقتدی قرأت نہ کرے اور ایک یہ کہ مقتدی قرأت کرے۔ یہ فیصلہ کہ ان دونوں میں سے کون سی بات نئی ہے اور کون سی پرانی۔ امام بیہقی اور حافظ ابن کثیر کی رائے یہ ہے کہ قول قدیم یہ ہے کہ جہری نمازوں میں قرأت نہ کرے اور قول جدید یہ ہے کہ جہری ہوں یا سری تمام نمازوں میں قرأت واجب ہے۔ امام شافعی کے مذہب میں قدیم اور جدید کے اختلاف نے اس مسئلہ

ہیں سنگین صورت اختیار کر لی ہے۔ جن لوگوں نے کتاب الام کو امام شافعی کی قدیم کتابوں میں شمار کیا ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ امام کے پیچھے نہ پڑھنے کی بات امام شافعی کا قول قدیم ہے۔ لیکن یہ بات محققین کے نزدیک تاریخی طور پر صحیح نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں علامہ محمد بن اسماعیل الیمانی نے توضیح الافکار میں اور حافظ جلال الدین السیوطی نے حسن المحاضرہ میں بالتصریح لکھا ہے کہ الام امام شافعی کی کتب جدیدہ میں سے ہے۔

بہر حال جدید ہو یا قدیم اس حد تک تو امام شافعی بھی دوسرے اماموں کے ہمنوا ہیں کہ اگر ایک شخص رکوع میں ملا اور اسے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے کا موقعہ نہیں ملا تو اس کو رکعت مل گئی اور اس کی نماز ہو گئی۔ کتاب الام میں اور فقہ شافعیہ کی متعدد کتابوں میں اس کی تصریح ہے۔ ابن عبدالبر نے تصریح کی ہے کہ:

> یہ امام مالک، شافعی، ابوحنیفہ، ان کے ساتھیوں، ثوری، الاوزاعی، ابوثور، احمد، اسحاق راہویہ کا مذہب ہے۔

بات تشنۂ تکمیل رہ جائے گی اگر ہم یہاں عام شارحین قرآن کی تشریحات پیش نہ کریں۔ حافظ ابن جریر طبری اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں:

> اللہ سبحانہ ان اہل ایمان سے فرماتے ہیں جو اس کی کتاب کو مانتے ہیں اور جن کے لیے قرآن ہدایت ورحمت ہے کہ اے مسلمانو! جب تمہارے سامنے قرآن کی تلاوت ہو تو اس کو سنو یعنی اپنے کانوں کو اس طرف لگا دو تاکہ تم اس کی آیات کو سمجھو اور اس کی نصیحتوں سے عبرت پذیر ہو اور چپ رہو تاکہ تم اس پر تدبر و تفکر کر سکو اور اس میں لغو نہ کرو کیونکہ اس سے تمہیں تدبر کا موقعہ نہ ملے گا تاکہ تم پر رحم کیا جائے۔ تمہارا رب تم پر رحمت کرے گا جب تم اس کی نصیحتوں پر عمل کرو گے اور جن فرائض کو اللہ نے تمہارے لیے بیان کیا ہے ان کی پابجائی کرو گے۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ نے اپنی مشہور تفسیر میں فرماتے ہیں:

> جب اللہ سبحانہ نے یہ بتادیا کہ قرآن عزیز پوری انسانیت کے لیے بصیرت، ہدایت اور رحمت ہے تو اس کے بعد ارشاد فرمایا کہ قرآن کی تعظیم کے لیے جب اس کی تلاوت ہو تو خاموش ہو جاؤ۔ ایسا نہ ہو جیسا کہ مشرکین

مکہ کا وطیرہ رہا ہے کہ لا تسمعوا هذا القرآن لیکن یہ خاموش رہنے کا حکم تاکیدی طور پر فرض نمازوں میں جب کہ امام بلند آواز سے قرأت کر رہا ہو جیسا کہ امام مسلم نے اپنی صحیح میں ابوموسیٰ کے حوالہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے کہ امام بنایا ہی جاتا ہے اس لیے کہ اس کی اقتدا کی جائے جب وہ اللہ اکبر کہے تو تم اللہ اکبر کہو اور جب پڑھے تو تم خاموش رہو۔

علامہ ابوالسعود اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں :

قرآن کریم کی سماعت کی طرف ایسی توجہ کرو جس سے تحقیق اور قبولِ حق کا جذبہ نظر آئے اور اثنائے قرأت میں بالکل خاموش رہو اور قرأت کے پورا ہونے تک نہایت تعظیم سے اس کو سنو تاکہ توجہ کا پورا اور مکمل فائدہ ہو۔ آیت کے ظاہری الفاظ اس کے مقتضی ہیں کہ نماز میں اور خارج از نماز میں جہاں اور جس وقت بھی قرأت ہوتی ہو خاموش رہنا چاہیے۔ لیکن جمہور صحابہ کرام کا مسلک یہ ہے کہ وجوبی طور پر خاموش رہنا صرف مقتدی کے لیے ہے۔

امام حسین بن محمود بغوی اپنی تفسیر معالم التنزیل میں لکھتے ہیں :

ان تمام اقوال میں صحیح ترین قول پہلا ہے وہ یہ کہ آیت اذا قری القرآن کا شانِ نزول صرف نماز ہے اس لیے کہ آیت مکہ مکرمہ میں نازل ہوئی ہے اور جمعہ مدینہ میں فرض ہوا ہے۔ لہٰذا خطبہ اس کا شانِ نزول کیوں کر ہو سکتا ہے ہاں مگر علماء کا اتفاق ہے کہ خطبہ کے وقت میں بھی خاموش رہنا چاہیے۔

علامہ ابوحیان الاندلسی البحر المحیط میں اس کی تشریح یوں فرماتے ہیں :

اللہ سبحانہ نے جب پہلے بتا دیا کہ قرآن بصیرت، ہدایت اور رحمت ہے۔ اب حکم دیا ہے کہ جب قرآن کی قرأت ہو تو متوجہ ہو جاؤ اور خاموش رہو، کیونکہ جو کتاب بصیرت، ہدایت اور رحمت کے اوصاف سے موصوف ہے اس کا حق یہی ہے کہ اس کی طرف بھرپور توجہ کی جائے تاکہ استماع اور خاموشی کے ذریعے یہ عظیم نتائج حاصل ہو سکیں۔ بے بصیرتی کا

بصیرت سے، گمراہی کا ہدایت سے، غضب کا رحمت سے مداوا ہو سکے۔ ظاہر یہی ہے کہ قرآن جب بھی پڑھا جائے اس کو سنا جائے اور خاموشی اختیار کی جائے۔

علامہ سلیمان الجمل نے الفتوحات الالہیہ میں اس کی تشریح اس طرح کی ہے؛

علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ جب قرآن کی تلاوت ہو تو سننے اور خاموش رہنے کا محل کون سا ہے کیونکہ یہ دونوں امر ہیں اور امر وجوب کے لیے ہوتا ہے۔ اس کا تقاضا یہی ہے کہ سننا اور خاموش رہنا واجب ہو۔ پہلی رائے یہ ہے کہ حکم عام ہے جس وقت بھی اور جہاں بھی قرآن پڑھا جائے سننا اور خاموش رہنا واجب ہے۔ یہ حسن بصری اور ظاہر یہ کی رائے ہے۔ دوسری رائے یہ ہے کہ یہ حکم نماز میں باتیں کرنے والوں کے لیے آیا ہے۔ ان سے کہا گیا ہے کہ باتیں نہ کرو خاموش ہو کر قرآن سنو۔ تیسری رائے یہ ہے کہ امام کے پیچھے قرآت بالجہر کی ممانعت کے بارے میں آیا ہے۔ عبداللہ بن مسعود کہتے ہیں کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو امام کے ساتھ پڑھتے سنا، نماز کے بعد آپ نے فرمایا کہ کیا ابھی تک اللہ کے حکم اذا قری القرآن فاستمعوا لہ کو سمجھنے کا وقت نہیں آیا۔

علامہ حافظ الدین عبداللہ بن احمد نسفی مدارک التنزیل میں لکھتے ہیں؛

آیت بظاہر یہی چاہتی ہے کہ نماز اور غیر نماز میں قرآت قرآن کے موقعہ پر سننے والوں کو متوجہ ہونا چاہیے اور خاموش رہنا چاہیے۔

علامہ محمود بن احمد زمخشری اپنی تفسیر کشاف میں لکھتے ہیں:-

آیت کی ظاہری سطح یہی چاہتی ہے کہ نماز کی حالت ہو یا نماز سے باہر۔ بہر صورت قرآن کی طرف توجہ کرنا اور خاموش رہنا ضروری ہے۔ اور یہ بھی کہا گیا ہے کہ لوگ نماز میں باتیں کرتے تھے۔ قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔ پھر یہ بات ختم ہو گئی کہ خارج از نماز قرآن کی تلاوت ہو تو سننے والا خاموش رہے۔

قاضی بیضاوی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں،

آیت کا ظاہر اسی کا مقتضی ہے کہ جہاں قرآن کی تلاوت ہو سننا اور خاموش رہنا واجب ہو لیکن عام علماء نماز سے باہر سننے اور خاموش رہنے کو مستحب قرار دیتے ہیں ۔

حافظ جلال الدین السیوطی نے الدرالمنثور میں اس آیت کی تشریح میں جس قدر روایات درج کی ہیں ۔ ان میں بیشتر وہ ہیں جو بتا رہی ہیں کہ آیت کا تعلق نماز سے ہے یعنی آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ امام جب نماز میں قرأت کرے تو تم سنو اور خاموش رہو ۔ ان میں ابوہریرہ ، ابن عباس ، محمد بن کعب القرظی ۔ امام مجاہد حضرت عبداللہ بن مغفل ، حضرت عبداللہ بن مسعود ، حضرت علی ، حضرت زید بن ثابت ، ابراہیم نخعی ، ابوالعالیہ ، کی روایات ہیں ۔ علامہ شوکانی نے اپنی مشہور تفسیر فتح القدیر میں اولیت ان ہی روایات کو دی ہے جن سے نماز میں امام کے پیچھے پڑھنے کی ممانعت ثابت ہوتی ہے آخر میں لکھا ہے کہ :

اسی قسم کی سلف سے روایات ہیں اور بعضوں نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ یہ آیت نماز میں امام کی قرأت کے بارے میں نازل ہوئی ہے ۔

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں ۔

آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ نماز یا خارج از نماز میں جب بھی قرآن کی قرأت ہوتی ہو تو خاموش رہنا چاہیے لیکن خارج از نماز سماع و عدم سماع دونوں کے جواز پر دلیل قائم ہو چکی ہے لیکن جہری نمازوں میں انصات بہرحال ضروری ہے اور ایسے ہی سری نمازوں میں بھی ۔ کیونکہ ہمیں معلوم ہے کہ امام پڑھ رہا ہے ۔

آئیے سر راہے جدید شارحین قرآن سے بھی کچھ علمی استفادہ کر لیجیے ۔ مشہور مفسر قرآن علامہ سید رشید رضا اپنی شہرہ آفاق المنار میں لکھتے ہیں :

اس آیت میں شیطان کے جھٹکوں سے بچنے اور قرآن کے ذریعے رحمت حاصل کرنے کا راستہ بتایا ہے ۔ فرمایا کہ اس کا طریقہ یہ ہے کہ جب قرآن پڑھا جاتے تو اسے سنو اور خاموش رہو ۔ استماع سمع سے زیادہ بلیغ ہے کیونکہ استماع کے معنے ہیں ارادہ اور نیت کے ساتھ

قوتِ شنوائی کو کلام کے ادراک کے لیے متوجہ کرنا۔ اور سمع تو بغیر ارادے کے بھی ہو سکتی ہے۔ انصات نام ہے استماع کی خاطر خاموش رہنے کا تاکہ پڑھنے والا جو کچھ پڑھ رہا ہے اس سے ہٹ کر کسی اور چیز میں مشغول نہ ہو لہٰذا جو شخص استماع اور انصات کرتا ہے وہ بھی سمجھنے اور غور کرنے کی صلاحیت رکھتا ہے اور اسی کے لیے رحمت کی اُمید کی جاتی ہے۔ یہ آیت دلیل ہے اس بات کی جب قرآن کی تلاوت ہو اس کو سنا جائے اور خاموش رہے خواہ نماز میں ہو یا نماز سے باہر۔ ابن المنذر نے اس پر اجماع نقل کیا کہ بیرون نماز و خطبہ قرآن سننا اور خاموش رہنا واجب نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بہت بڑے حرج کا باعث ہے کیونکہ اس طرح قرآن کی تلاوت کی خاطر زندگی کے سارے مشاغل کو چھوڑنا پڑے گا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حد تک تو بات میں معقولیت ہے۔ آپ کی تلاوت تبلیغ اور وعظ و ارشاد کے لیے ہوتی تھی اس لیے کسی مسلمان کے لیے جائز نہ تھا کہ آپ قرآن تلاوت کر رہے ہوں اور قرآن نہ سنے۔ یہی امام کے پیچھے مقتدی اور خطیب کے سامنے سامعین کا حال ہے۔ آیت کا اصل موضوع نماز ہے اسی لیے لوگوں نے اس آیت سے امام کے پیچھے جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے پڑھنے کی ممانعت پر استدلال کیا ہے۔

الاستاذ الکبیر علامہ احمد مصطفےٰ المراغی نے اپنی تفسیر المراغی میں اس آیت کی تشریح بڑے پیارے انداز میں کی ہے۔

اے مسلمانو! جب تمہارے سامنے قرآن تلاوت کیا جائے تو اپنے کانوں کو اس کی طرف متوجہ کرو تاکہ تم اس کی آیات کو سمجھ لو اور اس کے مواعظ تمہارے لیے سامانِ عبرت ہو، اور خاموش رہو تاکہ تمہیں تدبر و تعقل کا موقعہ ملے اور یہ اس لیے کرو تاکہ اس عبرت گیری اور نصیحت پذیری کے نتیجہ میں تم پر تمہارا رب رحمت کرے۔ جو شخص خاموشی کے ساتھ قرآن کے لیے سراپا توجہ ہو گا۔ وہ بھی قرآن میں تدبر کر سکے گا اور جو ایسا ہو گا وہ اس لائق ہے کہ اس پر خدا کی رحمت ہو۔

علامہ الشام محمد جمال الدین قاسمی اپنی مشہور تفسیر محاسن التاویل میں اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں :

ظاہر آیت کا مطالبہ یہی ہے کہ قرآت قرآن کے وقت نماز اور غیر نماز میں متوجہ ہو کر سننا اور خاموش رہنا واجب ہے ۔ یہی ظاہر یہ کہتے ہیں ۔ الحسن البصری اور ابو مسلم الاصفہانی کی رائے ہے ۔ امام مسلم نے اپنی صحیح میں ابو موسیٰ اشعری کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی لکھا ہے کہ امام بنایا ہی جاتا ہے اس لیے کہ اس کی اقتدار کی جاتے لہٰذا جب وہ اللہ اکبر کہے تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب وہ قرآت کرے تو تم خاموش رہو ۔ ارباب سنن نے بھی بحوالہ ابو ہریرہ یہ روایت پیش کی ہے ۔

ان کے علاوہ اور بھی شارحین قرآن ہیں ۔ سب کا تفسیری چہرہ پیش کرنا مقصد نہیں ان تشریحات سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا ۔ سب کے سب اپنی تشریحات میں قرآن کی اس آیت میں استماع و انصات کے مطالبہ کے سامنے سر تسلیم خم کر رہے ہیں ۔ ایسے بہت کم جنہوں نے آیت کی ضرب کاری سے بچنے کے لیے یہ کہہ کر دفاع کیا ہے کہ آیت کے مخاطب مسلمان نہیں مشرکین ہیں ۔ مولانا عبدالحی نے اس رائے کو پامال اور رکیک کہا ہے ۔ یہ امام رازی کی جدت ہے ۔ ان کی یہ جدت طرازی خود زبان حال سے بول رہی ہے کہ اس آیت کی قوت کو وہ شدت سے محسوس کر رہے ہیں ۔ امام بیہقی کو برملا یہ اقرار کرنا پڑا ہے :۔

ہم اس بات کا انکار نہیں کرتے ہیں کہ یہ آیت نماز کے بارے میں یا نماز اور خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے جیسا کہ سلف امت کے اقوال ہم نے نقل کیے ہیں لیکن ہمارا اعتراض یہ ہے کہ انھوں نے یا ان میں سے بعض نے حدیث کو مختصر کر دیا ہے اور اس آیت کا شان نزول مطلق نماز کو قرار دیا ہے ۔

امام بیہقی کو اس کا اقرار ہے کہ آیت قرآنی کا شان نزول نماز ہے لیکن اعتراض یہ ہے کہ صرف نماز نہیں بلکہ خطبہ بھی ہے جیسا کہ حدیث میں ہے ۔ لیکن یہ خیال بالکل بے جان ہے کیونکہ جمعہ اور عیدین کا وجوب مدینہ طیبہ میں ہوا ہے اور آیت قرآنی مکی ہے ۔

پھر اس کا شانِ نزول خطبہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہاں آیت کے حکم میں خطبہ عموم الفاظ کی وجہ سے داخل ہے۔ جمہور نے خطبہ کی بات کو بے جان قرار دیا ہے۔ خود امام رازی نے یہ بات کہہ کہ آیت کا نزول خطبہ میں ہوا ہے لکھا ہے کہ قانون عام ہے اسے خطبہ تک کیسے محدود کیا جا سکتا ہے۔ اور نواب علامہ شوکانی جو امام کے پیچھے قرأت کے شوق میں اجماعیات کا بھی انکار کر دیتے ہیں۔ وہ دعاء توجیہ انی وجھت وجھی للذی فطر... الخ کے بارے میں امام کے پیچھے مقتدی کو منع کرتے ہیں اور وجہ یہ بتاتے ہیں:۔

امام جب اونچی قرأت کر رہا ہو تو مقتدی کو اس وقت قرأت نہیں کرنی چاہیے کیونکہ قرآن کریم اور سنت کے عمومات اور اکثر دلیلیں بتاتی ہیں کہ امام جب اونچی قرأت کر رہا ہو تو اس وقت مقتدی پر استماع اور انصات واجب ہے۔

خطبہ کی حد تک تو نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ نے بھی لکھا ہے:

میں کہتا ہوں کہ آیت کے خطبہ کے بارے میں نازل ہونے میں شبہ ہے کیونکہ آیتِ قرآنی مکی ہے اور خطبہ مدینہ میں واجب ہوا ہے۔ جیسا کہ تاریخ سے ہر باخبر جانتا ہے۔ قرطبی، خطیب اور خازن نے ایسا ہی بتایا ہے...

آیتِ قرآنی سے گریز کی راہیں

کچھ لوگ اس آیت سے بچنے کے لیے یہ بہانہ بھی تراشتے ہیں کہ یہ آیتِ قرآنی اذا قری القرآن... الخ قرآن کی سورہ مزمل کی آیت فاقرءوا ما تیسر من القرآن سے منسوخ ہے اور اپنے اس موقف کی انہوں نے یہ دلیل پیش کی ہے کہ ابو نصر اوزی کہتے ہیں کہ آیت فاقرءوا ما تیسر من القرآن مدینہ میں نازل ہوئی۔ سیوطی لکھتے ہیں کہ فاقرءوا ما تیسر مدینہ میں نازل ہوئی۔ لہٰذا سورۃ مزمل کی آیت فاقرءوا ما تیسر من القرآن ناسخ ہے اور اذا قری القرآن منسوخ ہے۔

یہ دعویٰ قطعاً بے بنیاد اور غلط ہے کیونکہ۔ اولاً حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ امام ابو نصر کا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سورہ مزمل میں آیت فاقرءوا ما تیسر من القرآن مدینہ میں نازل ہوئی کیونکہ پوری امت اس پر متفق ہے کہ سورہ مزمل ساری مکی ہے۔ امام

ابونصر کو سورہ مزمل میں قتال کے ذکر سے یہ شبہ ہوا ہے کہ یہ سورت مدنی ہے لیکن ایسا سمجھنا درست نہیں ہے کیونکہ

علم ان سیکون منکم مرضی واخرون یقاتلون فی سبیل اللہ

بیماری اور جہاد میں پابندی کے ساتھ تہجد کی نماز ادا نہیں ہوسکے گی اس لیے اس کی تاکید اللہ تعالیٰ نے ختم کردی ہے۔ اور اس آیت میں سیکون سے جہاد کی خوشخبری سنا کر جہاد کی فرضیت سے پہلے ہی تہجد کی نماز کی فرضیت ساقط کردی ہے۔ اس سے یہ کیونکہ ثابت ہوا کہ جہاد اور قتال کا حکم اس وقت نازل ہوچکا تھا۔ بہرحال آیت مکہ میں نازل ہوئی۔

حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی نے یہاں جو فیصلہ کن بات فرمائی ہے وہ اس لائق ہے کہ ناظرین معالم القرآن کے مطالعہ میں آئے۔ فرماتے ہیں :

اوّل قرأت مقتدی کی فرض تھی۔ اس آیت یعنی اذا قرئ القرآن الخ سے ممنوع ہوگئی اور مدینہ طیبہ میں بھی یہ حکم پہنچ گیا تھا۔ گویا ایک کلیہ دین کا مقرر ہوگیا تھا کہ مقتدی کچھ نہ پڑھے حسب حکم آیت کے ــــ اور آیت فاقرأوا ماتیسر من القرآن چونکہ اس سے پہلے نازل ہوئی تھی بحق مقتدی منسوخ ہوگئی۔ اور امام و منفرد کے حق میں ویسی ہی قطعی اس کا حکم باقی تھا۔ کیونکہ منسوخ البعض قطعی رہتی ہے چنانچہ اس قاعدہ کو سب اہل علم جانتے ہیں۔ لہٰذا مقتدی کے حق میں سورہ مزمل کی آیت سے استدلال کرنا درست نہیں ہے کیونکہ آیت مزمل کی نزول میں پہلے ہے اور سورہ اعراف کی یہ آیت بعد میں نازل ہوئی اور آخر اوّل کا ناسخ ہوتا ہے حکم بقدر تعارض ہیں۔

بہرحال سورۃ مزمل پوری مکی ہے۔ السیوطی لکھتے ہیں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ سورہ مزمل کی آخری آیت مدینہ میں نازل ہوئی ہے وہ غلط فہمی کا شکار ہیں۔ کیونکہ حضرت عائشہ سے روایت ہے کہ سورۃ مزمل کا آخری حصہ پہلے حصہ کے نزول کے پورے ایک سال کے بعد نازل ہوا ہے۔ اور سورۃ مزمل قرآن عزیز کی ابتدائی سورتوں میں سے ایک ہے۔

بچنے کی ایک اور راہ

کچھ بزرگ یہ بھی فرماتے ہیں کہ قرآن کی یہ دونوں آیتیں ایک دوسرے کے خلاف

ہیں فاقرؤا ماتیسر من القرآن سے امام مقتدی اور منفرد کو قرآن پڑھنے کی اجازت مل رہی ہے اور اذا قری القرآن سے مقتدی کو منع کیا جارہا ہے۔ اس کو یوں بھی پیش کرتے ہیں کہ دونوں میں تعارض ہے اور تعارض کا حکم یہ ہے کہ دونوں کو نظر انداز کر دیا جائے۔ لہٰذا قرآن کی آیت اذا قری القرآن سے مقتدی کے لیے ترک قرأت پر استدلال صحیح نہیں ہے۔

تعارض کی صورت میں تساقط وہاں ہوتا ہے جہاں جمع ممکن نہ ہو۔ یہاں دونوں کے نزدیک جمع ممکن ہے۔ مقتدی پر قرأت کا بوجھ ڈالنے والوں اور مقتدی کو قرأت کی ذمہ داری سے سبکدوش کرنے والوں کے نزدیک، جو مقتدی پر قرأت واجب کہتے ہیں وہ اس طرح جمع کرتے ہیں کہ فاقرؤا ماتیسر من القرآن سے سب کے لیے مطلق قرارت کو ضروری کہتے ہیں اور اذا قری القرآن سے سورہ فاتحہ کو مستثنیٰ کر لیتے ہیں یعنی جب امام سورۃ فاتحہ پڑھے تو مقتدی بھی پڑھے اور جب امام باقی قرآن کی تلاوت کرے تو مقتدی خاموش رہے۔ اور جو لوگ مقتدی پر قرأت کی ذمہ داری نہیں ڈالتے وہ کہتے ہیں کہ فاقرؤا ماتیسر من القرآن سے امام اور منفرد پر قرأت فرض ہے اور اذا قری القرآن سے مقتدی قرأت کی ذمہ داری سے سبکدوش ہے۔ مقتدی کا استثنا زیادہ قرینِ صواب ہے۔ فاتحہ کے استثنا سے۔ کیونکہ یہ آیت جمہور کے خیال میں عام مخصوص البعض ہے۔ آخر مدرک رکوع کو بھی اس سے مستثنیٰ کر کے مدرک رکعت قرار دیا گیا ہے۔ اور اذا قری القرآن میں کسی درجہ میں تخصیص اصل حکم کو ختم کرنے کے مترادف ہے۔

اصل یہ ہے کہ ان دونوں آیتوں میں تعارض ہی نہیں ہے۔ کیونکہ تعارض کے لیے ضروری ہے کہ

۱۔ دونوں حکموں کا محل ایک ہو۔

۲۔ دونوں میں تقدم و تاخر کا پتہ نہ ہو۔

۳۔ ایک کو دوسرے پر ترجیح نہ دی جا سکے۔

۴۔ دونوں میں تطبیق ممکن نہ ہو۔

لیکن ان دونوں آیتوں میں تعارض کی ایک شرط بھی موجود نہیں ہے۔ یہاں دونوں کا محل جدا جدا ہے۔ آیت اذا قری القرآن کا محل فرض نماز ہے۔ جیسا کہ عبداللہ بن عباس

بیان کرتے ہیں اور آیت فاقرأوا ما تیسر من القرآن کا محل تہجد کی نماز ہے۔ جیسا کہ ابوداؤد میں تصریح ہے۔ اور امام بیہقی لکھتے ہیں۔ اہل علم میں مشہور و معروف ہے۔ حافظ ابن القیم لکھتے ہیں کہ یہ آیت صلاۃ تہجد کے بارے میں ہے۔ جب ایک آیت کا محل فرضی نماز ہے اور دوسری کا نفلی نماز ہے تو پھر تعارض کیسے۔ تعارض کے لیے وحدت محل شرط ہے۔ دونوں میں تقدم و تاخر ہے۔ سورہ مزمل کا نزول بہت پہلے ہوا ہے جبکہ سورۃ اعراف بعد میں نازل ہوئی ہے۔ وجہ ترجیح بالکل ظاہر ہے۔ اگر بالفرض دونوں کا محل ایک ہوتا اور تقدم و تاخر بھی معلوم نہ ہوتا تب بھی اذا قرئ القرآن کے حکم کو ترجیح ہوتی۔ کیونکہ اس آیت میں مقتدی کو قرأت سے منع کیا گیا ہے۔ ترجیح کے لیے اتنی بات کافی ہے۔ علاوہ ازیں ان دو آیتوں میں جمع و تطبیق چنداں دشوار نہیں ہے کیونکہ اذا قرئ القرآن مقتدی کے بارے میں ہے اور فاقرأوا ما تیسر منفرد اور امام کے بارے میں ہے۔ یہ تطبیق کہ فاقرأوا ما تیسر سے سورہ فاتحہ اور قرآن مراد ہے اور اذا قرئ القرآن سے فاتحہ مستثنیٰ ہے۔ غیر منطقی اور غیر اصولی ہے۔ اسے کوئی ذوق سلیم پیش نہیں کرسکتا۔ حیرت ہے کہ کچھ بزرگوں نے اس جمع سے اپنے آپ کو کیسے مطمئن کرلیا ہے۔

ایک اور عذر بارد

کچھ بزرگوں نے اس آیت کی طاقت سے بچنے کے لیے یہ عذر بارد کیا ہے کہ آیت اِذا قُرِیَ القُرآن مکی ہے اور امام کے پیچھے قرآت کرنے کا حکم مدینہ میں ہوا ہے۔ کیونکہ عبادہ ابن الصامت مدنی ہیں اور ابوہریرہ ۷ھ میں مسلمان ہوئے۔ قرآن کی اس آیت کی چوٹ سے بچنے کی یہ تدبیر بھی بالکل بے جان ہے کیونکہ قرآن عزیز کی کسی آیت اور حکم کو منسوخ کرنے کے لیے کسی محکم قطعی حکم کی ضرورت ہے۔ حضرت عبادہ اور حضرت ابوہریرہ کی اخبار آحاد سے قرآن حکیم کی آیت کیسے منسوخ ہوسکتی ہے۔ پھر حافظ ابن حجر لکھتے ہیں کہ کسی متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے متقدم الاسلام صحابی کی روایت کو صرف تقدم و تاخر کی وجہ سے منسوخ نہیں قرار دیا جاسکتا۔ نہ معلوم متاخر الاسلام صحابی کی روایت سے قرآنی حکم قطعی کیسے منسوخ کیا جاسکتا ہے۔ پھر کیا صرف حضرت عبادہ ابن الصامت اور حضرت ابوہریرہ ہی مدنی تھے۔ اور حضرت

ابوموسیٰ الاشعری، حضرت جابر بن عبداللہ، حضرت ابوالدرداء، حضرت انس بن مالک حضرت زید بن ثابت اور حضرت مالک بن بحینہ مدنی نہ تھے جن سے امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت کی ممانعت کی حدیثیں آتی ہیں۔ اور یہ حضرت ابوہریرہ کا قول ہے۔ اس قول سے قرآن کی آیت کیسے منسوخ ہو سکتی ہے جبکہ قاعدہ یہ ہے کہ مرفوع حدیث کے مقابلہ میں بھی اُمت میں سے کسی کا قول قابلِ قبول نہیں ہو سکتا۔ حیرت ہے کہ ایک طرف موقوفاتِ صحابہ کو حجت نہیں مانتے اور دوسری ان سے قرآنی آیت اذا قری القرآن کو منسوخ ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔

ایک اور راہ فرار

امام کے پیچھے قرأت کا شوق پورا کرنے کی خاطر اس آیتِ قرآنی کی ضرب سے بچنے کی ایک تدبیر یہ بھی کچھ نے اختراع کی ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول خطبہ ہے لہٰذا یہ آیت امام کے پیچھے پڑھنے سے نہیں روکتی۔ اس بے حقیقت اور بے کار بات کی علمی دُنیا میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے جب کہ دلائل و براہین سے یہ بات ثابت ہو چکی ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول نماز ہے۔ خطبہ وغیرہ اس کے عمومی حکم میں داخل ہے بے شک یہ سعید بن جبیر، مجاہد اور عطاء کی رائے ہے لیکن محققین نے اسے رد کر دیا ہے کیونکہ یہ آیت مکی ہے اور جمعہ کی فرضیت سلہ میں مدینہ میں ہوئی جیسا کہ امام ابن جریر نے لکھا ہے اور امام بغوی بھی معالم میں تصریح کر چکے ہیں کہ آیتِ قرآنی مکی ہے اور جمعہ کا معاملہ مدنی زندگی سے تعلق رکھتا ہے۔ امر واقعہ یہ ہے کہ آیتِ قرآنی کا شانِ نزول تو نماز اور صرف نماز ہے لیکن جن حضرات نے یہ کہا ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول خطبہ ہے تو اُن کی مراد یہ ہے کہ اس آیت کا مضمون عمومِ الفاظ کے اعتبار سے خطبہ کو بھی شامل ہے۔ شاہ ولی اللہ الفوز الکبیر میں لکھتے ہیں:

> صحابہ و تابعین بسیار بود کہ نزلت فی کذا و کذا می گفتند و غرض ایشاں تصویر با صدق آں این آیت بود۔
>
> صحابہ و تابعین اکثر و بیشتر کہتے کہ یہ آیت فلاں واقعہ میں نازل ہوئی۔ ان کا منشا اس سے صرف یہ ہوتا کہ یہ واقعہ میں اس آیت کے مصداق میں داخل ہے۔

یہ بات امام بیہقی کا نام لے کر پیش کی جا رہی ہے۔ حالانکہ امام بیہقی اپنی کتاب میں لکھ چکے ہیں کہ عبداللہ ابن مسعود، عبداللہ بن عباس، مجاہد بن جبیر، سعید بن المسیب، الحسن البصری، ابوالعالیہ، محمد بن شہاب الزہری، عطا ابن ابی رباح اور محمد بن کعب القرظی جیسے سب اکابر اس آیت کی شان نزول نماز کو بتاتے ہیں۔ حافظ ابن جریر لکھ چکے ہیں کہ ان تمام اقوال میں سب سے زیادہ صحیح اور راجح بات یہ ہے کہ اس آیت کا شانِ نزول نماز ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ضحاک، ابراہیم نخعی، قتادہ، شعبی اور عبدالرحمان بن زید بن اسلم فرماتے ہیں کہ آیت کا شانِ نزول نماز ہے۔ اس کے باوجود پھر یہ کہنا کہ آیت کا شانِ نزول خطبہ ہے دھاندلی کے سوا کیا ہے۔

ایک اور معذرت

کچھ بزرگوں کی جانب سے اس آیت کے ذریعہ مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت پر یہ معذرت بھی پیش کی گئی ہے کہ یہ آیت نماز میں باتیں کرنے پر نازل ہوئی تھی یعنی اس آیت کے ذریعے مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت سے نہیں بلکہ باتیں کرنے سے روکا گیا ہے۔ ایسا سمجھنا بھی غلط ہے کیونکہ :

اوّلاً، صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ نماز بات چیت کی ممانعت اس سے نہیں بلکہ سورہ بقرہ کی آیت قُومُوا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ سے ہوئی ہے۔

ثانیاً، زید بن ارقم کی روایت سے یہ بات تاریخی طور پر ثابت ہو چکی ہے کہ صحابہ کرام نماز میں ہجرت کے بعد کی باتیں کرتے تھے۔ یہ مدنی زندگی کی بات ہے۔ قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی قُومُوا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ، سوچنے کی بات ہے کہ اگر قرآن کی اس آیت اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ سے تکلم فی الصلوٰۃ ممنوع ہو چکا تھا تو صحابہ کرام مدینہ میں ہجرت کے بعد کیسے باتیں کرتے۔ دونوں باتیں بالکل واضح اور بے غبار ہیں۔

ایک یہ کہ نماز بات چیت پر پابندی قرآن کی آیت قُومُوا لِلّٰہِ قَانِتِیْنَ کے ذریعے عمل میں آئی ہے۔

دوسری یہ کہ بات چیت پر پابندی مدینہ میں ہوئی ہے نہ کہ مکہ میں اور سورۃ اعراف کی آیت اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ مکی ہے نہ کہ مدنی۔

السیوطی نے الدرالمنثور میں ان دو باتوں کی ایک سے زیادہ روایات درج کی ہیں مثلاً بخاری و مسلم و ابوداؤد میں زید بن ارقم کہتے ہیں کہ ہم زمانۂ نبوت میں نماز میں باتیں کرتے تھے یہاں تک کہ قرآن کی آیت وَ قُومُوا لِلّٰهِ قَانِتِيْنَ نازل ہوئی اور ہمیں چپ رہنے کا حکم ہُوا۔ اور مسلم میں ہے کہ ہمیں بات چیت سے روک دیا گیا۔ اس کے علاوہ طبرانی نے ابن عباس کی، ابن جریر و ابن المنذر نے عکرمہ کی، سعید بن منصور نے محمد بن کعب کی، عبد بن حمید نے عطیہ کی، عبدالرزاق نے مجاہد کی روایات پیش کی ہیں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ نسخ کلام مدینہ میں ہُوا ہے - اور اس بات کی تائید میں جو روایات پیش کی جاتی ہیں کہ نماز میں بات چیت کی ممانعت اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ ...الخ سے ہوئی ہے وہ سب پایہ اعتبار سے گری ہوئی اور کمزور ہیں - ایک روایت میں محمد بن دینار ہے دوسری میں مومل بن اسماعیل ہے، تیسری میں عبداللہ بن عامر اور چوتھی میں عاصم بن عمر ہے۔ یہ سب ضعیف منکر الحدیث، کثیر الخطاء، متروک ہیں۔ اس قسم کی روایات کے سہارے مسائل کا فیصلہ کرنا اہلِ علم کے شایانِ شان نہیں ہے۔

ایک اور بہانہ

کچھ بزرگوں نے اس گرفت کو زیادہ ہی محسوس کیا۔ انہوں نے اس سے گلوخلاصی کے لیے ایک اور راہ نکالی۔ اور وہ یہ کہ آیت اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ میں استماع اور انصات کا حکم ہے اور ان دونوں کا مطلب یہی ہے کہ مقتدی کو بحالت قرأتِ امام توجہ کرتے ہوئے خاموشی اختیار کرنی چاہیے اور جب امام قرأت کر رہا ہو اس وقت مقتدی کو کچھ نہ پڑھنا چاہیے اور مکمل خاموشی اختیار کرنی چاہیے لیکن مقتدی کو سکتاتِ امام میں قرأت کرنے سے یہ آیت نہیں روکتی ہے۔ اور نواور ہمارے مولانا عبدالحی لکھنوی بھی امام الکلام میں اسی وسوسہ میں مبتلا ہیں۔ لیکن سوال یہ ہے کہ دو سکتوں کے علاوہ امام کے سکتات کا ثبوت کیا ہے۔ جو دو سکتے ثابت ہیں وہ یہ ہیں۔ ایک تکبیر تحریمہ کے بعد کا سکتہ اور دوسرا سکتہ سورۃ فاتحہ کی قرأت سے فارغ ہونے کے بعد کا۔ پہلے سکتہ میں نہ تو قرأتِ فاتحہ کا ثبوت ہے اور نہ گنجائش اور دوسرا سکتہ سورہ فاتحہ کی قرأت کے بعد امام اس لیے کرتا ہے کہ قرأت سے فارغ ہونے کے بعد صرف سانس لے سکے۔ صرف اس سکتہ میں

سورہ فاتحہ کی قرأت کیسے ممکن ہے۔ شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں:

امام احمد، امام مالک، امام ابوحنیفہ اور جمہور اہل اسلام اس کے ہرگز قائل نہ تھے کہ سورہ فاتحہ کے بعد امام اس لیے سکتہ کرے کہ مقتدی اس سکتہ میں سورہ فاتحہ پڑھ سکے نہ یہ سکتہ کے وجوب کے قائل تھے اور نہ استحباب کے۔

اور دوسرے موقعہ پر رقمطراز ہیں:

جہاں تک ہمیں معلوم ہے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں ہے تاکہ مقتدی سورۂ فاتحہ وغیرہ پڑھ لیں۔ امام مالک، امام ابوحنیفہ اور امام احمد بن حنبل وغیرہ جمہور اس پر متفق ہیں کہ امام کے لیے یہ بات مستحب بھی نہیں ہے کہ وہ سکتہ کرے تاکہ مقتدی قرأت کر سکیں۔

قاضی محمد بن عبداللہ ابوبکر بن العربی مالکی کہتے ہیں۔

اُمت کا اس پر اتفاق ہے کہ امام پر سکتہ واجب نہیں ہے۔

حافظ ابن القیم الجوزیہ لکھتے ہیں:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی صحیح اور ضعیف حدیث میں یہ ثابت نہیں ہے کہ آپ نے محض اس لیے سکتہ کیا ہو کہ مقتدی سورہ فاتحہ پڑھ لیں۔ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایسا کوئی طویل سکتہ فرماتے جس میں مقتدی سورہ فاتحہ تلاوت کر سکتے تو یہ بات صحابہ کرام کی نگاہوں سے اوجھل نہ رہتی اور ان کو اس کا علم ہوتا اور تکبیر افتتاح کے سکتہ سے زیادہ اہم بنا کر وہ اسے نقل کرتے۔

علامہ امیر یمانی لکھتے ہیں:

امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت کا پروانہ دینے والے باہم مختلف ہیں۔ ایک گروہ یہ کہتا ہے کہ امام کے سکتات میں پڑھے اور دوسرا کہتا ہے کہ چپ رہے۔ امام قرأت سے فارغ ہو تو پڑھ لے لیکن ان دونوں باتوں کا حدیث میں کوئی ثبوت نہیں ہے۔

بہر حال سکتاتِ امام کا کسی حدیث سے ثبوت نہیں ملتا ہے۔ اور اس موضوع پہ جو احادیث پیش کی جاتی ہیں وہ سب پایہ اعتبار سے ساقط ہیں، خواہ وہ کنز العمال ہی

ابن عمر کی روایت ہو۔ اس کی سند میں مثنیٰ ابن الصباح ہے جو متروک اور ضعیف ہے اور چاہے ابوہریرہ کی مستدرک حاکم والی روایت ہو اس کی سند میں محمد بن عبداللہ ضعیف ہے اور چاہے عمرو بن شعیب عن ابیہ عن جدہ امام بیہقی کی کتاب القرأۃ والی روایت ہو اس سند کے موضوع پر محدثین کا کلام مشہور ہے۔ یہی حال باقی دوسری روایات کا ہے مولانا عبدالحی نے امام الکلام میں لکھا ہے سکتہ والی ساری حدیثیں معلول ہیں۔

ان کے علاوہ کچھ اور بھی راہیں کچھ لوگوں نے اس آیتِ قرآنی پر عمل سے بچنے کی اختیار کی ہیں لیکن ان کی حیثیت دماغی ورزش سے زیادہ کچھ نہیں اس لیے ہم ان کو بیان کر کے ناظرینِ معالم کا وقت ضائع کرنا نہیں چاہتے اگر آپ مزید تفصیل کے خواہاں ہیں تو حضرت مولانا سرفراز خاں مدظلہ العالی کی کتاب احسن الکلام کا مطالعہ کیجیے۔ میں نے خود ان سے استفادہ کیا ہے۔ جزاہ اللہ تعالیٰ عنا وعن جمیع المسلمین

اسی آیت کی تشریح میں حضرت مولانا عثمانی نے ایک حدیث بھی پیش کی ہے۔ میری مراد ابوموسیٰ اشعری کی وہ حدیث ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ہدایت دی ہے کہ نماز با جماعت ہو اور تم مقتدی ہو تو جب امام اللہ اکبر کہے تو تم اللہ اکبر کہو۔ اور جب امام قرأت کرے تو تم خاموش رہو، اور جب امام غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو۔ آئیے اس حدیث کے متعلق بھی کچھ مفید باتیں سن لیجیے۔ پوری حدیث اس طرح ہے:

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں خطاب فرمایا اور سنت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی تلقین فرمائی اور ہمیں نماز کا طریقہ سکھایا اور فرمایا کہ نماز پڑھنے سے پہلے اپنی صفوں کو درست کر لو، پھر ایک تم میں سے تمہارا امام بنے جب وہ اللہ اکبر کہے تم بھی اللہ اکبر کہو اور جب وہ قرأت کرے تو تم خاموش رہو اور جب وہ غیر المغضوب علیہم ولا الضالین کہے تو تم آمین کہو
>
> صحیح مسلم ص۱۷۴ ج ۱

یہ حدیث صحیح قرآن عزیز کی اس آیت گرامی کی تشریح ہے۔ حافظ ابن عبدالبر لکھتے ہیں:

> اہلِ علم کا اس پر اجماع ہے کہ آیت اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ میں جس استماع و انصات کا مطالبہ ہے اس سے نماز مراد ہے اور نماز کے

مراد ہونے کی کھلی اور واضح دلیل یہ ہے کہ مقتدی جہری نمازوں میں امام کے ساتھ قرأت نہیں کرتا ہے اور اس کی شہادت جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہے کہ جب امام پڑھے تم خاموش رہو۔

یہ صحیح حدیث کہتی ہے کہ قرأت کرنا امام کا کام ہے۔ مقتدی کا کام صرف توجہ کرنا اور خاموش رہنا ہے۔ یہ حدیث صحیح مسلم کے علاوہ حدیث کی دوسری کتابوں میں بھی موجود ہے۔ اسی کی تائید ابوہریرہ کی اس حدیث سے ہوتی ہے جو امام نسائی نے روایت کی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے امام اس لیے مقرر کیا جاتا ہے کہ اس کی اقتدا کی جائے۔ جب وہ تکبیر کہے تم اللہ اکبر کہو اور جب وہ قرأت کرے تم خاموش رہو۔ اور جب وہ سمع اللہ لمن حمدہ کہے تم ربنا لک الحمد کہو۔

یہ بھی حدیث کی متعدد کتابوں میں آئی ہے۔ یہ حدیث بھی قرآنی آیت کی تائید کرتی ہے اور بتاتی ہے کہ امام کا کام قرأت کرنا اور سمع اللہ لمن حمدہ کہنا ہے اور مقتدی کا فریضہ خاموش رہنا اور ربنا لک الحمد کہنا ہے۔

اس کی کھلی تائید ابوہریرہ کی اس حدیث سے بھی موطا امام مالک میں ہے کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک جہری نماز سے فارغ ہونے کے بعد ارشاد فرمایا کہ کیا تم میں سے کسی نے ابھی میرے ساتھ قرأت کی ہے ایک شخص بولا جی ہاں یا رسول اللہ میں نے قرأت کی ہے۔ آپ نے فرمایا جبھی تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآن کی تلاوت میں چھینا جھپٹی کیوں ہو رہی ہے۔ آپ کے اس ارشاد کے بعد جن نمازوں میں آپ جہر سے قرأۃ کرتے تھے لوگوں نے آپ کے پیچھے بالکل قرأت چھوڑ دی۔

یہ حدیث موطا کے علاوہ حدیث کی دیگر کتابوں میں بھی موجود ہے۔ یہ بھی اذا قرئ القرآن آیت قرآنی کی شرح ہے۔ یہ واقعہ صبح کی نماز کا ہے جس میں تقریبًا سارے صحابہ کرام موجود ہوں گے مگر صحابہ کی اس ساری جماعت میں حضور کے پیچھے قرأت کرنے والا صرف ایک شخص تھا۔ اس سے پتہ چلا ہے کہ سارے صحابہ اس آیتِ قرآنی سے یہی سمجھے ہوئے تھے کہ جب قرآن پڑھا جائے تو اس کا سننا اور خاموش رہنا نماز میں ضروری ہے

اور مقتدی کو امام کے پیچھے قرأت کرنا منع ہے ۔

اس قسم کی اور بھی بہت سی حدیثیں آتی ہیں ۔

قرآن کی اس آیت اور ان احادیث کی وجہ سے امام ابو حنیفہؒ، امام مالکؒ اور امام احمدؒ نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ یہ نماز با جماعت میں مقتدیوں کے بارے میں ہے ۔ باقی رہی بغیر جماعت کے نماز یں امام کی نماز تو اس کا حکم قرآن کی دوسری آیت اور دوسری احادیث میں ہے ۔ قرآن کی آیت سے میری مراد سورۂ مزمل کی وہ آیت ہے جو آپ پہلے پڑھ چکے، یعنی فَاقْرَؤُا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ ، اس پر تفصیلی تبصرہ تو سورۂ مزمل پارہ ۳۰ میں آئے گا ۔ یہاں تو سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اس آیتِ قرآنی سے معلوم ہوا نماز میں قرآن کی تلاوت نماز کا ایسا ہی رکن ہے جیسے قرآن میں قیام پر پوری نماز کا رکوع پر، پوری نماز کا سجود پر نماز کا اطلاق ہوا ہے ایسے ہی اس آیت میں قرآن بول کر پوری نماز مراد ہے ۔

قرآن کا ثبوت قطعی ہے اور احادیث کا ظنی ۔ قرآن کے ثبوت کی جو نوعیت ہے وہ حدیث کی نہیں، اسی وجہ سے حدیث کا درجہ باعتبارِ ثبوت قرآن کے بعد ہے ۔ علامہ شاطبی نے اس پر ایک مستقل فصل لکھی ہے ۔ عنوان ہے :

رتبة السنة التاخر عن الکتاب سنت کا مرتبہ قرآن کے بعد ہے ۔

اساس میں نوعیتِ ثبوت کے اسی جوہری فرق کی وجہ سے پوری عمارت جو اس اساس پر اٹھائی گئی ہے اس میں امتیاز پیدا ہو گیا ۔ ارکان و فرائض کسی چیز کی ماہیت ہوتے ہیں، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج یہ سب آیاتِ قرآنیہ سے ثابت ہیں ۔ ان کے ارکان و فرائض بھی قرآن ہی سے ثابت ہیں جیسے قیام، قرأۃ، سجدہ، رکوع، اس لیے اس آیت سے نماز میں قرآن کی تلاوت کا فرض ہونا معلوم ہوا ۔ نماز میں صرف فرائض ہی نہیں بلکہ نماز مجموعہ ہے فرائض، واجبات، سنن اور مستحبات کا ۔ صرف نماز نہیں بلکہ قانونِ قدرت یہی ہے کہ دنیا میں کسی بھی چیز کے اجزاء اہمیت و غیر اہمیت کے لحاظ سے یکساں نہیں ہوتے ۔ ایک درخت میں جڑ، شاخیں، پتیاں، ٹہنیاں سب اس کے اجزاء کہلاتے ہیں لیکن ہر شخص جانتا ہے کہ اس کے تمام اجزاء ایک حیثیت نہیں رکھتے ۔ اسی طرح ایک شخص میں ہاتھ، پیر، سر، دل، دماغ وغیرہ سب کے سب اجزاء شمار ہوتے ہیں مگر ان اجزاء میں باہم اتنا فرق ہے کہ بعض کے کٹ جانے سے درخت باقی رہتا ہے اور بعض کے کٹ جانے سے صرف

زیبائش میں فرق پڑتا ہے اور بعض کے کٹ جانے سے درخت کی نشوونما میں فرق ہوتا ہے اور بعض کے کٹ جانے سے درخت کی نشوونما میں فرق ہوتا ہے اور بعض کے کٹ جانے اور کچھ کے نہ ہونے سے درخت ہی فنا ہوجاتا ہے۔ لہٰذا جیسے مادیات میں کسی چیز کے اجزاء میں اس قدر فرق تمیزی ہوتا ہے اسی سے مجتہدین و فقہاء نے شرعی حقائق کے اجزاء میں قرآن وسنت کی روشنی میں بھی فرق جوہری معلوم کیا ہے۔ نماز کے کچھ اجزاء وہ ہیں جن کی کمی سے نماز کے حسن و زیبائش پر حرف آتا ہے اور کچھ اجزاء وہ ہیں جن کے نہ ہونے سے نماز کی حقیقت میں کمی آجاتی ہے اور بعض اجزاء وہ ہیں جن کے ناپید ہونے سے نماز نماز ہی نہیں رہتی۔ پہلی قسم کو مستحبات، دوسری کو واجبات اور تیسری کو فرائض کہتے ہیں۔ شاید آپ کے دماغ میں یہ خلش ہو کہ ان مراتب کا اندازہ اسلام کے قانون دان اداروں نے کیسے کیا۔؟

اس کا اندازہ قانونی اداروں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے طرز عمل سے اور ارشادات سے کیا ہے، نماز کے بعض اجزاء کے ترک سے نماز کو قابل اعادہ اور ناقص قرار دیا۔ اور بعض کے ترک سے گو ناقص کہا مگر دوبارہ پڑھنے کو نہیں کہا اور بعض کی وجہ سے نماز کا ہونا نہ ہونا برابر بتایا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ نماز کے اجزاء میں فرض، واجب کا فرق صرف دلیل کے قطعی اور ظنی ہونے کی وجہ سے نہیں ہے بلکہ دراصل خود ان اجزاء کی حقیقت کی وجہ سے ہے۔ یہ بات بڑی تفصیل سے بحرالعلوم نے رسائل الارکان میں لکھی ہے۔ بہرحال نماز میں آیت قرآنی فاقرءوا ما تیسر من القرآن سے قرأت قرآن فرض ہے یعنی نماز کے ان اجزاء میں سے ہے جن کے نہ ہونے سے نماز کا وجود ہی نہیں ہوتا۔ اور عبادہ ابن الصامت کی حدیث کی وجہ سے

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے نماز سورۂ فاتحہ کے بغیر نہیں ہے۔

سورہ فاتحہ نماز میں واجب ہے لیکن قرآن کی زیر تشریح آیت اِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ اور ان حدیثوں کی وجہ سے جو پہلے بیان ہوچکی ہیں مقتدی پر فاتحہ کا پڑھنا واجب نہیں ہے بلکہ سننا اور خاموش رہنا واجب ہے کیونکہ عبادہ ابن الصامت کی حدیث، نماز فاتحہ کے بغیر نہیں، مطالبہ نماز باجماعت میں امام کے سورہ فاتحہ کے پڑھنے سے بالکل

پورا ہو رہا ہے۔ اور اس کی دلیل یہ حدیث امام اور منفرد کے بارے میں ہے مقتدی کے بارے میں نہیں ہے یہ ہے کہ اسی عبادہ کی حدیث میں یہ الفاظ بھی مختلف روایات میں آتے ہیں فصاعدا اس سے زیادہ کچھ اور ما تیسر جو کچھ آسان ہو۔ ماذاد کچھ اور زیادہ۔ ظاہر ہے کہ مقتدی پر سورت کی قرآت واجب نہیں ہے جبکہ امام اور منفرد پر واجب ہے اور روایات میں ان الفاظ کی زیادتی محض راویوں کی ذہنی کاوشوں کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ فی الواقع عربی اسالیب کا بھی تقاضا ہے۔ کیونکہ عبادہ کی اصل حدیث

لا صلاۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب

لفظ قراۃ عربی زبان میں متعدی ہے۔ قرآن میں اسی طرح استعمال ہوا ہے۔ مثلاً اذا قرأت القرآن اور اذا قرء القرآن۔ جب کوئی متعدی ہو اور اس کو حروف جار کے ذریعے پر متعدی بنایا جاتا ہے تو اس میں یہ راز بتانا ہوتا ہے کہ یہاں کچھ اور بھی ہے مثلاً قرآن میں وامسحوا برؤسکم ہے۔ مسح متعدی ہے اور مسحت الجدار بولا جاتا ہے مگر یہاں یہ بتانا مقصود ہے کہ سر پر صرف ہاتھ پھیرنا نہیں بلکہ پانی سے بھیگا ہوا ہاتھ پھیرنا ہے اس لیے مفعول پر با لگا دی ہے اخذت ید رشید اور اخذت بید رشید میں بھی یہی فرق ہے۔ اخذت ید رشید وہاں بولا جائے گا۔ جہاں براہ راست رشید کا ہاتھ پکڑا جائے لیکن اخذت بید رشید وہاں آئے گا جہاں اور بھی لوگ موجود ہوں اور ان میں سے رشید کا ہاتھ پکڑا جائے۔ قرآن میں اقرا باسم ربک الذی خلق میں اقرا کا مفعول با کے ساتھ لایا گیا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو اس کی وجہ یہی سمجھتا ہوں کہ جبریلؑ نے آپ سے صرف پڑھنے کا مطالبہ نہیں بلکہ لکھی ہوئی چیز پڑھنے کا مطالبہ کیا تھا۔ اس لیے اقراء باسم ربک الذی خلق فرمایا زرقانی علی الموطا، میں عبید بن عمیر کی مرسل روایت سے اس کی تائید ہوتی ہے

جاء جبریل بنمط من دیباج فیہ کتاب

جبریل ریشم کی ڈبیہ میں لکھی ہوئی چیز لے کر آئے

اور ویسے بھی حضور اقدس کا یہ جواب کہ ما انا بقاری اسی وقت صحیح ہوتا ہے، جب آپ سے لکھی ہوئی چیز پڑھنے کا مطالبہ ہو کیونکہ اُمیت کتابت کے منافی ہے اُمّی لکھی ہوئی چیز نہیں پڑھ سکتا۔ اور زبانی تعلیم سے تلقین کردہ الفاظ تو پڑھ

سکتا ہے۔ بہر حال قرأت متعدی ہے اس کے مفعول پر بار صرف اس لیے لگائی گئی ہے کہ فاتحہ ہی نہیں بلکہ کچھ اور بھی پڑھنا چاہیے۔ اسی کو مختلف احادیث میں روایت بالمعنے کے طور پر فصاعدا، فما زاد، ما تیسر اور سورۃ کی تعبیرات سے ظاہر کیا گیا ہے۔ اور جاننے والے جانتے ہیں کہ فاتحہ سے زیادہ مقتدی پر پڑھنے کی ذمہ داری کسی کے نزدیک نہیں ہے لہٰذا اس قسم کی ساری حدیثیں مطلق نماز کے بارے میں ہیں۔ اس قسم کی حدیثوں سے نماز میں سورہ فاتحہ اور سورۃ کا وجوب معلوم ہوتا ہے کیونکہ حدیث میں لاصلاۃ کے عمومی الفاظ کے تحت سورہ فاتحہ اور اس کے ساتھ کچھ اور کا بھی حکم دیا ہے تو جیسے سورہ فاتحہ واجب ہے اسی طرح فصاعدا اور ما زاد بھی واجب ہے۔

زیر تشریح آیت کا منطوق اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جب امام قرأت کر رہا ہے تو مقتدی کا کام سننا اور خاموش رہنا ہے۔ اس منطوق سے سارے ائمہ نے اثر لیا ہے بلکہ اکثر نے اس کے مدلول سے یہ سمجھا ہے کہ جب امام قرأت کر رہا ہو خواہ وہ نماز سری ہو مقتدی کو خاموش رہنا چاہیے۔ ابن قدامہ رقمطراز ہیں :

> مختصر یہ ہے کہ امام کے پیچھے نماز میں مقتدی پر قرأت واجب نہیں ہے چاہے امام جہری نماز پڑھ رہا ہو اور چاہے سری جماعت کی روایت امام احمد کا مسلک یہی ہے۔ یہی امام زہری، امام سفیان ثوری، امام مالک، امام ابو حنیفہ اور محدثین میں امام اسحاق بن راہویہ کا مذہب ہے۔ صرف امام شافعی اور امام داؤد ظاہری کہتے ہیں کہ ہر حال میں مقتدی پر قرأۃ واجب ہے کیونکہ لاصلاۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب عام ہے لیکن حالت جہر میں وہ بھی خاموش رہنے کا حکم دیتے ہیں۔

اور یہی ابن قدامہ لکھتے ہیں :

> مقتدی جب امام کی قرأت سن رہا ہے تو اس پر قرأت نہ واجب ہے اور نہ ہی مستحب ہے۔ یہ امام احمد، امام زہری، امام سفیان ثوری، امام مالک، امام ابن عیینہ، امام ابن المبارک، امام اسحاق، اور یہی امام شافعی کا ایک قول ہے اور تابعین میں سعید بن المسیب، عروہ بن الزبیر، ابو سلمہ بن عبدالرحمن، سعید بن جبیر، اور سلف کی ایک جماعت کی یہی رائے ہے۔

دوسرا قول امام شافعی کا یہ ہے کہ مقتدی امام کے پیچھے ہر حال میں پڑھے۔ یہی امام لیث بن سعد، اوزاعی، ابن عون، مکحول اور ابوثور کا کہنا ہے ۔

لیکن امام نووی نے شرح المہذب میں ابن المنذر اور خطابی کے حوالہ سے ذرا کھول کر بیان کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ :-

> سفیان ثوری، ابن عیینہ اور کوفہ والوں کی ایک جماعت کا یہ مسلک ہے کہ امام کے پیچھے مقتدی پر کوئی قرأت نہیں ہے۔ لیکن امام زہری، امام مالک، امام احمد، ابن المبارک اور اسحاق بن راہویہ کا خیال پہلے فریق کی طرح یہ ہے ۔ کہ جہری نمازوں میں مقتدی قرأت نہ کرے اور سری نمازوں میں پڑھنا ضروری ہے۔ ابن عون، اوزاعی اور ابوثور اور ان کے علاوہ کی رائے میں سب نمازوں میں مقتدی کے لیے پڑھنا ضروری ہے ۔

مگر جہاں تک امام احمد کے مسلک کا تعلق ہے اس کی ترجمانی صحیح وہ ہی ہے جو ابن قدامہ نے کی ہے کہ سری نمازوں میں امام احمد کی رائے میں مقتدی کے لیے سورۂ فاتحہ کا پڑھنا مستحب اور پسندیدہ ہے واجب نہیں ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے بھی امام احمد کا یہی مسلک بتایا ہے ۔

علامہ حازمی نے کتاب الاعتبار میں مذاہب کی وہی تفصیل بیان کی ہے جو علامہ ابن قدامہ نے پیش کی ہے اور لکھا ہے :-

> ابو حنیفہ، مالک، اوزاعی، لیث بن سعد، ابن المبارک، احمد اور اسحاق بن راہویہ اور ان کے علاوہ جمہور یہ کہتے ہیں کہ امام کے پیچھے مقتدی کے لیے جہری نماز میں فاتحہ پڑھنا جائز نہیں ہے اور یہی امام شافعی کا قدیم مذہب ہے ۔

ان توضیحات سے معلوم ہوا کہ جہری نماز کی حد تک قرآنی آیت کے منطوق پر سب ائمہ عمل پیرا ہیں اور کہتے ہیں کہ جہری نماز میں مقتدی کے لیے فاتحہ کا پڑھنا جائز نہیں ہے۔ صرف امام شافعی کا ایک قول ہے کہ جہری نمازوں میں مقتدی پر فاتحہ پڑھنا واجب ہے۔ اگرچہ امام شافعی کا خود شوافع میں بھی قول مشہور ہے لیکن واجب ہونے کے باوجود ان کا یہ بھی فیصلہ ہے ۔

ایسا شخص جو امام کے ساتھ رکوع میں ہے اس پر فاتحہ نہیں ہے۔
اور یہ بھی امر واقعہ ہے کہ

چاروں اماموں ابوحنیفہ، مالک، شافعی اور احمد بن حنبل اور جمہور فقہا کا فیصلہ یہ ہے کہ رکوع میں ملنے والا رکعت پالیتا ہے۔

اسی فیصلہ کا پس منظر یہی ہے کہ امام کی قرأت مقتدی کے لیے کافی ہے۔ اگر یہ ضمانت نہ ہوتی تو رکوع میں ملنے والے کے بارے میں رکعت حاصل کرنے کا کبھی فیصلہ نہ ہوتا۔
اب تک جو کچھ کہا ہے اس سے یہ حقیقت واضح ہو کر سامنے آگئی ہے کہ قرآن کی یہ آیت اور ابوموسیٰ اشعری کی تشریحی حدیث یہ بتاتی ہے کہ جہری نمازوں میں امام کی قرأت کے وقت مقتدی کو نہ پڑھنا چاہیے۔ لیکن صرف اتنی نہیں ہے بلکہ اس سے آگے بھی ہے کہ:

۱۔ نماز جہری نہ ہو بلکہ سری ہو۔ مثلاً ظہر عصر ہو، مغرب کی آخری رکعت یا عشا کی آخری دو رکعت ہوں۔

اس موقعہ پر مقتدی کو کیا کرنا چاہیے۔ بے شک امام پڑھ رہا ہے لیکن مقتدی کو استماع کا موقعہ نہیں ہے۔ ایسے ہی امام جہری نماز میں ہے مگر وہ مقتدیوں کو سکتات کی مدد سے پڑھنے کا موقعہ دے رہا ہے ایسی صورت میں مقتدی کو کیا کرنا چاہیے۔
اس موضوع پر اگرچہ بہت کچھ لکھا گیا ہے اور مجوزین و مانعین کی جانب سے لکھا گیا ہے۔ مجوزین کا زور اس پر صرف ہو رہا ہے کہ فاتحہ کے بغیر مقتدی کی نماز ہی نہیں ہوتی اور مانعین یہاں تک چلے گئے کہ فاتحہ کا پڑھنا مکروہ ہے۔ افراط و تفریط کے اس ہنگامہ میں مجھے مولانا عبدالحی لکھنوی، مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا سید انور شاہ کشمیری کی پیش کردہ راہِ اعتدال بہت پسند آئی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ ان تینوں بزرگوں کی تحقیق ہدیۂ ناظرین کردوں۔ تینوں بزرگوں نے اس موضوع پر کتابیں لکھی ہیں۔ مولانا عبدالحی نے امام الکلام، مولانا رشید احمد نے ہدایت المعتدی اور سبیل الرشاد اور مولانا سید انور شاہ کشمیری نے فصل الخطاب کے نام سے کتابیں لکھی ہیں۔ مولانا عبدالحی نے امام الکلام کے علاوہ موطا امام مالک کی شرح التعلیق الممجد اور شرح الوقایہ کی شرح السعایہ میں بھی اس موضوع پر تفصیلی کلام کیا ہے۔ مولانا فرماتے ہیں:

ہماری رائے یہ ہے کہ امام کے پیچھے سورہ فاتحہ پڑھنے کو مکروہ قرار دینا اگر راہِ تفریط ہے اور حدیث عبادہ چھوڑنے کو مستلزم ہے تو امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کو فرض کہنا کہ نہ پڑھنے سے نماز ہی نہ ہو راہ افراط ہے اور حدیث جابر چھوڑنے کو مستلزم ہے۔ اگر وہ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنے کے لیے حدیث عبادہ صلاۃ الا لفاتحۃ الکتاب کا سہارا لیتے ہیں تو ہم ان سے وہی بات کہیں گے جو امام احمد نے کہی ہے کہ اس حدیث کو حضرت جابر نے بھی پیش کیا ہے مگر اس کا مصداق مقتدی کے علاوہ امام اور منفرد کو بتایا ہے۔ اور پھر اس سے زیادہ سے زیادہ وجوب ثابت ہوتا ہے۔ اگر مقتدی کے موضوع پر قراۃ الامام قراۃ لہ، حدیث نہ ہوتی تو ہم مقتدی کے حق میں بھی واجب کہتے۔ اگر وہ عبادہ کی دوسری ابوداؤد کو دلیل میں پیش کرتے ہیں تو یہ حدیث جابر کی حدیث سے معارض ہے اور پھر اس طرق ضعیف ہیں۔ الغرض بہتر یہ ہے کہ وہ طریقہ اپنایا جائے کہ جس سے ساری حدیثیں جمع ہو جائیں اس کی صورت یہ اور صرف یہ ہے کہ سری نمازوں میں مقتدی کی قرأت کو واجب نہیں جائز کہا جائے اور جہری نمازوں میں سکتات امام میں قرأت کو جائز کہا جائے اور حدیث جابر کی وجہ سے نہ پڑھنے کو بھی جائز کہا جائے۔

زیر تشریح آیت پر تفصیلی تبصرہ کے بعد امام الکلام میں لکھتے ہیں کہ:

اس ساری رد و کد کے بعد انصاف کی بات یہ ہے کہ کہ جس سے احناف نے امام کے پیچھے مقتدی کے لیے قرأت نہ کرنے پر استدلال کیا ہے سری نمازوں میں مقتدی کو قرأت کرنے سے نہیں منع کرتی ہے۔ اور نہ جہری نمازوں میں سکتات امام کے وقت قرأت سے روکتی ہے۔ یہ تو صرف یہ بتاتی ہے کہ جہری نمازوں میں جب امام قرأت کر رہا ہو اس وقت مقتدی قرأت نہ کرے، یہ بات وہاں دلیل کا کام دے سکتی ہے جب کہنے والا یہ کہے کہ مقتدی امام کے ساتھ ساتھ پڑھے اور یا اس شخص سے کہی جا سکتی ہے جو یہ دعویٰ کرے کہ مقتدی پر فاتحہ واجب ہے اور امام کے لیے مقتدی

کی خاطر سکتات مسنون ہیں۔ باقی اس آیت سے سری نمازوں میں یا سکتاتِ امام میں مقتدی کے لیے خاموش ہونے کے ضروری ہونے پر استدلال صرف اس وقت ہو سکتا ہے جب ناقابلِ فہم اور فضول تاویلوں کا سہارا لیا جائے۔

مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سبیل الرشاد میں فرماتے ہیں :

مکہ میں ابتدائے اسلام میں نمازِ تہجد فرض ہوئی تھی جس کی سورۃ مزمل ابتدارِ بعثت میں نازل ہوئی کہ حسبِ تحریرِ سیوطی اتقان میں اوّل سورۃ اقرا ثانیاً سورہ قلم، ثالثاً ابتدارِ سورۃ مزمل کا نزول ہے۔ اور سب امام مقتدی فاتحہ و سورت دونوں کو پڑھتے تھے۔ پھر بعد ایک سال کے حسبِ روایت حضرت عائشہ صدیقہؓ کی مکہ ہی میں آخر سورۃ مزمل نازل ہوا، جس میں فَاقْرَءُوْا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْاٰنِ ہے۔ تو اس آیت سے نمازِ تہجد طویل منسوخ ہو کر قدرِ مَا تَيَسَّرَ باقی رہ گئی۔ اور اس وقت بھی مقتدی و منفرد و امام سب پر قرأت فرض رہی۔ بعد اس کے معراج میں صلوٰتِ خمسہ فرض ہو کر نمازِ تہجد کی فرضیت منسوخ ہو گئی اور پانچوں نمازیں مکان میں پڑھی جاتی تھیں۔ اور ان میں مقتدی قرأت کرتے تھے حسبِ حکمِ قدیم کے۔ پھر ایک مدت کے بعد مکہ ہی میں سورۃ اعراف نازل ہوئی اور اس میں آیت وَاِذَا قُرِئَ الْقُرْاٰنُ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ وَاَنْصِتُوْا نازل ہوئی تو اس سے قرأتِ مقتدی کی بالکل منسوخ ہو گئی۔ اس پر بہت شواہد احادیث مرفوعہ و موقوفہ، صحیح و ضعیف موجود ہیں جو مولوی عبدالحی صاحب مرحوم نے اپنے رسالہ امام الکلام میں نقل کیے ہیں۔

اس کے بعد امام ربانی نے تین احادیث نقل کر کے لکھا ہے :

غرض ان احادیث سے یہ ہے کہ آخر حدیث سے ثابت ہوتا ہے کہ فاتحہ و سورت دونوں اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے نماز میں پڑھتے تھے اور مطلق حکم آیت سے دونوں کا پڑھنا منسوخ ہوا ہے اور آپ نے بھی اس مطلق حکم کو مقید سورۃ نہیں فرمایا بلکہ عام فاتحہ و سورت میں رکھا ہے۔ اور اس مجاز سے زمانے کے لوگ جو اس آیت کا نزول خطبہ میں بیان

کر کے اس حکم کو خطبہ پر مقصور رکھتے ہیں۔ یہ سراسر اُن کی غلطی ہے کیونکہ اوّل صریح احادیث سے ثابت ہو گیا کہ اس کا نزول قرآت مقتدی کے بارے میں ہے دوسرے یہ کہ جمعہ مدینہ میں فرض ہوا ہے اکثر علماء کے نزدیک اور جو علماء مکہ میں فرضیت جمعہ کی بیان کرتے ہیں تو ان کے نزدیک بھی جمعہ کو ادا کرنے کا موقعہ مکہ میں حضور کو کبھی نہیں ملا۔ ایسا ہے تو آپ نے کب مکہ میں ادا کیا اور کب لوگوں نے خطبہ میں بات کی تھی جو یہ آیت نازل ہوئی۔ کیونکہ اعراف باتفاق محدثین ومفسرین مکی ہے۔ اور یہ آیت بھی مکی ہے کسی نے نے اس آیت کا استثنا نہیں کیا نہ کسی نے اس کو مدنی لکھا ہے۔ اور پھر حکم تو عموم الفاظ پر ہوتا ہے نہ کہ خصوصی مراد پر اور یہ قاعدہ مسلمہ تمام اُمت کا ہے۔ اس میں کسی کا کوئی اختلاف نہیں اس لیے اگر یہ آیت خطبہ کے بارے میں نازل ہوئی ہے پھر بھی مقتدی کو عام ہے۔ اور امام بخاری جزء القرآۃ میں تصریح کرتے ہیں کہ یہ آیت نماز و خطبہ دونوں میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ آیت کا حکم دونوں کو شامل ہے۔ یہ بھی محدثین کہتے ہیں ورنہ مکہ میں خطبہ کہاں تھا۔

مقصد یہ ہے کہ قرآت مقتدی کی مطلقاً مکہ میں قبل ہجرت منسوخ ہو چکی تھی اور عبداللہ بن مسعود صحابی فقیہ و قدیم اور دیگر حاضرین کو نسخ محقق ہو چکا تھا۔ کیونکہ ہر وقت حاضر باش تھے اور علی ہذا دیگر اصحاب حاضرین مکہ کو معلوم تھا کہ پہلے قرآت مقتدی پر فرض تھی۔ اس آیت سے ممنوع ہو گئی اور مدینہ طیبہ میں بھی یہ حکم پہنچ گیا تھا۔ گویا دین کا ایک کلیہ مقرر ہو گیا تھا کہ مقتدی کچھ نہ پڑھے۔ اور آیت فَاقْرَءُوا مَا تَيَسَّرَ مِنَ الْقُرْآنِ جو اس سے پہلے نازل ہو چکی تھی وہ بحق مقتدی منسوخ ہو گئی اور امام و منفرد کے حق میں ویسے ہی اس کا حکم قطعی رہا۔ کیونکہ منسوخ البعض بھی قطعی ہوتا ہے برخلاف مخصوص البعض کے یہ قاعدہ سب اہل علم جانتے ہیں۔ لہٰذا مقتدی کے لیے آیت مزمل سے استدلال درست نہیں ہے کیونکہ سورہ مزمل پہلے نازل ہوئی اور سورہ اعراف بعد میں۔ اور متاخر پہلے کے لیے

ناسخ ہوتا ہے۔ جب آپ مدینہ طیبہ تشریف لائے اور علی الاعلان مسجد میں جماعت ہونے لگی تو یہ مقتدی کے خاموش رہنے کا ضابطہ جاری تھا۔ اور خود آنحضرت کو بھی علم تھا کہ یہ مسئلہ سب پر حسب حکم آیت اعراف واضح ہو گیا ہے کیونکہ بعد نزول آیت کوئی آیت اس کی ناسخ نازل نہیں ہوئی اور نہ آپ نے اس آیت کے خلاف کوئی مقتدیوں کو حکم دیا۔ اور دلیل اس کی یہ ہے کہ حدیث عبادہ جو مجوزین کی بہترین دلیل ہے اس کے الفاظ یہ ہیں: صلی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم الصبح فثقلت علیہ القرأۃ فلما انصرف قال انی اراکم تقرأون وراء امامکم اور ابوداؤد کی روایت میں ہے۔ لعلکم تقرأون اور ایک روایت میں ھل تقرأون؟ ان روایات میں آپ کا ایسی کلمات دریافت فرمانا اس بات کی دلیل ہے کہ آپ نے مقتدیوں کو امام کے پیچھے قرأت کا حکم نہیں دیا تھا۔ کیونکہ اگر آپ کے حکم سے پڑھتے تو لعلکم تقرأون شاید تم پڑھتے ہو اور ھل تقرأون کیا تم پڑھتے ہو فرما کر کیوں دریافت فرماتے۔ اس طرح آپ کا سوال کرنا اس بات کی کھلی نشانی ہے کہ یہ قرأت آپ کی اجازت اور حکم سے نہ تھی۔ جب آپ نے پوچھا تو کچھ نے پڑھنے کا اقرار کیا۔ بہر حال اس استفہام سے ظاہر ہے کہ اس واقعہ تک بھی قاعدہ کلیہ نماز کا مقرر تھا کہ مقتدی امام کے پیچھے کچھ نہ پڑھتے تھے اور آپ کو کسی کے پڑھنے کی خبر نہ تھی اس واقعہ اور آپ کے مطلع ہونے کے بعد ہوا جو کچھ ہوا

باقی رہی یہ بات کہ جب قرآن کی آیت قرأت مقتدی میں ممانعت کی نازل ہو چکی تھی اور حضور اقدس علیہ السلام کا حکم بھی اس کے خلاف نہ ہوا تھا اور نماز کا قانون یہی تھا کہ مقتدی قرأت نہ کرے تو پھر صحابہ کرام امام کے پیچھے کیوں پڑھتے تھے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ تو صاف اور واضح بات ہے کہ تمام جماعت نہیں پڑھتی تھی۔ البتہ کچھ صحابہ جن کو نزول آیت کا علم نہ تھا وہ پڑھتے تھے۔ اسی لیے ابوداؤد کی ایک روایت میں ہے فقال بعضنا انا نصنع ذالک کچھ نے کہا ہاں یہ کرتے ہیں [1]

---

[1] حاشیہ اگلے صفحہ پر

بظاہر یہ بعض ہی پڑھنے والے تھے اگر سب یا اکثر پڑھتے تو پہلے دوسری ہی جماعت میں غالباً خبر ہو جاتی کہ مجمع میں کھس پھس مخفی نہیں رہتی ہے۔ لہذا اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پڑھنے والے کچھ وہ حضرات تھے جن کو نسخ کا پتہ نہ تھا۔

اور حضرت عبادہ جیسے حضرات صحابہ اس واقعہ کے بعد بھی امام کے پیچھے قرأت کے قائل رہے وہ جواز ہی کے قائل تھے اور یہ بھی ممکن ہے کہ یہ حضرات امام کے سکتات میں پڑھتے ہوں لنظر لعلت حکم آیت کے کہ عین حالتِ قرأت میں قرأت سے منع کیا گیا ہے کہ استماع قرآن میں مانع نہ ہو۔ اگر سکتات میں پڑھا جائے تو مضائقہ نہیں ہے۔ چنانچہ بعض روایات میں ھذا نقرأ یعنی ہم جلدی جلدی پڑھتے ہیں۔ آپ کی شروع قرأت سے پہلے اور سکتات میں تاکہ خلط آپ کی قرأت سے نہ ہو اور وجہ جلدی کی یہی تھی۔ مگر یہ بھی ہوا ہے تو بعض کا فعل و اجتہاد ہے نہ جملہ صحابہ کا۔ کیونکہ اگر اکثر کا عمل ہوتا تو غالب یہی ہے کہ پہلی ہی دوسری جماعت میں حضرت علیہ السلام کو خبر ہو جاتی کہ اگرچہ مجمع میں کیسا ہی اخفا کیا جائے مگر اکثر رجال میں آواز اونچی ہو جاتی اس کو تجربہ سے مشاہدہ کیا جا سکتا ہے خصوصاً جبکہ خاموشی ہو۔
الحاصل جب آپ کو قرأت میں منازعت و ثقل واقع ہوا اور لوگوں

ف پچھلے صفحہ کا حاشیہ :- موطا امام مالک میں ہے فقال رجل نعم انا یا رسول اللہ ایک شخص نے کہا ہاں یا رسول اللہ۔ یہ واقعہ صبح کی نماز کا ہے دیکھئے سنن کبریٰ ج ۲ ص۱۵۸ ابوداؤد ج ۱ ص۱۲۰۔ جس میں تقریباً سارے صحابہ موجود ہوں گے مگر ان میں سے آپ کے پیچھے قرأت کرنے والا ایک شخص تھا۔ اور آپ نے ان دیگر اشخاص کو بھی کچھ نہیں کہا۔ جنہوں نے قرأت نہیں کی تھی۔ اور صحابہ کرام میں سے کسی نے یہ نہیں کہا کہ حضرت آپ نے قرأت کرنے کا خود حکم دیا ہے پھر کیا ممانعت کا کوئی جدید حکم آیا ہے۔ اور یہ محال ہے کہ آپ نے قرأت کرنے کا حکم دیا ہو اور اس پر عمل کرنے والا صرف ایک شخص ہو۔ جہری نمازوں میں اس سے بڑھ کر امام کے پیچھے قرأت کے منع ہونے کا اور کیا ثبوت ہو سکتا ہے۔

کا پڑھنا معلوم ہوا تو آپ نے حکم فرمایا:

لا تفعلوا الا بفاتحۃ الکتاب فانہ لا صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب۔

یعنی اگر جلدی جلدی سکتات امام ہی میں پڑھتے ہو تو سورہ فاتحہ کے سوا نہ پڑھو۔

اس سے معلوم ہوا کہ وہ لوگ فاتحہ اور سورت دونوں پڑھتے تھے جیسا کہ قبل نزول آیت کے سب صحابہ پڑھتے تھے مگر اب سکتات میں پڑھتے تھے اور پہلے رعایت سکتات نہ تھی پس جب یہ حکم ہوا تو اب صحابہ میں دو فریق ہو گئے۔

مجوزین کی جماعت نے ظاہر الفاظ حدیث سے یہ سمجھ لیا کہ آپ نے ایجاب قرأت فاتحہ کا فرمایا ہے اور عموم آیت کو خاص فرمایا۔ انہ لا صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب کے مگر مع ہذا دوسرے فریق کی نماز کو فاسد نہیں جانتے تھے کہ دوسرا فریق بھی مصاب ہو گیا تھا تو ان کا اس پر عمل ہوا کہ امام کے پیچھے فاتحہ سری نماز ہو یا جہری سکتات امام میں ہر حال میں پڑھنا چاہیے اور یہ فریق اسی پر قائم رہا۔ اور فخر عالم علیہ السلام نے بھی ان کو رد نہ کیا اور نہ وحی سے اس میں اصلاح کی گئی۔ اور جو لوگ مانع ہیں انہوں نے اس حکم کو ناسخ و مخصص آیت کا نہ جانا بلکہ جانا کہ یہ رخصت قرأۃ فاتحہ کی سکتات امام میں ہے کہ جلدی جلدی ادا کرے کہ بعد شروع قرأت امام کے پڑھنا منع ہے اور جملہ فانہ لا صلاۃ الا بفاتحۃ الکتاب کو وجہ رخصت جانا کہ باوجود اس قصد ممانعت کے کہ آیت سے ثابت ہے پھر خاص فاتحہ کی رخصت کیوں فرمائی حالانکہ سب قرآن یکساں ہے اس کی کیا خصوصیت ہوئی ورنہ سکتات میں سورت بھی جائز ہوتی تو اس کی وجہ رخصت آپ نے یہ فرمائی کہ فاتحہ کو نماز سے بہت مناسبت ہے اور نماز کے ساتھ اس کو ایسی خصوصیت ہے کہ کسی دوسری سورت کو اس قدر نہیں یہاں تک کہ سورۃ فاتحہ کا نام ہی صلاۃ سے تعبیر کیا گیا۔ اس حدیث قدسی میں ہے قسمت الصلوٰۃ بینی و بین عبدی نصفین لہٰذا جب اس قدر خصوصیت بالصلوٰۃ ہے تو اگر سکتات میں اس کو پڑھ لے تو رخصت ہے اور یہ قدر قلیل آیات محل تنازع میں

ختم بھی ہو سکتی ہیں اور خلط قرآتِ امام کی نوبت نہیں آتی۔ پس یہ جملہ بیان خصوصیت رخصت کے لیے ہے نہ بیان وجوب قرآت فاتحہ کے واسطے مقتدی کے حق میں۔ اور وجوب قرآتِ فاتحہ کا اس حدیث میں امام اور منفرد کے لیے ہے۔ پس معنے یہ ہوتے کہ تم سکتہ میں اگر فاتحہ پڑھو تو میں اس کی سی نہیں کرتا جیسا کہ تم اب کرتے ہو اس لیے کہ فاتحہ بہت موکد واجب صلوٰۃ منفرد و امام میں ہے مگر اور سورت ہرگز نہ پڑھو نہ سکتاتِ امام میں نہ حالتِ قرآتِ امام میں اور دلیل رخصت کی سکتاتِ امام میں آپ نے خود اس حدیث میں بیان فرمادی ہے وانا اقول ومالی ینازعنی القرآن (جب ہی تو میں کہہ رہا تھا کہ میرے ساتھ قرآن میں چھینا جھپٹی کیوں ہو رہی ہے) اس سے صاف معلوم ہو گیا کہ وجہ حرمت کی منازعت تھی۔ اور ظاہر ہے کہ منازعت سورۂ فاتحہ میں ایسی ہی ہے جیسا سورت میں۔ لیکن سورت فاتحہ کی آیتیں تھوڑی ہیں اس لیے ثنا وغیرہ کے سکتہ میں بلامنازعت پڑھی جاسکتی ہے۔ لہٰذا رخصت کی گنجائش ہے بخلاف دیگر سورت کے۔ لیکن اس کے باوجود حدیث میں ارشاد موجود ہے کہ نہ پڑھنا بہتر ہے کیونکہ نہی سے جو استثنا کیا جاتا ہے اس میں وجوب امر کی طرح نہیں ہوتا ہے بلکہ صرف اباحت ہوتی ہے۔ لہٰذا یہاں اباحت و رخصت ہے۔ اب حکم آیت کا مثل سابق اپنے عموم پر ہے۔ اس میں کوئی تخصیص نہیں ہوئی ہے۔ معلوم ہوا کہ اس طبقہ نے جو کچھ سمجھ کر عمل کیا تھا خود رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے تا آخر حیات اس کی تردید نہیں فرمائی بلکہ خاموشی سے ہمنوائی کی اور اس موضوع پر وحی آئی اس لیے یہ فریق بھی راہ راست پر اور برحق ٹھہرایا گیا۔

اس کے بعد وہ روایات جن سے وجوبِ فاتحہ معلوم ہوتا ہے مجوزین ان کو عام کہتے ہیں اور مقتدی کو بھی شامل کرتے ہیں اور مانعین خاص بتاتے ہیں امام و منفرد کے ساتھ مثلاً عبادہ کی وہ روایت جو اس واقعہ سے الگ سادہ شکل میں ہے لاصلوٰۃ لمن لم یقرا۔الخ اس میں مانعین کے خیال میں مقتدی پر فاتحہ کا وجوب نہیں ہے بلکہ یہ امام و منفرد کے لیے ہے نہ کہ مقتدی کے

لیے کیونکہ اس روایت عبادہ میں معمر نے امام زہری سے لفظ فصاعدا زیادہ کیا ہے یعنی لا صلوٰۃ لمن لم یقرأ بفاتحۃ الکتاب فصاعداً اور سفیان نے بھی زہری سے یہ زیادتی فصاعداً کی روایت کی ہے اور یہ بھی مقرر ہے کہ زیادت ثقہ کی حجت ہے۔[1] یہ زیادتی صاف کہہ رہی ہے کہ حکم مقتدی کے بارے میں نہیں ہے کیونکہ مقتدی کو آپ پہلے ہی سے فاتحہ سے زیادہ پڑھنے سے منع فرما چکے ہیں۔ لہٰذا یہ بلاشبہ مقتدی کے لیے نہیں ہے۔ ایسے ہی ابوہریرہ کی منادی میں لفظ فما زاد موجود ہے۔ یہ منادی بھی مقتدی کے لیے نہیں ہے۔ اسی طرح ابوسعید خدری کی روایت میں امرنا ان نقرأ بفاتحۃ

---

[1] حضرت امام ربانی بتانا یہ چاہتے ہیں کہ یہ کہنا فصاعداً کی زیادت میں معمر منفرد ہیں خود قواعد و اصول کے خلاف ہے کیونکہ معمر بالاتفاق ثقہ اور حجت ہیں اور ثقہ کی زیادتی بالاتفاق قابلِ قبول ہے۔ پھر یہ کہ فصاعداً کی زیادتی ابوداؤد میں بسند صحیح موجود ہے۔ علاوہ ازیں فصاعداً کی زیادتی امام اوزاعی اور شعیب بن ابی حمزہ سے بھی مروی ہے۔ اور یہی فصاعداً کی زیادتی عبدالرحمٰن بن اسحاق مدنی سے بھی مروی ہے اور صالح بن کیسان سے بھی منقول ہے۔ بلکہ فصاعداً کے بجائے حضرت ابوسعید خدری سے مرفوع روایت میں ما تیسر اور دوسری روایت میں ما زاد آیا ہے اور ان کے علاوہ اور بھی متعدد الفاظ آتے ہیں۔ ایک روایت وسورۃ معہا ہے اور ایک روایت میں ایتین وثلاث کی زیادت ہے۔ ایک روایت میں والسورۃ کی زیادتی ہے۔ ایک روایت وثلاث آیات فصاعداً آیا ہے ایک روایت میں وآیتین من القرآن ہے۔ ایک روایت میں ثم اقرأ بما معک کی زیادتی ہے۔ ایک روایت میں بما شاء اللہ ان تقرأ ہے۔ ایک روایت شئی منہا ہے۔ ایک روایت میں ثم قرأت بما معک من القرآن ہے۔ اور اسی قسم کے الفاظ کتب حدیث میں اور بھی موجود ہیں مگر مشتے نمونہ از خروارے ہی کافی ہے بہرحال روایت عبادہ میں فصاعداً کی زیادتی روایت کی دنیا میں ایک واقعہ اور ثابت شدہ حقیقت ہے۔ اس لیے یہ دعویٰ کہ فصاعدا کی زیادت بیان کرنے میں معمر منفرد ہیں۔ اصول و قواعد کی روشنی میں بالکل بے جا اور بے دلیل ہے۔

الکتاب وما تیسر بھی سچی مقتدی نہیں ہے۔ اور جن مرفوع یا موقوف روایات میں مقتدی کو فاتحہ پڑھنے کی اجازت ہے وہ بطور رخصت کے خواں کے واسطے جو رعایت سکتات کر سکتے ہیں اور جو ان ہی رواۃ سے ممانعت ہے وہ ان عوام کے لیے ہے جو سکتات کا خیال نہیں کرتے۔ لہٰذا ہرگز جیسے امام کے پیچھے قرأت نہ کرنے والے کی نماز فاسد نہ ہوگی ایسے ہی امام کے پیچھے قرأت کرنے والے کی نماز میں کوئی نقصان نہ ہوگا۔ یہ مسئلہ اجتہادی ہے اور ہر ایک صحابہ کی رائے اور تاویل اور حضور اقدس کے ارشاد پر عمل کر رہا ہے۔ کسی کو دوسرے پر طعن کی کوئی گنجائش نہیں ہے[1]
مولانا محمد یوسف بنوری نے حضرت شاہ صاحب کی ترجمانی کا معارف السنن میں پورا پورا حق ادا کر دیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ :

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ ابو حنیفہ سے جو علمی سرمایہ منقول ہے اس میں امام ابوحنیفہ کے مذہب میں جہری اور سری نماز میں قرأت نہیں ہے۔ اس کے بعد فقہاء کی تصریح ہے کہ جہری میں ناجائز ہے اور سری نماز میں فقہائے احناف کی روایات مختلف ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ پڑھنا مستحب ہے کچھ کہتے ہیں کہ مباح ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ مکروہ تحریمی ہے، اور کچھ کہتے ہیں کہ مکروہ تنزیہی ہے۔ متاخرین میں مشہور کراہت تحریمی ہے۔ ابن الہمام کے کلام سے بھی فتح القدیر میں یہی معلوم ہوتا ہے۔ اور صاحب بحر کی تصریح کے مطابق غایۃ البیان میں الاتقانی کا یہی خیال ہے اور ابن الہمام نے صاحب ہدایہ کی اس روایت کی تردید کی ہے کہ امام محمد سری نمازوں میں قرأت کے استحسان کے قائل ہیں۔ لیکن سری نمازوں میں امام محمد سے استحسان کی روایت بلاشبہ ثابت ہے کیونکہ صاحب ہدایہ نقل مذاہب میں استدلالی شخصیت ہیں۔ مولانا عبدالحی تعلیق موطا میں فرماتے ہیں کہ استحسان والی روایت ضعیف ہے لیکن درایت کے نقطہ نظر سے قوی ہے۔ اور کتاب الآثار

---

[1] سبیل الرشاد

اور موطا میں امام محمد کی تصریحات یہ تو بتاتی ہیں کہ سری نمازوں میں قرأت نہیں ہے اور یہ کہ قرأت پسندیدہ نہیں ہے لیکن ان سے یہ معلوم نہیں ہوتا کہ قرأت مکروہ ہے بلکہ زیادہ سے زیادہ یہ کہ نہ پڑھنا اولیٰ ہے۔ میری رائے میں اصل مذہب ابی حنیفہ یہ ہے کہ جہری نمازوں میں قرأت ناجائز ہے اور سری نمازوں میں ناپسندیدہ ہے۔ مولانا عبدالحی امام الکلام میں سری نمازوں میں ملا کر آیت جائز کہتے ہیں۔ اور اس سلسلے میں مشائخ کے اقوال بھی پیش کرتے ہیں۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اس کی دوسرے ماخذوں سے بھی تائید ہوتی ہے۔ مثلاً ذخیرہ میں سری نمازوں میں قرأت کے متعلق مشائخ کا اختلاف ذکر کیا ہے پھر اپنا مختار عدم قرأت بتایا ہے۔ نیز مقدمہ غزنویہ میں ہے کہ ہمارے کچھ اصحاب نے امام کے پیچھے سری نمازوں میں مقتدی کے لیے قرأت کو پسند کیا ہے اور اسی کو امام ابو حنیفہ کا قول اوّل قرار دیا ہے۔[1]

مولانا عبدالحی امام الکلام میں بہت بڑی تفصیل کے بعد رقمطراز ہیں:

یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ سب سے زیادہ قوی مسلک جس پر ہمارے اصحاب ہیں وہ سری نمازوں میں مقتدی کے لیے قرأت کا استحسان ہے جیسا کہ یہ روایت ہے۔ امام محمد ابن الحسن سے اور جسے فقہا کی ایک جماعت نے اختیار کیا ہے۔ روایت اگرچہ تاریخی اعتبار سے ضعیف ہے لیکن درایت کے نقطہ نظر سے قوی ہے اور غنیۃ المستملی سے یہ بات معلوم ہو چکی ہے کہ جس روایت کی پشت پناہی درایت کرے اسے اپنانا چاہیے۔[2]

حضرت مولانا امام ربانی رشید احمد گنگوہیؒ مولانا عبدالحی اور حضرت مولانا سید انور شاہ کشمیری کے بیانات کا خلاصہ یہ ہے کہ:

۱- جہری نمازوں میں امام کے ساتھ مقتدی کو قرأت کرنی منع ہے۔

۲- جہری نمازوں میں اگر امام سکتہ کرتا ہو تو سکتوں میں پڑھنا جائز ہے۔

---

[1] معارف السنن [2] امام الکلام

۳۔ جہری نمازوں میں سورہ فاتحہ کے علاوہ قرآن پڑھنا سکتہ میں بھی جائز نہیں ہے۔
۴۔ جہری نمازوں میں امام کے سکتات میں پڑھنا واجب نہیں ہے۔
۵۔ سری نمازوں میں امام کے پیچھے مقتدی پر پڑھنا واجب نہیں ہے۔
۶۔ سری نمازوں میں مقتدی کو قرأت کرنا جائز ہے۔
۷۔ سری نمازوں میں امام کے پیچھے فاتحہ کے سوا کچھ اور قرآن پڑھنا جائز ہے۔
۸۔ امام کے پیچھے جہری اور سری نمازوں میں قرأت کرنے والوں کی نماز ہو جاتی ہے۔
۹۔ امام کے پیچھے جہری اور سری نمازوں میں قرأت کرنے والوں کی نماز ہو جاتی ہے
۱۰۔ یہ مسئلہ صحابہ میں اجتہادی ہے ان مسائل میں ایک دوسرے کو برا کہنے کی کوئی گنجائش نہیں۔

آیت کی ایک اور تفسیر

حافظ ابن الہمام نے اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فاستمعوا لہ میں اللہ سبحانہ نے جہری نمازوں میں مقتدیوں کو قرأت سے منع کیا ہے اور وانصتوا میں سری نمازوں میں قرأت سے روکا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ آیت قرآنی میں استماع اور انصات بولے گئے ہیں۔ استماع کے معنے صرف سننا نہیں بلکہ کان دھرنا اور توجہ کرنا ہے۔ اگر آیت میں سماع کا لفظ ہوتا تو یہ بات ٹھیک ہو جاتی کہ جہری میں سنو اور سری میں چپ رہو لیکن آیت میں استماع آیا ہے اور استماع تو انصات کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے چپ نہیں رہے گا تو استماع نہ ہو گا۔ خاموشی نہ ہو گی تو توجہ ضرور بٹے گی۔ یہاں مطلق سکوت مطلوب نہیں بلکہ استماع کی خاطر مطلوب ہے۔ اگر ایک بات کی طرف متوجہ ہیں لیکن خاموش نہیں ہیں تو آپ واقعہ میں متوجہ نہیں۔ اور اگر آپ خاموش تو ہیں مگر بات کی طرف متوجہ نہیں تو آپ کی خاموشی بے معنی۔ مقصود تو یہ ہے کہ خاموشی کے ساتھ قرآن کی طرف پوری توجہ ہو۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ علامہ سید انور شاہ کشمیری نے حافظ ابن الہمام کی اس بات کو قابل اعتنا نہیں سمجھا بلکہ یہ کہہ کر۔ کہ ابن الہمام کا استدلال کچھ نہیں۔ اس کی معنویت سے انکار کر دیا۔ اور بتایا کہ منشاء آیت قرآنی صرف جہری نمازوں میں امام کے پیچھے قرأت سے روکتا ہے۔ اس کا سری نمازوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مولانا عبدالحی نے امام الکلام میں ابن الہمام سے اختلاف کیا اور بات کو انوکھے انداز میں سمجھایا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آیت قرآنی میں یہ دونوں

استماع اور انصات کا حکم صرف امر تعبدی نہیں ہے کہ جن کی پشت پر کوئی عقلیت نہ ہو بلکہ یہ اسی طرح عقلی پس منظر رکھتے ہیں جیسے خطبہ کے وقت خاموشی کا حکم۔ ان کا پس منظر دراصل یہ ہے کہ قرآن نازل ہی اس لیے ہوا ہے کہ اس میں تدبر و تفکر کیا جائے۔ اور یہ مقصد استماع و انصات کے بغیر حاصل ہی نہیں ہو سکتا۔ اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ یہ مقصد صرف ان نمازوں میں حاصل ہو سکتا ہے جن میں امام بالجہر قرأت کر رہا ہے۔ مقتدیوں پر چونکہ تدبر کرنا ضروری ہے اس لیے اس ضرورت کے تحت استماع و انصات ناگزیر ہے۔ سری نمازوں میں امام کی آواز مقتدیوں تک پہنچتی ہی نہیں ہے اس لیے تدبر و تفکر ممکن ہی نہیں ہے خواہ وہ خاموش رہیں۔ اس لیے سری نمازوں میں خاموشی کے لیے کوئی معقولیت نہیں ہے۔ یہ کہنا کہ سری نمازوں میں خاموشی محض تعبدی ہے بلا دلیل ہے۔

شاید آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ یہ کہنا کہ قرآن کا نزول تدبر و تفکر کے لیے ہوا ہے بلا دلیل ہے۔ قرآن کی بے شمار آیات میں یہ بات واضح طور پر بتائی گئی ہے کہ قرآن کا مقصد نزول تدبر و تفکر ہے۔ احادیث مرفوعہ اور موقوفہ میں بھی یہ بات قوت سے واضح کی گئی ہے۔ نیز امت کے فضلاء نے تصریح کی ہے۔ صاحب نہایہ لکھتے ہیں۔ قرأت خود مقصود نہیں بلکہ تدبر و تفکر کی خاطر مقصود ہے۔ کافی کبایہ اور معراج الدرایہ میں ہے کہ قرأت قرآن سے مقصود تدبر و تفکر ہے اور یہ مقصد استماع و انصات کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا [1]

بہر حال حافظ ابن الہمام کی اس تشریح کو ارباب علم و تحقیق میں وہ پذیرائی نہ مل سکی جس کی توقع تھی۔

آیت قرآنی کا تشریحی مقام اس سے زیادہ تفصیلی مباحث کا متحمل نہیں ہو سکتا۔ اس موضوع پر مجوزین اور مانعین علماء نے علمی تحقیقات کا کافی سرمایہ فراہم کر دیا ہے۔ سب نے داد تحقیق دی ہے۔ سب سے پہلے امام بخاری نے جزء القراۃ لکھا ہے۔ شوافع میں سے امام بیہقی نے کتاب القرأت لکھی ہے اور پاکستان و ہند

---

[1] امام الکلام اور غیث الغمام

میں بھی اس پر علمی اور تحقیقی کام ہُوا ہے۔ اہلحدیث علماء میں سے نواب مولانا صدیق حسن خاں، مولانا میاں نذیر حسین، مولانا عبداللہ پشاوری، مولانا عبدالرحمٰن مبارکپوری، اور احناف میں سے مولانا رشید احمد گنگوہی، مولانا محمد قاسم نانوتوی، مولانا عبدالحی لکھنوی، مولانا محمد ہاشم سندھی، مولانا احمد علی سہارنپوری، علامہ ظہیر احسن بہاری، مولانا سید انور شاہ کشمیری، مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خاں کی کتابیں موجود ہیں۔ اس کے علاوہ شروح حدیث میں اس پر تفصیلی تبصرہ کیا گیا ہے۔ لیکن یہ ایک ناقابلِ انکار حقیقت ہے کہ مسئلہ زمانہ صحابہ سے اختلافی چلا آرہا ہے۔ امام بیہقی کتاب القرآۃ میں لکھتے ہیں کہ:

> صحابہ کرام کے عہد سے اس وقت تک باقاعدہ اس مسئلہ میں اختلاف چلا آتا ہے۔ (کتاب القرآۃ)

علامہ خطابی نے معالم السنن میں لکھا ہے:۔

> اس مسئلہ میں علماء کا اختلاف رہا ہے۔ صحابہ کی ایک جماعت امام کے پیچھے قرأت کو ضروری بتاتی تھی۔ اور کچھ صحابہ کرام امام کے پیچھے قرأت کے قائل نہ تھے۔ فقہاء بھی تین راہوں میں بٹے رہے کچھ امام کے پیچھے قرأت کو سب نمازوں میں ضروری کہتے تھے اور کچھ سرّی نمازوں میں ضروری کہتے تھے اور کچھ سرّی اور جہری نمازوں میں مقتدی کے لیے قرأت کے قائل نہ تھے۔

اللہ سبحانہٗ کو یاد کرنے کا طریقہ

۲۰۶۔ اور اے پیغمبر یاد کرتا رہ اپنے جی میں اپنے رب کو گڑگڑا کر اور ڈر کر اور زبان سے بھی آہستہ آہستہ بغیر آواز بلند کیے صبح اور شام اور مت ہو تو غفلت والوں میں سے۔ بلاشبہ جن لوگوں کو اللہ کا قرب ہے وہ اس کی بندگی سے بڑائی نہیں کرتے اور وہ اس کی تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور اسی کے حضور سجدہ کرتے ہیں۔ بڑا ذکر تو قرآن حکیم ہے۔ اس کا اب بیان ہو چکا۔ اب عام ذکر اللہ کے کچھ آداب بیان کرتے ہیں۔ یعنی ذکر اللہ کی اصلی رُوح یہ ہے کہ جو زبان سے کہے دل سے اس کی طرف دھیان کرے تاکہ ذکر کا پورا نفع ظاہر ہو اور زبان و دل دونوں عضو

خدا کی یاد میں مشغول ہوں، ذکر کرتے وقت دل میں رقت ہونی چاہیے۔ سچی رغبت و رہبت سے خدا کو پکارے جیسے کوئی خوشامد کرنے والا ڈرا ہوا آدمی کسی کو پکارتا ہے۔ ذاکر کے لہجہ میں آوازیں اور ہیئت میں تضرع و خوف کا رنگ محسوس ہونا چاہیے۔ ذکر و مذکور کی عظمت و جلال سے آواز کا پست ہونا قدرتی چیز ہے و خشعت الاصوات للرحمٰن فلا تسمع الا ھمساً"۔ اسی لیے زیادہ چلانے کی ممانعت آئی ہے۔ دھیمی آواز سے سراپا چہرا خدا کا ذکر کرے تو خدا اس کا ذکر کرے گا۔ پھر اس سے زیادہ عاشق کی خوش بختی کیا ہوگی۔ رات دن خصوصاً صبح و شام کے اوقات ذکر سے خالی نہ ہوں۔ جب مقرب فرشتوں کو اس کے ذکر سے عار نہیں ہے بلکہ ہر وقت اسی کی یاد میں لگے رہتے ہیں اسی کو سجدہ کرتے ہیں تو انسان کو اور بھی زیادہ ضروری ہے کہ اس کے ذکر و عبادت و سجدہ سے غافل نہ رہے۔ اس آیت پر بھی سجدہ کرنا چاہیے [۱]۔

آیت بالا میں تلاوتِ قرآن کریم کے بگوش دل سننے، متوجہ ہو لے اور خاموش رہنے کا حکم دیا تھا جو خود یادِ الٰہی کی ایک خاص صورت تھی اور تعمیلِ حکم کی ایک خاص شکل تھی اب حکمِ عمومی اور دائمی یاد کا حکم دیا جا رہا ہے۔ علماء نے یادِ الٰہی کی دس صورتیں بتائی ہیں۔

اوّل، تلاوتِ قرآن۔
دوم، تسبیح سبحان اللہ کہنا۔
سوم، تحمید، الحمد للہ کہنا۔
چہارم، تعلیل، لا الٰہ الا اللہ کہنا۔
پنجم، تکبیر، اللہ اکبر کہنا۔
ششم، حوقلہ، لا حول ولا قوۃ الا باللہ کہنا۔
ہفتم، استغفار، استغفر اللہ یا کوئی اور استغفار پڑھنا۔
ہشتم، درود، درود کے صیغے بہت ہیں۔ ان میں سے سب سے افضل وہ ہے جو نماز میں پڑھا جاتا ہے۔

---

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

نہم، استعاذہ، اعوذ باللہ من الشیطان الرجیم۔ احادیث میں اس کے اور پیمانے بھی آتے ہیں۔

دہم، اسمائے الٰہیہ کو پڑھنا۔ احادیث میں اللہ سبحانہٗ کے ۹۹ نام آتے ہیں۔ ان اذکار میں سے کوئی ذکر کرنا۔

اس آیت میں ذکر کے بارے میں یہ باتیں بتائی گئی ہیں۔

اوّل یہ کہ ذکر فی النفس ہو۔ عربی زبان میں اس کے تین معنے آتے ہیں۔ آہستہ پڑھنا، دل میں غور و فکر کرنا، اور اکیلے پڑھنا۔ یہاں اگر آہستہ پڑھنے کے معنے لیے جائیں تو دُونَ الجَہرِ مِنَ القَولِ میں پھر اسی کا تکرار ہو جائے گا اور یہ کلام کی شانِ بلاغت کے خلاف ہے اس لیے یہاں دو ہی معنے ہو سکتے ہیں۔ دل ہی دل میں غور و فکر کرنا، یا پھر اکیلے پڑھنا۔ اگر دل ہی دل میں غور و فکر کرنا مراد ہو تو دون الجہر من القول کی قید بے معنے ہو کر رہ جائے گی اس لیے بلاغت کا تقاضا یہ ہے کہ معنے یہ ہوں کہ تنہائی اور خلوت میں اللہ کو یاد کیجیے۔ ایک حدیث قدسی سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ بخاری و مسلم میں ہے:

فان ذکرنی فی نفسہٖ ذکرتہٗ فی نفسی وان ذکرنی فی ملاء ذکرتہٗ فی ملاء خیر منہم۔

میرا بندہ اگر مجھے تنہائی میں یاد کرتا ہے تو میں بھی اس کو تنہائی میں یاد کرتا ہوں اور جب وہ مجھے جلوت اور جماعت میں ذکر کرتا ہے تو میں اس جماعت سے بہتر جماعت میں یاد کرتا ہوں۔

اس حدیث میں فی نفسہٖ تنہا اور اکیلے کے معنے میں ہے کیونکہ اس کا تقابل فی ملاء جماعت سے کیا گیا ہے۔ اور کنز العمال میں فی نفسہٖ کی جگہ خالیاً آیا ہے جو صراحت سے اس مفہوم کو ادا کر رہا ہے۔ اس آیت میں تقابل ہے پہلے فَاسْتَمِعُوا وَاَنْصِتُوا میں ذکر اجتماعی بتایا تھا۔ اب اس آیت میں ذکر انفرادی کی طرف رہنمائی ہو رہی ہے۔ یہاں سے اس حدیث کا مطلب بھی واضح اور صاف ہو کر سامنے آجاتا ہے جس میں حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

جس نے نماز پڑھی اور اس میں سورہ فاتحہ نہیں پڑھی تو اس کی نماز

اُدھوری ہے اُدھوری ہے اُدھوری ہے مکمل نہیں ہے۔ ابوالسائب کہتے ہیں میں نے حضرت ابوہریرہ سے دریافت کیا کہ جناب جب میں امام کے پیچھے ہوں تو کیا کروں انہوں نے میرا بازو دبا کر جواب دیا اقرأ بہا فی نفسک یا فارسی۔
اس کے دو معنے ہیں کہ اپنے دل میں پڑھ لیا کر یا یہ کہ امام کے پیچھے نہیں اکیلے پڑھا کر یعنی جب اکیلے ہو تو اس وقت سورۃ فاتحہ پڑھ لیا کرو۔ علامہ ابوالولید الباجی شرح موطا میں لکھتے ہیں کہ ابوالسائب کے سوال کرنے کا سبب یہ تھا کہ انہوں نے جب بڑے بڑے اماموں اور دیگر لوگوں کو امام کے پیچھے ترکِ قرأت کرتے امام کے پیچھے دیکھا تو حضرت ابوہریرہؓ پر یہ اعتراض کیا۔ اس روشنی میں بھی ان ہی معنے کی تائید ہوتی ہے۔
یہیں سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ اس آیت سے امام کے پیچھے فاتحہ پڑھنے پر استدلال پا در ہوا کے مترادف ہے کیونکہ
اوّلاً، اگر واقعی اس آیت سے یہ مسئلہ ثابت ہوتا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کرام اور جمہور سلف کی نگاہوں سے اوجھل نہ ہوتا۔
ثانیاً، اس آیت میں نہ امام کا ذکر ہے نہ مقتدی کا نہ قرأت اور نہ سورۃ فاتحہ کا مطلق ذکر کو خود ساختہ قیدوں سے مقید کرنا کیوں کر صحیح ہو سکتا ہے۔
ثالثاً، اگر واقعی یہ آیت نماز کے بارے میں ہے تو اس کا صحیح عمل یہ ہو سکتا ہے کہ اذکر کا مخاطب امام ہے نہ کہ مقتدی کیونکہ اذکر، ربک اور لا تکن میں مفرد صیغے اس کی دلیل ہیں اور اس سے پہلی آیت فاستمعوا، انصتوا اور لعلکم ترحمون میں مقتدیوں کو خطاب ہے کیونکہ یہ جمع کے صیغے ہیں اور مطلب یہ ہے کہ امام کو سری نمازوں میں امام کو اپنے دل میں قرأت کرنی چاہیے۔ پہلی آیت میں جہری نمازوں کا حکم امام اور مقتدی دونوں کو بتایا تھا اس آیت میں امام کو سری نمازوں کا حکم بتا دیا ہے۔
رابعاً، حافظ ابن کثیر نے اسے بعید از مراد قرار دے کر لکھا ہے کہ ایسا سمجھنا تو اس امر خداوندی کے سراسر منافی ہے جس میں مقتدیوں کو خاموش رہنے کا حکم دیا ہے اور حافظ ابن کثیر نے اس خیال کی تردید حافظ ابن جریر اور عبدالرحمان بن زید بن اسلم کا نام لے کر کی ہے۔ ابن جریر نے اس آیت کی یہ تشریح کی تھی۔
چاہیے تیری یادِ الٰہی قرآن سننے کے وقت دعا میں بغیر جہر کے آہستہ ہو۔

ان سے پہلے حافظ ابن کثیر کہتے ہیں کہ اسی قسم کی تفسیر عبدالرحمان بن زید بن اسلم نے کی ہے۔ خود حافظ ابن جریر نے ان کی یہ تفسیر نقل نہیں کی ہے بلکہ ان سے جو کچھ نقل کیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اِذَا قُرِیَ القُرآن کی انہوں نے یہ تشریح کی ہے کہ :

استماع وانصات کا حکم اس وقت ہے جب امام نماز کے لیے کھڑا ہو۔

لیکن حافظ سیوطی نے الدر المنثور میں ابن جریر اور ابوالشیخ کے حوالہ سے لکھا ہے کہ :

استماع وانصات کا حکم اس وقت ہے جب امام نماز کے لیے کھڑا ہو، کان لگا کر سنو اور خاموش رہو۔ اور اے خاموش رہنے والے تو اپنے جی میں عاجزی اور خوف کے ساتھ اللہ کو یاد کر اور آہستہ کر۔

اور اس بنیاد پر لوگوں نے یہ عمارت اٹھالی کہ :

اس سے مراد یہ ہے کہ مقتدی آہستہ آہستہ قرأت کرے۔

افسوس کہ بیہقی کی کتاب القرأۃ میرے پاس نہیں ہے۔ السیوطی نے عبدالرحمان بن زید بن اسلم کے اس بیان کو ابن ابی شیبہ اور ابوالشیخ کے حوالہ سے پیش کیا ہے خواہ کچھ ہو حافظ ابن کثیر نے اسے قرآنی مراد کے منافی قرار دیا ہے۔ روایتی نقطہ نظر سے بھی اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے کیونکہ اس مفسر یعنی عبدالرحمان بن زید بن اسلم کی شخصیت بارگاہ محدثین میں جانی پہچانی ہے۔ ان کی احادیث کی بازار علم میں کوئی قیمت نہیں۔ حاکم اور ابونعیم کہتے ہیں کہ یہ اپنے والد کے نام پر احادیث کا جھوٹی اور من گھڑت ہونے پر شمارہ کہتا تھا۔ امام احمد، علی ابن المدینی، نسائی، حافظ ابوزرعہ، ابو حاتم سب ان کے ضعیف ہونے پر متفق ہیں۔

اور لطف کی بات یہ ہے کہ خوش فہمی کی بات یہ ہے کہ بات کو وزن بنانے کے لیے اس تشریح کی پیشانی پر بجائے عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے زید بن اسلم کے نام کا لیبل لگا دیا گیا۔

بہرحال امام کے پیچھے قرأت کے لیے یہ سہارا بہت کمزور ہے۔

دوم، دوسری بات یہاں یادِ الٰہی کے بارے میں یہ فرمائی گئی ہے کہ ذکر میں ذاکر پر عاجزی اور خوف کی کیفیت طاری ہو۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ رغبت و رہبت سے وہ چارہ ہو یعنی اللہ سے رحمتوں کی امید رکھتا ہو اور ساتھ ہی اس کی عقوبتوں سے لرزاں بھی ہو۔ ان دونوں کا تعلق انسان کے قلب سے ہے اور قلب میں یہ کیفیت اس وقت تک نہیں پیدا ہو سکتی جب تک ذکر شعوری نہ ہو۔ ذکر کے شعوری ہونے کے لیے ضروری ہے کہ جو کچھ

کہہ رہا ہو اس کا ذہن و دماغ اس کا ادراک بھی کرتا ہو۔ علماء نے تصریح کی ہے کہ اذکار کی افادیت کا دارومدار ان کے سمجھ کر کہنے میں ہے۔ اذکار میں صرف قرآن ایسا ذکر ہے جسے بغیر معنے سمجھے پڑھنا اجر سے محرومی نہیں ہے۔ باقی دوسرے اذکار کے لیے ضروری ہے کہ شعوری ہوں۔ رغبت و رہبت سے بیگانہ ذکر نہ روح میں طہارت و پاکیزگی اور نہ طاعات میں نورانیت کی اس میں ضمانت ہے۔

سوم یہ کہ آہستہ ہو آواز بلند نہ ہو۔ حافظ ابن القیم نے بدائع الفوائد میں ذکر اور دعا میں ہم آہنگی بتاتے ہوئے یہ لکھا ہے کہ دعا و ذکر دونوں باہم ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ اور دونوں کے آہستہ خفیہ اور بغیر جہر کرنے کے فوائد بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ آہستگی کا اولین فائدہ یہ ہے کہ اس سے مومن کے ایمان کی عظمت کھل کر سامنے آتی ہے کیونکہ آہستہ ذکر کرنے والا جانتا ہے کہ اللہ سبحانہ اس کی خفیہ دعا کو سنتا ہے۔ دوسرے یہ کہ آہستگی کو ادب اور تعظیم میں بہت دخل ہے۔ اسی لیے ارباب اقتدار کو باآواز بلند نہیں پکارا جاتا ہے اور ان کے سامنے آواز اونچی نہیں کی جاتی۔ تیسرے یہ کہ آہستگی خشوع کی حالت پیدا کرنے میں بہت زیادہ معین ہے اور خشوع و تضرع دعا و ذکر کی جان ہے۔ چوتھے آہستگی اخلاص میں زیادہ مؤثر ہے، پانچویں یہ کہ قلب کی جمعیت اس سے پیدا ہوتی ہے آواز کی بلندی سے دل میں انتشار ہوتا ہے چھٹے یہ کہ آہستگی اللہ سے قرب کی نشانی ہے۔ گویا اللہ کو اس طرح یاد کرتا ہے یا پکار کرتا ہے جیسے قریب قریب کو پکارتا ہے اس طرح نہیں جیسے دور سے آواز دی جاتی ہے۔ ساتویں، آدمی کو آہستگی میں اللہ کو یاد کرنے اور اس سے دعا کرنے کا بھرپور موقع ملتا ہے برخلاف آواز بلند کرنے کے کہ اس میں زبان تھک جاتی ہے۔ یہ اور اس کے علاوہ اور بہت سے فوائد اخفا کے لکھے ہیں۔ اسی لیے احادیث میں ذکر و دعا میں آواز کی پستی کو سراہا ہے۔ مثلاً صحیح بخاری میں ہے:

حضرت ابوموسیٰ اشعری فرماتے ہیں کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ خیبر کے لیے نکلے تو لوگ ایک میدان میں پہنچے انہوں نے باآواز بلند اللہ اکبر کہنا شروع کیا۔ اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اپنی جانوں پر رحم کرو بے شک تم بہرے اور غائب کو نہیں پکارتے ہو۔ تم تو اس

ذات کو پکار رہے ہو جو سننے والی اور قریب ہے اور وہ تمہارے ساتھ ہے۔

یہ صحیح اور صریح ارشاد نبوت بتا رہا ہے کہ بجز مستثنیٰ مواقع کے بلند آواز سے ذکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں ہے۔ اسی لیے آپ نے حضرات صحابہ کو اس سے منع فرمایا ہے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد قرآن کی اسی آیت کی تشریح ہے۔ شارحین حدیث نے بھی اس سے یہی کچھ اخذ کیا ہے۔ امام محی الدین نووی اس حدیث کی شرح میں فرماتے ہیں:

اس ارشاد سے معلوم ہوا کہ جب جہر کی ضرورت نہ ہو تو ذکر میں پست آواز رکھنی چاہیے کیونکہ آہستہ آواز اس کی توقیر و تعظیم میں زیادہ کام کرتا ہے۔ ہاں اگر بلند آواز سے ذکر کرنے کی ضرورت پیش آئے تو پھر آواز بلند کرنی چاہیے جیسا کہ احادیث میں آتا ہے۔

اور علامہ بدرالدین عینی اس کی شرح میں فرماتے ہیں۔

اس کا حاصل یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز سے ذکر اور دعا دونوں کو ناگوار سمجھا ہے۔

ایک دوسری حدیث میں حضرت سعد بن ابی وقاص اللیثیؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

بہترین ذکر وہ ہے جو آہستہ ہو اور بہترین رزق وہ ہے جو ضروریات میں کفایت کرے۔

اسی بنا پر قرآن حکیم کی اس آیت سے امام ابوحنیفہ نے ذکر بالجہر کے بدعت ہونے پر استدلال کیا ہے۔ علامہ ابن نجیم البحرالرائق میں فرماتے ہیں کہ:

امام ابوحنیفہ نے فرمایا ہے کہ بلند آواز سے ذکر کرنا بدعت ہے اور اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کے مخالف ہے۔

امام سرخسی اپنی کتاب مبسوط میں لکھتے ہیں:

احناف کے نزدیک اذکار اور دعا میں مستحب یہ ہے کہ آہستہ ہوں مگر جس چیز کا مقصد ہی اظہار و اعلان ہو وہاں آواز بلند کرنا مستحب ہے جیسے اذان اعلان کے لیے اور خطبہ وعظ کے لیے اور تکبیر نماز کے لیے اور نماز کی

تکبیریں تحریمہ صلاۃ اور انتقال ارکان بتانے کے لیے۔ اور قرأت مقتدی کے سنانے کے لیے۔ تلبیہ بھی اس چیز کو شروع کرنے کے لیے جس کا دین میں اظہار مقصود ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی تحریر فرماتے ہیں:

اس پر علماء کا اجماع ہے کہ ذکر آہستہ ہی بہتر ہے اور جہر بدعت ہے، مگر ان خاص جگہوں میں جہاں جہر کی ضرورت ہے۔

چہارم یہ کہ صبح و شام ہو۔ علماء نے لکھا ہے کہ اس سے مقصود دوام ذکر ہے۔ یعنی ان اوقات میں ذکر ہمیشہ ہو۔ اور اس سے یہ بات دلالۃً معلوم ہو رہی ہے کہ ذکر کی بہتات ہو۔ حافظ ابن القیم نے الوابل الصیب میں ذکر کے ۹۰ فائدے لکھے ہیں۔ ان میں کچھ باتیں بہت ہی مفید ان کے قلم سے نکلی ہیں جزاہ اللہ عنا۔ مثلاً ذکر شیطان کو دور کرتا ہے اور اس کی قوت کو توڑتا ہے، اللہ سبحانہ کی خوشنودی کا سبب ہے دل سے فکر و غم کو دور کرتا ہے۔ دل میں فرحت و انبساط پیدا کرتا ہے، بدن کو اور دل کو قوت بخشتا ہے چہرہ اور دل کو منور کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی محبت پیدا کرتا ہے۔ اور محبت ہی اسلام کی روح اور دین کا مرکز ہے اور سعادت و نجات کا مدار ہے۔ جو شخص یہ چاہتا ہے کہ اللہ کی محبت تک اس کی رسائی ہو اس کو چاہیے کہ اس کے ذکر کی کثرت کرے۔ جیسا کہ پڑھنا اور تکرار کرنا علم کا دروازہ ہے ایسے ہی اللہ کا ذکر اس کی محبت کا دروازہ ہے ذکر سے مراقبہ نصیب ہوتا ہے جو مرتبہ احسان تک پہنچا دیتا ہے یہی مرتبہ ہے جس میں اللہ تعالیٰ کی عبادت ایسی نصیب ہوتی ہے گویا اللہ سبحانہ کو دیکھ رہا ہے۔ اللہ کی طرف رجوع پیدا کرتا ہے جس سے رفتہ رفتہ یہ نوبت آجاتی ہے کہ ہر چیز میں اللہ سبحانہ اس کی جائے پناہ اور ماویٰ و ملجا بن جاتے ہیں اور ہر مصیبت میں اسی کی طرف توجہ ہو جاتی ہے۔ اللہ جل شانہ کی بارگاہ میں ذکر کا سبب ہے چنانچہ کلام پاک میں ارشاد ہے فاذکرونی اذکرکم اور حدیث میں ہے من ذکرنی فی نفسہ ذکرتہ فی نفسی اگر ذکر میں اس کے سوا کوئی بھی فضیلت نہ ہوتی تب بھی شرافت اور کرامت کے اعتبار سے بھی ایک فضیلت کافی تھی چہ جائیکہ اور بھی بہت سی فضیلتیں ہیں دوام ذکر کی بدولت اپنے آپ کو بھولنے سے اس کو امن نصیب ہوتا ہے جو سعادت دارین کا بہت بڑا سبب ہے،

کیونکہ اللہ کی یاد کو بھلا دینا اپنے کو بھلا دینے کا سبب ہوتا ہے اور جب آدمی خود فراموش ہو جاتا ہے تو مصالح سے نظر ہٹ جاتی ہے اور یہ ہلاکت کا سبب بن جاتا ہے۔ ذکر کا نور دنیا میں بھی ساتھ رہتا ہے اور قبر میں بھی ساتھ رہتا ہے اور آخرت میں پل صراط پر آگے آگے چلتا ہے۔ جو شخص راستوں میں گھروں میں، سفر میں اور حضر میں کثرت سے ذکر کرے قیامت میں اس کی گواہی دینے والے کثرت سے ہوں گے قرآن میں ہے یومئذ تحدث اخبارها اس روز زمین اپنی خبریں بیان کرے گی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جانتے ہو زمین کی خبریں کیا ہوں گی۔ صحابہ نے لاعلمی ظاہر کی تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جس نے جو کام کیا ہے وہ بتائے گی کہ فلاں فلاں وقت مجھ پر یہ کام کیا ہے نیک ہو یا بد، اس لیے مختلف جگہوں میں کثرت سے ذکر کرنے والوں کے گواہ بھی زیادہ ہوں گے۔

بہر حال حاصل یہ ہے کہ ذکر کیا جائے اور ان چار شرطوں کے ساتھ کیا جائے کہ اوّل تنہائی ہو، دوم رغبت و رہبت کی حالت ہو، سوم آہستہ ہو، چہارم زیادہ ہو اور ہمیشہ ہو تو رضائے الٰہی کا مقام حاصل ہو جائے اور غفلت ختم ہو جائے گی اور اس کے نتیجہ میں ان فرشتوں سے تشبہ ہو جائے گا جو اللہ کی عبادت سے سرکشی نہیں کرتے اور تسبیح میں لگے رہتے ہیں اور اس کی جناب میں سجدہ ریز رہتے ہیں۔ یا یوں کہہ دیجئے کہ یہ آیت علت ہے پہلی آیت میں حکم کی یعنی ذکر اب تمہیں اس لیے کرنا چاہیے کہ یہ اللہ کے قرب کا ذریعہ ہے۔ اللہ کی ذات چونکہ جسمانیت سے پاک ہے اسی لیے اس کا قرب صرف ذکر سے حاصل ہوتا ہے۔ ایک حدیث میں آیا ہے کہ اللہ سے محبت کی علامت اس کے ذکر سے محبت ہے اور اللہ سے بغض کی علامت اس کے ذکر سے بغض ہے۔

چونکہ اس آیت سے غلط رو لوگوں نے غلط سہارے لیے ہیں اس لیے آئیے اس کی تشریح خود شارحین قرآن کی زبانی بھی گوش گزار فرما لیجئے۔

امام ابو محمد حسین بن مسعود الفراء البغوی الشافعی اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ:

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس آیت کے معنے ہیں کہ نماز میں قرأت آہستہ کرو عاجزی کرتے ہوئے ڈرتے ہوئے یعنی میری بارگاہ میں عاجزی، فروتنی اور ڈرتے ہوئے آؤ۔ اور یہ سری نمازوں کے بارے میں ہے

اور دون الجہر من القول کا یہ مطلب ہے کہ جہری نماز میں جہر شدید نہ کر بلکہ آہستہ اور سکون کے ساتھ ہو کہ اپنے مقتدیوں کو سنا سکے۔ اور حضرت مجاہد اور ابن جریج کہتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ہے کہ اس کی طرف عاجزی کرتے ہوئے اپنے دلوں میں اس کا ذکر کریں نہ کہ یہ دعا میں آواز بلند ہو اور نہ چلائیں۔

اس میں حضرت ابن عباس کی یہ تفسیر بھی آ گئی کہ یہ آیت کریمہ نماز میں قرأت کے بارے میں ہے۔ سری نمازوں میں عاجزی و زاری کے ساتھ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے ہوئے قرأت کی جائے۔ اور جہری نماز میں اس قدر جہر ہو کہ پیچھے مقتدی سن سکیں یعنی ضرورت سے زیادہ جہر نہ ہو اور پھر اس کے بعد حضرت مجاہد اور حضرت ابن جریج کی وہی تفسیر نقل کی ہے جو حضرات مفسرین کرام نقل کرتے ہیں۔

مشہور مفسر قرآن امام محمد بن جریر الطبری اس آیت کی تفسیر میں طویل تشریح کرتے ہوئے معروف تابعی حضرت مجاہد کی تفسیر اس طرح نقل کرتے ہیں:

امام مجاہد نے فرمایا کہ لوگوں کو حکم دیا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کا اپنے دلوں میں عاجزی اور ڈرتے ہوئے ذکر کریں۔

اور امام ابن جریج سے اس کی یہ تفسیر نقل کرتے ہیں کہ:

عاجزی اور انکساری کے ساتھ دعا کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور دعا میں آواز بلند کرنا اور چیخنا چلانا مکروہ ہے۔

علامہ ابوالبرکات عبداللہ ابن احمد النسفی اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

یہ آیت اذکار کے بارے میں عام ہے۔ قرأت قرآن، دعا، تسبیح، تہلیل وغیرہ سب کو شامل ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ ذکر کا لفظ کسی مخصوص ذکر اور ورد سے مقید نہیں ہے بلکہ قرآن کی تلاوت، دعا، سبحان اللہ اور لا الٰہ الا اللہ وغیرہ سب کے لیے عام ہے اس کے بعد یہی صاحب مدارک لکھتے ہیں کہ:

دون الجہر من القول کا یہ مطلب ہے کہ ایسا کلام ہو جس میں جہر نہ ہو کیونکہ اخفا کو اخلاص سے گہرا لگاؤ ہے اور حسن تفکر کے بھی زیادہ نزدیک ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کریم کی تلاوت ہو یا دعا، تسبیح و تہلیل ہو یا کوئی اور ذکر ہو سب میں اخفا مطلوب ہے۔

علامہ علاء الدین علی ابن محمد المعروف بالخازن دون الجہر من القول کی تشریح میں نقل کرتے ہیں۔

حضرت مجاہد اور ابن جریج فرماتے ہیں کہ یہ حکم دیا گیا ہے کہ اپنے دلوں میں عاجزی و انکساری کے ساتھ اس کا ذکر کریں نہ یہ کہ دعا میں آواز بلند کی جائے۔

امام فخر الدین رازی مفاتیح الغیب میں لکھتے ہیں:

دون الجہر من القول کے معنے یہ ہیں کہ اپنے رب کو اس طرح یاد کر کہ اپنے آپ کو سنا سکے کیونکہ مقصد تو یہ ہے کہ زبانی ذکر حاصل ہو اور ذکر لسانی جب اس طرح ہو کہ اپنے نفس کو سنا سکے تو اس ذکر سے خیال متاثر ہوگا اور خیال کا متاثر ہونا قلبی و روحانی ذکر کی قوت کا موجب ہے۔

علامہ ابو السعود محمد بن محمد العمادی لکھتے ہیں:

یہ آیت تمام اذکار میں عام ہے کیونکہ آہستہ ذکر کو اخلاص میں بہت زیادہ دخل ہے اور یہ قبولیت کے زیادہ قریب ہے۔

علامہ سید محمود آلوسی بغدادی اپنی تفسیر روح المعانی میں لکھتے ہیں:

یہ ہر ذکر کے لیے عام ہے کیونکہ اخفا کا اخلاص میں خاص دخل ہے اور یہ قبولیت کے بھی قریب ہے۔

اور دون الجہر کی تفسیر میں تحریر فرماتے ہیں:

اور جہر سے مراد زیادہ آواز اونچی کرنا ہے اور دون الجہر سے جہر کی ایک اور قسم مراد ہے۔ حضرت ابن عباس نے اس قسم کو بیان کیا ہے کہ اپنے رب کو سنا سکے۔

اس تشریح سے معلوم ہوا کہ اذکار میں جہر مفرط مطلوب نہیں بلکہ جہر کی ایک ایسی نوع اور قسم مطلوب ہے جو جہر مفرط اور آہستہ کے درمیان ہو۔ اور حضرت عبداللہ بن عباس نے اس کی تفسیر یہ فرمائی کہ ذکر کرنے والا اپنے رب کو سنا سکے۔

الغرض دُون الجہر میں ایسا جہر مراد نہیں کہ دوسرے لوگ سُن سکیں اور ان کے مشاغل میں خلل پڑے۔ قاضی ثناء اللہ نے دُون الجہر من القول کا جو مطلب بتایا ہے وہ بھی اس کا موید ہے فرماتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ اس انداز سے بولا جائے جو آہستہ سے اُوپر ہو اور جہر سے کم ہو اس سے مراد جہری نماز ہے مطلب یہ ہے کہ زیادہ شدت سے جہر نہ کرو بلکہ آہستہ اور سکون سے ہو تاکہ جو تمہارے پیچھے اقتدا میں ہیں وہ سُن لیں۔ اسی طرح اس آیت کی تشریح ابن عباس نے کی ہے۔

غور فرمائیے کہ جہری نماز میں بھی جس میں مطلوب ہی جہر ہے جہر شدید ممنوع ہے حالانکہ اس میں مقتدیوں کو سنانا مقصود ہوتا ہے لیکن ایسی حد تک جہر ہو جس حد تک نماز میں شامل مقتدی سُن سکیں ضرورت سے زیادہ درست نہیں ہے۔

آخر میں یہ بات پھر ذہن میں تازہ کر لیجئے کہ امام ابوحنیفہ کے نزدیک وہ تمام اذکار جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جہر ثابت نہیں جہر بدعت ہے، خواہ نماز کے بعد تکبیر ہو یا تہلیل ہو یا استغفار ہو۔ اس موضوع پر ہم نے اپنی کتاب "اسلام کا نظامِ اذکار" میں تفصیلی بحث کی ہے۔ مزید بصیرت کے لیے مولانا ابوالزاہد محمد سرفراز خان صفدر کی کتابیں حکم الذکر بالجہر اور اخفاء الذکر مطالعہ کیجئے۔

بتانا یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی یاد میں ہمیشہ مشغول رہنا چاہیے اور اس میں کسی حال میں بھی غفلت نہ ہونی چاہیے۔ زندگی کے ہر موڑ پر اللہ کی یاد ہو۔ دُنیا میں جو کچھ گمراہیاں پھیل رہی ہیں اور انسان کے اخلاق و اعمال میں جو فساد بھی رونما ہوا ہے اس کا سبب صرف یہ ہے کہ انسان اس بات کو بھول جاتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس کا مالک و رب ہے اور وہ خدا کا بندہ ہے اور دُنیا میں اس کو آزمائش کے لیے بھیجا گیا ہے اور دُنیا کی زندگی ختم ہونے کے بعد اسے اپنے رب کو حساب دینا ہوگا۔ لہٰذا جو شخص حق پر چلنا چاہتا ہے اور دُنیا کو اس پر چلانا چاہتا ہے اس کو اس کا بہت زیادہ اہتمام کرنا چاہیے کہ یہ بھول کہیں کو خود نہ ہو جائے اسی لیے اجتماعی اور انفرادی یادِ الٰہی اور دائمی توجہ الی اللہ کی آخر میں تاکید کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ بڑائی میں آکر خدا کی طاعت و عبادت سے علیحدگی اختیار کرنا شیاطین کا کام ہے اور اس کا

نتیجہ اللہ کی رحمت سے دوری ہے۔ اس کے برعکس خدا کو یاد کرنا، اس کے سامنے سربسجود ہونا اور اس کی بندگی میں ثابت قدم رہنا ملائکہ کی سیرت ہے اور اس کا نتیجہ ترقی، بلندی اور خدا سے قرب ہے۔ اگر اس زندگی اور اس زندگی میں ترقی چاہتے ہو تو اپنی زندگی کو شیاطین کے بجائے ملائکہ کے طرزِ عمل کے مطابق بناؤ کہ یہ کامیابی کا راستہ ہے۔ اس آیت ان الذین عند ربک میں ایک طرف تو اہلِ ایمان کو بتایا ہے کہ جو لوگ اللہ سبحانہ کو ہمہ وقت اور ہمیشہ یاد کرتے ہیں اگرچہ وہ رہتے دنیا میں ہیں لیکن وہ اپنے افکار و اعمال اور اخلاق میں ملائکہ سے مشابہ ہو جاتے ہیں کیونکہ جس طرح ملائکہ ہر وقت تسبیح و تہلیل اور خدا کی یاد میں رہتے ہیں اسی طرح اہلِ ایمان بھی یادِ الٰہی میں مشغول رہتے ہیں۔ دوسری طرف اس آیت میں مشرکین پر تعریض ہے کہ یہ اس نعمت سے محروم ہیں۔

سجدہ تلاوت

قرآن کے ان مقامات میں سے جہاں سجدہ تلاوت کیا جاتا ہے یہ قرآن میں پہلا موقعہ ہے حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

یہ قرآن میں پہلا سجدہ ہے۔ یہاں قرآن پڑھنے والے اور قرآن سننے والے کے لیے بالاجماع سجدہ مشروع ہے۔

سجدہ تلاوت کی قانونی حیثیت کیا ہے۔ اس سوال کا جواب یہ ہے کہ امام ابوحنیفہؒ سجدہ تلاوت کو واجب کہتے ہیں اور دوسرے ائمہ اسے سنت بتاتے ہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بسا اوقات جب مجمع میں آیت سجدہ تلاوت کرتے تو آپ خود بھی سجدہ کرتے اور مجمع میں جو شخص جہاں ہوتا وہیں سجدہ ریز ہو جاتا۔ کبھی آپ نے خطبہ کے دوران آیت سجدہ تلاوت کی تو منبر سے اُتر کر سجدہ کیا ہے۔ عام علما، صحابہ اس سجدہ کی صحت کے لیے انہی شرائط کے قائل ہیں جو نماز کے لیے ضروری ہیں یعنی باوضو ہونا، قبلہ رو ہونا اور نماز کی طرح زمین پر سر رکھنا صحابہ میں صرف حضرت عبداللہ بن عمر کے بارے میں صحیح بخاری میں آتا ہے کہ وہ بغیر وضو سجدہ کرتے تھے لیکن حافظ ابن حجر عسقلانی فتح الباری میں لکھتے ہیں کہ

بغیر وضو کے سجدہ کرنے میں ان کی کسی نے امام شعبی کے سوا ہمنوائی نہیں کی ہے۔ بہرحال جمہور کا مذہب یہی ہے کہ سجدہ تلاوت کے لیے وہ تمام شرطیں ہیں جو نماز کے لیے ضروری ہیں۔

الحمد للہ سورۃ اعراف کی تشریحات اس سیاہ کار کے قلم سے آج مورخہ ۲۱، ذی الحجہ ۱۴۰۳ھ بوقت پانچ بجے صبح قبل صلوٰۃ فجر پوری ہوئی ہیں۔ رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْم۔

مَعَالِمُ الْقُرْآن

سُورَۃ اَلْاَنفال ۸

الانفال

سورت کا نام اور اس کا مقام

سورت کا نام اس میں انفال کے ذکر کی رعایت سے ہے۔ عبداللہ ابن عباس نے اس میں غزوہ بدر کے تفصیلی ذکر کی وجہ سے اسے سُورۃ البدر بھی کہا ہے۔ حافظ سیوطی نے یہاں ایک بات لکھ کر بیگانوں کے ذہنوں میں کھلبلی اور بیگانوں کے ہاتھوں میں ہتھیار مہیا کر دیے۔ ان کا کہنا ہے کہ سُورہ انفال کا اس موقعہ پر ذکر نبوت کی جانب سے سرکاری نہیں بلکہ حضرت عثمان کا اجتہادی کارنامہ ہے لیکن خدا بھلا کرے علامہ آلوسی کا کہ انہوں نے السیوطی کی ساری بنائی ہوئی عمارت کو بیک جنبش قلم مسمار کر دیا۔ اور بتایا کہ دونوں سُورتوں کی ہم آہنگی، ربط اور مناسبت بزبانِ حال کہہ رہی ہے کہ اعراف و الانفال باہم ایک دوسرے سے مربوط ہیں۔ سورہ اعراف میں وامر بالعرف کا ایک ضابطہ پیش کیا جب کہ سورہ انفال میں اسی قانون کی متعدد جزئیات ذکر کی گئی ہیں۔ سورہ اعراف میں انبیاء اور ان کی قوموں کے واقعات کا تفصیلی تذکرہ ہے جبکہ سورہ انفال میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے درمیان ہونے والے واقعات کا بھرپور ذکر ہے۔ سورہ اعراف میں حضور کے مخاطبوں کی جانب معجزات کی طلب کا اجمالی جہرہ پیش کیا تھا اور سورہ انفال میں اسی کو کھول کر بیان کیا ہے۔ سورہ اعراف میں یہ قانون بتایا تھا کہ جب قرآن کی تلاوت ہو تو اہل ایمان کے لیے ضروری ہے کہ استماع اور انصات کو اپنائیں اور سورہ انفال میں جماعت اہل ایمان میں اس کا عملی شاہکار پیش کیا گیا ہے انما المومنون الذین اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم واذا تلیت علیھم ایاتہ زادتھم ایمانا یہ مشتے نمونہ خروارے ہے اور بھی

بہت سی مناسبات ہیں۔ اس صورت میں یہ کہنا بالکل سطحی ہے کہ سورہ انفال کا سورۂ اعراف کے بعد مقام توقیفی نہیں ہے بلکہ اجتہادی ہے۔ اور جس روایت کو حافظ سیوطی نے اس نازک ترین مسئلہ میں سہارا بنایا ہے وہ مسند احمد، ابن حبان اور الحاکم کی روایت کی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر جب سورتیں نازل ہوتی تھیں تو آپ لکھنے والے کو بلاتے اور فرماتے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں رکھ دو۔ سورہ انفال مدنی زندگی کے شروع میں نازل ہوئی جب کہ سورہ برأت قرآن کی آخری سورتوں میں سے ہے یعنی باعتبار نزول۔ سورہ برأت اور انفال میں واقعاتی ہم آہنگی ہے۔ میں نے خیال کیا کہ سورہ انفال اسی سے تعلق رکھتی ہے حضور کا وصال ہو چکا تھا اور اس موضوع پر آپ کا کوئی ارشاد نہ تھا اس لئے میں نے دونوں سورتوں کو باہم جوڑ دیا اور میں نے دونوں کے مابین بسم اللہ نہیں لکھی اور دونوں کو میں نے سبع طوال میں رکھ دیا۔

یہ تو حضرت عثمان کا وہ جواب ہے جو عبداللہ بن عباس کو اس سوال پر دیا کہ جسے بیہقی نے دلائل النبوت میں نقل کیا ہے۔

آپ نے سورہ انفال کے لئے یہ مقام کیوں تجویز کیا اور دونوں کے درمیان بسم اللہ کیوں نہیں لکھی۔؟

اس پر حضرت عثمان نے وہ جواب دیا جو آپ پہلے سُن چکے۔ یہ حدیث سنن ترمذی میں موجود ہے۔ اس کی امام ترمذی نے تحسین کی ہے۔ یہ حدیث محمد بن بشار نے ان حضرات سے سُنی ہے یحییٰ بن سعید، محمد بن جعفر، ابن ابی عدی اور سہل بن یوسف، ان سب کی معلومات کا سہارا عوف ابن جمیلہ ہیں۔ اور عوف کو اس معاملہ میں یزید الفارسی کا تلمذ حاصل ہے۔ یزید الفارسی کہتے ہیں کہ عبد سے یہ واقعہ عبداللہ ابن عباس نے بیان کیا۔ امام بیہقی نے اسی واقعہ کے سہارے یہ لکھ دیا کہ سب سورتوں کی ترتیب نبوت کی جانب سے سرکاری ہے لیکن سورہ انفال و برأت کی ترتیب نہیں بلکہ حضرت عثمان کی اجتہادی ہے اور بعد میں السیوطی نے بھی بیہقی

کی ہاں میں ہاں ملادی ۔

• یہ بات بالکل بے معنی اور اس میں کوئی معقولیت نہیں ہے کہ تمام سورتوں کی ترتیب تو حضور کی جانب سے ہو اور ان دو سورتوں کی ترتیب نہ ہو ۔ حالانکہ صحیح روایات سے ثابت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سارا قرآن رمضان میں ہر سال حضرت جبریل کو سناتے اور وفات والے سال آپ نے دوبار سنایا ۔ آخر قرآت میں آپ ان دو سورتوں کو کس جگہ پڑھتے تھے ۔ امر واقعہ اور حقیقت یہی ہے کہ ان دو سورتوں کی ترتیب بھی ویسے ہی سرکاری ہے جیسے باقی قرآن کی سورتوں کی ترتیب ۔ باقی رہی یہ حدیث تو اس کی سند میں یزید الفارسی ہے ۔ پتہ نہیں کہ یزید بن ہرمز ہے یا کوئی اور ۔ صحیح یہی ہے کہ یہ کوئی اور ہے ۔ اس کے باپ کا پتہ نہیں ۔ عبداللہ بن زیاد اور حجاج بن یوسف سے مصاحف کے موضوع پر روایات کا سہرا اس کے سر ہے ۔ ابو حاتم کہتے ہیں کہ کوئی مضائقہ نہیں ۔ یحییٰ بن سعید ان سے شناسا نہیں ۔ آگے قدم اٹھائیے ذرا عوف ابن ابی جمیلہ کے بارے ارباب فن نقد رجال کے تاثرات دیکھئے ۔ لکھا ہے کان قدریا رافضیا شیطانا ۔ آپ ہی خدا لگتی کہ ایسی روایات اور ایسے راویوں کے سر پر متواتر ، قطعی اور فیصلہ شدہ امور کو مشکوک بنایا جاتا ہے ۔ إنا للہ

سورہ انفال کا تاریخی پس منظر

آپ تیرہ سال کی زندگی کے پُر آشوب ایام گزار رہے تھے کہ ۱۱ھ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اطراف کے قبائل کی طرف توجہ فرمائی اور عرب کی مجالس و محافل اور سالانہ اجتماعات کے موقعہ پر اللہ کا پیغام سنایا ۔ آپ کی دعوت کو کچھ نے پذیرائی دی اور کچھ اپنی شومئ قسمت پر قانع رہے ۔ جب موسم حج آتا تو عرب کے اطراف و جوانب سے زیارت بیت اللہ اور طوافِ کعبہ کی خاطر بہت بڑا اجتماع ہوتا جس میں اہلِ مدینہ بھی ہوتے ۔ آپ نے اس سال ان کو بھی دعوت دی ۔ وفد مدینہ میں اسعد بن زرارہ ، عوف بن حارث ، رافع بن مالک ، قطبہ ابن عامر ، عقبہ بن عامر ، جابر بن عبداللہ ، عامر بن عبد حارثہ شامل تھے ۔ اور سب کے سب کا تعلق قبیلہ خزرج سے تھا ۔ انہوں نے دعوتِ حق سُن کر اپنی جگہ مشورہ کیا اور کہنے لگے کہ یہ شخص وہی

معلوم ہوتا ہے جس کے بارے میں مدینہ کے یہود ہم سے کہا کرتے ہیں کہ ایک پیغمبر مبعوث ہوگا جس کے ساتھ ہم مل کر تمہارا مقابلہ کریں گے۔ اچھا یہ ہے کہ ہم پہل کر جائیں اور اسلام کو قبول کر لیں۔ یہ مشورہ کر کے وہ حاضرِ خدمت ہوئے اور اسلام کو قبول کر کے عرض کیا کہ ہم مدینہ والوں میں باہم سخت جنگ و جدال ہے۔ اگر آپ کی وجہ سے ان میں اتحاد ہو جائے تو یہ ہماری بڑی خوش نصیبی ہوگی۔ اب ہماری روانگی ہے آئندہ سال حاضرِ خدمت ہوں گے۔

آخر کار نبوت کے بارہویں سال حج کے موقعہ پر ۷۵ نفوس کا ایک وفد نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے رات کی تاریکی میں ملا اور اس نے نہ صرف یہ کہ اسلام قبول کیا بلکہ آپ کو اور آپ کے پیروؤں کو اپنے شہر میں جگہ دینے پر بھی آمادگی ظاہر کی۔ یہ اسلامی تاریخ میں ایک انقلابی موقعہ تھا جسے اللہ سبحانہ نے خاص اپنے فضل سے فراہم کیا۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اس پیش کش کو خندہ پیشانی سے قبول کیا۔ اس طرح مدینہ والوں نے گویا اپنے شہر کو مدینۃ الاسلام کی حیثیت سے پیش کیا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قبول کر کے پہلا اسلام آباد بنا لیا۔

مدینہ والوں کی یہ پیشکش جذباتی نہیں بلکہ شورائی تھی۔ عین اس وقت جبکہ بیعت ہو رہی تھی۔ اسی وفد کے ایک ذکی نوجوان اسعد بن زرارہ نے وفد کو مخاطب کر کے کہا۔

> اے یثرب والو ذرا ٹھہرو، ہم لوگ جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوتے تو یہ سمجھ کر آتے ہیں کہ یہ اللہ کے رسول اور ان کو یہاں سے مدینے لے جانے کا مطلب یہ ہے کہ ہم پوری عرب قوم سے دشمنی مول لے رہے ہیں۔ اس کے تمہارے بہترین لوگ موت کے گھاٹ اتریں گے، اور تم پر تلواریں برسیں گی۔ اگر تم میں اس کی طاقت ہے تو بے شک ان کو لے چلو اس کا اجر تمہیں اللہ دے گا لیکن اگر تمہیں اپنی جانیں عزیز ہیں اور اندیشے ستاتے ہیں تو پھر ان کو مدینے لے جانے کی کوئی ضرورت نہیں ہے ان کو یہیں چھوڑ دو۔ اس وقت معذرت کر دینا خدا کے یہاں قابلِ پذیرائی ہے۔

یہ تو امام احمد کی روایت میں ہے۔ محمد بن اسحاق صاحب مغازی کہتے ہیں کہ اسی موقعہ پر ایک دوسرے شخص عباس بن عبادہ بن فضلہ نے وفد کو مخاطب کر کے یہ تقریر کی :

دوستو! تمہیں پتہ ہے کہ ان کے ہاتھ پر کس چیز کا عہد کر رہے ہو۔ تمہارا یہ عہد اور تمہاری یہ بیعت اس بات کی ہو رہی ہے کہ تمہیں پوری کائنات انسانی سے جنگ کرنی ہے۔ لہٰذا اگر تم یہ خیال کرتے ہو کہ جب تمہارے اموال مصائب کی نذر ہو جائیں گے اور تمہارے اشراف موت کی گھاٹ پر اتر جائیں گے تو تم ان کو دشمنوں کے حوالے کر دو گے تو اچھا یہ ہے کہ آج چھوڑ دو۔ کیونکہ خدا کی قسم یہ دنیا و آخرت کی رسوائی ہے اور اگر تم اس عزم میں پکے ہو اور یہ پختہ ارادہ رکھتے ہو کہ مالوں کی تباہی و بربادی اور اشراف کے قتل و غارت کے باوجود ان سے کیا گیا عہد پورا کرو گے تو بخدا یہ دنیا و آخرت کی سب سے بڑی خیر ہے۔

لکھا ہے کہ اس پر سارے وفد نے بیک زبان ہو کر کہا کہ :

ہم ان کو لے جا کر اپنے مالوں کی تباہی اور اشراف کے قتل کو گوارا کرنے کے لئے تیار ہیں۔

اور یہ تقریریں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے کہنے پر ہوئی تھیں۔ آپ نے فرمایا تھا کہ :

تم میں بات کرنے والا بات کرے لیکن تقریر لمبی نہ ہو، کیونکہ مشرکین کے جاسوس تمہارے تاک میں ہیں۔ ان کو اگر پتہ لگ جائے گا تو معاملہ ابتر ہو جائے گا۔

اس کے بعد وفد نے وہ مشہور بیعت کی جسے تاریخ میں بیعت عقبہ ثانیہ کہتے ہیں۔ ان تقریروں کے بعد حضور اقدس نے قرآن کی تلاوت کی اور وفد کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا :

لوگو! میں اس بات پر تم سے بیعت لیتا ہوں کہ تم میرے لیے روک بن کر رہو گے۔ جیسے اپنی اولاد اور عورتوں کے لیے رہتے ہو۔

وفد میں براء بن معرور نے کھڑے ہو کر جواب دیا۔

قسم ہے اس ذات کی جس نے آپ کو علمبردارِ حق بنا کر روانہ کیا ہم ضرور آپ کی حفاظت و حمایت کریں گے۔ اب ہم سے بیعت لیجئے یا رسول اللہ بخدا ہم بڑے جنگجو ہیں۔ جنگ ہمیں وراثت میں ملی ہے۔

ابھی گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی کہ ابوالہیثم بن التیہان نے مجمع میں سے کھڑے ہو کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ

ہمارے اور دوسرے یہود کے درمیان کچھ سیاسی عہد و پیمان ہیں آپ کی خاطر ہم ان کو ختم کریں گے۔ آپ یہ تو فرمائیے کہ کل کو یہ تو نہ ہو کہ اب ہمیں بے یار و مددگار چھوڑ کر مکہ میں اپنی قوم میں واپس تشریف لے جائیں۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مسکرا کر فرمایا:

نہیں میں تم میں سے ہوں اور تم میرے ہو، میری ان سے جنگ ہوگی جن سے تم لڑو گے اور ان سے صلح ہوگی جن سے تم صلح کرو گے۔

اس کے بعد بیعت ہوئی۔

چونکہ یہ صورت حال سیاسی طور پر بلاشبہ اہل مکہ کے لیے خطرہ کی گھنٹی تھی اس کا صاف اور واضح مطلب یہ تھا کہ حضور اقدس کو ایک ٹھکانہ مل رہا تھا۔ یہ پرانے نظامِ جاہلیت کے لیے پیغام موت تھا۔ اور مدینہ میں مسلمانوں کی سیاسی زندگی کے قیام سے قریش کو صرف سیاسی اور اجتماعی نہیں بلکہ معاشی خطرہ نظر آ رہا تھا کہ یمن سے شام کی طرف جو تجارتی شاہراہ بحر احمر کے کنارے کنارے شام تک جاتی ہے وہ مسلمانوں کی زد میں آ جائے گی۔

قریش اس بات سے واقف تھے چنانچہ جس رات بیعت عقبہ ہوئی اسی رات قریش کو اس کا علم ہوا اور ان میں کھلبلی پڑ گئی۔ پہلے تو انہوں نے کوشش کی کہ اہل مدینہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے توڑا جائے۔ اس میں ناکامی کے بعد انہوں نے جو قدم اٹھایا وہ بہت خطرناک قدم تھا۔ حضور اقدس کی ہجرت سے چند ہی روز پہلے قریش کی مجلسِ شوریٰ منعقد ہوئی اور اس میں یہ فیصلہ ہوا کہ

ہاشمی خاندان کو چھوڑ کر تمام قبائل سے ایک ایک نمائندہ لیا جائے اور یہ سب مل کر حضور اقدس پر حملہ کریں لیکن ان کی یہ تدبیر کارگر نہ ہوئی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بعافیت مدینہ پہنچ گئے۔ اس کے بعد قریش نے دوسرا قدم یہ اٹھایا کہ عبداللہ بن ابی کو مدینہ خط لکھا کہ تم حضور کو مدینہ سے نکال دو ورنہ ہم تم پر حملہ کر دیں گے۔ مگر اللہ کے فضل سے اس میں بھی ناکامی ہوئی۔

اب مدینہ میں اسلامی حکومت کا ڈھانچہ قائم ہو چکا تھا۔ لیکن حالات خطرناک سے خطرناک ہوتے جا رہے تھے۔ ضروری تھا کہ مسلمان کوئی ایسا قدم اٹھائیں جس سے قریش کے حملہ کا خطرہ دور ہو۔ اس کے لیے مسلمانوں نے سب سے پہلا جو قدم اٹھایا وہ یہ تھا کہ اس تجارتی شاہراہ پر اپنی گرفت مضبوط کریں جو یمن سے شام تک بحر احمر کے کنارے کنارے جارہی تھی تاکہ قریش اور وہ دوسرے قبائل جن کا مفاد اس راستہ سے وابستہ تھا اسلام اور مسلمانوں کے ساتھ اپنی معاندانہ روش پر نظرثانی کرنے کے لیے مجبور ہو جائیں۔

احادیث کسی ترتیبِ تاریخی کے ساتھ جمع نہیں ہوئی ہیں بلکہ جس کو جو بات یاد ہے وہ پیش کرتا ہے۔ دونوں موقعوں کے اجتماعات میں راویوں سے خلط ہو گیا ہے۔ مدینہ ہی میں اگر قتال کا مشورہ ہوتا تو جانے کی کیفیت وہ نہ ہوتی جو ہوئی ہے۔ افرادی قوت بھی زیادہ ہوتی۔ سامانِ جنگ بھی ساتھ ہوتا۔ کوئی شخص بھی پیچھے نہ رہتا کیونکہ اس خبر کے ملنے پر کہ قریش کا لشکر حملہ آور ہو رہا ہے اس کو روکنا ہے جہاد فرض عین ہوتا اور سب کا جانا ناگزیر ہوتا۔ لیکن واقعہ یہ نہیں ہے حقیقت وہ ہے جو کعب بن مالک نے بیان کی ہے۔

کعب کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر میں کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا سوائے غزوۂ تبوک کے اور ہاں میں غزوۂ بدر میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔ اور اس میں شریک نہ ہونے کی وجہ یہ تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جنگ کے لیے نہیں بلکہ قریش کے تجارتی قافلہ کے لیے تشریف لے گئے۔ اسی لیے اس میں شریک نہ ہونے والوں میں سے کسی پر کوئی عتاب نہیں ہوا۔ جنگ کا سامان تو اللہ سبحانہ نے اچانک

کر دیا تھا۔

صحیح مسلم میں حضرت کعب بن مالک کا یہ واضح بیان کھلے بندوں اعلان کر رہا ہے کہ مدینہ سے روانگی جنگ کے پیش نظر نہیں بلکہ تجارتی قافلہ کی خاطر ہوئی تھی۔ یہ الگ بات ہے کہ اللہ سبحانہ نے تجارتی قافلہ کے بجائے جنگِ بدر کا سامان کر دیا۔

بہر حال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ابوسفیان کے قافلہ کی اطلاع پا کر مدینہ سے نکلے۔ ادھر ابوسفیان بھی جو سالارِ قافلہ تھا بے خبر نہ تھا اسے بھی تشویش تھی کہ مسلمان اس کی تلاش میں ہوں گے۔ جو لوگ راستے میں ملتے وہ شام سے واپس مکہ جاتے ہوئے ان سے پوچھ گچھ کے بعد اطمینان کے بغیر قدم آگے نہ بڑھاتا تھا۔ جب اُسے یقین ہو گیا کہ مسلمان راستے کا چکر لگا رہے ہیں تو اس نے بدر پہنچنے سے پہلے ہی ضمضم غفاری کو مکہ مکرمہ روانہ کر دیا تاکہ قریش کو خبر کر دے کہ قافلہ خطرے میں ہے۔ اس کے بچاؤ کے لیے جو کچھ کیا جا سکے جلد از جلد کر لو۔

کوکبۂ نبوت کی حرکت

مدینہ منورہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روانہ ہونے کی تاریخ محمد بن اسحاق نے ۸ رمضان المبارک ۲ھ (۵/۴ مارچ ۶۲۴) بتائی ہے۔ پیر کا دن تھا۔ لیکن ابنِ سعد نے ۱۲ رمضان المبارک لکھی ہے اور دن ہفتہ کا بتایا ہے۔

اس سفر میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جن مقامات سے گزرے ان کی تفصیل یہ بتائی گئی ہے۔ عقیق، ذوالحلیفہ، اولات الجیش، تربان، ملل، غمیس الحمام، منیرات الیمامہ، سیالہ، فج الروحاء، شنوکہ، عرق الظبیہ، سجسج، منصرف، النازیہ، وادی رحقان، صفراء، وادی ذفران۔

ذفران کے مقام پر جب آپ پہنچے تو آپ کو اطلاع ملی کہ قریش مکہ کا لشکر قافلہ کی حفاظت کے لیے آ رہا ہے۔ اب تک طائفتین میں سے ایک پیش نظر تھا یعنی تجارتی قافلہ، دوسرے کے بارے میں یقینی طور پر کچھ معلوم نہ تھا۔ اب دونوں طائفے منظرِ عام پر آ گئے تھے۔ قرآن میں ہے:

اذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انھا لکم

اللہ نے وعدہ کیا تھا کہ تمہیں دونوں میں سے ایک ملے گا۔
ذفران ہی میں وہ مجلسِ شوریٰ قائم ہوئی جسے یہ فیصلہ کرنا پڑا کہ تجارتی قافلہ کی جگہ لشکرِ قریش سے سامنا ہوا تو کیا کرنا چاہیے۔

مسلمان طلایہ گرد

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روایت کے مطابق صفرا سے اور ایک روایت کے مطابق مدینہ ہی سے بسبس الجہنی اور عدی ابن ابی کو تجارتی قافلے کی خبریں لانے کے لیے بدر بھیج دیا تھا۔ وہ بدر پہنچے، پانی کے پاس اونٹ بٹھاتے اور مشکیزہ بھرنے لگے۔ اس اثنا میں دو لڑکیاں پانی لینے آ رہی تھیں اور جھگڑا بھی کر رہی تھیں ایک کا قرض دوسرے کے ذمہ تھا۔ قرض خواہ تقاضا کر رہی تھی۔ دوسری نے جواب دیا کہ کل یا پرسوں قافلہ آنے والا ہے میں ان کے پاس مزدوری کر کے تیرا قرض ادا کر دوں گی۔ مجدی ابن عمرو نامی ایک شخص وہیں تھا۔ یہ پہلے بھی قریش اور مسلمانوں کی لڑائیاں دیکھ چکا تھا۔ اس نے قافلہ کے آنے کی تصدیق کی۔ اور دونوں لڑکیوں کا جھگڑا ختم کرا دیا۔ بسبس اور عدی کی اتنی خبر کافی تھی۔ اور یہی خبر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک پہنچا دی۔

تجارتی قافلہ بچ نکلا

ان کے جانے کے بعد ابوسفیان بدر پہنچا اور مجدی سے پوچھا، کیا تم نے کسی کی آہٹ پائی ہے۔ مجدی نے بتایا کہ دو سوار آتے تھے۔ اونٹ بٹھا کر انہوں نے مشکیزوں میں پانی بھرا تھا۔ ابوسفیان اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ پہنچا۔ مینگنیاں اٹھا کر توڑیں۔ ان میں کھجور کی گٹھلیوں کے ریزے دکھائی دیے۔ سمجھ گیا کہ یہ اہلِ مدینہ کے اونٹ ہیں۔ اسے یقین ہو گیا کہ مسلمان قافلہ کی تلاش میں ہیں۔ چنانچہ وہ تیزی سے قافلہ کی طرف لوٹا اور بدر سے اس کا رخ ہٹا کر اس راستہ پر چل دیا جو ساحلِ سمندر کے ساتھ تھا یعنی بدر کو اس نے بائیں ہاتھ چھوڑ دیا۔
اب حکیم مطلق کی حکمت ملاحظہ ہو کہ پہلے دشمن کا ایک گروہ پیش نظر تھا یعنی

قافلہ اور دوسرے کا گمان بے شک تھا لیکن اس کا وجود یقینی نہ تھا۔ پھر دونوں گروہ منظرِ عام پر آگئے۔ قافلہ نے خطرے کا نشان دیکھ کر راستہ بدل لیا اور منظرِ عام سے غائب ہو گیا۔ دشمن کا جو گروہ پہلے غائب تھا اب وہ منظرِ عام پر تھا یعنی قریش کا لشکر ابوجہل کی قیادت میں جو اس لیے آیا تھا کہ قافلہ کو بچائے لیکن قافلہ کے سلامت نکل جانے کے باوجود ابوجہل کے اصرار پر واپس نہ ہوا بلکہ دندناتا ہوا بدر آیا۔

یہاں یہ بھی بتا دینا ضروری ہے کہ قریش کو مکہ سے نکل کر بدر تک پہنچنے میں آٹھ روز لگے۔ منازل کی اجمالی کیفیت یہ ہے۔

۱۔ مکہ مکرمہ اور عسفان کے درمیان، ابوجہل نے دس اونٹ ذبح کیے۔

۲۔ عسفان، امیہ ابن خلف نے نو اونٹ ذبح کیے۔

۳۔ قدید، سہیل ابن عمرو نے دس اونٹ ذبح کیے۔

۴۔ قدید سے قریش سمندر کی طرف پلٹے وہاں پانی شیریں تھا وہاں کے پڑاؤ میں شیبہ نے دس اونٹ ذبح کیے۔

۵۔ حجفہ، عتبہ ابن ربیعہ نے دس اونٹ ذبح کیے۔

۶۔ ابوا، ابناء حجاج نے دس اونٹ ذبح کیے۔

۷۔ ابوا، اور بدر کے درمیان عباس نے دس اونٹ ذبح کیے۔

۸۔ بدر۔ ابوالبختری نے دس اونٹ ذبح کیے۔

ذفران کی مجلس

حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں لکھا ہے کہ حضورِ اقدس نے دوبار صحابہ کا اجتماع مشورہ کے لیے کیا۔ ایک بار مدینہ میں جب قافلہ تجارت کی آپ کو خبر ملی۔ دوسری بار ذفران میں جب آپ کو قافلہ تجارت کی حفاظت کے لیے مشرکینِ مکہ کے لشکر کی خبر ملی۔ پہلی مجلسِ مشاورت کا صحیح مسلم اور بخاری میں ذکر ہے۔ دوسری مجلسِ مشاورت کا بھی امام بخاری نے بحوالہ عبداللہ ابن مسعود ذکر کیا ہے۔ شاید اسی وجہ سے امام بخاری نے دونوں حدیثوں کو دو علیحدہ بابوں میں ذکر کیا ہے۔ اور مسلم کی حدیث کعب بن مالک کو پہلے اور حدیث ابن مسعود کو بعد میں ذکر کیا ہے۔ اس ترتیب سے انہوں

نے اشارہ کر دیا کہ جس مجلس کا کعب بن مالک ذکر کر رہے ہیں وہ پہلے مدینہ میں ہوئی جب آپ کو ابوسفیان کے قافلہ تجارت کا علم ہوا اور جس کی نشاندہی عبداللہ بن مسعود کر رہے ہیں وہ بعد میں ذفران میں ہوئی جب آپ کو مشرکین مکہ کے لشکر کا علم ہوا۔

قریش کی آمد کی اطلاع پاتے ہی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو جمع کیا تاکہ آئندہ کے متعلق ان کی رائے معلوم ہو جائے۔ سب سے پہلے حضرت ابوبکر نے مؤثر تقریر کی، پھر عمر بولے، بعد میں مقداد نے کہا۔

یا رسول اللہ اللہ آپ کا رب جو کچھ فرمائے وہی کیجیے ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ خدا کی قسم ہم وہ نہ کہیں گے جو بنی اسرائیل نے حضرت موسیٰ سے کہا تھا۔

اذهب انت وربك فقاتلا

تو اور تیرا رب جا کر لڑو۔

ہم تو انا ههنا قاعدون یہاں بیٹھ کر دیکھیں گے۔ اس خدا کی قسم جس نے آپ کو مبعوث کیا۔ اگر آپ برک الغماد[1] تک بھی چلے جائیں تو ہم آپ کا ساتھ دیں گے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ سن کر تعریف کی اور دعا فرمائی لیکن حضرت ابوبکر، حضرت عمر اور حضرت مقداد تینوں مہاجرین میں سے ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم انصار کی رائے معلوم کرنا چاہتے تھے۔ خیال تھا کہ شاید انصار ساتھ نہ دیں کیونکہ انصار نے حفاظت کی ذمہ داری صرف مدینہ منورہ کے لیے اٹھائی تھی۔ چنانچہ آپ نے پھر فرمایا کہ مجھے مشورہ دو۔ اب سعد بن معاذ اٹھے اور فرمایا:

یا رسول اللہ! شاید آپ ہم سے خطاب فرما رہے ہیں۔ ہم آپ پر ایمان لا چکے ہیں۔ آپ کی تصدیق کی اور گواہی دی کہ آپ جو تعلیم لے کر آئے ہیں وہ سچی ہے، ہم آپ کی فرمانبرداری اور اطاعت کے پختہ وعدے کر چکے ہیں۔ آپ جس طرف کا ارادہ فرمائیں تشریف لے چلیں

---

[1] برک الغماد یمن میں جگہ کا نام اور مکہ مکرمہ سے پانچ منزل کی مسافت پر ہے۔ ان کے خیال میں یہ زیادہ سے زیادہ مسافت کی ایک تعبیر ہے۔

ہم آپ کے ساتھ ہیں ۔ اس خدا کی قسم جس نے آپ کو سچائی کے ساتھ مبعوث کیا ۔ اگر آپ سمندر بھی ہمارے سامنے لے آئیں اور اس میں داخل ہوں تو ہم آپ کے ساتھ داخل ہو جائیں گے ۔ اور ہم میں سے ایک بھی پیچھے نہ ہٹے گا ہم اسے ناپسند نہیں کرتے کہ کل آپ ہمیں لے کر دشمنوں سے مقابل ہوں، ہم جنگ میں استوار اور مقابلے میں سچے ہیں ۔ امید ہے کہ اللہ آپ کو ہماری طرف سے ایسے کارنامے دکھائے جن سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہوں ۔ اب اللہ کا نام لے کر چلیں ۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کی تقریر سے بہت خوش ہوئے اور فرمایا:

چلو اور خوش ہو جاؤ کہ اللہ نے میرے سے دونوں گروہوں میں سے ایک کا وعدہ فرمایا ہے ۔ اور میں گویا اس وقت قریش کے پچھڑنے کی جگہیں دیکھ رہا ہوں ۔

ذفران سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم روانہ ہوئے تو ان گھاٹیوں میں سے گزرے جنہیں الاصافر کہتے ہیں ۔ پھر الدبہ بستی میں قیام فرمایا ۔ بعد از اں حنان کو دائیں چھوڑ دیا ۔ یہ ایک ٹیلہ ہے جو بڑے پہاڑ کی طرح ہے ۔ آپ نے بدر کے قریب پڑاؤ کیا ۔ شام ہوئی تو علی، زبیر اور سعد بن ابی وقاص کو ایک جماعت کے ساتھ بدر کے چشمے پر روانہ کیا کہ کچھ خبریں لے آئیں ۔ وہ دو غلاموں کو پکڑ کر لے آئے جو لشکر قریش کے لیے پانی لانے کی خدمت پر مقرر تھے ۔ صحابہ نے ان سے ابوسفیان کے متعلق دریافت کیا تو جواب ملا کہ ہمیں کچھ معلوم نہیں ۔ پھر ان کی پٹائی کی تو دونوں نے مان لیا کہ ہم ابوسفیان کے ملازم ہیں ۔ اس پر انہیں چھوڑ دیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے ۔ سلام پھیرا تو فرمایا کہ جب انہوں نے سچ کہا تو تم نے ان کی پٹائی کی اور جب جھوٹ بولا تو تم نے چھوڑ دیا ۔

پھر آپ بنفس نفیس مخاطب ہوئے فرمایا مجھے قریش کے متعلق بتاؤ ۔

غلام ۔ اس ٹیلے کے پیچھے ہیں جو دور نظر آ رہا ہے ۔ اس سے ان کا ارشاد اس ٹیلے کی طرف تھا جس کا نام عقنقل ہے اور اس طرف کے ناکے کو العدوۃ القصوی کہتے ہیں ۔

پھر فرمایا کہ وہ لوگ کتنے ہیں۔
غلام۔ بہت ہیں۔
فرمایا، کھانے کے لیے روزانہ کتنے اونٹ ذبح کیے جاتے ہیں۔
غلام، کسی روز نو اور کسی روز دس۔
اس جواب سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اندازہ فرما لیا کہ لشکر قریش کی تعداد نو سو اور ایک ہزار کے درمیان ہے۔ اور یہ اندازہ بالکل درست تھا۔
پھر آپ نے دریافت فرمایا کہ قریش کے سربرآوردہ لوگوں میں سے کون کون ہیں۔
غلام۔ عقبہ ابن ربیعہ، شیبہ ابن ربیعہ، ابوالبختری، ابن ہشام، حکیم بن حزام، نوفل بن خویلد، حارث بن عامر، طعیمہ بن عدی، نضر بن حارث، زمعہ ابن الاسود، ابوجہل بن ہشام، امیہ ابن خلف، سہیل بن عمرو، عمرو بن عبدود۔
یہ سن کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مکہ نے اپنے جگر کے ٹکڑے تمہارے مقابلے کے لیے ڈال دیے ہیں۔
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بدر پہنچ کر پہلے قریبی چشمے پر اتر گئے۔ حباب بن المنذر نے عرض کیا یا رسول اللہ کیا اس جگہ آپ اللہ کے حکم سے اترے ہیں، فرمایا نہیں یہ ایک رائے ہے۔ حباب نے گزارش کی کہ یہ اچھا مقام نہیں۔ آگے تشریف لے چلیے۔ ہم اس چشمے کے قریب اتریں گے جو قریش سے قریب ہے، اس کے پیچھے جتنے چشمے ہیں، انہیں ناکارہ بنا دیں گے، اور چشمے کے پاس حوض بنا کر اس میں پانی بھر لیں گے۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حباب کی رائے کو صحیح قرار دیتے ہوئے آگے بڑھے اور قریش کے قریب جو چشمہ تھا اس کے پاس نزول فرمایا۔

(۸) سُوْرَۃُ الْاَنْفَالِ مَدَنِیَّۃٌ (۸۸) آیاتھا ۷۵ رکوعاتھا ۱۰

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

یَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْاَنْفَالِ ؕ قُلِ الْاَنْفَالُ لِلّٰهِ وَ الرَّسُوْلِ ۚ
فَاتَّقُوا اللّٰهَ وَ اَصْلِحُوْا ذَاتَ بَیْنِكُمْ ۪ وَ اَطِیْعُوا اللّٰهَ وَ رَسُوْلَهٗۤ
اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِیْنَ ﴿۱﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اِذَا ذُكِرَ
اللّٰهُ وَجِلَتْ قُلُوْبُهُمْ وَ اِذَا تُلِیَتْ عَلَیْهِمْ اٰیٰتُهٗ زَادَتْهُمْ اِیْمَانًا
وَّ عَلٰى رَبِّهِمْ یَتَوَكَّلُوْنَ ﴿۲﴾ الَّذِیْنَ یُقِیْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَ مِمَّا
رَزَقْنٰهُمْ یُنْفِقُوْنَ ﴿۳﴾ اُولٰٓىِٕكَ هُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ حَقًّا ؕ لَهُمْ
دَرَجٰتٌ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَ مَغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ كَرِیْمٌ ﴿۴﴾

اے پیغمبر لوگ آپ سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں، آپ کہہ دیجیے کہ اموالِ غنیمت دراصل اللہ اور اس کے رسول کے ہیں۔ لہٰذا اگر تم مومن ہو تو تمہیں اللہ سے ڈرنا چاہیے، باہم صلح رکھنی چاہیے، اللہ اور اس کے رسول کی طاعت

کرنی چاہیے۔[2] مومنوں کی شان یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور جب اُن کے سامنے اللہ کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ ہر حال میں اپنے آقا پر بھروسہ رکھتے ہیں۔[3] جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں بلاشبہ ایسے ہی لوگ فی الواقع پکے مومن ہیں۔ اُن کے لیے اُن کے پروردگار کے پاس مراتب ہیں اور بخشش، اور اچھی عزت کی روزی۔[4]

کامیابی کے اسباب اور کامرانوں کا چہرہ

ایک پیدا شدہ سوال کے جواب میں ذہنوں کو مادیت سے ہٹا کر اصل روحانیت کی طرف متوجہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ کامیابی کا مدار نہ سامانِ جنگ کی فراوانی ہے نہ افرادی قوت کی بہتات ہے بلکہ صرف اور صرف سیرت و کردار کی بلندی، باہم یکجہتی اخوت اور ایمان کے تقاضوں سے دب کر اللہ و رسول کی طاعت ہے۔ مسلمان جنگ مادیت کی خاطر اور نہ مادی فائدے بٹورنے کے لیے ہے بلکہ دنیا کے اخلاقی و تمدنی فساد کو اصولِ حق کے مطابق درست کرنے کے لیے ہے جسے اس وقت اختیار

کیا جاتا جب کہ مزاحم قوتیں دعوت و تبلیغ کے راستہ میں مزاحم ہو کر اصلاح کو ناممکن بنا دیتی ہیں۔ مصلحین کی نظر اپنے مقصد پر ہونی چاہیے۔ مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ دُنیا سے بُرائی ختم ہو اور اللہ کے کلمہ کا بول بالا ہو۔ ان فوائد پر نظر نہ ہونی چاہیے جو مقصد کے لیے سعی کرتے ہوئے بطورِ انعام اللہ سبحانہ کی عنایت سے مل جائیں۔ ان فوائد سے اگر ابتدا ہی میں نظر نہ ہٹا دی جائے تو بہت جلدی اخلاقی انحطاط رونما ہو کر یہی فوائد مقصود بن کر رہ جاتے ہیں۔

اصل مقصد شخصیت کے نشوونما اور اجتماعی سیرۃ کی تعمیر کے راستہ میں جتنی رکاوٹیں ہو سکتی ہیں ان کو دُور کرنا اور وہ تمام ترغیبات و ترہیبات فراہم کرنا ہے جو اس کے حصول میں مددگار ہوں۔ بنیادی چیز اللہ سے عابدانہ تعلق ہے۔ یہی وہ مرکز ہے جس سے اسلامی زندگی کے تمام اجزاء حرکت اور زندگی حاصل کرتے ہیں۔ تمام خارجی ادارے اور سلیے اطوارِ زندگی اسی ایک مصدر سے مشتق ہیں۔ مملکت کا تصور، قانونی نظام رسُول کی شخصیت اور اس کا منصب و مقام غرض اسلامی زندگی کی ہر معمولی سے معمولی چیز اسی مرکز سے وابستہ ہے۔

اس بنیادی تصور سے ہٹ کر اگر مادی راحت و آسائش اور معاشی خوشحالی کا حصول مقصد بنا لیا جائے تو شخصیت کی نشوونما نہ ہوگی اور تہذیبِ نفس کا کوئی سامان نہ ہوگا اس لیے یہاں سب سے پہلے اموالِ غنیمت کے بارے میں بتا دیا کہ یہ لوگوں کا نہیں بلکہ اللہ و رسُول کا مال ہے۔ اس مال کو یہاں انفال کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ مسلمان کی کوششوں اور اس کے اعمال و افعال مادی چیزوں سے ہٹ کر آخری غایت اور عالمی مقصد سے ہم آہنگ ہونا چاہیے۔ نظر مقصد پر ہونی چاہیے وسائل مقصد تو زمان و مکان کی تبدیلی سے بدلتے رہتے ہیں۔ مقصد تو صرف زندگی کے ہر گوشہ میں عبادت ہے اور یہی کائنات کا مقصدِ وجود ہے۔

غنیمت سے متعلق سوال

ا۔ اے پیغمبر لوگ آپ سے مالِ غنیمت کے بارے میں پوچھتے ہیں۔ آپ کہہ دیجیے کہ اموالِ غنیمت دراصل اللہ اور اس کے رسول کے ہیں۔ بدر میں جو مالِ غنیمت ہاتھ

آیا۔ اس کے متعلق صحابہ میں نزاع تھی۔ نوجوان جو آگے بڑھ کر لڑے تھے، وہ کل مال غنیمت کو اپنا حق سمجھتے تھے۔ پرانے لوگ جو نوجوانوں کی پشت پر تھے۔ ان کا کہنا یہ تھا کہ ہمارا سہارا لگانے سے فتح ہوئی لہٰذا غنیمت ہم کو ملنی چاہیئے۔ ایک جماعت جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کر رہی تھی، وہ اپنے کو اس مال کا مستحق سمجھتی تھی۔ ان آیات میں بتلا دیا کہ فتح صرف اللہ کی مدد سے ہوئی ہے۔ کسی کا سہارا زور پیش نہیں جاتا لہٰذا مال کا مالک اللہ سبحانہ ہے۔ پیغمبر اس کے نائب ہیں جس طرح اللہ اپنے رسول کی معرفت حکم دے۔ اسی کے موافق مال غنیمت تقسیم ہونا چاہیئے [1]

قدیم زمانے میں طریقہ یہ تھا کہ جو مال جس کے ہاتھ آتا وہی اس کا مالک ہوتا۔ یا پھر بادشاہ یا سپہ سالار تمام اموال پر قبضہ کر لیتا۔ پہلی صورت میں اکثر ہوتا کہ فتح یاب فوجوں کے درمیان اموال غنیمت پر سخت تنافس برپا ہو جاتا اور بسا اوقات ان کی خانگی جنگ فتح کو شکست میں تبدیل کر دیتی، دوسری صورت میں سپاہیوں کو چوری کا عارضہ لگ جاتا اور وہ اموال کو چھپانے کی کوشش کرتے۔ قرآن نے اموال غنیمت کو اللہ و رسول کا مال قرار دے کر پہلے تو یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ تمام مال غنیمت لا کر بے کم و کاست امام کے سامنے رکھ دیا جائے۔ اور ایک سوئی تک چھپا کر نہ رکھی جائے پھر آگے چل کر تقسیم کا قانون بنا دیا۔ اس طرح دونوں خرابیاں دور ہو گئیں۔

انفال، نفل کی جمع ہے۔ اس کے معنے اضافہ اور زیادتی کے ہیں جو چیز کسی کو اس کے حق سے زیادہ دی جائے تو جس قدر حق سے زیادہ دی گئی ہے وہ نفل ہے اسی طرح اگر کسی نے حق واجب سے زیادہ ادا کیا تو حصہ مزید کو نفل کہتے ہیں۔ یہاں انفال سے اس مال غنیمت کو تعبیر کیا گیا ہے جو راہ خدا میں جہاد کرنے والوں کو مفتوح دشمن سے میدان جنگ میں حاصل ہوتا ہے۔ اس تعبیر میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے دشمن سے جو مال غنیمت حاصل کرتے ہیں اس کی حیثیت ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطیہ کی ہے کیونکہ جہاد کا جو اجر ہے وہ اس سے بالکل الگ مستقلاً اللہ کے ہاں دائمی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جس قسم کے سوال کا قرآن نے یہاں ذکر کیا ہے۔ اس کی تفصیل حدیث و سیرت کی کتابوں میں موجود ہے۔ سیرت ابن ہشام میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جنگ سے فراغت کے بعد حکم دیا کہ فوج میں سے جن لوگوں نے مال جمع کیا ہے سب اکٹھا کیا جائے چنانچہ وہ سب یکجا کیا گیا۔ اب لوگوں میں اختلاف ہوا کہ یہ کس کا حق ہے۔ جن لوگوں نے جمع کیا تھا وہ مدعی ہوئے کہ یہ ہمارا حق ہے۔ اگر ہم نہ ہوتے تو یہ مال حاصل نہ ہوتا اسی طرح جو لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت پر تھے انہوں نے کہا کہ مالِ غنیمت میں دوسرے لوگ ہم سے زیادہ حقدار نہیں ہیں۔ ان ہی مختلف سوالات کا قرآن نے یہ جامع اور اصولی جواب دیا ہے کہ ان کو بتادو کہ اموالِ غنیمت اللہ اور رسول کی ملک ہیں۔ اللہ و رسول کی ملک، قرآن میں اجتماعی ملکیت کی تعبیر ہے۔ اس اصولی جواب نے مالِ غنیمت کے بارے میں اس جاہلی دستور کو ختم کر دیا جو اب تک رائج تھا اور جس کی بنا پر یہ سوالات پیدا ہوتے تھے۔

شاید آپ کے ذہنوں میں یہ سوال ابھر آئے اسلام میں اموالِ غنیمت کو جب کہ ان کے مالک موجود ہیں کیونکر حلال کیا گیا ہے۔ مالِ غنیمت وہ مال ہے جو غیر مسلموں سے لڑائی کے نتیجہ میں مسلمانوں کو ملا ہو۔ اگر مسلمانوں میں باہم جنگ ہو جائے اور ان میں فاتح و مفتوح ہوں تو ان کا مال مالِ غنیمت نہیں ہے۔ مالِ غنیمت کے موضوع پر تفصیلی مباحث تو ان شاء اللہ پارہ دہم میں آ رہی ہیں۔ یہاں تو صرف یہ واضح کرنا ہے کہ اسلام نے میدانِ جنگ میں حاصل شدہ اموال میں جو راہ اختیار کی ہے۔ وہ یہ نہیں ہے کہ کافروں کا جو مال مسلمانوں کے قبضے میں آجائے وہ حلال ہے۔ اور مسلمانوں کے اموال جو کافروں کے ہاتھ آئیں وہ ان کے لیے حرام ہیں، بلکہ معاملہ طرفین میں یکساں ہے جیسے غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے اموال پر مالکوں کی رضامندی کے بغیر قبضہ کر کے مسلمان ان کے قانونی مالک بن سکتے ہیں۔ اسی طرح غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے لیے بھی اس حق کو اسلام نے قانونی قرار دیا ہے۔ یعنی اسلامی حکومت کے اموال پر العیاذ باللہ اگر ان کا قبضہ ہو جائے تو مالک کی رضامندی کے بغیر وہ بھی ان کے مالک ہو جاتے ہیں۔ دراصل اس دفعہ کا تعلق قانونِ جنگ سے ہے اسی بین الاقوامی قانون کی بنا پر کہ شریعت میں چونکہ بیطے کر دیا گیا ہے کہ اسلامی حکومت

شہریوں کا مال غیر اسلامی حکومت کے باشندوں کے لیے مباح اور جائز ہے یعنی قبضہ کرنے کے بعد ان کی ملکیت میں داخل ہو جاتا ہے۔ اور ان سے اگر کوئی مسلمان خریدے تو یہ قانونی مالک سے مال کا خریدنا ہوگا۔ پھر جس طرح مسلمانوں کا مال غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کی ملک میں صرف قبضہ سے داخل ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اسلامی حکومت کے باشندوں کے لیے غیر اسلامی حکومتوں کا مال بھی مباح و جائز ہے یعنی قبضہ کے بعد مسلمان اس کے قانونی مالک بن جاتے ہیں۔ اموالِ غنیمت کے مسلمان جائز مالک اسی بنا پر ہوتے ہیں کہ ان لوگوں کے اموال کو جنگ کے نتیجے میں مسلمانوں کے لیے جائز اور مباح قرار دیا ہے۔

کامیابی کا مدار

۲۔ لہٰذا اگر تم مومن ہو تو تمہیں اللہ سے ڈرنا چاہیے، باہم صلح رکھنی چاہیے، اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کرنی چاہیے۔ سچے مسلمان کا کام یہ ہے کہ معاملہ میں خدا سے ڈرے، آپس میں صلح و آشتی سے رہیں۔ ذرا ذرا سی بات پر جھگڑے نہ ڈالیں۔ اپنی آراء اور جذبات سے قطع نظر کر کے محض خدا و رسول کا حکم مانیں[1] یعنی ایمان باللہ صرف زبان کے خشک اقرار کا نام نہیں ہے بلکہ یہ دراصل اللہ سبحانہ سے ایک عہد ہے۔ ایک شخص جب مسلمان ہوتا ہے وہ اس بات کا عہد کرتا ہے کہ اس کا ارادہ اس کی عقل اور اس کے جذبات و خواہشات قانونِ الٰہی اور احکامِ رسالت کی اطاعت میں حائل نہ ہو سکیں گے اور خدا و رسول کے حکم کے مقابلے میں وہ ان سب کی قربانی دینے پر آمادہ رہے گا۔ اس اطاعت و سپردگی کے معاوضہ میں اسے رضائے الٰہی اور تقرب خداوندی کی بشارت دی جاتی ہے۔ اس پورے معاملہ کو قرآن عزیز نے انتہائی بلاغت کے ساتھ اس جملہ میں پیش کر دیا ہے ان کنتم مومنین۔ یہ محض دراصل اسلامی معاشرہ کا قیام اسی عہد و میثاق کے ذریعہ عمل میں آیا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تخیل آرائی نہیں ہے بلکہ ایک حقیقت ہے جس کا ثبوت قرآن حکیم اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات سے ملتا ہے۔

یہ ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے کہ زندگی میں خدا کی نافرمانی سے بچ کر رہو اور اس سے ڈرو۔ اپنے باہمی معاملات درست رکھو اور خدا ور سول کی اطاعت میں سرگرم ہو جاؤ۔

اس موقعہ پر الانفال للہ والرسول فرما کر فاتقوا اللہ ارشاد فرمانا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ خاص انفال کے موضوع پر مخاطبوں میں کوئی نافرمانی نمودار ہوئی تھی۔ یہ نافرمانی کیا تھی؟ باہمی مشاجرات اور جھگڑے کی نافرمانی تھی۔ اس نافرمانی کی نوعیت میں روایات میں اختلاف ہے۔

مسند امام احمد میں ہے، عبادہ ابن الصامت کہتے ہیں کہ ہم لوگ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمرکاب بدر میں گئے اور مسلمانوں اور کافروں کی بدر میں مڈبھیڑ ہوئی۔ اللہ نے کافروں کو شکست دی اس کے بعد مسلمانوں کے تین گروہ ہو گئے۔ ایک گروہ نے کافروں کا تعاقب کیا اور ان کو قید و قتل کرنا شروع کر دیا۔ دوسرا گروہ مال غنیمت جمع کرنے لگا۔ تیسرا گروہ رسول اللہ کے ارد گرد حفاظت میں رہا۔ جب رات ہوئی اور سب لوگ جمع ہوئے تو مالِ غنیمت کے بارے میں اختلاف ہو گیا۔ جمع کرنے والوں کا خیال تھا کہ اس میں ان کے سوا کسی کا کوئی حق نہیں۔ تعاقب کرنے والوں نے کہا کہ ہم تم سے زیادہ حقدار ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے محافظین بولے کہ ہم دشمن کے قریب سے حضور اقدس کی نگرانی کر رہے تھے۔ اس وقت یہ آیات نازل ہوئیں۔

ابوداؤد، نسائی اور مسند احمد میں ہے کہ حضرت سعد بن ابی وقاص کہتے ہیں کہ بدر کے دن میرا بھائی عمیر شہید ہو گیا۔ اس کے عوض میں نے سعد بن العاص کو قتل کیا اور اس کی تلوار جس کا نام ذو الکتیفہ تھا لے کر حضور کی خدمت میں پہنچا اور درخواست کی کہ یہ تلوار مجھے دے دیجئے۔ حضور نے فرمایا اسے مالِ غنیمت میں رکھ دو۔ میں بہت مغموم ہوا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ حضور نے فرمایا اب وہ تلوار لے لو۔

ابوداؤد، نسائی، حاکم میں عبداللہ ابن عباس کے حوالہ سے ہے کہ بدر کے دن رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اعلان عام کیا جو شخص کام کرے گا اس کو انعام ملے گا۔ قوم کے نوجوان دوڑ پڑے۔ بوڑھے جھنڈے اٹھائے رہے۔ غنیمت آئی تو جوانوں نے اپنے انعام کا مطالبہ کیا۔ بوڑھے بول پڑے تم ہم سے زیادہ حقدار نہیں ہو ہم تو تمہاری پشت پناہی کر رہے تھے۔

یہ روایات بتاتی ہیں کہ جھگڑا ایک روپ میں نہیں بلکہ کئی صورتوں میں نمایاں ہوا اسی لیے یہاں آیت میں فرمایا کہ چونکہ انفال یعنی اموالِ غنیمت اشخاص کی نہیں بلکہ سرکار کی ملک ہیں اس معاملہ میں باہمی تشاجر کی ضرورت نہیں۔ باہمی جھگڑا اور فساد خدا کی نافرمانی ہے اس سے بچو۔ جھگڑنے کی جگہ جو کام کرنے کے ہیں وہ کرو۔ سب سے اہم اور بنیادی کام یہ ہے کہ باہم صلح و آشتی، بھائی چارہ اور اخوت پیدا کرو کہ یہ ایمان کا اولین تقاضا ہے۔

قرآن و سنت میں باہمی بھائی چارہ، اتحاد و اتفاق پر اجتماعی زندگی کی مضبوطی کے لیے جو اہمیت بتائی گئی ہے وہ الم نشرح ہے۔ قرآن کا یہ حکم کہ اصلحوا ذات بینکم میں انتشار، افتراق اور اشتتات سے بچنے کی ہدایت کی ہے۔ قرآن حکیم نے جا بجا اجتماعیت کو اسلامی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد اور خدا کی رحمت و نعمت قرار دیا ہے اور اسی لیے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت ہے اور جماعت سے علیحدگی کو جاہلیت اور حیاتِ جاہلی سے تعبیر کیا ہے۔ اسلامی زندگی متفرق اینٹوں کا نام نہیں دیوار کا نام ہے۔ الگ الگ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ وجود اگر ہے تو اجتماعی وجود کا ہے لیکن جماعت کا وجود مرکزیت کے بغیر نہیں ہو سکتا۔ اسلام فی الحقیقت سنت اللہ اور فطرت اللہ ہی کا دوسرا نام ہے۔ اگر نوعِ انسانی کی سعادت کے لیے قانونِ اسلام اسی فاطر السماوات والارض کا بنایا ہوا ہے جس نے تمام کائنات کے لیے قانونِ حیات بنایا ہے تو ضروری ہے کہ دونوں میں اختلاف نہ ہو۔ اسلام کا نظامِ جماعت بھی قانونِ مرکزیت سے وابستہ ہے۔ قرآن نے یہ بات جا بجا واضح کی ہے کہ جس طرح اجسام و اشیاء کی زندگی اپنے اپنے مرکزوں سے وابستہ ہے اسی طرح نوعِ انسانی اور اس کی جماعت و افراد کا جسمانی و معنوی بقا بھی قانونِ مرکزیت پر

موقوف ہے۔ جس طرح ستاروں کی زندگی اور حرکت کا مرکز و محور سورج ہے اسی طرح اسلامی زندگی کا مرکز سعادت اللہ و رسول کی طاعت ہے۔ اللہ کی طاعت بالذات ہے کیونکہ وہ رب العالمین ہے۔ اور نبوت کی طاعت نیابت کی وجہ سے ہے۔ اسی مرکز طاعت کو یہاں واطیعوا اللہ والرسول سے تعبیر کیا ہے۔ یہ اسلامی زندگی کا اصل اصول ہے اور یہی اسلام اور کفر کے درمیان حدِ فاصل ہے کفر بے قیدی اور بے راہ روی ہے۔ وہ ایک ایسی زندگی ہے جس میں افراد اور جماعتوں کے ارادوں پر کوئی بالاتر ضابطہ حیات اور اعلیٰ تر آئین زندگی حکمران نہیں ہوتا ہے۔ کفار کا ارادہ بے قید اور ان کا نفس بے لگام ہوتا ہے وہ انسان سے بالاتر کسی اور اقتدار کے آگے جھکنے کو تیار نہیں ہوتے۔ کبھی تو وہ عجز و درماندگی کی آخری حد تک پہنچ جاتے ہیں اور مٹی کے ڈھیر تک کے سامنے سر جھکا دیتے ہیں اور کبھی وہ غرور اور فرعونیت کے نشہ میں اس قدر سرشار ہوتے ہیں کہ انسان سے بالاتر کسی قوت کو تسلیم ہی نہیں کرتے۔ اپنے ہی جیسے انسانوں کی غلامی اور چاکری انہیں جمہوریت، اشتراکیت اور سرمایہ دارانہ نظام میں گوارا ہے لیکن قانونِ الٰہی کی اطاعت سے انہیں بیر ہے۔ اس کے برخلاف ایمان، تقویٰ اور طاعت کی زندگی چاہتا ہے ایسا تقویٰ اور ایسی طاعت جو کسی انسان یا انسانوں کی کسی جماعت کے ارادوں اور خواہشات پر نہیں بلکہ قانونِ الٰہی اور رضائے الٰہی پر مبنی ہو۔ ایسے ہی تقویٰ اور آئین شناسی سے انسان اپنے ارادہ پر قابو پا سکتا ہے۔ اور نفس و خواہشاتِ نفس کی غلامی سے نجات پا سکتا ہے۔ یہی تسخیرِ نفس ہے اور یہ تنہا کسی ایک انسان کا کام نہیں ہے۔ یہ ناممکن ہے کہ ایک اکیلا انسان خواہ وہ کتنی ہی اعلیٰ درجہ کی صلاحیتوں کا مالک ہو، ان مواقع اور مشکلات پر قابو پا سکے جو فطرت اور اس کی لاتعداد قوتوں کو مسخر کرنے میں پیش آتی ہیں۔ اس طرح یہ بھی ناممکن نہیں ہے کہ ایک شخص بلاشرکتِ غیرے ان اصول و ضوابط اور اس آئین حیات کی پابندی کر سکے جس کا مقصد انسان کی تکمیل ذات ہے اس مقصد کی خاطر اجتماعی زندگی کا قیام اور انسانوں کی ایک مربوط جماعت کی شکل میں زندگی بسر کرنا ضروری ہے اور یہ اس وقت تک ممکن نہیں ہے جب تک ایک مرکزی طاقت نہ ہو۔ اطیعوا اللہ والرسول اسی مرکزی طاقت کی نشاندہی کی گئی ہے۔ اس کے سامنے تمام افراد جماعت کو سرِ تسلیم خم کرنا

چاہیئے۔ اپنی آراء، اپنے نظریات، اپنے افکار، اپنے خیالات اور اپنے جذبات کو قربان کر کے بے لوث اور مخلصانہ اس کی طاعت کرنی چاہیئے۔ یہی ایمان باللہ والرسول کا ناگزیر تقاضا ہے۔ اس کے بغیر ایمان درخت کی ایک سوکھی جڑ کے سوا کچھ نہیں ہے۔

اہلِ ایمان کا چہرہ

۳۔ مومنوں کی شان یہ ہے کہ جب اللہ کا ذکر کیا جاتا ہے تو ان کے دل دہل جاتے ہیں اور ان کے سامنے جب اللہ کی آیتیں تلاوت کی جاتی ہیں تو ان کے ایمان میں اور اضافہ ہو جاتا ہے اور وہ ہر حال میں اپنے آقا پر بھروسہ کرتے ہیں۔ یعنی جب خدا کا نام درمیان میں آجائے خشیت و خوف سے کانپ اٹھیں۔ آیات و احکام الٰہی سُن کر ان کا ایمان و یقین زیادہ مضبوط ہوتا ہے اس قدر قوی و مضبوط ہو جائے کہ ہر معاملہ میں ان کا اصل بھروسہ اور اعتماد بجز خدا کے کسی پر باقی نہ رہے[1]

اب تک جو بات نظریاتی طور پر پیش کی گئی ہے۔ ان آیات میں اسی کا عملی نمونہ پیش کیا جا رہا ہے۔ اور سچے اہل ایمان کے اوصاف بیان ہو رہے ہیں۔ دراصل جن اہل ایمان سے پہلے یہ بات کہی گئی تھی کہ اگر ایمان کا دعوٰی کرتے ہو تو یہ کام کرو تقوٰی اختیار کرو، باہم صلح و آشتی پیدا کرو۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔ ان ہی کا حال ایک استثنائی جملہ کے ذریعے بیان کیا جا رہا ہے۔ پہلی بات سُن کر دماغ میں یہ خلش ہوتی ہے کہ کیا اسلامی زندگی ایسے افراد کا مجموعہ ہے جن کے دامن تقوٰی، طاعت خدا و رسول اور اصلاح ذات البین سے خالی ہیں۔ فرمایا نہیں یہ تو وقتی طور پر حالات کی بنا پر ایسا ہوا۔ ان کو اموال غنیمت کے بارے میں اللہ کی بات کا علم نہ تھا ورنہ ان کے تو کیا کہنے ہیں۔ ان کی روحانی رفعتوں کا تو اللہ کے سوا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا۔ یہ بات کہ اس آیت میں المومنون سے پہلی آیت والے مومنین مراد ہیں ایک قاعدہ پر مبنی ہے۔ قاعدہ جب ایک بار ایک اسم کو نکرہ بنا کر اور دوسری بار اسی کو معرفہ بنا کر لایا جائے۔ دونوں میں عینیت اور ہم آہنگی ہوتی ہے۔ اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے ان کا

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

چہرہ پیش کرتے ہوتے پانچ اہم اور بنیادی باتیں ارشاد فرمائی ہیں۔ ان صفات کو جس انداز میں بیان کیا گیا ہے وہ اس بات کی عکاسی کر رہی ہیں کہ یہ صفات بالفعل اس وقت موجود ہیں۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو اندازِ بیان المومنون الذین نہ ہوتا۔ منطوقِ قرآن تو ان لوگوں کا ہی چہرہ پیش کرتا ہے۔ ہاں اس کے مفہوم میں یہ بات ضرور داخل ہے کہ جو لوگ بھی قیامت تک ایمان کا دعویٰ کریں ان کو اس نمونہ کا ایمان پیش کرنا چاہیے۔ مطلب یہ ہے کہ اصل وضع کے اعتبار سے تو یہ جملہ خبریہ ہے لیکن انشا اس کے مفہوم میں داخل ہے۔ سب سے پہلے یہ بات جان لینی چاہیے کہ اس فقرے کی پیشانی پر لفظ انما لگا ہوا ہے اور عربی زبان میں یہ لفظ وہاں ہوتا ہے جہاں یہ بتانا ہو کہ جن کا ذکر ہو رہا ہے بس ان میں ہی یہ صفات پائی جاتی ہیں۔ ان کے علاوہ یہ صفت کہیں نہیں پائی جاتی ہے ظاہر ہے کہ قیامت تک ہونے والے مسلمانوں سے یہاں ایمان کی نفی مقصود نہیں بلکہ بتانا یہ ہے کہ یہ لوگ جن کا ذکر ہو رہا ہے یہ ایمان میں اربابِ کمال ہیں کیونکہ المومنون کا ال اور الذین زبانِ حال سے بول رہا ہے کہ جن کا ذکر ہو رہا ہے وہ خاص طبقہ ہے مطلب یہ ہے کہ ایمان میں کمال واخلاص کا تمام ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کے لیے کمال و اخلاص میں بھی نمونہ ہیں۔

کمالِ ایمان کی پہلی نشانی

اذا ذکر اللہ وجلت قلوبھم پہلی علامت یہ بتائی ہے کہ ان کو اللہ سبحانہ کی عظمت وکبریائی اور اس کی جلالت کا شعور ہوتا ہے۔ اس وجہ سے وہ اللہ سبحانہ سے برابر ڈرتے رہتے ہیں جب ان کے سامنے اللہ سبحانہ کا نام آجاتے۔ جب ان کو یاد دہانی کرائی جاتے جب ان کے سامنے اللہ سبحانہ کی بات کا ذکر ہو جاتے تو وہ اس کو خوف وخشیت کے احساس سے دب کر سنتے ہیں۔ گویا ایمان کا پہلا تقاضا وجل ہے۔ وجل کہتے ہیں اس ہیبت کو جو بڑوں کی شان، جلالت وکبریائی سے ہو۔ خوف وخشیت کو چھوڑ کر وجل کی تعبیر اختیار کرنے میں خاص حکمت یہ ہے کہ عذاب سے ڈرنا عام اہلِ ایمان کا درجہ ہے اہلِ کمال کو عذاب کی وعید کی نوبت نہیں آتی وہ تو اللہ سبحانہ کی عظمت و جلال اور عزت وکبریائی سے لرزاں و ترساں رہتے ہیں۔ قرآن کی دوسری آیت اس کے

منافی نہیں ہے جس میں ذکر ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب اللہ سبحانہ سے دلوں میں چین قرار اور سکون آتا ہے۔ جلالت قدر اور عظمت سے دل میں ہیبت ہوتی ہے اور محبت کے تقاضے سے دلوں میں اطمینان ہوتا ہے یعنی جب اللہ جلیل القدر حاکم کی حیثیت سے ذکر ہوتا ہے تو دل دہل کر رہ جاتے ہیں اور جب محبوب کی حیثیت سے ذکر ہوتا ہے تو دلوں میں سکون و اطمینان حاصل ہوتا ہے۔ کیونکہ بندوں کے اللہ سبحانہ سے دوگونہ تعلقات ہیں۔ حاکمیت اور محبوبیت حاکم ہونے کی حیثیت میں بندے اس کے محکوم ہیں۔ اور اس کی کبریائی، عظمت اور اس کے عزت و جلال سے لرزاں رہتے ہیں۔ اس حیثیت سے جب اس کا نام آتا ہے تو دل دہل جاتے ہیں۔ بندے اس کے اوامر کی طاعت کرتے ہیں اس نے نواہی کی نافرمانی سے اسی احساس کے ساتھ بچتے ہیں کہ اللہ کی ذات احکم الحاکمین ہے اور محبوب ہونے کی حیثیت میں جب اس کا ذکر ہوتا ہے تو دلوں میں سکون و قرار آجاتا ہے۔ حاکمیت کی حیثیت میں اللہ کی بندگی کی جاتی ہے اور محبوب کی حیثیت میں اس کی پرستش ہوتی ہے۔ اسلام کے عبادت کے شعائر میں ان دونوں حیثیتوں کی عکاسی ہے۔ نماز اور زکوٰۃ اس کی شان حاکمیت کا مظہر ہیں جبکہ روزہ اور حج اس کی شان محبوبیت کا۔ اس لیے اگر ذکر اللہ بیک وقت دو کام کرتا ہے۔ دلوں کو گرما دینے اور نرما دینے کا تو اس میں کوئی تنافی نہیں۔ جن لوگوں کے پیش نظر حق سبحانہ کی یہ دو حیثیتیں نہیں وہ دونوں آیتوں کو سمجھنے میں حیران ہیں۔ کوئی کہتا ہے کہ توحید، وعدہ وعید سے دل دہلتے ہیں۔ اوامر سے دلوں میں خوف آتا ہے۔ کوئی کہتا ہے کہ اللہ سبحانہ کے انعامات کے موقعہ پر دلوں میں سکون ہوتا ہے اور معاصی کے ارتکاب کے موقعہ پر دلوں میں خوف ہوتا ہے۔ کچھ کی رائے یہ ہے کہ نعمت کے ذکر پر دلوں میں اطمینان ہوتا ہے اور عذاب کے ذکر پر دلوں میں ہیبت آتی ہے۔

کمال ایمان کی دوسری نشانی

دوسری علامت یہ بتائی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی آیات ان کو سنائی جاتی ہیں یہ آیات ان کے ایمان میں اضافہ کر دیتی ہیں۔ یہاں آیات سے قرآن کی آیات مراد ہیں یعنی اللہ کے احکام و قوانین۔ مطلب اللہ سبحانہ پر ایمان کے بعد ان کو زندگی میں سب سے زیادہ تلاش

اس بات کی رہتی ہے کہ اللہ کی پسند و ناپسند کیا ہے؟ اور پسند و ناپسند کا یہ علم ان کی دولت ایمان میں اضافہ کرتا ہے۔ ایمان دراصل دل کے باور کر لینے کا نام ہے۔ یہی تصدیق ہے اور اس کی حیثیت درخت کی جڑ یا پھر مکان کی بنیاد کی ہے۔ ایمان کے لیے دونوں باتیں زبان نبوت نے دو تمثیلوں میں بیان فرمائی ہیں۔ لیجئے آپ بھی سن لیجئے۔ مگر ایمان کی تمثیل کی زبان میں سمجھنے سے پہلے یہ حقیقت ذہن نشین کر لیجئے کہ یہ آیت قرآنی اس باب میں قاطع ہے کہ قرآن کے نزدیک ایمان کی ہر حالت یکساں نہیں ہے وہ گھٹتا بھی ہے بڑھتا بھی ہے۔ نفس تصدیق کے لحاظ سے سب برابر ہیں کیفیت و یقین میں تفاوت ہے[1]

اس بات کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے دو تمثیلوں کے ذریعے ذہن نشین کرایا ہے۔ پہلے درخت کی تمثیل سنیے:

ایمان کی ستر یا ساٹھ سے اوپر شاخیں ہیں سب سے افضل لا الٰہ الا اللہ کہنا ہے اور سب سے ادنیٰ راستہ سے کسی معمولی چیز کا ہٹا دینا ہے اور شرم و حیا بھی ایمان کی ایک شاخ ہے۔ متفق علیہ

سمجھانا یہ ہے کہ ایمان صرف درخت کی اس سوکھی جڑ یعنی تصدیق کا نام نہیں ہے جس میں عمل صالح کی ایک شاخ بھی نہ پھوٹے بلکہ وہ اس تروتازہ اذعان و یقین کا نام ہے جس میں اعمال صالحہ کی بے شمار شاخیں سدا پھوٹتی رہیں۔ اس پر رنگ برنگ کی عبادات کے پھول کھلیں اور ایسے ایسے نافع اعمال کی بہار آئے کہ راستہ سے ایک کانٹے کا ہٹا دینا ان میں ایک ادنیٰ ترین عمل شمار ہو۔ ایسا ایمان زندہ ایمان ہے لیکن ایمان کے جس درخت پر اعمال صالحہ کا کوئی پتا اخلاق حسنہ کا کوئی پھل اور احوال صادقہ کی کوئی مہک اور لپٹ نہ ہو وہ زندہ ایمان نہیں مردہ ایمان ہے۔ اسی بات کو قرآن عزیز نے ایک اور بلیغ انداز میں پیش کیا ہے۔

مثل کلمۃ طیبۃ کشجرۃ طیبۃ اصلھا ثابت وفرعھا فی السماء توتی اکلھا کل حین باذن ربھا۔

---

[1] ترجمان القرآن

اچھی بات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک درخت جڑ اس کی جمی ہوئی، شاخیں
آسمان سے باتیں کرتی ہوئیں، اپنے پروردگار کے حکم سے ہر وقت پھل دیتا ہے۔
یہی حال مومن کے ایمان کا ہے۔ ایمان کو درخت سے تشبیہہ دی ہے لیکن اس درخت سے نہیں جس پر پھول اور پھل کی کوئی رونق نہ ہو یا اس پر بہار آئے تو سال بھر میں صرف ایک ہی بار آئے بلکہ اس درخت سے جو سدا بہار ہو۔

اب یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ جڑ کو ایمان قرار دیں اور اعمال صالحہ کو اس کے ثمرات کہہ دیں۔ یا پھر پورے درخت ہی کو ایمان کہہ دیں اور یہ بھی آپ کے صوابدید پر موقوف ہے کہ آپ ایمان کی زیادتی کی بشارت کو پتوں کی شادابی، پھولوں کی فراوانی اور پھل کی گرانباری تک محدود رکھیں یا اصل جڑ میں بھی اضافہ کا دعویٰ کریں۔

دوسری تمثیل یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ:

اسلام کا محل پانچ ستونوں پر قائم کیا گیا ہے۔ شہادتیں نماز کا قائم کرنا، زکوٰۃ دینا، حج کرنا، روزے رکھنا۔ (بخاری و مسلم)

یہ سمجھانا چاہتے ہیں اور ایک عام مثال کے ذریعے سمجھا رہے ہیں کہ جس طرح اپنے گردوپیش میں روزمرہ اپنا گھر دیکھتے ہو۔ اس میں چھت ہوتی ہے، ستون ہوتے ہیں، در و دیوار ہوتے ہیں اور یہ سب مل کر ہی تمہارا مکان کہلاتا ہے۔ پھر اس مکان کی کوئی بنیاد بھی ہوتی ہے جس پر یہ مکان قائم ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اتنا بڑا عظیم الشان مکان تو آنکھوں سے نظر آتا ہے مگر وہ بنیاد جس پر اتنی بڑی عمارت قائم ہے کہیں نظر نہیں آتی ہے وہ زمین میں ہوتی ہے۔ اسی طرح اسلام کی عمارت کو سمجھ لو کہ وہ بھی ایک مجموعہ ہے۔ اس کے بھی اجزاء ہیں۔ اس کی بھی بنیاد ہے۔ پھر اس کے اجزاء میں ایسا ہی فرق ہے جیسا کہ مکان کے اجزاء میں ہوتا ہے۔ ہر چیز مکان کی بقا کے لیے ضروری نہیں ہوتی ہے۔ تصدیقِ قلبی یعنی ایمان مکان کی بنیاد ہے جس طرح مکان کی بنیاد زمین میں مدفون ہوتی ہے اسی طرح ایمان بھی دل میں پوشیدہ ہوتا ہے۔ اسلام کے ارکانِ خمسہ کی یہ عمارت اسی پوشیدہ تصدیق پر قائم ہوتی ہے۔
اس آیت میں ایمان کے زیادہ ہونے سے مکان کی بنیاد اور درخت کی جڑ یعنی

تصدیق میں زیادتی بتانا مقصود نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ ایک مومن جب کبھی گوش انقیاد و طاعت سے قرآن کی آیتیں سنتا ہے تو ہر بار معانی پر غور و تفکر اس کے قلب میں جنت کی نئی رغبت اور آخرت کا نیا خوف اللہ سبحانہٗ کی ایک نئی محبت اس کی طاعت کا ایک نیا جذبہ پیدا کر دیتا ہے اسی کا نام اللہ سبحانہٗ نے اس آیت میں ایمان کی زیادتی رکھا ہے۔ اس معنے کے اعتبار سے اگر ایمان میں زیادتی و کمی نہ ہو پھر تو فاسقوں، فاجروں کے ایمان بھی جلیل القدر صحابہ کے ایمان کے ہم پلہ ہو جائیں گے۔ اور ایسا ہرگز نہیں ہے۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورۃ توبہ کے آخر میں آئے گی۔ اور آیت میں مجہول کا صیغہ لا کر یہ بھی اشارہ کر دیا ہے کہ یہ کوئی ضروری نہیں ہے کہ وہ خود قرآن تلاوت کریں تو ان پر یہ کیفیت طاری ہو بلکہ اگر تلاوت کرنے والا تلاوت کر رہا ہو تو ایمان کے تقاضے سے دب کر حکم کی تعمیل میں خاص توجہ سے سنتے ہیں اور خاموش رہتے ہیں اس وقت بھی ان پر یہی کیفیت طاری ہوتی ہے۔ یعنی ان کے قلوب میں اللہ کی کبریائی اس کے جلال و عظمت سے ہیبت طاری ہو جاتی ہے۔

کمالِ ایمان کی تیسری نشانی

کمالِ ایمان کی تیسری نشانی یہ بتائی ہے کہ ان میں اللہ پر توکل و اعتماد کی بھرپور صفت پائی جاتی ہے علیٰ ربھم کی تقدیم بتا رہی ہے کہ وہ اپنے معاملات میں اللہ کے سوا کسی پر اعتماد نہیں کرتے ہیں۔ اسباب کی وہ پابجائی صرف اسباب کی حد تک کرتے ہیں۔ ان کو وہ بہانہ اور ذریعہ سمجھتے ہیں اور بنانے اور بگاڑنے والا صرف اللہ کو مانتے ہیں۔ روزی کے لیے ان کا اعتماد رزق کے اسباب پر نہیں بلکہ خالق اسباب پر ہوتا ہے۔ میدانِ جنگ میں ان کا آسرا افراد کی کثرت، سامانِ جنگ کی فراوانی، اور جرنیل کی تدبیر پر نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ کی قدرتِ فاعلی اور اس کی مدد و نصرت پر ہوتا ہے۔

توکل کے لفظی معنے اپنے معاملات کو سپرد کرنے کے ہیں۔ اصطلاح میں اسباب پر عمل کرتے ہوئے اسباب پر یقین نہ کرنا بلکہ خالق اسباب پر نتائج کے بارے میں یقین کرنے کا نام توکل ہے۔ توکل ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے۔ یہ قرآن کی

اصطلاح میں بے حد اہمیت رکھتا ہے۔ عام لوگ اس کے معنے یہ سمجھتے ہیں کہ کسی کام کیلیے جدوجہد اور کوشش و محنت نہ کرنے کا نام توکل ہے لیکن یہ سراسر قرآن کا مذاق ہے اور مذہبی اپاہجوں کا دل خوش کن فلسفہ ہے۔ جس کو اسلام سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ حالانکہ توکل، کوشش، محنت، جدوجہد، تگ و دو کو چھوڑ دینے کا نہیں بلکہ محنت کے نتائج کو اسباب سے نہیں بلکہ اللہ سے حاصل ہونے کو چاہتا ہے۔ اگر محنت نہ کرنا توکل کے مفہوم میں کسی درجہ میں داخل ہوتا تو قرآن تلاشِ رزق کے لیے فامشوا فی مناکبھا اور جنگ کی خاطر خذوا حذرکم اور اعدوا لهم ما استطعتم من قوۃ کے مطالبات نہ کرتا۔

یہ دراصل ترکِ دنیا کو حصولِ دنیا کا ذریعہ بنا کر زندگی گزارنے کا طریقہ ہے۔ اسلام، قرآن اور نبوت نے توکل کے اس تصور یعنی بے عملی کا روزِ اوّل ہی انکار کر دیا تھا۔ اگر کسی درجہ میں قرآن توکل کے اس تصور کو پسند کرتا تو قرآن میں زراعت و باغبانی، شکار، شکاری کتوں، شکاری پرندوں، خشکی کا شکار، دریائی جانوروں کا شکار، مویشیوں کی پرورش، برّی بحری جانوروں کے مختلف اجزاء، گوشت، کھال، اُون، بال، دودھ، شہد وغیرہ سے استفادہ کی مختلف نوعیتیں تجارت، تجارت کے سلسلے میں حیوانی وغیر حیوانی، برّی و بحری سواریوں کے ذریعے مواصلات و حمل و نقل کی سہولتوں کا ذکر، صنعت و حرفت اور اس کے مختلف سادہ اور پیچیدہ شعبے رنگریزی، نجاری، زرگری، ظروف سازی، شیشہ سازی، زرہ سازی، پارچہ بافی، معماری، سنگ تراشی، کان کنی، غواصی مزدوری، مزدوری کی مختلف قسمیں، حکومتی ملازمت کاروباری تنظیم وغیرہ وغیرہ کا اشارۃً بھی ذکر نہ ہوتا۔ لیکن قرآن کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ قرآنی خطابات میں اس مصنوعی توکل کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اللہ اکبر کہاں یہ نقطۂ نظر کہ جو جس حد تک دُنیوی کاروبار سے الگ ہو کر توکل کی زندگی بسر کرے گا۔ اسی حد تک خدا کے حضور میں بلندی حاصل کرے گا اور کہاں یہ عقیدہ کہ دُنیا کے مشغلوں میں انہماک اور ان میں استغال ہی خدا کی خوشنودی اور قرب کا ذریعہ بنا دیا جائے۔ پہلا راہبانہ اور جوگیانہ تصور ہے اور دوسرا اسلامی تصور ہے۔

بہرحال توکل توحید کے اعلیٰ ترین مقامات میں ہے۔ مومن صرف اللہ پر توکل کرتا ہے اور اپنی مطلوبات کو اسی کی جناب میں پیش کرتا ہے۔ ترکِ اسباب اور اللہ کی مملکت میں اللہ کے بنائے قوانین کی خلاف ورزی بلا ریب توکل نہیں ہے۔ اس کی مثال اس شخص کی ہے جس کے لیے بادشاہ نے کھانے اور پینے کی ذمہ داری لے کر دسترخوان کمرہ میں لگا دیا ہو اور کہہ دیا ہو کہ یہاں سے کھایا کرو لیکن یہ کمرے سے اٹھ کر کھانا کھانے نہیں جاتا اور یہ خیال کرتا ہے کہ اس میں بادشاہ کی نافرمانی ہے اور اس انتظار میں رہتا ہے کہ بادشاہ یہ طریقہ بدل کر کھانا اس کے پاس روانہ کرے۔ جو حیثیت اس شخص کی بادشاہ کی نظر میں ہوگی وہ ہی اس متوکل کی اللہ کے یہاں ہوگی جو اللہ کے قانون پر عمل نہیں کرتا۔

کمالِ ایمان کی چوتھی نشانی

۴۔ جو نماز قائم کرتے ہیں اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔ بلاشبہ ایسے ہی لوگ فی الواقع پکے مومن ہیں، ان کے لیے ان کے پروردگار کے پاس مراتب اور بخشش ہے اور اچھی عزت ہے۔ یعنی اسی کے سامنے سرِ عبودیت جھکائیں۔ اسی کے نام پر دولت خرچ کریں۔ غرض عقیدہ خلق عمل اور مال ہر چیز سے خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کی کوشش میں رہیں۔ ایسے ہی لوگوں کو سچا اور پکا ایماندار کہا جا سکتا ہے۔ جو خدا کے یہاں اپنے اپنے درجہ کے موافق بڑے بڑے مقامات و مراتبِ قرب پر فائز ہوں گے جنہیں معمولی کوتاہیوں سے درگزر کر کے عزت کی روزی سے سرفراز کیا جائے گا رزقنا اللہ عنہ بفضلہ[1]

اس میں کمالِ ایمان کی چوتھی نشانی نماز بتائی گئی ہے۔ اور اس نشانی کے لیے اقامتِ صلوٰۃ کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اقامت کے معنے ہیں نماز کو ٹھیک طور پر اس طرح ادا کرنا کہ اس کے ظاہری ارکان قیام و رکوع، سجود اور قرأت بھی پورے کمال کے ساتھ اس کی باطنی روح خشوع حضور اور تلاوت میں تدبر و تفکر کی دولت سے

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مالامال ہو۔ یہی وہ نماز ہے جس کے ثمرات سے نمازی ہمدوش ہوتا ہے۔ یعنی اعمال و اخلاق میں برائیوں سے اس کا دامن آلودہ نہیں ہوتا۔

نماز میں صحابہ کی سرشاریوں کا کیا حال تھا۔ اس پر تفصیلی تبصرہ کے لیے بہت بڑی فرصت چاہیے۔ یہاں اتنی بات ضرور گوش گزار کر لیجیے کہ قرآن نے صحابہ کی عابدانہ سرشاریوں میں نماز کو خاص اہمیت دی ہے۔ ایک ارشاد ہے:

رجال لا تلھیھم تجارۃ ولا بیع عن ذکر اللہ واقام الصلوٰۃ

ایسے لوگ جن کو اللہ کی یاد سے کاروبار اور خرید و قیمت غافل نہیں کرتا ہے۔

نماز کا عشق ان میں اس قدر سرایت کر گیا تھا کہ قرآن عزیز نے اس موضوع پر ان کا چہرہ اس طرح پیش کیا ہے۔

تتجافیٰ جنوبھم عن المضاجع یدعون ربھم خوفا وطمعا و مما رزقناھم ینفقون۔

جدا رہتے ہیں ان کے پہلو خواب گاہوں سے پکارتے رہتے ہیں اپنے مالک کو خوف و لالچ سے اور جو کچھ ہم نے ان کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں۔

اقامت الصلوٰۃ اور انفاق دراصل ایمانی زندگی میں راس الصفات کی حیثیت رکھتے ہیں۔ ان ہی سے ان تمام اوصاف کی شیرازہ بندی ہوتی ہے جن سے ایمانی زندگی میں استواری اور پائیداری آتی ہے۔ قرآن میں ان دونوں کا ذکر ساتھ ساتھ آتا ہے۔ نماز میں اگر ایک طرف وقت کی، جذبات و میلانات اور خواہشات کی قربانی ہے تو زکوٰۃ میں پسینہ سے کمائی ہوئی دولت کی قربانی ہے۔ جب بندہ ان دو قربانیوں کے لیے تیار ہو جاتا ہے تو پھر اس کے لیے اللہ کی راہ میں ہر قربانی آسان ہو جاتی ہے۔

آخر میں ارشاد ہے کہ یہی پکے اہل ایمان ہیں۔ یعنی جن میں یہ صفات ہیں وہی واقعی طور پر کمال ایمان رکھتے ہیں ان کے ایمان میں کسی درجہ میں کوئی کمی نہیں ہے۔ قلبی تصدیق اور زبانی اقرار بلا شبہ ایمان کے سب سے بڑے رکن ہیں مگر یہ

اسی وقت واقعی اور حقیقی ہوں گے جبکہ ان اوصاف کی شہادت ان کے ساتھ موجود ہو۔ اور اسلام کا مقدس عہد بھی اسی وقت پورا کیا جا سکتا ہے جبکہ جوارح نیکی کے لیے مضطرب نظر آئیں۔

حارث بن مالک انصاری حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس سے گزرے حضور نے دریافت کیا، حارث کیا حال ہے؟ بولے میں پکا مومن ہوں، فرمایا، دیکھ کیا کہہ رہا ہے ہر چیز اپنی پشت پر واقعیت اور حقیقت رکھتی ہے۔ تیرے ایمان کی واقعیت کیا ہے۔ بولے کہ یا رسول اللہ دُنیا میری نظر میں کچھ بھی نہیں۔ رات کی بیداری اور دن کی روشنی یعنی رات کا قیام اور دن کو روزہ میرا کام ہے۔ اور میرے ایمان کا حال یہ ہے کہ گویا نگاہیں عرش بریں کو سامنے دیکھ رہی ہیں۔ مجھے جنتی ملاقات کرتے اور دوزخی شور مچاتے نظر آ رہے ہیں۔ فرمایا حارثہ مقام عرفان یہی ہے۔ الحسن البصری سے کسی نے دریافت کیا کہ کیا آپ مومن ہیں۔ فرمایا ایمان دو ہیں۔ ایک تو اللہ کو، فرشتوں کو، اللہ کی کتابوں کو، اللہ کے رسولوں کو، آخرت جنت اور دوزخ، بعث اور حساب کو ماننے کا نام ہے۔ اس معنے کے لحاظ سے میں واقعی مومن ہوں، اور دوسرا ایمان وہ ہے جس کا ذکر انما المومنون الذی اذا ذکر اللہ میں کیا گیا ہے تو مجھے یہ پتہ نہیں ہے کہ میں ان میں سے ہوں یا نہیں۔

ملا علی نے شرح فقہ اکبر میں جو بات لکھی ہے اس میں الحسن البصری کے اس ارشاد کی عکاسی نظر آتی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

> اصل ایمان و توحید میں سارے مسلمان برابر ہیں لیکن قوت وضعف کے لحاظ سے ان میں مراتب کا بڑا فرق ہے۔ کیونکہ کفر و ایمان کی مثال اندھی اور بینا آنکھ کی ہے۔ بیناؤں کی بینائی کتنا اختلاف ہوتا ہے۔ ایک شخص کو اندھیرا تہ ہوتا ہے ایک شخص دن میں دیکھتا ہے مگر بہ وقت ایک شخص باریک خط دیکھ سکتا ہے اور ایک موٹا، کوئی قریب سے دیکھ سکتا ہے اور دُور سے بھی دیکھ لیتا ہے۔ غالباً اسی تفاضے کے پیش نظر امام محمد نے فرمایا ہے کہ مجھے یہ بات پسند نہیں ہے کہ کوئی شخص اپنے ایمان کے بارے یہ تعبیر اختیار کرے کہ میرا ایمان جبریل کے ایمان جیسا ہے۔ بلکہ یوں

کہنا چاہیے میرا مومن بہ بھی وہ بھی ہے جو حضرت جبریل کا۔ اور ایسے ہی یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ میرا ایمان نبیوں کے ایمان جیسا ہے اور نہ ہی یہ کہنا درست ہے کہ میرا ایمان ابو بکر و عمر جیسا ایمان ہے۔ یعنی اتحاد تو صرف مومن ہونے میں ہے کیفیت ایمان میں نہیں ہے۔

یہاں اولٰئک ھم المومنون حقاً میں قرآن نے صحابہ کے ایمانوں کی کیفیت بیان کی ہے۔ مومن بہ کو بیان نہیں کیا۔

آخر میں فرمایا ہے لھم درجات عند ربھم و مغفرۃ و رزق کریم۔ درجات سے مراد مراتب، منازل اور ارتقا کے مقامات ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے یہاں ان ایمان والوں کے ان گنت درجات ہیں۔ لفظ درجات میں معنوی اور حسی دونوں بلندیاں داخل ہیں۔ درجات اوّل تو جمع لے کر آئے اور پھر اس میں تنوین تفخیم کی لگائی اور اس کو اور زیادہ وقیع بنانے کے لیے عند ربھم کا اضافہ کیا۔ بتانا یہ ہے کہ ان کے رفع مراتب کا اللہ کے یہاں آخر کوئی نہیں ہے۔ یہ ہے زندگی کا وہ اصلی ارتقا۔ جس کا قرآن داعی ہے دُنیا تو صرف عناصر کے مادّی ارتقا سے واقف ہے لیکن نبوّت کی دعوت مادیت سے کہیں بلند ہے۔ عناصر کی ترکیب کی ارتقائی شکل انسان نے اور انسان کی زندگی کی ارتقائی شکل وہ ہے جسے قرآن الجنۃ یا النار کہتا ہے۔ جب آپ غلّہ سے زندگی بنتا مانتے ہیں تو ایمان و عمل سے زندگی کا بننا کیوں نہیں مانتے۔ مادہ سے مادی زندگی کے لیے فنا ہے اور ایمان و عمل سے بننے والی زندگی دائمی ہے۔ اس کی صفت خالدین فیہا اور اسے آخر میں مغفرت فرما کر اشارہ کر دیا ہے کہ انسان اعمال کے لحاظ سے خواہ کتنا ہی بلند اور اُونچا ہو جائے کوتاہی اور قصور جنابِ الٰہی کی عظمت، کبریائی اور جلال کے اعتبار سے ضرور ہو سکتی ہے۔ انسان جب تک انسان ہے یہ محال ہے کہ اس کا نامہ عمل سرتاسر معیاری کارناموں کی دستاویز ہو اور لغزش، کوتاہی اور خامی سے بالکل خالی ہو لیکن اللہ سبحانہٗ کی رحمتوں میں سے یہ بھی بڑی رحمت ہے کہ جب انسان بندگی کی لازمی شرائط پوری کر دیتا ہے تو اللہ سبحانہٗ اس کی کوتاہیوں سے چشم پوشی فرما لیتا ہے اور اس کی خدمات جن صلے کی مستحق ہوتی ہے اس سے کچھ زیادہ صلہ اپنے فضل سے عطا کرتا ہے ورنہ اگر قاعدہ یہ مقرر کیا جاتا کہ ہر قصور کی سزا اور ہر خدمت کی جزا الگ الگ دی جائے گی تو کوئی بڑا سے

بڑا صالح بھی سزا سے نہ بچ سکتا۔ آیت میں درجات دجل اور اخلاص کے مغفرت اقامہ صلاۃ کے اور رزق کریم انفاق کے مقابلے میں ہے ۔

كَمَآ اَخْرَجَكَ رَبُّكَ مِنْۢ بَيْتِكَ بِالْحَقِّ ۠ وَاِنَّ فَرِيْقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِيْنَ

لَكٰرِهُوْنَ ۝۵ يُجَادِلُوْنَكَ فِى الْحَقِّ بَعْدَ مَا تَبَيَّنَ كَاَنَّمَا

يُسَاقُوْنَ اِلَى الْمَوْتِ وَهُمْ يَنْظُرُوْنَ ۝۶ وَاِذْ يَعِدُكُمُ اللّٰهُ

اِحْدَى الطَّآئِفَتَيْنِ اَنَّهَا لَكُمْ وَتَوَدُّوْنَ اَنَّ غَيْرَ ذَاتِ

الشَّوْكَةِ تَكُوْنُ لَكُمْ وَيُرِيْدُ اللّٰهُ اَنْ يُّحِقَّ الْحَقَّ بِكَلِمٰتِهٖ وَ

يَقْطَعَ دَابِرَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۷ لِيُحِقَّ الْحَقَّ وَيُبْطِلَ الْبَاطِلَ

وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُوْنَ ۝۸

(اس معاملہ کو بھی ایسا ہی سمجھو) جیسا کہ آپ کے پروردگار نے سچائی کے ساتھ آپ کو آپ کے گھر سے نکالا ۵۔ اور بلاشبہ اہلِ ایمان کا ایک گروہ اس بات کو پسند نہ کرتا تھا وہ آپ سے امرِ حق کے معاملہ میں جھگڑا کر رہے تھے باوجودیکہ معاملہ واضح ہو چکا تھا، ان کا حال یہ تھا کہ

گویا ان کو موت کی طرف ہانکا جا رہا ہے اور موت ان کو نظر آ رہی ہے۔[6] اور مسلمانو! وہ وقت بھی یاد کرو جب اللہ تم سے وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک ضرور تمہیں ملے گا اور تم چاہتے تھے کہ بے کانٹے والا گروہ تمہیں ملے۔ اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو جما دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے۔ اور یہ اس لیے ہوا کہ حق کو حق کر کے دکھلا دے اور باطل کو باطل خواہ مجرم پیشہ لوگوں کو یہ کتنا ہی ناگوار ہو۔[7]

جنگِ بدر کا پس منظر

یہ سورت مدنی ہے۔ جنگِ بدر کے بعد نازل ہوئی۔ مکہ کی تیرہ سالہ زندگی میں مشرکینِ مکہ نے جو دردناک ہوشربا مظالم مٹھی بھر مسلمانوں پر روا رکھے اور مظلوم مسلمانوں نے جس صبر و استقلال اور معجز نما استقامت و للہیت سے مسلسل تیرہ برس تک ان ہولناک مصائب و نوازل کا تحمل کیا وہ دنیا کی تاریخ کا بے مثال واقعہ ہے قریش اور ان کے حامیوں نے کوئی صورت ظلم و ستم کی نہ چھوڑی تاہم مسلمانوں کو حق تعالیٰ نے ان وحشی ظالموں کے مقابلے میں ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہ دی۔ صبر و تحمل کے

امتحان کی آخری حد یہ ہے کہ مسلمان مقدس وطن، عزیز و اقارب، اہل و عیال، مال و دولت سب چیزوں کو خیر باد کہہ کر خالص خدا و رسول کی خوشنودی کا راستہ طے کرنے کے لیے گھروں سے نکل پڑے۔ جب مشرکین کا جبر و تشدد اور مسلمانوں کی مظلومیت و بے کسی حد سے گزر گئی۔ اور ہر اہل ایمان کے قلوب، وطن و قوم، زن و فرزند، مال و دولت غرض ہر ایک ماسوائے اللہ کے تعلق سے خالی اور پاک ہو کر محض خدا و رسول کی محبت اور دولت توحید و اخلاص سے ایسے بھرپور ہو گئے کہ گویا غیر اللہ کی ان میں گنجائش ہی نہ رہی۔ تب ان مظلوموں کو جو تیرہ برس سے برابر کفار کے حملے سہہ رہے تھے اور وطن چھوڑنے پر بھی امن حاصل نہ کر سکے تھے۔ ظالموں سے لڑنے اور بدلہ لینے کی اجازت ملی۔

اذن الذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر الذین اخرجوا من دیارھم بغیر حق الا ان یقولوا ربنا اللہ۔

جن اہل ایمان کے خلاف ظالموں نے جنگ شروع کر رکھی ہے اب ان کو بھی جنگ کی اجازت دی جاتی ہے کیونکہ وہ سراسر مظلوم ہیں۔ اور بے شک اللہ ان کی مدد پر قادر ہے۔ یہ وہ مظلوم ہیں جن کو ناحق ان کے گھروں سے نکال دیا گیا۔ ان کا صرف یہ جرم تھا کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا مالک و آقا اللہ ہے۔

مکہ کا ادب مانع تھا کہ مسلمان ابتداءً چڑھ کر وہاں جائیں اس لیے ہجرت کے بعد تقریباً ڈیڑھ سال تک لائحہ عمل یہ رہا کہ مشرکین مکہ کے تجارتی سلسلوں کو جو شام و یمن وغیرہ سے قائم تھے، شکست دے کر ظالموں کی اقتصادی حالت اور مسلمانوں کی مالی پوزیشن مضبوط کی جائے۔ ہجرت کے پہلے سال ابوا، بواط، عشیرہ وغیرہ چھوٹے چھوٹے غزوات وسرایا جن کی تفصیل کتب احادیث وسیر میں ہے اسی سلسلے میں وقوع پذیر ہوا ہے۔ ۲ھ میں آپ کو معلوم ہوا کہ ایک بھاری تجارتی مہم ابوسفیان کی سرکردگی میں شام کو روانہ ہوئی۔ ابوسفیان کا یہ تجارتی قافلہ جس کے ساتھ تقریباً ساٹھ قریشی، ایک ہزار اونٹ اور پچاس ہزار دینار کا مال تھا جب شام سے مکہ کو واپس ہوا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو خبر پہنچی۔ صحیح مسلم

کی روایت کے موافق آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ آیا اس جماعت سے تعرض کیا جائے۔
طبری کی روایت کے موافق لوگوں نے اس مہم میں جانے سے پہلو تہی کی، کیونکہ انہیں کسی بڑی جنگ کا خطرہ نہ تھا جس کے لیے بڑا اہتمام و اجتماع کی ضرورت ہو۔ دوسرے انصار کی نسبت یہ بھی خیال کیا جاتا تھا کہ انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے نصرت و حمایت کا معاہدہ صرف اس صورت میں کیا تھا کہ کوئی طبقہ مدینہ پر چڑھائی کرے یا آپ پر حملہ آور ہو۔ ابتداء اقدام کر کے جانا خواہ کسی صورت میں ہو ان کے معاہدہ میں شامل نہ تھا۔ مجمع کا یہ رنگ دیکھ کر ابوبکر و عمر اور رئیس انصار سعد بن رضی اللہ عنہم نے حوصلہ افزا تقریریں کیں۔ آخر حضور تین سو سے کچھ زائد آدمیوں کی جمعیت لے کر قافلہ کی طرف روانہ ہو گئے چونکہ کسی بڑے مسلح لشکر سے مڈبھیڑ ہونے کی کوئی توقع نہ تھی اس لیے جمعیت اور سامانِ اسلحہ کا زیادہ اہتمام نہیں کیا گیا۔ فی الوقت جو اکٹھے ہو گئے سرسری سامان کے ساتھ روانہ ہوئے۔ اسی لیے بخاری کی روایت میں حضرت کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ جو لوگ غزوۂ بدر میں شریک نہیں ہوئے۔ ان پر کوئی عتاب نہیں ہوا۔ کیونکہ حضورؐ صرف تجارتی مہم کے ارادے سے نکلے تھے۔ اتفاقاً خدا نے باقاعدہ جنگ کی صورت پیدا فرما دی۔ ابوسفیان کو آپ کے ارادے کا پتہ چل گیا۔ اس نے فوراً مکہ آدمی روانہ کیا۔ وہاں سے تقریباً ایک ہزار کا لشکر جس میں قریش کے بڑے بڑے سردار تھے، پورے ساز و سامان کے ساتھ مدینہ کی طرف روانہ ہو گیا۔ حضور اقدس مقام صفراء میں تھے۔ جب آپ کو معلوم ہوا کہ ابوجہل وغیرہ بڑے بڑے ائمۃ الکفر کی کمانڈ میں مشرکین کا لشکر یلغار کرتا چلا آ رہا ہے۔ اس غیر متوقع صورت کے پیش آ جانے سے اپنے صحابہ کو اطلاع دی کہ اس وقت دو جماعتیں تمہارے سامنے ہیں تجارتی قافلہ اور سرکاری فوج۔ اللہ کا وعدہ ہے کہ دونوں میں ایک پر تمہیں مسلط کرے گا، تم بتلاؤ کہ دونوں میں سے کسی جماعت کی طرف بڑھنا چاہتے ہو۔ چونکہ فوجی مہم کے لیے تیار ہو کر نہ آئے تھے اس لیے اپنی تعداد اور سامان جنگ کی قلت کو دیکھتے ہوئے کچھ لوگوں کی رائے یہ ہوئی کہ تجارتی قافلہ پر حملہ کرنا زیادہ مفید ہے مگر حضور اس رائے سے خوش نہ تھے۔ حضرت ابوبکر و عمر اور مقداد بن الاسود نے ولولہ انگیز جوابات دیے اور آخر میں حضرت سعد بن معاذ کی تقریر کے بعد بھی فیصلہ ہوا کہ

فوجی مہم کا مقابلہ کیا جاتے۔ چنانچہ مقامِ بدر پر دونوں فوجیں بھڑ گئیں۔ اللہ سبحانہٗ نے مسلمانوں کو فتح عظیم عطا فرمائی۔ کافروں کے ستر بڑے بڑے سردار مارے گئے اور ستر قیدی ہوئے۔ اس طرح کفر کا زور ٹوٹا۔ اس سورت میں عموماً اسی واقعہ کے اجزاء و متعلقات کا بیان ہوا ہے۔

بدر کے لیے نکلنا بامرِ الٰہی تھا

۵۔ جیسا کہ آپ کے پروردگار نے سچائی کے ساتھ آپ کو آپ کے گھر سے نکالا۔ یعنی سوچو کہ اس جنگِ بدر میں شروع آخر تک کس طرح حق تعالیٰ کی تحریک و تائید اور امداد و توفیق مسلمانوں کے حق میں کارفرما دی۔ خدا ہی تھا جو نصرتِ دینِ اسلام کے حق میں سچے وعدے کر کے اپنے نبی کو ایک امرِ حق یعنی کفار کے ساتھ جہاد کرنے کے لیے مدینہ سے باہر لے آیا۔ لہ

اصل ارشاد کما اخرجک ربک من بیتک بالحق ہے۔ اس میں لفظ کما آیا ہے۔ شارحینِ قرآن اسے تشبیہ کے لیے کہتے ہیں۔ عربی میں تشبیہ کے لیے اور اردو میں ایسے اور جیسے کی جگہ کذالک اور کما بولتے۔ قرآن میں کہیں ایسا بولا گیا ہے اور جیسا چھوڑ دیا گیا ہے اور کبھی جیسا بولا جاتا ہے اور ایسا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ دوسرے مقامات پر کذالک ایسا آیا ہے مثلاً کذالک جعلنکم امۃ وسطا" لیکن جیسا یعنی کما نہیں ہے اور کہیں کما ارسلنا فیکم میں جیسا ہے مگر ایسا نہیں ہے۔ پیشِ نظر آیت بھی اسی قبیل سے ہے۔ یہاں بھی اشارہ محذوف ہے۔

شارحینِ قرآن نے جیسا کی خاطر ایسا مقرر کرنے کے لیے تقریباً بیس صورتیں پیش کی ہیں۔ حافظ ابن جریر نے یہاں طول طویل تقریر کی ہے اور زمخشری و رازی نے بھی بہت کچھ دادِ تحقیق دی ہے لیکن حق یہ ہے کہ تعبیر کا حق ادا نہ ہو سکا۔ الخفاجی نے سب کی آراء لکھ کر کہدیا ہے کہ ان میں سے اکثر جی میں کھٹکتی ہیں۔ اکثر نے اس کا پیوند انفال سے جوڑا ہے اور مشبہ الانفال للہ والرسول کو قرار دیا ہے۔ ابی

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

بدر کے لیے جانا ایک حال ہے اور یہ مشتبہ ہے اور اموالِ غنیمت کا تقسیم ہونا مشبہ ہے اور وجہ شبہ ناگواری اور کراہت ہے۔ سب سے پہلے اس کی تخریج کا سہرا فراء نحوی کے سر ہے۔ بعد کے شارحینِ قرآن نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے۔ اُردو تفاسیر میں بھی اسی کو اپنایا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں :

یہ انفال کا لوگوں کی مرضی کے مطابق تقسیم نہ ہونا گو طبعاً لوگوں کو ناگوار گزرا ہو مگر بوجہ تضمن مصالح کثیرہ کے بھی خیر ہے بس یہ امر مشقت طبعی اور تضمن مصالح میں ایسا ہے جیسا کہ

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں ۔

یعنی غنیمت کا جھگڑا ابھی ویسا ہی ہے جیسا نکلتے وقت عقل کی تدبیریں کرنے لگے ۔

مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی مولانا اشرف علیؒ کی ہمنوائی کی ہے۔ مولانا ابوالکلام آزادؒ ترجمان القرآن میں لکھتے ہیں ۔ اس معاملہ کو بھی ویسا ہی سمجھے جس طرح جنگ بدر میں یہ بات ہوئی کہ تیرے پروردگار نے تجھے سچائی کے ساتھ الخ اور مولانا ادریس فرماتے ہیں ۔ اے نبی جس طرح لوگوں نے اس تقسیم انفال میں اختلاف کیا اور بعضوں کو یہ تقسیم طبعاً گراں گزری اور بعض اس سے ناخوش تھے مگر بوجہ مصالح کثیرہ خیر اسی میں تھی کہ اللہ کے رسول نے اللہ کے حکم سے تم میں یہ مال تقسیم کر دیا اور تمہاری کا خیال نہ کیا ۔ اسی طرح جب تیرے پروردگار نے مولانا امین احسن اصلاحی کا بھی میلان اسی طرف ہے اگرچہ الجھا ہوا ہے اور واضح نہیں ہے ۔ مولانا مودودی لکھتے ہیں کہ جس طرح اس وقت یہ لوگ خطرے کا سامنا کرنے سے گھبرا رہے ہیں حالانکہ حق کا مطالبہ اس وقت بھی تھا کہ خطرے کے منہ میں چلے جائیں ۔ اسی لیے انہیں آج مال غنیمت کا چھوڑنا دشوار ہو رہا ہے حالانکہ حق کا مطالبہ یہی ہے کہ اسے چھوڑ دیں اور حکم کا انتظار کریں ۔

اصل میں یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ اموالِ غنیمت میں اختلاف کی بات اللہ سبحانہ کے اس فیصلے الانفال للہ والرسول کے بعد رونما ہوئی ہے حالانکہ یہ بات نہیں ہے ، بلکہ اختلاف کی بات اس آیت کے نازل ہونے سے پہلے کی ہے ۔ اور یہ اختلاف رونما ہونے

کی وجہ ان کے ایمان کی کمزوری نہ تھی بلکہ اس کی بنیادی وجہ یہ تھی کہ عرب جاہلیت میں دستور تھا کہ لڑائی میں جو مال جس کے ہاتھ آئے وہ اسی کا ہے۔ رومیوں میں بھی اسی کا دستور تھا۔ اسی دستور کی بنا پر بدر کی لڑائی کے بعد اموالِ غنیمت میں اختلاف ہوا مسندِ امام احمد میں عبادہ ابن الصامت کی دونوں روایات بھی یہ بتاتی ہیں کہ یہ اختلاف مالِ غنیمت کے بارے میں نزولِ قرآن سے پہلے ہوا۔ اگر نزولِ قرآن کے بعد ہوتا تو اس کو ایمان کی کمزوری کہا جاسکتا تھا لیکن جس معاملہ میں قرآن نازل ہی نہیں ہوا اس میں مخاطبوں پر کمزوری کا الزام زیادتی ہے۔ یہ تو ایسا ہے جیسے کوئی نماز کی فرضیت سے پہلے نماز نہ پڑھنے کو کسی کی کمزوری بتائے۔ جب قرآن کا حکم آگیا کہ الانفال للہ والرسول تو اس کے بعد ان کی ناگواری کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ یہ تاویل کہ یہ ایمانی نہیں صرف طبعی کمزوری تھی ایک بے جان سی بات ہے۔ یہ صحیح ہے کہ جب قرآن نے یہ حکم دے دیا کہ مالِ غنیمت جو کچھ بھی ہاتھ آئے حکومت کا ہے نہ کہ لوٹنے والوں کا۔ لوگوں کی ذاتی طمع وحرص ابھرنے کی راہ روک دی۔ چونکہ یہ رواج اور دستور کے خلاف پابندی تھی اس لیے ضروری تھا کہ لوگوں پر یہ بات شاق ہو۔ اس لیے پہلے تقویٰ اور طاعت کی تلقین کی۔ پھر اہلِ کمال کی ایمان میں نشان بتاکر ان کی حوصلہ افزائی کی اور پھر فرمایا کہ اس معاملہ کو بھی ویسا ہی سمجھو جیسا جنگِ بدر میں پیش آیا ہے۔

مولانا عثمانی فرماتے ہیں:

جیسے خدا ہی کی مدد سے ابتداء سے انتہا تک یہ مہم سر ہوئی مالِ غنیمت کو بھی اسی کا سمجھنا چاہیے۔ وہ اپنے پیغمبر کے ذریعے سے جہاں بتلائے خرچ کرو۔ کما اخرجک ربک من بیتک کے کاف کو میں نے اپنی تقریر میں صرف تشبیہ کے لیے نہیں لیا بلکہ ابوحیان کی تحقیق کے موافق تعلیل کے لیے رکھا ہے جیسے واذکروہ کما ہداکم میں علماء نے تصریح کی ہے۔ اور اخرجک ربک من بیتک کے مضمون کو میں نے الانفال للہ والرسول کا ایک سبب قرار دیا ہے۔ ابوحیان کی طرح اعزک اللہ وغیرہ مقدر نہیں مانا۔

مولانا عثمانی نے جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ جی کو لگتی ہے کہ کاف تعلیل کے لیے ہے

اور مطلب یہ ہے کہ چونکہ آپ کا میدانِ جنگ میں جانا اور اس کے نتیجے میں اموال غنیمت کا حاصل ہونا اللہ کے حکم سے ہے اس لیے اموال کی تقسیم بھی اللہ ہی کے حکم سے ہوئی ہے نہ تمہاری رائے کو نکلنے میں دخل تھا اور نہ تقسیم میں دخل تھا۔

اہلِ ایمان کی ناخوشی

۶۔ اہلِ ایمان کا ایک گروہ اس بات کو پسند نہ کرتا تھا۔ وہ آپ سے امر حق کے معاملہ میں جھگڑ رہے تھے۔ باوجودیکہ معاملہ واضح ہو چکا۔ ان کا حال یہ تھا کہ گویا ان کو موت کی طرف ہانکا جا رہا ہے اور موت ان کو نظر آ رہی ہے۔ یعنی بدر کے میدان میں اس وقت لے آیا جبکہ ایک جماعت مسلمانوں کی لشکرِ قریش سے نبرد آزمائی کرنے پر راضی نہ تھی۔ یہ لوگ ایسی سچی اور طے شدہ چیز میں پس و پیش کر رہے تھے اور حجتیں نکال رہے تھے جس کی نسبت بذریعہ پیغمبر انہیں ظاہر ہو چکا تھا کہ وہ یقیناً خدا کی فرمائی ہوئی اٹل بات ہے۔ یعنی اسلام اور پیروانِ اسلام کا بذریعہ جہاد غالب و منصور ہونا ابوجہل کے لشکر سے مقابلہ کرنا ان کو اس قدر شاق اور گراں تھا جیسے کسی شخص کو آنکھوں دیکھتے موت کے منہ میں جانا مشکل ہے تاہم خدا اپنی توفیق سے ان کو میدانِ جنگ میں لے آیا اور اپنی امداد سے مظفر و منصور واپس لایا۔[1]

آیت میں تشریح طلب یہ باتیں ہیں:

۱۔ یہ مختصر سی ٹولی جسے فریق من المومنین کہا ہے کس چیز کو ناپسند کر رہی تھی اور کیوں۔

۲۔ وہ حق کیا ہے جس میں یہ ٹولی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بحث و مجادلہ کر رہی تھی۔

۳۔ من بعد ما تبین سے کیا مراد ہے کیا چیز ظاہر ہو چکی تھی اور کیسے۔

سب سے پہلے یہ بات دھیان میں رکھنی چاہیے کہ مختصر سی ٹولی کا تعلق ان

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

مومنین سے ہے جو بدر کی جنگ میں شریک ہوتے۔ اب یہ غور فرمائیے کہ اس ٹولی کو کیا چیز ناپسند تھی۔ آلوسی لکھتے ہیں کہ ان کو نکلنا پسند نہ تھا۔ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ ان کو مشرکین کی طلب پسند نہ تھی۔ خفاجی کہتے ہیں کہ ان کو لڑائی پسند، نکلنا ہو یا طلب اور یا پھر جنگ کیوں پسند نہ تھی۔ سب لکھتے ہیں اس لیے کہ جنگ کی تیاری نہ تھی۔

دوسری بات کہ وہ حق کیا ہے جس میں یہ ٹولی حضور سے مباحثہ کر رہی تھی۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ حق یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رائے میں مشرکین سے جہاد کرنا چاہیے اور ان کا خیال یہ تھا کہ اس کی چونکہ بالفعل تیاری نہیں ہے اس لیے وہ کام کرنا چاہیے جس کی تیاری کر کے آتے ہیں۔ آلوسی لکھتے ہیں کہ وہ آپ سے مشرکین سے جنگ کے بارے میں بحث کر رہے تھے اور اس کے باوجود بحث کر رہے تھے کہ آپ ان کو کھول کر بتا چکے تھے کہ حق کا غلبہ ہوگا۔ لیکن ان کا موقف یہ تھا کہ اگر آپ ہمیں پہلے بتا دیتے تو ہم تیار ہو کر آتے۔ ان کو سواد زائد سو کا مقابلہ پریشان کر رہا تھا۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ مجادلہ یہ تھا کہ وہ کہہ رہے تھے کہ آپ تو ہمیں صرف چالیس آدمیوں کا مقابلہ کہہ کر لائے تھے اور یہ تو باقاعدہ لڑائی اور میدانِ جنگ ہے۔ اس کو سر کرنے کے لیے طاقت کا توازن ضروری ہے یعنی صحابہ کی یہ جماعت اس مسئلہ پر اسباب و وسائل کی دنیا کو پیش نظر رکھ کر غور کر رہی تھی۔ ٹھیک اسی طرح جیسے اموالِ غنیمت کے معاملہ میں رسم و رواج کے پیش افتادہ کے قانون کے مطابق سوچ رہی تھی مگر وہاں اور یہاں دونوں جگہ قانون تکوینی کام کر رہا تھا۔ اس بحث و مباحثہ کے نتیجہ میں جب ان کی سمجھ میں یہ بات آگئی کہ اس معاملہ میں اللہ سبحانہٗ کا ارشاد اور حکم ہے تو سب خوش ہو گئے اور نصرتِ الٰہی پر اعتماد کر کے آگے بڑھے۔ بالکل ایسے ہی جیسے میدانِ جنگ میں حضرت حباب بن منذر نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ جو مقام انتخاب کیا گیا ہے وحی کی رو سے ہے یا فوجی تدبیر ہے۔ ارشاد ہوا کہ وحی نہیں ہے۔ حضرت حباب نے کہا تو بہتر ہوگا کہ آگے بڑھ کر چشمہ پر قبضہ کر لیا جائے اور آس پاس کے کنویں بے کار کر دیے جائیں۔ آپ نے یہ رائے پسند فرمائی اور اسی پر عمل کیا گیا۔ یہاں بھی ساری کراہت اور بحث و مجادلہ صرف اسی وقت تک تھا جب تک ان کو معلوم نہ تھا کہ

عالم الغیب کا فیصلہ ہے۔ اور جب معلوم ہو گیا تو سب سراپا طاعت ہو گئے، جیسے اموالِ غنیمت میں حکم آنے کے بعد سب نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ جب تک حکم نہیں آیا تھا اور سمجھنے والے سمجھ رہے تھے کہ یہ آپ کی رائے ہے تو منظر یہی تھا کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون گویا ان کو زبردستی موت کے منہ میں دھکیلا جا رہا ہے۔ یہ ان کی سمجھ میں نہ آنے کے باوجود طاعت کی سرشاری بیان ہو رہی ہے نہ کہ کمزوری۔

مسلمانوں سے کامیابی کا وعدہ

۷۔ اور مسلمانو! وہ وقت بھی یاد کرو جب تم سے اللہ تعالیٰ وعدہ کر رہا تھا کہ دونوں گروہوں میں سے ایک ضرور تمہیں ملے گا اور تم چاہتے تھے کہ بے کانٹے والا گروہ تمہیں ملے۔ اور اللہ کا ارادہ یہ تھا کہ اپنے ارشادات سے حق کو جما دے اور کافروں کی جڑ کاٹ دے اور یہ اس لیے ہوا کہ حق کو حق کر کے دکھلا دے اور باطل کو باطل، خواہ جرم پیشہ لوگوں کو یہ کتنا ہی ناپسند ہو۔ مسلمان چاہتے تھے کہ تجارتی قافلہ پر حملہ آور ہو کر کانٹے نہ چبھے اور بہت سامال ہاتھ آئے لیکن خدا کی مرضی یہ تھی کہ اس چھوٹی سی بے سروسامان جماعت کو کثیر التعداد اور مرتب و پُرشوکت لشکر سے لڑا کر اپنی باتوں سے سچ کو سچ کر دکھلائے اور کفارِ مکہ کی جڑ کاٹ ڈالے تاکہ اس طرح اس کے وعدوں کی سچائی حیرت انگیز طریقہ پر ظاہر ہو کر سچ کا سچ اور جھوٹ کا جھوٹ ہونا کفار کے علی الرغم صاف صاف آشکارا ہو جائے۔ چنانچہ یہی ہوا۔ بدر میں قریش کے ستر سردار مارے گئے۔ جن میں ابوجہل بھی تھا۔ اور ستر ہی قیدی ہوئے۔ اس طرح کفر کی کمر ٹوٹ گئی اور مشرکینِ مکہ کی بنیادیں ہل گئیں فللہ الحمد والمنۃ[1]

وہ معاملہ یہ تھا کہ ہجرت کے دوسرے سال جب رؤسائے مکہ نے مدینہ پر حملہ کیا تو اسی زمانے میں ایک تجارتی قافلہ بھی شام سے آ رہا تھا اور مدینہ کے قرب وجوار یعنی بدر سے ہو کر گزرنے والا تھا۔ کیونکہ مکہ سے شام جانے کے لیے راستہ بدر سے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہی جاتا تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وحی الٰہی سے مطلع ہو کر فرمایا کہ ایک گروہ مکہ سے آرہا ہے۔ دوسرا قافلہ ہے۔ ان دو میں کسی ایک سے ضرور جنگ ہوگی اور تم کامیاب ہوگے۔ چونکہ دونوں جماعتوں میں سے ایک سے ضرور نبرد آزمائی کے نتیجہ میں کامیابی کی بشارت تھی۔ دو گروہوں کا اجمالی چہرہ بھی آیت میں بتادیا۔ ایک کانٹے والا اور دوسرا بغیر کانٹے کے، یعنی ایک مسلح دوسرا غیر مسلح یا یوں کہہ دیجئے ایک فوجی لشکر جو مسلح ہے اور دوسرا تاجروں کا ایک قافلہ جو غیر مسلح ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کو یہ بات کہ دو گروہوں میں سے ایک سے مقابلہ ہونا ہے کب بتائی اور کہاں بتائی۔ صحیح مسلم کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابو سفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا اسی وقت اپنے مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی۔ اور یہ سب کی مانی ہوئی بات ہے کہ ابو سفیان کی آمد کا حال مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا۔

نیز صحیح بخاری ہی میں ہے کہ کعب کہتے ہیں کہ

> رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر میں کسی غزوہ سے پیچھے نہیں رہا۔ بجز غزوۂ تبوک کے۔ اور ہاں غزوۂ بدر میں بھی میں شریک نہ تھا۔ اور جو اس میں شریک نہ ہوا اس پر کچھ عتاب نہیں ہوا، کیونکہ حضور اقدس قریش کے قافلہ کے لیے نکلے تھے کہ خدا جانے دونوں فریق کو اچانک آمنے سامنے کر دیا۔

کعب کی یہ حدیث بتاتی ہے کہ حضور مدینہ سے صرف اس لیے روانہ ہوئے کہ ابو سفیان کے تجارتی قافلہ کو روکیں اور بس۔

سوال یہ ہے کہ اجتماع کہاں ہوا اور صحابہ سے مشورہ کب اور کہاں ہوا؟ قرآن میں جن دو گروہوں سے مڈبھیڑ کی خبر دی گئی ہے یہ مدینے ہی میں صحابہ کو دے دی گئی تھی یا مدینہ سے باہر۔

تجارتی قافلہ پر حملہ کا مسئلہ

ایک خیال عام شارحینِ قرآن، محدثین اور مفسرین کا ہے۔ اسی کو اردو کے

مفسرین نے بھی اپنایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے تو صرف ابوسفیان کے قافلہ کی خاطر چلے تھے اور حضور کو مدینے میں ابوسفیان کے قافلہ کے سوا مکہ کی فوجی مہم کی کوئی اطلاع نہ تھی۔ لیکن جب آپ وادی ذفران میں پہنچ کر مقام پذیر ہوئے وہاں آپ کو معلوم ہوا کہ قافلہ تجارت کی مدد کے لیے مکہ سے فوجی طاقت بدر میں جمع ہو رہی ہے۔ اسی جگہ اپنے صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ مہاجرین و انصار اس میں شریک تھے۔

دوسری طرف مولانا شبلی مرحوم، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم اور مولانا امین احسن اصلاحی ہیں۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ حضور کو فوجی مہم کی مدینہ ہی میں خبر آگئی تھی اور آپ مدینہ سے تجارتی قافلہ کے لیے نہیں بلکہ فوجی مقابلہ کے لیے روانہ ہوئے۔ مولانا شبلی کو یہ اعتراف ہے کہ اس معاملہ میں وہ اکیلے ہیں لیکن ان کو اصرار ہے کہ حق وہی ہے جس کے وہ علمبردار ہیں۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں۔

> اس بات کا مجھے مطلق خوف نہیں کہ اس فیصلے میں عام مورخین اور ارباب سیر میرے حریف ہیں۔ نہایت جلدی نظر آجائے گا کہ حق اکیلا تمام دُنیا پر فتح پا سکتا ہے۔

مولانا شبلی کے دلائل یہ ہیں :

۱۔ وان فریقا منھم لکارھون میں واو حالیہ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ مسلمانوں کا ایک گروہ جو لڑائی سے جی چراتا ہے یہ موقع عین وہ موقع تھا جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپ آگے بڑھے کیونکہ واو حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہی ہونا چاہیے۔

۲ آیت مذکورہ میں یہ تصریح ہے کہ یہ جس وقت کا واقعہ ہے اس وقت دو گروہ سامنے تھے۔ ایک کاروانِ تجارت اور ایک قریش کی فوج۔ اربابِ سیر کہتے ہیں کہ آیتِ قرآنی میں یہ اس وقت کا واقعہ مذکور ہے، جب آنحضرت، بدر کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن بدر کے قریب پہنچ کر تو کاروانِ تجارت صحیح و سلامت بچ کر نکل گیا تھا اس وقت یہ کیونکہ صحیح ہو سکتا ہے کہ دونوں میں سے ایک کا وعدہ ہے۔ اس لیے یہ بالکل ظاہر ہے کہ قرآن مجید کی نص کے مطابق یہ واقعہ اس وقت کا ہونا

چاہیے جب دونوں گروہوں کے ہاتھ آنے کا احتمال ہو سکتا ہو اور یہ صرف وہ وقت ہو سکتا ہے جب حضور مدینہ میں تھے اور دونوں طرف کی خبریں آ گئی تھیں۔

۳۔ سب سے زیادہ قابل لحاظ یہ امر ہے کہ قرآن مجید آیت مذکورہ میں کفار کے دو فریق کا خدا نے ذکر کیا ہے۔ ایک قافلہ تجارت دوسرا اصحاب شوکت، آیت میں تصریح ہے کہ مسلمانوں کی ایک جماعت ایسی تھی جو چاہتی تھی کہ کاروان تجارت پر حملہ کیا جائے۔ خدا نے ان لوگوں پر ناراضی ظاہر کی۔

یہ اور اس قسم کی باتیں تفصیل سے مولانا شبلی نے بیان کی ہیں۔ اور بتایا ہے کہ مدینہ سے روانگی صرف مشرکین کے لشکر سے مقابلہ کے لیے ہوئی تھی۔ تجارتی قافلہ آپ کے پیش نظر نہ تھا۔

آئیے مولانا شبیر احمد عثمانی اور مولانا محمد ادریس کی زبانی شارحین قرآن، محدثین اور مورخین کا یہی موقف سمجھ لیجئے۔ اور دونوں کو پڑھ کر پھر غور کیجئے کہ اصل بات کیا ہے۔ مولانا عثمانی کی تقریر میں مولانا شبلی کے جوابات کی طرف اشارات ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں:

صاحب روح المعانی کی تصریح کے موافق اخرجک ربک من بیتک میں صرف خروج من البیت مراد نہیں ہے بلکہ خروج من البیت سے دخول فی الجہاد تک کا ممتد اور وسیع زمانہ مراد ہوتا ہے جس میں وان فریقا من المومنین لکارھون یجادلونک فی الحق وغیرہ سب احوال واقع ہوتے۔ ایک فریق کی کراہت تو علی خروج من المدینہ ہی کے وقت ظاہر ہو گئی تھی جسے ہم صحیح مسلم اور طبری کے حوالہ سے سورۃ الانفال کے پہلے فائدہ میں بیان کر چکے ہیں اور مجادلہ کی صورت غالباً آگے چل کر لشکر کی اطلاع ملنے پر مقام صفرلہ میں پیش آئی۔ اس کے سمجھ لینے کے بعد بعض مبطلین کے مغالطات کا استیصال ہو جائے گا۔

اور یہ بھی مولانا کا ارشاد سن لیجئے:

جن لوگوں کا خیال یہ ہے کہ اس سفر میں حضورؐ شروع ہی سے فوجی لشکر کے مقابلہ کے لیے نکلے تھے جو مدینہ پر از خود اقدام کرتا ہوا چلا آ رہا تھا۔ تجارتی قافلہ پر حملہ کی نیت آپ نے اول سے آخر تک کسی وقت نہیں کی۔ وہ فی الحقیقت لیے

خود ساختہ اصول پر تمام ذخیرۂ حدیث و سیر و اشارات قرآنیہ کو قربان کرنا چاہتے ہیں۔ یہ منطق ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ کفار محاربین جن کی دستبرد سے مسلمانوں کی جان و مال کی کوئی چیز نہ بچی اور نہ آئندہ بچنے کی توقع ہے ان کو جانی و بدنی نقصان پہنچانا تو جائز سمجھا جائے۔ لیکن تجارتی اور مالی نقصان پہنچانا خلاف تہذیب و انسانیت ہو۔ یعنی ان کی جانیں تو کفر و طغیان اور ظلم و شرارت کی وجہ سے محفوظ نہ ہوں مگر اموال بدستور محفوظ رہیں۔ گویا زندگی کے حق سے محروم ہو جائیں تو ہو جائیں پر سامان زندگی سے محروم نہ ہوں ان ھذا الا شئ عجاب۔ باقی یہ دعویٰ کہ یہ لوگ حملہ آور نہ ہوں ان کو مسلمانوں کو از خود حملہ جائز نہیں ہے کیونکہ وقاتلوا فی سبیل اللہ الذین یقاتلونکم کے خلاف ہو گا۔ قطع نظر اس سے کہ یہ مسئلہ موجودہ واقعہ سے بے تعلق ہے۔ کیونکہ کفار مکہ پہلے ہر قسم کے مظالم اور حملے مسلمانوں پر کر چکے تھے اور آئندہ کے لیے باقاعدہ دھمکیاں دے رہے تھے بلکہ اس بارے میں ان کی سازشیں اور مراسلتیں جاری تھیں۔ فی نفسہ بھی صحیح نہیں کیونکہ یہ آیت ابتدائے ہجرت میں اتری تھی۔ اس کے بعد دوسری آیات جن میں مطلق قتال کا حکم ہے نازل ہو گئیں۔ پھر یہ بھی قابل غور ہے کہ صرف اتنا کہنے سے حملہ آوروں کی مدافعت کرو یہ لازم نہیں آتا کہ کسی حالت میں بھی حملہ کی اجازت نہیں۔

آئیے آگے چلنے سے پہلے حضرت مولانا محمد ادریس کے ارشادات عالیہ بھی اختصار کے ساتھ سن لیجئے:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا غزوہ بدر سے مقصد قریش کے اس کاروان تجارت پر یلغار کرنا تھا جو ابوسفیان کی سرکردگی میں شام سے واپس آرہا تھا۔ قریش مکہ کے کسی حملہ کا دفاع مقصد نہ تھا۔ علامہ شبلی کی سیرۃ النبی میں رائے یہ ہے کہ غزوہ بدر کا مقصد کاروان تجارت پر حملہ کرنا نہ تھا بلکہ آپ کو مدینہ ہی میں یہ خبر آگئی تھی کہ قریش ایک عظیم جمعیت لے کر مدینہ پر حملہ کرنے کے لیے نکلے ہیں اس لیے حضور ان کی مدافعت کے لیے نکلے اور بدر کا معرکہ پیش آگیا۔ غزوہ بدر سے آپ کا مقصود کاروان تجارت پر حملہ کرنا نہ تھا بلکہ قریش کے حملہ کا دفاع تھا۔ علامہ شبلی کا یہ خیال تمام محدثین اور مفسرین کی تصریحات کے خلاف ہے۔

ابن ابی حاتم نے حضرت ابوایوب انصاری سے روایت کی ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس نے ہم سے فرمایا اور ہم مدینہ میں تھے کہ مجھے خبر دی گئی ہے کہ ابوسفیان کا تجارتی قافلہ آرہا ہے کیا تمہیں یہ مرغوب ہے کہ تم چلو عجب نہیں کہ اللہ تعالیٰ اس قافلہ کو بطور غنیمت ہمیں عطا کر دے۔ صحابہ نے عرض کیا کہ ہاں ہم کو یہ منظور ہے اس کے بعد ہم روانہ ہو گئے۔ ایک یا دو روز کی منزل قطع کرنے کے بعد آپ نے ہمیں بتایا کہ کفار مکہ کو ہماری روانگی کی اطلاع ہو گئی۔ وہ تیار ہو کر ہمارے مقابلہ کے لیے آرہے ہیں، تم بھی مقابلہ کے لیے تیاری کرو۔ ہم نے کہا کہ یا رسول اللہ ہم میں بخدا ان لوگوں سے مقابلہ کی تاب نہیں ہے۔ ہم تو صرف قافلہ کے ارادے سے آئے ہیں۔ آپ نے پھر اپنی بات دہرائی تو حضرت مقداد نے کہا کہ ہم بنی اسرائیل کی طرح نہ کہیں گے۔

یہ روایت فتح الباری اور زرقانی علی المواہب میں ہے۔

ایک دوسری روایت البدایہ والنہایہ اور ابن کثیر میں ہے :۔

عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جب یہ سنا کہ ابوسفیان تجارتی قافلہ کے ساتھ شام سے واپس آرہا ہے تو آپ نے مسلمانوں کو اس کی طرف خروج کا حکم دیا اور فرمایا کہ قریش کا قافلہ آرہا ہے جس میں بے شمار اموال ہیں لہٰذا تم اس پر حملہ کرنے کے لیے چلو۔ ممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ ہم کو یہ اموال عطا فرما دیں۔ کچھ آپ کے ہمراہ گئے اور کچھ نہیں گئے جس کی وجہ یہ تھی کہ لوگوں کا اس کا خیال بھی نہ تھا کہ کوئی جنگ کی صورت پیش آجائے گی۔ الخ

اس لیے حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں :

غزوۂ بدر کا سبب یہ ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو ابوسفیان کے قافلہ کی طرف خروج کی دعوت دی تاکہ اس کے اموال پر قبضہ کریں، کیونکہ اس قافلہ میں بہت اموال تھے اور آدمی کم تھے اس لیے اکثر انصار کو یہ گمان بھی نہ ہوا کہ قتال کی نوبت آئے گی۔

اس لیے بہت تھوڑے آدمی آپ کے ساتھ گئے اور لڑائی کی خاص تیاری نہیں کی، برخلاف مشرکین کے وہ پوری تیاری کے ساتھ آئے۔

خلاصہ کلام یہ کہ ان تمام روایات سے روزِ روشن کی طرح واضح ہو گیا کہ حضورؐ اور صحابہ کرام مدینہ سے کاروانِ تجارت کے ارادے سے نکلے اور قریشِ مکہ اور ابوجہل اسی کاروانِ تجارت کو بچانے کے لیے نکلے تھے اور بس[1]

انصاف کی بات یہ ہے کہ قرآن نے دونوں کا تذکرہ کیا ہے تجارتی قافلہ کا اور مشرکین کی مسلح فوج کا۔ اور ان دونوں کی جگہ بدر تھی۔ ابوسفیان کو بدر پہنچ کر مکہ کی طرف جانا تھا اور مشرکین مکہ کو بھی بدر آنا تھا۔ یہ بات بالکل واضح ہے کہ ابوسفیان کی واپسی کی شام سے اطلاع مدینے پہنچی۔ چونکہ تجارتی قافلہ بڑا تھا جیسا کہ لکھنے والوں نے لکھا ہے کہ اس میں ایک ہزار اونٹوں پر پچاس ہزار دینار کا سامان تھا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ پہنچ کر پہلا کام یہی کیا تھا کہ قریش کی شامی تجارت بند کر دی جائے۔ یہ قافلہ ۲ھ جمادی الاولیٰ میں شام کی طرف روانہ ہوا۔ اور آپ کو اس کی روانگی کی اطلاع ملی تھی اور آپ دو سو مہاجرین لے کر اسی قافلہ کا تعاقب کرنے کے لیے عشیرہ تشریف لے گئے۔ آپ کے پہنچنے سے کئی روز پہلے یہ قافلہ نکل چکا تھا ابن سعد کی تصریح کے مطابق اب یہی قافلہ شام سے سامان تجارت لے کر آرہا تھا کہ آپ کو اطلاع مل گئی۔ پہلے دو سو صرف مہاجر تھے۔ اس بار تین سو تیرہ حضرات آپ کے ہمراہ ہو گئے۔ چونکہ صرف قافلہ کو روکنا تھا اور قافلہ میں صرف تیس چالیس آدمی تھے اس لیے زیادہ تگ و دو نہیں کی گئی۔ اس بار اس قافلے میں انصار کی تعداد مہاجرین سے زیادہ تھی۔ اور یہ پہلا موقعہ ہے کہ اس قسم کی مہم میں انصار ساتھ گئے۔

اولین اور اصلی خبر قافلہ تجارت کی تھی اس لیے عام ذہنوں میں قافلہ تجارت تھا قافلہ تجارت ہی کے مطابق جانے والوں نے تیاری کی۔ اگر ذہنوں میں فوجی مہم کا مقابلہ ہوتا تو تیاری اس کے مطابق ہوتی صرف دو گھوڑے اور ستر اونٹ نہ ہوتے

---

[1] سیرۃ مصطفےٰ از مولانا محمد ادریس

اور افرادی قوت بھی زیادہ ہوتی۔ عام ذہن یہی تھا کہ تجارتی قافلہ لینا ہے۔ جب آپ مقام صفراء میں پہنچے تو آپ کو معلوم ہوا کہ قافلہ نے اسی خطرے کے پیش نظر راستہ بدل لیا ہے اور ساحل سمندر سے ہو کر نکل گیا ہے۔ جب آپ کو یہ علم ہوا تو اب فوجی مہم کے سوا کچھ نہ تھا۔ اس وقت آپ نے مہاجرین و انصار سے مشورہ کیا اور پیش پا افتادہ حالات کی اطلاع دی۔ خود حضور اقدس کی رائے یہی تھی کہ فوجی مہم سر کی جائے۔ اجتماع میں جن لوگوں نے حضور اقدس کا منشا سمجھ لیا انہوں نے فوراً ہاں میں ہاں ملائی۔ حضرت ابوبکر، عمر نے اپنی تقریروں میں بسر و چشم آپ کے اشارے کو قبول کیا۔ حضرت مقداد نے بھی جاں نثاری کا اظہار کیا۔ انصار میں سے سعد بن معاذ نے حضور کا اشارہ سمجھ کر دلیرانہ انداز میں تقریر کی۔ ابو ایوب انصاری کہتے ہیں کہ ہم مدینہ میں تھے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو قافلہ ابی سفیان کی خبر دی اور فرمایا کہ اگر تم چلو تو اللہ تعالیٰ تم کو مال غنیمت عطا فرماتے گا۔ ہم نے عرض کیا میرے اور روانہ ہو گئے۔ جب ایک دو دن کا راستہ طے کر چکے تب آپ نے ہم کو قریش کی فوج سے جہاد و قتال کے لیے تیار ہونے کا حکم دیا۔ کچھ لوگوں نے تامل کیا۔ حضرت مقداد نے کھڑے ہو کر دلیرانہ انداز میں آپ کی دعوت کا استقبال کیا اور مسند احمد میں ہے کہ مقداد کی تقریر کے بعد سب نے بالاتفاق یہی بات کہی جو مقداد نے کہی تھی۔ مشورہ میں تصویر کے دونوں رُخ ہوتے ہیں۔ اصل چیز وہ ہے جو مشورہ میں طے ہوتی ہے۔ قرآن عزیز نے ان اختلاف کرنے والوں کو فَرِيقًا مِّنَ الْمُؤْمِنِينَ کہہ کر جو بات ارشاد فرمائی ہے وہ فیصلہ ہونے سے پہلے کی بات ہے۔ یعنی مجلس شوریٰ کے اجتماع میں اہل ایمان میں ایک طبقہ کے یہ تاثرات تھے کہ:

۱۔ وہ لڑائی کو ناپسند کرتے تھے۔

۲۔ مجلس شوریٰ میں وہ حضور انور سے اس معاملہ میں مباحثہ کرتے تھے۔

۳۔ جنگ کی بات قافلہ سے ہٹ کر ان کے سامنے کھل کر آگئی تھی۔

۴۔ جنگ کے موضوع پر گفتگو میں ان کا انداز یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ان کو موت کے منہ میں جانا ہے۔

۵۔ نبوت نے وحی کے ذریعے سے ان کو تجارتی قافلہ اور فوجی لشکر دونوں کی خبر

دے کر کہا تھا کہ ایک میں کامیابی کا اللہ نے وعدہ کیا ہے۔
۶۔ رائے عام چاہتی تھی کہ تجارتی قافلہ ہے۔
قرآن کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ جنگ کو ناپسند کرنے والا صرف ایک چھوٹا سا طبقہ تھا۔ لیکن تجارتی قافلہ کا حاصل ہونا یہ سب کی آرزو اور خواہش تھی یعنی اول وہلہ میں جب پیغمبر نے دو باتوں کی خبر دی تھی کہ تجارتی قافلہ بھی ہے اور فوجی لشکر بھی ہے اور خدا کا وعدہ ہے کہ ان میں جس میں تمہارا مقابلہ ہوگا، تمہاری کامیابی ہے' اس وقت تودون غیرذات الشوکۃ حکم کی تعبیر بتا رہی ہے کہ بلا استثنا سب کی خواہش یہی تھی کہ تجارتی قافلہ ہاتھ آئے اور اس میں کامیابی ہو۔ اور یہ بات قرین قیاس بھی ہے کہ پہلے مادی طاقت مضبوط بنالی جائے پھر مقابلہ کیا جائے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بدر سے پہلے جو سرایا روانہ کیے اور جو غزوات کیے ان کا بھی پس منظر یہی تھا اور مدینہ سے اسی قافلہ کو روکنے کے لیے دوسو مہاجرین کے ساتھ آپ عشیرہ گئے تھے اس کا بھی مقصد یہی تھا کہ ابوسفیان قافلہ لے کر شام جا رہا ہے اس کی ناکہ بندی کی جائے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ قافلہ نکل گیا اور آپ واپس آگئے اور اسی قافلہ کی جب شام سے واپسی کی آپ کو اطلاع ملی تو آپ نے لوگوں کو ساتھ چلنے کی یہ کہہ کر دعوت دی کہ
قریش کا قافلہ سرمایہ سے لد کر واپس آرہا ہے اس کے لیے چلو،
شاید اللہ سبحانہ' وہ سارا سرمایہ تم کو مال غنیمت میں دے دے۔
اسی بنیاد پر اگر اختلاف کرنے والوں نے اختلاف کیا تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے۔ یہ اتفاق کی بات ہے کہ مقام صفراء میں پہنچ کر معلوم ہوا کہ تجارتی قافلہ جا چکا ہے اور اب باقاعدہ مشرکین کی فوج سے مقابلہ ہے آپ نے صحابہ سے مشورہ کیا۔ کچھ نے اختلاف کیا لیکن بالآخر سب کا فیصلہ یہی ہوا کہ مقابلہ کیا جائے ان میں سے ایک بھی ایسا نہیں جو واپس گیا ہو۔
لوگوں کی چاہت تجارتی قافلہ کی تھی۔ اور ضرور تھی اور نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب خود قرآن کہہ رہا ہے و تودون لیکن حالات نے پلٹا کھایا اور عالم غیب میں فیصلہ یہی ہوا کہ مقابلہ صرف فوجی لشکر سے ہو۔ کیوں؟ اس لیے کہ تکوینی طور پر عالم غیب

میں اللہ سبحانہ، کا ارادہ یہی ہوا اور اس لیے ہوا کہ حق کا بول بالا ہو اور باطل کا منہ کالا ہو۔ صحابہ کی چاہت کا تعلق عالم اسباب سے تھا جبکہ ارادۂ الٰہی کا تعلق عالم اسباب سے بالا عالم غیب سے تھا۔ جب صحابہ کو منشاءِ الٰہی معلوم ہو گیا تو سب بلا استثنٰی جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔

مولانا شبلی ہوں یا مولانا اصلاحی اور مولانا مودودی ہوں۔ ان کا اس باب میں قافلے کو حملہ کا ہدف تسلیم کرنے سے گریز کرنا اور قرآن کا سہارا لینا سراسر تکلف ہے۔ قریش اور مسلمانوں کے درمیان حالتِ جنگ قائم تھی اور حالتِ جنگ میں دشمن کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرنا قطعاً قابلِ طعن نہیں ہے۔ اسے ڈاکہ اس وقت سمجھا جا سکتا ہے جب بے قصور ہوں اور لوٹنے والے حکومت نہیں خانگی افراد ہوں۔ ورنہ دو حکومتوں میں کشیدگی پر نہ صرف جان بلکہ مال و آبرو کے خلاف بھی ہر فریق دوسرے فریق کو نقصان پہنچانے کا حق رکھتا ہے۔ جن بزرگوں نے اس موضوع پر تکلفات فرمائے ہیں۔ میں محسوس کرتا ہوں کہ انہوں نے حقیقی صورتِ حال پیشِ نظر نہیں رکھی اور صرف اس خیال سے متاثر ہو گئے کہ کہیں مسلمانوں پر غارت گری کا الزام عائد نہ ہو جائے۔ لیکن پیش بندی کے طور پر دشمن کو نقصان پہنچانا اور اسے جنگ کے معاملہ میں بے دست و پا بنا دینا ہر اعتبار سے درست اور جائز ہے اور یہ سب سے نزدیک تدابیرِ جنگ میں سے ایک مؤثر تدبیر ہے الفتنۃ اشد من القتل اور الفتنۃ اکبر من القتل کا مطلب بھی یہی ہے۔

خدا جانے اس بدیہی حقیقت سے اعراض کیوں مناسب سمجھا گیا ہے۔ یہ غارت گری نہ تھی۔ ایک جانی دشمن کے عناد سے بھرے منصوبوں کو ناکام بنانے کی ایک مثبت اور پائدار کوشش تھی۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ قریشِ مکہ ان املاک پر قابض ہو گئے تھے، جو مسلمان چھوڑ کر آئے تھے۔ قریش کے حملے اور چھاپے جاری تھے حالانکہ مسلمان نہ قریش سے لڑنے کے خواہاں تھے اور نہ کسی اور سے جنگ کرنا چاہتے تھے۔ قافلے پر حملہ جارحانہ اقدام نہ تھا بلکہ یہ سراسر دفاعی کارروائی تھی جو حالتِ جنگ کے دوران کی گئی۔ خود مولانا شبلی فرماتے ہیں :

قریش نے ہجرت کے ساتھ ہی مدینہ پر حملہ کی تیاریاں شروع کر دی تھیں۔ عبداللہ بن ابی کو انہوں نے خط لکھا کہ یا محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دو یا ہم آکر ان کے ساتھ تمہارا بھی کام تمام کر دیں گے۔ قریش کی چھوٹی چھوٹی ٹکڑیاں مدینہ کی طرف گشت لگاتی رہتی تھیں۔ کرز فہری مدینہ کی چراگاہوں تک آکر غارت گری کر گیا تھا۔

اس کے بعد مولانا فرماتے ہیں:

حملہ کے لیے سب سے بڑی ضروری چیز مصارفِ جنگ کا بندوبست تھا۔ اس لیے اب کے موسم میں قریش کا جو کاروانِ تجارت شام کو روانہ ہوا اس سروسامان سے روانہ ہوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی کل کی کل دے دی۔ نہ صرف مرد بلکہ عورتیں جو کاروبارِ تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں ان کا بھی ایک ایک فرد اس میں شریک تھا۔[1]

غور فرمائیے جب یہ قافلہ تجارتی صرف اس مقصد کے لیے جا رہا ہے کہ اس سے آئی ہوئی دولت اور سرمایہ سے قریش مدینہ میں حملہ کریں گے تو کیا دُنیا میں معمولی سی سیاسی بوجھ والا شخص سب سے پہلے جنگ میں کامیابی کے اس ذریعہ پر ضربِ کاری ہی نہ لگائے گا۔ حضور اقدس اسی تجارتی قافلہ کو مکہ جانے سے روکنا چاہتے تھے۔ اور سب گھر سے اسی ارادے سے نکلے تھے۔ اب یہ الگ بات ہے کہ مشیت ایزدی نے تجارتی قافلہ پر حملے کے بجائے جنگِ بدر کا سامان کر دیا جسے قرآن نے یوم الفرقان سے تعبیر کیا ہے۔

معذرت آمیز انداز کیوں؟

اصل میں کسی بھی معاملے کے متعلق معذرت آمیز انداز اختیار کرنا موقف کی کمزوری کی نشاندہی کرتا ہے۔ اور جب موقف ہی کمزور اختیار کیا جائے تو اُسے دلائل کے زور سے اور الفاظ کی فراوانی سے مستحکم نہیں کیا جا سکتا۔ اور پھر موضوع کے بنیادی

[1] سیرت النبیؐ

حقائق آفتاب جہاں تاب کی طرح تاباں ہوں تو ان کی طرف سے آنکھیں بند کر کے معذرت کا پہلو اختیار کرنا سراسر حیرت افزا ہے۔

بلاشبہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے تجارتی قافلہ کی مراجعت کے متعلق دستے روانہ کرتے رہے۔ ایسی ہی کوئی اطلاع پاکر اور یہ معلوم کر کے کہ اس تجارتی قافلہ کا پیش منظر مدینہ پر حملہ کی تیاری سے آپ مدینہ منورہ سے نکلے۔ ادھر ابوسفیان جو تجارتی قافلہ کا سالار تھا بے خبر اور غافل نہ تھا۔ اسے بھی تشویش تھی کہ مسلمان اس کی تلاش میں ہوں گے۔ جو لوگ راستہ میں ملتے تھے ان سے پوچھ گچھ کے بعد اطمینان کے بغیر قدم آگے نہیں بڑھاتا تھا۔ جب اسے یقین ہو گیا کہ مسلمان راستہ کا چکر لگا رہے ہیں تو اس نے بدر پہنچنے سے پہلے ہی ضمضم غفاری کو مکہ مکرمہ روانہ کر دیا تاکہ قریش کو خبر کر دے کہ قافلہ خطرے میں ہے۔ اور اس کے بچاؤ کے لیے جو کچھ ہو سکے کر لیں۔

کوکبۂ نبوت کی مدینہ سے روانگی

مدینہ منورہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے روانہ ہونے کی تاریخ ابن اسحاق کے مطابق ۸ رمضان المبارک ۲ھ مطابق ۴-۵ مارچ ۶۲۴ء ہے۔ دن دوشنبہ یعنی پیر کا تھا یہ بیان تقویم کے مطابق ہے۔ ابن سعد نے روانگی کی تاریخ ۱۲ رمضان المبارک ۲ھ ۸ مارچ بتائی ہے اور لکھا ہے کہ دن دوشنبہ کا تھا۔

اس سفر میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جن مقامات سے گزرے ان کی یہ تفصیل بتائی گئی ہے۔ عقیق، ذوالحلیفہ، اولات الجیش تربان، ملل، غمیس الحمام، صخیرات الیمامہ، سیالہ، فج الروحاء، شنوکہ، عرق الظبیہ، سجسج، منصرف، النازیہ، وادی رحقان، صفراء، وادی ذفران۔ اسی مقام پر پہلی مرتبہ اطلاع ملی کہ قریش مکہ کا لشکر تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لیے آرہا ہے۔ یہاں تک طائفتین میں سے صرف ایک پیش نظر تھا یعنی تجارتی قافلہ۔ دوسرے کے بارے میں یقینی طور پر کچھ معلوم نہ تھا۔ اب دونوں قافلے منظر عام پر آگئے تھے۔ جیسا کہ زیر تشریح آیت کہہ رہی ہے یعنی اذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انہا لکم ذفران ہی کی منزل میں وہ مجلس شوریٰ قائم ہوئی جس میں یہ

فیصلہ کرنا پڑا کہ تجارتی قافلے کے بجائے لشکر قریش سے مڈبھیڑ کی نوبت آتے تو کیا کرنا چاہیے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک روایت کے مطابق صفراء سے اور دوسری روایت کے مطابق مدینہ منورہ سے بسبس اور عدی کو تجارتی قافلہ کی خبریں لانے کے لیے بدر روانہ کیا۔ وہ بدر پہنچے۔ پانی کے پاس اونٹ بٹھائے اور مشکیزہ بھرنے لگے۔ اس اثنا میں دو لڑکیاں آئیں اور جھگڑتی ہوئی آئیں۔ ایک کا قرض دوسری کے ذمہ تھا۔ اور قرض خواہ تقاضا کر رہی تھی۔ دوسری نے جواب دیا کہ کل پرسوں قافلہ آنے والا ہے۔ میں ان کے پاس مزدوری کر کے تیرا قرض ادا کر دوں گی۔ مجدی ابن عمرو نامی ایک شخص وہیں تھا۔ یہ پہلے ہی قریش اور مسلمانوں کی لڑائیوں میں فیصلہ کرا چکا تھا۔ اس نے قافلہ کے آنے کی تصدیق کی۔ اور دونوں لڑکیوں کا جھگڑا ختم کر دیا۔ بسبس اور عدی کے لیے اتنی خبر کافی تھی اور یہی خبر انہوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا دی۔

ان کے جانے کے بعد ابوسفیان بدر پہنچا اور مجدی سے دریافت کیا کہ کیا تم نے کسی کی آہٹ پائی ہے۔ مجدی نے بتایا کہ دو سوار آئے تھے اور اونٹ بٹھا کر انہوں نے پانی مشکیزے میں بھرا۔ ابوسفیان اونٹوں کے بیٹھنے کی جگہ پہنچا۔ مینگنیاں اٹھا کر بھر لہرائی۔ ان میں کھجور کی گٹھلیوں کے ریزے دکھائی دیے۔ یہ اہل مدینہ کے اونٹوں کا خاص چارہ تھا اسے یقین ہو گیا کہ مسلمان قافلہ کی تلاش میں ہیں۔ وہ تیزی سے قافلہ کی طرف لوٹا اور بدر سے اس کا رُخ پلٹا کر اس راستہ پر چل دیا جو ساحل بحر کے ساتھ تھا یعنی بدر کو اس نے بائیں ہاتھ چھوڑ دیا۔

حکمتِ الٰہی کا فیصلہ

اب اللہ سبحانہ کی حکمت نوازی ملاحظہ ہو کہ پہلے دشمن کا ایک گروہ پیشِ نظر تھا یعنی قافلہ تجارت اور دوسرے کا گمان بے شک ہو گا لیکن اس کا وجود یقینی نہ تھا۔ پھر دونوں گروہ منظرِ عام پر آ گئے۔ اب پہلے گروہ یعنی قافلہ نے معمولی نشانِ خطرے کا دیکھ کر راستہ بدل لیا اور وہ منظرِ عام سے غائب ہو گیا۔ دشمن کا جو گروہ پہلے غائب تھا اور صرف اس لیے وجود پذیر ہوا تھا کہ قافلے کو گزند نہ پہنچنے دے وہ قافلہ کے سلامت نکل

جانے کے باوجود ابوجہل کے اصرار پر واپس نہ ہُوا بلکہ دندناتا ہُوا بدر آگیا تاکہ اِس پاس کے قبیلوں پر اپنا رُعب جماتے۔ ان دو گروہوں میں سے ایک کے ہاتھ آنے کا خدائی وعدہ ایسے انداز میں پورا ہُوا کہ جنگ بدر سے اسلامی تاریخ میں حق کی فتح اور باطل کی شکست و ریخت کا دروازہ کھل گیا۔

آیت پر دوبارہ نظر

آئیے ان آیات پر تاریخ و روایت کی روشنی میں ایک بار پھر نظر ڈال لیجئے۔ جدید شارحین قرآن اس غلط فہمی کا شکار ہیں کہ جنگ بدر کے بارے میں تاریخ و سیرت کی روایات کا بڑا حصہ قرآن کے خلاف ہے۔

قرآن کے خلاف کیا ہے؟

یہ کہ آپ جب مدینہ سے نکلے تو صرف قافلہ تجارت پر حملہ کرنا تھا دو چار منزل چل کر معلوم ہُوا کہ قریش فوجیں لیے چلے آرہے ہیں۔ اس وقت اپنے مہاجرین و انصار کو جمع کیا کہ ان کا عندیہ دریافت فرمائیں۔

آئیے قرآن کی روشنی میں معلوم کریں کہ ان باتوں میں سے کون سی بات قرآن کے خلاف ہے۔ اتنی بات تو خود قرآن ہی بتارہا ہے کہ تجارتی قافلہ اور مسلح لشکر دونوں کا مسلمانوں سے سابقہ تھا۔ اور یہ بھی قرآن ہی سے معلوم ہو رہا ہے کہ بلا امتیاز اور بلا استثنیٰ اسب کا پیش نہاد تجارتی قافلہ تھا۔ یہ بات قرآن میں تو دون غیر ذات الشوکہ سے معلوم ہو رہی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ پیش نہاد کب تھا اس کا جواب اس کے سوا اور کیا ہے کہ مدینہ سے خروج کے وقت تھا۔ اسی لیے قرآن نے اسے واذ یعدکم کے تحت لاکر بیان کیا ہے۔ اس سے صاف پتہ لگتا ہے کہ مدینہ سے روانگی قافلہ تجارت کے لیے ہوئی تھی۔ اگر اس وقت فوجی لشکر کا کوئی تصور بھی ہوتا تو قرآن کی تعبیر یہ نہ ہوتی۔ کیونکہ اس صورت میں بلکہ مدینہ سے نکلتے وقت دونوں صورتیں موجود ہوں اور پھر صحابہ جانتے اور سمجھتے ہوئے کہ اللہ کی مرضی اور حکم یہ ہے کہ فوجی لشکر پر حملہ کیا جائے حکم عدولی کریں تو یہ ایک ایسا سنگین جرم ہوتا جس کے اظہار کے لیے صرف تو دون غیر ذات الشوکہ کی تعبیر نہ ہوتی بلکہ احد کی طرح

کہا جاتا عصیتم من بعد ما اراکم ما تحبون منکم من یرید الدنیا ومنکم من یرید الاخرۃ ، لیکن قرآن کے اوراق کھلے ہوئے ہیں۔ قرآن نے اس موضوع پر کوئی تہدیدی انداز اختیار نہیں کیا۔ کہا تو صرف یہ کہا کہ تمہیں یہ پسند تھا کہ قافلہ ہاتھ آجائے۔ یہ بھی صرف اظہارِ واقعہ ہے نہ کہ اظہارِ ناراضی، اور یہ اظہارِ واقعہ بھی اسی وقت درست ہو سکتا ہے جب پہلے تجارتی قافلہ کی خاطر گھر سے چلے ہوں۔ اور آگے چل کر ان کا فوجی طاقت سے سامنا ہو گیا ہو۔ اور یہ بھی قابلِ غور ہے کہ قرآن نے یہ بات مسلمانوں کی کسی ٹولی کے بارے میں نہیں فرمائی ہے بلکہ پوری جماعت کے بارے میں فرمائی ہے یعنی اس سے مستثنیٰ کوئی نہیں۔ اگر مدینہ ہی سے فوجی لشکر پیشِ نہاد تھا تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے۔ سب کے سب مقصدِ خداوندی یعنی یہ کہ حق کا بول بالا ہو سے ہٹ کر تجارتی قافلہ کو ترجیح دے رہے تھے۔ اس میں صرف اجل صحابہ نہیں بلکہ حضور انور بھی داخل ہوں گے۔ اوروں کا پتہ نہیں میں تو اس تصور سے کانپ جاتا ہوں۔ آخر آپ کس قانون سے تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم حکم کی زد سے کیسے بچائیں گے۔ یہ فکری آوارگی نہیں تو اور کیا ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ

مدینہ سے سب کا پیشِ نہاد تجارتی قافلہ تھا۔ اسی لیے اس کی تیاری میں عام مستعدی نہیں ہوئی۔ جنگ کا کسی کو احساس تک نہ تھا۔ جب مدینہ سے نکل کر صفرا نامی جگہ میں پہنچے تو قافلہ ہی کی نگرانی کی خاطر فوجی قوت کا علم ہوا۔ اسی موقعہ پر حضور نے فرمایا۔ اللہ کا نام لے کر آگے بڑھو۔ خدا نے مجھ سے دونوں گروہوں میں ایک کا وعدہ کیا ہے اذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین۔ اور اسی موقعہ پر شوریٰ ہوا۔ اور اسی شوریٰ میں کچھ نے یہ تاثر ظاہر کیا کہ ہم جنگ کی تیاری کر کے نہیں آئے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت مقداد اور حضرت سعد بن معاذ کی تقریروں نے رُخ بدل دیا۔ جن لوگوں نے جنگ نہ کرنے کا تاثر ظاہر کیا قرآن نے ان کا ذکر اس طرح کیا کہ وان فریقا من المومنین لکارھون۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ لڑائی سے کراہت عین اس وقت ہو رہی تھی جب آپ مدینہ سے نکل آئے بلکہ یہ حال مقدر ہے اور مقدرہ کی تعبیر اختیار ہی اس لیے کی گئی ہے کہ کراہت کا زمانہ خروج کے بعد ہے۔

بلا شبہ وہ اس موقعہ پر یہ معلوم ہو جانے کے باوجود کہ تجارتی قافلہ نکل چکا ہے اور اب فوجی لشکر سامنے ہے صحابہ کرام حضور اقدس سے بحث کر رہے تھے کہ ہم تیاری کر کے نہیں آئے۔ ہماری تعداد کم ہے ہمارے پاس سامان جنگ بھی نہیں ہے، قرآن نے اسی کی تصویر یجادلونک فی الحق بعد ما تبین میں پیش کی ہے۔ صحابہ کا یہ اختلاف حالات کے تحت تھا یعنی اس لیے تھا کہ فوجی اقدام کے لیے جس قسم کے وسائل کی ضرورت ہے وہ ہمارے پاس موجود نہیں ہیں۔ ابوایوب انصاری کے الفاظ ہیں واللہ ما لنا طاقۃ بقتال القوم۔ بخدا ہم میں مقابلہ کی طاقت نہیں ہے لیکن جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

واللہ لکانی الان انظر مصارع القوم

بخدا میری نگاہیں دشمنوں کے قتل ہونے کی جگہ دیکھ رہی ہیں۔

تو سب نے رائے بدل لی اور بے سروسامانی اور بے بسی کے باوجود میدان جنگ میں جانے کے لیے تیار ہو گئے۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ اس بے کسی کی حالت میں صحابہ کی طاعت کی اسی سرشاری کی تصویر قرآن نے ان الفاظ میں پیش کی ہے۔

کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون۔

گویا انہیں موت کی طرف دھکیلا جا رہا ہے اور وہ اپنی موت کو آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

ڈر اور خوف حالات کی وجہ سے تھا اور اس کے باوجود اقدام فرمانبرداری کی وجہ سے تھا کیسا بلیغ اور خوبصورت انداز ہے۔ یہی جواب تک تجارتی قافلہ پر نظر جمائے ہوئے تھے منشاء الٰہی معلوم ہونے کے بعد فوجی لشکر سے مقابلہ کے لیے تیار ہو گئے۔

یہاں معاً سوال پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس بے سروسامانی کی حالت میں انہوں نے کیا کیا۔ قرآن نے آگے اسی کا جواب دیا ہے کہ اسباب کو چھوڑ کر سب خالق اسباب کی طرف متوجہ ہو گئے اذ تستغیثون ربکم۔

إِذْ تَسْتَغِيثُونَ رَبَّكُمْ فَاسْتَجَابَ لَكُمْ أَنِّي مُمِدُّكُم بِأَلْفٍ مِّنَ
الْمَلَائِكَةِ مُرْدِفِينَ ﴿۹﴾ وَمَا جَعَلَهُ اللَّهُ إِلَّا بُشْرَىٰ وَ
لِتَطْمَئِنَّ بِهِ قُلُوبُكُمْ ۚ وَمَا النَّصْرُ إِلَّا مِنْ عِندِ اللَّهِ ۚ
إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۱۰﴾

ع ۱۵ ۱

جب تم اپنے پروردگار سے فریاد کر رہے تھے پس اس نے تمہاری فریاد کو شرفِ پذیرائی عطا کی۔ یہ کہہ کر کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے کہ یکے بعد دیگرے آئیں گے تمہاری ضرور مدد کروں گا۔ ۹ اور اللہ نے فرشتوں والی بات صرف اس لیے کی کہ تمہارے لیے خوشخبری ہو اور تاکہ تمہارے بے قرار دل مطمئن ہو جائیں، اور مدد تو ہر حال میں اللہ کی جانب سے ہوتی ہے کیونکہ وہی بلاشبہ سب پر غالب آنے والا اور حکمت والا ہے۔ ۱۰

جنگ میں کامیابی کی معنوی طاقت

جس معنوی طاقت کا اس آیت میں بیان ہو رہا ہے اس کا صحیح اندازہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ فریقین کی مادی قوتوں کا پیش کر دینا ضروری ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کرام کی تعداد اس جنگ میں تین سو سے کسی قدر زیادہ تھی۔ یہ تعداد مختلف روایتوں میں تین سو پانچ سے تین سو انیس تک بتائی گئی ہے۔ ان میں مہاجرین ۷۴، یا ۷۷ تھے باقی سب انصار تھے۔ ان کے ساتھ دو گھوڑے اور ستر اونٹ تھے۔ گھوڑوں میں ایک مقداد کا دوسرا مرثد غنوی کا تھا۔ اس سلسلے میں زبیر بن العوام اور مصعب بن عمیر کے نام بھی آئے ہیں۔ ہر اونٹ کی سواری میں تین تین شخص شریک تھے اور باری باری سوار ہوتے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے شریک مرکب علیؓ اور ابولبابہؓ تھے جن کو الروحا سے مدینہ منورہ میں قائمقام کی حیثیت سے واپس کر دیا تھا۔ دونوں نے حضور اقدس کی خدمت میں عرض کی کہ ہم خوشی سے پیدل چلیں گے آپ سواری فرمائیں۔ فرمایا نہ تم دونوں مجھ سے زیادہ پیادہ روی میں طاقتور ہو اور نہ میں ثواب حاصل کرنے میں بے نیاز ہوں۔

قریش کے لشکر کی تعداد کم از کم ساڑھے نو سو تھی اور ان کے ساتھ ایک سو گھوڑے تھے۔ اونٹوں کی کثرت کا اندازہ اسی سے ہو سکتا ہے کہ ہر منزل پر ۹ یا ۱۰ اونٹ ذبح کرتے تھے۔ زرہیں اور باقی ساز و سامان جنگ بھی ان کے پاس بہت زیادہ تھا۔

بلاشبہ مادی طاقت میں اہل ایمان اہل کفر کے مقابلہ میں کچھ نہ تھے۔ اس تقابلی مطالعہ پر سب پریشان اور خوف زدہ تھے کیونکہ ان کی حالت بڑی ہی بے بسی کی تھی قدرتی طور پر یہ لوگ ہراساں ہوئے۔ صحیح مسلم میں ہے حضرت عمر فرماتے ہیں کہ جب حضور نے ملاحظہ فرمایا کہ مسلمانوں کی افرادی قوت بہت کم ہے اور کافروں کی بہت زیادہ ہے تو قبلہ کی طرف منہ کر کے کھڑے ہوئے اس وقت حضور تہبند باندھے اور چادر اوڑھے ہوئے تھے اور دعا مانگنی شروع کی۔ اسی طرح اپنے پروردگار سے استغاثہ کرتے رہے اور دعا مانگتے رہے۔ یہاں تک کہ دوش مبارک سے چادر سرک گئی۔ حضرت ابوبکر نے چادر اٹھا کر پھر اوڑھا دی۔ اور ایک طرف سے حضور کو دبوچ

کہ عرض کیا یا رسول اللہ بس آپ کی دعا کافی ہو چکی۔ اللہ عنقریب اپنا وعدہ پورا فرمائے گا۔ سعد بن معاذ نے حضور اقدس کے لیے ایک ٹیلہ پر ایک سائبان سا بنا دیا تھا۔ ابوبکر حضور اقدس کے ساتھ تھے۔ سعد بن معاذ دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔

اہلِ ایمان کا جنابِ الٰہی میں استغاثہ

۹۔ جب تم اپنے پروردگار سے استغاثہ کر رہے تھے پس اس نے تمہاری فریاد کو شرف پذیرائی دیا۔ یعنی جب حکم الٰہی کے تحت بے بسی، بے کسی کی اور افرادی قوت نہ ہونے کے باوجود میدان جنگ میں طاعت کی سرشاریاں دکھانے کے لیے تیار ہو گئے تو مادی طاقت کی تلافی معنوی طاقت سے اس طرح کی کہ اللہ کی جناب میں اغثنا یا غیاث المستغثین کہہ کر دعائیں مانگنے لگے۔ یہ اندازِ خطاب کہہ رہا ہے کہ یہ وہی ہیں جو قافلہ تجارت کا گھر سے ارادہ کر کے آئے تھے۔ اور ان میں کوئی بھی حربِ زبانی نہیں کر رہا تھا نہ یہ دل کے غریب تھے، نہ عقل کے بودے تھے اور نہ احقاق حق کے تقاضوں سے نا آشنا تھے۔ ان کو پتہ تھا کہ نبوت کا مزاج کیا ہے اور اسلام کا مطالبہ کیا ہے۔ یہ حالات کے تحت بات کر رہے تھے۔ ظاہر یہی ہے کہ سب دعائیں کر رہے تھے سب رو رہے تھے اور سب اللہ سے مدد مانگ رہے تھے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ جب صحابہ نے یقین کر لیا کہ لڑائی ضرور ہو گی تو انہوں نے اللہ سے دعا کی۔ لیکن احادیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تذکرہ صرف اس لیے آیا ہے کہ آپ کی دعا کا والہانہ انداز سب کو مبہوت و حیران کر رہا تھا۔ سوچنے کی بات ہے کہ نصرت کا وعدہ ہو چکا ہے۔ آپ لوگوں کو کامیابی کی خوشخبری دے رہے ہیں۔ مگر باوجود وعدہ کے محض اس لیے کہ خدا خدا ہے بندہ نہیں ہے بے نیاز ہے سب اس کے محتاج ہیں وہ سب سے غنی ہے کیا معلوم وعدہ کب پورا کیا جائے گا۔ حضرت علی فرماتے ہیں:

میں بدر کے دن لڑائی کے لیے میدان جنگ میں گیا واپس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں پڑے ہوئے یا حیّ یا قیوم فرما رہے ہیں۔ پھر میں میدانِ جنگ میں گیا لڑا پھر واپس گیا تو میں نے حضور کو اسی حال میں دیکھا۔ (فتح الباری)

سجدے سے سر اٹھایا جاتا ہے۔ آسمان کی طرف ہاتھ اٹھے ہوئے ہیں۔ تن بدن کا ہوش باقی نہیں ہے۔ کاندھوں سے چادر سرک سرک گرگئی ہے لیکن کامل انہماک و استغراق دل کی ساری قوت و توجہ، اصرار و الحاح کے ساتھ زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں۔

یا اللہ۔ آپ کو یاد دلاتا ہوں آپ کا عہد، آپ کا وعدہ، یا اللہ اگر آپ چاہیں تو آپ کی عبادت نہ ہو۔ یا اللہ اگر یہ جماعت تباہ ہوگئی اسلام والوں کی تو آپ کی زمین پوجا نہ ہوگی۔

وعدہ اور بشارت کے باوجود رب اور رب کی مدد کو جس بے کلی اور اضطراب سے بقول عبداللہ بن مسعود بدر میں آج تلاش کیا جا رہا ہے کہ

ہم نے اپنی گم شدہ چیز کو کوئی تلاش کرتا ہو نہیں سنا اس طرح جس طرح حضور اقدس بدر کے دن اپنے رب سے نصرت تلاش کر رہے تھے۔

مالک کے قدموں پر اس لوٹنے والے کو دیکھ دیکھ کر دوسروں سے رہا نہیں جاتا ہے جیسا کہ بخاری میں ہے تب ابوبکر نے آپ کا دست مبارک پکڑ لیا اور کہا کہ بس کیجئے یا رسول اللہ۔ تفصیل مسلم میں ہے۔

آئے ابوبکر اور آپ کی اتری ہوئی چادر کو آپ کے اوپر ڈال دیا۔ پھر آپ سے لپٹ گئے اور فرمایا ہے کہ اے اللہ کے نبی ضرور پورا کرے گا آپ سے کیا ہوا اپنا وعدہ۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ مواقع دو ہیں اور دونوں میں شخصیتیں دو ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکرؓ پہلا موقعہ ہجرت کا ہے غار ثور میں دوسرا موقعہ بدر کا ہے عریش میں۔ ہجرت کے موقعہ پر غار ثور میں ابوبکر ڈر رہے ہیں غمگین ہو رہے ہیں اور حضور اقدس ابوبکر کو لا تحزن ان اللہ معنا کہہ کر تسلی دے رہے ہیں۔ حضور مطمئن اور ابوبکر بے چین و بے قرار ہیں لیکن یہاں ابوبکر مطمئن ہیں اور حضور اقدس پر اضطراب اور بے قراری کی کیفیت طاری ہے۔ اور حضرت ابوبکر یہ کہہ کر حضور کو تسلی دے رہے ہیں بس کیجئے آپ سے کیا ہوا وعدہ ضرور پورا کرے گا۔

علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ:

یہ وہم بھی نہ ہونا چاہیے کہ اللہ پر اعتماد کی دولت اس وقت حضور کے مقابلہ میں حضرت ابوبکر کے پاس زیادہ تھی۔ بلکہ اصل واقعہ یہ ہے کہ حضور اضطراب اور بے چینی کا باعث صحابہ کی شفقت تھی۔ آپ چاہتے تھے کہ ان میں معمولی قوت آئے کیونکہ صحابہ مادی قوت سے تہی دامن تھے۔ اور یہ اسلامی زندگی میں جنگ کا پہلا موقعہ تھا اس لیے آپ نے دعا میں زیادہ توجہ اور خیال سے کام لیا۔ جب حضرت ابوبکر نے فرمایا کہ اے اللہ کے پیغمبر بس کیجیے تو آپ کو ابوبکر کی طمانیت اور قوت سے پتہ لگ گیا کہ مقصد حاصل ہو گیا اس لیے آپ نے فرمایا سیھزم الجمع۔ اور ابن اسحاق کی روایت میں ہے کہ آپ نے ابوبکر ہی سے مخاطب ہو کر فرمایا ابشر یا ابا بکر اتاک نصر اللہ ابوبکر بشارت ہو اللہ کی مدد آگئی۔

علامہ السید رشید رضا نے یہاں عجیب نکتہ آفرینی کی ہے وہ بھی گوش گزار فرمالیجیے:

دونوں مقام ہجرت اور بدر الگ الگ ہیں اور دونوں کے تقاضے جدا جدا ہیں۔ ہجرت کے لیے جب آپ مکہ سے نکلے تو آپ نے اپنے بچاؤ کے لیے اسباب و وسائل کی حد تک سب کی تکمیل فرمالی تھی زادِ راہ لے لیا، دو اونٹنیاں فراہم کر لیں۔ راستہ بتانے کے لیے راہبر لے لیا۔ رات کی تاریکی میں کاشانۂ مبارک سے نکل کر چھ میل کے فاصلہ پر غارِ ثور میں چھپ گئے۔ نشانِ قدم ختم کرنے کے لیے ابوبکر نے کندھوں پر بٹھالیا۔ غار میں آپ نے چھپ کر تین دن اور تین راتیں گزاریں۔ گویا مکہ سے نکلنے کی ساری تدبیریں کر لی گئیں۔ یعنی

۱۔ حضرت ابوبکر نے پہلے سے دو سانڈنیاں ہجرت کے لیے تیار کر لی تھیں۔

۲۔ مکہ مکرمہ سے جنوب کی جانب سفر اس لیے اختیار کیا کہ یثرب شمال میں تھا۔ اور اس کی طرف جانے والے تمام راستے شمال ہی کی طرف جاتے تھے لہٰذا پیچھے آنے والے لوگ ان ہی راستوں کے آس پاس سرگرم تلاش ہوتے۔

۳۔ اغلب ہے کہ غارِ ثور میں پناہ لینے کا فیصلہ بھی پہلے کر لیا ہوگا۔

۴۔ حضرت ابوبکر نے اپنے بیٹے عبداللہ کو اس کام پر مامور کر دیا تھا کہ دن بھر قریش کی باتیں سن کر جو کچھ ضروری سمجھے رات کے وقت غار میں آکر بتادے۔

۵۔ حضرت اسماء۔ رات کی تاریکی میں کھانا پہنچاتی تھیں ۔

۶۔ عامر بن فہیرہ، حضرت ابوبکر کے آزاد کردہ غلام تھے ان کو تاکید کر دی گئی تھی کہ دودھ والی بکریاں روک رکھیں اور رات کے وقت ان کو غار کے دہانے پر لے آیا کرے۔

۷۔ صبح کے وقت عامر بن فہیرہ بکریوں کا ریوڑ دہانہ غار سے دُور تک مکہ کی طرف لے جاتے تھے تاکہ کسی آنے والے کے پاؤں کا نشان باقی نہ رہے۔

۸۔ ایک شخص عبداللہ بن اریقط کو رہبری کے لیے پہلے سے مقرر کیا تھا۔

گویا مادی اسباب میں سے سب کی پابجائی کر لی تھی اور اب نتیجہ اللہ پر چھوڑ دیا تھا اسی کا نام توکل ہے۔ اللہ سبحانہ، نے آپ کو اطمینان، سکینۃ سے مالامال فرمایا۔ اور ارواحِ ملائکہ سے آپ کو قوت دی۔ ابوبکر چونکہ اس مقام پر نہ تھے اس لیے غمگین تھے۔

بدر کے روز معاملہ بالکل برعکس تھا۔ جنگ میں وہ اسباب و وسائل بالکل ناپید تھے جن کے بل بوتے پر کامیابی ہوتی ہے۔ نہ افرادی قوت تھی اور نہ سامان خوراک تھا۔ اور نہ ہی اسلحہ تھا نہ ہی سواری تھی اور کسی کمک کے آنے کی کوئی توقع نہ تھی۔ مدینہ سے کسی تیاری کے بغیر صرف چالیس آدمیوں کے مقابلہ کی نیت سے نکلے تھے۔ حالات نے رُخ پلٹا اور ایک لشکر کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ مادی اسباب کے ساتھ معنوی قوت بھی مفقود تھی۔ خود پڑھ چکے ہو ان فریقاً من المومنین لکارھون۔ ان حالات میں ہلاکت کا یقینی خطرہ تھا۔ معنوی اور مادی اسباب کے فقدان نے اسے یقینی بنا دیا تھا۔ آپ پر بے تابی، بے قراری اور اضطراب و خوف کی کیفیت طاری تھی۔ ایسا نہ ہو کہ مختصر سی جماعت ختم ہو کر رہ جائے۔ حضرت ابوبکر کو ان حالات کا علم نہ تھا۔ آپ نے حضور کو غمگین، پریشان اور بے چین و بے قرار دیکھ کر آپ کو تسلی دی۔ اور اللہ سبحانہ، کا وعدہ یاد دلایا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے موقعہ پر توکل اور بدر میں خوفِ الٰہی کا مظاہرہ کیا۔ دونوں مقام پر شانِ نبوت نمایاں طور پر نظر آ رہی ہے۔ ہجرت میں اسباب کی پابجائی کے بعد اللہ پر نظر تھی اور بدر میں اللہ کے قانونِ اجتماعی کے پیشِ نظر خوف، اضطراب کام کر رہا تھا۔

اب اس خلش کی کوئی گنجائش نہیں رہی کہ جب اللہ سبحانہ، کی طرف سے فتح و نصرت

کا وعدہ تھا تو اضطراب کیوں تھا۔ بات صاف ہے کہ اللہ سبحانہ کی جانب سے بے شک تھا لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نظر اللہ سبحانہ کی شان استغنا اور بے نیازی پر تھی کہ مالکِ مطلق ہے جو چاہے کر ڈالے۔ مقامِ عبدیت کا ادب یہی ہے کہ باوجود وعدہ حق کے اس سے ڈرتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ کوئی چیز کسی حال میں اس پر واجب نہیں ہے۔ بندہ کا کام مانگنا ہے وہ جو کچھ عطا فرماتے وہ اس کا فضل وانعام ہے۔
شاہ عبدالحق محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ حضور اقدس کا اس طرح والہانہ دعا مانگنا اس لیے نہیں کہ ان کو اللہ کے وعدے پر یقین نہیں بلکہ اس لیے ہے کہ ان پر اللہ سبحانہ کی شانِ استغنا کا خوف غالب تھا۔
دعا قبول ہوئی اور آپ میدانِ جنگ میں تشریف لاتے اور آکر بتایا کہ یہاں مشرکینِ مکہ کے رؤسا کی قتل گاہیں ہیں اور نام بنام ہر ایک کی قتل گاہ بتائی۔ بتانے والے بتاتے ہیں کہ جو جس کی قتل کی جگہ بتائی گئی وہیں وہ قتل کیا گیا۔

افرادی قوت کی تلافی

۹۔ یہ کہہ کر کہ میں ایک ہزار فرشتوں سے کہ یکے بعد دیگرے آئیں گے تمہاری ضرور مدد کروں گا۔ اس طرح کی آیت آلِ عمران میں پارہ چہارم کے ربع اوّل پر گزر چکی ہے وہاں کے فوائد ملاحظہ کر لیے جائیں۔ البتہ اس جگہ فرشتوں کی تعداد تین سے پانچ ہزار تک بیان کی گئی تھی۔ اگر واقعہ ایک ہے تو کہا جائے گا کہ اوّل ایک ہزار کا دستہ آیا ہوگا۔ پھر اس کے پیچھے دوسرے دستے آئے ہوں جن کی تعداد تین سے پانچ ہزار تک پہنچی شاید لفظ "مردفین" اسی طرف اشارہ ہو[1]
یہ دعا کی قبولیت کے نتیجے میں پہلا انعام ہے۔ مسلمانوں کے پاس افرادی قوت کی کمی تھی۔ سب سے پہلے اس کی تلافی کی گئی کہ تم تین سو ہو اور تمہارے مقابلہ پر کفر کی طاقت ایک ہزار ہے۔ ہم اس کی تلافی اس طرح کرتے ہیں کہ تمہیں ایک ہزار فرشتوں کی امداد روانہ کرتے ہیں۔ اور ان کے ظاہر ہونے کی یہ شکل بتائی کہ ان کے دستے

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

کے بعد اوپر نیچے کے بعد پرے آئیں گے۔ میدانِ جنگ میں فوجیوں کا یہ خاص نفسیاتی علاج ہے کہ جب امداد کے لیے کمک کے بعد کمک آرہی ہو تو فوجیوں کا حوصلہ ہر کمک کی آمد پر دُونا ہو جاتا ہے اور اسی اعتبار سے مدِمقابل کے اعصاب ڈھیلے پڑ جاتے ہیں پیچھے چوتھے پارہ میں پڑھ آئے ہو۔

اذ تقول للمومنين الن يكفيكم ان يمدكم ربكم بثلاثة الاف من الملائكة منزلين

کیا تمہارے لیے یہ بات کافی نہیں ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے تمہاری تین ہزار نازل کردہ فرشتوں سے مدد کرے۔

اور اس کے آگے ہے:

بلى ان تصبروا وتتقوا ويأتوكم من فورهم هذا يمددكم ربكم بخمسة الاف من الملائكة مسومين ۔

ہاں اگر تم صبر کرو گے اور تقویٰ اختیار کرو گے اور دشمن کا تم پر فوری حملہ ہوگا تو تمہارا پروردگار تمہاری پانچ ہزار نشان والے فرشتوں سے مدد کرے گا۔

یہاں ایک ہزار اور وہاں تین اور پانچ ہزار فرشتوں کی امداد بدر ہی میں آئی ہے یا کسی اور جگہ۔ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں لکھا ہے کہ تین اور پانچ ہزار والی امداد میں شارحین قرآن دو راستے پر ہیں۔

ایک یہ کہ یہ اُحد میں ہوئی ہے اور یہ امداد مشروط تھی، شرط پوری نہ ہوئی، امداد بھی نہیں آئی۔ یہ مشہور مفسر ضحاک اور مقاتل کی رائے ہے۔

دوسرے یہ کہ یہ بدر کے دن کی بات ہے۔ یہ عبد اللہ ابن عباس، مجاہد اور قتادہ کا خیال ہے۔ ان کا موقف یہ ہے کہ لوگوں نے اللہ سے دُعا مانگی تو اللہ سبحانہٗ نے فرشتوں کی امداد تدریجی طور پر دی، اوّل ایک ہزار پھر تین ہزار اور پھر پانچ ہزار حافظ ابن کثیر نے بھی بڑے بڑے تابعین کے حوالہ سے دونوں باتیں لکھی ہیں۔ حسن بصری، عامر الشعبی، ربیع ابن انس کہتے ہیں کہ تین اور پانچ ہزار والی بات حضور نے بدر والے دن فرمائی تھی۔ بہر حال کچھ ہو دونوں میں یہ فرق ضرور ہے کہ

ہزار والی امداد غیر مشروط ہے جب کہ تین اور پانچ والی بات مشروط ہے

فرشتے بدر میں کیوں آئے ؟

۱۰- اور اللہ نے فرشتوں والی بات صرف اس لیے کی کہ تمہارے لیے خوشخبری ہو اور تاکہ تمہارے بے قرار دل مطمئن ہو جائیں ، اور مدد تو ہر حال میں اللہ کی جانب سے ہوتی ہے وہی بلاشبہ سب پر غالب آنے والا اور حکمت والا ہے - اس آیت میں نفی و استثناء کے ذریعے قصر کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرشتوں کی امداد صرف اس لیے روانہ کی ہے کہ

۱- مسلمانوں کو خوشخبری ہو کہ اللہ نے جس نصرت کا وعدہ فرمایا تھا وہ آگئی -

۲- افرادی قوت کے اضافہ سے مسلمانوں کے دلوں میں جو بے چینی اور بے قراری ہو رہی تھی وہ اطمینان و سکینت سے تبدیل ہو -

مطلب یہ ہے کہ ملائکہ کی امداد کی غرض و غایت یہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے لڑائی کی فتح مندی میں فرشتوں کا یہی حصہ تھا - چنانچہ محققین تفسیر و حدیث کی رائے بھی ہے کہ فرشتوں کا نزول مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط رکھنے کے لیے ہوا تھا - اور حضرت عمرؓ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ مادی طور پر بھی صحابہ کو ملائکہ کے ساتھ ہونے کا یقین تھا - حضرت عمرؓ فرماتے ہیں بدر والے دن بلاریب فرشتے ہمارے ساتھ تھے - یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ ملائکہ کے ذریعے مسلمانوں میں افرادی قوت کا اضافہ کیا گیا تھا - لیکن لڑائی میں صحیح روایات میں ملائکہ کی شرکت ثابت نہیں ہے اور نہ اس کی ضرورت پیش آئی - اگرچہ علماء کی رائے یہ بھی ہے کہ ملائکہ نے قتال بھی کیا ہے لیکن اس کی تائید صحیح روایات سے نہیں ہوتی ہے -

آخر میں ارشاد ہے وما النصر الا من عند اللہ مدد تو صرف اللہ کی ہے مطلب یہ ہے کہ اسباب مادی ہوں یا معنوی ان پر آسرا نہ ہونا چاہیے - سہارا تو اللہ کی نصرت اور امداد پر ہونا چاہیے اس لیے دعا و طلبگاری میں اسی کی طرف متوجہ ہونا چاہیے نہ کہ ان وسائل کی طرف - حضرت مولانا اشرف علیؒ کا بیان القرآن میں استنباط لطیف ہے کہ یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ باوجود اسباب ، غیر موثر ہونے اور مسببات کے

منجانب اللہ ہونے کے پھر بھی اسباب میں حکمتیں ہیں۔ اسباب پر عمل پیرا ہو لیکن خالق اسباب سے نظر نہ ہٹے۔ دیکھ لیجئے اسی جنگ بدر میں خالق اسباب کی طرف اتنا انہماک یعنی کامیابی کا حقیقی اور واقعی اختیار جس کے قبضے میں ہے اس سے مانگنے میں اس قدر زور صرف ہو رہا ہے کہ دیکھنے والے آپ کی بے قراری سے بے قرار ہو رہے ہیں اور دوسری طرف اسباب کی طرف اتنی توجہ کہ اللہ سبحانہ جنگ میں جن وسائل سے کامیابی عطا فرماتے ہیں ان وسائل کے اختیار کرنے میں اب کوئی دقیقہ نہیں چھوڑ رہے ہیں۔ میدان جنگ میں بہترین موقع کا انتخاب فوج کی صف بندی، صفوں کی ترتیب، اسلحہ کے استعمال میں ترتیب، تیر کب چلائیں، تلوار کب استعمال کی جائے، پتھروں اور ڈھیلوں سے ان پر کس وقت حملہ کیا جائے۔ ہر ایک کا ایک خاص فاصلہ مقرر کر دیا۔ دشمن کی ہر حرکت و سکون کی نگرانی۔ یہاں تک کہ دست مبارک میں خود تیر لے کر صفوں کو درست فرما رہے تھے۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ جو پیدا کر رہا ہے اس سے بھی مانگا جائے اور جن راہوں اور وسائل سے کامیابی آتی ہے ان کی بھی پاسبانی کی جائے۔ تعلیم کی یہی جامعیت اسلام کی خصوصیت ہے اسلام کو الدین القیم قرار دیتے ہوئے قرآن میں ارشاد ہے،

فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیہا لا تبدیل لخلق اللہ

اللہ کی فطرت جس پر اللہ نے لوگوں کو پیدا کیا ہے اللہ کی تخلیق کو بدل دینا نہیں ہے۔

اس کا مطلب یہی کہ اللہ کی مملکت میں اللہ نے کامیابی کے جو قوانین بنا دیے ہیں اسلام ان میں تبدیلی پیدا نہیں کرتا۔

ولتطمئن قلوبکم سے یہ بھی مترشح ہو رہا ہے کہ طبعاً تسلی اسباب ظاہری سے ہوتی ہے۔ تدبیریں دونوں ہیں دعائی تدبیر اور عقلی تدبیر۔ بدر میں کامیابی کے لیے دونوں تدبیریں اختیار کی گئیں۔ عقلی تدبیر یہ کہ جنگ سے پہلے رات کے وقت لشکر اسلام کو قطاروں میں تقسیم کر کے باقاعدہ صف بندی کی۔ اس کے بعد ان کا معائنہ کیا اور جہاں آگے پیچھے کوئی نظر آیا اسے درست کیا۔ اس کے ساتھ ہی آپ نے فوج کے مختلف حصوں پر افسر متعین فرمائے اور ان کے الگ الگ علمبردار بھی مقرر کیے۔ پھر فوج کو ہدایات دیں اور نصیحت فرمائی کہ صف بندی نہ توڑیں جب تک حکم نہ ہو لڑائی شروع نہ کریں۔ دشمن

دُور ہو تو تیر نہ چلائیں زد پر آئے تو تیر چلائیں اور قریب آئیں تو پتھر ماریں اور زیادہ نزدیک آئیں تو تیروں سے رد کیں۔ اور سب سے آخر میں تلوار نکالیں۔ یہ تھی عقلی تدبیر۔ اس کے ساتھ اپنے دعائی تدبیر فرمائی۔ یہ آپ پہلے پڑھ چکے کہ آپ نے کس قدر توجہ الحاح اور اضطراب سے دُعا مانگی۔

یہاں یہ بات بھی سمجھ لینی چاہیے کہ تدبیریں دونوں ہیں دعائی بھی اور عقلی بھی لیکن چونکہ دُعائی تدبیریں مانگا صرف ایک سے جا رہا ہے جیسا کہ وما النصر الا من عند اللہ میں بتایا ہے۔ اور عقلی میں جن ذرائع اور وسائل سے کامیابی آتی ہے وہ بے شمار ہیں اور انسان کی نگاہ زیادہ ان ہی وسائل پر پڑتی ہے اس لیے اسلام نے زیادہ اہمیت دُعائی تدبیر کو دی ہے۔ قرآن میں

وللہ غیب السماوات والارض والیہ یرجع الامر کلہ فاعبدہ وتوکل علیہ

آسمان و زمین کی پوشیدہ چیزیں اللہ کی ہیں سارا معاملہ اللہ کی طرف سے پس اسی کی عبادت کرو اور اسی پر بھروسہ کرو۔

اس کا یہی مطلب ہے کہ عقل سے تم زیادہ سے زیادہ کامیابی کے ان ہی قوانین کو معلوم کر سکتے ہو جو تمہارے حواس اور عقل کی گرفت میں آ سکتے ہیں لیکن عالم غیب کے قوانین کا وہ حصہ جو تمہاری حواس اور ادراک سے بالا ہے۔ اس کے متعلق تم اس کے سوا کچھ بھی نہیں کر سکتے کہ اللہ سے مانگتے جاؤ اور اسی پر بھروسہ کرو گویا عقل و حواس کی راہوں سے جو معلومات حاصل ہو سکیں ان کا تقاضا پورا کرنے کے بعد اللہ پر اعتماد کرو۔ وہ آخری پناہ ہے۔ وہی مختار کل ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا ہے کہ وہ اپنے پر سہارا کرنے والوں کو بے سہارا چھوڑ دے من یتوکل علی اللہ فھو حسبہ کا یہی مطلب ہے۔

بہرحال اس آیت دُعائی تدبیر کا سب سے پہلا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ ایک ہزار فرشتوں کی تدریجی کمک سے غزوہ بدر میں مسلمان فوج کی افرادی قوت میں اضافہ کیا گیا۔ یہ تو حسی طور پر آنکھوں سے نظر آ رہی تھی اور معنوی طور پر اس محسوس کا فائدہ یہ ہوا کہ بے چینی اور مضطرب دلوں میں اطمینان ہو کر غلبہ اور فتح کی توقعات بشارت بن کر سامنے آ گئیں۔ گویا یہ دُعائی تدبیر کا پہلا نتیجہ ہے۔

إِذْ يُغَشِّيكُمُ النُّعَاسَ أَمَنَةً مِّنْهُ وَيُنَزِّلُ عَلَيْكُم مِّنَ السَّمَاءِ
مَاءً لِّيُطَهِّرَكُم بِهِ وَيُذْهِبَ عَنكُمْ رِجْزَ الشَّيْطَانِ وَ
لِيَرْبِطَ عَلَىٰ قُلُوبِكُمْ وَيُثَبِّتَ بِهِ الْأَقْدَامَ ﴿١١﴾

وہ وقت یاد کرو جب اللہ سبحانہ نے چین کی خاطر تم پر غنودگی طاری کر دی تھی۔[11] اور آسمان سے تم پر پانی برسا دیا تھا، کہ تمہیں پاک وصاف ہونے کا موقعہ عطا کرے، اور تم سے شیطان کی گندگی کو دور کر دے اور تاکہ تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تاکہ تمہارے قدم جما دے۔[12]

دُعائی تدبیر کے مزید نتائج

اس آیت میں دُعائی تدبیر کے دو محسوس نتائج کی رونمائی فرمائی ہے ایک یہ کہ ساری گھبراہٹ اور ساری بے قراریوں کے باوجود اللہ نے تمہیں نیند کی نعمت عطا فرمائی۔ جس پر نیند غالب ہو اسے خوف کا احساس نہیں ہوتا اور جو ڈرتا ہے اسے نیند نہیں آتی ہے۔ معرکہ جنگ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے بہادروں کی آنکھ سے نیند اُڑ جاتی ہے مگر مایہ تسکین عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی دُعائی تدبیر کا اعجاز یہ تھا کہ بدر کے کارزار میں مسلمان سپاہیوں کی

بے خطری اور بے خوفی کے لیے ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ کر دیا گیا تاکہ کسی خوف و خطر کا احساس کیے بغیر وہ اپنے فرض کو انجام دیں۔ دوسرا یہ کہ بدر کے میدان میں جہاں مسلمانوں نے صفیں قائم کی تھیں وہ جگہ بلند تھی اور جہاں سے قریش کی فوج لڑ رہی تھی وہ جگہ نشیب میں تھی۔ اللہ سبحانہ نے کفار کی شکست کا ایک ظاہری سامان پیدا کر دیا کہ عین اس وقت میدان جنگ میں موسلا دھار بارش ہو گئی۔ جس نے ادھر تو مسلمانوں کی طرف گرد و غبار بٹھا کر مسلمانوں کے پاؤں جما دیے ادھر کافروں کی طرف پانی کا ریلا چلا گیا کہ ان کو زمین پر قدم رکھنا مشکل ہو گیا۔ آج کل فن جنگ میں جس بات پر سب سے زیادہ زور دیا جاتا ہے وہ یہ ہے کہ سپاہیوں کی سپرٹ یعنی معنوی قوی درست رکھے جائیں۔ یہاں اسی حقیقت کی طرف اشارہ کیا ہے۔ صرف اس بات نے کہ پانی کی ضرورت باقی نہیں رہی، ریت میں دھنسنے کا خطرہ جاتا رہا اور نہانے دھونے کی وجہ سے جسم میں تازگی آ گئی۔ لوگوں کے اندر جس درجہ خود اعتمادی اور سرگرمی پیدا کر دی ہو گی اس کا اندازہ صرف اہل نظر ہی کر سکتے ہیں۔

بعض اوقات قدرتی حوادث کا ایک معمولی سا واقعہ بھی فتح و شکست کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ میجر جنرل محمد اکبر خاں نے لکھا ہے کہ ۱۹۳۷ء میں برطانوی فوج آزاد قبائل میں فقیر ایپی کے خلاف یورش کرتی ہوئی مقام گرام تک پہنچ گئی۔ مئی کا مہینہ تھا کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ اس ماہ میں بارش ہو سکتی ہے۔ فوج نے نالہ کے بہاؤ کی زمین فوج کے پڑاؤ کے لیے اس لیے تجویز کی تھی کہ یہاں فوج کے لیے جگہ کافی ہے اور پھر یہاں قبائلیوں کے شبخون سے محفوظ تھا۔ انگریزی فوج کی نفری چالیس ہزار سے زیادہ تھی اور ہر قسم کے اسلحہ سے مسلح تھی۔ قبائلیوں کے پاس صرف رائفل تھی۔ پڑاؤ کے بعد فوج کے برطانوی کمانڈر نے فقیر ایپی کے پاس پیغام بھیجا کہ اب بھی موقعہ ہے ہتھیار ڈال دو ورنہ تباہ کر دیے جاؤ گے۔ فقیر ایپی کی مدد مسعودی قبیلہ کر رہا تھا جس کی تعداد چار سو سے کم تھی۔ فقیر ایپی نے برطانوی فوج کو کہلا بھیجا کہ میرا پروردگار اللہ ہے۔ میں آخری دم تک لڑوں گا۔ جب فوجی افسروں کی کانفرنس میں فقیر ایپی کا جواب سنایا گیا تو سب لوگ ہنس پڑے۔ شرکائے کانفرنس کمانڈر سے حملہ کے احکام حاصل کر کے اپنے اپنے خیموں کو واپس ہو رہے تھے کہ آسمان پر دفعتہً ایک

بدلی نمودار ہوئی۔ جب اس میں سے گرج کی آواز آئی تو سب خوش ہوئے کہ اب گرمی کی شدت کم ہوگی اور موسم خوشگوار ہو جائے گا۔ دیکھتے ہی دیکھتے اولے پڑے اور تھوڑی دیر میں ژالہ باری نے اتنی شدت اختیار کی کہ تمام پہاڑ سفید ہو گئے۔ پھر بارش آئی اور اتنی تیز آئی کہ اولے بہہ کر ایک ٹیلہ کی صورت میں ہمارے کیمپ کی طرف بڑھے۔ اور جو خیمے نشیب میں تھے ان کو سیلاب بہا کر لے گیا۔ پھر یہی نہیں کہ اس سیلاب سے فوج کو نقصان ہوا اور حرب وضرب سے لے کر رسد تک کا سامان ضائع ہو گیا بلکہ بہت سامان بہہ کر فقیر ایپی کے کیمپ کی طرف چلا گیا جو دریا کے بہاؤ کی جانب تھا اور قبائلیوں کے ہاتھ آیا۔

اس کے نتیجہ میں برطانوی کمانڈر کو مجبوراً حملہ ملتوی کرنا پڑا۔ اسی قسم کی دشواریاں بدر میں بارش سے قریش کے لشکر کو بھی ہو پیش آئی۔ ان کے بار بردار اونٹ دلدل میں پھنس گئے۔ نقل وحمل دشوار ہو گیا۔

میدان کارزار میں نیند کا آنا

۱۱۔ وہ وقت یاد کرو جب اللہ سبحانہ نے چین کی خاطر تم پر غنودگی طاری کر دی۔ نیند اطمینان وراحت کا ذریعہ بھی ہے اور دل کے اطمینان اور دماغ کی یکسوئی کی نشانی بھی۔ جس کا ذہن پریشان اور دماغ منتشر ہو اس کی نیند اُڑ جاتی ہے۔ اور ایسے شخص کے لیے کوئی کام عزم وحوصلہ اور استقلال وعزیمت کے ساتھ ممکن نہیں ہوتا۔ اسی وجہ سے دورانِ جنگ فوج کے لیے سونے کا موقعہ ملنا اور اس موقعہ سے فائدہ اٹھانا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ نیند کی اسی اہمیت کے پیش نظر دشمن فوج کے حوصلے پست کرنے کی ایک تدبیر یہ بھی ہے کہ اس کو سونے کا موقعہ نہ دیا جائے یہ اللہ کا بڑا ہی فضل ہے کہ کسی فوج کو سونے کا موقعہ مل جائے اور وہ اس سے فائدہ اٹھا سکے۔ کیونکہ اس سے فائدہ اٹھانا صرف موقعہ ملنے ہی پر نہیں بلکہ اس کا بہت کچھ انحصار سونے والے کی ذہنی وقلبی صلاحیت پر بھی موقوف ہے۔

النعاس امنۃ کا مطلب یہ ہے کہ ایسی غنودگی طاری کر دی گئی جو امن وسکون والی تھی اور جس سے مسلمانوں کا خوف وہراس اور ہر قسم کی پریشانی اور خطرات دور

ہو گئے اور سارا غم غلط ہو گیا۔

بدر میں یہ نیند کس وقت آئی۔ کچھ کی رائے میں یہ عین میدان جنگ میں آئی۔ لیکن دلائل نبوت میں حضرت علی کا بیان ہے کہ بدر کی پہلی رات کوئی نہ تھا جو آرام سے سو نہ گیا ہو، ہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم رات بھر عبادت کرتے رہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ جس کے دل میں خوف و خطر ہو وہ کبھی آرام سے سو نہیں سکتا۔ اس نیند کا طاری ہونا بے خوفی کا القا تھا۔

قرآن کا انداز بتا رہا ہے کہ نیند کا معاملہ جنگ سے پہلے عمل میں آیا کیونکہ نیند کا ذکر ان انعامات کے سلسلے میں ہو رہا ہے جو بالفعل جنگ شروع ہونے سے پہلے ظہور میں آئی ہیں۔ پہلے فرشتوں کی امداد کی بشارت ہے۔ بعد کی آیت بارش کے نزول کا ذکر ہے۔ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ دونوں باتیں جنگ سے پہلے ہوئی ہیں۔ پھر ان دونوں کے درمیان میں ایک ایسی بات کیسے آ سکتی ہے جس کا تعلق بالکل حالت جنگ سے ہو یہ بلاغت قرآن کے خلاف ہے اس لیے حضرت علی کا بیان بالکل درست معلوم ہوتا ہے کہ یہ انعام الٰہی لڑائی سے پہلے کی پہلی رات میں ہوا ہے۔

بدر کی رات میں نیند آنا بھی اللہ کا انعام ہے اور دعائی تدبیر کے نتائج میں سے ہے۔ ورنہ ایسے سنگین حالات میں کسے نیند آتی ہے۔ ایسے مواقع پر تو خوف کے مارے نیند اڑ جاتی ہے۔ اور پھر ان لوگوں کو نیند کیسے آ سکتی ہے جن کے بارہ میں خود قرآن ہی بتا رہا ہے کانما یساقون الی الموت و ھم ینظرون۔ شاید یہاں آپ یہ خلش محسوس کریں کہ قرآن نے یہاں نعاس کا لفظ بولا ہے۔ اس کے معنے اونگھ کے ہیں لیکن یہ شبہ بے جان ہے کیونکہ یہاں اس کے ساتھ یغشی کا لفظ آیا ہے جس کے معنے ڈھانپ دینے کے ہیں یعنی نیند کو ان پر اس طرح طاری کر دیا گیا تھا جیسے کسی چیز کو ڈھانپ دیا جاتا ہے وہ بے خوف و خطر مزے کی میٹھی نیند سوتے اور یہی اللہ کا انعام ہے۔

بدر میں باران رحمت کا نزول

۱۲۔ اور آسمان سے تم پر پانی برسا دیا تھا کہ تمہیں پاک و صاف ہونے کا موقعہ

ملے اور تم سے شیطان کی گندگی دور کر دے اور تاکہ تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور تاکہ تمہارے قدم جما دے۔ بدر کا معرکہ فی الحقیقت مسلمانوں کے لیے بہت ہی سخت آزمائش اور عظیم الشان امتحان کا موقع تھا۔ وہ تعداد میں تھوڑے تھے، بے سروسامان تھے۔ فوجی مقابلہ کے لیے تیار ہو کر نہ نکلے تھے۔ مقابلہ پر ان سے تین گنا تعداد کا لشکر تھا۔ جو پورے ساز و سامان سے کبر و غرور کے نشہ میں سرشار ہو کر نکلا تھا مسلمانوں اور کافروں کی پہلے ہی قابلِ ذکر ٹکر تھی۔ پھر صورت ایسی پیش آئی کہ کفار نے پہلے ہی پانی وغیرہ پر قبضہ کر لیا تھا۔ مسلمان بلند جگہ پر تھے۔ ریت بہت زیادہ تھی۔ جس میں چلتے ہوئے پاؤں دھنستے تھے۔ گرد و غبار نے الگ پریشان کر رکھا تھا۔ پانی نہ ملنے سے ایک طرف غسل و وضو کی تکلیف، دوسری طرف تشنگی ستا رہی تھی۔ یہ چیزیں دیکھ کر مسلمان ڈرے کہ بظاہر آثار شکست کے ہیں۔ شیطان نے دلوں میں وسوسہ ڈالا کہ اگر واقعی تم خدا کے مقبول بندے ہوتے تو ضرور تائید ایزدی تمہاری طرف ہوتی ایسی پریشانی کی اور یاس انگیز صورتِ حال پیش نہ آتی۔ اس وقت حق تعالیٰ نے قدرتِ کاملہ سے زور کا مینہ برسایا جس سے میدان کی ریت جم گئی۔ غسل و وضو کرنے اور پینے کے لیے پانی کی افراط ہو گئی۔ گرد و غبار سے نجات ملی۔ کفار کا لشکر جہاں تھا وہاں کیچڑ اور پھسلن سے چلنا دشوار ہو گیا۔ جب یہ ظاہری پریشانیاں دور ہو گئیں تو حق تعالیٰ نے مسلمانوں پر ایک قسم کی غنودگی طاری کر دی۔ آنکھ کھلی تو دلوں سے سارا خوف و ہراس جاتا رہا۔ بعض روایات میں ہے کہ حضور اور حضرت ابوبکر صدیق رات بھر عریش میں مشغولِ دعا رہے۔ آخر میں حضور پر ایک خفیف سی نیند طاری ہو گئی۔ جب اس سے چونکے تو فرمایا کہ خوش ہو کہ جبریل تمہاری مدد کو آ رہے ہیں۔ عریش سے باہر تشریف لاتے تو سیھزم الجمع و یولون الدبر زبان مبارک پر جاری تھا۔ بہرحال اس بارانِ رحمت نے بدن کو ظاہری احداث اور دلوں کو شیطان کے وساوس سے پاک کر دیا اور ریت کے جم جانے سے ظاہری طور پر قدم جم گئے اور اندر سے ڈر نکل کر دل مضبوط ہو گئے۔ [1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اللہ اکبر۔ اللہ سبحانہ، کی کارسازی نے کس طرح ساری مشکلیں حل کر دیں کہ عین موقع پر بارش ہو گئی اور افراط کے ساتھ سب کو پانی میسر آگیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ لوگ نہا دھو کر صاف ستھرے ہو گئے۔ کوئی نہ تھا جو چست و چاق اور تازہ دم نہ ہو گیا ہو۔ بارش کی وجہ سے ریت جم گئی پاؤں کے دھنس جانے کا اندیشہ جاتا رہا۔ اپنی کامیابی کی طرف سے بے اعتمادی و مایوسی جو دراصل شیطانی وسوسوں کی ناپاکی تھی اب کسی کے دل میں باقی نہ رہی۔ یہ اس رات کا واقعہ ہے جس کی صبح کو بدر کی لڑائی پیش آئی۔ اس بارش کے تین فائدے ہوئے ایک یہ کہ مسلمانوں کو پانی کی کافی مقدار مل گئی اور انہوں نے حوض بنا کر بارش کا پانی روک لیا، دوسرے یہ کہ مسلمان چونکہ وادی کے بالائی حصہ پر تھے اس لیے بارش کی وجہ سے ریت جم گئی اور زمین اتنی مضبوط ہو گئی کہ قدم اچھی طرح جم سکیں اور نقل و حرکت بآسانی ہو سکے۔ تیسرے یہ کہ لشکر کفار نشیب کی طرف تھا۔ اس لیے وہاں اس بارش کی بدولت کیچڑ ہو گئی اور پاؤں دھنسنے لگے۔ مطلب یہ ہے کہ بدر کے میدان جہاں مسلمانوں کی اپنی صفیں قائم تھیں وہ جگہ بلند تھی اور جہاں قریش کی فوج کھڑی تھی وہ جگہ نشیب میں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی شکست کا ایک ظاہری سبب پیدا کر دیا کہ عین اس رات میدانِ جنگ میں موسلادھار بارش کر دی جس نے ادھر تو مسلمانوں کی طرف گرد و غبار بٹھا دیا ان کے پاؤں جما دیے اور ادھر کافروں کی طرف پانی کا ریلا آگیا کہ ان کو زمین پر قدم رکھنا دشوار ہو گیا۔

یہ دعائی تدبیر کا تیسرا نتیجہ بیان ہوا۔ پہلا یہ کہ نزولِ ملائکہ ہوا، دوسرا رات کو آرام کی نیند سوئے تیسرے یہ کہ بارانِ رحمت نازل ہوئی۔

قرآن نے نزول بارانِ رحمت کے چار فائدے بتائے ہیں۔

ایک یہ کہ لیطہرکم بہ اس کے ذریعے پاکیزگی اور طہارت ہو۔ طہارت کو انعامِ الٰہی بنا کر ذکر کرنے میں اس طرف اشارہ ہے کہ طہارت و پاکیزگی صحابہ کرام کا خاص ذوق ہو۔ اور صحابہ میں یہ ذوق قرآن ہی کا پیدا کردہ تھا۔ قرآن نے ان کو بتایا تھا واللہ یحب المتطہرین اللہ تعالیٰ طہارت رکھنے والوں سے محبت کرتے ہیں۔ پانی کے اصلی اور بنیادی فائدے یعنی پینے کو نظر انداز کر کے تطہیر کو بیان کرنا اس بات کی نشاندہی کرنے کے لیے ہے کہ مومن کی نگاہ میں پانی کا اصلی فائدہ اور اس کی

حقیقی قدر و قیمت اس بات میں ہے کہ وہ پاکیزگی اور طہارت کا ذریعہ ہے اور یہ چیز اللہ کو بے حد محبوب ہے۔

بلاشبہ صحابہ کو ان کے ذوقِ طہارت کے پیشِ نظر یہ چیز پریشان کر رہی ہوگی کہ نماز کے لیے وضو کیسے ہوگا۔ طہارت کے لیے کیا کریں گے۔ غسل کی ضرورت پیش آئی تو کیا ہوگا۔ صحابہ کی اس مخصوص پریشانی سے یہاں اللہ سبحانہ نے پانی کے عام حیوانی فائدوں کو نظر انداز کر کے اس کی روحانی برکت کا خاص طور پر ذکر فرما دیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ الطہور شطر الایمان یعنی ایمان کے سارے تقاضوں کو اگر تنصیف کی نسبت قائم کی جائے تو پاکیزگی اور طہارت ایمان کا نصف تقاضا ہے۔

دوسرا فائدہ یہ ہوا یذھب عنکم رجز الشیطان۔ بلاشبہ رجزِ شیطان سے مراد وساوس ہیں۔ لیکن جس طرح روحِ انسانی کی گندگی وساوس سے ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح جسمِ انسانی جراثیم سے گندا اور میلا ہو کر بیماریوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ آدمی جب گندا اور میلا ہوتا ہے تو شیطانی وسوسوں کے ساتھ بیماری کے جراثیم کا بھی غلبہ ہوتا ہے۔ اگرچہ قرآن کا منطوق تو طہارت کے ذریعہ وساوسِ شیطان کو دور کرنا ہے جس سے روح میں پاکیزگی آتی ہے لیکن اس کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ پانی اور صفائی ہوگی تو جسم بیماریوں کے ان جراثیم سے محفوظ ہو جائیں گے جو گندگی اور میل سے پیدا ہوتے ہیں۔ اور اگر پانی نایاب ہو جائے تو شیطان کو عام ذہنوں میں بددلی اور مایوسی پھیلانے کا موقعہ مل جاتا ہے۔

تیسرا فائدہ یہ بیان ہوا ہے لیربط علی قلوبکم یہ مستقل فائدہ ہے اور اس کے استقلال کی خاطر صرف تعلیل مکرر لایا گیا ہے تاکہ تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے۔ معلوم ہوا کہ دشمنوں کی افرادی قوت کی بہتات، سامانِ جنگ کی ان کی طرف فراوانی سے دل پریشان ہو رہے تھے۔ اللہ سبحانہ کی نصرت اور امداد کا یہ مقدمہ یا تمہید دیکھ کر دلوں میں مضبوطی آگئی کہ خواہ تعداد تھوڑی اور چاہے سامانِ جنگ کی کمی ہے لیکن اللہ سبحانہ کی نصرت ان سب چیزوں کی تلافی کر دے گی۔ اور علیٰ لا کر اشارہ کر دیا کہ پہلے ان کے دلوں میں جو گھبراہٹ تھی اب اللہ کی مدد کا بارش

کی صورت میں مشاہدہ کر کے ان کے دل ڈھارس اطمینان و سکون اور مستقبل میں فتح کے یقین سے بھر گئے۔ اب وہ مستقبل کو وسائل کی کمی کی وجہ سے شک کی نگاہوں سے نہیں بلکہ بھرپور اعتماد کی نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔

چوتھا فائدہ یہ ارشاد ہوا ہے یثبت بہ الاقدام اس کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ زمین میں ریت جم جانے سے تمہارے قدم نہ پھسلیں گے بلکہ جم جائیں گے۔ حافظ ابن القیمؒ فرماتے ہیں کہ اس رات اللہ سبحانہ نے ایک ہی بارش کی لیکن یہ بارش مشرکین کی جانب موسلا دھار تھی اور اہلِ ایمان کی طرف خوشگوار پھوار کی صورت میں ہوئی اس سے ریت جم گئی۔ حضور انور رات ہی میں پانی تک پہنچ گئے اور حوض تیار کر کے پانی کو روک لیا۔ اور حوضوں کے اردگرد مسلمان فوج نے پڑاؤ کیا۔ اور اسی موقعہ پر حضور کے لیے اونچے ٹیلہ پر صحابہ نے ایک عریش تیار کیا۔ امام مجاہد کی رائے ہے کہ باران رحمت رات کو سونے سے پہلے آئی تھی۔ اگر ایسا ہے تو مارچ کے مہینے میں یقیناً خنکی ہو گئی ہو گی۔ اور بہت ہی خوشگوار فضا ہو گی۔ فضا کی اسی خوشگواری سے ناکامی کا وہ احساس جو شیطانی وسوسوں سے پیدا ہو رہا تھا دور ہو گیا اور مستقبل کے بارے میں اللہ سبحانہ پر بھرپور اعتماد کی فضا قائم ہو گئی۔ اگر بدر میں بارش نہ ہوتی تو اہلِ ایمان کے لیے لڑائی ممکن نہ ہوتی۔ کیونکہ یہ سب پاپیادہ تھے۔ مولانا آزاد نے یہ بات بر موقعہ لکھی ہے کہ جنگ واٹرلو کے تمام مورخین متفق ہیں کہ اگر ۱۷، ۱۸ جون کی درمیانی رات میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا نقشہ بدل گیا ہوتا۔ کیونکہ اس صورت میں نپولین کو بارہ بجے تک زمین خشک ہونے کا انتظار نہ کرنا پڑتا۔ واٹرلو میں اگر بارش نہ ہوتی تو یورپ کا سیاسی نقشہ بدل جاتا لیکن اگر بدر میں بارش نہ ہوتی تو کیا ہوتا۔ تمام کرۂ ارضی کی ہدایت و سعادت کا نقشہ الٹ جاتا۔ اسی طرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی دعا میں اشارہ کیا تھا۔

اللھم ان تھلک ھذہ العصابۃ فلا تعبد

خدایا اگر یہ مٹھی بھر جماعت آج ہلاک ہو گئی تو روئے زمین میں تیری عبادت نہ رہے گی۔

ادھر تو یہ ہوا کہ مسلمان شاداں و فرحاں ہو گئے اور بارش ان کے لیے رحمت کا پیغام

بن گئی، مگر اُدھر کیا ہُوا بارش کی وجہ سے قریش کے باربردار اونٹ دلدل میں پھنس گئے۔ حمل ونقل دُشوار ہو گئی۔ قریش کو آگے بڑھنے میں دُشواری پیش آئی۔ پہاڑی علاقوں میں جنگ کا زریں اصول یہ ہے اور اس پر دُنیا کے دفاعی ماہرین کا اتفاق ہے کہ فوج کو کبھی وادیوں اور نالوں میں پڑاؤ نہ ڈالنا چاہیے کیونکہ ایسے علاقوں میں اگر کبھی ایک تیز بارش ہو جائے تو سیلاب آجاتا ہے اور اس سے جان ومال کا نقصان ہوتا ہے۔ اور اگر معمولی قسم کی بارش ہوتی ہے تو بدترین قسم کی دلدل ہو جاتی ہے جسے انسان اور حیوان دونوں مشکل سے عبور کر سکتے ہیں۔

مقامِ بدر پہاڑوں کے درمیان ۵½ میل لمبی اور چار میل چوڑی وادی ہے جس میں آنے جانے کے تین راستے ہیں۔ بجانب شرق مدینہ کی طرف سے داخل ہونے والا وادی کے درمیان میں کھلتا ہے۔ شمالی درہ شام سے آنے والوں کے لیے شمال میں اور جنوبی درہ مکہ سے آنے والوں کے لیے جنوب میں کھلتا ہے۔ جنوبی داخلہ کے بعد ایک چھوٹی پہاڑی اور نخلستان فوج کو چھپا کر بٹھانے کے لیے نہایت موزوں مقام ہے اور اسی مقام پر قریش کی فوج آکر ٹھہری۔ صحابہ کرام حضور اقدس کے حکم سے درہ کے منہ سے کسی قدر ہٹ کر پہاڑوں کی اوٹ میں قیام کرنے لگے تھے تو حضرت حباب بن منذر آگے آئے اور عرض کیا یا رسُول اللہ اگر اس مقام پر قیام اللہ سبحانہ، کے حکم سے ہے تو بجا۔ اور اگر آپ کی ذاتی رائے ہے تو میں کچھ عرض کروں۔ حضور نے فرمایا کہ میری ذاتی رائے ہے۔ بولے کہ پھر یہ مقام مناسب نہیں۔ ہمیں چاہیے کہ وسط وادی میں نخلستان کے قریب پانی کے چشموں پر قبضہ کر لیں تاکہ مقام کی بلندی اور پانی کی دستیابی کے لحاظ سے ہم ان سے برتر رہیں۔ حضور نے پسند فرمایا اور اسلامی فوج نئے مقام پر پہنچ گئی۔ یہ جگہ خشک ریتلی تھی اور اونچی تھی۔ قریش نشیب میں تھے جہاں زمین چکنی تھی۔ اللہ سبحانہ نے اسی رات باران رحمت نازل کی۔ مسلمانوں کی قیامگاہ پانی جذب کر کے مستحکم ہو گئی۔ اور قریش کی قیامگاہ کیچڑ اور پانی سے دلدل بن گئی۔

اِذْ يُوْحِيْ رَبُّكَ اِلَى الْمَلٰٓئِكَةِ اَنِّيْ مَعَكُمْ فَثَبِّتُوا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ؕ
سَاُلْقِيْ فِيْ قُلُوْبِ الَّذِيْنَ كَفَرُوا الرُّعْبَ فَاضْرِبُوْا فَوْقَ
الْاَعْنَاقِ وَاضْرِبُوْا مِنْهُمْ كُلَّ بَنَانٍ ﴿۱۲﴾ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ
شَآقُّوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ۚ وَمَنْ يُّشَاقِقِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ
اللّٰهَ شَدِيْدُ الْعِقَابِ ﴿۱۳﴾ ذٰلِكُمْ فَذُوْقُوْهُ وَاَنَّ لِلْكٰفِرِيْنَ
عَذَابَ النَّارِ ﴿۱۴﴾

جب تیرے رب نے فرشتوں کو وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں ، لہٰذا اہلِ ایمان کو جمائے رکھو[۱۳]۔ میں ضرور کافروں کے دلوں میں دہشت ڈالوں گا[۱۴]۔ لہٰذا تم ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ ، اور ان کے ہاتھوں کے ہر پور پر چوٹ لگاؤ[۱۵]۔ اور یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ و رسول کی مخالفت کی ہے اور جو بھی اللہ اور اس کے

رسُول کی مخالفت کرے گا تو اللہ سبحانہ اسے سخت سزا دینے والا ہے۔[16] اے کافرو! یہ ہے تمہاری سزا، اس کا مزا چکھو اور یقین کرو کہ کافروں کے لیے دوزخ کا عذاب ہے۔[17]

اہلِ حق کا جماؤ اور کُفر کی مرعوبیت

ان آیات میں بھی اسی دعائی تدبیر کا نتیجہ بیان ہُوا ہے۔ تردد کی حالت، حالات کی نزاکت اور مٹھی بھر مسلمانوں کے دلوں کی کیفیت کا جو نقشہ خود اللہ سبحانہ نے پیش کیا ہے اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خود دھکیل کر مسلمانوں کو مدینہ سے باہر نکالا ورنہ عقل کا فیصلہ یہ کب ہو سکتا ہے کہ چھوٹی سی جمعیت کا گھروں سے اسی میل دور جا کر ایک بھاری فوج سے تصادم ہو۔ لیکن اس کے باوجود اللہ سبحانہ اہل ایمان کو میدان جنگ کی طرف بڑھائے گیا۔ اکثر کی خواہش یہی تھی کہ ابوسفیان کا قافلہ ہاتھ آئے۔ لیکن اللہ سبحانہ نے حوادث و حالات کے پردوں میں جلوہ آرا ہو کر اپنی مشیت کا مظاہرہ فرمایا۔ اور ظاہر بینوں کو دکھلا دیا کہ اللہ سبحانہ کے حکم سے باطل پر حق کیسے غالب آتا ہے۔ گویا ظاہری مصالح کے خلاف اللہ سبحانہ نے خود مسلمانوں کو میدان جنگ میں لا ڈالا۔ کوچ پر مستعدی کا باعث یہ وعدہ ہُوا کہ ایک گروہ ہاتھ لگے۔ مسلمان یہ سمجھے کہ ہاتھ لگنے والا گروہ تجارتی قافلہ ہے۔ وہ کمر ہمت باندھ کر نکل کھڑے ہوتے لیکن حق سبحانہ کا مقصد کہیں بلند تھا۔ وہ حق و باطل کا ٹکراؤ چاہتا تھا تا کہ کش مکش کے پردے میں دعائی تدبیر کے ذریعے تائیدِ غیبی کے مظاہروں سے اسلام کے غلبہ کے اسباب پیدا کرے۔ تقدیر و تدبیر کے درمیان یہی وہ نقطۂ اتصال ہے جس کے گرد مومن کا ایمان مصروف طواف رہتا ہے۔ یہی وہ نکتہ ہے جس میں سر ایمان تمام تر مستعد ہے۔ ایمان کو اسی

غذا ملتی ہے اور یہی مومن کا سرمایہ حیات ہے۔ اسی کا قرآن کی ان آیات میں نہایت بلیغ انداز میں ذکر ہو رہا ہے۔

فرشتوں کو وحی

۱۳۔ جب تیرے رب نے فرشتوں کو وحی کی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں لہٰذا اہلِ ایمان کو جمائے رکھو۔ ملائکہ کا اعتقاد دُنیا کے تمام مذہبوں اور قوموں میں کسی نہ کسی طرح موجود ہے لیکن ان کے اس اعتقاد میں بہت سی ایسی باتیں داخل تھیں جو توحیدِ کامل کے منافی تھیں۔ اسکندریہ کے نوافلاطونی فلسفہ کی رو سے عقلِ اوّل کی اضطراری پیدائش سے خدا کو معطل ہو جانا پڑا اور فرشتوں کو عقول کی صورت میں رفیقِ کارفرما قرار دیا گیا۔ عراق کے صابی اجرام سماوی کی شکل میں ان کی پرستش کرتے تھے اور ان ہی کو عالم کا فرمانروا سمجھتے تھے۔ یہود ان کو کسی قدر صاحبِ اختیار تصور کرتے تھے اور گاہ گاہ ان کو خدائی کا درجہ دیتے تھے۔ ہندوں میں وہ دیوتا اور دیوی بن کر ایک طرف انسانی خصائص سے ملوث تھے۔ اور دوسری طرف اپنے ذاتی اختیارات کے لحاظ سے چھوٹے خداؤں کے مرتبے پر فائز تھے۔ عیسائی ان میں سے بعض مثلاً روح القدس کو خدا کا ایک جزو تسلیم کرتے تھے اور یہ تثلیث کا ایک رُکن تھا۔ عربوں میں فرشتے خدا کی بیٹیوں کا درجہ رکھتے تھے اور ان کی پوجا کرتے، ان کو اپنے گناہوں کا سفارشی سمجھتے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرشتوں کے بارے میں ان تمام عقائدِ باطلہ کو مٹا دیا اور ایک ایک کر کے ہر عقیدہ کی تردید کی اور بتایا کہ فرشتے بھی خدا کی دوسری مخلوقات کی طرح ایک مخلوق ہیں۔ ان کو خدائی کا کوئی اختیار نہیں وہ صرف خدا کی اطاعت و عبادت اور اس کے احکام کی بجا آوری میں مصروف رہتے ہیں۔ ان میں سے جس کے جو کام سپرد ہے وہ اس کو انجام دیتے ہیں۔ وہ ہماری طرح بندے ہیں۔ اللہ سبحانہ ان سے جو کام چاہتا ہے لیتا ہے۔ فرشتوں کی طرف خدا کی وحی کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ ان کو احکام نافذ کرنے کا حکم دیتا ہے۔ جس طرح انبیاء پر وحی کی آمد کی کیفیت ہماری علمی دسترس سے باہر ہے ٹھیک اسی طرح فرشتوں پر وحی آنے کی حقیقت کا ہمیں علم نہیں ہے۔ ان کا تعلق حقائقِ غیب سے ہے اور غیب کے

معاملات کے بارے ہماری ہر تعبیر ناقص ہے۔
آیت میں ملائکہ سے مراد فرشتوں کی وہی فوج ہے جس کا اوپر ذکر ہوا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ اللہ نے ان ہی فرشتوں کو جن کو اپنے نبی کی مدد کے لیے اتارا، وحی کی یہاں وحی کی تعبیر سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آتی ہے کہ فرشتوں کو احکام بھی خدا کی جانب سے براہِ راست نہیں بلکہ بذریعہ وحی ملتے ہیں۔ وحی آئی کہ میں تمہارے ساتھ ہوں تم اہل ایمان کو جمائے رکھو اور ثابت قدم بناؤ۔ ساتھ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ میں تمہاری اس کام میں مدد کروں گا۔ اس سے معلوم ہوا کہ خدا کی معیت کے بغیر فرشتے بھی کچھ نہیں کر سکتے۔ فرشتوں کی جانب سے اہل ایمان کو ثابت قدم یا جمانے کی کیا حقیقت تھی؟ یہ معاملہ بھی عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے اور اس عالم کے حقائق کی ہم اپنے ذہن و ادراک سے حقیقت نہیں معلوم کر سکتے۔ لوگوں کے فہم سے قریب کرنے کے لیے شارحین قرآن لکھتے ہیں کہ فرشتے ایسی باتیں اہل ایمان کے دلوں میں القا کرتے تھے جن سے ان کے عزائم میں پختگی آتی۔ فرشتوں کی جانب سے ایسے القاء کو الہام کہتے ہیں۔ جیسے شیطان کے القا کو وسوسہ کہتے ہیں اور کچھ کے خیال میں افرادی طاقت کا مظاہرہ کا نام ہی تثبیت ہے۔ بہرحال عددی طاقت سے ہو یا دلوں میں الہام کے ذریعے ہو کچھ ہو، طریقہ اور ذریعہ کچھ ہو مقصود تو مسلمانوں کے دلوں کو اس بے بسی اور بے کسی کے وقت میں دلیر بنانا ہے۔

کافروں پر اہلِ ایمان کا رعب

۱۴۔ میں ضرور کافروں کے دلوں میں دہشت ڈالوں گا۔ حافظ ابن کثیر نے یہ مطلب بتایا ہے کہ اے فرشتو اہلِ ایمان میں جماؤ اور ثابت قدمی پیدا کرو۔ اور ان کو کافروں کے مقابلہ میں طاقتور بناؤ۔ اسی ذریعہ سے میں کافروں پر دہشت ڈالوں گا۔ دراصل یہ استیناف بیانی ہے فرمایا کہ اگر تم نے مسلمانوں کو جمائے رکھا تو میں ضرور اہلِ کفر کے دلوں میں دہشت ڈال دوں گا۔ یا اس کا تعلق اہلِ ایمان سے ہے کہ اگر انہوں نے ثباتِ قدم کا میدانِ جنگ میں مظاہرہ کیا تو میں ضرور اہلِ کفر کے دلوں میں رعب ڈال دوں گا۔ یہ زیادہ اچھا ہے۔ کیونکہ اصلی قوت فوج کا حوصلہ ہے اگر حوصلہ بحال ہو

اور ثابت قدمی ہو تو معمولی طاقت سے بھی دشمن زیر ہو جاتا ہے۔ اور اگر حوصلہ ختم ہو جائے تو سامانِ جنگ کی فراوانی، افرادی قوت کی بہتات بھی بے کار ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے بہت بڑا وعدہ ہے۔ لیکن اس کے پورا ہونے کا مدار ثابت قدمی اور حوصلہ کی بلندی پر ہے اسی لیے فثبتوا کے بعد آیا ہے۔ اور اگر آپ چاہیں تو اس جملہ کو استینافیہ کہہ سکتے ہیں۔ یہ گویا فثبتوا کی علت بن جاتے گا۔ مطلب یہ ہو گا کہ فرشتو تم اہلِ ایمان میں تثبیت کا کام کرو کیونکہ میں کافروں میں ان کی دہشت ڈالوں گا۔ یہ بات بالکل وہی ہے جو حافظ ابن کثیر نے بتائی ہے۔

کافروں کی گردنیں مارو

۱۵۔ تم ان کی گردنوں پر ضرب لگاؤ اور ان کے ہاتھوں کے ہر پور پر چوٹ لگاؤ۔
یہ خطاب کس کو ہے۔ اہلِ ایمان کو یا فرشتوں کو۔ حافظ ابن کثیر نے حافظ ابن جریر کی رائے یہ نقل کی ہے اضربوا من عدوکم ایہا المومنون۔ یعنی اس کے مخاطب فرشتے نہیں بلکہ اہلِ ایمان ہیں۔ اور حافظ ابن کثیر نے اس پر کوئی تنقید نہیں کی ہے معلوم ہوا کہ ان کی بھی رائے یہی ہے کہ مسلمان مخاطب ہیں۔ محققینِ تفسیر و حدیث کی رائے یہی ہے کہ فرشتوں کا نزول مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط رکھنے کے لیے ہوا تھا لڑائی میں ان کی شرکت ثابت نہیں۔ ہے نہ اس کی کوئی ضرورت پیش آئی تھی اور اس آیت میں فاضربوا کا خطاب مسلمانوں سے ہے نہ کہ فرشتوں سے۔

پہلی آیت وما جعلہ اللہ الا بشریٰ میں نفی و استثنا کے ذریعے حصر کا تقاضا بھی یہی ہے کیونکہ اس آیت میں بتایا ہے کہ فرشتوں کا کام یہ اور صرف یہ تھا کہ کمزور مسلمانوں کے دل قرار پا جائیں۔ سیاق ہی سے مخاطب اہلِ ایمان ہیں۔

جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ مخاطب فرشتے ہیں وہ حیران کن پریشانیوں میں مبتلا ہیں۔ وہ فرماتے ہیں کہ چونکہ فرشتوں کو کافروں کو مارنے کا طریقہ نہ آتا تھا اس لیے فاضربوا فوق الاعناق واضربوا منہم کل بنان کہہ کر ان کو مارنے کا طریقہ بتایا گیا ہے۔ چنانچہ نواب صدیق حسن خاں مرحوم فرماتے ہیں:

ملائکہ کو انسانوں کو مارنے کا طریقہ معلوم نہ تھا اس لیے ان کو اللہ نے تعلیم دی۔

لیکن اس کی پشت پر کوئی تاریخی روایتی دستاویز نہیں ہے۔ حافظ ابن جریر رہ روایات کے مسئلہ میں توسع سے کام لیتے ہیں لیکن ملائکہ کے قتال کے موضوع پر انہوں نے بھی کوئی روایت نہیں پیش کی ہے۔ حافظ سیوطی نے اس موقع پر جو روایات پیش کی ہیں ان کا ماخذ ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ ہے اور اہلِ علم پر ان کتابوں کی روایتی حیثیت پوشیدہ نہیں ہے۔ ان روایات کا ضعف سب کا جانا بوجھا ہے۔ آیت میں فوق الاعناق اور کل بنان سے۔ قریش کی مرعوبیت کو ظاہر کیا گیا ہے۔ یعنی وہ اس قدر مرعوب ہو جائیں گے اور ان کے حوصلے اس قدر پست ہو جائیں گے کہ تم ان کو جانوروں کی طرح کاٹ ڈالو گے۔ یہ ان کی بے بسی کی بلیغ تعبیر ہے۔ اور اس میں ان کی تحقیر بھی ہے۔ آگے آیت میں اس قتل کی مرعوبیت کی اور تحقیر کی وجہ بتائی جا رہی ہے۔

اللہ و رسول کی مخالفت کی سزا

۱۶۔ اور یہ اس لیے کہ انہوں نے اللہ و رسول کی مخالفت کی ہے اور جو بھی اللہ و رسول کی مخالفت کرے گا تو اللہ سبحانہٗ اسے سخت سزا دینے والا ہے۔ یعنی سب کچھ اس لیے واقعہ بن کر سامنے آیا ہے کہ ان لوگوں نے اللہ و رسول کی مخالفت کی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنگ کی اسلام میں اصلی علت اللہ و رسول کی مخالفت ہے۔ یہ دنیا خیر و شر دونوں کا مسکن ہے۔ اسلام کی نظر میں اللہ و رسول کا ہر حکم خیر ہے اور اس کے مقابلہ میں آنے والی ہر قوت شر ہے۔ شر جب بھی خیر کے راستہ میں رکاوٹ بن جائے تو اس رکاوٹ کا ہٹانا مسلمانوں کی دینی ذمہ داری ہے۔ اسی کے نتیجہ میں خیر اور شر باہم ٹکراتے ہیں۔ قرآن نے یہاں بدر کی سرگرمیوں اور جنگ کرنے کی وجہ یہ اور صرف یہ بتائی ہے کہ مشرکین نے اللہ و رسول کی راہ روکی۔ ان کی مخالفت پر میدان میں آگئے اس لیے ان کو اللہ کی جانب سے یہ سزا ملی۔ اسی کا نام قرآن کی زبان میں جہاد ہے۔ بتانا یہ ہے کہ اہلِ ایمان کے ذریعے مشرکین جس عذابِ شدید کا نشانہ بنے ہیں۔ اس کی علت اللہ و رسول کی مخالفت ہے ورنہ ان مسلمانوں کی ان سے کوئی عداوت نہ تھی، بلکہ قرابت تھی اور قرابت دور کی نہیں بہت قریب کی۔ لیکن ایثار و جاں بازی کا عالم یہ تھا کہ دونوں

فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو دنیا کو نظر آیا کہ خود ان کے جگر گوشے تلوار کے سامنے ہیں۔ حضرت ابوبکرؓ کے بیٹے مشرکین کی صف سے تلوار لے کر نکلے تو حضرت ابوبکرؓ خود آگے بڑھے۔ عتبہ میدان میں آیا تو اس کے فرزند حضرت حذیفہ اس کے مقابلہ پر آ گئے۔ حضرت عمرؓ کی تلوار ماموں کے خون سے رنگین تھی۔ قرابت کے ساتھ یہ سب وطنی بھائی بھی تھے اور ہم وطن ہونے کے ساتھ یہ سب ہم زبان بھی تھے۔ گو نسلی، وطنی اور لسانی تعلقات سب کے ایک تھے اور اس معنے کے لحاظ سے سب اُمۃ واحدہ تھے۔ لیکن ان سارے علائق کو صحابہ کرام نے صرف اس لیے خیر باد کہہ دیا کہ ان رشتہ داروں، ہم وطنوں اور ہم زبانوں نے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کی تھی اور بس۔ اس طرح قرآن کی یہ آیت صحابہ کا مقام ایمان بتا رہی ہے۔

خوشتر آں باشد کہ سرّ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں!

یہ آیت بتا رہی ہے کہ اللہ سے بغاوت اور اس کی بھیجی ہوئی ہدایت سے منہ موڑنا کوئی معمولی درجہ کا جرم نہیں ہے بلکہ یہی سب سے بڑا جرم ہے۔ اس کی سزا دنیا میں بھی بھگتنی پڑتی ہے۔ اس آیت نے یہ بات بھی کھول دی ہے کہ کسی انسان کا وضع کردہ کوئی نظام خواہ فردِ واحد کا بنایا ہوا ہو یا جماعت کا نبوت کے لائے ہوئے نظام کے مقابلے میں پائے استحقار سے ہٹ کر آئے جانے کے لائق ہے اور اس کے لیے ایک مسلمان کے ایمان تقاضا یہ ہے کہ برادری، قرابتداری، وطنیت اور دوسرے سارے مفادات کو چھوڑ کر اللہ و رسول کا وفادار رہے۔ قرآن مسلمانوں کو ہرگز اس کی اجازت نہیں دیتا ہے کہ وہ نبوت کے مخالف نظام کو اپنائیں۔ اسی لیے قرآن نے یہاں بطور ضابطہ اور قانون یہ بتایا ہے۔

عذاب شدید نتیجہ ہے اللہ اور اس کے رسول کی مخالفت کا اور جو بھی مخالفت رسول اختیار کرے گا تو اللہ اس کو سنگین سزا دے گا۔

یہ مشہور مفسر قرآن ابوالسعود نے اس آیت سے یہی نتیجہ نکالا ہے۔

آخرت میں کفر کی سزا

۱۴۔ اے کافرو! یہ ہے تمہاری سزا اس کا مزہ چکھو اور یقین کرو کہ کافروں کے

لیے دوزخ کا عذاب ہے ۔

یہاں یہ نکتہ قابلِ غور ہے دُنیا میں سزا کی علت اللہ و رسُول کی مخالفت بتائی ہے اور آخرت میں سزا کی علت کفر بتائی ہے ۔ اس سے معلوم ہُوا کہ اسلام دُنیا میں جنگ کافروں سے کفر کی وجہ سے نہیں کرتا ہے بلکہ اس لیے کرتا ہے کہ کفر حق کی راہ میں رکاوٹ بن کر آجاتا ہے ۔ کیونکہ یہ دنیا خیر و شر دونوں کا مسکن ہے یہاں بھلائی کی طاقتیں موجود ہیں اور بُرائی کی بھی اور دونوں کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کی پوری آزادی ہے ۔ اسی لیے ایمان میں کسی پر جبر و اکراہ نہیں ہے ۔ جب کفر اللہ و رسُول کا مخالف بن کر سامنے آتا ہے تو پھر اس کی سزا دی جاتی ہے بر خلاف آخرت کے کہ وہاں عذاب کی علت صرف کفر ہے اسی لیے ارشاد ہُوا ہے ان للکافرین عذاب النار ۔

آیئے اب ان آیات پر مولانا عثمانیؒ کا تشریحی نوٹ بھی گوش گزار فرما لیجیے ۔ اگرچہ اس تشریح میں فرشتوں کے قتال کی بات بھی بتائی گئی ہے لیکن یہ عام شہرت کی بنا پر ہے اصل حقیقت ہم بتا چکے ہیں ۔

جنگ بدر کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ اس معرکہ میں خود ابلیس لعین کفار کے سردار اعظم سراقہ ابن مالک بدلجی کی صورت میں متمثل ہو کر ابوجہل کے پاس آیا ۔ اور مشرکین کے خوب دل بڑھائے کہ آج تم پر کوئی غالب نہیں آسکتا ۔ میں اور میرا سارا قبیلہ تمہارے ساتھ ہے ۔ ابلیس کے جھنڈے تلے بڑا بھاری شیاطین کا لشکر تھا ۔ یہ واقعہ آگے آئے گا ۔ اس کے جواب میں حق تعالیٰ نے مسلمانوں کی کمک پر شاہی فوج کے دستے جبریل و میکائیل کی کمانڈ میں یہ کہہ کر روانہ کیے کہ میں تمہارے ساتھ ہوں ۔ اگر شیاطین آدمیوں کی شکل میں متشکل ہو کر کفار کے حوصلے بڑھا رہے ہیں اور ان کی طرف سے لڑ رہے ہیں اور مسلمانوں کے قلوب کو وسوسہ ڈال کر خوفزدہ کر رہے ہیں تو تم مظلوم اور ضعیف مسلمانوں کے دلوں کو مضبوط کرو ۔ اُدھر تم ان کی ہمت بڑھاؤ گے اِدھر میں کفار کے دلوں میں دہشت و رُعب ڈال دوں گا ۔ تم مسلمانوں کے ساتھ ہو کر ان ظالموں کی گردن مارو اور پور پور کاٹ ڈالو ۔ کیونکہ آج ان سب جنی و انسی کافروں نے مل کر خدا و رسُول سے مقابلہ کی

لڑائی ہے سوا نہیں معلوم ہو جائے کہ خدا کے مخالفوں کو کبھی سخت سزا ملتی ہے۔ آخرت میں جو سزا ملے گی اصل تو وہی ہے لیکن دنیا میں بھی اس کا تھوڑا سا نمونہ دیکھ لیں اور عذاب الٰہی کا کچھ مزہ چکھ لیں۔ روایات میں ہے کہ بدر میں لوگ ملائکہ کو آنکھوں سے دیکھتے تھے اور ان کے مارے ہوئے کفار کو آدمیوں کے قتل کئے ہوئے کفار سے الگ شناخت کرتے تھے۔ خدا تعالیٰ نے یہ ایک نمونہ دکھا دیا کہ اگر کبھی شیاطین الانس والجن ایسے غیر معمولی طور پر حق کے مقابل جمع ہو جائیں تو وہ اہل حق اور مقبول بندوں کو ایسے غیر معمولی طریقوں سے فرشتوں کی کمک پہنچا سکتا ہے باقی ویسے فتح و غلبہ اور ہر چھوٹا بڑا کام خدا ہی کی مشیت و قدرت سے انجام پاتا ہے۔ اسے نہ فرشتوں کی احتیاج ہے نہ آدمیوں کی۔ اور اگر فرشتوں ہی سے کام ہے تو ان کو وہ طاقت بخشی ہے کہ تنہا ایک ایک فرشتہ بڑی بڑی بستیوں کو اٹھا کر الٹ سکتا ہے۔ یہاں تو عالم تکلیف میں ذرا سی تنبیہ کے طور پر شیاطین کی غیر معمولی دوڑ دھوپ کا جواب دینا تھا اور بس۔ [1]

حضرت شیخ الاسلام کی یہ تشریح تکلف و تاویل پر مبنی ہے۔ ہم اس پر کوئی تبصرہ کرنا خلاف ادب سمجھتے ہیں۔ ملائکہ کے قتال کے بارے میں مولانا نے جو یہ انکشاف فرمایا ہے کہ ملائکہ کے مقتولین کو لوگوں کے مقتولین سے الگ شناخت کرتے تھے۔ یہ ربیع ابن انس کی روایت ہے۔ اور ربیع ابن انس کا تشیع افراط کے درجہ میں مشہور نقاد یحییٰ بن معین کی زبانی سب کو معلوم ہے۔ حافظ ابن کثیر نے اسے بلا سند پیش کیا ہے۔ اور حافظ سیوطی نے ابن ابی حاتم کا حوالہ دیا ہے۔ باقی ملائکہ کے دیکھنے کی بات تو یہ بلا ریب صحیح ہے۔ ان کی نمائش ہی نے تو صحابہ کو دلیری دی ہے بلکہ یہ فرشتوں کی نمود ہی تھی کہ قریش کی فوج کو مسلمانوں کی تعداد دگنی نظر آ رہی تھی یرونھم مثلیھم رای العین۔ جسے خود قرآن رای العین کہے اس کے بارے میں یارائے انکار کیسے ہو سکتا ہے۔ اگرچہ آیت کے یہ معنی بھی کئے گئے ہیں کہ اہل ایمان کفار کو دو چند دیکھ رہے تھے لیکن اس میں دیکھنے کی بات ہی کیا ہے وہ تو دو چند نہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سہ چند تھے۔ اصل یہی ہے مشرکین صحابہ کو اپنے سے دوچند دیکھ رہے تھے۔ مشرکین کی تعداد ۹۰۰ تھی اور صحابہ کی تعداد ۳۰۰ تھی۔ اس میں ایک ہزار فرشتوں کے اضافہ سے مشرکین کو تعداد دوچند نظر آ رہی تھی۔ اور بلاشبہ یہ نظر آنے والے فرشتے تھے۔ بہرحال فرشتوں کا نظر آنا دونوں کے لیے ضروری تھا۔ اس سے صحابہ کا حوصلہ بلند ہو رہا تھا اور مشرکین پر رعب پڑ کر ان کا حوصلہ پست ہو رہا تھا۔ قابلِ غور تو صرف فرشتوں کے جنگ میں قتال کی بات ہے۔ علامہ السید رشید رضا نے اس موضوع پر بہترین تبصرہ کیا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا لَقِيتُمُ الَّذِينَ كَفَرُوا زَحْفًا فَلَا تُوَلُّوهُمُ
الْأَدْبَارَ ﴿١٥﴾ وَمَن يُوَلِّهِمْ يَوْمَئِذٍ دُبُرَهُ إِلَّا مُتَحَرِّفًا لِّقِتَالٍ
أَوْ مُتَحَيِّزًا إِلَىٰ فِئَةٍ فَقَدْ بَاءَ بِغَضَبٍ مِّنَ اللَّهِ وَمَأْوَاهُ جَهَنَّمُ ۖ
وَبِئْسَ الْمَصِيرُ ﴿١٦﴾

مسلمانو! جب کافروں سے تمہارا لڑائی میں سامنا ہو تو ان کی طرف سے پیٹھ نہ پھیرو۔[18] اور جو شخص لڑائی کے موقعہ پہ ان سے پیٹھ پھیرے گا تو وہ بلاشبہ خدا کے غضب کا نشانہ بن گیا اور اس کا ٹھکانا دوزخ ہے اور وہ بدترین ٹھکانا ہے مگر ہاں جو شخص لڑائی کی مصلحت سے ہٹ جائے یا اپنے گروہ کی طرف جگہ لینی چاہے وہ اس سے مستثنیٰ ہے۔[19]

اہلِ ایمان کی فوجی تربیت

اس سے پہلی آیات میں انعاماتِ الٰہیہ کا تذکرہ ہوا۔ اور بدر کی لڑائی میں اہلِ ایمان

کی کامیابی پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ بتایا کہ فتح وشکست کا مدار اسباب ووسائل پر نہیں بلکہ اللہ سبحانہ کی نصرت وتوفیق پر ہے اور یہ محض اللہ ہی کا فضل تھا۔ گو مسلمان باوجود تعداد میں کم ہونے کے اور باوجود بے سروسامان ہونے کے بدر میں کامیاب ہو گئے۔ مسلمانوں کے دلوں کا اطمینان، کافروں پر ان کی دہشت، فرشتوں کی آمد اور عین وقت پر بارش، مسلمانوں کے لیے غیبی امداد تھی اور اسی کی وجہ سے مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ ان ہی آیات میں پورے زور کے ساتھ مسلمانوں کو یہ بھی بتایا تھا کہ ان کو اللہ کی مدد پر بھروسہ کرنا چاہیے۔ ظاہری اسباب پر بھروسہ کرنا مسلمانوں کا کام نہیں۔ یہ ممکن ہے کہ ظاہری اسباب ہوں اور کامیابی نہ ہو لیکن یہ ناممکن ہے کہ اللہ کی مدد ہو اور کامیابی نہ ہو۔ لیکن اللہ سبحانہ کی امداد کا یقین اور اس کے فضل پر بھروسہ کرنے کا ہرگز یہ مطلب نہیں ہے کہ اب مسلمانوں کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے مسلمانوں کا کام ہی یہ ہے کہ وہ ایک طرف اللہ پر بھرپور بھروسہ کرتا ہے لیکن دوسری طرف وہ اسباب کی طرف سے قطعاً بے پروا نہیں ہوتا۔ وہ جو کچھ کر سکتا ہے قطعاً مستعدی سے کرتا ہے۔ اسباب فراہم کرتا ہے، ظاہری تدبیر کرتا ہے۔ اللہ کی دی ہوئی طاقت اور عقل کو استعمال کرتا ہے اور پھر سب کچھ اللہ کے سپرد کر دیتا ہے اس لیے ان آیات میں یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ جب حق وباطل میں ٹکر ہو جائے۔ جب برائیاں نیکیوں کے مقابلے پر تل جائیں تو اس وقت مسلمانوں کا فرض یہ ہے کہ وہ مقابلہ کے لیے میدان میں ڈٹ جائیں اور کسی چیز یہاں تک کہ اپنی جان کی بھی پروا نہ کریں۔ جس قدر محنت ہو گی اسی کی نسبت سے اللہ کی نصرت ہو گی۔ اللہ کا قانون یہ ہے لینصرن اللہ من ینصرہ اللہ ضرور مدد کرے گا ان کی جو اللہ کی مدد کریں گے۔

معانی مفردات

زحف اس کے اصلی معنے پیٹ کے بل یا پیٹھ کے بل چلنے کے ہیں جیسے سانپ چلتا ہے یا بچہ چلتا ہے اور یا پھر گھٹنوں کے بل چلنے کے ہیں۔ اسی لیے یہ کسی بھاری بھرکم سامان سے لدے ہوئے لشکر کے جنگ کے لیے نکلنے پر بولا جاتا ہے۔ زمخشری فرماتے ہیں کہ زحف العسکر الی العدو کے معنے ہیں لشکر کا بوجھ اور کثرت کے ساتھ دشمن

کے مقابلہ پر جانا۔ اسی سے زحف کے معنے فوج اور لشکر کے آتے ہیں۔ اس کی جمع زحوف آتی ہے۔ الادبار : جمع دُبُر کی ہے۔ پیچھے کو کہتے ہیں اور قبل اس کی ضد آگے کے معنے میں ہے۔ کنائی زبان میں مرد و عورت کے اندام نہانی کو بھی کہتے ہیں۔ پیٹھ پھیر لینے کا مطلب جنگ سے بھاگ جانا ہے۔ متحرفا : تحرف سے اسم فاعل ہے حرف مادہ ہے اس کے معنے طرف میں ہو جانے کے ہیں۔ باب تفعل میں تکلف کے معنے ہوتے ہیں۔ متحیز : یہ بھی باب تفعل ہے۔ حیز سے بنا ہے حیز کے معنے جگہ کے ہیں اس کا مادہ حوز ہے۔ حوز اس جگہ کو کہتے ہیں جس کے گرد باڑ ہو۔ زمخشری لکھتے ہیں کہ انحاز عن القوم کے معنے لوگوں سے الگ ہو جانے کے ہیں اور انحاز الیھم کے معنے لوگوں سے مل جانے کے ہیں۔ یہاں یہی معنے ہیں۔ فئۃ : جماعت اور گروہ کو کہتے ہیں۔

لڑائی سے بھاگنا سنگین جرم ہے

۱۵۔ مسلمانو! جب کافروں سے لڑائی میں تمہارا سامنا ہو تو ان کی طرف سے پیٹھ نہ پھیرو۔ فرار من الزحف، جہاد میں سے نکل کر بھاگنا اور لڑائی میں کفار کو پیٹھ دکھانا بہت سخت گناہ اور اکبر الکبائر میں سے ہے۔ اگر کافر تعداد میں مسلمانوں سے دگنے ہوں۔ اس وقت تک فقہاء نے پیٹھ پھیرنے کی اجازت نہیں دی ہے[1] اصل ارشاد اذا لقیتم الذین کفروا زحفا ہے۔ زحفا منصوب ہے اور منصوب ہونے کی وجہ یہ ہے کہ الذین کفروا کا حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب ان کفار سے تمہارا مقابلہ ہو جو تم پر حملہ آور ہوں۔ یعنی تم ہجوم کی نہیں بلکہ دفاع کی پوزیشن میں ہو تو دشمن کو پیٹھ دکھانا تمہارے لیے ہرگز روا نہیں ہے۔ علامہ آلوسی نے پیٹھ دکھانے سے یہ لطیف نکتہ آفرینی کی ہے کہ جیہ جائے کہ بھاگنا۔ یعنی دشمن اگر ہجوم کر کے ہے اور وہ تعداد میں تم سے زیادہ ہو تو پھر اے اہل ایمان جب میدان جنگ میں تمہارا ان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مقابلہ ہو تو بھاگنا بڑی بات ہے پشت بھی نہ پھیرو بلکہ ڈٹ کر اور جم کر مقابلہ کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ جب دشمن کی تعداد زیادہ ہو تب بھاگنا ناجائز ہے۔ اگر برابر ہو۔ یا ان کی تعداد اہلِ ایمان سے کم ہو پھر تو اور زیادہ حرام ہے۔

آیت میں زحفاً لاکر یہ بھی بتادیا کہ جنگ کے دو طریقے ہیں، ایک گوریلا جنگ اور دوسرا منظم فوج کشی۔ گوریلا جنگ یعنی اچانک حملہ، یہ اتنا زبردست حربہ ہے کہ حملہ آور اسے استعمال کرکے دشمن کو ہراساں کر دیتا ہے۔ اس کا اصول یہ ہے کہ حملہ کرو اور بھاگ جاؤ۔ اس کے لیے چھوٹے چھوٹے دستے نکلتے اور چھاپہ مار کر اپنی پناہ گاہوں میں آجاتے۔ اس کا کوئی مخصوص ضابطہ نہ تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ طریق کار مدینہ تشریف لانے کے بعد دشمن کو ہراساں کرنے اور اس کی تجارتی شاہراہ پر قبضہ کرنے کے لیے اختیار کیا۔

۱۔ حضور انور نے قتال کی اجازت کے بعد ہجرت کے ساتویں مہینہ میں سب سے پہلا فوجی دستہ حضرت حمزہ ابن عبدالمطلب کی کمان میں تیس مہاجرین پر مشتمل قریش کے ایک تجارتی قافلہ کو روکنے کے لیے روانہ کیا۔ یہ قافلہ ابوجہل کی زیرِ سرکردگی میں تین سو قریشیوں کا شام سے واپس آرہا تھا۔ حضرت حمزہ سیف البحر تک پہنچے۔ ایک شخص نے بیچ بچاؤ کر دیا اور مقابلہ نہ ہو سکا۔

۲۔ اس کے بعد آپ نے ہجرت کے آٹھویں ماہ شوال میں ۶۰ مہاجرین کا ایک دستہ حضرت عبیدہ ابن الحارث کی کمان میں رابغ روانہ کیا۔ یہ حضرات جب ثنیہ مراد پر پہنچے تو وہاں ۲۰۰ قریش ابوسفیان کے ساتھ تھے، کوئی حملہ نہیں ہوا۔

۳۔ ہجرت کے نویں مہینہ ذی قعدہ میں بیس سواروں کا دستہ حضرت سعد بن ابی وقاص کی کمان میں قریش کی ایک جماعت کو روکنے کے لیے خرار روانہ کیا۔ یہ لوگ چھپ کر رات کو سفر کرتے تھے۔ پانچویں دن صبح کو خرار پہنچے تو معلوم ہوا کہ قریش کا قافلہ جا چکا ہے۔

۴۔ ہجرت کے بارہویں ماہ صفر میں خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مقام ودان تک قریش کی ایک جماعت کی مزاحمت کی خاطر تشریف لے گئے مگر وہ لوگ نہ ملے۔ آپ واپس تشریف لے آئے۔

۵۔ ہجرت کے تیرھویں مہینے ماہ ربیع الاوّل میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ۲۰۰ صحابہ کرام لے کر قریش کی ایک جماعت کو روکنے کے لیے بواط تک تشریف لے گئے۔ قریش کا یہ قافلہ امیہ ابن خلف کی نگرانی میں ۱۰۰ قریشیوں ۲۵۰۰ اونٹوں پر مشتمل تھا۔ لیکن قافلہ نہ ملا۔ آپ واپس تشریف لے آئے۔

۶۔ کرز بن جابر نے مدینہ کے اطراف میں گھیر ڈالا۔ حضور خود اس کے تعاقب کے لیے روانہ ہوئے۔ وادیٔ سفوان تک آپ تشریف لے گئے جو بدر کے قریب ہے۔

۷۔ اس کے بعد ہجرت کے سولہویں ماہ جمادی الآخرہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ۲۰۰ مہاجرین کے ساتھ قریش کی مزاحمت کے لیے نکلے۔ ینبع کے جنوب میں ایک مقام تک تشریف لے گئے جس کا نام ذوالعشیرہ ہے۔ لیکن وہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ قریش کی جماعت جا چکی ہے۔

۸۔ ہجرت کے سترہویں مہینے یعنی ماہ رجب میں قریش کی نقل و حرکت معلوم کرنے کے لیے حضور نے حضرت عبداللہ بن جحش کو بارہ آدمیوں کے ساتھ روانہ کیا۔ یہ واقعہ آپ معالم القرآن کی دوسری جلد میں پڑھ چکے ہیں۔

یہ سب گوریلا جنگ کی صورتیں تھیں۔ اس آیت میں ان کا حکم بیان نہیں ہو رہا ہے بلکہ جنگ کی دوسری صورت منظم فوج کشی کا اس میں حکم بیان ہو رہا ہے۔ منظم فوج کشی کا ایک ضابطہ تھا جس کی پابندی فوجوں کو کرنی پڑتی تھی۔ آیت میں "زحفاً" کا لفظ اسی لیے استعمال ہوا ہے تاکہ واضح ہو جائے کہ اس کا تعلق ان سرایا سے نہیں جو اچانک حملہ کے لیے گوریلا جنگ میں روانہ کیے جاتے ہیں۔ گویا اس آیتِ گرامی کے ذریعے مسلمانوں کو غزوۂ بدر کے بعد پیش آنے والی جنگوں کے بارے ہدایات دی جا رہی ہیں اور بتایا جا رہا ہے کہ دشمن سے جب فوجی مقابلہ ہو تو میدانِ جنگ سے بھاگنا حرام ہے اور اس کے مفہوم میں یہ بات بھی داخل ہے کہ مسلمانوں کی فوج کی تربیت اعلیٰ پیمانہ پر کرنی چاہیے۔ فوجی تربیت کا مقصد صرف ایک ہے اور وہ یہ ہے کہ فوج پامردی اور قابلیت سے لڑ سکے۔ یہ تربیت سپہ سالار سے ادنیٰ سپاہی تک سب کے لیے لازم ہے۔ فوجی تربیت کا اوّلین اور لازم ترین اصول نظم ہے اس کے ساتھ ہی جسمانی اور دماغی تربیت کی جاتی ہے۔ جسمانی تربیت سے سپاہی سخت جان بنتا ہے

اور دماغی تربیت سے احکام کی تعمیل عقلمندی سے کرتا ہے۔ اس طرح سپاہی میں خود اعتمادی پیدا ہوتی ہے۔ نظم و ترتیب سے فوج ایک اعلیٰ درجہ کا مضبوط ہتھیار بن جاتی ہے اس کو دشمن کے خلاف کامیابی سے استعمال کیا جا سکتا ہے۔ جس طرح نماز کے حکم کے ساتھ وہ تمام چیزیں خود بخود واجب ہو جاتی ہیں جن کے بغیر نماز کی اقامت نہیں ہو سکتی اسی طرح اس کہنے کے ساتھ کہ اذا لقیتم الذین کفروا زحفا" وہ تمام چیزیں خود بخود واجب ہوتی ہے جو دشمن کے مقابلہ کے لیے ناگزیر ہیں۔ جنگ میں دشمن سے مقابلہ کی تیاری سیاسی، اخلاقی اور مادی تینوں طرح کی ہوتی، قرآن کا مطالبہ ہے۔ میدان جنگ میں دشمن کے مقابلے پر ڈٹنے کے لیے فوج میں عزم ہمت، نظم و ضبط، عقل و فہم جسمانی طاقت اور مصائب کی برداشت کی قوت کا ہونا ضروری ہے۔ لڑائی کے میدان میں اخلاقی قوتوں کی خاص آزمائش ہوتی ہے۔

اسی اہمیت کے پیش نظر قرآن نے میدان جنگ سے فوجیوں کے بھاگ جانے سے روکا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جنگ سے بھاگنے کو گناہ کبیرہ بتایا ہے۔

امام بخاری اور امام مسلم نے صحیحین میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد گرامی نقل کیا ہے۔

مسلمانو! سات تباہ کن چیزوں سے بچ کر رہو۔ دریافت کیا گیا یا رسول اللہ وہ کیا ہیں؟ فرمایا، اللہ کے ساتھ شرک کرنا، جادو کرنا، ناحق کسی کو مار ڈالنا، سود کھانا، مال یتیم کھانا۔ میدان جنگ سے بھاگ جانا، اور پاک دامن عورتوں پر تہمت لگانا۔

اور آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ مسلمانوں کی جماعت میں یکجہتی و اتحاد فرض ہے انتشار باہمی بھی وہ ہی نتیجہ پیدا کرتا ہے جو فوجیوں کا میدان جنگ سے بھاگ آنا، جہاد سے روگردانی اور بھاگ آنا صرف اس لیے حرام ہے کہ اس سے اسلام کی اجتماعی قوت کو نقصان پہنچے گا تو افتراق باہمی کیسے جائز ہو سکتا ہے۔

جنگ سے فرار کی مستثنیٰ صورتیں

۱۶- اور جو شخص لڑائی کے موقعہ پر پیٹھ پھیرے گا تو وہ بلاشبہ خدا کے

غضب کا نشانہ بن گیا اور اس کا ٹھکانا جہنم ہے اور جہنم بدترین ٹھکانا ہے۔ مگر ہاں جو شخص لڑائی کی مصلحت سے ہٹ جائے یا اپنے گروہ کی طرف جگہ لینی چاہے وہ اس سے مستثنیٰ ہے یعنی اگر پسپائی کسی جنگی مصلحت سے ہو۔ مثلاً پیچھے ہٹ کر حملہ کرنا زیادہ موثر ہے یا ایک جماعت سپاہیوں کی مرکزی فوج سے الگ ہوگئی وہ اپنے بچاؤ کے لیے پسپا ہوکر مرکز سے ملنا چاہتی ہے تو ایسی پسپائی جرم نہیں ہے۔ گناہ اس وقت ہے جبکہ پسپائی صرف لڑائی سے جان بچانے کی نیت سے ہو۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اس مستثنیٰ کی وہ صورتیں ہیں جو کوئی سپاہی کسی جنگی تدبیر کے لیے اختیار کرتا ہے یا کوئی ایسی صورت اس کے سامنے آگئی ہے کہ وہ اپنے ایک مورچہ سے ہٹ کر اپنے کسی مورچہ کی طرف سمٹنا چاہتا ہے، یعنی جو چیز حرام ہے وہ فرار کی نوعیت کا پیٹھ دکھانا ہے، وہ پیچھے ہٹنا اس سے مستثنیٰ ہے جو تدبیر جنگ کی نوعیت کا ہو۔

ان آیات سے تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ مدمقابل اگر افرادی طاقت اور قوت و شوکت کے لحاظ سے اہل ایمان سے میدان جنگ میں برتر ہوں تو ان کے مقابلہ سے مسلمانوں کے لیے بھاگنا بجز ان مذکورہ بالا دو صورتوں کے جائز نہیں ہے لیکن اگر دشمن کی تعداد بہت زیادہ ہو پھر کیا کرنا چاہیے۔ اسی سورت کی آیت الآن خفف اللہ نمبر ۶۶ سے معلوم ہوتا ہے کہ میدان جنگ میں ایک مسلمان کو کم از کم دو دشمنوں پر بھاری ہونا چاہیے لہٰذا اگر دشمن دوگنے سے بھی زیادہ ہوں اور مسلمان لڑنے میں مصلحت نہ سمجھیں تو ایسا کر سکتے ہیں لیکن اس صورت میں بھی عزیمت یہی ہوگی کہ خدا پر بھروسہ کریں اور لڑنے سے منہ نہ موڑیں۔ اس حکم کو خاص جنگ بدر کے لیے سمجھنا صحیح نہیں ہے کیونکہ اعتبار عموم لفظ کا ہے نہ کہ خصوص سبب کا اور آیت میں یومئذ سے لڑائی کا وقت مراد ہے بدر کا دن نہیں۔ اس کی تائید کہ آیت میں یومئذ سے مراد لڑائی کا وقت مراد ہے اس سے بھی ہوتی ہے کہ آیت کا نزول بدر کے بعد ہوا ہے۔ اصل یہ ہی ہے کہ آیت کا منطوق عام ہے اگرچہ کچھ صحابہ و تابعین نے اسے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بدر کے لیے مخصوص قرار دیا ہے۔ مگر حافظ ابن کثیر نے صیغۂ مجہول لا کر اس کی تضعیف کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اور کچھ نے اس سے زیادہ گنجائش پیدا کی ہے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ صرف صحابہ کے لیے حرام تھا کیونکہ جہاد ان پر فرض عین تھا۔ لیکن یہ بات بھی کچھ وزن نہیں رکھتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ دشمن کے شدید دباؤ پر صرف پسپائی ناجائز نہیں ہے جبکہ اس کا مقصد اپنے عقبی مرکز کی طرف پلٹنا ہو یا اپنی ہی فوج کے کسی دوسرے حصہ سے ملنا ہو۔ جو چیز حرام کی گئی ہے وہ فرار ہے جو کسی جنگی مقصد کے لیے نہیں بلکہ محض بزدلی کے لیے شکست خوردگی کی وجہ سے ہوتی ہے اور اس لیے ہوتی ہے کہ بھاگنے والے کو اپنے مقصد کے بجائے جان زیادہ پیاری ہوتی ہے۔ اس فرار کو بڑے گناہوں میں شمار کیا گیا ہے چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ

تین گناہ ایسے ہیں کہ ان کے ساتھ کوئی نیکی فائدہ نہیں دیتی ہے ایک شرک دوسرے والدین کی نافرمانی، تیسرے میدان جنگ سے فرار۔

اس فعل کو اتنا بڑا گناہ قرار دینے کی وجہ صرف یہ ہی نہیں ہے کہ یہ ایک بزدلانہ فعل ہے بلکہ اس کی وجہ یہ ہے کہ ایک شخص کا فرار بسا اوقات ایک پوری پلٹن کا اور ایک پلٹن کا فرار، ایک پوری فوج کو بدحواس کر کے بھگا دیتا ہے۔

غزوۂ احد میں پسپائی کو شیطانی کردار قرار دیا ہے انما استزلهم الشيطان ببعض ما كسبوا۔ لیکن جرم کی اس سنگینی کے باوجود اللہ نے سب کو معاف کر دیا۔ ولقد عفا الله عنهم۔ یہی صورت حال غزوۂ حنین میں پیش آئی۔ بہرحال جنگ سے فرار قرآن وسنت کی روشنی میں مذکورہ بالا صورتوں کے علاوہ سنگین جرم ہے۔ یہ جرم کی سنگینی ہے کہ ایک بار ایک غیر فوجی مہم میں عبداللہ ابن عمر دشمن سے بھاگ کر مدینہ آگئے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں آ کر اعتراف کیا کہ ہم مقابلہ سے بھاگ کر آگئے۔ چونکہ یہ فوجی مقابلہ نہیں بلکہ گوریلا جنگ بھی اس لیے حضور اقدس نے یہ کہہ کر ان کو تسلی دی اور فرمایا انتم العكارون وانا فئتكم تم بھاگنے والے نہیں بلکہ کمک حاصل کر کے دوبارہ حملہ کرنے والے ہو اور میں تمہاری کمک ہوں۔ اگرچہ یہ واقعہ یزید ابن ابی زیاد کے حوالہ سے آیا ہے۔ اکثر ناقدین رجال نے ان کو ضعیف بتایا ہے۔ لیکن اس کے باوجود امام ترمذی نے اس کی تحسین کی ہے

بہر حال تاریخی حیثیت واقعہ کی کچھ ہو میں تو اس سے یہی سمجھتا ہوں کہ عبداللہ ابن عمر نے گوریلا دستوں اور باقاعدہ منظم فوجی جنگ کا حکم ایک سمجھ لیا تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ کہہ کر اس کی اصلاح فرما دی انتم العکارون۔

خلاصہ یہ ہے کہ اس آیت گرامی کے مصداق کے بارے میں شارحین قرآن نے ایک سے زیادہ خیالات پیش کئے ہیں۔

ایک یہ کہ حکم عام ہے اور تا قیام قیامت آیت قرآنی کا مطالبہ یہی ہے کہ دشمن حملہ آور ہو تو مقابلہ میں ڈٹ جانا چاہیے چاہے تعداد زیادہ ہو لیکن سورۃ انفال میں آنے والی آیت نے یہ بات کھول دی ہے کہ اپنے سے دوگنی تعداد کا یہ حکم ہے۔ اس سے زیادہ تعداد ہو تو وہ اس میں داخل نہیں ہے۔ بنا بریں عبداللہ ابن عباس فرماتے ہیں جو تین گنا کے سامنے سے ہٹ گیا وہ بھاگنے والا نہیں، ہاں جو دو گنے سے بھاگا وہ بھگوڑا ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یہ آیت صرف بدر والوں کے بارے میں ہے یعنی بدر کے روز یہ حکم تھا اس کے بعد نہیں۔

تیسری رائے یہ ہے کہ یہ آیت منسوخ ہے اور اس کی ناسخ انفال میں آنے والی آیت تخفیف ہے۔

ہمیں اس موضوع پر شرح السیر الکبیر میں امام شمس الدین السرخسی کی رائے زیادہ پسند آئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

جنگ سے گریز پائی صرف گناہ نہیں بلکہ گناہ کبیرہ ہے۔ حضور نے ان پانچ گناہوں میں شمار کیا ہے جن کا کفارہ کوئی نہیں ہے اور اس کو ہلاکت خیز گناہوں کی فہرست میں شامل کیا ہے۔ اگر مسلمانوں کی افرادی طاقت دشمن کی افرادی قوت سے آدھی ہو۔ ایک اور دو کی نسبت ہو تو مسلمانوں کے لیے بھاگنا حرام ہے۔ آغاز اسلام میں حکم یہ تھا کہ مسلمانوں کی عددی طاقت میں دشمنوں کے مقابلہ میں اگر ایک اور اس کی نسبت ہو تو ان کے لیے بھاگنا جائز تھا۔ اس کے بعد بھاگنے کے حرام ہونے کا حکم باقی ہے لیکن عددی تناسب کو ایک اور دس سے ہٹا کر ایک اور دو کی نسبت کر دی۔

لیکن یہ یاد رہے کہ یہ اس وقت ہے جبکہ مسلمانوں کے پاس سامانِ جنگ موجود ہو۔ بے ہتھیار کو ہتھیار والے کے سامنے ہٹ جانا ، بے تیر کو تیر انداز کے سامنے سے دُور ہو جانا۔ توپ کے دہانے کے سامنے سے ایک طرف ہو جانا جنگ سے بھاگنا نہیں ہے ۔ طاقت موجود ہو تو پھر اگر مسلمانوں کی فوج بارہ ہزار ہو، دشمن خواہ زیادہ ہو اس وقت بھاگنا بالکل ناجائز ہے ۔

فَلَمْ تَقْتُلُوْهُمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ قَتَلَهُمْ ۠ وَمَا رَمَيْتَ اِذْ رَمَيْتَ وَ
لٰكِنَّ اللّٰهَ رَمٰى ۚ وَلِيُبْلِيَ الْمُؤْمِنِيْنَ مِنْهُ بَلَاۗءً حَسَنًا ۭ اِنَّ
اللّٰهَ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۷﴾ ذٰلِكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ مُوْهِنُ كَيْدِ الْكٰفِرِيْنَ ﴿۱۸﴾
اِنْ تَسْتَفْتِحُوْا فَقَدْ جَاۗءَكُمُ الْفَتْحُ ۚ وَاِنْ تَنْتَهُوْا فَهُوَ خَيْرٌ
لَّكُمْ ۚ وَاِنْ تَعُوْدُوْا نَعُدْ ۚ وَلَنْ تُغْنِيَ عَنْكُمْ فِئَتُكُمْ
شَيْـــًٔا وَّلَوْ كَثُرَتْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ مَعَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۹﴾ ع ۲ ۱۶

لہٰذا تم نے اے مسلمانو میدانِ جنگ میں کافروں کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے قتل کیا ہے [20]۔ اور اے پیغمبر تم نے جب مشتِ خاک پھینکی تھی تو تم نے اس کو دشمن تک نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے دشمنوں تک پہنچائی [21]۔ اور یہ اس لیے ہوا تھا تاکہ اس طریقہ سے وہ اہلِ ایمان کو بہترین آزمائش میں آزمائے، بلاشبہ اللہ سننے والا، جاننے والا ہے [22]۔ یہ تو ہو چکا

اور یقین کرو کہ اللہ کافروں کو کمزور کر رہا ہے۔[۲۳] اگر تم فتح ہی
کے خواہاں تھے تو فتح تم کو مل گئی اور اگر باز رہو گے تو یہ
تمہارے لیے اچھا ہے اور اگر تم پلٹ جاؤ گے تو ہم بھی
پلٹ جائیں گے اور یاد رکھو کہ تمہاری جماعتی اکثریت
تمہارے کچھ کام نہ آئے گی اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔[۲۴]

بدر دعائی تدبیر کے اور نتائج

جنگ بدر کی غیر معمولی کامیابی کے بعد ہر مسلمان اپنے کارناموں کو بیان کرتا۔ کوئی کہتا کہ میں نے جنگ میں ایسی بہادری کا مظاہرہ کیا، کوئی اپنی جفاکشی اور جانفشانی کی داستان سناتا، کوئی بتاتا کہ میں نے فلاں کو مارا ہے۔ اس طرح سب اپنے کارنامے بیان کرنے لگے۔ تھوڑے تھے بہتوں کو مار بھگایا، کمزور تھے زورآوروں کے مقابلے میں بازی جیت گئے ایسے موقع پر اپنی قوت پر ناز ہونا ایک طبعی چیز ہے اور یہ سمجھنا کہ ہم بھی کچھ ہیں ایک حقیقت ہے۔ اہل ایمان کے لیے ایسا خیال مضر بھی ہے اور غلط بھی۔ اس خیال کی اصلاح بروقت ضروری تھی۔ چنانچہ ان آیات میں اللہ سبحانہٗ نے اہل ایمان کو جتا دیا کہ تم نے اپنے مدمقابل کو جو شکست دی ہے یہ تمہارا کارنامہ نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہٗ کا فضل و انعام ہے۔ یہی حقیقت ہے اس پر یقین کرنے سے تمہاری اخلاقی قوت برتر ہوگی اور تم اس سے زیادہ خطرناک مواقع پہ ڈٹ کر مقابلہ کر سکو گے۔ لیکن یہ ساری کہانی شارحین قرآن کی قیاس آرائی ہے ورنہ قرآن کا انداز بیان بالکل مربوط ہے۔ اس میں ایسا کوئی خلا نہیں جس سے کسی واقعہ کی نشاندہی ہوتی ہو جیسا کہ آپ کو

تشریح میں خود محسوس ہو جائے گا۔

اہل ایمان کو خدا پر اعتماد کرنا چاہیے

۲۰۔ اے مسلمانو! تم نے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے ان کو قتل کیا ہے۔ تم بے سروسامان قلیل التعداد مسلمانوں میں اتنی قدرت کہاں تھی کہ محض تمہارے زور بازو سے کافروں کے ایسے ایسے منہ مارے جاتے یہ تو خدا ہی کی قدرت کا کرشمہ ہے کہ اس نے ایسے متکبر سرکشوں کو فنا کے گھاٹ اتارا۔ یہ ضرور ہے کہ بظاہر کام تمہارے ہاتھوں سے لیا گیا اور ان میں وہ فوق العادت قوت پیدا کر دی جسے تم اپنے کسب و اختیار سے حاصل نہ کر سکتے تھے۔ یہ اس لیے کیا گیا کہ خدا کی قدرت کا اظہار ہو۔[1]

شارحین قرآن نے اس آیت پر جو تشریحی فوٹ نوٹ لکھے ہیں ان کا خلاصہ یہ ہے۔

حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

اللہ سبحانہ نے مشرکین کے قتل کی اہل ایمان سے نفی کی ہے اور اس کی نسبت اپنی طرف کی ہے صرف یہ بتانے کے لیے کہ اسباب کی حیثیت حقیقی نہیں ہے۔ حقیقی اور واقعی حیثیت تو خالق اسباب کی ہے۔ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ انسانی کردار میں اللہ کا کوئی حصہ نہیں یہ ان کے خلاف کھلی حجت ہے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ:

کہ فاعل حقیقی اور موثر اصلی اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے بندہ کا حصہ تو صرف کسب کے درجہ تک ہے۔ یہ قتل تمہاری قوت سے نہیں بلکہ اللہ کی امداد سے ہوا ہے ورنہ تم میں اس کا یارا کب تھا کہ اپنے سے سہ چند قوت کو پچھاڑ دے۔

علامہ نیشاپوری نظام الفرقان میں لکھتے ہیں:

اکثر مفسرین کے خیال میں یہ ہے کہ مسلمانوں نے جب قریش کو شکست دے دی تو ان میں کچھ تفاخر رونما ہو گیا ان سے کہا گیا کہ تم نے قتل نہیں کیا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بلکہ اللہ نے قتل کیا ہے ۔

علامہ قرطبی، امام رازی، علامہ زمخشری، علامہ آلوسی سب نے اسی کے قریب قریب لکھا ہے۔ لیکن قرآن کی تعبیر خود بتا رہی ہے ۔ اگر یہ آیات غزوہ بدر کے بعد نازل ہوئی ہیں، جیسا کہ عام شارحین کی رائے ہے۔ تو یہاں فار کا استعمال واضح اور صاف ہے۔ گویا یہ کہا گیا ہے اے پیروان دعوت ایمانی کبھی میدان جنگ سے منہ نہ موڑو کیونکہ تمہیں ڈٹنے اور جمنے کا مشرکین سے زیادہ مظاہرہ کرنا چاہیے۔ تم کو ہی اللہ نے افرادی قوت کم ہونے اور سامان نہ ہونے کے وقت مدد عطا فرمائی ہے اور تمہیں ہی اللہ کی تائید حاصل رہی۔ تمہاری ہی اللہ نے ڈھارس باندھی اور تمہاری ہی اللہ نے میدان جنگ میں قدم جمائے جب یہ سب کام اللہ نے کیے تو پھر تم نے اپنی مادی طاقت سے ان کو قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے تمہارے ہاتھوں سے اپنی تائید غیبی کے ذریعہ قتل کرایا ہے۔ اسی آیت کے ہم معنے قرآن میں یہ آیت ہے ۔

قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیکم و یخزھم

ان سے جنگ کرو اللہ تمہارے ہاتھوں ان کو عذاب دے گا اور ان کو ذلیل وخوار کرے گا۔

اس صورت میں فا شرط مقدر کے جواب میں آئی ہے گویا پوری بات یوں تھی۔

جب صورت حال یہ ہے تو تم نے ان کو اپنی مادی طاقت سے قتل نہیں کیا بلکہ اللہ نے اپنی تائید غیبی سے قتل کیا ہے ۔

اور ابوحیان اندلسی کے خیال میں یہ فا جواب شرط کی نہیں ہے بلکہ جملوں میں باہم ربط کے لیے آئی ہے۔ کیونکہ پہلے حکم ہوا تھا فاضربوا فوق الاعناق۔ اسی حکم کی بجاآوری سبب بنی ہے، مشرکین کے قتل کا۔ اب ان کو بتایا جارہا کہ تم فعل میں استقلالی حیثیت نہیں رکھتے کیونکہ اس پر قدرت عطا کرنا اللہ کا کام ہے ۔

نبوت کی مشت خاک

۲۱۔ اور اے پیغمبر تم نے جب مشت خاک پھینکی تھی تو تم نے اس کو دشمن تک نہیں پھینکا بلکہ اللہ نے دشمنوں تک پہنچائی۔ جب جنگ کی شدت ہوئی تو

حضور نے ایک مٹھی کنکریاں لشکرِ کفار کی طرف پھینکیں اور تین مرتبہ شاھت الوجوہ فرمایا۔ خدا کی قدرت سے کنکریوں کے ریزے ہر کافر کی آنکھ میں پہنچے۔ وہ سب آنکھیں ملنے لگے۔ ادھر سے مسلمانوں نے فوراً دھاوا بول دیا۔ آخر بہت سے کفار کھیت رہے۔ اسی کو فرماتے ہیں گو بظاہر کنکریاں تم نے اپنے ہاتھ سے پھینکیں تھیں لیکن کسی بشر کا یہ فعل عادۃً ایسا نہیں ہو سکتا کہ مٹھی بھر کنکریاں ہر سپاہی کی آنکھ میں پڑ کر ایک مسلح لشکر کی ہزیمت کا سامان بن جائے۔ یہ صرف خدائی ہاتھ تھا جس نے مٹھی بھر کنکریوں سے فوجوں کے منہ پھیر دیے۔[1]

محدثین اور مورخین کے بیان کے مطابق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ممتاز صحابہ کے ساتھ میدانِ جنگ کا معائنہ کیا اور جگہ جگہ بتاتے گئے کہ دشمن کا فلاں افسر فلاں جگہ ہوگا۔ حضور اقدس کا انتہائی خطرہ کے موقعہ پر اس درجہ اطمینان کے اظہار سے فوج میں جو ولولہ اور خود اعتمادی پیدا ہوئی ہوگی اس کا اندازہ لگا لینا مشکل نہیں ہے۔ حضور اقدس نے اپنی اس چھوٹی سی فوج کے لیے رضاکار عورتیں بھی مقرر کی تھیں۔ زخمیوں کی مرہم پٹی کرتی تھیں۔ سپاہیوں کو پانی پلاتیں۔ میدان میں دشمن کے گرے ہوئے تیر اٹھا کر مسلم تیر اندازوں کو دیتیں۔

جب آپ فوج کا معائنہ کر کے ہدایات جاری کر چکے تو آپ چند صحابہ کے ساتھ اس پہاڑی ٹیلہ پر پہنچے۔ جہاں آپ کے لیے عریش بنائی گئی تھی۔ یہاں سے میدانِ جنگ صاف نظر آرہا تھا۔ دشمن کے حملے کو دیکھ کر آپ نے آسمان کی طرف نظر اٹھائی اور مٹھی بھر خاک اٹھا کر دشمن کی طرف شاھت الوجوہ کہہ کر پھینکی۔ اس کے فوراً بعد پہاڑ کی طرف سے ایک ہوا کا جھونکا آیا جس کے ساتھ قریش کی طرف ریت کا طوفان بڑھا اور ان کے کیمپ میں ابتری پھیل گئی۔ ایک طرف مسلمانوں کے تیروں کی بارش تھی۔ دوسری طرف ریت کا طوفان اور تیسری طرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حملہ کرنے والے دستہ کو دشمن کے دائیں بازو پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اس دستہ میں سید الشہداء حمزہ، علی مرتضٰی اور ابو دجانہ وغیرہ جیسے نامور بہادر شامل تھے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قریش کے اسپ سوار اور شتر سوار ریت کے دلدل میں پھنس گئے۔ اس لیے دشمن کے اوسان خطا ہو گئے۔ ابو جہل نے پوری طاقت سے حملہ کیا مگر کارگر نہ ہوا۔ خود بھی دو بچوں سے اسی حملے میں مارا گیا اور دوسرے ساتھی بھی کام آئے۔ قریش کے پاؤں اکھڑ گئے اور افراتفری میں بھاگ اٹھے۔

قرآن نے اسی واقعہ کی یہاں تصویر پیش کی ہے۔ بدر میں کنکریاں پھینکنے کا واقعہ مختلف روایتوں میں آیا ہے۔ اور حافظ عسقلانی نے بھی لکھا ہے۔ اگرچہ علامہ طیبی نے یہ کہہ کر انکار کیا ہے کہ بدر کے دن کنکریوں کا واقعہ نہیں ہوا بلکہ حنین کی لڑائی میں یہ واقعہ ہوا ہے۔ حافظ سیوطی نے علامہ طیبی کی بے خبری پر افسوس کیا ہے اور لکھا ہے کہ ان کا حفاظِ حدیث میں شمار نہیں ہے۔ حدیث میں ان کا مبلغ علم صحاح ستہ مسند احمد مسند دارمی ہے اور بس۔ محدثین نے یہ واقعہ لکھا ہے اس لیے انکار بے معنی ہے۔

شارحینِ قرآن اس آیت کی تشریح میں تصوف و کلام کی وادیوں میں نکل گئے۔ جبریہ نے اس آیت کریمہ سے انسان کے مجبور ہونے کا پروانہ خیال کیا۔ صوفیا نے اس سے وحدۃ الوجود کی راہ نکالی۔ اشاعرہ نے کسب اور خلق میں باہم ہم آہنگی پیدا کی لیکن آیتِ قرآنی سب افکار و نظریات سے بالا ہے اور ان تاویلات سے پاک ہے۔ امام رازی اور علامہ آلوسی نے ان ہی موضوعات کو پیش نظر رکھ کر سوالات و جوابات کا ایک عجیب انداز پیش کیا ہے۔

دراصل ان بزرگوں کی نظر اس حقیقت سے اوجھل ہو گئی ہے کہ اس آیت میں اعجازِ نبوت کی نشاندہی ہو رہی ہے۔ اعجاز کی حقیقت یہی ہے کہ وہ فعلِ خداوندی ہوتا ہے اور نبوت کی حیثیت ایک آلہ کی ہوتی ہے۔ معجزے کے بارے میں عام لوگوں میں یہ غلط عقیدہ قائم ہو گیا تھا کہ نبی براہِ راست عالمِ کائنات میں تصرف کر سکتا ہے۔ چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسٰی کے معجزات کو جس انداز سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ تمام کائنات حضرت عیسٰی کے قبضے میں تھی اور وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کرتے تھے۔ یہی بنیادی پتھر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے دیوارِ کج کھڑی کی۔ اور اسی کا نتیجہ ہے کہ توحید کی عمارت اس پر قائم نہ رہ سکی۔ قرآن عزیز نے نہایت شدت اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادہ سے نہیں بلکہ خدا کی قدرت اور مشیت سے

ظاہر ہوتے ہیں۔ شاہ عبدالحق محدث دہلوی مدارج النبوت میں لکھتے ہیں :

معجزہ نبی کا فعل نہیں ہوتا بلکہ خدا تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جس کو وہ نبی کے ہاتھ پر ظاہر کرتا ہے۔

شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں :

معجزہ کا صادر ہونا اور ایمان کا قبول کرنا نبی کی خواہش اور اختیار سے نہیں ہوتا تاوقتیکہ اللہ تعالیٰ نہ چاہے اور ارادہ نہ فرمائے وہ واقع نہیں ہوتا۔

فتوح الغیب میں شیخ عبدالقادر جیلانی لکھتے ہیں :

معجزہ اور کرامت خدا تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے جو بندہ کے ہاتھ پر اس کی تصدیق و تکریم کی غرض سے ہوتا ہے۔ معجزہ بندہ کا فعل نہیں ہے جو اس کے ارادہ و اختیار سے صادر ہو جیسے کہ دوسرے افعالِ اختیاریہ ہوتے ہیں۔

یہ قرآن عزیز کے اسی اظہارِ حقیقت اور خالص تعلیم کا اثر تھا کہ اسلام میں توحید و نبوت کی حقیقتیں مشتبہ نہیں ہوئیں۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی میں ادنیٰ سا شائبہ بھی الوہیت کا مسلمانوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا اور تمام مذاہبِ عالم پر توحید کا علمبردار صرف اسلام رہا۔ بہرحال کنکریاں پھینکنا اگرچہ حضور اقدس کا معجزہ تھا مگر یہ فعل صرف حق تعالیٰ شانہ کا تھا۔ اسی لیے جو چیز حضور کے اختیار میں نہ تھی اور جس میں آپ کی قدرت اور کسب کو کوئی دخل نہ تھا اس کی صاف لفظوں میں اللہ سبحانہ نے نفی فرما دی حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں :

یعنی وہ تو صرف اللہ کی ذات تھی جس نے یہ ریزے ان کا فرول تک پہنچائے اور ان کو ذلیل کیا۔ یہ چیز آپ کے اختیار میں نہ تھی۔

اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں :

اے اللہ کے پیغمبر تم نے وہ سنگریزے نہیں پھینکے کہ تم ان کو دشمنوں تک پہنچا دیتے اور تمہیں اس پر قدرت نہ تھی جس وقت تم نے بظاہر سنگریزے پھینکے بلکہ اللہ نے پھینکے یعنی پھینکنے کے مقصد کو پورا کیا اور

ان سب کی آنکھوں تک پہنچا دیا تا آنکہ وہ شکست کھا گئے۔

معرکہ بدر میں حکمت خداوندی

۲۲۔ اور یہ اس لیے ہوا تھا تاکہ اس طریقے سے وہ اہل ایمان کو بہترین آزمائش میں آزمائے بلاشبہ اللہ سننے والا اور جاننے والا ہے۔ یعنی یہ اس لیے کیا گیا کہ خدا کی قدرت ظاہر ہو اور مسلمانوں پر پوری مہربانی اور خوب طرح احسان کیا جائے بے شک خدا مومنین کی دعا و فریاد کو سننے والا اور ان کے افعال و احوال کو خوب جانتا ہے۔ اور یہ بھی جانتا ہے کہ مقبول بندوں پر کس وقت کس عنوان سے احسان کرنا مناسب ہے۔[1]
اس آیت گرامی کے ترجمہ و تشریح میں شارحین قرآن لکھتے ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے اس کا ترجمہ اس طرح کیا ہے کہ اللہ چاہتا تھا ایمان والوں پر اپنی جانب سے خوب احسان کرے تحقیق اللہ ہے سنتا اور جانتا۔ مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں کہ تاکہ اللہ مسلمانوں کو اپنی طرف سے خوب اجر دے بلاشبہ اللہ خوب سننے والا جاننے والا ہے۔ مولانا محمد ادریس اور مفتی محمد شفیع صاحب نے بھی یہی لکھا ہے۔ مولانا آزاد فرماتے ہیں یہ اس لیے ہوا تھا کہ اللہ اس کے ذریعے ایمان والوں کو ایک بہترین آزمائش میں ڈال کر آزمائے بلاشبہ اللہ سننے والا جاننے والا ہے۔ مولانا مودودیؒ فرماتے ہیں کہ یہ اس لیے ہوا کہ اللہ مومنوں کو ایک بہترین آزمائش سے کامیابی کے ساتھ گزار دے۔ لفظی ترجمہ یہ ہے تاکہ آزمائش کرے اللہ اہل ایمان کی اچھی آزمائش۔ مقصد سب کا ایک ہے حضرت شاہ صاحب نے بلا کے معنے احسان فرماتے ہیں۔ ان ہی معنے کو محققین نے اختیار کیا ہے۔ ابلاء اللہ ابلاء حسنا اس وقت بولا جاتا ہے جب اللہ سبحانہٗ کسی کے ساتھ اچھا معاملہ کرے اور اسے نیکی کی توفیق دے کر آزمائے۔ زہیر شاعر کہتا ہے:

جزی اللہ بالاحسان ما فعلا بکم
وابلا هما خیر البلاء الذی یبلو

یعنی اللہ تعالیٰ نے ان دونوں سے وہ بہترین معاملہ فرمایا جو اپنے بندوں سے وہ کرتا ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور انسان کو خیر و شر ہی سے آزمایا جاتا ہے

علامہ طیبی نے یہاں یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ ابلا کے معنے ہیں کہ اللہ نے اہل ایمان کو میدان جنگ میں خوب آزمایا ہے ابلی اللہ عبادہ بلاحسنا کے معنے یہ ہیں کہ اللہ اپنے بندوں کو میدان میں اچھے جوہر نمایاں کیے۔ ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ ابلی فلان اس وقت بولا جاتا ہے جب کوئی لڑائی میں یا سخاوت میں مثالی کارنامہ کرے۔ ابوالسعود مفسر فرماتے ہیں کہ لیبلی المومنین کا معطوف علیہ محذوف ہے۔ پوری بات یوں ہو گی میدان جنگ میں یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ اللہ سبحانہ اپنی تائید و نصرت کی شان دکھائے اور مسلمانوں کے جوہر اچھی طرح نمایاں کر دے۔

دونوں صورتوں میں یہ آیت شہ کا بدر کے مقام کی نشاندہی کر رہی ہے۔ پہلے معنے کے لحاظ سے اس طرح کہ بدر کا معرکہ قائم ہوا ہے اس لیے کہ اللہ سبحانہ اپنے صحابہ کرام پر اپنے انعامات کی ارزانی فرمائے اور دوسرے معنے کے اعتبار سے اس طرح کہ بدر کا معرکہ قائم ہوا ہے اس لیے کہ اللہ سبحانہ صحابہ کی جواں مردی، شجاعت کے جوہر کی سر عام نمائش کرے۔ دونوں میں مقام صحابہ کی نشاندہی ہے۔ شائد اسی لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اللہ سبحانہ نے شرکائے بدر سے فرمایا ہے۔

جو چاہے کرو میں نے تمہیں بخش دیا ہے

زندگی میں اباحت کا نہیں گناہوں کی مغفرت کا پروانہ ہے۔ اسی لیے علماء کا اس پر اتفاق ہے کہ اس بشارت کا تعلق دنیوی احکام سے نہیں ہے بلکہ آخرت سے ہے۔ آخر میں ارشاد ہوا ہے اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ یعنی اللہ بدر میں ان کی دعاؤں، طلبگاریوں، دہائیوں اور استغاثوں کو سن رہا تھا اور ان کے ارادوں، نیتوں، اقوال اور اعمال کو جانتا تھا۔

جہاد کفر کی کمزوری کا ذریعہ ہے

۲۳۔ یہ تو ہو چکا اور یقین کرو کہ اللہ کافروں کو کمزور کر رہا ہے۔ یعنی اس وقت بھی خدا نے کفار مکہ کے سارے منصوبے خاک میں ملا دیے اور آئندہ بھی ان کی تدبیروں کو سست کر دیا جائے گا[1] اصل ارشاد میں ذالکم آیا ہے۔ یہ مبتدا سے محذوف

[1] افادات شیخ الاسلام

کی خبر ہے اگر اس محذوف کے چہرہ کو کھول دیا جائے تو پوری بات یوں ہوگی۔ معرکۂ بدر کی ایک حکمت یہ بھی کہ تم پر اللہ کے انعامات کی بارش ہو یا یہ کہ تمہاری جواں مردی اور شجاعت کا بول بالا ہو اس کے ساتھ معرکۂ بدر کی حکمت یہ بھی ہے کہ نہ صرف اب بلکہ مستقبل میں کافروں کی ساری سازشوں کو رسوا کیا جائے۔ اس سے یہ بات مترشح ہو رہی ہے کہ جن کو بدر میں شکست ہو چکی ہے۔ اب مستقبل میں ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہے گا۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا، بدر کے بعد قریش مکہ کی کوئی تدبیر ان کے لیے سود مند نہیں آئی۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ مستقبل کے لیے ایک اور بشارت ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ اللہ سبحانہ، مستقبل میں ان کی سازشوں کو ناکام بنا دے اور ان کے نظام کو ذلیل و رسوا کرے گا اور ان کو تباہی و بربادی کا نشانہ بنائے گا۔ جیسا کہ بتایا، تاریخ گواہ ہے ایسا ہی ہوا اس لحاظ سے یہ بھی حضور اقدس کا معجزہ ہے گویا یہ بھی نبوت کی دعائی تدبیر کا ایک جیتا جاگتا نتیجہ ہے۔

غزوہ بدر حضور اقدس کا معجزہ ہے

اب ہم قرآن کی تشریح میں اس جگہ آ گئے ہیں جہاں ہمیں یہ بات صاف طور پر سمجھ لینی چاہیے کہ بدر کی جنگ صرف جنگ ہی نہیں ہے بلکہ رسول اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک شاندار اعجازی کارنامہ ہے۔ جس طرح مختلف نبیوں کے زمانے میں دوسری قوموں کے لیے عذاب کے مختلف معجزات کا ظہور ہوا۔ اسی طرح جس قوم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے تھے اس کے لیے غزوہ بدر معجزہ عذاب تھا۔ ہجرت سے پہلے حضور اقدس کی بددعا سے پہلے قریش پر قحط کا عذاب آیا جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں سا نظر آتا تھا۔ کچھ لوگ سائے قریش نے خدمت نبوی میں آکر کہا کہ اے محمد تم رحمت و شفقت اور صلہ رحمی کی دعوت دیتے ہو۔ تم دیکھتے ہو کہ اس قحط سے قریش کا کیا حال ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اور یہ بلا دور ہوئی مگر پھر قریش کی سرگرمی کا وہی عالم ہو گیا۔ اس کے بعد معجزہ عذاب کے سوا کوئی چارہ نہ تھا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بدر کا بطشۂ کبریٰ ان کی ہلاکت کی نشانی قرار پایا۔ قرآن حکیم نے

ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں اپنا اعلان عام سنا دیا تھا۔ اس سے پہلے اس قحط کی پھر ان کے گڑگڑانے کی اور اس کے بعد یہ کہہ کر غزوۂ بدر کی پیشین گوئی کی تھی یوم نبطش البطشۃ الکبرٰی انا منتقمون اس آیت میں یہ بتا دیا گیا ہے کہ البطشۃ الکبرٰی ان لوگوں کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو فرعون کے لیے غرق بحر کی تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ بطشہ کبرٰی والی آیت قریش کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ قریش نے جب نافرمانی کی حد کر دی تو حضور اقدس نے اللہ سے دعا کی تھی، اے اللہ ان کے لیے حضرت یوسف کے سات برس والا قحط نازل فرما۔ چنانچہ سخت قحط پڑا۔ مکہ والوں نے حضور سے ازالہ قحط کے لیے درخواست کی۔ آپ نے دعا کی اور بارش ہوئی۔ قرآن نے بتایا انا کاشفوا العذاب قلیلا انکم عائدون اچھا ہم تھوڑے دنوں کے لیے عذاب ہٹاتے ہیں لیکن تم پھر وہی کچھ کرو گے یعنی ایمان نہ لاؤ گے چنانچہ ایسا ہی ہوا تب اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بدر کا دن مقرر فرمایا[1]

آپ نے یہ بات بارہا سنی ہوگی کہ صحن حرم میں جو رؤسائے قریش آپ کی نماز میں خلل انداز ہوتے تھے۔ آپ نے ان کا نام لے کر ہر ایک کے لیے بددعا کی تھی۔ اس سے پہلے کہ غزوہ بدر پیش آئے ہجرت کے بعد ہی آپ نے ان کی ہلاکت و بربادی کا اعلان کر دیا تھا۔ بدر سے پہلے حضرت سعد انصاری عمرہ کو گئے تھے۔ ابوجہل نے ان کو روکا امیہ نے بیچ میں دخل دینا چاہا۔ حضرت سعد نے کہا امیہ تم دخل نہ دو۔ حضور نے فرمایا کہ تم ان کے ہاتھوں سے مارے جاؤ گے۔ یہ سن کر امیہ ڈر گیا۔ چنانچہ جب بدر کا موقع پیش آیا تو اس نے اسی ڈر سے جانے میں پس و پیش کی۔ لوگوں کے طعن سے اس نے جانا چاہا تو اس کی بیوی نے دامن تھام لیا اور کہا کیا تم کو اپنے یثربی دوست کی بات یاد نہیں[2]

جب غزوۂ بدر کے لیے آپ مسلمانوں کو ساتھ لے کر نکلے تو اس وقت جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں مسلمانوں کے سامنے قریش کی دو جمعیتیں تھیں۔ ایک قریش کا تجارتی قافلہ جو بدر سے ہو کر مکہ جا رہا تھا۔ دوسرا رؤسائے قریش کا جنگی لشکر جو

---

[1] صحیح بخاری [2] صحیح بخاری کتاب المغازی

مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلا تھا۔ خدا نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان دو جمعیتوں میں سے ایک ان کے ہاتھ لگے گی۔ عام مسلمان یہی سمجھتے تھے کہ تجارتی قافلہ ان کے ہاتھ آئے گا۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آج معمولی فتح و شکست کا نہیں بلکہ اس بطشۃ الکبریٰ کا دن ہے جس کا بارگاہ الٰہی میں مدت سے وعدہ تھا۔ رات کو جب مسلمان بدر کے پڑاؤ پر پہنچے تو انہیں یہ فکر ہوئی کہ قریش کے تجارتی قافلہ کا پتہ لگایا جائے۔ چنانچہ مسلمان مخبر ادھر اُدھر گئے اور ایک چرواہے کو پکڑ لائے اور اس سے قریش کے قافلہ کا حال پوچھنے لگے۔ اس نے جواب دیا کہ قریش کے قافلہ کا تو مجھے علم نہیں البتہ اُن کا لشکر ادھر پڑا ہے۔ یہ سن کر مسلمانوں نے اس کو مارا کہ یہ ہم سے صحیح حال چھپاتا ہے۔ مار کھانے پر اس نے کہا اچھا ٹھہرو قافلہ کا حال بتاتا ہوں۔ جب لوگ اسے چھوڑ دیتے تو پھر وہ یہی کہتا کہ مجھ کو قافلہ کی خبر نہیں البتہ یہ جانتا ہوں کہ ادھر قریش کا لشکر سامنے پڑا ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نماز میں مصروف تھے۔ اس سے فراغت ہوئی تو فرمایا جب وہ جھوٹ کہتا ہے تو تم چھوڑ دیتے ہو اور جب وہ سچ کہتا ہے تو تم مارتے ہو۔ اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ قریش کی تباہی کا دن ہے۔ یہ ابوجہل کا مقتل ہے، یہ عتبہ کا ہے، یہ ابی کا ہے۔ عبداللہ بن مسعود جو صحن حرم کی بددعا کے دن موجود تھے وہ کہتے ہیں کہ عرب کے ساتوں رئیس جن کے حق میں آپ نے بددعا کی تھی سب کے سب میدانِ بدر میں ڈھیر ہو گئے۔ اور بطشۂ کبریٰ کے انتقام کی پیشین گوئی پوری ہوئی۔

بہرحال بدر کا دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اعجازی شاہکار ہے اور روحانی تدبیر کا شاندار نتیجہ ہے۔ اسی لیے آیت میں یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ بدر میں جو کچھ ان پر عذاب آیا صرف وہی نہیں بلکہ مستقبل میں بھی ان کے بچ رہنے کی کوئی تدبیر کامیاب نہ ہوگی۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

> مسلمانو! جان لو کہ اس فتح و کامیابی کے ساتھ اللہ تعالیٰ ان کی سازشوں کو کمزور کرے گا تاآنکہ وہ ذلیل ہو کر حق کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیں یا ختم ہو جائیں [1]

---

[1] تفسیر ابن جریر

اعمال کی درستگی کے بغیر دعائی تدبیر

۲۴- اگر تم فتح مندی کے خواہاں تھے تو فتح تم کو مل گئی، اگر باز رہو گے تو یہ تمہارے لیے اچھا ہے اور اگر لوٹ جاؤ گے تو ہم بھی پلٹ جائیں گے اور یاد رکھو تمہاری جماعتی عددی طاقت تمہارے کچھ کام نہ آئے گی۔ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔ یہ خطاب کفار مکہ کو ہے وہ ہجرت سے پہلے حضور اقدس سے کہتے تھے متی هذا الفتح ان کنتم صادقین یعنی ہمارے اور تمہارے درمیان یہ فیصلہ کب ہو گا۔ سو پورا فیصلہ تو قیامت کے روز ہو گا مگر ایک طرح کا فیصلہ آج میدان بدر میں بھی تم نے دیکھ لیا کہ کیسے خارق عادت کے طور پر تم کو کمزور مسلمانوں کے ہاتھوں سے سزا ملی۔ اب اگر نبی علیہ السلام کی مخالفت اور کفر و شرک سے باز آ جاؤ تو تمہارے لیے دنیا و آخرت کی بہتری ہے ورنہ پھر اگر اسی طرح لڑائی کرو گے تو ہم بھی پھر اسی طرح مسلمانوں کی مدد کریں گے اور انجام کار تم ذلیل و خوار ہو گے۔ جب خدا کی تائید مسلمانوں کے ساتھ ہے تو تمہارے جتھے اور جماعتیں خواہ کتنی ہی تعداد میں ہوں کچھ کام نہ آئیں گے۔ بعض روایات میں ہے کہ ابو جہل نے مکہ سے روانگی کے وقت کعبہ کے پردے پکڑ کر دعا کی تھی کہ خداوندا دونوں میں جو اعلیٰ و اکرم اسے فتح دے اور فساد مچانے والے کو مغلوب کر فقد جاءکم میں اس کا بھی جواب ہو گیا کہ جو واقعی اعلیٰ افضل تھے۔ ان کو فتح مل گئی اور مفسد ذلیل و رسوا ہو گئے۔ ؎

شارحین قرآن نے اس آیت گرامی کی دو طریقہ پر تشریح کی ہے۔

ایک تو یہ ہے جسے شیخ الاسلام نے اپنایا ہے۔ یہی عام شارحین قرآن کی رائے ہے۔ اس صورت میں اس آیت کے مخاطب اہل ایمان نہیں بلکہ مشرکین مکہ ہیں لیکن سیاق و سباق میں مخاطب اہل ایمان ہیں۔ پہلے یا ایها الذین آمنوا اذا لقیتم ہے اور بعد میں بھی یا ایها الذین آمنوا اطیعوا الرسول آیا ہے اور ان کے درمیان کوئی بھی قرینہ موجود نہیں جس کی وجہ سے خطاب کا رخ عبادت میں مشرکین کی طرف ہو۔

؎ افادات شیخ الاسلام

اوروں کا پتہ نہیں مگر میری رائے میں یہ بلاغت قرآنی کے خلاف ہے۔ اس لیے کچھ شارحین قرآن کی رائے یہ ہے کہ آیت گرامی کے اہل ایمان مخاطب ہیں۔ علامہ آلوسی اور قاضی ثناء اللہ نے اس کو حضرت ابی بن کعب کی تشریح قرار دیا ہے۔ اور قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ سیاق قرآنی سے اسی کی تائید ہوتی ہے۔ اگر آیت میں روئے سخن اہل ایمان کی طرف ہے تو مطلب صاف ہے کہ مسلمانو! تم نے بدر کے موقعہ پر فتح کی دعا مانگی تھی۔ اللہ نے تمہیں فتح دے دی ہے۔ اب آئندہ کے لیے یاد رکھو کہ اگر زندگی میں خدا کی نافرمانی سے بچو گے ایمان کے ساتھ اعمال و اخلاق درست رکھو گے تو یہ تمہارے لیے بہتر ہوگا۔ اور تمہیں ہی اس کا فائدہ ہوگا۔ اور اگر تم پلٹ جاؤ گے یعنی تمہاری زندگیاں خدا اور اس کے رسول کی طاعت سے بیگانہ ہو جائیں گی تو پھر ہم بھی پلٹ جائیں گے۔ یعنی جیسے تمہارے اعمال ہوں گے ویسے ہی نتائج ہوں گے وان تعودوا نعد دو لفظوں میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو جزائے عمل کے بارے میں کہا جا سکتا ہے۔ اس سے قرآن کی معجزانہ بلاغت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے ان تعودوا نعد اگر تمہاری زندگی میں اعمال غلط ہو جائیں گے تو ہم بھی لوٹ جائیں گے۔ بدر کی فتح تو تمہارے اعمال کا نتیجہ ہے۔ اگر تم اسلامی زندگی کو خیر باد کہہ دو گے تو اللہ کا قانون مجازات بھی تمہارے حق میں بدل جائے گا۔ عمل اور نتیجہ دو ایسی لازم و ملزوم حقیقتیں ہیں جو کسی حال میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتی ہیں۔ نتیجہ عمل کا سایہ ہے۔ جہاں عمل آیا اس کا سایہ بھی ساتھ آگیا۔ تم نے اچھے عمل کی طرف رُخ کیا اور ایمان کے جوہر دکھائے جیسا کہ لیبلی المومنین سے معلوم ہو رہا ہے۔ کامیابی اور فتح مندی نے بھی تمہارا رُخ کر لیا۔ نہ اب بدر میں تمہیں کامیابی افرادی طاقت سے ملی ہے اور نہ آئندہ افرادی قوت تمہارے کام آئے گی خواہ افرادی طاقت کتنی زیادہ ہو جائے۔ مدار کامیابی تو صرف ایمان اور اس کے تقاضوں کو پورا کرنا ہے اور بس۔ بدر میں ہم نے تمہارے ایمان کے مظاہرے کی وجہ سے تمہیں فتح مندی سے ہمدوش کیا ہے آئندہ بھی ایمان کے اگر ایسے ہی مظاہر رونما ہوئے تو فتح مندی یقینی ہے۔ اس میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ تمہیں اللہ نے ایک ایسی اُمت بنایا ہے جو باقی ساری نوع انسانی کی ہادی اور پوری انسانیت کی پاسبان ہے۔ اور یہی تمہارے وجود کا اولین اور آخری مقصد ہے۔ اگر تم اس مقصد سے بے تعلق ہو گئے تو تمہاری اہمیت ختم ہو

جائے گی، تمہاری قدر و قیمت اسی وقت تک باقی رہے گی جب تک تم اپنے وجود کے مقصد کو پورا کرتے رہو گے۔ دُنیا کی مادی طاقت اور افراد کی عددی اکثریت تمہارے کچھ کام نہ آئے گی۔ اگر تم اپنی زندگیوں کو اپنے مقصدِ وجود سے وابستہ نہ رکھو گے۔ اگر مقصدِ وجود سے وابستہ رہو گے تو بے سرو سامانی، مفلسی اور غربت اور تعداد میں قلت کے باوجود بدر کی طرح اللہ سبحانہٗ تمہاری مدد کرے گا۔ کیونکہ اللہ کی معیت ایمان والوں کو حاصل ہوتی ہے۔

بہر حال جمہور شارحینِ قرآن کی وہ رائے ہے جو مولانا عثمانی نے پیش فرمائی ہے اگر سیاقِ قرآنی کا انداز یہ نہ ہوتا جو ہے تو جمہور کی تشریح زیادہ قرینِ قیاس ہے لیکن سیاقِ قرآنی اس کا ساتھ نہیں دے رہا ہے اس لیے آیت کی تشریح میں ابی بن کعب کا موقف زیادہ پائیدار ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوٓاْ أَطِيعُواْ ٱللَّهَ وَرَسُولَهُۥ وَلَا تَوَلَّوْاْ عَنْهُ وَأَنتُمْ

تَسْمَعُونَ ﴿٢٠﴾ وَلَا تَكُونُواْ كَٱلَّذِينَ قَالُواْ سَمِعْنَا وَهُمْ لَا يَسْمَعُونَ ﴿٢١﴾

إِنَّ شَرَّ ٱلدَّوَآبِّ عِندَ ٱللَّهِ ٱلصُّمُّ ٱلْبُكْمُ ٱلَّذِينَ لَا يَعْقِلُونَ ﴿٢٢﴾

وَلَوْ عَلِمَ ٱللَّهُ فِيهِمْ خَيْرًا لَّأَسْمَعَهُمْ ۖ وَلَوْ أَسْمَعَهُمْ لَتَوَلَّواْ

وَّهُم مُّعْرِضُونَ ﴿٢٣﴾

مسلمانو! اللہ کی اور اُس کے رسول کی اطاعت کرو اس

سے روگردانی نہ کرو اور تم سن رہے ہو[25] اور ان لوگوں کی

طرح نہ ہو جاؤ جنہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا حالانکہ وہ

نہیں سنتے[26] بلاشبہ اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ لوگ

ہیں جو بہرے گونگے ہیں جو عقل سے کام نہیں لیتے[27]

اور اگر اللہ کو معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی خیر ہے تو وہ

ضرور ان کو سننے کی توفیق دیتا۔ اور اگر وہ ان کو سنوا

دیا وہ ضرور بے رُخی برتتے ۔[۲۸]

اسلامی زندگی مکمل طاعت کا نام ہے

اگر یہ مسلّم ہے کہ اس وقت رات نہیں ہے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس وقت لازماً دن ہے۔ اس لیے جب یہ تحقیق ہو گئی کہ انسانیت کا کوئی مسئلہ نہیں جو اسلام کے دائرے سے باہر ہو۔ وہ ایک ایسا دین ہے جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ جو قدم بھی اٹھانا چاہتا ہے اس کی رہنمائی کو سامنے پاتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ اس قدر جامع دین ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرتے ہوئے ہے۔ کچھ اسی طرح جس طرح کہ ہوا کا کرہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ قرآن نے اس آیت میں مسلمانوں کو اسلام کی ہمہ گیر طاعت کا حکم دیا ہے۔ خدا اور رسول کی طاعت کے مقابلہ میں یہاں کسی اور طاعت کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ پہلے یہ بتایا تھا کہ اللہ اہلِ ایمان کے ساتھ ہے۔ ان آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ خدا کا اہلِ ایمان کے ساتھ ہونا مردم شماری کے رجسٹر میں مسلمان درج ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ دو شرطوں کی تکمیل پر موقوف ہے۔

اوّل یہ کہ مومن ہونے کا دعویٰ کرتے ہو تو زندگی کی ہر شاخ میں اللہ و رسول کی طاعت کرو۔

دوسرے یہ کہ حضور اقدس کا حکم سننے کے بعد روگردانی نہ کرو۔ حضور اقدس کی بات سے لاپرواہی نہ کرو۔ ایسا نہ ہو کہ فرمانِ رسول سننے کے بعد سُنی ان سُنی برابر کر دو اور تعمیل نہ کرو۔ ان لوگوں کی طرح نہ ہو جاؤ جو زبان سے کہہ دیتے ہیں کہ ہم نے سُن لیا لیکن واقع میں وہ سنتے نہیں ہیں کیونکہ اس کی طرف توجہ اور اس پر عمل نہیں کرتے۔ منشاء یہ ہے کہ صرف مردم شماری کا مسلمان ہونا کافی نہیں ہے۔

خدا کی نصرت کیسے آتی ہے؟

۲۵- مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول کی طاعت کرو، اس سے رُوگردانی نہ کرو

اور تم سن رہے ہو۔ پہلے فرمایا تھا کہ اللہ ایمان والوں کے ساتھ ہے۔ اب ایمان والوں کو بتایا جا رہا ہے کہ ان کا معاملہ خدا اور رسول کے ساتھ کیسا ہونا چاہیے جس سے وہ خدا کی نصرت کے مستحق ہوں سو بتلا دیا کہ ایک مومن صادق کا کام یہ ہے کہ ہمہ تن خدا اور رسول کا فرمانبردار رہے۔ احوال و حوادث خواہ اس کا کتنا ہی منہ پھیرنا چاہیں مگر خدا کی باتوں کو جب وہ سن کر سمجھ چکا اور تسلیم کر چکا تو قولاً و فعلاً کسی حال میں ان سے منہ نہ پھیرے[1] وانتم تسمعون اصل میں حال بن کر آیا ہے۔ اس کے دو معنے ہیں۔ ایک معنی یہ ہیں کہ یہ جانتے ہوئے کہ آپ کی دعوت کیا ہے ان کی طاعت سے روگردانی نہ کرو۔ یعنی ہر حال میں آپ کے احکام کی پیروی کرو۔ احکام کی نوعیت خواہ کچھ ہو۔ یہ معنے حافظ ابن کثیر نے بیان فرمائے ہیں۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ تم یہ جانتے ہو کہ قرآن نے پیغمبر کی طاعت واجب کی ہے اور اس کی نافرمانی سے منع کیا ہے۔ پھر نبوت کے احکام سے روگردانی کرتے ہو ایسا نہ کرو۔ یہ معنے علامہ آلوسی نے بتائے ہیں۔ دونوں میں گہری معنویت ہے۔ دونوں کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کے رسول کی اطاعت کرو جس طرح ایمان کا تقاضا ہے۔ وانتم تسمعون حال ہے اور ذوالحال کی قید ہوتا ہے۔ یہ قید جرم کی سنگینی کو ظاہر کر رہی ہے۔ یعنی یہ کہ رسول کی موجودگی میں جب کہ تم اس کی دعوت سن رہے ہو اس سے اعراض نہ کرو۔ اس ارشاد کی بالکل وہی حیثیت ہے جو قرآن میں اس آیت کی ہے۔

کیف تکفرون وانتم تتلی علیکم آیات اللہ وفیکم رسولہ

تم راہ کفر کیسے اختیار کر سکتے ہو جبکہ تمہارے سامنے اللہ کی آیتیں پیش ہو رہی ہیں اور تم میں اللہ کا رسول موجود ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے نبوت کی طاعت سے اعراض کی کب گنجائش ہے جبکہ تم میں اللہ کا رسول موجود ہے اور تم اس سے خدا کے احکام سن رہے ہو ولا تولوا میں عنہ کی ضمیر کا مرجع صرف اللہ کا رسول ہے حالانکہ پہلے اللہ اور رسول دونوں کا ذکر ہے۔ یہ اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے، جیسے اللہ کے رسول کی طاعت بالکل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اللہ کی طاعت ہے ٹھیک اسی طرح رسول سے اعراض بھی اللہ سبحانہٗ سے اعراض ہے جس نے رسول سے منہ پھیر لیا اس نے اللہ سے منہ موڑ لیا - اللہ سبحانہٗ تعلق اور اس کی طاعت کا واحد ذریعہ اللہ کا رسول ہے -

دراصل اسلامی زندگی کی فطرت اور حقیقت پر غور کیا جائے تو یہ حقیقت بے غبار ہو کر سامنے آتی ہے کہ اس کا اصلی مقصد افراد کی تکمیل ذات اور مسلمان کی اجتماعی خودی کی نشوونما ہے - یہ مقصد اسی وقت حاصل ہو سکتا ہے جب انفرادی شخصیت اور اجتماعی سیرت کا کوئی ایسا مکمل نمونہ افراد کے سامنے موجود ہو - کیونکہ اس کے بغیر شخصیت کا حقیقی مفہوم اور اجتماعی سیرت کا معیار مقرر کرنا دشوار ہے - قرآن کا فیصلہ ہے کہ رسول کی شخصیت و سیرت ایک نمونہ ہے اور ایسا نمونہ ہے کہ قرآن رسول کی طاعت کو براہِ راست خدا کی طاعت اور رسول سے اعراض کو براہِ راست اللہ سبحانہٗ سے اعراض بتا رہا ہے - اس کا کھلا مطلب یہ ہے کہ رسول کی ذات مورد عنایات الٰہی اور مرکز الطاف و توجہات ہوتی ہے - اس کے اخلاق و عادات اس کی زندگی کے طور طریقے سب اللہ سبحانہٗ کی نظر میں محبوب ہوتے ہیں اور زندگی کے تمام طریقوں میں اس کا طریقہ حیات لوگوں کے اخلاق میں اس کا اخلاق اور لوگوں کی گوناگوں عادتوں میں سے اس کی عادتیں اللہ کے نزدیک پسندیدہ ہوتی ہیں -

جمہور کی رائے میں اس آیت کے مخاطب منافقین نہیں بلکہ مومنین ہیں اور ان کو غزوۂ بدر کی کامیابی کے بعد مستقبل میں کامیابی سے ہمدوش ہونے کا طریقہ بتایا جا رہا ہے - لیکن کچھ کا خیال ہے کہ اس کے مخاطب منافقین ہیں اور انتم تسمعون ان کے رویہ کی شناعت کو ظاہر کر رہا ہے کہ جب تم رسول کی موجودگی میں ٹھوکریں کھاؤ گے تو کل تمہارا کیا بنے گا لیکن یہ خیال درست نہیں ہے -

احکام نبویہ پر جاں نثاری ہونی چاہیے

۲۶ - اور ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جنہوں نے کہا کہ ہم نے سنا حالانکہ وہ نہیں سنتے یعنی زبان سے کہتے ہیں کہ ہم نے سن لیا حالانکہ وہ سنا ہی کیا جو آدمی سیدھی سی بات کو سن کر سمجھے نہیں یا سمجھ کر قبول نہ کرے - پہلے یہودیوں نے موسیٰ علیہ السلام

سے کہا تھا سمعنا و عصینا ہم نے سن لیا مگر مانا نہیں۔ مشرکین مکہ کا قول آگے آتا ہے قد سمعنا لو نشاء لقلنا مثل ھذا یعنی جو قرآن آپ سناتے ہیں ہم نے سن لیا ہم چاہیں تو اسی جیسا کلام بنا کر لے آئیں۔ مدینہ کے منافقین کا تو شیوہ ہی تھا کہ پیغمبر علیہ السلام اور مسلمانوں کے سامنے زبانی اقرار کر گئے اور دل سے اسی طرح منکر رہے۔ بہرحال مومن صادق کی شان ان یہود مشرکین اور منافقین کی طرح نہ ہونی چاہیے۔ اس کی شان یہ ہے کہ دل سے زبان سے عمل سے حاضر و غائب احکام الہیہ اور فرامینِ نبویہ پر نثار ہوتا ہے [1]

اصل میں اس آیت میں یہود کی طرف اشارہ ہے۔ یہود کا قرآن میں اس سے پہلے یہ چہرہ پڑھ چکے ہو و یقولون سمعنا و عصینا، ہم نے سنا اور نہیں مانا۔ کہنا ان کو چاہیے تھا سمعنا و اطعنا۔ ہم نے سن لیا اور مان لیا۔ اہلِ عرب یہ اس موقعہ پر بولتے ہیں جب اپنے کسی بڑے، کسی سردار، کسی بادشاہ کے حکم پر اپنی طرف سے امتثالِ امر کے لیے آمادگی اور مستعدی کا اظہار کرنا چاہتے ہیں۔ اور یہ بھی قرآن میں ہے کہ یہود کا یہ طرزِ عمل اپنے پیغمبر کی موجودگی میں رہا ہے گویا اہلِ ایمان کو بتایا جا رہا ہے کہ مستقبل میں اگر تم نے بھی یہ طرزِ عمل اختیار کیا تو کامیابی کی جگہ ناکامی آجائے گی۔ ایمان کی حدود میں اسلامی زندگی علم و عمل میں نبوت سے وابستگی کا نام ہے۔ اس سے جدائی جب ہوگی تنزل و ادبار کا اسی وقت آغاز ہو جائے گا۔ ماضی میں ایسا ہو چکا ہے کہ نبوت کے علم و عمل سے جدا ہو کر سب کچھ رکھنے کے باوجود سب کچھ کھو بیٹھے۔ اقبال کی جگہ ادبار، عروج کی جگہ تسفل، ترقی کی جگہ تنزل، عزت کی جگہ ذلت، حکومت کی جگہ محکومی اور بالآخر زندگی کی جگہ موت ان پر چھا گئی۔ یہ آیت ٹھیک ایسے ہی موقعہ پر آئی جیسے تم آلِ عمران میں یہ آیت پڑھ چکے ہو۔

و لا تکونوا کالذین تفرقوا و اختلفوا من بعد ما جاء البینات۔ واُولٰئک لھم عذاب عظیم۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو جُدا جُدا ہو گئے اور واضح آیات آنے کے باوجود باہم اختلاف میں پڑ گئے۔

نظم کلام کی روشنی میں ان آیات کا مطالعہ کرو گے تو یہ حقیقت بے نقاب ہو کر سامنے آجائے گی کہ نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے محروم ہونے کے بعد اہل کتاب اختلاف و انتشار کا شکار ہو گئے۔ اور یہ انتشار ایمان کے بعد درحقیقت کفر کی طرف پلٹ جانے کے مترادف ہے۔ دُنیا میں مسلمان کی سربلندی کے لیے ضروری ہے کہ ان کی زندگی نبوت کے علم و عمل سے وابستہ ہو۔ اگر وہ اپنی شامتِ اعمال سے نبوت کے علم و عمل سے ہٹ کر کسی اور راہ کو اپنا لیتے ہیں۔ تو ان کو ذلت و رُسوائی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اس آیت کا بھی مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں بدر جیسی کامیابی چاہتے ہو تو ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو اس دُنیا کی زندگی میں نبوت سے ہٹ گئے اور نبوت کی بات مسلمان ہونے ہوئے سُنی ان سنی کر دی۔ کان کی حد تک ارشادِ نبوت سن لیا لیکن عمل کے معاملہ میں نبوت سے بیگانگی اختیار کر لی۔ غور کرو آج ہماری اجتماعی زندگی کی سب سے بڑی اور بنیادی بیماری یہی ہے۔ اہل ایمان کو بتا دیا گیا کہ تمہارا طرزِ عمل یہ نہ ہونا چاہیے۔ علامہ قرطبی کی یہ بات یہاں برمحل ہے کہ

یہ آیت اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے کہ مومن کا یہ کہنا کہ میں نے سن لیا بے معنے اور بے فائدہ ہے جب تک اس کی زندگی میں امتثال اور بجا آوری کا اظہار نہ ہو۔ اوامر کو سن کر اگر تعمیل نہیں کرتا اور نواہی کو سن کر اگر اجتناب نہیں کرتا تو سننے اور ماننے کے کوئی معنے نہیں۔

علامہ زمخشری لکھتے ہیں :

قرآن اور نبوت کو مانتے ہوتے اگر تمہاری زندگی میں کچھ باتوں میں طاعت رسول نہیں ہے تو تمہارا ماننا نہ ماننا اور تمہارا سننا نہ سننا ہے۔

اسلامی زندگی کا بدترین عنصر

۲۷۔ بلاشبہ اللہ کے نزدیک بدترین جانور وہ لوگ ہیں جو بہرے گونگے ہیں جو

عقل سے کام نہیں لیتے۔ یعنی جنہیں خدا نے بولنے کے لیے زبان، سننے کو کان اور سمجھنے کو دل و دماغ دیے ہیں۔ پھر انہوں نے یہ سب قوتیں معطل کر دیں۔ نہ زبان سے حق بولنے اور حق کو دریافت کرنے کی توفیق ہوئی نہ کانوں سے حق کی آواز سُنی نہ دل و دماغ سے حق کو سمجھنے کی کوشش کی۔ غرض خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو اس اصلی کام میں صرف نہیں کیا جس کے لیے فی الحقیقت عطا کی گئی تھیں بلاشبہ ایسے لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں۔ [1]

انسان کو جانوروں سے ممتاز کرنے والی چیز صرف علم ہے۔ علم کے حاصل ہونے کے تین ہی ذریعے ہیں۔ سننا، دیکھنا اور سمجھنا۔ قرآن ان لوگوں کو جو علم کے ان ذرائع کو معطل کر کے اپنے نوعی امتیاز سے محروم ہو جاتے ہیں جانور ہی نہیں بلکہ بدترین جانور قرار دیتا ہے۔ اور اس کی وجہ سے انسان کو بولنے کی نعمت ملی ہے۔ خلق الانسان و علمہ البیان۔ ایک انسان اگر ان علمی ذرائع سے فائدہ نہیں اٹھاتا ہے۔ کانوں سے بہرا اور زبان سے گونگا ہو کر رہتا ہے تو اس کی اور حیوان کی زندگی میں کوئی فرق نہیں رہتا بلکہ یہ حیوانوں سے بھی بدتر ہو جاتا ہے کیونکہ اس طرح وہ اپنے نوعی امتیاز سے محروم ہو جاتا ہے۔ انسان اپنے علمی کمال ہی کی وجہ سے تمام مخلوقات میں امتیازی حیثیت رکھتا ہے۔ ساری مخلوقات اللہ کی صفتِ قدرت کا مظہر ہیں جبکہ انسان اللہ کی صفتِ علم کا مظہر ہے۔ اور معلوم ہے کہ قدرت علم کے توابع میں سے ہے کیونکہ علم کی یہ خصوصیت ہے کہ وہ سب سے بالا اور سب سے مستغنی ہے سب کی صفتیں اس کے پیچھے اور اس کی محتاج ہیں۔ اسی لیے انسان میں مدارِ خلافت علم کو قرار دے کر فرشتوں کے سامنے آدم علیہ السلام کی شانِ علمی کی نمائش ہوئی ہے۔ اگر مدعیانِ ایمان خود نبوت کے علم ہی سے بیگانہ ہو جائیں اور دعوائے ایمان رکھتے ہوئے نبوت کے علم کی حد تک کانوں سے بہرے، زبانوں سے اور قلب سے عقل و شعور سے بیگانہ ہو جائیں تو ان کے دعویٰ ایمان کی قدر و قیمت کیا ہو سکتی ہے۔ اکثر شارحینِ قرآن نے اس آیت کا رُخ منافقین کی طرف موڑ دیا ہے لیکن اس

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

نفاق سے وہ نفاق مراد نہیں جو مدینے کے منافقین کا تھا کہ بظاہر مسلمان ہو گئے تھے۔ دل میں منکر تھے بلکہ اس سے مراد وہ لوگ ہیں جو ایمان کے مدعی ہو کر ایمان کے تقاضے پورے نہیں کرتے، ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں مگر نماز نہیں پڑھتے، زکوٰۃ نہیں دیتے، جہاد نہیں کرتے، اسلام سے آشنا نہیں ہیں۔ اسی اسلام ناآشنائی کو قرآن یہاں الصم البکم الذین لا یعقلون سے تعبیر کر رہا ہے۔ یعنی مردم شماری میں مسلمان ہیں مسلمانوں جیسے نام رکھتے ہیں لیکن اسلام سے بالکل بے خبر ہیں اور ایمان کے تقاضوں سے ان کی زندگی بے گانہ ہے۔

مذمت کی اس سے زیادہ بلیغ تعبیر کیا ہو سکتی ہے جو قرآن نے تشبیہ کے ذریعے پیش کی ہے۔

پہلی آیت میں بدر جیسی کامیابی حاصل کرنے کے لیے ارشاد ہوا تھا کہ بنیادی چیز یہ ہے کہ اللہ و رسول کی طاعت کرو۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ طاعت ہوتی ہے اوامر اور نواہی میں اور یہ علم کے بغیر ممکن نہیں۔ اس لیے بدر جیسی کامیابی حاصل کرنے کے لیے دوسری اہم چیز یہ ہے کہ اسلام آشنا ہو اور اسے دنیا میں پیش کرو۔ اسلام کی حد تک گونگا، بہرا اور بے سمجھ بن کر رہنا خدا کو بے حد ناپسند ہے۔

اسلام ناآشناؤں کی محرومی

۲۸۔ اگر اللہ کو معلوم ہوتا کہ ان میں کچھ بھی خیر ہے تو وہ ضرور ان کو سننے کی توفیق دیتا اگر ان کو سنوا دیتا تو وہ ضرور بے رخی اختیار کر لیتے۔ یعنی اصل یہ ہے کہ ان لوگوں میں بھلائی کی جڑ ہی نہیں ہے کیونکہ حقیقی بھلائی انسان کو اس وقت ملتی ہے جب اس کے دل میں طلبِ حق کی سچی تڑپ ہو اور نور و ہدایت قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔ جو طلبِ حق کی روح سے یکسر خالی ہو چکی اور اس طرح خدا کی بخشی ہوئی قوتوں کو اپنے ہاتھوں برباد کر چکی ہو۔ رفتہ رفتہ اس میں قبولِ حق کی لیاقت و استعداد بھی نہیں رہتی۔ اسی کو فرمایا ہے کہ اللہ نے ان کے دلوں میں قبولِ خیر و ہدایت کی لیاقت نہیں دیکھی۔ اگر ان میں کچھ بھی لیاقت دیکھتا تو اپنی عادت کے موافق ضرور ان کو اپنی آیتیں سنا کر سمجھا دیتا۔ باقی بحالت موجودہ اگر انہیں آیات سنا اور سمجھا دی جائیں تو

یہ ضدی اور معاند لوگ سمجھ کر بھی تسلیم اور قبول کرنے والے نہیں ہیں[1]

یہ بھی ان ہی اہلِ کتاب کا مزید چہرہ پیش کیا گیا ہے جن کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ مسلمانو! تم ان جیسے نہ ہو جانا جنہوں نے زبان سے کہا تھا ہم نے سُن لیا لیکن انہوں نے قبول نہیں کیا۔ ایسے لوگ جو ایمان کے مدعی ہو کر علم و عمل کی دُنیا میں ایمان کے تقاضوں سے تہی دامن ہوں اللہ کے نزدیک صرف جانور نہیں بلکہ بدترین جانور ہیں کیونکہ یہ حق سنتے نہیں ہیں، حق کو سمجھتے نہیں اور حق کے لیے ان کے مُنہ میں زبان نہیں ہے۔ جو انسان، انسان ہو کر اپنے حواس اور عقل سے کام نہیں لیتا وہ انسان نہیں بدترین جانور ہے۔

یہاں پہنچ کر انسانی ذہن میں یہ خلش ضرور پیدا ہوتی ہے کہ جب نبوت کے لائے ہوئے علم کے سننے اور سمجھنے پر ہی انسانیت کا دارومدار ہے اور اس سے محرومی خدا کو اس قدر ناپسند ہے کہ اس سے محروم ہو کر انسان انسان نہیں بلکہ چوپایہ بن جاتا ہے تو پھر خدا خود اپنی قدرت سے ان کو سننے کی توفیق کیوں نہیں دے دیتا۔

اسی سوال کا جواب اس آیت میں دیا گیا ہے لیکن جواب سننے سے پہلے امام رازی کی یہ بات گوش گزار فرما لیجیے۔

جو موجود ہے وہ علمِ الٰہی میں ہے۔ کسی چیز کا علمِ الٰہی میں نہ ہونا اس کے نہ ہونے کو مستلزم ہے۔

مطلب یہ ہے کہ خالق و مخلوق کے علم میں یہ بنیادی فرق ہے۔ مخلوق کو علم ہوتا ہے جب چیز موجود ہو۔ اور چیز کے موجود ہونے کی شرط یہ ہے کہ علمِ الٰہی میں ہو۔ ایک چیز اگر علمِ الٰہی میں نہیں تو سمجھ لیجیے کہ اس کا وجود بھی نہیں ہے۔

جواب یہ ہے کہ اگر ان میں ذرہ خیر کا کچھ بھی ہوتا تو ان کو سننے اور سمجھنے کی توفیق مل جاتی یہ صلاحیت ان میں چونکہ موجود نہیں ہے اس لیے ان کو توفیق نہیں ملی۔ اللہ کا قانون ہدایت و ضلالت کے بارے میں یہ ہے کہ اللہ نے یکساں طور پر ہر انسان میں خیر و شر قبول کرنے کی صلاحیت رکھی ہے جو لوگ اپنے اعمال سے خیر قبول کرنے کی صلاحیت کو طاقتور بناتے ہیں ان کو مزید خیر کی توفیق ملتی ہے اور وہ آہستہ آہستہ خیر میں ترقی کرتے جاتے

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہیں اس کے برعکس جو لوگ اعمالِ بد کے ذریعے شر قبول کرنے والی صلاحیت کی تربیت کرتے ہیں ان کو جبر نہیں ملتی ہے بلکہ قانون یہ ہے کہ ان کو جو ہدایت فطرت سے ملی ہوتی ہوتی ہے وہ بھی سلب ہو جاتی ہے۔ بتلانا یہ ہے کہ جن لوگوں نے نبوّت کی دعوت کو قبول نہیں کیا دراصل انہوں نے اپنی استعداد ایمانی کو کھو دیا تھا۔ اگر اللہ سبحانہٗ ان کو اس روگردانی کی حالت میں سننے کی توفیق بھی دیتا پھر بھی ان کے دل پذیرائی کے لیے تیار نہ ہوتے کیونکہ وہ اس نورِ فطرت کو اپنی بدعنوانیوں سے ختم کر چکے تھے جس سے قبولِ خیر کی توفیق ہوتی ہے۔

وہ انسان جو گونگا بہرا بنتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے خدا اس کو بہرا گونگا بنا کر پھر اس کو بولنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا ہے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا اور اللہ کی ذات ظلم کے شائبہ سے بھی پاک ہے۔ قرآن میں ہدایت وضلالت بھی اسی معنے میں ہے۔ انسان کے اچھے بُرے کے جواب میں خدا کی طرف سے ہدایت یا ضلالت آتی ہے۔ جب انسان سے کُفر کا صدور ہو جاتا ہے تب خدا کی طرف سے ضلالت آتی ہے اور اس کو تشبیہاً یوں کہا جاتا ہے کہ ان کے دلوں پر مہر لگ گئی کہ سمجھتے نہیں ہیں کانوں پر مہر لگ گئی کہ سنتے نہیں ہیں اور آنکھوں پر پردہ پڑا ہوا ہے کہ دیکھتے نہیں ہیں۔ مثلاً طبع اللہ علیہا بکفرھم یعنی کُفر کا صدور ان سے ہوا تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو گیا برخلاف اس کے اگر لوگ کانوں سے پیغامِ حق سنیں۔ زبان سے حق کا اعلان کریں اور دل سے سمجھنے کی کوشش کریں تو اللہ سبحانہٗ اپنی توفیق سے سرفراز فرماتے ہیں۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَجِيبُوا لِلَّهِ وَلِلرَّسُولِ إِذَا دَعَاكُمْ لِمَا
يُحْيِيكُمْ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَحُولُ بَيْنَ الْمَرْءِ وَقَلْبِهِ وَأَنَّهُ إِلَيْهِ
تُحْشَرُونَ ﴿٢٤﴾ وَاتَّقُوا فِتْنَةً لَّا تُصِيبَنَّ الَّذِينَ ظَلَمُوا
مِنكُمْ خَاصَّةً وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ شَدِيدُ الْعِقَابِ ﴿٢٥﴾
وَاذْكُرُوا إِذْ أَنتُمْ قَلِيلٌ مُّسْتَضْعَفُونَ فِي الْأَرْضِ
تَخَافُونَ أَن يَتَخَطَّفَكُمُ النَّاسُ فَآوَاكُمْ وَأَيَّدَكُم
بِنَصْرِهِ وَرَزَقَكُم مِّنَ الطَّيِّبَاتِ لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿٢٦﴾

مسلمانو! اللہ کی پکار کا جواب دو اور اللہ کے رسول کی پکار کا جواب دو جب وہ تم کو اس بات کی دعوت دے جو تمہیں زندگی دیتی ہے۔[29] اور خوب جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور تمہیں اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔[30] اور اس فتنے سے

بچو جس کی زد میں صرف ظالم ہی نہ آئیں گے اور جان لو

کہ اللہ کا عذاب سخت ہے [۳۱] اور وہ وقت یاد کرو جب تم

ملک میں ایک کمزور اقلیت تھے، تمہیں اندیشہ تھا کہ

لوگ تمہیں ختم کر دیں گے اللہ نے تمہیں ٹھکانا دیا اور اپنی

مدد سے تمہیں قوت عطا فرمائی اور تمہیں بہترین روزی

عطا کی تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ [۳۲]

اسلامی زندگی کے اجتماعی خطرے

پچھلی آیات میں انفرادی زندگی کے خطرات پر متنبہ کیا تھا۔ اب اسلامی زندگی کے اجتماعی خطرات کی طرف اشارات ہو رہے ہیں۔ پہلے بتایا گیا تھا کہ مستقبل میں اسلامی زندگی کی تابانی کی بدر کے بعد اولین شرط یہ ہے کہ اوامر اور نواہی میں اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کی جائے۔ یعنی صرف پرستش تک اسلام کو محدود نہ رکھا جائے بلکہ اس کے دائرہ اطاعت میں زندگی کے سارے گوشے ہوں۔ ایک مکمل دین و قانون کی حیثیت میں زندگی کا ہر گوشہ اس کی نگرانی میں ہو۔ روحانی، اخلاقی، خاندانی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی گوشوں میں اسلام نافذ ہو۔ اس کے بعد بتایا تھا کہ مکمل زندگی کو اسلام کی نگرانی کے لیے ضروری ہے کہ انفرادی طور پر ہر شخص اسلام آشنا ہو۔ اسلام کے لیے تمہاری زندگی بہرے، گونگوں اور نادانوں کی نہ ہو۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ پیش پا افتادہ حالات میں اجتماعی زندگی کے لیے جب اللہ کا رسول تمہیں پکارے

تمہارا ایمانی تقاضا یہ ہے کہ اس کی دعوت پر لبیک کہو۔ اور بتایا ان فتنوں سے دامن بچا کر رکھو جنہیں سوسائٹی کا ایک فرد یا ایک جماعت برپا کر دیتی ہے لیکن جب اس کی آگ بھڑک اٹھتی ہے تو صرف اُنہیں کو نہیں جلاتی ہے جنہوں نے سلگائی تھی سب ہی لپیٹ میں آجاتے ہیں اور اس لیے آجاتے ہیں کہ کیوں آگ لگانے والے کا ہاتھ نہیں پکڑا۔ کیوں بروقت آگ بجھانے کی کوشش نہیں کی۔ یعنی نہی عن المنکر اور اجتماعی زندگی سے مفاسد مٹانے کو اپنے قومی شعار بنالو۔ اس کے بعد اس خاص انعام کا ذکر کیا ہے کہ مکہ میں تمہاری تعداد تھوڑی تھی۔ دُنیا کی نظر میں تم کمزور اور بے سروسامان تھے۔ یہ اللہ کا فضل ہے کہ اس نے مدینہ میں تمہیں آباد کیا اور صرف آباد نہیں کیا بلکہ تمہاری باقاعدہ حکومت قائم کی اور ہر قسم کی نعمت سے تمہیں نوازا۔ ان عنایات کے نتیجہ میں تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ کے شکر گزار بندے بن کر رہو۔ یعنی جو نعمتیں اللہ نے تم کو عطا کی ہیں ان کو اللہ کی مرضی میں استعمال کرو۔ اگر تم ایسا کروگے تو بدر کی کامیابی کی طرح تمہیں مستقبل میں بھی کامیابیاں حاصل ہوں گی۔ اور اگر نہیں کروگے تو سُن چکے ہو ان تعودوا نعد اگر تم پلٹ جاؤ گے یعنی اعمال بدل جائیں گے تو ہم بھی پلٹ جائیں گے یعنی اعمال کے نتائج بدل جائیں گے۔

انسانیتِ اعلیٰ کے قیام کی دعوت

۲۹۔ مسلمانو! اللہ کی پکار کا جواب دو اور اللہ کے رسُول کی پکار کا جواب دو۔ جب وہ تم کو اس بات کی دعوت دے جو تمہیں زندگی دیتی ہے۔ یعنی خدا اور رسُول تم کو جس کام کی دعوت دیتے ہیں مثلاً جہاد وغیرہ اس میں از سر تا پا تمہاری بھلائی ہے ان کا دعوتی پیغام تمہارے لیے دُنیا میں عزت و اطمینان کی زندگی اور آخرت میں حیاتِ ابدی کا پیغام ہے پس مومنین کی شان یہ ہے کہ خدا و رسُول کی پکار پر فوراً لبیک کہیں جس وقت اور جدہر وہ بلائیں سب اشغال چھوڑ کر اُدہر ہی پہنچیں۔[1]
مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کی دعوت اس لیے ہے کہ تمہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

زندہ کر دے یعنی وہ انسانیت اعلیٰ کے انبعاث و قیام کی دعوت ہے۔ اس دعوت نے دفت کی تمام مُردہ جماعتوں کو کس طرح قبروں سے اٹھا کر زندگی کے میدانوں میں متحرک کر دیا ہے اس لیے جب تمہیں معلوم ہو گیا کہ رسُول کی طاعت فرض ہے اور خدا کے پیغام کو سننا اور سمجھنا ضروری ہو تو پھر تمہیں رسول کی پکار کو پوری توجہ، پوری قوت، پوری عزیمت اور ہمت کے ساتھ پذیرائی دینی چاہیئے۔ حیات کے بارے میں شارحین قرآن نے مختلف خیالات ظاہر کئے ہیں کچھ کہتے ہیں کہ علمی حیات مراد ہے، کچھ جہاد بتاتے ہیں، کچھ ایمان و اسلام کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں، اور کچھ کی رائے میں قرآن ہے۔ لیکن یہاں موقعہ و محل کے لحاظ سے علمی حیات زیادہ قرین قیاس ہے کیونکہ اس کے بغیر نہ جہاد ہے نہ قرآن ہے اور نہ ہی ایمان و اسلام ہے۔ یہ علمی حیات ہی ہے کہ عرب کے ساربانوں کو جہانبانی کے مقام پر پہنچا دیا۔ اور ابوبکر، عمر، علی، عائشہ، سعد بن ابی وقاص اور عمر بن العاص جیسے اکابر عالم پیدا ہو گئے۔ اور پچاس برس کے اندر کرہ ارض کی سب سے بڑی مہذب و اشرف قوم عرب ہو گئے۔ اللہ و رسُول کی دعوت حقیقی زندگی کی دعوت ہے۔ اسی سے بصیرت پیدا ہوتی ہے۔ اسی سے عقل کو وہ نور ملتا ہے جو آفاق و انفس کے حقائق سے پردے ہٹاتا ہے۔ اسی سے دل کو وہ زندگی ملتی ہے جو اس کو ایک مضغہ گوشت سے تجلیات و انوار الٰہی کا مہبط بنا دیتی ہے۔ فرمایا کہ اللہ کے رسُول کی دعوت کو پذیرائی دو اسی سے تم کو حقیقی اور دائمی زندگی حاصل ہو گی۔

آیت میں استجابت سے مراد امتثال و طاعت ہے۔ آیت میں اللہ سبحانہٗ کا ذکر تاکید اور زور کے لیے ہے ورنہ اصل مقصود حضور اقدس کی طاعت بتانا ہے۔ عین نماز کی حالت میں بھی آپ اگر کسی کو پکاریں پھر بھی استجابت ضروری ہے خود حضور اقدس نے اس موضوع پر اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ صحیح بخاری میں ہے۔ ابوسعید بن المعلی کہتے ہیں میں نماز پڑھ رہا تھا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے بلایا، میں نماز پوری کر کے حاضر خدمت ہوا۔ آپ نے دریافت کیا کہ دیر سے کیوں آئے ہو، میں نے عرض کیا کہ نماز پڑھ رہا تھا۔ آپ نے ارشاد فرمایا کیا اللہ سبحانہٗ نے یہ حکم نہیں دیا ہے یا ایھا الذین آمنوا استجیبوا للہ و للرسول

اذا دعاکم۔ ترمذی اور مستدرک حاکم میں حضرت ابوہریرہ کے حوالہ سے ابی بن کعب کا بھی ایسا ہی واقعہ منقول ہے۔ اس سے حافظ ابن حجر عسقلانی نے یہ استنباط کیا ہے اولاً امر کا تقاضا یہ ہے کہ فوری طور پر بجا آوری کی جاتی ہے۔ کیونکہ حضور اقدس نے بلانے پر ان صحابی کے دیر کرنے پر ناراضگی کا اظہار فرمایا؛

ثانیاً، عام حالات میں عام الفاظ بولے جاتے ہیں ؛

ثالثاً، اس سے معلوم ہوا کہ عین حالتِ نماز میں حضور اقدس کے بلانے کا جواب دینا مفسدِ صلوٰۃ نہیں ہے لیکن یہ حافظ کا استنباط اپنے اندر کچھ معنویت نہیں رکھتا اس کو یوں کہا جائے تو زیادہ معنویت ہے کہ حضور کے پکارنے پر نماز توڑ کر جواب دینا واجب ہے۔ خود بعض شوافع کا بھی یہی مسلک ہے۔

اس آیت کا عموم یہ کہتا ہے کہ ہر مومن پر حضور اقدس کی بات کو پذیرائی دینا واجب اور فرض ہے زندگی میں اور وصال مبارک کے بعد بھی خواہ اس کا تعلق زندگی کے کسی گوشہ سے ہو۔ آیت میں کوئی قید اور کوئی استثنا نہیں ہے۔

علامہ سید رشید رضا نے یہ بات بالکل برمحل لکھی ہے۔

> جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور کی طاعت صرف آپ کی زندگی میں واجب ہے۔ یہ وصال مبارک کے بعد آپ کی طاعت نہیں ہے صرف قرآن پر عمل کرنا ہی آپ کی طاعت ہے۔ یہ لوگ زنادقہ خود گمراہ ہیں دوسروں کو گمراہ کرتے ہیں۔ ان کا پیش نہاد اس کے سوا کچھ نہیں کہ مسلمانی کا لبادہ پہن کر اسلام کی بنیادیں کھوکھلی کریں۔ اور واقعہ یہ ہے کہ حضور اقدس کی طاعت بے قید فرض ہے اور قیامت تک ہر دور میں واجب ہے۔ حضور کی ذات گرامی تو اپنے مقام پر ہے ہمارا موقف تو یہ ہے کہ اسلامی زندگی میں خلفائے راشدین ائمہ اہل بیت، فقہا، اور محدثین کی پیروی بھی ضروری ہے۔ آداب زندگی، عدالتی اور سیاسی اجتہادات میں قوانین شرعیہ اور مصالح عامہ کی رعایت رکھتے ہوئے ان پر عمل کرنا چاہیے۔

اخلاص کے لیے ایک مؤثر تدبیر

۳۰ - اور خوب جان لو کہ اللہ آدمی اور اس کے دل کے درمیان حائل ہو جاتا ہے اور تمہیں اللہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۔ یعنی حکم بجالانے میں دیر نہ کرو شاید تھوڑی دیر بعد دل ایسا نہ رہے کہ اپنے دل پر آدمی کا اپنا قبضہ نہیں ہے بلکہ دل خدا کے ہاتھ میں ہے جدھر چاہے پھیر دے بیشک وہ اپنی رحمت سے کسی کا دل ابتداً نہیں روکتا نہ اس پر مہر کرتا ہے۔ ہاں جب بندہ امتثال امر الٰہی میں سستی اور کاہلی کرتا رہے تو اس کی جزا میں روک دیتا ہے یا حق پرستی چھوڑ کر ضد و عناد کو شیوہ بنا لے تو مہر کر دیتا ہے کذا فی الموضح۔ بعض نے یحول بین المرء و قلبہ کو قرب کے لیے بتایا ہے یعنی حق تعالیٰ بندہ سے اتنا قریب ہے کہ اس کا دل بھی اتنا قریب نہیں ہے۔ نحن اقرب الیہ من حبل الورید تو خدا کی حکم برداری سچے دل سے کرو۔ خدا تم سے بڑھ کر تمہارے دلوں کے احوال و سرائر پر مطلع ہے خیانت اس کے آگے نہیں چل سکے گی۔ اسی کے پاس سب کو جمع ہونا ہے وہاں سارے مکتوبات و سرائر کھول کر رکھ دیے جائیں گے [1]

ایک مسلمان میں اسلامی زندگی سے اخلاص کے لیے اگر کوئی سب سے زیادہ مؤثر تدبیر ہے تو وہ صرف یہ ہے کہ دو باتیں ایک مسلمان کے ذہن میں اتر جانی چاہئیں۔ ایک یہ کہ اسلامی زندگی میں اس کا معاملہ اللہ سبحانہ کے ساتھ ہے جو ایسا علیم بذات الصدور ہے کہ آدمی اپنے دل میں جو نیت، جو خواہش، جو غرض، اور جو خیال راز بنا کر رکھتا ہے۔ وہ سب اس کو معلوم ہے۔ دوسرے یہ کہ اس زندگی کا بہرحال اس کو حساب دینا ہے۔ اس سے بچ کر کہیں بھاگ نہیں سکتا۔ دو عقیدے جس قدر پختہ ہوں گے اسی قدر ایک مسلمان میں اسلامی زندگی کی خاطر اخلاص رونما ہو گا اس لیے اخلاص کے لیے قرآن ان دو عقیدوں پر زور دیتا ہے۔ یہی دو باتیں اخلاص کی بنیاد ہیں۔ اس آیت میں بتایا ہے کہ یہ نہ ہو کہ انسان کے افکار و اعمال میں حکمت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

الٰہی کا یہ قانون کام کر رہا ہے۔ بسا اوقات اس کے ارادہ میں اور اس کے دل کے جذبات اور انفعالوں کے درمیان اچانک کوئی غیر متوقع بات آکر حائل ہو جاتی ہے۔ اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اچانک اچھائی سے برائی میں جا پڑتا ہے اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ اچانک بُرائی سے اچھائی میں آ نکلتا ہے چنانچہ کتنے ہی اچھے ارادے ہیں جن سے عین وقت پر ہمارے دل نے انکار کر دیا اور کتنے ہی بُرائی کے منصوبے ہیں جن سے اچانک ہمارے دل نے بغاوت کر دی لہٰذا انسان کو اپنے دل کی نگرانی کرتے رہنا چاہیے۔ اسی لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اکثر یہ دعا ہوتی تھی اللّٰھم مقلب القلوب ثبت قلبي علی دینك اور فرمایا یہ بھی نہ بھولو کہ خدا کے حضور پیش ہونا ہے کیونکہ جس دل میں آخرت کا یقین ہوگا وہ زندگی کی غفلتوں سے کبھی مغلوب نہ ہوگا۔

آیت میں بندے اور اس کے دل کے درمیان اللہ کے حائل ہونے سے اس کے قانون کا حائل ہونا مراد ہے۔ جو باتیں اللہ کے قانون کے اور اس کی مقررہ سنت کے تحت ظہور میں آتی ہیں بسا اوقات اللہ تعالیٰ ان کو اپنی طرف منسوب کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ایسے لوگوں کے دل ایسے بے قابو ہو جاتے ہیں کہ وہ ان کو کسی طرح بھی قابو میں نہیں لا سکتے۔ انسان کا دل جب بُرائیوں کے پیچھے لگتا ہے تو ایک خاص حد تک تو اس کا حال یہ رہتا ہے کہ انسان اگر متنبہ ہو جائے اور اس کو روکنا چاہے تو روک سکتا ہے اور اس کو اصلاح کی راہ پر لگا سکتا ہے لیکن جب اس حد سے دل آگے بڑھ گیا اور انسان کو توفیق نہ ہوئی کہ وہ اس کو لگام دے تو پھر آدمی کے قابو سے باہر ہو جاتا ہے اور وہ دل کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔

حاصلِ آیت یہ ہے کہ نبوت کی بات کو فوراً شرف پذیرائی دینی چاہیے اور اس معاملہ میں بھرپور اخلاص سے کام لینا چاہیے۔ یہ سمجھ کر کہ فرصت غنیمت ہے اور یہ یقین کر کے کہ تمہیں اللہ کے حضور پیش ہونا ہے۔

آیئے اب اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن کے خیالات سے بھی استفادہ کر لیجئے۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں کہ۔ یہ اللہ سبحانہٗ کی جانب مسلمانوں کو خبر دی جا رہی ہے۔ بدر کے روز مسلمانوں کو عدد کی کثرت سے اندیشہ تھا۔ اللہ سبحانہٗ نے بتایا کہ قلوب کی حالت اللہ کے قبضے میں ہے۔ کثرت سے بہتوں کے دل خوفزدہ ہو

سکتے ہیں جیسے بدر میں کفار کے بہت تے اور قلیل تعداد کو ثبات ہو سکتا ہے جیسے مسلمانوں کو بدر میں ہوا۔ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں مومن اور معاصی کے درمیان اور کافر اور ایمان کے درمیان خدا حائل ہو جاتا ہے۔ یعنی خدا کا قانون حائل ہو جاتا ہے اس کے قانون کی وجہ سے مومن کا اتصال کفر و معاصی سے نہیں ہوتا اور کافر ایمان و طاعت کے قریب نہیں آتا۔ سعید بن جبیر، ضحاک، عکرمہ، مجاہد اور ابو صالح کی یہی رائے ہے۔ یہی صحیح ہے کیونکہ قلب کا فعل، اعتقاد ہے۔ یا ارادہ و انفعال اور دونوں کا خالق اللہ ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ اللہ کی ذات جسم اور جسمانیت سے پاک ہے تو وہ کیسے حائل ہوتا ہے۔ تو جواب یہ ہے کہ یہاں حقیقی معنے نہیں بلکہ مجازی معنے مراد ہیں۔ یعنی قانونِ الٰہی حائل ہو جاتا ہے۔ آپ چاہیں تو قانون کی جگہ مشیتِ الٰہی کہہ دیں اور چاہیں تو علمِ الٰہی سے تعبیر کر لیں۔

اجتماعی گناہوں کے نتائج

۳۱ - اور اس فتنے سے بچو جس کی زد میں صرف ظالم ہی نہ آئیں گے اور جان لو کہ اللہ کا عذاب سخت ہے۔ یعنی فرض کیجیے کہ ایک قوم کے اکثر افراد نے ظلم و عصیان کا وطیرہ اختیار کر لیا۔ کچھ لوگ جو اس سے علیحدہ رہے انہوں نے مداہنت برتی و نصیحت کی نہ اظہارِ نفرت کیا تو یہ ہے وہ فتنہ جس کی لپیٹ میں وہ ظالم اور یہ خاموش مداہن سب آجائیں گے۔ جب عذاب آئے گا تو حسبِ مراتب سب اس میں شامل ہوں گے کوئی نہ بچے گا۔ اس تفسیر کے موافق آیت کا مقصود یہ ہے کہ خدا و رسول کی حکم برداری کے لیے خود تیار رہو اور نافرمانوں کو نصیحت و فہمائش کرو۔ نہ مانیں تو بیزاری کا اظہار کرو۔ باقی حضرت شاہ صاحب نے آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ مسلمانوں کو ایسے فساد سے بالخصوص بچنا چاہیے جس کا عذاب کا اثر گناہ گار کی ذات سے متعدی ہو کر دوسروں تک پہنچتا ہے۔ پہلے فرمایا تھا کہ خدا و رسول کا حکم ماننے میں ادنیٰ تاخیر اور سستی نہ کرو تمہیں دیر کرنے کی وجہ سے دل نہ ہٹ جاتے۔ اب فرماتے ہیں کہ اگر نیک لوگ کاہلی کریں گے تو تمام لوگ بالکل چھوڑ دیں گے تو رسم بد پھیل جائے گی۔

اس کا وبال سب پر پڑے گا جیسے جنگ میں دلیر سستی کریں تو نامرد بھاگ ہی جائیں گے پھر شکست ہو تو دلیر بھی نہ تھام سکیں لے

مطلب یہ ہے کہ اس فتنہ سے اہلِ ایمان کو دامن بچا کر رکھنا چاہیے جس کی پاداش میں صرف ظالم ہی نہ پکڑے جائیں گے بلکہ ان کی شامتِ اعمال سے سب ہی اس لپیٹ میں آجائیں گے۔ نیک لوگ بھی انہی کے منہ میں آجائیں گے اور بد بھی۔ جب دلیر لڑائی میں بزدلی کا مظاہرہ کریں تو بزدل خود بخود گریز پائی اختیار کریں گے۔ اس کے نتیجہ میں شکست کا وبال سب کو بھگتنا ہوگا۔ اسی طرح دین میں مدافعت کرنے اور گنہگاروں کو گناہ سے روکنے کی وجہ سے جب عذابِ الٰہی آتا ہے تو سب پر آتا ہے تا آنکہ جانور بھی اس سے محفوظ نہیں رہتے۔

مسندِ امام احمد میں عدی بن عمیر کے حوالے سے ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ خاص لوگوں کی بدعملی کی وجہ سے اللہ سبحانہٗ عام لوگوں کو اس وقت تک عذاب میں مبتلا نہیں کرتا جب تک وہ لوگ اپنے سامنے برائیاں ہوتے دیکھ کر روکتے رہیں۔ ہاں اگر قادر ہونے کے باوجود نہ روکیں تو اللہ سبحانہٗ کی گرفت سب کو آپکڑتی ہے۔

مسند احمد ہی میں حذیفہ ابن الیمان کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے۔ قسم ہے اس اللہ کی جس کے قبضہ میں میری جان ہے، تمہیں معروف کا حکم دینا چاہیے اور منکرات سے روکنا چاہیے۔ اگر ایسا نہ کروگے تو اللہ سبحانہٗ تم پر ایسے لوگوں کو مسلط کردے گا جن سے بچنے کی دعائیں مانگو گے مگر قبول نہ ہوں گی۔ نعمان بن بشیر کی روایت میں حضور اقدس نے اسے ایک مثال سے سمجھایا ہے۔ جہاز میں نیچے درجہ والے اگر پانی لینے کے لیے جہاز میں سوراخ کریں اور اوپر والے ان کو نہ روکیں تو سب ہی غرق ہوجائیں گے۔ یہ تمثیل فتنۃ لا تصیبن الذین ظلموا منکم خاصۃ سب سے اچھی اور عمدہ تفسیر ہے۔ گویا قرآن نے اس آیت کے ذریعے جماعت کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض کی ہے۔ اسی

لے افاداتِ شیخ الاسلام

اخلاقی فرض کا قانونی نام امر بالمعروف، نہی عن المنکر ہے۔ یہ وہ تعلیم ہے جو دُنیا کے تمام مذاہب میں اسلام کی اخلاقی نگرانی کے اُصول کو نمایاں کرتی ہے۔ تورات میں قابیل کا یہ فقرہ کہ "کیا میں اپنے بھائی کا رکھوالا ہوں" عیسائیت کے اخلاق کا ایک اہم اصول بن گیا ہے۔ اسی اخلاقی اصول نے یورپ میں اس قانونی مسئلہ کی صورت اختیار کر لی ہے جس کا نام شخصی آزادی کی بحالی ہے لیکن اسلام کے قانون میں واقعی ہر شخص اپنے بھائی کا رکھوالا بنایا گیا ہے۔ کلکم راع و کلکم مسئول عن رعیتہ۔ قرآن میں صداقت کے ساتھ لوگوں کو نیکی کی ہدایت کرنے اور برائی سے بچنے اور بچائے رکھنے کا فرض مسلمانوں پر عائد کیا ہے۔ اس آیت میں قرآن جس بات کی طرف رہنمائی کر رہا ہے وہ اجتماعی اور عمومی برائی اور اس کے عمومی نتائج ہیں۔ یہ عمومی نتائج ہی اجتماعی فتنے ہیں جو وبائے عام کی طرح پوری قوم کی شامت لے آتے ہیں۔ یعنی صرف برائی کرنے والا ہی پکڑا نہیں جاتا بلکہ سب پکڑ لیے جاتے ہیں۔ مثال کے طور پر یوں سمجھو کہ جب تک کسی شہر میں گندگیاں خال خال انفرادی طور پر کچھ مقامات پر رہتی ہیں ان کا اثر محدود ہوتا ہے اور ان سے وہ مخصوص افراد ہی متاثر ہوتے ہیں جنہوں نے اپنے جسم اور اپنے گھر کو گندگی سے آلودہ کر رکھا ہو لیکن جب گندگی عام ہو جاتی ہے اور کوئی گروہ بھی پورے شہر میں ایسا نہیں ہوتا جو اس خرابی کو روکنے اور صفائی کا انتظام کرنے کی سعی کرے تو پھر ہوا، زمین، پانی ہر چیز میں سمیت پھیل جاتی ہے اور اس کے نتیجے میں جو وبا آتی ہے اس کی لپیٹ میں آ جاتے ہیں۔ اسی طرح اخلاقی نجاستوں کا حال ہے۔ اگر وہ انفرادی طور پر بعض افراد میں موجود رہیں اور نیک لوگوں کی وجہ سے دبی رہیں تو ان سے نقصانات کم ہوتے ہیں لیکن جب معاشرہ کا اجتماعی ضمیر کمزور ہو جاتا ہے تو مجموعی طور پر پورے معاشرہ کی شامت آ جاتی ہے اور وہ فتنہ عام برپا ہو جاتا ہے۔

بس اللہ تعالیٰ کے اس ارشاد کا مقصد یہ ہے کہ نبوت جس اصلاح و ہدایت کے لیے آئی ہے اور تمہیں جس خدمت میں ہاتھ بٹانے کی دعوت دے رہی ہے اسی میں درحقیقت تمہارے لیے انفرادی اور اجتماعی حیثیت سے زندگی ہے۔ اگر اس میں سچے دل سے مخلصانہ حصہ نہ لوگے اور برائیوں کو جو لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں برداشت کرتے رہو گے تو وہ فتنہ عام برپا ہو جائے گا جس کی آفت سب کو لپیٹ میں لے لے گی۔

آخر میں فرمایا واعلموا ان اللہ شدید العقاب یہ اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے قوانین جس طرح جسمانیات و مادیات میں بے لچک ہیں اسی طرح اخلاقیات میں بھی بے لچک ہیں۔ خراب آب و ہوا میں سانس لینے والا جس طرح آب و ہوا کے فساد سے لازماً متاثر ہوتا ہے اسی طرح بُرے ماحول میں زندگی بسر کرنے والا اس کے بُرے عواقب کی زد میں آجاتا ہے۔

اہلِ عرب پر انعامِ خداوندی

۳۲- اور وہ وقت یاد کرو جب تم ملک میں ایک کمزور اقلیت تھے، تمہیں اندیشہ تھا کہ تمہیں لوگ ختم کر دیں گے، اللہ نے تمہیں ٹھکانا دیا اور اپنی مدد سے تمہیں قوت عطا فرمائی اور تمہیں بہترین روزی عطا فرمائی تاکہ تم اس کا شکر ادا کرو۔ یعنی اپنی قلت و ضعف کو خیال کر کے خدا کا حکم جہاد ماننے میں سُستی مت دکھلاؤ۔ دیکھو ہجرت سے پہلے بلکہ اس کے بعد بھی تمہاری تعداد تھوڑی تھی، سامان بھی نہ تھا۔ تمہاری کمزوری کو دیکھ کر لوگوں کو طمع ہوتی تھی کہ تم کو ہضم کر جائیں تمہیں ہر وقت یہ خدشہ رہتا تھا کہ دشمنانِ اسلام کہیں نوچ کھسوٹ کر نہ لے جائیں مگر خدا نے تم کو مدینہ میں ٹھکانا دیا۔ انصار و مہاجرین میں عدیم النظیر رشتہ مواخات قائم کر دیا۔ پھر معرکہ بدر میں کیسی کھلی ہوئی غیبی امداد پہنچائی۔ کفار کی جڑ کاٹ دی۔ تم کو فتح الگ دی، مالِ غنیمت اور فدیہ اساری الگ دیا۔ غرض حلال طیب ستھری چیزیں اور انواع و اقسام کی نعمتیں عطا فرمائیں تاکہ تم اس کے شکر گزار بندے بنے رہو۔[1]

اس آیت کے بارے میں شارحین قرآن کی دو رائیں ہیں۔

ایک رائے یہ ہے کہ آیت کے مخاطب مہاجرین ہیں دوسری رائے یہ ہے کہ آیت کا رُخ سخن سارے عرب کی طرف ہے۔ یہ دوسری رائے قتادہ ابن دعامہ کی ہے وہ فرماتے ہیں کہ اہلِ عرب پوری انسانی دُنیا میں سب سے زیادہ ذلیل، معیشت میں سب سے زیادہ بدحال۔ معاش میں سب سے زیادہ تنگ دست، ننگے بھوکے بنجار کرتے زمین

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں ان سے زیادہ کوئی بدحال نہ تھا۔ اللہ نے اسلام کے ذریعے ان کو عزت بخشی۔ اقتدار عطا فرمایا۔ یہ سب کچھ اسلام کی بدولت ہوا۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ ورسول نے اسلام کی نعمت سے تمہیں مالا مال کیا ہے اب تم نے دیکھ لیا ہے کہ اسلام کی راہ میں تمہیں اس نے ہر قدم پر سہارا دیا ہے۔ تم تھوڑے تھے۔ پوری زمین میں تمہیں کمزور سمجھا جاتا تھا۔ اللہ نے تمہیں قوت دی ہے۔ اپنی نصرت سے نوازا۔ تمہارے لیے پاکیزہ معاش ومعیشت کی راہیں کھولیں۔ ان سب باتوں کا تقاضا ہے کہ تم نعمتِ اسلام کی قدر کرو اور مستقبل میں اسلام کے وفادار بن کر رہو۔ اس اندیشے میں نہ پڑو کہ اسلام پر چل کر تم کسی خطرے کا نشانہ بن جاؤ گے۔

قرآن کی یہ آیت تاریخی اور اجتماعی حجت ہے یہ بتا رہی ہے کہ عرب دنیا کی اصلاح کا ذریعہ اسلام ہے۔ اسی کی وفاداری سے ان کو دنیا میں سعادت اور سیادت کی نعمت ملی ہے اس نعمت کی شکر گزاری صرف یہ نہیں ہے کہ لوگ صرف یہ مان لیں کہ اسلام نے ہمیں کمزوری کی حالت سے نکالا ہے بلکہ اصل شکر گزاری یہ ہے کہ دنیا میں زندگی کے دوسرے نظاموں کے مقابلے میں اسلام کے پورے وفادار بن کر رہیں۔ اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کریں۔ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشن اخلاص اور جاں نثاری کے ساتھ کام کریں اور اس راہ میں جو خطرات اور مصائب پیش آئیں ان کا مردانہ وار مقابلہ کریں اور یقین کریں کہ جب وہ اللہ سبحانہ کا کام اخلاص سے کریں گے تو اللہ سبحانہ ضرور ان کا کفیل ہوگا۔ اور بس۔ غور کریں چند محلوں پر مشتمل شہری مملکت سے مدینہ میں جس کام کا آغاز ہوا وہ روزانہ دو سو چوہتر میل سے بھی زیادہ مربع میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی ہے اور دس سال میں جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات ہوئی تو دس لاکھ سے زیادہ مربع میل کا رقبہ آپ کے زیرِ اقتدار آچکا تھا۔ اس میں تقریباً ہندوستان کے برابر علاقہ کی فتح میں جس میں یقیناً ملینوں آبادی تھی دشمن کے صرف ڈیڑھ سو آدمی قتل ہوئے اور مسلمان فوج کا مشکل سے اس دس سال میں ماہانہ ایک سپاہی شہید ہوا۔ انسانی خون کی یہ عظمت تاریخ عالم میں بلا خوفِ تردید بے نظیر ہے۔ ؎

؎ عہدِ نبوی کے میدانِ جنگ

يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَخُونُوا اللَّهَ وَالرَّسُولَ وَتَخُونُوا
أَمَانَاتِكُمْ وَأَنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٧﴾ وَاعْلَمُوا أَنَّمَا أَمْوَالُكُمْ
وَأَوْلَادُكُمْ فِتْنَةٌ وَأَنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٨﴾ ع
يَاأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِن تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَل لَّكُمْ فُرْقَانًا وَ
يُكَفِّرْ عَنكُمْ سَيِّئَاتِكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۗ وَاللَّهُ ذُو الْفَضْلِ
الْعَظِيمِ ﴿٢٩﴾

اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو۔ اور
نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تم اس سے باخبر ہو۔[۴۳]
اور خوب جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک
آزمائش ہیں، اور جان لو کہ اللہ ہی کے پاس اجرِ عظیم ہے۔[۴۴]
اے مسلمانو! اگر تم اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو گے تو وہ
تمہارے لیے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی ایک

قوت فراہم کر دے گا اور تم سے تمہاری بدحالیاں ہٹا دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ سبحانہ بہت بڑے فضل و کرم والا ہے۔ ۴۵

اسلامی زندگی کے اجتماعی خطرے

ان آیات میں مزید اجتماعی خطروں کی طرف اشارہ کیا جارہا ہے اور یہ تین خطرے ہیں ایک امانت میں خیانت ، دوسرے مال و اولاد کی خاطر دین کو خیرباد کہنے کا ، تیسرے اجتماعی زندگی میں خدا کی نافرمانی کا۔ خیانت سے مقصود وہ تمام خیانتیں ہیں جو اسلام کے احکام کی تعمیل و تبلیغ اور اُمت کے مصالح و مقاصد میں کی جائیں۔ اور تقویٰ سے مراد اوامر کی پابجائی اور نواہی سے بچنا ہے کیونکہ اسلام کا اولین مقصد یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جن سے کفر کا وجود عبارت ہے۔ دُنیا کے ہر دوسرے وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کی بقا کا آرزومند اور کشمکش حیات میں مبتلا ہے اور اس میدان میں اسلام تنہا اس کا مدمقابل ہے کیونکہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے کفر کی ضد ہے۔ اسلام اور کفر کے درمیان مصالحت ناممکن اور ان کی لڑائی بلا فصل قائم ہے۔ یہ لڑائی دُنیا کی دوسری لڑائیوں پر حاوی اور ان سے مافوق ہے بلکہ اور جتنی نزاعیں اور لڑائیاں ہیں ان کا سلسلہ کہیں نہ کہیں جاکر اس لڑائی سے ضرور مل جاتا ہے۔ کفر کی طاقتیں اسلام کی مزاحم ہوتی ہیں لیکن ان کی یہ مزاحمت حق و صداقت کی سعی کمال کا سبب بن جاتی ہے۔ اس لیے اسلام کو کفر کے مقابلے کے لیے ایسی جماعت درکار ہے جس کا دامن ہر قسم کی بُرائی سے بے داغ ہو تاکہ کفر کا صحیح اور مکمل مقابلہ ہو سکے۔ یہاں اصل مقابلہ مادی نہیں معنوی ہے۔ معنوی مقابلے میں معنوی طاقت کی ضرورت ہے۔

خیانت سنگین جرم ہے

۳۴۳۔ اے مسلمانو! اللہ اور اس کے رسول سے خیانت نہ کرو اور نہ اپنی امانتوں میں خیانت کرو حالانکہ تم اس سے باخبر ہو۔ خدا اور رسولؐ کی خیانت یہ ہے کہ ان کے احکام کی خلاف ورزی کی جائے زبان سے اپنے کو مسلمان کہیں اور کام کفار کے کریں۔ یا جس کام پر خدا اور رسولؐ نے مامور کیا اس میں دخل فصل کیا جائے یا مالِ غنیمت میں چوری کی جائے۔ والعیاذ باللہ۔ بہرحال ان تمام امانتوں میں جو خدا اور رسولؐ یا بندوں کی طرف سے تمہارے سپرد کی جائیں۔ خیانت سے بچو اس میں ہر قسم کے حقوق اللہ اور حقوق العباد آگئے۔ روایات میں ہے کہ یہود بنو قریظہ نے جب حضورؐ سے صلح کی درخواست کی اور یہ کہ ان کے ساتھ وہی معاملہ کیا جائے جو بنی نضیر کے ساتھ ہوا ہے تو آپ نے ارشاد فرمایا نہیں میں تم کو اتنا حق دیتا ہوں کہ سعد بن معاذ کو حاکم بنالو، جو فیصلہ وہ تمہاری نسبت کریں وہ منظور ہونا چاہیے۔ انہوں نے حضرت ابولبابہ کو حضورؐ سے اجازت لے کر اپنے یہاں بلوایا اور دریافت کیا کہ تمہاری اس معاملہ میں کیا رائے ہے ہم سعد بن معاذ کی تحکیم منظور کرلیں یا نہ کریں۔ ابولبابہ کے اموال اور اہل وعیال بنو قریظہ کے یہاں تھے وہ ان کی خیر خواہی کرتے تھے۔ انہوں نے اپنے حلقوم کی طرف ہاتھ سے اشارہ کیا یعنی اگر سعد بن معاذ کی تحکیم منظور کی تو ذبح ہو جاؤ گے۔ ابولبابہ اشارہ کر کے گزرے مگر فوراً احساس ہوا کہ میں نے خدا اور رسولؐ کی خیانت کی، واپس آکر اپنے کو ایک ستون سے باندھ دیا اور عہد کیا نہ کچھ کھاؤں گا نہ پیوں گا حتیٰ کہ موت آجائے یا اللہ تعالیٰ میری توبہ قبول کرے۔ سات آٹھ دن یوں ہی بندھے رہے۔ فاقہ کشی سے غشی طاری ہوگئی۔ آخر بشارت پہنچی کہ حق تعالیٰ شانہٗ نے تمہاری توبہ قبول کی۔ کہا کہ خدا کی قسم میں اپنے آپ کو نہ کھولوں گا جب تک خود جناب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے دستِ مبارک سے میری رسّی نہ کھولیں گے۔ آپ تشریف لائے اور اپنے ہاتھ سے اپنے قیدی کو آزاد کیا۔ ابن عبدالبر کا دعویٰ ہے کہ یہ واقعہ غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنے کی بنا پر پیش آیا تھا واللہ اعلم[1]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

شیخ الاسلام نے جو روایت لکھی ہیں یہی واقعہ متعدد روایات میں عبداللہ ابن قتادہ، زہری، کلبی، سدی اور عکرمہ کے حوالہ سے پیش کیا گیا ہے اور اسی کو شارحین قرآن نے آیت کا پس منظر قرار دیا ہے۔ لیکن یہاں ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ سورہ انفال غزوہ بدر کے حالات و واقعات پر مشتمل ہے۔ غزوہ بدر ۲ھ میں ہوا جبکہ قریظہ کا محاصرہ ۵ھ میں ہوا۔ اس لیے ابولبابہ کا واقعہ اس آیت کا پس منظر نہیں ہو سکتا۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ ابولبابہ کا عمل اس آیت کے خلاف تھا لیکن یہ نہیں کہہ سکتے کہ آیت کا پس منظر یہی واقعہ ہے۔ شارحین قرآن نے آیت کے پس منظر میں اور بھی واقعات لکھے ہیں۔ ایک واقعہ ابوسفیان کے مکہ سے روانہ ہونے کا ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ عامر بن عبداللہ کہتے ہیں کہ ابوسفیان مکہ سے روانہ ہوا۔ حضرت جبریل نے حضور کو اس کی روانگی کی اطلاع دی۔ حضور نے لوگوں کو بتایا اور حکم دیا کہ چلو۔ منافقین میں سے ایک شخص نے ایک خط کے ذریعے حضور کے ارادے کی اطلاع ابوسفیان کو دے دی۔ اس پر قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔ گویا اس آیت میں منافقین کے اس عمل پر تعریض کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اس کی یہ خیانت دعوئے ایمان کے منافی ہے۔ یہ روایت بھی اس کے بارے میں ہے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں کہ اس کی سند اور سیاق محل نظر ہیں۔ امام رازی نے اس جیسے اور بھی واقعے لکھے ہیں مگر آخر میں لکھا ہے کہ العبرۃ لعموم اللفظ۔ اعتبار تو قرآن کے عموم کا ہے۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ ہر آیت کے پس منظر میں ضرور کوئی واقعہ ہو۔ آیت اپنے سیاق سے مربوط ہے اور اس کے منہ میں مطلب ڈالنے کے لیے کسی پس منظر کی حاجت نہیں ہے

یاایھا الذین امنوا استجیبوا للہ وللرسول اذا دعاکم میں جس بات کا مطالبہ کیا ہے یعنی اللہ و رسول کی دعوت پر لبیک کہو کیونکہ اسی سے تم کو حقیقی اور دائمی زندگی حاصل ہوگی۔ اس آیت میں اس کی مخالفت سے روکا گیا ہے کہ دعوئے ایمان کرکے اگر لبیک نہ کہو گے تو یہ اللہ اور اس کے رسول سے خیانت ہوگی۔ سمعنا اطعنا کا اقرار کرکے بے وفائی خیانت ہے۔ ایمان انقیاد باطن، التزام طاعت اور وفاداری کا ایک عہد ہے اور عہد ایک امانت ہوتا ہے۔ اس کی خلاف ورزی خفیہ ہو یا علانیہ خیانت ہے۔ حافظ ابن تیمیہ، حسن بصری سے نقل کرتے ہیں:

ایمان صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ کا نام نہیں ہے، ایمان اسے کہتے

ہیں جو دل میں گھر کر جائے اور اعمال اس کی تصدیق کریں۔
اللہ اور رسول کے ساتھ خیانت یہ ہے کہ اقرار کر کے اسے پورا نہ کیا جائے، ایمان لا کر
ان کے حکموں کی تعمیل نہ کی جائے۔ دین و ملت کے مصالح کے ساتھ غداری کی
جائے۔ اور اللہ و رسول اور مسلمانوں کے دشمنوں کو چھپے چوری مدد پہنچائی جائے یا
مسلمانوں کے چھپے راز اُن کو بتائے جائیں (تخونوا اماناتکم) میں آپس کی امانتوں
میں خیانت سے روکا گیا ہے۔ آپس کی امانتوں میں خیانت یہ ہے کہ جو چیز جس کے
پاس امانت ہے اس میں خیانت کرے اور کسی کا جو راز کسی کو معلوم ہو، اس کو
دوسروں پر ظاہر کر دے۔ یہ حدیث کئی دفعہ پڑھ چکے ہو کہ منافق کی تین علامتوں
میں سے ایک یہ ہے کہ جب کوئی امانت اس کے سپرد کی جائے تو وہ اس میں خیانت
کرے۔ حافظ منذری نے باب الترغیب فی انجاز الوعد میں عبداللہ بن مسعود کی ایک
موقوف روایت پیش کی ہے کہ انہوں نے فرمایا کہ خدا کی راہ میں مارا جانا ہر گناہ کا کفارہ ہے
لیکن امانت میں خیانت کا نہیں۔

آیت میں امانتوں سے مراد وہ تمام ذمہ داریاں ہیں جو کسی پر اعتبار کر کے اس کے
سپرد کی جائیں۔ اس میں سارے سرکاری عہدے اور نجی معاملات داخل ہیں۔ امانات
امانت کی جمع ہے۔ یہاں لفظ امانت خاص معنے میں نہیں بلکہ عام معنی میں آیا ہے
اس میں تمام حقوق و فرائض انفرادی نوعیت کے ہوں یا اجتماعی نوعیت کے، اپنوں سے
تعلق رکھتے ہوں یا بیگانوں سے، مالی معاملات ہوں یا سیاسی معاہدات سب لفظ
امانت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ شاہ عبدالقادر نے قرآن کی آیت انا عرضنا
الامانۃ کی تشریح کرتے ہوئے امانت کی یہ تعریف کی ہے۔ امانت کیا ہے
پرائی چیز رکھنی، اپنی خواہش کو روک کر، اس معنے میں علم بھی امانت ہے رائے
بھی امانت ہے، عہدے اور مناصب بھی امانت ہیں۔ قرآن کے نقطۂ نظر سے حکومت
اور سیاسی اقتدار بھی امانت ہے۔ حدیث میں اس کی تشریح آئی ہے۔ جناب رسول اللہ
صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوذر غفاری سے فرمایا تھا انک ضعیف وانھا
لامانۃ تو کمزور ہے اور حکومت امانت ہے۔ فقہی نقطۂ نظر سے ذرائع اور وسائل
مقاصد کے تابع ہوتے ہیں اس لیے حکومت اگر امانت ہے تو حکومت سازی کا

ذریعہ ووٹ بھی امانت ہے۔ اور امانت کے بارے میں قرآن کا حکم ہے ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا اور حکم ہے و تخونوا اماناتکم یعنی ووٹ ان کو دو جن میں اہلیت ہو۔ اگر نااہل کو تم نے ووٹ دیا تو مجرمانہ خیانت کر رہے ہو وانتم تعلمون کا مطلب یہ ہے کہ تم جانتے ہو کہ اس میں اس کی اہلیت نہیں اور پھر اس کو ووٹ دے رہے ہو تو یہ اور زیادہ سنگین جرم ہے۔ بے خبری تو ایک درجہ میں عذر بھی ہے لیکن جانتے بوجھتے ایسا کرنا بہت بڑا جرم ہے۔

دولت اور اولاد میں فتنہ

۲۸۔ اور خوب جان لو کہ تمہارے مال اور تمہاری اولاد ایک آزمائش ہیں اور جان لو کہ اللہ ہی کے پاس اجر عظیم ہے۔ یعنی آدمی مال اور اولاد کی خاطر ہی خدا کی اور بندوں کی چوری کرتا ہے اس لیے متنبہ فرما دیا کہ امانت داری کی جو قیمت اللہ کے یہاں ہے وہ یہاں کے مال و اولاد وغیرہ سب چیزوں سے بڑھ کر ہے[1]

اب اللہ اور اس کے رسولؐ کی محبت و طاعت میں کمزوری کی اصلی وجہ بتائی جارہی ہے۔ یعنی بتایا جارہا ہے کہ ایمان میں یہ بیماری کہاں سے لگی ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ جو لوگ خدا اور رسولؐ کی دعوت پر لبیک نہیں کہتے وہ مال و اولاد کی محبت میں گرفتار ہیں۔ اور یہ بیماری جب لگ جاتی ہے تو انسان از خود رفتہ ہو کر اللہ و رسولؐ کو فراموش کر جاتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں اللہ کی نعمت ہیں لیکن جب یہ خدا فراموشی کا سبب بن جائیں تو دونوں فتنہ بن جاتی ہیں۔ خدا اور رسولؐ سے بے وفائی ہو یا دوسروں کے حقوق میں خیانت ہو سب کا بنیادی سبب ہی دونوں کی حد سے بڑھی ہوئی محبت ہے۔ یہ امر واقعہ ہے کہ انسان کے اخلاص ایمانی میں جو چیز بالعموم خلل ڈالتی ہے اور جس کی وجہ سے اکثر بے ایمانی، غداری اور خیانت جیسے سنگین جرائم کا ارتکاب کرتا ہے وہ اپنے مالی مفاد اور اپنی اولاد کے مفاد سے اس کی حد سے بڑھی ہوئی دلچسپی ہوتی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ یہ مال و اولاد جن کی محبت میں گرفتار ہو کر تم عموماً راستی سے ہٹ جاتے ہو

[1] افادات شیخ الاسلام

دراصل یہ دنیا کی امتحان گاہ میں تمہارے لیے سامانِ آزمائش ہے۔ فی الواقع جسے تم بیٹا یا بیٹی کہتے ہو۔ یہ دراصل امتحان کا ایک پرچہ ہے اور جسے تم سرمایہ اور دولت کہتے ہو یہ بھی امتحان کا دوسرا پرچہ ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اگر قرآن کے بیان کے مطابق انسان کی پوری زندگی ابتلائی ہے۔ اسی ابتلائی زندگی میں امتحان کے اصلی یہ دو پرچے ہیں مال اور اولاد۔ ابتلائی ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اللہ سبحانہٗ جن باتوں کو نہیں جانتے ان کو جاننا چاہتے ہیں بلکہ انسانی فطرت میں اقتدار، اختیار، انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی اسی قوت کے صحیح استعمال کے مطالبہ کا نام امتحان ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے اس آیت میں اہلِ ایمان کو اسی کے جان لینے کا حکم دیا۔ یعنی جان لو کہ تمہارا مال اور اولاد دونوں تمہاری ابتلائی زندگی کے امتحانی پرچے ہیں۔ قرآن نے آدمی کی زندگی کے پانچ دور بتائے ہیں۔ اس میں آخری دور تکاثر فی الاموال والاولاد کو قرار دیا۔ یعنی مال اور اولاد کی کثرت میں باہم مقابلہ کرنا۔ زندگی کے اس دور میں پہلے تو دولت و ثروت کا مقابلہ ہوتا ہے۔ تنخواہیں ناپی جاتی ہیں۔ آمدنیوں کا موازنہ کر کے اندر ہی اندر ہر ایک دوسرے کے مقابلے میں آگے بڑھ جانے کی فکر میں منہمک رہتا ہے۔ الاموال کے بعد پھر الاولاد کا مقابلہ شروع ہو جاتا ہے۔ بیٹے گنے جاتے ہیں، بیٹیاں شمار ہوتی ہیں۔ گھر، خاندان، برادری، کنبہ تک اس کو وسیع کر دیا جاتا ہے۔ الاموال اور الاولاد کے تکاثر کا یہ مشغلہ زندگی کا آخری مشغلہ ہوتا ہے۔ بالآخر اسی کو دنیا میں کلیابی کا معیار بنا لیا جاتا ہے۔ قرآن ہی میں ہے:

ای الفریقین خیر مقاما واحسن ندیا

بتاؤ دونوں جماعتوں میں سے کون بہتر ہے اور کس کا جلسہ شاندار ہے۔

اور یہی نہیں بلکہ نبوت کی تعلیمات کو رد کرنے والوں نے ان دونوں کی بہتات کو حق پر ہونے کی کسوٹی بنا رکھا تھا۔ قرآن میں ہے:

نحن اکثر اموالا واولادا وما نحن بمعذبین

مال و اولاد میں تو ہم زیادہ ہیں ہمیں خدا کا عذاب نہیں ہوگا۔

آج بھی معیار یہی ہے۔ اسی لیے قرآن ان دونوں کو موجودہ ابتلائی زندگی میں پرچہ امتحان قرار دیا ہے۔

خیر و شر میں امتیاز کی کسوٹی

۳۵۔ اے مسلمانو! اگر تم اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہو گے تو وہ تمہارے لیے حق و باطل میں امتیاز کی قوت فراہم کر دے گا اور تم سے تمہاری بدحالیاں ہٹا دے گا اور تمہیں بخش دے گا اور اللہ سبحانہ بہت بڑے فضل و کرم والا ہے۔ یعنی اگر خدا سے ڈر کر راہ تقویٰ اختیار کر لوگے تو خدا تم میں اور تمہارے مخالفوں میں فیصلہ کر دے گا۔ دُنیا میں بھی تم کو عزت دے گا اور ان کو ذلیل یا ہلاک کرے گا جیسے بدر میں کیا اور آخرت میں بھی کہ تم نعیم دائم میں رہو گے۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہو گا و امتازوا الیوم ایها المجرمون اور المرسلات میں ہے ھذا یوم الفصل دوسری بات یہ ہے کہ تقویٰ کی برکت سے حق تعالیٰ تمہارے دل میں ایک نور ڈال دے گا جس سے تم ذوقاً و وجداناً حق و باطل اور نیک و بد کے درمیان فیصلہ کر سکو گے۔ اس کے علاوہ ایک بات حضرت شاہ صاحب نے لکھی ہے کہ شاید فتح بدر میں مسلمانوں کے دل میں خیال آیا ہو کہ یہ فتح اتفاقی ہے۔ حضرت سے مخفی کافروں پر احسان کریں کہ ہمارے گھر بار اور اہل و عیال کو مکہ میں نہ ستادیں۔ سو پہلی آیت میں خیانت کو منع فرمایا اور دوسری آیت میں تسلی دی کہ آگے فیصلہ ہو جائے گا تمہارے گھر بار کافروں میں گرفتار نہ رہیں گے۔[1]

اصل ارشاد میں ایک شرط کے پورا کرنے پر مستقبل میں تین انعامات کی خوشخبری دی ہے۔ شرط یہ ہے ان تتقوا اللہ۔ حضرت شاہ صاحب نے اس کا ترجمہ کیا ہے کہ اگر تم ڈرتے رہو گے در اصل یہ ایک تشریح طلب مضمون ہے جسے حضرت شاہ صاحب نے مختصر لفظوں میں پیش کیا ہے۔ مشرکین اور اہل کتاب کے حیا سوز معاشرے دہشت انگیز ماحول اور گھٹی ہوئی فضا میں ان لوگوں کو جنہوں نے نبوت کی دعوت پر لبیک کہہ کر بدر میں قربانی دی ہے۔ بتایا جا رہا ہے کہ مستقبل میں بدر جیسی کامیابی حاصل کرنے اور مشرکین و اہل کتاب کی چیرہ دستی اور ان کی ایمان سوز سازشوں سے بچنے کی آخرالیقین تدبیر یہ ہے کہ پوری قوت سے اپنے اندر اجتماعی تقویٰ پیدا کرو۔ مشرکین

---

[1] نادرات شیخ الاسلام

جو کچھ کر رہے ہیں یا اہل کتاب جو کچھ کہہ رہے ہیں یہ سب کی سب اندھی قوتیں ہیں جن میں نہ فہم حقیقت ہے اور نہ عقل و دانش کی روشنی ہے اور نہ انسانیت کی منزل مقصود کا کوئی نشان۔ یہ سب قوتیں وقتی حالات اور ہنگامی تقاضوں کی مخلوق ہیں۔ اور اس وقت تک اہل ایمان کے ایوانوں پر شبخون مارتے رہیں گے جب تک ایمان ایک جاندار طاقت بن کر ان کے سامنے نہیں آئے گا۔ ایمان کے جاندار بننے کا دارومدار صرف زبانی اقرار سے نہیں بلکہ یقین کی شدت اور عمل کی پختگی پر ہے۔ جس طرح درخت کی مضبوطی جڑ کی طاقت پر منحصر ہوتی ہے اور جڑ ہی سے درخت کو نشوونما کا پورا سامان ملتا ہے۔ اسی طرح ایمان دنیا میں ایک زندہ اور کارفرما قوت کی حیثیت سے اس وقت ابھرتا ہے۔ جب ایمان کی روشنی سے دل و دماغ منور ہوں۔ آیت میں ایمان کے حوالہ سے خطاب کرنا اور پھر ان تتقوا اللہ کی شرط پیش کرنا اس کی طرف اشارہ کر رہا ہے کیونکہ ایمان ہی وہ مرکزی قوت ہے جس سے اسلامی زندگی کے مختلف اجزاء ترکیبی اپنی زندگی اور قوت کے لیے غذا حاصل کرتے ہیں۔ ایمان باللہ کی حقیقی کسوٹی تقویٰ ہے۔ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ ایک مسلمان اپنی زندگی میں متقیانہ سیرت اپنائے بلکہ اس راہ میں سب سے پہلی قربانی ہی یہ ہے کہ جہاں جہاں اللہ کی نافرمانی ہو رہی ہے اور جس طرح ہو رہی ہے اس سے یک قلم کنارہ کش ہو جائے۔ ذاتی منفعت، ملکی مصلحت اور قومی مفادات اس راہ میں اگر رکاوٹ ہوں تو ٹھکرا دے یہی تقویٰ ہے

یہ شرط پیش فرما کر اس کی جزا میں تین انعامات کا ذکر ہے۔

پہلا انعام یہ ہے یجعل لکم فرقانا "اللہ تمہارے لیے حق و باطل میں امتیاز کرنے والی قوت بنا دے گا۔ فرقان ہر اس چیز کو کہتے ہیں جو حق اور باطل کے درمیان امتیاز کر دے۔ یہ امتیاز اندرونی طور پر ہو سکتا ہے اور بیرونی بھی، علمی اور عقلی بھی، عملی اور واقعاتی بھی۔ قرآن دلائل و براہین کو بھی فرقان کہتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو جماعت اجتماعی زندگی میں تقویٰ کی سیرت اختیار کرے گی اس میں حق و باطل اور خیر و شر میں امتیاز کی ایک خاص قوت پیدا ہو جائے گی اور اس لیے کبھی باطل و شر کی طرف قدم نہ اٹھائے گی۔ واقعات کی روشنی میں اگر آپ اس آیت کی جیتی جاگتی تفسیر دیکھنا چاہتے ہیں تو صدر اول کے مسلمانوں کو دیکھ لیجیے۔ عرب کے صحرا نشین

جن کی ساری زندگیاں اُونٹ چرانے میں بسر ہوئیں۔ یکایک ایرانیوں اور رومیوں جیسی متمدن قوموں کی قسمتوں کے مالک تھے۔ لیکن خیر و شر میں امتیاز کی ایسی قوت ان میں آ گئی تھی کہ جو کچھ جتنا کچھ جیسا کچھ کرتے تھے وہ حق و عدل اور خیر و سعادت کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔

آیت کا منشا یہ ہے کہ اگر تم دنیا میں اللہ سے ڈرتے ہوئے گزارو گے اور تمہاری دلی خواہش یہ ہو کہ تم سے کوئی ایسی حرکت سرزد نہ ہو جو رضائے الٰہی کے خلاف ہو۔ تو اللہ تعالیٰ تمہارے اندر وہ قوت تمیز پیدا کر دے گا جس سے قدم قدم پر تمہیں خود یہ معلوم ہوتا رہے گا کہ کون سا رویہ صحیح ہے اور کون سا غلط۔ کس رویہ میں خدا کی رضا ہے اور کس میں اس کی ناراضی۔ زندگی کے ہر موڑ پر، ہر دوراہے پر نشیب و فراز پر تمہاری اندرونی بصیرت تمہیں بتانے لگے گی کہ کدھر قدم اُٹھانا چاہیے اور کدھر نہیں اٹھانا چاہیے۔ کون سی راہ حق ہے اور خدا کی طرف جاتی ہے اور کون سی راہ غلط ہے اور شیطان سے ملاتی ہے۔ گویا اس طرح اس آیت میں مسلمانوں سے یہ وعدہ کیا گیا ہے کہ مستقبل تمہارے لیے تاباں ہے بشرطیکہ تم تقویٰ پر مضبوطی سے جمے رہے یعنی اللہ اور اس کے رسول سے بدعہدی اور بے وفائی کے مرتکب نہ ہوئے۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ، وہ وقت جلدی لائے گا کہ فضا میں جو کفر و شرک کے بادل نظر آ رہے ہیں سب چھٹ جائیں گے اور جو حق تم لے کر کھڑے ہوئے ہو اس کا بول بالا اس طرح ہو گا کہ دشمنوں کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جائیں گے۔

دوسرا انعام یہ ہے ویکفر عنکم سیاتکم اور تم سے تمہاری بدحالیاں مٹا دے گا۔ قرآن میں اجتماعی خوشحالیوں کے لیے حسنہ اور اجتماعی بدحالیوں کے لیے سیئات کی تعبیر آئی ہے۔ یہاں یہی مراد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تم زندگی کے مختلف گوشوں میں ایمان کے اولین تقاضے پر کاربند رہے تو اللہ تمہاری اجتماعی بدحالیوں کو مٹا دے گا۔ اور اس کی جگہ تمہیں اجتماعی خوشحالیاں عطا فرمائے گا۔

اس میں بھی مسلمانوں سے وعدہ ہو رہا ہے کہ اگر تم تقویٰ پر مضبوطی سے جمے رہے تو تمہاری موجودہ اجتماعی بدحالیاں ختم ہو جائیں گی۔ اس کا تماشا بھی دنیا نے آنکھوں سے دیکھا۔ جن کو کھانے کو روٹی نہ ملتی تھی۔ ان کے گھروں میں قیصر و کسریٰ کے خزانوں

کی ریل پیل ہو رہی تھی۔ اونٹ چرانے والے دنیا کی متمدن قوموں کی قسمت کے مالک بن گئے۔ فقر و فاقہ کی ساری گھٹائیں چھٹ گئیں اور حالات یکسر بدل گئے۔ یہ کہ سیئات سے مراد اجتماعی بدحالیاں ہیں۔ یہ کوئی میری ذاتی رائے نہیں یا میرے دماغ کا کوئی خود تراشیدہ نتیجہ نہیں بلکہ سینہ قرآن سے ابلی ہوئی بات ہے۔ اس موضوع پر قرآنی آیات کا جو ذخیرہ ہے سب کا نقل کرنا تو مشکل ہے۔ مثلاً چند آیات پیش کرتا ہوں۔

ان تمسسكم حسنة تسوهم وان تصبكم سيئة يفرحوا بها

اگر تم پر خوش حالی آجائے تو ان کو غمگین بنا دے اگر کوئی بدحالی آجائے تو وہ خوشیاں منائیں۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

اذا اصاب المومنين خصب ونصر وتائيد - ساءذالك المنافقين وان اصاب المسلمين سنة اى جدب - فرح المنافقون

اہل ایمان کو جب معاشی خوشحالی، نصرت و قوت ملتی ہے تو منافقین کو غم ہو جاتا ہے اور جب مسلمان قحط سالی کا شکار ہوتے ہیں تو وہ خوش ہوتے ہیں۔

اس آیت میں سیئۃ سے مراد معاشی بدحالی ہے۔

ایک اور جگہ ارشاد ہے:

وان تصبهم سيئة يقولوا هذه من عندك

اور اگر ان کو کوئی بدحالی پہنچتی ہے تو وہ کہتے ہیں کہ یہ تمہاری وجہ سے ہے

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

سيئة الجدب والضر فى اموالهم

سیئۃ سے مراد قحط سالی اور مالی نقصان ہے۔

ایک اور ارشاد ہے:

ثم بدلنا مكان السيئة الحسنة حتى عفوا

پھر تبدیل کر دی ہم نے بدحالی کی جگہ خوشحالی یہاں تک کہ وہ زیادہ ہو گئے۔

حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔

حولنا الحال من شدة الی رخاء ومن مرض وسقم الی صحة وعافیة ومن فقر الی غنی۔

ہم نے حالات بدل دیے معاشی بدحالی کی جگہ معاشی خوشحالی، بیماری کی جگہ صحت اور فقیری کی جگہ مالداری۔

اس کے علاوہ قرآن ہی میں ایمان و تقویٰ کے نتیجے میں معاشی برکتوں کا ذکر آتا ہے۔

ولو ان اهل القریٰ امنوا واتقوا لفتحنا علیهم برکات من السماء والارض۔

اور آبادیاں والے اگر ایمان و تقویٰ کی زندگی اپنا لیتے تو ہم ان پر آسمان و زمین سے ضرور برکتوں کو کھول دیتے۔

اگر حقیقت یہ ہے اور نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ خود قرآن گواہی دے رہا ہے تو پھر یہاں سیئات سے اجتماعی معاشی بدحالیاں مراد لینے میں کون سی قباحت ہے مطلب یہ ہے کہ اگر ایمان کی زندگی میں تقویٰ کا سرمایہ فراہم کرلوگے تو ہم تمہیں اس دنیا کی زندگی میں اجتماعی طور پر معاشی خوشحالی عطا کریں گے اور تمہاری معاشی بدحالیوں کو ملیا میٹ کر دیں گے۔

تیسرا انعام یہ ہے، و یغفر لکم اور تمہیں بخش دے گا۔ غفر کے معنے ڈھانپنے کے نہیں بلکہ محفوظ رکھنے کے ہیں۔ مغفر خود کو اس لیے کہتے ہیں کہ وہ سر کو تلوار کی ضرب سے محفوظ رکھتی ہے۔ اس لیے نہیں کہتے کہ وہ سر کو ڈھانپتی ہے۔ غفار پٹے کو کہتے ہیں۔ کیونکہ وہ آزاد کو گرنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ اس انعام کا تعلق بھی دنیا سے ہے اور یہ بھی مستقبل کے بارے میں وعدہ ہے۔ مطلب یہ ہے اگر تم اپنی زندگی میں تقویٰ اختیار کرو گے تو اللہ سبحانہ، تمہیں گناہوں سے اپنی حفاظت میں لے لے گا۔ اگر یہ سورت بدر اور اصحاب بدر کے بارے میں نازل ہوئی ہے تو اس کا صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے اصحاب بدر کی گناہوں سے حفاظت فرمائی ہے یہ اصحاب بدر کی گناہوں سے حفاظت کا پروانہ ہے۔ یہی مطلب ہے اس ارشادِ نبوت کا جو خاص اہل بدر کے بارے میں ہے۔

اعملوا ما شئتم فقد غفرت لکم

آخر میں ارشاد ہوا ہے واللہ ذوالفضل العظیم یہ آیت ان تینوں انعامات کی علت ہے یعنی یہ انعامات تم پر صرف اس لیے ہوتے ہیں کہ اللہ سبحانہ بہت بڑے فضل والے ہیں۔ یہ بات نہیں کہ یہ تمہارے کیے کی قیمت ہے اور قیمت ہونے کی وجہ سے یہ انعامات اللہ کے ذمہ ہو گئے ہیں۔ نہیں بلکہ یہ محض اس کا فضل و احسان ہے کہ وہ انعامات سے تمہیں مالا مال کر رہا ہے۔ اوروں نے تو نہیں لیکن قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس آیت سے یہ نکتہ خوب نکالا ہے کہ اللہ کے انعامات اعمال کی قیمت نہیں ہیں بلکہ محض ان کے ذوالفضل العظیم ہونے کا تقاضا ہے۔ اسی آیت سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات معلوم کی ہے کہ

تم میں سے کسی کو اس کا عمل نہیں بچائے گا۔ صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ آپ کو بھی آپ کا عمل نہیں بچائے گا۔ فرمایا مجھے بھی نہیں تاآنکہ ڈھانپ لے مجھے اللہ اپنی رحمت اور فضل میں۔

گویا ہماری عابدانہ نیازمندیوں کی حیثیت ایسی ہے جیسے کوئی آقا اپنے غلام کو فرائض ادا کرنے پر انعام دینے کا وعدہ کرے۔

بہر حال یہ پوری آیت مستقبل میں اہل ایمان سے دنیا میں کامیابی کے وعدوں پر مشتمل ہے۔ اب تک بدر کی فتح کے بعد قرآن نے اہل ایمان کو جو کچھ بتایا ہے اس پر ایک اجمالی نظر ڈال لیجیے۔

بات یہاں سے چلی تھی کہ مستقبل میں اگر بدر جیسی کامیابی حاصل چاہتے ہو تو

اولاً: اللہ و رسول کی بھرپور اطاعت کرو۔

ثانیاً، حکم سننے کے بعد سرمو انحراف نہ کرو۔

ثالثاً، نبوت کے علم کی حد تک بہرے گونگے اور بے عقل بن کر نہ رہو۔

رابعاً، نبوت کی پکار پر لبیک کہو۔

خامساً، اپنے ماضی کو دھیان میں رکھو کہ تم کیا تھے۔

سادساً، اپنا معاملہ خدا کے ساتھ نہ رکھو اور ہر کام فکرِ آخرت سے دب کر کرو۔

سابعاً، اجتماعی گناہوں سے بچ کر رہو جن کے نتیجے میں اجتماعی بلائیں آتی ہیں

ثامناً، خدا اور رسول اور اہلِ ایمان کے بارے میں وفادار بن کر رہو خائن نہ بنو۔

تاسعاً ، مالی مفادات اور اولاد کا مقابلہ خدا اور رسُول سے ہو تو خدا اور رسُول کو ترجیح دو ۔
عاشراً ، ایمان کی پوری زندگی میں تقویٰ اختیار کرو۔ تلک عشرۃ کاملۃ ۔
یہ ابتدائی اور بنیادی باتیں ہیں جن پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے اس دُنیا میں کامیابی موقوف ہے ۔ اگر یہ باتیں تمہارے اندر موجود ہوں گی تو کامیابی کا سہرا تمہارے سر ہوگا اور مطلع پر جو غبار نظر آرہا ہے یہ سب چھٹ جائے گا اور اسلام اس طرح غالب ہو کر چمکے گا کہ دُشمنوں کی نگاہیں خیرہ ہو کر رہ جائیں گی ۔ قرینہ بتا رہا ہے کہ ان آیات میں اسلام اور مسلمانوں کے کامل غلبہ کا وعدہ ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ وہ وقت دُور نہیں ہے کہ جب کُفر کی طاغوتی طاقتیں زیر ہو جائیں گی اور اسلام کا آفتاب اپنی پوری تابانی سے تمہارے سامنے آجائے گا ۔ بس یہ شرط ہے کہ اپنے اندر یہ دس باتیں پیدا کر لو ۔

وَاِذْ يَمْكُرُ بِكَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لِيُثْبِتُوْكَ اَوْ يَقْتُلُوْكَ اَوْ يُخْرِجُوْكَ ؕ وَيَمْكُرُوْنَ وَيَمْكُرُ اللّٰهُ ؕ وَاللّٰهُ خَيْرُ الْمٰكِرِيْنَ ﴿۳۰﴾

اور یاد کرو اس وقت کو جبکہ کفار آپ کے بارے میں سازشیں کر رہے تھے[۳۶] کہ آپ کو قید کر دیں یا قتل کر دیں[۳۷]، اور وہ سازشیں کر رہے تھے اور اللہ تدبیر کر رہا تھا، اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے[۳۸]۔

ہجرت مدینہ اور مکہ سے روانگی

یہ آیت قرآنی بتا رہی ہے کہ انسان اپنے جہل و غفلت کی سرشاریوں میں کیا سوچتا ہے، اور حکمتِ الٰہی کی مخفی تدبیروں کا فیصلہ کیا ہوتا ہے۔ جب ہجرت سے پہلے قریش آپ کی گرفتاری، قتل اور جلاوطنی کے منصوبے بنا رہے تھے۔ ایک لمحہ کے لیے بھی ان کو پیش یا افتادہ حالات کا احساس نہ تھا۔ لیکن خود ان کے ظلم و عداوت نے ان کا سامان کر دیا۔ اگر قریش کی جانب سے ظلم نہ ہوتا تو ہجرت نہ ہوتی، اور اگر ہجرت نہ ہوتی تو بدر نہ ہوتا بلکہ وہ تمام نتائج نہ ہوتے جو ہجرت سے رونما ہوئے، کیونکہ ہجرت ایک ہی واقعہ نہیں تھا بلکہ بے شمار وقائع کا مجموعہ تھا۔ اسلام کے ظہور کی تاریخ دراصل دو بڑے اور اصولی دوروں میں تقسیم ہے۔ ایک دور مکی زندگی کا ہے، دوسرا دور مدنی زندگی کا۔ پہلا دور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

کی بعثت سے شروع ہوتا ہے اور ہجرت پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا غارِ حرا کے اعتکاف سے ہوتی ہے اور تکمیل غارِ ثور کے انزوا پر۔ دوسرا ہجرت سے شروع ہوتا ہے اور حجۃ الوداع پر ختم ہو جاتا ہے۔ اس کی ابتدا مدینہ کی فتح سے ہوئی۔ اور تکمیل مکہ کی فتح پر ہوئی۔

دنیا کی نظروں میں اسلام کے فروغ وظہور کا دوسرا دور ہے کیونکہ اسی دور میں اسلام کی پہلی غربت ختم ہوئی اور ظاہری حشمت و طاقت کا سامان ہوا۔

بدر کی جنگ فتح ہتھیاروں کی فتح تھی۔ مکہ کی فتح، عرب کی فتح کی تمہید تھی، لیکن قرآن کی نظر میں اس کی زندگی کا اصلی دور ہجرت سے پہلا دور ہے۔ اسلام کی ساری قوتوں کی بنیادیں اسی دور میں استوار ہوئیں۔ بلاشبہ بدر کی فتح نے دنیا میں اپنی بے مثال طاقت کا اعلان کر دیا لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کو استعمال کر رہے تھے ان کی قوت و طاقت کس جگہ تیار ہوئی تھی۔ یقیناً مکہ کی فتح عرب کی فیصلہ کن فتح تھی لیکن اگر مدینہ پہلے فتح نہ ہوتا تو مکہ کی فتح کی راہ ہموار نہ ہوتی۔ یہ سچ ہے کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہجرت سے فتح ہوا۔ دوسرے دور میں خواہ جسمانی طاقت کتنی زیادہ ہو گئی ہو لیکن اس کی روح پہلے دور میں تیار ہوئی۔ ہجرت سے پہلا دور اگر تخم ہے تو دوسرا دور اس کا برگ و بار ہے پہلا دور اگر بنیاد تھی تو دوسرا دور اسی بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت تھی۔ پہلا نشو و نما کا دور تھا دوسرا ظہور و غلبہ کا۔ دوسرے کا ظہور خواہ کیسا ہی شاندار ہو لیکن بنیاد اور استعداد کی حیثیت پہلے دور کو حاصل ہے۔ اس آیت میں قرآن اسی طرف اشارہ کر رہا ہے۔

واقعۂ ہجرت کی یاددہانی

۳۶ - اور یاد کرو اس وقت کو جب کفار اے پیغمبر آپ کے بارے میں سازشیں کر رہے تھے۔ یہاں واقعۂ ہجرت کو یاد دلانے سے مقصود یہ ہے کہ مستقبل میں اسی وعدہ کو جو پہلے بجعل لکم فرقانا میں کیا ہے زیادہ مؤکد کر دیا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر یہ معلوم کرنا چاہتے ہو کہ مستقبل میں تمہیں اللہ سبحانہٗ کس طرح ناموافق حالات میں کامیابی دے گا اور مخالف ہواؤں کو کیسے سازگار بنا دے گا تو واقعۂ ہجرت پر غور کرو۔

یہ واقعہ کب اور کس تاریخ میں پیش آیا ہے اور آپ کون سے دن مکہ مکرمہ سے نکل کر غارِ ثور میں پہنچے۔ قاضی سلیمان منصور پوری کے بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ۲۷ صفر المظفر ۱۳ نبوی کو کا شانہ نبوت سے بقصد ہجرت روانہ ہوئے۔ جمعرات کا دن گزر چکا تھا اور جمعہ کی رات شروع ہو گئی تھی۔ عیسوی تاریخ ۱۰ ستمبر ۶۲۲ء تھی۔ تطابق میں ایک دن کے آگے پیچھے ہونے کا امکان بھی ہے۔ طبقات ابن سعد کے مطابق مکہ مکرمہ سے روانگی کی تاریخ یکم ربیع الاول ۱۳ نبوی تھی یعنی ۱۳ ستمبر ۶۲۲ء۔ پہلے حساب کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تین روز غارِ ثور میں گزار کر یکم ربیع الاول کو عزم فرمائے مدینہ طیبہ ہوئے یعنی ۱۳ ستمبر ۶۲۲ء۔ دوسرے حساب کے مطابق روانگی ۴ ربیع الاول کو عمل میں آئی یعنی ۱۶ ستمبر ۶۲۲ء کو۔ روانگی کا دن پہلے حساب کے مطابق یقیناً دوشنبہ تھا۔ طبقات ابن سعد میں بھی روانگی کا دن دوشنبہ ہے گویا دن میں کوئی اختلاف نہیں صرف تاریخ میں اختلاف ہے۔

تین راتیں غارِ ثور میں گزار کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم منزل مقصود کی طرف روانہ ہوئے۔ بعض روایات میں ہے کہ یہ سفر رات کو شروع ہوا۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ غالباً صبح بہت سویرے روانگی ہوئی ہو گی تاکہ دن چڑھنے سے پہلے مکہ مکرمہ کے قرب وجوار کو پیچھے چھوڑا جا سکے۔ ایک سانڈنی پر حضور اقدس اور حضرت ابوبکر آگے پیچھے سوار ہوئے۔ دوسری پر عبداللہ بن اریقط اور عامر بن فہیرہ سوار تھے۔

غارِ ثور سے نکل کر وہ راستہ اختیار کیا گیا جس سے عام آمد و رفت نہ تھی۔ اسی طرح مغربی اور شمالی رخ چلتے چلتے سمندر کے قریب پہنچ گئے۔

سہ شنبہ کے روز ابوبکر نے ایک چٹان کے پاس سایہ دیکھا، زمین صاف کر کے اس پر چادر بچھائی تاکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم استراحت کریں۔ ادھر اُدھر دیکھا تو ایک چرواہا نظر آیا اس کے ہاتھ اور بکری کے تھن خوب صاف کرا کے دودھ نکلوایا۔ برتن کا منہ ڈھانپ دیا تاکہ دودھ گرد وغبار سے محفوظ رہے اس میں پانی ڈال کر خدمت اقدس میں پیش کیا۔ آپ نوش فرما چکے تو روانہ ہو گئے۔

راستے کے مقامات

طبقات ابن سعد، سیرۃ ابن ہشام اور بعض دوسری کتابوں میں مقاماتِ سفر کے

نام بھی دیے ہیں مثلاً رابغ تک طبقات میں قدید اور ابن ہشام میں عسفان کا ذکر ہے
طبقات میں رابغ کے بعد یہ مقامات ہیں، خرار، ثنیۃ المرہ، لقف، مدیکہ، مجاح،
مرجح مجاج، بطن مرجح، ذات کشد، جسے بعض کشت لکھا ہے، جداجد، اذافر،
بطن ایم، ذاسلم الغنانیہ، بطن القاحہ، عرج، جدوات، غائرہ، رکوبہ، بطن الحقیق،
جنجانۃ، الوحید، بطن ایم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مغرب کی نماز ادا کی۔ رابغ
سے آگے سراقہ کا واقعہ پیش آیا۔ اس کا قبیلہ رابغ ہی میں آباد تھا۔ کفار قریش جناب رسول
اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو پا نہ سکے تو اعلان کر دیا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یا ابوبکر کو بھی
زندہ یا مردہ لے آئے گا اسے ایک سو اونٹ انعام دیے جائیں گے۔ سراقہ کو یہ خبر مل
چکی تھی۔ وہ مجلس میں بیٹھا تھا کہ کسی نے بتایا کہ ساحل بحر کی طرف چند سائے سے
نظر آتے ہیں شاید وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے ساتھی ہوں۔ سراقہ
کو یقین ہو گیا کہ وہی ہیں۔ لیکن آدمی کو یہ کہہ کر ٹال دیا کہ وہ فلاں فلاں ہیں اور ابھی
یہاں سے گزرے ہیں۔ وہ دراصل اکیلا انعام لینا چاہتا تھا۔ سراقہ چپ چاپ اٹھا نوکرانی
سے کہا کہ میرا گھوڑا ٹیلے سے پرے لے جا کر ٹھہر۔ خود نیزہ لے کر پیدل وہاں پہنچا۔
اور سوار ہو کر تعاقب میں نکل پڑا۔ قریب پہنچا تو یقین ہو گیا کہ رسول اللہ صلی اللہ
علیہ وسلم اور ان کے ساتھی جا رہے ہیں۔ تیر نکال کر فال دیکھی تو خلاف نکلی لیکن سو
اونٹوں کا نشہ سر پر سوار تھا، باز نہ آیا۔ وہ خود کہتا ہے کہ میں نے فال کے خلاف کیا۔
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مالک حقیقی سے لو لگائے قرآن عزیز کی تلاوت
کر رہے تھے۔ ابوبکر چوکنے تھے اور ان کی نظر ہر طرف تھی۔ سراقہ قریب پہنچ
گیا۔ ابوبکر نے حضور اقدس کو بتایا تو آپ نے فرمایا اے اللہ اس کی شر سے بچا۔ فوراً
سراقہ کے گھوڑے کے پاؤں گھٹنوں تک زمین میں دھنس گئے اور وہ گر پڑا، اٹھا اور گھوڑے
نے پاؤں بمشکل زمین سے نکالے تو سراقہ کہتا ہے کہ ایسی گرد اڑی جو دھوئیں کی
طرح آسمان تک پھیل گئی۔ سراقہ کو یقین ہو گیا کہ یہ معاملہ دوسرا ہے۔ درخواست
کر کے سواریاں ٹھہرائیں۔ زادِ راہ پیش کی مگر قبول نہ ہوئی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ
وسلم نے اتنا فرمایا کہ ہمارا ذکر کسی سے نہ کرنا۔ واپس ہوتے ہوتے سراقہ نے امان نامہ
کے لیے درخواست کی۔ حضور اقدس کے ارشاد کے مطابق عامر بن فہیرہ نے چمڑے

کے ایک ٹکڑے پر امان نامہ لکھ کر سراقہ کے حوالہ کر دیا۔ جنگِ اُحد کے بعد سراقہ مسلمان ہوا۔ اور فتح مکہ کے بعد امان نامہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دکھایا۔ استیعاب میں ہے کہ سراقہ واپس ہونے لگا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ سراقہ اس وقت تیری کیا شان ہو گی جب تیرے ہاتھوں میں کسریٰ کے شاہی کنگن ہوں گے۔ سراقہ نے دریافت کیا کسریٰ ابن ہرمز شہنشاہ ایران کے کنگن؟ آپ نے فرمایا ہاں۔ سراقہ حیران و ششدر رہ گیا۔ جب فاروق اعظم کے زمانے میں مداین فتح ہوا اور ایران کا مالِ غنیمت آیا تو اس میں کسریٰ کے کنگن بھی تھے حضرت فاروق اعظم نے سراقہ کو پہنا ئے۔

راستے میں حضرت زبیر سے ملاقات ہوئی جو شام سے تجارتی قافلہ کے ساتھ آ رہے تھے۔ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر کی خدمت میں سفید کپڑوں کا ایک ایک جوڑا پیش کیا اور عرض کیا کہ میں بھی قافلہ اور مال کو مکہ مکرمہ پہنچا کر ہجرت کر کے آ جاؤں گا۔ حضرت ابوبکر متعدد تجارتی سفر اسی تجارتی شاہراہ پر کر چکے تھے اس لیے اطراف واکناف میں کافی شناسائی تھی۔ اتفاقاً راستہ میں کوئی واقف کار مل گیا اور پوچھا کہ آپ کے ساتھ اگلے کون ہیں؟ اشارہ حضور اقدس کی طرف ہوتا۔ حضرت ابوبکر نے فرمایا رجل یھدی السبیل راہ بتانے والا ہے۔ آپ کے ذہن میں مفہوم یہ ہوتا کہ میرے مرشد ہیں سننے والا سمجھتا کہ راستہ بتانے کے لیے آدمی ساتھ لے لیا ہے۔

سفرِ ہجرت میں کل آٹھ روز لگے جن کے نزدیک غارِ ثور سے روانگی یکم ربیع الاول کو ہوئی ان کے حساب کے مطابق رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ۸ ربیع الاول کو قبا پہنچے۔ اور جن مورخین نے روانگی ۴ ربیع الاول بتائی ہے ان کے حساب سے قبا میں حضور کا ورود مسعود ۱۲ ربیع الاول کو ہوا۔

تشریف آوری کی خبر پہلے پہنچ چکی تھی۔ تمام لوگ ہمہ تن چشم انتظار تھے۔ اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم آ رہے ہیں۔ لوگ ہر روز صبح سویرے گھروں سے نکل کر آبادی کے باہر جمع ہو جاتے اور دوپہر تک انتظار کر کے واپس ہو جاتے۔ ایک روز انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ کی بلندی سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر آواز دی کہ اہلِ عرب لو تم جس کا انتظار

کرہے تھے وہ آگیا۔

آگیا اسلام کا تابندہ گوہر آگیا

ساری آبادی تکبیر کی آواز سے گونج اٹھی۔ انصار ہتھیار سے سج سج کر بے تابانہ گھروں سے نکل آئے۔

اسے اتفاق کہہ دیجئے یا عالم غیب میں فیصلہ خداوندی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جس روز قبا میں پہنچے اس روز نبوت کا تیرھواں سال پورا ہو رہا تھا۔ دوسرے روز سے نئے سال کا آغاز ہونے والا تھا۔ دوسرا دور نئے سال کے پہلے دن سے شروع ہوا دوشنبہ کی آپ کی سیرت میں جو خصوصیت حاصل ہے اسے بھی پیش نظر رکھئے۔ آپ دوشنبہ ہی کو اس دنیا میں تشریف لائے۔ دوشنبہ ہی کو منصب نبوت ملا۔ دوشنبہ ہی کو غار ثور سے نکل کر مدینہ کی طرف روانگی ہوئی، دوشنبہ ہی کو قبا پہنچے اور دوشنبہ ہی کو اس دنیا سے رحلت فرماتے دار بقا ہوئے اللھم صل صلوٰۃ کاملۃ و سلم سلاما تاما علی سیدنا محمد و علی آل سیدنا محمد کما صلیت علی ابراھیم و علی آل ابراھیم انک حمید مجید۔

ہجرت کا پس منظر

۳۰۔ کہ آپ کو قید کر دیں یا قتل کر دیں یا جلاوطن کر دیں۔ ہجرت سے پیشتر کفار مکہ نے دار الندوہ میں جمع ہو کر مشورہ کیا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں کیا کیا جائے۔ انہوں نے ساری قوم کو پریشان کر رکھا ہے اور باہر کے کچھ لوگ ان کے جال میں پھنستے جاتے ہیں۔ کہیں رفتہ رفتہ بڑی طاقت اکٹھی نہ کر لیں جس کا مقابلہ دشوار ہو۔ اس وقت رائیں مختلف تھیں۔ کوئی کہتا کہ قید کیا جائے اور خوب زخمی کیے جائیں۔ کسی کی رائے تھی کہ انہیں وطن سے نکال دیا جائے تاکہ ہمیں ہر وقت کے خرخشہ سے نجات ملے۔ آخر میں ابوجہل کی رائے پر فیصلہ ہوا کہ تمام عرب قبائل میں سے ایک ایک جوان منتخب ہو اور وہ سب مل کر آن واحد میں ان پر تلوار کا ہاتھ چھوڑیں تاکہ بنی ہاشم سارے عرب سے لڑائی نہ کر سکیں اور دیت دینی پڑے تو تمام قبائل پر تقسیم ہو جائے۔ [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام رحمہ

یہ ان حالات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو مدینہ کی طرف ہجرت کی اجازت دے دی۔ چنانچہ صحابہ کرام چھوٹے چھوٹے گروہوں میں مدینے کی طرف جانے لگے۔ مسلمانوں کی صرف تھوڑی سی تعداد مکہ مکرمہ رہ گئی جن میں ممتاز ترین ہستیاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم، حضرت ابوبکرؓ، اور حضرت علیؓ کی تھیں۔ باقی وہ بزرگ تھے جو مسکین اور بے استطاعت تھے۔ صحابہ کی اس اجتماعی ہجرت کو دیکھ کر قریش کے ارباب اقتدار میں کھلبلی مچ گئی۔ ان کو خیال آیا کہ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ روانہ ہو گئے تو مسلمان منظم ہو کر طاقت بن جائیں گے اور ان کو اپنے مشن کے پھیلانے کے مواقع مل جائیں گے۔ اس طرح رفتہ رفتہ مختلف قبیلوں کو ساتھ ملا کر قریش کے لیے بہت بڑا خطرہ بن جائیں گے چنانچہ ارباب اقتدار نے دار الندوہ میں جو ان کا دار الشوریٰ تھا جمع ہو کر اس صورت حال پر غور کیا۔ اس جلسہ میں تین تجویزیں پیش ہوئیں۔

۱۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قید کر دیا جائے۔

۲۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو کسی ایسی جگہ جلا وطن کر دیا جائے جہاں سے وہ ان فدائیوں کے ساتھ کوئی رابطہ نہ پیدا کر سکیں جو مدینہ جا چکے ہیں۔

۳۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کر دیا جائے۔

قرآن نے ان تینوں کے لیے یہ تعبیر اختیار کی ہے لِيُثْبِتُوكَ اَوْ يَقْتُلُوكَ اَوْ يُخْرِجُوكَ قید والی تجویز اس لیے رد کر دی گئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قید کر لینا ممکن تھا لیکن قید رکھنا ممکن نہ تھا۔ شعب ابی طالب میں محصور کرنے اور بائیکاٹ کرنے کا سابقہ تجربہ سامنے تھا۔ ان کو علم تھا کہ حضور اقدس بہرحال اپنی رہائی کا سامان کر لیں گے۔ دوسری تجویز میں بظاہر یہ خامی محسوس ہوئی کہ ایسا کوئی مقام تھا ہی نہیں جہاں سے مدینہ کے ساتھ رابطہ نہ ہو سکے۔ تیسری تجویز یعنی یہ کہ قتل کر دیا جائے لیکن سوال یہ تھا کہ خاندان نبوت بنی عبد مناف کے جوش انتقام سے بچاؤ کی صورت کیا ہو گی۔ ابوجہل کی تجویز یہ تھی کہ قریش کے ممتاز قبیلوں میں سے ایک ایک جوان چن لیا جائے۔ وہ رات کو حضور کے مکان کا محاصرہ کر لیں۔ صبح کے وقت آپ نماز کے لیے باہر نکلیں تو تمام محاصرین ایک دم حملہ کر کے آپ کا کام تمام کر دیں۔ اس طرح بنو عبد مناف کے سوا تمام

قریش اس خون میں شریک ہو جائیں گے اور سب کا مقابلہ بنو عبد مناف نہ کر سکیں گے۔
جو لوگ مسکن مبارک کے محاصرے کے لیے چنے گئے تھے ان کے نام طبقات ابن سعد کے مطابق یہ ہیں۔

۱۔ ابو جہل عمرو بن ہشام
۲۔ عقبہ ابن ابی معیط
۳۔ نضر بن الحارث
۴۔ اُمیہ ابن خلف
۵۔ ابی بن خلف
۶۔ زمعہ ابن الاسود
۷۔ بنیہ ابن الحجاج
۸۔ منبہ ابن الحجاج
۹۔ طعیمہ ابن عدی
۱۰۔ حکم بن ابی العاص
۱۱۔ ابو لہب
۱۲۔ ابن الغیطلہ

ان میں سے پہلے آٹھ غزوہ بدر میں مسلمانوں کے ہاتھوں مارے گئے۔
ادہر بارہ آدمی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے گھر کا محاصرہ کرنے کے لیے مقرر ہوئے اُدہر آپ کو اجازت مل گئی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ سے روانگی کا ارادہ فرمالیا۔
صحیح بخاری میں حضرت عائشہ کی ایک روایت ہے کہ ہم ٹھیک دوپہر کے وقت گھر میں بیٹھے تھے کہ کسی نے کہا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے ہیں آپ کا سر ڈھکا ہوا تھا۔ عادت شریفہ کے مطابق وہ وقت ہمارے گھر آنے کا نہ تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے کہا میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔ بخدا یہ تشریف آوری یوں ہی نہیں کوئی اہم معاملہ ہے۔ آپ اجازت لے کر اندر آئے اور فرمایا جو بھی آپ کے پاس ہو اسے باہر کر دیں۔ ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں۔

صرف آپ کے گھر والے ہیں۔ آپ نے فرمایا مجھے ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے۔ ابوبکرؓ نے عرض کیا یا رسول اللہ رفاقت و معیت کا آرزومند ہوں۔ فرمایا ہاں یعنی رفاقت ہو گی۔ ایک اور روایت ہے کہ حضرت عائشہؓ نے فرمایا میں نے کسی کو خوشی میں روتے نہیں دیکھا تھا حضور اقدس کی زبان سے ہاں نکلا تو حضرت ابوبکرؓ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ یہ خوشی کے آنسو تھے اور دنیا میں اس سے بڑھ کر خوشی کا مقام کون سا ہو سکتا تھا کہ ایسے مبارک سفر میں رہبر عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی ہم کابی کی سعادت نصیب ہو۔ حضرت ابوبکرؓ نے عرض کیا کہ میں نے دو سانڈنیاں ببول کی پتیاں کھلا کھلا کر اسی غرض سے پالی ہیں۔ ان میں سے ایک آپ لے لیں فرمایا قیمت سے لوں گا۔

یہ فیصلہ فرما کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم گھر تشریف لے گئے۔ اگرچہ قریش آپ کے جانی دشمن تھے مگر مکہ مکرمہ کے اکثر لوگ آپ کے پاس امانتیں رکھتے تھے۔ آپ نے تمام امانتوں کا معاملہ حضرت علیؓ کو سمجھا دیا اور فرمایا کہ یہ ان کے مالکوں کو لوٹا کر مدینہ آ جاؤ۔ نیز فرمایا کہ بے تکلف میرے بستر پر لیٹ جاؤ۔ بفضلہ تعالیٰ کوئی تکلیف نہ ہو گی ان تمام انتظامات سے فارغ ہوئے تو محاصرین نے کاشانہ مبارک کو گھیر لیا۔ پھر کیا ہوا۔ اسی کو قرآن نے آگے بیان کیا ہے۔

سازشوں میں خدائی تدبیر کا مظاہرہ

۳۸۔ اور وہ سازشیں کر رہے تھے اور اللہ تدبیر کر رہا تھا اللہ بہترین تدبیر کرنے والا ہے۔ یہاں تو وہ اشقیاء یہ سازشیں کر رہے تھے ادھر ان کے توڑ میں اللہ سبحانہ کی بہترین اور لطیف تدبیر تھی۔ حضور کو فرشتوں نے آ کر اطلاع دی آپ نے اپنے بستر پر حضرت علیؓ کو لٹا کر اسی مجمع کی آنکھوں میں جو آپ کے قتل کے لیے جمع ہوا تھا خاک جھونکتے ہوئے نکل گئے۔ آپ کا اور حضرت علیؓ کا بال بھی بینکا نہ ہوا اور دشمن خائب و خاسر رہے۔ پھر جنہوں نے آپ کے قتل کا مشورہ دیا تھا بدر میں وہی قتل کیے گئے۔ اس لیے بتلا دیا کہ جب خدا ساتھی ہو تو کوئی کچھ نہیں کر سکتا اور جس طرح اس نے اپنے پیغمبر کو بچا لیا تمہارے گھر بار اور اہل و عیال کو بھی جو مکہ میں ہیں حفاظت کر سکتا ہے۔

دشمن اگر قوی است نگہبان قوی تر است [1]

اللہ سبحانہ کی تدبیر نے کس طرح شب ہجرت میں نبوت کی حفاظت فرمائی۔ اس کو سمجھنے کے لیے یہ بات دھیان میں رکھئے کہ کفار نے دارالندوہ میں پوشیدہ طور پر جو آپ کے قتل کا مشورہ کیا کوئی مسلمان وہاں موجود نہ تھا اور نہ کسی طرح جانا وہاں ممکن تھا مگر اللہ سبحانہ نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو ہر چیز کی خبر دے دی۔ دن، تاریخ، وقت سب سے آگاہی ہو گئی اور پھر یہ کہ جس شب کو آپ نے ہجرت کی سب کو معلوم ہے کہ اس رات کو آپ کے گھر کے چاروں طرف دشمن کا پہرہ تھا تاہم آپ ان کی آنکھوں میں خاک جھونک کر ان کے ہی درمیان سے گزر کر حضرت ابو بکر کے ساتھ شہر سے نکلے۔ ادھر حضرت ابو بکر کے ہاں حضرت عائشہ اور حضرت اسماء نے جلد جلد سفر کا سامان درست کیا یعنی کھانا تیار کر کے چمڑے کے ایک تھیلے میں رکھا۔ جب تھیلے کا منہ باندھنے کے لیے کوئی چیز نہ ملی تو حضرت اسماء نے اپنے کمر بند سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر منہ باندھ دیا۔ اس وقت سے حضرت اسماء "ذات النطاقین" مشہور ہو گئیں۔ ایک روایت میں ہے کہ کمر بند کے دو ٹکڑے کر کے ایک سے کھانے کا تھیلا اور دوسرے سے پانی کا مشکیزہ باندھ دیا۔ کاشانہ مبارک سے نکل کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابو بکر کے ساتھ جن کا مکان مکہ مکرمہ کے جنوبی حصہ میں تھا۔ شہر سے جنوبی سمت میں چل پڑے۔ چھ میل کے فاصلہ پر ثور نام پہاڑ تھا۔ جس کے اندر ایک بڑا غار تھا۔ راستہ سخت پتھریلا تھا۔ حضرت ابو بکر نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف سے بچانے کے لیے تھوڑی دور تک کندھوں پر بٹھالیا۔ چلتے وقت وہ کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے آگے کبھی پیچھے، کبھی دائیں کبھی بائیں ہو جاتے گویا چاہتے تھے کہ ہر سمت سے حضور کی حفاظت میں اپنی جان قربان کر دیں۔ غار کے متعلق تفصیلی تبصرہ انشاءاللہ دسویں پارہ میں آرہا ہے۔ یہاں تو سمجھنے کی بات یہ ہے۔ اللہ سبحانہ نے حضور کی حفاظت کی کیا تدبیر فرمائی۔ اللہ سبحانہ نے ہر قدم پر دشمنوں کے منصوبے ناکام بنا دیے اور اپنے رسول پاک کو ہر خطرے سے محفوظ رکھا۔ مجھے یقین ہے کہ جب سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہجرت کا فیصلہ ہو چکا تھا اسی وقت سے نکلنے کی تمام تدابیر بھی سوچ لی گئی ہوں گی مثلاً ۱۔ حضرت ابوبکر نے پہلے سے اس مقصد کی خاطر دو سانڈنیاں تیار کر لی تھیں
۲۔ مکہ مکرمہ سے جنوب کی طرف سفر اس لیے اختیار کیا کہ مدینہ طیبہ شمال میں تھا اور اس کی طرف جانے والے راستے شمال ہی کی طرف جاتے تھے لہٰذا تعاقب کرنے والے لوگ انہیں راستوں کی طرف تلاش کے لیے جاتے جنوب کی طرف تلاش کا ان کو خیال بھی نہ آتا۔
۳۔ بلاشبہ غار ثور میں قیام کا فیصلہ بھی پہلے سے کر لیا گیا ہو گا۔
۴۔ حضرت ابوبکر نے اپنے بیٹے عبداللہ کو اس کام پر مامور کر دیا تھا کہ دن بھر قریش کی باتیں سن کر جو کچھ ضروری سمجھے رات کے وقت غار میں سنا جائے۔
۵۔ حضرت اسماء رات کی تاریکی میں کھانا پہنچا دیتی تھیں۔
۶۔ عامر بن فہیرہ حضرت ابوبکر کے آزاد کردہ غلام تھے اور بکریاں چراتے تھے ان کو تاکید کر دی گئی تھی کہ دودھ والی بکریاں روک رکھیں اور رات کے وقت انہیں غار کے دہانے پر لے کر آیا کریں اس طرح تازہ دودھ مل جاتا تھا۔
۷۔ صبح کے وقت عامر بن فہیرہ ریوڑ دہانہ غار کے پاس سے دور تک مکہ مکرمہ کی طرف لے جاتے تھے تاکہ کسی آنے جانے والے کے پاؤں کے نشان باقی نہ رہے
۸۔ ایک شخص عبداللہ بن اریقط کو رہبری کے لیے پہلے سے مقرر کر لیا تھا۔
یہ تمام انتظامات اس خوبی اور خوش اسلوبی سے کیے گئے کہ ہر کام وقت پر اور انتہائی رازداری سے ہوتا رہا۔ یہاں تک تو ساری تدابیر کا تعلق عالم مادی سے تھا، عالم غیب میں کیا تدابیر ہوئیں۔ وہ بھی سن لیجئے۔
۱۔ قاتلوں کے جمگھٹ میں سے مٹھی خاک ڈال کر آپ گھر سے تشریف لے گئے اور کسی کو پتہ نہ ہوا۔
۲۔ عرب آثار قدم سے کھوج لگانے میں ماہر تھے۔ صبح کو وہ آپ کا پتہ لگاتے ہوئے غار کے دہانے تک پہنچ گئے۔ اللہ سبحانہ نے یہ تدبیر کی کہ ان کی یہ سوجھ سلب کر لی کہ وہ غار کے اندر دیکھ سکیں۔
۳۔ مسند احمد کی ایک روایت میں ہے کہ غار کے دہانے پر مکڑی نے جالا بنالیا تھا

اس آیت قرآنی میں بظاہر خطاب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے لیکن اپنے موقعہ محل کے اعتبار سے دو پہلو رکھتی ہے۔ ایک پہلو سے یہ سباق سے تعلق رکھتی ہے۔ دوسرے پہلو سے یہ سیاق سے مربوط ہے۔ سباق میں یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ نبی کی قوم پر عذاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک نبی قوم میں موجود ہوتا ہے اور سیاق میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ نبی کو ہجرت کا اس وقت تک حکم نہیں ہوتا جب تک نبی کی قوم انتہائی عناد میں نبی ہی کو ختم کرنے کے درپے نہ ہو جائے۔ دونوں باتیں کھل کر سامنے آگئی ہیں۔

ایک یہ کہ آپ کی ہجرت کا باعث آپ کی قوم کا عناد و دشمنی اور آپ کے قتل کی سازش ہے۔ اسی سازش کا نتیجہ ہے کہ آپ کو اللہ نے ہجرت کا حکم دیا ہے۔

دوسری بات یہ کہ نبی کی قوم پر اس وقت تک عذاب نہیں آتا ہے جب تک نبی کی ذات گرامی ان میں موجود ہوتی ہے۔

وَإِذَا تُتْلَىٰ عَلَيْهِمْ آيَاتُنَا قَالُوا قَدْ سَمِعْنَا لَوْ نَشَاءُ لَقُلْنَا مِثْلَ
هَٰذَا ۙ إِنْ هَٰذَا إِلَّا أَسَاطِيرُ الْأَوَّلِينَ ﴿٣١﴾ وَإِذْ قَالُوا اللَّهُمَّ
إِنْ كَانَ هَٰذَا هُوَ الْحَقَّ مِنْ عِنْدِكَ فَأَمْطِرْ عَلَيْنَا حِجَارَةً
مِنَ السَّمَاءِ أَوِ ائْتِنَا بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٢﴾ وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُعَذِّبَهُمْ
وَأَنْتَ فِيهِمْ ۚ وَمَا كَانَ اللَّهُ مُعَذِّبَهُمْ وَهُمْ يَسْتَغْفِرُونَ ﴿٣٣﴾
وَمَا لَهُمْ أَلَّا يُعَذِّبَهُمُ اللَّهُ وَهُمْ يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ وَمَا كَانُوا أَوْلِيَاءَهُ ۚ إِنْ أَوْلِيَاؤُهُ إِلَّا الْمُتَّقُونَ
وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٣٤﴾

اور جب ان کے سامنے ہماری آیات پیش کی جاتی ہیں
تو وہ کہتے ہیں ہم سن چکے ہیں، اگر ہم چاہیں تو ہم بھی
اس جیسا کہہ لیں، یہ تو صرف اگلوں کی داستانیں ہیں۔ ۳۱
اور اے پیغمبر جب ان لوگوں نے کہا تھا اے اللہ اگر

آپ کی جانب سے یہی حق ہے یعنی اسلام کی دعوت
تو پھر ہم پر پتھروں کی بارش آسمان سے برسا دے
یا ہمیں کسی دردناک عذاب میں مبتلا کر دے[۴۰]۔ اور اللہ
کا دستور یہ نہیں ہے کہ آپ ان میں موجود ہوں اور
ان کو عذاب میں ڈال دے اور نہ اللہ کا یہ دستور ہے
کہ لوگ معافی مانگ رہے ہوں اور پھر ان کو عذاب
میں ڈال دے[۴۱]۔ اور اب ان کو عذاب نہ دینے کی وجہ
کیا ہے جبکہ وہ اہل ایمان کو مسجد حرام سے روک
رہے ہیں، اور فی الواقع وہ مسجد حرام کے متولی نہیں
ہیں۔ مسجد حرام کے متولی تو اہلِ تقویٰ ہی ہو سکتے ہیں۔
لیکن اکثر کو اس حقیقت کا علم نہیں ہے[۴۲]۔

قریشِ مکہ کے جماعتی اقبال کا خاتمہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قریش کو تقریباً ۱۳ برس تک دعوت

دی۔ اور ان تیرہ سالوں کے اندر اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی۔ اور آیاتِ ہدایت سے ان کو مختلف نمونے دکھائے اور آخر وہ وقت آیا۔ جو اپنے اپنے پیغمبروں کے سامنے دوسری قوموں پر آچکا تھا یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افرادِ صالحہ جو بے خوف وخطر حق قبول کر سکتے تھے انہوں نے حق قبول کر لیا۔ صرف وہ رؤسائے قریش جو قبولِ حق کی مطلق صلاحیت نہ رکھتے تھے یا وہ ضعفاء تھے جو ان رؤسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی قوت نہ رکھتے تھے اور اس لیے ضرورت ہوئی کہ ان رؤسا کے وجود سے ارضِ حرم کو پاک کیا جائے۔ قریش کو اب آخری عذاب کی اطلاع دی گئی۔ اطلاع ملنے پر انہوں نے اپنے پیشرووں کی طرح اس کا مذاق اڑایا اور حضور سے کہنے کہ جس عذاب کی دھمکی دی جاتی ہے وہ کیوں نہیں آتا۔ اگر تم میں قدرت ہے تو وہ عذاب لاؤ اور اپنی صداقت کا نشان دکھاؤ۔ نبوت کا جواب تھا کہ

انما الغیب للہ ، فانتظر وانی معکم من المنتظرین

قرآن نے رؤسائے قریش کی طرف اشارہ کر کے پوچھا

فھل ینظرون الا سنۃ الاولین

کیا وہ لوگ پہلی قوموں کے دستور کا انتظار کر رہے ہیں۔

اب گزشتہ قوموں کے قانون کے پورا ہونے کے دن آگئے یعنی حضورِ اقدس اور اہلِ ایمان کو گنہ گار قوم کی آبادی کے اندر سے نکل جانے کی اجازت مل گئی کیونکہ جب تک رسول اپنی قوم سے ہجرت نہیں کرتا عذابِ ہلاکت کا نشان ظاہر نہیں ہوتا۔ چنانچہ قریش کو جو اس عذاب کو دیکھنے کے لیے بے تاب تھے پہلے ہی بتا دیا گیا۔

وان کادوا لیستفزونک من الارض لیخرجوک منھا
واذا لا یلبثون خلافک الا قلیلا

اگر اس زمین سے وہ تجھے بے قرار کر دیں گے تاکہ تجھے شہر بدر کر دیں تو پھر تیرے جانے کے بعد وہ بہت تھوڑا عرصہ رہیں گے۔

مظالم کی انتہا ہو گئی۔ حضورِ اقدس نے بلند آواز میں بددعا کی اور اللہ سبحانہٗ کی بارگاہ میں قریش کی ہلاکت کی بددعا کی۔ لیکن یہاں بھی رحمتِ عالم نے حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰ کی طرح پوری قوم کی تباہی و بربادی کی دعا نہیں مانگی بلکہ صرف قریش

کے سات رئیسوں کے حق میں بددعا کی اور فرمایا کہ خداوندا ابوجہل، عتبہ، شیبہ، عقبہ، اُمیہ، ابی اور ولید کو پکڑ۔
انبیا کی صفت کے مطابق آپ نے ہجرت کی اور جس دن کا انتظار تھا وہ آگیا۔
قرآن نے ان آیات میں بتایا ہے کہ روسائے قریش پر آیتِ عذاب نازل ہونے کے لیے ہجرت کا انتظار تھا وہ ہو چکی اب کوئی مزید انتظار نہیں ہے۔

قریش کا مکابرہ

۳۹ - اور جب ان کے سامنے ہماری آیات پیش کی جاتی ہیں تو وہ کہتے ہیں کہ ہم سن چکے اگر ہم چاہیں تو ہم بھی اس جیسا کہہ لیں، یہ تو صرف اگلوں کی داستانیں ہیں۔
نضر بن الحارث کہا کرتا تھا کہ ہم چاہیں تو قرآن جیسا کلام بنا لائیں، اس میں قصے اور کہانیوں کے سوا کیا رکھا ہے۔ مگر قرآن تو سب جھگڑوں کا فیصلہ اسی بات پر رکھتا تھا پھر چاہا کیوں نہیں۔ کسی نے کہا تھا کہ میرا گھوڑا اگر چلے تو ایک دن میں لندن پہنچے مگر چلتا نہیں۔ بہرحال پچھلی قوموں کے احوال سن کر کہتے تھے کہ سب قصے کہانیاں ہیں اب بعد میں دیکھ لیا کہ محض افسانے نہ تھے وعدہ الٰہی تم پر بھی آیا جیسے پہلوں پر آیا تھا۔ ؎

یہ قرآن سے عناد کا آخری شاہکار ہے۔ یہ نضر بن الحارث ایران وغیرہ ملکوں میں جاتا رہتا تھا وہاں سے رستم و اسفندیار کے قصے سن کر آتا۔ یہود و نصاریٰ سے بھی ملتا۔ ان سے تورات و انجیل سنتا، قرآن میں نبیوں اور اُن کی قوموں کی داستان سن کر شاید اس کو یہ خیال ہو گیا ہو کہ یہ قصے تو میں بھی بیان کر سکتا ہوں۔ شاید اسی نے عرب میں یہ بات کہی ہے اور لوگوں نے اسی کی تقلید میں اس کو دُہرایا ہو اس لیے بعینہٖ جمع بات بتائی گئی ہے۔ اس کے ساتھ وہ یہ بات ہرگز نہ مانتے تھے کہ یہ داستان اقوام انبیا خود حضورِ اقدس کی ساختہ و پرداختہ ہے۔ اور نہ وہ حضورِ اقدس کو جھوٹا خیال کرتے تھے فانھم لا یکذبونک ولکن الظالمین بآیات

؎ افادات شیخ الاسلام

اللہ یجحدون۔ قریش کے ارباب اقتدار اور زعماء سمجھتے تھے کہ حضور اقدس نے کسی سے کبھی کوئی علمی فیض حاصل نہیں کیا۔ وہ تو اس مقصد کے لیے مشورے کرتے تھے کہ عرب کو قرآن سے روکا جائے۔ یہ نضر بن الحارث کفر و عناد میں مثالی شخص تھا۔ قرآن سے لوگوں کو روکنے کے لیے اس نے یہ تماشا رچایا بلکہ بتایا گیا ہے کہ اچھی خوبصورت گلوکارہ گانے والی خرید کر لاتا اور ان ہی قصوں کو منظوم کرکے اس سے پڑھواتا تاکہ لوگوں کی توجہ قرآن سے ہٹا سکے۔ اسی کے بارے قرآن میں ہے۔

ومن الناس یشتری لھو الحدیث لیضل عن سبیل اللہ

نضر بن الحارث کا یہ کہنا کہ اگر ہم چاہیں تو ہم بھی یہی کہہ سکتے ہیں اس بات کی ہرگز دلیل نہیں ہے کہ وہ ایسا کرنے پر قادر ہے اگر ایسا ہوتا تو وہ یقیناً کر گزرتا۔ بلکہ یہ تو صرف قرآن کے واقعات و قصص پر ایک تنقید ہے یعنی یہ کچھ بھی نہیں ایسے ہی افسانے ہیں جیسے رستم و اسفندیار کے افسانے، اس کا مقصد اس طریق سے لوگوں کو قرآن سے ہٹانا تھا۔ اور یہ تعبیر اس بات کی نشاندہی کر رہی تھی کہ قرآن عزیز کی شیرینی، نمکینی، تاثیر تسخیر سب کو یکساں فریفتہ کر رہی تھی اور یہی قرآن کا اعجاز ہے۔

کیا یہ امر واقعہ نہیں ہے کہ عین اس وقت جب ایک امی کی طرف یہ مدعیانہ اعلان عرب میں شائع ہوا اس وقت عرب کے قبیلہ قبیلہ میں زبان اور شعراء اور آتش بیان خطبا موجود تھے مگر اس کے سامنے سب کی زبانیں گنگ ہو گئیں۔ کفار عرب نے اسلام اور نبوت کی تکذیب کی، کیا کیا کوششیں کیں مگر یہ نہ ہو سکا کہ قرآن عزیز کی ایک سورت کا جواب پیش کرتے جو نبوت کے دعوے صداقت کو پل جھپکنے میں پست کر دیتا۔ کیا اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ وہ اس کی مثال لانے سے عاجز تھے۔

قرآن کی اثر انگیزی کا کیا حال تھا۔ اس کا اندازہ کرنا ہو تو تاریخ کی زبانی سنیے۔ ولید بن مغیرہ قریش میں بڑا دولت مند اور صاحب اثر تھا۔ وہ ایک بار آپ کی خدمت میں آیا اور فرمائش کی کہ کچھ پڑھ کر سنائیے۔ آپ نے چند آیتیں پڑھیں۔ اس نے دوبارہ پڑھوا کر سنیں۔ آخر بیخود ہو کر کہا خدا کی قسم اس میں کچھ اور ہی شیرینی اور تازگی ہے۔ اس نخل کی شاخوں میں پھل اور اس کا تنا بھاری ہے۔ یہ کسی انسان کا کلام نہیں۔

بنو ذہل بن شیبان کے سامنے آپ نے چند آیتیں پڑھیں گو وہ مسلمان نہیں ہوا مگر کلام الٰہی سے بے حد متاثر ہوا۔ نجاشی کے دربار میں جب حضرت جعفرؓ نے سورہ مریم کی تلاوت کی تو اس پر رقت طاری ہو گئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے پھر کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے نور ہیں۔

اس قسم کے اور واقعات ابن اسحاق نے سیرۃ میں نقل کیے ہیں۔ معالم القرآن کی جلدوں میں آپ پڑھ چکے ہیں کہ لوگ قرآن عزیز کی آیتیں سن کر متاثر ہو جاتے ہیں۔ حضرت عمرؓ کا دل ایک سورت کی چند آیتیں پڑھ کر اور سن کر پتھر سے موم ہو گیا۔ حضرت جبیر بن مطعم اسیرانِ بدر کو چھڑانے آتے تھے انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سورہ طور کی ایک دو آیتیں سن لیں تو ان کا دل دھڑکنے لگا۔ حضرت عثمان بن مظعون نے چند آیتیں سن لیں تو فوراً حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ حضرت الطفیل بن عمرو الدوسی کے کانوں میں اتفاقاً قرآن عزیز کی چند آیتیں پہنچ گئیں تو مسلمان ہو گئے طائف کے سفر میں حضرت خالد العدوانی نے آپ کو والسماء والطارق پڑھتے سنا گو وہ اس وقت مسلمان نہ ہوئے مگر پوری سورت ان کو یاد ہو گئی۔ حبشہ سے بیس آدمیوں کی ایک جماعت حاضرِ خدمت ہوئی۔ آپ نے ان کو قرآن پڑھ کر سنایا۔ ان کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

قرآن عزیز کی اسی اثر انگیزی اور تسخیر نے نضر بن الحارث کو یہ بات سمجھائی کہ اس اثر کو قصوں اور کہانیوں سے ختم کیا جا سکتا ہے۔ یہاں بتانا یہ ہے کہ مشرکین کی اسی قسم کی جسارتیں ان کے لیے عذاب کا باعث ہوئی ہیں۔

انتہائی جہل و شقاوت

۴۰۔ اور اے پیغمبر جب ان لوگوں نے کہا تھا کہ اے اللہ اگر آپ کی جانب سے یہی حق ہے یعنی اسلام کی دعوت تو ہم پر پتھروں کی بارش آسمان سے برسا دے یا کسی عذاب دردناک میں مبتلا کر دے۔ اس آیت میں مشرکین مکہ کے انتہائی جہل و شقاوت و عناد کا اظہار ہے۔ یعنی وہ کہتے تھے کہ خداوندا اگر یہی دین حق ہے جس کا ہم اتنی دیر سے اور اس قدر شد و مد سے تکذیب کر رہے ہیں تو پھر کیوں دیر

ہے گزشتہ قوموں کی طرح ہم پر بھی پتھروں کا مینہ کیوں نہیں برسایا جاتا یا اسی طرح کے کسی دوسرے عذاب میں مبتلا کر کے ہمارا استیصال کیوں نہیں کر دیا جاتا۔ کہتے ہیں کہ یہ دعا ابوجہل نے مکہ سے نکلتے وقت کعبہ کے سامنے کی تھی جو کچھ مانگا تھا، اس کا ایک نمونہ بدر میں دیکھ لیا۔ وہ خود مع ۶۹ سرداروں کے کمزور اور بے سروسامان مسلمانوں کے ہاتھوں سے مارا گیا۔ ستر سردار اسیری کی ذلت میں گرفتار ہوئے۔ اس طرح خدا نے ان کی جڑ کاٹ دی بے شک قوم لوط کی طرح آسمان سے پتھر نہیں برسائے لیکن ایک مٹھی سنگریزے جو خدا تعالیٰ نے محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ سے پھینکے تھے وہ آسمانی سنگباری کا چھوٹا سا نمونہ تھا۔ فلم تقتلوھم ولکن اللہ قتلھم وما رمیت اذ رمیت ولکن اللہ رمیٰ۔

صحیح بخاری میں انس بن مالک کے حوالہ سے اس دعا کرنے والے کا نام ابوجہل آیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے لکھا ہے۔ اصل میں ابوجہل ہی ہے۔ اگرچہ قرآن میں صیغہ جمع آیا ہے، اصل بات ابوجہل نے کہی تھی باقی نے ہاں میں ہاں ملائی اس لیے صیغہ جمع آیا ہے۔ طبرانی میں بحوالہ عبداللہ ابن عباس دعا کرنے والے کا نام نضر بن الحارث بتایا ہے اور لکھا ہے کہ قرآن کی آیت کا سبب نزول یہی ہے یعنی سأل سائل بعذاب واقع الخ۔ مجاہد، عطار اور سدی کی یہی رائے ہے۔ یہ دونوں باتیں درست ہو سکتی ہیں کیونکہ ہو سکتا ہے کہ دونوں نے ہی دعا مانگی ہو لیکن دعا کی نسبت سربراہِ قوم کی طرف کر دی۔ حضرت قتادہ کہتے ہیں کہ یہ دعا مانگنے والے اس امت کے بیوقوف اور نادان لوگ ہیں۔ قسطلانی نے شرح بخاری میں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ جب نضر بن الحارث نے قرآن کو پہلوں کا قصہ کہا تو حضور اقدس نے ارشاد فرمایا ارے تیرا خانہ خراب یہ تو اللہ کا کلام ہے تب نضر بن الحارث اور ابوجہل نے کہا اللھم ان کان ھذا ھو الحق من عندک فامطر علینا۔

عام لوگ اس دعائی پیمانہ کو دیکھ کر اسے دعا سمجھتے ہیں لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن عزیز کا حقانیت سے انکار کا ایک بلیغ انداز ہے۔ اگر یہ صرف دعا کا

پیمانہ ہوتا تو قرآن کی حقانیت پر عذاب کو نہ مانگنا یہ کہنا کہ اگر قرآن حق ہے تو ہم پر پتھر برسا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ وہ قرآن کی حقانیت کو محال تصور کرتا ہے۔ اس لیے یہ بات دعا کے طور پر نہیں بلکہ قرآن کی حقانیت کو چیلنج کے انداز میں ہے مطلب یہ ہے کہ اگر یہ قرآن اور اس کی دعوت اے اللہ واقعی آپ کی جانب سے ہے جیسا کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم دعویٰ کر رہے ہیں تو آپ ہم کو اس انکار پر پتھروں سے سزا دیجیے جیسا کہ اصحاب فیل کو آپ نے سزا دی یا کوئی اور سزا دیجیے۔ یہ دعا بتا رہی ہے کہ ان کا انکار نادانی اور بے خبری کا نہ تھا اور اس لیے نہ تھا کہ حضور کی دعوت غلط ہے بری ہے یا نقصان دہ ہے بلکہ اس کا باعث ان کا تمرد، عناد، نشہ اقتدار اور کبر تھا۔ یہ تاریخی لطیفہ خوب ہے کہ حضرت معاویہ نے قوم سبا کے کسی شخص سے کہا کہ تمہاری قوم کس قدر بیوقوف ہے کہ عورت کو سربراہِ مملکت بنالیا تھا۔ مخاطب حاضر جواب تھا بولا میری قوم سے زیادہ آپ کی قوم احمق اور بیوقوف ہے کہ دعا مانگ رہی ہے کہ اے اللہ اگر یہ حق ہے تو ہمیں عذاب میں مبتلا کر دے۔ کہنا چاہیے تھا کہ اگر حق ہے تو قبول کرنے کی توفیق دے دے۔ حق ہونے پر عذاب کی درخواست سب سے بڑی حماقت ہے۔

عذابِ الٰہی کے لیے اللہ کا قانون

۳۳۔ اور اللہ کا دستور یہ نہیں ہے کہ آپ ان میں موجود ہوں اور ان کو عذاب میں ڈال دے اور نہ اللہ کا یہ دستور ہے کہ لوگ معافی مانگ رہے ہوں اور پھر ان کو عذاب میں ڈال دے۔ سنۃ اللہ یہ ہے کہ جب کسی قوم پر تکذیبِ انبیاء کی وجہ سے عذاب نازل کرتے ہیں تو اپنے پیغمبر کو ان سے علیحدہ کر لیتے ہیں۔ خدا نے جب حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے علیحدہ کر لیا تب مکہ والے بدر کے عذاب میں پکڑے گئے۔

نزولِ عذاب سے دو چیزیں مانع ہیں ایک ان کے درمیان پیغمبر کا وجود تھا۔ دوسرے استغفار یعنی کہ حضرت کے قدم عذاب اٹک رہا تھا اب ان پر عذاب آیا ایسے ہی جب تک گنہ گار نادم رہے اور توبہ کرتی رہے تو پکڑا نہیں جاتا اگرچہ بڑے سے

بڑا گناہ ہو۔ حضرت نے فرمایا گنہ گاروں کی پناہ دو چیزیں ہیں ایک میرا وجود دوسرے استغفار کذا فی الموضع تنبیہ حضرت شیخ الہند مولانا محمود الحسن قدس اللہ سرہ العزیز نے آیت ماکان اللہ لیعذبہم کے معنے یہ کیے ہیں اور اللہ ہرگز عذاب نہ کرتا ان پر جب تک تو رہتا ان میں۔ یہ بعض مفسرین کے موافق ہیں، لیکن اکثر کے نزدیک اس کا مطلب یہ ہے کہ مشرکین جس قسم کا خارقِ عادت عذاب طلب کر رہے تھے جو قوم کی قوم کا دفعتہً استیصال کر دے ان پر ایسا عذاب بھیجنے سے دو چیزیں مانع ہیں ایک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود کہ اس کی برکت سے اس امت پر خواہ امتِ دعوت ہی کیوں نہ ہو ایسا خارقِ عادت عذاب نہیں آتا۔ یوں کسی وقت افراد و آحاد پر آجائے وہ اس کے منافی نہیں۔ دوسرے استغفار کرنے والوں کی موجودگی خواہ وہ مسلمان ہوں یا غیر مسلم جیسا کہ منقول ہے کہ مشرکین مکہ بھی تلبیہ و طواف میں غفرانک کہتے تھے۔ باقی غیر خارقِ عادت معمولی عذاب مثلاً قحط یا وبا یا قتل کثیر وغیرہ اس کا نزول پیغمبر یا بعض مستغفرین کی موجودگی میں بھی ممکن ہے۔ آخر جب وہ لوگ شرارتیں کریں گے تو خدا کی طرف سے تنبیہ کیوں نہ کی جائے گی۔ آگے اسی کو بیان فرمایا[1]

دراصل اس آیت میں عذاب آنے کے لیے اللہ کے قانون کا ذکر ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ عذابِ الٰہی آنے کی دو شرطیں ہیں، ایک یہ کہ جن لوگوں پر اور جس جگہ پر عذاب آتا ہے ضروری ہے کہ نبی اس قوم سے اور اس جگہ سے ہجرت کر جائے۔ جب عذاب آنا ہوتا ہے نبی کو وہاں سے ہجرت کرنے کا حکم ہو جاتا ہے۔ حضرت نوح کو مع رفقا کے کشتی پر سوار کرا کے کفار سے الگ کیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں انی مہاجر الی ربی، حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاتے ہیں۔ حضرت لوط، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب سب نے اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر اپنی نافرمان قوموں سے علیحدگی اختیار کی اور جب تک یہ ہجرت نہیں ہو لیتی اور مومن و کافر الگ نہیں ہو جاتے معجزہ عذاب نہیں بھیجا جاتا۔ حضرت نوح جب تک کشتی پر سوار ہو کر علیحدہ نہیں ہوتے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

طوفان نہ آیا۔ حضرت ابراہیم جب تک کلدانیوں کے ملک عراق سے نکل کر شام اور مصر نہ چلے گئے ان پر عذاب نہ آیا۔ اسی طرح حضرت لوطؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، اور حضرت شعیبؑ اپنی اپنی جماعتوں کو ملے کر جب تک الگ نہ ہو گئے ہلاکت کا عذاب نہ آیا۔ اور جب انہوں نے ہجرت کر لی تو یہ معجزہ عذاب مختلف صورتوں میں ان قوموں پر نازل ہوا اور اہل ایمان کو نجات اور کافروں کو ہلاکت نصیب ہوئی۔

قرآن عزیز میں ان حقائق کو بکثرت بیان کیا گیا ہے اور نیز اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دستور اور قانون فرمایا ہے۔

اسی دستور کے مطابق عذاب ہلاکت کے نازل ہونے کے لیے پہلے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔

ایک اہل ایمان کی جماعت کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شہر مکہ سے ہجرت، دوسرے ہجرت سے پہلے ہدایت کی آخری نشانی ظاہر ہو جائے چنانچہ ہجرت سے پہلے شق قمر کا معجزہ ظاہر ہوا اُسے دیکھ کر جب مکہ کے اربابِ اقتدار ایمان نہ لائے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مکہ سے ہجرت کا حکم ہوا اور عذابِ ہلاکت نازل ہونے کا وقت قریب آ گیا۔ صحابہ میں جو اسرارِ نبوت کے محرم تھے وہ تاڑ گئے تھے کہ یہ ہجرت قریش کی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ مستدرک حاکم اور مسند احمد بن حنبل میں ہے کہ جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے نکلے تو حضرت ابوبکرؓ نے کہا کہ انا للہ مکہ والوں نے اپنے پیغمبر کو نکال دیا اب یہ ضرور ہلاک ہو جائیں گے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں تیرہ برس تک قریش کو دعوت دی اور ان تیرہ سالوں میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی۔ قریش نے فرصت و مہلت کے سارے اوقات اپنی سرکشی و تمرد کی نذر کر دیے۔ اب قریش کو آخری عذاب ہلاکت کی اطلاع دے دی گئی لیکن نادان مذاق اڑاتے رہے۔ ان کو معجزہ عذاب دیکھنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ پیشین گوئی جھوٹ ہے اللہ سبحانہٗ نے فرمایا کہ جب تک نبوت کی آمد کی برکات ختم نہ ہو جائیں عذاب نہ آئے گا۔ سنت الٰہی کے مطابق اللہ سبحانہٗ نے حضور اقدس کو ہجرت کی دعا بتائی۔ ربِّ

ادخلنی مدخل صدق و اخرجنی مخرج صدق واجعل من لدنک سلطانا نصیرا
یہ دعا مقبول ہوئی اور بشارت آئی جاء الحق و زھق الباطل ، انبیاء کی سنت کے
مطابق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت فرمائی اور جس دن کا انتظار تھا وہ
آگیا ۔ قرآن نے کہا کہ رؤسائے قریش پر عذاب آنے کے لیے ایک وجہ تو یہ تھی کہ خود ذات
پیغمبر ان میں موجود تھی ۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ جب تک بستی میں ایسے لوگ موجود ہوں جو
اپنی سابقہ غفلت اور غلط روی پر متنبہ ہو کر اللہ سے معافی کی درخواست کرتے ہوں
اور آئندہ کے لیے اصلاح کا ارادہ رکھتے ہوں ۔ اس وقت اللہ تعالیٰ عذاب ہلاکت نہیں
لاتا ۔ اصل ارشاد میں ماکان اللہ معذبہم وھم یستغفرون یعنی اللہ سبحانہ
لوگوں کو ایسی حالت میں مبتلائے عذاب نہیں کرے گا جب کہ وہ خدا کی جناب میں
معافی مانگ رہے ہوں ۔ اس فقرہ کے تین مطلب بتائے گئے ہیں ۔

ایک یہ کہ جب تک پیغمبر کے پیرو کار مکہ میں موجود ہیں عذاب نہ آئے گا ۔ یعنی وہ
کمزور مسلمان جو استطاعت نہ ہونے کی وجہ سے ہجرت نہ کر سکتے تھے ۔ علامہ طیبی نے اسی کو
بلیغ ترین وجہ قرار دیا ہے ۔ اس صورت میں عذاب سے عذاب استیصال مراد ہوگا ۔
بدر کا معجزہ یقیناً معجزہ ہلاکت ہے لیکن قریش کے رؤسا کے اقتدار کے لیے معجزہ
ہلاکت ہے نہ کہ پوری قوم کے استیصال کے لیے ۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ حضور اقدس
نے دعا میں سات ارباب اقتدار کا نام لیا تھا ۔ پوری قوم کے لیے عذاب کی نہیں
ہدایت کی دعا تھی ۔ حضرت عبداللہ بن مسعود جو صحن حرم کی بددعا کے دن موجود تھے
وہ کہتے ہیں کہ عرب کے ساتوں رئیس جن کے حق میں آپ نے بددعا کی تھی کل کے کل
بدر کے میدان میں مارے گئے اور عذاب ہلاکت کی پیش گوئی پوری ہوئی ۔

دوسرا یہ کہ استغفار سے خود کافروں کی استغفار مراد ہے جیسا کہ مشرکین طواف
غفرانک کہتے تھے ۔

تیسرا مطلب یہ ہے کہ استغفار سے مراد تو یہ ہے یعنی ہر چند نبی کی ہجرت کے
بعد اب ان سے امان اٹھ چکی ہے اب کوئی چیز ان کو عذاب سے بچانے والی نہیں
ہے لیکن اگر وہ اب بھی توبہ کرنے والے بن جائیں تو اللہ سبحانہ ، ان کو عذاب سے
بچالے گا ۔ گویا اوپر کے حصے میں جو شدید قسم کی دھمکی دی گئی تھی اس فقرے نے

اس کو ذرا نرم کر دیا ہے یعنی اب بھی ان کے لیے موقع ہے کہ چاہیں تو اپنی روش بدل لیں، خدا سے معافی مانگیں اور اپنے آپ کو اس گرفت سے بچا لیں۔ ترمذی میں حضرت ابو موسیٰ اشعری کے حوالہ سے حضور اقدس کا ارشاد آیا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے مجھے دو قسم کی امانوں سے نوازا ہے۔ ایک تو اُمت کے لیے میں خود امان ہوں دوسرے استغفار امان ہے۔ جب دُنیا سے رُخصت ہو جاؤں گا تو استغفار عذاب سے قیامت تک کے لیے سامان امن ہے۔ یعنی دو چیزیں اُمت پر عذاب سے مانع ہیں ایک میری ذات دوسرے استغفار۔

ایک سنگین غلط فہمی

۴۲۔ اور اب ان کو عذاب نہ دینے کی وجہ کیا ہے جبکہ وہ اہلِ ایمان کو مسجد حرام سے روک رہے ہیں۔ اور فی الواقع وہ مسجد حرام کے متولی نہیں ہیں۔ مسجد حرام کے متولی تو صرف اہلِ التقویٰ ہو سکتے ہیں لیکن اکثر کو اس حقیقت کا علم نہیں ہے۔ عذاب کا نہ آنا ان دو سبب سے ہے جو اوپر مذکور ہوئے ورنہ تمہاری شرارتیں اور ظلم و شقاوت تو ایسی چیزیں ہیں کہ فوراً عذاب آنا چاہیے۔ اس سے زیادہ ظلم کیا ہوگا کہ موحدین کو حرم شریف میں آنے یا عبادت کرنے سے طرح طرح کے حیلے تراش کر روکا جائے بلکہ ان کے وطن مکہ معظمہ سے نکال کر ہمیشہ کے لیے کوشش کی جائے کہ یہ خدا کے پاکباز اور عبادت گزار بندے نہ آنے پائیں۔ اور ستم ظریفی یہ ہے کہ اس ظلم کے جواز کے لیے یہ سند پیش کی جاتی ہے کہ ہم حرم شریف کے متولی با اختیار ہیں جس کو چاہیں آنے دیں جسے چاہیں روک دیں۔ یہ ہمارا حق ہے۔ حالانکہ اول تو یہ حق متولی کو بھی نہیں کہ مسجد میں لوگوں کو نماز عبادت سے روکے دوسرے حق تولیت ان کو پہنچتا بھی نہیں۔ حرم شریف کے متولی تو صرف متقی اور پرہیزگار بندے ہو سکتے ہیں۔ مشرک اور بد معاش اس کے حقدار نہیں ہو سکتے۔ لیکن ان میں اکثر اپنی جہالت سے یوں سمجھ رہے ہیں کہ ہم اولادِ ابراہیم ہیں اور فلاں قبیلہ سے ہیں۔ تولیت کعبہ ہمارا موروثی حق ہے جس کے لیے کوئی خاص قید و شرط نہیں ہے سو بتلا دیا کہ اولادِ ابراہیم میں جو پرہیزگار ہو اسی کا حق ہے ایسے بے انصافوں کا

حق نہیں کہ جس سے وہ آپ ناخوش ہوتے نہ آنے دیا۔[1]

آیت میں عذاب سے عذاب استیصال مراد نہیں بلکہ وہی عذاب ہلاکت مراد ہے جو بدر کی صورت میں رونما ہوا جسے قرآن عزیز نے البطشۃ الکبریٰ کہا ہے۔ یہ رؤسائے قریش کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو فرعون کے لیے غرق بحر کی حیثیت تھی۔ یہاں اس سے فتح مکہ مراد نہیں ہے جیسا کہ حافظ ابن حجر عسقلانی کی فتح الباری میں رائے ہے۔ آخر، ہجرت کا باعث اس کے سوا کیا تھا کہ یہ رؤسائے قریش اہل ایمان کو مسجد حرام میں آنے سے روکتے تھے۔ ایک دفعہ کا ذکر ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صحن حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ رؤسائے قریش ادھر ادھر بیٹھے ہوئے ہنسی دل لگی کی باتیں کر رہے تھے۔ ابوجہل نے کہا کون مذبح میں جا کر وہاں سے اونٹ کی اوجھڑی اٹھا لائے گا۔ چنانچہ ایک شریر نے یہ خدمت انجام دی اور جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گئے تو وہ نجاست آپ کی پشت مبارک پر ڈال دی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس بوجھ سے سر نہیں اٹھا سکتے تھے اور کفار اس منظر کو دیکھ کر ہنسی سے بے خود ہوئے جاتے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعود جو اس موقعہ پر موجود تھے کہتے ہیں کہ میں یہ دیکھ رہا تھا۔ لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں ان کے منہ آتا۔ اسی اثنا میں ایک شخص نے جا کر حضرت فاطمہ کو اطلاع دی جو اس زمانہ میں بچی تھیں، وہ آئیں اور اس نجاست کو ہٹایا تو آپ نے سر اٹھایا۔ یہ پہلا موقع ہے کہ حضور اقدس رؤسائے قریش کے ایمان سے مایوس ہوتے ہیں۔ اور یہ اس لیے نہیں کہ آپ کے جسم مبارک کو تکلیف ہوئی بلکہ اس لیے کہ وہ نماز میں جو اس دنیا میں آپ کی محبوب ترین چیز تھی خلل انداز ہوتے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز میں بددعا کی اور رؤسائے قریش کی ہلاکت کی اللہ کی جناب میں درخواست کی اور سات رئیسوں کے نام لیے اور فرمایا خداوندا قریش کے سرداروں کی گرفت کر خداوندا ابوجہل، عقبہ، شیبہ، عتبہ، ابن معیط، امیہ ابن خلف، ولید بن عقبہ اور ابی بن خلف کو پکڑ، یہ بددعا سن کر سب کے ہوش اڑ گئے۔ یہ ساتوں بدر میں مارے گئے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

يَصُدُّونَ عَنِ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ کا اس سے بڑا شاہکار اور کیا ہو سکتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان رؤسائے قریش کو بدر میں عذاب نہ دینے کا باعث کیا ہے جبکہ مانع عذاب موجود نہیں ہے۔ ذاتِ نبوت مکہ سے مدینہ روانہ ہو چکی ہے اور ان کو خدا کی جناب میں معافی مانگنے کی توفیق میسر نہیں ہے اور ان کی دستاویز جرم میں سب سے بڑا جرم منظر عام پر آ چکا ہے یعنی لوگوں کو اللہ کے گھر میں عبادت سے روکنا۔ پھر ان کو عذاب کیوں نہ دیا جائے اور ان رؤسا کو ختم کیوں نہ کیا جائے۔

یہ فرمانے کے بعد قریش کے اس غرور باطل پر ضرب لگائی ہے جو خانہ کعبہ کی تولیت کی بنا پر ان کو تھا فرمایا وما کانوا اولیاء قریش کو یہ زعم تھا کہ وہ خانہ کعبہ کے متولی وفادہ اور سقایہ کی خدمت انجام دے رہے ہیں اور حضرت ابراہیم کی اولاد ہیں۔ یہی ان کے خدا کے یہاں متقرب ہونے کی نشانی ہے۔ اس کے رد میں فرمایا کہ محض میراث میں مجاورت اور تولیت پا لینے سے کوئی شخص یا خاندان یا جماعت کسی عبادت گاہ کی جائز متولی نہیں ہو سکتی۔ جائز متولی اور وارث تو صرف وہ شخص ہو سکتا ہے جو خدا ترس اور پرہیز گار ہو۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہ لوگ خائن غدار اور اس گھر کے مقصد تعمیر اور اس کی حرمت کو تباہ کرنے والے ہیں۔ اس گھر کے اصلی حقدار متولی وہ متقی بندے ہیں جو ان ظالموں کے ہاتھوں مسجد حرام سے نکال دیے گئے۔ جب صورت حال یہ ہے کہ حضور اقدس کو انہوں نے ہجرت پر مجبور کر دیا اور ان کی سرکشی یہاں تک پہنچ گئی کہ خدا کے بندوں کو عبادت گاہ سے بجبر روکنے لگے تو اب کوئی وجہ نہیں کہ پاداشِ عمل کے ظہور میں تاخیر ہو۔ چنانچہ وہ بدر کی صورت میں ظاہر ہوا اور قریشِ مکہ کے جماعتی اقبال کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو گیا۔

وَمَا كَانَ صَلَاتُهُمْ عِنْدَ الْبَيْتِ إِلَّا مُكَاءً وَتَصْدِيَةً ۚ
فَذُوقُوا الْعَذَابَ بِمَا كُنْتُمْ تَكْفُرُونَ ﴿٣٥﴾ إِنَّ الَّذِينَ
كَفَرُوا يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ لِيَصُدُّوا عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ ۚ
فَسَيُنْفِقُونَهَا ثُمَّ تَكُونُ عَلَيْهِمْ حَسْرَةً ثُمَّ يُغْلَبُونَ ۗ
وَالَّذِينَ كَفَرُوا إِلَىٰ جَهَنَّمَ يُحْشَرُونَ ﴿٣٦﴾ لِيَمِيزَ اللَّهُ
الْخَبِيثَ مِنَ الطَّيِّبِ وَيَجْعَلَ الْخَبِيثَ بَعْضَهُ عَلَىٰ بَعْضٍ
فَيَرْكُمَهُ جَمِيعًا فَيَجْعَلَهُ فِي جَهَنَّمَ ۚ أُولَٰئِكَ هُمُ
الْخَاسِرُونَ ﴿٣٧﴾

اور کعبہ میں ان کی نماز اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ سیٹیاں
بجاتے اور تالیاں پیٹتے تو اب اس کفر کا مزہ چکھو
جیسے تم اپنائے ہوئے تھے ۳۵۔ بلاشبہ جن لوگوں نے
راہِ کفر اختیار کی ہے وہ اپنا سرمایہ لوگوں کو راہِ خدا

سے ہٹانے میں خرچ کرتے ہیں[۴۴]۔ لہٰذا یہ لوگ آئندہ بھی ضرور خرچ کریں گے لیکن پھر یہ مال خرچ کرنا ان کے لیے سامانِ حسرت بن جائے گا اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے دب کر رہ جائیں گے اور جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے ان کو آخرت میں دوزخ کی طرف سمیٹا جائے گا۔[۴۵] اور یہ سب کچھ اس لیے ہو گا تاکہ اللہ تعالیٰ بُرے کو اچھے سے ممتاز کر دے، اور بُرے کو بُرے سے جوڑ کر اسے یکجا کر دے، پھر اس مجموعہ کو جہنم میں ڈال دے، یہی لوگ فی الواقع تباہی اور خسارے والے ہیں۔[۴۶]

کفر و ایمان کے درمیان امتیاز

جیسے نبوت کا اوّلین مقصد یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جن سے کفر کا وجود عبارت ہے۔ دُنیا کے ہر وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کی بقاء کا آرزو مند اور کشمکش حیات میں مبتلا ہے ایسے ہی نبوت کے مقاصد میں یہ بات بھی داخل ہے کہ کفر و ایمان میں حدِ فاصل قائم کر دے اور ان تمام ملاوٹوں کو یکسر

مٹا دے جو کفر و ایمان میں ہم آہنگی اور ہم رنگی کی نشاندہی کرتی ہوں۔ جیسے ایمان کی زندگی کے لیے شرک کی حیثیت ایک ناسور کی ہے ایسے ہی طاعت کے نام پر خالص گناہ کی نمائش بھی ایمان کی زندگی کے لیے وہ جرثومہ خبیث ہے جو ایمان کی صحت کو تباہ کر دیتا ہے۔ نبوت کے مشن کی تکمیل کے لیے ان دونوں کا ہونا ضروری ہے۔ عرب کے مشرکین ایک طرف اگر وہ شرک کی نجاست سے آلودہ تھے تو دوسری طرف وہ اللہ کے نام پر شریعت سازی کے کارخانے کھولے ہوئے تھے اور بڑی بے باکی کے ساتھ خدا کے نام پر اعمال کے پیمانے بناتے تھے۔ ایک پیمانہ یہاں بتایا ہے کہ طواف میں ذکر اللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجاتے، ہماری شریعت میں اسی کا نام بدعت ہے علامہ شاطبی فرماتے ہیں کہ دین میں ایسا اختراع کیا ہوا طریقہ جو شریعت کے مشابہ ہو اور جس پر عمل سے اللہ کی عبادت میں مبالغہ مقصود ہو۔ قرآن نے ان آیات میں بتایا ہے کہ نبوت کا بنیادی مقصد خبیث و طیب میں عام نگاہوں میں امتیاز پیدا کرنا ہے۔ ایمان و کفر، تقویٰ و فجور، طاعت و بغاوت، توحید و شرک، فرمانبرداری اور نافرمانی، خوش اخلاقی و بد اخلاقی، ایمانداری و بے ایمانی، ان میں سے پہلا طیب اور دوسرا خبیث ہے۔ نبوت چاہتی کہ یہ دونوں لوگوں کے سامنے نمایاں ہو کر آجائیں عام نگاہیں کفر کو ایمان بغاوت کو طاعت، فجور کو تقویٰ، شرک کو توحید نہ سمجھیں۔

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بولہبی

قریش کی تماشائی عبادت

۳۵۔ اور کعبہ میں ان کی نماز اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے لہٰذا اب اس کفر کا مزہ چکھو جسے تم اپنائے ہوئے تھے۔ یعنی حقیقی نمازیوں کو تو مسجد حرام سے روکتے ہیں اور خود ان کی نماز کیا ہے؟ کعبہ کا برہنہ طواف کرنا، اور ذکر اللہ کی جگہ سیٹیاں اور تالیاں بجانا۔ جیسے آج بھی بہت سی قومیں گھنٹیاں اور ناقوس بجانے کو بڑی عبادت سمجھتی ہیں۔ غرض نہ خود اللہ کی عبادت کرتے ہیں اور نہ دوسرے کو کرنے دیتے ہیں۔ ان بے معنی اور لغو

ہاتوں کو عبادت قرار دے رکھا ہے۔ بعض نے کہا کہ سیٹیاں اور تالیاں بجانا مسلمانوں کی عبادت میں خلل ڈالنے کے لیے ہوتا تھا یا ازراہِ استہزاد تمسخر ایسا کرتے تھے[۱]
عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ مشرکین عرب اپنے رخسار زمین پر رکھ کر سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ وہ بیت اللہ کا ننگے طواف کرتے سیٹیاں بجاتے اور تالیاں پیٹتے۔ مجاہد کہتے ہیں کہ مسلمانوں کی عبادت میں اس انداز سے رخنہ اندازی کرتے۔ زہری کہتے ہیں کہ اہل ایمان کا مذاق اڑاتے۔ آیت وما کان صلاتھم کا عطف یا ھم لیصدون پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ وہ عذاب کے بدر کی صورت میں اس لیے مستحق ہیں کہ لوگوں کو مسجد حرام سے روکتے ہیں اور خود یادِ الٰہی کو لہو ولعب کا نمونہ بنائے ہوئے ہیں۔ اور یا اس کا عطف وما کانوا اولیاء پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مسجد حرام کے متولی نہ ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے عبادت کے پیمانے اپنے ایجاد کر لیے ہیں۔ نماز کی جگہ سیٹیاں بجانا اور تالیاں پیٹنا اپنا رکھا ہے۔ بیت اللہ کا برہنہ طواف مرد اور عورتیں ہاتھوں کی انگلیوں سے بگل بنا کر منہ سے بجاتے اور کبھی دونوں ہاتھوں سے تالیاں پیٹتے۔

دراصل ان کے مخترعہ اعمال عبادت کے لیے یہ ایک مثال بیان ہوئی ہے۔ ہونا تو یہ چاہیے کہ عبادات میں دین ابراہیم کی پیروی کرتے لیکن انہوں نے شرک و بدعت کا قلعہ بنا رکھا ہے۔ نماز کی بالکل آبرو مٹا دی۔ فرمایا کہ ان کی نماز کیا ہے سیٹی بجانا، تالی پیٹنا، یہ قرآنی بلاغت ہے کہ اس نے دو لفظوں میں ان کی عبادات کا سارا نقشہ پیش کر دیا۔ حیرت کی بات ہے کہ آج بھی عبادت کے جو غیر اسلامی اور جاہلی طریقے چلے ہوتے ہیں۔ ان کا جزدِ اعظم بھی باجا گاجا تالیاں اور سیٹیاں ہیں۔ فقہاء و مفسرین نے یہاں ان صوفیاء کے کردار پر ماتم کیا ہے۔ جو وجد، حال لاکر اچھلتے کودتے تالیاں بجاتے اور ناچتے۔ اور اسے روحانی کمال سمجھتے ہیں۔
قرطبی لکھتے ہیں کہ اس میں مشرکین کے اعمال سے پوری مشابہت ہے جو سیٹیوں اور تالیوں کے ذریعے حافظ ابن القیم اغاثۃ اللھفان میں فرماتے ہیں۔

[۱] افاداتِ شیخ الاسلام

اللہ کا قرب تلاش کرنے والے اور نمازیوں، ارباب ذکر و قرأت کا سکون برباد کرنے والوں میں آج بھی ان مشرکین کے اعمال کا عکس ہے۔ ابن عرفہ اور ابن الانباری کہتے ہیں کہ سیٹی بجانا اور تالیاں پیٹنا نماز نہیں ہے بلکہ اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ مشرکین نے ان دونوں کو نماز کی جگہ عبادت کا پیمانہ بنا لیا تھا۔ اس لحاظ سے اس گناہ کا وزن زیادہ ہو گیا۔ مطلب یہ ہے کہ آج بھی جو لوگ گانے بجانے کے ذریعے اللہ کا قرب تلاش کرتے ہیں وہ اپنے عمل میں ان مشرکین سے ہم آہنگی رکھتے ہیں خواہ مشابہت بالکل ظاہری کیوں نہ ہو۔ حافظ ابن تیمیہ اپنے فتاویٰ میں لکھتے ہیں سیٹیاں بجانے، گانے اور باجے بجانے اور اس کے لیے مجالس منعقد کرنے کو عبادت کا پیمانہ اور اللہ کے قرب کا ذریعہ سمجھنا ہرگز دین اسلام نہیں ہے۔ نہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شریعت ہے۔ نہ خلفائے راشدین کا طریقہ ہے اور نہ مسلمانوں کے اماموں میں سے کسی نے اسے بنظر استحسان دیکھا ہے۔ بلکہ دینی زندگی میں یہ کام نہ زمانہ نبوت میں ہوا ہے نہ زمانہ خلافت میں، نہ زمانہ صحابہ و تابعین میں اور نہ اتباع تابعین کے زمانہ میں، نہ خیر القرون میں ہوا ہے۔ یہ بدعت خیر القرون کے بعد ایجاد ہوئی ہے۔ اسی سے امام شافعی نے اس ایجاد کو دیکھ کر فرمایا تھا کہ میں نے بغداد میں ایک ایسی بدعت کا مطالعہ کیا ہے جسے زنادقہ نے بنایا ہے۔ اس کا مقصد لوگوں کو قرآن سے ہٹانا ہے امام احمد سے اس کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ فرمایا میں اسے ناجائز سمجھتا ہوں۔ سارے ائمہ فقہ و حدیث اور اکابر صوفیائے کرام ابراہیم بن ادھم، الفضیل بن عیاض، معروف الکرخی، سری سقطی اسے بہت بڑا گناہ سمجھتے تھے بلکہ شیخ عبدالقادر جیلانی نے اس سماع کو مشائخ طریقت کے مسلک کے خلاف بتایا ہے۔

امام شافعی اصول دین سے باخبر ہیں۔ ان کا یہ فیصلہ کہ یہ زنادقہ کی ایجاد ہے عبرت کا سامان ہے۔ اگر کوئی شخص دین کا ذوق رکھتا ہے تو بہت سی بدعتوں کو ان کی ظاہری ہیئت ہی سے پہچان لیتا ہے کہ ان خرافات کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ مراثی کا تعزیوں میں وجود، مزاروں پر قوالیاں اور ڈھول ڈھمکے اور خانقاہوں میں گانے بجانے کی خرافات ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کی لغویت کا فیصلہ کرنے کے لیے کسی علمی کاوش کی ضرورت ہو۔ ہر صاحب ذوق بیک نظر دیکھ

سکتا ہے کہ ان چیزوں کو دین سے دُور کا بھی واسطہ نہیں ہو سکتا۔ دین کی ہر بات میں متانت وقار اور پاکیزگی کی جھلک اور معرفت حکمت و دانش اور روحانیت کی مہک ہوتی ہے۔

آخر میں فرمایا ہے فذوقوا العذاب الخ قریش کے جرائم گنانے کے بعد قریش کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ تم یہ خبط دماغ سے نکال دو کہ تم خانہ کعبہ کے متولی ہو تمہارے کفر، تمہاری خیانت و بدعہدی کی ایک پوری تاریخ بن چکی ہے تو اب اس کی پاداش میں اللہ سبحانہ کے عذاب کا مزہ چکھو۔ اس میں اشارہ بدر میں عذاب ہلاکت کی طرف ہے۔ سلف میں اکثر کی یہی رائے ہے۔ حافظ ابن جریر نے تفسیر میں اسی کو اپنایا ہے یا یوں کہہ دیجیے کہ جس عذاب کا تم نے مطالبہ کیا تھا اب اس عذاب کا مزہ چکھو۔

قریش میں اسلام کے خلاف جوش

۳۶۔ بلاشبہ جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے وہ اپنا سرمایہ لوگوں کو راہِ خدا سے ہٹانے میں خرچ کرتے ہیں۔ بدر میں بارہ سرداروں نے ایک ایک دن اپنے ذمہ لیا تھا کہ ہر روز ایک شخص لشکر کو کھانا کھلائے گا۔ چنانچہ دس اونٹ روزانہ کسی ایک کی طرف سے ذبح کیے جاتے تھے۔ پھر جب شکست ہو گئی تو ہزیمت خوردہ مجمع نے مکہ پہنچ کر ابوسفیان وغیرہ سے کہا کہ جو مال تجارت قافلہ لایا ہے وہ سب محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے انتقام لینے میں صرف کیا جائے۔ چنانچہ سب اس پر راضی ہو گئے۔ اسی طرح کے خرچ کرنے کا یہاں ذکر ہے۔[1]

جیسا کہ پہلے بتایا جا چکا ہے کہ دُنیا کے دوسرے وجودوں کی طرح کفر کا بھی ایک وجود ہے۔ یہ بھی اپنی ہستی کی بقا کا آرزومند ہے اور کشمکش حیات میں تن کر مقابلہ کرتا ہے۔ کفر میں تابِ مقاومت نہ ہو تو ایمان کی کوئی قیمت نہیں ہے کہ چیزوں کی قدر و قیمت اضداد سے ہوتی ہے۔ کفر میں اسلام کو مٹانے کے لیے کس قدر جوش و خروش تھا۔ اسی کی اس آیت میں وضاحت ہو رہی ہے کہ قریش اپنے کفر کی خاطر ایمان کے مقابلے میں بڑی فیاضی سے دولت لٹا رہے تھے۔ یہ بات کھول کر اس لیے

[1] افادات شیخ الاسلام

بتائی گئی ہے کہ فی الواقع قریش کے لیڈروں نے بدر کے موقع پر بڑی دریادلی دکھائی تھی جنگ کا سامان اور فوج کی رسد فراہم کرنے میں ہر سردار نے ایک دوسرے پر سبقت لے جانے کی کوشش کی۔ بارہ سرداروں میں سے ایک ایک نے ہر روز بدر کی لڑائی میں دس اونٹ ذبح کرنے کا وعدہ کیا۔ الخفاجی نے لکھا ہے کہ ان بارہ سرداروں کے نام یہ ہیں:

ابوجہل، عقبہ، بنیہ، منبیہ، ابوالبختری، النضر، حکیم بن حزام، ابورفعہ، الحارث، العباس، عتبہ، شیبہ، یہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ قریش جنگ پر تلے بیٹھے تھے اور اس کے مصارف کی یہ تجویز سوچی گئی تھی کہ اہل مکہ کے پاس جو سرمایہ تھا وہ شام جانے والے قافلے کے سپرد کر دیا جائے اور اس سفر تجارت میں جس قدر نفع ہو وہ پورے کا پورا مسلمانوں کے خلاف سامان جنگ کی تیاری پر لگا دیا جائے۔ یہی تجارتی قافلہ تھا جس پر حملہ ابتدا میں مسلمانوں کے پیش نظر تھا اور احدالطائفتین سے ابتدا میں یہی قافلہ سمجھا گیا۔ اس میں ایک ہزار اونٹ اور پچاس ہزار دینار کا سامان تجارت تھا۔ یہی قافلہ بدر سے ہٹ کر نکل آیا تھا۔ بدر میں شکست کے بعد جب قریش واپس مکہ پہنچے۔ انہوں نے اسلام سے انتقام کے جوش میں ابوسفیان سے کہا کہ اس سارے سرمایہ کو مسلمانوں کے خلاف جنگ کے لیے لگایا جائے تاکہ ہم بدر کا بدلہ لے سکیں۔ اسی کی طرف قرآن نے یہاں يُنفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ سے اشارہ کیا ہے اور ان کی اس دریادلی کا باعث یہ بتایا ہے کہ اس طرح وہ لوگوں کو دین اسلام سے ہٹانے یا اسلام کی ابھرتی طاقت کو ختم کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔

مستقبل میں قریش کی تیاری

۴۵ - اس کے لیے لوگ آئندہ بھی ضرور خرچ کریں گے لیکن پھر یہ مال خرچ کرنا ان کے لیے سامانِ حسرت بن جائے گا اور پھر وہ ہمیشہ کے لیے دب کر رہ جائیں گے اور جن لوگوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے۔ ان کو آخرت میں دوزخ کی طرف سمیٹا جائے گا جب دُنیا میں مغلوب و مقہور اور آخرت میں معذب ہوں گے۔ تب افسوس و حسرت سے ہاتھ کاٹیں گے کہ مال بھی گیا اور کامیابی بھی نہیں ہوئی۔

چنانچہ اول بدر میں پھر اُحد وغیرہ میں سب مالی اور جسمانی طاقت خرچ کر کے دیکھ لیا کچھ نہ کر سکے آخر ہلاک یا رسوا ہوئے یا نادم ہو کر کفر سے توبہ کی ہے

قرآن نے اہل بدر کو مستقبل کے بارے میں خبر دی ہے کہ یہی لوگ مستقبل میں بھی تمہارے خلاف بڑی گرمجوشی اور دریا دلی کا مظاہرہ کریں گے۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں وہو انفاقہم فیما یستقبل یہ مستقبل میں ان کے انفاق کی خبر ہے۔ گویا ینفقون میں بدر میں اموال خرچ کرنے کی داستان تھی اور یہاں مستقبل میں خرچ کرنے کی خبر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اے اہل ایمان راہ حق سے روکنے کے لیے جو یہ دریا دلی ہو رہی ہے اور جو مستقبل میں ہوگی ان سے مرعوب نہ ہوں۔ ان کے خزف ریزوں اور تنکوں سے اس سیلاب کا مقابلہ نہ ہو سکے گا جو حق و ایمان کا آرہا ہے۔ بلاشبہ انہوں نے بڑی فیاضی سے خرچ کیا ہے اور بھی خرچ کریں گے لیکن ان تمام فیاضیوں کا نتیجہ کف افسوس ملنے کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ یہ بہت جلد منہ کی کھائیں گے۔ دنیا میں ان کے لیے شکست مقرر ہو چکی ہے اور آخرت میں یہ جہنم کی طرف ہانک دیے جائیں گے۔ اس سے بڑھ کر حسرت اور کیا ہو سکتی ہے کہ آدمی جس کام پر اپنا تمام وقت تمام محنت تمام قابلیت اور پورا سرمایۂ زندگی لگا دے۔ اس کی انتہا پر پہنچ کر معلوم ہو کہ وہ تباہی و بربادی ہے اور اس کام پر جو کچھ اس نے لگایا ہے اس پر سود یا منافع پانے کی جگہ اسے اُلٹا جرمانہ بھگتنا پڑا ہے۔

خبیث و طیب میں امتیاز

۳۶۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوگا تاکہ اللہ تعالیٰ بُرے کو اچھے سے ممتاز کر دے اور بُرے کو بُرے سے جوڑ کر اسے یکجا کر دے پھر اس مجموعہ کو جہنم میں ڈال دے۔ یہی لوگ فی الواقع تباہی اور خسارے والے ہیں۔ یعنی دنیوی اور اُخروی دونوں قسم کا نقصان۔ موضح القرآن میں ہے کہ آہستہ آہستہ اللہ تعالیٰ اسلام کو غالب کر دے گا۔ اس درمیان میں کافر اپنا جان و مال کا زور خرچ کر لیں گے تاکہ

افادات شیخ الاسلام

نیک و بد جدا ہو جائے جن کی قسمت میں اسلام لکھا ہے وہ سب مسلمان ہو چکیں اور جن کو کفر پہ مرنا ہے وہ ہی اکٹھے دوزخ میں جائیں [1]

اس آیت میں کھول کر بتادیا کہ اللہ سبحانہ نے نصرت و غلبہ، کامیابی اور فتح مندی اہل ایمان کے لیے رسوائی، ناکامی، مقہوری اور ذلت معاندین کے لیے رکھی ہے تاکہ کفر و ایمان، عدل و ظلم، حق و باطل میں حدِ فاصل اور امتیاز ہو جائے۔ برا مٹ جائے۔ اور اچھا باقی رہ جائے۔ کفر مٹ جائے ایمان باقی رہ جائے، باطل مٹ جائے حق رہ جائے۔ جو بات یہاں بدر کے سلسلے میں فرمائی ہے بالکل ایسی ہی بات غزوہ احد کے موضوع پر بھی ارشاد فرمائی ہے۔

ما کان اللہ لیذر المومنین علی ما انتم علیہ حتی یمیز الخبیث من الطیب۔

اللہ کے یہ شایاں نہیں کہ اہل ایمان کو موجودہ حالت میں چھوڑ دے، وہ برے کو اچھے سے ضرور ممتاز کرے گا۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے یہ قانون بتایا ہے کہ اچھے اور برے میں امتیاز ناگزیر ہے۔ اس کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ کفر و ایمان، عدل و ظلم، ہدایت و ضلالت، تقویٰ و فجور میں امتیاز ہونا چاہیے۔ یعنی اہل ایمان کی اللہ کی جانب سے مدد ہونی چاہیے اور ان کو کفر کے مقابلے میں غالب ہونا چاہیے اور یہ امتیاز صرف علمی نہیں بلکہ فعلی اور عملی ہونا چاہیے۔ کفر و ایمان دونوں ضد ہیں۔ اور اللہ کے "قانون" میں ضدین کا اجتماع نہیں ہو سکتا۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ جن لوگوں نے ایمان کو اپنایا ہے وہ ایمان کے تقاضے پورے کریں۔ کیونکہ ایمان کا معیار ہی یہ ہے کہ مسلمان کفر کے مقابلے میں ایمان کا بول بالا کرے اور اس کی راہ میں جان لڑانے کے لیے آمادہ ہو۔ مومن کے ایمان کا یہ بنیادی "تقاضا ہی نہیں بلکہ ذمہ داری ہے کہ جس چیز پہ ایمان لایا ہے اس کے حق ہونے کی شہادت دے اور ہر ممکن طریقے سے اس بات کی کوشش کرے کہ خدا کے بندے فی الواقع اس کے بندے بن جائیں۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

اور اس کے بھیجے ہوئے اس دینِ حق سے دُور رہ کر اپنی دُنیا پریشان اور اپنی آخرت تباہ نہ کریں۔ اس ذمہ داری کا کھلا تقاضا یہ ہے کہ اہلِ ایمان اپنے دائرے میں سمٹے نہ رہیں بلکہ آگے بڑھیں۔ اللہ کا دین ہے کہ دُنیا میں پھیل جائیں اور اس راہ میں کسی کو مزاحم نہ ہونے دیں۔ اور زندگی کے اجتماعی نظام باطل کے ہاتھوں سے چھین کر حق کے ہاتھوں میں دیں۔ یہ ہے طیب و خبیث کا امتیاز، کُفر خبیث ہے اور ایمان طیب ہے۔ ان دونوں میں اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی، قانونی اور روحانی طور پر امتیاز ہونا چاہیے۔ بدر کی صورت میں اہلِ ایمان کے ہاتھوں رُسوا کر کے قریش کو عذاب میں مبتلا کر کے بھی امتیاز قائم کیا ہے۔ پھر یہی نہیں بلکہ خبیث جہاں جہاں بھی پایا جاتا ہے وہ سب کو یکجا کرے گا۔ ان میں باہم اتحاد قائم ہو گا، ان کی یونین بنے گی۔ پھر سب کو دُنیا میں تمہارے ذریعے رُسوا کرے گا اور آخرت میں ان کو جہنم کا ایندھن بنائے گا۔

یا آیت کا مطلب یہ ہے کہ بدر کے ذریعے اہلِ کُفر کی تعذیب اس لیے عمل میں آئی ہے کہ جنہوں نے اسلام کا جام تو منہ سے لگا لیا ہے لیکن ابھی حلق کے نیچے نہیں اُترا۔ کسی تعلیم کو اختیار کر کے یقین و عمل کی جو روح پیدا ہونی چاہیے اس سے یک قلم محروم ہیں۔ اخلاص و صداقت کے لیے ان میں کوئی جگہ نہیں۔ جہاد کے تصور سے ان کی رُوحیں لرزتی ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ ہیں جنہوں نے ایمان قبول کر لینے کے بعد صرف مصیبتیں جھیلی نہیں ہیں بلکہ دل کی پوری آمادگی اور رُوح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگیاں ان میں بسر کر ڈالیں۔ اب تک یہ دونوں ملے جلے تھے۔ خام پختہ خبیث و طیب ہر قسم کے افراد پر مشتمل ایمانی جماعت تھی۔ یہ بات اللہ کی حکمت کے خلاف تھی کہ جو جماعت پوری دُنیا کی قیادت کے لیے مبعوث ہوئی ہے۔ وہ اس طرح اچھے بُرے، فاسد و صالح کا مکسچر ہی ہے۔ دونوں میں امتیاز کی صورت اللہ سبحانہ نے اپنی سنت کے مطابق یہ اختیار کی کہ بدر کو ایمان باللہ کے لیے حقیقی کسوٹی بنا کر سب کے سامنے رکھ دیا۔ کیونکہ ایمان خالص کا معیار ہی یہ ہے کہ انسان معبودانِ باطل کے مقابلے میں اللہ سبحانہ کی معبودیت کا بول بالا کرے اور اس راہ میں جان لڑانے کے لیے آمادہ ہو جائے۔ دُنیا کی اور نیکیوں میں

ذاتی منفعت کی توقع اور خواہش نفس کی آمیزش ہو سکتی ہے لیکن خدا کی راہ میں جاں نثاری صرف محبت کے جذبے سے پیدا ہوتی ہے۔ ماں باپ کی خبر گیری میں رضائے الٰہی سے زیادہ والدین کی محبت کا جذبہ کارفرما ہو سکتا ہے۔ سب رشتہ داروں اور فقراء و مساکین کی امداد بنی نوع انسان کی عام ہمدردی پر بھی مبنی ہو سکتی ہے لیکن جہاد میں سر دے دینا صرف رضائے الٰہی کے لیے ہو سکتا ہے اس میں اور جذبہ کی آمیزش ممکن نہیں ہے۔

ایمان باللہ کی اس حقیقی امتحان کا موقعہ غزوۂ بدر نے فراہم کیا۔ یہی وہ کسوٹی بن گئی جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہو گئی۔ قرآن کہتا ہے کہ بدر میں مصائب کے ہجوم نے خبیث و طیب کو الگ الگ کر دیا ہے اور اللہ کا قانون یہی ہے کہ اچھوں کو بروں سے ممتاز کرنے کے لیے وہ دونوں کو مصائب میں ڈال دیتا ہے تاکہ خام اور پختہ، مخلص اور منافق دونوں الگ الگ ہو جائیں۔ جو دنیا میں خبیث ہے وہ آخرت میں بھی خبیث ہے اور جو دنیا میں طیب ہے وہ آخرت میں بھی طیب ہے۔ اور اس کے ساتھ یہ بھی اللہ کا قانون ہے کہ جب وہ خبیث کو طیب کے ذریعے ختم کرنا چاہتا ہے تو خبیث خواہ کتنی صورتوں میں کتنی قسموں میں ہو باہم ان کو جوڑ دیتا ہے اور تدبر نہ کر دیتا ہے۔ ان میں باہم سنگھٹن قائم ہو جاتا ہے۔ اس طرح ان خبیثوں میں ہم آہنگی اور اجتماعیت پیدا کر کے پہلے دنیا میں ختم کرتا ہے اور پھر آخرت میں ان کو جہنم رسید کر دیتا ہے۔

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ اس آیت گرامی کا موجودہ زندگی سے نہیں بلکہ آخرت کی زندگی سے تعلق ہے اور مطلب یہ ہے کہ آخرت کو ان کو سزا یہ ہو گی کہ کافروں کو دوزخ میں لے جانے کے لیے جمع کیا جائے گا تاکہ اللہ تعالیٰ ناپاک کو پاک سے الگ کر دے کیونکہ جب دوزخیوں کو دوزخ کی طرف لائیں گے ظاہر ہے کہ اہل جنت سے علیحدہ ہو جائیں گے اور ان سے الگ کر کے ناپاک لوگوں کو ایک دوسرے سے ملا دے یعنی ان سب کو متصل کر کے ان سب کو جہنم میں ڈال دے ایسے ہی لوگ خسارے میں ہیں جس کا کہیں منتہی نہیں۔ یہ تشریح بیان القرآن میں حضرت مولانا اشرف علی نے اختیار کی ہے اور اسی کو مفتی محمد شفیع

اور مولانا محمد ادریس نے معارف القرآن میں شرف پذیرائی دیا ہے لیکن آپ پڑھ چکے ہیں کہ حضرت شاہ عبدالقادر اس آیت گرامی کو موجودہ زندگی سے متعلق بتاتے ہیں وہ فرماتے ہیں کہ :

اللہ آہستہ آہستہ اسلام کو غالب کرے گا اس بیچ میں کافر اپنا زور، جان اور مال کا خرچ کرلیں گے تاکہ نیک و بد جدا ہو جائے یعنی جن کی قسمت میں اسلام لکھا ہے وہ سب مسلمان ہو چکے اور جن کو کفر پر ہونا ہے وہی اکٹھے دوزخ میں جائیں گے ۔

آیت کا یہی مطلب عبداللہ بن عباس کی تشریح سے ہم آہنگ ہے فرماتے ہیں :

تاکہ اہل سعادت کو اہل شقاوت سے ممتاز کردے ۔

شارحین قرآن نے اس موضوع پر یہ بھی بتایا ہے کہ خبیث عمل کو طیب عمل سے ممتاز کردے یا راہ شیطان میں کیے گئے اخراجات کو راہ خدا میں کیے گئے اخراجات سے ممتاز کردے یا اس مال خبیث کو جسے مشرکین نے حضور اقدس کی عداوت میں پانی کی طرح بہایا ہے اس مال طیب سے جسے اہل ایمان نے نبوت کی نصرت کے لیے خرچ کیا ہے ممتاز کردے پھر ان اموال خبیثہ کو اکٹھا کرکے جہنم میں ڈالے اور جہنم میں خرچ کرنے والوں کو عذاب دے ۔

قُلْ لِّلَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ يَّنْتَهُوْا يُغْفَرْ لَهُمْ مَّا قَدْ سَلَفَ ۚ وَاِنْ
يَّعُوْدُوْا فَقَدْ مَضَتْ سُنَّتُ الْاَوَّلِيْنَ ﴿۳۸﴾ وَقَاتِلُوْهُمْ حَتّٰى لَا
تَكُوْنَ فِتْنَةٌ وَّيَكُوْنَ الدِّيْنُ كُلُّهٗ لِلّٰهِ ۚ فَاِنِ انْتَهَوْا فَاِنَّ
اللّٰهَ بِمَا يَعْمَلُوْنَ بَصِيْرٌ ﴿۳۹﴾ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ
مَوْلٰىكُمْ ۭ نِعْمَ الْمَوْلٰى وَنِعْمَ النَّصِيْرُ ﴿۴۰﴾

جنہوں نے راہِ کفر اختیار کی ہے ان سے کہہ دیجیے کہ اگر وہ باز آجائیں تو ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے[47]۔ اور اگر پھر وہ یہی کچھ کریں گے تو اس بارے میں پہلوں کا طریقہ گزر چکا ہے[48]۔ اور مسلمانو! تم ان سے لڑتے رہو تاآنکہ فتنہ نہ رہے[49]۔ اور دین سارے کا سارا اللہ کا ہو جائے[50]۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو وہ جو کچھ کریں گے اللہ کی نگاہ میں ہے[51]۔ اور اگر وہ پھر گئے

تو پھر جان لو کہ اللہ سبحانہ تمہارا کارساز ہے، کیا ہی اچھا کارساز اور کیا خوب مددگار ہے۔ ۵۲

کفر سے مصالحت کی شرط

یہ سن آئے ہو کہ نبوت کا اولین مقصد یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کو ملیامیٹ کر دیا جائے جن سے کفر پروان چڑھتا ہے۔ دنیا میں کفر بھی ایک ہستی رکھتا ہے اور وہ بھی اپنے بقا کے لیے کوشش اور جدوجہد کرتا ہے اور اس میدان میں صرف نبوت اس کی مدمقابل اور حریف ہے کیونکہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے ایمان کی داعی ہونے کی وجہ سے کفر کی ضد ہے۔ ایمان اور کفر کے درمیان مصالحت ناممکن اور ان کی لڑائی ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ رہے گی۔ یہ لڑائی دنیا کی دوسری لڑائیوں پر حاوی اور ان سے مافوق ہے بلکہ اور جتنی لڑائیاں ہیں ان کا سلسلہ کہیں نہ کہیں ختم ہوتا ہے کہ یا کفر میں تاب مقاومت نہ رہے یا اس کا مقابلہ کرنے کے لیے ایمان نہ ہو۔ حضور اقدس کا ارشاد گرامی ہے۔

> مجھے اس بات کا حکم دیا گیا ہے کہ انسانی دنیا سے اس وقت تک برسر پیکار رہوں جب تک کہ وہ اس بات کی شہادت نہ دیں کہ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کریں زکوٰۃ دیں۔ اگر وہ یہ کر لیں تو پھر ان کے خون معصوم ہیں۔ ان کے اموال محفوظ ہیں۔ ہاں یہ کہ کوئی اسلام کے قانون میں پکڑا جائے اس کے بعد ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

یعنی ایمان و کفر کے درمیان جنگ ختم ہونے کی صرف ایک صورت ہے وہ یہ کہ ایمان کی راہ قبول کر لیں اور کفر کی راہ سے ہٹ جائیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے بلکہ مطلب یہ ہے کہ کفر جب ایمان کے

مقابلہ میں تن کر آئے اس کی مزاحمت اس وقت کی جائے گی جب تک کفر مقابلہ سے باز نہ آجائے
انداز بیان اقاتل الناس ہے اقتل الناس نہیں ہے۔ صلح اور جزیہ کے ذریعے بھی اگرچہ
جنگ ختم ہوتی ہے مگر یہ دونوں صورتیں طرفین کی رضامندی پر موقوف ہیں۔ فریق مقابل
صلح کی درخواست کرے یا جزیہ دینا منظور کرے گا تو اس کی درخواست قبول کی جا سکتی
ہے لیکن جنگ ختم کرنے کا وہ حتمی اور یقینی ذریعہ جو صرف کفر کے ہاتھ میں ہے وہ
ایمان ہے۔ یہی ایک راستہ ہے جس پر چل کر کفر ایمان کو جنگ ختم کرنے پر مجبور
کر سکتا ہے۔ اس آیت میں قرآن نے بھی یہی بتایا ہے کہ اگر کفر، کفر سے باز آ آئے
تو اس کے ماضی کے سارے جرائم معاف ہو سکتے ہیں۔

عفو وکرم کا قانون

۴۷۔ جنہوں نے راہ کفر اختیار کی ہے ان سے کہہ دیجئے اگر وہ باز آجائیں تو
ان کے پچھلے گناہ معاف کر دیے جائیں گے۔ یعنی اگر اب بھی کفر و طغیان اور عداوت
اسلام سے باز آجائیں اور پیغمبر علیہ السلام کی حلقہ بگوشی اختیار کر لیں تو پہلے حالت
کفر میں جو گناہ کر چکے ہیں وہ سب معاف کر دیے جائیں گے الاسلام یہدم ما کان
قبلہ حقوق العباد معاف نہ ہوں گے ان کا مسئلہ علیحدہ ہے[1] غزوہ بدر کے بعد یہ
قریش مکہ سے کہا جا رہا ہے اگر اب بھی وہ اس روش سے باز آجائیں، توبہ و اصلاح
کر لیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر لبیک کہیں۔ اگر انہوں نے
اپنا طرز عمل تبدیل کر لیا تو جو شرارتیں اب تک کر چکے ہیں اللہ سبحانہ ان کو معاف کر دے
گا۔ گزشتہ اعمال کی بنا پر ان سے کوئی مواخذہ نہ ہوگا۔

مسند احمد اور سنن سعید بن منصور میں عمرو بن العاص کے حوالہ سے ایک حدیث
آئی ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

> جب اللہ تعالیٰ نے میرے دل میں اسلام کی حقانیت ڈال دی تو میں
> آپؐ کے پاس حاضر ہوا تاکہ آپ مجھے بیعت فرما لیں۔ آپ نے بیعت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے عرض کیا کہ میں اس وقت تک بیعت نہ کروں گا جب تک میرے پچھلے گناہ معاف نہ ہو جائیں۔ آپ نے فرمایا کہ اے عمرو کیا تجھے خبر نہیں کہ ہجرت پہلے سب گناہوں کو ختم کر دیتی ہے اے عمرو کیا تو یہ نہیں جانتا ہے کہ اسلام پہلے گناہوں کا تمام قصہ پاک کر دیتا ہے۔

اس ارشادِ گرامی میں ذنوب کا لفظ آیا ہے۔ ذنوب کے معنے افراد کے انفرادی وہ گناہ ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہو۔ بلاشبہ جو دین تمام ادیان کو ایک دین اور سب ملتوں کو ایک ملت بنانے آیا ہے اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ تمام اہلِ ملل کی سب سے مشترک خواہش کو پورا کرنے کی ضمانت دے۔ یہ ظاہر ہے کہ دین کی تلاش صرف اس لیے ہے کہ بندہ کو اپنے مالک و مولیٰ کے قہر سے نجات ملے۔ اور طبعاً بھی ایک گنہ گار کی سب سے بڑی خواہش ہوتی ہے۔ اس لیے قرآن اس کا اعلان کرتا ہے کہ ملک و ملت ہر نسل و رنگ کا جو گنہ گار بھی اس کی آغوش میں آجائے گا وہ اس کے گناہوں کی مغفرت اور نجاتِ ابدی کا ضامن ہو گا۔

یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ مغفرت کا تعلق ذنوب اور گناہوں سے ہے ان حقوق کے ساتھ نہیں جو قرض، عاریت، امانت اور خرید و فروخت کے سلسلے میں اس کے ذمہ ہیں۔ قرآن حقوق کی ادائیگی سے سبکدوش نہیں کرتا بلکہ اس کی ذمہ داری اور بڑھا دیتا ہے۔ قرض خواہ کا قرض ادا کرنا ہو گا اور امانت والے کو اس کی امانت ضرور سپرد کرنی پڑے گی۔ قرآن کی آیت اور عمرو بن العاص کی حدیث کا تعلق ان اعمال سے ہے جو بندے اور خدا کے درمیان ہیں۔ اسلام کے بعد ایک شخص کی انفرادی زندگی سے وہ سب محو ہو جائیں گے اور کیسے محو نہ ہوں جب کہ اسلام اس کے کفر و شرک کی اصل تاریکی کو محو کر چکا ہے۔ فقہا نے اس سے یہ سیاسی نکتہ بھی نکالا ہے کہ کافر حربی سے زنا، قتل، سرقہ اور لوٹ مار جیسے جرائم بھی ساقط ہو جائیں گے کیونکہ وہ حالتِ کفر میں اسلامی قانون کا معاملات میں پابند نہ تھا لیکن اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہری پر مسلمان ہونے کے بعد بھی یہ حقوق باقی رہیں گے۔ اور انفرادی زندگی میں امام ابو حنیفہ نے مرتد

کے بارے میں یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ مرتد سے اسلام میں واپسی کے بعد حالتِ کفر میں فوت شدہ عبادات کی قضا کا مطالبہ نہ ہوگا

عصمتِ موثمہ اور عصمت مقومہ

اسلام قبول کرنے کی یہ پہلی برکت ہے کہ اس کی حلقہ بگوشی کے بعد جان و مال دونوں کی عصمت فوراً نصیب ہو جاتی ہے۔ فقہاء کے نزدیک اس عصمت کی دو قسمیں ہیں۔ عصمت موثمہ، عصمت مقومہ۔

عصمت موثمہ یہ ہے جس کے ازالہ سے صرف گناہ ہو

عصمت مقومہ یہ ہے کہ جس کے ازالہ سے گناہ بھی ہو اور خون بہا بھی دینا پڑے۔

پہلی عصمت اسلام قبول کرنے سے حاصل ہوتی ہے اور دوسری دارالاسلام میں سکونت حاصل کرنے سے۔ اس لحاظ سے اگر ایک مسلمان دارالحرب میں رہتا ہے تو اس کو عصمت موثمہ تو حاصل ہے لیکن عصمت مقومہ حاصل نہیں ہے۔ لہٰذا اگر کوئی مسلمان دارالحرب میں قتل کر دیا جائے تو اس کے قاتل کو صرف گناہ ہوگا مگر اس پر دیت لازم نہ آئے گی۔ پوری عصمت اس وقت حاصل ہوگی جب دارالاسلام میں سکونت رکھتا ہو۔ ابو داؤد میں بحوالہ جریر بن عبداللہ البجلی یہ واقعہ ہے:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مختصر سا دستہ قبیلہ خثعم کی طرف روانہ کیا۔ ان میں سے کچھ لوگوں نے سجدہ میں گر کر اپنی جان بچانی چاہی۔ اسلامی فوج نے اس سے بے پروا ہو کر ان کو مار ڈالا۔ جب یہ واقعہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پہنچا تو آپ نے ان کی نصف دیت ادا کرنے کا حکم دیا اور فرمایا کہ میں ایسے ہر مسلمان سے بری الذمہ ہوں جو مشرکین میں گھل مل کر رہے۔ لوگوں نے دریافت کیا کیوں یا رسول اللہ آپ نے فرمایا دونوں کی آگ نظر نہ آئے۔

یعنی دونوں کو اتنے فاصلہ پر رہنا چاہیے کہ ایک دوسرے کی آگ نظر نہ آئے۔

اس واقعہ میں نصف دیت آپ نے اس لیے ادا کرنے کا حکم دیا کہ معاملہ ایک مسلمان جماعت کا تھا اور آئندہ کے لیے اعلان کر دیا کہ پوری عصمت اس وقت حاصل ہوگی

جب مسلمان ہونے کے ساتھ سکونت بھی دارالسلام میں اختیار کرے۔ اس حدیث سے یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ دارالحرب کی سکونت مسلمان کے لیے موزوں نہیں ہے لیکن دارالسلام کی طرف ہجرت اسی وقت ہوسکتی ہے جبکہ دارالسلام موجود ہو اور اس کی طرف ہجرت کرنا ممکن بھی ہو اور اگر بدنصیبی ہے کہیں دارالسلام ہی نہ ہو یا مسلمانوں کی مسلسل غفلت کی وجہ سے دارالحرب میں ان کی تعداد اتنی زیادہ ہوجائے کہ دارالسلام میں ان کی کھپت ناممکن ہو جائے تو پھر ہجرت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ان حالات میں مسلمانوں پر فرض ہوگا کہ وہ اپنے ماحول ہی میں رہ کر ایسی فضا پیدا کریں جس میں اسلامی زندگی بسر کرنے کی ان کو پوری آزادی حاصل ہو۔ اور جب تک اسلامی قانون پر عمل کرنے میں کوئی ادنیٰ رکاوٹ بھی ہو اس وقت تک آرام کی نیند نہ سوئیں۔

مشرکین مکہ کو دھمکی

۳۸۔ اور اگر پھر وہی کچھ کریں گے تو اس بارے میں پہلوں کا طریقہ گزر چکا ہے۔ یعنی جس طرح اگلے لوگ پیغمبروں کی تکذیب و عداوت سے تباہ ہوئے ان پر بھی تباہی آئے گی یا یہ مطلب ہے کہ جیسے بدر میں ان کے بھائی بندوں کو سزا ملی ہے انہیں بھی سزا دی جائے گی[۱] دوسری بات کہ ان کے ساتھ وہی معاملہ ہوگا جو بدر میں روسائے قریش کے ساتھ ہو چکا ہے امام مجاہد کی رائے ہے۔ پہلی بات عام شارحین قرآن نے اختیار کی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی اسی کو اولیت دی ہے لیکن حافظ ابن جریر کے انداز بیان سے مترشح ہوتا ہے کہ ان کو امام مجاہد کی رائے پسند ہے۔ موقعہ کے لحاظ سے بات بھی یہی درست ہے کہ ترہیب کی تاثیر کو قوی کرنے کے لیے حال ہی کے واقعہ کو عبرت کے طور پر پیش کیا جائے۔ شنید اور دید میں بڑا فرق ہے۔ بے شک قوم عاد، قوم ثمود، قوم لوط کے واقعات تاریخی حقائق ہیں لیکن بہرحال سنی ہوئی بات ہے۔ آنکھوں سے دیکھا ہوا معاملہ تو بدر کا ہے۔ جس نے پوری عرب دنیا کو چونکا دیا تھا۔ قرآن نے بدر کے دن کو یوم الفرقان کہا ہے کیونکہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ہلاکت تھا۔ جس طرح دوسری قوموں پر مختلف معجزات عذاب آئے ایسے ہی جس قوم میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو کر آئے اس کے لیے غزوۂ بدر معجزۂ عذاب تھا۔ جس طرح دوسری قوموں کے لیے عذاب کے معجزے ان کے انبیاء کی بددعاؤں کا نتیجہ تھے اسی طرح بدر کا معجزۂ ہلاکت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا کا نتیجہ تھا اس لیے واضح قرینہ کا تقاضا یہی ہے کہ ترہیب کے لیے قریب ترین معجزۂ ہلاکت کو پیش کیا جائے۔ اس صورت میں فقد مضت سنۃ الاولین میں اوّلین سے مقتولین بدر مراد ہوں گے۔ اگر تعبیر یہ ہوتی کہ فَقَدْ مَضَتْ سُنَّۃُ مَنْ قَدْ اَرْسَلْنَا قَبْلَکَ مِنْ رُّسُلِنَا تو پھر انبیاء کی سنت مراد ہوتی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ بدر کی صورت میں جو عذاب ہلاکت آیا ہے اسے تم دیکھ چکے ہو اگر آئندہ اسلام اور نبوت کے خلاف تم نے اپنے معاندانہ طرزِ عمل کا اعادہ کیا تو تمہارے ساتھ بھی وہی سلوک ہوگا جو بدر والوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔

مسلح جہاد کا اوّلین مقصد

۳۹۔ اور مسلمانو! تم ان سے لڑتے رہو تا آنکہ فتنہ نہ رہے۔ یعنی کافروں کا زور نہ رہے کہ ایمان سے روک سکیں یا مذہب حق کو موت کی دھمکی دے سکیں جیسا کہ تاریخ شاہد ہے کہ جب بھی کفار کا غلبہ ہوا مسلمانوں کا ایمان اور مذہب خطرہ میں پڑ گیا۔ اسپین کی مثال دنیا کے سامنے ہے کہ کس طرح قوت اور موقع ہاتھ آنے پر مسلمانوں کو تباہ کیا گیا یا مرتد بنایا گیا۔ بہرحال جہاد و قتال کا اوّلین مقصد یہ ہے کہ اہل اسلام مامون و مطمئن ہو کر خدا کی عبادت کر سکیں۔ اور دولت ایمان و توحید کفار کے ہاتھوں سے محفوظ ہو۔ چنانچہ فتنہ کی یہی تفسیر ابن عمر وغیرہ صحابہ رضی اللہ عنہم سے کتب حدیث میں منقول ہے [1]

حضرت شیخ الاسلام نے شارحین قرآن کی عام شاہراہ سے ہٹ کر یہاں فتنہ کی تشریح فرمائی ہے۔ حافظ ابن جریر نے اپنی تفسیر میں فتنہ کی تشریح شرک سے کی ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

اور حافظ ابن کثیر نے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔ قاضی بیضاوی، علامہ محمود آلوسی، علامہ شوکانی، علامہ نیشاپوری اور دوسرے شارحین قرآن حضرت مولانا اشرف علی، مفتی محمد شفیع صاحب، مولانا احمد سعید، مولانا عبدالماجد دریا بادی نے بھی یہی تفسیر اختیار کی ہے۔ غالباً سب سے پہلے حضرت مولانا شاہ عبدالقادر نے موضح القرآن میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے بتایا تھا کہ:

لڑو جب تک فساد نہ رہے یعنی کافروں کا زور نہ رہے کہ ایمان سے روک سکیں۔

اسی کی پیروی مولانا عثمانی نے اپنی تشریحات میں کی ہے۔ دراصل فتنہ قرآن و سنت کا ایک اصطلاحی لفظ ہے اور اس کا مطلب یہ ہے کہ ظالموں کی دستبرد کی وجہ سے مسلمانوں کی زندگی کا امن و سلام محفوظ نہ رہے۔ آزادی سے کوئی اللہ کی عبادت نہ کر سکے اور لوگوں کو اسلام پر چلنے سے روکا جائے۔ یہ خواہ مشرکین و کفار کے تسلط سے ہو یا خود اہل ایمان اس طرح انتشار کا شکار ہو جائیں کہ حق و باطل کی تمیز باقی نہ رہے اور صلاح کا قدم اٹھانا اُلٹا فساد کا باعث ہو جائے۔ عبداللہ بن عمر سے جب مشاجرات صحابہ میں جنگ کی شرکت کے لیے کہا گیا اور آپ کے سامنے قرآن کی یہی آیت تلاوت کی گئی تو آپ نے فرمایا کہ فتنوں کو فرو کرنے کے لیے جو جنگ تھی وہ تو ہم نے کی ہے۔ اب تم اس جنگ کا آغاز کر رہے ہو جس سے اور فتنے پیدا ہوں گے۔ اپنی مادی اور روحانی طاقت کا اندازہ کیے بغیر فتنوں سے زور آزمائی کرنا صرف ایک جذباتی طرز عمل ہے۔ اور فتنوں کو کچلنے کے لیے پہلے سامان مہیا کر لینا عقل کا فیصلہ ہے۔ جذبات جب نتائج سے یکسر خالی ہوں تو وہی ناکامی کا پیش خیمہ ہوتے ہیں۔ اسی طرح جب عقل جذبات سے بیگانہ ہو جاتی ہے تو وہ بھی صرف دماغی فلسفہ بن کر رہ جاتی ہے کامیابی کا راز جوش کے ساتھ ہوش میں پنہاں ہے۔

بہر حال فتنہ سے مراد کفار کا وہ زور ہے جس کے ذریعے اہل ایمان کو ان کی مرضی کی اسلامی زندگی اپنانے سے روکتے تھے فرمایا کہ ان سے جنگ کرو اور یہ یہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ روئے زمین سے اس فتنہ کا استیصال ہو جائے

کسی کے لیے اس کا کوئی امکان باقی نہ رہ جائے کہ وہ کسی مسلمان کی اسلامی زندگی میں رکاوٹ بن سکے۔ اگر لوگوں کو اسلامی زندگی گزارنے کا حق نہ دیا جائے اور اپنے معبودِ حقیقی کی بندگی سے اپنے زور سے روکا جاتے تو یہ اتنا بڑا ظلم ہے جس سے بڑا ظلم اور کوئی نہیں ہو سکتا حتیٰ کہ ناحق خون کی بھی اس کے مقابلے میں کوئی قیمت نہیں ہے کیونکہ اگر کسی کی جان لے لی گئی تو اس کا مطلب زیادہ سے زیادہ یہ ہے کہ اسے دنیا کی چند روزہ بہار سے محروم کر دیا گیا لیکن اگر کسی سے اس کی خدا پرستی لے لی گئی اور اپنے رب کا بندہ بننے سے اسے روک دیا گیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس کی اصل زندگی ہی تباہ کر دی گئی اور اسے آخرت کی ابدی نعمتوں سے محروم کر دیا گیا۔ بلاشبہ دونوں ہی چیزیں ناپسندیدہ ہیں لیکن جب ان دو ناپسندیدہ چیزوں میں سے کسی ایک کو منتخب کرنا پڑے تو ایک احمق بھی پہلی کے مقابلے میں دوسری کا انتخاب نہ کرے گا اس لیے قرآن عزیز جب یہ کہتا ہے کہ والفتنۃ اشد من القتل تو یہ ایک ایسی بات فرماتا ہے جس کی صداقت میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ اگر اس بات میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں، کوئی وجہ نہیں ہے کہ اپنی جانیں دے کر اور دوسروں کی جانیں لے کر اگر اسلام کے راستے کی جبری رکاوٹیں دور کر دی جائیں تو اس کے بہتر ہونے میں دو رائیں ہو سکیں۔

یہ بھی یاد رہے کہ یہ زور اور غلبہ خالص کفر کی جانب سے ہو یا نام مسلمانوں میں فسق و فجور کی جانب سے ہو دونوں فتنے ہیں اور دونوں کا استیصال جہاد کا اولین مقصد ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر خود مسلمانوں میں فسق و فجور آ جائے اور فسق و فجور پر مبنی اقتدار قائم ہو اور یہ اقتدار مسلمانوں کی اسلامی زندگی اور خدا کی بندگی میں رکاوٹ ہو تو اس فتنہ کا استیصال بھی مسلمانوں کے فرائض میں داخل ہے۔ اگر اس کی استطاعت نہیں رکھتے تو عافیت اس میں ہے کہ ان سے کنارہ کش رہیں۔ بیگانوں میں نہیں لیکن بیگانوں کی حد تک فتنوں کی ذات میں خود بڑی کشش ہوتی ہے۔ بے دین ناسمجھی سے ان کو دین سمجھ کر ان کی طرف کھنچے چلے جاتے ہیں۔ اور دیندار طبقہ حالات کے تحت ان میں شرکت پر مجبور ہو جاتا ہے۔ یہ فتنہ شرک و کفر، بدعت و الحاد، تحریف و تبدیل، فسق و فجور، عریانی و بے حجابی کے مختلف روپ بدل کر آتا ہے۔

ترک صلاۃ، ترک صوم، ترک زکوٰۃ، عبادتِ قبور یہ سب اپنی اپنی جگہ فتنے ہیں۔ ان کی مثال متعدی امراض کی ہوتی ہے جو فضائے عالم میں دفعتہً پھیل جاتے ہیں۔ صحیح بخاری و مسلم میں حضرت ابوسعید خدری کے حوالہ سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے :

وہ زمانہ قریب ہے جبکہ مسلمان کے لیے سب سے بہتر مال چند بکریاں ہوں گی جنہیں لے کر وہ اپنے دین کو فتنوں سے بچانے کے لیے پہاڑوں کی چوٹیوں میں اور جنگلوں میں بھاگ جائے گا۔

اس سے معلوم ہوا کہ فتنوں کے سیلاب میں گھٹیا صحت ایمان کی نشانی نہیں بلکہ لاپروائی کی بات ہے۔ عافیت اسی میں ہوتی ہے کہ اس فضا سے نکل جائے۔ اس حقیقت پر امام بخاری نے ایک مستقل باب قائم کر کے متنبہ کیا ہے۔

اسلام میں جنگ کا آخری مقصد

۵۰۔ اور دین سارے کا سارا اللہ کا ہو جائے۔ یہ جہاد کا آخری مقصد ہے کہ کفر کی شوکت نہ رہے حکم اکیلے خدا کا چلے۔ دینِ حق سب ادیان پر غالب آجائے لیظھرہ علی الدین کلہ خواہ دوسرے باطل ادیان کی موجودگی میں۔ جیسے خلفائے راشدین کے عہد میں ہوا یا سب باطل مذاہب کو ختم کر کے، جیسے نزولِ مسیح کے وقت میں ہوگا۔ بہرحال یہ آیت اس کی واضح دلیل ہے کہ جہاد و قتال خواہ ہجومی ہو یا دفاعی، مسلمانوں کے حق میں اس وقت تک برابر مشروع ہے۔ جب تک یہ دونوں مقصد حاصل نہ ہو جائیں۔ اسی لیے حدیث میں آتا ہے [الجھاد ماض الی یوم القیامۃ][1] حافظ ابن کثیر نے اس آیت کی تشریح میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے دو ارشاد مبارک پیش فرمائے ہیں۔ لیجئے آپ بھی استفادہ فرمالیجئے :

حضرت ابوہریرہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں اللہ کی جانب سے مامور ہو کر آیا ہوں کہ لوگوں سے جنگ

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

کرتا رہوں یہاں تک کہ لوگ اقرار کر لیں کہ اللہ کے سوا بندگی کے لائق کوئی نہیں
اور مجھے اللہ کا رسول مان لیں اور میں جو خدا کی جانب سے کتاب لے کر آیا
ہوں اسے مان لیں۔ جب وہ یہ عہد کر لیں تو وہ ان کی جانیں اور اپنے اموال
میری جانب سے محفوظ ہوں گے ہاں جو بازپرس اسلامی قانون کرے گا
وہ اپنی جگہ حق ہے باقی ان کے باطن کا حساب اللہ کے حوالے ہے۔

اس حدیث کے مختلف الفاظ ہیں۔ بعض میں صرف توحید کا ذکر ہے بعض میں توحید کے ساتھ رسالت کا بھی ذکر ہے اور کچھ میں توحید و رسالت کے ساتھ نماز اور زکوٰۃ کا بھی تذکرہ ہے۔ یہ سب ایک ہی مقصد کی مختلف تعبیرات ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جب تک حضورؐ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لائے ہوئے تمام دین کو تسلیم نہ کیا جائے ایمان حاصل نہیں ہوتا۔ اس بات کی طرف کہیں تو دو مشہور ارکان نماز، روزہ، ذکر کر کے اشارہ کر دیا۔ کہیں تمام دین کو شہادتین کے پیمانہ میں پیش کر دیا ہے اور کہیں یہ دیکھ کر کہ صحیح توحید رسولؐ پر ایمان لائے بغیر مکمل نہیں ہوتی صرف کلمہ پر اکتفا کر لیا۔ مدعا سب کا ایک ہے یعنی پورے دین اسلام کی تصدیق و پذیرائی۔

اصل ارشاد میں الدین کلہ للہ آیا ہے۔ اس میں دو باتیں سمجھنے کی ہیں۔ ایک یہ کہ قرآن کی زبان میں دین کن معنوں میں آیا ہے، دوسرے یہ کہ دین کی کلہ سے تاکید کیوں کی گئی ہے۔ الدین کلہ کا مطلب ہے سارا دین، سارے دین سے کیا مقصود ہے ادھورا دین کیا ہوتا ہے۔

دین قرآن میں ایک معنے میں نہیں بلکہ ایک سے زیادہ معنے میں آیا ہے۔ یہ دان یدین کا مصدر ہے اس کے چار معنے ہیں:

۱۔ غلبہ و اقتدار، حکمرانی و فرمانروائی جیسے دان الناس
۲۔ اطاعت، بندگی جیسے دنت الرجل۔ تدین لهم بها العرب
۳۔ شریعت و قانون جیسے کانت قریش ومن دان بدینهم
۴۔ جزاء، بدلہ۔ کما تدین تدان

قرآن میں یہ لفظ ان چاروں معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ آیت کے معنے یہ ہوں گے، کہ دین سارا کا سارا اللہ کا ہے یعنی نظام زندگی سب کا سب اللہ کا ہو اس میں

کسی قسم کی کوئی پیوند کاری نہ ہو۔ سب کا سب دین اللہ کا ہو۔ اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ غلبہ، اقتدار، حکمرانی اور فرمانروائی اللہ کی ہو، اطاعت و بندگی زندگی کے مختلف گوشوں میں صرف اللہ کی ہو، شریعت و قانون ہمارے لیے صرف اللہ کا ہو۔ جزاء و سزا صرف اللہ کی ہو۔ اس اعتبار سے غور کیجیے کہ قرآن و سنت نے اللہ سبحانہ کا تصور کیا قائم کیا ہے اور انسان کی ذات اور کائنات سے اس کے تعلق نیز اس کی تعدیہ کی نسبت نبوت کا نظریہ کیا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے سارا ملک اور اقتدار اللہ سبحانہ کا ہے۔ قل اللھم مالک الملک توتی الملک من تشاء کہہ دو اے اللہ ملک کے مالک تو ہی ہے جسے چاہتا ہے حکومت عطا کرتا ہے۔ انسان کی حیثیت اس زمین میں اللہ کے خلیفہ کی ہے جسے ایک مکمل قانون حوالہ کر کے اس لیے روانہ کیا ہے کہ وہ اس قانون کو خود اپنی زندگی اور معاملات کے لیے مشعلِ راہ بنائے اور دوسروں کو بھی اسی قانون کے مطابق چلانے کی کوشش کرے۔ اس کام کے لیے اسے کچھ تھوڑے بہت اختیارات بھی تفویض کیے گئے ہیں۔ اور اسی مقصد کے حصول کی خاطر کائناتِ خارجی اور اس کی لاتعداد قوتوں کو انسان کا خادم بنا دیا گیا ہے کہ وہ ان کو جس طرح چاہے کام میں لائے۔ انسان اس لیے نہیں ہے کہ وہ خارج کا بے بس غلام بن کر رہے۔ اس کا شرف و امتیاز یہ ہے کہ وہ خارج اور اس کی قوتوں پر اپنے ارادے کو موثر کرے اور جس کا خلیفہ بن کر آیا ہے اس کی ذات و صفات سے قرب پیدا کرے تاکہ اس کی ذات، ذاتِ الٰہی کا پرتو بن جائے۔ حضور اقدس کا ارشاد ہے تخلقوا باخلاق اللہ۔ اللہ کی ذات سے یہ ہرگز مراد نہیں کہ وہ انسانوں کی طرح جسم اور اس کے لوازم سے آلودہ ہے۔ شاہ عبدالعزیز فرماتے ہیں اللہ کی ذات جسم اور جسمانیت سے پاک ہے۔ اس کے قرب کا ذریعہ صرف اس کی یاد اور اس کی طاعت ہے۔ یاد سے مراد پرستش اور طاعت سے مراد بندگی ہے یعنی خدا کا قرب حاصل کرنے کی صرف دو راہیں ہیں ایک پرستش اور دوسرے بندگی۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ پرستش اور بندگی جو دین ہے یہ صرف اللہ کی ہو۔ یہ تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے کہ نبیوں کی امتوں نے ان دونوں میں ہم آہنگی قائم نہیں رکھی۔ دین کے نام پر پرستش کو لے لیا اور بندگی کو خیرباد کہہ دیا حالانکہ روزِ ازل سے اسلام کی

گاڑی کے دو پہیئے ہیں اور ان دونوں میں یگانگت قائم رکھی گئی ہے۔ عموماً پرستش کی زندگی تک دین کا نام استعمال کیا گیا ہے اور بندگی کے دائرے کو دنیا کہہ دیا گیا۔ قرآن نے دین میں یہودیوں کے جس تفرق کی نشاندہی کی ہے وہ یہی ہے۔ اور اسی تفرق سے قرآن نے امتِ اسلامیہ کو روکا تھا واعتصموا بحبل اللّٰہ جمیعاً ولا تفرقوا۔ یہاں تفرق سے فرقہ بندی نہیں بلکہ دین کے اسی حصے بٹ جانا مراد ہے اور اس کی طرف قرآن نے یہ کہہ کر مسلمانوں کی رہنمائی کی تھی یا ایہا الذین اٰمنوا ادخلوا فی السلم کافۃ اس آیت میں کافۃ السلم کا حال ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پورے اسلام میں داخل ہو ادھورے اسلام میں نہ داخل ہو۔ یہ نہ ہو کہ صرف اللّٰہ کی پرستش کرو اور بندگی میں اللّٰہ سے تمہارا کوئی تعلق نہ ہو۔ یہی ادھورا اسلام یعنی پرستش کو اپنانا اور بندگی کو خیر باد کہنا۔ پھر قرآن نے یہودیوں کو یہ کہہ کر ڈانٹا تھا کہ :

افتومنون ببعض الکتاب وتکفرون ببعض۔

کیا تم کتابِ الٰہی کی کچھ پر ایمان رکھتے ہو اور کچھ کا انکار کرتے ہو۔

یہی بات آج مسلمانوں پر صادق آتی ہے۔ ان سے بھی یہی پوچھا جا سکتا ہے کہ کیا تم کُتِبَ عَلَیکُمُ الصِّیَامُ پر ایمان رکھتے ہو اور کُتِبَ عَلَیکُمُ القصاص پر ایمان نہیں رکھتے ہو۔ اسلام پرستش اور بندگی دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ آیت میں الدین کے ساتھ کلہ کا اضافہ یہ بتلانے کے لیے کیا ہے کہ پرستش اور بندگی دونوں کا سارا کا سارا مجموعہ جب تک صرف اللّٰہ کے لیے نہ ہو جائے تم اس وقت تک جنگ کرتے رہو۔ یہی اسلامی جنگ کا آخری مقصد ہے۔ اولین مقصد یہ ہے کہ دنیا سے کفر کا زور ختم ہو جائے، ہر قسم کا فساد مٹ جائے۔ اخلاقی، معاشرتی، خاندانی، معاشی، سیاسی اور روحانی فسادات میں سے کوئی فساد باقی نہ رہے۔ اور آخری مقصد یہ ہے کہ پرستش اور بندگی میں عابدانہ تعلقات اللّٰہ کے بندوں کے صرف اللّٰہ سے ہو جائیں اور بس۔ اگر صورتِ حال یہی ہے اور کیوں نہ ہو جب کہ سفینۂ قرآن سے اُبلی ہوئی صدا یہی ہے، تو پھر انسانیت کا کوئی مسئلہ نہیں جو اسلام کے دائرے سے باہر ہو۔ وہ بندگی و پرستش پر مبنی ایسا دین ہے جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا

ہے۔ مسجد میں بھی، گھر میں بھی، برادری میں بھی، بازار میں بھی، خانقاہ میں بھی، عدالت میں بھی، تعلیم گاہ میں بھی، حکومت کے ایوانوں میں بھی، زندگی کی ہر شاخ میں وہ رہنمائی کرتا ہے۔ مختصر یہ کہ وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری، اخلاقی، انتظامی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، قانونی اور روحانی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے۔ کچھ اسی طرح جس طرح ہوا کا کرہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔

جنگ کے دو گونہ مقاصد اور فقہا

اسلام کے قانون دان طبقہ نے مسلح جہاد کے ان دو مقاصد کے پیش نظر جہاد کی تشریح میں دو جامع لفظ بولے ہیں۔ اعلاء کلمۃ اللہ اور دوسرا دفع الشر عن العباد اور بتایا ہے کہ جہاد کی فرضیت کی غایت یہی دو چیزیں ہیں۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں۔

جہاد فرض ہوا ہے اعزاز دین اور عام انسانی زندگی سے برائی کو ہٹانے کے لیے۔

صاحب نہایہ لکھتے ہیں کہ آیت زیر تشریح میں ان دونوں باتوں کی طرف اشارا ہے لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ سے دفع الشر عن العباد اور یکون الدین اللہ میں کلمۃ اللہ سے اعزاز دین اللہ مراد ہے۔ ان ہی مقاصد کو پیش نظر اسلام کے قانون دان طبقہ نے قانونی حیثیت سے بین الاقوامی ضابطہ کی تشکیل کی ہے اور بتایا ہے کہ اسلام کے سامنے دنیا کی تمام قوموں کی تین قسمیں ہیں۔

اول مشرکین عرب ان کے لیے صرف دو صورتیں ہیں اسلام یا تلوار۔ اس آیت میں روئے سخن ان کی طرف ہے۔

دوم، اہل کتاب یعنی ان کتابوں کے پیروکار جن کے نام قرآن میں آئے ہیں۔ مثلاً عیسائی اور یہودی۔ ان کے لیے تین صورتیں ہیں۔

الف، اسلام قبول کرلیں۔

ب، اسلام قبول نہیں کرتے تو اسلامی مملکت کے شہری بن جائیں۔

ج، اگر اسلامی مملکت کے شہری نہیں تو مصالحت کرلیں۔

اسلامی مملکت کا شہری بننے کی صورت میں ان سے ٹیکس لیا جائے گا اور ان کی جانوں، مالوں، ان کے معابد کی حفاظت کی جائے گی۔

سوم، شبہ اہل کتاب یعنی وہ لوگ جو تورات، انجیل اور زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابئی وغیرہ، مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے، ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے۔ ان دو باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے بقیہ حقوق اسلام نے ان کو عطا کیے ہیں۔

ان آیات قرآنی میں قتال کی بحث صرف مشرکین عرب اور قریش سے ہے اسی روشنی میں ان کا مطالعہ کرنا چاہیے۔ اس آیت کی تشریح البقرہ میں گزر چکی وہاں نوٹ نمبر ۵۵۴ کا ضرور مطالعہ کرنا چاہیے۔

قانونی طور پر اسلام کا فیصلہ

۵۱۔ پس اگر وہ باز آجائیں تو وہ جو کچھ کریں گے اللہ کی نگاہ میں ہیں۔ یعنی جو ظاہر میں اپنی شرارت اور کفر سے باز آجائیں ان سے قتال نہیں۔ ان کے دلوں کا حال اور مستقبل کی کیفیات کو خدا کے سپرد کیا جائے گا۔ جیسا وہ کام کریں گے خدا کی نگاہ سے غائب ہو کر نہیں کر سکتے۔ مسلمان صرف ظاہر حال کے مطابق عمل کرنے کے مکلف ہیں وفی الحدیث۔

امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ فاذا قالوا ھا عصموا منی دماءھم واموالھم الا بحقھا وحسابھم علی اللہ عزو جل ہلہ

میں اس بات پر مامور ہوں کہ اس وقت تک برابر جنگ جاری رکھوں تا آنکہ وہ اس کی گواہی دیں کہ اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم بلاشبہ اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کریں، زکوٰۃ ادا کریں۔ جب وہ ان احکام کو مان لیں تو اب مجھ سے وہ اپنی جان و مال کو بچا لیں گے ہاں بجز اس صورت کے جو اسلامی قانون کے تحت ہو، اس کے بعد ان کا معاملہ اللہ

لہ افادات شیخ الاسلام

کے پیش نظر ہے۔ وہ جانتے کہ ان کا اسلام نمائشی ہے یا واقعی۔
آیت کا روئے سخن مشرکین عرب کی طرف ہے۔ انتہوا کا متعلق محذوف ہے۔
مطلب یہ ہے کہ اگر اپنی کافرانہ اور مشرکانہ روش سے باز آجائیں یعنی اسلام قبول
کرلیں تو پھر ان سے کوئی جنگ نہیں بلکہ وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ سورہ توبہ میں
یہ بات کھول کر کہہ دی گئی ہے فان تابوا و اقاموا الصلاۃ فاخوانکم فی الدین۔
باقی رہا یہ سوال کہ ان کا اسلام نمائشی ہے یا واقعی، اس کے جواب میں ارشاد ہوا کہ
یہ دیکھنا تمہارا کام نہیں ہے، یہ اللہ کا کام ہے کیونکہ ان کے اعمال یہ اللہ کی نگاہ
ہے۔ تمہیں اس اندیشہ سے بالا ہونا چاہیے۔ یہ آیت کریمہ روئے زمین کے سارے
کافروں کے بارے میں نہیں بلکہ صرف مشرکین عرب کے بارے میں ہے۔ فقہاء احناف
اور اکثر تابعین کا یہی خیال ہے۔ قرطبی نے، ابو حیان اندلسی نے اور علامہ آلوسی
نے اسی کو اپنایا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ بیت اللہ کی تعمیر ملت ابراہیم کے مرکز
کی حیثیت سے ہوئی ہے۔ یہ گھر اللہ سبحانہ کی عبادت کے لیے تعمیر ہوا۔ قریش نے
اس گھر کے تمام مقاصد کو برباد کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کی دعا کے مطابق
جب اپنا آخری پیغمبر روانہ کیا تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ ان سے جنگ کرو اور
یہ جنگ جاری رکھو یہاں تک کہ پورے علاقہ میں اللہ کے دین کے علاوہ یعنی
اسلام کے علاوہ کوئی دین باقی نہ رہے۔ اسی بات کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ
وسلم نے یوں تعبیر فرمایا ہے کہ اس سرزمین پر دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔

ایک اہم سوال

شاید آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ دنیا کی تمام قوموں سے الگ مشرکین عرب
سے جنگ کے موضوع پر یہ امتیاز کیوں رکھا گیا ہے کہ سب کو اسلام کی، اسلام
کی شہریت کی اور محارب ہونے کی رعایت دی گئی ہے جبکہ عرب کے مشرکین
کو صرف اسلام اور جنگ دو صورتوں میں ایک صورت اختیار کرنے کو کہا گیا ہے
اور وں کا پتہ نہیں میں جو کچھ سمجھا ہوں وہ یہ ہے کہ کوئی نظریاتی امت زندہ
نہیں رہ سکتی جب تک کہ اس کا کوئی مرکز نہ ہو۔ کوئی تعلیم باقی نہیں رہ سکتی جب

تک اس کی قائم و جاری درسگاہ نہ ہو۔ کوئی دریا نہیں جاری رہ سکتا جب تک ایک سرچشمہ سے اس کا یگانگت نہ ہو۔

نظامِ شمسی کا ہر ستارہ روشنی اور حرارت صرف اپنی مرکزِ شمسی ہی سے حاصل کرتا ہے۔ اسی کی بالاتر جاذبیت ہے جس نے یہ پورا کارخانہ سنبھال رکھا ہے۔ یہی قانونِ الٰہی ہے جس پر اس کی شریعت کے تمام اجتماعی احکام مبنی ہیں۔ لہٰذا جیسے قرآن نے اُمت کے لقا اور حق و ہدایت کے لیے طرح طرح کے مرکز بنائے ایسے ہی ایک زمینی مرکز بھی قیامت تک کے لیے ضروری تھا۔

قرآن نے اس غرض کے لیے سرزمینِ حجاز کو منتخب کیا۔ یہی ناف زمین دُنیا کی آخری اور دائمی ہدایت کے لیے مرکزی چشمہ اور روحانی درسگاہ قرار پائی۔ چونکہ حجاز سرزمینِ عرب میں واقع ہے اس لیے تمام سرزمینِ عرب بھی اس حکم میں داخل ہو گئی۔

مرکزِ ارضی کا مطلب یہ ہے کہ اسلام کی دعوت ایک عالمگیر اور دُنیا کی بین الاقوامی دعوت تھی۔ وہ کسی خاص ملک میں محدود نہ تھی مسلمانوں کی قومیت کے اجزاء ساری دُنیا میں پھیل جانے والے تھے۔ ان بکھرے ہوئے افراد کو ایک رشتہ تسبیح میں منسلک رکھنے کے لیے ضروری تھا کہ ایسی کوئی جگہ مخصوص ہو جو ان بکھرے ہوئے افراد کے لیے مرکزی نقطہ ہو۔ سارے منتشر افراد وہاں پہنچ کر سمٹ جائیں تمام پھیلی ہوئی شاخیں وہاں اکٹھی ہو کر جڑ جائیں۔ ہر شاخ کو اس جڑ سے زندگی ملے۔ ہر نہر اس سرچشمہ سے سیراب ہو۔ ہر ستارہ اس سورج سے روشنی لے۔ ہر انتشار کو اس سے اتحاد و یگانگت ملے۔ یہی مقام ساری اُمت کی تعلیم و ہدایت کے لیے ایک بین المللی درسگاہ ہے۔ یہی تمام روئے زمین پر پھیلی ہوئی اہل ایمان کی کثرت کے لیے نقطۂ اتحاد ہے۔ اگر تمام دُنیا انسانوں کی باہمی کشمکش اور فتنہ و فساد سے دوزخ بن جائے تو یہ ایک پاک و مقدس جگہ ایسی ہے جو ہمیشہ امن و رحمت کی بہشت ہے۔ اس کا ایک ایک چپہ مقدس ہے، اس کا ایک ایک کونہ اللہ سبحانہٗ کے مقدس نام پر محترم ہے۔ اس کا ایک ایک ذرہ اس کے جلال و قدوسیت کا جلوہ گاہ ہے۔ دُنیا پر کفر و شرک کے جماؤ اور راٹھان کا کیسا ہی سخت سے سخت وقت آجائے مگر وہ سچی توحید اور مخلصانہ عبادتوں کا ایسا گھر ہے جہاں اللہ سبحانہٗ

اور اس کی صداقت کے سوا کسی کو خیال بھی نہیں آتا۔

شاخوں کی شادابی جڑ پر موقوف ہے۔ درختوں کی جڑ اگر سلامت ہے تو شاخوں اور پتوں کے مرجھانے سے باغ اجڑ نہیں سکتا۔ دس ٹہنیاں کاٹ دی جائیں تو بیس نئی نکل آئیں گی۔ اسی طرح امت کا اگر مرکز ارضی محفوظ ہے تو اس کے بکھرے ہوئے ٹکڑوں کی بربادی سے امت نہیں مٹ سکتی۔ جس طرح اہل ایمان کی اجتماعی زندگی کے لیے خلافت امامت کو مرکز بنایا ہے۔ ٹھیک اسی طرح امت کے زمینی پھیلاؤ اور پھیلاؤ کے لیے ابراہیمی عبادت کدہ یعنی کعبہ کو اس کی سرزمین حجاز اور اس کے ملک جزیرہ عرب کو دائمی مرکز قرار دیا۔ قرآن کی آیت جعل اللہ الکعبۃ البیت الحرام قیاما للناس اور واذ جعلنا البیت مثابۃ للناس وامنا اور حیث ما کنتم فولوا وجوھکم شطرہ کا یہی مطلب ہے

زیر تشریح آیت میں بتایا گیا کہ اگر مشرکین عرب کفر و شرک سے اور اسلام کے خلاف باغیانہ روش سے باز آجائیں تو اللہ سبحانہ ان کی ماضی کی غلطیوں کو نہ دیکھے گا بلکہ ان کے مستقبل کے اعمال کو دیکھے گا اگر وہ واقعی ہوئے تو جزا دے گا اور اگر نمائشی ہوتے تو سزا دے گا۔ اس لیے مسلمانو! تمہیں ہر حال میں ان کے اسلام کو قبول کر لینا چاہیے۔ جو شخص زبان سے اعلان کرتا ہے تو مان لینا چاہیے۔ جیسے کسی چیز کے وجود کی تین صورتیں ہوتی ہیں لفظی، ذہنی اور عینی ایسے ہی ایمان کے وجود کی بھی تین صورتیں ہیں۔ ایمان کا لفظی وجود اس کا زبان سے اقرار کرنا ہے۔ حافظ ابن تیمیہ کتاب الایمان میں لکھتے ہیں کہ اسلام کے ثبوت کا دارومدار کسی ایسی چیز پر ہونا چاہیے جس کا علم یکساں طور پر سب کو ہو سکے اس لیے کلمۂ توحید کا اقرار زبانی ہی کو اسلام قبول کرنے کا معیار بنا دیا گیا اور اسی ایک کلمہ پر جنگ کے آغاز و خاتمہ کو بنیاد و اساس کی حیثیت دے دی ہے پہلے ارشاد نبوت سن چکے ہو امرت ان اقاتل الناس حتی یقولوا لا الٰہ الا اللہ۔ یہ نبوت کے نظام حیات کی بہت بڑی فیاضی ہے کہ صرف زبانی اقرار کو جان و مال اور آبرو کی عصمت میں ضمانت بنا دیا جائے۔ دنیا کا کوئی نظام بھی یہ رعایت نہیں دیتا۔ لیکن یہ نہیں سمجھ لینا چاہیے کہ اسلام میں ایمان کے وجود عینی اور ذہنی

کے بغیر صرف لفظی وجود کوئی حیثیت رکھتا ہے کیونکہ قلبی تصدیق ایمان کا وہ اہم رکن ہے جو ایک لمحہ کے لیے بھی کبھی نظرانداز نہیں کیا جا سکتا ہے، تا آنکہ اگر جان بھی جارہی ہو زبان سے کلمہ کفر کہنے کی صرف اس شرط پر اجازت ہے کہ قلب کی گہرائیاں اذعان و یقین سے معمور رہیں۔

الا من اکرہ وقلبہ مطمئن بالایمان

یہ صرف نبوت کا نظام ہے جو یہ دعوت دیتا ہے کہ اپنے حریفوں کی زبان پر بھی اعتماد کرلو۔ اور یہ فکر نہ کرو کہ ان کے دل میں کیا ہے۔

ایک بار صحابہ کرام نے ایک کافر کو بکریاں چراتے دیکھا۔ دوران جنگ ہر فریق گھات میں لگا رہتا ہے۔ صحابہ کرام نے چاہا کہ اس کی بکریاں چھین لیں۔ مدمقابل نے اپنا پانسہ کمزور دیکھا، مسلمان ہونے کا اعلان کر دیا۔ لیکن اس وقت میں دشمن کا اقرار وفاداری کب قبول کیا جا سکتا ہے۔ اس لیے صحابہ نے یہ سمجھ کر کہ یہ بچاؤ کا طریقہ ہے اس کی بکریاں لے لیں۔ اس واقعہ کی اہمیت اتنی محسوس کی گئی کہ خود اللہ سبحانہ نے دست اندازی فرمائی تنبیہہ انداز لہجہ میں وحی آئی۔

لا تقولوا لمن القیٰ الیکم السلام لست مومنا

حدیث کی کتابوں میں اس قسم کے واقعات ایک دو نہیں بہت ہیں جہاں ایمان کے صرف لفظی وجود یعنی اقرار کو دنیوی احکام کے لیے ضروری سمجھ لیا گیا۔

موقعہ کی نزاکت کے پیش نظر حضرت امام بخاری نے کتاب الایمان میں اپنے فقہی مسلک کو ایک عنوان قائم کرکے سمجھایا ہے۔

اذا لم یکن الاسلام علی الحقیقۃ وکان علی الاستسلام۔
او الخوف من القتل لقولہ تعالیٰ، قالت الاعراب آمنا
قل لم تومنوا ولکن قولوا اسلمنا۔

شارحین بخاری اس کے مطلب میں دور کی وادیوں میں نکل گئے۔ کسی نے اس سے ایمان و اسلام کا تغایر اور کسی نے اتحاد سمجھا۔ کسی نے اسلام حقیقی اور مجازی کی بحث چھیڑ دی اور کسی نے اسلام لغوی اور اسلام شرعی کی بات بتائی۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ حضرت امام بخاری صرف یہ بتاتے ہیں کہ ایک اسلام ہے اور ایک استسلام

ہے۔ اسلام یہ ہے کہ ایک شخص فی الواقع دل کی گہرائیوں سے اعتقاد و انقیاد کے ساتھ نبوت کے لائے ہوئے نظامِ حیات کو اپنائے اور استسلام یہ ہے کہ حالات کے تحت مالِ غنیمت میں لالچ یا قتل کے اندیشہ سے مسلمان بن جائے۔ پہلا اسلام واقعی اسلام ہے۔ دنیا و آخرت دونوں میں کارآمد ہے دوسرا استسلام ناآخرت میں کام آنے والا نہیں لیکن دنیا میں کارآمد ہے۔ ہم شہری زندگی میں اسے مسلمان کہیں گے اور ایسے اسلامی مملکت میں مسلمان شہری قرار دیں گے۔ علامہ سندھی نے عبارت میں اوالخوف کا معطوف علیہ کس طرح کھول کر امام بخاری کی مراد ظاہر کر دی۔ اور شارح عقیدہ سفارینی نے تو معطوف علیہ مذکور نہ ہونے کی وجہ سے امام بخاری پر یہ الزام لگا دیا کہ ان کے خیال میں خوف کی حالت کا اسلام معتبر نہیں ہے۔ حالانکہ ایسا سمجھنا درست نہیں ہے۔ صورتیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ جان بچانے کی خاطر صرف نمائشی طور پر مسلمان ہو رہا ہے۔ قلب کو اذعان و یقین کی نصیب نہیں ہے تو یہ اسلام دنیا میں معتبر ہے لیکن آخرت میں مفید نہیں ہے۔ دوسرے یہ کہ قلب یقین سے معمور ہے لیکن مسلمان عین میدان جنگ میں ہو رہا ہے تو یہ ایمان آخرت اور دنیا دونوں جگہ معتبر اور مفید ہے۔ امام بخاری ہرگز اس کے مخالف نہیں۔ اور مخالف کیسے ہو سکتے ہیں جیسا کہ تاریخِ اسلام ایسے افراد سے بھری ہوئی ہے جو تلواروں کے سائے میں مسلمان ہوتے ہیں۔ اس کے باوجود ان کا اسلام قبول ہوا۔ یہ واضح ہے کہ دین کی تبدیلی جس طرح دلائل کی بنیاد پر ہوتی ہے۔ اسی طرح دنیوی یا کسی خوف و ہراس کی وجہ سے بھی ہو سکتی ہے۔ دونوں صورتوں میں قانونی طور پر اسلام قابلِ پذیرائی ہے۔ یہاں قرآن فان اللہ بما یعملون بصیراً میں یہی بات سمجھا رہا ہے کہ دلوں کا حال تمہیں معلوم نہیں ہے۔ اگر وہ کفر و شرک سے باز آجاتے ہیں تو وہ قانونی طور پر مسلمان ہیں۔ باقی مستقبل میں اعمال تو اس کی جزا و سزا اللہ کا کام ہے۔

اہلِ ایمان کے لیے اللہ کی ولایت

۵۲- اور اگر وہ پھر جائیں تو پھر جان لو کہ اللہ سبحانہٗ تمہارا کارساز ہے

کیا ہی اچھا کارساز اور کیا ہی خوب مددگار ہے۔ یعنی مسلمانوں کو چاہیے کہ خدا کی مدد اور حمایت پر بھروسہ کر کے جہاد کریں۔ کفار کی کثرت اور ساز و سامان سے مرعوب نہ ہوں، جیسے جنگ بدر میں دیکھ چکے ہو کہ اللہ سبحانہٗ نے مسلمانوں کی کیا خوب امداد و حمایت کی [لہ] مطلب یہ ہے کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو پھر تمہیں اس یقین کے ساتھ ان کا مقابلہ کرنا چاہیے کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے بگڑے حالات بنانے والا اور آڑے وقت میں تمہاری مدد کرنے والا ہے۔ تمہیں ان کی عددی طاقت اور ان کے سر و سامان کی بہتات سے ہراساں نہیں ہونا چاہیے اللہ سبحانہٗ نے جیسے اب تک تمہاری نصرت فرمائی ایسے ہی آئندہ بھی تمہاری مدد کرے گا۔ وہ بہترین کارساز ہے۔ اپنی مشکلات جو اس کو اپنا ملجا و ماویٰ بناتے ہیں وہ ان کو کبھی مایوس نہیں کرتا ہے، وہ بہترین مددگار ہے۔ حق کی امداد وہ کرتا ہے وہ کبھی ناکامیوں سے دوچار نہیں ہوتے ہیں۔ اللہ سے تمہارا عابدانہ تعلق جس قدر زیادہ مضبوط ہوگا اسی قدر اللہ کی نصرت تمہارے ہمدوش ہوگی۔ جن کا اللہ مولیٰ ہوتا ہے وہ دنیا و آخرت میں کامیاب ہوتے ہیں دُنیا میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت کسی مقصد کی خاطر جدوجہد کرتی ہے تو اس کے سامنے اُمید بھی ہوتی ہے مایوسی بھی، کامیابی بھی اور ناکامی بھی۔ لیکن قرآن بتاتا ہے کہ مومن وہ ہے جسے اللہ کی رفاقت حاصل ہے۔ اس کی جدوجہد میں اللہ کی ولایت کی وجہ سے جو کچھ ہے اُمید و کامیابی بھی ہے مایوسی اور ناکامی کی اس پر پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی۔ کیونکہ وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کے لیے کرتا ہے۔ اس کے لیے یہ بات کامیابی نہیں ہوتی کہ کسی خاص منزل تک پہنچ جائے بلکہ اس کی راہ میں چلتے رہنا اور جدوجہد میں لگے رہنا بجائے خود بڑی سے بڑی کامیابی ہے۔ وہ جب اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس لیے کہ کسی خاص منزل تک ضرور پہنچے بلکہ صرف اس لیے کرتا ہے کہ اس کے اللہ سے عابدانہ تعلقات ہیں اور اللہ اس کا مولیٰ ہے اور مولیٰ کی راہ میں چلتے رہنا ہی اس کی منزل مقصود ہے،

لہ افاداتِ شیخ الاسلام

رہ رواں را خستگی راہ نیست
عشق ہم راہ است وہم منزل است

الحمدللہ معالم القرآن کی نویں جلد ۹۶۳ صفحات پر مشتمل آج مورخہ ۱۷ صفر المظفر ۱۴۰۴ھ مطابق ۲۳ نومبر ۱۹۸۳ء بروز چہار شنبہ بوقت ۵ بج کر ۲۷ منٹ پر ختم ہوئی ۔

ربنا تقبل منا انک انت السمیع العلیم وتب علینا انک انت التواب الرحیم۔

معالم القرآن

جلد دہم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

علم وکتاب واٹس ایپ گروپ

انتساب

میں معالم القرآن کی جلد دہم کو جس میں اسلام کی اجتماعی زندگی کا بھرپور چہرہ پیش کرنے کے بعد دنیا میں اسے قائم کرنے، اس کے لیے محنت کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ بلکتی انسانیت کے فکری، اخلاقی، مابیساتی معاشی، سیاسی اور روحانی بیماریوں کا یہی واحد علاج ہے۔ اور اسلام کے ماننے والوں کے ایمان باللہ کا یہی حقیقی امتحان ہے۔ قابل صد احترام فضیلت مآب الحاج عبد الغنی صاحب زادت معالیہم اور ان کے صاحبزادگان جناب محمد اسماعیل صاحب اور جناب محمد عثمان صاحب مالکان "تاجر" گوجرانوالہ کے نام سے منسوب کرتا ہوں جن کی اسلام سے مخلصانہ ہمدردی اور اس کے لیے قربانی دریا دلی سے یہ جلد دہم زیور طباعت سے آراستہ ہو کر ہدیہ ناظرین ہو رہی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ سبحانہ اس جذبہ خیر کو تادیر سلامت رکھے اور ان کے اس مخلصانہ جذبہ سخاوت کو ان کی اولاد کے لیے برکتوں کا اور ان کے مرحوم والدین کے لیے رحمتوں کا ذریعہ بنائے اور اسے دنیا و آخرت میں ان کی کامیابی کا بہانہ کر دے۔ آمین

قاری عبد الرحمٰن ایم اے

ناظم ادارہ تعلیمات قرآن

دار العلوم شہابیہ سیالکوٹ

ملکیت ———— ادارہ تعلیمات قرآن دار العلوم الشہابیہ

عناوین ———— ۳۲۶

آیات ———— ۴۵ + ۹۲ = ۱۳۷

طابع ———— حافظ شبیر احمد عثمانی

تزئین و آرائش ———— السید انور حسین نفیس رقم

کتابت ———— محمد نواز عابد کیلانی حضرت کیلیانوالہ

ناشر ———— قاری عبدالرحمٰن ایم اے

صفحات ———— ۶۹۶

تاریخ اشاعت ———— جنوری ۱۹۸۸ء

مطبع ———— تجارت پرنٹرز ۱۴۔ ایبٹ روڈ لاہور

قیمت ———— ایک صد روپیہ

ملنے کا پتہ

ادارہ تعلیمات قرآن۔ دار العلوم الشہابیہ سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

قرآنی اصطلاحات

اَئمۃ الکفر۔ امام کی جمع ہے۔ اِمام فعال کے وزن پر امر یوم سے بنا ہے اس کے معنے ہیں جس کی اق
کی جائے۔ حدیث میں ہے انما جعل الامام لیوتم بہ امام ہوتا ہی اس لیے ہے کہ اس کی اقتدا کی جا
اَمَ کے معنے ارادہ کرنے کے آتے ہیں اس لیے من یوتم بہ جس کی اقتدا کا قصد کیا جائے امام کہلاتا ہ
کبھی نیکی اور اچھائی میں اقتدا کی جاتی ہے اور کبھی بُرائی میں۔ دونوں قسم کے رہنماؤں کو امام کہتے ہیں۔ یہاں کفر کا
بتایا ہے یہ کفر کے رہنما ہیں۔ ائمہ کفر یہاں قریش کے زعما اور قائدین کے لیے آیا ہے۔ دین کے معاملہ میں سا
عرب قریش کے تابع تھا۔ پیشوائی اور سرداری کا مقام انہی کو حاصل تھا۔ قریش کے لیے اس لقب کو اختیار کر
ان کے خلاف جہاد کی ترغیب ہے۔ کہ سارے کفر کے سرغنہ و امام یہ ہیں۔ اسلام کے خلاف طعن و طنز اور استہزا
جتنے تیر و نشتر اور جتنے ہتھیار ایجاد ہوتے تھے سب انہی کے کارخانے میں بنتے تھے۔

اِتمام: اس کے معنے پورا کرنے کے ہیں۔ پورا کرنا دو طرح کا ہوتا ہے ایک کمیت کے اعتبار سے ا
دوسرا کیفیت کے لحاظ سے۔ کمیت کے اعتبار سے اگر اجزا پورے ہوں تو تام کہلاتا ہے اور کیفیت کے لحاظ سے
اوصاف پورے ہوں تو کمال کہلاتا ہے۔ ہر کامل تمام ہوتا ہے لیکن ہر تام کے لیے کامل ہونا ضروری نہیں۔

اَثخان: ثخن سے ہے۔ اس کے معنے دشمن کو خوب اچھی طرح قتل کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ پارہ ۲۶ س
۴۷ میں آرہا ہے۔ اور میدانِ جنگ ہی کے موضوع پر ہے حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد
اما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا ذالک۔ جس میں بتایا ہے کہ حق و باطل کا مقابلہ تو رہتا ہی ہے۔ جس وق
مسلمانوں اور کافروں میں جنگ ہو جائے تو مسلمانوں کو پوری مضبوطی اور بہادری سے کام لینا چاہیے۔ باطل کا زور جب
ہی ٹوٹے گا کہ بڑے بڑے شریر مارے جائیں۔ اور ان کے جتھے ٹوٹ جائیں اس سے ہنگامہ کارزار میں کسل
بزدلی اور توقف و تردد کو راہ نہ دو۔ اور دشمنانِ خدا کی گردنیں مارنے میں کچھ باک نہ کرو۔ خوب خوں ریزی کے بعد
تمہاری دھاک بیٹھ جائے اور ان کی قوت پاش پاش ہو جائے۔ اس وقت قید کرنا بھی کفایت کرتا ہے۔

اذان: یہ اذن یاذن کا مصدر ہے لغت میں اس کے معنے اعلان اور منادی کے ہیں۔ اسی سے نماز کے اعلان کو بھی اذان کہتے ہیں۔ یہ اعلان چونکہ پکار کر اور بآواز بلند ہوتا ہے اس لیے اسے ندا بھی کہا جاتا ہے۔ یہاں اس منادی کے معنے میں ہے کہ حج کے موقعہ پر اعلان کر دیا جائے کہ اللہ اور اس کا رسول معاہدوں سے بری الذمہ ہیں معاہدوں کے خا... کے اعلان کو یہاں اذان کہا ہے۔

استطاعۃ: مادہ طوع ہے۔ قرآن میں تطوع بھی اسی مادہ سے آیا ہے طوع کے معنے خوشی سے اور رغبت ک... کے ہیں اسی سے کرھًا ناخوشی کے مقابلہ میں طوعًا خوشی سے آتا ہے استطاعۃ کے معنی ہیں ان چیزوں کا تمام و ک... پایا جانا جن کی وجہ سے کام ہو سکے۔ علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے بصائر میں محققین کی طرف نسبت کر کے یہی معنے بتا... ہیں۔ اور لکھا ہے کہ وہ چار چیزیں ہیں جن کے تمام و کمال ہونے پر استطاعت ہونا موقوف ہے۔ فاعل کے لیے خاص ح... ساخت، کام کی صورت قابلی۔ کام کی صورت مادی اور ذریعہ۔ ان میں سے اگر ایک بھی موجود نہ ہو تو استطاعت نہیں۔

اشہر الحرم: اشہر شہر کی جمع قلت ہے۔ جمع کثرت شہور آتی ہے۔ قرآن میں دونوں جمع آتی ہیں اِنّ... یعنی چار حرمت والے مہینے۔ یہ حرمت والے مہینے چار ہیں منہا اربعۃ حرم۔ حضور اقدس ﷺ کے ا... سے معلوم ہوا ہے کہ یہ چار حرمت والے مہینے محرم، رجب، ذوالقعدہ اور ذوالحجہ ہیں۔ امام نووی فرماتے ہیں کہ اس پر ام... اتفاق ہے کہ:

حرمت والے مہینے یہ چار ہیں لیکن ان کی ترتیب میں اختلاف ہے۔ اہل کوفہ ان کی ترتیب اس طرح بتاتے ہیں۔ محرم ذوالقعدہ اور ذوالحجہ۔ اس ترتیب میں چاروں مہینے ایک سال میں آتے ہیں۔ اور اہل مدینہ ترتیب یوں بتاتے ہیں ذ... ذوالحجہ محرم اور رجب۔ یہ ترتیب ارشاد نبوت سے ہم آہنگ ہے۔ الجصاص لکھتے ہیں وھی التی بینھا النـ... صلی اللہ علیہ وسلم بانھا ذوالقعدہ و ذوالحجہ والمحرم و رجب الجصاص ہی نے لکھا ہے کہ دو وجہ سے ا... کو حرمت والا قرار دیا ہے ایک کہ ان میں قتال حرام ہے دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مہینوں میں گناہوں کی سزائیں دوسرے... کے مقابلے میں زیادہ سنگینی آجاتی ہے جیسے ان مہینوں میں کی گئی طاعت دوسرے مہینوں کے مقابلے میں زیادہ قیمتی ہو جاتی

الٌّ: اس لفظ کے اصلی معنے قرابت، عہد اور حلف کے آتے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں کہ عہد حلف اور قرابہ... نمایاں حالت کا نام الٌّ ہے۔ جب کوئی چیز اس طرح چمکنے لگے کہ اس کا انکار ناممکن ہو تو اس کے لیے تئل بو... امام رازی نے اپنی تفسیر میں اس کے چھ معنی لکھے ہیں۔ مثلاً

۱۔ عہد کے معنے میں شاعر کہتا ہے۔

وجدناھم کاذبا الھم   وذوالال والعھد لا یکذب

اس شعر میں ال سے مراد عہد ہے۔ ہم نے ان کے عہد کو جھوٹا پایا حالانکہ عہد و پیمان کرنے والا جھوٹا نہیں ہوتا۔

۲۔ الٌ کے معنے قرابت کے ہیں حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں۔

لعمرك ان الك من قريش　　　كال السقب من رال النعام

تیسری قسم تیری رشتہ داری قریش سے ایسی ہے جیسی کہ اونٹنی کے بچہ کی رشتہ داری شتر مرغ سے ہوتی ہے۔

۳۔ ال حلف کو کہتے ہیں۔

لولا بنو مالك والال مرقبة　　　ومالك فيهم الآلاء والشرف

اگر بنو مالک ہوتے اور قسم کہ جس کی پابندی کی گئی ہے اور بنو مالک ہی میں بخششیں اور شرافت ہے۔

۴۔ ال اللہ سبحانہ کا نام ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مسیلمہ کذاب کی یاوہ گوئی کو سن کر فرمایا تھا ان هذا الكلام لم يخرج من ال یہ بات اللہ سبحانہ کی نہیں ہو سکتی ہے۔ لیکن زجاج کو اس پر اعتراض ہے۔

۵۔ زجاج کہتے ہیں کہ میری رائے میں ال کی حقیقت لغت کی زبان میں کسی چیز کا تیز کرنا ہے۔ اسی سے پہاڑ کو الہ کہتے ہیں تیزی اور استحکام کی رعایت سے عہد و قرابت کے معنے آتے ہیں۔

۶۔ امام زہری کی رائے ہے کہ یہ عبرانی ایل کی بگڑی ہوئی صورت ہے۔ اسی ایل کی تعریب ال ہے۔

۷۔ کچھ کے خیال میں یہ ال یؤل سے بنا ہے جو صفائی اور چمک کے لیے بولتے ہیں۔

اگرچہ تعداد میں سات ہیں مگر فی الواقع وہ ہی تین ہیں جن کی طرف ہم نے شروع میں اشارہ کیا ہے ال نام خدا کو محققین نے قبول یا امام ابن جریر طبری نے لکھا ہے کہ چونکہ لفظ ال ان تمام معانی کے لیے استعمال ہوتا ہے اس لیے اچھا یہی ہے کہ اسے ام معانی میں استعمال کیا جائے لا يرقبون في مومن الا ولا ذمة کا ترجمہ یوں کرنا چاہیے کہ یہ مشرکین کسی مومن ن بھی نہ اللہ کا پاس کرتے ہیں نہ رشتہ داری کا نہ کسی عہد کا خیال کرتے ہیں اور نہ قسم کا۔

براءة۔ یہ برئ یبرأ کا اسم مصدر ہے۔ مصدر براء آتا ہے۔ اصل میں اس کے معنے ہر اس چیز سے جس کا پاس لتا ہو چھٹکارا ڈھونڈھنے کے ہیں۔ اسی سے صفت کا صیغہ بریئ آتا ہے اس کی جمع براء آتی ہے جیسے عقیل کی لاء ـــ یہاں یہ ان معاہدات کی ذمہ داری سے دستکش ہونے کے معنے میں ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ت فرمانے کے بعد مشرکین عرب کے مختلف قبائل سے موقت اور غیر موقت نوعیت کے لیے تھے۔

الجزية: علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے البصائر میں جزا کے چھ معانی میں ایک معنی اسلامی مملکت کے غیر مسلم شہریوں ے کے لکھے ہیں اور وجہ تسمیہ یہ بتائی ہے کہ چونکہ یہ ٹیکس غیر مسلم شہریوں کی حفاظت کا بدلہ ہے اس لیے اسے جزیہ کہتے ے کا مطلب سب ہے کہ لفظ جزیہ عربی زبان میں جزی یجزی سے بنا ہے لیکن حال میں جو مولانا شبلی نے اس موضوع

پر داد تحقیق دی ہے وجہ یہ ہے کہ لفظ عربی میں ایران سے آیا ہے فارسی لفظ گزیت کی تعریب ہے۔ عربی میں لفظ دو معنے میں آتا ہے خراج کے معنے میں جو اراضی سے وصول کیا جاتا ہے اور ٹیکس کے معنے میں جو اشخاص سے وصول کیا جاتا ہے جب جزیہ ٹیکس کے معنی میں ہو تو یہ دو قسم کا ہوتا ہے صلحی اور قہری۔ صلحی جزیہ ان لوگوں سے لیا جاتا ہے جنھوں نے بغیر کسی جنگ کے بطور خود اپنی مرضی سے اسلامی مملکت کا شہری بن کر رہنا اختیار کیا ان کو فقہا کی زبان میں معاہد بھی کہا جاتا ہے اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے ان لوگوں کے ساتھ اسلامی مملکت اس عہدنامے کے مطابق معاملہ کرے گی جو ان کے اور حکومت کے مابین طے پاچکا ہے۔ ان لوگوں سے اسلامی حکومت جو معاہدہ کرے گی اسے توڑنے کی اسلام میں سخت ممانعت ہے۔ قہری یہ ہے کہ جنھوں نے حکومت اسلامی سے جنگ کی ہو اور جنگ میں مغلوب ہو کر طاعت پر مجبور ہوئے ان سے لیا جاتا ہے۔ اس کی مقدار افراد کی صلاحیت کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ نابالغ بچوں، عورتوں، غلاموں معذوروں اور نکموں سے نہیں لیا جاتا ہے۔

الحج الاکبر: علماء کا اس موضوع پر اختلاف ہے کہ حج اکبر سے کیا مراد ہے۔ ملا علی قاری نے اس موضوع پر الحظ الاوفر فی الحج الاکبر کے نام سے رسالہ بھی لکھا ہے۔ اور حافظ ابن حزم ظاہری نے بھی اس پر داد تحقیق دی ہے امام مجاہد کہتے ہیں کہ حج قران حج اکبر ہے اور حج افراد حج اصغر ہے۔ محققین محدثین وفقہاء کی اکثریت نے اسی کو شرف پذیرائی رہا ہے۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما عرفہ کے دن کو حج اکبر بتاتے ہیں اور کچھ کا خیال ہے کہ یوم النحر الحج اکبر ہے شاید یوم نحر کو حج اکبر سمجھنے کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ اعمال حج اس روز ہوتے ہیں۔ اصل میں اکبر اور اصغر اضافی ہیں۔ بلاشبہ جمعہ کا حج دوسرے دنوں کے حج سے اکبر ہے۔ حج قران حج افراد سے اکبر ہے اور مطلق حج عمرہ سے اکبر ہے ان میں کوئی تعارض نہیں ہے واقعہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب معاہدہ حدیبیہ ۶ھ میں عمرہ ادا کیے بغیر لوٹ گئے تھے ذی قعدہ ۷ھ میں دوبارہ مکہ تشریف لے گئے اس مرتبہ آپ کے ساتھ دو ہزار صحابہ تھے۔ اونٹوں کے علاوہ گھوڑے بھی ساتھ تھے۔ اور ہدی کے لیے ۶۰ اونٹ ساتھ لیے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عمرہ کیا اور مکہ میں تین دن قیام کیا۔ ۲۰ رمضان ۸ھ کو جمعہ کے روز مکہ فتح کیا۔ ذی قعدہ ۸ھ میں آپ نے جعرانہ سے واپسی پر عمرہ کیا۔ اور آپ عتاب بن اسید کو مکہ میں اپنا جانشین بنا کر مدینہ واپس تشریف لے گئے۔ ۹ھ میں آپ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج کی حیثیت سے روانہ کیا۔ اسی حج میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کو مشرکین سے کیے گئے معاہدات کے خاتمہ کے لیے سورہ براءت کی ابتدائی آیات دے کر روانہ کیا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے اسی حج کو عمرۃ القضاء ۷ھ اور عمرہ جعرانہ ۸ھ کے مقابلہ میں یوم الحج الاکبر فرمایا ہے۔ اس کی تائید طبرانی کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو سمرہ ابن جندب کے حوالہ سے ملا علی قاری نے الحظ الاوفر میں نقل کی ہے کہ حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے یوم الحج الاکبر یوم حج ابوبکر بالناس حج اکبر کا دن وہ ہے جس روز ابوبکر نے لوگوں کو حج کرایا ہے۔ جمعہ کے دن وقوف عرفہ کو عام لوگ جو حج اکبر کہتے ہیں تو شائد اس کی وجہ یہ ہے جو مشہور

حدث امام زیلعی نے شرح کنز الدقائق میں پیش کی ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے بہترین دن وہ عرفہ ہے جو جمعہ کے روز ہے یہ دوسرے دنوں کے ستر حجوں سے زیادہ افضل ہے اخرجہ رزین بن معاویہ فی تجرید الصحاح من حدیث طلحہ بن عبداللہ

لغت
سقایۃ الحاج : سقایۃ کے معنے پانی پلانا۔ پلانے کی جگہ، پینے کا برتن۔ سقایہ کے بارے میں شارحین اور اہل لغت کے خیالات میں بے حد انتشار ہے۔ کچھ اسے سقی یسقی کا مصدر بتاتے ہیں اور کچھ استقی کا مصدر کہتے ہیں۔ کوئی اسم مصدر بتاتا ہے اور کوئی مصدر کو اسم فاعل کے معنے میں کہتا ہے۔ اور کوئی حاجیوں کو پانی پلانے کی جگہ کو سقایہ بتاتا ہے۔ علامہ سید رشید رضا نے اپنی تفسیر المنار میں اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ لیجئے آپ بھی مستفید ہو جایئے۔

سقایہ لغت میں اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں پانی وغیرہ پلایا جاتا ہے۔ اسی معنے میں ہے جعل السقایۃ فی رحل اخیہ۔ رکھ دیا پینے کا پیالہ اپنے بھائی کے سامان میں۔ پیالہ رکھنے والے حضرت یوسفؑ ہیں اور سامان ان کے بھائی بن یمین کا ہے۔ بھائی کو عرصے کے بعد دیکھا تھا۔ دل نہیں مانتا تھا کہ بھائی جدا ہو لیکن روک بھی نہیں سکتے تھے۔ اس خیال سے کہ بھائی کے پاس اپنی نشانی رہے۔ اس کے سامان میں چاندی کا کٹورا رکھ دیا۔ اور بھائیوں پر یہ بات ظاہر نہ کی۔ جب قافلہ روانہ ہو چکا تو محل کے کارندوں کو چاندی کا پیالہ نظر نہ آیا۔ بہت تلاش کیا نہ ملا۔ جب ملا تو قافلہ والوں کا پیچھا کیا۔ ان کے سوا یہاں کوئی نہ ٹھہرا تھا۔ تلاش کیا گیا تو بن یمین کے سامان سے نکل آیا۔ یہ غیب سے بن یمین کے ٹھہرنے کا سامان ہوا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے وہم میں بھی یہ بات نہ تھی۔ نہ کارندوں کو کوئی علم تھا کذالک کدنا لیوسف۔ اسے سقایہ اس لیے کہا گیا کہ اس سے پانی پلایا جاتا تھا اور صواع الملک اس لیے کہا گیا کہ صاع کی طرح اس سے ناپا جاتا تھا —— اور سقایہ وہ جگہ ہے جہاں حج کے موقعہ پر لوگوں کو شربت پلایا جاتا تھا حدیث میں ہے ماثر الجاھلیۃ تحت قدمی الاسقایۃ الحاج وسدانۃ البیت۔ جاہلیت کے سارے کارنامے میرے قدموں تلے ہیں سوائے حاجیوں کو پانی پلانے اور بیت اللہ کی پاسبانی کے —— اور علامہ نووی الاسماء والصفات میں لکھتے ہیں سقایۃ العباس مسجد حرام میں ایک مقام ہے جس میں حاجیوں کے لیے پانی کا انتظام ہوتا ہے۔ اس کے اور زمزم کے درمیان چالیس ہاتھ کا فاصلہ ہے۔ ازرقی نے تاریخ مکہ میں لکھا یا ہے کہ سقایہ چمڑے کے حوض تھے جو قصی بن کلاب کے زمانے میں حرم کے صحن میں رکھے جاتے تھے اور ان میں کنوؤں کے ذریعے پانی بھرا جاتا۔ پھر قصی نے مرتے وقت سقایہ کا منصب عبد مناف کو دے دیا لفظ کی ساخت بتاتی ہے کہ اس میں پیشہ وری آ گئی تھی۔ اسی طرح حجابہ جو بیت اللہ کی پاسبانی تھی۔ یہ دونوں پیشے قریش کے کارنامے تھے اسلام نے دونوں کو برقرار رکھا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ کا یہ کہنا انا صاحب السقایہ اس کا مطلب یہی ہے کہ میں اس کے متولی نگران اور ناظم تھے۔

صدقات: یہ صدقہ کی جمع ہے۔ راغب نے مفردات القرآن۔ فیروزآبادی نے بصائر ذوی التمیز فی لطائف کتاب العزیز میں لکھا ہے کہ صدقہ وہ ہے جو اپنے مال میں سے جسے آدمی بطور عبادت نکالتا ہے جیسے زکوٰۃ لیکن صدقہ اصل میں نفلی خیرات کے لیے بولا جاتا ہے اور زکوٰۃ واجب کے لیے۔ لیکن قرآن میں زکوٰۃ کو صدقہ کہا ہے۔ یا تو اس لیے کہ مال کی قربانی ایمان کی صداقت کی نشانی ہے اور یا اس لیے کہ صدقہ کرنے والا اپنے کردار کے صدق کا ارادہ کرتا ہے۔ صدق کے معنے اصل میں سچ کہنے اور سچ کر دکھانے کے ہیں۔ اسلامی نظام سے وفاداری کی صداقت زکوٰۃ سے ہوتی ہے اس لیے اسے صدقہ کہا۔ نکاح کی واقعاتی صداقت مہر سے ہوتی ہے اس لیے اسے صَدُقہ کہا گیا۔

صغار: عربی میں صغر یصغر کے معنے کمتر ہونے کے آتے ہیں۔ فقر کی حالت ہو یا محکومی و غلامی کی حالت دونوں کمتر ہیں۔ فیروزآبادی بصائر ذوی التمیز میں صاغرون پر لکھتے ہیں الراضی بالمنزلۃ الدنیئۃ صاغر ہر وہ شخص ہے جو کمتر رُتبہ پر راضی ہو جائے مطلب یہ ہے کہ جو اسلام کی محکومی اور غلامی پر خوش ہو بلکہ اسلامی مملکت کو ٹیکس ادا کریں۔ یعنی اپنی خوشی سے جزیہ دینا منظور کریں۔ امام شافعیؒ نے کتاب الام میں تصریح کی ہے کہ میں نے متعدد اہل علم سے سُنا ہے کہ وھم صاغرون کا مطلب یہ ہے کہ ان پر اسلام کے قوانین جاری ہو جائیں۔ یعنی اسلامی حکومت کے قوانین کے آگے جُھک جائیں۔

نسیئی: فعیل کے وزن پر مصدر ہے نکیر اور نذیر کی طرح۔ اس کے معنے دیر کرنا ہیں۔ بغیر ھمزہ نبی کی طرح نسا ہمزہ کے ساتھ بدأ کی طرح اور نساً نداء کی طرح آیا ہے سب کے معنے دیر کرنے کے ہیں۔ فیروزآبادی نے فعیل بمعنے مفعول بتایا ہے۔ یعنی مؤخر کہا گیا جیسے قتیل بمعنی مقتول اور جریح بمعنے مجروح آتا ہے۔

نسیئی کیا ہے؟ خود قرآن نے بتا دیا ہے یحلونہ عاما و یحرمونہ عاما لیواطئوا عدۃ ما حرم اللہ ایک ماہ کو ایک سال حلال کر لیتے ہیں اور پھر اسی کو دوسرے برس حرام کر دیتے ہیں تاکہ اللہ کے حرام کردہ مہینوں کی گنتی کو اپنی گنتی کے مطابق کریں۔ عرب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانہ سے یہ بات چلی آتی تھی کہ سال کے چار مہینے امن کے مہینے ہیں۔ اس میں لڑائی نہیں ہونی چاہیے رجب ذوالقعدہ ذوالحجہ اور محرم اسی لیے انہیں اشہر الحرم کہتے ہیں۔ یعنی حرمت کے مہینے۔ نیز قمری مہینوں کے حساب سے کہ قدرتی حساب ہے حج کا مہینہ بھی متعین تھا۔ اور وہ اسی نام سے پکارا جاتا تھا یعنی ذی الحجہ اسی ماہ کی آٹھویں، نویں دسویں حج کے اعمال و رسوم کے دن کہلاتے تھے۔ ایک مدت تک یہ بات اسی طرح قائم رہی۔ چونکہ عرب جاہلیت دینی قیود اور علمی حدود سے ناآشنا تھی۔ اس لیے مطلب برآری کی راہ نکالنے میں انہیں دقت پیش آتی راہ یہ نکالی کہ امن کے مہینوں کا معاملہ ان کے قدرتی حساب پر موقوف نہ رکھا بلکہ اس کے لیے ایک خود ساختہ اعلان ضروری ٹھہرا لیا جو حج کے موقعہ پر کیا جاتا۔ مجدالدین لکھتے ہیں کہ منیٰ سے روانگی ہوتی تو بنی کنانہ کا ایک شخص کھڑے ہو کر اعلان کرتا۔

میرا فیصلہ ناقابل رد ہے۔ لوگ کہتے انسئنا شہرا مہینہ کو مؤخر کیجئے یعنی محرم کی حرمت کو ہم سے ہٹا کر صفر میں کر دیجئے اس اعلان کے ذریعے حسب ضرورت امن کے مہینے ہٹا دیتے یا حج کا مہینہ مؤخر کر دیتے۔ کرتے کرتے جب یہ فرق دو تک پہنچ جاتا اور محرم سال سے ختم ہو جاتا تو پھر لوٹانا شروع کر دیتے۔ عمیر بن قیس اسی معاملہ کو فخریہ پیش کرتا ہے۔

السنا الناسئین علی معد　　　شھور الحل نجعلھا حراما

کیا ہم ہی نہیں وہ جو معد کے مقابلے میں حلت کے مہینوں کو ہٹا کر ان کو حلال بناتے تھے۔

چونکہ یہ طریقہ سراسر جہل و کوری پر مبنی تھا اور اس کی وجہ سے سارا تقویمی و تاریخی سلسلہ درہم برہم ہو گیا تھا اس لیے ضروری تھا کہ اس ناخداشناسی اور خدا کی بغاوت پر مبنی رسم کو یک قلم بند کیا جائے۔ اور حج کے لیے ایک معین اور قطعی وقت مقرر کیا جائے۔

نَفَر: لغت میں نفر القوم فی الامر کے معنے تیزی کے ساتھ کسی کام میں لگ جانے اور کرنے کے ہیں۔ اسی سے نفیر ہے وہ لوگ جو کام میں پہل کریں اور وہ بلاوا جو کام کے کرنے کے لیے ہو۔ قانون اسلام میں دفاع کی صورت کو نفیر عام کہتے ہیں۔ جہاد فرض کفایہ ہوتا ہے اگر حملہ و ہجوم کی صورت میں ہو اور فرض عین ہو جاتا ہے اگر دفاعی ہو۔ یہی نفیر عام ہے۔ ابن الہمام لکھتے ہیں اگر نفیر عام ہو کہ مسلمانوں کے شہروں پر دشمن حملہ آور ہو جائے تو جہاد فرض عین ہے۔ جہاد کی دعوت دینے والا سربراہ عادل ہو یا فاسق اور عنایہ میں ہے۔ اگر نفیر عام کی حالت ہو تو پھر جہاد فرض عین ہے۔

نفیر عام کا مطلب کیا ہے؟ یہ مطلب ہے کہ دفاع کی ضرورت پیش آ جائے اور ہر شخص کو اس کا علم ہو جائے یا یہ مطلب ہے کہ جب تک کوئی بلانے والا نہ بلائے گا۔ نفیر عام کی حالت نہ پیدا ہو گی۔ اس کا جواب حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث رح نے مؤطا کی شرح میں دیا ہے۔ نزدیک استنفار جہاد فرض علی الاعیان می شود۔ استنفار را چوں تتبع کنیم حاصل شود ما لے کہ مقتضائے استنفار شدہ است از قصد کفار بلاد مارا و قیام حرب درمیان جیوش مسلمین و کافرین۔

حرفِ آغاز

باسمہ سبحانہ

یہ معالم القرآن کی دسویں جلد ہے۔ نویں جلد جنوری ۱۹۸۵ء میں شائع ہوئی تھی۔ آج پورے دو سال چار ماہ کے بعد یہ جلد آپ کی خدمت میں پیش کی جارہی ہے۔

اس میں بقیہ سورہ انفال اور تین حصے سورہ برارت ہے۔

سورہ انفال کا باقی حصہ اموال غنیمت کی تقسیم۔ اہل ایمان کی فوجوں اور مشرکین کی مڈبھیڑ۔ میدان جنگ میں اہل ایمان کو ثبات قدم اور ذکر اللہ کی تلقین۔ اللہ رسول کی اطاعت کا حکم۔ باہمی نزاع سے دور رہنے کا امر، کافروں کے چلن سے بچنے کی ہدایت، سراقہ کا ابتداء میں مشرکین کے ساتھ جانا اور لڑائی شروع ہوتے ہی بھاگ جانا۔ منافقین کی اہل ایمان پر دین کے نشہ میں مغرور ہونے کی پھبتی کسنا۔ عہد شکن لوگوں کو دوسروں کی عبرت کے لیے سزا دینا۔ اہل ایمان کو جنگ کے لیے تیاری کا حکم، دشمن کی جانب سے صلح کی درخواست کو پذیرائی دینا۔ اہل ایمان میں باہمی الفت انعام الٰہی ہے ایمان و کفر میں عددی مقابلہ کا پیمانہ۔ بدر کے قیدیوں کا حکم۔ معاہدین کی مدد کا قانون۔ میراث میں قرابت و رشتہ داری کو بطور بنیاد بنانا۔

سورہ برارت کا آغاز اور عہد شکن قبائل سے معاہدہ ختم۔ چار ماہ کی مہلت، اسلام سے آشنائی کا ارادہ رکھنے والوں کو قیام کی اجازت اور امن کا پروانہ۔ اعلان جنگ کے اسباب و علل۔ اہل ایمان کو اہل عرب سے قطع تعلقات کا حکم۔ حب ایمانی اور غیر ایمانی میں مقابلہ تو حب ایمانی کا مقام۔ حنین کا واقعہ اور عددی طاقت موجبات فتح میں سے نہیں بلکہ اصل چیز ایمانی قوت ہے۔ حرم میں مشرکین کا داخلہ بند۔ اہل کتاب سے اعلان جنگ، وفادار غیر مسلم شہریوں سے جزیہ۔ یہود و نصاریٰ کے مشرکانہ ذہن کا مشرکین جاہلیت سے تقابلی مطالعہ۔ اسلام کی دعوت کی بنیاد توحید و رسالت ہے۔ رسالت کا مقصد وحید اللہ کے قانون کو دنیا کے سارے قوانین پر غالب کرنا ہے۔ رسالت کے قانون کی برتری میں دو اپوزیشنیں زمانہ جاہلیت کی اس جاہلانہ رسم کا خاتمہ جس کا حسابی معیار کوئی نہ تھا۔ غزوہ تبوک کے لیے جہاد کی ترغیب۔ واقعہ ہجرت کا تذکرہ۔ منافقین کا غزوہ تبوک

میں کردار تقسیم زکوٰۃ کا قانون۔ نفاق اور ایمان کی تنظیموں کا تقابلی مطالعہ حضور اقدس ﷺ کو منافقین کے لیے استغفار کی ممانعت۔ جہاد میں عذر لنگ پیش کرنے والے کا تذکرہ ـــــ بس ان ہی اجمالی باتوں کی اس دسویں جلد میں تشریحات ہیں ـــــ

تاخیر سے اس جلد کے منظر عام پر آنے کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دارالعلوم الشہابیہ کے تعلیمی اور انتظامی کاروبار میں رکاوٹ بنتے رہے ـــــ اور اس پر مزید یہ کہ مولانا عبدالرحمٰن استاذ دارالعلوم الشہابیہ نے دارالعلوم کی گیارہویں جماعت کو فاضل عربی کے امتحان میں داخلہ کی ترغیب دے دی اور داخلہ روانہ کردیا۔ یہ بات میرے مذاق کے خلاف تھی لیکن طلبہ کے میلان اور مولانا موصوف کی ترغیب کے سامنے میں بے بس ہوکر رہ گیا۔

تعلیمی کام کا سارا بوجھ دارالعلوم الشہابیہ کے صدر المدرسین مولانا منظور احمد پر پڑ گیا۔ اصولی طور پر میرا اخلاقی فرض ہوگیا کہ اس کام میں مولانا سے بھرپور تعاون کروں۔ مجھے سارے کام چھوڑ کر مولانا کا ہاتھ بٹانا پڑا۔ اور لگاتار چھ ماہ کی ٹھیٹ روز محنت کے بعد دارالعلوم الشہابیہ کی گیارہویں جماعت اس قابل ہوگئی کہ فاضل عربی کے امیدوار کی حیثیت سے کمرہ امتحان میں بیٹھ سکے الحمد للہ کہ سات طلبہ کی پوری جماعت صرف ایک طالب علم کے سوا فاضل عربی کے امتحان میں کامیابی سے ہمکنار ہوگئی۔ مستثنیٰ طالب علم کی بھی کمپارٹ آئی۔ لیکن یہ بڑے دکھ اور درد کی بات ہے کہ فاضل عربی کے امتحان میں کامیاب ہونے والے طلبہ کی اس خوشی میں خود امتحان کے محرک اصل حضرت مولانا عبدالرحمٰن کو شرکت کا موقعہ نہ ملا۔ مولانا عبدالرحمٰن صاحب جگر کی بیماری میں مبتلا رہنے کے بعد لاہور کے واپڈا ہسپتال میں مورخہ ۹ ذی قعدہ ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۷ جولائی ۱۹۸۶ء اتوار کے دن بوقت ۸ بجے صبح اللہ کو پیارے ہوگئے۔ تغمدہ اللہ برحمتہ۔

بس حالات کی یہی نیرنگیاں دسویں جلد کے لیے تاخیر کا باعث بنی ہیں۔

اس جلد میں مجھے جن علمی گہواروں سے استفادے کا موقعہ ملا ہے ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ بصائر ذوی التمیز	مجدالدین فیروزآبادی
۲۔ اعلاء السنن	مولانا ظفر احمد عثمانی
۳۔ التفہیمات الالٰہیہ	حکیم الامت شاہ ولی اللہ
۴۔ اتحاف السادۃ المتقین	علامہ السید مرتضیٰ الزبیدی
۵۔ الدرر فی اختصار المغازی والسیر	حافظ ابن عبدالبر المغربی
۶ البدایہ والنہایہ	حافظ ابن کثیر دمشقی
۷ التمہید علی الموطا	حافظ ابن عبدالبر

۸۔ زاد المسیر	ابن الجوزی
۹۔ مجموعہ الوثائق السیاسیہ	ڈاکٹر حمید اللہ
۱۰۔ ابوذر غفاری	مولانا مناظر احسن گیلانی
۱۱۔ النہایہ فی غریب الحدیث	لابن الاثیر الجزری
۱۲۔ الجواب الصحیح لمن بدل دین المسیح	حافظ ابن تیمیہؒ
۱۳۔ ازالۃ الخفاء	حکیم الامت شاہ ولی اللہ
۱۴۔ قرۃ العینین	" " "
۱۵۔ آیاتِ خلافت	مولانا عبدالشکور

یہ اللہ سبحانہ کا بے پایاں انعام ہے کہ اس نے معالم القرآن کی طباعت میں اخراجات کے کمر شکن بوجھ سے میرے دل دماغ کو بالکل یکسوئی عطا فرما دی۔ اللہ سبحانہ جزائے خیر عطا فرمائے قابلِ صد احترام جناب الحاج عبدالغنی مالک وطن ا کویت اور ان کے صاحبزادگان جناب محمد اسماعیل مالک "تاجر" گوجرانوالہ اور جناب محمد عثمان کو جن کی قرآن وسنت مخلصانہ وابستگی اور دریا دلی نے معالم القرآن کی طباعت کے تا تکمیل تمام مصارف کی ذمہ داری قبول فرما کر اپنے لیے او صاحبزادگان کے لیے اپنے والدین کے لیے قیامت تک اجر وثواب کا ایک دائمی اور ناپیدا کنارہ سمندر قائم کر دیا۔ کے کلام کو اللہ کے بندوں تک پہنچانے کی نیکی وہ نیکی ہے جس کی جزا کا آخر کوئی نہیں ہے۔

یہ وقت کی اہم ترین ضرورت اور ایمان کا بلند ترین تقاضا ہے۔

اس عمل میں نیکی کے اعتبار سے لزوم بھی ہے اور تعدیہ بھی اور یہ رضائے الٰہی کا پیمانہ بھی ہے۔

دل کی پہنائیوں سے صرف مولف ہی نہیں بلکہ معالم القرآن کا ہر قاری حاجی صاحب اور ان کے صاحبزادگان کے جناب الٰہی میں دست بدعا رہے گا۔ اور جب تک معالم القرآن تکمیل کی منزلیں طے کرتی رہے گی بلکہ جب تک معالم ا پڑھی جائے گی معالم القرآن کے ہر قاری کے علم وعمل کی جزا میں حاجی صاحب موصوف اور ان کے صاحبزادہ کا حصہ اور قائم رہے گا۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

پارہ دھم ایک نظر میں

اسلامی معاشرت

توحید

مساجد اللہ کی ہیں ان کی آباد کاری اہل ایمان کا کام ہے

اللہ کی رحمت اور اللہ کی رضا

نصرت کرنا اللہ کا کام ہے

اللہ کی جانب سے طمانیت وسکینت کا نزول

غنی بنانا اللہ کا کام ہے

تحریم کا قانون بنانا اللہ کا کام

یگانہ اللہ سبحانہ کی عبادت ہونی چاہیے

اللہ کی عبادت میں شرک نہ ہونا چاہیے

ہر افتاد اللہ کی جانب سے ہے۔

اللہ پر توکل ہونا چاہیے وہ ہی مولیٰ ہے

مومن کے لیے اللہ سبحانہ ہی غایت ومقصود ہے

ایمان کا تقاضا اللہ کی رضا جوئی ہے

سب سے بڑی نعمت اللہ کی رضا ہے

سیاسی قوانین

باہمی نزاع سے سیاسی زندگی کی ہوا اکھڑ جاتی ہے

سیاست میں بطر اور ریا ایمان کے منافی ہے

سیاسی زندگی میں عروج اور پستی کا قانون

سیاسی زندگی میں معاہدے ناگزیر ہیں لیکن بنیاد صداقت اور دیانت ہونی چاہیے

سیاسی زندگی میں دشمن اگر صلح کی طرف مائل ہو تو عواقب سے بے پرواہو کر صلح کر لینی چاہیے

سیاسی زندگی میں باہمی الفت اخوت اور اتحاد جان ہے

اہل ایمان میں سیاسی ولایت کا قانون

اگر کوئی غیر مسلم اسلام آشنائی کے لیے سیاسی امن چاہیے تو دینا چاہیے۔

مسجد حرام پر اس سال کے بعد مشرکین کا سیاسی غلبہ ہمیشہ کے لیے ختم ہے۔

اجتماعی قوانین

دفاعی قوانین

دستوری قواعد

اِخلاقی قوانین

اللہ سبحانہٗ کی صفات

اللہ کے احوال و شئون

آخرت کی زندگی

رسالت و نبوت

صحابہؓ کرام کا چہرہ

مالیاتی مسائل

اسلامی شعائر

تاریخی واقعات

غزوہ بدر کبریٰ
بدر میں قیدیوں کا واقعہ
مسلمانوں میں ایمان و ہجرت کی بنیاد پر مواخات
ہجرت کی اساس پر دو مملکتوں کے مسلمانوں کے تعلقات
فتح مکہ کا تاریخی واقعہ
۹ھ عرب کے مختلف قبائل سے معاہدے ختم ہونے کا اعلان
مشرکین سے معاہدہ ختم اور چار ماہ کی مہلت
نسی کی رسم کے خاتمہ کا اعلان
اسلام میں غیر مسلم شہریوں پر ٹیکس کا نفاذ
واقعہ ہجرت کا تاریخی مقام
غزوہ حنین
غزوہ تبوک
زکوٰۃ کا سرکاری نظام
منافقین کا معاشرتی مقاطعہ اور نماز جنازہ کی ممانعت
غزوہ تبوک میں شریک ہونے پر بے بس اور بے سہارا اہل ایمان کا رونا۔

مُقدّمہ

باسمہ سبحانہٗ: الحمد للہ والسلام علیٰ عبدہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم

سورہ برارت کا زمانہ نزول سنہ ۹ ہجری ہے۔ یہ سورت دراصل امت اسلامیہ کے نام ایک آخری پیام ہے اور اس کے احکام و مواعظ سے اصل مقصود مستقبل میں پیش آنے والے واقعات ہیں نہ کہ پیش پا افتادہ۔ گویا امت کو آیندہ مرحلوں کے تیار کیا جا رہا ہے۔ اگر یہ حدیث صحیح ہے۔ اور صحیح نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ صحیح بخاری میں حضرت براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے آئی ہے کہ آخر سورۃ نزلت کاملۃ براءۃ سورہ برارت پوری کی پوری نزول میں سب سے آخری سورت ہے۔ شارحین حدیث کو حضرت براء کی بات جی کو نہیں لگتی ہے۔ حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں ایک سے زیادہ تاویلیں کی ہیں۔ اور آخر میں لکھا ہے کہ صاف بات یہ ہے کہ اس کا بیشتر حصہ غزوہ تبوک میں نازل ہوا ہے کچھ نے یہ کہہ کر اپنے مخاطبوں کو مطمئن کرنے کی کوشش کی۔

آغاز سورہ سے پانچویں رکوع تک کا زمانہ نزول آخر ذی تعدہ سنہ ۹ھ کے لگ بھگ ہے۔

رکوع ۶ سے رکوع ۹ تک کا زمانہ نزول رجب سنہ ۹ھ سے کچھ پہلے ہے۔

رکوع ۱۰ سے شروع ہو کر آخر تک کا زمانہ نزول غزوہ تبوک سے واپسی پر ہے۔ حافظ ابن حزم نے تبوک سے واپسی کی تاریخ رمضان سنہ ۹ھ بتائی ہے۔

خبر نہیں کہ صحیح روایت کی موجودگی میں ان دور از کار تاویلوں کی ضرورت کیوں پیش آئی ہے بات صاف ہے کہ پوری سورت یکبارگی نازل ہوئی اور غزوہ تبوک سے واپسی پر دوران سفر نازل ہوئی ہے۔ غزوہ تبوک کے لیے آپ مدینہ سے رجب سنہ ۹ میں روانہ ہوئے اور رمضان سنہ ۶ میں تشریف لائے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی سال امیر حج بن کر روانہ ہوئے۔ حج کا زمانہ ذی الحجہ ہے۔

اس سورت میں پورے اسلامی نظام کا سیاسی نقشہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ نظام صرف مقامی

نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے۔ بین الاقوامی ہونے کی حیثیت میں مسلمانوں کی اسلامی ذمہ داریاں۔ مسلمانوں کے مختلف قوموں سے تعلقات کی نوعیت اسلامی نظام کے مقابلے میں دوسرے نظاموں کی حد تک مسلمانوں کا طرزِ عمل ۔ دفاع میں جہاد کی اہمیت ۔ افراد کی جانچ پڑتال کا پیمانہ۔ اسلام کے قانونی نظام کا دوسرے نظاموں سے مقابلہ۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے مسائل سے اس سورت میں بحث کی گئی ہے اور یہ بھی آیندہ کے لیے بتایا گیا ہے کہ اب چونکہ نظم ونسق اہل ایمان کے پاس ہے اس لیے وہ طرزِ عمل واضح طور پر اختیار کیا جائے جو گہوارہ وحی یعنی عرب کو بھرپور طور پر دارالسّلام بنانے میں معین ہو۔ اس کے لیے یہ نظام عمل بتایا گیا کہ :

اوّلاً۔ عرب سے شرک اور اس کے آثار قطعاً مٹا دیئے جائیں۔ کفر کی ساری رسوم ختم کر دی جائیں۔ کفر کے اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام اور روحانی نظام کو زندگی کے ہر گوشہ سے نکال دیا جائے۔

ثانیاً: عرب کی تمدنی زندگی میں کفر وشرک کی جو رسمیں موجود ہیں ان کا فی الفور استیصال کر دیا جائے نسی کی رسم ان سب میں سب سے زیادہ نمایاں تھی۔ اس پر براہ راست ضرب لگا کر مسلمانوں کو بتا دیا کہ مسلمانوں کو رسوم کفر کے ساتھ کیا معاملہ کرنا چاہیے۔

ثالثاً: عرب کو اسلام کا مرکز بنانے کے بعد دنیا کے سارے نظاموں پر اسلام کے نظام کو غالب اور برتر کرنے کے کیا اقدام کرنا چاہیے۔ اس علاقہ میں روم وایران کی سیاسی طاقتیں اسلام کے راستہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اس لیے مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ عرب سے باہر جو لوگ دین حق کے پیرو نہیں ہیں ان کی خودمختارانہ فرماں روائی کو ختم کر کے لیظھرہ علی الدین کلہ کا عملی دنیا میں مظاہرہ کرو۔

ان مقاصد کو حاصل کرنے کے لیے اللہ سبحانہ نے اس بارے میں اہل ایمان کی اجتماعی زندگی پر خاص طور سے زور دیا ہے مثلاً ۔ اطیعوا اللہ ورسولہ ولا تنازعوا فتفشلوا وتذھب ریحکم اور لو انفقت ما فی الارض جمیعا ما الفت من قلوبھم ولکن اللہ الف بینھم۔ سورہ برأت میں اسی اجتماعیت کا چھوان الفاظ میں پیش کیا ہے۔ المومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر ویقیمون الصلوٰۃ ویوتون الزکوٰۃ ویطیعون اللہ ورسولہ اولئک سیرحمھم اللہ

اسلام میں اجتماعیت کا شیرازہ نظام حکومت سے وابستہ ہے اس لیے اس بارے میں خاص اسلامی حکومت کے آمدنی کے وسائل پر توجہ دلائی ہے مثلاً اموالِ غنیمت، صدقات، زکوٰۃ، عشر، صدقہ الفطر، کفارات، غیر مسلموں سے تحفظ کا ٹیکس ــــ اور دفاع کے لیے ضروریات دفاع کی پابجائی کے لیے انفاق کی اہمیت، دفاع کے لیے تیاری

کا حکم۔ نظام حکومت قائم ہو جانے کے بعد مملکت اسلامی کا بھرپور تصور، اسلامی مملکت سے غیر اسلامی ممالک کے معاہدے برعہد کی صورت میں معاہدوں کے اختتام کا اعلان۔ سربراہ مملکت کی شخصیت اور مملکت میں اس کا مقام۔ مملکت کے وجود میں آنے کے بعد اسلامی مملکت کے نصب العین کا اعلان ارسل رسولہ بالھدیٰ ودین الحق لیظھرہ علی الدین کلہ۔ یہی اجتماعیت ہے جس کا نمونہ پانچ وقت کی نماز با جماعت میں پیش کیا گیا ہے۔ منشا یہی ہے کہ پوری زندگی علیٰ صفة الصلاۃ ہونی چاہیے۔

وَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَا غَنِمْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَاَنَّ لِلّٰهِ خُمُسَهٗ وَ
لِلرَّسُوْلِ وَلِذِي الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنِ وَابْنِ
السَّبِيْلِ اِنْ كُنْتُمْ اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ وَمَآ اَنْزَلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا
يَوْمَ الْفُرْقَانِ يَوْمَ الْتَقَى الْجَمْعٰنِ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿٤١﴾

اور جان رکھو کہ مالِ غنیمت میں سے جو کچھ تمہیں میدانِ جنگ میں ملا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ، اس کے رسُول کے لیے ہے اور رسول کے رشتہ داروں کے لیے یتیموں کے لیے مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے ہے[۵۳]۔ اگر تمہارا اللہ پر اور اس چیز پر ایمان رکھتے جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلہ کے دن نازل کی تھی یعنی جس روز دو جماعتیں ایک دوسرے سے بھڑ گئیں اور اللہ کو ہر چیز پر پوری دسترس حاصل ہے[۵۴]۔

مُفردات کے مُعانی

غنمتم: غنم سے بنایا ہے۔ غنم کے معنی مجدالدین فیروز آبادی نے یہ بتائے ہیں کہ وہ چیز جو آدمی کو بغیر محنت اور مشقت مل جائے لیکن یہ اس کے پورے معنی نہیں ہیں۔ کیونکہ جنگ میں جو مال ملتا ہے محنت اور مشقت تو اس میں بھی ہوتی ہے بلکہ زیادہ ہوتی ہے اس کے اصلی معنے مادی بدل کے بغیر کسی چیز کا مل جانا۔ تجارت میں جو کچھ منافع حاصل ہوتے ہیں وہ مال کا بدل ہوتے ہیں۔ اس لیے غرم اس کی ضد ہوتا ہے یعنی بغیر کسی جرم کے مالی سزا۔ بتانا یہ ہے کہ غنیمت میں محنت تو ہوتی ہے مگر بدل مادی نہیں ہوتا۔ اور اگر محنت بھی نہ ہو پھر کچھ دستیاب ہو جائے تو اسے غنیمت باردہ کہتے ہیں

یوم الفرقان: جدائی کا دن یعنی جس روز حق و باطل میں جدائی ہو گئی۔ اور ایمان و کفر کے درمیان فیصلہ ہو گیا۔ یہ بدر کا دن ہے جو سترہ رمضان المبارک کو پیش آیا۔

العدوۃ الدنیا: عدوۃ کنارہ کو کہتے ہیں یہ لفظ بضم العین اور بکسر العین دونوں طرح آتا ہے۔ علامہ فیومی

نے مصباح میں تصریح کی ہے کہ قریش عین پر پیش بولتے ہیں اور قیس زبر دیتے ہیں۔ میدان بدر کے دوسرے کنارے کو جو مدینہ منورہ کی جانب تھا اور جہاں لشکر نبوی فروکش تھا العدوۃ الدنیا کہا ہے۔ دنیا ادنیٰ کا مؤنث ہے۔ اور العدوہ کی صفت ہے۔ العدوۃ القصویٰ۔ قصویٰ اقصیٰ کا مؤنث ہے اس کے معنی دور کا کنارہ ہیں۔ یہ میدان بدر کا پرلا کنارہ ہے جو کہ مکہ کی طرف تھا اور جہاں کفار مکہ کی فوجیں فروکش تھیں۔ یاد رہے کہ بدر کے اطراف و جوانب میں جو پہاڑ ہیں ان میں سے جو دو سفید پہاڑ دور سے ریت کے تودوں کی شکل میں نظر آتے ہیں اب بھی ان میں سے جو پہاڑی مدینہ منورہ کی جانب ہے اس کا نام العدوۃ الدنیا اور دوسری جو مکہ کی طرف ہے اسے العدوۃ القصویٰ ہے۔

الرکب: راکب کی جمع ہے جس کے معنے سوار کے ہیں۔ عرف میں اس کا استعمال شتر سوار کے لیے ہوتا ہے۔ اہل عرب کے قافلے چونکہ بیشتر شتر سواروں پر مشتمل ہوتے تھے اس لیے کاروان کے معنے میں استعمال ہوتا ہے یہاں ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کو کہا گیا ہے جو شام سے سامانِ تجارت لے کر آ رہا تھا۔

جہاد اور اموالِ غنیمت

یہ آپ پہلے سن چکے ہیں کہ اسلام قبول کرنے کے بعد اہل ایمان کو پہلی بار اسلام کے مطالبہ پر غیر مسلموں سے لڑنے کا اتفاق ہوا۔ اس سے پہلے وہ قبائلی جنگیں لڑتے رہے۔ زمانہ جاہلیت کی لڑائیوں کے قانون سے وہ آشنا تھے لیکن ان کو اسلام میں جنگ اور اس سے پیدا شدہ مسائل کے بارے میں اسلام کے قانون کا علم نہ تھا۔ دوسرے تمدنی مسائل کی طرح مسلمان ابھی تک جنگ کے معاملے میں بھی اکثر پرانے ہی تمدن کے تصورات لیے ہوئے تھے اس وجہ سے بدر کی لڑائی میں لوگوں کو جو اموال ملے قرآن نے سورت کے آغاز میں اس کا اجمالی ضابطہ بیان فرمایا ہے۔ یہاں اب اسی ضابطہ کی تفصیل بتائی جا رہی ہے پہلے اجمالاً اموالِ غنیمت کے بارے میں یہ قانون بتا دیا کہ یہ اموال قبضہ سے شخصی ملکیت نہیں ہوتے ہیں بلکہ یہ سب کے سب سرکاری املاک ہیں اس کے لیے تعبیر یہ اختیار فرمائی للہ والرسول۔ اور پھر غنائم کے لفظ کو چھوڑ کر انفال بولا۔ انفال جمع نفل کی ہے۔ اس تعبیر میں یہ لطیف اشارہ ہے کہ اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے دشمن سے جو مالِ غنیمت حاصل کرتے ہیں وہ اللہ کی راہ میں ان کی محنتوں کی اجرت نہیں ہے بلکہ بلا بدل ایک زائد انعام ہے۔ کیونکہ نفل کے معنے لغت میں اضافہ اور زیادتی کے ہیں۔ اسی سے نماز میں تطوع کو نوافل کہتے ہیں۔ جہاد کا جو اجر ہے وہ اس سے بالکل الگ ہے وہ پائیدار ہے اور دائمی ہے اور مستقلاً اللہ کی بارگاہ میں محفوظ ہے۔ آغاز میں صرف یہی بتایا تھا کہ اموالِ غنیمت سرکاری املاک ہیں۔ اس بات کو نہیں چھیڑا تھا کہ سرکاری املاک کے بعد ان کے مصارف کیا ہیں تاکہ پہلے تسلیم و اطاعت مکمل ہو جائے اسلامی زندگی کے لیے منت۔ ان کی سرفروشی و قربانی اور جہاد کے بارے میں دوسرے

احکام بیان فرمائے اور بتایا کہ اسلامی زندگی کے عناصر ترکیبی کیا ہیں۔ اور بالکل آخر میں مقصدِ جہاد کو واضح الفاظ میں سمجھانے کے بعد اب بتایا ہے کہ ان سرکاری املاک کے قانونی مصارف کیا ہیں۔

مالِ غنیمت کے قانونی مصارف

۵۲ اور جان رکھو کہ مالِ غنیمت میں جو کچھ تمہیں میدانِ جنگ میں ملا ہے اس کا پانچواں حصہ اللہ اور اس کے رسول کے لیے ہے۔ اور رسول کے رشتہ داروں کے لیے یتیموں اور مسکینوں کے لیے اور مسافروں کے لیے ہے۔

آغازِ سورت میں الانفال للہ والرسول فرمایا تھا۔ یہاں اس کی قدرے تفصیل بیان فرمائی ہے کہ جو مالِ غنیمت کافروں سے لڑ کر ہاتھ آئے اس میں کا پانچواں حصہ خدا کی نیاز ہے جسے اللہ کی نیابت کے طور پر پیغمبر علیہ الصلاۃ والسلام وصول کر کے پانچ جگہ خرچ کر سکتے ہیں۔

۱۔ اپنی ذات پر

۲۔ اپنے ان قرابت داروں پر (بنی ہاشم بنی المطلب) جنھوں نے قدیم سے آپ کی نصرت و امداد کی اور اسلام کی خاطر، محض قرابت کی وجہ سے آپ کا ساتھ دیا۔ اور مدِ زکوٰۃ سے ان کے لیے لینا حرام ہوا۔

۳۔ یتیموں پر۔

۴۔ حاجت مند مسلمانوں پر۔

۵۔ مسافروں پر۔

پھر غنیمت میں جو چار حصے باقی رہے وہ لشکر پر تقسیم کیے جائیں۔ سوار کو دو حصے اور پیدل کو ایک۔ حضور اقدس ﷺ کے بعد خمس کے مصارف میں سے حنفیہ کے نزدیک صرف تین اخیر کے باقی رہ گئے۔ کیونکہ حضور کی رحلت کے بعد حضور کی ذات کا خرچ نہیں رہا اور نہ اہلِ قرابت کا وہ حصہ رہا جو ان کو حضور کی نصرت قدیمہ کی بنا پر ملتا تھا۔ البتہ مساکین و یتامیٰ کا جو حصہ ہے اس میں حضور کے قرابت دار مساکین اور اہلِ حاجت کو مقدم رکھا جانا چاہیے۔ بعض علماء کے نزدیک حضور ﷺ کے بعد امیر المؤمنین کو اپنے مصارف کے لیے خمس الخمس ملنا چاہیے واللہ اعلم۔ بعض روایات میں ہے کہ جب غنیمت میں سے خمس (اللہ کے نام کا پانچواں حصہ) نکالا جاتا تھا تو نبی کریم ﷺ اول اس میں سے کچھ حصہ بیت اللہ کے لیے نکالتے تھے۔ بعض فقہاء نے لکھا ہے کہ جہاں سے کعبہ بعید ہے وہاں مساجد کے لیے نکالنا چاہیے[1]۔

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

یہاں غنیمت کے موضوع پر یہ بنیادی اور اہم باتیں سمجھ لینی چاہئیں۔

۱۔ غنیمت کیا ہے؟
۲۔ غنیمت کی حیثیت کیا ہے؟
۳۔ غنیمت کی حلت کے شرائط کیا ہیں؟
۴۔ غنیمت کے مصارف کیا ہیں؟

غنیمت اسلام کی قانونی زبان میں وہ املاک منقولہ ہیں جو میدان جنگ میں غیر مسلموں سے مسلمانوں کے قبضہ میں آئیں یعنی وہ اموال منقولہ جن پر رقبہ جنگ میں اسلامی فوج اپنے اسلحہ کی طاقت سے قابض ہو جائے وہ اموال غنیمت ہیں۔

قاضی ابو یوسف نے کتاب الخراج میں غنیمت کی تعریف اس طرح کی ہے۔

وہ اموال جو مسلمانوں کو اہل شرک کی فوجوں سے ہاتھ لگیں اور جو ساز و سامان اور اسلحہ اور جانوروں کی قسم سے ہوں یعنی اموال منقولہ۔

دوسری جگہ پر فرماتے ہیں؛

جو کچھ مسلمانوں کو اہل شرک کی فوجوں اور ان کے سامان ہتھیار وغیرہ سے ملے۔

اس سے معلوم ہوا کہ غنیمت کا اطلاق صرف ان اموال منقولہ پر ہوتا ہے جو جنگی کارروائی کے نتیجہ میں دشمن کے لشکروں کی مدد سے ہاتھ آئے۔ لشکروں کی مدد سے باہر عام آبادیوں کو لوٹتے مارتے پھرنا شریعت کی نگاہ میں درست نہیں ہے اگرچہ دار الحرب کے تمام اموال مباح ہیں۔ اور کوئی شخص غیر مستامن کے اموال سے تعرض کرے تو اس پر نہ کوئی ضمان ہوگا اور نہ مال واپس کیا جائے گا لیکن اس قسم کی لوٹ مار پسندیدہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کا سربراہ مملکت ممکن طریقہ سے اپنی فوجوں کو ایسی حرکات سے روکے گا۔ بہر حال اسلامی فوج کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مخالف ملک کی عام آبادی پر دست درازی کر کے مال غنیمت جمع کرے۔

یہ تو غنیمت کی تعریف ہوئی۔ لیکن اسلامی قانون میں غنیمت کے ساتھ کچھ اور بھی اصطلاحات ہیں۔ مثلاً فئی، نفل سلب اور صفی۔

فئی، وہ اموال منقولہ وغیر منقولہ ہیں جو غنیم کے لشکر سے جنگ کے نتیجہ میں نہ ملے ہوں۔ بلکہ نتیجۂ فتح کے طور پر حکومت کے زیر تصرف آئیں۔ عام اس سے کہ غنیم کی رعایا کے املاک ہوں یا دشمن حکومت کے ہوں۔ اسلامی اصطلاح میں ایسے اموال کو فئے کہتے ہیں۔ ابو عبید القاسم بن اسلام نے کتاب الاموال میں غنیمت اور فئی میں یہ فرق بتایا ہے۔

غنیمت اور فئے میں یہ فرق ہے کہ جو کچھ کافروں سے جبراً چھینا جائے۔ اس وقت جبکہ عملاً جنگ قائم ہو وہ غنیمت

ہے — جو مال جنگ بند ہونے کے بعد اور اس ملک کے اسلامی ملک بن جانے کے بعد ان مفتوح لوگوں سے حاصل ہو وہ فیئے ہے — یہی نوعیت اس مال کی ہے جو جنگ شروع ہونے سے پہلے دشمن سے مل جائے[1]۔

لفظ فیئے کا کوئی اور مفہوم اس کے سوا نہیں ہے۔ اور کُتب فقہ میں مجھ کو کہیں بھی کسی ایسی فیئے کا نشان نہیں جس کو ہر شخص بطور خود حاصل کرے اور اپنی ہی جیب میں رکھ لے نقہاء قدم قدم پر فیئی للمسلمین اور فیئی یوضع فی بیت مال المسلمین اور فیئی لجماعۃ المسلمین کہتے ہیں اور اسی قسم کے دوسرے الفاظ ملتے ہیں جو اس بات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ متقدمین اس فیئے سے واقف تھے جو جماعت کی ملک ہوتی ہے اور حکومت اسلا کے زیر تصرف ہوتی ہے۔

غنیمت اور نہبہ میں فرق

غنیمت حاصل کرنے کا صرف ان لوگوں کو حق دیا گیا ہے جو اسلامی حکومت کے زیر حفاظت ہوں اور جن کو اسلامی حکومت کے سربراہ کی اجازت نصًا یا حکمًا ہو۔ ان کے سوا اگر عام مسلمان فردًا فردًا یا جماعت بنا کر بطور خود لوٹ مار کرنے لگیں تو ان کی حیثیت لیٹروں کی ہوگی! اور یہ غنیمت غنیمت نہ ہوگی بلکہ نُہبہ (لوٹ) ہوگی۔ علامہ سرخسی رقم طراز ہیں۔

اگر ایسے لوگ جنہیں سربراہ مملکت اسلامی کی حمایت حاصل نہیں سربراہ کی اجازت کے بغیر غنیم کے علاقہ میں غیر ذمہ دارانہ طور پر داخل ہوں اور مال لوٹیں تو ہمارے نزدیک یہ مال غنیمت نہ ہوگا بلکہ وہ مال انہی کے لیے خاص ہوگا اس کی وجہ جو امام شمس الدین السرخسی نے لکھی ہے وہ بھی گوش گذار فرما لیجیے۔

فرماتے ہیں:

بات دراصل یہ ہے جیسا کہ ہم اوپر بیان کر چکے ہیں کہ غنیمت اس مال کا نام ہے جو انتہا درجہ کے پاک اور اشرف طریقے سے دستیاب ہوا اور وہ یہ ہے کہ اس میں اللہ کے کلمہ کا بول بالا اور قانون کی برتری مقصود ہو۔ اسی لیے اس میں اللہ کا پانچواں حصہ مقرر ہے یہ بات اس مال میں نہیں ہوتی جس کو ایک شخص چوروں کی طرح حاصل کرتا ہے کیونکہ اس کا مقصد صرف کسب مال ہوتا ہے[2]۔

بہرحال غنیمت اور نہبہ میں جوہری فرق ہے۔ اس فرق کو نہ سمجھنے کی وجہ سے رائے عامہ چند در چند غلط فہمیوں کا شکار ہو جاتی ہے۔

سلب: اس مال کو کہتے ہیں جو سربراہ یا قائمقام کسی سپاہی کو کسی خاص شخص کے بارے میں کہے جو اس کو مارے گا

[1] کتاب الاموال صفحہ ۲۵۴۔ [2] المبسوط ج ۱۰ ص ۴۷۔

تو اس کا سامان اور ہتھیار وغیرہ اس کے ہوں گے۔ ارشاد ہے:

جس شخص نے کسی کو قتل کیا اُس کا سامان اُسی کا ہوگا۔

امام عبداللہ بن محمود الموصلی لکھتے ہیں۔

مقتول کا سلب یہ چیزیں ہوتی ہیں۔ ہتھیار، کپڑے، گھوڑا سامان اور وہ سب کچھ جو کپڑوں اور مال وغیرہ سے اس کے پاس ہوں۔

نفل: وہ مال ہے جو میدانِ جنگ میں دلیری اور تحریض کے لیے کسی کے لیے مزید کی غنیمت کے علاوہ پیش کش کی جائے۔

صفی: وہ مال ہے جسے مالِ غنیمت میں سے سربراہ تقسیم سے پہلے اپنے لیے مخصوص کرلے۔

غنیمت کی حیثیت کیا ہے

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز نے غنیمت کی حلت کی نظریاتی حیثیت جس انوکھے انداز میں خداداد علم کے ذریعے بیان فرمائی وہ اس قابل ہے کہ معالم القرآن کے قاریوں کے سامنے بطورِ سوغات پیش کی جائے فرماتے ہیں:

بنی آدم کی تخلیق کی بلند ترین اور بزرگترین غرض صرف عبادت ہے اور اموال قرآنی آیت کی روشنی میں انسانوں کے لیے ہیں۔ ان دونوں باتوں کو ملا کر اگر غور کیا جائے تو آپ کا ضمیر آپ کو یہ ضرور بتائے گا کہ اموال کی حیثیت اس زندگی میں سامان عبادت کی ہے۔ اسے ایک مثال سے سمجھئے کہ کھانے کے لئے روٹی پکائی جاتی ہے۔ اور دیگچی، چولہا، لکڑی، توا، چمٹا یہ سب کچھ روٹی پکانے کا سامان ہے جس طرح اگر روٹی پکانا مقصود نہ ہو تو دیگچی، توے اور چمٹے کی آپ کی نظر میں کوئی قیمت نہیں۔ ٹھیک اسی طرح اگر عبادت مقصود نہ ہو تو پھر ان مالوں کی خالق کی نظر میں کوئی قیمت نہیں۔ اگر اللہ سبحانہ نبوت کے ذریعے یہ حکم دیں کہ جو لوگ مقصد تخلیق عبادت کی پابجائی نہیں کر رہے ہیں ان سے جہاد کے ذریعے یہ سارا چھین لو۔ اور عبادت کے پابجائی میں صرف کرو تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے۔ آخر اگر آپ زمین میں درخت پھل کے لیے لگاتے ہیں اور وہ درخت پھل نہیں دیتا ہے اور آپ اس درخت کو کاٹ کر دوسرا درخت پھلدار لگادیں تو یہ تقاضائے عقل ہے یا نہیں۔ یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ جہاد صرف اعلاء کلمۃ اللہ کا نام ہے بلکہ ان وسائل پر قبضہ کرنا بھی جہاد ہی ہے جن کی قوت سے مقصد تخلیق عبادت

بناء ہو رہا ہے۔ کفار کا ان باتوں پر اہلِ ایمان کے مقابلے پر قبضہ حیوانات کی طرح کا ہے۔

اس نظریئے کے تحت اگر مسلمان کفر کی جانوں پر قابو پائیں اور ان کے مالوں پر قبضہ کریں تو مقصدِ تخلیق کو پروان چڑھانے کی خاطر مسلمان ان کی جانوں میں جانوروں کی طرح تصرف کر سکتے ہیں۔ اور اسی نظریہ سے یہ بات بھی الم نشرح ہو گئی کہ اموال پر کفار کی ملکیت اہلِ ایمان کے مقابلے میں بے حد کمزور اور ناپائدار ہے۔

اصل میں مالِ غنیمت کی بنیاد یہی نظریہ ہے۔ اس نظریہ کا تقاضا تو صرف ہونا چاہیے تھا کہ کفر کے املاک و اموال پر اہلِ ایمان کا قبضہ جائز ہو۔ اور اہلِ ایمان کے مالوں پر کفر کا قبضہ ناجائز اور غیر قانونی ہو لیکن یہ اسلام کی رواداری اور فراخ حوصلگی ہے کہ جس طرح غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے مملوکات پر مالکوں کی رضامندی کے بغیر قبضہ کر کے مسلمان ان کے قانونی مالک بن سکتے ہیں ٹھیک اسی طرح غیر اسلامی حکومتوں کے اس حق کو بھی اسلام نے قانونی حق قرار دیا ہے یعنی اسلامی حکومتوں کے باشندوں کے اموال پر العیاذ باللہ اگر غیر اسلامی حکومتوں کا قبضہ ہو جائے تو مالک کی رضامندی کے بغیر وہ بھی ان کے مالک ہو جاتے ہیں۔ اس کا تعلق قانونِ جنگ سے ہے اور اسی حیثیت میں غنیمت کی حلت کا راز ہے یعنی جس طرح مسلمانوں کا مال غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کی ملک میں صرف قبضہ سے داخل ہو جاتا ہے اسی طرح اسلامی حکومت کے باشندوں کے لیے بھی غیر اسلامی حکومتوں کے باشندوں کا مال بھی مباح و جائز ہے یعنی قبضہ کے بعد مسلمان اس کے مالک بن جاتے ہیں غنیمت کے اموال کے قانونی مالک مسلمان اسی لیے ہو جاتے ہیں کہ ان کے اموال کو اسلام نے مسلمانوں کے لیے مباح قرار دیا ہے۔

غنیمت کے حلال ہونے کی شرطیں

غنیمت کے اموال کی حلت علی الاطلاق نہیں۔ اسلام نے اس کی حلت کی کچھ شرطیں بتائی ہیں۔ یعنی جنگ کے نتیجے میں جو اموال غیر اسلامی حکومت کے باشندوں سے بزور حاصل ہوں ان کے حلال ہونے کی چند ضروری شرطیں ہیں۔

(۵۴) سب سے بنیادی شرط مالِ غنیمت کے حلال ہونے کی قبضہ ہے۔ اور قبضہ کے معنے یہ ہیں کہ بلا شرکت غیر یہ اس کو اپنے کام میں لا سکتا ہو اس سے نفع اٹھا سکتا ہو، کسی دوسرے انسان کو اسے روکنے کا حق نہ ہو علمائے اسلام نے ملکیت کی تعریف میں اس مفہوم کو ادا کیا ہے۔ علامہ الامام القرافی کے الفاظ یہ ہیں۔

ملک شریعت کی زبان میں کسی چیز میں یا کسی چیز کے نفع میں ایک ایسی اجازت ہے جس کا تقاضا ہوتا ہے کہ یہ شخص جس کو یہ اجازت حاصل ہے۔ خاص اس چیز سے یا اس کی منفعت سے نفع حاصل کرے[1]

[1] انوار البروق فی انواع الفروق

لیکن غنیمت میں ملکیت کے دو درجے ہیں ایک حقیقت کا ثابت ہو جانا اور دوسرے حق کا مؤکد ہونا۔ قبضے سے حق ثابت ہوتا ہے۔ حق کا تاکد نہیں ہوتا ہے۔ یعنی قبضہ سے صرف اتنا ہوتا ہے کہ اس میں لینے والے کا حق ہے مگر لینے والا کو اس سے نفع اٹھانے اور اس میں اپنی مرضی سے تصرف کرنے کا حق نہیں ہے بالفاظ دیگر قبضہ تو ہے مگر ناتمام ہے۔

علامہ محمود موصلی لکھتے ہیں:

قانون یہ ہے کہ غنیمت میں صرف دسترس سے ملکیت نہیں ہوتی ہے۔ صرف حق ثابت ہوتا ہے ملکیت کے لیے ضروری ہے کہ احراز ہو۔ اور پھر تقسیم شرعی ہو[1]

علامہ شمس الدین السرخسی رقمطراز ہیں:

ہمارے نزدیک قبضہ سے صرف حق ثابت ہوتا ہے۔ دارالاسلام میں لے جانے سے یہ حق مضبوط ہوتا اور تقسیم سے اس کی تکمیل ہوتی ہے[2]

۲۔ دوسری اہم اور بنیادی شرط غنیمت کے حلال ہونے کی یہ ہے کہ اموالِ غنیمت دارالحرب سے دارالاسلام میں منتقل ہو جائیں۔ اسے قانون کی زبان میں احراز کہتے ہیں۔ احراز کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ اموالِ غنیمت کو دارالاسلام پر منتقل کر دیا جائے۔ علامہ محمود لکھتے ہیں۔

اموالِ غنیمت کو دارالحرب میں تقسیم نہ کیا جائے بلکہ اسے دارالاسلام میں منتقل کریں۔ پھر تقسیم کریں۔

دوسرے فقہاء کی بھی یہی تصریحات ہیں کہ دارالحرب میں مالِ غنیمت کو تقسیم نہ کیا جائے۔ مسلمان فوجی جب تک دارالحرب میں مقیم ہیں اس وقت تک وہ اموالِ غنیمت سے استفادہ نہیں کر سکتے۔ اس قید سے صرف سامان خورد و نوش اور جانوروں کا چارہ مستثنیٰ ہے۔ یعنی دورانِ جنگ میں جس قدر رازوقہ اور چارہ فوجیوں کے ہاتھ لگے اس میں سے ہر مجاہد بقدرِ ضرورت لے سکتا ہے۔ اس کے سوا باقی تمام اموالِ غنیمت لشکر کے سربراہ کے پاس جمع کیا جائے اور ان کو غانمین میں اس وقت تک تقسیم نہ کیا جائے گا جب تک وہ دارالاسلام میں منتقل نہ کر دیئے جائیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ احناف کے نزدیک اموالِ غنیمت جب تک دارالحرب میں ہوں غانمین کی ملک ان پر مکمل نہیں ہوتی ہے۔ امام شافعی رح کی رائے اس کے خلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ محاربین کا مال مباح ہے اس لیے جس وقت مجاہدین اسلام اس پر قابض ہوئے اسی وقت اس کے مالک ہو گئے۔ مگر امام ابو حنیفہ رح اور ان کے اصحاب فرماتے ہیں کہ یہ ملک ضعیف ہے گو ہمارا قبضہ ہو چکا ہے لیکن ملک تو ان کا ہے جب تک مال ان کے ملک سے ہمارے ملک میں منتقل نہ ہو جائے ہم پوری طرح اس کے مالک نہیں ہوئے اس لیے کہ تکمیل ملک کے لیے صرف قبضہ کافی نہیں ہے۔

[1] الاختیار لتعلیل المختار۔

[2] المبسوط ج ۱۱

حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی قدس اللہ سرہ العزیز نے اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ:

مسلمان جب تک دارالحرب میں ہے تو اس وقت تک قبضہ کل کفار کا ہے اور مسلمان کا صرف قبضہ جزئی ہے اور تم جانتے ہو کہ جزئی قبضہ حرکت و سکون میں قبضہ کلی کے تابع ہوتا ہے اس لیے مسلمانوں کا جزئی قبضہ ناقابلِ اعتبار ہوگا۔ غرض جب تک مسلمان دارالحرب میں ہیں کفار کی طرف سے ان اموال کے مسلمانوں سے واپس لینے کا امکان ہے اور قبضہ کی تکمیل نہیں ہے اس لیے جب تک اموالِ غنیمت دارالحرب سے دارالاسلام میں منتقل نہ ہوں گے ایسا استخلاص نہ ہوگا جس کی بنیاد پر مسلمانوں کو مالک قابض اور متصرف کہہ سکیں [1]

احراز کی دوسری صورت یہ ہے کہ جس ملک کو مسلمانوں نے فتح کیا ہے اس کو بھی مسلمان دارالاسلام بنالیں۔

علامہ شمس الدین السرخسی رقمطراز ہیں کہ:

جس ملک میں مسلمان اُترے ہوں اس پر حقِ ملکیت اس وقت تک موکد و مضبوط نہ ہوگا جب تک اس ملک کو دارالاسلام نہ بنالیں گے [2]

اس تصریح سے معلوم ہوتا ہے کہ اموالِ غنیمت میں اسلامی حکومت اس وقت تک پورا تصرف کا حق نہیں رکھتی ہے جب تک علاقہ مقبوضہ کو دارالاسلام نہ بنالیا جائے یا آج کی سیاسی زبان میں اپنے مقبوضات کے ساتھ اس کے الحاق کا باقاعدہ اعلان نہ کر دیا جائے۔ دارالاسلام بن جانے کے بعد چونکہ قبضہ کی تکمیل ہو جاتی ہے اس لیے وہاں اب اموالِ غنیمت میں تصرف کرنے اور تقسیم کرنے کا اسلامی حکومت کو حق ہے

جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد و عمل اسی کی تائید کرتا ہے امام مکحول دمشقی فرماتے ہیں کہ:

رسول اللہ ﷺ نے اموالِ غنیمت کو دارالاسلام کے علاوہ کہیں تقسیم نہیں فرمایا۔

محمد بن اسحاق کی روایت میں ہے کہ حضور ﷺ نے حنین کے غنائم واپسی پر جعرانہ میں تقسیم فرمائے جو اس زمانے میں دارالاسلام کی سرحد پر تھا۔ خیبر کے اموال خیبر میں اس لیے تقسیم فرمائے کہ وہ دارالاسلام بن گیا تھا۔

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد و عمل اور فقہاء کی تصریحات کہہ رہی ہیں کہ اموالِ غنیمت کو دارالاسلام میں تقسیم کیا جائے۔

۳- تیسری اہم شرط مالِ غنیمت کے حلال ہونے کی یہ ہے کہ قرآن کی ہدایت کے مطابق اس کی تقسیم شرعی ہوئی ہو۔ فقہاء نے اس شرط کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ تقسیم سے پہلے مالِ غنیمت کی خرید و فروخت کو بھی ناجائز بتایا ہے۔ مالِ غنیمت میں تقسیم

---

[1] مکاتیب قاسمی
[2] المبسوط ج ۱۰

شرائط کے بعد حکومت کی جانب سے کسی کو کچھ بخشنا بالکل ایک قانونی فعل ہے جیسے بیع و شرا اور ہبہ وغیرہ مال غنیمت کے حلال ہونے کی یہ اہم اور بنیادی شرطیں ہیں۔ مال غنیمت ہی میں جنگی قیدی اور غیر منقولہ جائیدادیں بھی داخل ہیں۔
غیر منقولہ جائداد مثلاً ملک کی زمینیں وغیرہ میں فقہاء کا اختلاف ہے۔ امام شافعی رح کے خیال میں زمینوں کا بھی یہی حکم ہے جو اموال منقولہ کا ہے لیکن امام ابو حنیفہ رح یہ فرماتے ہیں کہ تقسیم غنائم کا حکم اموال منقولہ کے بارے میں ہے املاک غیر منقولہ جائداد وغیرہ کو مجاہدین میں تقسیم کرنا واجب نہیں ہے یہ امیر مملکت کے اختیار پر موقوف ہے کہ ملکی مصالح اور اپنے صوابدید کے مطابق عمل کرے۔ چاہے تو تقسیم کر دے یا مسلمانوں کی مصالح کی خاطر روک لے یا سابق شہریوں کے پاس رہنے دے اور ان سے خراج وصول کرے اس کی تفصیل انشاء اللہ پارہ ۲۸ میں آئے گی۔
جنگی قیدیوں پر ہم معالم القرآن کی جلد پنجم میں ایک اجمالی تبصرہ کر چکے ہیں اس پر تفصیلی تبصرہ انشاء اللہ ۲۶ پارہ میں آرہا ہے۔

اس تفصیل سے آپ اس نتیجہ پر ضرور پہنچے ہوں گے کہ اسلامی قانون جس طرح اسلامی مقبوضات پر اہل اسلام کے حقوق ملکیت تسلیم کرتا ہے اسی طرح غیر اسلامی مقبوضات پر اہل حرب تک کے مالکانہ حقوق تسلیم کرتا ہے۔ اگرچہ جنگ ان کے اموال کو ہمارے لیے مباح کر دیتی ہے مگر شریعت نے ہم کو اس اباحت سے فائدہ اٹھانے کی عام غیر مشروط اجازت نہیں دی؟ بلکہ ان کے ملک سے ہمارے ملک میں منتقل ہونے کی چند باضابطہ قانونی شکلیں مقرر کی ہیں۔ اور وہ ایسی شکلیں ہیں جن میں ہمارے اور اہل کفر کے درمیان پوری مساوات ہے۔ اسلامی قانون کہتا ہے کہ ہم ان کے اموال کے مالک اس وقت ہوں گے۔ جب باقاعدہ جنگ میں ان پر قبضہ کر کے دارالاسلام میں لے آئیں گے یا اس ملک کا دارالاسلام سے الحاق کرلیں گے اسی طرح وہ بھی جب ہمارے اموال پر جنگ کے ذریعے سے قابض ہو کر اپنے ملک میں لے جائیں گے اور ان کے ملک میں ان کے مالکانہ حقوق کا احترام کرنا ہم پر لازم ہوگا۔

امام شمس الدین سرخسی فرماتے ہیں ؛

> جب اموال پر قبضہ کر کے ملک میں پہنچا دیا گیا ہو تو یہ اس مال پر حق ملکیت کا پورا سبب ہے اور دنیا حاصل کرنے کے اسباب میں ہمارے اور کفار کے درمیان مساوات ہے بلکہ دنیا میں ان کا حصہ ہمارے حصہ سے کچھ زیادہ ہی ہے کیونکہ ان کے لیے تو صرف دنیا ہی ہے اور اخذ مال سے ان کا مقصود بجز اکتساب مال کے اور کچھ نہیں بخلاف اس کے کہ ہمارا مقصد اکتساب مال نہیں ہے [1]

آیئے اب قرآن کی آیت میں تقسیم غنیمت کے قانون کو پڑھیئے۔ قانون یہ بتاتا ہے کہ مال غنیمت کو ۵ پر تقسیم کیا

[1] المبسوط ج ۱۱

کیا جائے۔ چار حصے تو مجاہدین میں تقسیم کر دیئے جائیں اور پانچویں حصے کو اس طرح تقسیم کیا جائے۔

اللہ کے لیے۔

اللہ کے رسول کے لیے۔

اللہ کے رسول کے رشتہ داروں کے لیے۔

یتیموں کے لیے۔

مسکینوں کے لیے۔

مسافروں کے لیے۔

مطلب یہ ہے کہ اموال غنیمت میں سے سب سے پہلے اس مال سے سرکاری حصہ نکالنا چاہیئے۔ پہلے تو شروع میں تمام اموال غنیمت کو سرکاری قرار دیا تھا الانفال للہ والرسول لیکن یہاں یہ بتانے کے لیے کہ اس سرکاری حصے میں خود جناب رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ مبارکہ پر خرچ کیا جائے گا لام کا اضافہ کرکے وللرسول فرمایا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن میں غنیمت کی شرح مقدار کے سوا زکوٰۃ عشر کی شرح مقدار نہیں بتائی گئی۔ اسلامی قانونِ مالیات میں اسی کو بنیاد بنا کر شرحیں مقرر کی گئی ہیں۔ زکوٰۃ کا نصاب چاندی میں دو صد درہم یا اس کے مماثل سونا ہے ان دو سو کو آپ پانچ پر تقسیم کریں تو چالیس روپے آئے گا۔ یہ کل زکوٰۃ کی شرحیں ۱/۵ - ۱/۱۰ - ۱/۲۰ - ۱/۴۰ دے کر دوسرے کا نصف یا ایک دوسرے کا ڈبل ہوتی چلی گئی ہیں۔ اس سے اندازہ ہوگا غنیمت والے خمس کو بنیاد بنا کر یہ تقسیم و تحدید حساب اقتصادیات کے خاص اصول پر مبنی ہے۔

اسی خمس سے یہ نکتہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ غنیمت ایسا سرمایہ ہے جو بلا بدل حاصل ہوا ہے۔ اور اس میں قرآن نے خمس مقدار مقرر کی ہے لہذا ایسا سرمایہ جو بلا بدل اتفاقاً ہاتھ آجائے اس میں بھی پانچواں حصہ ہے۔ یہ اصول کہ جو سرمایہ بلا کسی بدل کے اتفاقاً کسی مسلمان کے ہاتھ آجائے۔ اس میں سے پانچواں حصہ سرکار کا ہے وہی ہے جس کی بنا پر رکاز میں پانچواں حصہ سرکار کا حق تسلیم کیا گیا ہے۔

بہر حال غنیمت کے اموال میں سے پہلے پانچواں حصہ سرکاری خزانہ میں داخل ہوگا۔ اس کے بعد ۴/۵ حصے مجاہدین میں تقسیم کیے جائیں گے

قرآن نے یہاں سب سے پہلے اس ۱/۵ کے مصارف بتائے ہیں۔ ان میں سب سے پہلے اللہ سبحانہ کا اسمِ گرامی ہے علماء کا تقریباً اس پر اتفاق ہے کہ اس آیت میں اللہ سبحانہ کا ذکر تبرکاً آیا ہے۔ اور علامہ آلوسی نے جمہور کی طرف نسبت

---

۵ المبسوط ج ۱۱

کرکے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ یہاں اللہ سبحانہ کا اسمِ گرامی حضورِ اقدس ﷺ کی عظمتِ شان ظاہر کرنے کے لیے آیا ہے۔ قاضی ثناء اللہ قدس اللہ سرہ العزیز نے یہاں جو لطیف بات لکھی ہے وہ اس قابل ہے کہ آپ بھی لطف اندوز ہوں۔ فرماتے ہیں:

انما غنمتم میں ما موصولہ ہے اور ما موصولہ ہونے کی وجہ سے جملہ میں معنیٔ شرطی ہیں۔ اسی وجہ سے اس کی جزا پر فا آئی ہے۔ اصل جزا یہ ہے فالحکم ان للہ خمسہ یعنی مالِ غنیمت جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی تمہیں ملا ہے اس کا حکم ہے کہ اس کا ۱/۵ خمس اللہ کی مِلک ہے جو فوجیوں اور غنیمت لانے والوں کی ملکیت نہیں ہے۔ یہ خمس غانمین پر زکوٰۃ کی طرح واجب نہیں بلکہ یہ خود بالذات غنیمت میں اللہ کا حق ہے۔ اسی وجہ سے یہ پیغمبر ﷺ کے لیے حلال ہے۔ لیکن زکوٰۃ آپ کے لیے حلال نہیں ہے۔

یہ بتانے کے بعد قرآن نے اللہ سبحانہ کی اس ملکیت کے مصارف بتاتے ہیں ان مصارف میں اوّلین مصرف جناب رسول اللہ ﷺ کی ذاتِ گرامی ہے۔ یہاں یہ سوال بہت اہمیت رکھتا ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کو حصہ کس حیثیت میں ملتا تھا۔ رسول ہونے کی حیثیت میں یا سربراہِ مملکت ہونے کی حیثیت میں۔ قتادہ کی رائے ہے کہ حضور انور ﷺ کو یہ وظیفہ سربراہ ہونے کی وجہ سے ملتا تھا۔ حال کے شارحین قرآن میں سے کچھ نے اسی کو اپنایا ہے۔ امام ابو حنیفہ کی رائے اس موضوع پر یہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کو یہ حصہ منصبِ رسالت کی وجہ سے ملتا تھا۔ امام ابو حنیفہ رہ کا استدلال یہ ہے کہ جب حکم کسی وصف پر مرتب ہوتا ہے وہ وصف اس کی علت ہوتا ہے یہاں للرسول قرآن میں موجود ہے۔ معلوم ہوا کہ رسالت اس حصہ ملنے کی علت ہے اور چونکہ آپ کے بعد منصبِ رسالت ختم ہے آپ کو قرآن نے ہی خاتم النبیین کہا ہے اس لیے آپ کا یہ حصہ آپ کے وصال کے بعد ختم ہے۔ امام ابو حنیفہ رہ کی یہ بات قرآن کے طالبعلم کو اپیل کرتی ہے۔ لیکن یہاں پہنچ کر یہ سوال خود بخود ذہن میں چٹکیاں لینے لگتا ہے کہ آپ کے وصال کے بعد اس آپ کے حصہ کا مصرف کیا ہے۔ ابوبکر الجصاص نے احناف کی ترجمانی کرتے ہوئے اس سوال کا جو جواب دیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ حضورِ اقدس کے اس حصے کو مالِ غنیمت ہی میں واپس کر دیا جائے گا۔ ابنِ کثیر رہ نے لکھا ہے کہ حافظ ابنِ جریر کا میلان یہ ہے کہ حضورِ اقدس ﷺ کے اس حصے کو باقی چار قسموں ذوی القربیٰ، یتامیٰ، مساکین اور ابن السبیل پر صرف کیا جائے۔ اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ آپ کو یہ حصہ سربراہ کی حیثیت سے ملتا تھا وہ اس کو آپ کے بعد سربراہ کا حصہ بتاتے ہیں۔ امام شافعی رہ کی بھی یہی رائے ہے لیکن خلفائے راشدین کا تعامل اس کا مؤید نہیں ہے۔ انھوں نے حضورِ اقدس کا حصہ کبھی اپنی طرف منتقل نہیں کیا۔

دوسرا مصرف اس خمس کا ذوی القربیٰ ہیں۔ ذوی القربیٰ سے یہاں کون لوگ مراد ہیں؟ اس میں شروع ہی سے

اہل علم کے خیالات مختلف ہیں۔ کچھ کی رائے ہے کہ ذوی القربیٰ قریش بلا استثناء مراد ہیں، کچھ کہتے ہیں وہ مراد ہیں جن پر زکوٰۃ حرام ہے۔ کچھ کا خیال ہے کہ ہاشم اور مطلب کی اولاد مراد ہے۔ اور کچھ کی رائے میں صرف ہاشم کی اولاد مراد ہے حافظ ابن کثیر نے ہاشم اور مطلب کی اولاد کو یہ کہہ کر ترجیح دی ہے۔

هذا قول جمهور العلماء انهم بنو هاشم وبنو المطلب

یہی وہ قرابت دار ہیں جنہوں نے جناب رسول اللہ ﷺ کی جاہلیت اور آغاز اسلام میں مدد کی تھی۔ یہی حضورؐ اقدس کے ساتھ شعب ابی طالب میں قید تھے ظاہر ہے کہ ان کی کفالت کی ذمہ داری مدینہ میں آکر حضور اقدس ﷺ پر عائد ہوتی تھی خواہ یہ ذمہ داری عرفی اور شرعی نوعیت کی ہو یا اخلاقی انداز کی ہو۔ اس سے یہ بات خودبخود معلوم ہوتی ہے کہ ذوالقربیٰ سے مراد وہ لوگ ہیں جنہوں نے ہر دور میں قرابت کی بنیاد پر حضور اقدس ﷺ کا ہاتھ بٹایا اور مدد کی اس مرحلہ پر یہ نظریاتی اختلاف خاص اہمیت رکھتا ہے کہ ان کو خمس میں سے حصہ ملنے کی بنیاد صرف قرابت ہے۔ یا نصرت ہے یا قرابت ونصرت دونوں ہیں۔ اور یا پھر قرابت اور فقر ہے۔ اس نظریاتی اختلاف کے نتیجہ میں حضورؐ اقدس ﷺ کے وصال کے بعد ذوالقربیٰ کے اس حصے کے بارے میں اختلاف رونما ہو گیا۔ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ اور دوسرے ائمہ نے قرابت کو اساس بنا کر ذوی القربیٰ کے اس حصے کو آپؐ کے وصال کے بعد بھی برقرار رکھا۔ اور امام ابوحنیفہ نے نصر کو بنیاد بنا کر ذوی القربیٰ کے حصہ کو ختم کر دیا اور بتایا کہ اس ۱/۵ کو تین یتامیٰ، مساکین اور مسافروں پر تقسیم کیا جائے۔ حضورؐ ﷺ کے اقارب میں جو مساکین ہوں ان کو مساکین ہونے کی وجہ سے دیا جائے۔ صرف قرابت کی بنیاد پر ان کا قانونی طور پر کوئی حصہ نہیں۔ خلفائے راشدین بھی ان کو فقر اور محتاجی کی وجہ سے دیتے تھے۔

شیخ ابو منصور ماتریدی نے اس پر ایک مقنن کی حیثیت سے نگاہ ڈال کر یہ راز بتایا کہ ذوی القربیٰ کو قرابت کی وجہ نہیں بلکہ محتاجی اور فقر کی وجہ سے اس خمس میں سے حصہ ملتا ہے لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ اگر ایسا ہی ہو تو ان کو ذوی القربیٰ کے عنوان سے الگ کیوں ذکر کیا جب کہ یہ مقصد مساکین کے لفظ سے حاصل ہے۔ شیخ ابو منصور فرماتے ہیں اس لیے کہ شاید کوئی یہ نہ سمجھ بیٹھے کہ حضورؐ کے اقرباء کا اس میں کوئی حصہ نہیں کیونکہ یہ ۱/۵ ہی غنیمت کی زکوٰۃ ہے اور زکوٰۃ ذوی القربیٰ کو حلال نہیں ہے۔ تصریح کر دی کہ یہ وہ زکوٰۃ نہیں ہے۔ بہرحال یہ تو قانونی نکتہ سنجیاں اور باریکیاں ہیں ہمیں اس مقام پر امام مالکؒ کی رائے زیادہ اچھی لگتی ہے کہ اس خمس کو خرچ کرنے کا مسئلہ سربراہ مملکت کے صوابدید اور اختیار تمیزی پر موقوف ہے جہاں وہ مصلحت دیکھے خرچ کرے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں وھو اصح الاقوال۔

آخر میں تین حصے یتامیٰ، مساکین اور مسافروں کے ہیں سوچنے کی بات ہے کہ اسلامی خزانہ کی اس پہلی آمدنی کو پہلے پانچ حصوں پر تقسیم کیا گیا۔ پھر اس پانچویں حصے کو بھی زمانہ نبوت میں پانچ پر تقسیم کیا گیا کل ۲۵ روپے تھے ان کو

پانچ پر تقسیم کیا گیا پھر پانچ روپے کو پانچ پر تقسیم کیا گیا۔
ایک روپیہ اپنی ذات کا۔ ایک روپیہ آپ کے رشتہ داروں کا۔ ایک روپیہ یتیموں کا۔ ایک روپیہ مسکینوں کا اور ایک روپیہ مسافروں کا۔

پانچ روپے میں صرف ایک روپیہ اس قوت کے ذاتی مصارف کے لیے مقرر کیا گیا جس کے ذریعے یہ اقتدار حاصل ہوا یعنی حضور اقدس ﷺ اور ایک حصہ آپ کے جانثار رشتہ داروں کے لیے جنھوں نے مکہ سے مدینے تک آپ کا ہر حال میں ساتھ دیا تھا۔ باقی تین حصوں کو بجائے کشوری و فوجی مصارف کے ملک کے الیتامیٰ، المساکین اور ابن السبیل کے لیے چھوڑ دیا گیا۔ اور یہ تو شروع میں ہوا۔ پھر جب صرف پندرہ بیس سال کے تھوڑے عرصہ میں فتح کا دائرہ اتنا وسیع ہو گیا کہ اس میں ساری ایرانی حکومت بازنطنی حکومت کا اکثر سما گیا اس وقت یہ پانچ بھی صرف تین کے لیے رہ گئے۔ مساکین۔ یتامیٰ اور ابن السبیل۔ حضور اقدس ﷺ کی ذاتِ گرامی کے لیے جو قرآن نے پانچوں کا پانچواں رکھا۔ اس کا حال خود آپ کی حیاتِ مبارکہ میں یہ تھا کہ آپ کی ضروریات سے جو بچ جاتا تھا۔ اس کو بھی آپ مسلمانوں ہی کے عام مصالح میں صرف فرما دیا کرتے تھے۔ علانیہ بھرے مجمعوں میں اعلان فرماتے:

> اللہ سبحانہ نے جو آمدنی اے مسلمانو تمہیں غنیمت بنا کر دی ہے اس میں خود میرے لیے بجز اس خمس کے اور کچھ لینا جائز نہیں۔

پھر اس کے بعد فرماتے:

> پھر یہ خمس بھی تم کو ہی واپس کر دیا جاتا ہے۔

اس فقرے کی شرح حضرت امام شافعیؒ سے یہ منقول ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی اس سے مراد آپ کا وہ حصہ تھا جو خمس سے آپ کو ملتا تھا۔ بعد کو آپ کے خلفائے راشدین نے جو عملی ثبوت اپنی خلافت کے زریں دور میں اسی سلسلے میں پیش کیے ہیں تاریخ کے اوراق ان سے بھرے ہوئے ہیں کہ مالِ غنیمت کے سارے خمس کو یتامیٰ۔ مساکین اور مسافروں کے لیے مقرر کر دیا۔ یہی اسلام کا انسانی دنیا میں وہ جدید اقدامی کارنامہ ہے جس کی انسانیت کی پوری تاریخ میں دنیا کی حکومتیں نظیر نہیں پیش کر سکتی ہیں۔

اموالِ غنیمت کے باقی چار حصص

یہاں تک جو کچھ بیان ہوا ہے وہ قرآن کا ... ہے لیکن اس کا مدلول یہ بھی ہے کہ اموالِ غنیمت میں سے ۱/۵ نکالنے کے بعد باقی چار حصص کو ان فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے جو اس مالِ غنیمت حاصل کرنے کا ذریعہ بنے ہیں یہ

تقسیم کیے ہو صحابہ میں عمر بن الخطاب علی بن ابی طالب ؓ تابعین میں عمر بن عبدالعزیز، ابن سیرین ؒ اور ائمہ مجتہدین میں امام مالک، امام اوزاعی، امام لیث بن سعد امام سفیان ثوری، امام شافعی، امام احمد بن حنبل، امام ابو ثور، امام ابو یوسف، امام محمد بن الحسن ؒ فرماتے ہیں پیدل کو ایک حصہ دیا جائے اور سوار کو تین حصے دیے جائیں ایک حصہ سوار کا دو حصے گھوڑے کے۔ صرف امام ابو حنیفہ ؒ کی رائے یہ ہے کہ سوار کو تین نہیں دو دیے جائیں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے دونوں کے دلائل کا موازنہ پیش کیا ہے اور جمہور کے مسلک کو ترجیح دی ہے۔

بہر حال آیت قرآنی صراحتاً نہیں اشارۃً بتا رہی ہے کہ ۵/۱ نکالنے کے بعد باقی فوجیوں میں تقسیم کر دیا جائے۔ حضور اقدس ﷺ نے یہی طریقہ اختیار فرمایا تھا بعد میں خلفائے راشدین نے اسی طریقہ پر عمل کیا۔ بنو امیہ اور بنو عباس کے دورِ حکومت میں بھی غنیمت فوجیوں کے درمیان تقسیم کی جاتی رہی اور اسلامی فقہ کے تمام مکاتب اس بات پر متفق ہیں کہ مالِ غنیمت کے باقی چار حصے جنگ میں حصہ لینے والوں میں تقسیم کیے جائیں۔

دورِ جدید میں اموالِ غنیمت کی نوعیت بدل گئی۔ قرنِ اوّل میں اور اس کے بعد بھی صدیوں تک غنیمت میں ہاتھ آنے والے اسلحہ ایسے ملتے جو افراد کے درمیان تقسیم کیے جا سکتے تھے لیکن دورِ جدید میں ایسے اسلحہ اور فوجی سامان بھی ہاتھ آسکتے ہیں جو افراد کے درمیان تقسیم نہیں کیے جا سکتے ہیں۔ مثلاً ہوائی جہاز، بحری جہاز، غوطہ خور جہاز، ٹینک، جیپ گاڑیاں، ٹرک، مشین گنیں، توپ، راکٹ، اور دیگر ایٹمی سامانِ جنگ، ان میں سے بعض چیزیں بڑی اور قیمتی ہونے کی وجہ سے ناقابلِ تقسیم ہیں۔ اور تقریباً ساری چیزیں ایسی ہیں جن کو افراد کی ذاتی ملکیت میں دینا اسلام اور مسلمانوں کے مصالح کے خلاف ہوگا۔ ان میں سے اکثر اسلحہ صرف بڑے پیمانے کی جنگ میں کام آسکتا ہے اور بڑے پیمانے پر جان و مال کی تباہی کی قوت رکھتا ہے ان کو افراد کی ذاتی ملکیت میں دینے سے فتنہ و فساد کے ملک میں رونما ہونے کا اندیشہ ہے۔ تمدنی مصالح کا تقاضا ہے کہ بڑے پیمانے پر جان و مال تباہ کرنے کی قوت صرف حکومت کے قبضہ میں ہو۔ اگر یہ طاقت افراد کے ہاتھ میں بھی رہے تو اس بات کا اندیشہ ہے کہ وہ اسے اپنی اغراض کی تکمیل کے لیے باہمی تنازعات میں یا کسی موقعہ پر حکومت کے خلاف بغاوت میں استعمال کر کے شہریوں کی زندگی کو خطرہ میں ڈال دیں۔

قرنِ اوّل میں عام طور پر افراد اپنے اسلحوں کے ساتھ جنگ میں شریک ہوتے تھے۔ اس لیے غنیمت میں ملنے والے اسلحہ کی افراد کے درمیان تقسیم فوجی اعتبار سے ملک کے لیے مفید ہوتی تھی۔ جدید حالاتِ جنگ کا تقاضا ہے کہ اپنے سپاہیوں کو اسلحہ فراہم کرنے کی ذمہ داری خود حکومت لے۔ ان حالات میں غنیمت میں ملنے والے اسلحوں کو فوجی افراد کی ذاتی ملکیت میں دینا فوجی اعتبار سے بھی بے سود ہوگا کیونکہ ان کو جدید اسلحہ سے مسلح رکھنے کا کام اسلامی حکومت کو بہر حال ہی کرنا ہوگا۔ جیسا کہ اوپر اشارہ کیا جا چکا ہے۔ خطرناک بھاری اسلحہ کی ذاتی ملکیت کو قانوناً ممنوع قرار دینا زیادہ مناسب

ہوگا ——

یہ ایک اجتہادی مسئلہ ہے اور ضرورت ہے کہ اُمت کے فقہائے مجتہدین اس موضوع پر کوئی رائے قائم کریں اور سوچیں کہ :

دورِ قدیم میں سپاہیوں کے اسلحہ ان کی ذاتی ملک ہوتے تھے اور سامان جنگ کا انتظام ان کو خود کرنا ہوتا تھا۔

دورِ قدیم میں سپاہی کی تنخواہ نہ ہوتی تھی وہ جنگ میں رضاکارانہ جاتا تھا۔

اَب دورِ جدید میں اسلحہ کی ذمہ داری حکومت پر ہوتی ہے اور سپاہی حکومت سے تنخواہ یاب ہوتا ہے اور سپاہی کی ہر ضروریات کی حکومت کفالت کرتی ہے۔ ان بدلے ہوئے احوال کا احکام کی تبدیلی پر کیا اثر پڑتا ہے۔ شاید حالات کے اسی تغیر کے پیشِ نظر یہاں قرآن نے یہ تصریح نہیں کی ہے کہ اموالِ غنیمت میں سے ۵/۱ نکالنے کے بعد چار حصے فوجیوں میں تقسیم کیے جائیں۔ غنائم دونوں ہیں منقولہ اور غیر منقولہ۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا غیر منقولہ غنائم کے بارے میں فیصلہ تاریخ کی کتابوں، حدیث کی کتابوں، فقہ کی کتابوں میں موجود ہے۔ اس میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں اور اس کو پوری جماعت کا اجتماعی فیصلہ بنایا گیا ہے۔ اسی طرح سہم الرسول کے بارے میں فقہ کے چاروں اماموں کا فیصلہ آپ سُن چکے ہیں ذوالقربی کے خمس میں سے حصے کے متعلق آپ فقہاء میں سے امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کا فتویٰ پڑھ چکے ہیں۔ کہنا چاہتا ہوں کہ اگر نص کے منطوق پر احوال وظروف کے تغیر کا اثر پڑ سکتا ہے تو مدلول پر بدلے ہوئے حالات کا اثر کیوں نہیں پڑ سکتا ہے۔ اگر کسی مخصوص صورتِ حال میں شریعت کے کسی حکم پر عمل کے نتیجے میں ضرر وفساد پیدا ہونے کا کوئی اندیشہ قوی ہو اور یہ ضرر وفساد اس ضرر وفساد سے بڑا ہو جو اس حکم پر عمل نہ کرنے سے پیدا ہوگا تو اس حکم پر عمل نہ کرنا چاہیے۔

ازالہ ضرر کے اصول سے فقہاء نے جو قاعدے مرتب کیے ہیں ان موضوع پر استفادہ کرنا چاہیے۔

إِذْ أَنْتُمْ بِالْعُدْوَةِ الدُّنْيَا وَهُمْ بِالْعُدْوَةِ الْقُصْوَىٰ وَ
الرَّكْبُ أَسْفَلَ مِنْكُمْ ۚ وَلَوْ تَوَاعَدْتُمْ لَاخْتَلَفْتُمْ فِي
الْمِيعَادِ ۙ وَلَٰكِنْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا لِيَهْلِكَ
مَنْ هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ وَيَحْيَىٰ مَنْ حَيَّ عَنْ بَيِّنَةٍ ۗ وَإِنَّ
اللَّهَ لَسَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٤٢﴾ إِذْ يُرِيكَهُمُ اللَّهُ فِي مَنَامِكَ قَلِيلًا ۖ
وَلَوْ أَرَاكَهُمْ كَثِيرًا لَفَشِلْتُمْ وَلَتَنَازَعْتُمْ فِي الْأَمْرِ
وَلَٰكِنَّ اللَّهَ سَلَّمَ ۗ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ﴿٤٣﴾ وَ
إِذْ يُرِيكُمُوهُمْ إِذِ الْتَقَيْتُمْ فِي أَعْيُنِكُمْ قَلِيلًا وَيُقَلِّلُكُمْ
فِي أَعْيُنِهِمْ لِيَقْضِيَ اللَّهُ أَمْرًا كَانَ مَفْعُولًا ۗ وَإِلَى اللَّهِ
تُرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿٤٤﴾

ع ۵ ۱

یہ وُہ دن تھا کہ تم ادہر قریب کے ناکے پر تھے اور وہ یعنی دُشمن دُور کے ناکے پر۔ اور قافلہ تم سے نچلے حصّہ پر یعنی سمندر کے کنارے کی طرف تھا[55]۔ اور اگر تم نے باہم مقابلہ کا وعدہ کیا ہوتا تو ضرور تم جنگ سے پہلوتہی کرتے[56]۔ جو صُورتحال پیش آئی صرف اِس لیے آئی کہ جو کچھ اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا اُس کا ظہور ہو جائے اور اس لیے تاکہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ حُجت پوری ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ اتمام حُجت کے بعد زندہ رہے اور بلاشُبہ اللہ سب کچھ سُنتا ہے اور سب کچھ جانتا ہے[57] اور اے پیغمبر یہ وہ دن تھا کہ اللہ سبحانہٗ نے آپ کو خواب میں ان کی تعداد تھوڑی کر کے دکھائی۔ اور اگر آپ کو خواب میں اللہ سبحانہٗ ان کی تعداد

زیادہ دکھا دیتا تو مسلمانو! تم ضرور ہمت چھوڑ بیٹھتے۔ اور اس معاملہ میں باہم الجھ جاتے لیکن اللہ سُبحانہ نے تمہیں اس سے بچا لیا۔ یقین کرو کہ اللہ سینوں کے چھپے رازوں کو جانتا ہے[۵۸] اور یہ بات بھی غور کی ہے کہ عین مقابلہ کے وقت میں اللہ ان کو تمہاری نظروں میں۔ اور تمہیں ان کی نگاہوں میں تھوڑا کر کے دکھا رہا تھا۔ یہ سب کچھ اس لیے کیا تھا تاکہ جس بات کا اللہ نے فیصلہ کر لیا ہے اس کو کر دکھائے۔ سارے کاموں کا دارومدار اللہ سُبحانہ کی ذات پر ہے[۵۹]

بدر یوم الفرقان ہے

۳۔ اگر تمہارا اللہ پر اور اس چیز پر ایمان ہے جو ہم نے اپنے بندے پر فیصلہ کے دن نازل کی تھی۔ یعنی جس روز دو جماعتیں ایک دوسرے سے بھڑ گئیں اور اللہ کو ہر چیز پر دسترس ہے۔ فیصلہ کے دن سے مراد یوم بدر ہے جس میں حق و باطل کی کشمکش کا کھلا ہوا فیصلہ ہو گیا۔ اس دن حق تعالیٰ نے اپنے کامل ترین بندے پر فتح و نصرت اُتاری فرشتوں کی امدادی کمک پہنچی اور سکون و اطمینان کی کیفیت نازل فرمائی تو جو لوگ خدا پر اور اس کی تائید غیبی پر ایمان رکھتے ہیں ان کو غنیمت میں سے خدا کے نام کا پانچواں حصہ نکالنا بھاری نہیں ہو سکتا۔ جیسے اس روز تم کو مظفر و منصور کیا۔ وہ قادر ہے کہ آئندہ بھی تم کو غلبہ اور فتوحات عنایت فرمائے[۱]

اس آیت میں جو جملہ شرطیہ کا پیمانہ ہے اس کی نوعیت زجر ہے توبیخ کی نہیں جیسا کہ کچھ نوخیز شارحین قرآن کا خیال ہے کہ:

> چونکہ روئے سخن ان نکتہ چینوں کی طرف خاص طور سے ہے جنھوں نے اموالِ غنیمت سے متعلق سوال اٹھایا تھا اس وجہ سے فرمایا اگر تم اللہ پر ایمان رکھتے ہو۔

بلکہ اس کی نوعیت بالکل وہی ہے جیسے دوسرے مواقع پر ان کنتم تومنون باللہ والیوم الآخر کی ہے۔ یہاں شرط کی جزاء محذوف ہے پوری بات اس طرح ہے کہ اگر تم اللہ اور ما انزلنا علی عبدنا پر ایمان رکھتے ہو تو خوب جان لو کہ اموالِ غنیمت میں خمس کا قانون بھی اللہ نے بنایا ہے اور اس کی تقسیم بھی اللہ کی بنائی ہوئی ہے جو جس کا ہے اس کے سپرد کر دو مطلب یہ ہے کہ ایمان کے ثبوت کے لیے نرا علم کافی نہیں ہے اس

[۱] افادات شیخ الاسلام

کے لیے عمل اور طاعت کی شہادت بھی ہونی چاہیے۔ اور قرآن نازک مواقع پر ایمان ہی کے حوالہ سے مخاطبوں میں طاعت کی انگیخت کرتا ہے۔

اور یہاں ان کنتم امنتم باللہ و رسولہ کی تعبیر چھوڑ کر ان کنتم امنتم باللہ وما انزلنا علیٰ عبدنا یوم الفرقان کی تعبیر بلیغ موقعہ و محل کے لحاظ سے اختیار کی ہے۔ بتایا ہے کہ بدر کے روز جو کچھ جتنی کچھ اور جیسی کچھ تمہیں کامیابی حاصل ہوئی ہے وہ تمہارا کارنامہ نہیں ہے بلکہ یہ اللہ سبحانہ کی کارسازی اور اللہ کی جانب سے اپنے رسول پر نازل کردہ برکات کا فیضان ہے۔ یہ فقرہ کہ جو کچھ ہم نے بدر کے دن اپنے بندے پر نازل کیا بڑا ہی معنی خیز ہے۔ بدر میں ہونے والے انعامات کو کوزہ میں بند کر دیا ہے۔ ذرا غور فرمایئے اور ایک اچٹتی نظر ان انعامات پر ڈالیے۔

بدر میں پہلا انعام

پہلے پڑھ چکے ہو کہ بدر کے معرکہ سے پہلے قریش کا ایک تجارتی قافلہ مال و اسباب سے لدا ہوا شام سے مکہ جا رہا تھا۔ اور اوپر سے قریش کی فوج بڑے ساز و سامان کے ساتھ مسلمانوں سے لڑنے کو نکلی تھی۔ مدینے سے نکلنے سے پہلے ہی اللہ تعالیٰ نے اس صورتحال سے مسلمانوں کو آگاہ کر دیا تھا اور کہہ دیا تھا کہ ان دونوں میں سے ایک چیز تم کو ملے گی یا تو یہ قافلہ اور یا پھر قریش کی فوج شکست کھائے گی اور تم کو مال غنیمت ملے گا چنانچہ بدر میں یہ ہی صورت واقعہ پیش آئی اور اللہ کا وعدہ پورا ہوا۔

دوسرا انعام بدر میں

بدر کے میدان میں جہاں مسلمانوں نے اپنی صفیں قائم کی تھیں وہ جگہ بلند تھی اور جہاں قریش کی فوج کا پڑاؤ تھا وہ جگہ نشیب میں تھی اللہ سبحانہ نے کفار کی شکست کا ایک مادی سبب پیدا کر دیا کہ عین اس وقت میدانِ جنگ میں موسلا دھار بارش ہو گئی جس نے ادھر تو مسلمانوں کی طرف گرد و غبار بٹھا کر ان کے پاؤں جما دیئے۔ اور ادھر کافروں کی طرف پانی کا سیلاب آ گیا کہ ان کو زمین پر قدم رکھنا مشکل ہو گیا۔

بدر میں تیسرا انعام

مسلمانوں کی تعداد کم تھی اس کی تلافی اس طرح کی کہ ایک ہزار فرشتوں کی کمک آ گئی۔ ان فرشتوں کے آنے کی قرآن نے شکل یہ بتائی کہ ان کے دستے کے بعد دستے اور پرے کے بعد پرے نمایاں ہوں گے۔ میدانِ جنگ میں لڑنے والوں کی یہ سائیکالوجی ملحوظ رہے کہ جن کی حمایت میں کمک پر کمک آ رہی ہو ان کا حوصلہ ہر کمک پر دونا ہو جاتا ہے اور اسی اعتبار سے مدِ مقابل کے اعصاب کا تناؤ ڈھیلا ہوتا جاتا ہے۔

بدر میں چوتھا انعام

بدر دار و گیر کا معرکہ تھا۔ اس معرکہ میں جہاں سب پریشان تھے حضور اقدس ﷺ کی ذات گرامی سکون دل اور سر بسجود پیشانی کے ساتھ ظاہری ہتھیاروں سے منزہ ہو کر دعاؤں میں مصروف تھی ۔ آپ نے سر اٹھایا اس حیرتناک منظر پر نگاہ ڈالی اور زمین سے ایک مٹھی کنکری اور خاک اٹھا کر دشمن کی طرف پھینکی۔ یکبارگی باطل کا طلسم چور چور ہو گیا۔

بدر میں پانچواں انعام

رات کو جب مسلمان بدر کے پڑاؤ پر پہنچے تو انھیں یہ فکر ہوئی کہ قریش کے قافلہ کا پتہ لگایا جائے۔ چنانچہ مسلمان مخبر ادھر ادھر گئے اور ایک چرواہے کو پکڑ لائے اور اس سے قریش کے قافلہ کا حال پوچھنے لگے اس نے جواب دیا کہ قافلہ کا حال تو مجھے معلوم نہیں ہے البتہ ان کا فوجی لشکر ادھر پڑا ہے۔ یہ سن کر مسلمانوں نے اُسے مارا کہ صحیح حال نہیں بتایا ہے مار کھانے پر اس نے کہا کہ اچھا ٹھہرو بتاتا ہوں۔ جب لوگ چھوڑ دیتے تو وہ پھر یہی کہتا کہ قافلہ کا تو پتہ نہیں ہے البتہ یہ جانتا ہوں کہ قریش کا لشکر سامنے پڑا ہے۔ حضور اقدس ﷺ نماز پڑھ رہے تھے نماز سے فارغ ہوئے تو فرمایا کہ جب وہ جھوٹ کہتا ہے تو تم چھوڑ دیتے ہو اور جب وہ سچ بولتا ہے تو اسے مارتے ہو اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ قریش کی تباہی کا دن ہے۔ یہ ابو جہل کا مقتل ہے۔ یہ عتبہ کا ہے یہ ابی کا ہے وغیرہ۔ راوی کہتا ہے کہ آپ نے جس کا مقتل جہاں متعین فرمایا تھا۔ ایک نے بھی سر مو وہاں سے تجاوز نہ کیا۔ اور معرکہ جنگ میں وہ وہیں مرا پڑا ملا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جو صحن حرم کی بددعا کے دن موجود تھے وہ کہتے ہیں کہ عرب کے ساتوں رئیس جن کے حق میں آپ نے بددعا کی تھی کل کے کل بدر کے میدان میں ڈھیر ہو گئے اور بطشۃ الکبری کے انتقام کی پیش گوئی پوری ہو گئی۔

بدر میں چھٹا انعام

معرکہ جنگ وہ مقام ہے جہاں بڑے بڑے بہادروں کی آنکھ سے نیند اڑ جاتی ہے مگر اللہ سبحانہ کی قدرت کی یہ کارسازی اور حضور اقدس ﷺ کا یہ اعجاز تھا کہ بدر کے کارزار میں مسلمان سپاہیوں کی بے خطری اور بے خوفی کے لیے ان کی آنکھوں پر نیند کا غلبہ کر دیا تاکہ کسی خوف و خطر کا خیال کیے بغیر وہ اپنا فرض انجام دے سکیں۔

یہ اور اس قسم کے دوسرے انعامات کو جتانے کے لیے قرآن نے یہاں ما انزلنا علی عبدنا یوم الفرقان کی بلیغ تعبیر اختیار فرمائی ہے مطلب یہ ہے کہ اگر تم اللہ سبحانہ کو مانتے ہو اور اس کے جناب رسول اللہ ﷺ پر ان انعامات کی بارش نازل ہوتے آنکھوں سے دیکھ چکے ہو تو پھر دعویٰ ایمان کی پشت پر کردار کی شہادت میں کبھی تاخیر نہ کرنا اور یہ بات دھیان میں رکھنا کہ اللہ سبحانہ کی ذات ہر چیز پر قادر ہے۔ اس کی قدرت کی نشانیوں کا تم بدر میں مشاہدہ کر چکے ہو۔ قرآن پاک ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور مومنوں کا وصف لازم بتاتا ہے۔ ہر اہم موقعہ پر

اس نے مسلمانوں کو یا ایھاالذین امنوا کی ندا سے خطاب کیا ہے جس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل پیرا ہوتے ہیں جو ایمان سے متصف ہیں۔ بہت سی جگہوں پر ان کنتم مومنین ہے اس سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات ایمان والوں ہی کے لیے خاص ہے اور وہی اس کے اہل اور سزاوار ہیں۔

بدر کا تاریخی چہرہ

درمیان ہیں یوم التقی الجمعان فرما کر بدر کا تاریخی چہرہ بھی پیش کر دیا دو جماعتوں سے مراد لشکر قریش اور مسلمانوں کی جماعت مسلمانوں کی تعداد ۳۱۳ اور مشرکین کے لشکر کی تعداد ۹۵۰ تھی۔

اہلِ ایمان کی اس تعداد ۳۱۳ میں بھی بڑی دلآویزی ہے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں حجۃ الوداع میں صحابہ کی تعداد ایک لاکھ ۲۲ ہزار بتائی ہے حضور اقدس ﷺ نے ابوذر رضی اللہ عنہ کی ایک حدیث میں انبیاء کی تعداد بھی ایک لاکھ چوبیس ہزار بتائی ہے اور ان میں اولوالعزم الرسل کی ۳۱۳ بتائی ہے۔ دونوں کا موازنہ کر کے دیکھو تو صحابہ کا مقام بالعموم اور اصحابِ بدر کا مقام بالخصوص واضح ہو کر سامنے آتا ہے۔ خیر یہ تو لطیفہ تھا۔ ان دونوں جماعتوں کا باہم مقابلہ بدر پر ہوا۔ جمعہ کا دن، ار رمضان المبارک ۲ھ تھی۔

جنگِ بدر کی جغرافیائی حیثیت

(۵۵) یہ وہ دن تھا کہ تم ادھر قریب کے ناکے پر تھے اور وہ یعنی دشمن دور کے ناکے پر تھا ـــــ اور قافلہ تم سے نچلے پر یعنی سمندر کے کنارے پر تھا۔ ورلے کنارے سے مراد میدانِ جنگ کی وہ جانب ہے جو مدینہ طیبہ سے قریب تھی اسی طرح پرلا کنارا وہ ہوگا جو مدینے سے بعید تھا اور نیچے یعنی ابوسفیان کا تجارتی قافلہ نیچے کی طرف ہٹ کر سمندر کے کنارے کنارے جا رہا تھا قافلہ اور مسلمانوں کے درمیان قریش کی فوج تھی[1]۔ یہ جنگِ بدر کا جغرافیہ بتایا ہے یمن سے شام تک ایک تجارتی شاہراہ تھی۔ تجارتی شاہراہ بدر سے گذر کر شام جاتی تھی اسی تجارتی شاہراہ پر جہاں بدر واقع تھا بدر کی حدود سے ذرا پہلے شمال و مغرب کی سمت میں شام کی جانب مدینے سے قریب ایک پہاڑی تھی جسے قرآن نے العدوۃ الدنیا کہا ہے۔ دوسری پہاڑی مدینے سے دور جنوب مشرق میں تھی جسے یہاں العدوۃ القصوی کہا ہے۔ اور تجارتی شاہراہ سے تین میل کے فاصلے پر بحرِ احمر کا کنارہ تھا وہ تجارتی قافلہ جس کے تعاقب میں مسلمان مدینے سے چلے تھے اس تجارتی شاہراہ سے ہٹ کر مسلمانوں سے بچتا ہوا سمندر کے کنارے کنارے جا رہا تھا اسی کو یہاں قرآن نے الرکب اسفل منکم کہا ہے مکہ والوں کا خاص پیشہ تجارت تھا ان کے تجارتی قافلے شمال میں شام اور جنوب میں یمن سے تجارت کے لیے جاتے

[1] افادات شیخ الاسلام

تھے ان قافلوں کا راستہ بحر احمر کے کنارے کنارے مدینے کے پاس سے ہو کر گذرتا تھا۔ اس لحاظ سے مدینہ کو اس راہ پر ایک بہت ہی اہم چوکی کی حیثیت حاصل تھی۔ شعبان ۲ھ فروری یا مارچ ۶۲۳ء میں قریش کا ایک بہت بڑا قافلہ جس کے ساتھ تقریباً پچاس ہزار پونڈ کا مال تھا اور محافظ چالیس پچاس سے زائد نہ تھے۔ قافلے کا پس منظر تھا کہ اس کی آمدنی سے اسلحہ خرید کر مدینہ پر حملہ کیا جائے گا۔ حملہ کے لیے سب سے بڑی ضروری چیز مصارف جنگ کا بندوبست تھا اس لیے اس بار قریش کا جو کارواں تجارت شام کو روانہ ہوا وہ اس شان سے روانہ ہوا کہ مکہ کی تمام آبادی نے جس کے پاس جو رقم تھی سب کی سب دے دی۔ ابن سعد نے ابوسفیان کی یہ بات لکھی بخدا مکہ میں کوئی قریشی مرد و عورت نہ تھا جس کی رقم تجارت میں نہ لگی ہو ہمارے مورخین کو اسباب و نتائج کی جستجو نہیں ہوتی۔ مگر سوچنے کی بات ہے کہ اہل مکہ کو سارا سرمایہ تجارت میں لگانے کی ضرورت اس کے سوا کیا تھی کہ اس سرمایہ سے جنگ کی تیاری کر کے مدینہ پر حملہ کیا جائے اور ہمیشہ کے لیے مسلمانوں کو ختم کر دیا جائے۔ یہی تجارتی قافلہ شام سے سامان تجارت لے کر واپس آرہا ہے۔ اسی کی روانگی کی خبر مدینہ میں حضور کو ہوئی تھی کہ قریش کی ایک جماعت مال تجارت لے کر شام جانے کے لیے مکہ سے روانہ ہو چکی ہے۔ اس کی تلاش میں آپ نکلے۔ ینبع کے قریب ایک مقام تک تشریف لے گئے جس کا نام ذی العشیرہ ہے۔ یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ کئی روز پہلے یہ قافلہ یہاں سے روانہ ہو گیا۔ یہی جماعت جب شام سے سامان تجارت لے کر واپس آرہی تھی تو پھر آپ کو اطلاع ملی کہ قافلہ واپس آرہا ہے یہی قافلہ، ا رمضان ۲ھ مطابق مارچ، اپریل ۶۲۳ء سے پہلے کسی تاریخ میں بدر سے گذر رہا تھا اس کی آمد کی آپ کو اطلاع ہوئی۔ آپ اسی کو روکنے کے لیے مدینے سے بغیر جنگ کی تیاری کے ۳۱۳ سپاہیوں کو لے کر بدر کی طرف روانہ ہوئے۔ لیکن منظور الٰہی کچھ اور تھا۔ بدر میں آپ پہنچے تو آپ کے سامنے مشرکین کی فوج تھی۔ یعنی قافلہ اور آپ کے درمیان مشرکین کی فوج حائل تھی آپ اور مشرکین کی فوج بالائی حصہ پر اور پہاڑوں کے درمیان وادی میں جبکہ قافلہ وادی سے دور ساحل کے قریب نیچی حصے سے گذر رہا تھا۔ سوچئے کہ اگر آپ قافلہ کے ارادے سے مدینے سے نہیں آرہے تھے تو قرآن کو یہاں قافلہ کا تذکرہ کرنے کی ضرورت کیا تھی۔ قرآن یہاں تیسری بار قافلہ کا ذکر کر رہا ہے۔ پہلا موقعہ وہ ہے جب قرآن نے یہ بتایا کہ اذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین مسلمانو! اللہ تم سے دو جماعتوں میں سے ایک کا وعدہ کرتا ہے۔ یہاں دو جماعتوں سے ایک تجارتی قافلہ، دوسرے مشرکین کی فوج مراد ہے دوسرا موقعہ وہ ہے جب قرآن نے یہ انکشاف کیا۔

وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم اور تمہارا پیش نہاد یہ تھا کہ تجارتی قافلہ تمہیں مل جائے۔

سوال یہ ہے کہ اگر وہ مدینے سے قافلہ تجارت کے لیے نہیں نکلے تھے تو ان کی یہ خواہش کیسے اور کیوں ہوئی۔

یہ تیسرا موقعہ ہے کہ قرآن بتا رہا ہے کہ یہی قافلہ جس کے تعاقب کے لیے مدینے سے آئے تھے تمہارے سامنے وادی

کے زیریں حصے سے گذر رہا تھا۔ ان تینوں کو ملا کر اگر ذرا غور سے کام لیا جائے تو یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مدینے سے نکلتے وقت صرف قافلہ پیش نظر تھا جب فوج کی موجودگی کی ذفران میں جاکر اطلاع ملی تو اللہ سبحانہ نے مسلمانوں سے وعدہ کیا کہ دونوں موجود ہیں ایک تمہیں ضرور ملے گا۔ اس وعدہ پر طبعی طور پر اور حالات کے پیش نظر سب کی خواہش یہی تھی کہ تجارتی قافلہ ملے لیکن حق کو حق کرنے کے لیے منظور الٰہی کچھ اور تھا۔

تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم ویرید اللہ ان یحق الحق

اب واقعہ کی نوعیت پر غور کرو واقعہ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ مدینہ سے ۳۱۳ کی مختصر سی جماعت لے کر تجارتی قافلہ کو روکنے کے لیے نکلے۔ اگر مدینہ ہی سے جنگ کے لیے نکلے ہوتے تو قرآن یہ نہ کہتا کہ کما اخرجک ربک۔ تیرے رب نے تجھے نکالا یعنی جنگ کی خاطر تیرا نکلنا نہ تھا بلکہ تیرے ارادے کے بغیر تیرے رب نے تجھے نکالا۔ اگر مدینے سے جنگ کے لیے نکلتے تو تعبیر یہ ہوتی کما اخرجت من بیتک۔ تو اپنے گھر سے نکلا۔ آیت میں الحق سے مراد امر واقعہ جنگ ہے۔ مدینے سے روانہ ہو کر جب ذفران میں پہنچے تو آپ کو معلوم ہوا کہ قافلہ تجارت کی حفاظت کے لیے قریش کا مسلح لشکر بھی ہے۔ اب صورتحال بالکل واضح تھی کہ تجارتی قافلہ کی حفاظت کے لیے مشرکین کی فوج سامنے کھڑی ہے۔ اسی کو قرآن نے بعد ما تبین (با وجودیکہ معاملہ واضح تھا) سے بتایا ہے اگر مدینہ سے ہی جنگ کی تیاری کر کے نکلتے تو کسی کے ناگوار ناپسند ہونے کا سوال ہی نہ ہوتا۔ ناگواری اور ناپسندیدگی کا اظہار اگر کچھ نے کیا ہے تو صرف اس لیے کیا ہے کہ مدینے سے جنگ کی تیاری کر کے نہیں آئے تھے۔ اور یہ ناگواری ظاہر کرنے والے منافقین نہیں بلکہ سچے اور پکے مومن تھے قرآن نے خود ان کو المومنین کہا ہے۔ ان فریقا من المومنین لکارھون

ابن ابی حاتم نے حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے۔

جب ہم نے ایک دو روز کی مسافت طے کر لی تو حضور ﷺ نے فرمایا بتاؤ جنگ کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے ہم نے جواب میں عرض کیا کہ مالنا طاقۃ بقتال القوم ہم میں جنگ کی طاقت نہیں ہے۔ ہم تو قافلہ کے ارادے سے آئے تھے۔

قرآن بھی یہی کہتا ہے اور سب کے بارے میں کہتا ہے تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم تم سب کی خواہش یہ تھی کہ تجارتی قافلہ ملے۔

یہ کہنا بھی بے جان ہے کہ وان فریقا من المومنین میں واو حالیہ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ کراہت اس وقت ہوئی جب حضور ﷺ مدینے سے نکل آئے تھے۔ قاضی بیضاوی نے اگرچہ یہی بات لکھی ہے لیکن اس موضوع پر محققین کی رائے یہ ہے کہ یہ استیناف بیانی ہے اور اٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ ہے کہ جب حضور اقدس

خود جنگ کے لیے نہیں نکلے بلکہ آپ کو اللہ نے نکالا ہے تو پھر مسلمانوں کا کیا حال تھا فرمایا کہ ان میں ایک مختصر سی جماعت لڑائی کو پسند نہ کرتی تھی اور لڑائی کے موضوع پر حضور اقدس ﷺ سے مبادلہ کر رہی تھی بتانا یہ ہے کہ جنگ کی صورت میں جو کچھ بھی پیش آیا ہے اس کا عالم مادی اور عالم اسباب سے کوئی تعلق نہیں ہے جو کچھ ہوا ہے عالم غیب میں فیصلے کے مطابق ہوا ہے نہ پیغمبر خود نکلے اور نہ صحابہ جنگ کے لیے تیار تھے۔ نہ ان کے پاس افرادی قوت تھی اور نہ سامان جنگ تھا اور نہ ان کا جنگ کا کوئی ارادہ تھا۔ یہ سب کچھ اللہ سبحانہ نے اپنی قدرت غیبیہ سے کیا ہے۔

بہر حال یہاں "الرکب اسفل منکم" لا کر قرآن نے اشارا کر دیا کہ تم جس کے تعاقب میں مدینے سے نکلے تھے وہ تم سے دور زیریں حصے سے گذر رہا تھا۔ اور تمہیں اپنی توقعات کے خلاف فوج سے مقابلہ کرنا پڑا۔

جنگ کا وقت مقرر نہ تھا

(۵۶) اور اگر تم نے باہم مقابلہ کا وعدہ کیا ہوتا تو ضرور تم جنگ سے پہلو تہی کرتے یعنی اگر فریقین پہلے سے لڑائی کا کوئی وقت ٹھہرا کر جانا چاہتے تو ممکن تھا کہ اس میں اختلاف ہو جاتا یا وعدہ کے وقت پہنچنے میں ایک فریق پس و پیش کرتا کیوں کہ ادھر مسلمان کفار کی تعداد اور ظاہری ساز و سامان سے خائف تھے۔ ادھر کفار مسلمانوں کی حقانیت خدا پرستی اور بے جگری سے مرعوب رہتے تھے دونوں کو جنگ کی ذمہ داری لینے یا شرکت کرنے میں تردد ہو سکتا تھا[1] مطلب یہ ہے کہ عام دستور اور معمول تو یہ ہے کہ مقابلہ کے لیے فریقین اپنے ارادے اور مرضی سے جنگ کا میدان اور تاریخ مقرر کرتے ہیں لیکن بدر میں ایسا نہیں ہوا نہ مسلمان مدینے سے جنگ کے لیے نکلے اور نہ مشرکین مکہ سے اس ارادہ سے آئے۔ مسلمانوں کا ارادہ تجارتی قافلہ کو روکنا تھا اور مشرکین کا خیال تجارتی قافلہ کی حفاظت تھی۔ یہ آیت اس بات میں قاطع ہے کہ مسلمان مدینہ سے جنگ کے ارادے سے نہیں آئے تھے اس کی تائید صحیح مسلم کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت کعبؓ کے حوالے سے آئی ہے۔

> حضرت کعبؓ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ ﷺ کو چھوڑ کر کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا سوائے غزوہ تبوک کے۔ اور ہاں غزوہ بدر میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔ لیکن اس پر کسی کو کوئی عتاب نہیں ہوا۔ کیوں کہ ادھر حضور اقدس ﷺ جنگ کے لیے نہیں بلکہ تجارتی قافلہ کے لیے گئے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے اتفاقیہ آپ کی قریش سے مڈبھیڑ کرا دی۔

اگر قریش کی فوج تجارتی قافلہ کو بچانے کے لیے نہیں بلکہ جنگ کے لیے آئی تو قرآن یہ کیوں کہتا و لو تواعدتم لاختلفتم فی المیعاد۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آیئے یہاں علامہ زمخشری کی زبانی ایک سوال کا جواب بھی گوش گذار فرمایئے۔

سوال یہ ہے کہ قرآن نے میدانِ جنگ کا جغرافیائی مقام اور جنگ کا توقیتی نقشہ کیوں پیش کیا ہے یہ کیوں بتایا ہے کہ بدر کی جنگ کسی پیشگی وقت کی تعیین کے بغیر پیش آئی جانبین سے اس سلسلے میں پہلے کچھ فیصلہ نہیں ہوا تھا۔ اور یہ کیوں انکشاف کیا ہے کہ دونوں جماعتوں کے میدانِ بدر میں قیامگاہ وادی کے دو کنارے تھے ایک کنارہ مدینے سے قریب دوسرا مدینے سے دُور تھا ــــ اور قافلہ تجارت وادی بدر سے تین میل دور نظر بچا کر جا رہا تھا۔

دراصل قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ مشرکین کے پاس عددی طاقت تھی۔ ان کو شوکت بھی حاصل تھی۔ اور کامیابی اور غلبہ کے سارے مادی وسائل ان کے ہمرکاب تھے۔ ادھر مسلمانوں کے پاس نہ عددی طاقت تھی نہ ان کو کوئی شوکت حاصل تھی۔ ان کے حالات ہر طرح سے بہت بڑی ابتری کا شکار تھے۔ ان حالات میں مسلمانوں کی کامیابی کا باعث مادی قطعاً نہیں بلکہ یہ محض اللہ سبحانہٗ کی قدرت کی کارسازی ہے جس نے میدانِ بدر میں مسلمانوں کو فتح سے ہمدوش کیا۔ سوچیئے وادی کا وہ کنارہ جہاں مشرکین نے قبضہ جمایا تھا وہاں پانی موجود تھا۔ زمین بھی پختہ تھی۔ برخلاف اس کنارے کے جہاں مسلمانوں نے ڈیرا لگایا تھا وہاں پانی نہ تھا اور زمین بھی ایسی ریتلی جہاں پاؤں دھنس جائیں آدمی بے تکلف چل بھی نہ سکے۔ پھر اس پر طرہ یہ کہ دشمن کی پشت پر پورے ساز و سامان کے ساتھ تجارتی قافلہ تھا۔ عددی طاقت ان کی پہلے بھی زیادہ تھی۔ قافلہ کی پشت پناہی ان کے حوصلے اور بلند کر رہی تھی۔ اور قافلہ کے بچاؤ کا احساس ان میں دلیری اور شجاعت فراہم کر رہا تھا۔ ان حالات میں دونوں جماعتوں مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان جنگ ہوئی اور نتیجہ میں حالات کی ناسازگاری اور واقعات کی ناہمواری کے باوجود اہل ایمان کامیابی اور فتح مندی سے ہمدوش ہوئے۔ کیوں ہو گئے اور کیسے ہو گئے۔ ذہن میں اٹھے ہوئے اس سوال کا جواب آگے ارشاد ہوا ہے۔

اللہ سُبحانہٗ کی مخفی تدبیر کی کرشمہ سازی

(۵۷) لیکن جو صورتحال پیش آئی صرف اس لیے آئی کہ جو کچھ اللہ نے فیصلہ کر لیا تھا اس کا ظہور ہو جاتے اور اس لیے کہ جسے ہلاک ہونا ہے وہ حجت پوری ہونے کے بعد ہلاک ہو اور جسے زندہ رہنا ہے وہ اتمامِ حجت کے بعد زندہ رہے اور بلاشبہ اللہ سب کچھ سننے والا ہے اور جاننے والا ہے۔ یعنی قریش قافلہ کی مدد کو آئے تھے اور تم قافلہ پر حملہ کرنے والے قافلہ بچ گیا اور دونوں فوجیں ایک میدان کے دو کناروں پر آپڑیں۔ ایک کو دوسرے کی خبر نہیں۔ یہ تدبیر اللہ کی تھی۔ اگر تم قصداً جاتے تو شاید بروقت نہ پہنچتے۔ اور اس فتح کے بعد صداقتِ نبوت کھل کر سامنے آگئی: جو مرا وہ بھی یقین جان کر مرا۔ اور جو جیتا رہا وہ بھی حق پہچان کر تا کہ اللہ کا الزام پورا ہو کذا فی الموضح۔ اور ممکن ہے مرنے اور جینے سے کفر و ایمان مراد ہوں۔ یعنی اب جو ایمان لائے

اور جو کفر پر جا رہا ہے۔ دونوں کا ایمان و کفر وضوح حق کے بعد ہو۔[1]

آغاز میں اللہ سبحانہ نے اسی سورت میں بدر کی جنگ کی فلاسفی یہ بتائی تھی کہ لیحق اللہ الحق یعنی اللہ سبحانہ چاہتا ہے کہ حق کو اپنی باتوں سے مستحکم کردے۔ اور یہاں ابھی فرمایا تھا کہ یہ حق اور باطل کے درمیان فیصلہ کا دن ہے یا الفرقان اور اب آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ یقضی اللہ امرا کان مفعولا۔ تاکہ اللہ سبحانہ اس کام کو پورا کردے جسے پورا ہونا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کو یہ جنگ اس لیے منظور ہوئی کہ اس سے اسلام کا حق ہونا علی رؤس الاشہاد ظاہر ہو جائے اور دنیا دیکھ لے کہ اس قلتِ عدد، بے سروسامانی اور جنگ کے لیے نہ نکلنے کے باوجود اہلِ ایمان غالب آگئے۔ یہ ایک اعجازی کارنامہ ہے۔ دراصل حضورِ اقدس ﷺ نے قریش کے لیے اسی قسم کی بددعا مانگی تھی جیسی حضرت نوح علیہ السلام نے ——— طوفان سے پہلے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غرق سے پہلے اپنی اپنی قوم کے لیے دعا مانگی تھی حضرت نوح علیہ السلام نے کہا کہ خداوندا اب زمین پر کوئی کافر جینے والا نہ چھوڑ۔ جب تک وہ زندہ رہیں گے تیرے نام کی تقدیس نہ ہوگی نہ ان کی نسل سے کوئی تیرا نام لینے والا پیدا ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا خداوندا ان کے دل سخت کردیئے کہ جب تک عذاب دیکھ لیں ایمان نہ لائیں گے۔ لیکن اس موقعہ پر حضورِ اقدس ﷺ کی زبان سے جو فقرہ نکلا وہ یہ تھا کہ:

خداوندا اپنا وعدہ پورا کر، اگر یہ مٹھی بھر مسلمان تباہ ہو گئے تو پھر تیرا کوئی نام لینے والا نہ ملے گا۔

حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام نے براہ راست اپنی قوم کی تباہی کی دعا مانگی لیکن حضورِ اقدس ﷺ نے جب بھی دعا مانگی تو صرف اہلِ اسلام کی فتح و نصرت کی۔ دشمنوں کی تباہی و بربادی کی نہیں۔ بہرحال بدر کی جنگ کی صورت میں حضورِ اقدس ﷺ کی دعا قبول ہوئی اور سب خارق عادت کے طور پر عالمِ غیب سے ظہور قدرت کی صورت میں ہوا۔ قرآن بدر کے موضوع پر کما اخرجک سے اس چیز کو بتا رہا ہے۔ کہ جو کچھ ہوا ہے یہ اعجاز ہے۔ اس کا مادی عالم سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے بلکہ عالمِ غیب کے طے شدہ فیصلہ کے مطابق ہوا ہے۔ مفاتیح الغیب میں امام رازیؒ کی نگاہ اس نکتہ پر پہنچی ہے۔ فرماتے ہیں یہ حضورِ اقدس ﷺ کا سب سے بڑا اعجاز ہے جو لوگ بدر کی کامیابی میں مادی اسباب تلاش کرتے ہیں وہ روحِ قرآن سے بے خبر ہیں۔ واقعہ کے آغاز سے انجام تک قرآن نے جو تصویر پیش کی ہے اس کا بغور مطالعہ کرو۔ قرآن بتا رہا ہے کہ:

۱۔ حضورِ اقدس ﷺ بدر کی جنگ کے لیے خود نہیں آئے بلکہ اللہ لے کر آیا ہے۔

۲۔ ایک جماعت جنگ نہیں چاہتی تھی۔

۳۔ سب کو ان کی مرضی کے خلاف موت کے منہ لے جایا جا رہا تھا۔

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

۴۔ سب کا مطمع نظر تجارتی قافلہ تھا۔

۵۔ عددی طاقت موجود نہ تھی۔

۶۔ مادی وسائل ناپید تھے ہتھیار تک نہ تھے۔

۷۔ ساری کمزوریوں کے ساتھ میدانِ جنگ میں زمین ریتلی تھی پانی نہ تھا۔

ان حالات میں انعامات یہ ہوئے۔

۱۔ عددی طاقت کی کمی کو فرشتوں سے پورا کیا گیا۔

۲۔ لڑائی کی رات میں سُلا کر دلوں میں اطمینان پیدا کیا گیا۔

۳۔ بارش کے ذریعے ریتلی زمین کو چلنے کے قابل بنا دیا اور پینے کے لیے پانی دیا۔

۴۔ دلوں کی ڈھارس بندھائی۔

۵۔ قدموں میں جماؤ پیدا کیا۔

۶۔ کافروں کے دل میں رعب ڈالا۔

۷۔ نبوت کی مُشتِ خاک کو دشمن کی آنکھوں تک پہنچایا۔

لڑائی ہوئی ——— اور نتیجہ یہ کہ مسلمانوں کے دس آدمی شہید ہوئے اور دشمن کے ستر آدمی مارے گئے اور اتنے ہی قید ہوئے۔ فرمائیے یہ اللہ کی مدد اور نبوت کا اعجاز نہیں تو اور کیا ہے۔ اس میں زندہ معجزہ کے بعد ایمان والے کا ایمان وضوح حق کے بعد ہوگا اور کافر کا کفر بھی حق کے نمایاں ہونے کے بعد ہوگا۔ اللہ کی حُجت پوری ہوگئی ہے۔ صاحب نظام الفرقان نے یہاں یہ بات پتے کی لکھی ہے کہ ؛

یہ اس بات کی مکمل دلیل ہے کہ اللہ سبحانہ کے کام معلل بالحکم والمقاصد والغایات ہوتے ہیں۔ اگرچہ یہ بات اشاعرہ نہیں مانتے ہیں۔

خواب میں کُفّار کا کم دیکھنا

(۵۸) اور اے پیغمبر یہ وہ دن تھا کہ اللہ سبحانہ نے آپ کو خواب میں ان کی تعداد تھوڑی کر کے دکھائی۔ اور اگر آپ کو خواب میں اللہ سبحانہ ان کی تعداد زیادہ دکھاتا تو مسلمانو تم ضرور ہمت چھوڑ بیٹھتے۔ اور اس معاملہ میں باہم اُلجھ جاتے۔ لیکن اللہ سبحانہ نے تمہیں اس سے بچا لیا یقین کرو کہ اللہ سینہ کے چھپے رازوں کو جانتا ہے۔ یعنی ان کو زیادہ سمجھ کر کوئی لڑنے کی ہمت کرتا کوئی نہ کرتا اس طرح اختلاف ہو کر کام کھنڈت میں پڑ جاتا۔ لیکن اللہ سبحانہ نے حضور اقدس ﷺ کو خواب میں تھوڑی تعداد

دکھا کر اس بزدلی اور نزاع سے بچا لیا وہ خوب جانتا ہے کہ کس چیز سے دلوں میں جرأت و شجاعت پیدا ہوتی ہے اور کس بات سے بزدلی و نامردی لہ

بدر کی جنگ چونکہ اسلام کی ہمیشہ کے لیے موت و حیات کی ساعت تھی اس لیے کارساز قدرت نے اپنی عجیب عجیب نشانیوں سے حق کو فتح اور باطل کو شکست دی۔ چنانچہ معلوم ہوتا ہے کہ غزوہ بدر سے پہلے آنحضرت کو اس معرکہ کا نقشہ عالم رؤیا میں دکھایا گیا تھا اور اس میں کفار کی تعداد بہت کم دکھائی گئی تھی۔ یہ ان کی ذلت اور شکست کی طرف اشارا تھا۔ مسلمانوں نے جب یہ خواب سنا تو ان کو ہمت ہوئی۔ اگر عالم رؤیا میں کفار کی کثرت دکھائی جاتی تو ان کے حوصلے پست ہو جاتے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ حضور اقدس نے یہ خواب کب دیکھا تھا۔ عام شارحین قرآن نے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا۔ علامہ رشید رضا اس موقع پر یہ کہہ کر آگے نکل گئے کہ :

یہ عجیب بات ہے کہ حدیث کے مشہور ذخیرے میں اس خواب کے موضوع پر کوئی حدیث نہیں ہے۔

حافظ ابن کثیر نے صرف امام مجاہد کا آغاز میں جو قول نقل کیا ہے اس میں بھی اس کی نشاندہی نہیں ہے۔ البتہ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بغیر کسی روایتی سہارے کے یہ انکشاف کیا ہے کہ :

بدر کے دن حضور اقدس ﷺ نے لڑائی کے آغاز سے پہلے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے کہا کہ میری اجازت کے بغیر جنگ نہ کرنا۔ اگر دشمن تمہارے قریب ہو جائے تو تیر اندازی کرنا۔ تلوار نہ اٹھانا۔ یہ فرما کر آپ محو خواب ہو گئے تھوڑے عرصے کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا۔ یا رسول اللہ ﷺ دشمن قریب ہو گیا اور ہم تک پہنچ گیا۔ آپ بیدار ہوئے۔ اور دیکھا ہوا خواب آپ نے لوگوں کو سنایا۔

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کو خواب میں کافر تھوڑے نظر آئے۔ پیغمبر کا خواب غلط نہیں چونکہ ان میں آخر تک کفر پر قائم رہنے والے تھوڑے ہی تھے اکثریت ان کی تھی جو بعد میں حلقہ بگوش اسلام ہو گئے تھے اس لیے حضورؐ کو خواب میں کافر تھوڑے دکھائے گئے بس پیغمبر کا خواب حق ہے۔ اور کچھ کا کہنا ہے کہ خواب میں کبھی کوئی حقیقت مجاز کے لباس میں ظاہر ہوتی ہے اور کبھی کسی چیز کے ظاہر کے بجائے اس کی معنوی حقیقت بتائی جاتی ہے۔ یہاں یہی صورت ہے کفار کی فوج تعداد میں اگرچہ بہت زیادہ تھی لیکن معنوی اور اخلاقی اعتبار سے اس کی حیثیت بہت کم تھی۔ ان کی یہی معنوی قلت خواب میں قلتِ تعداد کی صورت میں دکھائی گئی۔ اسی لحاظ سے خواب میں تاویل کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہاں قرآن نے لفظ قلیل بولا ہے اور معلوم ہے کہ یہ لفظ صرف عددی قلت کے لیے نہیں

لہ افادات شیخ الاسلام

آتا ہے بلکہ بے حقیقت اور بے وزن کے معنے میں بھی آتا۔ ایک بہت مشہور شعر ہے۔

فان الک فی شرارکم قلیلاً ۔۔۔ فانی فی خیارکم کثیر

کثرت و قلت تعداد کا نظارہ

(۵۹) اور یہ بات بھی غور کی ہے کہ عین مقابلہ کے وقت میں اللہ ان کو تمہاری نظروں میں تھوڑا اور تمہیں ان کی نظروں میں تھوڑا کر کے دکھا رہا تھا . . . . یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ جس بات کا اللہ نے فیصلہ کر لیا ہے اسے کر دکھائے ۔ سارے کاموں کا دارومدار اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی ہے۔ پیغمبر کو خواب میں کافر ۔ اور مسلمانوں کو عین میدانِ جنگ میں تھوڑے دکھائی دیئے تاکہ مسلمان جرأت سے لڑیں اور پیغمبر کے خواب کی تعبیر یہ بھی ہو سکتی ہے کہ تھوڑی تعداد سے مقصود ان کی مغلوبیت ہو۔ باقی کفار کی نظر میں جو مسلمان تھوڑے دکھائی دیئے تو وہ واقعی تھوڑے تھے ۔ یہ اس وقت کا واقعہ ہے جب دونوں فوجیں اوّل آمنے سامنے ہوئیں ۔ پھر جب مسلمانوں نے دلیرانہ حملے کئے اور فرشتوں کا لشکر مدد کو پہنچ گیا اس وقت کفار کو مسلمان دوگنے نظر آنے لگے ۔ کما فی آل عمران واخری کافرۃ یرونھم مثلیھم رای العین [1] مطلب یہ ہے کہ دشمنوں کو تمہاری آنکھوں میں تھوڑا کر کے اس لیے دکھایا تاکہ حضور اقدس ﷺ نے جو خواب دیکھا تھا تمہیں اری میں اس کا مشاہدہ ہو جائے اور تمہارا یقین، تمہارا حوصلہ اور ہمت بڑھ جائے چنانچہ جب مسلمان اپنے دشمنوں سے لڑنے کے لیے سامنے آئے اور دونوں جماعتیں مدمقابل ہوئیں تو عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اپنے پاس والے شخص سے کہنے لگے کہ غالباً یہ سارے ستر ہوں گے اس نے کہا کہ میرے خیال میں سو ہوں گے حالانکہ سُن آئے ہو کہ کافروں کی تعداد مسلمانوں سے تگنی تھی ۔ ایسی حالت میں مسلمانوں کا بددل ہونا لازمی تھا ۔ اللہ سبحانہٗ نے اپنی قدرتِ کاملہ سے مسلمانوں کی نگاہوں میں کچھ ایسا تغیر کر دیا کہ کافر مسلمانوں کو تھوڑے نظر آنے لگے ۔ دوسری طرف ویقللکم فی اعینھم ۔ کفار کو مسلمان تھوڑے نظر آنے لگے ۔ مقصد یہ تھا کہ رؤسائے کفار میدان سے بھاگ کر جانیں بچا کر نہ جانے پائیں ۔ اس کی یہ تدبیر کی کہ مسلمان اصل تعداد سے بھی ان کو کم نظر آنے لگے ۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ انھوں نے اپنی فتح کو یقینی سمجھ کر حصولِ نتیجہ کے لیے نہ تو سرفروشانہ کوشش کی اور نہ بھاگنے کی کوئی ضرورت محسوس کی اور یہی بات مسلمانوں کے حق میں مفید ہو گئی پہلے تو اللہ سبحانہٗ نے کافروں کی نگاہ میں مسلمانوں کو کم کر کے دکھایا تاکہ کفار بے پروا ہو کر لڑ پڑیں پھر جب میدانِ جنگ میں دونوں جماعتوں میں گتھم گتھا ہو گئی تو اللہ سبحانہٗ کے حکم سے مسلمانوں کی تعداد دشمنوں کی نگاہ میں ان کی اپنی تعداد سے دو نی نظر آنے لگی ۔ اس کا اثر یہ ہوا کہ قریش نے ڈر کر ہمت ہار دی ۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تیسرے پارے میں اس پر تفصیل تبصرہ ہو چکے ہیں۔ واخریٰ کافرۃ یرونہم مثلیھم رای العین
آخر میں فرمایا لیقضی اللہ امراً کان مفعولاً۔ تاکہ اللہ اس کام کو پورا کرے جو اس کے علم میں ہوا ہوا تھا۔ یعنی اللہ نے اپنی قدرت سے یہ کرشمہ اس لیے ظاہر کیا تاکہ اسلام کی حقانیت اور صداقت اور کفر کا باطل ہونا کھل کر سامنے آجائے۔ اور یہ جملہ بظاہر مکرر ہے لیکن بغور مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس تکرار میں گہری معنویت ہے۔ پہلی آیت میں یہ فقرہ مومنوں کے کافروں پر فتح اور غلبہ پانے کی علت بن کر آیا تھا اور یہاں ایک جماعت کو دوسری جماعت کی نظروں میں کم دکھلانے کی علت بن کر آیا ہے۔

ذرا ٹھہر جائیے اور بدر کے میدان میں جو کچھ ہوا اس پر غور کیجئے۔ پہلے فرمایا تھا۔ لیحق اللہ الحق ویبطل الباطل۔ پھر فرمایا لیقضی اللہ امراً کان مفعولاً۔ اب تیسری بار فرمایا لیقضی اللہ امراً کان مفعولاً والی اللہ ترجع الامور۔ ان میں بار بار اور تکرار یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ بدر کی جنگ قومی برتری۔ ملک گیری، معاشی خوشحالی کی جنگ نہیں تھی بلکہ یہ صرف حق کی برتری کی جنگ تھا۔ حق کے علم برداروں کے پاس نہ افرادی قوت تھی نہ ساز و سامان جنگ تھا نہ وہ مادی وسائل سے ہم دوش تھے نہ ان میں مقابلہ کی طاقت تھی اور نہ وہ اپنی کمزوریوں کے پیش نظر جنگ کے لیے تیار تھے اور نہ وہ جنگ کی خاطر گھر سے آئے تھے۔ بس اللہ نے نبوت کی صداقت کو بتانے کے لیے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ ان اہل ایمان کے ناتواں ہاتھوں، کمزور جسموں بھوکے اور تشنے نفوس کے ذریعہ دنیا میں حق کا بول بالا ہو جائے اور لوگوں پر واضح ہو جائے کہ حق کیا ہے۔
یہ کچھ اسباب کے تحت نہیں ہوا بلکہ اللہ سبحانہ نے اپنی قدرت کے ذریعے اسباب و حالات کے خلاف اہل ایمان کو کامیابی عطا فرمائی۔ اسی بات کو ظاہر کرنے کے لیے قرآن نے اسی سورت میں تعبیرات اختیار کی ہیں اسے یوں سمجھئے کہ قرآن نے بدر میں صحابہ کی کامیابی سے اپنے مخاطبوں کو یہ تاثر دیا ہے کہ اگر مومنین صالحین کی ایک جماعت خالصتہً روحانی اخلاقی مقاصد کے لیے نظام حق کے قیام کی جدوجہد کر رہی ہو تو اس کی کامیابی یقینی ہے اور محض طبعی اسباب و عوامل یا مادی ساز و سامان اس کی کامیابی یا ناکامی پر اثر انداز نہ ہوں گے۔ بتانا یہ ہے کہ اگر کوئی گروہ ایمان و عمل صالح کے مقتضیات کو پورا کرے اور اپنی طرف سے سعی و تدبیر کی کوئی کوتاہی نہ کرے تو اس کی کامیابی محض اسی بنا پر مشتبہ نہ ہوگی کہ اسباب مادی یا کثرت تعداد کے لحاظ سے مقابل جماعتیں اس پر فوقیت رکھتی ہیں بلکہ مقابل قوتیں کتنی ہی زبردست آلات و اسباب سے مسلح ہوں کامیابی بہر حال اسی گروہ کی ہوگی جو اپنے قومی طبقات اور دنیوی مفادات کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی خاطر عالم انسانی کی فلاح کے لیے مصروف جدوجہد ہو اس کی وجہ یہ ہے کہ کائنات عالم اپنے ظاہری طبعی وجود کے باوصف بالآخر روحانی قوانین کی محکوم ہے اور اس کی فطرت انسان کے اخلاقی تقاضوں اور روحانی مطالبات سے ہم آہنگ ہے اس لیے اس میں جو ظاہری اور مخفی قوتیں کارفرما ہیں وہ سب اس کی منتظر رہتی ہیں کہ کوئی گروہ انسانیت کے اخلاقی جذبات اور روحانی اُمنگوں کو لے کر عرصہ وجود پر نمودار

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی میں رہے تاآنکہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ بات واضح طور پر ثابت ہو گئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جزیرہ عرب میں دو دین اکٹھے نہیں رہ سکتے۔ حضرت عمرؓ نے یہ ثابت ہو جانے کے بعد اعلان کیا جس کے پاس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی عہد نامہ ہوا سے وہ پیش کرنا چاہیے تاکہ اس کو نافذ کیا جا سکے ورنہ میں تمہیں ملک بدر کروں گا چنانچہ آپ نے ان کو ملک بدر کر دیا۔

ایک وسوسہ اور اس کا ازالہ

شائد آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ اگر علت یہی ہے کہ عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے تو اس کام کی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود تکمیل کیوں نہیں کی؟

جواب یہ ہے کہ احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں ایک قسم ان احکام کی ہے جن کا تعلق افراد کی اصلاح و تزکیہ سے ہوتا ہے جیسے تمام اوامر و نواہی اور فرائض و واجبات دوسرے وہ ہیں جن کا تعلق افراد سے نہیں بلکہ امت کے قومی اور اجتماعی فرائض اور ملکی سیاسیات سے ہوتا ہے جیسے قوانین سیاسیہ اور فتح ممالک۔

سنت الٰہی یوں ہے کہ پہلی قسم کے احکام خود شارع کی زندگی ہی میں تکمیل تک پہنچ جاتے ہیں اور وہ ان کی تکمیل کا اعلان کر کے دنیا سے جاتے ہیں لیکن دوسری قسم کے لئے ایسا ہونا ضروری نہیں ہے۔ ان کے نفاذ و وقوع کے لیے ایک خاص وقت مطلوب ہوتا ہے اور وہ شارع کے بعد بتدریج تکمیل و تنفیذ پاتے ہیں پس ان کی نسبت یا تو بطور پیشین گوئی بتایا جاتا ہے یا اپنے جانشینوں کو وصیت کر دی جاتی ہے۔

یہ جلاوطنی کا مسئلہ اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ضروری نہ تھا کہ اس کا پورا پورا انفاذ خود حضور کی حیات مقدسہ میں ہو جاتا۔ آپ نے یہود کے اخراج سے عملاً نفاذ شروع کر دیا تھا۔ یہود خیبر سے آغاز ہی میں معاملہ کر لیا تھا کہ جب ضرورت ہو گی یہاں سے جلاوطن کر دیئے جائیں گے۔ پھر اسی منصوبہ کی تکمیل کی اپنے جانشینوں کو وصیت کر دی۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں اس کی تکمیل کا وقت آ گیا۔ اور یہود خیبر نے اپنی شرارتوں سے خود ہی اس کا موقع فراہم کر دیا۔

ایک اور شبہ کا ازالہ

شاید آپ یہ الجھن محسوس کریں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنے زمانہ خلافت میں اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل خیبر کی شرارتوں اور واقعہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے پہلے ایسا کیوں نہیں کیا۔

بات ٹھیک ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تنفیذ وصیت سے پہلے تنفیذ وصیت پر تمکین حاصل ہونا ضروری ہے۔ حالات

يَاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا لَقِيْتُمْ فِئَةً فَاثْبُتُوْا وَاذْكُرُوا اللّٰهَ كَثِيْرًا لَّعَلَّكُمْ تُفْلِحُوْنَ ۞ وَاَطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَا تَنَازَعُوْا فَتَفْشَلُوْا وَتَذْهَبَ رِيْحُكُمْ وَاصْبِرُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ۞

اے امانت ایمان کے علمبردارو جب تمہارا کسی فوج سے آمنا سامنا ہو تو تم ثابت قدم رہو۔ اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ کامیابی سے تم ہمدوش ہو۔ اور اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول کی۔ اور باہم نہ جھگڑو۔ (ایسا کرو گے) تو تم کمزور ہو جاؤ گے اور دُنیا میں تمہاری ہَوا اُکھڑ جائے گی۔ اور ڈٹے رہو اللہ سبحانہ ڈٹنے والوں کے ساتھ ہے۔

ہو تو وہ اس کی طرف دستِ تعاون دراز کرے۔ لیکن جب باوجود انتظار و امید کے کائنات کسی ایسی جماعت سے ناامید ہو جاتی ہے تو مجبور ہو کر عالمِ انسانیت کی ان جماعتوں کے سامنے جو دنیا کی سرداری اور پیشوائی کے لیے مصروف کشمکش ہوتی ہیں کامل جانبداری کے ساتھ راہ کامیابی کھول دیتی ہے اور بالآخر وہی جماعت اس کشمکش میں کامران و فتح مند نکلتی ہے جو طبعی اسباب مادی وسائل اور اہلیت کار کے لحاظ سے برتر ہوتی ہے۔

آخر میں جو بات ارشاد ہوئی ہے کہ والی اللہ ترجع الامور سارے کاموں کا مرجع اللہ ہی ہے۔ اسباب کی تاثیر اسی کے ہاتھ میں ہے لہٰذا اگر وہ اپنی قدرتِ کاملہ سے کسی وقت اپنے پیدا کیے ہوئے اسباب کا رُخ پھیر کر کوئی کرشمہ ظاہر کر دے تو وہ نہ تو تعجب والی بات ہے اور نہ قابلِ تردد ہے۔ اسباب بالذات مؤثر نہیں بلکہ ان کی تاثیر اللہ سبحانہ کے ارادہ اور مشیت کے تابع ہے کیونکہ وہ مسبب الاسباب ہے کوئی سبب اس کے ارادہ اور مشیت سے الگ ہو کر کام نہیں کرتا۔ اس لیے بدر میں جو کچھ ہوا وہ اسباب و وسائل سے نہیں بلکہ محض اللہ کی مشیت اور قدرت سے ہوا ہے۔

جنگ میں کامیابی کا سرچشمہ

پہلے وقاتلوهم حتى لا تكون فتنة ويكون الدين كله لله میں یہاں تک جہاد کرو کہ فتنہ نہ رہے

اور دین سب کا سب اللہ کا ہو جائے۔ یہ بات کھول کر بتادی تھی کہ اسلام صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں ہے۔ بلکہ یہ زندگی کا پورا نظام ہے۔ انفرادی زندگی کا بھی اور اجتماعی کا بھی۔ یگانہ معبود کی پرستش کا بھی اور اجتماعی زندگی میں اللہ کی بندگی اس میں روح کی طمانیت کے ساتھ اخلاق کی درستگی، خاندان کی اصلاح سوسائٹی اور معاشرہ کی راست روی۔ اقتصادی اور معاشی زندگی کی ناہمواریوں کا علاج اقتدار و حکومت کا نظام اور دستور و قانون کے مسائل سب کچھ موجود ہیں۔ یہ کل کا کل اسلام ہے اور اس کل کو دنیا میں قائم کرنا اور سب پر برتر کرنا ایک مسلمان کے ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے اس راہ میں محنت کرنے، قرابت کو چھوڑنے۔ مفادات کو نظر انداز کرنے مال لٹانے اور جان کھپانے کا نام جہاد ہے۔ اس محنت میں بدر کی طرح مستقبل میں قتال کی نوبت آئے گی۔ مقابلہ کرنا ہوگا۔ اس موقعہ پر کامیابی کے وسائل کیا ہیں۔ ان آیات میں قرآن ان ہی وسائل کی نشاندہی کر رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ یہ معاشی، وطنی، قومی جنگ نہیں ہے۔ یہ صرف دنیا سے برائی کو مٹانے اور نیکی کو قائم اور برپا کرنے کی جد و جہد ہے اس کی کامیابی کا راز صرف اس میں ہے کہ اللہ سبحانہ سے اولاً محبانہ تعلق ہو۔ اس کی یاد سے زبان و دل معمور ہوں۔ زندگی کے کسی گوشہ میں اللہ اور اس کے رسول کی بغاوت نہ ہو۔ باہم یک جہتی اور ہم آہنگی ہو تنازع اور افتراق نہ ہو۔ مصائب کو سہنے۔ گناہوں سے رکنے اور عبادت پر جمنے کی روح جماعت میں بھرپور ہو۔ ان ہی وسائل پر ان آیات میں تبصرہ ہے اور مستقبل میں فلاح و کامیابی کا راز اس میں ہے۔

ثباتِ قدم اور ثباتِ قلب

(٦٠) اے امانت ایمان کے علمبردارو جب تمہارا کسی فوج سے مقابلہ ہو تو ثابت قدم رہو اور اللہ کو بہت یاد کرو تاکہ تم کامیابی سے ہمدوش ہو اس میں نماز دعا تکبیر اور ہر قسم کا ذکر اللہ شامل ہے۔ ذکر اللہ کی تاثیر یہ ہے کہ ذاکر کا دل مضبوط اور مطمئن ہوتا ہے جس کی جہاد میں سب سے زیادہ ضرورت ہے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا سب کا بڑا ہتھیار یہی تھا۔ والذین اٰمنوا و تطمئن قلوبھم بذکر اللہ الا بذکر اللہ تطمئن القلوب[1]۔

اس آیت میں دفاعی اصول بتلائے گئے ہیں اور بتایا ہے کہ اذا لقیتم فئۃ۔ جب تمہاری کسی جماعت سے مڈبھیڑ ہو جائے۔ لقیتم کا مصدر لقاء ہے۔ اس کا بیشتر استعمال میدان جنگ میں فوجوں کے آمنے سامنے ہونے کے لیے ہے زمخشری نے یہی لکھا ہے کہ زیادہ استعمال یہی ہے۔ لفظ فئۃ کا بیشتر استعمال محاربین کے لیے ہوتا ہے۔ قرآن میں یہ لفظ ان معنی ہی میں استعمال ہوا ہے۔ قرینہ موجود ہے۔ اس لیے فئۃ کی صفت کا ذکر نہیں کیا اور اس لیے بھی بے قید رکھا ہے تاکہ باغی طبقہ بھی اس میں داخل ہو جائے۔ مطلب یہ ہے کہ جب تمہارا میدان جنگ میں دشمن کی فوجوں سے مقابلہ ہو تو جنگ میں کامیابی کے لیے ضروری ہے کہ اولین طور پر تمہاری فوج میں دو چیزیں ضروری موجود ہوں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اوّل یہ کہ جنگ ہونے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی رہنی چاہیے۔ اہلِ حق کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اس ثابت قدمی کی روحانی قوت سے ہوتی ہے۔ تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گذرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو شکست دے دی۔ قرآن نے یہ نکتہ اسی وقت اپنے جاں نثاروں کو سمجھا دیا تھا جب ان کی تعداد تھوڑی اور دشمنوں کی زیادہ تھی میدانِ کارزار میں مسلمانوں کو حکم ہوا تھا کہ وہ اپنی تعدادی قلت کی پروا نہ کریں اور ثابت قدمی کے ساتھ اپنے سے دوچند کا مقابلہ کریں اور ان کو یہ دعا بتائی گئی تھی ربنا افرغ علینا صبراً وثبت اقدامنا۔ حافظ ابن کثیر نے یہاں مصنف عبدالرزاق کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہما کی ایک حدیث نقل کی ہے۔

حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے دشمن سے مقابلہ کی تمنا نہ کرو۔ اللہ سے عافیت مانگو لیکن اگر مقابلہ ہو جائے تو ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو اور اللہ کو خوب یاد کرو۔ دشمن اگر شور و شغب کریں تو تم بالکل خاموشی اختیار کرو۔

دوسری بات جس کا دشمن سے مقابلہ کے وقت اہلِ ایمان کی فوج میں ہونا ضروری ہے وہ اللہ سبحانہ کا بہت ذکر ہے۔ واذکروا اللہ کثیرًا قرآن نے حق سبحانہ سے بندوں کے تعلقات دوگونہ بتائے ہیں ایک اللہ سبحانہ کی محبوبیت کے دوسرے اللہ سبحانہ کی حاکمیت کے۔ قرآن ان دونوں میں ہم آہنگی چاہتا ہے جدائی نہیں چاہتا ہے عین میدانِ جنگ میں جہاں ایک سپاہی خالص اللہ کی حاکمیت کی خاطر اپنی جان کا تحفہ پیش کر رہا ہے اسے حکم ہو رہا ہے کہ زیادہ سے زیادہ اپنے محبوب مطلوب اور مقصود کو یاد رکھو۔ صرف میدانِ جنگ میں ہی نہیں قرآن نے ایسے تمام مواقع پر جنہیں دنیا اور صرف دنیا کہا جاتا ہے اللہ کو بہت یاد کرنے کا حکم دیا ہے قرآن میں نماز جمعہ ختم ہونے پر کاروبار میں مشغول ہونے کا حکم ہو رہا ہے اور ساتھ ہی یہ بھی حکم ہو رہا ہے کہ واذکروا اللہ کثیرا لعلکم تفلحون۔ اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ قرآن اللہ سبحانہ کے ان دونوں حاکمیت اور محبوبیت کے تعلقات میں یکجائی اور ہم آہنگی چاہتا ہے۔ قرآن حکیم کے نزدیک جو چیز دین ہے وہ اللہ سبحانہ کی حاکمیت اور محبوبیت دونوں کے مجموعہ کا نام ہے۔ یعنی محبوب ہونے کی حیثیت میں اس کی پرستش اور حاکم ہونے کی حیثیت میں اس کی بندگی ہے۔ اس میں تفریق یہودیت اور نصرانیت ہے محبوب ہونے کی حیثیت میں صرف پرستش کو اختیار کر لینا اگر عیسائیت ہے تو حاکم ہونے کی حیثیت میں صرف بندگی کو اپنا لینا یہودیت ہے۔ قرآن کی اصطلاح میں اس کا نام تفریق فی الدین ہے۔ اور اسی کے تفرق سے وہ بار بار روکتا ہے۔ یہاں یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب میدانِ جنگ میں ہو تو اللہ کو بہت یاد کرو۔ اللہ کو یاد کرنا اس کی محبت کا تقاضا ہے اس سے تمہارے دلوں میں سکون و اطمینان آئے گا۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ نے الوابل الصیب میں ذکر کے فوائد پر مبسوط بحث کی ہے اور لکھا ہے وفی الذکر اکثر من مائۃ فائدہ ذکر کے سو سے زیادہ فائدے ہیں۔ پھر ان کی تفصیل بتائی ہے۔ بلاشبہ اللہ کو یاد کرنا اللہ سبحانہ کی محبوبیت کا تقاضا ہے اور میدانِ جنگ میں محنت کرنا اللہ کی حاکمیت کا تقاضہ ہے۔ محبت کے تقاضے کے تحت اللہ سبحانہ کے لیے اعمال اگر پرستش ہیں جس کا نام ولایت ہے تو حاکمیت کے تقاضہ

کے تحت اعمال کی بجا آوری اللہ کی بندگی ہے جس کا نام خلافت ہے دونوں میں بنیاد اور عمارت کی نسبت ہے پرستش اساس ہے بندگی اسی بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت ہے ولایت اساس ہے تو خلافت عمارت ہے۔ ایسی ہر عمارت جس کی اساس نہ ہو اسلام کا مقصود نہیں ہے پہلے اساس بناؤ پھر اس پر عمارت اٹھاؤ۔ حضور اقدس ﷺ کی سیرت گواہ ہے کہ پہلے آپ نے پورے تیرہ سال اساس بنانے میں صرف کیے ہیں۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے کہ میدان جنگ میں ان دو باتوں کو اپناؤ تاکہ تم فلاح سے ہمدوش ہو جاؤ لعلکم تفلحون۔ یعنی ہمارے اس حکم کی حکمت، مصلحت یہ ہے کہ اس راہ سے تم کو فلاح ملے گی۔

معلوم ہوا کہ اہل ایمان کے لیے فلاح کی لازمی اور بنیادی شرط یہ ہے کہ ثبات قدم کے ساتھ ان کے اللہ سبحانہ سے عابدانہ تعلقات ہوں اور ان تعلقات میں ایسی پختگی ہو کہ تلواروں کی چمک میں تیروں کی بارش میں، مصائب کے ہجوم میں وہ اللہ کو بہت یاد کرنے والے ہوں۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ سے عابدانہ تعلقات کے بغیر صرف آخرت کی نہیں دنیا کی فلاح بھی ہاتھ نہیں آتی ہے یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے۔ کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔

اس معاملے میں اہل ایمان کو دوسروں پر قیاس کرنا درست نہیں ہے دوسری قومیں اپنی ساری نافرمانیوں کے باوجود اونچے سے اونچا مقام حاصل کر سکتی ہیں لیکن مسلمانوں کے لیے ایسا کوئی امکان نہیں۔ ان کے لیے عزت و اقتدار پانے کی بنیادی شرط بس ایک ہی ہے کہ ان کے اللہ سبحانہ سے عابدانہ تعلقات استوار ہوں۔ اس فرق کی وجہ یہ ہے کہ ملت اسلامیہ کے لیے عروج و زوال کا قانون اللہ تعالیٰ نے وہ نہیں رکھا ہے جو دوسری قوموں کے لیے مقرر ہے۔

تین چیزیں اور جن پر فلاح موقوف ہے

(۶۱) اور اطاعت کرو اللہ کی اور اللہ کے رسول کی اور باہم نہ جھگڑو ایسا کرو گے تو کمزور ہو جاؤ گے اور دنیا میں تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور ڈٹے رہو اللہ ڈٹنے والوں کے ساتھ ہے۔ یعنی ہوا خیزی ہو کر اقبال اور رعب کم ہو جائے گا بے رعبی کے بعد فتح و ظفر کیسے حاصل کر سکو گے۔ جو سختیاں اور شدائد جہاد کے وقت پیش آئیں۔ ان کو صبر و استقامت سے برداشت کرو ہمت نہ ہارو مثل ہے کہ ہمت کا حامی خدا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو بتلا دیا گیا کہ کامیابی کی کنجی کیا ہے؟ معلوم ہوا کہ دولت لشکر اور سیگزین وغیرہ سے فتح و نصرت حاصل نہیں ہوتی۔ ثابت قدمی صبر و استقلال قوت و طمانیت قلب یاد الٰہی، خدا اور رسولؐ اور اس کے قائمقام کی اطاعت و فرمانبرداری اور باہمی اتفاق و اتحاد سے حاصل ہوتی ہے۔ اس موقعہ پر بے ساختہ جی چاہتا ہے کہ صحابہ رضی اللہ عنہم اجمعین کے متعلق ابن کثیر رح کے چند الفاظ نقل کر دوں جو اخلاص و ایمان کی انتہائی گہرائی سے نکلے ہوئے ہیں۔

شجاعت خدا اور رسول کے احکام یا سچائی اور رہنمائی کے قبول کرنے میں جو مقام صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا ہے وہ ماضی اور مستقبل کی قوموں میں سے دنیا کی کسی قوم کا نہیں ہے۔ انھوں نے حضور اقدس ﷺ کی برکت اور آپ کی طاعت کے ذریعے لوگوں کے دلوں کو ہی نہیں بلکہ مشرق و مغرب میں قلت تعداد کے باوجود ملکوں کو فتح کیا، روم، ایران، ترک صقالیہ بربر سوڈان اور مصر سب مقہور و مغلوب ہو گئے اللہ کے قانون کا بول بالا ہوا اور اللہ کا دین سارے ادیان پر غالب ہو گیا۔ اسلامی ممالک کی حدود مشارق و مغارب میں تیس سال سے کم مدت میں پھیل گئیں۔ اللہ ان سے خوش ہوا اور اللہ نے ان کو خوش کر دیا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں بھی ان میں ہی کر دے وہ بڑا مہربان اور توبہ قبول کرنے والا ہے۔[1]

یہاں سب سے اہم اور بنیادی بات اللہ اور اس کے رسول کی طاعت ہے۔ اللہ کی اطاعت بالذات ہے اور رسول کی اطاعت خدا کا رسول ہونے کی وجہ سے ہے۔ زندگی میں نبی کی اطاعت ضروری ہے اور ایسا سمجھنا شرط ایمان ہے دین و شریعت کے دائرے میں نبی جو کچھ کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چون و چرا نہ کرے اور خواہ اس کی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے بہر صورت یہ یقین رکھے کہ وہ خیر ہی خیر ہے اور سراپا حق ہے۔

اتباع و طاعت نبی میں فرق

قرآن نے حضور اقدس ﷺ کے بارے میں دو حکم دیئے ہیں ایک اطاعت کا اور دوسرے اتباع کا، جیسا کہ پہلے سن آئے ہو کہ اللہ سبحانہ کے بندوں سے تعلقات دوگونہ ہیں ایک محبوبیت کے دوسرے حاکمیت کے، محبوب ہونے کی حیثیت میں اللہ کی عبادت کی جاتی ہے اور حاکم ہونے کی حیثیت میں اللہ کی طاعت کی جاتی ہے محبوبیت کی حدود میں قرآن نے حضور اقدس ﷺ کی اتباع کا حکم دیا ہے۔ اتباع کے معنی پیروی کرنا، سیکھنا نا کہ بانٹنا۔ کاپی کرنا اور نقل کرنا۔ حکم ہے۔ صلوا کما رأیتمونی اصلی جیسے مجھے نماز پڑھتے دیکھتے ہو نماز پڑھو اور حاکمیت کی حدود میں قرآن نے حضور اقدس ﷺ کی اطاعت کا حکم دیا ہے۔ نبی کی یہ حیثیت خود قرآن نے مقرر کی ہے۔ وما ارسلنا من رسول الا لیطاع باذن اللہ۔ اور اس اطاعت کا قرآن نے صرف مطالبہ ہی نہیں کیا بلکہ بتایا ہے کہ یہ اطاعت دل کی پوری رضامندی سے ہونی چاہیے۔ ارشاد ہے۔

فلا و ربک لا یومنون حتی یحکموک فیما شجر بینھم ثم لا یجدوا فی انفسھم

---

[1] افادات شیخ الاسلام۔ ابن کثیر کی اصل عبارت شیخ الاسلام کے تفسیری حواشی میں تھی۔ ہم نے ناظرین معالم القرآن کے لیے عربی عبارت کا اردو میں ترجمہ کر دیا ہے۔

حرجا مما قضیت ویسلموا تسلیما۔

اے نبیؐ — تیرا رب گواہ ہے کہ یہ لوگ مومن نہیں ہو سکتے جب تک کہ وہ اپنے آپس کے نزاعی امور میں تمہیں فیصلہ کرنے والا تسلیم نہ کریں اور پھر جو کچھ تم فیصلہ کرو اس پر اپنے دلوں میں کوئی تنگی نہ پائیں۔ بلکہ اسے پوری آمادگی کے ساتھ قبول کرلیں۔

اور ایسا ہونا بہرحال ضروری ہی ہے۔ عقل انسانی اس کے سوا ایک نبی کے لیے اور کچھ باور بھی نہیں کرتی۔ انسان اگر اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کو ماننے اور اس کے احکام کی اطاعت کے لیے پیدا کیا گیا ہے اور اس کی بندگی کا طریقہ معلوم کرنے اور اس کے احکام کو جاننے کا واحد ذریعہ صرف نبی ہی ہے تو نبی کی کامل اطاعت اور پیروی کے بغیر اللہ کی اطاعت اور بندگی کی کوئی شکل ممکن ہی نہیں۔ اگر راستہ چلے بغیر آپ منزل تک نہیں پہنچ سکتے۔ اور آلات پرواز کے بغیر فضائی سفر نہیں کر سکتے تو نبی کی اطاعت کے بغیر آپ اللہ کی بندگی بھی نہیں کر سکتے ایسی حالت میں نبی کی اطاعت فی الواقع اللہ سبحانہ کی اطاعت ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ کیونکہ —— طاعت اللہ سبحانہ کی حاکمیت کا تقاضا ہے اور حاکمیت میں قرآن نے نیابت بتائی ہے۔ اذ قال ربك للملائكة انی جاعل فی الارض خلیفہ۔ چونکہ حاکمیت میں نیابت ہوتی ہے اس لیے قرآن نے طاعت کے دائرے کو وسیع کر دیا ہے ارشاد ہے۔ یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم۔ لیکن اتباع چونکہ اللہ سبحانہ کی محبوبیت کا تقاضا ہے اور وہ اعمال میں ہوتی ہے اس لیے اس کو ذاتِ پیغمبر اور خلفائے راشدین تک محدود کر دیا۔ اور ان کی سنت کو بھی سنت کہا اور اس کی اتباع کا حکم دیا۔ ارشاد ہے۔ علیکم بسنتی وسنۃ الخلفاء الراشدین المھدیین عضوا علیھا بالنواجذ۔ چونکہ خلافت راشدہ ٹھیک ٹھیک طریق نبوت پر قائم ہونے والی تھی۔ اس لیے آپؐ نے امت کو وصیت کی کہ نہ صرف ان کی اطاعت کی جائے۔ بلکہ ان کے تمام اجتماعی کاموں کو مثل اعمالِ نبوت کے سنت سمجھا جائے اور اس کی اتباع کی جائے۔ جو لوگ اتباع اور اطاعت میں فرق نہیں سمجھے ان کو اسلامی زندگی کے معاملہ میں دشوار گذار گھاٹیوں سے گذرنا پڑا۔ حالانکہ دونوں الگ الگ ہیں ایک صورت یہ ہے کہ مسلمان کسی کو اپنا جماعتی سربراہ اور حاکم مان لیں اور ایک امیر کی جیسی فرمانبرداری شہریوں کو کرنی چاہیے ٹھیک ٹھیک ویسی ہی فرمانبرداری کریں۔ کوئی بات ایسی نہ کریں جس سے ثابت ہو کہ اسے اپنا حاکم نہیں سمجھتے اس کا نام طاعت ہے دوسری صورت یہ ہے کہ کسی کو اپنے دینی و اخلاقی اعتقاد و عمل میں پیشوا مان لیا جائے اور راستی و ہدایت کے اعتبار سے اس کی زندگی کو اپنے لیے نمونہ بنائے اور اس کے قدم بقدم چلنے کی کوشش کرے اس کا نام اتباع ہے۔ دونوں صورتیں الگ الگ ہیں۔ بلاشبہ اطاعت ایک عام حالت ہے۔ اور اس میں اتباع کی حالت بھی داخل ہے لیکن اتباع اطاعت سے زیادہ خاص ہے اور ضروری نہیں کہ ہر اطاعت اتباع ہی ہو خلفائے راشدین کے

بار بہ ہیں امت کو اطاعت اور اتباع دونوں کا حکم دیا گیا ہے جب کہ بعد میں سلاطین اور ارباب حکومت کے لیے صرف اطاعت کا حکم ہے۔ اگر بزرگوں کی اس جوہری فرق پر نظر ہوتی تو ان کو تراویح کے بیس ہونے، جمعہ میں اذان کے اضافے۔ اور طلاق ثلاثہ بیک مجلس بیک بار جیسے مسائل میں کوئی تردد نہ ہوتا۔

شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ نے اتباع اور اطاعت کے جوہری فرق کو خوب سمجھا ہے اور بتایا ہے کہ اتباع کا دائرہ خلافت راشدہ تک محدود ہے اس کے بعد اتباع نہیں صرف اطاعت ہے۔ ازالۃ الخفاء میں فرماتے ہیں :۔

ہر نماز ے وزکوٰتے او معروفے ونہی منکرے کہ از ممکنان ظاہر شود نمود و محل رضا است

اور خلافت خاصہ کے لوازم میں یہ بات خاص طور پر بتائی ہے کہ :

قول خلیفہ در دین حجت باشد نہ بآں معنی کہ تقلید عوام مسلین او را صحیح باشد زیرا کہ این معنے از لوازم اجتہاد است در خلافت بیان ان گذشت ونہ بان معنے کہ خلیفہ فی نفسہ بے اعتماد بر تنبیہ آنحضرت ﷺ واجب الطاعۃ باشد زیرا کہ این معنی غیر نبی را میسر نیست بلکہ مراد اینجا منزلتی است بین المنزلتین

خلیفہ کی بات دین میں حجت ہے اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی زندگی کی رائے عامہ کو ان کی تقلید کرنی چاہیے یہ بات لوازم اجتہاد میں سے ہے اور اس کا یہ مطلب بھی نہیں کہ خلیفہ کی بات بالذات حضور اقدس ﷺ سے الگ ہو کر قابل اتباع ہے کیونکہ یہ مقام غیر نبی کے لیے ہرگز نہیں ہے بلکہ یہاں ان دونوں کے درمیان مقام مراد ہے یعنی مادون التشریع وما فوق الاجتہاد۔

اور اس مقام کی جو تفصیل بتائی ہے وہ بھی حضرت شاہ صاحب ہی کی زبانی سن لیجئے۔ فرماتے ہیں :

تفصیل اس کی یہ ہے کہ آنحضرت ﷺ نے کچھ کاموں کو کچھ لوگوں کا نام لے کر ان کے حوالہ کیا ہے۔ اس لیے ان کا اتباع ضروری ہے جیسا کہ حضور کے مقرر کردہ امراء کی اطاعت ضروری ہے۔ خلفائے راشدین میں یہ خوبی ایسی ہی ہے جیسے فرائض میں زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کی بات کا دوسرے مجتہدین کے مقابلہ میں وزن ہے اور جیسے فقہ و قراءت میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی بات کا اور قراءت میں ابی بن کعب رضی اللہ عنہ کی بات کا وزن ہے ـــــ حضور اقدس کو بذریعہ وحی معلوم ہوا کہ آپ کے بعد کچھ مسائل میں اختلاف ہو گا۔ حضور نے امت کو اسی گرداب سے نکالنے کے لیے خلفائے راشدین کو معیار مقرر کر دیا۔

بہرحال حضور نے اتباع کو صرف خلافت راشدہ تک محدود کیا اور اطاعت کو ہر سربراہ مملکت، ہر حکمران تک پھیلا دیا اور یہ قید لگا دی کہ لاطاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق۔

اس موقعہ پر طاعت کا مفہوم یہ ہے کہ دشمن کے مقابلے پر بھرپور نظم اور کامل ڈسپلن کا مظاہرہ کرو جو حکم اللہ سبحانہ نے

دیا ہے اس کی بھی طاعت کرو اور جو حکم رسول دے اس کی بھی بے چون و چرا تعمیل کرو۔ جس طرح یاد الٰہی سے خالی ہو کر انسان انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ اسی طرح اگر جماعت کی طاعت میں ڈھیل ہو تو جماعتی نظم درہم برہم ہو جاتا ہے۔

اتحاد و اتفاق

اس ارشاد میں دوسری بات یہ بتائی ہے لا تنازعوا آپس میں نہ جھگڑو۔ تنازع کا مطلب یہ ہے کہ جماعت اور اطاعت کی زندگی کو ہمیشہ قائم رکھو۔ یہی اسلامی زندگی ہے اور اس کا عکس اسلام کی نہیں جاہلیت کی زندگی ہے۔ جاہلیت کی زندگی میں ہلاکت کا اصل تخم تفرقہ اور باہم تنازع اور کسی ایک مرکزی قوت سے وابستہ نہ ہونا تھا۔ قرآن نے آکر جس زندگی سے آشنا کیا وہ کیا تھی؟ یہی کہ باہمی اتحاد و اتفاق اور تمام منتشر افراد میں یگانگت رونما ہو کر بعض و حسد کی طرح ان سب کے سر ایک ہی چوکھٹ پر جھکیں۔ سب کی زندگی کا مقصد ایک ہو۔ قرآن نے اسی کو نعمت کہا ہے۔ واذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔ اسی لیے تمام احادیث میں یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے کہ جماعت سے مقصود یہ ہے کہ اہل ایمان کی اجتماعی اور ملی زندگی کے لیے ایک مرکزی وجود ہو۔ اس کی محبت اس کی رفاقت اس کی اطاعت اس کی حرکت پر حرکت اس کے سکون پر سکون، اس کی طلب پر لبیک اس کی دعوت پر جان و مال لگانا ہر مسلمان کا فرض ہے۔ ایسا فرض جس کے بغیر وہ جاہلیت کی تاریکی سے نکل کر اسلامی زندگی کی روشنی میں نہیں آسکتا۔ اسلام کی اصطلاح میں اسی اجتماعی مرکز کا نام امام اور خلیفہ ہے اور جب تک یہ مرکز اپنی جگہ سے نہیں ہٹتا ہے یعنی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے جب تک وابستہ ہے ہر مسلمان پر اس کی طاعت و امانت فرض ہے۔ اسلام کی زبان میں اسی کا نام جماعت ہے۔ احادیث میں واضح کیا گیا ہے کہ جو شخص جماعت اور طاعت امام سے الگ ہو گیا گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا اس کی موت اسلام پر نہیں بلکہ جاہلیت پر ہوگی۔ اس موضوع پر اس کثرت سے ارشادات نبوت موجود ہیں اور زمانہ صحابہؓ سے لے کر تدوین کتب کے زمانے تک اس قدر ان کی شہرت ہے کہ اسلام کے عقیدہ توحید و رسالت کے بعد شاید ہی کوئی اور چیز اس درجہ تواتر و یقین تک پہنچی ہو۔

سب سے پہلے مسند امام احمد کی ایک روایت پیش کرتا ہوں:

> حضرت حارث اشعری کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ ﷺ کا ارشاد ہے۔ میں تم کو ان پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا مجھے اللہ نے حکم دیا ہے۔ جماعت، سمع، طاعت، ہجرت، اور اللہ کی راہ میں جہاد۔ یقین کرو کہ جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا۔ اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی سے جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے۔

لوگوں نے عرض کیا کیا ایسا شخص جہنمی ہوگا۔ اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو فرمایا ہاں اگرچہ روزہ رکھتا ہو۔ نماز پڑھتا ہو اور اپنے زعم میں اپنے تئیں مسلمان سمجھتا ہو۔

صحیحین میں حضرت انس ﷜ کے حوالہ سے یہ ارشاد نبوت آیا ہے کہ:

اگر ایک حقیر صورت غلام حبشی بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے تو تمہیں چاہیے کہ اس کی سنو اور طاعت کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات حضور اقدس ﷺ بار بار اور کثرت سے اپنی تقریروں میں فرماتے تھے۔ اسی لیے مختلف لفظوں میں مختلف مواقع پر یہ بیان نقل ہو کر آیا ہے۔ حجۃ الوداع کے عظیم الشان اور یادگار عالم موقعہ پر فرمایا کہ:

اگر ایک حبشی غلام بھی تمہارا سربراہ ہو اور کتاب اللہ کے ذریعے تم پر حکومت کرے تو اس کی سنو اور طاعت کرو۔

صحیح بخاری اور مسلم میں ہے۔

جس نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا اور سربراہ مملکت کی طاعت سے باہر ہو گیا اور اسی حالت میں بغیر توبہ کے مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہوگی۔

اسلام سے پہلے اہل عرب پر غیر جماعتی قبائلی عصبیت ناخدا شناسی پر مبنی جو زمانہ گذرا ہے اس کو جاہلیت کہتے ہیں۔

حضرت عبداللہ بن عباس ﷠ کی روایت میں ہے۔

اگر کوئی شخص اپنے امیر کو ایسی بات کرتے دیکھے جو اسے پسند نہ ہو تو چاہیے کہ صبر کرے اس کی طاعت سے باہر نہ ہو کیونکہ جو شخص مسلمان سربراہ سے بالشت بھر بھی باہر ہوا اور اسی حالت پر مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی حالت پر ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت میں ہے۔

جس نے مسلمان سربراہ کی طاعت سے ہاتھ کھینچ لیا تو روز قیامت وہ اللہ کے سامنے حاضر ہوگا۔ اور اس کے لیے بچاؤ کا کوئی سامان نہ ہوگا۔ اور جو مسلمان دنیا سے اس طرح رخصت ہوا کہ مسلمان سربراہ کی طاعت کے حلقے سے اس کی گردن خالی تھی تو یقین کرو کہ اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

ان کے علاوہ بے شمار احادیث اس موضوع پر آئی ہیں سب کا حاصل یہ ہے کہ اطاعت امیر میں جماعتی زندگی اختیار کرو۔ افتراق و انتشار کے شکار نہ ہو۔ اگر تم نے افتراق و تشتت کو اپنا لیا تو یاد رکھو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ ایک طرف تمہارے حوصلے پست ہو جائیں گے اور دوسری طرف تمہاری ہوا اکھڑ جائے گی۔ اور تمہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔

صبر کا دامن تھام کر رکھو

بالکل آخر میں ارشاد ہوا۔ واصبروا ان اللہ مع الصابرین۔ صبر کرو یعنی اپنے جذبات پر پورا قابو رکھو۔ جلد بازی

 ہو بلکہ ٹھنڈے دل اور جچی تلی قوت فیصلہ کے ساتھ کام کرو، خطرات اور مشکلات سامنے

گھبراہٹ، طمع اور نامناسب جوش سے بچو، ٹھنڈے دل اور جچی تلی قوت فیصلہ کے ساتھ کام کرو۔ خطرات اور مشکلات سامنے ہوں تو تمہارے قدموں میں لغزش نہ آئے۔ اشتعال انگیز مواقع پیش آئیں تو غیظ و غضب کا ہیجان تم سے کوئی بے محل حرکت سرزد نہ کرائے۔ مصائب کے ہجوم ہوں اور حالات میں ناسازگاری ہو تو پریشانی میں تمہارے حواس پراگندہ نہ ہو جائیں۔ حصول مقصد کے شوق سے بے قرار ہو کر یا نیم پختہ تدبیر کو سرسری نظر میں کارگر دیکھ کر تمہارے ارادے شتاب کاری سے مغلوب نہ ہوں۔ اور اگر کبھی دنیوی فوائد و منافع اور لذات نفس کی ترغیبات تمہیں اپنی طرف لے جا رہی ہوں تو ان کے مقابلے میں بھی تمہارا نفس اس درجہ کمزور نہ ہو کہ بے اختیار ان کی طرف کھنچ جاؤ۔

صبر کے لغوی معنے روکنے اسہارنے کے ہیں یعنی اپنے آپ کو گھبراہٹ سے روکنا اور اس کو اپنی جگہ ثابت قدم رکھنا اور یہی صبر کی معنوی حقیقت بھی ہے۔ یعنی اس کے معنے بے اختیاری کی خاموشی اور انتقام نہ لے سکنے کی مجبوری کے نہیں بلکہ بامردی، دل کی مضبوطی، اخلاقی جرأت اور ثبات قدم کے ہیں۔ قرآن پاک میں صبر کا لفظ اسی معنے میں آیا ہے اگرچہ حالات کی تبدیلی سے اس کے مفہوم میں کہیں کہیں ذرا ذرا فرق پیدا ہو گیا ہے باایں ہمہ سب کا مرجع ایک ہے یعنی ثابت قدمی، استقامت، صبر کے وہ مختلف مفہوم جن میں قرآن نے اس کو استعمال کیا ہے۔ یہ ہیں۔ صبر کا پہلا مفہوم یہ ہے۔ کہ وقت مناسب کا انتظار کرنا فاصبر ان العاقبۃ للمتقین۔ یعنی ہر قسم کی تکلیف اپنا کر اور اپنے مقصد پر جمے رہ کر کامیابی کے وقت کا انتظار کرنا۔ اس انتظار کی کشمکش کی حالت میں جب ایک طرف حق کی بے کسی، بیچارگی اور بے بسی پاؤں کو ڈگمگا رہی ہو اور دوسری طرف باطل کی عارضی شورش اور ہنگامی غلبہ دلوں کو کمزور کر رہا ہو حق پر قائم رہ کر اس کی کامیابی کی پوری امید رکھنی چاہیے ایسا نہ ہو کہ وعدہ الٰہی کے ظہور میں اگر ذرا دیر ہو تو مشکلات سے گھبرا کر حق کا ساتھ چھوڑ دو۔ اور باطل کے گروہ میں مل جاؤ۔

فاصبر لحکم ربك ولا تطع منهم اثما او کفورا۔

صبر کا دوسرا مفہوم یہ ہے کہ مصیبتوں اور مشکلوں میں اضطراب اور بے قراری نہ ہو بلکہ ان کو اللہ سبحانہ کا حکم سمجھ کر خوشی خوشی جھیلا جائے اور یہ یقین رکھا جائے کہ جب وقت آئے گا تو اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے خود ان کو دور فرمائے گا۔ اللہ سبحانہ نے ایسے لوگوں کی مدح فرمائی ہے۔

والصابرین علی ما اصابھم اور جو مصیبت میں صبر کریں۔

صبر کا تیسرا مفہوم یہ ہے کہ منزل مقصود کی راہ میں جو مشکلیں اور خطرے پیش آئیں۔ دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں اور مخالفین جو طعن و طنز کریں ان میں سے کسی چیز کو خاطر میں نہ لائے اور ان سے بد دل اور پست ہمت ہونے کے بجائے اور زیادہ استقلال اور استواری پیدا ہو۔ بڑے بڑے کام کرنے والوں کی راہ میں یہ روڑے اکثر اٹکائے گئے مگر انھوں نے استقلال اور مضبوطی کے ساتھ ان کا مقابلہ کیا اور کامیاب ہوئے حضور اقدس ﷺ کو دوسری مرتبہ کی وحی میں جب

وتبلیغ کا حکم ہوا تو ساتھ ہی اس حقیقت سے بھی باخبر کر دیا گیا۔ ولربك فاصبر۔
صبر کا چوتھا مفہوم یہ ہے کہ بُرائی کرنے والوں کی بُرائی کو نظر انداز اور جو بدخواہی سے پیش آئے اور تکلیفیں دے اس کے قصور کو معاف کیا جائے یعنی تحمل اور برداشت میں اخلاقی پامردی دکھائی جائے۔
یہ صبر کی وہ قسم ہے جو اخلاقی حیثیت سے بہت بڑی بہادری ہے مسلمانوں کو اس بہادری کی تعلیم بار بار دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ یہ صبر و برداشت کمزوری سے یا دشمن کے خوف سے یا کسی اور سبب سے نہ ہو بلکہ صرف خدا کے لیے ہو۔
صبر کا پانچواں اہم مفہوم لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی ہے۔ قرآن حکیم نے اس لفظ کو اس مفہوم میں بارہا استعمال کیا ہے اور زیرِ نظر آیت میں بھی ان ہی معنے میں آیا ہے اور ایسے لوگوں کو جو اس وصف سے آراستہ ہوں صادق القول راست باز بتایا ہے۔
میدان جنگ میں کامیابی کی چار شرطوں میں سے ایک اہم شرط بہادرانہ صبر و استقامت ہے۔
حق کے مددگاروں کی ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر و استقامت کی روحانی قوت سے ہوتی ہے۔ تاریخ کی نظر سے یہ مشاہدے اکثر گذرے ہیں کہ چند مستقل مزاج اور ثابت قدم بہادروں نے فوج کی فوج کو شکست دے دی۔ اللہ نے یہ نکتہ اس آیت میں اپنے ماننے والوں کو سمجھایا ہے۔
اس آیت میں صبر کی فضیلت میں فرمایا ہے۔ ان اللہ مع الصابرین۔ صبر کرنے والوں کو اللہ کی محبت حاصل ہوتی ہے۔ یہ محبت خداوندی خود ضامن نصرت ہے کہیں ارشاد ہوتا ہے۔ واللہ یحب الصابرین۔ اللہ سبحانہ صبر کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔
غزوۂ اُحد میں مسلمانوں کو فتح نہیں ہوئی بلکہ ستر مسلمان شہید ہو جاتے ہیں کچھ مسلمانوں میں اس سے افسردگی پیدا ہوئی اللہ سبحانہ نے اس حزن و ملال کے ازالہ کے لیے پچھلے پیغمبروں کی داستان سنائی ہے۔
وکاین من نبی قاتل معه ربیون کثیر فما وهنوا لما اصابهم فی سبیل الله وما ضعفوا وما استکانوا والله یحب الصابرین۔
کتنے پیغمبر ہیں جن کے ساتھ ہو کر بہت سے خدا کے طالب لڑے ہیں۔ پھر اللہ کے راستہ میں تکلیف اُٹھا کر انھوں نے ہمت نہیں ہاری اور نہ ان کے دل بودے ہوئے اور اللہ ثابت قدم رہنے والوں سے محبت کرتا ہے۔
اس آیت پاک نے غلط فہمیوں کے ان تہ برتہ پردوں کو چاک کر دیا ہے۔ جو صبر کی اصل حقیقت کے چہرے پر پڑے ہیں اور بتا دیا کہ صبر دل کی کمزوری بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کی مجبورانہ درگزر کا نہیں بلکہ دل کی انتہائی قوت ہمت

کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات ومصائب کو اللہ سبحانہ کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام صبر ہے۔ ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آجانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گذشتہ ناکامی کے تصور کو جو اس کی کمی یا زیادتی سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے۔

وَلَا تَكُونُوا كَالَّذِينَ خَرَجُوا مِن دِيَارِهِم بَطَرًا وَرِئَاءَ النَّاسِ
وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۚ وَاللَّهُ بِمَا يَعْمَلُونَ
مُحِيطٌ ۝ وَإِذْ زَيَّنَ لَهُمُ الشَّيْطَانُ أَعْمَالَهُمْ وَقَالَ
لَا غَالِبَ لَكُمُ الْيَوْمَ مِنَ النَّاسِ وَإِنِّي جَارٌ لَّكُمْ ۖ فَلَمَّا
تَرَاءَتِ الْفِئَتَانِ نَكَصَ عَلَىٰ عَقِبَيْهِ وَقَالَ إِنِّي بَرِيءٌ
مِّنكُمْ إِنِّي أَرَىٰ مَا لَا تَرَوْنَ إِنِّي أَخَافُ اللَّهَ ۚ وَاللَّهُ
شَدِيدُ الْعِقَابِ ۝ إِذْ يَقُولُ الْمُنَافِقُونَ وَالَّذِينَ
فِي قُلُوبِهِم مَّرَضٌ غَرَّ هَٰؤُلَاءِ دِينُهُمْ ۗ وَمَن يَتَوَكَّلْ
عَلَى اللَّهِ فَإِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝

اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کی نگاہوں میں نمائش کرتے ہوئے نکلے اور جن کا حال یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔ اور یہ لوگ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اللہ سبحانہ کی ذات اس پر چھائی ہوئی ہے [۴۷] اور جب شیطان نے ان کے کاموں کو ان کے سامنے سجا کر پیش کیا اور بول پڑا آج لوگوں میں سے تم پر برتر ہونے والا کوئی نہیں ہے اور میں تمہاری پشت پناہ ہوں۔ پھر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو الٹے پاؤں واپس ہوا اور کہا کہ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں ہے مجھے وہ کچھ نظر آرہا ہے جو تم نہیں دیکھتے ہو۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ کی سزا سنگین ہے [۴۸] اور جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ ہے کہنے لگے کہ ان مسلمانوں کو دین کا نشہ

چڑھا ہوا ہے اور جو بھی اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو بلاشبہ اللہ تعالیٰ بہت بڑے دبدبہ والا اور حکیم ہے ۶ھ

کی بلندی، عزم کی استواری اور مشکلات و مصائب کو اللہ سبحانہ کے بھروسہ پر خاطر میں نہ لانے کا نام صبر ہے ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آجانے پر بھی وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اور اپنے مقصد پر جما رہے اور اللہ سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گذشتہ ناکامی کے قصور کو جو اس کی کمی یا زیادتی سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے۔

معانی مفردات

بطرا اترانا، فخر کرنا ہیں زجاج کہتے ہیں ہر نعمت میں سرکش ہوجانے کا نام ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ دولت اگر ہم چشموں میں منافرت اور گھمنڈ کا ذریعہ بن جائے تو یہی بطر ہے۔ قرطبی کہتے ہیں کہ اللہ کی نعمتوں کے بل بوتے پر معاصی میں چھوٹ ہونے کا نام بطر ہے۔ اس کی نمائش گفتار، کردار، لباس، حرکات و سکنات میں ہوتی ہے۔ رئاء دکھاوا، دکھانا، خود نمائی باب مفاعلہ کا مصدر ہے اس کے معنے ہیں دوسرے کے دکھاوے کے لیے کام کرنا۔ کسی کام کو اس لیے کرنا کہ لوگ دیکھ کر تعریف کریں۔ یصدون یہ صد سے ہے جمع مذکر غائب ہے فعل مضارع کا۔ اس کے دو مصدر ہیں صد اور صدود۔ صد اگر مصدر ہے تو باب نصر سے متعدی ہے معنی ہیں روکنا اور اگر مصدر صدود ہو تو اس کے معنے رکنا بھی ہیں یہ لازم ہے شیطان عربی زبان میں ہر سرکش شیطان ہے جن ہو یا انسان۔ اور یا چوپایہ سیبویہ نے کبھی اس کے نون کو زائد بتایا ہے۔ اور کبھی اصلی۔ کیونکہ اس کے بارے میں اختلاف ہے جو لوگ اس کا مادہ شطن بتاتے ہیں وہ شیطان کو فیعال کے وزن پر کہتے ہیں اس صورت میں نون اصلی ہے اور جو لوگ اسے شاط یشیط سے مشتق کہتے ہیں وہ شیطان کو فعلان کے وزن پر بتاتے ہیں۔ شطن کے معنے دور ہونے کے ہیں شیطان وہ جو رحمت سے دور ہو اور شیط کے معنے جلنے ہلاک ہونے کے باطل ہونے کے ہیں اور سرکش و متمرد میں یہ ساری صفتیں ہوتی ہیں۔

دولت اور طاقت کی نمائش

ریا کے لغوی معنے دکھاوا اور نمائش کے ہیں۔ انسانی اعمال کی اصل حقیقت ان کی نیت اور غرض پر مبنی ہے اس لیے درستی نادرستی اور اچھائی و برائی کا بہت کچھ مدار غرض و نیت پر ہے۔ ارشاد نبوت ہے انما الاعمال بالنیات۔ اور ریا اسی نیت یعنی اعمال کی غرض وغایت ہی کی بنیاد کھوکھلی کر دیتی ہے۔ جس سے ساری عمارت ہی بودی اور کمزور ہو جاتی ہے۔ نمائش

کا اصل مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی خوبیوں کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسن ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا بنا کر پیش کرے۔ غرور بھی اسی ولولہ کا جذبہ ہے اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ نہیں اسی لئے قرآن نے دونوں کو یک جان پیش کیا ہے اور ان کی برائی بیان کی۔ دنیا کی قومیں میدان جنگ میں ساری برائیوں کو جائز سمجھتی ہیں لیکن قرآن نے خالص جنگ کے موضوع پر اہل ایمان کو یہ ہدایت دی ہے کہ محض اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمائش تمہاری جنگ کا مقصد نہ ہو بلکہ حق کی حمایت اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا نصب العین ہونا چاہیے۔

(۶۲) اور تم ان لوگوں کی طرح نہ ہونا جو اپنے گھروں سے اتراتے ہوئے اور لوگوں کی نگاہوں میں نمائش کرتے ہوئے نکلے اور جن کا حال یہ ہے کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں اور یہ لوگ جو کچھ بھی کر رہے ہیں اللہ سبحانہ کی ذات گرامی اس پر چھائی ہوئی ہے ابو جہل لشکر لے کر بڑی دھوم دھام اور باجے گاجے کے ساتھ نکلا تھا تاکہ مسلمان مرعوب ہو جائیں۔ اور دوسرے قبائل عرب پر مشرکین کی دھاک بیٹھ جائے۔ راستہ میں اس کو ابو سفیان کا پیغام پہنچا کہ قافلہ سخت خطرہ سے باہر نکل چکا ہے اب تم مکہ کو لوٹ جاؤ۔ ابو جہل نے نہایت غرور سے کہا کہ ہم اس وقت واپس جا سکتے ہیں جبکہ بدر کے چشمہ پر پہنچ کر مجلس طرب و نشاط منعقد کر لیں۔ گانے والی عورتیں خوشی اور کامیابی کے گیت گائیں۔ شرابیں نوش کریں، مزے اڑائیں اور تین روز تک اُونٹ ذبح کر کے قبائل عرب کی ضیافت کریں تاکہ یہ دن ہمیشہ کے لیے ہماری یادگار رہے۔ اور آئندہ کے لیے ان مٹھی بھر مسلمانوں کے حوصلے پست ہو جائیں کہ پھر کبھی ہمارے مقابلہ کی جرات نہ کریں اسے کیا خبر تھی کہ جو منصوبے باندھ رہے ہیں اور تجویزیں سوچ رہے ہیں وہ سب اللہ سبحانہ کے قبضہ میں ہیں چلنے دے یا نہ چلنے دے بلکہ جا ہے تو انہی پر اُلٹ دے چنانچہ یہی ہوا بدر کے پانی اور جام شراب کی جگہ انہیں موت کا پیالہ پینا پڑا محفل سرود و نشاط تو منعقد نہ کر سکے ہاں نوحہ اور ماتم کی صفیں بدر سے مکہ تک بچھ گئیں۔ جو مال تفاخر و نمائش میں خروج کرنا چاہتے تھے وہ مسلمانوں کے لیے مال غنیمت بنا۔ ایمان و توحید کے غلبہ کا بنیادی تیر بدر میں نصب ہو گیا گویا ایک طرح اس چھوٹے سے قطعۂ زمین میں اللہ سبحانہ نے رُوئے زمین کی ملل و اقوام کی قسمتوں کا فیصلہ کر دیا۔ بہرحال اس آیت میں مسلمانوں کو آگاہ فرمایا ہے کہ جہاد محض ہنگامہ کُشت و خون کا نام نہیں ہے بلکہ عظیم الشان عبادت ہے۔ عبادت اترادے یا دکھاوے کو کرے تو قبول نہیں لہٰذا تم فخر و غرور اور نمود و نمائش میں کفار کی چال نہ چلو۔[1]

اسلامی زندگی کو پروان چڑھانے کے لیے جو محنت کی جاتی ہے دشمن کے مقابلے میں اسے کامیاب بنانے کے لیے چھ باتوں پر زور دیا ہے کہ نتیج و کامیابی کا اصل سرچشمہ یہ ہیں۔

۱۔ ثابت قدم رہو۔ کیونکہ میدان کی ساری کامیابی کا انحصار اسی پر ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

۲۔ بہت زیادہ اللہ کو یاد کرو۔ کیونکہ قدم کا جماؤ دل کے ثبات پر موقوف ہے اور دل کے اطمینان کا بہترین ذریعہ ذکر اللہ ہے۔
۳۔ اللہ ورسول کی طاعت کرو کیونکہ بغیر طاعت کوئی جماعت کامیاب نہیں ہو سکتی۔ نافرمانی ناکامی کا واضح اور کھلا راستہ ہے۔

یہاں تک مثبت باتیں ہیں یعنی یہ کام کرنے کے ہیں۔ منفی باتیں یعنی نہ کرنے والے کام یہ ہیں۔

۴۔ باہمی نزاع نہ ہو۔ انتشار وافتراق اس دنیا میں امتوں کے لیے عذاب عظیم ہے۔
۵۔ صبر کا دامن ہاتھ سے نہ چھوڑو کتنی ہی مشکلات سے دوچار ہو۔ برداشت کرتے رہو۔

اسی سلسلہ کی آخری ہدایت اس آیت میں دی گئی ہے کہ اہل ایمان کو ایسا کردار اختیار نہ کرنا چاہیے جو وہ لوگ اپناتے ہیں جو اللہ سے غافل اور اس کے دین سے روگرداں ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ ہدایت جنگ بدر کے واقعات پر تبصرہ کرنے کے بعد دی جارہی ہے۔ بدر کی لڑائی کے لیے جب قریش مکہ سے مدینہ کی طرف چلے تو کچھ عجیب آن بان اور شان سے چلے۔ گانے بجانے والی لونڈیاں ساتھ تھیں۔ جگہ جگہ ناچ ورنگ کی محفلیں گرم ہوتی تھیں۔ شراب کا دور چلتا تھا اور ہر ایک اس گھمنڈ میں تھا کہ اب ہماری اتنی بڑی طاقت کے سامنے کون آئے گا۔ اور آئے گا تو کب ٹھہرے گا۔ راستہ میں جن جن قبیلوں کے پاس سے گذرتے تھے ان پر اپنے ساز و سامان اور طاقت کا رعب جماتے تھے اور یہ ڈینگیں مارتے تھے کہ بھلا اب ہمارے سامنے کون سر اٹھا سکتا ہے۔ مسلمانوں کو بتایا جارہا ہے کہ وہ ایسے گندے اخلاق سے بچیں۔ طاقت بس اللہ کی طاقت ہے۔ فتح اور شکست اس کے ہاتھ ہے۔ گھمنڈ اور غرور اسے پسند نہیں ہے۔ اترانے والوں کو اکثر منہ کی کھانی پڑتی ہے اور بڑے بول کا سر نیچا ہوتا ہے۔ مسلمانوں کو چاہیے کہ جب وہ اللہ کی راہ میں جان اور مال قربان کرنے کے لیے نکلیں تو اچھے سے اچھے اخلاق ان سے ظاہر ہوں۔ اللہ کو یاد رکھیں۔

اصل ارشاد میں لفظ بطر آیا ہے اس کے معنے حق سے اکڑنے اور اس سے متکبرانہ روگردانی کرنے کے ہیں۔ قرآن نے یہاں اس بدمستی اور سرکشی کے لیے استعمال کیا جو حق سبحانہ کی نعمتیں پاکر کسی شخص یا گروہ میں ظاہر ہوتی ہے اور وہ نیازمندی کی جگہ غرور اور سرکشی میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ قرآن میں ہے۔ وکم اھلکنا من قریۃ بطرت معیشتھا۔ اور کتنی بستیاں ہیں جو اپنے وسائل معیشت کی فراوانی پر اکڑنے لگی تھیں۔ دراصل بطر یہاں ذکر کے مقابلے پر آیا ہے بتایا یہ جارہا ہے کہ مسلمانو! تمہیں میدان جنگ میں اللہ سے لگاؤ رکھنا چاہیے ان لوگوں کی طرح نہ ہو جانا جو دنیا میں پڑنے کے بعد یاد الٰہی سے بیگانہ ہو کر اپنی دولت کی فراوانی پر مچل جاتے ہیں۔ دولت کا یہ بطر قوموں کے لیے دنیا میں ہلاکت کا سامان ہے۔ کثرت تعداد اور اسباب و وسائل کی بہتات پر مچلنا اہل ایمان اور اللہ سے تعلق رکھنے والوں کا کام نہیں ہے۔ اہل ایمان کا کام بندگی کی تواضع

اور عبدیت کی فروتنی ہے۔ اگرچہ یہاں بالذات مسلمانوں کو یہ بتایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں کی جنگ جنگ نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت ہے۔ شانِ عبادت اس میں نمایاں رہنی چاہیے۔ ڈھول ڈھمکے۔ تماشے ناچ۔ ناچ گانے۔ عورتوں مردوں کا اختلاط وہ احوال ہیں جو عبادت کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتے۔ اس میں اس طرف بھی اشارا ہے کہ آئندہ مسلمانوں کے سامنے ایسے حالات آنے والے ہیں کہ اگر وہ خبردار نہ رہے تو وہ بھی اس قسم کے فتنوں کا شکار ہو سکتے ہیں۔ اسی سے کچھ محققین نے ہماری معاشرتی زندگی کے بارے میں یہ نکتہ بھی معلوم کیا جیسا کہ حضرت نواب صاحبؒ نے حضرت شاہ عبدالعزیز رحؒ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ لوگ جو جلوس بارات ڈھول ڈھمکوں کے ساتھ شادیوں کے موقع پر نکالتے ہیں وہ قرآن کی اس آیت کی روشنی میں ناجائز ہے اللہ اکبر کیا وقتِ نظر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ ہدایت صرف میدانِ جنگ کے لیے نہیں بلکہ پوری اسلامی زندگی کے لیے ہے۔ بلکہ اگر یوں کہا جائے تو بیجا نہیں ہے کہ یہ ہدایت صرف اسی زمانہ کے لیے نہیں بلکہ آج کے لیے بھی ہے اور ہمیشہ کے لیے ہے۔ میدان جنگ میں کفر کی زندگی جس انداز سے اس وقت چل رہی تھی آج بھی ویسے ہی چل رہی ہے۔ قحبہ خانے اور فواحش کے اڈے اور شراب کے پیپے ان کی زندگی کا قیمتی حصہ ہیں۔ خفیہ طور پر نہیں بلکہ علانیہ نہایت ڈھٹائی کے ساتھ وہ عورتوں اور شراب کا زیادہ سے زیادہ درشن مانگتے ہیں اور ان کے سپاہیوں کو خود اپنی قوم ہی سے یہ مطالبہ کرنے میں باک نہیں ہوتا کہ وہ جو بہو بیٹیوں کو بڑی سے بڑی تعداد میں ان کی ہوس رانیوں کا شکار ہونے کے لیے پیش کریں پھر بھلا کوئی دوسری قوم ان سے کیا توقع کر سکتی ہے کہ یہ اس کو اپنی اخلاقی گندگی کا سنڈاس بنانے میں کوئی کسر اٹھا رکھیں گے۔

آیت میں بطر کے ساتھ دوسرا لفظ رئاء الناس آیا ہے۔ اس کے معنے لوگوں کو دکھانا ہیں۔ انسانی اعمال کی اصل حقیقت نیت اور غرض پر مبنی ہے۔ اس لیے اعمال کی درستی و نادرستی اچھائی اور بُرائی کا مدار نیت اور غرض پر ہے۔ ریا اسی نیت یعنی اعمال کے مصدر کی بنیاد کو کھوکھلا کر دیتی ہے جس سے عمل کی ساری اٹھی ہوئی عمارت کمزور ہو جاتی ہے نمائش کا اصلی مقصد یہ ہوتا ہے کہ انسان اپنی اچھائی اور بڑائی کا اظہار کر کے لوگوں میں اپنی نسبت حسنِ ظن پیدا کرے اور اپنے کو بڑا بنانے، فخر گھمنڈ دولت پر مچلنا بھی اسی شوق کا جذبہ ہے کیونکہ اس کا منشا بھی اپنے نفس کی بڑائی اور دکھاوے کے سوا کچھ نہیں۔ اسی لیے قرآن نے یہاں دونوں کو یکجا کر کے ان کی بُرائی کی ہے۔ بتانا یہ ہے کہ مسلمانو! اپنی طاقت کا غرور اور اپنی قوت کی نمائش مشرکین مکہ کی طرح تمہاری جنگ کا مقصد نہیں ہے بلکہ حق کی حمایت اور اللہ کی بات کو اونچا کرنا تمہارا مقصد ہے۔ اسلام کی اصطلاحی زبان میں کفر کے بعد نفاق کا درجہ ہے، نفاق کیا ہے؟ ایمان کی جھوٹی نمائش دل میں کچھ اور زبان پر کچھ۔ چونکہ ریا اور نمائش اعمال کی اصلی روح کو بگاڑ دیتی ہے اس لیے حضور اقدس ﷺ نے قرآنی ہدایات کی روشنی میں اس کے ہر ایک ریشہ کی بیخ کنی کی ہے۔ عبادات میں، انفاق میں، راہ خدا میں محنت کرنے میں اور سارے دوسرے اعمال میں اس پر قدغن قائم کی ہے۔

آیت میں کفار قریش کی طرف اشارا کر کے مسلمانوں کو بتایا جا رہا ہے کہ تم ان کی طرح نہ ہونا جو مکہ سے اس شان، -

نکلے تھے گانے بجانے والی لونڈیاں ساتھ تھیں۔ جگہ جگہ ٹھہر کر رقص و سرود اور شراب نوشی کی مجلسیں جماتے تھے جو جو قبیلے اور بستیاں راستہ میں تھے ان پر اپنی طاقت و شوکت اور اپنی کثرتِ تعداد اور اپنے ساز و سامان کا رعب جماتے تھے اور نعرے لگاتے تھے کہ ہمارا مقابلہ کون کرسکتا ہے۔ یہ تھی ان کی اخلاقی حالت۔ مسلمانو! تم دنیا میں علمبردارِ حق بن کر آئے ہو تم کبھی ان کی کاپی نہ کرنا۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں آیت کا منشا مسلمانوں کو یہ بتانا ہے کہ بطر اور ریاء میں تم ان کی کاپی نہ کرنا۔ بلکہ اخلاص و تقویٰ کی مثالی زندگی اپنانا۔ علامہ نسفیؒ لکھتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ خبردار تم اہلِ مکہ کی طرح طاقت پر نہ مچلنا اور اپنے کردار کی نمائش نہ کرنا بلکہ اس کے برعکس تمہیں اللہ کے ڈر سے رنج و غم کی تصویر اور صبر و تقویٰ کی مثال بن کر لوگوں کے سامنے آنا چاہیے۔

آگے ارشاد ہوا ہے ویصدون عن سبیل اللہ یعنی ان اخلاقی نجاستوں سے زیادہ ناپاک ان کے مقاصدِ جنگ ہیں۔ ان کی طاقت کی نمائش اور اس ساری شان و شوکت کے مظاہرہ کا بنیادی مقصد یہ اور صرف یہ ہے۔ کہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکیں وہ چاہتے ہیں کہ خدا نے اپنی زمین میں جو کچھ سارے انسانوں کے لیے پیدا کیا ہے اس پر وہ تنہا قابض و متصرف ہوں اور کوئی ان کا شریک و سہیم نہ ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اس ساری کارروائی سے ان کا منشا یہ ہے کہ لوگوں کو محمد رسول اللہ ﷺ کی دعوت سے ہٹائیں۔ ان نادانوں کو پتہ نہیں ہے کہ انسان خواہ کتنی وسعتوں اور پھیلاؤ کے ساتھ اپنی تدابیر میں مگن ہو جائے اس کی ہر چیز ہر وقت اللہ سبحانہ کے قبضہ میں ہے اور اس کی ساری جولانیوں کے اردگرد اللہ کی باڑ لگی ہوئی ہے۔

امام رازی نے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ ایک ہی فقرہ میں ان کی اخلاقی نجاستوں کو اسم کے ذریعے اور ان کے مقصدِ جنگ کو فعل کے ذریعے ظاہر کیا گیا ہے یعنی بطر اور ریاء اسم ہیں اور یصدون فعل ہے۔ زجاج نحوی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اسم کے ساتھ جو ان کا کردار ظاہر کیا ہے وہ کردار کے دوام اور ہمیشگی کو جتانے کے لیے ہے اور فعل کے ذریعہ ان کے کردار کا تذکرہ وقتی اور ہنگامی پیش پا افتادہ حالت کو بتانے کے لیے ہے بتانا یہ ہے کہ طاقت کی نمائش اور دولت پر گھمنڈ تو ان کی دائمی سرشت ہے اور اسلام سے لوگوں کا روکنا یہ ایک وقتی اور ہنگامی حادثہ ہے۔ علامہ آلوسی نے اسی بات کو اس طرح بتایا ہے ان البطر والریاء دابھم والصد تجدد دھم یعنی طاقت کا غرور اور اس کی نمائش تو ان کی عادت ہے۔ لیکن اسلام کی مخالفت یہ وقتی حادثہ ہے۔

اس آیت میں یہ بات بہت زیادہ غور کے قابل ہے۔ آیت کے مخاطب مسلمان بلاشبہ بطر و ریاء الناس میں مبتلا نہ تھے۔ لیکن یہاں ان کو کھلے اور واشگاف لفظوں میں مشرکین کے ساتھ مشابہت سے روکا جا رہا ہے۔ ہمیں سوچنا چاہیے کہ ہم مسلمان ہو کر اور ولایت کے دعوے کر کے کن کن چیزوں میں اور کیسی کیسی حرام و مکروہ چیزوں میں کافروں اور اللہ کے

دشمنوں سے مشابہت کر رہے ہیں۔
اس آیت کا یہ بھی مدلول ہے کہ کار خیر میں ریا کاری کی نیت نہ ہونی چاہیے اور نہ اس پر اترانا چاہیے بلکہ ہر کام اللہ کی رضا جوئی اور خوشنودی کے لیے ہونا چاہیے شاہ عبد القادر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں کہ جہاد عبادت ہے۔ عبادت اترا دے اور دکھاوے کو کرے تو قبول نہیں ہے۔ ساری عبادات کا حکم یہی ہے نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج، سارے صدقات سب کی قبولیت کی بنیادی شرط اخلاص ہے۔ یاد رہے کہ اخلاص قبولیت کی شرط ہے صحت کی شرط نہیں۔ صحت کا تعلق عالم شہادت سے ہے جبکہ قبولیت کا تعلق عالم غیب سے ہے۔ ایک شخص نے وضو مکمل کیا ہے پاک کپڑے اور پاک جگہ ہے اور نماز دستور کے مطابق ادا کر رہا ہے لیکن نماز اللہ کے لیے نہیں مخلوق کی خاطر پڑھ رہا ہے۔ قانون میں اس کی نماز درست اور صحیح ہے لیکن عند اللہ اسے شرف قبولیت حاصل نہ ہوگا۔ یہی حال دوسرے اعمال کا ہے۔

بدر میں شیطان کا مشرکین کو اکسانا

(۶۲) اور جب شیطان نے ان کے کاموں کو ان کے سامنے سجا کر پیش کیا اور بول پڑا کہ آج لوگوں میں سے تم پر برتر ہونے والا کوئی نہیں ہے اور میں تمہاری پشت پناہ ہوں۔ پھر جب دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو الٹے پاؤں واپس ہوا۔ اور کہا کہ مجھے تم سے کوئی سروکار نہیں مجھے وہ کچھ نظر آرہا ہے جو تم نہیں دیکھتے ہو۔ میں اللہ سے ڈرتا ہوں اور اللہ کی سزا سنگین ہے۔ قریش اپنی جمعیت پر مغرور تھے لیکن بنی کنانہ سے ان کی چھیڑ چھاڑ رہتی تھی۔ خطرہ یہ ہوا کہ کہیں بنی کنانہ کامیابی کے راستہ میں آڑے نہ آجائیں۔ فوراً شیطان ان کی پیٹھ ٹھونکنے کے لیے کنانہ کے سردار اعظم سراقہ ابن مالک کی صورت میں اپنی ذریت کی فوج لے کر نمودار ہوا اور ابوجہل وغیرہ کو اطمینان دلایا کہ ہم سب تمہاری مدد حمایت پر ہیں۔ کنانہ کی طرف سے بے فکر رہو میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جب بدر میں زور کا رن پڑا۔ اور شیطان کو جبریل وغیرہ نظر آئے تو ابوجہل کے ہاتھ میں سے ہاتھ چھڑا کر الٹے پاؤں بھاگا۔ ابوجہل نے کہا کہ سراقہ! عین وقت پر دغا دے کر کہاں جاتے ہو۔ کہنے لگا میں تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتا۔ مجھے وہ چیزیں دکھائی دے رہی ہیں جو تمہیں نظر نہیں آتی ہیں یعنی فرشتے خدا کے یعنی اس خدائی فوج کے ڈر سے میرا دل بیٹھا جاتا ہے۔ اب ٹھہرنے کی ہمت نہیں ہے کہیں کسی سخت عذاب یا آفت میں نہ پکڑا جاؤں۔ قتادہ کہتے ہیں کہ ملعون نے جھوٹ بولا۔ اس کے دل میں اللہ کا ڈر نہ تھا۔ ہاں وہ جانتا تھا کہ اب قریش کا لشکر ہلاکت میں گھر چکا ہے۔ کوئی قوت بچا نہیں سکتی ہے یہ اس کی قدیم عادت ہے کہ اپنے متبعین کو دھوکہ دے کر اور ہلاکت میں پھنسا کر عین وقت میں کھسک جاتا ہے اسی کے موافق یہاں بھی کیا ہے۔ الشیطان یعدکم الفقر ویامرکم بالفحشاء اور یعدھم ویمنیھم وما یعدھم الشیطان الا غرورا۔ اور کمثل الشیطان اذ قال للانسان اکفر فلما کفر قال انی بریٔ منک

انی اخاف اللہ رب العالمین　　اور وقال الشیطان لما قضی الامر ان اللہ وعدکم وعد الحق و وعدتکم فاخلفتکم وما کان لی علیکم من سلطان ۔الخ[1]

آیت کی جو تشریح شیخ الاسلام نے کی ہے شارحین قرآن کے ایک گروہ کی یہی رائے ہے۔ دراصل علمائے تفسیر کے اس آیت کی تشریح میں دو قول ہیں۔

۱۔ اول یہ کہ آیت قرآنی میں مجازی معنے مراد ہیں یعنی یہ کہ شیطان نے قریش مکہ کے دلوں میں یہ وسوسہ اور خیال پیدا کیا تھا کہ آج تم مغلوب نہیں غالب رہوگے۔ میں تمہارا حمایتی ہوں۔ تمہاری تعداد زیادہ ہے۔ ساز و سامان بکثرت ہے تمہارے عقائد تمہیں پناہ دیں گے۔ علامہ زمخشری نے بھی یہی مطلب بتایا ہے۔

۲۔ دوسرے یہ کہ آیت قرآنی میں حقیقی معنے مراد ہیں۔ شیطان نے ان سے واقعی یہ کہا تھا۔ بنی کنانہ کے سردار کا نام سراقہ ابن مالک ابن جعشم تھا۔ شیطان اس کی صورت کا لبادہ پہن کر قریش کے پاس آیا تھا اور وہ باتیں کہیں جو قرآن میں مذکور ہیں۔ یہ سوال کہ اس نے ایسا کیوں کیا شارحین قرآن نے اسے اس طرح سمجھایا ہے کہ اس زمانے میں قریش کی بنی بکر سے کچھ اَن بن اور چشمک تھی۔ قریش کو ہر وقت ان کی جانب سے حملہ کا خطرہ رہتا تھا۔ اسی لیے قریش بدر کی طرف جانے اور مسلمانوں پر حملہ کرنے میں تردد کر رہے تھے۔ شیطان سراقہ کی صورت بنا کر آیا اور کہنے لگا کہ آج تم پر کوئی نہیں آسکتا۔ میں اپنی جماعت سمیت تمہارے ساتھ ہوں۔ بنی بکر سے تم کوئی اندیشہ نہ کرو میں پوری ذمہ داری لیتا ہوں کہ وہ تم پر کوئی حملہ نہ کریں گے۔ اس کی ان باتوں سے قریش کو دلیری ہوگئی اور بدر کی طرف چل دیئے۔ سراقہ بھی ان کے ساتھ تھا جب میدان کارزار گرم ہوا اور ابلیس نے فرشتوں کو دیکھا تو اس وقت شیطان گھبرایا۔ حارث ابن ہشام کا ہاتھ پکڑے ہوئے کھڑا تھا اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور چل دیا۔ حارث چلاتا ہی رہا کہ سراقہ اس حالت میں ہمیں چھوڑ کر کہاں جا رہے ہو مگر اس نے سنی اَن سنی کردی اور ایک نہ مانی اور کہنے لگا میری آنکھیں جو کچھ دیکھ رہی ہیں وہ تمہیں نظر نہیں آتا ہے یہ کہہ کر حارث کی چھاتی پر مکہ مار کر چل دیا۔ ابوجہل نے آگے بڑھ کر لوگوں کو تسلی دی۔ اور بتایا کہ سراقہ دراصل درپردہ محمد ﷺ سے ملا ہوا ہے۔ لات و عزیٰ کی قسم ہم واپس نہ ہوں گے۔ جب تک مسلمانوں کو قیدی بنا کر نہ لے جائیں اور ان کو مزہ نہ چکھائیں بدر میں مشرکین مکہ شکست سے دوچار ہو کر مکہ واپس ہوئے تو سراقہ کو برا بھلا کہہ رہے تھے کہ اس نے ہمیں شکست سے دوچار کیا۔ سراقہ کو جب یہ بات معلوم ہوئی تو وہ بولا بخدا مجھے تو تمہارے جانے کی خبر بھی نہیں ہوئی۔ جب تم بدر سے شکست کھا کر آگئے تو پھر تمہاری جنگ کی خبر ملی۔ ان ہی مکہ والوں میں سے جب کچھ لوگ بعد میں مسلمان ہوئے تو ان کو یقین ہوا کہ سراقہ اصل میں سراقہ نہ تھا۔ شیطان تھا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلی تشریح بھی ابن کثیر اور ابن جریر نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے پیش کی ہے۔ ارشاد ہے عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر کے دن ابلیس اپنا جھنڈا اور لشکر لے کر آیا اور مشرکین کے ساتھ تھا۔ مشرکین کے دلوں میں اس نے یہ بات ڈالی کہ آج تم پر کوئی غالب آنے والا نہیں میں تمہارے ساتھ ہوں۔ جب مسلمان اور مشرکین کا مقابلہ شروع ہوا اور شیطان کو فرشتے نظر آئے تو بھاگ اٹھا اور بولا جو کچھ مجھے نظر آرہا ہے تم نہیں دیکھتے ہو۔

ابن کثیر رح نے اسی کو پہلے پیش کیا اس کا واضح اور صاف مطلب ہے کہ عالم غیب کی دونوں روحانی قوتیں طیب اور خبیث اپنا اپنا کام کر رہی تھیں اہل ایمان کی حوصلہ افزائی اگر فرشتے کر رہے تھے تو اہل کفر کو شیاطین دلیری دے رہے تھے آخر اس میں حیرت کی کونسی بات ہے جب قرآن خود بتا رہا ہے کہ:

ومن یعش عن ذکر الرحمٰن نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین۔

جو بھی یاد الٰہی سے آنکھیں چرا لیتا ہے تو ہم اس کے پیچھے ایک شیطان لگا دیتے ہیں پھر وہ اس کا ساتھی بن جاتا ہے۔

شیطان کیا ہے صرف اللہ سبحانہ کا ایک انتقامی تازیانہ ہے اللہ سبحانہ نے انسان کو جس مقصد کی تکمیل کے لیے زمین میں بسایا ہے جو بھی جس حد تک اس قدرتی نصب العین سے ہٹتا ہے نہ رکنے والے کوڑے کی شکل میں وہی ان پر برستا رہتا ہے۔ ٹھیک جیسے بل سے نکلنے والے چوہے کو بلی دبوچ لیتی ہے۔ اپنے نصب العین سے ہٹنے والوں کو الشیطان بھی اسی طرح دبوچ لیتا ہے، اس کو اسی لیے بنایا گیا ہے۔ یہی اس کا کام ہے ایک جگہ نہیں قرآن میں مختلف مقامات میں یہی بات بتائی گئی ہے۔

ان عبادی لیس لک علیھم سلطن — میرے بندوں پر تجھے کوئی قابو حاصل نہیں ہے۔

اور اس کے ساتھ یہ اعلان بھی ہے۔

واجلب علیھم بخیلک ورجلک و — اور چڑھ جا ان پر اپنے سوار اور پیادوں کے ساتھ
شارکھم فی الاموال والاولاد وعدھم — اور ساجھی بن جا ان کے مالوں اور بچوں میں اور وعدے
ومایعدھم الشیطان الاغرورا — کر ان سے اور شیطان کے وعدے تو دھوکا ہی دھوکا ہوتا ہے

اللہ سبحانہ کی بغاوت پر زندگی جو بڑھتی اور چڑھتی جاتی ہے دراصل وہ خود نہیں بڑھتی ہے بلکہ شیطان جو ان کو قابو میں کیے ہوتے ہے وہ ہی بڑھاتا اور چڑھاتا ہے۔ اسی موقعہ پر شیطان کی زبانی قرآن میں یہ الفاظ آئے ہیں کہ اس نے آدم کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا لاحتنکن ذریتہ الا قلیلا میں ڈھائی لگاؤں گا اس کی اولاد کو۔ گدھوں اور گھوڑوں کے منہ پر بجاتے

لگام کے رسی باندھ کر کبھی کھینچتے ہیں اسی کو عربی احتناک اور اردو میں ڈہائی لگانا کہتے ہیں۔ شیطان کا کام یہ ہے کہ جس چیز میں کامیابی نہیں وہ باور کراتا ہے کہ اسی میں کامیابی ہے۔ دوام کی خاصیت سے جو واقع میں محروم ہے دھوکہ دیتا ہے کہ وہ خلود بخش ہے۔ جن اعمال و افعال کا بالآخر کوئی نتیجہ نہیں باور کراتا رہتا ہے یہی نتیجہ خیز ہیں۔ جس راہ پر چلنے والوں کو کچھ نہیں ملتا سکھاتا رہتا ہے کہ سب کچھ اسی راہ میں ملتا ہے۔ الغرض جو ہے شیطان کی تسلط کے بعد نظر آتا ہے کہ وہ ہی نہیں اور جو نہیں ہے وہی ہے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔

فرشتوں اور شیاطین کی غیبی قوتوں کو جب عالم غیب کی خدا کی بنائی ہوئی قوتیں مانتے ہیں اور جانتے ہیں کہ روحوں کی پاکیزگی میں اگر فرشتے ذریعہ ہیں تو روحوں کی گندگی کا شیاطین سبب ہیں آخر اجسام کی صحت اور بیماری کے لیے آپ حیاتین اور جراثیم کو مانتے ہیں تو پھر روحوں کی صحت اور بیماری کے اسباب کا آپ کیسے انکار کر سکتے ہیں۔ فرق صرف یہی ہے کہ حیاتین اور جراثیم کو آپ کا ڈاکٹر خوردبین کے ذریعے جانتا ہے اور آپ کو بتاتا ہے اور ملائکہ اور شیاطین کا اللہ کا رسول نور نبوت کے ذریعے ادراک کر لیتا ہے اور آپ کو بتاتا ہے۔ افسوس ہے کہ جن ان دیکھے اسباب و علل کو بتانے کے لیے نبوت آتی ہے ان ہی ان دیکھی باتوں کو بنیاد بنا کر آپ نبی کی قوت میں شک اندازی کر رہے ہیں طبیب کے پاس مریض اسی لیے تو جاتا ہے کہ مرض کے جن اسباب کا اسے پتہ نہیں طبیب سے ان کا علم حاصل کرے اور اسی کے مطابق علاج کرے لیکن بیماری کے جن پوشیدہ اسباب کی حکیم نشاندہی کرتا ہے۔ اگر مریض ان ہی پوشیدہ اسباب کو دلیل بنا کر طبیب کی طبابت کا انکار کرنے لگے تو اب ایسے مریض کو کیا کہیں گے۔ بتائیے اس قسم کے مریضوں کا علاج دنیا کا کون حکیم کر سکتا ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حواس اور عقل کے ذریعے جن چیزوں تک رسائی ممکن نہ تھی ان ہی کو بتانے کے لیے وحی آتی ہے۔

اس لیے آیت کا مطلب عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تشریح کے مطابق یہ ہے کہ شیطان نے مشرکین مکہ میں یہ وسوسہ اندازی کی کہ تم جو کچھ کر رہے ہو بالکل درست ہے حالات تمہارے لیے سازگار ہیں۔ میں تمہارا مددگار ہوں۔ جب دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہوئیں اور شیطان کو مسلمانوں کی سمت میں فرشتے نظر آئے تو شیطان نے راہ فرار اختیار کر لی۔ اور بول پڑا کہ میرا تم سے کوئی تعلق نہیں ہے مجھے وہ کچھ نظر آ رہا ہے جو تم نہیں دیکھتے ہو مجھے اندیشہ ہے کہ ملائکہ کی گرفت میں نہ آجاؤں! اور قیامت سے پہلے ہی میرا کام تمام ہو جائے۔ اللہ کی ذات شدید العقاب ہے۔ قیامت تک مہلت کے باوجود اس عذاب سے دو چار ہو سکتا ہوں

یہ آیت قرآنی کی وہ تشریح ہے جو ابن جریج نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے بتائی ہے اس صورت میں آیت قرآنی میں آئے ہوئے افعال تزیین، قول، نکوص میں اسناد مجازی ہوگی۔

اور اگر حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی اس تشریح کو آیت کی تفسیر میں اپنایا جائے جسے ابن کثیر اور

ابن جریر نے بحوالہ علی ابن ابی طلحہ رحمۃ اللہ علیہ پیش کیا ہے۔ اور جسے محمد ابن اسحاق نے بحوالہ کلبی عن ابی صالح پیش کیا ہے، کلبی کی روایات تو محدثین کے یہاں قابل پذیرائی نہیں ہیں۔ علی ابن ابی طلحہ کے تفسیری نوٹ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے اگرچہ معتبر ہیں مگر انقطاع کا دھبہ ان کی پیشانی پر بھی ہے۔ محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ علی ابن ابی طلحہ رحمۃ اللہ علیہ کا خود حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے سماع ثابت نہیں ہے۔ پھر بدر میں خود حضرت عبداللہ بن عباس کی عمر شاں ہے یہ بھی ارسال کی نشاندہی کرتی ہے بہرحال روایت کی تاریخی حیثیت کچھ ہو اس کی بنیاد پر اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ شیطان بدر کے روز سراقہ ابن مالک کا لبادہ پہن کر آیا۔ شیاطین کا تمثل ہے۔ ملائکہ کا تمثل قرآن سے ثابت ہے۔ فتمثل لھا بشرا سویا۔ ارواح طیبہ کے تمثل کو مان لینے کے بعد ارواح خبیثہ میں کونسا استحالہ ہے شیطان کی روح خبیث نے سراقہ ابن مالک کی صورت اختیار کر لی۔ بعد کو اس نے میدان جنگ سے گریز پائی اختیار کر لی۔ مشرکین کو شکست ہوئی۔ اہل مکہ شکست کے بعد تاثر یہ تھا کہ ہماری ناکامی کا باعث سراقہ ابن مالک ہے۔ سراقہ نے ہمیں ہرا دیا۔ امام رازی نے یہ بات بہت اونچی لکھی ہے کہ فیہ معجزۃ عظیمۃ لرسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم۔ شیطان کے سراقہ کے لبادہ پہن کر آنے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا شاندار معجزہ ہے۔

تاریخ انسانی کا عجیب واقعہ

(۴۹) اور جب منافقین اور وہ لوگ جن کے دلوں میں روگ تھے کہنے لگے کہ ان مسلمانوں کو دین کا نشہ چڑھا ہوا ہے اور جو بھی اللہ پر بھروسہ کرتا ہے تو بلاشبہ اللہ بڑے دبدبہ والا اور حکیم ہے۔ مسلمانوں کی تھوڑی جمعیت اور بے سروسامانی اور اس پر ایسی دلیری و شجاعت کو دیکھتے ہوئے منافقین اور ضعیف القلب لوگ کہنے لگے تھے کہ یہ مسلمان اپنے دین کی حقانیت پر مغرور ہیں جو اس طرح اپنے کو موت کے منہ میں ڈال دیتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ یہ غرور نہیں توکل ہے جس کو اللہ سبحانہ کی زبردست قوت پر اعتماد ہو اور یقین رکھے کہ جو کچھ اوپر سے ہوگا عین حکمت و صواب ہوگا وہ حق کے معاملہ میں ایسا ہی بے جگر اور دلیر ہو جاتا ہے۔[1]

مشرکین کے تذکرے کے بعد اب منافقین اور حاسدین کا ذکر ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ حقائق سے بے خبر اور مادہ پرست لوگ دین میں سرشاریوں کو دیکھ کر کیسی کیسی باتیں کرتے ہیں۔ یہ اس دور کے دانشوروں یا ترقی پسندوں کا اہل ایمان کے بارے میں تاثر تھا کہ غر ھولاء دینھم۔ ان کو ان کے دین نے دھوکہ دے دیا ہے۔ گویا وہ اپنے خیال میں ان لوگوں کو بیوقوف اور احمق سمجھ رہے تھے جو سچائی کے ساتھ اسلام قبول کر کے اپنے آپ کو تکلیفوں، مشقتوں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور خطرات میں مبتلا کر رہے تھے۔ ان کی رائے میں یہ سراسر احمقانہ فعل تھا کہ محض حق پرستی کی خاطر تمام دنیا کی دشمنی مول لی جاتی۔ البقرہ کے شروع میں ان ہی منافقین اور دل کے بیماروں کا یہ نعرہ پڑھ چکے ہو۔ انومن کما آمن السفہاء کیا ہم بھی ان بیوقوفوں کی طرح ایمان لے آئیں۔ یہاں بھی یہی کہہ رہے ہیں صرف تعبیر کا اختلاف ہے غر ھولاء دینھم اور تعبیر کا یہ اختلاف حالات کے اختلاف کی وجہ سے ہے۔ آج بھی دنیا چودہ صدیاں گذرنے پر صدر اول کے مسلمانوں کی کامیابی پر حیران ہے صرف بدر ہی نہیں بلاشبہ صدر اول میں مسلمانوں کے حالات کا یہ انقلاب شرمناک اور رسوا کن ضعف و ذلت کے بعد یہ زبردست طاقت اور سربلندی یاس و نومیدی کے بعد یہ زندگی اور تازگی خواب غفلت کے بعد یہ بیداری بقہوری، مجبوری اور مظلومی کی حالت میں کامیابی تاریخ کا ایک نادر اور انوکھا واقعہ ہے۔ مورخین کا اتفاق ہے کہ تاریخ انسانی میں اس سے زیادہ عجیب و غریب واقعہ پیش نہیں آیا۔ صرف بدر ہی نہیں بلکہ پوری اسلامی زندگی کی کامیابی پر دنیا حیران ہے۔ اس وقت کے ترقی پسندوں نے تو غر ھولاء دینھم کہہ کر اپنے کو مطمئن کر لیا تھا لیکن اس زمانہ کے دانشور اور ترقی پسند اس کامیابی پر کیسے حیران ہیں یہ ان کی زبانی سنئے۔

اسٹوڈرد امریکی اپنی کتاب جدید دنیائے اسلام میں لکھتا ہے۔

تاریخ انسانی میں جس قدر واقعات ہوئے ہیں اسلام کے ظہور کا واقعہ شائد ان سب سے زیادہ عجیب ہے۔ اسلام کا ظہور اس قوم میں ہوا جو بالکل غیر منظم اور پراگندہ تھی اس ملک میں جو انحطاط کی آخری حد کو پہنچا ہوا تھا لیکن ابھی پوری ایک صدی نہ گذری تھی کہ اسلام نصف کرۂ ارض میں پھیل چکا تھا۔ بلند اور طاقتور ممالک کو اس نے زیر و زبر کر کے دکھا دیا تھا۔ قدیم ترین مذاہب کو جو صدیوں بلکہ ہزاروں سال پیشتر سے قائم تھے ڈہا دیا۔ انسانوں اور قوموں کی ذہنیتیں بدل دیں۔ اور ایک نئی دنیا کی طرح ڈال جو انتہائی مضبوط اور طاقتور تھی۔ یہی عالم اسلام ہے۔

یہی مصنف اسی کتاب میں لکھتا ہے۔

اسلام کی اس عظیم الشان کامیابی پر جس قدر ہم غور کرتے ہیں اسی قدر تعجب میں اضافہ ہوتا ہے اور عقل حیران رہ جاتی ہے تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ دنیا کے تمام مذاہب نے نشو و نما پائی اور مشکلات و رکاوٹوں کا مقابلہ کرنے میں بہت سست رفتار سے کامیابی حاصل کی۔

مشہور مورخ گبن لکھتا ہے۔

عربوں نے بہت معمولی قوت سے شاہان روم و ایران کے خلاف محاذ قائم کیا اور یہ دونوں عظیم الشان حکومتیں دیکھتے ہی دیکھتے ایک ایسے دشمن کا شکار ہو گئیں جسے یہ دونوں صدیوں سے حقیر سمجھتی تھیں۔

مارکس مار یموف اپنی کتاب العالم الاسلامی میں لکھتا ہے۔

ہمارے لیے یہ سمجھنا تقریباً ناممکن ہے کہ کس طرح عربوں نے جو مختلف قبائل میں تقسیم اور جن کے پاس ضروری جنگی سامان نہ تھا۔ اس قدر قلیل مدت میں رومیوں اور ایرانیوں کو شکست دے دی۔

بتانا چاہتا ہوں کہ مسلمانوں کی کامیابی پر صرف مدینہ کے منافقین ہی حیران و ششدر نہ تھے بلکہ آج تک پوری دنیائے دانش و بینش حیران ہے۔ وہ بھی کہتے تھے۔ غر ھٰؤلاء دینھم اور آج بھی یہی کہہ رہے ہیں۔ تعبیرات مختلف ہیں روح دونوں جگہ ایک ہے۔

قرآن نے یہاں اس کا جواب دیا ہے۔ ومن یتوکل علی اللہ الخ آیت کی تشریح میں حضرت شاہ عبدالقادرؒ فرماتے ہیں کہ اللہ نے فرمایا کہ یہ غرور نہیں توکل ہے اور مولانا عثمانیؒ فرماتے ہیں جس کو اللہ سبحانہ کی زبردست قوت پر اعتماد ہو وہ حق کے معاملہ میں ایسا ہی بے جگرا اور دلیر ہوتا ہے۔ آیئے ان دونوں بزرگوں نے جو کچھ اجمال و اختصار سے فرمایا ہے اس کی تشریح سن لیجئے۔ بتایا جا رہا ہے کہ ان شاندار فتوحات کا راز اور اس حیرت انگیز انقلاب کی وجہ یہ اور صرف یہ تھی کہ حضور اقدس ﷺ کی تعلیم کی برکت سے عربوں میں ایک نئی روح اور نیا ولولہ پیدا ہو گیا تھا۔ اب وہ پہلے کی طرح بے خدا اور غیر منظم نہ تھے بلکہ وہ ایک زندہ نظام حیات کے حامل اور زبردست قوت کے مالک تھے۔ ان کو از سر نو زندگی ملی تھی۔ ان کی دفاعی تربیت بالکل نئے طریقہ پر ہوئی تھی۔ ان کی ذہنیتوں میں انقلاب آچکا تھا دنیا ان کے لیے اور وہ دنیا کے لیے بالکل بدل چکے تھے۔ انہیں احساس ہوا کہ اللہ نے ان کو اس لیے روانہ کیا ہے کہ وہ لوگوں کو تاریکی سے نکال کر روشنی میں لائیں اور انسانوں کی بندگی چھڑا کر خدا کی بندگی پر آمادہ کریں۔ انہیں دنیا کی تنگی سے نکال کر کشادگی کی طرف لائیں اور ادیان کو کجروی اور بے اعتدالی سے نکال کر اسلام کی صاف صراطِ مستقیم پر لگائیں۔ ان کو یقین غالب تھا کہ اللہ سبحانہ ان کی مدد کا ضامن ہے اس نے ان سے فتح و نصرت کا وعدہ کیا ہے۔ اور خدا کا وعدہ کبھی غلط نہیں ہو سکتا۔ انہیں اللہ سبحانہ اور اس کے وعدوں پر یقین تھا۔ قلت اور کثرت کا سوال ان کے لیے ہیچ ہو گیا۔ خطرات کا خوف ان کے دل سے جاتا رہا۔ ان کو اللہ سبحانہ کا یہ ارشاد یاد رہا۔

ان ینصرکم اللہ فلا غالب لکم وان یخذلکم فمن ذا الذی ینصرکم من بعدہ ۔
وعلی اللہ فلیتوکل المومنون ۔

مسلمانوں کا یہ عقیدہ کہ وہ اللہ سبحانہ کے قانون کے فروغ کی جدوجہد اور عام انسانوں کی ہدایت کے لیے مبعوث ہوئے ہیں۔ اور یہ کہ اللہ ان کا مددگار ہے اور ان کی کامیابی کا ذمہ دار ہے۔ ان کے دلوں کا اطمینان اور اللہ پر اعتماد اسی اعتقاد کا نتیجہ تھا۔ اس عقیدہ کی بدولت مسلمانوں میں عجیب و غریب بے خوفی پیدا ہو گئی تھی وہ اپنی جانوں کو خطرہ میں ڈال کر ایسے کام

کر گذرتے تھے جو انسانی طاقت سے باہر ہیں۔اس عقیدہ نے مسلمانوں میں بے پناہ قوت پیدا کر دی تھی۔کیسے ہی ناخوشگوار حالات پیش آتے ان کے عزم و ارادے میں کوئی ضعف نہ آتا ان کے سکون و اطمینان میں کوئی فرق نہ پڑتا۔تعداد اور ساز و سامان کو وہ ہیچ سمجھنے لگے تھے اور اسباب کی پرستش سے وہ بے نیاز ہو گئے تھے ان کے دل مضبوط تھے۔ہمتیں بلند تھیں عزائم پختہ تھے ان کی نظروں میں دین و اخلاق کی اتنی عظمت تھی کہ دنیا اور دنیا کی ساری زینتیں ان کی نگاہوں میں ہیچ ہو گئیں تھیں۔میدان جنگ میں ان کے سب سے بڑے مددگار ان کے اخلاقِ عالیہ اور ان کی ایمانی صفات تھیں۔ان کا سب سے بڑا اثاثہ اللہ پر اعتماد و توکل اور اللہ سبحانہ کی عزت و حکمت کا یقین تھا اسی کو یہاں قرآن نے و من یتوکل علی اللہ فان اللہ عزیز حکیم کہا یعنی کہنے والا ان کی فتوحات کو دین کا نشہ بتا رہا ہے۔نشہ کی حالت اچھی نہیں ہوتی یہ دین کا نشہ نہیں بلکہ پورے شعور اور کامل دانائی کے ساتھ اللہ سبحانہ پر بھرپور اعتماد و توکل ہے۔

یہ کہنے والے کون تھے کہ غر ھٰولاء دینھم ان کو دین نے مغرور بنا دیا ہے اس میں شارحین قرآن نے مختلف باتیں کہی ہیں۔قرآن تو صرف یہ بتا رہا ہے کہ کہنے والے منافقین اور دل کے مریض تھے۔ابن کثیر نے علی ابن ابی طلحہ رضی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ کی رائے نقل کی ہے کہ یہ کہنے والے مشرکین مکہ تھے۔قتادہ کہتے ہیں کہ ابوجہل اور اس کے ہمنوا تھے۔ابن جریج کہتے ہیں کہ مکہ میں کچھ منافقین تھے۔مجاہد کہتے ہیں کہ قریش کے سربرآوردہ حضرات تھے الحسن بصری کہتے ہیں کہ وہ لوگ تھے جو بدر میں شریک نہیں ہوئے یعنی مسلمان بہرحال اسی قسم کے خیالات ان منافقین کے بارے میں شارحین قرآن نے ظاہر کیے ہیں اوروں کا پتہ نہیں قرآن کا انداز بیان بتا رہا ہے کہ یہ مسلمانوں میں سے نہیں ہیں مشرکین کو قرآن نے منافق نہیں کافر ہی کہا ہے اس لیے بلاشبہ ان منافقین سے مراد مدینہ کے وہ یہود ہیں جنہوں نے اسلام کا بھیس بدل رکھا تھا۔انھوں نے مسلمانوں کا حوصلہ پست کرنے کے لیے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ان لوگوں کو ان کے دین نے دھوکہ دے رکھا ہے ہیں تو مٹھی بھر مگر مقابلہ کرنے گئے ہیں قریش کی مسلح فوج کا۔یہ باتیں جب ان لوگوں کی جانب سے ہوں جو مردم شماری میں مسلمان ہوں اور حالات بھی وہ ہوں جو بدر میں تھے تو اس کے اثرات بہت خطرناک ہو سکتے ہیں لیکن اللہ نے اہل ایمان کو ان کے زہر سے محفوظ رکھا۔

وَلَوْ تَرٰٓى اِذْ يَتَوَفَّى الَّذِيْنَ كَفَرُوا ۙ الْمَلٰٓئِكَةُ يَضْرِبُوْنَ
وُجُوْهَهُمْ وَاَدْبَارَهُمْ ۚ وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ ۝ ذٰلِكَ
بِمَا قَدَّمَتْ اَيْدِيْكُمْ وَاَنَّ اللّٰهَ لَيْسَ بِظَلَّامٍ لِّلْعَبِيْدِ ۝
كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ كَفَرُوْا بِاٰيٰتِ
اللّٰهِ فَاَخَذَهُمُ اللّٰهُ بِذُنُوْبِهِمْ ۗ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ شَدِيْدُ
الْعِقَابِ ۝ ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ لَمْ يَكُ مُغَيِّرًا نِّعْمَةً اَنْعَمَهَا
عَلٰى قَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ ۙ وَاَنَّ اللّٰهَ سَمِيْعٌ
عَلِيْمٌ ۝ كَدَاْبِ اٰلِ فِرْعَوْنَ ۙ وَالَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ ۗ
كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِ رَبِّهِمْ فَاَهْلَكْنٰهُمْ بِذُنُوْبِهِمْ وَاَغْرَقْنَآ
اٰلَ فِرْعَوْنَ ۚ وَكُلٌّ كَانُوْا ظٰلِمِيْنَ ۝

اور اگر تمہاری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آجاتا جب فرشتے ان کافروں کی روحیں قبض کر رہے تھے اور ان کے چہروں اور ان کی پیٹھوں پر یہ کہتے ہوئے مار رہے تھے کہ اب جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو ـــ تو یہ ایک خوفناک منظر ہوتا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ تمہارے ہاتھوں نے اعمال کے ذریعے اس کے اسباب آگے روانہ کیے تھے اور اس لیے ہوا کہ اللہ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ یہ صورتحال آلِ فرعون اور ان کے پیشروؤں کے دستور کے مطابق ہے جنھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تھا تو اللہ ان کے

گناہوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا تھا بلاشبہ اللہ طاقتور سخت پاداش والا ہے[۵۲] یہ اس لیے ہوا
کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو نعمت کسی قوم کو عطا کر دیتا ہے اسے اس وقت تک نہیں
بدلتا جب تک وہ انعام یافتہ لوگ خود اپنے اعمال کو نہ بدل ڈالیں اور اس لیے بھی کہ اللہ
سب کچھ سننے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے[۵۳] ان کے ساتھ بھی معاملہ ایسا ہی ہوا ہے
جیسا آل فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کے ساتھ ہوا تھا۔ انھوں نے اپنے مالک کی
آیات کی تکذیب کی تھی ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر ڈالا اور آل فرعون
کو ہم نے دریا برد کر دیا اور وہ ظلم پیشہ لوگ تھے[۵۴]

مُفردات کے معانی

یتوفی۔ توفی سے مضارع ہے توفی کے لغت میں اصل معنے پورا لینے اور اس پر پورا قبضہ کرلے کے ہیں
نیند کی حالت میں آدمی کا ہوش پورا اٹھالیا جاتا ہے اور موت کے وقت میں آدمی کی روح پورے طور پر قبض کر لی جاتی ہے۔
اس لیے مجازاً قرینے کی موجودگی میں نیند اور موت کو توفی کہہ دیتے ہیں۔ یہاں ملائکہ کا ذکر قرینہ ہے اس بات کا کہ توفی موت
کے معنے میں ہے علامہ گازرانی تفسیر بیضاوی کے حاشیہ میں لکھتے ہیں ـــــ توفی کا لفظ نیند کے لیے مجازاً استعمال ہوا
ہے کیونکہ وہ بھی ایک طرح کا پورا لینا ہے۔ جن لوگوں کا مذاق عربیت پختہ نہیں ہے وہ جب دیکھتے ہیں کہ عام لوگ توفی
کو موت کے معنے میں لیتے ہیں ـــــ تو وہ اسی کو توفی کے حقیقی معنے سمجھ لیتے ہیں جو سراسر غلط
ہے۔ بلاغت کے نکتہ شناس جانتے ہیں کہ بلغاء کے محاورات میں توفی کا استعمال اس کے حقیقی معنی میں ہوتا ہے۔ علامہ
ابوالبقاء کلیات میں رقمطراز ہیں کہ توفی کے دو معنے ہیں مجازی اور حقیقی موت دینا مجازی ہیں اور یہ عام لوگوں کا استعمال
ہے اور حقیقی معنے پورا لینا ہے اور یہ بلاغت کار لوگوں کا استعمال ہے۔ امام راغب رح لکھتے ہیں کہ کبھی موت اور نیند
کو بھی توفی سے تعبیر کر دیا جاتا ہے۔

حریق۔ آگ، جلانے والا، جلا ہوا حرق سے جس کے معنے جلانے کے ہیں بروزن فعیل، صفت مشبہ کا صیغہ
فاعل اور مفعول دونوں کے معنے دیتا ہے یہاں بمعنے فاعل آگ کے معنے میں ہے۔

ظلام ظلم کرنے والا ظلم سے مبالغہ کا صیغہ ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذاتِ گرامی سے نفی ظلم کے سلسلے میں یہاں بالتکرار کا صیغہ استعمال ہوا ہے۔ ظلام میں مبالغہ کیت کے اعتبار سے ہے کیفیت کے لحاظ سے ہرگز نہیں اللہ سبحانہ ذرا بھی ظلم نہیں کرتا یہ مطلب نہیں کہ زیادہ ظلم نہیں کرتا تھوڑا کرتا ہے۔ نیز یہ بھی خیال رہے کہ ظلام اسم نسبت بھی ہے۔ اور عطار کی طرح آتا ہے یعنی جس طرح کھجور کی نسبت سے تمار۔ اور عطر کی نسبت سے عطار بولتے ہیں ایسے ہی ظلم کی نسبت سے ظلام بولتے ہیں۔ معنی یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ کی طرف ظلم کی نسبت ہو ہی نہیں سکتی ہے۔

دَأب حال عادت، رسم دستور اس عادت مستمرہ کا نام کہ جو ہمیشہ ایک حالت پر رہے داب ہے یہ اصل میں داب یداب کا مصدر ہے جس کے معنے لگاتار کسی کام میں لگنے کے ہیں اور اسی سے اس کا استعمال عادت اور طریقہ کے معنے میں ہوتا ہے۔

ذنب گناہ ذنوب جمع اصل میں ذنب کے معنے کسی چیز کی دُم پکڑنے کے ہیں اور دم کے اعتبار سے ہی اس کا استعمال ہر اس فعل کے متعلق ہوتا ہے جس کا انجام برا ہو۔ اور اسی وجہ سے برے انجام کا نام ذنب ہے اور چونکہ گناہ کا انجام برا ہوتا ہے اس لیے اسے ذنب کہتے ہیں۔

آلِ فرعون یہ بات بار بار بتائی جا چکی ہے کہ آل کا لفظ صرف اولاد کے معنے میں نہیں ہوتا بلکہ اس کا اطلاق قوم اور اتباع سب پر ہوتا ہے۔ آلِ فرعون سے مراد قوم اور فرعون کے اتباع ہیں اسی روشنی میں ان آیات کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

قریش کی بدر میں ہلاکت کی تشبیہ

جس طرح دوسری قوموں کے لیے عذاب کے مختلف معجزات ظاہر ہوئے اسی طرح قریش کے لیے بدر معجزۂ عذاب ہلاکت تھا۔ اسی کو قرآن نے مکہ ہی میں البطشۃ الکبریٰ کہہ کر ڈرایا تھا۔ ہجرت سے پہلے حضور اقدس ﷺ کی دعا سے قریش پر قحط کا عذاب آیا جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں سا نظر آتا تھا۔ بعض رؤسائے قریش نے خدمتِ اقدس میں حاضر ہو کر کہا کہ محمد تم رحمت و شفقت اور صلہ رحم کی دعوت دیتے ہو، تم دیکھتے ہو کہ اس قحط سے قریش کا کیا حال ہے حضور اقدس ﷺ نے دعا فرمائی اور یہ بلا دور ہوئی۔ مگر پھر قریش کی سرگردانی کا وہی حال ہو گیا تو ان کے لیے معجزہ عذاب کے سوا کوئی طریقہ علاج باقی نہ رہا چنانچہ ہجرت کے بعد بدر کا البطشۃ کبریٰ (بڑی پکڑ) ان کے لیے ہلاکت کی نشانی قرار پائی۔ قرآن حکیم نے ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں اپنا یہ اعلانِ عام سنا دیا تھا۔ جس میں پہلے قحط کی۔ پھر ان کے گڑگڑانے کی اور اس کے بعد غزوۂ بدر کی پیشین گوئی تھی۔

فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین یغشی الناس ھذا عذاب الیم ربنا اکشف
عنا العذاب انا مومنون انی لھم الذکری وقد جاءھم رسول مبین ثم
تولوا عنہ وقالوا معلم مجنون انا کاشفوا العذاب قلیلا انکم عائدون یوم
نبطش البطشۃ الکبری انا منتقمون ولقد فتنا قبلھم قوم فرعون۔

اس روز کا انتظار کرو جب آسمان کھلے طور پر ایسا دھواں لے کر آئے جو لوگوں کو اپنے اندر ڈھانپ لے۔ یہی تو سب سے دردناک انگیز سزا ہے۔ اس وقت وہ کہیں گے۔ اے ہمارے آقا و مولیٰ تو ہم سے یہ عذاب ہٹا لے ہم سب کچھ مان لیں گے (مگر) ان کو سمجھ کہاں ہے حالانکہ ان کے پاس کھلے طور پر خدا کا فرستادہ آچکا ہے پھر بھی اس سے روگرداں ہیں اور کہہ رہے ہیں پڑھایا گیا پاگل ہے۔ بلاشبہ ہم عذاب کو تھوڑا سا ہٹائیں تم ضرور پھر وہی کچھ کر کے رہو گے۔ اس دن کا انتظار کرو جب ہماری پکڑ رونما ہو گی۔ بلاشبہ ہم بدلہ لینے والے ہیں۔ اور ان سے پہلے ہم فرعون کی قوم کو آزما چکے ہیں۔

ان آیاتِ کریمہ میں پورے واقعہ کی تصویر کھینچ دی گئی ہے اور آخر میں یہ بھی ظاہر کر دیا ہے کہ بطش الکبریٰ ان رؤسائے قریش کے لیے وہی حیثیت رکھتی ہے جو فرعون کے لیے غرقِ بحر کی حیثیت تھی۔ حضرت عبداللہ بن مسعود نے بیان کیا ہے کہ یہ آیتیں قریش کی شان میں نازل ہوئی ہیں قریش نے جب نافرمانی کی تو آنحضرت ﷺ نے اللہ سبحانہ سے دعاء کی کہ اے اللہ ان پر حضرت یوسف علیہ السلام کے سات برس والے قحط کی طرح قحط نازل فرما۔ چنانچہ مکہ میں سخت قحط پڑا یہاں تک کہ بھوک سے آسمان اور قریش کی آنکھوں کے درمیان دھواں سا اٹھتا نظر آتا تھا۔ انھوں نے حضور اقدس ﷺ سے آکر دعاء کی درخواست کی۔ چنانچہ آپ نے دعاء کی اور بارش ہوئی۔ اللہ سبحانہ نے فرمایا کہ وہ پھر اپنی حالت پہ آجائیں گے یعنی ایمان قبول نہ کریں گے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ تب اللہ تعالیٰ نے ان کے لیے بطشۃ الکبریٰ کا دن مقرر فرمایا یعنی بدر۔

مرنے کے وقت کا سماں

(۶۵) اور اگر تمہاری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آجاتا جب فرشتے ان کافروں کی روحیں قبض کر رہے تھے اور ان کے چہروں اور پیٹھوں پر یہ کہتے ہوئے مار رہے تھے کہ اب جلنے کے عذاب کا مزہ چکھو تو یہ ایک خوفناک منظر ہوتا۔ یعنی مار کر کہتے ہیں کہ ابھی تو یہ لو اور عذابِ جہنم کا مزہ آیندہ چکھنا۔ بہت سے مفسرین نے اس کو بھی بدر کے واقعہ میں داخل

کیا ہے یعنی اُس وقت جو کافر مارے جا رہے تھے ان کے ساتھ فرشتوں کا یہ معاملہ تھا مگر آیت کے الفاظ سب کافروں کو عام ہیں اس لیے راجح یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ واقعہ عالم برزخ کا ہو اب بدر کے واقعات سے تعلق یہ ہوگا کہ دنیا میں ان کافروں کی یہ گت بنی برزخ میں یہ ہو رہا ہے اور آخرت کے عذاب کا تو کہنا ہی کیا ہے [1]

حافظ ابن کثیر نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے کہ آیات کا سیاق اگرچہ کفار بدر کی روح نکالے جانے کے متعلق ہے مگر مرنے کے وقت ہر کافر کا یہی حال ہوتا ہے اسی لیے آیت میں کفار بدر کی تخصیص نہیں بلکہ سورۃ انعام میں سب کافروں کے بارے میں یہی بات بتائی ہے۔

ولو ترىٰ اذ الظالمون فى غمرات الموت والملائكة باسطوا ايديهم اخرجوا انفسكم۔

اور اگر تمہاری آنکھوں کے سامنے وہ منظر آ جائے جب سب ظلم کار لوگ جانکنی کی بے ہوشیوں میں ہوں گے اور فرشتے ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے اور کہہ رہے ہوں گے کہ اپنی جانیں باہر نکالو پکڑیں تو آپ حیران ہو جائیں گے۔

یعنی موت کی باطنی اور روحانی سختیوں میں ہوں گے اور فرشتے روح قبض کرنے اور سزا دینے کو ہاتھ بڑھا رہے ہوں گے

سورہ محمد ﷺ میں موت کے وقت کا حال بیان ہوا ہے کہ جب فرشتے ان کی روحوں کو قبض کرتے ہیں تو ان کے چہروں اور پیٹھوں پر ضرب لگاتے ہیں۔ فرمایا

فكيف اذا توفتهم الملائكة يضربون وجوههم وادبارهم۔

پھر کیا حال ہوگا جب فرشتے ان کو پورا پورا لیں گے ان کے چہروں اور پیٹھوں پر مارتے ہوئے۔

یہ قیامت سے پہلے اور دنیا کے عذاب ہلاکت سے پہلے کے واقعات ہیں اور اسی وقفہ کا نام برزخ ہے۔ ان آیات میں برزخ ہی کے عذاب کا چہرہ پیش ہو رہا ہے۔

زیر تشریح آیت سے جہاں یہ معلوم ہو رہا ہے کہ کافروں پر موت کے بعد ہی عذاب شروع ہو جاتا ہے وہاں یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ یہ عذاب ان پر ان کے چہروں پر اور پیٹھوں پر مار کی صورت میں ہوتا ہے مگر یہ منہ اور پیٹھ وہ نہیں جو بے جان لاشہ کی صورت میں ہمارے سامنے موجود ہے بلکہ اس آیت میں نہایت بلیغ انداز میں کافر کی روح کو جانور سے تشبیہ دی گئی ہے کہ جس طرح جانور کو تیز ہنکانے وقت کبھی آگے منہ پر اور کبھی پیچھے پیٹھ پر مارتے ہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

اسی طرح گویا کافر کی روح کو زبردستی فرشتے مارتے ہوئے اور ہنکاتے ہوئے لے چلیں گے اور کہیں گے کہ چلو عذاب کا مزہ چکھو۔

صرف اسی آیت میں نہیں بلکہ قرآن عزیز کی متعدد آیات میں برزخ کے مناظر پیش کیے گئے ہیں۔ احادیث صحیحہ میں بھی عالم برزخ کی تفصیلات آئی ہیں۔ لیکن احادیث میں برزخ کے حالات عموماً قبر کی اصطلاح میں بیان کیے گئے ہیں مگر لفظ قبر سے درحقیقت مقصود وہ خاک کا تودہ نہیں ہے جس کے نیچے کسی مردے کی ہڈیاں پڑی رہتی ہیں بلکہ وہ عالم ہے جس میں یہ مناظر پیش آتے ہیں اور وہ ارواح ونفوس کی دنیا ہے مادی عناصر کی نہیں۔ اسی لئے اللہ سبحانہ نے قرآن پاک میں اس عالم کے تعلق سے ہمیشہ نفوس اور نفس کو خطاب کیا ہے ان ہی کے عذاب وثواب اور رحمت ولعنت کا ذکر ہے۔ اس عالم میں جو جسم نظر آتا ہے وہ مرنے والے کے اعمال کا مثالی پیکر ہوتا ہے جو ہوبہو اس کے خاکی جسم کا مثنی ہوتا ہے۔ تم نیند میں ہو اور تمہارا نیم مردہ بے حس جسم بستر پر دراز ہے مگر تم خواب میں دیکھ رہے ہو کہ بعینہ تمہارا جسم آگ میں جل رہا ہے یا باغ وبہار کی لذتوں میں مصروف ہے تم کو اس سے وہ ہی تکلیف اور راحت مل رہی ہے جو بیداری میں اپنے بستر پر پڑے ہوئے جسم کی تکلیف وراحت سے مل سکتی ہے اس خواب میں جس طرح تمہارے مادی جسم کے علاوہ تم کو اپنا ایک خیالی جسم نظر آتا ہے جو ہوبہو تمہارا مادی جسم ہے اسی طرح موت کے خواب میں تم کو اپنا ایک مثالی جسم نظر آئے گا جو اکثر حالتوں میں ہوبہو تمہارے اس خاکی جسم کے مطابق ہوگا۔ اور تمہاری روح اسی جسم مثالی کے عذاب وراحت سے متاثر ہوگی کہ اعمال کی اصل ذمہ دار روح ہے۔ جسم خاکی نہیں۔ فرمایا کل نفس بما کسبت رھینۃ۔ یعنی ہر جان اپنے اعمال کے ہاتھوں گرد ہے اس لیے اصل مکلف روح ہے جسم نہیں ہے۔ جسم بمنزلہ آلہ کے ہے۔ دنیا میں اس کا ایک جسم خاکی تھا۔ برزخ میں اس کا ایک اور جسم ہوگا جو مادہ اور مادیات سے پاک ہوگا۔ تاہم اس کو اپنے جسم خاکی سے ایک قسم کی نسبت حاصل ہوگی اور اتنی ہی نسبت کی بنا پر قبر کی اصطلاح عام بول چال میں جاری ہے کیونکہ ہم اپنی آنکھوں سے مردوں کو اسی قبر میں جاتے دیکھتے ہیں۔

اس آیت میں یضربون وجوھھم وادبارھم سے امام رازی نے یہ لطیف بات نکالی ہے کہ کافر کی روح جب دنیا سے روانہ ہوتی ہے تو دنیا کے چھوٹنے کا تو اسے صدمہ ہوتا ہی ہے ادھر آخرت پر جب نظر کرتا ہے۔ تو ادھر بھی تاریکی ہی تاریکی نظر آتی ہے اگاڑی اور پچھاڑی دونوں ہی میں تباہی دیکھتا ہے۔

جزاوسزا کا قانون

(۶۶) یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ تمہارے ہاتھوں نے اعمال کے ذریعے اس کے اسباب آگے روانہ کیے تھے اور اس

لیے ہو کہ اللہ سبحانہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا ہے۔ یعنی یہ سب تمہارے کرتوت کی سزا ہے ورنہ خدا کے یہاں ظلم کی کوئی صورت نہیں اگر معاذ اللہ ادھر سے رتی برابر بھی ظلم کا امکان ہوتا تو پھر وہ اپنی عظمت شان کے مطابق ظالم نہیں ظلام ہی ہوتا کیونکہ کامل کی ہر صفت کامل ہی ہونی چاہیئے کچھ کہتے ہیں کہ ظلام میں مبالغہ کمیت کے اعتبار سے ہے نہ کہ کیفیت کے لحاظ سے یعنی ذرا سا بھی ظلم نہیں کرتا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ زیادہ ظلم نہیں کرتا اور تھوڑا کرتا ہے۔ لیکن شیخ الاسلام جو بات فرما رہے ہیں اس میں گہری معنویت ہے اور مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی ذات مجمع کمالات ہے اگر ظلم کا ادنیٰ کسی درجہ میں امکان ہوتا تو اللہ سبحانہ کی دوسری صفات کی طرح اس میں بھی کمال ہوتا وہ ظالم نہیں بلکہ ظلام ہوتا جیسے دوسری صفات میں اسے کمال ہے اس میں بھی کمال ہوتا۔ اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ ظلام عطار کی طرح اسم نسبت ہے معنی یہ ہیں کہ اس کی طرف سرے سے ظلم کی نسبت ہی نہیں ہو سکتی ہے۔

دراصل اس آیت میں اللہ سبحانہ نے جزا و سزا کا قانون اور اس کے اصول کی نشاندہی فرمائی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جس طرح موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون پر بنایا ہے جسے دانشور لوگ قانون قدرت اور زبانِ نبوت میں تقدیر کہتے ہیں۔ اسی طرح اس نے اپنے ہر عالم کے لیے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار انجام پاتا ہے۔ ہم غلطی سے یہ سمجھتے ہیں کہ یہ اصول صرف مادیات تک محدود ہیں۔ حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات، عملیات ہوں یا علمیات۔ ہر ایک میں یہ یکساں جاری و ساری ہیں۔ جس طرح یہ قانون فطرت ہے کہ زہر کھانے سے جسمانی ہلاکت ہوتی ہے اسی طرح یہ بھی قانون ہے کہ گناہ سے روح انسانی مر جاتی ہے۔ اور جس طرح اصول حفظان سے لاپروائی کا نتیجہ بیماری ہے اسی طرح اصولِ تزکیہ قلب کی عدم متابعت سے بھی وہ مریض ہو جاتا ہے اور پھر جس طرح اصولِ حفظانِ صحت کی پابندی سے وہ اپنی جسمانی بیماری کے آلام سے نجات پاتا ہے ایسا ہی روحانی تدابیر اور علاج کے ذریعے ہی وہ شفایاب ہوتا ہے۔

اعمال کے خواص و آثار

جس طرح دنیا میں ہر چیز کی خاصیت ہے اور وہ جب جہاں وجود پذیر ہوتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات و اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے۔ اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت کے بھی اصول ہیں ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء کا کام ہے۔ علم النفس اور علم الاجتماع کی تحقیقاتی پہنائیوں نے اس بات کے سمجھنے میں اب بہت کچھ سہولت پیدا کر دی ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ عالم دنیا میں اولاً عالمِ برزخ میں ثانیاً اور بالآخر عالمِ آخرت میں جو کچھ اور جتنا کچھ ہوگا وہ

ل؎ افادات شیخ الاسلام

تمہارے کردار کا نتیجہ ہے۔ جس طرح دنیا میں ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہے۔ ٹھیک اسی طرح انسانوں کو اپنے اعمال کا ایک لازمی نتیجہ عالم برزخ اور عالم آخرت میں ملنے والا ہے۔ جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم زہر کھا کر کیوں مر گئے۔ اسی طرح یہ سوال بھی ہم نہیں کر سکتے کہ ہم کو اعمال کے ان نتائج سے عالم برزخ اور عالم آخرت میں کیوں دوچار ہونا پڑ رہا ہے۔ یہ اللہ کی رحمت ہے کہ اس نے اشیاء کی طرح اعمال کے نتیجوں سے قبل از وقت مطلع فرما دیا ہے۔ ہم اس کے نیک و بد کی تمیز کا احساس بخشا عقل عنایت کی، ضمیر عطا کیا پھر نبوت کی راہنمائی ارزانی فرمائی۔ اس پر انسان اگر باز نہ آئے اور ان اعمال کا ارتکاب کرے تو انسان کو ان اعمال کے نتائج سے کون بچا سکتا ہے؟۔ اللہ سبحانہ کے یہاں اشیاء کی طرح نتائج اعمال کا یہی قانون ہے۔

گویا اس آیت میں دو اہم اور بنیادی باتیں کھول کر بتا دی گئی ہیں ایک اصلی دوسری ضمنی۔ اصلاً تو یہ بات واضح کی گئی ہے کہ جزا و سزا انسان کے اعمال کا نتیجہ ہے۔ قرآن نے اس ضابطہ کو متعدد بار متعدد عنوانوں سے پیش کیا ہے۔ ضمناً یہ بھی بتا دیا گیا ہے کہ اللہ کے یہاں عدل ہی عدل ہے؟ ظلم کا وہاں کسی درجہ میں امکان نہیں ہے۔ مجرمین کو سزا دینا اس کے عدل کا تقاضا ہے اللہ سبحانہ اپنے بندوں پر ظلم نہیں کرتا ہے یہ سزا تمہارے اعمال ہی کی صورت ہے۔ لیس بظلام للعبید۔ میں مبالغہ کی نفی نہیں بلکہ نفی میں مبالغہ ہے۔ لوگوں نے قابل سزا اعمال کر کے خود اپنے اوپر ظلم کیا ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی تمام نقائص سے منزہ ہے۔ اسی قسم کی آیت آل عمران کے آخر میں بھی گذر چکی ہے وہاں بھی ہم نے اس پر بحث کی ہے۔

تاریخ کی شہادت

(٦٧) یہ صورتحال آل فرعون اور ان کے پیشروؤں کے دستور کے مطابق ہے جنھوں نے اللہ کی آیات کا انکار کیا تھا تو اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا تھا بلاشبہ اللہ طاقتور سخت پاداش والا ہے۔ یعنی قدیم سے یہی دستور رہا ہے کہ جب لوگ آیات اللہ کی تکذیب و انکار یا انبیاء سے جنگ پر مصر ہوئے تو اللہ نے ان کو کسی نہ کسی عذاب میں پکڑ لیا ہے[1]

یہاں بھی بدر کے ذکر میں فرعونیوں کا کداب آل فرعون کے عنوان سے ذکر کیا ہے اور آل عمران میں بھی بدر ہی کے ذکر میں فرعونیوں کا ذکر ہوا ہے۔ یہاں بھی تشبیہ ہے اور وہاں بھی تشبیہ ہے۔ بتانا صرف یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی اقوام دنیا میں عادت مستمرہ یہی ہے۔ داب کے معنے عربی میں عادت مستمرہ ہی کے آتے ہیں علامہ آلوسی نے یہ بات خوب

[1] افادات شیخ الاسلام

لکھی ہے۔

ان کے اعمال اوران اعمال کے نتائج کی نمائش کا حال بالکل وہی ہے جو آل فرعون کے اعمال اور اعمال کے نتائج کا حال تھا۔

آل عمران میں بدر کے حالات کا اجمال ہے لیکن یہاں انفال میں بدر کے حالات کی تفصیل ہے۔ ان دونوں جگہوں میں ہم آہنگی ہے۔ یہ بات الم نشرح ہو کر سامنے آگئی ہے کہ بدر کی حیثیت مشرکین عرب کے لیے ٹھیک ویسی ہی ہے جو فرعونیوں کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں تھی۔ یعنی سنت الٰہی یوں ہے کہ جو جیسا کرتا ہے ویسا ہی بھگتتا ہے اس سے پہلے دوسری قوموں نے مثلاً فرعون وغیرہ نے اللہ کے احکام سے سرتابی کی اور آیات اللہ کی تکذیب کی اللہ نے ان کے قصور کی پاداش میں ان کی گرفت کی۔ ان مشرکین مکہ کی حالت بھی ویسی ہی ہے۔ لہٰذا اللہ سبحانہ نے ان کی گرفت بھی فرمائی۔

مطلب یہ ہے کہ نبوت کے مقابلے میں کفر و تکذیب کا رویہ جو ان مشرکین مکہ نے اختیار کیا ہے یہ کوئی نیا نہیں بلکہ اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ ان کے کفر و تکذیب کا رشتہ تاریخ میں فرعونیوں سے ملتا ہے۔ ان کا طرز عمل بالکل وہی ہے جو فرعونیوں اور فرعون سے پہلی قوموں کا تھا۔ انھوں نے جان بوجھ کر دنیا کی محبت کی خاطر نبوت کو جھٹلایا۔ اور اللہ کی آیات کا انکار کیا۔ ان کو بھی نشہ تھا کہ نحن اکثر اموالا و اولادا لیکن ان کا مال و اولاد ان کے کچھ بھی کام نہ آیا۔ اسی طرح ان کے حق میں یہ مادی سہارے کچھ کام نہ آئیں گے۔ تاریخ کی یہ ہم آہنگی اس بات کی شہادت ہے کہ حضور اقدس ﷺ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام دونوں کے مخاطبوں کا کفر کفر تکذیب تھا۔ جب جرائم دونوں کے مشترک ہیں۔ بلاشبہ سزا میں بھی ہم آہنگی ہے۔ گویا اشارا کر دیا کہ قوموں کی موت و حیات کے لیے اللہ سبحانہ کے یہاں مقررہ قوانین ہیں۔ اوران کے نتائج اٹل ہیں۔ جب ایک جماعت کا کفر اور اس کی تکذیب اس حد تک پہنچ جاتی ہے جو جماعتوں کی ہلاکت کے لیے مقرر ہے تو پھر نتائج کا ظہور بھی یکساں ہوتا ہے اور یہ بھی بتا دیا کہ انسان زور و اقتدار میں کتنا ہی بڑھ جائے گروہ حق کا راستہ کبھی نہیں روک سکتا اسے مغلوب ہی ہونا پڑے گا۔ فاخذھم اللہ بذنوبھم میں واضح کر دیا کہ دنیا میں ہر قوم خود ہی اپنی زندگی کا گہوارہ بناتی ہے اور پھر خود ہی اپنے ہاتھوں سے اپنی قبر بھی کھودتی ہے یعنی بالآخر اللہ نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں پکڑ لیا۔ اور جب پکڑ لیا تو پھر ان کی کوئی چیز بھی ان کو اللہ کی گرفت سے نہ بچا سکی اس فقرے میں پہلے فا لے کر آئے جو نتیجہ کے معنے دیتی ہے پھر بذنوبھم میں با سببیہ لا کر اشارا کر دیا کہ جو کچھ ہوا اس کا سبب ان کے گناہ تھے اور یہ نتیجہ تھا ان اعمال کفر کا جو وہ کرتے رہے ہیں آخر میں فرمایا ان اللہ قوی شدید العقاب یعنی جو گرفت آئی وہ کسی کے ٹالے نہیں ٹل سکتی اور جس طرح وہ پکڑے گئے

نے تمہاری بھی پکڑ ہوئی۔

قرآن کا تاریخی استدلال

اس آیت میں قرآن نے اجمالی طور پر گذشتہ قوموں کے واقعات سے استشہاد کیا ہے اور بتایا ہے کہ جس طرح یہاں ہر بات کے لیے مقررہ قوانین ہیں اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی سعادت و شقاوت اور زندگی و موت کا بھی ایک قانون ہے۔ اور جس طرح اللہ سبحانہ کے تمام قوانین یکساں ہیں، عالمگیر ہیں، غیر مبدل ہیں اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی طرح رہا ہے۔ اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوتے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی۔ جس طرح سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہے خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں کھایا جائے اسی طرح اس قانون کے احکام و نتائج بھی یکساں ہی ہوں گے خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں پیش آئیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اب سے ہزار سال پہلے تو سنکھیا کا خاصہ ہلاکت رہا ہو اور اب زندگی ہو جائے۔ بس جو کچھ ماضی میں پیش آ چکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی کیونکہ اللہ کے قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں۔ قرآن نے جا بجا اس قانون کو سنۃ اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

قرآن نے روسائے قریش کی طرف اشارا کر کے پوچھا۔

فھل ینظرون الا سنۃ الاولین

چنانچہ گذشتہ قوموں کے قانون پورا ہونے کے دن آ گئے۔ کفار قریش کو جو اس قانون کے تماشائی بننے کے مشتاق تھے بدر کے آنے سے پہلے ہی یہ جتا دیا گیا تھا۔

سنۃ من قد ارسلنا قبلک من رسلنا ولا تجد لسنتنا تحویلا

تم سے پہلے رسول جو گذر چکے ہیں ان کی سنۃ یہی ہے اور ہماری سنۃ کو تم ٹلتا ہوا نہ پاؤ گے۔

سنتِ الٰہی کے مطابق آپ کو ہجرت کی یہ دعا بتائی گئی۔

رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا

اے میرے کارساز مجھے خوبی سے کہیں پہنچا اور خوبی سے نکال اور اپنے پاس سے ایک مدد کرنے والی طاقت عطا فرما۔

انبیاء کی سنت کے مطابق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے متبعین کے ساتھ ہجرت کی اور جس دن کا انتظار تھا وہ آ گیا۔ ہجرت کے دوسرے سال رمضان میں بدر کا واقعہ پیش آیا۔ اسی کو قرآن نے بطش اکبر کہا تھا۔ جب آپ غزوہ بدر

کے لیے مسلمانوں کو لے کر نکلے تو اس وقت جیسا کہ آپ پڑھ چکے ہیں، مسلمانوں کے سامنے قریش کی دو جمعیتیں تھیں، ایک قریش کا شامی قافلہ جو بدر کی راہ سے گذر کر مکہ جا رہا تھا۔ دوسرا قریش کا جنگی لشکر جو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے مکہ سے آ رہا تھا۔ اللہ سبحانہ نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان دو جمعیتوں میں سے ایک ان کے ہاتھ لگے گی عام مسلمان یہی سمجھے تھے کہ تجارتی قافلہ ان کے ہاتھ آئے گا لیکن حضور اقدس ﷺ کو وحی الٰہی کی روشنی میں اچھی طرح معلوم تھا کہ آج معمولی فتح و شکست کا دن نہیں بلکہ اس بطشۃ الکبریٰ کا دن ہے جس کا بارگاہ الٰہی میں مدت سے وعدہ تھا۔

اس سورت میں جس میں بدر کے تمام واقعات کا ذکر ہے اس میں اللہ سبحانہ نے ظاہر کر دیا کہ یہی وہ فیصلہ کا دن تھا جس کا انتظار تھا۔

ما انزلنا علی عبدنا یوم الفرقان۔

اور یہ کچھ اس لیے ہوا کہ ایسا ہو کر رہنا تھا۔

وکان امر اللہ مفعولا۔

آخر میں فرمایا کہ:

کداب آل فرعون والذین من قبلھم کفروا بایات اللہ

یہ اس بات کی طرف اشارا ہے کہ بدر قریش کے لیے ویسا ہی حضور اقدس ﷺ کا معجزۂ ہلاکت ہے جیسے فرعونیوں کے لیے غرقِ بحر حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزۂ ہلاکت تھا۔

قوموں کی سعادت و شقاوت کا قانون

(۶۸) یہ اس لیے ہوا کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو نعمت کسی قوم کو عطا کر دیتا ہے اسے اس وقت تک نہیں بدلتا جب تک وہ انعام یافتہ لوگ خود اپنے اعمال کو نہ بدل ڈالیں اور اس لئے بھی کہ اللہ سبحانہ سب کچھ سننے والا جاننے والا ہے۔ یعنی جب لوگ اپنی بے اعتدالی اور غلط کاری سے نیکی کی فطری قوتوں اور استعداد کو بدل ڈالتے ہیں۔ اور خدا کی بخشی ہوئی داخلی یا خارجی نعمتوں کو اس کے بتلائے ہوئے کام میں ٹھیک موقعہ پر خرچ نہیں کرتے بلکہ الٹے اس کی مخالفت میں صرف کرنے لگتے ہیں تو حق تعالیٰ اپنی نعمتیں ان سے چھین لیتا ہے اور شانِ انعام کو انتقام سے بدل دیتا ہے وہ بندوں کی ساری باتوں کو سنتا اور تمام احوال کو جانتا ہے۔ کوئی چیز اس سے پردے میں نہیں۔ لہٰذا جس سے جو معاملہ کرے گا نہایت ٹھیک اور برمحل ہو گا۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ نیت اور اعتقاد جب تک نہ بدلے تو اللہ کی بخشی ہوئی نعمت چھینی نہیں جاتی، گویا بانفسھم سے خاص نیت اور اعتقاد مراد لیا ہے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے واضح طور پر بتا دیا ہے کہ قوموں اور جماعتوں کے عروج و زوال اور ان کی موت و حیات کا قانون کیا ہے فرمایا کہ یہ اللہ سبحانہ کا مقررہ قانون ہے کہ جب وہ کسی گروہ کو اپنی نعمتوں سے سرفراز کرتا ہے تو اس میں بھی تغیر نہیں کرتا جب تک کہ خود اس گروہ کے افراد خود اپنی حالت متغیر نہیں کر دیتے۔ یعنی عادت الٰہی یوں ہی ہے اور قانون عدل اسی طرح نافذ ہے کہ جو قوم اپنی حالت خود بدلتی ہے۔ خدا داد نعمت کا شکر ادا کرنے کی جگہ کفر کرتی ہے۔ راہ ہدایت کو چھوڑ کر کجروی اختیار کرتی ہے۔ انصاف و عدل کی جگہ حق تلفی کرنے لگتی ہے تو اللہ سبحانہ بھی اپنی دی ہوئی نعمت اس سے چھین لیتا ہے عزت کی جگہ ذلت حکومت کی جگہ محکومی، حریت و آزادی کی جگہ غلامی، دولت کی جگہ افلاس اور راحت کی جگہ مصائب نازل کرتا ہے اور انجام کاریوں ہی برباد کر دیتا ہے ورنہ خدا خود کسی سے اپنی دی ہوئی نعمتیں نہیں چھینتا ہے۔ اور خواہ مخواہ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا ہے۔

دراصل اس آیت میں حکمت بیان کی جا رہی ہے اس بات کی کہ اللہ سبحانہ قوموں کی گرفت کیوں فرماتا ہے۔ فرمایا کہ جب اللہ سبحانہ کسی قوم پر انعام کی فراوانی فرماتا ہے تو یوں ہی نہیں فرماتا بلکہ اس کی نوازشیں کچھ صفات و کردار پر مبنی ہوتی ہیں۔ اسی طرح جب وہ کسی قوم کو انعام سے محروم کرتا ہے تو یوں ہی محروم نہیں کر دیتا بلکہ وہ یہ دیکھ کر کرتا ہے کہ قوم نے اپنے آپ کو ان صفات و اخلاق سے محروم کر لیا جن کی بنیاد پر اس کو انعام کا مستحق ٹھہرایا گیا تھا۔ یہ چیز مقتضی ہوئی کہ جب انعام یافتہ خرابیوں میں مبتلا ہو تو ان پر اللہ کی جانب سے گرفت آئے اور اس طرح اللہ اپنی حجت تمام کر دے۔ اس گرفت کے بعد اگر قوم بیدار ہو جاتی ہے تو اس کا استحقاق باقی رہتا ہے اگر بیدار نہیں ہوتی تو وہ انعام الٰہی سے محروم ہو جاتی ہے۔ یہ گویا قریش کو تنبیہ ہے کہ اب بھی موقع ہے فائدہ اٹھالو۔ اللہ سبحانہ نے تم پر جو انعام فرمایا تھا وہ تم سے چھیننا نہیں چاہتا ہے بلکہ تمہارے اعمال و اخلاق کے بگاڑ نے اس کے اسباب پیدا کیے ہیں۔ تم اپنے آپ کو بدل کر اور اصلاح کر کے پھر اپنے استحقاق کو بحال کر سکتے ہو۔

اہم قانون اجتماع

یہ آیت قرآنی بتا رہی ہے کہ جس طرح ہر بات کے لیے اللہ سبحانہ کے مقررہ قوانین ہیں اسی طرح قوموں اور جماعتوں کے لیے بھی ایک مقررہ قانون ہے۔ قوموں کی سعادت و شقاوت اور ان کی موت و حیات کا بھی ایک ضابطہ ہے۔ اور جس طرح اللہ سبحانہ کے تمام قوانین یکساں ہیں عالمگیر ہیں۔ اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی طرح رہا ہے اور ہمیشہ ایک طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی قوموں کے لیے سعادت، سیادت، عزت، رفعت اور برتری کی اساس، صفات و اخلاق ہیں۔ اگر وہ اچھے

افکار اچھے اعمال اور اچھے اخلاق سے مالا مال ہوتی ہے تو ان پر انعامات الٰہی کی ارزانی ہوتی ہے۔ اور اگر اچھے افکار اچھے اعمال اور اچھے اخلاق میں دوام ہوتا ہے تو انعامات میں بھی دوام ہوتا ہے۔ اشخاص کی تبدیلی سے انعامات میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے بلکہ افکار، اعمال اور اخلاق کی تبدیلی سے انعامات میں تبدیلی ہوتی ہے۔ جب تک اعمال و اخلاق اور افکار صالحہ موجود ہیں، عزت و سعادت اور سیادت و رفعت بھی موجود رہتی ہے۔ قوموں کی سعادت و سیادت اور عزت و رفعت کا مادی طاقت کی فراوانی اور عددی طاقت کی بہتات سے دور کا بھی واسطہ نہیں جیسا کہ مشرک قوموں کا تصور ہے نحن اکثر اموالا و اولادا۔ اور نہ ہی رفعت و عزت اور سعادت کا نسب اور نسبت سے کوئی رابطہ ہے جیسا کہ عام یہودی تصور ہے نحن ابناء الله واحباءه۔

قرآن نے ما بانفسھم کی بلیغ تعبیر کے ذریعے اپنے مخاطبوں کے کوزہ ذہن میں یہ بات اتار دی ہے کہ اعمال، اخلاق اور افکار صالحہ سے تہی دامن ہو کر عددی طاقت، مالی طاقت کو کامیابی کا ذریعہ سمجھنا اپنے آپ کو دھوکہ میں رکھنا ہے۔ جس طرح سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہے خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں کھایا جائے اسی طرح اس قانون کے احکام و نتائج بھی یکساں ہی ہوں گے خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں پیش آئیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ فرعونیوں کے لیے تو سنکھیا کا نتیجہ ہلاکت ہو اور قریش کے لیے زندگی ہو جائے۔ جو کچھ ماضی میں پیش آ چکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ کیونکہ اللہ کے قوانین میں تبدیلی نہیں ہے۔

قریش اور فرعونیوں میں ہم آہنگی

(۶۹) ان کے ساتھ بھی معاملہ ایسا ہی ہوا ہے جیسا آل فرعون اور ان سے پہلے لوگوں کے ساتھ ہوا ہے۔ انھوں نے اپنے مالک کی آیات کی تکذیب کی تھی۔ ہم نے ان کو ان کے گناہوں کی پاداش میں ہلاک کر ڈالا۔ اور آل فرعون کو ہم نے دریا برد کر دیا اور وہ ظلم پیشہ لوگ تھے فرعونیوں اور ان سے پہلی قوموں کو ان کے جرائم کی پاداش میں ہلاک کیا۔ اور خصوصیت کے ساتھ فرعونیوں کا بیڑا غرق کر دیا۔ یہ سب اس وقت ہوا جب انھوں نے اللہ سبحانہ سے بغاوت کر کے خود اپنی جانوں پر ظلم کیا۔ ورنہ اللہ سبحانہ کو کسی مخلوق سے ذاتی عداوت نہیں ہے۔[1]

اسی انداز کی تعبیر پہلے بھی آ چکی ہے۔ لیکن دونوں میں جوہری فرق ہے۔

۱- پہلی آیت میں کفروا بایات الله ہے جب کہ دوسری میں کذبوا بایات ربھم ہے
۲- پہلی آیت میں اخذھم الله بذنوبھم ہے جبکہ دوسری آیت میں فاھلکناھم بذنوبھم

[1] افادات شیخ الاسلام

واغرقنا آل فرعون وکل کانوا ہے۔

تعبیر کا تنوع اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے۔ پہلی آیت میں بتایا گیا تھا کہ فرعونیوں نے ذاتی طور پر جو طرز عمل اختیار کیا تھا وہ اللہ کی آیات کا کفر تھا۔ یعنی دستاویز جرم میں جس چیز کی نمائش کی گئی وہ کفر تھا۔ اسی کفر کے نتیجہ میں ان میں فکری، اخلاقی اور عملی برائیاں رونما ہوتیں۔ ان برائیوں کے لیے قرآن نے ذنوب کی تعبیر اختیار کی ہے ان برائیوں کے نتیجے میں ان سے نعمتیں چھین لی گئیں اور آیندہ تباہی کے لیے یہ کہہ کر تنبیہہ کر دی۔ ان اللہ قوی شدید العقاب۔

دوسری آیت میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ ہم نے ان کو نعمتیں عطا فرمائی تھیں۔ ہم نے ان کی اصلاح کے لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو پیغمبر بنا کر روانہ کیا۔ انھوں نے بجائے قدر کرنے کے اس نعمت کی ناقدری کی اور اپنے مربی کی آیات کی تکذیب کی۔ اور اس طرح اللہ سبحانہ کی دی ہوئی نعمتوں کا رُخ اللہ سبحانہ کی تکذیب کی طرف پھیر دیا۔ اب ان کے دامن میں صرف گناہوں کے دھبے نہ تھے بلکہ بغاوت وسرکشی کا طوفان تھا۔ اب ہم نے ان سے صرف اپنی نعمتیں ہی نہیں چھینیں بلکہ ان کو ان کی بغاوتوں کی پاداش میں ہلاک کر دیا اور فرعونیوں کو دریا برد کر دیا۔ یہ سب کے سب ظالم تھے۔

اس روشنی میں دونوں آیتوں میں کوئی تکرار نہیں ہے۔ پہلی آیت میں یہ واضح کیا کہ قریش مکہ کا حال کفر میں فرعونیوں کی طرح ہے۔ فرعون کی بھی پکڑ ہوئی اور قریش مکہ کی بھی پکڑ ہوئی۔ فرعونیوں کی پکڑ بھی معاشی بدحالی کی صورت میں پہلے ہوئی۔ فارسلنا علیہم الطوفان والجراد اور قریش مکہ کی پکڑ بھی قحط سالی کی صورت میں مکہ میں ہوئی۔ اور دوسری آیت میں بتایا گیا ہے کہ قریش کا حال بھی خدا کی دی ہوئی نعمتوں کے غلط استعمال اور حضور اقدس کا طاقت کے نشہ میں مقابلہ کرنے کی وجہ سے بدر میں ویسا ہی ہوا جیسا کہ فرعونیوں کا حال موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ میں دریا برد کر کے ہوا۔ دونوں میں دونوں جگہ پوری پوری ہم آہنگی ہے۔

قرآن کے اس طرز استدلال نے ایک زیادہ عام حقیقت کی طرف بھی ارشاد کر دیا ہے اور وہ یہ ہے کہ تاریخ کا صحیح استعمال کیا ہونا چاہیے اس سے معلوم ہوا کہ تاریخ و وقائع کا مطالعہ اس لیے کرنا چاہیے کہ آئندہ کے لیے عبرت حاصل ہو۔ یعنی جو کچھ گذر چکا ہے وہ آئندہ کے لیے ذخیرۂ بصیرت ہو اور ماضی کے آئینے میں مستقبل کا چہرہ دیکھا جا سکے۔

إِنَّ شَرَّ الدَّوَآبِّ عِندَ اللَّهِ الَّذِينَ كَفَرُوا فَهُمْ لَا
يُؤْمِنُونَ ﴿٥٥﴾ الَّذِينَ عَاهَدتَّ مِنْهُمْ ثُمَّ يَنقُضُونَ
عَهْدَهُمْ فِي كُلِّ مَرَّةٍ وَهُمْ لَا يَتَّقُونَ ﴿٥٦﴾
فَإِمَّا تَثْقَفَنَّهُمْ فِي الْحَرْبِ فَشَرِّدْ بِهِم مَّنْ خَلْفَهُمْ
لَعَلَّهُمْ يَذَّكَّرُونَ ﴿٥٧﴾ وَإِمَّا تَخَافَنَّ مِن قَوْمٍ خِيَانَةً فَانبِذْ
إِلَيْهِمْ عَلَىٰ سَوَاءٍ ۚ إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْخَائِنِينَ ﴿٥٨﴾ وَلَا
يَحْسَبَنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا سَبَقُوا ۚ إِنَّهُمْ لَا يُعْجِزُونَ ﴿٥٩﴾

ع ۳

اللہ کے نزدیک جانداروں میں بدترین انسانوں کا وہ گروہ ہے جس نے راہِ کفر اختیار کی ہے پس وہ کسی طرح بھی ایمان کی راہ اختیار نہیں کرتے ہیں[۵۵] یعنی وہ لوگ جن سے آپ نے عہد و پیمان کیا تھا۔ پھر ہر بار عہد شکنی کرتے ہیں اور ان میں قطعاً خدا ترسی کا نام و نشان نہیں ہے[۵۶] لہٰذا اگر تم ان کو لڑائی میں کہیں پاؤ تو ان کو ایسی سزا دو کہ ان کی پشت پناہی کرنے والے بھی حواس باختہ ہو جائیں تاکہ وہ بدعہدی کے انجام سے کچھ سبق لیں[۵۷]۔ اور اگر تمہیں کچھ لوگوں سے دغا اور بدعہدی کا اندیشہ ہو تو تمہیں چاہیے کہ ان کا عہد ان کی طرف اس طرح پھینک دو کہ تم اور وہ دونوں برابر ہو جاؤ۔ بلا ریب اللہ سبحانہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے۔ اور یاد رکھو منکرین اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے۔ وہ کبھی اللہ کو ہرا نہیں سکتے ہیں[۵۹]

معانی مفردات

عہد قول، قرار، پیمان، معاہدہ عہود جمع امام راغب فرماتے ہیں عہد اللہ یعنی خدائی عہد و پیمان تو کبھی اس طرح ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ اس بات کو ہماری عقلوں میں بٹھا دیتا ہے اور کبھی یہ شکل ہوتی ہے کہ اس کے پیغمبر کتاب و سنۃ کے ذریعے اس بات کا ہم کو حکم دیتے ہیں۔ اور کبھی خود اپنے التزام کی بنا پر ایک شے جو اصل شرع کے اعتبار سے ہم پر پہلے لازم نہ تھی اب لازم ہو جاتی ہے جیسے کہ نذر وغیرہ۔

تثقفنهم مضارع مؤکد ثقف سے ہے یہ باب سمع سے آتا ہے ثقف کے معنے کسی چیز کے ادراک کرنے اور اس کے انجام دینے میں مہارت کے ہیں لیکن بعد میں صرف ادراک کے معنے میں آیا ہے۔

شرد۔ یہ تشرید سے امر ہے اس کے معنے ایسی سزا دینے کے ہیں جسے دوسرے دیکھ کر بھاگ جائیں۔ شرد کے معنے متفرق اور تتر بتر ہونے کے ہیں اسی سے الابل الشاردہ بولا جاتا ہے۔

سواء برابر اسم مصدر ہے بمعنے استواء یعنی دونوں طرف بالکل برابر۔ اس کا تثنیہ اور جمع نہیں آتا ہے علامہ سیوطی الاتقان میں لکھتے ہیں سواء بمعنے مستوی برابر کے معنے میں ہے کسرہ کے ساتھ یہ اسم متصور ہوگا جیسے مکانا سوی جگہ برابر یعنی صاف اور ہموار اور فتحہ کے ساتھ جیسے سواء علیهم ءانذرتهم ام لم تنذرهم اور بمعنے وسط بھی آتا ہے اس صورت میں بھی فتحہ کے ساتھ ہوگا جیسے فی سواء الجحیم اور بمعنے تمام بھی آتا ہے جیسے فی اربعة ایام سواء قرآن میں یہ لفظ بمعنے غیر نہیں آیا ہے۔

سبقوا سبق سے ماضی کا جمع مذکر ہے باب ضرب انھوں نے سبقت کی وہ آگے نکل گئے۔ بچ گئے۔

دشمنوں سے ایفائے عہد کی تاکید

یہاں تک مشرکین مکہ کی داستان تھی اب روئے سخن مدینہ کے یہود کی طرف ہو رہا ہے۔ حضور اقدس ﷺ مدینہ تشریف لائے تو یہاں یہودیوں کی تین بستیاں تھیں۔ بنی قینقاع، بنی نضیر اور بنی قریظہ حضور اقدس ﷺ نے ان سب سے صلح و امن اور باہم دگر اعانت کا معاہدہ کیا۔ معاہدہ کی ایک شرط یہ تھی کہ تمام جماعتیں مل کر رہیں گی اور اگر کسی فریق پر اس کے دشمن حملہ کریں گے تو سب اس کی مدد کریں گے لیکن ابھی معاہدہ کی سیاہی خشک نہیں ہوئی تھی کہ یہودیوں نے خلاف ورزی شروع کر دی۔ اور قریش سے مل کر مسلمانوں کی تباہی کی سازشیں کرنے لگے۔ حتیٰ کہ خود حضور اقدس ﷺ کو ہلاک کرنے کی تدبیروں میں لگ گئے۔ ان آیات میں بتایا ہے

کہ اب ایسے دغاباز لوگوں کے ساتھ نباہ نہیں ہو سکتا جو کھلم کھلا ڑیں ان کا مقابلہ کرو۔ جو ایسا نہ کریں اور غدر و فریب کا اندیشہ ہو تو ان کو کھلے طور پر خبر دے دو کہ اب معاہدہ فسخ ہو گیا۔ لیکن فرمایا کہ یہ بات اس طرح کی کہ دوسرے فریق کو نقصان پہنچے یعنی وقت سے پہلے فسخ معاہدہ سے خبردار ہو جائے اور اگر تیاری کرنا چاہے تو ہماری طرح تیاری کا اسے بھی موقعہ مل جائے۔

یہاں سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ قرآن نے ہر معاملہ حتیٰ کہ جنگ کے معاملے میں بھی سچائی اور دیانت داری کا جو معیار قائم کیا ہے وہ کس قدر بلند ہے۔ کہیں بھی اس کا کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا جہاں اخلاقی کمزوری کو پھلنے اور پھولنے کا موقع ملے۔ کیا دنیا میں اس وقت تک کسی قوم نے احکام جنگ کو اس درجہ بلند اخلاقی کے معیار پر رکھا ہے؟ نہیں اور قطعاً نہیں۔

بدترین خلائق لوگ

(۷۰) اللہ کے نزدیک جانداروں میں بدترین انسانوں کا وہ گروہ ہے جس نے راہِ کفر اختیار کی ہے پس وہ کسی طرح بھی ایمان کی راہ کو نہیں اپناتے ہیں۔ جو لوگ ہمیشہ کے لیے کفر اور بے ایمانی پر تل گئے۔ اور انجام سے بالکل بے خوف ہو کر غداری اور بدعہدی کے خوگر ہو رہے ہیں وہ اللہ سبحانہ کے نزدیک بدترین جانور ہیں۔ فرعونیوں کا حال بدعہدی اور غداری کا یہی تھا۔

ولما وقع علیھم الرجز قالوا یا موسیٰ ادع لنا ربک بما عھد عندک لئن کشفت عنا الرجز لنومنن لک ولنرسلن معک بنی اسرائیل۔ فلما کشفنا عنھم الرجز الی اجل ھم بالغوہ اذا ھم ینکثون۔

اور جب ان پر عذاب کی سختی آن پڑی تو کہنے لگے کہ اے موسیٰ تیرے پروردگار نے تجھ سے جو عہد کیا ہے تو اس کی بنا پر ہمارے لیے دعا کر۔ اگر تیری دعا سے عذاب ٹل گیا تو ضرور ہم تیرے معتقد ہو جائیں گے اور بنی اسرائیل کو چھوڑ دیں گے کہ تیرے ساتھ چلے جائیں لیکن پھر جب ایسا ہوا کہ ہم نے ایک خاص وقت تک کے لیے کہ انہیں اس تک پہنچنا تھا عذاب ٹال دیا تو اچانک وہ اپنی بات سے پھر گئے[1]

اصل ارشاد میں شر الدواب آیا ہے۔ یہ انداز بیان ان لوگوں کے لیے آیا ہے جو سوچنے اور سمجھنے کی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ساری صلاحیتوں کو تج کر بیٹھتے ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ انسانوں کے کسی گروہ کی قدر و قیمت اسی وقت تک ہے جب تک ان میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیت باقی ہے جن میں سوچنے کی صلاحیت ہی ناپید ہو جائے وہ نہ پہلے ایمان لائے اور نہ ان سے آئندہ ایمان لانے کی کوئی آس ہے۔ اب وہ صرف گندگی کا ایک ڈھیر ہیں۔ اللہ کی زمین پر ان کے باقی رہنے میں اب کوئی خیر نہیں ہے۔ بعثت اللہ سبحانہ کی آخری حجت ہوتی ہے جن کی آنکھوں کے پردے رسول آنے کے بعد بھی نہیں اٹھتے۔ ان کا اندھاپن لاعلاج ہے۔ اور زمین پر ان کا باقی رہنا قطعاً بے معنے ہے اللہ تعالیٰ کسی کو جینے کی جو مہلت دیتا ہے صرف جینے کے لیے نہیں دیتا بلکہ تعقل و تفکر اور تدبر و تذکر اور زندگی سنوارنے اور سدھارنے کے لیے دیتا ہے۔

قرآن کی یہ تعبیر بتا رہی ہے کہ عقل و حواس سے ٹھیک طرح کام نہ لینا اور اندھوں کی طرح چلنا انسانیت کے درجہ سے گر جانا ہے۔ قرآن اسی اندھے پن کے نتیجہ کو کفر کہتا ہے۔ لہٰذا ایمان کی راہ عقل و بصیرت کی راہ ہے اور کفر اندھے پن کا دوسرا نام ہے۔

معاہدہ کن سے ہوا؟

(۷) یعنی وہ لوگ جن سے آپ نے عہد و پیمان کیا۔ پھر ہر بار عہد شکنی کرتے ہیں۔ اور ان میں قطعاً خدا ترسی کا نام و نشان نہیں ہے حضور اقدس ﷺ کے زمانہ میں مدینہ کے یہود فرعونیوں کی طرح آپ سے عہد کر لیتے کہ ہم مشرکین مکہ کو مدد نہ دیں گے پھر ان کی امداد کرتے اور کہہ دیتے کہ ہم کو عہد یاد نہ رہا تھا بار بار ایسا ہی کرتے رہے آگے بتلایا جا رہا ہے کہ ایسے غداروں کے ساتھ کیا معاملہ ہونا چاہیے [1]

جن لوگوں کے بارے میں شر الدواب کہہ کر پہلے ایمان نہ لانے کی خبر دی گئی ہے یہ ان کا ذکر ہے اور الذین عاھدت منھم۔ کا فقرہ پہلے جملہ الذین کفروا سے بدل ہے۔ یہ مدینے کے یہود ہیں۔ نبی کریم ﷺ جب مدینہ طیبہ تشریف لائے تو آپ نے سب سے پہلے مدینہ کے یہودیوں سے حسن جوار اور باہمی تعاون کا معاہدہ کیا تھا۔ اس آیت میں اسی معاہدہ کی طرف اشارا ہے۔ جن سے یہ معاہدہ ہوا یہ کون تھے۔ اس پر مورخین کا اتفاق ہے کہ یہ یہودی تھے لیکن اس میں اختلاف ہے کہ یہودی نسلاً تھے یا صرف مذہباً تھے۔ دوسرا سوال یہ ہے کہ ان سے جو معاہدہ ہوا وہ کیا تھا۔

مدینہ منورہ میں ہجرت کے وقت آبادی میں یہودی کم و بیش ۴۰ یا ۵۰ فی صد تھے۔ لیکن باقی عرب آبادی کے

[1] افادات شیخ الاسلام

مقابلے میں ان کی دولت مندی کا اندازہ اس سے کیا جاسکتا ہے کہ ابن النجار کی تاریخ مدینہ کے مطابق ان یہودیوں کی اگر وہ گڑھیاں تیس تو عربوں کے قبضے میں صرف ۱۳ تھیں۔ یہ یہودی زیادہ تر تین قبیلوں بنی قینقاع، بنی النضیر اور بنو قریظہ میں منقسم تھے۔ ان میں آپس میں اتنی پھوٹ تھی کہ بعض قبیلے اگر قبیلہ اوس کے حلیف تھے تو دوسرے قبیلے قبیلہ خزرج کے حلیف تھے اور باہم لڑتے رہتے تھے۔ ان تینوں میں قینقاع عزت و حرمت میں سب سے ممتاز تھے غالباً اس کی وجہ ان کا تمول تھا۔ قینقاع کے معنے سنار کے ہیں اور بظاہر ان کا پیشہ زرگری زیور سازی، زیور فروشی اور سودی قرض دینا تھا۔ نضیر تر و تازہ درخت یا پودے کو کہتے ہیں۔ اور یہ قبیلہ نخلستانوں کا مالک اور زراعت پیشہ تھا۔ قریظہ اس درخت کو کہتے ہیں جو عرب میں دباغت کے لیے خاص طور پر کام آتا ہے گویا یہ پیشہ ور چمار تھے اور جوتے وغیرہ بناتے تھے۔ ان کو کم ذات اور حقیر سمجھا جاتا تھا۔ اگرچہ مورخین عرب کا بیان یہی ہے کہ یہ تینوں قبیلے نسلاً یہودی تھے لیکن تاریخی قرائن سے اس کی تصدیق نہیں ہوتی۔ یہودی اگرچہ ساری دنیا میں مارے مارے پھرے لیکن انھوں نے اپنے نام کہیں نہیں بدلے۔ آج بھی وہ جہاں ہیں اسرائیلی نام رکھتے ہیں۔ برخلاف اس کے مدینہ کے یہودیوں کے نام۔ نضیر، قینقاع اور قریظہ وغیرہ ہیں جو خالص عربی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک بڑے مورخ یعقوبی نے صاف تصریح کی ہے کہ قریظہ اور نضیر عرب تھے جو یہودی بن گئے تھے (یعقوبی جلد ۲) نیز مسعودی نے بھی کتاب الاشراف والتنبیہ میں ایک روایت لکھی ہے کہ یہ جذام کے قبیلے سے تھے کسی زمانہ میں عمالقہ اور ان کی بت پرستی سے بیزار ہو کر حضرت موسیٰ ﷺ پر ایمان لائے اور شام سے نقل مکانی کر کے حجاز آ گئے۔ یہ تین قبیلے قینقاع، نضیر اور قریظہ مدینہ کے اطراف میں آباد تھے اس لیے باوجود دولت مندی کے ان یہودیوں کی حیثیت مدینہ میں نو وارد مہمانوں کی معلوم ہوتی ہے اصل باشندوں کی نہیں کیونکہ جب ۱ھ میں شہری مملکت مدینے میں قائم ہوئی اور یہ یہودی قبائل بھی اس میں شہری طور پر شامل ہوئے تو الگ وحدتوں کے طور پر نہیں بلکہ خالص عرب کے موالی کے طور پر شامل ہوئے۔

معاہدہ کیا تھا؟

حضور اقدس نے ہجرت مدینہ کے بعد اہل مدینہ سے معاہدہ کیا۔ یہ تو ٹھیک طور پر معلوم نہیں کہ شہری مملکت مدینہ کا دستور کب مرتب اور نافذ ہوا لیکن تاریخ الخمیس ص ۲۹۸ ج ا میں تصریح ہے کہ یہ دستور ہجرت کے پانچ ماہ بعد مرتب ہوا۔ اس کا مطلب ہے کہ رجب یا شعبان ۱ھ میں یہ دستور مرتب ہوا۔ مفصل معاہدہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ اور سیرۃ ابن ہشام میں محمد ابن اسحاق کے حوالہ سے ذکر کیا ہے۔ ہم ناظرین معالم القرآن کی ضیافت طبع کے لیے پورا معاہدہ دفعات کی صورت میں پیش کرتے ہیں۔

حضور اقدس ﷺ کا تحریری معاہدہ

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

یہ تحریری معاہدہ ہے مدینے کے مندرجہ ذیل طبقوں کے درمیان

الف۔ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم

ب۔ مسلمان مہاجرین ساکنین شہر مکہ

ج۔ مدینہ کے مسلمان

د۔ مدینہ کے یہودی

ہ۔ مدینہ کے نصرانی

ذ۔ مدینہ کے غیر مسلم

دفعہ ۱۔

مذکرۃ الصدر ہر شش گروہ سیاسی طور پر ایک جماعت کی حیثیت رکھتے ہیں۔

دفعہ ۲۔

ان میں سے ہر گروہ فرداً فرداً مندرجہ ذیل امور کا ذمہ دار ہے۔

قریش اپنے قبائل کی طرف سے قدیمی طے شدہ اور اسلام کی طرف سے مصدقہ دیت کی ادائیگی میں انصاف عدل کے ذمہ دار ہیں۔ اور اس دفعہ میں مدینے کے مندرجہ ذیل گروہ بھی شامل ہیں۔

۱۔ بنو عوف۔

۲۔ بنو حارث از قبیلہ خزرج۔

۳۔ بنو ساعدہ۔

۴۔ بنو جشم۔

۵۔ بنو نجار۔

۶۔ بنو عمرو بن عوف

۷۔ بنو ثعلب۔

۸۔ بنو اوس۔

دفعہ ۳۔

۱۔ کوئی گروہ دیت کی مقررہ حدوں میں تخفیف کی راہ نہ پیدا کرے۔

۲۔ کوئی مسلمان کسی مسلمان کے مظلوم حلیف کے مقابلے میں اپنے حلیف کی بے جا حمایت نہ کرے۔

۳۔ جو شخص باہم ادائے دیت میں سفارش کی راہ پیدا کرنے کی سعی کرے اس شخص کے خلاف دوسرے مسلمانوں کو تمام ورثاء کی مناسب طرفداری کرنا ہوگی۔

۴۔ جو مسلمان خود یا اس کا بیٹا جماعت میں فساد اور تفرقہ پیدا کرنے میں ساعی ہو، اس کے خلاف تمام مسلمانوں کو یکجا ہو کر یہ فتنہ فرو کرنا چاہیے۔

۵۔ اگر کسی مسلمان کے ہاتھ سے کوئی غیر مسلم مارا جائے تو دوسرے مسلمان کا غیر مسلم کی حمایت میں مسلمان پر جور رد تعدی کرنا خلاف معاہدہ ہوگا۔

۶۔ اگر غیر مسلم مسلمان کے درپے ہو تو کسی مسلمان کو ایسے کافر کی حمایت نہ کرنا ہوگی۔

۷۔ مسلمانوں کا ہر فرد یکساں طور پر خدا کی پناہ میں ہے اور تمام مسلمان ایک دوسرے کے دوست ہیں۔

دفعہ ۴۔

۱۔ مسلمان کے لیے کسی یہودی کے ایسے معاملے میں مدد کرنے پر کوئی حرج نہیں ہے جس سے وہ یہودی مسلمان کے انصاف پر اطمینان حاصل کر سکے۔

۲۔ مسلمان کی لڑائی میں شہید ہونے کے بعد ایک دوسرے مسلمان پر اس کی ذمہ داری عائد نہ کی جائے گی۔

۳۔ تمام مسلمان اسلام کے احسن اور اقوم طریق پر ثابت قدم رہیں گے۔

۴۔ کوئی مسلمان کسی مشرک کو مسلمان کے خلاف پناہ نہ دے گا نہ کسی ایسے مال کا ضامن ہوگا جو مشرک نے ناجائز طور پہ مسلمان کے مال سے حاصل کیا ہو اور نہ کوئی مسلمان مشرک کی حمایت میں مسلمان کے درپے ہوگا۔

۵۔ مسلمان کے قتل ناحق پر اگر مقتول کے ورثاء رضامندی سے دیت لینے پر مائل نہ ہوں تو قاتل کو جلاد کے حوالے کیا جائے گا۔

۶۔ جو مسلمان اس معاہدے میں شامل ہے اگر وہ دل سے خدا تعالیٰ اور روز آخرت پر ایمان لا چکا ہے تو اسے کسی مفسد کی حمایت کرنا ہوگی۔ مفسد کو پناہ دینا بھی اس کی حمایت میں شامل ہے ایسے بے انصاف مسلمان پر دنیا و آخرت میں دونوں میں خدا کی لعنت اور عذاب ہے۔ جس عذاب کے بدلے میں اس سے کوئی معاوضہ قبول نہ کیا جائے گا۔

دفعہ ۵۔

مسلمان اپنے باہمی تنازعات میں خدا اور اس کے رسول کی طرف رجوع کرنے کے پابند ہوں گے۔

دفعہ ۶۔

مسلمانوں کی جنگوں میں ان کی مالی اعانت کرنا ہر یہودی پر واجب ہوگا۔

۱۔ قبیلہ بنو عوف کے تمام یہود کو مسلمانوں کے ساتھ ایک فریق کی حیثیت سے مل کر رہنا ہوگا۔ مسلمان اور یہودی دونوں اپنے اپنے مذہب کے پابند ہوں گے۔

۲۔ یہ ذمہ داری بنو عوف کے غلاموں پر بھی ہوگی اور عدم پابندی کی صورت میں ان کے آقا ان کی طرف سے جواب دہ ہوں گے سرکشی کی صورت میں نہ صرف بنو عوف کے مرد بلکہ ان کے بال بچوں پر مواخذہ کیا جا سکتا ہے

۳۔ اس دفعہ میں مدینے کے مندرجہ ذیل یہودی بھی شامل ہوں گے

۱۔ بنو نجار۔

۲۔ بنو حارث۔

۳۔ بنو ساعدہ۔

۴۔ بنو جشم۔

۵۔ بنو ثعلبہ اور ان کے حلیف۔

۶۔ جفنہ جو بنو ثعلبہ کی شاخ ہے۔

۷۔ بنو شطیبہ۔

الغرض یہ دفعہ یہودی قبیلے کے حلیفوں پر لاگو ہے۔

۵۔ ان میں سے کوئی فرد یا شاخ یا قبیلہ اس دفعہ سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اجازت کے بغیر مستثنیٰ نہیں ہو سکتا۔

۶۔ ان میں سے کوئی فرد یا جماعت کسی کو مجروح کرنے پر مواخذہ سے بری نہیں ہو سکتا۔

۷۔ ان میں سے جو فرد یا جماعت قتل ناحق کا ارتکاب کرے اس کا وبال اس پر اور اہل و عیال سب پر آ سکتا ہے۔

۸۔ ان یہودیوں میں سے کسی پر ناحق ایسی تہمت پر اس کا ناصر اور حامی اللہ ہے۔

۹۔ مسلمان اور یہود دونوں اپنے مصارف زندگی کے خود کفیل ہوں گے۔

۱۰۔ دونوں فریقوں میں سے جو فرد اس قرارداد سے منحرف ہوگا دوسرا فریق اس باغی پر قابو حاصل کرنے میں پہلے فریق کا

معاون ہوگا۔

۱۱۔ یہود اور مسلمان دونوں ایک دوسرے کے گروہ اور فرد کے ساتھ صلح اور نصیحت پر عمل کریں گے اور صلح و نصیحت میں کسی قسم کی رخنہ اندازی نہ ہونے دیں گے۔

۱۲۔ فریقین میں سے کوئی فرد یا جماعت دوسرے فریق کی حق تلفی گوارا نہ کرے گا بلکہ ایک دوسرے کے مظلوم کی حمایت کرنا اس کا فرض ہوگا۔

۱۳۔ مسلمان جب تک اپنے دشمنوں سے برسرپیکار رہیں یہود ان کی اعانت کرتے رہیں گے۔

۱۴۔ شہر مدینہ میں ایک دوسرے کے ساتھ جنگ کرنا حرام ہے۔

۱۵۔ ہر فرد اپنے ہمسایہ کی طرفداری اپنے نفس کی مانند کرے گا۔

۱۶۔ اس معاہدہ کے پابند افراد اور گروہ باہمی اختلاف اور تنازع کا مقدمہ خدا اور اس کے رسول محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کریں گے۔

۱۷۔ شرکائے معاہدہ میں سے کوئی فرد یا جماعت قریش مکہ کو اپنے ہاں پناہ نہ دے گی اور نہ قریش مکہ کے کسی حلیف کی حمایت کرے گی۔

۱۸۔ مدینہ پر حملہ ہونے کی صورت میں شرکائے معاہدہ میں سے ہر فرد اور جماعت حملہ آور کی مداخلت کے خلاف دوسرے فریق کی حمایتی ہوگی۔

۱۹۔ شرکائے قرارداد کسی جماعت کی طرف سے دشمن کے ساتھ مصالحت میں دوسرے گروہ میں شریک ہوں گے۔

۲۰۔ دشمن سے صلح کی صورت میں اگر کسی نوع کی منفعت ہوگی تو مسلمانوں کی طرح دوسرے شرکائے قرارداد بھی اس سے منتفع ہوں گے۔

۲۱۔ ہاں جو اپنے دین سے منحرف ہو جائے اس کے لیے یہ دروازہ بند رہے گا۔

۲۲۔ حالت جنگ میں معاہدہ فریق کے ہر فرد کو مالی اعانت میں اپنا حصہ ادا کرنا ہوگا۔

۲۳۔ قبیلہ اوس کے یہود اور ان کے موالی بھی اس قرارداد کے اسی طرح پابند ہیں جس طرح وہ قبائل جن کے نام آچکے ہیں۔

حرفِ آخر

۱۔ اس معاہدے کی خلاف ورزی ظالم اور مفسد کے سوا اور کوئی شخص نہیں کر سکتا۔

۲۔ جو شخص مدینہ میں خلوص اور امن کے ساتھ سکونت رکھے اور وہ جو مدینے سے خلوص اور امن کے ساتھ کسی اور جگہ نقل مکانی کرنا چاہے۔ ان دونوں پر کوئی مواخذہ نہیں لیکن فساد اور شرارت کرنے کے لیے قیام مدینہ اور یہاں

ترک اقامت دونوں قابل گرفت ہیں۔

۲- جو شخص دوسروں کے بھلائی کا طلبگار ہے اللہ سبحانہ اور محمد رسول اللہ ﷺ بھی اس کے خیر اندیش ہیں۔

یہ ہے وہ معاہدہ جو رسول اللہ ﷺ نے ہجرت مدینہ کے پہلے سال میں اہل مدینہ سے کیا۔ قاضی سلیمان کا یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ:

اس مبارک ارادے کی تکمیل کے لیے اگر کافی وقت مل جاتا تو دنیا کو پتہ لگ جاتا کہ رحمۃ للعالمین دنیا میں صلح پھیلانے اور امن قائم کرنے کے لیے تشریف لائے۔　　(رحمۃ للعالمین ص۱۳۰ ج۱)

زیر نظر آیت الذین عاھدت منھم کی تشریح اس حد تک بے غبار ہو کر سامنے آگئی کہ حضور اقدس ﷺ نے کن لوگوں سے معاہدہ کیا اور اس معاہدہ کی تاریخ میں تفصیلات کیا ہیں؟

قوموں کی سیاسی اور قانونی تقسیم

اس آیت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ مدینہ میں تشریف آوری کے بعد آپ کے غیر مسلم مخاطبوں نے قانونی حیثیت سے تین روپ اختیار کر لیے تھے۔ یہ تقسیم مدینہ میں اسلامی اسٹیٹ قائم ہونے کے بعد وجود میں آئی۔

۱- وہ لوگ جن سے آپ نے معاہدہ کیا۔

۲- دوم وہ لوگ جن سے آپ نے اعلان جنگ کیا۔

۳- سوم وہ لوگ جو نہ معاہد تھے اور نہ محارب۔

ان تینوں سے آپ نے وحی کی روشنی میں معاملہ فرمایا۔ یہ تقسیم سیاسی حالات کی تخلیق تھی۔ ورنہ دعوت کی بنیاد پر حضور اقدس ﷺ نے دنیا کی قوموں کو چار حصوں میں تقسیم فرمایا اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق مقرر فرمائے۔

۱- مسلمان جو قرآن اور دوسری کتابوں کو کتاب الٰہی یقین کرتے ہیں ان میں ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور برائی میں ایک دوسرے کا شریک ہے۔ وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی بیاہ کر سکتے ہیں۔ اور ایک دوسرے کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں۔ اسلام میں ان کے حقوق برابر ہیں۔

۲- اہل کتاب یعنی ان کتابوں کے ماننے والے جن کا نام قرآن میں مذکور ہے وہ اسلامی حکومت کے شہری بن سکتے ہیں ان کے معابد محفوظ رہتے ہیں اپنی حفاظت کا مالی ٹیکس ادا کرنے پر مسلمان ان کی جان و مال اور آبرو کے محافظ ہوتے ہیں ان کی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور کھا سکتے ہیں۔ ان کا جائز کھانا مسلمان کھا سکتے ہیں اور اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

۳۔ شبہ اہل الکتاب۔ یعنی وہ لوگ جو ان کتابوں کو نہیں مانتے جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب کے دعوے کے باوجود ستاروں کو پوجتے تھے اور مجوسی یعنی پارسی جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی سورج، آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقعہ پر علمائے اسلام نے انہی پر قیاس کر کے ہندو قوم اور برہمنوں وغیرہ کو بھی اسی صنف میں داخل کیا۔ مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے۔ ان دو باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے باقی تمام حقوق ان کو حاصل ہوں گے۔

۴۔ کفار و مشرکین یعنی وہ لوگ جن کے پاس نہ آسمانی کتاب ہے اور نہ وہ کسی دین الٰہی کی طرف منسوب ہیں۔

دونوں تقسیموں کے احکام الگ الگ ہیں ان میں خلط سے کام نہ لینا چاہیئے۔ بلاشبہ قرآن کی یہ آیت رہنما ہے کہ غیر مسلموں کی قوت کو ختم کرنے اور ان کی مدافعت کی خاطر کچھ غیر مسلموں سے معاہدہ کرنا اور ان سے تعاون حاصل کرنا جائز ہے جیسا کہ بعض بزرگوں نے آیت قرآنی اور حضور اقدس ﷺ کے معاہدہ اہل مدینہ سے استنباط کیا ہے۔ لیکن صورتیں دو ہیں۔

ایک یہ کہ اسلامی اسٹیٹ خود کچھ غیر مسلموں سے یہ سیاسی معاہدہ کرے۔ یعنی معاہد اسلامی اسٹیٹ ہو اور جن سے معاہدہ کیا جا رہا ہے وہ غیر مسلم ہوں۔

دوسری صورت یہ ہے کہ معاہد مسلمان ہوں لیکن ان کا کوئی سیاسی مقام نہ ہو بلکہ سیاست میں دوسروں کے رحم و کرم پر ہوں جیسے پہلی صورت کے جائز ہونے میں کوئی شبہ نہیں ایسے ہی دوسری صورت کے ناجائز ہونے کا معاملہ قطعاً بے غبار ہے۔

معاہدین کی جانب سے عہد شکنی

اس کے بعد ارشاد ہے ثم ینقضون عھدھم فی کل مرۃ یعنی پھر وہ اپنا ہر بار عہد توڑتے ہیں۔ مضارع کی تعبیر یہ بتلانے کے لیے کہ نقض عہد میں تعدد اور زیادتی ہے۔ یہ گویا عہد کے بعد ان کی غداری اور دغا بازی کی داستان ہے۔ نقض عہد کا مطلب یہ ہے کہ کسی کو زبان دے کر اطمینان دلایا جائے اور موقع پا کر اس کے خلاف کیا جائے۔ قرآن عزیز اس کو خیانت بتاتا ہے۔ عربی میں اس کو عام طور پر غدر بھی کہتے ہیں۔ قرآن نے اس کی شدید برائی بیان کی ہے۔ اس آیت میں ان یہودیوں کا ذکر ہے جو ہر دفعہ عہد کر کے بدعہدی اور دغا بازی کرتے تھے مگر یہ بات اس میں عمومیت کے ساتھ بیان ہوئی ہے کہ بدعہدی سراسر تقویٰ کے خلاف ہے۔

یہ ان معاہدین کے عہد توڑنے کی کہانی ہے۔ تینوں یہودی قبائل قینقاع، نضیر اور قریظہ میں سے سب سے پہلے مخالفت کے میدان میں قینقاع نے قدم رکھا اور ابن سعد کے بیان کے مطابق جنگ بدر ہو چکی تو انہوں نے حسد و بغاوت کا مظاہرہ کیا۔ عہد و پیمان توڑ ڈالے اور یہودیوں میں ان سے بہادر کوئی گروہ نہ تھا۔ (طبقات ابن سعد ج ۲ ص ۲۹)

بنو قینقاع

کشمکش کی ابتداء بنو قینقاع ہی سے ہوئی ایک عرب خاتون کسی یہودی دوکاندار سے سودا لینے گئی۔ دوکان پر اور بھی یہودی بیٹھے تھے۔ کسی نے خاتون کی بے خبری میں اس کے لباس کے زیریں حصے کا ایک گوشہ کانٹے سے اوپر کے کپڑوں میں ٹانک دیا۔ وہ چلی تو برہنہ ہو گئی اور اس نے چیخ ماری۔ یہودی اس پر ہنسنے لگے۔ ایک مسلمان نے یہ کیفیت دیکھی تو شریروں کو مارنے کے لیے دوڑا۔ یہودی دوکاندار کشمکش میں مارا گیا۔ باقی یہودیوں نے غیور مسلمان کو شہید کر دیا۔ حضور اقدس ﷺ کو اس افسوسناک واقعہ کی خبر ملی تو قینقاع کے اکابر کو جمع کر کے نرمی سے سمجھایا کہ آپ لوگوں نے جو طریقہ اختیار کر رکھا ہے یہ اچھا نہیں۔ شرارتیں چھوڑ دو اور خدا سے ڈرو۔ وہ لوگ اپنے آدمیوں کی حرکت پر اظہارِ ندامت کے بجائے جو شرافت کا بدیہی تقاضا تھا۔ غرور و تکبر پر اتر آئے اور بولے کہ بدر کی فتح پر مغرور نہ ہو جانا ہم سے سابقہ پڑے گا تو پتہ لگ جائے گا کہ لڑائی کیا ہوتی ہے اور لڑنے والے کیسے ہوتے ہیں۔

یقین ہے کہ بنو قینقاع نے یہ روش بنو نضیر اور بنو قریظہ، اور منافقین مدینہ کی شہ پر اختیار کی ہو گی۔ اور ان کو بھروسہ ہو گا کہ اگر مسلمانوں نے جنگ کی تو تمام یہودیوں اور منافقوں کی طرف سے پوری امداد ملے گی۔ آخر حضور اقدس ﷺ کو حکم دینا پڑا کہ بنو قینقاع کے قلعوں کا محاصرہ کر لیا جائے۔ انجام کار ان لوگوں کے تکبر و شجاعت کا سارا نشہ ہرن ہو گیا۔ ایک انگلی بھی ان کی حمایت میں نہ اٹھ سکی۔ اور وہ اس پر راضی ہو گئے کہ رسول اللہ ﷺ جو فیصلہ فرمائیں گے انہیں منظور ہو گا۔

عبداللہ بن ابی نے جو بظاہر مسلمان اور دل سے یہودیوں کا حامی تھا درخواست کی کہ انہیں جلاوطن کر دیا جائے۔ یہ درخواست منظور ہو گئی۔ اور بنو قینقاع مدینہ منورہ سے نکل کر بلقا کے ایک مقام اذرعات میں جا بسے۔ وہ تاجر یا زرگر تھے جہاں بھی جاتے اپنا کاروبار جاری رکھ سکتے تھے۔ ان میں سات سو جنگجو تھے اور تین سو کے پاس فولادی زرہیں تھیں یہ واقعہ جنگ بدر سے چند روز ایک مہینہ بعد پیش آیا۔ اور عجیب اتفاق ہے کہ بدر کے بعد مدینہ کو دو جنگیں پیش آئیں اول احد دوم خندق۔ بدر کے بعد بنو قینقاع نکلے احد کے بعد بنو نضیر کو جلاوطن کیا گیا اور خندق کے بعد بنو قریظہ کا فیصلہ ہو گیا۔

کعب بن اشرف

کعب بن اشرف ابتدائی اسلامی دور میں مدینہ منورہ کا ایک بہت بڑا فتنہ تھا جو شر و فساد پھیلانے میں تنہا ایک بڑے گروہ اور کثیر الافراد قبیلے سے کم نہ تھا۔ اس کا باپ قبیلہ طے سے تھا جس نے بنو نضیر کے رئیس سلام بن ابی الحقیق کی بیٹی سے شادی کر لی تھی۔ اسی نضری یہودی عورت کا بیٹا کعب تھا جس نے بنو نضیر کی آبادی سے جنوبی جانب ایک ٹیلے پر ایک قلعہ بنا لیا تھا۔ وہ دولت مند تھا۔ باپ کی وجہ سے عربوں اور ماں کی وجہ سے یہودیوں میں اسے وسیع اثر رسوخ حاصل تھا۔ سب سے آخر میں یہ کہ مشہور شاعر تھا اور اس زمانے میں شاعروں کو عموماً سب لوگ قدر و منزلت کی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ زندگی کے ظاہری اسباب کی سازگاری کے ساتھ بہت بداخلاق، خود پسند، متکبر اور اسلام دشمن تھا۔ یہودی علماء کے لیے اس نے وظیفے مقرر کر رکھے تھے۔ ایک موقعہ پر انھوں نے کہا کہ حضور اقدس ﷺ وہی نبی ہیں جس کے آنے کی خبر یہودیوں کے صحیفوں میں دی گئی ہے تو کعب نے ان کے وظیفے بند کر دیئے۔ جب ان علماء نے اپنی غلطی کا اقرار کیا تو وظیفے جاری کیے۔ اگرچہ وہ بھی مدینہ منورہ کے ابتدائی عہد نامہ صلح و امن میں شریک تھا مگر شروع ہی سے اس نے قریش مکہ اور دوسرے اسلام دشمن عناصر سے خاص روابط پیدا کر لیے تھے۔ قریش کے جو سردار بدر میں مارے گئے تھے۔ ان کے مرثیے لکھ کر چالیس آدمیوں کے ساتھ مکہ مکرمہ گیا۔ مرثیے پڑھ کر خود بھی رویا اور قریش کو بھی رلایا ساتھ ہی قریش سے عہد لیا کہ اس جنگ کا بدلہ لیں گے۔ واپس آ کر رسول اللہ کی ہجو میں اشعار کہے۔ شعر کہہ کر لوگوں کو آپ کے خلاف بھڑکاتا تھا اپنے قصیدوں کی تشبیب میں مسلم خواتین کا ذکر نہایت نازیبا طریق پر کرتا۔ دولت مند اور با اقتدار شخص کی اخلاقی حس مر جائے اور خوفِ خدا اس کے دل سے نکل جائے تو وہ سب کے لیے آفت کا پرکالہ بن جاتا ہے۔ مولانا شبلی مرحوم نے تاریخ یعقوبی کے حوالہ سے لکھا ہے کہ کعب نے حضور اقدس ﷺ کو دھوکہ سے قتل کرنا چاہا تھا۔ اس روایت کی تائید اس روایت سے بھی ہوتی ہے جو حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں عکرمہ کی سند سے نقل کی ہے کہ:

> کعب نے حضور اقدس ﷺ کو دعوت پر بلایا اور لوگوں کو متعین کر دیا کہ جب آپ تشریف لائیں تو دھوکہ سے آپ کو ہلاک کر دیں۔

کعب بن اشرف کا قتل

اس فتنہ عظیمہ کا خاتمہ ناگزیر ہو گیا تو محمد بن مسلمہ نے اس خدمت کا بیڑا اٹھایا۔ ان کے ساتھ یہ حضرات بھی تھے۔

۱۔ ابونائلہ سلکان بن سلامہ بن وقش۔
۲۔ حارث بن اوس بن معاذ۔
۳۔ ابو عبس بن جبیر۔

ابونائلہ سلکان بن سلامہ کعب کے رضاعی بھائی تھے۔ سب سے پہلے وہی دن کے وقت کعب سے ملے اور کہا کہ ہمارے صاحب یعنی حضور اقدس ﷺ ہم سے صدقہ مانگتے ہیں اور ہم تنگ دست ہیں براہ نوازش ہمیں وسق دو وسق غلہ دیجئے کعب یہ سن کر خوشی سے پھول گیا اور بولا کہ ابھی کیا ہوا ہے۔ وہ دن دور نہیں ہے جب تم بیزار ہو کر اسے چھوڑ دو گے۔

ابونائلہ۔ خیر اب تو محمد کی اتباع اختیار کر چکے ہیں۔ دیکھنا یہ ہے کہ اس سلسلے کا انجام کیا ہوتا ہے۔ تم یہ بتاؤ کہ قرض دو گے کہ نہیں۔

کعب۔ دے دوں گا بشرطیکہ کوئی چیز رہن رکھو۔

ابونائلہ۔ کیا چیز؟

کعب۔ اپنی عورتیں رہن رکھ دو۔

ابونائلہ۔ تمہارے حسن و جمال کے سبب ہمیں اپنی عورتوں پر اعتماد نہیں ہے۔

کعب۔ پھر بچے رہن رکھ دو۔

ابونائلہ۔ اس سے تو ہم عرب میں بدنام ہو جائیں گے کہ وسق دو وسق غلے کے لیے بچے رہن رکھ دیئے۔ البتہ ہتھیار رہن رکھ سکتے ہیں حالانکہ ہمیں ان کی آج کل بہت ضرورت ہے۔

کعب اس پر راضی ہو گیا۔ ابونائلہ نے واپس آکر رفیقوں کو سب کچھ بتا دیا۔ چاندنی رات میں یہ سب نکل کر کعب کے قلعے کے پاس پہنچے اسے آواز دی۔ بیوی نے روکا کہ رات کو کہاں جا رہے ہو بولا کہ میرا بھائی ابونائلہ اور محمد بن مسلمہ ہیں۔ قلعہ سے باہر نکل کر تمام رفیق کعب کے ساتھ ٹہلتے رہے۔ کعب نے عطر لگا رکھا تھا جس کی لپٹیں دور دور تک جا رہی تھیں۔ محمد بن مسلمہ نے کہا تمہارے سر سے بڑی عمدہ خوشبو آرہی ہے اجازت دو تو ذرا سونگھ لوں۔ کعب نے کہا کہ سونگھ لو پس اس کا سر پکڑتے ہی ساتھیوں سے کہا کہ اب اسے ختم کر دو۔ چنانچہ تلواریں اس پر پڑیں اور وہ ختم ہو گیا۔ جانبازوں نے سر کاٹ لیا۔ مرتے وقت کعب نے اس زور سے چیخ ماری کہ اردگرد کے یہودی قلعوں میں آگ روشن ہو گئی۔ اسی وقت ابونائلہ اور محمد بن مسلمہ اور دوسرے ساتھی لمبا چکر لگاتے ہوتے مدینہ منورہ پہنچے اور رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں مہم کے کامیاب انجام کی کیفیت پیش کر دی۔

یہودی دوسرے روز کعب کے مارے جانے کی شکایت لے کر بارگاہ رسالت میں حاضر ہوئے۔ رسول اللہ

نے کعب کی تمام فتنہ انگیزیاں ایک ایک کر کے گنا دیں۔ چنانچہ وہ چپ چاپ لوٹ گئے۔ یہ بھی واضح تھا کہ اگر کعب کو کھلم کھلا قتل کی کوشش کی جاتی تو جنگ چھڑ جاتی اور خدا جانے اس میں کتنی جانیں جاتیں۔ پھر کعب اسی طرح مارا گیا جس طرح وہ رسول اللہ ﷺ کی جان لینے کا منصوبہ بنا رہا تھا۔

رسول اللہ ﷺ نے یہودیوں کے وفد سے یہ بھی فرما دیا تھا کہ بہتر ہو اگر تم لوگ آئندہ امن و امان سے رہنے پر آمادہ ہو جاؤ اور فتنہ و فساد کی تخم ریزی سے بچ کر رہو۔ چنانچہ ان کی رضامندی سے نیا معاہدہ لکھا گیا جس میں یہودیوں نے امن و امان سے رہنے کا اقرار نئے سرے سے کیا ہے[1]

عہد شکنی کرنے والوں کا انجام

(۵۷) لہٰذا اگر تم ان کو لڑائی میں کہیں پاؤ تو تم ان کو ایسی سزا دو کہ پشت پناہی کرنے والے بھی حواس باختہ ہو جائیں تاکہ وہ بد عہدی کے انجام سے سبق سیکھ لیں۔ یعنی اگر یہ دغاباز غدار معاہدوں کو علانیہ پس پشت ڈال کر آپ کے مقابل میدان جنگ میں آ جائیں تو ان کو ایسی سخت سزا دیجئے جسے دیکھ کر ان کے پیچھے آنے والے یا ان کے بعد آنے والی نسلیں بھی عبرت حاصل کریں اور عہد شکنی کی کوئی جرأت نہ کر سکیں[2]

عربی میں ثقف کے معنے پالینے کے اور تشرید کے معنے تتر بتر کرنے کے آتے ہیں۔ امام رازی اور علامہ قرطبی نے یہی معنے لکھے ہیں۔

مدینے کے آس پاس رہنے والے یہودیوں نے جس طرح اپنے عہد و قرار توڑے تھے اس کا حال آپ پڑھ چکے ہیں اس سلسلے میں اب مسلمانوں کو ہدایات دی جا رہی ہیں۔

پہلی ہدایت یہ دی گئی ہے کہ اگر باوجود عہد کے یہ لوگ لڑائی کے لیے نکل آئیں اور تمہارے مقابلہ کے لیے تیار ہو جائیں یا تمہارے کسی دشمن کا ساتھ دے کر لڑائی کے میدان میں تمہارے سامنے آ جائیں تو پھر اس وقت انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ ڈٹ کر ان کا مقابلہ کیا جائے اور ان کا سر اچھی طرح کچل دیا جائے تاکہ ان کی دیکھا دیکھی کہیں وہ لوگ بھی اپنے معاہدوں سے نہ پھر جائیں جو ابھی تک میدان میں نہیں آ رہے ہیں اور انہیں ہمت نہ ہو کہ وہ تمہارے مقابلے کے لیے اتر آئیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی قوم سے ہمارا معاہدہ ہو اور پھر وہ اپنی معاہدانہ ذمہ داریوں کو پس پشت ڈال کر ہمارے خلاف کسی جنگ میں حصہ لے تو ہم بھی معاہدے کی اخلاقی ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو جائیں گے اور ہمیں حق ہو گا کہ اس سے جنگ کریں۔ نیز اگر کسی قوم سے ہماری لڑائی ہو رہی ہے اور ہم دیکھیں کہ دشمن کے ساتھ ایسی قوم کے افراد بھی شریک جنگ ہو گئے جس سے

---

[1] طبقات ابن سعد، ابوداؤد باب کیف کان اخراج الیہود

[2] افادات شیخ الاسلام

ہمارا معاہدہ ہے تو ہم کو ان کے قتل کرنے اور ان سے دشمن کا سا معاملہ کرنے میں ہرگز تامل نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ انھوں نے اپنی انفرادی حیثیت میں اپنی قوم کے معاہدے کی خلاف ورزی کر کے اپنے آپ کو اس کا مستحق قرار دے دیا ہے کہ ان کی جان و مال کے معاملہ میں اس معاہدہ کا احترام ملحوظ نہ رکھا جائے جو ہمارے اور ان کی قوم کے درمیان ہے۔ بتانا یہ ہے کہ ابھی تو یہ جو کچھ کر رہے ہیں پردے میں کر رہے ہیں۔ ان میں سے کوئی سامنے آنے کی جرأت نہیں کر رہا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی گروہ سامنے آنے کی جرأت کرے اور جنگ کے میدان میں تمہیں مل جائے تو ان کو ایسی سزا دو کہ ان کے پرخچے اڑ جائیں اور جو ان کے پیچھے بیٹھے ہوئے آنکھیں دکھا رہے ہیں ان کے بھی ہوش اڑ جائیں۔

پہلی آیت کے آخر میں ارشاد ہوا تھا ھم لا یتقون یعنی ان کے دلوں میں اللہ کا ڈر نہیں ہے۔ اس کے ذریعے اشارہ کیا تھا کہ دراصل ہر قسم کی اخلاقی خرابی کی جڑ یہی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ سے نڈر ہو جائے اسے جواب دہی اور اپنے بُرے انجام کا خوف نہ رہے۔ جو لوگ اللہ تعالیٰ سے نڈر ہو کر اور آخرت کی زندگی کو نظر انداز کر کے چاہتے ہیں کہ انسانیت کے لیے اخلاق اور انسانیت کا کوئی قانون بنالیں اور محض قانون کی قوت پر انسان کو بھلا مانس بنالیں وہ سخت دھوکے میں ہیں۔ اور ان کے تجربے ہمیشہ ناکام رہیں گے۔ افراد کو تو چھوڑیئے آج کل بڑی بڑی حکومتیں اپنے ذرا سے ملکی اور قومی فائدے کے لیے معاہدوں کو ٹھکرا دیتی ہیں۔ اور بڑے بڑے صلحنامے چارٹر اور معاہدے دھرے کے دھرے رہ جاتے ہیں۔ آج یہ حال ان قوموں کا ہے جو اخلاق اور انسانیت کے بڑے بڑے دعوی لے کر میدان میں آئی ہیں اور جو اپنے کو دنیا کے سامنے معلم اخلاق کی حیثیت سے پیش کرتی ہیں اس خرابی کی بنیادی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ھم لا یتقون ان کو کسی کے سامنے جواب دہی کا ڈر نہیں ہے۔ اغراض و مفادات کی پرستاری ان کا نصب العین ہے۔ اس اخلاقی فساد کی بنیادی وجہ ایک اور صرف ایک ہے۔ اور وہ یہ کہ ھم لا یتقون ان کو کسی کے سامنے جوابدہی کا اندیشہ نہیں۔

یہاں قرآن نے اس موضوع پر جو ہدایت دی ہے وہ یہ ہے کہ ایسے لوگ اگر باوجود عہد کے لڑائی کے لیے نکل آئیں اور تمہارے مقابلہ کی تیاری کریں یا تمہارے کسی دشمن کے حمایتی بن کر تمہارے سامنے آجائیں تو پھر انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے اور ان کی بھرپور سرکوبی کی جائے لیکن اس کارگذاری اور اس دردناک سزا کا مقصد انتقام لینا نہیں یا اپنے غصہ کو فرو کرنا نہیں بلکہ مقصد یہ اور صرف یہ ہے کہ لعلھم یذکرون شائد یہ صورتحال دیکھ کر ان کو کچھ عبرت ہو اور اپنے کیے پر پشیمان ہو کر اپنی اصلاح کر لیں اور آئندہ قتال کی جرأت نہ کریں اور معاہدوں کو توڑنے کا کوئی ارادہ نہ کریں۔

یہاں سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ اسلام جنگ کو بالذات پسند نہیں کرتا ہے۔ پسند کی چیز جنگ نہیں امن اور عافیت ہے صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ ایام جنگ ہی میں حضور اقدس ﷺ مسلمانوں کو یہ بات بتائی تھی کہ۔

لوگو! دشمن سے مڈبھیڑ کی تمنا نہیں نہ کرو۔ اللہ سے عافیت مانگو لیکن اگر تمہارا مقابلہ ہو جائے تو ڈٹ جاؤ۔ اور یقین کرو کہ جنت تلواروں کی چھاؤں میں ہے۔

جنگ تو ایک اجتماعی ضرورت ہے اس کا مقصد فساد و عدوان کو روکنا اور کلمۂ حق کا بول بالا کرنا ہے۔ اسلام میں جنگ کا مقصد انتقام اور غصہ کو فرو کرنا نہیں۔ خدا کی مخلوق کو ذلیل کرنا اور اموال و املاک پر قبضہ کرنا نہیں بلکہ اللہ کے بندوں کو برائی سے بچانا اور عدل و انصاف کی راہ پر لگانا ہے اسی بنیادی اور اہم بات کی طرف لعلھم یذکرون میں اشارا کیا ہے حافظ ابن کثیر نے سدی کے حوالہ سے یہی مطلب نقل کیا ہے۔ لعلھم یحذرون تاکہ وہ مستقبل میں ان برائیوں سے بچ کر رہیں۔ متاخرین شارحین قرآن میں سے قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے بھی یہی بات سمجھی ہے کہ یتعظون فلا ینقضون العھد آئندہ ان کو عبرت ہو اور عہد شکنی سے باز آجائیں۔

معاہدین کے بارے میں ضابطہ اخلاق

(۵۸) اور اگر تمہیں کچھ لوگوں سے دغا اور بدعہدی کا اندیشہ ہو تو تمہیں چاہیے کہ ان کا عہد ان کی طرف اس طرح پھینک کر تم اور وہ دونوں برابر ہو جاؤ بلاریب اللہ تعالیٰ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں فرماتا ہے۔ اور منکرین اس گھمنڈ میں نہ رہیں کہ وہ بازی لے گئے۔ بلاشبہ اللہ کو کبھی نہیں ہرا سکتے۔

پہلے یہ ہدایت دی گئی تھی کہ اگر کوئی معاہد فریق باوجود عہد کے تم سے مقابلہ کے لیے تیار ہو جائے یا تمہارے کسی دشمن کا ساتھ دے کر تمہارے مقابلہ میں آجائے تو پھر عدل و انصاف کا تقاضا یہی ہے کہ ان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے اور ان کو سنگین سزا دی جائے تاکہ مستقبل میں پھر وہ یہ حرکت نہ کریں۔ اب اس آیت میں یہ ہدایت دی جا رہی ہے کہ اگر کسی قوم کے بارے میں تمہیں یہ اندیشہ ہو کہ اس کی نیت اچھی نہیں ہے اور وہ بھی اس انتظار میں ہے کہ جب موقع پائے تمہیں نقصان پہنچائے۔ اگر حالات کا اندازہ کرنے کے بعد تم اس نتیجے پر پہنچے ہو کہ وہ قوم اپنے معاہدے کو ہرگز نہیں نبھائے گی تو تمہارا کام ہے کہ اسے صاف صاف بتا دو کہ اب ان کے اور تمہارے درمیان کوئی معاہدہ نہیں رہا ہے۔ تمہارے لیے کسی حال میں بھی جائز نہیں ہے کہ دوسرے فریق کو انجان رکھتے ہوئے دھوکہ کے ساتھ اس پر حملہ کر دو۔ خیانت کرنے والے کے ساتھ خیانت کرنا تمہارا کام نہیں اور تم دنیا میں برائیوں کی کاپی کے لیے نہیں آئے ہو دوسرے کے غلط کام تمہارے لیے غلط کو جائز نہیں بنا سکتے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر کسی وقت کسی معاہد کی جانب سے تمہیں خیانت یعنی عہد شکنی کا خطرہ پیدا ہو جائے تو یہ ضروری نہیں کہ تم معاہدہ کی پابندی کو بدستور قائم رکھو لیکن یہ بھی جائز نہیں کہ معاہدے کو صاف طور پر ختم کر دینے سے پہلے تم ان کے خلاف کوئی اقدام کرو بلکہ ایسے موقع پر ضروری ہے کہ ان کو آگاہ کر دیا جائے کہ تمہاری بدنیتی کا ہمیں علم ہو چکا ہے

یا تمہاری خلاف ورزی ہمیں معلوم ہو چکی ہے یا یہ کہ تمہارے معاملات ہمیں مشتبہ نظر آتے ہیں اس لیے آیندہ ہم معاہدے کے پابند نہیں ہیں۔ تم کو بھی اختیار ہے کہ ہمارے خلاف جو کارروائی چاہو کرو۔ آیت قرآنی کے الفاظ یہ ہیں۔

اما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علی سواء

یعنی اگر ایک گروہ ابھی میدان جنگ میں تو نہیں نکلا ہے لیکن اس سے تمہیں دغا کا اندیشہ ہے تو چاہیے کہ اس کا عہد اسی پر لوٹا دو یعنی عہد فسخ کر دو۔

اس طرح کہ دونوں جانب یکساں حالت میں ہو جائیں یعنی ایسا نہ کیا جائے کہ اچانک شکست عہد کی انہیں خبر دی جائے بلکہ پہلے سے ان کو خبردار کر دینا چاہیے تاکہ دونوں فریقوں کو یکساں طور پر تیاری کا وقت مل جائے مطلب یہ ہے کہ اگر ایک قوم نے علانیہ بدعہدی نہیں کی ہاں آثار و قرائن بتا رہے ہیں کہ عہد شکنی پر آمادہ ہے تو آپ کو اجازت ہے کہ مصلحت سمجھیں تو ان کا عہد واپس کر دیں اور معاہدہ سے دست برداری کی اطلاع کر کے مناسب کارروائی کریں تاکہ فریقین پچھلے معاہدات کے بارے میں شک و اشتباہ میں نہ رہیں دونوں مساویانہ طور پر آگاہ ہو کر اپنی تیاری اور حفاظت میں مشغول ہوں آپ کی جانب سے کوئی چوری اور خیانت نہ ہو۔ سب معاملہ صاف صاف ہو حق تعالیٰ خیانت کی کارروائی کو خواہ کفار کے ساتھ ہو پسند نہیں کرتا۔[1]

امام رازی نے تفسیر کبیر میں بتایا ہے کہ اگر معاہد فریق کی جانب سے تمہیں عہد شکنی کا اندیشہ ہو تو اسے اچھی طرح آگاہ کر دو کہ آج سے ہمارا تمہارا معاہدہ منسوخ ہے یعنی مسلمان سربراہ مملکت نے جن لوگوں سے معاہدہ کیا ہے اگر ان کی جانب سے عہد شکنی کے آثار ظاہر ہوں تو اور نقض عہد کا احتمال ہو تو معاہدہ کو ختم کرنے کی اطلاع کر دینی واجب ہے لیکن اگر معاہدے کی خلاف ورزی علانیہ ہو تو فسخ معاہدے کی اطلاع دینی ضروری نہیں ہے۔

حافظ ابن جریر نے اس آیت کی تشریح اس طرح کی ہے۔

اے پیغمبر اگر تمہیں اس دشمن سے نقض عہد کا اندیشہ ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہے تو لڑائی سے پہلے اس معاہد کو اطلاع دے دو کہ تمہارے اور اس کے درمیان معاہدہ ختم ہو گیا ہے تاکہ تم اور تمہارا دشمن دونوں یکساں طور پر باخبر ہو جائیں کہ معاہدہ ختم ہو چکا ہے اور جنگ کی تیاری کر لے اور آپ پر بدعہدی کا الزام نہ آئے۔

اس کے بعد ابن جریر نے بتایا ہے کہ علی سواء کا مطلب یہ ہے کہ تمہارا اور تمہارے دشمن دونوں کا علم اس موضوع پر برابر اور یکساں ہو جائے کہ دونوں ایک دوسرے کے محارب ہیں عہد و پیمان اور صلح و امان کا زمانہ ختم ہو چکا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

حافظ ابن کثیر نے علیٰ سواء کا مطلب یہ بتایا ہے کہ تم ان کو مطلع کر دو کہ معاہدہ ختم ہو چکا ہے تاکہ تمہارا اور تمہارے دشمن کا اس موضوع پر علم یکساں ہو جائے کہ تم ان سے اور وہ تم سے محارب ہیں معاہد نہیں ہیں اور تمہارے اور ان کے درمیان کوئی معاہدہ نہیں ہے متاخرین میں سے علامہ آلوسی نے آیت میں علیٰ سواء کی یہ تشریح کی ہے کہ ——— "یہ درمیان اور برابری کی راہ اختیار کرو اور وہ یہ ہے کہ تم ان کو صاف اور علانیہ بتا دو کہ تمہارے اور دشمن کے درمیان مدت معاہدہ ختم ہو چکی ہے۔ ان سے ایسی حالت میں جنگ نہ کرو کہ ان کو معاہدہ کے ختم ہونے کی اطلاع نہ ہو اور وہ سمجھ رہے ہوں کہ معاہدہ موجود ہے تمہیں خیانت تو درکنار شائبہ خیانت سے بھی بچنا چاہیے۔"

مشہور مفسر قرآن محدث امام بغوی نے معالم التنزیل میں علیٰ سواء کا یہی مطلب بتایا ہے کہ آپ لڑائی سے پہلے معاہدین کو فسخ معاہدے کی اطلاع کر دیں تاکہ فسخ معاہدے کے موضوع پر آپ کا اور آپ کے معاہدین کا علم یکساں اور برابر ہو جائے۔ بہر حال سب شارحین قرآن نے آیت کا مطلب یہی بتایا ہے کہ اگر آپ کو کسی معاہد جماعت سے خیانت اور بد عہدی کا اندیشہ ہو اور قرائن سے یہ محسوس ہو کہ لوگ در پردہ کوئی شرارت کرنا چاہتے ہیں تو آپ ان کو فسخ عہد کی اطلاع کر دیں اور اس اطلاع سے تم اور وہ دونوں علم میں برابر ہو جائیں۔ محض اندیشہ اور خطرہ کی بنا پر بغیر اطلاع دشمن پر حملہ کرنا ایک قسم کی خیانت ہے

آیت کی اس تشریح میں متقدمین اور متاخرین شارحین قرآن کے درمیان کوئی اختلاف نہیں۔ خبر نہیں صاحب تدبر قرآن نے آیت کے معنے میں یہ نکتہ آفرینی کیسے کر ڈالی کہ:

علیٰ سواء کا مفہوم یہ ہے کہ انہی کے برابر کا اقدام تم بھی کرنے کے مجاز ہو۔ اس سے یہ بات نکلتی ہے کہ اینٹ کا جواب پتھر سے نہ دینا چاہیے۔

آیت قرآنی کا نہ یہ منطوق ہے نہ مدلول ہے اور نہ مفہوم ہے۔ خبر نہیں صاحب تدبر قرآن اپنے مخاطبوں کو اس انداز سخن کے ذریعے کیا سمجھانا چاہتے ہیں؟ کیا وہ یہ بتانا چاہتے ہیں کہ قرآنی آیت کا اہل ایمان سے مطالبہ یہ ہے کہ میدان جنگ میں اگر تمہارا دشمن سے مقابلہ ہو تو اینٹ کا جواب پتھر سے نہ ہو بلکہ جواب ہم وزن ہو۔ کیا معاہدہ ختم ہونے کے آثار ان کی جانب سے دیکھ کر معاہدہ فسخ ہونے کی ان کو اطلاع دینا اینٹ کا جواب پتھر ہے۔ یہ اینٹ کا جواب پتھر نہیں بلکہ برابر کا اقدام ہے۔ اگر آپ ان کو اطلاع نہ دیں گے اور بغیر اطلاع ان پر حملہ آور ہوں گے یہ ہے اینٹ کا جواب پتھر سے یہ بات اس طرح کی جائے کہ دوسرے فریق کو نقصان نہ پہنچے یعنی وقت سے پہلے فسخ معاہدہ سے باخبر ہو جائے۔ اگر طیاری کرنا چاہے تو ہماری طرح اسے بھی طیاری کا پورا موقعہ ملے۔ اسی ارشاد الٰہی کے مطابق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسلام کی بین الاقوامی پالیسی کا یہ مستقل اصول مقرر کیا تھا۔

من کان بینه وبین قوم عهد فلا يشد عقده ولا يحلها حتى ينقضي امدها :

الیہم عہدھم علی سواء

جس کا کسی قوم سے معاہدہ ہوا سے چاہیے کہ معاہدے کی مدت ختم ہونے سے پہلے عہد کا بند نہ کھولے یا ان کا عہد برابری کو ملحوظ رکھتے ہوئے ان کی طرف پھینک دے۔

اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے زمانہ حکومت میں اسی قانون کو بین الاقوامی معاملات میں استعمال کیا۔ چنانچہ امام احمدؒ نے بروایت مسلم بن عامر بیان کیا ہے کہ جب امیر معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے روم پر چڑھائی کی تو اسلامی فوجوں اور رومی فوجوں میں ایک خاص مدت تک کے لیے صلح ہو گئی۔ جب معاہدے کی مدت ختم ہونے کے قریب ہوئی تو مسلمانوں نے سرحد پر صف بندی کر دی تاکہ مدت ختم ہو جانے پر بغیر اطلاع دیئے رومیوں پر حملہ کر دیں۔ اتفاقاً حضرت عنبسہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ گھوڑے پر سوار نعرۂ تکبیر لگاتے ہوئے آئے اور پکار کر کہنے لگے وفاء لاغدر عہد پورا کرو بدعہدی نہ کرو کیوں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب کسی قوم سے معاہدہ کیا جائے تو اس کی کوئی گرہ نہ باندی جائے نہ کھولی جائے یعنی اس میں کچھ کم کیا جائے نہ زیادہ کیا جائے اور یا اس کو پہلے سے خبر دے کر معاہدہ کو یک قلم رد کر دیا جائے یہ سن کر حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے فوجیں واپس بُلا لیں[1]

غور کی بات یہ ہے کہ حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معاہدہ کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہی تھی لیکن ان کا یہ فعل معاہدہ کی روح اور معنی کے خلاف تھا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابی نے اس کو بھی بدعہدی سمجھا اور امیر لشکر کو اس سے بھی روک دیا۔ اسی سے ہمارے فقہاء نے یہ بات سمجھی ہے کہ بدعہدی کرنا تو درکنار غدر اور بدعہدی کی صورت بھی حرام ہے۔

بہرحال اس آیت کی روشنی میں مسلمانوں کے لیے یہ کسی طرح جائز نہیں ہے کہ اگر کسی شخص یا گروہ سے ان کا معاہدہ ہو اور ان کو اس کے طرز عمل سے یہ شکایت لاحق ہو جائے کہ وہ عہد کی پابندی میں کوتاہی برت رہا ہے یا یہ اندیشہ ہو جائے کہ وہ موقعہ پاتے ہی ان سے غداری کرے گا تو ان کو اپنی جگہ یہ فیصلہ کر لینے کا ہرگز حق حاصل نہیں ہے کہ ان کے اور دشمن گروہ کے درمیان معاہدہ نہیں رہا بلکہ وہ اس کے پابند ہیں کہ جب ایسی صورت پیش آئے تو معاہد کے خلاف کوئی کارروائی کرنے سے پہلے اس کو صاف صاف بتا دیں کہ ہمارے اور تمہارے درمیان اب معاہدہ باقی نہیں رہا تاکہ فسخ معاہدہ کا فریقین کو یکساں علم ہو جائے۔

اس موقع پر یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اسلامی قانون اس آیت کی روشنی میں صرف ایک صورت میں بغیر اطلاع حملہ کرنے کو جائز قرار دیتا ہے اور وہ صورت یہ ہے کہ فریق ثانی علی الاعلان معاہدہ کو توڑ چکا ہو اور اس نے کھلم کھلا مسلمانوں

---

[1] سنن ابی داؤد باب الوفاء بالعہد۔

کے خلاف معاندانہ کارروائی کی ہو. ایسی صورت میں یہ ضروری نہیں ہے کہ ہم اس آیت قرآنی کے مطابق فسخ معاہدہ کا نوٹس دیں. بلکہ ہمیں اس کے خلاف بلا اطلاع کارروائی کرنے کا حق حاصل ہے۔ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ عہد شکنی کی اطلاع دینا اس وقت واجب ہے کہ جب قرائن اور علامات سے یہ معلوم ہو کہ وہ عہد شکنی کرنے والے ہیں لیکن اگر انہوں نے اعلانیہ عہد شکنی کر دی ہے تو پھر فسخ معاہدہ کی اطلاع کی ضرورت نہیں ہے۔ بغیر اطلاع کے ان پر حملہ کرنا جائز ہے جیسا کہ قریش نے جب صلح حدیبیہ کو توڑا تو حضور اقدس ﷺ نے بغیر اطلاع قریش پر حملہ کر دیا اور مکہ فتح کر لیا. خبر نہیں کہ مولانا دریابادی نے فقہاء کا نام لے کر یہ بات کیسے لکھ دی ہے کہ :

یعنی اس قوم نے بدعہدی عملاً نہ کی ہو لیکن قرائن سے صاف معلوم اور ظاہر ہو رہا ہو کہ وہ بدعہدی کرنے والے ہیں فانبذ الیھم علی سواء یعنی اس طرح اس عہد کے باقی نہ رہنے کی اطلاع اس فریق کو کر دیں فقہاء نے لکھا ہے کہ یہ امر واجب نہیں تخییری ہے اور امام کے اختیار تمیزی پر موقوف ہے [1]

حالانکہ فقہاء نے ایسی بات کہیں نہیں بتائی ہے۔ فقہاء تو غدر اور بدعہدی کی صورت کو بھی مسلمانوں کے لیے حرام قرار دیتے ہیں۔ انہوں نے صاف لکھا ہے کہ لابد من النبذ تحرزاً عن الغدر المنھی عنہ یعنی معاہدہ کو فسخ معاہدہ کی اطلاع دینی ضروری ہے اس غداری اور بدعہدی سے بچنے کے لیے جس سے اللہ سبحانہ نے منع کیا ہے[2]۔ بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ اطلاع کے لیے اس قدر عرصہ اور مدت شرط ہے جس میں اطلاع کا پہنچنا ممکن ہو۔ و یشترط مدۃ یبلغ خبر النبذ الی جماعتھم۔

جنگ میں بلند اخلاقی کا معیار

قرآن نے ہر معاملہ میں حتیٰ کہ جنگ میں بھی سچائی اور دیانت کا جو معیار قائم کیا ہے وہ کس قدر بلند ہے۔ زندگی میں کہیں کوئی گوشہ ایسا نہیں چھوڑا ہے جہاں اخلاقی کمزوری کو ابھرنے کا موقعہ دیا گیا ہو. جنگ و صلح کی حالت میں انسان کا نظام اخلاق دفعتہً بدل جاتا ہے ایک شخص بذات خود نہایت رحمدل ہے لیکن میدان جنگ میں جا کر نہایت بے رحم ہو جاتا ہے۔ ایک شخص ذاتی معاملات میں نہایت حلیم الطبع ہے. لیکن کسی فوج میں شامل ہو کر سخت مشتعل اور مغلوب الغضب ہو جاتا ہے ایک شخص امن و صلح کے زمانے میں نہایت صادق القول اور پابندِ عہد ہے لیکن زمانہ جنگ میں اتنا ہی غدار اور عہد شکن ہو جاتا ہے۔ ایک جماعت، ایک قوم، ایک ملک امن و سکون کے دور میں انسانیت کا بہتر سے بہتر نمونہ ہوتا ہے لیکن جنگی اغراض طامعانہ اقدامات اور حربی مصالح کے عہدِ فساد میں آ کر چارپایوں سے زیادہ وحشی اور درندوں

[1] تفسیر ماجدی

[2] الاختیار لتعلیل المختار

بے پناہ خونخوار ہو جاتا ہے۔ اسی بنا پر حکما کہتے ہیں کہ سیاست اپنے پہلو میں دل نہیں رکھتی ہے ـــــ لیکن دنیا میں صرف اسلام ہی ایک ایسی زندہ ہستی ہے۔ جو اپنے پہلو میں دل اور دل میں ایک غیر ممکن التغیر اخلاقی طاقت رکھتی ہے۔ اس پر عوارض خارجیہ کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ ظاہر و باطن شخصیت و جمہوریت افتراق و اجتماع جنگ و صلح اس کے لیے تمام حالتیں یکساں ہیں۔ اس کا معیار اخلاق جس طرح امن و صلح کی حالت میں قائم رہا اسی طرح استحکام و استواری کے ساتھ جنگ کے سیلاب اور آتش و خون کے طوفان میں بھی قائم و ثابت رہا۔

السید رشید رضا نے یہ بات بالکل برموقعہ لکھی۔

اس آیت اور اس کے ہم معنے احادیث و آثار میں یہ بات پوری وضاحت اور قوت سے بتا دی گئی ہے کہ اسلام عین جنگ کی حالت میں بھی حق و عدل اور اخلاق کا نگران ہے موجودہ سیاسی دنیا میں اور ماضی میں سیاسی قوانین میں اسلام کے قانونِ عدل کی کوئی مثال نہیں ہے۔ بڑے افسوس اور دکھ کی بات ہے کہ اس کے باوجود عیسائی دنیا اسلام کو بے انصافی کا طعنہ دیتی ہے اور حضور اقدس ﷺ کی پاکیزہ اور بے داغ زندگی کو اپنی حرف گیریوں کا نشانہ بناتی ہے۔

قرآن حکیم کی یہ آیت جن سیاسی قوانین کی نشاندہی کر رہی ہے آیئے ان کا بھی مطالعہ کر لیجئے۔

۱۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ حکومتِ اسلامی کا سربراہ اگر مسلمانوں کی اجتماعی مصالح کے پیشِ نظر کافروں کی حکومت سے معاہدہ کرنا چاہے تو اسے ایسا کرنے کی اجازت ہے۔ اور اس معاہدہ کا ایفا واجب ہے بشرطیکہ کافروں کی جانب سے بدعہدی کے آثار نہ ہوں۔

۲۔ اگر بدعہدی کے آثار محسوس ہوں تو فسخ عہد کرنا جائز ہے اور ان کو فسخ عہد کی اطلاع ضروری ہے تاکہ مسلمانوں پر بدعہدی کا الزام نہ ہو۔ اور یہ الزام کافروں کے لیے اسلام سے دوری کا ذریعہ بن جائے۔

۳۔ فسخ عہد کی اطلاع کے لیے اتنی مدت ضروری ہے کہ ان کو خبر ہو جائے۔

۴۔ غداری، دغابازی اور بدعہدی انسان کو اللہ تعالیٰ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے۔ اور اس کی ناخوشی کا سبب ہے

۵۔ ایفائے عہد میں مسلم و کافر میں کوئی فرق نہیں دونوں برابر ہیں امام بیہقی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے شعب الایمان میں میمون بن مہران کا یہ بیان نقل کیا ہے کہ تین باتوں میں مسلمان اور کافر کا حکم ایک ہے۔

۱۔ جس سے تم معاہدہ کرو اس کو پورا کرو مسلمان ہو یا کافر کیونکہ عہد اللہ کا ہے۔

۲۔ رشتہ دار سے صلہ رحمی کرو مسلمان ہو یا کافر۔

۳۔ جب کوئی تمہارے پاس امانت رکھے اس کی ادائیگی کرو مسلمان ہو یا کافر۔

حدیث میں ہے کہ قیامت کے روز ہر غدار کا ایک جھنڈا ہوگا یعنی اس سے اس کی بد عہدی اور غداری کی تشہیر ہوگی۔

مالکیہ نے اس سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ مسلمان اگر سربراہ مملکت سے بد عہدی کرے تو اس کے جرم کی سنگینی دوسروں کے مقابلہ میں زیادہ ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ ولا یحسبن الذین کفروا سبقوا انھم لا یعجزون۔ کافر یہ ہرگز خیال نہ کریں کہ وہ بچ گئے ہیں بلاشبہ وہ اللہ کو کبھی ہرا نہیں سکتے۔ نیز عہد کا جو حکم اوپر مذکور ہوا ممکن تھا کہ کافر اس کو مسلمانوں کی سادہ لوحی پر محمول کر کے خوش ہوتے کہ جب ان کے یہاں خیانت و غدر جائز نہیں تو ہم کو خبردار اور بیدار ہونے کے بعد پورا موقع اپنے بچاؤ اور مسلمانوں کے خلاف تیاری کرنے کا ملے گا اس کا جواب دیا ہے کہ کتنی ہی تیاری اور انتظام کرو جب مسلمانوں کے ہاتھوں خدا تم کو مغلوب اور رسوا کرنا اور دنیا یا آخرت میں سزا دینا چاہے گا تو تم کسی تدبیر سے اس کو عاجز نہ کر سکو گے نہ اس کے احاطہ قدرت و تسلط سے نکل کر بھاگ سکو گے گویا مسلمان کو تسلی کر دی کہ وہ خدا پر بھروسہ کر کے اس کے احکام کا امتثال کریں تو سب پر غالب آجائیں گے گے۔ [1]

مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے ارشاد ہوا تھا کہ اگر معاہدے کی خلاف ورزی کی علامات ظاہر ہو جائیں تو تمہیں بھی معاہدہ فسخ کرنے کی اجازت ہے لیکن تمہیں اس فسخ معاہدے کی دشمن کو اطلاع دینی چاہیے چونکہ وہ چپکے چپکے معاہد ہوتے ہوئے معاہدہ کی خلاف ورزی کر رہا ہے اس لیے تم بھی ایسا ہی کرو۔ اس کی اجازت تمہیں نہیں ہے تمہیں فسخ معاہدے کی اطلاع کر دینی چاہیے۔ کیونکہ اطلاع نہ دینا اور خاموشی سے معاہدہ کی خلاف ورزی کرنا خیانت ہے اور اللہ خیانت کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔ اخلاقی اعتبار سے مسلمانوں کی جانب سے اس طرز عمل کا مظاہرہ اگرچہ بہت بڑی اخلاقی برتری ہے لیکن سیاسی اعتبار سے دشمن مسلمانوں کے اس موقف کو کمزوری پر محمول کر سکتا ہے۔ ظاہر ہے کہ فسخ معاہدہ کی دشمن کو اطلاع دینا اسے ہوشیار اور بیدار کر دینا ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ میدان مسلمانوں کے ہاتھ نہ رہے گا۔ اسی شبہ کو اس آیت میں دور کیا ہے کہ واقعی ایسا کرنا بظاہر سیاسی خسارہ ہے لیکن اگر تم میدانِ جنگ میں اخلاق کی نمائندگی کرو گے تو وہ کبھی کامیاب نہ ہوں گے۔ بلکہ مقہور و مغلوب ہی رہیں گے۔

اس سے معلوم ہوا کہ سیاست میں قرآن نے جو اخلاقی برتری کا پلڑا اونچا رکھا ہے اور عین میدانِ جنگ میں مسلمانوں کو مخالفین کے مقابلے میں عہد کی پابندی کو ضروری اور خیانت کو حرام قرار دیا ہے تو اس کی وجہ کوئی مصلحت یا مسلمانوں کی بیچارگی نہیں بلکہ اس کی علت دراصل یہ ہے کہ مسلمان دنیا میں امۃ وسط بہترین امت اور خیر امت سب سے اچھی امت بن کر

[1] افادات شیخ الاسلام

آتے ہیں ان کے بہتر ہونے اور خیر ہونے کا تقاضا ہی یہ ہے کہ ہر حال میں دنیا میں خیر کی نمائندگی کریں۔ کمزوری کے زمانہ میں تو سب اخلاق کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مسلمانوں کو حکم ہو رہا ہے کہ طاقتور ہو کر عدل و انصاف خیر و صلاح کا مظاہرہ کرو۔ برائی میں کسی کی کاپی نہ کرو۔ خوب سمجھ لو کہ دشمن بچ کر نہیں جا سکتا اور وہ تمہیں ہرا نہیں سکتا۔

یہاں یہ بات عام شارحین نے لکھی ہے کہ اس آیت میں دو قراتیں ہیں ایک صیغہ خطاب کے ساتھ لاتحسبن الذین کفروا سبقوا اس کا مطلب تو کھلا ہے کہ اے پیغمبر تم ان کافروں کے بارے میں یہ خیال نہ کرو کہ بچ گئے ہیں اس صورت میں الذین کفروا مفعول اوّل ہے اور سبقوا مفعول دوم ہے اور انھم لایعجزون ایک اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ دوسری قرارت یعنی لایحسبن میں الذین کفروا فاعل ہے اور لایحسبن کا مفعول اوّل انفسھم محذوف ہے اور دوسرا سبقوا مذکور ہے اور مطلب یہ ہے کہ کافر اپنے تئیں بچا ہوا خیال نہ کریں۔ یا یوں کہہ دیجئے کہ فاعل محذوف ہے ولایحسبن حاسب الذین کفرا سبقوا مطلب یہ ہے کوئی خیال کرنے والا کافروں کے بارے میں ہرگز یہ خیال نہ کرے کہ وہ اپنے معاہدوں میں خیانت کی وجہ سے ہماری گرفت سے بچ گئے۔

قرآن میں دوسرے مواقع پر بھی اس قسم کی تعبیرات آئی ہیں مثلاً لاتحسبن الذین کفروا معجزین فی الارض۔ اور ام حسب الذین اجترحوا السیٔات ان یسبقونا۔ حافظ سیوطی نے لکھا ہے کہ اس آیت میں الذین کفروا سے وہ لوگ مراد ہیں جو بدر کے دن بچ گئے تھے لیکن آیاتِ قرآنی کا سیاق بتا رہا ہے کہ خاص لوگ مراد نہیں ہیں۔ قاضی بیضاوی کا میلان بھی یہی ہے۔

وَاَعِدُّوْا لَهُمْ مَّا اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ قُوَّةٍ وَّمِنْ رِّبَاطِ الْخَيْلِ
تُرْهِبُوْنَ بِهٖ عَدُوَّ اللّٰهِ وَعَدُوَّكُمْ وَاٰخَرِيْنَ مِنْ دُوْنِهِمْ ۚ
لَا تَعْلَمُوْنَهُمْ ۚ اَللّٰهُ يَعْلَمُهُمْ ۭ وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ شَيْءٍ
فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ يُوَفَّ اِلَيْكُمْ وَاَنْتُمْ لَا تُظْلَمُوْنَ ﴿۶۰﴾ وَاِنْ
جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا وَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ ۭ اِنَّهٗ هُوَ السَّمِيْعُ
الْعَلِيْمُ ﴿۶۱﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْٓا اَنْ يَّخْدَعُوْكَ فَاِنَّ حَسْبَكَ
اللّٰهُ ۭ هُوَ الَّذِيْٓ اَيَّدَكَ بِنَصْرِهٖ وَبِالْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۶۲﴾ وَاَلَّفَ
بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ ۭ لَوْ اَنْفَقْتَ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا مَّآ اَلَّفْتَ
بَيْنَ قُلُوْبِهِمْ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ اَلَّفَ بَيْنَهُمْ ۭ اِنَّهٗ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۶۳﴾

اور مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں ہے زیادہ سے زیادہ طاقت پیدا کر کے اور گھوڑے طیار کر کے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے سامان مہیا رکھو۔ اس طرح تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو ہراساں کر سکو گے اور کچھ اور دشمنوں پر بھی تمہاری دھاک بیٹھ جائے گی جن کا تمہیں علم نہیں۔ اللہ ان کو خوب جانتا ہے اور دیکھو اللہ کی راہ میں تم جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا مل جائے گا اور تمہاری کوئی حق تلفی نہ ہوگی۔ اور اے پیغمبر اگر آپ کے مخالفین صلح و آشتی کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہو جائیے اور مستقبل کے لیے اللہ پر بھروسہ کیجئے اللہ ہی کی ذات سب کچھ سننے اور جاننے والی ہے۔ اور اگر اے پیغمبر وہ آپ کو دھوکا

دینا چاہیں گے تو بلاشبہ اللہ سبحانہ آپ کو کافی ہے وہی تو ہے جس نے ماضی میں اپنی مدد سے اور اہلِ ایمان کی عددی طاقت سے آپ کو قوت دی۔ اور اہلِ ایمان کے دلوں میں باہم اُلفت و محبت کی سرشاریاں نمایاں کیں۔ اگر آپؐ رُوئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر دیتے پھر بھی آپؐ ان کے دِلوں میں مُحبّت کی سرشاریاں نہ پیدا کر سکتے لیکن یہ تو اللہ کی ذات ہے جس نے ان میں باہم مُحبّت و اُلفت کے جذبات نمایاں کیے۔ بلاشبہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔

مُفردات کے معانی

رباط الخیل ۔ رباط باندھنا سرحد پر چوکی دینا۔ باب مفاعلت کا مصدر ہے اور مجرد میں ربط کا بھی مصدر ہے جس کے معنے مضبوط اور مستحکم باندھنے کے ہیں۔ نیز اسم بھی آتا ہے۔ اس چیز کے معنے میں جس کے ساتھ دل یا گھوڑے باندھے جائیں۔ اور اس جگہ کے معنے میں بھی جہاں دشمن کے دفاع کے لیے لشکر کا پڑاؤ ہوتا ہے جیسے مورچہ چھاؤنی۔ یہاں اس کا استعمال مصدر ہی کے معنے میں ہوا ہے گھوڑے باندھنا۔ علامہ خازن لکھتے ہیں۔

رابطہ کی اصل یہ ہے کہ ادھر کے لوگ اپنے گھوڑے اور ادھر کے لوگ اپنے گھوڑے اس طرح باندھ لیں کہ فریقین میں سے ہر ایک دوسرے سے جنگ کے لیے تیار رہے۔ بعد میں ہر اس شخص کو جو سرحد پر اقامت گزین ہو کر سرحد پار کرے خواہ اس کے پاس سواری ہو یا نہ ہو۔

کچھ بزرگوں نے اسے مشترک قرار دیا ہے اس لیے رباط الخیل میں اضافت بیانی ہوگی۔ جیسے عین الشمس۔

الخیل۔ گھوڑوں کو کہتے ہیں۔ گھوڑ سوار کو بھی کہتے ہیں۔

سلم۔ صلح، انقیاد، اور طاعت کو کہتے ہیں۔ تسلیم سے بنا ہے۔ عربی میں یہ بھی مؤنث استعمال ہوتا ہے اس کی ضد حرب بھی مؤنث استعمال ہوتا ہے ایک شاعر نے دونوں کو مؤنث استعمال کیا ہے۔

السلم تاخذ منها ما رضيت به
والحرب تكفيد من انفاسها جوع

خدع۔ دھوکا دینا فریب دینا اصل ارشاد میں ان یریدوا ان یخدعوك آیا ہے۔ شرط کی جزا محذوف

ہے یعنی لمصالحھم ۔ آگے اس کی دلیل ہے۔

حسبك ۔ حسب صفت مشبہ بمعنے کافی اور مددگار کاف محل جر میں ہے

الزجاج نے اسے اسمائے افعال میں سے بتایا ہے لیکن ابوحیان اندلسی نے اسے غلط قرار دیا ہے۔ کافی کے معنے

میں اسے شعراء نے بھی استعمال کیا ہے۔

اذا کانت الھیجاء وانشقت العصا

فحسبك والضحاك سیف مھند

اَیَّدَ ۔ اید سے ہے ۔ تائید کے معنے قوت دینے کے ہیں اید قوت اور طاقت کو کہتے ہیں بے شمار موقعوں پر قرآن

میں ان معنے میں آیا ہے اَلَّفَ الف مادہ ہے یہ تالیف سے ماضی ہے اس کے معنے اس نے محبت ڈالی۔

فوج اور اس کے لیے چھاؤنی بنانے کا حکم

نویں پارے کے آخر میں مسلمانوں کو حکم ہوا تھا کہ عدل وحق کی راہ روکنے والوں سے مسلح جنگ کی جائے اور اس وقت تک کی جائے جب تک وہ اس راہ کو کھلا چھوڑ کر ہٹ نہ جائیں اسے قتال کہتے ہیں۔ عملی طور پر یہ جہاد کی سب سے اعلیٰ شکل اور صبر آزما ہم ہے لیکن انسانیت میں حق و عدل کے بقاء کے لیے بہت ضروری ہے۔ نویں پارے ہی میں اس قتال کی غایت بھی بتا دی گئی تھی وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ یعنی جنگ کا حکم اس لیے دیا گیا ہے تاکہ اللہ کا نام لینے اور اس کے احکام کے مطابق زندگی گذارنے کی راہ صاف ہو جائے اور فتنے کی حالت ختم ہو جائے۔

یہاں بتایا جا رہا ہے کہ کفر وایمان کی یہ آویزش وقتی نہیں بلکہ دائمی ہے۔ اس کا مقابلہ کرنے کے لیے وقتی اور انفرادی محنت کارگر اور مفید نہیں بلکہ اجتماعی اور دائمی محنت کی ضرورت ہے۔ اس دائمی اور اجتماعی محنت کی قرآن نے یہاں صورت یہ بتائی اعدوالھم مااستطعتم من قوۃ ومن رباط الخیل کہ اپنی بساط کے مطابق طاقت کو فراہم کیا جائے اور اسے منظم کیا جائے۔ اس کے لیے فوج میں انفرادی قوت کے ساتھ مادی قوت بہم پہنچائی جائے۔ پھر اس انفرادی اور مادی طاقت کی پوری طرح تنظیم کی جائے۔ ایسا حکم کیوں ہے اس لیے کہ اسلام ساری دنیا کے لیے ہے وہی دنیا میں حق اور آخرت میں شرط نجات ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے یا باطل ہے یا اللہ کے نزدیک ناقابل پذیرائی ہے۔ مسلمان اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ اسلام کی اس حیثیت کے تقاضے پورے کریں اسے ساری دنیا تک پہنچائیں۔ اس کے حق ہونے کی شہادت دیں اور ہر ممکن طریقے سے اس بات کی کوشش کریں کہ خدا کے بندے فی الواقع اس کے بندے اور فرمانبردار بن جائیں۔

اور یہ کام اجتماعی محنت کے بغیر ہو نہیں سکتا۔ اجتماعی محنت کی صورت اجتماعی سیاسی نظام کے بغیر وجود میں نہیں آسکتی۔ اس لیے بدر کی جنگ کے بعد مسلمانوں کو حکم ہو رہا ہے کہ اب یہ کام پوری سیاسی تنظیم کے ذریعے کیا جائے فوجی قوت پیدا کی جائے سامان جنگ فراہم کیا جائے اور فوج میں نظم و نسق کے لیے باقاعدہ چھاؤنیاں بنائی جائیں۔ صحابہؓ نے اس آیت کی روح کو سمجھ کر اپنے کو ہر پہلو سے منظم کیا۔ اس کے نتیجے میں وہ پورے عالم پر بھاری ہو گئے اور دنیا میں کہیں بھی کسی غیر اسلامی نظام کو نافذ رہنے کا حقدار تسلیم نہیں کیا۔

فوج اور سامانِ جنگ کی تیاری

(۴) اور مسلمانو! جہاں تک تمہارے بس میں ہے زیادہ سے زیادہ طاقت پیدا کر کے اور گھوڑے تیار کر کے دشمنوں کے مقابلہ کے لیے سامان مہیا رکھو۔ یعنی خدا پر بھروسہ کرنے کے یہ معنے نہیں کہ اسباب ضروریہ مشروعہ کو ترک کر دیا جائے نہیں۔ مسلمانوں پر فرض ہے کہ جہاں تک قدرت ہو، سامانِ جہاد فراہم کریں۔ نبی کریم ﷺ کے عہد مبارک میں گھوڑے کی سواری، شمشیر زنی اور تیر اندازی وغیرہ کی مشق کرنا سامانِ جہاد تھا، آج بندوق، توپ، ہوائی جہاز، آبدوز کشتیاں، آہن پوش کروزر وغیرہ تیار کرنا اور استعمال میں لانا اور فنونِ حربیہ کا سیکھنا بلکہ ورزش وغیرہ کرنا سب سامانِ جہاد ہے۔ اسی طرح آیندہ جو اسلحہ و آلاتِ حرب و ضرب تیار ہوں انشاء اللہ وہ سب اس آیت کے منشا میں داخل ہیں باقی گھوڑے کے متعلق تو آپ خود بھی فرما چکے ہیں الخیل معقود فی نواصیھا الخیر الی یوم القیامۃ قیامت تک کے لیے گھوڑوں کی پیشانیوں میں خیر رکھ دی گئی ہے۔ اور احادیث میں ہے کہ جو شخص گھوڑا جہاد کی نیت سے پالتا ہے اس کے کھانے پینے بلکہ ہر قدم اٹھانے میں اجر ملتا ہے اور اس کی خوراک وغیرہ تک قیامت کے دن ترازو میں وزن کی جائے گی [1]

مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس سامانِ جنگ اور ایک مستقل فوج ہر وقت تیار رہنی چاہیے تاکہ بوقت ضرورت فوراً جنگی کارروائی کر سکو۔ یہ نہ ہو کہ خطرہ سامنے آنے پر گھبراہٹ میں جلدی جلدی رضاکار اور اسلحہ، سامانِ رسد جمع کرنے کی کوشش کی جائے اور اس اثنا میں کہ یہ تیاری مکمل ہو دشمن اپنا کام کر جائے۔ آیت میں ما استطعتم جو کچھ تمہارے بس میں ہو لا کر بتا دیا کہ یہ تو ممکن نہیں ہے کہ کوئی جماعت اس طرح کا سرو سامان کر سکے جو ہر اعتبار سے مکمل ہو اس لیے فرمایا کہ اپنے مقدور کے مطابق جو کچھ کر سکتے ہو کر لو۔ اور ادائے فرض کے لیے آمادہ ہو جاؤ یہ بات نہیں کہ جب تک

[1] افادات شیخ الاسلام

دنیا بھر کا سازو سامان نہ ہو۔ دفاع کا کام نہ کیا جائے اور بے بسی کا عذر کرتے رہیں۔

دوسرا لفظ من قوۃ نکرہ لاکر بتایا ہے کہ ہر قسم کی قوت فراہم کرنی چاہیے عددی قوت، سامانِ جنگ کی قوت آلاتِ حرب کی قوت رسل و رسائل کی قوت حمل و نقل کی قوت اور رسد کی قوت لفظ قوت سب کو شامل ہے۔ الاان القوۃ الرمی میں تیر اندازی کو قوت بتایا ہے۔ یہ اس دور کی بات ہے آج کے دور میں صرف تیر اندازی قوت نہیں آج قوت کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ یہ ایک باقاعدہ فن ہے اور ہر روز اس میں نت نئی ترقی ہو رہی ہے۔ علامہ محمود آلوسی نے درست لکھا ہے؛

آج تیر اندازی مقصد برآری کے لیے مفید نہیں ہے۔ آج تیر کی جگہ بندوق اور توپ نے لے لی ہے۔

ظاہر ہے کہ بندوق اور توپ کا مقابلہ تیر سے نہیں ہو سکتا۔

صحیح مسلم میں حضرت عقبہ بن عامر کے حوالہ سے جو ارشادِ نبوت آیا ہے کہ آپؐ نے برسرِ منبر فرمایا کہ اعدوالھم مااستطعتم من قوۃ من قوۃ سے مراد تیر اندازی ہے۔

الا ان القوۃ الرمی　　الا ان القوۃ الرمی

الا ان القوۃ الرمی تو اس کا منشا یہی بتانا ہے کہ دفاع میں جو چیز وقت کا تقاضا پورے کرے اس کو اپنانا قوت ہے آج تیر انداز کی نیابت بندوق کا نشانہ۔ توپ کا گولہ ہوائی جہازوں سے بمباری اور اس کے علاوہ وہ تمام چیزیں جو اس مقصد کو پورا کرتی ہوں۔ ارشادِ نبوت بطور تمثیل ہے کیونکہ حضورؐ کے زمانے میں دشمن کی مدافعت کا یہی سب سے بڑا ذریعہ تھا۔ اس زمانے میں تیر کی جگہ بندوق کی گولی، توپوں کی گولہ باری۔ جہازوں کی بمباری نے لے لی۔ احادیث میں جو فضائل تیر اندازی کے بیان ہوئے ہیں آج وہی فضائل بندوق۔ توپ۔ ٹینک اور بمباری کے ہیں۔ آگے ارشاد ہے ومن رباط الخیل اس سے مراد وہ گھوڑے ہیں جو خاص جنگ کے لیے تربیت دیئے جاتے ہیں اور اسی غرض کے لیے محفوظ اور تیار رکھے جائیں۔ جنگ میں ہر قسم کے گھوڑے کام نہیں آتے ہیں۔ اس زمانے کی جنگ میں گھوڑوں ہی کی خاص اہمیت تھی اور عرب کی مخصوص آب و ہوا کے لحاظ سے ان کے یہاں گھوڑوں کی تربیت کا خاص اہتمام بھی تھا اسی چیز کی قرآن یہاں مسلمانوں کو ہدایت دے رہا ہے کہ جہاد کے لیے تیر اندازی کی تنظیم کرو اور تربیت دیئے ہوئے گھوڑے بھی تیار کرو۔ یہ تو منطوق قرآن ہے اس کے مدلول میں یہ بات خود بخود داخل ہے کہ تیر انداز کے لیے تیر انداز اور گھوڑوں کے لیے شہسواروں کی تنظیم کرو کیونکہ صرف گھوڑا اور صرف تیر تو بغیر شہسوار اور تیر انداز کے بے معنی ہے۔ تیاری کرنے کا مطلب یہ ہے کہ افرادی قوت اور سامانِ جنگ کی باقاعدہ تنظیم کرو اب تک جو کچھ ہوتا رہا ہے وہ تو یہ ہے کہ جب کسی جنگی مہم کی صورت پیش آتی عرب کے عام دستور کے مطابق ہر سپاہی جو سامان اسے میسر ہوتا اس کو لے کر تیار ہو جاتا۔ لیکن اس آیت میں مسلمانوں

کو ہدایت کی جا رہی ہے کہ اپنی فوجی قوت نفری کے اعتبار سے بھی اور اسلحہ و سامان جنگ کے اعتبار سے زیادہ سے زیادہ بڑھائیں اس زمانے میں گھوڑوں کی وہی اہمیت تھی جو ہمارے زمانے میں ٹینک ہوائی جہاز آبدوز کشتیوں کو حاصل ہے۔ علامہ خفاجی کی یہاں یہ نکتہ آفرینی خوب ہے کہ :

یہاں تیاری کا حکم اس لیے دیا ہے کہ بدر میں تیاری نہ تھی اتفاقیہ جنگ کی صورت پیش آگئی تھی۔ اللہ کی مدد نے فتح کی صورت بنا دی بتایا ہے اور تنبیہ کی ہے کہ اللہ کی جانب کی مدد بغیر مادی تیاری کے ہر وقت نہ آئے گی۔

بہر حال آیت قرآنی کا مطالبہ ہے کہ دفاع کے لیے دفاعی قوتوں کی تنظیم کرو اس میں افرادی قوت کے ساتھ سامان جنگ، خوراک بخوبی داخل ہیں۔ مفتی محمد شفیع نے یہ بات خوب فرمائی ہے۔

اس میں تمام جنگی سامان اسلحہ، سواری وغیرہ داخل ہیں۔ اپنے بدن کی ورزش، فنون حربیہ کا سیکھنا، قرآن عزیز نے اس جگہ اس زمانہ کے مروجہ ہتھیاروں کا ذکر نہیں کیا بلکہ قوت کا عام لفظ لاکر اس طرف اشارا کر دیا کہ یہ قوت ہر زمانے اور ہر ملک و قوم کے اعتبار سے مختلف ہو سکتی ہے اس زمانے کے اسلحہ تیر تلوار اور نیزے تھے اس کے بعد بندوق اور توپ کا زمانہ آیا اور آج بموں اور راکٹوں کا وقت ہے لفظ قوت ان سب کو شامل ہے اس لیے آج کے مسلمانوں کو بقدر استطاعت ایٹمی قوت ٹینک اور لڑاکا طیارے آب دوز کشتیاں جمع کرنی چاہئیں۔ کیونکہ یہی قوت کے مفہوم میں داخل ہیں۔ اور اس کے لیے جس علم و فن کو سیکھنا پڑے۔ ان سب کا حکم جہاد کا ہے بشرطیکہ مقصد اسلام اور مسلمانوں کا دفاع ہو۔

اسی لیے عام شارحین قرآن نے قوۃ کی تفسیر میں بتایا ہے کہ ہر وہ جو جنگ میں طاقتور بنائے خواہ کچھ ہو۔ قاضی بیضاوی علامہ آلوسی، علامہ شوکانی وغیرہ سب ایک زبان ہیں۔

حضرت مولانا محمد ادریس نے اس آیت کے تقاضے کو سمجھ کر دنیا بھر کی اسلامی حکومتوں کو مشورہ دیا ہے کہ :

اس آیت کی رو سے مسلمان حکومتوں پر جدید اسلحہ کی تیاری اور ان کے کارخانوں کا قائم کرنا فرض ہوگا۔ اس لیے کہ اس آیت میں قیامت تک کے لیے ہر زمان و مکان کے مناسب قوت و طاقت کی فراہمی کا حکم دیا گیا ہے۔ جس طرح کافروں نے تباہ کن ہتھیار تیار کیے ہیں۔ ہم پر بھی اسی قسم کے تباہ کن ہتھیاروں کا تیار کرنا فرض ہوگا تاکہ کفر و شرک کا مقابلہ کر سکیں۔

ایک شبہ کا ازالہ

یہاں کچھ ان لوگوں کو جن کی اسلامی قانون پر نگاہ گہری نہیں ہے یہ شبہ ہوا ہے کہ اس دور میں جس قدر آتشیں اسلحہ

تیار ہو رہا ہے بندوق کی گولی سے بم راکٹ اور ایٹمی اسلحہ تک ان کا استعمال جنگ میں مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کیونکہ صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

ان النار لا یعذب بھا الا اللہ۔

آگ سے سزا اللہ کے سوا کوئی نہیں دیتا ہے۔

علامہ آلوسی کی تفسیر روح المعانی کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے زمانے ۱۲۷۰ھ میں کچھ علماء کا یہ تاثر تھا کہ مسلمانوں کے لیے اس ارشاد نبوت کی روشنی میں آتشیں اسلحہ کا استعمال جائز نہیں۔ چنانچہ وہ فرماتے ہیں۔

میری رائے میں آتشیں اسلحہ کا استعمال ضرورت کی بناء پر ہے اور یہ ذریعہ ہے مقصد میں کامیابی کا۔

علامہ آلوسی نے بات کو کھول کر نہیں پیش کیا دراصل مسئلے دو ہیں ایک جہاد کا اور دوسرا جرائم کی سزا کا۔ اس ارشاد نبوت کا تعلق جرائم کی سزا سے ہے نہ کہ جہاد سے۔ جہاد کے بارے میں قرآن کا فیصلہ ہے۔

وان عاقبتم فعاقبوا بمثل ما عوقبتم بہ

اور دشمنوں کی سختی کے جواب میں سختی کرو تو چاہیے کہ ویسی ہی اور اتنی کرو جیسی تمہارے ساتھ کی گئی۔

یہ آیت مسلمانوں کو بتارہی ہے کہ میدان جنگ میں مسلمان بھی وہی ہتھیار استعمال کریں جو دشمن کر رہا ہے۔ ہاں جرائم کی سزا میں مجرموں کو آگ کی سزا دینا جیسا کہ جابر اور ظالم حکمران کرتے ہیں ناجائز ہے۔ جرائم کی سزا پر میدان جنگ کے ہتھیاروں کو قیاس کرنا بیہودہ قیاس ہے۔

اس آیت نے بتایا ہے کہ:

۱۔ فوجی تنظیم کرنا۔ اس کے لیے چھاؤنیاں بنانا مسلمانوں کے فرائض میں داخل ہیں۔

۲۔ وقت کی ضرورت کے مطابق ہتھیار مہیا کرنا اس کے لیے کارخانے اور فیکٹریاں بنانا مسلمانوں کا ملی فریضہ ہے۔

فوجی تنظیم کا مقصد

(۷۵) اس طرح تم اللہ کے دشمن اور اپنے دشمن کو ہراساں کر سکو گے اور کچھ اور دشمنوں پر بھی تمہاری دھاک بیٹھ جائے گی جن کو تم نہیں جانتے اللہ ان کو خوب جانتا ہے۔ یعنی یہ سب سامان اور تیاری دشمنوں پر رعب جمانے اور دھاک بٹھلانے کا ایک ذریعہ ہے۔ باقی فتح و ظفر کا اصل سبب تو اللہ سبحانہ کی مدد ہے جو پہلے بیان ہو چکا ہے۔ اور وہ لوگ جن کو بالتعیین تم نہیں جانتے منافقین ہیں جو مسلمانی کے پردے میں تھے یا یہود بنی قریظہ یا روم و فارس وغیرہ وہ سب قومیں جن سے آئندہ مقابلہ ہونے والا تھا۔ (افادات شیخ الاسلام)

اس آیت میں اس دفاعی اور فوجی تنظیم کا مقصد بتایا جارہا ہے جس کے لیے پہلی آیت میں تیاری کا حکم دیا ہے۔ ارشاد ہوا ہے کہ اس تیاری کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے اور خدا کے دشمنوں پر تمہارا رعب ہو جائے۔ دنیا کو جنگ سے روکنے والی چیز صرف جنگ کی تیاری ہے۔ اس رعب کا فائدہ یہ ہوگا کہ تمہارے دشمنوں کو موقع نہیں ملے گا کہ تمہارے مخالفین کی مدد کر سکیں۔ دوسرے یہ کہ تمہارے مخالفوں کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہوگا۔ تیسرے یہ کہ تمہاری طاقت کی تیاری ان کے اسلام میں داخل ہونے کا ذریعہ بن جائے گی۔ آیت کا مطلب یہ ہوا کہ مسلمانو تم اپنی مقدور کے مطابق بھرپور تیاری کرو۔ فوج بناؤ۔ اسلحہ فراہم کرو۔ فوج صرف پیادہ نہ ہو بلکہ پیادہ کے ساتھ سوار فوج مہیا کرو اور اس تیاری کا مقصد یہ ہے کہ تمہارے دشمن پر تمہاری دھاک بیٹھ جائے فرمایا جو اللہ کا دشمن ہے وہ تمہارا دشمن ہے اور جو تمہارا دشمن ہے وہ اللہ کا دشمن ہے اس لیے کہ مسلمان کی جنگ جس سے بھی تھی وہ اللہ کے دین کی خاطر تھی۔ یہ دشمن کون تھے امام راغبؒ فرماتے ہیں کہ بدر کے واقعہ کے بعد مشرکین مکہ اور ان کے حلفا اس کا مصداق تھے۔ صرف مشرکین اور ان کے حلفا نہیں بلکہ وہ تمام اسلام کے مخالفین اس میں داخل ہیں جن کا معاندانہ طرزِ عمل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف نمایاں ہو کر سامنے آگیا تھا۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ:

> اللہ سبحانہ نے اس آیت میں بتایا ہے کہ اس تیاری کا مقصد یہ ہے کہ تم اللہ کے اور اپنے دشمن کو ڈراؤ اور یہ اس طرح ہوگا کہ جب مخالفین کو مسلمانوں کی تیاری کا پتہ چلے گا تو ان پر رعب پڑ جائے گا اور اس رعب کا فائدہ یہ ہوگا کہ ان میں دارالاسلام کی طرف نگاہ اٹھانے کی جرأت نہ ہوگی دوسرے یہ کہ وہ جزیہ کی ادائیگی کی پابندی کریں گے۔ تیسرے یہ کہ بسا اوقات یہ چیز ان کے اسلام میں داخل ہونے کا سبب بن جائے گی چوتھے یہ کہ ان کو مسلمانوں کے مخالف گروہ کی امداد کی جرأت نہ ہوگی پانچویں یہ کہ اسلامی حکومت کی مزید شوکت کا سبب ہوگی۔

بہرحال عدو اللہ و عدوکم سے مراد اہلِ مکہ اور ان کے حلفاء ہیں۔ اور ان میں یہود بھی تھے کہ ان کی عداوت بھی بدر کے بعد کھل کر سامنے آگئی تھی آخر میں فرمایا ہے وآخرین من دونهم لا تعلمونهم الله يعلمهم یعنی کچھ تمہارے مخالفین وہ لوگ بھی ہیں جن کو تم نہیں جانتے اور اللہ جانتا ہے۔ یہ کون لوگ ہیں۔ اس میں شارحین قرآن کی آراء مختلف ہیں مجاہد اور مقاتل کی رائے ہیں بنو قریظہ ہیں سدی ایرانی بتاتے ہیں۔ اور ابن زید اور الحسن منافقین بتاتے ہیں اور کچھ کا خیال ہے کہ کفار جن مراد ہیں۔ آخری بات ایک حدیث کے سہارے کہی گئی ہے لیکن ابن کثیر نے اس حدیث کے بارے میں یہ فیصلہ دے کر پوری عمارت گرا دی۔ هذا الحديث منكر لا يصح متنه ولا اسناده اس حدیث کی نہ سند صحیح

ہے اور نہ متن۔ قرین قیاس یہی ہے کہ اس سے مراد بیرونی طاقتیں ہیں رومی، غسانی اور ایرانی جن کا مخالف اسلام ہونا نزول آیت کے زمانے میں مسلمانوں کو معلوم نہ تھا جو بعد میں اس وقت سامنے آئیں جب اسلام نے پورے عرب کو زیر نگیں کر لیا۔ قرآن نے یہاں مسلمانوں کو پیش پا افتادہ حالات کے بارے میں ہدایات دیتے ہوئے ان دشمنوں کی طرف بھی اشارا کر دیا۔ جو مستقبل قریب یا مستقبل بعید میں سامنے آنے والے ہیں تاکہ مسلمان اچھی طرح دور تک نگاہ رکھ کر اپنی ذمہ داری محسوس کریں اور یہ خیال نہ کریں کہ یہ وقتی حادثہ تھا جو آیا گذر گیا۔

اشاروں اشاروں میں مسلمانوں کو ان کی ذمہ داری بتا دی گئی کہ تم دوسری امتوں کی طرح کی امت نہیں ہو۔ پہلی امتیں اگر صرف ایک ذمہ داری رکھتی تھیں اور وہ یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کریں تو مسلمانوں کی اس عام ذمہ داری کے ساتھ ایک ذمہ داری یہ بھی ہے کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کو اس طرح پیش کریں جیسا پیش کرنے کا حق ہے اور جس کا عملی نمونہ جناب رسول اللہ ﷺ ان کے سامنے رکھ گئے ہیں۔ اسی ذمہ داری کو بتانے کے لیے واخرین من دونھم کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔

فوجی تیاری کے لیے سرمایہ کی ضرورت

(۷۶) اور دیکھو اللہ کی راہ میں تم جو کچھ خرچ کرو گے وہ تمہیں پورا پورا ل جائے گا اور تمہاری کوئی حق تلفی نہ ہوگی۔ یہ مال جہاد کی طرف اشارہ ہے یعنی جہاد کی تیاری میں جو مال خرچ کرو گے اس کا پورا پورا بدلہ ملے گا یعنی ایک درہم کے سات سو درہم واللہ یضاعف لمن یشآء اور بسا اوقات دنیا ہی میں اس سے کہیں زیادہ معاوضہ مل جاتا ہے[1]

چونکہ جنگ کی تیاری بغیر مال کے نہیں ہو سکتی تھی اس لیے اس آیت میں انفاق فی سبیل اللہ پر زور دیا۔ اور بتا دیا کہ جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ خرچ کرو گے اس کا اجر پورا پورا ملے گا۔ مال کے خرچ کرنے میں نفس کو پریشانی اسی بات کی ہوتی ہے کہ یہ ضائع ہو رہا ہے اور اس کے معاوضہ میں کچھ حاصل نہ ہوگا یہاں اسی خیال کی جڑ کاٹ دی اور اطمینان دلایا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والے کھوئیں گے کچھ بھی نہیں بلکہ سب وہاں پر حاصل کریں گے اور ان کے اجر میں ذرا بھی کمی نہ ہوگی۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت سے یہ بات استنباط فرمائی ہے کہ سرکاری خزانہ کو بھرا ہوا رکھنا ضروری ہے تاکہ دشمن سے مقابلہ کے موقعہ پر کام آسکے۔

قرآن میں جگہ جگہ اور قدم قدم پر مسلمانوں سے انفاق کا جو مطالبہ ہو رہا ہے یہ اس ذہنیت کے لیے بہت بڑا تازیانہ ہے کہ صحابہ کا معاشرہ فقر و ناداری کا معاشرہ تھا۔ ان کے پاس سرمایہ نہ تھا تو قرآن ان کو انفاق کی دعوت کیوں دے

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے قرآن نے صرف انفاق کی دعوت نہیں دی بلکہ بتایا ہے کہ نیکی حاصل نہیں ہو سکتی اگر خدا کی راہ میں خرچ کرنے کی عادت راسخ
نہ ہو جائے لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون گویا حکومت اور قانون کو درمیان میں لائے بغیر قرآن انسان کے اخلاقی
احساس کو اتنا مضبوط دیکھنا چاہتا ہے کہ جہاں خارج سے اس پر کوئی دباؤ اور دنیا کی ملامت و سرزنش کا کوئی موقع نہ ہو۔
وہاں بھی ایک انسان دوسرے کی اعانت و دستگیری اور اجتماعی کاموں میں ہاتھ بٹانے کو اپنا فرض منصبی خیال کرے پورا قرآن
انفاق کی تاکید سے بھرا پڑا ہے۔ اگر وہ سب آیات جمع کر دی جائیں جن میں انفاق کا حکم دیا گیا ہے تو معلوم ہوگا کہ نماز روزہ
کے بعد اگر کسی عمل کی تکرار تلقین کی گئی ہے تو وہ انفاق فی سبیل اللہ ہے۔ انفاق فی سبیل اللہ اخلاقی فضیلت رکھنے کے علاوہ
معاشی اہمیت کا بھی سرمایہ دار ہے۔ جس جماعت میں انفاق کی روح کارفرما ہوگی اس میں غربت و افلاس اور درد و مصیبت
کی صدائیں مشکل سے سنی جائیں گی۔ جس سوسائٹی میں غریبوں کی دستگیری محتاجوں کی اعانت یتیموں کی خبرگیری اور اقربار
کی ہمدردی کا جذبہ برسرکار ہوگا وہاں معاشی تنگدستی کی شکایت ناپید ہوگی۔ جہاں انفاق کی سرگرمیاں ہوں وہاں گردش
زر میں کوئی رکاوٹ نہیں ہو سکتی۔ اور جہاں اس میں رکاوٹ نہ ہوگی وہاں معاشی خرابیوں کا ایک بڑا دروازہ آپ سے آپ
بند رہے گا۔ کیونکہ دنیا کے اکثر و بیشتر معاشی مفسدات اسی راہ سے آتے ہیں۔ گردش زر جس قدر مکمل ہوگی معاشی
زندگی اسی قدر پُرسکون ہوگی۔

دعوتِ امن کا اعلان

(۶۱) اور اے پیغمبر اگر آپ کے مخالفین صلح و آشتی کی طرف مائل ہوں تو آپ بھی اس کی طرف مائل ہو جائیے اور مستقبل کے
لئے اللہ پر بھروسہ کیجئے۔ اللہ ہی کی ذات سب کچھ سننے والی اور جاننے والی ہے مسلمانوں کی تیاری اور مجاہدانہ قربانیوں
کو دیکھ کر بہت ممکن ہے کہ کفار مرعوب ہو کر صلح و آشتی کے خواستگار ہوں تو آپ کو ارشاد ہے کہ حسب صوابدید آپ
بھی صلح کا ہاتھ بڑھا دیں۔ کیونکہ جہاد سے خونریزی نہیں۔ اعلاء کلمۃ اللہ اور دفع فتنہ مقصود ہے۔ اگر بدون خونریزی کے
یہ مقصد حاصل ہو جائے تو خواہ مخواہ خون بہانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر یہ احتمال ہو کہ شائد کفار صلح کے پردے میں
ہم کو دھوکہ دینا چاہتے ہیں تو کچھ پروا نہ کیجئے اللہ پر بھروسہ رکھیے وہ ان کی نیتوں کو جانتا اور ان کے اندرونی مشوروں کو
سنتا ہے اس کی حمایت کے سامنے ان کی بدنیتی نہ چل سکے گی آپ اپنی نیت صاف رکھیئے [1]

اس آیت میں قطعی لفظوں میں قرآن کی دعوتِ امن کا اعلان ہوا ہے۔ یہ آیت اس وقت نازل ہوئی جب کہ جنگِ بدر
کے فیصلے نے مسلمانوں کی فتح مندی آشکارا کر دی تھی اور تمام جزیرۂ عرب ان کی طاقت سے متاثر ہونے لگا تھا تاہم حکم ہوا

[1] افادات شیخ الاسلام

جب کبھی دشمن امن و صلح کی طرف جھکے چاہیے کہ بلا تامل تم بھی جھک جاؤ۔ اگر ان کی نیت میں فتور ہوگا تو ہوا کرے۔ اس کی وجہ سے صلح و امن کے قیام میں ایک لمحے کے لیے بھی دیر نہ کرنی چاہیے۔

یہاں صاحب تفہیم القرآن کی یہ تشریح بے حد لطیف اور دلاویز ہے کہ:

بین الاقوامی معاملات میں تمہاری پالیسی بزدلانہ نہیں ہونی چاہیے بلکہ خدا کے بھروسہ پر بہادرانہ اور دلیرانہ ہونی چاہیے۔ دشمن جب گفتگوئے مصالحت کی خواہش ظاہر کرے بے تکلف اس کے لیے تیار ہو جاؤ اور صلح کے لیے ہاتھ بڑھانے سے صرف اس بنا پر انکار نہ کرو کہ وہ نیک نیتی سے صلح کرنا نہیں چاہتا بلکہ غداری کا ارادہ رکھتا ہے۔ کسی کی نیت بہرحال یقینی طور پر معلوم نہیں ہو سکتی۔ اگر وہ واقعی صلح ہی کی نیت رکھتا ہو تو تم خواہ مخواہ اس کی نیت پر شبہ کر کے خونریزی کو طول کیوں دو۔ اگر وہ غدر کی نیت رکھتا ہو تو تمہیں خدا کے بھروسہ پر بہادر ہونا چاہیے۔ صلح کے لیے بڑھنے والے ہاتھ کے جواب میں ہاتھ بڑھاؤ تاکہ تمہاری اخلاقی برتری ثابت ہو۔ اور لڑائی کے لیے اٹھنے والے ہاتھ کو اپنی قوت بازو سے توڑ کر پھینک دو تاکہ کبھی کوئی غدار قوم تمہیں نرم چارہ سمجھنے کی جرأت نہ کرے۔

سمجھنے والوں کے لیے یہ کیسی گہری اور لطیف بات ہے کہ قرآن ابھی بتا رہا تھا اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ و من رباط الخیل۔ وہی قرآن اب ہدایت دے رہا ہے وان جنحوا للسلم فاجنح لھا۔ اور امن اور جنگ دو متضاد حالتیں ہیں۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ اسلام میں متقابل میلانات کے مابین ایک عجیب و غریب مصالحت پائی جاتی ہے۔ یہاں ہر تصور کے ساتھ اس کا مخالف بھی موجود ہے۔ بلاشبہ اسلام دنیا میں امن و سلامتی کی دعوت لے کر آیا ہے۔ لیکن امن پسندی میں اس نے کبھی اس قدر غلو نہیں کیا کہ جنگ کی ضرورت سے بالکل انکار کر دیتا۔ اس نے صاف اعلان کر دیا کہ بعض حالات و مواقع پر اور بعض مقاصد کے لیے جنگ اتنی ہی ضروری ہے جتنا عام حالات میں امن ضروری ہے۔ اس نے فتنہ و فساد مٹانے کے لیے اپنے پیروؤں کو حکم دیا کہ اس وقت تک جنگ کرو جب تک فتنہ و فساد کا سر کچل نہ دیا جائے وقاتلوھم حتی لا تکون فتنۃ و یکون الدین کلہ للہ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ قیام امن کے لیے جنگ ضروری ہے۔ وہ امن کا اتنا شیدائی نہیں ہے کہ کسی صورت میں جنگ کو روا ہی نہ رکھے۔ اگر وہ ایسا کرتا تو نتیجہ یہ ہوتا کہ امن کبھی قائم نہ ہوتا یعنی خود تصور امن کی نفی ہو جاتی اسلام نے قتل کو ممنوع اور شدید ترین معصیت قرار دیا ولا تقتلوا النفس التی حرم اللہ الا بالحق۔ لیکن اسی قتل کو قصاص کی صورت میں نہ صرف جائز کیا بلکہ لازم قرار دیا اور اسے زندگی بتایا ولکم فی القصاص حیاۃ یا اولی الالباب (اے عقلمند قصاص میں تمہارے لیے زندگی ہے) ان دو متضاد تصورات کو سامنے رکھیے۔

اول یہ کہ قتل نفس شدید جرم ہے۔

دوسرے یہ کہ قتل نفس ایک ضروری فعل ہے اور اسی میں تمہارے لیے زندگی ہے۔ اب خود ہی فیصلہ کیجئے کہ اسلام نے دو متضاد احکام دیتے ہوئے کس خوبی سے ان میں مصالحت کی ہے۔

اسی طرح اگرچہ اس نے اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کیا ہے کہ اعدوا لهم ما استطعتم من قوة ومن رباط الخيل. مقدور بھر طاقت فراہم کرو اور ہر قسم کی طاقت اور گھوڑے سواروں کی فوج مگر اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا وان جنحوا للسلم فاجنح لها. یہاں بھی جنگ اور امن دو متضاد تصورات ہیں۔ اگر امن میں غلو کیا جائے تو ظالموں اور شریروں کو عقوبت کا کوئی خوف نہ رہے گا اور اگر جنگ کا حکم نہ دیا جائے تو دُنیا میں بدامنی اور خونریزی کا بازار گرم ہو جائے گا اسلام نے ان دونوں میں اس طرح مصالحت کی کہ امن کی حالت کو ایک مستحسن اور قابل قدر مقصد قرار دیا اور جنگ کو امن قائم کرنے کا ذریعہ بنایا ــــــ غرض اسلامی تعلیمات کے جس پہلو پر غور کرو گے متضاد تصورات اور متصادم میلانات کو اس طرح سمویا ہوا پاؤ گے۔ صحیح معنی میں اسلامی زندگی بسر نہیں ہو سکتی جب تک مسلمان اپنے عمل کی وحدت میں ان اضداد کو حل نہ کرے۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اسلام کا اولین مقصد یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جن سے کفر کا وجود عبارت ہے۔ دُنیا کے ہر دوسرے وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کی بقاء کا آرزومند ہے۔ اور کش مکش حیات میں مبتلا ہے اور اس میدان میں اسلام اس کا تنہا مدِ مقابل ہے۔ کیونکہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے کفر کی ضد ہے اسلام اور کفر کے درمیان مصالحت ناممکن اور ان کی لڑائی مستقل قائم ہے۔ یہ لڑائی دنیا کی دوسری تمام لڑائیوں پر حاوی اور ان سے زیادہ ہے۔ کفر کی طاقتیں اسلام کے سفر ارتقاء میں مزاحم ہوتی ہیں لیکن ان کی یہ مزاحمت حق و صداقت کی سعی کمال کا سبب بن جاتی ہے۔ کفر و اسلام کا یہ تصادم اور ان دونوں کی ازلی پیکار اسلام کی قوت حیات کی افزونی اور کفر کے ضعف و شکست پر منتج ہوتی ہے۔ اس لیے جن بزرگوں نے یہ بات لکھی ہے کہ اصل فریضہ دنیا سے محنت و کوشش اور جہاد کے ذریعہ کفر کو مٹانا ہے۔ ضرورت اور مصلحت کی وجہ سے کفر سے صلح کی اجازت ہے حکم نہیں، اس کا پس منظر یہی نظریہ ہے۔

شرح السیر الکبیر میں امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے۔

امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اگر مسلمانوں میں کافروں کے مقابلہ کی طاقت اور قوت ہو تو پھر ان سے صلح کرنا کسی طرح مناسب اور زیبا نہیں ہے کیونکہ حق تعالیٰ نے کافروں سے جہاد کا حکم دیا ہے اور صلح کی صورت میں یہ فریضہ ادا نہ ہو گا یا اس کی ادائیگی میں تاخیر ہو گی۔ اور مسلمان سربراہ مملکت کے لیے

کسی طرح مناسب نہیں کہ وہ اسلام اور مسلمانوں کے دشمنوں سے بغیر ضرورت صلح کرے کیونکہ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے لا تھنوا ولا تحزنوا وانتم الاعلون ان کنتم مومنین سست نہو اور غمگین نہ ہو تم ہی سربلند ہوگے اگر ایمان والے ہو — اور اگر مسلمانوں میں کافروں کے مقابلہ کی قوت نہ ہو پھر صلح کر لینے میں کوئی حرج نہیں .... کیوں کہ ایسی حالت میں صلح کر لینے میں ہی مسلمانوں کے لیے خیر ہے۔ ارشاد ہے وان جنحوا للسلم فاجنح لھا۔ اگر کافر صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی صلح کی طرف مائل ہو جاؤ نیز ایسی حالت میں صلح کرنا بھی تقال کی تدبیر ہے۔ قوت فراہم کرنے کے بعد پھر مقابلہ کیا جائے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں اسی لیے حضور اقدس ﷺ نے حدیبیہ کے سال میں مشرکین کے مطالبہ پر دعوت صلح کو شرف پذیرائی دیا تھا اور جن شرائط پر صلح ہوئی تھی وہ سب کو معلوم ہیں۔

اگرچہ امام مجاہد نے آیت کا پس منظر بنو قریظہ یہودیوں کو بتایا ہے۔ لیکن ابن کثیر نے یہ کہہ کر اس کا انکار کیا ہے

لان السیاق کلہ فی وقعۃ بدر۔

قرآنی سیاق سارا کا سارا بدر سے متعلق ہے۔

اصل یہ ہے کہ کوئی تخصیص نہیں ہے آیت عام ہے۔ اس لیے سب سے صلح ہو سکتی ہے۔

بین الاقوامی معاملات میں حق کا احترام

(٦٢) اور اے پیغمبر اگر وہ آپ کو دھوکا دینا چاہیں گے تو بلاشبہ اللہ سبحانہ آپ کو کافی ہے۔ وہی تو ہے جس نے اپنی اپنی مدد سے اور اہل ایمان کی عددی طاقت سے آپ کو قوت دی۔ اگر صلح کر کے وہ لوگ دغابازی اور عہد شکنی کا ارادہ کریں تو فکر نہ کیجیے۔ اللہ سبحانہ آپ کی مدد کے لیے کافی ہے ان کے سب فریب و خداع بے کار کر دے گا۔ اسی نے بدر میں آپ کی غیبی امداد فرمائی اور ظاہری طور پر جان نثار و سرفروش مسلمانوں سے آپ کی تائید کی[1]۔ مطلب یہ ہے کہ اگر تمہارا دشمن تمہیں دھوکا دینے کے لیے تم سے صلح کر رہا ہے اور دل میں یہ ارادہ کیے ہوئے ہے کہ موقع پاتے ہی تم پر ہاتھ صاف کرے گا تو اس بات کا بالکل اندیشہ نہ کرو۔ تمہیں دل کا حال کیا معلوم۔ اگر تمہارے دشمن کی نیت خراب ہے تو اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے۔ تمہیں اس پر بھروسہ کرنا چاہیے جب تک اس کی مہربانی تمہارے ساتھ ہے۔ تمہارے دشمن کی چالیں تمہارا کچھ بگاڑ نہ سکیں گی۔ تم کو تو صرف ایک بات کی فکر کرنا چاہیے۔ اور وہ یہ کہ اللہ سے تمہارا تعلق زیادہ سے زیادہ مضبوط رہے تم آپ کو

[1] افادات شیخ الاسلام

زیادہ سے زیادہ اس کی امداد کا حقدار بنا لو۔ اس کے احکام اور ہدایات کی زیادہ سے زیادہ پیروی کرنا نتائج کے بارے میں پورے طور پر مطمئن رہنا چاہیے کہ وہ تمہارا ساتھ دیں گے کیونکہ اللہ کے ہاتھ میں ہیں اور اللہ کی ذات تمہیں کافی ہے۔ یہاں فان حسبك الله کا فقرہ بڑا بلیغ اور گہری معنویت لیے ہوئے ہے۔ قلم اس کی معنویت اور بلاغت بیان کرنے سے قاصر ہے خاص طور پر غور کرنے کی چیز یہ ہے کہ قرآن حق و انصاف کے جس اصول کی تلقین انسان کو اس کی انفرادی زندگی کے لیے کرتا ہے اسی کی تلقین اس کی اجتماعی زندگی کے لیے بھی کرتا ہے اور اسی کی تلقین اس کی بین الاقوامی زندگی کے لیے بھی کرتا ہے۔ اور اس تصریح کے ساتھ کرتا ہے کہ اگر اس میں کچھ خطرہ اور اندیشہ بھی ہو۔ جب بھی کسی خیر کی پیشکش ٹھکرانی نہ چاہیے بلکہ اللہ پر بھروسہ کر کے قبول کر لینی چاہیے۔ آپ اگر اس کی عملی تصویر دیکھنا چاہتے ہیں تو صلح حدیبیہ میں دیکھ سکتے ہیں۔ بتانا یہ ہے کہ آپ مستقبل کو شک کی نگاہوں سے نہ دیکھیں اگر وہ صلح میں آپ کو کوئی دھوکہ دینا چاہیں گے تو آپ کی حمایت کے لیے اللہ کافی ہے۔ اس کے بعد ایک واقعاتی حقیقت کی طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا کہ هو الذی ایدك بنصره و بالمومنين یہ اللہ ہی کی ذات ہے جس نے آپ کی بدر میں مدد فرمائی تھی۔ اور اہل ایمان کی جماعت کو آپ کی پشت پناہی کے لیے کھڑا کر دیا تھا دونوں قسم کی امدادوں کا ذکر فرمایا ظاہری اور باطنی۔ ظاہری مسلمانوں کی عددی طاقت کے ذریعے باطنی غیبی امداد کے ذریعے یہ دونوں قسم کی امدادیں اللہ کے کافی ہونے کی دلیل ہیں۔

تزکیہ اخلاق کا بہترین عمل

(۷۹) اور اہل ایمان کے دلوں میں باہم محبت و الفت کی سرشاریاں نمایاں کیں اگر آپ روئے زمین کی ساری دولت بھی خرچ کر دیتے پھر بھی آپ ان کے دلوں میں محبت کی سرشاریاں نہ پیدا کر سکتے۔ لیکن یہ تو اللہ کی ذات ہے جس نے ان میں باہم محبت و الفت کے جذبات نمایاں کیے۔ بلاشبہ اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ اسلام سے پہلے عرب میں جدال و قتال اور نفاق و شقاق کا بازار گرم تھا۔ ادنیٰ ادنیٰ باتوں پر قبائل آپس میں ٹکراتے رہتے تھے۔ دو جماعتوں میں جب لڑائی شروع ہو جاتی تو صدیوں تک اس کی آگ ٹھنڈی نہ ہوتی تھی مدینے کے دو زبردست قبیلوں اوس و خزرج کی حریفانہ نبرد آزمائی اور دلیرانہ بغض و عداوت کا سلسلہ کسی طرح ختم نہ ہوتا تھا۔ ایک دوسرے کے خون کا پیاسا اور عزت و آبرو کا بھوکا تھا۔ ان حالات میں آ گئے نامدار جناب محمد رسول اللہ ﷺ توحید و معرفت اور اتحاد و اخوت کا عالمگیر پیغام لے کر مبعوث ہوئے۔ لوگوں نے ان کو بھی ایک فریق ٹھہرا لیا اور سب نے مل کر خلاف و شقاق کا رخ ادھر پھیر دیا پرانے بغض اور عداوتیں چھوڑ کر ہر قسم کی دشمنی کے لیے حضور کی ذات قدسی صفات کو مطمح نظر بنا لیا۔ وہ آپ کی پند و نصیحت سے گھبراتے تھے اور آپ کے سایہ سے بھاگتے تھے۔ دنیا کی کوئی طاقت نہ تھی جو درندوں کی بھیڑ اور بہائم کے گلہ میں معرفت

الٰہی اور حب نبوی کی روح پھونک کر اور شراب توحید کا متوالا بنا کر سب کو ایکدم اخوت والفت باہمی کی زنجیر میں جکڑ دیا تھی اور اس مقدس وجود کا درم ناخریدہ غلام اور عاشق جان نثار بنا دیتی جس سے زیادہ چند روز پہلے ان کے نزدیک کوئی مبغوض ہستی نہ تھی۔ بلاشبہ روئے زمین کے خزانے خرچ کر کے بھی یہ مقصد حاصل نہ کیا جا سکتا۔ جو اللہ کی رحمت و اعانت سے ایسی سہولت کے ساتھ حاصل ہو گیا۔ اللہ سبحانہ نے حقیقی بھائیوں سے زیادہ ایک کی الفت دوسرے کے دل میں ڈال دی اور پھر سب کی الفتوں کا مرکز حضور انور ﷺ کی ذات منبع البرکات کو بنا دیا قلوب کو دفعتاً ایسا پلٹ دینا اللہ سبحانہ کی زبردست قدرت کا کرشمہ ہے اور ایسی شدید ضرورت کے وقت سب کو محبت والفت کے ایک نقطہ پر جمع کر دینا اس کے کمال حکمت کی دلیل ہے[1]

اس موقعہ پر اہل ایمان کو مطمئن کرنے کے لیے اللہ سبحانہ نے ایک بڑے انعام کو یاد دلایا ہے۔ عرب کے مختلف خاندان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اور ہمیشہ آپس میں ایک دوسرے سے لڑتے رہتے۔ یہ محض اللہ سبحانہ کا فضل واحسان ہے کہ جونہی اللہ کے دین کے رشتہ میں منسلک ہوئے تو ایک دوسرے کے بھائی بھائی بن گئے اور ان میں ایسی محبت رونما ہوئی جو کبھی سگے بھائیوں میں بھی نہیں دیکھی گئی۔ وہ سب ایک دوسرے کے جان نثار اور بھائی بن گئے۔ یہ اتنی بڑی نعمت تھی کہ اگر دنیا کا سارا خزانہ صرف کر کے اس نعمت کو حاصل کرنا چاہتے تو حاصل نہ ہوتا ـــــ اللہ تعالیٰ اپنے اس بے پایاں انعام کو یاد دلا کر اہل ایمان کو اطمینان دلا رہا ہے کہ جس خدا نے یہ سب کچھ کر دیا ہے وہ ہی سارے کام بنانے کے لیے کافی ہے۔ اہل ایمان کو زندگی کے سارے معاملات میں اسی پر بھروسہ رکھنا چاہیے اور کسی موقعہ پر اس اندیشہ سے کہ کل کیا ہوگا اپنی اخلاقی برتری کو ہاتھ سے نہ دینا چاہیے۔

عام شارحین قرآن کی نظر صرف الف بین قلوبھم میں اٹک کر رہ گئی اس لیے انھوں نے صرف یہ کہنا کافی سمجھا کہ۔

اس کے ساتھ اس آیت میں یہ بھی بتلا دیا گیا کہ مختلف لوگوں کے دلوں کو جوڑ کر ان میں الفت ومحبت پیدا کرنا کسی انسان کے بس کا کام نہیں صرف اس ذات کا کام ہے جس نے سب کو پیدا کیا ہے۔ اگر کوئی انسان ساری دنیا کی دولت بھی اس کام کے لیے خرچ کر ڈالے کہ باہم منافرت رکھنے والے لوگوں کے دلوں میں الفت پیدا کر دے تو وہ کبھی اس پر قابو نہیں پا سکتا[2]

یہ کوئی معمولی بات نہیں ہے بلکہ خاص تائید غیبی کا کرشمہ ہے کسی شیطانی مقصد کے لیے کسی بھیڑ کا اکٹھا کر لینا تو مشکل نہیں ہوتا۔ ہر نعرہ باز یہ کر سکتا ہے لیکن خاص اللہ کے کام کے لیے جس میں خدا کی خوشنودی اور آخرت کی

[1] افادات شیخ الاسلام

[2] معارف القرآن مفتی صاحب

اس کے سوا کسی بھی دوسری چیز کا کوئی ادنیٰ شائبہ نہ ہو کہ حق پر جان نثاروں کی ایک جمعیت کا فراہم ہو جانا بغیر اس کے ممکن نہیں ہوا کہ اللہ نے تائید کی اور اس کی توفیق بخشی اور رہنمائی کی۔ جو لوگ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جمع ہوئے تھے اپنی یہ نئی زندگی اختیار کرنے سے پہلے دورِ جاہلیت کی تمام برائیوں میں آلودہ تھے۔ اور ان کے قبیلے جدا جدا تھے اور ان میں شدید قسم کے تعصبات تھے۔ اور ان کے دیوتا الگ الگ تھے اور یہ آنکھیں بند کر کے ان کی پرستش کرتے۔ ان کے مفادات باہم متصادم تھے اور یہ ان کے حاصل کرنے کے لیے جائز و ناجائز اور عدل و ظلم کے تمام حدود و قیود سے آزاد تھے اس قسم کے لوگوں کو ان کے تمام تعصبات، مفادات اور تمام رسوم و عادات سے چھڑا کر بالکل ایک نئے سانچے میں ڈھال دینا اور اس سانچے کو ان کی نگاہوں میں اتنا محبوب بنا دینا کہ اس کی خاطر وہ قوم وطن، خاندان، جائیداد اور بیوی بچے سب چھوڑ کر اٹھ کھڑے ہوں۔ یہ خدا ہی کے لیے ممکن ہے کوئی انسان یہ کام انجام نہیں دے سکتا۔ اگرچہ وہ دنیا جہاں کے سارے وسائل اس پر صرف کر ڈالے [1]

اشارات اس بھائی چارے اور الفت و محبت کی طرف جو اللہ تعالیٰ نے ایمان لانے والے اہلِ عرب کے درمیان پیدا کر کے ان کو ایک مضبوط جتھا بنا دیا تھا۔ حالانکہ اس جتھے کے افراد ان مختلف قبیلوں سے نکلے تھے جن کے درمیان صدیوں سے دشمنیاں چلی آ رہی تھیں۔ خصوصیت کے ساتھ اللہ کا یہ فضل اوس و خزرج کے معاملے میں تو سب سے زیادہ نمایاں تھا۔ یہ دونوں قبیلے دو ہی سال پہلے تک ایک دوسرے کے خون کے پیاسے تھے۔ اور مشہور جنگ بعاث کو کچھ زیادہ دن نہیں گذرے تھے جس میں اوس نے خزرج کو اور خزرج نے اوس کو گویا صفحۂ ہستی سے مٹا دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ ایسی شدید عداوتوں کو دو تین سال کے اندر گہری دوستی میں تبدیل کر دینا اور ان متنافر اجزاء کو جوڑ کر ایسی ایک بنیان مرصوص بنا دینا جیسی کہ نبی کریم ﷺ کے زمانے میں اسلامی جماعت تھی یقیناً انسان کی طاقت سے بالاتر تھا۔ اور دنیوی اسباب کی مدد سے یہ عظیم الشان کارنامہ انجام نہیں پا سکتا تھا۔ پس اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ جب ہماری تائید و نصرت نے یہ کچھ کر دکھایا ہے تو آئندہ بھی تمہاری نظر دنیوی اسباب پر نہیں بلکہ خدا کی تائید پر ہونی چاہیے کہ جو کچھ کام بنے گا اسی سے بنے گا [2]

دنیا میں کوئی کام انسان کے لیے اس سے زیادہ مشکل نہیں ہے کہ بکھرے ہوئے انسانی دلوں کو ایک رشتۂ الفت میں پرو دے اور یہ کام تقریباً ناممکن ہو جاتا ہے جب معاملہ ایسے انسانوں کا ہو جو صدیوں سے باہم جنگ و جدال کی آب و ہوا میں پرورش پاتے رہے ہوں اور جن کے نفسیاتی سانچوں میں باہمی آمیزش و ائتلاف کا کوئی ڈھنگ باقی نہ رہا ہو۔ پیغمبرِ اسلام کا ظہور ایسے ہی لوگوں میں ہوا تھا مگر ابھی ان کی دعوت پر بارہ برس ہی گذرے تھے کہ مدینہ میں ایک ایسا گروہ پیدا ہو گیا

[1] تدبر قرآن [2] تفہیم القرآن

جو اس اعتبار سے بالکل ایک نئی قسم کی مخلوق تھی۔ وہ جب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے باہمی کینہ وانتقام کے مجسمے تھے لیکن جونہی مسلمان ہوئے محبت و سازگاری کی ایسی پاک و قدوسیت ابھر آئی کہ ان میں کا ہر فرد دوسرے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کردینے کے لیے مستعد ہوگیا۔ فی الحقیقت یہی وہ تزکیہ اخلاق کا عمل ہے جو ایک پیغمبرانہ عمل تھا اور جو حضور اقدس کی تعلیم و تربیت نے انجام دیا[1]

یہ تھے اُردو شارحینِ قرآن آئیے ذرا عربی میں لکھنے والوں کے تأثرات سے بھی کچھ استفادہ کر لیجئے۔

حافظ ابن کثیر ؒ فرماتے ہیں۔

اہل عرب میں بغض و عداوت کا ایک تسلسل قائم تھا۔ انصار بھی باہم آویزش کا شکار تھے اوس و خزرج کے درمیان زمانہ جاہلیت کی جنگیں سب کو معلوم ہیں اللہ سبحانہ نے نور ایمان کے ذریعے اس مسلسل آویزش کو ختم کیا۔ جیسا کہ قرآن میں دوسرے موقع پر بتایا ہے واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداء فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا۔ اور صحیح بخاری، صحیح مسلم میں ہے کہ جناب رسول اللہ ﷺ نے مجمع انصار میں یہ تقریر فرمائی اے گروہ انصار کیا تم گمراہ نہ تھے اللہ نے میرے ذریعے تم کو ہدایت دی۔ کیا تم معاشی اعتبار سے تنگ دست نہ تھے اللہ نے میرے ذریعے تمہیں غنی بنایا اور کیا تم منتشر نہ تھے اللہ نے میرے ذریعے تمہیں ایک رشتہ الفت میں پرو دیا[2]

علامہ زمخشری فرماتے ہیں۔

اہل ایمان کے دلوں میں نسبت قرآن حضور اقدس ﷺ کے معجزات میں سے ایک عظیم معجزہ ہے کیونکہ معمولی سی بات پر دشمنی کینہ اور حمیت و عصبیت کے خوگر تھے۔ حمیت و عصبیت ہی ان کا قومی نصب العین تھا انتقام کے بغیر ان کو کبھی چین نہ آتا تھا۔ وہ دل کبھی باہم نہ ملتے تھے حضور اقدس کی اتباع کے صدقے ان میں باہم محبت ہوئی ان میں یگانگت آئی۔ کہ گویا ایک کمان سے تیر اندازی کرنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے دلوں کو رشتہ محبت میں پرو دیا۔ ان میں اجتماعیت آئی۔ اور ان میں باہم اس قدر محبت ہوگئی کہ بغض و عناد کا نام و نشان نہ رہا یہ کام اس ذات کے سوا کوئی نہیں کرسکتا۔ جو دلوں کا مالک ہے اور دلوں کو جیسے چاہے پلٹتا رہتا ہے[3]

ابو حیان اندلسی فرماتے ہیں کہ

آیت عام ہے اس میں اوس خزرج کی کوئی تخصیص نہیں ہے۔ اہل عرب حمیت اور عصبیت کی بیماری میں مبتلا تھے۔ چھوٹی سی چھوٹی چیز پر اس کا مظاہرہ کرتے۔ ان میں کوئی چیز اتحاد پیدا کرنے کا ذریعہ نہ تھی اللہ سبحانہ نے ان کے دلوں میں اتباع رسالت کا ولولہ پیدا کردیا اور یہی ولولہ ان کی باہمی محبت کا ذریعہ بن گیا۔ اس کی خاطر انھوں نے اپنی جانوں

[1] ترجمان القرآن　　[2] ابن کثیر　　[3] کشاف

مال کی قربانی دی. اصل بات یہ ہے کہ محبت اس وقت نمایاں ہوتی ہے جب محبوب سے خیر حاصل ہونے کا تصور ہوتا ہے۔
اگر محبت کا سبب جلدی ختم ہو جانے والا ہوتا ہے تو محبت بھی جلدی ختم ہو جاتی ہے معشوق عاشق کو مال کی وجہ سے چاہتا
ہے اور عاشق معشوق کو مزہ کی خاطر ملتا ہے۔ جب دونوں کی مراد پوری ہوتی ہے دونوں میں محبت ہو جاتی ہے اگر مراد
پوری نہ ہو تو بغض و عناد رونما ہو جاتا ہے۔ لیکن محبت ہونے کا سبب کمال روحانی ہو تو اس میں کبھی زوال نہیں آتا ہے
حضور اقدس ﷺ نے عرب کا اسی حقیقی کمال روحانی سے تعلق پیدا کیا اس کے نتیجے میں وہ بھائی بھائی ہو گئے [1]

اصل ارشاد میں الف بین قلوبھم آیا ہے یہ الف سے ہے اس کے معنے امام راغب نے یہ بتائے ہیں۔
مختلف چیزوں کا اس تناسب اور ترتیب سے اکٹھا ہو جانا کہ جس چیز کو جس جگہ ہونا چاہیے وہ جگہ اس کو
ملے جو پہلے ہونے کا حقدار ہے وہ پہلے رہے اور جس کو آخری جگہ ملنی چاہیے وہ آخری جگہ پائے۔
آئیے امام راغب کی بات ان کی زبانی سن لیجئے۔

ماجمع من اجزاء مختلفۃ ورتب ترتیبا قدم فیہ ماحقہ ان یقدم واخر
فیہ ماحقہ ان یؤخر۔

آپ کچھ سمجھیں مگر میں تو اس سے یہی سمجھا ہوں کہ اہل ایمان میں تالیف سے مقصود وہ حالت ہے جب مختلف
کارکن قوتیں کسی ایک مقام ایک مرکز، ایک سلسلے، ایک وجود ایک طاقت اور ایک فرد واحد پر اپنی قدرتی اور مناسب
ترکیب و ترتیب سے اکٹھی ہو جائیں اور مقام مراد، قومی، اعمال اور افراد پر ایک اجتماعی و انضمامی دور طاری ہو گیا تا آنکہ ہر قوت
اکٹھی، ہر عمل باہمدگر جڑا ہوا۔ ہر چیز بندھی اور سمٹی ہوئی۔ ہر فرد زنجیر کی کڑیوں کی طرح ایک دوسرے سے متحد ہے۔
کسی چیز، کسی گوشہ کسی عمل میں علیحدگی نظر نہیں آتی۔ جدائی انتشار الگ الگ، جز جز فرد فرد ہو کر رہنے والی حالت
نہیں رہتی۔

مادے میں جب یہ اجتماع اور انضمام ہوتا ہے تو اسی سے تخلیق و تکوین کے تمام مراتب ظہور پذیر ہوتے ہیں۔
لہذا زندگی اور وجود نام ہے اجتماع و تالیف کا۔ یہی حالت جب اخلاق پر طاری ہوتی ہے تو اخلاق کی زبان میں اسے
نیز اور قانون کی اصطلاح میں اسے عمل صالح کہتے ہیں جب انسان پر یہ حالت طاری ہوتی ہے تو طب کی اصطلاح
میں اسے صحت اور تندرستی کہتے ہیں۔ اور پھر یہی حالت جب قومی و اجتماعی زندگی کی قوتوں پر طاری ہوتی ہے تو اس کا
نام حیات اجتماعی اور جماعت ہوتا ہے اور اس کا ظہور جماعتی اقبال و ترقی اور نفوذ و تسلط کی صورت میں دنیا دیکھتی ہے
قرآن نے یہاں مسلمانوں کو جنگ کی تیاری میں طاقت کی بہم رسانی افرادی طاقت، اسلحہ اور اس کے لیے مال خرچ

[1] نظام الفرقان

کرنے کی تاکید کے بعد جو الف بین قلوبھم کے انعام کا ذکر کیا ہے تو صرف یہ بتانے کے لیے کیا ہے کہ اجتماع و ائتلاف اسلامی زندگی کی سب سے بڑی بنیاد ہے اور یہ بھی بتلا دیا کہ اہل ایمان میں اس اجتماع و ائتلاف کی صالح و حقیقی زندگی پیدا کرنا محض انسانی تدبیر سے ممکن نہیں۔ دنیا میں کوئی انسانی تدبیر امت نہیں پیدا کر سکتی یہ کام صرف اللہ ہی کی توفیق و رحمت اور اس کی وحی و تنزیل کا ہے کہ بکھرے ہوئے ٹکڑوں کو جوڑ کر ایک بنا دیا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہاں الف بین قلوبھم لا کر قرآن صرف الفت و محبت کی بات نہیں بتا رہا ہے بلکہ وہ مسلمانوں کو سمجھا رہا ہے کہ اسلامی زندگی یہ ہے کہ اتحاد و ائتلاف ہو اور امتزاج و نظم ہو۔ اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اعمال حیات میں منتشر نہ ہوں۔ ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں۔ اور ان کے تمام اعمال مل کر انجام پائیں۔ کسی گوشہ عمل میں پھوٹ نہ ہو ائتلاف کا مرتبہ اتحاد سے بلند تر ہے اتحاد صرف باہم مل جانا ہے لیکن ائتلاف سے مقصود ایسا اتحاد ہے جو محض اتحاد نہ ہو بلکہ ایک صحیح اور مناسب ترکیب کے ساتھ اتحاد ہو یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ جس فرد کو اس کی صلاحیت و قوت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہیے وہی جگہ ملی ہو۔ اور ہر فرد کی انفرادی قوت کو جماعتی ترکیب میں اتنا ہی دخل دیا جائے جتنی مقدار میں دخل پانے کی اس میں استعداد ہو۔ ایسا نہ ہو کہ رشید کو سردار ہونا چاہیے اور اس سے چاکری کا کام لیا جائے اور حمید کی قابلیت کا عنصر صرف چھوٹا سا جزو جماعت ہونے کی صلاحیت رکھتا ہے۔ اس کو سیر بھر قرار دیا جائے۔

امتزاج ترکیب کا تیسرا مرتبہ ہے اس میں کمیت سے زیادہ کیفیت کا اتحاد ہونا چاہیے۔ یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماعی مزاج جس قسم کے مزاج کے ساتھ مل کر ایک متحدہ کیفیت حاصل کر سکتا ہے ایسا ہی مزاج اس کے ساتھ ملا دیا جائے۔ یہ نہ ہو کہ دو ایسے آدمیوں کو ملا دیا گیا جن کی طبیعت و خصلت اور استعداد و صلاحیت باہم گر میل نہیں کھا سکتی اور اس لیے خواہ کتنا ہی دونوں کو ملاؤ لیکن تیل پانی کی طرح ہمیشہ الگ ہی نظر آئیں گے باہم مل کر یک جان نہ ہوں گے اللہ سبحانہ نے جیسے عناصر کو اس طرح پیدا کیا ہے کہ باہم اگر مل کر ایک نئے مرکب وجود میں متشکل ہوں؛ اسی طرح افراد انسانی کو بھی اس نے پیدا کیا تاکہ ان کے باہم ملنے سے جماعت پیدا ہو۔ جماعت ایک مرکب وجود ہے۔ افراد اس کے عناصر ہیں۔ فرد بجائے خود کوئی کامل وجود نہیں رکھتا۔ محض ایک مثنی ہے اور جب تک اپنے بقیہ ٹکڑوں سے مل نہ جائے کامل وجود نہیں پا سکتا۔ لیکن یہ باہم ملنا امتزاج کے ساتھ ہونا چاہیے تاکہ ہر ٹکڑا اپنے صحیح و مناسب ٹکڑے کے ساتھ مل کر اس طرح جڑ جائے کہ معلوم ہو کہ یہ نگینہ اس انگشتری کے لیے تھا۔

نظم: سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی و تقویمی حالت ہے جب اس کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم اپنے اپنے دائرے میں محدود اور اپنے اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

یہ تینوں خود بخود الفت کا ناگزیر تقاضا ہیں۔ الفت کا ان کے بغیر وجود ہی نہیں ہے۔ الفت کے یہ سہ گانہ عناصر وجود میں آ نہیں سکتے اور نہ قائم رہ سکتے ہیں جب تک کہ کوئی بالاتر فعال و مدبر طاقت وجود میں نہ آئے اور وہ منتشر افراد کو ایک متحد، مؤتلف ممزوج اور منظم جماعت کی شکل میں قائم نہ رکھے۔ لہذا ایک امام کا وجود ناگزیر ہوا اس لیے ناگزیر ہے کہ سب سے پہلے تمام افراد ایک ایسے شخص کو اپنا امام و مطاع تسلیم کریں جو بکھرے ہوئے افراد کو اتحاد و ائتلاف امتزاج و نظم کے ساتھ جوڑ دینے سے ایک حی و قائم جماعتی وجود پیدا کرنے کی قابلیت رکھتا ہو۔ اصل مرکز جماعتی طاقت کا امام ہے۔

اسی بنا پر حضور اقدس ﷺ نے اسلام اور اسلامی زندگی کا دوسرا نام جماعت رکھا ہے۔ اور جماعت سے علیحدگی کو جاہلیت اور حیات جاہلی کہا ہے۔ اور اسی وجہ سے بکثرت احادیث و آثار میں ہر مسلمان کو ہر حال میں التزام جماعت اور اطاعت امیر کا حکم دیا گیا ہے اگرچہ وہ غیر مستحق ہو نا اہل ہو فاسق ظالم ہو بشرطیکہ مسلمان ہو اور نماز قائم رکھے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ آیت میں صرف محبت ہی کا ذکر نہیں ہے بلکہ جس چیز کا قرآن یہاں انعام بتا رہا ہے وہ مسلمانوں کا نظام جماعت ہے۔ جن کاموں کے کرنے کا پہلے حکم دیا گیا ہے۔ ان میں ایک کام بھی بغیر جماعت کے پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔ سورت کا موضوع غزوۂ بدر ہے۔ اس سورت میں مسلمانوں کو اجتماعی احکام دیئے جا رہے سب سے پہلے حکم ہوا کہ:

۱۔ قاتلوھم حتٰی لا تکون فتنۃ ویکون الدین کلہ للہ

۲۔ اذا لقیتم فئۃ فاثبتوا واذکروا اللہ کثیرًا

۳۔ لا تنازعوا فتفشلوا واصبروا

۴۔ لا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرًا

۵۔ فاما تثقفنھم فی الحرب فشرد بھم من خلفھم

۶۔ اما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم

۷۔ اعدوا لھم ما استطعتم من قوۃ

۸۔ ما تنفقوا من شئ فی سبیل اللہ

۹۔ وان جنحوا للسلم فاجنح لھا

۱۰۔ ان یریدوا ان یخدعوک فان حسبک اللہ۔

آپ خود سوچئے کہ کیا اس زمین میں یہ بات کوئی وزن رکھتی ہے کہ اللہ کا اے مسلمانو! یہ انعام ہے کہ اس نے

حقیقی بھائیوں سے زیادہ تمہارے دلوں میں محبت ڈال دی ہے ——— یا اس کے مقابلے میں یہ بات وزن رکھتی ہے کہ ان احکام کی پابجائی کا مدار یہ ہے کہ اللہ نے تم کو ایسی جماعت بنا دیا ہے کہ تم میں اتحاد ہے اختلاف ہے اتحاد ہے اور تنظیم ہے۔ یہ اللہ کا تم پر خاص انعام ہے۔ ایسا انعام کہ کہیں کسی قیمت پر دستیاب نہیں ہو سکتا۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ اسی پارے میں آ رہی ہے۔ سردست ان ہی اشارات پر اکتفا کرتا ہوں۔ جماعت کے موضوع پر احادیث۔ ائمہ کی تصریحات آگے آ رہی ہیں۔ مجھے اعتراف ہے کہ میں اس تشریح میں منفرد ہوں لیکن مجھے خوشی ہے کہ قرآن کے سیاق و سباق کی مجھے تائید حاصل ہے۔

يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَسْبُكَ اللّٰهُ وَمَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٦٤﴾
يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ حَرِّضِ الْمُؤْمِنِيْنَ عَلَى الْقِتَالِ ۭ اِنْ يَّكُنْ
مِّنْكُمْ عِشْرُوْنَ صٰبِرُوْنَ يَغْلِبُوْا مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ
مِّنْكُمْ مِّائَةٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفًا مِّنَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ
لَّا يَفْقَهُوْنَ ﴿٦٥﴾ اَلْئٰنَ خَفَّفَ اللّٰهُ عَنْكُمْ وَعَلِمَ اَنَّ
فِيْكُمْ ضَعْفًا ۭ فَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ مِّائَةٌ صَابِرَةٌ يَّغْلِبُوْا
مِائَتَيْنِ ۚ وَاِنْ يَّكُنْ مِّنْكُمْ اَلْفٌ يَّغْلِبُوْٓا اَلْفَيْنِ بِاِذْنِ
اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِيْنَ ﴿٦٦﴾

اے نبی اللہ تجھے اور ان لوگوں کو جنھوں نے تیرا اتباع کیا کافی ہے ﴿۶۴﴾ اے نبی مسلمانوں
کو لڑائی کا شوق دلا مسلمانو! ـــــ اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم ہوں گے
تو دو سو پر غالب آجائیں گے۔ اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں گے تو ایک ہزار کافروں
پر غالب آجائیں گے۔ یہ اس لیے کہ کافر بصیرت سے محروم ہیں ﴿۶۵﴾ مسلمانو اب اللہ سبحانہ نے
تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اسے علم ہے کہ تم میں کمزوری ہے اب اگر تم ثابت قدم ایک سو
ہوگے تو دو سو پر غالب آؤ گے اور تم ہزار ہو گئے تو دو ہزار کو مغلوب کرو گے بلاشبہ اللہ سبحانہ
ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۶۶﴾

مفردات کے معانی

حرض: تحریض سے امر ہے مادہ حرض ہے۔ لغت میں ہلاکت کے قریب

ہولے کو کہتے ہیں جس میں کوئی خیر نہ ہو اسے بھی حرض کہتے ہیں اور تحریض کے امام راغب نے معنی یہ بتائے کہ کسی چیز کی طرف زیادہ خوبصورت اور آسان حصول بنا کر ترغیب دلانا اس طرح گویا تحریض کے معنے ہلاکت کو مٹانا جیسے تمریض کے معنے بیماری کو دور کرنا ہیں۔

لَا یَفْقَھُوْنَ ۔ نہیں سمجھتے ہیں فقہ جس کے معنے سمجھنے کے اور دریافت کرنے کے ہیں۔ امام راغب لکھتے ہیں۔ شاہد کے ذریعے علم غائب تک پہنچنے کا نام فقہ ہے لہذا فقہ علم سے خاص ہے۔ اور اصطلاح شریعت میں تو احکام شریعت کے علم کو کہتے ہیں۔ پہلے معنے میں جب اس کا استعمال ہوتا ہے تو باب سمع سے آتا ہے اور مصدر فقہ اور فقہ آتا ہے اور جب دوسرے معنے میں آتا ہے تو باب کرم سے آتا ہے اور مصدر فقاہت آتا ہے۔ دو چیزیں ہیں اور دونوں الگ الگ ہیں ایک اعمال ہیں دوسرے مقاصد ہیں۔ کچھ لوگ وہ ہوتے ہیں جن کی نگاہ صرف اعمال تک رہتی ہے اور کچھ وہ ہوتے ہیں جن کے پیش نظر اعمال میں مقاصد ہوتے ہیں۔ پہلی حالت کا نام علم ہے دوسری حالت کو فقہ کہتے ہیں مثلاً آپ نماز پڑھتے ہیں آپ کو نماز کے اعمال کا علم ہے اور نماز کا مقصد رضائے الٰہی کا حصول ہے۔ اگر نماز کے عمل میں آپ کی نگاہ مقصد پر ہے آپ صاحب بصیرت اور فقیہہ ہیں۔ اگر مقصد پیش نظر نہیں تو آپ صاحب بصارت اور عالم ہیں۔ کافر جنگ کے موضوع پر صاحب بصارت اور عالم ہوتا ہے لیکن صاحب بصیرت اور فقیہہ نہیں ہوتا۔ ایک سادہ سا عام فرق ہے امام غزالی نے اسے نہایت اچھے انداز میں احیاء العلوم میں سمجھایا ہے۔ علامہ مرتضٰی زبیدی نے شرح احیاء میں امام غزالی کی بات میں جان ڈال دی ہے تفصیل کے شائقین اس کا مطالعہ کریں۔

مومن کی طاقت کا اصلی راز

لڑائی میں سب سے بڑی طاقت وہ اخلاقی قوت ہے جو لڑنے والوں میں موجود ہو۔ دل کے جماؤ اور پورے اطمینان کے بغیر جو لڑائی لڑی جائے گی اس میں کامیابی صرف اسی صورت میں ہو سکتی ہے کہ مقابل کی فوجی طاقت بے انتہا کمزور ہو۔ لڑنے والوں کے دل کے جماؤ اور اطمینان کے لیے ضروری ہے کہ انہیں اپنے مقصد کا شعور ہو ہر سپاہی یہ جانتا ہو کہ اسے کس لیے لڑنا ہے اور کیوں لڑنا ہے جس قدر یہ شعور زیادہ ہوگا اتنی طاقت کے ساتھ سپاہی مقابلہ کر سکیں گے رہے وہ لوگ جنہیں کسی مقصد کا شعور ہی نہ ہو اور وہ محض بیگاریوں کی طرح لڑائی کے لیے آگئے ہوں ان کے پاؤں بہت جلد معمولی دباؤ سے اکھڑ جاتے ہیں اور کسی مقابلے میں ڈٹ کر جم نہیں سکتے۔ کوئی شخص اس وقت تک اپنی جان کی بازی نہیں لگا سکتا جب تک اسے یہ یقین نہ ہو جائے کہ جس مقصد کے لیے وہ لڑ رہا ہے اس کی قیمت اس کی اپنی زندگی سے کہیں زیادہ ہے اور اگر وہ مقصد حاصل نہ ہو سکے تو پھر اس کا زندہ رہنا بے کار ہے جو لوگ کسی خاص قوم کی سربلندی یا کسی ملک کی آزادی یا کسی خاص طبقہ کی فلاح کے لیے لڑتے ہیں اور جو اپنی لڑائی کا مقصد اچھی

ڈرا سمجھتے ہیں اور اس مقصد کو اپنی زندگی سے قیمتی جانتے ہیں وہ ان سپاہیوں کے مقابلے میں کہیں زیادہ طاقتور ثابت ہوتے ہیں جو محض کرائے پر حاصل کیے جاتے ہیں۔

اس بات کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ ایک مومن کی اصل طاقت کا راز کیا ہے کہ اس کا اور اللہ سبحانہ کا تعلق کیا ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات پر اس کا ایمان ہوتا ہے۔ اس کی قوت پر وہ پورا بھروسہ کرتا ہے اپنی زندگی کی حقیقت کو جانتا ہے۔ اس عارضی زندگی کے بعد جو ہمیشہ رہنے والی زندگی اسے ملنے والی ہے اسے اچھی طرح سمجھتا ہے حق و باطل کے فرق کو بھی جانتا ہے اور اسے پورا یقین ہوتا ہے کہ کامیابی آخرکار حق ہی کا حصہ ہے اس شعور بالغ کی وجہ سے وہ اپنی زندگی کا سب سے بہتر مصرف یہی سمجھتا ہے۔ اسی قوت کی وجہ سے ایک جیسی جسمانی اور مادی قوت والے گروہوں میں ایک اور دس کی نسبت ہو جاتی ہے۔

مقابلہ میں اللہ ہی کافی ہے

(۸۰) اے نبی اللہ تجھے اور ان لوگوں کو جنھوں نے تیرا اتباع کیا کافی ہے اس کے دو معنے ہو سکتے ہیں۔ اکثر سلف کے نزدیک یہ مطلب ہے کہ اے پیغمبر خدا تجھے اور تیرے ساتھیوں کو کافی ہے۔ یعنی قلت مدد اور بے سروسامانی سے گھبرانا نہ چاہیے۔ اور بعض علماء نے یہ معنے لیے ہیں کہ اے پیغمبر فی الحقیقت اللہ اکیلا کافی ہے اور ظاہر اسباب کے اعتبار سے مخلص مسلمانوں کی جماعت خواہ کتنی ہی تھوڑی ہو کافی ہے۔[1]

حافظ ابن القیم نے زاد المعاد کے مقدمہ میں اس پر تفصیل بحث کی ہے۔

آیت میں اعرابی صورتیں چار ہیں۔

اول یہ کہ واو کو عاطفہ قرار دیا جائے حسبک کی ضمیر متصل کو معطوف علیہ اور من تبعک کو معطوف قرار دیا جائے اور معنے یہ ہوں کہ اے پیغمبر تجھے اور تیری پیروی کرنے والوں کو اللہ کافی ہے اس کے ہوتے ہوئے آپ کو کسی کی احتیاج نہیں ہے۔ جنگ کی حالت ہو یا صلح کی۔ صلح میں دشمن خیانت سے کام لے یا دیانت سے ہر حال میں آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اللہ کافی ہے۔ قرآن میں حوتلہ اور حسبلہ توکل کے عنوان میں اور توکل اللہ کے سوا کسی پر توحید کے خلاف ہے۔

حافظ ابن کثیر نے مشہور امام شعبی عبد الرحمٰن بن زید اور عطا خراسانی جیسے اسالمین تفسیر سے یہی معنے نقل کیے ہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حسبك الله وحسب من شهد معك آپ کو اور آپ کے ساتھ جو موجود ہیں ان کو اللہ کافی ہے۔

دوسرا یہ کہ و من اتبعك میں واؤ عاطفہ نہیں بلکہ بمعنٰے مع ہے اور مفعول معہ ہونے کی وجہ سے من اتبعک منصوب ہے مطلب یہ ہے کہ اے پیغمبر تجھے تیرے ساتھیوں سمیت اللہ کافی ہے مشہور امام زجاج کا یہی خیال ہے۔ انھوں نے اس کی تائید میں یہ شعر پڑھا ہے۔

اذا كانت الهيجاء و اشتجرا لقنا

نحسبك والضحاك سيف مهند

لیکن ابو حیان اندلسی اسے صحیح نہیں مانتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ یہ سیبویہ کے خلاف ہے۔ سیبویہ نے حسبک و زید درہم میں کفی مقدر مانا ہے۔ مشہور نحوی فرا بھی زجاج کے ہمنوا ہیں۔ مگر ابو حیان اندلسی کو سیبویہ کی بات کی در شگی پر اصرار ہے۔ اور اصرار بھی معمولی نہیں بلکہ اتنا کہ حافظ عسقلانی نے درر کامنہ میں امام ذہبی سے نقل کیا ہے کہ جب حافظ ابن تیمیہ مصر گئے۔ تو شیخ ابو حیان سے ملاقات ہوئی۔ پہلی ہی مجلس میں وہ کچھ ایسے وارفتہ ہو گئے کہ فی البدیہہ کچھ اشعار کہے ایک یہ۔

كنا نحدث عن حبر يجيئ منها

انت الامام الذى قد كان ينتظر

اور بول پڑے والله ما رأت عيناى مثل هذا الرجل بخدا میری آنکھوں نے اس جیسا نہیں دیکھا۔ لیکن بعد کو صحبت سازگار نہ ہوئی۔ نحو کے اسی مسئلہ کی نسبت ابو حیان نے سیبویہ کا حوالہ دیا ابن تیمیہ نے کہا کہ سیبویہ نحو میں نبی اور معصوم نہیں ہے اس نے اپنی کتاب میں ۸۰ غلطیاں کی ہیں۔ یہ ان میں سے ایک ہے۔ اس پر ابو حیان برہم ہو گئے اور پھر آخر تک مخالف رہے حافظ عسقلانی لکھتے ہیں و صير ذالك ذنبا لا يغفر ابو حیان کی بارگاہ میں یہ ابن تیمیہ کا ناقابل معافی گناہ تھا۔ بہر حال یہ تو معاصرانہ چشمک ہے۔ اصل بات وہی ہے جو زجاج اور فراء نے بتائی ہے۔

تیسرا یہ کہ من اتبعك من المومنين مبتدا ہونے کی وجہ سے مرفوع قرار دو اور اس کی خبر محذوف ہو یعنی حسبهم الله مطلب یہ ہے کہ آپ کو اللہ کافی ہے اور ان لوگوں جو آپ کی پیروی کر رہے ہیں اللہ کافی ہے۔ یہ بھی بے غبار اور اسلام کے پیش کردہ تصور توحید کے مطابق ہے۔

چوتھا یہ کہ یہ من اتبعك من المومنين کا عطف اللہ پر ہو اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ اے پیغمبر تجھے اللہ اور اہل ایمان کافی ہیں۔ اگرچہ کچھ بزرگوں نے یہ مطلب بھی بتایا ہے لیکن یہ درست نہیں ہے کیونکہ حسبلہ، جو قلہ در کفایت توکل، تقوی اور عبادت کی طرح اللہ سبحانہ کے لیے خاص ہے۔ قرآن نے اس سے پہلی آیت میں تقابل طاللہ پیش کیا ہے۔

وان یریدوا ان یخدعوك فان حسبك الله. هو الذی ایدك بنصره وبالمؤمنین

اس میں حسب اور تائید کو بالمقابل پیش کیا ہے اور بتایا کہ کفایت تو صرف یگانہ خدا کے لیے ہے اور تائید اہل ایمان کے ذریعے ہے۔ قرآن میں ہر جگہ اہل ایمان کا نعرہ حسبنا اللہ آیا ہے کہیں بھی حسبنا اللہ ورسولہ نہیں آیا ہے آپ پوچھ سکتے ہیں کہ عین میدانِ جنگ میں قرآن کا اس پر زور کیوں ہے۔ کہ اے پیغمبر تجھے اور اہل ایمان کو اللہ کافی ہے۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اسلام کے تمام اجزا جس مرکز سے حرکت اور زندگی حاصل کرتے ہیں وہ اللہ سبحانہ کی ذات وصفات کا تصور ہے۔ اسلام کے جملہ اعتقادات اور سارے اعمال واقدار اسی تصور کی بنیاد پر قائم ہیں اسلام نے صفات الٰہی کی توضیح وتصریح میں جس جامعیت اور ہمہ گیری سے کام لیا ہے وہ دنیا کے دوسرے مذاہب میں مفقود ہے۔ اس کے تمام خارجی ادارے اور تمام نظامات اسی ایک مصدر سے مشتق ہیں اسلامی مملکت کا تصور، اسلام کا قانونی نظام رسول کی شخصیت اور اس کا منصب، اسلامی معاشرے کا اخلاقی ضابطہ اعمال وفرائض کی تمام شاخیں غرض کہ اسلامی نظام کا ہر معمولی سے معمولی جزء بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ اس مرکزی تخیل سے ہے۔ اس بنیادی تصور کو نکال دیجئے تو اسلامی زندگی کا کوئی جزء بھی اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ میدانِ جنگ ہی کی خصوصیت نہیں بلکہ اسلامی زندگی کے منصۂ شہود پر آنے کی وجہ یہی ہے کہ شخصیت کے نشوونما اور اجتماعی سیرۃ کی تعمیر کے راستہ میں جتنی رکاوٹیں ہو سکتی ہیں انہیں دور کرے اور وہ تمام ترہیبات وترغیبات فراہم کرے جو اس مقصد کے حصول میں مددگار ہوں۔ یہی وجہ ہے کہ اسلامی مملکت کا تصور اللہ سبحانہ کی ذات وصفات کے بنیادی اور مرکزی تصور سے ماخوذ ہے۔

اہل ایمان کو جہاد کی ترغیب

(۸۱) اے نبی مسلمانوں کو لڑائی کا شوق دلا۔ مسلمانو! اگر تم میں سے بیس آدمی ثابت قدم ہوں تو دو سو پر غالب آئیں گے اور اگر تم میں سے ایک سو ہوں گے۔ تو ایک ہزار کافروں پر غالب آئیں گے۔ یہ اس لیے کہ کافر بصیرت سے محروم ہیں۔ یہ مسلمانوں کو جہاد کی ترغیب دی ہے کہ تھوڑے بھی ہوں تو جی نہ چھوڑیں۔ خدا کی رحمت سے دس گنے دشمنوں پر غالب آئیں گے سبب یہ ہے کہ مسلمان کی جنگ محض خدا کے لیے ہے وہ خدا کو اور اس کی مرضی کو پہچان کر اور یہ سمجھ کر میدان جنگ میں قدم رکھتا ہے کہ اللہ سبحانہ کے راستہ میں مرنا اصلی زندگی ہے۔ اس کو یقین ہے کہ میری تمام قربانیوں کا ثمرہ آخرت میں ملنے والا ہے خواہ میں غالب ہوں یا مغلوب اور اعلائے کلمۃ اللہ کے لیے جو تکلیف اٹھاتا ہوں وہ فی الحقیقت مجھے دائمی خوشی اور ابدی مسرت سے ہمکنار کرنے والی ہے۔ مسلمان جب یہ سمجھ کر جنگ کرتا ہے تو

تائید ایزدی مددگار ہوتی ہے اور موت سے وحشت نہیں ہوتی۔ اسی لیے پوری دلیری اور بے جگری سے لڑتا ہے کافر چونکہ اس حقیقت کو نہیں سمجھ سکتا اس لیے محض حقیر اور فانی اغراض کے لیے بہائم کی طرح لڑتا ہے۔ اور قوت قلبی اور امداد غیبی سے محروم رہتا ہے۔ بناء علیہ خبر اور بشارت کے رنگ میں حکم دیا گیا کہ مومنین کو اپنے سے دس گنے دشمنوں کے مقابلے پر ثابت قدمی سے لڑنا چاہیے۔ اگر مسلمان بیس ہوں تو دو سو کے مقابلہ سے نہ ہٹیں اور سو ہوں تو ہزار کو پیٹھ نہ دکھلائیں (تنبیہ) بیس اور سو دو عدد شاید اس لیے بیان فرمائے کہ اس وقت مسلمان تعداد کے لحاظ سے "سریہ" میں کم از کم بیس اور جیش میں ایک سو سپاہی ہوتے ہوں گے۔ اگلی آیت مدت کے بعد اتری اس وقت مسلمانوں کی تعداد بڑھ گئی تھی اس لیے سریہ کم از کم ایک سو کا اور جیش ایک ہزار کا ہوگا۔ دونوں آیتوں میں یہاں نسبت کے وقت اعداد کا یہ تفاوت ظاہر کرتا ہے کہ اگلی آیت کے نزول کے وقت مسلمانوں کی مردم شماری بڑھ گئی تھی [1]

اس آیت میں سب سے پہلے اور اہم بات تحریض علی القتال کی ہے حکم ہوا ہے کہ اے نبی مسلمانوں کو جنگ کا شوق دلا۔ ترغیب دے یعنی مسلمانوں کو ترغیب دے کہ اللہ کے کلمہ بلند کرنے اور کفر کے شر و فساد کو ختم کرنے کے لیے تیار ہو جائیں۔ حث اور تحقیق کی عام عربی کو چھوڑ کر تحریض کی تعبیر یہ بتانے کے لیے اختیار کی گئی ہے کہ اس میں تمہارا بچاؤ ہے اگر ایسا نہ کروگے تو تمہاری ہلاکت ہے۔ اور ایسا کہنے کی وجہ صرف یہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں داخل ہونا اپنے نفس کے جملہ حقوق سے دست بردار ہونا ہے۔ کیونکہ اسلام کے لفظی معنے ہیں کہ اپنے تئیں کسی کے حوالہ کر دینا اور اس کی پوری پوری طاعت بجا لانا ایک شخص جب مسلمان ہوتا ہے تو وہ اس بات کا وعدہ کرتا ہے اس کا ارادہ اس کی عقل اس کے جذبات و خواہشات قانون الٰہی اور احکام خداوندی کی اطاعت میں حائل نہ ہو سکیں گے اور خدا کے حکم کے مقابلے میں وہ ان سب کی قربانی دینے پر آمادہ رہے گا۔ اس اطاعت و سپردگی کے معاوضہ میں اسے رضائے الٰہی اور تقرب خداوندی کی بشارت دی جاتی ہے۔ اس پورے معاملہ کو قرآن نے انتہائی بلاغت کے ساتھ چند لفظوں میں بیان کر دیا ہے۔ ان اللہ اشترٰی من المومنین انفسھم واموالھم بان لھم الجنۃ

بس اسی بنا پر بیان فرمایا ہے کہ اے پیغمبر ان لوگوں کو جو اللہ سے ایمان کے نام پر معاہدہ کر چکے ہیں ان کو قتال کا شوق دلائیے اس سے معلوم ہوا کہ اہل ایمان کو ترغیب دینا ہی ایک مستقل فریضہ ہے۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے عین میدان جنگ میں یہی ترغیب دی ہے۔ غزوہ بدر میں حضور اقدس ﷺ ایک خیمہ میں تشریف فرما تھے۔ آپ نے صحابہ سے ارشاد فرمایا۔ قوموا الی جنۃ عرضھا السموات والارض آگے بڑھو ایسی جنت کی طرف جس کی چوڑائی آسمان و زمین سے کہیں زیادہ ہے۔ اور متقیوں کے لیے بنائی گئی ہے۔ حضرت عمیر بن الحمام ایک صحابی ہیں وہ بھی سن رہے تھے کہنے لگے واہ واہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا واہ واہ

[1] ارشادات حضرت شیخ الاسلام

کس بات پر عرض کیا کہ یارسول اللہ مجھے یہ تمنا ہے کہ میں بھی ان میں سے ہوتا۔ آپ نے فرمایا تم بھی ان میں سے ہو۔ اس کے بعد جھولی میں سے چند کھجوریں نکالیں اور کھانے لگے۔ اس کے بعد کہنے لگے کہ ان کھجوروں کے ختم ہونے کا انتظار جو ہاتھ میں ہیں بڑی لمبی زندگی ہے۔ کہاں تک انتظار کروں گا۔ یہ کہہ کر ان کو پھینک دیا اور تلوار لے کر مجمع میں گھس گئے اور شہید ہونے تک لڑتے رہے [1]

دوسری بات اس آیت میں ایک اور دس کی نسبت کے بارے میں ارشاد ہوتی ہے یعنی تمہیں جم کر میدان میں مقابلہ کرنا چاہیے اگر تم بیس ہو گئے تو دو سو پر غالب ہو گے۔ یعنی ایک مسلمان دس کافروں پر غالب ہو گا۔ یہ اگرچہ خبر ہے اور اس لحاظ سے بشارت ہے لیکن ساتھ ہی یہ حکم بھی ہے کہ اگر مسلمان بیس ہوں تو دو سو کا مقابلہ کریں مطلب یہ ہے کہ اگر کسی جگہ اسی نسبت سے ان سے مقابلہ کی نوبت آجائے تو قلت تعداد کو بہانہ بنا کر پیٹھ دکھانا جائز نہیں ہے۔ پیٹھ دکھانے کا گناہ سنگین ہے۔

یاایھا الذین اٰمنوا اذا لقیتم الذین کفروا زحفا فلا تولوھم الادبار۔

مسلمانو! جب کافروں کے لشکر سے تمہارا مقابلہ ہو جائے تو تم انہیں پیٹھ نہ دکھاؤ۔

اس لیے قدرتی طور پر مسلمانوں نے اس ذمہ داری کو محسوس کیا ہوگا۔ اور اسی احساس کے ساتھ اس کو ادا کرنے کی کوشش کی ہوگی۔ مطلب یہ ہے کہ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ ایمان و کفر کے مقابلے میں اگر ایک اور دس کی بھی نسبت ہو تو ایمان کو غالب ہونا چاہیے اور کفر کو مغلوب ہونا چاہیے ——— ایمان کو غالب اور کفر کو کیوں مغلوب ہونا چاہیے یعنی اس ایک اور دس کی نسبت میں آگے آیت میں اس کی توضیح ہے۔ ارشاد ہے۔ بانھم قوم لا یفقھون۔ یعنی ایمان و کفر میں ایک اور دس کی نسبت اگر ہو تو ایمان کی کامیابی کا راز یہ ہے ——————— کہ ایمان اپنے مقصد کا شعور رکھتا ہے اور ٹھنڈے دل سے خوب سوچ سمجھ کر اس سے لڑ رہا ہے کہ جس چیز کے لیے وہ جان کی بازی لگانے آیا ہے وہ اس کی انفرادی زندگی سے زیادہ قیمتی ہے اور اس کے ضائع ہو جانے کے بعد جینا بے قیمت ہے لا کفر کے ساتھ لڑنے والے آدمی سے کئی گنی زیادہ طاقت رکھتا ہے اگر جسمانی طاقت میں کافر اور مومن کے درمیان کوئی فرق نہ ہو۔ پھر ایمان کو جب حقیقت کا شعور حاصل ہو جو اپنی ہستی اور اللہ سبحانہ کی ذات گرامی اور اللہ سبحانہ کے ساتھ اپنے تعلق اور حیات دنیا کی حقیقت اور موت کی حقیقت اور آخرت کو اچھی طرح جانتا ہو اور جسے حق و باطل کے فرق اور غلبہ باطل کے نتائج کا بھی صحیح ادراک ہو اس کی طاقت کو وہ لوگ بھی نہیں پہنچ سکتے جو قومیت یا وطنیت یا روٹی کپڑے مکان کا شعور لے کر میدان میں آئیں۔ قرآن نے ایک موقعہ پر ایمان کا چہرہ یہ پیش کیا ہے۔

---

[1] طبقات ابن سعد مسلم کتاب الامارہ

والذین اذا ذکروا بآیات ربھم لم یخروا علیھا صما وعمیانا۔

جب ان کو ان کے رب کی باتیں سمجھائی جائیں تو ان پر وہ بہرے اندھے ہو کر نہیں گرتے ہیں۔

بلکہ نہایت فکر و تدبر اور دھیان سے سنتے ہیں اور سن کر متاثر ہوتے ہیں اس میں تذکیر کا نتیجہ یہ بتایا ہے کہ آپ کے مخاطب صرف جذباتی نہیں بلکہ انتہائی عقل مند اور مدبر ہیں اور اپنے رب کی باتوں کو خوب سوچ سمجھ کر اپناتے ہیں۔ یہاں نبوت کی تحریض کا یہ نتیجہ بتایا جا رہا ہے کہ اہل ایمان ارباب بصیرت ہیں۔ ان کو مقصد کا پورا پورا شعور حاصل ہے۔ اس شعور کے ساتھ جب مومن میدان جنگ میں نکلتا ہے تو وہ اپنے نہاد وجود کے اندر ایک لشکر کی قوت محسوس کرتا ہے اس کو اپنے دائیں بائیں اللہ سبحانہ کی نصرت نظر آتی ہے موت اس کو زندگی سے زیادہ محبوب ہو جاتی ہے اس لیے کہ اس کی بصیرت اس کے سامنے اس منزل کو روشن کر کے دکھاتی ہے جو اللہ کی راہ میں شہید ہونے والوں کے لیے مخصوص ہے۔ یہی بصیرت اس کے اندر وہ ثبات پیدا کرتی ہے جو اس کو تنہا اس بصیرت سے محروم دس آدمیوں پر غالب کر دیتی ہے۔

اس سے آپ کو نبوت کی تذکیر اور تحریض دونوں کے اہل ایمان میں نتائج نمایاں محسوس ہوں گے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی دعوت فکر و غور دانش و بینش، عقل و شعور کی دعوت ہے نہ کہ دیوانگی۔ اور بے عقلی کی۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ آگے آ رہی ہے۔

اس سے یہ نکتہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اہل ایمان کو کافروں سے زیادہ ہر علم و فن میں جانکار ہونا چاہیے۔

خلاصہ یہ ہے کہ ایمان کا رتبہ اصل تو یہی ہے کہ مقابلہ کے وقت مومن و کافر میں ایک اور دس کی نسبت ہو۔ اسی کو عزیمت کہتے ہیں عزیمت کے ساتھ رخصت بھی بتا دی۔

جنگ میں اہل ایمان کے لیے رخصت

(۸۲) مسلمانو! اب اللہ سبحانہ نے تمہارا بوجھ ہلکا کر دیا ہے اسے علم ہے کہ تم میں کمزوری ہے۔ اب اگر تم ثابت قدم ایک سو ہو گے تو دو سو پر غالب ہو گے۔ اور تم ہزار ہو گے تو دو ہزار کو مغلوب کر دو گے بلاشبہ اللہ سبحانہ ثابت قدم رہنے والوں کے ساتھ ہے۔

بخاری میں ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ گذشتہ آیت جس میں مسلمانوں کو دس گنا کافروں کے مقابلے پر ثابت قدم رہنے کا حکم تھا۔ جب لوگوں کو بھاری معلوم ہوئی تو اس کے بعد یہ آیت اتری الان خفف اللہ عنکم۔ یعنی خدا نے تمہاری ایک قسم کی کمزوری اور سستی کو دیکھ کر پہلا حکم اٹھا لیا۔ اب صرف اپنے سے دگنی تعداد کے

مقابلے میں ثابت قدم رہنا ضروری اور بھاگنا حرام ہے۔ یہ کمزوری اور سستی جس کی وجہ سے حکم میں تخفیف ہوئی کئی وجوہ سے ہو سکتی ہے۔ ابتدائے ہجرت میں گنے چنے مسلمان تھے جن کو قوت و جلادت معلوم تھی کچھ مدت کے بعد ان کے بہت سے افراد بوڑھے اور کمزور ہو گئے اور جو نئی پود آئی ان میں پرانے مہاجرین و انصار جیسی بصیرت استقامت اور تسلیم و تفویض نہ تھی۔ اور تعداد بڑھ جانے سے کسی درجہ میں اپنی کثرت پر نظر اور توکل علی اللہ میں قدرے کمی ہوئی ہو گی۔ اور ویسے بھی طبیعت انسانی کا خاصہ ہے کہ جو سخت کام تھوڑے آدمیوں پر پڑ جائے تو کرنے والوں میں جوشِ عمل ہوتا ہے اور ہر شخص اپنی بساط سے بڑھ کر ہمت کرتا ہے لیکن وہی کام جب بڑے مجمع پر ڈال دیا جائے تو ہر ایک دوسرے کا منتظر رہتا ہے اور یہ سمجھتا ہے کہ آخر کچھ میں ہی تنہا اس کا ذمہ دار نہیں ہوں۔ اسی قدر جوش حرارت اور ہمت میں کمی ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ اول کے مسلمان یقین میں کامل تھے۔ ان پر حکم ہوا تھا کہ اپنے سے دس گنے کافروں پر جہاد کریں۔ پچھلے مسلمان ایک قدم کم تھے تب یہی حکم ہوا کہ دگنوں پر جہاد کریں۔ یہی حکم اب بھی باقی ہے اگر دو سے زیادہ پر حملہ کریں تو بڑا اجر ہے۔ حضرت کے وقت میں ہزار مسلمان اسی ہزار سے لڑے ہیں۔ غزوہ موتہ میں تین ہزار مسلمان دو لاکھ کے مقابلہ میں ڈٹے رہے۔ اس طرح کے واقعات سے اسلام کی تاریخ پُر ہے[1]

اس سے پہلی آیت میں اہلِ ایمان اور اہلِ کفر میں ایک اور دس کی نسبت بتائی گئی تھی۔ اب یہاں ایک اور دو کی نسبت بتائی جا رہی ہے مطلب یہ ہے کہ اگرچہ اہلِ ایمان اور اہلِ کفر کے درمیان طاقت کی نسبت ایک اور دس ہی کی ہے لیکن چونکہ مسلمانوں میں اب کچھ کمزوری ہے اس لیے اب اس عزیمت میں یہ رخصت دے دی گئی ہے کہ ایک مسلمان دو کافروں کا مقابلہ کرے۔ دونوں حکم ہیں ایک عزیمت ہے اور دوسرا رخصت ہے پڑھ آئے ہو کہ سورۃ انفال کچھ آیتوں کو مستثنیٰ کرنے کے بعد ساری یکبار نازل ہوئی ہے اور غزوہ بدر کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اس آیت میں رخصت کی علت وعلم ان فیکم ضعفًا میں ضعف کو قرار دیا تھا۔ یہ ضعف کیا تھا۔ شارحین قرآن نے ایک سے زیادہ باتیں بتائی ہیں۔ کسی نے کہا کہ بدنی قوت ہے۔ کسی نے بتایا کہ بصیرت کی کمی ہے کوئی بولا کہ توکل اور اعتماد علی اللہ کی قلت ہے لیکن یہ سب مفروضات ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ بدر پہلی جنگ تھی۔ اور اتفاقی حادثہ کے طور پر پیش آ گئی تھی۔ اہلِ ایمان کی پیشِ نظر مقصد کے مطابق تربیت کم ہوئی تھی۔ تربیت کی کمی کی اس سورت میں قرآن نے نشاندہی کی ہے۔ مثلاً سب سے پہلے جنگ ختم ہوتے ہی کچھ لوگ مالِ غنیمت لوٹنے اور قیدیوں کو پکڑنے میں لگ گئے۔ قرآن نے تریدون عرض الدنیا کہہ کر اس طرف اشارا کیا۔ پھر مالِ غنیمت جمع ہوا تو اس کی تقسیم پر باہم جھگڑا ہو گیا قرآن نے الانفال للہ والرسول فاتقوا اللہ واصلحوا ذات بینکم کہہ کر اشارا کیا۔ اور اس پر مزید یہ کہ معلوم ہو جانے

[1] افادات شیخ الاسلام

کے باوجود کہ اللہ کا وعدہ ہے کہ دو میں سے ایک ملے گا مشرکین کی فوج یا تجارتی قافلہ۔ عام نگاہیں تجارتی قافلے کی فکر میں تھیں قرآن نے اس طرف یہ کہہ کر اشارہ کیا ہے و تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم یہی وہ کمزوریاں ہیں جن کی طرف قرآن نے اشارہ کیا اور بتایا ہے کہ ان کمزوریوں کی وجہ سے اللہ سبحانہ نے رخصت دے دی ہے یعنی عزیمت تو یہ ہے کہ ایک اور دس کی نسبت ہو رخصت یہ ہے کہ ایک اور دو کی نسبت ہو تاریخ بتاتی ہے کہ اس کے بعد جب اہل ایمان کی نبوت نے بھرپور تربیت کر دی تو اہل ایمان نے صرف ایک اور دس کی نسبت ہی نہیں بلکہ اس سے کہیں زیادہ نسبتیں قائم کر کے فتوحات حاصل کی ہیں۔ جنگ موتہ میں حضور اقدس ﷺ نے جو لشکر روانہ کیا تھا اس کی تعداد صرف ۳۰۰۰ ہزار تھی لشکر اسلام مدینہ سے روانہ ہوا۔ ادھر خود ہرقل قیصر روم ایک لاکھ فوج کے ساتھ مآب میں موجود تھا اور ایک لاکھ جنگ جو لخم۔ جذام وغیرہ قبائل میں سے جمع ہو گئے۔ اور روایات میں پورے لشکر کی تعداد کم از کم ڈیڑھ لاکھ بتائی ہے۔ صحیح بخاری میں خود حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ کا بیان ہے کہ جنگ موتہ میں میرے ہاتھ سے نو تلواریں ٹوٹی ہیں۔ یرموک کا واقعہ اس سے زیادہ حیرت انگیز ہے صحابہ کرام کی تعداد چوبیس ہزار ہے اور رومیوں کی دو لاکھ ہے رومیوں کے مقتولین کی تعداد ستر ہزار ہے۔ سوچئے نبوت کی ۲۳ سالہ تربیت کے بعد کفر و ایمان کے درمیان ایک اور دس سے بڑھ کر تناسب کیا ہوا کیا ایک نے آٹھ ہزار سے مقابلہ نہیں کیا ہے۔

اس لیے آیت میں تخفیف کا یہ مطلب نہیں ہے کہ پہلے ایک اور دس کی نسبت تھی اور اب ایک اور دو کی نسبت ہے بلکہ اس کا صحیح مطلب یہ ہے کہ اصولی اور معیاری حیثیت سے تو اہل ایمان اور کفار میں ایک اور دس ہی کی نسبت ہے لیکن چونکہ ابھی تربیت مکمل نہیں ہوئی ہے اس لیے سردست صرف یہی مطالبہ ہے کہ اپنے سے دگنی طاقت سے ٹکرانے میں تمہیں کوئی تامل نہ ہونا چاہیے۔ اسلام کی عمر آزاد ماحول میں صرف دو سال کی ہوئی تھی اور اہل ایمان کی اجتماعی تربیت بالکل ابتدائی حالت میں تھی۔ کہ بدر کا حادثہ پیش آ گیا۔ اس کے بعد آپ کی تربیت کاملہ کے نتیجہ میں زمانہ نبوت ہی میں صحابہ کمال تربیت کا بہترین نمونہ بن گئے۔ اکثر دگنی تگنی اور بعض وقت دس گنی طاقت سے مقابلہ ہوا اور قریب قریب ہمیشہ ہی فتح حاصل ہوئی۔ چند محلوں پر مشتمل ایک شہری مملکتہ سے جو آغاز ہوا وہ روزانہ ۲۷۴ میل مربع کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی ہے اور دس سال بعد جب حضور اقدس ﷺ رحلت فرمائے دار بقا ہوئے تو دس لاکھ میل سے زیادہ مربع میل کا رقبہ آپ کے زیر اقتدار آ چکا تھا۔ یہ اسی اجتماعی تربیت کا نتیجہ تھا۔ اس کے بعد جو کچھ ہوا وہ دنیا جانتی ہے۔

کیا یہ آیت ناسخ ہے

عام خیال یہی ہے کہ یہ آیت جس میں ایک اور دو کی نسبت بتائی گئی ہے پہلی آیت کو منسوخ کر رہی ہے جس میں

اہل ایمان اور اہل کفر کے لیے ایک اور دس کی نسبت بتائی گئی تھی۔ اس کی تائید میں عام شارحین قرآن حضرت عبداللہ ابن عباس کا وہ اثر پیش کرتے ہیں جو امام بخاری نے صحیح میں نقل کیا ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں۔ جب یہ آیت قرآنی ان یکن منکم عشرون صابرون یغلبوا مائتین۔ نازل ہوئی۔ تو مسلمانوں کو یہ خیال کرکے کہ ایک مسلمان کو دس کافروں کے مقابلہ سے روگردانی ناجائز ہے بہت گرانی ہوئی تو یہ آیت تخفیف نازل ہوئی الآن خفف اللہ عنکم اللہ نے گنتی میں کمی کر دی اور اسی نسبت سے صبر میں بھی کمی کر دی۔

حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ ابن المبارک اور وہب بن جریر کی روایت میں نقص من الصبر کی جگہ نقص من النصر آیا ہے۔ پہلی روایت کا مطلب یہ ہے کہ جس جماعت کا ایک اور دو کی نسبت میں مطالبہ ہے وہ ایک اور دس کی نسبت سے کمتر ہے یعنی مقابل کی جتنی عددی طاقت کم ہوئی اسی قدر مومن کے صبر میں کمی آگئی اور دوسری روایت کا مطلب یہ ہے کہ جس قدر نصرت اللہ کی جانب سے ایک اور دس کے مقابلہ میں ہوگی اتنی ایک اور دو کے مقابلہ میں نہ ہوگی مطلب یہ ہے کہ اسباب و وسائل جس قدر زیادہ ہوتے جاتے ہیں اللہ سبحانہ کی براہ راست مدد اسی نسبت سے کم ہوتی جاتی ہے۔ اور یہ بات بالکل واضح ہے کہ اللہ کی نصرت کا استحقاق اپنے اندر صفت صبر پیدا کرنے سے ہوتا ہے۔ صفت صبر پیدا کیے بغیر نصرت نہیں آتی ہے صرف اتنی بات معلوم ہوتی ہے کہ ایک اور دس کا مقابلہ عزیمت ہے ایک اور دو کا مقابلہ رخصت ہے۔ ہاں امام محمد بن اسحاق کی روایت میں حضرت عطاء کے حوالہ سے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے یہ الفاظ آئے ہیں نسختها بالاية الاولی۔ حافظ عسقلانی فرماتے ہیں اس کی سند میں اتصال نہیں ہے۔ اور یہ نسخ بھی اصطلاحی نہیں ہے۔ اصل بات وہی ہے جو پہلے بتائی جا چکی ہے کہ پہلی آیت میں عزیمت بتائی گئی ہے جب کہ دوسری آیت میں رخصت ہے اور یہ ایسا ہی ہے جیسے مسافر کے لیے سفر میں روزہ رکھنا عزیمت ہے اور چھوڑ دینا رخصت ہے۔

علامہ قرطبی نے یہ بات خوب لکھی ہے۔

حدیث ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما بتاتی ہے کہ ایک اور دس کی نسبت ضروری تھی لیکن اس فرض کو ایک اور دو کی نسبت دے کر تخفیف کر دی اور اب یہ ضروری ہو گیا کہ ایک سو مسلمان دو سو کافروں کے مقابلہ سے روگردانی نہ کریں لہذا یہ تخفیف ہوئی نہ کہ نسخ

یہاں یہ بات ذہن میں رکھنے کی ہے کہ اپنے سے زیادہ تعداد پر غالب آنے کی وجہ جو دونوں آیتوں میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ مسلمانوں میں صفت صبر موجود ہے۔ پہلی آیت میں ان یکن منکم عشرون صابرون اور

آیت تخفیف میں فان یکن منکم مائۃ صابرۃ یغلبوا مائتین اور اصول کا قاعدہ ہے کہ صفت کا صیغہ کلام میں علت کا کام دیتا ہے جیسے السارق والسارقۃ فاقطعوا میں قطع ید کی علت چوری ہے ٹھیک اسی طرح یہاں غلبہ کی علت صبر ہے۔ صبر کے لغوی معنے رو کنے اور سہارنے کے ہیں۔ اسی سے جماؤ اور ثابت قدمی کے معنے میں آیا ہے یعنی لڑائی پیش آجانے کی صورت میں میدانِ جنگ میں بہادرانہ استقامت اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرنا۔ قرآن نے اس لفظ کو اس معنے میں بے شمار مواقع پر استعمال کیا ہے۔ ظاہری قلت تعداد کی تلافی اسی صبر و ثبات کی روحانی قوت سے ہوتی ہے۔ یہی وہ صفت ہے جسے قرآن اپنے ماننے والوں میں زیادہ سے زیادہ پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اول دن سے لے کر دعوت و تبلیغ کی انتہائی منزلوں تک مومن کو اس کی ضرورت ہے۔ یہی وہ قوت ہے جو اسے تنہائیوں میں گھر کی چار دیواری میں بازاروں میں میدان جنگ میں اور حکومت کے تخت پر ہر جگہ اللہ کے دین پر قائم رکھ سکتی ہے صبر کے اس مفہوم کو سامنے رکھنے کے بعد یہ بات آسانی سے سمجھ میں آسکتی ہے کہ مومنین کی تھوڑی تعداد اہل کفر کی زیادہ تعداد پر کس طرح غالب آسکتی ہے۔

مَا كَانَ لِنَبِيٍّ أَنْ يَكُوْنَ لَهٗٓ أَسْرٰى حَتّٰى يُثْخِنَ فِي الْأَرْضِ ۭ تُرِيْدُوْنَ عَرَضَ الدُّنْيَا ڰ وَاللّٰهُ يُرِيْدُ الْاٰخِرَةَ ۭ وَاللّٰهُ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٧﴾ لَوْلَا كِتٰبٌ مِّنَ اللّٰهِ سَبَقَ لَمَسَّكُمْ فِيْمَآ أَخَذْتُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ ﴿٦٨﴾ فَكُلُوْا مِمَّا غَنِمْتُمْ حَلٰلًا طَيِّبًا ڮ وَّاتَّقُوا اللّٰهَ ۭ إِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٦٩﴾

ع ۵

نبی کے یہ بات شایان نہیں ہے کہ ملک میں غلبہ حاصل ہوئے بغیر قیدی بنائے مسلمانو! تمہاری نگاہیں دنیا کا سامان دیکھ رہی ہیں اور اللہ سبحانہ کے پیش نظر تمہارے لیے آخرت ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔[۸۳] اگر پہلے سے نوشتہ خداوندی نہ ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے تو اس کی پاداش میں تمہیں سنگین سزا ملتی[۸۴] لہٰذا اب جو کچھ تمہیں غنیمت میں ملا ہے حلال و طیب ہے اسے استعمال کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔[۸۵]

مُفردات کے معانی

اسرٰی یہ اسر سے ہے اسیر کی جمع ہے جیسے جریح اور قتیل کی جمع جرحٰی اور قتلٰی آتی ہے۔ اسیر کی جمع اساریٰ بھی آتی ہے۔ ابوجعفر نے یہاں اساریٰ بھی پڑھا ہے۔ اِسار اصل میں پیر کی بیڑی کو کہتے ہیں اور قیدیوں کو بیڑیوں سے باندھتے تھے اس لیے ہر جنگ میں گرفتار کو اسیر کہنے لگے خواہ پیر میں بیڑی نہ بھی ہو۔ ابوعمرو بن العلاء نے اسریٰ اور اساریٰ میں ایک لطیف فرق بتایا ہے گرفتاری کے وقت جن قیدیوں کو باندھا نہ جائے وہ اسریٰ ہیں اور جن

کو گرفتاری کے وقت باندھ دیا جائے اساری ہیں۔

یثخن۔ یہ مضارع ہے۔ اثخان سے۔ اصل ثخن ہے ثخانتہ دبیز اور موٹائی کو کہتے ہیں ہر موٹی چیز اور سخت چیز کو ثخین کہتے ہیں۔ جرابوں میں مسح کے لیے فقہاء نے ثخانتہ کو شرط قرار دیا۔ علامہ موصلی المختار میں لکھتے ہیں یجوز المسح علی الجوربین اذا کانا ثخینین۔ بطور استعارہ قتل میں زیادتی اور مبالغہ کو کہتے ہیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ قتل وحرکت سے روک کر آدمی کو سخت بنا دیتا ہے۔ اسی سے اثخنہ المرض بولا جاتا ہے جب بیماری طاقتور ہو کر بیمار کو لاچار کردے۔ اسی لیے امام واحدی نے اثخان کے معنے قوت اور شدت کے بتائے ہیں۔ عرض سامان جو وقتی ہو اسی سے الدنیا عرض حاضر بولا جاتا ہے اسی سے متکلمین جوہر کے بالمقابل کو بطور استعارہ عرض کہتے ہیں نقد کے مقابلے پر جو سامان ہوتا ہے اسے بھی عرض کہتے ہیں۔ امام راغب فرماتے ہیں عرض وہ ہے جسے ثبات نہ ہو۔ علامہ السید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں عرض کے معنے دنیا کے مٹ جانے والے سامان کے ہیں اور عرض بسکون راء سونے چاندی کے علاوہ ساز وسامان کو کہتے ہیں اس کی جمع عروض آتی ہے۔ دنیوی اثاثہ کو عرض کیوں کہتے ہیں اس کی وجہ علامہ شوکانی نے یہ بتائی ہے کہ وہ عارضی فانی اور ناپائیدار ہوتا ہے اور عرض بکسر العین کے معنے آبرو کے ہیں۔ سعد بن ناشب کہتا ہے۔

واذھل من داری واجعل ھدمھا
لعرضی من باقی المذمۃ حاجبًا

ابراہیم بن کنیف النبہانی کہتا ہے۔

وقینا بحسن الصبر منا نفوسنا
فصحت لنا الاعراض والناس ھزّل

آبرو کو عرض ہی اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کو ثبات نہیں ہوتا ہے۔ بہرحال عرض کے معنے عارضی، وقتی، ہنگامی اور بے ثباتی کے ہیں۔

جہاد کا مقصد اعلاء کلمۃ اللہ ہے

جو عمل سب سے اونچا ہو۔ کوئی وجہ نہیں کہ اس کا اجر بھی سب سے اونچا نہ ہو قرآن کی آیات اور ارشادات نبوت میں اس کے کھلے اشارات ہیں بلکہ وضاحتیں موجود ہیں۔ مزید اطمینان کے لیے جناب رسول اللہ ﷺ کے یہ ارشادات بھی سنیے۔

دو آنکھوں کو دوزخ کی آگ نہ چھوئے گی۔ ایک وہ جو اللہ کے خوف سے رو پڑی۔ دوسری وہ جس نے اللہ کی راہ میں پہرہ دیتے ہوئے رات گذاری ہو۔ (ترمذی)

جہاد فی سبیل اللہ کی گرد اور جہنم کا دھواں یہ دونوں چیزیں کسی بھی شخص کے لیے جمع نہیں ہو سکتی ہیں۔ (ترمذی)

غزوہ بدر میں جن لوگوں نے شرکت کی۔ ان کے بارے میں آپ نے ایک موقعہ پر فرمایا۔

تمہیں کیا معلوم شاید کہ اللہ تعالیٰ نے اہل بدر کی طرف دیکھ کر فرما دیا ہو، جو چاہے کرو میں نے تمہیں بخش دیا ہے۔

مطلب اس کا یہ نہیں ہے کہ یہ مستقبل میں گناہ کرنے کا پروانہ ہے بلکہ منشا یہ ہے جیسا کہ علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ اللہ سبحانہ بدر میں شرکت کرنے والوں کو مستقبل میں طاعت کی توفیق عطا فرمائے گا اگر ان سے کوئی غلطی ہو جائے گی تو اس کو معاف کر دے گا اور ایمان کی اس نعمت سے مالا مال رکھے گا جن سے ان کے سینے بھرے ہوئے ہیں۔

جہاد کو اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں جو اتنا اونچا مقام حاصل ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ کی بندگی ایک مومن کا مقصدِ حیات ہے اور امتِ مسلمہ کا منشا تخلیق یہ اور صرف یہ ہے کہ اس مقصدِ حیات سے دنیا کو روشناس کرائے اور اس کی شہادت دے۔ اس سے بڑی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے جو اپنی جان دے کر پیش کی جائے۔

دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسلمان کے وجود کا جو مقصد ہے یہ مسلح جہاد اس کے حصول کی سب سے اونچی اور معیاری کوشش ہے۔ اس مقصد کی اونچائی۔ اس کی بلندی، اس کی رفعت ایک بے غبار حقیقت ہے اصول کی بات ہے کہ جو چیز بہت ارفع اور شاندار ہوتی ہے وہ اسی قدر نازک بھی ہوتی ہے۔ مقصد کے حصول کے لیے جہاد ایک ناگزیر ضرورت ہے لیکن بے حد نازک ہے ضرورت کا علم تو جلدی ہو جاتا ہے لیکن نزاکت کے لیے بہت بڑی طویل تربیت کی ضرورت ہے۔ بدر اسی مقصد کے حصول کی ایک معیاری کوشش تھی۔ لیکن یہ کوشش بغیر ارادے کے ہنگامی طور پر سامنے آگئی تھی۔ اور خواص کو چھوڑ کر کچھ کو اس کی نزاکت کا علم نہ تھا۔ نزاکت یہ کہ جہاد کا مقصد دولت کی فراہمی نہیں ہے بلکہ اللہ کے کلمہ کا بول بالا کرنا اور کفر کا زور توڑنا ہے۔ ضرورت تو سب کے علم میں تھی لیکن نزاکت کا احساس سب کو نہ تھا۔ اس کی وجہ سے بدر میں وہ کمزوریاں سامنے آئیں جن کی قرآن نے نشاندہی کی ہے مثلاً یہ

تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم

تم چاہتے تھے کہ تجارتی قافلہ ملے لشکر سے جنگ نہ کرنی پڑے۔

یہ بات اس لیے رونما ہوئی کہ نبوت نے کفر کی شوکت کا خاتمہ کرنے کے لیے پہلا قدم یہ اٹھایا کہ بزور قریشی

قافلوں کی آمدورفت کو اپنے زیر اثر علاقہ میں روک لیا جائے۔ یہی بدر کی لڑائی کا باعث ہے لوگوں نے اس سے یہ نتیجہ نکال لیا کہ دولت کی فراہمی مقصود ہے حالانکہ یہ مقصود نہیں مقصود کے حصول کا ذریعہ ہے۔ وسائل اور مقاصد کی تمیز طویل محنت اور بڑی تربیت سے پیدا ہوتی ہے اس کے نتیجے میں ساری کمزوریاں رُونما ہو گئیں۔

اول۔ جنگ کی دعوت کے موقعہ پر تجارتی قافلہ کی بات کرنے لگے۔

دوم۔ لڑائی ختم ہونے پر فوج کا تعاقب کرنے کی جگہ مال غنیمت سمیٹنے اور قیدیوں کو گرفتار کرنے میں لگ گئے یعنی جب بدر میں کفار کے پاؤں اکھڑے اور وہ وہاں سے بھاگ نکلے تو بجائے اس کے کہ مسلمان اسی جوش و خروش سے ان کا تعاقب کرتے اور کفر کے ان سرغنوں کو موت کے گھاٹ اتارتے تاکہ کفر کی کمر ٹوٹ جاتی اور اس کے سرغنہ لیڈروں کی قوت و نخوت کا فور ہو جاتی مگر وہ مال غنیمت اکٹھا کرنے اور قیدیوں کو گرفتار کرنے میں لگ گئے۔ اجلہ صحابہ حضرت سعد بن معاذ، حضرت عمر بن الخطاب اور حضرت عبداللہ بن رواحہ ﷺ کو یہ انداز ناگوار ہوا۔

سوم یہ کہ جنگ ختم ہونے کے بعد مال غنیمت کی تقسیم پر جھگڑ پڑے جیسا کہ سورہ کے آغاز میں آپ پڑھ آئے ہیں۔

یہ سب باتیں اس لیے رونما ہوئیں کہ ان لوگوں کو پہلی مرتبہ پرچم اسلام کے نیچے لڑنے کا اتفاق ہوا تھا۔ ان کو معلوم نہ تھا کہ اسلام میں جنگ اور اس سے پیدا شدہ مسائل کے متعلق ضابطہ کیا ہے۔ کچھ ابتدائی ہدایات سورہ بقرہ اور سورہ محمد میں دی جا چکی تھیں۔ لیکن اسلامی جنگ کی بنیاد رکھنی ابھی باقی تھی۔ بہت سے تمدنی مسائل کی طرح مسلمان ابھی تک جنگ کے معاملہ میں بھی اکثر پرانی رسوم اور رواجوں کے تصورات لیے ہوئے تھے۔

اس آیت میں بھی جنگ کے موضوع پر ایک غیر اسلامی طرزِ عمل کی اصلاح کی گئی ہے۔

جہاد کا اوّلین مقصد کفر کا خاتمہ ہے

(۸۳) نبی کے یہ بات شایانِ شان نہیں ہے کہ ملک میں غلبہ حاصل ہوئے بغیر قیدی بنا لے۔ مسلمانو تمہاری نگاہیں دنیا کا سامان دیکھ رہی ہیں اور اللہ سبحانہ کے پیشِ نظر تمہارے لیے آخرت ہے اور اللہ غالب حکمت والا ہے۔

بدر کی لڑائی سے ستر کافر مسلمانوں کے ہاتھوں میں قید ہو کر آئے حق تعالیٰ ان کے متعلق دو صورتیں مسلمانوں کے سامنے پیش کیں قتل کر دینا یا فدیہ لے کر چھوڑ دینا۔ اس شرط پر کہ آئندہ سال اسی تعداد میں تمہارے آدمی قتل کیے جائیں گے۔ حقیقت میں اللہ سبحانہ کی جانب سے ان دو صورتوں کا انتخاب کے لیے پیش کرنا۔ امتحان ت

و آزمائش کے طریقہ پر تھا کہ ظاہر ہو جائے کہ مسلمان اپنی رائے اور طبیعت سے کس طرف جھکتے ہیں جیسے ازواج مطہرات کو دونوں صورتوں میں تخییر دی گئی تھی۔

ان کنتن تردن الحیاۃ الدنیا و زینتھا فتعالین امتعکن و اسرحکن سراحًا جمیلا۔ (الاحزاب ع)

یا معراج میں آپ کے سامنے خمر و لبن دودھ شراب کے دو برتن پیش کیے گئے تھے آپ نے دودھ کو اختیار فرمایا تھا۔ جبریل علیہ السلام نے کہا کہ اگر بالفرض آپ شراب کو اختیار فرما لیتے تو آپ کی امت بہک جاتی۔ بہرحال آپ نے صحابہؓ سے اس معاملہ میں رائے طلب کی۔ ابو بکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ سب قیدی اپنے خویش و اقارب ہیں۔ بہتر ہے کہ فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔ اس نرم سلوک اور احسان کے بعد ممکن ہے کچھ لوگ مسلمان ہو کر وہ خود ان کی اولاد و اتباع ہمارے دست و بازو بن جائیں اور جو مال بالفعل ہاتھ آئے اس سے جہاد وغیرہ دینی کاموں میں سہارا ملے باقی آئندہ سال ہمارے ستر آدمی شہید ہو جائیں تو مضائقہ نہیں ہے درجہ شہادت لے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان بھی فطری رحمدلی اور شفقت و صلہ رحمی کی بنا پر اسی رائے کی طرف تھا بلکہ صحابہ کی عام رائے اسی طرف تھی۔ بہت سے ان ہی وجوہ کی بنا پر جو ابو بکرؓ نے بیان کیں۔ اور بعض محض مالی فائدے کو دیکھتے ہوئے اس رائے پر متفق تھے کما یظہر من قولہ تعالیٰ تریدون عرض الدنیا صرح بہ الحافظ ابن حجر وابن القیم۔ حضرت عمر اور سعد بن معاذ نے اس سے اختلاف کیا۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ قیدی کفر کے امام اور مشرکین کے سردار ہیں۔ ان کو ختم کر دیا جائے تو کفر و شرک کا سر ٹوٹ جائے گا۔ تمام مشرکین پر ہیبت پڑ جائے گی آئندہ مسلمانوں کو ستانے اور خدا کے راستہ سے ہٹانے اور روکنے کا حوصلہ نہ رہے گا۔ خدا کے آگے مشرکین سے ہماری انتہائی نفرت و بغض اور کامل بیزاری کا اظہار ہو جائے گا کہ ہم نے خدا کے معاملہ میں اپنی قرابتوں اور مالی فوائد کی کچھ پروا نہیں کی۔ اس لیے مناسب ہے کہ ان قیدیوں میں سے جو کوئی ہم میں سے کسی کا عزیز و قریب ہو وہ اسے اپنے ہاتھ سے قتل کرے۔ الغرض بحث و تمحیص کے بعد ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مشورہ پر عمل ہوا کیونکہ کثرت رائے اُدھر تھی۔ اور خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم طبعی رافت و رحمت کی بنا پر اسی طرف مائل تھے اور ویسے بھی اخلاقی اور کلی حیثیت سے عام حالات میں وہی رائے قرین صواب معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اسلام اس وقت جن حالات سے گذر رہا تھا ان پر نظر کرتے ہوئے وقتی مصالح کا تقاضا یہ تھا کہ کفار کے مقابلہ میں سخت کمر شکن کارروائی کی جائے۔ تیرہ سال کے ستم کشوں کو طاغوت کے پرستاروں پر یہ ثابت کر دینے کا پہلا موقعہ ملا تھا کہ تمہارے تعلقات قرابت، اموال جتھے اور طاقتیں اب کوئی چیز تم کو خدا کی شمشیر انتقام سے پناہ نہیں دے سکتی۔ ابتداء ایک مرتبہ ظالم مشرکین پر رعب و ہیبت بٹھلا دینے کے بعد نرم خوئی اور صلہ رحمی کے استعمال کے لیے آئندہ بہت سے مواقع باقی رہتے

تھے ادھر ستر مسلمانوں کے قتل پر آمادہ ہو جانا معمولی بات نہ تھی اسی لیے اس رائے کو اختیار فرمانا وقتی مصالح اور ہنگامی حیثیت سے حق تعالیٰ کے یہاں پسندیدہ نہ ہوا۔ ماکان لنبی ان یکون لہ اسریٰ حتی یثخن فی الارض میں اسی ناپسندیدگی کی طرف اشارا ہے۔ صحابہ رضی اللہ عنہم کی یہ ایک سخت خطرناک غلطی اجتہادی قرار دی گئی۔ اور جن بعض لوگوں نے زیادہ مالی فوائد پر نظر کر کے اس سے اتفاق کیا تھا۔ ان کو صاف طور پر تریدون عرض الدنیا سے خطاب کیا گیا یعنی دنیا کے فانی اسباب پر نظر کر رہے ہو۔ حالانکہ مومن کی نظر انجام پر ہونی چاہیئے خدا کی حکمت مقتضی ہو تو وہ تمہارا کام اپنے زور قدرت سے ظاہری سامان کے بغیر ہی کر سکتا ہے بہرحال فدیہ لے کر چھوڑ دینا اس وقت کے حالات کے اعتبار سے بڑی بھاری غلطی قرار دی گئی۔ اتنا یاد رکھنا چاہیے کہ روایات سے حضور کی نسبت صرف اس قدر ثابت ہے کہ محض صلہ رحمی اور رحمدلی کی بنا پر آپ کا رجحان اس رائے کی طرف تھا البتہ صحابہ میں بعض صرف مالی فوائد کو پیش نظر رکھ کر اور اکثر حضرات دوسری مصالح دینیہ اور اخلاقی داعیہ کے ساتھ مالی ضروریات کو بھی پیشِ نظر رکھ کر یہ رائے پیش کر رہے تھے۔ گویا صحابہؓ کے مشورے میں کلاًیا جزواً مالی حیثیت ضرور پیش نظر تھی کسی درجے میں مالی فوائد کے خیال سے بغض فی اللہ میں کوتاہی کرنا اور اصل مقصد جہاد سے غفلت برتنا اور ستر مسلمانوں کے قتل پر اپنے اختیار سے رضامند ہو جانا صحابہ جیسے مقربین کے مقام رفیع اور منصب جلیل کے منافی سمجھا گیا۔ اسی لیے ان آیات میں سخت عتاب آمیز لہجہ اختیار کیا گیا ہے۔ حدیث میں ہے کہ لڑائی میں ایک شخص کو سر پہ زخم آیا اسے غسل کی حاجت ہوئی۔ پانی سر پہ استعمال کرنا سخت مہلک تھا۔ ساتھیوں سے مسئلہ پوچھا انہوں نے کہا کہ پانی کی موجودگی میں ہم تیرے لیے گنجائش نہیں پاتے اس نے غسل کر لیا اور فوت ہو گیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جب اس کی اطلاع ہوئی فرمایا قتلوہ قتلھم اللہ (الحدیث) اس سے ظاہر ہوا کہ اجتہادی غلطی اگر زیادہ واضح اور خطرناک ہو تو اس پر عتاب ہو سکتا ہے گویا یہ سمجھا جاتا ہے کہ مجتہد نے پوری کوشش صرف کرنے میں کوتاہی کی [1]

حضرت شیخ الاسلام نے جو کچھ فرمایا ہے اس میں بنیادی اور اہم بات جس پر مطالب کی پوری عمارت اٹھائی گئی ہے یہ ہے کہ بدر میں جو لوگ گرفتار ہو کر آئے تھے ان کے بارے میں اللہ سبحانہ نے حضور اقدس کی وساطت سے مسلمانوں کو بتایا تھا کہ :

۱۔ ان کو قتل کر دو۔

۲۔ ان کو فدیہ لے کر چھوڑ دو۔

اس شرط پر کہ آئندہ سال مسلمانوں میں ستر کو شہید کرانے کے لیے تیار ہو جاؤ یعنی اگر فدیہ لے کر چھوڑا تو آئندہ سال

[1] افادات شیخ الاسلام

ستر مسلمانوں کی قربانی دینی ہوگی اس طرح مسلمانوں کو ان دو باتوں سے ایک کو اپنانے کا اللہ سبحانہ نے اختیار دیا تھا۔ مسلمانوں نے فدیہ لینے کی صورت کو قبول کر لیا اس پر اللہ کا عتاب آیا۔

مولانا نے یہ بات جس بنیاد پر ارشاد فرمائی ہے وہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث ہے۔ جو بقول حافظ ابن کثیر، ترمذی، نسائی اور ابن حبان نے روایت کی ہے۔ حدیث یہ ہے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ بدر کے دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس حضرت جبریلؑ تشریف لائے اور بولے کہ اپنے صحابہ کو اختیار دے دیجئے چاہیں تو قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دیں۔ اور چاہیں تو قتل کر دیں۔ مگر شرط یہ ہے کہ آیندہ سال مسلمانوں میں ستر قتل ہوں گے۔ صحابہ کرام نے آیندہ سال اپنے میں سے ستر کا شہید ہونا اور فدیہ قبول کر لیا۔

تاریخی نقطۂ نظر سے حافظ ابن کثیرؒ نے اس روایت کو یہ کہہ کر ھذا حدیث غریب جداً اپنے کو صحت کی ذمہ داری سے سبکدوش کر لیا۔ غرابت کا مطلب ہی یہ ہے کہ اس حدیث کے بیان کرنے میں راوی عام واقعہ نگاروں سے الگ اور ممتاز ہے۔ شائد امام احمد سے ایسی ہی احادیث کے بارے میں منقول ہے ان غرائب نہ لکھا کرو یہ مناکیر ہیں۔ ان کے راوی ضعیف ہوتے ہیں۔ بہر حال حدیث روایتی نقطۂ نظر سے کچھ ہو مگر اس کی روشنی میں قرآن کی اس آیت کا جو مطلب سامنے آتا ہے وہ یہ ہے کہ صحابہ کو قیدیوں کے قتل اور فدیہ لینے میں اللہ کی جانب سے اختیار دیا گیا تھا۔ انھوں نے بجائے قتل کے فدیہ لینا پسند کیا اس پر عتاب الٰہی آیا۔

یہاں سب سے پہلے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ یہ تخییر کا مسئلہ قرآن کے مطابق جنگِ بدر سے پہلے اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کے سامنے پیش کیا تھا۔

واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انھا لکم

مسلمانو! اللہ تم سے وعدہ کرتا ہے کہ دشمن کی دو جماعتوں میں سے کوئی ایک ضرور تمہارے ہاتھ آئے گی۔

خدا کا چاہنا یہ تھا کہ قریش کے لشکر سے مسلمانوں کا مقابلہ ہو لیکن مسلمانوں کی چاہت کیا تھی۔ قرآن ہی نے بتایا ہے۔

وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم

تم چاہتے تھے کہ جس جماعت میں لڑائی کی طاقت نہ تھی وہ ملے

قرآن آپ کے سامنے کھلا ہوا ہے۔ قرآن نے اس پر ایک لفظ بھی عتاب کا نہیں فرمایا۔ کیونکہ تکوین کے مرحلے

پر تربیت سے پہلے اس قسم کے حالات سے جماعت کو گذرنا ہی پڑتا ہے۔ غزوہ بدر مسلمانوں کی تاریخ میں پہلا ہنگامی حادثہ ہے۔ ہنگامی حالات میں اونچ نیچ یمین ویسار کی کیفیتیں ناگزیر ہیں۔ اور پھر اگر تشریح کے لیے اس حدیث کو بنیاد بنایا جائے تو تریدون عرض الحیاۃ الدنیا کی زد میں جمہور صحابہ آجاتے ہیں۔ عمر اور سعد بن معاذ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کو چھوڑ کر سب کا نقطہ نظر یہی تھا کہ فدیہ لیا جائے۔ اور وں کا پتہ نہیں میں تو اس کے تصور سے ہی کانپ جاتا ہوں۔ اور پھر اس روایت کا عام شارحین قرآن نے بھی کوئی تذکرہ نہیں کیا ہے۔

آیئے اب وہ روایات بھی گوش گذار فرما لیجیے جو اس آیت گرامی کے پس منظر میں عام شارحین نے لکھی ہیں۔

پہلی روایت امام مسلم نے کتاب الجہاد والسیر میں پیش کی ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں جب مسلمانوں نے بدر کے دن قیدی بنائے۔ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر و عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما سے فرمایا بتاؤ ان قیدیوں کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا یہ لوگ آپ کے چچازاد بھائی اور خاندان ہیں۔ میری رائے ہے کہ آپ ان سے فدیہ لے لیجئے اور چھوڑ دیجئے فدیہ کی رقم کفار کے مقابلہ میں کام آئے گی اور ممکن ہے کہ اللہ ان کو مسلمان ہونے کی توفیق دے دے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی طرف روئے سخن کر کے دریافت کیا عمر تمہاری کیا رائے ہے حضرت بولے بخدا میری رائے وہ نہیں ہے جو ابوبکر نے پیش کی میرا خیال ہے کہ اب ان کو ہمارے سپرد کیجئے تاکہ ہم ان کو قتل کر دیں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کے حوالے ان کے بھائی عقیل کیجئے وہ اسے قتل کرے۔ مجھے میرا رشتہ دار دیجئے میں اسے ماروں۔ یہ لوگ تو رہنمایان کفر اور اس کے لیڈر ہیں۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا میلان ابوبکر کی طرف تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ دوسرے روز میں آیا تو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دونوں بیٹھے رو رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ آپ کیوں رو رہے ہیں۔ اگر رونا آئے تو میں بھی روؤں۔ ورنہ آپ کے ساتھ رونے والوں کی صورت بنالوں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ قیدیوں کے فدیہ کے بارے میں جو تیرے ساتھیوں نے فدیہ کا مشورہ دیا تھا اس پر اللہ کی طرف سے جو عذاب کی نمائش ہوئی اس پر رو رہا ہوں۔

اور امام ترمذی نے عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کے حوالے سے اسی واقعہ کی تصویر اس طرح پیش کی ہے کہ: جب بدر کے روز قیدی لائے گئے تو ابوبکر نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ آپ کی قوم ہے

آپ کا خاندان ہے ان پر رحم کیجئے شاید اللہ ان کو ایمان کی توفیق دے دے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے کہا کہ یا رسول اللہ ﷺ یہ لوگ تو آپ کے مکذبین ہیں آپ کو گھر سے نکالنے والے اور آپ کے قاتلین ہیں۔ ان کو قتل کر دیجئے۔ عبداللہ بن رواحہ بولے کوئی لکڑیوں والی وادی دیکھئے اور ان کو آگ میں ڈال دیجئے حضرت عباس رضی اللہ عنہ بھی قیدی تھے سب کی باتیں سن رہے تھے بولے کیا آپ قطع رحمی کریں گے۔ حضور ﷺ نے کوئی جواب نہیں دیا آپ اندر تشریف لے گئے لوگوں کے قیاس مختلف تھے کچھ کہہ رہے تھے کہ حضور ﷺ ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے اپنائیں گے کچھ کا خیال تھا کہ عمر رضی اللہ عنہ کی بات پر عمل کریں گے حضور اقدس ﷺ باہر تشریف لائے اور بولے اللہ سبحانہ نے کچھ دل نرم بنائے ہیں۔ دودھ سے بھی زیادہ نرم و گداز اور کچھ دل سخت بنائے ہیں پتھر سے بھی زیادہ سخت۔ اے ابوبکر تیری حالت بالکل حضرت ابراہیم ع جیسی ہے فمن تبعنی فانہ منی ومن عصانی فانک غفور رحیم اور حضرت عیسیٰ کی طرح ہے۔ ان تعذبھم فانھم عبادک اے عمر تیری حیثیت حضرت نوح علیہ السلام جیسی ہے رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیاراً۔ اور تیرا معاملہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح ہے۔ ربنا اطمس علی اموالھم تم نادار اور تنگدست ہو کوئی قیدی فدیہ اور گردن زنی کے بغیر نہ جائے۔ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میں نے کہا کہ یا رسول اللہ سہیل بن بیضاء کو مستثنیٰ کر دیجئے وہ تو اسلام کا ذکر کرتا رہتا ہے فرمایا اچھا وہ نہیں۔

ایک اور بھی روایت مسند امام احمد میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے آئی ہے۔ روایات اپنی جگہ صحیح ہیں۔ ان واقعات کے ہونے میں کوئی شبہ نہیں مگر سوال یہ ہے کہ قرآن کی اس آیت گرامی کا یہ پس منظر ہیں اور یا آیت قرآنی کے لیے یہ واقعات سبب نزول ہیں۔ اس آیت میں قیدیوں کے قتل کی بات ہی نہیں ہے۔ آیت میں تو صرف یہ بتایا جا رہا ہے کہ جب تک میدان جنگ میں خونریزی نہ ہو جائے قیدی بنانا مناسب نہیں ہے۔ ما کان لنبی ان یکون لہ اسری حتی یثخن فی الارض کسی نبی کے یہ شایان نہیں ہے کہ خوب خونریزی سے پہلے لوگوں کو قیدی بنائے مطلب یہ ہے کہ غلبہ سے پہلے قیدی بنانا ٹھیک نہیں ہے حتی یثخن فی الارض کے معنے یہ نہیں کہ جب تک زمین خون آلود نہ ہو جائے بلکہ معنے یہ ہیں کہ جب تک فاتح کی حیثیت سے دبدبہ قائم نہ ہو جائے۔ امام بخاری نے اس کے معنے حتی یغلب فی الارض اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے حتی یظھر

علی الارض کیے ہیں دونوں کی مراد ایک ہے۔ بدر میں غلطی یہ ہوئی تھی کہ شکست کے بعد بجائے دشمن کا تعاقب کرنے کے مال غنیمت سمیٹنے اور قیدی پکڑنے میں لگ گئے اگر اس وقت ہی تعاقب کر کے دشمن کا خاتمہ کر دیتے تو مستقبل میں جس قدر حوادث فتح مکہ تک پیش آئے ایک بھی رونما نہ ہوتا۔ چند روز بعد ہی فتح مکہ کا آفتاب طلوع ہو جاتا۔ تریدون عرض الدنیا کی تعریض بھی اسی لیے ہے۔ اسی لیے حضور اقدس ﷺ کا ذکر علیحدہ کیا ہے۔ تاکہ معلوم ہو جائے کہ ذات نبوت اس میں داخل نہیں ہے۔

انداز سخن ایسا گرم اختیار کرنے کی اس کے سوا کوئی وجہ نہیں ہے کہ اس پر قرآن میں پہلے تاکید کے ساتھ ہدایت آچکی تھی۔ سورۂ محمد میں ہے۔

اذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا۔

اس آیت میں اثخان کو ضرب الرقاب کے لیے غایت مقرر کیا تھا۔ اور بدر میں ضرب الرقاب کو اثخان تک نہیں پہنچایا یعنی حق کا بول بالا اور دشمن کا منہ کالا نہیں ہوا تھا کہ غنیمت سمیٹنے اور قیدی بنانے میں لگ گئے اس لیے اللہ کی جانب سے عتاب ہوا۔ قیدی بنالے کے بعد قیدیوں سے فدیہ لینا وجہ عتاب نہیں ہے۔ اور روایات میں جو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور سعد بن معاذ کی تصریح آئی ہے کہ اگر عذاب آتا تو ان دو کے سوا کوئی نہ بچتا اس کی وجہ بھی یہی ہے علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔

یہ آیت بدر کے روز نازل ہوئی۔ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم پر اللہ سبحانہ کی ناراضگی کی نشانی بن کر آیت کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے لیے اس قسم کا کردار مناسب نہ تھا جس کے نتیجے میں نبوت کے لیے غلبہ اور دبدبہ سے پہلے قیدی ہو گئے اور صحابہ بھی تریدون عرض الدنیا میں مخاطب ہیں ورنہ لڑائی کے وقت میں کسی کو چھوڑنے کا حکم نہیں دیا تھا اور آپ کے حاشیہ خیال میں سامان دینا نہ تھا۔ جو کچھ کیا جنگ میں کام کرنے والوں نے کیا ــــ حضور اقدس ﷺ کا ذکر صرف اس لیے آیا ہے کہ آپ نے میدان جنگ میں عریش سے ایسا کرتے دیکھا تو روکا کیوں نہیں۔ سعد بن معاذ، عمر بن الخطاب رضی اللہ تعالیٰ عنہما اور عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ بات ناگوار ہو رہی تھی کہ تعاقب چھوڑ کر کیوں غنیمت کے پیچھے پڑے ہیں حالات کے یکبارگی انقلاب اور مدد الٰہی کے نزول میں حضور اقدس ﷺ اس قدر مصروف تھے کہ لوگوں کو روک نہ سکے اسی وجہ سے آیات کے نزول کے

رت حضور اقدس ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ رو دیے۔

بہرحال آیت بدر میں جنگ کے بارے میں فروگذاشت پر تنبیہ کر رہی ہے قیدیوں کے قتل سے آیت قرآنی قطعاً خاموش ہے۔

یہاں دو حقیقتیں ہیں اور دونوں اپنی جگہ صحیح ہیں۔

ایک یہ کہ بدر میں مسلمان فوجی غلبے سے پہلے مال غنیمت اور قیدیوں کی گرفتاری میں لگ گئے۔ جو حکم قرآنی حتی اذا اثخنتموھم کے خلاف اقدام تھا۔

دوسرے یہ کہ بدر میں جو لوگ قید ہو کر آئے ان کے ساتھ کیا برتاؤ کیا جائے اس بارے میں قرآن کی واضح ہدایت پہلے سے موجود تھی فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء اس پر عتاب کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ اس لیے آیت کی واقعات کی روشنی میں تشریح یہی ہے کہ بدر کی لڑائی سے پہلے سورہ محمد جسے سورہ قتال بھی کہتے ہیں نازل ہو چکی تھی۔ اسی لیے امام ابوحنیفہ سورہ محمد کی اس آیت فاما منا بعد کو سورہ انفال کی آیت فاما تثقفنھم فی الحرب سے منسوخ بتاتے ہیں قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں۔ ھذہ الایۃ منسوخۃ بقولہ تعالیٰ فاما تثقفنھم فی الحرب —— سورہ محمد ﷺ میں جنگ بدر سے پہلے جنگ کے بارے میں جو ابتدائی ہدایات تھیں ان میں بتا دیا گیا تھا کہ

فاذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق فاما منا بعد واما فداء حتی تضع الحرب اوزارھا ذالک ولو یشاء اللہ لانتصر منھم ولکن لیبلو بعضکم ببعض۔

جب تمہاری کافروں سے مڈبھیڑ ہو تو ان کی گردنیں مارو یہاں تک جب تم ان کا خون بہا دو اور تمہارا غلبہ ہو جائے تو ان کو قید کر لو۔ قید کرنے کے بعد تم چاہو تو احسان کرو اور مفت چھوڑ دو اور چاہو تو فدیہ لے کر چھوڑ دو۔

اس آیت میں جنگی قیدیوں سے فدیہ وصول کرنے کی اجازت ہے لیکن اس کے ساتھ شرط یہ لگا دی گئی ہے کہ پہلے دشمن کی طاقت کو اچھی طرح کچل دیا جائے۔ شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں جب تک کافروں کا زور نہ ٹوٹے قتل ہی چاہیے اور جب زور ٹوٹ جائے تب قید ہی کافی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ پہلے کفر کا زور توڑا جائے پھر قیدی بنانے کی فکر کی جائے اس حکم کی وجہ سے مسلمانوں نے بدر میں جو قیدی گرفتار کیے اور اس کے بعد ان سے جو فدیہ لیا وہ تھا تو قرآن کے حکم کے مطابق مگر غلطی یہ ہوئی کہ دشمن کی طاقت کو کچل دینے کی جو شرط لگائی تھی وہ پوری نہ ہوئی۔ جنگ میں جب

دشمن میدان چھوڑ گیا تو مسلمانوں کا ایک بڑا گروہ غنیمت کی فکر میں ہو گیا اور کچھ مسلمان قریشیوں کو گرفتار کرنے میں لگ گئے اور بہت کم مسلمانوں نے دشمنوں کا کچھ دور تک پیچھا کیا اگر مسلمان بدر میں بھرپور تعاقب کرتے تو قریش کی طاقت کا اسی روز خاتمہ ہو جاتا۔ لیکن بجائے تعاقب کرنے کے کچھ لوگ قیدی پکڑنے اور کچھ مال اکٹھا کرنے میں مشغول ہو گئے یہ عمل چونکہ اثخان سے پہلے رونما ہوا۔ اسی پر یہ عتاب نازل ہوا۔ یہاں قرآن کا یہ انداز بلیغ بڑا ہی لطیف ہے کہ عتاب کا رُخ حضور اقدس ﷺ کی طرف نہیں ہے بلکہ مسلمان فوجیوں کی طرف ہے تریدون عرض الدنیا۔ حضور ﷺ کا ذکر اس انداز میں ہوا ہے کہ محسوس ہو رہا ہے کہ جو کچھ ہوا اس میں آپ کا کوئی دخل نہیں۔ ما کان لنبی ان یکون له نبی کی یہ شان نہیں ہے کہ اثخان فی الارض یعنی غلبہ سے پہلے پہلے اس کے لیے قیدی ہوں۔ یعنی قید کرنے والے اور ہیں نبی تو صرف جنگ کی کمان کر رہا تھا۔ آیت قرآنی یہ بتا رہی ہے کہ جن لوگوں نے ایسا کیا انھوں نے اپنے رسم و رواج کے مطابق کیا نبوت کے مشن کو سمجھ کر نہیں کیا۔ نبوت کا مشن یہ نہیں کہ اموال جمع کرے اور خزانے بھرے نبی کا کام تو یہ ہے کہ کفر کی طاقت ختم ہو اور اللہ کے کلمہ کا بول بالا ہو۔ شائد عمر بن عبدالعزیز نے اپنے گورنروں کو جب لکھا کہ لوگوں کو دعوتِ اسلام دو۔ اور انھوں نے جواباً کہا کہ اس سے خزانہ شاہی متاثر ہو گا۔ کیونکہ مسلمان ہونے کے بعد جزیہ کی آمدنی نہ رہے گی۔ تو جواب میں یہ بات جو لکھی تھی۔ ما کان محمد رسول اللہ جابیا ولکن کان داعیا حضور اقدس ﷺ خزانہ بھرنے نہیں بلکہ اسلام کی دعوت دینے آئے تھے۔ اسی آیت سے استنباط کر کے لکھی تھی۔

قرآن یہاں سمجھا رہا ہے کہ یہ تم سے غلطی ہوئی ہے اور اسی غلطی پر یہ عتاب ہوا ہے۔
اس موضوع پر جو روایات آئی ہیں ان میں کچھ اختلاط ہوا ہے۔ واقعات کی حد تک سب باتیں درست ہیں لیکن ہر بات آیت کا سبب نزول نہیں ہے۔ کچھ روایات آپ سن چکے ہیں اور کچھ آ رہی ہیں

اِجازت خداوندی نہ ہوتی تو......

(۸۴) اگر پہلے سے نوشتہ خداوندی نہ ہوتا تو جو کچھ تم نے لیا ہے اس کی پاداش میں تمہیں سنگین سزا ملتی۔ یہ غلطی تو فی حد ذاتہ ایسی تھی کہ سخت سزا ان لوگوں کو دی جاتی۔ جنھوں نے دنیوی سامان کا خیال کر کے ایسا مشورہ دیا مگر سزا دہی سے وہ چیز مانع ہے جو خدا پہلے سے لکھ چکا ہے اور طے کر چکا ہے اور وہ کئی باتیں ہو سکتی ہیں۔

۱- مجتہد کو اس قسم کی خطا پر عذاب نہ ہو گا۔

۲- جب تک اللہ سبحانہ امراً و نہیاً کسی چیز کا صاف حکم بیان نہ فرمائے اس وقت تک اس کے مرتکب کو عذاب

نہیں ہوتا۔

۳- اہل بدر کی خطاؤں کو خدا معاف کر چکا ہے۔

۴- غلطی سے جو رویہ قبل از وقت اختیار کر لیا گیا یعنی فدیہ لے کر قیدیوں کو رہا کر دینا ـــــ اللہ سبحانہ کے علم میں طے شدہ تھا۔ آئندہ اس کی اجازت ہو جائے گی۔ فاما منا بعد واما فداء۔

۵- یہ بھی طے شدہ ہے کہ جب تک پیغمبران میں موجود ہے یا لوگ صدق دل سے استغفار کرتے ہیں عذاب نہ آئے گا۔

۶- ان قیدیوں میں سے بہتوں کی قسمت میں ایمان لانا لکھا گیا ہے الغرض اس قسم کے موانع اگر نہ ہوتے تو یہ غلطی اتنی عظیم و ثقیل تھی کہ سخت عذاب نازل ہو جانا چاہیے تھا۔ ایک روایت میں ہے کہ اس قولی تنبیہ کے بعد وہ عذاب جو اس طرح کی خوفناک غلطی پر آسکتا تھا۔ آپ کے سامنے نہایت قریب کر کے دکھایا گیا۔ گویا یہ قولی تنبیہ کو زیادہ مؤثر بنانے کی ایک صورت تھی۔ آپ اس پس منظر کو دیکھ کر وفور گریہ و بکا ہو گئے۔ حضرت عمرؓ نے سبب پوچھا تو آپ نے فرمایا کہ میرے سامنے ان کا عذاب پیش کیا گیا ہے یعنی جس کا آنا ان پر ممکن تھا اگر مذکورہ بالا موانع نہ ہوتے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ آپ کے سامنے عذاب کی نمائش ایسی تھی۔ جیسے صلوٰۃ کسوف ادا کرتے وقت آپ کے سامنے جنت و دوزخ دیوار قبلہ میں متمثل کر دی گئی تھی یعنی اس متوقع عذاب کا صرف نظارا کرانا تھا اور بس۔[1]

شیخ الاسلام نے جو کچھ بتایا ہے۔ یہی کچھ عام شارحین قرآن نے لکھا ہے لیکن یہ تفسیر نہیں بلکہ تاویل کا ایسا لبادہ ہے کہ اس کی رو سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سمیت ساری جماعت گنہ گار قرار پاتی ہے اور ایسی تاویل کو محض روایات کی بنا پر قبول کر لینا بڑا سنگین معاملہ ہے۔

آیت قرآنی کا ہماری تشریح کے مطابق مطلب واضح اور صاف ہے کہ اگر ہم سورۂ محمد میں اس سے پہلے فدیہ قبول کرنے کی اجازت نہ دے چکے ہوتے تو ہم اس غلطی پر تمہیں سنگین سزا دیتے۔ الجصاص رقمطراز ہیں۔

> بدر کے روز مسلمانوں کو مشرکین کے قتل کرنے کا حکم تھا۔ اللہ سبحانہ نے فرمایا تھا۔ فاضربوا فوق الاعناق واضربوا منھم کل بنان اور یہ بھی حکم تھا اذا لقیتم الذین کفروا فضرب الرقاب حتی اذا اثخنتموھم فشدوا الوثاق اس لیے بدر میں امت کا اولین فرض یہ تھا کہ مشرکین کو تہ تیغ کیا جائے خونریزی کے بعد جب غلبہ ہو جائے تو پھر گرفتار شدہ قیدیوں کا فدیہ لیا جائے۔ خونریزی اور غلبہ سے پہلے قید کرنا اور ان کا فدیہ لینا ممنوع تھا مسلمانوں نے بدر کے دن غنیمت سمیٹنی شروع

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کر دی اور مشرکین کو قید کر لیا اور بعد کو ان کا فدیہ لیا مسلمانوں کا یہ طرز عمل کتاب اللہ کے خلاف تھا اسی لیے اللہ نے عتاب فرمایا لہ

یہ تصریح بتا رہی ہے کتاب من اللہ سے مراد سورۂ محمد کی آیت ہے یعنی اگر قرآن میں فدیہ لینے کی اجازت نہ ہوتی تو موجودہ صورتِ حال کا تقاضا یہ تھا کہ خدا کی جانب سے تمہیں سخت سزا ملتی۔ قیدیوں کا فدیہ لینا جرم نہ تھا بلکہ اصل گناہ یہ تھا کہ دشمن پر غلبہ پائے بغیر قیدی بنائے گئے۔ اور مالِ غنیمت کے لیے کوشش کی گئی نہ مالِ غنیمت لینا جرم ہے اور نہ قیدیوں سے فدیہ لینا جرم ہے۔ جرم تو یہ ہے کہ اثخان فی الارض کے بغیر مالِ غنیمت کی فکر ہوئی اور قیدی بنائے گئے۔ فیما اخذتم کہہ کر قرآن نے بات کھول دی ہے کہ بدر میں اثخان فی الارض کے بغیر جو کچھ تم نے لیا خواہ غنائم ہوں یا قیدی ہوں یہ غلط تھا۔ ورنہ مالِ غنیمت ہو یا قیدی ہوں ان میں سے کوئی چیز ممنوع نہیں ہے۔ سیرۃ ابنِ ہشام میں فیما اخذتم کی تشریح من الاساری الغنائم سے کی ہے۔ یہ واقعہ میدانِ جنگ اور بدر کا ہے۔ قیدیوں سے فدیہ لے کر چھوڑنے اور اس کے متعلق میٹنگ ہونے کا مسئلہ بدر کا نہیں بلکہ مدینہ کا ہے۔ راویوں نے واقعات میں خلط کر دیا ہے۔ ان آیات کی تشریح میں شارحین قرآن نے جو روایات بیان کی ہیں وہ کچھ آپ سُن چکے ہیں۔ کچھ اور سُن لیجئے۔

ابن المنذر، ابوالشیخ اور ابن مردویہ بحوالہ نافع حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ بیان لکھا ہے کہ لوگوں کا بدر کے قیدیوں میں اختلاف ہوا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر و عمر سے مشورہ کیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ فدیہ لے لیجئے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ ان کو قتل کر دیجئے کوئی بولا کہ یہ لوگ تو وہ ہیں جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قتل کا ارادہ کیا اور اسلام کی عمارت گرانے کے درپے تھے اور حضرت ابوبکرؓ ان کا فدیہ لینا چاہتے ہیں اور کوئی بولا کہ اگر ان میں حضرت عمرؓ کے والد یا بھائی ہوتے تو عمرؓ قتل کی بات نہ کرتے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکرؓ کی بات کو شرفِ پذیرائی دیا۔ قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔ لولا کتاب من اللہ حضورؐ نے فرمایا کہ عمرؓ کی مخالفت کے نتیجہ میں ہم سب عذاب کی لپیٹ میں آجاتے۔ اگر عذاب آتا تو عمرؓ کے سوا کوئی نہ بچتا۔

حافظ ابنِ جریر نے ابنِ زید کے حوالے سے بتایا ہے کہ وہ فرماتے ہیں کہ:

اللہ کے دین کی نصرت کرنے والوں میں سوائے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سب کی نگاہ غنیمت پر تھی۔ عمرؓ کے سامنے جو قیدی آتا وہ گردن اڑا دیتے۔ اور کہتے یا رسول اللہؐ ہمارا مشن یہ ہے کہ ہم

لہ احکام القرآن

اللہ کے قانون کے لیے جہاد اس وقت تک کریں کہ یگانہ خدا کی عبادت ہو۔ ہمارا غنائم سے کیا تعلق ہے۔
حضورؐ نے فرمایا کہ اے عمرؓ اس معاملہ میں اگر عذاب آتا تو تیرے سوا کوئی نہ بچتا۔ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے آیندہ ایسا نہ کرنا کہ میری اجازت کے بغیر کسی چیز کو حلال سمجھو۔

ابن سعد بن اسحق کہتے ہیں۔

حضور اقدس ﷺ نے فرمایا اگر آسمان سے عذاب نازل ہوتا۔ تو سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے سوا کوئی نہ بچتا۔

سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کی تخصیص کیوں ہے۔ یہ گتھی بھی خود ان ہی نے سلجھا دی ہے سیرۃ ابن ہشام میں ہے کہ:

جب لوگ میدان جنگ میں دشمن کو قیدی بنانے لگے اس وقت حضور اقدس ﷺ عریش[1] میں تھے اور سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ عریش کے دروازے پر پہرہ دے رہے تھے۔ حضور اقدس ﷺ نے سعد بن معاذ رضی اللہ عنہ کے چہرے پر کچھ ناگواری کے آثار دیکھ کر فرمایا بخدا اسعدرضؓ تجھے لوگوں کا کردار کچھ پسند نہیں ہے۔ سعدرضؓ بولے جی ہاں بخدا یا رسول اللہ یہ پہلا موقعہ اللہ نے اہلِ شرک کو ختم کرنے کا مہیا کیا ہے۔ مجھے تو مشرکین کا قتل کے ذریعے خون بہا دینا ان کو گرفتار کرنے سے زیادہ پسند ہے۔

ان روایات میں دونوں باتوں میں اختلاط ہو گیا میدانِ جنگ میں غنائم اور گرفتاری ـــــ اور مدینہ میں قیدیوں کی رہائی، عام شارحین قرآن نے ان آیات کو قیدیوں کی رہائی اور ان کے فدیہ سے متعلق سمجھ لیا ہے۔ حالانکہ ان آیات کا تعلق بدر کی جنگ میں پکڑ دھکڑ اور غنیمت کا مال سمیٹنے سے ہے۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ قیدیوں کا مسئلہ کوئی پیش نہیں آیا۔ ضرور پیش آیا ہے اور پیش آنا چاہیے۔ جب قیدی بنا لیے گئے تو اس کا حل بھی ان کو سوچنا ہے اور اس سلسلے میں میٹنگ بھی ہوئی ہے اور اس میں صحابہؓ نے مشورے بھی دیئے ہیں۔ اور اس میں قیدیوں کے بارے میں فیصلہ بھی ہوا۔ فیصلہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کے مطابق ہوا۔ اور قیدیوں کو فدیہ لے کر رہا کیا گیا۔ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی رائے کو راجح قرار دیا ہے۔ اگرچہ دوسرے علماء نے اس کا تقابلی مطالعہ کیا ہے۔

قیدیوں کے فدیہ کی حلت

(۸۵) لہٰذا اب جو کچھ تمہیں غنیمت میں ملا ہے وہ حلال و طیب ہے اسے استعمال کرو۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو بیشک

---

[1] عریش جھونپڑی کو کہتے ہیں یہ ایک ٹیلہ پر بنائی گئی تھی۔ یہاں سے جنگ کا میدان صاف نظر آتا تھا۔ اس عریش کا منشا کچھ تو دھوپ سے بچنا تھا اور دشمن کے نرغے کے بچاؤ کے پیش نظر ایسا کیا ہوگا۔ یہاں چند تیز رفتار اونٹنیاں تھیں۔ فوج کو اطلاعات بھیجنے کا ان سے کام لیا جاتا تھا۔

اللہ بخشنے والا مہربان ہے پچھلے عتاب وتہدید سے مسلمان ڈر گئے کہ مال غنیمت کو جس میں فدیہ اساری بھی شامل ہے اب ہاتھ نہیں لگانا چاہیے۔ اس آیت میں تسلی فرمادی کہ وہ اللہ کی عطا ہے خوشی سے کھاؤ۔ ہاں جہاد کے سلسلے میں مال غنیمت کو مطمع نظر بنانا یا اس قدر اہمیت دینا نہیں چاہیے کہ مقاصد عالیہ اور مصالح کلیہ سے اغماض ہونے لگے۔ بے شک دینی حالات و مصالح کے اعتبار سے تم نے ایک غلط طریق کار اختیار کیا مگر نفس مال میں کوئی خبث نہیں خدا سے ڈرتے رہو گے تو وہ اپنی رحمت سے غلطیوں کو معاف کردے گا[1]

اموالِ غنیمت و اعلموا انما غنمتم من شئی فان للہ خمسہ میں حلال ہو چکے ہیں۔ اب یہاں اس آیت میں وہ اموال حلال کر دیئے گئے ہیں جو قیدیوں سے فدیہ میں وصول ہوئے ہیں اور ان کو بھی اموال غنیمت ہی میں شمار کر لیا۔ پوری بات اس طرح تھی کہ چونکہ پہلے فدیہ لینے کی اجازت دی جا چکی ہے اس لیے اب سنگین غلطی کے باوجود فدیہ میں لیے ہوئے اموال تمہارے لیے حلال وطیب ہیں مال خبیث نہیں اسے استعمال کرو اور باقی کو اجتماعی مصالح میں صرف کرو مگر آیندہ اس قسم کی روش اختیار نہ کرنا کہ غلبہ اور اثخان سے پہلے قیدی بناؤ یا مال غنیمت کی طرف متوجہ ہو یہ بات کہ اس سے مراد مال غنیمت نہیں بلکہ وہ اموال ہیں جو قیدیوں سے فدیہ میں حاصل ہوئے شارحین قرآن میں سے کچھ نے سمجھی ہے۔ محی السنۃ علامہ بغوی معالم التنزیل میں فرماتے ہیں۔

> جب یہ آیت پہلے نازل ہوئی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم فدیہ کے مال لینے سے رک گئے اس پر یہ آیت نازل ہوئی اس لیے ما غنمتم سے مراد فدیہ میں آئے ہوئے اموال ہیں یا مال غنیمت۔ اور مقصود قیدیوں کے فدیہ میں آئے ہوئے اموال کا حکم بتانا ہے ورنہ اموال غنیمت کی حلت تو پہلے واعلموا انما غنمتم سے معلوم ہو چکی ہے۔

اور صاحب روح المعانی علامہ آلوسی نے بھی اس آیت کو قیدیوں کے فدیہ کے لیے محمل بتایا ہے۔ اور ابوہریرہؓ کی روایت کو اس کا مؤید قرار دیا ہے۔

بدر میں قریش کے قیدی

حضور اقدس ﷺ تین روز بدر میں قیام فرما رہے۔ پھر قیدیوں اور مال غنیمت کے ساتھ منزل بمنزل مراجعت فرمائی۔ اسیران قریش میں سے دو دین کے بڑے دشمن تھے اور ان سے مسلمانوں کو بے حد اذیت پہنچ چکی تھی۔ انہیں موت کی سزا دی۔ صفراء میں پہنچے تو مال غنیمت تقسیم فرمایا۔ اپنا حصہ بھی صحابہ کے برابر رکھا

[1] افادات شیخ الاسلام

مدینہ منورہ پہلے ہی دو قاصد روانہ کر دیئے تھے مدینہ کے لیے زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عالیہ کے لیے عبداللہ بن رواحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ زید بن حارثہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ پہنچے تو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے لوگ حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کی تدفین سے فارغ ہو چکے تھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بدر کی طرف روانہ ہوئے تو حضور م کی صاحبزادی حضرت رقیہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا اہلیہ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ بیمار تھیں۔ اس وجہ سے حضرت عثمان رض کو اہلیہ کی بیماری کے لیے چھوڑنا پڑا۔ اور پھر مدینہ سے چلتے وقت لڑائی کا کوئی ارادہ بھی نہ تھا۔ جیسا کہ قرآن کی آیت۔

واذ یعدکم اللہ احدی الطائفتین انھا لکم وتودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم۔

اور جب اللہ تم سے دو گروہ میں سے ایک کا وعدہ کر رہا تھا کہ وہ تمہارے ہاتھ لگے گا اور تمہاری تمنا یہ تھی کہ کمزور گروہ تمہیں ملے۔

سے صاف معلوم ہو رہا ہے کہ مدینے سے چلتے وقت مسلمانوں کو یقین نہ تھا کہ ان کی مڈبھیڑ قریش کے لشکر سے ہو گی۔ ہاں یہ امکان ضرور تھا کہ چونکہ قریشی تجارتی قافلہ ایک ہزار اونٹوں پر دس ہزار دینار کا سامان لے کر آ رہا ہے اس لیے اس کی حفاظت کے لیے قریش ضرور کوئی قدم اٹھائیں گے۔ صحیح مسلم میں حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا بیان بھی اس کا موید ہے۔

کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا سوائے غزوہ تبوک کے اور ہاں میں غزوہ بدر میں بھی شریک نہیں ہوا تھا۔ لیکن غزوہ بدر میں شریک نہ ہونے والوں پر کوئی عتاب نہیں ہوا تھا۔ کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے تجارتی قافلہ کے لیے نکلے تھے کہ ہنگامی طور پر لڑائی پیش آ گئی۔

لڑائی کا فیصلہ مدینہ میں نہیں ذفران کی مجلس مشاورت میں ہوا جب قریش کے لشکر کی اطلاع ملی۔ بے کسی، بے سروسامانی سے خالی اور نفری صرف ۳۱۲۔ اس کے باوجود جنگ کا فیصلہ کیا قرآن نے اس فیصلہ کے بعد ذفران سے بدر کی طرف صحابہ کی روانگی کا بڑے بلیغ انداز میں ذکر کیا ہے۔ کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون گویا ان کو موت کی طرف ہانکا جا رہا تھا اور موت کو وہ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے تھے۔ لڑائی ہوئی قریش کے ستر آدمی مارے گئے۔ ستر گرفتار ہوئے۔ غنیمت تو بدر ہی میں تقسیم ہو گئی لیکن قیدی مدینہ منورہ لائے گئے۔

قیدیوں سے حسن سلوک

اسیران جنگ دو دو اور چار چار صحابہ میں تقسیم کر دیئے گئے اور ارشاد ہوا کہ آرام کے ساتھ رکھے جائیں۔ صحا

نے ان کے ساتھ یہ برتاؤ کیا کہ ان کو کھانا کھلاتے اور خود کھجور کھاتے تھے۔ ان قیدیوں میں ابوعزیز بھی تھے جو حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ کے بھائی تھے۔ ان کا بیان ہے کہ مجھ کو جن انصاریوں نے قید رکھا تھا وہ جب صبح و شام کا کھانا لاتے تو روٹی میرے سامنے اور خود کھجوریں اٹھا لیتے مجھ کو شرم آتی اور میں روٹی ان کے ہاتھ میں دیتا لیکن وہ ہاتھ بھی نہ لگاتے اور مجھے واپس کر دیتے۔ یہ اس بنا پر تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تاکید کی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے۔

بدر کے قیدیوں میں ایک شخص سہیل بن عمرو ——— تھا جو نہایت فصیح اللسان تھا اور عام مجمعوں میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف تقریر کرتا تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ نے کہا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اجازت دیجئے کہ میں اس کے دو نیچے کے دانت توڑ دوں کہ پھر اچھا بول نہ سکے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ میں اگر اس کے عضو کو بگاڑوں گا تو اگرچہ میں نبی ہوں مگر خدا اس کے بدلہ میں میرے اعضاء بھی بگاڑ دے گا۔

حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے بدن پر کُرتہ نہ تھا۔ لیکن ان کا قد اس قدر اونچا تھا کہ کسی کا کُرتہ ان کے بدن پر ٹھیک نہ آتا تھا۔ عبداللہ ابن ابی رئیس المنافقین نے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ کا ہم قامت تھا اپنا کُرتہ منگوا کر دیا۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عبداللہ کے کفن کے لیے جو اپنا کُرتہ عنایت فرمایا تھا وہ اسی احسان کا معاوضہ تھا۔

عام روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ آکر صحابہ سے مشورہ کیا جیسا کہ مسلم وغیرہ حدیث کی کتابوں میں آتا ہے جس کی تفصیل آپ پہلے سن چکے ہیں کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے مشورہ دیا کہ سب اپنے ہی عزیز و اقارب ہیں فدیہ لے کر ان کو چھوڑ دیا جائے لیکن حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلام کے مسئلہ میں دشمن عزیز بیگانے اور بیگانے برابر تھے انھوں نے یہ رائے دی کہ سب کو قتل کر دیا جائے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر کی رائے پسند کی اور فدیہ لے کر چھوڑ دیا۔

فدیہ کی مختلف صورتیں

غور و فکر اور مشورے کے بعد قرار پایا کہ،

۱۔ اسیروں سے فدیہ لے کر چھوڑ دیا جائے۔

۲۔ فدیہ کی زیادہ سے زیادہ رقم چار ہزار درہم تھی۔ لیکن اتنی استطاعت صرف چند میں تھی۔

۳۔ اس بڑی رقم کے بعد کچھ کے لیے تین ہزار۔ کچھ کے لیے دو ہزار اور کچھ کے لیے ایک ہزار مقرر کیے گئے۔

۴۔ جن کی استطاعت اتنی بھی نہ تھی مگر وہ پڑھے لکھے تھے ان سے کہا گیا کہ مسلمان بچوں کو لکھنا پڑھنا سکھا دیں تو رہا کر دیئے جائیں گے زید بن ثابت رضی اللہ عنہ نے اسی طرح لکھنا سکھا تھا۔

۵۔ جو کچھ بھی نہ دے سکتے تھے انہیں محض احسان کر کے چھوڑ دیا گیا۔

چنانچہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ اور رسول اللہ ﷺ کے دوسرے خاندانی افراد سے بھی باقاعدہ فدیہ لیا گیا۔ ابو العاص بن الربیع رضی اللہ عنہ رسول اللہ ﷺ کے داماد یعنی حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے شوہر بھی قیدیوں میں شامل تھے اس وقت تک مسلمان نہ ہوئے تھے۔ انھوں نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا کو کہلا بھیجا اس رقم میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کا وہ ہار بھی آیا تھا جو مرحومہ نے بیٹی کو شادی کے موقعہ پر دیا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی ہار پر نظر پڑی تو بہت سی پرانی یادیں تازہ ہو گئیں چشم مبارک سے بے اختیار آنسو بہہ پڑے فرمایا۔ تمہاری مرضی ہو تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کر دو۔ چنانچہ بے تامل ہار واپس کر دیا گیا اور اس کی قیمت ابوالعاص کے فدیہ میں محسوب کر لی گئی۔ ابوالعاص پھر سامان تجارت لے کر شام گئے۔ اس وقت حضرت زینب رضی اللہ عنہا مدینہ منورہ آ چکی تھیں۔ واپسی کے وقت ان کا قافلہ لٹ گیا۔ لیکن ان کی ایک ایک چیز محفوظ رہی۔ ابوالعاص مدینہ پہنچ کر زینب کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ پھر ان کی ہر چیز واپس کر دی گئی۔ وہ مکہ مکرمہ گئے۔ سب کی ایک ایک چیز لوٹائی۔ اور خود واپس آکر مسلمان ہو گئے۔

آیت کا مطلب یہ ہوا کہ چونکہ فدیہ وصول کرنے کی اجازت اس سے پہلے تمہیں دی جا چکی ہے اس لیے تمہاری اس کوتاہی پر کہ تم دشمن کی طاقت کو کچلنے کی شرط کو پورا کیے بغیر مال اور قیدیوں کی طرف لپک پڑے تھے تم کو تنبیہ کی جاتی ہے اور اب جو کچھ تم نے لے لیا ہے اسے خرچ کرنے کی اجازت دی جاتی ہے لیکن تمہاری یہ روش اللہ کو سخت ناپسند ہے آئندہ تم اس سے بچتے رہو۔ ہر معاملہ میں وہ روش اختیار کرو جو تقویٰ کا تقاضا ہے۔ اپنی کوتاہیوں کی معافی مانگو اللہ یقیناً معاف کرنے والا ہے۔

اس آیت کی تشریح حقائق و واقعات کی روشنی میں آپ سن چکے ہیں۔ روایات میں راویوں کے بیان سے شارحین قرآن کی تشریح میں اختلاف ہو گیا ہے۔ عام شارحین قرآن نے آیت کا پس منظر اسی مجلس شوریٰ کا فیصلہ بتایا ہے جو مدینہ میں منعقد ہوئی اور جس میں اکثریت نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کی ہمنوائی میں رائے دی کہ قیدیوں سے فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے۔ اس مجلس شوریٰ کا انعقاد بدر سے واپسی پر مدینہ میں ہوا۔ حضور اقدس ﷺ تین روز بدر میں قیام پذیر رہے۔ پھر قیدیوں اور مال غنیمت کے ساتھ منزل بمنزل مراجعت فرمائی صفرا میں پہنچے مال غنیمت تقسیم کیا۔ دشمن کو سزا دی جو قید ہوئے ان کو اپنی نگرانی میں مدینہ روانہ کیا گیا اور ظاہر ہے کہ پیدل روانہ ہوئے مدینہ منورہ حضور اقدس ﷺ پہلے پہنچ گئے تھے۔ بعد کو قیدی پہنچے۔ قیدی پہنچے تو آپ نے ان کو مختلف اصحاب میں تقسیم

کردیا۔ ظاہر ہے کہ اس تمام کارگذاری میں کم از کم دس روز لگ گئے ہوں گے۔ دس روز کے بعد وہ مجلس شوریٰ منعقد ہوئی جس کا ذکر عبداللہ بن مسعود اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کی روایات میں ہے۔ اس مجلس شوریٰ نے مشورہ کے بعد فیصلہ کیا کہ قیدیوں سے فدیہ لے کر ان کو رہا کر دیا جائے۔ اس آیت کا اس واقعے سے کوئی تعلق نہیں ہے بلکہ آیت اس وقت نازل ہوئی ہے جب بدر میں میدان جنگ گرم ہے۔ دشمن کے ستر آدمی مر گئے اور دشمن کے پاؤں اُکھڑ گئے اور اس کے نتیجے میں دشمن کی فوجوں میں بھگدڑ مچ گئی۔ مسلمان فوجی بجائے اس کے کہ دشمن کا تعاقب کرکے اس کی قوت کو ختم کرتے قیدیوں کو پکڑنے میں لگ گئے، اسی صورت حال کی تصویر یہ آیت پیش کر رہی ہے یہ آیت بدر ہی میں نازل ہوئی ہے اور اسی وقت تنبیہہ کی گئی ہے اس آیت کا قیدیوں کے قتل اور ان کے فدیہ لینے سے کوئی تعلق نہیں اگرچہ شارحین قرآن کی اکثریت اس کا پس منظر قیدیوں کا فدیہ بتاتی ہے۔ لیکن یہاں یہ کہنا کہ آیت کے مخاطب مسلمان نہیں بلکہ خود قریش مکہ ہیں جیسا کہ بعض نئے مصری اور پاکستانی شارحین قرآن کا میلان ہے قطعاً درست نہیں ہے۔ نہ واقعات اس کی تائید میں ہیں اور نہ عربی ادب کا ذوق بلاغت اس کی اجازت دیتا ہے۔

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّمَنْ فِيْٓ اَيْدِيْكُمْ مِّنَ الْاَسْرٰٓى اِنْ يَّعْلَمِ اللّٰهُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ خَيْرًا يُّؤْتِكُمْ خَيْرًا مِّمَّآ اُخِذَ مِنْكُمْ وَيَغْفِرْ لَكُمْ ۭ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٧٠﴾ وَاِنْ يُّرِيْدُوْا خِيَانَتَكَ فَقَدْ خَانُوا اللّٰهَ مِنْ قَبْلُ فَاَمْكَنَ مِنْهُمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٧١﴾

اے پیغمبر لڑائی کے قیدیوں میں سے جو تمہارے قبضہ میں ہیں ان سے کہہ دو[۸۶] کہ اگر اللہ کے علم میں تمہارے دلوں میں کوئی نیکی ہوگی تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بدرجہا بہتر تمہیں اللہ عطا فرمائے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا اور اللہ ماضی کے گناہوں کو معاف کرنے والا اور آئندہ رحمت کرنے والا ہے[۸۷]۔ اور اگر ان کا ارادہ آپ کو دغا دینے کا ہے تو اس سے پہلے وہ اللہ کو دغا دے چکے ہیں اس کے نتیجے میں اللہ نے آپ کو ان پر قابو دیا ہے اور اللہ بڑے علم والا حکمت والا ہے[۸۸]۔

معانی مفردات

امکن۔ امکان سے ماضی ہے۔ امکان اور تمکین دونوں کا مادہ مکن ہے اور دونوں کے معنے میں ہم آہنگی بنا دینا قدرت دینا۔ اس کا مفعول محذوف ہے۔ پوری عبارت یوں ہے۔ امکنک منھم۔ تجھے ان پر قابو دے دیا۔

اسلام میں جنگ کے قیدی

اسلام سے پہلے جس طرح جنگ کے طریقے وحشیانہ تھے اسی طرح جنگی قیدیوں کے ساتھ بھی انتہائی بدسلوکی کی جاتی تھی۔

انہیں قتل کرڈالنا۔ درندوں کے آگے ڈلوادینا۔ زندہ جلادینا یا پھر انتہائی ذلت کے ساتھ ان سے عمر بھر غلامی کرانا بالکل عام بات تھی۔ اسلام نے ان سب طریقوں کی اصلاح کی۔ جنگی قیدیوں کے لیے آسان اور منصفانہ اصول بنائے۔ سوسائٹی میں ان کا مقام مقرر کیا۔ اور انہیں اس بات کا موقع دیا کہ اگر وہ اپنی شرارت سے باز آجائیں اور توبہ کریں تو انہیں برابری کے حقوق دیئے جائیں گے۔ اسلام نے جنگی قیدیوں کو جو جو رعایات دی ہیں ان سب کا ذکر تو یہاں نہیں کیا جا سکتا اس آیت میں صاف صاف بتایا جارہا ہے کہ اگر جنگی قیدیوں کی نیت درست ہو اور وہ شرارت سے باز آجائیں تو ان کے لیے انعام اس طرح ایک طرف تو وہ اللہ کی مغفرت اور اس کی رحمت کے حقدار بنیں گے دوسری طرف یہ بھی ممکن ہے کہ اس دنیا میں ان سے جو کچھ چھن گیا ہے اس سے کہیں زیادہ اللہ تعالیٰ انہیں دے دے پھر ان کو یہ بھی بتایا جارہا ہے کہ اب تک انہوں نے جو روش اختیار کی ہے اس کا نتیجہ تو انھوں نے دیکھ لیا ہے کہ آج وہ مسلمانوں کے قیدی بنے ہوئے ہیں۔ آئندہ کے بارے میں انہیں سوچ لینا چاہیے۔

قیدیوں کو دعوتِ ایمان

(۸۶) اے پیغمبر لڑائی کے قیدیوں میں سے جو تمہارے قبضے میں ہیں ان سے کہہ دو۔ آیت میں اسریٰ جمع اسیر کی ہے مطلب یہ ہے کہ جن قیدیوں سے تم نے فدیہ لے لیا ہے۔ ابن سعد اور ابن عساکر کی تصریح کے مطابق سارے قیدیوں کے بارے میں ہے۔ علامہ آلوسی نے بھی اسے سب قیدیوں کے بارے میں جمع کا صیغہ ہونے کی وجہ سے کہا ہے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں کچھ شارحین قرآن نے یہ انکشاف کیا ہے کہ اس آیت میں اسریٰ سے مراد عباس اور ان کے ساتھی ہیں۔ لیکن آیت میں روئے سخن عام ہے۔

صحیح بخاری کے حوالہ سے حافظ ابن کثیر نے بدر کے قیدیوں کی تعداد ستر بتائی ہے۔ ابن ہشام نے سیرۃ میں ان قیدیوں کے یہ نام بتائے ہیں۔

۱۔ عقیل بن ابی طالب
۲۔ نوفل بن الحارث
۳۔ السائب بن عبید
۴۔ عثمان بن عمرو
۵۔ الحارث بن ابی وجزہ
۶۔ عمرو بن ابی سفیان
۷۔ ابوالعاص بن الربیع
۸۔ ابوالعاص بن نوفل
۹۔ ابوربشہ بن ابی عمرو
۱۰۔ عمرو بن الزراق
۱۱۔ عقبہ بن عبدالحارث
۱۲۔ عدی بن الخیار

۱۲- عثمان بن عبد شمس
۱۳- ابو ثور
۱۴- ابو عزیز بن عمیر
۱۵- الاسود بن عامر
۱۶- السائب بن ابی حبیش
۱۷- الحویرث بن عباد
۱۸- سالم بن شماخ
۱۹- خالد بن ہشام
۲۰- امیہ ابن ابی حذیفہ
۲۱- ولید بن الولید
۲۲- عثمان بن عبد اللہ
۲۳- صیفی ابن وفار
۲۴- ابو المنذر بن ابی رفاعہ
۲۵- ابو عطاء عبد اللہ بن الحارث
۲۶- مطلب بن حنطب
۲۷- خالد بن الاعلم
۲۸- ابو وزعہ بن خبیرہ
۲۹- فردۃ بن قیس
۳۰- حنظلۃ بن قبیصہ
۳۱- الحجاج بن الحارث
۳۲- عبد اللہ بن ابی
۳۳- ابو عزہ عمرو بن عبد
۳۴- الفاکہ مولی امیہ
۳۵- رب بن عمیر
۳۶- سہیل بن عمرو
۳۷- ربیعہ بن دراج
۳۸- عبد بن زمعہ
۳۹- عبد الرحمٰن بن مشنوم
۴۰- الطفیل ابن ابی قنیع
۴۱- عتبہ بن عمرو بن مجدم
۴۲- بے نام
۴۳- عتبہ
۴۴- عقیل بن عمرو
۴۵- تمیم بن عمرو
۴۶- خالد بن اسید
۴۷- ابو العریض بن یسار
۴۸- نبہان
۴۹- عبد اللہ بن حمید
۵۰- عقیل
۵۱- سابق بن عیاض
۵۲- جابر بن الزبیر
۵۳- قیس بن السائب
۵۴- عمرو بن ابی بن خلف
۵۵- ابو رہم بن عبد اللہ
۵۶- نسطاس
۵۷- ابو رافع
۵۸- اسلم
۵۹- حبیب بن جابر

۶۱- السائب بن مالک۔
۶۲- نافع
۶۳- نبقیع
۶۴- ابن تیم بن عمرو
۶۵- العباس بن عبدالمطلب
۶۶- بے نام
۶۷- بے نام
۶۸- بے نام
۶۹- بے نام
۷۰- بے نام

قیدیوں کے یہ وہ نام ہیں جن کا ذکر ابن ہشام نے کیا ہے۔ ان میں حضرت العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہیں ہیں ان کو بھی شمار کر لیا جائے تو یہ کل ۶۵ نام ہوئے۔ محمد بن اسحاق نے صرف ۴۳ نام بتائے باقی ابن ہشام کا اضافہ ہے۔ حافظ ابوالقاسم السہیلی نے ان قیدیوں میں سے ان کو نام بنام بتایا ہے جو مسلمان ہو گئے تھے مثلاً

۱- العباس بن عبدالمطلب
۲- عقیل بن ابی طالب
۳- نوفل بن الحارث
۴- ابوالعاص الربیع
۵- ابوعزیز بن عمیر الصدوری
۶- السائب بن حبیش
۷- خالد بن ہشام
۸- عبداللہ بن السائب
۹- المطلب بن حنطب
۱۰- ابو وداعہ بن الحارث
۱۱- عبداللہ ابن ابی
۱۲- وہب بن عمیر
۱۳- سہیل بن عمرو
۱۴- عبد بن زمعہ
۱۵- قیس بن السائب
۱۶- نسطاس

دلوں کی صفائی پر توفیق آتی ہے

(۸۷) کہ اگر اللہ کے علم میں تمہارے دلوں میں کوئی نیکی ہوگی تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے بدرجہا بہتر تمہیں اللہ عطا فرمائے گا اور تمہارے گناہ معاف کر دے گا۔ اور اللہ ماضی کے گناہوں کو معاف کرنے والا اور آئندہ رحمت کرنے والا ہے۔ کچھ قیدیوں نے اپنے اسلام کا اظہار کیا تھا مثلاً حضرت العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ وغیرہ ان سے کہا گیا کہ اللہ دیکھے گا کہ واقعی تمہارے دل میں ایمان و تصدیق موجود ہے تو جو کچھ زرِ فدیہ تم نے دیا ہے اور تم سے وصول کیا گیا ہے اس سے کہیں زیادہ اور کہیں بہتر تم کو مرحمت فرمائے گا اور پچھلی خطاؤں سے درگذر کرے گا[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اللہ سبحانہ کی جانب سے بدر کے ان قیدیوں کی طرف یہ پیغام ہے کہ تم سے جو فدیہ لیا گیا ہے اس سے دل گرفتہ ہونے کے بجائے نہیں اللہ و رسول کا احسان مند ہونا چاہیے۔ اور اس احسان کا حق یہ ہے کہ تم اپنی روش کو تبدیل کرو۔ اگر تم نے اپنے کو بدل لیا اور اس انعام کی قدر کی تو اللہ کی رحمت اور اس کی توفیق تمہارا ساتھ دے گی اور اس زر فدیہ سے جو تم سے لیا گیا ہے کہیں بڑھ کر وہ تمہیں اسلام کی نعمت سے نوازے گا۔ اور تمہاری مغفرت فرما دے گا۔

جن قیدیوں نے فدیہ دیا تھا ان کی کافی تعداد تھی۔ زیادہ سے زیادہ فدیہ کی رقم چار ہزار درہم اور کم از کم ایک ہزار تھی۔ ایسے بھی تھے جن سے کوئی کام لیا گیا اور ایسے بھی تھے جن پر احسان کیا گیا اور چھوڑ دیئے گئے لیکن تاریخ نے اس آیت کے پس منظر میں جو عملی مثال محفوظ رکھی ہے وہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے۔ لکھا ہے کہ قریش نے اپنے قیدیوں کا فدیہ بھیجا اور رہا کرا لیا۔ حضرت العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ بھی بدر کے ان قیدیوں میں تھے انھوں نے بارگاہ رسالت میں عرض کیا کہ یا رسول اللہ میں تو مسلمان تھا۔ فرمایا تمہارے اسلام کا حال خدا جانے۔ بظاہر تم جنگ میں آئے تھے۔ لہٰذا اپنا اور اپنے دونوں بھتیجوں نوفل بن حارث اور عقیل بن ابی طالب کا اور اپنے حلیف عتبہ بن عمرو کا فدیہ ادا کرو۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا۔ اتنا مال میرے پاس کہاں ہے۔ فرمایا وہ مال کہاں گیا جو ام الفضل اور تم نے زمین میں گاڑا ہے۔ اور تم نے ام الفضل سے کہا تھا کہ خبر نہیں کہ اس سفر میں کیا پیش آئے۔ اگر میں نہ لوٹا تو یہ دفینہ مال میرے بچوں فضل، عبداللہ اور تمہارے لیے ہے۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے عرض کیا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اب میں یقینی طور پر سمجھ گیا کہ آپ اللہ کے رسول ہیں کیوں کہ میں نے آدھی رات کے وقت وہ مال دفن کیا تھا اور ام الفضل کے سوا کسی کو اس کی خبر نہیں ہے اب میں فدیہ دیتا ہوں لیکن بیس اوقیہ سونا جو میرے پاس تھا اور غنیمت میں لے لیا گیا وہ میرے حساب میں لگا لیجیے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہرگز نہیں وہ تو اللہ نے ہمیں عطا کیا ہے۔ پھر حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا اور اپنے دونوں بیٹوں اور اپنے حلیف کا فدیہ دیا۔ حضرت عباس نے یہ بھی انکشاف فرمایا کہ اللہ سبحانہ کے اس ارشاد یؤتکم خیرا مما اخذ منکم کی صحیح تفسیر میں ہوں ۲۰ اوقیہ کی جگہ مسلمان ہونے کے بعد مجھے بیس غلام ملے۔ جو خود بھی قیمتی ہیں اور پھر ہر غلام میرے لیے کاروبار کرتا تھا۔ متعدد روایات سے ثابت ہے کہ حضرت عباس مسلمان ہونے کے بعد بہت مالدار ہو گئے تھے۔

صحیح بخاری میں ہے کہ انصار نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت عباس ہمارے بھانجے ہیں۔ ہم ان کا فدیہ چھوڑ دیتے ہیں لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مساوات کی بنا پر گوارا نہیں فرمایا اور ان کو بھی فدیہ ادا کرنا پڑا۔ فدیہ کی عام مقدار ۴ ہزار درہم تھی لیکن امراء سے زیادہ لیا گیا۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ زیادہ دولت مند تھے اس لیے ان سے بھی زیادہ رقم لی گئی انھوں نے حضورؐ سے شکایت کی لیکن ان کو کیا معلوم تھا

کہ اسلام نے جو مساوات قائم کی۔ اس میں قریب و بعید۔ عزیز و بیگانہ خاص و عام کے تمام تفرقے مٹ چکے تھے لیکن ایک طرف ترازوئے فرض کی یہ مساوات تھی دوسری طرف محبت کا یہ تقاضا تھا کہ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی کراہ سن کر رات کو آپ آرام نہ فرما سکے لوگوں نے ان کی گرہ کھول تو آپ نے آرام فرمایا۔

حضور اقدس ﷺ کے داماد ابو العاص بھی اسیرانِ جنگ میں تھے۔ ان کے پاس فدیہ کی رقم نہ تھی حضور اقدس ﷺ کی صاحبزادی حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو جو ان کی زوجہ تھیں اور مکہ میں تھیں کہلا بھیجا کہ فدیہ کی رقم بھیجدیں۔ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کا جب نکاح ہوا تھا تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے جہیز میں ایک قیمتی ہار دیا تھا۔ حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے زرِ فدیہ کے لیے ہار ہی گلے سے اتار کر روانہ کر دیا۔ حضور اقدسؐ نے دیکھا تو ۲۵ برس کی محبت بھری یادیں تازہ ہو گئیں۔ آپؐ بے اختیار رو پڑے اور صحابہؓ سے فرمایا کہ اگر تمہاری مرضی ہو تو بیٹی کو ماں کی یادگار واپس کر دوں سب نے تسلیم کی گردنیں جھکا دیں اور وہ ہار واپس کر دیا گیا۔ یعنی تکمیر خیر کی عملی تفسیر دیکھیے۔ ابو العاص رہا ہو کر آئے۔ اور حضرت زینب رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو مدینہ بھیج دیا۔ ابو العاص بہت بڑے تاجر تھے چند سالوں کے بعد بڑے ساز و سامان کے ساتھ شام کی طرف مالِ تجارت لے کر نکلے واپسی میں مسلمان سپاہیوں نے ان کو مع ان کے تمام سامان کے گرفتار کر لیا سامان سارا تقسیم ہو چکا تھا۔ یہ چھپ کر حضرت زینبؓ کے پاس پہنچے انھوں نے پناہ دی۔ حضور اقدس ﷺ نے لوگوں سے پھر فرمایا کہ مناسب سمجھو تو ابو العاص کا سامان واپس کر دو پھر طاعت کی گردنیں جھک گئیں۔ اور سپاہیوں نے ایک ایک دھاگا لا کر واپس کر دیا۔ اب یہ وار ایسا تھا کہ کارگر نہ ہوتا۔ ابو العاص مکہ آئے۔ اور تمام شرکا کو حساب سمجھا کر دے دیا۔ اور دولتِ اسلام سے مالا مال ہو گئے۔

ذرا اس آیت کو بنظرِ عمیق پڑھیے آپ محسوس کریں گے کہ بدر کے قیدیوں کو فدیہ لے کر چھوڑ دینا اللہ سبحانہ کو اس قدر پسند تھا کہ ان قیدیوں کو اپنے نبی کے ذریعے یہ پیغام بھیجا کہ یہ اس لیے کیا گیا ہے کہ اگر تم نے اس احسان کی قدر کی تو اس سے تمہارے لیے اسلام کے قبول کرنے اور گناہوں کی مغفرت کی راہ کھل جائے گی۔ کہاں قرآن کا قیدیوں کے بارے یہ تصورِ ہدایت اور کہاں قیدیوں سے فدیہ لینے کا خیال کر یہ ایسا سنگین جرم ہے کہ لمسکم فیما اخذتم عذاب عظیم۔ ان دونوں باتوں میں کوئی جوڑ نہیں ہے بلکہ حقیقت یہی ہے کہ تنبیہ قیدیوں کے فدیہ پر نہیں ہے بلکہ بدر کے میدان میں دشمن کا تعاقب کرنے اور غنیمت سمیٹنے پر ہے اگر فدیہ لینا قرآن کے نزدیک جرم ہوتا تو حضور اقدس ﷺ کے ذریعے قیدیوں کو یہ پیغام کبھی نہ آتا کہ فدیہ تمہارے اسلام کا ذریعہ بن جائے گا۔

مستقبل آپ کا تاباں ہے

(۸۸) اگر ان کا ارادہ آپ کو دغا دینے کا ہے تو اس سے پہلے وہ اللہ کو دغا دے چکے ہیں اس کے نتیجے میں اللہ نے

آپ کو ان پر قابو دیا ہے اور اللہ بڑے علم والا اور حکمت والا ہے۔ اور اگر اظہار اسلام سے مقصود صرف پیغمبر کو دھوکا دینا ہے یا دغابازی کرنے کا ارادہ ہے تو پیشتر وہ خدا سے دغابازی کر چکے ہیں یعنی فطری عہد الست کے خلاف کفر و شرک اختیار کیا۔ بعض بنی ہاشم جو ابوطالب کی زندگی میں عہد کر کے حضور اقدس ﷺ کی حمایت پر متفق ہوئے تھے۔ اب کافروں کے ساتھ ہو کر آئے اس کا انجام دیکھ لیا کہ آج کس طرح مسلمانوں کی قید اور قابو میں ہیں آئندہ بھی دغابازی کی ایسی ہی سزا مل سکتی ہے۔ خدا تعالیٰ سے اپنے دلوں اور نیتوں کو چھپا نہیں سکتے اور نہ اس کے حکیمانہ انتظامات کو روک سکتے ہیں۔

حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں خدا کا وعدہ پورا ہوا ان میں جو مسلمان ہوئے حق تعالیٰ نے بے شمار دولت بخشی جو نہ ہوئے خراب ہو کر تباہ ہوئے [1]

مطلب یہ ہے کہ اگر ان کی نیت خالص بھی نہ ہو اور ان کا مقصود آپ کو دھوکا ہی دینا ہو تو تب بھی آپ تشویش نہ کیجئے۔ اللہ ان کی چال چلنے نہ دے گا اور انہیں آپ کے ہاتھ میں گرفتار کرا دے گا جیسا کہ اس سے پہلے بدر میں کرا چکا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ مستقبل میں ان سے بدعہدی کے اندیشے ایمان کی دعوت میں رکاوٹ نہ ہونے چاہئیں اصل کام تو لوگوں کو ایمان کی دعوت دینا ہے۔ اور حضور اقدس ﷺ کی زندگی کا ایک ایک لمحہ اسی کے لیے وقف رہا چونکہ آپ کی دعوت عالمی تھی اس لیے دعوت کے انتظامات بھی خاص اہتمام چاہتے تھے۔ مگر قریش کے جوش عداوت نے آغاز ہی میں ایسے افسوسناک حالات پیدا کر دیئے تھے کہ پہلے مسلمانوں کی ایک جماعت کو وطن چھوڑ کر حبش میں پناہ لینی پڑی۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اس دعوت کے لیے اہل مدینہ کے دل کھول دیئے اور مسلمانوں کے لیے ایک نیا امن میسر آ گیا۔ حضور اقدس دعوت کا اصل کام پورا کرنے کے لیے وہاں چلے گئے۔ قریش نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ اور رزم و پیکار کا ایک نیا سلسلہ شروع کر دیا۔ حضور اقدس ﷺ نے مشکلات کے اس ہجوم میں دعوت کا سلسلہ جاری رکھا مگر دلجمعی اور یکسوئی لازم تھی اس کا کوئی موقعہ بھی ہاتھ سے نہ دیا۔ اس نیک مقصد کی خاطر کامیابی کے مسلمانوں کو گر بتائے جا رہے ہیں۔

فاثبتوا۔ جم کر رہو۔

اذکروا اللہ کثیرا۔ اللہ کو بہت زیادہ یاد کرو۔

اطیعوا اللہ ورسولہ۔ اللہ و رسول کی اطاعت کرو۔

لاتنازعوا۔ باہم آویزش پیدا نہ کرو۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اصبروا۔ مشکلات کو برداشت کرو۔

لاتکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرا و رئاء الناس "ان کی طرح نہ ہو جو ایمان وراستی کی جگہ گھمنڈ اور دکھاوے کا طریقہ اختیار کرتے ہیں"۔ کہیں نصرت کو حکم ہو رہا ہے کہ

اما تخافن من قوم خیانۃ۔ اگر کسی قوم سے تمہیں خیانت کا اندیشہ ہو تو تم بدعہدی نہ کرو۔

کہیں ہدایت ہو رہی ہے۔

ان جنحوا للسلم۔ اگر وہ صلح کی طرف مائل ہوں تو تم بھی یہ موقعہ ہاتھ سے نہ دو صلح کر لو۔

صلح میں اگر وہ تمہیں دھوکا دینا چاہیں پھر بھی تم ایمان وراستی کو ہاتھ نہ دو اللہ پر اعتماد کرو۔

یہاں کہا گیا کہ قیدیوں سے کہہ دو کہ اگر تم اسلام قبول کر لو گے تو جو کچھ تم سے لیا گیا ہے اس سے کہیں اچھا تم کو ملے گا اور وہ آپ کو اسلام کے نام پر دھوکہ دینا چاہیں تو آپ ان کا معاملہ اللہ کے سپرد کریں۔

مقصد یہ ہے کہ دعوت کو کسی مرحلہ پر ہاتھ سے نہ جانے دیں کہ اصل مقصود اللہ کے بندوں کو جہنم کی لپٹوں سے بچانا ہے۔

بدر نے تاریخ کا رُخ بدل دیا

مورخین اور اصحاب سیر نے بھی بدر کی تاریخی اہمیت کا اعتراف کیا ہے۔ وہ یہ کہنے پر مجبور ہیں کہ معرکہ بدر ایک انگائی معرکہ تھا بلکہ اس نے قریش مکہ کی قوت کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ کر دیا اور مسلمانوں کے لیے دعوت کی راہیں کھول دیں۔ لیکن وہ بھی اس حقیقتِ حال سے شاید بے خبر ہیں کہ معرکہ بدر صرف مشرکین مکہ اور مسلمانوں کی آویزش حق و باطل کا معرکہ نہیں تھا بلکہ جس زمانے میں یہ واقعہ پیش آیا اس وقت دنیا ایک موڑ پر کھڑی تھی۔ اور تاریخ عالم کا اشہب تیز گام اس موڑ پر حیران سرگردان کھڑا تھا کہ کس جانب رُخ کرے اس لیے بدر کا انقلاب عالمگیر انقلاب تھا۔

صفحۂ عالم پر اگر بدر کا معرکہ پیش نہ آتا اور مشرکین مکہ کی طاقت کو شکست و ریخت سے دوچار نہ کیا جاتا تو بلاشبہ پوری دنیا ظلم و فساد کا گہوارہ بن جاتی۔ انسانی ضمیر کی خودکشی ہوتی اور بنیادی حقوق کا نام و نشان نہ رہتا۔ مشرکین کی طاغوتی قوت ختم ہوئی تو دنیا میں عدل و انصاف حق پرستی اور نکوکاری کی ہوائیں چل پڑیں اس لیے اللہ سبحانہ کا یہ عظیم الشان احسان کہ بدر میں مسلمان کامیاب ہوئے صرف مسلمانوں ہی کے لیے نہ تھا بلکہ تمام کائنات انسانی پر احسان تھا۔

اس موقعہ پر مولانا ابوالکلام آزاد رح نے خوب فرمایا ہے۔

بعض اوقات قدرتی حوادث کا ایک معمولی سا واقعہ بھی فتح و شکست کا فیصلہ کر دیتا ہے۔ جنگ واٹرلو کے تمام مورخین متفق ہیں کہ اگر ۱۷ اور ۱۸ جون کی درمیانی شب میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا نقشہ بدل گیا ہوتا کیونکہ اس صورت میں خشک ہونے کا بارہ بجے تک انتظار نہ کرنا پڑتا سویرے ہی لڑائی شروع کر دیتا نتیجہ یہ نکلتا کہ بلوشر کے پہنچنے سے پہلے ولنگٹن کو شکست ہو جاتی واٹرلو میں اگر بارش نہ ہوئی ہوتی تو یورپ کا سیاسی نقشہ بدل جاتا ـــــ لیکن اگر بدر میں بارش نہ ہوئی ہوتی تو کیا ہوتا؟ ۔ تمام روئے زمین کی ہدایت وسعادت کا نقشہ الٹ جاتا۔ اسی طرف حضور اقدس ﷺ نے اپنی دعا میں اشارا کیا۔ اللھم ان تھلك ھذہ العصابۃ فلا تعبد فی الارض ۔ خدایا اگر خدام حق کی یہ چھوٹی سی جماعت آج ہلاک ہو گئی تو کرۂ ارضی میں تیرا سچا عبادت گذار کوئی نہ رہے گا [1]

مولانا کا ارشاد اس واقعہ کی طرف ہے جہاں بدر کے میدان میں مسلمانوں نے اپنی صفیں قائم کی تھیں وہ جگہ بلند تھی اور جہاں سے قریش کی فوج لڑ رہی تھی وہ جگہ نشیب میں تھی۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی شکست کا ایک ظاہری سامان کر دیا کہ عین اس وقت میدانِ جنگ میں موسلادھار بارش کر دی۔ جس نے ادھر تو مسلمانوں کی طرف گرد و غبار بٹھا کر ان کے پاؤں جما دیئے اور ادھر کافروں کی طرف پانی کا ریلا بھیج کر ان کو زمین پر قدم رکھنا مشکل کر دیا۔ ارشاد ہے۔

وینزل علیکم من السماء ماء لیطھرکم بہ ویذھب عنکم رجز الشیطان ولیربط علی قلوبکم ویثبت بہ الاقدام ۔

اور خدا کے اس احسان کو یاد کرو کہ جب وہ آسمان سے پانی برسا رہا تھا تاکہ تم کو اس پانی سے پاک کر دے اور ناپاکی تم سے دور کر دے تمہارے دلوں کو مضبوط کر دے اور اس سے تمہارے قدموں کو جما دے۔

طبقات ابن سعد میں ہے کہ مسلمان اڑتی ہوئی بالو پر اترے تھے بارش ہوئی جس سے وہ کوہ صفا کی مانند ہو گئی۔ لوگ اس پر آسانی سے دوڑ سکتے تھے قریش کا پڑاؤ نشیب میں ہونے کے باعث دلدل کی شکل اختیار کر گیا۔

[1] ترجمان القرآن

غزوۂ بدر پر دوبارہ نظر

غزوۂ بدر کی تفصیلات تو آپ کے سامنے کھل کر آچکی ہیں۔ ان مباحث میں سب سے اہم بحث یہ ہے کہ بدر کی لڑائی کسی پلاننگ کے تحت ہوئی یا اتفاقیہ ہوگئی۔ حضور اقدس ﷺ مدینے سے لڑائی کے ارادے سے چلے تھے یا قریش مکہ پر معاشی دباؤ ڈالنے اور بزور قریشی قافلوں کی آمد و رفت کو اپنے زیر اثر علاقہ میں روک دینے کے لیے۔

شارحین قرآن، محدثین اور مورخین کی رائے عامہ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ مدینے سے جنگ کے ارادے سے نہیں بلکہ مشرکین مکہ کے تجارتی قافلہ کو روکنے کے لیے چلے تھے۔ اس کے برعکس مولانا شبلی مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کا خیال یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ مدینے سے جنگ کے لیے چلے تھے اور جنگ کوئی اتفاقی حادثہ نہ تھا۔ ان کے اس موقف کے بارے میں ہم نویں جلد میں کچھ اشارات کر چکے ہیں لیکن موضوع کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اس پر مبسوط بحث کی جائے۔ یہ خوشی کا مقام ہے کہ اس موضوع پر سیر حاصل بحث مولانا حفظ الرحمن قصص القرآن میں کر چکے ہیں۔ ہم ناظرین معالم کی تفریح طبع کے لیے مولانا موصوف کی تحقیق پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہے ہیں لیکن تعبیر و اضافات کی چند مقامات پر ذمہ داری میری ہے۔

مولانا فرماتے ہیں :۔

> غزوہ بدر سے متعلق بیان کردہ تفصیلات جمہور علمائے اسلام کے نزدیک مسلم ہیں۔ خصوصاً اس مسئلہ میں تو سلف و خلف میں سے کسی کی بھی دو رائیں نہیں ہیں کہ مسلمان جب مدینے سے نکلے تو صرف قافلہ پر حملہ مقصود تھا۔ لیکن وادی زفران میں پہنچ کر قدرتی حادثہ نے ایک دوسرے کو مقابلے سے دوچار کر دیا۔ اور یہ مشرکین مکہ کی وہ پوزیشن تھی جو مسلمانوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ظہور میں آئی تھی۔

عیر و نفیر

اب مسلمانوں کو عیر اور نفیر دو کا سامنا کرنا پڑ گیا۔ اس لیے بھی وہ مقام ہے۔ جہاں مسلمانوں کو بشارت دی گئی کہ ان دونوں میں سے کسی ایک کو مسلمانوں کے سپرد کیا جائے گا۔ اور بعض مسلمانوں نے اگرچہ حالات کی بنا پر نفیر کو عیر کے مقابلہ میں ناپسند کیا لیکن حضور اقدس ﷺ کو اللہ سبحانہ نے بذریعہ وحی مطلع کر دیا تھا کہ اللہ سبحانہ نفیر کے مقابلہ کا فیصلہ کر چکا ہے۔ اس لیے حضور اقدس ﷺ کا رجحان نفیر

کی جانب ہوا اور مشورے کے بعد وہی فیصلہ ہوا جو خدا اور خدا کے رسول کی مرضی تھی۔ قرآن کی ان آیات میں اسی حقیقت کا کھلا اعلان ہے۔ کما اخرجك ربك من بيتك بالحق اور اذ انتم بالعدوة الدنيا وهم بالعدوة القصوى۔ لیکن مؤرخین اور محدثین کی رائے عامہ کے خلاف مولانا شبلی نے سیرۃ النبی م جلد اول میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ:۔

مسلمان شروع ہی میں مدینہ سے صرف نفیر کے لیے نکلے تھے اور خدا کے وعدہ عیر و نفیر کا حال مسلمانوں کو مدینہ ہی میں معلوم ہو چکا تھا۔ اور نبی کریم ﷺ نے عیر و نفیر کے متعلق جو کچھ مشورہ کیا اور صحابہ نے جو تقریریں کیں وہ سب وادی ذفران میں نہیں بلکہ مدینہ میں ہو چکا تھا

مولانا مرحوم نے اپنے اس دعوے کو ثابت کرنے کے لیے طویل بحث فرمائی۔ اور احادیث و سیر کی بیان کردہ ترتیب کا اس لیے انکار کر دیا کہ وہ اس کو قرآن کے خلاف سمجھتے ہیں۔

چونکہ یہ مسئلہ علم و تحقیق سے تعلق رکھتا ہے اس لیے ضروری ہے کہ خالص علمی انداز میں اس پر محاکمہ کیا جائے تاکہ حقیقت کھل کر سامنے آئے۔

بے غبار حقیقت

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ قرآن حکیم نے اس واقعہ کی تفصیلات بتاتے ہوئے دو جگہ بصراحت اس حقیقت کا اعلان کہ نفیر کا معاملہ مدینہ سے عیر کی خاطر نکلنے کے بعد اچانک پیش آیا اور اس لیے بعض مسلمانوں نے نفیر کے مقابلہ کو ابتداءً خطرہ کی گھنٹی سمجھا۔

۱۔ پہلا مقام سورہ انفال کی یہ آیات ہیں جو کما اخرجك سے شروع ہو کر واضربوا منهم كل بنان تک چلی گئی ہیں یہ تقریباً ۸ آیات ہیں۔

قرآن عزیز نے ان آیات میں اس پورے واقعہ کو اختصار کے ساتھ بیان کیا ہے جو معرکہ بدر میں از اول تا آخر پیش آیا یعنی مدینہ سے نکلنے پر مسلمانوں کے سامنے جو جو صورتیں آئیں ان سب کو ایک دوسرے کے ساتھ مربوط کر کے بیان کیا ہے۔ جس طرح کما اخرجك ربك من بيتك کے ساتھ وان فريقا من المؤمنين لكارهون کا تعلق ہے۔ ٹھیک اسی طرح واذ يعدكم الله اور اذ تستغيثون ربكم اور اذ يغشيكم النعاس امنة منه وينزل عليكم من السماء وغیرہ واقعات کا بھی تعلق ہے۔

ظاہر ہے کہ مولانا شبلی مرحوم بھی جمہور کے ساتھ اس سے متفق ہیں کہ نبی کریم ﷺ کا درگاہ الٰہی

میں استغاثہ۔ ملائکہ کی مدد کا آنا یسلمانوں پر اونگھ کا طاری کر کے ان کو تازہ دم کر دینا۔ آسمان سے بارش ہو کر مسلمانوں کے حق میں رحمت ہونا یہ سب حالات آن واحد میں ظہور پذیر نہیں ہوئے تھے بلکہ یہ ایک طویل سلسلہ تھا جو ایک مدت میں پیش آیا۔

مولانا موصوف فرماتے ہیں :

ترکیب نحوی میں وان فریقا من المومنین میں واو حالیہ ہے جس کے معنے یہ ہیں کہ مسلمانوں کا جو گروہ لڑائی سے جی چرا رہا ہے یہ موقعہ عین وہ موقع ہے جب آپ مدینہ سے نکل رہے تھے نہ کہ مدینہ سے نکل کر جب آپ آگے بڑھے کیونکہ واو حالیہ کے لحاظ سے خروج من البیت اور اس گروہ کے جی چرانے کا وقت اور زمانہ ایک ہونا چاہیے (سیرۃ النبیؐ)

لہذا اگر بقول مولانا آیت کما اخرجك ربك میں اس آن کے سوا جو مدینہ سے خروج کے ساتھ مربوط ہے اور کچھ مراد نہیں ہے تو پھر ماننا پڑے گا کہ باقی وہ تمام واقعات جو اس آیت کے ساتھ مربوط کر کے بیان ہوئے ہیں وہ سب بھی ایک ہی آن سے متعلق ہونے چاہئیں۔ اگرچہ ان کی حیثیت استیناف کی ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ایسا کہنے کی کوئی جرأت نہیں کر سکتا۔

آیت کا صریح اور صاف مطلب یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہ نے تم کو ایک مرتبہ مدینہ سے حق کی خاطر نکالا تھا اور تمہارے سامنے ایسی صورتحال پیش کر دی تھی کہ تم پر یہ گراں گذرنے لگا تھا کہ کیوں ہم مدینہ سے نکلے کہ آخر کار ہمارے سامنے یہ صورت گراں بار آگئی اور یہ وقت تھا کہ عیر و نفیر میں سے ایک کا تم سے وعدہ کیا۔[1]

اسی وجہ سے تمام شارحین قرآن نے وان فریقا من المومنین لکارھون پر یہ نوٹ لکھا ہے۔
اور یہ جملہ حال واقع ہو رہا ہے اور حال بھی حال مقدرہ ہے کیونکہ جس کراہت کا ذکر ہو رہا ہے۔
وہ مدینہ سے نکلنے کے بعد پیش آئی ہے جیسا کہ تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا اس لیے یہاں
اخراج سے زمانہ ممتد مراد ہے آنی مراد نہیں۔ (روح المعانی)

بیضاوی کے مشہور حاشیے عنایۃ القاضی میں ہے۔

والحال مقدرۃ۔ لان الکراھۃ وقعت بعد الخروج بوادی ذفران۔

[1] ڈاکٹر محمد حمید اللہ فرماتے ہیں وا ذیعد کم اللہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ مدینے سے چلتے وقت مسلمانوں کو یقین نہ تھا کہ وہ قافلے سے ملیں گے یا بدر والے دستے سے دونوں امکانات تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا کہنا بالکل بجا لیکن مدینہ سے نکلنے کے وقت سب کا ارادہ قافلہ کا تھا۔ اگر قریش کی فوج کا یقین ہوتا تو مسلمان[۲۱۲] کی تعداد میں بغیر سامان جنگ کے کبھی مدینہ سے روانہ نہ ہوتے۔ تعداد بھی زیادہ ہوتی سامان جنگ بھی ہوتا۔

اس کا صاف مطلب یہ ہوا کہ جو شخص لکارہون میں مذکورہ واقعہ کرامت کو آنی قرار دیتا ہے اور اس کو مدینہ میں ثابت کرتا ہے۔ اس کے پاس ایک احتمال کے سوا کوئی دلیل نہیں ہے۔ اور احتمال بھی ایسا جس کا ثبوت ان سے نہیں ملتا جو آیات میں موجود ہیں۔ اس کے برعکس جو شخص یہ کہتا ہے کہ اخرجك میں اخراج آنی اور زمانی نہیں بلکہ وہ مدت دراز مراد ہے جس میں یہ معرکہ پیش آیا۔ تو اس دعوے کی پشت پر بعد کی آیات قرآنی واضح قرینہ ہیں اور اس دعویٰ کی تصویب کرتی ہیں۔

۲۔ دوسرا مقام سورہ انفال ہی کی وہ آیات ہیں جو ما انزلنا علیٰ عبدنا یوم الفرقان سے شروع ہو کر الی اللہ ترجع الامور پر ختم ہوتی ہیں۔ ان آیات میں قرآن حکیم نے سب سے پہلے مسلمانوں اور مشرکین کے درمیان ہونے والی جنگ کے لیے میدانِ جنگ کا نقشہ اس طرح بتایا ہے کہ مسلمانوں کا محاذِ جنگ مدینے کے قریب وادی میں تھا۔ اذ انتم بالعدوۃ الدنیا۔ اور مشرکین مکہ کی فوج ان کے بالمقابل جانب بعید کی وادی میں پڑاؤ کیے ہوئے تھی۔ وھم بالعدوۃ القصویٰ اور اس وقت ابوسفیان کا تجارتی قافلہ مسلمانوں کی وادی سے نیچے سمندر کے کنارے گذر رہا تھا گویا مسلمان جہاں قیام پذیر تھے وہاں پوزیشن کچھ اس طرح تھی کہ مسلمانوں کے سامنے مشرکین مکہ کی فوج نشیب کی وادی میں تھی اور مسلمانوں کے پیچھے ابوسفیان کا تجارتی قافلہ نشیب میں سمندر کے کنارے پر تھا نقشہ کچھ اس طرح تھا۔

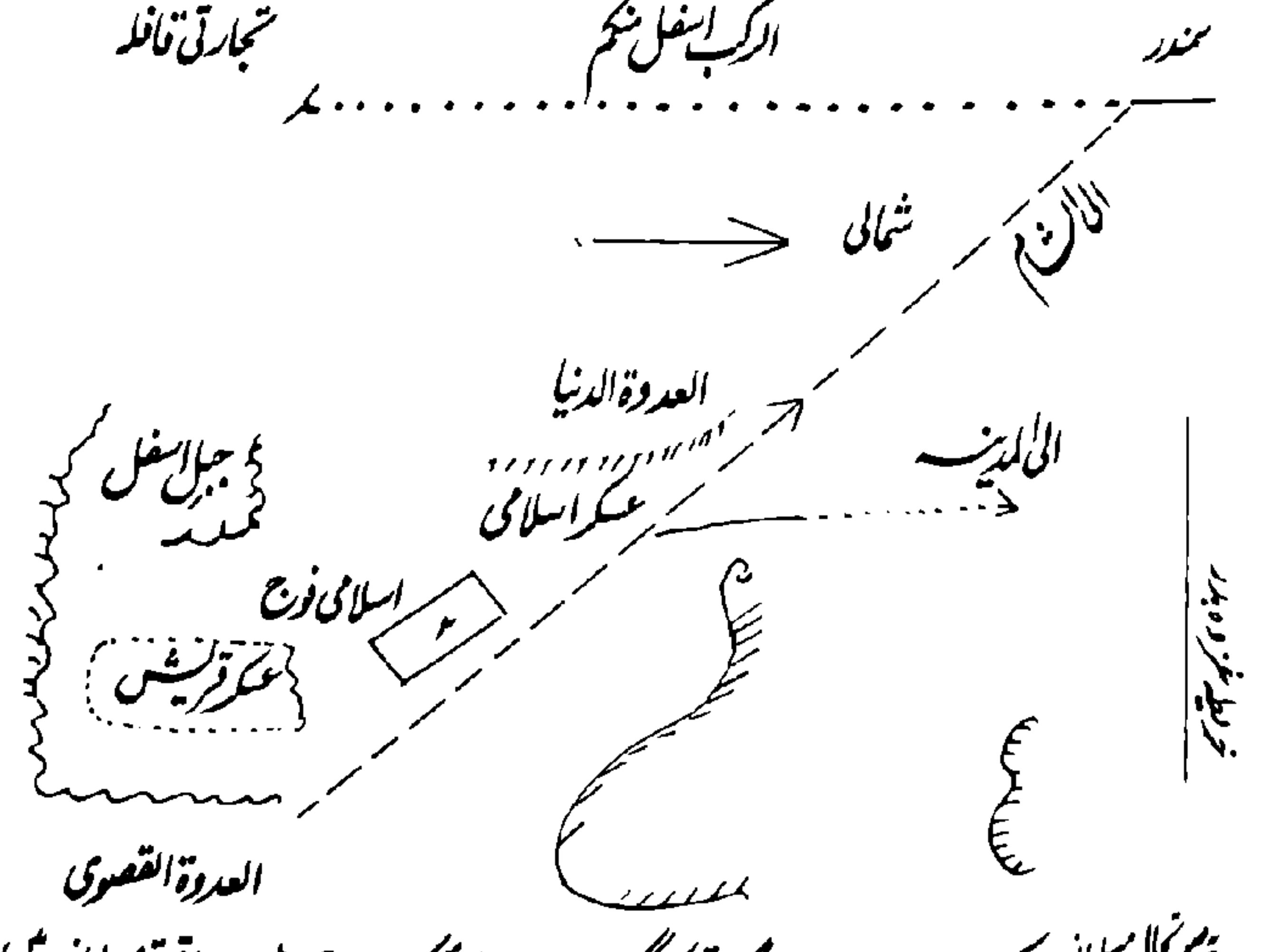

یہ صورت حال مسلمانوں کے لیے اس قدر ناساز گار تھی کہ اگر مسلمانوں پر لڑائی کی بات چھوڑ دی جاتی تو مسلمانوں میں

اس موضوع پر اختلاف ہو جاتا۔ کیونکہ ان کی فوجی پوزیشن ہرگز جنگ کے حق میں نہ تھی۔ یہ جو کچھ ہوا تھا ایسے سر و سامان کے تحت نہیں ہوا بلکہ ایسا کرنے کا بس اللہ نے فیصلہ فرمالیا تھا۔ لیقضی الله امرا کان مفعولا

یہاں قابل غور بات یہ ہے کہ اگر مشرکین مکہ کی فوج کشی کا حال مسلمانوں کو مدینے ہی میں معلوم ہو جاتا اور حضور اقدس ﷺ نے مدینہ ہی میں اس موضوع پر مسلمانوں سے مشورہ کیا ہوتا اور اللہ سبحانہ نے مسلمانوں سے مدینہ میں ہی احدی الطائفتین کا وعدہ کیا ہوتا تو پھر عقل انسانی یہاں حیران رہ جاتی ہے اور یہ بات بالکل سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ ان سب معاملات کے طے ہو جانے کے باوجود مسلمان خود کو کس لیے بے سر و سامان سمجھ رہے تھے اور جنگ سے جی کیوں چرا رہے تھے جبکہ مدینہ میں مسلمانوں کے پاس ہزاروں اونٹ موجود تھے۔ گھوڑے بھی نہ تھے سو پچاس گھوڑوں کا مہیا ہونا معمولی بات تھی۔ تلواروں اور نیزوں کی بھی کوئی کمی نہ تھی اور ان سب باتوں پر مستزاد یہ کہ جب ان کو دشمن کی عددی طاقت کا بھی صحیح اندازہ تھا تو آخر وہ کیا سبب تھا کہ مسلمان جن میں انصاری بھی ہیں اور مہاجرین بھی ——— صرف ۳۱۳ ہی کی تعداد میں کیوں نکلے۔ اور اس بے سر و سامانی میں نکلے کہ نیزے اور تلوار تک بھی ان کے پاس موجود نہ تھے۔ چہ جائے کہ باقی سامان حرب و ضرب مکمل ہوتا۔ اور یہ بھی سوچئے کہ بدر کے اس غزوہ کے علاوہ کسی بھی غزوہ یا سریہ کا حوالہ دیا جا سکتا ہے کہ نبی کریم ﷺ نے اس کے لیے مدینہ میں بیٹھ کر تیاری فرمائی اور مسلمانوں میں دشمن سے مقابلہ کے لیے وہ ہراسانی پیدا ہوئی ہو جس کا ذکر قرآن اس انداز سے کرتا ہے وان فریقا من المومنین لکارھون یجادلونک فی الحق بعد ما تبین کانما یساقون الی الموت کیا ہمارے سامنے غزوہ تبوک کی مثال نہیں ہے کہ دشمن کی تعداد لاکھوں تک پہنچی ہوئی ہے اور مشرکین مکہ جیسے غیر متمدن نہیں ہیں بلکہ متمدن عیسائی طاقت سے مقابلہ ہے جو ہر قسم کے متمدن ساز و سامان سے مسلح ہے اور پھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ میں نہیں۔ مدینے کے قرب و جوار میں نہیں بلکہ خود دشمن کے گھر جا کر معرکہ حق و باطل گرم کرنا چاہتے ہیں لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ایک مسلمان بھی ہراساں نہیں۔ گراں خاطر نہیں بلکہ پروانہ وار نثار ہونے کو تیار ہیں اور ایک دوسرے پر بازی لے جانے کے لیے مدینے سے تبوک کی طرف قدم بڑھا رہے ہیں۔

بات بالکل صاف ہے کہ مسلمان درحقیقت اس بے سر و سامانی کے ساتھ لڑنے کے لیے نہیں بلکہ قافلہ پر قبضہ کرنے کے لیے گئے تھے اور قافلہ کے لیے یہ جمعیت اور یہ سامان کافی تھا لیکن بدر کے قریب پہنچ کر یکایک صورتحال تبدیل ہو گئی۔ اور مسلمانوں کو دو باتوں کا ایک ساتھ علم ہوا۔ ابو جہل مکہ سے لشکر لے کر سامنے موجود ہے اور ابو سفیان کا قافلہ بدر کو چھوڑ کر سمندر کے کنارے جا رہا ہے۔ اذ انتم بالعدوۃ الدنیا وھم بالعدوۃ القصوی والرکب اسفل منکم۔ اب مسلمان دونوں کے درمیان ہیں۔ اس اچانک حالات کی تبدیلی نے

مسلمانوں کو جنگ کے لیے مجبور کر دیا اور صورتحال وہ ہو گئی جس کی تصویر قرآن نے پیش کی ہے۔ وان فریقا من المومنین
لکارھون ـــــــ اور کانما یساقون الی الموت وھم ینظرون۔

بہرحال ان ہر دو مقامات کا قبادر، کلام الٰہی کا سیاق و سباق اور آیات کے اندر موجود قرائن و دلائل کے ہوتے ہوئے مولانا شبلی کا کما اخرجک ربک کے اجمال سے بے دلیل دعوی کرنا کسی طرح درست نہیں ہے۔

یہ حال مقدرہ ہے

آیت قرآن وان فریقا من المومنین میں واو حالیہ ہونے کی وجہ سے حال ضرور ہے مگر یہ حال مقدر ہے۔ حال مقدر کے لیے بقاعدہ عربیت ہرگز یہ ضروری نہیں ہے کہ حال اور ذوالحال کا زمانہ ایک ہو کر دونوں آن واحد میں واقع ہوں بلکہ زمانہ کا امتداد نہ صرف ممکن بلکہ اکثر ہوتا ہے۔ حال مقدرہ کی عربی زبان میں شالیں موجود ہیں۔ حال مقدرہ کا مطلب یہ ہے کہ جو واقعہ کسی وجہ سے مستقبل میں ہونے والا ہے اس کو بر سبیل تقدیر واؤ حالیہ کے ساتھ اس طرح بیان کیا جاتا ہے کہ گویا وہ اسی آن میں پیش آتا ہے کیونکہ اس کا پیش آنا یقینی ہے۔ اور اس صورت میں آیت کے معنے یہ ہوں گے کہ مدینہ سے خروج اس حالت میں پیش آیا کہ مستقبل میں تمہیں ان حالات سے دوچار ہونا پڑا۔

کاروانِ تجارت کا تعاقب

یہ بات واضح نہیں ہے کہ کاروانِ تجارت مسلمانوں کے ہاتھ سے اس طرح بچکر نکل گیا تھا کہ مسلمان اس کا تعاقب نہ کرسکیں قرآن میں ارشادِ ربانی۔ والرکب اسفل منکم صاف بتا رہا ہے کہ قافلہ تجارت اس جگہ سے جہاں مسلمانوں کا قیام تھا ترائی میں گذر رہا تھا یعنی مسلمانوں کے نشانے کی زد پر تھا بلکہ انداز بتا رہا ہے کہ مسلمان اسے دیکھ رہے تھے جب کہ مسلمان بلندی پر تھے اور وہ نیچے تھا اس سے وہ وادی ذفران میں مشورے کے وقت بھی کاروان تجارت کے بارے میں سوچ رہے تھے۔ اور یہ وعدہ کہ دونوں میں سے ایک تم کو ملے گا۔ اسی وقت ہو سکتا ہے جب دونوں موجود ہوں اللہ نے حضور اقدس ﷺ کو یہ تبلادیا تھا کہ عیر سے نہیں بلکہ تمہارا سابقہ نفیر سے ہوگا۔

اس صورت حال کو ہمارے اصحاب سیرۃ نے واضح نہیں کیا مگر بعض نے اس حقیقت کو مستند روایات سے ثابت کیا ہے حافظ ابن کثیر نے تفسیر اور البدایہ میں حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حافظ بدرالدین

عینی نے عمدۃ القاری میں بسند اس واقعہ کو حضرت ابو ایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے۔

ہم مدینہ میں تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مجھے ابھی معلوم ہوا ہے کہ ابوسفیان کا کاروان تجارت شام سے آرہا ہے کیا تم تیار ہو کہ اس کو اپنی گرفت میں لے لو ممکن ہے کہ اللہ سبحانہ اس بہانے ہم کو مال غنیمت دے دے۔ ہم نے عرض کیا جی ہاں۔ آپ بھی روانہ ہوئے اور ہم بھی۔ ابھی ہم نے ایک یا دو روز کا سفر کیا تھا کہ آپ نے ہمیں بتایا کہ اہل مکہ فوج کشی کے ارادے سے آرہے ہیں اب کیا ارادہ ہے۔ تب ہم نے عرض کی یا رسول اللہ قسم بخدا موجودہ حالت میں دشمن کے مقابلہ کی طاقت نہیں ہے البتہ قافلہ پر حملہ کا ارادہ ضرور ہے۔

اس سے بھی قرآن کی تائید ہوتی ہے کہ تجارتی قافلہ اور مشرکین کی فوج دونوں منظر عام پر آچکی تھیں لیکن مسلمان مدینے سے جنگ کے لیے نہیں تجارتی قافلہ کے لیے گئے تھے۔ اگر مشرکین کی فوج سامنے نہ ہوتی تو حضور یہ نہ فرماتے ما ترون فی قتال القوم فوج سے مقابلہ کے بارے میں تمہارا کیا خیال ہے اور قرآن یہ نہ کہتا۔ و ھم بالعدوۃ القصوی اور اگر تجارتی قافلہ سامنے نہ ہوتا تو ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ یہ نہ فرماتے اردنا العیر ہم تو قافلہ کا ارادہ کر کے آئے ہیں اور قرآن یہ نہ کہتا۔ والرکب اسفل منکم۔

مولانا شبلی کا جذباتی نعرہ

جہاں قرآن مسلمانوں سے بات ایسی کہتا ہے جس میں ذات نبی کو شریک نہیں کرتا تو قرآن کا دستور یہی ہے کہ ذات نبوت کا پہلے ذکر کر دیتا ہے اور پھر مسلمانوں کو مخاطب کرتا ہے۔ مثلاً بدر میں فوجی تعاقب کو چھوڑ کر مسلمان مال غنیمت سمیٹنے اور قیدی گرفتار کرنے میں لگ گئے تو مسلمانوں کو یہ کہہ کر تنبیہ کی تریدون عرض الدنیا لیکن ذات نبوت کا ما کان لنبی ان یکون لہ اسری کہہ کر پہلے ذکر کر دیا اسی طرح عیر اور نفیر کے بارے میں صحابہ کے میلانات کا ذکر ان لفظوں میں کیا تودون ان غیر ذات الشوکۃ تکون لکم لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اس سے پہلے کما اخرجک ربک من بیتک بالحق میں پر شکوہ طریقہ پر کیا اور بتا دیا کہ اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم داخل نہ تھے۔ اسی سے جمہور امت کی رائے یہ قائم ہوئی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی چاہت وہ ہی تھی جو اللہ سبحانہ کی تھی یعنی عیر نہیں بلکہ مقابلہ نفیر سے ہونا چاہیے۔ اس واقعہ اور حقیقت کے باوجود خبر نہیں مولانا شبلی عالمانہ روش سے ہٹ کر جذبات میں کیوں بہ گئے

سوال یہ ہے کہ آپ ان دو میں سے کس کے ساتھ ہیں عام روایتوں کے مطابق اس سوال کا کیا

جواب ہوگا میں تو اس تصور سے کانپ اٹھتا ہوں۔ (سیرۃ النبی جلد اول)
واقعہ کی وہ نوعیت نہیں جو مولانا شبلی پیش کر رہے ہیں۔ واقعہ کی نوعیت وہ ہے جسے ہم نے بصراحت پیش کیا ہے اور جسے تسلیم کرنے کے بعد شبہ کی کوئی گنجائش نہیں۔ واقعہ کا چہرہ خود داغدار بنایا جائے اور اپنے لگائے ہوئے داغوں پر سوالات قائم کرکے دوسروں کو پریشان کیا جائے۔ یہ کوئی علمی کارنامہ نہیں ہے۔

مولانا شبلی کا ایک بے جان شبہ

مولانا شبلی نے اپنے اس موقف پر کہ حضور اقدس ﷺ اور صحابہ عیر کے لیے نہیں بلکہ مدینہ ہی سے جنگ کے ارادے سے تشریف لے گئے تھے۔

قرآن کی اس آیت:

لا یستوی القاعدون من المومنین غیر اولی الضرر والمجاھدون فی سبیل اللہ باموالھم وانفسھم سے عجیب استدلال کیا ہے۔

ان کا کہنا ہے۔

صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول نقل کیا ہے یعنی وہ لوگ جو بدر میں شریک نہیں ہوئے اور وہ جو شریک ہوئے برابر نہیں۔ صحیح بخاری میں یہ بھی ہے۔ کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو پہلے غیر اولی الضرر کا جملہ نہ تھا۔ یہ آیت سن کر عبداللہ ابن ام مکتوم رضی آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اپنے اندھے پن کا عذر کیا اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا غیر اولی الضرر۔ یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں بلکہ لڑنا اور جان دینا ہے۔ (سیرۃ النبی)

بے شک صحیح بخاری میں اس آیت کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا یہ ارشاد نقل ہوا ہے یعنی وہ لوگ جو بدر میں شریک نہیں ہوئے وہ ان کے برابر نہیں ہوسکتے جو بدر میں شریک ہوئے۔ یہ عبداللہ بن عباس رضی کی بیان فرمودہ تشریح ہے۔ آیت کا سبب نزول نہیں ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ خود بدر میں دو سال کے تھے۔ ان کے والد محترم بدر کے تبدیلیوں میں تھے جن کی تفصیل پہلے سن چکے ہو اس لیے اس بیان کا تعلق واقعہ سے نہیں۔ یہ ایک تفسیری توضیح ہے۔

اور یہ بھی صحیح ہے کہ صحیح بخاری میں یہ ہے کہ پہلے آیت میں غیر اولی الضرر نہ تھا۔ عبداللہ بن ام مکتوم رضی

خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور اپنے نابینا ہونے کا عذر پیش کیا اس پر وہیں یہ جملہ نازل ہوا۔

ان دونوں باتوں کو جوڑ دینا اور اس فن کاری کے ذریعے یہ نتیجہ نکالنا کہ یہ صاف اس بات کی دلیل ہے کہ مدینہ ہی میں معلوم ہو گیا تھا کہ:

قافلہ پر حملہ کرنا نہیں ہے۔

ہاتھ کی صفائی ہے۔ کیونکہ اس آیت کے شان نزول کے متعلق دو صحابہ سے روایات آئی ہیں ایک زید بن ثابت دوسرے براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ سے اور یہ دونوں صحیح بخاری میں موجود ہیں۔ اور دونوں اس آیت کا شان نزول غزوہ بدر نہیں بتاتے۔ لیجئے آپ بھی سن لیجئے۔

زید بن ثابت رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے مجھے اس آیت کا املا کرایا لایستوی القاعدون تو عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ آگئے۔ حضور املا کرا رہے تھے۔ عبداللہ بولے یا رسول اللہ خدا کی قسم اگر مجھ میں جہاد کی استطاعت ہوتی تو میں ضرور آپ کی ہمرکابی کرتا۔ یہ بیچارے نابینا تھے اسی وقت غیر اولی الضرر کی استثناء نازل ہوئی اس نزول کے وقت آپ کا گھٹنا میرے گھٹنے پر تھا میں کہہ نہیں سکتا کہ مجھ پر کیا بیتی۔ آنا بوجھ مجھے محسوس ہوا کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ میرا گھٹنا چکنا چور ہو جائے گا۔

براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ کی روایت بھی صحیح بخاری میں ہے۔

براء کہتے ہیں کہ جب آیت قرآنی لایستوی القاعدون نازل ہوئی تو حضورؐ نے زیدؓ کو کتابت کے لیے بلایا زیدؓ لے یہ آیت لکھی۔ عبداللہ ابن مکتومؓ آگئے۔ انھوں نے بارگاہ رسالت میں نابینا ہونے کی شکایت کی تو غیر اولی الضرر کا فقرہ نازل ہوا۔

ان دونوں روایتوں میں آپ دیکھ رہے ہیں کہ نزول آیت کے سلسلے میں بدر کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ ان دونوں روایتوں کو ذکر کرنے کے بعد امام بخاری نے عبداللہ ابن عباسؓ کا یہ تفسیری نوٹ پیش کیا ہے کہ:

عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ کا بیان ہے کہ بدر میں شرکت نہ کرنے والے بدر میں شرکت کرنے والوں کے برابر نہیں ہیں۔

یعنی اس آیت میں بتائے ہوئے ضابطہ کا یہ بھی مصداق ہیں۔ یہ مطلب نہیں کہ آیت کا پس منظر غزوہ بدر ہے۔ عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ کے اس تفسیری نوٹ کی شارحین بخاری نے وجہ یہ بتائی ہے کہ یہ عام قاعدہ ہے کہ اگرچہ آیت قرآنی کا تاریخی پس منظر کوئی واقعہ ہو لیکن اس آیت کے مدلول اور مفہوم کا جو حالات مصداق بن سکتے ہیں صحابہ کرامؓ ان سب

کا ذکر کرتے ہیں۔ حافظ عسقلانی نے مشہور شارح بخاری ابن التین کا تاثر بتایا ہے۔

القرآن ینزل فی الشئ و یشتمل علی ما فی معناہ

مولانا شبلی کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے تفسیری نوٹ کو بطور واقعہ پیش کیا اور دوسری روایات سے جن میں بدر کا ذکر نہیں۔ عبداللہ بن ام مکتوم رضی اللہ عنہ کی کہانی گھڑ کے دونوں کی پیوندکاری کر دی اور فیصلہ فرما دیا ــــــ پتہ چل گیا کہ مدینہ ہی میں علم ہو گیا تھا کہ قافلہ پر حملہ کرنا نہیں ہے۔ انا للہ خالی اللہ المشتکی حالانکہ دونوں باتیں الگ الگ ہیں یہ بات بھی صحیح ہے کہ :

۱۔ لایستوی القاعدون کا سبب نزول غزوہ بدر کا واقعہ نہیں ہے۔ جیسا کہ بخاری کی دو روایتوں سے معلوم ہوا اور یہ بھی صحیح ہے کہ :

۲۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی تفسیر کے مطابق بدر میں حصہ لینے والے اور نہ لینے والے برابر نہیں ہیں۔

ان دونوں باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے ــــــ مولانا شبلی نے دونوں میں تضاد پیدا کر دیا۔

مولانا شبلی کا ایک انوکھا استدلال

مولانا نے قرآن کی یہ آیت نقل کی ہے۔

ولا تکونوا کالذین خرجوا من دیارھم بطرا و رئاء الناس ــــــ اور اس کو بنیاد بنا کر اس پر عمارت یہ اٹھائی ہے کہ :

> اگر قریش صرف قافلہ تجارت کو بچانے کے لیے نکلتے تو خدا کیوں کہتا کہ وہ اظہار شان دکھاوے کے لیے لوگوں کو خدا کی راہ سے روکتے ہوئے نکلے۔

یہ بھی مولانا کا عجیب استدلال ہے اس لیے کہ جن روایات میں یہ ہے کہ کفار قریش قافلہ تجارت کو بچانے کے لیے نکلے۔ ان ہی روایات میں یہ بھی بصراحت موجود ہے کہ جب ابوسفیان نے قاصد کے ہاتھ لکھا کہ ہم مسلمانوں کی زد سے بچ گئے۔ تم اب واپس مکہ چلے جاؤ۔ ابوجہل نے صاف انکار کر دیا اور کہا کہ اب تو ہم مسلمانوں کا صفایا کر کے ہی جائیں گے۔ اور یہی وہ جذبہ تھا جس نے کفار قریش کو بدر کی جانب اس نخوت کے ساتھ پیش قدمی پر ابھارا تھا۔

اس میں شک نہیں ہے کہ قریش جنگ پر تلے بیٹھے تھے اور اس کے لیے مصارف کی تجویز یہ سوچی گئی کہ اہل مکہ کے پاس جو سرمایہ ہے وہ شام جانے والے قافلے کے حوالے کر دیا جائے اور اس سفر تجارت میں جتنا منافع ہو وہ پورے کا پورا مسلمانوں کے خلاف سروسامان جنگ کی تیاری میں صرف کیا جائے یہی تجارتی قافلہ تھا جس میں حافظ عسقلانی کی تصریح

کے مطابق ایک ہزار اونٹ تھے اور پچاس ہزار دینار کا سامان تجارت تھا اور بقول مولانا شبلی نہ صرف مرد بلکہ عورتیں بھی کاروبار تجارت میں بہت کم حصہ لیتی ہیں ان کا بھی ایک ایک فرد اس میں شریک تھا۔ ابن سعد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نرد ابوسفیان جو قافلہ کا سردار تھا۔ اس کے حوالہ سے لکھا ہے۔

واللہ ما بمکۃ من قرشی ولا قرشیۃ لہ نش وصاعدا الا بعث بہ معنا مکہ میں کوئی مرد اور عورت ایسی نہ تھی جس کا حصہ اس میں نہ ہو۔

مولانا شبلی فرماتے ہیں۔

ہمارے مورخین کو اسباب و نتائج کی جستجو نہیں ہوتی اس لیے انھوں نے اس واقعہ کو محض واقعہ کی حیثیت سے لکھ دیا لیکن ان کو احساس نہیں ہوا کہ مکہ کو تمام سرمایہ اگل دینے کی کیا ضرورت تھی۔

نہ صرف مؤرخین و محدثین نے ان اسباب و نتائج سے بحث کی ہے بلکہ خود جناب رسول اللہ ﷺ نے ان ہی نتائج کے پیش نظر اس قافلہ کو روکنے کی کوشش فرمائی۔ مکہ سے روانگی کے وقت بھی اور شام سے واپسی کے وقت بھی اسی تجارتی قافلے کے روکنے کو مولانا شبلی لوٹ اور ڈاکہ فرما رہے ہیں۔ کیا دو حکومتوں میں کشیدگی پر ہر فریق دوسرے کو نقصان پہنچانے کا حقدار نہیں ہوتا۔ کیا کوئی ذی ہوش سیاستدان یہ جانتے ہوئے کہ یہ سب کچھ ہمارے خاتمہ کی پلاننگ ہو رہی ہے سب سے پہلی ضرب اس پر نہ لگائے گا۔ مکہ سے ابوجہل اسی قافلہ کی حفاظت کے لیے آیا تھا اور جب قافلہ مسلمانوں کی زد سے محفوظ ہو کر نکل گیا تو ابوجہل کامیابی کے نشہ میں مخمور ہو کر واپسی کے لیے تیار نہ ہوا اور بول پڑا کہ اب تو ہم یہاں جشن منا کر جائیں گے اور اسلام کا خاتمہ کر کے رہیں گے اسی نشہ میں مخمور حالت کا قرآن اس آیت میں ذکر کر رہا ہے اور

خوشتر آں باشد اسرِ دلبراں
گفتہ آید در حدیث دیگراں

صحابہ کو بتایا جا رہا ہے کہ تم میں متقیانہ سیرت ہو۔

حدیث کعب رضی اللہ عنہ اور مولانا شبلی

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث جو اسناد و روایت کے اعتبار سے اونچا مقام رکھتی ہے اور مضمون کے لحاظ سے مولانا شبلی کے اس موقف پر ضرب کاری ہے۔

حدیث یہ ہے۔

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو چھوڑ کر کسی غزوہ میں پیچھے نہیں رہا۔ بجز غزوہ تبوک کے۔ اور ہاں غزوہ بدر میں بھی میں شریک نہیں ہوا تھا۔ اور جو اس میں شریک نہیں ہوا تھا اس پر کوئی عتاب نہیں ہوا۔ کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے قافلہ کے لیے گئے تھے کہ اچانک خدا نے دونوں فریق کو جمع کر دیا۔ (صحیح مسلم)

مولانا نے اس روایت پر سب سے پہلے یہ تنقید کی ہے کہ سارے دفتر حدیث میں اس کی مؤید کوئی حدیث نہیں ہے۔ حالانکہ صورتحال بالکل اس کے برعکس ہے۔ اس حدیث کی دوسری روایات سے بھی تائید ہوتی ہے مثلاً آپ پہلے حضرت ابوایوب انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث پڑھ آئے ہیں جسے حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں حافظ بدرالدین عینی نے عمدۃ القاری میں ابن ابی حاتم اور ابن مردویہ کے حوالہ سے لکھا ہے۔ اس میں صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اول مدینے سے ابوسفیان کے قافلہ کے لیے نکلے اور جب ایک یا دو دن کی مسافت پر پہنچے تو معلوم ہوا کہ کفار مکہ کا لشکر مقابلہ کے لیے آرہا ہے تب آپ نے پھر مشورہ کیا۔ اور اسی مشورہ میں کچھ مسلمانوں نے جنگ کے حق میں گرانی کا اظہار کیا اس لیے یہ کہنا صحیح نہیں ہے کہ ذخیرہ حدیث میں حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کے علاوہ کوئی روایت اس کو ظاہر نہیں کرتی ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ سے ابوسفیان کے تجارتی قافلہ کے لیے نکلے تھے۔

حدیث کعب رضی اللہ عنہ پر مولانا شبلی کا ایک اور شبہ

مولانا نے حدیث کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر ایک اور شبہ بھی کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ کعب بن مالک رضی اللہ عنہ کی حدیث حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت کے بھی خلاف ہے جو صحیح مسلم اور مصنف ابن ابی شیبہ میں آئی ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو جب ابوسفیان کے قافلہ کی آمد کا علم ہوا تو آپ نے مشورہ کیا۔ ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تقریر کی آپ نے توجہ نہ کی حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تقریر کی آپ نے توجہ نہ کی۔ سعد بن عبادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور بولے یا رسول اللہ کیا آپ کا روئے سخن ہماری طرف ہے یعنی انصار کی طرف خدا کی قسم کہ اگر ہم کو سمندر میں گھس جانے کا آپ حکم دیں گے تو سمندر میں کود پڑیں گے۔

اس کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں کہ:

اس حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب ابوسفیان کے آنے کا حال معلوم ہوا تو اسی وقت آپ نے

مہاجرین وانصار سے مشورہ کیا اور انصار سے اعانت کی خواہش کی اس بنا پر یہ ثابت ہوگیا کہ اس غزوہ میں شرکت کے لیے آپ نے انصار سے مدینہ ہی میں خواہش کی تھی۔"

مگر مولانا کا یہ استدلال صحیح نہیں ہے کیونکہ اس روایت میں راوی نے بہت بڑی غلطی کی۔ وہ یہ کہ اس نے انصار مقررین میں سے سعد بن عبادہ کا نام لیا ہے۔ حالانکہ تمام محدثین کا اس پر اتفاق ہے کہ "حضرت سعد بن عبادہ ﷺ کی تقریر نہیں بلکہ حضرت مقداد ﷺ کی تھی اور یہی صحیح ہے۔ سعد بن عبادہ نے اسی قسم کی تقریر حدیبیہ میں کی تھی جس کا ذکر روایات میں بکثرت موجود ہے۔ اصل میں راوی سے غلط ہوگیا ہے۔ اور حدیث کے ابتدائی جملوں میں بھی راوی سے غلط ہوگیا کہ مدینہ کے ابتدائی مشورے اور وادی ذفران کے شبوز تاریخی مشورے میں کوئی امتیاز نہیں کیا۔ اس بات کی حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں نشاندہی کی ہے۔ فرماتے ہیں:

> اور مسلم میں ہے کہ سعد بن عبادہ ﷺ نے وہ تقریر کی جو مقداد کی طرف منسوب ہے اور اس پر اعتراض یہ ہے کہ سعد بن عبادہ ﷺ غزوہ بدر میں شریک نہیں ہوئے ہاں دونوں حدیثوں میں باہم مفاہمت اس طرح ہو سکتی ہے کہ دراصل بدر کے معاملہ میں دو بار مشورہ ہوا پہلا مشورہ ابوسفیان کے قافلہ کی خبر آنے پر اور دوسرا مشورہ ذفران میں مشرکین کے لشکر آنے پر۔ طبرانی میں ہے کہ سعد بن عبادہ ﷺ نے حدیبیہ میں تقریر کی تھی یہی درست ہے۔

رہا یہ سوال کہ انصار جب قافلہ کے لیے مدینہ سے نکل چکے تھے تو وادی ذفران میں دوبارہ ان سے مشورہ لینے کی کیا ضرورت تھی۔ مدینہ میں انصار سے مشورہ اس لیے کیا گیا تھا کہ قافلہ کی خاطر جانے میں وہ بھی شریک ہونا چاہتے ہیں یا نہیں۔ وادی ذفران میں جنگ کی صورت حال پیش آنے پر دوبارہ ان سے مشورہ اس لیے کیا کہ انصار سے بیعت میں صرف یہ بات داخل تھی کہ صرف مدینہ میں آپ کی نصرت کریں گے۔ اب صورتحال بدل چکی تھی اور مدینہ سے باہر وقت... کا سوال بن کر سامنے آگیا اس لیے آپ نے ان سے دریافت کیا۔ حافظ ابن حجر نے اس عقدہ کو فتح الباری میں واضح لفظوں میں کھولا ہے۔

> حضور ﷺ کو انصار کی جانب سے اندیشہ تھا کہ غالباً وہ ہمنوائی نہ کریں گے کیونکہ انصار نے صرف مدینہ میں رہتے ہوئے نصرت کی بیعت کی تھی۔ مدینہ سے باہر جاکر جنگ کے لیے بیعت نہ کی تھی۔

اس لیے اس نازک حالت میں انصار سے مشورہ ضروری تھا کہ اس حالت میں بھی وہ مدینہ سے باہر معرکہ آرائی کے لیے تیار ہیں یا نہیں۔ بہرحال بخاری، مسلم، نسائی، ترمذی اور دیگر کتب حدیث میں مذکور غزوہ بدر سے متعلق روایات کے خلاف مسلم کی روایت الس کے آخری ٹکڑوں میں جو کچھ بھی ہے وہ سب اسی مشورے سے متعلق ہے جو وادی

ذفران ہی میں مدینے سے باہر ہوا تھا اور تمام صحیح روایات کے خلاف یہ راوی کا وہم ہے کہ اس نے پہلے ٹکڑے کے ساتھ دوسرے ٹکڑے کو اس طرح خلط ملط کر دیا ہے کہ گویا یہ سب کچھ ابوسفیان کے قافلہ کے وقت ہی پیش آیا تھا اور اس پر بھی مستزاد یہ کہ اس روایات میں کفار قریش سے جنگ کا اشارہ تک موجود نہیں ہے کہ مولانا کے لیے دلیل ہو سکے بلکہ ابوسفیان کے قافلہ ہی کا ذکر ہے اسی لیے مولانا کو اس روایت کے ٹکڑوں کو اپنے موافق بنانے میں تکلفات سے کام لینا پڑا ہے۔

حدیث کعب رضی اللہ عنہ پر مولانا کی انوکھی تنقید

حدیث کعب رضی اللہ عنہ پر مولانا شبلی نے یہ بے محل تنقید بھی کی ہے کہ:

چونکہ کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ غزوہ بدر میں شریک تھے اس لیے ان کی روایات اس موقعہ پر مشاہدہ واقفیت کی روایت نہیں۔

استدلال کے موقعہ پر یہ عجیب دلیل ہے۔ اس لیے کہ جب مولانا موصوف کا یہ دعویٰ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم شروع ہی میں کفار قریش سے جنگ کے ارادے سے نکلے تھے۔ اور مدینہ ہی میں مشہور تاریخی مشورہ فرمایا تھا۔ تو کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ خواہ غزوہ بدر میں شریک نہ ہوئے ہوں لیکن مدینہ میں بہر حال موجود تھے۔ اس لیے یہ کیسے ممکن ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم انصار و مہاجرین سے مشورہ فرمائیں اور موجودہ صحابہ شرکت نہ کریں۔ اس لیے حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت کو مشاہدہ کی روایت نہ ماننا بالکل بے جوڑ بات ہے۔ ہاں اگر یہ کہا جائے کہ جنگ کے بارے میں مشورہ مدینے سے باہر ذفران میں ہوا جیسا کہ جمہور کا خیال ہے اور جس کی مولانا شبلی نفی کر رہے ہیں تو بات میں کچھ جان پڑ سکتی ہے کہ اگر کعب رضی اللہ عنہ اس مشورے کے متعلق فرمائیں تو وہ مشاہدہ کی روایت نہیں ہے کیونکہ وہ غزوہ بدر میں شریک نہیں تھے۔

اور مولانا شبلی نے کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بارے میں یہ بھی لکھا ہے کہ اس واقعہ کی روایت سے ان کا مقصد یہ ہے کہ غزوہ بدر کی اہمیت کم ہو جائے۔

مولانا کا ایک صحابی کے متعلق یہ سوء ظن بھی قطعاً بے سند اور بے دلیل ہے اس لیے کہ حضرت کعب بدر کی اہمیت کم کرنا نہیں چاہتے بلکہ اس کی اہمیت اور عظمت کا احساس ہی ان کو اس پر مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنی عدم شرکت کے لیے یہ معذرت پیش کریں کہ ان کو یہ سعادت اس لیے نصیب نہ ہو سکی کہ جب مسلمان مدینے سے نکلے تھے اس لیے سب کی شرکت ضروری نہیں تھی تاہم جو نکلے ان کو وہ بے نظیر شرف ہاتھ آ گیا جس سے ہم محروم ہو گئے۔

ایک باریک نکتہ

حضرت کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت میں ایک اور باریک نکتہ ہے جو مولانا شبلی کے دعوے کو باطل کرتا ہے وہ یہ کہ حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس جانب بھی توجہ دلا رہے ہیں کہ اگر غزوہ بدر تبوک کی طرح مدینے کے اندر ہی طے ہوتا اور اس کے متعلق تبوک کی طرح مدینہ ہی میں مشورہ ہوتا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ ہی سے جنگ کے لیے جاتے تو یہ ناممکن تھا کہ اس قدر اہم اور عظیم الشان غزوہ کے لیے نفیر عام نہ ہوتا اور جو لوگ جان چرا کر بیٹھ جاتے واپسی پر ان سے باز پرس نہ ہوتی۔ جبکہ غزوہ تبوک میں کعب بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور ان کے دو رفقاء پر عدم شرکت کی وجہ سے عتاب اور سنگین باز پرس ہوئی۔ اور بدر میں ان پر عتاب ہوتا اور ان سے کوئی باز پرس نہ ہوتا اس کی دلیل ہے کہ معرکہ بدر ارادی اور کسی منصوبہ بندی کے تحت نہیں بلکہ اتفاقی تھا بالکل اچانک بطور حادثہ پیش آگیا اور در حقیقت نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمان مدینے سے "عیر" کے لیے نکلے تھے۔ غرض حضرت کعب رضی اللہ عنہ غزوہ بدر کی حیثیت کو کم کرنا نہیں چاہتے ہیں۔

پھر یہ عجیب بات ہے کہ مولانا شبلی تو یہ معلوم کر سکیں کہ قرآن ناطق ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ ہی سے کفار قریش کے مقابلہ کے لیے نکلے اور بقول ان کے احادیث بھی یہی صراحت کر رہی ہیں لیکن کعب بن مالک رضی اللہ عنہ پر ساری عمر یہ حقیقت آشکارا نہ ہوئی۔

کیا مولانا کے خیال میں کعب معاذ اللہ جان بوجھ کر اپنی برتری ظاہر کرنے کے لیے کذب بیانی سے کام لے رہے تھے یہ بات مولانا تو سوچ سکتے ہیں مگر میں تو اس کے تصور سے بھی کانپ جاتا ہوں۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بیان سے غلط استدلال

اسی طرح مولانا مرحوم کا حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس بیان سے استدلال صحیح نہیں ہے جس میں بدر کے واقعہ کا اس انداز میں ذکر ہے۔

> جب ہم مدینے آئے تو وہاں وہ پھل کھانے کو ملے جو ہمارے مزاج کے موافق نہ تھے اس سے ہم بیمار ہو گئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بدر کے بارے میں دریافت کرتے رہے جب ہم کو خبر ملی کہ مشرکین آرہے ہیں تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بدر کو چلے۔ بدر ایک کنوئیں کا نام ہے جہاں ہم مشرکین سے پہلے پہنچ گئے۔

بہ روایت طویل ہے مگر اس میں ابتدائی واقعات کو نظر انداز کر کے صرف معرکہ کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ اس میں نہ مدینے میں مشورے کا ذکر ہے نہ بعض مسلمانوں کی کراہت اور گرانی کا ذکر ہے۔ اور نہ مہاجرین وانصار کی ولولہ انگیز تقریروں کا اشارہ ہے۔ حتیٰ کہ مسلمانوں کی تعداد اور بے سروسامانی کا بھی کوئی تذکرہ نہیں ہے۔ اور اس پر طرہ یہ کہ مہاجرین کی آمد کے وقت پانی کی نا مرادی آب و ہوا کا ذکر کر کے بدر کے واقعہ کو شروع کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ فاصلہ دو سال کا ہے۔ اور اس عرصہ میں بے شمار کئی واقعات ہوئے ہیں۔ یہ واقعات تاریخ اور حدیث کی کتابوں میں مشہور ہیں۔ سوچنے کی بات ہے کہ اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت قافلہ کے ذکر سے خاموش ہے اور اس وجہ سے یہ دعویٰ کیا جائے کہ قافلہ کا وہاں مدینہ میں کوئی ذکر ہی نہ تھا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مدینے سے روانگی قافلہ کے لیے نہیں ہوئی تو کیا اسی بنیاد پر تاریخ کے ان واقعات کا بھی انکار کیا جائے جو ان دو سالوں میں پیش آئے ہیں اور جن کا حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت میں ذکر نہیں ہے حالانکہ قرآن اور حدیث کی کتابوں میں اس کا ذکر موجود ہے۔

روایت و درایت کا مسئلہ۔ انھوں نے کہا کہ جب ایک ہی واقعہ کے متعلق مفصل و مجمل دونوں قسم کی روایات ہوں تو ہمیشہ مجمل کی تشریح کے لیے مفصل کا سہارا لیا جائے گا۔

اسی وجہ سے ابن جریر نے اپنی تاریخ میں امام احمدؒ نے مسند میں ابن ابی شیبہ نے مصنف میں اور بیہقی نے دلائل میں بدر کی مفصل و مجمل روایات کے ضمن میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت کا ذکر کیا ہے۔ اور محدثین کا یہی طریقہ ہے کہ موضوع سے متعلق سارا سرمایہ یک جا رکھ دیتے ہیں جس میں اجمال و تفصیل دونوں ہوتے ہیں۔ صرف اجمال کو لے لینا اور تفصیل کو اپنی غرض کی خاطر نظر انداز کر دینا محققانہ انداز نہیں ہے۔ بہر حال حضرت علی رضی اللہ عنہ کی روایت اگر قافلے کے ذکر سے خاموش ہے تو دوسری روایات میں قافلہ کا ذکر موجود ہے کسی خاص روایت میں کسی واقعہ کا ذکر نہ ہونا یہ ہرگز اس کے عدم کی دلیل نہیں ہے۔

جہاں تک مولانا شبلی مرحوم کے دلائل نقلیہ کا ذکر ہے۔ مولانا نے اسی پر بس نہیں کی ہے بلکہ اپنے موقف کو مضبوط بنانے کے لیے کچھ عقلی دلائل بھی پیش کیے ہیں آیئے ان کا مطالعہ بھی کر لیجئے وہ فرماتے ہیں۔

انصار کیوں شریک ہوئے

ان کا سب سے پہلا وسوسہ یہ ہے کہ اگر مدینے سے روانگی قافلہ کے لیے تھی تو انصار کیوں شریک ہوئے حالانکہ بدر سے پہلے جس قدر سرایا اس مقصد کے لیے گئے اس میں کبھی کوئی انصاری نہیں گیا۔

لیکن یہ استدلال درست نہیں ہے کیونکہ کاروان تجارت کا یہ معاملہ زیادہ اہم نہیں تھا اور دشمن میں مقابلہ کی تاب نہ

تھی اس لیے حضور اقدس ﷺ نے خیال فرمایا کہ جو مال غنیمت ملے اس میں انصار کا بھی حصہ ہو لیکن انصار کے معاہدے کے پیش نظر اس بات کی ضرورت تھی کہ ان سے مشورہ لیا جائے کہ وہ جانا چاہتے ہیں یا نہیں۔ چنانچہ کاروانِ تجارت کے سلسلے میں مدینے کے اندر مشورہ کیا گیا جس میں انصار نے بخوشی رفاقت کو منظور کیا۔ چنانچہ حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں بتایا ہے کہ:

> حضور اقدس ﷺ نے جب شام سے ابوسفیان کے کاروانِ تجارت کا حال سنا تو مسلمانوں کو کاروانِ تجارت کے لیے دعوت دی اور فرمایا کہ قریش کا تجارتی قافلہ سرمایہ سے بھرپور آرہا ہے اس کے لیے چلو شاید اللہ سبحانہ یہ مالِ غنیمت تمہیں عطا کر دے۔ لوگ تیار ہو گئے۔ بعض تو خوشی خوشی ساتھ ہو گئے اور بعض نے جانا اس لیے پسند نہیں کیا کہ ان کے خیال میں حضور ﷺ کسی جنگی مہم پر نہیں جا رہے تھے۔

اس روایت میں یہ الفاظ شاید تمہیں مالِ غنیمت ہاتھ آجائے اور یہ کہ ان کو لڑائی کا گمان نہ تھا صاف بتا رہے ہیں کہ انصار صرف اس لیے مدینے سے نکلے کہ ان کو جنگ کا کوئی اندیشہ نہ تھا اور مالِ غنیمت کی توقع تھی۔

قافلہ کو روکنے کے لیے بدر کیوں گئے

مولانا شبلی کو یہ بھی وسوسہ ہوا ہے کہ مکہ سے جو قافلہ تجارت کے لیے شام جاتا تھا مدینے کے پاس سے گذر کر جاتا تھا۔ کاروانِ تجارت پر حملہ کرنا مقصود ہوتا تو شام کی طرف بڑھنا تھا۔ یہ بالکل خلافِ قیاس ہے کہ کاروانِ تجارت شام سے آرہا ہے، آپ بجائے شام کی طرف جانے کے مکہ کی طرف جا رہے ہیں۔

بلاشبہ اس شام سے آنے والے قافلہ کو جناب رسول اللہ ﷺ مدینے کے شمال یا مغرب میں روک سکتے تھے۔ لیکن شام سے اس کے نکلنے کی اطلاع موجودہ زمانہ نہیں تھا کہ تار یا ٹیلیفون پر وقت کے وقت مل جاتی۔ اونٹوں کے قافلہ کی اطلاع اونٹ سوار ہی دے سکتے تھے اور بمشکل دو ایک روز اوّل مدینے سے ساحل جانے میں دو تین دن ضرور لگ جاتے ہیں۔ ایک بڑا قافلہ بلاشبہ آہستہ آہستہ ہی چلتا ہے۔

بدر ایسا مقام تھا جو ساحل سے قریب بڑا مقام تھا۔ سارے قافلے وہیں سے گذرتے تھے۔ مکہ اور مدینہ کا قریب ترین مقام اتصال بھی وہی تھا اس کی توقع تھی کہ مسلمان اس کو وہاں جالیں گے۔ مغرب کی طرف ساحل کو جاتے تو قافلہ گذر جاتا۔ اور ہوا بھی یہی۔ یعنی قافلہ کی آمد سے بمشکل چند گھنٹے پہلے آپ بدر گئے۔ مقصد غیر معروف راستو پر چل کر چکر لگا کر پہنچنا تھا۔ تاکہ حریف کو پتہ نہ لگ سکے۔

بدر کے قریب پہنچ کر متعدد سانڈنی سوار بھیجے تاکہ اس کا پتہ چلائیں کہ قافلہ کہاں ہے جو سانڈنی سوار شمال مغرب میں شام کے راستے پر پہنچ گئے۔ انھوں نے واپس آکر غالباً حضور اقدس ﷺ کو یہ اطلاع ضرور دی ہوگی کہ قافلہ اب آیا ہی چاہتا

ہے اور اس اطلاع پر یہ خیال کر کے کہ قافلہ بدر سے گذرے گا۔ حضور اقدس ﷺ نے عین راستہ کی وادی کے مدخل کے پاس پڑاؤ ڈالا۔ قافلے کو اطلاع مل گئی تھی کیونکہ خود شام کو جاتے وقت مسلمانوں نے اس کا تعاقب کیا تھا۔ اس سے پہلے چھ سات قریشی قافلوں کو بھی تجربہ ہو چکا تھا۔ اس لیے قافلہ چوکنا تھا۔ قافلے عموماً رات کو چلتے ہیں اور صبح کے قریب منزل پر پہنچ کر آرام کرتے ہیں۔ بدر کی خطرناک وادی سے قریش واقف تھے اسی لیے پہنچنے سے کافی مسافت پہلے قافلہ رک جاتا ہے اور ابوسفیان ٹوہ لینے نکلتا ہے۔

بہرحال کسی کارروائی کے لیے بدر کا انتخاب پوری تنظیم سے ہوا تھا یہ بات کہ چونکہ شام کی طرف نہیں گئے اس لیے پیش نظر قافلہ نہیں دلیل اور واقعات کی ترازو میں بے وزن ہے۔ اور جب ارادہ الٰہی یہ ہو چکا تھا کہ بدر میں معرکہ حق و باطل اس طرح بپا ہو تو تقدیر الٰہی کے سامنے ساری انسانی تدبیریں بیکار ہو جاتی ہیں۔

آخر یہ معذرت آمیز انداز کیوں؟

اصل میں کسی بھی معاملے کے متعلق معذرت آمیز انداز اختیار کرنا ضعف موقف کا نشان ہوتا ہے اور جب موقف ضعیف اختیار کر لیا جائے تو اسے دلائل کے زور سے اور الفاظ کی فراوانی سے مستحکم نہیں کیا جا سکتا۔ پھر جب مسئلہ کے بنیادی حقائق آفتاب جہاں تاب کی طرح درخشاں ہوں تو ان کی طرف سے آنکھیں بند کر کے معذرت کا پہلو اختیار کرنا سراسر حیرت افزا ہے۔

بات یہ ہے کہ مولانا شبلی مرحوم نے آرنلڈ کی رہنمائی میں یا اس کی تقلید میں اس واقعہ کا تمام نقشہ جمہور امت کے خلاف اس لیے پیش کرنے کی کوشش کی کہ وقت کے عیسائی مستشرقین کے اس اعتراض سے مرعوب ہو گئے تھے کہ قافلہ کا لوٹنا انتہائی معیوب بات ہے لہٰذا جو شخص نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھتا ہے وہ ایسا کردار کیسے پیش کر سکتا ہے حالانکہ یہ بات مرعوب ہونے کی اور معذرت پیش کرنے کی نہ تھی بلکہ ضرورت اس بات کی تھی کہ تاریخی حقائق کی روشنی میں بتایا جاتا کہ کاروان تجارت کو روکنا اس وقت کی سیاسی حکمت عملی تھی۔ اور اس حکمت کا اختیار کرنا جنگی نقطہ نظر اور مسلمانوں کے بقاء و تحفظ کے لیے ناگزیر تھا۔۔۔۔

صورتحال یہ تھی کہ حضور اقدس ﷺ اور مسلمان مکہ چھوڑ کر مدینہ آ گئے تاکہ اطمینان سے دین حق کی تبلیغ کریں لیکن قریش کی عداوتوں نے وہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا۔ قریش نے سب سے پہلے عبداللہ بن اُبی اور اس کے ہمنواؤں سے ساز باز کی۔ ابوداؤد میں ہے،

نبی کریم ﷺ مدینہ تشریف لائے تو بدر کے واقعہ سے بہت پہلے کفار قریش نے عبداللہ ابن ابی

اور اس کے بت پرست ساتھیوں کو جو اوس و خزرج میں باقی رہ گئے تھے یہ لکھا ہے کہ تم نے ہمارے صاحب کو پناہ دی ہے اور ہم خدا کی قسم کھا کر کہتے ہیں کہ یا تو تم ان سے لڑو یا ان کو نکال دو ورنہ ہم سب تم پر چڑھ آئیں گے اور تمہارے جوانوں کو قتل کر دیں گے اور تمہاری عورتوں کو باندیاں بنالیں گے [1]

پھر معاملہ صرف دھمکیوں تک نہیں رہا بلکہ تجارتی قافلوں کی آڑ میں یہود مدینہ سے برابر مسلمانوں کے استیصال کے لیے ساز باز کرتے رہے اور صرف یہی نہیں بلکہ کاروان تجارت کا نصب العین ہی اسلام کا خاتمہ اور مسلمانوں کا استیصال بن گیا ـــــ ایسی حالت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے تھا دشمن کو اپنے خلاف اور اپنے استیصال کے لیے سازش کے مقابلہ کی تیاریوں میں مشغول رہنے. کاروان تجارت کے ذریعے مدینہ میں مقیم دشمنوں کے ساتھ مشرکین کو معاندانہ خط و کتابت جاری رکھنے اور کاروان تجارت کے ذریعے اپنی تباہی کے لیے سرمایہ فراہم کرنے اور اس سے سامان جنگ خریدنے کے لیے آزاد چھوڑ دینا اور اس طرح ہمیشہ کے لیے اپنی موت کو دعوت دینا یا ان تمام ذرائع پر ضرب کاری لگانا اور اس فتنہ کا سر کچل دینے کی کوشش کرنا۔!

اب سوچئے کہ آپ کیا کریں گے؟ اس سوال کا جواب اس کے سوا کیا ہے کہ وہی کچھ کریں گے جو اس وقت مسلمانوں نے کیا۔ عقل تدبیر اور سیاست کا تقاضا یہی ہے: تاریخ بتاتی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے مشرکین کی تجارت کو روکنے کے لیے سب سے پہلے حضرت حمزہ کو تیس سواروں کے ساتھ عیص کی جانب ساحل بحر پر روانہ کیا ان کی مڈبھیڑ قریش مکہ کے تین سواروں سے ہو گئی۔ ابوجہل قیادت کر رہا تھا لیکن لڑائی نہ ہوئی۔ بہرحال یہ فوجی دستہ کاروان تجارت کو روکنے کے لیے نکلا تھا۔ زرقانی علی المواہب میں ہے۔

مسلمانوں کا یہ دستہ قریش کے کاروان تجارت کو روکنے کے لیے نکلا۔ جو شام سے مکہ جا رہا تھا یعنی مسلمان چاہتے تھے کہ جس مقصد کی خاطر ان تجارتی قافلوں کی حرکت ہے ان پر غلبہ کر کے اس مقصد کو پورا نہ ہونے دیں [2]

اور ابوسفیان کے جس کاروان تجارت کے واقعہ سے بدر کے معرکہ کا تعلق ہے اس کے متعلق تو تمام ارباب سیر و تاریخ ایک زبان ہیں کہ قریش میں اہل ایمان کے استیصال کے لیے جوش و خروش اس درجہ بڑھا ہوا تھا کہ جب ابوسفیان کا کاروان تجارت مکہ سے چلا ہے تو کوئی قریشی مرد اور عورت ایسی نہ تھی جس نے اس میں حصہ نہ لیا ہو اور اپنا سرمایہ قافلہ کے سپرد نہ کیا ہو۔ زرقانی میں ہے۔

کاروان تجارت کے ساتھ پچاس ہزار دینار تھے۔

---

[1] ابوداؤد

[2] زرقانی علی المواہب ج ۱

اور ہر قریشی مرد و عورت جس کے پاس ایک مثقال سونا تھا اس کا سرمایہ اس میں موجود تھا۔

ابو سفیان کا یہ تجارتی کارواں صرف کاروان تجارت نہیں بلکہ جنگ کی تیاری کے لیے بس کی گانٹھ کی حیثیت رکھتا تھا۔

اس سے حرب و ضرب کا سامان خریدنا اور اس سامان کے ذریعے مدینہ پر حملہ کرنا تھا اس کا اندازہ ابو جہل کی اس تقریر سے

ہوتا ہے جو اس نے قافلہ کے خطرہ میں آنے کی خبر کے بعد اہل مکہ کے سامنے کی۔

بچاؤ، بچاؤ انتہائی ذلت اور دشواریوں کا سامنا کر کے بھی بچاؤ۔ کاروان تجارت صرف کاروان نہیں بلکہ تمہارے مال و دولت کا خزانہ ہے اگر محمد ﷺ اس پر قابض ہو گئے تو تم ہمیشہ کے لیے ناکام و نامراد ہو جاؤ گے۔

کیا ابو جہل کا یہ خطرہ صرف کاروان تجارت کے لٹ جانے پر ہو سکتا ہے۔ ہرگز نہیں۔ دراصل وہ جانتا تھا کہ یہ کاروان تجارت نہیں بلکہ سامان جنگ کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے جس کی حفاظت کے لیے آج کی مہذب اور متمدن دنیا میں فیصلہ کن لڑائیاں ہوتی ہیں۔

خدا لگتی اور انصاف کی کہیے کہ اس قسم کے کاروان تجارت کو کسی حکومت کا روک دینا اور اس کے خلاف فوجی کارروائی کرنا کونسا گناہ ہے جس کے لیے ہم دوسروں کی ہرزہ سرائی سے مرعوب ہو کر حقائق کا انکار کریں۔

یہ عوام کا قافلہ کو لوٹنا نہیں بلکہ یہ اسلامی حکومت کی کفری حکومت کے خلاف فوجی کارروائی ہے۔ اس میں قانونی، سیاسی اور اخلاقی لحاظ سے کوئی قباحت نہیں ہے۔

اب آخر میں صرف ایک سوال پر میں اس ساری بحث کو ختم کرتا ہوں کہ اگر معرکہ بدر میں ابتدا ہی سے بذریعہ وحی مدینہ میں بتا دیا گیا تھا کہ مشرکین سے تمہیں جنگی مقابلہ کرنا ہے اور قافلہ پر حملہ کرنے کا تصور ہی گناہ عظیم اور شان اسلام کے خلاف ہے تو قرآن ہی نے اس تصور کی احدی الطائفتین کہہ کر حوصلہ افزائی کیوں کی اور کیوں صاف صاف یہ نہیں کہہ دیا کہ اللہ سبحانہ ایک لمحہ کے لیے بھی تم کو قافلہ پر قابو پانے کی اجازت نہیں دیتا۔ کیونکہ اس کا تصور ہی گناہ عظیم ہے تو کیا قرآن عزیز کا احدی الطائفتین۔ کا اس طرح ذکر کرنا اس بات کی کھلی گواہی نہیں ہے کہ معرکہ بدر سے قبل چند اکابر کی یہ جماعت قافلہ کے لیے نکلی تھی مگر اچانک جب کفار مکہ سے سابقہ پڑا اور مسلمانوں کی بے سروسامانی دیکھ کر قافلہ پر تعرض کرنا چاہا تو اللہ تعالیٰ نے اول یہ وعدہ دیا کہ ان دونوں عیر و نفیر میں سے ایک ضرور تم کو دیں گے۔ اور پھر حضور اقدس ﷺ کو بذریعہ وحی بتا دیا کہ اللہ سبحانہ کی مرضی یہ ہے کہ وہ اب قافلہ کی بجائے معرکہ حق و باطل میں مسلمانوں کو کامیابی عطا کر کے ہمیشہ کے لیے تاریخ ظلم کا رُخ عدل کی جانب پھیر دینا چاہتا ہے۔

بہرحال قرآن عزیز، حدیث اور تاریخی حقائق کی روشنی میں معرکہ حق و باطل غزوہ بدر کے متعلق جمہور علمائے

اسلام کا مسلک ہی صحیح ہے اور بلاشبہ واقعات کی صحیح و مستند تفصیلات کسی طرح بھی شان نبوت کے خلاف نہیں اور نہ علم الاخلاق علم الاجتماع اور حق و صدق پر مبنی سیاسیات مدن کے منافی ہیں۔ ھذا ھو الحق والحق احق ان یتبع۔

اگرچہ مولانا مودودی اور مولانا اصلاحی کا بھی یہی موقف ہے لیکن ہم نے مولانا شبلی کے بیان کردہ دلائل کا جائزہ لیا ہے۔ دوسرے بزرگوں نے جو راہ اپنائی ہے وہ مولانا شبلی ہی کی بتائی ہوئی ہے۔

اللھم ارنا الحق حقا وارزقنا اتباعہ وارنا الباطل باطلا وارزقنا اجتنابہ۔

آمین یارب العالمین

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ وَ
أَنفُسِهِمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ
بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ وَالَّذِينَ آمَنُوا وَلَمْ يُهَاجِرُوا مَا
لَكُم مِّن وَلَايَتِهِم مِّن شَيْءٍ حَتَّىٰ يُهَاجِرُوا ۚ وَإِنِ
اسْتَنصَرُوكُمْ فِي الدِّينِ فَعَلَيْكُمُ النَّصْرُ إِلَّا عَلَىٰ
قَوْمٍ بَيْنَكُمْ وَبَيْنَهُم مِّيثَاقٌ ۗ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٧٢﴾
وَالَّذِينَ كَفَرُوا بَعْضُهُمْ أَوْلِيَاءُ بَعْضٍ ۚ إِلَّا تَفْعَلُوهُ
تَكُن فِتْنَةٌ فِي الْأَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيرٌ ﴿٧٣﴾ وَالَّذِينَ
آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَالَّذِينَ
آوَوا وَّنَصَرُوا أُولَٰئِكَ هُمُ الْمُؤْمِنُونَ حَقًّا ۚ لَّهُم مَّغْفِرَةٌ
وَرِزْقٌ كَرِيمٌ ﴿٧٤﴾ وَالَّذِينَ آمَنُوا مِن بَعْدُ وَهَاجَرُوا وَ
جَاهَدُوا مَعَكُمْ فَأُولَٰئِكَ مِنكُمْ ۚ وَأُولُو الْأَرْحَامِ بَعْضُهُمْ
أَوْلَىٰ بِبَعْضٍ فِي كِتَابِ اللَّهِ ۗ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٧٥﴾ ع ١٠ ٦

جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا۔
اور جن لوگوں نے (مہاجرین کو (مدینہ) میں جگہ دی اور ان کی مدد کی یہی لوگ باہم ایک
دوسرے کے رفیق ہیں۔ اور وہ لوگ جو نعمتِ ایمان سے مالامال ہوئے مگر انھوں

نے ہجرت نہیں کی تو ان سے تمہاری رفاقت کا کوئی علاقہ نہیں جب تک وہ ہجرت کرکے نہ آئیں، ہاں اگر دین کے بارے میں وہ تم سے مدد کے خواہاں ہوں تو بلاشبہ تم پر ان کی مددگاری لازم ہے۔ لیکن اگر وہ کسی ایسی قوم کے خلاف تم سے مدد کے خواہاں ہوں جن سے تمہارا عہد و پیمان ہے (تو پھر تم مدد نہیں کر سکتے) اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اس کو دیکھ رہا ہے^{٩٠} اور جنھوں نے راہ کفر اختیار کی وہ باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں اگر تم ایسا نہ کرو گے تو ملک میں فتنہ اور بہت بڑی گڑبڑ رونما ہو جائے گی^{٩١} اور وہ لوگ جو ایمان کی حالت میں ہجرت اور راہ خدا میں جہاد کا فرض ادا کر چکے ہیں یہی سچے اور سچے مسلمان ہیں، ان کے لیے بخشش اور عزت و آبرو والی روزی ہے^{٩٢} اور وہ لوگ جو اس کے بعد نعمت ایمان سے مالا مال ہوئے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمہاری ہمرکابی میں جہاد کیا وہ بھی تم ہی میں سے ہیں۔ اور رشتہ دار اللہ کی کتاب میں باہم زیادہ حقدار ہیں۔ بلاشبہ اللہ کو سب باتوں کا پورا پورا علم ہے^{٩٣}۔

معانی مفردات

ھاجروا یہ باب مفاعلۃ سے ماضی کا جمع مذکر غائب ہے یہ ہجر سے بنا ہے۔ اسی سے فعلۃ کے وزن پر ہجرۃ آتا ہے۔ ہجر کے معنی چھوڑ دینے کے ہیں امام راغب لکھتے ہیں۔ الھجر والھجران مفارقۃ الانسان غیرا اما بالبدن او باللسان او بالقلب یعنی ہجر نام ہے انسان کا کسی بدن زبان اور دل سے جدائی اختیار کر لینا قرآن وسنت کی زبان میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت سعادت و صداقت کے کسی مقصد اصل کے لیے اپنی دنیوی محبوبات ومالوفات کو ترک کر دے مثلاً دولت کو آرام کو عزیز و اقربا کے قرب کو تو اس کا نام ہجرت ہے۔ خدا کے ہر رسول اور ان کے پیروؤں کو تمام حق کی راہ میں یہ منزل طے کرنی پڑتی ہے۔ انی مھاجر الی ربی۔ چونکہ وطن و مکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے ترک کرنے میں اہل و عیال مال و متاع دوست و احباب ہر طرح کے علاقوں کو ترک کرنا پڑتا ہے

اس لیے ترکِ وطن کی ہجرت اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہوئی۔ اور زیادہ تر ہجرت کا اطلاق تارکین وطن ہی پر ہوا۔

جاھدوا باب مفاعلہ سے ماضی کا جمع مذکر غائب ہے۔ جہاد اور مجاہدہ اس کا مصدر آتا ہے۔ جہد سے بنا ہے اس کے معنے امام راغب نے استفراغ الوسع فی مدافعۃ العدو ظاھرا و باطنا لکھے ہیں یعنی دشمن اور دشمن کی تمام قوتوں کو دور کرنے میں انتہار درجہ کی کوشش کرنا۔ یہ کوشش زبان سے بھی ہوتی ہے مال سے بھی اور جان سے بھی ہوتی ہے۔ جس قسم کی کوشش کی ضرورت ہو ہر قسم جہاد فی سبیل اللہ میں داخل ہے۔

آوَوا یہ باب افعال سے ماضی کا جمع مذکر غائب ہے اس کا مصدر ایواء ہوتا ہے۔ یہ آوی سے بنا ہے اسی سے ٹھکانے کے معنے میں ماوی آتا ہے اوی یاوی باب ضرب سے ہے ولایۃ یہ بھی مصدر ہے بالکسر سیاست کے ہم وزن اور ہم معنے ہے علامہ آلوسی لکھتے ہیں۔ ولایۃ السلطان اور زجاج نے بھی بالکسر کے معنے امارۃ کے بتائے ہیں۔ فعال بالکسر کا وزن اسموں میں محیط و شامل کے لیے جیسے عمامہ اور مصادر میں صنعتوں کے لیے آتا ہے جیسے کتابۃ خیاطۃ وغیرہ اور ولایت بالفتح فعالہ کے وزن پر مدد اور سازگاری اور رفاقت کے معنے میں آتا ہے۔ نسب کے تعلقات پر ولایت بولا جاتا ہے۔

اولوا الارحام۔ دونوں لفظ جمع ہیں اولو ذو کی جمع ہے ارحام رحم کی جمع ہے رحم عورت کے پیٹ کا وہ حصہ جس میں بچہ ہوتا ہے یعنی بچہ دانی اور مجازاً قرابت کے معنے میں استعمال ہوتا ہے کیونکہ اہل قرابت ایک ہی رحم سے پیدا ہوتے ہیں۔ زیادہ ماں کے پیٹ سے تعلق رکھنے والے رشتوں پر بولا جاتا ہے۔ اور فرائض کے فن میں اولوالارحام وہ رشتہ دار کہلاتے ہیں جن کا قرآن نے فرضاً حصہ نہ بنایا ہو اور جو عصبہ نہ ہوں یہ دس قسمیں ہیں۔ ماموں۔ خالہ۔ ماں کا دادا۔ ماں کے بھائی کا بیٹا۔ بیٹی کا لڑکا۔ بہن کا لڑکا۔ بھائی کی بیٹی چچا اور چچی کی بیٹی۔ ماں کا چچا۔

اولیٰ زیادہ اوفق، زیادہ مستحق۔ اسم تفضیل ہے۔ اگر ولی سے ہو تو اس کے معنی زیادہ قریب کے ہیں اور اگر ولایت سے ہو تو اس کے معنی زیادہ مستحق کے ہیں۔ ولی کے اصلی معنے پے در پے اور مسلسل واقع ہونے کے ہیں۔ اسی لحاظ سے قریب ہونے کے معنے میں یہ استعمال ہوتا ہے اس کا صلہ جب لام آئے تو یہ ڈانٹ اور دھمکی کے لیے آتا ہے۔

تعمیر ملت کا سنگِ بنیاد

زمانۂ نبوت میں مسلمان چار قسموں میں منقسم تھے۔

۱۔ مہاجرین اولین وہ لوگ جو ترکِ وطن کر کے صلح حدیبیہ سے پہلے مدینہ طیبہ کی اسلامی حکومت میں آئے۔

۲۔ مدینہ طیبہ کے اصلی مسلمان باشندے جو انصار کے نام سے مشہور ہوئے۔

۳۔ وہ مسلمان جنھوں نے ہجرت کی سعادت حاصل نہیں کی۔

۴۔ وہ مسلمان جنھوں نے صلح حدیبیہ کے بعد مدینہ ہجرت کی۔

ان آیات قرآنی میں ان چاروں کا چہرہ اوران کے قانونی روابط اوران کے احکام بیان ہورہے ہیں اور ساتھ ہی اس مواخات کا بھی ضمنی تذکرہ ہے جو حضور اقدس ﷺ نے مدینہ میں مسلمانوں میں قائم فرمائی تھی۔

حافظ عسقلانی نے حافظ ابن عبدالبر کے حوالے سے یہ انکشاف کیا ہے کہ مواخات دوبار ہوئی۔ ایک مکہ میں دوسری مرتبہ مدینہ میں۔ مکہ میں جو مواخات ہوئی تھی وہ صرف ان مسلمانوں کے درمیان تھی جو یہیں مقیم تھے۔ اور مدینہ میں جو مواخات ہوئی وہ مہاجرین اور انصار کے مابین ہوئی۔

حافظ عسقلانی ہی نے ابوالقاسم السہیلی کے حوالہ سے فتح الباری میں مواخات کا پس منظر یہ بتایا ہے۔

حضور اقدس ﷺ نے انصار و مہاجرین کے درمیان بھائی چارہ اس لیے قائم کیا تاکہ مسافر مہاجرین میں سے مسافر ہونے کا احساس ختم ہو اور گھر بار اور خاندان کی جدائی کا غم غلط ہو اور باہم ایک دوسرے کا سہارا اور ایک دوسرے کے غم خوار بن کر رہیں۔

یعنی دراصل مہاجرین کا تعلق مکہ سے تھا۔ ان میں سے اکثریت کی تعلیم و تربیت ہو چکی تھی۔ وہ مصائب کے ان خوفناک طوفانوں میں زندگی گذار چکے تھے جن کا ایک معمولی سا ریلا بھی انسان کو زیادہ سے زیادہ بلند ہمت اور پختہ کار بنا دینے کے لیے کافی سمجھا جاتا ہے۔ وہ خوددار اور غیور انسان تھے۔ حوصلے فلک بوس۔ عزائم مستحکم مقاصد کی قدر و سبقت پر یقین کامل۔ ایسے لوگوں کے سامنے زندگی کا کوئی نقشہ بھی آجاتا۔ انہیں اپنے لیے مناسب مقام پیدا کرنے میں کوئی دقت پیش نہ آتی۔ انہیں یہ بھی یقین تھا کہ انسانی زندگی کا جو نظام وہ بروئے کار لانا چاہتے ہیں اسے ہر حال میں کامیاب ہونا چاہیے اور عالم انسانیت کے لیے خیرات و برکات کی بہاروں کے ایک ایسے مبارک دور کا آغاز ہو جائے گا جس کی کوئی نشانی اس وقت تک تاریخی یادداشتوں میں نہ تھی۔ ان کی ذاتی ضرورتیں اس درجہ قلیل و مختصر تھیں کہ کوئی بھی حالت پیش آجاتی انہیں قطعاً پریشانیوں سے سابقہ نہ ہوتا وہ اس غرض سے گھر بار اور املاک چھوڑ کر نہیں آئے تھے کہ نئی سرزمین میں پہنچتے ہی ویسی ہی املاک مل جائیں گی البتہ وہ ہر خطے کے آدمیوں کو جلد سے جلد حقیقی انسان بنتے دیکھنے کے لیے یقیناً مضطرب و بے قرار تھے اور اسلام کا مقصد یہی تھا۔ اس کے سوا کچھ نہ تھا۔

اگرچہ انصار کو اسلام سے وابستگی اختیار کیے ہوئے مختصر سی مدت گذری تھی۔ لیکن وہ کسی بھی خصوصیت میں مہاجرین سے کم نہ تھے بلکہ ان کی روح میں ایثار و قربانی نے بے تامل جن جن شکلوں میں ظہور کیا اس سے زمانہ بھر پر آشکارا ہو گیا کہ انصار کی کوئی نظیر نہ ان سے پیشتر کسی آبادی دیکھی گئی نہ اس کے کسی خطے میں ایسا قدوسی گروہ نظر آیا۔ شاید یہی روح ایثار انصار کی برگزیدگی کا اصل سبب ٹھہری اور ان کو اسلام اور مسلمانوں کی پناہ گاہ بننے کا دائمی شرف حاصل ہوا۔

معلوم ہوتا ہے کہ انسان اخلاقی و روحانی ارتقاء کے مراحل طے کرتے ہوئے کتنی ہی بلندیاں حاصل کریں تاہم وہ خوش ذوات کے مقررہ سہاروں سے ہمیشہ کے لیے بے نیاز نہیں رہ سکتے۔ کسی نہ کسی وقت روح کی گہرائیوں سے ایسی ہریں اٹھ کر سطح پر آجاتی ہیں جنہیں ہم انسانیت کے احساس کے سوا اور کسی چیز سے تعبیر نہیں کر سکتے۔ غالباً روح انسانی کی یہی پیاس تھی جس کی سیرابی کا مواخات کے ذریعے انتظام فرمایا گیا۔

اسلام میں نصرت کی بنیاد ایمان ہے

(۹۰) جو لوگ ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا اور جن لوگوں نے مہاجرین کو جگہ دی اور ان کی مدد کی یہی لوگ باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں۔ قیدیوں میں کچھ ایسے تھے جو دل سے مسلمان تھے مگر حضرت کے ساتھ مکہ سے ہجرت نہ کر سکے اور بادلِ ناخواستہ کفار کے ساتھ ہو کر بدر میں آئے ان آیات میں یہ بتلانا ہے کہ ایسے مسلمانوں کا کیا حکم ہے حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں کہ حضرت کے اصحاب دو فرقے تھے مہاجرین وانصار۔ مہاجرین کنبہ اور گھر چھوڑنے والے اور انصار جگہ دینے والے اور مدد کرنے والے ان دونوں میں آنحضرتؐ نے بھائی چارہ قائم کر دیا تھا آیت کا مضمون یہ ہوا کہ جتنے مسلمان حضرت کے ساتھ حاضر ہیں ان سب کی صلح و جنگ ایک ہے۔ ایک کا موافق سب کا موافق۔ ایک کا مخالف سب کا مخالف بلکہ آغازِ ہجرت میں رشتہ مواخات کے اعتبار سے ایک دوسرے کا وارث بھی ہوتا تھا۔[1]

اس آیت میں چند مباحث ہیں۔

مسجد نبوی کی تعمیر مکمل ہوئی تو حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مکان میں رسول اللہ نے انصار و مہاجرین کو جمع کیا۔ اس اجتماع میں نوے یا ایک سو صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم شریک ہوئے۔ لیکن اس اجتماع کی تاریخ میں اختلاف ہے ایک رائے تو یہی ہے کہ مسجد کی تعمیر سے فراغت کے بعد آپ نے مواخات کا آغاز کیا۔ کچھ کی رائے میں مسجد بنانے سے پہلے یہ کام کیا۔ کچھ کی رائے ہے کہ ہجرت سے پانچ ماہ بعد کچھ نو ماہ بعد۔ اور کچھ ایک سال تین ماہ بدر سے پہلے بتاتے ہیں۔ یہ سب باتیں درست ہیں کام کا آغاز تو ہجرت کے بعد ہی کر دیا تھا یعنی پانچ ماہ بعد اس عرصہ میں مسجد بن چکی تھی ـــــــ اور یہ کام شروع ہونے کے بعد ایک عرصہ تک جاری رہا۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس اجتماع میں صحابہ کے سامنے تجویز پیش کی۔ تاخوا فی اللہ اخوین اخوین اللہ کی خاطر دو دو آدمی بھائی بھائی بن جائیں ناموں کی پوری فہرست کہیں نہیں ملی جو نام مختلف

[1] فوائد از شیخ الاسلام

روایتوں میں آئے ہیں وہ درج ذیل ہیں

مہاجرین	انصار
ابوبکر الصدیق	خارجہ بن زید
عمر فاروق	عتبان بن مالک
ابوعبیدہ ابن الجراح	سعد بن معاذ
عبدالرحمن بن عوف	سعد بن الربیع
زبیر بن العوام	سلمہ ابن سلامہ
علقمہ بن عبیداللہ	کعب بن مالک
عثمان بن عفان	انس بن ثابت
سعید بن زید	ابی بن کعب
مصعب بن عمیر	ابوایوب انصاری
ابوحذیفہ بن عتبہ بن ربیعہ	عباد بن بشیر
عمار بن یاسر	حذیفہ بن الیمان
ابوذر غفاری	منذر بن عمرو
حاطب بن ابی بلتعہ	عویم بن ساعدہ
سلمان فارسی	ابوالدرداء
بلال	ابورویحہ بن عبداللہ

بعض ناموں کے متعلق روایات میں اختلاف ہے۔ ابن اسحاق کا بیان ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اور فرمایا ھذا اخی۔ یہ میرا بھائی ہے۔ پھر حمزہ اور زید بن حارثہ رضی اللہ عنہما کی مواخات کا ذکر کیا ہے۔ اور جعفر بن ابی طالب اور معاذ بن جبل کی مواخات کا ذکر ہے۔ ابن ہشام نے محمد بن اسحاق کا تعاقب کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ بیان درست نہیں کیونکہ جعفر بن ابی طالب اس وقت مدینہ میں موجود نہ تھے اصل میں محمد بن اسحاق نے مکی مواخات اور مدنی مواخات میں خلط کر دیا۔ یہ مکی مواخات میں تو ہو سکتا ہے مدنی مواخات سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ حافظ عراقی فرماتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضور ﷺ کے درمیان مواخات کی روایات ضعیف ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے بھی اس کا انکار کیا ہے۔ حافظ عسقلانی نے ایک روایت کے سہارے حافظ ابن تیمیہ کا تعاقب کیا ہے۔ وہ روایت امام حاکم

نے بحوالہ جمیع بن عمیر پیش کی ہے جس میں حضور ﷺ سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مواخات کا ذکر ہے اول تو خود حاکم کی ذات ہی روایت کو مشتبہ بناتی ہے پھر جس کے حوالہ سے وہ روایت پیش کر رہے ہیں یعنی جمیع بن عمیر وہ بھی محدثین کے نزدیک پایۂ اعتبار سے ساقط ہیں۔ ابن نمیر کہتے ہیں کہ اکذب الناس ہے ابن حبان کا انکشاف ہے کہ رافضی ہے اور جھوٹی حدیثیں گڑھتا تھا۔ کم سے کم بات اس کے بارے میں جو کہی گئی ہے وہ امام بخاری کی ہے۔ ان کا ارشاد ہے فیہ نظر۔

ہر خونی رشتہ سے بڑھ کر

مواخات ہو چکی تو ہر انصاری نے اپنے مہاجر بھائی کو ساتھ لے جا کر گھر کی ایک ایک چیز کا جائزہ دے دیا اور کہہ دیا کہ اس میں نصف آپ کا اور نصف ہمارا ہے مثلاً عبد الرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ سعد بن الربیع رضی اللہ عنہ کے بھائی بنائے گئے جو انصار میں سب سے زیادہ مالدار تھے۔ انھوں نے اپنے بھائی مہاجر سے یہ بھی کہہ دیا کہ میری دو بیویاں ہیں۔ ان میں سے جسے آپ پسند کریں میں طلاق دے دیتا ہوں عدت گذرنے پر اس سے آپ شادی کر لیں لیکن عبد الرحمٰن رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے شکریہ ادا کرتے ہوئے کچھ لینے سے انکار کر دیا اور کہا کہ مجھے صرف بازار کا راستہ بتا دیجئے۔ چنانچہ بنو قینقاع کے بازار میں گھی اور پنیر کی دوکان کھول لی۔ رفتہ رفتہ ان کی تجارت میں اتنی ترقی ہوئی کہ وہ خود ہی فرماتے تھے کہ مٹی پر ہاتھ ڈالتا ہوں تو سونا بن جاتی ہے ان کا سامان تجارت سات سات سو اونٹوں پر لدا ہوتے تھے اور کاروانِ تجارت جس روز مدینہ پہنچتا تھا تو سارے شہر میں دھوم مچ جاتی تھی۔

مولانا شبلی نے یہ بات بہت برموقعہ لکھی ہے۔

انصار نے مہاجرین کی بھائی اور برادری کا جو حق ادا کیا دنیا کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں مل سکتی۔

بہرحال فریقین مہاجر و انصار نے محبت کا ایک عجیب و غریب جذبہ برانگیختہ کر دیا تھا۔ مولانا آزاد مرحوم فرماتے ہیں۔

> مسلمانوں میں اسلامی مواخات کا ایسا ولولہ پیدا ہو گیا تھا کہ خون کے عزیزوں سے کہیں زیادہ رشتہ ایمان کے ان عزیزوں کے ساتھ سمجھنے لگے تھے۔ حتیٰ کہ اگر ایک مر جاتا تو رشتہ مواخات کا بھائی اس کا وارث سمجھا جاتا۔ انھوں نے سارے پرانے رشتے بھلا دیئے تھے۔ صرف ایک ہی رشتہ کی لگن باقی رہ گئی تھی۔ یعنی سب اللہ کے رسول کے فدائی اور سب اسی کے حُسنِ جہاں آرا پر سب کچھ نثار کر دینے والے ہیں۔

تو نخل خوش ثمر کیستی کہ باغ و چمن
ہمہ ز خویش برید و بہ تو پیوستند

یہاں آیت کے اس حصے پر بھی ذرا ایک نظر ڈال لیجئے کہ بعضھم اولیاء بعض۔ یعنی یہ مہاجر و انصار باہم ایک دوسرے کے ولی ہیں اس ولایت کا مطلب کیا ہے؟

ولایت کے دو معنے بتائے گئے ہیں ایک توارث دوسرے حمایت و نصرت جن لوگوں نے آیت قرآنی میں ولایت کو توارث کے معنے میں لیا ہے ان میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہیں وراثت نسبی قرابت کی بنا پر نہیں بلکہ مہاجرین و انصار میں مواخات کی بنا پر ہوگی۔ چنانچہ فرماتے ہیں

یہ آیت میراث کے موضوع پر ہے۔ ہجرت کی بنیاد پر وراثت ملتی تھی۔ مہاجرین غیر رشتہ داروں کے وارث ہوتے تھے ایمان رکھتے ہوئے اگر کوئی ہجرت نہ کرتا تو وہ اپنے مہاجر رشتہ دار کا وارث نہ ہوتا تھا۔ فتح مکہ پر ہجرت ختم ہوگی تو ہجرت کی بنیاد پر وراثت کا بھی خاتمہ ہوگیا۔ اب وراثت رشتہ اور قرابت کی بنیاد پر قائم ہوگئی اور یہ حکم منسوخ ہوگیا۔

علامہ خفاجی نے امام مجاہد اور حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کا ہمنوا بتایا ہے اور لکھا ہے کہ،

مہاجر اپنے بھائی انصاری کا وارث ہوتا تھا جبکہ مدینہ میں اس کا کوئی مہاجر رشتہ دار نہ تھا اور مسلمان غیر مہاجر سے اس کا وراثت میں کوئی تعلق نہ ہوتا یہی صورتحال فتح مکہ تک باقی رہی ہجرت ختم ہونے پر وراثت کو قرابت کی بنیاد پر قائم کر دیا گیا۔ ولی آیت میں قریبی اور مددگار دونوں معنے میں ہے۔ اصل میں تو یہ لفظ قرب مکانی کے لیے ہے۔ پھر معنوی قرب جیسے رشتہ داری ایمان اور مددگاری کے لیے بولا جانے لگا۔ آغاز اسلام میں حضور اقدس ؐ نے رشتہ ایمان کے نام پر اخوت قائم کی اور میراث وغیرہ میں اسی اخوت ایمانی کو اخوۃ قرابت کا درجہ دے دیا اس لیے یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اس تفسیر کے ولایت کے لغوی معنے ساتھ نہیں دیتے ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہوا کہ ولایت اگر بمعنی توارث ہے تو یہ آیت منسوخ ہے۔ چنانچہ ابن عربی مالکی نے احکام القرآن میں تصریح کی ہے۔

پھر اللہ سبحانہ نے فتح مکہ اور قانون وراثت کے ذریعہ اس حکم کو منسوخ کر دیا۔ خواہ وارث دار الحرب میں ہو یا دار الاسلام میں ہو کیونکہ سُنت سے ہجرت کی فرضیت ختم ہو چکی ہے۔

اس کے معنے یہ ہوئے کہ سورہ نساء میں جب قانون وراثت آ گیا تو یہ حکم منسوخ ہو گیا جیسا کہ و اولوا الارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ میں اس طرف اشارا ہے۔ ابوبکر الجصاص کا بھی یہی موقف ہے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ ہجرت اور مواخات کی بنیاد پر وراثت قائم ہوئی تھی نسبی رشتوں کی بنیاد پر نہیں

مہاجر اور غیر مہاجر مسلمانوں کے درمیان رشتہ وراثت ختم ہو گیا تھا۔

اور یہ بھی فرماتے ہیں کہ:

کہ فرض ہجرت ختم ہونے کے ساتھ توارث بالھجرۃ بھی ختم ہو گیا اب توارث کی بنیاد رشتہ داریاں اور انساب ہیں۔

یہ ان بزرگوں کا موقف ہے جو آیت میں ولایت کو توارث کے معنے میں لے کر اس کے منسوخ ہونے کے علمبردار ہیں۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہاں عام شاہراہ سے ہٹ کر ایک خاص انداز اختیار کیا ہے وہ فرماتے ہیں۔

میری رائے میں یہ آیت منسوخ نہیں ہے خواہ ولایت بمعنے توارث ہو۔ جب تک دونوں آیتوں میں مفاہمت ممکن ہو نسخ کو اپنانا ٹھیک نہیں ہے۔ میرے خیال میں حضرت عبداللہ بن عباس رضؓ کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ کافر رشتہ دار مسلمان مہاجرین کے اختلاف دین کی وجہ سے وارث نہیں ہوتے۔ اور مسلمان غیر مہاجر اپنے مسلمان بھائی کا اختلاف دارین کی بنا پر وارث نہیں ہوتا ہے یہ صورتحال فتح مکہ تک قائم رہی۔ مگر فتح ہوا ہجرت ختم ہو گئی تو وراثت کی بنیاد قرابت ہو گئی۔ انصاری مہاجر کی میراث عقد موالات کی وجہ سے لیتا تھا اور عقد موالات خود وراثت کے اسباب میں سے ایک بنیادی سبب ہے جبکہ میت کا کوئی سببی یا نسبی وارث نہ ہو یہ صورت اب بھی موجود ہے لہذا نسخ کا سوال ہی نہیں ہے ایسی کوئی مثال نہیں ہے کہ کسی مہاجر نے انصاری کی میراث لی ہو یا انصاری نے مہاجر کی میراث لی ہو مسلمان رشتہ دار ہوتے ہوئے۔ اور نہ آیت کا موضوع یہ مسئلہ ہے۔

قاضی صاحب یہ بتانا چاہتے ہیں کہ مواخات کے نام پر جو توارث اس آیت میں پیش کیا جا رہا ہے دراصل وہ عقد موالات ہے۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا مواخات والے جو وراثت پاتے تھے وہ قرآن کی اس آیت کی وجہ سے پاتے تھے جیسا کہ عام شارحین بتا رہے ہیں یا اس موالات کی وجہ سے پاتے تھے جو عرب میں رائج تھی اور جسے قرآن نے یہاں بعضھم اولیاء بعض کہہ کر قائم رکھا پھر قرآن نے اس رواج کو منسوخ کیا۔

ولکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم

اور ہم نے والدین اور رشتہ داروں کے چھوڑے ہوئے سرمایہ کے حقدار مقرر کر دیئے ہیں۔ اور جن لوگوں سے تمہارے عہد و پیمان ہو چکے ہیں۔ ان کو ان کا حصہ دو بلاشبہ اللہ ہر چیز کی نگرانی کر رہا ہے۔

اب دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ مواخات والوں کو زیر تشریح آیت کی بنا پر میراث دی جائے اور پھر اس آیت کے بعد میں آنے والی آیت اولوا الارحام سے اور آیت احزاب سے منسوخ کیا جاوے۔

دوسرے یہ کہ مواخات والوں کو موالات کی بنا پر وراثت دی جائے اور آیت بالا کے ذریعے موالات کے عرب رواج کو منسوخ کہا جائے ہماری رائے میں دوسری رائے راجح ہے۔ قاضی ثناء اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ کا میلان اسی طرف ہے اور مولانا اشرف علی رحمہ اللہ تعالیٰ نے اسی کو پسند کیا ہے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے اگر زیر تشریح آیت میں عقدِ موالات کی بنا پر مہاجرین وانصار میں رشتہ قائم رکھا ہے اور سورہ نساء کی آیت کے ذریعے عقدِ موالات کو ختم کر دیا ہے تو کیا موالات کی ساری انواع کو ختم کر دیا ہے۔ یا موالات کی کوئی قسم باقی ہے جسے اس آیت کا منطوق قرار دیا جا سکے اور آیت قرآنی نسخ سے محفوظ ہے عرب کا دور جاہلیت ختم ہو جانے کے بعد زمانہ اسلام میں بھی عقدِ موالات کے ہی کچھ آثار نظر آتے ہیں۔ دوسری صدی تک یہ اسلامی دستور باقی تھا کہ جب کوئی نو مسلم مشرف باسلام ہوتا تو وہ جس قبیلہ کے کسی شخص سے عقدِ موالات کرتا یعنی دوستی کا عہد و پیمان باندھتا اسی قبیلہ کی طرف منسوب ہو جاتا اور اس کا حلیف اور مولیٰ کہلاتا۔ اسی نسبت سے امام ابن ماجہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو ربعی، امام بخاری رحمہ اللہ تعالیٰ کو جعفی، امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کو تیمی کہتے ہیں۔ یہ نسبت غلامی کی نہیں بلکہ دوستی کے عہد و پیمان کی نسبت ہے۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے بارے میں امام طحاوی رحمہ اللہ نے مشکل الآثار میں عقدِ موالات پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> عبداللہ بن یزید رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ میں امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے پاس گیا انہوں نے مجھ سے پوچھا کہ تم کون ہو میں نے عرض کیا کہ ایسا شخص جس پر اللہ نے اسلام کے ذریعے احسان کیا یعنی نو مسلم ہوں امام صاحب نے فرمایا یوں نہ کہو بلکہ ان قبائل میں سے کسی سے تعلق پیدا کرو پھر تمہاری نسبت بھی ان کی طرف ہوگی میں خود بھی ایسا ہی تھا۔

یہ عبداللہ بن یزید امام اعظم ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے شاگرد ہیں۔ چنانچہ حافظ ذہبی لکھتے ہیں کہ یہ ابوحنیفہ اور ابن عون کے شاگرد ہیں۔ فن حدیث میں ان کا شمار امام بخاری کے اساتذہ میں سے ہے۔ خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بتانا یہ تھا کہ امام اعظم کو تیمی غلامی کی وجہ سے نہیں بلکہ عقدِ موالات کے دستور کی وجہ سے کہتے ہیں۔ بالتصریح تو معلوم نہیں ہو سکا کہ یہ عقدِ موالات کس نے کیا تھا بہر حال عقدِ موالات کا یہ دستور زمانہ اسلام میں موجود رہا۔ یہاں تک تو سارے ائمہ فقاہت متفق ہیں کہ وارث ہوتے ہوئے مولائے عقدِ موالات کو کچھ میراث نہیں ملتی ہے خواہ وہ وارث ذوی الفروض نسبی ہوں یا عصبہ یا ذوی الارحام۔ لیکن جب کوئی نہ ہو تو اس میں فقہاء کا اختلاف ہے جیسا کہ الجصاص

نے تفصیل لکھی ہے. خلاصہ یہ ہے کہ اگر اقربا میں سے کوئی وارث نہ ہو تو امام ابوحنیفہ، امام ابو یوسف، امام محمد، اور امام زفر رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں جو شخص جس مسلمان کے ہاتھ پر مسلمان ہوا ہو اور اس نے اس مسلمان سے عقد موالات کر لیا ہو اور وہ جس سے عقدِ موالات ہے بغیر وارث کے مر گیا تو یہ نو مسلم اس کا وارث ہوگا. امام مالک ابن شبرمہ امام ثوری، امام اوزاعی اور امام شافعی رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ایسے شخص کا سارا مال مسلمانوں کا اشتراکی سرمایہ ہے اور اسے خزانہ سرکار میں داخل کیا جائے گا. الجصاص رقم طراز ہیں۔

سارے قرآن اور ساری سنت میں ایسی کوئی قانونی دفعہ نہیں جس سے ذوی الارحام اور ورثہ کی عدم موجودگی عقد موالات کرنے والوں کو میراث سے محروم کر سکے۔

بہر حال یہ آیتِ گرامی عقد موالات کے لیے اب بھی اپنے دامن میں عمل کا پہلو رکھتی ہے اس لیے اسے منسوخ کہنے کی کوئی وجہ نہیں ہے. بلکہ عقدِ ولایت اس کا مصداق ہے۔ الجصاص نے یہاں ایک بہت گہری اور پتے کی بات لکھی ہے کہ:

ولایت میراث کا ایسا ہی سبب ہے جیسے نسب میراث کا سبب ہے یہ دوسری بات ہے کہ اسباب کے اختلاف سے کچھ کو ملے اور کچھ کو نہ ملے۔ جیسے نسب میں کچھ رشتہ داروں کو میراث ملتی ہے اور کچھ کو نہیں ملتی ہے۔

وفائے عہد کا التزام

۱۹ اور وہ لوگ جو نعمت ایمان سے مالا مال ہوئے مگر انھوں نے ہجرت نہیں کی تو ان سے تمہاری رفاقت کا کوئی تعلق نہیں ہے جب تک وہ ہجرت کر کے نہ آئیں. ہاں اگر دین کے بارے میں وہ تم سے مدد کے خواہاں ہوں تو بلاشبہ تم پر ان کی مددگاری لازم ہے. لیکن اگر وہ کسی ایسی قوم کے خلاف تم سے مدد کے خواہاں ہوں جن سے تمہارا عہد و پیمان ہو تو پھر تم ان کی مدد نہیں کر سکتے ہو اور جو کچھ تم کرتے ہو اللہ اسے دیکھ رہا ہے اور جو مسلمان اپنے ملک میں رہے جہاں غیروں کا زور تسلط ہو یعنی دار الحرب ہجرت نہ کی۔ ان کی صلح و جنگ میں دار الاسلام کے رہنے والے مسلمان مہاجرین و انصار شریک نہیں۔ اگر دار الحرب کے مسلمانوں نے صلح و معاہدہ کسی جماعت کفار سے کر لیا ہے تو دار الاسلام کے آزاد مسلمان اس معاہدہ کے پابند نہیں ہو سکتے. بلکہ ان سے حسب مصلحت جنگ کر سکتے ہیں. ہاں یہ ضرور ہے کہ دار الحرب کے مسلمان جس وقت دینی معاملہ میں آزاد مسلمانوں سے مدد طلب کریں تو ان کو اپنے مقدور کے موافق مدد کرنا چاہیے مگر جس جماعت سے ان آزاد مسلمانوں کا معاہدہ ہو چکا ہو اس کے مقابلہ میں تا بقائے عہد دار الحرب کے

مسلمانوں کی امداد نہیں کی جاسکتی۔ نیز توریث باہمی کا سلسلہ جو مہاجرین وانصار میں قائم کیا گیا تھا اس میں بھی دار الحرب کے مسلمان شامل نہیں تھے[1]

۱۔ پہلی آیت میں بتایا تھا کہ جو لوگ ایمان لائے اپنا گھر بار چھوڑ کر مدینہ آگئے جان ومال سے راہ خدا میں جہاد کیا خواہ کسی قبیلہ اور کسی حلقہ کے ہوں عقد موالات کے ذریعے ایک ہی برادری کے فرد ہو گئے۔ ان کا ہر فرد اس عقد موالات کا رکن ہے۔ بعضهم اولیاء بعض

اب پیش نظر آیت میں اسی قانون کی دوسری دفعہ یہ بتائی جا رہی ہے

۲۔ جو ایمان تو لائے مگر ابھی تک انھوں نے ہجرت نہیں کی ان کا اس عقد موالات سے کوئی تعلق نہیں اور اس رشتہ کے حقوق میں ان کا کوئی حصہ نہیں ہو سکتا جب تک وہ ہجرت کر کے مسلمانوں سے آنہ ملیں۔

۳۔ اگر وہ دین کے معاملہ میں مدد چاہیں تو تمہارا فرض ہے کہ ان کی مدد کرو۔ محض اس وجہ سے کہ وہ ابھی تک ہجرت نہیں کر سکے ایسا نہیں ہو سکتا کہ ہماری مددگاری کے دینی حق سے محروم ہو جائیں۔

۴۔ یہ بات ہرگز نہ بھولنی چاہیے کہ عہد و پیمان کی نگرانی مسلمانوں کا سب سے پہلا فرض ہے۔ لہٰذا اگر وہ کسی ایسے غیر مسلم گروہ کے خلاف مسلمان حکومت سے مدد چاہیں جس سے تم صلح کا عہد کر چکے ہو تو تمہارے لیے جائز نہ ہوگا ان کی مدد کے لیے عہد شکنی کرو۔ نتیجہ خواہ کچھ ہو لیکن اپنے قول وقرار پر قائم رہنا چاہیے۔

ان میں سے ہر بات تفصیل وتشریح کی محتاج ہے۔

پہلی بات کہ جو لوگ مسلمان تو ہیں لیکن انھوں نے ہجرت نہیں کی ہے ان کا اس مواخات اور عقد موالات سے کوئی تعلق نہیں جو مدینہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے انصار مہاجرین کے درمیان قائم کیا تھا یعنی یہ حضرات اس کے رکن نہیں ہیں۔ ان کو اس موافات کی وجہ سے کوئی وراثت میں حصہ نہ ملے گا۔ یہاں بھی ولایت کی نفی سے مراد توارث کی نفی مقصود ہے۔ الجصاص لکھتے ہیں۔

ان میں توارث کی نفی ولایت نہ ہونے کی وجہ سے کی گئی ہے

یعنی عقد موالات میں شامل نہ ہونا اس کا باعث ہے۔ محققین نے یہی مطلب بتایا ہے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں:

میراث میں ان کا کوئی حصہ نہیں چاہیے عقد موالات کے ارکان سے ان کی کیسی ہی قرابت کیوں نہ ہو۔

یہاں یہ بات قابل غور ہے کہ اس محرومی کا باعث فریضہ ہجرت کو چھوڑ دینا ہے یا اختلاف دارین ہے۔ قرآن نے لم یھاجروا کہہ کر پہلی بات کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اگر حال ذوالحال کی قید ہوتا ہے تو یہ بات بالکل صاف ہے کہ

[1] افادات شیخ الاسلام

ترک ہجرت اس کی علت ہے۔ اور علت ختم ہونے سے معلول کا ختم ہوجانا ایک بدیہی بات ہے۔ بتانے والوں نے خوب کھول کر سمجھایا ہے۔

یہ صورتحال فتح مکہ تک قائم رہی اس کے بعد جب ہجرت کی فرضیت ختم ہوگئی تو وراثت کا مدار نسب اور قرابت ہوگیا۔

بہرحال یہاں بھی ولایت کے معنے وراثت کے ہیں جو قرابت کی وجہ سے ملتی ہے اس آیت کے ذریعے ان مسلمانوں کو جنھوں نے ہجرت نہیں کی اس عقد موالات سے خارج کیا ہے جو مہاجرین و انصار کے مابین ہوا تھا۔

صحیح بخاری میں امام بخاری نے لکل جعلنا موالی پر عبداللہ بن عباس کا یہ بیان نقل کیا ہے۔

مہاجرین جب مدینہ میں آئے تو مہاجر کو انصاری کی میراث ملتی تھی بغیر کسی نسبی رشتہ کے۔ صرف اس مواخات کی وجہ سے جو رسول اللہ ﷺ نے مہاجرین و انصار کے مابین کرائی تھی جب قرآن کی یہ آیت والذین عقدت ایمانکم نازل ہوئی تو یہ مواخات کی بنا پر توارث ختم ہوگیا۔

یہاں حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ تعالیٰ کی یہ وضاحت بھی قابل مطالعہ ہے۔

ابتدائے اسلام میں جب تک کہ اکثر مسلمانوں کے رشتے دار مسلمان نہ ہوتے تھے اور اس وجہ سے رسول اللہ نے باہم انصار و مہاجرین میں مواخات جس کا اثر عقد موالات جیسا تھا منعقد فرمایا۔ اس وقت رسم قدیم کے موافق حکم رہا کہ انصار و مہاجرین کے درمیان میراث جاری رہی۔ پھر جب لوگ کثرت سے مسلمان ہوگئے تو اس میں اول وہ ترمیم ہوئی جو اس آیت میں مذکور ہے یعنی چھٹا حصہ مولی الموالات کو اور باقی دوسرے ورثہ کو ملتا بعد چندے سورہ احزاب کی آیت واولوالارحام سے ——— بالکل ہی اس مولی الموالات کا حصہ منسوخ ہوگیا۔

وکر الجصاص نے احکام القرآن میں والذین عقدت ایمانکم پر نوٹ لکھا ہے۔

سنت میں حضور اقدس ﷺ کے ایسے ارشادات موجود ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ عقد موالات کرنے والوں کے لیے وراثت ہے۔ ابوداؤد میں تمیم داری کے حوالہ سے ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں نے دریافت کیا یارسول اللہ ﷺ اس شخص کے بارے میں طریق کار کیا ہے جو کسی مسلمان کے ہاتھ پر اسلام قبول کرے۔ آپ نے فرمایا کہ جس کے ہاتھ پر کوئی نومسلم اسلام لاتا ہے وہ اس نومسلم کی زندگی اور موت میں اس کا سب سے زیادہ قریبی ہے۔ موت میں قریبی ہونے کا اس کے سوا

کیا مشابہ ہے کہ وہ اس کی میراث کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔ یہی رائے ہے حضرت عمر حضرت عبداللہ ابن مسعود حسن بصری، ابراہیم نخعی کی بلکہ امام زہری سے دریافت کیا گیا کہ نو مسلم اگر عقد ولایت کرے تو اس کا کیا حکم ہے فرمایا کوئی مضائقہ نہیں۔ سعید بن المسیب کا فتوی یہ ہے کہ اگر کوئی نو مسلم کسی قوم کے ہاتھ پر مشرف باسلام ہو تو ان کے لیے اس کی میراث جائز ہے۔ ربیعہ ابن عبدالرحمن کا فیصلہ یہ ہے کہ دارالحرب ہو یا دارالاسلام اگر کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کے ہاتھ پر مسلمان ہو تو اس کی میراث اس کو ملے گی جس کے ہاتھ پر مسلمان ہوا ہے [1]

حافظ عسقلانی نے تمیم داری کی حدیث پر لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے اصحاب کا یہی مذہب ہے مگر ان کی شرط یہ ہے کہ دونوں کے درمیان عقد موالات ہوا ہو۔ اور محدثین میں سے یہی مذہب مشہور محدث اسحاق بن راہویہ کا ہے بلکہ حافظ ابن القیم نے تہذیب السنن میں تصریح کی ہے کہ اسحاق کے ساتھ تمیم کی روایت پر عمل کرنے والوں میں امام احمد طاؤس ربیعہ اور لیث بن سعد بھی ہیں اور یہی حضرت عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ اور عمر بن عبدالعزیز کا فیصلہ ہے۔

بہرحال زیر نظر آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو لوگ مسلمان تو ہیں لیکن انھوں نے وقت کے اہم فرض ہجرت کا تقاضا پورا نہیں کیا وہ مسلمان ہونے کے باوجود اس عقد موافات میں شامل نہیں ہیں۔

اس صاف اور بدیہی تشریح کے باوجود جو آپ پڑھ چکے ہیں خبر نہیں۔ مولانا مودودی نے اس آیت کی تشریح میں یہ بات کیسے لکھ دی ہے۔

> اسی عدم ولایت کے بنا پر دارالکفر اور دارالاسلام میں مسلمان باشندے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہو سکتے۔ ایک دوسرے کے قانونی ولی نہیں بن سکتے۔ اور باہم شادی بیاہ نہیں کر سکتے۔

مولانا کا یہ فتوی مذہب امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور جملہ مذاہب اربعہ کے خلاف ہے۔ اور والذین امنوا ولم یھاجروا مالکم من ولایتھم من شیئ کا یہ ہرگز مطلب نہیں ہے اس میں ولایت کو اگر بمعنی وراثت لیا جائے تو یہ حکم اس وقت کا ہے جبکہ ابتدائے قدوم مدینہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مہاجرین و انصار کے درمیان موافات قائم کی تھی جس کی بنا پر مہاجرین انصار کے اور انصار مہاجرین کے وارث ہوتے تھے جس کی دلیل قرآن میں اس سے پہلی آیت بعضھم اولیاء بعض ہے پھر جب مہاجرین و انصار کا باہمی توارث سورہ نساء نازل ہونے کے بعد ولکل جعلنا موالی مما ترک الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم

[1] احکام القرآن للجصاص

سے اور سورہ احزاب کی آیت واو لوالارحام بعضھم اولی ببعض سے اور سورہ انفال کی آیت او لوالارحام بعضھم اولی ببعض سے یہ حکم ختم ہو گیا کہ مسلم مہاجر مسلم غیر مہاجر کا وارث نہیں ہو سکتا۔ بلکہ سورۃ نساء کی آیت الوارث کے مطابق ہو گا —— مولانا کے خیال کے مطابق پاکستان کا مسلمان دنیا بھر میں کسی مسلمان باشندہ سے ازدواجی وراثتی اور معاملاتی تعلق پیدا نہیں کر سکتا ہے۔ ایک ہندوستانی مسلمان مرد سے ایک پاکستانی عورت کی شادی نہیں ہو سکتی ایک پاکستانی لڑکی کسی ہندوستانی مرد سے شادی کی مجاز نہیں۔ پاکستانی مسلمان بیٹے کا ہندوستانی مسلمان باپ کی جائداد میں کوئی حصہ نہیں ہے۔ یہ اور اس قسم کے بہت سے مسائل ہیں جو مولانا موصوف کی ذہنی اپج کے مطابق بالکل ناجائز و حرام ہیں حالانکہ نہ یہ قرآن کی ان آیات کا منطوق ہیں نہ مدلول ہیں اور نہ مفہوم اور روں کا پتہ نہیں گر میں ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ اس علمی زلتہ کا بنیادی سبب ولایت کا وہ تصور ہے جو ان کا خود تراشیدہ ہے وہ فرماتے ہیں۔

ولایت سے مراد وہ رشتہ ہے جو ایک ریاست کا اپنے شہریوں سے ہوتا ہے اور شہریوں کا اپنی ریاست سے ہوتا ہے۔

اس کا نتیجہ انھوں نے یہ نکالا ہے کہ:

یہ آیت دستوری و سیاسی ولایت کو ریاست کے ارضی حدود تک محدود کر دیتی ہے اور ان حدود کے باہر کے مسلمانوں کو اس مخصوص رشتہ سے خارج کر دیتی ہے۔

ولایت کا یہ بنیادی تصور ہی ان کی فکری جولانیوں کے لیے بس کی گانٹھ اور ریڑھ کی ہڈی ہے۔ ولایت سے مراد ایک ریاست کا شہری ہے اور شہریوں کا ریاست سے رشتہ نہیں بلکہ ایک مسلمان کا دوسرے مسلمان سے رشتہ ہے اس رشتہ کی اُس وقت کے حالات میں اصل بنیاد ہجرت ہے۔ ہجرت سیاسی زبان کی اصطلاح نہیں۔ بلکہ قرآنی اصطلاح ہے اور یہ اُس وقت کے حالات میں فرض ہے۔ قرآن نے اسی کو اساس بنا کر مواخات کا دائرہ قائم کیا ہے جیسا کہ بعضھم اولیاء بعض سے معلوم ہو رہا ہے۔

بہرحال مولانا مودودی کی تشریح نہ صرف یہ کہ عام شارحین قرآن کی تشریح کے خلاف ہے بلکہ مذاہب اربعہ سے بھی متصادم ہے۔

آیت کی تشریح پر دوبارہ نظر

ولایت کے دوسرے معنے بھی ہیں۔ امداد، اعانت، حمایت، نصرت، قاضی بیضاوی نے اس کو اس طرح سمجھایا ہے او بالنصرۃ والمظاہرۃ یعنی ولایت توارث کی ہوتی ہے یا نصرت اور مدد کی ہے اور علامہ آلوسی رقم طراز ہیں۔

الولایۃ بالنصرۃ۔ الجصاص نے لکھا ہے دوسرے معنے نصرت اور حمایت کے ہیں۔ اس صورت میں پہلی آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ اسلامی معاشرے میں خاندانی نسب کی عصبیت کو چھوڑ کر اعتبار صرف ایمان واسلام اور ہجرت اور جہاد کا ہوگا یہ ایک دوسرے کے ولی یعنی حامی وناصر ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ حمایت ونصرت اہل کفر کے مقابلہ میں ہے یہ بات اگرچہ خبر کے انداز میں کہی گئی ہے لیکن اس میں انشائی معنی مقصود ہیں۔ یعنی حکم یہ ہے کہ اہل کفر کے مقابلے میں اہل ایمان ایک دوسرے کے حامی و مددگار بن کر کھڑے ہوں اور جب ضرورت پیش آئے تو ایک دوسرے کی مدافعت کریں ——— اور دوسری آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن مسلمانوں نے ہجرت نہیں کی ہے دارالاسلام والوں پر ان کی حمایت نصرت اور حفاظت ومدافعت کی ذمہ داری نہیں ہے اس ذمہ داری کے نہ ہونے کی وجہ یہی ہے کہ عملاً ایسا کرنا ممکن نہیں ہے اور اس سے بہت سی بین الملکی الجھنیں پیدا ہونے کا اندیشہ ہے۔ اور پھر اس وقت حکم یہی تھا کہ تمام لوگ جو مسلمان ہو چکے ہیں دارالکفر کے علاقے سے نکل کر مدینہ میں مجتمع ہوں تاکہ اہل کفر سے نمٹنے اور بیت اللہ کی آزادی کے لیے منظم جدوجہد عمل میں آسکے اس کے بعد بتایا ہے کہ اگرچہ دارالاسلام والوں پر ان مسلمانوں کی حمایت ومدافعت کی ذمہ داری نہیں ہے۔ جنھوں نے دارالکفر سے ہجرت نہیں کی ہے: تاہم اگر وہ دین کے معاملہ میں مدد کے طالب ہوں تو ان کو ممکن مدد بہم پہنچائی جائے بشرطیکہ یہ مدد کسی ایسی قوم کے خلاف نہ ہو جس سے تمہارا معاہدہ ہو معاہدہ کا احترام مقدم ہے اگر تم کسی سے صلح کا عہد وپیمان کر چکے ہو تو تمہارے لیے جائز نہیں کہ مسلمانوں کی مدد کے لیے عہد شکنی کرو۔ نتیجہ خواہ کچھ نکلے لیکن اپنے قول وقرار پر قائم رہنا چاہیے۔ یہ اشارہ اس طرف تھا کہ مدینہ آکر حضور اقدس نے مدینہ اور اطراف مدینہ کی مختلف جماعتوں سے باہمی صلح وسازگاری کا معاہدہ کر لیا تھا جو معاہدہ صحیفہ کے نام سے مشہور تھا صحیفے کے اکثر فریق عہد شکنی کر چکے تھے۔ لیکن ابھی تک مسلمانوں کی طرف سے انفساخ کا اعلان نہیں ہوا تھا اس سے اندازہ کرو کہ قرآن نے وفائے عہد کا اگرچہ مخالفوں کے ساتھ ہو اور اگرچہ اس کی وجہ سے اپنوں کی مدد نہ کی جا سکے کس درجہ لحاظ رکھا ہے۔

شارحین قرآن نے ان آیات کی یہی تشریحات پیش فرمائی ہیں شارحین قرآن کی اکثریت پہلی تشریح پیش کرتی ہے شارحین قرآن میں امام رازی کو دوسری تشریح پر بہت اصرار ہے۔ انھوں نے لفظ ولایت کی وراثت والی تشریح پر بہت لے دے کی ہے چنانچہ وہ فرماتے ہیں

لفظ ولایت میں وراثت کے معنی میں قطعی نہیں کیونکہ اس لفظ کے لغوی معنے صرف قریب ہونے کے ہیں۔ السلطان ولی من لا ولی لہ قریب ہی کے معنے میں بولا جاتا ہے اور اس کا وراثت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ قرآن میں الا ان اولیاء اللہ لاخوف علیھم میں ولایت کے معنے وراثت نہیں ہیں بلکہ قرب کے ہیں اس لیے آیت میں ولایت کے معنے نصرت اور معاونت کے ہیں اور مقصد یہ ہے کہ

دشمن کے مقابلے میں ہم آہنگ رہو اور ہر ایک دوسرے سے ایسا لگاؤ رکھے جیسے اپنے سے رکھتا ہے
اور جب لفظ ولایت میں معاونت و نصرت کے معنے موجود ہیں تو وراثت کے معنے میں لینے کی ضرورت نہیں ہے۔

لیکن امام رازی کے اس شبہ کا علامہ خفاجی نے عنایۃ القاضی میں۔ ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں اور متاخرین میں سے علامہ جمال الدین القاسمی نے محاسن التاویل میں مسکت جوابات دیئے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ ولایت کے اصل معنے قرب کے ہیں اور ولی اقرب ہی کو کہتے ہیں۔ اسی قرب کے معنے کی وجہ سے اس کے معنے نصرت اور وراثت کے ہیں۔ نصرت بھی قرب کی وجہ سے ہوتی ہے اور وراثت بھی قرب ہی کی وجہ سے ملتی ہے۔ اور جیسا کہ علامہ خفاجی نے لکھا ہے کہ اس سببیت کا علاقہ ہے یعنی قرابت سبب ہے وراثت کا۔ ٹھیک اسی طرح جیسے قرابت ایمانی سبب ہے نصرت و معاونت کا۔ دونوں جگہ قرینے کی وجہ سے معنے مجازی ہیں۔ علامہ خفاجی نے امام رازی کے جواب میں یہ بات لکھی ہے۔

فالولایۃ علی ھذا الوراثۃ المسببۃ من القرابۃ

اور بالکل بجا لکھا ہے۔ اور اسی معنے کی رعایت سے السلطان ولی من لا ولی لہ میں بھی معنے وراثت کے ہیں اور مطلب یہی ہے کہ جس کا کوئی وارث نہ ہو تو اس کا ترکہ بیت المال میں داخل کیا جائے تو یہ وراثت ہی ہوئی اور نکاح میں جو ولی ہوتا ہے وہ بھی وہی ہوتا ہے جو حقدار وراثت ہوتا ہے حدیث لا نکاح الا بولی کا مطلب یہی ہے۔ کہ نکاح میں ولایت اسی کا حق ہے جو لڑکی سے قرابت کی بنا پر وراثت کا حقدار ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے۔

مثبت للولایۃ لجمیع من کان من اھل المیراث علی حسب القرب وتاکید السبب

اور قرآن میں من قتل مظلوما فقد جعلنا لولیہ سلطانا۔ کے معنے بھی یہی ہیں یعنی جو شخص ظلم سے مارا جائے تو ہم نے اس کے وارث کو قصاص کا حق دے دیا ہے۔ اور ما کانوا اولیاءہ ان اولیاءہ الا المتقون کے معنے یہی ہیں کہ مشرکین مکہ حرم کے متولی نہیں۔ اس کے متولی تو صرف متقی ہو سکتے ہیں یعنی وہ ارباب تقویٰ جن کو ابراہیم سے قرب ہو وہی اس کے وارث ہو سکتے ہیں۔ بہرحال علاقہ سببیت کی وجہ سے ولایت کے معنے وراثت کیے گئے ہیں۔

آیئے اب ان آیات کا ایک اجمالی نظر سے بھی مطالعہ کر لیجئے۔ یہ آیات بتا رہی ہیں کہ:

۱۔ ہر وہ مسلمان جو دار الکفر میں ہے اسے ہجرت کر کے مدینے آجانا چاہیے اور دار الکفر میں قیام پذیر نہ ہونا چاہیئے
۲۔ جو دار الکفر سے ہجرت کر کے مدینے نہ آئیں گے وہ رشتہ مولفات میں داخل نہ ہوں گے۔ اموال غنیمت اور فیئ

ہیں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا امام احمد رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس موضوع پر حضرت بریدہ اسلمی رضی اللہ عنہ کے حوالے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں یہ انکشاف کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب کسی فوجی دستہ یا کسی لشکر پر امیر بنا کر روانہ فرماتے تو امیر کو یہ وصیت فرماتے کہ اپنی ذاتی زندگی میں اللہ کی نافرمانی سے بچ کر رہنا۔ اور ساتھیوں کی خیر خواہی کو ملحوظ رکھنا۔ اللہ کا نام لے کر اللہ کے راہ میں جہاد کرنا۔ جب دشمن کا آمنا سامنا ہو تو اس کے سامنے تین باتیں پیش کرنا جس بات کو بھی وہ اپنا لیں اسے مان لینا اور ان سے جنگ نہ کرنا۔

پہلی بات یہ کہ ان کو اسلام کی دعوت دینا اگر وہ مان لیں تو قبول کر لینا۔

دوسری بات یہ کہ مسلمان ہونے کے بعد ان کو ہجرت کی ہدایت کرنا اور ان کو بتا دینا کہ اگر وہ ہجرت کریں گے تو ان کے سارے شہری حقوق مہاجرین جیسے ہوں گے۔ اگر وہ ہجرت نہ کریں تو ان پر واضح کر دینا کہ وہ مسلمان بادیہ نشین ہوں گے۔ قانون الٰہی ان پر مسلمانوں کی طرح نافذ ہوگا لیکن فیئی اور مال غنیمت میں ان کا کوئی حصہ نہ ہوگا۔ الا یہ کہ وہ مسلمانوں کے ساتھ جہاد میں شرکت کریں۔

تیسری بات یہ کہ اگر وہ اسلام قبول نہ کریں تو ان کو اسلامی حکومت کا شہری بن کر جزیہ کی ادائیگی کے ساتھ رہنے کی دعوت دینا۔

اگر ان سب باتوں کا وہ انکار کر دیں تو اللہ سے مدد مانگنا اور ان سے جہاد کرنا ——— یہ حدیث مسلم میں بھی ہے۔

۲۔ ایمان کے بعد ہجرت اور جہاد وہ دو عملی نشانیاں یا ایمان کی وہ کسوٹی ہیں جن کے ذریعے ایک مومن کے ایمان کا امتحان ہوتا ہے۔ اور یہی اس دور میں اسلامی قومیت کی اساس ہیں۔

اہلِ کفر باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں

۹۲ اور جنھوں نے راہ کفر اختیار کی وہ باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں اگر تم ایسا نہ کرو گے تو ملک میں فتنہ اور ایک بہت بڑی شورش بپا ہو جائے گی۔ یعنی کافر و مومن میں نہ حقیقی رفاقت ہے نہ ایک دوسرے کا وارث ہو سکتا ہے۔ ہاں کافر کافر کا رفیق و وارث ہے۔ بلکہ سب کفار تم سے دشمنی کرنے کو آپس میں ایک ہیں جہاں پائیں گے ضعیف مسلمانوں کو ستائیں گے۔ اس کے بالمقابل اگر مسلمان ایک دوسرے کے رفیق و مددگار نہ ہوں گے۔ یا کمزور مسلمان اپنے کو آزاد مسلمانوں کی معیت و رفاقت میں لانے کی کوشش نہ کریں گے تو سخت خرابی اور فتنہ بپا ہو جائے گا یعنی کمزور مسلمان مامون نہ رہ سکیں گے۔ ان کا ایمان تک خطرہ میں ہوگا۔ افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں بھی شارحینِ قرآن نے ولایت کے دونوں معنے نصرت اور وراثت کو پیشِ نظر رکھ کر تشریح کی ہے۔ شیخ الاسلام نے دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرنے کی کوشش فرمائی ہے۔ لیکن دوسرے شارحین نے اپنے اپنے مزاج کے مطابق الگ الگ تشریح کی ہے۔ جو ولایت کے مجازی معنے نصرت کے لیتے ہیں انھوں نے لکھا ہے کہ جہاں تک اسلام اور مسلمانوں کا تعلق ہے اس کی عداوت میں سارے کفار باہم دست بازو بن گئے ہیں۔ جو اللہ کا بندہ اسلام قبول کر لیتا ہے اس کی تعذیب و ایذارسانی سب کے نزدیک کارِ ثواب ہے۔ یہاں تک کہ ظالموں کے ظلم سے اس کو بچانے کے لیے اس کے اپنے بھائی بندوں کی محبت بھی مردہ ہو چکی ہے۔ اس کی جان اور اس کا مال سب مباح ہیں ایسی حالت میں اگر مسلمان بھی ان مظلوموں کی مدد نہ کریں گے تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دین سے پھیرنے کے لیے سارے ملک میں ظلم و فساد عام ہو جائے گا۔ گو تعبیر تو خبر کے انداز میں صرف بتا رہی ہے کہ کفر خواہ کسی لباس میں ہو باہم ایک دوسرے کے رفیق ہیں مگر اس کے مدلول میں یہ انشائی معنے بھی ہیں کہ مسلمانوں کو ان سے موالات کرنے سے روکا جا رہا ہے اور کہا جا رہا ہے کہ چاہے تمہارے رشتہ دار ہی کیوں نہ ہوں تمہیں ان سے موالات نہیں کرنی چاہیے تمہاری موالات صرف اہلِ ایمان سے ہونی چاہیے۔

امام رازی نے اس تشریح کی بنیاد پر فتنہ و فساد کی اس طرح وضاحت فرمائی ہے کہ۔

۱۔ مسلمانوں کی کمزوری کے وقت میں اگر مسلمان کافروں سے ملیں گے جبکہ مسلمانوں کی عددی طاقت کم ہے۔ اور کافروں کی عددی طاقت زیادہ ہے تو یہ میلاپ اختلاط اور موالات ذریعہ بن جائے گا مسلمان کے کافروں سے مل جانے کا۔

۲۔ اگر مسلمانوں میں یک جہتی اور اتحاد نہ ہوگا تو ان کی جماعتی زندگی کا مظاہرہ نہ ہو سکے گا اور یہ کافروں میں جرأت کا سبب بن جائے گی۔

۳۔ جب ہر روز مسلمانوں کی عددی اور مادی طاقت میں اضافہ ہوگا تو یہ کفر میں اسلام کی رغبت کا ذریعہ ہوگا۔

بہرحال یہ تشریح ان شارحینِ قرآن کی ترجمانی کر رہی ہے جو آیت میں ولایت کے مجازی معنے نصرت لیتے ہیں۔ لیکن جن شارحینِ قرآن نے ولایت کے معنے مجازی وراثت لیے ہیں وہ اس آیت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں۔

اس آیت میں وجہ بیان کی گئی ہے اس بات کی کہ مسلمان مسلمان کا وارث کیوں ہوتا ہے فرمایا کیوں کہ باہمی توارث سے سب ایک ہی جماعت سمجھی جائے گی اور ایک مستقل اور علیحدہ جماعت ہوئے بغیر اسلام کو قوت و شوکت حاصل نہ ہوگی۔ اگر تم نے اس حکم عدم توارث پر عمل نہیں کیا اور باوجود دینی مخالفت کے محض قرابت کی بنا

پر کافر و مومن میں علاقہ توارث قائم رکھا تو اسلامی شوکت ختم ہوجائے گی۔ اس تشریح کی وجہ سے علماء نے یہ بات سمجھی ہے کہ کافر کافر کا وارث ہوتا ہے اور مسلمان مسلمان کا وارث ہوتا ہے لیکن کافر مسلمان اور مسلمان کافر کا وارث نہیں ہو سکتا ہے۔ اختلاف دین میراث سے محرومی کا سبب ہے۔ پھر جب کافر کی وراثت کافر کو ملتی ہے تو کافر کو اپنی اولاد کے سارے معاملات میں ولایت بھی حاصل ہے۔ وہ اپنے اموال میں تصرفات بھی کر سکتا ہے یعنی اس آیت کی رو سے غیر مسلم اگر اسلامی مملکت کا شہری ہو تو اسلام اسکے بنیادی حقوق اور اس کی آزادیاں برقرار رکھتا ہے۔ یہ بات غیر مسلموں کے لیے بعضھم اولیاء بعض سے اسی طرح معلوم ہو رہی ہے جیسے خود مسلمانوں کے لیے بعضھم اولیاء بعض سے معلوم ہو رہی ہے الجصاص رقمطراز ہیں۔

اس آیت میں اس بات کی صاف رہنمائی ہے کہ کافروں کو اپنی خورد سال اولاد پر نکاح مالی تصرفات کی پوری آزادی حاصل ہے۔ اس کے لیے عدالت کی کوئی پابندی نہیں ہے۔

یہ بات کہ کافر مسلمان کا یا مسلمان کافر کا وارث نہیں ہوتا۔ صرف اس آیت کے اشارے ہی سے معلوم نہیں ہو رہی ہے بلکہ اس سے خود جناب رسول اللہ ﷺ نے بھی یہی بات سمجھی ہے اجمالی طور پر صحیحین میں اور تفصیلاً مستدرک حاکم میں حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ کے حوالے سے جناب رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد آیا ہے۔

دو ملت والے ایک دوسرے کے وارث نہیں ہوتے مسلمان کافر کا اور کافر مسلمان کا وارث نہیں ہوتا۔

پھر آپ نے یہی آیت گرامی والذین کفروا بعضھم اولیاء بعض تلاوت فرمائی۔

اور یہ بھی اسی آیت سے مدلولاً معلوم کہ اختلاف دینین کی طرح اختلاف دارین بھی میراث سے مانع ہے۔ صرف میراث ہی سے نہیں بلکہ نکاح اور دوسرے معاملات سے بھی مانع ہے۔ اختلاف دین تو یہی ہے کہ مسلمان مرد ہے اور عورت کافر ہے یا اس کا عکس تو اس صورت میں نکاح درست نہیں ہے کہ یہ اختلاف دین ہے۔ اختلاف دارین کی بنا پر ایسے دو کافر بلاشبہ میراث سے محروم ہوں گے کہ ایک اسلامی مملکت کا شہری ہو اور دوسرا غیر اسلامی مملکت کا حربی ہو ان دونوں میں نہ وراثت ہے اور نہ نکاح۔ لیکن اگر دونوں مسلمان ہوں ایک دار حرب میں مقیم ہو۔ بیوی دار اسلام کی شہری ہو تو ان کا حکم یہ نہیں ہے دونوں ایک دوسرے کے وارث بھی ہوں گے اور نکاح بھی ہو سکتا ہے۔

الجصاص رقم طراز ہیں:

اختلاف دارین کا مطلب یہ ہے کہ ایک دار الاسلام کا باشندہ ہو خواہ مسلمان ہو یا شہریت لے کر ہو اور دوسرا حربی کافر ہو دار الحرب کا باشندہ ہو۔ لیکن اگر دونوں مسلمان ہوں تو ان کا حکم ایک ہی مملکت کا ہوگا اگرچہ ان میں سے ایک دار الحرب میں مقیم ہو اور دوسرا دار الاسلام میں ہو۔ (احکام القرآن)

ہجرت صداقت کی کسوٹی ہے

۹۴ اور وہ لوگ جو ایمان لائے اور انھوں نے ہجرت کی۔ راہ خدا میں جہاد کا فرض ادا کیا۔ یہی پکے اور سچے مسلمان ہیں۔ ان کے لیے عزت و آبرو والی روزی ہے یعنی دنیا میں بھی اور آخرت میں سردار کے ساتھ والے مسلمان اعلیٰ ہیں گھر بیٹھنے والوں سے۔ آخرت میں ان کے لیے بڑی بھاری بخشش ہے اور دنیا میں عزت کی روزی یعنی غنیمت اور دوسرے مالی حقوق[1]

اس آیت میں ہجرت کو مسلمانوں کے لیے صداقت کی کسوٹی قرار دیا ہے فرمایا کہ سچے اور پکے مسلمان وہی ہیں جنھوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اور جنھوں نے مہاجرین کو پناہ دی اور ان کی مدد کی۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ:

۱۔ مسلمان کے دعویٰ اعمال کی صداقت کی سب سے بڑی پہچان ایمان اور جہاد ہیں۔ کیونکہ ہجرت نام ہے اعلیٰ مقاصد کی راہ میں کمتر فوائد کو قربان کر دینے اور حصول مقصد میں جو چیز حائل ہو ان کو چھوڑ دینے کا۔ خواہ آرام و راحت ہو، مال و دولت ہو، نفسانی خواہشات ہوں حتیٰ کہ قوم ہو ملک ہو وطن ہو، اہل و عیال ہوں سب کو چھوڑ دینا۔ آج بھی علم و عمل کا کوئی گوشہ نہیں جس میں کامیابی بغیر اس کے مل سکے۔ انسان کی مطلوبات میں سے کوئی چھوٹی سے چھوٹی چیز ایسی نہیں جو ہجرت کے بغیر حاصل ہو سکے۔ یہ دنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں۔ حیرت انگیز انکشافات انقلاب انگیز ایجادات، دولت کی فراوانی۔ تجارت کی عالمگیری، نئی نئی آبادیوں کا قیام۔ قسم قسم کے وسائل معیشت کا ظہور۔ ملکوں کا عروج۔ قوموں کی بالادستی تمدن کی وسعت صرف انسان کے عمل ہجرت کے نتائج و ثمرات ہیں۔

جہاد کے معنے یہ ہیں کہ مقصود تک پہنچنے والی رکاوٹوں کو راستے سے ہٹانا مال لگا کر جان کھپا کر۔ دنیا میں کوئی قوم کوئی ملک کوئی جماعت کوئی قبیلہ کوئی خاندان کوئی گھر کوئی شخص بغیر جہاد زندگی کی بہار نہیں پا سکتا۔

ہدایت کا یہ حق ہے کہ وہ اپنی زندگی کا ثبوت دے اور راستہ سے ضلالت کو ہٹائے۔ یہی دونوں ایمان کی صداقت کی کسوٹی ہیں۔ اور صحابہ کی پوری جماعت میں یہ دونوں چیزیں ایمان کے بعد اسی طرح عام تھیں جس طرح ہم میں روٹی کپڑا مکان کے لیے یہ دونوں عام ہیں۔

۲۔ یہ بھی یہ آیت بتا رہی ہے کہ تاریخی سرمائے میں اسلام کا اصلی سرمایہ مہاجرین و انصار ہیں۔ یہ دونوں حضور اقدس ﷺ کے اعجاز عمل کا شاہکار ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے اپنی نبوت کی صداقت کے لیے دو معجزے بطور دلیل نبوت پیش کیے ہیں ایک علمی دوسرا عملی، علمی معجزہ قرآن کی صورت میں اور عملی معجزہ مہاجرین و انصار کی صورت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں یہے قرآن نے دونوں کا چہرہ دلیل کے طور پر پیش کیا ہے۔

السابقون الاولون من المهاجرین والانصار والذین اتبعوهم باحسان رضی الله عنهم و رضوا عنه۔

مہاجرین وانصار میں جو لوگ سبقت کرنے والے سب سے پہلے ایمان لانے والے ہیں اور وہ لوگ جنھوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔

مہاجرین ہیں السابقون الاولون۔ انصار ہیں السابقون الاولون اور پھر وہ لوگ جو ان دونوں جماعتوں کے قدم بقدم چلے اور بعد میں آئے سورہ حشر میں بھی مہاجرین وانصار کا یہی چہرہ پیش فرما کر ان کے بعد آنے والوں کا اس طرح ذکر کیا ہے۔

والذین یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان ولا تجعل فی قلوبنا غلاً للذین آمنوا۔

اور وہ لوگ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب بخشش فرما ہماری اور ہمارے ان بھائیوں کی جو ہم سے پہلے ایمان لا چکے ہیں۔ اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کھوٹ نہ بنا۔

اس لحاظ سے یہ آیت سب سے بڑی شہادت اور سب سے بڑا سارٹیفکیٹ ہے مہاجرین وانصار کے ایمان، ان کی قربانیوں، ان کی جان سپاریوں اور اللہ کی راہ میں بے حد و بے حساب جان نوازیوں کا۔ اولئك هم المومنون حقا میں اگر حصر ہے اور یہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ مسند اور مسند الیہ کے درمیان ضمیر فصل آ رہی ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ ان مہاجرین وانصار میں صفت ایمان کے سوا کچھ نہیں نہ کفر ہے اور نہ نفاق۔ نہ دل کا کھوٹ ہے اور نہ عمل کی خرابی ہے۔

اسلامی بھائی چارے کی بنا پر میراث نہیں

اور وہ لوگ جو اس کے بعد نعمت ایمان سے مالامال ہوئے اور انھوں نے ہجرت کی اور تمہاری ہمرکابی میں جہاد کیا وہ بھی تم ہی میں سے ہیں۔ اور رشتہ دار اللہ کی کتاب میں باہم زیادہ حقدار ہیں بلاشبہ اللہ کو سب باتوں کا پورا پورا علم ہے۔ یعنی مہاجرین میں جتنے بعد میں شامل ہوتے جائیں وہ سب باعتبار احکام مہاجرین اولین کی برادری میں شامل ہیں۔ ہجرت کے تقدم و تاخر کی وجہ سے صلح و جنگ یا وراثت وغیرہ کے احکام پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ ہاں اگر قدیم مہاجرین کا کوئی رشتہ دار پیچھے مسلمان ہوا یا بعد میں ہجرت کر کے آیا تو وہ قدیم مہاجر کی میراث کا زیادہ حقدار ہے اگرچہ رفاقت قدیم اوروں سے ہے۔ وہی جانتا ہے کہ کس کا کس قدر حق ہونا چاہیے۔ لہذا اس کے احکام سراسر علم و حکمت پر مبنی ہیں [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں سب سے پہلے ان مسلمانوں کو جنھوں نے اب تک ہجرت نہیں کی ہجرت کی ترغیب دی ہے اور بتایا ہے کہ تمہارے لیے بھی اسلامی معاشرہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اس کی طرف سبقت کرو اور اس میں اپنا مقام حاصل کرو۔ اور دارالاسلام کے مسلمانوں کو تاکید کی ہے کہ بعد میں ایمان لانے والوں اور ہجرت کرنے والوں کے لیے اپنے دلوں کے دروازے کھلے رکھو کہ وہ بھی تمہارے ہی دینی بھائی ہیں اور تمہارے ہی وجود ملی کے اجزا ہیں۔ نہ ان کے مقابل میں تمہارے اندر کوئی احساس برتری ہو۔ نہ دلوں میں کوئی تنگی۔

آخر میں فرمایا۔ واو لوالارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ۔ مطلب یہ ہے کہ مواخات اور عقد موالات کی بنا پر میراث قائم نہ ہوگی اور نہ وہ حقوق جو نسب اور مصاہرت کی بنیاد پر ملتے ہیں۔ مواخات کی وجہ سے ملیں گے۔ ان امور میں موالات اور مواخات دینی کی جگہ رشتہ داری کا تعلق بھی قانونی حقوق کی بنیاد رہے گا۔ یہ بات اس لیے ارشاد ہوئی ہے کہ ہجرت کے بعد نبی کریم ﷺ نے مہاجرین وانصار کے درمیان جو مواخات قائم کی تھی اس کی وجہ سے اب تک میراث کی بنیاد بھی موالات تھی۔ اب وہ ختم کر دی گئی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ عہد اول کے مہاجرین وانصار میں اسلامی اخوت کا ایسا ولولہ پیدا ہو گیا کہ خون کے عزیزوں سے کہیں زیادہ رشتہ ایمان کے ان عزیزوں کو اپنا سمجھنے لگے تھے حتی کہ اگر ایک مر جاتا تو رشتہ مواخات کا بھائی اس کا وارث سمجھا جاتا۔ انھوں نے اسلام کے رشتہ کو اختیار کر کے سارے رشتے قرابت کے خاندان کے قوم کے وطن کے زبان کے اور پیشوں کے سارے رشتے بھلا دیئے تھے صرف ایک ہی رشتہ کی لگن باقی رہ گئی تھی، ایمان واسلام اس لئے بیان فرمایا ہے کہ اولوالارحام بعضھم اولی ببعض فی کتاب اللہ جو قرابت دار ہیں وہ اللہ سبحانہ کے ٹھہرائے ہوئے قرابت دار ہیں اور صلہ رحمی کا رشتہ کسی حال میں نظر انداز نہیں کیا جا سکتا ہے بس وراثت کے اصل حقدار وہی ہیں۔ اب میراث کی تقسیم قرابت کی بنیاد پر ہوگی۔ موالات کی بنیاد پر نہ ہوگی۔ مواخات کی بنا پر وراثت کا انتظام عارضی تھا۔ قانون وراثت نازل ہونے کے بعد یہ عارضی انتظام خود بخود ختم ہو گیا۔

اس پر تو اتفاق ہے کہ قانون وراثت نازل ہونے کے مواخات کی بنیاد پر تقسیم وراثت کا عارضی اور وقتی انتظام ختم ہو گیا ہے لیکن اس میں اہل علم کی رائیں مختلف ہیں کہ اس عارضی انتظام کو کب ختم کیا گیا۔

عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے امام بخاری نے یہ بات لکھی ہے کہ مواخات اور عقد موالات کی بنیاد پر وراثت کی تقسیم کو سورہ نساء کی آیت ولکل جعلنا موالی مما ترك الوالدان والاقربون والذین عقدت ایمانکم فاتوھم نصیبھم سے ختم کیا گیا ہے۔ اور طبرانی کی روایت میں عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہ کی جانب یہ بات منسوب کی گئی ہے کہ ایک شخص دوسرے سے عقد موالات کرتا تھا اس کی موت پر اس کا وارث ہوتا تھا سورۂ

احزاب کی اس آیت کے ذریعے واولوالارحام بعضهم اولی ببعض فی کتاب الله من المومنین والمهاجرین الا ان تفعلوا الی اولیائکم معروفا وراثت کی تقسیم کا یہ معاملہ ختم کر دیا گیا ہے۔ ان دونوں باتوں میں کوئی تعارض نہیں ہے یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں میں جوہری فرق ہے ایک مواخات ہے جو حضور اقدس ﷺ نے مدینہ کی ابتدائی زندگی میں مہاجرین کی بیگانگت کو ختم کرنے کے لیے قائم کی تھی۔ دوسرا عرب میں رائج عقد موالات ہے جس کی حقیقت قتادہ نے بیان کی ہے کہ ایک شخص دوسرے سے زمانہ جاہلیت میں معاہدہ کرتا تھا میرا خون تیرا خون تو میرا وارث میں تیرا وارث ہوں۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما بخاری کی روایت میں یہ بتا رہے ہیں کہ مواخات کی بنیاد پر تقسیم وراثت کو سورہ نساء کی آیت نے ختم کیا ہے اور طبرانی کی روایت میں بتا رہے ہیں کہ عرب جاہلیت کے عقد موالات کی بنیاد پر تقسیم وراثت کے معاملہ کو سورہ احزاب کی آیت نے ختم کیا۔

اس سورت میں قرآن کی آیت —— واولوالارحام بعضهم اولی ببعض فی کتاب الله میں اولوالارحام سے مراد اس کے اصطلاحی معنی نہیں بلکہ لغوی معنے ہیں اور کتاب اللہ سے مراد نازل شدہ قرآن نہیں بلکہ لوح محفوظ والا قرآن ہے۔ کیونکہ سورہ انفال سورہ نساء سے پہلے نازل ہوئی ہے اس جملے کے ذریعے مواخات کی بنیاد پر تقسیم میراث کو ختم نہیں کیا گیا ہے بلکہ اس کے ذریعے اہل قرابت کی اہمیت بتا دی گئی ہے کہ کسی بھی امر میں دو انسانوں کا اشتراک ان کے باہمی تعلقات اور حقوق محبت و اعانت کی اصلی گرہ ہے یہ اشتراک کہیں ہم عمری کہیں ہم درسی کہیں ہمسائیگی کہیں ہم مذاقی کہیں ہم پیشگی کہیں ہم وطنی کہیں ہم زمانی کہیں ہم قومی کی مختلف صورتوں میں نمایاں ہوتا ہے۔ اس اشتراک کے عقد محبت کو استوار اور مضبوط رکھنے کے لیے جانبین پر حقوق کی نگہداشت اور فرائض محبت کی ادائیگی واجب ہے۔ لیکن ان تمام بندہ کر ٹوٹ جانے والے اشتراکوں سے بڑھ کر وہ اشتراک ہے جس کا موطن رحم مادر ہے یہ رحمی اللہ سبحانہ کی باندھی ہوئی گرہ ہے جو متفرق انسانی ہستیوں کو خاص اپنے دست قدرت سے باندھ کر ایک کر دیتی ہے۔ اور جس کا توڑنا انسان کی قوت سے باہر ہے اس لیے اس کے حقوق کی نگہداشت بھی انسان پر سب سے زیادہ ضروری ہے۔ یہاں اللہ سبحانہ نے زیر تشریح ایت میں اسی کی طرف اپنے مخاطبوں کو متوجہ کیا ہے کہ ولایت ایمان اور ہجرت اپنی جگہ بڑا ہی مقدس اور پاکیزہ رشتہ ہے اس رشتہ کی بنیاد پر جو تعاون اور امداد ہو وہ بھی اعلیٰ اور اشرف ہے۔ لیکن قرابت اور رحم کا رشتہ اصلی اور اللہ سبحانہ کا قائم کردہ ہے۔ اس کا تقاضا ہے کہ صلہ رحمی ہو۔ والدین کے ساتھ حسن سلوک ہو۔ لہذا دو مومنوں میں قریب رشتہ دار مومن غیر رشتہ دار مومن سے تمہاری نیکیوں، تمہاری ہمدردیوں کا زیادہ حقدار ہے ولایت کی ساری قسموں میں رشتہ دار مومن کو غیر رشتہ دار مومن کے مقابلہ میں ترجیح ہونی چاہیے۔ وراثت ہو یا نکاح سب میں رشتہ داری کو ملحوظ رکھنا چاہیے۔

ایک حدیث میں ہے کہ ایک شخص نے حضور اقدس ﷺ سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ مجھے کوئی ایسی چیز بتا دیجئے کہ مجھے جنت مل جائے فرمایا خدا کی بندگی کرو شرک کرو نماز ادا کرو زکوٰۃ دو اور قرابت کا حق ادا کرو۔[1] ارشاد ہے جس کو یہ پسند ہو کہ اس کی روزی میں وسعت اور اس کی عمر میں برکت ہو تو اس کو چاہیے کہ صلہ رحمی کرے۔[2]

بہرحال یہاں دونوں کے تقابلی مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اہل ایمان میں جب دونوں ولائتیں آمنے سامنے ہو جائیں تو ترجیح قرابت ولایت کو ہوگی بشرطیکہ یہ تقابل اہل ایمان کے درمیان ہو یعنی دونوں مومن ہوں۔ اسی لیے مومن مہاجرین کا ذکر کرنے کے بعد بعضکم اولیاء بعض فرمایا ہے اور یہاں اولیاء نہیں بلکہ اہل قرابت کا عنوان قائم کر کے بعضہم اولی ببعض فرمایا۔ اولیاء ولی کی جمع ہے صفت کا صیغہ ہے جبکہ اولیٰ اسم تفضیل ہے جو دوسروں کے مقابلہ میں زیادتی چاہتا ہے۔ اس لیے ذوی الارحام اہل ایمان کی ولایت کا پہلو عام اہل ایمان کی ولایت پر مقدم ہوگا۔

آیت قرآنی میں اولوالارحام آیا ہے اولو ذو کی جمع ہے اور ارحام رحم کی جمع ہے مطلب ہے رحموں والے یعنی رشتہ دار، علم فرائض میں اولوالارحام یا ذوی الارحام اصطلاحی لفظ ہے وہ لوگ جن کو قرآن نے اصحاب الفروض میں شمار نہ کیا ہو اور نہ وہ عصبہ ہوں۔

ان کی وراثت کے بارے میں علماء کا اختلاف ہے یعنی اگر میت کا کوئی وارث نہ ہو تو کیا وراثت ذوی الارحام کو ملتی ہے۔ صحابہ میں حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، ابوالدرداء رضی اللہ عنہم تابعین میں سے مسروق، محمد بن الحنفیہ، ابراہیم نخعی اور ائمہ میں سے سفیان ثوری اور امام ابوحنیفہ، امام احمد ذوی الارحام کی توریث کے قائل ہیں۔ ان کا موقف یہ ہے کہ ذوی الارحام میں دو چیزیں ہوتی ہیں اسلام اور قرابت، اس لیے اسے اس شخص کے مقابلہ میں وراثت ملنی چاہیے جس میں قرابت نہیں صرف اسلام ہے۔

الحمدللہ سورہ انفال کی تشریحات سے آج مورخہ ۲ ذی الحج ۱۴۰۵ھ بروز جمعرات مطابق ۲۹ اگست ۱۹۸۵ء بوقت ۸ بج کر ۴۵ منٹ صبح فراغت ہوئی۔

ربنا تقبل منی معالم القرآن انک انت السمیع العلیم و تب علی انک انت التواب الرحیم

---

[1] مسلم۔ بخاری کتاب الادب

التوبہ

سورت کا نام

اس سورت کے نام مفسرین قرآن نے ایک سے زیادہ بتائے ہیں۔ التوبہ یہ نام اس لیے ہے کہ اس سورت کے آخر میں تین اہل ایمان کی توبہ قبول ہونے کا ذکر ہے۔ براءۃ اس لیے کہ اس کے آغاز میں مشرکین سے بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے۔ البحوث اس لیے کہ اس میں منافقین کے اسرار کو خوب کریدا گیا ہے۔ الفاضحہ اس لیے کہ اس میں منافقین کی زندگی کو شاہراہ عام پر رکھ دیا گیا ہے۔ ان کے علاوہ بھی اس سورۃ کے متعدد نام دئیے ہیں۔ المنقرۃ، المبعثرہ، المثیرہ، المدمدمۃ، المخزیہ، المنکلہ، المشردہ، المقشقشہ، مشہور نام صرف دو ہیں۔ التوبہ اور البراءۃ۔

سورت کے آغاز میں تسمیہ

قرآن کے دستور میں سورت کے آغاز میں بسم اللہ لکھی جاتی ہے تاکہ دونوں سورتوں میں باہم امتیاز ہو جائے۔ لیکن اس دستور کے خلاف یہاں بسم اللہ نہیں لکھی گئی۔ کیوں؟

اس کی وجہ شارحین قرآن نے ایک سے زیادہ بتائی ہیں مگر ان تمام میں اصل اور بنیادی وجہ وہی ہے جس کی نشاندہی خود عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ایک پوچھنے والے کے جواب میں فرمائی ہے۔

عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کہتے ہیں کہ میں نے حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ سورہ توبہ کے آغاز میں بسم اللہ کیوں نہیں لکھی ہے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جواب میں فرمایا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا قاعدہ یہ تھا کہ آپ پر جب کئی کئی آیتوں والی سورتیں نازل ہوتی تھیں تو آپ وحی لکھنے والوں کو بلا کر فرما دیتے کہ ان آیات کو فلاں سورت میں لگا دو سورۃ انفال ان سورتوں میں سے ہے جو مدینہ میں نازل ہونے والی سورتوں میں سے اوائل میں سے ہے اور سورۂ برات ان

ان سورتوں میں سے ہے جو نزول کے اعتبار سے آخر میں ہے اور دونوں سورتوں میں ہم آہنگی ہے اس لیے میں نے دونوں کو ساتھ ساتھ کر دیا حضور اقدس ﷺ دنیا سے رحلت فرمائے دار بقا ہو گئے لیکن آپ نے کھول کر یہ بات ارشاد نہیں فرمائی کہ یہ سورت انفال سے متعلق ہے اس وجہ سے میں نے دونوں کے درمیان بسم اللہ نہیں لکھی ہے۔

مطلب یہی ہے کہ اس سورت میں بسم اللہ موجود نہ تھی جو کاتبین وحی نے لکھا اور جس کو ابوبکر کے زمانہ میں نقل کیا گیا۔ اصل اور بنیادی وجہ یہی ہے باقی باتیں سب مختلف لوگوں کی فکری جولانیاں ہیں۔ اس سے یہ بات بھی کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کے قرآن کی حفاظت میں احساسات کس قدر لطیف تھے کہ انھوں نے اپنی رائے سے اس سورت پر بسم اللہ لکھنا بھی گوارا نہیں کیا بلکہ قرآن کو حضور اقدس ﷺ سے لینے اور جیسا دیا گیا تھا ویسا ہی اس کو محفوظ رکھنے میں کس درجہ اہتمام تھا۔ اس لیے اصل اور بنیادی وجہ یہی ہے کہ چونکہ حضورؐ نے خود بسم اللہ نہیں لکھوائی اس لیے صحابہ نے بھی نہیں لکھی۔

علماء نے اس کی اور وجوہ بھی بتائی ہیں۔ ان کی حیثیت علت کی نہیں بلکہ حکمت کی ہے۔ مثلاً علامہ شوکانی نے فتح القدیر میں المبرد کے حوالہ سے لکھا ہے کہ عرب میں یہ دستور تھا جب قوموں میں باہم معاہدہ ہوتا۔ ایک فریق معاہدے کو ختم کرنا چاہتا۔ اور عہد توڑنے کی اطلاع دوسرے فریق کو دیتا تو اس دستاویز کو بسم اللہ سے مزین نہ کرتا۔ چونکہ اس سورت میں اس عہد کے ختم ہونے کا اعلان ہو رہا ہے جو حضور اقدس ﷺ اور مشرکین مکہ کے درمیان تھا۔ اس لیے اس کی پیشانی پر بسملہ نہیں لکھی گئی یہی پس منظر ہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس ارشاد کا جب ان سے دریافت کیا گیا کہ سورہ براءت کے آغاز میں بسم اللہ کیوں نہیں؟ فرمایا کہ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم امن کا پروانہ ہے جب کہ سورہ براءت کے ذریعے اعلانِ جنگ ہے۔

سورہ برات روایت و تاریخ کی آغوش میں

اس سورت کا واقعات کی روشنی میں مطالعہ کرنے کے لیے ضروری ہے کہ صلح حدیبیہ ۶ھ سے لے کر ۹ھ کے اوائل تک کے حالات پیش نظر ہوں۔

اس عرصہ میں پورے عرب کی تبلیغ کا مسئلہ۔ اور پھر عرب سے باہر دنیا کی تبلیغ کا مسئلہ نبوت کے پیش نظر تھا۔ چوں کہ آپؐ کی رسالت عالمی اور آفاقی تھی اس لیے انتظامات تبلیغ بھی اہتمام کے متقاضی تھے مگر قریش کے جوش عداوت و فساد نے آغاز ہی میں ایسے خوفناک حالات پیدا کر دیئے کہ پہلے مسلمانوں کی ایک خاص بڑی جماعت کو وطن چھوڑ کر

حبش میں پناہ لینی پڑی تاکہ وہ ظلم و ستم کی اس آگ سے محفوظ رہیں جو قریش نے مکہ اور آس پاس کے علاقوں میں بھڑکا رکھی تھی اور اطمینان سے خدائے واحد کی عبادت کر سکیں —— پھر اللہ تعالیٰ نے اس دعوت کو قبول کرنے کے لیے اہل یثرب کے دل کھول دیئے اور مسلمانوں کے لیے ایک نیا مامن میسر آگیا۔ قریش نے یہاں بھی پیچھا نہ چھوڑا اور رزم و پیکار کا ایک سلسلہ شروع کر دیا۔ قریش کی عداوت دیکھ کر بعض دوسرے قبیلے بھی مسلمانوں کے نئے مرکز یعنی مدینہ منورہ پر یورشوں کے منصوبے تیار کرنے لگے تاکہ مال بھی ملے اور قریش مکہ کی نظروں میں اعتبار بھی بڑھے۔ حضور اقدس ﷺ نے مشکلات کے ان ہجوم میں بھی تبلیغ اور تعلیم و تزکیہ کا سلسلہ مقدسہ جاری رکھا۔ مگر جو دلجمعی اور یکسوئی لازم تھی۔ اس کا انتظام معاہدہ حدیبیہ کے بعد ہی ہوا۔ جس کے مطابق قریش دس سال کے لیے جنگ سے دست بردار ہو چکے تھے۔ حدیبیہ کے بعد دعوت و تبلیغ اور اسلامی نظام کی قوت کی جو تدبیریں اختیار کی گئیں۔ ان کی بدولت دو سال کے اندر ہی اسلام اس قدر پھیل گیا کہ دنیائے کفر و شرک اس کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئی۔

دراصل قریش ایک ایسے چکر میں پڑ گئے تھے۔ جس سے باہر نکلنے کا کوئی راستہ ان کو نظر نہ آتا تھا۔ ان میں لڑنے کی تاب نہیں تھی۔ ان کی معاشی زندگی کا دار و مدار تجارت پر تھا۔ لڑائیوں سے تجارت بے حد متاثر ہوئی۔ اسلام کا حلقہ قریش کی سختیوں کے باوجود وسیع ہوتا جا رہا تھا صلح حدیبیہ کی ایک شرط یہ بھی تھی کہ قبائل عرب فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں شریک جنگ ہو جائیں۔ چنانچہ اسی وقت بنو خزاعہ نے جناب رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور بنو بکر قریش کے حلیف بن گئے۔ ان دونوں قبیلوں کے درمیان مدت سے رقابت چلی آرہی تھی۔ صلح حدیبیہ ان دونوں پر بھی حاوی تھی۔ صلح پر اٹھارہ یا انیس مہینے گذر چکے تھے کہ رجب یا شعبان ۸ھ میں بنو بکر میں سے نوفل بن ورقاء نے اپنے قبیلے کے بہت سے افراد ساتھ لے کر بنو خزاعہ پر اچانک شبخون مارا۔ بنو خزاعہ نے حد حرم میں پناہ لی۔ جہاں کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا حملہ آور رک گئے مگر نوفل نے کہا کہ تم لوگوں کو حد حرم میں چوریاں کرتے ہوئے باک نہیں۔ پھر اپنا خون بہا لینے میں کیوں رکتے ہو۔ یہ موقع پھر ہاتھ نہ آئے گا۔ چنانچہ حملہ جاری رہا۔ یہاں تک کہ بنو خزاعہ نے مکہ مکرمہ پہنچ کر بدیل بن ورقاء اور اس کے مولیٰ رافع کے مکانوں میں پناہ لی۔ بنو خزاعہ میں سے ۴۰ ناقہ سواروں کے ساتھ مدینہ منورہ پہنچ کر بارگاہ رسالت میں فریاد کی پھر بدیل بن ورقاء نے حاضر ہو کر حالات عرض کیے حضور اقدس ﷺ کو سن کر سخت رنج ہوا۔ یہ صریح بد عہدی تھی۔ جس کے ذمہ دار قریش تھے۔ حضور اقدس ﷺ نے ایک قاصد قریش کے پاس روانہ کیا اور تین صورتیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی ایک منظور کر لو۔

۱۔ مقتولوں کا خون بہا دلایا جائے۔

۲۔ قریش بنو بکر کی حمایت سے دست کشی کا اعلان کریں۔

صاف صاف کہہ دیں کہ معاہدہ حدیبیہ ٹوٹ گیا۔

۲- وہ اس معاہدہ کو توڑ کر اسلام سے آخری اور فیصلہ کن مقابلہ کرنا چاہتے تھے لیکن حضور اقدس ﷺ نے ان کی عہد شکنی کے بعد ان کو پنپنے کا موقعہ نہ دیا اور مکہ پر حملہ کرکے رمضان ۸ھ میں اسے فتح کر لیا۔ اس کے بعد اسلام فتح مکہ کے بعد سیاسی طور پر تومند ہو چکا تھا اور عرب کی قسمت کا قطعی فیصلہ ہو چکا تھا کہ اب اسے دارالاسلام بن کر رہنا ہے۔ اس واقعہ پر ایک سال بھی نہ گذرا تھا کہ عرب کا بیشتر حصہ اسلام کے دائرے میں داخل ہو گیا تھا اور نظام کفر کے چند پراگندہ عناصر مختلف گوشوں میں باقی رہ گئے تھے اس نتیجہ کے حد کمال تک پہنچنے میں ان حالات نے بھی کام کیا جو شمال میں رومی حکومت کی سرحد پر رونما ہو رہے تھے۔ حضور اقدس ﷺ تیس ہزار کی ہمرکابی میں رومی سرحد پر گئے لیکن رومیوں نے آپ کے مقابلے پر آنے سے پہلو تہی کی۔ اس کے نتیجہ میں تمام عرب پر آپ کی اور آپ کے دین کی دھاک بیٹھ گئی۔ اور اس کا ثمرہ دنیا نے دیکھا کہ عرب کے گوشے گوشے سے وفد پر وفد آنے شروع ہوئے۔ اور اسلام کے حلقہ میں داخل ہو گئے۔

داخلی اور خارجی خطرے

اگرچہ اسلام تومند ہو چکا تھا۔ لیکن اس کے سامنے دو خطرے تھے ایک داخلی یعنی منافقین کا دوسرا خارجی یعنی کافروں کا۔ یہ دونوں خطرے سامنے تھے۔ اس سورت میں ان دونوں خطروں کا پورا پورا چہرہ پیش کیا گیا ہے۔

منافقین کا خطرہ

مشہور ہے کہ عدو واحد داخل الباب اَنکی من سبعین عدوا خارج الباب دروازہ کے اندر ایک دشمن باہر کے ستر دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے۔ ایک عام غلط فہمی یہ پھیلی ہوئی ہے کہ دانستہ یا نادانستہ یہ سمجھ لیا گیا ہے کہ منافقوں کا گروہ کوئی خاص سازشی گروہ تھا۔ جو جاسوسوں کی طرح بھیس بدل کر مسلمانوں میں رہنے لگا تھا باہر نکلتا تو مسلمان بن جاتا۔ ایسا نہیں بلکہ ان لوگوں نے اسلام کو بطور دین و اعتقاد کے اسی طرح اختیار کیا تھا جس طرح دوسرے مسلمانوں نے اختیار کیا اسی سورت میں کفروا بعد اسلامھم ہے یعنی اسلام کو اپنا کر ہم کفر کی باتیں کیں۔ وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے وہ نماز پڑھتے تھے روزے رکھتے تھے۔ اسلام کے طریقے پر اولاد کی پرورش کرتے تھے۔ جہاں تک ایک دین کو بطور دین اختیار کر لینے کا تعلق ہے کوئی بات ایسی نہ تھی جو بظاہر ان کے مسلمان ہونے کے خلاف ہو۔ تاہم قرآن نے فیصلہ کیا کہ یہ مردم شماری کے مسلمان ہیں۔ کیونکہ اسلام کا گھونٹ تو انھوں نے پی لیا لیکن حلق کے نیچے نہیں اترا۔ کسی تعلیم کے اختیار کر لینے کے بعد یقین و عمل کی جو روح پیدا ہونی چاہیے اس سے بالکل محروم تھے۔ اخلاص و صداقت کے لیے ان کے دلوں میں کوئی جگہ نہ تھی وہ اللہ

کا کلام سنتے مگر اس لیے نہیں کہ عمل کریں بلکہ اس لیے کہ صرف سنتے رہیں۔ وہ نماز پڑھتے مگر بے دلی کے ساتھ، خیرات کرتے مگر مجبور ہو کر ان کے دلوں میں دین سے زیادہ دنیا کا عشق تھا۔ اسلام کے جو احکام ان کی شخصی اغراض کے خلاف نہ ہوتے ان پر خوشی خوشی عمل کرتے جو خلاف ہوتے ان سے گریز کر جاتے۔ جب کبھی خوش حالیوں کا موقعہ ہوتا تو وہ سب کے سب مومن تھے۔ جب کبھی قربانیوں کا موقعہ آجاتا تو آخری صفوں میں بھی نظر نہ آتے۔ جہاد کے تصور سے ان کی روحیں لرز جاتیں۔ انفاق کا حکم ان کے لیے موت کا پیغام ہوتا۔ اسلام کے دشمنوں سے سازگاریاں رکھنے میں انہیں کوئی تامل نہ ہوتا وہ سمجھتے تھے کہ دونوں طرف ملے رہنے میں مصلحت ہے۔

ایمان و کفر کی طرح نفاق کی تمام حالتیں یکساں نہیں۔ چونکہ اصل کے اعتبار سے یہ حالت بھی انکار ہی کی ایک اقراری صورت ہے اس لیے جب بڑھتی ہے تو انکار قطعی ہی کی طرف جاتی ہے اور اسی کے خصائص رونما ہونے لگتے ہیں۔ اسی سورت میں ہے و ممن حولکم من الاعراب منافقون کسی کا نفاق زیادہ تر یہ تھا کہ ہجرت سے جی چراتے تھے۔ کسی پر انفاق مال شاق تھا۔ کوئی جہاد سے بچنا چاہتا تھا کسی پر نماز کا قیام سخت گذرتا تھا کچھ ایسے تھے کہ احکامِ الٰہی اور آیاتِ قرآنی کی ہنسی اڑاتے تھے اور اس تاک میں رہتے کہ مسلمانوں پر کوئی آفت آپڑے تو کھلم کھلا دشمنوں کے کیمپ میں کھڑے نظر آئیں۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ ان سب نے اسلام بطور دین کے قبول کیا تھا اور مسلمانوں ہی میں ان کا شمار ہوتا تھا وہ خود بھی اپنے کو مسلمان سمجھتے تھے اور مسلمان بھی ان کو مسلمان سمجھتے تھے۔

اس سورت میں قرآن نے ان منافقین کا ایسا بھرپور چہرہ پیش کیا ہے کہ ان کے اعمال و خصائص کے اس میں مذکور ہونے کی رعایت سے اس کے نام رکھے گئے۔ الفاضحہ کیوں کہ اس میں منافقین کی پردہ دری کر کے رسوائی کی گئی ہے۔ المقشقشہ کیونکہ یہ سورت نفاق سے برائت کا سامان مہیا کرتی ہے۔ ایسے اور بہت سے نام جن کا ذکر پہلے سن چکے ہو۔

بیرونی خطرہ

جب اسلام کی دعوت زیادہ پھیل گئی اور پورے عرب کی تسخیر عمل میں آگئی تو وہ عیسائی ریاستیں جو عرب اور شام کے سرحدی علاقہ میں قائم ہو گئیں تھیں اور رومی حکومت کے ماتحت تھیں اس تحریک کی ترقی گوارا نہ کر سکیں اور رومی سلطنت شہنشاہی کی پشت پناہی کی وجہ سے مغرور ہو کر آمادہ پیکار ہو گئیں سب سے پہلا معاملہ حارث بن عمیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی شہادت کا پیش آیا۔ حضور اقدس ﷺ نے ان کو دعوت اسلام کا خط دے کر موتہ روانہ کیا۔ جہاں کا رئیس شرجیل بن عمرو غسانی تھا۔ اس نے انہیں بغیر کسی جرم کے قتل کرا دیا۔ اس صریح ظلم و غدر نے حضور اقدس ﷺ کو جنگ پر

دور کر دیا اور ایک فوج شنہ ہجری میں روانہ کی۔ اُس وقت شہنشاہ قسطنطنیہ بھی شام میں مقیم تھا اس سے رئیس موتہ نے مدد مانگی اور شاہی فوج بھی میدان میں آ گئی۔ لیکن اس کے باوجود مسلمان فوج ۳ ہزار فوجیوں پر مشتمل اس شاہی فوج کے مقابلہ کے بے تیار ہو گئی جس کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ اس دلیری کا نتیجہ یہ ہونا چاہیے تھا کہ مسلمان فوری بالکل پس جاتے لیکن سارا عرب دیکھ کر ششدر رہ گیا کہ ایک اور ۳۳ کی نسبت سے اس مقابلہ میں کفار مسلمانوں پر غالب نہ آ سکے۔ اور مسلمان کامیاب رہے اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شام اور اس سے متصل رہنے والے نیم آزاد قبائل، عراق کے قریب رہنے والے نجدی قبائل اسلام کی طرف متوجہ ہو گئے اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمان ہو گئے۔

اس واقعہ کے بعد شام کے تمام عرب قبائل نے تہیہ کر لیا کہ پوری قوت سے مسلمانوں پر حملہ کریں۔ شہنشاہ قسطنطنیہ نے بھی ان کی اعانت کا فیصلہ کر لیا۔ چنانچہ ابھی ایک سال نہیں گذرا تھا کہ شاہی فوجیں شام میں جمع ہونے لگیں اور حضور اقدس ﷺ کو اس دفاعی مہم میں خود نکلنا پڑا۔ یہی دفاعی اقدام ہے جو غزوہ تبوک کے نام سے مشہور ہوا لیکن جب حضور اقدس ﷺ تبوک پہنچے تو معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے اس بیباکانہ اقدام نے دشمنوں کے حوصلے پست کر دیئے اور اب حملہ کا ارادہ ملتوی کر دیا۔

یہ ہے سورہ برأت کا وہ پس منظر جسے نگاہ میں رکھنے کے بعد آپ آسانی سے ان مسائل کو پوری طرح سمجھ سکتے ہیں جن سے سورۃ توبہ میں بحث کی گئی ہے۔

تاریخِ نزول سُورۃ توبہ

امام بخاری نے براء بن عازب سے روایت کی ہے کہ آخری سورت جو نازل ہوئی برأت ہے اخیر سورۃ نزلت تامۃ اور حاکم وغیرہ نے ابی بن کعب اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے کہ سب سے آخری آیتیں جو نازل ہوئیں الم البقرہ کی دو آیتیں ہیں۔ لیکن تمام روایتوں کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ برأت سب سے آخری نہیں ہو سکتی۔ کم از کم واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ اور سورہ نصر اس کے بعد نازل ہوئی ہے۔ لیکن ان میں کوئی تضاد نہیں۔ آیتوں میں باعتبار نزول آخری واتقوا یوما ترجعون ہے اور سورتوں میں باعتبار نزول آخری سورت برأت ہے۔ براء نے سورت کی بات بتائی ہے جب کہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما اور ابی بن کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آیت کی بات ارشاد فرمائی ہے۔ باقی سورہ اذا جاء نصر اللہ کے نزول میں آخری ہونے کی بات تو علامہ زمخشری کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ

اگر یہ سورت نزول میں آخری ہے تو اس کے شروع میں اذا کیوں لایا گیا ہے جو استقبال کے معنے کی

طرف رہنمائی کر رہا ہے۔
اگرچہ حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں اور علامہ طیبی نے کشف میں اس کے جوابات دیئے مگر تشفی بخش نہیں ہیں۔
بہرحال سورہ برارت آخر میں ہو یا نہ ہو لیکن باعتبار نزول کے یہ آخری کلام ضرور ہے۔ اور اسی لیے بہ حیثیت مجموعی یہ سورت میں اور آخری دو آیتوں میں خصوصیت کے ساتھ اسی طرح کا طرز خطاب پایا جاتا ہے جیسے امت کو آخری احکام دیئے جا رہے ہیں یا آخری موعظت کا پیام ہو۔
چنانچہ آخری دو آیتوں میں عرب کی اس نسل سے خطاب ہے جو اس وقت مخاطب تھی۔ فرمایا کہ اللہ کا رسول تم میں آگیا اور اس نے اپنا فرض رسالت ادا کر دیا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے تم میں نہیں آیا۔ سنت الٰہی کے مطابق تم ہی میں پیدا ہوا۔ اور چونکہ وہ تم ہی میں سے ہے اس لیے اول سے آخر تک اس کی ساری باتیں تمہاری نگاہوں کے سامنے ہیں۔ اس کا لڑکپن بھی تم میں گذرا۔ اس کی جوانی کے دن بھی تم میں بسر ہوئے۔ پھر اس نے نبوت کا اعلان کیا تو اس کی زندگی کا کوئی گوشہ تمہاری نگاہوں سے اوجھل نہیں رہا۔ اس کی ساری باتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے۔ پھر جو کچھ گذرنا تھا گذرا اور تم نے مظلومی و بیکسی کے اعلان بھی سنے، فتح و کامرانی میں اس کی تصدیق بھی کر لی۔ تم میں کوئی نہیں جو اس کی بے داغ زندگی کا شاہد نہ ہو اور کوئی نہیں جس نے اس کی ایک ایک بات کی سچائی آزما نہ لی ہو۔
یہ بات یہاں کیوں کہی گئی۔ صرف اس لیے کہ یہ سورت اس وقت نازل ہوئی۔ جب تمام عرب میں کلمہ حق کا بول بالا ہو چکا تھا۔ اور یہ آخری پیغام تھا۔ بہرحال سورہ برارت ایک وداعی پیغام ہے اس کا ابتدائی حصہ آیات ۱ تا چالیس تک فتح مکہ کے بعد ۸ ہجری میں نازل ہوا سورت کا بقیہ حصہ بھی ۹ ہجری میں غزوہ تبوک میں اور اس کے بعد نازل ہوا۔

سورہ انفال ــــ سورہ برارت

یہ دو سورتیں ہیں۔ ان دونوں میں باہم اس درجہ ربط، آمیزش اور ملاپ ہے کہ دونوں کے درمیان جدائی کی خاص نشانی بسم اللہ الرحمن الرحیم بھی نہیں لکھی گئی۔ اس موضوع پر شارحین قرآن نے بہت کم لکھا ہے لیکن مولانا عثمانی رح نے جو کچھ لکھا ہے وہ اس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ بار بار کیا جائے۔ مولانا فرماتے ہیں:
سورہ انفال اوائل ہجرت میں اور یہ سورۃ برارت اواخر ہجرت میں نازل ہوئی۔ آنحضرت ﷺ کی عادت تھی کہ جو آیات قرآنی نازل ہوتیں، فرما دیتے کہ ان کو فلاں سورت میں فلاں موقعہ پر رکھو۔ ان آیات کے متعلق جنہیں اب سورہ توبہ یا برارت کہا جاتا ہے آپ نے کوئی تصریح نہیں فرمائی کہ کسی سورت میں درج کی جائیں جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ

مستقل سورت ہے کسی دوسری سورت کا جز نہیں لیکن عام قاعدہ یہ تھا کہ جب نئی سورت نازل ہوتی۔ تو پہلی سورت سے جدا کرنے کے لیے بسم اللہ آتی تھی۔ سورہ توبہ کے شروع میں بسم اللہ نہ آئی جو مشعر ہے کہ یہ جداگانہ سورت نہیں۔ ان وجوہ پر نظر کر کے مصاحف عثمانیہ میں اس کے آغاز میں بسم اللہ نہیں لکھی گئی۔ لیکن کتابت میں اس کے اور انفال کے درمیان فصل کر دیا گیا کہ نہ پوری طرح اس کا استقلال ظاہر ہو اور نہ دوسری سورت کا جز ہو۔ باقی انفال کے بعد متصل رکھنے کی وجہ یہ ہے کہ انفال نزول میں مقدم ہے بلا خاص وجہ کے موخر کیوں کی جائے۔ اور دونوں کے مضامین باہم اس قدر مربوط منتسق واقع ہوئے ہیں کہ گویا براءت کو انفال کا تتمہ اور تکملہ کہا جا سکتا ہے۔ سورۃ انفال تمام تر غزوہ بدر اور اس کے متعلقات پر مشتمل ہے۔ یوم بدر کو قرآن نے یوم الفرقان کہا کیونکہ اس نے حق و باطل اسلام و کفر اور موحدین و مشرکین کی پوزیشن کو بالکل جدا کر کے دکھلا دیا۔ بدر کا معرکہ فی الحقیقت خالص اسلام کی عالمگیر اور طاقتور برادری کی تعمیر کا سنگ بنیاد اور حکومت الٰہی کی تاسیس کا دیباچہ تھا والذین کفروا بعضهم اولياء بعض کے مقابلے میں جب خالص اسلامی برادری کی طرف انفال کے خاتمہ پر الا تفعلوه تكن فتنة في الارض و فساد كبير کہہ کر توجہ دلائی ہے۔ اس کا صریح اقتضا ہے کہ اس عالمگیر برادری کا کوئی طاقتور اور زبردست مرکز حسی طور پر بھی دنیا میں قائم ہو۔ جو ظاہر ہے کہ جزیرۃ العرب کے سوا نہیں ہو سکتا جس کا صدر مقام مکہ معظمہ ہے۔ انفال کے آخر میں یہ بھی بتا دیا گیا تھا کہ جو مسلمان مکہ وغیرہ سے ہجرت کر کے نہیں آئے اور کافروں کے زیر سایہ زندگی بسر کر رہے ہیں دار الاسلام کے آزاد مسلمانوں پر ان کی ولایت و رفاقت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے ما لكم من ولايتهم من شيء حتى يهاجروا۔ ہاں حسب استطاعت ان کے لیے دینی مدد بہم پہنچائی جانی چاہیے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ مرکز اسلام میں موالات اور اخوت اسلامی کی کڑیوں کو پوری مضبوطی کے ساتھ جوڑنے کے لیے دو باتوں میں سے ایک بات ہونی چاہیے یا تمام عرب کے مسلمان ترک وطن کر کے مدینہ آجائیں اور اسلامی برادری میں بے روک ٹوک شامل ہوں۔ اور یا آزاد مسلمان مجاہدانہ قربانیوں سے کفر کی قوت توڑ کر جزیرۃ العرب کی سطح ایسی ہموار کر دیں کہ کسی مسلمان کو ہجرت کی ضرورت باقی نہ رہے یعنی سارا جزیرۃ العرب تقریباً خالص اسلامی برادری کا ایسا ٹھوس مرکز اور غیر مخلوط مستقر بن جائے جس کے دامن سے عالمگیر اسلامی برادری کا نہایت محکم و شاندار مستقبل وابستہ ہو سکے۔ یہ دوسری صورت بھی ایسی تھی۔ جس سے روز روز کے فتنہ و فساد کی بیخ کنی ہو سکتی تھی اور مرکز اسلام کفار کے اندرونی فتنوں سے بالکل پاک صاف اور آئے دن کی بدعہدیوں اور ستمرانیوں سے پورا مامون و مطمئن ہو کر تمام دنیا کو اپنی عالمگیر برادری میں داخل ہونے کی دعوت دے سکتا تھا۔ اسی اعلیٰ اور پاک مقصد کے لیے مسلمانوں نے ۲ھ ہجری میں پہلا قدم میدان بدر کی طرف اٹھایا تھا جو آخر کار ۸ھ میں مکہ معظمہ کی فتح عظیم پر منتج ہوا۔ جو فتنے اشاعت یا حفاظت اسلام کی راہ میں آڑے تھے فتح مکہ نے

ان کی جڑوں پر تیشہ لگایا۔ لیکن ضرورت تھی کہ وقاتلوھم حتی لاتکون فتنۃ کے امتثال میں اسلامی برادری کے مرکز اور حکومت الہیہ کے مستقر کو فتنہ کے جراثیم سے بالکل صاف کر دیا جائے تاکہ وہاں سے تمام دنیا کو اسلامی دیانت اور حقیقی تہذیب کی دعوت دیتے وقت تقریباً سارا جزیرۃ العرب یک جان و یک زبان ہو اور کوئی اندرونی کمزوری یا خلفشار بیرونی مزاحمتوں کے ساتھ مل کر اس مقدس مشن کو نقصان نہ پہنچا سکے۔ بس جزیرۃ العرب کو ہر قسم کی کمزوریوں اور فتنوں سے پاک کرنے اور عالمگیر دعوت اسلامی کے بلند ترین مقام پر کھڑا کرنے کے لیے لازم ہوا کہ دعوت اسلام کا مرکز خالص اسلامیت کے رنگ میں رنگین ہو۔ اس کے قلب و جگر سے صدائے حق کے سوا کوئی دوسری آواز نکل کر دنیا کے کانوں میں نہ پہنچے۔ پورا جزیرہ سارے جہان کا معلم اور ہادی بنے اور ایمان و کفر کی کشمکش کا ہمیشہ کے لیے خاتمہ ہو جائے۔ سورہ براءت کے مضامین کا یہی حاصل ہے۔ چنانچہ چند روز میں خدا کی رحمت اور سچائی کی طاقت سے مرکز اسلام ہر طرح کے وساوس کفر و شرک سے پاک ہو گیا اور سارا عرب متحد ہو کر شخص واحد کی طرح تمام عالم میں نور ہدایت اور عالمگیر اخوت اسلامی پھیلانے کا کفیل و ضامن بنا فللہ الحمد۔ الغرض سورہ انفال میں جس چیز کی ابتداء تھی سورہ توبہ میں اس کی انتہاء ہے۔ اسی لیے سہ اول با آخر نسبتے دارد کے موافق براءت کو انفال کے ساتھ بطور تکملہ ملحق کر دیا گیا۔ اور یہی مناسبات ہیں جن کو علماء نے لکھا ہے۔

آیاتہا ۱۲۹ (۹) سُوْرَةُ التَّوْبَةِ مَدَنِيَّةٌ (۱۱۳) رکوعاتہا ۱۶

بَرَاءَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ مِّنَ
الْمُشْرِكِيْنَ ﴿١﴾ فَسِيْحُوْا فِى الْاَرْضِ اَرْبَعَةَ اَشْهُرٍ وَّ
اعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى اللّٰهِ وَاَنَّ اللّٰهَ مُخْزِى الْكٰفِرِيْنَ ﴿٢﴾
وَاَذَانٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖٓ اِلَى النَّاسِ يَوْمَ الْحَجِّ الْاَكْبَرِ
اَنَّ اللّٰهَ بَرِىْٓءٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ وَرَسُوْلُهٗ فَاِنْ تُبْتُمْ
فَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ غَيْرُ مُعْجِزِى
اللّٰهِ وَبَشِّرِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ ﴿٣﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ
عٰهَدْتُّمْ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ ثُمَّ لَمْ يَنْقُصُوْكُمْ شَيْـًٔا وَّلَمْ
يُظَاهِرُوْا عَلَيْكُمْ اَحَدًا فَاَتِمُّوْٓا اِلَيْهِمْ عَهْدَهُمْ اِلٰى مُدَّتِهِمْ
اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ﴿٤﴾

اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے ان مشرکین کی جانب جن سے اے مسلمانوں تم نے
عہد و پیمان کیا تھا بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے لہٰذا اے مشرکو! تم ملک میں چار مہینے
تک چل پھر سکتے ہو اور یاد رکھو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کرو گے۔ اور سمجھ لو کہ اللہ کفر کو رسوا
کر کے چھوڑے گا۔ اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے یہ اعلان عام ہے حج کے
بڑے دن کہ اللہ و رسول مشرکین کے معاہدوں سے بری الذمہ ہیں۔ لہٰذا اگر ظلم و

سرکشی سے توبہ کرو تو یہ تمہارے لیے مفید ہے اور اگر نہ مانو گے تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور جو لوگ کفر و شرک کو اپنائے ہوئے ہیں ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے[۲]۔ ہاں مشرکین میں سے وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا پھر انہوں نے اپنے عہد کے نباہنے میں بالکل کوتاہی اور کمی نہیں کی۔ اور نہ انھوں نے تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد کی وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ لہٰذا چاہیے کہ ان سے جس قدر مدت کے لیے عہد ہوا ہے اس مدت کو پورا کرو اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے[۳]۔

مُفردات کے معانی

براۃ یہ بری یبرأ کا مصدر ہے بری من الدین اس وقت بولا جاتا ہے جب قرض سے سبکدوش ہو جائے یہاں معنے معاہدہ کی ذمہ داری سے سبکدوش ہونے کے ہیں اور اس کی حیثیت وہی ہے جو عربی میں ھذا الکتاب من فلان الی فلان کی ہے۔ امام راغب لکھتے ہیں برأ برار تبرأ۔ تبری کے معنے ان چیزوں سے چھٹکارا پانے اور دور رہنے کے ہیں جن کا قرب ناگوار ہو۔

اذان یہ تاذین سے اسم ہے۔ ایسی پکار جو کافروں میں ہنگامہ کر دے اسی سے نماز کے لیے اذان ہے اذن بہ کے معنے اعلان کرنے کے ہیں یہی معنی آذن کے ہیں۔ اذِن جب باب سمع سے ہو، تو اس کے معنے کان لگانا متوجہ ہونا ہیں۔ یہاں معنے اعلانِ عام اور اطلاع عام کے ہیں۔

معاہدین کا عہد ختم

حضور اقدس ﷺ اسلام کی دعوت لے کر دنیا میں تشریف لائے۔ آپ نے اپنی دعوت کو دلائل اور حقائق کے لباس میں پیش کیا۔ یہ اعلان کیا کہ اسلام کو کسی کے حلقوم میں جبراً نہ ڈالا جائے گا یہ سب کچھ خوشی اور رضا کا معاملہ ہے۔ دلیل کی پتی تلی ترازو میں رکھ کر اسلام کو برضا و رغبت قبول کرو۔ اس کے باوجود مشرکین نے اسے بزورِ شمشیر دبانا چاہا۔ اہلِ ایمان کو لاتعداد قسم کی تکلیفیں دیں۔ پورے ماحول میں کوئی قتل اور تعذیب سے بغیر کسی حلیف کی مدد کے محفوظ نہ رہ سکا۔ اسی کے نتیجہ میں مسلمانوں کی بڑی تعداد کو گھر سے بے گھر ہونا پڑا۔ جس کا جہاں سر سمایا وہاں روانہ ہو گیا۔ حضور اقدس ﷺ کی

ذات گرامی ان کی ایذاؤں اور سختیوں کا نشانہ بنی، انھوں نے علانیہ آپ کے قتل، آپ کے شہر بدر کرنے اور آپ کو گرفتار کرنے کا دارالندوہ میں مشورہ کیا۔ آخر میں قتل کی پوری اسکیم کو اپنا کر رہے ہے۔ اللہ سبحانہ نے آپ کو ہجرت کا حکم دیا۔ آپ اور آپ کے ساتھی مدینہ روانہ ہو گئے۔ مدینہ میں ایسے افراد آپ کو دستیاب ہو گئے جنھوں نے آپ کی دعوت کو اپنانے اور اس کی مدد کا فیصلہ کر لیا۔ آپ کے مدینہ پہنچنے پر آپ کے اور مشرکین مکہ کے درمیان آج کی زبان میں جنگی حالات تھے۔ مدینہ میں آپ نے یہود و نصاریٰ سے صلح و امن کا معاہدہ کیا۔ لیکن انھوں نے عہد شکنی کی اور مشرکین مکہ کی مدد کی۔ حدیبیہ میں آپ نے مشرکین سے دس سال کے لیے امن و امان کا عہد کیا۔ آپ نے یہ معاہدہ کمزوری کی بنا پر نہیں طاقتور ہو کر کیا۔ مقصد یہ تھا کہ امن و امان ہو اور پر امن ماحول میں دلائل و حقائق کی روشنی میں لوگوں کو اسلام کا مطالعہ کرنے کا موقعہ ملے۔ اس معاہدہ میں بنو خزاعہ حضور اقدس کے حلیف اور بنو بکر قریش مکہ کے حلیف کی حیثیت سے معاہدے کے ارکان تھے۔ بنو بکر نے خزاعہ کے خلاف جارحانہ اقدام کیا اور قریش نے بنو بکر کی اسلحہ سے امداد کی۔ اس کے نتیجہ میں امن کا ماحول بدامنی میں صلح جنگ میں تبدیل ہو گئی۔ یہ صورت حال فتح مکہ تک رہی اور فتح مکہ کا باعث بنی۔ اسی کے نتیجے میں شرک کی حکومت ختم ہو گئی۔ احوال و ظروف اور واقعات نے بتا دیا کہ مشرکین کے یہاں عہد و پیماں کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ نبوت کی تاریخ کا جو بھی مطالعہ کرے گا وہ یہ ضرور محسوس کرے گا کہ جو جماعتیں حضور اقدس ﷺ کی مخالف تھیں ان کے تمام کام اول تا آخر تک ظلم و تشدد دغا و فریب وحشت و خونخواری پر مبنی رہے اور حضور اقدس ﷺ اور ان کے ساتھیوں نے جو کچھ کیا ان کا ایک ایک فعل صبر و تحمل درستی و دیانت اور عفو و بخشش کا اعلیٰ سے اعلیٰ نمونہ تھا مظلومی میں صبر مقابلہ میں عزم، معاملہ میں راست بازی، طاقت و اختیار میں درگذر تاریخ انسانیت کے وہ نوادر ہیں جو کسی ایک زندگی میں اس طرح یک جا نہیں ہو سکتے۔

معاہدات کی منسوخی کا اعلان

(۱) اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے ان مشرکین کی جانب جن سے اے مسلمانو! تم نے عہد کیا ہے بری الذمہ ہونے کا اعلان ہے۔ لہٰذا اے مشرکو تم ملک میں چار ماہ تک چل پھر سکتے ہو اور یاد رکھو کہ اللہ کو تم عاجز نہ کر سکو گے اور سمجھ لو کہ اللہ سبحانہ کفر کو رسوا کر کے چھوڑے گا ۶ ہجری بمقام حدیبیہ جب نبی کریم ﷺ اور قریش کے درمیان معاہدہ صلح ہو چکا تو بنی خزاعہ جو مسلمانوں کے اور بنو بکر جو قریش کے حلیف تھے بنی بکر نے معاہدہ کی پروا نہ کرتے ہوئے خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے اسلحہ وغیرہ سے ظالم حملہ آوروں کی مدد کی۔ اس طرح قریش اور ان کے حلیف دونوں معاہدہ حدیبیہ پر قائم نہ رہے۔ جس کے جواب میں ۸ ہجری میں نبی کریم ﷺ نے اچانک حملہ کر کے مکہ معظمہ بڑی

آسانی سے فتح کر لیا ان قبائل کے سوا دوسرے قبائل عرب سے مسلمانوں کا میعادی یا غیر میعادی معاہدہ تھا جن میں سے کچھ اپنے معاہدے پر قائم رہے اور بہت سے قبائل وہ تھے جن سے کسی قسم کا معاہدہ نہیں ہوا تھا اس سورت کی مختلف آیات مختلف قبائل کے متعلق نازل ہوئی ہیں شروع کی آیات میں غالباً ان مشرکین مکہ کا ذکر ہے جن سے معاہدہ تھا اگر میعادی تھا ان کو اطلاع کر دی گئی کہ ہم معاہدہ نہیں رکھنا چاہتے چار ماہ کی مہلت تم کو دی جاتی ہے کہ اس مدت کے اندر اسلامی برادری میں شامل ہو جاؤ یا وطن چھوڑ کر مرکز ایمان و توحید کو اپنے وجود سے خالی کر دو اور یا جنگی مقابلے کے لیے تیار ہو جاؤ لیکن یہ خوب سمجھ لینا کہ تم خدا کی مشیت کو روک نہیں سکتے۔ اگر اسلام نہ لائے تو وہ تم کو دنیا و آخرت میں رسوا کرنے والا ہے تم اپنی تدبیروں اور حیلہ بازیوں سے اسے عاجز نہ کر سکو گے۔ باقی جن قبائل سے کوئی معاہدہ ہی نہیں تھا ہے کہ ان کو بھی چار ماہ کی مہلت دی گئی ہو۔ یہ اور اس کے بعد کی آیتوں کا اعلان عام ۹ھ ہجری میں حج کے موقع پر تمام قبائل عرب کے سامنے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کیا[1]

اس آیت میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

۱۔ یہ معاہدہ کن لوگوں سے ہوا۔

۲۔ کس معاہدے کے فسخ کا یہاں اعلان ہوا ہے۔

جہاں تک پہلی بات کا تعلق ہے تو اس کے بارے میں شارحین قرآن متفق ہیں کہ حضور اقدس نے متعدد قبائل سے معاہدے کیے تھے کچھ قبائل سے معاہدہ مقررہ مدت کے لیے تھا اور کچھ سے بغیر میعاد کے تھا۔ اور اس پر بھی اتفاق ہے کہ اس آیت میں غیر میعادی معاہدہ کا ذکر ہے۔ جس معاہدہ کا اس آیت میں ذکر ہے وہ حدیبیہ کا معاہدہ ہے۔ علامہ بغوی معالم التنزیل میں لکھتے ہیں۔

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تبوک تشریف لے گئے تو منافقین نے طرح طرح کی افواہیں اڑانی شروع کر دیں اور مشرکین نے عہد شکنی کا آغاز کر دیا۔ آپ نے سورہ انفال کی آیت و اما تخافن من قوم پر عمل کرتے ہوئے نقض عہد کا اعلان کیا۔

حافظ ابن کثیر رقم طراز ہیں،

> شارحین قرآن کا یہاں اختلاف ہے کچھ بتانے والوں نے بتایا ہے کہ یہ آیت ان عہدوں کے بارے میں ہے جو میعادی نہ تھے یا جن سے چار مہینے سے کم مدت کے لیے عہد تھا جن کا عہد موقت اور میعادی تھا اس کا ذکر قرآن میں آگے آ رہا ہے یہ بہترین رائے ہے یہی ابن جریر کا مختار ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

دونوں باتیں درست ہیں لیکن ان معاہدین میں کچھ ایسے بھی تھے جن کا معاہدہ موقت اور میعادی تھا مگر انہوں نے معاہدہ توڑ دیا تھا۔ اسی کی طرف امام بغوی نے یہ کہہ کر اشارہ فرمایا؛ اور مشرکین نے عہد شکنی کا آغاز کر دیا یہ عہد شکنی کرنے والے وہ معاہدین تھے جنھوں نے حدیبیہ میں دس سال تک امن و امان سے رہنے کا عہد کیا تھا۔ اس پر تفصیل تبصرہ تو معالم القرآن کی جلد ۶ میں آئے گا۔ یہ معاہدہ کیا تھا۔ تاریخ کی کتابوں میں اس کی تفصیلات محفوظ ہیں۔ ہم ناظرین معالم القرآن کی دلچسپی کے لیے اس معاہدہ کا متن پیش کرتے ہیں۔

۱۔ تیرے نام سے اے اللہ۔

۲۔ یہ وہ معاہدہ ہے جو محمد بن عبداللہ اور سہیل بن عمرو میں طے ہوا۔

۳۔ ان دونوں نے اس بات پر صلح کر لی ہے کہ دس سال تک جنگ روک دی جائے۔ جس کے دوران لوگ امن سے رہیں اور ایک دوسرے سے رُکے رہیں۔

۴۔ یہ کہ محمد کے ساتھیوں میں سے جو حج یا عمرے کے لیے مکہ آئے تو اس کی جان و مال کو امان ہوگا۔ اور قریش کا جو شخص تجارت کے لیے مصر یا شام جائے۔ بروایت ابی عبید عراق یا شام جاتے ہوئے مدینے سے گذرے تو اسے جان و مال کا امان ہوگا۔

۵۔ یہ کہ قریش کا جو شخص اپنے ولی کی اجازت کے بغیر محمد کے پاس آئے گا تو آپ اسے ان کے سپرد کر دیں گے اور محمد کے ساتھیوں میں جو شخص قریش کے پاس آجائے گا وہ اسے آپ کے سپرد نہیں کریں گے۔

۶۔ یہ کہ باہم سینے ہر طرح بند رہیں گے جن میں باہر سے کوئی غداری داخل نہیں ہو سکے گی؟ اور نہ خفیہ کسی دوسرے کو مدد دی جائے گی نہ علانیہ خود خلاف عہد وفا کریں گے۔

۷۔ یہ کہ جو محمد کے عہد اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے وہ بھی ایسا کر سکے گا۔ اور جو قریش کے عہد اور ذمہ داری میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ وہ بھی ایسا کر سکے گا۔ اس پر قبائل خزاعہ نے اٹھ کر کہا کہ ہم محمد کے معاہدے اور ذمہ داری میں شریک ہوتے ہیں اور بنی بکر نے کہا کہ ہم قریش کے معاہدے اور ذمہ داری میں داخل ہوتے ہیں

۸۔ یہ کہ تو اس سال ہمارے پاس سے واپس چلا جائے گا اور ہمارے ہاں مکہ نہیں آئے گا۔ البتہ سال آئندہ ہم باہر چلے جائیں گے اور تو اور تیرے ساتھی وہاں مکہ میں داخل ہو کر تین راتیں ٹھہر سکیں گے۔ تیرے ساتھ سوار کا ہتھیار ہوگا یعنی تلوار میان میں پڑی ہوگی۔ اس کے سوا اور کوئی ہتھیار لے کر تو وہاں نہ آسکے گا۔

۹۔ یہ کہ یہ قربانی کے جانور وہیں رہیں گے جہاں ہم نے ان کو پایا یعنی حدیبیہ میں اور ان کو ذبح کر دیا جائے گا اور ان کو ہمارے پاس مکہ میں نہیں لایا جائے گا۔ اور تم صراحت کرو ہمارے اور تمہارے حقوق برابر ہوں گے۔

یہ تھا وہ معاہدہ جو حدیبیہ میں جناب رسول اللہ اور مشرکین مکہ کے درمیان ہوا تھا۔ یہ موقت اور میعادی معاہدہ تھا لیکن مشرکین نے اس معاہدے کی خلاف ورزی کر کے عہد شکنی کی۔

حدیبیہ کے معاہدہ کی خلاف ورزی

مشرکین نے حدیبیہ کے اس معاہدے کو توڑ دیا۔ حدیبیہ کے معاہدے میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ قبائل عرب میں سے فریقین میں سے جس کے ساتھ شریک ہونا چاہیں گے شریک ہو جائیں۔ چنانچہ اسی وقت بنو خزاعہ نے رسول اللہ ﷺ کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور بنو بکر قریش کے حلیف ہو گئے۔ ان دونوں قبیلوں کے درمیان مدت سے رقابت چلی آرہی تھی۔ معاہدہ حدیبیہ میں یہ دونوں ہی شریک تھے جس طرح قریش مکہ اور مسلمان۔ صلح پر اٹھارہ ماہ یا انیس گذرے تھے کہ رجب یا شعبان ۸ھ میں بنو بکر میں سے نوفل بن معاویہ نے اپنے قبیلے کے بہت سے افراد کو ساتھ لے کر بنو خزاعہ پر اچانک شبخون مارا۔ بنو خزاعہ نے حدِ حرم میں پناہ لی جہاں کسی پر ہاتھ نہیں اٹھایا جا سکتا تھا۔ حملہ آور رک گئے۔ مگر نوفل نے کہا کہ تم لوگوں کو حدِ حرم میں چوریاں کرتے ہوئے باک نہیں پھر اپنا خون بہا لینے میں کیوں رکتے ہو۔ یہ موقع پھر ہاتھ نہیں آئے گا چنانچہ حملہ جاری رہا۔ یہاں تک بنو خزاعہ نے مکہ مکرمہ پہنچ کر بدیل بن ورقار اور اس کے مولیٰ رافع کے گھر میں پناہ لی۔ یہ حملہ قریش کی سازباز کے بغیر نہیں ہو سکتا تھا۔ طبری کا بیان ہے کہ قریش میں سے عکرمہ ابن ابو جہل صفوان بن امیہ نے بھیس بدل کر بنو بکر کا ساتھ دیا۔

بنو خزاعہ میں سے عمرو بن سالم نے ۴۵ ناقہ سوار سواروں کے ساتھ مدینہ میں آکر بارگاہ رسالت میں یہ منظوم فریاد کی۔

لاھم انی ناشد محمداً حلف ابینا و ابیہ الا تلدا

اے اللہ میں محمد کو یاد دلاتا ہوں وہ موروثی حلف جو ہمارے باپ اور اس کے باپ میں ہوا تھا

ان قریشا اخلفوک الموعدا و نقضوا میثا قلک الموکدا

کہ قریش نے تیرے سے وعدہ خلافی کی ؛ اور تیرے پختہ عہد کو توڑ دیا۔

ھم بیتونا بالوتیر ھجداً فقتلونا رکعاً و سجدا

انھوں نے ہم کو وتیر کے چشمے کے پاس سوتے ہوئے آدبوچا۔ انھوں نے ہمیں نماز میں قتل کر دیا۔

اس سے معلوم ہوا کہ یہ لوگ مسلمان ہو چکے تھے۔ ابن القیم نے تصریح کی ہے کہ خزاعہ قبیلہ مرالظہران میں رہتا تھا۔ یہ مقام جدہ کے قریب آج بھی مشہور ہے پھر بدیل بن ورقار نے آکر حالات بتائے۔ حضور اقدس ﷺ

عالم القرآن

کو سخت رنج ہوا۔ یہ صریح عہد شکنی تھی جس کے ذمہ دار قریش تھے۔ حضور اقدس ﷺ نے ایک قاصد قریش کے پاس روانہ کیا اور تین صورتیں پیش کیں کہ ان میں سے کوئی ایک منظور کر لی جائے۔

۱- مقتولوں کا خون بہا دلایا جائے۔

۲- قریش بنو بکر کی حمایت سے دست کشی کریں۔

۳- صاف کہہ دیں کہ معاہدہ حدیبیہ ٹوٹ گیا۔

قرطہ ابن عمرو نے قریش کی طرف سے کہا کہ صرف تیسری صورت منظور ہے۔ یعنی یہ کہ معاہدہ حدیبیہ ٹوٹ گیا حضور اقدس ﷺ نے مکہ کی تیاری شروع کر دی۔ اتحادی قبائل کے پاس قاصد بھیجے کہ تیار ہو کر آئیں غرض رمضان ۸ھ کو کوکبۂ نبوی نہایت عظمت و شان سے مدینہ سے روانہ ہوا۔ دس ہزار آراستہ فوج رکاب میں تھی۔ قبائل عرب راستہ میں آکر ملتے جاتے تھے۔ بالآخر آپ مکہ میں فاتحانہ داخل ہو گئے۔ فتح کے بعد آپ مدینہ واپس ہوئے اور مکہ میں حضرت عتاب بن اسید کو امیر مقرر کیا۔

۸ھ میں مکہ فتح ہوا لیکن چونکہ ابھی تک ملک میں اچھی طرح امن قائم نہیں ہوا تھا ۸ھ میں مسلمانوں نے حج حضرت عتاب بن اسید کی امارت میں کیا۔ اگرچہ حج کے ارکان مشرکین کے اہتمام میں انجام پائے۔

صدیقِ اکبر کا حج

اب ۹ھ ہے۔ غزوہ تبوک سے واپسی کے بعد حضور اقدس ﷺ نے ذیقعدہ ۹ھ میں تین سو مسلمانوں کا ایک قافلہ مدینہ منورہ سے حج کے لیے روانہ فرمایا۔ ان میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ قافلہ کے امیر اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نقیب تھے۔ اور حضرت سعد بن ابی وقاص، حضرت جابر اور حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم معلم تھے۔ اور قربانی کے لیے حضور اقدس کی جانب سے بیس اونٹ ساتھ تھے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مناسکِ حج کی لوگوں کو تعلیم دی۔ یوم النحر میں خطبہ دیا۔ اس کے بعد حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کھڑے ہوئے اور سورہ برأت کی آیتیں پڑھ کر سنائیں۔ اور اعلان کر دیا کہ اب کوئی مشرک خانہ کعبہ میں داخل نہ ہو سکے گا۔ کوئی برہنہ حج نہ کرے گا اور وہ تمام معاہدے جو مشرکین سے تھے ان کے نقض عہد کی وجہ سے آج سے چار ماہ کے بعد ٹوٹ جائیں گے۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس اعلان کی اس زور سے منادی کی کہ گلا بیٹھ گیا۔ یہ تاریخِ اسلام میں دوسرا حج ہے۔ اس حج میں مشرکین بھی شریک تھے۔ مگر مسلمانوں نے حج اپنے طریق پر کیا اور مشرکین نے اپنے طریق پر۔ الغرض حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حج کرایا۔ خطبہ پڑھا، مناسکِ حج کی تعلیم دی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یوم النحر میں جمرہ کے قریب کھڑے ہو کر اعلان کیا جیسا کہ ان کو رسول اللہ ﷺ نے کہا تھا

اور جس کے ساتھ عہد تھا اس کا عہد واپس کرنے کا اعلان کیا اور کہا کہ اے لوگو کوئی کافر جنت میں نہ جائے گا اور اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے گا اور نہ کوئی ننگا بیت اللہ کا طواف کرے اور جس کا عہد رسول اللہ کے ساتھ کسی مدت کے لیے ہے وہ باقی رہے گا۔ حافظ ابن القیم لکھتے ہیں کہ حمیدی نے روایت کیا ہے کہ زید بن نفیع کہتے ہیں کہ میں نے حضرت علیؓ سے دریافت کیا کہ آپ کو حج میں کس کام کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ فرمایا کہ چار احکام لے کر گیا۔

۱۔ یہ کہ جنت میں مومن کے سوا کوئی داخل نہ ہوگا۔

۲۔ کوئی ننگا بیت اللہ کا طواف نہ کرے گا۔

۳۔ مسلمان اور کافر اس سال کے بعد کعبہ میں جمع نہ ہوں۔

۴۔ رسول اللہ کے ساتھ جس کا معاہدہ کسی معین مدت کے لیے ہے وہ معاہدہ اس مدت تک قائم رہے گا اور جس کا معاہدہ کسی مدت کے لیے نہیں اس کو چار ماہ کی مہلت ہے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ کرنے کے بعد سورہ برأت کا اعلان کرنے کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ کیا اس سے کچھ کو وسوسہ ہوا کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روانگی حضرت ابوبکرؓ کی معزولی ہے۔ یہ شبہ بے خبری اور بے علمی اور حالات سے ناواقفیت سے پیدا ہوا ہے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے خود فرمایا کہ میں مامور ہوں۔ امیر آپ ہیں۔ حافظ ابن القیم زاد المعاد میں لکھتے ہیں کہ ابن سعد کی تصریح کے مطابق صدیق اکبرؓ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ کیا حضورؐ نے آپ کو مناسک حج ادا کرنے کے لیے روانہ کیا ہے؟ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا نہیں۔ میں تو صرف سورہ برأت کا اعلان کروں گا۔ حج آپ کرائیں گے یہ اس بات کی شہادت ہے کہ امیر حج حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ تھے لیکن سوال یہ ہے کہ جب امیر حج ابوبکرؓ تھے تو حضرت علیؓ کو کس مقصد کے لیے روانہ کیا گیا تھا۔ اس میں شبہ نہیں ہے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سورہ برأت کے اعلان کے لیے بھیجا۔ لیکن اس کی وجہ یہ نہیں کہ ابوبکرؓ بحالت امارت یہ فرض انجام نہیں دے سکتے تھے بلکہ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ معاہدین کے معاہدوں کے ختم ہونے کا براءة من الله و رسوله کا اعلان کرنے کے لیے گئے تھے اور چونکہ عرب میں دستور یہ تھا کہ معاہدے کو ختم کرنے کا اعلان صرف وہی کر سکتا ہے جس سے معاہدہ ہوا یا پھر اسی کے خاندان کا کوئی فرد۔ ابوبکر سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نسبی تعلق نہ تھا اور حضرت علی رضی اللہ عنہ آپ کے چچیرے بھائی اور داماد تھے اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سورہ برأت دے کر یہ فرض سپرد کیا۔ دستور کے مطابق اگر

معاہدوں کے ختم ہونے کا حضور یا ان کا رشتہ دار اعلان نہ کرتے تو مشرکین عرب معاہدوں کو ختم نہ سمجھتے۔ شاہ عبد الحق نے مدارج النبوت میں اور امام بغوی نے معالم التنزیل میں اس طرف اشارا کیا ہے کہ حضور نے حضرت صدیق کو ہم آیتیں سورہ برات کی دی تھیں کہ ان کا اعلان کریں۔ لیکن اس کے بعد حضور نے حضرت علی رضہ کو اپنی ناقہ العضبا پر روانہ کیا اور واپسی کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے حضور سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ کیا میرے خلاف کوئی حکم نازل ہوا فرمایا نہیں لیکن مناسب یہی تھا کہ میرے اہل میں کوئی شخص معاہدے کے متعلق اعلان کرے۔

اس سے اس کی نشاندہی ہوتی ہے کہ عرب دستور کی خاطر ایسا کیا گیا ہے۔

علما نے اس کی ایک اور وجہ بھی بتائی ہے کہ سورۃ براءت میں اللہ سبحانہ کی جانب سے صدیق اکبر کی مدح وثنا کی گئی ہے۔ اس لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کا جناب الٰہی میں مقام بتانے کے لیے ضروری تھا کہ خاندان نبوت کا کوئی فرد یہ بتائے نہ کہ خود ابوبکر اپنے مناقب پیش کریں۔

بہر حال زیر تشریح آیت کا تعلق اس معاہدے سے ہے سورۃ براءت کی ان ابتدائی آیتوں میں اس کو ختم کیا گیا ہے اور اس روز اس کی مدت مقرر کر دی گئی یعنی چار مہینے۔ یہ ان لوگوں کے لیے ہے جن کا معاہدہ میعادی نہ تھا یا جو میعادی معاہدہ کی عہد شکنی کر چکے تھے ان سے معاہدہ ختم کرنے کا اعلان ہوا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ان معاہدین کو ہم ماہ کی مہلت دی گئی ہے۔ یہ اعلان ۱۰ ذوالحجہ کو ہوا۔ اس وقت سے ۱۰ ربیع الثانی پر یہ مدت ختم ہوگی۔ یہ مہلت ان کو اس لیے دی گئی ہے کہ اس زمانے میں اپنے بارے میں خوب سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں، ان کو اپنا مقام متعین کرنے میں آسانی ہو، آیا وہ اسلامی نظام کو قبول کرنا چاہتے ہیں۔ یا ملک چھوڑنا چاہتے ہیں یا پھر جنگ کرنا چاہتے ہیں جو کچھ کریں خوب سوچ کر کریں۔ طبری نے بحوالہ سدی بتایا ہے کہ اس اعلان کے بعد عام طور پر لوگوں نے اسلام قبول کر لیا۔

اس طرح یہ قرآنی حکم واما تخافن من قوم خیانۃ فانبذ الیھم علی سواء پر نبوت نے عمل کر کے دکھا دیا جیسا کہ امام بغوی نے لکھا ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ جب تمہیں کسی قوم سے خیانت کا اندیشہ ہو تو علی الاعلان اس کا معاہدہ اس کی طرف پھینک دو اور اسے خبردار کر دو کہ اب ہمارا تمہارا کوئی معاہدہ نہیں۔ اس اعلان کے بغیر کسی معاہد قوم کے خلاف جنگی کارروائی شروع کر دینا درست نہیں۔ اسی ضابطہ اخلاق کے مطابق معاہدات کی منسوخی کا یہ اعلان عام ان تمام قبائل کے خلاف کیا گیا جو عہد و پیمان کے باوجود ہمیشہ اسلام کے خلاف سازشیں کرتے رہتے تھے۔ اور موقع پاتے ہی پاس عہد کو بالائے طاق رکھ کر دشمنی پر اتر آتے تھے۔ یہ کیفیت بنی کنانہ، بنی ضمرہ اور شائد ایک آدھ قبیلہ کے سوا باقی ان تمام قبائل کی تھی جو اس وقت تک شرک پر قائم تھے۔ یہ اعلان کس طرح پہنچایا گیا۔ اس کا اندازہ کرنا ہو تو محمد بن کعب کے یہ الفاظ پڑھیے۔ قرأھا علیھم فی منازلھم ایک ایک گھر کے دروازے پر اس کی منادی کی گئی۔ بلکہ ابوہریرہ کہتے ہیں

کہ میرا تو گلا بھی شور مچا کر بیٹھ گیا۔

اس اعلان برأت کے بعد پورے جزیرۃ العرب میں شرک اور مشرکین کا وجود غیر قانونی اور قابل دست اندازی پولیس ہو گیا ان کے لیے سارے ملک میں کوئی جائے پناہ نہ تھی بلکہ عرب کا بیشتر علاقہ اسلام کے زیر نگین آچکا تھا۔ ان کو اب تک آس نہیں تھی کہ کوئی بیرونی طاقت مسلمانوں پر حملہ آور ہو کر اسلام کا شیرازہ بکھیر دے گی لیکن اللہ سبحانہ نے ان کی امیدوں پر پانی پھیر دیا اور معاہدہ کے ختم ہونے کا اعلان کر کے ان کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہ چھوڑا کہ یا تو لڑنے پر تیار ہو جائیں۔ یا ملک سے اپنا بستر گول کریں —— اور یا پھر اسلام کے حلقہ میں آجائیں۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ معاہدے کی نسبت آیت میں مسلمانوں کی طرف اور مشرکین کو بطور معاہد پیش فرما کر فسخ معاہدے کی نسبت اللہ و رسولہ کی طرف کی گئی ہے اس میں اشارا ہے کہ معاہدے کو ختم اللہ سبحانہ کے حکم کے مطابق کیا جا رہا ہے اور اسلام کے ضابطہ اخلاق کی درست ہے کہ وہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ نہیں کرتا بلکہ اپنے مخاطبوں کو حالات پر غور کرنے کی مہلت دیتا ہے

حج کے موقعہ پر عام منادی

۲ اللہ اور اس کے رسول کی جانب سے یہ اعلان عام ہے حج کے بڑے دن کہ اللہ و رسول مشرکین کے معاہدوں سے بری الذمہ ہیں۔ لہٰذا اگر ظلم و سرکشی سے توبہ کر لو تو یہ تمہارے لیے مفید ہے اور اگر نہ مانو گے تو خوب سمجھ لو کہ تم اللہ کو عاجز نہیں کر سکتے اور جو لوگ کفر و شرک کو اپنائے ہوئے ہیں ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری دے دیجئے۔ یہ اعلان غالباً ان قبائل کے حق میں تھا جنھوں نے میعادی معاہدہ کیا۔ پھر خود ہی عہد شکنی کی یعنی ایسے لوگوں سے اب کوئی معاہدہ باقی نہیں ہے۔ اگر یہ سب لوگ کفر و شرک سے توبہ کر لیں تو ان کی دنیا و آخرت دونوں سنور جائیں گی۔ نہیں تو خدا کا جو کچھ ارادہ ہے تطہیر جزیرۃ العرب کا وہ پورا ہو کر رہے گا کوئی طاقت اور تدبیر اسے مغلوب نہیں کر سکتی۔ اور کافروں کو کفر و بدعہدی کی سزا مل کر رہے گی ان قبائل کی عہد شکنی اگرچہ فتح مکہ سے پہلے ہو چکی تھی بلکہ اسی کے جواب میں مکہ فتح کیا گیا تاہم ۹ھ ہجری میں حج کے موقعہ پر اس کا بھی اعلان عام کرا دیا گیا تاکہ واضح ہو جائے کہ اس قسم کے جتنے لوگ ہیں ان سے کسی قسم کا معاہدہ اب باقی نہیں رہا[1]

یوم حج اکبر کیا ہے

حج کے بڑے دن یوم الحج الاکبر سے کیا مراد ہے۔ شارحین قرآن اس موضوع پر کسی ایک مرکزی خیال پر متفق نہیں ہیں۔ ایک رائے یہ ہے کہ عرفات میں وقوف کا دن یوم الحج الاکبر ہے۔ یہ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے اس رائے کو حضرت عمر بن الخطاب، عبداللہ بن عمر، عبداللہ بن الزبیر رضی اللہ تعالیٰ کی تائید حاصل ہے۔ عطاء ابن ابی رباح، طاؤس، مجاہد اور سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ بھی ان کے ہمنوا ہیں۔ یہی امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ کی رائے ہے۔

دوسری رائے یہ ہے کہ یوم الحج الاکبر سے مراد یوم النحر یعنی عید قربان کا دن ہے۔ حضرت علی، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ ابن ابی اوفی، المغیرۃ ابن شعبہ رضی اللہ تعالیٰ انہی کے ہمنوا ہیں۔ شارحین قرآن میں محمد بن جریر طبری اسی خیال کے علمبردار ہیں۔

ابوداؤد میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب حجۃ الوداع میں یوم نحر میں وقوف کیا تو دریافت فرمایا یہ کونسا دن ہے؟ لوگوں نے جواب میں فرمایا کہ یہ یوم النحر ہے آپ نے فرمایا کہ یہی یوم الحج الاکبر ہے۔ امام بخاری نے حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ مجھے یوم النحر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے اعلان عام کے لیے منیٰ میں روانہ کیا کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے گا اور کوئی عریاں بیت اللہ کا طواف نہ کرے گا اور یوم الحج الاکبر یوم النحر ہے۔ اسے حج اکبر اصغر کے مقابلہ میں کہا گیا ہے۔ ابن ابی اوفی رضی اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ یوم النحر ہی یوم الحج الاکبر ہے۔ اس میں قربانی کی جاتی ہے۔ اس میں حجامت ہوتی ہے احرام والے احرام کھول کر حلال ہوتے ہیں۔ سفیان ثوری اور ابن جریج رضی اللہ تعالیٰ کا خیال ہے کہ منیٰ کے سارے دن یوم الحج الاکبر ہیں گویا یوم زمانے اور وقت کے معنے میں ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ حج اکبر وہ ہے جس میں وقوف عرفات ہو اور عمرہ حج اصغر ہے یہ اور اس قسم کے خیالات ہیں جو عام تفسیر کی کتابوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔ دراصل اس سے کوئی مخصوص قسم کا حج مراد نہیں ہے اکبر کا لفظ صرف حج اصغر یا عمرہ سے تقابل و اشتراک کے لیے ہے۔ امام رازی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ یہی حج اکبر ہے عمرہ کے مقابلہ میں کہ وہ حج اصغر ہوتا ہے۔ ابن عربی نے قاضی اسماعیل مالکی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ، سارے خیالات کی چھان بین سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ حج اکبر حج ہی ہے۔

امام ابوحنیفہ اور امام شافعی رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی یہی کہتے ہیں۔ باقی اس آیت میں یوم الحج الاکبر تو اس سے مراد ۹ھ ہجری کا وہ حج ہے جو حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کی امارت میں ہوا کیونکہ یہ پہلا موقعہ ہے جب مسلمانوں کو باقاعدہ حج کی سعادت حاصل ہوئی اس سے پہلے مسلمانوں کو جو مواقع ملے ان میں وہ صرف عمرہ کر سکتے تھے۔ عمرہ کو حج اصغر کہتے ہیں۔ اس نسبت سے پورے حج کے لیے حج اکبر کا لفظ استعمال ہوا ہے۔

اذان من اللہ ورسولہ بھی اسی معاہدہ کے بارے میں ہے جس کے متعلق آغاز سورت میں براءۃ من اللہ ورسولہ کہہ کر اطلاع دی تھی یہ اسی کے متعلق اعلان عام ہے۔ اذان کے معنے اعلان عام کے ہیں اس میں حکم ہوا ہے کہ حج کے دن یہ منادی کرادی جائے کہ اللہ و رسول کا اس قسم کے معاہدوں سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اب جو توبہ کر کے

اسلام قبول کرے اس کے لیے خیر کا دروازہ کھلا ہوا ہے اور جو روگردانی کریں گے وہ اللہ کی پکڑ سے بچ نہیں سکیں گے۔ حج کے موقعہ پر اعلان عام کرنے کا حکم اس لیے ہوا ہے کہ عرب میں حج ہی کا اجتماع ایک ایسا اجتماع ہوتا تھا جس میں ملک کے کونے کونے سے لوگ جمع ہوتے تھے جس کے سبب ہر وہ بات جو وہاں پھیل جائے پورے ملک میں پھیل جاتی۔ خاص طور پر ۹ھ کے حج تک چونکہ صورت یہ تھی کہ مشرکین بھی حج کو جاتے تھے اس لیے وہاں کا اعلان سب تک پہنچ جاتا تھا خواہ مسلمان ہوں یا کافر۔ اسی لیے الی الناس کی تعبیر آئی ہے۔

مذکورہ اعلان سے مستثنیٰ

۴　ہاں مشرکین میں سے وہ لوگ جن سے تم نے معاہدہ کیا۔ پھر انھوں نے اپنے عہد کے نبا ہنے میں بالکل کوتاہی اور کمی نہیں کی اور نہ انھوں نے تمہارے مقابلہ میں کسی کی مدد کی وہ اس سے مستثنیٰ ہیں۔ لہٰذا چاہیے کہ ان سے جس قدر مدت کے لیے عہد ہوا ہے اس مدت کو پورا کرو اللہ متقیوں سے محبت کرتا ہے۔ یہ استثناء ان قبائل کے لیے ہے جن کا معاہدہ میعادی تھا اور وہ اس پر برابر قائم رہے۔ کچھ کوتاہی ایفائے عہد میں نہیں کی نہ بذاتِ خود کوئی کارروائی خلافِ عہد کی اور نہ دوسرے بدعہد اہل کو مدد پہنچائی مثلاً بنی ضمرہ، بنی مدلج ان کے متعلق اعلان کر دیا گیا کہ میعاد معاہدہ منقضی ہونے تک مسلمان بھی برابر معاہدہ کا احترام کریں گے۔ میعاد ختم ہونے کے بعد کوئی جدید معاہدہ نہیں اس وقت ان کے لیے بھی وہی راستہ ہے جو اوروں کے لیے تھا۔[1]

علامہ قرطبی فرماتے ہیں اس آیت الا الذین عاھدتم من المشرکین میں لفظ الا استثناء کے لیے ہے اور استثناء میں دو احتمال ہیں۔ استثناء متصل ہو یا منقطع ہو۔ متصل ہونے کی صورت میں معنے یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ کی جانب سے اعلان براءت ہے مشرکین کے لیے سوائے ان لوگوں کے جن سے میعادی معاہدہ ہو۔ اور منقطع ہونے کی صورت میں معنے یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ ان سے براءت کا اعلان کرتا ہے لیکن ان لوگوں سے نہیں جن سے تم نے میعادی معاہدہ کیا ہے ان کی میعاد معاہدہ پوری کرنی چاہیے۔

یہاں شارحین قرآن نے اس سوال کو بھی خاصی اہمیت دی ہے کہ استثناء کی صورت میں مستثنیٰ منہ کون ہے۔ علامہ زمخشری کی رائے میں مستثنیٰ منہ محذوف ہے اور یہ فسیحوا فی الارض میں ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ آیت کا روئے سخن اہل ایمان کی طرف ہے ان سے کہا جا رہا ہے کہ اللہ و رسول ان معاہدین سے بری الذمہ ہے جن سے اے مسلمانو! تم نے عہد و پیمان کیا ہے۔ لہٰذا تم ان سے کہہ دو کہ چار مہینے گھومو پھرو لیکن یہ بات ان سے نہ کہنا جن سے تم نے عہد کیا ہے اور انھوں نے تا حال ایفائے عہد

[1] افادات شیخ الاسلام

میں کوئی کوتاہی نہیں کی ہے ان کے معاہدہ کی مدت پوری کرنا تمہارا فرض ہے ان کے ساتھ عہد شکنی کرنے والوں کا معاملہ نہ کرو۔
حافظ ابن کثیر نے بھی تعبیر کے تھوڑے سے تغیر سے یہ بات فرمائی۔ ان کے ارشاد کا خلاصہ جو کچھ میں سمجھا ہوں وہ

یہ ہے:
یہ چار ماہ کی مدت کی تعیین سے استثنا ہے جن کا عہد میعادی نہیں تو ان کے لیے مدت چار ماہ ہے ان کو آزادانہ ملک میں گھومنے اور پھرنے کا قانونی حق ہے مگر جن کا عہد میعادی ہے ان کے لیے مدت وہی ہے جو معاہدہ میں لکھی ہے لیکن شرط یہ ہے کہ انھوں نے عہد شکنی نہ کی ہو اور اہل ایمان کے مدمقابل کسی گروہ کی مدد نہ کی ہو۔

یہ بات بھی یہاں توجہ کے لائق ہے کہ یہ کون لوگ ہیں جن سے مسلمانوں نے میعادی معاہدہ کیا تھا اور انھوں نے نہ تو عہد شکنی کی اور نہ ہی مسلمانوں کے خلاف کبھی کسی مدمقابل کو امداد بہم پہنچائی۔

علامہ بغوی نے معالم التنزیل میں انکشاف فرمایا ہے کہ یہ مستثنیٰ قبائل بنوضمرہ۔ اور بنوکنانہ ہیں۔ سدی کی رائے میں یہ بنوضمرہ بنومدلج ہیں۔ امام مجاہد اس کا مصداق خزاعہ اور مدلج کو بتاتے ہیں محمد بن عبادہ نے بنو خزیمہ کا نام لیا ہے اور عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما حدیبیہ میں قریش کو بتاتے ہیں۔ بہرحال یہ امر تو یقینی ہے کہ اس وقت ایسے ضرور موجود تھے اس کی تعیین پر قرآن کی تشریح موقوف نہیں قرآن ہمیشہ کے لیے ضابطہ اخلاق پیش کر رہا ہے۔

قبائل سے معاهدے

تاریخ کے مطالعے سے امام بغوی کی تائید ہوتی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک قبیلہ سے نہیں متعدد قبائل سے مدینہ پہنچنے کے بعد سیاسی معاہدے کیے تھے۔

اس کا پتہ تو نہیں چلتا لیکن امکان ہے کہ مدینے کے انصار نے آس پاس کے کچھ قبائل دوستی اور حلیفی زمانہ جاہلیت میں بھی کر رکھی ہو اگر ایسا رہا ہے تو یقیناً وہ معاہدے اسلامی مملکت کو وراثت میں ملے ہوں گے۔ رمضان ۱ھ میں ہجرت کے چھ ماہ بعد ہی جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قریش کے متعلق اپنی سیاست یہ مقرر فرمائی کہ ان پر معاشی دباؤ ڈالا جائے اور اس سلسلے میں ایک فوجی دستہ قبائل جہینہ کے علاقہ میں روانہ کیا تو وہاں کا سردار مسلمانوں کا حلیف تھا۔ اس فوجی دستہ میں کوئی انصاری نہ تھا سب مہاجرین ہی تھے اس لیے مجدی بن عمرو الجہنی سے یا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کے بعد خود کوئی معاہدہ کیا تھا یا کم از کم انصار کی پرانی حلیفی کی تجدید کر کے اسے مدینے کے مسلمانوں کے لیے عام کر دیا تھا۔ ابن سعد اور ابن ہشام اس حلیفی کا تو ذکر کرتے ہیں مگر نہ تو معاہدہ حلیفی درج کرتے ہیں اور نہ کوئی مزید تفصیل کہ وہ کب

اور کہاں ملے ہوا تھا بجز اس ایک اہم اطلاع کے کہ مجدی ابن عمرو مسلمانوں اور قریشیوں دونوں کا حلیف تھا۔
سنہ ۲ھ کے آغاز میں صفر کے مہینے میں رسول اللہ ﷺ خود ایک جمعیت کے ہمراہ مدینے کے جنوب مغرب میں کاروانی اسٹیشن ابوا تشریف لے گئے۔ قریشی کاروانی اس دفعہ بھی مسلمانوں کے بعد از وقت آنے کے باعث جا چکے تھے۔ حضور اقدس ﷺ نے خالی ہاتھ واپسی کی مگر آس پاس کے لوگوں سے تعلقات پیدا کیے اور بنی ضمرہ کے ایک سردار مخشی بن عمرو سے دائمی حلیفی کا ایک معاہدہ کیا۔

یہ اہم معاہدہ جو غالباً اولین بھی ہے یہاں درج کیا جاتا ہے۔

۱۔ مہربان رحم کرنے والے خدا کے نام سے۔
۲۔ یہ ایک تحریر ہے محمد رسول اللہ کی طرف سے بنی ضمرہ کے لیے۔
۳۔ اس بات پر کہ ان کی جانوں اور مالوں کو تحفظ ہو گا۔
۴۔ اور یہ کہ انہیں ہر ایسے دشمن کے خلاف مدد دی جائے گی جو ظلم سے ان پر اچانک آ پڑے۔
۵۔ ان کے ذمہ ہے کہ نبی کی مدد اس وقت تک کرتے رہیں۔ جب تک سمندر سیپ کو گیلا کرتا رہے۔ الا یہ کہ اللہ کے دین کے بارے میں وہ جنگ کریں یا ان سے جنگ کی جائے۔
۶۔ ان پر اس بارے میں اللہ اور اس کے رسول کا ذمہ ہے
۷۔ اور ان کو مدد اس شرط پر دی جائے گی کہ وعدہ وفا کریں اور عہد شکنی سے بچیں۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ان ہی کے ہمسایوں بنی مدلج سے جو معاہدہ ہوا اس کے متعلق ابو عبید نے کتاب الاموال میں تصریح کی ہے کہ وہ سنہ ۹ھ تک مسلمان نہیں ہوئے اور سنہ ۹ھ میں سورہ براءت کے نزول پر ان کو بھی ایک نہایت دیا گیا کہ ان کا معاہدہ دوستی چار ماہ بعد ختم سمجھا جائے الا یہ کہ وہ اسلام قبول کر لیں۔ یہ قبیلہ مدلج وہی ہے جس کے سردار سراقہ ابن مالک نے ہجرت کے موقعہ پر قریشی انعام کے لالچ میں اولاً حضور اقدس ﷺ کا تعاقب کیا اور اعجاز نبوت دیکھ کر معافی مانگی تھی۔ جب حضور اقدس ﷺ غزوۂ ذات العشیرہ میں سراقہ کے علاقہ میں آئے تو اس نے نہ صرف حلیفی خوشی سے قبول کی بلکہ ساری مسلمان فوج کی بڑی شاندار دعوت کی۔ بلاذری نے انساب الاشراف میں لکھا ہے کہ مہمان نوازی کے دور تعلق سے قریشی کارواں جسے پکڑنے کے لیے وہاں آئے تھے ہاتھ سے نکل گیا۔

قبیلہ جہینہ کے سردار مجدی بن عمرو کی مسلمانوں اور قریش دونوں کے ساتھ بیک وقت دوستی کا ذکر آیا۔ اس قبیلے کی دوشاخوں سے کیے ہوئے معاہدہ کا متن ابن سعد نے بتایا ہے۔ اس کے شرائط کم و بیش وہی ہیں جو بنو ضمرہ کے معاہدے کے ہیں۔ معاہدہ یہ ہے۔

ان کو ان کی جان و مال پر امان ہے۔
۱۔ ان کو ہر ایسے کے خلاف مدد دی جائے گی جو ان پر ظلم کرے یا ان سے جنگ کرے بجز دین اور اہل و عیال کے۔
۲۔ اور ان کے خانہ بدوشوں کو بھی جو معاہدے کی تعمیل اور عہد شکنی سے اجتناب کریں وہی حقوق ہوں گے جو ان کی بستیوں میں رہنے والوں کے ہیں۔
۳۔ اور اللہ ہی سے مدد چاہی جاتی ہے۔
۴۔ بنو ضمرہ کا قبیلہ بہت بڑا تھا اس کی ایک شاخ بنی عبد بن عدی تو مکے کے حدود حرم میں جا بسی تھی۔ اسی کی ایک اور شاخ بنو غفار کہلاتی تھی۔ اس قبیلہ کا معاہدہ الفاظ اور شرائط مندرجہ کے باعث جنگ بدر کے قریب قریب زمانے کا معلوم ہوتا ہے۔

معاہدہ یہ ہے۔

۱۔ یہ معاہدہ بنو غفار کے لیے ہے۔
۲۔ یہ کہ وہ مسلمانوں میں سے سمجھے جائیں گے ان کے وہی حقوق ہیں جو مسلمانوں کے اور ان پر وہی واجبات ہیں جو مسلمانوں پر ہیں۔
۳۔ اور یہ کہ نبی نے ان کے مالوں اور ان کی جانوں کے متعلق اللہ اور اس کی ذمہ داری قبول کی ہے۔
۴۔ ان کو ایسے دشمن کے خلاف مدد دی جائے گی جو ان پر ظلم کے ساتھ پیش قدمی کرے۔
۵۔ اور یہ کہ نبی جب ان کو اپنی مدد کے لیے بلائیں تو یہ قبول کریں گے اور ان پر آپ کی مدد واجب ہوگی۔ بجز اس کے جو دین کے بارے میں جنگ ہو۔
۶۔ یہ تحریر کسی گناہ کے مواخذے میں آڑے نہ آئے گی۔

ان کے علاوہ اور بھی قبائل سے آپ نے معاہدے کیے۔ مثلاً مزینہ یہ لوگ مدینے سے صرف بیس میل کے فاصلے پر رہتے تھے اشجع قبیلہ یہ قبیلہ غطفان کی ایک شاخ ہے۔ اسی قبیلہ کا سردار نعیم بن مسعود الاشجعی ہے۔ اس کے علاوہ خزاعہ سے آپ نے حلفی کا معاہدہ کیا تھا۔ بہر حال مختلف قبائل سے رسول اللہ ﷺ نے جو معاہدے کیے تھے۔ ان معاہدین میں سے جنہوں نے عہد شکنی نہیں کی اور جنہوں نے مسلمانوں کے خلاف اہل کفر کی مدد نہیں کی اور ان کے معاہدے میعادی تھی وہ اس ارشاد گرامی کی رو سے مستثنیٰ ہیں اس سے یہ بات مکمل کر سامنے آگئی کہ مذکورہ بالا اعلان منافقین عہد ہی سے متعلق تھا۔ لیکن ٹھہری یہ حقیقت بھی اس سے معلوم ہوتی ہے کہ یہ معاہدے بھی صرف ان کی قرار دادہ مدت ہی تک باقی رکھنے کی اجازت ہوتی تھی مدت گذر جانے کے بعد یہ بھی کالعدم ہوگئے۔ آئندہ کے لیے کسی نئے معاہدے کی اجازت نہیں دی گئی۔ چنانچہ اس اعلان براءت کے

بعد حضور اقدس ﷺ نے مشرکین کے کسی گروہ سے کوئی معاہدہ نہیں کیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ان مشرکین سے جو معاہدے کیے گئے تھے وہ صرف دعوت و تبلیغ کی خاطر کیے گئے تھے۔ اب تبلیغ و دعوت اور اتمام حجت کا دور ختم ہو رہا تھا اس لیے اب ان کے کسی گروہ سے کسی معاہدے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ایفائے عہد کا اسلام کے پیش کردہ ضابطہ میں کیا مقام ہے کہ ان مشرکوں کے ساتھ جن کا معاہدہ میعادی ہے اور جنھوں نے معاہدہ کی حرمت کو قائم رکھا ایفائے عہد کو اللہ سبحانہ نے تقویٰ بتایا ہے اور جو اس عہد کو پورا کریں ان کو متقی کہا ہے اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا۔ مگر یہ ملحوظ خاطر رہے کہ یہ انفرادی تقویٰ نہیں بلکہ اجتماعی اور سیاسی تقویٰ ہے۔ اسلام میں جس طرح ہر مسلمان سے انفرادی تقویٰ کا مطالبہ ہے اسی طرح مسلمانوں سے من حیث الجماعت اجتماعی اور سیاسی تقویٰ کا بھی مطالبہ ہے یعنی مسلمان دوسری قوموں سے جو معاملات اور معاہدات کریں ان میں راست باز صداقت شعار اور وفادار بن کر رہیں۔ کسی عہد اور قول و قرار کی کوئی ادنیٰ خلاف ورزی بھی نہ کریں۔ السرخسی نے شرح السیر الکبیر میں عہد کی وفاداری پر زور دیتے ہوئے لکھا ہے کہ بدعہدی اتنا بڑا سنگین جرم ہے کہ اس کی صورت بھی حرام ہے۔ السید رشید رضا نے اس موقعہ پر یہ بات بالکل برمحل فرمائی ہے کہ یہ آیت قرآنی بتا رہی ہے کہ

۱۔ عہد کو پورا کرنا اسلام کے ضابطہ اخلاق میں سب سے اہم فریضہ ہے۔

۲۔ عہد موقت اور میعادی کو وقت مقررہ سے پہلے ختم کرنا جائز نہیں ہے۔

۳۔ وفاء عہد کی بنیادی شرط یہ ہے کہ معاہدہ کی بھرپور حفاظت کی جائے۔

۴۔ مخالف کی جانب سے وفاء عہد کی شرائط میں یہ بات داخل ہے کہ وہ ہمارے مخالفین کی کسی نوع سے امداد نہ کرے

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب ——— اس آیت پر لطیف فوائد علمی پیش فرماتے ہیں۔ آئیے ان سے بھی استفادہ فرمائیے۔

فتح مکہ کے وقت مشرکین کی قسمیں

فتح مکہ کے وقت مشرکین چار قسموں میں منقسم تھے۔

ایک قسم ان لوگوں کی تھی جن سے حدیبیہ میں معاہدہ ہوا تھا اور انھوں نے خود اس معاہدہ کی دھجیاں اڑا دی تھیں۔

دوسرے وہ قبائل تھے جن سے میعادی معاہدہ آپ نے کیا تھا اور وہ اس معاہدے پر قائم تھے جیسے بنی کنانہ کے دو قبیلے بنی ضمرہ، بنی مدلج۔

تیسرے کچھ قبائل ایسے تھے جن سے معاہدہ صلح غیر میعادی تھا۔

چوتھے وہ لوگ تھے جن سے کسی قسم کا کوئی معاہدہ نہ تھا۔
پہلی جماعت یعنی قریش مکہ جنھوں نے معاہدہ حدیبیہ کو توڑا تھا اور جن کی داستان آپ تفصیل سے سن چکے ہیں ان کے بارے میں قرآن کا فیصلہ آگے آیت فاذا انسلخ الاشھر الحرم میں آرہا ہے۔
دوسری جماعت جن سے معاہدہ میعادی تھا اور وہ اس پر قائم تھے ان کا حکم الا الذین عاھدتم من المشرکین ثم لم ینقصوکم شیئا ولم یظاھروا علیکم احدا فاتموا الیھم عھدھم الی مدتھم ان اللہ یحب المتقین میں بتایا گیا ہے کہ ان کی مدت معاہدہ پوری کی جائے۔ یہ حکم بنی ضمرہ اور بنو مدلج کا ہے۔
تیسری اور چوتھی جماعت یعنی جن سے معاہدہ غیر میعادی تھا یا جن سے معاہدہ نہ تھا ان کا حکم یہ ہے کہ ان کو چار ماہ کی مہلت دی گئی ہے اور معاہدہ والوں سے معاہدہ ختم کر دیا گیا۔ براءۃ من اللہ میں اسی کا ذکر ہے۔

معاہدہ ختم ہونے پر مہلت دینے کا اعلان

ان احکام کا نفاذ اور مہلت اس وقت سے شروع ہوگی جب ان احکام کا اعلان بھرپور طریقہ پر تمام عرب میں ہو جائے اس اعلان عام کے لیے یہ انتظام کیا گیا کہ ۹ھ میں ایام حج میں منیٰ و عرفات میں اس کا اعلان کیا جائے واذان من اللہ و رسولہ میں اسی کو صراحۃً بتایا گیا ہے۔ اسی حکم ربانی کی تعمیل کے لیے ۹ھ کے حج میں حضرت صدیق اکبر اور علی مرتضیٰ کو تین سو صحابہ کے ساتھ مکہ روانہ کیا اور اعلان کرایا۔
ابتدائی آیات میں یہ رہنمائی ملتی ہے کہ کمزور قوموں کو بلا مہلت کسی جگہ سے نکل جانے کا حکم یا ان پر یکبارگی حملہ بزدلی اور غیر شریفانہ فعل ہے جب ایسا کرنا ہو تو پہلے اعلان عام کیا جائے اور ان کو اس کی مہلت دی جائے کہ اگر وہ ہمارے قانونی نظام کو پسند نہیں کرتے ہیں تو آزادی کے ساتھ جہاں چاہیں جا سکتے ہیں یہ بات قرآن کی آیت فسیحوا فی الارض سے معلوم ہو رہی ہے۔
یہ بھی ان آیات ہی کی رہنمائی ہے کہ کسی قوم سے معاہدہ صلح کر لینے کے بعد اگر معاہدہ میعادی ہو اور آپ میعاد سے پہلے ختم کرنا چاہتے ہیں تو اگرچہ چند شرائط کے ساتھ اس کی اجازت ہے لیکن بہتر یہی ہے کہ معاہدہ کی میعاد پوری کی جائے۔
یہ بات بھی ان آیات سے مترشح ہو رہی ہے کہ فریق مقابل کے ساتھ ہر معاملہ میں مسلمانوں کے دھیان میں یہ بات رہنی چاہیے کہ مسلمان کی دشمنی کسی کی ذات سے نہیں بلکہ کافرانہ افکار، اطوار اور اقدار سے ہے۔
آخر میں یہ بھی واضح کر دیا گیا کہ عہد کا پورا کرنا صرف قومی اور سیاسی مصالح کی بنا پر نہ ہو بلکہ اس کی بنیاد سرتاسر تقویٰ ہو اور بس۔۔۔۔۔۔

آیت کی واقعات کی روشنی میں تشریح آپ کے سامنے آچکی ہے اب صرف ایک شبہ یا وسوسہ کا ازالہ باقی ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

واقعہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس ۹ھ میں حج کا امیر بنا کر روانہ کیا اور بعد کو معاہدوں کی تنسیخ کے لیے سورۂ برارت کی ابتدائی آیات دے کر آپ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ کیا۔ لوگوں کو وسوسہ یہ ہوا ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ افضل ہیں اور اس لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ ہی خلافت کے حقدار ہیں۔

اس کا جواب اگرچہ تفسیر کی عام کتابوں میں موجود ہے علامہ آلوسی نے روح المعانی میں، قرطبی نے الجامع میں اور السید رشید رضا نے المنار میں اس پر اجمالی اور تفصیلی بحث کی ہے۔ ان ہی بزرگوں کی پیروی میں یہاں معالم القرآن کے ناظرین کے منہ کا مزہ درست کرنے کے لیے کچھ عرض کرنا ضروری ہے۔

آفتاب ہدایت میں مولانا کرم الدین نے اس شبہ کی ترجمانی اس طرح کی ہے کہ:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سورہ برارت کی تبلیغ کے لیے مکہ مکرمہ روانہ کیا تھا۔ بعد میں جبریل علیہ السلام نازل ہوئے اور پیغام دیا کہ اس کام کے لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ کرو۔ چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جا کر فرض تبلیغ احکام سورہ برارت انجام دیا تو جب آپ ایک سورت کی تبلیغ کی قابلیت نہ رکھتے تھے تو وہ خلیفہ کس طرح ہو سکتے تھے جس کے ذمے تمام احکام شرعیہ کی تبلیغ کا کام ہوتا ہے۔

اور اس کا جواب یہ دیا ہے کہ:

روایات اہل السنۃ اس بارے میں مختلف ہیں۔ اکثر روایات میں یوں ہے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے ہی سے امیر حج مقرر فرما کر روانہ فرمایا تھا۔ بعد ازاں سورۂ برارت کا نزول ہوا تو آپ نے اس کی تبلیغ کے لیے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا۔ اس صورت میں معترض کا اعتراض سرے سے غلط ٹھہرتا ہے۔ کہ جس کام کے لیے ابوبکر مامور ہوئے یعنی مناسکِ حج کی تعلیم کے لیے وہ کام آخر تک انھوں نے ہی انجام دیا۔ اس میں اعتراض کی کونسی بات ہے۔ دوسرا قول یہ ہے کہ جب حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو امیر حج بنا کر روانہ کیا گیا تو سورہ برارت کی تبلیغ کا کام بھی آپ کے سپرد کیا گیا۔ لیکن بعد کو حضرت علی رضی اللہ عنہ کو سورۂ برارت کی تبلیغ کا کام سپرد کر کے حضرت ابوبکر کا ہاتھ بٹانے کے لیے روانہ کیا گیا۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ہی کے ماتحت ہو کر حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یہ کام انجام دیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو خصوصیت سے اس کام کے لیے روانہ کرنے کی وجہ صرف یہ تھی کہ عرب میں دستور یہ تھا کہ جب کوئی

معاہدہ کرنا یا اس کو توڑنا ہوتا اور صلح یا جنگ کا معاملہ درپیش ہوتا وہ ایسے شخص کے ہاتھ سے انجام پذیر ہو سکتا تھا جو بادشاہ کی قوم میں سے اس کا فرزند یا داماد ہو۔ دوسرا کوئی شخص خواہ کتنی بڑی شخصیت رکھتا ہو اس کام کے لیے منتخب نہیں ہو سکتا ہے چونکہ سورہ براءت اس بات کا اعلان تھا کہ سابقہ معاہدات ختم ہو چکے ہیں اس لیے یہ فرض حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو انجام دینے کا حکم ہوا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چچازاد بھائی اور داماد تھے۔ اگر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی بجائے یہ اعلان کوئی اور کرتا تو مشرکین کو اس کے ماننے میں دستور کے مطابق تردد ہوتا اور وہ اعتراض کرتے کہ اگر ایسا اعلان مقصود تھا تو شاہی خاندان کے کسی خاص آدمی کے ذریعہ اس کا اعلان کیوں نہیں کیا گیا۔ مشرکین کے اسی عذر کو رفع کرنے کے لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اس ڈیوٹی پر لگایا گیا۔ اس میں قابلیت و عدم قابلیت کا کوئی سوال نہیں ہے۔ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی قابلیت میں ذرا متردد ہوتے تو آپ ان کو آغاز میں اس کام کے لیے کیوں منتخب فرماتے۔ یہ تو صرف حج کی امارت ہے ابوبکر کا سرکار نبوت کی جانب سے اس سے بھی بڑے اور ذمہ داری کے کاموں کے لیے انتخاب ہوا ہے۔ یہاں بھی جو کام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے سپرد ہوا ہے وہ بڑا اہم اور ذمہ داری کا کام تھا۔ سرکاری طور پر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اتنے بڑے اجتماع میں انتظامی سربراہ اور قائد حج بنا کر روانہ کیا گیا ہے وہاں پیش پا افتادہ حالات میں مقدمات کا فیصلہ اور مسائل شرعیہ کی تعلیم و تبلیغ جیسے امور کے لیے ایسی شخصیت کی ضرورت تھی جو بیک وقت مجتہد، منتظم اور مدبر ہو۔ سورۃ براءت کی آیات کی تلاوت کے لیے کوئی انتظامی، اجتہادی صلاحیت درکار نہ تھی۔ بتانا ہے کہ اس کو بنیاد بنا کر نہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر کوئی اعتراض ہو سکتا ہے اور نہ اس سے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی برتری ثابت ہوتی ہے۔

تاریخ، سیرت اور حدیث کی کتابوں میں یہ بات پوری وضاحت سے بتادی گئی ہے کہ اس موقعہ پر حضرت ابوبکر رضؓ کی حیثیت امیر کی اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی مامور کی تھی۔ نمازیں ابوبکر رضی اللہ عنہ کی اقتدا میں ہو رہی تھیں مناسک حج ان کی امامت میں ادا ہو رہے تھے۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جب ناقہ پر سوار ہو کر تشریف لائے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے دریافت کیا امیرا جئت ام مامورا۔ امیر ہو کر آئے ہو یا مامور حضرت علی رضی اللہ عنہ کا جواب یہ تھا کہ جئت مامورا۔ میں مامور کی حیثیت سے آیا ہوں۔

خلاصہ یہ کہ امارت حج کی ذمہ داری اتنی عظیم تھی کہ اس ذمہ داری کے ساتھ اصالتاً خود حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا سورہ براءت کا پیغام جگہ جگہ اور ہر خیمہ میں جا کر پہنچانا بے حد مشکل تھا ذمہ داری کے اس بوجھ کو ہلکا کرنے کے لیے سورہ براءت والے کام کے لیے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو روانہ فرمایا۔ اس طرح تقسیم کار ہو گئی حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا کام اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اپنا کام بوجہ احسن انجام دیا۔

یہ تھے مولانا کرم الدین آفتاب ہدایت ہیں۔

اتنی بات تو اتفاقی ہے اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ حج کی امارت حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عطا ہوئی تھی اور واقعات کی دنیا میں ابوبکر نے حج اپنی امارت میں کرایا۔ سوچنے کی بات ہے کہ مکہ پر بھرپور تسلط ہے۔ اور مکہ اسلامی حکومت کے زیرنگیں ہے حضرت عتاب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سرکاری طور پر مکہ کے گورنر ہیں۔ اسلامی اقتدار قائم ہونے کے بعد پہلے حج کا حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر بنایا گیا ہے۔ ٹھیک اسی طرح جیسے وفات سے پہلے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے آخری نماز کا امام حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بنایا ہے۔ ان دونوں ارکان اسلام میں ابوبکر کی امامت اس بات کی غمازی کر رہی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خلافت کے لیے ابوبکر کی ذات گرامی جمیع صحابہ میں احق اور اہل ہے واقعات بتاتے ہیں کہ ابوبکر کی امارت ہی میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معاہدوں کی تنسیخ کا اعلان کیا ہے بلکہ اس فرض کی انجام دہی کے لیے وقت بھی امیر ہونے کی حیثیت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے لیے مقرر کیا اور بحیثیت امیر حکم دیا کہ یا علی قم فبلغ رسالۃ رسول اللہ۔ علی اٹھو اور حضور انور کا پیغام پہنچاؤ بلکہ کام کو انجام دینے کی خاطر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی امداد کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے کچھ دوسرے صحابہ کو بھی مقرر کیا جیسے ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ

یہ بات کہ اس خاص کام کے لیے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کیوں مقرر کیا اس پر اجمالی گفتگو پہلے ہو چکی ہے لیکن اس موضوع پر علامہ آلوسی نے نکتہ آفرینی فرمائی ہے وہ بھی گوش گذار فرمالیجئے۔

> حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو امیر حج اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو معاہدوں کے ختم ہونے کا اعلان اسلیئے سپرد کیا گیا کہ صدیق اکبر رض کی ذات گرامی اللہ کی صفت رحمت و جمال کی مظہر ہے۔ جیسے بدر کے قیدیوں کے ذکر میں آپ پڑھ چکے ہیں مثلک یا ابابکر مثل ابراهیم اور مثلک یا ابابکر مثل عیسیٰ اور ارشاد نبوت میں ہے ارحم امتی بامتی ابو بکر اس لیے اہل ایمان کے معاملات آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوبکر کے سپرد کیے۔ اور حضرت علی اسد اللہ الغالب ہونے کی وجہ سے جلال کے مظہر تھے اس لیے کافروں سے معاہدے توڑنے کا معاملہ ان کے سپرد کیا یہ اسلام کی دو آنکھیں تھیں ایک میں صفت جمالی تھی اور دوسری میں صفت جلالی۔ میدان عرفات کے اس اجتماع میں کافر و مومن دونوں تھے اس لیے جلال اور جمال دونوں کی ضرورت تھی۔

ایک صاحب نے امام محمد بن جریر طبری کی پیش کردہ سدی کے حوالہ سے ایک روایت سے بڑا ہی انوکھا اور عجیب استدلال کیا ہے۔ آیئے پہلے وہ روایت سن لیجیے۔

سدی کہتے ہیں۔ جب قرآن میں سورہ برات کی چالیس آیتیں نازل ہوئیں۔ ابوبکر کو انہیں دے کر روانہ

فرمایا اور ان کو حج کی امارت بھی سپرد کی۔ جب وہ روانہ ہو گئے اور ذوالحلیفہ کے درخت تک پہنچے پیچھے سے حضور نے حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ کیا۔ انہوں نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے سورۃ برارت کی آیات لے لیں۔ ابوبکر حضور کے پاس واپس آئے۔ دریافت کیا کہ یارسول اللہ میرے ماں باپ آپ پر قربان ہوں کیا میرے بارے کچھ آسمان سے نازل ہوا ہے فرمایا بالکل نہیں بلکہ بات یہ ہے کہ سورۃ برارت کو میری جانب سے ایسے شخص کو نہ پہنچانا چاہیے جو میرا غیر ہو بلکہ ایسے کو پہنچانا چاہیے جو میرے سے ہو۔

اس سے ان صاحب نے یہ استنباط کیا ہے کہ یہ روایت بتلا رہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں نسبت یگانگت کی ذاتی ہے ——— اور یہ بھی یہ روایت بتا رہی ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ تمام صحابہ میں اللہ کے نزدیک بہترین اور بزرگترین ہیں کیونکہ جو شخص ذاتِ پیغمبر سے مماثلت رکھتا ہو وہ بمنزلہ ذات پیغمبر کے ہے اور آگے لکھا ہے ——— کہ حضرت علیؓ کے بارے میں یہ بات ثابت شدہ حقیقت ہے جو خود ابوبکر کو بھی تسلیم ہے۔ کچھ لوگوں نے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ کو اس مقام سے گرانے کے لیے یہ سازش کی ہے کہ منی سے قریب نسبی مراد ہے اور نسب کا سہارا لینے کے لیے یہ بات بنائی ہے کہ عرب کا دستور تھا کہ معاہدوں کو ختم کرنے کے لیے خود معاہد یا اس کا کوئی رشتہ دار اعلان کرے۔

وہ تھی بنیاد اور یہ ہے اس کھوکھلی بنیاد پر اٹھی ہوئی عمارت۔ آیئے ہم اس بنیاد کا علمی جائزہ لیں۔

بلاشبہ یہ روایت سدی کی زبانی حافظ محمد بن جریر طبری نے اپنی تفسیر میں پیش کی ہے۔ لیکن جائے حیرت ہے کہ ان صاحب نے اس موضوع پر آئی ہوئی تمام روایات کو چھوڑ کر اپنے دعوے کی دلیل کے لیے اسے منتخب کیا ہے اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دوسری روایات ان صاحب کے دعوی کے لیے مفید نہیں ہیں۔ لیکن سدی کی اس روایت میں ان کے خیالی پلاؤ کے لیے کچھ سالہ دستیاب ہو سکتا ہے چاہے اس روایت کا چہرہ بگاڑ کر ہی کیوں نہ ہو۔ مزہ یہ ہے کہ سدی یہ روایت کسی بھی سہارے کے ذریعے نہیں کہہ رہا ہے بلکہ وہ خود اپنی جانب سے کہہ رہا ہے یہ اس بات کی دلیل ہے کہ یہ کہانی اس کی اپنی ساختہ پرداختہ ہے۔ اگر وہ کسی صحابی کا نام لے کر پیش کرتا تو کم از کم یہ معلوم تو ہوتا کہ سہارا اور مرکز کیا ہے۔ وہ تمام صحیح روایات جو اس موضوع پر احادیث وسیر کی کتابوں میں مستند ذرائع سے آئی ہیں وہ سب سدی کے اس بیان کے خلاف ہیں۔ یہ ایک بے غبار حقیقت ہے۔ روایت کے میدان میں اس واقعہ کو ترجیح ہونی چاہیے جو مستند روایتوں سے آئی ہے اس کے مقابلہ میں جس کی حیثیت صرف ایک انفرادی رائے کی ہے۔ اس پر طرفہ تماشا یہ ہے کہ یہ صاحب ادعاء تحقیق کے باوجود سدی کی اس انفرادی رائے کو بھی پورا نقل نہیں کرتے ہیں بلکہ اس کو بھی قطع و برید کرکے دنیا کے سامنے پیش کر رہے ہے۔ سدی کے اس بیان میں یہ بھی ہے۔

اے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کیا تجھے یہ بات پسند نہیں کہ تو میرا غار کا ساتھی ہے اور حوض کوثر پر روز قیامت میرے ساتھ ہے ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فوراً کہا کیوں نہیں یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بس ابوبکر حج کے امیر اور علی اعلان برارت لے کر روانہ ہو گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ نے یوم نحر میں اعلان کیا۔

۱۔ اس سال کے بعد کوئی مشرک مسجد حرام میں نہ آئے گا۔

۲۔ کوئی برہنہ بیت اللہ کا طواف نہ کرے گا۔

۳۔ جن کا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عہد میعادی ہے ان کا عہد میعاد تک ہے۔

۴۔ یہ کھانے پینے کے دن ہیں۔

۵۔ جنت میں مسلمان کے سوا اللہ سبحانہ کسی کو داخل نہ کرے گا۔ یہ سن کر مجمع نے کہا ہم بھی تیرے اور تیرے چچا کے بیٹے کے عہد سے دست بردار ہوتے ہیں۔ اب نیزہ بازی اور تلوار زنی کے سوا کوئی راہ نہیں ہے مشرکین واپس ہوئے تو باہم ایک دوسرے کو ملامت کرنے لگے تم ایسی حالت میں کیا کرو گے جب کہ قریش حلقہ بگوش اسلام ہو چکے ہیں لہٰذا یہ لوگ بھی مسلمان ہو گئے۔

سدی کا یہ پورا بیان تفسیر ابن جریر کی جلد عاشر میں ہے۔

آپ ہی انصاف کریں کہ اگر ان صاحب کے خیال میں آپ کے اس مزعومہ دعویٰ کے لیے یہ روایت اور سدی کا یہ بیان دلیل ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم میں یگانگت ہے اور یگانگت بھی ایسی کہ نفسہ نفسہ حضرت علی رض کی ذات حضور ہی کی ذات ہے تو کیا سدی کا یہ بیان اس بات کی دلیل نہیں ہے کہ ابوبکر دنیا میں حضور کے جیسے غار کے ساتھی ہیں ایسے ہی آخرت میں حوض کوثر پر آپ کے ساتھی ہوں گے

۱۔ پھر سدی کا بیان ہے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سورہ برارت کی چالیس آیات دے کر روانہ کیا بتائیے کیا ان چالیس آیتوں میں اذ ھما فی الغار اذ یقول لصاحبہ آیت نہیں ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ حضور اقدس نے حضرت علی کو اس لیے روانہ کیا کہ وہ لوگوں کے سامنے ابوبکر رض کے مناقب اور ان کا مقام اعلیٰ بیان کریں اور بتائیں کہ ابوبکر کیا ہیں اور ذات رسول سے ان کا کیا تعلق ہے اور حضور نے اس اجتماع عام میں حج کے قائم کرنے کے لیے اپنا نائب کیوں بنایا ہے اور پھر ابوبکر کی امارت میں برارت کی تبلیغ کا کیوں حکم دیا ہے۔ چنانچہ صحیح روایات میں آیا ہے کہ حضرت ابوبکر رض نے میدان عرفات میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حکم دیا کہ حضور کا پیغام لوگوں کو سناؤ۔

ان صاحب نے روایت کے اس حصے کو جان کر چھوڑ دیا ہے تاکہ مخاطبوں کے دماغ میں یہ بات نہ آ جائے کہ تاریخ نبوت کے اہم حادثہ میں تنہا رفاقت کا فرض ابوبکر ادا کر رہے ہیں۔ زندگی کا یہی حادثہ یعنی ہجرت ظہور اسلام کا نقطہ آغاز اور دنیا میں

اسلام کی روشنی کا ذریعہ ہے۔ اگر ہجرت کے موقعہ پر ابوبکر کی رفاقت کوئی معمولی بات ہوتی تو قرآن اسے اس پر شوکت انداز میں بیان نہ کرتا کہ ایک طرف سید البشر کا ان کو صاحب بتائے اور نبوت کی زبان سے ان کے لیے اللہ کی معیت کا اعلان کرائے۔

باقی رہا ان صاحب کا سدی کی روایت میں آئے ہوئے جملہ رجل منی سے ناجائز استفادہ اور اس پر اپنی مزعومہ عمارت کی تعمیر تو یہ درست نہیں ہے کیونکہ صحیح روایات میں اس کی تفسیر یہ آچکی ہے اور رجل من اہل بیتی جس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ معاہدے کی تنسیخ کا اعلان عرب دستور کے مطابق مجھے یا میرے کسی قرابت دار کو کرنا چاہیے۔ بہرحال اس قسم کے وساوس کا نام عقائد نہیں ہو سکتا۔ عقائد کی عمارت کتاب و سنت کے محکمات پر اٹھتی ہے خیالی باتوں، ذہنی وسوسوں اور وہمی خواطر کا نام عقائد نہیں ہوتا ہے۔

فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْهُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَيْثُ
وَجَدْتُّمُوْهُمْ وَخُذُوْهُمْ وَاحْصُرُوْهُمْ وَاقْعُدُوْا لَهُمْ
كُلَّ مَرْصَدٍ ۚ فَاِنْ تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا
الزَّكٰوةَ فَخَلُّوْا سَبِيْلَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿٥﴾ وَاِنْ
اَحَدٌ مِّنَ الْمُشْرِكِيْنَ اسْتَجَارَكَ فَاَجِرْهُ حَتّٰى يَسْمَعَ كَلٰمَ
اللّٰهِ ثُمَّ اَبْلِغْهُ مَاْمَنَهٗ ۭ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ قَوْمٌ لَّا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦﴾ ع

لہٰذا جب حرمت والے مہینے گذر جائیں تو پھر ان مشرکین کو مارو جہاں بھی تمہیں دستیاب ہوں اور ان کو گرفتار کرو، ان کو گھیر لو اور ہر جگہ ان کے لیے گھات میں بیٹھ جاؤ۔ بعد ازیں اگر وہ توبہ کر لیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں تو ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کرو۔ بلاشبہ اللہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے اور اے پیغمبر اگر ان مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے امان کا خواہاں ہو تو اسے امان دے دیجئے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے۔ پھر اسے اس کے جائے امن پر پہنچا دیجئے یہ بات اس لیے ہے کہ یہ لوگ اسلام کا علم نہیں رکھتے ہیں۔

مفردات کے معانی

انسلخ۔ ماضی کا واحد مذکر انسلاخ سے۔ گذر جانا اصل میں سلخ سے ہے جس کے معنے سانپ کے کینچلی اتارنے کے ہیں اسی معنی میں آیت لھم اللیل نسلخ منہ النھار آیا ہے۔ ایک شاعر کہتا ہے۔

اذا ما سلخت الشہر املکت مثلہ
کفی قاتلا سلخی الشہور واھلالی

الحرم حرام کی جمع ہے جیسے سحاب کی جمع سحب آتی ہے وہ مہینے جن میں اللہ نے قتال حرام کیا ہے یہ ذوالقعدہ ذوالحجہ محرم اور رجب ہیں۔ خذوا جمع مذکر حاضر امر کا اخذ سے قیدی کو اخیذ کہتے ہیں۔ اس کے معنے یہاں پکڑنے اور گرفتار کرنے کے ہیں۔

مرصد اسم ظرف ہے کسی جگہ بیٹھ کر دشمن کو تاڑ میں رکھنا۔ ستاروں کی رفتار معلوم کرنے کی جگہ کو رصدگاہ کہتے ہیں۔
استجار واحد مذکر ماضی استجارہ سے اس کے معنے جوار کی درخواست کرنا۔ پڑوسی کی حمایت اور اس کی جانب سے دفاع عرب کے اخلاق میں سے ہے حتی کہ مددگار کو جار کہتے ہیں جیسے کہنا ہو کہ میں تمہارا مددگار ہوں تو بولتے ہیں انی جار لکم یہاں معنے پناہ چاہنے کے ہیں۔

اسلامی زندگی کا پیمانہ

پیچھے یہ بات کھول کر بتادی گئی ہے کہ ان معاہدین کے سوا جن کے معاہدے میعادی ہیں۔ سب کے معاہدے ختم ہیں اب ان کے سامنے صرف دو راہیں ہیں۔ اسلام قبول کرلیں۔ یا پھر میدان جنگ میں آمنے سامنے ہو کر فیصلہ کریں۔ ظاہر ہے کہ جب آپ مخالف سے اسلام کو اپنانے کی پیشکش کر رہے ہیں تو آپ کے ذمہ یہ بھی ہے کہ آپ ان کو اسلامی زندگی کا کوئی محسوس اور مرئی نمونہ بتائیں ان آیات میں اسلامی زندگی کا پیمانہ بتایا گیا ہے کہ اگر وہ کفر سے باز آجاتے ہیں اور اسلامی زندگی کا پیمانہ نماز، زکوٰۃ اور عملی زندگی اپنا لیتے ہیں تو وہ اسلام کی اجتماعی زندگی کے مسلمان شہری ہیں۔ گویا جس بات کے بعد ایک جماعت مسلمانوں کی اجتماعی سوسائٹی میں مسلمان تسلیم کی جاسکتی ہے وہ یہ ہے کہ کفر سے توبہ کے بعد اسلامی نظام کی حقیقت کا اقرار کرے اور عمل میں دو باتیں ضرور آجائیں ایک نماز کی جماعت کا قیام اور زکوٰۃ کی ادائیگی۔ اگر یہ دو عمل ایک جماعت میں مفقود ہیں تو اس کا شمار مسلمانوں میں نہ ہوگا۔ یہ غیر مسلم آبادی۔ غیر مسلم جماعت کے اسلام میں داخل ہونے کا قرآن نے پیمانہ بتایا ہے۔ اس سلسلے میں فرد اور جماعت کے فرق کو نظرانداز نہ کرنا چاہیے۔ بلاشبہ ایک فرد اگر تارک صلاۃ ہے تو وہ گنہ گار اور اس کا تعلق منفی کے فتوے سے ہے اور اگر ایک جماعت من حیث الجماعۃ ترک صلاۃ کرتی ہے تو وہ اسلامی زندگی کی محسوس و مرئی نشانی سے محروم ہے اور اس کا تعلق اسلامی حکومت سے ہے۔

(۴) لہٰذا جب حرمت والے مہینے گذر جائیں تو پھر ان مشرکین کو مارو جہاں بھی تمہیں دستیاب ہوں۔ اور ان کو گرفتار کرو۔ ان کو گھیرو۔ اور ان کے لیے گھات میں بیٹھ جاؤ۔ بعد ازیں اگر وہ توبہ کرلیں نماز قائم کریں زکوٰۃ دیں تو ان سے کسی قسم کا تعرض نہ کرو۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ بڑا ہی بخشنے والا اور رحمت والا ہے۔ استثناء سے فارغ ہو کر پھر مستثنیٰ منہ کا حکم بیان کرتے ہیں یعنی ان

عہد شکنی کرنے والوں سے اگرچہ اب کوئی معاہدہ نہیں رہا اور اس لیے علی الفور جنگ کی جا سکتی ہے۔ تاہم اشہر حرم کی حرمت کی رعایت مانع ہے کہ فوراً اُن پر حملہ کیا جائے خواہ اس لیے کہ اس وقت تک اشہر حرم میں ابتداء قتال کرنا ممنوع ہوگا۔ یا مصلحۃً تھوڑی سی بات کے لیے لوگوں میں تشویش پیدا کی جائے کیونکہ ان مہینوں میں قتال کی حرمت ان کے یہاں معروف و مسلّم چلی آرہی تھی بہرحال ماہ محرم کے ختم تک ان کو مہلت دی گئی تاکہ جو چاہیں اپنا بندوبست کریں اس کے بعد تطہیر جزیرۃ العرب کی خاطر جنگ ہے چارہ نہیں۔ جو کچھ برتاؤ جنگ میں ہوتا ہے۔ مارنا، پکڑنا، گھیراؤ ڈالنا۔ داؤ لگانا، گھات میں رہنا وہ سب ہوگا۔ البتہ اگر بظاہر کفر سے توبہ کر کے اسلامی برادری میں داخل ہو جائیں جس کی بڑی علامت نماز پڑھنا اور زکوٰۃ دینا ہے تو پھر مسلمانوں کو ان سے تعرض کرنے اور ان کا راستہ روکنے کی اجازت نہیں ہے۔ رہا باطن کا معاملہ وہ خدا کے سپرد ہے مسلمانوں کا معاملہ ان کے ظاہر ہی پر ہوگا۔ اس آیت سے معلوم ہوا کہ اگر کوئی شخص اسلام کا کلمہ پڑھ کر نماز ادا نہ کرے یا زکوٰۃ نہ دے تو مسلمان اس کا راستہ روک سکتے ہیں۔ امام احمد۔ امام شافعی، امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ کے نزدیک اسلامی حکومت کا فرض ہے کہ تارک صلوٰۃ اگر توبہ نہ کرے تو اسے قتل کر دے امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک ردۃً اور مالک و شافعی کے نزدیک حداً و تعزیراً۔ امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اسے خوب زدوکوب کیا جائے اور قید میں رکھا جائے حتی یموت او یتوب حتیٰ کہ مر جائے یا توبہ کرے۔ بہرحال تخلیہ سبیل کسی کے نزدیک نہیں رہے مانعین زکوٰۃ ان کے اموال میں حکومت جبراً زکوٰۃ وصول کرے اور اگر وہ لوگ مل کر حکومت سے برسر پیکار ہوں تو راہ راست پر لانے کے لیے جنگ کی جائے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ نے مانعین زکوٰۃ پر جو جہاد کیا اس کا واقعہ کتب حدیث و تاریخ میں مشہور ہے [1]

ان آیات میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

سب سے پہلی اور اہم بات یہ ہے کہ اس آیت میں الاشھر الحرم سے کون سے مہینے مراد ہیں۔ شارحین قرآن کی اس موضوع پر دو رائیں ہیں۔

کچھ علماء کی رائے تو وہی ہے جسے شیخ الاسلام نے اپنایا ہے یہ کہ ان سے مراد وہی مہینے ہیں جو عرب میں حرمت والے تھے ذی قعدہ، ذی الحج، محرم اور رجب ان میں تین متصل ہیں اور ایک الگ ہے ابن جریر نے اپنی تفسیر میں اسی کو اختیار کیا ہے آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ جن مشرکین سے عہد نہیں ہے یا جن سے عہد تھا اگر وہ عہد شکنی کر چکے ہیں ان سے اشہر حرم میں قتال نا جائز ہے لہٰذا جب یہ حرمت والے مہینے گذر جائیں تو تمہیں ان مشرکین کو قتل کرنے کا حکم ہے۔ گویا اس آیت میں ضمناً پہلے حرمت والے مہینوں میں قتال کی حرمت کا حکم بتایا اور پھر بتایا کہ جب یہ حرمت والے مہینے گذر جائیں تو پھر تمہیں قتال کا حکم ہے۔

لیکن اس پر قاضی بیضاوی اور علامہ آلوسی اور دوسرے شارحین قرآن نے یہ اعتراض کیا ہے کہ اس مطلب کی نظم قرآن اور

[1] افادات شیخ الاسلام

بیان قرآن اجازت نہیں دیتا۔ اور یہ بات بے بی وزنی۔ کیونکہ عرب والے جب پہلے ایک بات کے لیے تعبیر نکرہ کی اختیار کرتے ہیں پھر اسی کے لیے تعبیر معرفہ موصوفہ کی اختیار کریں تو اس صورت میں دوسرا عین اول ہوتا ہے اگر آپ کہیں گے کہ رایت تلمیذا و ضربت التلمیذ الشریف تو اس صورت میں تلمیذ شریر جس کی آپ نے پٹائی کی ہے وہی ہے جسے آپ نے دیکھا تھا آیت میں بھی یہی صورتحال ہے پہلے فسیحوا فی الارض اربعة اشھرا کو نکرہ بنا کر لایا گیا اور اب دوبارہ اسی کو معرفہ موصوف کے ساتھ لایا جا رہا ہے فاذا انسلخ الاشھر الحرم معلوم ہوا کہ ان اشہر حرم سے وہی چار مہینے مراد ہیں جن میں ملک میں پہلے آزادانہ نقل وحرکت کی اجازت دی گئی ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے اس مطلب پر یہ شبہ پیش کیا ہے کہ اس مطلب کی صورت میں آیت میں اشہر حرم کا حکم بیان ہو رہا ہے حالانکہ ایسا نہیں بلکہ اشہر حرم کا حکم اسی سورت میں آگے آ رہا ہے ان عدة الشھور عند الله اثنا عشر شھرا۔

کچھ علماء اور شارحین قرآن کی رائے یہ ہے کہ ان چار مہینوں سے عرب کے مشہور حرمت والے مہینے مراد نہیں بلکہ ان سے وہ چار ماہ مراد ہیں جن میں معاہد کو عہد ختم ہونے کے بعد غور وفکر کی مہلت اور آزادی سے ملک میں چلنے پھرنے کی رخصت دی گئی ہے۔ فسیحوا فی الارض اربعة اشھر۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ دی ہوئی مہلت کے چار مہینے ختم ہو جائیں گے تو ان سے حالت جنگ قائم ہو جائے گا۔ اور ان مشرکین کی حیثیت حربیوں کی ہوگی۔ اور حربی کی حیثیت سے ان کے ساتھ وہ سب کچھ کیا جائے جو حربیوں کے ساتھ کیا جا سکتا ہے یعنی میدان جنگ کے تقاضوں کے تحت تم ان سے جو کچھ سلوک کر سکتے ہو کرو۔

فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم یہ مشرکین جہاں بھی تمہیں مل جائیں ان کو اس مدت کے گذر جانے کے بعد قتل کرو ان کے لیے دو ہی صورتیں ہیں اسلام اور جنگ مشرکین عرب کے ساتھ قرآن کا یہ خاص معاملہ کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان ہی میں سے رسول بھیجا۔ ان کی زبان میں ان پر کتاب نازل کی۔ اسی طرح کی ان کو دعوت دی گئی جس کے وہ مدعی تھے۔ رسول اللہ نے مسلسل ۲۳ سال تک ان پر محنت کی تو اس ساری محنت کے بعد جو لوگ قبول حق پر آمادہ نہ ہوئے پھر بھی ان کو آزادی سے اپنے مستقبل کے بارے میں سوچنے کے لیے چار ماہ کی مہلت دی گئی فرمایا کہ جب یہ چار ماہ گذر جائیں تو اب حالت جنگ ہے ان چار ماہ کو اشہر حرم کہا ہی اس لیے گیا ہے کہ ان میں ان کو مارنا قتل کرنا حرام کیا گیا ہے اس عرصہ میں مسلمانوں کے لیے ان پر حملہ کرنا ناجائز قرار دیا گیا ہے ان سے وہ اشہر حرم مراد نہیں جو حج اور عمرے کے لیے حرام قرار دیئے گئے

فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم یہ آیت اگرچہ عام ہے لیکن یہاں دو تخصیصیں ہیں ایک تخصیص کی نشاندہی خود قرآن نے کی ہے کہ حرم میں قتال حرام ہے قرآن میں ہے ولا تقاتلوھم عند المسجد الحرام حتی یقاتلوکم

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے مسلمانوں کو حرم میں قتال کی اس شرط پر اجازت دی ہے کہ تمہاری جنگ دفاعی ہو، ہجومی نہ ہو۔ یہ شرط یہاں بھی محفوظ رہے گی۔ کیونکہ قرآن میں اگر ایک مقام پر حکم مقید ہو اور دوسرے میں مطلق۔ تو مطلق میں قید ملحوظ رہے گی۔

دوسری تخصیص قرآن سے نہیں سنت سے معلوم ہو رہی ہے یعنی ان مشرکین کو قتل کرو اور ان سے جنگ کرو لیکن تمہاری جنگ مادی اغراض کے لیے نہ ہو نہ ان لوگوں پر ہاتھ اٹھاؤ جو دین حق کی راہ میں مزاحمت نہیں کرتے اور نہ لڑائی میں جاہلیت کے طریقے استعمال کرو، عورتوں، بچوں، بوڑھوں اور زخمیوں پر دست درازی نہ کرنا۔ دشمنوں کے مقتولوں کا مثلہ کرنا۔ کھیتوں اور مویشیوں کو خواہ مخواہ برباد کرنا۔ اور دوسرے تمام وحشیانہ افعال قرآن کی زبان میں اعتداء ہیں جس سے قرآن نے لاتعتدوا ان اللہ لایحب المعتدین کہہ کر مسلمانوں کو منع کیا ہے۔ اور احادیث میں ان سب کی ممانعت آئی ہے۔ آیت کا منشا یہ ہے کہ طاقت کا استعمال ان مشرکین کے لیے چار ماہ گذرنے پر کیا جائے جن سے کہ معاہدہ نہ تھا۔ یا جن سے معاہدہ تھا مگر ان کی جانب سے عہد شکنی ہو چکی ہے ان کو چار مہینے کی مدت میں اپنے بارے میں سوچنے اور فیصلہ کرنے کا موقع ہے کہ جزیرۃ العرب میں رہنا ہے تو صرف قبول اسلام کے بعد رہنا ہے۔ اس کے علاوہ جزیرہ میں رہنے کی کوئی صورت نہیں ہے ان چار ماہ میں وہ اگر کوئی متبادل انتظام رہائش کا کر سکتے ہیں تو ان کو اجازت ہے لیکن چار ماہ کی مدت گذرنے پر فیصلہ تلوار سے ہوگا۔

گویا چار ماہ کے بعد عرب میں مشرکین کا وجود عملاً خلاف قانون ہو جائے گا۔ اور ان کے لیے پورے جزیرے میں کوئی پناہ گاہ نہ ہوگی اور اہل ایمان کو ان کو یہاں سے نکال دینے کا پورا پورا حق حاصل ہوگا اور نکالنے کے لیے اہل ایمان کو وہ تمام اطوار اپنانے کا حق ہوگا جو ایک دشمن کے لیے میدان جنگ میں اختیار کیے جا سکتے ہیں۔ قرآن نے یہاں تین باتوں کی نشاندہی کی ہے

اول: خذوھم یعنی ان کو گرفتار کر لو۔ یہ وہی اخذ ہے جس کی پہلے اثخان فی الارض سے پہلے ممانعت کی گئی یہاں صاف اجازت دی جا رہی ہے۔ بلکہ حکم دیا جا رہا ہے۔ علامہ آلوسی نے تصریح کی ہے کہ ان مشرکین کی گرفتاری صرف استیلاء کے لیے ہے کیونکہ ان قیدیوں کو غلام بنانا جائز نہیں۔ فان مشرکی العرب لایسترقون۔ بلکہ ان کو قید کرنے کے بعد مسلمان ہونے کی دعوت دی جائے گی نہیں مانیں گے تو قتل کیے جائیں گے۔

واحصروھم دشمن کسی محفوظ جگہ میں ہو جیسے قلعہ وغیرہ تو اس کا گھیراؤ ال لینا۔ ان کو نہ نکلنے دینا۔ ہر طرح سے ان کا ناطقہ بند کر دینا۔ اس میں ان کی خوراک بند کر دینا [illegible] ان نہ پہنچے۔ مادی مدد ختم کرنا ہر قسم کی سپلائی پر پابندی لگا دینا داخل ہے۔

واقعدوا لھم کل مرصد۔ ان کی تا[illegible] ہر پہلو سے ان کی نگرانی ملک میں گھومنے اور شہروں میں ان کے آنے جانے کا خیال رکھو۔

عام شاہراہوں اور اہم مقامات پر ان کی تاڑ رکھو۔ اب ان کا چلنا پھرنا گھومنا سب خلاف قانون ہے۔

عفو و درگذر اور قتال کا تقابلی مطالعہ

یہ بات یہاں ذہن میں رکھنی چاہیے کہ یہاں اقتلوا المشرکین کا جو حکم دیا گیا ہے اس کا تعلق صرف مشرکین عرب سے تھا جو عرب میں دعوت اسلامی کی پامالی کے لیے لڑ رہی تھیں یہ ساری دنیا کے تمام مشرکوں کے لیے حکم نہیں ہے چنانچہ اول سے لے کر آخر تک خطاب خاص جماعتوں سے ہے اور صاف لفظوں میں واضح کر دیا ہے کہ ان جماعتوں نے کس طرح عہد شکنی کی اور کس طرح خود ہی جنگ کا باعث ہوئے نیز ظلم و جنگ کی ابتدا کرنے والے بھی وہی ہیں۔ یہاں سے یہ بات خود بخود صاف ہوگئی ہے کہ اس آیت کے ذریعے کفار سے عفو و درگذر کی نصیحت کو جو منسوخ کہتے ہیں۔ اور اس آیت کو آیت السیف کہتے ہیں اس کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ حافظ السیوطی کہتے ہیں۔

> وہ احکام جو کسی وجہ سے ہوں۔ پھر وجہ تبادی ہو وہ حقیقت میں منسوخ نہیں بلکہ انساء کے قبیل سے ہیں جیسے ضعف ——— اور تعداد کی کمی کے وقت میں صبر و درگذر کا حکم، پھر قتال کے ذریعے اس کا نسخ اس کا تعلق احوال و ظروف کے اختلاف سے ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اکثر جو آیات عفو و صفح کو آیۃ السیف سے منسوخ بتاتے ہیں اس میں کوئی وزن نہیں بلکہ اس قسم کی آیات کا تعلق احوال و ظروف کے اختلاف سے ہے یعنی جو حکم کسی وجہ سے کسی وقت دیا گیا ہے اس کا امتثال اسی وقت تک ہے جب تک وجہ موجود ہے۔ وجہ کے انتقال سے حکم بھی منتقل ہو جائے گا۔ یہ نسخ نہیں ہے۔ نسخ تو نام ہے حکم کو ختم کر دینے کا ختم ہونے کے بعد اس کی پابجائی جائز نہیں ہے مکی کہتے ہیں کہ علماء کی ایک جماعت کہتی ہے ایسے تمام احکام جن میں توقیت اور غایت ہوتی ہے۔ محکم ہیں منسوخ نہیں ہیں۔ کیونکہ حکم مؤجل میں نسخ نہیں ہوتا ہے۔ [1]

اس قسم کی آیتوں کے متعلق جن میں کفار سے عفو و درگذر کی نصیحت ہے عام شارحین قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ وہ قرآن میں اس آیۃ السیف سے پہلے کی بات ہے۔ اس آیۃ السیف نے کفار کے حق میں عفو و درگذر کے ہر حکم کو منسوخ کر دیا ہے۔ لیکن شارحین قرآن میں کچھ ایسی ہستیاں بھی ہیں جو اس آیت السیف کے حکم اور عفو و درگذر کی نصیحت کے درمیان کوئی منافات نہیں سمجھتے اور اس لیے ایک دوسرے کو منسوخ نہیں کہتے ان کا کہنا ہے کہ عفو و درگذر کا تعلق زندگی کے عام معاملات سے ہے جبکہ جنگ کا تعلق خاص معاملات اور خاص لوگوں سے ہے۔ انسانی زندگی کے عام معاملات کو میدان جنگ کے خاص معاملات پر قیاس نہ کرنا چاہیے۔ اس آیت میں قرآن کے مخاطب وہ خاص لوگ ہیں جن کی اسلام دشمنی اور عہد شکنی منصۂ شہود پر آ گئی تھی۔ اس کے باوجود قرآن نے چار ماہ کی مدت

---

[1] الاتقان فی علوم القرآن

دے کر یہاں بھی عفو سے کام لیا ہے۔

دوسری بات ان آیات میں سمجھنے کی یہ ہے کہ فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ فخلوا سبیلھم میں ان کے سامنے ایک پیمانہ پیش کیا گیا ہے اور بتایا گیا ہے کہ دنیا کے تمام مشرکین سے الگ ان کی یہ دار و گیر اس وقت تک بند نہ کی جائے گی جب تک یہ اپنے کفر و شرک سے تائب ہو کر ایمان قبول نہ کریں اور نماز قائم نہ کریں اور زکوٰۃ نہ دیں۔ تابوا ایک جامع تعبیر ہے کفر و شرک سے بیزاری اور اسلام کے سارے فکری نظام کو اپنانے کی۔ اور نماز و زکوٰۃ تعبیر ہے اسلام کے نظام عبادت اور نظام اقتصاد میں داخل ہونے کی جس سے یہ ہوا کہ اسلام کے بغیر نہ ان کے لیے اسلامی مملکت کا شہری ہونے یا معاہد بن کر اسلامی نظام میں باقی رہنے کی کوئی گنجائش ہے نہ لونڈی غلام بن کر۔ ان کے لیے صرف دو راہیں ہیں یا تو اسلام قبول کریں یا تلوار۔ منشا یہ کہ اگر وہ شرک و کفر سے باز آجائیں اور اسلام قبول کر کے نماز اور زکوٰۃ کی پابندی اختیار کر لیں یا بالفاظ دیگر اسلامی نظام زندگی میں داخل ہو جائیں تو پھر ان سے کوئی تعرض نہ کیا جائے اب یہ لوگ حربی نہیں بلکہ اسلامی مملکت کے مسلمان شہری ہیں۔

اسلام سے وفاداری کا پیمانہ

اس آیت میں جمع کے صیغے استعمال ہوئے ہیں۔ اقاموا۔ اقموا۔ اتوا۔ اور ان جمع کے صیغوں میں ضمیروں کا مرجع مشرکین ہیں۔ یہ دونوں باتیں بتا رہی ہیں کہ کسی غیر مسلم جماعت کے اسلام سے وفاداری کا پیمانہ یہ اور صرف یہ ہے کہ ان کی زندگی میں یہ دو محسوس اور موٹی چیزیں نماز اور زکوٰۃ موجود ہوں۔ ایک نہیں بلکہ دونوں ہوں۔ اگر ان میں سے ایک بھی ان کی زندگی میں نہ ہو تو ان کی اسلام سے وفاداری کا اعتبار نہ ہوگا۔ حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فتنہ ارتداد میں اسی آیت سے استدلال کیا تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جن لوگوں نے فتنہ برپا کیا تھا۔ ان میں سے ایک جماعت کہتی تھی کہ ہم اسلام کے منکر نہیں ہیں نماز بھی پڑھنے کے لیے تیار ہیں مگر زکوٰۃ نہیں دیں گے۔ صحابہ کرام کو بالعموم یہ پریشانی لاحق تھی کہ آخر ایسے لوگوں کے خلاف تلوار کیسے اٹھائی جا سکتی ہے لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اس آیت کا حوالہ دے کر فرمایا کہ ہمیں تو ان لوگوں کے چھوڑ دینے کا حکم صرف اس صورت میں دیا گیا تھا جبکہ یہ شرک سے توبہ کریں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں مگر جب یہ تین شرطوں میں سے ایک شرط اڑا رہے ہیں تو پھر ہم انہیں کیسے چھوڑیں۔

احادیث سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ امام بخاری و مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالے سے ارشاد نقل کیا ہے۔

مجھے حکم دیا گیا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ کرتا رہوں تا آنکہ لوگ گواہی دیں کہ اللہ کے سوا کوئی الہ نہیں ہے اور محمد اللہ کے رسول ہیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں جب وہ یہ کریں تو ان کے مال، جان

محفوظ ہوں گے مگر یہ کہ اسلام کا حق بھی ان کی جان و مال کو پا ہے۔ اور ان کا حساب اللہ کے ذمے ہے۔

امام بخاری نے الجامع الصحیح میں اور ترمذی، ابوداؤد اور نسائی نے سنن میں حضرت انس بن مالک رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے یہ ارشاد پیش کیا ہے۔

مجھے حکم ہے لوگوں سے جنگ کرنے کا یہاں تک وہ کہہ لیں لا الٰہ الا اللہ جب وہ یہ کہہ لیں اور ہماری نماز جیسی نماز پڑھ لیں اور ہمارے قبلہ کا استقبال کریں اور ہمارے ذبیحہ کی طرح ذبح کریں تو قانونی حق کے سوا ان کے خون اور ان کے اموال ہمارے لیے حرام ہیں۔ ان کا حساب اللہ کے ذمہ ہے۔

ان سب ارشادات نبوت کا روئے سخن غیر مسلموں کی طرف ہے یعنی بتانا یہ چاہتے ہیں کہ ایک غیر مسلم جماعت اسلامی ملک کے مسلمان شہری کب بنتے ہیں جو آیت قرآنی میں بات کہی گئی وہی بات ان احادیث میں بتائی گئی ہے۔ اور مقصد کفر سے ہٹ کر اسلام کو اپنانے کا عنوان بتانا ہے۔ یہ عنوان شہری زندگی کے لیے ہے لیکن عین میدان جنگ میں اسلام کو قبول کرنے کا عنوان صرف شہادتین کا اعلان ہے۔ احوال کے تغیر سے اسلام کی پذیرائی کا عنوان بدل جاتا ہے۔ جنگ کی حالت کے تقاضے امن کے تقاضوں سے مختلف ہوتے ہیں پہلی حالت اضطرار کی ہے جبکہ دوسری حالت اختیار کی ہے۔ اسلام میں اضطرار و اختیار دونوں حالتیں الگ الگ ہیں۔ بہرحال اصلاً تو یہ غیر مسلم جماعتوں کے لیے ہیں اسی سے یہ بھی استنباط کیا گیا ہے کہ مسلمان جماعت اگر ان دو باتوں میں سے کسی ایک سے یعنی نماز سے یا زکوٰۃ سے ہٹ جائے تو اس کا حکم بھی حربیوں کا ہے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے عمل سے معلوم ہوتا ہے گویا مسلمان جماعت کی جانب سے نماز یا زکوٰۃ کا انکار کرنا اسلام میں ایک بہت بڑا باغیانہ جرم قابل دست اندازی فوج ہے۔

بہرحال اس آیت میں ان تین کاموں توبہ، نماز اور زکوٰۃ کو عرب کے غیر مسلموں پر دعوت پہنچنے کے بعد اسلامی شہریت کی شرط قرار دیا ہے یعنی ان کاموں کے کرنے سے مشرکین عرب اسلامی مملکت کے مسلمان شہری ہوں گے۔ وہ پرامن زندگی بسر کر سکیں گے۔ مسلمانوں کے ساتھ حج کرنے کی ان کو اجازت ہوگی۔ مسجد حرام میں ان کے داخلہ پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔

حدیث ابن عمر اور حدیث انس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اہل اسلام اور دوسروں کے درمیان جو اعمال مابہ الامتیاز اور حد فاصل تھے وہ یہی اعمال تھے کیونکہ تصدیق اگرچہ اصل ایمان ہے جسے قرآن نے توبہ کہا ہے لیکن وہ ایک قلبی صفت ہے اور اقرار اگرچہ زبان سے متعلق ہے مگر وہ بھی وقتی چیز ہے دو دینوں میں کھلا ہوا امتیاز ان کے علیحدہ علیحدہ شعائر کے ذریعہ ہی سے ہو سکتا ہے۔ اسلامی شعائر میں نماز سب سے زیادہ امتیاز عمل ہے قبلہ کا معاملہ یہود و نصاریٰ کے نزدیک حقانیت مذہب کا معیار تھا۔ معاشرتی لحاظ سے جس معاملہ میں وہ اہل ایمان سے کھلا ہوا احتراز کرتے تھے وہ ذبیحہ کا مسئلہ تھا۔ لہٰذا اگر عبادت میں وہ اہل ایمان جیسی نماز پڑھ لیتے ہیں اور قبلہ کا اتباع کر لیتے ہیں

اور معاشرتی لحاظ سے اہل ایمان سے آملنے کو تیار ہو جاتے ہیں کہ ان کا ذبیحہ کھا لیتے ہیں تو یہ اس بات کی مکمل شہادت ہوگی کہ وہ دل سے ایمان قبول کر چکے ہیں۔ اس لیے ان کے ساتھ خدا اور رسول کا عہد ہونا چاہیے اب ان کے ساتھ کوئی بدعہدی درحقیقت خدا اور رسول کے ساتھ بدمعاملگی کے مترادف ہوگی۔ پھر قرآن کی آیت اور ارشاد نبوت کی رہنمائی یہ ہے کہ اگر ان کی عملی زندگی پہلی زندگی سے بالکل علیحدہ ہو چکی ہے اور وہ اسلامی شعائر کو قائم کرنے لگے ہیں تو ان کے اسلام میں اب شبہ کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہی۔ قرآن کی آیت اور حدیث کا منشا ہرگز یہ نہیں ہے کہ جو مدعی اسلام صرف یہ تین افعال ادا کرے وہ پکا مسلمان ہی رہے گا خواہ وہ ہزار قسم کے افعال کفر کرتا رہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے ان تین کاموں کی تخصیص کی وجہ یہ بتائی ہے۔

> صرف ان تین افعال کے ذکر کرنے کی حکمت یہ ہے کہ اہل کتاب توحید کے اقرار کے ساتھ نمازیں بھی پڑھتے ہیں استقبال قبلہ بھی کرتے ہیں۔ جانور ذبح کر کے بھی کھاتے ہیں مگر نہ ہماری طرح نماز پڑھتے ہیں۔ نہ ہمارے قبلہ کی طرف منہ کرتے ہیں اور نہ ہمارا ذبیحہ کھاتے ہیں۔ اور کوئی ان میں غیر اللہ کے نام پر بھی ذبح کرتا ہے۔
> نماز اور زکوٰۃ ایسے افعال ہیں کہ ان کی اطلاع بسہولت ہو سکتی ہے۔ برخلاف دین کے اور افعال کے نیز اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ لوگوں کے ساتھ معاملہ ظاہری حالات کے موافق کیا جاتا ہے۔ جو شخص جس دین کے شعاروں کو علی الاعلان ادا کرے گا۔ اس کے ساتھ اسی دین والوں کا معاملہ کیا جائے گا جب تک اس سے اس کے خلاف محسوس نہ ہو[1]

ایک شبہ اور اس کا جواب

شاید آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ یہ تو جبر و اکراہ ہے۔ نہیں یہ جبر و اکراہ نہیں۔ اگر جبر و اکراہ ہوتا تو قرآن ان کو چار ماہ کی مہلت نہ دیتا بات یہ نہیں ہے کہ اگر نماز نہ پڑھو گے تو قتل کیے جاؤ گے بلکہ اصل بات یہ ہے کہ اگر اسلامی مملکت میں مسلمان شہری بن کر رہنا چاہتے ہو تو مسلمان ہونے کی شرط یہ ہے۔ یہ اکراہ نہیں ہے بلکہ مسلمان ہونے کی راہنمائی ہے اگر وہ مسلمان ہونا نہیں چاہتے ہیں تو وہ بخوشی یہاں سے جا سکتے ہیں لیکن جزیرۃ العرب میں رہنے کی شرط اسلام ہے۔ نبوت کی پوری تاریخ میں ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جہاں محض اسلام پر مجبور کرنے کے لیے آپ نے کسی پر چڑھائی کی ہو اگر اسلام جبر و اکراہ اور زبردستی کے ذریعے تبدیل عقیدہ کو جائز قرار دیتا تو اسلام میں داخل ہونے والوں سے اتنا اغماض کیوں کرتا کہ امام یہ تحقیق بھی نہ کرے کہ ان کا ایمان نمائشی تو نہیں ہے بلکہ حکم یہ ہوتا کہ جب تک ان کے اسلام کی طرف سے

[1] فتح الباری ص۱۰۱

کمل اطمینان نہ ہو جائے اس وقت تک جنگ جاری رکھی جائے۔ صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث میں ہے کہ آپ نے یہ ارشاد فرما کر یہ آیت تلاوت فرمائی فذکر انما انت مذکر لست علیہم بمصیطر آپ ان کو سمجھاتے جایئے کیونکہ آپ کا کام سمجھانا ہے آپ ان پر ڈکٹیٹر نہیں ہیں۔ غور فرمایئے اگر حدیث کے پہلے حصہ میں کافروں کی بات میں جبر و اکراہ کا کوئی شائبہ بھی ہوتا تو پھر اس کے ساتھ اس آیت کو تلاوت کرنے کا کیا موقعہ تھا۔ یہ تو کھلا ہوا اختلاف ہے۔ معلوم ہوا کہ اسلام کو دلوں میں ڈال دینا رسول کا کام ہی نہیں ہے۔ یہ کام تو اللہ کا ہے۔ رسول کا کام صرف وعظ و تبلیغ کے ذریعے اسلام کی خوبیاں بیان کرنا ہے تلوار کے ذریعے سے کسی چیز کی خوبی نہ تو دلوں میں اتاری جا سکتی ہے اور نہ اس کا منصب نبوت سے کوئی تعلق ہو سکتا ہے۔ جبر و اکراہ کے ساتھ حدیث کے اس ٹکڑے کا کوئی مفہوم نہیں ہو سکتا۔ جبر کے ہوتے ہوئے آپ مصیطر تو ہو سکتے ہیں لیکن مذکر نہیں ہو سکتے اس لیے یہ بدیہی بات ہے کہ یہاں قبول اسلام پر مجبور کرنے کے لیے جنگ نہیں بلکہ مشرکین نے جو جنگ اسلام کے خلاف قائم رکھی تھی اسے ختم کرنے کی یہ ایک قطعی شکل بیان کی گئی ہے فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ اور شکل بھی ایسی جو ان کی مرضی پر موقوف ہے۔ جنگ انہوں نے شروع کی ہے اس لیے ختم بھی ان کو کرنی چاہیے۔

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ مذہب میں زبردستی نہیں اسکا اعلان سب سے پہلے قرآن نے کیا لا اکراہ فی الدین اور ظاہر ہے کہ جو دین اپنی اشاعت کے لیے صرف دعوت و تبلیغ کا راستہ رکھتا ہو جس نے اس کے اصول بتائے ہوں جس نے عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کا ہر معاملہ میں لوگوں سے مطالبہ کیا ہو۔ ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت کا اظہار کیا ہو وہ کیونکر جبر و اکراہ اور زبردستی کے طریقہ کو اختیار کر سکتا ہے۔ قرآن نے نہ صرف یہ کہ دین کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بھی بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں ہے۔ قرآن دین کی ابتداء ایمان سے کرتا ہے۔ ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بزور پیدا نہیں کر سکتی بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی طرح دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی۔ بے شک اسلام میں حق کی حمایت اور باطل کی شکست کے لیے جنگ ہے اور آنحضرت نے بھی یہ لڑائی لڑی ہے اس سے مخالفوں نے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ یہ لڑائی اس لیے تھی کہ اسلام کو تلوار کے زور سے لوگوں میں پھیلایا جائے۔ حالانکہ قرآن میں ایک آیت بھی ایسی نہیں جس میں کسی کافر کو زبردستی مسلمان بنانے کا حکم ہو اور نہ آنحضرت کی سیرت میں کوئی ایسا واقعہ ہے جس میں کسی کافر کو زبردستی تلوار کے زور سے مسلمان بنایا گیا ہو بلکہ اگر ہے تو یہ ہے۔

میدانِ جنگ میں تبلیغ

(۵) اور اے پیغمبر اگر ان مشرکین میں سے کوئی شخص تم سے امن کا خواہاں ہو تو اسے امان دے دیجئے یہاں تک کہ وہ اللہ کا کلام سن لے پھر اسے اس کے جائے امن پر پہنچا دیجئے یہ بات اس لیے ہے کہ یہ لوگ اسلام کا علم نہیں رکھتے ہیں۔ پہلے فرمایا تھا

سو اگر اپنی کفریات سے توبہ کر کے اسلام میں داخل ہو جائیں تو مامون ہیں ممکن ہے کہ کسی شخص کو اصولِ اسلام سے آگاہی نہ ہو اور تحقیق و رفع شکوک کی غرض سے مسلمانوں کے پاس آنا چاہے اس کی نسبت فرمایا کہ اپنی حفاظت اور پناہ میں لے کر خدا کا کلام اور اسلام کے حقائق و دلائل سناؤ۔ اگر قبول نہ کرے تو اسے قتل نہ کرو بلکہ اس کے مامن میں پہنچا دو۔ جہاں پہنچ کر وہ مطمئن ہو جائے اس کے بعد وہ سب کافروں کے برابر ہے۔ یہ امن دینے کا حکم اس لیے ہے کہ اسلامی اصول و حقائق سے ان لوگوں کو آگاہی نہیں ہے لہٰذا ان کے سامنے خوب حق واضح کر دینا چاہیے۔ اگر اس کے بعد بھی عناد برتے تو قد تبین الرشد من الغی کے بعد دین میں کوئی اکراہ نہیں ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ جب تک وہ مسلمان نہ ہو جائے اس کو پناہ نہ دو بلکہ یہ فرمایا کہ اس کو پناہ دے کر اس کی جائے پناہ تک پہنچا دیا جائے اور اس کو کلام الٰہی سنایا جائے تاکہ اس کو غور و فکر کرنے کا موقع ملے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اس طرح مسلمان ہوگا۔ اس کے تبدیلِ مذہب کا محرک تلوار نہ ہوگی بلکہ اس کا محرک صرف پیغامِ حق ہوگا۔ سوچنے کی بات ہے کہ جنگ کی سخت سے سخت حالت میں اصل مقصد یعنی ارشاد و موعظت کا دروازہ کس طرح کھلا رکھا ہے اور کس طرح دین اعتقاد کے معاملہ کو جبر و اکراہ کے شبہ سے بھی بالاتر رکھا گیا اس آیت میں فرمایا کہ ان مشرکین میں سے کوئی ایسا بھی ہو سکتا ہے جس میں قرآن سننے اور حقیقتِ حال معلوم کرنے کی خلش پیدا ہو اگر کوئی ایسا آدمی آ جائے تو عین لڑائی کی حالت میں بھی اسے بخوشی پناہ دو جب تک رہنا چاہے رہے قرآن سنے اور جب جانا چاہے تو اسے اس کے ٹھکانے پر بحفاظت پہنچا دیا جائے تاکہ امن کی جگہ پہنچ کر آزادی و اختیار کے ساتھ غور و فکر کرے اور جو راہ چاہے اختیار کرے [1]

یہ بات کہیں لکھی ہوئی تو نہیں دیکھی لیکن میرا اپنا گمان یہی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے جنگ کے بارے میں جو قانون بتایا ہے اسی آیت سے آپ کا استنباط ہے۔ یعنی یہ کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی کی نوبت آ جائے تو میدانِ جنگ میں پہنچ کر بھی دعوت و تبلیغ کا خیال دور نہ کیا جائے بلکہ تلوار کے فیصلہ سے پہلے دو باتیں ان کے سامنے پیش کرنی چاہئیں اول یہ کہ اسلام کے حلقہ بگوش ہو جاؤ اور لڑائی چھوڑ کر ہمارے بھائی ہو جاؤ۔ اگر ایسا کرو تو تم بھی اقتدار اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے اور اگر یہ منظور نہ ہو تو ہمارا سیاسی نظام قبول کر لو۔ اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر طرح کی ذمہ داری ہمارے سر ہوگی۔ اگر وہ ان دو باتوں میں سے کوئی قبول کر لیں تو ان سے لڑنا جائز نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے کئی منظر ہیں کہ کسی دشمن سے دشمن قوم نے اسلام یا صرف اسلامی نظام کو قبول کر لیا ہے اور خون ریزی رک گئی ہے اور لڑائی کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گیا۔

حضور اقدس ﷺ کا دستور تھا کہ جب کسی فوج کو روانہ کرتے تو فوجی قافلہ کو یہ ہدایت فرماتے :-
جب تمہارا مشرکوں میں سے کسی دشمن قوم سے مقابلہ ہو تو اس کو تین باتوں میں سے ایک بات کے قبول کرنے کی دعوت [2]

---

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

[2] ترجمان القرآن

دو۔ وہ مان لے اس کو قبول کرلے اس پر حملہ کرنے سے رُک جا۔ اس کو اسلام کی دعوت دے اگر وہ قبول کرے تو اس سے رک جا۔ اس کے بعد اس سے خواہش کر کہ وہ مسلمانوں کے ملک میں آجائے تو اس کا وہی حق ہوگا جو مسلمانوں کا ہے اور اگر وہ نہ مانے تو اس کی حالت بدو مسلمانوں کی ہوگی۔ قانون اس پر مسلمانوں کا جاری ہوگا لیکن غنیمت اور فیئ میں اس کا حصہ نہ ہوگا جب تک وہ جہاد میں شرکت کرے اگر وہ اسلام قبول نہ کرے تو پھر تو اس کو اسلامی نظام قبول کرنے کی دعوت دے اگر وہ اس نظام میں رہ کر جزیہ دینا قبول کرے تو اس سے بھی رک جا اگر وہ اس کو بھی نہ مانے تو پھر خدا کی مدد مانگ اور لڑائی شروع کر دے [1]

یہ وہ اصولِ جنگ ہے جس سے خونریزی کی روک تھام مقصود تھی نہ یہ کہ کسی کو مجبور کرکے بزورِ شمشیر مسلمان بنالینا صحابہ کرام کے زمانے میں ایرانیوں سے جب لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز تک میدان جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی بلکہ دعوت و تبلیغ کرتے رہے حضرت سلمان فارسی رضی اللہ تعالیٰ عنہ تین روز تک ان کو سمجھاتے رہے اور کہتے رہے کہ میں تمہاری قوم سے ہوں لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیر فرمان ہیں۔ اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں۔ اور اگر تم اپنے ہی مذہب پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو لیکن محکوم رہو گے [2]

اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیل مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں کھلی ہیں اس آیت میں یہ بتایا گیا کہ اگر میدانِ جنگ میں مشرکوں میں سے کوئی آپ سے پناہ مانگے تو آپ اس کو پناہ دیدیجئے یہاں تک کہ وہ کلام اللہ سن لے۔ پھر اس کو اس کے امن کی جگہ پہنچا دیجئے کیونکہ ان کو علم نہیں ہے یہ نہیں کہا گیا کہ اگر وہ پناہ ملنے اور کلام الٰہی سننے کے بعد مسلمان نہ ہو تو اس کو اس کے مامن میں پہنچانے کی جگہ قتل کردو۔ اس سے معلوم ہوا کہ اسلام کی امن پسندی اور رواداری کے مفہوم کو الٹ کر بیان کیا جاتا ہے۔

الغرض فاقتلوا المشرکین کے ذریعے جس دار و گیر کا سنگین حکم ہوا تھا اس میں بھی اتمام حجت کے لیے یہ رعایت دی گئی ہے۔ فرمایا کہ اس دار و گیر، پکڑ دھکڑ کے دوران اگر کوئی شخص امان چاہے تو اسے امان دے دو اور اس کو اسلام کی دعوت اور اس کا مقصد اچھی طرح سمجھا دو اور سمجھانے کے بعد اسے امن کی جگہ پہنچا دو تاکہ وہ ٹھنڈے دل سے اپنے معاملہ پر غور کرکے فیصلہ کر سکے کہ وہ اسلام قبول کرتا ہے یا تلوار یہ امان بخشی صرف اتمام حجت کے نقطۂ نظر سے ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے ذالک بانھم قوم لا یعلمون یہ اس رعایت کی وجہ بتائی ہے کہ چونکہ یہ لوگ اُمّی ہیں دین و شریعت سے بے خبر اور نبوت و رسالت سے ناآشنا۔ اس وجہ سے ہو سکتا ہے کہ دعوت و تبلیغ کے بعد بھی کوئی کمی رہ گئی ہو اس لیے اگر کوئی شخص طالب ہدایت ہو تو اس کو رعایت دی جائے۔

[1] صحیح مسلم کتاب الجہاد
[2] جامع ترمذی

شارحین قرآن نے اس آیت قرآنی سے کچھ علمی مسائل بھی نکالے ہیں آیئے آپ بھی ان سے استفادہ کریں۔

حافظ عماد الدین ابن کثیر فرماتے ہیں۔

منشا یہ ہے کہ جو شخص دار حرب سے دار اسلام میں سفارت تجارت صلح کی نمائندگی یا جزیہ کی ادائیگی یا کسی اور وجہ سے آئے اور اسلامی حکومت سے امان کا طالب ہو تو اسے امان دینی چاہیے۔ جب تک وہ دارالاسلام میں رہے اور جب تک وہ واپس نہ جائے اس کی حفاظت کی ذمہ دار اسلامی حکومت کی ہے لیکن علماء کی رائے ہے کہ ایک سال سے زیادہ اسے قیام کی اجازت نہ دی جائے [۱]

اور ابو بکر الجصاص اس آیت پر لکھتے ہیں۔

اس آیت قرآنی کا مسلمانوں سے یہ مطالبہ ہے کہ اگر کوئی غیر مسلم حربی ہم سے توحید و رسالت کے بارے میں دلائل کے ذریعے اسلام آشنائی کا خواہاں ہو تو اس کے اس مطالبہ کی پذیرائی کرنی چاہیے۔ اور اس درخواست کے بعد میدان جنگ میں حربی ہونے کے باوجود اسکا قتل کرنا جائز نہیں ہے ———— اور یہ بھی اسی آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ جو شخص بھی اسلام کے بارے میں کچھ معلومات کا خواہاں ہو تو یہ ہماری ذمہ داری ہے کہ اس کی تشنگی کے لیے علمی سیرابی کا سامان فراہم کریں۔ ابلغہ مامنہ کا اسلامی حکومت سے یہ مطالبہ ہے کہ ایسے پناہ گیر حربی کی حفاظت کرے اور لوگوں سے اسے کوئی تکلیف نہ ہونے دے۔ اس آیت میں یہ بھی رہنمائی ہے کہ مسلمان حکومت اپنے غیر مسلم شہریوں کی جان و مال اور آبرو کی محافظ ہے اور یہ بھی یہ آیت بتا رہی ہے کہ دار الحرب کے باشندوں کو اسلامی حکومت دارالاسلام میں قیام کی بقدر ضرورت اجازت دے سکتی ہے [۲]

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب یہاں بڑی مفید بات لکھ گئے۔

جو شخص اسلام کی تحقیق اور معلومات حاصل کرنے کے لیے ہمارے پاس آئے تو ہم پر واجب ہے کہ اس کو اجازت دیں اور اس کی حفاظت کریں اس کو کسی قسم کی تکلیف یا نقصان پہنچانا جائز نہیں ہے۔ تفسیر قرطبی میں ہے کہ یہ اس وقت ہے جبکہ اس کے آنے کا مقصد اللہ کا کلام سننا اور اسلام کی تحقیق کرنا ہو اور اگر کوئی دوسری غرض تجارت وغیرہ تو وہ مسلمان حکمران کے مصالح اور حکمران کے صوابدید پر موقوف ہے [۳]

ابو بکر العربی نے احکام القرآن میں بھی علامہ قرطبی کی ہمنوائی کی ہے وہ فرماتے ہیں:

قرآن کی آیت صرف اس شخص کے متعلق ہے جو قرآن سننا اور اسلام آشنا ہونا چاہتا ہے۔ اس کے علاوہ

---

[۱] ابن کثیر		[۲] احکام القرآن		[۳] معارف القرآن

کسی دوسرے مقصد کی خاطر حربی کو دارالاسلام میں قیام کی اجازت تو اس کا تعلق مسلمانوں کی اجتماعی مصالح اور منافع سے ہے۔

یہاں یہ سوال بھی کچھ شارحین اٹھا گئے کہ حربی کو قیام کی دارالاسلام میں اجازت صرف اسلامی سرکار ہی دینے کی مجاز ہے یا کسی درجہ میں مسلمان عوام کو بھی یہ حق حاصل ہے۔ اس کے چہرے سے بھی ابو بکر العربی نے نقاب اٹھائی ہے وہ احکام القرآن میں رقم طراز ہیں۔

سربراہ مملکت کی اجازت میں تو دو رائیں نہیں ہیں لیکن جہاں تک مسلمانوں کی رائے عامہ کا تعلق ہے ان میں داخل سب ہیں آزاد، غلام، مرد، عورت، بچے۔ آزاد کے لیے اس حق کو امام مالک، امام شافعی امام ابوحنیفہ اور امام احمد رحمہ اللہ تعالیٰ نے مانا ہے لیکن غلام کے بارے میں امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ کا جواب ہاں میں ہے امام مالک اور ابوحنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اس کی اجازت نہیں دیتے ہیں۔ اور امام ابوحنیفہ نے اس موضوع پر یہ ضابطہ بتایا ہے کہ جس کا مال غنیمت میں کوئی حصہ نہیں وہ کسی کو امان دینے کا مجاز نہیں ہے خواہ وہ غلام ہو یا عورت اور بچہ ہو۔[1]

آیت سے ایک انوکھا استدلال

حیرت ہے کہ امام رازی نے اس آیت سے ایمان مقلد کے معتبر نہ ہونے پر استدلال کیا ہے۔ فرماتے ہیں،

یہ آیت بتلاتی ہے کہ دین میں تقلید کافی نہیں ہے بلکہ نظر واستدلال ضروری ہے۔ کیونکہ اگر تقلید کافی ہوتی تو اس کافر کو مہلت ملنے کا سوال نہ ہوتا بلکہ اس سے کہا جاتا کہ ایمان لاؤ یا پھر قتل ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ۔ جب یہ بات اس سے نہیں کہی گئی تو پتہ چل گیا کہ دین میں تقلید کافی نہیں ہے بلکہ دلیل وحجت کی نپی تلی ترازو ہونی چاہیے۔[2]

امام رازی کے منہ سے نکلی ہوئی اس بات کو پہلے السید رشید رضا نے بغیر کسی تنقید کے المنار میں نقل کیا۔ پھر مولانا ابوالکلام آزاد نے اسی بات کو ان شاندار لفظوں میں پیش کیا۔

اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ دین کے بارے میں تقلید کافی نہیں فہم و اذعان ضروری ہے ورنہ قرآن کا سنانا اور پھر غور و فکر کی مہلت دینا ضروری نہ ہوتا۔ یاد رہے کہ قرآن جس طرح اس معاملہ میں جبر کی پرچھائی دیکھنا نہیں چاہتا اسی طرح تقلیدی اعتقاد کا بھی روادار نہیں۔[3]

[1] احکام القرآن [2] تفسیر کبیر [3] ترجمان القرآن

علامہ مصطفیٰ المراغی نے بھی امام رازی ہی سے متاثر ہو کر یہ بات تفسیر مراغی میں لکھی ہے لیکن علامہ شوکانی اور مشہور عالم
نواب صدیق حسن خان نے اپنی تفسیر فتح القدیر اور فتح البیان میں عدم تقلید کے بہت بڑے زعیم ہونے کے باوجود اس آیت کی تشریح میں
اس بات کا صراحۃً تو بڑی بات ہے اشارۃً بھی ذکر نہیں کیا۔ لیکن جن بزرگوں نے اس آیت سے یہ بات معلوم کی ہے ہم ان سے یہ
پوچھنے کا حق رکھتے ہیں کہ تقلید سے آپ کی مراد کیا ہے۔ فروعات اور اعمال فرعیہ میں تقلید جیسا کہ مسلمانوں کی رائے عامہ ائمہ اجتہاد کی
کرتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس کا آیت قرآنی میں اشارۃً بھی ذکر نہیں ہے۔ کیونکہ یہاں اہل ایمان کے بارے میں نہیں بلکہ مشرکین کے
بارے میں ہے وان احد من المشرکین۔ اگر یہ نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر کیا آپ لوگوں کے مجلہ دماغ میں یہ بات آ رہا ہے
ہیں کہ ایمان مقلد قرآن کے نزدیک معتبر نہیں بلکہ وہ ایمان معتبر ہے جو نظر و فکر، غور و تدبر اور اذعان و بصیرت کی قوت سے پیدا
کیا جائے اگر یہی مراد ہے تو اس کو پوری امت میں سے معتزلہ اور متکلمین کے ایک فرقے کے سوا کسی کی حمایت حاصل نہیں ہے
وہ کہتے ہیں کہ ایمان مقلد معتبر نہیں ہے اس پر دلائل کی روشنی میں ہی توحید و رسالت کو حاصل کرنا واجب ہے۔ ان کے خیال میں
ایمان ایسی تصدیق کا نام ہے جو تشکیک مشککت سے بھی زائل نہ ہو سکے یقیناً ایسی تصدیق دلائل کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتی۔ علامہ
تاج الدین السبکی نے تقلیدی ایمان کی چند صورتیں لکھی ہیں۔

۱۔ یہ کہ اسلام کی حقانیت ہی پر پورا یقین نہ ہو اور قلب میں شک و تردد ہو۔

۲۔ یہ کہ اسلام کی حقانیت کا اذعان اگرچہ حاصل ہو۔ مگر نجات ابدی کے لیے تمام ادیان یکساں نظر آئیں۔

۳۔ یہ کہ اسلام کی حقانیت پر کوئی شک و تردد باقی نہ ہو۔ نجات ابدی صرف دین اسلام میں منحصر سمجھے۔

پہلی دو صورتیں یقیناً معتبر نہیں اور تیسری صورت یقیناً معتبر ہے خواہ دماغ میں دلیل کا تصور بھی نہ ہو۔

اس حقیقت کا ثبوت اس سے زیادہ کیا ہو سکتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ اور آپ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے
زمانہ میں کفار کے جم غفیر میدان جنگ میں حلقہ بگوش اسلام ہوئے ان سب کا اسلام معتبر مانا گیا ہے اور کسی ایک واقعہ میں بھی
یہ ثابت نہیں ہوتا کہ ان نومسلموں کو اسلام کے فرائض و واجبات کی طرح نظر و استدلال سیکھنے کی بھی دعوت دی گئی ہو۔ ابتداء میں جن
اشخاص اور جن قبائل نے اسلام قبول کیا ان میں اسلام نظر و استدلال کے زور سے نہیں آیا بلکہ ان کے قلوب کی اثر پذیری کی وجہ سے
آیا۔ چنانچہ ابتدائے بعثت میں جن لوگوں نے اسلام قبول کیا وہ فکر و نظر اور استدلال سے مالا مال نہ تھے بلکہ وہی تھے جو نیک طبع اور
ایماندار، راستی پسند اور حق جو تھے۔ اور جو نبوت کے اوصاف و خصائص سے واقف تھے۔ گذشتہ انسانی مذاہب سے کچھ نہ کچھ واقف تھے

علامہ آلوسی اکابر محققین سے نقل کرتے ہیں کہ ایمان دراصل اس بدیہی تصدیق کا نام ہے جو اہل ایمان کے دلوں میں اس طرح
سما جاتی ہے کہ اگر وہ خود بھی اسے نکالنے کی کوشش کریں تو نکال نہ سکیں۔ تاریخ میں ایسے لوگوں کی مثالیں کم نہیں جو دلائل پر غور و فکر
کے بغیر اسلام لے آئے اس کے برعکس ایسی مثالیں بہت ہیں جن کے سامنے حقانیت اسلام کے دلائل روز روشن کی طرح

عیاں تھے مگر اس کے باوجود وہ اس سعادتِ عظمیٰ سے محروم رہے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ ایمان و یقین کا حاصل ہونا صرف دلائل کی پرورش ہی پر موقوف نہیں بلکہ دلائل کی روشنی میں حاصل شدہ ایمان یکسر نا قابلِ وثوق اور اذعان سے تہی دامن ہوتا ہے اس میں یہ احتمال ہر وقت رہتا ہے کہ اگر دلائل دوسری جانب واضح ہو جائیں تو ایمان بھی رخصت ہو جاتا ہے۔ شیخ اکبر فتوحاتِ مکیہ میں امام غزالی کی کتاب فیصل التفرقہ سے نقل کرتے ہیں کہ متکلمین کی اس جماعت کا غلو اور حق سے انحراف بھی کس درجہ تعجب خیز ہے کہ عوام کا ایمان صرف اس لیے معتبر نہیں کہ ان کو حقانیتِ اسلام کا یقین متکلمین کے اختراعی دلائل کی راہ سے حاصل نہیں ہوا یہ لوگ ان متواتر واقعات سے بھی باخبر نہیں ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کے عہدِ مسعود اور صحابہ کے مبارک دور میں بہت سے جاہل بت پرستوں کا ایمان معتبر مان لیا گیا تھا حالانکہ نہ خود ان کو دلائل کا پتہ تھا اور نہ کسی نے بعد میں انہیں دلائل کی تعلیم دی ہے۔

واقعہ یہ اور صرف یہ ہے کہ ایمان ایک نور ہے جو اللہ سبحانہ خاص اپنے فضل و رحمت سے بندہ کے دل میں ڈال دیتے ہیں اس کا ظاہری سبب کبھی تو کوئی باطنی تحریک ہوتی ہے اور کبھی کسی دیندار کی زیارت۔ روایات سے ثابت ہے کہ بعض منکرین آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور آپ کے روئے انور پر نگاہ پڑتے ہی بے ساختہ بول اُٹھے، کہ یہ کاذب کا چہرہ نہیں ہے۔ اس قسم کا ایک واقعہ نہیں بے شمار واقعات ہیں۔ ان میں ایک شخص بھی بعد میں فکر و نظر اور استدلال کے ذریعے اذعان پیدا کرنے کی محنت میں مشغول نہیں ہوا بلکہ وہی نورِ ایمانی کا ایک ذرہ جو پہلی نظر میں حاصل ہوا تھا تلاوتِ قرآن کے ذریعے بڑھتا گیا اور پھیلتا گیا۔

تاریخ اور واقعات کی روشنی میں یہ حقیقت بالکل بے غبار ہے کہ عین میدانِ جنگ میں یا بزم میں لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہوتے ان کو فرائض و واجبات کی ضرور تلقین ہوتی لیکن یہ کہیں بھی ذکر نہیں کہ ان کو توحید و رسالت کے دلائل کی تعلیم ہوتی۔ یہ تو درست ہے کہ کلامی دلائل بھی ایمان کا سبب ہو سکتے ہیں لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ ایمان صرف دلائل کے پستانوں پر ہی موقوف ہے۔

حقیقت تو یہ ہے کہ وہ ایمان جو دلائل کی طاقت سے وجود میں آتا ہے وہ ضعیف ترین ایمان ہوتا ہے۔ راسخ اور قوی ایمان وہ ہے جو اخبارِ متواترہ کے ذریعے سے حاصل ہوتا ہے یا ایسے قرائن سے میسر ہوتا ہے جن کو اگر زبان بیان کرنا چاہے تو ادا بھی نہ کر سکے۔ یہی وہ ایمان ہے جو شک و تردد سے بالا ہوتا ہے۔ کیونکہ شک و تردد کا مقام دلائل ہوتے ہیں جہاں دلائل نہیں وہاں شک و تردد بھی نہیں۔

امام رازی علمِ کلام کے شہسوار ہیں ان کی خواہش ہے کہ دنیا بھی ان کی طرح کلامی اسلحہ خانہ کے ہتھیاروں کے ذریعے قرآن کا مطالعہ کرے۔

اس حد تک تو ہم بھی امام رازی کے ہمنوا ہیں کہ علمِ کلام کو ایمان کے لیے ایک دفاعی سرمایہ کی حیثیت میں اپنانے میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ امام الحرمین ابو محمد جوینی نصیحۃ المسلمین میں یہ بات بڑی ہی پتے کی تھے فرما گئے۔

قرآن کے دلائل غذا کے درجے میں ہیں۔ ہر انسان ان سے فائدہ اٹھا سکتا ہے۔ کلامی موشگافیاں دوا کی حیثیت میں

ہیں کچھ کے لئے سود مند ہیں مگر بہتوں کو اس کے استعمال سے نقصان ہو رہا ہے۔ قرآنی تصریحات پانی کی طرح ہیں دودھ پیتا بچہ بھی پی سکتا ہے لیکن کلامی کچن کے روغنی کھانے صرف طاقتور ہی کھا سکتے ہیں اور وہ بھی زیادہ کھانے کے بعد بیمار ہو جاتے ہیں۔

امام غزالی نے المنقذ من الضلال میں اقرار کیا ہے کہ:

علم کلام سے مقصود صرف ایمان کی حفاظت و نگرانی ہے۔

خیر ادریس پر تو حیرت نہیں لیکن تعجب ہے کہ مولانا آزاد نے اس آیت سے یہ بات کیسے سمجھ لی۔ یہ بات کہ ایمان تقلید معتبر نہیں رد اہل حدیث اور محدثین کے یہاں معتبر نہیں۔ نواب صدیق حسن خاں رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔

كَيْفَ يَكُوْنُ لِلْمُشْرِكِيْنَ عَهْدٌ عِنْدَ اللّٰهِ وَعِنْدَ رَسُوْلِهٖٓ اِلَّا
الَّذِيْنَ عٰهَدْتُّمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۚ فَمَا اسْتَقَامُوْا لَكُمْ
فَاسْتَقِيْمُوْا لَهُمْ ۭ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِيْنَ ۝ كَيْفَ وَاِنْ
يَّظْهَرُوْا عَلَيْكُمْ لَا يَرْقُبُوْا فِيْكُمْ اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ۭ يُرْضُوْنَكُمْ
بِاَفْوَاهِهِمْ وَتَاْبٰى قُلُوْبُهُمْ ۚ وَاَكْثَرُهُمْ فٰسِقُوْنَ ۝

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان مشرکین کا عہد اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عہد ہو۔ ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے پاس عہد و پیمان کیا تو جب تک وہ تمہارے عہد پر قائم رہیں تم بھی ان کے عہد پر قائم رہو۔ اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے ان کو جو متقی ہیں۔ ان مشرکین کا عہد کیونکر عہد ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر وہ آج پھر غلبہ پا جائیں تو نہ تو تمہارے لیے قرابت کا پاس کریں نہ کسی عہد و پیمان کا وہ اپنی باتوں سے تمہیں خوش کرنا چاہتے ہیں مگر ان کے دلوں کا فیصلہ اس کے خلاف ہے اور ان کی اکثریت بدکردار لوگوں پر مشتمل ہے۔

مَعانی مُفردات

فما استقاموا۔ ماضی کا جمع مذکر غائب ہے استقامت سے۔ استقامت کے معنی سیدھا رہنے یا سیدھا چلنے کے ہیں۔ اسی سیدھا کرنے کے معنے میں تقویم سے مادہ قوم ہے جس کے معنے کھڑے ہونے کے ہیں تقوم تقویم سے اور اقامہ اور استقامہ بات بنتے ہیں۔

ان یظہروا۔ یظہر سے مضارع معلوم کا جمع مذکر غائب ہے جب اس کے ساتھ علیٰ آئے تو اس کے معنے غلبہ اور برتری کے

آتے ہیں اسی سے اظہار ہے جس کے معنے برتر کرنے اور غالب کرنے کے ہیں۔ لایرقبوا جمع مذکر غائب مضارع مادہ رقب
اس کے معنے نگرانی کرنا۔ انتظار کرنا اور اندیشہ کرنا ہیں۔ زمخشری نے اساس میں اس کے معنے چوکنا رہنے کے بتائے ہیں الّا
جاتا ہے لایراقب اللہ فی اموره الّ ہمزہ کے زیر کے ساتھ قرابت کے معنے میں آتا ہے۔ حسان بن ثابت کا شعر ہے۔

کال السقب من وال النعام

لعمرك ان الك من قریش

پھر اس کے معنے حلف اور عہد کے بتاتے ہیں۔ ان معنے کی رعایت سے یہ لفظ ال بمعنے جوار سے مشتق ہے اہل عرب جب
باہم سازگاری کا معاہدہ کرتے تو ان کی آوازیں بلند ہو جاتی تھیں۔ پھر یہ لفظ بطور استعارہ قرابت کے لیے بولنے لگے اور رشتہ
داروں کے درمیان قرابت کا معاملہ دو حلیفوں سے زیادہ پائدار ہوتا ہے۔

ذمہ۔ اور ذمام وہ عہد جس کی پاسداری نہ کرنا قابل مذمت ہو۔ یہ حق بھی ہوتا ہے۔ اور عہد بھی۔ اور فقہ کی زبان میں
حالت جس کی وجہ سے آدمی میں وجوب حق کی اہلیت ہو جائے۔ اہل عرب میں عہد شکنی کو عار سمجھتے تھے۔

پابندی عہد اور اسلام

سچ یہ ہے کہ اخلاقی احکام کا تعلق جہاں تک تعلیم محض سے ہے وہ کوئی ایسی متاع غریب نہیں جس کے پیش کرنے پر اسلام فخر کرے۔ اخلاقی احکام ہمیں ہر جگہ مل سکتے ہیں اور قریباً ہر مذہب نے اپنا مقصد یہی بتلایا ہے کہ انسان کو اخلاق کا درس سنائے۔ اگر قرآن تعلیم دیتا ہے کہ عہد و مواثیق کی پابندی کرو تو آئین موسوی اور ضابطہ ناصری بھی یہ نہیں کہتا کہ عہد باندھ کر توڑ ڈالو۔ حتیٰ کہ آریائی نسل کی وہ فلسفیانہ روحانیت بھی جس نے ہندوستان و ایران میں ظہور کیا۔ اپنی ہر ادنیٰ سے ادنیٰ شاخ کے اندر تعلیمات و احکام سے لبریز ہے۔

پس اصل چیز تعلیم نہیں بلکہ تعلیم کے نتائج اور اس کا عمل ہے۔ دیکھنا یہ ہے کہ قرآن حکیم نے جو کچھ کیا اس نے عملی شکل میں کیسی صورت اختیار کی۔ انسان کی روح اس لیے بیمار نہیں کہ زبانوں نے تعلیم کم کر دی اور کاغذوں پر زیادہ نہیں لکھا گیا بلکہ اس کا اصل دکھ زندگی کی عملی مشکلات میں ہے اور صرف وہی تعلیم فتحمند ہو سکتی ہے جو ایک مستحکم عملی نمونہ اپنے ساتھ رکھتی ہو۔

عملی حقیقت کے لحاظ سے اولین نمونہ حضور اقدس ﷺ ہیں ان آیات میں اسی کی وضاحت کی گئی ہے کہ دشمنوں کی پے در پے عہد شکنیوں اور ظلم و عداوت کی انتہا نے کس طرح نبوت اور صحابہ کرام کو جنگ پر مجبور کیا۔

(۶) یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ان مشرکین کا عہد اللہ اور اس کے رسولؐ کے نزدیک عہد ہو۔ گذشتہ آیات میں جو برات کا اعلان کیا گیا تھا یہاں اس کی حکمت بیان کرتے ہیں یعنی ان مشرکین عرب سے کیا عہد قائم رہ سکتا ہے اور آئندہ کیا صلح ہو سکتی

یہ خطاب عام ہے اور کہا جا رہا ہے کہ بھلا ان مشرکین کے کسی عہد و پیمان کی کوئی ذمہ داری اللہ اور اس کے رسول پر کیسے ہو سکتی ہے جنھوں نے بار بار عہد کئے اور بار بار خلاف ورزی کی اور پھر صلح حدیبیہ کا آخری عہد بھی اس ظالمانہ طریق پر پامال کیا اب ان کا عہد کیوں کر عہد سمجھا جا سکتا ہے علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ پوری بات اس طرح ہے کہ مشرکین کے لیے غدر و بدعہدی کو اندر چھپاتے ہوئے عہد کیسے ہو سکتا ہے اور کفر کے خیال میں پوری بات اس طرح ہے۔ کہ مشرکین کا اللہ سے ایسا عہد کیسے ہو سکتا ہے کہ کل کو اللہ کے عذاب سے بے خوف ہو جائیں اور اللہ کے رسول سے کب ایسا عہد ہو سکتا ہے جس کی وجہ سے وہ دنیا میں عذاب اطمینان کا سانس لے سکیں۔ اور حافظ ابن جریر نے اس کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

> اے مسلمانو! مشرکین کے لیے ایسا عہد اور ایسی ذمہ داری اللہ اور اس کا رسول کب لے سکتا ہے جسے پورا کیا جائے اور اس کی وجہ سے ان مشرکین کو ملک میں گھومنے اور پھرنے کی آزادی ہو۔ مطلب یہ ہے کہ اب ان کا کوئی عہد نہیں ہے۔

معاهدوں کا احترام

(۷) ہاں جن لوگوں کے ساتھ تم نے مسجد حرام کے پاس عہد و پیمان کیا تھا۔ تو جب تک وہ تمہارے عہد پر قائم رہیں تم بھی ان کے عہد پر قائم رہو۔ اللہ تعالیٰ دوست رکھتا ہے ان کو جو متقی ہیں۔ صلح حدیبیہ میں مسلمانوں نے کفار سے جو معاہدہ کیا تھا۔ اس کے بعد اللہ کی کارسازی نے یہ موقع بہم پہنچایا کہ فریق مخالف کی قوت روز بروز گھٹتی اور اسلام کی قوت بڑھتی گئی۔ اس حالت میں اس معاہدہ کو توڑ دینا کیا مشکل تھا مگر یہی وہ وقت تھا جس میں مسلمانوں کے مذہبی اخلاق کی آزمائش کی جا سکتی تھی کہ اپنی قوت اور دشمنوں کی کمزوری کے باوجود وہ کہاں تک اپنے معاہدے پر قائم رہتے ہیں چنانچہ اللہ سبحانہ نے بار بار اس معاہدے کی استواری اور پابندی کی یاد دلائی اور فرمایا تم اپنی طرف سے کسی حال میں اس معاہدہ کی خلاف ورزی نہ کرو۔ جن مشرکوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا ان سے لڑنے کی اگرچہ اجازت دے دی گئی تھی اور مکہ فتح بھی ہو چکا تھا۔ پھر یہ حکم ہوا کہ ان کو چار مہینوں کی اور مہلت دو۔ آگے چل کر جب یہ اعلان ہوتا ہے کہ اب ان مشرکوں اور مسلمانوں کے درمیان کسی قسم کے معاہدہ کی ذمہ داری نہیں رہی۔ تو ساتھ ہی ان مشرکوں کے ساتھ ایفائے عہد کی تاکید کی گئی جنھوں نے حدیبیہ کے معاہدے کی حرمت کو قائم رکھا۔ اور ان مشرکوں کے ساتھ اس ایفائے عہد کو اللہ سبحانہ نے تقویٰ بتایا اور جو اس عہد کو پورا کریں ان کو متقی فرمایا۔ اور ان سے اپنی محبت اور خوشی کا اظہار فرمایا۔ آگے بڑھ کر ان مشرکوں سے اپنی برأت کا اعلان کرتے وقت جنھوں نے اس معاہدہ کو توڑا تھا۔ اللہ سبحانہ مسلمانوں کو پھر تاکید فرماتا ہے کہ ایسا نہ ہو کہ جوش میں ان عہد شکن مشرکوں کے ساتھ ان

له افادات شیخ الاسلام

مشرکوں کے ساتھ بھی خلاف ورزی کی جائے جنھوں نے اس معاہدے کو قائم رکھا ہے۔

آیت میں سیدھے رہنے کا مطلب ہے کہ جب تک وہ اپنے عہد پر قائم رہیں تم بھی اس عہد کو پورا کرتے رہو۔ اور اگر اپنے اس عہد کو اس احتیاط سے پورا کریں ان کا شمار اہل تقویٰ میں ہوگا۔ یہ قرآن پاک کے محاورہ میں تعریف کا نہایت اہم لفظ ہے۔ اور اہل تقویٰ اللہ کی محبت اور رضامندی کی دولت سے سرفراز ہوتے ہیں۔ نتیجہ یہ نکلا کہ معاہدہ کا ایفا اللہ سبحانہ کی خوشی اور پیار کا موجب ہے اور یہ وہ آخری انعام ہے جو کسی نیک کام پر بارگاہ الٰہی سے کسی کو مل سکتا ہے۔

عند المسجد الحرام لاکر صلح حدیبیہ کی طرف نہایت خوبصورت اشارا کیا ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے جتنے معاہدے کیے ہیں ان میں اگر کوئی معاہدہ مسجد حرام کی نسبت سے اپنے آپ کو متعارف کرا سکتا ہے تو وہ صرف حدیبیہ کا معاہدہ ہے کیونکہ یہی معاہدہ مسجد حرام کے قرب جوار میں طے پایا تھا۔ مسجد حرام کا لفظ لاکر ایک طرف تو معاہدہ کا تعارف ہو گیا دوسری طرف اس سے اس کی غیر معمولی حرمت بھی واضح ہوئی کہ یہ کوئی معمولی معاہدہ نہیں ہے بلکہ اسے تکمیل کا سہرا حرم میں حاصل ہوا ہے۔

آخر میں فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم کا بلیغ جملہ لاکر احوال و ظروف کے ناپیدا کنار سمندر کو کوزہ میں بند کر دیا یعنی قریش جب تک اس معاہدے پر قائم رہیں تم بھی اس پر قائم رہو۔ اگر وہ اس کو توڑ دیں تو تم بھی اسے توڑ دو۔ کوئی معاہدہ یک طرفہ قائم نہیں رہتا ہے دونوں پارٹیاں مل کر اس کو قائم رکھتی ہیں۔ یہی تقاضائے عدل ہے اور اسلام اسی کا تمہیں حکم دیتا ہے۔ فقرہ کی بلاغت کا تقاضا ہے کہ اس کی جامعیت کو کھول کر لوگوں کے سامنے پیش کیا جاتا۔

دغابازوں اور بدعہدوں کا عہد

(۸) ان مشرکین کا عہد کیوں کر عہد ہو سکتا ہے جبکہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر وہ آج تم پر غلبہ پا جائیں تو نہ تو تمہارے لیے قرابت کا پاس کریں اور نہ کسی عہد و پیمان کا۔ وہ اپنی باتوں سے تمہیں خوش کرنا چاہتے ہیں لیکن ان کے دلوں کا فیصلہ اس کے خلاف ہے اور ان کی اکثریت بدکاروں پر مشتمل ہے۔ یعنی ان مشرکین عرب سے کیا عہد قائم رہ سکتا ہے اور آئندہ کیا صلح ہو سکتی ہے جن کا حال تم مسلمانوں کے ساتھ یہ ہے کہ کسی وقت ذرا قابو تم پر حاصل کر لیں تو ستانے اور نقصان پہنچانے میں قرابت کا مطلق لحاظ کریں اور نہ قول و قرار کا۔ چونکہ اتفاق سے تم پر غلبہ اور قابو حاصل نہیں ہے اس لیے محض زبانی عہد و پیمان کر کے تم کو خوش رکھنا چاہتے ہیں ورنہ ان کے دل ایک منٹ کے لیے بھی اس عہد پر راضی نہیں۔ ہر وقت عہد شکنی کا موقع تلاش کرتے رہتے ہیں چونکہ ان میں اکثریت غداروں کی ہے۔ اگر کوئی اکا دکا وفائے عہد کا خیال بھی کرتا ہے تو کثرت کے مقابلہ میں اس کی کوئی پیش نہیں جاتی۔ بہرحال ایسی دغاباز بدعہد قوم سے خدا اور رسول کا کیا عہد ہو سکتا ہے۔ البتہ جن قبائل

تم بالخصوص مسجد حرام کے پاس معاہدہ کر چکے ہو سو تم ابتدا کر کے نہ توڑو جب تک وہ وفاداری کے سیدھے راستہ پر چلتے رہیں تم بھی ان سے سیدھے راہ رہو اور بڑی احتیاط رکھو کہ کوئی حقیر سے حقیر بات بھی ایسی ہونے پائے جس سے تم عہد شکنی کی گندگی سے داغدار ہو۔ خدا کو وہی لوگ محبوب ہیں جو پوری احتیاط کرتے ہیں چنانچہ بنو کنانہ وغیرہ نے مسلمانوں سے بدعہدی نہ کی تھی مسلمانوں نے نہایت دیانتداری اور احتیاط کے ساتھ اپنا عہد پورا کیا اعلان براءۃ کے وقت ان کے معاہدہ کی میعاد منقضی ہونے میں نو ماہ باقی تھے۔ ان میں معاہدہ کی پوری پابندی کی گئی [1]

ان آیات میں یہ بات بہت زیادہ فکر و غور کی محتاج ہے کہ بات کا آغاز تو کیف یکون للمشرکین عهد عند الله وعند رسولہ سے کیا ہے لیکن ابھی بات پوری نہ ہوئی تھی کہ جملہ معترضہ لا کر مسجد حرام کے جوار میں معاہدہ کرنے والوں کو ان سے مستثنیٰ کر دیا۔ جملہ معترضہ کے بعد پہلی بات کو از سر نو بیان کرنا شروع کیا اور ابتدائی تمہید سے شروع کر کے بات کو پورا کیا۔ فرمایا کیف وان یظهروا علیکم لا یرقبوا فیکم الا ولا ذمۃ۔ یہ بات علامہ آلوسی نے روح المعانی میں کھولی ہے کہ کیف کو مکرر لے کر آئے صرف یہ بتانے کے لیے کہ مشرکین کا عہد میں کردار کسی بھی رعایت کا مستحق نہیں۔ یا مقصد یہ ہے کہ ان سے وفائے عہد ان حالات میں ناممکن ہے۔ اور پھر کیف کے بعد یہاں فعل کا کوئی ذکر نہیں بلکہ ایک قدم آگے بڑھا کر جملہ حالیہ وان یظهروا لے آئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں سے اللہ و رسول کا کوئی عہد کیوں کر ہو سکتا ہے جب کہ ان کا حال یہ ہے کہ اگر ان کو کہیں تم پر دسترس یا غلبہ مل جائے تو ان کو تمہاری قرابت کی پروا نہ ہوگی۔ اور نہ کبھی تم سے کیے گئے عہد کی پاسداری کا لحاظ ہوگا۔

زندگی میں تعلقات کی بنیادیں دو ہی چیزیں فراہم کرتی ہیں معاشرتی تعلقات کی بنیاد رشتہ رحم و قرابت پر قائم ہوتی ہے جبکہ سیاسی روابط کی بنیاد باہمی معاہدات کی عائد کردہ ذمہ داریوں کے احترام پر ہوتی ہے۔ قرابت اور رشتہ داروں کے لیے قرآن میں ال آیا ہے۔ اس سے ان حقوق کی طرف اشارا ہے جو ایک اصل و نسل ایک جوہر و معدن سے ہونے یا قرابت اور جوار کی بنا پر ایک دوسرے پر آپ سے آپ قائم ہو جاتے ہیں۔

سیاسی تعلقات کو آیت میں ذمہ سے تعبیر کیا ہے یعنی وہ ذمہ داریاں جو کسی معاہدے میں شریک ہونے والی جماعتوں پر از روئے معاہدہ عائد ہوتی ہیں۔ فرمایا کہ اس اعلان براءت سے تم اس پریشانی میں نہ پڑ جانا کہ اب ان لوگوں سے تمام معاشرتی اور اجتماعی تعلقات ختم ہو رہے ہیں تعلقات کبھی یکطرفہ قائم نہیں رہتے۔ تم میں سے جو لوگ ان کے تعلقات کو عزیز رکھتے ہیں۔ انہیں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ وہ اگر تم پر کبھی قابو پا جائیں گے تو نہ تو قرابت کا خیال کریں گے اور نہ کسی اجتماعی معاہدے کی پاسداری کریں گے۔ ملاقاتوں میں جو یہ لوگ باتونی ہو کر باتیں بناتے ہیں۔ وہ محض زبانی ہمدردی کی نمائش اور

[1] افادات شیخ الاسلام

تمہیں بے وقوف بنانے کی ایک کوشش ہے ورنہ واقع میں ان کے دلوں میں اور ان کی زبانوں میں کوئی ہم آہنگی نہیں ہے
آخر میں ارشاد ہوا ہے اکثرھم فاسقون یعنی جس طرح ان کی قرابت داری محض زبانی اور نمائشی ہے اسی طرح اپنے عہد و پیمان کے معاملہ میں یہ بالکل جھوٹے ہیں۔ ان کی اکثریت عہد شکن ہے فسق کا لفظ یہاں ان معنے میں نہیں جو محدثین اور فقہاء کی اصطلاح ہے بلکہ یہاں یہ لفظ غداری اور عہد شکنی کے معنے میں ہے اور قرآن میں اس لفظ کا استعمال ان معنے میں معروف ہے۔

دونوں آیتوں میں دو لفظ تقویٰ اور فسق مقابلہ پر آئے ہیں وفائے عہد کرنے والوں کے لیے تقویٰ مقام مدح میں آیا ہے اور عہد شکنی کرنے والوں کے لیے فسق مقام مذمت میں بولا گیا ہے یہاں دونوں کے تقابلی مطالعہ میں گہری تنز ہے گویا یہاں تقویٰ وفائے عہد کا نام ہے تو فسق نقض عہد اور عہد شکنی کا نام ہے۔

اِشْتَرَوْا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ ثَمَنًا قَلِيْلًا فَصَدُّوْا عَنْ سَبِيْلِهٖ ؕ
اِنَّهُمْ سَآءَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ۝ لَا يَرْقُبُوْنَ فِيْ مُؤْمِنٍ
اِلًّا وَّلَا ذِمَّةً ؕ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُعْتَدُوْنَ ۝ فَاِنْ
تَابُوْا وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ فَاِخْوَانُكُمْ فِي
الدِّيْنِ ؕ وَنُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ يَّعْلَمُوْنَ ۝ وَاِنْ
نَّكَثُوْٓا اَيْمَانَهُمْ مِّنْ بَعْدِ عَهْدِهِمْ وَطَعَنُوْا فِيْ دِيْنِكُمْ
فَقَاتِلُوْٓا اَئِمَّةَ الْكُفْرِ ۙ اِنَّهُمْ لَآ اَيْمَانَ لَهُمْ لَعَلَّهُمْ يَنْتَهُوْنَ ۝

انھوں نے اللہ کی آیات کو بہت ہی حقیر قیمت پر بیچ ڈالا ہے پھر لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکنے لگے ان کے یہ کرتوت بہت ہی برے ہیں[۹]۔ وہ کسی مرد مومن کے لیے نہ تو قرابت کا پاس کرتے ہیں اور نہ کسی ذمّہ داری کا۔ لہذا یہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں[۱۰]۔ پس اگر یہ لوگ توبہ کریں نماز قائم کریں، اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اور اہل علم کے لیے ہم اپنے احکام کھول کر بیان کرتے ہیں[۱۱]۔ اور اگر یہ لوگ عہد و پیمان کے باوجود عہد شکنی کریں اور تمہارے دین میں دست اندازی کریں تو تم ان کفر کے سرداروں سے جنگ کرو۔ ان کے معاہدے معاہدے نہیں ہیں۔ تاکہ یہ لوگ ظلم سے باز آجائیں[۱۲]۔

مفردات کے معانی

معتدون یہ اعتداء سے ہے اس کا مادہ عدوان ہے اس کے لغوی معنے حد سے تجاوز کرنے کے ہیں یا یوں کہہ دیجیے

کہ حق سے تجاوز کرنے کے ہیں۔ اعتدار کا لفظ زیادتی کے ہر پہلو کو جامع ہے یہاں عہد شکنی کے معنے میں ہے۔
اخوان یہ اخ کی جمع ہے۔ اخ کی جمع اخوۃ بھی ہے دونوں قرآن میں استعمال ہوئی ہیں۔ دونوں نسبی دینی اور دوستی کے بھائی چارے پر بولی جاتی ہیں یہاں اخوان دینی اخوت کے لیے آیا ہے دوسرے مقام پر دوستی کے بھائی چارے کے لیے آیا ہے یہ یاد رہے کہ اخوان کا لفظ قرآن میں نسبی اخوت کے لیے کہیں نہیں آیا ہے۔
نکثوا ماضی کا جمع مذکر غائب ہے نکث سے۔ اصل میں بٹی ہوئی رسی کو جوڑنے اور اس کو توڑنے کے لیے بولا جاتا ہے یہاں عہد توڑنے کے معنے میں ہے۔

معاہدہ ختم کرنے کی مزید وجوہ

ان آیات میں مشرکین سے معاہدہ ختم کرنے کی مزید وجوہ بتائی گئی ہیں کہ ان مشرکین کا معاملہ اللہ سبحانہ کے ساتھ اور اللہ کے بندوں کے ساتھ درست نہیں ہے اللہ کی جانب سے ان کے پاس اللہ کا رسول پیغام ہدایت اور زندگی گذارنے کا ضابطہ لے کر آیا لیکن اس کے مقابلہ میں دنیوی منفعتوں کو ترجیح دی۔ وقتی مفادات کے پیچھے پڑ گئے خود بھی اس ہدایت سے روگردانی کی اور دوسروں کو بھی روگردان کرنے میں نمایاں حصہ لیا یہ تو ان کا معاملہ اللہ سبحانہ سے ہے۔ اور اللہ کے بندوں سے ان کے معاملہ کی نوعیت یہ ہے کہ کسی مسلمان کے معاملہ میں ان کو نہ رحم و قرابت کا پاس ہے اور نہ عہد و پیمان کا کوئی لحاظ ہے۔ ان آیات میں بتایا گیا ہے کہ معاہدوں کے معاملہ میں ان کی اخلاقی کمزوریاں کیا تھیں اور کن اخلاقی کمزوریوں کے تحت انھوں نے کیے ہوئے معاہدات کی پروا نہ کی بنیادی وجہ جو فی الواقع سب سے بڑی اخلاقی کمزوری تھی یہ تھی کہ ان میں مادہ پرستی اس قدر گھر کر گئی تھی کہ اس کے حصول کے لیے وہ ہر قسم کی دیانت پاکبازی اور ایمانداری عہد و پیمان کو داؤ پر لگا دیتے تھے اور اس میں اس قدر جھوٹے اور بے لگام ہو گئے کہ نہ صرف خود ایمان کے مقابلہ میں کفر کے رسیا تھے بلکہ چاہتے تھے کہ دوسرے بھی ایمان دوستی اور حق پرستی کی راہ پر نہ چلیں۔ یہی ان کی بدکرداری نہ تھی بلکہ وہ مادہ پرستی میں ایسے دیوانے ہو چکے تھے کہ اس کی راہ میں اگر رحم و قرابت حائل ہوتے یا عہد و پیمان راہ میں رکاوٹ ہوتا تو وہ اس کی بھی کوئی پروا نہ کرتے۔ آیات کو بغور مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ باتیں دو ہیں۔
ایک یہ کہ مسلمانوں نے ان سے معاہدے کیوں ختم کیے۔
دوسرے یہ کہ مشرکین نے عہد شکنی کیوں کی۔
بظاہر محسوس ہوتا ہے کہ یہاں قرآن پہلی بات کی وجوہ بیان کر رہا ہے لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہاں دوسری بات کی وجوہ بیان ہو رہی ہیں۔

(۹) انھوں نے اللہ کی آیات کو بہت ہی حقیر قیمت پر بیچ ڈالا ہے پھر لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنے میں لگ گئے۔ ان کے

یہ کروت بہت ہی برے ہیں یعنی یہ مشرکین وہ لوگ ہیں جنھوں نے دنیا کی تھوڑی سی طمع اور اپنی اغراض و اہوا کی خاطر خدا کے احکام و آیات کو رد کر دیا۔ اس طرح خود بھی خدا کے راستہ پر نہ چلے اور دوسروں کو بھی چلنے سے روکا جو ایسے بدترین اور نالائق کاموں میں پھنسے ہوں اور خدا سے نہ ڈریں۔ وہ عہد شکنی کے وبال سے کیا ڈریں گے اور اپنے قول و قرار پر کیا قائم رہیں گے [1]

اس ارشاد میں اصل دو باتیں آئی ہیں ایک یہ کہ انھوں نے اللہ کی آیات کے بدلے تھوڑی سی قیمت وصول کر لی۔ اس کا مطلب ہے کہ ایک طرف اللہ کے قوانین ان کو بھلائی، درستی، اخلاق کی پاکیزگی اور قانون حق کی پابندی کی دعوت دے رہے ہیں۔ دوسری طرف دنیوی زندگی کے وہ چند مادی فوائد ہیں جو خواہش نفس کی بے لگام پیروی سے حاصل ہوتے ہیں۔ ان لوگوں نے دونوں چیزوں کا موازنہ کیا اور پھر اصل چیز کو چھوڑ کر دوسری چیز کو اپنے لیے اختیار کر لیا۔ علامہ طیبی نے اس فقرے کو استیناف بیانی قرار دیا ہے وہ فرماتے کہ یہ ایک ذہن میں پہلی آیت سے اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے پہلے فرمایا تھا اکثر ھم فاسقون ان مشرکین مکہ کی اکثریت عہد شکن ہے۔ مقا سوال ہوا کہ عہد شکنی کیوں کر رہے ہیں جواب میں ارشاد ہوا کیونکہ اشتروا بایات اللہ ثمنا قلیلا۔ وہ اللہ کی آیات کے بدلے حقیر قیمت قبول کر لیتے ہیں۔ یہ حقیر قیمت کیا تھی۔ دنیوی مفادات اور زندگی میں کام آنے والے منافع۔ بس یہی منفعت گیری اور مادہ پرستی ان کی عہد شکنیوں کا باعث تھی۔

دوسری بات یہ ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکنے لگے اس کا مطلب ہے کہ ان ظالموں نے اس پر ہی اکتفا نہیں کیا کہ ہدایت کی جگہ ضلالت کو اپنے لیے پسند کیا بلکہ اس سے آگے بڑھ کر انھوں نے کوشش یہ کی کہ دعوت حق کا کام کسی طرح چلنے نہ پائے۔ خیر و صلاح کی اس پکار کو کوئی نہ سنے بلکہ وہ منہ ہی بند کر دیئے جائیں جن سے یہ پکار اٹھتی ہے۔ جس صالح زندگی کو اللہ سبحانہ زمین پر قائم کرنا چاہتا تھا اس کے قیام کو روکنے میں انھوں نے ایڑی چوٹی کا زور لگا دیا اور ان لوگوں پر عرصہ حیات تنگ کر دیا جو اس نظام حق کے متبع بنے جو محمد رسول اللہ ﷺ اللہ سبحانہ کی جانب سے لے کر آئے تھے۔ اصل ارشاد میں صدوا عن سبیلہ آیا ہے اس کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ صدود لازم ہے اور معنے یہ ہیں کہ وہ اللہ کے راستہ سے ہٹ گئے دوسرے یہ کہ صد متعدی ہے اور معنے یہ ہیں کہ انھوں نے رائے عامہ کو اسلام سے روکا۔ یہاں فقرے میں فاء کا استعمال بتا رہا ہے کہ ان کی نفع اندوزی لوگوں کو اللہ کے راستہ سے ہٹانے اور اسلام کی راہ میں روڑا بننے کا باعث تھی قاضی بیضاوی نے یہی بات لکھی ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے انھم ساء ما کانوا یعملون۔ یعنی یہ لوگ اپنے اس کردار کے لحاظ سے بدترین ہیں کردار کی تفصیل شارحین قرآن نے شرک عہد شکنی اور لوگوں کو دین حق کی پیروی سے روکنا بتائی ہے۔ صرف یہی نہیں بلکہ ان آیات میں ان کے

[1] افادات شیخ الاسلام۔

کردار کا پورا چہرہ جو پیش کیا ہے وہ بھی اس میں داخل ہے۔ یعنی بے ایمانی میں اتنا چھوٹ ہو جانا کہ قرابت اور رحم کی بھی پروا نہ کرنا۔ عہد و پیمان کی ذمہ داریوں کو محسوس نہ کرنا۔ معاملات میں ہم آہنگی نہ ہونا۔ عہد شکن ہونا۔ ہدایت کے مقابلہ میں ضلالت کو پذیرائی دینا۔ لوگوں کو حق کی راہ چلنے سے روکنا۔ یہ سب بدترین اعمال ہیں۔ ان اعمال کی برائی اور شناعت اتنی واضح اور کھلی ہے کہ ان کا مرتکب معاشرہ کبھی اچھا نہیں ہو سکتا۔ قرآن بتا رہا ہے کہ ان گندگیوں کے لبادے میں لپٹی حضرات سے اگر معاہدات کو ختم نہ کیا جائے تو اور کیا کیا جائے۔

اجتماعی ہی نہیں بلکہ انفرادی نقصان

(۱۰) وہ کسی مرد مومن کے لیے نہ تو قرابت کا پاس کرتے ہیں اور نہ کسی ذمہ داری کا۔ لہٰذا یہی لوگ زیادتی کرنے والے ہیں۔ یعنی تمہارے ہی ساتھ نہیں بلکہ مسلمان نام سے ان کو بیر ہے۔ کوئی مسلمان ہو۔ موقع پانے پر اس کو نقصان پہنچانے کے لیے سب تعلقات قرابت اور قول و قرار اٹھا کر رکھ دیتے ہیں اس بارے میں ان کی ظلم و زیادتی حد سے بڑھی ہوئی ہے[1]

کچھ شارحین کی رائے میں یہ تکرار ہے۔ اور کچھ کا خیال ہے کہ تکرار نہیں بلکہ پہلی آیت میں روئے سخن مشرکین کی طرف ہے جبکہ دوسری آیت میں یہودیوں کی طرف ہے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ پہلی آیت میں بے قید مسلمانوں کے حقوق کی نگرانی کا ذکر ہے۔ جبکہ دوسری میں مسلمانوں کے خاص گروہ کے حقوق کی نگرانی کرنا ہے۔ یہ اور اسی قسم کی آراء پیش کی گئی ہیں۔ لیکن امر واقعہ یہ ہے کہ اسلامی زندگی دو حصوں پر منقسم تھی ایک اجتماعی اور دوسرے انفرادی۔ اجتماعی زندگی سے مسلمانوں کا نظم جماعت ہے جس کے تحت ان کی زندگیوں کے سارے گوشے ترتیب پا رہے تھے سب جمع ہو کر ایک ذات گرامی یعنے حضور اقدس ؐ سے جڑے ہوئے تھے اور آپ کی ذات ملک کے نظم و سیاست۔ جماعت کی تنظیم میں مرکز تھی۔ تمام صحابہ اپنی زندگی کے تمام اطوار و اقدار میں آپ کے اشاروں کی منتظر۔ وقت کی سیاست۔ جنگ و امن کے سارے معاملات آپ ہی کے اردگرد گھومتے تھے۔ یہ نظام حیات یا مسلمانوں کا اجتماعی نظام اس درجہ مضبوط۔ اس درجہ کامل اور اس قدر ہمہ گیر تھا کہ دنیا کو اس پر رشک آتا تھا۔ اس کے مقابلے میں ہر مسلمان کی انفرادی زندگی تھی۔ ان کا رہنا سہنا۔ ان کا کھانا پینا وغیرہ اس سے متعلق تھا۔ قرآن نے پہلی آیت میں بتایا کہ مشرکین کو مسلمانوں کی اجتماعی زندگی ان کا اقتدار اور ان کی سیاست اس قدر مبغوض ہے کہ اس کے خلاف اقدام میں نہ وہ کسی رشتہ داری کی پروا کرتے ہیں اور نہ کسی عہد و پیمان کی ذمہ داری کو نگاہ میں لاتے ہیں۔ اس آیت میں مسلمانوں کی انفرادی زندگی کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ مشرکین کو ان کی انفرادی زندگی بھی ایک آنکھ نہیں بھاتی ہے۔ وہ دشمنی میں اتنے از خود وارفتہ ہو گئے ہیں کہ نہ ان کو قرابت کا خیال

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے اور نہ کسی موالات کا۔

اور علامہ نسفی نے مدارک میں آیت میں خاص اور عام مسلمانوں کا فرق جو بتایا ہے وہ اجتماعی اور انفرادی سے الگ ہے۔

آخر میں جو فرمایا ہے واولئک ھم المعتدون۔ یہی لوگ حد سے گذر جانے والے ہیں۔ اس جملہ میں قصر ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اعتدار مسلمانوں میں بالکل نہیں۔ اعتدار صرف مشرکین میں ہے یعنی مشرکین انتقام کے جوش میں بے تحاشا مسلمانوں کے نبرد آزما اور غیر نبرد آزما سب کو مارتے ہیں۔ مسلمانوں کے کھیتوں باغوں اور ان کی چراگاہوں کو آگ لگا دیتے ہیں۔ ان کے بے زبان جانوروں کو مار دیتے ہیں عہد اور عہد شکن قوموں کی دیکھا دیکھی معاہدوں کی پروا نہیں کرتے ان کی پے بہ پے عہد شکنیوں اور ظلم و عداوت کی انتہا نے مسلمانوں کے لیے اعلان جنگ ناگزیر کر دیا تھا۔ انھوں نے بار بار عہد کیے اور بار بار خلاف ورزی کی اور پھر صلح حدیبیہ کا آخری عہد بھی اس ظالمانہ طریق پر پامال کیا تو اب ان کے اعتدار میں کیا شبہ ہو سکتا ہے اب تو یہ شر و تمرد میں آخری حدوں کو پھاند گئے ہیں

قرآن نے اعتدار کی بھرپور مذمت کی ہے اور مسلمانوں کو بھی اس سے روکا ہے لاتعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین۔ زیادتی نہ کرو اللہ سبحانہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا ہے اس کے معنے یہ ہیں کہ میدان جنگ میں بچوں عورتوں اور بوڑھوں کو نہ مارا جائے۔ مشرکین عرب نے یہ تمام حدود پھاند ڈالی تھیں۔ مسلمان عورتیں مسلمان بوڑھے۔ مسلمان معذوران کے ظلم و ستم کا نشانہ بنے۔ جیسا کہ آپ پیچھے پڑھ آئے ہیں۔ اس لیے قرآن نے اعتدار کی مہر ان پر لگا دی اور بتا دیا کہ حقوق تلف کرنے اور حدود توڑنے میں انھوں نے سبقت کی ہے تو ایسے بدعہدوں اور ایسے ظالموں کے ساتھ اللہ و رسول کا عہد کیسے رہ سکتا ہے۔

نماز و زکوٰۃ اخوتِ اسلامی کا پیمانہ

(11) پس اگر یہ لوگ توبہ کریں، نماز قائم کریں اور زکوٰۃ ادا کریں تو وہ تمہارے دینی بھائی ہیں۔ اور اہل علم کے لیے ہم احکام کھول کر بیان کرتے ہیں یعنی اب بھی اگر کفر سے توبہ کر کے احکام دینیہ نماز و زکوٰۃ وغیرہ پر عمل پیرا ہوں تو نہ صرف یہ کہ آیندہ کے لیے مامون و محفوظ ہو جائیں گے بلکہ اسلامی برادری میں شامل ہو کر ان حقوق کے مستحق ہوں گے جن کے دوسرے مسلمان مستحق ہیں جو کچھ بدعہدیاں اور شرارتیں پہلے ہو چکیں سب معاف کر دی جائیں گی۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ جو فرمایا بھائی ہیں حکم شریعت میں اس سے سمجھ لیں کہ جو شخص قرائن سے معلوم ہو کہ ظاہر میں مسلمان ہے اور دل سے یقین نہیں رکھتا اس کو حکم ظاہری میں مسلمان گنیں مگر معتمد اور دوست نہ جانیں ——

دینی بھائی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ شرطیں پوری کرنے کا نتیجہ صرف یہی نہ ہوگا کہ تمہارے لیے ان پر ہاتھ اٹھانا اور ان کے جان ومال سے تعرض کرنا حرام ہو جائے گا بلکہ مزید براں اس کا فائدہ یہ بھی ہوگا کہ اسلامی سوسائٹی میں ان کو برابر کے حقوق حاصل ہوں گے۔ معاشرتی تمدنی اور قانونی حیثیت سے وہ تمام دوسرے مسلمانوں کی طرح ہوں گے کوئی فرق وامتیاز ان کی ترقی کی راہ میں حائل نہ ہوگا۔

یہی آیت اسی عنوان سے پہلے بھی آچکی ہے اور دونوں جگہ مشرکین کا ذکر ہے۔ پہلی آیت میں بتایا کہ اگر مشرکین توبہ کریں نماز قائم کریں زکوٰۃ دیں تو مسلمانوں کے لیے روا نہیں ہے کہ ان سے جنگ کریں گویا محاربین میں جنگ کے خاتمہ کے لیے یہ تین باتیں کافی ہیں اور اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اگر وہ یہ تین کام کریں تو مسلمان برادری کے رکن ہیں۔ ان کے وہی شہری اور بنیادی حقوق ہیں جو اسلامی مملکت میں مسلمانوں کے ہوتے ہیں دو صورتیں ہیں اور دونوں میں جوہری فرق ہے ایک یہ کہ مشرکین سے جنگ کا خاتمہ کیسے ہو۔ کیا صلح کر کے جنگ کو ختم کیا جائے یا پہلے کی طرح کوئی جدید معاہدہ کر کے ان سے جنگ ختم کی جائے یا پھر ان کو اسلامی مملکت کا شہری بنا کر اور جزیہ لے کر جنگ ختم کی جائے فرمایا ان صورتوں میں سے کسی بھی صورت کو مشرکین عرب کے لیے نہ قبول کیا جائے ان سے جنگ ختم کرنے کی اور ان کو آزادانہ جزیرۃ العرب میں رہنے کی صرف ایک صورت ہے اور وہ یہ کہ وہ اسلام کو قبول کر لیں اور اس کی قبولیت کے لیے وہ تین کام کریں توبہ، نماز اور زکوٰۃ ——

اس آیت میں بتایا جا رہا ہے کہ اسلامی اخوت کی پہلی ہی تین چیزیں بنیادی ہیں توبہ، نماز، اور زکوٰۃ —— اگر یہ کام کرتے ہیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔ کیسا ہی بڑے سے بڑا کافر اور سخت سے سخت دشمن ہو جس وقت وہ حلقہ بگوش اسلام ہو جائے اور اسلامی قانون قبول کرے وہ مسلمانوں کا دینی بھائی ہے۔ فاخوانکم فی الدین۔ غلام بھی اگر حلقہ بگوش اسلام ہو جائے تو وہ اسلام کے رشتہ میں داخل ہو جاتا ہے۔ اگر اس کے باپ کا نام ونسب بھی معلوم نہ ہو وہ دین کے رشتہ سے مسلمانوں کا بھائی ہے۔

فان لم تعلموا اباءهم فاخوانكم فى الدين و مواليكم ایسا کیوں ہے؟

اس لیے کہ حضور اقدس ﷺ تشریف لائے تو اپنے ساتھ خون کے رشتے سے بڑھ کر ایک اور رشتہ لائے اور وہ دین کا رشتہ ہے جس نے مدت کے بچھڑوں کو ملا دیا۔ دشمنوں کو بھائی بھائی بنا دیا۔ خاندانی اور قبائلی یگانگی سے بڑھ کر اسلامی برادری کی یگانگی ان کے اندر پیدا کر دی جس نے اس طرح ان کی ہر قسم کی عداوتوں کا خاتمہ کر دیا اور باہمی دشمنیوں کو ان کے دلوں سے ایسا بھلا دیا کہ وہ درحقیقت بھائی بھائی ہو گئے۔

مسلمانوں کی اس باہمی اخوت کی تشریح جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنی زبان مبارک سے اس طرح فرمائی ہے کہ

لہ افادات شیخ الاسلام

مسلمانوں کو باہم ایک دوسرے پر رحم کرنے اور شفقت کرنے میں جسم انسانی کی طرح دیکھو گے کہ اس کے ایک عضو میں بھی تکلیف ہو تو بدن کے سارے اعضاء بخار اور بے خوابی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ (صحیح بخاری کتاب الادب ومسلم)

صحیح مسلم کی ایک اور روایت میں ہے کہ

سارے مسلمان مل کر ایک آدمی کی طرح ہیں کہ اگر اس کی ایک آنکھ بھی دُکھے تو سارا بدن دکھ محسوس کرتا ہے اور اگر سر میں درد ہو تو سارا جسم تکلیف میں ہوتا ہے۔

یہاں شاہ عبدالقادر نے موضح القرآن میں اس آیت سے یہ نکتہ آفرینی خوب فرمائی ہے ــــــ یہ جو فرمایا کہ بھائی ہیں حکم شرع میں اس سے سمجھ لیں کہ جو شخص قرآن سے معلوم ہو کہ ظاہری مسلمان ہے دل سے یقین نہیں رکھتا اس کو حکم ظاہری میں مسلمان گنیں لیکن معتمد اور دوست نہ پکڑیں ــــــ شاہ صاحب بتانا یہ چاہتے ہیں کہ نماز اور زکوٰۃ مسلمان ہونے کی شرط نہیں بلکہ اخوت کی شرطیں ہیں۔ اخوت کے لیے ضروری ہے کہ نماز اور زکوٰۃ کا محسوس پیمانہ اپنے عمل میں رکھتے ہوں۔ قرآن نے ولالت اور دوستی کی بھی نماز اور زکوٰۃ کو شرط بتایا ہے۔

انما ولیکم اللہ و رسولہ والذین امنوا الذین یقیمون الصلوٰۃ و یؤتون الزکوٰۃ وھم راکعون۔

تمہارے دوست تو اللہ اس کا رسول اور وہ اہل ایمان ہیں جو نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ دیتے اور اللہ کے حضور جھکے رہتے ہیں۔

حکومت کے اسلامی ہونے کی بھی نماز اور زکوٰۃ شرطیں ہیں۔

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔

وہ کہ اگر ہم ان کو طاقت دیں ملک میں تو نماز قائم کریں زکوٰۃ دیں اور اچھے کام کا حکم کریں اور برے سے روکیں

غرض مسلمانوں کی حکومت، ان کی ولایت اور ان کی اخوت کے اسلامی ہونے کی نماز اور زکوٰۃ شرطیں ہیں۔

کچھ لوگوں نے اس آیت کے مفہوم سے استدلال کیا ہے کہ تارک نماز مسلمان نہیں یہ درست نہیں مسلمان ہونا اور بات ہے اور ان میں اخوت ہونا اور بات ہے۔ آپ یہ تو کہہ سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی میں نماز اور زکوٰۃ نہ ہو تو وہ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی نہیں اور یہ بھی آپ کہہ سکتے ہیں کہ اگر ایک مسلمان نماز نہیں پڑھتا ہے تو اس کی زندگی اسلامی نہیں لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ وہ مسلمان نہیں جن لوگوں کی نظر اس بنیادی نکتہ پر تھی انھوں نے تارک صلاۃ کو کافر نہیں بتایا لیکن ترک صلاۃ کو قابل

دست اندازی پولیس سنگین جرم قرار دیا۔ امام ابوحنیفہ، امام شافعی اور امام مالک کا یہی مسلک ہے۔ اگرچہ صرف امام احمد ترک صلاۃ کو کفر بتاتے ہیں۔

علامہ السبکی نے طبقات الشافعیۃ الکبریٰ میں امام شافعی اور امام احمد رحمہما اللہ تعالیٰ کا ایک مناظرہ بھی دلچسپ نقل کیا ہے۔

امام شافعی ——— کیا آپ تارکِ صلاۃ مسلمان کو کافر کہتے ہیں۔

امام احمد ——— جی ہاں

امام شافعی ——— جب وہ کافر ہے تو مسلمان کیسے ہو۔

امام احمد ——— لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ

امام شافعی ——— یہ تو وہ پہلے ہی کہہ رہا ہے۔ اس کا تو اس نے انکار ہی نہیں کیا۔

امام احمد ——— نماز پڑھے گا تو مسلمان ہو جائے گا۔

امام شافعی ——— جب وہ کافر ہو چکا ہے تو کافر کی نماز ہو ہی نہیں سکتی۔

امام احمد ——— خاموش ہو گئے۔

یہاں دو مسئلے ہیں اور دونوں روح کے لحاظ سے بالکل الگ الگ ہیں۔ ایک یہ کہ کوئی جماعت نماز چھوڑ دے یعنی اپنی اجتماعی زندگی ہی سے اسلام کا یہ لیبل ہٹا دے۔ اس آیت کی رو سے وہ جماعت کفر کی آغوش میں چلی جائے گی۔ حضرت ابوبکر نے یہی بات مانعین زکوٰۃ کے بارے میں اس آیت سے سمجھی۔ دوسری بات کہ ایک فرد نماز چھوڑ دے۔ فرد ترکِ صلاۃ سے کافر نہ ہوگا لیکن اس کی زندگی اسلامی نہ رہے گی۔ پہلی آیت اور اس آیت دونوں کا رُخ مشرکین عرب کی طرف ہے۔ دونوں جملہ شرطیہ ہیں لیکن مزہ یہ ہے کہ شرط دونوں جگہ ایک ہے فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ لیکن جواب شرط دونوں جگہ مختلف ہے پہلی آیت میں جواب شرط فخلوا سبیلھم ہے جب کہ دوسری آیت میں فاخوانکم فی الدین ہے۔ شرطوں کا یہ اتحاد اور جواب کا یہ تنوع سیاق کے تقاضے سے ہے پہلی آیت میں مشرکین کے بارے میں فاقتلوا المشرکین کے حکم کے بعد یہ آیت آئی ہے اس کے مطابق فخلوا سبیلھم جواب تھا کہ اب تمہیں ان کو کچھ کہنے کا حق نہیں۔ دوسری آیت مشرکین کا چہرہ پیش کرنے کے بعد کہ کفران میں رچ گیا ہے۔ ضلالت اور راہ خدا سے اعراض ان کی طبیعت بن گئی ہے ——— اس لیے یہاں جواب بھی برمحل اور برموقعہ ہے کہ فاخوانکم فی الدین۔ اس جواب میں اسلام کی طرف زیادہ کشش ہے۔

ایک ضروری اور اہم سوال

شاید آپکے ذہنوں میں یہ سوال ابھر آئے کہ ارشادِ نبوت میں اسلام کے تو پانچ ارکان بتائے گئے جب کہ آیت قرآنی صرف تین بتا رہی ہے۔ حدیث آپنے بارہا سنی ہوگی۔ صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اسلام کا قصر پانچ ستونوں پر قائم کیا گیا ہے۔ شہادتین، نماز، زکوٰۃ، روزہ، اور حج۔

یہ ارشادِ نبوت مسلم ترمذی اور نسائی میں بھی ان ہی الفاظ میں ہے۔ آیت قرآنی میں تین ارکان کا ذکر ہوا ہے شہادتین یعنی توبہ اور اقامتِ صلاۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ۔ اور ارشادِ نبوت میں دو کا اضافہ اور روزہ اور حج۔ اور ان سب کی حیثیت اسلام کے مکان کی ستونوں کی ہے۔ عام شارحین قرآن نے تو اس شبہ کی اہمیت کو کچھ محسوس نہیں کیا مگر سوچنے کی بات ہے کہ جب اسلام تو ارکان پانچ ہیں اور ان پانچوں میں گہرا ارتباط ہے تو اس موقعہ پر صرف تین کو ذکر کرنے کی وجہ کیا ہے ارکان کے باہمی ارتباط پر حافظ ابن رجب حنبلی نے بحث کی ہے فرماتے ہیں۔ ان میں باہم ایسا ربط ہے کہ اگر ان میں ایک بھی نہ ہو تو باقی بھی کمزوری کا شکار ہو جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ ارکان جیسے پورے اسلام کے قصر کو سنبھالے ہوئے ہیں ایسے ہی باہم ایک دوسرے کے لیے بھی سہارا بنے ہوتے ہیں۔ اگر سب موجود ہوں تو پورے قصر اسلام کا وزن باہم تقسیم کر لیتے ہیں اور اگر ان میں کوئی ایک نہیں ہوتا تو اسی کا وزن دوسرے ارکان پر پڑ جاتا ہے اور قصر کے لیے اور خود ستونوں کے لیے بھی یہ خطرے کی گھنٹی ہوتی ہے یہ تو ظاہری ربط ہے اور معنوی ربط اس سے بھی زیادہ ہے۔ ان میں معنوی ربط ایسا ہے کہ ایک دوسرے کے جز کی طرح ہے ایک کی ادائیگی سے دوسرے کی توفیق ہوتی ہے اس لیے حدیث میں اسلام کی اس پراسرار تشبیہ میں ارکانِ خمسہ کا باہمی رشتہ ہی سمجھنا چاہیے۔

ان ارکان کا باہمی ربط بھی یہی چاہتا ہے کہ قرآن میں ان پانچوں کا ذکر ہو۔ لیکن آپ دیکھ رہے ہیں کہ قرآن صرف تین پیش کرتا ہے توبہ اقامتِ صلاۃ اور ایتاءِ زکوٰۃ۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر میں اس کی بنیادی وجہ جو سمجھا ہوں یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے بندوں سے تعلقات دو قسم کے ہیں ایک یہ کہ وہ حاکم ہیں ان کے احکام و قوانین کی طاعت کی جائے دوسرے یہ کہ اللہ سبحانہ محبوب ہیں ان سے محبت کی جائے۔ اس لحاظ سے اسلام میں عبادات بھی دو قسم کی ہیں کچھ عبادتیں وہ ہیں جن کے ذریعے اللہ کی حاکمیت کا سکہ دل پر قائم ہوتا ہے اور کچھ وہ ہیں جن کے ذریعے جذبہ محبت میں انگیخت پیدا ہوتی ہے۔ حاکمیت سے متعلق عبادات کے لیے ہماری زبان میں بندگی کی تعبیر ہے جبکہ محبت سے تعلق رکھنے والی عبادات کو ہم پرستش کہتے ہیں نماز اور زکوٰۃ سے اللہ کی بندگی کا اظہار ہوتا ہے روزہ اور حج اللہ کی پرستش کی نمائندگی کرتی ہیں۔ سورہ براءت میں روئے سخن محاربین سے ہے

ان سے میدان جنگ میں بندگی ہی کا مطالبہ ہو سکتا ہے اس لیے یہاں صرف نماز اور زکوٰۃ کے ذکر پر اکتفا فرمایا۔ اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے اہل ایمان کے لیے اسلام کا مکمل چہرہ پیش فرمایا ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ نفصل الایات ہم یہ احکام مبنی بر دلائل اہل علم کے لیے کھول کر بیان کرتے ہیں تاکہ ان کو ایمان وکفر اور حق وباطل کے فاصلے معلوم ہو جائیں۔ یہاں اہل علم سے مراد وہ لوگ ہیں جو اللہ سبحانہ کی نافرمانی کے انجام کو جانتے ہیں اور اس کا کچھ خوف اپنے اندر رکھتے ہیں اس فقرے میں ایک قسم کی تنبیہہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ جاننا اور سمجھنا چاہتے ہیں ان کے لیے اس باب میں پوری وضاحت کر دی گئی ہے کوئی ابہام باقی نہیں ہے اب اگر مسلمانوں میں سے کسی نے ان مشرکین کے ساتھ اس سے الگ ہو کر معاملہ کرنا چاہا اس کا ذمہ دار وہ خود ہوگا۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ علم یہاں کنایۃً تامل وتفکر کے معنے میں آیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ احکام ان لوگوں کے لیے ہیں جو فکر وغور سے حقائق تک پہنچتے ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اسی آیت سے یہ بات سمجھی ہے کہ اس آیت نے تمام اہل قبلہ کے خون حرام کر دیئے ہیں جب کہ عبداللہ بن مسعود رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نماز وزکوٰۃ کی قرآن میں ہم آہنگی کو دیکھ کر یہ فتویٰ دیا کہ —— تمہیں نماز وزکوٰۃ دونوں کا حکم دیا گیا ہے جس نے زکوٰۃ نہیں دی اس کی نماز نہیں ہے۔ حضرت ابن زید رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہاں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی فقاہت کو خوب سراہا ہے۔ رحم اللہ ابابکر ما کان افقہہ اللہ سبحانہ ابوبکر پر اپنی رحمت کی موسلا دھار بارش نازل کرے کیسی شاندار فقاہت کے مالک تھے ابن زید کا ارشاد حضرت ابوبکر کے اس فیصلہ کے بارے میں ہے جو انہوں نے مانعین زکوٰۃ کے بارے میں صحابہ کے سامنے پیش کیا تھا۔

واللہ لا افرق شیئین جمع اللہ بینہما۔

بخدا میں ان دو چیزوں کے درمیان جدائی نہ کروں گا جن کو اللہ نے جمع کیا ہے۔

عہد شکنی کرنے والوں سے جنگ

(۱۲) اگر یہ لوگ عہد وپیمان کے باوجود عہد شکنی کریں اور تمہارے دین میں دست اندازی کریں تو تم ان کفر کے سرداروں سے جنگ کرو ان کے معاہدے معاہدے نہیں ہیں تاکہ یہ لوگ ظلم سے باز آجائیں یعنی اگر عہد وپیمان توڑ ڈالا جیسے بنی بکر نے خلاف عہد خزاعہ پر حملہ کر دیا اور قریش نے حملہ آوروں کی مدد کی اور کفر سے باز نہ آئے بلکہ دین حق کے متعلق طعنہ زنی اور گستاخانہ عیب جوئی کرتے رہے تو سمجھو کہ اس طرح لوگ ائمۃ الکفر کفر کے سردار اور امام ہیں۔ کیونکہ ان کی حرکات دیکھ کر اور باتیں سن کر بہت کچے اور بیوقوف پیچھے ہو لیتے ہیں۔ ایسے سرغنوں سے مقابلہ کرو کیونکہ ان کا کوئی قول وقسم اور عہد وپیمان باقی نہیں رہا ممکن ہے کہ تمہارے ہاتھوں سے سزا پاکر اپنی شرارت وسرکشی سے باز آجائیں۔ (افادات شیخ الاسلام)

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن میں ہم آہنگی نہیں ہے۔

کچھ کی رائے یہ ہے کہ آیت کے پس منظر میں قریش ہیں مطلب ہے کہ جن لوگوں نے بار بار عہد کیے اور بار بار خلاف ورزی کی اور پھر صلح حدیبیہ کا آخری معاہدہ اس ظالمانہ انداز میں پامال کیا اب ان کا عہد کیوں کر عہد سمجھا جاسکتا ہے ہاں بنو فریق اپنے عہد پر قائم رہے تو یقیناً ان کا عہد بھی محکم قائم ہے۔ اسی طرح یہ آیت گویا قرآن کی آیت

کیف یکون للمشرکین عھد عند اللہ و عند رسولہ الا الذین عاھدتم عند المسجد الحرام فما استقاموا لکم فاستقیموا لھم

کی وضاحت ہے وہاں فرمایا تھا کہ جن لوگوں نے تم سے مسجد حرام کے پاس معاہدہ کیا جب یہ لوگ اس پر قائم رہیں تم بھی قائم رہو اب بتایا جارہا ہے کہ اگر یہ لوگ معاہدہ کو توڑ دیں تو تم ان کے ائمہ کفر سے جنگ کرو۔ ائمہ کفر سے قریش کے صنادید اور عمائد مراد ہیں کیونکہ دین کے معاملے میں سارا عرب ان کے تابع تھا پیشوائی اور سرداری کا مقام ان کو حاصل تھا۔ اسلام کے خلاف طعن و طنز اور استخفاف و استہزا کے جتنے تیر و نشتر چلتے تھے سب کے موجد قریش ہی تھے۔ انھم لا ایمان لھم بھی ان ہی سے متعلق ہے مطلب یہ ہے کہ ان کے عہد و پیمان کا کوئی وزن نہیں ہے۔ یہ زیادہ دیر اس کو نباہ نہ سکیں گے آج نہیں تو کل یہ اس کو پارہ پارہ کردیں گے۔ جب بھی اسے توڑدیں تم ان سے جنگ کرو تاکہ یہ اپنی شرارتوں سے باز آجائیں باز آجانے کے لیے قرآن کی تعبیر لعلھم ینتھون آئی ہے۔ اس فقرے کے ذریعے اس جنگ کے مقصد کو واضح کردیا بتایا یا تاکہ وہ ظلم و بدعہدی سے باز آجائیں۔ اسی طرح سورہ انفال میں لعلھم یذکرون آیا ہے یعنی یہ ہیں تاکہ عبرت پذیر ہوں یعنی یہ جنگ انتقامی جذبہ کے خیال یا دنیوی انتفاع و تغلب کے لیے نہیں ہے بلکہ صرف اس لیے ہے کہ ارباب ظلم و تشدد اپنی بدکرداریوں سے باز آجائیں۔ آیت کی یہ تشریح اکثر شارحین قرآن نے اختیار کی ہے مگر اس تشریح پر اعتراض یہ ہوتا ہے کہ سورہ برأت کا زمانہ نزول غزوہ تبوک اور فتح مکہ کے بعد ہوا ہے اور یہ احکام سورہ برأت کی تبلیغ یوم نحر چار مہینے کے بعد ۹ھ میں پیش آرہے ہیں۔ اس اعتراض کی قوت کو قرطبی نے بھی محسوس کیا اور ان کے علاوہ دوسرے شارحین نے بھی۔ کچھ اس اعتراض کی قوت سے اتنے مرعوب ہوگئے کہ سورہ برأت کے زمانہ نزول ہی کا انکار کر بیٹھے۔ اور کچھ نے اسی اعتراض کی وجہ سے اس آیت کی تشریح میں دوسری راہ اختیار کرلی۔

ان کے خیال میں اس آیت کا تعلق قریش سے نہیں بلکہ ان زندیقوں سے ہے جن کا ظہور حضور اقدس ﷺ کے بعد زمانہ خلافت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ میں ہوا تھا۔ اس رائے کو علامہ زمخشری نے کشاف میں اختیار کیا ہے۔ اس صورت میں آیت کی تشریح اس طرح کی ہے۔

اس آیت کے الفاظ سے بظاہر یہ گمان ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنا عہد توڑدیں تو ان سے لڑو لیکن نظم کلام پر غور کرنے سے

صاف معلوم ہوتا ہے کہ یہاں عہد سے مراد اسلام اور اطاعت امر کا عہد ہے۔ کیونکہ معاہدات کو تو پہلے ہی ساقط کیا جا چکا ہے اور اب آیندہ ان سے معاہدہ کرنا سرے سے پیش نظر نہ تھا لہذا یہاں خلاف ورزی معاہدہ کا کوئی سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر آیت اوپر والی آیت کے متابعد آئی ہے جس میں کہا گیا ہے کہ اگر وہ توبہ کریں اور نماز و زکوٰۃ کی پابندی قبول کر لیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں اس کے بعد یہ کہنا کہ اگر وہ اپنی قسمیں توڑ دیں صاف طور پر یہ معنے رکھتا ہے کہ اس سے مراد ان کے اسلام قبول کرنے اور اسلامی نظام جماعت کی پابندی کا عہد کرنے کے بعد پھر اسے توڑ دینا ہے دراصل اس آیت میں فتنہ وارتداد کی طرف اشارہ ہے جو ڈیڑھ سال کے بعد خلافت صدیقی کی ابتدا میں برپا ہوا تھا۔ حضرت ابوبکر نے اس موقعہ پر جو طرز عمل اختیار کیا وہ ٹھیک اس ہدایت کے مطابق تھا جو اس آیت میں پہلے ہی دی جا چکی تھی [1]

علامہ نیساپوری، قاضی بیضاوی اور دوسرے شارحین قرآن کی اس تشریح کو زمخشری کی حمایت حاصل ہے۔

لیکن پہلی تشریح پر اگر تاریخی حیثیت سے اعتراض ہوا اور اس سے بچنے کے لیے ان بزرگوں نے تشریح کا یہ انداز اختیار کیا۔ تو اس تشریح پر بھی یہ اعتراض ہے کہ یہ تفسیر خود قرآن کے سیاق اور سباق کے خلاف ہے۔ کیونکہ:۔

اولاً اس آیت میں عہد توڑنے کا عہد کرنے کے بعد ذکر ہے اور یہ چاہتا ہے کہ نزول آیت سے پہلے معاہدہ ہو چکا ہو اور یہ معاہدہ حدیبیہ بھی ہو سکتا ہے جو ماضی میں ہو چکا ہے۔ صیغے بھی تعبیر میں ماضی کے استعمال ہوئے ہیں۔ حدیبیہ کے عہد میں نہ صرف قریش مکہ ہی نہ تھے بلکہ مسلمانوں کے اور قریش کے حلفاء بھی اس میں شریک تھے جیسے بنو کنانہ اور بنو خزاعہ۔ تعبیر میں جمع کے صیغے اور جمع کی ضمیریں منہ بولی شہادتیں کہہ رہی ہیں کہ معاہد ایک قبیلہ نہیں بلکہ متعدد قبائل تھے۔ فتح مکہ کے بعد بھی مکہ والے مکہ ہی میں موجود تھے اور مسلمانوں کے خلاف سازشوں میں لگے ہوئے تھے۔

ثانیاً۔ اس آیت میں یہ فرمانے کے بعد کہ ان عہد شکنوں کے رہنماؤں سے تمہیں قتال کرنا چاہیے۔ فقاتلوا ائمۃ الکفر۔ مسلمانوں کو ان ہی سے قتال پر ابھارنے کے لیے قتال کی تین وجہیں پیش کی ہیں کہ۔

۱۔ انھوں نے اپنے عہدوں کو توڑ دیا ہے۔

۲۔ انھوں نے رسول خدا کو گھر سے نکالا ہے۔

۳۔ جنگ کا آغاز ان کی جانب سے ہوا ہے۔

یہ تینوں باتیں قریش کے سوا کہاں پائی جاتی ہیں۔ کیا یہ اوصاف مرتدین خلافت صدیقی پر چسپاں ہو سکتے ہیں

ثالثاً۔ اگر آیت میں خلافت صدیقی کے مرتدین مراد ہوں گے تو آیت قرآنی ضمیروں کے انتشار کا شکار ہو جائے گی اور ضمیروں کا ایسا انتشار فصاحت کے خلاف ہے آغاز میں کیف یکون للمشرکین عہد آیا ہے اس کے بعد

[1] تفہیم القرآن۔

آنے والے افعال اور ضمائر کا مرجع مشرکین ہیں۔ استقاموا ۔ یظھروا ، یرقبوا ، یرضون ، اشتروا ، صدوا ، یعملون ، لایرقبون ، تابوا اقاموا ، اتوا ، یعلمون ، نکثوا ، طعنوا ، ینتھون ، ان سب افعال کی ضمیروں کا مرجع مشرکین ہیں۔ اگر آیت میں مرتدین مراد ہوں گے۔ تو نکثوا اور طعنوا کی ضمیروں کا مرجع مشرکین نہ ہوں گے بلکہ ان کا مرجع مسلمان ہوں گے اور مسلمانوں سے وہ مسلمان مراد ہوں گے جنھوں نے اسلام کا حلقہ گردنوں میں ڈالا ہے نماز اور زکوٰۃ کو اسلامی زندگی کے لیے بطور عنوان اختیار کیا ہے۔ یہ فک ضمائر قرآن جیسی فصاحت کی علمبردار کتاب میں ممکن نہیں ہے

بہرحال آیت کی یہ تشریح پہلی تشریح سے زیادہ مخدوش اور غیر مربوط ہے پہلی اگر تاریخیت سے ہمنوانہ ہونے کی وجہ سے قابل قبول نہیں۔ تو یہ دوسری تشریح قرآن کے سیاق و سباق سے ہم نوانہ ہونے

ہمیں اس آیت کی تشریح میں السید رشید رضا کی یہ بات پسند آئی ہے جو انھوں نے ساری قیل و قال کے بعد المنار میں پیش کی ہے فرماتے ہیں۔

> امر واقعہ یہ ہے کہ یہ آیت ان مشرک معاہدین کے بارے میں ہے جو معاہدین میں سے باقی رہ گئے تھے۔ اور اسی کے حکم میں بھی داخل ہیں جو مسلمانوں کے ساتھ ان مشرکین جیسا طرز عمل اختیار کریں گے۔

آیت قرآنی کو پڑھ کر آگے نہ بڑھ جائیے۔ ٹھہریئے اور ان اہل علم کے ذوق اجتہاد اور تحقیق علمی کی بھی داد دیجئے جنھوں نے اسلامی زندگی کے قانونی اور سیاسی مسائل اس سے معلوم کیے ہیں۔

اگر مملکت کا غیر مسلم شہری جسے ساری دستوری آزادیاں حاصل ہیں اور جس کے جان، مال اور آبرو کے تحفظ کی اسلامی مملکت نے ذمہ داری اٹھائی ہے وہ اگر اسلامی مملکت کا شہری ہو کر دین اسلام کے خلاف دل آزار اور توہین آمیز لب و لہجہ اختیار کرے تو اس آیت کی روشنی میں اس سے امن کا معاہدہ ختم ہو جائے گا اور اس کا یہ جرم اسلامی قانون میں قابل دست اندازی پولیس ہے اور اسلامی عدالت اسے قتل کی سزا دے سکتی ہے۔ کیونکہ معاہدہ سے نکل جانے کے بعد ذمی نہیں حربی کی حیثیت میں آگیا۔ علامہ نسفی مدارک میں رقمطراز ہیں۔

> جب ذمی اسلام کے خلاف زبان درازی کرے تو اسے قتل کی سزا دی جاسکتی ہے کیونکہ اسلامی مملکت کا شہری ہونے کی حیثیت سے اس سے معاہدہ یہ ہے کہ اسلام کے خلاف زبان درازی نہ کرے، زبان درازی سے اس کا عہد ختم ہو گیا۔ اور اسلام کی ذمہ داری ختم ہو گئی۔

ابو بکر الجصاص نے احکام القرآن میں اس قانون کی عمومیت پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ۔

> معاہدین جب بھی معاہدہ کی خلاف ورزی کریں یا اسلام پر زبان طعن دراز کریں تو ان کا عہد ٹوٹ جائے گا۔

علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اسلام پر زبان درازی کرنے میں قرآن اور حضور اقدس ﷺ کی ذات گرامی کو نشانہ بنانے

والوں کے بارے میں لکھا ہے۔

حضور اقدس ﷺ کی شان میں گستاخی سے ذمی کے قتل کی سزا عدالت کا کام ہے یہ امام مالک امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی رائے ہے اور احناف میں سے شیخ ابن الہمام بھی یہی کہتے ہیں۔

بات کھلی ہے کہ جیسے یہ جرم کسی مسلمان سے سرزد ہو تو اس کا عہد ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ ٹھیک اسی طرح اگر یہی جرم کسی اسلامی ملک کے غیر مسلم شہری سے سرزد ہو جائے تو اس کا بھی عہد ذمہ ختم ہو جائے گا۔ دونوں کی سزا ایک ہے۔ یہ بات نہیں کہ مسلمان اگر یہ جرم کرے تو معاف ہے اور غیر مسلم یہ جرم کرے تو مستوجب عقوبت ہے۔ جرم دونوں کا ایک ہے سزا بھی دونوں کی ایک ہے۔ یہ اسلام کی قانونی مساوات ہے۔

اس آیت پر ذرا ایک نگاہ اور ڈال لیجئے آیت میں نکث آیا ہے یہ دراصل ما استقاموا کے مقابلے میں ہے یعنی وہ اپنے معاہدوں پر استقامت سے محروم ہو کر نقض عہد کر جائیں اور طعنوا فی دینکم یہاں تابوا واقاموا الصلوۃ واتوا الزکوۃ کے مقابلہ میں ہے بجائے اسلامی نظام کو قبول کرنے کے اسلام کے خلاف زبان درازیاں شروع کر دیں تو ایسے معاہدین سے تمہیں جنگ میں کوئی پس و پیش نہ کرنا چاہیے تمہیں ان سے قتال کرنا چاہیے کیونکہ فی الواقع یہی کفر کے امام اور لیڈر ہیں کافروں کی قیادت بھی کر رہے ہیں۔ کفر کا جھنڈا ان کے ہی ہاتھوں میں ہے۔ ان کا کوئی عہد ہرگز عہد نہیں ہے۔

بالکل آخر میں جہاد کی غایت و غرض بھی لعلھم ینتھون کہہ کر بتا دی کہ اسلام میں جہاد کی غرض و غایت وہ نہیں جو دوسرے نظاموں میں ہوتی ہے بلکہ اسلام میں جہاد کا اولین مقصد یہ ہے کہ شر و فساد کو ختم کیا جائے اور انسانی زندگی میں خیر و صلاح کو قائم کیا جائے۔ انتہاء کے معنے باز آنا ہیں اس کا مطلب ہے کہ مسلمان کی لڑائی اس وقت تک ہے کہ کفر کی طاقتیں شر و فساد سے باز آ جائیں۔ اگر وہ شر و فساد سے باز آ کر خیر و صلاح کو قبول کر لیں تو پھر کوئی جنگ نہیں۔ قرآن نے باز آنے والوں کو یہ خوشخبری دی ہے۔

قل للذین کفروا ان ینتھوا یغفر لھم ما قد سلف۔

آپ ان انکار کرنے والوں سے کہہ دیجئے کہ اگر باز آ جائیں تو ماضی کے سارے گناہ معاف ہو جائیں گے۔

یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ آیت میں باز آنے کو جنگ ختم کرنے کی صورت بتایا گیا ہے لیکن اس کا مفہوم جبر و اکراہ نہیں۔ اسلام و کفر دونوں برابر کی طاقتیں ہیں جو دنیا میں ہمیشہ نبرد آزما رہی ہیں۔ ان کی باہمی جنگ کبھی جبر و اکراہ کی تعریف میں نہیں آ سکتی ہے۔ جبر یہ ہے کہ جب اسلام کا قبضہ اقتدار پر ہو جائے تو وہ بے بس لوگوں کی گردنوں پہ تلوار رکھ کر اسلام لانے کے لیے مجبور کرے۔ ہمارے علم میں اسلام کی تاریخ میں کبھی ایسا نہیں کیا گیا بلکہ عین میدان جنگ میں دو صورتیں ایسی نکال دی گئیں کہ اگر کفار اسلام قبول کرنا نہ چاہیں تو مصالحت کر کے یا جزیہ دے کر اپنے دین پر قائم رہ سکتے ہیں۔

بکن مشرکین عرب کو یہ رعایت نہیں دی گئی ان کے سامنے صرف تین ہی صورتیں ہیں اسلام قبول کریں۔ میدان جنگ میں آجائیں یا چار ماہ کی مدت میں ترک وطن کر جائیں۔ یہاں انتہاء کے معنے کفر و شرک اور عہد شکنی سے باز آنے کے ہیں۔ دوسرے پارے میں مشرکین عرب کے بارے میں یہ قانون دفعہ پڑھ چکے ہو۔

فان انتھوا فلا عدوان الا علی الظالمین۔

أَلَا تُقَاتِلُونَ قَوْمًا نَّكَثُوا أَيْمَانَهُمْ وَهَمُّوا بِإِخْرَاجِ
الرَّسُولِ وَهُم بَدَءُوكُمْ أَوَّلَ مَرَّةٍ ۚ أَتَخْشَوْنَهُمْ ۚ فَاللَّهُ
أَحَقُّ أَن تَخْشَوْهُ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ﴿١٣﴾ قَاتِلُوهُمْ يُعَذِّبْهُمُ
اللَّهُ بِأَيْدِيكُمْ وَيُخْزِهِمْ وَيَنصُرْكُمْ عَلَيْهِمْ وَيَشْفِ صُدُورَ
قَوْمٍ مُّؤْمِنِينَ ﴿١٤﴾ وَيُذْهِبْ غَيْظَ قُلُوبِهِمْ ۗ وَيَتُوبُ اللَّهُ
عَلَىٰ مَن يَشَاءُ ۗ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ ﴿١٥﴾ أَمْ حَسِبْتُمْ أَن
تُتْرَكُوا وَلَمَّا يَعْلَمِ اللَّهُ الَّذِينَ جَاهَدُوا مِنكُمْ وَلَمْ
يَتَّخِذُوا مِن دُونِ اللَّهِ وَلَا رَسُولِهِ وَلَا الْمُؤْمِنِينَ
وَلِيجَةً ۚ وَاللَّهُ خَبِيرٌ بِمَا تَعْمَلُونَ ﴿١٦﴾ ع ۲ ۱۰ ۸

کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے ہو جنھوں نے اپنے عہد و پیمان کو توڑ ڈالا اور جنھوں نے اللہ کے رسول کو نکالنے کا منصوبہ بنایا اور انھوں نے ہی بار اوّل تم سے جنگ کا آغاز کیا۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ اگر تم ایمان والے ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ ۱۳ تم ان سے جنگ کرو اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دے گا اور ان کو ذلیل کرے گا اور تم کو ان پر غالب کرے گا اور اہل ایمان کے دلوں کو ٹھنڈا کرے گا اور ان کے دلوں کی جلن ختم کر دے گا اور جس پر چاہے گا اپنی رحمت سے رجوع کرے گا اور اللہ علم و دانائی والا ہے ۱۵۔ کیا تم نے خیال کیا ہے کہ تمہیں چھوڑ دیا جائے گا حالانکہ ابھی تو

اللہ کو جاننا ہے تم میں سے ان کو جنھوں نے جہاد کیا ہے اور یہ کہ جنھوں نے اللہ، اللہ کے رسول اور اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کسی کو اپنا پوشیدہ دوست نہیں بنایا ہے یاد رکھو۔ تمہارے اعمال جو کچھ بھی ہیں اللہ ان سے باخبر ہے ۱۵۔

معانی مفردات

بلاء وا کے ماضی کا جمع مذکر غائب بدأ سے بنا ہے مھموز اللام ہو تو معنے شروع کرنا متعدی باب فتح سے ہے اگر ناقص واوی ہو بدا یبدو تو باب نصر سے معنے ظاہر ہونا ہیں۔ مھموز سے باب افتعال ابتداء آتا ہے اور ناقص سے باب افعال ابداء آتا ہے دونوں متعدی آتے ہیں۔

یخزھم اخزاء سے مضارع مجزوم ہے جواب امر ہونے کی وجہ سے مجزوم ہے خزی کے معنے رسوا ہونا ای ے خزی رسوائی کے معنے میں ہے اس کا باب افعال اخزاء رسوا کرنا ہے۔

ولیجہ ولج یلج ولوج سے صفت کا صیغہ ہے راز دار کے معنے میں اصل معنے داخل ہونا ہے ہر چیز جس کو تم کسی چیز میں داخل کرو اور اس کا اس سے کوئی تعلق نہ ہو ولیجہ ہے اس کی جمع ولائج ہے۔

ایمان کی سب سے بڑی آزمائش

ان آیات میں روئے سخن اہلِ ایمان کی طرف ہے اور ان کو جہاد کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ جہاد نام ہے شر و فساد کو مٹانے اور خیر و صلاح کو برپا کرنے کے لیے جان توڑ محنت کرنا اور اس کی خاطر اپنے کو تج کر دینا ہے قرآن و حدیث اس عمل کے عظمت کے تذکروں سے بھرے ہوئے ہیں ان کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ جتنا محبوب اللہ کی بارگاہ میں یہ عمل ہے۔ نماز کے سوا کوئی عمل اتنا محبوب نہیں ہے۔ دشمنانِ حق کے مقابلے میں دعوتی اور فکری جہاد کرنے والوں کو جب قرآن نے کا مددگار انصار اللہ قرار دیتا ہے تو اندازہ لگائیے کہ وہ ان لوگوں کو کیا کچھ قرار نہ دے گا جو اس کے دین کی خاطر اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کے لیے ہی میدان میں اتر آئیں۔ چنانچہ وہ ایسے لوگوں کو اپنا مددگار ہی نہیں بلکہ اپنا محبوب بتاتا ہے ان اللہ یحب الذین یقاتلون فی سبیلہ صفا۔ اس محبوبیت کی تھوڑی سی جھلک حضور اقدس ﷺ کی زبان سے سنیئے۔

ایک شبانہ روز سرحد کی نگرانی ایک ماہ کے مسلسل روزوں اور نمازوں سے بھی افضل ہے (صحیح مسلم)

ایک اور ارشاد ہے۔

ہر مرنے والے کا عمل اس کی موت کے ساتھ ہی ختم ہو جاتا ہے لیکن اس شخص کا معاملہ اس سے مختلف ہے جو اللہ کی راہ میں جنگی پڑاؤ ڈالنے والا ہوتا ہے کیونکہ اس کا یہ عمل قیامت تک بڑھتا ہی رہے گا (ترمذی)

ایک اور ارشاد ہے۔

قسم ہے اس ذات کی جس کی مٹھی میں محمد کی جان ہے اللہ کی راہ میں جہاد کرنے کے لیے ایک صبح یا ایک شام کا سفر دنیا و مافیہا سے بڑھ کر ہے اور راہ خدا میں دشمن کے بالمقابل آکر ٹھہرا رہنا گھر میں ستر برس کی نمازوں سے بہتر ہے۔ ترمذی

صرف یہی نہیں کہ اللہ کے کلمے کو بلند کرنے اور دنیا سے شر و فساد کو مٹانے کے لیے لڑنا اس کی محبت، مغفرت اور رحمت کا حقدار بنا دیتا ہے بلکہ اس کی نگاہ میں تو وہ لوگ بھی بڑا اونچا مقام پا لیتے ہیں جو لڑنے والوں کو صرف بالواسطہ مدد دیتے ہیں اور جہاد کی تیاریوں میں ان کا ہاتھ بٹاتے ہیں۔

(۱۳) کیا تم ایسے لوگوں سے جنگ نہیں کرتے ہو جنھوں نے اپنے عہد و ایمان کو توڑ ڈالا اور جنھوں نے اللہ کے رسول کو نکالنے کا منصوبہ بنایا اور انھوں نے ہی بار اول تم سے جنگ کا آغاز کیا۔ کیا تم ان سے ڈرتے ہو۔ اگر تم ایمان والے ہو تو اللہ اس کا زیادہ مستحق ہے کہ تم اس سے ڈرو۔ قریش نے قسمیں اور معاہدے توڑ دیئے تھے کیونکہ خلاف عہد خزاعہ کے مقابلے میں بنو بکر کی مدد کی اور ہجرت سے پہلے پیغمبر علیہ السلام کو وطن مقدس مکہ مکرمہ سے نکالنے کی تجاویز سوچیں اور وہی نکلنے کا سبب بنے اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین (الایہ) مکہ میں بے قصور مسلمانوں پر بیٹھے بٹھائے مظالم کی ابتداء کی۔ جب ابوسفیان کا تجارتی قافلہ بچ نکلا تو از راہ نخوت و رعونت بدر کے میدان میں مسلمانوں سے چھیڑ کرنے کے لیے گئے۔ اور صلح حدیبیہ کے بعد بھی اپنی جانب سے عہد شکنی کی ابتدا کی کہ مسلمانوں کے حلیف خزاعہ کے مقابلے میں بنو بکر کی پیٹھ ٹھونکتے رہے۔ اور اسلحہ وغیرہ سے ان کی مدد کرتے رہے آخر کار مسلمان ان سے لڑے اور مکہ معظمہ کو مشرکین کے قبضہ سے پاک کیا۔ الا تقاتلون سے غرض معلوم ہوتی ہے کہ جو قوم اس طرح کے احوال رکھتی ہو اس سے جنگ کرنے میں مسلمانوں کو کسی وقت کچھ تامل نہ ہونا چاہیے۔ اگر ان کی طاقت اور ساز و سامان جمعیت کا خوف ہو تو مومنین کو سب سے بڑھ کر خدا کا خوف ہونا چاہیے خدا کا ڈر جب دل میں آجائے پھر سب ڈر نکل جاتے ہیں۔ ایمان کا تقاضا یہ ہے کہ بندہ خدا کی نافرمانی سے ڈرے اور اس کے قہر و غضب سے لرزاں و ترساں ہے کیونکہ نفع و ضرر سب اس کے ہاتھ میں ہے کوئی مخلوق ادنیٰ سے ادنیٰ نفع و ضرر پہنچانے پر بدون اس کی مشیت کے قادر نہیں[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

سارے شارحین قرآن کی رائے میں الا تقاتلون کی تعبیر مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں جہاد کی ترغیب ہی کے لیے نہیں بلکہ تحضیض اور انگیخت کے لیے آئی ہے۔ قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی، ابن الجوزی، ابن کثیر، ابن جریر، شوکانی، رازی اور قرطبی نے یہی بات لکھی ہے کہ اس آیت میں مسلمانوں کو جنگ کے لیے ابھارا ہے۔ پہلی آیت میں وان نکثوا کی تعبیر آئی تھی جس سے معلوم ہوا تھا کہ معاہدہ ان کی جانب سے اسی طور پر باقی تھا لیکن یہاں نکثو کی تعبیر لا کر بتا دیا کہ انھوں نے معاہدہ توڑ دیا ہے اس طرح اس ارشاد میں جہاد کی ترغیب کے لیے ماضی کی ساری داستان مسلمانوں کے سامنے رکھ دی۔

پہلی یہ بات فرمائی نکثوا ایمانھم انھوں نے اپنے معاہدے توڑ دیئے۔ اس معاہدے سے کونسا معاہدہ مراد ہے۔ قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی اور ابن الجوزی کے خیال میں یہ وہ عہد شکنی ہے جس میں قریش کہ نے معاہدہ حدیبیہ کی خلاف ورزی کی تھی۔

قریش کی عہد شکنی

معاہدہ حدیبیہ میں ایک دفعہ یہ تھی کہ قبائل عرب فریقین میں سے جس کے ساتھ چاہیں شریک ہو جائیں۔ چنانچہ اسی وقت بنو خزاعہ نے رسول اقدس ﷺ کے ساتھ معاہدہ کر لیا اور بنو بکر قریش کے حلیف ہو گئے۔ ان دونوں قبیلوں کے درمیان مدت سے رقابت اور چشمک تھی۔ معاہدہ حدیبیہ ان دونوں پر بھی حاوی تھا جیسے قریش مکہ اور مسلمانوں پر حاوی تھا۔ معاہدہ پر اٹھارہ یا انیس ماہ گذرے تھے کہ رجب یا شعبان ۸ھ یعنی اواخر اکتوبر تا اواخر دسمبر ۶۲۹ء میں بنو بکر میں سے نوفل بن معاویہ ــــــ نے اپنے قبیلہ کے بہت سے افراد لے کر بنو خزاعہ پر اچانک حملہ کر دیا۔ بنو خزاعہ نے حد حرم میں پناہ لی۔ حملہ آور رک گئے مگر نوفل نے کہا تم لوگوں کو حد حرم میں چوریاں کرتے ہوئے کوئی باک نہیں ہے پھر اپنا بدلہ لینے میں کیوں رکتے ہو۔ حملہ جاری رہا یہاں تک کہ بنو خزاعہ نے مکہ پہنچ کر بدیل بن ورقاء کے مکان میں پناہ لی۔

اسی عہد شکنی کو یہاں نکثوا ایمانھم سے تعبیر کیا ہے۔ یہ تو ہوئی قریش کے خلاف ان کے ماضی سے پہلی فرد جرم۔

رسول کا اخراج

دوسرا جرم قریش کے ماضی سے قریش ہی کا جو بیان کیا گیا ہے وہ ہے وھموا باخراج الرسول یہ دراللہ کی اس سازش کی طرف اشارہ ہے جو قریش کے لیڈروں نے آپ کی دعوت حق کو یک قلم ختم کر دینے کے لیے کی تھی۔ اس کے لیے مختلف لیڈروں کی طرف سے مختلف تجویزیں پیش ہوئیں۔ تاریخ و سیرت کی کتابوں سے معلوم ہوتا ہے کہ غور و بحث

کے بعد قتل کی تجویز پر اتفاق ہوگیا اور قتل کی یہ تدبیر سوچی گئی کہ قریش کے تمام بڑے خاندان اس میں شریک ہوں تاکہ خاندان ہاشم کے لوگ قصاص کا مطالبہ نہ کر سکیں۔ ہجرت پر نویں جلد کا نوٹ ۳۶ سورہ انفال ضرور مطالعہ کر لیجئے۔ یہاں آیت میں لفظ ہم لاکر اشارہ کر دیا کہ انھوں نے رسول کے شہر بدر کرنے کا منصوبہ بنایا تھا ورنہ رسول کا نکلنا حکم خداوندی کے تحت تھا۔ علامہ خفاجی فرماتے ہیں الواقع فیھا الھم بالاخراج لا الاخراج یعنی انھوں نے نکالنے کا منصوبہ بنایا تھا نکالا نہیں تھا نکالنے کے لیے منصوبہ بندی کی جسارت بھی بجائے خود قرآن کے نزدیک ایک جرم عظیم ہے سورہ انفال میں ان کی اسی منصوبہ کو قرآن نے مکر کہا ہے وہاں منصوبہ میں تین چیزیں بتائی ہیں قید کر دینا، قتل کر دینا اور نکال دینا۔ آیت قرآنی یہ ہے

واذ یمکر بک الذین کفروا لیثبتوک او یقتلوک او یخرجوک

اور یہاں صرف اخراج کا ذکر کیا ہے۔ چونکہ ان کی مجلس مشاورت ہی ہر خروج وطن کا باعث تھی اس لئے یہاں صرف اخراج کا ذکر کیا ہے۔ سورہ ممتحنہ میں بھی اسی اخراج کا ذکر کیا ہے۔ یخرجون الرسول وایاکم ان تؤمنوا باللہ

قریش کی جانب سے جنگ کا آغاز

تیسری فرد جرم قرآن نے یہاں مخالفین پر یہ لگائی ہے کہ جنگ کا آغاز بھی انھوں نے کیا ہے اس کے لیے تعبیر یہ اختیار فرمائی ھم بداءوکم اول مرۃ یعنی بزور جنگ کرنے میں پہل انھوں نے کی ہے۔ یہاں یہ اشارہ جنگ بدر کی طرف ہے۔ مشرکین کا فوجی لشکر صرف اس لیے آیا تھا کہ قافلہ کو بچائے۔ دونوں موجود تھے۔ اذ انتم بالعدوۃ الدنیا وھم بالعدوۃ القصویٰ والرکب اسفل منکم۔ مشرکین کی فوج دور تھی۔ قافلہ مسلمانوں سے نچلے حصہ پر تھا۔ قافلہ نے خطرہ کا معمولی نشان دیکھ کر راستہ بدل لیا اور منظر عام سے غائب ہوگیا قریش کا جو فوجی لشکر صرف اس لیے آیا تھا کہ قافلہ کو بچائے وہ قافلہ کے سلامت نکل جانے کے باوجود ابوجہل کے اصرار پر واپس نہیں ہوا۔ بلکہ دندناتا ہوا بدر آیا تاکہ آس پاس کے قبائل پر اپنی قاہری و جباری کا رعب ڈالے۔ ان کا نعرہ تھا کہ ہم اب حضور انور اور ان کی دعوت کو ختم ہی کر کے جائیں گے اس لیے جنگ کی ابتداء بھی ان کی جانب سے ہوئی۔ یہ قریش کے جرائم کی فہرست بیان ہوئی ہے اس لیے اس آیت کا تعلق بلا ریب قریش ہی سے ہے اور یہ سب حال کی نہیں ماضی کی داستان ہے۔ حال میں مسلمانوں کو اس لیے سنائی جا رہی ہے کہ وہ مستقبل میں حالات کا ہر طرح سے مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں کیونکہ۔

اولاً تمام مشرک قبائل کو بیک وقت معاہدات کی منسوخی کا نوٹس دیا جا چکا ہے پھر مشرکین کے لیے حج کی بندش کعبہ کی تولیت میں تغیر اور رسوم جاہلیت کا کلی انسداد کا مطلب یہ تھا کہ ایک بار سارا ملک مسلمانوں کے خلاف کوہ آتش فشاں ہو جائے اور مشرکین اپنا خون اپنے مفادات کی خاطر بہا دینے کے لیے تیار ہو جائیں اور سارے قبائل مسلمانوں کے خلاف

ایک سنگین محاذ بنالیں۔

ثانیاً۔ حج کو صرف مسلمانوں کے لیے مخصوص کر دینے اور مشرکین پر کعبہ کا راستہ بند کر دینے کے معنے یہ تھے کہ ملک کی آبادی کا بیشتر حصہ کعبہ کی طرف اس نقل و حرکت سے باز آجائے جو صرف مذہبی حیثیت سے نہیں بلکہ معاشی حیثیت سے عرب کے لیے ایک غیر معمولی حیثیت رکھتی تھی۔ اور جس پر اس زمانے میں عرب کی معاشی حیثیت کا بہت بڑا انحصار تھا۔

ثالثاً جو لوگ صلح حدیبیہ اور فتح مکہ کے بعد ایمان لائے تھے ان کے لیے یہ معاملہ بڑی آزمائش کا تھا۔ کیونکہ ان کے بہت سے رشتہ دار ابھی تک کافروں کی صف میں تھے۔ اور ان میں ایسے لوگ بھی تھے جن کے سارے مفادات مشرکین سے وابستہ تھے۔

ان حالات میں قرآن نے اہل ایمان کو ترغیب دی کہ الا تقاتلون کیا تم ان لوگوں سے جنگ کرو گے اور ان کو پورے عرب سے ختم کرنے کے لیے قدم نہیں اٹھاؤ گے۔ بالفاظ دیگر اس ترغیب اور تحضیض کے معنی یہ ہیں۔ کہ مسلمانوں کو خود اپنے ہاتھوں اپنے اقارب اپنے خاندان، اپنی قوم اپنے ہموطنوں کو تہس نہس کرنے کی تیاری کا حکم ہو رہا ہے بلکہ آج کی زبان میں اتحاد کے سارے رشتوں، زبان، ملک، قوم اور پیشہ سب پر اسلام کے مقابلے میں ضرب کاری لگانے کا حکم دیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اسلام کے نظام حیات میں زبان، نسل، قوم، وطن اور پیشہ کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے یہاں امت بنتی ہے ایمان کے نام پر اور قدر و قیمت ہے یہاں اعمال و اخلاق کی۔ اور بس۔

ایمان کے حوالہ سے تنبیہہ

اس کے بعد اہل ایمان کو ایمان کے حوالہ سے ایمان کے تقاضے پورے کرنے پر تنبیہہ کی جا رہی ہے۔ ایمان زبان کے صرف دعویٰ کا نام نہیں ہے۔

حسن بصری کا ارشاد ہے۔

ایمان صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ کا نام نہیں اور نہ آرزؤں اور تمناؤں کا نام ہے بلکہ ایمان وہ ہے جو دل میں گھر کر جائے اور اعمال اس کی تصدیق کریں۔ (کتاب الایمان حافظ ابن تیمیہ)

این شربت عاشقی ست خسرو
بے خون جگر چشید نتوان

آیت میں ان کنتم مومنین یہ بتانے کے لیے نہیں لایا گیا کہ قرآن کے مخاطبوں میں کمزور ایمان والے بھی موجود ہیں بلکہ اس لیے لایا گیا ہے کہ ایمان کے ساتھ ایمان کے کچھ تقاضے بھی ہیں۔ ان کو پہچانا جائے اور پھر ان کو پورا کیا جائے۔

ایمان باللہ کا تقاضا یہ ہے کہ جنگ کے معاملے میں مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھو یہ نہ سوچو کہ خاندان کا کیا بنے گا تم کیا کھاؤ گے
اہل وطن کو کیا منہ دکھائیں گے ان سب اندیشوں سے بالا ہو کر صرف اللہ سے ڈرو۔ اور یہ ہو کہ اگر ایمان کے تقاضے پورے نہ کیے
تو خدا کو کیا جواب دیں گے فرمایا کہ ان لوگوں سے نہ ڈرو بلکہ اللہ سے ڈرو جو ڈرنے کا سب سے زیادہ حقدار ہے۔

خشیت کے ساتھ محبّت کی تعلیم

قرآن نے خوف وخشیت کے ساتھ خدا کی محبت اور پیار کی بھی تعلیم دی ہے۔ انسان میں سارے کاموں کا ولولہ دو ہی
چیزوں سے پیدا ہوتا ہے خوف اور شوق یا خشیت اور محبت۔ یہ دونوں جذبے الگ الگ بھی پائے جاتے ہیں اور ایک ساتھ
اور آگے پیچھے بھی۔ ان دونوں کے لوازم بھی الگ الگ ہوتے ہیں۔ دعویٰ محبت کا نتیجہ ناز، کبھی گستاخی اور کبھی اپنے مہربان و
محبوب غایت اعتماد کی وجہ سے نافرمانی بھی۔ ظاہر ہے کہ جذبہ محبت کے ان لوازم کا مداوا صرف خوف سے ہو سکتا ہے اس لیے خالق و مخلوق کے
درمیانی رابطہ کی تکمیل نہ تنہا خوف سے ہو سکتی ہے اور نہ تنہا محبت سے بلکہ ان دونوں کے اشتراک امتزاج اور اعتدال سے یہ مقصد حاصل
ہو سکتا ہے اور یہی قرآن کی تعلیم ہے۔ اسی لحاظ سے قرآن نے بندوں کے اللہ سے تعلقات دو گونہ بتائے ہیں۔ حاکمیت اور
محبوبیت۔ حاکمیت کا تقاضا اگر اطاعت ہے تو محبت کا تقاضا عبادت ہے۔ اسی طرح اللہ سبحانہ نے اپنے بندوں پر قاہر بھی ہے۔
اور رحمان و رحیم بھی۔ وہ منتقم اور شدید العقاب بھی ہے اور غفور رحیم بھی۔ وہ اپنے بندوں کو سزا بھی دیتا ہے اور پیار بھی
کرتا ہے۔ خفا بھی ہوتا ہے اور نوازش بھی کرتا ہے اس سے ہی ہمیں ڈرنا چاہیے۔ اور اس سے ہمیں محبت کرنی چاہیے اس سے
زیادہ اور مزے دار بات یہ ہے کہ قرآن اللہ سے ڈراتا ہے مگر جبار قہار کہہ کر نہیں بلکہ رحمان و رحیم کہہ کر۔ چنانچہ خدا کے نیک بندوں
کی صفت ہے۔

وخشی الرحمان بالغیب۔ من خشی الرحمان بالغیب۔

اس جگہ اگر ایمان کا تقاضا خشیت کو قرار دیا ہے تو دوسرے رکوع میں ایمان کا تقاضا اللہ کی محبت کو بتاتا ہے زا خوف
ایمان نہیں اور نری محبت بھی ایمان نہیں۔ ایمان تو شوق اور خوف کے مجموعہ کا نام ہے

پھر اس آیت میں ایمان کے حوالے سے مسلمانوں کو تنبیہ کی ہے کہ تمہیں اللہ سے زیادہ ڈرنا چاہیے۔ احق کا استعمال بتا
رہا ہے کہ خوف تو اوروں کا بھی ہوتا ہے اور یہ ایک طبعی چیز ہے لیکن عقلاً اللہ کا خوف مسلمانوں کو زیادہ ہونا چاہیے۔

جہاد کی غرض و غایت

(۱۴) تم ان سے جنگ کرو اللہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دے گا اور تم کو ان پر غالب کرے گا۔ اہل ایمان کے دلوں کو

ٹھنڈا کرے گا اور ان کے دلوں کی جلن ختم کردے گا اور جس پر چاہے گا اپنی رحمت سے رجوع کرے گا اور اللہ علم و دانائی والا ہے۔ اس آیت میں شریعت جہاد کی اصل حکمت پر متنبہ فرمایا ہے۔ قرآن حکیم میں اقوام ماضیہ کے جو قصے بیان ہوئے ہیں ان سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب کوئی قوم کفر و شرارت اور انبیاء کی تکذیب و عداوت میں حد سے بڑھ جاتی ہے تو قدرت کی طرف سے کوئی تباہ کن آسمانی عذاب ان پر نازل ہوتا ہے جس سے ان کے سارے مظالم اور کفریات کا دفعۃً خاتمہ ہو جاتا ہے۔

فکلا اخذنا بذنبہ فمنھم من ارسلنا علیہ حاصبا و منھم من اخذتہ الصیحۃ

و منھم من خسفنا بہ الارض و منھم من اغرقنا۔

لہٰذا سب ہی کی ہم نے گرفت کی ہے کچھ تو وہ ہیں جن پر ہم نے تیز و تند ہوا روانہ کی، کچھ کو چیخ نے آپکڑا کچھ کو ہم نے زمین دوز کر دیا اور کچھ کو ہم نے پانی میں غرق کر دیا۔

کوئی شبہ نہیں کہ عذاب کی یہ اقسام بہت سخت مہلک اور آئندہ نسلوں کے لیے عبرتناک تھیں لیکن ان صورتوں میں معذبین کو دنیا میں رہ کر اپنی ذلت و رسوائی کا نظارہ نہیں کرنا پڑتا تھا اور نہ آئندہ کے لیے توبہ و رجوع کا کوئی امکان باقی رہتا تھا۔ شریعت جہاد کی اصل غرض و غایت یہ ہے کہ مکذبین اور متعنتین کو حق تعالیٰ بجائے بلا واسطہ عذاب دینے کے اپنے مخلص وفادار بندوں کے ہاتھ سے سزا دلوائے۔ سزا دہی کی اس صورت میں مجرمین کی رسوائی اور مخلصین کی قدر افزائی زیادہ ہے وفادار بندوں کا نصرت و غلبہ علانیہ ظاہر ہوتا ہے۔ ان کے دل یہ دیکھ کر ٹھنڈے ہوتے ہیں کہ جو لوگ کل تک انہیں حقیر و ناتواں سمجھ کر ظلم و ستم اور استہزاء و تمسخر کا تختہ مشق بنائے ہوئے تھے آج خدا کی تائید و رحمت سے انہی کے رحم و کرم یا عدل و انصاف پر چھوڑ دیئے گئے ہیں۔ کفر و باطل کی شوکت و نمائش کو دیکھ کر جو اہل ایمان گھٹتے رہتے تھے یا جو ضعیف و مظلوم مسلمان کفار کے مظالم کا انتقام نہ لے سکنے کی وجہ سے دل ہی دل میں غیظ کھا کر چپ ہو رہتے تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے سے ان کے قلوب تسکین پاتے تھے۔ اور آخری بات یہ ہے کہ خود مجرمین کے حق میں بھی سزا دہی کا یہ طریقہ نسبتاً زیادہ نافع ہے کیوں کہ سزا پانے کے بعد رجوع و توبہ کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ حالات سے عبرت حاصل کر کے بہت سے مجرموں کو توبہ نصیب ہو جائے چنانچہ حضور پُر نور ﷺ کے زمانہ میں ایسا ہی ہوا کہ تھوڑے دنوں میں سارا عرب صدق دل سے اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا آخر میں فرمایا کہ اللہ سبحانہ علیم و حکیم ہے یعنی ہر ایک کی حالت کو دیکھ کر حکمت کا معاملہ کرتا ہے اور ہر زمانے میں اس کے مناسب احکام بھیجتا ہے [1]

ان آیات میں روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے اور ان میں مسلمانوں کو حکم ہوا ہے کہ جن کا چہرہ آیات بالا میں تمہارے سامنے پیش کیا گیا ہے تم ان سے جنگ کرو۔ اس جنگ کے اغراض و مقاصد کیا ہیں یہ تو آپ خود قرآن کی زبان سے سنیں گے

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جس سے کفر کا وجود عبارت بنانا صرف یہ چاہتا ہوں کہ اسلام کا اولین مقصدِ حیات یہ ہے کہ شر و فساد کی ان قوتوں کا استیصال کیا جائے جس سے کفر کا وجود عبارت ہے۔ دنیا کے ہر وجود کی طرح کفر بھی اپنی ہستی کی بقاء کا آرزو مند ہے۔ اور اس میدان میں اسلام اور صرف اسلام کفر کی راہ روک رہا ہے۔ کیونکہ وہ اپنی فطرت کے اعتبار سے کفر کی ضد ہے اسلام اور کفر کے درمیان مصالحت ناممکن ہے اور ان کی لڑائی بالفعل قائم ہے کفر کی طاقتیں اسلام کے سفر ارتقاء میں مزاحم ہوتی ہیں لیکن ان کی مزاحمت حق و صداقت کی سعی کمال کا سبب بن جاتی ہے۔ جس طرح انسان کو اپنے خارجی ماحول کی مخالف قوتوں سے کشمکش کرنا پڑتی ہے اور یہی کشمکش اس کی قوتوں کو صیقل کرتی ہے جس سے بالآخر وہ اپنے ماحول پر غلبہ حاصل کرتا ہے۔ اسی طرح اسلام بھی کفر سے جنگ آزما ہو کر اپنے قویٰ کو مضبوط اور اپنی داخلی صلاحیتوں کو اجاگر کرتا ہے۔ کفر و اسلام کا یہ تصادم اور ان دونوں کی ازلی پیکار اسلام کی قوت حیات کی افزونی اور کفر کے ضعف و شکست پر منتہی ہوتی ہے اور اس پیکار کی وجہ سے اسلام اپنے اندرونی ارتقاء کے مراحل نسبتہ سہولت کے ساتھ طے کر سکتا ہے اس روشنی میں آپ اس آیت کا مطالعہ کریں تو آپ کو محسوس ہوگا قاتلوا کے ذریعے مسلمانوں کو قتال کا حکم دینے کے راز قتال کی جو اغراض و غایات بتائی ہیں اور اس کی جیتی جاگتی مثالیں دی ہیں قرآن نے اس آیت میں چھ باتیں فرمائی ہیں۔ :

۱۔ یعذبھم اللہ بایدیکم اللہ سبحانہ تمہارے ہاتھوں سے ان کو سزا دے گا۔ اس میں اشارہ ہے اس سنت الٰہی کی طرف کہ جو قوم تکذیب پر اڑ جاتی ہے۔ رسول کی ہجرت کے بعد اس پر لازماً عذاب آتا ہے۔ اسی دستور کے مطابق عذاب کے نازل ہونے سے پہلے دو چیزوں کی ضرورت تھی۔

۱۔ مومنین کی جماعت کے ساتھ حضور اقدس ﷺ کی مکہ سے ہجرت۔

۲۔ ہجرت سے پہلے ہدایت کی کسی آخری نشانی کا ظاہر ہونا۔

چنانچہ ہجرت سے پہلے شق قمر کا معجزہ ظاہر ہوا اس کو دیکھ کر بھی جب قریش کے رؤسا ایمان نہ لائے تو حضور اقدس ﷺ کو مکہ سے ہجرت کا حکم ہوا اور ہلاکت کے عذاب نازل ہونے کا وقت قریب آگیا۔ یہاں وھموا باخراج الرسول میں اسی طرف اشارہ ہے۔ صحابہ کرام میں جو اسرار نبوت کے محرم تھے وہ پہلے ہی سمجھ چکے تھے کہ یہ ہجرت قریش کی بربادی کا پیش خیمہ ہے۔ مستدرک حاکم اور مسند امام احمد میں ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ مکہ سے نکلے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے فرمایا اِنّا لِلّٰہِ مکہ والوں نے اپنے پیغمبر کو نکال دیا اب تو ضرور ہلاک ہوں گے اسی عذاب ہلاکت کا آغاز یوم بدر سے ہوا جسے قرآن نے البطشۃ الکبریٰ کہا ہے۔

عذاب دو طرح آتا ہے ایک میں اللہ سبحانہ کی شانِ قدرت کا اظہار ہوتا ہے دوسرے میں اللہ سبحانہ کی شان حکیمی کی نمائش ہوتی ہے اس آیت میں جس عذاب کی بات ہو رہی ہے اس کا تعلق اللہ سبحانہ کی شان حکیمی سے ہے اس لیے آیت کا انجام بجائے واللہ علی کل شیئ قدیر کے واللہ علیم حکیم ہوا۔ اگر زمینی، فضائی یا آسمانی عذاب ہوتا تو

اللہ کی قدرت ہوتی جیسا کہ دوسرے انبیاء کی امتوں میں ہوا ہے لیکن اب دورِ نبوت محمدیہ میں شانِ حکمت کا مظاہرہ ہوا۔ اس طرح عذاب کا فائدہ، جیسا کہ شیخ الاسلام نے اشارا کیا ہے یہ ہے کہ مومنین کے لیے عذاب کا یہ انداز نسبتہً زیادہ نافع ہے کیونکہ سزا پانے کے بعد توبہ و انابت کا دروازہ کھلا رہتا ہے حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام کے دور میں عذاب کا اظہار قدرت تھا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی اے خدا زمین پر کوئی بسنے والا کافر نہ چھوڑ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دعا کی خداوندا ان کے دل سخت کر دے جب تک عذاب دیکھ لیں گے ایمان نہ لائیں۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے جو اس وقت دعا نکلی وہ یہ تھی خداوندا اپنا وعدہ پورا کر اگر یہ مٹھی بھر مسلمان تباہ ہو گئے تو تیرا نام لینے والا کوئی نہ ہوگا۔ حضرت نوح اور حضرت موسیٰ علیہما السلام نے اپنی اپنی قوم کی تباہی کی دعا مانگی جبکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف اہلِ ایمان کی کامیابی اور فتح و نصرت کی دعا مانگی دشمنوں کی تباہی کی نہیں۔

آیت کا مطلب ہے کہ اللہ ان کو تمہارے ہاتھوں سے عذاب دے کر شانِ حکمی کا اظہار فرمائے گا۔

۲۔ ویخزھم دوسری بات یہ ہے کہ اللہ سبحانہ ان کو رسوا کرے گا یعنی ان کو تمہارے ہاتھوں قیدی بنا کر ذلیل و رسوا کرے گا اور جو قید نہیں ہوئے مقہور و مغلوب ہوں گے۔ یہ رسوائی بھی اسی عذاب کا ایک حصہ ہے کیونکہ تکذیبِ رسول کا باعث ان کی چودھراہٹ اور بڑائی تھی اور بڑائی کی سزا رسوائی ہے۔

۳۔ وینصرکم علیھم۔ اللہ تمہاری مدد کر کے تمہیں فتح مند کرے گا یعنی تمہیں کفر کے مقابلے میں غلبہ عطا فرمائے گا۔ تمام لڑائیوں میں اہلِ ایمان کی کامیابی کا راز اللہ کی مدد اور نصرت رہی ہے غزوہ بدر، غزوہ حنین میں اللہ کی نصرت چونکہ سامنے نظر آ رہی تھی اس لیے قرآن نے دونوں جگہوں کی خاص طور پر نشاندہی کی ہے۔ لقد نصرکم اللہ ببدر اور لقد نصرکم اللہ فی مواطن کثیرۃ ویوم حنین۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ کی راہ میں محنت کرنے والوں کی اللہ سبحانہ مدد فرماتے ہیں قرآن نے مسلمانوں کو ہدایت کی ہے کہ وہ اللہ سے نصرت مانگیں اور وانصرنا علی القوم الکافرین کہیں۔ دراصل نبوت جو مشن لے کر آتی ہے خواہ کس قدر مشکلات پیش آئیں۔ کتنی رکاوٹیں ہوں، کتنی ہی تکلیفیں ہوں۔ بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے۔ پیغمبروں کی سیرت اور ان کی دعوت کی تاریخ خود اس پر گواہ صادق ہے یہ نصرت نہ صرف اس دنیا میں بلکہ میدانِ حشر میں بھی ہوگی۔

انا لننصر رسلنا والذین امنوا فی الحیاۃ الدنیا ویوم یقوم الاشھاد۔

اللہ سبحانہ کی اس تائید و نصرت پر یقین اس درجہ ہو جاتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس راہ میں برداشت کر لیتے ہیں۔ اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لیے پھرتے ہیں مخالفوں کی فوج و لشکر تیغ و خنجر اور خوف و خطر کے باوجود وہ اپنی دعوت اور اپنے مشن سے باز نہیں آتے ہیں اور کسی دام پر مخالفوں سے دعوت سے دست بردار ہو کر صلح نہیں کرتے ہیں۔ اہلِ کفر کو شروع شروع

میں اہل ایمان کی ظاہری بیچارگی اور تنہائی کو دیکھ کر ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے لیکن اللہ سبحانہ کے اس گمان بد کی تردید کر کے فرماتا ہے۔ فلا تحسبن اللہ مخلف وعدہ رسلہ۔ روز ازل سے ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ حق کی منادی کرنے والوں کی ہی فتح ہوگی۔

۴۔ ویشف صدور قوم مومنین۔ مومنوں کے دلوں میں اپنی مصیبتوں اور تکلیفوں کے جتنے دکھ ہیں وہ سب اچھے ہو جائیں گے اور ان کو اس بیماری سے شفا حاصل ہوگی۔ مسلمان بے بس اور بے کس ہونے کی وجہ سے قریش کے زیر دل اور سنگ دلوں کے ہاتھوں مکہ میں سنگ دلانہ مظالم کا نشانہ بنے ہوئے تھے فرمایا کہ اللہ سبحانہ اس طرح ان اہل ایمان کے کلیجے ٹھنڈے کرے گا جو اسلام لانے کے جرم میں ان ظالموں کے ہاتھوں ستائے گئے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اعداء دین کی مغلوبیت پر خوش ہونا امر طبعی بلکہ محمود ہے۔ خاص کر ان لوگوں کے لیے جو ان پر حق کی حجت پوری کر کے اپنے فرض سے سبکدوش ہو چکے ہیں۔

۵۔ ویذھب غیظ قلوبھم۔ ان کے دلوں کی جلن دور ہو جائے گی مشرکین کی عہد شکنی اور ان کے مظالم سے جو اہل ایمان کے دلوں میں جلن اور گھٹن ہو رہی تھی وہ سب ختم ہو جائے گی۔

حیرت ہے کہ بعض شارحین قرآن کو شفاء صدور اور اذہاب غیظ قلوب میں تکرار محسوس ہوا۔ حالانکہ دونوں کا منشا الگ الگ ہے شفاء ہوئی ہے اسلام کی برتری دیکھ کر اور گھٹن دور ہوئی ہے ان کی مقہوری اور مغلوبیت دیکھ کر۔

۶۔ ویتوب اللہ علی من یشاء جنہیں توبہ ملنی ہے وہ تائب ہوں یعنی اللہ تعالیٰ ان کو حلقہ بگوش اسلام فرمائے گا۔ اس میں اشارہ ہے اس طرف کہ کچھ لوگوں کو توبہ کی توفیق نصیب ہو جائے گی۔ غالباً اس بات کو بالکل آخر میں اس لیے لایا گیا ہے کہ شروع میں لانے سے ایک طرف تو اہل ایمان کی تیاری جنگ ہلکی پڑ جاتی اور دوسری طرف مشرکین کے لیے دھمکی کا پہلو ہلکا پڑ جاتا۔ جس نے پوری سنجیدگی سے اپنی پوزیشن کی نزاکت پر غور کرنے اور بالآخر اسلام کے حلقہ بگوش ہونے پر آمادہ کیا۔

یہ ایک قسم کی خوشخبری ہے ان مسلمانوں کے لیے جو اپنے عزیزوں قریبوں کے ایمان کے آرزومند تھے۔

قرآن نے اس آیت میں جن چھ باتوں کا ذکر کیا ہے حرف بحرف پوری ہوئیں۔ مشرکین عرب کی ہستی ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم ہو گئی۔ ان ہی مسلمانوں کے ہاتھوں جو ۱۳ برس تک ان کے مظالم سہتے رہے تھے ان کی قوت کا خاتمہ ہو گیا۔ ان کی رسوائی اس سے زیادہ کیا ہوگی کہ تاریخ کے صفحات میں اس کو بقاء دوام مل گیا۔ اور پھر مسلمانوں کے دلوں کی مظلومیت و بیچارگی کے سارے دکھوں کو کیسی شفاء کامل ملی کہ پچیس برس کے اندر وہ کرۂ زمین کی سب سے اشرف اور بہتر مخلوق ہو گئے آپ مانیں یا نہ مانیں یہ امر واقعہ ہے کہ ان مردان کار کی محنتوں جانبازیوں اور اس پر اللہ کی مدد سے جیسا کہ ڈاکٹر حمید اللہ نے لکھا ہے۔

۱۔ مدینہ منورہ کی شہری مملکت حضور اقدس ﷺ کی حیات طیبہ میں روزانہ دو سو چوہتر میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی رہی۔

دس سال بعد جب حضور ﷺ کی وفات ہوئی تو دس لاکھ سے بھی زیادہ مربع میل کا رقبہ آپ کے زیر اقتدار آ چکا تھا۔

۲- پھر تقریباً بر اعظم ہندوستان و پاکستان کے برابر وسیع علاقہ بھی فتح کیا جس میں تقریباً ملین کی آبادی تھی۔ دشمن کے بمشکل ۱۵۰ آدمی قتل ہوئے مسلمان فوج کا مشکل سے اس دس سال میں ماہانہ ایک سپاہی شہید ہوتا رہا۔

میں ان اعداد کا معاملہ تو سمجھ نہیں سکا۔ بعض اعداد معلوم نہیں۔ لیکن جو معلوم ہیں ان کو جمع کر لیا جائے تو یقیناً ۱۵۰ سے زائد ہوں گے اور یہ کہنا غالباً قرین صحت نہیں ہے کہ دس سال تک ہر مہینے میں مسلمانوں کا صرف ایک سپاہی شہید ہوتا رہا یعنی تمام جنگوں میں صرف ۱۲۰ مسلمان شہید ہوئے۔

اعداد سے اختلاف کے باوجود ڈاکٹر صاحب کے اس ارشاد کی تائید میں ایک لمحہ کے لیے بھی تامل نہیں ہو سکتا ہے کہ دس سال کے عرصہ میں دس لاکھ مربع میل کا رقبہ نبوت کے زیر اقتدار آ چکا تھا۔ لوگ معجزات کا انکار کرتے ہیں اس سے زیادہ پرتاثیر اور یقینی طور پر ناقابل انکار معجزہ کونسا ہو سکتا ہے۔

یہ تو ہوئی یعذبھم اللہ بایدیکم و یخزھم و ینصرکم علیھم کی زندہ و جاوید عملی تفسیر۔ باقی ویتوب اللہ علی من یشاء کو واقعہ کی صورت میں آپ دیکھنا چاہتے ہیں۔ تو اس کا سرسری اندازہ یوں کر سکتے ہیں۔ کہ بدر میں حضور اقدس ﷺ کے ساتھ مہاجرین و انصار میں جان نثاروں کی تعداد تین سو سے کسی قدر زیادہ تھی، احد میں یہ تعداد ۷۰۰ سو تھی۔ خندق میں تین ہزار حدیبیہ کے موقعہ پر صرف عمرہ ادا کرنا تھا صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کی تعداد زیادہ سے زیادہ ۱۴۰۰ تھی۔ عمرۃ القضاء کے وقت دو ہزار اور فتح مکہ کے موقعہ پر دس ہزار اور تبوک میں تیس ہزار تھی۔ یہ حقیقت ہے۔ کہ عام عربوں کے لیے قبول اسلام میں سب سے بڑی رکاوٹ قریش مکہ کے شدید رویہ کی وجہ سے پیدا ہوئی۔ صحیح بخاری میں ہے۔

> عرب اسلام لانے میں فتح مکہ کا انتظار کر رہے تھے وہ کہتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ اور ان کی قوم کو باہم فیصلہ کر لینے دو اگر حضور اقدس ﷺ قوم پر غالب آ گئے، تو بلاشبہ واضح ہو جائے گا کہ وہ سچے نبی ہیں چنانچہ جب فتح مکہ کا واقعہ پیش آ گیا تو عرب کی ہر قوم نے اسلام قبول کر لینے میں جلدی کی۔

عام عربوں میں قریش کو انتہائی رسوخ حاصل تھا۔ تولیت کعبہ نے ان میں خاص نوع کا تقدس پیدا کر دیا تھا۔ عرب پشتوں سے ان کی مذہبی قیادت کے معتقد چلے آ رہے تھے اور عام معاملات میں بھی ان ہی کو منصب قیادت کا حامل سمجھتے تھے فتح مکہ نے یہ سب سے بڑی رکاوٹ درہم برہم کر ڈالی تھی اور جس سیاہ پردہ نے اسلام کی آسمانی روشنی کو عام نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا وہ تار تار ہو گیا۔ غرض فتح مکہ کے بعد عرب کی تمام چھوٹی قوتوں یا قبیلوں اور گروہوں پر آشکارا ہو چکا تھا کہ اب ان کا مستقبل اسلام سے وابستہ ہو چکا ہے لہذا ان سب کے لیے صرف دو راستے رہ گئے تھے۔

۱- قبول اسلام اور اس کے تمام اوامر و نواہی کی پابندی۔

۲- مرکزی اسلامی قوت سے مصالحت اور اس کی حفاظت پر انحصار۔

چنانچہ تمام گروہوں کے نمائندے یا تو اسلام قبول کر کے بارگاہِ رسالت میں آئے اور یا مدینہ پہنچ کر اسلام قبول کر لیا

یہ ہے یتوب اللہ علی من یشاء۔

ایمان کی کسوٹی جہاد ہے

(۱۵) کیا تم نے خیال کر لیا ہے کہ تمہیں چھوڑ دیا جائے گا۔ حالانکہ ابھی تو اللہ کو جاننا ہے تم میں سے ان کو جنھوں نے جہاد کیا ہے اور ان کو جنھوں نے اللہ کے رسول اور اہلِ ایمان کو چھوڑ کر کسی کو اپنا راز دار نہیں بنایا ہے۔ یاد رکھو تمہارے اعمال جو کچھ بھی ہیں اللہ ان سے باخبر ہے۔ مشروعیت جہاد کی یہاں ایک اور حکمت بیان ہوئی یعنی ایمان اور بندگی کے زبانی دعوے کرنے والے تو بہت ہیں لیکن امتحان کی کسوٹی پر جب تک کسا نہ جائے کھرا اور کھوٹا ظاہر نہیں ہوتا۔ جہاد کے ذریعے سے اللہ سبحانہ دیکھنا چاہتا ہے کہ کتنے مسلمان ہیں جو اس کی راہ میں جان اور مال نثار کرنے کو تیار ہیں۔ اور خدا اور رسول اور مسلمانوں کے سوا کسی کو اپنا راز دار یا خصوصی دوست بنانا نہیں چاہتے۔ خواہ وہ ان کا کتنا ہی قریبی رشتہ دار کیوں نہ ہو۔ یہ معیار ہے جس پر مومنین کا ایمان پرکھا جاتا ہے۔ جب تک عملی جہاد نہ ہو صرف زبانی جمع خرچ سے کامیابی حاصل نہیں ہوتی ہے۔ پھر عمل بھی جو کچھ کیا جائے اس کی خبر خدا کو ہے کہ صدق و اخلاص سے کیا یا نمود و ریا سے جیسا عمل ہوگا ویسے اسی کے موافق پھل ملے گا[1] یہ سارے مسلمانوں سے خطاب ہے کہ یہ اعلان ایک کسوٹی ہے جو تمہارے کھوٹے اور کھرے میں امتیاز کر دے گی کہ کون لوگ ہیں جو اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اور ایسے بے لاگ ہیں کہ انہیں اللہ اس کے رسول اور اہلِ ایمان کے سوا کسی کی دوستی اور قرابت کی کوئی پروا نہیں ہے اور کون لوگ دوسروں کی خاطر اللہ و رسول اور اہلِ ایمان کو نظر انداز کرنے والے ہیں۔

یہ امتحان اللہ کی حکومت کا ایک دستوری ضابطہ ہے جس سے ایمان کا دعویٰ کرنے والوں کو لازماً گذرنا پڑتا ہے۔ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر ایک کے اعمال سے باخبر ہے لیکن اس کا طریقہ یہ ہے کہ وہ امتحان کی کسوٹی پر پرکھ کر کھرے اور کھوٹے کو نمایاں کرتا ہے۔ اور اہل ایمان کی تطہیر کرتا رہتا ہے۔ اگر تمہارا یہ خیال ہے کہ دعویٰ ایمان کر کے یوں ہی چھوڑ دیئے جاؤ گے تو یہ خیال صحیح نہیں ہے۔

اس آیت میں ایک لطیف اشارا اس طرف بھی ہو رہا ہے کہ اللہ اللہ کے رسول اور صحابہ کرام سے وفاداری میں کوئی تقسیم نہیں ہے یہ تینوں ایک دوسرے کے ساتھ وفاداری میں لازم و ملزوم ہیں جس طرح خدا کے رسول سے وفاداری نہ کرنے والا خدا کا وفادار نہیں ہو سکتا اسی طرح رسول کے صحابہ سے وفاداری نہ کرنے والا خدا اور اس کے رسول کا کبھی وفادار نہیں ہو سکتا اور یہ بھی اس پوری قوت کے ساتھ معلوم ہو رہا ہے کہ اگر کوئی شخص اہلِ ایمان کے مقابلے میں کسی اور کو اپنا دوست اور معتمد بناتا ہے تو وہ صرف مسلمانوں کا

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں بلکہ خدا اور رسول کا بھی وفادار نہیں ہے اگرچہ دعوئی میں کتنی ہی بلند آہنگی کا اظہار کرے۔

اس آیت میں دو باتوں کو بطور ایمان کی کسوٹی کے پیش کیا گیا ہے

ایک اللہ کے راستہ میں جہاد کرنا۔

دوسرے مسلمانوں کو چھوڑ کر غیر مسلموں کو معتمد اور راز دار نہ بنانا۔

دونوں ہی باتیں اسلامی زندگی کی بنیادی باتیں ہیں۔ دونوں کا تعلق اسلامی زندگی سے اساسی ہے۔ اگر یہ ایک مومن کا مقصد حیات ہے اور ایمان کے نام پر امت اگر اس لیے وجود میں لائی گئی ہے کہ وہ دنیا کے سامنے حق کی شہادت پیش کرے تو اس عبادت سے بڑی عبادت اور اس شہادت سے اونچی شہادت اور کیا ہو سکتی ہے جو اپنی جان دے کر انجام دی گئی ہو۔ کوئی شک نہیں کہ اللہ کی یہ سب سے بڑی عبادت اور حق کی یہ سب سے اونچی شہادت ہے دوسرے لفظوں میں یہ کہ مسلمان کے وجود کا جو مقصد ہے جہاد اس مقصد کی انجام دہی کی سب سے معیاری کوشش ہے۔ اور جس وقت وہ اس جہاد میں اپنی جان کو بھی قربان کر دیتا ہے اس وقت اللہ کی بندگی اور حق کی شہادت کی آخری منزل اس کے قدموں کے نیچے ہوتی ہے کیونکہ کسی مقصد یا فرض کی خاطر اپنی جان تک کو قربان کر دینا یقینی طور پر اس کا حق کو ادا کر دینا ہے اور فی الواقع ایسا ہی شخص اس بات کا مستحق ہوتا ہے کہ اسے اس مقصد کا حقیقی علمبردار اور اس فرض کا سب سے سچا خادم کہا جائے اور یہ چیز حاصل نہیں ہو سکتی جب تک کہ اس راہ میں لگنے والے ان تمام کانٹوں سے دامان ایمان کو محفوظ نہ کرے جو کسی درجہ میں بھی رکاوٹ بن سکتے ہیں اسی لیے ان دو باتوں کو ایمان کی کسوٹی کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔

آنکس کو ترا بخواست جاں را چہ کند　　فرزند و عیال و خاناں را چہ کند

مَا كَانَ لِلْمُشْرِكِيْنَ اَنْ يَّعْمُرُوْا مَسٰجِدَ اللّٰهِ شٰهِدِيْنَ عَلٰٓى اَنْفُسِهِمْ بِالْكُفْرِ ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ ۚۖ وَفِي النَّارِ هُمْ خٰلِدُوْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّمَا يَعْمُرُ مَسٰجِدَ اللّٰهِ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَلَمْ يَخْشَ اِلَّا اللّٰهَ فَعَسٰٓى اُولٰٓئِكَ اَنْ يَّكُوْنُوْا مِنَ الْمُهْتَدِيْنَ ﴿۱۸﴾

اللہ کی مسجدوں کی آبادکاری ان مشرکوں کا کام نہیں ہے جو اپنے بارے میں کفر کا اعتراف کر رہے ہوں یہی لوگ ہیں جن کے اعمال حرف غلط ہو کر رہ گئے اور ان کو دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہے۔ مساجد کے آبادکار تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ پر اور آخرت والے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ نماز کو قائم کریں اور زکوٰۃ دیں۔ اور اللہ کے سوا کسی اور سے نہ ڈریں ان ہی سے ہدایت یافتہ ہونے کی امید ہے۔

معانی مفردات

ان یعمروا یہ مضارع منصوب کا جمع مذکر غائب ہے۔ عمارۃ کے معنے لغت میں مسجد میں عبادت کے لیے یا خدمت کے لیے قیام کرنے کے ہیں۔ گھر کے ساکن کو عامر کہتے ہیں جمع عمار آتی ہے۔ عمر الرجل اللہ بولا جاتا ہے آدمی نے اللہ کی عبادت کی۔ عمارہ بالکسر مکان کی آبادکاری کا ذریعہ۔ عمارۃ بالضم آبادکاری کی اجرت۔ اسی سے حج میں عمرہ ہے اللہ کی طاعت امام راغب فرماتے ہیں عمارت بربادی کی ضد ہے اور انما یعمر میں یہ لفظ عمارت کی نگرانی کے معنے میں ہے یا عمرہ بمعنے زیارت سے ہے یا بمعنے اقامت سے ہے۔ اسی سے اعتمار و تعمیر آتے ہیں۔

اور البقرہ میں پڑھ آئے ہو کہ حضرت ابراہیم نے بیت اللہ کی تعمیر کے موقعہ پر دو دعائیں کی تھیں۔ ایک دعا یہ تھی کہ اے اللہ ایسا پیغمبر روانہ فرما جو ان کے سامنے تیری آیات تلاوت کرے اور ان کو کتاب و حکمت کی تعلیم کے زیور سے آراستہ کرے۔ دوسری دعا یہ تھی کہ اے اللہ ہماری اولاد میں سے ایک امت مسلمہ پیدا فرما۔ یہ دونوں دعائیں کعبہ کی تعمیر کے وقت حضرت ابراہیم و اسماعیل نے اللہ کی بارگاہ عالی میں پیش کیں جب حال اور قال اجابت دعا کے لیے سازگار تھے۔ حال یہ تھا کہ دونوں اللہ کا گھر بنا رہے ہیں۔ محنت کر رہے ہیں تپتی دھوپ میں پسینہ سے برابور ہے اور زبان پر دونوں دعائیں اخلاص سے اور ادب کے ساتھ کر رہی تھیں کہ خداوندا ہماری ذریت میں سے ایک ایسا عظیم المرتبت پیغمبر روانہ فرما جو انکو کتاب و حکمت کی تعلیم دے اور ان کا تزکیہ کرے۔ اللہ سبحانہ نے ان کی دعاؤں کو شرف قبول بخشا حضور اقدس ﷺ تشریف لائے اور امت مسلمہ وجود میں آئی۔ مشرکین مکہ نے نبوت سے مزاحمت کی اور آپ کی راہ میں رکاوٹیں کھڑی کر دیں۔ مسلمانوں کی زندگی اجیرن بنا دی۔ بالآخر ان کی چیرہ دستیوں کی وجہ سے ہجرت عمل میں آئی۔ مکہ چھوڑ کر مدینہ آ گئے لیکن مخالفین نے یہاں بھی ایک آن چین نہ لینے دیا۔ خود بھی برسر پیکار رہے۔ دوسروں کو بھی سازشوں کے ذریعے ورغلاتے رہے۔ اہل ایمان نے جوابی کارروائی کی۔ اور بالآخر اللہ کی مدد سے وہ دن آ گیا کہ مکہ فتح ہو گیا توحید کا بول بالا ہوا شرک کا منہ کالا ہوا —— مکہ فتح ہونے کے بعد ضروری ہوا کہ بیت اللہ کی مشرکانہ عبادات سے تطہیر کی جائے۔ جس سال آپ نے مشرکین کے تمام عہدوں کے ختم ہونے کا اعلان کیا اسی سال یعنی ۹ ھ میں یہ بھی اعلان کیا کہ آئندہ سال سے کوئی مشرک مشرکانہ عبادت مسجد حرام میں نہ کر سکے گا۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور ان کے ساتھی یوم النحر میں جگہ جگہ خیمہ خیمہ اور گھر گھر منادی کر رہے تھے کہ اس سال کے بعد کوئی مشرک حج نہ کرے گا کوئی برہنہ طواف نہ کرے گا معاہدوں کے لیے چار ماہ کی مہلت اور مشرکین کو مسجد حرام میں عبادت سے روکنے کے لیے سال بھر کی مہلت دی گئی۔ اس کی وجہ کیا ہے۔ اس کی دو وجہیں ہیں۔

ایک یہ کہ معاہدین میں کچھ وہ بھی تھے جن کے معاہدے میں یہ دفعہ موجود تھی کہ فریقین میں سے کوئی دوسرے کو مسجد حرام سے نہیں روکے گا۔ عہد کی پاسداری کی اسلام میں بے حد اہمیت ہے اس لیے ضروری ہوا کہ اتنا وقت ان کو ملے کہ معاہدہ کی مدت ختم ہو جائے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ غیر معاہدین کو مسجد حرام سے روکنا ۸ ھ ۹ ھ میں بغیر قتال کے ممکن نہ تھا کیونکہ لوگ لازماً پرانی ریت کا وجہ سے حج کو ضرور کرتے۔ قتال کی صورت میں دو قباحتیں ظاہر ہو جاتیں ایک یہ کہ معاہد اور غیر معاہد کی تمیز نہ ہوتی دوسری یہ کہ حرم میں قتال کرنا پڑتا۔ اس لیے پورے ایک سال کی مدت رکھی تاکہ سب کو یکساں طور پر علم ہو جائے۔ ان آیات میں اسی ممانعت کا تذکرہ ہو رہا ہے۔

(۱۶) اللہ کی مسجدوں کی آبادکاری ان مشرکوں کا کام نہیں ہے جو اپنے بارے میں کفر کا اعتراف کر رہے ہوں۔ یہی لوگ ہیں جن کے اعمال حرف غلط ہو کر رہ گئے۔ اور ان کو دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہے۔ مشرکین مکہ بڑے فخر سے کہتے تھے کہ ہم مسجد حرام کے متولی اور

خادم ہیں۔ مگر ان کی بڑی خدمت گذاری یہ تھی کہ پتھر کی سینکڑوں مورتیاں کعبہ میں رکھ چھوڑی تھیں ان ہی کی نذر و نیاز کرتے اور منتیں مانتے تھے بہت سے لوگ ننگے طواف کرتے تھے۔ ذکر اللہ کی جگہ سیٹیاں بجاتے تھے اور خدائے واحد کے سچے پرستاروں کو وہاں نماز پڑھنے کی اجازت نہ دیتے تھے لے دے کر ان کی بڑی عبادت یہ تھی کہ حاجیوں کے لیے پانی کی سبیل لگا دی یا حرم شریف میں چراغ جلا دیا یا کعبہ پر غلاف چڑھا دیا اور کبھی ضرورت ہوئی تو شکست و ریخت کا انتظام کر دیا مگر یہ اعمال محض بے روح تھے کیونکہ مشرک کو جب خدا کی صحیح معرفت حاصل نہیں تو کسی عمل میں اس کا قبلہ توجہ اور مرکز اخلاص خدائے وحدہ لاشریک کی ذات منبع الکمالات نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے کافر کا کوئی عمل خدا کے نزدیک قابلِ قبول عمل نہیں اسی کو حبطت اعمالھم سے تعبیر فرمایا۔ الغرض کفار مکہ جو اپنے حال و قال سے اپنے کفر و شرک پر ہر وقت شہادت دیتے ہیں اس لائق نہیں کہ ان سے مساجد اور خصوصاً مسجد حرام کی حقیقی تعمیر و آبادی ہو سکے۔[1]

اس آیت میں معاہدین کے معاہدے ختم کرنے کے بعد قریش مکہ کی مسجد حرام سے تولیت کے ختم ہونے کا اعلان ہو رہا ہے فرمایا کہ اصلاً یہ پرستاران توحید کی عبادت گاہ تھی اور ان کے لیے ہی بنائی گئی تھی اب آئندہ بھی ان کے لیے مخصوص رہے گی۔ مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ اپنے مشرکانہ اعمال سے اور رسوم سے اسے ملوث کریں جیسا کہ اوپر گذر چکا ہے کہ ۹ھ ہجری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ نے جن امور کا اعلان عام کیا تھا ان میں ایک بات یہ بھی تھی کہ آئندہ سال سے کوئی مشرک خانہ کعبہ میں قدم نہ رکھ سکے گا۔ اسی حکم کی یہ تمہید ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جن مساجد کی خدائے واحد کی عبادت کے لیے روز اول ہی سے تاسیس عمل میں آئی ہے اس کے متولی مجاور خادم اور آباد کار وہ لوگ ہرگز نہیں ہو سکتے جو خدا کے ساتھ خداوندی صفات حقوق اور اختیارات میں دوسروں کو شریک کرتے ہوں اور طرہ یہ کہ وہ اب بھی کفر ہی کے علمبردار بنے ہوئے ہیں اور وہ علی رؤس الاشہاد اعلان کر چکے ہوں کہ ہم اپنی بندگی اور پرستش کو ایک خدا کے لیے خاص کرنے کے لیے تیار نہیں تو پھر ان کا کیا حق ہے کہ کسی ایسی عبادت گاہ کے متولی بنے رہیں جو صرف اللہ سبحانہ کی عبادت کے لیے بنائی گئی ہے۔

اس سے پہلی آیات میں بھی ان کے جرائم کی فہرست پیش کر کے بتایا تھا کہ یہ اس لائق ہیں کہ ان سے نہ صرف اعلان برأت کیا جائے بلکہ اعلانِ جنگ کیا جائے۔ اب تولیت بیت اللہ سے ان کے ہٹانے کا اعلان ہو رہا ہے۔ اور فرمایا جا رہا ہے۔ ما کان للمشرکین ان یعمروا مساجد اللہ آیت میں مشرکین کا لفظ اگرچہ عام ہے مگر مقصود اس سے قریش ہیں۔ اگرچہ اس کے مدلول میں ہر وہ شخص جس میں شرک کا وصف پایا جاتا ہو داخل ہے اور اسی عموم کی خاطر اس وصف کے ذریعے مشرکین مکہ کا ذکر کیا ہے یعنی یہ صرف مشرکین مکہ ہی کا نہیں بلکہ کسی بھی مشرک کا حق نہیں ہے کہ ان یعمروا آباد کاری کریں عمارت کے لغت میں معنے آباد کاری کے ہیں لیکن آباد کاری ہو نہیں سکتی جب تک پہلے بناوٹ نہ ہو اس لیے عمارت کا منطوق اگر آباد کاری ہے تو اس کا

[1] افادات شیخ الاسلام

دول مساجد کا بنانا ہے۔ اس لیے مشرکین کو نہ مساجد کی آبادکاری کا حق ہے اور نہ مساجد بنانے کا۔ آبادکاری کا تو اس لیے کہ وہ مساجد کو اعمال شرکیہ اور رسوم کفریہ سے ملوث کریں گے اور بنانا اس لیے کہ مسجد بنانا ان کے یہاں قربات میں سے کوئی قربت نہیں اس لیے ان کی بنائی ہوئی مسجد، مسجد نہیں۔ ہاں بنانے کی ایک صورت ہے کہ وہ مسلمان کو ہبہ کر دیں پھر مسلمان اسے وقف کر دیں۔

مساجد کو جمع لایا گیا ہے۔ اصلاً مقصود تو مسجد حرام ہے مگر جمع لا کر اشارہ فرما دیا ہے کہ اعمال شرکیہ اور رسوم کی ادائیگی میں روئے زمین کی ساری مساجد کا حکم یہی ہے کہ نہ مشرکین ان میں اپنی رسوم اور عبادت مشرکانہ ادا کر سکتے ہیں اور نہ ان کو بنا سکتے ہیں۔

آیت کا مطلب ہے کہ مشرکین کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ مسجد حرام کے جو تمام مسجدوں کا مرکز اور قبلہ ہے، متولی بنے رہیں۔

شاھدین علی انفسھم بالکفر جبکہ وہ خود اپنے کفر کے گواہ ہیں۔ کفر سے یہاں ان کی مشرکانہ زندگی ہے۔ یہاں شرک کو کفر سے تعبیر کر کے اشارہ کر دیا ہے کہ شرک کے ساتھ خدا کو ماننا نہ ماننے کے ہم معنے ہے۔ اللہ سبحانہ کو ماننا صرف وہ معتبر ہے جو توحید عبادت کے ساتھ ہو۔ اگر آپ شرک کرتے ہوئے آپ خدا کو مانتے ہیں تو قرآن کی نظر میں یہ ماننا نہیں ہے۔

مشرکین یہ دو متضاد چیزیں اپنے دامن میں جمع کیے ہوئے تھے ایک طرف مسجد حرام کی عمارت اور دوسری طرف شرک کی نجاست فرمایا ان دو باتوں کو جمع کرنا ان کو زیب نہیں دیتا۔ اور کچھ شارحین قرآن کہتے ہیں کہ اس فقرے میں نفی کا مرجع قید ہے اور مطلب ہے کہ ان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ شرک کی آلودگی رکھتے ہوئے بیت اللہ کی تولیت پر گھمنڈ اور فخر کریں ان کو نشہ تھا کہ ہم بیت اللہ کے مجاور ہیں چنانچہ علامہ بغوی نے لکھا ہے کہ جب حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ قید ہو کر آئے ان پر مسلمانوں نے شرک قطع رحمی کی پھبتی کسی بلکہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ترش اور سخت لب و لہجہ میں یہ بات کہی۔ تو حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے آگے سے جواباً کہا کہ ہماری خوبیوں پر پردہ ڈالتے ہو اور ہماری برائیوں کو اچھالتے ہو۔ ہم مسجد حرام کے آبادکار ہیں کعبہ کے نگران ہیں۔ حاجیوں کے مہمان نواز ہیں۔ قیدیوں کو رہا کراتے ہیں۔ شرک کے ساتھ ان کو ان نیکیوں پر فخر تھا۔ قرآن نے ان کے اسی سرمایہ افتخار پر یہاں ضرب لگائی ہے اولئك حبطت اعمالھم ان کے یہ اعمال شرک کی نجاست کی وجہ سے رائیگاں اور بیکار ہو گئے۔ شرک اتنا بڑا جرم ہے۔ کہ اس کے ساتھ کوئی نیکی نیکی نہیں ہے۔ نیکی کی قدر و قیمت تو صرف توحید سے پڑتی ہے خدا کے یہاں صرف وہ نیکی قبول ہوتی ہے جو توحید کی زمین پر ہو۔ جس طرح ایک عورت کا اپنے شوہر کے ساتھ سارا چاؤ پیار بیکار ہے جبکہ اس کا شوہر کے سوا کسی اور سے بھی تعلق ہو ٹھیک اسی طرح بندہ کی ساری نیکیاں بیکار ہیں جب وہ اپنے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک ٹھہرا رہا ہو۔

آخر میں فرمایا و فی النار ھم خالدون۔ یعنی ان اعمال کے سبب ان کو دوزخ میں ہمیشہ رہنا ہوگا۔ شرک کی وجہ سے نیکیاں بھی گناہ کی صورت اختیار کر لیں گی۔

آیت قرآن کا اصل مقصود مشرکین مکہ کی تولیت کا خاتمہ ہے یہ بات کہ مشرکین کا مسجد حرام میں داخلہ ہو سکتا ہے یا نہیں اس کا

ذکر آگے آرہا ہے یہاں تو تقابلی مطالعے کے طور پر یہ بات پوری قوت سے واضح کی جارہی ہے کہ مسجد حرام کی تولیت کا حقدار کون ہے اور کون نہیں۔ پہلے منفی پہلو واضح کیا ہے کہ یہ منصب مشرکین کے لیے نہیں۔ پھر اس کی بنیادی وجہ بیان فرمائی ہے اور ساتھ ہی اس زمانے کی رواجی نیکیوں کے حوالہ سے بتایا ہے کہ ان کی یہ خدمات بالکل بے حقیقت اور بے وزن ہیں۔ ان کی بنیاد ہرگز اس کی صلاحیت نہیں رکھتے کہ ان کو تولیت دی جائے۔ کوئی نیکی اس وقت قابلِ اعتبار ہوتی ہے جب وہ اصل مقصود سے وفاداری کے ساتھ ہو۔ اگر اصل مقصد برباد ہو جائے تو کوئی جزوی نیکی اصل مقصد کی نیابت نہیں کر سکتی۔ ایک مسجد کا متول اگر مسجد کو بت خانہ بنالے تو صرف اس بنا پر اس کو متول نہیں بنایا جا سکتا کہ اس نے مسجد میں پانی اور لوٹوں کا انتظام کیا ہے۔ مسجد میں پانی اور لوٹوں کا انتظام بجائے خود نیکی ہے لیکن ایسی نیکی نہیں کہ اس کی خاطر کسی کے اس حق کو تسلیم کر لیا جائے کہ وہ مسجد کو بت خانہ بنائے رکھے اور اس کی زمامِ تولیت اس کے ہاتھ میں رہے۔

اس مقصد کو ظاہر کرنے کے لیے قرآن کی یہ آیت آئی ہے اس کے سوا دوسری باتیں اس کا منطوق نہیں بلکہ مدلول ہیں منطوق کی حد تک بات قطعی ہے لیکن مدلول تو بہر حال ہماری سمجھ ہے۔ امام رازی نے تفسیر میں ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں آیت قرآنی کے مدلول سے متعدد مسائل نکالے ہیں اور لوگوں کے سامنے پیش کیے ہیں جن کا تعلق صرف مسجدِ حرام سے نہیں بلکہ عام مساجد سے ہے مثلاً کافر کا مسجد میں داخل ہونا کافر کا مسجد بنانا مسجد کے انتظامی معاملات میں کافر کا در اندازہونا۔ یہ اور اس قسم کی بہت کی باتیں ہیں جن کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔

مسجدِ حرام کی تولیت کا اصل حقدار

(١٧) مساجد کے آباد کار تو وہی لوگ ہو سکتے ہیں جو اللہ پر آخرت والے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اور اللہ کے سوا کسی اور سے نہ ڈریں۔ ان ہی سے ہدایت یافتہ ہونے کی امید ہے۔ پہلے فرمایا تھا کہ مسلمان بدوں امتحان کے یوں ہی نہیں چھوڑے جا سکتے بلکہ بڑے بڑے عزائم اعمال مثلاً جہاد وغیرہ میں ان کی ثابت قدمی دیکھی جائے گی اور یہ کہ تمام دنیا کی مخلوقات پر کس طرح خدا رسول کی جانب کو ترجیح دیتے ہیں۔ ان آیات میں یہ بتلایا ہے کہ خدا کی مساجد حقیقۃً ایسے ہی اولوالعزم مسلمانوں کے دم سے آباد رہ سکتی ہیں مساجد کی حقیقی آبادی یہ ہے کہ ان میں خدائے واحد کی عبادت اس کی شان کے لائق ہو۔ ذکر اللہ کرنے والے کثرت سے موجود ہوں جو بے روک ٹوک خدا کو یاد کریں۔ لغویات و خرافات سے ان پاک مقامات کو محفوظ رکھا جائے یہ مقصد کفار و مشرکین سے کب حاصل ہو سکتا ہے۔ یہ کام صرف ان لوگوں کا ہے جو دل سے خدائے واحد اور آخری دن پر ایمان لا چکے ہوں جوارح سے نماز کی اقامت میں مشغول رہتے ہیں۔ اموال میں سے باقاعدہ زکوٰۃ دیتے ہیں اور اللہ سبحانہٗ کے سوا کسی سے نہیں ڈرتے ہیں۔ اسی لیے مساجد کی صیانت و تطہیر کی خاطر جہاد کے لیے تیار رہتے ہیں۔ ایسے مومنین جو دل و زبان ہاتھ پاؤں مال و دولت ہر چیز سے خدا کے

مطیع فرمانبردار ہیں ان کا فرض منصبی ہے کہ مساجد کو آباد کریں اور تعمیر مساجد کے جھوٹے دعوے رکھنے والے مشرکین کو خواہ وہ اہل قرابت ہی کیوں نہ ہوں وہاں سے نکال باہر کریں کیونکہ ان کے وجود سے مساجد اللہ کی آبادی نہیں بربادی ہے [1]

اس آیت میں یہ وضاحت ہو رہی ہے کہ یہ لوگ مسجد حرام کی تولیت کی اہلیت نہیں رکھتے ہیں تو کون لوگ رکھتے ہیں؟ اس اٹھے ہوئے سوال کا جواب بصورت انما کر دیا جا رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ صرف یہی اس کے اہل ہیں جن کا چہرہ آگے پیش ہو رہا ہے ان کے علاوہ اس کی کسی میں اہلیت نہیں ہے۔ فرمایا صرف اور صرف وہ لوگ اس کے اہل ہیں جو من آمن باللہ والیوم الاخر ہو اللہ اور آخرت والے دن پر ایمان رکھتے ہوں۔

شارحین قرآن کو یہاں حیرت ہے کہ ایمان باللہ اور بالیوم الآخر کے ساتھ ایمان بالرسالت کا ذکر کیوں نہیں کیا۔ لوگوں نے مختلف باتیں کہی ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ مدار نجات ایمان باللہ اور بالیوم آخر ہے۔ بالیوم الآخر سے مراد قیامت جنت و دوزخ ہیں۔ انبیاء ان ہی باتوں کی تعلیم و تشریح کے لیے تشریف لاتے ہیں۔ عقول انسانی ان کے صحیح ادراک سے کوتاہ دامن ہے۔ اس لیے اللہ سبحانہ نے اس کا بوجھ ہم پر نہیں ڈالا بلکہ نجات و فلاح کا راستہ بتلانے کی ذمہ داری خود لے لی ہے۔ اس کے بعد ہمارا کام صرف اس بتائے ہوئے راستہ پر چلنا ہے چونکہ ایمان نبوت کے بغیر میسر آ ہی نہیں سکتا اس لیے ایمان باللہ کے مفہوم میں رسول پر ایمان لانا خود بخود داخل ہے۔ اسی طرح قرآنی آیات میں کہیں کہیں صرف ایمان باللہ کا ذکر ہے اس سے یہ شبہ نہ ہونا چاہیے کہ صرف ایمان باللہ و بالیوم الآخر سے نجات ہو سکتی ہے۔ قرآن کا تصنیف کے بجائے خطابت کا انداز ہے اس لیے اس کا مطلب سمجھنے کے لیے ایک خطیب کے انداز بیان کا تصور رکھنا چاہیے۔ وہ جب کسی ماحول میں گفتگو کرتا ہے تو بہت سے امور اس کے سامنے اور بہت سی باتیں متکلم و مخاطب کے دماغوں میں ہوتی ہیں۔ اور بہت سی خطیب کے انداز تکلم سے سمجھی جاتی ہیں۔ جب ان سب چیزوں کو پیش نظر رکھا جاتا ہے تو کلام سمجھنے میں کوئی دشواری نہیں ہوتی۔ یہاں خود خدا کا رسول اللہ سبحانہ کا کلام پیش کرتا ہے جب وہ بولتا ہے تو اللہ کا ایک ترجمان بن کر بولتا ہے۔ اس کی ہستی آنکھوں سے نظر آتی ہے اس لیے اسے اپنے بیان میں زور ان ہی باتوں پر دینا پڑتا ہے جو غائب اور غیر محسوس ہیں۔ جب آمنوا باللہ کا حکم دیتا ہے تو یہ جانتا ہے کہ یہ حکم میری آواز پر جو مانے گا۔ اس کو پہلے میرا ماننا لازم ہوگا۔ مخاطبوں کو بھی جو کچھ پس و پیش ہوتا ہے تو زیادہ تر اسی شخصیت میں ہوتا ہے وہ بہت سی باتوں کا انکار کرتے ہیں تو اس وجہ سے کہ اس کے منہ سے نکل رہا ہے۔ اسی لیے ایمان بالرسول جو فی الواقع ایمان باللہ کا ذریعہ تھا اب رکن رکین اور اصل الاصول بن جاتا ہے جس طرح ایمان میں اللہ و رسول کے درمیان تفریق کی گنجائش نہیں ہے ایک کا منکر دوسرے کا منکر سمجھا جاتا ہے۔ اسی طرح رسولوں میں باہم یہی نسبت موجود ہے یعنی ایک کا منکر دوسرے کا منکر ہے۔ یہاں ماضی حال اور مستقبل سب برابر ہیں۔ اعمال و

[1] ارشادات شیخ الاسلام

اقوال کی صداقت ایمان کی صداقت پر موقوف ہے اور ایمان کی صداقت خدا اور اس کے رسولوں پر ایمان لانے سے مربوط ہے۔ اس لیے ایمان بالرسول اور رسول کے فرمانے پر دوسرے رسولوں پر ایمان لانا مرکزی نقطہ بن جاتا ہے اب آیات ذیل کو پڑھیے۔

۱۔ انما المومنون الذین آمنوا باللہ و رسلہ۔

مومن دراصل وہی ہیں جو اللہ اور اس کے رسولوں پر ایمان لائے۔

۲۔ ان الذین یکفرون باللہ و رسلہ و یریدون ان یفرقوا بین اللہ و رسلہ و یقولون نومن ببعض و نکفر ببعض و یریدون ان یتخذوا بین ذالک سبیلا اولئک ھم الکافرون حقا۔

جو لوگ اللہ اور اس کے رسولوں کا انکار کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ اللہ اور اس کے رسولوں میں فرق کریں۔ یہی لوگ اصل کافر ہیں۔

۳۔ من یکفر باللہ و ملائکتہ و کتبہ و رسلہ والیوم الاخر

جو انکار کرے اللہ کا اور اس کے فرشتوں کا اور رسولوں کا اور قیامت کا۔

ان تین آیتوں میں سے پہلی آیت میں اللہ اور رسول پر بلا تفریق ایمان لانے کا ذکر ہے۔ دوسری آیت میں ان کے درمیان ایمان میں فرق کرنے والوں کو کافر کہا ہے اور تیسری آیت میں فرشتوں اور یوم آخر کو بھی شامل کر لیا گیا ہے اب صرف ایک آیت کو لے کر ایمان کی بحث کا فیصلہ کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ علامہ آلوسی کی یہ بات بالکل برمحل ہے۔

ایمان بالرسول ایمان باللہ میں داخل ہے کیونکہ ایمان کی حدود میں یہ دونوں ایک ہیں جب ایک کا ذکر ہوتا ہے۔ تو دوسرا خود بخود سمجھا جاتا ہے۔

آیت کی بلاغت یہ ہے کہ بجائے یہ کہنے کے کہ مسجد حرام کی تولیت کے حقدار مسلمان ہیں یہ کہا گیا ہے کہ حقدار وہ لوگ ہیں جو اللہ اور یوم آخر پر ایمان رکھتے ہوں نماز قائم کرتے ہوں زکوٰۃ دیتے ہوں۔ بتانا یہ ہے یہ وہ بنیادی صفات ہیں جو منصب تولیت کے لیے بنیادی شرائط کی حیثیت رکھتی ہیں تاکہ یہ حقیقت کھل کر سامنے آجائے کہ یہ منصب کسی گروہ یا خاندان کا اجارہ نہیں ہے بلکہ یہ تمامتر شرائط اور صفات سے مربوط ہے ایمان باللہ لا کر بتایا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ سے اس کو سچی عقیدت ہو اور اپنے کو صحیح معنے میں احکام الٰہی کا متبع بنائے اور ایمان بالآخرۃ سے یہ ظاہر فرمایا ہے کہ اس کو اپنے سارے کاموں کے حساب و کتاب کی ذمہ داری کا پورا احساس بھی ہو اور پھر ان میں کامیابی اور ناکامی پر ثواب و عقاب کا یقین بھی ہو یہ دل اور نیت کی شرط ہے باقی ظاہری طور پر بھی وہ ایسا ہو کہ جس سے خدا پرستی نمایاں ہو بدنی لحاظ سے اور مالی لحاظ سے بھی جس کو اقامت صلاۃ اور ادائے زکوٰۃ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ لیکن بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ ان کاموں میں شہرت و عزت اور ریاء و سمعہ کا لبادہ آجاتا ہے اس لیے یہ بھی فرما دیا کہ یہ کام عزت د

شہرت اور نام و نمود کے لیے نہیں بلکہ اللہ کی ناراضگی کے اندیشے سے دب کر کرے. خلاصہ یہ ہے کہ مقابلہ کے وقت میں چاہے وہ زخمی ہو یا خارجی اللہ سبحانہ کی ناراضگی کا اندیشہ غالب رہے جو شخص ان صفات سے موصوف ہو گا وہ اس لائق ہے کہ اسے تولیت کا منصب دیا جاتے. اگر ایسے اشخاص کو یہ منصب ملے گا وہ کامیاب بامراد اور فائز المرام ہوں گے. فعسیٰ اولئک ان یکونوا من المھتدین۔ یہاں عسیٰ کے لفظ سے تعبیر کرنے میں اشارہ ہے کہ یہ راہ کوئی آسان راہ نہیں ہے اس میں قدم قدم پر مشکلات ہیں۔ صرف وہی لوگ جادہ مستقیم پر استوار رہ سکتے ہیں جن کے پاس توفیق الٰہی کی زادِ راہ ہو۔

أَجَعَلْتُمْ سِقَايَةَ الْحَاجِّ وَعِمَارَةَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ كَمَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَجَاهَدَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ۚ لَا يَسْتَوُونَ عِندَ اللَّهِ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿١٩﴾ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ بِأَمْوَالِهِمْ وَأَنفُسِهِمْ أَعْظَمُ دَرَجَةً عِندَ اللَّهِ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْفَائِزُونَ ﴿٢٠﴾ يُبَشِّرُهُمْ رَبُّهُم بِرَحْمَةٍ مِّنْهُ وَرِضْوَانٍ وَجَنَّاتٍ لَّهُمْ فِيهَا نَعِيمٌ مُّقِيمٌ ﴿٢١﴾ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ إِنَّ اللَّهَ عِندَهُ أَجْرٌ عَظِيمٌ ﴿٢٢﴾

کیا تم لوگوں نے حاجیوں کے لیے سبیل لگانے اور مسجد حرام کی آبادکاری کو اس شخص کے کام کے ہم پلہ بنا دیا ہے۔ جو اللہ پر آخرت کے دن پر ایمان لایا اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا۔ اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہیں اور اللہ ظالموں کی رہنمائی نہیں کرتا ہے[۱۹] وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا تو یقیناً اللہ کے نزدیک ان کا بڑا درجہ ہے اور یہی بامراد اور کامیاب ہیں[۲۰]۔ ان کا رب ان کو اپنی رحمت اور کامل خوشنودی کی بشارت دیتا ہے اور ایسے باغات کی جہاں ان کے لیے ہمیشگی کی نعمت ہوگی اور وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ بلاشبہ اللہ کے پاس بہت بڑا اجر ہے[۲۲]۔

معانی مفردات

سقایۃ الحاج۔ سقایہ پانی پلانا، پلانے کی جگہ، پینے کا برتن۔ سقایہ کے بارے میں اہل لغت اور مفسرین کے اقوال سخت پریشان ہیں کوئی اس کو سقی یسقی کا مصدر بتاتا ہے اور کوئی استقی کا اور کوئی مصدر کو بمعنے اسم فاعل کہتا ہے۔ اور کسی کے خیال میں اس جگہ کا نام ہے جہاں حاجیوں کو پینے کے لیے پانی دیا جاتا تھا۔ علامہ سید رشید رضا مصری نے المنار میں اس کی شان دار تحقیقی بحث لکھی ہے وہ ہدیہ ناظرین ہے ——— سقایہ لغت میں ان ٹین کو کہتے ہیں جس سے پانی وغیرہ پلایا جاتا ہے اسی معنے میں ہے۔ جعل السقایۃ فی رحل اخیہ رکھ دیا پینے کا پیالہ اسباب میں اپنے بھائی کے اور اس جگہ کو بھی کہتے ہیں جہاں پانی پلایا جاتا ہے۔ یہ مونث بھی استعمال ہوتا ہے اور مذکر بھی لسان العرب میں ہے ——— سقایہ وہ جگہ ہے جس میں حج کے موقعہ پر پینے کے لیے شربت وغیرہ تیار کیا جاتا ہے اس کے بعد لکھا ہے کہ حدیث میں آتا ہے ماثر الجاھلیۃ تحت قدمی الاسقایۃ الحاج وسدانۃ البیت! جاہلیت کے قابل ذکر کارناموں میں ہر کارنامہ میرے قدموں کے نیچے ہے سوائے حاجیوں کے پانی پلانے کے انتظام اور خانہ کعبہ کی خدمت گذاری کے، کہ قریش پانی میں کشمش ڈال کر حاجیوں کو پلاتے تھے۔ اور حضرت العباس بن عبد المطلب جاہلیت اور اسلام دونوں میں اس کے متولی رہے ہیں۔ جس حدیث کی طرف صاحب لسان العرب نے اشارہ کیا ہے حضور اقدس ﷺ کے حجۃ الوداع کی بعض روایات میں آیا ہے۔ اور امام نووی الاسماء والصفات میں فرماتے ہیں۔ سقایۃ العباس مسجد حرام میں ایک مقام ہے جس میں لوگوں کے پینے کے لیے پانی لایا جاتا تھا۔ اس کے اور زمزم کے درمیان چالیس ہاتھ کا فاصلہ ہے۔ ازرقی نے اپنی کتاب تاریخ مکہ میں بتایا ہے کہ سقایہ چمڑے کے حوض تھے جو قصی بن کلاب کے زمانہ میں مسجد حرام کے صحن میں رکھے جاتے تھے اور ان میں اونٹوں کے ذریعے کنوؤں سے شیریں پانی لایا جاتا تھا پھر قصی نے مرتے وقت سقایہ کا منصب اپنے بیٹے عبد مناف کے سپرد کیا وہ برابر عبد مناف کے پاس رہا یہاں تک کہ ان کا انتقال ہو گیا۔

پرستش اور بندگی کے اعمال کا موازنہ

اللہ سبحانہ کے بندوں سے ایمان کی بنیاد پر دو قسم کے تعلقات ہیں پرستش کے اور بندگی کے۔ ان دونوں کی یک جائی کا نام اسلام ہے۔ انسان کی ہمیشہ سے کمزوری یہ رہی ہے کہ اس نے ان دونوں میں یکجائی نہیں رہنے دی۔ یہودیت اور نصرانیت قرآن میں اسی تفریق کی مثالیں ہیں۔

ان آیات میں قرآن اسی پر تنبیہہ کر رہا ہے کہ تم تاریخ کو نہ دہرانا کہ دونوں میں یک جائی نہ رہنے دو یہاں پرستش کے چند اعمال نمونہ کے طور پر پیش کر کے فرمایا ہے کہ یہ اعمال بے شک نیکیاں ہیں اور ان کا تعلق پرستش سے ہے لیکن یہ ان نیکیوں کے

ہم پلہ، ہموزن نہیں جن کا تعلق بندگی سے ہے جیسے جہاد فی سبیل اللہ کچھ ان لوگوں کے ذہنوں میں جو فتح مکہ کے بعد مسلمان ہوئے تھے اسی قسم کے خیالات آنے لگے کہ حرم کعبہ کی پاسبانی۔ اس میں عبادت، حاجیوں کی خدمت سے اونچی کوئی نیکی نہیں۔ قرآن نے تنبیہ کی کہ ان کاموں کے نیکیاں ہونے میں کوئی شبہ نہیں لیکن یہ نیکیاں اللہ کی راہ میں جان کھپانے اور جہاد کرنے کے قطعاً ہم وزن اور ہم پلہ نہیں ہیں اللہ و رسول پر ایمان لانے کے بعد سب سے بڑی نیکی اللہ کی راہ میں جہاد ہے۔ ہر حال اور ہر زمانے میں ایک مومن کی زندگی کے لیے ایمان و صداقت کی بنیاد یہی چیز اور اسی کا سچا عشق و ولولہ ہے۔ یہی مسام دین ہے۔ یہی عماد ملت ہے۔ یہی اساس شرع ہے۔ یہی ملاک اسلام ہے یہی ایمان و نفاق کی اصل کسوٹی ہے۔ یہی مومن کو منافق سے الگ کر دینے کے لیے اصل پہچان ہے نماز اسی سے ہے۔ روزہ اسی سے ہے۔ حج اسی سے ہے زکوٰۃ اسی کی خاطر ہے۔ سب اس کے لیے ملتوی ہو سکتے ہیں لیکن یہ کسی کی خاطر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ نماز دین کا ستون ہے اور برائیوں سے بچنے کی ڈھال لیکن یہ دین کی بنیاد ہے اور برائیوں کو معدوم کرنے والی تلوار ہے۔ اس کی فضیلت کو نہ نماز پہنچ سکتی ہے نہ روزہ نہ اس سے بڑھ کر دوسرا عمل ہے جو اللہ کی نظروں میں محبوب ہو اور کرنے والے کو اس کی دائمی محبت سے سرفراز کرے

بہر حال قرآن نے اسی غلطی پر تنبیہ کیا ہے۔ خبر نہیں کچھ شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح میں صاحبزادگی، مجاوری سجادہ نشینی کی بو کہاں سے سونگھ لی۔ آیت قرآنی کا رخ رواجی نیکیوں کا حقیقی نیکیوں سے تقابل کی طرف نہیں ہے بلکہ قرآن کا روئے سخن سراسر اہل ایمان کی طرف ہے اور حقیقی نیکیوں کا حقیقی نیکیوں سے تقابل مقصود ہے اس لیے اس بات میں یہاں کوئی وزن نہیں ہے کہ۔

"جو لوگ ان صفات سے خالی ہوں وہ محض اس لیے کہ صاحبزادے ہیں۔ سجادہ نشینی ان کے خاندان میں چلی آرہی ہے اور خاص خاص موقعوں پر کچھ مذہبی رسوم کی نمائش وہ بڑی شان سے کر دیتے ہیں نہ کسی مرتبے کے مستحق ہو سکتے ہیں اور نہ یہ جائز ہو سکتا ہے کہ ایسے بے حقیقت موروثی حقوق کو تسلیم کر کے مقدس مقامات اور مذہبی اداروں کو ان کے ہاتھوں میں دے دیا جائے۔

اور نہ اس بات کی یہاں کوئی قدر ہے کہ:

دراصل قریش مکہ کو خانہ کعبہ کی مجاوری اور حاجیوں کے کاروبار کے منصرم ہونے پر بڑا غرور تھا۔ اور جب ایک جماعت اعتقاد و عمل کی روح سے محروم ہو جاتی ہے تو اسی طرح کے رسوم و مظاہر کو ہر طرح کی بزرگی و سعادت کا ذریعہ سمجھنے لگتی ہے۔

یہ دونوں اس ذہن کی تخلیق ہیں کہ آیت قرآنی میں رواجی نیکیوں اور حقیقی نیکیوں میں تقابل ہو رہا ہے یہی اس آیت کی تشریح و تفسیر میں ٹیڑھی اینٹ ہے جس سے تشریح کی پوری عمارت کج ہو کر رہ گئی۔ عام شارحین قرآن کا اس آیت کی تشریح میں یہی

نقطۂ نظر ہے لیکن آپ آیت کے تشریحی نوٹ میں پڑھیں گے کہ آیت کے مطالب کا رُخ کدھر ہے۔

(۱۸) کیا تم لوگوں نے حاجیوں کی سبیل لگانے اور مسجد حرام کی آبادکاری کو اس شخص کے ہم پلہ بنا دیا ہے جو اللہ پر آخرت والے دن پر ایمان لایا۔ اللہ کی راہ میں جہاد کیا اللہ کے نزدیک یہ دونوں برابر نہیں ہیں۔ مشرکین مکہ کو اس پر بڑا فخر و ناز تھا کہ ہم حاجیوں کی خدمت کرتے ہیں۔ ان کو پانی پلاتے ہیں کھانا کھلا دیتے اور مسجد حرام کی حرمت یا کسوت کعبہ یا تیل بتی وغیرہ کا انتظام کرتے ہیں اگر مسلمان اپنے جہاد و ہجرت پر نازاں ہیں تو ہمارے پاس عبادات کا یہ ذخیرہ موجود ہے۔ ایک زمانہ میں حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی حضرت علی رضی اللہ عنہ کے مقابلہ میں اسی طرح کی بحث کی تھی۔ بلکہ صحیح مسلم میں ہے کہ ایک دفعہ چند مسلمان آپس میں جھگڑ رہے تھے کوئی کہتا تھا کہ میرے نزدیک اسلام لانے کے بعد حاجیوں کو پانی پلانے کے کام سے زیادہ کوئی عبادت نہیں۔ دوسرے نے کہا کہ میرے خیال میں اسلام کے بعد بہترین عمل مسجد حرام کی خدمت ہے مثلاً جھاڑو دینا روشنی وغیرہ کرنا۔ تیسرا بولا کہ جہاد فی سبیل اللہ تمام اعمال سے افضل ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ان کو ڈانٹا کہ تم جمعہ کے وقت منبر رسولؐ کے سامنے بیٹھ کر اس طرح کی بحث کر رہے ہو ذرا صبر کرو جب حضور اقدس جمعہ سے فارغ ہو جائیں گے آپ سے یہ چیز دریافت کر لی جائے گی۔ چنانچہ جمعہ کے بعد حضورؐ سے سوال کیا تو یہ آیات نازل ہوئیں۔ اجعلتم سقایۃ الحاج۔ یعنی حاجیوں کو پانی پلانا اور مسجد حرام کا ظاہری طور پر بسانا ایمان باللہ اور جہاد فی سبیل اللہ میں سے کسی کے برابر نہیں ہو سکتا۔ افضل ہونا تو کجا۔ جہاں جہاد کے ساتھ ایمان باللہ کا ذکر کیا تو اس لیے کیا کہ مشرکین کے فخر و غرور کا جواب ہو سکے کہ تمام عبادات کی روح ایمان باللہ ہے۔ اس روح کے بغیر پانی پلانا یا مسجد حرام کی خدمت کرنا محض مردہ عمل ہے۔ تو یہ بے جان اور مردہ عمل ایک زندہ جاوید عمل کی برابری کیسے کر سکتا ہے وما یستوی الاحیاء ولا الاموات۔ اگر صرف مومنین کے اعمال کا باہم موازنہ کرنا ہے تو ایمان باللہ کا ذکر جہاد فی سبیل اللہ کی تمہید کے طور پر ہوگا۔ اصل مقصود جہاد وغیرہ عزائم اعمال کی فضیلت کو بیان کرنا ہے۔ ایمان کے ذکر سے تنبیہ فرما دی کہ جہاد فی سبیل اللہ ہو یا کوئی عمل ایمان کے بغیر ہیچ اور لاشے ہے۔ ان عزائم اعمال (جہاد ہجرت وغیرہ) کا تقوم بھی ایمان باللہ ہی سے ہوتا ہے۔ اس نکتہ کو وہی لوگ سمجھتے ہیں جو فہم سلیم رکھتے ہوں۔ ظالمین اور بے موقع کام کرنے والوں کی ان حقائق تک رسائی نہیں ہوتی۔[1]

چونکہ اس آیت کے پس منظر میں شارحین قرآن مختلف ہیں اس لیے آیت کا موضوع مقرر کرنے میں شارحین قرآن کے درمیان اختلاف پایا جاتا ہے۔

آیت کا موضوع کیا ہے۔ اہل ایمان اور اہلِ کفر کا اعمال میں تفاضل یا خود اہل ایمان کے درمیان اعمال میں باہمی تفاضل۔ شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں دونوں کے درمیان ہم آہنگی اور مفاہمت کی بہترین کوشش فرمائی ہے۔ فجزاہ اللہ عنا وعن المسلمین۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جو شارحین قرآن آیت کا موضوع اہل ایمان اور اہل کفر میں اعمال کا تفاضل بناتے ہیں۔ انہوں نے عنوان بھی ایسے ہی قائم کیے۔ مثلاً نواب صدیق حسن خان رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں خوطب بہ المشرکون۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں فالخطاب للمشرکین۔ ان بزرگوں کی رائے سخن میں قرآنی آیت کا روئے سخن مسلمانوں کی طرف نہیں بلکہ مشرکین کی طرف ہے۔ یعنی قرآن غیر مسلموں اور مسلمانوں کا مقابلہ کر کے بتا رہا ہے کہ مسلمان ایمان اور جہاد کی وجہ سے ان غیر مسلموں سے افضل ہیں جو سقایۃ الحاج اور عمارت بیت اللہ جیسی نیکیاں کرتے ہیں۔ اس کو امام رازی نے تفسیر میں ترجیح دی ہے۔ اور صرف امام رازی نہیں بلکہ ابن جریر، شوکانی، ابن الجوزی اور دوسرے مفسرین نے اسی کو ترجیح دی ہے اس کے لیے جن روایات کا سہارا لیا ہے۔ وہ بھی گوش گذار فرمالیجیے۔

عوفی نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ مشرکین کہتے تھے کہ ہم بیت اللہ کی خدمت کرنے والے حاجیوں کے لیے پانی کا انتظام کرنے والے ہیں اس لیے ہم ان لوگوں سے اچھے ہیں جو ایمان رکھتے ہیں اور جہاد کرتے ہیں۔

ابن ابی طلحہ نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے اس آیت کی تفسیر میں بتایا ہے کہ یہ آیت عباس بن عبدالمطلب کے بارے میں نازل ہوئی۔ جب وہ بدر میں قید ہو کر آئے تو انہوں نے کہا مسلمانو تم نے اگر ہجرت، جہاد اور اسلام میں ہم سے سبقت کر لی ہے تو کیا بات ہے ہم بھی بیت اللہ کی خدمت کرتے ہیں حاجیوں کو پانی پلاتے ہیں اور قیدیوں کو چھڑاتے ہیں اس پر اللہ تعالےٰ نے فرمایا اجعلتم سقایۃ۔

حضرت ضحاک بن مزاحم رحمۃ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ مسلمانوں نے حضرت العباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر بدر والے روز قید ہونے کے بعد شرک کا آوازہ کسا حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے فرمایا کہ ہم بھی الخ۔

امام شعبی رحمۃ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ آیت حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور عباس کے ایک مکالمہ پر نازل ہوئی۔

ابن جریر نے ابو صخرہ کے حوالہ سے محمد بن کعب القرظی کے بارے میں بتایا ہے کہ ان کا ارشاد ہے کہ طلحہ بن شیبہ اور عباس بن عبدالمطلب اور علی ابن ابی طالب ایک بار باہم فخریہ انداز میں گفتگو اپنے کارناموں پر کر رہے تھے۔ طلحہ نے کہا کہ میں بیت اللہ کا چابی بردار ہوں۔ عباس بولے میں پانی پلانے کا منتظم ہوں۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ بولے مجھے پتہ نہیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ میں نے لوگوں سے چھ ماہ پہلے قبلہ کی طرف نماز پڑھی ہے۔ میں مجاہد فی سبیل اللہ ہوں۔

سدی مفسر سے بھی ایسی ہی روایت ہے۔

عبدالرزاق نے حسن بصری کے حوالہ سے اسی قسم کا مباحثہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ عباس اور طلحہ کے مابین پیش کیا ہے۔
ان روایات میں کسی ایک روایت کی بھی حیثیت چشم دید گواہ کی نہیں ہے ان سب کی حیثیت رائے کی ہے۔ ان کی تاریخی حیثیت خود اتنی مضبوط نہیں جس کے سہارے اتنے بڑے واقعہ کا فیصلہ کر دیا جائے۔

سوچنے کی بات ہے کہ مقابلہ کن سے کیا جا رہا ہے جنہوں نے اسلام کو قبول نہیں کیا۔ ایک غیر مسلم کے نزدیک ایمان اور جہاد نیکی نہیں ایمان کی حیثیت اس کے خیال میں ترہم کی اور جہاد کی سراسر فساد کی ہے۔ ایسی حالت میں اہل ایمان کی نیکیوں کا بے ایمانوں کی نیکیوں سے تقابل بے معنی ہے۔ مسلمان کے نظریہ کے مطابق کافر کی نیکی نیکی نہیں اور غیر مسلم کے خیال میں مسلمان کی نیکی نیکی نہیں۔ پھر باہم تقابل کیا۔

یہ بھی قابل غور بات ہے کہ جب قرآن ابھی ایک آیت پہلے مشرکین کے ان اعمال یعنی عمارت، سقایت اور حجابت، بیت اللہ کو کالعدم رائیگان اور بیکار کہہ چکا ہے تو پھر ان کے اعمال کا اہل ایمان کے اعمال سے کیسے تقابلی مطالعہ پیش کر سکتا ہے آپ ابھی تو سن آئے ہیں حبطت اعمالھم۔ اس تقابل سے یہ بات خود بخود معلوم ہو رہی ہے کہ قرآن ان نیکیوں کو حالت کفر میں نیکیاں نہیں مانتا۔ پہلے کفر کی بنیاد پر نیکیوں کی نفی اور پھر کفر ہی کی موجودگی میں ان کی ان نیکیوں کا اہل ایمان کی نیکیوں سے مقابلہ قابل فہم نہیں ہے۔

اس لیے کچھ شارحین قرآن نے اس آیت کا موضوع اہل ایمان کے درمیان اعمال میں تفاضل قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ قرآن کے سیاق اور سباق کا یہی تقاضا ہے سیاق میں قرآن کے مخاطبات اہل ایمان سے ہیں۔ قاتلوا ائمۃ الکفر الا تقاتلون۔ قاتلوھم یعذبھم اللہ بایدیکم۔ ام حسبتم ان تترکوا ولما یعلم اللہ الذین جاھدوا۔ یہاں تک روئے سخن اہل ایمان کی طرف ہے۔ اس آیت میں بلا قرینہ یکبارگی روئے سخن مشرکین کی طرف ہو جانا۔ بلاغت قرآنی کے خلاف ہے جبکہ سباق میں بھی اسی مسئلے کو مبرہن کرنے کے لیے اہل ایمان مخاطب ہیں۔ علامہ ابو السعود کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے لا یساعدہ النظم التنزیلی۔ قرآن کا نظم اس کی ہمنوائی نہیں کرتا۔

اور جن شارحین نے آیت کا یہ موضوع قرار دیا ہے ان کے خیال میں آیت قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ خدا کی بندگی اور خدا کی پرستش والے اعمال میں مسلمانو! کیا تم موازنہ کر کے پرستش والے اعمال حاجیوں کو پانی پلانا مسجد حرام کی آبادکاری بندگی والے اعمال جہاد فی سبیل اللہ کے ہم پلہ کر رہے ہو ایسا ہرگز نہیں ہے لا یستوون عند اللہ یہ دونوں اللہ کے نزدیک برابر نہیں ہیں ایک شخص حاجیوں کو پانی پلا رہا ہے۔ بیت اللہ میں یاد الٰہی میں مشغول۔ طواف کر رہا ہے۔ اس کا وہ مقام اللہ کے نزدیک نہیں جو جان ہتھیلی پر رکھ کر اپنے خون کے قطروں سے میدان جنگ میں حق کی شہادت دے رہا ہے۔ شاید عبد اللہ بن مبارک نے اسی بات کو سمجھانے کے لیے یہ فرمایا تھا۔

یا عابد الحرمین لو ابصرتنا

لعلمت انک بالعبادۃ تلعب

اس مطلب کی تائید صحیح مسلم کی اس حدیث سے بھی ہوتی ہے جو حضرت نعمان بن بشیر کے حوالے سے آتی ہے۔ نعمان بن بشیر کہتے ہیں کہ:

میں حضور اقدس ﷺ کے ممبر کے پاس میں بیٹھا تھا کہ ایک شخص بولا مجھے مسلمان ہونے کے بعد کوئی پروا نہیں اگر میں حاجیوں کو پانی پلانے کے سوا کوئی کام کروں۔ دوسرا بولا مجھے پروا نہیں کہ مسلمان ہونے کے بعد مسجد حرام میں بیٹھ کر عبادت کے سوا اگر کوئی کام نہ کروں۔ تیسرا بولا اللہ کی راہ میں جان کھپانا اور جہاد کرنا سب سے اونچا کام ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان تینوں کو ڈانٹ دیا اور فرمایا حضور ﷺ کے ممبر کے پاس کیوں شور کر رہے ہو۔ یہ جمعہ کا دن تھا جب نماز ہو چکی تو حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور ﷺ سے ان کے اختلاف کے بارے میں دریافت کیا۔ قرآن کی یہ آیت اجعلتم سقایۃ الحاج نازل ہوئی۔

یہ صحیح حدیث علی رؤس الاشہاد بتا رہی ہے کہ یہ مسلمانوں کے درمیان نیکیوں کے مفاضلہ کی بات تھی نہ کہ کافروں اور مسلمانوں کے درمیان۔ اس صحیح حدیث کی موجودگی میں آیت کا مطلب مقرر کرنے کے لیے بے سند روایتوں کا سہارا لینا درست نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر نے دوسری کہانیاں درج کرنے کے بعد لکھا ہے۔

اس آیت کی تفسیر سے متعلق ایک حدیث مرفوع بھی آئی ہے۔ اس کو پیش کر دینا ہی یہاں ضروری ہے [1]

حافظ ابن جریر نے بھی اپنی تفسیر میں اسی کو مقدم رکھا ہے۔ دوسرے شارحین قرآن میں کچھ نے اس حدیث سے چشم پوشی کر لی ہے حد یہ ہے کہ نواب صدیق حسن خان رحمہ اللہ تعالیٰ نے بھی فتح البیان میں اس کو نظر انداز کر دیا ہے۔

اس تشریح پر کچھ شبہات

پہلا شبہ یہ ہے کہ اس حدیث میں ہے کہ اس واقعہ میں یہ آیت نازل ہوئی ہے۔ اس شبہ کا جواب علامہ قرطبی نے دیا ہے کہ ایسے مواقع پر راویوں سے تسامح ہو جاتا ہے حضور اقدس ﷺ آیت قرآنی بطور استشہاد پیش کرتے ہیں راوی خیال کر لیتا ہے کہ اسی موقعہ پر نزول آیت ہوا ہے۔ ایسا بہت سے مواقع پر ہوتا ہے جیسا کہ آپ حافظ سیوطی کے الاتقان کے حوالہ سے پہلے بھی یہ بات سن چکے ہیں۔

لیجئے علامہ قرطبی کی پوری بات سن لیجئے۔

راویوں سے اس انداز بیان میں کہ یہ آیت نازل ہوئی کچھ تسامح ہوا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت عمر کے سوال کے جواب میں حضور اقدس ﷺ نے یہ آیت تلاوت فرمائی ہے۔ راوی نے یہ خیال کر لیا ہے

---

[1] ابن کثیر

کہ اسی موقعہ پر نازل ہوئی ورنہ دراصل یہ تلاوت حضور اقدس ﷺ کی جانب سے اس بات پر کہ جہاد افضل ہے استدلال کی صورت میں تھی۔ یہ مطلب نہیں کہ خاص اس واقعہ میں اس آیت کا نزول ہوا ہے۔

دوسرا شبہ یہ ہے کہ اہل ایمان کے اعمال میں تفاضل بتانا ہوتا تو تشبیہ میں آمن باللہ والیوم الاخر ذکر نہ ہوتا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ مقصود یہ ہے کہ یہ اعمال اگر ایمان کی زمین پر ہوں تب دوسرے اعمال سے افضل ہیں۔ ایمان تو قرآن میں شرط اول کے درجہ میں ہے۔ یہ کوئی سامان آرائش نہیں بلکہ یہ حقیقی واقعی اور بنیادی چیز ہے۔ اور اس شرط کا ہونا اس لیے بھی ضروری ہے کہ غالباً یہ باتیں کرنے والے وہ مسلمان ہوں گے جو فتح مکہ کے موقعہ پر مسلمان ہوئے۔ ان کو جتانا ہے کہ جب مقصود کا شعور نہ ہو تو سب بیکار ہے۔ کیونکہ مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب وہ اصل قوت ہے جو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد مقصد کا شعور اس کی جدوجہد کا اصل محرک ہے۔ مقصد ہی حیات ہے۔ بے مقصدی موت ہے اسلام کا پورا نظام ایمان کی بنیادوں پر استوار ہے روزہ، نماز، حج، زکوٰۃ جہاد فرائض عبادات اور اوامر و نواہی سب کے سب بالآخر اس غایت اصلی ایمان کے تابع ہیں کہ خدا کی زمین پر اس کی پرستش اور بندگی کی جائے۔

تیسرا شبہ یہ ہے کہ یہ آیت مسلمانوں میں باہم تفاضل اعمال کی نشاندہی کرتی تو آیت کے انجام پر واللہ لا یھدی القوم الظالمین نہ ہوتا یہ شبہ بھی بے بنیاد ہے ظلم کے معنے اتنے سنگین نہیں ہیں جتنے سمجھ لیے گئے۔ اس کے معنے بے موقع بے محل اور بے جا کرنے کے ہیں۔ یہ لفظ امتی تو درکنار نبیوں کے بارے میں بھی بولا گیا ہے! حضرت آدم کے بارے میں ہے ولا تقربا ھذہ الشجرۃ فتکونا من الظالمین۔ حضور اقدس ﷺ کے بارے میں ہے۔ لئن اتبعت اھواءھم من بعد ما جاءك من العلم انك اذًا لمن الظالمین۔ اللہ کے قانون میں رورعایت کی گنجائش کسی کے لیے نہیں ہے۔ طبیعت کے تقاضے سب میں ہوتے ہیں۔ یہ اور بات ہے کہ توفیق الٰہی ان کا تعلق ہر دنت اور ہر آن اپنے سے قائم رکھتی ہے۔ آیت کے معنے یہ ہیں کہ اللہ اپنی جانوں پر ظلم کرنے والوں کو راہ یاب نہیں کرتا۔

بہرحال آیت قرآنی کا موضوع اہل ایمان کے اعمال میں تفاضل سے ہے اہل کفر اور اہل ایمان کے اعمال میں تفاضل سے نہیں ہے۔ اگر اس آیت میں کفر وایمان کی عملی کشمکش کا ذکر ہوتا تو آئندہ آیت میں تغایر کو بتانے کے لیے حرف عطف ضروری لایا جاتا مگر آپ دیکھ رہے ہیں کہ بغیر عطف کے آیت آرہی ہے۔

مقام مجاہدین کی برتری

(19) وہ لوگ جو ایمان لائے اور ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کیا یقیناً اللہ کے نزدیک ان کا بڑا درجہ ہے اور یہی بامراد اور کامیاب ہیں۔ یعنی ایمان ہجرت اور جہاد والوں کا مرتبہ اللہ کے نزدیک بہت بڑا ہے اور یہی لوگ بامراد ہیں۔

آیت میں ایمان کے ساتھ دو عمل بتائے ہیں ایک ہجرت اور دوسرے جہاد ایمان تو اصل مقصد کی نشاندہی کر رہا ہے کیونکہ اس پر تو ساری زندگی کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ تو ساری اسلامی زندگی کے سارے اعمال سے یہاں ہجرت اور جہاد کا مقابلہ کیا ہے نیکیاں تو سب اپنی جگہ نیکیاں ہیں لیکن ان ساری نیکیوں میں اللہ کے یہاں ان اہل ایمان کا درجہ سب سے بڑا ہے جو ہجرت اور جہاد کا عمل کرتے ہیں پہلی آیت میں بتایا تھا کہ عام نیکیاں کرنے والے مجاہدین فی سبیل اللہ کے برابر نہیں اس آیت میں بتایا ہے کہ ان کا درجہ سب سے بڑا ہے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ ایمان کی حقیقی کسوٹی ہجرت اور جہاد ہیں۔ ہجرت ہجر سے جس کے معنے چھوڑ دینے کے ہیں اسلام کی اصطلاحی زبان میں ایمان کی خاطر اپنی دنیوی مرغوبات و محبوبات کو چھوڑ دینے کا نام ہجر ہے مثلاً دولت کو آرام و راحت کو، عزیز و اقربا کو، وطن و مکان کو۔ چونکہ وطن و مکان کا علاقہ ایک ایسا علاقہ ہے جس کے ترک کرنے میں اہل و عیال، مال و متاع دوست و احباب ہر طرح کے علاقوں کو ترک کر دینا پڑتا ہے اور اس کی محبت و الفت کی زنجیر اور ساری زنجیروں سے بھاری ہے اس لیے ترکِ وطن اعلیٰ اور جامع قسم کی ہجرت ہے۔ اور ہجرت کا بول زیادہ تر اسی کے لیے استعمال ہوا ہے۔

جہاد جہد سے بنا ہے جس کے معنی دشمن اور دشمن کی ساری قوتوں کو دور کرنے اور اپنے کو قائم و باقی رکھنے میں انتہا درجہ کی کوشش جہاد ہے۔ چونکہ اسلام کے قیام کی اصل بنیاد جہاد ہے اس لیے ہر حیثیت سے اور ہر اعتبار سے اس پر زور دیا گیا اور سارے عملوں اور نیکیوں کو جو ایک مسلمان دنیا میں کر سکتا ہے اس عمل کا رتبہ و اجر افضل و اعلیٰ ٹھہرایا جس عمل میں جس قدر زیادہ ایثار و قربانی ہوگی اتنا ہی زیادہ اس کا اجر و ثواب بھی ہوگا۔ ظاہر ہے کہ اس عمل سے بڑھ کر اور کس عمل میں مال و جان کا ایثار ہو سکتا ہے۔ حتیٰ کہ یہی عمل ایمان کی اصلی کسوٹی بن گیا جس مومن کا دل اس کے ولولہ و طلب سے خالی ہو وہ ایمان کی روشنی سے محروم اور نفاق کی ظلمت کا شکار ہے۔ صحیح مسلم میں ہے۔

جو مسلمان اس حالت میں دنیا سے گیا کہ نہ تو کبھی اللہ کی راہ میں جنگ کی اور نہ اس کی طلب کا کبھی اس کے دل میں ولولہ ہوا تو اس کی موت ایسی حالت میں ہوئی جو نفاق کی شاخوں میں سے ایک شاخ ہے۔

بخاری میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا۔ ای العمل افضل کونسا عمل سب سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے فرمایا ایمان باللہ و رسولہ پھر پوچھا اس کے بعد آپ نے فرمایا۔ الجھاد فی سبیل اللہ۔ اللہ کی راہ میں جہاد۔

بخاری میں ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا گیا لوگوں میں سب سے اچھا کون ہے فرمایا مومن یجاھد فی سبیل اللہ بنفسہ و مالہ مومن جو اللہ کی راہ میں اپنی جان اور مال سے جہاد کرے۔

بعض احادیث میں اس عمل جہاد کا دوسرے اعمال عبادت سے موازنہ کیا ہے۔ ترمذی میں ارشاد نبوت ہے۔

تم میں سے ایک کا راہ خدا میں کھڑا ہونا گھر میں بیٹھ کر ساٹھ سالہ عبادت سے افضل ہے۔

اور ترمذی ہی میں ہے۔

جس مسلمان نے ایک رات بھی جہاد کرتے ہوئے دشمن کے انتظار میں کاٹی اس کے لیے ایسا اجر ہے گویا ہزار راتیں قیام کیا اور دن کو روزہ رکھا

بخاری و مسلم میں ہے۔

تین بار آپ سے پوچھا گیا کہ جہاد کے برابر کونسا عمل ہے تین مرتبہ فرمایا تمہارے بس کی بات نہیں یعنی کوئی عمل ایسا نہیں جو جہاد کے برابر ہو اور تم کر سکو پھر فرمایا مجاہد کی مثال نہ دن میں روزہ رکھنے والے اور رات میں قیام کرنے والے قرآن تلاوت کرنے والے اس شخص پر جو نماز اور روزہ کرتا ہی رہے۔

اس آیت میں اللہ کی راہ میں جہاد کرنے والے اہل ایمان کے اسی مقام بلند کی اعظم درجة عند الله واولئك هم الفائزون کہہ کر خبر دی گئی ہے۔

اللہ کی راہ میں قربانیوں پر بشارت

(۲۰) ان کا رب ان کو اپنی رحمت اور کامل خوشنودی کی بشارت دیتا ہے اور ایسے باغات کی جہاں ان کے لیے ہمیشگی کی نعمت ہوگی اور وہ ان میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ بلاشبہ اللہ کے پاس بہت اجر ہے یعنی اس کے یہاں ثواب و درجات کی کیا کمی ہے جس کو جتنا چاہے مرحمت فرمادے پہلی آیت میں تین چیزوں کا ذکر تھا۔ ایمان جہاد اور ہجرت ان تین پر بشارت بھی تین چیزوں کی دی رحمت، رضوان، خلود فی الجنۃ، ابو حیان نے لکھا ہے کہ رحمت ایمان پر مرتب ہے۔ ایمان نہ ہو تو آخرت میں خدا کی رحمت و مہربانی سے کوئی حصہ نہیں مل سکتا اور رضوان جو بہت اعلیٰ مقام ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ کا صلہ ہے۔ مجاہد فی سبیل اللہ تمام نفسانی حظوظ و تعلقات ترک کر کے خدا کے راستہ میں جان و مال نثار کرتا اور خدا کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے انتہائی قربانی پیش کرتا ہے لہذا اس کا صلہ بھی انتہائی ہونا چاہیے اور وہ حق تعالیٰ شانہ کی رضا کا مقام ہے باقی ہجرت وہ خدا کے لیے وطن مالوف اور گھر بار چھوڑنے کا نام ہے اس لیے مہاجر کو خوشخبری دی گئی کہ تیرے وطن سے بہتر وطن اور تیرے گھر سے بہتر گھر تجھے ملے گا جس میں ہمیشہ اعلیٰ درجہ کی آسائش و راحت سے رہنا ہوگا جس سے ہجرت کرنے کی کبھی نوبت نہ آئے گی [1]

اس آیت میں واقعی تین چیزوں کا ذکر ہے۔ اور پہلی آیت میں بھی تین اعمال ایمان، ہجرت اور جہاد کا ذکر ہے۔ ابو حیان کی نکتہ آفرینی کے مطابق ایمان کے مقابلے میں رحمت اور جہاد کے مقابلے میں رضوان اور ہجرت کے مقابلے میں جنات ہیں لیکن اس میں ترتیب درست نہیں رہی ہے کیونکہ قرآن میں پہلے ایمان پھر ہجرت اور اس کے بعد جہاد کا ذکر ہے اگر ترتیب بھی قائم رکھی

[1] افادات شیخ الاسلام

جائے تو ایمان کے مقابلے میں رحمت ، ہجرت کے مقابلے میں رضوان جہاد کے مقابلے میں جنات آتا ہے مگر یہاں ذہن میں خلش ہوتی ہے لف ونشر مرتب ہوتا ہے یا غیر مرتب ۔ اگر مرتب ہو تو ایمان کے مقابلے میں رحمت ، ہجرت کے مقابلے میں رضوان اور جہاد کے مقابلے میں جنات آتا ہے ۔ اور اگر غیر مرتب ہو تو ایمان کے مقابلے میں جنات ، ہجرت کے مقابلے میں رضوان اور جہاد کے مقابلے میں رحمت آتا ہے ۔ اس لیے اس نکتہ میں نہ لطافت ہے نہ بلاغت ہے ۔"

اصل یہ ہے کہ آیت ایک عمل پر جزا نہیں بلکہ مجموعہ اعمال پر مجموعی جزا ہے یعنی جو شخص ایمان و ہجرت اور جہاد کا سرمایہ لے کر آئے گا اللہ کے یہاں اس کی جزا رحمت ، رضوان اور جنت میں دائمی مقام ملے گی ۔

جنت کو آخر میں لائے ہیں ۔ پہلے رحمت اور رضوان کا ذکر کر دیا تاکہ جنت کی طلب میں شوق زیادہ ہو ۔

خدا کی رحمت کب نہیں اور کہاں نہیں مگر دنیا کے فطری قوانین کے بموجب اس دنیا میں ایسے واقعات اور حوادث بھی پیش آتے ہیں جن کو رحمت کے بجائے قہر الٰہی سے تعبیر کرتے ہیں ۔ پھر یہ واقعہ بھی ہے کہ خود ہم کو ہمارے اعمال کی وجہ سے اللہ سبحانہ کے قہر میں مبتلا ہونا پڑتا ہے لیکن جنت وہ مقام ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غضب کا نام و نشان نہ ہوگا ۔ وہاں ہر طرف اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غضب کا نام و نشان نہ ہوگا ۔ وہاں ہر طرف اور ہر آن اس کے فضل و رحمت کی بارش ہوگی ۔ اس کی رحمت کے سوا وہاں کوئی اور منظر کہیں اور کبھی دکھائی نہ دے گا ۔ اہل جنت جن کے چہرے خوشی سے دمکتے ہوں گے ۔ رحمت ان کو اپنے گھیرے میں لے لے گی ۔

جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز رضوان ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے سے راضی ہونا کہ اس کے بعد نہ کبھی اپنے بندہ پر عتاب فرمائے گا اور نہ اس سے ناراض ہوگا بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال دولت عطا فرمائے گا ۔ متقیوں کے لیے اللہ نے جو نعمتیں رکھی ہیں وہ ان گنت نعمتیں ہیں لیکن سب سے آخر میں جو نعمت رکھی ہے وہ نعمت رضوان ہے ۔ اس پر تفصیلی بحث اسی جلد کے آخر میں آ رہی ہے ۔

آیئے ذرا اس پر بھی غور فرمایئے کہ جن اعمال پر ان انعامات کی یہ بارش ہو رہی ہے یعنی ایمان ، ہجرت اور جہاد ۔ ایمان تو اپنی جگہ ہے اس کے بغیر تو کوئی عمل قابل پذیرائی نہیں یہ تو اللہ و رسول سے عہد وفاداری کا نام ہے ۔ اسی عہد وفاداری کو نبھاتے ہوئے دین کے سارے کاموں میں سے یہاں جو ہجرت اور جہاد کا ذکر کیا ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ جن کا ذکر کیا جا رہا ہے ان کے پیش نظر یہ اور صرف یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی زمین پر بس اسی کی بندگی اور صرف اسی کی پرستش کی جائے اور معبودان باطل کو ہر جگہ سے نکال پھینکا جائے خواہ یہ معبود ہوائے نفس کی صورت میں ہوں یا دیوتاؤں اور بتوں کی ۔ طبقاتی اور قومی مفاد کی صورت میں ظاہر ہوں ، آمروں ، لیڈروں اور بادشاہوں کا بھیس بدل کر آئیں ۔ اس مقصد کی خاطر اگر ترک وطن کرنا پڑے تو خندہ پیشانی سے کرے وطن ، قوم زبان رنگ و نسل کی کوئی وفاداری اللہ و رسول کے عہد وفاداری میں حائل

ہو اور اگر اس مقصد کی خاطر اپنی جان مال مکان دوکان کارخانہ، منصب و اقتدار کو داؤ پر لگانا پڑے تو اس میں کوئی پس و پیش
کرے۔ ان اہل ایمان کے یہ اوصاف اس بات کی گواہی دے رہے ہیں کہ ان میں اعلائے کلمۃ اللہ کی خدمت انجام دے
کر اللہ کا قرب حاصل کرنے کی آرزو تھی۔ یہ چاہتے تھے کہ اسلام کے اخلاقی اقدار اور قرآن کے معیار خیر و شر کو سارے عالم پر حکمران
ا کر اپنے اللہ کو راضی کریں۔ اس کام کو کرتے وقت ان کی نمازوں میں روح تھی۔ عبادات میں جان تھی اور اسلام کے سارے
ہو اور اس غایت آخری سے اپنی زندگی اور پرورش کا سامان حاصل کر رہے تھے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ لَا تَتَّخِذُوٓا۟ ءَابَآءَكُمْ وَإِخْوَٰنَكُمْ أَوْلِيَآءَ إِنِ ٱسْتَحَبُّوا۟ ٱلْكُفْرَ عَلَى ٱلْإِيمَٰنِ ۚ وَمَن يَتَوَلَّهُم مِّنكُمْ فَأُو۟لَٰٓئِكَ هُمُ ٱلظَّٰلِمُونَ ﴿٢٣﴾ قُلْ إِن كَانَ ءَابَآؤُكُمْ وَأَبْنَآؤُكُمْ وَإِخْوَٰنُكُمْ وَأَزْوَٰجُكُمْ وَعَشِيرَتُكُمْ وَأَمْوَٰلٌ ٱقْتَرَفْتُمُوهَا وَتِجَٰرَةٌ تَخْشَوْنَ كَسَادَهَا وَمَسَٰكِنُ تَرْضَوْنَهَآ أَحَبَّ إِلَيْكُم مِّنَ ٱللَّهِ وَرَسُولِهِۦ وَجِهَادٍ فِى سَبِيلِهِۦ فَتَرَبَّصُوا۟ حَتَّىٰ يَأْتِىَ ٱللَّهُ بِأَمْرِهِۦ ۗ وَٱللَّهُ لَا يَهْدِى ٱلْقَوْمَ ٱلْفَٰسِقِينَ ﴿٢٤﴾

ع ۸ ۳

اے اہل ایمان اگر تمہارے باپ دادے اور تمہارے بھائی بند ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کریں تو ان کو اپنا رفیق نہ بناؤ اور یاد رکھو جو بھی تم میں ان کو اپنا رفیق بنائے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا[۲۳] اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ تمہارے بیٹے تمہارے بھائی۔ تمہاری بیویاں، تمہاری برادری، تمہارا وہ مال جو تم نے کمایا ہے۔ تمہاری وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہے۔ تمہارے وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں یہ ساری چیزیں تمہیں اللہ اور اس کے رسول اور اللہ کی راہ میں جہاد سے زیادہ محبوب ہیں تو انتظار کرو یہاں تک اللہ اپنا فیصلہ تمہارے سامنے لے آئے اور اللہ فاسقوں کی رہنمائی نہیں کرتا ہے[۲۴]

مفردات کے معانی

استحبوا۔ ماضی کا جمع مذکر غائب ہے استحباب مصدر ہے۔ حب مادہ ہے استحباب کے معنے پسند کرنا ہیں اور حب کے لغوی معنے کسی ایسی چیز کا ارادہ کرنے یا اسے چاہنے کے ہیں جس کے کسی خیر کا ملنا یقینی یا متوقع ہو[1] اسی طرح لسان العرب میں اس لفظ کے معنے وداد یعنی پسند کرنا یا چاہنا بتاتے ہیں اور بغض کو اس کی نقیض قرار دیا ہے۔ ابن القیم نے محبت کے لغوی معنے بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ مادہ پانچ چیزیں بتاتا ہے۔

۱۔ صفائی اور سپیدی اسی سے دانتوں کی سپیدی کو حبب الاسنان کہتے ہیں۔

۲۔ بلندی اور غلبہ اسی سے پانی کے بلبلوں کو حبب الماء اور حباب کہتے ہیں۔

۳۔ جمنا اور جمنا اسی سے اونٹ کو اگر بیٹھ کر نہ اٹھے حب البعیر کہتے ہیں۔

۴۔ مغز اسی سے دانہ کو حب اور دل کے لیے حبۃ القلب بولتے ہیں۔

۵۔ روکنا اور حفاظت اسی سے اس برتن کو جس میں پانی محفوظ رکھا جائے حب الماء کہتے ہیں[2]

جہاد اللہ و رسول کی محبت کا تقاضا ہے

یہ آیت جہاد فی سبیل اللہ کو اللہ کی محبت کا لازمی ثمرہ بتا رہی ہے جیسے قرآن کی یہ آیت ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی حضور اقدس ﷺ کی اتباع کو محبت الٰہی کی نشانی بتا رہی ہے۔ اور وہ اس طرح کہ اس میں جہاد کا لفظ اللہ و رسول کا بیان واقع ہوا ہے جو اس امر کی دلیل ہے کہ جہاد کی محبت اور اللہ و رسول کی محبت دونوں انتہائی حد تک لازم و ملزوم ہیں یعنی قرآن کے نزدیک وہ ایک ہی حقیقت کی مختلف تعبیریں ہیں۔ اس طرح یہ ارشادِ خداوندی بتا رہا ہے کہ دین کی نصرت اور اقامت کے لیے اپنی طاقتیں نچوڑ دینا محبت الٰہی کا ایسا ناگزیر تقاضا ہے جس کے بغیر اس کے وجود کا کوئی اعتبار ہی نہیں۔ ممکن نہیں کہ اللہ سبحانہ کی محبت اندر موجود ہو مگر وہ جہاد فی سبیل اللہ کے قالب میں ڈھل ڈھل کر باہر نہ آتی ہو۔ حافظ ابن تیمیہؒ نے محبت الٰہی کے مسئلے پر بحث کرتے ہوئے صاف بتایا ہے۔

> اتباعِ شریعت اور جہاد فی سبیل اللہ ہی وہ سب سے بڑا فرق و امتیاز ہے جو اللہ کی سچی محبت کرنے والوں اور محض مدعیوں کے درمیان پایا جاتا ہے۔ اور جس کے ذریعے ان اولیاء اللہ کے جو اللہ کے واقعی محب اور محبوب ہیں۔ اور ایسے مدعیان محبت کے درمیان تمیز کی جا سکتی ہے جو دعوے محبت کے ساتھ مخالف شرع

[1] مفردات القرآن

[2] مدارج السالکین

باتوں اور اپنے جی کی گھڑی ہوئی بدعتوں کا اتباع کرتے رہتے ہیں یا حب محبت کا یہ خود ساختہ مفہوم لیتے ہیں کہ خدا کی پیدا کی ہوئی ہر چیز سے محبت کی جائے حتیٰ کہ کفر و فسق جیسی چیزوں سے [1]

(۲۱) اے اہل ایمان اگر تمہارے باپ اور تمہارے بھائی بند ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کریں تو تم ان کو اپنا رفیق نہ بناؤ اور یاد رکھو جو بھی تم میں سے ان کو اپنا رفیق بنائے گا وہ اپنے آپ پر ظلم کرے گا۔ پہلی آیات میں بتایا تھا کہ جہاد و ہجرت اعظم اور افضل ترین اعمال ہیں۔ بسا اوقات ان دونوں اعمال میں خویش و اقارب کنبہ برادری کے تعلقات مخل انداز ہو جاتے ہیں اس لیے فرمایا کہ جن لوگوں کو ایمان سے کفر عزیز ہے ایک مومن انہیں کیسے عزیز رکھ سکتا ہے۔ مسلمان کی شان نہیں کہ ان سے رفاقت اور دوستی کا دم بھرے حتیٰ کہ یہ تعلقات اس کو جہاد و ہجرت سے روک ہو جائیں ایسا کرنے والے گنہ گار ہیں کہ اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں [2]۔ شیخ الاسلام نے تفسیر میں بہت ہی اختصار سے کام لیا ہے بات ذرا تشریح طلب ہے۔

اصل یہ ہے کہ مکہ کا طلقاء کا ایک بڑا گروہ نیا نیا مسلمانوں میں داخل ہوا تھا یعنی ان باشندگان مکہ جنھیں حضور اقدس ﷺ نے عفو و بخشش کی ایک بے نظیر مثال قائم کرتے ہوئے فتح مکہ کے دن آزاد کر دیا تھا اور فرمایا تھا انتم الطلقاء آج تم سے کوئی باز پرس نہیں۔ یہ ابھی اسلامی زندگی کی پختگی کے محتاج تھے۔ اور ان میں سے بہتوں کے عزیز و اقربا دشمنوں سے ملے ہوئے تھے۔ جب اعلان جنگ ہوا تو انہیں اپنے قرابت داروں کی فکر ہوئی۔ کچھ نے جاہلیت کے نسبی اور خاندانی عصبیت کی صدا ابھی بلند کی جو ابھی پوری طرح ان کے دلوں سے ختم نہیں ہوئی تھی ــــ کچھ منافق اور کچے دل کے آدمی بھی تھے وہ کہنے لگے اب جنگ کے اعلان کی کیا ضرورت ہے جو کچھ ہونا تھا ہو چکا ــــ عام مسلمانوں میں بھی فتح و عروج کی وجہ سے کچھ نہ کچھ بے پروائی سی پیدا ہو گئی تھی لوگ خیال کرتے ہوں گے اب تو تمام عرب کلمہ حق کے آگے جھک رہا ہے اور دشمنوں میں دم خم باقی نہیں رہا۔ حالانکہ مشیت الٰہی نے عروج اسلام کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ کچھ اور ہی تھا اور اس موقعہ پر طبیعتوں کی بے پروائی نہ صرف مستقبل کے لیے بلکہ موجودہ حالت کے لیے بھی خطرہ سے خالی نہ تھی اس لیے ضروری ہوا کہ اہل ایمان کو ایمان و عمل کے عزائم کی از سر نو تلقین کی جائے اور یاد دلایا جائے کہ آزمائش ابھی ختم نہیں ہوئی ہے بلکہ شروع ہوئی ہے از آں جملہ اس اعلان جنگ کی آزمائش ہے جسے دشمنوں کے غدر و فریب نے ضروری کر دیا ہے اور ملک کے امن و امان کا استحکام اس کے بغیر ممکن نہیں ہے چنانچہ پہلے فرمایا ام حسبتم ان تترکوا کہ تمہیں اسی طرح چھوڑ دیا جائے گا بلکہ ایمان و عمل کی اور بھی آزمائشیں باقی ہیں جن سے تمہیں دوچار ہونا ہے۔ اب یہاں سچے مومنوں کی فضیلت بیان فرمانے کے بعد اس آیت میں توجہ دلائی ہے کہ ایمان کا دعویٰ اور اہل ایمان کے دشمنوں کے ساتھ موالات و رفاقت ایک دل میں جمع نہیں ہو سکتے

[1] العبودیۃ

[2] افادات شیخ الاسلام

اگر باپ اور بھائی بھی دشمن کی صف میں ہوں تو تمہیں ان سے کوئی علاقہ نہیں رکھنا چاہیے [1]

اس آیت نے یہ بات کھول کر سمجھا دی ہے کہ اہل ایمان کے تعلق دوستی اور اعتماد کی بنیاد وطن، قوم، نسب اور خاندان پر نہیں بلکہ ایمان پر ہے اگر مسلمانوں میں سے کسی کا باپ بھائی ایمان کے مقابلہ میں کفر کا دلدادہ ہے تو ان کو اپنا معتمد اور دوست نہ بنانا چاہیے جو ایسا کرے گا وہ اپنے پر خود ہی ظلم کرے گا۔ قرطبی نے یہاں یہ بات بر موقعہ لکھی ہے کہ اس آیت کے مخاطب پورے عالم کے مسلمان ہیں اور یہ حکم حالات کی تخلیق اور فرضی نہیں بلکہ قیامت تک کے لیے ہے اور سب کے لیے ہے کہ ایمان و کفر میں کوئی رابطہ نہیں ہے لیکن یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ اس طرح کے تمام احکام کا تعلق جنگ سے ہے نہ کہ انسانی زندگی کے عام حالات سے۔ جہاں تک ایک انسان کے دوسرے انسان سے تعلق کا مسئلہ ہے اس موضوع پر اصل محبت و شفقت ہمدردی و سلوک اور تعاون و سازگاری ہے اس کے سوا کوئی بات نہیں۔ قرطبی نے اس موقعہ پر لکھا ہے کہ سلوک، تعاون کے معاملات یہاں بھی مستثنیٰ ہیں الاحسان والھبۃ مستثناۃ من الولایۃ۔ دلیل میں صحیح بخاری کے حوالہ سے حضرت اسمار کا یہ عمل پیش کیا ہے کہ یا رسول اللہ ﷺ میری والدہ آئی ہیں۔ وہ مشرکہ ہیں، کیا میں ان سے حسن سلوک اور رواداری کر سکتی ہوں فرمایا صلی امک تو اپنی ماں سے حسن سلوک کر۔ جب حالت جنگ میں بھی اس کا استثنار ہے تو جنگ نہ ہونے کی صورت میں تو اس کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ انسانی برادری کے علائق کا قرآن انکار نہیں کرتا۔ انسان ہونے کی حیثیت میں ہر انسان کا انسان سے تعلق ہے وہ تمام باتیں جو انسانی علاقوں کو منقطع کرتی ہیں خدا کی طرف سے نہیں ہیں۔ یہاں الجصاص نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ یہ جنگ کے احکام ہیں کہ والدین سے اور بھائیوں سے رفاقت و ولایت کے تعلقات راہِ ایمان میں رکاوٹ نہ ہونے چاہئیں۔ ورنہ قرآن نے عام حالات میں کافر باپ کے ساتھ نیکی کرنے اور اس کے ساتھ حسن سلوک اور تعاون کرنے کا حکم دیا ہے یہاں مسلمانوں کو زمانہ جنگ میں علائق منقطع کرنے کا حکم صرف اس لیے دیا ہے کہ کچھ منافق قسم کے لوگ کافروں سے رفاقت و سازگاری کے تعلقات رکھے ہوئے تھے۔ لکھا ہے یہ ایک کسوٹی بنا دی گئی مومن و منافق میں امتیاز کے لیے۔ جو مومن ہیں وہ دشمنوں کے کیمپ سے کسی قسم کا تعلق نہ رکھیں۔ اور جو منافق ہیں وہ کافروں سے تعلقات رکھتے ہیں۔ ان کا اکرام و تعظیم کرتے ہیں۔ ان سے بھائی چارہ اور تعلقات رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر پوری تفصیل بحث قرآن کے ۲۸ پارے سورہ ممتحنہ میں آرہی ہے۔

حُبِّ ایمانی اور غیر ایمانی میں موازنہ

اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ اگر تمہارے باپ تمہارے بیٹے تمہارے بھائی، تمہاری بیویاں، تمہاری برادری، تمہارا وہ مال جو تم نے کمایا ہے تمہاری وہ تجارت جس کے مندا پڑ جانے کا تمہیں اندیشہ ہے، تمہارے وہ مکانات جو تمہیں پسند ہیں یہ ساری

[1] ترجمان القرآن۔

کرتے ہیں۔ ان کی وجہ سے وہ اپنے آپ کو طیبات سے محروم کر لیتے ہیں والدین کا جذبہ محبت اولاد سے ان کی پرورش ان کی صحت اور تعلیم و تربیت کا سبب ہوتا ہے۔ اولاد مستقبل میں ان کی امیدوں کا سہارا ہوتی ہے قرآن نے اولاد کو دنیوی زندگی کی شان و شوکت بتایا ہے۔

المال والبنون زينة الحياة الدنيا۔

۳۔ بھائیوں سے محبت۔ بھائی چھوٹا ہے تو اولاد میں چھوٹے بچے کی جگہ ہے بڑا ہے تو باپ کی جگہ ہے۔ ایک طرف شفقت ہوتی ہے اور دوسری طرف احترام ہوتا ہے۔ اور دونوں میں نفسیاتی کشش ہے۔

۴۔ بیوی سے محبت بقاء نسل اور اولاد کی خواہش دونوں کو یکجائی کا موقع دیتے ہیں۔ اور دونوں کی یکجائی انسانی نسل میں اضافہ کا سبب ہوتی ہے انسان کی چاہتوں اور محبتوں میں میاں بیوی کی محبت ایک طاقتور رشتہ ہے بلکہ قرآن نے تو بتایا ہے کہ یہ رشتہ بنایا ہی اللہ نے مودت و رحمت کے لیے ہے۔

وجعل بينكم مودة و رحمة۔

۵۔ خاندان کی محبت وقار و عزت، تعاون اور عصبیت کی خاطر انسان اپنے خاندان سے محبت کرتا ہے۔ عرب میں خاندانی عصبیت حد سے زیادہ تھی۔ اسی کے بل بوتے پر ساری جنگوں کی کامیابی کا انحصار تھا۔ اور اسی کے ارد گرد ان کی داخلی و خارجی سیاست چکر لگاتی تھی۔

۶۔ اموال کی محبت، چونکہ مال کے پیچھے آدمی کی محنت ہوتی ہے اور آدمی جس چیز پر جان کھپاتا ہے اس سے طبیعت کو لگاؤ ہو جاتا ہے۔ لگاؤ ہونے کے بعد طبیعت اور عقل دونوں میں اس کی قدر و قیمت ہو جاتی ہے۔

۷۔ تجارت سے محبت۔ اس سے مراد کاروبار بھی ہو سکتا ہے اور دکان کا سامان بھی ہو سکتا ہے۔ زمانہ جنگ میں اچھے اچھے کاروبار رہ جاتے ہیں۔ مکہ کے کچھ مسلمان تاجر تھے۔ ان کی دوکانوں میں سامان تجارت تھا خریداروں کی اکثریت مشرکین کی تھی دکانیں حج کے موسم میں لگتی تھیں اور مشرکین کی حج میں شرکت پر اسلامی حکومت سرکاری طور پر قدغن قائم کر چکی تھی۔

۸۔ پسندیدہ مکانوں کی محبت اگر یہ کسے مکان سے کون محبت نہیں کرتا ہے مکہ میں کچھ مسلمانوں کے مکان ہوں گے جن میں زندگی کی ساری آسائشیں موجود ہوں گی۔ اور مکہ میں کچھ مکان بصورت جائداد ہوں گے جن کو ایام حج میں کرایہ پر چڑھاتے ہوں گے۔ حالت جنگ میں دونوں مفادات خطرہ کا شکار ہو جاتے ہیں بالخصوص ایسی حالت میں جبکہ حالت جنگ ہے اور مشرکین کی شرکت قانوناً ممنوع قرار دے دی گئی ہے۔ بہر حال یہ آٹھ قسمیں ہیں قرابت زوجیت منافع اور رہائشی مکانات یہ سب ہی اس کی متقاضی تھیں جنگ نہ ہو کیوں کہ جنگ کی حالت میں ان محبوبات کو چھوڑنا پڑے گا۔

قرآن نے اس آیت میں اہم اور بنیادی بات یہ بتائی ہے جیسا کہ امام رازیؒ نے لکھا ہے کہ اگر ان محبوبات میں اور محبت ایمانی میں تقابل ہو جائے تو مومن وہ ہے جس پر ان تمام الفتوں میں سے کسی الفت کا جادو نہ چل سکے اور کوئی علاقہ بھی اسے اتباع حق سے نہ روک سکے۔

اس آیت قرآنی میں تفصیل کے ساتھ ان سارے عواقب کی طرف اشارا کر دیا ہے جو اسلامی زندگی اختیار کر لینے کے بعد غیر متوقع نہیں ہوتے ہیں یعنی یہ ہو سکتا ہے کہ باپ بیٹے اور بیٹا باپ سے بھائی اپنے بھائی سے شوہر اپنی بیوی سے علیحدہ ہو جائے کنبہ برادری روٹھ جائے اپنا جمع کیا ہوا مال ہاتھوں سے نکل جائے چلتی ہوئی تجارت میں روڑا اٹک جائے اپنے رہائشی مکان ترک کرنے پڑ جائیں مگر بتلاؤ ایسے وقت میں تم کس کا ساتھ دو گے اگر کہیں عزیزوں کا ساتھ دیا تو یہ اس کا ثبوت ہوگا۔ کہ جو ایثار و قربانی کا عہد تم نے اپنے خدا سے باندھا تھا وہ غلط تھا پھر جو اس عہد شکنی کی پاداش ہو اس کا انتظار کرنا چاہیے۔

اسلام بتلاتا ہے کہ عزیزوں کے بڑے حقوق ہیں اور سب حقوق کی رعایت کرنا انسان کا فرض ہے مگر اللہ اور حضور اقدس ﷺ کا حق سب سے مقدم ہے اور اسی لیے جب کسی کے حق کی ادائیگی میں ان کا حق رہ جانے کا اندیشہ ہو تو ان کا حق مقدم کرنا ہوگا۔ والدین اپنی جگہ بہت زیادہ حقدار ہیں مگر اللہ سبحانہ اور ذات نبوت کا حق ان سے بہت زیادہ ہے اسی لیے آغاز آیت میں انداز بیان ہے کہ اگر تمہارے والدین ایمان پر کفر کو ترجیح دین اور اللہ سبحانہ کے حق کو فراموش کرنے لگیں تو پھر تمہارا یہ فرض ہے کہ تم ان کے حق کو نظر انداز کر دو۔

قرآن کی آیت دراصل ہمارے سامنے ایک تاریخی حقیقت پیش کر رہی ہے اور وہ یہ کہ اسلام کے ابتدائی دور میں خدا اور رسول پر ایمان لانا والدین اور اولاد کے درمیان سب سے بڑے افتراق کا سبب تھا۔ بہت ممکن تھا کہ ان رشتوں کی محبت اسلامی سعادت حاصل ہونے میں رکاوٹ ہوتی۔ تاریخ سے معلوم ہوتا ہے کہ بعض مواقع پر یہ محبتیں وقت کے تقاضوں میں رکاوٹ بن کر کھڑی ہو گئیں۔ یہ آیت بتاتی ہے کہ اگر باپ کے لیے کبھی ایسا موقع آ جائے کہ اسلام کی وجہ سے اولاد چھوڑنی پڑے یا اولاد کے لیے ایسا حادثہ پیش آ جائے کہ اسلام کی خاطر اپنے والدین کو خیرباد کہنا پڑے تو ایمان یہ ہے کہ یہ قربانیاں کر گذرے۔

حُبِّ ایمانی کیا ہے

محبت ایک باطنی کیفیت ہے جو آنکھوں سے دیکھی نہیں جا سکتی اور نہ کسی اور طرح محسوس کی جا سکتی ہے۔ اس کا تو صرف قالب ہی دیکھا اور محسوس کیا جا سکتا ہے۔ اور جب واقعہ یہ ہے تو ماننا پڑے گا کہ یہ قالب بھی دراصل اس کے ان دیکھے وجود کا واحد ثبوت ہے اس لیے محبت الٰہی کے معنی و مقصود کو سمجھ لینا اس پر موقوف ہے کہ قرآن سے اس کے عملی مظاہر معلوم ہوں۔ قرآن حکیم

نے اللہ سبحانہ کی محبت کے عملی مفہوم کی کئی جگہ وضاحت کی ہے سب سے اصولی اور جامع وضاحت سورہ آل عمران کی اس آیت میں ہے۔

قل ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی یحببکم اللہ۔

یہ آیت محبت الٰہی کے موضوع پر جہاں دوسرے اہم اور بنیادی مسائل سے بحث کرتی ہے وہیں اس کی اصل اور حقیقت کی بھی نشاندہی کرتی ہے کیونکہ جب وہ کہتی ہے کہ اللہ کی محبت کا واحد راستہ اللہ کے رسول محمد رسول اللہ کی پیروی ہے تو اس سے صرف حضور اقدس ﷺ کی اتباع کی فرضیت ہی ثابت نہیں ہوتی بلکہ یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ اللہ کی مطلوبہ محبت اپنے ٹھیک اور معیاری مفہوم میں ٹھیک وہی محبت ہے جو اس کے رسول میں موجود تھی۔ حضور اقدس کے سینے میں اپنے اللہ سے جو محبت تھی وہ کیسی اور کس نوعیت کی تھی۔ اس سوال کا جواب ظاہر ہے کہ صرف آپ کی عملی زندگی ہی دے سکتی ہے۔ اس مبارک اور نمونہ کی زندگی کا جس کا ایک ایک خط و خال قرآن حدیث اور سیرت کی کتابوں میں ابھرے نقوش کی طرح بالکل نمایاں دیکھا جا سکتا ہے۔

یہ آیت بتاتی ہے کہ محبت الٰہی کا فطری تقاضا ضروری مظہر اور واحد لازمی ثبوت حضور اقدس ﷺ کا اتباع ہے جو شخص اس اتباع میں جتنا زیادہ بڑھا ہوگا اتنا ہی زیادہ اللہ سے محبت کرنے والا ہوگا اور جو اتباع سے جتنا زیادہ ناقص ہوگا اتنا ہی زیادہ محبت سے محروم ہوگا اتباع رسول اتنا معروف لفظ ہے جس کے لیے کسی شرح کی ضرورت نہیں ہے اس کا مدعا مسلم طور پر یہ ہے کہ آپ کے جمیع احکام میں اطاعت کی جائے۔ ایمان و عمل اخلاق و آداب اور زندگی کے طور طریقوں میں آپ ہی کے نقوش قدم کو دلیل راہ بنایا جائے۔ آپ کی زندگی کیا اور کیسی تھی دو لفظوں میں اس کا جواب دیا جا سکتا ہے کہ آپ کی زندگی مجسم قرآن تھی۔ قرآن اگر پرستش و بندگی کا مکمل ہدایت نامہ تھا تو آپ اس ہدایت نامہ کی مکمل تصویر تھے۔ اس ہدایت کی تعمیل میں اگر قائم بالعمل مجاہد تھے خشیت و انابت کے پیکر تھے۔ صبر و شکر کے مجسمے تھے اور آخرت کے طالب اور رضائے مولیٰ کے آرزومند تھے تو دوسری طرف گھر کے اندرونی گوشوں سے لے کر تمدن و سیاست کے آخری کناروں تک کوئی میدان کار ایسا نہیں جس میں آپ معروف نہ ہوں۔ یہی زندگی ہے جو قرآنی فیصلے کے تحت محبت الٰہی کا واحد عملی مفہوم اور اس کی حقیقت کا واحد لازمی مظہر ہے اس لیے جس کی محبت الٰہی عمل کے اس قالب میں ظاہر نہ ہوتی ہو وہ قرآن کی مطلوبہ محبت ایمانی نہیں ہو سکتی محبت کے نام پر اور کوئی چیز ہوگی۔

محبت ایمانی کا یہ مفہوم اتنا واضح ثابت اور بدیہی ہے کہ قرآن پر ایمان رکھتے ہوئے اس سے کسی طرح اختلاف نہیں کیا جا سکتا۔ چنانچہ اس میدان میں جس نے داد تحقیق دی ہے تو یہی بات بتائی ہے کہ اللہ سبحانہ اور اس کے رسول کی طاعت کے بغیر محبت ایمانی کا کوئی تصور ہی نہیں ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم متکلمین کی ترجمانی کر رہے ہیں جو کہتے ہیں کہ اللہ کی محبت کا اصل اور بنیادی مفہوم اس کی ذات کی محبت نہیں بلکہ اس کی اطاعت و غلامی کی محبت یا اس کے اجر و احسان کی

بت ہے یا اللہ کی اطاعت پر جماؤ ہی اس کی محبت ہے ۔[1]

حقیقت کی ہماری رائے میں صحیح تعبیر نہیں ہے۔ بات صحیح وہی ہے جو جمہور علمائے اہل السنۃ نے بیان کی ہے کہ بت الٰہی سے مراد اللہ سبحانہ کی ذات کی محبت ہے ۔[2]

لیکن اس کے باوجود اس موضوع پر بھی دو رائیں نہیں ہیں کہ طاعت لوازم محبت سے ہے۔ یعنی جس طرح یہ ممکن نہیں ہے کہ سورج تو چمک رہا ہو مگر روشنی اور گرمی نہ ہو۔ اسی طرح یہ بھی ناممکن ہے کہ دل میں اللہ کی محبت تو موجود ہو مگر زندگی میں اس کے احکام کی پیروی نہ ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آگ ہو اور تپش نہ ہو۔ جب دل میں محبت کی انگیٹھی دہک رہی ہے لازماً اس میں گرمی کی لپٹیں بھی ہوں گی امام غزالی فرماتے ہیں۔ نعم ھذا الحب یستلزم الطاعۃ ۔[3]

محبت عقلی یا محبت طبعی

محبت ایمانی کا یہ عملی مفہوم اس حقیقت پر سے پردہ اٹھانے کے لیے قطعاً کافی ہے کہ محبت ایمانی قطعی طور پر عقلی نوعیت کی ہے۔ کیونکہ یہ اعمال و اوصاف جو قرآن نے محبت ایمانی کے ضروری مظاہر کی حیثیت سے بیان کیے ہیں طبعی محبت سے کوئی مناسبت نہیں رکھتے۔ یہ بداہۃً عقلی محبت اور ایمانی عقیدت ہی کے مظاہر ہو سکتے ہیں۔

غور فرمائیے کہ جب محبت الٰہی کے لیے اتباع نبوت کو شرط قرار دیا ہے تو اس کی تہ میں کونسی محبت کارفرما ہو سکتی ہے عقلی اور اعتقادی قسم کی یا طبعی اور جذباتی قسم کی کوئی شک نہیں کہ یہ محبت اپنی اصل نوعیت میں عقلی و اعتقادی ہی محبت تھی۔ طبعی اور جذباتی ہرگز نہیں تھی۔ کیونکہ یہ ایک مانی ہوئی بات ہے کہ دل کے اندر جو کچھ ہوتا ہے اعمال میں وہی ڈھل کر سامنے آتا ہے دوسرے لفظوں میں حرکات و اعمال انسان کی اندرونی کیفیات کے سچے ترجمان ہوتے ہیں اس لیے اگر دل میں اللہ سبحانہ کی طبعی محبت ہوتی ہے تو خارج میں اس کا ظہور انہی شکلوں میں ہوتا ہے جو اس محبت کا فطری تقاضا ہیں ایسی صورتوں میں ہرگز نہ ہوتا جو عقلی محبت کا تقاضا ہیں۔ اسی طرح اگر دل اللہ سبحانہ کی عقلی محبت سے سرشار ہو تو انسان سے وہی اعمال صادر ہوں گے جن کا اس محبت کا مزاج مطالبہ کرتا ہے نہ کہ وہ اعمال جن کا طبعی محبت مطالبہ کرتی ہے۔ حضور اقدس

---

۱ تفسیر کبیر میں ہے انا قلنا نحب اللہ فمعناہ نحب طاعۃ اللہ وخدمتہ او نحب ثوابہ واحسانہ۔ جلد دوم

۲ شرح مسلم نووی میں ہے۔ محبتہم استقامتہم علی الطاعۃ

۳ علامہ آلوسی روح المعانی میں لکھتے ہیں۔ المحبۃ تتعلق حقیقۃ بذات اللہ تعالیٰ وینبغی للکامل ان یحب اللہ لذاتہ

۴ اس موضوع پر سیر حاصل بحث حافظ ابن تیمیہ کی النبوات، حافظ ابن القیم کی کتاب روضۃ المحبین، امام غزالی کی احیاء العلوم اور اس کی شرح اتحاف السادۃ المتقین میں

۵ روح المعانی جلد سوم

کے اعمال حیات صاف پکارتے ہیں کہ وہ جس تخم محبت کے برگ و بار ہیں وہ اصلاً اللہ سبحانہ کی عقلی محبت ہے نہ کہ طبعی کیوں کہ طبعی محبت کے اعمال و مظاہر بالکل دوسرے ہوتے ہیں۔ وہ نہیں ہوتے جو حیات مبارکہ میں پائے جاتے ہیں۔

محبت الٰہی کی یہ نوعیت جو قرآنی ارشادات سے واضح ہو رہی ہے اور جو عقل کا بہترین تقاضا بھی ہے۔ اہل نظر سے کبھی پوشیدہ نہیں رہی ہے چنانچہ حضرت ابن عطاء رحمۃ اللہ علیہ سے جب محبت الٰہی کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انھوں نے جواب میں یہ ارشاد فرمایا:

محبت ایسی ڈالیوں کا نام ہے جو دل کی زمین میں نصب کی جاتی ہیں اور بقدر عقل پھل دیتی ہیں۔

بقدر عقل علی قدر العقول کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ کہنے والے کے نزدیک محبت کا سرچشمہ انسان کی عقل ہے نہ کہ اس کی طبیعت اور طبعی جذبات۔

اسی طرح مولانا اسماعیل الشہید فرماتے ہیں۔

اس جگہ ایک بڑا ہی باریک نکتہ قابل توجہ ہے جس سے آج کل اکثر لوگ غافل ہیں اور اسے فراموش کر بیٹھے ہیں کہ وہ حبّ نفسانی جسے عشق کہتے ہیں اور حب ایمانی جسے عقلی کہتے ہیں ان دونوں میں فرق ہے۔

مولانا موصوف کے اس بیان سے صرف یہی معلوم نہیں ہوتا کہ محبت الٰہی کی دو الگ الگ قسمیں ہیں۔ ایک حب نفسانی جسے عشق کہتے ہیں دوسری حب ایمانی جس کا مشہور نام حب عقلی ہے بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اسلام و قرآن کو مطلوب دوسری ہی محبت ہے۔ نہ کہ پہلی۔

ایک اور ارشاد سنیئے جو اس موضوع پر صراحت کی آخری حد کو پہنچا ہوا ہے حکیم الامت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ سے جس محبت کا حکم ہے وہ حب عقلی ہے نہ کہ طبعی اسی لیے نصوص میں حب طبعی عشق کا عنوان کہیں مذکور نہیں بلکہ جا بجا حب کا ذکر ہے اس سے معلوم ہوا کہ حب طبعی مراد نہیں بلکہ حب عقلی مطلوب ہے[1]

دونوں میں بنیادی اور جوہری فرق ہے حب عقلی محب اور چاہنے والے میں کامل فرزانگی چاہتی ہے جب کہ حب عشقی دیوانگی چاہتی ہے قرآن نے صحابہ کا جو چہرہ پیش کیا ہے یہ ہے۔

اذا ذکروا بایات ربھم لم یخروا علیھا صما و عمیانا

جب ان کے سامنے ان کے رب کی آیات پیش کی جاتی ہیں وہ بہرے اور اندھے ہو کر ان پر نہیں پڑتے ہیں۔ بلکہ کانوں سے سن کر آنکھوں سے دیکھ کر پورے شعور بالغ کے ساتھ اللہ کے احکام کی پابجائی کرتے ہیں۔

حب طبعی میں عبادت کا مقصود صرف محبوب کی رضا ہوتا ہے جبکہ حب عقلی میں عبادت کا مقصود وصال خدا ہوتا ہے

[1] صراط مستقیم

[2] شریعت اور طریقت

دونوں میں فرق ہے یہ اور اس قسم کی بہت سی باتوں میں دونوں کی راہیں الگ الگ ہیں۔ بہرحال قرآن و سنت کی دعوت عشق الٰہی حب طبعی کی نہیں بلکہ ایمانی محبت اور حب عقلی کی ہے۔ یہ اہل ایمان میں حب عقلی ہی ہے کہ اس کے مقابلے میں کسی اور کی محبت کو وہ ذرہ برابر اہمیت نہیں دیتے ہیں۔ والذین امنوا اشد حبا للہ۔ یہ وہ محبت ہے جس سے دل کا خالی ہونا دین سے پھر جانے کے مترادف ہے۔ من یرتد منکم عن دینہ فسوف یاتی اللہ بقوم یحبھم و یحبونہ اسی طرح اس نے ان لوگوں کے دعوئ ایمان کو تسلیم کرنے سے پوری شدت کے ساتھ انکار کر دیا اور انہیں اس آیت میں عذاب کی کھلی دھمکی دی جو دوسری محبتوں کو اللہ کی محبت پر غالب کریں۔ غرض قرآن حکیم نے اللہ سبحانہ کی غایت تعظیم اور انتہائی محبت کو اہل ایمان کا خاصہ اور ایمان کی شرط لازم قرار دیا ہے اور اس حقیقت پر کوئی پردہ نہیں رہنے دیا ہے کہ محبت الٰہی کے بغیر اطاعت و عبادت کا وجود ایسا ہی ناممکن ہے جیسے کسی سوکھی ڈالی سے پتوں اور پھولوں کا نکلنا ناممکن ہے۔

محبت ایمانی میں صحابہؓ کا مقام

محبت ایمانی کی اس آزمائش میں صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم جس طرح پورے اترے اس کی شہادت تاریخ نے محفوظ کر لی ہے۔ بلاشائبہ مبالغہ کہا جا سکتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کے کسی گروہ نے اپنے سارے دل اور ساری عقل کے ساتھ ایسی محبت نہ کی ہوگی جیسی صحابہ نے اللہ سبحانہ سے کی۔ انھوں نے اس محبت کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیا جو انسان کر سکتا ہے اور پھر اسی کی راہ سے سب کچھ پایا جو انسانوں کی کوئی جماعت پا سکتی ہے۔

انسان جب کسی مقصد کی راہ میں قدم اٹھاتا ہے اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے تو دو طرح کی حالتیں پیش آتی ہیں۔ کچھ جوانمرد اور باہمت ہوتے ہیں وہ بلا تامل مصیبتیں جھیل لیتے ہیں لیکن ان کو جھیلنا ہی ہوتا ہے۔ یہ بات نہیں ہوتی کہ مصیبتیں ان کے لیے مصیبتیں نہ رہی ہوں عیش و راحت ہو گئی ہوں۔ کیونکہ پھر مصیبت مصیبت ہے باہمت کڑوا گھونٹ بغیر کسی جھجک کے پی لے گا لیکن اس کی کڑواہٹ کی بدمزگی ضرور محسوس کرے گا لیکن کچھ لوگ ایسے ہیں جن کو صرف باہمت ہی نہ کہنا چاہیے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ سمجھنا چاہیے۔ ان میں صرف ہمت اور جوانمردی ہی نہیں ہوتی بلکہ محبت و شیفتگی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے وہ مصیبتوں کو مصیبتوں کی طرح جھیلتے ہی نہیں بلکہ عیش و راحت کی طرح ان سے لذت و سرور حاصل کرتے ہیں۔ راہ محبت کی مصیبت ان کے لیے عیش و راحت کی ایک نئی لذت بن جاتی ہے۔ اگر اس راہ میں ان کو کانٹوں پر لیٹنا پڑے تو کانٹوں کی چبھن میں ان کو ایسی راحت ملے جو کسی کو پھولوں کی سیج پر لوٹ کر نہیں مل سکتی۔ حتیٰ کہ اس راہ کی مصیبتیں جس قدر بڑھتی جاتی ہیں اتنی ہی زیادہ ان کے دلوں کی کلیاں کھلتی جاتی ہیں ان کے لیے صرف اس بات کا تصور کہ یہ سب کچھ کسی کی راہ میں پیش آرہا ہے اور اس کی نگاہیں ہمارے حال سے بے خبر نہیں ہیں عیش و سرور کا ایک ایسا بے پایاں جذبہ پیدا کر دیتا ہے کہ اس کی سرشاری میں جسم کی کوئی کلفت اور

ذہن کی کوئی اذیت محسوس ہی نہیں ہوتی۔ یہ ان لوگوں کی بات ہو رہی ہے جو خدا کی محبت کیا خدا کی معرفت سے بھی ناآشنا ہے لیکن حضور اقدس ﷺ کی تعلیم نے ان کو کس طرح آشنائے حقیقت کر دیا اور ان کو ذات الٰہی کے ساتھ وابستگی محبت اور سرشاری کے لطف سے کس درجہ بہرہ اندوز کر دیا واقعات تاریخ کی آغوش میں ان گنت ہیں۔ انشاء اللہ کسی دوسرے موقعہ پر ان سے روشناس کیا جائے گا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت

اس آیت میں دو محبتوں کا ذکر ہے اللہ کی محبت اور اللہ کے رسول کی محبت۔ اللہ کی محبت بالذات ہے اور حضور کی محبت اللہ کے رسول ہونے کی وجہ سے ہے ایسے ہی درجہ بدرجہ سب کی محبت ہے صحابہ کی محبت۔ انصار کی محبت عرب کی محبت اولیاء اللہ کی محبت، خانہ کعبہ کی محبت، محبوب بالذات تو صرف اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے باقی جس سے بھی محبت ہے وہ اللہ کی وجہ سے ہے۔ چونکہ قرآن نے اللہ کی محبت کی نشانی حضور اقدس ﷺ کی اتباع کو قرار دیا ہے اس لیے حضور کی محبت بھی ایمانی محبت کا حصہ ہے۔ صحیح بخاری اور مسلم میں انس بن مالکؓ کا بیان ہے کہ:

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے تم میں سے کوئی مومن ہو نہیں سکتا جب تک میں اسے اپنے بیٹے باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب ہو جاؤں۔

شیخ بدرالدین عینی لکھتے ہیں کہ محبت کے تین اسباب ہیں۔ کمال، جمال، احسان اور یہ تینوں اوصاف حضور اقدس سے زیادہ کسی میں موجود نہیں۔ آپ کا کمال تو اسلامی قانون و شریعت سے ظاہر ہے۔ آپ کا جمال احادیث شمائل میں موجود ہے آپ کی روحانی و جسمانی حسن کاریوں کا اندازہ ہی کون کر سکتا ہے۔ پھر آپ کی محبت تمام مخلوقات سے زیادہ کیوں نہ ہو۔ باپ بیٹے کی محبت طبعی ہے اور حضور اقدس ﷺ کی محبت عقلی ہے۔ حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ کمال یہ ہے کہ تقاضائے عقل تقاضائے طبیعت پر غالب آجائے۔ ایمان صرف عقائد و اعمال ہی کا نام نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جن سے شدہ شدہ مومن کا قلب مزین و رنگین ہو جاتا ہے۔ شفا میں سیرت محمد بن اسحاق سے نقل کیا ہے کہ جنگ احد میں ایک انصاری عورت کا باپ بھائی شوہر تینوں شہید ہو گئے۔ جب اسے خبر ملی تو اس نے دریافت کیا کہ آنحضرت ﷺ تو بخیریت ہیں۔ لوگوں نے کہا کہ ہاں بخیر ہیں۔ اس نے کہا چلو مجھے دکھلا دو تاکہ میں خود آپ کے روئے مبارک کو دیکھ لوں جب اس نے آپ کو دیکھ لیا تو بولی کل مصیبۃ بعدك جلل۔ جب آپ زندہ ہیں سلامت ہیں تو آپ کے بعد ہر مصیبت آسان ہے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ آنحضرت ﷺ کی ذات انور ہمیں اپنے مال اولاد اور والدین اور پیاس میں سرد پانی سے زیادہ عزیز تھی۔ اہل مکہ جب زید بن دثنہ کو قتل کے لیے حرم سے باہر لے چلے تو ابوسفیان بولا زید قسم کھا کر کہو

کیا اس وقت تمہیں یہ پسند ہے کہ محمد ﷺ تمہاری جگہ ہوتے اور تم اپنے گھر ہوتے۔ زید نے قسم کھا کر کہا مجھے یہ ہرگز گوارا نہیں کہ میں گھر میں ہوں اور یہاں آپ کے جسم میں ایک کانٹا بھی چبھے۔ ابوسفیان کہنے لگا میں نے کسی کو اتنی محبت کرتے نہیں دیکھا جتنا کہ محمد ﷺ کے ساتھی آپ سے محبت کرتے ہیں۔

قاضی عیاض نقل کرتے ہیں کہ ایک شخص آپ کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا آپ مجھے اپنے اہل اور مال سے زیادہ محبوب ہیں مجھے یاد آتی ہے تو صبر نہیں آتا جب تک یہاں آکر آپ کو دیکھ نہیں لیتا اب غم یہ ہے کہ وصال مبارک کے بعد تو آپ انبیاء علیہم السلام کے ساتھ ہوں گے وہاں میں آپ کو کیسے دیکھا کروں گا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ اولئك الذين انعم الله عليهم من النبيين والصديقين والشهداء والصالحين وحسن اولئك رفيقا۔ جو لوگ اللہ و رسول کا کہا مانتے ہیں وہ ان لوگوں کے ساتھ ہوں گے جن پر اللہ نے انعام فرمایا ہے یعنی انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین۔ اور ان لوگوں کی رفاقت بہت ہی اچھی ہے —— آپ نے اس کو بلا کر یہ آیت سنادی لکھا ہے کہ عبداللہ بن زید بن عبداللہ اپنے باغ میں کام کر رہے تھے۔ دفعتاً ان کے فرزند پہنچے اور حضور اقدس ﷺ کے وصال کی خبر دی اسی وقت دعا کے لیے ہاتھ اٹھا دیئے اور کہا کہ اے اللہ مجھے نابینا کردے کہ ان آنکھوں سے اب کسی کو نہ دیکھ سکوں۔ یہ اور اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے صحابہ کو آپ سے ایسی ہی محبت تھی جیسا کہ حدیث انس میں موجود ہے بدقسمتی سے اگر کسی کو یہ تعلیم حاصل نہیں تو وہ ان کی محبت میں تاویل نہ کرے جن کو یہ مقام حاصل تھا۔

اس آیت میں احب اليكم من الله ورسوله یعنی اللہ اور اس کا رسول سب سے زیادہ محبوب ہوں۔ دونوں کی محبت کی یکجائی بتا رہی ہے کہ دونوں کی محبت مطلوب ہے۔ اگر حق تعالیٰ شانہ کی محبت خالق مالک رازق معبود ہونے کی وجہ سے ہے تو آپ کی محبت اللہ کا رسول ہونے ہی کی وجہ سے نہیں بلکہ اللہ کی محبت کی وجہ سے ہے یعنی اللہ کی محبت آپ کی محبت کے بغیر بے معنے ہے، ترمذی کی ایک حدیث میں اس بات کو ذرا کھول کر سمجھایا گیا ہے۔

> حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے اللہ سے محبت رکھو۔ کیونکہ وہ تم کو طرح طرح کی نعمتوں سے نوازتا ہے۔ اور مجھ سے محبت رکھو اللہ کی محبت کی وجہ سے اور میرے اہل بیت سے محبت رکھو میری محبت کی وجہ سے۔

اس حدیث میں اللہ سبحانہ کی محبت کا سب سے آسان طریقہ یہ تبلایا گیا ہے کہ تم ان نعمتوں کو دیکھو جو شب و روز —— بلا عوض اور بلا کسی استحقاق کے تم کو میسر ہیں اللہ سبحانہ کی محبت پیدا ہو جائے گی۔ جب اللہ سبحانہ کی محبت تمہارے دل میں ہو جائے گی تو لازمی طور پر رسول کی محبت بھی دل میں گھر کر جائے گی کیونکہ رسول کا رشتہ اللہ سے ہی ہے کہ وہ اللہ کی جانب سے تمہاری ہدایت کا ذریعہ ہے۔ اور واسطہ ہدایت ہونے کی وجہ سے اس کی ذات پوری کائنات میں قیمتی ہے اس لیے رسول کی

محبت پورا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو بارگاہ محبت کا وسیلہ سمجھو۔ اسلام میں محبت کا اصل محور و مرکز اللہ کی ذات ہے اور یہاں کی توحید کا امتیازی مقام ہے کہ انسان کے قلبی علائق کے گوشے صرف ایک ذاتِ اقدس کے لیے وقف رہیں جس سے بھی محبت کی جائے اس کی وجہ سے کی جائے اسی لیے اذان و اقامت میں اعلان توحید کے ہمرکاب اعلان رسالت رکھا گیا ہے تاکہ اللہ کی محبت کے بعد رسول اللہ کی محبت و عظمت قلب میں خود بخود جاگزیں ہو جائے اور اسی لیے قرآن حکیم میں اللہ نے اپنی محبت کو حضور انور کی اتباع پر موقوف کیا ہے ابو سلیمان الدارانی فرماتے ہیں کہ جب لوگوں نے خدا کی محبت کے دعوے اور نعرے لگانے شروع کیے تو اللہ سبحانہ نے یہ آیت محنت نازل فرمادی۔ ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی۔ یعنی علامت و دلیل محبت الٰہی صرف اتباع رسول ہے گویا اصل محور و مرکز اللہ سبحانہ کی محبت ہے اور اس کا صحیح معیار اللہ کے رسول کی اتباع ہے اب ہر شخص اپنے متعلق ولی ہونے یعنی خدا کی محبت کا مدعی بنے مگر رسول کی عظمت و محبت سے وہ تہی دامن ہے۔ یا رسول کی محبت کا دم بھرتا ہے مگر اللہ سبحانہ کی عظمت و محبت سے خالی ہے۔ وہ سراسر دھوکہ میں ہے۔ رسول کی عظمت و محبت اس کا احترام اور اولین فریضہ ہے اور یہ اس لیے ہے کہ وہ اس باعظمت ذاتِ کبریا کا رسول ہے جس کی تمام کائنات مخلوق ہے رسول کی صحیح محبت یہ ہے۔ اپنے خود تراشیدہ خیالات پر رسول کی محبت کرنا صحیح محبت نہیں۔ اس علاقہ کو ذرا وسعت دو تو رسول کے اہلبیت سامنے آتے ہیں ان سے محبت اس لیے ضروری ہے کہ رسول کی محبت ضروری ہے۔ اب اگر کوئی شخص رسول کی محبت کا مدعی ہے مگر اہل بیت کی محبت نہیں رکھتا یا اہل بیت کی محبت کا نعرہ لگاتا ہے مگر اللہ اور اس کے رسول کی محبت کے آثار اس میں نہیں پائے جاتے کیا ہم اسے صحیح محبت والا کہہ سکتے ہیں۔ رسول کا رشتہ جس طرح اہل بیت کے ساتھ ہے اسی طرح اس جماعت کے ساتھ ہے جس میں اس نے شب و روز گذارے، جنھوں نے اس کے لیے جانیں قربان کردیں۔ اور اس کی رفاقت میں تمام علائق ختم کر دیے۔ اگر کوئی شخص　اس کی جماعت سے بغض رکھے تو کیا تم اسے رسول سے محبت کرنے والا کہو گے۔ ارشادِ نبوت ہے۔

میرے صحابہ کے بارے میں خوفِ خدا رکھنے اور میرے بعد ان کو ہدفِ ملامت نہ بنانا یاد رکھو جو ان سے محبت رکھے گا وہ میری وجہ سے محبت رکھے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا وہ میری وجہ سے بغض رکھے گا اور جو ان کو تکلیف دے گا اس نے بلاشبہ مجھے تکلیف دی اور جس نے مجھے تکلیف دی اس نے اللہ کو تکلیف دی۔ بس قریب ہے وہ اس کی گرفت کرے۔[1]

بخاری و مسلم میں براء بن عازب رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ:

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے انصار سے صرف مومن محبت رکھے گا اور ان سے صرف منافق بغض رکھے گا۔ جو ان سے محبت کرے گا۔ اللہ ان سے محبت کرے گا اور جو ان سے بغض رکھے گا اللہ ان سے بغض رکھے گا۔

---

[1] ترمذی عن عبداللہ بن مغفل۔

یہ پہلے بتلایا جا چکا ہے کہ اسلام میں محبت کا مرکز صرف اللہ کی ذات ہے پھر جہاں تک بھی اس کی شاخیں پھیلتی جاتی ہیں۔ سب کا منشا وہی ذات گرامی ہے رسول سے محبت اللہ کی وجہ سے صحابہ سے محبت رسول کی محبت کی وجہ سے انصار کی محبت بھی رسول کی محبت کی وجہ سے اور پھر عرب سے محبت رسول کا وطن ہونے کی وجہ سے، اس لیے محبت میں اصل مرکز اللہ کی ذات ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیے کہ جس طرح رسول کی طاعت اللہ کی طاعت ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ اسی طرح ٹھیک رسول کی محبت اللہ کی محبت ہے نہ طاعت میں اللہ و رسول کے درمیان تفریق ہے اور نہ محبت میں ان کے درمیان تقسیم ہو سکتی ہے ایک کا محب دوسرے کا محب ہے اور ایک کا محبوب دوسرے کا محبوب بن کر رہتا ہے۔

بہرحال قرآن کی اس آیت کا مطالبہ یہ ہے کہ زندگی کے فوائد اور مرافق سے اللہ و رسول کا مقابلہ ہو جائے تو ایمان یہ ہے کہ اللہ و رسول کو مقدم رکھے۔

اپنے ایمان کا احتساب کیجئے

آیئے اس آیت کی روشنی میں ہم اپنے ایمان کا احتساب کریں صحابہ کرام کے ایمان اور ہمارے ایمان میں بنیادی فرق ہے۔ ہمارا ایمان وہ ایمان نہیں جسے عہد رسالت کے مسلمانوں نے قبول کیا تھا اور جس پر انھوں نے اپنی زندگی کی بنیادیں استوار کی تھیں۔ وہ ایک جاندار انقلاب انگیز اور متحرک نظام فکر و عمل تھا جس کا خمیر محبت کی ولولہ انگیزیوں اور جنون نوازیوں سے تیار ہوا تھا جس میں ایثار و قربانی اور سرفروشیوں کی ایک دنیا آباد تھی اور جس میں محض افراد کی شخصی نجات کا نہیں بلکہ پورے عالم انسانیت کی نجات کا تصور اور جذبہ کارفرما تھا۔ صحابہ کرام ایک نظام تمدن اور طرز زندگی کے داعی تھے ایک عالمگیر نصب العین کے نمائندے تھے اور ایک جہانی اور عالمگیر مقصد کے علمبردار تھے چنانچہ ان کے اعمال و عبادات کی قدر و قیمت اسی نسبت سے متعین کی جاتی تھی جس نسبت سے وہ اس نصب العین اور غایت اولیٰ کی تقویت کا باعث ہوتے تھے۔ جہاد فی سبیل اللہ ان کے اخلاص و اتقاء کا پیمانہ تھا اور خدا کے ہاں ان کا اجر بھی اسی پیمانے سے تقسیم ہوتا تھا۔ اسلامی نصب العین کی ترقی اور اسلامی نظام تمدن اور طرز تفکر کی دعوت ان کی زندگی کا اتنا بڑا سرمایہ تھا کہ اگر کبھی ان سے اس کام میں کوتاہی ہو جاتی تو ساری عبادتیں اور ریاضتیں ان کی نگاہ میں ہیچ ہو جاتیں۔

قرآن کی زیر تشریح آیت کو کرر سہ کرر پڑھیے اور غور کیجیے کہ یہ مخاطبت کن لوگوں سے ہے۔ ان سے جن کی نمازیں یکسر خلوص و للہیت سے معمور تھیں۔ جن کے اعمال صالحہ اور فضائل اخلاق دنیا کی ساری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے جن کے درجات اور علو مرتبت پر خود قرآن گواہی دے رہا ہے اس کے باوجود انہیں چیلنج دیا جا رہا ہے کہ اگر زندگی کی محبتوں اور الفتوں نے دین حق کی اقامت اور اعلائے کلمۃ اللہ کی راہ میں ادنیٰ سی رکاوٹ بھی پیدا کی تو پھر خدا کے حکم کے منتظر رہو۔

لَقَدْ نَصَرَكُمُ اللّٰهُ فِيْ مَوَاطِنَ كَثِيْرَةٍ ۙ وَّيَوْمَ حُنَيْنٍ ۙ اِذْ
اَعْجَبَتْكُمْ كَثْرَتُكُمْ فَلَمْ تُغْنِ عَنْكُمْ شَيْـًٔـا وَّضَاقَتْ
عَلَيْكُمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ ثُمَّ وَلَّيْتُمْ مُّدْبِرِيْنَ ۝٢٥ ثُمَّ
اَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلٰي رَسُوْلِهٖ وَعَلَي الْمُؤْمِنِيْنَ وَاَنْزَلَ
جُنُوْدًا لَّمْ تَرَوْهَا وَعَذَّبَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا ۭ وَذٰلِكَ جَزَاۗءُ
الْكٰفِرِيْنَ ۝٢٦ ثُمَّ يَتُوْبُ اللّٰهُ مِنْۢ بَعْدِ ذٰلِكَ عَلٰي مَنْ يَّشَاۗءُ ۭ
وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝٢٧ يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنَّمَا الْمُشْرِكُوْنَ
نَجَسٌ فَلَا يَقْرَبُوا الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ بَعْدَ عَامِهِمْ هٰذَا ۚ
وَاِنْ خِفْتُمْ عَيْلَةً فَسَوْفَ يُغْنِيْكُمُ اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖٓ
اِنْ شَاۗءَ ۭ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝٢٨

مسلمانو! اللہ سبحانہ نے تمہاری بہت سے مواقع پر مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی جب تم اپنی افرادی طاقت پر نازاں تھے اور وہ افرادی طاقت تمہارے کچھ کام نہ آئی۔ زمین ساری پہنائیوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی تھی پھر تم نے میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا دی تھی۔ پھر اللہ نے اپنے رسول اور اہلِ ایمان پر سکینت نازل فرمائی اور ایسی فوجیں اتاریں جو تمہیں نظر نہیں آ رہی تھیں اور کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کو سزا دی۔ یہی بدلہ ہے حق کا انکار کرنے والوں کا[۲۲] پھر اس کے بعد اللہ اپنی رحمت کا معاملہ فرمائے گا جس سے

چاہے گا اور اللہ بڑا ہی مغفرت والا اور مہربان ہے[۲۷]۔ مسلمانو! مشرکین نجس ہیں لہٰذا وہ اس سال کے بعد مسجدِ حرام کے نزدیک نہ آئیں[۲۵]۔ اور اگر تمہیں اس وجہ سے معاشی بدحالی کا اندیشہ ہو تو گھبراؤ نہیں اللہ سبحانہ تمہیں اپنے فضل سے عنقریب غنی بنا دے گا۔ اللہ دانائی اور علم والا ہے[۲۶]۔

مَعانی مُفردات

حنین جگہ کا نام ہے۔ حافظ عسقلانی نے فتح الباری میں اسے ذی المجاز کے پہلو میں طائف کے قریب ایک وادی بتایا ہے اور لکھا ہے کہ مکہ اور حنین کا فاصلہ عرفات کی جانب سے دس میل ہے۔ کچھ کی رائے میں چھ میل ہے اور واقدی کی رائے میں تین میل ہے۔ علامہ آلوسی نے بھی طائف سے تین میل بتایا ہے۔ اکثر شارحین قرآن اور سیرت نگاروں کے خیالات اسی کے لگ بھگ ہیں، سب یہی کہتے ہیں کہ طائف اور مکہ کے درمیان جگہ کا نام ہے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ حجاز کے ان دو شہروں کے درمیان جس قدر راستے ہیں ان میں کسی پر حنین نامی کوئی جگہ نہیں ہے۔ میری معلومات کے مطابق ڈاکٹر حمید اللہ پہلے محقق ہیں جنھوں نے حنین کا سراغ لگانے کی کوشش کی۔ حنین کے تعین کا ایک بدیہی طریقہ یہ ہے کہ معلوم کیا جائے کہ حضور اقدس ﷺ جنگ حنین کے بعد کس راستہ سے طائف گئے اس قرینے سے کام لے کر ڈاکٹر حمید اللہ نے وہ مقام متعین کر لیا۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ جنگ کے بعد حنین سے نخلۃ الیمانیہ گئے۔ پھر قرن اور ملیح ہوتے ہوئے وادی لیہ کے مقام بحرۃ الرغا میں پہنچے جہاں ایک روز قیام فرمایا۔ لیہ میں مالک بن عوف النصری کا قلعہ تھا وہاں سے ہوتے ہوئے آپ نخب پہنچے جسے الفقرہ بھی کہتے ہیں۔ پھر طائف کے قریب نزول فرمایا۔ اسی قرینے کے مطابق ڈاکٹر صاحب نے مکہ مکرمہ سے قرن تک سفر کا نقشہ یوں بتایا کہ پہلے جعرانہ پھر نخلۃ الیمانیہ۔ پھر قرن۔ جنگ حنین جعرانہ اور نخلۃ الیمانیہ کے درمیان ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے حنین کا فاصلہ مکہ مکرمہ سے تیس، چالیس میل بتایا ہے۔ دوسرے لفظوں میں حنین کو مکہ یا طائف کے راستوں پر نہیں بلکہ اسے مکہ سے شمال مشرق اور طائف سے شمال مغرب میں تلاش کرنا چاہیے۔

عیلۃ۔ فقر، تنگدستی، معاشی بدحالی، اسی سے عائل ہے تنگدست کے معنے میں۔

غزوۃ حنین

اسلام کی کامیابی جہاں قریش مکہ کی پشتینی اقتدار کے لیے نیز تولیت کعبہ کے سلسلے میں خود غرضی کی بنا پر تراشے ہوئے

اوضاع و اطوار کے لیے پیام مرگ تھی اس وجہ سے جوش غضب نے انہیں پاگل کر دیا تھا وہاں بعض دوسرے قبائل کے نزدیک کا یہ ناقابلِ برداشت تھی کہ کثرتِ تعداد، مہارت فنونِ جنگ اور قوت و طاقت کی بنا پر ممتاز سمجھے جاتے تھے۔ انہیں بھی خیال ہو گیا کہ اگر نو مولود قوت مرکز عرب یعنی مکہ مکرمہ پر قابض ہو جائے گی تو ان قبائل کی خود رائی شکنجے میں پڑ جائے گی۔ ان میں سے ہوازن و ثقیف بطورِ خاص قابلِ ذکر ہیں جو طائف اور اس کے اطراف میں مقیم تھے چنانچہ جب اسلامی قوت کے تدریجی ارتقاء سے قریش پر ایک گونہ بیچارگی کی حالت طاری ہو گئی تو ہوازن و ثقیف کے رؤساء نے عرب کا دورہ کر کے مختلف قبیلوں کو مسلمانوں کی مخالفت پر ابھارا اس اثناء میں یکایک مکہ مکرمہ پر اسلام کا قبضہ ہو گیا۔ تو ہوازن و ثقیف معاً جنگ کے لیے تیار ہو گئے ان کو یہ خیال بھی ہوگا کہ مسلمانوں کو شکست دے کر وہ اپنی آزادی ہی کے لیے ایک زبردست خطرہ کا انسداد نہ کریں گے بلکہ قریش کی پوری میراث پر بھی قابض ہو جائیں گے۔ اس طرح ان کا اقتدار بڑھ جائے گا۔

جنگ کی تیاری

ہوازن کے رئیس اعظم مالک بن عوف نے جو تیس سال کا پُرجوش جوان تھا، سب سے پہلے جنگ کا فیصلہ کر کے تمام قبائلی گروہوں اور شاخوں کو شرکت کی دعوت دی۔ چنانچہ بنو نصر اور بنو جشم سب کے سب شریک ہو گئے۔ بنو سعد بن بکر اور بنو ہلال میں سے کچھ لوگ آئے۔ البتہ بنو کعب اور بنو کلاب میں سے کوئی قابلِ ذکر شخص شامل نہ ہوا ثقیف کے رئیسوں میں سے قارب بن الاسود نیز ذوالخمار سبیع بن الحارث اور اس کا بھائی احمر بن الحارث ساتھ تھے اور تمام معاملات میں ان سے مشورے لیے جاتے تھے۔ ریاست عامہ کا منصب مالک بن عوف ہی کو حاصل تھا۔

بنو جشم کے معروف رئیس اور عرب کے مشہور شہسوار درید بن الصمہ کو بھی ساتھ لے لیا گیا تھا۔ اگرچہ وہ کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ کیونکہ عمر سو سال سے متجاوز ہو چکی تھی، اور اس کی بینائی بھی جاتی رہی تھی۔ تاہم اس کی دانائی، صواب اندیشی اور تجربہ کاری سب کے نزدیک مسلّم تھی مالک بن عوف نے حکم دے دیا تھا کہ تمام لوگ پورا مال و اسباب اور بال بچے ساتھ لائیں تاکہ ان کی وجہ سے جنگ میں لوگوں کی پامردی کو تقویت پہنچے۔ لیکن اس تدبیر کا نتیجہ الٹا نکلا جیسا کہ آگے چل کر واضح ہوگا۔ یہ لوگ وادی اوطاس میں پہنچ گئے۔

دُرید بن صمّہ

دُرید نے آتے ہی پوچھا کہ ہم کون سے مقام پر ہیں جواب ملا کہ اوطاس میں۔ اس نے کہا کہ یہ مقام جنگ کے لیے موزوں ہے۔ زمین نہ تو اتنی نرم ہے کہ اس میں لڑنے والوں کے پاؤں دھنس جائیں اور نہ اتنی سخت ہے کہ گھوڑوں کو کاٹے پھر اس نے پوچھا یہ کیا ہے کہ اونٹ بلبلاتے ہیں گدھے شور کر رہے ہیں بچے رو رہے ہیں اور بکریاں ممیا رہی ہیں۔ جواب ملا کہ مالک کے حکم سے مال و اسباب

بال بچے ساتھ لے آئے ہیں پوچھا کیوں؟ کہا گیا کہ ان کی محبت لوگوں کو زیادہ جم کر لڑنے پر آمادہ کرے گی۔

درید بولا جس کے پاؤں اکھڑ جائیں بھلا وہ یہ سب کچھ کب دیکھتا ہے جنگ میں صرف تلوار کام دیتی ہے شکست ہوئی زنان وعیال مصیبت کا باعث بن جائیں گے۔

پھر درید نے بنو کعب بنو کلاب کے بارے میں پوچھا بتایا گیا کہ ان میں سے کوئی نہیں آیا۔ درید نے کہا کہ اگر آج عزت وشرف کا دن ہوتا تو کعب و کلاب ضرور آتے میرے خیال میں تمہیں بھی وہی کرنا چاہیے جو کعب و کلاب نے کیا۔

درید نے مالک سے کہا کہ ہوازن کو تہلکے میں نہ ڈالو۔ اہل وعیال کو کسی محفوظ مقام پر ٹھہراؤ۔ فارغ ہو کر لڑو۔ فتح ہوئی تو سب تم سے آملیں گے شکست ہوئی تو یہ بچے رہیں گے۔ لیکن مالک نے یہ کہہ کر درید کی رائے ٹھکرادی کہ تو پیر فرتوت ہے اور تیری عقل سٹھیا گئی ہے۔

حالات کی تحقیق

حضور اقدس ﷺ کو ہوازن وثقیف کے عزائم اور جنگی تیاریوں کی خبر ملی تو عبداللہ بن حدرد الاسلمی کو مقرر کیا کہ ان قبیلوں کے اندر چلے جائیں۔ ہر معاملے کے متعلق صحیح اور قطعی معلومات حاصل کریں۔ جب تک ایک ایک بات واضح نہ ہو جائے۔ ان کا ساتھ نہ چھوڑیں چنانچہ ابن ابی حدرد اپنا فرض احسن طریقے پر پورا کر کے حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوتے اور پوری کیفیت عرض کر دی۔

یہ معلومات اس وجہ سے بھی ضروری تھیں کہ اگر جدال وقتال روکنے اور مناسب طریق پر صلح ومصالحت کرنے کی کوئی صورت ہو تو اس سے پورا فائدہ اٹھایا جائے اور اس وجہ سے بھی ضروری تھیں کہ اگر جنگ ناگزیر ہو تو موقع ومحل کی مناسبت سے اس کے لیے انتظامات کیے جائیں۔

تیاری اور روانگی

بہرحال حضور اقدس ﷺ حرم پاک میں بیٹھ کر جنگ جوؤں کے حملہ کا انتظار نہیں فرما سکتے تھے کیونکہ اس صورت میں حدود حرم کے اندر خونریزی ہوتی جو اس مقام کی عزت وحرمت کے منافی تھی ویسے بھی حضور اقدس ﷺ کی عادت مبارکہ تھی کہ حتی الامکان اچانک جنگ کرنے والوں کے سر پر پہنچ جاتے اور ان کی جمعیت درہم برہم کر ڈالتے۔

آپ نے ابوجہل کے سوتیلے بھائی عبداللہ بن ربیعہ سے تیس ہزار درہم مصارف کے سلسلے میں قرض لیے۔ صفوان ابن امیہ سے جس نے قبول اسلام کے لیے مہلت لے رکھی تھی۔ ایک سو زرہیں مستعار لیں۔ عتاب ابن اسید کو مکہ مکرمہ پر حاکم مقرر کیا اور ۶ شوال المکرم ۸ھ

کو اس سمت روانہ ہو گئے۔ جہاں ہوازن و ثقیف جمع ہو رہے تھے۔ دس شوال کو منزلِ مقصود پر پہنچے۔

جنگ کے متعلق تمام روایات سامنے رکھ کر صحیح کیفیت کا اندازہ کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ دشمن کو اندازہ ہو گیا تھا کہ اسلامی فوج کس راستے سے آ رہی ہے چنانچہ اس نے راستہ کے ایک نشیب میں ادھر ادھر محفوظ مقامات پر کمین گاہ بنا کر تیر انداز بٹھا دیئے تھے۔ صبح کی تاریکی زائل نہیں ہوئی تھی۔ جھٹ پٹے کا وقت تھا۔ مسلمانوں کے مقدمۃ الجیش میں بنو سلیم اور طلقاء کے تھے جو اس وقت تک اسلام بھی نہیں لائے تھے وہ کمین گاہوں کی زد میں پہنچے تو ایک دم ہر سمت سے تیروں کی بارش ہو گئی۔

ابن ہشام میں ہے۔

جب وادی حنین سامنے آئی تو ہم نے تہامہ کی طرف جانے والی وادیوں میں سے ایک نشیبی ڈھلائی اور وسیع وادی میں اترنا شروع کر دیا ہم اترتے جا رہے تھے۔ صبح کی تاریکی ابھی ختم نہ ہوئی تھی۔ دشمن ہم سے پہلے وادی میں آ گئے تھے۔ انھوں نے ہر تنگ گھاٹی میں ہر گوشے ہر خفیہ راستے سے ہم پر حملہ کر دیا۔ یہ ان کا سوچا سمجھا منصوبہ تھا اور اس کے لیے پوری تیاری کر رکھی تھی [1]

پہلے بنو سلیم پلٹے۔ پھر اہل مکہ نے راہ فرار اختیار کی۔ بعد ازاں عام ابتری پھیل گئی نہ کوئی صورت حال کا اندازہ کرنے کی حیثیت میں رہا اور نہ کوئی پیچھے مڑ کر دیکھتا تھا۔ اس کے بعد کیا ہوا اس کا قرآن میں بڑے پرشوکت انداز میں بیان ہے۔

(۲۴) مسلمانو! اللہ سبحانہ نے تمہاری بہت سے مواقع پہ مدد کی ہے اور حنین کے دن بھی جب تم اپنی افرادی قوت پر نازاں تھے اور وہ افرادی طاقت تمہارے کچھ کام نہ آئی۔ زمین ساری پہنائیوں کے باوجود تم پر تنگ ہو گئی تھی پھر تم نے میدانِ جنگ میں پیٹھ دکھا دی تھی۔ پھر اللہ نے اپنے رسول پر سکینت نازل فرمائی اور اہلِ ایمان پر اور ایسی فوجیں اتاریں جو تمہیں نظر نہیں آ رہی تھیں اور کفر کی راہ اختیار کرنے والوں کو سزا دی۔ یہی بدلہ ہے حق کا انکار کرنے والوں کا پچھلی آیت میں تنبیہہ کی گئی تھی کہ جہاد فی سبیل اللہ کے وقت مومنین کی کنبہ برادری، اموال و املاک وغیرہ کسی چیز پر نظر نہ ہونی چاہیے۔ یہاں آگاہ فرمایا ہے کہ مجاہدین کو خود اپنی فوجی جمعیت و کثرت پر گھمنڈ نہ کرنا چاہیے۔ نصرت و کامیابی اکیلے خدا کی مدد سے ہے جس کا تجربہ پیشتر بھی بہت سے میدانوں میں تم کر چکے ہو بدر، قریظہ، نضیر اور حدیبیہ وغیرہ میں جو کچھ نتائج رونما ہوئے وہ صرف امدادِ الٰہی نصرتِ غیبی کا کرشمہ تھا اور آخر میں غزوہ حنین کا واقعہ تو ایسا صریح اور عجیب و غریب نشان آسمانی نصرت و امداد کا ہے جس کا اقرار سخت معاند دشمنوں کو بھی کرنا پڑا۔

حنین میں جنگ

فتح مکہ کے بعد فوراً آپ کو اطلاع ملی کہ ہوازن و ثقیف وغیرہ بہت سے قبائل عرب نے ایک لشکر جرار تیار کر کے بڑے ساز و

[1] سیرت ابن ہشام

سامان سے مسلمانوں پر حملہ کا ارادہ کیا ہے۔ یہ خبر پاتے ہی آپ نے دس ہزار مہاجرین و انصار کی فوج گراں کو جو مکہ فتح کرنے کے لیے مدینے سے ہمراہ آئی تھی۔ طائف کی طرف کوچ کر دیا دو ہزار طلقا بھی جو فتح مکہ کے وقت مسلمان ہوئے تھے آپ کے ہمراہ تھے یہ پہلا موقعہ تھا کہ بارہ ہزار کی عظیم الشان فوج کیل کانٹے سے لیس ہو کر میدان جہاد میں نکلی۔ یہ منظر دیکھ کر بعض صحابہ سے رہا نہ گیا اور بے ساختہ بول اٹھے کہ جب ہم تھوڑے تھے اس وقت ہم غالب رہے تو آج ہماری اتنی بڑی تعداد کسی سے مغلوب ہونے والی نہیں۔ یہ جملہ مردان توحید کی زبان سے نکلنا بارگاہ احدیت میں ناپسند ہوا۔ ابھی مکہ سے تھوڑی دور نکلے تھے کہ دونوں لشکر متقابل ہو گئے۔ فریق مخالف کی جمعیت چار ہزار تھی جو سر پر کفن باندھ کر اور سب عورتوں اور بچوں کو ساتھ لے کر ایک فیصلہ کن جنگ کے لیے پوری تیاری سے نکلے تھے۔ اونٹ گھوڑے مویشی اور گھروں کا کل اندوختہ کوڑی کوڑی کر کے ہمراہ لائے تھے۔ ہوازن کا قبیلہ تیر اندازی کے فن میں سارے عرب میں شہرت رکھتا تھا۔ اس کے بڑے بڑے ماہر تیر اندازوں کا دستہ وادی حنین کی پہاڑیوں میں گھات لگائے بیٹھا تھا۔ صحیحین میں براء بن عازب کی روایت ہے کہ پہلے معرکہ میں کفار کو ہزیمت ہوئی وہ بہت سامان چھوڑ کر پسپا ہو گئے یہ دیکھ کر مسلمان سپاہی غنیمت کی طرف جھک پڑے۔ اس وقت ہوازن کے تیر اندازوں نے گھات سے نکل کر ایک دم دھاوا بول دیا۔ آن واحد میں چاروں طرف سے اتنے تیر برسائے کہ مسلمانوں کو قدم جمانا مشکل ہو گیا۔ اول طلقا میں بھاگڑ پڑی۔ آخر سب کے پاؤں اکھڑ گئے زمین ساری فراخی کے باوجود تنگ ہو گئی کہ کہیں پناہ کی جگہ نہ ملتی تھی۔ حضور اقدس ﷺ مع چند رفقا کے دشمنوں کے نرغے میں تھے ابوبکر، عمر، عباس، علی، عبداللہ بن مسعود وغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم تقریباً اسی صحابہ بلکہ اہل سیر کی تصریح کے مطابق صرف دس نفوس قدسیہ عشرہ کاملہ میدان جنگ میں باقی رہ گئے جو پہاڑ سے زیادہ مضبوط نظر آ رہے تھے۔ یہ خاص موقعہ تھا جبکہ دنیا نے پیغمبرانہ توکل و صداقت اور معجزانہ شجاعت کا ایک محیر العقول نظارہ ان ظاہری آنکھوں سے دیکھا۔ آپ سفید خچر پر سوار ہیں۔ عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ ایک رکاب اور ابو سفیان بن الحارث رضی اللہ عنہ دوسری رکاب تھامے ہوئے ہیں۔ چار ہزار کا لشکر پورے جوش انتقام میں ٹوٹا پڑتا ہے۔ ہر چہار طرف سے تیروں کی بارش ہو رہی ہے ساتھی منتشر ہو چکے ہیں مگر رفیق اعلیٰ آپ کے ساتھ ہے ربانی تائید اور آسمانی سکینہ کی غیر مرئی بارش آپ پر اور آپ کے ہو گنے چنے رفیقوں پر ہو رہی ہے جس کا اثر آخر کار بھاگنے والوں تک پہنچتا ہے جدھر سے ہوازن و ثقیف کا سیلاب بڑھ رہا تھا آپ کی سواری کا منہ اس وقت بھی اسی طرف ہے اور ادھر ہی آگے بڑھنے کے لیے خچر کو مہمیز کر رہے ہیں۔ دل سے خدا کی طرف لو لگی ہے اور زبان پر نہایت استغنا و اطمینان کے ساتھ انا النبی لا کذب انا ابن عبد المطلب جاری ہے یعنی بے شک میں پیغمبر ہوں سچا اور عبد المطلب کی اولاد ہوں۔ اسی حالت میں آپ نے صحابہ کو آواز دی۔ الی عباد اللہ انی رسول اللہ خدا کے بندو ادھر آؤ یہاں آؤ کہ میں خدا کا رسول ہوں۔ پھر آپ کی ہدایت کے موافق حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جو نہایت جہیر الصوت تھے۔ اصحاب سمرہ کو پکارا جنھوں نے درخت کے نیچے حضور ﷺ کے ہاتھ پر بیعت جہاد کی تھی۔ آواز کا کانوں میں پہنچنا تھا کہ بھاگنے والوں نے سواریوں کا رخ میدان

جنگ کی طرف پھیر دیا۔ جس کسی اونٹنی نے رخ بدلنے میں دیر کی وہ گلے میں زرہ ڈال کر اونٹ سے کود پڑا اور سواری چھوڑ کر حضور کا رُخ کیا۔ اسی اثنا میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے تھوڑی سی مٹی اور کنکریاں اٹھا کر لشکر کفار پر پھینکیں جو خدا کی قدرت سے ہر کافر کے چہرے اور آنکھوں پر پڑی ادھر حق تعالیٰ نے آسمان سے فوجیں روانہ کر دیں جن کا نزول غیر مرئی طور پر مسلمانوں کی تقویت و ہمت افزائی اور کفار کی مرعوبیت کا سبب ہوا۔ پھر کیا تھا کفار کنکریوں کے اثر سے آنکھیں ملتے رہے جو مسلمان قریب تھے انھوں نے پلٹ کر حملہ کر دیا آناً فاناً میں مطلع صاف ہو گیا۔ بہت سے بھاگے ہوئے مسلمان لوٹ کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے تو دیکھا لڑائی ختم ہو چکی ہے ہزاروں قیدی آپ کے سامنے بندھے کھڑے ہیں اور مال غنیمت کے ڈھیر لگے ہیں۔ فسبحان من بیدہ ملکوت کل شیء۔ اس طرح کافروں کو دنیا میں سزا ملی [1]

یہاں ایک ضروری بات تشنہ تحقیق ہے وہ یہ کہ اس ابتدائی شکست کا سبب کیا تھا مورخین کہتے ہیں اور اسی کو عام شارحین قرآن نے اختیار کیا ہے کہ شکست کا بنیادی سبب یہ تھا کہ قبیلہ ہوازن نے میدانِ جنگ میں پہلے پہنچ کر تمام مناسب مقامات پر قبضہ کر لیا اور تیراندازوں کے دستے پہاڑ کی گھاٹیوں میں چھپا دیے۔ مسلمانوں کی فوج رات کے آخری حصہ میں وادی حنین میں پہنچی تو دشمن نے یکبارگی تیروں کی بارش شروع کر دی۔ آگے بنو سلیم اور اہل مکہ تھے وہ بھاگ کھڑے ہوئے اور اس کے نتیجے میں ساری فوج کے پاؤں اکھڑ گئے اور سب میں ابتری پیدا ہو گئی۔ حافظ ابن القیم نے زاد المعاد میں حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں یہی سبب لکھا ہے لیکن مورخین کی بتائی ہوئی یہ داستان ان احادیث کے خلاف ہے جو اس موضوع پر صحیحین میں آئی ہیں۔ صحیحین کی احادیث کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کو حنین کی جنگ میں پہلے کامیابی ہوئی ہے لوگ کامیابی کو دیکھ کر مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے تو دشمن کے تیراندازوں نے موقع پا کر تیراندازی شروع کر دی جس سے مسلمانوں کی صفوں میں بے ترتیبی انتشار اور پراگندگی پیدا ہو گئی۔ بخاری میں حضرت براء ابن عازب کا بیان ہے۔

> ایک شخص قیسی نے حضرت براء سے دریافت کیا کہ کیا آپ لوگ حنین والے دن حضور اقدس کو چھوڑ کر بھاگ گئے تھے بولے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نہیں بھاگے تھے۔ دراصل ہوازن کے لوگ بڑے ماہر تیرانداز تھے۔ ہم نے جب ان پر حملہ کیا تو وہ شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے تو ہم لوگ مال غنیمت پر ٹوٹ پڑے تو انھوں نے ہمیں تیروں پر دھر لیا میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سفید خچر پر سوار دیکھا اور ابو سفیان ابن الحارث اس کی باگ تھامے ہوئے تھے اور حضور فرما رہے تھے انا النبی لا کذب۔ انا ابن عبد المطلب۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میرا خیال یہی ہے کہ ان لوٹ مار کرنے والوں میں مکہ کے ان طلقاء کا ہاتھ تھا جو دو ہزار کی تعداد میں مسلمانوں کی فوج بن کر آئے تھے دراصل ان میں کچھ لوگ آئے بھی اس لیے تھے کہ مسلمانوں کو عین جنگ میں دھوکا دیں۔ چنانچہ صحیح مسلم

[1] افادات شیخ الاسلام

ہں ہے کہ حضرت ام سلیم رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے جو اس جنگ میں شریک تھیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ یا رسول اللہ ان طلقاء کو قتل کر دیجئے ان کی وجہ سے شکست ہوئی ہے۔

ہمارے سوا ان طلقاء کو قتل کر دیجئے انہی نے شکست دلائی ہے۔

امام نووی نے صحیح مسلم کی شرح میں اس فقرے پر یہ تبصرہ کیا ہے کہ:

سب لوگ نہیں بھاگے تھے بلکہ مؤلفۃ القلوب میں جو منافقین تھے اور مکہ کے مشرکین جو اس جنگ میں شریک ہو گئے تھے اور جو اب تک مسلمان نہیں ہوئے تھے۔ انہوں نے بھاگنا شروع کیا اور یہ ناگہانی ہزیمت اس وجہ سے ہوئی کہ دشمنوں نے ایک ساتھ تیروں کی بارش شروع کر دی تھی اور فوج میں ایسے اہل مکہ بھی تھے جن کے دلوں میں ایمان راسخ نہیں ہوا تھا اور مسلمانوں پر مصائب کے منتظر رہے ان میں عورتیں اور بچے بھی تھے جو صرف غنیمت کے لیے آئے تھے۔

ابو حیان اندلسی البحر المحیط میں لکھا ہے۔

ان طلقاء کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو شکست سے دوچار کیا جائے

علامہ آلوسی نے بھی یہی انکشاف کیا ہے۔

سب سے پہلے طلقاء مکہ و فریب سے شکست کھا کر پیچھے ہٹ گئے اس لیے مسلمان فوجوں میں بے ترتیبی اور پسپائی رونما ہوئی۔

لہٰذا مؤرخین کا یہ کہنا کہ ہوازن والوں نے صحابہ کے حنین میں پہنچتے ہی بے خبری کی حالت میں مسلمانوں پر حملہ کر دیا تھا درست نہیں ہے جبکہ صحیح مسلم میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے ہے جیسا کہ فتح الباری میں حافظ صاحب نے بتایا ہے۔

حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں ہم نے مکہ فتح کیا پھر حنین میں جہاد کیا۔ مشرکین نے میدانِ جنگ میں شاندار طریقے پر صف بندی کی تھی۔ پہلے گھوڑے سواروں کی صف پیادہ فوجوں کی صف پھر عورتوں کی پھر جانوروں کی صفیں تھیں۔ ہماری تعداد زیادہ تھی۔ میمنہ پر حضرت خالد تھے۔ ہمارے گھوڑے سوار پیچھے کو ہٹ رہے تھے۔ ہماری دیکھتی آنکھوں ہمارے سواروں کا دستہ ہٹ گیا اور دیہاتی سب بھاگ گئے۔ اور وہ لوگ جن کا پتہ ہے۔

اس سے بھی معلوم ہوا کہ لڑائی باقاعدہ منصوبہ بندی کے ساتھ ہوئی تھی کسی قسم کی ہنگامی حالت نہ تھی۔ ابتداء میں فتح ہوئی لیکن جیسا کہ براء کی روایت میں ہے کہ اس فتح کے نظارے میں لوگ غنیمت سمیٹنے میں لگے۔ غنیمت سمیٹنے والوں پر تیروں کی بارش ہوئی۔ وہ آگے سے بھاگے۔ آگے بھی طلقاء مکہ تھے۔ ان کے پیچھے گھوڑے سوار تھے۔ ان گھوڑے سواروں کے جلو میں گر کر نہ رہ سکے

تھا۔ بھاگنے والے بھی طلقاء تھے۔ امام بخاری نے صحیح میں ہشام بن زید کے حوالہ سے بتایا ہے کہ بھاگنے والے بھی طلقاء تھے۔

حضرت انس رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں۔

آپ کے ساتھ دس ہزار آدمی تھے اور آپ کے ساتھ طلقاء بھی طلقاء بھاگنے والے۔

گو کہ بہت گھوڑے سواروں میں تھا اور گھوڑے سوار طلقاء کی بھگدڑ کے نتیجے میں تتر بتر ہو گئے لیکن حضور ﷺ اپنے گھوڑے پر جمے اور ڈٹے رہے بلکہ آگے بڑھتے رہے حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت تو یہی کہتی ہے کہ آپ ﷺ اول میں اکیلے رہ گئے اس لیے یہ بات تو بالکل صاف ہے کہ باقی اونٹ سوار اور پیدل فوج برابر آپ کے ساتھ رہی، ابتری صرف تیر اندازی اور طلقاء کی بھگدڑ کی وجہ سے صرف گھوڑے سواروں میں ہوئی اور فتح آتی آتی شکست میں بدل گئی۔ امام بخاری کی روایت میں جو آیا ہے کہ آپ اکیلے رہ گئے۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آپ بالکل اکیلے تھے۔ اس کا مطلب ہے کہ جس جگہ رسول اللہ تھے وہاں کوئی نہ تھا۔ کیونکہ اسی روایت میں ہے کہ حضرت انس فرماتے ہیں کہ جب رسول اللہ ﷺ نے انصار کو آواز دی تو انصار نے یہ الفاظ کہے لبیك یارسول الله ابشر نحن معك ہاں یارسول اللہ ﷺ آپ خوش ہوں ہم آپ کے ساتھ ہیں اسی باب میں حضرت انس کی روایت اس سے پہلے ہے جس میں انصار کے یہ الفاظ ہیں لبیك یارسول الله وسعدیك یارسول الله نحن بین یدیك جی ہاں اے اللہ کے رسول ہم آپ کے ساتھ ہیں یہ روایات بتا رہی ہیں کہ انصار یہیں موجود تھے اور ان میں سے کوئی نہیں بھاگا تھا اور بخاری میں حضرت براء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے۔ کہ ابوسفیان بن الحارث اس وقت حضور اقدس ﷺ کے پاس موجود تھے۔ مسلم میں حضرت عباس رضی اللہ عنہ کے الفاظ ہیں کہ میں نے اور ابوسفیان بن الحارث نے حضور سے علیحدگی اختیار نہیں کی تھی۔ ترمذی میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں ہے کہ اس دن حضور کے ہمراہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے فتح الباری میں حاکم کے حوالہ سے بتایا ہے کہ اس روز حضور کے ساتھ ۸۰ آدمی باقی رہ گئے تھے اور حافظ عسقلانی نے بھی یہ ہی بیہقی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ حارثہ ابن النعمان کہتے ہیں کہ سو آدمی باقی رہ گئے تھے [1]

ان روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ بھاگنے والے سب طلقاء تھے ورنہ مہاجرین و انصار سب موجود تھے، چونکہ سب حضرات حضور ﷺ کے آس پاس تھے۔ تھوڑی تھوڑی تعداد میں ہنگامی انتشار کے بعد جمع ہو رہے تھے اس لیے مختلف لوگوں نے مختلف تعداد بتائی ہے۔

یہ صرف محمد ابن اسحاق کی روایت ہے کہ حضور ﷺ کے پاس اس وقت مہاجرین و انصار میں سے حسب ذیل

[1] نواب صدیق حسن خاں نے سیرۃ شامیہ کے حوالہ سے نقل کیا ہے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ حنین میں جمنے والے ۱۰۰ تھے ۳۳ مہاجرین میں سے تھے اور ۶۷ انصار تھے۔ یہ گویا ۱۰۰ کی تفصیل ہوئی۔

اصحاب موجود تھے۔ حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت علی، حضرت عباس، حضرت ابوسفیان بن الحارث، حضرت جعفر بن ابی سفیان، حضرت فضل بن عباس، حضرت ربیعہ بن الحارث، حضرت اسامہ حضرت ایمن بن ام ایمن رضی اللہ عنہم

اگر ہم اس روایت کو صحیح مان لیں اور کسی سند کا مطالبہ نہ کریں تو اس کا مطلب ہے کہ گھوڑے سواروں میں جب بھگدڑ مچی یعنی تیروں کی تاب نہ لاکر جب گھوڑے بھاگ کھڑے ہوئے۔ اس وقت گھوڑے سواروں میں یہ حضرات حضور کے ساتھ رہے معلوم ہوتا ہے کہ یہ بھی گھوڑے سوار تھے ان میں حضرت عباس اور حضرت ابوسفیان رضی اللہ عنہما پیادہ تھے حضور کی رکاب تھامے ہوئے۔ اور دوسرے خچر کا لگام پکڑے ہوئے تھے۔

اس تفصیل کا حاصل یہ ہے کہ حضرت انس کی بخاری کی روایت میں جو یہ جملہ آیا ہے بقی وحدہ حضور اکیلے رہ گئے تھے وہ ظاہری معنے میں نہیں حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس کا مطلب بتایا ہے کہ حضور اقدس آگے اور بقیہ لوگ پیچھے تھے۔ لیکن اس کا صاف مطلب ہے کہ یہ بیانہ ثابت قدم رہنے والوں کی قلت بتانے کے لیے ہے اور وہ بھی گھوڑے سواروں میں ورنہ حقیقت یہ تھی یہ بات کہ ابتری صرف گھوڑے سواروں میں آئی اور وہ بھی طلقاء مکہ کے مال سمیٹنے کی وجہ سے اس کی تائید اس سے بھی ہوتی ہے کہ جب جنگ ختم ہوگئی ابن اسحاق کی روایت کے مطابق ایک مسلمان عورت نے اپنے تاثرات کو اس طرح ظاہر کیا۔

غلبت خیل اللہ خیل اللات   وخیلہ احق بالثبات

بات ادھوری رہ جائے اگر ہم ان طلقاء کے بارے میں کچھ ضروری باتیں نہ بتائیں۔ یہ تو آپ امام نووی کی زبان سے سن آئے ہیں کہ ان میں ابھی کچھ مسلمان بھی نہ ہوئے تھے اور جو ہوئے تھے وہ بھی ہواؤں کا رخ دیکھ کر ہوئے تھے۔ بخاری کی روایت سے معلوم ہو چکا ہے کہ بھاگنے والے بھی یہی تھے۔

ابن سعد رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ خود شیبہ بن عثمان نے بتایا ہے کہ میں نے ارادہ کیا کہ قریش کے ساتھ میں بھی حنین جاؤں اور موقع ملے تو قریش کے خون کے بدلے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کروں اس کے بعد میں جب اکیلے ساتھ روانہ ہوا تو میں اپنے خیال میں مگن تھا اور میرا ارادہ اور مضبوط ہو گیا حتی کہ جس وقت لوگ رل مل گئے تو میں اپنے مقصد کے پیش نظر تلوار لے کر حضور کی طرف بڑھا اور تلوار کو بلند بھی کر لیا تھا کہ یکایک آگ کی ایک لہر بجلی کی طرح میرے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے درمیان ظاہر ہوئی خوف سے میری حالت بری ہو گئی۔ اسی حال میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے آواز دی میں نزدیک گیا فرمایا کہ اور نزدیک آؤ میں نزدیک ہوا آپ نے اپنا ہاتھ میرے سینہ پر رکھ دیا اسی وقت میرے سینہ میں ایک عظیم تغیر پیدا ہوا اور مجھ کو محسوس ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میرے دل میں اپنی جان سے زیادہ ہے حضور نے فرمایا کہ اور نزدیک آؤ اور دشمنوں سے مقابلہ کرو میں بڑھا اور تلوار چلانے لگا۔ محبت کا یہ عالم تھا کہ اگر میرا باپ بھی زندہ ہوتا اور اس وقت سامنے آتا تو میں تلوار سے اس کا بھی مقابلہ کرتا۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ طلقاء جو آگے لگے ہوئے تھے ان میں غیر مسلم بھی تھے ناپختہ مسلمان بھی تھے منافق بھی اور نئی بھی تھے یہی منصوبے کے تحت بھاگے تھے۔ براء بن عازب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی زبانی پہلے سن آئے ہو کہ آگے جو لوگ تھے وہ ناتجربہ کار تھے اور غیر مسلح تھے ان پر جو تیروں کی بارش ہوئی بھاگ کھڑے ہوئے۔

بہرحال ابن اسحاق کی روایت کی بنیاد پر یہ کہنا کہ اچانک حملہ ہوا اس سے بھگدڑ پڑ گئی اور سب بھاگ گئے صحیح نہیں۔ اچانک کچھ نہیں ہوا۔ جو کچھ ہوا خاص منصوبہ بندی کے تحت ہوا۔ فوجیں آمنے سامنے ہوئیں ابتداء میں مسلمانوں کو کامیابی ہوئی۔ اسی کامیابی کو دیکھ کر آگے لگنے والے مالِ غنیمت پر ٹوٹ پڑے دشمن کی جانب سے تیروں کی بارش ہوئی تو بھاگ اٹھے ان کے پیچھے گھوڑے سوار تھے۔ گھوڑے کچھ تیروں کی بارش سے اور کچھ بھگدڑ سے بدکے اور بھاگے۔ گھوڑے سواروں میں ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سواری تھی۔ ان سواروں میں ایک پیکر مقدس اپنی جگہ جما ہوا تھا۔ آپ کی سواری کی لگام حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اور رکاب سفیان رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں جانب مڑ کر دیکھا اور کہا یا معشر الانصار جواب دیا ہم حاضر ہیں پھر آپ نے بائیں مڑ کر فرمایا اب بھی جواب آیا ہم حاضر ہیں۔ جلال نبوت میں فرمایا انا النبی لا کذب، انا ابن عبد المطلب۔ حضرت عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہایت بلند آواز تھے۔ آپ نے ان کو حکم دیا کہ مہاجرین و انصار کو بلاؤ۔ انھوں نے زور سے نعرہ مارا۔ یا معشر الانصار۔ یا اصحاب الشجرہ۔ اس آواز کا کانوں میں پڑنا تھا کہ تمام فوج یک جا ہو گئی۔ جن لوگوں کے گھوڑے نہ آ سکے انھوں نے زرہیں پھینک دیں اور گھوڑوں سے کود پڑے۔ انصار میں خزرج والے بڑے جنگ جو تھے۔ جب انھوں نے ہاتھ دکھائے حضور دیکھ کر خوش ہوئے اور فرمایا الان حمی الوطیس اب تنور تپا ہے۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضور بغلہ سے اترے زمین سے ایک مٹھی مٹی لی کفار کی طرف متوجہ ہوئے اور شاہت الوجوہ کہہ کر جب وہ مٹی کفار کی طرف پھینکی تو دشمن کا کوئی شخص نہ بچا جس کی آنکھ میں خاک پڑی ہو۔ کفار میں بھگدڑ مچ گئی اور مسلمانوں کو اللہ نے فتح دی۔ دشمن سراسیمہ ہو کر بھاگ پڑا میدان خالی ہو گیا۔ صرف مال اسباب اور اہل و عیال رہ گئے۔ فراریوں میں سے کچھ گروہ اوطاس کی طرف چلے گئے اور کچھ نے طائف کا رخ کیا۔ بنو عنزہ نخلہ کی طرف گئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مفرورین کے تعاقب کا انتظام فرمایا۔

ابو عامر اشعری اوطاس کی جانب مامور ہوئے۔ انھوں نے بہت سے لوگوں کو مارا لیکن مسلمہ ابن درید کے تیر سے ان کو مہلک زخم لگا اور شہادت پائی ابو عامر نے وفات سے پیشتر ابوموسیٰ اشعری کو اپنی جگہ مقرر کیا ساتھ ہی کہا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دعا کی درخواست کرنا۔ چنانچہ حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ نے درخواست کی اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ابو عامر رضی اللہ عنہ کے لیے دعا کی۔

درید بن الصمہ مارا گیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نخلہ الیمانیہ، قرن، ملیح، بحرۃ الرغا سے ہوتے ہوئے طائف پہنچ گئے۔

اور مالِ غنیمت حنین سے جعرانہ روانہ کر دیا گیا۔

شہدائے حنین

جنگِ حنین میں یہ اصحاب شہید ہوئے۔

۱۔ ایمن بن عبید
۲۔ یزید بن زمعہ
۳۔ سراقہ ابن حارث
۴۔ ابو عامر اشعری

مالِ غنیمت اور قیدی

جنگِ حنین کے قیدیوں اور مالِ غنیمت کی مجموعی کیفیت درج ذیل ہے۔

عورتیں اور بچے	۶ ہزار
اونٹ	۲۴ ہزار
بھیڑ بکریاں	۴۰ ہزار
چاندی	۴ ہزار اوقیہ

مالِ غنیمت کی تقسیم

مالِ غنیمت کی تقسیم میں رسول اللہ ﷺ نے مکہ کے جدید الاسلام لوگوں کے ساتھ تالیفِ قلب کی خاطر زیادہ رعایت فرمائی، چنانچہ ابو سفیان اور اس کی اولاد کو تین سو اونٹ حکیم بن حزام کو دو سو اونٹ کے علاوہ آٹھ آدمیوں کو سو سو بہت سے لوگوں کو پچاس پچاس اونٹ دیئے فوج میں سے ہر شخص کو فی کس چار اونٹ اور چالیس بکریاں ملیں۔ سواروں کا حصہ زیادہ تھا۔

اہلِ مکہ پر خاص کرم نوازی بعض نوجوان انصار کے لیے موجب اعتراض بن گیا اور کچھ کی شکایتیں حضور اقدس ﷺ کو پہنچیں تو آپ نے انصار کو ایک خیمے میں جمع کیا اور فرمایا،

اے انصار کیا یہ سچ نہیں کہ تم گمراہ تھے اور خدا نے میرے ذریعے سے تمہیں ہدایت دی، تم منتشر و پراگندہ تھے خدا نے میرے ذریعے سے تم میں اتفاق پیدا کیا، تم مفلس تھے خدا نے میرے ذریعے سے تمہیں مالدار بنایا۔

انصار حضور اقدس ﷺ کی تقریر میں ہر بات پر کہتے تھے بے شک اللہ ورسول نے ہم پر احسان کیا حضور اقدس ﷺ نے تقریر میں فرمایا۔

تم اس کے جواب میں یہ کیوں نہیں کہتے ہو کہ اے محمد جب سب لوگوں نے تمہیں جھٹلایا تو ہم نے تیری تصدیق کی۔ جب تمہیں گھر اور وطن سے نکال دیا تو ہم نے تجھے پناہ دی۔ جب تم محتاج تھے تو ہم نے تیری مدد کی میں کہتا ہوں گا تم سچ کہتے ہو۔ اے انصار تم ہمارے شعار ہو اور دوسرے لوگ دثار ہیں۔ اے اللہ انصار پر رحم کر۔ انصار کی اولاد پر رحم کر ان کی اولاد کی اولاد پر رحم کر۔

آخر میں فرمایا۔

اے انصار کیا تمہیں یہ پسند نہیں کہ دوسرے لوگ اونٹ اور بکریاں لے جائیں اور تم محمد مصطفےٰ کو لے کر اپنے گھر جاؤ۔

انصار چیخ اٹھے کہ ہمیں صرف محمد ﷺ درکار ہیں۔

دراصل انصار میں کچھ کو خیال ہو گیا تھا کہ اب رسول اللہ ﷺ شائد مدینہ منورہ نہ جائیں۔ اور مکہ مکرمہ میں قیام فرمائیں اسی تاثر نے ان میں شاید پریشانی اور دل شکستگی پیدا کی اور ان کی زبان پر ایک ایسی بات آئی جس کی ان کی فطری روح اور ایمان سے کوئی مناسبت نہ تھی وہ تو اپنے پاس سے سب کچھ دے کر خوش ہوتے تھے۔ پھر بھلا ہر کا مال دوسروں کو زیادہ ملنے پر کیوں کر رنجیدہ یا شاکی ہو سکتے تھے۔ جب عشق و محبت میں ناکامی کی بلائے مہیب گھٹا کی طرح ماحول پر چھاتی نظر آتی ہے تو دل و دماغ کی طبعی کارفرمائی میں بھی خلل آجاتا ہے۔ اس پر تعجب کی کوئی وجہ نہیں ہے یہ معاملہ تو اس وجود مقدس سے عشق کا تھا حضور اقدس نے اپنی تقریر میں انصار کے ساتھ جانے کا خاص طور پر ذکر کیا اس سے وہ خوشی سے بلیوں اچھل گئے اور ان کے قلب سے تمام پریشانیوں بے چینیوں کو دھو ڈالا۔

وفد ہوازن کی آمد

رسول اللہ ﷺ طائف سے لوٹے تو عمرہ ادا کیا۔ پھر جعرانہ تشریف لائے۔ اسیران جنگ کی رہائی کے لیے جس وفد ہوازن کا انتظار تھا۔ اس کی ایک شاخ سے حضور اقدس ﷺ کی رضاعی والدہ حلیمہ سعدیہ تھیں۔ رئیس وفد نے رضاعت ہی کے رشتہ سے بات کی اور کہا کہ اسیر عورتوں میں آپ کی پھوپھیاں اور خالائیں بھی ہیں۔ اگر سلاطین عرب میں سے کسی نے ہمارے کسی خاندان کا دودھ پیا ہوتا تو اس سے بھی بہت امیدیں ہوتیں۔ آپ سے بہت امیدیں ہیں۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ خاندان عبد المطلب کا حصہ تو میں چھوڑ سکتا ہوں لیکن عام رہائی کی تدبیر یہ ہے کہ نماز کے موقع پر سب لوگ جمع ہوں تو یہ درخواست

پیش کریں۔ بخاری میں یہ بھی ہے کہ یہ لوگ حلقہ بگوش اسلام ہو کر آئے تھے جاءہ وفد ھوازن مسلمین حافظ عسقلانی نے موسیٰ ابن عقبہ کے مغازی کے حوالہ سے یہ بھی بتایا ہے کہ میں اس موضوع پر مسلمانوں سے گفتگو کروں گا تم بھی بات کرنا اور اپنا مسلمان ہونا بتانا اور یہ بھی بخاری ہی میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ میں تو تمہارا انتظار کر رہا تھا۔ نماز ظہر کے بعد درخواست پیش ہوئی تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا مجھے تو صرف اپنے خاندان پر اختیار ہے لیکن میں عام مسلمانوں سے تمہاری سفارش کر سکتا ہوں۔ بخاری میں ہے کہ آپ نے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا۔ اما بعد فان اخوانکم قد جاء نا تائبین۔ یہ تمہارے بھائی توبہ کر کے آئے ہیں جس کا جی چاہے اپنا حصہ چھوڑ دے۔ یہ سنتے ہی مہاجرین و انصار نے اپنے حصے چھوڑ دیئے۔ یوں تمام عورتیں اور بچے واپس ہو گئے۔

آیئے اب ذرا آیت قرآنی کے آغاز پر بھی ایک اجمالی نظر ڈال لیجئے۔ فرمایا لقد نصرکم اللہ فی مواطن کثیرۃ اللہ نے تمہاری بہت سے مواقع پر مدد کی۔ یہ تاریخ کے حوالہ سے مسلمانوں کے حوصلے بلند کیے جا رہے ہیں۔ جنگ کرنے میں کوئی پس و پیش نہ کرو کیونکہ جس خدا نے پہلے مدد فرمائی ہے اس کی مدد اب بھی تمہارے شامل حال رہے گی۔ امام بخاری نے صحیح میں زید بن ارقم رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ کل غزوہ انیس ۱۹ تھے۔ حافظ عسقلانی انیس پر نوٹ لکھا ہے کہ راوی کا مطلب ہے کہ وہ جنگیں جن میں حضور اقدس ﷺ بنفس نفیس تشریف لے گئے انیس ہیں کچھ علماء نے مغازی اور سرایا کی تعداد اسی بتائی ہے۔ ویوم حنین اذ اعجبتکم کثرتکم۔ حنین میں مسلمانوں کی تعداد بارہ ہزار تھی اتنی بڑی کبھی کسی جنگ میں نہ تھی۔ افرادی طاقت کی بہتات پر ناز ایک طبعی چیز ہے ایک کا نہیں سب کا بھی یہ احساس ہو گا کہ آج تعداد کی کمی شکست کا باعث نہ ہو گی ہوا بھی ایسا ہی پہلے پہلے کامیابی مسلمانوں کو ہوئی لیکن اسی خود بینی اور کثرت تعداد پر ناز نے ہی فتح کو شکست میں بدل دیا۔ وہ جن پر ناز کیا تھا انھوں نے ہی مال غنیمت سمیٹنا شروع کیا اور وہی تیروں کی بارش میں بھاگنے والے تھے۔ اسی کثرت نے سب میں ابتری ڈال دی۔ یہاں صاف بتا دیا کہ شکست کا اصل راز بھی خود بینی اور افرادی طاقت کی بہتات پر ناز تھا۔ شارحین قرآن نے نام بھی بتائے ہیں کہ کہنے والوں نے کہا تھا کہ لن نغلب الیوم من قلۃ۔ آج ہم تعداد کی وجہ سے مغلوب نہ ہوں گے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ صرف اتنی بات نہ تو توکل کے منافی ہے اور نہ اسباب پر اعتماد کی نشان دہی کرتی ہے۔ قرآن کی تنبیہ تو اجتماعی احساس پر ہے کہ کامیابی کا مدار نہ افرادی قوت کی بہتات پر ہے اور نہ حالات کی سازگاری پر ہے اور نہ سامان جنگ پر ہے۔ کامیابی کا اصل مدار معنوی قوت یعنی اللہ سے تعلق ہے اگر معنوی قوت موجود ہو تو مادی قوت کی کمی پوری ہو سکتی ہے لیکن معنوی قوت نہ ہو تو مادی قوت کی بڑی سے بڑی بہتات بھی اس کی تلافی نہیں کرتی حنین کی جنگ میں اگلی صفوں میں یعنی طلقاء میں معنوی قوت ناپید تھی۔ اس لیے مادی قوت نے کام نہیں دیا۔ فلم تغن عنکم شیئا وضاقت علیکم الارض بما رحبت ثم ولیتم مدبرین نہیں کام آئی

افرادی طاقت کی بہتات زمین ساری وسعتوں کے باوجود تنگ ہوگئی اور تم نے جنگ سے منہ موڑ لیا۔ یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ جس عددی طاقت پر تم نے ناز کیا تھا وہ معنوی طاقت سے دامن گیر نہ تھی۔ ان کے دلوں کا اللہ سے کوئی تعلق نہ تھا، اعلاء کلمۃ اللہ کا نام ونشان نہ تھا یہ صرف گنتی ہی گنتی تھی۔ جنگ سر گن کر نہیں، سر کٹا کر جیتی جا سکتی ہے اور سر کی بازی لگانے کی بنیادی شرط یہ ہے کہ نصب العین کا شعور ہو۔ ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ وعلی المومنین۔ یہ اہل ایمان کو بشارت ہے۔ اس جگہ ثم کا استعمال بتا رہا ہے کہ اہل ایمان کو جو حادثہ پیش آیا تھا وہ کافی دیر تک رہا اور سکینۃ کا لفظ بتا رہا ہے کہ اس پیش آمدہ افتادہ حالات سے اہل ایمان کو بے حد پریشانی ہوئی۔ کیونکہ یہ سب کچھ بغیر ارادے کے ہنگامی طور پر رونما ہوا۔ اللہ سبحانہ نے اس پریشانی کا اپنے رسول اور اہل ایمان پر سکینت نازل فرما کر علاج کیا اور ساری فوج کے اکھڑے ہوئے پاؤں جما دیئے۔ ان جما دینے کا ذریعہ ساری فوج کے لیے حضور اقدس ﷺ اور کچھ اہل ایمان کی استقامت تھی۔ منتشر شیرازہ جمع ہوا اور شکست کے بعد فتح رونما ہوئی۔ قاضی ثناء اللہ نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ رسول کا ذکر آیت میں یہ بتانے کے لیے آیا ہے کہ آپ کی برکت سے اہل ایمان پر سکینت نازل ہوئی۔ شاید علیٰ کا تکرار یہی بتانے کے لیے ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جب آگے والوں نے بھاگنا شروع کر دیا اور انہیں بھاگتا دیکھ کر لشکر میں ابتری پیدا ہوئی قریب تھا کہ شکست ہو جائے اللہ سبحانہ نے حضور اقدس ﷺ کے قلب مبارک کو سکون واطمینان کی نعمت عطاء فرمائی اور آپ کے صدقے سب اہل ایمان کو یہ نعمت ملی۔ اس لیے سب میں ہمت وشجاعت کی نئی لہر دوڑ گئی۔ اور پھر اس بے جگری سے لڑے کہ دشمنوں کے قدم اکھاڑ دیئے۔ یہ حادثہ فی الحقیقت اللہ سبحانہ کی طرف سے مسلمانوں کی تادیب کے لیے تھا تاکہ محض کثرت تعداد ہی کو کامیابی کی بنیاد نہ سمجھ لیں۔ اصل چیز معنوی قوت ہے یعنی مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب وآرزو۔ اگر یہ موجود ہو تو مٹھی بھر انسان سینکڑوں انسانوں پر غالب آ سکتے ہیں۔

کم من فئۃ قلیلۃ غلبت فئۃ کثیرۃ باذن اللہ واللہ مع الصابرین

وانزل جنودا لم تروھا۔ ایسی فوجیں لایا جو تمہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اس موضوع پر شارحین قرآن کا اتفاق ہے کہ حنین میں نزول ملائکہ ہوا اور اس پر اکثریت ہے کہ ملائکہ نے جنگ میں حصہ نہیں لیا لیکن اس میں اختلاف ہے کہ ان کی تعداد کتنی تھی علامہ آلوسی نے متعدد خیالات لکھے ہیں۔

وعذب الذین کفروا۔ اور اللہ نے کافروں کو سزا دی کہ قتل ہوئے اور قیدی بنائے گئے اور دنیا میں یہی کفر کی سزا ہے۔ جب تک وہ ایمان کے مقابلے میں کفر کو پسند کرتے رہیں، اہل ایمان سے دشمنی رکھیں اور ان سے لڑیں۔ کفر وایمان دو متضاد چیزیں ہیں۔ یہ ایمان کی وسعت صدر ہے کہ وہ کفر کو کچھ نہیں کہتا جب تک ایمان کے راستے میں رکاوٹ نہ پیدا کرے۔ جن لوگوں کا یہاں ذکر ہے انہوں نے ایمان کو جینے کا حق دینے سے انکار کر دیا تھا۔ اور کفر ایمان کے مقابلے میں جب بھی اس انداز سے آئے کفر کی سزا یہی ہے جو ہوازن والوں کو ملی ہے۔

ہوازن کا قبولِ اسلام

پھر اس کے بعد اللہ رحمت کا معاملہ فرمائے گا جس کے ساتھ چاہے گا اور اللہ بڑا ہی مغفرت فرمانے والا اور مہربان ہے

(۲۷) اس میں اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ ان سب واقعات کے بعد بھی اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو توبہ کی توفیق دے گا۔ اور یہ مسلمان ہوں گے۔ یہ گویا مسلمانوں کو ایک قسم کی بشارت ہے۔ فتح حاصل کرنے کے بعد اور اس سے بڑی بشارت کیا ہو سکتی ہے کہ حق کے راستہ سے نہ صرف یہ کہ رکاوٹیں ختم ہو جائیں گی بلکہ رکاوٹ ڈالنے والے بھی حق کے علمبردار ہو جائیں گے۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ دنیا خیر و شر دونوں کا مسکن ہے۔ یہاں بھلائی کی بھی طاقتیں ہیں اور برائی کی بھی۔ اور دونوں کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کی پوری پوری آزادی ملی ہوتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دونوں باہم ٹکراتی رہتی ہیں۔ اس لیے یہ ایک فطری سی بات ہے کہ اسلام کی راہ بھی روکی جائے اور نہ صرف یہ کہ اس کی دعوت قبول نہ کی جائے بلکہ سرے سے اس دعوت کو برداشت ہی نہ کیا جائے۔ اس لیے قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ان رکاوٹوں کے بارے میں امت اسلامیہ کا کیا رویہ ہونا چاہیے۔ قرآن اس سوال کے جواب میں مسلمانوں کو یہ ہدایت دیتا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے حق کے راستہ سے ہٹانے کی بھرپور کوشش کرنی چاہیے مسلسل کرنی چاہیے اور آخری حد تک کرنی چاہیے اسی کوشش کو قرآن کی زبان میں جہاد فی سبیل اللہ کا نام دیا گیا ہے۔ جہاد کے لفظی معنی بھی حصول مقصد کی خاطر ساری طاقت نچوڑ دینے کے ہیں یہاں بتایا جا رہا ہے کہ تمہاری محنت کا نتیجہ سامنے آگیا۔ اب یہ لوگ حلقہ بگوشِ اسلام ہو جائیں گے۔ اب ان کو نظامِ کفر کے فروغ و بقاء کی کوئی امید ان لوگوں میں نہ رہے گی اور وہ سہارے ختم ہو جائیں گے جن کی وجہ سے وہ اب تک کفر سے چمٹے رہے ہیں۔ اب خود بخود یہ لوگ اسلام کے دامن رحمت میں پناہ لینے کے لیے آجائیں گے۔ چنانچہ تاریخ نے یہ بات محفوظ رکھی ہے۔

فتح مکہ اور فتح حنین میں زیادہ فاصلہ نہیں ہے۔ فتح مکہ کے لیے اسلامی فوجوں کا مکہ میں داخلہ ۲۰ رمضان ۸ھ میں ہوا اور ۶ شوال ۸ھ میں اسلامی فوجیں حنین کی طرف روانہ ہو گئیں۔ دونوں کے درمیان صرف ۱۶ روز کا فاصلہ ہے۔ اس لحاظ سے حنین بھی فتح مکہ کا تتمہ ہے۔ اہلِ مکہ نے مقابلہ نہیں کیا اور ہوازن و ثقیف مقابلہ پر آئے۔ عام عربوں میں اسلام کے لیے رکاوٹ جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے قریشِ مکہ کی رکاوٹ تھی۔ فتح مکہ اور فتح حنین نے یہ سب سے بڑی رکاوٹ درہم برہم کر ڈالی اور جس سیاہ پردے نے اسلام کی آسمانی روشنی کو عام نگاہوں سے اوجھل کر رکھا تھا وہ تار تار ہو گیا۔ ہوازن کے بارے میں پڑھ چکے ہو کہ حضور اقدس ﷺ ابھی جعرانہ ہی میں تھے کہ ایک وفد قبولِ اسلام کر کے خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا۔ اسی قبیلہ کی ایک شاخ بنو سعد بن بکر تھے انہوں نے اپنی طرف سے ہشام بن ضمام کو نمائندہ بنا کر روانہ کیا۔ محمد بن اسحاق اور ابو عبیدہ نے بتایا ہے کہ ۹ھ میں آئے واقدی کی رائے ہے کہ ۵ھ میں آئے۔ مگر محققین نے اسے تسلیم نہیں کیا۔ صحیح بخاری میں ضمام کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے یہاں دعوت

کے لیے داعی پہنچا تھا۔ اس کے بعد ہی ساری عوامی زندگی اسلام کی طرف متوجہ ہوگئی۔ اور یدخلون فی دین اللہ افواجا کی تفسیر ہوگئی۔

شاید آپ سوچیں کہ ایسا خود بخود ہوگیا ——— نہیں بلکہ اسلام کی دعوت کے لیے حضور اقدس ﷺ نے داعی مقرر فرمائے اور مختلف اطراف میں روانہ فرمائے۔

مسجد حرام میں مشرکین کا داخلہ بند

(۲۵) مسلمانو! مشرکین نجس ہیں لہٰذا وہ اس سال کے بعد مسجد حرام کے نزدیک نہ آئیں جب حق تعالیٰ نے شرک کی قوت کو توڑ کر جزیرۃ العرب کا صدر مقام مکہ معظمہ فتح کرا دیا اور قبائل عرب جوق در جوق دائرۂ اسلام میں داخل ہونے لگے تب ۹ھ میں اعلان کرایا گیا کہ آیندہ کوئی مشرک کافر مسجد حرام میں داخل نہ ہو بلکہ اس کے نزدیک یعنی حدود حرم میں بھی نہ آنے پائے کیونکہ ان کے قلوب کفر و شرک سے اس قدر پلید اور گندے ہیں کہ اس سب سے بڑے مقدس مقام اور مرکز توحید و ایمان میں داخل ہونے کے لائق نہیں اس کے بعد صحیح احادیث سے ثابت ہے کہ حضور نے جزیرۃ العرب سے مشرکین اور یہود و نصاریٰ کو نکال دینے کا حکم دیا چنانچہ حضور کی آخری وصیت کے موافق حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں یہ حکم عملاً نافذ ہوا اب بطور استیلا یا توطن کفار کے وہاں رہنے پر مسلمانوں کو رضامند ہونا جائز نہیں ہے بلکہ تطہیر جزیرۃ العرب بقدر استطاعت ان کا فریضہ ہے۔ ہاں احناف کے نزدیک کوئی کافر عارضی طور پر امام کی اجازت سے وہاں جا سکتا ہے بشرطیکہ امام اتنی اجازت دینا خلاف مصلحت نہ سمجھے باقی حج و عمرہ کی غرض سے داخل ہونے کی کسی کافر کو اجازت نہیں کما ورد فی الحدیث الا لا یحجن بعد العام مشرک[1]

اس آیت میں دو یا تین باتیں تشریح طلب ہیں۔

ایک تو منطوق قرآن ہے یعنی مسجد حرام میں کافر و مشرک کا داخل نہ ہونا۔ دوسرا مدلول قرآن یعنی جزیرۃ العرب میں غیر مسلم کا داخل نہ ہونا۔ شیخ الاسلام نے اپنے اشارات میں دونوں کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ہم پہلے منطوق قرآنی کو بیان کرتے ہیں

یہ آیت بھی اعلان براءت کی اہم دفعہ ہے کہ مشرکین اس سال کے بعد مسجد حرام کے پاس نہ پھٹکنے پائیں۔ یعنی آیندہ کے لیے ان کا حج اور ان کی زیارت ہی بند نہیں بلکہ مسجد حرام کی حدود میں ان کا داخلہ بھی بند ہے تاکہ شرک و جاہلیت کے اعادہ کا کوئی امکان ہی باقی نہ رہے۔

قابل غور یہ بات ہے کہ یہ حکم مسجد حرام کے بارے میں خاص ہے یا تمام مساجد کے لیے! امام ابوحنیفہ کے نزدیک اس سے مراد صرف یہ ہے کہ وہ حج اور عمرہ اور مراسم جاہلیت ادا کرنے کے لیے حدود حرم میں داخل نہ ہوں۔ امام

[1] افادات شیخ الاسلام

شافعی کے نزدیک اس حکم کا منشا یہ ہے کہ وہ مسجد حرام میں جا ہی نہیں سکتے امام مالک یہ رائے رکھتے ہیں کہ صرف مسجد حرام ہی میں نہیں جا سکتے بلکہ کسی مسجد میں بھی ان کا داخل ہونا جائز نہیں ہے۔

دوسری بات سوچنے کی یہ ہے کہ آیت میں نجاست سے مراد ظاہری ہے یا معنوی۔ تقریباً سارے اہل السنۃ کے علماء اس کا اس پر اتفاق ہے کہ نجاست سے مراد نجاست معنوی ہے یعنی اعتقادی شرک کی نجاست قلبی ہے نہ کہ نجاست جسمی۔

تیسری بات اس میں سمجھنے کی یہ ہے کہ فلا یقربوا المسجد الحرام سے مقصود کیا ہے۔ احناف کہتے ہیں کہ نہی تکوینی ہے تکلیفی نہیں۔ وہ اس کو محمول کرتے ہیں کفار کے ایسے قرب پر جو غلبہ واستیلاء کے ساتھ ہو یعنی آیندہ کفار کو مسجد حرام میں پاؤں جمانے کا موقع نہ دیا جائے۔ "قرب" کا لفظ منع واستیلاء وتمکین کے لیے کمال مبالغہ ہے۔

علامہ ابو السعود رقم طراز ہیں۔

مشرکین کو مسجد حرام کے قریب ہونے کی ممانعت کے بارے میں روئے سخن مسلمانوں کی طرف ہے کہ مشرکین کو اس پر اقتدار و غلبہ کا موقعہ نہ دو۔

اسی قسم کی تصریحات احناف شارحین قرآن اور فقہائے احناف نے فقہ کی کتابوں میں پیش کی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ احناف کے خیال میں مسلمانوں کے لیے جائز نہیں ہے کہ غیر مسلموں کو مسجد حرام میں غلبہ وتمکین کے ساتھ داخل ہونے دیں لیکن اگر کسی عارضی ضرورت سے کسی غیر مسلم کو آنے دیا جائے مثلاً تعمیر یا تجارت یا غیر مسلم حکومتوں کے غیر مسلم سفراء تو یہ جائز ہے مگر ائمہ ثلاثہ اور جمہور سلف اس کے خلاف ہیں ان کا کہنا ہے کسی حال میں بھی غیر مسلم مسجد حرام کے حدود میں داخل نہیں ہو سکتا اور مسلمانوں پر فرض ہے کہ وہ غیر مسلم کے قرب مکانی کو اگرچہ وہ عارضی اور بلا تمکین واستیلاء ہو روکیں اور اس مقام اور اس مقام کے اطراف و اکناف کو جہاں کا داخلہ حرم میں داخلہ کا ذریعہ ہے ہمیشہ صرف اہل اسلام کے لیے مخصوص کر دیں۔

امام نووی رقم طراز ہیں:

کسی حال میں جائز نہیں ہے کہ غیر مسلم کو حدود حرم میں داخل ہونے دیا جائے اور اگر کوئی غیر مسلم پوشیدہ طور پر چلا جائے تو اس کا اخراج واجب ہے اگر وہ مکہ میں مر جائے اور دفن بھی ہو جائے تو چاہیے کہ قبر کھود دی جائے اور لاش نکال دی جائے۔ اگر متغیر نہیں ہوئی ہے۔

بہرحال اس موضوع پر احناف دلیل کے میدان میں تہی دامن ہیں جمہور کا مذہب دلائل کی قوت رکھتا ہے۔ احناف کا یہ کہنا کہ آیت میں نہی تکوینی ہے بالکل بے وزن ہے۔ کیونکہ یہاں نہی اقتراب میں کمال در مبالغہ ہے اور یہ مبالغہ منع دخول میں ہے اور جب منع دخول ہے تو ظاہر ہے کہ قرب کی ہر صورت وحالت اس ممانعت میں داخل ہو گی اور جب قرآن بھی اس معاملہ میں مبالغہ کر رہا ہے تو معلوم ہوا کہ قرب میں مبالغہ ہی مقصود ہے عربی میں لا ادینك ھاھنا کا مطلب یہ ہی ہو گا کہ کسی

حال میں بھی میں تمہیں یہاں دیکھنا نہیں چاہتا ہوں۔ اُردو میں جب ہم کہیں گے کہ تم اس جگہ کے پاس بھی نہ پھٹکنا تو اس سے یہ
سمجھا جائے گا کہ کسی حال میں بھی تمہارا یہاں آنا ہمیں پسند نہیں نہ حاکم بن کر اور نہ محکوم ہو کر۔

اصل یہ ہے کہ دین حق کے قیام اور امت مسلمہ کی بقاء کے لیے ضروری تھا کہ جس طرح تعلیم و احکام کو ہمیشہ کے لیے
کتاب و سنت میں محفوظ کر دیا گیا اسی طرح باعتبار مکان بھی ایک مرکزی مقام ہمیشہ کے لیے ایسا مقرر کر دیا جاتا جو صرف
پرستاران حق کے لیے مخصوص ہوتا اور وہاں کی فضا شرک و فساد کی ناپاکی سے کبھی مکدر و ملوث نہ ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے سرزمین حجاز
کو اس کے لیے منتخب فرمایا۔ اور یہی ناف زمین دنیا کی آخری و باقی ہدایت و سعادت کے لیے ایک مرکزی سرچشمہ و دریا
کی حیثیت سے قائم کی گئی۔ ذالک تقدیر العزیز العلیم۔

اور چونکہ یہ مقصد کمال مبالغہ کے بغیر حاصل نہیں ہو سکتا اس لیے ضروری ہوا کہ نہ صرف غیر مسلموں کے قبضہ و تمکین کو بلکہ
سرے سے ان کے قرب ہی کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا جائے۔ کیونکہ اگر آمد و رفت کا دروازہ کھلا رہے گا تو مسلمانوں کی عصمت
کی اہمیت باقی نہ رہے گی۔ طبیعتیں غیر مسلموں کے حرم میں داخلہ کو برداشت کر لیں گی۔ اس صورت میں استیلا ممکن ہو جائے
گا۔ اور یہ سب جانتے ہیں کہ شریعت کے مقاصد میں ایک اہم مقصد صرف مفاسد کو روکنا نہیں بلکہ ان ذرائع پر بھی قدغن قائم
کرنا ہے جو مفاسد کا دروازہ کھولتے ہیں۔ یعنی قرآن صرف برائیوں کو نہیں روکتا بلکہ ان راہوں پر بھی پہرہ بٹھاتا ہے جو برائیوں
کی طرف جانے والی ہوں۔

بہرحال میرے خیال میں اس موضوع پر ائمہ ثلاثہ اور جمہور کا مذہب قوی ہے کہ مسجد حرام میں غیر مسلم کو داخل ہونے دینا
کسی حال اور کسی شکل میں جائز نہیں۔ اور اسی پر مسلمانوں کا تیرہ سو سال سے عمل ہے۔

مساجد میں غیر مسلموں کا داخلہ

اس پر امام ابو حنیفہ اور امام شافعی رحمہما اللہ تعالیٰ متفق ہیں کہ یہ آیت مسجد حرام کے لیے خاص ہے۔ دوسری مساجد کا یہ
حکم نہیں ہے ان میں غیر مسلم داخل ہو سکتا ہے لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ بلا قید جواز کے قائل ہیں جبکہ امام شافعی رحمہ اللہ تعالیٰ
اس میں مسلمانوں کی اجازت کو ضروری سمجھتے ہیں۔ صرف امام مالک ناجائز بتاتے ہیں۔

احناف کا مذہب فقہ کی کتابوں میں بالکل واضح اور صاف ہے کہ مساجد میں غیر مسلموں کا داخلہ جائز ہے صاحب ہدایہ نے
روایتی طور پر وفد ثقیف کی آمد پر ان کے مسجد نبوی میں قیام سے استدلال کیا ہے۔ فتح مکہ اور حنین کی کامیاب جنگ کے بعد جب
قبیلہ ثقیف کا وفد آیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نہ صرف ان کو مسجد میں آنے دیا بلکہ بحیثیت مہمان کے ان کو مسجد میں ٹھہرایا
آپ کو یاد ہو گا کہ حنین میں جنگ ہوازن و ثقیف ہی سے ہوئی تھی کچھ نے یہ شبہ بھی پیش کیا تھا۔ نتولهم في المسجد

وھم مشرکون۔ آپ ان کو مسجد میں ٹھہراتے ہیں وہ تو مشرک ہیں فرمایا ان الارض لا تنجس زمین ناپاک نہیں ہوتی ہے یعنی ان میں نجاست جسمانی نہیں اعتقادی ہے۔ ابوداؤد اور امام احمد نے عثمان ابن ابی العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے جو خود وفد میں شریک تھے روایت کیا ہے۔

وفد ثقیف جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں آیا تو آپ نے ان کا قیام مسجد میں تجویز فرمایا تا کہ ان کے دل کچھ نرم ہوں۔

حافظ زیلعی نے نصب الرایہ میں اس کے تمام طرق پر مبسوط بحث کی ہے یہ وفد رمضان ۹ھ میں آیا اور یہ وہ وقت ہے کہ اسلام کا اقتدار پر بھرپور قبضہ ہو چکا ہے۔ حنین میں مغلوب ہونے کے بعد وفد عاجزانہ اور مغلوبانہ آ رہا تھا۔ اور اس وفد کے سارے ارکان مشرک تھے اور مشرک بھی کیسے۔ اس وفد کا سردار ابن عبد یالیل تھا اور اس کا حال یہ ہے کہ ابوطالب کے انتقال کے بعد جب قریش مکہ کا ظلم اس حد تک پہنچ گیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے مکہ میں رہنا بھی دشوار ہو گیا تو آپ نے طائف کا سفر کیا کہ شائد باہر کے قبائل حق کا ساتھ دیں۔ لیکن آپ جب قبیلہ ثقیف کی بستی میں پہنچے تو اسی عبد یالیل اور اس کے دونوں بھائیوں نے آپ کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ طائف میں دم لینے کی مہلت نہ دی۔ دعوت حق کا جواب تھا کہ کیا خدا کو کوئی آدمی نہ ملا جسے پیغمبر بناتا جب آپ واپس ہوئے تو بستی کے لڑکوں اور غلاموں کو آپ کے پیچھے لگا دیا کہ تضحیک اور تحقیر کریں۔ انھوں نے آپ کی شان میں گستاخیاں کیں۔ اللہ اکبر اس جسم مقدس کو جس کے بقاء پر تمام روئے زمین کی ہدایت و سعادت موقوف تھی پتھروں کی بوچھاڑ سے زخمی کر دیا۔ پیشانی مبارک کا خون بہہ کر پائے مبارک کو رنگین کر رہا تھا اور یہ دعا ورد زبان تھی۔

اللھم انی اشکوا الیک ضعف قوتی و قلۃ حیلتی وھوانی علی الناس یارب المستضعفین۔

اس کے بعد جنگ ہوازن و ثقیف کے جو واقعات پیش آئے وہ آپ آیت بالا کی تشریح میں پڑھ چکے ہیں۔ جنگ ہوازن کے بعد عروۃ ابن سعود ثقفی مدینہ آیا اور مشرف باسلام ہوا۔ مسلمان ہونے کے بعد تبلیغ حق کے عشق نے چین سے نہ بیٹھنے دیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم روکتے رہے اور وہ قوم کی محبت کے اعتماد پر طائف واپس گئے اور اسلام کی دعوت کا کام شروع کر دیا لیکن ثقیف نے اس کے ساتھ یہ سلوک کیا کہ ایک روز عین نماز کی حالت میں شہید کر دیا۔ یہ تو اس وفد کی اسلامی عداوت کی تصویر ہے نور کفر سے ان کو کس قدر محبت تھی اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ جب فتح مکہ کے بعد یہ وفد آیا اور مسجد کے قیام میں کلام اللہ کی تلاوت با جماعت نماز کا نظارہ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت دیکھ کر اسلام لانے کے لیے تیار ہوئے تو اگرچہ اسلام کی صداقت مان چکے تھے لیکن پھر بھی بت پرستی اور کفر کا کانٹا دل سے نہیں نکلتا تھا چاہتے تھے کہ اپنی شرطیں منوا کر مسلمان ہوں۔

پہلے مطالبہ کیا کہ نماز کی پابندی سے ہمیں مستثنیٰ کر دیجئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لا خیر فی دین لیس فیہ

رکوع. وہ دین ہی کیا جس میں اللہ کے سامنے جھکنے والی پیشانی نہ ہو۔

پھر بولے اچھا زنا کے بغیر تو چارہ نہیں۔ ہماری قوم کے لوگ اکثر سفر میں رہتے ہیں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا انہ کان فاحشۃ وساء سبیلا۔ پھر بولے کہ سود چھوڑنا تو مشکل ہے۔ شراب تو ہماری غذا ہے۔ دونوں باتوں کے جواب میں ارشاد فرمایا۔ اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربا اور رجس من عمل الشیطان۔ جب ان ساری شرطوں اور مطالبوں کو بابِ نبوت نے رد کر دیا۔ تو آخر میں بولے کہ اچھا ساری باتیں منظور لیکن ربہ دیبی کو ہم نہیں ڈھا سکتے۔ اس کو حضور اقدس ﷺ نے منظور فرمایا اور خالد بن الولید کو چند صحابہ کے ساتھ اس مہم پر روانہ کیا کہ طائف کی دیبی کو گرائیں حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے مندر کی زمین تک کھود ڈالی مگر یہ لوگ یہی کہتے رہے کہ بے حرمتی کا وبال آئے گا۔ ان حقائق سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ یہ لوگ سخت قسم کے شرک اور اسلام کی عداوت میں کس درجہ سنگدل تھے اس کے باوجود حضور اقدس نے ان کو مسجد میں ٹھہرایا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جس قلعہ طائف کو مسلمانوں کی منجنیق چالیس دن تک سنگ باری کر کے فتح نہ کر سکی۔ اس کے بسنے والوں کے دلوں کو حضور اقدس کے خلق اعظم، اسلام کی سماحت، مسجد کے قیام اور اسلامی عبادت کے نظام نے چند گھنٹوں میں فتح کر لیا۔

صحیح مسلم میں بروایت حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا ہے کہ خود عائشہ نے ایک روز حضور سے دریافت کیا کہ اُحد والے دن سے بھی زیادہ سخت دن کوئی آپ پر آیا ہے فرمایا۔ ہاں وہ دن جب میں طائف گیا اور اعانت و قبول حق کی امید سے اپنی دعوت ابن عبد یالیل کے سامنے پیش کی اور اس نے میری کوئی پروانہ کی وہ دن اُحد سے بھی زیادہ سخت تھا۔ اسی روایت میں ہے کہ اس کے باوجود آپ نے فرمایا تھا کہ:

اس پر بھی مجھے اُمید ہے کہ ان کی نسل سے وہ لوگ پیدا ہوں گے جو اللہ کی عبادت کریں گے۔

غزوہ طائف میں جب قلعہ مسخر نہ ہوا اور وقتی مصالح کے تحت حصار اٹھا لیا گیا لوگوں نے کہا ثقیف کے لیے بددعا کیجئے۔ فرمایا۔ اللھم اھد ثقیفا وأت بھم

اے اللہ ثقیف کے دلوں کو قبول حق کے لیے کھول دے۔

چنانچہ یہی ہوا جن لوگوں نے پتھر مارے تھے وہ دوڑے دوڑے آئے کہ حق قبول کریں۔ یہی ہے ثم یتوب اللہ من بعد ذالک علیٰ من یشاء کی واقعاتی تعبیر۔ مسجد میں ان کے لیے خیمہ لگایا گیا اور حضرت مغیرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے میزبانی کے فرائض انجام دیئے اور مسجد میں ٹھہرانے کی علت یہ بتائی گئی حیث یسمعون القران۔ جہاں وہ قرآن سن سکیں۔
بہر حال یہ واقعہ بتا رہا ہے کہ کافر و مشرک کے مسجد میں داخلہ پر اسلام میں کوئی قدغن نہیں ہے۔ اس موضوع پر امام مالک کی رائے دلائل سے تہی دامن ہے جبکہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ کا دامن دلائل کے موتیوں سے بھرا ہوا ہے۔
امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کی تائید میں صرف ایک واقعہ نہیں ہے اور بھی واقعات ہیں۔ وفد نجران کا واقعہ بھی ان واقعات

میں سے ایک ہے جو صحاح اور سیرت کی کتابوں میں موجود ہے اور جس کی نسبت سورۂ آل عمران کی آیات مباہلہ بالاتفاق نازل ہوئیں۔ نجران یمن میں عیسائی آباد تھے حافظ ابن القیم نے اپنی عادت کے مطابق اس واقعہ کی فقہ پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اس میں اہل کتاب کو مسلمانوں کی مساجد میں داخل ہونے کا پروانہ ہے۔ (زاد المعاد)

صحیحین میں ثمامہ ابن آثال کا واقعہ موجود ہے۔ ثمامہ نجد کا رئیس تھا ہجرت کے پانچویں سال حضور اقدس ﷺ نے چند سوار نجد کی طرف روانہ کیے وہ ثمامہ کو گرفتار کر لائے اور مسجد نبوی کے ستون سے باندھ دیا۔ تمام روایات کے جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تین دن تک وہ مسجد میں رہا۔ تیسرے روز حضور اقدس ﷺ نے بلا کسی شرط کے رہا کر دیا۔ امام بخاری نے جواز دخول مشرک در مسجد میں اسی واقعہ سے استدلال کیا ہے کتاب الصلاۃ میں ایک خاص باب اس عنوان سے قائم کیا ہے کہ دخول المشرک فی المسجد اور اس میں اسی واقعہ سے استدلال کیا ہے۔

اس میں شک نہیں کہ امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کا مذہب اس بارے میں حق اور قوی ہے اور امت کا عمل بھی تیرہ صدیوں سے اسی پر ہے

یہود و نصاریٰ کا جزیرہ عرب سے اخراج

آیئے دوسرے مسئلہ پر بھی ذرا توجہ فرمایئے۔ یہاں تک تو قرآن کا منطوق ہے اور حکم خاص اس مرکز کے متعلق تھا جسے مسجد حرام کہتے ہیں کہ کوئی غیر مسلم نہ صرف یہ کہ وہاں نہ رہے بلکہ کسی حال میں اس کے قریب بھی نہ آئے۔ جمہور اہل اسلام کا اس پر اتفاق ہے کہ مسجد حرام سے مراد صرف خانہ کعبہ کا احاطہ نہیں بلکہ تمام سرزمین حرم ہے یہ حکم تو خاص اس مرکز کے متعلق تھا۔ قرآن کی آیت کے مدلول سے حضور اقدس ﷺ نے اس مرکز کے اردگرد کا حکم بھی بتادیا کہ اسلامی مرکز کا گرد و پیش اور اس کا مولد و منشا ہمیشہ غیروں کے اثر سے محفوظ ہو جائے۔ اسلام کو اپنے ظہور کے وقت مشرکین اور یہود و نصاریٰ سے سابقہ پڑا۔ مشرکین عرب کے بعد یہود و نصاریٰ کی بھی ایک بڑی جماعت جزیرۃ العرب میں آباد تھی۔ مدینہ میں یہودیوں کے متعدد قبیلے تھے خیبر میں ان کی ریاست تھی۔ یمن میں نجران عیسائیوں کا مرکز تھا۔

چنانچہ مدینہ کی سرزمین کو آپ نے اپنی زندگی ہی میں یہودیوں سے خالی کرا لیا آخری جماعت جو مدینہ سے نکالی گئی وہ بنو قینقاع اور بنو حارثہ تھے۔ امام مسلم نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کا قول نقل کیا ہے۔

بنو نضیر نے حضور سے جنگ کی حضور نے بنو نضیر کو جلاوطن کیا قریظہ کا قیام رہا۔ جب انھوں نے بھی جنگ کی تو وہ مفتوح و مغلوب ہوئے مرد قتل ہوئے عورتیں اور بچے قید ہوئے۔ کچھ بچے مسلمان ہوگئے مدینہ کے سارے یہود کو حضور نے مدینہ سے نکال دیا۔ (صحیح مسلم)

بخاری و مسلم میں اس اخراج کا واقعہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے بیان کے مطابق اس طرح سے کہ حضور اقدس صحابہ کو ساتھ لے کر یہودیوں کی تعلیم گاہ میں گئے اور فرمایا:

اے یہودیو۔ اسلام کو قبول کر لو نجات پاؤ گے پھر فرمایا یہ سرزمین سرکاری ہے اس پر اللہ و رسول کا قبضہ ہے میں تمہیں یہاں سے جلا وطن کرنا چاہتا ہوں جس کسی پاس کسی قسم کا اثاثہ ہو وہ فروخت کر لو۔ ورنہ جان لو اس ملک کی حکومت صرف اللہ اور اس کے رسول کی ہے جو غیر مسلم اس ملک میں باقی رہ گئے خارج کر دیئے جائیں گے۔

امام بخاری نے باب باندھا ہے۔ اخراج الیھود من جزیرۃ العرب اس میں پہلی روایت یہود مدینہ کے اخراج کی لائے ہیں۔ دوسری روایت حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مرض الوفات میں تین باتوں کی وصیت فرمائی تھی۔ ایک تھی اخرجوا المشرکین من جزیرۃ العرب۔

حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں کہ:

امام بخاری نے عنوان میں صرف یہود کا ذکر کیا ہے امام بخاری بتانا چاہتے ہیں کہ تمام غیر مسلم اقوام میں یہود ہی سب سے زیادہ توحید کے قائل ہیں ان کو خارج کیا گیا ہے تو دوسروں کے اخراج کا واجب ہونا بدرجہ اولیٰ ثابت ہو گیا۔ لہٰذا تصریح کی ضرورت نہیں [1]

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی روایت میں یہود و نصاریٰ کی تصریح ہے۔

میں ضرور جزیرہ عرب سے یہود و نصاریٰ کو نکالوں گا تا آنکہ جزیرہ میں صرف مسلمان رہ جائیں۔

امام احمد نے ابوعبیدہ ابن الجراح کے حوالہ سے بتایا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال سے پہلے آخری بول یہ تھا کہ حجاز کے یہودیوں کو اور نجران والوں کو جزیرۃ العرب سے نکال دو۔

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی روایت میں اس کی علت بھی بتا دی ہے۔

سب سے آخری وصیت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یہ تھی کہ جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہ ہوں۔

اسی وصیت اور حکم کی تعمیل میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خیبر اور یمن کے یہود و نصاریٰ کو عرب سے نکالا۔ حافظ عسقلانی فتح الباری میں رقم طراز ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جن یہود و نصاریٰ کو جزیرۃ العرب سے نکالا تھا ان کی تعداد چالیس ہزار تھی حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جو کچھ کیا تمام صحابہ کے مشورے اور اتفاق سے کیا اور حضور اقدس کی وصیت کی پوری تحقیق کے بعد کیا۔ امام مالک نے زہری کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

[1] فتح الباری

حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اسی میں رہے تا آنکہ حضـ … ر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ بات … ور پر ثابت ہو گئی کہ
حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ہے کہ جزیر … ں دو دین اکٹھے نہیں ر … ۔ حضرت عمرؓ نے
یہ ثابت ہو جانے کے بعد اعلان کیا جس کے پا … قدس ﷺ کا … زمانہ ہوا سے وہ پیش
کرنا چاہیے تاکہ اس کو نافذ کیا جا سکے ورنہ میں تم … بدر کروں گا چنانچہ آپ نے … ملک بدر کر دیا۔

ایک وسوسہ اور اس کا ازالہ

شائد آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ اگر علت یہی … عرب … دو دین جمع نہیں … تو اس کام کی حضور اقدس ﷺ نے خود تکمیل کیوں نہیں کی؟

جواب یہ ہے کہ احکام شرعیہ دو قسم کے ہیں ایک تو … احکا … یہ جن کا تعلق ا … ارح و تزکیہ سے ہوتا ہے جیسے تمام اوامر و نواہی اور فرائض و واجبات دوسرے دو ہیں … کا تعلق … سے نہیں بلکہ ام … اور اجتماعی فرائض اور ملکی سیاسیات سے ہوتا ہے جیسے قوانین سیاسیہ اور فتح ممالک۔

سنت الٰہی یوں ہے کہ پہلی قسم کے احکام خود شارعؑ زندگا … یل تک … ہیں اور وہ ان کی تکمیل کا اعلان کر کے دنیا سے جاتے ہیں لیکن دوسری قسم کے ایسا ہوتا ہے … نہیں … ان کے نفاذ … یہ لیے ایک خاص وقت مطلوب ہوتا ہے اور وہ شارع کے بعد بتدریج تکمیل و تنفیذ پاتے ہیں … پر … بت یا تو بطو … بتایا جاتا ہے یا اپنے جانشینوں کو وصیت کر دی جاتی ہے۔

یہ جلاوطنی کا مسئلہ اسی دوسری قسم سے تعلق رکھتا ہے اس … یہ حضـ … تاکہ اس کا پو … خود حضور کی حیات مقدسہ میں ہو جاتا۔ آپ نے یہود کے اخراج سے عملاً نفاذ شروع کر دیا تھا … خیبر … ہی میں صا … جب ضرورت ہو گی یہاں سے جلاوطن کر دیئے جائیں گے۔ پھر اسی منصوبہ کی تکمیل کی اپنے جانشین … کو … ہی۔ چنانچہ … ﷺ کے زمانے میں اس کی تکمیل کا وقت آ گیا۔ اور یہود خیبر نے اپنی شرارتوں سے خود … سر … انجام کر دیا۔

ایک اور شبہ کا ازالہ

شاید آپ یہ الجھن محسوس کریں کہ حضرت ابو بکر … ؓ … زمانہ خلافت … حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اہل خیبر کی شرارتوں اور واقعہ عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ … سے … ں نہیں کیا۔
بات ٹھیک ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ تنفیذ و … تے … سیت پر تکیہ … ناضروری ہے۔ حالات

کا وہاں کچھ ایسا تھا کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اہل ردت کے قتال وغیرہ مہمات نے مہلت نہ دی۔ اور حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ خلیفہ ہوتے ہی ایران عراق اور شام کی مہمات عسکریہ میں مشغول ہوگئے جب خیبر کی شرارتوں نے خود موقع فراہم کر دیا تو آپ نے یہ کام بھی انجام دے دیا۔ اور جس طرح مہمات شرائع خود حضور اقدس کے زمانے میں بتدریج تکمیل کو پہنچے ٹھیک اسی طرح مہمات سیاسیہ بھی خلافت راشدہ میں بتدریج تکمیل کو پہنچے۔

اب کسی کو اس کا حق نہیں ہے کہ محض رائے، مصلحت کے سہارے قرآن کے مدلول نبوت کے منطوق اور خلافت راشدہ کے محسوس عمل کا مقابلہ کرے۔

افسوس ہے کہ مولانا شبلی نے الفاروق میں یہود و نصاریٰ کے جزیرۃ العرب سے اخراج کی یہ توجیہ کی ہے کہ ___ یہود خیبر اور نصاریٰ یمن بغاوت کی تیاریاں کر رہے تھے اس لیے مجبور ہو کر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو نکال دیا۔ مولانا کو اس توجیہ کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اس عمل کو یورپ کے ادعائی مذاق کے مطابق دکھانا چاہتے تھے اور چونکہ لا یترك فی جزیرۃ العرب دینان کا معاملہ ان کے خیال میں آج کل کی تہذیب اور روشن خیالی کے خلاف تھا اور اس کی کوئی سائنٹفک توجیہ ان کو معلوم نہ تھی اس لیے بحالت مجبوری اور ناچار یہود خیبر کی شرارت کا سہارا لیا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت کو قرآن کے مدلول سے سمجھا ہوا شرعی ضابطہ سے ہٹا کر محض دفع بغاوت کا ایک سیاسی واقعہ بنا دیا فانا للہ والی اللہ المشتکیٰ۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے مولانا نے اسی ذہنی مرعوبیت کے پیش نظر تجارتی قافلے پر حملہ کا غزوہ بدر میں انکار کر دیا اور معذرت آمیز انداز اختیار کیا۔ حالانکہ کسی معاملے کے متعلق معذرت آمیز لب و لہجہ استعمال کرنا ضعف موقف کی علامت ہے۔ جب موقف ضعیف ہو تو اسے دلائل کے زوردار الفاظ کی فراوانی سے مستحکم نہیں بنایا جا سکتا۔

بہرحال حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے باتفاق جمیع صحابہ جو کچھ کیا وہ دراصل اسی وصیت نبوی اخرجوا الیہود والنصاریٰ من جزیرۃ العرب کی تعمیل تھی۔ خلاصہ یہ ہے کہ حضور کے ارشاد و عمل ان کے آخری لمحات کی وصیت حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اور تمام صحابہ کے اجماع واتفاق سے یہ بات روز روشن کی طرح علی رؤس الاشہاد ہو گئی۔ کہ اسلام نے ہمیشہ کے لیے جزیرۃ العرب کو صرف اسلامی آبادی ہی کے لیے مخصوص کر دیا ہے۔

جزیرہ عرب کی تحدید

یہاں تک پہنچنے کے بعد معالم کے قاری کے ذہن میں یہ سوال ضرور چٹکیاں لے گا کہ جزیرہ سے مقصود کیا ہے تمام مورخین اور قدیم جغرافیہ نگار اس پر متفق ہیں کہ عرب کو جزیرہ اس لیے کہا گیا کہ تین طرف سمندر اور ایک طرف دریا کے پانی سے محصور ہے یعنی تین طرف بحر ہند، خلیج فارس، بحر احمر (قلزم) واقع ہیں ایک جانب دریائے دجلہ۔ صورت اس کی یہ ہے کہ دریائے

فرات بلاد روم سے شروع ہوا اور قنسرین کے نواح میں عرب کی سرحد پر ظاہر ہوا پھر عراق میں ہوتا ہوا البصرہ کے پاس سمندر میں جا گرا
وہاں سے پھر عرب کو سمندر نے گھیرا اور لطیف و بحرین میں ہوتا ہوا عمان سے گذر گیا۔ پھر حضر موت اور عدن ہوتا ہوا یمن کی جانب
ان کے ساحلوں سے جا ٹکرایا۔ حتیٰ کہ جدہ میں نمودار ہو گیا جو مکہ اور حجاز کا ساحل ہے پھر ساحل طور اور خلیج ایلہ پر جا کر سمندر کی شاخ ختم
ہو گئی پھر سرزمین مصر شروع ہوتی ہے اور قلزم نمودار ہوتا ہے اور اس کا سلسلہ بلاد فلسطین سے سواحل عسقلان ہوتا ہوا سرزمین
پر وساحل اردن تک بیروت پر پہنچ جاتا ہے اور آخر میں قنسرین تک منتہی ہو کر وہ جگہ آتی ہے جہاں سے فرات نے عرب
کا احاطہ شروع کیا تھا۔ یہی جزیرہ ہے جس سے عرب کی سرزمین مراد ہے اور یہی عرب اقوام کا مولد و منشاء ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ عرب طول میں عدن سے لے کر عراق کی ترائی تک اور عرض میں ساحل بحر احمر سے خلیج عربی تک پھیلا ہوا ہے اس کی حد شمال میں دائیں جانب دجلہ ہے اور اگر عرض کا خط کھینچیں تو بائیں جانب شام آج کل جغرافیوں میں عرب کے یہی حدود بتائے جاتے ہیں۔

اس ساری تفصیل کے بعد آئیے اب صاحب معالم التنزیل امام بغوی کی زبانی اس تفصیل کا خلاصہ بھی سن لیجئے قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری اور خازن نے اپنی تفسیر میں اسی کو نقل کیا ہے فرماتے ہیں کہ

تمام اسلامی علاقے غیر مسلموں کے اعتبار سے تین قسم کے ہیں۔

۱۔ حرم کا علاقہ اس میں غیر مسلم کا داخل ہونا جائز نہیں ہے خواہ وہ غیر مسلم اسلامی مملکت کا شہری ہو یا امن کی راہداری رکھتا ہو یہی امام شافعی امام مالک اور امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کا مسلک ہے۔ اگر دار کفر سے کوئی غیر مسلم ایلچی بن کر آئے اور مسلمان سربراہ مملکت حرم میں ہو تو اسے حرم میں داخل ہونے کی اجازت نہ دے بلکہ خود حرم سے باہر آکر اس سے ملے۔ لیکن امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک معاہد غیر مسلم کو مسلمان سربراہ کی اجازت سے داخل ہونا جائز ہے۔

۲۔ جزیرۃ العرب اس میں غیر مسلموں کو تین دن سے زیادہ قیام کی اجازت نہیں لیکن مسلمان سربراہ مملکت سے راہداری لے کر داخل ہو سکتے ہیں۔

۳۔ ان دو کے علاوہ سارے اسلامی ممالک ان میں غیر مسلم داخل بھی ہو سکتے ہیں اور رہ بھی سکتے ہیں نہ ان کے داخلہ پر کوئی پابندی اور نہ ان کی رہائش پر۔ لیکن صرف مساجد میں داخلہ کے لیے اجازت شرط ہے۔

بالکل آخر میں حضرت مولانا آزاد کی زبانی بھی آیت کی تشریح سن لیجئے افسوس کہ مولانا کی تفسیر البیان شائع نہ ہو سکی۔ تشنہ کام لوگوں کے لیے بہت بڑی علمی سیرابی کا سامان ہو جاتا۔ اللھم اغفر لہ وارحمہ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اسی حکم کا ذکر ہے جو اوپر گذر چکا ہے یعنی آیندہ سے کوئی مشرک اس عبادت گاہ میں جو حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام نے

خدائے واحد کی پرستش کے لیے بنائی تھی داخل نہ ہو سکے گا۔ اور یہ مقام امت مسلمہ کے لیے مرکز ہدایت بن کر رہے گا جیسا کہ فی الحقیقۃ اسے ہونا چاہیے۔

اس آیت میں مشرکوں کے نجس ہونے سے مقصود ان کی قلبی نجاست ہے نہ کہ جسمانی کیونکہ اسلام کسی انسانی جسم کو ناپاک نہیں قرار دیتا۔ اور ہر انسان کو انسان ہونے کے لحاظ سے ایک درجہ پر رکھتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ اسلام نے چھوت چھات کی ہر قسم اور ہر شکل کو ناجائز قرار دیا ہے۔ خود پیغمبر اسلام کا یہودیوں اور مشرکوں سے ہر طرح کی معاشرت رکھنا۔ ایک ساتھ کھانا پینا ان کی دعوتوں میں جانا اور انہیں دعوتوں میں بلانا حتیٰ کہ انہیں مسجد میں ٹھہرانا ثابت ہے۔ لایقربوا المسجد الحرام کا حکم بالاتفاق مسجد حرام سے تعلق رکھتا ہے۔ عام مساجد میں غیر مسلموں کے لیے کوئی شرعی روک نہیں ہے چنانچہ پیغمبر اسلام نے یمن کے عیسائیوں اور طائف کے مشرکوں کو اپنی مسجد میں ٹھہرایا تھا۔[1]

معاشی بدحالی کا اندیشہ

(۲۶) اور اگر تمہیں اس وجہ سے معاشی بدحالی کا اندیشہ ہو تو گھبراؤ نہیں اللہ سبحانہ تمہیں اپنے فضل سے غنی بنا دے گا اللہ دانائی اور علم والا ہے۔ حرم میں مشرکین کی آمد و رفت بند کر دینے سے مسلمانوں کو اندیشہ ہوا کہ تجارت کو بڑا نقصان پہنچے گا۔ اور جو سامان تجارت یہ لوگ لاتے تھے وہ نہیں آئے گا اس لیے تسلی کر دی کہ اس سے نہ گھبراؤ تم کو غنا عطاء فرمانا محض اس کی مشیت پر موقوف ہے وہ چاہے گا تو کچھ دیر نہ لگے گی۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ خدا نے سارا ملک مسلمان کر دیا مختلف بلاد و امصار سے تجارتی سامان آنے لگا بارشیں خوب ہوئیں جس سے پیداوار بڑھ گئی۔ فتوحات و غنائم کے دروازے کھول دیئے۔ اہل کتاب وغیرہ سے جزیہ کی رقمیں وصول ہونے لگیں۔ غرض مختلف طریقے سے حق تعالیٰ نے غنا کے اسباب جمع کر دیئے۔ بے شک خدا کا حکم حکمت سے خالی نہیں۔[2]

مطلب ہے کہ مشرکین پر حرم میں داخل ہونے کی پابندی معاشی، تجارتی اور کاروباری حالات کے بگڑ جانے کا اندیشہ ہو۔ یہ اندیشہ والی بات اس لیے فرمائی ہے کہ حج کے زمانے میں باہر کا مال مکہ آتا اور مکہ کی چیزیں باہر کے تاجر خریدتے تھے۔ اس زمانے میں اس کاروباری پہلو کو اس قدر اہمیت ہو گئی کہ حج کا زمانہ اسی کاروباری پہلو سے متعین ہوتا قریش نے نسی کا قاعدہ ایجاد کر کے حج کا ایک خاص موسم متعین کر دیا تھا تاکہ موسمی تغیرات تجارتی کاروباری گرما گرمی میں رکاوٹ نہ بنیں۔ اب ۹ھ میں اسلام کی جانب سے جب اعلان ہوا کہ آیندہ مشرکین حج نہیں کر سکتے تو ان کو تشویش لاحق ہوئی جو کاروباری زندگی سے تعلق رکھتے تھے ان کو خیال آیا کہ مشرکین کو روک دینے سے کاروبار اور تجارت پر برا اثر پڑے گا جس سے مسلمانوں کی معاشی حالت بد سے بدتر ہو جائے گی۔ ظاہر ہے یہ سوچ ان کو ہی ہوئی ہو گی جن کی معیشت کا دار و مدار حج پر تھا اور یہ مکہ کے ان نو مسلموں کے سوا کون ہو سکتا ہے۔ انہوں نے کہا ہو گا۔ پھر ہم کہاں

[1] ترجمان قرآن

[2] افادات شیخ الاسلام

گے کہاں سے، کھانے کا انتظام کیا ہوگا؟ ورنہ مہاجرین وانصار تو یہ بات نہیں کہہ سکتے تھے کیونکہ ان کی معیشت کا کوئی تعلق حج سے نہ تھا۔
اللہ سبحانہ نے ان لوگوں کو مطمئن کرنے کے لیے فرمایا کہ معاشی بدحالی کا غم نہ کرو اللہ اگر چاہے گا تو اپنے فضل سے تمہیں غنی بنا دے
گا چنانچہ یہ واقعہ ہے کہ اللہ سبحانہ کا یہ وعدہ پورا ہوا اور اس طرح پورا ہوا کہ ایک دن کے لیے بھی تجارت اس قانون سے متاثر نہ ہوئی
اور کچھ عرصہ بعد تو یہ حال ہوا کہ مصر و شام اور روم و ایران کے خزانے بھی اونٹوں پر لد لد کر اسلامی حکومت کے سرکاری خزانے میں پہنچنے
لگے اور اللہ نے اپنے فضل سے اس طرح غنی کر دیا کہ لوگ اپنی زکوٰۃ کا مال مدینہ کی گلیوں میں لیے پھرتے تھے لیکن اس کا لینے
والا کوئی نہیں ملتا تھا۔

ان شاء اگر چاہے گا اس سے اس حقیقت پر متوجہ کرنا مقصود ہے کہ اس وعدہ کو پورا کرنے کے لیے کسی لمبے چوڑے
سامان کی ضرورت نہیں ہے محض اس کی مشیت کافی ہے۔ چنانچہ جب اس کی مشیت ہوئی سارا ملک اسلام کے زیر نگین آگیا۔
سامان تجارت دور دور سے آنے لگا بارشیں اچھی ہوئیں۔ پیداوار خوب ہونے لگی۔ فتوحات اور غنیمتوں کے دروازے کھل گئے
غرض مشیت کی ایک حرکت نے اسباب غنا جمع کر دیئے۔ فقہائے مفسرین نے آیت سے یہ بھی استنباط کیا ہے کہ رزق کے باب
میں تعلق خاطر اسباب ظاہری سے رکھنا جائز ہے اور توکل کے منافی نہیں۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں۔

اس آیت میں اس بات کی دلیل ہے کہ دل کا تعلق اسباب سے توکل کے منافی نہیں ہے۔

اور یہ بھی علماء نے اس آیت سے بات سمجھی ہے کہ روزی محنت کا نتیجہ نہیں بلکہ عطیہ خداوندی ہے جیسا کہ علامہ قرطبی نے
تفسیر میں لکھا ہے۔

اور یہ بھی اس کے ساتھ اس انشاء اللہ سے معلوم ہو رہا ہے کہ رزق کے لیے اللہ سبحانہ کی سنت یہ ہے کہ وہ وسائل اور
ذرائع سے حاصل ہوتا ہے۔ وسائل کے بغیر رزق کا حصول اللہ کی سنت کے خلاف ہے۔ اسی لیے ان سے کہا گیا ہے جس کا حاصل
یہی ہے کہ ثمرہ کا ہونا یقینی نہیں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اگر اسباب کی بجا آوری تم نے کی تو غنا حاصل ہونے کے لیے فضل خداوندی ہوگا
چونکہ اللہ کی مشیت کا ظہور اللہ کے علم و حکمت کے تحت ہوتا ہے اس لیے فرمایا ان اللہ علیم حکیم۔

قَاتِلُوا الَّذِينَ لَا يُؤْمِنُونَ بِاللَّهِ وَلَا بِالْيَوْمِ الْآخِرِ وَلَا
يُحَرِّمُونَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ وَرَسُولُهُ وَلَا يَدِينُونَ دِينَ الْحَقِّ
مِنَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ حَتَّىٰ يُعْطُوا الْجِزْيَةَ عَن يَدٍ
وَهُمْ صَاغِرُونَ ﴿۲۹﴾

جنگ کرو ان اہل کتاب سے جو نہ تو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت پر اور نہ حرام کرتے ہیں ان چیزوں کو جن کو اللہ و رسول نے حرام کیا اور نہ دین حق کی اطاعت کرتے ہیں یہاں تک وہ جزیہ دیں اپنی کشائش سے چھوٹے اور محکوم بن کر ۲۷ء

مفردات کے معانی

الجزیۃ عربی میں جزیہ خراج کے معنی میں بولا گیا ہے جو اراضی سے وصول کیا جاتا ہے اور ٹیکس کے لیے بھی جو اشخاص پر عائد ہوتا ہے۔ ایران و روم میں اس طرح کے ٹیکس لیے جاتے تھے۔ خود جزیہ کا لفظ بھی ایران کی پیداوار ہے یعنی فارسی لفظ گزیت کا معرب ہے۔ اس بارے میں مولانا شبلی مرحوم نے جو کچھ لکھا ہے وہ زمانہ حال کی نہایت قیمتی تحقیق ہے۔ اس کے اصل معنے جنگی ٹیکس کے ہیں۔ مولانا فرماتے ہیں دو ہی احتمال ہیں ایک یہ کہ لفظ جزیہ فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں ایک ہی معنے میں استعمال ہوا ہے۔ دوسرا یہ کہ اصل لفظ فارسی ہے اور فارسی سے عربی میں آیا ہے جیسے اور بہت سے فارسی الفاظ اہل عرب نے لے لیے ہیں عن ید اصل معنے تو ہاتھ کے ہیں لیکن یہاں وسعت اور کشائش سے کنایہ ہے یعنی ان سے لیا جائے جن کے ہاتھ میں ہو اور ہاتھ سے دیں اور جن کے پاس کچھ نہ ہو اور دینے میں ان کے ارادے کو دخل نہ ہو ان سے نہ لیا جائے جیسے بچے عورتیں صاغرون صغر سے ہے کبر کی ضد اس کے معنے چھوٹا ہونا یعنی محکوم اور اسلامی حکومت کے شہری بن کے رہنے کے ہیں۔

اہلِ کتاب سے قتال کا حکم

پہلی آیات میں ان مشرکین سے معاہدے ختم کرنے کا ذکر ہے جنھوں نے عہد کی خلاف ورزیاں کی تھیں یا جن کے معاہدے میعادی تھے اس آیت میں ان یہودیوں اور عیسائیوں سے تمام معاہدات فسخ کرنے کا حکم دیا ہے جنھوں نے یکے بعد دیگرے معاہدوں کی خلاف ورزیاں کی تھیں اور مسلمانوں کے امن و عافیت کے خلاف ایک بڑا خطرہ بن گئے تھے اور حکم دیا ہے کہ مشرکین عرب کی طرح ان سے بھی اعلانِ جنگ کرو۔

حضور اقدس ﷺ مدینہ تشریف لائے تو حجاز میں یہود کی متعدد جماعتیں آباد تھیں۔ لیکن عیسائیوں کی کوئی قریب آبادی نہ تھی وہ یا تو یمن میں تھے یا عرب و شام کے سرحدی علاقے میں۔ یہودیوں کا جو طرزِ عمل رہا اس کا حال آپ پہلے سن چکے ہیں۔ عیسائیوں کی حالت یہودیوں سے مختلف تھی۔ یمن کے عیسائیوں نے ابتداء ہی سے موافقانہ روش اختیار کی تھی اور خود اپنی خوشی سے جزیہ دینا قبول کر لیا تھا۔ پھر اسلام نے خود بخود اپنی راہ نکال لی لیکن آگے چل کر جب دعوتِ اسلام نمودار ہوئی تو وہ عیسائی ریاستیں جو عرب اور شام کے سرحدی علاقہ میں تھیں اور رومی حکومت کے ماتحت تھیں اسلام کی دعوت کی وسعتوں کو دیکھ نہ سکیں اور رومی حکومت کی اعانت پر مغرور ہو کر مسلمانوں سے جنگ کے لیے تیار ہو گئیں۔ سب سے پہلا معاملہ حضرت حارث بن عمیر رضی اللہ عنہ کی شہادت کا پیش آیا۔ حضور اقدس ﷺ نے ان کو اسلام کی دعوت کا خط دے کر موتہ بھیجا تھا۔ موتہ کا رئیس شرجیل بن عمرو غسانی تھا۔ اس نے حضرت حارث رضی اللہ عنہ کو بغیر کسی جرم کے قتل کر دیا۔ حضور اقدس ﷺ اس کھلے ظلم کے خلاف جنگ پر مجبور ہو گئے۔ اور ۸ھ میں ایک فوج روانہ کی گئی۔ اس وقت شہنشاہ قسطنطنیہ بھی شام میں مقیم تھا اس سے رئیس موتہ نے مدد مانگی۔ اور شاہی فوج بھی میدان میں آگئی۔ لیکن فتح مسلمانوں کی ہوئی۔

اس واقعے کے بعد شام کے تمام عرب قبائل نے سنگھٹن قائم کر کے مسلمانوں پر حملہ کا ارادہ کر لیا اور قسطنطنیہ کے بادشاہ نے ان کو مدد دینے کا فیصلہ کر لیا۔ ابھی ایک سال نہ گذرا تھا کہ شاہی فوجیں شام میں جمع ہونے لگیں اور حضور اقدس ﷺ کو خود دفاع کے لیے جانا پڑا۔ اسی کا نام تبوک کا غزوہ ہے۔

اس سورت کی یہ آیات اس واقعے کے بعد نازل ہوئیں۔ چونکہ اب مسلمانوں پر ان کی جانب سے سخت حملہ ہونے والا تھا۔ اور دوسری طرف عرب کے یہودی سازشوں میں لگے ہوئے تھے اس لیے ضروری ہو گیا تھا کہ مشرکین کی طرح ان یہودیوں اور عیسائیوں کے خلاف بھی اعلانِ جنگ کیا جائے۔

جیسے مشرکین سے ساری دنیا کے مشرکین مراد نہیں ایسی ہی عیسائی اور یہود سے سارے جہان کے عیسائی اور یہود مراد نہیں بلکہ وہی مراد ہیں جنھوں نے اسلام کی راہ روکی یا جو قیامت تک روکتے رہیں گے۔

(۲۷) جنگ کرو ان اہلِ کتاب سے جو نہ تو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں اور نہ آخرت پر اور نہ حرام کرتے ہیں ان چیزوں کو جن کو اللہ اور رسول نے حرام کیا اور نہ دینِ حق کی اطاعت کرتے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ جزیہ دیں کشائش سے عاجز اور محکوم بن کر۔ جب مشرکین کا قصہ پاک ہو گیا اور ملکی سطح ذرا ہموار ہوئی تو حکم ہوا کہ اہلِ کتاب یہود و نصاریٰ کی قوت توڑ دو۔ مشرکین کے وجود سے تو بالکل عرب کو پاک کر دینا مقصود تھا لیکن یہود و نصاریٰ کے متعلق اس وقت صرف اسی قدر مطمح نظر تھا کہ وہ اسلام کے مقابلہ میں زور نہ پکڑیں اور اس کی اشاعت و ترقی میں حائل نہ ہوں۔ اس لیے اجازت دی گئی کہ اگر یہ لوگ ماتحت رعیت بن کر جزیہ دینا منظور کر لیں تو کچھ مضائقہ نہیں قبول کر لو پھر حکومتِ اسلامیہ ان کے جان و مال کی محافظ ہو گی ورنہ ان کا علاج بھی وہی ہے جو مشرکین کا تھا یعنی مجاہدانہ قتال کیونکہ یہ بھی اللہ اور یومِ آخرت پر جیسا چاہئے ایمان نہیں رکھتے نہ خدا اور رسول کے احکام کی کچھ پروا کرتے ہیں رسول کریم ﷺ تو کجا اپنے تسلیم کردہ نبی حضرت مسیح علیہ السلام کی بھی پیروی نہیں کرتے ہیں محض اہواء و آراء کا اتباع کرتے ہیں جو سچا دین پہلے آیا یعنی حضرت مسیح وغیرہ کے زمانہ میں اور جو نبی آخر الزماں لے کر آئے کسی کے قائل نہیں بلکہ جیسا کہ عنقریب آتا ہے اس کوشش میں لگے رہتے ہیں کہ خدا کا روشن کیا ہوا چراغ اپنی پھونکوں سے گل کر دیں۔ ایسے بدباطن نالائقوں کو اگر یوں ہی چھوڑ دیا جائے تو ملک میں فتنہ و فساد اور کفر و تمرد کے شعلے بھڑکتے رہیں گے [1]

آیئے شیخ الاسلام نے جو کچھ اختصار سے فرمایا ہے اس کی تفصیل گوش گذار فرما لیجئے۔

یہاں کچھ اہم باتیں سمجھنے کی ہیں۔

اقوامِ دنیا کی قانونی تقسیم

اوّل یہ کہ حضور اقدس ﷺ نے دنیا کی قوموں کو چار حصوں میں تقسیم فرمایا۔ اور ان کے علیحدہ علیحدہ حقوق فرمائے جن پر اسلام کی تیرہ صدیوں سے برابر عمل ہو رہا ہے۔

۱۔ مسلمان جو قرآن اور دوسری آسمانی کتابوں کو مانتے ہیں ان میں سے ہر ایک دوسرے کا بھائی اور ہر اچھائی اور برائی میں ایک دوسرے کا شریک ہے وہ آپس میں ایک دوسرے سے شادی کر سکتے ہیں اور ایک دوسرے کے ہاتھ کا ذبح کیا کھا سکتے ہیں۔ ان سے جنگ حرام ہے اگر ان میں کوئی طبقہ اسلامی حکومت کا باغی ہو جائے تو ان کے اموال غنیمت نہیں اسلامی حکومت میں ان کے حقوق برابر ہیں۔

۲۔ مشرکین عرب یعنی وہ لوگ کہ اللہ تعالیٰ نے ان میں ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا۔ ان ہی کی زبان میں ان پر کتاب نازل ہوئی اسی ملت کی ان کو دعوت دی گئی جس کے وہ مدعی تھے۔ رسول اللہ نے مسلسل ۲۳ سال تک ان پر محنت کی ان کو جگایا۔ ان کی

[1] افاداتِ شیخ الاسلام

ہر مجلس اور بزم میں ان کے ایک ایک دروازے پر آپ نے دستک دی۔ ان کے ایک ایک شبہ اور اعتراض کا جواب دیا۔ ان کی تمام الزام تراشیوں تہمتوں اور عداوتوں کا مقابلہ کیا۔ ان کے مطالبہ پر معجزے بھی دکھائے اور ان کی امتحانی کسوٹیوں پر بھی اپنے کو کھرا اور سچا ثابت کر دکھایا ان کا حکم یہ ہے کہ ان سے اسلام اور صرف اسلام قبول کیا جائے نہ ان کو اسلامی مملکت کا شہری بنایا جائے اور نہ ان کو غلام بنایا جائے ان کے لیے صرف دو ہی راستے ہیں لا یقبل من مشرکی العرب الا الاسلام او السیف یعنی اسلام یا تلوار تیسرا راستہ ان کے لیے کوئی نہیں ہے۔

۲۔ اہل کتاب یعنی ان کتابوں کے پیرو جن کے نام قرآن حکیم میں آئے ہیں یا یوں کہو کہ جو لوگ گرچہ قرآن کو آسمانی کتاب نہیں مانتے مگر ان کتابوں میں سے جن کا نام قرآن میں ہے کسی کو وہ آسمانی کتاب مانتے ہیں وہ اپنی حفاظت کا مالی ٹیکس جزیہ ادا کر کے اسلامی حکومتوں میں رہ سکتے ہیں ان کے معابد اور مذہبی عمارتیں محفوظ رہتی ہیں۔ انکو مذہب بدلنے پر مجبور نہیں کیا جاتا۔ ان کی جان و مال اور عزت و آبرو کے مسلمان محافظ ہوتے ہیں انکی عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتے ہیں۔ ان کے ہاتھ کا ذبح کیا ہوا جانور مسلمان کھا سکتے ہیں ان کا جائز کھانا کھا سکتے ہیں اور ہم اپنا کھانا ان کو کھلا سکتے ہیں۔

۳۔ شبہ اہل کتاب یعنی وہ لوگ جو قرآن اور تورات و انجیل و زبور کو نہیں مانتے مگر وہ خود اپنے لیے کسی آسمانی کتاب پر ایمان لانے کے مدعی ہیں جیسے صابی جو ایک آسمانی کتاب کے دعوے کے باوجود ستاروں کو پوجتے ہیں اور مجوس جو ایک آسمانی کتاب رکھنے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ساتھ ہی سورج آگ اور دیگر مظاہر قدرت کی پرستش کرتے ہیں۔ ترکستان اور سندھ کی فتح کے موقع پر علمائے اسلام نے ان ہی پر قیاس کر کے ہندوؤں اور بدھوں وغیرہ کو بھی اسی صنف میں داخل کیا۔ مسلمان ان کی عورتوں سے نکاح نہیں کر سکتے اور ان کا ذبیحہ نہیں کھا سکتے۔ ان دو باتوں کے علاوہ اہل کتاب کے بقیہ تمام حقوق حضور اقدس ﷺ نے ان کو عطا کیے ہیں۔ وہ اسلامی حکومتوں میں ادائے جزیہ کے بعد ہر قسم کے ملکی حقوق میں شریک ہیں۔ ان کی جان و مال آبرو اور ان کے معبدوں کی حفاظت اسلامی حکومتوں کا فرض ہے۔

جزیہ کی قانونی تقسیم اور اس کا حکم

دوسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ آیت میں جو حکم بیان ہوا ہے وہ ان اہل کتاب کا ہے جنھوں نے مسلمانوں سے جنگ کی ہو اور شکست کھا کر اس کی طاعت پر مجبور ہوئے ہوں وہ اہل ذمہ اس سے بالکل الگ ہیں جن کو فقہا نے معاہد یا اہل صلح سے تعبیر کیا ہے۔ معاہد اہل ذمہ سے وہ لوگ مراد ہیں جنھوں نے بغیر جنگ و قتال کے بطور خود اپنی مرضی سے اسلامی حکومت کا شہری بن کر رہنا پسند کیا ہو۔ ان لوگوں کے ساتھ حکومت اسلامی اس عہد نامے کے مطابق معاملہ کرے گی جو ان کے اور حکومت کے درمیان طے ہوا ہے۔ ان لوگوں سے جو بھی معاہدہ طے پا جائے بلا کسی معقول وجہ کے اس کو توڑنے کی اسلام میں سخت ممانعت

آئی ہے۔ اسی طرح جزیہ کی دو قسمیں ہوتی ہیں۔ جزیہ صلحی۔ جزیہ قہری، جو جزیہ بطور صلح مقرر ہوا ہو وہ جزیہ صلحی ہے اس کی کوئی مقدار مقرر نہیں ہے باہمی رضامندی سے جو بھی طے ہو جائے وہی لیا جاتا ہے۔ اس میں کمی بیشی اور تبدیلی روا نہیں ہے کیونکہ اس کو بدل ڈالنا عہد شکنی ہے اور اسلام میں عہد شکنی کی کسی حال میں اجازت نہیں ہے بلکہ یہاں تک لکھا ہے کہ اگر اسلامی حکومت نے کسی آبادی سے کچھ بدل صلح لے کر مصالحت کی ہو مثلاً تین سال کے لیے معاہدہ ہوا ہے اور بدل صلح ان سے تین لاکھ روپیہ ہے اگر اسلامی حکومت عہد ختم کرنا چاہتی ہے اور مدت سے پہلے ختم کرنا چاہتی ہے مثلاً دو سال میں تو حکومت اسلامی عہد ختم کرنے کی دو شرطوں کے ساتھ مجاز ہے۔

اول یہ کہ عہد شکنی کی ان کو اطلاع کرے۔

دوسرے یہ اگر ایک سال میں معاہدہ ختم کیا ہے تو دو لاکھ روپیہ واپس کرنا ہوگا۔ قہری جزیہ وہ ہے جو کافروں کے میدان جنگ میں مغلوب ہو جانے کے بعد ان کو املاک پر قابض رکھنے کے بعد لیا جائے۔

غیر مسلموں سے جزیہ کیوں لیا جاتا ہے

تیسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ قرآن نے غیر مسلموں سے جزیہ لینے کا حکم کیوں دیا اس لیے کہ حق و انصاف کا تقاضا یہی تھا اور اس لیے کہ وہ چاہتا تھا کہ مسلمانوں کی مملکت میں غیر مسلموں پر اس قدر بوجھ نہ ڈالا جائے جتنا بوجھ مسلمانوں پر ڈالا جائے گا۔

اسلام نے مسلمانوں پر جنگی خدمت فرض کی تھی یعنی آج کل کی اصطلاح میں فوجی بھرتی جبری تھی اور اس لیے ضروری تھا کہ جو غیر مسلم اسلامی حکومت میں شہری زندگی بسر کریں وہ بھی ملک کی حفاظت کے لیے جنگ میں شریک ہوں لیکن اسلام نے اسے خلاف انصاف سمجھا کہ اس معاملے میں غیر مسلموں پر جبر کیا جائے۔ اس نے یہ بات ان کی مرضی پر چھوڑ دی کہ اور کہا کہ اگر خود اپنی خوشی سے چاہو تو جنگی خدمات میں مسلمانوں کی طرح شریک ہو۔ نہ شریک ہونا چاہو تو اس کے بدلے اپنی حفاظت کے لیے سالانہ رقم ادا کرو۔ اسی حفاظتی رقم کا نام جزیہ ہے۔

فی الواقع انسان کے عقائد و جذبات کی آزادی کا یہ ایسا اعتراف تھا جس کا اس زمانے میں کوئی دوسری قوم تصور بھی نہیں کر سکتی تھی۔ جنگ کے لیے نکلنا اپنی جان کو ہتھیلی پر رکھ لینا ہے اسلام مسلمانوں کو اس کے لیے مجبور کر سکتا ہے لیکن اسے کیا حق ہے کہ غیر مسلموں کو اس کے لیے مجبور کرے۔

صحابہ کرام کے زمانے میں غیر مسلموں کو سرکاری فرامین دیئے گئے ان میں صاف صاف اس کی تصریح ہے کہ جو فوج میں شریک ہوگا اس سے جزیہ نہیں لیا جائے گا جو نہ ہوگا اس سے جزیہ لیا جائے گا۔ الجصاص نے اس موقعہ پر یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے۔

قرآنی آیت کا مضمون کہہ رہا ہے کہ جزیہ صرف ان سے لیا جائے گا جن میں میدانِ جنگ میں جاکر جنگ کی صلاحیت ہے۔ کیونکہ جن میں مقاتلہ کی صلاحیت نہیں ہے وہ آیت قرآنی کے مخاطب نہیں مقاتلہ تو صرف جانبین میں ہی ہو سکتا ہے۔ اس لیے جزیہ صرف ان لوگوں سے لیا جائے گا جن میں لڑنے کی صلاحیت ہے۔

قرآن کے اسی اشارے سے سمجھ کر صحابہ نے یہ فیصلہ کیا تھا۔

ہمارے ذمہ اس شرط پر تمہاری حفاظت ہے کہ تم کو بقدرِ استطاعت جزیہ دینا ہوگا اور اگر ہم تم سے مدد لیں گے تو اس کے بدلہ میں جزیہ معاف کر دیا جائے گا[1]

آذربائیجان کی فتح میں یہ معاہدہ لکھا گیا۔

جو لوگ کسی سال فوج میں کام کریں گے تو اس سال کا جزیہ ان سے نہ لیا جائے گا[2]

یہ غیر مسلموں سے جزیہ لینے کی پہلی علت ہے۔

دوسری علت جزیہ لینے کی یہ ہے کہ اسلام نے مسلمانوں پر کئی طرح کے ٹیکسوں کا بوجھ ڈالا ہے۔ زکوٰۃ ان کو ادا کرنی پڑتی ہے عام صدقات و خیرات میں ان کو حصہ لینا پڑتا ہے۔ جنگ آجائے تو اس کا بوجھ بھی ان کو اٹھانا پڑتا ہے۔ اس لیے ضروری تھا کہ غیر مسلم شہریوں پر ایسا ہی بوجھ ڈالا جاتا۔ کیونکہ آزادی حقوق کے معاملہ میں مسلمان اور غیر مسلم میں کوئی فرق نہیں ہے۔ ان تمام ٹیکسوں سے مستثنیٰ کر کے جو مسلمانوں پر عائد کیے تھے صرف جزیہ کی صورت میں ٹیکس ان پر رکھا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غیر مسلموں پر بوجھ بھی نہ ہوا اور حقوق سب کے سب برابر رہے یعنی اگر ایک غیر مسلم فوجی خدمت سے انکار نہ کرے تو وہ اسلامی حکومت میں آزادی اور حقوق کی ویسی ہی زندگی بسر کرے گا جیسی ایک مسلمان بسر کر سکتا ہے لیکن مسلمان کی طرح اس پر سرکاری واجبات بالکل نہ ہوں گے کیا اس کی کوئی مثال پوری دنیا کی تاریخ پیش کی جا سکتی ہے۔ کسی قوم کے حقوق صرف چار چیزوں سے متعلق ہوتے ہیں جان مال آبرو مذہب۔ ان کے سوا جتنے حقوق ہیں وہ سب انہی کے تحت آتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے تمام مفتوحہ قوموں کے ان تینوں بنیادی حقوق کو محفوظ قرار دیا بیت المقدس کے عیسائیوں کو از روئے معاہدہ جو حقوق دیئے وہ یہ تھے

یہ وہ امان ہے جو خدا کے بندے امیر المومنین عمر رضہ نے اہل ایلیا کو دی۔ یہ امان جان مال، گرجا صلیب تندرست بیمار اور ان کے تمام اہل مذاہب کے لیے ہے نہ ان کے گرجا میں سکونت اختیار کی جائے گی۔ نہ وہ ڈھائے جائیں گے نہ ان کے احاطہ کو نقصان پہنچایا جائے گا نہ ان کی صلیبوں اور ان کے مال میں کچھ کمی کی جائے گی۔ مذہب کے بارے میں ان پر جبر نہ کیا جائے گا نہ ان میں سے کسی کو نقصان پہنچایا جائے گا[3]

یہ صرف ایلیا ہی تک محدود نہیں۔ جرجان، آذربائیجان اور موقان کے معاہدوں میں اسی قسم کی تصریحات پائی جاتی ہیں

---

[1] طبری تاریخ　[2] تاریخ طبری　[3] طبری حالات بیت المقدس

سب کا نقل کرنا یہاں دشوار ہے۔

اس سے یہ بات واضح ہو کر سامنے آگئی کہ جزیہ بدل ہے غیر مسلموں کی جانوں، مالوں، آبرو اور ان کے مذہب کے امان اور تحفظ کا۔ ان کی طرف اب شہری زندگی میں کسی کو میلی نگاہ سے دیکھنے کی بھی اجازت نہ ہوگی نہ خود مسلمان ان کی جان مال آبرو اور دین سے تعرض کریں گے اور نہ کسی کو تعرض کرنے دیں گے۔ تاریخ کی گواہی ہے کہ یرموک کے معرکہ کے سلسلے میں مسلمان جب غیر مسلم شہریوں کی حفاظت سے معذور ہو گئے تو جزیہ کی کل وصول شدہ رقم واپس کر دی۔ حضرت ابو عبیدہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سپہ سالار افواج شام اور تمام اضلاع کے حکام کو لکھ کر بھیجا کہ جتنا جزیہ وصول ہو چکا ہے سب واپس کر دیا جائے [1]

جزیہ کن سے وصول کیا جائے

یہ تو آپ الجصاص کے حوالے سے پڑھ چکے ہیں کہ جزیہ صرف مقاتلین سے وصول کیا جاتا ہے یعنی جن میں میدان جنگ میں جانے کی صلاحیت ہو ان کا تعلق خواہ کسی طبقے سے ہو اس کا مطلب ہے کہ اندھے سے کوڑھی سے مفلوج سے بوڑھے گرجوں میں رہنے والے پادریوں، سیاحت کرنے والوں سے عورتوں سے بچوں سے جزیہ نہ لیا جائے۔ الجصاص نے اس کی وجہ یہی بتائی ہے لیسوا من اھل القتال۔ علامہ موصلی نے لکھا ہے کہ:

بچوں پر عورتوں پر پاگلوں پر غلاموں پر بدل کتابت والوں پر اپاہجوں پر اندھوں پر، گنٹھیا کے بیماروں پر بڈھوں پر گوشہ نشین راہبوں پر نکمے فقیر پر کوئی جزیہ نہیں [2]

ان کی وجہ یہی بتائی ہے کہ یہ لوگ میدان جنگ کے ہیرو نہیں ہیں۔ اس لیے ان سے جزیہ نہ لیا جائے۔ بلکہ ان معذورین کی خود اسلامی حکومت کفالت کرتی تھی۔ قاضی ابو یوسف کتاب الخراج میں حیرہ کے فتح کے معاہدہ میں رقم طراز ہیں:

اگر اسلامی مملکت کا کوئی بوڑھا شہری کام کرنے سے رہ جائے یا کوئی آفت آجائے یا دولت مندی کے بعد غریب ہو جائے اور اس کے اہل مذہب اس کو خیرات دینے لگیں تو اس کا جزیہ ختم کر دیا جائے گا اور اس کی اولاد کو سرکاری خزانہ سے خرچ دیا جائے گا۔

یہ معاہدہ حضرت ابو بکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانے میں ہوا تھا حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بھی اسی پر عمل ہوتا رہا بلکہ آپ نے اس کو قرآنی استدلال سے اور زیادہ مؤکد بنا دیا۔ ایک بار ایک بوڑھے غیر مسلم شہری کو بھیک مانگتے دیکھا پوچھا بھیک کیوں مانگتے ہو اس نے کہا کہ مجھ پر جزیہ لگایا گیا ہے اور مجھ میں ادا کرنے کی قدرت نہیں ہے یہ سن کر آپ اسے اپنے

---

[1] کتاب الخراج

[2] الاختیار لتعلیل المختار

گھرے گئے اور کچھ نقد روپے دیے کر داروغے سے کہلا بھیجا کہ اس فقیر کے معذوروں کا سرکاری خزانہ سے وظیفہ مقرر کریں۔ قرآنی آیت انما الصدقات للفقراء میں فقراء اہل کتاب بھی داخل ہیں واللہ یہ انصاف نہیں کہ ان لوگوں کی جوانی کی توانائی سے ہم فائدہ اٹھائیں اور بڑھاپے میں نکال دیں۔[1]

جزیہ کی تاریخ اور تقدیر

یہ سورۂ برأت کی آیت ہے اور یہ سورت فتح مکہ کے بعد نازل ہوئی۔ فتح مکہ کے بعد عرب جوق در جوق اور فوج در فوج اسلام میں داخل ہونے لگے۔ اور تقریباً عرب کے تمام قبائل میں اسلام کی نشر و اشاعت ہوگئی اب عربوں سے جنگ کی ضرورت باقی نہ رہی اسی سے پہلا حملہ تبوک پر ہوا اور یہیں ایلہ کے رئیس صاحب دومۃ الجندل نے جزیہ قبول کیا پھر اس کے بعد نجران کے عیسائیوں نے جزیہ دینا قبول کیا جزیہ کے بدلے ان سے عہد کیا گیا کہ ان کا کوئی گرجا گرایا نہ جائے گا اور ان کا کوئی پادری نکالا نہ جائے گا۔ اور نہ ان کو اپنا دین چھوڑنے پر مجبور کیا جائے گا تاوقتیکہ کوئی نئی بات نہ کریں اور سودی کاروبار نہ کریں۔

حضور اقدس ﷺ نے حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کو جزیہ وصول کرنے کے لیے یمن روانہ کیا اور حکم دیا کہ ہر بالغ مرد سے ایک دینار نقد یا اس کی قیمت کا معافری کپڑا وصول کریں یہ یہودی تھے۔

حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بتایا کہ ہجر کے مجوسیوں سے حضور اقدس ﷺ نے جزیہ لیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ مجوسیوں کے بارے میں متردد تھے مگر اس شہادت کے بعد انھوں نے مجوسیوں سے جزیہ قبول کیا۔

الغرض جزیہ کی ابتدا تبوک کے بعد ہوئی اور تین قوموں سے جزیہ خود حضور ﷺ نے قبول کیا۔

۱- نجران اور ایلہ کے لوگوں سے جو نصرانی تھے۔

۲- دومۃ الجندل سے جس میں اکثر یہودی تھے۔

۳- ہجر کے مجوس سے۔

اگرچہ کسی بُت پرست سے حضور اقدس ﷺ کا جزیہ قبول کرنا ثابت نہیں ہے لیکن بت پرستی اور آتش پرستی میں کوئی فرق نہیں ہے صحیح یہ ہے کہ مجوس نہ کسی آسمانی کتاب پر ایمان رکھتے ہیں نہ کسی نبی کے پیرو ہیں۔ بعض روایات میں جو آیا ہے کہ ان کی آسمانی کتاب بھی وہ اٹھالی گئی اوّل یہ روایت صحیح نہیں ہے۔ دوئم اگر بالفرض ایسا ہو بھی تو یہ ان کے زیادہ منسوب من اللہ ہونے کی دلیل ہے۔ بعض وجوہ سے مجوسیوں کی حالت زیادہ خراب ہے کیونکہ مجوسی ایک خالق کے بھی قائل نہیں وہ خالق خیر اور خالق شر علیحدہ علیحدہ مانتے ہیں بُت پرست ایک خالق کے قائل ہیں۔ مجوسی محرمات ابدیہ یعنی اپنی بیٹی اور بہن سے نکاح درست کہتے

[1] کتاب الخراج

ہیں۔ بُت پرست ان لغویات کے قائل نہیں ہیں۔ جب ان خرابیوں کے باوجود سے جزیہ لے کر ان کو اپنے دین پر رہنے کی اجازت دی گئی ہے تو بُت پرستوں کو یہ اجازت کیوں حاصل نہ ہوگی بلکہ اس آیت میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ مشرکین سے بدرجہ اولیٰ جزیہ لیا جائے کیونکہ یہ ظاہر ہے من الذین اوتوا الکتاب میں من بیانیہ ہے لہذا سارے اہل کتاب بیان کردہ صفات سے موصوف ہوں گے۔ اس سے مراد وضع جزیہ بھی ہوا اور معلوم ہے کہ یہ صفات مشرکین میں بدرجہ اولیٰ پائی جاتی ہیں یعنی اللہ پر ایمان نہ رکھنا۔ آخرت کو نہ ماننا۔ خدا اور رسول کی حرام کردہ چیزوں کو حرام نہ کرنا۔ دین حق کی پیروی نہ کرنا۔ کیونکہ اہل کتاب توحید و معاد کا عقیدہ رکھتے ہیں گو اس میں غلطیاں کرتے ہیں اور مشرکین تو خود ان عقائد کے اصل ہی میں مخالف ہیں۔ جب مدار حکم شرکین میں زیادہ طاقت ور ہے تو اصل حکم بھی ان کے لیے بدرجہ اولیٰ ہوگا۔

باقی رہی یہ بات کہ حضور اقدس ﷺ نے بُت پرستوں سے جزیہ کیوں نہیں لیا اس کی وجہ شادی سے پہلے بتائی جاچکی ہے اور ویسے ہی ظاہر ہے کہ جزیہ کا جب حکم نازل ہوا اس سے پہلے تمام بت پرست قبائل میں اسلام پھیل چکا تھا اور اس کے بعد حضور کو بُت پرست قبائل سے جنگ کی نوبت نہیں آئی۔

آیت جزیہ سے قبل جن قبائل سے جنگ ہوئی ان پر نہ جزیہ لگایا گیا اور نہ لگایا جاسکتا تھا بت پرست ہوں یا اہل کتاب بنی قینقاع، بنی نضیر، بنی قریظہ، اہل خیبر سب اہل کتاب تھے مگر ان میں سے کسی سے حضور نے جزیہ نہیں لیا۔ کیونکہ جس وقت ان سے مقابلہ تھا اس وقت جزیہ کا حکم بھی نہ تھا۔ قرآن کی یہ آیت نازل ہی نہ ہوئی تھی۔

حضور اقدس ﷺ نے اہل ہجر کو اور منذرین ساوی کو اور دوسرے سربراہان مملکت کو خطوط روانہ کیے۔ ان میں بلا تفریق سب کو اسلام اور جزیہ کی دعوت دی۔ صحیح مسلم میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ جب دشمن سے لڑو تین باتوں کی دعوت دو۔

۱۔ وہ اسلام قبول کریں۔

۲۔ جزیہ دینا منظور کریں۔

۳۔ میدان میں آکر مقابلہ کریں۔

اس میں کوئی تفریق بت پرست اور اہل کتاب کی نہیں ہے۔ حضرت مغیرہ رضی اللہ عنہ کسریٰ کے عامل سے ملے تو فرمایا کہ ہمیں حکم ہے کہ ہم اس وقت تک تم سے جنگ کریں یا تو اسلام قبول کرلو۔ یا جزیہ دو۔

اسی لیے امام مالک، امام احمد اور امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ فرماتے ہیں کہ اہل کتاب اور بت پرست سب سے جزیہ قبول کرنا جائز ہے۔ لیکن صرف عرب کے بت پرستوں سے جزیہ نہیں لیا جائے گا۔

اولاً اس لیے کہ وہاں حضور کی نبوت ظاہر ہوئی اس لیے وہاں بُت پرستی ہرگز نہ رہنی چاہیے۔

ثانیاً اس لیے کہ وہ تمام قبائل مسلمان ہو گئے تھے پھر بت پرستی اگر وجود پذیر ہو سکتی تھی تو صرف ارتداد سے اور مرتد کے لیے بالاتفاق جزیہ نہیں ہے۔

ثالثاً اس لیے کہ حضورؐ کی وصیت ہے کہ جزیرہ عرب میں دو دین جمع نہیں ہو سکتے۔

حضور اقدس ﷺ نے نجران کے نصاریٰ سے جزیہ میں دو ہزار حلے لیے یمن کے یہود کے متعلق حضرت معاذ کو حکم دیا کہ ہر بالغ مرد سے ایک دینار لو اس سے معلوم ہوا کہ جزیہ کی کوئی خاص مقدار مقرر نہیں۔ اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جزیہ کے تین درجے مقرر کیے۔

غریبوں سے	بارہ درم سالانہ
متوسط لوگوں سے	چوبیس درم سالانہ
سرمایہ داروں سے	اڑتالیس ۴۸ درم سالانہ

ایک درم صرف ساڑھے تین ماشہ کا ہوتا ہے۔ اگر چاندی کی قیمت پچاس روپے تولہ ہو تو ایک درم چار روپے ۱۱ پیسہ کا تقریباً ہوتا ہے اس کا مطلب یہ ہوا کہ بارہ درم سالانہ تقریباً ۵۰ روپے ہوئے اس لحاظ سے گویا

غریبوں سے	پچاس روپے سالانہ
متوسط سے	سو روپے سالانہ
سرمایہ داروں سے	دو سو روپیہ سالانہ

بنتے ہیں۔ اس کا مقابلہ ان ٹیکسوں سے کیجئے جو غیر اسلامی حکومتیں لیتی ہیں اوروں کا پتہ نہیں مگر مشہور عیسائی مورخ جرجی زیدان نے تقابلی مطالعہ کرتے ہوئے جو بات لکھی ہے وہ سنانا چاہتا ہوں۔

مسلمانوں کو جزیہ کے نام سے جو رقم رومیوں اور ایرانیوں کو ادا کرنی پڑتی تھی ان ٹیکسوں کی مجموعی مقدار سے وہ بہت کم تھی جو یہی لوگ روم اور ایران کی حکومتوں کو دیتے تھے [1]

شائد آپ پوچھیں کہ یہ جزیہ اسلامی حکومت غیر مسلموں سے وصول کرتی تھی اس کا مصرف کیا تھا؟۔ الماوردی نے اس کا جواب الاحکام السلطانیہ میں دیا ہے وہ سن لیجئے۔

ضروری تھا کہ جزیہ کی رقم ذمیوں کی فلاح و بہبود، تعلیم و ترقی اور ان کی دوسری ضروریات پر صرف کی جائے۔

حافظ ابن الہمام نے فتح القدیر میں اس کے اور مصارف بھی لکھے ہیں۔ آیئے اب آیت قرآنی کے اجزاء پر بھی غور فرمائیے اس آیت میں مسلمانوں کو اہل کتاب سے قتال کرنے کا حکم دیا ہے اور اہل کتاب کے ذکر سے ان کا چار سلبی اوصاف کے ذریعے

[1] تاریخ التمدن الاسلامی

پھر پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ جن کا حال یہ ہے ان سے راستی صداقت اور پاس عہد کی کوئی اُمید نہیں ہو سکتی ہے ان سے جنگ کے سوا چارہ کار کوئی نہیں ہے۔

ان اہل کتاب کی سب سے پہلی صفت یہ بتائی ہے لایومنون باللہ ولاباليوم الآخر یعنی ان کا اللہ پر اور آخرت پر ایمان نہیں ہے۔ زبان سے وہ دعویٰ کرتے ہیں کہ اللہ پر اور آخرت پر ہمارا ایمان ہے لیکن قرآن کہتا ہے کہ وہ ایمان نہیں رکھتے ہیں شارحین قرآن یہاں ورطہ حیرت میں ہیں کہ دعوے کے باوجود ان سے ایمان کی کیوں نفی کی گئی۔ اگر یوں کہا جاتا کہ وہ اللہ کے رسول پر ایمان نہیں رکھتے تو بات کا ایک وزن ہوتا اور واقعہ کی تصویر ہوتی لیکن یہاں رسول کا کوئی ذکر نہیں ہے مرف اللہ اور آخرت پر ایمان کا ذکر ہے اور یہ بات سب جانتے ہیں کہ یہودی ہو یا عیسائی حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے تعلق کی وجہ سے خدا کو بھی مانتے ہیں اور آخرت کو۔

اس کشمکش سے نکلنے کے لیے شارحین قرآن نے جو راہیں تلاش کی ہیں وہ گوش گذار فرمایئے۔ صحابہ اور تابعین سے اس کوئی بیشتر چیز منقول نہیں ہے چنانچہ حافظ ابن جریر نے اس جملہ کی تفسیر کے بارے میں متقدمین شارحین سے کوئی بات نقل نہیں کی ہے۔ اس کی تشریح میں جو کچھ کہا ہے متاخرین کا سرمایہ ہے۔

حافظ ابن کثیر رحمہ فرماتے ہیں۔

چونکہ واقع میں یہود و نصاریٰ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں لائے اس لیے کسی نبی پر بھی ان کا ایمان صحیح نہیں ہے۔ وہ صرف اپنے خیالات و آراء کے پیروکار ہیں۔

امام رازی فرماتے ہیں لایومنون اس لیے فرمایا کہ:

یہ لوگ دعوے کرتے تھے ایمان باللہ کا مگر واقعہ یہ ہے کہ اکثر یہود مشبہ تھے اور آخرت کے بارے میں یہود و نصاریٰ دونوں بعث جسمانی کے منکر تھے۔

علامہ ابوالسعود نے یہ بتایا ہے۔

یہودی مشبہ اور عیسائی مثلثہ ہیں اللہ پر ان کا ایمان نہیں ہے آخرت کے موضوع پر ان کا علم نہ ہونے کے برابر ہے ایسے علم پر مبنی ایمان ایمان نہیں ہے۔

علامہ آلوسی فرماتے ہیں۔

ان کے ادعائی ایمان کو ایمان نہ ہونے کے برابر کر دیا ہے۔

علامہ زمخشری رقمطراز ہیں۔

ان سے ایمان کی نفی اس لیے کی ہے کہ یہودی مشبہ اور عیسائی مثلثہ ہیں۔ اور ایمان آخرت پر وہ نہیں جو ضروری ہے۔

یہ اور اسی طرح کے خیالات اکثر شارحین قرآن نے پیش کیے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس آیت میں مطلق ایمان کی نفی نہیں ایمان کے زود مدعی تھے مگر ایمان کے ساتھ ایمان کے لوازم سے ان کی زندگیاں۔ ان کے اعمال۔ ان کے اخلاق یکسر خالی تھے اس لیے یہاں اس ایمان کی نفی کی گئی ہے جو زندگی میں تقاضوں سے لوازم اور ثمرات سے بالکل بے گانہ تھا۔ یہاں ایمان کی نفی ایسی ہی کی گئی ہے جس طرح ومن الناس من یقول امنا باللہ وبالیوم الاخر وما ھم بمومنین میں نفی کی گئی ہے ایمان ملزوم اور اعمال صالحہ اسکے لوازم ہیں ان دونوں میں اصل و فرع اور لازم و ملزوم کا تعلق ہے جو ایک دوسرے سے الگ اور جدا نہیں ہو سکتے جس طرح ایمان کے بغیر عمل سرسبز نہیں رہ سکتا اسی طرح عمل کے بغیر ایمان بے برگ و بار درخت ہے جس کا فائدہ کے لحاظ سے عدم و وجود برابر ہے اس بنا پر جہاں ایمان ہے اس کے عملی نتائج و آثار کا وجود بھی ضروری ہے۔

یہ ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ درخت اپنے پھل سے پہچانا جاتا ہے اس لیے نخلِ ایمان کی شناخت بھی اس کے پھل ہی سے ہو سکتی ہے اب اگر ایسا شخص تم کو نظر آتا ہے جو زبان سے ایمان کا دعویٰ کرتا ہے مگر اس کے اعمال میں اس کے مطابق کوئی تبدیلی نہ ہو تو یہ نفاق عملی کے سوا کچھ ہو ایمان کا جھوٹا مدعی ہے قرآن کا اس پر ماھم بمومنین کا فتویٰ ہے۔ یہی بات قرآن نے یہودیوں اور عیسائیوں کے بارے میں کہی ہے اور آگے دعوے ایمان کے کھوکھلا ہونے کی ان کی عملی زندگی میں نشاندہی کی ہے۔ ولا یحرمون ما حرم اللہ و رسولہ یعنی اللہ اور اس کے رسول نے جن چیزوں کو ان پر حرام کیا تھا وہ اب ان کے لیے حرام نہیں ہیں۔ اول تو ہوائے نفس کے قسم قسم کے حیلے نکال کر حرام چیزوں کو حلال بنانے میں لگ گئے۔ نتیجہ یہ کہ جس دین کا حضرت موسیٰ اور عیسیٰ علیہما السلام نے تعلیم دی تھی ان کی زندگی اس سے یکسر خالی ہو گئی۔ اگر رسول سے حضرت موسیٰ اور عیسیٰ مراد ہوں تو ضمنا یہ بھی اشارا کر دیا ہے کہ ان یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنی تحریفات کے ذریعہ اپنے رسولوں کے دین کا چہرہ بگاڑ کر رکھ دیا ہے

ولا یدینون دین الحق وہ دین حق کے پیروکار نہیں ہیں۔ یا تو مطلب ہے کہ وہ اسلام کو نہیں اپناتے ہیں اور یا یہ مطلب ہے کہ وہ دین حق سے روگرداں ہیں یعنی جن انبیاء کے ماننے کا دعویٰ کرتے ہیں جو دین حق وہ لے کر آئے اس کی پیروی نہیں کرتے ہیں۔ دین سے یدینون آیا ہے اس کے معنے اطاعت کے ہیں۔ حتی یعطوا الجزیۃ عن ید وھم صاغرون۔ یہاں تک کہ دیں جزیہ ہاتھ سے محکومانہ حیثیت سے۔ ید کے معنی ایک سے زیادہ ہو سکتے ہیں۔

ایک معنے تابعداری کے ہیں عربی میں بولتے ہیں ھذہ یدی لک۔ میں آپ کا تابعدار ہوں۔ مطلب ہے کہ جزیہ کی ادائیگی تابعدار ہو کر کریں۔ دوسرے معنے نقد کے ہیں ید ابید۔ اسی معنے میں آتا ہے مطلب ہے کہ جزیہ نقد ادا کریں عن ید کے معنے ابو عبید نے اعجاز القرآن میں خوشی کے بھی لکھے ہیں طیبۃ نفس یعنی جزیہ بخوشی ادا کریں۔

صاغرون میں صغار کے معنے ذلت کے ہیں۔ امام شافعی فرماتے ہیں میں نے متعدد اہل علم سے سنا ہے کہ ھم صاغرون کا مطلب ہے کہ ان پر اسلامی حکومت کے قوانین جاری ہو جائیں یعنی وہ اسلامی مملکت کے شہری ہوں۔ حافظ جلال الدین السیوطی نے

کہا گیا۔ اس سے لوگوں نے استدلال کیا ہے کہ جزیہ ذلت اور بے عزتی کے ساتھ لینا چاہیے۔ جزیہ لینے والا بیٹھا ہو اور دینے والا سر جھکا کر کھڑا ہو۔ کمر بھی اکڑی نہ ہو۔ لینے والا اس کی داڑھی پکڑے۔

لیکن امام نووی رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس کی پرزور تردید کی ہے اور اس پر سیئۃ قبیحۃ بدترین بُرائی کا فتویٰ لگایا ہے اور لکھا ہے کہ یہ اسلام کی سماحت اور اس کی جانی بوجھی نرمی کے خلاف ہے۔ اگر مجھے تردید کرنی نہ ہوتی تو میں اس کے ذکر سے بھی اپنے قلم اور کتاب کو آلودہ نہ کرتا۔

حافظ ابن القیم نے بھی اس کو یہ کہہ کر رد کر دیا ہے۔

اس کی کوئی دلیل نہیں ہے اور نہ آیت قرآنی کا یہ مدعا ہے نہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے صحابہ سے ایسا منقول ہے۔ آیت کا واضح مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ جزیہ ان کو دے کر محض اسلامی قوانین کا محکوم ہو کر رہے جو اسلامی قوانین کے تحت شہری زندگی گذارنے کا نام ہے اور یہی صغار ہے۔

اصل بات تو صرف اس قدر ہے کہ اسلامی حکومت میں ہر مسلمان مرد پر فوجی خدمت لازم ہے۔ بوقت ضرورت سارے مسلمان شہری فوج بن سکتے ہیں غیر مسلم شہریوں کے لیے یہ رعایت رکھی گئی ہے کہ وہ فوجی خدمت سے ایک قلیل رقم کے بدلے میں مستثنیٰ ہو سکتے ہیں۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ جزیہ کفر یا کسی اعتقادی گمراہی کا معاوضہ نہیں بلکہ فوجی خدمات کا معاوضہ ہے۔ فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے وجب نصرۃ للمقاتلۃ۔ دفاع میں امداد کے لیے جزیہ واجب ہوا ہے۔ بیشک ابن الہمام لکھتے ہیں اور پوری صراحت سے لکھتے ہیں کہ حکومت میں جو گروہ دفاع کی خدمت انجام دے رہا ہے اس کی امداد کے لیے جزیہ ہے کیونکہ مملکت کے ہر شہری پر مملکت کے دفاع میں مدد کرنا ضروری ہے اور غیر مسلم شہری چونکہ یہ خدمت انجام نہیں دیتے ہیں اس لیے اس کے قائمقام جزیہ ہے ——— اور اس کی دلیل یہ ہے کہ جو غیر مسلم شہری جنگ میں حصہ لیتے ہیں ان پر کوئی جزیہ نہیں ہے۔ اور جزیہ دینے کے بعد ان کی حیثیت بالکل مسلمان شہریوں کی ہوتی ہے۔ صاحب ہدایہ نے لکھا ہے لھم ما للمسلمین وعلیھم ما علی المسلمین۔ ان کے شہری زندگی میں وہ سارے حقوق ہوں گے جو اسلامی مملکت کے مسلمان شہریوں کے ہوں گے۔

وَقَالَتِ الْيَهُودُ عُزَيْرٌ ابْنُ اللّٰهِ وَقَالَتِ النَّصٰرَى الْمَسِيحُ
ابْنُ اللّٰهِ ۖ ذٰلِكَ قَوْلُهُمْ بِأَفْوَاهِهِمْ ۖ يُضَاهِئُونَ قَوْلَ
الَّذِينَ كَفَرُوا مِنْ قَبْلُ ۚ قَاتَلَهُمُ اللّٰهُ ۚ أَنّٰى يُؤْفَكُونَ ﴿٣٠﴾
اِتَّخَذُوا أَحْبَارَهُمْ وَرُهْبَانَهُمْ أَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ
وَالْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ ۚ وَمَا أُمِرُوا إِلَّا لِيَعْبُدُوا إِلٰهًا
وَاحِدًا ۚ لَا إِلٰهَ إِلَّا هُوَ ۚ سُبْحٰنَهُ عَمَّا يُشْرِكُونَ ﴿٣١﴾
يُرِيدُونَ أَنْ يُطْفِئُوا نُورَ اللّٰهِ بِأَفْوَاهِهِمْ وَيَأْبَى اللّٰهُ إِلَّا
أَنْ يُتِمَّ نُورَهُ وَلَوْ كَرِهَ الْكٰفِرُونَ ﴿٣٢﴾ هُوَ الَّذِي
أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدٰى وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى
الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ ﴿٣٣﴾

اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے[۲۸] اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا
ہے یہ ہے ان کا کہنا اپنے منہ سے۔ یہ لوگ اپنی بات میں پہلے کافروں کی
بات کی مشابہت رکھتے ہیں[۲۹] اللہ ان کو ہلاک کرے کدھر پلٹے جا رہے ہیں[۳۰]۔
انھوں نے اپنے علماء اور مشائخ کو اللہ کو چھوڑ کر رب بنا لیا اور مسیح ابن مریم کو
حالانکہ ان کو صرف ایک معبود کی بندگی کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی بندگی
کے لائق نہیں ہے اس کی ذات ان کی شرک سازیوا پاک ہے[۳۱] یہ لوگ

سورۃ التوبۃ

چاہتے ہیں کہ اپنے پھونکوں سے اللہ کی روشنی کو بجھا دیں حالانکہ اللہ نہیں رہے گا بلکہ روشنی کو پورا کیے بغیر چاہے کافر برا مانیں ۳۲ اسی نے تو اپنے رسول کو الہدی اور دین الحق دے کر روانہ کیا ہے تاکہ اس کا بول بالا ہو ہر دین پر اگرچہ مشرکوں کو ناگوار ہو ۳۳

معانی مفردات

یوفکون افک سے مضارع مجہول ہے پھیر دینا۔ قاموس میں ہے کہ افک ضرب اور سمع دونوں سے آتا ہے۔ اور مصدر افک الف کے کسرہ کے ساتھ اور فتحہ کے ساتھ جھوٹ بولنے کے معنے میں آتا ہے اور افک عنہ کے معنے پھیرنے بدلنے رائے بدلنے اور مراد سے محروم کرنے کے ہوتے ہیں۔ امام راغب کہتے ہیں افک کا استعمال ہر اس چیز کے لیے ہوتا ہے جو اپنے اصل رُخ سے پھیر دی گئی ہو۔ اسی بنا پر ان ہواؤں کو جو اپنے چلنے کا اصلی رُخ چھوڑ دیں۔ مؤتفکات کہا جاتا ہے اور اعتقاد سے باطل کی طرف اور سچائی سے جھوٹ کی طرف اور اچھے سے بُرے اعمال کی طرف پلٹنے کے لیے انی یوفکون بولا گیا ہے۔

اِلٰہ بروزن فعال ہے بمعنے اسم مفعول مالوہ جس کی عبادت کی جائے ہر قوم کے نزدیک جس کی بندگی یا پرستش کی جائے وہ الٰہ ہے چاہے معبود برحق ہو یا معبود باطل۔ اس کی جمع آلہۃ آتی ہے جیسے امام کی جمع ائمہ آتی ہے۔

سبحانہ۔ علامہ سیوطی اتقان میں لکھتے ہیں کہ سبحان مصدر ہے پاکی بیان کرنا۔ اس کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں منصوب ہونا اور مفرد کی طرف مضاف ہونا مضاف الیہ چاہے اسم ظاہر ہو یا اسم ضمیر۔ جیسے سبحان اللہ اور سبحانہ علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے سبحان کو معرفہ لکھا ہے۔ یعنی تسبیح کا علم جنس ہے۔ یہی مختار جمہور ہے قاضی بیضاوی۔ علامہ زمخشری اور بہت سے علماء یہی کہتے ہیں۔ اس کے معنے ہیں اللہ کی ذات ہر برائی سے پاک ہے۔ شاہ ولی اللہ معرفت کا ایمان کی حد تک ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ اللہ کی معرفت ایمان میں صرف تسبیح اور تحمید کی حد تک مطلوب ہے۔ تسبیح یہ کہ اللہ کی ذات تمام عیبوں تمام کوتاہیوں سب برائیوں سے پاک ہے۔ تحمید یہ کہ اللہ کی ذات میں ساری بزرگیاں اور سارے کمالات ہیں۔

یہودیوں کے ایمان کا کھوکھلا پن

ان آیات میں یہودیوں اور عیسائیوں کے دعویٰ ایمان کے کھوکھلا پن کو واضح کیا جا رہا ہے۔ پہلے بتایا تھا کہ وہ ایمان کے

مدعی ہونے کے باوجود ایماندار نہیں ہیں۔ کیونکہ ان کی عملی اور فکری زندگی میں ایمان کے لوازم اور تقاضوں کے خلاف شہادتیں موجود ہیں۔

پہلی شہادت۔ لا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ

دوسری شہادت۔ ولا یدینون دین الحق

تیسری شہادت۔ وقالت الیھود عزیر ابن اللہ وقالت النصاری الخ

چوتھی شہادت۔ اتخذوا احبارھم ورھبانھم

پانچویں شہادت۔ یریدون ان یطفؤا نور اللہ بافواھھم

ان پانچوں شہادتوں کے بعد آخری اور فیصلہ کن بات ارشاد ہوئی ھو الذی یہ پانچوں شہادتیں اس بات کے ثبوت کے لیے پیش کی گئی ہیں کہ یہ لوگ ایمان باللہ کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔ خدا کی ہستی کو چاہے یہ مانتے ہوں لیکن ان کے خدا کو ماننے کے ساتھ ناخدا شناسی بلکہ خدا کی کھلم کھلا بغاوت بتا رہی ہے کہ ان کا خدا کو ماننا نہ ماننے کے برابر ہو گیا ہے۔ ایمان کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ اللہ کی شرائط کے تحت ہو لیکن ان کا ایمان اپنی خواہشوں اور بدعات کے تحت تھا۔ اللہ و رسول کی حرام کردہ چیزوں کو جائز بنا کر شریعت و قانون کو کالعدم کر دیا اور زندگی میں نظامِ حق سے بیزاری کا مظاہرہ کیا۔ مشرکانہ عقائد ایجاد کر کے انھوں نے خدا کی توحید کی نفی کر دی۔ زندگی میں تحلیل و تحریم کا حق اپنے عالموں اور مشائخ کو دے کر ان کو رب بنا لیا۔ اور پھر ستم بالائے ستم یہ کہ اللہ سبحانہ نے ان کو ان گمراہیوں سے نکالنے کے لیے دینِ حق کی روشنی روانہ کی ہے لیکن یہ اس کی پیروی تو درکنار اس روشنی کو ہر وقت بجھانے کی فکر میں لگے ہوئے ہیں کیا ایسے لوگ ایمان رکھتے ہیں۔ ہرگز نہیں ہرگز نہیں۔

حضرت عزیر کی ابنیت کا دعویٰ

(۲۸) اور یہودیوں نے کہا کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ اس وقت کچھ یہود کا یہ عقیدہ تھا کہ حضرت عزیر علیہ السلام خدا کے بیٹے ہیں لیکن یہ عقیدہ عام یہود کا نہ تھا اور زمانہ مابعد میں تو بعض علماء نے لکھا ہے کہ اب کوئی یہودی اس عقیدے کا باقی نہیں رہا۔ اگر عہد نبوی میں یہود کا کوئی فرقہ اس کا قائل نہ ہوتا تو ضرور تھا کہ اس وقت یہود قرآن کے بیان کی تغلیط کرتے جیسا کہ اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابا کی آیت سن کر عدی بن حاتم نے اعتراض کیا تھا۔ کہ احبار و رہبان کو رب تو کوئی نہیں مانتا۔ اس کا جواب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیا جو آگے آرہا ہے لہٰذا ابنیت عزیر کے عقیدے کی ان کی طرف نسبت کرنا اور ان کی جانب سے اعتراض و انکار منقول نہ ہونا اس کی دلیل ہے کہ ضرور اس وقت اس خیال کے لوگ موجود تھے ان جیسے وقت کے گذر جانے سے بہت سے مذاہب اور فرقے مٹ گئے وہ بھی نابود ہو گیا ہو تو کوئی مستبعد نہیں

ہے باقی ہم سے ایک ثقہ بزرگ امیر شاہ خان صاحب مرحوم نے بیان کیا کہ سیاحت فلسطین کے دوران مجھے بعض یہودی خاندان ایسے ملے جن کو اسی عقیدے کی نسبت سے عزیری کہا جاتا۔ واللہ اعلم[1]

آیئے پہلے اسی موضوع پر دوسرے شارحین قرآن کے تبصرے بھی پڑھ لیجیے۔

عزیر کا نام تورات میں عزرا ہے۔ ان کا زمانہ پانچویں صدی قبل مسیح کے لگ بھگ ہے۔ بخت نصر کے ہاتھوں بنی اسرائیل پر جو تباہی آئی۔ اس میں تورات کے صحیفے بھی بالکل ناپید ہو گئے۔ کہا جاتا ہے یہی عزرا ہیں جنھوں نے اپنی یادداشت سے از سر نو تورات کو مرتب کیا۔ عجب نہیں کہ ان کے اسی کارنامے کی بنا پر یہود نے ان کو ابن اللہ بنا دیا ہو تاکہ اس دعویٰ سے ان کی مرتب کی ہوئی تورات کو درجہ استناد حاصل ہو سکے[2]

عزیر سے مراد عزرا ہیں جن کو یہودی اپنے دین کا مجدد مانتے ہیں ان کا زمانہ ۴۵۰ قبل مسیح ہے۔ اسرائیلی روایات کے مطابق حضرت سلیمان علیہ السلام کے بعد جو دور ابتلا بنی اسرائیل پر آیا۔ اس میں نہ صرف یہ کہ تورات دنیا سے گم ہو گئی تھی بلکہ بابل کی اسیری نے اسرائیلی نسلوں کو اپنی شریعت اپنی روایات اور اپنی قومی زبان عبرانی تک سے ناآشنا کر دیا تھا آخر کار عزیر یا عزرا نے بائیبل کے پرانے عہدنامے کو مرتب کیا اور شریعت کی تجدید کی۔ اسی وجہ سے بنی اسرائیل ان کی بہت تعظیم کرتے ہیں اور یہ تعظیم اس حد تک بڑھ گئی تھی کہ بعض یہودی گروہوں نے ان کو ابن اللہ تک بنا دیا[3]

یہاں یہودیوں کا یہ قول جو نقل کیا ہے کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں تو اس سے مقصود یہودیوں کا عام اعتقاد نہیں ہے بلکہ مراد ان یہودیوں کا اعتقاد ہے جو یثرب میں آباد تھے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ سلام بن مشکم، نعمان ابن ابی اوفی، ابو انس، شاس بن قیس اور مالک بن صیف کہ رؤسا یہود میں سے تھے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور کہا کہ ہم آپ کی کس طرح پیروی کر سکتے ہیں جب کہ آپ نے ہمارا قبلہ ترک کر دیا اور عزیر کو ابن اللہ نہیں مانتے۔ ابن جریر عزیر سے عزرا مراد ہیں بخت نصر کے حملہ بیت المقدس میں تورات کے تمام نسخے جل گئے تھے اس لیے جب یہودی قید بابل سے چھوٹ کر آئے تو ان کے پاس تورات کا کوئی نسخہ نہ تھا اور ان کی نئی نسل عبرانی سے ناآشنا ہو گئی تھی۔ یہ حالت دیکھ کر حضرت عزرا نے کلدانی حروف میں اور ایسی عبرانی میں جو کلدانی زبان میں مخلوط تھی از سر نو تورات کے صحائف لکھے اور یہی نسخہ اصلی نسخہ کا بدل سمجھا گیا۔ چونکہ حضرت عزرا نے از سر نو شریعت مرتب کی۔ اور قید بابل کے بعد نئے دور کے بانی ہوئے اس لیے یہودیوں میں ان کی شخصیت بہت ہی مقدس مانی گئی ہے حتیٰ کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ہم مرتبہ اور شریعت کا دوسرا بانی کہا گیا۔ چنانچہ آج تک یہودیوں کا عام اعتقاد یہ ہے کہ اگر اس عہد میں لوگوں سے قصور نہ ہوا ہوتا تو عزرا بھی وہ سارے معجزے دکھا دیتے جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے دکھائے تھے[4]

---

[1] افادات شیخ الاسلام [2] تدبر قرآن [3] تفہیم [4] ترجمان القرآن

عزیر یہود کے مذہبی نوشتوں میں کاتب کی حیثیت سے مشہور ہیں تورات کی گمشدگی کے بعد انہی عزیر نے تورات از سر نو اپنی یادداشت سے لکھ دیا۔ اور اس لیے یہود ان کو مثیل الٰہی سمجھتے ہیں بلکہ بعض نے غلو کر کے اس مرتبہ سے بھی بڑھا دیا۔ ابن اللہ۔ عربی میں ابن اور ولد دو الگ الگ مفہوم رکھتے ہیں۔ ابن اللہ سے مراد صلبی یا حقیقی فرزند نہیں بلکہ خدا کا لاڈلا یا چہیتا فرزند معنوی مجازی ہے۔ یہود اسی معنے میں حضرت عزیر علیہ السلام کو اپنا مطاع کل اور بارگاہ حق میں محبوب مطلق مانتے تھے[1]

مولانا سید سلیمان ندوی ارض القرآن میں لکھتے ہیں۔

عزیر سے مراد عزرا کاہن ہیں۔ جنھوں نے تورات کو اپنے اعجاز سے دوبارہ زندہ کیا۔ معترضین اسلام کا بیان ہے کہ یہودیوں میں عزیر کی ابنیت کا کوئی عقیدہ نہیں ہے اس لیے قرآن کا یہ دعویٰ سراسر خلاف واقع ہے اس اعتراض کا سرسری جواب تو جیسا قاضی بیضاوی نے لکھا ہے یہ ہے کہ قرآن نے اپنی آواز مدینہ میں یہودیوں کے مجمع کے اندر بلند کی اور کہیں سے اس کی تکذیب اور خلاف واقعیت کی آواز نہ اٹھی۔ اس سے معلوم ہوا کہ عرب کے یہودیوں میں یہ اعتقاد موجود تھا۔ ابن جریر طبری نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت کی ہے کہ مدینہ میں اس اعتقاد کے لوگ موجود تھے ابن حزم نے ملل میں لکھا ہے کہ یہودیوں کا صدوقی فرقہ جو یمن میں تھا اس کا یہی عقیدہ تھا۔

میرے نزدیک اصل یہ ہے کہ یہودیوں میں ابنیت کا تخیل نہایت قدیم ہے۔ تکوین کے چھٹے باب میں ہے۔

خدا کے بیٹوں نے دیکھا کہ انسان کی بیٹیاں خوبصورت ہیں۔

ابن اللہ کے معنے عبرانیوں کے محاورے میں خدا کے محبوب اور پیارے کے تھے اسی لیے مسلمانوں کے مقابلے میں عرب کے عیسائیوں اور یہودیوں کا دعویٰ تھا نحن ابناء اللہ واحباءہ۔ ایسی حالت میں یہود عرب اگر عیسائیوں کے مقابلے میں ان کا غرور توڑنے کے لیے حضرت عزیر کو حضرت عیسیٰ کا مماثل اور ہمسر قرار دیتے ہوں تو کیا عجب ہے قرآن نے بھی اسی موقعہ پر یہودیوں کے اس قول کو نقل کیا ہے[2]

یہ متاخرین شارحین قرآن کی پیش کردہ تشریحات ہیں۔ لیکن یہ سوال ابھی تشنہ جواب ہے کہ عزیر کون ہیں۔ ان کا تورات سے کیا تعلق ہے اگر تورات موجودہ ان کی ساختہ و پرداختہ ہے تو اس کی روایتی اور تاریخی حیثیت کیا ہے۔ شارحین قرآن میں سے صرف علامہ رشید رضا نے اس پر کچھ اچھی باتیں پیش کی ہیں۔ ہم یہاں ناظرین معالم کی ضیافت طبع کے لیے اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

عزیر کی شخصیت

یہ تو آپ سن چکے ہیں کہ تورات میں جو عزرا ہے اسی کو عرب یہودیوں نے پیار و محبت کی خاطر تصغیر کر کے عزیر بولا ہے

[1] دریابادی

[2] ارض القرآن

اسماء میں اس قسم کی تبدیلی صرف عربی میں نہیں سب زبانوں میں ہوتی ہیں۔ اہل عرب نے یسوع کو عیسیٰ بنایا ہے۔ عزرا ہوں عبرانی کے یا عزیر ہوں عربی کے یہ ان کا نام ہے تورات میں جو صحیفہ عزرا کے نام سے ہے اس میں ان کا نسب نامہ یہ دیا ہے۔

عزرا ابن سرایا ابن عزریا ابن حلقیا اور اس کو حضرت ہارون علیہ السلام کے صاحبزادے عاذر تک بتایا ہے[1]

یہودی دائرۃ المعارف میں ہے کہ:

عزرا کا زمانہ یہودی تاریخ کا موسم بہار ہے۔ یہی شریعت موسیٰ کے ناشر ہیں۔ تورات طاق نسیان ہو چکی تھی لیکن عزرا نے اس کو دوبارہ زندگی کا لبادہ پہنایا ہے اگر ان کا زمانہ بنی اسرائیل کے گناہوں کا نہ ہوتا تو یہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرح کے معجزات دکھاتے۔

اور اسی میں یہ بھی ہے کہ:

انھوں نے شریعت کو آسوری حروف میں قلم بند کیا مشکوک مقامات پر نشان لگا دیئے۔ تاریخ یہود کا آغاز ان کے زمانہ سے ہے۔

ڈاکٹر جارج پوسٹ قاموس کتاب مقدس میں لکھتے ہیں کہ:

عزرا ایک یہودی کاہن اور مشہور کاتب ہے۔ بابل میں ان کی رہائش ارتخشتا بادشاہ میں رہی ہے اسی بادشاہ کے ساتویں سال میں عزرا یہودیوں کی ایک وافر تعداد لے کر مسجد اقصیٰ گئے یہ ۴۵۷ء قبل مسیح ہے سفر کی مدت چار ماہ ہے۔

اور یہ بھی لکھا ہے کہ:

یہودیوں کے یہاں ان کی شخصیت بڑی عظیم ہے کہ ان کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہم پلہ بتایا جاتا ہے۔ یہودی کہتے ہیں کہ انھوں نے کتاب مقدس کے صحیفوں کو جمع کیا ہے اور عبرانی قدیم حروف کی جگہ کلدانی حروف استعمال کیے ہیں۔

تورات کی تاریخی و روایتی حیثیت

باقی رہا یہ سوال کہ جس تورات کو حضرت عزیر دوبارہ منصۂ شہود پر لائے اس کی روائتی اور تاریخی حیثیت کیا ہے اس کا جواب حضرت مولانا رحمت اللہ کیرانوی نے اپنی مشہور کتاب اظہار الحق میں دیا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

[1] حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں جو نسب نامہ دیا ہے وہ یہ ہے عزیر ابن جروہ بن عدیا ابن ارب ابن وززنا ابن عدی ابن تقی ابن السبوع بن فنحاص ابن العاذر ابن ہارون ابن عمران۔

تمام اہل کتاب کا دعویٰ ہے کہ کتاب تاریخ اوّل وثانی کو عزرا پیغمبر نے بھی اور زکریا پیغمبروں کی اعانت سے تصنیف کیا ہے تو گویا ان دونوں کتابوں پر تینوں پیغمبر متفق ہیں —— دوسری جانب تاریخی کتب اس کی شہادت دے رہی ہیں کہ عہد عتیق کی کتابوں کا حال بخت نصر کے حادثہ سے پہلے ہی بدتر تھا۔ اور اس حادثہ کے بعد توان کا نام ہی نام رہ گیا تھا۔ اور اگر عزرا دوبارہ ان کتابوں کو تدوین نہ کرتے تو ان کے زمانے میں یہ کتابیں موجود نہ ہوتیں اور دوسرے زمانوں کا تو ذکر ہی کیا ہے —— اور یہ کتاب اہل کتاب کی اس کتاب میں تسلیم کی گئی ہے جو حضرت عزرا کی طرف منسوب ہے۔ اگرچہ فرقہ پروٹسٹنٹ اس کو آسمانی کتاب نہیں مانتا مگر اس اعتقاد کے باوجود اس کا درجہ ان کے نزدیک مورخین کی کتابوں سے بہرحال کم نہیں اس کے الفاظ یہ ہیں۔

توریت جلادی گئی تھی اور کوئی شخص بھی اس کا علم نہیں رکھتا تھا اور کہا گیا ہے کہ عزرا نے روح القدس کی مدد سے اس کو دوبارہ جمع کیا۔

اور کلیمنس اسکندریانوس کہتا ہے کہ!

آسمانی کتابیں سب ضائع ہو گئیں تھیں۔ پھر عزرا کو الہام ہوا کہ ان کو دوبارہ لکھے۔

ٹرٹولین کہتا ہے۔

مشہور یہی ہے کہ عزرا نے بابل والوں کی یروشلم پر غارت گری کے بعد تمام کتابیں لکھیں۔

تھیوفلکٹ کہتا ہے۔

کتب مقدسہ بالکل ناپید ہو چکی تھیں۔ عزرا نے الہام کے ذریعے ان کو دوبارہ جنم دیا۔

جان ملز کیتھولک اپنی کتاب مطبوعہ ڈربی ۱۸۴۳ء کے صفحہ ۱۱۵ میں لکھتا ہے۔

اہل علم اس پر متفق ہیں کہ اصل توریت کا نسخہ اور اسی طرح عہد عتیق کی کتابوں کے اصل نسخے بخت نصر کے فوجیوں کے ہاتھوں ضائع ہو گئے اور جب ان کی صحیح نقلیں عزرا پیغمبر کے ذریعے شائع ہوئیں وہ بھی انتیوکس کے حادثے میں ضائع ہو گئیں۔

ہم اسی پر اکتفا کرتے ہیں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ دنیائے اہل کتاب اپنے مذہب کے استناد میں عزیر کی مقروض ہے۔ اور اس استناد کی تاریخی حیثیت جو کچھ اور جیسی کچھ ہے وہ سب کی جانی بوجھی ہے کہ عزرا کی کتابت کا افسانہ راویوں نے گھڑا ہوا ہے۔

بہرحال یہودی حضرت عزیر کی پاکی اور ان کی عظمت کے بے حد معتقد تھے تاآنکہ کچھ نے ان کو ابن اللہ بھی کہا ہے۔ لیکن یہ بات ابھی علمی طور پر ثابت نہیں ہے کہ یہودیوں نے یہ تعظیماً و احتراماً کہا تھا یا عیسائیوں کی اصطلاح میں کہا تھا لیکن

مفسرین قرآن اس پر متفق ہیں کہ یہ سب کی بات نہ تھی بلکہ کچھ کا خیال تھا۔ اور بات وہی ہے جو حضرت عبداللہ بن عباس نے فرمائی ہے۔

سابقہ اہلِ کفر کی مشابہت

(۲۹) اور عیسائیوں نے کہا کہ مسیح اللہ کا بیٹا ہے۔ یہ ہے ان کا کہنا اپنے منہ سے۔ یہ لوگ اپنی بات میں پہلے کافروں سے مشابہت رکھتے ہیں یعنی ابنیت اور الوہیت مسیح کا عقیدہ پرانے مشرکین کے عقیدے کے مشابہ ہے بلکہ ان کی ہی تقلید میں یہ اختیار کیا گیا ہے جیسا کہ سورہ مائدہ کے فوائد میں ہم نقل کر چکے ہیں[1] مطلب یہ ہے کہ اس مہمل عقیدے پر ان کے پاس نہ کوئی عقلی دلیل ہے نہ نقلی۔ یہ تو محض ان جاہل قوموں کی تقلید ہے جو حق سبحانہ کی تجسیم کو مانتی تھیں اور عقیدہ حلول یا اوتار کی قائل تھیں اشارہ مشرکین یونان کی جانب ہے کہ ان ہی کے فلاسفہ کے اقوال کی روشنی سے پہلی صدی عیسوی کے یہود و نصاریٰ دونوں ہی متاثر ہو گئے تھے اور ان کی مشرکانہ تعلیمات کو اپنے مذہب کا جز منانے لگے۔ مسیحیت پر یونانی اور رومی مذہبوں کی چھاپ کی دریافت انیسوی صدی کے محققین و فضلاء کا خاص کارنامہ سمجھا جاتا ہے۔ تاریخ کا مطالعہ بتاتا ہے کہ ابنیت، حلول اور تثلیث کا عقیدہ مشرق و مغرب کے بت پرستوں میں موجود تھا خواہ یہ ہندوستان کے براہمہ یا بدھ ہوں یا چین و جاپان، ایران، مصر، یونان اور روم سے تعلق رکھتے ہوں۔

یہاں یہ بات خاص طور پر سمجھنے کی ہے کہ پورے قرآن میں کہیں یہ بات نہیں بتائی ہے کہ یہود کہتے ہیں اتخذ اللہ ولداً۔ لیکن عیسائیوں کے ذکر میں یہ بات بار بار قرآن و سنت میں دہرائی گئی ہے۔ ابن اور ولد میں بھی فرق ہے ولد تو صلبی اولاد ہی کو کہتے ہیں ابن کے اگرچہ حقیقی معنے بھی ہیں لیکن مجازاً محبوب کے معنے بھی دیتا ہے۔ جو تعظیماً مخلوق کو ابن کہتے ہیں وہ لازماً اللہ سبحانہ کو اب کہتے ہیں۔ مگر قرآن اللہ سبحانہ کے لیے اب کی جگہ رب کا لفظ لاتا ہے۔ اب اور رب ان دونوں کا معنوی تقابل کرو تو معلوم ہو گا کہ عیسائیوں اور یہودیوں کا تخیل قرآن کے سطح نظر سے کس درجہ پست ہے اب یعنی باپ کا تعلق اپنے بیٹے سے ایک خاص حالت کی بنا پر ایک خاص لحظہ میں قائم ہوتا ہے اور پھر اس کی حیثیت بدل کر پرورش اور حفاظت کی صورت میں بچپن کے ایک محدود عرصہ تک قائم رہتی ہے اس طرح گویا باپ کو بیٹے کے وجود سے یک گونہ تعلق ضرور ہوتا ہے مگر یہ تعلق حد درجہ ناقص محدود اور آنی ہوتا ہے۔ بیٹے کے وجود قیام بقاء ضروریات زندگی، سامان حیات، نشوونما اور ارتقاء کسی چیز میں باپ کی ضرورت نہیں ہوتی وہ اپنے باپ سے الگ مستقل اور بے نیاز زندگی بسر کرتا ہے مگر ذرا غور کرو کیا عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان جو رابطہ و تعلق ہے اس کا انقطاع کسی وقت ممکن ہے کیا بندہ اپنے خدا سے ایک دم اور

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک لمحہ کے لیے بھی بے نیاز اور مستغنی ہو سکتا ہے۔ کیا یہ تعلق باپ بیٹے کے تعلق کی طرح محدود اور مخصوص الاوقات ہوتا ہے۔ ربوبیت عبد و معبود اور خالق و مخلوق کے درمیان اس تعلق کا نام ہے جو آغاز سے انجام تک پیدائش سے وفات تک بلکہ وفات کے بعد سے ابد تک قائم رہتا ہے جو ایک لمحہ کے لیے منقطع نہیں ہو سکتا جس کے بل اور سہارے پر دنیا اور دنیا کی مخلوقات کا وجود ہے وہ گہوارہ عدم سے لے کر فنائے محض کی منزل تک ہر قدم پر ہر موجود کا ہاتھ تھامے رہتا ہے انسان ذرہ ہو یا بصورت غذا۔ قطرہ آب ہو یا قطرہ خون مضغہ گوشت ہو یا مشت استخوان۔ شکم مادر میں ہو یا اس سے باہر بچہ ہو، جوان ہو، ادھیڑ ہو یا بوڑھا کوئی آن کوئی لمحہ رب کے مہر و کرم اور لطف و محبت سے مستغنی اور بے نیاز نہیں ہو سکتا۔

علاوہ ازیں باپ اور بیٹے کے تعلق سے مادیت، جسمانیت، ہم جنسی اور برابری کا جو تخیل پیدا ہوتا ہے۔ اسی سے لفظ رب یک قلم پاک ہے اور اس میں ان ضلالتوں اور گمراہیوں کا خطرہ نہیں ہے جن میں عیسائیت اور ہندویت نے ایک عالم کو مبتلا کر رکھا ہے۔

یہ جو فرمایا ذالك قولهم بافواههم۔ یہ ان کی بات منہ کی ہے اس کے معنے بے سر و پا بات کہنے کے ہیں۔ نظریہ ابنیت کی تردید میں اس سے بڑی بات اور کیا ہو سکتی ہے کہ یہ ایک ایسی پا در ہوا بات ہے جس کی قطعاً کسی قسم کی کوئی علمی بنیاد نہیں ہے اور انسانیت کی ساری تاریخ میں جو کبھی سوچی نہیں گئی تھی۔ اسی کو مان کر الٰہیات کے سارے نظام کو درہم برہم کر دیا۔

حضرت مولانا مناظر حسن گیلانی نے اس موقعہ پر کیا اچھی بات فرمائی ہے۔

یقیناً حق تعالیٰ کے متعلق جتنی غلط سے غلط مہمل سے مہمل باتیں اب تک کہی گئی ہیں ان میں سب سے بری بات وہ ہے ان میں سب سے مہمل بات وہ ہے جو نظریہ ابنیت کے ماننے والوں کے منہ سے نکل رہی ہے جس کا حقیقت سے ذرہ برابر بھی لگاؤ نہیں ہے۔ بالواسطہ یا بلا واسطہ کسی قسم کی علمی تائید اسے حاصل نہیں ہے۔ علم و عقل کی تائید تو بڑی بات ہے واقعہ یہ ہے کہ جس انداز سے سوچا جائے بجز تردید کے عقل کی راہ میں کچھ بھی نہیں ہے۔

جس بات کو یہاں قول بالا فواہ کہا ہے قرآن نے دوسرے موقعہ پر اسی کو لوگوں کو مخاطب کر کے کہا ہے کہ لقد جئتم شیئاً ادا۔ یعنی تم بڑے اچنبھے کی بات پیش کر رہے ہو یعنی ایسی عجیب و غریب بات جو کبھی دیکھی اور سنی نہیں گئی اور فطرت انسانی جسے کسی طرح برداشت نہیں کر سکتی ہے۔ اسی لیے زبان نبوت نے اسے اللہ سبحانہ کی جناب میں گالی قرار دیا ہے ارشاد ہے یشتمنی ابن آدم۔ حق سبحانہ فرماتے ہیں کہ انسان نے مجھے گالی دی ہے۔ گالی یہی ہے کہ فلاں اللہ کا بیٹا ہے۔

آخر میں فرمایا یضاھئون قول الذین کفروا من قبل یعنی یہود و نصاریٰ اپنی اس بات میں کہ عزیر خدا کے بیٹے ہیں اور مسیح خدا کے بیٹے ہیں اپنے سے پہلے لوگوں کے مشابہ ہو رہے ہیں۔ مضاہاۃ کے معنے مشابہت کے آتے ہیں جس عورت کو ماہواری نہ آتی ہو اور اس طرح وہ مردوں سے مشابہ ہو جائے اسے ضہیاء کہتے ہیں۔ مطلب یہ کہ یہ دونوں اس بارے میں اپنے سے پہلے کافروں کی کاپی کر رہے ہیں۔ عبداللہ بن عباس، مجاہد اور قتادہ کہتے ہیں کہ یہاں مشرکین کے مشابہ ہیں جن کا خیال ہے کہ فرشتے اللہ کی بیٹیاں ہیں۔ لیکن مشرکین تو اب موجود ہیں اور قرآن کہہ رہا ہے کہ اپنے سے پہلے کافروں سے مشابہت رکھتے ہیں۔ یہ پہلے کافر کون ہیں۔ تاریخ ابنیت و حلول و تثلیث کا عقیدہ ہندوستان، چین، جاپان، ایران روم اور مصر کے بت پرستوں کا رہا ہے ان ہی کی یہ لوگ بھی نقل کر رہے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ مصر، یونان، روم و ایران اور دوسرے ممالک میں جو قومیں پہلے گمراہ ہو چکی تھیں ان کے ہی اپنے خیالات فاسدہ میں یہ بھی مشابہ ہیں۔

ابنیت کے نظریہ پر تعجب

(۳۰) اللہ ان کو ہلاک کرے کدھر بہکے جا رہے ہیں۔ یعنی خدا ان کو غارت کرے کہ توحید کی صاف اور واضح روشنی کے باوجود کدھر جا رہے ہیں[1] اصل تعبیر قاتلھم اللہ ہے۔ شارحین قرآن کا اس میں اختلاف ہے کہ یہ جملہ دعا کے لیے ہے یا تعجب کے لیے۔ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے اسے دعا کہا ہے اور ابن جریج نے اسے تعجب قرار دیا ہے۔ یعنی اس نظریہ ابنیت کی شناعت اور برائی اس قدر واضح ہے کہ اس کے اپنانے والوں پر تعجب ہوتا ہے کہ ایسی بدیہی اور کھلی حقیقت کے باوجود یہ کدھر جا رہے ہیں۔ اس موقعہ پر مشہور لغوی اصمعی نے یہ شعر پیش کیا ہے۔

یا قاتل اللہ لیلیٰ کیف تعجبنی　　　　واخبر الناس انی لا ابالیھا

تعجب ہے کہ لیلیٰ مجھے کیسے پسند کرتی ہے　　　　حالانکہ لوگوں نے اسے بتا دیا کہ میں اس کی پرواہ نہیں کرتا

زمخشری نے اساس اللغہ میں تعجب کے معنے میں یہ محاورہ بتایا ہے قاتلہ اللہ ما افصحہ۔ بہرحال دعا کی نسبت یہاں تعجب کے معنے زیادہ صاف ہیں۔

امام رازی نے بھی اسی کو اپنایا ہے فرماتے ہیں کہ

یہ لوگ اس لائق ہیں کہ ان کی اس بات پر تعجب کیا جائے۔

مطلب یہ ہے کہ نظریہ ابنیت کی اس گندگی کے باوجود اسے کیسے قبول کر رہے ہیں اور نظریہ توحید سے روگرداں ہو رہے ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

احبار و رہبان کی ربوبیت

(۳۱) انھوں نے اپنے علماء و مشائخ کو اللہ کو چھوڑ کر رب بنالیا ہے۔ اور مسیح بن مریم ﷺ کو۔ حالانکہ ان کو صرف ایک معبود کی بندگی کا حکم دیا گیا تھا اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں ہے۔ اللہ کی ذات ان کی شرک سازیوں سے پاک ہے ان کے علماء مشائخ جو کچھ اپنی طرف سے مسئلہ بتا دیتے خواہ حلال کو حرام یا حرام کو حلال کہہ دیتے اسی کو سند سمجھتے کہ بس خدا کے یہاں ہم چھٹکارا پالیں گے۔ کتب سماویہ سے کوئی سروکار نہ رکھا تھا محض احبار و رہبان کے احکام پر چلتے تھے اور ان کا یہ حال تھا کہ تھوڑا سا مال یا جاہی فائدہ دیکھا اور حکم شریعت کو بدل ڈالا جیسا کہ دو تین آیتوں کے بعد مذکور ہے۔ پس جو منصب خدا کا تھا یعنی حلال و حرام کی تشریع وہ علماء و مشائخ کو دے دیا تھا اس لحاظ سے فرمایا کہ انھوں نے عالموں اور درویشوں کو خدا ٹھہرایا تھا نبی ﷺ نے عدی بن حاتم کے اعتراض کا جواب دیتے ہوئے اسی طرح کی تشریح فرمائی ہے اور حضرت حذیفہؓ سے ایسا ہی منقول ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں عالم کا قول عوام کو سند ہے جب تک وہ شرع سے سمجھ کر کہے۔ جب معلوم ہو کہ خود اپنی طرف سے کہا یا طمع وغیرہ سے کہا پھر سند نہیں [1]

یہ آیت قرآنی مہمات معارف میں سے ہے۔ لیکن یہ بات خیال میں رکھیے کہ یہ دونوں الزام یعنی کسی کو خدا کا بیٹا بنانا اور کسی کو حلال و حرام کرنے کا حق دینا اس بات کے ثبوت میں پیش کیا گیا ہے کہ یہ یہودی اور عیسائی ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الآخر کے دعوے میں جھوٹے ہیں۔

شارحین قرآن میں سے متاخرین نے اس آیت پر طویل مباحث سے پڑھنے والوں کی ضیافت طبع کا سامان کیا ہے قاضی بیضاوی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

> اللہ کو چھوڑ کر رب بنانے کا مطلب یہ ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اپنے عالموں اور مشائخ کی ان باتوں میں طاعت کی جو انھوں نے خدا کی حرام کردہ چیزوں کو حلال بنایا اور حلال چیزوں کو حرام بنا دیا یا ان کو سجدے کرتے تھے اور مسیح ابن مریم علیہ السلام کو رب اس طرح بنایا کہ ان کو خدا کا بیٹا کہتے تھے حالانکہ ان رب بنانے والوں کو صرف یگانہ معبود اللہ کی طاعت کا حکم دیا گیا تھا۔ باقی انبیاء اور ان تمام کی طاعت جن کی طاعت کا حکم خود اللہ نے دیا ہے وہ فی الواقع اللہ کی طاعت ہے۔ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں وہ لوگوں کی شرک سازیوں سے پاک ہے۔

علامہ آلوسی روح المعانی میں فرماتے ہیں۔

[1] افادات شیخ الاسلام

یہودیوں نے اپنے علماء کو عیسائیوں نے اپنے مشائخ کو خدا کو چھوڑکر رب بنالیا یعنی انھوں نے تحلیل و تحریم میں ان کی طاعت کی ہے یہی تفسیر جناب رسول اللہ نے حضرت عدی کے جواب میں ارشاد فرمائی اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بھی ایک سائل کے جواب میں یہی بات فرمائی آیت میں عبادت بمعنی طاعت بطور استعارہ ہے یعنی اطاعت کو عبادت سے تشبیہ دی ہے یہ آیت ان گمراہ فرقوں کے خلاف ماتم کررہی ہے جو اپنے علماء اور اپنے مشائخ کی بات کی وجہ سے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو چھوڑ دیتے ہیں۔ اور مسیح بن مریم علیہ السلام کو عیسائیوں نے معبود بنالیا۔ یا ان کو خدا کا بیٹا بنالیا۔ اس میں اشارہ ہے کہ یہود نے عزیر علیہ السلام کو معبود نہیں بنایا تھا۔ حالانکہ ان لوگوں کو یگانہ معبود کی اطاعت کا حکم ملا تھا۔ رسول کی طاعت اور ان لوگوں کی طاعت جن کی طاعت کا خود خدا نے حکم دیا ہے اس میں داخل نہیں۔ وہ اللہ ہی کی طاعت ہے۔

امام رازی اپنی تفسیر میں لکھتے ہیں:

مفسرین کی اکثریت کہتی ہے کہ ارباب سے مراد یہ نہیں ہے کہ ان کے بارے میں ان کا عقیدہ یہ تھا کہ وہ دنیا کے معبود ہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اوامر و نواہی میں ان کی اطاعت کرتے تھے جیسا کہ عدی بن حاتم کے جواب میں حضور کا ارشاد بتارہا ہے — کہتے ہیں میں نے ابوالعالیہ سے دریافت کیا کہ احبار و رہبان کی ربوبیت کیسے تھی انھوں نے بتایا کہ احبار و رہبان کے اوامر و نواہی اللہ کی کتاب کے مخالف ہوتے تھے اور ان ہی کی اطاعت کرتے تھے کتاب اللہ کی پروا نہ کرتے تھے۔

یہی تشریح علامہ ابوالسعود نے تفسیر میں کی ہے۔ علامہ قرطبی حافظ ابن جریر نے اور حافظ ابن کثیر نے اس آیت کی یہی تشریح کی ہے۔ علامہ شوکانی نے اپنی تفسیر میں اسی کو اس طرح پیش کیا ہے۔

مطلب یہ ہے کہ جب انھوں نے اوامر اور نواہی میں ان کی اطاعت کی وہ گویا ایسے ہوگئے جیسے ان کو رب بنالیا۔

نواب صدیق حسن خان رح نے فتح البیان میں اس طرح تشریح کی ہے۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہودی اور عیسائی اپنے علماء اور مشائخ کے اوامر و نواہی کی طاعت کی وجہ سے ایسے ہوگئے جیسے انھوں نے ان کو رب بنالیا ہے کیونکہ انھوں نے احبار و رہبان کی ایسی ہی طاعت کی جیسے ارباب کی کی جاتی ہے۔

اس کے بعد دونوں بزرگوں علامہ شوکانی اور نواب صاحب نے ائمہ اجتہاد کے مقلدین کے خلاف استغاثہ کیا ہے۔

جدید شارحین قرآن میں السید رشید رضا، علامہ جمال الدین القاسمی محمد الدین شنقیطی سب نے یہی تشریح کی ہے۔

اور شارحین قرآن میں مولانا اشرف علی، مولانا احمد علی لاہوری، مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا غلام اللہ خان، مفتی محمد شفیع مولانا محمد ادریس کاندھلوی، مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ابوالاعلیٰ، مولانا امین احسن اصلاحی، علامہ عبدالدائم، پیر محمد کرم شاہ کی تفاسیر میرے پیش نظر ہیں۔ اس آیت کی تشریح میں ان بزرگوں نے جو کچھ کہا ہے اس سے بھی استفادہ فرمایئے۔

حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں:

یہود و نصاریٰ نے خدا کی توحید فی الطاعۃ چھوڑ کر اپنے علماء و مشائخ کو باعتبار طاعت کے رب بنا رکھا ہے کہ ان کی اطاعت تحلیل و تحریم میں مثل اطاعت خدا کرتے ہیں کہ نص پر ان کے قول کو ترجیح دیتے ہیں۔ اور ایسی اطاعت بالکل عبادت ہے بس اس حساب سے وہ ان کی عبادت کرتے ہیں۔

مفتی محمد شفیع صاحب لکھتے ہیں۔

معبود بنانے کا جو الزام ان پر عائد کیا گیا ہے اگرچہ وہ ان کو اپنا رب کہتے تھے اس کی وجہ یہ ہے کہ انھوں نے اطاعت مطلقہ جو خالص اللہ جل شانہ کا حق ہے۔ اس حق کو انکے حوالے کر دیا تھا کہ ہر حال میں ان کے کہنے کی پیروی کرتے تھے اگرچہ ان کا قول اللہ و رسول کے خلاف کبھی نہ ہو تو یہ ظاہر ہے کہ کسی کی ایسی طاعت کرنا کہ اللہ و رسول کے خلاف بھی کہے تو اس کی طاعت نہ چھوڑے یہ ایسا ہی ہے جیسے کسی کو اپنا رب اور معبود بنا لے جو کھلا ہوا کفر ہے۔

مولانا محمد ادریس صاحب فرماتے ہیں۔

ان اہل کتاب نے خدا کو چھوڑ کر اپنے عالموں اور درویشوں کو رب بنا لیا ہے کہ جو وہ فتویٰ دے دیں اس کو حکم خداوندی کی طرح واجب العمل سمجھتے ہیں اور ان کے قول کو اپنا دین و ایمان سمجھتے ہیں۔ اگرچہ وہ توریت و انجیل کے نصوص کے خلاف ہی کیوں نہ ہو ایسی بے چون و چرا اطاعت عبادت کے حکم میں ہے جو شرک ہے۔

پیر کرم شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی حلال کی ہوئی چیز کو اگر کوئی حرام کر دے یا ان کی حرام کردہ چیز کو حلال کر دے تو اس نے گویا تشریع و قانون سازی جو صرف اللہ تعالیٰ کا حق ہے اس کو اپنے ہاتھ میں لے لیا اور جن لوگوں نے ان کی باتوں کو مان لیا گویا انھوں نے اس کی خدائی مان لی۔

مولانا امین احسن اصلاحی فرماتے ہیں۔

اب یہ اس کی دلیل بیان ہو رہی ہے کہ انھوں نے اپنے فقیہوں اور راہبوں کو اللہ کے سوا اپنا رب مان

لیا ہے اس کے بعد عدی کی روایت کو تشریح میں پیش کیا ہے۔

مولانا مودودی فرماتے ہیں:

اس سے معلوم ہوا کہ کتاب اللہ کی سند کے بغیر جو لوگ انسانی زندگی کے لیے جائز و ناجائز کی حدود مقرر کرتے ہیں وہ دراصل خدائی کے مقام پر بزعم خود متمکن ہو جاتے ہیں اور جو ان کے حق تشریع سازی کو تسلیم کرتے ہیں وہ انہیں خدا بناتے ہیں۔

مولانا دریابادی فرماتے ہیں۔

یعنی انہیں ایسا مستقلاً صاحب اختیار مان رکھا ہے گویا وہی معبود و رب ہیں جو چاہیں وہ جائز کر دیں جو چاہیں وہ حرام ٹھہرا دیں۔ سارے اختیارات تشریع و قانون سازی کے گویا ان ہی کو حاصل ہیں۔

یہ ہے ان تشریحات کا خلاصہ جو شارحین قرآن نے اس آیت کے مطالب بیان کرتے ہوئے لوگوں کو بتایا ہے۔

جس ارشاد نبوت پر ان مطالب کی بنیاد ہے اگرچہ اس کی روایتی حیثیت کچھ اتنی مضبوط نہیں لے لیکن چونکہ شارحین قرآن نے اسے شرف قبول دیا ہے اور امام ترمذی نے غرابت کے ساتھ اس کی تحسین کی ہے اس لیے ہم بھی اسے برسرِ تسلیم قبول کرتے ہیں۔ آیئے پہلے حافظ ابن کثیر کی زبانی پوری حدیث گوش گذار فرمالیجئے۔

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ ان کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پہنچی تو وہ شام کی طرف کوچ کر گئے۔ وہ زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گئے تھے۔ کسی جنگ میں ان کی بہن اور ان کی قوم کے کچھ افراد قیدی ہو گئے تھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے میری بہن کو رہا کر دیا وہ اپنے بھائی یعنی میرے پاس آگئی اس نے مجھے اسلام کی دعوت دی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہونے کی ترغیب دی۔ عدی قبیلہ میں ریاست و زعامت کا مقام رکھتے تھے ان کے والد مشہور سخی حاتم طائی تھے۔ عدی مدینہ آئے ان کی آمد پر لوگوں میں ان کے آنے کے بارے میں چہ میگوئیاں ہوئیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے ان کے گلے میں چاندی کی صلیب تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کی یہ آیت تلاوت فرما رہے تھے اتخذوا احبارھم ورھبانھم اربابًا میں نے عرض کیا کہ ان لوگوں نے اپنے علماء اور مشائخ کی عبادت تو نہیں کی فرمایا ہاں کی ہے اس طرح کہ یہ لوگ حلال کو حرام اور حرام کو حلال بنا کر پیش کرتے اور لوگ ان کی بات مانتے۔ یہی ان کی عبادت ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عدی کو مخاطب کر کے

لے رواہ الترمذی وقال حسن غریب لا نعرفہ الا من حدیث عبد السلام بن حرب وغطیف ابن اعین لیس بمعروف فی الحدیث ورواہ الطبرانی من طرق عن عدی بن حاتم۔ وخرجہ السیوطی فی الدر رو زاد نسبتہ لابن سعد و عبد بن حمید وابن المنذر وابن ابی حاتم والطبرانی وابی الشیخ وابن مردویہ والبیہقی فی سننہ۔

فرمایا عدی تمہارا کیا خیال ہے کیا اللہ اکبر کا بول تمہیں نقصان دیتا ہے کیا تمہارے علم میں اللہ سے کوئی بڑا ہے کیا لا الہ الا اللہ تمہیں چبھتا ہے کیا اللہ کے سوا کوئی عبادت کے لائق ہے۔ اس کے بعد آپ نے عدی کو اسلام کی دعوت دی۔ عدی مسلمان ہو گئے عدی کہتے ہیں میں نے دیکھا کہ حضور اقدس ﷺ کا چہرہ خوشی سے چمک گیا ہے اس کے بعد حضور نے فرمایا کہ یہود مغضوب علیہم اور نصاریٰ ضالین ہے۔

حافظ ابن جریر نے اس موقعہ پر اپنے مذاق کے موافق دوسرے صحابہ سے بھی اسی کی تائید میں آیت کی تشریح نقل کی ہے مثلاً حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے دریافت کیا گیا کہ کیا یہودی اور عیسائی اپنے احبار و رہبان کی عبادت کرتے تھے فرمایا بلکہ تحلیل و تحریم کا ان کو اختیار دے رکھا تھا۔

حضرت حسن رضی اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ رب بنانا یہ ہے کہ وہ طاعت کرتے تھے۔

یہ سب تشریحات بہانگ دہل اعلان کر رہی ہیں کہ رب بنانے کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ یہودی اور عیسائی اپنے علماء اور مشائخ کی عبادت کرتے تھے بلکہ یہ ہے کہ یہودیوں نے اپنے علماء کو اور عیسائیوں نے اپنے مشائخ کو تشریع اور قانون سازی کا حق دے کر زندگی کی ساری شقوں میں اللہ کی کتاب کو چھوڑ دیا تھا۔ پہلے ان کی زندگی کے سارے فیصلے کتاب اللہ کی روشنی میں ہوتے تھے۔ اب ان کی زندگی کے سارے اطوار کتاب اللہ سے ہٹ کر احبار و رہبان کی خواہش اور رائے سے ہوتے تھے اور سب ایسے بے چون و چرا مانتے۔ دراصل اس روایت میں یہودی اور عیسائی تاریخ کا ایک اہم پہلو پیش کیا جا رہا ہے۔ اور بتایا جا رہا ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کو جو نظام حیات ملا تھا وہ خالصتاً الٰہی نظام تھا اور اس کی بنیاد تورات اور اسوہ انبیاء پر تھی۔ قرآن نے یہ بات کھول کر بتائی ہے۔

انا انزلنا التوراۃ فیھا ھدی و نور یحکم بھا النبیون الذین اسلموا للذین ھادوا والربانیون والاحبار بما استحفظوا من کتاب اللہ وکانوا علیہ شھداء فلا تخشوا الناس واخشون ولا تشتروا بایاتی ثمنا قلیلا ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الکافرون۔

ہم نے تورات نازل کی جس میں ہدایت اور روشنی تھی سارے نبی جو اللہ کے فرماں بردار تھے اسی کے مطابق یہودیوں کے معاملات کا فیصلہ کرتے تھے اور اسی طرح مشائخ اور علماء بھی اسی کے مطابق فیصلہ کرتے تھے کیونکہ انہیں کتاب اللہ کی حفاظت کا ذمہ دار بنایا گیا تھا اور وہ اس پر گواہ تھے اے یہودیو تم لوگوں سے نہ ڈرو میرے سے ڈرو، میری آیات کو ذرا ذرا سے معاوضے لے کر فروخت نہ کرو جو لوگ اللہ کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔

اور ایسی ہی بات قرآن نے عیسائیوں کے بارے میں بتائی ہے۔

ولیحکم اھل الانجیل بما انزل اللہ فیہ ومن لم یحکم بما انزل اللہ فاولئک ھم الفاسقون

ہمارا حکم تھا کہ انجیل والے اس قانون کے مطابق فیصلہ کریں جو اللہ نے نازل کیا ہے اور جو لوگ اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں وہی فاسق ہیں۔

قرآن کی یہ آیات بتارہی ہیں کہ صرف گرجا اور کلیسا کی حدود میں نہیں بلکہ زندگی کی ساری شاخوں میں ان کو حکم تھا کہ اخلاق، عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی دوائر میں اللہ کے قانون کی پیروی کریں ان کے علماء اور مشائخ نے اس جادہ مستقیم سے ہٹ کر عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی زندگی کو انسانی قوانین کے تابع کر دیا تھا۔

یہ بات ذہن میں رہے کہ احبار ورہبان کی حیثیت یہودیوں اور عیسائیوں میں ہرگز وہ نہ تھی جو آج مسلمانوں میں علماء اور مشائخ کی ہے بلکہ ان کی حیثیت عدالت کے ججوں اور حاکموں کی تھی۔ عدالت میں بیٹھ کر وہ فیصلے کرتے تھے۔

۱۔ یہ فیصلے کتاب اللہ کی روشنی میں نہ ہوتے تھے بلکہ خود ان کی ہوائے نفس کے تحت ہوتے تھے۔

۲۔ ان فیصلوں کے لیے وہ سودے کرتے تھے اور رشوت لیتے تھے۔

۳۔ بادشاہوں اور امراء کی خواہشوں کے مطابق اللہ کے قانون کو تبدیل کر دیتے۔

۴۔ حرام خوری ان کی طبیعت بن چکی تھی۔

۵۔ قرض اور سود کے معاملات میں وہ اسرائیلی اور غیر اسرائیلی کے درمیان تفریق کرتے۔

۶۔ اگر امی اور اسرائیلی کا مقدمہ ان کی عدالت میں آتا تو ہر حال میں اسرائیلی کو جتانے کی فکر ہوتی۔

۷۔ انسانی قدریں ناپید تھیں ان کا نظریہ تھا کہ غیر اسرائیلی کی ہر غلطی سے فائدہ اٹھانا چاہیے۔

اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ:

۱۔ خدا کی کتاب جو اس غرض سے نازل کی گئی تھی کہ اس کے مطابق عدالت میں فیصلے ہوں یک قلم بے اثر اور بے کار ہو کر رہ گئی۔

۲۔ ہدایت کا مرکز عملاً خدا کا حکم نہ رہا بلکہ انسانوں کا حکم ہو گیا۔ زندگی میں اللہ کے قانون سے اسی بے رخی کو قرآن نے یہاں لا یدینون دین الحق سے اور سورہ مائدہ میں وما اولئک بالمومنین سے تعبیر کیا ہے اور اسی کو قرآن نے ان کو رب بنانا کہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہودی اپنے علماء کی اور عیسائی اپنے مشائخ کی اطاعت کرتے تھے اللہ کی کتاب کو چھوڑ بیٹھے تھے۔

اس سورت میں جس موقعہ پر یہ بات کہی گئی ہے اگر وہ پیش نظر ہو تو بات بالکل بے غبار ہو کر سامنے آجاتی ہے۔ قرآن

جس دین حق کا داعی بن کر آیا ہے اسے دنیا میں قائم کرنے کے لیے جیسے اس نے مشرکین کے بارے میں صاف صاف کہا ہے کہ:
فاقتلوا المشرکین حیث وجدتموھم ایسے ہی اہل کتاب کے بارے میں بھی کہا ہے قاتلوا الذین لایومنون باللہ ولا بالیوم الاخر۔

جن لوگوں نے بات کو طاعت سے ہٹا کر عبادت کی طرف پھیر دیا ان کو یہاں الجھنوں اور دشواریوں سے دوچار ہونا پڑا۔ دراس آیت میں بہت از کار باتیں کرنی پڑیں جن کا آیت کے منطوق مدلول اور مفہوم سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔ اور اس پریشانی میں مسلمانوں کے ائمہ مجتہدین کے خلاف دہائی دینی پڑی۔ شوکانی، نواب صدیق حسن خان ہوں یا سید رشید رضا اور جمال الدین سب نے آیت کا رُخ یکبارگی ائمہ اجتہاد کی طرف کر دیا۔ حالانکہ آیت کا رُخ تو یہ اور صرف یہ ہے کہ اللہ کے قانون کی موجودگی میں ہم انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر زندگی گذارنے کے مجاز و مختار ہیں یا نہیں۔ قانون کے اصل سرچشمے صرف دو ہیں قرآن و سنت۔ ان میں جس قدر قوانین واضح شکل میں موجود ہیں وہ قطعی اور اٹل ہیں اور ہمیشہ کے لیے واجب التسلیم اور واجب الاطاعت ہیں۔ ان میں کبھی کوئی معمولی ردو بدل بھی نہیں ہو سکتا۔ نہ کوئی سربراہ مملکت حکومت چلانے میں ان سے بال برابر انحراف کر سکتا ہے نہ کسی مسلمان حاکم کے لیے جائز ہے کہ معاملات کا فیصلہ ان سے ہٹ کر کرے ایسا کرنا اسلام سے ہاتھ دھو بیٹھنا ہے احبار و رہبان تو آیت میں یہود اور عیسائیوں کے اس دور کی تاریخی تمثیل ہے جب نظام زندگی ان کے ہاتھوں میں تھا۔ ان کی جگہ اگر پارلیمنٹ ہو، اسمبلی ہو کیبنٹ ہو، انتظامیہ ہو عدلیہ ہو، فوجی نظام ہو اور یہی کردار پیش کرے کہ چور کو قطع ید کی سزا قرآن کے مطابق نہ دے بلکہ برطانیہ کے پارلیمانی نظام کے مطابق دے۔ زانی کو زنا کی سزا قاتل کو قتل کی اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کے مطابق نہ دے بلکہ پارلیمانی نظام کے مطابق دے تو یہ پارلیمنٹ کو اسمبلی کو، عدلیہ کو ججوں کو رب بنانا ہے۔ اسی لیے آیت میں عبادت کو طاعت کے معنے میں بتایا گیا ہے۔ علامہ آلوسی نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے۔

اللہ کی عبادت بھی اس وقت تک ہو نہیں سکتی جب تک طاعت میں تخصیص نہ ہو۔ اگر طاعت میں تخصیص نہیں تو عبادت میں بھی تخصیص نہیں ہے۔

شرک جیسے عبادت میں ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح طاعت میں بھی ہوتا ہے۔ خاص طاعت میں شرک کے بارے میں قرآن میں ہے۔

وان اطعتموھم انکم لمشرکون۔

اگر تم ان کی اطاعت کرو گے تو یہ مشرکانہ عمل ہوگا۔

ایک شرک تو یہ ہے کہ:

اللہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے یا وہ جو چاہے کر سکتا ہے یا ہمارا بھلا یا برا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے مثلاً کسی کو سجدہ کرے اور اس سے حاجت مانگے مختار جان کر لہ

یہ اللہ سبحانہ کی پرستش میں شرک ہے۔

دوسرا شرک یہ ہے کہ حکم میں شریک کرے یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند کرے اور اس پر چلے بس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک کرتے ہوں۔

اور سورہ انعام میں فرماتے ہیں۔

شرک صرف یہی نہیں ہے کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے لہ

یہ اللہ سبحانہ کی بندگی میں شرک ہے۔ شرک دونوں ہیں اور دونوں ازروئے قرآن ممنوع ہیں۔ اسلامی قانون کے اصول کی ہر کتاب میں یہ بات لکھی ہوئی ہے۔ الحاکم لاخلاف فی انہ اللہ یا لاحکم الامن اللہ۔

افسوس کی بات ہے کہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے بزرگوں کی نگاہ اس پر تو لگی کہ مسلمان ائمہ مجتہدین کی اجتہادات میں تقلید کر رہے ہیں اور اس کے خلاف تو خوب واویلا کیا لیکن ان کی نگاہوں نے یہ نہ دیکھا کہ مسلمان جج عدالتوں میں مسلمان حکمران دفاتر میں مسلمان ممبران پارلیمنٹ میں۔ مسلمان وکلاء قانون میں، مسلمان عوام عائلی و معاشرتی نظام میں مسلمان مزدور معاشیات میں مسلمان حکمران، سیاست میں اللہ کی اطاعت چھوڑ کر نا خدا ناشناسی اور اللہ کی کھلم کھلا بغاوت کر رہے ہیں۔ اللہ اکبر رفع الیدین اور آمین میں ابو حنیفہ رح کی تقلید تو شرک ہو گئی اور زندگی کے ہر گوشہ میں خدا کو چھوڑ کر انسانوں کی نہیں بلکہ کافروں کی اطاعت ہو رہی ہے۔ یہ ہے علمی زندگی میں فکر کی پستی۔ ذرا اس حرارت ایمان کی داد دیجئے جو مسائل فرعیہ میں ائمہ کی تقلید پر تو شرک فی الطاعۃ کی پھبتی کسی جاتی ہے لیکن کافروں کی عدالت میں بیٹھ کر قرآن کے دیوانی فوجداری قوانین کو چھوڑ کر کافروں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق فیصلہ جو کرتا ہے اس کو محبت کی نگاہوں سے دیکھا جاتا ہے انا للہ فالی اللہ المشتکی۔

آیت قرآنی تو یہ اور صرف بتا رہی ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں نے اللہ کی کتاب کو چھوڑ کر اپنی سیاسی اور قانونی زندگی میں احبار و رہبان کو حاکمانہ حیثیت میں قبول کر کے ان کی طاعت کا قلادہ اپنے گلوں میں ڈال لیا تھا۔ یہ احبار و رہبان عدالتوں میں بیٹھ کر اللہ کے قانون کے خلاف عوام کی امنگوں کے مطابق فیصلے کرتے تھے۔ یہ آیت فی الواقع امت اسلامیہ کے اس کردار کے خلاف ماتم کر رہی ہے جو اس نے اپنی سیاسی اور قانونی زندگی میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول

لہ موضح القرآن

لہ موضح القرآن

کی سنت چھوڑ کر طاغوت کی اطاعت کر رہی ہے۔

دیکھنا چاہیے کہ خود مسلمانوں کا کیا حال ہوا جو دنیا کے بتانے کو آئے تھے کہ ان الحکم الا للہ اور جنھوں نے غیروں کے سامنے اپنی زندگی کا یہ نصب العین بتایا تھا کہ بندوں کی بندگی سے نکال کر اللہ کی بندگی میں داخل کرنا ہمارا کام ہے۔ افسوس ہے کہ وہ خود ہی تیسری صدی سے اسی گمراہی میں مبتلا ہیں۔ انھوں نے بھی قانون سازی کا حق کتاب و سنت کی جگہ بادشاہوں رئیسوں ازعیموں کے حوالہ کر دیا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ وہ تمام مفاسد ظہور میں آگئے جو انسان کی انسان پر حاکمیت کے لازمی نتائج ہیں۔ اور سیاسی و قانونی زندگی میں انسانوں کی حاکمیت سے سب سے بڑا فساد یہ پیدا ہوا کہ صدیوں سے مسلمانوں کی عقلی ترقی رک گئی۔ اور کتاب اللہ کی جگہ انسانی قوانین کی اطاعت نے علم و بصیرت کی راہوں سے انہیں دور کر دیا حتی کہ اب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا ہے کہ اللہ کی کتاب اور اس کے رسول سے ہٹ کر مسلمان اپنی دینی سیاسی اور قانونی زندگی میں اشتراکیت جمہوریت کے دلدادہ ہو گئے ہیں اور پورے عالم کے مسلمانوں کا سیاسی معاشرتی اور اجتماعی زندگی میں یہی قبلہ ہیں۔ اس کے نتیجے میں مسلمان باہم دست بگریبان ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوتے جا رہے ہیں اور پوری اسلامی زندگی قتل ہو رہی ہے پہلے برطانیہ کے پارلیمانی قوانین کی طاعت ہوتی تھی اب اس کی جگہ اشتراکی اور جمہوری قوانین کی بندگی ہو رہی ہے۔

قرآن کی یہ آیت نہ رسول کی طاعت سے روکتی ہے اور نہ مجتہدین کی طاعت سے۔ کچھ نے اس آیت کا سہارا لے کر رسول کی طاعت کا انکار کر دیا اور کچھ نے ائمہ اجتہاد کی تقلید کے خلاف اس کو دلیل بنا کر پیش کیا۔ یہ دونوں راہیں افراط و تفریط ہیں۔ ان کی اجازت تو خود قرآن نے دی ہے۔ اطیعوا اللہ و اطیعوا الرسول و اولی الامر منکم

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے اپنی مشہور کتاب حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بات کھول کر سمجھا دی ہے۔

اور اس کا راز یہ ہے کہ تحلیل و تحریم اس تکوین اور آئین کا نام ہے جو عالم ملکوت میں نافذ ہے کہ فلاں چیز قابل گرفت ہے یا نہیں۔ یہی تکوین اور نفاذ امر اللہ کی صفات میں سے ہے باقی حضور اقدس ﷺ کی طرف تحلیل و تحریم کی نسبت تو اس معنے میں ہے کہ آپ کا ارشاد اس بات کی قطعی نشانی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس چیز کو حلال یا حرام کیا ہے۔ اور ائمہ مجتہدین کی طرف تحریم و تحلیل کی نسبت اس معنے میں ہے کہ وہ اس کو محض شارع سے روایت کرتے ہیں یا کلام شارع سے استنباط کرتے ہیں۔

قرآن عزیز نے اس مسئلہ کو علمی اور عملی دونوں انداز میں بالکل واضح کر دیا ہے اس آیت کی اصلی ضرب تو ان لوگوں پر ہے جو اللہ و رسول کے قانون کی موجودگی میں انسانوں کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق زندگی گذار رہے ہیں۔

حضرت عدی رضی اللہ عنہ کی حدیث بھی یہی بتا رہی ہے کہ کسی چیز کو حلال و حرام ٹھہرانا کسی انسان کا کام نہیں نہ فرد و لہ

کا نہ جماعت کا بلکہ خدا کا ہے اور اسی کا نام قانون سازی ہے۔ اس تحلیل وتحریم میں کسی کو شریک ٹھہرانا عین شرک ہے اسی طرح خدا کے علاوہ یا خدا کے حکم کے ساتھ بلا وساطت حکم خداوندی کسی دوسرے کے حکم کی اطاعت بھی شرک ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ان عرب یہود اور منافقین کو جو قانون الٰہی کی سختی سے بچنے کے لیے یا ایمان کی کمزوری کے سبب اپنے مقدمات یہودیوں کی عدالت میں لے جاتے تھے یا فیصلہ کے لیے عرب کاہنوں کے پاس جاتے تھے زجر وتوبیخ فرمائی اور ان کے اس عمل کو کھلا نفاق اور شرک قرار دیا چنانچہ ارشاد ہے۔

الم تر الی الذین یزعمون انھم آمنوا بما انزل الیک و ما انزل من قبلک یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وقد امروا ان یکفروا بہ۔

کیا آپ نے ان کو نہیں دیکھا جو گمان کرتے ہیں کہ وہ اس پر جو تیری طرف اتارا گیا اور جو تجھ سے پہلے اتارا گیا ایمان لا چکے ہیں وہ چاہتے ہیں کہ طاغوت کو اپنا حاکم بنائیں۔ حالانکہ ان کو حکم دیا گیا ہے کہ وہ اس کو نہ مانیں۔

طاغوت کا مشترک مفہوم یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ جس کے احکام کو قانون کا درجہ دے کر اطاعت کی جائے اور اس سے فیصلہ کرایا جائے وہ طاغوت ہے۔ قرآن حکیم میں یہ لفظ سات جگہ آیا ہے اور ہر جگہ اس سے مراد حاکم باطل یا معبود باطل مراد ہے۔

قوانین الٰہی کو چھوڑ کر کسی اور قانون کے مطابق فیصلہ کرنا اور فیصلہ چاہنا کفر بھی ہے ظلم بھی ہے اور فسق بھی ہے اس کا صاف مطلب ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قانون کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔

اوّلاً۔ اس کا یہ فعل حکم خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے۔

ثانیاً۔ اس کا یہ فعل عدل وانصاف کے خلاف ہے کیونکہ ٹھیک عدل وانصاف کے مطابق جو حکم ہو سکتا ہے وہ خدا کا حکم ہے اس لیے خدا کے حکم سے ہٹ کر جب اس نے فیصلہ کیا یا لیا تو ظلم کیا۔

ثالثاً۔ یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر کسی اور قانون کو اپنا یا اور یا کسی دوسرے قانون کو نافذ کیا تو درحقیقت بندگی اور طاعت کے دائرے سے اس نے قدم باہر نکالا اور یہی فسق ہے۔

قانون وشرح کی حقیقت تحلیل وتحریم ہی ہے اور یہ حق صرف اللہ کے لیے مخصوص ہے۔ انسان اگر اپنی طرف سے کسی قانون کو وضع کرے اور بلا سند الٰہی کسی چیز کو حرام یا حلال ٹھہرائے تو اس کا نام افترا علی اللہ کذبا۔ خدا پر جھوٹ تہمت وکذب باندھنا ہے۔

بہرحال یہ ایک غبار بات ہے کہ قانون ساز صرف اللہ سبحانہ ہے اور ولا یحرمون ما حرم اللہ ورسولہ

بی نوع کی نسبت جو حضور اقدس ﷺ کی طرف ہے وہ اس حیثیت سے ہے کہ آپ اللہ کے احکام کے مبلغ ہیں رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔ جس طرح خدا کے احکام میں اولی الامر کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے۔

قرآن کی آیت کا منطوق تو یہی ہے ہاں اس کے مدلول میں یہ بات بھی داخل ہے کہ اگر آپ کا مولوی، پیر، استاذ، امام ایک بات کہہ رہا ہے اور سر تا سر اپنی جانب سے کہہ رہا ہے اس کے لیے اس کے پاس قرآن و سنت سے کوئی دلیل نہیں ہے اور آپ اسی کی بات کو پذیرائی دے رہے ہیں تو یقیناً آپ اس کو رب بنا رہے ہیں۔ یا جیسا کہ امام رازی فرماتے ہیں۔

ہمارے شیخ کہتے ہیں کہ میں نے کچھ مقلدین مولوی ایسے بھی دیکھے کہ ان کے سامنے قرآنی آیات پیش کی گئیں جو ان کے مذاہب کے خلاف تھیں تو انھوں نے ان کو شرفِ پذیرائی نہیں دیا۔

یہ تو امام رازی اپنے دور کی بات کہہ رہے ہیں ہمارا اپنا تجربہ ہے کہ لوگوں کو دہر م سے زیادہ دھڑا اس قدر زیادہ محبوب ہے کہ ان کے سامنے شرک و بدعت کی تردید میں قرآن کی آیات پیش کیجیئے تو وہ بڑی سادگی سے کہتے ہیں کہ یہ آیت تو یہودیوں کے بارے میں ہے یا یہ آیت عیسائیوں کے متعلق ہے یا اس میں مشرکین مکہ کا ذکر ہے۔ حد ہے آپ اگر کسی شافعی کے سامنے قرآن کی آیت امام کے پیچھے قرأت کی ممانعت پر پیش کریں گے تو جبین بچیں ہو جائے گا امام شافعیؒ کے قول کی تاویل نہ کرے گا۔ بلکہ قرآن کی آیت کی تاویل کرے گا کبھی کہے گا اس کا تعلق خطبہ سے ہے اور کبھی کہے گا کہ اس کا تعلق سورہ فاتحہ کے سوا باقی قرآن سے ہے۔ اگر کہو کہ عزیز سورۃ فاتحہ بھی تو قرآن ہے تو بڑی سادگی سے کہے گا کہ فاتحہ قرآن نہیں یہ تو ام القرآن ہے۔

علامہ آلوسی نے یہ بات بالکل بجا فرمائی ہے کہ:

یہ آیت ان گمراہ فرقوں کی اس روش پر ماتم کر رہی ہے جو علماء اور لیڈروں کی بات کی وجہ سے اللہ کی کتاب اور سنت رسول کو چھوڑ بیٹھتے ہیں۔ حق اس لائق ہے کہ اسے شرفِ پذیرائی دی جائے خواہ وہ اس کے امام کے اجتہاد کے خلاف ہی کیوں نہ ہو۔

مطالب کی حد تک آیت کی تشریح ختم ہو چکی ہے لیکن بعض مہمات کی تشریح باقی ہے۔ کچھ علماء نے اس آیت سے عدم تقلید پر استدلال کیا ہے آئیے ان کی کہانی بھی خود ان کی زبانی سن لیجئے۔

علامہ شوکانی فتح القدیر میں فرماتے ہیں،

اس آیت میں ہر صاحب دل کو تنبیہ ہے کہ تقلید نہ کرنی چاہیے اللہ کے دین میں۔

نواب صدیق حسن خان ﷫ نے فتح البیان میں علامہ شوکانی کی ہی عبارت بغیر علامہ شوکانی کا نام لیے نقل کر دی ہے اور اس طرح انھوں نے گویا اس میں ہاں ملا دی۔

علامہ سید رشید رضا نے اس آیت پر تقلید کے خلاف بہت بڑا محاذ قائم کیا ہے اور اس انداز سے اس مسئلہ کو پیش کیا ہے گویا آیت قرآنی کا منطوق یہ ہی ہے۔

لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن نے عبادت کا دائرہ جس قدر تنگ رکھا ہے اطاعت میں اس قدر تنگی نہیں رکھی عبادت اس کی محبوبیت کا تقاضا ہے جبکہ طاعت اللہ سبحانہ کی حاکمیت کا تقاضا ہے۔ محبوبیت میں نیابت نہیں ہوسکتی لیکن حاکمیت میں نیابت ہوسکتی ہے۔ عبادت اللہ کے سوا کسی کی نہیں ہوسکتی امران لا تعبدوا الا ایاہ فرمائے حکم دیا ہے کہ اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو یہ کہیں نہیں فرمایا کہ امران لا یطیعوہ الا ایاہ اللہ کے سوا کسی کی اطاعت نہ کرو بلکہ اس کے برعکس اللہ سبحانہ نے اپنی طاعت کے ساتھ رسول کی طاعت کو شرط نجات قرار دیا ہے اور رسول کی طاعت کو اپنی طاعت بتایا ہے من یطع الرسول فقد اطاع اللہ۔ اللہ کی عبادت کا سرچشمہ اللہ کی الوہیت ہے۔ الہ اللہ کے سوا کوئی نہیں اور طاعت کا منبع اللہ کی ربوبیت یعنی حاکمیت ہے حاکمیت میں خلافت ہوسکتی ہے یعنی رسول حاکمیت میں اللہ کی نیابت کرتا ہے۔ رسول ہونے کی وجہ سے اللہ کے رسول کی طاعت کی جاتی ہے اور رسول کی نیابت میں اولی الامر کی اطاعت کی جاتی ہے۔ گویا اصل طاعت اللہ کی ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کا رسول ہونے کی وجہ سے اور رسول کے بعد ہر شخص کی طاعت اس شرط کے ساتھ ہے کہ وہ مطیع رسول ہو چاہے وہ فرمانروا ہوں، اولیاء ہوں یا پھر علماء قاضی ثناء اللہ کا یہ ارشاد بالکل برموقع ہے کہ جس شخص کے ہاتھ میں دامان طاعت رسول نہ ہو اس کی طاعت پر یہ آیت ضرب کاری ہے خواہ وہ کوئی ہو۔

کیا ائمہ اجتہاد ارباب من دون اللہ ہیں

مسلمان جو ائمہ اجتہاد کی اعمال فرعیہ میں تقلید کر رہے ہیں امام ابو حنیفہ، امام مالک، امام شافعی، امام احمد رحمہم اللہ تعالیٰ کیا وہ اس آیت کی روشنی میں اتخاذ اربابا من دون اللہ کا مشرکانہ عمل کر رہے ہیں۔ سب سے پہلے اس غلط فہمی کا شکار حافظ ابن حزم ظاہری ہوئے ہیں۔ حجۃ اللہ البالغہ میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے ان کو جواب دیا ہے کہ ایسا سمجھنا اس شخص کے بارے میں تو درست ہے جو کسی امام اجتہاد کی تقلید کرے اور اس کے بارے میں یہ عقیدت ہو کہ اس سے غلطی نہیں ہوسکتی اور اس کی بات حتمی درست ہے اور ذہن یہ ہو کہ اس کے خلاف اگر دلائل بھی ہوں پھر بھی اس کی ہی بات مانے گا۔ اگر ایسا ہے تو وہ بلا ریب اس آیت کا مصداق ہے لیکن ایسا شخص ہرگز اس کا مصداق نہیں جو دین کی زندگی میں نبوت کی طاعت کرتا ہے اور حلال و حرام کے سارے اختیارات اللہ کے لیے مانتا ہو لیکن چونکہ اسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے ارشادات کا پورا علم نہیں ہے اور آپ کے مختلف ارشادات میں تطبیق سے واقف نہیں ہے اور نہیں جانتا کہ مسائل کو کیسے استنباط کیا جاتا

ہے اس لیے وہ کسی عالم راشد کی اس خیال سے پیروی کرتا ہے کہ اس کی بات درست ہے اگر اس کی بات اسے خلاف سنت معلوم ہو تو فوراً ہٹ جاتا ہے اس کے جواز میں کوئی شبہ نہیں ہے یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ ہم کسی مجتہد کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ اس پر فقہ کی وحی آتی ہے اور ہم پر اس کی طاعت فرض ہے اور وہ معصوم ہے۔ اس کے برعکس ہم اگر کسی کی تقلید کرتے ہیں تو صرف اس لیے کرتے ہیں کہ ہمارے خیال میں وہ امام اجتہاد اللہ کی کتاب اور اللہ کے رسول کی سنت سے واقف ہے اس کی بات پر ہم غور کرتے ہیں تو ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس کی بات کا ماخذ کتاب و سنت میں صراحۃً مذکور ہے یا اس کی بات کتاب و سنت سے مستنبط ہے۔ اگر ان باتوں میں سے کوئی بات نہ ہوتی تو کوئی مومن کسی بھی مجتہد کی تقلید نہ کرتا۔[1]

یہ ہیں حضرت حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور ان کے موضوع تقلید پر شہ پارے۔ شاید آپ کے ذہنوں میں خلش ہو کہ ان چار ہی کی تقلید کیوں کی جاتی ہے تو اس کا جواب ان کے پوتے حضرت مولانا اسماعیل شہید رحمہ اللہ تعالیٰ نے اپنی مشہور کتاب منصب امامت میں دیا ہے فرماتے ہیں:

احکام شرعیہ کا علم دو طرح حاصل ہوتا ہے تقلید کی راہ سے یا تحقیق سے۔ انبیاء کے علوم تقلیدی نہیں تحقیقی ہوتے ہیں۔ تحقیق کے دو راستے ہیں ایک اجتہاد دوسرے الہام۔ انبیاء کے مشابہ علم احکام میں دو ہی ہو سکتے ہیں مجتہدین یا مصلحین۔ اور چونکہ کشف و الہام کے ذریعے احکام کا علم صدر اول میں نہ تھا۔ اس لیے علم احکام میں انبیاء کے مشابہ صرف مجتہدین ہیں۔ ان کو ائمہ فن سمجھنا چاہیے یعنی وہ اس فن کے امام ہیں جیسے چاروں امام۔ ابو حنیفہ، مالک، شافعی اور احمد رحمہم اللہ تعالیٰ اگرچہ مجتہدین ان چار کے سوا اور بھی بہت ہیں لیکن امت میں مقبول اور مشہور یہی چند اشخاص ہیں اس لیے گویا ان ہی چار کو اس فن میں نبوت سے بھرپور مشابہت حاصل ہے اسی وجہ سے تمام مسلمانوں میں خاص ہوں یا عام ان کو امام کے لقب سے پکارا جاتا ہے اور قوت اجتہاد سے موصوف مانا جاتا ہے۔[2]

یہ کہنا کہ تقلید نے علم و بصیرت کی راہوں سے مسلمانوں کو بیگانہ کر دیا اور ان کی عقلی ترقی روک دی تاریخی حالات کا منصفانہ تجزیہ نہیں ہے۔ مسلمانوں کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ مسائل فرعیہ میں ائمہ اجتہاد کی تقلید نہیں بلکہ پوری زندگی کے مسائل میں رؤسا، زعماء اور سلاطین کی تقلید ہے۔ ان کی تقلید نے مسلمانوں کو اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت سے بیگانہ بنایا ہے اور یا پھر ان علماء کی قیادت ہے جو اسلام کو دینداری نہیں بلکہ فن دینداری اور پیشہ دینداری بنائے ہوئے ہیں ورنہ جہاں تک دین کی زندگی میں اسلام کی ترقی کے لیے جیسے اجتہاد کی ضرورت ہے تقلید کی بھی ضرورت ہے۔ کیونکہ بقول مولانا شہید علم دو ہی راہوں سے آتا ہے محققین سے اور یا پھر تقلید سے اور ظاہر ہے کہ پوری امت کا ہر فرد

---

[1] حجۃ اللہ البالغہ

[2] منصب امامت

محقق نہیں ہو سکتا ہر کہ دمہ کا کام تحقیق نہیں ہے خود قرآن نے تحقیق کی ذمہ داری سب پر نہیں کچھ پر ڈال ہے۔

فلولا نفر من کل فرقۃ منھم طائفۃ لیتفقھوا فی الدین۔

پس کیوں ایسا نہ ہوا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آتی کہ دین میں فہم و دانش پیدا کرے۔

آیت میں طائفہ کا لفظ بتا رہا ہے کہ دین میں تفقہ اور تحقیق کی ذمہ داری سب پر نہیں ہے۔ بلکہ کچھ پر ہے۔ جب کچھ پر ہے تو بات صاف ہے کہ باقی کا علم تقلیدی ہے۔ اور جب تقلیدی ہے تو یہ بات واضح ہے کہ تقلید بھی امت کی ضرورت ہے اسلام نہ تو تقلید بلا اجتہاد چاہتا ہے اور نہ اجتہاد بلا تقلید، اجتہاد بلا تقلید اگر افراط ہے تو تقلید بلا اجتہاد تفریط ہے عدل کا تقاضا ہے کہ دونوں ہوں اور اپنی اپنی حدود میں ہوں۔ اسلام اپنے سیاسی اور قانونی نظام میں جامعیت کے ساتھ اجتماعیت چاہتا ہے جیسے سیاسی نظام میں وہ نہ تشتت و پراگندگی کو پسند کرتا ہے اور نہ جمود و استبداد کو۔ وہ ایک طرف اگر امارت چاہتا ہے تاکہ امت میں فوضویت اور انارکی نہ راہ پائے تو دوسری طرف امارت کے لیے شوریٰ کو ضروری قرار دیتا ہے تاکہ امت میں استبداد رونما نہ ہو۔ ٹھیک اسی طرح اسلام قانونی نظام میں نص نہ ہونے کی صورت میں نہ تو عوامی فکر کو اس طرح آزادی عطا کرتا ہے کہ امت کا ہر فرد مجتہد ہو اور کتاب و سنت ہر کہ و مہ کی فکری آوارگی کی جولانگاہ بن جائے۔ کہیں یہ انکار حدیث کا لبادہ پہن لے اور کہیں یہ منصب نبوت پر جا کر براجمان ہو جائے۔ کہیں یہ اجتماعی عمل صحابہ کے خلاف چیلنج بن جائے اور کہیں قرآن کے محکمات پر ہاتھ صاف کر دے اور نہ امت کے لیے ایسی تقلید جامد کو جائز قرار دیتا ہے کہ اس کے قوائے فکر و اجتہاد سرے سے معطل ہو جائیں اور عوامی زندگی کا نبوت کے لائے ہوئے علم و عمل سے رابطہ ٹوٹ جائے اور اس طرح امت کی اجتماعی زندگی پوری کی پوری قرآن و سنت سے بیگانہ ہو جائے۔

اسلام نے ایک طرف تو جنس اجتہاد کو باقی رکھا جس کی انواع حسب اقتضائے زمانہ آتی اور ختم ہوتی رہیں گی اور دوسری طرف تقلید کو قائم رکھا تاکہ عام زندگی کا تعلق اسلاف سے نہ ٹوٹے اور ناواقف اپنی رائے کو دین کا لباس پہنا کر اسلام کو ارائے و قیاسات کا مجموعہ نہ بنائے یعنی امت کے علمی تشتت کو تقلید سے اور تقلیدی جمود کو اجتہاد و تحقیق سے دور کر دیا۔

اگر آپ مانتے ہیں کہ اسلام معروف معنی میں مذہب نہیں بلکہ ایک دین ہے ایک نظام زندگی ہے جو انفرادی زندگی تک محدود نہیں ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی تقاضوں کی تشنگی کو دور کرتا ہے تو پھر عدم تقلید کی منادی کرنے کے اس کے سوا کوئی معنے نہیں کہ آپ قانون کے فن کو بتائے بغیر ہر کہ و مہ کو کیل بیرسٹر اور بارایٹ لا بننے کا پروانہ دے رہے ہیں۔ آپ سوچئے کہ آپ کدھر جا رہے ہیں اور دنیا کو کیا باور کرا رہے ہیں۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر یہ منطق میری سمجھ سے بالا ہے کہ ایک طرف آپ اسلام کے بارے میں یہ دعویٰ بھی کرتے ہیں کہ یہ ایک نظام زندگی ہے اور مکمل نظام ہے جو اس سے ہٹ جائے گا اس کی زندگی مصائب کا گہوارہ بن جائے گی اور دوسری طرف

اسلام کے ماضی سے رشتہ توڑنے کی دنیا کو دعوت دیتے ہیں۔ اگر آپ چاہتے ہیں کہ امت کے ہر فرد کا علم اسلام کے بارے میں تحقیقی ہو کسی کا علم تقلیدی نہ ہو تو یہ وہ بات ہے جس کا مطالبہ خود قرآن نے بھی امت سے نہیں کیا۔ جیسا آپ سن چکے ہیں۔ بہرحال اس آیت کا منطوق مسائل فرعیہ میں ائمہ اجتہاد کی تقلید نہیں بلکہ عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی زندگی میں اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت کو چھوڑ کر رؤسا، زعما اور ارباب اقتدار کی تقلید ہے بتانا یہ چاہتا ہوں کہ آیت قرآنی نماز میں روزے میں اور حج کے اجتہادی مسائل میں امام ابوحنیفہ امام شافعی، امام مالک اور امام احمد کی تقلید پر قدغن قائم نہیں کر رہی ہے۔ بلکہ معاملات سیاسی میں قومی مسائل میں اور اقدار زندگی میں اللہ اور اس کے رسول کو چھوڑ کر رؤسا اور سلاطین کی تقلید سے روک رہی ہے اور بتا رہی ہے کہ ان کے کہنے میں آکر خدا اور رسول کی بغاوت نہ کرو۔ اس کا روئے سخن صرف عوام کی طرف نہیں خواص کی طرف بھی ہے وہ ججوں اور وکیلوں سے کہہ رہی ہے کہ اگر تم جانتے ہو کہ قرآن میں چور کی سزا قطع ید ہے تو تم اللہ کے اس فیصلہ کو چھوڑ کر اگر ارباب اقتدار کے قانون کے مطابق فیصلے کرتے ہو تو یہ تمہاری جانب سے ارباب اقتدار کو رب بنا لینا ہے اور عوام سے کہتی ہے اگر تم اپنے مقدمات ایسے حکمرانوں کی عدالت میں لے جاتے ہو تو تمہارا یہ عمل ان کو ارباباً من دون اللہ بنانے کے مترادف ہے اور بس۔

اِسلام کا چراغ روشن رہے گا

(۳۲) یہ لوگ چاہتے ہیں کہ اپنی پھونکوں سے اللہ کی روشنی کو بجھا دیں حالانکہ اللہ نہ رہے گا اپنی روشنی کو پورا کیے بغیر چاہے کافر برا مانیں یعنی توحید خالص اور اسلام کا آفتاب جب چمک اٹھا تو یہ دوغلی باتیں اور مشرکانہ دعاوی کہاں فروغ پا سکتے ہیں یہ کوشش کہ بے حقیقت اور بے مغز باتیں بنا کر اور فضول بحث و جدال کر کے نور حق کو مدہم کر دیں ایسی ہے کہ کوئی بیوقوف منہ سے پھونکیں مار کر چاند یا سورج کی روشنی کو بجھانا یا ماند کرنا چاہے یاد رکھو یہ لوگ خواہ کتنے ہی جلیں مگر خدا نور اسلام کو پوری طرح پھیلا کر رہے گا۔[1]

سورہ صف میں بھی یہی آیت گرامی ذرا سے فرق کے ساتھ آئی ہے۔ ارشاد ہے۔ یریدون لیطفئوا نور اللہ بافواھھم واللہ متم نورہ اس سورت میں واللہ متم نورہ اور یہاں ویابی اللہ الا ان یتم نورہ۔ یہ تفنن کیوں ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ سورہ صف کا زمانہ نزول ۳ ہجری ہے یہ وہ وقت ہے جب مسلمانوں کو جنگ احد میں شکست ہوئی اور اسلام کا اقتدار سیاسی صرف مدینہ کے چند محلوں تک محدود تھا۔ مسلمانوں کی تعداد چند ہزار سے زیادہ نہ تھی اور سارا

[1] افادات شیخ الاسلام

عرب اس دین کو مٹانے کی فکر میں تھا ایک طرف قبائل اور دوسری طرف یہودی۔

عرب کا ملکی نظام یہ تھا کہ تمام ملک میں قبائل پھیلے ہوئے تھے اور ہر قبیلہ کا ایک رئیس اعظم تھا جو تمام قبیلہ پر حکمرانی کرتا تھا اور مال غنیمت سے چوتھ وصول کرتا تھا جس کو مرباع کہتے تھے۔ اس کے علاوہ غنائم میں سے جو عورت یا کوئی اور عمدہ چیز اس کو پسند آتی تھی اس کو چھانٹ لیتا تھا اس کا نام صفی تھا یہ گویا چھوٹی چھوٹی حکومتیں تھیں جو تمام ملک میں پھیلی ہوئی تھیں یہ ریاست خاندانی اصول پر چلتی تھی۔ باپ کے مرنے کے بعد بیٹا رئیس ہوتا تھا قبیلہ کے تمام معاملات ذاتی نزاعیں قصاص یا خون بہا کے فیصلے سب رئیس کے ہاتھ سے ہوتے تھے۔ یہ رؤسا عام قوم سے بہت سے حقوق میں برتر ہوتے تھے۔

اس لیے عرب میں تمام رؤسائے قبائل کو صاف نظر آتا تھا کہ اسلام کا پھیلنا ان کے ہر قسم کے فخر و امتیاز کا مٹ جانا ہے

عرب میں ایک دوسری حریف طاقت یہودیوں کی تھی جو حجاز سے لے کر شام کے دروازوں تک پھیلے ہوئے تھے۔ ان کے ہاتھ میں بڑے مضبوط قلعے تھے فن جنگ سے واقف تھے سامان و اسلحہ بھی وافر رکھتے تھے۔ دولت کی بہتات تھی باغوں اور زمینوں پر ان کا قبضہ تھا۔ عرب کے تمام مادی ذرائع کے وہ تنہا اجارہ دار تھے۔ اسلام آیا تو اس طرح کہ اس نے یہودیوں کے ایک ایک عیب کو طشت از بام کیا اور ان کے مذہبی وقار کے کھوکھلے پن کو علی الاعلان ظاہر کیا۔

اس لیے انہیں صاف نظر آتا تھا کہ یہ نئی طاقت ملک میں جڑ پکڑ کر ان کو بیخ و بنیاد سے اکھاڑ دے گی۔

عرب کے مختلف قبیلوں اور سرحدی صوبوں پر ایران اور روم کی حکومتوں کا قبضہ تھا۔ عراق۔ یمن اور بحرین پر ایران کا حکومت تھی اور حجاز کی شمالی حدود پر قیصر کا قبضہ تھا۔ عرب کے مختلف ہمسایہ قبیلے ان ہی دو میں کسی ایک سلطنت کی حفاظت کا نعرہ لگاتے تھے۔

اسی لیے عرب میں اسلام کی قوت کا جب ان کو احساس ہوا تو انھوں نے اس کی داروگیر کرنی چاہی۔ کسریٰ ایران نے یمن کے گورنر کو لکھا کہ اس نئے مدعی نبوت کو پکڑ کر ہمارے دربار میں حاضر کرو اور قیصر نے تو کھلم کھلا حملہ کی تیاری بھی کر دی تھی جس کی وجہ سے تبوک کی فوج کشی ہوئی اور آخر حضور اقدس ﷺ کے بعد اسلام کو ان دونوں ہمسایہ طاقتوں سے نبرد آزما ہونا پڑا۔

اُحد کے معرکہ کے بعد جو زک مسلمانوں کو پہنچی تھی۔ اس کی وجہ سے ان کی ہوا اُکھڑ گئی تھی۔ اور گرد و پیش کے قبائل ان پر شیر ہو گئے تھے ان حالات میں فرمایا۔ واللہ متم نورہ اللہ کے اس نور کو کوئی بجھا نہ سکے گا پوری طرح روشن سورج کی طرح بالفعل روشن ہو کر رہے گا۔ یہ گویا پیشین گوئی تھی کہ عرب قبائل اور یہودی اقتدار ختم ہو کر رہے گا یہ ۳ھ ہجری کی بات ہے یہ ایک صریح پیشین گوئی ہے جو حرف بحرف صحیح ثابت ہوئی اللہ سبحانہ کے سوا اس وقت کون جان سکتا تھا کہ احد میں شکست کے بعد اسلام کا مستقبل کیا ہوگا۔

یہ پیش نظر آیت ۹ھ میں نازل ہوئی اور یہ تمام تر امت کے نام دوائی پیام تھا اور احکام سے مقصود پیش آنے والے واقعات تھے اس میں فرمایا و یابی اللہ الا ان یتم نورہ اللہ یہ روشنی پوری کیے بغیر نہ رہے گا یہ قبائل اور یہود یوں کے علاوہ ایران و روم کی طرف اشارہ تھا کہ اسلام کا بول بالا ہو کر رہے گا اور یہ طاقتیں مٹ کر رہیں گی۔

آئیے اب اسی روشنی میں یہ ارشاد نبوت پڑھیے۔ یہ مسند امام احمد کی حدیث ہے اور حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں اسے جگہ دی ہے یہ اس کی صحت کی ضمانت ہے۔

حضرت عدی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوا۔ آپ نے مجھ سے فرمایا کہ اسلام قبول کر لے میں نے عرض کیا میں ایک دین سے تعلق رکھتا ہوں تو آپ نے فرمایا مجھے تیرے دین کا تیرے سے زیادہ پتہ ہے۔ میں نے کہا کیا میرے دین کو آپ میرے سے زیادہ جانتے ہیں؟ فرمایا ہاں کیا تم فرقہ رکوسیہ سے تعلق نہیں رکھتے ہو۔ اور تم اپنی قوم سے چوتھا بھی لیتے ہو میں نے عرض کیا جی ہاں فرمایا یہ تو تمہارے دین میں تمہارے لیے حلال نہیں ہے۔ میں نے نیازمندانہ طرز عمل اختیار کر لیا آپ نے فرمایا مجھے پتہ ہے کہ تمہارے اور اسلام کے درمیان کیا رکاوٹ ہے یہی نا کہ تمہارا خیال یہ ہے کہ اسلام کو پذیرائی دینے والے وہ عرب اور کمزور لوگ ہیں جن کو عرب نے بھی پرے ہٹا دیا ہے کیا تمہیں حیرہ کا پتہ ہے میں نے عرض کیا کہ میں نے دیکھا نہیں ہے ہاں سنا ضرور ہے فرمایا قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں میری جان ہے اللہ اس معاملہ کو یعنی اسلام کے اقتدار کو پورا کر کے رہے گا تا آنکہ حیرہ سے ایک کجاوہ سوار عورت روانہ ہوگی۔ بیت اللہ کا بغیر کسی خوف کے طواف کرے گی اور بخدا تم کسریٰ کے خزانے فتح کرو گے۔ میں نے کہا کسریٰ ابن ہرمز فرمایا ہاں کسریٰ ابن ہرمز تم مال خرچ کرو گے اور لینے والا کوئی نہ ہوگا۔ عدی کہتے ہیں دو باتیں پوری ہو چکی ہیں بخدا تیسری بھی پوری ہو کر رہے گی کیونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی فرمائی ہوئی ہے

اللہ اکبر عرب قبائل یہ پوری دنیا رومی اقتدار اور ایرانی حکومت سب کی کوشش ہے سب کی خواہش ہے کہ اللہ کی روشنی اسلام کے چراغ کو اپنی مادی طاقت کی پھونکوں سے بجھا دیا جائے۔ یریدون ان یطفئوا نور اللہ بافواھھم مگر اللہ نے فیصلہ فرمایا ہے کہ عرب کے صحرانشین کے ذریعے جن کی ساری زندگیاں اونٹ چراتے بسر ہوئیں تھیں اسلام کا بول بالا کرے اور ایرانیوں اور رومیوں جیسی متمدن قوموں کی قسمتوں کو ان کا مالک بنائے۔

ڈاکٹر فلپ ہٹی اپنی تاریخ عرب میں لکھتا ہے۔

اگر کوئی فرد ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں ایسی پیشین گوئی کی جسارت کرتا کہ دس سال کے اندر اندر عرب کی سراسر غیر متمدن اور غیر متعارف سرزمین سے ایک نادیدہ قوت کا ظہور ہونے والا ہے۔ جو وقت کی

دونوں عالمی طاقتوں سے ٹکرا جائے گی ایک یعنی ساسانیوں کی پوری میراث سنبھال لے گی اور دوسری یعنی بیزنطینوں کے بہترین صوبوں پر قبضہ جمالے گی تو لاریب اسے پاگل قرار دیا جاتا۔ لیکن یہی صورتحال پیش آئی۔ پیغمبر اسلام کی وفات کے بعد عرب کی بنجر اور بے آب سرزمین جادو کی چھڑی سے ایسے سورماؤں کی پرورش گاہ بن گئی۔ جس کی مثال کیت وکیفیت دونوں کے اعتبار سے کسی دوسری جگہ ملنی دشوار ہے۔ عراق، ایران شام اور مصر میں خالد بن ولید اور عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ کی مہمیں تاریخ رزم کی ان مہمات میں سے ہیں جنہیں نہایت درخشاں انداز میں پایۂ تکمیل تک پہنچایا گیا اور ان کا مقابلہ نپولین، ہنی بال یا سکندر کی مہموں سے کیا جائے تو ترجیح کی مستحق قرار پائیں گی[1]

اسلام قرآن اور حضور اقدس ﷺ کے مقابلے میں عرب قبائل اور یہودیوں، رومیوں اور ایرانیوں کی سازشوں کو قرآن نے پھونکیں مارنے سے تعبیر کیا ہے اور یہ بڑی ہی بلیغ تعبیر ہے اسلام اگر اللہ کا دین ہے اور یہی نور اللہ ہے تو اسے ختم کرنے کے لیے دنیا کی ساری مادی طاقتوں کی کوششوں کی حیثیت آفتاب کو پھونکیں مار کر بجھانے سے زیادہ کچھ نہیں ہے بتانا یہ ہے کہ ان کی کوششوں سے خواہ یہ کتنی زیادہ ہوں اسلام کا بال بیکا نہ ہوگا کیوں؟ اس لیے کہ ویابی اللہ الا ان یتم نورہ اس لیے کہ اللہ نے اسلام کا بول بالا کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے قرآن نے یہ کہہ کر صحابہ کو دلیری دی تھی۔

حیرت ہے کہ تاریخ کی اس بدیہی اور بے غبار حقیقت کے باوجود شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح میں یہ تکلف کیوں فرمایا کہ:

> اللہ کے دین حق کی اپنی منہ زبانی باتوں کی سند پر مخالفت کرنا ایسا ہی ہے کہ کوئی سورج کو مٹی کا دیا سمجھ کر اس کو اپنے منہ کی پھونکوں سے بجھانا چاہے۔

اسلام کا سب ادیان پر غلبہ

(۳۳) اسی نے تو اپنے رسول کو الہدی اور دین الحق دے کر روانہ کیا ہے تاکہ اس کا بول بالا ہو ہر دین پر اگرچہ مشرکوں کو ناگوار ہو۔ اسلام کا غلبہ باقی ادیان پر معقولیت اور حجت ودلیل کے اعتبار سے یہ تو ہر زمانے میں بحمد اللہ نمایاں طور پر رہا ہے۔ باقی حکومت وسلطنت کے اعتبار سے وہ اس وقت حاصل ہوا ہے اور ہوگا جبکہ مسلمان اصول اسلام کے پوری طرح پابند اور ایمان وتقویٰ کی راہوں میں مضبوط اور جہاد فی سبیل اللہ میں ثابت قدم تھے یا آیندہ ہوں گے اور دین حق کا ایسا غلبہ کہ باطل ادیان کو مغلوب کر کے بالکل صفحۂ ہستی سے محو کر دے، یہ نزول مسیح کے بعد قرب قیامت میں ہونے والا ہے[2]

---

[1] تاریخ عرب

[2] افادات شیخ الاسلام

یہ آیت گرامی مہات معارف قرآنی میں ہے؛ اور اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ یہ آیت قرآن میں ایک بار نہیں تین بار آتی ہے ایک بار سورہ صف میں اور دوسری بار سورہ فتح میں اور تیسری بار اس سورت میں یعنی پہلے ۳ھ میں غزوہ احد کے بعد اور ۶ھ میں صلح حدیبیہ کے بعد اور یہ آیت ۹ھ میں فتح مکہ کے بعد آئی۔ ۳ھ میں غزوہ احد میں شکست کے بعد بتایا کہ جو لوگ اللہ کی بندگی کے ساتھ دوسروں کی بندگیاں ملاتے ہیں اور اللہ کے دین میں دوسرے دینوں کی آمیزش کرتے ہیں جو اس بات پر راضی نہیں ہیں کہ پوری کی پوری زندگی اسلام کے تحت قائم ہو ان کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کا رسول اس لیے نہیں آیا ہے کہ کچھ لو اور کچھ دو کی پالیسی اختیار کر کے ان کے ساتھ مصالحت کرے بلکہ اس لیے روانہ کیا گیا ہے کہ اسلام کو نظام زندگی کے ہر شعبے میں نافذ کر کے اسے سب پر غالب کرے۔ مشرکین مزاحمت میں جتنا زور لگا سکتے ہیں لگالیں رسول کا مقصد پورا ہو کر رہے گا اس اعلان سے احد کے بعد ایک طرف اہل ایمان میں دلیری آئی اور دوسری طرف مشرکین بھی حیران رہ گئے۔

دوسری آیت ۶ھ میں حدیبیہ کی صلح کے بعد نازل ہوئی اس موقعہ پر یہ اعلان پھر دہرایا گیا۔ کیونکہ حدیبیہ میں جب معاہدہ صلح لکھا جانے لگا تھا اس وقت کفار مکہ نے حضور اقدس ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ رسول اللہ کا لفظ لکھنے پر اعتراض کیا تھا ان کے اصرار پر خود حضور ﷺ نے معاہدے کی تحریر سے یہ الفاظ مٹا دیئے تھے۔ اکثر مسلمان معاہدے کی شرطوں پر بہت پریشان تھے۔ اہل ایمان کی اسی پریشانی کو طمانیت وسکون میں تبدیل کرنے اور کفار کو دانت پیسنے کی خاطر یہ ارشاد ہوا کہ غم کی کوئی بات نہیں آپ جو ہدایت اور دین حق لے کر آئے ہیں بول بالا اسی کا ہونا ہے اور اس پر اللہ گواہ ہے۔ اب اس موقعہ پر فتح مکہ کے بعد دنیا کی سپر پاور یعنی رومی حکومت نے اسلام کو آنکھیں دکھانی شروع کیں تو قرآن نے اس اعلان کو یہاں پھر دوہرایا اور بتایا کہ جس دین حق اور ہدایت کو اللہ نے اپنے رسول کو دے کر روانہ کیا ہے وہ اس لیے نہیں آیا ہے کہ کسی دوسرے نظام زندگی کا تابع اور مغلوب کر رہے بلکہ وہ پوری کائنات کے خالق و مالک کا دین حق ہے اور رسول اس کا نمائندہ ہے وہ اس دین حق کو غالب کرنے آیا ہے اگر کوئی دوسرا نظام زندگی دنیا میں ہے بھی تو وہ اس دین حق کے تحت صاغرون بن کر رہے گا یعنی اسلام کی بخشی ہوئی گنجائشوں میں سمٹ کر رہنا ہوگا۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمہ اللہ تعالیٰ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔

حضور اقدس ﷺ خلافت عامہ لے کر مبعوث ہوئے ہیں۔ اور آپ کے دین کا غلبہ تمام ادیان پر بغیر جہاد اور اس کے سامان کے ہو نہیں ہو سکتا جب مسلمان جہاد چھوڑ بیٹھیں گے اور گائے کی دم کے پیچھے پڑ جائیں گے مسلمانوں کو ذلت گھیرے گی اور دوسرے ادیان کا ان پر غلبہ ہو جائے گا۔

اب شاہ صاحب کی عبارت کو بتکرار پڑھیں اور غور کریں کہ کیا کہہ رہے ہیں اور اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں کیا اتارنا چاہتے ہیں، جو کچھ فرما رہے ہیں وہ اس آیت قرآنی کی روح ہے۔

یہ آیت ہمیں دنیا کے ادیان کے مقابلے میں اسلام کی حیثیت بتا رہی ہے کہ اسلام ساری دنیا کے لیے دین حق اور ذریعہ نجات ہے۔ اس کے سوا جو کچھ ہے یا باطل ہے اور یا اللہ کے نزدیک غیر مقبول ہے۔ اس بات کا ناگزیر تقاضا یہ ہے کہ اسلام کو ماننے والے اللہ کا دین لے کر دنیا کے گوشے گوشے میں پہنچیں اور اسلام کی راہ میں کسی کو مزاحم نہ ہونے دیں۔ جن لوگوں کے سینے نہ کھلیں۔ ان کو اسلام لانے کے لیے ہرگز مجبور نہ کریں۔ لیکن انہیں اس بات کی بھی اجازت نہ دیں کہ وہ دوسروں کے دلوں اور دماغوں پر پہرے دار بن کر بیٹھ جائیں۔ ظاہر بات ہے کہ اسلام کو ایسا ماحول اس وقت ہی دستیاب ہو سکتا ہے جب زندگی کا اجتماعی نظام باطل کے ہاتھوں سے چھین کر خود اس کے ہاتھوں میں آجائے۔ کیونکہ انسانی معاشرے پر جو نظام مسلط ہوتا ہے وہ لوگوں کے ذہنوں کو بھی اپنے تسلط میں رکھتا ہے۔ کم از کم اسلام تو یہی کہتا ہے اور جو شخص بھی اسلام کی مذکورہ حیثیت کو سامنے رکھ کر غور کرے گا وہ یہ ماننے پر مجبور ہوگا اب اگر کوئی دوسرا نظام سیاسی اسلام کے راستے میں رکاوٹ ہے تو اس کے معنے صاف یہ ہیں کہ اسلام کہیں بھی کسی غیر اسلامی نظام حیات کو نافذ رہنے کا حق دار تسلیم نہیں کرتا اور چاہتا ہے کہ اقتدار اس کے ہاتھ میں ہو۔ اور جہاں بھی اس کے اقتدار کو تسلیم کرنے سے انکار کیا جائے وہاں طاقت استعمال کی جائے چنانچہ قرآن جہاں ایک مدت تک دفاعی جہاد کی تاکید پر تاکید کرتا رہا وہاں اس وداعی پیام یعنی سورہ برات میں اس نے آخری نشانہ یہ بتایا کہ:

یظھرہ علی الدین کلہ

ضمیر کا مرجع حتا دین الحق کیونکہ ضمیر کا مرجع قریب ہو تو زیادہ اچھا ہے۔ اور اسی میں معنویت ہے کہ جس دین حق کو رسول لے کر آیا ہے اللہ اس کو سب ادیان پر غالب کرے گا۔ اور اگر ضمیر کا مرجع رسول کو قرار دیا جائے اور مطلب بتایا جائے کہ اللہ اپنے رسول کو سارے دین سے باخبر کرے گا تو اس میں کوئی معنویت نہیں ہے کہ دین تو سارا ہی رسول لے کر آیا ہے اور وہ اس سے پہلے بھی باخبر ہے پورے ۲۳ سال کے بعد اس کہنے میں کوئی معنویت نہیں ہے۔ اگرچہ اس تشریح کی نسبت حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی طرف کی گئی ہے لیکن محققین نے اسے قابل ذکر نہیں سمجھا ہے۔

بہرحال آیت میں سارے دینوں پر اسلام کے غالب کرنے سے مراد صرف نظریاتی غلبہ نہیں بلکہ اس کے ساتھ سیاسی غلبہ بھی ہے۔ اسی وجہ سے اس کے بعد والی آیت میں یہ کہہ کر اسلام کو غالب کرنے کی تدبیر بتائی گئی ہے۔

قاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ

اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس قتال اور جہاد کو کبھی ختم نہ ہونے والی ضرورت اور ذمہ داری بتاتے ہوئے امت کو خبردار کیا ہے۔

الجھاد ماض منذ بعثنی اللہ الی ان یقاتل آخر امتی الدجال لا یبطلہ جور جائر ولا عدل عادل۔

جہاد میرے وقت سے لے کر اس وقت تک جاری رہے گا جب تک میری امت کا آخری فرد دجال سے نہ لڑے۔
یہ جہاد نہ تو کبھی کسی ظالم امیر کے ظلم کی وجہ سے ساقط ہوگا اور نہ کسی عادل امیر کے عدل کی وجہ سے۔

حضور اقدس ﷺ نے اپنے آخری دور میں اور خلفائے راشدین نے اپنے زمانوں میں عرب سے باہر کے حکمرانوں کو جو دعوت اسلام نے دی اور ان کے انکار پر جس طرح طاقت کے ذریعے انہیں اسلامی اقتدار کا تابع فرمان بنایا وہ اسی غرض کے تحت دفاعی نہیں بلکہ اقدامی جہاد تھا۔

اقدامی جہاد کی وضاحت

اقدامی جہاد کے بارے میں جس کا یہ آیت قرآنی مطالبہ کر رہی ہے یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ:

اولاً۔ اس کا ہرگز یہ منشا نہیں ہے کہ لوگوں کو جبراً مسلمان بنایا جائے کیونکہ اسلام کا تعلق دل سے ہے اور دل جبر سے کبھی معتقد نہیں ہوتا قرآن میں یہ بات کھول کر اور واضح کی گئی ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ چاہتا کہ اس کے بندوں میں کوئی گمراہ نہ ہوتا تو وہ ان کو پیدا ہی مومن بنا کر کرتا یا پیدا کرنے کے بعد جبراً مومن بنا دیتا فلو شاء لهداكم اجمعين یا ولو يشاء الله لهدى الناس جميعًا۔ لیکن چونکہ انسان جس غرض کے لیے پیدا کیا گیا ہے اس کے پیش نظر یہ جبری اسلام کسی طرح صحیح نہ تھا اس لیے اس نے ایسا نہیں کیا چنانچہ اس کا صاف اعلان ہے لا اکراہ فی الدین ایسی حالت میں وہ اس بات کو کیسے صحیح قرار دے سکتا تھا کہ اگرچہ اسلام کے معاملے میں میں نے جبر نہیں کیا ہے تو مسلمانو تم جبر کرو۔ یہ اعلان تو صاف بتاتا ہے کہ اسلام قبول کرنے کے لیے جبر کسی حال میں نہ کیا جائے گا۔ نہ پیدائشی طور پر نہ خارجی اور سیاسی طور پر۔ اس معاملے میں ہر انسان کے لیے آزادی ہے۔ چاہے تو قبول کرے چاہے تو نہ کرے۔

ثانیاً یہ کہ کسی قوم کو آقا اور دوسری قوم کو اس کا غلام بنانے کی مہم نہیں ہے یعنی جس چیز کو استعماریت یا سامراج کہا جاتا ہے اس سے اس کا دور کا بھی کوئی تعلق نہیں ہے اس کے برخلاف یہ کچھ ایسی بنیادی صداقتوں کی صرف سیاسی بالادستی تسلیم کرانے کی مہم ہے جن پر اس پوری کائنات کا نظام قائم ہے اور جن کے تسلیم کرنے پر انسان کی دنیا اور آخرت دونوں کی فلاح موقوف ہے۔ پھر جو لوگ دوسروں سے ان بنیادی صداقتوں کی صرف سیاسی بالادستی تسلیم کرانے اٹھے ہوئے ہیں ان کا حال یہ ہے کہ وہ خود ان کی کلی بالادستی مانے ہوئے ہیں۔ سوچیے جو گروہ خود سب سے بڑے آقا سے مکمل غلام کی حیثیت رکھتا ہو وہ کسی دوسرے کو کیا اور کیسے اپنا غلام بنائے گا۔ اس کے علاوہ دوسروں سے ان بنیادی صداقتوں کی یہ جزوی بالادستی بھی وہ اپنے کسی فائدے کے لیے نہیں بلکہ خود انہیں کے فائدے کے لیے تسلیم کراتے ہیں وہ ان سے کچھ لیتے نہیں بلکہ ان کو کچھ دینے کی ضرور کوشش کرتے ہیں۔ کیونکہ اس طرح وہ انہیں اس حق کو قریب سے دیکھنے کا موقع فراہم کرتے ہیں جس میں ان کی

دونوں جہانوں کی مسرتیں چھپی ہوئی ہیں۔ بلاشبہ ان کی حمیت کو یہ سیاسی محکومی ناگوار ہوگی لیکن یہ حمیت ایک غلط قسم کی حمیت ہوا ہے اور خود ان کے اپنے مفاد کے خلاف ہوتی ہے اس لیے ہرگز کسی توجہ کی مستحق نہیں ہے۔

شارحین قرآن نے بالعموم اس آیت میں سیاسی غلبہ نہیں بلکہ نظریاتی غلبہ مراد لیا ہے۔ قرطبی فرماتے ہیں کہ یہ غلبہ دلیل و حجت کا ہے بالحجة والبراهين شوکانی لکھتے ہیں کہ اسلام کا غلبہ دلائل، معجزات اور ان قوانین کے ذریعے ہے جو اللہ نے اپنے بندوں کے لیے بنائے ہیں من البراهين والمعجزات والاحکام۔ امام رازی رقم طراز ہیں کہ کسی چیز کی دوسری پر برتری کبھی دلیل کے ذریعے ہوتی ہے۔ کبھی کثرت اور بہتات سے اور کبھی استیلا اور دبدبے سے اور آگے فرماتے ہیں کہ اسلام کا نظریاتی غلبہ جانا پہچانا ہے۔ ظهور هذا الدين بالحجة مقرر معلوم۔

حالات کی تبدیلی سے شرح و تفسیر میں تبدیلی رونما ہو جاتی ہے دراصل خود بدلتے نہیں ہیں۔ کوشش یہ کرتے ہیں کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے اتار کر اپنی پستیوں سے ہمکنار کرلیں۔ مسلمانوں کی بدعملی سے سیاسی اقتدار چھن گیا درفلامی آیا تو قرآن کی تفسیر پر اس کا اثر پڑا ہے۔ ورنہ آیت کی اصل تشریح وہی ہے جو حافظ ابن کثیر، حافظ ابن جریر اور محققین نے اختیار کی ہے کہ دنیا کے تمام موجود نظاموں کے مقابلے میں اسلام کا بول بالا کرے گا اور یہ حقیقت بالکل بے غبار ہے جیسا کہ الجصاص نے لکھا ہے:

جو کچھ بتایا گیا تھا ویسا ہی کچھ ہوا حضور اقدس ﷺ کی امت کا مخالف اسلام قوموں کے مقابلے میں بول بالا ہوا۔ اس واقعہ میں حضور کی نبوت کی قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی کھلی شہادت ہے۔

یہ اشاعت و غلبہ اسلام کی ایک زبردست پیشین گوئی ہے اور وہ پوری ہوئی اسلام نے دنیا پر اس طرح کامیاب حکومت کی کہ اس کے سامنے تمام متمدن حکومتوں کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ اس سے بڑھ کر پیشین گوئی کی صداقت اور کیا ہو سکتی ہے

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِنَّ كَثِيرًا مِّنَ الْأَحْبَارِ وَالرُّهْبَانِ لَيَأْكُلُونَ
أَمْوَالَ النَّاسِ بِالْبَاطِلِ وَيَصُدُّونَ عَن سَبِيلِ اللَّهِ ۗ
وَالَّذِينَ يَكْنِزُونَ الذَّهَبَ وَالْفِضَّةَ وَلَا يُنفِقُونَهَا
فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَبَشِّرْهُم بِعَذَابٍ أَلِيمٍ ﴿٣٤﴾ يَوْمَ يُحْمَىٰ
عَلَيْهَا فِي نَارِ جَهَنَّمَ فَتُكْوَىٰ بِهَا جِبَاهُهُمْ وَجُنُوبُهُمْ وَ
ظُهُورُهُمْ ۖ هَٰذَا مَا كَنَزْتُمْ لِأَنفُسِكُمْ فَذُوقُوا مَا كُنتُمْ تَكْنِزُونَ ﴿٣٥﴾

اے اہلِ ایمان بہت سے علماء اور مشائخ کھاتے ہیں لوگوں کے مال ناجائز طور پر اور لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں[۳۴] اور جو سونے اور چاندی کو ذخیرہ بناتے ہیں اور راہِ خدا میں اسے خرچ نہیں کرتے ان کو دردناک عذاب کا مژدہ سنا دیجئے[۳۵]۔ یہ عذاب اس روز ہوگا جس دن سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا پھر اس سے ان کی پیشانیوں پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا یہ ہے جو تم نے ذخیرہ کیا تھا اپنے لیے۔ اس ذخیرہ کا مزہ چکھو[۳۶]۔

مفردات کے معانی

الاحبار۔ یہ جمع حبر کی ہے قرطبی فرماتے ہیں کہ حبر وہ ہے کہ جس کی گفتگو میں حسن، نظم اور اتقان ہو۔ اسی سے بیل دار کپڑے کو محبر کہتے ہیں اسی سے تحبیر کے معنے سجانا خوبصورت بنانے کے ہیں! ابو موسیٰ اشعری خوش آواز تھے نماز میں تلاوت قرآن کر رہے تھے۔ حضور اقدس ﷺ سن رہے تھے۔ انھوں نے نماز سے فراغت حاصل کی تو حضور نے ان کو شاباش دی اور فرمایا کہ ابو موسیٰ اللہ نے تجھے تو مزامیر داؤد سے مزمار دیا ہے! ابو موسیٰ نے خوش ہو کر کہا اگر مجھے پتہ ہوتا کہ یا رسول اللہ

آپ سن رہے ہیں تو لجبرت تجبیر اخوب بنا سنوار کر پڑھتا۔ احبار کے واحد میں اختلاف ہے کچھ حبر بکسر الحاء کہتے ہیں اور کچھ حبر بفتح الحاء بتاتے ہیں۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ مفسرین قرآن بفتح الحاء کہتے ہیں اور اہلِ لغت بکسر الحاء ابن السکیت نے دونوں میں فرق بتایا ہے کہ حبر بالکسر روشنائی اور بالفتح عالم کو کہتے ہیں۔ آلوسی فرماتے ہیں کہ عالم کو کہتے ہیں چاہے مسلمان ہو یا غیر مسلم۔

الرھبان۔ جمع راہب کی ہے راہب رہبۃ سے ہے جس کے معنے ڈر ہیں رھب یرھب کا مصدر ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ حمیری زبان میں رہب آستین کو کہتے ہیں۔ اصمعی کا بیان ہے کہ میں نے ایک اعرابی کو کہتے سنا اعطنانی رھبك جو تیری آستین میں ہے دے دے رھبان زاہدان اہلِ کتاب کو کہتے ہیں قرطبی کہتے ہیں راہب وہ ہے جس میں لوگوں سے ہٹ کر محض اللہ کے ڈر سے اخلاص نیت ہو۔ اس کے اوقات اس کے کام اور اس کا لگاؤ صرف اللہ سے ہو۔ امام بغوی فرماتے ہیں کہ رھبان عابدانِ صومعہ نشین ہیں اس کا واحد راہب ہے جیسے فارس اور فرسان راکب اور رکبان اور کبھی رہبان ہی واحد ہوتا ہے اس کی جمع رہابین آتی ہے۔ امام راغب فرماتے ہیں کہ رہبان واحد اور جمع دونوں آتے ہیں۔ جو اس کو واحد قرار دیتے ہیں وہ اس کی جمع رہابین بناتے ہیں اور رہبانیۃ زیادہ مناسب ہے اسی سے رہبانیت ہے فرطِ خوف سے عبادت کی بجا آوری میں غلو کرنے کا نام ہے افادالراغب علامہ زمخشری فرماتے ہیں۔ راہبوں کا فعل رہبانیت ہے پیاپے بغیر افطار روزے رکھنا، ٹاٹ پہننا، گوشت نہ کھانا وغیرہ ــــ یکنزون جمع کرتے ہیں۔ رکھنا کرتے ہیں اسی سے اکتناز ہے عربی میں اس اونٹنی کو جس کا گوشت مٹا ہوا ہو ناقۃ کناز اللحم کہتے ہیں۔ کنز کے لیے مدفون ہونا شرط نہیں ہے۔

ناجائز دولت اور اس کا ذخیرہ

پہلی آیات میں یہودیوں اور عیسائیوں کا ذکر تھا کہ وہ اپنے علماء اور مشائخ کو رب بنائے ہوئے ہیں۔ یہاں اب احبار و رہبان کا بھرپور چہرہ پیش کیا جارہا ہے۔ اور بتایا جارہا ہے کہ جن کے پیچھے لگ کر عوامی زندگی خدا سے بیگانہ ہوچکی ہے خود ان کا کردار کیا ہے؟ عدالت کے سارے دیوانی و فوجداری مسائل کی ذمہ داری یہودیوں میں احبار اور عیسائیوں میں رہبان پر تھی۔ بلکہ دنیا میں بچاؤ اور آخرت کی ساری قانونی اتھارٹی وہی تھے۔ قانون سازی بھی ان کا کام تھا اور حکومت کی وساطت سے قانون کا نفاذ بھی وہی کرتے تھے۔ یعنی وہ صرف مسائل میں دینی رہنما نہ تھے بلکہ قانون سازی، دیوانی، فوجداری جرائم میں سزا دینا۔ اور دینی زندگی میں گناہ پر تعزیری کارروائی کرنا ان کا کام تھا۔ گویا عوام کی پوری زندگی ان کی گرفت میں تھی۔ چاہے روحانی ہو یا معاشی، سیاسی ہو یا اخلاقی، معاشرتی ہو یا قانونی، زندگی کے ہر گوشے پر ان کی حکمرانی تھی اس کے ساتھ

ان کا کام یہ تھا کہ اللہ کے دین کی ساری باتوں کو یک قلم دوکانداری اور پیشہ بنالیا تھا یعنی دیندار نہ تھے بلکہ دین کو بطور فن اپنائے ہوتے تھے اور پھر دین کو پیشہ بنائے ہوئے تھے اور ان کی پوری زندگی ہر معنے میں دکانداری کی زندگی ہو گئی تھی احبار و رہبان ہونے کے معنے بھی یہ ہو گئے تھے کہ اللہ و رسول کے نام سے پیشہ کی روٹی کھانے والے، علم دین کا پڑھنا پڑھانا دین کی تعلیم، مقدمات کے فیصلے معاشرتی زندگی کے تقاضے، دین کی دعوت ہدایت قرارت ذکر کوئی کام ایسا نہ تھا کہ بغیر اجرت کے کیا جاتا ہو ــ قانون کو توڑ مروڑ کر یا طرح طرح کے حیلے نکال کر ایسی صورتیں نکال لیتے جس سے ان کا الو سیدھا ہو جائے ۔ قرآن نے یہاں چند جملوں میں نہیں بلکہ چند لفظوں میں ان کا ان کی پوری زندگی کا بھرپور چہرہ پیش کر دیا ہے اور یا ایھا الذین امنوا سے آغاز کر کے اشارہ کر دیا کہ مسلمانو تم بھی اس آئینے میں اپنا چہرہ دیکھتے رہنا ۔ ایسا نہ ہو کہ تم بھی ان کے قدم بقدم چل پڑو ۔

(۳۴) اے اہل ایمان بہت سے علماء اور مشائخ کھاتے ہیں لوگوں کے اموال ناجائز طور پر ۔ اور لوگوں کو اللہ کے راستے سے روکتے ہیں یعنی روپیہ لے کر احکام شرعیہ اور اخبار الٰہیہ بدل ڈالتے ہیں ادھر عوام الناس نے انہیں جیسے پہلے گذرا خدائی کا مرتبہ دے رکھا ہے جو کچھ یہ علماء و مشائخ غلط سلط کہہ دیں وہ ہی ان کے نزدیک حجت ہے ۔ اسی طرح یہ علماء و مشائخ نذرانے وصول کرتے تھے اور اپنی سیادت و ریاست قائم رکھنے کے لیے عوام کو مکر و فریب کے جال میں پھنسا کر راہ حق سے روکتے رہتے ہیں کیونکہ عوام اگر ان کے جال سے نکل جائیں اور دین حق اختیار کر لیں تو ساری آمدنی بند ہو جائے یہ حال مسلمانوں کو سنایا تاکہ متنبہ ہو جائیں کہ امتوں کی تباہی اور خرابی کا بڑا سبب تین جماعتوں کا بے راہ ہونا اور اپنے فرائض کو چھوڑ دینا ہے علماء، مشائخ اور اغنیاء ان میں سے دو کا ذکر ہو چکا تیسری جماعت رؤساء کا ذکر آگے آتا ہے عبداللہ بن المبارک ؒ نے خوب فرمایا ہے ۔

وھل افسد الدین الا الملوک　　　　واحبار سوء و رھبانھا[1]

یہ آیت اس اعتبار سے بےحد اہمیت رکھتی ہے کہ اس کی پیشانی پر یا ایھا الذین امنوا لگایا گیا ہے ۔ مسلمانوں کو مخاطب کر کے یہ بتانا مقصود ہے کہ یہودیوں اور عیسائیوں کا ایمان سے محروم ہو جانا اللہ کی کتاب اور اس کے رسول سے بیگانہ ہو جانا اور قانون الٰہی کو زندگی میں عملاً چھوڑ دینا دراصل ان کے علماء مشائخ کی گمراہیوں اور دنیا پرستیوں کا نتیجہ تھا ۔

شاہ ولی اللہ محدث نے فوز الکبیر میں یہ بات بہت ہی وزنی لکھی ہے کہ :

اگر احبار یہود کی حالت دیکھنی چاہتے ہو تو آج کے علماء کو دیکھ لو اور اگر عیسائیوں کے مشائخ کا نقشہ بنانا چاہتے ہو تو آج کل کے مشائخ کے سامنے بیٹھ کر کھینچ لو ۔

یہاں حضرت مولانا ابوالکلام کا تبصرہ اس آیت پر بہت شاندار ہے اس لیے ہم معالم القرآن پڑھنے والوں کی ضیافت طبع کے لیے مولانا کا تشریحی نوٹ کا خلاصہ درج کرتے ہیں ۔

[1] افادات شیخ الاسلام

یہودیوں اور عیسائیوں کے مذہبی حلقوں اور اداروں کی تاریخ اب منضبط ہو چکی ہے اس پر نظر ڈالی جائے تو بے شمار باتیں سامنے آئیں گی لیکن خصوصیت کے ساتھ حسب ذیل امور قابل غور ہیں۔

۱۔ بادشاہوں اور امیروں کی مطلب برآری کے لیے حلال کو حرام اور حرام کو حلال بناتے تھے اور انعام واکرام حاصل کرتے۔ حلال کو حرام یا حرام کو حلال بنانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ شریعت کے کسی حکم کا انکار کر دیتے بلکہ یہ ہے کہ اس کے حکموں کو توڑ مروڑ کر ایسی صورتیں نکال لیتے کہ امیروں کی ہوائے نفس پوری ہو جائے۔

۲۔ ناجائز کھانے کی ایسی صورتیں نکال لیتے کہ فلاں جماعت کافروں کی جماعت ہے ان کا مال دھوکے اور فریب سے بھی کھا لیا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں بلکہ ثواب ہے۔

۳۔ معاملات ومقدمات میں رشوت لے کر فیصلے کرتے۔

۴۔ راہبوں میں جو شخص زیادہ شہرت حاصل کر لیتا۔ لوگوں کی اس سے عقیدت وابستہ ہو جاتی۔ وہ ان سے طرح طرح کی نذریں وصول کرتا۔

۵۔ تمام مذہبی اعمال ورسوم کے لیے باقاعدہ قیمتیں مقرر تھیں اور اس غرض سے کہ آمدنی کے وسائل زیادہ بڑھیں۔ ہمیشہ نئی نئی رسمیں اور نئی نئی تدبیریں نکالتے رہتے نتیجہ یہ نکلا کہ مذہبی زندگی کے تمام اعمال خرید وفروخت کی چیز بن گئے۔

۶۔ کتاب اللہ کے علم وتعلم کو صرف اپنے ہی حلقہ کے لیے مخصوص کر لیا کہ یہ عوام کے سمجھنے کی چیز نہیں۔ صرف سن کر تبرکاً ثواب کما لینے کی چیز ہے۔

۷۔ عوام میں یہ اعتقاد پیدا کر دیا کہ نجات کا سر رشتہ ان ہی کے ہاتھوں میں ہے۔

۸۔ جلب زر کا یہ طریقہ نکالا کہ مغفرت کے پروانے فروخت ہونے لگے۔

۹۔ طرح طرح کے تبرکات وآثار بنائے تھے لوگ ان کی زیارت کرنے اور مقررہ نذریں ادا کرتے۔

۱۰۔ مقابر اور مشاہد کی مجاوری بھی ان کا ذریعہ معاش تھا۔ اس راہ سے وہ دنیا کی ایک دولت سمیٹتے تھے۔

۱۱۔ جو مر جائے اسے ثواب پہنچانے کے لیے مقررہ رقمیں وصول کرتے اور اس غرض کے لیے طرح طرح کی رسمیں رائج کر دی تھیں۔

دراصل اس آیت میں احبار ورہبان کے دو سنگین جرم بتائے ہیں ایک اکل اموال الناس بالباطل۔ دوسرا صد عن سبیل اللہ

آیت میں لام بتا رہا ہے کہ یہ حضور اقدس ﷺ کے زمانہ کے علماء اور رہبان کا کردار تھا کیونکہ مضارع پر لام ولفظ

ہو کر اسی طرح حال کے معنے دیتا ہے جیسے مضارع پر س یا سوف داخل ہو کر استقبال کے معنے دیتا ہے۔

قرآن نے اکل اموال بالباطل ان کا سب سے بڑا جرم نمایاں کیا ہے چونکہ یہ ان کا معاشی جرم ہے اس لیے قرآن یہ فرد جرم ان پر لگا کر ایک اہم معاشی مسئلہ کی طرف رہنمائی کر رہا ہے لیا کلون اموال الناس بالباطل لے لیتے ہیں لوگوں کے مال باطل کی راہ سے۔ لینے کو کھانے سے تعبیر کرنا علامہ آلوسی کی رائے میں مجاز مرسل ہے دونوں میں تعلق یعنی کھانے اور لینے میں علت و معلول یا لازم و ملزوم کا ہے اور اگر اموال سے مراد ہی کھانے ہوں تو دوسری بات ہے بہر حال کچھ ہو باطل کی راہ سے کھانا یا لینا ہو اس کا مطلب یہ ہے کہ کچھ دیئے بغیر لوگوں کا مال لیتے ہیں بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بدن کا ہر عضو اپنی جگہ جسمانی مشین کی خدمت انجام دے رہا ہے اور اگر ایسا نہ کرے تو اسی وقت اس عضو کو بدن سے جدا کر دیا جاتا ہے اسی طرح امت میں جماعتی جسم کا فرد حصہ بن کر جینے کا حق اسی وقت رکھتا ہے کہ جس طرح یہ دوسرے فرد سے فائدہ اٹھا رہا ہے اسی طرح بلاریب اس کو اپنی صلاحیت کے مطابق دوسروں کو بھی نفع پہنچانا چاہیے خواہ صورت کوئی ہو ظاہر ہے کہ معاشی نظام بھی لینا اور دینا ہے۔ مثلاً کاشت کار غلہ دیتا ہے پارچہ باف کپڑا بنتا ہے۔ ڈاکٹر علاج کرتا ہے۔ استاذ علم تقسیم کرتا ہے یہ سب کچھ دے کر لے رہے ہیں لیکن یہ احبار و رہبان غریب عوام کو لینے کے معاوضہ میں کیا دے رہے ہیں؟ مادی شکل میں نہ سہی کسی اور شکل میں ذہنی، عقلی، روحانی فوائد میں سے کسی فائدے کی شکل میں ان کو کیا دیتے ہیں۔ قرآن بتا رہا ہے کہ سب کا نہیں بلکہ اکثریت کا یہی حال ہے کہ کسی کو کچھ نہیں دیتے ہیں اکل اموال الناس بالباطل کی اس سے زیادہ بدترین شکل اور کیا ہو سکتی ہے، چور بھی کچھ دیئے بغیر لوگوں سے لیتا ہے۔ سود خوار بھی کچھ دیئے بغیر لیتا ہے لیکن احبار و رہبان کی چوری اور نفع اندوزی کو مجرم چور کی چوری سے کیا نسبت ہے؟

یہ تو احبار و رہبان کی اکثریت کے معاشی جرم کا ذکر ہے۔ اگلے فقرہ میں حصول معاش کے اس غلط ذریعہ کو اختیار کر لینے کی وجہ سے جن ایمانی شرارتوں کی یہ جولانگاہ بنے ہیں ان کا ویصدون عن سبیل اللہ میں ذکر ہے غریب عوام کو دین سے بے بہرہ رکھ کر یہ لوگ اللہ کی سیدھی راہ سے عوام کو روکتے اور بھٹکاتے ہیں۔ اور بھٹکانے کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کرتے ہیں اس کی تفصیل آپ مولانا آزاد کے تشریحی نوٹ میں پڑھ چکے ہیں۔

ایک خاص مسئلہ پر ضروری تنبیہہ

آگے بڑھنے سے پہلے ذرا ایک غلط فہمی کو دور کر لیجئے۔ لیا کلون اموال الناس بالباطل کے معنے ہیں کہ احبار و رہبان کچھ دیئے بغیر لوگوں کا مال لیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہی احبار و رہبان کچھ دے کر لوگوں سے مال لیں اور بجائے لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکنے کے اللہ کا راستہ بتائیں تو قرآن کو ان کے اس عمل پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اس لیے

جبار ورہبان کا جو طبقہ اہلِ ایمان کی جماعت کو بذریعہ تعلیم، تہذیب، تدریس، تالیف و تصنیف یا وعظ و تذکیر کسی اور ذریعہ سے واقعی نفع پہنچا رہا ہے اور اس میں اپنا قیمتی وقت خرچ کر رہا ہے۔ اس سلسلے میں اگر ان کو عوام کی جانب سے کچھ امداد ملتی ہے تو بلاریب یہ امداد اکل اموال الناس بالباطل میں داخل نہیں ہے۔ حضور اقدس ﷺ سے بھی بڑا اسوہ کون ہو سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ نبوت سے پہلے آنحضور ؐ نے گلہ بانی بھی کی ہے اور تجارت بھی۔ لیکن سوال نبوت سے پہلے کا نہیں منصبِ نبوت پر سرفرازی کے بعد کا ہے۔ کیا کوئی بتا سکتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفوس کے کاموں کے علاوہ کبھی کسی معاشی مشغلہ میں مشغول ہوئے ہیں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی دولت ان کی زندگی میں ختم ہو چکی تھی۔ یہاں تک کہ طائف کے رئیس نے حضور ؐ کی غربت کو بھی انکار نبوت کی دلیل بنایا تھا۔ ہجرت کے بعد جب مدینہ تشریف لائے اور کچھ روز کے بعد وہ سب آ گئے جن کے اخراجات کا بار حضور ؐ پر تھا۔ جن میں آپ کے مولی زید اور آپ کی دائی کھلائی ام ایمن بھی تھیں تو جب تک اسلامی فتوحات کا دروازہ نہیں کھلا تھا آخر خود حضور ؐ اور آپ کے اہل و عیال کا گذر بسر کا ذریعہ کیا تھا۔ سیرت نگاروں نے اگرچہ اس کا ذکر نہیں کیا تو کیا بخاری شریف میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت موجود نہیں ہے کہ:

> كان الرجل يجعل للنبي صلى الله عليه وسلم النخلات حتى افتتح قريظة والنضير
>
> یعنی جب قریظہ اور بنی نضیر کی جائداد نہ ملی تھی تو دستور یہی تھا کہ حضور اقدس کے لیے کھجور کے کچھ درخت مخصوص کر دیتے تھے۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ ہجرت کے بعد چار پانچ سال تک حضور اقدس کے مرید یا تلامذہ یعنی صحابہ کرام رضی اللہ عنہم خدمت کی اس سعادت سے سرفراز ہوتے رہے۔ مختلف روایات میں انصار کی خدمت کا تذکرہ حدیث کی کتابوں میں موجود ہے بلکہ صدقہ نہ لینا اور ہدیہ قبول کرنا کچھ صحابہ نے اسی کو نبی شناسی کا پیمانہ بنایا۔ سلمان فارسی کا حال پڑھیے تھے۔ احد میں مخیریق نامی صحابی جو یہودی سے مسلمان ہوئے تھے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے اصابہ میں اور علامہ ابو القاسم السہیلی نے الروض الانف میں لکھا ہے کہ ان صحابی نے ایک باغ نہیں بلکہ سات باغ حضور اقدس ﷺ کو دیئے تھے کہ جو چاہیں کریں۔ ان باغوں کے نام یہ تھے بُرقہ، دلال، صائفہ، حسنیٰ، الاعراف، المثبت، مشربہ ام ابراہیم۔ مخیریق جب احد میں شہید ہو گئے تو حضور اقدس ﷺ نے ان باغوں کو وقف کر دیا تھا اور لکھا ہے کہ یہ اسلام میں سب سے پہلا وقف تھا۔ آخری باغ میں ایک بنگلہ تھا۔ حضرت ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا یہاں رہتی تھیں۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ صدقات نہیں ہدیوں کی صورت میں جو عوام کی جانب سے ان بزرگوں کو کچھ فتوحات ملتی ہیں اگر وہ ان فتوحات کے لینے سے انکار نہیں کرتے ہیں جبکہ وہ قدر ضرورت سے زائد آمدنی کو اشاعت اسلام تاسیس مدارس میں اور نشر کتب

ہیں خرچ کر رہے ہوں قرآن کے سامنے نبوت کا یہی نمونہ ہے

اکتناز مال کی ممانعت

(۳۵) اور جو سونے اور چاندی کو ذخیرہ بناتے ہیں اور راہ خدا میں اسے خرچ نہیں کرتے ہیں ان کو دردناک عذاب کی خوشخبری سنا دیجئے جو لوگ دولت اکٹھی کریں خواہ حلال طریقے سے ہو مگر خدا کے راستہ میں خرچ نہ کریں مثلاً زکوٰۃ نہ دیں اور حقوق واجب ادا نہ کریں ان کی یہ سزا ہے تو اسی سے ان احبار و رہبان کی سزا معلوم کر لو جو حق چھپا کر یا بدل کر روپیہ بٹورتے ہیں اور ریاست قائم رکھنے کی حرص میں عوام کو خدا کے راستے سے روکتے ہیں بہرحال دولت وہ اچھی ہے جو آخرت میں وبال نہ بنے لـه

شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح تو کی ہے لیکن اس آیت کا پہلی آیت سے پیوند نہیں بتایا۔ اس کا توسب اقرار کرتے ہیں کہ یہ الذین کی وجہ سے مستقل قسم ہے یہ الاحبار والرھبان کی صفت نہیں ہے چنانچہ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

یہ تیسری قسم کا ذکر ہو رہا ہے لوگ علماء مشائخ اور سرمایہ داروں ہی کے دست نگر ہوتے ہیں علماء مشائخ اور دولت مند، ان میں بگاڑ پیدا ہو جائے تو عام زندگی بگڑ جاتی ہے۔

مگر یہ سوال یہاں بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ ان سرمایہ داروں کا اس موقعہ پر ذکر جو دولت کا ذخیرہ کرتے رہتے ہیں اور اللہ کے بتائے ہوئے مصارف میں خرچ نہیں کرتے جہاں احبار و رہبان کی بات ہو رہی ہے کیوں ہے؟ کیا ان دونوں یعنی علماء مشائخ ــــ اور سرمایہ داروں میں کوئی مناسبت ہے بظاہر تو یہی معلوم ہوتا ہے کہ احبار و رہبان کی زندگی بسر کرنے والوں کی اکثریت جس طرح خداداد توانائیوں کے سرمائے کو پچاس پچاس ساٹھ ساٹھ سال تک یوں ہی ضائع کرتی رہتی ہے اور اپنی انفرادی قوتوں سے جماعت کی کوئی خدمت نہیں کرتی۔ اسی طرح دولت مند اپنی زائد از ضرورت آمدنی والے سرمایہ کو بجائے نفع پہنچانے کے کنز بنا بنا کر اس کے افادی پہلوؤں کو ضائع کرتے رہتے ہیں۔ دونوں طبقوں میں یہی اشتراکی مناسبت ہے اور کہہ سکتا ہے کہ آخرت والی زندگی میں جن سزاؤں کا ذکر کیا گیا ہے ان میں احبار و رہبان کا حصہ نہ ہوگا جب دونوں کے جرموں کی نوعیت میں ہم آہنگی ہے تو کیا سزا کی نوعیت میں تناسب نہ ہوگا۔ بلکہ جرم کی سنگینی میں احبار و رہبان سرمایہ داروں سے بڑھ گئے ہیں کیونکہ دولت مند اگر کسی کو اپنی مالی توانائی سے فائدہ نہیں پہنچاتے تو کچھ دیئے بغیر کسی کا مال بھی نہیں کھاتے لیکن احبار و رہبان کی اکثریت تو اکل اموال الناس بالباطل کے جرم میں بھی مبتلا ہے۔ اس لحاظ سے احبار و رہبان کے معاشی جرم میں دولت مندوں کے جرم سے زیادہ سنگینی ہے۔

ایک تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ

یہ بھی ممکن ہے کہ اس جگہ دولت مندوں کے ذکر میں ایک تاریخی حقیقت کی طرف اشارہ ہو۔ زمانہ نزول قرآن کی تاریخ

پڑھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یورپ اور ہندوستان کی تاریخ کا یہ وہ زمانہ ہے جس میں نام نہاد مذہبی پیشواؤں نے مختلف ترکیبوں سے عوامی زندگی کو اپنے قبضے میں رکھنے کے لیے ایسے داؤ بنا رکھے تھے کہ ان کی گرفت سے وہ کسی طرح باہر نہیں ہو سکتے تھے۔ یورپ میں تو جیسا کہ پڑھ چکے ہو کہ اعترافِ جرم کا ایسا ہتھکنڈہ مذہبی پیشہ وروں کو مل گیا تھا کہ جو شخص پادری کے سامنے اپنے گناہ کا اقرار کر لیتا اسے بخشش کا پروانہ مل جاتا۔

سربراہانِ مملکت ان ہی احبار و رہبان کے نیچے اس طرح دبے ہوئے تھے کہ گویا ان کے فرمان کی خلاف ورزی حکومت سے دست برداری کے مترادف تھی۔ خدا کی رحمت کا عام بیوپار احبار و رہبان کے پیدا کردہ نظام میں اس قدر عام تھا کہ آٹھ آنے دس آنے سیر خدا کی رحمت ان سے خریدی جا سکتی تھی۔

آسمان پر رحمت کا دروازہ صرف اس کے لیے کھولا جاتا جس کے لیے یہ احبار و رہبان زمین پر کھولتے تھے۔ یہ اور اس قسم کی سینکڑوں ترکیبیں تھیں جن کے ذریعے عوام کی کمائی پر احبار و رہبان اور ان کے ایجنٹوں کا پورا اقتدار قائم تھا۔ ان مانے طور پر جس کسی سے جس قدر اور جس وقت چاہتے تھے عیسائی مذہب کے یہ احبار و رہبان وصول کر لیتے تھے۔

نتیجہ یہ تھا کہ گرجوں اور چرچوں کے خزانے شاہی خزانوں سے کہیں زیادہ وسیع ہو چکے تھے۔ معمولی معمولی گرجوں میں لاکھوں کی دولت بصورت کنز رہتی تھی۔ مشہور واقعہ ہے کہ ہرقل کو ایرانیوں کے مقابلے میں جب فوجی مصارف کی ضرورت پیش آئی اور شاہی خزانہ ان کی پابجائی میں ناکافی ثابت ہوا تو بادشاہ روم کو قرض کی صورت میں سب سے بڑی مالی امداد ان ہی احبار و رہبان سے ملی۔ بالکل یہی حال ہندوستان میں برہمنوں، سادھوؤں، یوگیوں اور جوگیوں کا تھا۔ محمود غزنوی کو سومنات میں جو غیر معمولی سرمایہ ملا تھا۔ وہ ہندو مذہب کے احبار و رہبان کی ذخیرہ کی ہوئی دولت تھی۔ اس زمانے میں بھی جب اشتراکیوں نے زار روس کی حکومت پر قبضہ کیا تو اشتراکیوں کو سرمایہ کی غیر معمولی مقدار روس کے گرجوں ہی سے ملی۔

بہرحال تاریخ کے ان واقعات کو پیشِ نظر رکھنے کے بعد دونوں آیتوں کی باہمی مناسبت کا کچھ سراغ ضرور ملتا ہے۔

اسلام کے مذہبی خدّام کی خصوصیّت

شاید قرآن کے اسی تہدیدی انداز کا اثر ہے کہ مسلمانوں میں مذہبی خدمات انجام دینے والے طبقوں کا ایک بڑا گروہ باوجودیکہ وہ مسلمانوں کی دینی خدمت میں اپنا زیادہ وقت اخلاص اور دیانت و امانت سے صرف کرتا تھا اور اس کام کی وجہ سے جو امداد ان کو مسلمان عوام یا اسلامی حکومت کی جانب سے ملتی تھی یہ اکل بالباطل نہ تھا یعنی کچھ دیئے بغیر دوسروں کا مال لینا نہ تھا لیکن قرآن کی ان ہی دھمکیوں سے وہ اتنے مرعوب تھے کہ اس کا لینا بھی وہ پسند نہ کرتے تھے اور اپنی معاشی ضرورتوں کے لیے دوسرے کام کرتے تھے یہ جو آپ فقہائے احناف میں دباغ، خیاط، نداف، صداد، حلوائی، تدوری جیسے الفاظ

دیکھتے ہیں تو ان کا مطلب یہی تو ہے کہ یہ بزرگ دین کی خدمت کرتے ہوئے یہ کام کرتے تھے اور خدمت دین کی کوئی اُجرت نہ لیتے تھے آپ فقہائے احناف شوافع، حنابلہ اور موالک پر لکھی ہوئی طبقات پر کتابیں پڑھیں بلکہ محدثین کے اقوال پر لکھے ہوئے تذکرے پڑھیں ہر جگہ آپ کو پیشہ کی نسبت ملے گی۔

ان فقہاء کا یہ حسن کہ دین کی خدمت پر کوئی اجرت نہ لیتے تھے بلکہ زندگی چلانے اور گذارنے کے لیے کاروبار کرتے تھے اکبر کے زمانے میں عیب بن کر رہ گیا۔ اکبر کے دربار میں فقہاء پر جب تنقید ہوتی تو مشہور ابوالفضل وزیران فقہا کے متعلق کہتا تھا کہ ہر جوتے گانٹھنے والے، مٹھائی بیچنے والے کا قول ہم پر حجت نہیں ہو سکتا۔ اشارہ اسلام کے ان فقہاء اور علماء کی طرف ہوتا تھا جو عوام اور حکومت سے کسی قسم کی معاشی امداد لینا پسند نہ کرتے تھے بلکہ مختلف دستکاریوں اور عام ذرائع معاش سے روزی حاصل کرتے تھے۔ ابوالفضل کی نگاہ میں ان کا یہی ہنر عیب ہو گیا۔

خیرات کا قانونی و اخلاقی ضابطہ

اس آیت کی تشریح تو آپ موقعہ محل کے اعتبار سے سن چکے ہیں لیکن آیئے شارحین قرآن نے اس آیت کی شرح کرتے ہوئے جو کچھ فرمایا ہے وہ بھی گوش گذار فرمالیجئے۔

پہلی بات یہ ہے کہ آیت قرآنی کا روئے سخن کس کی طرف ہے۔ اس پر تین خیال ہیں کچھ کہتے ہیں کہ روئے سخن سب کی طرف ہے مسلمان، یہودی اور عیسائی یہ حضرت ابوذر غفاری کی رائے ہے۔

کچھ کہتے ہیں کہ روئے سخن صرف اہل کتاب کی طرف ہے یہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے ہے۔

کچھ بتاتے ہیں کہ صرف مسلمان مراد ہیں۔ یہ حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے ہے۔

پھر اس میں اختلاف ہے کہ کنز کا مصداق کیا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں وہ مال جس کی زکوٰۃ نہ دی جائے۔ اس صورت میں انفاق کے معنے زکوٰۃ ادا کرنے کے ہوں گے شارحین قرآن کی رائے عامہ یہی ہے۔

کچھ کا خیال ہے کہ چار ہزار سے زیادہ مال کنز ہوتا ہے یہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی رائے ہے اور کچھ کی رائے میں ضرورت سے زیادہ سب کچھ کنز ہے۔

ان دو باتوں میں اختلاف کی وجہ سے آیت کی تشریح میں صحابہ میں دو فریق پیدا ہو گئے تھے ایک کہتا تھا کہ جو کچھ ملے سب کچھ خدا کے راستہ میں خرچ کر دینا چاہیے کل کے لیے کچھ نہ رکھنا چاہیے۔ ورنہ جو شخص ایسا نہ کرے گا وہ اس آیت کے تحت عذاب کا مستحق ہو گا۔

دوسرا کہتا تھا کہ اللہ سبحانہ نے ہماری دولت میں جو حق واجب کیا ہے یعنی زکوٰۃ اس کے ادا کرنے کے بعد سرمایہ جمع

کرنا عذاب کا سبب نہیں ہے لیکن اہل راز صحابہ اور علمائے امت نے اپنے قول وعمل سے اس مشکل کی پوری گرہ کھول دی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تورات میں مقررہ زکوٰۃ ادا کرنے کے سوا مال کی خیرات کی کوئی تعلیم نہیں۔ اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انجیل میں آسمانی بادشاہی کی کنجیاں اسی کے حوالہ کی گئی ہیں جو سب کچھ خدا کی راہ میں لٹا دے۔ یہ دونوں تعلیمیں اپنی اپنی جگہ صحیح اور درست ہیں لیکن جس طرح پہلی تعلیم بعض بلند ہمت حوصلہ مندوں کے حوصلہ سے کم ہے۔ اسی طرح دوسری تعلیم جو نہایت بلند روحانی تخیل ہے مگر وہ عملاً عام انسانوں کے حوصلہ سے زیادہ ہے اس لیے کہا جاسکتا ہے کہ وہ ایک گونہ انسانی فطرت کے دائرہ سے باہر ہے اور اسی لیے بہت کم لوگ اس پر عمل کر سکے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم موسوی اور عیسوی دونوں شریعتوں کی جامع ہے اسلام نے خیرات کے دو درجے مقرر کر دیئے ایک قانونی اور دوسرا اخلاقی۔ نیز مال خیرات کی دو سطح برقرار باقی رکھی جو موسوی شریعت میں تھی یہ وہ کم سے کم خیرات ہے جس کا سالانہ ادا کرنا ہر مستطیع اور صاحب نصاب پر فرض ہے اور اس کا وصول اور خرچ کرنا جماعت کا فرض ہے اور اخلاقی خیرات جس کو ہر انسان کی مرضی اور خوشی پر منحصر رکھا ہے۔ اس کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تعلیم کی طرح بلند سے بلند روحانی تخیل کے مطابق قرار دیا اور بلند ہمت انسانوں کو اس پر عمل کرنے کی ترغیب دی۔ صحابہ میں دونوں قسم کے لوگ تھے۔ جو کل کے لیے آج اٹھا کر رکھنا حرام سمجھتے تھے جیسے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور وہ بھی تھے جو وقت پر اپنی تمام دولت اسلام کے قدموں میں لا کر ڈال دیتے تھے جیسے حضرت ابوبکر اور ایسے بھی تھے جو اپنی تجارت کا تمام سرمایہ خدا کی راہ میں بیک وقت لٹا دیتے تھے جیسے حضرت عبدالرحمان بن عوف اور وہ بھی تھے جو خود بھوکے رہ کر دوسروں کو کھلا دیتے تھے اور خود تکلیف اٹھا کر دوسروں کو آرام پہنچاتے تھے جیسے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور بعض انصار کرام۔

بہرحال حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم مختلف انسانی طبیعتوں کے موافق اور فطرت سلیمہ کے عین مطابق ہے۔ اور ہر ایک کے لیے اس کی استعداد اور اہلیت کے مطابق کامیابی کا دروازہ کھولتی ہے۔ اس نے وہ طریقہ سکھایا ہے جس سے اہل حاجت اور نیک کاموں کے لیے عملاً ہر وقت امداد مل سکے اور ساتھ ہی اہل دل اور اہل استعداد کے مرتبہ کمال کے لیے بلند سے بلند روحانی معیار کی دعوت بھی پیش کر دی ہے۔ اور اس کی خوبیاں اور برائیاں بھی بیان کر دی ہیں تاکہ امت کے باحوصلہ افراد ہمت کے شہپر دل اڑ کر سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچنے کی کوشش کریں۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور دوسرے صحابہ کے درمیان اس مسئلہ میں اختلاف کا حل یہی ہے کہ صحابہ جو کچھ بتا رہے ہیں وہ قانونی بات ہے اور ابوذر جو کچھ کہہ رہے ہیں وہ قانونی نہیں بلکہ اخلاقی بات ہے۔ حافظ ابن عبدالبر فرماتے ہیں

حضرت ابوذر غفاری سے بہت سے آثار اس موضوع پر مروی ہیں کہ آپ گذارہ سے فالتو سرمایہ کو کنز کہتے تھے اور ایسا کرنے والے کی مذمت کرتے تھے اور قرآن میں اس آیت کا مصداق اس کو بتاتے لیکن صحابہ کی رائے عام

ابوذر کے اس موقف کی مخالف تھی۔

صحیح بخاری میں حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ کے اس مسلک پر امام بخاری کی اس حدیث سے واضح روشنی پڑتی ہے جو زید بن وہب رضی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے آئی۔

زید رضی اللہ عنہ کہتے ہیں میرا گذر ربذہ سے ہوا تو حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ سے ملاقات ہوئی۔ میں نے دریافت کیا کہ آپ یہاں کیسے فرمایا میں شام میں تھا میرے اور حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ کے درمیان اس آیت قرآنی والذین یکنزون میں اختلاف ہو گیا۔ معاویہ کہتے تھے کہ یہ آیت اہل کتاب کے بارے میں ہے میرا موقف یہ تھا کہ اہل کتاب اور اہل ایمان دونوں کے بارے میں ہے۔ میرے اور ان کے درمیان یہ اختلاف تھا حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ نے میری شکایت حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو لکھ دی حضرت عثمان نے مجھے مدینہ آنے کو لکھا۔ میں مدینہ آگیا۔ لوگ مجھ پر اس طرح ٹوٹ پڑے گویا انھوں نے مجھے اس سے پہلے دیکھا ہی نہیں اس کا تذکرہ میں نے حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ سے کیا حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تمہاری مرضی مدینہ سے قریب کہیں جانے کی ہے تو ٹھیک ہے بس اس وجہ سے میں نے یہاں ڈیرہ لگا لیا ہے اور اگر کوئی حبشی بھی امیر ہو تو سمع وطاعت میرا فرض ہے۔[1]

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کی حکومت کا دور وہ زمانہ ہے جب عرب میں دولت افراط کی حد تک پہنچ گئی تھی حضرت ابوذر غفاری نے شام میں قرآن پاک کی اس آیت کے مطابق فتویٰ دیا کہ دولت کا جمع کرنا حرام ہے[2]۔ اور ہر شخص کے پاس جو کچھ اس کی ضرورت سے زائد ہو۔ خدا کی راہ میں دے دے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی بخاری کی شرح میں لکھتے ہیں کہ:

زید بن وہب رضی اللہ عنہ نے ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے یہ سوال اس لیے کیا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے مخالفین نے یہ مشہور کر دیا کہ ابوذر کو انھوں نے شہر بدر کر دیا۔ ابوذر نے ان کو بتایا کہ اس مقام پر رہائش کا معاملہ ان کا اپنا اختیاری ہے سرکاری نہیں وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں وہاں آتے تھے۔

حافظ عسقلانی نے یہ انکشاف کیا ہے کہ ابن سعد کے طبقات میں ہے کہ:

کوفہ کے کچھ لوگوں نے حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ سے کہا تھا کہ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے کیا آپ ہمارے ساتھ عثمان کی مخالفت میں شریک ہوں گے ابوذر نے جواباً کہا کہ ہرگز نہیں۔ اگر مجھے عثمان مشرق سے مغرب تک بھی روانہ کریں میں پھر بھی ان کی بات سنوں گا اور طاعت کروں گا۔

اس واقعہ میں دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ علم ورائے کی آزادی اور علماء کا احترام اس دور کا نمایاں امتیاز تھا۔ حافظ عسقلانی نے اسی حدیث

---

[1] صحیح بخاری　[2] مسند امام احمد

پر لکھا ہے کہ:

اس زمانہ میں سربراہان مملکت علماء کا کس قدر احترام کرتے تھے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ نے خود گرفت نہیں کی بلکہ مرکزی حکومت کو اطلاع دی۔ اور حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ باوجودیکہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ کے نظریہ سے اختلاف رکھتے تھے مگر ان پر کوئی سختی نہیں کی اور اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت اور سرکار کے خلاف شورش سے بچ کر رہنا چاہیے۔ یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ مفسدہ کا اندیشہ ہو تو افضل کو مفضول کی طاعت کا حکم دیا جا سکتا ہے اور یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ امر بالمعروف میں کسی کا لحاظ نہ ہونا چاہیے۔

صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں احنف بن قیس کا یہ بیان بھی آتا ہے کہ:

میں کچھ قریشیوں کے پاس بیٹھا تھا کہ ایک شخص آیا موٹے چھوٹے کپڑے پہنے ہوئے آکر کھڑا ہوا اسلام کیا پھر بولا کہ دولت کا ذخیرہ کرنے والوں کو صنف کی خوشخبری سنا دو جہنم کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر یہ چھاتی کے پستان پر رکھا جائے گا۔ تا آنکہ بغل کے نیچے سے نکلے گا پھر بغل کے نیچے رکھا جائے گا اور پستان سے نکلے گا۔ ایسا ہی ہوتا رہے گا۔ یہ کہہ کر چل دیا میں پیچھے ہو لیا اور اس کے پاس بیٹھا۔ مجھے یہ پتہ نہیں تھا کہ یہ کون ہے میں نے عرض کیا کہ جو کچھ آپ نے فرمایا لوگوں نے پسند نہیں کیا بولے لوگوں کو عقل نہیں ہے مجھ سے تو میرے خلیل نے کہا تھا میں نے دریافت کیا کہ آپ کا خلیل کون ہے فرمایا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم آپ نے مجھ سے فرمایا اے ابوذر کیا کوئی نظر آرہا ہے۔ ابوذر کہتے ہیں میں نے سورج کو دیکھا کہ کتنا دن باقی ہے میرا خیال تھا کہ غالباً حضور مجھے کسی کام کو روانہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کہا جی۔ فرمایا ابوذر میں اس بات کو پسند نہیں کرتا ہوں کہ احد پہاڑ کے برابر میرے پاس سونا ہو اور میں اس کو خرچ کروں۔ میں تو صرف تین دینار چاہتا ہوں۔ اس کے بعد ابوذر نے کہا کہ یہ لوگ عقل سے بیگانے ہیں دنیا جمع کر رہے ہیں میں بخدا ان سے نہ دنیا مانگوں گا اور نہ ان سے دین کے بارے میں کچھ پوچھوں گا تا آنکہ میں اللہ سے مل جاؤں۔

یہ حدیث بھی اس بات کی تائید کرتی ہے کہ ابوذر جو کچھ بتا رہے ہیں قانونی نہیں اخلاقی پیمانہ ہے۔ اور یہ ہر کرد مہ کے لیے نہیں بلکہ اصحاب عزیمت اور خواص کے لیے ہے اگر یہ قانون کی بات ہو تو قرآن کے سارے مالیاتی نظام سے متصادم ہو جائے سوچئے اگر قانون یہی ہے کہ جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ ہے ضرورت سے زائد روزانہ خرچ کر دے اور یہ سب کے لیے ہے تو پھر قرآن میں انفاق کے مطالبات کی بجا آوری کا عمل کیا ہے مطلب یہ ہے کہ زکوٰۃ کب فرض ہوگی حج کب فرض ہوگا۔ قربانی کون کرے گا۔ بیوی کا مہر کیسے دے گا میراث کی تقسیم کہاں ہوگی۔ جب جمع کچھ نہ ہوگا تو ان قرآنی فرائض کی بجا آوری کا کوئی مکلف ہی نہ ہوگا۔ یہ ایسے ہی بات ہے جیسے شیخ شرف الدین رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اپنے مکتوبات میں حضرت شبلی کے بارے میں

لکھی ہے۔

کسی نے حضرت شبلی سے امتحاناً پوچھا کہ زکوٰۃ کتنے پر ہوتی ہے بولے فقہاء کے مسلک پر جواب چاہتے ہو یا فقراء کے مسلک پر کہا دونوں کے فرمایا فقہاء کے مذہب کے مطابق سال گذرنے پر دو سو درم میں سے پانچ درم اور فقراء کے مسلک پر فوراً پورے کے پورے دو سو درم اور اسی کی خوشی میں اپنی جان بھی پیش کر دینی چاہیے پوچھنے والے نے کہا کہ ہم نے یہ مذہب ائمہ دین سے حاصل کیا شبلی نے کہا کہ ہم نے یہ مذہب حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے حاصل کیا۔

بہرحال حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا موقف قانونی نہیں سراسر اخلاقی ہے۔

ابوذر رضی اللہ عنہ کے طرز عمل کا ایک اور محمل

ایک محمل تو یہی ہے کہ یہ معاملہ عزیمت سے تعلق رکھتا ہے اور اخلاقی بات ہے قانونی نہیں جیسا کہ سید سلیمان ندوی نے سیرۃ النبیؐ میں بتایا ہے حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس طرز عمل کا ایک اور محمل یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ بات ان عام مسلمانوں سے کہہ رہے ہیں جو قدر ضرورت سے زائد سرمائے کو ذخیرہ بنا کر رکھ دیتے ہیں کہ اس مال کو ذخیرہ نہ بنائیں بلکہ کاروبار میں لگائیں تاکہ عام لوگوں کی معیشت میں برتری ہو۔ جہاں مال ذخیرہ بنا کر رکھ دیا جاتا ہے وہاں اقتصادی اور تمدنی زندگی رو بہ زوال ہو جاتی ہے۔ آخر اسلام میں سونے چاندی کے برتنوں کے حرام ہونے کی بنیادی وجہ یہی تو ہے کہ ملک کی دولت کو بیکار کرنا ہے اور اقتصادی مسلک میں ایک پیسے تک کو بیکار رکھنا جرم ہے جس کے معنے یہی ہیں کہ سونے اور چاندی کو برتنوں کی صورت میں رکھنا معاشی نقطہ نظر سے ملک اور قوم کا جرم ہے۔ دنیا کے معاشیوں کو شائد اس کا اب علم ہوا ہے مگر اسلام کی معاشیات کے سربراہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو آج سے چودہ سو سال پہلے یہ اعلان فرمایا کہ سونے اور چاندی کے برتنوں میں نہ پانی پیا کرو اور نہ ان کی پلیٹوں میں کھانا کھایا کرو[1]۔ اور صرف ممانعت ہی پر اکتفا نہیں فرمائی بلکہ ملک کے اس معاشی جرم کے متعلق یہاں تک فرمایا۔

چاندی کے برتن میں جو کھاتا پیتا ہے جہنم کی آگ میں اس کے پیٹ میں وہ کھولے گا[2]

اس لیے بالاتفاق تمام فقہائے اسلام کا فیصلہ ہے کہ سونے چاندی کے برتن کا استعمال مرد اور عورت دونوں کے لیے حرام ہے اور جو حکم ظروف کا ہے وہی مردوں کے لیے زیورات کا بھی ہے بجز انگوٹھی کے کہ اس میں فقہاء کا اختلاف ہے ہر قسم زیور سونے کے ہوں یا چاندی کے مردوں پر حرام ہیں۔ اور عورتوں کو زیورات کی اگرچہ اجازت ہے لیکن یہ اجازت

[1] صحاح ستہ [2] صحیح بخاری

تمنائے نبوت کی عکاسی نہیں ہے۔ منشار نبوت یہی ہے کہ عورتیں بھی ملک کے اس سرمایہ کو یعنی سونے اور چاندی کو اپنے گلے اور اپنے ہاتھوں کی بیڑیاں نہ بنائیں تو بہتر ہے۔

یالیت امتی لم تحل الذھب۔ کاش میری امت سونے کا زیور نہ پہنتی۔ (مسند احمد)

اور دن کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ حضور اقدس ﷺ نے یہ برتنوں اور زیوروں والی بات اسی آیت سے استنباط فرما کر امت کو بتائی۔ پھر اگر حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ بھی یہی لوگوں سے کہتے ہوں کہ سونے اور چاندی کو بے مقصد روک لینے اور ذخیرہ کرنے سے مسلمانوں کی معاشی حالت رو بہ تنزل ہو جائے گی تو اس میں کیا استحالہ ہے۔

یہ بات تو سب کی جانی بوجھی ہے کہ ایک صحابی حضور اقدس ﷺ کے پاس آئے اور سونے کا ایک ڈلا یہ کہتے ہوئے خدمت اقدس میں پیش کیا کہ یہ میری طرف سے صدقہ ہے۔ حضور اقدس نے بے رخی اختیار فرمائی۔ اس نے پھر توجہ دلائی وہ بار بار توجہ دلاتا تھا اور آپ بے رخی برتتے تھے۔ جب اس کا اصرار حد سے گذر گیا تب حضور اقدس ﷺ نے سونے کا یہ ڈلا ہاتھ میں لے لیا اور اس کے بعد اس زور سے اس کی طرف پھینکا کہ بیان کرنے والا کہتا ہے کہ اگر اس کے لگ جاتا تو اسے تکلیف ہوتی یا زخمی کر دیتا۔ اس کے بعد فرمایا کہ تم میں ایک شخص سارا مال اٹھا کر لے آتا ہے اور کہتا ہے کہ یہ صدقہ ہے۔ اس کے بعد خالی ہاتھ ہو کر بیٹھ جاتا ہے پھر لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلاتا ہے اس کے بعد آپ نے فرمایا خیر صدقۃ ما کان عن ظھر غنی۔ سب سے اچھا صدقہ وہ ہے جو تونگری کی پشت پناہی میں ہو اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کے لیے اس کی اجازت نہیں ہے کہ وہ اپنا سارا مال صدقہ کر ڈالیں۔ بخاری کی اس حدیث کے اس فقرے خیر صدقۃ ما کان عن ظھر غنی کا مطلب علامہ خطابی نے معالم السنن میں یہ بتایا ہے۔

ایسی تونگری جس پر بھروسہ کر سکتا ہو اور جس کی پشت پناہی حاصل کر سکتا ہو اس وقت جب مصائب اور حوادث کا وہ شکار ہو۔

علامہ خطابی نے اس مطلب کو بیان کرتے ہوئے اپنی تائید میں دوسری حدیث پیش کی ہے جس میں ہے خیر الصدقۃ ما ابقت غنی بہترین صدقہ وہ ہے جو آدمی کی تونگری کو باقی رکھے۔ اس کا صاف مطلب ہے کہ صدقہ یا انفاق کرتے ہوئے اس کا خیال رکھنا چاہیے کہ اتنا سرمایہ آدمی کے پاس رہ جائے جس سے وہ آئندہ آمدنی حاصل کرنے یا مصارف پیش آنے میں مدد لے بہرحال حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے پیش نظر مسلمانوں کی معاشی حالت تھی اسی لیے وہ عوام کو سرمائے کو ذخیرہ کرنے سے روکتے تھے

ابوذر کے کردار کا ایک اور محمل

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کے اس کردار کا کہ ضرورت سے زائد مال کو ذخیرہ کرنا اس آیت قرآنی کی رو سے حرام ہے

اور ایسا کرنے والا قرآن کی اس آیت میں بیان کردہ سنگین سزا کا سزاوار ہے شارحین قرآن نے ایک عمل یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کا روئے سخن عوام کی طرف نہیں بلکہ مسلمان سربراہ مملکت کی طرف تھا۔ انھوں نے شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو دیکھا کہ اموال فئے کو پیش پا افتادہ حالات کے لیے سرکاری خزانہ میں محفوظ کر رہے ہیں تو ان کو بتایا کہ خلفاء راشدین کے زمانہ میں یہ مال مسلمانوں میں تقسیم ہوتا تھا۔ اور تقسیم ہونے کی قانونی وجہ یہ تھی کہ اس دور میں ملک کا دفاع مسلمانوں کے فرائض میں داخل تھا۔ اس کے لیے تنخواہ یاب فوج نہ تھی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بلا خوف اعلاء حق میں بیباک تھے۔ ان کی زبان سے نکلی ہوئی بات میں عوامی مفاد تھا، بات منہ سے نکلتے ہی عوام میں پذیرائی ہوگئی اور نتیجہ یہ کہ ابوذر قیادت کر رہے تھے اور عوام کی بھیڑ ان کے ساتھ تھی۔ خفیہ اور علانیہ اس کے لیے جلسے اور اجتماعات بھی شروع ہوگئے حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ نے بجائے اس کے خود روکتے۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کو ساری روئداد لکھ دی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ان کو مدینہ بلا لیا اور بس اگر یہ بات ہے تو اس کا تعلق دونوں کے اجتہاد سے ہے حضرت ابوذر کا اجتہاد یہ تھا کہ یہ مال شہریوں میں تقسیم ہونا چاہیے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اجتہاد یہ تھا کہ لوگوں میں افراط زر ہے اس لیے اس مال کو امت کی مصالح کی خاطر سرکاری خزانہ میں جمع ہونا چاہیے۔ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کی بات وقتی اور جذباتی تھی جبکہ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ کی رائے دور اندیشی پر مبنی تھی غلط نہ وہ تھے اور نہ یہ لیکن معاشرہ میں غلط کار لوگ ایسے وقت کی تلاش میں ہوتے ہیں کہ کسی نہ کسی بہانے شہری زندگی میں کچھ ہلچل ہو۔ اس لیے حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے احتیاطی تدبیر اختیار فرمائی کہ بجائے اس کے کہ صوبائی سربراہ کی حیثیت سے خود کوئی قدم اٹھائیں مرکزی گورنمنٹ کو اطلاع دے دی۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضرت ابوذر رضی اللہ عنہ کے مزاج کی شدت سے واقف تھے خود اسے مدینہ بلا لیا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی کا فتح الباری میں میلان اسی طرف ہے۔ لکھتے ہیں۔

والصحیح ان انکار ابی ذر علی السلاطین الذین یاخذون المال لانفسهم و لا ینفقونه فی وجهه۔

مطلب یہی ہے کہ یہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ایک مسئلہ میں امر بالمعروف تھا۔

حافظ ابن تیمیہ کا فیصلہ

یہ تو آپ سن آئے ہیں کہ ربذہ میں حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قیام شہر بدری کی بنا پر نہیں بلکہ اپنی رضامندی سے تھا مگر کچھ لوگوں نے یہاں بھی بات کا بتنگڑ بنا لیا۔ اور اس بات کو بھی حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے مثالب میں شمار کر لیا حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنہ میں اس معاملہ کو موضوع بنا کر تشفی بخش جواب دیا فرماتے ہیں۔

عبداللہ بن الصامت رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی والدہ نے یہ بات قسم کھا کر کہی کہ حضرت

ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ربذہ روانہ نہیں کیا تھا۔ حضرت حسن بصری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں معاذ اللہ ان یکون اخرجہ عثمان۔ خدا کی پناہ اس سے کہ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے نکالا ہو یعنی یہ ہو ہی نہیں سکتا۔ یہ حقیقت بالکل بے غبار ہے کہ حضرت ابوذر نیک زاہد تھے۔ ان کا مذہب تھا کہ حاجت سے زیادہ سرمایہ کو خرچ کر دینا چاہیے اور اسے جمع کر نا دہ کنز ہے جس سے روز قیامت مالک کو داغا جائے گا۔ قرآن کی یہی آیت و الذین یکنزون تلاوت کرتے تھے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد بھی سناتے کہ اے ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ میں یہ پسند نہیں کرتا ہوں کہ احد کے برابر میرے پاس سونا ہو اور مجھ پر رات گذرے ایسے حال میں کہ میرے پاس اس میں سے ایک دینار ہو اور یہ بتاتے بھی سناتے کہ قیامت کے روز وہ لوگ اجر و ثواب میں تھوڑے ہوں گے جو دنیا میں بہت زیادہ مال والے ہوں گے جب عبدالرحمٰن ابن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا انتقال ہوا اور انھوں نے بے حساب مال چھوڑا تو ابوذر اس کو قابل مواخذہ کنز سمجھے۔ اس موضوع پر حضرت عثمان حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مناظرہ کر رہے تھے کہ حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ تشریف لے آئے۔ کعب نے گفتگو سن کر حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہمنوائی کی۔ حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے جذبات سے بے قابو ہو کر حضرت کعب رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو مارا فضرب ابوذر گھونسہ یا تھپڑ رسید کیا ہوگا۔ یہی صورت حال شام میں حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ساتھ پیش آئی۔ پوری امت کا موقف ابوذر کے خلاف ہے کہ کنز وہ ہے جس کی زکات نہ دی جائے۔ آخر اللہ سبحانہ نے قرآن میں تقسیم میراث کا طریقہ بتایا ہے اگر ایک شخص مال چھوڑ کر دنیا سے رخصت نہیں ہوتا ہے تو اس کی میراث کا سوال بھی پیدا نہیں ہوتا ہے بے شمار صحابہ کرام زمانہ نبوت میں سرمایہ دار تھے آپ نے ان پر کبھی گرفت نہیں فرمائی۔ خود انبیاء کی ایک جماعت سرمایہ دار تھی حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہی عن المنکر میں اتنے آگے چلے گئے تھے کہ مباحات بھی ان کی نگاہ نکیر سے نہ بچ سکے اسی کے نتیجہ میں وہ معاشرے سے الگ ہو کر عزلت نشین ہو گئے تھے سچے اور پکے مومن مگر ان میں جذباتی بہت کی کمزوری تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خود ابوذر میں اس کی نشاندہی فرمائی تھی فرمایا تھا ـــــ ابوذر میرے خیال میں تم کمزور ہو میں تمہارے لیے وہ کچھ پسند کرتا ہوں جو اپنے لیے کرتا ہوں۔ خبردار امیر نہ بننا اور مال یتامٰی کی تولیت نہ اختیار کرنا۔ اور اس کے ساتھ حضور کا یہ بھی ارشاد ہے۔ طاقتور مومن کمزور مومن سے اچھا ہے۔ اس لیے اراکین مجلس شوریٰ بلاریب حضرت ابوذر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے زیادہ طاقتور اور برتر ہیں۔

یہ بات ہم نے حافظ ذہبی کی المنتقی سے نقل کی ہے۔ آیئے ربذہ کے قیام کے بارے میں مشہور مورخ ابن خلدون کی بات بھی سن لیجئے۔

ابوذر نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ سے مدینے سے باہر جانے کی یہ کہہ کر اجازت مانگی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے حکم دیا کہ جب عمارتیں سلع پہ بن جائیں تو مدینہ چھوڑ دینا حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اجازت دے دی۔ آپ نے ربذہ میں رہائش اختیار کی وہاں مسجد بنائی۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اونٹوں کا ایک گلہ اور دو غلام دیئے اور ساتھ ہی سرکار سے ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ آپ مدینے آتے رہتے تھے مدینہ اور ربذہ کے درمیان تین میل مسافت ہے یاقوت نے جغرافیہ میں بتایا ہے کہ ربذہ مدینے کے راستہ میں بہترین پڑاؤ ہے۔

کنز کی آخرت میں شکلیں

(۳۶) یہ عذاب اس روز ہوگا جس دن سونے اور چاندی کو دوزخ کی آگ میں تپایا جائے گا۔ پھر اس سے پیشانیوں، پہلوؤں اور پیٹھوں کو داغا جائے گا اور کہا جائے گا کہ یہ ہے جو تم نے ذخیرہ کیا تھا اپنے لیے۔ اس ذخیرہ کا مزہ چکھو۔ بخیل دولتمند سے جب خدا کے راستہ میں خرچ کرنے کو کہا جائے تو اس کی پیشانی پر بل پڑ جاتے ہیں۔ زیادہ کہو تو اعراض کر کے ادھر سے پہلو بدل لیتا ہے اگر اس پر بھی جان نہ بچی تو پیٹھ پھیر کر چل دیتا ہے اس لیے سونا چاندی تپا کر ان ہی تین موقعوں پیشانی، پہلو، پیٹھ پر داغ دیئے جائیں گے تاکہ اس کے جمع کرنے اور گاڑنے کا مزہ چکھ سکے[1]

قتل عمد کے بعد شدید کسی عمل کے لیے قرآن نے اس قدر شاید وعید سنائی ہو جتنی کہ اس آیت میں ان لوگوں کو سنائی گئی ہے جو سرمایہ کا اکتناز کرتے ہیں۔ اسلام کے معاشی نظام میں اکتناز ناپسندیدہ یہ ہے کہ دولت کے بڑے بڑے خزانے افراد کے پاس ہوں۔ قرآنی تعلیمات کے مطابق اگر ایک شخص مالی واجبات کے مطالبے پورا کرتا رہے تو اکتناز وجود ہی میں نہیں آسکتا ہے اللہ کے حقوق، والدین کے حقوق، اولاد کے حقوق، رشتہ داروں کے حقوق، زوجین کے حقوق، یتیموں کے حقوق، پڑوسیوں کے حقوق، حاجت مندوں کے حقوق، مزدوروں کے حقوق، بیماروں کے حقوق، نوکروں کے حقوق، مہمانوں کے حقوق، مسلمانوں کے حقوق، انسانی برادری کے حقوق، بالآخر جانوروں کے حقوق کی ذمہ داریاں جو ایک مسلمان پر قرآن نے ڈال ہیں۔ اگر ان کی واقعی بجائی کی جائے تو اسلامی معاشرے میں اکتناز کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ دولت ہونا جسے غنا کہتے ہیں مذموم نہیں لیکن دولت کے ذریعے اہل حقوق کے حقوق ادا نہ کرنا اور اس پر سانپ بن کر بیٹھ جانا مذموم ہے اور یہاں اسی کی مذمت ہو رہی ہے۔ قرآن میں قارون کے حوالے سے جس سب سے بڑے بخیل کا ذکر ہے اس کی سب سے بڑی برائی یہی تو ہے کہ وہ اس دنیا میں رہتے ہوئے نہ دنیا کی پرواہ کرتا تھا اور نہ آخرت کی۔ لاتنس نصیبك من الدنیا واحسن کما احسن اللہ۔ جیسے اللہ نے تیرے سے نیکی کی ہے تجھے بھی مخلوقِ خدا سے ایسی ہی نیکی کرنی چاہیے لیکن معاشرے میں رہتے ہوئے معاشرے کی ساری ذمہ داریوں

[1] افادات شیخ الاسلام

سے بے نیازمستانہ نعرہ لگاتا تھا۔ انما اوتیتہ علی علم عندی۔

اسلام نے سرمایہ داروں پر ان حقوق کی بجا آوری کی ذمہ داریاں ڈالی ہیں ہر ملک پر آبادی کے ان طبقات کی جو سرمایہ کی فراوانی رکھتے ہیں یہ ذمہ داری بتائی گئی ہے کہ ان سے لیا جائے اور ان میں تقسیم کیا جائے جو مجبوری کی زندگی گذار رہے ہیں صرف زکوٰۃ ہی نہیں بلکہ زکوٰۃ کے سوا بھی معاشرے کے مختلف طبقات کی امداد کی اسلام نے مختلف صورتیں پیدا کی ہیں۔ حدیث کی کتابوں میں صاف بتایا گیا ہے کہ ان فی المال حقا سوی الزکوٰۃ مال میں زکوٰۃ کے سوا بھی حق ہے۔ اور یہ جو فرمایا ہے۔ اذا ادیت الزکوٰۃ فقد قضیت ما علیک۔ تم نے جب زکوٰۃ ادا کر دی تو تم نے حق ادا کر دیا اس کا مطلب ہے کہ حکومت کا سرکاری حق تم نے ادا کر دیا۔ زکوٰۃ کی ادائیگی کے بعد اب حکومت کا کوئی قانونی مطالبہ نہیں ہے۔ باقی صدقات، خیرات اور دوسرے تمام حقوق کے مالیاتی واجبات یہ یقیناً افراد کی انفرادی ذمہ داری ہے۔ اب اگر ایک شخص دولت رکھتے ہوئے ان ذمہ داریوں کو پورا نہیں کر رہا ہے وہ یقیناً آخرت کی اس سزا کا مستوجب ہے۔ قرآن نے اس معاملہ کو قانونی اس درجہ میں رکھا ہے کہ ہر ایک سے ان سے عہدہ برا ہونے کا مطالبہ کیا ہے لیکن اس درجہ میں قانونی نہیں بنایا کہ چور اور قاتل کی طرح اسے سزا دی جائے اسی وجہ سے یہاں آخرت کی سزا کو سنگین بنا کر پیش کیا ہے۔ جن جرائم کی سزا قرآن میں دنیا میں تجویز کی گئی ہے وہاں آخرت میں سزا کے لیے کوئی سنگینی نہیں۔ مثلاً چوری، زنا، قتل، ڈاکہ وغیرہ۔ یہ بات کہ قرآن نے یہاں دنیا میں سزا کیوں تجویز نہیں کی۔ اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ قرآن پولیس کے ذریعے معاشرے کو ٹھیک بنانا نہیں چاہتا بلکہ ایمان و احتساب کی قوت سے نیک بنانا چاہتا ہے۔

آخرت میں اس کی جو سزا تجویز کی گئی ہے یعنی یہ کہ قیامت کے روز پیشانی کا داغ پہلو اور پیٹھ کا زخم یہ دولت بنے گی جو راہ خدا سے چرا کر جمع کی ہے۔ دولت فراہم کرنے کی سرگردانی میں بڑا دخل دو چیزوں کو ہوتا ہے ایک ہم چشموں میں اپنا سر اونچا رکھنے کی خواہش دوسری اپنی ذاتی آرام و راحت کی طلب فرمایا جو لوگ دنیا میں سربلندی اور فخر کی خاطر دولت جمع کریں گے ان کی دولت بروز قیامت ان کی پیشانی پر داغ لگائے گی۔ اسی طرح جو لوگ نرم ریشمی و مخملیں گدوں غالیچوں قالینوں اور صوفوں کے درپے ہو کر انفاق کی سعادت سے محروم رہیں گے ان کی یہ بچائی ہوئی دولت ان کے پہلوؤں اور ان کی پیٹھوں کو زخمی کرے گی۔

دراصل بخیل اس نکتہ کو بھول جاتا ہے کہ مال و دولت مقصود بالذات چیز نہیں بلکہ وہ صرف چیزوں کے حصول کا ذریعہ ہے۔ سونے چاندی کی اینٹیں خود بخود روٹی کپڑا اور مکان کی چار دیواری نہیں بن سکتی ہیں اس لیے ان کو سمیٹ کر رکھنے سے کچھ حاصل نہیں ہے۔ ان کو ضروری اور اعلیٰ مقاصد کے حصول میں خرچ کرنا ان کا صحیح مصرف ہے اور ان ہی اعلیٰ مقاصد کو قرآن نے فی سبیل اللہ کہا ہے جو اس راہ میں خرچ نہیں کرتا ہے وہ اپنے لیے درہم و دینار جمع نہیں کرتا وہ اپنے پہلو، پیٹھ اور

پیشانی کے داغ کا سامان کرتا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ جرم کی سنگینی کا تقاضا بھی یہ ہے کہ ان کی جمع کردہ دولت ہی کو مختلف شکلوں میں ان کے لیے عذاب بنایا جائے
صحیح بخاری، صحیح مسلم نیز صحاح ستہ کی صحیح حدیثوں میں آیا ہے کہ جنت و دوزخ میں جانے سے پہلے میدان حشر کے
اس اجماع عظیم میں اپنے سرمائے سے متعلقہ ذمہ داریوں کو ادا کرنے سے گریز کرنے والے اپنے آپ کو پائیں گے کہ مالہ
شجاع اقرع لہ زبیبتان یطوقہ یوم القیامۃ ویاخذ بلھزمتیہ ثم یقول انا مالك
انا کنزك۔ ان کا مال ایک ایسے سانپ کی شکل میں ہوگا جس کا سر بالکل چکنا ہوگا اور جس کے چہرے پر دو سیاہ نشان ہوں
گے وہ ان بخیلوں کی گردنوں سے لپٹ پڑے گا اور ان کے دونوں جبڑوں کو پکڑ کر کہے گا میں ہوں تیرا مال میں ہوں تیرا خزانہ
ان ہی حدیثوں میں ہے کہ اونٹوں اور دوسرے مویشیوں کی زکوٰۃ ادا نہ کرنے والے کو قیامت کے دن ان ہی جانوروں سے روندا جائے
گا۔ یہ بھی ہے کہ سونے اور چاندی کی تختیاں آگ میں تپائی جائیں گی اور ان ہی لوگوں کے پہلو، پیشانیاں، پیٹھیں ان تپائی ہوئی
تختیوں سے داغی جائیں گی یہ مدت ان لوگوں کو اتنی دراز محسوس ہوگی کہ موجودہ دنیا کے وقت کا جو پیمانہ ہے اس کے حساب سے
حضور اقدس نے پچاس ہزار سال اس کی مدت بتائی ہے۔ اعاذنا اللہ والمسلمین منہ

إِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللَّهِ اثْنَا عَشَرَ شَهْرًا فِي كِتَابِ اللَّهِ يَوْمَ خَلَقَ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ مِنْهَا أَرْبَعَةٌ حُرُمٌ ۚ ذَٰلِكَ الدِّينُ الْقَيِّمُ ۚ فَلَا تَظْلِمُوا فِيهِنَّ أَنْفُسَكُمْ ۚ وَقَاتِلُوا الْمُشْرِكِينَ كَافَّةً كَمَا يُقَاتِلُونَكُمْ كَافَّةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿٣٦﴾ إِنَّمَا النَّسِيءُ زِيَادَةٌ فِي الْكُفْرِ ۖ يُضَلُّ بِهِ الَّذِينَ كَفَرُوا يُحِلُّونَهُ عَامًا وَيُحَرِّمُونَهُ عَامًا لِيُوَاطِئُوا عِدَّةَ مَا حَرَّمَ اللَّهُ فَيُحِلُّوا مَا حَرَّمَ اللَّهُ ۚ زُيِّنَ لَهُمْ سُوءُ أَعْمَالِهِمْ ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٣٧﴾

ع ۵ ۱۱

بلاشبہ اللہ کے نزدیک جس دن سے اللہ نے آسمان و زمین کی تخلیق فرمائی ہے۔ اللہ کی کتاب میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے ان بارہ مہینوں میں سے چار مہینے حرمت کے ہیں۔ دین کی سیدھی اور پائدار راہ یہی ہے۔[۲۷] لہٰذا ان حرمت والے مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔[۲۸] اور سارے مشرکین سے بلا استثنا جنگ کرو جیسے وہ تم سب سے جنگ کرتے ہیں اللہ کی معیت ان کو حاصل ہوتی ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔[۲۹] اس کے سوا کچھ بھی نہیں کہ نسی تو کفر میں بڑھوتری اور زیادتی ہے اس سے ان لوگوں کو جنہوں نے راہ کفر اختیار کی گمراہ کیا جاتا ہے ایک ماہ کو ایک سال حلت کا مہینہ اور اسی کو ایک سال حرمت کا مہینہ بنا دیتے ہیں تاکہ مطابقت پیدا

کریں ان مہینوں کی گنتی سے جن کو اللہ نے حرمت والا بنایا ہے۔ بس اس طرح وہ اللہ کے حرام کردہ مہینوں کو حلت والے مہینے بنالیں۔ ان کی نظر میں ان کے یہ بُرے اعمال خوشنما معلوم ہوتے ہیں اور اللہ کفر کی راہ پر چلنے والوں کو سعادت کی راہ نہیں دکھاتا ہے۔[۳۷]

مفردات کے معانی

الشھور۔ شھر کی جمع ہے مہینہ کو کہتے ہیں۔ اس سے مراد قمری مہینے ہیں شمسی نہیں۔ قمری جس کا شمار چاند دیکھنے سے ہوتا ہے اور شمسی جس کا شمار آفتاب کے ایک برج سے دوسرے برج میں داخل ہونے سے ہوتا ہے۔ مہینہ کو شہر اس لیے کہا گیا کہ لوگوں میں اس کے آغاز و انجام کی شہرت ہوتی ہے۔ شرعی امور میں یعنی اعمال و عبادات میں قمری مہینہ معتبر ہے۔ کیونکہ انسان کے لیے مہینوں کا قدرتی حساب یہی ہے۔ چاند چھپتا ہے اور پھر نکلتا ہے۔ ہر شخص خواہ کسی متمدن شہر میں رہتا ہو خواہ صحرا میں معلوم کر سکتا ہے کہ کب مہینہ ختم ہوا اور کب شروع ہوا اس کے لیے نہ تو علم ہیئت کی حساب دانوں کی ضرورت ہے نہ تقویم کی جدولوں کی ۔ علاوہ بریں موسموں اور طلوع و غروب کے وقتوں کی جو تبدیلیاں قدرتی طور پر ہوتی رہتی ہیں وہ سب اس حساب میں پیش آتی رہتی ہیں مثلاً رمضان اور حج کا مہینہ ہمیشہ گردش میں رہتا ہے۔ یہ مہینے محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاولیٰ، جمادی الاخریٰ، رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذوالقعدہ، ذوالحجہ ہیں۔ حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ علیہ نے علامہ سخاوی کے حوالہ سے ان مہینوں کی وجہ تسمیہ بتائی ہے۔

حُرُم۔ یہ حرام کی جمع ہے۔ یا تو یہ معنے ہیں وہ مہینے جو حرمت و احترام والے ہیں یا وہ مہینے ہیں جن میں جنگ و جدال حرام ہے۔

کافۃ۔ اس کے معنے سب کے ہیں۔ یہ قرآن میں چار جگہ آیا ہے اور ہر جگہ نکرہ آیا ہے۔ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ اس پر الف لام لگا کر الکافۃ بولنا جائز ہے یا نہیں کچھ کہتے ہیں کہ جائز ہے اور کچھ بتاتے ہیں کہ ناجائز ہے۔

مہینوں کا پیمانہ قمری ہے

شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے اس آیت پر ایک جامع تبصرہ کیا ہے پہلے اسے پڑھ لیجیے۔ فرماتے ہیں۔

میرے نزدیک اوپر سے سلسلہ مضمون کا یوں ہے کہ گذشتہ رکوع میں مشرکین کے بعد اہل کتاب (یہود و نصاریٰ) سے جہاد کرنے کا حکم دیا۔ پھر اس رکوع کے شروع میں بتلایا کہ ان کے عقائد اور طور و طریق بھی مشرکین سے ملتے جلتے ہیں ان کا عزیر و مسیح کو خدا کا بیٹا کہنا ایسا ہی ہے جیسے مشرکین ملائکۃ اللہ کو خدا کی بیٹیاں کہتے تھے بلکہ نصاریٰ میں ابنیت مسیح کا عقیدہ مشرکین کی تقلید سے آیا ہے دونوں کو خدائی کا درجہ دیتے ہیں۔ انھوں نے مسیح و روح القدس کو خدا ٹھہرا لیا۔ باوجود دعوی کتاب کے احبار و رہبان کے احکام کو شریعت الٰہیہ کا بدل تجویز کر لیا یعنی احبار و رہبان رشوتیں لے کر اور حرام مال کھا کر جس چیز کو حرام یا حلال کر دیتے احکام سماوی کی تکذیب و تبدیل کر لیا جاتا۔ ان کا یہ طریقہ ٹھیک مشرکین کے طریقہ سے مشابہ ہے۔ ان کے سرکردہ بھی جس چیز کو چاہتے حلال و حرام ٹھہرا کر خدا کی طرف نسبت کر دیتے تھے جس کا ذکر سورہ انعام میں مفصل گذر چکا ہے اور یہاں بھی اس کی ایک مثال بیان کی جا رہی ہے۔ عرب میں قدیم سے معمول چلا آتا تھا کہ سال کے بارہ مہینوں میں سے چار مہینے "اشہر حرم" خاص ادب و احترام کے مہینے ہیں ذوالقعدہ، ذوالحجہ، محرم، رجب ان میں خونریزی اور جدال و قتال قطعاً بند کر دیا جاتا تھا۔ حج و عمرہ اور تجارتی کاروبار کے لیے امن و امان کے ساتھ آزادی سے سفر کرتے تھے۔ کوئی شخص ان ایام میں اپنے باپ کے قاتل سے بھی تعرض نہ کرتا تھا بلکہ بعض علماء نے لکھا ہے کہ اصل ملت ابراہیم میں یہ چار ماہ اشہر حرم قرار دیئے گئے تھے۔ اسلام سے ایک مدت پہلے جب عرب کی وحشت و جہالت حد سے گذر گئی اور باہمی جدال و قتال میں بعض قبائل کی درندگی اور انتقام کا جذبہ کسی آسمانی و زمینی قانون کا پابند نہیں رہا تو نسی کی رسم نکالی یعنی جب کسی زور آور قبیلہ کا ارادہ ماہ محرم میں ہی جنگ کرنے کا ہوا تو ایک سردار نے اعلان کر دیا کہ اس سال ہم نے محرم کو اشہر حرم سے نکال کر اس کی جگہ صفر کو حرام کر دیا۔ پھر اگلے سال کہہ دیا کہ اس سال حسب دستور قدیم محرم حرام اور صفر حلال رہے گا۔ اس طرح سال بھر میں چار مہینوں کی گنتی تو پوری کر لیتے لیکن ان کی تعیین میں اپنی پسند سے ردو بدل کر لیتے۔ حافظ ابن کثیر کی تحقیق کے مطابق نسی کی رسم صرف محرم و صفر میں ہوتی تھی اور اس کی وہی صورت تھی جو پہلے بیان ہوئی امام مغازی محمد بن اسحاق نے لکھا ہے کہ پہلا شخص جس نے یہ رسم جاری کی قَلَمَّس کنانی تھا۔ پھر اس کی اولاد در اولاد یوں ہی چلا آیا آخر میں اسی کی نسل سے ابو ثمامہ جنادہ بن عوف کنانی کا معمول تھا کہ حج کے موقعہ پر اعلان کیا کرتا کہ امسال محرم اشہر حرم میں داخل رہے گا یا صفر۔ اسی طرح محرم و صفر میں سے ہر ماہ کبھی حلال اور کبھی حرام کیا جاتا تھا۔ اور عام طور پر لوگ اسی کو قبول کر لیتے تھے گویا عہد جاہلیۃ میں کافروں کے کفر کو بڑھانے والی ایک چیز یہ بھی تھی کہ خدا کے حلال یا حرام کیے ہوئے مہینہ کو بدل ڈالنے کا حق کنانہ کے ایک سردار کو سونپ دیا گیا تھا ٹھیک اسی طرح یہود و نصاریٰ کا حال تھا کہ انھوں نے تحلیل و تحریم کی باگ طامع اور غرض پرست احبار و رہبان کے ہاتھ میں دے دی تھی۔ دونوں جماعتوں کی مشابہت ظاہر کرنے کے لیے "نسی" کی رسم کو یہاں ذکر کر دیا اور ان عدۃ الشھور اس کے رد کی تمہید ہے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

(۳۷) بلاشبہ اللہ کے نزدیک جس دن سے اللہ نے آسمان وزمین کی تخلیق فرمائی ہے اللہ کی کتاب میں مہینوں کی تعداد بارہ ہے۔ ان میں چار مہینے حرمت والے ہیں۔ دین کی سیدھی اور پائدار راہ یہی ہے۔ یعنی آج سے نہیں جب سے آسمان وزمین پیدا کیے خدا کے نزدیک بہت سے احکام شرعیہ جاری کرنے کے لیے سال کے بارہ مہینے رکھے گئے ہیں۔ جن میں سے چار اشہر حرم ادب کے مہینے ہیں۔ جن میں گناہ اور ظلم سے بچنے کا اور زیادہ اہتمام کرنا چاہیے یہی سید ھادین ابراہیم علیہ السلام کا ہے[1]

مطلب ہے کہ شریعت الٰہی اور اللہ کے قانون میں قابل اعتبار قمری سنہ کے بارہ مہینے ہیں نہ اس سے زیادہ اور نہ اس سے کم اور یہ آج کی بات نہیں بلکہ روز آفرینش ہی سے اللہ کا یہ فیصلہ ہے فی کتاب اللہ کے ساتھ یوم خلق السموات کی تصریح سے مقصود تاکید میں زور پیدا کرنا ہے۔ یہ کل بارہ مہینے ہیں۔ محرم، صفر، ربیع الاول، ربیع الثانی، جمادی الاول، جمادی الاخریٰ رجب، شعبان، رمضان، شوال، ذوالقعدہ، ذوالحجہ۔ ان میں چار حرمت والے مہینے ہیں محرم۔ رجب۔ ذوالقعدہ، ذوالحجہ۔ امام نووی فرماتے ہیں گنتی تو چار ہی سب کے نزدیک ہے اور اس پر اتفاق ہے لیکن اس بات میں کہ ان کی ترتیب کیا ہے اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ امام ابو جعفر النحاس نے اپنی کتاب صناعۃ الکاتب میں بتایا ہے کہ کوفیین ان مہینوں کی ترتیب یہ بتاتے ہیں محرم رجب ذوقعدہ اور ذوالحجہ۔ اس ترتیب میں چاروں مہینے ایک سال میں آتے ہیں اور اہل مدینہ ترتیب بتاتے ہیں ذوالقعدہ ذوالحجہ، محرم، رجب۔ اہل مدینہ کی بتائی ہوئی ترتیب ارشاد نبوت سے ہم آہنگ ہے۔ الجصاص لکھتے ہیں۔

وھی التی بینھا النبی صلی اللہ علیہ وسلم بانھا ذوالقعدہ و ذوالحجۃ والمحرم ورجب۔

حافظ ابن کثیر نے اس ترتیب کی لطیف افادی حیثیت بتائی ہے فرماتے ہیں کہ:

حرمت والے مہینے چار ہیں تین لگاتار ہیں اور ایک الگ ہے۔ حج کے مہینے سے پہلے ایک مہینہ یعنی ذوالقعدہ ہے اس میں لڑائی وغیرہ بند رہتی تھی اور حج کی تیاری ہوتی تھی ذوالحجہ حج کا مہینہ ہے اس میں لوگ حج کرتے اور ادائے مناسک میں مشغول ہوتے تھے۔ اس کے بعد محرم کو حرمت والا مہینہ اس لیے بنایا تاکہ لوگ امن وامان سے اپنے گھروں میں جاسکیں۔ اور درمیان سال میں رجب کو حرمت والا ماہ اس لیے قرار دیا کہ لوگ بیت اللہ کی زیارت کر سکیں اور عمرہ کر سکیں اور عمرہ کی ادائیگی کے بعد واپس جاسکیں۔

ابوبکر الجصاص نے ان مہینوں کو حرم کہنے کی وجہ بتاتے ہوئے لکھا ہے کہ:

دو وجہ سے ان کو حرم قرار دیا ہے ایک یہ کہ ان میں قتال حرام ہے اہل جاہلیت بھی ان میں قتال کی حرمت کا اعتقاد رکھتے تھے دوسری وجہ یہ ہے کہ ان مہینوں میں گناہوں کی سزا میں دوسرے مہینوں کے مقابلے میں زیادہ سنگینی ہے

[1] انکلاب الاسلام شیخ الاسلام

جیسے ان مہینوں میں دوسرے مہینوں کے مقابلہ میں طاعت زیادہ قیمتی ہے۔ اللہ سبحانہ نے یہ اس لیے کیا ہے کہ اس ہے برائی سے بچنے اور نیکی کی طرف بڑھنے میں بہت بڑی مصلحت ہے۔ جیسے جمعہ کے روز نماز جمعہ، رمضان کے مہینے میں روزے رکھے ہیں۔ یہ تو زمانہ کے لحاظ سے ہے۔ مکان کے اعتبار سے جیسے بعض جگہوں میں برائیوں کے ارتکاب اور طاعات کی بجاآوری دونوں میں عظمت آجاتی ہے جیسے مسجد حرام اور مسجد نبوی اس لیے ان جگہوں اور ان مہینوں میں گناہوں سے بچ کر رہنا ذریعہ بن جائے گا باقی جگہوں اور باقی مہینوں میں گناہوں سے بچنے اور طاعات میں لگنے کا۔ اور اس طرح پوری زندگی نیکیوں کا گہوارہ اور برائیوں سے دور ہو جائے گی اس لیے وقتوں اور جگہوں کے تقدس کو نیکیوں کی طرف مائل کرنے اور برائیوں سے دور رکھنے میں عظیم ترین مصالح ہیں۔

علامہ جمال الدین قاسمی نے المہائمی سے یہ بات بہت اچھی نقل کی ہے کہ:

سال کو تین پر تقسیم کر کے ایک تہائی کو حرمت والا بنایا تاکہ تحریم کے مقابلہ میں تحلیل غالب رہے۔ تحلیل تقاضائے رحمت ہے۔ جبکہ تحریم تقاضائے عزت و جبروت ہے۔ اس تہائی میں بھی خوبی یہ رکھی ہے کہ سال کے آغاز و انجام کو حرام بنایا اور چونکہ صحیح وسط نہ آتا تھا اس لیے سال کے نصف آخر کے آغاز کا مہینہ اور سال کے انجام سے پہلے کا مہینہ لے لیا۔ تاکہ سال آغاز و انجام اور درمیان کے لحاظ سے تحریم کی آغوش میں رہے۔

آخر میں فرمایا ہے ذالک الدین القیم۔ یعنی یہ مہینوں کی تعداد اور مہینوں کی یہ تقسیم کہ بارہ میں دس حلت کے اور چار حرمت کے مہینے ہیں یہی صحیح اور پائیدار قانون ہے۔ اور امام بغوی فرماتے ہیں کہ یہی ٹھیک حساب ہے اور عام شارحین قرآن نے بتایا ہے کہ یہی وہ پائیدار قانون ہے جس پر حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام عمل پیرا تھے اہل عرب میں حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل علیہما السلام ہی کی وراثت میں ان مہینوں کا اس قدر احترام تھا کہ اس زمانے باپ اور بھائی کا قاتل بھی مل جاتا تو اس کو بھی کچھ نہ کہتے۔

حرمت والے مہینوں کی حرمت کا تقاضا

(۳۸) لہٰذا ان حرمت والے مہینوں میں اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔ اصل ارشاد میں ہے۔ فلا تظلموا فیھن انفسکم۔ ان کی بے حرمتی کر کے اور ان میں محرمات کا ارتکاب کر کے اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو۔ ضمیر کا مرجع الاشھر الحرم ہے جیسا کہ اکثر شارحین قرآن کی رائے ہے اور یہی زیادہ صحیح ہے۔ زمانہ جاہلیت میں حج کی دینی حیثیت تو برائے نام رہ گئی تھی۔ ورنہ اس نے درحقیقت ایک بڑے میلہ کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس میں ہر طرف سے ہر قماش کے لوگ جمع ہوتے تھے اور وہ سب کچھ ہوتا

تھا جو میلوں میں ہوتا ہے۔ شور و غل ہوتا تھا، دنگا فساد ہوتا تھا، عورتوں سے چھیڑ خانی ہوتی تھی غرض فسق و فجور کا بازار گرم ہوتا تھا۔ قرآن نے ان باتوں کو بند کر دیا۔ اور حج کو تقدس تورع نیکی اور ذکر الٰہی کا سراسر مرقع بنا دیا فرمایا کہ ان حرمت والے مہینوں کی حرمت کا تقاضا یہ ہے کہ ان میں فسق و فجور میں مبتلا ہو کر اپنی جانوں پر ظلم نہ کرو اور ایک مطلب یہ ہے کہ ان ایام میں جنگ و جدل اور بدامنی پھیلا کر ان مہینوں کی حرمت کو رائیگاں نہ کرو۔ اس سے معلوم ہوا کہ محترم وقت اور مقدس جگہ میں گناہ عقوبت کے لحاظ سے زیادہ سنگین ہوتا ہے اور طاعت میں اجر میں بھی زیادتی ہو جاتی ہے۔ صرف جگہ اور وقت ہی نہیں اگر مقدس شخص سے آپ کی نسبت ہے تو اس نسبت سے بھی گناہ اور طاعت کی جزا و سزا میں اضافہ ہو جاتا ہے۔ قرطبی نے محترم اور معظم شخصیت کے لیے حضور اقدس کا نام لیا ہے اور قرآن کی یہ آیت تلاوت کی ہے یانساء النبی من یات منکن بفاحشۃ مبینۃ یضاعف لها العذاب ضعفین۔ یعنی اے نبی کی بیوی جو بھی تم میں سے کسی بدکاری کا ارتکاب کرے گی اسے سزا ڈبل ہوگی۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ضمیر کا مرجع الشھور بتایا ہے اور مطلب یہ ہے کہ پورے سال میں اس جگہ کے تقدس کا لحاظ کرو اور خدا کی نافرمانی کر کے اپنی جانوں پر ظلم نہ ڈھاؤ۔

کیا اس آیت کی رو سے ان مہینوں میں قتال بھی حرام ہے۔ قرطبی نے عطاء ابن ابی رباح کے حوالہ سے لکھا ہے کہ وہ قسم کھا کر کہتے تھے کہ لوگوں کے لیے حرم کے علاقے اور حرمت والے مہینوں میں جنگ کرنا حرام ہے ہاں اگر کوئی حملہ کرے تو دفاع کر سکتے ہیں۔ لیکن علماء کی رائے عامہ نے اس رائے کو پذیرائی نہیں دی۔ اور اس کے لیے انھوں نے حضور اقدس کے طائف کے محاصرے اور ہوازن کی جنگ سے استدلال کیا ہے یہ جنگ ۸ھ میں شوال و ذی قعدہ میں ہوئی ہے۔ اور کچھ نے دونوں میں اس طرح مفاہمت پیدا کی ہے کہ حرمت والے مہینوں میں جنگ کا آغاز تو درست نہیں لیکن اگر حلال مہینوں میں آغاز کر دیا اور زمانہ جنگ طویل ہو کر حرمت والے مہینوں میں داخل ہو گئی ہے تو جنگ کو جاری رکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں۔ ہوازن و ثقیف کی جنگ کی صورت حال یہی تھی۔ دفاع کی حد تک حرم اور اشہر حرم میں قتال کی اجازت سورۃ بقرہ میں آ چکی ہے۔ الشھر الحرام بالشھر الحرام والحرمات قصاص فمن اعتدی علیکم فاعتدوا علیہ بمثل ما اعتدی علیکم۔ حرمت والا مہینہ حرمت والے مہینہ کا بدلہ ہے۔ مہینوں کی حرمتیں ادلہ بدلہ اور برابر ہیں حرمت کا مہینہ یعنی ذی قعدہ جس میں عمرہ کی قضا کرنے جا رہے ہو بدلہ ہے اس حرمت والے مہینہ یعنی ذیقعدہ سال گذشتہ کا جس میں کفار نے تم کو عمرہ سے روک دیا تھا اور مکہ میں جانے نہ دیا تھا اب تم شوق سے ان سے بدلہ لو کیونکہ ادب و حرمت رکھنے میں تو برابری ہے یعنی اگر کوئی کافر ماہ حرام کی حرمت کرے اور تم سے نہ لڑے تو تم بھی ایسا ہی کرو مکہ والے جو سال گذشتہ میں تم پر ظلم کر چکے ہیں انھوں نے نہ ماہ حرام کی حرمت کا پاس کیا اور نہ حرم کا خیال کیا۔ اور نہ تمہارے احرام کا خیال کیا۔ اگر اس دفعہ بھی سب حرمتوں کو نظر انداز کر کے آمادہ پیکار ہوں تو تم بھی کسی حرمت کا خیال نہ کرو۔

جہاد اسلام کی اجتماعی زندگی کا تقاضا ہے

(۳۹) اور سارے مشرکین سے بلا استثناء جنگ کرو جیسے وہ تم سے جنگ کرتے ہیں اللہ کی معیت ان کو حاصل ہوتی ہے جو تقویٰ اختیار کرتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اس آیت سے نکلتا ہے کہ کافروں سے لڑنا ہمیشہ روا ہے چنانچہ غزوہ تبوک جس کا آگے ذکر آتا ہے ماہ رجب میں ہوا اور آپس میں ظلم کرنا ہمیشہ گناہ ہے ان مہینوں میں اکثر علماء کی رائے یہی ہے لیکن بہتر ہے کہ اگر کوئی کافر ان مہینوں کا ادب کرے تو ہم بھی اس سے لڑائی کی ابتداء نہ کریں لہ

شیخ الاسلام کا تشریحی نوٹ لا تظلموا فیھن انفسکم اور قاتلوا المشرکین سے متعلق ہے۔ حرمت والے مہینوں میں قتال کے بارے میں آپ علماء کے خیالات سن چکے ہیں۔ رائے عامہ یہی ہے کہ جائز ہے مگر دیکھیے ہے جب کہ قرآن بتا رہا ہے کہ منھا اربعۃ حرم۔ اس موقعہ پر ان کا یہ استدلال بڑا ہی عجیب ہے کہ تھا تو حرام مگر اس کی حرمت منسوخ ہوگئی۔ ناسخ کیا ہے؟ وہ کہتے ہیں کہ قرآن کی یہ آیت قاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم ناسخ ہے۔ ناسخ کیسے ہے اس طرح کہ اس میں یہ اضافہ کر لو فیھن و فی غیرھن۔ اوروں کا پتہ نہیں مگر یہ بات میرے جیسے کم فہم طالب علم کی سمجھ میں نہیں آتی کہ ایک ہی آیت کے ایک حصہ میں حکم ہو رہا ہے اور اسی آیت کے دوسرے حصہ میں اسے اپنے اضافے سے منسوخ بتایا جا رہا ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا بیان یہاں قابل غور ہے۔

امام بغوی فرماتے ہیں کہ علماء کا اس میں اختلاف ہے کہ حرمت والے مہینوں میں قتال حرام ہے یا نہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ حرام تھا، پھر منسوخ ہوگیا اور قرآن کی اس آیت سے منسوخ ہوا۔ قاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم۔ اس آیت کی تشریح اس طرح کرتے ہیں کہ حرمت والے اور غیر حرمت والے مہینوں میں قتال کرو۔ یہ قتادہ۔ عطاء الخراسانی، زہری اور سفیان ثوری کی رائے ہے یہ تو ان کا قرآن سے استدلال ہے۔ حدیث سے ان کا استدلال یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے حنین میں اور ثقیف سے طائف میں جنگ کی تھی اور طائف کا محاصرہ شوال اور ذی قعدہ کے آغاز میں ہوا تھا۔ یہ ہے امام بغوی کا اس موضوع پر بیان۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ آیت قاتلوا المشرکین کافۃ میں ناسخ بننے کی صلاحیت نہیں ہے۔

اوّلاً: اس لیے کہ منسوخ ہونے والی آیت یعنی اربعۃ حرم ذالک الدین القیم اس کے ساتھ ہے اور نسخ کے لیے ضروری ہے کہ ناسخ و منسوخ میں کچھ وقت کا فاصلہ ہو۔

ثانیاً، قاتلوا المشرکین میں زمانہ کے لحاظ سے عموم نہیں ہے کہ اس کو حرمت زمانہ کے لیے ناسخ

لہ افادات شیخ الاسلام

بنایا جا سکے۔

ثالثاً: تشریح میں مقدر عبارت بے محل ہے اور بے دلیل ہے۔

رابعاً: حضور ﷺ نے طائف کا شوال میں ضرور محاصرہ کیا۔ لیکن ذی قعدہ شروع ہوتے ہی آپ نے محاصرہ اٹھا لیا تھا۔

خامساً: اگر ذی قعدہ میں قتال کی حدیث ثابت بھی ہو جائے تو یہ خبر واحد ہے اور خبر واحد سے اللہ کی کتاب منسوخ نہیں ہو سکتی۔

سادساً: یہ آیات قرآنی ۹ھ میں نازل ہو رہی ہے غزوہ طائف کے بعد۔ غزوہ طائف ۹ھ میں ہوا۔ ۸ھ کا حکم عمل نبوت ۹ھ کے حکم قرآنی کے لیے کیسے ناسخ ہو سکتا ہے۔

سابعاً: حضور اقدس ﷺ نے وصال مبارک سے ۸۰ روز پہلے حجۃ الوداع میں ان مہینوں کی حرمت خطبہ میں بیان کی ہے۔ اس لیے صحیح بات ان لوگوں کی ہے جو کہتے ہیں کہ منسوخ نہیں ہے۔ عطاء ابن ابی رباح اسی لیے قسم کھا کر کہتے تھے کہ لوگوں کے لیے حرم میں اور حرمت والے مہینوں میں قتال جائز نہیں ہے ہاں صرف دفاعی صورت اس سے مستثنیٰ ہے اور یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔

اب آیئے پیش نظر آیت کی تشریح سن لیجئے۔ اس جگہ یہ بات عام ہے وقاتلوا المشرکین کافۃ لیکن البقرہ میں اس میں ایک قید ہے اور وہ یہ ہے کہ ولا تعتدوا ان اللہ لا یحب المعتدین۔ اس کے معنے یہ ہیں کہ حرم میں اپنی طرف سے لڑائی شروع نہ کرو۔ اور جو حکم حرم مکہ کا ہے وہی اشہر حرم کا ہے دونوں میں حالت دفاع مستثنیٰ ہے۔

قتال انفرادی نہیں اجتماعی ہے

قتال کے بارے میں قرآن کی جمع کے لفظوں میں تعبیرات بہت معنے خیز ہیں فقہاء نے ان ہی تعبیرات سے یہ نتیجہ نکالا ہے کہ قتال کا فریضہ انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے۔ ضروری ہے کہ نظام مملکت ہو۔ امام کی سربراہی ہو۔ فوج اور عسکریت کا وجود اور وجوب اسی آیت سے بطور عبارت النص کے معلوم ہو رہا ہے اور امام کی سربراہی کی بھی یہ آیت بطور اقتضاء النص کے نشاندہی کر رہی ہے۔ کیونکہ فوجی تنظیم اور اس کی اجتماعی ترتیب بغیر سرکار یعنی امام کے ممکن نہیں ہے۔

اسی سے قتال کی دو قسمیں معلوم ہو رہی ہیں۔ دفاعی اور اقدامی، دفاع کی صورت میں جہاد فرض عین ہوتا ہے جب کہ اقدام کی صورت میں جہاد فرض کفایہ ہوتا ہے۔ کفایہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں سے کچھ پر فرض

ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ فرضیت سب پر ہے اور ادائے فرض کا مطالبہ سب سے ہے لیکن کچھ کے کرنے کے بعد ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں اسی کو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ جماعتی فرائض اور شخصی فرائض۔ جماعتی فرائض یعنی فرض کفایہ سے وہ احکام مقصود ہیں جو بہ حیثیت جماعت امت پر فرض ہیں۔ فرض کفایہ میں شریعت کا خطاب اشخاص سے نہیں بلکہ جماعت سے ہے۔ دوسری قسم شخصی فرائض یعنی فرض عین کی ہے یعنی وہ فرائض جن کی فرضیت جماعت پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے اور ایک کے کرنے سے دوسرا بری الذمہ نہیں ہوتا۔

شرعاً قتال کی اقدامی صورت فرض کفایہ ہے۔ ضروری نہیں کہ بیک وقت ہر مسلمان اس میں حصہ لے۔ صاحب ہدایہ لکھتے ہیں:

جہاد فرض کفایہ ہے جب مسلمانوں کی کوئی جماعت اس کے لیے کھڑی ہوگئی تو باقی مسلمانوں کے لیے واجب نہ رہا لیکن اگر کوئی گروہ بھی اس کے لیے نہ اٹھا تو پھر تمام مسلمان جہاد ترک کر دینے کی وجہ سے گنہگار ہوں گے کیونکہ فرض پوری قوم پر ہوتا ہے۔

اسی طرح فقہ شافعی کی کتاب اقناع میں ہے۔

وہ فرض کفایہ ہے جب ایک گروہ اس کی بجاآوری کرے تو سب کی ذمہ داری پوری ہو جاتی ہے۔

ابن ادریس اس کی شرح میں لکھتے ہیں:

یہ صورت تو اس قتال کی ہے جس کی صورت اقدام کی ہے۔ دوسری قسم دفاع کی ہے یعنی جب کوئی غیر مسلم جماعت مسلمانوں کی آبادیوں پر حملہ کر دے تو اس حملہ و تسلط کو ہر طرح کا مقابلہ کر کے روکنا مسلمانوں کا فرض ہے یہ دفاعی جہاد فرض کفایہ نہیں ہے بلکہ بالاتفاق نماز کی طرح ہر مسلمان پر فرض عین ہے۔

اس آیت میں کافۃ آیا ہے قاتلوا المشرکین کافۃ۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ لفظ کافۃ یا تو فاعل کی ضمیر انتم سے حال ہے اور یا المشرکین قاتلوا کے مفعول سے حال ہے اگر فاعل کی ضمیر سے حال ہو گا تو معنے یہ ہوں گے تم سب مل کر مشرکوں سے جنگ کرو۔ اور اگر مفعول المشرکین سے حال ہو گا تو معنے یہ ہوں گے تم تمام مشرکوں سے بلا استثناء جنگ کرو۔ ہم نے ترجمہ میں دوسرے معنے کو اختیار کیا ہے شیخ الہند نے بھی اپنے ترجمہ میں اسی کو اختیار کیا ہے۔ اگر آیت کا روئے سخن اقدام ہے تو دوسرے معنے صحیح ہیں اور یہاں اقدام ہی معلوم ہوتا ہے آیت کا مقصد قتال کی ترغیب ہے پہلے بتایا تھا کہ اللہ نے اپنے رسول کو الہدیٰ اور دین حق دے کر روانہ کیا ہے تاکہ اسے سارے دینوں پر غالب کرے سارے دینوں پر غالب کرنے سے مراد نظریاتی غلبہ بھی ہے اور سیاسی غلبہ بھی۔ اسی وجہ سے اس اعلان کے ساتھ یہ حکم دیا ہے۔ وقاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ۔ اور حضور اقدس ﷺ نے اس قتال اور

جہاد کو کبھی ختم نہ ہونے والی ضرورت اور ذمہ داری بتاتے ہوئے امت کو خبردار کیا ہے۔

جہاد میرے وقت سے لے کر اس وقت تک رہے گا جب تک کہ میری امت کا آخری فرد دجال سے لڑے

چونکہ اس جہاد کی نوعیت اقدامی جہاد کی ہے اس لیے فرمایا کہ بلا استثناء سارے مشرکین سے جنگ کرو۔

آخر میں فرمایا ہے کہ واعلموا ان اللہ مع المتقین اللہ کی معیت ان لوگوں کے حصے میں آتی ہے جن کے دامن پر برائیوں کے داغ نہ ہوں۔ قرآن نے یہ بات اپنے مخاطبوں کو بتکرار بتائی ہے کہ کامیابی اہل تقویٰ کے لیے ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہاں یہ بات بڑی ہی لطیف لکھی ہے۔

اس میں اللہ سے قرب کی بشارت ہے اور اللہ کی معیت اہل ایمان کے لیے بلا کیف ہے اور تقویٰ کو بنیاد بنا کر اللہ نے مدد کی ضمانت دی ہے۔

رسم نسی قطعاً کافرانہ رسم ہے

(۴۰) اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ نسی تو کفر میں سراسر زیادتی اور بڑھوتری ہے اس لیے ان لوگوں کو جنہوں نے کفر کی راہ اختیار کی گمراہ کہا جاتا ہے۔ ایک ماہ کو ایک سال حلت کا مہینہ اور اسی کو ایک سال حرمت کا مہینہ بنا دیتے ہیں تاکہ مطابقت پیدا کریں ان مہینوں کی گنتی سے جن کو اللہ نے حرمت والا بنایا ہے بس اس طرح وہ اللہ کے حرام کردہ مہینوں کو حلت والے مہینے بنالیں ان کو یہ بُرے اعمال خوشنما معلوم ہوتے ہیں اور اللہ کفر کی راہ پر چلنے والوں کو سعادت کی راہ نہیں دکھاتا ہے۔ یعنی برے کام کو اچھا سمجھ رہے ہیں جب سمجھ الٹ جائے تو بھلائی کا راستہ کہاں ملے۔ اس آیت میں جو رسم نسی کا ذکر فرمایا ہے اس کی تفصیل گزشتہ آیت کے فوائد میں زیر آیت ذلک الدین القیم گذر چکی ہے[1]

نسی کے موضوع پر بات کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ پہلے یہ معلوم کیا جائے۔

۱۔ نسی کی لغوی حیثیت کیا ہے۔

۲۔ نسی کی اصطلاحی حیثیت کیا ہے۔

۳۔ نسی کی تاریخی حیثیت کیا ہے۔

۴۔ مراد قرآن کیا ہے۔

نسی کے لغوی معنے

نسی: جوہری صاحب صحاح کے خیال میں بر وزن فعیل ہے اور معنی میں مفعول کے ہے جیسے قتیل بمعنے مقتول آتا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

اور کچھ کی رائے ہے کہ انسار مزید سے نعیل کے وزن پر ہے جیسے انذر سے نذیر آکر سے نکیر زمخشری کا میلان اسی طرف ہے۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ نسأ ینساء کا مصدر ہے یہ مہموز اور ناقص دونوں طرح آتا ہے اس کے معنے دیر کرنے کے ہیں اسی سے چیز ل جائے اور قیمت ادھار ہو نسیئہ کہتے ہیں کیونکہ قیمت کی ادائیگی میں دیری ہوئی ہے۔ نسأت المراۃ عورت کے حاملہ ہونے پر بولتے ہیں کیونکہ ماہواری میں اس سے تاخیر ہو جاتی ہے۔ نسأت الناقۃ اس وقت بولتے ہیں جب اونٹنی کو تیز دوڑایا جائے اور تاخیر سے روکا جائے۔ منساۃ اس چھڑی کو کہتے ہیں جس کے ذریعے ہانکا جائے اور تاخیر سے روکا جائے۔

نسی کی تاریخی حیثیت

اس رسم کی ایجاد کا سہرا کس کے سر ہے۔ اس میں علماء کا اختلاف ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباس، قتادہ اور ضحاک کی رائے ہیں کنانہ کے تین لڑکے ہیں ابن عباس　　　　کی بحوالہ ضحاک ہی روایت ہے کہ اس کا موجد عمرو بن لحی بن قمعہ ہے امام زہری فرماتے ہیں کہ اس کی ایجاد کا سہرا بنی کنانہ کے قبیلے کے سر ہے۔ البلاذری کے انساب میں ہے کہ ابو ثمامہ القلمس ابن امیہ ابن عوف یہ کام کرتا تھا اور اس نے چالیس سال تک یہ کام کیا۔ امام مغازی محمد بن اسحاق کا بھی یہی میلان ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ جو یہ کام کرتا تھا قیادت اور زعامت بھی عرب کی اسی کے پاس ہوتی تھی۔ چنانچہ ایک شاعر فخریہ کہتا ہے۔

ومنا ناسئ الشہر القلمس

یعنی قلمس مہینوں میں نسی کرنے والا ہم ہی میں سے ہے۔

ایک اور شاعر کہتا ہے:؎

السنا الناسئین علی معد شہور الحل نجعلہا حراما

کیا ہم حلت کے مہینوں میں نسی کی رسم کے مطابق حرام کرنے والے نہیں ہیں

علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں بھی یہی بتایا ہے کہ قلمس نامی قبیلہ کنانہ سے تعلق رکھنے والا زمانہ جاہلیت میں جمرہ عقبہ کے پاس کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتا تھا۔

بہر حال اکثر اس پر متفق ہیں کہ یہ کارنامہ قلمس نامی شخص کا ہے اور اس رسم کا تاریخی نسب نامہ اس سے ملتا ہے۔ علامہ ابن الجوزی نے یہ انکشاف بھی کیا ہے۔

مشہور امام لغت فراء کہتے ہیں کہ اہل عرب زمانہ جاہلیت میں جب منیٰ سے واپسی کا ارادہ کرتے تو بنی کنانہ میں ایک شخص کھڑا ہوتا جس کا نام نعیم بن ثعلبہ ہے اور پورے موسم حج کا وہی لیڈر ہوتا وہ کھڑے ہو کر

اعلان کرتا ہیں وہ ہوں جس میں کوئی عیب نہیں نکالا جا سکتا جسے جواب نہیں دیا جا سکتا اور جس کے فیصلہ کو ٹھکرایا نہیں جا سکتا۔ لوگ کہتے براہ نوازش مہینہ کو مؤخر کر دیجئے۔ مقصد یہ ہوتا کہ محرم کی حرمت کو مؤخر کر کے اسے صفر میں بنا دیجئے۔ وہ ایسا کر دیتا۔ وہ ایسا اس لیے کرتے تھے کہ حرام مہینے لگاتار ہونے کی وجہ سے ان کی قزاقی اور لوٹ مار میں رکاوٹ ہوتی تھی۔ ان کی معاشی زندگی کی گاڑی لوٹ مار اور غارتگری ہی سے چلتی تھی۔

نسی کی اصطلاحی حیثیت

اس موضوع پر شارحین قرآن نے جو خیالات ظاہر کیے ہیں پہلے وہ گوش گذار فرمائیے۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں بعض اقوام جو اپنے مہینوں کا حساب درست رکھنے کے لیے لوند کا ماہ ہر تیسرے سال بڑھاتی ہیں وہ نسی میں داخل نہیں اور بعض اکابر سلف سے جو نسی کے تحت یہ منقول ہے کہ عرب جاہلیت میں سال کے مہینوں کا عدد بدل ڈالتے تھے مثلاً بارہ کے چودہ مہینے بنا لیتے یا حساب میں ایسی گڑبڑ کی کہ جو ذوالقعدہ تھا وہ ذوالحجہ بن گیا حتیٰ کہ ۹ھ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا حج بھی ان کے حساب سے ذی قعدہ میں ہوا۔ اور حدیث ان الزمان قد استدار کھیئتہ کی تقریر اسی کو پیش نظر رکھ کر کی گئی۔ ان سب چیزوں پر حافظ ابن کثیر نے تعاقب کیا ہے [1]

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع۔ حضرت مولانا محمد ادریس کاندھلوی کی معارف القرآن میں مولانا دریابادی اور حضرت مولانا اشرف علی رحمہ اللہ اسی خیال کے ہمنوا ہیں۔ حال کے شارحین میں ہمارے پیش نظر مولانا ابوالاعلیٰ اور مولانا امین احسن اصلاحی ہیں۔

مولانا مودودی فرماتے ہیں:

عرب میں نسی دو طرح کی ہوتی تھی۔ اس کی ایک صورت تو یہ تھی کہ جنگ و جدال و غارت گری اور خون کے انتقام لینے کی خاطر کسی حرام مہینے کو حلال قرار دیتے تھے اور اس کے بدلے میں کسی حلال مہینے کو حرام کر کے حرام مہینوں کی تعداد پوری کر دیتے تھے۔ دوسری صورت یہ تھی کہ قمری سال کو شمسی سال کے مطابق کرنے کے لیے اس میں کبیسہ کا ایک مہینہ بڑھا دیتے تھے تاکہ حج ہمیشہ ایک ہی موسم میں آتا رہے۔ اور وہ ان زحمتوں سے بچ جائیں جو قمری حساب کے مطابق مختلف موسموں میں حج کی گردش کرتے رہنے سے پیش آتی ہیں۔ اس طرح ۳۳ سال تک حج اپنے اصل وقت کے خلاف دوسری تاریخوں میں ہوتا رہتا اور صرف چونتیسویں سال ایک مرتبہ ٹھیک ذی الحجہ کی ۱۰ تاریخ کو ادا ہوتا تھا۔ یہی وہ بات ہے جو جناب رسول اللہ ﷺ نے اپنے خطبے میں

فرمائی تھی کہ ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق السموات والارض یعنی اس سال کا وقت گردش کرتا ہوا ٹھیک اپنی اس تاریخ پر آگیا جو قدرتی حساب سے اس کی اصل تاریخ ہے۔ لہ

مولانا اصلاحی فرماتے ہیں:

نسی سے عرب جاہلیت کی اصطلاح میں وہ مہینہ مراد ہوتا ہے جس کو چند دن پیچھے ہٹا کر اس کے دنوں میں اضافہ کر دیتے تھے۔ شمسی سال قمری سال سے تقریباً گیارہ دن زیادہ ہوتا ہے۔ قمری سال کی اس کمی کو پورا کرنے کے لیے اہل عرب یہ کرتے تھے کہ اس میں کمی کے بقدر اضافہ کر دیتے جس کی عملی شکل یہ تھی کہ ہر آٹھ سال میں تین ماہ بڑھائے جاتے گویا ہر دوسرے یا تیسرے سال کے خاتمہ پر ایک ماہ کبیسہ کا ہوتا اس طرح اپنے خیال کے مطابق انھوں نے قمری مہینوں بالخصوص اشہر حرم کا احترام بھی باقی رکھا اور اپنے تجارتی فوائد و مصالح کے نقطہ نظر سے اس کو شمسی بھی بنا لیا تھا۔ لہ

شارحین قرآن نے نسی کی دو طرح تشریحیں بتائی ہیں۔ ان سب کی تشریحات کو یہاں پیش کرنا بہت بڑی طوالت ہے اس موضوع پر مجھے مولانا ابوالکلام آزاد رحمۃ اللہ علیہ کی تحقیق فکر انگیز معلوم ہوتی ہے اس لیے معالم القرآن پڑھنے والوں کی ضیافت طبع کے لیے پیش کرتا ہوں۔

آیت میں نسی سے کیا مراد ہے؟ اسے خود قرآن نے بتلا دیا ہے اور صحابہ کرام نے مزید تشریح کر دی۔ لیکن بعد کو مفسروں کی کاوشوں نے خصوصاً علماء ہیئت کی دقیقہ سنجیوں نے اسے ایک پیچیدہ سوال بنا دیا غالباً ابو معشر فلکی پہلا شخص ہے جس کا خیال اس طرف گیا کہ یہ کبیسہ کا معاملہ تھا پھر ابوریحان بیرونی نے بھی اس کی پیروی کی۔ گذشتہ صدی کے بعض مستشرقین یورپ کو بھی اس مسئلہ پر خصوصیت سے توجہ ہوئی۔ کیونکہ انھوں نے خیال کیا اس سے عرب جاہلیت کی تقویمی معلومات پر روشنی پڑے گی چنانچہ پوکاک دی ساسی، اگاسین دی پرسیول، اسپرنگر، ول ہواسن وغیرہم نے اس پر طول طویل بحثیں کی ہیں۔ اور زمانہ حال کا ایک اطالوی مستشرق پرنس کا تانی بھی اپنی زیر تصنیف تاریخ اسلام کی پہلی جلد میں اس پر بحث کر چکا ہے مستشرقین ہی کی صف میں محمود فلکی کو بھی شمار کرنا چاہیے جس نے کبیسہ کا نظریہ تسلیم کر کے یہ کوشش کی کہ اس عہد کے شمسی مہینوں کی تقویمی حالت منضبط کی جائے۔

لیکن حق یہ ہے کہ اس نظریہ کے لیے کوئی تاریخی بنیاد موجود نہیں ہے اور صاف بات وہی معلوم ہوتی ہے جس کی طرف خود قرآن نے اشارہ کیا ہے اور آثار صحابہ میں اس کی تفصیل موجود ہے۔

عرب میں حضرت اسماعیل علیہ السلام کے زمانہ سے یہ بات چلی آتی تھی کہ سال کے چار مہینے امن کے مہینے ہیں۔ ان میں لڑائی نہ ہونی چاہیے رجب ذوالقعدہ، ذوالحجہ اور محرم۔ اسی لیے انہیں اشہر الحرم کہتے تھے یعنی حرمت کے مہینے۔

لہ تفہیم القرآن

بزقمری مہینوں کے حساب سے کہ قدرتی حساب ہے حج کا مہینہ ہی متعین تھا اور وہ اسی نام سے پکارا جاتا تھا یعنی ذی الحجہ۔ اسی مہینے کی آٹھویں، نویں، دسویں حج کے اعمال و رسوم کے دن سمجھے جاتے تھے۔

ایک مدت تک بات اسی طرح قائم رہی لیکن پھر لوگوں پر اس کی پابندی شاق گذرنے لگی۔

اولاً اس لیے کہ قمری مہینوں کے حساب کی وجہ سے حج کا زمانہ ہمیشہ ایک ہی موسم میں نہیں آتا تھا، بدلتا رہتا اور اس کی وجہ سے قریش کے سفر تجارت میں خلل پڑتا۔

ثانیاً اس لیے کہ امن کے مہینوں کا معاملہ بھی ان کی جنگ جویانہ مقاصد کے خلاف واقع ہوتا تھا۔ ایک قبیلہ کو دوسرے قبیلہ سے کتنی ہی عداوت ہو اور انتقام کا کتنا ہی موزوں موقعہ سامنے دیکھے لیکن اس کی جرأت نہیں کر سکتا تھا کہ ان مہینوں کی بے حرمتی کر کے اعلانِ جنگ کر دے چونکہ عرب جاہلیت کی طبیعتوں کے لیے نہ تو اپنی قیود تھیں نہ علمی حدود اس لیے مطلب برآری کا ایک ڈھنگ نکال لینے میں انہیں کوئی دقت پیش نہیں آئی۔ وہ ڈھنگ یہ تھا کہ امن کے مہینوں کا معاملہ ان کے قدرتی حساب پر موقوف نہیں رکھا بلکہ اس کے لیے ایک خود ساختہ اعلان ضروری ٹھہرایا جو حج کے موقعہ پر کیا جاتا تھا۔ اس اعلان کے ذریعے حسب ضرورت امن کے مہینے پیچھے ڈال دیتے یا حج کا مہینہ مؤخر کر دیتے مثلاً محرم امن کا مہینہ تھا اعلان کر دیا جاتا کہ اس سال محرم صفر میں ہوگا۔ نتیجہ یہ نکلتا کہ محرم کا حقیقی مہینہ حکماً معدوم ہو جاتا اور اس میں لڑائی شروع ہو جاتی۔ پھر یہ فرق دور تک پہنچ جاتا تو اسے لوٹانا شروع کر دیتے یہاں تک کہ اصل مہینوں کی ترتیب پھر قائم ہو جاتی۔

چونکہ یہ طریقہ سراسر جہل و فساد پر مبنی تھا اور اس کی وجہ سے نہ تو تقویم کا کوئی معیار باقی رہا تھا نہ امن و جنگ کے ایام کا۔ اس لیے ضروری تھا کہ اس کا قطعاً انسداد کر دیا جائے اور حج کے لیے ایک معین اور قطعی زمانہ مقرر ہو جائے۔ اگر فی الحقیقت اس معاملہ کی بنیاد کسی حسابی قاعدہ پر ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ قرآن اسے زیادۃ فی الکفر سے تعبیر کرتا[1]

بہرحال نسئی کے دو معنے ہیں ایک وہ ہیں جو خود قرآن نے بتائے ہیں کہ یحلونہ عاما ویحرمونہ عاما یعنی امن والے مہینے کو ایک سال حرمت والا مہینہ بنا دیتے اور ایک سال اسی کو حلت والا مہینہ کر دیتے، محرم کے ساتھ ان کا یہ معاملہ ہوتا۔ دوسرے معنے یہ ہیں کہ وہ اس میں کبیسہ کا عمل کرتے اور شمسی اور قمری مہینوں میں تطابق پیدا کر لیتے اور ہر آٹھ سالوں میں تین ماہ بڑھا دیتے گویا ہر دوسرے یا تیسرے سال کے خاتمہ پر ایک ماہ کبیسہ کا ہوتا۔

پہلی بات کا تعلق جہل و نادانی سے ہے دوسری بات سرتاسر علمی ہے قرآن یہاں ان کے علم و فکر کی بات نہیں کر رہا ہے بلکہ ان کی جہل و کوری کا ماتم ان لفظوں میں کر رہا ہے یحلونہ عاما ویحرمونہ عاما۔ صحابہ اور تابعین بھی اس سے یہی سمجھے ہیں۔ اس لیے آیت میں مراد پہلے ہی معنے میں کبیسہ والی بات کا آیت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس موضوع پر مزید معلومات کے لیے ڈاکٹر جواد علی کی کتاب المفصل فی تاریخ العرب بہترین ہے۔ موصوف نے اس پر ایک مبسوط مقالہ میں سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس کا حاصل بھی یہی ہے۔ بات صرف یہ ہے کہ یہ ایک دینی تشریع ہے کہ حرمت والے مہینے

---

[1] ترجمان القرآن

چار ہیں اس میں اتباع ہوا کی راہ سے تاویل کے ذریعے تبدیلی کر ڈالی۔ یعنی حرمت والے مہینوں کی تعداد تو باقی رکھی لیکن حرمت والے مہینوں کو بدلنا شروع کر دیا اسی کو قرآن نے کفر میں بڑھوتری سے تعبیر کیا ہے یعنی اصل کفر جو وہ مشرکانہ اعمال کے ذریعے کر رہے تھے اس میں یہ مزید اضافہ ہے کیونکہ تحلیل و تحریم اللہ کا حق ہے۔ انہوں نے اس حق پر چھاپہ مارا ہے اور یہ لوگ اسی راہ سے ان سب کا فرگروان کا کہنا ماننے ہیں یہ راہ اور گمراہ کر رہے ہیں، اور گمن ہیں کہ چونکہ ہم گنتی پوری کر رہے ہیں اس لیے ہم ملت ابراہیم کے پیرو ہیں۔

غرض دین ابراہیمی کا صرف اتنا احترام تھا کہ سال میں چار مہینوں کی گنتی پوری کر لیتے تھے۔ لیکن اللہ سبحانہ نے سال میں حرمت کے مہینوں کی جو ترتیب مقرر فرمائی تھی اس میں طرح طرح کی تاویلیں کر کے اپنی اغراض کے مطابق بنا لیتے تھے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے اس رد و بدل کی وجہ سے یہ امتیاز ہی ختم ہو گیا کہ ذی الحجہ کا مہینہ کون ہے اور محرم کونسا ہے۔ اسی بنا پر یہ تمہید آئی ہے۔

حافظ ابن کثیر کی تحقیق

یہاں حافظ ابن کثیر نے اس آیت کی جو تشریح کی ہے وہ اس لائق ہے کہ اس کا مطالعہ کیا جائے۔ حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے۔

اللہ سبحانہ نے اس آیت میں مشرکین کی اس بات پر مذمت کی ہے کہ وہ اللہ کے قانون اور شریعت میں اپنی غلط آراء کے ذریعے تصرفات کرتے ہیں اور ناپاک خواہشوں کی وجہ سے اللہ کے احکام کو تبدیل کرتے ہیں۔ اللہ کی حرام کردہ چیزوں کو حلال اور حلال کو حرام بناتے ہیں۔ یہ ان لوگوں کے کردار کی عکاسی ہے جن میں قومی حمیت، عصبیت اور شہامت اس قدر تھی کہ تین ماہ کے تسلسل کو وہ برداشت نہ کر سکتے تھے۔ ان میں مہینوں کا قانون تحریم دشمنوں سے میدان جنگ میں مقابلہ میں سب سے بڑی رکاوٹ تھا۔ انہوں نے اسلام سے بہت پہلے محرم کی حرمت کو پامال کر کے اسے ماہ حلال بنا لیا اور صفر کا نام محرم رکھ لیا۔ اس طرح وہ حلال مہینہ کو حرام اور حرام کو حلال بناتے وہ صرف چار ماہ کی مدت پوری کرتے لیکن بے قیدی کے ساتھ محرم کی جگہ صفر کو حرام بنا لیتے جیسا کہ ان کے شاعر نے فخریہ کہا ہے۔

اس کے بعد حافظ ابن کثیر نے امام مجاہد کا تشریحی نوٹ لکھا ہے اور بتایا ہے کہ یہ تشریح بڑی ہی عجیب ہے۔ اس تشریح کی رو سے امام مجاہد کہتے ہیں کہ مشرکین ایک ماہ میں دو سال حج کرتے تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے جو ۹ھ میں حج کیا۔ یہ امام مجاہد کی رائے میں ذی قعدہ میں ہوا اور ۱۰ھ میں حضور اقدس ﷺ نے جو حج کیا وہ ذی الحجہ میں ہوا ہے۔ حضور اقدس نے منیٰ میں جو تقریر فرمائی اور اس تقریر میں جو یہ بات ارشاد فرمائی۔ ان الزمان قد استدار کھیئتہ یوم خلق اللہ السموات والارض۔ اس میں اسی طرف اشارا ہے۔

لیکن حافظ ابن کثیر کو امام مجاہد کی تشریح سے اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں؛

کہ اگر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا حج ذوالقعدہ میں ہوا جیسا کہ مجاہد کہہ رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کا حج ہی نہیں ہوا اور ایسے حج کو جو شرعاً ہوا ہی نہیں ہے قرآن الحج الاکبر کہہ رہا ہے۔

اگر ابوبکر کا حج قانون کے لحاظ سے بے وقت ہونے کی وجہ سے غلط ہوتا تو قرآن اسے الحج الاکبر نہ کہتا۔ اور پھر نسی کے عمل سے یہ کب لازم آتا ہے کہ دو سال تک وہ ایک ہی ماہ میں حج کرتے۔ نسی کا ماحصل تو صرف یہ ہے کہ وہ ایک سال محرم الحرام کو حرام کی بجائے حلال بناتے تھے اور اس کی جگہ صفر کو حرام کہتے پھر مہینوں کی ترتیب وہی رہتی تھی۔ مہینوں کی گنتی بھی وہی رہتی مہینوں کے نام بھی وہی رہتے۔ پھر دوسرے سال محرم کو ماہ حرام قرار دیتے اس کے بعد سارے مہینے اپنی جگہ رہتے تھے اس میں نہ کوئی رخنہ ہوتا اور نہ کوئی تبدیلی قرآن کی آیت یحلونہ عاما ویحرمونہ عاما کا یہی مطلب ہے۔ ان کے پیش نظر یہ بات ضرور رہی کہ حرمت والے مہینوں کا سال بھر میں شمارہ کم نہ ہونے پائے وہ صرف یہ کرتے تھے کہ کبھی تیسرے ماہ یعنی محرم کو پہلے لے آتے اور کبھی اسے صفر میں ڈال کر موخر کر دیتے۔ باقی رہا ارشاد نبوت ان الزمان قد استدار تو اس کی تشریح ہم پہلے بتا چکے ہیں اس کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ مہینوں کی گنتی اور حرمت والے مہینوں کی تحریم کا معاملہ اللہ کی کتاب میں عدد اور ترتیب کے اعتبار سے پہلے ہو چکا ہے آج بھی وہی ہے ایسا نہیں جیسا کہ جاہل عرب اپنی جہالت کی وجہ سے بتائے ہوئے ہیں۔

جس ارشاد نبوت کا حافظ ابن کثیر نے حوالہ دیا ہے پوری بات بخاری و مسلم میں حضرت ابوبکرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے اس طرح آئی ہے۔

> فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے وقت گھوم پھر کر آ گیا ہے اپنی اسی حالت کے مطابق جیسے اللہ کی آسمان و زمین کی تخلیق کے دن تھی۔ سال بارہ مہینے کا ہے ان میں سے چار حرمت والے مہینے تین لگاتار ہیں ذوالقعدہ ذوالحجہ اور محرم مضر کا وہ رجب جو جمادی الثانیہ اور شعبان کے درمیان ہے۔

اس ارشاد کا مطلب اس کے سوا کچھ نہیں کہ زمانہ کا دور اپنی اس حالت پر اس دن تھا جس دن خدا نے آسمان و زمین کو پیدا کیا تھا۔ ذرا غور فرمائیے کہ یہ بات کہاں کہی جا رہی ہے اور کب کہی جا رہی ہے یہ بات حجۃ الوداع میں وفات سے تقریباً دو ماہ پہلے کہی جا رہی ہے۔ ۲۳ سال کی مدت میں ایک متحدہ امت، ایک متحدہ سلطنت، ایک متحدہ اخلاقی نظام ایک کامل قانون ایک مکمل شریعت ایک ابدی نظام حیات، خدا پرستی، تدین تقویٰ، ایمانداری پارسائی، اور پاکبازی کا ایک مجسم دور یعنی ایک نئی زمین نیا آسمان پیدا ہو گیا۔ یہی حقیقت تھی جس کو علی طرح آپ نے اپنی امت کے سب سے بڑے مجمع میں ظاہر کیا گویا سارے عرب کے اسلام کے سائے میں آنے اور اسلام کا نظام حکومت سارے عرب میں چھا جانے پر جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی کا آخری فرض اللہ سبحانہ کی شہنشاہی کا اعلان پایۂ تکمیل کو پہنچ گیا تو آپ نے اس کا ان بلیغ الفاظ میں اعلان فرمایا۔ الیوم استدار الزمان کھیئتہ یوم خلق اللہ السموات والارض۔ زمانہ پھر کر اس مرکز پر آ گیا جس پر وہ اس دن تھا جس دن اللہ سبحانہ نے اسے پیدا فرمایا تھا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا مَا لَكُمْ إِذَا قِيلَ لَكُمُ انْفِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اثَّاقَلْتُمْ إِلَى الْأَرْضِ ۚ أَرَضِيتُمْ بِالْحَيَاةِ الدُّنْيَا مِنَ الْآخِرَةِ ۚ فَمَا مَتَاعُ الْحَيَاةِ الدُّنْيَا فِي الْآخِرَةِ إِلَّا قَلِيلٌ ﴿٣٨﴾ إِلَّا تَنْفِرُوا يُعَذِّبْكُمْ عَذَابًا أَلِيمًا وَيَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ وَلَا تَضُرُّوهُ شَيْئًا ۗ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿٣٩﴾ إِلَّا تَنْصُرُوهُ فَقَدْ نَصَرَهُ اللَّهُ إِذْ أَخْرَجَهُ الَّذِينَ كَفَرُوا ثَانِيَ اثْنَيْنِ إِذْ هُمَا فِي الْغَارِ إِذْ يَقُولُ لِصَاحِبِهِ لَا تَحْزَنْ إِنَّ اللَّهَ مَعَنَا ۖ فَأَنْزَلَ اللَّهُ سَكِينَتَهُ عَلَيْهِ وَأَيَّدَهُ بِجُنُودٍ لَمْ تَرَوْهَا وَجَعَلَ كَلِمَةَ الَّذِينَ كَفَرُوا السُّفْلَىٰ ۗ وَكَلِمَةُ اللَّهِ هِيَ الْعُلْيَا ۗ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿٤٠﴾

اے اہل ایمان تمہیں کیا ہو گیا ہے جب تم سے راہِ خدا میں قدم اٹھانے کو کہا جاتا ہے تو تم زمین میں ڈھے جاتے ہو کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی میں مگن ہو گئے ہو یاد رکھو آخرت کے مقابلے میں سامان دنیا کی حیثیت بالکل تھوڑی ہے یعنی کچھ بھی نہیں ۳۸ اگر تم راہِ خدا میں قدم نہ اٹھاؤ گے تو اللہ تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہارے بدلے میں اور لوگ لے آئے

گا اور تم اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ و گے اور اللہ سب کچھ کر سکتا ہے[۳۹]۔ اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہ کرو گے (تو کوئی پروا نہیں) اللہ نے تو اپنے رسول کی اس وقت بھی مدد کی ہے جب کافروں نے اس حال میں اس کو گھر سے بے گھر کیا کہ اللہ کا رسول دو میں سے دوسرا تھا، جبکہ وہ دونوں غار میں تھے۔ جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا غمگین نہ ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے۔ پھر اللہ نے اپنا سکون و قرار اس پر نازل کیا اور اس کی امداد کے لیے ایسی فوجیں روانہ کیں جو تمہیں نظر نہیں آ رہی تھیں۔ اور بالآخر اللہ نے اہل کفر کی بات کو پست کر دیا۔ اور اللہ کی بات تو ہمیشہ اونچی ہوتی ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے[۴۰]۔

معانی مفردات

انفروا امر کا جمع مذکر حاضر ہے نفیر اور نفور کے معنے نکلنے۔ کوچ کرنے اور بھاگنے کے ہیں باب ضرب سے آتا ہے۔ اصل میں نفر کے معنے کسی چیز کے لیے بیتاب ہونے یا اس سے بیزار ہونے کے ہیں۔

اثاقلتم تم بوجھ سے جھکے تثاقل سے ہے۔ باب تفاعل اور تفعل کی بگڑی ہوئی صورت افاعل اور افعّل بھی آتا ہے اس کے معنے گراں بار اور بوجھل ہونے کے ہیں۔ اشیا کو کبھی تو بھاری اور بوجھل ہونے کی وجہ سے ثقیل کہا جاتا ہے اور کبھی جن اجسام کا رُخ اوپر کی طرف ہوتا ہے ان کو خفیف (ہلکا) کہتے ہیں جیسے دھواں اور جن کا رُخ نیچے کی طرف ہو ان کو ثقیل کہتے ہیں جیسے پانی اور پتھر۔ یہاں دوسرے معنے ہی کے اعتبار سے بوجھ سے جھکے جانے کے معنے مراد ہیں اسی کو شاہ عبدالقادر نے ڈھے جانا کہا ہے۔

الغار پہاڑ میں تھوڑے سے خلا کو کہتے ہیں۔ یہ جبلِ ثور میں غار کا ذکر ہے غار کی جمع غیران آتی ہے جیسے نار کی جمع نیران۔ پہاڑوں میں چھوٹا خلا غار کہلاتا ہے لیکن اگر بڑا ہو تو اسے کہف کہتے ہیں۔ کہف کی کبھی وسعت میلوں ہوتی ہے غار ہو یا کہف دونوں پہاڑی تہ خانے ہوتے ہیں غار چھوٹا ہوتا ہے اور کہف بڑا ہوتا ہے۔

ایمان باللہ کے لئے امتحانی کسوٹی جہاد ہے

ایمان باللہ کا حقیقی امتحان صرف جہاد میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس پر کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے۔ یہاں اہلِ ایمان کو تنبیہ کیا جا رہا ہے کہ اپنی نیکیوں پر قانع ہو کر نہ بیٹھو کیونکہ ممکن ہے کہ یہ نیکیاں خالص اور بے آمیز ہوں بلکہ ان میں ذاتی یا قومی مفاد کی آمیزش ہو۔ اپنے ایمان کا امتحان کرنا چاہتے ہو تو دیکھو کہ اللہ سبحانہ کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی تم میں کتنی خواہش ہے کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ شیخ الاسلام حضرت مولانا عثمانی نے یہاں ایک بہترا تشریحی نوٹ لکھا ہے پہلے اسے پڑھ لیجئے۔

یہاں سے غزوہ تبوک کے لیے اہلِ ایمان کو ابھارا گیا ہے۔ گذشتہ رکوع سے پہلے رکوع میں قاتلوا الذین لا یومنون باللہ ولا بالیوم الاخر۔ اہلِ کتاب کے مقابلے میں جہاد کرنے کی ترغیب دی گئی تھی۔ درمیان میں جو ذیلی مضامین آئے۔ ان کا ربط موقع بموقعہ ظاہر ہوتا رہا ہے۔ گویا وہ سب رکوع حاضر کی تمہید تھی۔ اور رکوع حاضر غزوہ تبوک کی تمہید ہے۔ فتح مکہ و غزوہ حنین کے بعد سنہ ۹ ہجری میں تو نبی کریم ﷺ کو معلوم ہوا کہ شام کا نصرانی بادشاہ ملک غسان قیصر روم کی مدد سے مدینہ پر چڑھائی کرنے والا ہے۔ حضور اقدس نے مناسب سمجھا کہ ہم خود حدود شام پر اقدام کر کے اس کا جواب دیں۔ اس کے لیے آپ نے عام طور پر مسلمانوں کو حکم دیا کہ جہاد کے لیے تیار ہو جائیں۔ گرمی سخت تھی۔ قحط سالی کا زمانہ کھجور کی فصل پک رہی تھی۔ سایہ خوشگوار تھا۔ پھر اس قدر بعید مسافت طے کر کے جانا اور نہ صرف ملک غسان بلکہ قیصر روم کی باقاعدہ اور سر و سامان سے آراستہ افواج سے نبرد آزما ہونا کوئی کھیل تماشا نہ تھا۔ ایسی مہم میں مومنین مخلصین کے سوا کس کا حوصلہ تھا کہ جانبازانہ قدم اٹھا سکتا۔ چنانچہ منافقین جھوٹے حیلے بہانے تراش کر کھسکنے لگے۔ بعض مسلمان بھی ایسے سخت وقت میں اس طویل و صعب سفر سے کترا رہے تھے جن میں بہت سے تو آخر ساتھ ہو لیے اور گنے چنے آدمی رہ گئے جن کے کسل و تقاعد نے اس شرفِ عظیم کی شرکت سے ان کو محروم کر رکھا۔ حضور اقدس ﷺ تقریباً تیس ہزار مجاہدین کا لشکرِ جرار لے کر حدود شام کی طرف روانہ ہو گئے۔ اور مقامِ تبوک میں ڈیرے ڈال دیئے اور قیصر روم کے نام نامہ مبارک لکھا جس میں اسلام کی دعوت دی گئی حضور کی صداقت اس کے دل میں گھر کر گئی مگر قوم نے موافقت نہ کی اس لیے قبولِ اسلام سے محروم رہا۔ شام والوں کو جب حضور کے ارادے کی خبر ہوئی۔ قیصر روم کو بتایا۔ اس نے مدد نہ کی۔ ان لوگوں نے اطاعت کی مگر اسلام قبول نہ کیا۔ تھوڑی مدت کے بعد حضور کا وصال ہوا اور فاروق اعظم کے عہدِ خلافت میں تمام ملکِ شام فتح ہوا جب حضور ﷺ تبوک سے غالب و منصور واپس تشریف لائے اور اللہ سبحانہ نے بڑی بڑی سلطنتوں پر اسلام کی دھاک بٹھا دی تو منافقین مدینہ بہت فضیحت ہوئے۔ نیز چند سچے مسلمان جو محض سستی اور کسل کی بنا پر

گئے تھے بیحد نادم اور متحسر ہوئے۔ اس رکوع کے شروع سے بہت دور تک ان ہی واقعات کا ذکر ہے۔ مگر زیادہ منافقین کی حرکات بیان ہوئی ہیں۔ کہیں کہیں مسلمانوں کو خطاب اور ان کے احوال سے تعرض کیا گیا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کو بڑی شدت سے جہاد کی طرف ابھارا اور بتلایا ہے کہ تھوڑے سے عیش و آرام میں پھنس کر جہاد کو چھوڑنا گویا بلندی سے پستی کی طرف گر جانے کے مترادف ہے۔ مومن صادق کی نظر میں دنیا کے عیش و آرام کی آخرت کے مقابلے میں کوئی وقعت نہ ہونی چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ اگر خدا کے نزدیک دنیا کی وقعت پر پشہ کے برابر ہوتی تو کسی کافر کو ایک گھونٹ پانی کا نہ دیتا[1] اگرچہ شیخ الاسلام نے ان آیات کا ربط بیان کر دیا ہے لیکن یہاں سے چونکہ غزوہ تبوک کے ذکر کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس لیے کچھ غزوہ تبوک کے بارے میں قرآن کی آیات کی تشریحات کے لیے معلومات ضروری ہیں۔ تاکہ بات پوری بصیرت کے ساتھ علم میں آئے۔

غزوہ تبوک کی اہمیّت

غزوہ تبوک حضور اقدس ﷺ کا آخری غزوہ تھا۔ مختلف وجوہ سے اسے خاص اہمیت حاصل ہے۔

اولاً۔ وقت کی دو بڑی شاہنشاہیاں تھیں یعنی رومی اور ایرانی۔ انہیں زمانہ رسالت میں وہ اہمیت حاصل تھی جو آج کل امریکہ اور روس کو حاصل ہے۔ ان میں سے ایک طاقت کے ساتھ براہ راست ٹکر کا یہ پہلا موقعہ ہے۔

ثانیاً: اس کے لیے تیس ہزار مجاہدین تیار ہوئے۔ ان کے ساتھ اونٹوں کے علاوہ حسب روایت طبقات ابن سعد دس ہزار گھوڑے تھے۔ سرزمین عرب سے اتنی بڑی تعداد اس سامان کے ساتھ پہلے کبھی فراہم نہیں ہوئی تھی۔

ثالثاً: تمام مجاہدین رضا کار تھے۔ ان میں سے تنخواہ دار ایک بھی نہ تھا ضروری سامان اور زاد و توشہ کے علاوہ سواریاں بھی رضا کارانہ تھیں۔

رابعاً: ان رضا کاروں کے درجات عالیہ بھی پیش نظر رہنے چاہئیں اللہ تعالیٰ کے ان سعادت شعار بندوں نے جان و مال اور دنیا کی ہر چیز اللہ کی راہ میں بے دریغ قربان کرنے کی توفیق پائی۔

خامساً: منزل مقصود بہت دور تھی۔ راستہ سخت دشوار گذار اور موسم بے حد ناخوشگوار تھا۔ لیکن اہل حق کو رسول اللہ ﷺ کی دعوت پر لبیک کہنے میں ایک لمحہ کے لیے تامل نہ ہوا۔

سادساً: اسلامی نظام کے برکات و حسنات کا یہ کتنا ایمان افروز اور حیرت انگیز کرشمہ تھا کہ اللہ تعالیٰ کا پاک رسول ﷺ صرف آٹھ سال بیشتر بحالت بیچارگی مکہ مکرمہ سے نکل کر مدینہ منورہ پہنچے تھے۔ اس مختصر سی مدت میں غازیانِ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

صداقت کیش کی اتنی بڑی قوت پیدا ہوگئی جو سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے سرحد پر اس قیصر سے ٹکرانے کے لیے تیار تھی جو تھوڑا عرصہ پہلے ساسانی شاہنشاہی پر کاری ضرب لگا چکا تھا۔

کیا معنوی تربیت کے ذریعے مردم گری کے اس محیر العقول معجزے سے کسی کو بھی یارائے انکار ہو سکتا ہے یا اختلاف کی گنجائش ہو سکتی ہے۔

تبوک کا محلِ وقوع

تبوک حجاز کے منتہائے شمال میں اس شاہراہ پر واقع ہے جو شام کی طرف سے مدینہ منورہ یا مکہ مکرمہ آنے والے تجارتی قافلوں کا عام راستہ تھی اور ظہورِ اسلام کے بعد حج و زیارت کی غرض سے جو قافلے آتے جاتے رہے ان کا عام راستہ بھی یہی تھا۔ بیسویں صدی کے اوائل میں سلطان عبدالحمید خاں مرحوم نے حجاز ریلوے تعمیر کرائی تھی تو اس کا اہم اسٹیشن تبوک تھا۔

مولانا آزاد مرحوم نے مدینہ منورہ سے تبوک کا فاصلہ ۱۹۰ کلو میٹر بتایا ہے۔ یہ فاصلہ سرسری حساب کے مطابق کم و بیش ۱۲۸ میل بنتا ہے سفرنامہ ارض القرآن میں مدینہ منورہ سے العلا تک فاصلہ ۵۰۰ میل اور العلا سے الحجر یا مدائن صالح کا فاصلہ تیس میل درج ہے۔ اگر ۵۲۰ میل کے اس فاصلے میں مدائن صالح سے تبوک کا فاصلہ بھی شامل کر لیا جائے تو پوری مسافت ۶۵۰ میل بنتی ہے۔

پرانے اندازِ بیان کے مطابق مدینہ منورہ اور تبوک کی درمیانی مسافت چودہ مرحلوں کی بتائی گئی ہے لیکن ۶۵۰ میل کے چودہ مرحلے فرض کرنا بہت مشکل ہے۔ ممکن ہے سفرنامہ ارض القرآن کا حساب صحیح نہ ہو یا ممکن ہے کہ کار کے میٹر کا حساب ملحوظ رکھا گیا ہو جسے خدا جانے کہاں کہاں چکر لگانا پڑا اسے آخر میں ممکن ہے کہ کیلو میٹروں کو سہواً میل سمجھ لیا ہو۔

عزمِ تبوک کا سبب

عزمِ تبوک کا اصل سبب یہ تھا کہ شمالی جانب سے مختلف خبریں آ رہی تھیں۔ قیصرِ روم حملہ کی تیاریاں خوب سرگرمی سے کر رہا ہے کیونکہ وہ جنگ موتہ کا بدلہ لینا چاہتا ہے جس میں صرف تین ہزار مجاہدین نے قیصر اور قبائلیوں کے کئی گنا زیادہ لشکر کو میدان سے ہٹ جانے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس وقت سے قیصر اور اس کے ماتحت سرحدی ریاستوں نے جن میں غسانی پیش پیش تھے عزم کر رکھا تھا کہ اسلامی قوت کو اوائل بلوغ ہی میں کچل ڈالیں مولانا شبلی فرماتے ہیں۔

شام کے نبطی سوداگر مدینہ میں روغن زیتون بیچنے آیا کرتے تھے انھوں نے خبر دی کہ رومیوں نے شام میں لشکر گراں جمع کیا ہے اور فوج کو سال بھر کی تنخواہ تقسیم کر دی ہے اس فوج میں لخم و غسان کے تمام عرب شامل ہیں اور

مقدمۃ الجیش تک آگیا ہے۔ مواہب لدنیہ میں طبرانی سے روایت نقل کی ہے کہ عرب کے عیسائیوں نے ہرقل کو لکھ بھیجا تھا کہ محمد ﷺ اور عرب سخت قحط کی وجہ سے بھوکوں مر رہے ہیں اسی بنا پر ہرقل نے چالیس ہزار فوج روانہ کی۔

عیسائیوں کو اسلامی قوت اور اسلامی برکات کی صلاحیت توسیع و نفوذ کا بہتر اندازہ ہوگا کیونکہ وہ سرحد پر رہتے تھے۔ یہ نزدہ عربوں کے امیال و عواطف سے پوری طرح آگاہ ہوں گے۔ اگر انہوں نے قیصر کو برانگیختہ کرنے کے لیے جھوٹی خبریں بھی بنالیں تو اس پر حیرت کیا ہے۔

کاشانۂ نبوت سے تیاری کا حکم

جب مختلف ذرائع سے قیصر کے عزم یورش کی تصدیق ہوگئی اور بظاہر شک و شبہ کا کوئی امکان باقی نہ رہا تو رسول اقدس ﷺ نے فیصلہ فرمالیا کہ جنگ ناگزیر ہے تو یہ حجاز کی شمالی سرحد پر ہونی چاہیے۔ اس میں کئی مصلحتیں تھیں۔

۱۔ ابتدائی مراحل ہی میں جنگ کو حملہ آور کے گھر میں پہنچایا جا سکتا ہے اور اپنے ملک کو تختۂ مشق بننے سے محفوظ رکھا جا سکتا ہے۔

۲۔ سینکڑوں میل کا فاصلہ طے کر کے دفاع کے لیے مستعدی کے ساتھ سرحد پر جانا بجائے خود دشمن کے جوشِ اقدام کو سرد کر سکتا تھا۔

۳۔ دشمن کسی ملک میں آتا ہے تو آبادی کے مختلف عناصر کو گوناں گوں ترغیبات سے ساتھ ملانے کی کوشش کرتا ہے۔ حجاز کے شمالی حصوں کے قبائلی عناصر یا تو نئے نئے حلقہ بگوشِ اسلام ہوئے تھے اور ابھی دینِ حق ان کے دلوں میں راسخ نہیں ہوا تھا یا دہ اسلام کی طرف مائل ہو رہے تھے لیکن دشمن کا اقدام ان مسلمانوں کو آزمائش میں ڈال سکتا تھا جنہیں اسلام قبول کیے زیادہ وقت نہیں گذرا تھا۔ اور ان کے لیے رکاوٹ کا باعث بن سکتا تھا۔

۴۔ دشمن کسی ملک میں آجاتا ہے تو آبادیوں کے امن و امان اور جان و مال کے لیے خطرہ پیدا ہو جاتا ہے اور بہرحال بہت یا تھوڑے نقصان کا ضرور نشانہ بنتا ہے۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے تبوک کے لیے تیاری کا حکم دے دیا اور تمام طبقوں خصوصاً اغنیاء کو فوج کے لیے سواریاں اور دوسرے مصارف کے انتظام کی طرف توجہ دلائی گئی۔

احوال و ظروف کی ناسازگاری

سوء اتفاق سے اس وقت گرد و پیش کے حالات خاصے ناخوشگوار تھے موسم شدید گرم تھا۔ سفر بہت طویل راستہ دشوار گذار تھا

خشک سالی کے باعث قحط کی سی حالت تھی۔ پھل پکنے والے تھے لیکن معاملہ اسلام کی حفاظت کا تھا جس پر تمام مسلمانوں کے ایمان جان ومال کی حفاظت کا انحصار تھا مختلف اصحاب نے انفاق میں بڑی فراخ حوصلگی سے حصہ لیا مثلاً۔

۱۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پورا مال خدمتِ رسالت میں پیش کر دیا۔ یہاں تک کہ کُرتے کے بٹن بھی توڑ کر دے دیئے

۲۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے پورے مال کے دو حصے کیے۔ ایک حصہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر دیا۔

۳۔ حضرت عثمان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے تین سو اونٹ ساز وسامان کے ساتھ حاضر کیے اور ایک ہزار دینار قاضی سلمان منصور پوری لکھتے ہیں کہ حضرت عثمان نے نو سو اونٹ ایک سو گھوڑے اور ایک ہزار دینار پیش کیے۔ اور بعض جیش العسرہ کے لقب سے نوازے گئے۔

۴۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چالیس ہزار درہم پیش کیے۔

۵۔ خواتین نے زیورات پیش کیے۔

۶۔ حضرت ابوعقیل انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رات بھر کنوئیں کا پانی نکال کر ایک کھیت سیراب کیا۔ اور مزدوری میں چار سیر کھجوریں ملیں اس میں سے دو سیر بارگاہ نبوت میں پیش کر دیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم دیا کہ یہ کھجوریں پورے مال پر بکھیر دیں۔

غزوہ تبوک میں پیچھے رہ جانے والے

جو لوگ غزوہ تبوک میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ گئے اور پیچھے رہ جانے کی وجہ سے مخلفین کہلائے ان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ منافقین جو بے بنیاد عذر پیش کر کے گھروں میں بیٹھے رہے۔

۲۔ وہ مخلص اور جان نثار مساکین جن کے پاس نہ سواری کا انتظام تھا اور نہ وہ توشہ وزاد راہ کی استطاعت رکھتے تھے وہ اپنی بیچارگی پر بے اختیار روتے تھے اس لیے البکائین کہلائے۔

۳۔ بعض مخلصین سے بھی سہل انگاری ہوئی۔ سوچتے اور پروگرام بناتے وقت نکل گیا۔ ان کا ذکر آگے آئے گا۔

آدمیوں کی کثرت، سواریوں کی قلت اور ضروری ساز وسامان کی کمی کے باعث تبوک جانے والے لشکر کو جیش العسرۃ کہا گیا ہے۔ چونکہ اس غزوہ کی وجہ سے منافقین کا پردہ بالکل تار تار ہو گیا تھا اور ان کی بہت رسوائی ہوئی تھی اس لیے اس غزوہ کا نام غزوہ فاضحہ بھی ہے اور اسی وجہ سے سورہ توبہ کا ایک نام سورہ فاضحہ بھی ہے۔

اخلاص کے ایمان افروز نمونے

سفر بہت طویل تھا راستہ میں کوئی پیچھے رہ جاتا اور حضور اقدس ﷺ یہ سنتے فرماتے کہ اسے چھوڑ دو۔ اگر اس میں کوئی بھلائی ہے تو وہ ضرور تم سے آملے گا۔ اور اگر اس کی حالت کچھ اور ہے تو سمجھو کہ خدا نے تمہیں بچا لیا۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا اونٹ راستہ میں سست ہو گیا اور وہ پیچھے رہ گئے اونٹ بیٹھ گیا اور وہ رک گئے اونٹ کی قوت رفتار سے مایوس ہو گئے۔ تو سامان خود اٹھا کر لشکر کے نقش ہائے قدم پر پیدل چلنے لگے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ایک منزل پر قیام فرما تھے تو کسی نے دیکھا کہ کوئی شخص پیدل آرہا ہے حضور ﷺ سے عرض کیا گیا تو فرمایا ابوذر ہوں گے۔ چنانچہ وہی نکلے۔

حضرت ابوخیثمہ کا واقعہ اس سے بھی زیادہ عجیب ہے۔ رسول اللہ ﷺ روانہ ہو چکے تھے۔ دوپہر کا وقت تھا۔ دھوپ میں تیزی اور گرمی تھی۔ حضرت ابوخیثمہ کی دونوں بیویوں نے پانی چھڑک چھڑک کر اپنے مکان ٹھنڈے کیے۔ کھانا تیار کر لیا پینے کے لیے ٹھنڈا پانی لا رکھا۔ ابوخیثمہ آئے تو دروازے پر کھڑے ہو گئے۔ بیویوں کے اہتمام پر نظر ڈالی۔ پھر بولے حضور اقدس ﷺ تیز دھوپ اور گرم ہوا میں ہوں اور ابوخیثمہ بیویوں کے پاس بیٹھ کر کھانا کھائے۔ یہ انصاف نہیں۔ خدا کی قسم میں کسی بھی مکان میں ہرگز داخل نہ ہوں گا۔ جب تک رسول اللہ ﷺ سے نہ مل جاؤں چنانچہ سواری کے لیے اونٹ منگایا اور اسی وقت روانہ ہو گئے۔ حضور اقدس ﷺ تبوک پہنچ چکے تھے۔ کسی نے اطلاع دی دور کوئی آرہا ہے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ ابوخیثمہ ہوں گے پاس آئے تو ابوخیثمہ تھے۔ گویا پیچھے رہ جانے کے نتیجے میں تنہا سینکڑوں میل کی مسافت طے کر کے لشکر سے جا ملے۔

حضرت علی رضی اللہ عنہ کا واقعہ

حضور اقدس ﷺ نے مدینے سے روانگی کے وقت محمد بن مسلمہ انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو عامل مدینہ مقرر کیا۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اہل بیت کی نگرانی کے لیے چھوڑ دیا۔ حضور اقدس ﷺ جرف میں تھے اسی اثناء میں منافقین نے یہ بات بنائی کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو حضور ﷺ اس لیے چھوڑ گئے کہ ان سے حضورؐ کو کچھ سرگرانی تھی۔ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ بات سنی تو فوراً تبوک کے لیے روانہ ہو گئے اور جرف میں حضورؐ سے جا ملے۔ عرض کیا کہ آپؐ مجھے بچوں اور عورتوں میں چھوڑ کر جا رہے ہیں فرمایا کیا تم اس پر راضی ہو کہ تمہیں میرے سے وہ ہی نسبت ہو جو ہارونؑ کو موسیٰؑ سے تھی۔

واقعہ یہی ہے کہ سفر طویل تھا اور انجام کا علم نہ تھا کہ کیا صورت پیش آئے گی اس لیے اہل بیت کے لیے کسی قریبی رشتہ دار

کو مقرر کرنا مدینہ میں مصلحت تھا چنانچہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ مدینہ واپس تشریف لے آئے۔

سفر میں دیارِ ثمود سے گذر

تبوک جاتے ہوئے راستہ میں صرف ایک واقعہ قابلِ ذکر ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے الحجر (مدائن صالح یعنی دیارِ ثمود) پہنچتے ہی حکم دے دیا کہ یہاں کا نہ پانی پیا جائے نہ اس پانی سے وضو کیا جاتے نہ اس سے آٹا گوندھا جائے۔ اگر کسی گوندھ لیا ہو تو وہ اونٹ کو کھلا دے صرف ایک کنواں مستثنیٰ رکھا گیا جو حضرت صالح رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے زمانہ کا تھا جس سے آپ کی اونٹنی پانی پیتی تھی اسی لیے اسے بیر ناقہ کہتے تھے۔ خود حضور اقدس ﷺ اس مقام سے گذرے تو چہرۂ اقدس پر پردہ ڈال لیا اور سواری کر تیز چلایا تاکہ جلدی گذر جائیں۔

حضور اقدس ﷺ کا طریقہ یہی تھا کہ جن مقامات میں مجرم قومیں غضب ایزدی کا نشانہ بن چکی تھیں وہاں سے جلد از جلد گذر جاتے عرفات کے راستہ میں وادی محسر آتی ہے یہاں اصحابِ فیل پر عذاب آیا تھا۔ اس وادی سے عرفات آتے جاتے جلد گذر جانے کا دستور تھا۔

تبوک میں مقام

تبوک پہنچ کر رسول اللہ ﷺ کم و بیش بیس روز قیام فرما رہے اس عرصہ میں نہ قیصر اور غسانیوں کی کسی فوج کا نہ حملہ کی تیاری کے متعلق کچھ معلوم ہو سکا۔ ان حالات میں جنگ کا کونسا امکان تھا ممکن ہے کہ غلط افواہوں کا فتنہ سرحد کے نصرانی قبیلوں اور غسانیوں نے برپا کیا ہو۔ یہ بھی ممکن ہے کہ جہاد کے لیے مسلمانوں کی بے مثال مستعدی دیکھ کر دشمنوں کا عزم یورش مضمحل ہو گیا ہو۔ موتہ کا تجربہ ان کے سامنے تھا جس میں تین ہزار نے کم از کم تینتیس گنا لشکر کو ہراساں کر دیا تھا۔ تبوک میں تو تیس ہزار جانباز آمادہ پیکار تھے اور ان کی قیادت خود حضور اقدس ﷺ بنفس نفیس فرما رہے تھے۔

اہلِ ایلہ کے لیے امان نامہ

ایلہ جسے آج ایلات کہتے ہیں اور وہاں اسرائیل نے بندرگاہ بنالی ہے۔ عقبہ کے پاس ہے۔ اس کا مسیحی حاکم یحنہ بن روبہ خدمتِ اقدس میں حاضر ہوا اور جزیہ دینے کا اقرار کر کے اس نے امان نامہ حاصل کیا جس کا مضمون یہ ہے۔
یہ اللہ کی طرف سے اور محمد النبی کی طرف جو اللہ کے رسول ہیں یحنہ بن روبہ اور اہلِ ایلہ کے لیے امان نامہ ہے۔ سمندر میں ان کی کشتیوں اور جہازوں، نیز خشکی کے راستوں میں ان کے قافلوں اور مسافروں کے لیے اللہ اور اللہ کے

رسول کا ذمہ ہے اس ذمہ داری میں اہل شام اہل یمن یا سمندر میں کشتی بازی کرنے والے وہ لوگ بھی شامل ہیں جو ان کے پاس رہتے ہیں اگر ان میں سے کوئی شخص معاہدے کی خلاف ورزی کرے گا تو اس کا مال اس کی جان بچانے میں حائل نہ ہوگا وہ اس کے لیے حلال ہوگا جو اسے لے لے۔ یہ جائز نہ ہوگا کہ جو پانی ان کے ہاں جاتا ہے اسے بند کیا جائے یا خشکی یا تری میں جس راستے وہ جانا چاہیں انہیں روکا جائے لہ

اہل جربا اور اہل اذرح

جربا اور اذرح دونوں قریب قریب ہیں اور دونوں معان کے نزدیک ہیں ان دونوں جگہوں کے باشندے بھی تبوک کے نام کے زمانے میں امان نامہ حاصل کرنے آئے۔ ان کے لیے شرطیں یہ تھیں۔

۱۔ ماہ رجب میں ایک سو دینار ادا کرتے رہیں۔

۲۔ اگر مسلمانوں سے کوئی شخص کسی جرم پر تعزیر کے اندیشہ سے ان کے ہاں پہنچ جائے تو مسلمانوں کے حوالے کر دیں۔

دومۃ الجندل

یہ وادی سرحان کے جنوبی سرے پر واقع ہے آج کل اس کو جوف کہتے ہیں جو شمالی نجد کا مشہور مقام ہے دومہ یا دوما دراصل حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بیٹے کا نام ہے اس کی اولاد جہاں آباد ہوئی وہ جگہ آغاز میں دومہ کہلائی۔ اس کا ذکر بائبل میں بھی مختلف جگہ آتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ علیہ نے ارض القرآن میں اس کی توضیح کی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت خالد بن الولید کو چار سو بیس سواروں کے ساتھ دومۃ الجندل بھیجا جو کم و بیش پانچ مرحلوں پر تھا۔ مورخین نے اس کی مسافت پندرہ رات بتائی گئی ہے۔ اکیدر بن الملک وہاں کا حاکم تھا جو بنی کندہ میں سے تھا وہ مذہباً نصرانی تھا۔ بتلاتے ہیں کہ حضرت خالد رضی اللہ عنہ دومۃ الجندل پہنچے تو چاندنی رات تھی اور اکیدر شکار کھیل رہا تھا۔ حضرت خالد رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حملہ کر دیا اکیدر قید ہو گیا اس کے بھائی نے جنگ کی اور مارا گیا۔ آخر اکیدر سے معاملہ طے کر لیا گیا۔ اس نے دو ہزار اونٹ آٹھ سو گھوڑے، چار سو زرہیں اور چار سو نیزے دینے منظور کیے۔ پھر حضرت خالد اکیدر اور اس کے بھائی کو ساتھ لے کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ پہنچے۔ جزیہ ادا کرنے کی شرط پر نہ صرف اکیدر کو رہا کیا گیا بلکہ دومۃ الجندل کے علاوہ تیما کی حکومت بھی اسی کے سپرد کر دی گئی۔ اسی طرح ایلہ کے علاوہ تبوک کا انتظام بھی یحنہ بن رؤبہ کے سپرد کر دیا گیا۔ یاد رہے کہ تیما بھی حضرت اسماعیل علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں تیما ان کے ہی نام سے آبادی کا نام ہے تیما تبوک سے ایک سو ستر میل جنوب میں واقع ہے

روانگی اور واپسی کی تاریخ

تمام روایتوں میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ رجب ۹ھ میں تبوک گئے تھے تاریخ کسی نے نہیں لکھی ہے ان مہمات کا بتایا گیا ہے۔ مدینہ منورہ رمضان ۹ھ مطابق دسمبر ۶۳۰ء واپس تشریف لائے۔ واپسی کی تاریخ بھی کہیں نظر سے نہیں گزری ۲۰ روز یا ایک دو دن کم یا زیادہ آپ تبوک میں قیام پذیر رہے۔

جہاد کی ترغیب

(۴۱) اے ایمان والو تمہیں کیا ہو گیا جب تم سے راہ خدا میں قدم اٹھانے کو کہا جاتا ہے تو تم زمین میں ڈھے جاتے ہو کیا تم آخرت کے مقابلے میں دنیا کی زندگی میں مگن ہو گئے ہو۔ یاد رکھو آخرت کے مقابلے میں سامانِ دنیا کی حیثیت بالکل تھوڑی ہے یعنی کچھ بھی نہیں ہے۔ آیت میں خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن ان منافقین کی طرف ہے جو اپنی تن آسانیوں اور مفاد پرستیوں کی وجہ سے جہاد کی حضور اقدس ﷺ کی جانب سے منادی ہونے کے باوجود اس سے جی چرا رہے تھے۔ فرمایا کہ یہ تمہیں کیا ہو گیا ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہو اور ایمان کے تقاضے پورے نہیں کرتے ہو۔ ایمان کے تقاضے پورا کرنے کا وقت آتا ہے تمہارا یہ حال ہو جاتا ہے کہ ایمان کے تقاضے کے بوجھ سے تمہاری گردن ٹوٹ گئی ہو اور تمہارے لیے اٹھنا دشوار ہو۔ آگے استفہامیہ فقرے ارضیتم بالحیاۃ الدنیا فرما کر ان کی اصل دکھتی رگ کی نشاندہی کر دی ہے۔ بیماری یہ ہے کہ تم لوگ آخرت اور اس کی نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی زندگی اور اس کی وقتی لذتوں پر قانع ہو گئے ہو تم سمجھتے ہو کہ یہی دنیا سب کچھ ہے اور تم اس نقد لذت کو کسی ادھار لذت کی خاطر چھوڑنا نہیں چاہتے ہو۔ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ آخرت کی زندگی دنیا کی زندگی کے مقابلہ میں کیا ہے۔ تم کسی حقیر زندگی کے لیے کیسی لازوال پر شوکت اور شاندار زندگی کھو رہے ہو۔ دنیا کی زندگی کو آخرت کی زندگی سے قطرہ اور سمندر کی یا ذرے اور آفتاب کی نسبت بھی زیادہ ہے فما متاع الحیاۃ الدنیا فی الآخرۃ الا قلیل اس کے دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ عالم آخرت کی بے پایاں زندگی اور وہاں کے بے حد حساب ساز و سامان کو جب تم دیکھو گے تب تمہیں معلوم ہو گا کہ دنیا کی تھوڑی سی زندگی میں لطف اندوزی کے جو بڑے بڑے امکانات تم کو حاصل تھے اور زیادہ سے زیادہ جو اسباب عیش تم کو میسر تھے وہ ان غیر محدود نعمتوں کے مقابلہ میں کچھ بھی حیثیت نہیں رکھتے۔ دنیا کی ساری نعمتیں محدود اور معدود ہیں اور آخرت کی نعمتیں لامحدود اور لامعدود ہیں اور اس وقت تم کو اپنی ناعاقبت اندیشی و کم نگاہی پر افسوس ہو گا کہ تم نے کیوں ہمارے سمجھانے کے باوجود دنیا کے عارضی اور قلیل منافع کی خاطر اپنے آپ کو ان ابدی اور کثیر منافع سے محروم کر لیا۔ دوسرے یہ کہ متاع حیاۃ دنیا آخرت میں کام آنے والی چیز نہیں ہے یہاں تم خواہ کتنا ہی سرو سامان مہیا کرو موت کی آخری ہچکی کے ساتھ ہر چیز

دست بردار ہونا پڑے گا اور سرحد موت کے دوسری طرف جو عالم ہے وہاں ان میں سے کوئی چیز تمہارے ساتھ نہ جائے گی وہاں اس کا کچھ حصہ تم پا سکتے ہو تو صرف وہی چیز جسے تم نے خدا کی رضا پر قربان کیا ہو اور جس کی محبت پر تم نے خدا اور اس کے دین کی محبت کو ترجیح دی ہو۔

قرآن میں نفاق کی رونمائی

جیسا کہ پہلے بتایا گیا ہے کہ خطاب اگرچہ عام ہے لیکن روئے سخن منافقین کی طرف ہے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

یہ ان لوگوں پر عتاب کا آغاز ہے جو غزوہ تبوک میں حضور کے ساتھ نہیں گئے تھے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

اس موضوع پر کوئی اختلاف نہیں کہ یہ آیات ان لوگوں کے عتاب میں جو غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے نازل ہوئی ہیں۔

اگر ایسا ہے اور ایسا نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب بات متفق علیہ ہے تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہے کہ دورِ نبوت میں منافقین کسی سازشی گروہ کا نام نہیں جو مسلمان نہ ہوں۔ بلکہ یہ سب مسلمان تھے اور جانے پہچانے مسلمان تھے پورے معاشرہ میں ان کے نامسلمان ہونے کا کسی کو کوئی شائبہ نہ تھا اور شائبہ کیسے ہو سکتا تھا جب کہ قرآن ان کو خود یاایھا الذین آمنوا کہہ کر مخاطب کر رہا ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ دنیا میں تین قسم کے آدمی ہوتے ہیں۔

مستعد اور صالح انسان یہ ہر اچھی بات کو پہچان لیتے ہیں اور قبول کر لیتے ہیں اور پھر سرگرم عمل ہو جاتے ہیں۔

مفسد قسم کے لوگ یہ ہر اچھی بات کا انکار کرتے ہیں کبھی سیدھی بات کو یہ قبول ہی نہیں کرتے۔ انکار ان کی طبیعت ہوتا ہے

درمیانے لوگ یہ ہر بات کو سن لینے اور مان لینے کے لیے تیار ہو جاتے ہیں لیکن ان میں فی الواقع تیاری نہیں ہوتی ہے۔ وہ قدم تو اٹھاتے ہیں مگر چلنا نہیں چاہتے۔ اور چلتے ہیں تو پہلے قدم میں لڑکھڑا جاتے ہیں نہ ان میں پہلے گروہ کی مستعدی ہوتی ہے اور نہ ان میں دوسرے گروہ کی بے باکی ہوتی ہے کہ صاف انکار کر دیں۔ اقرار کی حد تک تو پہلے گروہ کے ساتھ ہوتا ہے لیکن جہاں تک اذعان و عمل کا تعلق ہے وہ دوسرے گروہ جیسا ہوتا ہے۔ مذبذبین بین ذالك لا الی ھؤلاء ولا الی ھؤلاء جزم و یقین اور عزم و عمل پہلے گروہ کا خاصہ ہے۔ انکار و جحود دوسرے کا اور شک و تذبذب اور بے عملی و تعطل تیسرے کا۔ بعینہ یہی حال ایمان و عمل کے دائرہ کا بھی ہے یہاں بھی طبیعت انسانی کی تینوں حالتیں ظہور میں آتی ہیں مستعد طبیعتیں قبول کر لیتی ہیں اور چل پڑتی ہیں یہ مومن ہیں مفسد انکار کرتے اور مخالفت پر کمر کس لیتے ہیں یہ کافر ہیں کچھ

لوگ قبول کر لیتے ہیں لیکن فی الحقیقت قبول کی روح ان کے اندر نہیں ہوتی یہ منافق ہیں۔ قرآن نے کفر کی طرح نفاق کے اعمال و خصائص بھی پوری
تفصیل سے سلسلہ بیان کیے ہیں۔ کیونکہ کفر کی طرح نفاق بھی محض نتیجہ نزول قرآن کی پیداوار نہیں، ہمیشہ ظہور میں آنیوالی گمراہی تھی اور انسانوں کی گمراہیاں کسی
خاص زمانے، جگہ اور قوم کی نہیں بلکہ نوع انسانی کی گمراہیاں ہوتی ہیں ایسے ہی قرآن کے مخاطبوں میں بھی یہ تین قسمیں تھیں فتح مکہ کے بعد عرب کے لوگ مسلمان ہو گئے
ان میں دو طرح کے مسلمان تھے۔ مخلصین بھی تھے اور وہ بھی تھے جنھوں نے اسلام کو بطور دین و اعتقاد اسی طرح اپنایا تھا جس طرح
مسلمانوں نے وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے ان کے گھر کا ہر فرد یقین کرتا تھا کہ ہم مسلمان ہیں وہ نماز پڑھتے تھے روزہ رکھتے
تھے اسلامی طور طریقے پر اولاد کی پرورش کرتے تھے جہاں تک کسی دین کو اختیار کر لینے کا تعلق ہے کوئی بات ایسی نہ تھی جو
بظاہر ان کے مسلمان ہونے کے خلاف ہو لیکن اسلام کا گھونٹ تو انھوں نے پی لیا تھا مگر حلق کے نیچے نہیں اترا تھا کسی تعبیر کو اپنا
کر لینے کے بعد یقین و عمل کی جو روح پیدا ہونی چاہیے اس سے یک قلم محروم تھے وہ اللہ کا کلام سنتے مگر اس لیے نہیں کہ عمل کریں
بلکہ اس لیے کہ صرف سنتے رہیں۔ اخلاص اور صداقت کے لیے ان کے دلوں میں کوئی جگہ نہیں تھی۔ وہ نماز پڑھتے مگر بے دل سے، وہ
خیرات کرتے مگر مجبور ہو کر ان کے دلوں میں دین سے زیادہ دنیا کا عشق تھا۔ اسلام کے جو احکام ان کے شخصی اغراض کے خلاف نہ
ہوتے ان پر خوش خوش عمل کرتے۔ جو خلاف ہوتے ان سے نکل بھاگنا چاہتے۔ جب کبھی خوشحالیوں کا موقعہ ہوتا تو وہ سب سے پہلے
مومن ہوتے۔ جب کبھی قربانیوں کا موقع آجاتا تو سب سے آخری صفوں میں بھی دکھائی نہ دیتے۔ جہاد کے تصور سے ان کی روحیں لرز
جاتیں انفاق کا حکم ان کے لیے پیام موت ہوتا۔ اسلام کے دشمنوں سے سازگاریاں رکھنے میں انہیں کچھ تامل نہ ہوتا۔ وہ سمجھتے
کہ دونوں طرف ملتے رہنے میں ہی مصلحت ہے۔ اگر بازی الٹ پڑی اور دشمن فتحیاب ہو گئے تو ان کے پاس بھی اپنی جگہ بنی رہے
گی یہ تھے منافقین جن کو قرآن　یہاں یاایھا الذین آمنوا سے مخاطب کر رہا ہے۔ اس موضوع پر پوری تفصیل حدیث اور
قرآن کی روشنی میں انشاء اللہ گیارہویں جلد میں آرہی ہے وہاں انشاء اللہ پوری شرح و بسط سے بحث ہوگی۔

آیت قرآنی کا مطالبہ

یہ بات ذہن میں رکھنی چاہیے کہ ان آیات میں تاریخ کے خاص واقعہ کو پیش نظر رکھ کر مسلمانوں کو اللہ کی راہ میں دین کی برتری
کے لیے محنت کرنے کی ترغیب دی جارہی ہے۔ غزوۂ تبوک ہونا نہیں بلکہ ہو چکا ہے۔ اس آیت میں مسلمانوں کی ان کمزوریوں
کی نشاندہی کر کے جو غزوہ تبوک میں پیش آچکی تھیں ان کا علاج بتایا جارہا ہے۔ کیونکہ عرب میں اسلام کا مشن پایۂ تکمیل کو پہنچ
جانے کے بعد دوسرا اہم مرحلہ جو سامنے تھا وہ یہ تھا کہ عرب کے باہر دین حق کا بول بالا کیا جائے۔ اس معاملہ میں روم و ایران کی قوت
سب سے بڑی رکاوٹ تھی۔ اور ناگزیر تھا کہ عرب کے کام سے فارغ ہونے کے بعد ان سے تصادم ہو۔ حضور اقدس
ان کو دعوت اسلام کے خطوط روانہ کر چکے تھے اس لیے جن لوگوں نے تبوک کے موقعہ پر سستی و کمزوری دکھائی ان کو مخاطب کیا گیا اور

خطاب میں شدت عتاب ظاہر کی گئی آغاز ہی مالکم سے کیا ہے یہ کلمہ ملامت و توبیخ ہے یعنی تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ اور یہ تمہارے کے بعد اس بیماری کا ذکر کر دیا جس کی وجہ سے حوصلے پست ہو جاتے ہیں۔ یعنی دنیا اور اس کی چیزوں کی محبت ارضیتم بالحیاۃ الدنیا من الاخرۃ کیا تمہیں آخرت کے مقابلہ میں دنیا کی زندگی بھا گئی۔ یہ اصل بیماری ہے اور امت میں سارے فساد کی جڑ ہے۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے۔

حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا قریب ہے کہ دنیا کی قومیں باہم ایک دوسرے کو تمہیں مٹانے کی دعوت دیں گی ایسے جیسے کھانے والے ایک دوسرے کو کھانے کی دعوت دیتے ہیں۔ ایک شخص نے کہا کہ یارسول اللہ کیا ہماری تعداد کم ہو جائے گی فرمایا نہیں بلکہ تمہاری کثرت ہوگی لیکن ایسے ہوں گے جیسے سیلاب کا کوڑا کرکٹ اللہ سبحانہ تمہارے دشمنوں کے دلوں سے تمہارا دبدبہ ہٹا دیں گے اور تمہارے دل میں ڈال دیں گے کسی نے دریافت کیا کہ یارسول اللہ وہن کیا ہوتا ہے فرمایا دنیا کی محبت اور موت کی ناگواری (ابوداؤد، بیہقی۔ مشکوٰۃ)

مرض کی نشاندہی کرنے کے بعد اس کا علاج بھی تجویز فرما دیا فما متاع الحیوۃ الدنیا فی الاخرۃ الا قلیل۔ دنیا کی زندگی کا سامان آخرت کے مقابلہ میں بہت ہی تھوڑا ہے۔ دنیا میں ہر نعمت محدود اور معدود ہے اور آخرت میں ہر نعمت لامحدود اور لامعدود ہے۔ اس کا دھیان رکھو۔ اس کا یقین کرو اور اس کا مراقبہ کرو تو دنیا کی محبت کافور ہو جائے گی آخرت اور اس کی نعمتوں سے محبت ہو جائے گی۔ صحابہ کے زمانہ میں امت کے لیے اصل اور قوی ترین محرک اور داعیہ عمل یہی ہے۔ جیسا کہ قرآن عزیز کی بے شمار آیتوں سے ظاہر اور روشن ہے۔ احادیث میں اس کی بھرپور وضاحت ہے۔ حافظ ابن کثیر نے مسند امام احمد کے حوالے سے حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد نقل کیا ہے:

دنیا کی ساری نعمتیں آخرت کے مقابلے میں ایسی ہیں جیسے سمندر کے پانی کے مقابلہ میں انگلی پر لگا ہوا پانی جو حیثیت سمندر کے پانی کے مقابلے میں انگلی پر لگے ہوئے پانی کی ہے وہی حیثیت آخرت کے مقابلے میں دنیا کی ہے

بڑے دکھ اور افسوس کی بات ہے کہ روشن خیالی، تہذیب، تمدن کی ترقیوں نے مادیت کے اس دور میں اسی قوی ترین محرک اور موثر ترین داعیہ کو سب سے زیادہ کمزور کر دیا ہے اب مسلمانوں کو آخرت سے اس قدر بیگانہ کر دیا گیا کہ انکو روٹی کپڑے مکان کا لالچ دیا جاتا ہے۔ کہاں جنت اور اس کی نعمتوں کا لالچ اور کہاں روٹی کپڑے مکان کا لالچ این الثریا واین الثری فانا للہ وانا الی اللہ المشتکیٰ۔ یاد رکھو یہ بیماری ہے اور اس بیماری کا علاج صرف اور صرف فکر آخرت ہے۔ صحابہ کی ساری کامیابیوں کا راز ذکر اللہ اور فکر آخرت میں چھپا ہوا ہے۔ جس قدر اللہ کا ذکر ہوگا اور فکر آخرت ہوگا۔ اسی قدر اہل ایمان کی کامیابی ہوگی۔ مسلمان کی زندگی ذکر اللہ سے خالی اور فکر آخرت سے بیگانہ نہیں ہوتی ہے۔

قوموں میں قانونِ استبدال

(۴۲) اگر تم راہ خدا میں قدم نہ اٹھاؤ گے تو اللہ تمہیں دردناک سزا دے گا اور تمہارے بدلے میں اور لوگ لے آئے گا اور تم اس کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکو گے اور اللہ سب کچھ کر سکتا ہے۔ یعنی اللہ سبحانہ کا کام تم پر موقوف نہیں ہے۔ تم اگر سستی کرو گے تو وہ اپنی قدرت کاملہ سے کسی دوسری قوم کو دینِ حق کی خدمت کے لیے کھڑا کر دے گا تم اس سعادت سے محروم رہو گے جو تمہارے ہی نقصان کا موجب ہے ؎

منت منہ کہ خدمت سلطان ہمیکنی   منت شناس ازو کہ بخدمت بداشتت [1]

یہ بھی تنبیہ ہے کہ اگر تم خدا کی راہ میں جہاد کے لیے نہ اُٹھے تو خدا کے دردناک عذاب کی پکڑ میں آجاؤ گے اور یہ خیال نہ کرو کہ تمہارے نہ اٹھنے سے اللہ سبحانہ کا کچھ بگڑ جائے گا۔ تمہارا جہاد کرنا خود تمہارے لیے موجب سعادت ہے ورنہ اللہ سبحانہ کا کوئی کام تم پر منحصر نہیں ہے وہ اپنے دین کی حمایت و نصرت کے لیے اور دل سے کام لے لے گا اور اللہ سب کچھ کر سکتا ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کا کام کچھ تم پر منحصر نہیں ہے کہ تم کرو گے تو ہو گا ورنہ نہ ہو گا۔ فی الواقع یہ تو اللہ کا فضل و احسان ہے کہ اس نے دین کی خدمت کے لیے تمہیں موقع دے دیا ہے اگر تم یہ کام نہ کرو گے تو اللہ سبحانہ تمہیں اس مقام سے ہٹا کر کسی دوسری قوم کو اس کی توفیق بخش دے گا۔

دراصل اس آیت میں قانونِ استبدال بتایا جا رہا ہے یعنی کہا جا رہا ہے کہ یاد رکھو کہ اگر تم نے ادائے فرض میں کوتاہی کی تو اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے کہ تمہاری جگہ کسی دوسری قوم کو لے آئے گا۔

اللہ سبحانہ کی حکمت نے افراد کی طرح جماعتوں کی زندگی و بقا و قیام کے لیے بھی ایک خاص نظام مقرر کر دیا ہے اور اسی کے مطابق ایک جماعت کی جگہ دوسری جماعت۔ اور ایک قوم کی زندگی دوسری قوم کی زندگی سے ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ افراد کے نظامِ حیات کی طرح جماعتوں کا نظامِ حیات بھی جد و جہد سعی و طلب فکر و عمل کی صلاحیت کا نظام ہے اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہو گا کہ مقصد کا شعور اور اس کے حصول کی طلب و آرزو وہ اصل قوت ہے جو اقوام و ملل کو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد مقاصد کی کشش اس کی جد و جہد کا اصل محرک ہے مقصد اور نصب العین ہی سے زندگی میں ترتیب و تنظیم پیدا ہوتی ہے اور انسانی قوتیں ایک مرکز پر جمع ہونے لگتی ہیں یہی حال اسلام کے نظام کا ہے یہ پورا نظام لیظهره على الدين كله اور دینِ حق کے قیام کی سعی و طلب پر استوار ہے۔ اصل مقصد یہ ہے کہ خدا کی زمین پر بس اسی کی بندگی اور پرستش کی جائے۔ اگر خدا کے سوا کہیں کسی کی پرستش یا بندگی ہو رہی ہے تو قرآن کی زبان

[1] افادات شیخ الاسلام

بھی یہ فتنہ ہے۔ یہ فتنہ دیوتاؤں، بتوں کی ملتاتی اور قومی مفاد کی صورت میں ہو یا آمروں لیڈروں اور بادشاہوں کا بھیس بدل کر آئے۔ مسلمان کا کام یہ ہے کہ اس نصب العین کی خدمت انجام دے کر اللہ کا تقرب حاصل کرے۔ اسلام کی اخلاقی قدروں اور قرآن کے معیار خیر و شر کو سارے عالم پر حکمران بنا کر اللہ کو راضی کرے فرمایا اگر اس مقصد کو لے کر تم نہیں اٹھو گے تو اللہ سبحانہ تمہیں دردناک سزا دے گا یعنی تمہیں قحط سے ہلاک کر دے گا یا کسی دشمن کو تم پر مسلط کر کے سنگین سزا دے گا قاضی بیضاوی نے ایسا ہی لکھا ہے اور تمہیں ہٹا کر کوئی ایسی قوم لائے گا جو تمہاری مغائر ہو گی۔ یہ بھی وعید ہے بلکہ دھمکی میں تشدید ہے مطلب ہے کہ ایسے لوگ ہوں گے جنہیں نصب العین سے عشق ہو گا اور اسے حاصل کرنے کے لیے ان میں طلب اور سعی ہو گی۔ اللہ اور اس کے رسول کے لیے ان میں طاعت کی سرشاریاں ہوں گی۔ اللہ نے اپنے رسول کی نصرت کا وعدہ کیا ہے اور یہ بھی اس کا فیصلہ ہے کہ اسلام اور دینِ حق کا بول بالا ہو کر رہے گا۔ اگر تمہارے ذریعے یہ کام نہ ہو گا تو اور ذریعے سے ہو گا۔ اللہ کے دین کی برتری میں تمہارا تشاقل اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ سکے گا۔ اللہ کو پوری پوری قدرت حاصل ہے۔

مطلب یہ ہے کہ تمہیں اصلاحِ عالم کے لیے تیار کیا گیا ہے اور تمہیں بھی یہ کام کرنا ہے۔ تمہیں صرف اپنے کو دوزخ سے نہیں بچانا بلکہ پورے عالم کو جہنم سے بچانا ہے۔ اسی لیے تم کو امتِ وسطٰ اور خیر امت بنایا ہے۔ اگر تم ہی دنیا کے مشاغل میں لگ کر اس کام کو نہیں کرو گے تو اللہ سبحانہ تمہیں بھی معزول کر دے گا جیسا کہ پہلے بنی اسرائیل کو معزول کر چکا ہے

یہاں یہ بات ملحوظ رہے کہ اللہ کے علم میں ہے کہ شرط و جزا اس میں کوئی بھی شرمندہ تعبیر نہ ہو گی اس لیے شارحین قرآن کا یہ کہنا کہ اہلِ فارس یا اہلِ یمن ان کی جگہ لیں گے بالکل بے محل اور بے جوڑ بات ہے یہ تو کام پر ابھارنے کے لیے صرف اندازِ تہدید ہے ورنہ حضورِ اقدس ﷺ کی بعثت کا بنیادی مقصد ہی ایک خاص قوم کو تربیت دے کر اصلاحِ عالم کے لیے تیار کرنا تھا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بات پوری وضاحت سے سمجھائی ہے۔

وہ ایک قوم کو سنتِ راشدہ کی طرف ہدایت دیتا ہے ان کو پاک اور درست کرتا ہے۔ پھر ان کو اپنا دست و بازو بناتا ہے ان کے ذریعے وہ پوری روئے زمین میں جہاد کرتا ہے اور ان کو وہ شہروں اور ملکوں میں پھیلا دیتا ہے جیسا کہ قرآن میں ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس[1]

اس جماعت کا یہ تربیتی کورس ہے۔ نادان اس قسم کی آیات سے شکوک و شبہات میں پڑ جاتے ہیں۔ قرآن کا مطالعہ کرتے وقت یہ بات ضرور پیشِ نظر رکھنی چاہیے کہ جو باتیں کہی جا رہی ہیں ان کا تربیت سے تعلق ہے۔

دین کی نصرت اور ہجرت

(۴۴) اگر تم اللہ کے رسول کی مدد نہ کرو گے (تو کوئی پروا نہیں) اللہ نے تو اپنے رسول کی اس وقت بھی مدد کی ہے جب

[1] حجۃ اللہ البالغہ

کافروں نے اس کو اس حال میں گھر سے بے گھر کیا کہ اللہ کا رسول دو میں سے دوسرا تھا۔ جب وہ دونوں غار میں تھے جب وہ اپنے ساتھی سے کہہ رہا تھا کہ غمگین نہ ہو اللہ ہمارے ساتھ ہے پھر اللہ نے اس پر اپنا سکون و قرار نازل کیا اور امداد کے لیے ایسی فوجیں روانہ کیں جو تمہیں نظر نہیں آرہی تھیں اور بالآخر اللہ نے اہلِ کفر کی بات کو پست کر دیا۔ اور اللہ کی بات تو ہمیشہ اونچی ہوتی ہے۔ اور اللہ غالب اور حکمت والا ہے۔ یعنی بالفرض اگر تم نبی کریم ﷺ کی مدد نہ کرو گے نہ سہی۔ ان کا منصور و کامیاب ہونا کچھ تم پر موقوف نہیں ایک وقت پہلے ایسا ہو چکا ہے جب ایک یارِ غار کے سوا کوئی آپ کے ساتھ نہ تھا۔ معدودے چند مسلمان مکہ والوں کے مظالم سے تنگ آکر ہجرت کر گئے تھے آخر آپ کو بھی ہجرت کا حکم ہوا۔ مشرکین کا آخری مشورہ قرار پایا تھا کہ ہر قبیلہ کا ایک نوجوان منتخب ہو اور وہ سب مل کر بیک وقت آپ پر تلواروں کی ضرب لگائیں۔ تاکہ خون بہا دینا پڑے تو سب قبائل پر تقسیم ہو جائے اور بنی ہاشم کی یہ ہمت نہ ہو کہ خون کے انتقام میں سارے عرب سے لڑائی مول لیں جس شب میں اس ناپاک کارروائی کو عملی جامہ پہنانے کی تجویز تھی۔ حضورِ اقدس ﷺ نے اپنے بستر پر حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لٹایا تاکہ لوگوں کی امانتیں احتیاط سے آپ کے بعد مالکوں کے حوالہ کر دیں اور حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تسلی فرمائی کہ تمہارا بال بھی بیکا نہ ہوگا۔ پھر خود بنفس نفیس ظالموں کے ہجوم میں سے شاہت الوجوہ فرماتے ہوئے اور ان کی آنکھوں میں خاک جھونکتے ہوئے صاف نکل آئے حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ساتھ لیا اور مکہ سے چند میل ہٹ کر غارِ ثور میں قیام فرمایا یہ غار پہاڑ کی بلندی پر ایک بھاری مجوف چٹان ہے۔ جس میں داخل ہونے کا صرف ایک راستہ تھا۔ وہ بھی ایسا تنگ کہ انسان کھڑے ہو کر یا بیٹھ کر اس میں گھس نہیں سکتا۔ صرف لیٹ کر داخل ہونا ممکن تھا۔ اول حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے اندر جا کر صاف کیا۔ سب سوراخ کپڑے سے بند کیے کہ کوئی کیڑا کانٹا گزند نہ پہنچا سکے۔ ایک سوراخ باقی تھا اس میں اپنا پاؤں اڑا دیا۔ سب انتظام کر کے حضور ﷺ سے اندر تشریف لانے کو کہا۔ آپ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے زانو پر سر رکھ کر استراحت فرما رہے تھے کہ سانپ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے پاؤں کو ڈس لیا مگر صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پاؤں کو حرکت نہ دیتے تھے۔ مبادا حضور کی استراحت میں خلل پڑے جب آپ ﷺ کی آنکھ کھلی اور قصہ معلوم ہوا تو آپ نے لعاب مبارک صدیق کے پاؤں کو لگا دیا جس سے فوراً شفا ہو گئی۔ ادھر کفار قائف کو ہمراہ لے کر جو نشانہائے قدم کی شناخت میں ماہر تھا حضورِ اقدس ﷺ کی تلاش میں نکلا اس نے غارِ ثور تک نشانِ قدم کی شناخت کی مگر خدا کی قدرت کہ غار کے دروازے پر مکڑے نے جالا تن لیا اور جنگلی کبوتر نے انڈے دے دیئے یہ دیکھ کر سب نے قائف کو جھٹلا دیا اور کہنے لگے یہ مکڑی کا جالا تو محمد رسول اللہ کی ولادت سے بھی پہلے کا ہے۔ اگر اندر کوئی داخل ہوتا تو یہ جالا اور انڈے کیسے سالم باقی رہتے۔ حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ کو اندر سے کفار کے پاؤں نظر پڑتے تھے انہیں اپنی نہیں بلکہ جان سے زیادہ محبوب جس کے لیے سب کچھ فدا کر چکے ہیں۔ دشمنوں کی نظر نہ پڑ جائے۔ گھبرا کر کہنے لگے۔ یا رسول اللہ ان لوگوں نے اگر ذرا جھک کر اپنے قدموں کی طرف نظر کی تو ہم کو دیکھ پائیں گے حضور ﷺ نے فرمایا کہ ابوبکر رضی اللہ عنہ تیرا

کیا خیال ہے ان دو کی نسبت جن کا تیسرا اللہ ہے یعنی جب اللہ ہمارے ساتھ ہے تو پھر کس کا ڈر ہے اس وقت حق تعالیٰ نے ایک خاص قسم کا سکون و اطمینان حضور ﷺ کے قلب مبارک پر اور آپ کی برکت سے ابوبکر کے قلب مقدس پر نازل فرمایا اور فرشتوں کی فوج سے حفاظت و تائید کی یہ اسی تائید غیبی کا کرشمہ تھا کہ مکڑی کا جالا جسے اوھن البیوت بتلایا ہے بڑا مضبوط و مستحکم ذریعہ تحفظ بن گیا۔ اس طرح خدا نے کافروں کی بات نیچی اور ان کی تدابیر خاک میں ملا دیں۔ آپ تین روز غار میں قیام فرما کر بعافیت تمام مدینہ طیبہ پہنچ گئے بے شک انجام میں خدا ہی کا بول بالا ہوتا ہے وہ ہر چیز پر غالب ہے اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے بعض نے وایدہ بجنود لم تروھا سے بدر و حنین میں نزول ملائکہ مراد لیا ہے مگر ظاہر سیاق وہی ہے جو ہم نے بیان کیا ہے واللہ اعلم [1]

ہجرت پر ہم جلد نہم سورہ انفال کے نوٹ نمبر ۳۶، ۳۷، اور ۳۸ میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں ـــــ جب مکہ میں اعداء حق نے فیصلہ کر لیا کہ تمام قبائل کے سردار مل کر بیک وقت حملہ کر دیں تو آپ کو ہجرت کا حکم ہوا آپ حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر ثور کے غار میں پوشیدہ ہو گئے جو مکہ سے چھ میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے یہاں آپ نے تین راتیں بسر کیں اور پھر مدینہ روانہ ہو گئے۔ دشمن جو آپ کی تلاش میں تھے وہ غار ثور میں بھی پہنچے لیکن اللہ نے ایسا سامان کر دیا تھا کہ وہ ناکام واپس ہو گئے۔

ہجرت اور روحانی اصول و نوامیس

جس طرح اللہ تعالیٰ نے اس عالم مادی میں کچھ طبعی اور فطری قوانین مقرر فرما دیئے ہیں جن میں عموماً تخلف نہیں ہوتا۔ اسی طرح عالم روحانی میں بھی اس نے کچھ اصول و نوامیس بنا دیئے ہیں جن کے خلاف نہیں ہوا کرتا۔ منجملہ ان اصول و نوامیس کے ایک یہ ہے کہ جب کسی قوم میں کوئی نبی مبعوث ہوتا ہے تو ہر طرح قوم کو سمجھاتا ہے۔ تبلیغ کا ہر فرض اس کے سامنے ادا کرتا ہے شریر قوم معجزات طلب کرتی ہے بالآخر اس کے سامنے معجزات پیش کیے جاتے ہیں اور جب اس پر بھی وہ ایمان نہیں لاتی۔ تو پیغمبر کو ہجرت کا حکم کیا جاتا ہے اور اس کے بعد اس بدبخت قوم پر عذاب آتا ہے۔ چنانچہ انبیائے کرام کی سیرتیں اس اصول کی بہترین تشریح کرتی ہیں۔ آج اسی قاعدہ کی تعمیل کا حضور اقدس ﷺ کو حکم ہوتا ہے۔ آپ کو معراج کی سب سے بڑی نشانی عطا کی گئی مگر اس کو بھی وہ جھٹلاتے ہیں۔ معراج ہی میں ہجرت کی دعا بتائی جاتی ہے۔ قل رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا۔

جب ہجرت کا حکم ہوتا ہے تو آپ ترک وطن کا ارادہ فرماتے ہیں صحیح بخاری میں ہے۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ ہم ٹھیک دوپہر کے وقت گھر میں تھے کہ کسی نے کہا کہ حضور اقدس ﷺ تشریف لائے ہیں آپ کا سر مبارک

[1] افادات شیخ الاسلام

ڈھکا ہوا تھا۔ عادت شریف کے مطابق وہ وقت ہمارے گھر آنے کا نہ تھا والد صاحب نے کہا میرے والدین آپ پر قربان ہوں بخدا یہ تشریف آوری یوں ہی نہیں کوئی بات ضرور ہے۔ آپ اجازت لے کر اندر تشریف لائے اور فرمایا کہ جو کوئی پاس ہو اسے باہر کر دیں ابوبکر نے عرض کیا صرف آپ کے گھر والے ہیں فرمایا مجھے ہجرت کی اجازت ہو گئی ہے ابوبکر نے عرض کیا یا رسول اللہ رفاقت کا آرزو مند ہوں فرمایا ہاں رفاقت ہوگی۔ ایک اور روایت میں ہے کہ حضرت عائشہ ﷺ نے فرمایا میں نے کسی کو خوشی میں روتے نہیں دیکھا تھا حضور اقدس ﷺ کی زبان مبارک سے ہاں نکلا تو حضرت ابوبکر ﷺ کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔

روانگی کے لیے ضروری انتظامات

محافظ حقیقی اللہ سبحانہ نے جس نے ہر قدم پر دشمن کے منصوبے ناکام بنائے اور اپنے رسول پاک کو ہر خطرے سے محفوظ رکھا۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ جب سے حکم ہجرت ہو چکا تھا اسی وقت سے نکلنے کی ساری تدبیریں بھی سوچ لی گئی ہوں گی مثلاً

۱۔ حضرت ابوبکر ﷺ نے پہلے سے دو سانڈنیاں سفر کے لیے تیار کر لی تھیں۔

۲۔ مکہ مکرمہ سے جنوب کی جانب سفر اس لیے اختیار کیا کہ مدینہ شمال میں تھا۔

۳۔ غالباً غارِ ثور میں پناہ لینے کا فیصلہ بھی پہلے ہی کر لیا ہو گا۔ یہ فیصلہ چلتے چلتے راستہ میں نہیں ہوا۔

۴۔ حضرت ابوبکر نے اپنے بیٹے عبداللہ کو اس کام پر مامور کیا تھا کہ دن بھر قریش کی باتیں سن کر رات کے وقت غار میں آکر بتائے۔

۵۔ اسی طرح حضرت اسماء ﷺ کی ڈیوٹی لگادی کہ رات کی تاریکی میں کھانا لایا کریں۔

۶۔ عامر بن فہیرہ کو تاکید کر دی گئی تھی کہ دودھ والی بکریاں روک رکھیں اور رات کے وقت انہیں غار کے دہانے پر لے آیا کریں۔

۷۔ ایک شخص عبداللہ بن اریقط کو رہبری کے لیے مقرر کر لیا تھا۔

ان انتظامات کے بعد حضور اقدس ﷺ اپنے کاشانۂ مبارک سے اول شب ہی میں نکل آئے تھے جو لوگ محاصرہ کر کے بیٹھے ہوئے تھے ان کو خبر تک نہ ہوئی۔ آپ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے گھر آئے۔ وہاں حضرت عائشہ اور حضرت اسماء ﷺ نے جلد جلد سفر کا سامان تیار کیا۔ کھانا تیار کر کے چمڑے کے تھیلے میں رکھا۔ جب تھیلے کا منہ باندھنے کے لیے کوئی چیز نہ ملی۔ تو حضرت اسماء نے اپنے کمربند سے ایک ٹکڑا پھاڑ کر منہ باندھ دیا اس وقت سے ذات النطاقین مشہور ہو گئیں۔

اس طرح حضور اقدس ﷺ ابوبکر کو ساتھ لے کر شہر سے جنوبی سمت چل پڑے۔

غارِ ثور

چھ میل کے فاصلے پر ثور نامی پہاڑ ہے جس کی اندر بلندی پر ایک بڑا غار ہے راستہ سخت سنگلاخ اور دشوار گذار ہے دہانہ بہت تنگ ہے اندر جانے کا راستہ مغربی جانب ہے جو صرف ۲ فٹ اور تین فٹ کا ہے اس میں سے آدمی لیٹ کر جاتا ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے حضور اقدس ﷺ کو تکلیف سے بچانے کے لیے تھوڑی دور تک اپنے کندھوں پر بٹھایا۔ غارِ ثور میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے تین راتیں گذاریں۔ ۲۷ صفر کو مکہ سے نکلے تھے جمعرات کا دن گذر چکا تھا اور جمعہ کی رات شروع ہو گئی تھی عیسوی تاریخ ۱۰ ستمبر ۶۲۲ء تھی۔ طبقات ابن سعد کے مطابق مکہ مکرمہ سے روانگی کی تاریخ یکم ربیع الاول ہے یعنی ۱۳ ستمبر ۶۲۲ء۔ پہلے حساب کے مطابق حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم تین روز غارِ ثور میں قیام فرما رہے اور یکم ربیع الاول کو یعنی ۱۳ ستمبر کو عزم فرمائے مدینہ طیبہ ہوئے۔ روانگی کا دن بالاتفاق دوشنبہ ہے۔

صدیقِ اکبر رضی اللہ تعالیٰ کا حزن واضطراب

یہ تین راتیں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ نے کہ شمع نبوت کے پروانے تھے جس عالم میں بسر کی ہوں گی اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے عشق ومحبت کا کچھ بھی ذائقہ چکھا ہو۔ اللہ کا رسول غار میں پوشیدہ تھا۔ دشمن سراغ میں تھے ہر لمحہ اندیشہ تھا کہ کہیں سراغ نہ پالیں اور ایک مرتبہ ان کی صدائیں بھی کانوں میں آنے لگیں تھیں۔ ایسی حالت میں ظاہر ہے کہ ان کے دل کے حزن واضطراب کا کیا عالم ہوگا۔ بلاشبہ انہیں یقین تھا کہ اللہ اپنے رسول کا مددگار ہے لیکن عشق ومحبت کا قدرتی تقاضا ہے کہ محبوب کو خطرے میں دیکھ کر اضطراب ہو اس سے وہ دل کو روک نہیں سکتے تھے۔ اگر روک سکتے تو محبت کی عدالت کا فیصلہ ان کے خلاف ہوتا۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم کے سکونِ قلب کا عالم دوسرا تھا۔ ان کا رفیقِ غار جب جوشِ محبت میں مضطرب ہوتا تو تسلی دیتے اور فرماتے لاتحزن غمگین نہ ہو ان اللہ معنا اللہ ہمارے ساتھ ہے خود حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کا بیان ہے کہ جب دشمن غار کے قریب آگئے تو میں نے مضطرب ہو کر کہا ان میں سے کسی نے پاؤں اونچا کیا تو ہمیں دیکھ لے گا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ابوبکر تم ان دو کے بارے میں کیا خیال کرتے ہو جن کے لیے تیسرا خود اللہ ہے فرمایا ہے فانزل اللہ سکینتہ علیہ۔ اللہ نے اپنی جانب سے سکون نازل فرمایا یعنی ابوبکر پر کیونکہ حضور اقدس ﷺ کا قلب تو پہلے ہی پُرسکون ومطمئن تھا۔

اس آیت میں حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ تعالیٰ کے ان فضائل ومناقب کا خزانہ ہے جن کے ذریعے آپ کی ذاتِ گرامی

تمام صحابہ میں ممتاز ہے۔ مثلاً۔

نبوت کا حضرت ابوبکرؓ پر اعتماد

اوّلاً۔ ایسے ہولناک وقت میں حضور اقدس ﷺ کا اپنے مشن اور اپنی ذات کے بارے میں سب کو چھوڑ کر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر اعتماد اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ اخلاص و عقیدت میں آپ بے مثال تھے۔ اس کی تائید اس ارشاد نبوت سے بھی ہوتی ہے جسے ابن عساکر اور ابن عدی نے بحوالہ انس روایت کیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے ایک بار مدنی زندگی میں حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے دریافت کیا کہ حسان! کیا تم نے کچھ اشعار ابوبکر پر کہے تھے۔ بولے جی ہاں۔ ارشاد ہوا سناؤ میں سنوں گا۔ حضرت حسان رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے یہ دو شعر سنائے۔

وثانی اثنین فی الغار المنیف وقد　　طاف العدو به اذ صعد الجبلا

وکان حِبَّ رسول اللہ قد علموا　　من البریۃ لم یعدل بہ رجلا

حضور اقدس ﷺ خوب ہنسے اور فرمایا تم ٹھیک کہتے ہو وہ ایسے ہی ہیں جیسے تم نے کہا۔

عتاب سے حضرت ابوبکرؓ مستثنیٰ ہیں

ثانیاً۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ حضرت حسن بصری۔ سفیان بن عیینہ اور امام شعبی رحمہم اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ ان آیات میں اللہ سبحانہ نے نبوت کی نصرت نہ کرنے پر سب پر عتاب فرمایا لیکن حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی مدح فرمائی ہے کہ انھوں نے نصرت فرمائی ہے یعنی سب میں مستثنیٰ شخصیت صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ہے جنھوں نے اس آڑے اور نازک وقت میں حضور اقدس ﷺ کی مدد کی اور اس سفر میں آپ کی رفاقت کی۔ اور یہ بات بالکل بے غبار ہے کہ اس سفر میں ابوبکرؓ کو رفاقت کے لیے حضور اقدس ﷺ نے اللہ سبحانہ کے حکم اور ایماء سے پسند فرمایا تو اس کا صاف مطلب ہے کہ یہ اللہ کی جانب سے ابوبکر کو جمیع صحابہ پر فضیلت کی سند ہے۔

ابوبکرؓ ثانی اثنین ہیں

ثالثاً۔ اس آیت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ثانی اثنین دو میں دوسرا فرمایا ہے سارے اہل ایمان کو مخاطب کر کے یہ انداز اختیار کرنا ان دو کی فضیلت اور بزرگی کا اللہ سبحانہ کی جانب سے اعلان ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حضور اقدس کا ثانی فرمایا ہے گویا مرتبہ نبوت اور صدیقیت کی طرف اشارہ کیا ہے یعنی نبوت کے بعد مرتبہ صدیقیت کا ہے حضور اقدس کے بعد درجہ

صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا ہے۔ ظاہر ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا ثانی وہی شخص ہو سکتا ہے جو حضور اقدس ﷺ کے بعد سب سے افضل ہو۔ کمالات علمیہ اور عملیہ میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس ﷺ کے ثانی تھے۔ اللہ سبحانہ نے حضور اقدس کو مبعوث فرمایا تو دین کی دعوت میں حضرت ابوبکر حضورؐ کے ثانی تھے۔ ابوبکرؓ نے ایمان لانے کے بعد دعوتِ دین کا کام کیا اور دعوت کے نتیجے میں طلحہ، زبیر، عثمان بن عفان اور ایک جماعت نے اسلام قبول کیا۔ غزوات میں ابوبکر خادم ہونے کی حیثیت سے ساتھ رہتے تھے۔ آپ سے جدا نہ ہوتے تھے یعنی غزوات میں بھی حضورؐ کے ثانی ہوتے تھے حضور اقدس ﷺ بیمار ہوئے تو امامت میں ابوبکرؓ ہی حضورؐ کے ثانی تھے وصال مبارک ہوا تو امامت کبریٰ میں بھی حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس ﷺ کے ثانی تھے حضرت ابوبکر کی وفات ہوئی تو قبر میں بھی حضرت ابوبکر آپ کے ثانی تھے۔ غرض یہ کہ از اول تا آخر حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس ﷺ کے ثانی ہیں۔ اور انشاء اللہ آخرت میں بھی ابوبکرؓ ثانی ہوں گے۔

حضرت ابوبکرؓ کی صحابیت کا اعلان

رابعاً۔ قرآن نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لصاحبہ حضور اقدس ﷺ کا صحابی کہا ہے اور یہ وہ شرف ہے کہ کسی کو حاصل نہیں ہے یعنی صحابہ تو سب ہیں لیکن جن کے نبوت کے صاحب ہونے کا قرآن نے اعلان کیا ہے وہ ابوبکرؓ کے سوا کوئی نہیں۔ اسی وجہ سے علماء نے یہاں سے یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ ابوبکرؓ کے صاحب پیغمبر ہونے کا منکر قرآن کے اس اعلان کا منکر ہے اور انکار قرآن کی سنگینی سب کو معلوم ہے۔

حضرت ابوبکرؓ کو اللہ کی معیت ہے

خامساً حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو مخاطب کر کے فرمایا ان اللہ معنا اللہ ہمارے ساتھ ہے یہ نہیں فرمایا ان اللہ معی کہ اللہ میرے ساتھ ہے اس سے یہ بات بالکل واضح ہے کہ آیت میں جس معیت کا اعلان حضورؐ نے اپنے لیے فرمایا ہے اسی معیت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو بھی شریک کر لیا ہے اور پھر اللہ کی معیت کے اعلان سے یہ بات بھی حضورؐ نے سمجھا دی ہے کہ جن جن اوصاف پر اللہ کی معیت آتی ہے ابوبکر ان سب اوصاف سے موصوف ہیں مثلاً ابوبکر میں صفت صبر درجہ کمال میں پائی جاتی ہے قرآن میں ہے۔ ان اللہ مع الصابرین۔ ایمان کی صفت کے اس درجہ اعلیٰ سے متصف ہیں جس کو اللہ کی معیت کا شرف حاصل ہوتا ہے۔ ان اللہ مع المومنین۔ تقویٰ۔ اس بزرگترین درجے کے ابوبکرؓ مالک ہیں جس پر اللہ کی معیت حاصل ہوتی ہے ان اللہ مع المتقین اور ابوبکرؓ کو درجہ احسان کا وہ کمال حاصل ہے جس پر روحانی کمالات کی انتہا ہے

ان اللہ مع المحسنین۔ گویا ایک ہی فقرے ان اللہ معنا کے ذریعے بارگاہ نبوت سے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے رکن کامل متقی صابر اور محسن ہونے کا سارٹیفکیٹ ملا ہے اور جس کی ایمان صبر، تقویٰ اور احسان کی زبان نبوت گواہی دے، نہیں بلکہ جسے نبوت اپنے ساتھ ان اوصاف میں شریک کرے اس کے افضل، اعلیٰ اور اولیٰ ہونے پر کب شبہ ہو سکتا ہے۔ اور صرف یہی نہیں، بلکہ اس آیت نے معیت کی نوعیت بھی مقرر کر دی اگر یوں فرماتے ان اللہ معی و معك اللہ میرے ساتھ اور تیرے ساتھ ہے تو سننے والا سمجھ لیتا کہ معیت تو ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے لیکن دونوں کی نوعیت الگ الگ ہے ایک ہی معنا ہمارے ساتھ کہہ کر فیصلہ کر دیا کہ اللہ کی معیت نوعیت کے اعتبار سے دونوں کی ایک ہے جو معیت حضور ﷺ کو حاصل ہے وہی ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حاصل ہے اور جملہ اسمیہ لا کر یہ شبہ بھی دور کر دیا کہ یہ معیت تو وقتی ہے بلکہ بتا دیا کہ اللہ کی یہ نوعیت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے لیے دائمی ہے کیونکہ جملہ اسمیہ ثبوت اور دوام کو بتاتا ہے۔

غالباً حافظ ابن تیمیہ نے یہ بات لکھی ہے یہ یاد نہیں کہ کہاں لکھی ہے کہ اس موقعہ پر حضور اقدس ﷺ نے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اپنے ساتھ اللہ کی معیت میں شریک کر لیا لیکن حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے اپنے صحابہ کرام کو لے کر نکلے ہیں اور سمندر کے کنارے پہنچے ہیں۔ پیچھے سے فرعون کی فوجوں نے تعاقب کیا ہے جب اصحاب موسیٰ نے فرعون کی فوجوں کو پیچھے اور پانی کی موجوں کو آگے دیکھا تو گھبرا کر بول پڑے قال اصحاب موسیٰ انا لمدرکون۔ اصحاب موسیٰ نے کہا کہ ہم تو پکڑے گئے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کلا ان معی ربی ہرگز نہیں میرے ساتھ میرا رب ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کسی ایک صحابی کو بھی رب کی معیت میں اپنے ساتھ داخل نہیں کیا حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حضرت ہارون علیہ السلام اور حضرت یوشع علیہ السلام بھی تھے۔ اس سے امت میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مقام کا پتہ لگتا ہے اس موضوع پر ایک وعظ میں حضرت مولانا اشرف علی نے انکشاف فرمایا اور بڑا لطیف انکشاف ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو معیت میں اس لیے شریک کیا کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو اپنی کوئی فکر نہ تھی۔ پریشانی حضور اقدس کی تھی اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ دولت توکل سے مالا مال تھے اور موسیٰ علیہ السلام کے صحابہ کرام نہ تو صدیق اکبر رضی اللہ عنہ جیسے متوکل تھے اور نہ ان کی طرح حضرت موسیٰ کے عاشق زار اور جاں نثار تھے۔ ان کو اپنی جان کا خطرہ تھا اور خطرہ بھی نہیں بلکہ یقین تھا جیسا کہ انا لمدرکون کا انداز بتا رہا ہے۔ اگر حضرت موسیٰ کے ساتھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے ہم پلہ ہوتے تو وہ بھی یہی کہتے کہ رب ہمارے ساتھ ہے۔ علامہ قسطلانی نے یہاں اور لطیفہ پیدا کر دیا کہ حضرت موسیٰ کو معیت ربانی حاصل ہے جب حضور اقدس کو معیت الٰہیہ حاصل ہے۔ اللہ اسم اعظم ہے جو تمام صفات کمال کا جامع ہے۔ دونوں میں بہت بڑا فرق ہے۔

حضرت علیؓ نے ابوبکرؓ کے مناقب کا اعلان کیا

سادسًا۔ غالبًا یہی وجہ ہے کہ ۹ھ کے حج میں حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو سورۂ براءت کے اعلان کے لیے روانہ کیا۔ اس آیت میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے فضائل اور مناقب تھے۔ اپنے مناقب اپنے فضائل اپنے منہ سے کسی کو گوارا نہیں ہوتے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ کو روانہ فرمایا کہ مجمع میں ابوبکر کے مناقب اور فضائل تم بیان کرو تاکہ سننے والوں کو تمہاری زبان سے ابوبکرؓ کے مقام کا اندازہ ہو۔ حضور اقدس ﷺ کے اس طرزِ عمل سے اندازہ ہوگیا کہ نبوت کی بارگاہ میں صدیق اکبرؓ کا مقام کیا ہے۔

مرزا مظہر جانِ جاناں فرماتے ہیں کہ:

> حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی فضیلت کے لیے یہ بات بس ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابوبکرؓ کے لیے وہ معیت بتائی ہے جو خود حضور کے لیے ہے۔

حضرت ابوبکرؓ پر اللہ کی سکینت

سابعًا اس آیت میں جس سکینت کا ذکر ہے وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ پر نازل ہوئی کیونکہ پریشانی حضرت ابوبکرؓ کو تھی ان کو ہی سکون کی ضرورت تھی ورنہ حضور اقدس ﷺ تو اس قدر مطمئن تھے کہ خاص اس وقت محو استراحت تھے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ فانزل اللہ سکینتہ علیہ کی ضمیر کا مرجع صاحب ہے مطلب ہے کہ ازالہ غم کے لیے حضورؐ کے اس ارشاد کے بعد اللہ سبحانہ نے ابوبکر پر سکینت نازل فرمادی۔ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں امام رازی نے مفاتیح الغیب میں یہی مطلب بتایا ہے۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے ہیں کہ سکینت سے اطمینان مراد ہے۔ اور اطمینان چاہیئے پریشان و غمگین کو۔ اب آپ یہ خود ہی فیصلہ کریں کہ غمگین کون تھا۔

حافظ ابن القیم نے مدارج السالکین میں سکینت کے موضوع پر سیر حاصل تبصرہ کیا ہے۔ منازل السائرین اسی کتاب کا متن ہے۔ صوفیاء میں شیخ الاسلام ہروی کتاب کے مصنف ہیں وہ فرماتے ہیں کہ سکینت ایک خاص کیفیت اور حالت کا نام ہے جس میں تین چیزیں بیک وقت موجود ہوتی ہیں ایک نور دوسرے قوت تیسرے روح۔ نور سے قلب روشن ہوتا ہے ایمانی حقائق اس پر منکشف ہوتے ہیں۔ قوت سے قلب میں عزم و استقلال آتا ہے اور روح سے دل میں حیات اور زندگی پیدا ہوتی ہے۔

اس تشریح کی موجودگی میں آپ سوچئے کہ ابوبکر صدیق رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سکینت نازل ہونے کا مطلب کیا ہے یہی ناکہ آپ پر حقائق ایمانیہ منکشف تھے اطاعت و بندگی کے وقت آپ کو خاص نشاط حاصل تھا اور قلب کبھی غفلت سے دوچار

نہ ہوتا تھا۔

قرآن میں سکینت کا نزول اہل ایمان پر ہوتا ہے اور یہاں صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ پر سکینۃ کا نزول ہوا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ صدیق اکبر رضی اللہ عنہ غار ثور میں تمام اہل ایمان کی نمائندگی فرما رہے ہیں۔ اسی کا نظارہ دنیا نے ۹ ھ ہجری کی امارت میں دیکھا تھا۔

حضرت ابوبکرؓ کے سرمایہ سے سامان ہجرت

ثامناً حضرت صدیق اکبر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اپنی دولت کا بڑا حصہ ابتدائے دعوت حق ہی سے راہ اسلام میں بے دریغ صرف کر چکے تھے۔ سفر ہجرت کے تمام اخراجات بھی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے برداشت کیے۔ جو کچھ سرمایہ تھا سب ساتھ لے لیا اور اس کا اندازہ پانچ ہزار درہم بتایا جاتا ہے۔ ہجرت کے سارے انتظامات حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی دور اندیشی، معاملہ فہمی، راز داری اور جان نثاری کی ایسی شہادت پیش کر رہے ہیں جس سے روشن تر شہادت کوئی نہیں ہو سکتی۔ صحیح بخاری میں ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ سے کسی گفتگو میں غصہ ہو گئے حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معافی مانگی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے معافی نہ دی۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور صورت حال بیان کی حضورؐ نے سن کر فرمایا ابوبکرؓ تجھے خدا معاف کرے گا اور یہ بات تین بار فرمائی۔ حدیث کے راوی ابوالدرداء رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ندامت ہوئی اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے گھر آ کر دریافت کیا کہ ابوبکرؓ ہیں؟ جواب ملا نہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور سلام کہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرے کا رنگ غصے سے بدلا ہوا تھا حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ ڈر گئے دو زانو ہو کر بیٹھ گئے اور بولے بخدا یا رسول اللہ میں نے کوئی زیادتی نہیں کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

> بلاشبہ اللہ نے مجھے تمہاری طرف رسول بنا کر روانہ کیا ہے تم نے کہا کہ تو جھوٹا ہے ابوبکر نے کہا کہ سچا ہے ابوبکر نے اپنی جان و مال سے میری غم خواری کی کیا تم میرے صاحب کو چھوڑتے ہو دو بار یہی بات فرمائی اس کے بعد حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو کسی نے کچھ نہیں فرمایا اور یہ بھی فرمایا کہ تمام لوگوں میں مجھ پر مال اور جان سے احسان صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا ہے۔

صرف سفر ہجرت کے موقعہ پر سانڈنی کے بارے میں فرمایا کہ سانڈنی میں مفت نہیں قیمت سے لوں گا۔

ابوبکرؓ کی اوصاف میں نبوت کی عکاسی

تاسعاً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اوصاف کی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی ذات گرامی عکاس تھی جن اوصاف کی خدیجۃ الکبریٰ

نے حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں نشاندہی کی تھی اور ان اوصاف کو دلیل بنا کر حضوراقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نبی برحق مان لیا تھا جب حضورؐ نے غار حرا سے واپسی پر ساری داستان حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا کو بتائی اور حضرت خدیجہ رضہ کے تاثرات اس پر معلوم کرنا چاہے تو خدیجۃ الکبریٰ نے کہا۔

کلا لا یخزیك الله ابداً	ہرگز نہیں آپ کو آپ کا رب کبھی اندوہ گین نہ کرے گا۔
تصل الرحم	آپ تو اقربا نوازی کرتے ہیں۔
تحمل الکل۔	پامال اور گرے پڑے افراد کو معاشرہ میں سہارا دیتے ہیں۔
تقری الضیف	آپ تو مہمان نوازی کرتے ہیں۔
تکسب المعدوم	مصیبت زدوں کے کام آتے ہیں۔
تعین علی نوائب الحق	اور حق کے نوائب پر مدد کرتے ہیں۔

یہ نبوت کا وہ چہرہ ہے جسے صداقت کے لیے حضرت خدیجہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے بطور استدلال پیش فرمایا ہے آیئے صحیح بخاری میں حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا بیان کرتی ہیں کہ جب مکہ میں مسلمانوں پر ابتلائی دور تھا ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اسی زمانہ میں حبشہ کی طرف ہجرت کا ارادہ کرکے رخت سفر باندھ لیا۔ روانہ ہوگئے اور مشہور مقام برک الغماد تک سفر کی منزل طے کرلی۔ راستہ میں قارہ قبیلہ کا سردار نامی ابن الدغنہ مل گیا۔ بولا!

ابن الدغنہ رضی اللہ عنہ ابوبکر کہاں جانے کا ارادہ ہے۔

ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ مجھے میری قوم نے نکال دیا ہے۔ میرا ارادہ ہے زمین میں سیاحت کروں اور اپنے رب کی عبادت کروں۔

ابن الدغنہ رضی اللہ عنہ ابوبکر تیرے جیسا شخص نہ نکلتا ہے نہ نکالا جاتا ہے تُو تو اقربا پر شفقت کرتا ہے بیکسوں کی دستگیری کرتا ہے۔ مہمان نوازی کرتا ہے۔ مصیبت زدوں سے ہمدردی کرتا ہے۔

دونوں کا تقابلی مطالعہ فرمایئے اور دیکھئے کہ ابوبکر کی ذات حضوراقدس کی اخلاقی قدروں کا کیسا شاندار اور خوبصورت عکس ہے۔ اقدار کی اسی عکاسی کی وجہ سے وحی الٰہی نے ابوبکر کو ثانی اثنین قرار دیا ہے اور اسی تطابق کی وجہ سے حضور اقدس نے غار میں فرمایا یا ابا بکر ما ظنك باثنین الله ثالثھما اے ابوبکر ان دو کے بارے میں تیرا کیا خیال ہے جن میں تیسرا اللہ ہے۔

قرآن میں حضرت ابوبکرؓ کی مدح

عاشراً۔ قرآن وہ کامل ترین کتاب ہے جو اللہ سبحانہ کی جانب سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم انسانی ہدایت کے لیے

لے کر تشریف لائے ہیں۔ اس کتاب کے خصائص میں سے ایک اہم خصوصیت یہ ہے کہ وہ انسانیت کے سامنے اپنانے کے لیے اعمال صالحہ اخلاقِ حسنہ اور اوصافِ حمیدہ پیش کرتا ہے اور ان کے موصوفین کی مدح کرتا ہے ایسے ہی دو بچنے کے لیے اعمال سیئہ اخلاق قبیحہ اور اوصاف مذمومہ کا ذکر کرتا ہے اور ان کے اپنانے والوں کی مذمت کرتا ہے۔ پورے قرآن کریم میں ماسوائے انبیاء کو چھوڑ کر وہ کبھی اس معاشرے کے افراد و اشخاص کا ذکر نہیں کرتا ہے جو حضور اقدس کا مخاطب ہے خواہ وہ اچھے ہوں یا بُرے بُروں میں جیسے صرف ابولہب کا شخص ذکر کیا ہے کیونکہ وہ برائی میں ایک مثالی شخصیت ہے اسی طرح قرآن نے اشخاص میں سے جس کی مدح کی ہے وہ صرف حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ ہیں۔ اور مدح کا یہ عجیب و غریب انداز اختیار کیا ہے کہ وہ ثانی اثنین۔ دونوں غار میں ہیں۔ ابوبکر حضور اقدس کے صاحب ہیں۔ ابوبکر حضور اقدس کی وجہ سے غمگین و پریشان ہیں۔ حضور اقدس ان کو تسلی دے رہے ہیں اور بتا رہے ہیں کہ ہم دونوں کو اللہ کی معیت حاصل ہے اور اللہ سبحانہٗ ابوبکر کے غم کو غلط کرنے کے لیے سکون کی نعمت سے مالا مال فرمایا۔ فَاَنْزَلَ اللّٰهُ سَكِيْنَتَهٗ عَلَيْهِ۔

یہ بات حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کی وہ خصوصیت ہے جس میں آپ کا کوئی شریک اور سہیم نہیں ہے۔ بلاشبہ حضرت زید اور عبداللہ ابن ام مکتوم رضی اللہ تعالیٰ کا بھی قرآن نے ذکر کیا ہے لیکن ان کا تذکرہ مقام مدح میں نہیں ہے۔

ہجرت سے متعلق دو باتیں باقی ہیں۔

ایک یہ کہ ہجرت سے اسلامی تاریخ کا آغاز ہوا ہے۔

دوسرے یہ کہ ہجرت کا سفر غارِ ثور سے مدینہ تک کیسے ہوا۔

غارِ ثور سے مدینہ کی طرف

آیئے پہلے سفرِ ہجرت پورا کر لیجئے۔ تین راتیں غارِ ثور میں گذار کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہوتے وقت پر دو سانڈنیاں غار کے پاس پہنچ گئیں جن میں سے ایک کی قیمت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ادا فرمادی تھی۔ شائد اسی سانڈنی کا نام "قصوی" ہے۔ کچھ روایات میں ہے کہ یہ سفر رات میں شروع ہوا۔ مصلحت کا تقاضا یہی تھا۔ غالباً سویرے سویرے روانہ ہوئے ہوں گے تاکہ دن چڑھنے سے پہلے ہی مکہ مکرمہ کے آس پاس سے دور ہو جائیں۔ سواروں کی ترتیب یہ تھی کہ ایک سانڈنی پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت ابوبکر سوار تھے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ پیچھے تھے اور دوسری سانڈنی پر عبداللہ بن اریقط اور عامر بن فہیرہ سوار تھے۔

غارِ ثور سے نکل کر وہ راستہ اختیار کیا گیا جس پر عام آمد و رفت نہ تھی۔ سہ شنبہ کے روز دوپہر ہوگئی تو حضرت ابوبکر نے ایک چٹان کے پاس سایہ دیکھا۔ زمین صاف کر کے اس جگہ چادر بچھائی تاکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم استراحت فرما سکیں۔ ادھر

اُدھر دیکھا تو ایک چرواہا نظر آیا۔ اس کے ہاتھ اور بکری کے تھن خوب صاف کر کے دودھ نکلوایا۔ برتن کا منہ ڈھانک دیا تاکہ دودھ گرد و غبار سے محفوظ رہے اس میں پانی ڈال کر خدمتِ اقدس میں پیش کیا آپ نوش فرما چکے تو روانہ ہو گئے۔

جب حضور اقدس ﷺ رابغ کے قلعہ اور ساحلِ بحر کے درمیانی راستہ سے گذر رہے تھے تب سراقہ بن جعشم نے آپ کا تعاقب کیا۔ عبدالرحمٰن بن مالک مدلجی رضی اللہ تعالیٰ عنہ جو سراقہ کا برادر زادہ ہے وہ بیان کرتا ہے کہ سراقہ خود سر پر لگائے نیزہ تانے بدن پر ہتھیار سجائے اپنی گھوڑی پر ہَوا سے باتیں کرتا جا رہا تھا کہ اس کی نظر حضور اقدس ﷺ پر پڑ گئی۔ اس نے سمجھا کہ وہ کامیاب ہو گیا۔ اتنے میں گھوڑی گھٹنوں کے بل گر پڑی۔ سراقہ بھی نیچے گر گیا۔ اٹھا گھوڑی کو اٹھایا سوار ہوا پھر چلا۔ حضور اقدس ﷺ تلاوتِ قرآن فرما رہے تھے کہ حضور کو دشمن کے قریب تر ہونے کی اطلاع دی گئی فرمایا اے اللہ ہمیں اس کے شر سے بچا۔ ادھر یہ دعائی الفاظ زبانِ مبارک سے نکلے ادھر گھوڑی کے پاؤں زمین میں دھنس گئے۔ سراقہ گر پڑا اور سمجھ گیا کہ اللہ کی حفاظت پر غالب آنا محال ہے۔ اس نے عاجزانہ انداز میں جان کی امان مانگی۔ امان دی گئی۔ سراقہ آگے بڑھا اور عرض کی کہ اب میں ہر ایک حملہ آور کو پیچھے ہی روکتا رہوں گا۔ پھر اس کی درخواست اور حضور اقدس کے ایما پر عامر بن فہیرہ نے اسے امان نامہ لکھ دیا۔ الاستیعاب میں ہے کہ جب سراقہ واپس ہونے لگا تو حضور اقدس ﷺ نے فرمایا، سراقہ اس دن تیری کیا شان ہو گی جب تیرے ہاتھوں میں ایران کے بادشاہ کسریٰ کے کنگن پہنائے جائیں گے سراقہ نے پوچھا کسریٰ شاہ ایران کے کنگن؟ فرمایا۔ ہاں۔ سراقہ کی آنکھیں حیرت سے کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ فاروقِ اعظم کے زمانہ میں جب مدائن فتح ہوا اور ایران کا مالِ غنیمت مدینہ منورہ پہنچا تو اس میں کسریٰ کے کنگن بھی تھے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے سراقہ کو پہنائے۔

راستہ ہی میں حضور اقدس کے قافلہ ہجرت کا گذر خیمہ ام معبد پر ہوا یہ عورت قوم خزاعہ سے تھی۔ مسافروں کی خبر گیری اور ان کی تواضع کے لیے مشہور تھی سرِ راہ پانی پلایا کرتی تھی اور مسافر وہاں ٹھہر کر سستایا کرتے تھے۔

یہاں پہنچ کر بڑھیا سے دریافت کیا کہ اس کے پاس کھانے کی کوئی چیز ہے وہ بولی نہیں اگر ہوتی تو دریافت کرنے سے پہلے حاضر کر دیتی۔ حضور اقدس ؐ نے خیمہ کے گوشہ میں ایک بکری دیکھی۔ پوچھا کہ یہ بکری کیوں کھڑی ہے ام معبد نے کہا کمزور ہے ریوڑ کے ساتھ چل نہیں سکتی۔ حضور اقدس ؐ نے فرمایا کہ اجازت ہے کہ ہم اسے دوھ لیں ام معبد نے کہا کہ اگر آپ کو دودھ معلوم ہوتا ہے تو دوھ لیں۔ حضور اقدس ؐ نے بسم اللہ کہہ کر بکری کے تھنوں کو ہاتھ لگایا۔ برتن مانگا وہ ایسا بھر گیا کہ دودھ اُچھل کر زمین پر بھی گر گیا۔ یہ دودھ حضور اقدس اور آپ کے ساتھیوں نے پیا۔ دوسری دفعہ بکری کو دوہا گیا۔ برتن بھر گیا۔ یہ بھی ہمراہیوں نے پیا۔ تیسری دفعہ پھر برتن بھر گیا اور وہ آپ نے ام معبد کے لیے چھوڑ دیا اور آگے روانہ ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد ام معبد کا شوہر آیا۔ خیمہ میں دودھ کا بھرا ہوا برتن دیکھ کر حیران ہو گیا اور بولا کہ یہ کہاں سے آیا ام معبد نے کہا کہ ایک بابرکت شخص آیا تھا اور یہ دودھ اس کے قدم کا نتیجہ ہے۔ وہ بولا یہ تو وہی صاحب قریش معلوم ہوتا ہے جس

کی مجھے تلاش ہے۔ اچھا تم ذرا چہرہ تو پیش کرو۔ ام معبد بولی۔

پاکیزہ اور کشادہ چہرہ، پسندیدہ خو۔ نہ توند نکلی ہوئی نہ چندیا کے بال گرے ہوئے۔ زیبا صاحب جمال، آنکھیں سیاہ و فراخ بال لمبے اور گھنے۔ آواز میں بھاری پن، بلند گردن، روشن مردمک سرگین چشم، باریک و پیوستہ ابرو۔ سیاہ گھنگریالے بال، خاموش باوقار گویا دلبستگی لیے ہوئے۔ دور سے دیکھنے میں زیبندہ و دلفریب قریب سے نہایت شیریں و کمال حسین شیریں کلام۔ واضح الفاظ۔ کلام الفاظ کی کمی و بیشی سے معرا تمام گفتگو پروئی ہوئی موتیوں کی لڑی۔ میانہ قد نہ کوتاہ نہ طویل، زیبندہ نہال کی تازہ شاخ۔ زیبندہ منظر، والاقدر، رفیق ایسے ہر وقت اس کے گرد و پیش رہتے ہیں۔ جب وہ کچھ کہتا ہے چپ چاپ سنتے ہیں۔ حکم دیتا ہے تو تعمیل کے لیے جھپٹتے ہیں۔ مخدوم مطاع نہ کوتاہ سخن نہ فضول گو۔

یہ چہرہ سن کر ام معبد کا شوہر بولا کہ یہ ضرور صاحب قریش ہے میں اسے ضرور ملوں گا[1]

سید سلیمان ندوی کو اصرار ہے کہ یہ روایت ضعیف ہے وہ فرماتے ہیں کہ:

یہ روایت بغوی، ابن شاہین ابن سکن ابن مندہ، طبرانی بیہقی ابونعیم حاکم میں ام معبد کے بھائی حبیش بن خالد کی زبانی مذکور ہے اور حاکم نے نہ صرف یہ کہ اسے صحیح کہا ہے بلکہ اور دیگر طریقوں سے بھی اسے صحیح ثابت کرنے کی کوشش کی ہے مگر معلوم ہے کہ حاکم کے صحیح کہنے کی علماء کی نگاہ میں کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔ چنانچہ حافظ ذہبی نے اس روایت پر تنقید کرتے ہوئے تصریح کی ہے کہ ان میں سے کوئی طریقہ سند صحیح کے شرائط کے مطابق نہیں ہے[2]

افسوس ہے کہ مولانا موصوف کے اس بیان سے محدثین کے اصول کے مطابق ہمیں اتفاق نہیں ہے بڑے بڑے محدثین و مورخین نے اسے اپنی کتابوں میں درج کیا ہے۔ حافظ ابن القیم زاد المعاد میں۔ ابن الاثیر نے نہایہ میں حافظ ابوالقاسم السہیلی نے الروض الانف میں، شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں حافظ عسقلانی نے فتح الباری اور الاصابہ میں۔ حافظ ابن عبدالبر نے الاستیعاب میں ابن سعد نے طبقات میں ہیثمی نے مجمع الزوائد میں، اور بتایا ہے کہ طبرانی نے اسے روایت کیا ہے اور اس کے رجال صحیح ہیں ہشام بن حزام اور ان کے والد دونوں ثقہ ہیں۔ ان کے علاوہ دوسرے محدثین میں امام حاکم نے نہ صرف یہ کہ اس کی تصحیح کی ہے بلکہ لکھا ہے کہ ام معبد کا واقعہ متواتر فی اخبار صحیحۃ۔ باقی رہا حافظ ذہبی کا امام حاکم کی روایت کے بارے میں تبصرہ کہ لیس من ھذہ الطرق علیٰ شرط الصحیح تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ مستدرک کی روایت معتبر نہیں بلکہ مطلب صرف یہ ہے کہ ان طریقوں میں سے کوئی طریقہ اصطلاحی صحت کی شرطوں کے مطابق نہیں ہے۔ صحت

[1] زاد المعاد
[2] سیرۃ النبی ج ۳ ص ۱۷۷

حدیث کی شرطوں پر اگر ایک حدیث بھرپور طریقہ پر پوری نہیں اترتی ہے تو اس کا مطلب ہے کہ اس کا درجہ حسن کا ہے جو صحیح سے کمتر ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ حدیث موضوع ہے۔ امام ذہبی حدیث کا علیٰ شرط الصحیح انکار کر رہے وہ اس کے حسن، ضعیف ہونے کا انکار کر کے اس کے وجود کے منکر نہیں ہیں۔ معتبر نہ ہونے کا مطلب ہے کہ حدیث موضوع ہے۔ یہ بات امام ذہبی نے نہیں فرمائی ہے۔ امام ذہبی محدثین کی اصطلاحی زبان میں بات کر رہے ہیں۔

یہ سفر جاری رہا راستے میں حضرت زبیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے ملاقات ہوئی وہ شام سے تجارتی قافلہ کے ساتھ آ رہے تھے انھوں نے رسول اللہ ﷺ اور حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی خدمت میں سفید کپڑوں کا ایک جوڑا پیش کرتے ہوئے عرض کیا کہ میں بھی قافلے اور مال کو مکہ مکرمہ پہنچاتے ہی ہجرت کر کے آ جاؤں گا۔

حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ بہت سے تجارتی سفر کر چکے تھے اس لیے تجارتی شاہراہوں کے اطراف کے بہت سے لوگ انہیں پہچانتے تھے۔ ان میں سے اتفاقیہ راستے میں کوئی مل جاتا اور پوچھتا کہ آپ کے آگے کون ہے تو حضرت ابوبکرؓ فرماتے رجل یھدینی السبیل (یہ راہ بتانے والا ہے) حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے ذہن میں اس کا مفہوم یہ تھا کہ میرے آپ ہادی ہیں۔ آپ نے مجھے صراط مستقیم بتائی ہے جواب سننے والے سمجھتے کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رستہ بتانے والا ساتھ لیا ہے۔

بریدہ اور ۷۰ حضرات رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا اسلام

اثنائے سفر میں بریدہ اسلمی ملا۔ یہ اپنی قوم کا سردار تھا۔ قریش نے گرفتاری پر ایک سو اونٹوں کا انعام مقرر کیا تھا۔ بریدہ اسی انعام کے لالچ سے حضور اقدس کی تلاش میں تھا۔ جب نبی کریم ﷺ کے سامنے ہوا اور حضور سے ہم کلام ہونے کا موقعہ ملا تو بریدہ ستر آدمیوں سمیت مسلمان ہو گیا اپنی پگڑی اتار کر نیزے پر باندھ لی۔ جس کا سفید پھریرا ہوا میں لہراتا اور بشارت سناتا تھا کہ امن کا بادشاہ، صلح کا حامی دنیا کو عدالت و انصاف سے بھرپور کرنے والا تشریف لا رہا ہے۔

قبا میں ورودِ مبارک

سفر ہجرت میں کل آٹھ دن لگے جن کے نزدیک مکہ سے روانگی یکم ربیع الاول کو ہوئی تھی۔ ان کے حساب کے مطابق رسول اللہ ﷺ ۸ ربیع الاول کو قبا پہنچ گئے۔ جن مورخین نے روانگی کی تاریخ ۴ ربیع الاول بتائی ان کے حساب کے مطابق قبا میں ورود مبارک ۱۲ ربیع الاول کو ہوا۔

کیفیت ورودِ مبارک

تشریف آوری کی خبر پہلے پہنچ چکی تھی۔ تمام شہر ہمہ تن چشم انتظار تھا بچے فخر اور جوش میں کہتے پھرتے تھے کہ پیغمبر ﷺ آرہے ہیں لوگ ہر روز تڑکے سے نکل کر شہر کے باہر جمع ہو جاتے اور دوپہر تک انتظار کر کے حسرت سے واپس چلے جاتے۔ ایک روز انتظار کر کے واپس جا چکے تھے کہ ایک یہودی نے قلعہ سے دیکھا اور قرائن سے پہچان کر پکارا کہ اے اہل عرب لو تم جس کا انتظار کرتے تھے وہ آگیا۔ تمام شہر نعرۂ تکبیر سے گونج اٹھا انصار ہتھیاروں سے سج کر بے تابانہ گھروں سے نکل آئے یہ قبا ہے جو مدینہ میں انصار کی متعدد آبادیوں میں سے ایک آبادی یا بستی تھا۔ اس وقت تمام آبادیوں کے انصار موقع پر موجود نہ ہوں گے۔ کیونکہ اول بظاہر یقین نہ ہوگا کہ حضور اقدس ﷺ سب سے پہلے قبا میں پہنچیں گے دوم تمام آبادیوں سے زیادہ لوگ پہنچ ہی نہ سکتے تھے۔ کیونکہ ان میں سے کچھ زیادہ فاصلے پر تھیں۔ ممکن ہے کہ کچھ اصحاب روزانہ قبا آجاتے ہوں۔

مشیت کی اندازہ فرمائی

حضور اقدس ﷺ دوپہر کے بعد قبا پہنچے ہوں گے کیونکہ اس روز ۸ ربیع الاول کو معمول کے مطابق دوپہر تک انتظار کر کے لوگ واپس جا چکے تھے کوئی اسے بخت و اتفاق سمجھے یا اللہ سبحانہ کی مشیت کی اندازہ فرمائی کہ حضور اقدس ﷺ جس روز قبا پہنچے اس روز نبوت کا تیرہواں سال ختم ہو رہا تھا اور دوسرے روز نئے سال کا آغاز ہونے والا تھا گویا حضور اقدس ﷺ کا ایک دور اس روز پورا ہوا۔ دوسرا دور نئے سال کے پہلے دن سے شروع ہوا۔ نیز دوشنبہ کو حضور اقدس کی سیرۃ طیبہ میں جو خصوصیت حاصل ہے اسے بھی پیش نظر رکھیے۔ آپ دوشنبہ ہی کو اس دنیا میں جلوہ افروز ہوئے۔ دوشنبہ ہی کو منصب نبوت ملا۔ دوشنبہ ہی کو غار ثور سے نکلے۔ دوشنبہ ہی کو قبا پہنچے۔ اور دوشنبہ ہی کو رحلت فرمائے دار بقا ہوئے۔ قبا اس میں مسجد کی تاسیس، جمعہ کا قیام، انشاء اللہ گیارہویں جلد میں آئے گا۔

سنہ ہجری کا ہجرت سے آغاز

تاریخ عالم کا یہ عظیم واقعہ جس کی یاد ہر سال کے انجام و آغاز میں پوشیدہ ہے ہجرت کا واقعہ ہے کیونکہ پہلی محرم سے نیا اسلامی سال شروع ہوتا ہے اور اس کی بنیاد اسی واقعہ ہجرت پر ہے۔

یہ دنیا کی تمام قوموں کی یادگاروں کی طرح طاقت کی کامرانیوں کی یادگار نہیں بلکہ کمزوری کی فتمندیوں کی یادگار ہے:

اسباب و سائل کی فراوانیوں کی یادگار نہیں بے سروسامانیوں میں کامیابیوں کی یادگار ہے۔ یہ طاقت اور حکومت کے جاہ وجلال کی یادگار نہیں بےکسی و بیچارگی میں ثبات و استقلال کی یادگار ہے یہ فتح مکہ کی یادگار نہیں جسے دس ہزار تلواروں کی چمک نے فتح کیا تھا۔ یہ فتح مدینہ کی یادگار ہے جسے تلواروں کی چمک نے نہیں بلکہ ایک نادار و غریب اور بے سروسامان انسان کی روح ہجرت نے فتح کیا تھا۔ تاریخ اسلام کی ساری آنے والی فتح مندیاں اسی ہجرت میں بیج کی طرح پوشیدہ تھیں۔ اسی لیے جب یہاں اہل ایمان کو تسخیر عرب کے بعد پوری دنیا کے لیے جہاد کی ترغیب دی گئی تو اس معنوی فتح مندی کی یاد لوگوں کو دلائی گئی۔ اذ اخرجہ الذین کفروا ثانی اثنین اذ ھما فی الغار الخ۔

اسلام کے ظہور سے پہلے دنیا کی متمدن قوموں میں متعدد سنہ جاری تھے زیادہ مشہور یہودی، رومی اور ایرانی سنہ تھے۔ عرب جاہلیت کی اندرونی زندگی اس قدر متمدن نہ تھی کہ حساب و کتاب کی کسی وسیع پیمانے پر ضرورت ہوتی، اوقات دوام کی حفاظت اور یادداشت کے لیے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لے لیتے اور اس سے وقت کا حساب لگاتے۔ سنین جاہلیت میں عام الفیل یعنی بادشاہ حبش کے حجاز پر حملہ کرنے کا سال عرصہ تک یہی واقعہ عرب کے حساب و کتاب میں بطور سنہ مستعمل رہا۔ ظہور اسلام کے بعد یہ اہمیت خود اسلام کے واقعات نے لی۔

صحابہ کرام کا قاعدہ تھا کہ عہد اسلام کے واقعات میں سے کوئی اہم واقعہ لے لیتے اور اسی کا پیمانہ بنا لیتے۔ ہجرت مدینہ کے بعد ہی سورہ حج کی وہ آیت نازل ہوئی جس میں قتال کی اجازت تھی۔ اذن للذین یقاتلون بانھم ظلموا وان اللہ علی نصرھم لقدیر۔ کچھ عرصہ تک یہی واقعہ حسابی پیمانہ بنا رہا۔ اسے سنہ اذن قتال کہتے تھے۔ اسی طرح سورہ برات نازل ہوئی تو برابر چال میں سنہ برات کا بھی رواج رہا۔ زمانہ نبوت کا آخری واقعہ حجۃ الوداع تھا۔ روایات سے اسی طرح سے متعدد سنوں کا پتا چلتا ہے مثلاً سنۃ التمحیص۔ سنۃ الترفئہ، سنۃ الزلزال، سنۃ الاستیناس۔ علامہ بیرونی نے الآثار الباقیہ میں اس طرح کے دس سنوں لکھے ہیں۔

احساس ضرورت اور مشورہ

اس بارے میں متعدد روایتیں ہیں۔ سب سے زیادہ مشہور روایت میمون بن مہران کی ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ایک مرتبہ ایک کاغذ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے سامنے پیش ہوا جس میں شعبان کا ماہ درج تھا حضرت عمرؓ نے دریافت کیا کہ شعبان سے کونسا شعبان مقصود ہے اس برس کا یا آئندہ برس کا پھر آپ نے سرآوردہ صحابہ کرام کو جمع کیا اور ان سے کہا کہ اب حکومت کے مالی وسائل بہت زیادہ ہو گئے ہیں اور جو کچھ ہم تقسیم کرتے ہیں وہ ایک ہی وقت میں ختم نہیں ہو جاتا لہٰذا ضروری ہے کہ حساب و کتاب کے لیے کوئی ایسا طریقہ اختیار کیا جائے کہ اوقات ٹھیک طور پر منضبط ہو سکیں اس پر لوگوں نے کہا کہ ایرانیوں

سے مشورہ کرنا چاہیے یہاں اس کے طریقے کیا تھا۔ چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے ہرمزان کو بلایا اس نے بتایا کہ ہمارے یہاں ایک حساب موجود ہے۔ جسے ماہ روز کہتے ہیں اسی ماہ روز کی معرب مورخہ ہے۔ پھر یہ سوال سامنے آیا کہ اسلامی تاریخ کا آغاز کہاں سے ہو۔ سب نے اتفاق کیا کہ ہجرت کے سال سے ہو۔

ابن حبان نے قرہ ابن خالد سے ایک دوسری روایت بھی درج کی ہے۔ اس میں ایک دوسرے واقعہ کا ذکر ہے خلاصہ یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پاس یمن سے ایک عامل آیا تھا۔ اس نے کہا کہ لکھنے پڑھنے میں آپ لوگ تاریخ نہیں لکھتے ہیں۔ اس طرح فلاں بات فلاں سنہ میں، سنہ کے فلاں ماہ میں ہوئی۔ اس پر حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور لوگوں کو اس معاملے کا خیال ہوا۔ پہلے انھوں نے ارادہ کیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت سے سنہ کا حساب شروع کر دیں۔ پھر خیال آیا کہ وفات سے شروع کریں۔ لیکن آخر میں یہ رائے قرار پائی کہ ہجرت سے تقرر ہو۔

ان روایات کی مزید تشریح امام شعبی کے اُس بیان سے ہوتی ہے جو محب طبری نے الریاض النضرہ میں نقل کیا ہے کہ:

ابو موسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو لکھا کہ آپ کی جانب سے ہمارے نام خطوط آتے ہیں مگر ان پر کوئی تاریخ نہیں ہوتی اور یہ وقت وہ تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکومت کے مختلف دفاتر قائم کر دیئے تھے اور خراج کے اصول و قواعد طے پا گئے تھے اور اس سے محسوس ہو رہا تھا کہ ضبط اوقات کے لیے ایک تاریخی پیمانہ مقرر ہو پرانی تاریخیں موجود تھیں۔ لیکن وہ پسند نہیں کرتے تھے کہ ان کو اختیار کریں۔ ابو موسیٰ اشعری نے لکھا تو انہیں زیادہ توجہ ہوئی صحابہ کو جمع کر کے مشورہ کیا۔ مشورہ میں سب کی رائے یہی قرار پائی کہ ہجرت کا واقعہ بنیاد قرار دے کر سنہ ہجری اختیار کیا جائے۔

ابو ہلال العسکری نے الاوائل میں اور مقریزی نے تاریخ میں حضرت سعید بن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے نقل کیا ہے کہ واقعہ ہجرت سے سنہ شروع کرنے کی رائے حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے دی تھی۔ وہ کہتے ہیں۔

جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے صحابہ سے مشورہ کیا کہ کس روز سے تاریخ کا حساب شروع کیا جائے تو حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا اس دن سے جس دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہجرت کی اور مدینہ آئے۔

مشہور مورخ یعقوبی نے بھی یہی لکھا ہے۔ ۱۶ھ کے واقعات میں لکھتا ہے کہ:

اسی زمانے میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ارادہ کیا کہ ضبط تحریر کے لیے ایک تاریخ مقرر ہو۔ پہلے ان کو خیال آیا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت سے شروع کریں۔ پھر خیال آیا کہ آپ کی وفات سے آغاز کیا جائے پھر رائے ہوئی کہ حضور کی بعثت سے ابتداء ہو لیکن حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے رائے دی کہ ہجرت سے شروع کرنا چاہیے۔

۱۔ اس بارے میں دنیا کی قوموں کا طریقہ ان کے سامنے آیا اور خود انہیں بھی یہ بات صاف نظر آئی کہ حضور اقدس کی پیدائش یا بعثت کو

اپنی ملی تاریخ کی بنیاد ٹھہرائیں لیکن چونکہ یہ بات اس معیارِ نظر سے ہٹی ہوئی جو اس قسم معاملات میں اسلام نے قائم کیا تھا اس لیے نہایت واضح اور صاف ہونے پر بھی ان کی طبیعت کو مطمئن نہ کر سکی وہ ایسا محسوس کرنے لگے کہ کوئی دوسری بات ہونی چاہیے وہ دوسری بات کیا تھی؟ ہجرت کا واقعہ۔ جونہی یہ بات سامنے آئی سب کے دلوں نے قبول کر لی تاریخ کا یہ مبدا دنیا کی تمام تاریخوں اور یادگاروں کے خلاف تھا۔ صرف خلاف ہی نہ تھا بلکہ صریح الٹا تھا۔ دنیا کی تمام قومیں فتح اقبال سے اپنی تاریخ شروع کرتی ہیں لیکن صحابہ نے بیچارگی سے اپنی تاریخ کا آغاز کیا۔ بلا شبہ ان کی یہ سمجھ دنیا کی قوموں کے مقابلے میں الٹی تھی لیکن اس سمجھ کے عین مطابق تھی جو اسلام کی تربیت میں ان میں پیدا کر دی تھی۔ انھوں نے اپنی اجتماعی زندگی کی تعمیر قوموں کی تقلید سے نہیں بلکہ قرآن کی روح سے کرنا چاہی تھی۔ قرآن نے واقعہ ہجرت کا ذکر یہاں اس طریقہ پر کیا ہے جس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ بے سروسامانی و غربت کے اس عمل ہی میں فتح و نصرت اور پورے عالم میں کامیابی کی سب سے بڑی معنویت پوشیدہ تھی ثانی اثنین اذ ھما فی الغار۔ یہ سورت یعنی سورۃ برأت اس وقت نازل ہوئی جب اسلام فاتح کی حیثیت حاصل کر چکا تھا۔ معلوم ہوا کہ ساری فتح مندیوں کے باوجود اس کی ضرورت تھی کہ واقعہ ہجرت کی یاد دلائی جائے حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اس پر مبسوط مقالہ لکھا ہے۔ میں نے اسی کا خلاصہ معالم میں پیش کر دیا ہے۔

انْفِرُوْا خِفَافًا وَّثِقَالًا وَّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِكُمْ
وَاَنْفُسِكُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۭ ذٰلِكُمْ خَيْرٌ لَّكُمْ اِنْ كُنْتُمْ
تَعْلَمُوْنَ ﴿۴۱﴾ لَوْ كَانَ عَرَضًا قَرِيْبًا وَّسَفَرًا قَاصِدًا
لَّاتَّبَعُوْكَ وَلٰكِنْۢ بَعُدَتْ عَلَيْهِمُ الشُّقَّةُ ۭ وَسَيَحْلِفُوْنَ
بِاللّٰهِ لَوِ اسْتَطَعْنَا لَخَرَجْنَا مَعَكُمْ ۚ يُهْلِكُوْنَ اَنْفُسَهُمْ ۚ
ع ۶ ۱۲ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۴۲﴾

مسلمانو! ساز و سامان سے ہلکے ہو یا بوجھل نکل کھڑے ہو اور راہ خدا میں اپنے مالوں اور جانوں سے جہاد کرو۔ اگر تمہیں اپنے نفع و نقصان کا علم ہے تو یہی تمہارے حق میں بہتر اور مفید ہے[۴۱]۔ اے پیغمبر اگر قریب الحصول فائدہ اور متوسط درجہ کا سفر ہوتا تو یہ لوگ بلاشبہ تمہارے پیچھے پیچھے چلتے لیکن ان کو مسافت دور معلوم ہوتی ہے[۴۲]۔ اور آپ کے روبرو ضرور خدا کی قسم کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم جا سکتے تو ضرور تمہارے ہمراہ جاتے۔ وہ قسمیں کھا کر اپنے کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں[۴۲]۔

مفردات کے معانی

خفاف جمع خفیف کی ہلکا، سبک، خفت سے بنا ہے جس کے معنے ہلکا ہونے کے ہیں بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ خفیف ثقیل کے مقابلہ پر بولا جاتا ہے ان دونوں کا استعمال حسب ذیل معنی میں ہوتا ہے۔ ا۔ وزن کے اعتبار سے

ایک کو خفیف دوسرے کو ثقیل کہتے ہیں۔

۲۔ زمانہ کی مناسبت سے چنانچہ ایک مقررہ وقت میں ایک گھوڑا دوسرے گھوڑے سے زیادہ دوڑے تو کہتے ہیں۔ فرس خفیف، فرس ثقیل۔

۳۔ جو لوگوں کو بھلا لگے اس کو خفیف اور جو لوگوں کو بُرا لگے اس کو ثقیل (گراں) کہتے ہیں۔

۴۔ جو طیش میں آجائے اسے خفیف کہتے ہیں اور جس میں وقار ہو اسے ثقیل کہتے ہیں۔

۵۔ جن اجسام کا رُخ اوپر کی جانب ہو جیسے آگ خفیف اور جن کا رُخ نیچے کی جانب ہو جیسے پانی ثقیل کہلاتے ہیں ثقالاً۔ ثقیل کی جمع ہے صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔ آیت میں لغوی معنے نہیں۔ مرادی معنے مراد ہیں دونوں خفاف اور ثقال مرادی معنے ہیں یہں کچھ کہتے ہیں کہ جوان اور بوڑھے مراد ہیں کچھ تونگر اور مفلس مراد لیتے ہیں، کچھ مسافر اور مقیم کہتے ہیں اور کچھ چست اور سست بتاتے ہیں اور حقیقت یہ ہے کہ سب ہی مراد ہیں۔ کیونکہ آیت کا مقصود جہاد فی سبیل اللہ میں نکلنے کی دعوت ہے کہ ہر حال میں اللہ کی راہ میں نکلنا چاہیے۔ خواہ دشواری اٹھانی پڑے یا آسانی ہو۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ یعنی درحالیکہ اسباب وحشم بسیار دارید یا بجز قدر ضروری بدست شما نباشد وباین توجیہہ آیت محکم باشد غیر منسوخ۔ شقہ مسافت امام راغب نے شقہ کے معنے اس سمت کے لکھے ہیں جہاں پہنچنے تک مشقت لاحق ہو۔ ایسا راستہ جو بغیر محنت ومشقت کے طے نہ ہو۔

جہاد کے لیے نکل جانے کا حکم

دینی اور ملی ضرورتوں کے لحاظ سے جہاد ہمیشہ ایک ہی اہمیت نہیں رکھتا ہے بلکہ کبھی تو وہ محض ایک فضیلت اور عزیمت کا کام ہوتا ہے اور کبھی دین کا لازمی تقاضا اور ایمان کی ضروری علامت ہوتا ہے اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جس وقت دشمن کے مقابلے میں عام لام بندی کی ضرورت نہ ہو بلکہ کچھ لوگ بھی اس مہم کو سر کر لینے کے لیے کافی ہوں اس وقت یہ جنگی خدمت صرف ایک فضیلت کا کام ہوگی۔ اس خدمت کا انجام دینے والا اگرچہ بڑے اجر وثواب کا حقدار ٹھہرے گا۔ اور اس پر وہ ساری نوازشیں ہوں گی جن کا قرآن وسنت میں ذکر ہے مگر جو اس خدمت میں شریک نہ ہوگا تو کچھ کے اس فریضہ کو ادا کر لینے سے اس پر کوئی الزام عائد نہ ہوگا۔ ایسے ہی مواقع کے لیے قرآن میں کہا گیا ہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ کے وعدہ مغفرت کے مستحق دونوں ہیں لیکن گھر بیٹھے رہنے والوں کے مقابلے میں لڑنے والوں کا مرتبہ بہت اونچا ہے۔

وفضل اللہ المجاہدین باموالھم وانفسھم علی القاعدین درجہ وکلا وعد اللہ الحسنیٰ

لیکن جس وقت صورتحال یہ نہ ہو بلکہ امیر المومنین نے ضرورت محسوس کر کے عام لام بندی کا اعلان کر دیا ہو اس وقت یہ جنگی خدمت صرف فضیلت کی چیز نہیں رہ جاتی بلکہ دین کا ضروری تقاضا اور ایمان کی کسوٹی بن جاتی ہے۔ دور نبوت میں جن لوگوں نے نبوت کی جانب سے اعلان عام کے باوجود نکلنے میں ڈھیل دکھائی ان کو بھی اس رکوع میں مالکم اذا قیل لکم انفروا سے مخاطب کیا گیا ہے۔ اور ان ہی لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ جب نکلنے کا حکم ہو چکا ہے بہرحال تم کو نکلنا چاہیے خواہ برضا و رغبت خواہ بکراہت خواہ خوشحالی میں ہو خواہ تنگ دستی میں خواہ حالات موافق ہوں یا ناموافق۔

(۴۴) مسلمانو ساز و سامان سے ہلکے ہو یا بوجھل نکل کھڑے ہو اور راہ خدا میں اپنی جانوں اور مالوں سے جہاد کرو اگر تمہیں اپنے نفع اور نقصان کا علم ہے تو یہی تمہارے حق میں بہتر اور مفید ہے یعنی پیادہ اور سوار فقیر اور غنی، جوان اور بوڑھے، جس حالت میں ہوں نکل کھڑے ہوں۔ نفیر عام کے وقت کوئی عذر پیش نہ کریں[1]۔ خفافا اور ثقالا دو متقابل لفظ ہیں ان کی مختلف اور متعدد تفسیریں آتی ہیں مثلاً تنگدست اور خوشحال جوان تیز رو۔ پیر سست رفتار بیکار اور مشغول بے سروسامان اور باسامان، خوشدلی سے بے دلی سے مقصود بہرحال عموم حکم ہے کہ جس حال میں بھی ہو جہاد کے لیے نکل پڑو۔ حافظ ابن جریر نے متعدد تفسیریں نقل کر کے قول فیصل یہ لکھا ہے کہ خفاف کے تحت وہ سب داخل ہیں جنہیں قوت خوشحال صحت جوان عمری بے شغلی غرض کسی بنا پر آسانیاں حاصل ہوں۔ اور ثقال کے تحت وہ سب آجاتے ہیں جنہیں اس کے برعکس مذکورہ بالا اوصاف میں دشواریاں لاحق ہوں اور اسی کے قریب قریب حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ مسلمانوں پر ہر حال میں نکلنا ضروری ہے جی چاہے یا نہ چاہے فراخی ہو یا تنگی۔ علامہ قرطبی نے خفاف اور ثقال پر دس اقوال لکھے ہیں۔ حق یہ ہے کہ استعداد اور کم استعداد کی تمام حالتیں اس میں داخل ہیں نوجوان نکل چلنے میں ہلکا ہوتا ہے۔ زیادہ عمر کا آدمی بوجھل ہوتا ہے سرگرم آدمی فوراً اٹھ کھڑا ہوگا۔ کسل مند کے قدم بوجھل ہوں گے جس کے علائق زیادہ ہیں وہ اپنے کو اتنا ہلکا نہ پائے گا جتنا ایک مجرد آدمی یا کم علائق رکھنے والا۔ اسی طرح کوئی سر و سامان سفر سے ہلکا ہوگا کوئی اسلحہ جنگ سے اس طرح کی ساری صورتیں اس میں داخل ہیں۔ صحابہ کرام نے اس آیت سے یہی سمجھا ہے جب کبھی جنگ کا اعلان ہو جاتا تو کسی حال میں بھی وہ اپنے کو شرکت سے معاف نہیں رکھتے تھے الا یہ کہ قطعاً عاجز و معذور ہوں۔

ابو راشد حرانی کہتے ہیں میں نے مقداد بن اسود کو حمص میں دیکھا جنگ کے لیے نکل رہے تھے میں نے کہا کہ خدا نے تمہیں معذور ٹھہرا دیا ہے یعنی بوڑھے ہو بولے انفروا خفافا و ثقالا کا کیا جواب ہے۔

حبان بن زید شرعبی سے مروی ہے کہ میں نے افسس جاتے ہوئے فوج میں ایک نہایت بوڑھے آدمی کو دیکھا جس کی بھویں آنکھوں پر آ گری تھیں میں نے حیرت سے کہا کہ کیا خدا نے معذوروں کو معاف نہیں کر دیا ہے اس نے کہا کہ خدا نے تو ہمیں

[1] افادات شیخ الاسلام

ہر حال میں نکل کھڑے ہونے کا حکم دیا ہے خفافا و ثقالا۔ ابوایوب انصاری سے بھی ایسا ہی مروی ہے۔

یہ آیت اس موضوع پر قطعی ہے کہ جب جہاد کے لیے بلایا جائے اور نفیر عام ہوجائے تو سوائے ان معذروں کے جن کا
ذکر پارہ کے آخر میں آرہا ہے کوئی مستثنیٰ نہیں اور ہر شخص پر واجب ہوجاتا ہے کہ جان و مال سے شریک جہاد ہو۔ اور اس
ارے میں کوئی عذر مسموع نہیں ہے۔

جیسے پڑھ آئے ہو کہ غزوہ تبوک کی مہم حضور اقدس ﷺ کی جانب سے ایک دفاعی مہم تھی۔ جب حضور اقدس کو
مختلف ذرائع سے قیصر روم کے اقدام کی تصدیق ہوگئی تو حضور اقدس ﷺ نے دفاع کا اعلان فرمادیا اور اس کے لیے آپ نے
حجاز کی شمالی سرحد کو منتخب کیا۔ دفاع اسلام کے ان بنیادی حکموں میں سے ہے جس کو ایک مسلمان، مسلمان رہ کر کبھی ترک نہیں
کرسکتا ہے اگر ایک مسلمان کے دل میں رائی برابر بھی ایمان کی محبت ہے تو اس کی طاقت سے باہر ہے کہ دفاع کی صدائے حق سُنے
اور از سرتاپا کانپ اُٹھے۔

جہاد کی بہت سی قسموں میں سے ایک قسم قتال یعنی لڑائی ہے اور اس کی بھی دو قسمیں ہیں۔ اقدامی اور دفاعی۔ اقدام کی
بنیاد ہی دفاع پر ہے یعنی جب تک دنیا میں عالمگیر صلح و امن اور عام اخوت قائم نہ ہوجائے ضروری ہے کہ حریف و مفسد قوتوں
سے ہمیشہ مقابلہ کیا جائے اگر ایسا نہ کیا جائے تو دشمن اہل ایمان کو چین سے نہ بیٹھنے دیں گے اور اسلام کی اشاعت اور اس کے
مشن کی تبلیغ میں ہمیشہ رکاوٹ بنیں گے۔

فرائض شرعیۃ کی دو قسمیں

فقہاء کی اصطلاح میں فرائض شرعیہ کی دو قسمیں ہیں کفایہ اور عین یہ وہی اعمال انسانی کی تقسیم ہے جس کو جماعتی فرائض اور
شخصی فرائض کے ناموں سے پکارا جاتا ہے فرض کفایہ سے مقصود وہ احکام ہیں جو بحیثیت جماعت و اجتماع مسلمانوں پر فرض ہیں
نہ کہ بحیثیت فرد و انفراد یعنی ایسے فرائض جو مسلمان جماعتوں اور آبادیوں کے ذمے عائد کردیئے گئے ہیں کہ ان کا انتظام کردیں بس
انتظام ہونا چاہیے۔ یہ ضروری نہیں کہ ہر فرد بہ ذات خاص اس میں حصہ بھی لے۔ اگر ایک گروہ نے ایک وقت میں انجام دے
دیا تو باقی مسلمانوں سے ساقط ہوگیا جیسے تجہیز و تکفین میت اور نماز جنازہ۔ فرائض کفایہ میں شریعت کے مخاطب اشخاص نہیں بلکہ
جماعت ہے۔ ہر مسلمان پر جماعت کی ذمہ داری ہے کہ یہ کام کرے جب کام ہوجاتا ہے، تو باقی افراد پر اس کا وجوب نہ رہے گا۔
دوسری قسم اعیان کی ہے یعنی وہ فرائض جن کی فرضیت جماعت پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان پر عائد ہوتی ہے اور ایک کے
کرنے سے دوسرا بری الذمہ نہیں ہوتا ہے جیسے پانچ وقت نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج۔
شرعاً قتال کی پہلی صورت یعنی اقدام و ہجوم فرض کفایہ ہے۔ ضروری نہیں کہ بیک وقت ہر مسلمان اس میں حصہ لے۔ ہر عہد

اور ہر ملک میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو یہ فرض انجام دیتی رہے اس پر تبصرہ انشاء اللہ پارہ ۱۱ میں زیر تشریح آیت وماکان المومنون لینفروا کافۃ میں آئے گا۔

دوسری قسم دفاع ہے یعنی جب کوئی غیر مسلم جماعت مسلمانوں کی آبادیوں پر اور حکومتوں پر حملہ کا ارادہ کرے تو اس کو ہر طرح مقابلہ کر کے روکنا اور اسلامی ملکوں اور آبادیوں کو غیر مسلموں کے تسلط اور ہر طرح کے قبضہ و اثر سے محفوظ رکھنا۔ یہ فرض عین ہے نماز روزے کی طرح ہر مسلمان سے اس کی پابجائی کا مطالبہ ہے۔ ایک گروہ کے دفاع کرنے سے باقی مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے۔ جس طرح ایک گروہ کے نماز پڑھ لینے سے باقی مسلمانوں کے ذمہ سے نماز ساقط نہیں ہوتی۔

ہدایہ میں ہے۔

الا ان یکون النفیر عامًا فحینئذ یصیر من الاعیان۔

لیکن جس وقت نفیر عام ہو جائے جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔

نفیر نفر سے ہے۔ نفر کے معنے تیزی کے ساتھ ایک جگہ سے دوسری جگہ جانے کے ہیں۔ ایسے لائے اور اجتماع پر جو لڑائی کے لیے ہو نفیر کا اطلاق ہوتا ہے۔ انفروا خفافًا و ثقالاً کا مطلب یہ ہی ہے کہ اگر دفاع کی ضرورت عام اجتماع و قیام کا وقت آ جائے تو جنگ کرنا ہر مسلمان پر فرض ہے۔ حافظ ابن الہمام نے فتح القدیر میں ہدایہ کی عبارت کی شرح اس طرح کی ہے۔

فرض کفایہ کی صورت اس وقت ہے کہ نفیر عام نہ ہو لیکن اگر مسلمانوں کے کسی شہر پر غیر مسلموں نے حملہ کر دیا تو اس وقت جنگ کرنا ہر مسلمان فرد پر فرض عین ہو جائے گا چاہے جنگ کے لیے دعوت دینے والا عادل ہو یا فاسق ہو۔

اور عنایہ میں ہے:

اگر نفیر عام کی صورت ہو تو پھر جہاد کرنا ان مسلمانوں پر فرض ہو جائے گا جو دشمن سے قریب ہوں اور اس پر قابو رکھتے ہوں۔

اور اقدامی جہاد میں جب کہ جہاد فرض کفایہ ہوتا ہے کچھ جماعتیں مستثنی ہیں۔ مثلاً عورتیں اور نوکر لیکن اگر دفاع کی صورت پیش آ جائے تو فرضیت ایسی ہمہ گیر ہوتی ہے کہ بچوں اور معذوروں کے سوا کوئی گروہ کوئی فرد مستثنی نہیں ہو سکتا۔ بیوی شوہر کی اجازت کے بغیر نوکر بغیر آقا کی اجازت کے مشغول جہاد ہو جائے۔ آیت کا یہی تقاضا اور ایمان کی یہی پکار ہے۔

یہ سب فقہاء کی تصریح ہے۔ امام بخاری نے باب باندھا ہے

وجوب النفیر یعنی جب حفظ ملت کی ضرورت پیش آ جائے تو قتال کے لیے سب کا اٹھ کھڑے ہونا واجب

ہے اور قرآن کی اسی آیت سے استدلال کیا ہے انفروا خفافا وثقالا۔ اس کے بعد حضرت عبداللہ ابن عباس کی یہ روایت پیش کی ہے۔ لاھجرۃ بعد الفتح ولکن جھاد ونیۃ فاذا استنفرتم فانفروا فتح مکہ کے بعد قانونی ہجرت کوئی نہیں بس اب تو جہاد اور نیت جہاد ہے لہذا جب تمہیں اٹھ کر چلنے کو کہا جائے اٹھ کر چل دو۔ یعنی جب تمہیں دعوت دی جائے جہاد کرو ــــــ فتح الباری میں ہے۔

جب ضرورت پیش آئے مثلاً دشمن حملہ آور ہو جائے جسے امام متعین کرد ے اس پر فرض ہے۔

موطا امام مالک میں ہے۔

جب دشمن ہمارے شہروں پر حملہ آور ہوں اور امام مسلمانوں کو دعوت جہاد دے تو نفیر عام کے وقت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔

یہاں اس شبہ کو بھی دور کر دیجئے کہ پہلی آیت میں ارشاد ہوا ہے اذا قیل لکم انفروا جب تم سے کہا جائے کہ نکلو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نکلنے کو کہا جائے تب نکلو۔ لیکن اس آیت انفروا خفافاً و ثقالاً کا مطالبہ یہ ہے کہ بلانے والا بلائے یا نہ بلائے ہر حال میں جہاد کے لیے نکل جاؤ۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ نفیر عام سے مقصود کیا ہے؟ یہ مقصود ہے کہ دفاع کی ضرورت پیش آجاتے اور ہر شخص کو اس کا علم ہو جائے یا یہ مقصود ہے کہ جب تک کوئی بلانے والا مسلمانوں کو نہ بلائے گا نفیر عام کی حاجت پیدا نہ ہوگی اس کا جواب شاہ ولی اللہ نے موطا کی شرح میں یہ دیا ہے۔

استنفار کے وقت جہاد مسلمانوں پر فرض عین ہو جاتا ہے استنفار کی حقیقت یہ ہے کہ کفار بلاد مسلمین کا ارادہ کریں مسلمانوں اور کافروں کے درمیان جنگ چھڑ جائے بس یہی استنفار ہے۔

شاہ صاحب کے بیان سے ظاہر ہو گیا کہ نفیر کی صورت کیا ہے۔ یہ ضروری نہیں کہ کوئی شخص دعوت دے مقصود یہ ہے کہ ایسی حالت پیدا ہو جائے جو نفیر کی متقاضی ہو۔ ابوبکر الجصاص نے احکام القرآن میں اس مسئلہ کو پوری قوت سے سمجھایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ:

یہ سب مسلمانوں کے اعتقاد میں جانی بوجھی بات ہے کہ جب ملک کی بارڈر پر دشمن کا خطرہ ہو اور بارڈر والوں میں تاب مقاومت نہ ہو تو پوری امت پر جہاد فرض ہے۔ اس موضوع پر دو رائیں نہیں ہیں۔ اختلاف تو صرف اس میں ہے کہ جب دشمن کے مقابلے میں بھرپور طاقت مسلمانوں کی موجود ہو اور دشمن کے غالب آنے کا کوئی اندیشہ نہ ہو تو کیا مسلمانوں کے لیے جہاد نہ کرنے کی اجازت ہے یا نہیں۔ عبداللہ بن عمر، عطاء، عمرو بن دینار اور ابن شبرمہ کی رائے میں گنجائش ہے۔ مقداد بن الاسود، ابو طلحہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما صحابہ اور تابعین اور احناف یہ کہتے ہیں مسلمانوں پر جہاد فرض ہے تاآنکہ وہ اسلام قبول کر لیں یا جزیہ دیں۔

جہاد بالمال کا حکم

یہاں یہ بات بھی ملحوظ رہے کہ اس آیت میں اور دوسری آیات میں جانوں کے ساتھ ساتھ مالوں سے بھی جہاد کرنے کا حکم ہے قرآن میں مالی جہاد پر تنبیہ و تاکید کے متعلق بکثرت آیات میں بلکہ مشکل کہیں جہاد کا حکم ہو گا جہاں جہاد بالمال کا ذکر نہ ہو اور قابل ذکر امر یہ کہ ان میں سے ہر ایک موقع پر جان کے جہاد پر مال کے جہاد کو مقدم کیا گیا ہے۔ میدان جنگ میں ذاتی اور جسمانی شرکت ہر شخص کے لیے ممکن نہیں ہے لیکن مالی شرکت ہر ایک کے لیے آسان ہے۔ جسمانی جہاد یعنی لڑائی کی ہر وقت ضرورت پیش نہیں آتی ہے۔ لیکن مالی جہاد کی ہر وقت ہر آن ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کی کمزوری یہ ہے کہ مال کی محبت اس کی جان کی محبت پر اکثر غالب آجاتی ہے اس لیے مال کو جان پر مقدم رکھ کر ہر قدم پر انسان کو اس کی کمزوری پر ہشیار کیا گیا ہے۔

نفاق اور اخلاص میں امتیاز

(۴۵) اے پیغمبر اگر قریب الحصول فائدہ اور متوسط درجہ کا سفر ہوتا تو یہ لوگ بلاشبہ تمہارے پیچھے پیچھے چلتے لیکن ان کو مسافت دور معلوم ہوتی ہے۔ یہ منافقین کو کہا کہ اگر سفر ہلکا ہوتا اور بے محنت مالِ غنیمت ہاتھ آنے کی توقع ہوتی تو جلدی سے ساتھ ہو لیتے لیکن ایسی کٹھن منزلوں کا طے کرنا ان سے کہاں ممکن ہے [1]

اس آیت قرآنی سے سلسلہ بیان ان منافقین کی طرف متوجہ ہوا ہے جن کے لیے غزوہ تبوک کا معاملہ ایک آخری اور فیصلہ کن آزمائش ثابت ہوا تھا۔ اس نے تظاہر اور نمائش کے سارے پردے چاک کر دیئے یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرام اس سورت کو الفاضحہ کے نام سے بھی پکارتے تھے کیونکہ اس سورت نے منافقوں کے بھید کھول کر ان کی فضیحت کر دی تھی۔

غزوہ احد کے ذکر میں سورہ آل عمران میں پڑھ چکے ہو کہ ما کان اللہ لیذر المومنین علی ما انتم علیہ حتی یمیز الخبیث من الطیب۔

ایسا نہیں ہو سکتا کہ اللہ اہل ایمان کو اسی حالت میں چھوڑ دے جس حالت میں تم ہو وہ ضرور پاک لوگوں کو ناپاک لوگوں سے الگ کرے گا۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے بتایا ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جنھوں نے اسلام کا گھونٹ پیا ہے لیکن ان کے حلق کے نیچے نہیں اترا ہے۔ کسی تعلیم کے اختیار کر لینے کے بعد یقین و عمل کی جو روح پیدا ہونی چاہیے اس سے یک قلم محروم ہیں۔ اخلاص و صداقت کے لیے ان میں کوئی جگہ نہیں ہے اسلام کے جو احکام ان کی شخصی اغراض کے موافق ہیں ان پر خوش خوش عمل کرنے

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں۔ جو ان کی اغراض کا ساتھ نہیں دیتے ان سے بھاگنا چاہتے ہیں۔ جب کبھی خوشحالیوں کا موقعہ ہوتا ہے تو وہ دعویٰ اسلام میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں لیکن قربانیوں کے موقعہ پر آخری صفوں میں ہوتے ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ ہیں کہ ایمان قبول کر لینے کے بعد ان کی ایمانی محبت کا حال یہ ہے کہ انہوں نے راہ حق میں مصیبتیں جھیلی ہی نہیں ہیں بلکہ دل کی پوری خوشنودی اور روح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگیاں اس میں بسر کر ڈالیں۔

اب تک یہ دونوں ملے جلے تھے خام پختہ خبیث اور طیب مخلص اور منافق۔ کھرا اور کھوٹا اللہ نے اعلان فرمایا کہ اللہ کھرے کو کھوٹے سے منافق کو مخلص سے ممتاز کر کے آشکارا کر دے گا۔ چنانچہ یکے بعد دیگرے ایسے مرحلے پیش آتے رہے ہیں جن میں نفاق کے چہروں کو بے نقاب ہونا پڑا۔ اس سلسلے کا آخری مرحلہ غزوہ تبوک ہے۔

سن چکے ہو کہ اس موقعہ پر ناموافق حالات سے عام مسلمانوں کی سرگرمیاں بھی ابتداء میں کچھ ادھر ہی رہی تھیں لیکن منافقوں کی حالت بالکل دوسری تھی۔ یہ حکم ان کے لیے پیام موت سے بھی زیادہ سخت ہوا لگے حیلے بہانے کرنے۔ ہر شخص ایک نیا بہانہ گھڑ کر لاتا اور کہتا کہ ویسے تو مجھے کوئی عذر نہیں مگر مشکل یہ ہے کہ فلاں کام ضروری آن پڑا ہے۔ فلاں بات ناقابل برداشت ہو رہی ہے فلاں الجھاؤ سلجھایا نہیں جا سکتا اب جیسا آپ کا حکم ہو۔ مقصود یہ تھا کہ جھوٹی سچی مجبوریاں سنائیں گے تو حضور اقدس کا اخلاق ایسا نہیں ہے کہ کسی کو مجبور کر کے لے جانا چاہیں۔ ان کی رافت و رحمت ہمیشہ رسی ڈھیلی چھوڑ دیتی ہے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا حضور اقدس ﷺ ان کے حیلے بہانے سنتے اور یہ دیکھ کر کہ بخوشی چلنے کے لیے تیار نہیں کہہ دیتے کہ اچھا تمہیں رخصت ہے

اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں انہی واقعات کی طرف اشارہ فرمایا ہے ارشاد ہے کہ اگر کوئی ایسی بات ہوتی کہ فوری فائدہ دکھائی دیتا اور سفر بھی دور کا نہ ہوتا تو ان کے نفاق کو چھپنے کی آڑ مل جاتی جیسے بار بار مل چکی ہے یہ فوراً تیرے پیچھے قدم اٹھا دیتے۔ ظاہری حکم کی تعمیل کرتے۔ دل میں دنیا کا لالچ اور مکر و عذر کی چالیں ہوتیں۔ چنانچہ احد میں ایسا ہی ہوا تھا مگر انہیں مشکل یہ آ پڑی کہ معاملہ نکل آیا ہے عرب سے باہر دور دراز کا اور سفر کی مشقتیں بڑی سخت ہیں۔ نہ تو دنیا کے نفع قریب کی توقع نہ قریب مقام کی سہولت بے بس ہو گئے اور نمائش کے طور پر بھی ساتھ نہ جا سکے۔ اللہ کی طرف سے بھی فیصلہ کن آزمائش تھی جس نے چوراہے میں سارا بھانڈا پھوڑ دیا اور جب کبھی راہ حق میں آزمائش آ جاتی ہے تو منافقوں کے چہرے اسی طرح بے نقاب ہوتے ہیں۔

یہ بہانہ ساز لوگ جھوٹے ہیں

(۴۲) اور مسلمانوں کے روبرو ضرور خدا کی قسم کھا کر کہیں گے کہ اگر ہم جا سکتے تو ضرور تمہارے ہمراہ جاتے وہ قسمیں کھا کر اپنے کو ہلاکت میں ڈال رہے ہیں اللہ خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں یا تو نکلنے سے پہلے قسمیں کھا کر طرح طرح کے حیلے حوالے کریں گے کہ اب ان کو مدینہ میں ٹھہرے رہنے کی اجازت دے دیں یا واپسی پر جھوٹی قسمیں کھا کر باتیں بنائیں گے تاکہ اپنے نفاق پر پردہ

ڈالیں۔ حالانکہ خدا سے ان کا جھوٹ اور نفاق پوشیدہ نہیں رہ سکتا۔ یہ نفاق و فریب دہی اور جھوٹی قسمیں کھانا انجام کار ان ہی کے حق میں وبالِ جان ہوگا۔ [1]

پہلی آیت میں مخاطب حضور اقدس ﷺ تھے۔ اس آیت میں مخاطب مسلمان ہیں۔ اگر سورہ براءت کا نزول تبوک کے بعد ہوا ہے تو بلاشبہ ان کی یہ بات واپسی پر ہے۔ ماضی کے صیغوں سے تعبیر کا تقاضا بھی یہی ہے کہ یہ بات انھوں نے مسلمانوں سے بعد کو کہی ہے کہ اگر غزوہ تبوک میں جانے کی ہم میں طاقت ہوتی تو ہم تمہاری ہمرکابی میں ضرور تبوک جاتے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ یہ جھوٹ ہے اور جھوٹ ہی ان کی ہلاکت کا سبب ہے۔ اسی لیے حضور اقدس ﷺ نے جھوٹ کو منافق کی نشانی قرار دیا ہے فرمایا کہ منافق کی نشانیاں تین ہیں۔ جب کہے جھوٹ بولے، جب وعدہ کرے پورا نہ کرے۔ اور جب امین بنایا جائے تو خیانت کرے۔ [2] لفظوں میں تو یہ تین باتیں ہیں۔ لیکن حقیقت میں ایک ہی شکل کی تین مختلف صورتیں ہیں۔ جھوٹ بولنا تو جھوٹ ہی ہے مگر وعدہ کرکے پورا نہ کرنا بھی جھوٹ ہی ہے اور اسی طرح امین بن کر خیانت کرنا بھی عملی جھوٹ ہے کیونکہ جو امین بنتا ہے وہ معنیً اپنی نسبت یہ یقین دلاتا ہے کہ وہ اس میں خیانت نہ کرے گا اور جب اس نے اس کے خلاف کیا تو وہ عملاً جھوٹ بولا۔ جھوٹ اکیلی برائی نہیں بلکہ اس کی وجہ سے جھوٹے میں بیسیوں قسم کی برائیاں بھی لازمی طور پر پیدا ہوجاتی ہیں اسی لیے قرآن میں اللہ تعالیٰ نے کاذب کے ساتھ دوسری برائیوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ افاك اثيم جھوٹ بولنے والا۔ گنہ گار —— کاذب کفار جھوٹا احسان کا حق نہ ماننے والا مسرف کذاب بے باک جھوٹا۔

علامہ قرطبی نے آیت کا مطلب یہ بتایا ہے کہ تبوک میں نہ جانے والے جب مسلمان تبوک کی مہم سے واپس آئے ان سے کہنے لگے کہ اگر ہمارے پاس سواری کا جانور اور سرمایہ ہوتا تو ہم بھی تمہارے ساتھ جاتے۔ حالانکہ یہ لوگ جھوٹ بول کر اپنے کو تباہ کر رہے ہیں خدا خوب جانتا ہے کہ یہ لوگ اپنی حیلہ جوئیوں اور بہانہ سازیوں میں جھوٹے ہیں۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے بتایا ہے کہ یہ لوگ جہاد سے واپسی پر مسلمانوں کو قسمیں کھا کر بتا رہے ہیں کہ بخدا اگر ہمارے بس کی بات ہوتی تو ہم بھی ضرور جاتے۔ اللہ سبحانہ فرماتے ہیں کہ یہ لوگ جھوٹ کی وجہ سے ہلاک ہو رہے ہیں یہ دلیل ہے اس بات کی کہ جھوٹی قسمیں ہلاکت لاتی ہیں یہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں کہ استطاعت نہ تھی۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں مسلمانو! جب تبوک سے تم واپس ہوگئے تو تمہارے سامنے یہ پیچھے رہنے والے قسمیں کھا کر کہیں گے کہ اگر ہمیں عذر نہ ہوتا تو ہم بھی تبوک میں جاتے۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ: یہ لوگ تبوک سے واپسی کے وقت عذر باتیں بنائیں گے اور کہیں گے کہ بخدا اگر ہمارے کچھ بھی بس میں ہوتا تو ہم ضرور ساتھ جاتے وہ جھوٹی قسمیں کھا کر اپنے کو تباہی کے گڑھے میں ڈال رہے ہیں۔ سب شارحین قرآن نے اسی کے قریب قریب اس آیت کی تشریح کی ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

[2] صحیح بخاری

عَفَا اللّٰهُ عَنْكَ ۚ لِمَ اَذِنْتَ لَهُمْ حَتّٰى يَتَبَيَّنَ لَكَ
الَّذِيْنَ صَدَقُوْا وَتَعْلَمَ الْكٰذِبِيْنَ ﴿٤٣﴾ لَا يَسْتَاْذِنُكَ
الَّذِيْنَ يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ اَنْ يُّجَاهِدُوْا
بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِالْمُتَّقِيْنَ ﴿٤٤﴾
اِنَّمَا يَسْتَاْذِنُكَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ
الْاٰخِرِ وَارْتَابَتْ قُلُوْبُهُمْ فَهُمْ فِيْ رَيْبِهِمْ يَتَرَدَّدُوْنَ ﴿٤٥﴾
وَلَوْ اَرَادُوا الْخُرُوْجَ لَاَعَدُّوْا لَهٗ عُدَّةً وَّلٰكِنْ كَرِهَ اللّٰهُ انْۢبِعَاثَهُمْ
فَثَبَّطَهُمْ وَقِيْلَ اقْعُدُوْا مَعَ الْقٰعِدِيْنَ ﴿٤٦﴾
لَوْ خَرَجُوْا فِيْكُمْ مَّا زَادُوْكُمْ اِلَّا خَبَالًا وَّلَاَاوْضَعُوْا خِلٰلَكُمْ
يَبْغُوْنَكُمُ الْفِتْنَةَ ۚ وَفِيْكُمْ سَمّٰعُوْنَ لَهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌۢ
بِالظّٰلِمِيْنَ ﴿٤٧﴾ لَقَدِ ابْتَغَوُا الْفِتْنَةَ مِنْ قَبْلُ وَقَلَّبُوْا لَكَ
الْاُمُوْرَ حَتّٰى جَآءَ الْحَقُّ وَظَهَرَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿٤٨﴾

اے اللہ کے رسول اللہ آپ کو معاف کرے آپ نے ان کو رخصت کیوں دے دی ہے (آپ اس وقت تک ان کو رخصت نہ دیتے) جہاں تک سچے آپ کے سامنے کھل کر آجاتے اور جھوٹوں کا آپ کو علم ہوجاتا۔ جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ مالوں اور جانوں سے جہاد کی رخصت آپ سے نہیں مانگتے ہیں اللہ خوب جانتا

ہے کہ متقی کون ہیں۔ رخصت تو صرف وہی لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان نہیں رکھتے ہیں اور جن کے دلوں میں شک کے کانٹے ہیں۔ بس وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں[۴۵]۔ اور اگر ان کا نکلنے کا واقعی ارادہ ہوتا تو وہ اس کے لیے سازو سامان ضرور تیار کر لیتے (واقعہ یہ ہے) کہ اللہ نے ان کا اُٹھنا پسند نہیں کیا لہٰذا ان کو روک دیا اور ان سے کہہ دیا گیا دوسرے بیٹھنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو[۴۶]۔ اگر وہ تم میں ہو کر نکلتے بھی تو خرابی کے سوا تم میں کوئی چیز زیادہ نہ کرتے — اور تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کے گھوڑے دوڑا دیتے اور تم میں ایسے حضرات بھی ہیں جو ان کی بات پر توجہ کرتے ہیں اور اللہ خوب جانتا ہے ظالموں کو[۴۷]۔ اے پیغمبر بلاشبہ یہ لوگ پہلے ہی فتنہ خیزی کی تگ و دو کر چکے ہیں اور حالات کو زیر و زبر کر چکے ہیں۔ تا آنکہ حق نمایاں ہو گیا اور ان کی ناگواریوں میں اللہ کا حکم غالب ہو گیا[۴۸]۔

معانی مُفردات

عدۃ۔ ساز و سامان اسباب۔ علامہ راغب اصفہانی فرماتے ہیں مال ہتھیار وغیرہ بہت سا ساز و سامان جو تیار کیا جائے فیومی نے لکھا ہے کہ اس کی جمع عُدَدٌ آتی ہے جیسے غرفۃ کی جمع غُرَفٌ ہے۔ تاج العروس میں ہے عدۃ بالضم جو کچھ بھی تم گردش ایام کے لیے تیار کر سکو مال ہو خواہ ہتھیار اھبۃ کا استعمال جس معنے میں ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی معنے میں عدۃ اور عتاد بھی آتے ہیں۔ بولا جاتا ہے اخذت للامر عدتہ وعتادہ۔ یعنی میں نے اپنے معاملہ کی تیاری کر لی یہ اخفش کا بیان ہے اور ابن دریہ کا خیال ہے۔ العدۃ من السلاح ما اعتدتہ یعنی ہتھیاروں میں عدہ اسے کہتے ہیں جسے تم نے تیار کیا ہو ثبط باز رکھا۔ روک دیا۔ ثبط سے ماضی ہے جس کے معنے روک دینے اور باز رکھنے کے ہیں مادہ ثبط ہے۔ اسی سے تثبط بھی آتا ہے۔

خبال تباہ کرنا۔ خرابی مچانا۔ فساد و تباہی خبل یخبل کا مصدر ہے وہ خرابی اور فساد کہ جس کے لاحق ہونے سے کسی

جاندار میں اضطراب اور بے چینی پیدا ہو جائے مثلاً جنون یا ایسا مرض جو عقل اور فکر پر اثر انداز ہو۔

نفاق کے ایک سے زیادہ رُوپ

ایمان و کفر کی طرح نفاق کی بھی سب حالتیں یکساں نہیں ہوتی ہیں اور نہیں تھیں چونکہ اصل کے اعتبار سے یہ حالت بھی انکار ہی کی ایک اقرار نما صورت ہے۔ اس لیے جب بڑھتے بڑھتے تو انکار قطعی ہی کی طرف بڑھتی ہے اور اسی کے خصائص رونما ہونے لگتے ہیں کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ چنانچہ اس عہد کے منافقوں کی حالت یکساں نہ تھی۔ عبداللہ بن ابی کا نفاق ہر منافق کا نفاق نہ تھا۔ خود قرآن نے اسی سورت کی آیت وممن حولکم من الاعراب منافقون و من اهل المدينة مردوا على النفاق میں اس کی طرف اشارا کیا ہے۔ کسی نفاق کا رُخ زیادہ تر اس طرف تھا کہ ہجرت سے جی چراتے تھے کسی پر انفاق مال شاق تھا۔ کوئی جہاد سے بچنا چاہتا تھا۔ کسی پر نماز کا قیام سخت گذرتا تھا کوئی ایسا بھی تھا کہ احکامِ الٰہی اور آیاتِ قرآنی کا مذاق اڑاتا تھا۔ اور اس تاک میں تھا کہ اگر مسلمانوں پر آفت آپڑے تو کھلم کھُلا دشمنوں کے ساتھ ہو جائیں تاہم یہ قطعی ہے کہ ان سب نے اسلام بطور اپنے دین کے قبول کر لیا تھا۔ اور مسلمانوں میں سمجھے جاتے تھے۔ ان آیات میں ان کے صدری مکنونات اور نفسی خصائص کی تفصیل بتائی گئی ہے۔ اور ان کی علامات کو خوب کھول کر بیان کیا گیا ہے خلاصہ یہ ہے کہ جہاد کے موقعہ پر بچ بچ کر تا امکان اس میں شریک ہونا اگر شرکت کی نوبت آ ہی جائے تو اہلِ ایمان میں تفرقہ بازی اور فتنہ انگیزی کرنا بلا شبہ یہ اعمالِ نفاق کے ہیں اور ہم ان میں سے ایک ایک عمل کو عملِ نفاق کہہ سکتے ہیں اور یہی نفاق عمل ہے لیکن اس نفاق عمل کی وجہ سے ہم کسی کو منافقین کی صف میں کھڑا کر کے وہ سلوک کر سکتے ہیں یعنی کسی ان ظاہری اعمال کی بنیاد پر ہم کسی کو کافر گردان سکتے ہیں۔ ہرگز نہیں۔ حضرت حذیفہ فرماتے ہیں کہ آئندہ کسی پر یہ حکم نہ لگایا جائے گا نزولِ وحی کا زمانہ بالکل جدا تھا اس وقت وحی الٰہی جس کے متعلق نفاق کا حکم لگا دیتی تھی لگ سکتا تھا اب معاملہ صرف ظاہر پر ہے۔

(۴۷) اے اللہ کے رسول اللہ تجھے معاف کرے آپ نے ان کو رخصت کیوں دے دی ہے۔ آپ اس وقت تک ان کو رخصت نہ دیتے۔ یہاں تک کہ سچے آپ کے سامنے کُھل کر آجاتے اور جھوٹوں کا آپ کو علم ہو جاتا۔ منافقین جھوٹے عذر کر کے جب مدینے میں ٹھہرے رہنے کی اجازت طلب کرتے تو آپ ان کے کبر و نفاق سے اعراض کر کے اور یہ سمجھ کر کہ ان کے ساتھ چلنے میں فساد کے سوا کوئی بہتری نہیں اجازت دیتے تھے اس کو فرمایا اگر آپ اجازت نہ دیتے تو زیادہ بہتر ہوتا کیونکہ اس وقت ظاہر ہو جاتا کہ انھوں نے اپنے نہ جانے کو کچھ آپ کی اجازت پر موقوف نہیں رکھا ہے۔ جانے کی توفیق تو انہیں کسی حال میں نہ ہوتی۔ البتہ آپ کے سامنے ان کا جھوٹ سچ کھل جاتا پس اجازت دینا کچھ گناہ نہ تھا۔ البتہ نہ دینا مصالح

حاضرہ کے اعتبار سے زیادہ موزوں ہوتا۔ اس اعلیٰ واکمل صورت کے ترک کی وجہ سے خطاب کو عفا اللہ عنك سے شروع کرنا۔ عفو کا لفظ ضروری نہیں کہ گناہ ہی کے مقابلہ میں ہو۔ بعض محققین نے عفا اللہ عنك اس جملہ کو صدر کلام میں تعظیم و دعا کے طور پر لیا ہے جیسا کہ عرب کے محاورات میں شائع تھا مگر سلف سے وہی منقول ہے جو ہم نے پہلے بیان کیا اور لفظ لـم اذنت لهـم اس کی تائید کرتا ہے[1]

آغاز میں اس اندازِ تعبیر عفا اللہ عنك کے بارے میں شارحینِ قرآن نے بہت کچھ علمی انداز میں دادِ تحقیق دی ہے۔ زمخشری کو چھوڑ کر سب نے دلکش اور پُر محبت انداز میں تنبیہہ بتایا ہے۔ الشوکانی لکھتے ہیں وفی هـذا عتاب لطيف من الله سبحانه علامہ آلوسی لکھتے ہیں۔ هـذا عتاب لطيف من اللطيف الخبير سبحانه لحبيبه حافظ ابن کثیر حافظ ابن جریر اور علامہ بغوی نے یہاں تشریح میں سفیان بن عیینہ کا یہ تشریحی نوٹ پیش کیا ہے انظروا الی هـذا اللطف بـدأ بالعفو۔ الغرض عام شارحین قرآن کا تشریح میں میلان یہی ہے۔ صرف علامہ زمخشری اور ان کی پیروی میں قاضی بیضاوی یہ کہتے ہیں کہ عفا اللہ عنك کنایہ ہے گناہ سے اور مطلب ہے کہ اے پیغمبر تو نے غلطی کی اور بہت برا کیا۔ اخطأت وبئسما فعلت۔ زمخشری کی اس تشریح پر سب نے افسوس کیا ہے اور آلوسی کو زیادہ رنج اس بات کا ہے کہ قاضی بیضاوی نے زمخشری کی ہمنوائی کیوں کی ہے۔ زمخشری کی رائے میں معاذ اللہ یہ حضور اقدس کو گناہ پر توبیخ ہے۔ اس نے لکھا ہے کنايـه عن الجناية یعنی عفا اللہ عنك کی تعبیر حضور اقدس کا گناہ بتانے کے لیے ہے۔ گناہ نام ہے حکم کی نافرمانی کا۔ اجازت اور رخصت کے موضوع پر قرآن آپ کو پہلے مختار بنا چکا ہے اور کہہ دیا ہے کہ یہ آپ کے صوابدید اور اختیار تمیزی پر موقوف ہے سورہ نور میں اسی موضوع پر ارشاد ہے۔ فاذا استاذنوك لبعض شأنهم فاذن لمن شئت منهم جب آپ سے رخصت اور اجازت چاہیں تو آپ ان میں سے جسے چاہیں اجازت اور رخصت دے دیں۔ فرمایئے اس حکم کی موجودگی میں اگر رخصت مانگنے والوں کو آپ نے اجازت دے دی ہے تو اس میں گناہ کی کونسی بات ہے جو بات آپ کے اختیار تمیزی پر موقوف تھی۔ اس کو گناہ بتانا خواہ مخواہ کی دھاندلی ہے۔ اور یہاں اجازت کا پس منظر یہی ہے جیسا کہ علامہ ابو السعود نے بتایا ہے کہ ان کے جانے میں نہ دین کی کوئی مصلحت تھی اور نہ مسلمانوں کا کوئی فائدہ تھا بلکہ جیسا کہ خود قرآن نے بتایا ہے کہ ان کے جانے میں فساد ہی فساد اور فتنہ ہی تھا۔ اور خود اللہ سبحانہ کو بھی ان کا جانا پسند نہیں ہے کره الله انبعاثهـم۔ تو ایسی حالت میں اس تعبیر کو معصیت جنایت اور گناہ سے کنایہ قرار دینا کہاں کا انصاف ہے۔

محققین تو یہاں نہ تنبیہہ مانتے ہیں اور نہ توبیخ بلکہ وہ تو اسے انداز تکریم قرار دیتے ہیں۔ چنانچہ آپ سفیان ابن عیینہ کی

[1] افادات شیخ الاسلام

زبانی سن آئے ہیں انظر والی ھذا اللطف بدا بالعفو اس لطیف انداز پر غور فرمایئے کہ آغاز ہی عفو سے کیا ہے مشابہ ہے کہ یہ انداز تنبیہ اور توبیخ نہیں بلکہ انداز تکریم ہے۔ عربی محاورات میں یہ انداز بیان موجود ہے علی ابن جہم المتوکل کو مخاطب کرکے کہتا ہے۔

عفا اللہ عنك الا حرمة ــــــــــــ نعوذ بعفوك ان أبعد علامہ شہاب نے بتایا ہے کہ یہ پیمانہ وہاں بولا جاتا ہے جہاں گناہ نہ ہو جس کی تکریم مقصود ہو وہاں بولتے ہیں عفا اللہ عنك ما صنعت فی امری علامہ سجاوندی کہتے ہیں اس میں حضور اقدس ﷺ کی تعظیم کی تعلیم ہے۔ قاضی عیاض فرماتے ہیں کہ اس پیمانہ میں گناہ کا کوئی شائبہ نہیں ہے۔ قشیری کہتے ہیں جو اس کو گناہ کی معافی کا پیمانہ بتاتا ہے۔ وہ عربی زبان کی گہرائیوں سے ناآشنا ہے

بہرحال یہ دلکش اور محبت آمیز انداز یہاں صرف یہ بتانے کے لیے اختیار کیا گیا ہے کہ عفو و درگذر کی ایک حد ہونی چاہیے۔ یہ لوگ اس کے مستحق نہیں ہیں۔ یعنی چشم پوشی اور درگذر آپ کی کریم النفسی کا لازمی تقاضا ہے۔ حضور اقدس ﷺ جس طرح تمام اعلیٰ صفات کے مظہر تھے۔ اسی طرح آپ میں چشم پوشی بھی کمال درجہ موجود تھی۔ منافقین آپ کی اس کریم النفسی سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتے۔ جہاد سے فرار کے لیے وہ مختلف قسم کے جھوٹے اعذار تراشتے اور آپ کی جناب میں پیش کرکے جہاد سے رخصت چاہتے حضور ان کے ان بناوٹی اعذار سے واقف ہوتے ہوئے ان کو اپنی کریم النفسی کی بنا پر اجازت دے دیتے۔ حضور اقدس ﷺ کی اجازت سے چونکہ ان کو اپنے نفاق پر پردہ ڈالنے کا ایک موقع مل جاتا اس وجہ سے اللہ سبحانہ نے حضور اقدس ﷺ کو اس لطیف انداز میں آگاہ فرمایا کہ منافقین آپ کی کریم النفسی سے بہت غلط فائدہ اٹھا رہے ہیں آپ اپنی کریم النفسی کی وجہ سے ان کو اجازت دے دیتے ہیں جس سے وہ دلیر ہو جاتے ہیں کہ ان کی مکاری کامیاب ہو گئی۔ حالانکہ اگر آپ اجازت نہ دیتے تو ان کا بھانڈا پھوٹ جاتا۔ آپ کی اجازت کے بغیر جو گھر میں بیٹھے رہتے تو ہر شخص پہچان لیتا کہ یہ منافق ہیں۔ لیکن وہ آپ کی اجازت کو اپنے چہرے کی نقاب بنا لیتے ہیں۔

آیت قرآنی میں تعبیر کا یہ اختلاف قابل توجہ ہے کہ سچوں کے لیے صدقوا کی فعل ترکیب اور جھوٹوں کے لیے کاذبین کی اسمی ترکیب لائے ہیں۔ علامہ ابوالسعود نے بتایا ہے کہ تعبیر کا یہ فرق یہ بتانے کے لیے ہے کہ سچ منافقین میں ایک وقتی حادثہ کے طور پر ہوتا ہے جب کہ جھوٹ ان کی ایک دائمی عادت ہے۔ اور پھر آیت میں سچ کے لیے تبین اور جھوٹ کے لیے علم کی تعبیر بھی بے حد لطیف ہے۔ خبر میں اصل صداقت ہے کذب کا درجہ احتمالی ہے۔ وہ خودبخود نمایاں ہوتا ہے۔ برخلاف کذب کے کہ وہ اپنے لیے ثبوت چاہتا ہے۔ کیونکہ نیکی اصل ہے اور برائی سراسر بناوٹ ہے۔

ایمان واخلاص میں فرق

(۴۸) جو لوگ اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں وہ مالوں اور جانوں سے جہاد کی رخصت آپ سے نہیں مانگتے۔ اللہ خوب جانتا ہے کہ متقی کون ہیں رخصت تو صرف وہی لوگ مانگتے ہیں جو اللہ اور آخرت کے دن پر ایمان نہیں رکھتے ہیں اور جن کے دلوں میں شک کے کانٹے ہیں وہ اپنے شک ہی میں متردد ہو رہے ہیں۔ یعنی جن کے دلوں میں ایمان و تقویٰ کا نور ہے ان کی یہ شان نہیں کہ جہاد سے الگ رہنے کی اس طرح بڑھ بڑھ کر اجازت مانگیں۔ ان کا حال تو وہ ہے جو اس پارہ کے آخر میں بیان ہوا ہے تولوا واعینھم تفیض من الدمع حزنا ان لایجدوا ماینفقون یعنی بے سروسامانی وغیرہ کے عذر سے اگر جہاد فی سبیل اللہ کے شرف سے محروم رہ جائیں تو اس فعل کے فوت ہو جانے سے ان کی آنکھیں اشکبار ہوتی ہیں۔ بے حیا بن کر جہاد سے علیحدہ رہنے کی اجازت لینا انہی کا شیوہ ہے جن کو اللہ سبحانہ کے وعدوں پر یقین نہیں نہ آخرت کی زندگی کو سمجھتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اسلام اور مسلمانوں کے غالب و منصور ہونے کی جو خبریں دی ہیں ان کے متعلق ہمیشہ شک و شبہ میں گرفتار رہتے ہیں [1]

ان آیات میں جس کردار کی تصویر پیش کی گئی ہے اس میں کفر وایمان کا تقابل مطالعہ ہے یا نفاق وایمان کا۔ ایمان دو معنے میں آتا ہے ایک معنی کے اعتبار سے وہ کفر کا متقابل ہے اور ایک معنی کے اعتبار سے وہ نفاق کا تقابل ہے۔ ایمان جب نفاق کے متقابل ہو تو اخلاص کے معنے میں آتا ہے۔ یہاں اسی معنے میں ہے۔ قاضی بیضاوی نے تشریح میں اس فقرے کے ذریعے فان المخلص منھم یبادرون الیہ مخلصین جہاد کی طرف سبقت کرتے ہیں یہی بتایا ہے۔ یعنی جو اخلاص سے تہی دامن ہوں وہ جہاد سے جان چراتے ہیں مطلب یہ ہے کہ اہل تقویٰ کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ نیکی میں اجازتیں مانگیں جہاد بہت بڑی نیکی ہے اس کے لیے رخصت طلبی ایمان میں ناسور ہونے کی نشانی ہے۔ افضل وہی ہوتے ہیں جو اخلاص کے ساتھ رب کی خوشنودی کے لیے کام کرتے ہیں نہ کہ اپنی اغراض اور اپنے مفادات کے لیے۔ ان کا ہی کام عند اللہ مقبول ہوتا ہے۔ ان کو دین و دنیا میں فوز و فلاح ملتی ہے ان کو خدا کے یہاں محبوبیت ملتی ہے ان کو ہی اس دنیا میں ہر دلعزیزی ملتی ہے ان کے کاموں کو شہرت ملتی ہے۔ ان کے کارناموں کو زندگی بخشی جاتی ہے وہ اُمتوں اور جماعتوں کے محسن ہوتے ہیں۔ لوگ ان کے کاموں سے نسلاً بعد نسل استفادہ کرتے ہیں۔ اور ان کے لیے رحمت کی دعائیں مانگتے ہیں۔

یہ بات اس باب میں فیصلہ کن ہے کہ کفر و اسلام میں کشمکش ایک کسوٹی ہے جو کھرے مومن اور کھوٹے مدعی ایمان کو

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک دوسرے سے ممتاز کرتی ہے جو شخص اس کشمکش میں دل و جان سے اسلام کی حمایت کرے اور اپنی ساری طاقت اور سارے ذرائع اسلام کو سربلند کرنے کے لیے لگا دے اور کسی قربانی سے دریغ نہ کرے وہی سچا مومن ہے بخلاف اس کے کہ جو اس کشمکش میں اسلام کا ساتھ دینے سے جی چرلتے اور کفر کی سربلندی کا خطرہ سامنے دیکھتے ہوئے بھی اسلام کی سربلندی کے لیے جان و مال کی بازی کھیلنے سے پہلوتہی کرے اس کی یہ روش خود اس حقیقت کو واضح کر دیتی ہے کہ اس کے ایمان میں اخلاص نہیں ہے گویا یہ ایک پیمانہ ہے اخلاص و نفاق کے درمیان۔ جو لوگ اللہ اور آخرت پر سچا ایمان رکھتے ہیں وہ جہاد سے رخصت کی درخواستیں پیش نہیں کرتے ہیں رخصت کی درخواستیں لے کر وہی لوگ آتے ہیں جن کے ایمان میں اخلاص نہیں ہوتا بلکہ ان کے دلوں میں شک کا روگ ہوتا ہے۔ باقی رہے واقعی معذور تو ان کا عذر سامنے ہوتا ہے اور ہر شخص ان کو معذور گردانتا ہے جیسا کہ اسی پارے میں آگے معذورین کا ذکر آرہا ہے اور یہاں قرآن نے بھی واللہ علیم بالمتقین سے اس طرف اشارہ کیا ہے۔

ارادہ ہو تو اللہ کی جانب سے توفیق ہوتی ہے

(۴۹) اور اگر نکلنے کا واقعی ارادہ ہوتا تو وہ اس کے لیے ساز و سامان ضرور تیار کر لیتے۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ اللہ نے ان کا اٹھنا پسند نہیں کیا لہٰذا ان کو روک دیا۔ ان سے کہہ دیا گیا کہ بیٹھ جاؤ بیٹھنے والوں کے ساتھ۔ ان کا ارادہ بھی گھر سے نکلنے کا نہیں ورنہ اس کا کچھ تو سامان کرتے۔ حکم جہاد سنتے ہی جھوٹے عذر نہ لے دوڑتے واقعہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے ان کی شرکت کو پسند نہیں کیا۔ جاتے تو وہاں فتنے سر اٹھاتے نہ جانے کی صورت میں انہیں پتہ لگ جائے گا کہ مومنین کو خدا کے فضل سے ایک تنکے کے برابر ان کی پرواہ نہیں ہے۔ اسی لیے اللہ سبحانہ نے صفوف مجاہدین میں شامل ہونے سے روک دیا اس طرح نکنے کا وبال ان کے سر ہے گویا ان کو نکو بنا کر رکھ دیا گیا کہ جاؤ عورتوں بچوں اور اپاہج آدمیوں کے ساتھ گھر میں گھس کر بیٹھ رہو اور حضور اقدس ﷺ نے ان کے اعذار کاذبہ کے جواب میں جو گھر میں بیٹھ رہنے کی اجازت دی یہ بھی ایک طرح خدا ہی کا فرمانا ہے اس لیے تکویناً کی قید کی بھی ضرورت نہیں ہے[لہ]۔ یہ توفیق کے باب میں اللہ کے قانون کو بیان کیا جا رہا ہے نیکوں کا آہستہ آہستہ نیکیوں کو مزید راستہ دکھانے کا نام توفیق ہے توفیق کا ملنا انسان کی ابتدائی کوشش سے ہے یعنی انسان میں پہلے ارادہ ہو۔ طلب ہو۔۔۔ تو اللہ کی جانب سے توفیق آتی ہے۔ اس کی مثال بالکل بچہ کی سی ہے۔ بچہ چلنا یا بولنا کیوں کر سیکھتا ہے وہ پہلے چلنے اور بولنے کی خود کوشش کرتا ہے تو اس کے والدین اس کو چلنا اور بولنا سکھاتے ہیں بچہ پاؤں اٹھاتا ہے اور والدین اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو دو چار قدم۔۔۔ چلاتے ہیں اور اس طرح رفتہ رفتہ آہستہ آہستہ چلنا

لہ افادات شیخ الاسلام

سیکھتا ہے وہ پہلے زبان ہوتا ہے اور مبہم آوازیں نکالتا ہے۔ تووالدین اس کو با معنی الفاظ تلقین کرتے ہیں۔ اور اس طرح والد کی کوششیں مل کر بار آور ہوتی ہیں اسی طرح توفیق الٰہی اور ارادہ انسانی باہم مل کر انسانوں کی عملی تاریخ تیار کرتے ہیں یہاں قرآن بتا رہا ہے کہ اگر ان کے اندر جہاد کے لیے اٹھنے کا ارادہ ہوتا تو وہ کچھ نہ کچھ سامان ضرور کرتے چونکہ ان میں ارادہ نہ تھا اس لیے توفیق الٰہی کا ظہور نہ ہوا یہی سنت الٰہی ہے کہ جو لوگ نیکی کمانے کے لیے خود اپنے ارادے کو حرکت میں نہ لائیں گے اللہ سبحانہ کی جانب سے ان کو توفیق بھی ارزانی نہ ہوگی۔ اسی کو قرآن نے کرہ اللہ انبعاثھم سے تعبیر کیا یعنی با دل ناخواستہ ان کا اٹھنا اللہ کو پسند نہ تھا کیونکہ جب وہ شرکت جہاد کے جذبے اور نیت سے خالی تھے اور ان کے اندر دین کی سربلندی کے لیے جاں فشانی کرنے کا کوئی ارادہ نہ تھا تو وہ صرف مسلمانوں کی شرما شرمی سے بددلی کے ساتھ یا کسی شرارت کی نیت سے ستھری کے ساتھ اٹھتے تو یہ چیز ہزار خرابیوں کا باعث ہوتی۔ اس طرح اس آیت میں ارادہ اور طلب کے لیے ایک پیمانہ بتا دیا ہے کہ ارادہ اور طلب وہ ہے جس کی پشت پر تیاری کی شہادت ہو اگر تیاری نہ ہو تو اس کا نام ارادہ نہیں ہے۔ جب ارادہ ہی نہیں تو یہ عذر بھی نہیں بلکہ اس کا نام بہانہ ہے ان لوگوں نے جہاد میں نہ جانے کے لیے بہانے بنائے تھے۔ عذر ہوتا تو ارادہ ہوتا۔ ارادہ ہوتا تو تیاری ہوتی۔ عذر اور بہانے میں فرق ہے اس کو مثال سے سمجھیے جو شخص نماز جمعہ کی تیاری کر چکا ہے اور جانے کا ارادہ کر رہا ہے کہ دفعتہً پیٹ میں درد ہو گیا۔ بخار چڑھ آیا جس کی وجہ سے نہ جا سکا۔ یہ عذر ہے اور اس کے برعکس اگر ایک شخص نے جمعہ کے لیے جانے کا ارادہ ہی نہیں کیا اور اس کی کوئی تیاری ہی نہ کی پھر اتفاقاً کوئی عذر بھی سامنے آ گیا تو یہ شرعاً عذر نہیں بہانہ ہے۔ یہی حال سب اعمال کا ہے۔ لوگ کام نہ کرنے کے بہانوں کو عذر کہہ کر اپنے کو ٹال لینے کی فکر میں رہتے ہیں بتایا جا رہا ہے کہ کام کے لیے تیاری کرنے نہ کرنے ہی سے کسی عذر کے عذر ہونے اور بہانہ ہونے کا فیصلہ کیا جا سکتا ہے نہ تیاری کرنے والا سمجھتا ہے کہ میں نہیں گیا قرآن بتاتا ہے کہ تم نہیں گئے بلکہ اللہ نے جانے کی توفیق نہیں دی اسی کو تمثیلاً یوں تعبیر کیا ہے وقیل اقعدوا مع القاعدین یعنی اللہ نے ان کو توفیق نہیں دی ہے قاعدین سے مراد عورتیں بچے اور بیمار ہیں۔

چونکہ مقابلہ بیزنطانی شہنشاہی سے تھا جو مشرق میں رومۃ الکبریٰ کی جانشین تھی اور ابھی حال میں ایران کو شکست دے چکی تھی اس لیے منافقوں کو یقین تھا کہ مسلمانوں کے خاتمے کے دن آ گئے عبداللہ بن ابی سلول نے جو منافقوں کا سرغنہ تھا لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ حضور اقدس ﷺ اس سفر سے واپس نہ آئیں گے اور اسی یقین کی وجہ سے وہ جنگ میں جانے کے لیے تیار نہ تھے۔

منافقین کی فتنہ انگیزیاں

(۵۰) اور اگر وہ تم میں ہو کر نکلتے بھی تو خرابی کے سوا تم میں کوئی چیز زیادہ نہ کرتے اور تمہارے درمیان فتنہ انگیزی کے گھوڑے

دوڑاتے اور تم میں ایسے حضرات ہیں جو ان کی بات پر توجہ کرتے ہیں اور اللہ ظالموں کو خوب جانتا ہے یعنی اگر تمہارے ساتھ نکلتے تو اپنے جبن و نامردی کی وجہ سے دوسروں کی ہمتیں بھی سست کر دیتے اور آپس میں لگا بجھا کر مسلمانوں میں تفریق ڈالنے کی کوشش کرتے اور جھوٹی افواہیں اڑا کر ان کو دشمنوں سے ہیبت زدہ کرنا چاہتے غرض ان کے وجود سے بھلائی میں تو کوئی اضافہ نہ ہوتا ہاں برائی بڑھ جاتی اور فتنہ انگیزی کا زور ہوتا۔ ان ہی وجوہ سے خدا نے ان کو جانے کی توفیق نہ دی اور اب بھی ان کے جاسوس یا بعض ایسے سادہ لوح افراد تم میں موجود ہیں جو ان کی بات سے تھوڑا بہت متاثر ہوتے ہیں (ابن کثیر) اگرچہ ویسا فتنہ و فساد برپا نہیں کر سکتے جو ان شریروں کے وجود سے ہو سکتا تھا بلکہ ایک حیثیت سے ایسے جاسوسوں کا ہمراہ جانا مفید ہے کہ وہ بچشم خود مسلمانوں کی اولوالعزمی دیکھ کر ان سے نقل کریں تو ان کے دلوں پر بھی مسلمانوں کی ہیبت قائم ہو گی[1] مطلب یہ ہے کہ پیچھے رہ جانے والے یہ سمجھ رہے ہیں کہ پیچھے رہ کر ہم بچے لیکن واقعہ یہ ہے کہ ان کا نہ نکلنا ہی مسلمانوں کے لیے بہتر ہوا کیونکہ اگر یہ نکلتے تو فتنہ انگیزیاں کرتے اور کچے دل کے آدمیوں کو بہکاتے رہتے اس سے پہلے ارشاد تھا کہ کرہ اللہ انبعاثھم اللہ کے حضور ان کا اٹھنا ناپسند ہوا یعنی اللہ کے علم میں تھا کہ اب یہ نہیں نکلیں گے اور اللہ نے تمہارے لیے اس میں بہتری رکھی ہے بتانا یہ ہے کہ اگر یہ لوگ جنگ کے لیے نہیں نکلے تو اللہ سبحانہ کی مصلحت یہی تھی۔ اگر مسلمانوں کی ہمرکابی میں یہ بھی چلے جاتے تو تمہارے لیے یہ مفید بننے کی جگہ الٹے بہت بڑی مصیبت کا سامان بن جاتے ان کی بھاگ دوڑ تمہارے درمیان کوئی نہ کوئی فتنہ بپا کرنے میں ہوتی وفیکم سماعون لھم اور تمہارے اندر بھی ان منافقوں کی باتیں سننے والے اور ماننے والے موجود ہیں۔ یہ اشارہ ان سادہ لوح مسلمانوں کی طرف ہے جو اگرچہ منافق نہیں لیکن اپنی شرافت کی وجہ سے بسا اوقات ان منافقین کے چکمے میں آجاتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جماعتی زندگی کے لیے تذبذب اور کچے دل کے آدمیوں کی موجودگی ایک بڑا مہلکہ ہے۔ خصوصاً جب کہ ملت موت و حیات کی جدوجہد میں مشغول ہو یہی وجہ ہے کہ آزاد سے آزاد قومیں بھی مجبور ہوتی ہیں کہ جنگ کے وقت میں حکومت کو غیر معمولی اختیارات دیں۔ اور اگر شخصی آزادی کے قوانین بھی معطل کر دے تو معترض نہ ہوں کیونکہ اس وقت ایک منافق کی شرارت پوری قوم کو خطرہ میں ڈال سکتی ہے۔

ان آیات کا مطالبہ یہ ہے کہ حتی الامکان ایسے افراد کی موجودگی برداشت نہیں کرنی چاہیے کہ ان کی علیحدگی سے جو عارضی شور و شغب ہو گا وہ جماعتی مصالح کے لیے جو زیادہ مضر ہو گا۔ اگر درخت کی جڑ درست ہے تو جتنا چھانٹو گے اتنا ہی زیادہ پھیلتا جائے گا اور فاسد اعضاء کا علیحدہ کرنا مضر نہیں ہوتا۔ چھوڑ دینا جسم کے لیے مہلک ہوتا ہے۔

منافقین کا گندہ ماضی

اے پیغمبر بلاشبہ یہ لوگ پہلے ہی فتنہ خیزی کی تگ و دو کر چکے ہیں اور حالات کو زیر و زبر کر چکے ہیں تا آنکہ حق نمایاں

[1] افادات شیخ الاسلام

ہو گیا اور ان کی ناگواریوں میں اللہ کا حکم غالب ہو گا جس وقت حضور اقدس ﷺ مدینہ طیبہ تشریف لائے یہود اور منافقین مدینہ آپ کے خلاف طرح طرح کی فتنہ انگیزیاں کرتے رہے۔ اور اسلام کی روز افزوں ترقیوں کا تختہ الٹنے کے لیے بہت کچھ اُلٹ پھیر کی مگر بدر میں جب کفر و شرک کے بڑے بڑے ستون گر گئے۔ اور حیرت انگیز طریقہ پر اسلام کا غلبہ ظاہر ہوا تو ابن ابی سلول اور اس کے ساتھیوں نے کہا ان ھذا امر قد توجہ کہ یہ چیز تو اب رُکنے والی معلوم نہیں ہوتی چنانچہ بہت سے لوگ خوف کھا کر محض زبان سے کلمہ اسلام پڑھنے لگے مگر چونکہ دل ہی دل میں کفر چھپا ہوا تھا اس لیے جوں جوں اسلام اور مسلمانوں کی کامیابی اور غلبہ دیکھتے دل ہی دل میں جلتے اور غیظ کھاتے تھے۔ غرض ان کی فتنہ پردازی اور مکاری کوئی نئی چیز نہیں۔ شروع سے ان کا یہی وتیرہ رہا ہے۔ جنگ احد میں یہ لوگ اپنی جماعت کو راستہ سے لے کر لوٹ آئے تھے مگر آخر دیکھ لیا کہ حق کس طرح غالب ہو کر رہتا ہے اور باطل کیسے ذلیل و رسوا کیا جاتا ہے [1]

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین آپ کے اور آپ کے صحابہ کے خلاف اور آپ کے دین کی مخالفت میں بھرپور کردار ادا کر چکے ہیں اور ایک عرصہ تک اپنی ساری فکری قوتوں کو اس میں لگا چکے ہیں جب حضور اقدس قدم رنجہ فرمائے مدینہ ہوئے۔ پوری عرب کی سیاسی قوت نے آپ کے خلاف محاذ بنایا اور مدینہ کے یہود اور یہ منافقین بھی ان کے مخالفت میں ہمنوا تھے اللہ سبحانہ نے بدر میں حضور اقدس کی بے مثال مدد فرمائی اور اسلام کا بول بالا کیا تو یہی منافقین کا سرغنہ عبد اللہ ابن ابی کہہ رہا تھا کہ اسلام کی برتری حاصل ہو گئی۔ اس غلبہ اور برتری کو دیکھ کر یہ لوگ ظاہر میں حلقہ اسلام میں داخل ہو گئے پھر جوں جوں اسلام کو غلبہ ہوتا گیا ان کے گھروں میں صف ماتم بچھتی گئی یہی حتی جاء الحق وظھر امر اللہ وھم کارھون میں بتایا جا رہا ہے۔

حافظ ابن جریر نے یہ مطلب بتایا ہے کہ اے اللہ کے پیغمبر یہ منافقین آپ کے اور آپ کے ساتھیوں کے لیے ہمیشہ فتنہ کا سامان بنے رہے ہیں۔ ماضی میں ان کی کوشش یہی رہی ہے کہ صحابہ کرام کو دین سے برگشتہ کریں اس کے لیے تدبیر یہ کی ہے کہ مسلمان ہونے کے باوجود آپ سے اس موقعہ پر علیحدگی اختیار کی جب اجتماعیت کی ضرورت تھی اور یہی عبد اللہ ابن ابی اپنے ساتھیوں کو لے کر آپ سے الگ ہو گیا مقصد صرف یہ تھا کہ سارے صحابہ اس کی ہم نوائی کریں اور آپ تنہا رہ جائیں یہ پہلا فتنہ ہے جس کی طرف قرآن نے لقد ابتغوا الفتنۃ من قبل سے اشارہ کیا ہے۔ اور تقلبوا لک الامور کا مطلب یہ ہے کہ آپ کے اور آپ کے دین کے بارے میں ان کی فکری جولانیاں یہی رہی ہیں کہ آپ کو اور آپ کے دین کو ختم کر دیا جائے۔ ان کی امنگوں، خواہشوں کے علی الرغم آپ کا اور آپ کے دین کا بول بالا ہوا ہے۔

یہ اس گروہ منافقین کے ماضی کی اس آیت میں تصویر پیش کی ہے اور بتایا ہے کہ یہ لوگ ماضی میں کیا کرتوت کرتے رہے ہیں۔ قرآن نے صرف اشارہ کیا ہے کیونکہ یہ کوئی راز نہ تھا بلکہ منظر عام پر ہونے کی وجہ سے سب مسلمان جانتے تھے۔

[1] از افادات شیخ الاسلام

بھی ہیں جنہوں نے جنگ احد کے موقعہ پر پہلے تو شہر میں محصور ہو کر مقابلہ کرنے کا مشورہ دیا۔ پھر جب ان کا مشورہ قبول نہیں ہوا تو عبداللہ بن ابی اپنے تین سو آدمیوں کو لے کر عین موقع پر الگ ہو گیا۔ پھر جنگ کے بعد اسی کے ہم خیالوں نے یہ پروپاگنڈہ کیا کہ نعوذ باللہ حضور اقدس قوم کے خیر خواہ نہیں ہیں پھر یہی لوگ تھے جنہوں نے جنگ مریسیع کے موقعہ پر اپنی فتنہ انگیزی سے ایسی صورت پیدا کر دی کہ انصار و مہاجرین کے درمیان تلوار چلتے چلتے رہ گئی۔ اسی سلسلے میں ان کی ایک نہایت سنگین شرارت واقعہ افک کی صورت میں ظاہر ہوئی۔ جو بات کا بتنگڑ بنانے کی ایک نہایت ناپاک مثال ہے حنین کے موقع پر تقسیم غنیمت کے معاملے میں انھوں نے بدطینتی سے دلوں میں سخت کدورت پیدا کرنے کی کوشش کی۔ غرض جو موقعہ بھی ہاتھ آیا اس سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے مسلمانوں کے درمیان پھوٹ ڈالنے میں کوئی کمی نہیں کی لیکن اللہ سبحانہ نے ان کی مفسدانہ سرگرمیوں کے برعکس اسلام اور مسلمانوں کا بول بالا کیا۔

ابوبکر الجصاص کی رائے میں یہاں فتنہ سے مراد مسلمانوں میں باہم تفریق ڈالنا اور جماعتی نظم کو پامال کرنا ہے۔ فان الفتنہ ھھنا المحنۃ باختلاف الکلمۃ والفرقۃ۔ اگر حقیقت بین نگاہوں سے دیکھا جائے تو نفاق کی جڑ یہی ہے۔ قاضی بیضاوی نے بھی فتنہ کا مدعا یہی بتایا ہے تشتیت امرک وتفریق اصحابک اور دوسرے شارحین قرآن نے اسی کو شرف پذیرائی دیا ہے۔ اگر ایسا ہے تو اس کا واضح مطلب ہے کہ تشتت وافتراق۔ انتشار و تفریق کا ہر عمل نفاق ہے۔ یہ زندگی نہیں موت ہے۔ یہ عزت نہیں ذلت ہے یہ ترقی نہیں تنزل ہے سعادت نہیں شقاوت ہے تقویٰ نہیں فجور ہے حسنہ نہیں سیئہ ہے۔ اعاذنا اللہ من النفاق۔

وَمِنْهُم مَّن يَقُولُ ائْذَن لِّي وَلَا تَفْتِنِّي ۚ أَلَا فِي
الْفِتْنَةِ سَقَطُوا ۗ وَإِنَّ جَهَنَّمَ لَمُحِيطَةٌ بِالْكَافِرِينَ ۝
إِن تُصِبْكَ حَسَنَةٌ تَسُؤْهُمْ ۖ وَإِن تُصِبْكَ
مُصِيبَةٌ يَقُولُوا قَدْ أَخَذْنَا أَمْرَنَا مِن قَبْلُ وَيَتَوَلَّوا
وَّهُمْ فَرِحُونَ ۝ قُل لَّن يُصِيبَنَا إِلَّا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَنَا
هُوَ مَوْلَانَا ۚ وَعَلَى اللَّهِ فَلْيَتَوَكَّلِ الْمُؤْمِنُونَ ۝ قُلْ
هَلْ تَرَبَّصُونَ بِنَا إِلَّا إِحْدَى الْحُسْنَيَيْنِ ۖ وَنَحْنُ
نَتَرَبَّصُ بِكُمْ أَن يُصِيبَكُمُ اللَّهُ بِعَذَابٍ مِّنْ عِندِهِ
أَوْ بِأَيْدِينَا ۖ فَتَرَبَّصُوا إِنَّا مَعَكُم مُّتَرَبِّصُونَ ۝

اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جو کہتے ہیں مجھے رخصت دے دیجئے اور فتنہ میں
مبتلا نہ کیجئے۔ یاد رکھو کہ یہ لوگ فتنے میں جا گرے ہیں اور بلاشبہ دوزخ کفر کرنے والوں
کا گھیرا ڈالے ہوئے ہے۴۹۔ اگر آپ کو کوئی خوشحالی ملتی ہے تو ان کو بری لگتی ہے
اور اگر آپ پر کوئی افتاد آ پڑتی ہے تو کہنے لگتے ہیں کہ ہم نے اس افتاد سے پہلے ہی
اپنا بندوبست کر لیا تھا اور شاداں پشت پھیر کر چل دیتے ہیں۵۰۔ آپ فرما دیجئے
کہ ہم کسی افتاد کی لپیٹ میں کبھی نہیں آ سکتے۔ سوائے اس افتاد کے جو اللہ نے
ہمارے لیے لکھ دی ہے۔ اللہ ہی ہمارا کارساز ہے اور اللہ ہی پر بس اہل ایمان کو

بھروسہ کرنا چاہیے۔[۵۳] اے اللہ کے رسول ان سے کہہ دو کہ ہمارے بارے میں تمہیں صرف دو خوبیوں میں سے ایک کا انتظار ہے۔ اور ہمیں تمہارے بارے میں انتظار ہے کہ اللہ تم کو عذاب دیتا ہے یا ہمارے ہاتھوں سے دلواتا ہے لہذا انتظار کرو ہم بھی انتظار کر رہے ہیں[۵۴]

مفردات کے معانی

الحسنیین۔ حسنیٰ کا تثنیہ بروزن فعلیٰ اچھی اور عمدہ حسنہ اور حسنیٰ میں باریک سا فرق ہے کہ حسن اعیان اور ذوات کے لیے اور احداث و واقعات دونوں کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اسی طرح حسنہ جب صفت بن کر آئے دونوں کے لیے مستعمل ہوتی ہے اور اسم ہو کر استعمال ہو تو صرف احداث و واقعات کے لیے بولی جاتی ہے اور حسنیٰ کا استعمال صرف احداث میں ہوتا ہے۔ اعیان میں نہیں ہوتا ہے۔

لا تفتنی تو مجھے فتنہ میں نہ ڈال۔ یفتن یفتن فتنونا ضرب جس کے معنے فتنہ میں ڈالنے اور گمراہ کرنے کے آتے ہیں نہی کا صیغہ واحد مذکر حاضر ن وقایہ متکلم۔

ایمان کی منزل اور ہے کفر کی منزل اور ہے

ان آیات میں تقویٰ کی مصنوعی اور بناوٹی نمائش کو جہاں نفاق کی نشانی بتایا ہے وہاں ایمان و کفر کی ذہنیت کے فرق کو بھی واضح کیا ہے۔ کفر جو کچھ کرتا ہے اپنے نفس کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کے نفس کی خوشی کچھ دنیوی مقاصد کے حصول پر منحصر ہوتی ہے۔ یہ مقاصد اسے حاصل ہو جائیں تو وہ پھول جاتا ہے اور حاصل نہ ہوں تو اس پر مردنی چھا جاتی ہے۔ پھر اس کا سہارا تمام تر مادی اسباب پر ہوتا ہے وہ سازگار ہوں تو اس کا دل بڑھنے لگتا ہے اور ناسازگار ہوتے نظر آئیں تو اس کی ہمت ٹوٹ جاتی ہے۔ بخلاف اس کے ایمان جو کچھ کرتا ہے وہ اللہ کی رضا کے لیے کرتا ہے اور اس کام میں اس کا بھروسہ اپنی قوت یا مادی اسباب پر نہیں ہوتا بلکہ اللہ کی ذات پر ہوتا ہے راہ حق میں کام کرتے ہوئے اس پر مصائب نازل ہوں یا کامرانیوں کی بارش ہو دونوں صورتوں میں وہ یہی سمجھتا ہے کہ جو کچھ اللہ کی مرضی ہے وہ پوری ہو رہی ہے۔ مصائب کا ہجوم اس کا دل نہیں توڑتے

اور کامیابیاں اس کو اتراہٹ میں مبتلا نہیں کرتی ہیں کیونکہ اول تو وہ دونوں کو اپنے حق میں خدا کی جانب سے سمجھتا ہے اور اسے ہر حال میں یہ فکر ہوتی ہے کہ خدا کی ڈالی ہوئی اس آزمائش سے بخیریت گذر جائے دوسرے اس کے پیش نظر دنیوی مقاصد نہیں ہوتے کہ ان کے لحاظ سے وہ اپنی کامیابی یا ناکامی کا اندازہ کرے۔ اس کا مقصد وحید رضائے الٰہی ہوتا ہے۔ اور اس مقصد سے اس کے قریب یا دور ہونے کا پیمانہ کسی دنیوی کامیابی کا حصول یا عدم حصول نہیں ہے بلکہ صرف یہ امر ہے کہ راہ خدا میں جان و مال کی بازی لگانے کا جو فرض اس پر عائد ہوتا تھا اسے اس نے کہاں تک انجام دیا۔ اگر یہ فرض اس نے ادا کر دیا ہو تو خواہ دنیا میں اس کی بازی بالکل ہی رہ گئی ہو لیکن اسے بھروسہ رہتا ہے کہ جس اللہ کے لیے اس نے مال کھپایا اور جان دی ہے وہ اس کے اجر کو ضائع کرنے والا نہیں ہے۔ پھر دنیوی اسباب سے وہ آس ہی نہیں لگاتا ہے۔ تاکہ ان کی سازگاری اور ناسازگاری اس کو خوش یا رنجیدہ کر دے۔ اس کا سارا اعتماد خدا پر ہوتا ہے جو عالم اسباب کا حاکم ہے اور اس کے اعتماد پر وہ ناسازگار حالات میں بھی ایسی عزم و ہمت کے ساتھ کام کیے جاتا ہے جس کا اظہار اہل دنیا سے صرف سازگار حالات ہی میں ہوا کرتا ہے۔ بس اللہ فرماتا ہے کہ ان منافقین سے کہہ دو کہ ہمارا معاملہ تمہارے معاملہ سے بالکل مختلف ہے۔ تمہاری خوشی و رنج کے قوانین کچھ اور ہیں اور ہمارے کچھ اور۔ تم اطمینان اور بے اطمینانی کسی اور ماخذ سے لیتے ہو اور ہم کسی اور ماخذ سے۔

(۵۱) اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جو کہتے ہیں۔ مجھے رخصت دے دیجئے اور فتنہ میں مبتلا نہ کیجئے۔ یاد رکھو کہ یہ لوگ فتنہ میں جا گرے ہیں اور بلاشبہ دوزخ کفر کرنے والوں کا گھیراؤ ڈالے ہوئے ہے۔ ایک بڑے منافق جد بن قیس نے کہا کہ حضرت مجھے تو یہیں رہنے دیجئے روم کی عورتیں بہت حسین ہوتی ہیں۔ میں انہیں دیکھ کر دل پر قابو نہ رکھ سکوں گا تو مجھے وہاں جا کر گمراہی میں نہ ڈالیے۔ فرمایا یہ کہہ کر اور اپنے جبن کفر پر جھوٹی پرہیزگاری کا پردہ ڈال کر وہ گمراہی کے گڑھے میں گر چکا۔ اور آگے چل کر کفر و نفاق کی بدولت دوزخ میں گرنے والا ہے۔ بعض نے آیت کو عام منافقین کے حق میں رکھا ہے اور لا تفتنی کا مطلب لیا ہے کہ ہم کو ساتھ لے جا کر اموال وغیرہ کے نقصان میں مبتلا نہ کیجئے۔ اس کا جواب الا فی الفتنۃ سقطوا سے دیا ہے [1]

دراصل انسان میں جب سچائی باقی نہیں رہتی تو نیکی و پرہیزگاری ہی کے خیال کو نیکی اور پرہیزگاری کے خلاف استعمال کرنے لگتا ہے اور اس سے حیلے بہانے کا کام نکالتا ہے اور یہ نفاق کا سب سے پُر فریب حربہ ہے۔ بہت سے سادہ لوح دیندار اس کے دھوکے میں آجاتے ہیں۔ اس آیت میں اسی بات کی طرف اشارا ہے کچھ لوگ کہتے ہیں اس سفر میں جانا فتنوں سے دوچار ہونا ہے لہٰذا اس میں ہمیں نہ ڈالیے مدینہ ہی میں رہنے دیجئے۔ فتنہ سے ان کی کیا مراد تھی۔ قرآن نے بیان نہیں کیا اور اس لیے نہیں بتایا کہ صریحی قرائن اس کی وضاحت کر رہے ہیں یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

بلاشبہ وہ ہر قسم کے متوقع اور وہمی خطرات ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر پیش کرتے ہوں گے اور اسے فتنہ سے تعبیر کرتے ہوں گے مثلاً اس موسم میں ہزاروں آدمیوں کے لے جانے کی کیا تک ہے اس قدر دور دراز کے سفر میں لے جانا جان بوجھ کر ان کو ہلاک کرنے والی بات ہے اور یہ نیکی کا کام نہیں ہے پھر جہاں جانا ہے وہ دوسروں کا ملک ہے نہ معلوم کن کن برائیوں میں پڑنا پڑے۔ احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ جب حضور اقدس ﷺ نے تبوک جانے کا ارادہ کیا تو منافقوں کے ایک سردار جد بن قیس نے کہا میں عورتوں کے معاملہ میں بہت کمزور ہوں۔ مجھے ڈر ہے کہیں بنو اصفر کی عورتیں دیکھ کر مفتون نہ ہو جاؤں۔ پس مجھے رہ جانے کی اجازت دیجئے اور اس فتنے میں نہ ڈالیے۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو باتیں کہی گئی ہوں گی وہ اسی قسم کی ہوں گی۔ یہ متقیانہ قسم کا بہانہ کہ وہ عورتوں کے معاملے میں بہت کمزور ہے اس وجہ سے اسے جنگ میں شرکت سے معذور رکھا جائے۔ اگرچہ یہ عذر پیش تو کسی نے ضرور کیا ہوگا لیکن یہ عذر کی ایک ایسی صورت ہے جس کو تقویٰ اور دینداری کا لباس پہنانے کی ناپاک کوشش کی گئی ہے۔ قرآن نے اسی لیے اس کا خاص طور پر ذکر کیا ہے تاکہ مسلمانوں کو شیطان کے خاص حربہ سے آگاہ کر دیا جائے کہ کبھی کبھی وہ تقویٰ کے بھیس میں بھی حملہ آور ہوتا ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ عذر بھی اشخاص کے اعتبار سے نت نئے اور الگ ہوں گے۔ کوئی کہتا ہوگا کہ اہلیہ پورے دنوں سے ہے کوئی بتاتا ہوگا کہ دکان پر کوئی نہیں کوئی کہتا ہوگا کہ گھر میں بچے ہیں نگران کوئی نہیں کسی نے بہانہ کیا ہوگا کہ ملازمت کا مسئلہ ہے چھٹی نہیں۔ لیکن قرآن نے یہاں اس واقعہ کی طرف اشارہ صرف اس لیے کیا ہے کہ یہ دین کے نام پر بے دینی ہے۔ خالص معصیت سے آپ بچ سکتے ہیں لیکن گناہ کو جب آپ نیکی کے لباس میں پیش کریں تو اس سے بچنا بے حد دشوار ہے۔ دین میں ساری بدعات کی اصل علت یہی ہے آپ جانتے ہیں کہ یتیم کا مال کھانا حرام ہے لیکن یتیم ہی کے مال پر جب ختم کا لیبل لگا دیا جاتا ہے تو نہ صرف یہ کہ اس میں معصیت کا تصور نہیں رہتا بلکہ اس خالص خدا کی نافرمانی اور معصیت پر مشتمل کھانے کو متبرک بنا لیا گیا ہے۔ حافظ ابن القیم رحمہ اللہ تعالیٰ نے اغاثۃ اللہفان میں اس کی کئی اور متعدد مثالیں دی ہیں یاد رکھیے کہ شیطان ہر باطل پر نیکی کا حربہ چڑھا دیتا ہے ساری بدعتوں پر جب حبِ رسول کا سب صحابہ اور تبرا پر جب اہلبیت کا ائمہ اجتہاد سے باغیانہ اور بے باکانہ تعلقات پر طاعت رسول کا نا خدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت پر اسلامی جمہوریت کا لیبل لگا دیا جائے تو یہی تو معصیت پر تقویٰ کا لبادہ ہے۔ جرم کی سنگینی کے پیش نظر قرآن نے خاص طور پر اس واقعہ کی طرف اشارہ کیا ہے۔ اللھم اعذنا من شرور انفسنا من سیئات اعمالنا۔

ایسے ہی لوگوں کے بارے میں ہے الا فی الفتنۃ سقطوا یعنی تبوک پہنچ کر فتنے میں مبتلا ہونا تو ایک خیالی بلا ہے لیکن واقعی فتنہ تو یہ ہے کہ اس مصنوعی پرہیزگاری کی آڑ میں جہاد کو چھوڑ کر بیٹھ گئے ہو۔ اس لیے کہ فرائض دینی سے فرار کے لیے اس قسم کے عذر تراشنا بجائے خود ایک ایسا فتنہ ہے جس کے بعد ان کی بربادی کے لیے کسی اور فتنہ کی ضرورت

نہیں آخر میں ارشاد ہوا ہے وان جھنم لمحیطۃ بالکافرین ۔ ضمیر کی جگہ اسم کافرین لا کر بتا دیا کہ ان کی یہ سزا کفر کی وجہ سے ہے اور سزا کو یقینی اور واقعی ظاہر کرنے کے لیے اسم فاعل لائے ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنا اور حضور اقدس ﷺ کی نافرمانی اتنا سنگین گناہ ہے کہ اس کی پاداش میں ایسے لوگوں کو جہنم کی لپیٹ میں آنا ہے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے مال یتیم کھانے والے کے بارے میں ہے ان الذین یاکلون اموال الیتامیٰ ظلما انما یاکلون فی بطونھم نارا وسیصلون سعیرا ۔ علامہ آلوسی نے اسے تمثیل قرار دیا ہے ان منافقین کی احاطہ اسباب کی حالت کو جہنم کے احاطہ سے تشبیہ دی ہے اور لفظ کفران کے عمل کو خالص کافرانہ عمل بنانے کے لیے لائے ہیں ۔

اسلام پر افتاد سے نفاق کی شادمانی

(۵۲) اگر آپ کو خوشحالی ملتی ہے تو ان کو بری لگتی ہے ۔ اور اگر آپ پر کوئی افتاد آ پڑتی ہے تو کہنے لگتے ہیں کہ ہم نے اس افتاد کے لیے پہلے ہی اپنا بندوبست کر لیا تھا اور شاداں پشت پھیر کر چل دیتے ہیں ۔ منافقین کی عادت تھی کہ جب مسلمانوں کو غلبہ اور کامیابی نصیب ہوتی تو جلتے اور کڑھتے اور اگر کبھی کوئی سختی کی بات پیش آ جاتی مثلاً کچھ مسلمان شہید یا مجروح ہو گئے تو فخریہ کہتے کہ ہم نے از راہ دور اندیشی پہلے ہی اپنے بچاؤ کا انتظام کر لیا تھا ہم سمجھتے تھے کہ یہی حشر ہونے والا ہے ۔ لہٰذا ان کے ساتھ گئے ہی نہیں غرض ڈینگیں مارتے ہوئے اور خوشی سے بغلیں بجاتے ہوئے اپنی مجلسوں سے گھروں کو واپس جاتے[1]

حافظ ابن جریر نے یہی مطلب بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ بتا رہے ہیں کہ اے اللہ کے رسول اگر آپ کو کوئی خوشی ہوتی ہے اور اللہ سبحانہ تبوک کی جنگ میں آپ کے لیے کسی شادمانی کا سامان فرماتا ہے تو ان منافقین کے یہاں صف ماتم بچھ جاتی ہے اور غم میں ڈوب جاتے ہیں اور اگر کوئی افتاد آتی ہے فوج میں کچھ پریشانی ہوتی ہے حالات میں ناخوشگواری ہوتی ہے تو یہ لوگ خوشیاں مناتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس افتاد کے آنے سے پہلے ہی محمد مصطفیٰ سے جنگ میں پیچھے رہ کر اپنے بچاؤ کا سامان کر لیا تھا ۔

قد اخذنا امرنا من قبل کا علامہ نیساپوری نے یہ مطلب بتایا ہے ہم تو اپنے حسن تدبیر اور سیاسی بصیرت کی وجہ سے پہلے ہی حالات سے باخبر تھے ہمیں تو پہلے ہی سے نتائج کا علم تھا اس لیے ہم نے پہلے اپنا بچاؤ کر لیا تھا قرطبی فرماتے ہیں کہ ہم نے پہلے احتیاط سے کام لیا اور میدان جنگ کی طرف نہیں گئے اور علامہ آلوسی کہتے ہیں کہ مونث با افتادہ حالات کا پہلے ہی مداوا کر لیا تھا کہ جنگ میں شمولیت ہی اختیار نہیں کی ۔

یہاں نکتہ بلاغت یہ ہے کہ آل عمران میں حسنہ کے مقابلے میں سیئۃ لائے ہیں وان تصبکم سیئۃ یفرحوا بھا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور یہاں حسنہ کا مقابلہ سیئہ سے نہیں بلکہ مصیبۃ سے کیا ہے ان تصبك مصیبة، عنایۃ القاضی وکفایۃ الراضی میں اس کا بڑا لطیف جواب دیا ہے کہ آلِ عمران میں خطاب امت سے ہے اور یہاں مخاطب حضور اقدس ﷺ ہیں آپ کے حق میں ہر افتاد قابلِ اجر و ثواب ہے وہ آپ کے کسی عمل کا نتیجہ نہیں حالات کا تقاضا ہے بخلاف سیئہ کے کہ وہ اعمال کا نتیجہ ہے اور عتاب ہے

اس آیت میں دراصل اللہ سبحانہ نے ان کے اندرون کو بے نقاب کیا ہے اور بتایا ہے کہ عذر اور بہانے تو محض نمائشی ہیں۔ ورنہ اصل حقیقت یہ ہے۔ کہ ان کے دلوں میں تمہاری بدخواہی ہے جب تم کسی کامیابی سے ہمدوش ہوتے ہو تو ان کو رنج ہوتا ہے۔ اور تکلیف ہوتی ہے اور اگر تمہیں کسی مصیبت سے کبھی دوچار ہونا پڑ جائے تو ان کے گھروں میں گھی کے چراغ جل جاتے ہیں اور خوشی سے ان کے دل بلیوں اچھل جاتے اور کہتے کہ خوب ہوا ہم نے اپنا بچاؤ پہلے کر لیا تھا۔

حالات کا دارومدار اللہ کی طرف سے ہے

(۵۲) آپ فرما دیجئے کہ ہم کسی افتاد کی لپیٹ میں کبھی نہیں آسکتے سوائے اس افتاد کے کہ جو اللہ سبحانہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے اللہ ہی تو ہمارا کارساز ہے اور اللہ ہی پر اہلِ ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے یعنی سختی و نرمی جو جس وقت کے لیے مقدر ہے وہ ٹل نہیں سکتی۔ نہ دنیا میں اس سے چارہ ہے ہم چونکہ ظاہر و باطن میں اللہ سبحانہ کو اپنا حقیقی مولا اور پروردگار سمجھتے ہیں۔ لہذا ہماری گردنیں اس کے فیصلے کے سامنے پست ہیں۔ کوئی سختی اس کی فرمانبرداری سے باز نہیں رکھ سکتی۔ اور اسی پر ہم کو بھروسہ ہے کہ وہ عارضی سختی کو روزِ قیامت بالیقین اور بسا اوقات دنیا میں ہی راحت اور خوشی سے تبدیل کر دے گا[1]

حافظ ابن جریر نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ اے اللہ کے رسول آپ ان سے کہہ دیجئے جو غزوہ میں پیچھے گئے کہ ہمیں اللہ کے فیصلہ کے بغیر کوئی تکلیف نہیں آسکتی ہے۔ دشمنوں کے مقابلہ میں اللہ ہی ہمارا مددگار ہے اور اہلِ ایمان کو صرف اللہ ہی پر بھروسہ کرنا ہے۔ اگر وہ اللہ ہی پر بھروسہ کریں اور اس کے سوا کسی مدد کے متوقع نہ ہوں اور ان کے دلوں میں اس کے سوا کسی کا ڈر نہ ہو تو اللہ سبحانہ ان کو زندگی کے ہر گوشہ میں کافی ہوگا اور مخالفین کے مقابلے میں صرف ان کی مدد کرے گا۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں ہماری زندگیاں اللہ کی قدرت اور مشیت کے تابع ہیں اللہ ہی ہمارا آقا اور مالک ہے۔ اور ہمارا بس اسی پر بھروسہ ہے۔

اس آیت میں دو اہم مسئلے ہیں، ایک اس زندگی میں قضا و قدر کا دوسرا زندگی میں اللہ سبحانہ پر بھروسہ کرنے کا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قضاو قدر کا مسئلہ

قضاء و قدر کے مسئلہ کا خلاصہ یہ ہے کہ دنیا میں جو کچھ اب تک ہوا ہے جو کچھ ہو رہا ہے اور جو کچھ ہوگا۔ وہ اتفاقی حادثہ نہیں اور نہ خود بخود ہے بلکہ اس کائنات کے خالق اللہ سبحانہٗ علم سابق اور فیصلہ ازل کے مطابق ہوا ہے ہوتا ہے اور ہوتا رہے گا جس طرح مہندس اور انجینئر مکان بنانے سے پہلے مکان کا نقشہ تیار کر لیتا ہے اور اسی مجوزہ نقشے کے مطابق معمار اور مزدور اس تعمیر کو مکمل کرتے ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اس مہندس ازل خالق کائنات نے کائنات کی پیدائش سے پہلے اس کے تمام اصول وقواعد اور دوسرے اہم جزئیات طے کر کے ہر چیز کی نسبت فیصلہ کر دیا تھا اب اسی فیصلہ کے مطابق یہ کائنات اور اس کے تمام حوادث و واقعات انجام پا رہے ہیں۔ موت و حیات۔ فقر و غنا۔ شکست و فتح۔ ترقی و تنزل۔ عروج و زوال۔ کامیابی ناکامی۔ آرام و تکلیف۔ ہر چیز پہلے سے طے شدہ ہے اور اسی کے مطابق اس کا ظہور ہو رہا ہے۔ اس عقیدہ کا منشا یہ ہے کہ ہم کو جو کامیابی ہوتی ہے وہ ہماری کوشش کا براہ راست نتیجہ نہیں بلکہ وہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم کا نتیجہ ہے اس لیے اس پر ہمارا فخر کرنا بے جا ہے اسی طرح ہم کو جو جنگ میں ناکامی پیش آتی ہے وہ اللہ سبحانہٗ کی کسی حکمت و مصلحت کا نتیجہ ہے اور ہمارے کام سے پہلے ہمارے کاموں کے نتیجے اس علام الغیوب کے علم میں مقرر ہو چکے ہیں اس لیے شکست پر ہمیں دل شکستہ اور مایوس نہ ہونا چاہیے بلکہ اسی جوش و خروش اور سرگرمی سے پھر از سر نو جد و جہد میں مصروف ہونا چاہیے۔ اس عقیدہ کا نتیجہ پستی سستی اور دون ہمتی نہیں بلکہ بلندی استقلال اور صبر و ثبات ہے اور یہی وہ چیز ہے جو حضور اقدس ﷺ اور صحابہ کرام کے کارناموں میں ہر دیکھنے والے کو صاف نظر آتی ہے ان کو صاحب وحی کی یہ تعلیم تھی کہ وہ دشمنوں کو کہہ دیں کہ ہمیں ڈر نہیں ہے کیونکہ لن یصیبنا الا ما کتب اللہ لنا ھو مولانا و علی اللہ فلیتوکل المومنون۔ ہم پر کوئی آفت اس کے علاوہ آ ہی نہیں سکتی جو اللہ نے ہمارے لیے لکھ دی ہے وہ ہمارا آقا ہے اور اللہ ہی پر اہل ایمان کو بھروسہ کرنا چاہیے۔ خطرات اور مشکلات کی ان کو پرواہ نہیں جن کے لیے موت مقرر ہے وہ میدان جنگ میں بھی مریں گے۔ اور استراحت کے بستر پر بھی۔ اور جن کی موت کا وقت مقرر نہیں آیا وہ تلواروں کی دھاروں اور سمندروں کے طوفانوں میں بھی سلامت بچ کر نکل آئیں گے۔

یہی وہ عقیدہ ہے جو مسلمانوں کی ناقابل ہزیمت جرات اور غیر شکست پذیر عزیمت اور بے خوف بہادری کا راز ہے کچھ لوگوں نے اپنی غلط فہمی سے یہ سمجھا ہے کہ مسئلہ قضاء و قدر کے ماننے سے انسان کا مجبور محض ہونا لازم آتا ہے اور اس سے یہ تعلیم نکلتی ہے کہ انسان اپنی قسمت پر صابر و شاکر رہ کر سست و غافل بن کر بیٹھا رہے۔ حالانکہ اگر ایسا ہوتا تو نہ رسولوں کی بعثت کی ضرورت تھی نہ ربانی کتابوں کی حاجت ہوتی نہ تبلیغ و دعوت کی تاکید ہوتی اور نہ اصلاح و ہدایت کا حکم ہوتا اور خدا کی مخلوق اپنے حال پر چھوڑ دی جاتی مگر ایسا نہیں کیا گیا۔ لاکھوں پیغمبر آئے کتنی کتابیں نازل ہوئیں۔ کروڑوں مبلغ اور مرشد بنا کر

پھیلائے گئے ہدایت وارشاد کی تاکید پر تاکید آئی۔ لوگوں کی دعوت واصلاح ہر مسلمان کا فرض ٹھہرایا گیا۔ کوشش و محنت، سعی و تلاش اور جدوجہد کی ہر مسلمان کو تاکید کی گئی۔ محمد رسول اللہ کی جدوجہد سے معمور زندگی ہمارے لیے نمونہ بنائی گئی۔ خلفائے راشدین اور عام صحابہ کرام نے اپنے کارناموں سے اس نمونہ کی تصدیق کی۔

بہرحال یہ آیت بتارہی ہے کہ تم بتادو کہ ہمیں وہی کچھ پیش آنے والا ہے جو اللہ سبحانہ نے ہمارے لیے لکھ دیا ہے وہ ہمارا ولی ہے اور ہمیں اس پر پورا بھروسہ ہے۔

خُود اعتمادی کی جگہ خُدا اعتمادی کا نظریہ

دوسرا مسئلہ اس میں توکل کا ہے۔ توکل کے معنے بھروسہ کرنے کے ہیں اور اصطلاح میں اللہ سبحانہ پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں یعنی کام میں اسباب کے درجے تک سرتوڑ کوشش کرنا اور نتائج کے لیے محنت پر نہیں اللہ سبحانہ پر بھروسہ کرنا۔ اس میں عزم وارادہ اور تدبیر و کوشش سب داخل ہیں۔ توکل مسلمانوں کی کامیابی کا اہم راز ہے۔ حکم ہوتا ہے کہ جب کوئی لڑائی پیش آئے تو سب سے پہلے اس کے متعلق لوگوں سے مشورہ کرو۔ مشورہ کے بعد جب رائے ایک نقطہ پر ٹھہر جائے تو اسے انجام دینے کا پختہ عزم کرو اور اس عزم کے بعد کام کو پوری مستعدی اور تندہی کے ساتھ کرنا شروع کرو اور خدا پر بھروسہ رکھو کہ وہ تمہارے کام کا حسب دلخواہ نتیجہ پیدا کرے گا۔ اگر ایسا نتیجہ نہ نکلے تو اسے اللہ سبحانہ کی مشیت اور حکمت سمجھو اور اس سے مایوس اور بودے نہ ہو۔ اور جب نتیجہ خاطر خواہ نکل آئے تو یہ غرور نہ ہو کہ یہ تمہاری تدبیر اور جدوجہد کا نتیجہ ہے بلکہ یہ سمجھو کہ اللہ کا تم پر فضل ہوا ہے اور اسی نے تمہیں کامیابی سے ہمدوش کیا ہے ارشاد ہے۔

شاورھم فی الامر فاذا عزمت فتوکل علی اللہ ان اللہ یحب المتوکلین۔

معاملہ میں ان سے مشورہ کرو پھر جب پختہ ارادہ ہوجائے اللہ پر بھروسہ کرو اللہ بھروسہ کرنے والوں سے محبت کرتا ہے۔

اس آیت نے توکل کی پوری اہمیت اور حقیقت واضح کردی ہے کہ توکل بے دست وپائی اور ترک عمل کا نہیں بلکہ اس کا نام ہے کہ پورے عزم وارادہ اور مستعدی سے کام کو انجام دینے کے ساتھ اثر و نتیجہ کو خدا پر چھوڑ دیا جائے اور یہ سمجھا جائے کہ اللہ سبحانہ مددگار ہے تو کوئی ہم کو ناکام نہیں کرسکتا اور اگر وہ نہ چاہے تو کسی کی کوشش اور مددکارآمد نہیں ہوسکتی اس لیے ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ کام میں خدا پر بھروسہ کرے۔

آیت کا مطالبہ موقعہ و محل کے اعتبار سے یہ ہے کہ ہم مشکلات کے اور موانع کی کثرت اور پرزور مخالفوں کی تدبیروں سے نڈر ہوکر استحکام عزم و استقلال کے ساتھ اپنے کام میں لگے رہ کر خدا کی مدد و حالات کے مطابق نتائج کا دل میں یقین رکھیں۔

آج کی اجتماعی اصطلاح میں اسے خود اعتمادی کہتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ قومیں وہی کامیاب ہوتی ہیں جن میں خود اعتمادی ہو

لیکن اس خود اعتمادی کے ڈانڈے غرور اور فریب نفس سے جا ملتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے انانیت کی خود اعتمادی کے بجائے خدا اعتمادی کا نظریہ پیش کیا ہے جو غرور اور فریب نفس کے خطرہ سے محفوظ ہے۔

مومن کا منتہائے نظر احدی الحسنیین ہے

(۵۲) اے اللہ کے رسولؐ ان سے کہہ دو کہ ہمارے بارے میں تمہیں تو صرف دو خوبیوں میں سے ایک کا انتظار ہے اور ہمیں تمہارے بارے میں یہ انتظار ہے کہ اللہ تم کو خود عذاب دیتا ہے یا ہمارے ہاتھوں سے دلاتا ہے۔ لہٰذا انتظار کرو ہم بھی انتظار کرتے ہیں۔ اس صورت میں تم ہماری نسبت دو بھلائیوں میں سے کسی ایک کی ضرور امید کر سکتے ہو اگر خدا کے راستہ میں ہم مارے گئے تو شہادت وجنت اور واپس آئے تو اجر و غنیمت ضرور مل کر رہے گی جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ مجاہد کے بارے میں ان چیزوں کا تکفل فرمایا ہے برخلاف اس کے کہ ہم تمہاری نسبت منتظر ہیں کہ دو برائیوں میں سے ایک برائی ضرور پہنچ کر رہے گی یا نفاق وشرارت کی بدولت بلا واسطہ خدا کی طرف سے کوئی عذاب تم پر مسلط ہوگا یا ہمارے ہاتھوں سے خدا تمہیں سخت سزا دلائے گا جو رسوا کر کے تمہارے نفاق کا پردہ چاک کر دے گی۔ بہرحال تم اور ہم دونوں کو ایک دوسرے کا انجام دیکھنے کے لیے منتظر رہنا چاہیے۔ آخر معلوم ہو جائے گا کہ دونوں میں انجام بین اور دور اندیش کون ہے [۱]

اس آیت گرامی کا مطلب یہ ہے کہ تم ہمارے لیے جس بات کے انتظار میں رہتے ہو وہ یہ ہے کہ ہم جنگ میں مارے جائیں اور شکست ہو لیکن ہمارے لیے تو یہ ہی احدی الحسنیین ہے یعنی دو خوبیوں میں سے ایک خوبی۔ اور یہی مقام ہے جسے قرآن ایمان والوں کی خصوصیت بتاتا ہے۔

دنیا میں جب کبھی کوئی فرد یا جماعت کسی مقصد کے لیے جدوجہد کرتی ہے تو اس کے سامنے امید بھی ہوتی ہے یاس بھی کامیابی بھی ہوتی ہے اور ناکامی بھی لیکن ایمان یہ ہے کہ جدوجہد جو کچھ اور جیسی کچھ بھی ہے امید و کامرانی ہی ہے۔ مایوسی اور ناکامی کی اس پر پرچھائیں بھی نہیں پڑ سکتی ہے۔ کیونکہ وہ جو کچھ کرتا ہے اللہ کے لیے کرتا ہے اور اس کے لیے یہی بات کامیابی نہیں ہوتی ہے کہ کسی خاص منزل تک پہنچ جائے بلکہ اس کی راہ میں چلتے رہنا اور جدوجہد میں لگے رہنا بجائے خود بڑی سے بڑی کامیابی ہے وہ جب اپنا سفر شروع کرتا ہے تو اس لیے نہیں کرتا کہ کسی خاص منزل تک ضروری پہنچ جائے بلکہ صرف اس لیے کہ کسی کی راہ میں چلتا رہے اور یہ جو کسی کی راہ میں چلتے رہنا ہے تو یہی اس کی منزل مقصود ہے۔

رہرواں را خستگی راہ نیست !
عشق ہم راہ است ہم خود منزل است

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

دوسرے اگر جدوجہد کرتے ہوئے مرجائیں تو یہ ان کی ناکامیابی ہے مومن اگر مر جائے تو یہ اس کی بڑی سے بڑی فتحمندی ہے ایسی فتح مندی جس سے بڑی فتح مندی کی وہ اپنی ذات کے لیے آرزو ہی نہیں کر سکتا۔

آنانکہ غمِ تو برگزیدند ہمہ　　در کوئے شہادت آرمیدند ہمہ
در معرکہ دو کون فتح از عشق است　　با آنکہ سپاہ او شہید اند ہمہ

دوسرے اگر مخالفوں اور دشمنوں پر غالب آسکیں تو ان کی ہار ہوئی لیکن مومن وہ ہے جو ہار کے معنے ہی سے ناآشنا ہوتا ہے۔ وہ اگر کسی میدان میں غالب آئے جب بھی جیت اسی کی ہے۔ کیونکہ اس کی ہار جیت کا معیار میدان جنگ نہیں ہوتا خود اس کی طلب و سعی ہوتی ہے۔ اگر وہ اپنی طلب و سعی میں پورا نکلا تو اس نے میدان مار لیا۔ اگرچہ میدان جنگ میں اس کی لاش ہزاروں لاشوں کے نیچے دبی ہوئی ہو۔

یہی وجہ ہے کہ اس راہ میں وہ کبھی مر نہیں سکتا۔ اس کی موت بھی اس کی زندگی ہوتی ہے۔ ولکن لا تشعرون۔

یہ جو قرآن نے جا بجا زور دیا ہے کہ مومن کا مقصد سعی صرف اللہ اور اس کی سچائی ہے۔ اور مومن کی جہد کا نام جہاد فی سبیل اللہ ہے تو اس میں یہی حقیقت پوشیدہ ہے یعنی وہ ساری منزلوں سے جو دنیا میں پیش آسکتی ہیں بلند کر دیا گیا۔ اب یہاں کی کوئی منزل اس کی منزلِ مقصود نہیں ہو سکتی کہ اس تک پہنچ سکنا اس کی ناکامی کا فیصلہ کر دے اس کے لیے منزل مقصود تو صرف یہ ہے کہ حق کے راستہ میں چلتا رہے اور رُکے نہیں۔ اس کا ہر قدم جو چلتا رہا فتحمندی ہے اور ہر قدم جو رُک گیا۔ وہ نامرادی ہے۔ بہرحال دو خوبیوں احدی الحسنیین سے مقصود یہی حقیقت ہے یعنی فتح مندی یا شہادت۔ اور شہادت بھی فتح مندی ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ شہادت یا مال غنیمت" جیسا کہ کچھ لوگوں نے خیال کیا۔ اور حاشا کہ مالِ غنیمت ایک مومن کے لیے احدی الحسنیین ہو[1]

بزرگان سلف کی تشریحات سے احدی الحسنیین کی تفسیر فتح مندی اور شہادت منقول ہے حافظ ابن جریرؒ نے عبداللہ ابن عباس، مجاہد، ابن جریج اور قتادہ رضی اللہ عنہم سے جو تفسیر نقل کی ہے وہ یہی ہے کہ اللہ کی راہ میں جان کا کام آنا اور دشمن پر غلبہ۔ تعبیر یہی ہے کہ القتل فی سبیل اللہ۔ والظہور۔ حافظ ابن کثیرؒ نے ان تین بزرگوں کے حوالہ سے یہی بات بتائی ہے شہادۃ او ظفر بکم۔ ابن الجوزیؒ نے بھی لکھا ہے الحسنیان النصر والشہادۃ علامہ آلوسی نے بھی المراد منہما النصرۃ والشہادۃ بتایا ہے۔ علامہ شوکانی نے بھی فتح القدیر میں اسی کو اپنایا۔ مدارک میں نسفی کا بھی یہی مختار ہے۔ غالباً امام محمد بغوی صاحب معالم التنزیل پہلے مفسر ہیں جنھوں نے احدی الحسنیین کی تفسیر اما النصر والغنیمۃ سے کی ہے اور ان ہی کی پیروی میں دوسرے شارحین قرآن نے اس کی تشریح میں نصرت و غنیمت کے

---

[1] ترجمان القرآن

الفاظ لکھنے شروع کردیئے جیسے نواب صدیق حسن خان ورنہ متقدمین سے اس باب میں جو کچھ منقول ہے وہ سب جانتے ہیں، خبر نہیں علامہ قرطبی نے غنیمت اور شہادت کہہ کر عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ اور امام مجاہد رحمہ اللہ تعالیٰ کا حوالہ کہاں سے اور کیسے دیا ہے ورنہ جہاں تک ان بزرگوں کی تفسیر کا نقل سرمایہ مفسرین نے بالسند پیش کیا ہے اس میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ امام بغوی نے جو غنیمت اور شہادت سے تفسیر کی ہے وہ انھوں نے ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک حدیث سے استنباط کیا ہے یعنی ان کا اجتہاد ہے۔ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی جس حدیث سے انھوں نے یہ بات استنباط کی ہے وہ یہ ہے۔

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ نے اس شخص کی ذمہ داری لی ہے جو اپنے گھر سے صرف جہاد کو مقصود بنا کر نکلا کہ اس کو جنت میں پہنچائے گا یا اسے اپنے گھر لوٹائے گا اس چیز کے ساتھ جو اسے اجر یا غنیمت کی صورت میں حاصل ہوا ہے۔

اس حدیث میں لفظ غنیمت بے شک آیا ہے مگر ایک ثانوی درجہ میں ہے اصل اور بنیادی چیز تو اجر ہے اجر سے دنیا کا اجر نہیں بلکہ آخرت میں اللہ کی جانب سے ثواب مراد ہے۔ بہرحال عام شارحین قرآن کی رائے میں احدی الحسنیین کی تفسیر نصرت یا شہادت ہے۔

قُلْ اَنْفِقُوْا طَوْعًا اَوْ كَرْهًا لَّنْ يُّتَقَبَّلَ مِنْكُمْ ؕ اِنَّكُمْ كُنْتُمْ
قَوْمًا فٰسِقِيْنَ ﴿۵۳﴾ وَمَا مَنَعَهُمْ اَنْ تُقْبَلَ مِنْهُمْ نَفَقٰتُهُمْ اِلَّآ
اَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَبِرَسُوْلِهٖ وَلَا يَاْتُوْنَ الصَّلٰوةَ اِلَّا
وَهُمْ كُسَالٰى وَلَا يُنْفِقُوْنَ اِلَّا وَهُمْ كٰرِهُوْنَ ﴿۵۴﴾ فَلَا
تُعْجِبْكَ اَمْوَالُهُمْ وَلَآ اَوْلَادُهُمْ ؕ اِنَّمَا يُرِيْدُ اللّٰهُ لِيُعَذِّبَهُمْ بِهَا
فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ اَنْفُسُهُمْ وَهُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۵۵﴾
وَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ اِنَّهُمْ لَمِنْكُمْ ؕ وَمَا هُمْ مِّنْكُمْ وَلٰكِنَّهُمْ
قَوْمٌ يَّفْرَقُوْنَ ﴿۵۶﴾ لَوْ يَجِدُوْنَ مَلْجَاً اَوْ مَغٰرٰتٍ اَوْ مُدَّخَلًا
لَّوَلَّوْا اِلَيْهِ وَهُمْ يَجْمَحُوْنَ ﴿۵۷﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّلْمِزُكَ
فِى الصَّدَقٰتِ ۚ فَاِنْ اُعْطُوْا مِنْهَا رَضُوْا وَاِنْ لَّمْ
يُعْطَوْا مِنْهَآ اِذَا هُمْ يَسْخَطُوْنَ ﴿۵۸﴾ وَلَوْ اَنَّهُمْ رَضُوْا مَآ
اٰتٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ ۙ وَقَالُوْا حَسْبُنَا اللّٰهُ سَيُؤْتِيْنَا
اللّٰهُ مِنْ فَضْلِهٖ وَرَسُوْلُهٗٓ ۙ اِنَّآ اِلَى اللّٰهِ رٰغِبُوْنَ ﴿۵۹﴾ ع ۱۷

اے پیغمبر کہہ دو کہ تم راہ خدا میں مال بخوشی خرچ کرو یا ناخوش ہو کر تمہارا خرچ ہرگز قبول
نہ کیا جائے گا کیونکہ تم بدکار قسم کے لوگ ہو۵۵۔ اور خرچ کی قبولیت سے ان کو صرف اس لیے
محروم کیا ہے کہ انھوں نے اللہ اور اس کے رسول کا کفر کیا ہے اور وہ نماز کے لیے

نہیں آتے مگر کاہلی اور سستی سے اور وہ خرچ نہیں کرتے مگر بڑی ناگواری سے[۵۶]۔ آپ کو ان کا مال و اولاد والا ہونا تعجب میں نہ ڈالے۔ اس مال و اولاد کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ اس کے ذریعے ان کو دنیوی زندگی میں سزا دے اور کفر ہی کی حالت میں ان کی جانیں نکلیں گی[۵۷]۔ وہ خدا کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں بلکہ ایک گروہ ہے ڈرا اور سہما ہوا۔ اگر انہیں پناہ کی کوئی جگہ مل جائے یا غار اور یا گھس جانے کا کوئی مقام تو پلٹ جائیں گے اس کی طرف ایسے جیسے رسہ تڑا کر بھاگے جا رہے ہیں[۵۸]۔ اور ان میں کچھ ایسے ہیں کہ آپ پر صدقات کے بارے میں نکتہ چینی کرتے ہیں اگر ان صدقات میں سے ان کو دے دیا جائے تو خوش ہوتے ہیں اور ان صدقات میں سے اگر ان کو نہ دیا جائے تو اچانک بگڑ جاتے ہیں[۵۹]۔ اور کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ اللہ و رسول کی عطا پر خوش ہوتے اور کہتے ہمارے لیے اللہ کافی ہے۔ اللہ ہمیں اپنے فضل سے ضرور دے گا۔ اور اللہ کا رسول بھی۔ بلاشبہ ہمارا مقصود صرف اللہ ہے[۶۰]۔

معانی مفردات

طوعًا فرماں برداری، انقیاد یہ مصدر ہے اس کے معنے فرمانبرداری کرنے کے ہیں کرہ اس کی ضد ہے۔ اس کا فعل باب نصر اور سمع سے آتا ہے۔ طاع یطوع طاعا اور طاع یطاع طوعًا۔ جیسے کہ ازہری نے جو لغت کے مشہور امام ہیں کچھ اہل عرب سے نقل کیا ہے اور طاع یطاع کے لیے تصریح کی ہے کہ لغت جیدہ ہے۔ یہاں معنے بخوشی ہیں۔

تعجب اعجاب سے مضارع ہے تعجب میں ڈالتی ہے پسند آتی ہے حیران کرتی۔ واحد مؤنث غائب کا صیغہ ہے اصل مادہ عجب ہے یہ باب سمع سے عجب یعجب آتا ہے اسی سے عجیب چیز عجیب بات اور واقعہ کے لیے اعجوبۃ آتا ہے۔ تزھق مضارع کا صیغہ واحد مؤنث غائب ہے باب فتح سے آتا ہے مصدر زھوق زاء کے پیش کے ساتھ اگر

زبر کے ساتھ فعول کے وزن پر ہو تو صفت مشبہ کا صیغہ ہے فعول پیش کے ساتھ ۔ وزن پر ہو تو مصدر ہے اور فعول زبر کے ساتھ کے وزن پر ہو تو صفت کا صیغہ زہوق مصدر کے معنے غم سے جان نکلنا اور کسی چیز کے مٹ جانے کے ہیں۔

ملجأ پناہ گاہ لجا یلجا باب فتح سے آتا ہے پناہ میں آنا ہے اس سے اسم ظرف پناہ کی جگہ کے معنے میں ملجأ آتا ہے حدیث میں لا ملجأ من اللہ الا الیہ ۔ اسی سے ہے۔ ایسی جگہ جہاں آدمی موت کی حالت میں بچنے کے لیے پناہ لے جیسے پہاڑ کی چوٹی۔ قلعہ۔ سمندر میں جزیرہ۔

مغارات۔ اس کا واحد مغارۃ ہے۔ اصل میں غور سے ہے جس کے معنی گہرا ہونے کے ہیں۔ غار کو کہتے ہیں بعض مغارۃ اور غار میں فرق کرتے ہیں پہاڑ میں گہرے گڑھے کو غار اور زمین میں گہرے گڑھے کو مغارہ کہتے ہیں مغارۃ کی جمع تو مغارات آتی ہے لیکن غار کی جمع غیران آتی ہے جیسے نار کی نیران مدخل یہ دخول سے باب افتعال سے اسم ظرف ہے اصل میں مدتخل تھا تا کو دال بنا کر ادغام کر دیا گیا۔ زمین میں ایسی سرنگ جس میں آدمی مشکل سے جا سکے۔

یجمحون۔ جمع ہے فعل مضارع کا جمع مذکر غائب ہے باب فتح اصل میں گھوڑے کی سرکشی کے لیے بولتے ہیں .... جمح الفرس اور سرکش گھوڑے کو جموح کہتے ہیں عرب کے ایک شاعر نے اسی معنے میں استعمال کیا ہے غالباً امرؤالقیس ہے۔

سبوحا جموحا واحضارها		کمعمۃ السعف الموقد

یہاں مراد دوڑنا اور تیزی ہے۔

یلمز لمز سے مضارع کا واحد مذکر غائب باب ضرب سے آتا ہے۔ دو لفظ ہیں ایک لمز اور دوسرا ھمز۔ ہمز کے معنے کچوکے لگانے کے ہیں ہمیز کا لفظ اردو میں اسی سے بنا ہے سوار کے جوتے میں کیل ہوتی ہے گھوڑے کو ایڑ لگانے کی ضرورت ہوتی ہے تو اسی سے کچوکے لگانے کا کام لیتا ہے قریب قریب لمز کا بھی یہی مفہوم ہے منتہی الادب میں مارنے اور جلانے کے معنی بھی لکھے ہیں۔ افعال و اقوال سے دل میں کچوکے لگانے کو کہتے ہیں۔

منافقین کے خاص احکام

اسلام ایک ایسے مضبوط اور مستحکم عقد کا نام ہے جس میں جزم و اعتقاد کے لحاظ سے ذرا بھی تردد کی گنجائش نہیں ہوتی۔ جو لوگ اسے اپناتے ہیں ان کو اس بات کا یقین ہوتا ہے کہ جن اصول و عقائد کی طرف انہیں دعوت دی گئی ہے وہ کسی انسان کے خود ساختہ و پرداختہ نہیں ہیں بلکہ ان کا صدور ایسی ذات سے ہوا ہے جو ہمہ تن حق و صداقت ہے۔ جس کی عقل کائنات کے ہر گوشہ پر حاوی اور جس کی ہمہ بین آنکھ زمین و آسمان کی ہر شے کو محیط ہے۔ جب تک یہ یقین پیدا ہو جائے کوئی شخص دعوت

ایمان کو حق و صداقت کے ساتھ قبول نہیں کر سکتا اور نہ قرآن و سنت کے سامنے تسلیم و رضا کا سر جھکا سکتا ہے۔ اسی طرح ان اصولوں اور جن مقاصد و غایات کو وہ قبول کرتا ہے وہ اس کی آزاد مرضی اور غیر پابند قوت فیصلہ پر مبنی اور جبر و تشدد سے پاک ہوتے ہیں۔ پھر چونکہ وہ ان مقاصد اور اصولوں پر یہ سمجھ کر ایمان لاتا ہے کہ یہ خدا کی طرف سے ہیں اس لیے اس کا کوئی امکان نہیں ہوتا کہ وہ کبھی ان سے اختلاف کرے کیونکہ اس سے اختلاف کرنے کے معنے یہ ہوں گے کہ وہ اسلام سے منکر ہو گیا اور اس کے ساتھ وہ اس سوسائٹی سے خارج ہو جاتا ہے جس کا وہ اس بنا پر رکن بنا کہ اس نے اصول و مقاصد کو بلا تردد تسلیم کر لیا تھا جس پر مذکورہ سوسائٹی قائم ہوتی تھی ان کا حکم ان آیات میں بیان ہوا کہ ایسے لوگوں کا انفاق قبول نہ کیا جائے۔ اُخروی نجات سے یہ لوگ محروم رہیں گے جو بغیر توبہ مر جائیں گے۔ بخشے نہ جائیں گے اگرچہ خود حضور بھی ان کے لیے دعا کریں۔ حضرت حذیفہ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم خاص خاص منافقوں کے لیے ہوا تھا اور حضور اقدس ؐ نے ان کے نام بتا دیئے تھے۔ جبیر بن مطعم سے مروی ہے کہ یہ بارہ آدمی تھے۔ (فتح الباری)

(۵۵) اے پیغمبر کہہ دو کہ تم راہ خدا میں مال بخوشی خرچ کرو یا ناخوش ہو کر ہرگز قبول نہ کیا جائے گا کیونکہ تم بدکار تھے، رگ بن جد بن قیس رومی عورتوں کے فتنہ کا بہانہ کر کے یہ بھی کہا تھا کہ حضرت میں بذاتِ خود نہیں جا سکتا لیکن مالی اعانت کر سکتا ہوں اس کا جواب دیا کہ بے اعتقاد کا مال قبول نہیں خواہ خوشی سے خرچ کرے یا ناخوشی سے خدا کے راستے میں خرچ کرنے کی ان کو توفیق کہاں ولا ینفقون الا وھم کارھون۔ تاہم اگر بالفرض خوشی سے خرچ کرتے تو اللہ اسے قبول نہ کرے گا۔[1]

اس سے معلوم ہوا کہ جو افراد جماعت کے مقاصد کو نقصان پہنچائیں امام کو چاہیے کہ ان کی مالی اعانت قبول کرنے سے انکار کرے۔ کیونکہ ایسے لوگوں کا مال قبول کرنا انہیں بدعملیوں اور شرارتوں پر جرات دلانا ہے وہ سمجھتے ہیں کہ ہم روپیہ خرچ کر کے اپنے منافقانہ اعمال کی پردہ پوشی کرتے رہیں گے۔ ان کا منشا صرف یہ ہوتا ہے کہ اپنے آپ کو خطرہ میں نہ ڈالیں اور نمائشی طور پر لوگوں کی نگاہوں میں نام بھی جانبازوں میں آجائے اور مسلمانوں میں عزت بنی رہے اس لیے وہ کہتے تھے کہ ہم جنگی خدمت انجام دینے سے تو اس وقت معذرت چاہتے ہیں لیکن مالی امداد کے لیے حاضر ہیں اس لیے فرمایا کہ ان کو بتا دو کہ تمہارا کوئی انفاق بھی خواہ طوعاً ہو یا کرہاً جناب الٰہی میں قابلِ قبول نہیں ہے انفاق تو ان کا قبول ہوتا ہے جو اللہ و رسول کے وفادار ہوں جو بدعہد اور غدار ہیں اور محض نمائش کے لیے خرچ کرتے ہیں ان کے انفاق کی اللہ کے یہاں کوئی قدر نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ کو کسی کے مال کی ضرورت نہیں ہے وہ صرف ان کا ہی مال قبول کرتا ہے جو سچے اور پورے جذبہ اخلاص اس کے دین کی خدمت کرتے ہیں۔

علامہ قرطبی نے یہاں یہ بات خوب لکھی ہے کہ انفقوا اگرچہ امر ہے مگر اہلِ عرب ایسے شرط و جزا کے ہم معنے بنا کر برتتے

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک شاعر کہتا ہے۔

آسیئی بنا او احسنی لاملومۃ　　　لدینا ولا مقلیۃ الی تقلت

نیکی کرو یا برائی ہمارا تو تمہیں پتہ ہی ہے۔ اب آیت کا مطلب یہ ہے کہ خوشی ہو کر خرچ کرو یا ناخوش کسی صورت میں قبول نہ کیا جائے گا۔ خطیب نے یہ بات کہی کہ آیت کی عمومی معنویت کی طرف اشارہ کیا ہے کہ آیت اگرچہ منافقین کے بارے میں ہے مگر ہر وہ شخص اس کی ضرب کا نشانہ ہے جو مال کو لوجہ اللہ خرچ نہیں کرتا ہے بلکہ دکھاوے اور سناوے کے لیے کرتا ہے۔ قاضی بیضاوی نے قبول کے معنے بھی یہاں دو بتائے ہیں ایک یہ کہ ان سے لیا نہ جائے دوسرے یہ کہ اللہ کے یہاں قابل اجر و ثواب نہیں۔ دوسری صورت کا وجود پہلی صورت کے بعد ہے۔ یعنی ان سے لے لیا جائے تو ان کا انفاق قابل اجر نہیں ہے۔

منافقین کے خصائص

(۵۶) اور خرچ کی قبولیت سے ان کو صرف اسی لئے محروم کیا ہے کہ انھوں نے اللہ و رسول کا کفر کیا ہے اور وہ نماز کے لیے نہیں آتے مگر کاہلی اور سستی سے اور وہ خرچ نہیں کرتے مگر بڑی ناگواری سے۔ عدم قبول کا اصل سبب تو ان کا کفر ہے جیسا کہ ہم پہلے متعدد مواقع میں اشارہ کر چکے ہیں کہ کافر کا ہر عمل مردہ اور بے جان ہے۔ باقی نمازیں ہارے جی سے آنا یا برُے دل سے خرچ کرنا یہ سب کفر کے ظاہری آثار ہیں[1]۔ یہ بھی ان خاص منافقین کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے جن کے حضور اقدس نے نام بتائے تھے ان کے فکر و اعتقاد اور دین کے نام پر ان کی عملی زندگی۔ اس آیت میں دونوں لحاظ سے ان منافقین کا بھرپور حال ہے فرمایا فکر و اعتقاد تو یہ ہے کہ ان میں اللہ اور اس کے رسول کا کھلا کفر پایا جاتا ہے کفروا باللہ ورسولہ۔ یہی سب سے بڑی بنیاد ہے اس پر اعمال کی جو عمارت اٹھائی جائے وہ بودی اور ناپائدار ہوگی۔ اس کے تقاضے ایمان سے بالکل الگ ہیں۔ اعمال کی صحت کا مدار ایمان ہے کفر کے ساتھ اعمال خواہ کتنے اچھے ہوں قطعاً بے وزن اور بے قیمت ہیں۔ اس لیے فکری طور پر ان کے دعویٰ ایمان کا کھوکھلا پن ظاہر کیا۔ اور ایمان کے تقاضوں میں جو دو بنیادی چیزیں نماز اور زکوٰۃ ہیں ان میں ان کا حال یہ ہے کہ نماز کی ادائیگی بندھے بندھائے دوسروں کو دکھانے کے لیے ہارے جی کے ساتھ کرتے ہیں اور انفاق مال بھی بے دلی اور کراہت کے ساتھ صرف نمائش کے لیے کرتے ہیں۔ اعتقاد بھی غلط اور اعمال بھی غلط اور اس پر ان کا دعویٰ ہے مسلمان ہونے کا۔ حالانکہ ایمان نام ہے نبوت کے لائے ہوئے ہدایت نامہ کو ماننے اور اس کے تقاضے پورا کرنے کا۔ فرمایا اعتقاد کے اس کفر اور اعمال کے لیے ان کی بے دلی اور کراہت خدا کے نام پر دیئے ہوئے مال کی قبولیت

[1] افادات شیخ الاسلام

میں پہاڑ بن کر کھڑے ہو گئے ہیں۔
قبول کے جو معنے قاضی بیضاوی نے بتائے ہیں ایک یہ کہ ان سے نہ لیا جائے دوسرے یہ کہ اللہ کے یہاں قابل پذیرائی نہیں۔ ان میں واقعیت اس طرح ہے کہ وہ ایمان کا بھی دعویٰ کرتے تھے۔ نمازیں بھی ہارے جی سے پڑھتے صدقات بھی ناگواریوں سے دیتے تھے لیکن ان میں سے کوئی چیز ان کے کفر کی وجہ سے اللہ کے یہاں قابل پذیرائی نہ تھی۔ ان نیکیوں کا دنیا میں وجود اور ظہور بے شک تھا لیکن آخرت میں ان کے نتائج کا قطعاً ظہور نیکیاں بنا کر نہ ہوگا۔ بلکہ اس کا عکس ہوگا۔ کیونکہ کفر کی زمین میں نیکی کا کوئی پودا بارآور نہیں ہوتا ہے۔

مال واولاد نیکی کا پیمانہ نہیں

(۵۷) آپ کو ان کا مال واولاد والا ہونا تعجب میں نہ ڈال دے۔ اس مال واولاد کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ اس کے ذریعے سے ان کو دنیوی زندگی میں سزا دے۔ اور کفر ہی کی حالت میں ان کی جانیں نکلیں گی۔ شبہ گذر سکتا تھا کہ جب ایسے مردود ہیں تو ان کو مال واولاد وغیرہ نعمتوں سے کیوں نوازا ہے۔ اس کا جواب دیا ہے کہ یہ نعمتیں ان کے حق میں بڑا عذاب ہیں جس طرح ایک لذیذ اور خوشگوار غذا تندرست آدمی کی صحت وقوت بڑھاتی ہے۔ اور فاسد الاخلاط مریض کو ہلاکت سے قریب تر کر دیتی ہے۔ یہی حال ان دنیوی نعمتوں کا ہے۔ ایک کافر کے حق میں یہ چیزیں سوء مزاج کی وجہ سے زہر ہلاہل ہیں چونکہ کفار دنیا کی حرص ومحبت میں غرق ہوتے ہیں اس لیے اول اس کے جمع کرنے میں بیحد کوفت اٹھاتے ہیں پھر ذرا نقصان یا صدمہ پہنچ گیا تو جس قدر محبت ان چیزوں سے ہوتی ہے اسی قدر غم سوار ہوتا ہے۔ اور کوئی وقت اس کے فکر واندیشہ اور ادھیڑپن سے خالی نہیں ہوتا۔ پھر جب موت ان محبوب چیزوں سے جدائی کرتی ہے اس وقت کے صدمے اور حسرت کا تو اندازہ کرنا مشکل ہوتا ہے۔ غرض دنیا کے عاشق اور حریص کو کسی وقت حقیقی چین اور اطمینان میسر نہیں چنانچہ یورپ وامریکہ وغیرہ کے بڑے بڑے سرمایہ داروں کے اقوال اس پر شاہد ہیں۔ باقی مومنین جو دولت اور اولاد کو مقصود اور زندگی کا اصل مقصود نہیں سمجھتے۔ چونکہ ان کے دل میں حب دنیا کا مرض نہیں ہوتا اس لیے یہی چیزیں ان کے حق میں نعمت اور دین کی اعانت کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اس کے علاوہ اکثر کفار کثرت مال واولاد پر مغرور ہو کر کفر وطغیان میں اور زیادہ شدید ہو جاتے ہیں جو اس کا سبب بنتا ہے کہ اخیر دم تک کافر ہی رہیں۔ نیز منافقین مدینہ جن کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں ان کا حال یہ تھا کہ بادل ناخواستہ جہاد وغیرہ کے موقعہ پر ریا ونفاق سے مال خرچ کرتے تھے۔ اور ان کی اولاد میں بعض لوگ مخلص مسلمان ہو کر نبی کریم ﷺ کے ہمراہ جہاد میں شریک ہوتے تھے۔ دونوں چیزیں منافقین کے منشائے قلبی کے بالکل خلاف تھیں۔ اس طرح اموال واولاد ان کے لیے دنیا میں عذاب بن گئے تھے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں یعنی

یہ تعجب کرکر بے دین کو اللہ نے نعمت کیوں دی بے دین کے حق میں اولاد اور مال وبال ہے کہ ان کے پیچھے دل پریشان رہے اور ان کی فکر سے چھوٹنے نہ پائے مرتے دم تک نہ توبہ کرے نہ نیکی اختیار کرے [1]

یہاں شارحین قرآن نے چند اہم اور ضروری باتوں کی طرف اشارا کیا ہے کہ اعجاب جو تعجب کا مصدر ہے اس کے معنے کچھ نے تعجب کرنے کے بتائے کچھ نے اعجاب کے معنے پسند آنے اور اچھا لگنے کے بتائے ہیں۔ چنانچہ علامہ قرطبی نے لاتعجبك کی تفسیر لاتستحسن سے کی ہے یعنی تمہیں یہ بات اچھی نہ لگے اور علامہ آلوسی نے اس کی تفسیر میں لایسروك لکھا ہے یعنی پسند نہ آئے اور نہ بھادے تم کو۔ خطاب میں بھی کچھ نے حضور کو مخاطب بتایا ہے اور کچھ نے خطاب عام رکھا ہے۔ ہمارے خیال میں خطاب عام ہے اور اعجاب پسند کرنے کے معنے میں ہے مطلب ہے کہ اے مخاطب تجھے نعمتوں کی بہتات ان میں مال و اولاد کی صورت میں پسند نہ آئے۔

بہرحال اس آیت میں ایک اجتماعی قانون بیان ہوا ہے کہ باغیوں اور سرکشوں پر جو بے پایاں انعامات کی بارش ہوتی ہے اس کا پس منظر اللہ کے یہاں ان کی مقبولیت اور محبوبیت نہیں جیسا کہ عام لوگ سمجھتے ہیں بلکہ یہ انعامات ان پر بطور سزا انتقاماً ان کی مجرمانہ غفلتوں میں اضافہ کی خاطر کیے جاتے ہیں اور یہ اقوام ہی کو نہیں بلکہ افراد کے ساتھ بھی معاملہ ہوتا ہے۔ یعنی اموال اور اولاد کی صورت میں نعمتوں کی بہتات کی جاتی ہے بطور سزا تاکہ ان میں غفلتوں کا اضافہ ہوتا جائے مقصود اس داد و دہش سے یہی اور صرف یہی ہوتا ہے کہ ان کو دولت کی بے پایانی سے مخمور کر دیا جاتا ہے تاکہ پھر نیکی کی راہیں ان کو نظر بھی نہ آئیں۔ وہ اپنی جگہ مگن رہیں کہ قدرت کے پیارے وہی ہیں اور ان کو ہی اللہ سبحانہ نے نعمتوں سے استفادہ کے لیے پیدا فرمایا ہے۔ قرآن کی یہ آیت ان کے اسی مغالطہ پر تنبیہ کے لیے ہے کہ ان کا حال کہیں لوگوں کے ایمان کو نہ لرزا دے صاف اور کھلے لفظوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ الاموال اور الاولاد کی یہ وہی قسم ہے جس سے اللہ سبحانہ ان لوگوں کو سزا دیتے ہیں اور اس سے غرض یہی ہوتی ہے کہ اسی ناشکری اور کفران کی حالت میں ان کی روحیں بدن سے فرسودہ ہو کر نکلیں۔ اور اس طرح مریں کہ ان کو چونکنے اور سنبھلنے کا بھی موقعہ نصیب نہ ہو۔

قوموں کی حد تک تو یہ سزائی قانون ایسا نہیں جس کا دیکھنے والوں کو پتہ نہ ہو۔ دنیا میں ایسی قومیں جن کی زندگی کی ہر شاخ نا خدا شناسی بلکہ کھلم کھلا بغاوت نہ کر رہی ہوں۔ سب کی نگاہوں میں ہیں لیکن یہ بغاوت ان کے سامنے ایسے دنوں کو بھی لا رہی ہے جس میں کسی نہ کسی برتری اور نعمت مزید کا دروازہ ان پر کھول دیا جاتا ہے۔ اپنی سرکشیوں اور اللہ سبحانہ کی بغاوتوں میں وہ جس حد تک آگے بڑھتے جاتے ہیں اسی قدر ان میں نعمتوں کی بہتات ہوتی جاتی ہے۔

ایسی قوموں کے بارے میں قرآن کا طالب علم تو یہی جانتا ہے کہ یہ انعامات کی بارش ان پر اللہ سبحانہ کا انتقامی تازیانہ

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے تاکہ وہ اپنی غفلتوں میں بدمست ہو کر خوب چھوٹ اور بے لگام ہو جائیں اور خوب اترا جائیں یعنی ان کو خوب انعامات کے ذریعے پہلے ترقی و عروج ارتقاء و اعتلاء کی انتہائی بلندیوں پر پہنچا دیا جائے پھر ان ساری ترقیوں اولوالعزمیوں کے بعد اللہ سبحانہ مخفی تدبیر سے ان کو پکڑ لیتا ہے اور اس طرح پکڑتا ہے کہ ان کا کیا کرایا سب کا سب دھرا کا دھرا رہ جاتا ہے لیکن سرکش اور طاغی قوموں کے ساتھ اللہ سبحانہ کا یہ برتاؤ ان لوگوں کے لیے بڑا صبر آزما ہوتا ہے اور انتہائی خطرات کا سبب ہوتا ہے جنہیں انجام سے پہلے ان کے انتقامی دور میں زندگی گذارنی پڑتی ہے۔

بہرحال قوموں کی حد تک تو یہ مسئلہ صاف ہے۔ البتہ افراد کا مسئلہ ذرا مشکل ہے۔ ان لوگوں کو جن پر نعمتوں کے دروازے کھلے ہوئے ہیں اور کھلتے جا رہے ہیں۔ یہ دیکھنا چاہیے کہ اللہ سبحانہ اور ان کی مرضیات کا ان کی زندگی سے کیا تعلق ہے اگر حال یہ ہے کہ جس حد تک وہ اللہ سبحانہ اور اس کے قوانین سے ٹکرا رہے ہیں اسی حد تک ان پر انعامات کی افزونی ہو رہی ہے۔ غرور سرکشی کے میدان میں جس قدر آگے بڑھ رہے ہیں اسی حد تک دنیا اور دنیا کی نعمتیں ان کے قدم چومتی جا رہی ہیں تو ایسی حالت میں ان کو یقین کر لینا چاہیے کہ انعامات کا یہ تاج ان کے سر پر اس لیے نہیں رکھا گیا کہ اللہ سبحانہ ان سے خوش ہے بلکہ اس لئے رکھا گیا ہے کہ وہ اندھے ہو کر زندگی گذاریں اور اندھے ہی دنیا سے رخصت ہو جائیں۔ الاموال اور الاولاد کی یہ کثرت نشانی ہے اس بات کی کہ اللہ سبحانہ ان سے انتقام لینا چاہتا ہے اور ایسا انتقام کہ جو نکلنے کی ساری راہیں ان پر بند کر دی گئی ہیں۔

اگر مسلمان ہونے کے باوجود کوئی مغالطہ کا شکار ہے تو اس کی منطق ناقابل فہم ہے جو قرآن کو مانتے ہیں اور اسلام کو انسانی دماغ کا خود تراشیدہ نظام نہیں سمجھتے بلکہ نسل انسانی کے جینے اور مرنے کا قدرتی اور لاہوتی دستور مانتے ہیں ان کی منطق اس کے سوا کیا ہو سکتی ہے جس کی خبر قرآن نے دی ہے۔ اگر قرآن وحی ہے تو قرآن میں آمدہ مسئلہ کے سمجھنے میں کیا دشواری ہو سکتی ہے۔

بہرحال قرآن سمجھا رہا ہے کہ اس مال و اولاد کی محبت میں گرفتار ہو کر جو منافقانہ رویہ انھوں نے اختیار کیا ہے اسی کی وجہ سے وہ معاشرہ میں انتہائی ذلیل و خوار ہو کر رہیں گے۔ اور وہ ساری شان ریاست و عزت و ناموری اور مشیخت جو اب تک ان کو حاصل تھی نئے اسلامی نظام اجتماعی میں خاک ہو کر رہ جائے گی اور ان کا نام و نشان تک مٹ جائے گا۔ اور اس ذلت و رسوائی سے بڑھ کر عذاب ان کے لیے یہ ہو گا کہ جن منافقانہ عزائم کو یہ اپنے اندر پرورش کر رہے ہیں ان کی بدولت مرتے دم تک صدق ایمانی کی دولت نصیب نہ ہو گی۔

آیت میں دنیا میں جس عذاب کے ہونے کی ان کے لیے خبر دی گئی ہے اس سے بڑا دردناک عذاب ہے جو نفاق و بخل کی وجہ سے مال کا غم وبالِ جان ہو رہا ہے اور اولاد کو اپنے سے برگشتہ اور اسلام میں ثابت قدم دیکھ کر شب و روز جل رہے ہیں

کچھ کہتے ہیں کہ ان کو مصائب میں مبتلا کرے گا۔ حسن بصری کہتے ہیں کہ ان پر زکوٰۃ اور انفاق کی ذمہ داری کا بوجھ ڈالا جائے گا۔ اور کچھ کے خیال میں عذاب کی صورت یہ ہے کہ فتح کے وقت جب مال غنیمت تقسیم ہوگا اور منافقین کو نہ ملے گا تو اس نہ ملنے کا حزن وغم ان کے لیے عذاب ہوگا۔

شارحین قرآن کو یہاں پہلی آیت میں کفر کے ساتھ نماز اور انفاق کا پیوند حیرت میں ڈالے ہوئے ہے۔ اور یہ بھی حیرت کی بات کہ ایک طرف کافر کہا جا رہا ہے اور اس کے ساتھ جو جوابات انھوں نے دیئے ہیں وہ تسلی بخش نہیں۔ بات یہ ہے کہ یہاں منافقوں کا ذکر ہے اس لیے کفر یہاں بمعنے انکار نہیں بلکہ کفران ہے بمعنی ناشکری ہے۔ اور مطلب یہ ہے کہ اسلام کی نعمت پا کر ان لوگوں نے اللہ ورسول کی قدر نہیں کی بلکہ ناشکری کی ہے۔ اسی لیے دنیا میں ان کے عذاب کے بارے میں قدماء کے افکار مختلف ہیں بلکہ حسن بصری نے تو یہاں تک کہہ دیا ہے کہ دنیا میں ان کو عذاب زکوٰۃ وصول کر کے اور راہ جہاد میں سرمایہ لے کر دیا جائے گا اور جیسا کہ قرطبی نے لکھا ہے کہ حافظ ابن جریر کا یہی مختار ہے۔ یہ کہنا کہ

دنیا میں عذاب سے مراد وہ عذاب ہے جو رسول اللہ کے مکذبین کے لیے مقدر ہو چکا تھا۔

قطعاً غلط ہے اور شارحین قرآن کے یکسر خلاف ہے اس کہنے کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

بہرحال اس آیت میں اللہ سبحانہ نے انعامات کے لیے جماعتوں اور افراد میں سنت الٰہی بیان فرمائی ہے یہ ید اللہ کی تعبیر یہی بتا رہی ہے۔

منافقین کی نفسیاتی بیماری

(۵۸) وہ خدا کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ وہ تم میں سے ہیں حالانکہ وہ تم میں سے نہیں بلکہ ایک ڈرا سہما گروہ ہے۔ اگر انہیں پناہ کی کوئی جگہ مل جائے یا غار یا گھس جانے کا کوئی مقام تو پلٹ جائیں گے اس کی طرف ایسے جیسے رسہ تڑا کر بھاگے جا رہے ہیں یعنی صرف اس اندیشہ سے کہ کفر ظاہر کریں گے تو ان سے کافروں جیسا معاملہ ہوگا قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ ہم تو تمہاری جماعت یعنی مسلمانوں میں سے ہیں۔ حالانکہ یہ بالکل غلط ہے۔ اگر آج ان کو کوئی پناہ کی جگہ مل جائے یا کسی غار میں چھپ کر زندگی بسر کر سکیں یا کم از کم کسی جگہ سر گھسانے کی جگہ ہاتھ آ جائے۔ غرض حکومت اسلامی کا خوف نہ رہے تو سب دعوے چھوڑ کر بے تحاشا اسی طرف بھاگنے لگیں چونکہ اسلامی حکومت کے مقابلے میں کسی کی طاقت نہیں ہے اور نہ کوئی پناہ کی جگہ ملتی ہے اس لیے قسمیں کھا کھا کر جھوٹی باتیں بناتے ہیں [1]

قرطبی نے لکھا ہے کہ قسمیں کھا کر اپنے کو مومن بتانے کا یقین دلانا منافقین کا اخلاقی پیمانہ ہے اور حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ اللہ سبحانہ نے حضور اقدس ﷺ کو ان منافقین کی گھبراہٹ، بے چینی اور بے قراری کے بارے میں مطلع فرمایا ہے۔
دراصل یہ مدینے کے منافق زیادہ تر بلکہ تمام تر مالدار اور سن رسیدہ لوگ تھے حافظ ابن کثیر نے البدایہ والنہایہ میں ان کے ناموں کی فہرست دی ہے۔ ان میں صرف ایک نوجوان کا ذکر ہے اور غریب ان میں کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ لوگ مدینے میں جائدادوں اور پھیلے ہوئے کاروبار کے مالک تھے۔ ان کے ذاتی مصالح اور مفادات نے ان کو ابن الوقت بنا دیا تھا۔ اسلام جب مدینے میں آیا اور آبادی کے ایک بڑے حصے نے پورے اخلاص اور جوش ایمانی کے ساتھ اسے قبول کر لیا تو یہ لوگ عجیب چکر میں پھنس گئے انھوں نے دیکھا کہ ایک طرف تو خود ان کے اپنے قبیلے کی اکثریت بلکہ ان کے بیٹے اور بیٹیاں تک کو اس نئے دین نے ایمان کے نشے سے سرشار کر دیا ہے۔ ان کے خلاف اگر وہ کفر و انکار پر قائم رہتے ہیں تو ان کی ریاست عزت شہرت سب خاک میں مل جاتی ہے حتیٰ کہ ان کے اپنے گھروں میں ان کے خلاف بغاوت ہو جانے کا اندیشہ ہے۔ دوسری طرف اس دین کا ساتھ دینے کے معنی یہ ہیں کہ وہ سارے عرب سے بلکہ اطراف و نواح کی قوموں اور سلطنتوں سے بھی لڑائی مول لینے کے لیے تیار ہو جائیں۔ اغراض نفسانی کی بندگی کی وجہ سے وہ دنیا کے سارے معاملات پر صرف مفاد اور مصلحت ہی کی بنیاد پر نگاہ ڈالتے تھے اس لیے ان کو مفاد کے تحفظ کی بہترین صورت یہی نظر آئی کہ ایمان کا دعویٰ کریں۔ لیکن چونکہ دعویٰ ایمان کے ساتھ ایمان کے تقاضے پورے نہ کرتے تھے اس لیے اپنے آپ کو معتبر ثابت کرنے کے لیے اکثر جھوٹی قسموں کا سہارا لیتے اور اپنے اخلاقی خلا کو جھوٹی قسموں سے پر کرنے کی کوشش کرتے۔ وہ مسلمانوں کو مطمئن رکھنے کے لیے ان کو قسمیں کھا کھا کر یقین دلاتے کہ ہم آپ ہی میں سے ہیں ہمارے بارے میں کسی کو کوئی شبہ نہ ہونا چاہیے۔ قرآن نے بتایا کہ یہ تم میں سے نہیں ہیں بلکہ یہ محض ڈر کی وجہ سے تم میں ملے ہوئے ہیں۔ اب ان کے سامنے بھاگنے کا کوئی راستہ نہیں ہے۔ مکے کے کفار کا حشر ان کے سامنے ہے مدینے کے یہود کا انجام ان کو معلوم ہے۔ جائیں تو کہاں جائیں ملک چھوڑ کر اپنے مفادات کی وجہ سے باہر جا نہیں سکتے۔ اس صورتحال نے ان کو ایسے بھنور میں ڈال دیا تھا کہ نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن۔ قرآن نے بتایا ہے کہ ان کو آج اگر کوئی پناہ گاہ مل جائے۔ جہاں اپنے مفادات کے ساتھ یہ اپنے کو محفوظ کر لیں تو ایک روز بھی تمہارے ساتھ رہنا پسند نہ کریں بلکہ رسی تڑا کر بھاگ جائیں۔

منافقین کی خوشی، ناخوشی کا پیمانہ

(۵۹) اور ان میں سے کچھ ایسے ہیں کہ آپؐ پر صدقات کے بارے میں نکتہ چینی کرتے ہیں۔ اگر صدقات میں سے ان کو دے دیا جائے تو خوش ہوتے ہیں اور ان صدقات میں سے اگر نہ دیا جائے تو ناراض ہو جاتے ہیں کچھ منافقین اور اعراب صدقات و غنائم کی تقسیم کے وقت دنیوی حرص اور خود غرضی کی راہ سے حضور کی نسبت زبان طعن کھولتے ہیں کہ تقسیم میں

انصاف کا پہلو ملحوظ نہیں رکھا گیا مگر یہ اعتراض اسی وقت تک تھا جب تک ان کی خواہش کے موافق صدقات وغیرہ میں سے حصہ نہ دیا جائے۔ اگر انہیں خوب جی بھر کر خواہش و حرص کے موافق دے دیا گیا تو خوش ہو جاتے اور کچھ اعتراض نہ رہتا تھا۔ گویا ہر صورت مال و دولت کو قبلہ مقصود ٹھہرا رکھا تھا۔ آگے بتلاتے ہیں کہ ایک مدعی ایمان کا مطمح نظر یہ نہ ہونا چاہیے[1]

یہاں تک تو سرمایہ دار منافقین کا ذکر تھا۔ اب غریب اور نادار منافقین کا ذکر ہو رہا ہے۔ صحیح مسلم میں اس منافق کے نام کی بھی نشاندہی کی ہے جو اس غریب طبقہ کی نمائندگی کرتا تھا سنیئے پوری بات سن لیجئے۔

ایک بار حضور اقدس ﷺ کچھ مال تقسیم فرما رہے تھے اتنے میں ایک شخص نامی حرقوص آیا جو ذوالخویصرہ تمیمی کرکے مشہور تھا حضور اقدس کو مخاطب کر کے بولا کہ انصاف کیجئے یا رسول اللہ۔ حضور اقدس نے جواباً ارشاد فرمایا ارے تیری خرابی ہو میں اگر انصاف نہ کروں گا تو پھر کون انصاف کرے گا۔ حضرت عمر نے عرض کیا۔ یا رسول اللہ اجازت دیجیے کہ میں اس کی گردن مار دوں۔ فرمایا رہنے دو اس سے ایسے لوگ پیدا ہوں گے جن کی نمازوں کے مقابلے میں تم اپنی نمازیں اور جن کے روزوں کے سامنے تم اپنے روزوں کو حقیر سمجھو گے لیکن اس کے باوجود دین سے ایسے باہر ہو جائیں گے جیسے کمان سے تیر۔

یہ حدیث صحیح بخاری میں بھی بحوالہ ابوسعید خدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ آئی ہے۔ بخاری و مسلم کے علاوہ دوسرے ارباب روایت نے بھی اسے روایت کیا ہے۔

اس آیت سے یہ معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان منافقین کو زکوٰۃ وغیرہ صدقات عطا کرتے تھے پہلی آیت میں سرمایہ دار منافقوں کے بارے میں ہے کہ وہ مساجد میں نمازیں آتے تھے اور زکوٰۃ بھی ادا کرتے تھے نماز میں آتے بڑی بے دلی سے اور زکوٰۃ دیتے بڑی ناگواری سے۔ اس سے یہ بات بالکل بے غبار ہو جاتی ہے کہ اس دور میں ان کو کافر نہیں بلکہ مسلمان سمجھا جاتا تھا۔ ان کو ایمان کا دعویٰ تھا لیکن وہ اس دعوے کے مطابق ایمان کے تقاضے پورے نہ کرتے تھے اگر وہ کافر ہوتے تو ان کو صدقات نہ دیئے جاتے وہ مساجد میں نہ آتے۔ یہ صحیح ہے کہ سب کا نفاق ایک درجہ کا نہ تھا کسی میں کم کسی میں زیادہ۔ عبداللہ ابن ابی کا نفاق ہر منافق کا نفاق نہ تھا۔ وہ بڑھتے بڑھتے انکار قطعی تک پہنچ گیا لیکن ایسے لوگ گنتی کے تھے۔ سب ایسے نہ تھے۔ ان کی بہت سی قسمیں تھیں۔ قرآن نے منہم کی تعبیر منافقین کی انواع ہی بتانے کے لیے اختیار کی ہے۔

اسلامی حکومت قائم ہونے کے بعد نماز کی طرح زکوٰۃ کے لیے بھی قانونی طور پر اجتماعی نظم قائم ہو گیا تھا اور اس کی تقسیم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سرکاری طور پر ہوتی تھی سارے ملک میں باقاعدہ زکوٰۃ عائد کی گئی تھی۔ سب کی زرعی پیداوار سے ان کے مویشیوں سے ان کے اموال تجارت سے معادن سے اور ان کے سونے چاندی کے ذخائر سے ۲½ فیصدی ۵ فیصدی ۱۰ فیصدی ۲۰ فیصدی زکوٰۃ وصول کی جاتی تھی اور سرکاری طور پر نظم کے ساتھ ان اموال کو خرچ کیا جاتا تھا۔ اسی طرح حضور اقدس کے پاس اتنی دولت سمٹ کر آتی اور آپ کے ہاتھوں خرچ ہوتی تھی۔ دنیا پرست منافقین دولت کی اس فراوانی کو دیکھ کر ریجھ گئے وہ تقسیم صدقات کو دیکھ کر دلوں میں گھٹتے اور ہر قسم کے موقعہ پر طرح طرح کے اعتراضات الزامات سے آوازے کستے۔ ان کی اصل خواہش تو یہ تھی کہ یہ مال سارا کا سارا ہمیں کیوں نہیں ملتا مگر اسے چھپا کر وہ یہ بات بناتے کہ انصاف ٹھیک نہیں ہوتا اور اس میں جانبداری سے کام لیا جاتا ہے۔

مالدار منافقین اپنے کو مسلمانوں سے خوف کی وجہ سے وابستہ رکھے ہوئے تھے اور یہ غربا طمع اور لالچ کی وجہ سے مردم شماری کے مسلمان بنے ہوئے تھے۔

یہ مختلف اطوار اور مختلف اقدار نفاق ہیں جو مختلف قسم کے لوگوں میں پائے جاتے تھے۔ یہ ضروری نہیں کہ ایک ہی شخص میں اعمال کے یہ سارے نمونے ہوں کسی میں کوئی کسی میں کوئی احادیث میں جو علامتیں منافقین کی بیان ہوئی ہیں ان کا مطلب بھی یہی ہے کہ کسی میں کوئی ایک علامت ہوگی کسی میں دو کسی میں تین۔ یہ مطلب نہیں کہ ہر منافق میں یہ ساری علامتیں موجود ہوں۔ مثلاً مسند احمد میں بحوالہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کی ایک سے زیادہ علامتیں بتائی ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ منافقوں کی چند علامات ہیں مثلاً۔

۱۔ سلام کی جگہ زبانوں پر لعنت ہوتی ہے۔
۲۔ لوٹ مار کا مال وہ کھاتے ہیں۔
۳۔ خیانت کے مال کو وہ غنیمت سمجھتے ہیں۔
۴۔ مسجدوں میں بکواس کرتے رہتے ہیں۔
۵۔ نمازوں میں دیر سے آتے ہیں اتراتے ہوئے۔
۶۔ وہ خود کسی سے محبت نہیں کرتے ہیں۔
۷۔ ان سے کوئی الفت نہیں کرتا ہے۔
۸۔ رات کو شہتیر کی طرح بستروں پر پڑے رہتے ہیں۔
۹۔ دن میں شور مچاتے پھرتے ہیں۔

یہ علامتیں بتائی بھی اس لیے جا رہی ہیں کہ منافقین کی ظاہری سطح ہمیشہ مسلمانوں ہی کے ساتھ ملتی ہے اگرچہ بالکل

کافر ہوں تو اسے منافق کون کہے اس لیے نبوت نے ان کی علامات بتائی ہیں۔ ان علامات کا خلاصہ بداخلاقی، مطلب پرستی، بے ایمانی خیانت اور دین سے بیزاری ہے جب انسانی اخلاق بگڑ جاتے ہیں تو اس کی زبان گندی ہو جاتی ہے۔ استہزاء و تمسخر، و طنز عیب چینی، گالیاں، یاوہ گوئی، چرب زبانی آوازے کسنا تہمتیں لگانا اور اس جیسے ناپاک اطوار نمایاں ہو جاتے ہیں جب امانت نہیں رہتی تو لوٹ کا مال اسکے لیے طیب مال اور خیانت کرنا اس کی نظر میں مال غنیمت کی طرح محبوب ہوتا ہے جب اس میں مطلب پرستی اور خود غرضی آتی ہے تو اس کا دل ہر ایک کی ہمدردی اور محبت سے خالی ہو جاتا ہے اور اس لیے دوسروں کے لیے بھی بیگانہ ہو جاتا ہے خود غرضی کا ہمیشہ انجام یہی ہوتا ہے۔ اور جب دل دین سے بیزار ہوتا ہے تو نہ خانہ خدا کا احترام رہتا ہے اور نماز کے لیے چستی رہتی ہے۔

یہ منافقین کی اخلاقی، معاشرتی، معاشی اور روحانی پستی کی ایسی بھرپور تصویر ہے کہ اگر کوئی شخص ان کی اس سے بہتر تصویر بنانا چاہے تو بنا نہیں سکتا۔ ایک ایک عمل ایمان کے تقاضوں کے منافی ہے۔ ایمان امن اور امانت سے مشتق ہے وہ خیانت خود غرضی اور ایذارسانی کو برداشت نہیں کرتا۔ نماز کو تو خود قرآن ہی نے ایمان سے تعبیر کیا ہے۔ ما کان اللہ لیضیع ایمانکم اسں میں سستی ایک مومن کیسے کر سکتا ہے۔

بلاشبہ ایسا مسلمان جو اپنی زندگی میں کھلے منافق سے کوئی امتیاز نہیں رکھتا ارشاد نبوت میں بلاریب وہ منافق ہے اندر کا حال اللہ کے سوا جاننے والا کوئی نہیں یہ سرگذشت نفاق کی دنیا کی ہے جسے دعوت حق نے مخاطب کیا تھا لیکن آج خود ہمارا کیا حال ہے۔ افسوس ہے کہ ہم اس بیماری سے بچ نہ سکے۔ اور ہم نے اسلام کی عملی زندگی میں ایمان کے تقاضوں کو نفاق کے حوالہ کر دیا۔ اعتقاداً نہیں عملاً اور سوال یہاں عمل ہی کا ہے نہ کہ اعتقاد کا۔ نتیجہ یہ نکلا کہ عملی زندگی پوری کی پوری اسلام سے بیگانہ ہو گئی اور سب سے بڑا فساد یہ رونما ہوا کہ صدیوں سے مسلمانوں کی اجتماعیت ختم ہو گئی۔ اور نفاق نے اجتماعیت کی راہوں سے انہیں دور کر دیا۔ انا للہ فالی اللہ المشتکیٰ۔

ایمان کا صحیح تقاضا

(۶۰) اور کیا ہی اچھا ہوتا اگر وہ اللہ و رسول کی عطا پر خوش ہوتے اور کہتے کہ اللہ ہمارے لیے کافی ہے۔ اللہ ہمیں اپنے فضل سے ضرور دے گا اور اللہ کا رسول بھی۔ بلاشبہ ہمارا مقصود صرف اللہ ہے یعنی بہترین طریقہ یہ ہے کہ جو کچھ خدا پیغمبر کے ہاتھ سے دلائے اس پر آدمی راضی اور قانع ہو۔ اور صرف اللہ سبحانہ پر توکل کرے اور سمجھے کہ وہ چاہے گا تو آئندہ اپنے فضل سے بہت کچھ عطاء فرمائے گا۔ غرض دنیا کی متاع فانی کو نصب العین نہ بنائے صرف خداوند رب العزت کے قرب و رضا کا طالب ہو۔ اور جو ظاہری و باطنی دولت خدا اور رسول کی سرکار سے ملے اسی پر مسرور و مطمئن ہو۔ (افادات شیخ الاسلام)

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ:

یہ آیت کریمہ ایک طرف ایک عظیم ادب کی تعلیم دے رہی ہے تو دوسری طرف یہ شاندار راز بھی بتا رہی ہے کہ اللہ و رسول کے دینے پر خوش ہو اور صرف اللہ سبحانہ پر اعتماد و بھروسہ کرے اور ایسے ہی یہ آیت بتا رہی ہے کہ طاعت رسول اور اس کے اوامر و نواہی کے امتثال اور اس کی باتوں کی تصدیق اور اسی کے نشان قدم پر چلنے کی توفیق مانگنے کے لیے رغبتوں اور چاہتوں کا قبلہ صرف اللہ ہو۔

امام بغوی معالم التنزیل میں لکھتے ہیں:

اگر وہ اللہ و رسول کی تقسیم پر راضی ہو جاتے اور کہتے کہ اللہ ہمیں کافی ہے اللہ ہمیں ہماری ضرورت کی چیزیں اپنے کرم اور اللہ کا رسول ضرور دے گا۔ ہم تو صرف اللہ کے فضل کی وسعتوں کے لیے اللہ کی طرف راغب ہیں۔ وہی وسعت دے کر ہمیں صدقوں سے بے نیاز کر دے گا۔ اگر وہ ایسا کہتے تو ان کے حق میں مفید ہوتا۔

امام رازی اس کی تشریح میں فرماتے ہیں:

غنیمت کا مال جو حضور نے ان کو دیا ہے اگر وہ اس پر خوش ہو جاتے چاہے وہ تھوڑا ہے اور کہتے کہ ہمیں یہ کافی ہے اور اللہ ہمیں اگر اور غنیمت کا موقع نصیب فرمائے گا تو اللہ کا رسول اس سے زیادہ دے گا۔ ہم تو بس اللہ کی طاعت اس کے انعام و اکرام کے خواہاں ہیں۔

آیت کا مطلب ان تشریحات کی روشنی میں یہ ہے کہ مال غنیمت میں سے جو حصہ حضور اقدس ﷺ نے ان کو دیا ہے اس پر قناعت کرتے اور خدا کے فضل سے جو کچھ خود کماتے ہیں اور اللہ سبحانہ کے دیئے ہوئے ذرائع آمدنی سے جو خوش حالی انہیں میسر ہے۔ اس کو اپنے لیے کافی سمجھتے۔ تو ان کے لیے مفید ہوتا۔ انا الی اللہ راغبون۔ یعنی ہماری نظر دنیا پر اور اس کی حقیر متاع پر نہیں بلکہ اللہ اور اس کے فضل و کرم پر ہے۔ اسی کی خوشنودی ہم چاہتے ہیں۔ اسی سے امید رکھتے ہیں جو کچھ وہ دے اس پر ہم راضی ہیں مال کی محبت دراصل آثار کفر کا بقیہ ہے اور غنا و بے نیازی ایمانی برکات کی ابتداء۔ جو لوگ آپ کی پہلی ہی صحبت میں ایمان کا کیف حاصل کر چکے تھے یا بتدریج اس کی لذت سے آشنا ہو چکے تھے وہ رضا کے پیکر تھے۔ ہر شخص کی صلاحیت ایک نہیں ہوتی اور ہر شخص کا مزاجی پیمانہ یکساں نہیں ہوتا بلند طبیعتیں جو ہر حقیقت کی متلاشی ہوتی ہیں اور بعض حسن سلوک اور ظاہری ہمدردی کا اثر زیادہ قبول کرتی ہیں۔ یہاں فیاض فطرت ہر ایک کے ساتھ معاملہ ان کی فطرت کے مناسب کیا کرتا تھا ایک موقعہ پر آپ نے اشارہ فرما دیا تھا کہ مال کی تقسیم کو میری محبت کی تقسیم کا معیار تصور کرنا غلط ہے

إِنَّمَا الصَّدَقٰتُ لِلْفُقَرَآءِ وَالْمَسٰكِيْنِ وَالْعٰمِلِيْنَ عَلَيْهَا وَ
الْمُؤَلَّفَةِ قُلُوْبُهُمْ وَفِي الرِّقَابِ وَالْغٰرِمِيْنَ وَفِيْ سَبِيْلِ
اللّٰهِ وَابْنِ السَّبِيْلِ ۭ فَرِيْضَةً مِّنَ اللّٰهِ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿٦٠﴾

صدقات تو صرف فقیروں، مسکینوں اور ان لوگوں کے لیے جو صدقات کے کام پر لگے ہوں اور وہ جن کے دلوں میں اسلام کی الفت مقصود ہو۔ اور غلاموں کی گلو خلاصی میں، نیز قرضداروں کی مدد کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے ہیں۔ فرض ہے اللہ کی جانب سے۔ اللہ سب کچھ جاننے والا، حکمت رکھنے والا ہے ۶۰

مفردات کے معانی

الصدقات۔ صدقہ کی جمع ہے زکوٰۃ خیرات امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔ صدقہ وہ ہے جس کو انسان اپنے مال میں سے بطور عبادت نکالتا ہے جیسے زکوٰۃ۔ لیکن صدقہ نفلی خیرات کے لیے بولا جاتا ہے اور زکوٰۃ کے لیے۔ اور کبھی واجب کو صدقہ سے موسوم کر دیا جاتا ہے جبکہ اس کا ادا کرنے والا اپنے فعل میں صادق ہو۔ یہاں دو باتیں یاد رکھنے کی ہیں ایک کہ زکوٰۃ انبیاء علیہم السلام پر بالاتفاق فرض نہیں۔ مفتی ابوالسعود نے اس کی وجہ یہ لکھی ہے کہ یہ حضرات اپنے پاس ہر چیز کو بطور ودیعت رکھتے تھے خرچ کے موقعہ پر اسے صرف کر دیتے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ زکوٰۃ طہارت ہے اُس شخص کے حق میں کہ جو آلودہ گناہ ہو اور ذاتِ پیغمبر گناہوں سے پاک ہوتی ہے۔ دوسری بات یہ کہ زکوٰۃ نہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے حلال تھی اور نہ آپ کے خانوادے بنی ہاشم کے لیے۔

الفقراء۔ فقیر کی جمع ہے۔ مادہ فقر ہے۔ فقرہ اصل میں کمر کی ہڈی کو کہتے ہیں فاقرہ وہ افتاد جو کمر کی ہڈیاں توڑ

دے فقیر وہ جس کی کمر کی ہڈیاں ٹوٹی ہوئی ہوں یا ان میں بیماری ہو اور کمر شکن محتاجی کی وجہ سے فقیر کہتے ہیں یہ غنی کے مقابلے میں بولا جاتا ہے واللہ الغنی وانتم الفقراء

مساکین یہ مسکین کی جمع ہے یہ دو وزن پر ہوسکتا ہے اگر اس کا مادہ سکون ہے تو مفعیل کے وزن پر ہے اور اگر مادہ مسکنت ہو تو فعلیل کے وزن پر ہے اور اگر مفعیل کے وزن پر ہو اور سکون سے نکلا ہو تو سکون واطمینان والے کے معنے میں ہے اور اسی معنے میں یہ لفظ حدیث میں آیا ہے اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین اور اگر فعلیل کے وزن پر ہو تو اس کے معنے ذلیل وضعیف کے ہیں قرآن میں ضربت علیھم الذلۃ والمسکنۃ مسکنت اسی کا مصدر ہے عاجزی بیچارگی کے معنے ہیں۔ اس لیے مسکین کے معنے عاجز ذلیل اور نادار کے ہیں۔ اسی لیے ناداری، بیچارگی کے معنے میں مسکنت بولتے ہیں۔ فیروزآبادی نے یہ کہہ کر اس طرف اشارا کیا ہے انما لحقہ اسم المسکین من جھۃ الذلۃ فمن لم تکن مسکنۃ من جھۃ الفقر فالصدقۃ علیہ حرام۔ بلکہ قاضی بیضاوی نے تو یہاں تک کہہ دیا کہ کان النبی صلی اللہ علیہ یسأل المسکنۃ اور یہ اسی دعا کا جس میں مسکین کا لفظ آیا ہے ان بزرگوں نے مطلب بتایا ہے گویا جو چیز ہود وال پر عذاب بنا کر ماری گئی تھی حضور اسی کو معاذ اللہ۔ دعا کے ذریعے مانگ رہے تھے۔ لاحول ولاقوۃ الا باللہ۔

یہ فقیر و مسکین کی صرف لغوی تحقیق ہے۔ ان کے اصطلاحی معنے آگے آرہے ہیں۔

العاملین۔ کام کرنے والے عمل کرنے والے عمل سے اسم فاعل کا صیغہ جمع مذکر اس سے محکمہ زکوٰۃ کے کارندے مراد ہیں۔ جن کے ذمہ اسلامی حکومت میں زکوٰۃ وصدقات کی وصولیابی ہوتی ہے کیونکہ عامل کے معنے متولی امور اور کارندے کے بھی آتے ہیں۔ اور اسی رعایت سے محصل زکوٰۃ کو بھی عامل کہتے ہیں [1]

صدقات کے مصارف کی تحدید

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے مصارف زکوٰۃ کی تعیین وتحدید کی ہے وجہ یہ ہے کہ ہر شخص کو زکوٰۃ مانگنے کی ہمت نہ ہو اور کوئی اسے اپنی آمدنی کا ایک آسان ذریعہ نہ سمجھ لے جیساکہ بعض منافقین اور اہل بادیہ کا پچھلی آیت میں ذکر ہو چکا ہے جنھوں نے صدقات ہی کو اپنے ایمان واسلام کی قیمت سمجھ رکھا تھا ــــــ ایک بار ایک شخص نے حضور اقدس ﷺ سے زکوٰۃ کے مال میں سے کچھ لینے کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا۔ اے شخص اللہ تعالیٰ نے مال زکوٰۃ کی تقسیم میں کسی انسان کو بلکہ پیغمبر تک کو کوئی اختیار نہیں دیا ہے بلکہ اس کی تقسیم خود اپنے ہاتھ میں رکھی ہے۔ اور اس کے آٹھ مصرف مقرر فرمادئے

[1] تاج العروس

ہیں اگر تم ان آٹھ میں ہو تو میں تم کو دے سکتا ہوں [1]

اس تحدید و تعیین کے دو مقصد ہیں ایک تو یہ بھیک مانگنے والوں کی حوصلہ شکنی ہو کیونکہ وہ کہیں نہ کہیں سے لے ہی لیں گے اس لیے ان کی طرف اس قدر اعتنا ضروری نہیں۔ اصل توجہ ان مستور الحال مساکین کی طرف ہونی چاہیے جو صبر و قناعت کے ساتھ فقر و فاقہ کی تکلیف برداشت کر رہے ہیں کہ ان کی خبر بہتوں کو نہیں ہوتی اور اکثر وہ امداد سے محروم رہتے ہیں۔ دوسرا مقصد یہ ہے کہ اسلام اپنی تعلیم اور عمل سے یہ ثابت کرنا چاہتا ہے کہ پیشہ ور گداگروں کی عزت اس کی نگاہ میں کم ہے اور وہ ہر حال میں اس بے حیائی کو ناپسند کرتا ہے۔

زکوٰۃ کے مصارف کی تحدید سے مقصود یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ہر قسم ان سب میں وجوبا تقسیم کی جائے یا یہ ہے کہ خرچ انہی میں کی جا سکتی ہے جس مصرف میں خرچ کرنا ضروری ہو؟ تو اس بارے میں فقہا کا اختلاف ہے لیکن جمہور کا مذہب یہی ہے کہ تمام مصارف میں بیک وقت تقسیم کرنا ضروری نہیں ہے جس وقت جیسی حالت اور جیسی ضرورت ہو اسی کے مطابق خرچ کرنا چاہیے۔ اور یہی مذہب قرآن و سنت کی تصریحات اور روح کے مطابق ہے۔ ائمہ اربعہ میں صرف امام شافعیؒ اس کے خلاف گئے ہیں۔

یہ آٹھ مصارف جس ترتیب سے بیان کئے ہیں، اگر غور کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ قدرتی ترتیب یہی ہے۔ سب سے پہلے ان دو گروہوں کا ذکر کیا جو استحقاق میں سب سے زیادہ مقدم ہیں۔ کیونکہ زکوٰۃ کا اولین مقصود انہی کی اعانت ہے یعنی فقرا اور مساکین۔ پھر اس گروہ کا ذکر کیا جس کی موجودگی کے بغیر زکوٰۃ کا نظام نہیں چل سکتا۔ لیکن اس کو چونکہ استحقاق بالذات نہیں تھا اس لیے اسے پہلے نہیں ذکر کیا۔ پھر المولفۃ قلوبھم کا درجہ ہے کہ ان کا دل ہاتھ میں لینا ایمان کی تقویت اور حق کی اشاعت کے لیے ضروری تھا۔ پھر غلاموں کو آزاد کرانے اور قرضداروں کو بار قرض سے سبکدوش کرانے کے مقاصد نمایاں ہوتے جو نسبتہ موقت اور محدود ہے پھر فی سبیل اللہ کا مقصد رکھا کہ اگر مستحقین کی کسی وقت جماعتیں مفقود ہوں یا کم ہوں یا حالات نے ان کی اہمیت کم کر دی ہو۔ یا مال زکوٰۃ کی مقدار بہت زیادہ ہو گئی ہو تو ایک جامع مقصد کا دروازہ کھول دیا جائے جس میں دین و امت کے مصالح کی ساری باتیں آجائیں سب سے آخر میں ابن السبیل کا ذکر کیا کیونکہ تقدم میں یہ سب سے کم اور مقدار کے لحاظ سے بہت ہی محدود صورت میں پیش آنے والا مصرف تھا [2]

چونکہ تقسیم صدقات کے معاملہ میں پیغمبر پر طعن کیا گیا تھا اس لیے تنبیہ فرماتے ہیں کہ صدقات کی تقسیم کا طریقہ خدا کا مقرر کیا ہوا ہے۔ اس لیے صدقات وغیرہ کے مصارف متعین فرما کر فہرست حضور اقدس ﷺ کے ہاتھ میں دے دی ہے آپ اسی کے موافق تقسیم کرتے ہیں اور کریں گے۔ کسی کی خواہش کے تابع نہیں ہو سکتے۔ حدیث میں آپ نے فرمایا کہ خدا

---

[1] ابو داؤد

[2] ترجمان القرآن

نے صدقات کی تقسیم کو نبی یا غیر نبی کسی کی مرضی پر نہیں چھوڑا ہے ۔ بلکہ بذات خود اس کے مصارف متعین کر دیئے جو آٹھ ہیں فقراء جن کے پاس کچھ نہ ہو مساکین جن کو بقدر حاجت میسر نہ ہو عاملین جو اسلامی حکومت کی جانب سے تحصیل صدقات کے کاموں پر مقرر ہوں مؤلفۃ القلوب جن کے اسلام لانے کی امید ہو یا جو اسلام میں کمزور ہوں وغیر ذالک من الانواع اکثر علماء کے نزدیک حضور کی وفات کے بعد یہ مد نہیں رہی رقاب یعنی غلاموں کا بدل کتابت ادا کر کے آزادی دلائی جائے ۔ یا خرید کر آزاد کیے جائیں یا قیدیوں کا فدیہ دیا جائے ۔ غارمین جن پر کوئی حادثہ پڑا اور مقروض ہو گئے یا کسی کی ضمانت وغیرہ کے بار میں دب گئے ۔ سبیل اللہ جہاد میں جانے والوں کی اعانت کی جائے ابن السبیل مسافر جو حالت سفر میں نصاب کا مالک نہ ہو اگرچہ مکان پر دولت رکھتا ہو ۔ حنفیہ کے نزدیک تملیک ہر صورت میں ضروری ہے تفصیل فقہ میں ملاحظہ کی جائے [1]

(۶۱) صدقات تو صرف فقیروں، مسکینوں اور ان لوگوں کے لیے ہیں جو صدقات کے کام پر لگے ہوئے ہوں اور وہ جن کے دلوں میں اسلام کی الفت مقصود ہو ۔ آیت کی پیشانی پر کلمہ حصر انما لگا کر زکوٰۃ کے مصارف مقرر کر دیئے گئے ہیں یعنی جن مصارف کی صراحت کر دی گئی ہے ان کے علاوہ زکوٰۃ کی رقم کسی اور مصرف میں نہیں لگائی جا سکتی ۔ علامہ شوکانی رح رقم طراز ہیں :

صدقات کی یہ جنس صرف ان قسموں کے لیے ہے جن کا ذکر آیت قرآنی میں ہے ان کے سوا کسی کو نہ دی جائے یعنی صدقات کی آمدنی ان ہی مدوں میں خرچ ہونی چاہیے ۔ کسی اور مد میں اس کو خرچ نہ کیا جائے ۔ قرآن نے یہ مصارف آٹھ بتائے ہیں ۔

مساکین و فقراء زکوٰۃ کے مستحق ہیں

ان میں سب سے پہلے فقراء ہیں ۔ اس کے بعد مساکین ہیں ۔ فقہاء کے ان دونوں کی تشریح میں خیالات مختلف ہیں علامہ قرطبی نے اس موضوع پر نو اقوال نقل کیے ہیں ۔ اہل لغت میں سے یعقوب بن السکیت ، یونس بن حبیب اور اہل فقہ میں سے امام ابو حنیفہ رحمہ اللہ تعالیٰ اور قاضی عبدالوہاب رحمہ اللہ تعالیٰ کہتے ہیں کہ فقراء سے وہ لوگ مراد ہیں جن کے پاس ابتدائی ضروریات کی تکمیل کا سامان تو ہو لیکن اس کے علاوہ کچھ نہ ہو اور مساکین وہ ہیں جن کے پاس کچھ نہ ہو ۔ ابو بکر الجصاص نے ابوالحسن کوفی سے بھی یہی بات نقل کی ہے ۔ الجصاص نے امام زہری سے اسی بات کو اس طرح پیش کیا ہے کہ فقیر وہ ہے جو سوال نہ کرے اور مسکین وہ ہے جو سوال کرے اور لکھا ہے کہ ۔۔ اور امام ابو یوسف رحمہ اللہ تعالیٰ یہی فرماتے ہیں ـــــ اس کے برعکس کچھ بزرگوں کا خیال اس کے بالکل برعکس ہے فقیر وہ ہے جس کے پاس کچھ نہ ہو اور مسکین

[1] افادات شیخ الاسلام

وہ ہے جس کے پاس کچھ ہو۔ لیکن اس خیال کی بنیاد کچھ زیادہ پائدار نہیں ہے۔ صرف ایک دور کی قسم کی فکری روش ہے۔
ان کی سوچ یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فقر سے تو اللہ کی پناہ مانگی ہے لیکن مسکین ہونے کی اللہ سے دعاء مانگی ہے
مراد ابن ماجہ اور حاکم کی وہ حدیث ہے جو ابو سعید خدری کے حوالہ سے اور ترمذی میں انس بن مالک کے حوالہ سے آئی ہے کہ
حضور اقدس ﷺ نے یہ دعاء فرمائی ہے اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ
المساکین وہ کہتے ہیں کہ اس سے معلوم ہوا کہ مسکین فقیر سے اچھا ہوتا ہے اگر فقیر سے برا ہوتا تو حضور یہ دعاء نہ فرماتے
لیکن یہ صحیح نہیں ہے کیونکہ:

اوّلاً: تو حدیث کی امام نووی نے تضعیف کی ہے اور ابن الجوزی نے اسے موضوعات میں شمار کیا ہے۔ ترمذی کی
روایت انس کی بھی سند ضعیف ہے۔

ثانیاً: اگر حاکم کی تصحیح اور علامہ ذہبی کی تقریر پر اسے تاریخی طور پر صحت کا سارٹیفکیٹ بھی دے دیا جائے تو
دعاء میں لفظ مسکین فعیل کے وزن پر مسکنت سے نہیں بلکہ مفعیل کے وزن پر سکون سے ہے مطلب ہے کہ اللہ مجھے سکون
والمینان والا زندہ رکھ۔ یہی دعاء کا پس منظر قرآن نے بھی پیش کیا ہے ثم انزل اللہ سکینتہ علی رسولہ۔ پہلے معنی
میں مسکین تو محتاج، کمزور، عاجز اور ذلیل کے معنی میں ہوتا ہے ظاہر ہے کہ اس کی دعاء حضور نے نہیں مانگی۔

بہرحال فقیر ہو یا مسکین مقصود ایسے لوگ ہیں جو محتاج ہوں لیکن فقر عام ہے اور مسکنت خاص ہے فقیر اسے کہیں
گے جس کے پاس کچھ ہو مگر گذارہ نہ ہوتا ہو۔ اس کی خبر گیری کی جائے۔ مثلاً ایک طالب علم متعدد کتابوں کا مالک ہے جن کی مجموعی
قیمت مقررہ نصاب سے زیادہ ہے۔ اب اگر اس طالب علم کے پاس صرف اتنا ہے کہ وہ اپنی معمولی ضروریات کی تکمیل کر سکتا
ہے لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں رکھتا ہے وہ تو کتابوں کی ملکیت کے باوجود زکوٰۃ کا مستحق ہے۔ مسکین وہ ہے جس کی معاشی
حالت فقیر سے بھی زیادہ گری ہوئی ہو نہ بدن پر اُجلے کپڑے ہیں نہ گھر میں سامان ہے۔

فقیر اور مسکین میں اس لحاظ سے بھی فرق ہے کہ فقیر سوال نہیں کرتا ہے لیکن مسکین سوال کرنے میں اپنے اضطرار
کی وجہ سے عار محسوس نہیں کرتا۔ قرآن نے فقرا کا چہرہ ہی یہ پیش کیا ہے۔

للفقراء الذین احصروا فی سبیل اللہ لایستطیعون ضربًا فی الارض یحسبھم الجاھل
اغنیاء من التعفف تعرفھم بسیماھم لایسئلون الناس الحافا۔

صدقات ان فقراء کا حق ہے جو اللہ کے راستہ میں گھر گئے ہوں ان کو یہ طاقت نہیں کہ اپنے ذاتی کسب
معاش کے لیے زمین پر چل سکیں ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف خیال کرتا ہے کہ یہ مالدار ہیں۔ تم ان
کے چہرے دیکھ کر ان کی حالت پہچان سکتے ہو لیکن وہ لوگوں کے پیچھے پڑ کر سوال نہیں کرتے۔

امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ نے صحیح میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی حدیث میں

المسکین الذی لا یجد غنی یغنیہ ولا یفطن فتصدق علیہ ولا یقوم فیسال الناس

مسکین وہ ہے جسے ایسے وسائل میسر نہیں کہ تونگر کردیں جس کا فقر ظاہر نہیں کہ اسے خیرات دی جائے جو خود سوال کے لیے کھڑا نہیں ہوتا کہ لوگوں کے سامنے ہاتھ پھیلائے۔

مسکین کا واقعی چہرہ نہیں پیش کیا بلکہ گداگر اور غیر گداگر کا تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے۔ اس سے پہلے ارشاد ہے

لیس المسکین الذی یطوف علی الناس ترده اللقمۃ واللقمتان والتمرۃ والتمرتان۔

منشا یہ ہے گداگر کے مقابلہ میں واقعی گداگر کا چہرہ بتانا ہے اور مسکین سے فقیر ہی مراد ہے۔ دلیل اس کی یہ ہے کہ امام بخاری نے ترجمۃ الباب میں حضور کا ارشاد لا یجد غنی یغنیہ پیش کرنے کے بعد قرآن کی یہ آیت درج کی ہے للفقراء الذین احصروا۔ اس سے اشارا کردیا کہ ارشاد نبوت میں مسکین سے مراد فقیر ہے۔ کیونکہ یہ تو ممکن ہی نہیں کہ قرآن جو چہرہ فقیر کا بتائے اسی کے مقابلے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وہی چہرہ مسکین کا بتائیں۔

حیرت ہے اور تو اور مولانا آزاد بھی امام بخاری کے منشا کو نہ سمجھ سکے اور مسکین کو فقیر سے اچھا بتانے کے شوق میں آیت قرآنی اور ارشاد پیغمبرؐ میں ایک طرح کا معارضہ بنا دیا۔

بہر حال فقیر سے مراد قرآن کے مطابق ایسے لوگ ہیں جو محتاج ہوں جو اپنے کسب معاش کے لیے چل پھر نہ سکتے ہوں۔ اللہ کے راستے میں محبوس ہوں ان کی خودداری دیکھ کر ناواقف لوگ ان کو غنی خیال کرتے ہوں۔ لوگوں سے پیچھے پڑ کر سوال نہ کرتے ہوں۔ بلاشبہ ایسے علمائے دین جو دین کی تعلیم کے لیے وقف ہوں اور فکر معیشت کے لیے وقت نہ نکال سکیں فقراء میں داخل ہیں۔ نیز وہ تمام افراد جو ان کی طرح خدمت دین و امت کے لیے وقف ہو جائیں اور معیشت کا کوئی سامان نہ رکھتے ہوں۔

قوم کے تمام ایسے افراد جن پر وسائل معیشت کی تنگی کی وجہ سے معیشت کے دروازے بند ہیں یقیناً مساکین میں داخل ہیں اور اس مد کے اولین مستحق ہیں بلکہ یہ تمام مندرجہ زکوٰۃ کے قانونی حقدار ہیں۔

ا۔ ایسے تمام یتیم بچے، بچیاں جن میں یہ شرطیں ہوں۔

الف۔ باپ مر چکا ہو۔

ب۔ عمر ۱۸ سال سے زیادہ نہ ہو۔

ج۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔

د۔ خاندان میں قانونی طور پر ذمہ داری اٹھانے والا کوئی نہ ہو۔

۲۔ وہ بیوہ عورتیں جن میں یہ شرطیں ہوں۔
الف۔ شوہر کی وفات کے بعد شادی نہ کی ہو۔
ب۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔
ج۔ خاندان میں قانونی طور پر ذمہ دار کوئی نہ ہو۔

۳۔ طلاق والی عورتیں جن میں یہ شرطیں ہوں۔
الف۔ عدت کی مدت ختم ہو گئی ہو۔
ب۔ شادی نہ کی ہو۔
ج۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔
د۔ اخراجات کا کوئی قانونی ذمہ دار نہ ہو۔

۴۔ بوڑھا مرد، بوڑھی عورت جن میں یہ شرطیں ہوں۔
الف۔ عمر ۶۰ سال سے زیادہ ہو۔
ب۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔
ج۔ خاندان میں اس کا شرعاً ذمہ دار کوئی نہ ہو۔

۵۔ ایسے کمزور لوگ جن میں یہ شرطیں ہوں۔
الف۔ آفت زدہ ہو۔ موذی مرض کا شکار ہو۔
ب۔ ۱۸ سال سے زیادہ عمر کا ہو۔ ۶۰ سے زیادہ نہ ہو۔
ج۔ آمدنی کا کوئی ذریعہ نہ ہو۔
د۔ شرعاً اس کے اخراجات کا کوئی ذمہ دار نہ ہو۔

۶۔ ایسے بیمار جن میں یہ شرطیں ہوں۔
الف۔ کسی ایسی بیماری کا شکار ہو جس کی وجہ سے کام نہ کر سکے۔
ب۔ ۱۸ سال سے عمر زیادہ ہو۔ ۶۰ سے زیادہ نہ ہو۔
ج۔ ذریعہ آمدنی کوئی نہ ہو۔

۷۔ کم آمدنی والے جن میں یہ شرطیں ہوں۔
الف۔ آمدنی بالکل معمولی ہو۔ جو اخراجات پورے نہ کر سکے۔

ب ۔ عمر ۱۸ سال سے زیادہ اور ۶۰ سے متجاوز نہ ہو۔

ج ۔ معاشی زندگی کے لیے کسی کام پر قدرت نہ رکھتا ہو۔

د ۔ قانونی طور پر اخراجات کا کفیل کوئی نہ ہو۔

۸ ۔ طلبہ جن میں یہ شرطیں ہوں۔

الف ۔ کسی درسگاہ میں تعلیم پاتے ہوں۔

ب ۔ عمر اٹھارہ سال سے زیادہ ہو۔

ج ۔ گھر والے اس کی کفالت نہ کرتے ہوں۔

۹ ۔ نکمے جو کوئی کام نہ کرتے ہوں۔ جن میں یہ شرطیں ہوں۔

الف ۔ کام نہ کرنا غیر ارادی سبب کی وجہ سے ہو۔

ب ۔ عمر ۱۸ سال سے زیادہ اور ۶۰ سال سے کم ہو۔

ج ۔ کوئی دوسرا ذریعہ آمدنی کا نہ ہو۔

۱۰ ۔ قیدیوں یا مفقود کا بے سہارا خاندان۔

الف ۔ گھر والوں کا کوئی ذریعہ معاش نہ ہو۔

ب ۔ آمدنی کا کوئی وسیلہ نہ ہو۔

ج ۔ قانونی طور پر کسی پر ذمہ داری نہ ہو۔

یہ سب حضرات مساکین میں داخل ہیں اور ضروری ہے کہ زکوٰۃ کی مد سے ان کی خبر گیری کی جائے بشرطیکہ بنی ہاشم نہ ہوں۔ یعنی سید نہ ہوں۔

زکوٰۃ کی قانونی تنظیم

تیسری قسم صدقات کے ہشتگانہ مصارف میں سے قرآن نے یہاں العاملین علیہا بتائی ہے یعنی ان صدقات کی وصولی پر متعین ہونے والوں کی تنخواہیں بھی زکوٰۃ ہی کی مد سے دی جائیں گی۔ یہاں عاملین کا منطوق تو یہی ہے۔ کہ عاملوں کی تنخواہیں زکوٰۃ سے دی جائیں گی مگر اس کے مدلول میں یہ بات بھی داخل ہے کہ زکوٰۃ کا نظام اجتماعی ہے۔ اس کا جماعتی نظم ہونا چاہیے جیسے نماز ایک اجتماعی عمل ہے باجماعت ہونا چاہیے ٹھیک اسی طرح زکوٰۃ بھی ایک اجتماعی عمل ہے اسے اجتماعی نظم سے ہونا چاہیے فرق باریک سا ہے نماز کی باجماعت ادائیگی کے لیے امامت صغریٰ

کافی ہے لیکن زکوٰۃ کے اجتماعی نظم کے لیے امامت کبریٰ ضروری ہے ہو لے کر تو نماز بھی بغیر جماعت کے ہو ہی جاتی ہے مگر یہاں سوال ہونے کا نہیں قانونی ذمہ داری کا ہے۔ عاملین کا لفظ بتا رہا ہے کہ مسلمانوں کی حکومت ہونی چاہیے اور حکومت کے سربراہ کی جانب سے مسلمانوں سے زکوٰۃ کے وصول کرنے کا نظام ہونا چاہیے۔ اسی سربراہی کا نام امامت کبریٰ ہے اس موضوع پر تفصیلی بحث انشاء اللہ گیارہویں پارے کے پہلے رکوع میں آیت

خذ من اموالھم صدقۃ تطھرھم وتزکیھم میں آئے گی۔

اے پیغمبر ان کے مالوں سے زکوٰۃ لیجئے یہ ان کی جسم و روح کی طہارت کرے گی۔

اور اس کا پتہ نہیں مگر الجصاص نے جو لکھا ہے وہی پیش کرنا چاہتا ہوں کہ:

یہ آیت بتا رہی ہے کہ صدقات کی وصولی کا کام حکومت کے سپرد ہے۔

یعنی یہ مسلمان حکومت کا کام ہے کہ وہ لوگوں سے اپنے عاملوں کے ذریعے زکوٰۃ وصول کرے اور پھر ضروریات کے مطابق جس مصرف کو مقدم دیکھے اس میں صرف کرے۔ جب ایک شخص نے حکومت کے مقرر کردہ عامل کو زکوٰۃ دیدی اس کی زکوٰۃ ادا ہو گئی۔ اسی وجہ سے عاملوں کی تنخواہوں کا بوجھ بھی اسی فنڈ پر ڈالا گیا اگر ادائیگی کے لیے حکومت ضروری نہ ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مصارف کی مد میں مستقلاً عمال حکومت کا ذکر کیا جاتا۔ اسی لیے صاف اور کھلے طور پر مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ اس معاملہ میں عمال حکومت کی طاعت کریں اور بلا عذر زکوٰۃ ان کے حوالے کر دیں۔ اگر عمال حکومت ظالم ہی ہوں اور بیت المال کا سرمایہ غلط استعمال ہو رہا ہو۔ پھر بھی اصلاح حال کی کوشش کے ساتھ ادائیگی ضرور کرنی چاہیے۔ یہ نہیں کرنا چاہیے کہ زکوٰۃ بطور خود بانٹ دی جائے بشیر بن خصاصہ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے کہا کہ عمال کا ایک گروہ زیادتی کرتا ہے صدقات لینے میں کیا ہم ان کا مقابلہ کریں فرمایا نہیں (ابوداؤد) سعد بن ابی وقاص کی روایت میں ہے جب تک وہ نماز پڑھتے رہیں زکوٰۃ ان کو دو۔

امویوں کے زمانے میں جب نظام خلافت امارت میں بدل گیا۔ اور حکام ظلم و تشدد پر اُتر آئے تو کچھ لوگوں کو خیال ہوا کہ ایسے لوگوں کو زکوٰۃ نہ دینی چاہیے لیکن تمام صحابہ نے یہی فیصلہ کیا کہ زکوٰۃ انہی کو دینی چاہیے۔ یہ کسی نے نہیں کہا کہ خود اپنے ہاتھ سے خرچ کر ڈالو۔ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے پوچھا کہ اب زکوٰۃ کسے دیں۔ کہا کہ وقت کے حاکموں کو اس نے کہا کہ وہ کپڑوں اور خوشبو میں اُڑا دیں گے فرمایا اگرچہ ایسا کریں لیکن زکوٰۃ انہی کو دو (ابن ابی شیبہ) کیونکہ زکوٰۃ کا معاملہ بغیر نظام کے قائم نہیں رہ سکتا۔ ایسا کیوں ہوا۔ اور ان کی سوچ کا انداز یہ کیوں تھا۔ اس کا جواب اس کے سوا کیا ہے کہ والعاملین کا مطالبہ مسلمانوں سے یہی تھا کہ مسلمانوں کو یہ کام سیاسی نظام کے تحت باجماعت ادا کرنا چاہیے۔ انفرادی حیثیت سے اس فرض کی ادائیگی ایسی ہے جیسے بغیر جماعت نماز کی ادائیگی۔ یہ ادائیگی نہیں سر سے

بوجھ پھینکنے والی بات ہے نماز ہو یا زکوٰۃ دونوں میں ہم آہنگی ہے قرآن نے دونوں کو ہم آہنگ کر کے پیش کیا ہے دونوں اللہ سبحانہ کی شانِ محبوبیت کی نہیں بلکہ شان حاکمیت کے مظاہر ہیں۔ دونوں کا اللہ سبحانہ کی پرستش سے نہیں اللہ کی بندگی سے تعلق ہے دونوں اسلام کی اجتماعی زندگی کا نشان ہیں۔ جیسے نماز جماعت چاہتی ہے اسی طرح زکوٰۃ بھی اجتماعیت چاہتی ہے نماز کی اجتماعیت اگر امامت صغریٰ سے وابستہ ہے تو زکوٰۃ کی اجتماعیت کا شیرازہ امامتِ کبریٰ کا رہین منت ہے مسلمانوں کی آبادی اگر نماز باجماعت چھوڑ دے تو آبادی سے قتال واجب ہے ایسے ہی اگر مسلمان آبادی زکوٰۃ دینا امامت کبریٰ کو بند کر دے تو سربراہ پر ان سے قتال واجب ہے۔ دونوں کی یہی یکجہتی ہے۔ اسلامی زندگی میں اجتماعیت کے شاہکار ہیں۔ اسی ربط باہمی کی وجہ سے قرآن نے بتکرار واقیموا الصلوٰۃ واٰتوا الزکوٰۃ کی ندا بلند کی ہے۔

العاملین کے سلسلے میں یہ بات ذہن میں رکھنے کے لائق ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اپنی ذات اور اپنے خاندان بنی ہاشم پر زکوٰۃ کا مال حرام قرار دیا تھا چنانچہ آپ نے خود بھی صدقات کی تحصیل و تقسیم کا کام ہمیشہ بلا معاوضہ کیا اور دوسرے بنی ہاشم کے لیے بھی یہ قاعدہ مقرر کر دیا کہ اس سرکاری کام کو بلا معاوضہ انجام دیں تو جائز ہے۔ لیکن معاوضہ لے کر اس محکمہ کی کوئی خدمت کرنا ان کے لیے جائز نہیں ہے۔ آپ کے خاندان کے لوگ اگر صاحب نصاب ہوں تو زکوٰۃ دینا ان پر فرض ہے۔ لیکن اگر غریب، مسکین، مسافر قرض دار ہوں تو زکوٰۃ لینا ان پر حرام ہے علامہ آلوسی نے روح المعانی میں یہ بات صاف لکھی ہے۔ حافظ ابن کثیر نے بھی یہی لکھا ہے۔ ولا یجوز ان یکونوا من اقرباء رسول اللہ الذین لتحریم الصدقۃ علیھم۔ یعنی حضور اقدس ﷺ کے اقرباء کو اس محکمہ سے تنخواہ لینی جائز نہیں ہے۔

المؤلفۃ قلوبھم کون ہیں؟

مصارف زکوٰۃ میں چوتھی قسم المولفۃ قلوبھم ہے اس سے مراد وہ لوگ جو نئے نئے اسلام میں داخل ہوں اور ان کو اسلام سے وابستہ رکھنے اور اس کی خدمت پر آمادہ کرنے کے لیے مال دیا جائے۔ اور وہ غیر مسلم جن کو اسلام سے مانوس کرنے اور اس میں داخل ہونے پر آمادہ کرنے کے لیے مال دیا جائے یا اس لئے مال دیا جائے کہ ان کی قوم میں جو لوگ مسلمان ہوئے ہوں ان کی دشمنی نہ کریں۔ غیر مسلموں کو اسلام کی دشمنی سے باز رکھنے دوسرے غیر مسلموں کے مقابلے میں ان کی مدد حاصل کرنے اور فی الجملہ اسلامی ریاست کے مفاد کی ترویج کے لیے بھی مال دینا اس مد کے تحت آتا ہے۔ (السیاسۃ الشرعیہ)

اس موضوع پر تو کوئی اختلاف نہیں ہے کہ زمانہ نبوت میں بہت سے لوگوں کی تالیف قلب کے لیے امداد کی جاتی تھی۔
لیکن اس امر میں اختلاف ہے کہ آپ کے بعد بھی یہ مد باقی رہی یا نہیں۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ:

حضرت عمر، اور عامر الشعبی رضی اللہ تعالیٰ اور ایک جماعت کی رائے ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے وصال مبارک کے بعد یہ مد باقی نہیں رہی کیونکہ اللہ سبحانہ نے اسلام اور مسلمانوں کو سیاسی قوت عطا فرمادی ہے اور کفر کی طاقت ختم کردی۔ ان کے مقابلے میں دوسرے لوگ ہیں جن کا خیال ہے کہ اس مد کا مصرف اب بھی باقی ہے۔ حضور اقدس ﷺ نے فتح مکہ اور ہوازن کی شکست کے بعد بھی اس مد سے لوگوں کو وظیفے دیئے ہیں۔

احناف میں سے ابوبکر الجصاص احکام القرآن میں لکھتے ہیں کہ احناف کا مسلک اس موضوع پر یہی ہے کہ یہ مد اب باقی نہیں ہے یہ اس وقت کی بات ہے جب آغاز اسلام میں مسلمانوں کی تعداد تھوڑی اور کفر کی عددی طاقت زیادہ تھی۔ اب یہ مد باقی نہیں رہی حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما کے زمانے سے یہ مد ساقط ہو چکی ہے۔ اور اب مؤلفۃ القلوب کو کچھ دینا جائز نہیں ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ کمزور مسلمانوں کی اس مد سے مدد کی جاسکتی ہے لیکن کافر کو مدد نہیں دی جاسکتی، امام مالکؒ کہتے ہیں کہ مؤلفۃ القلوب کو اس مد میں سے نہ دیا جائے لیکن اگر کسی شہر میں یا سرحد پر ضرورت پیش آجائے تو سربراہ مملکت ایسا کرنے کا مجاز ہے امام احمد کا بھی یہی مسلک ہے۔

جیسے اس بات پر اتفاق ہے کہ مؤلفۃ القلوب مصارف زکوٰۃ میں ایک مد ہے ایسا ہی اس بات پر بھی محدثین و فقہاء متفق ہیں کہ اس مد میں سے حضور اقدس ﷺ نے کبھی کسی غیر مسلم ... کو کچھ نہیں دیا۔ غیر مسلموں کی تالیف قلب زکوٰۃ کے علاوہ دوسرے اموال سے کی گئی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مؤلفۃ القلوب صرف مسلمان ہیں جن کو اس مد سے مالی امداد دی گئی۔ یہ بات البتہ قابلِ غور ہے کہ اس مد سے مسلمانوں کو جو امداد دی گئی ہے اس کی بنیاد کیا ہے فقر یا کچھ اور اگر فقر ہے تو اس پر سب کا اتفاق ہے کہ اس بنیاد پر اب بھی اس مد سے امداد دی جاسکتی ہے۔ اختلاف صرف اس پر ہوگا جب یہ غنی اور صاحب نصاب ہوں امام شافعی اور امام احمد کے خیال میں چونکہ تمام مصارفِ زکوٰۃ میں فقر شرط نہیں اس لیے وہ مؤلفۃ القلوب میں ایسے لوگوں کو بھی داخل کرتے ہیں جو غنی اور صاحب نصاب ہوں۔ امام اعظم اور امام مالک رحمہما اللہ کے نزدیک عاملین زکوٰۃ کے علاوہ باقی تمام مصارف میں فقر شرط ہے۔

قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ اس کے نتیجے میں مؤلفۃ القلوب کی مد ائمہ اربعہ کے نزدیک منسوخ نہیں ہے

فرق صرف یہ ہے کہ کچھ بزرگوں نے فقراء و مساکین کے علاوہ کسی دوسرے مصرف میں فقر کو شرط نہیں قرار دیا اور کچھ نے فقر کو ضروری شرط کے درجہ میں بتایا ہے۔ جن بزرگوں نے العاملین کو چھوڑ کر المولفۃ قلوبھم، الغارمین ابن السبیل اور فی سبیل اللہ میں فقر کی شرط لگائی ہے وہ صرف ان مسلمانوں کو مؤلفۃ القلوب کی وجہ سے امداد دیتے ہیں جو فقیر ہوں۔ مسلمان اغنیاء کو اس کا حقدار نہیں سمجھتے۔

قاضی صاحب کا مفاہمت کا یہ فارمولا قابل داد ہے لیکن اس صورت میں العاملین کو چھوڑ کر کر ان کو زکوٰۃ میں سے تنخواہ ان کے عمل کی وجہ سے دی جائے گی چاہے وہ غنی ہوں مگر المولفۃ کو تالیف قلب رقاب کو غلام ہونے کی بنا پر غارمین کو تاوان کی وجہ سے مجاہدین کو اللہ کی راہ میں کام کرنے کی بنا پر اور ابن السبیل کو مسافر ہونے کی بنیاد پر زکوٰۃ نہیں دی جائے گی بلکہ فقیر ہونے کی وجہ سے دی جائے گی۔ اس کا نتیجہ لازماً یہ ہے کہ مصارف زکوٰۃ آٹھ نہیں بلکہ صرف دو ہیں ایک فقراء اور دوسرے العاملین۔ سوال یہ ہے کہ جب دو ہی زکوٰۃ کے مصارف ہیں تو قرآن نے آٹھ کی یہ فہرست کیوں پیش کی ہے؟ بات یہ ہے کہ اگرچہ مدات آٹھ ہیں۔ لیکن حضور اقدس نے خود ان ہشتگانہ مدات سے زکوٰۃ کے مال کی اصولی نوعیت یہ بتائی ہے۔

ان اللہ افترض علیھم صدقۃ فی اموالھم توخذ من اغنیائھم وترد علی فقرائھم

اللہ نے ان کے مالوں میں زکوٰۃ فرض کی ہے ان کے اغنیاء سے لی جائے اور فقراء کو دی جائے

اس وضاحت کی روشنی میں زکوٰۃ کی نوعیت ایک ایسے محصول کی ہے جس کے ذریعے اہل حاجت کی حاجت برآری کی خاطر تقسیم دولت کے اندر ایک گونہ ہمواری پیدا کرنا ہے۔ اصل بنیاد فقر اور حاجت مندی ہے اور یہی وہ بنیاد ہے جس کی خاطر زکوٰۃ فرض ہوئی ہے۔ زکوٰۃ اس قسم کا کوئی محصول نہیں جو آج کل حکومتیں اپنی رعایا پر عائد کرتی ہیں۔ موجودہ زمانے کا ہر محصول کسی نہ کسی صورت میں ان معاشرتی خدمات کے معاوضہ میں عائد کیا جاتا ہے جو حکومت رعایا کی خاطر انجام دیتی ہے مگر زکوٰۃ وہ محصول ہے جو امراء اور صاحب استطاعت افراد سے صرف اس لیے وصول کیا جاتا ہے کہ اس سے حاجت مند افراد کی حاجت براری کی جائے۔ موجودہ دور میں حکومت سے شہری زکوٰۃ سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہ نہیں کہہ سکتے کہ ہم سے اتنے محصولات لیے جاتے ہیں لہذا حکومت کو انہی محصولات کی آمدنی سے نفقہ کی مدد کرنی چاہیے۔ اس کا جواب حکومت یہی دے گی کہ جتنے محصولات تم سے لیے جاتے ہیں ان سے تمہارے ہی فوائد وابستہ ہیں نیام امن۔ جان و مال کا تحفظ، رسل و رسائل اور حمل و نقل کے وسائل کی ترقیاں ان محصولات ہی سے پوری ہو رہی ہیں۔ تعلیم کی اشاعت طبی امداد کی فراہمی اور دوسری

آسائشیں انہی محصولات کی رہین منت ہیں۔ لیکن زکوٰۃ وہ محصول ہے جو ان فائدوں سے قطع نظر خدا نے تم پر اس لیے عائد کیا ہے کہ اس سے غرباء اور فقراء فائدہ حاصل کریں۔ اس لیے ان تمام طبقوں میں جن کا قرآن نے مصارف زکوٰۃ میں ذکر کیا ہے بنیادی وصف اگر فقر ہے تو زکوٰۃ دی جائے گی ورنہ نہیں۔

المولفۃ قلوبھم میں اگر ایسے نومسلم ہوں جو نادار ہوں اور ناداری اور غربت کی وجہ سے کفر کی طرف ان کے پلٹنے کا یا غیر مسلموں سے رابطہ قائم کرنے کا اندیشہ ہو تو آپ ان کی مدد ان کی حاجت کی بنا پر کر سکتے ہیں لیکن اگر آپ چاہیں کہ ان نومسلموں کے گاؤں میں ان کی تالیف قلب کی خاطر زکوٰۃ کے مال سے کنواں بنا دیں، سڑک بنا دیں تو بلاریب یہ زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہے۔ ایسے ہی دوسرے مصارف کو سمجھ لیجئے بہرحال اصل بنیاد فقر ہے اور شائد بنیاد ہی کی طرف اشارہ کرنے کے لیے قرآن نے تمام مصارف پر للفقراء کو مقدم رکھا ہے اور اسی تقدیم سے جناب رسول اللہ ﷺ نے یہ بات سمجھی ہے ترد علی فقرائھم اور اسی کو ائمہ اربعہ نے پیش نظر رکھا ہے

اس بنا پر یہ وسوسہ کچھ وزنی اور جاندار نہیں ہے کہ مصارف صرف دو ہی رہ جائیں گے۔ لیکن اس کے باوجود یہ بھی حقیقت ہے کہ احناف کا استدلال اس واقعہ سے کہ حضور اقدس ﷺ کے وصال مبارک کے بعد عیینہ ابن حصن اور اقرع بن حابس حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کے پاس آئے اور انھوں نے ایک زمین آپ سے طلب کی اور آپ نے ان کو فرمان لکھ دیا۔ انھوں نے چاہا کہ مزید پختگی کے لیے دوسرے اعیان صحابہ بھی اس فرمان پر گواہیاں ثبت کر دیں۔ جب حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ کے پاس اسی مقصد کی خاطر گئے تو انھوں نے اس فرمان کو پھاڑ دیا اور فرمایا کہ بلاشبہ حضور اقدس ﷺ تالیفِ قلب کے لیے تمہیں دیا کرتے تھے مگر وہ اسلام کی کمزوری کا زمانہ تھا اب اللہ نے اسلام کو تم سے بے نیاز کر دیا ہے اس پر وہ حضرت ابوبکر رضی اللہ تعالیٰ کے پاس شکایت لے کر آئے لیکن نہ تو اس پر حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کچھ کہا اور نہ دوسرے صحابہ میں سے کسی نے حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی رائے سے اختلاف کیا۔ اس بنیاد پر احناف کہتے ہیں کہ مولفۃ القلوب کی مد مصارف زکوٰۃ سے ختم ہو گئی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اجتہاد دلیل کی بنا پر ہے دلیل یہ ہے اعز اللہ الاسلام۔ خود فقہائے احناف نے بھی اسی کو مرکز قرار دیا ہے۔

دراصل المؤلفۃ قلوبھم کی مد الصدقات کے مصارف میں ان لوگوں کے لیے جو محض مالی کمزوریوں کی وجہ سے اسلامی حکومت اور اسلام کی مخالفت کرتے ہیں جیسا کہ اس زمانے میں سیاسی شورش پسندوں کے ایک گروہ کا یہی حال ہے۔ ان لوگوں کو چپ کرانے کے لیے بھی الصدقات کے مصارف میں قرآن نے مولفۃ القلوب کی ایک مد رکھی ہے۔ اگرچہ عام طور پر فقہا کہتے ہیں کہ یہ مصرف صرف ابتداء اسلام میں تھا جیسا کہ آپ سن آئے

ہیں اور اس سلسلے میں ان کی دلیل بھی اب سن چکے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے مولفۃ القلوب کے بعض افراد کو دینے سے اس وجہ سے انکار کر دیا کہ اب اسلام اتنا قوی ہو چکا ہے کہ ان لوگوں کے تالیف قلب کی ضرورت نہیں رہی مقصد صرف اس قدر ہے کہ چند خاص لوگوں کو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دینے سے انکار کرتے ہوئے کہا تھا کہ ان اللہ اعز الاسلام اس کا یہ مطلب بتانا کہ ہر شخص کے لیے حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے اور ہمیشہ کے لیے ساقط کر دیا۔ میری کچھ سمجھ میں نہیں آیا قرآن نے جس مصرف کو منصوص کیا ہے اس کو اولاً حضرت عمر رضی اللہ عنہ منسوخ بھی کیسے کر سکتے ہیں۔ نیز ایک ایسی خبر واحد سے قرآن کے ایک قانون پر خط تنسیخ نہیں پھیرا جا سکتا۔ بلکہ اس کا صاف مطلب یہی ہے کہ یہ امام اور حکومت وقت کے صوابدید پر موقوف ہے۔ جس وقت جن لوگوں کے لیے اس کی ضرورت سمجھے دے جن کے لیے ضرورت نہ سمجھے نہ دے۔ اس دلیل کا تعلق ایک تو وقت و زمان کے احوال سے اور دوسرا اشخاص کے احوال سے ہے۔ اس وقت کے حالات میں مصالح اجتماعی کا تقاضا نہ تھا۔ احوال میں ٹھہراؤ نہیں ہے۔ اگر حالات بدل جائیں اور وقت کا تقاضا بھی یہ ہو تو قرآن کی دی ہوئی گنجائش سے فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔ البتہ اس کی ضرور رعایت رکھی جائے کہ جسے مدد دے رہے ہیں وہ مدد کا مستحق ہو اور مسلمان ہو۔ بلکہ اس مادی دور میں جب کہ روحانی حقائق کو بیگانے تو بیگانے یگانے بھی مادیت کی ترازو میں تول رہے ہیں اس کا دائرہ وسیع ہونا چاہیے۔ عیسائی مشنریوں کے مقابلے میں زکوٰۃ کے فنڈ سے نومسلموں کی حوصلہ افزائی۔ ان کی امداد۔ ان کی رہائش۔ ان کے خورد و نوش اور ان کی تعلیم و تربیت کا اجتماعی طور پر تنظیمی ڈھانچہ قائم کریں تو وقت کا تقاضا ہے۔

غلاموں کے آزاد کرنے میں

اور غلاموں کی گلو خلاصی میں نیز قرضداروں کی مدد کے لیے اور اللہ کی راہ میں اور مسافروں کے لیے ہے۔ فرض ہے اللہ کی جانب سے اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت والا ہے۔ مصارف زکوٰۃ میں پانچواں مصرف فی الرقاب ہے رقاب جمع رقبہ کی ہے مطلب یہ ہے کہ گردنیں چھڑانے میں زکوٰۃ سے مدد کی جائے۔ غلامی انسانی تمدن کی سب سے بوجھل زنجیر ہے۔ یہ زنجیر انسانیت کی نازک گردن سے صرف اسلام نے کاٹ کر الگ کی۔ غلاموں کو آزاد کرنے کے فضائل بتائے۔ ان کے ساتھ نیکی احسان حسن سلوک کی تاکید کی اور ان سب سے بڑھ کر یہ کہ زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک حصہ اس کے لیے نامزد کر دیا کہ اس سے غلاموں کو آزاد کرایا جائے چونکہ غلاموں کو آزاد کرنے کی پوری قیمت یا اس کی آزادی کا پورا زر فدیہ ہر ایک شخص برداشت نہیں کر سکتا تھا اس لیے زکوٰۃ کی مجموعی رقم سے اجتماعی طور پر اس فرض کو ادا کرنے کی صورت تجویز کی۔ انسانوں کے درماندہ طبقہ پر یہ اتنا بڑا عظیم الشان احسان کیا گیا ہے جس کی نظیر دنیا

ے مبنی کی فہرست میں نظر نہیں آتی۔ حضور اقدس ﷺ نے صرف اس لیے کہ انسانوں کے اس واجب الرحم فرقہ کو اپنی کھوئی ہوئی آزادی واپس ملے اپنی امت پر ایک دائمی رقم واجب ٹھہرا دی کہ اس کے ذریعے سے نیکی کے اس سلسلہ کو اس وقت تک قائم رکھا جائے جب تک دنیا کے تمام غلام آزاد نہ ہو جائیں یا اس رسم کا دنیا کی تمام قوموں سے خاتمہ نہ ہو جائے۔[1]

غلاموں کی آزادی میں مال زکوٰۃ خرچ کرنے کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ جس غلام نے اپنے مالک سے یہ معاہدہ کیا ہو کہ اگر میں تمہیں اتنی رقم ادا کر دوں تو تم مجھے آزاد کر دو اسے بدل کتابت آزادی کی قیمت ادا کرنے میں مدد دی جائے حضرت علی ابن ابی طالب، سعید بن جبیر، لیث رضی اللہ عنہم الثوری احناف اور شوافع اور اہل علم کی اکثریت فی الرقاب کا یہی مطلب بتاتی ہے۔

دوسری یہ کہ خود زکوٰۃ کی مد سے غلام خرید کر آزاد کیے جائیں عبد اللہ بن عباس، الحسن البصری۔ امام مالک اور امام احمد فی الرقاب کا یہی مطلب بتاتے ہیں امام بخاری کا صحیح میں میلان بھی اسی طرف ہے۔ امام زہری فرماتے ہیں کہ آیت کی مراد دونوں ہیں۔ یہ یاد رہے کہ احناف کے نزدیک زکوٰۃ کی مد سے صرف مکاتب غلام کا بدل کتابت دیا جا سکتا ہے۔ غلام خرید کر آزاد نہیں کیا جا سکتا اور اس میں کوئی اختلاف نہیں۔ غلام خرید کر آزاد کرنے میں اختلاف ہے۔

تعبیر میں اختلاف

آیت میں اس تعبیری اختلاف سے اہل علم نے لطائف علمی کی نکتہ آفرینی کی آیت کا آغاز للفقراء میں لام سے کیا ہے اور یہاں پہنچ کر لام کی جگہ فی آیا ہے وفی الرقاب ادب بلاغت کے مشہور نکتہ شناس علامہ زمخشری لکھتے ہیں یہ تنوع یہ بتانے کے لیے ہے کہ غلام اور قرضدار بہ نسبت مذکورین کے صدقہ و زکوٰۃ کے زیادہ حقدار ہیں کیونکہ فی ظرفیت کے لیے آتا ہے گویا ان کو صدقات کے لیے بمنزلہ برتن بنا دیا گیا ہے اور کہا گیا ہے کہ یہ برتن زیادہ حقدار ہے کہ تمہارے صدقات پہلوں کے مقابلے میں ان میں رکھے جائیں۔ کیونکہ رقاب اور غارمین دونوں ہی جکڑے ہوئے ہیں ایک غلامی میں اور دوسرا تاوان و قرض میں اور دونوں چھٹکارا اور خلاصی کے محتاج ہیں اور آگے فی سبیل اللہ، ابن السبیل لا کر اشارا کر دیا کہ بے سہارا مجاہد اور گھر سے دور بے مایہ مسافران دونوں سے بھی زیادہ صدقات کے مستحق ہیں۔

علامہ ناصر نے انتصاف میں اس سے بھی زیادہ وزنی بات لکھی ہے کہ:

[1] سیرۃ النبی

پہلی چاروں مدوں فقیر، مسکین، عامل اور المولفۃ قلوبہم کو اگر زکوٰۃ دی جاتی ہے تو انفرادی طور پر ان کو مالک بنایا جاتا ہے ملکیت کو ظاہر کرنے کے لیے لام لے کر آئے برخلاف رقاب اور غارمین کے ان کو جو مال دیا جائے گا وہ ان کو نہیں بلکہ غلام کے آقا اور قرض خواہ کو ملے گا۔ چونکہ ان کو شخصی طور پر مال نہ ملے گا بلکہ ان کی مصالح میں مال کو صرف کیا جائے گا اس لیے لام کی جگہ فی آیا ہے۔

صاحب انتصاف ہی نے اپنے دادا ابو العباس احمد بن الفارس کے حوالہ سے ایک علمی نکتہ یہ بھی لکھا ہے کہ:

انما الصدقات اگر مبتدأ ہے للفقراء اس کی خبر ہے لیکن متعلق کی ضرورت ہے امام شافعیؒ کے ذہن کے مطابق اس کا متعلق اگر مملوکۃ نکالا جائے تو یہ لام کی حد تک صحیح ہوگا لیکن آگے عبارت میں فی آرہا ہے اس کے لیے جداگانہ فعل کی ضرورت ہوگی۔ امام مالک کے نظریہ کے مطابق آیت قرآنی صرف مصارف بیان کر رہی ہے اس لیے متعلق مملوکۃ کی بجائے مصروفۃ ہوگا للفقراء اور فی الرقاب دونوں کا تعلق اس سے بغیر کسی تکلف کے صحیح ہو جائے گا۔

قرض داروں کی قرض سے سبکدوشی

یہ مد زکوٰۃ کا چھٹا مصرف ہے۔ الغارمین کے معنے ہیں تاوان اٹھانے والے اس سے مراد وہ نیک لوگ ہیں جنھوں نے دوسرے لوگوں اور قبیلوں میں مصالحت کرانے کے لیے کسی مالی ضمانت کی ذمہ داری اپنے اوپر لے لی ہے یہ مالی ضمانت ایک قومی نظام کی حیثیت سے زکوٰۃ کے بیت المال سے ادا کی جاسکتی ہے یا ایسا قرض دار جو اپنے مال سے اگر پورا قرض چکائے تو ان کے پاس قدر نصاب سے کم مال رہ جائے خواہ کسب کرتے ہوں یا بے روزگار ہوں خواہ عرف میں فقیر ہوں یا نہ دونوں صورتوں میں ان کی مد زکوٰۃ کی مد سے کی جاسکتی ہے۔ ابو بکر الجصاص لکھتے ہیں۔

جابر بن ابی جعفر رضی اللہ عنہ کہتے ہیں ایسا قرضدار جس کے بے جا اور بے محل اخراجات نہ ہوں اس کے قرض کی ادائیگی حکومت کی ذمہ داری ہے اور سعید کہتے ہیں کہ جن لوگوں پر معتدل معیشت میں بغیر مسرفانہ طرز زندگی کے قرض ہو جائے تو اللہ سبحانہ نے ان کے لیے مال زکوٰۃ میں حصہ رکھا ہے۔ قرض میں ان بزرگوں نے اسراف نہ کرنے کی قید اس لیے لگائی ہے کیونکہ جو شخص فضول خرچیوں میں ڈال کر اپنے کو مقروض بناتا ہے وہ اس لائق نہیں ہے کہ آئندہ کے لیے اس پر اعتماد کیا جائے۔ امام مجاہد نے جس کا گھر دوکان، کھیتی، مویشی سیلاب کی نذر ہو جائیں یا جس کے گھر دکان میں آگ لگ جائے اس کو بھی الغارمین کا مصداق بتایا ہے لیکن الجصاص فرماتے ہیں کہ یہ لوگ فقیر تو ہیں گر غریم

نہیں غالباً امام مجاہد ؒ کی مراد یہ ہو کہ اس کے نتیجہ میں وہ مقروض ہو جائے گا۔

فی سبیل اللہ زکوٰۃ کا مصرف

قرآن کی اصطلاح میں وہ تمام کام جو براہ راست اسلام کی حفاظت و تقویت کے لیے ہوں سبیل اللہ کے کام ہیں اور چونکہ اسلام کی حفاظت کا سب سے زیادہ ضروری کام دفاع ہے اس لیے زیادہ تر اطلاق اسی پر ہوا لہٰذا اگر دفاع درپیش ہے اور امام وقت اس کی ضرورت محسوس کرتا ہے کہ مدزکوٰۃ سے مجاہدین کی مدد کی جائے تو اس میں خرچ کیا جائے گا ورنہ دین و امت کے عام مصالح میں زکوٰۃ سے کام لیا جاسکتا ہے۔ اگر ساری مدات میں فقر کی ضروری قید ملحوظ ہے اور اس مد میں بھی اس کو ملحوظ رکھا جائے تو بلا استثنا دین کے سارے شعبوں میں قرآن اور علوم دینیہ کی ترویج و اشاعت میں مدارس کے اجراء و قیام میں دعاۃ و مبلغین کے قیام و ترسیل میں ہدایت و ارشاد امت کے تمام مفید وسائل میں اس مد سے کام لیا جاسکتا ہے۔ فقر کی قید کے بعد مجاہد اور حاج کی تخصیص کے کوئی معنے نہیں ہیں قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے۔

> جب مصارف کی ساری قسموں میں فقر کی ضروری قید ہے تو پھر فی سبیل اللہ کو حج اور جہاد کے ساتھ خاص کرنے میں کوئی معنویت نہیں ہے بلکہ اس میں سارے ابواب خیر داخل ہوں گے۔ لہٰذا جو شخص طالبان علم پر مال خرچ کر رہا ہے وہ یقیناً راہ خدا میں خرچ کر رہا ہے۔

کچھ علماء نے آیت فی سبیل اللہ کا مصداق میدان جنگ کے سپاہیوں اور حج میں جانے والے حاجیوں کو قرار دیا ہے چنانچہ امام شافعی قاضی ابو یوسف اور اہل علم کی رائے عامہ کہتی ہے کہ اس سے مراد وہ مجاہدین ہیں جن کے پاس سامان نہ ہو امام احمد اور امام محمد فرماتے ہیں وہ حاجی ہیں جن کے پاس اثاثہ نہ ہو۔ لیکن فقہاء نے فقر کی قید لگا کر اس تخصیص کی ضرورت محسوس نہیں کی۔ چنانچہ علامہ کاشانی نے بدائع الصنائع میں تصریح کی ہے ــــــ کہ وہ تمام کام جو نیکی و خیرات کے ہوں اس میں داخل ہیں اور فتاویٰ ظہیریہ میں اس کا مصداق طلبہ علم کو قرار دیا ہے۔

مسئلہ تملیک اور زکوٰۃ

جیسے تمام ائمہ کے نزدیک عاملین کو چھوڑ کر تمام مصارف میں زکوٰۃ لینے والوں کے لیے فقر شرط ہے ٹھیک اسی طرح ائمہ اربعہ کا اس پر بھی اتفاق ہے کہ زکوٰۃ کی ادائیگی کے لیے تملیک بھی شرط ہے نہ فقر کے بغیر

زکوٰۃ کی ادائیگی اور نہ تملیک کے بغیر زکوٰۃ ادا ہوتی ہے۔ فقراء ہوں یا مساکین۔ المؤلفۃ قلوبہم ہوں یا رقاب غارمین ہوں یا ابناء السبیل اور آخر میں تمام نیکی کے کام ہوں سب میں تملیک بنیادی اور اہم شرط ہے آپ زکوٰۃ کی مد سے خیر سگالی کے جذبے کے تحت محتاج خانے۔ دار المساکین۔ دار التالیف، دار التحریر اور قرض خواہوں یا مسافروں کے لیے سرائے مسافر خانے نیکی کے کاموں کے لیے مساجد اور مدارس تعمیر نہیں کر سکتے کیونکہ ان میں انفرادی ملکیت نہیں ہے۔ یہ کام سارے کے سارے نیکی اور خیرات کے کام ہیں اور یہیں بھی رفاہ عام کے لیے لیکن یہ زکوٰۃ کا مصرف نہیں ہیں ان کاموں کا کرنا زکوٰۃ سے الگ مسلمانوں کی اجتماعی ذمہ داری ہے یتیم خانوں میں یتیم بچوں مدارس میں طلبہ کو مساجد میں غریب نمازیوں سرائے میں غریب مسافروں کو آپ شخصی اور انفرادی طور پر زکوٰۃ دے سکتے ہیں۔ یہ بات یاد رہے کہ زکوٰۃ کے فرض ہونے کی شرطیں اور زکوٰۃ کے ادا ہونے کی شرطیں الگ الگ ہیں۔ زکوٰۃ کے فرض ہونے کی شرط اگر نصاب زکوٰۃ کا ہونا اور اس پر سال گذرنا ہے تو زکوٰۃ کی ادائیگی کی شرط زکوٰۃ لینے والے کا فقیر ہونا اور اسے مالک بنانا ہے۔ اگر یہ دونوں شرطیں نہ پائی جائیں تو زکوٰۃ کی ادائیگی نہ ہوگی۔ مثلاً۔

اگر آپ نے اپنی زکوٰۃ کسی میت کے کفن دفن پر خرچ کر دی یا آپ نے میت کا قرض ادا کر دیا۔ یا آپ نے میت کو ثواب پہنچانے کے لیے لوگوں کو گھر بلا کر کھانا کھلایا۔

اگر آپ نے کوئی شفا خانہ زکوٰۃ کے مال سے بنا دیا اور اس میں آپ نے مریضوں کا مفت علاج شروع کر دیا۔

اگر آپ نے زکوٰۃ کی رقم سے کوئی مسجد تعمیر کر دی اور اس میں نمازی نماز پڑھنے لگے۔ اگر آپ نے رفاہ عام کے لیے کوئی نلکا ٹیوب ویل یا نہر بنا دی۔ اگر آپ نے کوئی پل۔ سڑک رفاہ عام کے لیے بنا دی۔ اور اس سے لوگ متمتع ہونے لگے ان سب صورتوں میں آپ کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی اور اسی میں یہ بھی داخل ہے کہ اگر آپ نے کسی لائبریری میں زکوٰۃ کی رقم سے کتابیں وقف کر دیں یا کوئی مسافر خانہ یا سرائے بنا دی تو آپ کی زکوٰۃ ادا نہ ہوگی کیونکہ زکوٰۃ کی ادائیگی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ تملیک ہو۔ زکوٰۃ ہی پر تمام صدقات کو بھی قیاس کر لیجئے۔ اگر آپ نے کچھ لوگوں کو گھر بلا کر کھانا کھلایا تو یہ صدقہ نہیں یہ ضیافت ہے صدقہ کے لیے تملیک شرط ہے۔ اسی سے آپ میت کے ایصال ثواب کے لیے دیئے جانے والے کھانوں کا حکم معلوم کر سکتے ہیں۔ بہرحال زکوٰۃ ہو یا صدقہ اور یا ہبہ سب کے لیے اسلامی قانون تملیک ہے اور تملیک کے لیے قبضہ شرط ہے۔

ان مسائل میں چاروں ائمہ امام ابو حنیفہ، امام شافعی اور امام احمد اور امام مالک رحمہم اللہ تعالیٰ متفق ہیں جمہور امت میں اس موضوع پر کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔

مصارف زکوٰۃ پر ایک نظر

اگرچہ ملک کے غریبوں، فقیروں اور معذوروں کا مسئلہ مدینہ میں اسلامی حکومت کی نگاہ میں شروع سے تھا۔ لیکن آغاز میں غنیمت کے پانچویں حصے سے جو حصہ ان لوگوں کے لیے مقرر ہوا تھا اس وقت اجمالاً تین ہی تک بات محدود تھی۔ فان للہ خمسہ وللرسول ولذی القربیٰ والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل۔ لیکن اب زکوٰۃ فرض ہونے کے بعد قرآن میں باقاعدہ حاجت مندوں کی ایک تفصیلی فہرست نازل ہوگئی جس کا دائرہ ان تین کے علاوہ جن کا ذکر غنیمت کے پانچویں حصہ میں تھا یعنی یتامیٰ مساکین اور ابن السبیل آٹھ تک پھیلا دیا گیا۔ اور آغاز ہی میں للفقراء والمساکین کہہ کر مخاطب کے ذہنوں کو جھنجھوڑ دیا کہ معاشی قوت حاصل کرنے کے لیے جن جسمانی اور عقلی قوتوں کی ضرورت ہے۔ اس سے وہ یکسر محروم ہیں۔ اسی طرح ایسے لوگ جن میں یہ قوتیں ابھری ہوں لیکن بڑھاپے یا کسی اور وجہ سے جدوجہد کی صلاحیت ختم ہوگئی ہے اور سوسائٹی میں وہ عاجز، کمتر اور مسکنت کی نمائندگی کرتے ہیں یعنی حصول معاش کی قوتیں جن میں نہ ہوں یا حصول معاش کی قوتیں اور ذرائع بالکل مفقود تو نہ ہوں لیکن کچھ حالات اتفاقی کے شکار ہو کر معاشی ذرائع سے محروم ہوگئے ہوں مثلاً ناگہانی طور پر کسی بیماری کا حملہ ہوا اور علاج معالجہ میں کسی کا سارا سرمایہ ختم ہو جائے یا کاروبار میں یا زراعت میں اسے نقصان پہنچا ہو یا ایسے حوادث کے جو شکار ہوئے ہوں جیسے حضور اقدس　　کے زمانہ میں مہاجرین کا حال تھا۔ حوادث زمانہ میں ان ہی مبتلا ہونے والے نادار دل کو الفقراء کہتے ہیں۔ اسی لیے قرآن میں مہاجرین کے ساتھ فقراء کی صفت لائی گئی ہے حالانکہ حصول معاش کے لیے جن جسمانی و عقلی قوتوں کی ضرورت ہے وہ سب ان میں موجود تھیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ ہر ملک ہر سوسائٹی میں کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ باوجود عدم معذوری کے کچھ کرنا بھی چاہیں تو کر نہیں سکتے کیونکہ کرنے کی ساری راہیں اپنے اوپر بند کر لیتے ہیں۔ موجودہ زمانے کے بیروزگار تعلیم یافتہ طبقہ کی نوعیت بھی ایسی ہی ہے یعنی باوجود سب کچھ رکھنے اور سب کچھ ہونے کے معاشی ذرائع ان پر بند ہیں۔ اسلام نے جہاں مانگنے والوں کے لئے سوال کو اس وقت تک حرام کیا ہے جب تک اضطرار کی حالت نہ ہو لیکن اسی کے ساتھ دینے والوں کو حکم ہے جیسا کہ فاطمہ بنت حسین بن علی رضی اللہ عنہما سے روایت ہے کہ:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مانگنے والے کا حق ہے خواہ وہ گھوڑے پر سوار ہو کر آئے (البیہقی)

کیا معلوم گھوڑے سوار کی کیا حالت ہے جب کہ اس زمانے کے سائیکل سواروں کے بیشتر حالات سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے مطلب یہ ہے کہ اس فہرست میں قرآن نے پہلے الفقراء والمساکین کا ذکر کیا اور دونوں الفاظ

ان تمام لوگوں کو عام ہیں جو مندرجہ بالا سے موصوف ہوں۔ عمرو بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ فاتح مصر سے کسی نے ان الفاظ کی تفسیر دریافت کی تو بطور مثال کے ان چند طبقات کا ذکر کر دیا۔

العمیان	اندھے
العرجان	لنگڑے
الکسحان	اپاہج
الیتامیٰ	یتامیٰ

اور فرمایا کل منقطع بہ ہر وہ شخص جو وجوہ معاش سے محروم ہو۔

واقعہ یہ ہے کہ ان حاجت مندوں پر یوں ہی لوگوں کی نگاہ پڑتی ہے ہر قوم اور ہر ملک کے ارباب ثروت ان کی امداد اپنا اخلاقی اور دینی فرض سمجھتے ہیں اگرچہ حکومتوں نے اپنی آمدنی میں ان کا کوئی مستقل حصہ نہیں رکھا ہے مگر خوشی و مسرت کے مواقع پر اندھوں لنگڑوں غریبوں کو جمع کر کے کھانا کھلا دیا جاتا ہے یا کچھ پیسے بانٹ دیئے جاتے ہیں لیکن اسلام کی نظر اس سے آگے پہنچی اس نے مسلمانوں پر زکوٰۃ فرض کی اس کی وصولیابی کی ذمہ داری حکومت پر رکھ کر زکوٰۃ کی آمدنی کے اخراجات کے لیے اس کے آٹھ مصارف مقرر کر دیئے اور بتا دیا کہ ان مصارف کے سوا زکوٰۃ کی آمدنی کو خرچ کرنے کی حکومت مجاز نہیں ہے۔

ان مصارف میں ایک ضروری اور وقت کے تقاضے کے مطابق اہم مصرف غلاموں کی آزادی رکھا وفی الرقاب آج ابراہم لنکن اور ان جیسوں کا نام غلاموں کے آزاد کرانے میں بڑی عزت سے لیا جاتا ہے حالانکہ یورپ نے غلاموں کو آزاد کرنے یا کرانے کا بیڑہ اس وقت اٹھایا جب ترکوں اور عربوں اور دیگر مسلمان قوموں کے مقابلے میں ان کو اس کے سوا کوئی چارہ کار نظر نہیں آیا کہ جب تک ہم ہی لوگ غلامی کے انسداد پر رضامند نہ ہوں گے بری اور بحری راستوں سے یورپ کے بچوں اور عورتوں کو غلام بنانے کا طریقہ مسلمان نہ چھوڑیں گے آخر اس پر اتفاق ہوا مسلمانوں کے خلیفہ کے سامنے مسئلہ پیش ہوا شیخ الاسلام نے نحن احق بمکارم الاخلاق کے ساتھ اس نیک کام پر لبیک کہا۔ خلیفہ کے دستخط ہو گئے کیونکہ ظاہر ہے کہ غلام بنانا اسلام میں نہ فرض ہے نہ واجب سنت اور نہ مستحب بلکہ دنیا کی قوموں نے جنگی تجربات کی وجہ سے قیدیوں کو قتل کرنے سے غلام بنا لینا آسان سمجھا تھا۔ غلام چونکہ ہمیشہ دشمن قوم کے افراد ہوتے تھے ان کے ساتھ اچھا برتاؤ طبعاً نہ کیا جاتا تھا۔ جس کی داستان درد سے بھری ہوئی ہے اس جنگی صورت حال کے پیش نظر اسلام نے جنگی قیدیوں کے غلام بنانے کو جائز قرار دیا مگر اتنی ترمیم کر دی کہ جب تک وہ غلام رہیں ان کے ساتھ اچھا سلوک کیا جائے حتیٰ کہ

کھانے پینے کی حد تک برابر رکھا جائے اور جب اس کا زمانہ آجائے تو اسلام میں صرف یہی نہیں بلکہ بیسیوں شکلیں قانونی اور اخلاقی مثلاً کفارات وغیرہ کے ذریعے غلام آزاد کرائے جاتے ہیں بلکہ قرآن نے نیکی کی ایک بہت اہم مد فك رقبۃ قرار دیا۔

اس کے ساتھ اسلام نے غلاموں کو آزاد کرنے کے لیے کتابت کی بھی حوصلہ افزائی کی یعنی معاوضہ لے کر غلاموں کو آزاد کرنا ان سب آزادی کی تجاویز کے ساتھ اسلام نے زکوٰۃ کے مصارف میں ایک مصرف فی الرقاب بھی رکھ دیا۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ فی الرقاب سے بدل کتابت میں مدد کے ذریعے غلاموں کی غلامی میں ہاتھ بٹانا ہے مگر امام مالک رحمۃ اللہ علیہ کا خیال ہے کہ:

الرقاب سے وہ غلام مراد ہیں جنہیں الزکوٰۃ کی مد سے خریدا جاتا ہے اور اس کے بعد آزاد کیے جاتے ہیں۔

یہ تو خیر غلاموں کی آزادی کی بات ہے لیکن ہر ملک اور ہر آبادی میں غلاموں سے بھی بدتر ایک اور طبقہ بھی ہے یہ اس لیے زیادہ قابل رحم ہے کہ اوروں کے ساتھ حکومت نہ سہی عوام انفرادی طور پر حسن سلوک کچھ نہ کچھ کرتے رہتے ہیں لیکن انسانیت کے جس طبقہ کا میں ذکر کر رہا ہوں وہ بیکس محروم طبقہ ہے جس کو کسی زمانے میں حکومتی یا انفرادی ہمدردی کا مستحق نہیں سمجھا گیا میری مراد مقروضوں کا طبقہ ہے یہ دنیا کا وہ مظلوم طبقہ ہے جس کے ساتھ نیکی اور حسن سلوک تو درکنار دنیا میں حکومتیں ان سے زبانی ہمدردی کی بھی روادار نہیں ہیں۔ ہر حکومت اپنے قوانین کے تحت اس تاک میں رہتی ہے کہ مقروضوں کے ذمے قرض خواہوں کا جو مطالبہ ہے صرف اصل ہی نہیں بلکہ سود در سود کے ساتھ اس سے وصول کرا دیا جائے اس راہ میں مقروضوں کی ساری جائداد گھر کا سارا اثاثہ ہی کیوں نہ فروخت ہو جائے مقروضوں کا یہ طبقہ خبر نہیں کن مشکلات میں مبتلا ہو کر قرض لینے پر مجبور ہوتا ہے۔ مشکلات سے نجات دلانا تو درکنار بلکہ سود در سود کی زنجیر میں اور پھنستا جاتا ہے اور حکومت کی ساری مشینری اس کے درپے ہوتی ہے جب سب قرض خواہوں کی پشت پناہی کر رہے ہیں قرآن نے قرضداروں سے ہمدردی کی ہے قرض کو دنیاوی کاروبار یا معاملہ سے نکال کر اول تو مقروض کو ایک اہم ترین انسانی ہمدردی کا مظہر قرار دیا اور پھر بالآخر زکوٰۃ کے مصارف کی مد میں الغارمین کے عنوان کے ساتھ قرضداروں کے مسئلہ کو حکومت کے ہاتھ میں دے دیا۔

اسلام کے قانون دان طبقہ کا اتفاق ہے کہ جو مقروض ہوں یا زراعت و تجارت یا اسی قسم کے کاروبار میں جن کو نقصان پہنچ گیا ہو بیت المال میں ہر سال ایک مد الغارمین ہونی چاہیے۔ مقروضوں کے متعلق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سربراہ مملکت کی حیثیت سے اعلان فرما دیا تھا۔

مرنے کے بعد جو مال چھوڑ جائے وہ تو اس کے ورثہ کا ہے لیکن اگر قرض چھوڑ کر مرا ہے تو اس کی ذمہ داری ہم پر یعنی حکومت پر ہے۔

ان اہم مدوں کے علاوہ ہر شہر اور ہر آبادی میں ایک اور طبقہ بھی ہے۔ خصوصًا اس زمانے میں جب مواصلات کے ذرائع اتنے وسیع اور آسان نہ تھے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ وہ لوگ جو مختلف کاروبار کے سلسلے میں اپنے ملک یا شہر سے پردیس جاتے ہیں۔ ان میں بسا اوقات حالات کے تحت کبھی ایسی صورت پیش آتی ہے کہ وطن میں خواہ کتنے امیر ہوں لیکن پردیس میں وہ بالکل بے دست و پا ہو کر رہ جاتے ہیں۔ چونکہ پردیسی ہوتے ہیں اس لئے کسی سے ان کی نہ آشنائی ہوتی ہے اور نہ شناسائی۔ ایسی صورت میں ان کی حالت نہایت قابل رحم ہوتی ہے۔ یوں تو پہلے زمانہ میں ایسے پردیسیوں کے ساتھ انفرادی طور پر حسن سلوک کرتے تھے اور عرب میں تو مہمان نوازی اور مسافروں سے ہمدردی کا خاص ذوق تھا لیکن جن قوموں اور ملکوں میں ذات پات یا قومیت اور وطنیت کا مرض شدت پذیر ہو جاتا ہے ان کے یہاں غریب مسافر کی بہت ہی درگت بن جاتی ہے اور یہ بیماری موجودہ تمدن مغربی کی وجہ سے اگرچہ بہت عام اور خطرناک ہو گئی ہے بہرحال انسانیت کا یہ طبقہ ہر ملک اور ہر قوم میں قابل توجہ بنا رہا ہے قرآن نے مصاریف زکوٰۃ کی فہرست میں ابن السبیل کے نام سے اضافہ کیا اور اسلامی حکومت کے لیے قرآن نے ان کی خبر گیری کو بھی ایک اہم مسئلہ قرار دیا۔

آخر میں فی سبیل اللہ کے لفظ سے معاشرے کے ایسے افراد کو بھی مصاریف زکوٰۃ میں داخل کر دیا جو زندگی کے مختلف گوشوں میں جماعت کا کوئی کام کرنا چاہتے ہیں لیکن فقر کی وجہ سے ان کے بس سے باہر ہے جہاد میں جانا چاہتے ہیں۔ حج کرنا چاہتے ہیں۔ بیرون ملک جا کر یا اپنے ہی ملک میں علم کی طلب میں جانا چاہتے ہیں۔ ان کے اخراجات کی کفالت اسی مد سے کی جانی چاہیے۔

دراصل یہ اسلام کا جدید اقدامی کارنامہ ہے کہ انسانیت کے اس کس مپرس پس ماندہ طبقہ کی باضابطہ اور منظم شکل میں صرف زبان ہی سے نہیں بلکہ واقعی مالی اعانت کے لیے اسلامی حکومت کا کمربستہ ہو جانا اور اس کو عملاً کر گذرنا انسانیت کی تاریخ میں دنیا کی حکومتیں اس کی مثال پیش نہیں کر سکتی ہیں۔

سوچنے کی بات یہ ہے کہ اسلام نے مصاریف کی ان متعدد مدوں کو پورا کرنے کے لیے زکوٰۃ کے نام سے جو محصول لوگوں پر عائد کیا ہے۔ یعنی خزانہ حکومت پر جب ان جدید اخراجات کا بوجھ ڈالا تو اسلام نے ان اخراجات کی پابجائی کے لیے زکوٰۃ کے نام سے محصول عائد کر دیا تاکہ خزانہ حکومت متاثر نہ ہو اور اس کی تعمیل میں کبھی کوئی کوتاہی نہ ہو لیکن اس محصول کے لیے جن حکمتوں اور مصلحتوں سے کام لیا ہے عام لگاہوں نے ان پر غور نہیں

کیا ہے۔ میں ان میں سے کچھ عرض کرتا ہوں۔

زکوٰۃ کے مصالح ونکات

۱۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ ان ہشتگانہ مصاریف کی بابجائی کی خاطر اسلام جن لوگوں پر محصول عائد کرنا چاہتا ہے ان کے لیے اسلام نے اس رعایت کا اعلان کیا کہ جو لوگ اس کے ادا کرنے کی ذمہ داری اپنے اوپر لیں گے ان کو سرکار کے تمام مالی مطالبات سے سبکدوش کر دیا جائے گا یعنی زمین کا خراج جو ہر حکومت کا حق ہے اس سے اس مد کا محصول ادا کرنے والوں کو مستثنیٰ کر دیا جائے گا۔

۲۔ اسلام یہ محصول ملک کے ہر باشندے پر عائد نہیں کرتا ہے بلکہ یہ تمام مطالبات صرف ان لوگوں تک محدود رکھے گئے ہیں جو اپنی اور اپنے زیر پرورش متعلقین کے روزمرہ معمولی مصارف کی تکمیل کے بعد اپنے پاس کچھ پس انداز کر سکتے ہوں۔ اصطلاحاً اسی کا نام نصاب ہے اور ہر چیز کا نصاب اسلام نے جدا جدا رکھا۔

۳۔ اس کے بعد بھی یہ مطالبات ہر قسم کی مملوک چیز پر عائد نہیں ہوتے بلکہ صرف ان چیزوں پر عائد ہوتے ہیں جو نامی ہوں یعنی جن میں پیداواری صلاحیت ہو جیسے تجارت زراعت۔ بغرض افزائش نسل جن مویشیوں کی پرورش کی جاتی ہے یا نقد سرمایہ بشکل سونا ہو یا چاندی ظاہر ہے کہ آدمی ان کو بڑھا سکتا ہے اور ان سے پیداوار کر سکتا ہے بلکہ پیداوار کے عام ذرائع دنیا میں یہی ہیں اسی لیے ان کو نقدین کہتے ہیں۔

۴۔ زکوٰۃ میں اس بات کا بھی خیال رکھا گیا ہے کہ جن چیزوں کے حصول میں زیادہ محنت اور کدوکاوش ہوتی ہو، اسی نسبت سے مطالبہ میں تخفیف کی جائے اور جس حد تک اس کی پیدائش میں محنت کم اور قدرتی وسائل کو زیادہ دخل ہو محصول میں اضافہ ہوگا۔ تجارتی اموال اور سونا چاندی سے آمدنی حاصل کرنے میں پورا وقت صرف کرنا پڑتا ہے اس لیے اس میں چالیس روپے میں ایک روپیہ لیا جاتا ہے۔ برخلاف کاشت کے کہ اگر اس کی سیرابی وغیرہ میں مصنوعی ذرائع سے کام لینا نہ پڑے بلکہ قدرتی بارش یا نہروں کے پانی سے سیرابی ہو جائے تو دس من میں سے ایک من یعنی دسواں حصہ اور اگر مصنوعی ذرائع سے کام لینا پڑے تو بیسواں حصہ یعنی دس من میں سے بیس سیر۔ اور اگر کسی کو خزانہ یا دفینہ مل جائے تو اس میں پانچواں حصہ اور یہی حکم کانوں یعنی سونے چاندی لوہے۔ سیسہ پیتل کی معادن کا ہے ہاں البتہ ایسے مویشی جن کا زیادہ وقت چراگاہ اور جنگل میں گذرتا ہو جن کو السوائم کہتے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے ان میں ہر قسم اونٹ کا الگ گائے بیل کا الگ۔ بکریوں بھیڑوں کا الگ الگ نصاب مقرر کیا ہے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان میں بھی وہی چالیسویں حصہ کا عمل ہوا ہے جس کی دلیل یہ ہے کہ عرب میں

زیادہ تر ان ہی جانوروں کی پرورش بطور ذریعہ معاش کی جاتی تھی لیکن جب ایسے ممالک فتح ہوئے جہاں گھوڑوں کا کاروبار ہوتا تھا۔ جیسا کہ شیخ ابن الہمام کہتے ہیں۔

زمانہ نبوت میں مسلمانوں کے کسی طبقہ میں گھوڑوں کی پرورش افزائش نسل کی خاطر رواج نہ تھا بلکہ اونٹوں وغیرہ کا رواج تھا کیونکہ گھوڑوں کی پرورش کرنے والے اس زمانے میں یامدائن کے باشندے تھے یا دشت کے یا ترکمانی اور ان علاقوں پر مسلمانوں کا قبضہ حضرت عثمان و عمر کے زمانے میں ہوا[1]

بہر حال جب یہ ملک فتح ہوئے تو گھوڑوں پر زکوٰۃ کا مسئلہ سامنے آیا تو حضرت عمر نے فیصلہ کیا۔

اس قسم کے گھوڑوں کے پالنے والوں کو اختیار ہے۔ چاہیں تو ہر گھوڑے کی زکوٰۃ ایک دینار ادا کریں اور چاہیں تو یہ بھی کر سکتے ہیں کہ گھوڑے کی قیمت لگا کر ہر دو سو درہم سے پانچ درہم زکوٰۃ ادا کریں ——

جب دو سو درہم سے پانچ درہم کا یہاں بھی فیصلہ کیا تو وہی چالیسواں حصہ ہوا اس لیے قیاس یہی ہے کہ غالباً مویشیوں میں بھی چالیسویں حصے کے اصول کو ملحوظ رکھا ہو۔

۵۔ عام طور پر جن اموال پر محصول عائد کیا جاتا ہے عموماً ان کا محصول اسی وقت وصول نہیں کیا جاتا جس وقت مالک کی ملک میں وہ چیز آتی ہو بلکہ مالک ہونے کے بعد کامل ایک سال گزرنے کی ضرورت ہے یہ عام دستور ہے صرف زراعت اس سے مستثنیٰ ہے۔

۶۔ اس پر بڑی شدید تاکید ہے کہ حکومت کی خراجی وغیرہ آمدنیوں کو اس آمدنی سے بالکل الگ رکھا جائے یعنی مذکورہ بالا مصیبت زدہ طبقات کی امداد کے لیے جو آمدنی حاصل کی جاتی ہے۔ اس کا خاص نام الصدقات ہے اور الصدقات کے متعلق یہ حکم ہے کہ اس رقم کو حکومت کی دوسری آمدنیوں میں نہ ملایا جائے اور نہ خراجی مصارف میں اس آمدنی کا کوئی حصہ خرچ ہو سکتا ہے۔ قاضی ابو یوسف نے ہارون الرشید کو مخاطب کرتے ہوئے بڑے سخت تہدیدی لہجے میں یہ فتویٰ دیا ہے۔

جائز نہیں ہے کہ خراج کی آمدنی الصدقات اور العشور کی آمدنی کے ساتھ جمع کی جائے۔ کیونکہ خراج تو ہر قسم کے مسلمانوں کی مشترکہ آمدنی ہے اور الصدقات تو صرف ان ہی لوگوں کے لیے ہیں جن کا ذکر قرآن میں اللہ سبحانہ نے کیا ہے۔

[1] فتح القدیر ج ۱ ص ۵۰۱

بلکہ قاضی ابو یوسف نے یہاں تک تاکید کی ہے کہ زکوٰۃ اور خراج کے عامل تحصیلدار بھی الگ الگ ہوں۔ لکھا ہے
خراج کے تحصیلداروں کے ہاتھ میں الصدقات کی آمدنی کی وصولی کا مسئلہ نہ سپرد کیا جائے اور نہ یہ
جائز ہے کہ الصدقات کی آمدنی کو خراج کی آمدنی میں ملایا جائے۔

۶۔ جس علاقہ یا تعلقہ سے زکوٰۃ وصول کی جائے سب سے پہلے ان صدقات کے مستحق اسی علاقہ کے مندرجہ بالا طبقات کے اہل حاجت ہیں۔

ایک شہر سے دوسرے شہر صدقات کو منتقل کرنا مکروہ ہے بلکہ ہر فریق کا صدقہ ان ہی لوگوں میں
تقسیم کیا جائے۔ (ہدایہ)

شیخ ابن الہمام نے بھی لکھا ہے۔

زکوٰۃ میں یہ دیکھا جاتا ہے کہ آمدنی کس جگہ سے وصول ہوتی ہے۔

اس باب میں رسول اللہ ﷺ کی صحیح مشہور حدیث ہے۔

جس علاقہ کے اغنیاء سے صدقات وصول کیے جائیں اسی علاقہ کے غربا میں تقسیم کیے جائیں۔

حضرت عمران بن حصین رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے مروی ہے کہ وہ کسی جگہ الصدقات کے تحصیلدار بنا کر روانہ کیے گئے۔ کچھ روز کے بعد جب واپس ہوئے تو لوگوں نے دریافت کیا کہ مال کہاں ہے فرمایا۔

کیا آمدنی لانے کے لیے تم نے ہمیں روانہ کیا تھا۔ ہم نے تو جہاں سے لیا اسی جگہ تقسیم کر دیا۔
حضور اقدس ﷺ کے زمانہ مبارک میں یہی دستور تھا کہ جہاں سے لیتے وہیں تقسیم کر دیتے
تھے۔ (سنن بیہقی)

البتہ اگر وہاں کی ضرورت سے بچ جائے تو باقی ماندہ حصہ مرکز کے خزانہ میں جمع کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں جناب رسول اللہ ﷺ کی خدمت میں یمن وغیرہ کے صدقات آتے تھے۔ بہرحال کلیہ یہی ہے کہ الصدقات کو پہلے اس مقام کے مستحقین میں تقسیم کیا جائے جہاں کے ارباب حیثیت سے وصول کیا گیا ہے۔ خواہ وہ کسی شکل میں ہو۔ بعض فقہاء نے تو مختلف حدیثوں کی وجہ سے یہاں تک بتا دیا ہے کہ:

یہ زیادہ بہتر ہے کہ الصدقات کی آمدنی کو جن سے وصول کیا گیا ہے ان کے محتاج بھائیوں میں تقسیم
کیا جائے پھر اس کے بعد اس کا استحقاق بھائی کی اولاد کا ہے۔ پھر محتاج چچاؤں کا۔ پھر ماموؤں
کا۔ پھر عام رشتہ دار پھر پڑوسی۔ پھر جو لوگ اس سڑک پر رہتے ہوں جس پر صدقہ ادا کرنے والا
رہتا ہے[1]

[1] فتح القدیر

زکوٰۃ کی وصولی اور مصارف کے بارے میں اسلام نے جو قانون بنایا ہے اس کی موٹی موٹی باتیں آپ کے گوش گذار ہو چکی ہیں۔ صرف دو چیزیں باقی ہیں آخر میں وہ بھی سن لیجئے۔

اغنیاء کو زکوٰۃ نہ دینی چاہیے

ایک تو یہ ہے کہ جس طرح زکوٰۃ کی آمدنی کو خراج اور جزیہ کی آمدنیوں سے بالکل جدا رکھنے کا حکم ہے اسی طرح یہ بھی حکم دیا گیا ہے کہ اس مد کی آمدنی کا ایک حصہ کسی ایسے آدمی کو نہیں مل سکتا جو اسلامی نقطہ نظر سے غنی اور صاحب حیثیت ہو۔ غنی سے مراد یہ نہیں کہ وہ ہزاروں کا مالک ہو بلکہ ملک کا ہر ایسا باشندہ جو اپنی اور اپنے اہل و عیال کے روزمرہ مصارف کے سوا دو سو درہم یا ساڑھے باون تولہ چاندی یا اس کے برابر کسی سرمائے کا مالک ہو اس کے لیے زکوٰۃ کی آمدنی کا ایک حصہ بھی حرام ہے۔ اس معاملہ میں کتنی شدید احتیاط کی ضرورت ہے۔ اس کا اندازہ اس واقعہ سے ہو سکتا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے پاس ایک آدمی مٹکیزے میں دودھ لیے آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو بھی ایک پیالہ اس میں سے ملا۔ دودھ کچھ مزے دار تھا۔ آپ نے پوچھا کہ کہاں سے لائے ہو۔ بولا کہ فلاں گاؤں کی چراگاہ پر گیا تھا۔ وہاں الصدقات کے اونٹ چر رہے تھے۔ ایک اونٹنی کا لوگ دودھ دوہ رہے تھے۔ میں نے بھی تھوڑا سا مانگ کر اپنی چھاگل میں رکھ دیا۔ یہ سننا تھا کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پر عجیب کیفیت طاری ہو گئی راوی کا بیان ہے۔

اپنی انگلی منہ میں ڈالی اور زور لگا کر قے کر ڈالی۔

بہرحال قانونی غنی کے لیے اس مال کا ایک ایک پیسہ حرام ہے لیکن جو لوگ قانونی طور پر تو غنی نہیں ہیں لیکن شب و روز کی خوراک سے زیادہ ان کے پاس سامان ہو۔ ایسے لوگوں کے لیے حرام تو نہیں لیکن زکوٰۃ میں سے مانگنا اس کے لیے بھی حرام ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے کہ ایک طرف ان مصیبت زدہ طبقات کے لیے اسلامی حکومت نے اپنے خزانے میں یہ انتظام کر رکھا تھا لیکن اس کے ساتھ اس کی نظر اس پر بھی تھی کہ کہیں خزانے کی اس مد پر بھروسہ کر کے بے کاری کے لوگ عادی نہ ہو جائیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اس پر خاص نظر تھی۔ جب کوئی زکوٰۃ کی مد سے مانگنے والا آتا تو آپ ایک خاص نظر سے اس کو دیکھتے اور نرمی سے مختلف پیراؤں میں اسے سمجھاتے جس کا مطلب یہی ہوتا تھا کہ حتی الوسع صدقات کے مال سے صاحب استطاعت لوگوں کو پرہیز ہی کرنا چاہیے۔

حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ مجھ پر اور میرے اہل و عیال پر ایک وقت بڑی ہی عسرت کا آ گیا میں گھبرا کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں اس لیے حاضر ہوا کہ الصدقات کی مد سے کچھ میری مدد فرمائی جائے۔

کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے میرے عرض کرنے پر ارشاد فرمایا:

جو بے نیازی کا رویہ اختیار کرے گا خدا اسے بے نیاز رکھے گا اور جو دوسروں سے لینے میں احتیاط برتے گا۔ خدا بھی اس کی آبرو کی حفاظت کرے گا۔

حضرت ابو سعید پر حضور اقدس ﷺ کی اس نصیحت کا یہ اثر ہوا کہ:

میں دوسروں سے مانگنے میں احتیاط کروں گا خدا میری آبرو بچائے گا اور میں اپنے کو لوگوں سے بے نیاز رکھوں گا اللہ مجھے غنی بنا دے گا۔

کہتے ہوئے واپس ہوئے۔ ان کا بیان ہے کہ میں نے اپنے اس استعفاف اور استغنا کے نتائج بالآخر اپنی آنکھوں سے اس طرح دیکھے کہ:

ہم پر دنیا کی دولت کا سیلاب آگیا اور ہمیں غرق کر ڈالا صرف وہ ہی بچے جن کو اللہ نے بچا لیا۔

اس کاہلی اور بے عملی کے خطرے کے انسداد کے لیے حضور اقدس ﷺ عام مجلسوں میں جہاں اور باتیں فرماتے ایک فقرہ یہ بھی ارشاد فرماتے۔

الید العلیا خیر من الید السفلی　　　اوپر والا ہاتھ نیچے والے ہاتھ سے بہتر ہوتا ہے

حتی الامکان لوگوں کو بتایا جاتا کہ زکوٰۃ لینے سے بچنے کی کوشش کرو اور اس پر اصرار فرماتے تھے کہ جہاں تک ممکن ہو اپنی خداداد قوتوں سے روزی حاصل کی جائے۔

حضور اقدس ﷺ کے رشتہ داروں پر زکوٰۃ

۲۔ دوسری بات یہ ہے کہ زکوٰۃ کی ایک خصوصیت یہ بھی ہے کہ حضور اقدس ﷺ اور آپ ﷺ کے اقارب کو زکوٰۃ نہیں دی جا سکتی ہے۔ یعنی آپ ﷺ پر اور آپ ﷺ کے رشتہ داروں پر زکوٰۃ کی آمدنی حرام ہے۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میرا خیال ہے کہ جس وقت الصدقات کا فریضہ نازل ہوا بدگمانوں کو شائد اندیشہ ہو سکتا تھا کہ کہیں رسول اللہ ﷺ نے خود اپنی اور اپنے خاندان والوں کی معاشی مشکلات پر قابو پانے کے لیے یہ تدبیر اختیار کی ہے۔ اسلام سے پہلے مذہبی نمائندگی کے لیے صفات سے زیادہ ذاتی اور نسبی خصوصیات کو زیادہ دخیل سمجھا جاتا تھا ہندوستان میں بھی یہ عہدہ صرف ان لوگوں کے لیے مخصوص ہے جو برہمنوں کی نسل سے ہوں۔ اور یہی حال اکثر تقریباً غیر اسلامی سوسائیٹیوں کا ہے غالباً یہی ایک مصلحت تھی جس کی وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے خود اپنے اوپر اور اپنے خاندان والوں پر خواہ وہ غربت و فقر کے کسی حال میں ہوں زکوٰۃ کی آمدنی کو قطعی طور پر حرام کر دیا۔ اس سلسلہ میں

حضور اقدس ﷺ کے احساسات اس قدر لطیف تھے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ بچے تھے۔ زکوٰۃ کی کھجور کا ایک ڈھیر سامنے تھا۔ ڈھیر کے پاس پہنچ گئے اور صرف ایک کھجور منہ میں ڈال لی۔ حضور اقدس ﷺ کی نگاہ پڑ گئی۔ جھپٹ کر دوڑے اور فرمانے لگے۔

کخ کخ ارم بہا۔ تھو تھو اسے پھینک دے۔

اور فرمانے لگے

کیا تجھے پتہ نہیں ہے کہ ہم لوگ صدقہ نہیں کھاتے ہیں۔

بعض روایات میں الفاظ ہیں۔ ہم لوگوں کے لیے صدقہ کا مال جائز نہیں ہے حضور اقدس ﷺ کے جن اقارب پر زکوٰۃ کا مال حرام ہے ان میں حضرت علی حضرت عباس حضرت جعفر اور عقیل اور حارث بن عبد المطلب رضی اللہ عنہم کی اولاد ہیں ان سب پر زکوٰۃ کی آمدنی سے استفادہ حرام ہے ــــ بلکہ قانون دانوں نے یہاں تک بتایا ہے کہ ہاشمی کی زکوٰۃ ہاشمی کے لیے بھی جائز نہیں ہے اور امام ابوحنیفہ اور امام محمد رحمہما اللہ تو بنو ہاشم کے موال کے لیے زکوٰۃ کی آمدنی پر قدغن قائم کرتے ہیں۔ یہی امام شافعی اور امام مالک رحمہما اللہ کی رائے ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ فریضۃ من اللہ واللہ علیم حکیم یہ بات کو موکد بنانے کے لیے ہے یعنی تقسیم زکوٰۃ کا یہ قانون اور زکوٰۃ کی آمدنی کے یہ مصارف اللہ نے مقرر فرمائے ہیں۔ اس میں کسی انسان کی رائے کو دخل نہیں ہے۔ شائد ابوداؤد میں زیاد بن الحارث کی روایت میں حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد گرامی آیت میں اسی انداز بیان سے مستنبط ہے کہ

اللہ سبحانہ نے صدقات کے موضوع پر نبی اور غیر نبی کے فیصلہ کو پسند نہیں فرمایا خود فیصلہ فرما کر ہشتگانہ مصارف مقرر فرما دیئے۔

واللہ علیم یعنی لوگوں کے اموال اور ان کے مرتبہ استحقاق کو اللہ سبحانہ خوب جانتا ہے۔ جو کچھ اس نے کیا ہے وہ اپنے علم کی وجہ سے کیا ہے۔ اور اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہوتا ہے۔ وہ اپنے ضوابط اور قوانین میں بندوں کے مصالح کی رعایت کرتا ہے۔ اللہ کے علم و حکمت تک مخلوق کی رسائی نہیں ہوتی ہے۔

وَمِنْهُمُ الَّذِينَ يُؤْذُونَ النَّبِيَّ وَيَقُولُونَ هُوَ أُذُنٌ ۚ
قُلْ أُذُنُ خَيْرٍ لَّكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَيُؤْمِنُ لِلْمُؤْمِنِينَ
وَرَحْمَةٌ لِّلَّذِينَ آمَنُوا مِنكُمْ ۚ وَالَّذِينَ يُؤْذُونَ رَسُولَ
اللَّهِ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٦١﴾ يَحْلِفُونَ بِاللَّهِ لَكُمْ لِيُرْضُوكُمْ
وَاللَّهُ وَرَسُولُهُ أَحَقُّ أَن يُرْضُوهُ إِن كَانُوا مُؤْمِنِينَ ﴿٦٢﴾
أَلَمْ يَعْلَمُوا أَنَّهُ مَن يُحَادِدِ اللَّهَ وَرَسُولَهُ
فَأَنَّ لَهُ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدًا فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ
الْخِزْيُ الْعَظِيمُ ﴿٦٣﴾ يَحْذَرُ الْمُنَافِقُونَ أَن تُنَزَّلَ عَلَيْهِمْ
سُورَةٌ تُنَبِّئُهُم بِمَا فِي قُلُوبِهِمْ ۚ قُلِ اسْتَهْزِئُوا إِنَّ
اللَّهَ مُخْرِجٌ مَّا تَحْذَرُونَ ﴿٦٤﴾ وَلَئِن سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ
إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ
كُنتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ﴿٦٥﴾ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُم بَعْدَ
ع ٨ ١٣
إِيمَانِكُمْ ۚ إِن نَّعْفُ عَن طَائِفَةٍ مِّنكُمْ نُعَذِّبْ
طَائِفَةً بِأَنَّهُمْ كَانُوا مُجْرِمِينَ ﴿٦٦﴾

اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے رسول کو تکلیف دیتے ہیں اور کہتے ہیں وہ تو سب کچھ
سنتا ہے اور سب کی سنتا ہے کہہ دو کہ وہ سب کچھ اور سب کی سنتا ہے مگر تمہاری بہتری

کے لیے سنتا ہے وہ اللہ پر ایمان رکھتا ہے اور اہل ایمان کی بات مانتا ہے اور وہ تم میں سے اہل ایمان کے لیے سراپا رحمت ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو دکھ دیتے ہیں ان کے لیے دردناک عذاب ہے یہ لوگ تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں تاکہ تم کو راضی کریں۔ حالانکہ اگر یہ واقعی مومن ہوتے تو سمجھتے کہ اللہ اور اس کا رسول زیادہ حقدار ہے کہ اسے راضی رکھیں[63]۔ کیا ان کو پتہ نہیں ہے کہ جو بھی اللہ ورسول کا مقابلہ کرتا ہے اس کے لیے دوزخ کی آگ ہے جس میں وہ سدا رہے گا اور یہ بڑی رسوائی ہے[64]۔ منافقوں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ ان کے بارے میں کوئی ایسی سورت نازل ہو جائے جو ان کے دلوں کی باتوں کو علانیہ ظاہر کر دے اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم مذاق کرو بلاشبہ اللہ ان چیزوں کو ظاہر کر کے رہے گا جن کا تمہیں اندیشہ ہے[65]۔ اور اگر آپ ان سے دریافت کریں تو وہ ضرور کہیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے ہیں ان سے کہہ دو کہ کیا تم اللہ، اللہ کے احکام اور اللہ کے رسول سے ہنسی مذاق کر رہے تھے[66]۔ بہانے نہ بناؤ تم نے ایمان کے بعد راہ کفر اختیار کی ہے۔ اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف بھی کر دیں تاہم کچھ کو ضرور سزا دیں گے کیونکہ اصل میں یہی لوگ جرائم پیشہ تھے[67]۔

مفردات کے معانی

اذن کان جیسے آذان جمع اور مجازاً اس شخص کو بھی کہتے ہیں جو کان لگا کر سنے اور سن کر مانے اور علامہ جوہری

فرماتے ہیں کہ رجل اذن اس کے لیے بولا جاتا ہے جو ہر ایک کی بات سن لے۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے جاسوس کو عین کہتے ہیں۔

یومن باللہ ویومن للمومنین ایمان کو با اور لام کے ساتھ استعمال کیا ہے ایمان کا صلہ جب بار ہو تو اس کے معنے تصدیق کرنا اور جب لام ہو تو اعتماد کرنا مان لینا ہوتا ہے

یحادد یہ مضارع کا واحد مذکر غائب ہے محادۃ سے مادہ حد ہے حد کے معنے سمت اور جانب کے ہیں ایک دوسرے کے مقابلہ میں ہونا۔

الخزی ذلت رسوائی باب سمع سے خزی یخزی ہے وہ ذلت جس میں رسوائی اور بدنامی ہو۔

یحذر اندیشہ ناک ہونا ڈرنا حذر یحذر باب سمع سے آتا ہے۔ حذر محفوظ ہونا حذر بچاؤ کو کہتے ہیں۔

سورۃ سورت علامہ زمخشری کشاف میں رقم طراز ہیں سورت قرآن کے متعین حصے کا نام ہے۔ یہ کم سے کم تین آیت کی ہے۔ اور اس میں واو اگر اصل ہے تو یا سورۃ المدینہ پر موسوم ہے جس کے معنے شہر پناہ کے ہیں۔ کیونکہ یہ بھی قرآن کا ایک محدود ٹکڑا ہے اور یا اس لیے کہ فنون علمیہ اور انواع و اقسام کے قواعد پر مشتمل ہے جس طرح شہر پناہ اپنے اندرون کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ اور یا اس سورۃ سے موسوم ہے جس کے معنے رتبہ کے ہیں۔ اس نام کی وجہ یا تو یہ ہے کہ سورتیں بھی بمنزلہ درجوں کے ہیں جن پر قاری ترقی کرتا جاتا ہے۔ نیز خود سورتیں طوال اوساط اور قصار پر مرتب ہیں ــــــ اور یا یہ کہ دین میں ان کی رفعت شان اور جلالت مرتبہ مسلم ہے۔ اور اگر اس کے واو کو ہمزہ سے بدلا ہوا کہا جائے تو جیسے سوءۃ کے معنے کسی چیز کے بقیہ حصہ کے ہوتے ہیں۔ یہ بھی قرآن کا ایک ٹکڑا اور حصہ ہے[1]

لاتعتذروا۔ تم عذر نہ کرو بہانے مت بناؤ صیغہ نہی ہے اعتذار سے جس کے معنے عذر بیان کرنے کے ہیں۔ عذر انسان کا کسی ایسی بات کو تلاش کرنا ہے جو اس کے گناہوں کو سمیٹ دے۔ اس کی کئی صورتیں ہیں مثلاً یہ کہنے لگے کہ میں نے کیا ہی نہیں یا کیا تو ہے مگر اس لیے کیا ہے اور اس سلسلے میں ایسی بات پیش کرنے لگے جس سے بے گناہی ثابت کرے یا یوں کہے کہ کیا تو ضرور ہے مگر آئندہ نہ کروں گا۔ اس قسم کی باتیں عذر کہلاتی ہیں۔ اور اس آخری سورت کا نام توبہ ہے۔ پس ہر توبہ عذر میں داخل ہے لیکن ہر عذر توبہ نہیں ہے بلکہ بعض اعذار توبہ ہوتے ہیں۔

---

[1] الکشاف

نفاق کا حال اور استقبال

حضور اقدس ﷺ بعض مسلمانوں کا اخلاص پہچانتے اور انہیں قابل اعتماد سمجھتے تھے یہ بات منافقوں پر شاق گذرتی تھی حتی کہ کچھ نے کہا وہ کان کے کچے ہیں لوگوں کی باتوں میں آجاتے ہیں۔ جب وہ دیکھتے ہیں کہ ان کی منافقانہ روش پر عام برہمی پیدا ہو گئی تو قسمیں کھا کھا کر لوگوں کو یقین دلاتے اور انہیں اپنے سے راضی رکھنا چاہتے۔
اصل یہ ہے کہ انسان کی گمراہی کی بوالعجبیوں میں سے ایک عجیب بوالعجبی یہ ہے کہ وہ خدا پر ایمان رکھنے کا مدعی ہوتا ہے اور جانتا ہے کہ اس کے علم سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے۔ تاہم ہر طرح کے گناہ کیے جاتا ہے اور ایک لمحہ کے لیے اسے خیال نہیں ہوتا کہ میں کیا کر رہا ہوں لیکن جونہی انسانوں کی نظر میں اس کے گناہ نمایاں ہوتے ہیں اس کے ہوش وحواس گم ہو جاتے ہیں اور ہزار طرح کے جتن کرتا ہے کہ کہیں وہ اسے برا نہ سمجھنے لگیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس کا ایمان صرف علم کے درجہ تک ہے تصدیق کے درجہ کا نہیں۔ حالانکہ ایمان کے معنے جاننا اور سمجھنا نہیں بلکہ یقین کرنا باور کرنا ہیں۔ اگر ایمان تصدیق ویقین کے درجہ میں ہوتا۔ اس درجہ کا یقین جس درجہ کا یقین انسانوں کی موجودگی کا رکھتا ہے تو ممکن نہ تھا کہ اس سے بے پرواہو جاتا۔ قرآن کے نزدیک یہی نفاق کی حالت ہے۔
حافظ ابن تیمیہ، حسن بصری سے نقل کرتے ہیں کہ ایمان صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ کا نام نہیں بلکہ ایمان وہ ہے جو کہ دل میں سرایت کر جائے اور اعمال بھی اس کی تصدیق کریں بتانا یہ چاہتے ہیں کہ اعمال انسان کی کیفیات قلبیہ کا مظہر ہیں۔ اگر وہ نیک عمل کی زندگی بسر کرتا ہے تو یہ اس کی قلبی تصدیق کی دلیل ہے ورنہ اس کی گناہوں سے آلود زندگی خود اس کی بے ایمانی کی شاہد ہو گی۔

یہاں امام غزالی کی تحقیق حقیقت حال کی سب سے اچھی تعبیر ہے وہ فرماتے کہ باطن وظاہر بالکل جدا گانہ عالم نہیں ہیں کہ ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں بلکہ ہر دو کا باہمی ایسا گہرا تعلق ہے کہ ہمیشہ ایک کا دوسرے پر انعکاس ہوتا رہتا ہے۔ اگر اعتقاد باطن اعمال ظاہر کا مقتضی ہوتا ہے تو اعمال ظاہر واعتقاد باطن کے ممد ومعاون رہتے ہیں۔ دیکھو اگر ایک شخص یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ یتیم پر رحم کرنا انسان کا اولین فرض ہے تو اس کے اس عقیدہ کا یہ ناگزیر تقاضا ہے کہ وہ اس کے لیے سراپا رحمت بن جائے۔ پھر جب اس کے اعضاء جوارح میں اس دلسوزی کے لیے حرکت ہوتی ہے تو وہ محسوس کرتا ہے کہ اس کے اعتقاد میں ایک نئی روح داخل ہو رہی ہے اور جتنا جتنا اس کا تلطف وترحم کا یہ عمل ترقی کرتا جاتا ہے اسی قدر اس کے باطن میں شفقت ورحمت کا جوش زیادہ ہوتا جاتا ہے۔ غرض صفات قلبیہ کا یہی حال ہے پہلے وہ اعضاء میں جنبش عمل کرتی ہیں اور جب جوارح مصروف عمل

ہوجاتے ہیں ان کے آثار لوٹ کر پھر ان صفات کو اور منور کرتے ہیں۔ ایمان و عمل کا یہی حال ہے ایمان ایک یقین لازم ہے اس کا ناگزیر تقاضا یہ ہے کہ جوارح توحید خالص اور تصدیق رسالت کی اپنے عمل سے گواہی دیں اور جب اعضاء اس تقاضے کو پورا کرنا شروع کرتے ہیں تو ایمان اور راسخ ہو کر تر و تازہ اور سرسبز ہونے لگتا ہے۔ اب یہ آپ کے اختیار میں ہے کہ آپ اعمال کو ایمان کے اجزاء کہیں جیسا محدثین کا مذہب ہے یا اعمال کو ایمان کے نتائج کہیں جیسا کہ فقہاء کا مذہب ہے۔

(۶۳) اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو اللہ کے رسول کو تکلیف دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ وہ تو کان ہیں۔ سب کچھ سنتے ہیں اور سب کی سنتے ہیں۔ کہہ دو کہ وہ سب کچھ اور سب ہی کی سنتے ہیں۔ مگر تمہاری بہتری کے لیے سنتے ہیں۔ اس کا اللہ پر ایمان ہے اور اہلِ ایمان پر اعتماد ہے۔ اور وہ تم میں سے اہلِ ایمان کے لیے سراپا رحمت ہے۔ اور جو لوگ اللہ کے رسول کو تکلیف دیتے ہیں ان کے لیے دردناک سزا ہے۔ منافقین آپس میں بیٹھ کر اسلام و پیغمبر اسلام کے متعلق بدگوئی کرتے۔ جب کوئی کہتا کہ ہماری یہ باتیں پیغمبر ﷺ تک پہنچ جائیں گی تو کہتے کیا پروا ہے۔ ان کے سامنے ہم جھوٹی تاویلیں کر کے اپنی براءت کا یقین دلا دیں گے کیونکہ وہ کان ہی کان ہیں۔ جو سنتے ہیں فوراً تسلیم کر لیتے ہیں ان کو باتوں میں لے آنا کچھ مشکل نہیں۔ بات یہ تھی کہ حضرت اپنے حیاء، وقار اور کریم النفسی سے جھوٹے کا جھوٹ پہچانتے تب بھی نہ پکڑتے۔ خلقِ عظیم کی بنا پر معاف فرماتے۔ وہ بیوقوف جانتے کہ آپ نے سمجھا ہی نہیں ہے حق تعالیٰ نے اس کا جواب دیا کہ اگر وہ کان ہی ہیں تو تمہارے ہی بھلے کے واسطے ہیں۔ نبی کی یہ ادا تمہارے حق میں بہتر ہے۔ نہیں تو اول تم ہی پکڑے جاؤ گے اور یہ بھی ممکن ہے کہ حضور کی اس چشم پوشی اور خلقِ عظیم پر کسی وقت مطلع ہو کر تمہیں ہدایت ہو جائے۔ تمہاری جھوٹی باتوں پر حضور اقدس ﷺ کا سکوت اس لیے نہیں کہ انہیں واقعی تمہارا یقین آجاتا ہے۔ یقین تو ان کو اللہ پر ہے اور ایمانداروں کی بات پر۔ ہاں تم میں سے جو ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں ان کے حق میں آپ کی خاموشی و اغماض ایک طرح کی رحمت ہے کہ فی الحال منہ توڑ تکذیب کر کے ان کو رسوا نہیں کیا جاتا۔ باقی منافقین کی حرکاتِ شنیعہ خدا سے پوشیدہ نہیں۔ رسول کی پیٹھ پیچھے جو بدگوئی کرتے ہیں یا ھو اذن کہہ کر آپ کو ایذا پہنچاتے ہیں اس پر سزائے سخت کے منتظر رہیں [۱]

اس آیت میں بھی کچھ منافقین کا چہرہ پیش کیا گیا ہے سب میں ساری باتیں یک جا نہ تھیں۔ کچھ باتیں کچھ میں اور کچھ کچھ میں پائی جاتی تھیں سب کا کردار ایک تھا۔ کردار کے اعتبار سے ان منافقین میں تنوع تھا۔ اسی تنوع کو بتانے کے لیے مضمون کا تکرار ہوا ہے۔ یہاں جو کردار پیش کیا گیا ہے وہ یہ ہے کہ جناب نبوت میں ان کی بدگمانی

[۱] افادات شیخ الاسلام

یہ تھی کہ ان کے خیال میں حضور اقدس ﷺ کو کچھ خبر نہیں ان سے جو کچھ کہہ دو اسے باور کر لیتے ہیں اس لیے وہ کہتے ہیں ھو اذن آپ تو نرے کان ہی کان ہیں آپ کو دھوکہ دینا بڑا آسان ہے یہ انداز تعبیر عربی میں اُس شخص کے لیے استعمال ہوتا ہے جو کان کا کچا ہو اور دہوکہ میں آسکتا ہو۔ یہ یا تو مجاز مرسل ہے اذن بول کر ذات گرامی مراد ہے یا بطور مبالغہ کے زید عدل کے انداز پہ مجاز عقلی ہے۔ اور مبالغہ ہر بات کے سن لینے میں ہے۔ اگر مجاز عقلی ہے تو جیسے زید عدل میں مدح کا پہلو ہے ٹھیک اسی طرح ھو اذن میں ہجو کا پہلو ہے یعنی بس وہ نرا کان ہے ہر ایک کی بات سن لیتا اور اسے مان لیتا ہے۔ ہجو اس لیے ہے کہ بڑے لوگوں پہ حاسدین اور منافقین اسی انداز سے الزام لگایا کرتے ہیں کہ ہے تو بڑا آدمی مگر کان کا کچا ہے ہر ایک کی بات سن لینا جہاں کسی شخص کی شرافت کی دلیل ہے یہ اس کی سادگی بھولے پن اور عقل سے بیگانہ ہونے کی بھی دلیل ہے۔ منافقین یہ لفظ حضور اقدس کے لیے ان ہی معنے میں بولتے تھے۔ وہ اپنی نجی مجلسوں میں۔ اللہ، اللہ کے رسول اور احکام الٰہی کا مذاق اڑاتے اگر اسی مجلس میں کوئی منافق کہتا۔ ایسا نہ کرو کہیں ہمارے کرتوت کا حضورؐ کو علم نہ ہو جائے تو دوسرا جواب دیتا کہ اگر خبر ہو بھی جائے گی تو کچھ فکر نہیں آپ تو ہر بات اور ہر ایک کی بات سن لیتے ہیں ہر ایک کے دھوکہ میں آجاتے ہیں اگر ایسا ہوا ہم جاکر باتیں بناویں گے اور دھوکہ دے کر کام نکال لیں گے۔

اس کے جواب میں قرآن نے بتایا کہ آپؐ ان سے کہہ دیجئے کہ ہوں تو میں سراپا گوش لیکن سراپا گوش تمہاری بھلائی کے لیے ہوں قل اذن خیر لکم یعنی میں فساد اور شر کی باتوں کو سننے والا نہیں بلکہ صرف انہی باتوں کو سنتا ہوں جن میں خیر اور صلاح ہے اور جن کی طرف توجہ دینا امت کی بہتری اور دین کی مصلحت کا تقاضا ہے ان کے کان ہر وقت اس تمنا میں کھلے ہوئے ہیں کہ ان میں تمہاری اچھی باتوں اچھے کاموں اچھے ارادوں کی خبریں آویں اور ان سے ان کو خوشی ہو۔ یا یہ مطلب ہے کہ آپ کے خیر کے کان ہیں شر کے کان نہیں۔ حق و باطل اور خیر و شر کا فرق آپ پر مخفی نہیں ہے۔ نور نبوت کے ذریعے آپ سچ اور جھوٹ کو پہچان لیتے ہیں مگر بردباری اور چشم پوشی کی بنا پر سن کر خاموش ہو جاتے اور کریمانہ عادت کی بنا پر صراحۃً تکذیب نہیں کرتے۔ اور علانیہ طور پر ان کو رسوا نہیں کرتے۔

حضور اقدس کی یہ عادت مبارکہ تمہارے حق میں بہتر ہے ورنہ شروع ہی سے تمہاری گرفت ہو جاتی۔ ان منافقین نے آپ کی چشم پوشی اور مسامحت سے یہ سمجھا کہ حضور اقدس نے ہمارے جھوٹ کو سمجھا نہیں ہے اللہ سبحانہ نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا تمہاری باتوں کو سن لینا اور اس پر سکوت فرمانا اس کی دلیل نہیں کہ حضور اقدس کو تمہاری باتوں کا یقین آجاتا ہے۔ یہ تمہاری باتوں پر یقین نہیں کرتے بلکہ یومن

باللہ ویومن للمومنین ان کا ایمان اللہ پر ہے اور وہ صرف وہ بات باور کرتے ہیں جو سچے اور پکے اہل ایمان کے ذریعے ان کو پہنچتی ہے۔ اللہ سبحانہ اگر تمہارے بارے میں کوئی خبر دیں تو اس سے سچی اور پکی خبر اور کیا ہو سکتی ہے پیغمبر کو اس پر یقین ہوتا ہے اور کچھ اہل ایمان کے ذریعے پیغمبر کو تمہارے بارے میں کچھ باتیں معلوم ہوں تو اللہ کا رسول ان پر اعتماد کرتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ تمہارے متعلق حضور اقدس کے معلوماتی ذرائع بے حد مضبوط ہیں ہوائی نہیں ہیں پیغمبر ایسے ہوتے نہیں کہ وہ ہوائی باتوں پر کان دھریں اور رائے قائم کریں۔

ورحمۃ للذین امنوا منکم حضور اقدس ﷺ کی ذات گرامی تم میں سے ان لوگوں کے لیے سراپا رحمت ہے جو تم میں سے ایمان لے آئے اور انھوں نے ایمان کی روش اختیار کی۔ وہ تمہارے بدخواہ نہیں خیر خواہ ہیں وہ تمہاری فلاح صلاح چاہتے ہیں اور تمہاری دنیا و آخرت دونوں کی کامیابی اس میں ہے کہ تم صحیح ایمان کی روش اختیار کر کے پیغمبر کی رحمت و شفقت کے سزاوار بنو۔

آخر میں ارشاد ہوا والذین یوذون رسول اللہ لھم عذاب الیم یہ آیت ورحمۃ للذین امنوا منکم کے مقابلے میں ہے۔ بتایا ہے کہ اللہ کے رسول کو ایذا دینا گفتار سے یا کردار سے اس ایمان کے قطعاً منافی ہے۔ جو رحمت کا سبب بنتا ہے۔ لہٰذا اس کی سزا بھی سنگین ہے۔ لفظ رسول اللہ میں لطیف ارشارا ہے کہ حضور اقدس کو ایذا اللہ کو ایذا ہے یعنی سنگین سزا کا سبب ہے جیسے حضور کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے۔

آیت سے یہ بھی مترشح ہو رہا ہے کہ اللہ کے رسول کی ایذا، صرف گناہ نہیں بلکہ کفر ہے۔ ایذا کے بھی دو درجے ہیں ایک یہ کہ جناب رسالت کی ایذاء ہو اس کے کفر ہونے میں کوئی شبہ نہیں دوسرے یہ کہ آپ کے مذاق کے خلاف کوئی کام ہو جیسے کھانا کھانے کے بعد حضور کے گھر میں بیٹھے رہنا یہ حرام ضرور ہے اور سنگین گناہ ہے لیکن کفر نہیں۔ اس کا تعلق آداب سے ہے۔ یہاں لفظ رسول یہی بتانے کے لیے لائے ہیں رسول کو ایذا پہنچانا کفر اور اس کی سزا بڑی سنگین ہے یہ کہنا کہ آپ کان کے کچے ہیں جس کا جی چاہتا ہے آپ کے پاس پہنچ جاتا ہے آپ کے کان بھر دیتا ہے اور آپ اس کی بات کو مان لیتے ہیں۔ جناب رسالت میں گستاخی ہے اور گستاخی آپ کی ایذاء کا باعث ہے اور آپ کی ایذاء کفر ہے اور کفر کی سزا سنگین ہے۔

آگے مسلمانوں کو مخاطب کر کے فرمایا یحلفون باللہ لکم لیرضوکم واللہ ورسولہ احق ان یرضوہ ان کانوا مومنین۔ اے مسلمانو! وہ تمہارے سامنے تمہیں خوش کرنے کے لیے قسمیں کھاتے ہیں حالانکہ اگر ان کے پاس کسی درجہ میں بھی کچھ ایمان ہوتا تو وہ اللہ و رسول کو خوش کرنے کی فکر کرتے مطلب یہ ہے کہ یہ حرکت جو یہ منافقین اپنی بے ایمانی کو چھپانے کے لیے کر رہے ہیں خود ان کی بے ایمانی کی واضح دلیل ہے۔ یہ

عذر گناہ بدتر از گناہ ہے۔ انھوں نے اپنی صفائی کے لیے جو طریقہ اختیار کیا ہے وہ ان کو اور زیادہ مجرم ثابت کرنے والا بن گیا۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ کسی وقت حضرت ان کی دغابازی پکڑتے تو مسلمانوں کے روبرو قسمیں کھاتے کہ ہمارے دل میں بری نیت نہ تھی تاکہ ان کو راضی کر کے اپنی طرف کر لیں۔ نہ سمجھتے کہ یہ فریب کاری خدا اور رسول کے ساتھ کام نہیں آتی واقعی اگر دعویٰ ایمان میں سچے ہیں تو دوسروں کو چھوڑ کر اللہ و رسول کو راضی کرنے کی فکر کریں لہ یعنی اگر وہ راست باز ہوتے تو اللہ و رسول کو راضی کرنے کی فکر کرتے نہ کہ جھوٹی قسموں کے ذریعے مسلمانوں کے سامنے اپنے کو معصوم اور حضور اقدس ﷺ کو کان کا کچا ثابت کرنے میں لگ جاتے۔ یہ تو حضور اقدس ﷺ کے خلاف نہایت عیاری اور مکاری پر مبنی سازش ہے۔

یرضوہ میں ضمیر رسول کی جانب بھی ہو سکتی ہے جو مرجع قریب ہے اور اللہ کی جانب بھی جو مرجع بعید ہے ایک ہی ضمیر سے دونوں کام نکالنے میں نکتہ بلاغت یہ ہے کہ رسول کی رضا اللہ کی رضا سے منضم ہے۔ علامہ قرطبی نے اس کی ذرا تفصیل بتائی ہے وہ فرماتے ہیں۔

سیبویہ کے خیال میں یہ ایک جملہ نہیں بلکہ دو جملے ہیں پوری بات یوں ہے اللہ احق ان یرضوہ و رسولہ احق ان یرضوہ پہلے جملہ میں مبتدا و خبر دونوں موجود ہیں دوسرے جملہ میں مبتدا موجود ہے خبر محذوف ہے۔ عربی زبان میں اس قسم کی تعبیرات موجود ہیں۔ مثلاً ایک شعر ہے۔

نحن بما عندنا و انت بما عندک راض والرای مختلف

مبرد کہتے ہیں کہ خبر محذوف نہیں۔ ایک ہی جملہ ہے اصل میں یوں تھا واللہ احق ان یرضوہ و رسولہ۔

نحو کے مشہور امام فراء کہتے ہیں اصل تعبیر تو صرف یہ ہے کہ رسولہ احق ان یرضوہ اور لفظ اللہ تو آغاز میں محض افتتاحیہ ہے۔

نحاس کی رائے میں سیبویہ کی رائے زیادہ اچھی ہے۔ کیونکہ حضور اقدس ﷺ سے ماشاء اللہ و شئت جیسی تعبیر کی ممانعت آئی ہے۔ سیبویہ کی رائے کے مطابق فقرے کے معنے بالکل درست ہیں اور تقدیم و تاخیر بھی نہیں ہے لیکن اگر سیبویہ کے خیال کو اپنا لیا جائے تو موجودہ تعبیر میں جو نکتہ بلاغت ہے وہ باقی نہیں رہتا۔ بتانا یہ ہے کہ رسول ہونے کی حیثیت میں آپ کو خوش کرنا اللہ کو خوش کرنا ہے۔ کیونکہ رضائے الٰہی اتباع رسول میں ہے۔ ترکیب کے اعتبار سے تو سیبویہ کی بات بے غبار ہے لیکن اس میں نکتہ بلاغت نہیں ہے۔

لہ افادات شیخ الاسلام

نحاس نے جس ممانعت کی طرف اشارا کیا ہے اس سے ان کی مراد غالباً عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کی وہ حدیث ہے جسے امام نسائی نے سنن میں روایت کیا ہے کہ ایک بار کسی شخص نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے کہا ماشاء اللہ وشئت جو اللہ چاہے اور جو آپ چاہیں۔ آپ نے خود اس کو منع کیا اور ان الفاظ میں تنبیہ فرمائی جعلتنی للہ ندا تو نے مجھے اللہ کا ہمسر بنا دیا قل ماشاء اللہ وحدہ کہہ جو اکیلا اللہ چاہے مطلب ہے کہ ایک مومن کی زبان کو شرک کے موہم کلمات سے بھی احتراز کرنا چاہیے اور اس کے قلب و زبان پر صرف ایک اللہ کی فاعلیت کا نقش ہونا چاہیے۔ یہ بھی بتا دیا کہ یہ بات کیسے کہنی چاہیے۔ امام احمد ابو داؤد اور نسائی وغیرہ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لاتقولوا ماشاء اللہ وشاء فلان قولوا ماشاء اللہ ثم شاء فلان یہ نہ کہو کہ جو اللہ چاہے اور فلاں چاہے بلکہ یوں بولو جو اللہ چاہے پھر فلاں چاہے یعنی سبب حقیقی کے ساتھ تم اگر سبب ظاہری کو بھی ظاہر کرنا چاہو تو اس کا یہ طریقہ نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نام کے بالکل برابر اس شخص کا نام ذکر کرو جو ظاہر میں اس کا سبب بنا ہے بلکہ ادب ہے کہ پہلے تم صرف اللہ کا نام لو اس کے بعد دوسرے نمبر پر اس شخص کا بھی نام لے سکتے ہو۔ علامہ خطابی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث آداب سے متعلق ہے عقائد سے نہیں چونکہ واو عربی زبان میں جمع اور شرکت کے لیے آتا ہے اور ثم ترتیب کے لیے ہے اس لیے آپ نے بتایا کہ اللہ کی مشیت کے ساتھ کسی اور کی مشیت کو حرف واو کے ساتھ جمع نہ کیا جائے بلکہ اللہ کی مشیت جیسا کہ تمام مشیتوں پر مقدم ہے اسی طرح اس کی تقدیم ثم حرف ترتیب کے ساتھ ظاہر بھی کرنا چاہیے۔ (کتاب الاذکار)

اس سلسلہ میں حافظ ابن تیمیہ نے ایک بلیغ تحقیق ذکر فرمائی ہے اس کا ملحوظ رکھنا ایمان و کفر میں امتیاز کا ایک اہم ترین نکتہ ہے۔

اللہ سبحانہ کی توحید اور حضور انور کی تعظیم دونوں اسلامی رکن ہیں لیکن اس موضوع پر ناپختہ کاروں نے اپنی بے خبری سے ایک تعبیری کش مکش پیدا کر دی ہے۔ کچھ توحید کے مدعی یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک رسول کی شان رفیع میں عامی زبان استعمال نہ کی جائے اس وقت تک گویا حق سبحانہ کی توحید کا حق ہی ادا نہیں ہوتا۔ اور حب رسول کا دعویٰ کرنے والے نادان یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ توحید خداوندی کی زیادہ توضیح سے بھی شان رسالت کو ٹھیس پہنچتی ہے وہ اگر اپنی زبان سے ایک مرتبہ یا اللہ کہتے ہیں تو جب تک سو مرتبہ یا رسول اللہ نہیں کہتے ہیں۔ ان کو مزہ نہیں آتا۔ یہ دونوں راستے افراط و تفریط ہیں۔ حافظ ابن تیمیہ نے بڑی مفید باتیں لکھی ہیں اور بتایا ہے کہ تنقیص کے مواقع کیا ہیں اور تعظیم کے مواقع کیا؟ اور اس کی بڑی تفصیل بیان کی ہے خلاصہ یہ ہے کہ جب گفتگو کا موضوع توحید ہو تو اللہ سبحانہ کی خصوصیات

کی خاص طور پر حضور اقدس ﷺ سے نفی کرنا موجب کسر شان اور حضور کی تعظیم کے منافی نہیں ہے کیونکہ اللہ سبحانہ کی ذات وہ بلند بارگاہ ہے جہاں وہ ہے وہاں کوئی نہیں ہے اس لیے اس کی ذاتی خصوصیات کی نفی میں کوئی کسر شان نہیں ہے مثلاً یہ کہا جائے اولاد دینا رزق دینا۔ اور گناہوں کو بخشنا رسول کا کام نہیں یہ صرف اللہ سبحانہ کی شان ہے تو یہ بات عظمت رسول کے ہرگز منافی نہیں ہے۔ کیونکہ جس صفت کی رسول سے نفی کی گئی ہے درحقیقت وہ رسول کے لیے ثابت ہی نہیں ہے ہاں بے ضرورت ان صفات کی نفی کو مشغلہ بنائے رکھنا ہی سوء ادب اور گستاخی ہے مثلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو نصاریٰ نے خدا بنایا تو ان کی ذات سے خدائی صفات کی نفی کرنی عین حکمت ہے لیکن جن انبیاء کے بارے میں کسی کا یہ عقیدہ ہی نہیں ہے اور نہ اس کا کوئی اندیشہ ہے ان کے حق میں یہ عبارتیں توہین کی حد میں داخل ہو سکتی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس سلسلہ میں جو انداز بیان حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں اختیار کیا ہے وہ اور رسولوں کے لیے اختیار نہیں کیا۔ حالانکہ جب متکلم خود اللہ سبحانہ ہو اور بات رسولوں کی آجائے تو وہاں توہین کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

بہر حال آیت سیبویہ کے خیال میں دو جملوں پر مشتمل ہے۔ اور عربی انداز کے بھی زیادہ قریب ہے۔

اللہ و رسول کی اپوزیشن اور اس کا انجام

(۶۴) کیا ان کو پتہ نہیں ہے کہ جو بھی اللہ و رسول کا مقابلہ کرتا ہے۔ اس کے لیے دوزخ کا عذاب ہے جس میں وہ سدا رہے گا اور یہ بڑی رسوائی ہے یعنی جس رسوائی سے بچنے کے لیے نفاق اختیار کیا ہے اس سے بڑی رسوائی یہ ہے[1] مدینہ ہی کی زندگی میں ان مدعیان اسلام کے سامنے یہ بات پوری قوت اور وضاحت سے آچکی ہے۔

ان الذین یحادون اللہ و رسولہ کبتوا کما کبت الذین من قبلھم۔

بلاشبہ جو لوگ اللہ و رسول کا مقابلہ کرتے ہیں ان کو ایسے ہی ذلیل و خوار کیا جائے گا جیسے ان سے پہلے لوگ ذلیل و خوار کیے گئے ہیں۔

اور اسی سورت میں یہ آیت:

ان الذین یحادون اللہ و رسولہ اولئک فی الاذلین

بلاشبہ جو لوگ اللہ و رسول کا مقابلہ کرتے ہیں وہ ذلیل ترین لوگ ہیں۔

اور سورۂ نساء میں یہ آیت:

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی ویتبع غیر سبیل المومنین نولہ ما تولی ونصلہ جھنم۔

اور جو بھی اللہ کے رسول کی مخالفت پر راہ ہدایت واضح ہونے کے باوجود کمربستہ ہو جاتا ہے اور اہل ایمان کی راہ چھوڑ کر دوسری راہ پر چلتا ہے تو ہم اسے اس طرف لے جائیں گے جس طرف اس کا رُخ ہے اور ہم اسے دوزخ میں داخل کریں گے۔

جو ضابطہ اور جو قانون ان آیات میں بیان کیا گیا ہے اسی کا الم یعلموا میں حوالہ دے کر یہاں تکرار کیا گیا ہے۔
علامہ علاء الدین علی بن محمد خازن اپنی تفسیر میں رقمطراز ہیں۔

علمائے بلاغت کہتے ہیں کہ الم یعلموا کا انداز تعبیر وہاں اختیار کیا جاتا ہے جہاں کوئی چیز ماننے کے بعد فراموش کر دی جائے۔ یا جانتے ہوئے اس سے انجان بن جائے۔ اس وقت بولا جاتا ہے کیا تجھے پتہ نہیں، تجھے علم نہیں۔ حضور اقدس ﷺ مدینہ میں پورے نو سال گذار چکے ہیں اس دور میں آپ کے ذریعے ان کو دین اسلام کے قوانین وضوابط کا علم ہو چکا ہے اس لیے کہا جا رہا ہے الم یعلموا۔ کیا ان کو علم نہیں ہوا۔

گویا کہا جا رہا ہے کہ اس سے پہلے ان کو کھول کر بتایا جا چکا ہے کہ اللہ ورسول سے محادہ کا انجام تباہی اور ذلت و رسوائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ محادہ کے معنے مقابلہ مخالفت کے ہیں۔ مخالفت کرنے سے مراد اللہ سبحانہ کے مقرر کیے ہوئے فرائض اور حدود کو عملاً قبول نہ کرنا اور ان کے بجائے کچھ دوسرے حدود و فرائض کو اپنانا ہے علامہ آلوسی بجا د کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔ یخالف امر اللہ وامر رسولہ جو اللہ کے حکم اور رسول کے حکم کی مخالفت کرتے ہیں حافظ ابن جریر لکھتے ہیں انہ من یحارب اللہ ورسولہ ویخالفھما بالخلاف علیھما۔ جو اللہ اور رسول سے برسرِ پیکار ہو گا اور ان کے مخالف ہو کر ان کا مقابلہ کرے گا۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ من حاد اللہ ای شاقہ وحاربہ وخالفہ وکان فی حد واللہ ورسولہ فی حد جو اللہ کا مقابلہ کرے۔ اس سے برسرِ پیکار ہو اس کی مخالفت کرے اللہ اور اس کا رسول ایک طرف۔ اور وہ ان کے مقابلہ میں ہو۔ قاضی بیضاوی نے اس کی تفسیر اس طرح کی ہے من یشاقق جو اللہ ورسول کی مخالفت کرتا ہے اس میں منافقین کا کردار بیان ہو رہا ہے جو دعویٰ تو ایمان واسلام کا کرتے تھے لیکن ان کا رویہ اللہ ورسول کے ساتھ مخالفانہ تھا۔ اسلام کی جو بات ان کو اپنے مفاد اور اپنی خواہشوں کے خلاف محسوس ہوتی۔ اس کے خلاف سرگوشیوں کی مہم شروع کر دیتے تاکہ مخلص مسلمانوں کے دلوں میں بھی وسوسہ اندازی کریں ان کے ایمان واسلام پر ہاتھ صاف کر سکیں دراصل وہ

قانونی تعلقات زندگی کے مختلف گوشوں میں یہودیوں کے ساتھ رکھتے تھے لیکن نجی زندگی میں وہ مسلمان بنے ہوئے تھے قرآن نے ایک مقام پر ان ہی کا چہرہ یہ پیش کیا ہے کہ ایمان تو یہ قرآن پر رکھتے ہیں لیکن زندگی کے مختلف اطوار میں قانونی تعلقات یہود سے رکھتے ہیں یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت وہ مقدمات طاغوت کے پاس لے جاتے ہیں۔ قرآن یہاں بھی یہ بات سمجھا رہا ہے کہ اسلام زندگی کا ایک مکمل اور ہمہ گیر نظام ہے جو مسلمان کا دعوی کرنے کے باوجود اللہ ورسول کے مقابل، مخالف بنتے ہیں وہ دوزخ کا ایندھن ہیں ان کے ایمان کی بازار قیامت میں کوئی قیمت نہیں۔

ایمان کو جب انقیاد نصیب نہیں ہوتا وہ اسلام کے سیاسی نظام کی موجودگی میں دوسرے نظاموں کی طرف متوجہ رہتا ہے لیکن جب مقام انقیاد حاصل ہوتا ہے تو پھر قلب ہر طرف سے ہٹ کر اسلام ہی کا ہو کر رہ جاتا ہے قرآن پر بھی ایمان ہو۔ رسول کی بھی تصدیق ہو۔ پھر اپنے معاملات میں اپنے تمدنی مسائل میں کسی اور کی طرف نظر بھی ہو۔ یہ ایک طرح میں ایمان وکفر کا اجتماع ہے۔ کیا وثوق واعتماد اسی کا نام ہے کہ قرآن جو راہ بتائے اور اللہ کا رسول جو کچھ پیش کرے اسے قبول نہ کیا جائے۔

اس آیت قرآنی کو بار بار پڑھیے اور سوچئے کہ قرآن کے نزدیک اس ایمان کی کیا قیمت ہے جس میں اسلام کے سیاسی نظام کے لیے محادہ اور مقابلہ ہو قرآن ظاہر وباطن کو ایسے دو جدا گانہ عالم نہیں مانتا جو ایک دوسرے سے متاثر نہ ہوں بلکہ دونوں کا ایسا باہم ربط ہے کہ ہمیشہ ایک کا دوسرے پر انعکاس ہوتا رہتا ہے۔ اگر اعتقاد باطن اعمال ظاہرہ کا مقتضی ہو تو اعمال ظاہرہ اعتقاد باطن کے لیے ممد ومعاون ہیں۔ دیکھو اگر ایک شخص اعتقاد رکھتا ہے کہ ان الحکم الا للہ تو اس کے عقیدے کا یہ لازمی تقاضا ہے کہ وہ اپنے معاملات اور تمدنی مسائل میں اللہ کی بندگی کا نمونہ بن جائے۔

منافقین کو پردہ دری کا اندیشہ

(۶۵) منافقوں کو اس بات کا اندیشہ ہے کہ ان کے بارے میں کوئی ایسی سورت نازل ہو جائے جو ان کے دلوں کی باتوں کو علانیہ ظاہر کر دے۔ اے پیغمبر ان سے کہہ دو کہ تم مذاق کر دو۔ بلاشبہ اللہ ان چیزوں کو ظاہر کر کے رہے گا جن کا تمہیں اندیشہ ہے۔ منافقین اپنی مجلسوں میں اسلام اور پیغمبر اسلام کے بارے میں بدگوئی کرتے۔ مومنین صادقین پر آوازے کستے۔ مہمات دین کا مذاق اڑاتے۔ پھر جب خیال آتا کہ ممکن ہے یہ باتیں حضور تک پہنچ جائیں تو کہتے کیا مضائقہ ہے۔ وہ تو کان ہی کان ہیں۔ ہم ان کے سامنے جو تاویل وتوجیہ کر دیں گے سن کر اسی کو قبول کر لیں گے مگر چونکہ بسا اوقات وحی کے ذریعے ان کے نفاق وبدباطنی کی قلعی کھلتی رہتی تھی اس لیے یہ ڈر بھی لگا رہتا تھا کہ کوئی

سورت قرآن میں ایسی نازل نہ ہو جائے جو ہمارے مخالطبات سریہ دنیات خفیہ کا پردہ فاش کر دے۔ اصل یہ ہے کہ منافقین کا قلب جبن و کمزوری سے کسی ایک طرف قائم نہ ہوتا تھا ان کے دل ہر وقت دغدغے میں رہتے تھے کبھی آنحضرت کی شان اغماض و کریم النفسی کو دیکھ کر کچھ تسلی حاصل کرتے مگر صاعقہ قرآنی کی گرج سے پھر دل دہلنے لگتے تھے اسی لیے فرمایا کہ بہتر ہے کہ تم ٹھٹھے کرتے رہو اور استہزاء و تمسخر کا عمل جاری رکھو اور پیغمبر کی نسبت ھو اذن کہہ کر تسلی کر لو لیکن خدا اس چیز کو ضرور کھول کر رہے گا جس کا تم کو ڈر لگا ہوا ہے وہ تمہارے مکر و خداع کا تار تار بکھیر کر رکھ دے گا۔[1]

آیت قرآنی میں بات صرف یہ بتائی گئی ہے کہ دین کے بارے میں ان کی زبانیں چھوٹ اور بے لگام ہیں۔ لیکن جب منہ سے کوئی بات نکال لیتے ہیں تو ان کو یہ اندیشہ بھی ستاتا ہے کہ کہیں ہمارے کرتوت کی حضور اور مسلمانوں کو بذریعہ وحی خبر نہ ہو جائے۔ اسی اندیشہ کے پیش نظر انھوں نے جھوٹی قسموں کے ذریعے اپنی صفائی کی مہم چلائی ہے فرمایا کہ ان کو خبردار کر دو کہ اب تمہاری یہ پیش بندی کام نہ آئے گی۔ اللہ و رسول اور اللہ کی آیات کا جس قدر مذاق اڑانا ہے اڑا لو۔ اب وقت آگیا ہے کہ جن چیزوں کے بے نقاب ہونے سے تم ڈر رہے تھے اللہ ان سب کو بے نقاب کر کے رہے گا۔

یہاں شارحین قرآن کو حیرت ہو رہی ہے کہ اگر یہ غیر مسلم ہیں تو ان کو یہ اندیشہ کیسے ہو سکتا ہے جبکہ یہ حضور کو نبی نہیں مانتے ہیں اور آپ پر وحی کے قائل ہی نہیں ہیں۔ ابومسلم خراسانی نے یہ کہہ کر پیچھا چھڑا لیا ہے کہ انھوں نے اندیشہ کا اظہار بھی بطور استہزاء کیا تھا۔ لیکن اس کے برعکس دوسرے بزرگوں نے بتایا کہ ان منافقین خاص کے بارے میں ہے جن کی تعداد بیہقی کی روایت میں حضرت حذیفہؓ کے حوالے سے ۱۴-۱۵ بتائی گئی ہے اور صحیح مسلم میں حضرت حذیفہؓ کے حوالہ سے بارہ آئی ہے۔ ارشاد ہے۔ میری امت میں بارہ منافق ہیں جو جنت کی خوشبو نہ پائیں گے جن میں سے آٹھ آدمیوں کے دونوں شانوں کے درمیان میں آگ کے شعلہ کی طرح دنبل نکل کر ان کے سینہ سے پھوٹ پڑے گا۔ مشہور محدث امام بغوی نے بھی لکھا ہے کہ یہ آیت ان بارہ منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے جنھوں نے غزوہ تبوک سے واپسی پر حضور اقدس ﷺ کے بارے ایک گھاٹی پر ارادہ بد کیا تھا اور آپ کو حضرت جبریل علیہ السلام نے بتا دیا تھا یہی لوگ اپنے اس کرتوت کے بعد یہ اندیشہ کر رہے تھے کہ کہیں وحی الٰہی ہماری سازش کا انکشاف نہ کر دے۔ تفسیر کے مشہور امام زجاج نے اپنی راہ سب سے الگ بنائی ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ جملہ خبریہ نہیں بلکہ جملہ انشائیہ ہے اور آیت میں یحذر مضارع بمعنے امر ہے اور منافقین سے کہا جا رہا ہے کہ ان کو اس

[1] افادات شیخ الاسلام

بات سے اندیشناک ہونا چاہیے۔ جیسے دوسرے موقع پر ہے فلیحذر الذین یخالفون عن امرہ ان تصیبھم فتنۃ۔ لیکن اس میں کوئی خاص معنویت نہیں ہے۔

دراصل ایمان و کفر کی طرح نفاق کی تمام حالتیں یکساں نہیں ہیں چونکہ روح کے اعتبار سے نفاق کی حالت بھی انکار کی ایک اقراری صورت ہے اس لیے جب بڑھتی ہے تو انکار و کفر ہی کی طرف بڑھتی ہے۔ اور اسی کے خصائص رونما ہونے لگتے ہیں۔ کسی میں کم کسی میں زیادہ چنانچہ زمانہ نبوت کے منافقوں کی حالت نفاق یکساں نہ تھی جن بارہ کا یہاں حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کی زبانی ذکر ہوا ہے۔ ان کا نفاق ہر منافق کا نفاق نہ تھا۔ قرآن نے اسی سورت کے آخر میں اس طرف اشارا بھی کیا ہے وممن حولکم من الاعراب منافقون ومن اھل المدینۃ مردوا علی النفاق کسی نفاق کا رُخ اس طرف تھا کہ ہجرت سے جی چراتے تھے کسی پر انفاق مال شاق تھا۔ کوئی جہاد سے بچنا چاہتا تھا۔ یہاں قرآن نے جن کا ذکر کیا ہے ان کا نفاق ذاتِ نبوت سے عناد کی حد میں پہنچ گیا تھا۔ چنانچہ مسند احمد میں ابوالطفیل سے، بیہقی میں حضرت حذیفہ سے اور طبقات ابن سعد میں جبیر بن مطعم سے ابن ابی حاتم نے ضحاک سے جو واقعہ نقل کیا ہے اس سے ان کا ذاتِ نبوت سے کھلا عناد معلوم ہو رہا ہے کہ:

> جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم غزوۂ تبوک سے واپس آ رہے تھے تو رات کو بارہ منافق ایک گھاٹی پر ٹھہر گئے اور خفیہ مشورہ کر کے طے کیا کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ادھر سے گزریں گے تو ہم اچانک خفیہ طور پر اوپر سے پتھر لڑھکا دیں گے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو وحی کے ذریعے اس کا علم ہو گیا اور حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے بہ تعمیل حکم نبوی منافقوں کے اونٹوں کو مار مار کر ہٹا دیا مگر حضرت حذیفہ نے کسی کو نہ پہچانا۔ مگر حضور اقدس نے نام بنام سب کو بتا دیا۔

آیت میں یہی منافقین مراد ہیں۔

آیت کا مطلب تو یہی ہے کہ منافقین کو اندیشہ تھا کہ ان کے بارے میں قرآن میں کوئی سورت نازل ہو کر ان کی پردہ دری کر دی جائے گی اور اس طرح ان کے عزائم قبائح اور رذائل منظر عام پر آ جائیں گے اس صورت میں علیھم اور تنبئھم کی ضمیروں کا مرجع منافقین ہیں لیکن کچھ علماء نے ان ضمیروں کا مرجع مسلمانوں کو قرار دیا ہے اور بتایا ہے کہ منافقین کو یہ اندیشہ تھا کہ مسلمانوں پر ایسی کوئی سورت نازل ہو جائے گی کہ ذاتِ نبوت مسلمانوں کو ہمارا کچا چٹھا بتا دے گی۔ دونوں باتیں الگ الگ ہیں۔ اور دونوں میں باریک سا فرق ہے۔

ایک یہ کہ منافقین کے بارے میں کوئی سورت نازل ہو جائے اور نزول سورہ کے ذریعے ذاتِ پیغمبر منافقین کو ان کے دلوں کے سارے عزائم بتا دے اس کا مقصد خود نبوت کا اپنے علم کو منافقین کو بتانا ہے یہ علم بلاغت کی

زبان میں لازم فائدۃ الخبر ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ قرآن نازل ہو کر ہمارے قبائح اور رذائل مسلمانوں کو بتا دے گا ہمارے کرتوت کا مسلمانوں کو علم ہو جائے گا یہ علمار بلاغت کی اصطلاح میں فائدۃ الخبر ہے۔

آخر میں فرمایا استہزءوا ان اللہ مخرج ما تحذرون تم جھوٹی قسمیں کھا کر خوب مسلمانوں کو بنا لو۔ تمہیں جس بات کا اندیشہ ہے اللہ کی جانب سے اس کا اظہار ہو کر رہے گا۔ استہزار نفاق کی طبیعت ہے مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تمہارے قبائح۔ تمہارے رذائل اور افکار منظر عام پر ضرور لائے گا۔ اس میں منافقین کو دھمکی دی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ اب تمہارا معاملہ راز بن کر نہیں رہے گا بلکہ تمہیں بالکل ننگا کر دیا جائے گا۔

منافقین کا عذر گناہ بدتر از گناہ

(٦٦) اور اگر آپ ان سے دریافت کریں تو وہ ضرور کہیں گے کہ ہم تو ہنسی مذاق اور دل لگی کر رہے ہیں۔ کہہ دو کیا تم اللہ، اللہ کے احکام اور اللہ کے رسول ﷺ سے ہنسی مذاق کر رہے تھے۔ تبوک میں جاتے ہوئے بعض منافقین نے ازراہ تمسخر کہا کہ اس شخص محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیکھو کہ شام کے محلات اور روم کے شہروں کو فتح کر لینے کا خواب دیکھتا ہے انھوں نے رومیوں کی جنگ کو عربوں کی باہمی جنگ پر قیاس کر لیا ہے میں یقین کرتا ہوں کہ کل ہم سب رومیوں کے سامنے رسیوں میں بندھے ہوئے کھڑے ہوں گے۔ یہ ہمارے قرار (صحابہ کرام) پیٹو، جھوٹے اور نامرد ــــ روم کی باقاعدہ فوجوں سے جنگ کر سکیں گے وغیر ذالک من الہفوات اس قسم کے مقولے جو مسلمانوں کو روم سے مرعوب اور ہیبت زدہ کرنے اور شکستہ خاطر بنانے کے لیے کہہ رہے تھے۔ نبی کریم ﷺ کی خدمت میں نقل ہوئے آپ نے بلا کر بازپرس کی تو کہنے لگے کہ حضرت ہم کہیں سچ مچ ایسا اعتقاد تھوڑا ہی رکھتے ہیں، محض خوش وقتی و دل لگی کے طور پر کچھ کہہ رہے تھے کہ باتوں میں بآسانی سفر کٹ جائے''۔ قرآن نے جواب میں بتایا کہ اے پیغمبر کہہ دو کہ کیا تم اللہ، اللہ کے احکام اور اللہ کے رسول سے مذاق کر رہے تھے یعنی کیا دل لگی و خوش وقتی کا موقع و محل یہ ہے اللہ اور رسول کا استہزار اور احکام الٰہیہ کا استخفاف تو وہ چیز ہے کہ اگر محض زبان سے دل لگی کے طور پر کیا جائے تو وہ بھی کفر عظیم ہے۔ چہ جائے کہ منافقین کی طرح ازراہ شرارت و بدباطنی ایسی حرکت سرزد ہو[1]۔ یہ بھی ایک خاص اور اہم نفاق کی علامت ہے کہ اللہ سبحانہ کے

[1] افادات شیخ الاسلام

احکام اور اللہ کے رسول کی باتوں کی مجلس میں تضحیک کرتے ہیں اور جب اس پر ان کی گرفت کی جاتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم تو ایسے ہی دل لگی کر رہے تھے یعنی فی الواقع تضحیک نہیں کر رہے بلکہ محض خوش طبعی کر رہے تھے۔ شعراء آج بھی اشعار میں اللہ، اللہ کے احکام اور اللہ کے رسول کو تفریح کا موضوع بناتے ہیں اور جب ان کی گرفت کی جاتی ہے تو کہہ دیتے ہیں کہ ہم کوئی ارادتاً تھوڑا ہی مذاق اڑاتے ہیں یہ تو صرف شاعرانہ انداز ہے اردو ادب کے بہانے بر ملا اللہ ورسول پر تنقید بلکہ تنقیص کی جاتی ہے اور اس کا نام اردو ادب کی خدمت رکھتے ہیں۔ اس موضوع پر اگر کچھ لکھا جائے تو اوراق سیاہ ہو جاتے ہیں۔

اللھم اعذنا من منکرات الاخلاق وسوء الاعمال۔

شارحین قرآن نے اس کے پس منظر میں جن مناسبات کی نشاندہی کی ہے وہ ایک نہیں متعدد ہیں۔ سب کا خلاصہ یہ ہے کہیں تو وہی بات ہے جس کی نشاندہی حضرت شیخ الاسلام نے فرمائی ہے۔ کہیں یہ ہے کہ حضور اقدس ﷺ تبوک تشریف لے جا رہے تھے۔ اثناء راہ میں دریعہ ابن ثابت اور مخشی بن عمیر وغیرہما منافقین نے باہم کہنا شروع کیا کہ تم لوگ رومیوں کی دلیری اور بہادری ایسی ہی سمجھتے ہو جیسے عرب باہم لڑتے ہیں واللہ ہمیں تو یہ نظر آرہا ہے کہ کل کو لڑائی میں تم لوگ ان کی زنجیروں میں جکڑے جاؤ گے مخشی بولا ارے مجھے تو اندیشہ ہے۔ کہ تمہاری اس گفتگو کے بارے میں کہیں قرآن نازل ہو جائے۔ اور مجھے تو یہ اندیشہ ہے۔ کہ تم میں سے ہر ایک کے سو کوڑے مارے جائیں گے یہ باتیں کرو یہ لوگ اسی خرافات میں مبتلا تھے کہ ادھر حضور اقدس نے عمار بن یاسر سے فرمایا جا کر قوم کی خبر لو وہ منافقوں کی آگ میں جل رہی ہے اور منافقوں سے پوچھنا کہ تم نے کیا باتیں کی تھیں۔ اگر وہ انکار کریں تو کہنا کہ تم نے ضرور یہ باتیں کہی تھیں چنانچہ حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حکم کی تعمیل کی۔ اس وقت وہ لوگ حضور کی خدمت میں حاضر ہوئے اور عذر کرنے لگے۔ کچھ نے کہا کہ ہم تو راستہ کاٹنے کے لیے دل لگی کی باتیں کر رہے تھے۔ مخشی بن عمیر سچے دل سے مسلمان ہو گئے اور دعا مانگی اے اللہ مجھے اسی جگہ شہید کر کہ کسی کو میری قبر بھی معلوم نہ ہو۔

مشہور مفسر قرآن علامہ بغوی نے مقاتل اور قتادہ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ حضور اقدس غزوہ تبوک میں جا رہے تھے اور آپ کے آگے تین منافق جا رہے تھے دونوں قرآن اور حضور کا مذاق کر رہے تھے اور تیسرا ان کی باتوں پر ہنس رہا تھا۔ اللہ سبحانہ نے حضور اقدس ﷺ کو بذریعہ وحی مطلع کر دیا حکم دیا کہ ان تینوں کو لاؤ چنانچہ حاضر کیے گئے آپ نے دریافت کیا کہ تم نے یہ کہا ہے بولے کہ ہم تو ذرا دل لگی کی باتیں کر رہے تھے اور اس طرح راستہ کی مسافت طے کر رہے تھے قرآن نے یہاں ان کا یہ اعتراف پیش کیا ہے انما کنا نخوض ونلعب۔ اس میں ان کی جانب سے استہزاء کا اقرار ہے اور بتانا یہ چاہتے ہیں کہ استہزاء ہماری گفتگو سے سمجھا جا رہا تھا لیکن باتیں

ہم دل سے نہیں بلکہ دل لگی سے کر رہے تھے۔

استہزاء اور لعب میں فرق ہے۔ استہزاء ایسا مذاق جس میں دوسرے کی تذلیل مقصود ہو اور لعب جس میں تذلیل نہیں بلکہ محض جسمانی یا زبانی ورزش مقصود ہو کہنا نخوض کہہ کر انھوں نے مان لیا کہ ہم استہزاء نہیں کر رہے تھے بلکہ ہم تو راستہ کاٹنے کے لیے باتیں کر رہے تھے اور دل لگی کر رہے تھے۔

شانِ نبوت میں استہزاء کفر ہے

(٦٧) بہانے نہ بناؤ تم نے ایمان کے بعد راہ کفر اختیار کی ہے اگر ہم تم میں سے ایک گروہ کو معاف بھی کر دیں تاہم کچھ کو ضرور سزا دیں گے کیونکہ یہی لوگ فی الواقع جرائم پیشہ تھے یعنی جھوٹے عذر تراشنے اور حیلے حوالوں سے کچھ فائدہ نہیں جن کو نفاق و استہزاء کی سزا ملنی ہے مل کر رہے گی۔ ہاں جو اب بھی صدقِ دل سے توبہ کر کے اپنے جرائم سے باز آجائیں انہیں خدا معاف کر دے گا یا جو پہلے ہی سے باوجود کفر و نفاق کے اس طرح کی فتنہ انگیزی اور استہزاء سے الگ رہے ہیں انہیں استہزاء و تمسخر کی سزا یہاں نہیں ملے گی۔[1]

یہ آیت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ منافقین کا گروہ کافروں کا کوئی ایسا خاص گروہ نہ تھا جو جاسوسوں کی طرح بھیس بدل کر مسلمانوں میں رہنے لگا تھا باہر نکلتا تو مسلمان بن جاتا اکیلے میں ہوتا تو اپنے اصل بھیس میں لوٹ جاتا ایسا سمجھنا قرآن و احادیث کی تصریحات کے خلاف ہے۔ ان لوگوں نے اسلام بطور اپنے دین و اعتقاد کے اسی طرح قبول کیا تھا جس طرح دوسرے مسلمانوں نے۔ یہ آیت قد کفرتم بعد ایمانکم ایمان لا کر پھر تم نے کفر کی باتیں کیں اس کی شہادت پیش کر رہی ہے وہ اپنے آپ کو مسلمان سمجھتے تھے۔ ان کے گھر کا ہر فرد یقین کرتا تھا کہ ہم مسلمان ہیں۔ وہ نماز پڑھتے تھے۔ روزہ رکھتے تھے۔ اسلام کے طور طریقے پر اولاد کی پرورش کرتے تھے۔

ایسا سمجھنے کی اصل وجہ بلاشبہ یہی ہے کہ کچھ اہل علم کا خیال یہ ہے کہ عہد نبوت کے بعد منافقین کا کوئی وجود نہیں ہے۔ اب یا تو کوئی شخص کافر ہو سکتا ہے اور یا مسلمان۔ کسی کے منافق ہونے کا نہ اب کوئی موقع ہے اور نہ ضرورت کیونکہ منافق اس وقت ہوا کرتے تھے جب اسلام دنیوی اسباب کے لحاظ سے ناتواں اور کمزور تھا۔ اور اس کے مقابلہ میں کفر کی مادی طاقت چاروانگ عالم پر چھائی ہوئی تھی۔

یہ شبہ دراصل نفاق اور منافق کی حقیقت اس کے محرکات اس کے مصالح اور اس کے مظاہر پر پوری وسعت اور سنجیدگی سے غور نہ کرنے کا نتیجہ ہے۔ حافظ ابن القیم جوزی نے نفاق کے جو معنے لکھے ہیں اس پر غور فرمائیے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

نفاق وہ مہلک بیماری ہے جو موجود ہوتی ہے لیکن جس میں ہوتی ہے اسے پتہ نہیں ہوتا ہے۔ عام نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے۔ خود اس بیماری کے مریض پر بھی پوشیدہ ہوتی ہے۔

آگے فرماتے ہیں۔

نفاق کی کھیتی میں پودہ دو نہروں والا ہوتا ہے اس کا ایک تنا جھوٹ کا اور دوسرا تنا نمائش اور ریاکاری کا ہوتا ہے اور نفاق دو چشموں کے پانی سے پتیا اور بڑھتا ہے ایک بصیرت کی کمزوری اور دوسرے عزیمت و ہمت کی کمزوری جب جھوٹ، نمائش، بصیرت اور عزیمت کی کمزوری یک جا ہو جاتے ہیں نفاق کی کھیتی پھلتی پھولتی اور بڑھتی ہے۔

یہ لکھنے کے بعد فرماتے ہیں کہ:

منافقین کا چہرہ بیان کیا جائے تو بیحد طویل ہے اتنا کہ ان کی روئے زمین تعداد زیادہ ہونے کی وجہ سے ممکن تھا کہ پورا قرآن ان کے ذکر سے بھرا ہوتا ——— حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ نے ایک شخص کو دعا مانگتے سنا کہ اے اللہ منافقین کو ہلاک کر دے۔ حذیفہ، بھائی اگر منافقین نہ رہے تو قلت تعداد کی وجہ سے تمہارا سڑکوں میں جی گھبرا جائے گا۔[1]

نفاق کا حاصل اس کے سوا کیا ہے کہ زبان سے خدا کی خدائی اور رسول کی رسالت کا اقرار کیا جائے مگر دل میں خدا کے قانون اور رسول کی ہدایت سے کوئی لگاؤ نہ ہو۔ آئین قرآنی کے مقابلہ میں دنیوی مصالح۔ نفسانی رجحانات اور جسمانی لذائذ زیادہ مرغوب ہوں بلکہ انہیں مصلحتوں اور فائدوں کو حاصل کرنے اور محفوظ رکھنے کے لیے اسلام و ایمان کو آڑ بنایا جائے۔

آیت کا مطلب ہے کہ باتیں نہ بناؤ تمہارا یہ عذر گناہ تمہارے گناہ سے بھی بدتر ہے۔ اگر کوئی گروہ اللہ اور اس کے رسول کو ہنسی دل لگی کا ذریعہ بناتا تو اس کے مجرم ہونے کے لیے یہ کافی ہے تو کھلے بندوں ایک مومن کی جانب سے اعلان کفر ہے۔ تم اگر ایمان لائے تھے تو ایمان کا تقاضا یہ تھا کہ اپنے عمل سے اس کا ثبوت فراہم کرتے لیکن تم نے عمل سے ایمان کا نہیں کفر کا ثبوت پیش کیا ہے۔ اس لیے کہ اللہ و رسول سے استہزاء کفر ہے۔

یہاں امام رازی کی بات بیحد وزنی ہے کہ استہزاء دلیل استخفاف ہے اور ایمان میں سب سے بڑی اور اہم چیز اللہ و رسول کی تعظیم ہے۔ استخفاف بھی اور تعظیم بھی۔ ان دونوں میں یکجائی محال ہے۔

ایک شافعی عالم علامہ الکیا الہراسی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ یہ آیت ایک رہنما اصول ہے اس بات

---

[1] مدارج السالکین

کے یہ ہے کہ کفر کی بات میں جد و ہزل دونوں مساوی ہیں۔ یعنی بات آپ چاہے متانت سے کہیں یا مذاق سے دونوں کا مقام کفر میں ایک ہے۔

حافظ ابن حزم نے الملل والنحل میں لکھا ہے ہر وہ بات جس میں اللہ و رسول کا یا قرآن کی کسی آیت کا استخفاف ہو گستاخی اور بے ادبی ہو نہ اس کا سننا جائز ہے نہ بولنا جائز ہے اور نہ ایسی مجلس میں بیٹھنا جائز ہے۔

امام ابوبکر الجصاص رقم طراز ہیں۔ اللہ سبحانہ نے اس آیت میں اپنے نبی کو بتا دیا ہے کہ یہ بات کفر ہے خواہ ان کے منہ سے کیسے نکل ہو چاہے متانت سے کہی یا مذاق سے۔ کلمہ کفر کے اظہار میں دونوں حالتیں یکساں ہیں اور یہ بھی اس آیت سے معلوم ہو گیا کہ اللہ کی آیات اور دین کے قوانین سے متعلق کسی چیز سے مذاق کفر ہے۔

اور ابوبکر بن العربی لکھتے ہیں کہ ان منافقین کی زبانوں سے اللہ سبحانہ اور حضور اقدس ﷺ کی شان میں جو بات بھی نکلی ہے گستاخی ہے اور گستاخی کفر ہے اور کفر چاہے وقار کے انداز میں ہو یا مذاق میں کفر ہے اس موضوع پر امت میں کوئی اختلاف نہیں ہے با وقار بات حقیقت اور علم سے تعلق رکھتی ہے جب کہ مذاق کا تعلق باطل اور جہالت سے ۔ اعوذ باللہ ان اکون من الجاھلین

بہر حال آیت کا مطلب یہ ہے کہ اے منافقو اب زیادہ بہانے نہ کرو۔ اب تک تو ظاہر میں تم مسلمان تھے مگر اس استہزاء اور تمسخر کے بعد وہ تمہارا ظاہری اسلام بھی جاتا رہا اور اس استہزاء و تمسخر سے تم نے اپنے کفر کا اعلان کر دیا لہٰذا ایسے جھوٹے عذر تراشنے اور حیلوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمہیں جرم کی سزا مل کر رہے گی۔

ارشاد کا آخری حصہ ان نعف عن طائفۃ۔ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ منافقین کے بہت سے گروہ تھے اور ان کے نفاق کی نوعیتیں مختلف تھیں۔ ان کی بعض جماعتیں نہایت خطرناک تھیں۔ انھوں نے اسلام اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے لیے بڑی سنگین چالیں چلیں۔ ایسی ہی کچھ جماعتوں کی طرف یہاں اشارا ہے کہ اگر ہم نے تمہاری کچھ ٹولیوں کو یہاں معاف بھی کر دیا ہے اور ان کے معاملہ کو آخرت پر رکھ دیا ہے تو مغالطہ میں نہ رہو کچھ ٹولیاں ضرور اس دنیا میں ہمارے عذاب کی زد میں آ کر رہیں گی اور ہم ان کے جرائم کی ان کو ضرور سزا دیں گے ——— یا یوں کہہ دیجئے کہ جن لوگوں نے جان بوجھ کر استہزاء و تمسخر کی باتیں اس لیے کی ہیں کہ وہ رسول اور اس کے لائے ہوئے دین کو اپنے دعوئے ایمان کے باوجود ایک مضحکہ سمجھتے ہیں اور جن کے اس تمسخر کا مدعا یہ ہے کہ اہل ایمان کی ہمتیں پست ہوں اور وہ پوری قوت کے ساتھ جہاد کی تیاری نہ کر سکیں ان کو تو ہرگز معاف نہیں کیا جا سکتا کیونکہ ان کا تمسخر ایک مجرمانہ سازش ہے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ تم سب کو معاف نہیں کیا جائے گا کچھ کو ان کے جرم کی سزا ضرور ملے گی یعنی جن

لوگوں نے تمسخر واستہزا کا جرم کیا ہے۔ مطلب ہے کہ اگر تم میں سے کچھ کو توبہ وانابت کی وجہ سے معاف کریں گے تو کچھ کو ان کی مجرمانہ حالت کی وجہ سے ضرور سزا دیں گے۔ اس لیے معلوم ہوا کہ ان میں دو گروہ ہو گئے تھے۔ کچھ نے اپنے گناہوں سے توبہ کر لی ان کو معافی مل گئی اور کچھ کو اپنے جرائم کا احساس بھی نہ ہوا ان کو سزا کی دھمکی دی گئی اور لطف یہ ہے کہ تعذیب کا سبب بیان کر دیا گیا ہے لیکن معافی کے سبب کو ظاہر نہیں کیا اشارہ ہے کہ معافی کا سبب محض فضل ہے اور سزا کا سبب ان کی مجرمانہ زندگی ہے۔

اَلْمُنٰفِقُوْنَ وَ الْمُنٰفِقٰتُ بَعْضُهُمْ مِّنْۢ بَعْضٍ ۘ
يَاْمُرُوْنَ بِالْمُنْكَرِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمَعْرُوْفِ وَيَقْبِضُوْنَ
اَيْدِيَهُمْ ؕ نَسُوا اللّٰهَ فَنَسِيَهُمْ ؕ اِنَّ الْمُنٰفِقِيْنَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ ﴿۶۷﴾
وَعَدَ اللّٰهُ الْمُنٰفِقِيْنَ وَالْمُنٰفِقٰتِ وَالْكُفَّارَ نَارَ جَهَنَّمَ خٰلِدِيْنَ
فِيْهَا ؕ هِيَ حَسْبُهُمْ ۚ وَلَعَنَهُمُ اللّٰهُ ۚ وَلَهُمْ عَذَابٌ مُّقِيْمٌ ﴿۶۸﴾ كَالَّذِيْنَ
مِنْ قَبْلِكُمْ كَانُوْٓا اَشَدَّ مِنْكُمْ قُوَّةً وَّاَكْثَرَ اَمْوَالًا وَّاَوْلَادًا ؕ
فَاسْتَمْتَعُوْا بِخَلَاقِهِمْ فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِخَلَاقِكُمْ كَمَا
اسْتَمْتَعَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ بِخَلَاقِهِمْ وَخُضْتُمْ
كَالَّذِيْ خَاضُوْا ؕ اُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا
وَالْاٰخِرَةِ ۚ وَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْخٰسِرُوْنَ ﴿۶۹﴾ اَلَمْ يَاْتِهِمْ
نَبَاُ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ قَوْمِ نُوْحٍ وَّعَادٍ وَّثَمُوْدَ ۙ۬ وَقَوْمِ
اِبْرٰهِيْمَ وَاَصْحٰبِ مَدْيَنَ وَالْمُؤْتَفِكٰتِ ؕ اَتَتْهُمْ
رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ ۚ فَمَا كَانَ اللّٰهُ لِيَظْلِمَهُمْ وَلٰكِنْ
كَانُوْٓا اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۷۰﴾

نفاق والے مرد اور نفاق والی عورتیں باہم ایک ہیں۔ برائی کا حکم دیتے ہیں اور

نیکی سے روکتے ہیں۔ اپنی مٹھیاں بند رکھتے ہیں وہ خدا فراموش ہو گئے اس لیے اللہ بھی ان کو بھول گیا۔ بلاشبہ منافقین ہی نافرمان ہیں[۶۸]۔ اللہ نے منافق مردوں منافق عورتوں اور کافروں سے دوزخ کی آگ کا وعدہ کیا ہے اسی میں پڑے رہیں گے۔ وہی ان کو بس ہے۔ اور اللہ نے ان پر لعنت کی ان کے لیے برقرار رہنے والا عذاب ہے[۶۹]۔ منافقو! تم ان لوگوں کی طرح ہو جو تم سے پہلے تھے وہ تم سے زیادہ طاقتور اور مال و اولاد میں تم سے زیادہ بہتات والے تھے لہذا وہ اپنے حصہ سے فائدہ اٹھا کر چلے گئے تم بھی اپنے حصے سے فائدہ اٹھا لو۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے تم سے پہلے لوگ اپنے اپنے حصے سے فائدہ اٹھا چکے ہیں اور تمہاری سوچ بھی ویسی ہی ہے جیسی ان کی سوچ تھی[۷۰]۔ دنیا و آخرت میں ان کے اعمال بالکل اکارت اور رائیگاں ہو گئے۔ گھاٹے میں رہنے والے لوگ یہی ہیں[۷۱]۔ کیا ان سے پہلے جو قومیں قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم، مدین والے اور الٹی بستیوں والے گذر چکے ہیں ان کا پتہ ان کو نہیں ہوا ہے اُن کے پاس ان کے رسول خدا کی روشن دلیلیں لے کر آئے لہذا یہ اللہ کی شان نہ تھی کہ ان لوگوں پر ظلم کرتا بلکہ یہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے[۷۲]۔

معانی مفردات

یقبضون ایدیھم قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ یہ کنایہ ہے بخل سے اصل میں قبض الایدی نام ہے انگلیوں کو ہتھیلی کی طرف بند کرنے کا جیسے ہم اپنی زبان میں مٹھی کہتے ہیں۔ عربی میں یہ کنایہ ہے خرچ نہ

کرنے سے جیسا کہ بسط ایدی ہاتھ کھلا ہونا کنایہ ہے خرچ کرنے اور سخی ہونے سے۔

خضتم کالذی خاضوا۔ پہلا جمع مذکر حاضر دوسرا جمع مذکر غائب ہے ماضی مصدر خوض ہے۔ خوض کے اصل معنے تو دریا میں گھس جانے کے ہیں لیکن بات کے تعلق سے آئے تو اس کے معنے بال کی کھال ادھیڑنا ہی ہوتا ہے اور مادیات کے تعلق سے ہو تو اس کے معنے مادیات کے ہو کر رہ جانے کے ہوتے ہیں یہاں باطل ضلالت کے کیچڑ میں گھس جانا ہے۔

نفاق کا محسوس چہرہ اور انجام

قرآن میں منافقین کی قسمیں اور منافقین کی علامات کھول کر بتائی ہیں اس پر تفصیلی بحث توان شاء اللہ پارہ یازدہم میں آئے گی جہاں ہم قرآن کی روشنی میں منافقین کی بارہ قسمیں اور نفاق کی ۶۶ علامتیں بتائیں گے یہاں جو علامات و خصوصیات ذکر کی جا رہی ہیں وہ منافقین کی بارہ قسموں کی مشترک خصوصیات ہیں۔ ان سب کو برائی سے دلچسپی اور بھلائی سے عداوت ہوتی ہے۔ کوئی شخص برا کام کرنا چاہے تو ان کی ہمدردیاں، ان کے مشورے ان کی ہمت افزائیاں، ان کی اعانتیں، ان کی سفارشیں۔ ان کی تعریفیں اور مدح سرائیاں سب اس کے لیے وقف ہوں گی دل و جان سے سب اس برے کام میں شریک ہوں گے۔ دوسروں کو اس میں حصہ لینے کی ترغیب دیں گے۔ کرنے والے کی ہمت بڑھائیں گے اور ان کی ہر ادا سے ظاہر ہو گا کہ اس برائی کے پروان چڑھنے سے کچھ ان کے دل کو راحت اور ان کی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچتی ہے۔ بخلاف اس کے کوئی بھلا کام کر رہا ہو تو اس کی خبر سے ان کو صدمہ ہوتا ہے۔ اس کے تصور سے ان کا دل دکھتا ہے اس کی تجویز تک ان کو گوارا نہیں ہوتی ہے۔ اس کی طرف کسی کو بڑھتے دیکھتے ہیں تو ان کی روح بے چین ہو جاتی ہے۔ اس کی راہ میں روڑے اٹکاتے ہیں۔ اور ہر تدبیر سے یہ کوشش کرتے ہیں کہ کسی طرح وہ اس نیکی سے باز رہ جائے اور باز نہیں آتا تو اس کام میں کامیاب نہ ہو سکے۔ پھر یہ بھی ان سب کا مشترک خاصہ ہے کہ نیکی کے کام میں خرچ کرنے کے لیے ان کا ہاتھ کبھی نہیں کھلتا ہے خواہ وہ کنجوس ہوں یا بڑے خرچ والے۔ بہر حال ان کی دولت یا تو تجوریوں میں ہوتی ہے یا پھر حرام راستوں سے آتی ہے اور حرام ہی راستوں میں جاتی ہے۔ بدی کے لیے وہ اپنے وقت کے قارون بن جاتے ہیں مگر نیکی میں خرچ کرنے کے لیے ان سے زیادہ مفلس کوئی نہیں ہوتا۔

(۶۸) نفاق والے مرد نفاق والی عورتیں باہم ایک دوسرے کو برائی کا حکم دیتے ہیں اور نیکی سے روکتے ہیں اللہ کی راہ میں مٹھیاں بند رکھتے ہیں اللہ ضرور فراموش ہو گئے اس لیے اللہ بھی ان کو بھول گیا۔ بلاشبہ منافقین ہی نافرمان ہیں یعنی سب سے بڑے نافرمان ہی باطن منافق ہیں

جن کے مرد اور عورتیں زبانی اقرار اور اظہارِ اسلام کے باوجود شب و روز اسی تگ و دو میں لگے رہتے ہیں کہ ہر قسم حیلے اور فریب کر کے لوگوں کو اچھی باتوں سے بیزار اور بُرے کاموں پر آمادہ کریں۔ خرچ کرنے کے اصل موقعہ پر مٹھی بند رکھیں۔ غرض کلمہ پڑھتے رہیں لیکن نہ ان کی زبان سے کسی کو بھلائی پہنچے نہ مال سے جب تک خدا کو ایسا چھوڑ بیٹھے تو خدا نے بھی ان کو چھوڑ دیا چھوڑ کر کہاں گرایا اس کا ذکر آگے آرہا ہے لے

بتایا جارہا ہے کہ منافقین کی قسمیں اگرچہ متعدد ہیں لیکن تعدد کے باوجود یہ باتیں ان سب کا مشترکہ سرمایہ ہیں۔ اور صرف مرد ہی نہیں بلکہ عورتیں بھی ان کے ساتھ شریک ہیں۔ اور دونوں جرم میں برابر ہیں۔ منافقین قسمیں کھا کر کہہ رہے تھے کہ انھم لمنکم وہ تم میں سے ہیں قرآن بتا رہا ہے وہ تم میں سے نہیں بلکہ بعضھم من بعض باہم ایک ہیں۔ ان کے افکار میں ان کے اعمال میں اور ان کے اخلاق میں ہم آہنگی ہے برائی کے پھیلانے نیکی کی راہ میں رکاوٹیں قائم کرنے اور اسلام کی خاطر محنت سے گریز میں ایک دوسرے کے ہمنوا ہیں۔ علامہ نسفی لکھتے ہیں صفت نفاق میں سب شریک اور ایک جنس ہیں الجصاص فرماتے ہیں۔ نفاق پر ان کی اجتماعیت کو بتانے کے لیے یہ انداز اختیار کیا ہے۔ اب تک منافقین دعوی ایمان کی وجہ سے مسلمانوں میں رَلے ملے تھے۔ یہاں ان کی علامات کی نشاندہی فرما کر ان کو اہلِ ایمان سے چھانٹ کر الگ کر دیا ہے اور اہلِ ایمان کو بتا دیا ہے کہ وہ ان خصائص کے مردوں اور عورتوں کو اپنے میں شامل نہ ہونے دیں یہ گویا اعمال و اخلاق کی بنیاد پر اسلامی معاشرہ کی گندے عناصر سے تطہیر کا حکم ہوا ہے اور بتایا جارہا ہے کہ جس طرح مسلمانوں نے کفار و مشرکین سے اعلان برات کر کے علیحدگی اختیار کر لی ہے اسی طرح اپنے اندر کے ان نام نہاد مسلمانوں کو بھی چھانٹ کر الگ کر دیں جو اعمال و اخلاق میں کفار کے ہمنوا ہیں۔ اسلام کی اجتماعی مردم شماری کے رجسٹروں کی رہینِ منت نہیں۔ نہ یہ قومیت ہے جو وطن، زبان، رنگ و نسل کی ہم آہنگی اور اتحاد سے منصہ وجود پر آتی ہے۔ یہ امت ہے اس کی اساس اسلام اور صرف اسلام ہے افکار میں اعمال میں اسلام سے وفاداری اس کے ترکیبی عناصر ہیں۔ افرادی طاقت سے زیادہ ایمان و عمل کی طاقت درکار ہے۔

اِسلامی معاشرہ کی تکوین

عام شارحین نے اس سے جو کچھ سمجھا ہے وہ تو صرف یہی ہے کہ منافقین میں ہم آہنگی اور ہم جنسی ہے لیکن شاہراہ عام سے ہٹ کر ذرا اس پر غور فرمائیے کہ قرآن اس کے ذریعے ہمارے ذہن میں یہ بات اتارنا

لے افادات شیخ الاسلام

چاہتا ہے کہ جہاں تک اسلامی معاشرہ کے قیام اور وجود کا تعلق ہے وہ ایک ایسے محسوس ادائی عمل کا نتیجہ ہے جس کی موزوں تعبیر میثاق کے لفظ سے کی جاسکتی ہے۔ غور کیجئے کہ ایک فرد اسلامی معاشرہ کا رکن کیوں کر بنتا ہے۔ قبل اس کے کہ کوئی شخص اسلامی معاشرہ کا رکن بنے اسے اللہ سبحانہ کی وحدانیت اور محمد رسول اللہ کی رسالت کا اقرار کرنا پڑتا ہے۔ اس کے ساتھ وہ اس اقرار کے لازمی نتائج کو بھی تسلیم کرتا ہے۔ لفظ اسلام خود اس حقیقت پر گواہ ہے کہ اسلامی معاشرے میں شرکت کرنا اپنے نفس کے جملہ حقوق سے دست بردار ہونا ہے۔ کیونکہ اسلام کے لفظی معنے ہیں اپنے تئیں کسی کے حوالہ کر دینا اور اس کی پوری پوری اطاعت بجالانا ایک شخص جب مسلمان ہوتا ہے تو وہ اس بات کا عہد کرتا ہے کہ اس کا ارادہ اس کی عقل اور اس کے جذبات دخواہشات قانونِ الٰہی اور احکامِ خداوندی کی اطاعت میں حائل نہ ہوسکیں گے اور خدا اور رسول کے حکم کے مقابلے میں وہ ان سب کی قربانی دینے پر آمادہ رہے گا۔ اس طاعت وسپردگی کے مقابلے میں اسے رضائے الٰہی اور تقرب خداوندی کی بشارت دی جاتی ہے۔ اگر ایسا نہیں کرتا ہے اور زندگی کے ہر موڑ پر عہد وپیمان کو توڑتا ہے وہ اسلامی معاشرہ کا فرد نہیں ہوسکتا ہے اور اس عہد شکنی ہی کا نام قرآن کی زبان میں نفاق ہے کافر عہد قبول ہی نہیں کرتا ہے لیکن منافق عہد قبول کرتا ہے لیکن عہد سے وفاداری نہیں کرتا ہے اس لیے قرآن نے بتایا ہے کہ یہ عہد شکن طبقہ باہم ایک جنس ہیں۔ ان کا اسلامی معاشرہ سے کوئی لگاؤ نہیں ہے۔

آگے ان کی عہد شکنی کی نمایاں مثالیں دی ہیں فرمایا یامرون بالمنکر۔ برائی کا حکم دیتے ہیں تمام اخلاقی رذائل کیلئے قرآن میں سب سے زیادہ عام لفظ منکر ہے۔ اس میں عملی اور اخلاقی رذائل سب ہی داخل ہیں جھوٹ، خیانت، جھوٹی قسمیں وعدہ خلافی، بددیانتی، غداری، دغابازی، بہتان، چغل خوری، غیبت اور بدگوئی۔ دورخاپن، بدگمانی، بے ایمانی، چوری، ناپ تول میں کمی، رشوت، سود خواری، شراب نوشی، بغض وکینہ، ظلم، فخر وغرور، ریا، خود بینی، خود نمائی، فحش گوئی، لفظ منکر ان سب کو اپنی آغوش میں سمیٹے ہوئے ہے وینھون عن المعروف۔ اور نیکی سے روکتے ہیں معروف کے معنے ہیں جس کی اچھائی جانی پہچانی ہو یہ بھی نیکیوں اور اچھائیوں کے لیے ایک عام لفظ ہے اس میں زبان کی سچائی۔ دل کی سچائی۔ عمل کی سچائی صفت پاکبازی دیانتداری، امانت، شرم، رحم، عدل، عہد کی پابندی، احسان، عفو، درگذر، حلم ورفق، تواضع وخوش کلامی، ایثار، درمیانہ روی، استقامت اور حق گوئی، یہ سب ہی معروف میں داخل ہیں۔

قرآن بتارہا ہے کہ منافقین لوگوں کو منکرات کی تلقین کرتے ہیں اور ترغیب دیتے اور معروف سے لوگوں کو روکتے ہیں۔ یہ ایمان واسلام کے تقاضوں کی کھلم کھلا بغاوت ہے۔ اس کے باوجود وہ ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں

بالکل آخر میں فرمایا ہے ویقبضون ایدیھم یعنی جہاد اور راہِ خدا میں کچھ خرچ نہیں کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ بھی منکرات ہی میں داخل ہے لیکن اسے نمایاں اس لیے کیا ہے کہ حالات کے تحت اسلام کی اجتماعی زندگی کے لیے یہ خطرے کی گھنٹی ہے۔ اور منافقت کی سب سے بڑی علامت ہے صحیح مسلم میں عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منافقین کی اس حالت کو ایک عجیب مثال سے سمجھایا ہے۔

منافق کی مثال اس بکری کی ہے جو نر کی تلاش میں دو گلوں کے درمیان کبھی اس طرف اور کبھی اس طرف ماری ماری پھرتی ہے۔

مادیت کی پرستاری میں منافق کے لیے یہ مثال بڑی معنے خیز ہے۔ منافقوں کی بزدل جماعت کبھی اپنے نفع کی تلاش میں مسلمانوں میں اور کبھی کافروں میں مارے مارے پھرتی ہے۔ اس کا پس منظر، پیش منظر اور تہ منظر صرف دنیا کا مال ہوتا ہے اور مال ہی ان کا معبود ہوتا ہے اس بیماری سے نفرت پیدا کرنے کے لیے اس سے زیادہ موثر تشبیہ اور کیا ہوگی۔

نسوا اللہ فنسیھم جس کردار کے ذریعے انھوں نے خدا فراموشی کا مظاہرہ کیا اور زندگی کی ہر شاخ میں ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت کی ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا ہے کہ اللہ سبحانہ نے ان انعامات سے محروم کر دیا ہے اب ان کو یادِ الٰہی، طاعت خداوندی کی توفیق نہ ہوگی اللہ کی توفیق ان کی رفیق ہوتی ہے جو خدا فراموش نہیں ہوتے بلکہ قرآن نے قانون بتایا ہے کہ خدا فراموشی کے نتیجے میں ان پر شیطان مسلط کر دیا جاتا ہے جو ان کی نکیل اپنے ہاتھ میں لے کر ان کو کھینچتا پھرتا ہے عنایۃ القاضی میں لکھا ہے کہ خدا کا ان کو بھول جانا کنایہ ہے خدا کو یاد کرنے کی توفیق سلب ہونے سے۔

ان المنافقین ھم الفاسقون اس میں فاسق کے معنے غدار اور عہد شکن کے ہیں ___ یعنی ان منافقوں کو ان کے دعویٰ ایمان کی وجہ سے یہ نہ خیال کر لینا کہ یہ مسلمان ہیں ___ یہ اسلام کے نام لیوا ضرور ہیں مگر عہد شکن بے وفا اور غدار ہیں۔ انھوں نے طاعت کا عہد کر کے اسے توڑا ہے اور اسلام کا نام لے کر اسلام کے قدموں پر کلہاڑا مارا ہے اس لیے بدعہدی اور غداری میں جو درجہ ان کا ہے کسی کا نہیں ہے۔

آخرت میں منافقین کا انجام

(۶۹) اللہ نے منافق مردوں، منافق عورتوں اور کافروں کے لیے دوزخ کی آگ کا وعدہ کیا ہے۔ اسی میں پڑے

رہیں گے۔ وہی ان کو بس ہے اور اللہ نے ان پر لعنت کی اور ان کے لیے برقرار رہنے والا عذاب ہے یعنی یہ ایسی کافی سزا ہے اس کے بعد کسی سزا کی ضرورت نہیں رہتی۔ شاید یہ مطلب ہو کہ دنیا میں بھی خدا کی پھٹکار لعنت کا اثر برابر پہنچتا رہے گا۔ یا پہلے جملہ کی تاکید ہے [1]

اس آیت میں ان منافقین کو آخرت میں ملنے والی سزا کا ذکر ہے۔ یہاں چار سزائیں بتائی گئیں ہیں۔

اولاً دوزخ کی آگ۔ دوسرے دوزخ میں ان کا خلود تیسرے ان پر لعنت۔ چوتھے۔ عذاب کا دوام بتایا ہے کہ اسلام کا دعویٰ کرنے کے باوجود ان کو کافروں کے زمرے میں رکھا جائے گا اور ان سے کوئی رعایت نہیں کی جائے گی بلکہ ہمیشہ کے لیے کافروں کے ساتھ جہنم میں رہیں گے اللہ کی طرف سے ان پر لعنت ہوگی جس کے نتیجے میں امید کے سارے دروازے بند ہو جائیں گے۔ ایک دائمی عذاب ان پر مسلط ہوگا جس سے کبھی بھی ان کو رہائی نصیب نہ ہوگی۔

یہاں بعض کم فہم یہ اعتراض کرتے ہیں کہ انسان کا گناہ تو ایک لمحہ ہوتا ہے پھر اس کی سزا اتنی طویل کیوں ہے سال دو سال یا عمر بھر کے گناہوں کی سزا صدہا اور ہزار ہا سال کے عتاب سے دینا مناسب نہیں حالانکہ یہ لوگ اگر دنیوی واقعات ہی پر غور کرتے تو ان کی تسلی ہو جاتی۔ دنیا کا ہر بڑے سے بڑا قانونی گناہ ایک لمحہ میں انجام پاتا ہے۔ چوری یا قتل میں کتنی دیر لگتی ہے مگر سالہا سال کی سزا دی جاتی ہے اور اسے کوئی خلاف عقل نہیں بتاتا ——— دوسری صحیح تر مثال یہ ہے کہ انسان ذراسی جسمانی بدپرہیزی سے کبھی ہفتوں مہینوں بلکہ سالہا سال بیمار رہتا ہے اور ایک عرصہ دراز میں جا کر کہیں ان چند لمحوں کی غلطی کی بدولت عمر بھر اس کے روگ میں مبتلا رہتا ہے اور آخر میں مر جاتا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گناہ اور اس کی تلافی کی مدت میں یکسانی نہیں ہوتی بلکہ ہمیشہ غلطی کی مدت کے مقابلے میں اس کی تلافی کی مدت صدہا اور ہزارہا گنا زیادہ ہوتی ہے۔ کیونکہ طبیعت پر جو اثر پڑتا ہے اس کی تلافی کی مدت غلطی کی نوعیت طبیعت کی صلاحیت اور خلاق عالم کی مصلحت کی بنا پر مختلف ہوتی ہے۔ اسی لیے عتاب طویل سے رہائی کی مدت بھی ہر گنہ گار کے یکساں نہیں ہو سکتی ہے۔

یہاں حضرت امام غزالی کی تحقیق بے حد لطیف ہے وہ فرماتے ہیں کہ انسان اگرچہ ازلی نہیں مگر ابدی ضرور ہے اس لیے اس کو ایک ابدی مستقر چاہیے۔ دنیا اس کا ابدی مستقر نہیں صرف عارضی ہے ولکم فی الارض مستقر ومتاع الی حین۔ تمہیں خدا کی زمین پر صرف چند روز رہنا ہے اور ایک وقت مقرر تک اس کی نعمتوں سے کچھ فائدہ حاصل کرنا ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کا دائمی مستقر جنت یا دوزخ ہے۔ اللہ سبحانہ نے اس کی تقسیم اچھے بُرے اعمال پر نہیں رکھی بلکہ ایمان و کفر پر رکھی ہے اس لیے مومن خواہ کتنا ہی گنہ گار کیوں نہ ہو مگر اس کا ابدی مستقر جنت ہی ہوگا۔ اور کافر خواہ کتنے ہی اچھے اچھے کام کیوں نہ کرے لیکن اس کا ابدی مستقر دوزخ ہی ہوگا۔

رہی یہ بات کہ موقت ایمان و کفر کی جزا خلود کیوں رکھی گئی ہے تو اس کا سب سے بہتر جواب وہ ہے جو ابن قتیبہ نے تاویل مختلف الحدیث میں لکھا ہے۔ پھر اس کا خلاصہ حافظ بدرالدین عینی نے شرح بخاری میں اور عبدالوہاب الشعرانی نے الیواقیت والجواہر میں نقل کیا ہے۔

جنت میں خلود اور ابدی زندگی کی بنیاد عمل پر نہیں بلکہ بندہ کی نیت پر رکھی گئی ہے۔ اگر اس کی بنیاد عمل پر ہوتی تو آخرت کی زندگی کی مدت بھی عمل کے مطابق ہونی چاہیے تھی یا زیادہ سے زیادہ دگنی۔ لیکن چونکہ اس کی بنیاد نیت پر رکھی گئی اور اس کی نیت یہ ہوتی ہے کہ اگر اسے ہمیشہ ہمیشہ کی زندگی ملے تو اللہ کی اطاعت ہمیشہ ہی کرے گا۔ اس نیت میں اگر کوئی چیز رکاوٹ بنتی ہے تو وہ صرف موت ہے اس لیے اسے اپنی نیت کے مطابق دوام و خلود ملتا ہے۔

یہی حال دوزخ میں کافر کے خلود و دوام کا ہے [1]

لیکن یاد رہے کہ یقین اور اعتقاد جازم ایمان کی جان ہے۔ اللہ سبحانہ کی جس قدر نعمتیں ہیں وہ سب اس نعمت سے کمتر ہیں۔ اور منافق یقین کی اس نعمت سے محروم ہوتا ہے۔ صحیح بخاری میں عبداللہ بن مسعود کا ارشاد آیا ہے الیقین الایمان کلہ یقین ہی ایمان کی روح ہے۔ مسند امام احمد میں عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی یہ دعا آتی ہے۔ اللھم زدنا ایمانا ویقینا وفقھا اے اللہ ہمارے دلوں میں ایمان و یقین اور دین کی سمجھ زیادہ کردے۔ جامع ترمذی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے یہ دعائیہ کلمات آئے ہیں واقسم لنا من الیقین ماتھون بہ علینا مصائب الدنیا۔ اے اللہ ہمارے حصہ میں اتنا یقین عطا فرمادیجئے کہ جس سے مصائب کا برداشت کرنا آسان ہوجائے۔ سفیان ثوری محدث بھی ہیں اور فقیہ بھی انہوں نے یہ بات بڑے نکتہ کی فرمائی ہے لوان الیقین وقع فی القلب کماینبغی لطار اشتیاقا الی الجنۃ وھربا من النار اگر یقین پوری واقعیت کے ساتھ دل میں سماجائے تو جنت کے اشتیاق اور دوزخ کے ڈر کے مارے دل اڑنے لگے [2]

بہرحال ایمان کی حقیقت صرف جزم و یقین ہے۔ یہی یقین الفاظ کے قالب میں ہو تو ایمان کا وجود لفظی ہے

[1] عمدۃ القاری ج ۱ ص ۱۲۳

[2] فتح الباری ج ۱ ص ۱۱

اور جب ترقی کر کے دل میں داخل ہوتا ہے تو ایمان کا وجود ذہنی ہے اور جب پختگی اور رسوخ کے بعد اس میں کیفیت شہود رونما ہو یعنی آپ کی زندگی کے اعمال اخلاق میں اس کی نمائش ہو تو یہ ایمان کا وجود خارجی ہے۔ یہی عین ایمان ہے اور ہر مسلمان پر ضروری ہے کہ اس کے حاصل کرنے میں پوری جدوجہد کرے اگر وہ اس راہ میں قدم نہیں اٹھاتا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایمان کے وجود لفظی پر قانع ہے۔

تاریخ کے حوالہ سے کفر و نفاق کو دھمکی

(۷۰) منافقو! تم ان لوگوں کی طرح ہو جو تم سے پہلے تھے وہ تم سے زیادہ طاقتور اور مال و اولاد میں تم سے زیادہ بہتات والے تھے لہٰذا وہ اپنے حصے سے فائدہ اٹھا کر چلے گئے۔ تم بھی اپنے حصے سے فائدہ اٹھاؤ۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے تم سے پہلے لوگ اپنے حصے سے فائدہ اٹھا چکے ہیں۔ اور تمہاری سوچ بھی ویسی ہے جیسی ان کی سوچ تھی۔ یعنی دنیوی لذائذ کا جو حصہ ان کے لیے مقدر تھا اس سے فائدہ اٹھا گئے اور آخری انجام کا خیال نہ کیا۔ تم بھی ان کی طرح آخری انجام کے تصور سے غافل ہو کر دنیا کی متاع فانی سے جتنا مقدر ہے حصہ پا رہے ہو۔ اور ساری چال انہی ہی جیسی رکھتے ہو تو سمجھ لو جو حشر ان کا ہوا وہ ہی تمہارا بھی ہو سکتا ہے۔ ان کے پاس مال و اولاد اور جسمانی قوتیں تم سے زیادہ تھیں۔ پھر انتقام الٰہی کی گرفت سے نہ بچ سکے تو تم کو کا ہے پر بھروسہ ہے جو خدائی سزا سے اس قدر بے فکر بیٹھے ہو[1]

یہ قرآن کی بلاغت ہے کہ نصیحت کے موقع پر انداز بیان یہ اختیار کیا ہے کہ اولاً نہایت نرمی سے باز رہنے کی تلقین کرتا ہے باز رہنے کی خوبیاں بیان کرتا ہے اگر مخاطب کی کج فہمی تعمیل میں رکاوٹ بن جاتی ہے اور ماننے کو تیار نہیں ہوتا تو اعمال کی خرابیاں بیان کرتا ہے ممکن ہے کہ وہ خرابیاں سن کر باز آجائے اس کے بعد بھی اگر مخاطب ضد کرتا ہے تو اعمال کا نتیجہ پیش کر کے اس کو جھنجھوڑتا ہے۔ اس پر بھی اگر وہ باز نہیں آتا تو تاریخ سے ان قوموں کے نمونے پیش کرتا ہے جو ان اعمال کی پاداش میں اس تباہی کا شکار ہوتی ہیں چنانچہ یہاں بھی قرآن عزیز نے سب سے پہلے منافقوں کو نرمی سے سمجھایا۔ پھر افعال شنیعہ بیان کیے۔ اس کے بعد ان اعمال بد کے نتائج سے خبردار کیا آخر میں ان قوموں کی داستان سے ان کی داستان کو مشابہ بتایا۔ جن کے اعمال ان کی طرح تھے۔ پھر ان قوموں کے نتائج اعمال بتائے اور بتایا کہ ان کی ہی خصوصیت نہیں جو بھی اعمال کی کاشت ان کی طرح کرے گا اس کا انجام یہی ہے۔ اب تک منافقین کو غائب کے صیغوں کے

[1] افادات شیخ الاسلام

ذریعے سے سمجھایا جا رہا تھا۔ یہاں تہدید و تشدید کی خاطر روئے سخن غیبت سے ہٹا کر خطاب کی طرف موڑ دیا۔ بلاغت کی اصطلاح میں اس کا نام التفات ہے کالذین من قبلکم سب سے پہلے حرف تشبیہ لا کر منافقین کے احوال و اطوار کو ماضی کے تاریخی اطوار و احوال کے ساتھ تشبیہ دی ہے یہ بات تو ظاہر ہے کہ منافقین مشبہ ہیں اور الذین من قبلکم مشبہ بہ ہیں اور کاف حرفِ تشبیہ ہے۔ لیکن یہاں وجہ تشبیہ کیا ہے۔ اس میں شارحین قرآن کے خیالات مختلف ہیں۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں تمہارا کردار وہی ہے جو تم سے پہلوں کا ہے۔ اور قرطبی نے زجاج سے نقل کیا ہے کہ اللہ نے ان سے جہنم کا ایسا ہی وعدہ کیا جیسا ان سے پہلوں سے کیا تھا حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ ان پر بھی اللہ کی گرفت عذاب کی ویسی ہی آئے گی جیسے ان سے پہلی قوموں پر آئی ہے۔ حافظ ابن جریر لکھتے ہیں اے پیغمبر ان منافقین سے کہہ دیجئے جو کہتے ہیں انما کنا نخوض و نلعب کہ کیا تم پہلی قوموں کی طرح اللہ کی اہانت اور اس کے رسول کا مذاق کر رہے تھے۔ دراصل کالذین من قبلکم مبتدائے محذوف کی خبر ہے یعنی تم بھی ویسے ہی ہو جیسے تم سے پہلے تھے یعنی تمہارے اور ان کے اعمال میں تشابہ ہے۔ بہر حال یہ دھمکی ہے فرمایا کہ مال و اولاد کی بہتات پر ــــ تمہیں یہ جو دھوکہ ہے کہ تم اللہ کے لاڈلے ہو اور اس لیے چیزوں کی بہتات ہے۔ تم سے پہلے جو قومیں گذری ہیں۔ ان کو اللہ نے تم سے زیادہ دے رکھا تھا۔ ان کے لیے اس دنیا سے جتنا فائدہ اٹھانا مقدر تھا جب انھوں نے اتنا فائدہ اٹھا لیا تو اللہ سبحانہٗ نے ان کو ہلاک کر دیا ان ہی کی طرح اپنے حصے سے تم نے بھی فائدہ اٹھا لیا ہے اور ان ہی کی طرح بداعمالیوں کا سرمایہ بھی تم نے جمع کر لیا ہے تو اب تمہاری تباہی کا بھی وقت آ گیا ہے جس طرح ان کے اعمال دنیا و آخرت میں کام نہیں آئے اور وہ نامراد ہوئے اسی طرح تمہارے اعمال بھی دنیا و آخرت میں کام نہ آئیں گے اور تم بھی نامراد ہو گے۔ مطلب یہ ہے کہ مال و اولاد کو نہیں اعمال کو دیکھو۔ مال و اولاد تو بدکرداروں اور بدعنوانوں کو بھی مل جاتا ہے۔ اللہ کے فیصلے مال و اولاد پر نہیں اعمال پر ہوتے ہیں۔

دونوں جہان کی محرومی

(۷) دنیا و آخرت میں ان کے اعمال بالکل اکارت اور رائیگان ہو جائیں گے گھاٹے میں رہنے والے لوگ یہی ہیں۔ یعنی کوئی دنیوی و اخروی برکت و کرامت ان کو نصیب نہ ہو گی۔ باقی دنیوی فوائد کا جو حصہ بظاہر ملا وہ فی الحقیقت ان کے حق میں استدراج تھا جیسا کہ دو رکوع پہلے فلا تعجبك اموالهم ولا اولادهم کے فوائد میں گذر چکا اور اس سے بیشتر بھی کئی مواقع پر لکھا جا چکا ہے لہ (افادات شیخ الاسلام)

مطلب یہ ہے کہ دونوں جہان میں کامیابی سے محروم رہیں گے ان کی محنت برباد اور ان کی کوششیں اکارت ہوجائیں گی۔ یہ بڑی معنے خیز تعبیر ہے۔ اس کے بیک وقت دو مطلب ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ دنیا کی زندگی میں دین کے نام پر جو نمائشی کام کیے ہیں وہ سارے کام بیکار ہوجائیں گے اور بیکار ہونے کا مطلب ہے کہ ان کو ان کے اعمال کی جو مسلمانی کا لبادہ پہن کر رہے تھے کوئی قیمت نہ ملے گی وجہ ظاہر ہے کہ اعمال کی مقبولیت کے لیے بنیادی شرط یہ ہے کہ وہ ایمان واقعی کی زمین پر ہوں۔ ایمان کے بغیر خواہ کیسا ہی اچھا عمل ہو وہ قابل قبول نہیں ہے کیونکہ ایمان کے عدم سے دل کے ارادے اور خصوصاً اس مخلصانہ ارادے کا بھی عدم ہوجاتا ہے جس پر حسن عمل کا دارومدار ہے۔ عبداللہ بن جدعان ایک قریشی تھا۔ جس نے زمانہ جاہلیت میں رفاہ عام کے بڑے کام کیے مگر بایں ہمہ کافر تھا۔ اس کی نسبت حضور اقدس ﷺ سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے ایک بار دریافت کیا کہ یا رسول اللہ عبداللہ بن جدعان نے جاہلیت کے زمانے میں جو نیکی کے کام کیے کیا اس کو ان کا ثواب ملے گا فرمایا نہیں، کیونکہ کسی روز اس نے یہ نہیں کہا اللھم اغفر لی۔

دوسرا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ان کی وہ کوششیں اور تدبیریں جو وہ قرآن اسلام یا دوسرے الفاظ میں اسلام کے نظام حیات کی مخالفت میں کر رہے ہیں دنیا ہی میں رائیگاں ہوجائیں گی اور اسلام کا بول بالا ہو کر رہے گا۔ اور خواہ کفر کی کتنی بڑی قوتیں متحدہ محاذ قائم کرلیں یہ اپنی کوششوں میں ہرگز کامیاب نہ ہوں گے اور جب دنیا اور آخرت دونوں جگہ ناکامیاں ہی ناکامیاں نظر آئیں گی تو ان کے علاوہ گھاٹے والا اور کون ہو سکتا ہے۔

اقوام ماضیہ کا انجام

(۷۰) کیا ان سے پہلے جو قومیں قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیم، مدین والے اور الٹی بستی والے گذر چکے ہیں۔ ان کو ان کا پتہ نہیں ہوا ہے؟ ان کے پاس ان کے رسول خدا کی روشن دلیلیں لے کر آئے۔ یہ اللہ کی شان نہ تھی کہ ان پر ظلم کرتا بلکہ یہ لوگ خود اپنے اوپر ظلم کر رہے تھے۔ قوم نوح طوفان سے عاد آندھی سے ثمود چیخ سے ہلاک ہوئے ابراہیم علیہ السلام کی عجیب و غریب طریقے سے تائید فرمائی جنھیں دیکھ کر ان کی قوم ذلیل و ناکام ہوئی۔ ان کا بادشاہ نمرود نہایت بدحالی کی موت مارا گیا۔ اصحاب مدین چیخ زلزلہ وغیرہ سے تباہ ہوئے قوم لوط کی بستیاں الٹ گئیں۔ اوپر سے پتھروں کی بارش ہوئی ان سب قوموں کا قصہ بجز قوم ابراہیم کے سورۂ اعراف میں گذر چکا۔ (افادات شیخ الاسلام)

، یہ الذین من قبلکم کے اجمال کی تفصیل ہے۔ یعنی حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت ابراہیم، حضرت شعیب، اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوموں اور دعوتوں کا ذکر کیا ہے۔ حضرت نوحؑ کا ظہور دریائے دجلہ و فرات کے دوابہ میں ہوا تھا جو انسانی تمدن کا سب سے قدیم گہوارہ ہے قوم نوح کے بعد عرب میں قوم عاد کو عروج ہوا ان کی آبادیاں عمان سے لے کر حضرموت اور یمن تک پھیل گئی تھیں۔ حضرت ہود نے دعوت ان میں ہی پیش کی تھی۔ قوم ثمود عرب کے اس حصے میں آباد تھی جو حجاز اور شام کے درمیان وادی القریٰ تک چلا گیا تھا۔ حضرت صالح علیہ السلام کا ظہور ان میں ہی ہوا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ظہور فلسطین کے علاقہ میں ہوا۔ ان کی زندگی بہت ہمہ گیر اور ہمہ رس تھی مختلف ملکوں میں ان کی دعوت کی منادی ہوئی۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا ظہور قبیلہ مدین میں ہوا جو جزیرہ نما سینا میں عرب سے متصل آباد تھا۔ حضرت لوط حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے اور مقام سدوم میں ان کا ظہور ہوا تھا۔

ان تمام قوموں کی سرگذشتیں سورہ اعراف میں گذر چکی ہیں۔ یہاں تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔ غور کرنے کی بات یہ ہے کہ جتنے رسول جتنی قوموں میں آئے وہ کیسے وقتوں میں آئے اور کن لوگوں میں پیدا ہوئے ان کی دعوت کیا تھی؟ جس پر انھوں نے زور دیا ان کا طریق کار کیا تھا جس پر وہ برابر کاربند رہے۔ انھوں نے اپنے قدم جہاں ٹکائے تھے وہ جگہ کونسی تھی اور سہارے کے لیے جس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا وہ کون تھا؟ پھر ان میں اور ان کی قوموں میں جو معاملات پیش آئے وہ کس قسم کے تھے اور ان معاملات میں ان کا جو قول وفعل رہا وہ کس قسم کا تھا؟ ان ساری باتوں میں ہر رسول دوسرے رسول کی تصویر تھا اور ہر دعوت دوسری دعوت کا عکس تھی۔ کسی بات میں بھی تم ایک کو دوسرے سے جدا نہیں کر سکتے۔ سب اسی حال میں پیدا ہوئے کہ دنیوی طاقتوں اور حکمرانوں میں سے کچھ اپنے کو خدا کہتے تھے۔ سب کا ظہور ایسے ہی وقتوں میں ہوا جب خدا پرستی اور نیک عملی کی روشنی بجھ چکی تھی۔ سب انہی قوموں میں پیدا ہوئے جن قوموں کو انھوں نے مخاطب کیا تھا۔ سب کی زبانوں پر پکار ایک تھی۔ سب نے ایک طرح سے لوگوں کو بلایا۔ سب نے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ سب نے کہا کہ ظلم و بدعملی سے باز آجاؤ۔ اس کا نتیجہ ہلاکت ہے سب نے کہا کہ ہماری جدوجہد ادائے فرض ہے۔ مزدوری کی طلب نہیں سب نے کہا کہ ہمارے پاس علم و یقین ہے۔ ہم تمہیں ظن و جہل سے بچانا چاہتے ہیں۔ سب نے کہا کہ ہمارا دعویٰ اس کے سوا کچھ نہیں کہ ایمان و عمل صالح کے نتائج کی بشارت دینے والے ہیں۔ انکار و بدعملی کے نتائج سے خبردار کرنے والے ہیں۔ ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ سب نے کہا کہ تمہارا بھروسہ اپنی طاقتوں پر ہے۔ ہمارا اللہ سبحانہٗ پر ہے تم جو کچھ کر سکتے ہو کر لو ہم اپنے کام سے باز آنے والے نہیں۔ سب نے کہا کہ اگر مانتے نہیں تو کم از کم حق کے مقابلے

میں سرکشی کرنا چھوڑ دو کیونکہ سرکشی کا نتیجہ عذاب ہے۔

آئیے اب ان قوموں کو دیکھئے جن میں یہ انبیاء دعوت لے کر آئے۔ یہاں بھی ہر قوم اپنے طرز عمل میں ٹھیک ٹھیک دوسری قوم کی کاپی ہے اور کس طرح گمراہی کا چہرہ ہمیشہ ایک ہی جیسا ہے۔ جس طرح ہدایت کا چہرہ ایک رہا ہے کوئی بات بھی ایسی نہیں ہے جس میں ظلم و فساد کی ایک نمود ظلم و فساد کی دوسری نمود سے ہم رنگ ہو۔ سب نے اپنی اپنی باری وہ ہی کچھ کیا جو ان میں سے ایک نے کیا تھا۔ سب نے دعوت سے انکار کیا۔ سب نے انبیاء کا مذاق اڑایا۔ سب نے دلیلوں سے بے رخی کی۔ سب نے روشنیوں سے آنکھیں بند کر لیں۔ سب سرکشی کی چال چلے۔ سب نے جبر و تشدد سے دعوت کا مقابلہ کیا۔ سب نے موعظت و نصیحت کا جواب ظلم و تعدی سے دیا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی طرح کی صدائیں نکلیں۔ سب کے اعراض و انکار کا مزاج ایک طرح کا رہا۔ سب کو غرور و طغیان نے آخر وقت تک اس کی مہلت نہ دی کہ روشنی و تاریکی میں امتیاز کرتے۔ پھر انبیاء کی دعوت کو مانا تو کن لوگوں نے اور کتنوں نے مانا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ بے نواؤں اور درماندوں نے قبول کیا۔ اور سرداروں اور رئیسوں نے مقابلہ کیا۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ جنھوں نے مانا وہ تھوڑے تھے جنھوں نے انکار کیا وہ بہت تھے۔ نتیجہ بھی ہمیشہ ایک رہا کہ مومنوں نے اپنے ایمان کی وجہ سے نجات پائی اور سرکشوں نے اپنی سرکشی اور ظلم و فساد کی سزا بھگتی۔

یہ گویا اس معاملہ کا قدرتی خاصہ تھا اور خاصہ کبھی بدل نہیں سکتا فما کان اللہ لیظلمھم ولکن کانوا انفسھم یظلمون۔ یعنی اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ لوگوں پر ظلم کرے یہ تو ان کے ظلم کا قدرتی خاصہ ہے کہ ہلاکت ہو۔ یہ آگ کے لیے گرمی اور برف کے لیے ٹھنڈک تھی۔ سنکھیا کے لیے ہلاکت تھی۔ آگ جب سلگے گی۔ گرمی ہی ہو گی۔ برف جب جمے گی ٹھنڈک ہو گی۔ سنکھیا جب کھائی جائے گی ہلاکت لائے گی[1]

توجہ طلب حقیقت

یہی صورت حال حضور اقدس کی بعثت کے وقت بھی پیش آئی۔ دعوت کی آواز مظلوم تھی۔ اس کا انکار جابر و سرکش معاند کر رہے تھے معاندین ہلاک ہوئے۔ مظلومی اور بے چارگی کو کامیابی ہوئی۔

غور فرمائیے کہ ناکامی کن کو ہوئی اور کامیابی کس کو ہوئی اور کتنے عرصہ میں ہوئی صرف ۲۳ سال کے قلیل عرصہ میں۔ معاملہ محض پیغام حق کی تبلیغ کا تھا جو صلح و امن کے ساتھ برابر جاری رہا کس طرح اور کیوں کر اس کے مفصل حالات ہمیں معلوم نہیں۔ یہاں تک کہ ہجرت کے آٹھویں سال عرب کی اندرونی کش مکش ختم ہو گئی۔

[1] ترجمان القرآن

اور تبلیغ نے پہلی منزل کامیابی سے طے کر لی یعنی عرب جوق در جوق گروہ در گروہ حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ جو وجودِ اقدس حق و باطل کی پہلی امتحان گاہ میں یعنی غزوہ بدر میں صرف ۳۱۲ جانباز لا سکا تھا۔ وہ تبوک کی جانب روانہ ہوا تو اس کا پرچم حق تیس ہزار سرفروشوں پر لہرا رہا تھا۔ اتنا بڑا لشکر اس سے پہلے عرب کی سرزمین سے کبھی نہیں اٹھا تھا۔

کیا حقیقتہً مسلمانوں اور مخالفوں کا زیادہ سے زیادہ ڈیڑھ ہزار جانوں کے نقصان کے ساتھ اتنا عظیم القدر کارنامہ انجام دینے کی کوئی مثال روئے زمین کی سرگذشت کے کسی حصے سے بھی پیش کی جا سکتی ہے۔

پھر یہ روشن حقیقت بھی پیشِ نظر رکھیے کہ اتنے سے معمولی نقصان سے صرف آٹھ نو سال میں یہ سب کچھ عملی صورت میں دنیا کے سامنے آ گیا اور آسمان سے کوئی پتھر نہیں برسے۔ زمین میں کوئی زلزلہ نہیں آیا۔ ہوا اور آندھی کا کوئی جھکڑ نہیں چلا اور مدینہ کی شہری مملکت حیاتِ طیبہ میں روزانہ ۲۷۴ میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی رہی۔ قریباً ہندو پاکستان کے برابر وسیع علاقہ فتح ہوا۔ کیا اس وجودِ اقدس کے رحمۃ للعالمین ہونے میں کسی کو کوئی شک ہو سکتا ہے۔ لوگ معجزوں کا انکار کرتے ہیں۔ اس سے زیادہ پُرتاثیر اور ناقابلِ انکار معجزہ کون سا ہو سکتا ہے۔

وَالْمُؤْمِنُوْنَ وَالْمُؤْمِنٰتُ بَعْضُهُمْ اَوْلِيَآءُ بَعْضٍ ۘ يَاْمُرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَيَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَيُقِيْمُوْنَ الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوْنَ الزَّكٰوةَ وَيُطِيْعُوْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ اُولٰٓئِكَ سَيَرْحَمُهُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۷۱﴾ وَعَدَ اللّٰهُ الْمُؤْمِنِيْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَا وَمَسٰكِنَ طَيِّبَةً فِيْ جَنّٰتِ عَدْنٍ ؕ وَرِضْوَانٌ مِّنَ اللّٰهِ اَكْبَرُ ؕ ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيْمُ ﴿۷۲﴾

ع ۹ ۱۵

اور مومن مرد اور مومن عورتیں باہم ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔ نماز قائم رکھتے ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ ورسول کے حکم پر چلتے ہیں۔ یہی لوگ تو ہیں جن پر اللہ ضرور رحم فرمائے گا بلاشبہ اللہ بڑے غلبے اور حکمت والا ہے[۷۱]۔ اللہ نے مومن مردوں اور عورتوں سے ایسے باغات کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ وہ ان میں سدا رہیں گے اور ان سے ہمیشگی کے باغات میں صاف ستھری رہائش گاہوں کا بھی وعدہ کیا ہے اور سب سے بڑی نعمت رضائے الٰہی ہے۔ یہی سب سے بڑی کامیابی ہے[۷۲]۔

معانی مفردات

اولیاء یہ ولی کی جمع ہے جیسے نبی کی جمع انبیاء آتی ہے۔ ولی فعیل کے وزن پر صفت کا صیغہ ہے۔ اس کے دو مصدر آتے ہیں۔ ولی اور ولایۃ۔ ولی کے معنے لگاؤ، تعلق اور قربت کے ہیں۔ اور لگاؤ کے معنی کی رعایت سے اس کے معنے محبت، قرابت اور رفاقت کے آتے ہیں۔ اسی وجہ سے علماء نے اس کے معنے محبت کرنے والے کے کیے ہیں۔ نکاح اور جنازے کے موقعہ پر عورت کا ولی اور میت کا ولی اسی معنے میں بولا جاتا ہے۔ اس آیت میں بھی اسی معنے میں ہے اردو میں رفاقت اور مددگاری اسی کے لیے آتا ہے

جنات۔ جنت کی جمع ہے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جنات بلفظ جمع قرآن میں اس لیے آیا ہے کہ جنتیں سات ہیں (۱) جنۃ الفردوس (۲) عدن (۳) جنۃ النعیم (۴) دار الخلد (۵) جنۃ الماویٰ۔ (۶) دار السلام (۷) علیین۔

رضوان رضامندی۔ خوشنودی، مرضی۔ رضا، رضی یرضی کا مصدر ہے رضا کثیر یعنی بڑی رضامندی اللہ کی رضامندی ہے اور نہایت خوشنودی کو رضوان کہتے ہیں اور چونکہ سب سے بڑی رضامندی اللہ کی رضا ہے اس لیے قرآن میں رضوان کا لفظ جہاں بھی استعمال ہوا ہے رضائے الٰہی کے لیے خاص ہے۔

اہلِ ایمان کا چہرہ

اس سے پہلے مردم شماری کے ان مسلمانوں کا چہرہ پیش کیا گیا تھا جو ایمان کا دعوے کرتے تھے مگر ایمان کا کوئی تقاضا پورا نہ کرتے تھے بلکہ ان کی زندگی کفر کے تقاضوں کی نمائندگی کرتی تھیں۔ اب ان منافقین کے مقابلہ ان مخلصین کا چہرہ پیش ہو رہا ہے جو زندگی کی ہر شاخ میں ایمان کے تقاضے پورے کرتے ہیں۔ باہم محبت و وداد سے دل جڑے ہوئے ہیں سب کے پیش نظر ایک مقصد ہے اور مقصد کی خاطر سب کی لگن ایک ہے، ان میں اتحاد بھی ہے ایتلاف بھی ہے اور ان میں پورا پورا نظم بھی ہے وہ ایک مرکز سے وابستہ ہیں۔ اس سے زیادہ بھرپور چہرہ پیش نہیں کیا جا سکتا جو ان چند جملوں میں پیش کر دیا گیا ہے بلکہ اس سے زیادہ خوبصورت بات کسی انسانی گروہ کی مدح وستائش میں نہیں کی جا سکتی۔ جو ان جملوں میں کہہ دی گئی ہے ایمان۔ باہمی محبت معروف کے حکم اور منکر کی روک تھام، نماز، زکوٰۃ کے ساتھ پوری زندگی میں طاعت کی سرشاریوں کے بعد کون سی چیز باقی رہ گئی۔ خواہ اس کا دائرہ کوئی ہو۔

(۷۲) اور مومن مرد اور مومن عورتیں باہم ایک دوسرے کے رفیق اور مددگار ہیں نیکی کا حکم دیتے اور برائی سے روکتے ہیں۔ نماز قائم رکھتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں اور اللہ و رسول کے حکم پر چلتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جن پر اللہ ضرور رحمت فرمائے گا۔ بلاشبہ اللہ بڑے غلبے اور حکمت والا ہے۔ ابتدائے رکوع میں منافقین کے اوصاف بیان ہوئے ہیں یہاں بطور مقابلہ مومنین کی صفات بیان ہوئی ہیں یعنی جب کہ منافقین لوگوں کو بھلائی سے روک کر برائی کی ترغیب دیتے ہیں مومنین بدی کو چھڑا کر نیکی کی طرف آمادہ کرتے ہیں۔ منافقین کی مٹھی بند ہے مومنین کا ہاتھ کھلا ہوا ہے وہ بخل کی وجہ سے خرچ کرنا نہیں جانتے یہ اموال میں سے باقاعدہ حقوق زکوٰۃ وغیرہ ادا کرتے ہیں انھوں نے خدا کو بالکل بھلا دیا یہ پانچ وقت خدا کو یاد کرتے ہیں۔ اور تمام معاملات میں خدا اور رسول کے احکام پر چلتے ہیں اسی سے وہ مستحق لعنت ہوئے اور یہ رحمت خصوصی کے امید وار ٹھہرے [1]

آیت کی تشریح سے پہلے ذرا اس پر غور فرمائیے کہ یہاں نفاق و ایمان کا ایک جامع اور اہم تقابل مطالعہ پیش کیا ہے۔

(۱) نفاق کے مقابلے میں ایمان۔
(۲) ان کی ہم آہنگی کے مقابلے میں اہل ایمان کی ولایت۔
(۳) امر بالمنکر کے مقابلے میں امر بالمعروف۔
(۴) نہی عن المعروف کے مقابلے میں نہی عن المنکر۔
(۵) قبض ایدی کے مقابلے میں ایتاء زکوٰۃ۔
(۶) خدا فراموشی کے مقابلے میں اقامت صلاۃ۔
(۷) فسق کے مقابلے میں اطاعت۔
(۸) لعنت کے مقابلے اللہ کی رحمت۔
(۹) نار کے مقابلے میں جنات۔
(۱۰) عذاب مقیم کے مقابلے میں رضوان من اللہ اکبر۔

یہ ایمان و کفر میں باہمی تقابل نہیں بلکہ ایمان و نفاق میں تقابل ہے۔
حکیم الامت شاہ ولی اللہ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔

[1] افادات شیخ الاسلام

حضور اقدس ﷺ کی بعثت پوری مخلوق کی طرف چونکہ اس لیے ہوئی ہے کہ آپ کا دین دنیا کے سارے ادیان پر غالب و برتر ہو۔ اس لیے آپ کے دین میں چند قسم کے لوگوں کا ہونا ناگزیر ہوا۔ ان اقسام میں ایک امتیازی کسوٹی آپ نے بتائی ہے پہلی کسوٹی تو ان لوگوں کے لیے ہے جو دین کو ماننے والوں اور نہ ماننے والوں میں امتیاز بتائے۔ دوسری کسوٹی ان کے لیے جو دین میں پوری بشاشت اور اخلاص سے داخل ہیں اور ان میں جو دین میں داخل ہیں لیکن ان میں بشاشت ایمان نہیں ہے۔ اس لیے حضور اقدس نے ایمان کی دو قسمیں بتائی ہیں۔ ایک وہ ایمان جس پر احکام دنیا کا مدار ہے یعنی جسے اختیار کرنے کے بعد اس کی جان مال آبرو محفوظ ہو جائے۔ دوسرا وہ ایمان جس پر آخرت کی نجات موقوف ہے پہلے ایمان کا مقابل کفر ہے جب کہ دوسرے ایمان کا مقابل نفاق ہے چاہے اندر تصدیق نہ ہو تلوار کے خوف سے ظاہر میں مسلمان ہو اور چاہے تصدیق کرتا ہو مگر عملی زندگی میں ایمان کے تقاضے پورے نہ کرتا ہو۔ پہلا اصل منافق ہے دوسرا عملی نفاق ہے اسی کو فاسق بھی کہتے ہیں۔

ان آیات میں کفر و ایمان کا نہیں بلکہ ایمان و نفاق کا مقابلہ پیش کیا ہے۔ منافقین کے مقابلے میں ان کے دس اوصاف بتائے گئے ہیں۔

صحابہ کرام میں صفتِ ایمان

اوّل ایمان۔ نام ہے اس یقین جازم کا جس میں شک کا کوئی کانٹا نہ ہو۔ ایسا یقین جازم جس کے نتیجے میں انقیاد باطن، التزام طاعت اور عہد وفاداری نمایاں ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ صرف تصدیق قلبی نہیں بلکہ انقیاد قلبی اور التزام طاعت بھی اس کا ایک اہم جز ہے اگر ایک شخص تصدیق رکھتا ہے مگر عہد وفاداری نہیں کرتا وہ مومن نہیں کہلا سکتا ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور اسلام کے قانون پر عمل پیرا ہونے کا عزم بھی مصمم ہو گویا شرعی تصدیق اسی کا نام ہے۔

امام حسن بصری رحمہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔

ایمان صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ اور آرزوئں کا نام نہیں ہے بلکہ ایمان اسے کہتے ہیں جو دل میں سرایت کر جائے اور اعمال بھی اس کی تصدیق کریں۔

صحابہ کرام کا ایمان صرف ایمان نہیں بلکہ نمونہ کا ایمان ہے امنوا کما امن الناس میں اس کی طرف

اشارا ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ دعویٰ ایمان کے صحیح یا غلط ہونے کا معیار صرف صحابہ کرام کا ایمان ہے۔ جو اس کے مطابق نہیں وہ قرآن کی نظر میں ایمان نہیں۔ اس ایمان کو نفاق کے مقابلے میں لایا گیا ہے اس کا مطلب ہے کہ صحابہؓ کا ایمان صرف زبانی دعویٰ نہیں ہے بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے جسے انھوں نے واقعی اپنا لیا ہے جو ان کی زندگی کا اوڑھنا بچھونا ہے اور وہ اس پر خوش ہیں کہ اللہ ان کا رب ہے اسلام ان کا دین ہے اور حضور اقدس ﷺ اللہ کے رسول ہیں۔ اور اس میں اس قدر سرشار ہیں کہ اس سرشاری میں ان کو ایمان کی حلاوت محسوس ہوتی ہے ارشاد ہے۔

جس شخص میں تین باتیں ہوں گی اسے ایمان کا مٹھاس محسوس ہوگا اللہ ورسول اسے سب سے زیادہ محبوب ہوں جب وہ کسی سے محبت کرے تو بس اللہ کے لیے کرے۔ کفر میں واپس جانے کو ایسا ہی بُرا مانے جیسا آگ میں گرنے کو۔

صحابہ کرام میں صفتِ ولایت

دوسری صفت صحابہ کرام کی یہ بتائی گئی ہے۔ بعضھم اولیاء بعض اولیاء ولی کی جمع ہے ولی کے معنے محبت، مددگار بھائی کے ہیں یعنی صحابہ میں باہم محبت ہے۔ یہ محبت انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی ہے محبت کی تصویر صحیحین کی حدیث میں یہ بتائی گئی ہے۔

مسلمانوں کی باہم محبت کی مثال ایسی ہے جیسے ایک جسم اور اس کے مختلف اعضاء ایک عضو میں اگر درد ہو تو سارا جسم درد محسوس کرتا ہے اور اس کی بے چینی اور تکلیف میں اسی طرح حصہ لیتا ہے جیسے خود اس کے اندر درد اٹھ رہا ہو۔

صحیح بخاری کی ایک حدیث میں اس محبت کی یہ مثال دی ہے۔

مسلمان کی مسلمان کے لیے مثال دیوار کی سی ہے ہر اینٹ دوسری اینٹ سے سہارا لیتی ہے۔

پھر تشبیک اصابع سے اس کی تصویر بتلا دی یعنی ایک ہاتھ کی انگلیاں دوسرے ہاتھ کی انگلیوں میں رکھ کر کہ اس طرح ایک دوسرے سے جڑا ہوا اور متصل ہے۔ ان احادیث میں بھی بتایا گیا کہ مسلمانوں کی محبت متفرق اینٹوں کا نام نہیں ہے دیوار کا نام ہے الگ الگ اینٹ کا کوئی مستقل وجود نہیں۔ ہے تو اجتماعی وجود ہے، منافقین کے تذکرے میں بعضھم من بعض اور یہاں بعضھم اولیاء بعض فرمایا۔ اشارا ہے کہ مومنین میں تعلق اخوت مودۃ اور بھائی چارے کا ہے جب کہ منافقین میں ہم آہنگی صرف شکوک اور

تذبذب میں ہے۔ اہل ایمان کا باہم تعلق اصول ومقاصد کی بنا پر ہے جب کہ منافقین میں ہم آہنگی اغراض کی بنیاد پر ہے۔ اہل ایمان زبان کی سچائی دل کی سچائی اور عمل کی سچائی کی تصویر ہیں جبکہ منافقین رذائل کی نمائندگی کرتے ہیں

صحابہ کرام میں امر بالمعروف

تیسری بات صحابہ کرام کے بارے میں یہ بتائی گئی ہے کہ یہ جماعت امر بالمعروف کرتی ہے اور چوتھی یہ کہ یہ جماعت برائیوں سے روکتی ہے۔ تمام ایسی خوبیاں، بھلائیاں، نیکیاں جو سب کی جانی پہچانی ہوں معروف کہلاتی ہیں۔ ان کی کوئی آخری حد نہیں ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ اہل ایمان کے افراد پر ان کی قوت کے بقدر جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ قرآن نے اسی کو اہل ایمان کے دوسری امتوں کے مقابلے میں برتر اور بہتر ہونے کا معیار قرار دیا ہے۔ کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف و تنھون عن المنکر۔ دیکھو آل عمران جلد چہارم کا نوٹ ۱۹۲-۲۰۳۔ قاضی شوکانی فرماتے ہیں ہر وہ اچھی بات حالت عادت اور کام جسے عقل پسند کرے اور اس پر جی مطمئن ہو۔ معروف کہلاتا ہے قرآن میں یہ لفظ کئی بار آیا ہے اور اس میں بڑی جامعیت ہے اس کے معنے میں ہر نیک کام جس میں اللہ کی اطاعت یا لوگوں سے حسن سلوک ہو یا جس کام کی اخلاق نے ترغیب دی ہو داخل ہے۔ معروف حسن صحبت اور حسن معاشرت کو بھی کہتے ہیں۔ مروت اور احسان کو بھی کہتے ہیں۔ قرآن میں حسن اخلاق، حسن گفتار، حسن کردار، حسن معاملہ، حسن سلوک، حسن ادا اور انسانی اقدار سے متعلق ہر نیکی کو معروف کہا گیا ہے۔ گویا قرآن وسنت کی زبان میں لفظ معروف تمام اخلاقی، مالیاتی، انتظامی، معاشی، تمدنی، تہذیبی، سیاسی فضائل اور خوبیوں کے لیے ایک جامع لفظ ہے اور معروف کی طرح منکر میں بھی جامعیت ہے یہ لفظ تمام اخلاقی، تمدنی، تہذیبی، مالیاتی، معاشی سیاسی اور انتظامی رذائل کے لیے بولا جاتا ہے۔ مطلب ہے کہ اہل ایمان کے سارے احوال، اطوار اور اقدار میں معروف ہی معروف ہے منکر کا کہیں نام ونشان نہیں بلکہ وہ دنیا میں معروف پھیلا رہے ہیں اور منکرات کو روک رہے ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو منکرات کو پھیلا رہے ہیں اور خوبیوں پر قدغن قائم کر رہے ہیں۔ انصاف سے کہیے کہ زندہ رہنے کا حق کس کو۔ اس کو جس کا وجود انسانیت کی پیشانی پر داغ ہے یا اس کو جو انسانیت کے چہرے کا غازہ ہے۔

یہی تو وہ تعلیم ہے جو تمام دنیا کے مذاہب میں اسلام کے اخلاق کی نگرانی کے لیے اصول کو ممتاز کرتی ہے اور قومی ہمت افراد کا یہ فرض قرار دیتی ہے کہ وہ جماعت اور سوسائٹی کے مزاج اور اقوام کی نگہبانی

اور اس کے بگاڑ کی دیکھ بھال کرتے رہیں۔

صحابہ کرام میں اقامتِ صلاۃ

پانچویں اور چھٹی بات یہ بتائی گئی ہے کہ یہ اہلِ ایمان نماز قائم کرتے ہیں اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ سے بندوں کے تعلقات دو طرح کے ہیں ایک محبت کے دوسرے محکومیت کے۔ محبت کا مطلب یہ ہے کہ بندوں کے اللہ سبحانہ محبوب ہیں۔ محکومیت کا مطلب یہ ہے کہ بندے اللہ سبحانہ کے محکوم اور اللہ حاکم ہیں۔ محبت کے اعتبار سے اللہ کی پرستش کی جاتی ہے۔ جب کہ حاکم ہونے کے اعتبار سے اللہ کی بندگی کی جاتی ہے اسلامی عبادات میں دو عبادتیں روزہ اور حج، اللہ کی محبوبیت کا مظہر ہیں جب کہ نماز اور زکوٰۃ، اللہ کی بندگی کا شاہکار ہیں۔ اسی لیے قرآن نے کسی حکومت کے اسلامی ہونے کا پیمانہ یہ بتایا ہے۔

الذین ان مکناھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ وامروا بالمعروف ونھوا عن المنکر۔

وہ لوگ کہ اگر ہم ان کو زمین میں اقتدار دیں گے تو نماز قائم کریں گے زکوٰۃ دیں گے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کریں گے۔

اس کا مطلب ہے کہ اہلِ ایمان کا اللہ سے محکومانہ تعلق ہے۔ ان کے قلب و دماغ پر اللہ سبحانہ کی حاکمیت کا سکہ ہے۔ جب کہ منافقین کا اللہ سے محکومانہ تعلق مخلصانہ نہیں ہے۔ منافقین خدا فراموش ہیں اور اہل ایمان میں یادِ الٰہی کی سرشاریاں اقامتِ صلاۃ کی صورت میں موجود ہیں۔ منافقین راہ خدا میں خرچ کرنے میں بخیل ہیں جب کہ اہلِ ایمان حُبِّ مال سے دور ہیں اور راہ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔

ان ہی دو کو توبہ کے بعد اسلامی زندگی کی نشانی قرار دیا ہے۔ قرآن میں ہے۔

فان تابوا واقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ فاخوانکم فی الدین۔

اگر وہ توبہ کریں، نماز قائم کریں، زکوٰۃ دیں تو تمہارے دینی بھائی ہیں۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ اسلام میں دینی اخوت کا پیمانہ ہی نماز اور زکوٰۃ ہیں۔

اسلام کی تعلیم اور قرآن میں نماز اور زکوٰۃ کو یکجا ذکر کیا گیا ہے نماز اگر حقوق اللہ سے تعلق رکھتی ہے تو زکوٰۃ کا تعلق حقوق العباد سے ہے۔ ان دونوں فریضوں کا باہم لازم و ملزوم اور مربوط ہونا اس حقیقت کو منکشف کرتا ہے کہ اسلام میں حقوق اللہ اور حقوق العباد میں ہم آہنگی رکھی گئی ہے۔ قرآن میں جہاں کہیں نماز کا ذکر

ہے اس کے ساتھ ہی زکوٰۃ کا بھی ذکر کیا گیا ہے۔ قرآن کے جس مقام پر دونوں کو یکجا ذکر کیا گیا ہے۔ بارگاہ نبوت میں آکر جب کسی نے اسلام کے احکام دریافت کیے تو ہمیشہ آپ نے نماز کے ساتھ زکوٰۃ کو بیان فرمایا صحیحین کی کتاب الایمان میں اس قسم کی متعدد حدیثیں ہیں بلکہ کبھی کبھی ان دونوں کو اسلام کی شرائط بیعت ہی میں داخل کر لیا۔ چنانچہ حضرت جریر بن عبداللہ البجلی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت تین باتوں پر کی تھی نماز، زکوٰۃ اور ہر مسلمان کی خیر خواہی۔ اسی پر بس نہیں ایک قدم بڑھا کر اس پر بھی غور فرمائیے کہ اسلام میں جنگ کے خاتمہ کے لیے بھی توبہ کے بعد ان دو کو اساس قرار دیا ہے۔ عبداللہ ابن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ:

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے مجھے حکم ہوا ہے کہ لوگوں سے اس وقت تک جنگ جاری رکھو جب تک وہ یہ گواہی نہ دیں کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے رسول ہیں۔ نمازیں ادا کریں زکوٰۃ دیں۔ جب یہ کرلیں تو میری جانب سے ان کو ان کی جانوں اور مالوں کے تحفظ کی ضمانت ہے سوائے اس کے کہ قانون ہی گرفت کرے اس کے بعد ان کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

اس کے بعد یہ تحقیق ہی نہ کی جائے گی کہ یہ نمازیں اور زکوٰتیں حقیقی ہیں۔ یا ناشی اور وقتی، بہرحال اسلام میں ان دونوں کو خاص اہمیت ہے ان میں سے ایک کا انکار اسلام میں فوجداری جرم ہے۔

صحابہ میں طاعت کی سرشاریاں

اہل ایمان میں اللہ ورسول کے لیے طاعت کی سرشاریاں ہیں۔ طاعت اللہ سبحانہ کی شان حاکمیت کا تقاضا ہے جیسے عبادت اللہ کی شان محبوبیت کا تقاضا ہے۔ حاکمیت میں نیابت ہو سکتی ہے اس لیے خدا کی نیابت میں رسول کی طاعت کا حکم ہے۔ اور رسول کی طاعت کو بھی خدا کی طاعت کہا گیا ہے۔ اسی نیابت کی وجہ سے طاعت کا دائرہ قرآن میں وسیع کر دیا گیا ہے خدا کے رسول کی اطاعت کے ساتھ مسلمان اولی الامر کی اطاعت کا بھی حکم دیا گیا ہے۔ قرآن میں ہے۔

> یاایھا الذین امنوا اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم۔

اسی لیے ارشادات میں یہ بات پوری قوت سے سمجھائی گئی ہے۔

> من اطاعنی فقد اطاع اللہ من اطاع امیری فقد اطاعنی من عصٰی امیری

نقد عصانی۔

جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی، جس نے میرے امیر کی اطاعت کی، میری اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی نافرمانی کی اس نے میری نافرمانی کی۔

یعنی امیر المومنین کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے اور رسول کی اطاعت اللہ کی اطاعت ہے صحیحین میں حضرت انس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی حدیث ہے۔

اسمعوا واطیعوا وان استعمل علیکم عبد حبشی۔

ایک حقیر صورت حبشی بھی امیر ہو تو چاہیے اس کی سنو اور طاعت کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ بار بار اور کثرت سے آپ خطبوں میں ارشاد فرماتے تھے۔ اس سے مختلف لفظوں میں اور مختلف مواقع کی نسبت مروی ہے۔

حجۃ الوداع کے موقعہ پر فرمایا۔

لواستعمل علیکم عبد یقودکم بکتاب اللہ اسمعوا واطیعوا۔ (مسلم)

اگر کوئی غلام بھی تم پر امیر ہو اور وہ کتاب اللہ کی ساتھ تم پر حکومت کرے تم اس کی بات سنو اور اطاعت کرو۔

اطاعت امیر کی اسی زندگی کو احادیث میں جماعت اور اسلامی زندگی قرار دیا ہے اور اس کے عکس کو جاہلیت

صحیح بخاری و مسلم میں ہے۔

جس نے جماعت کا ساتھ چھوڑ دیا اور خلافت کی طاعت سے باہر ہو گیا اور اسی حالت میں بغیر توبہ کے مر گیا تو اس کی موت جاہلیت کی موت ہو گی۔

اس کے علاوہ بے شمار احادیث ہیں جن میں یہی حقیقت واضح کی گئی ہے۔ بہر حال آیت قرآن کا مطلب یہ ہے اہل ایمان کی زندگی سر تا سر اسلامی ہے وہ جماعت میں منسلک ہیں اور حضور اقدس کی بر خلوص طاعت کرتے ہیں، منافقین کی طرح نہیں کہ صرف اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے طاعت کرتے ہیں اور مفادات کو خطرے میں دیکھ کر اطاعت کا جوا اتار کر پھینک دیتے ہیں۔ مقدمات یہودی عدالتوں میں لے جاتے ہیں اور قرآن پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں۔ یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت نبوت پر ایمان کا دعویٰ کرتے ہیں لیکن نبوت کی حاکمیت کو تسلیم نہیں کرتے۔

اہل ایمان اللہ کی رحمت کے حقدار ہیں

ان اہل ایمان پر جن کے یہ اوصاف بیان ہوئے ہیں کہ وہ نعمت ایمان سے مالا مال ہیں۔ اور آپس میں اتحاد ایتلاف امتزاج اور نظم رکھتے ہیں۔ زندگی میں نیکیوں کی تلقین کرتے ہیں۔ برائیوں کو مٹاتے اور ان سے روکتے ہیں۔ خدا کی بندگی کے لیے اقامت صلاۃ اور ایتاء زکوٰۃ کرتے ہیں اور سب خوبیوں کے ساتھ زندگی کے ہر گوشہ اخلاق۔ خاندان۔ معاشرت۔ معاش۔ سیاست۔ قانون اور روحانیت میں اللہ اور نائب کی حیثیت سے اس کے رسول کی اطاعت کی سرشاریوں سے مالا مال ہیں۔ ان پر اسی دنیا میں اللہ ضرور رحمت فرمائے گا سیرحمھم میں س تاکید کے لیے ہے۔

اہل ایمان۔ اور منافقین کا کردار الگ الگ آپ نے پڑھ لیا اس سے آپ کو اندازہ ہو گیا ہو گا کہ اگرچہ ایمان کے ظاہری افراد کی حد تک دونوں میں ہم آہنگی ہے اور اسلام کی پیروی کے خارجی اظہار میں دونوں مشترک ہیں لیکن دونوں کے مزاج اخلاق، اطوار، عادات اور طرز فکر و عمل ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ جہاں زبان پر ایمان کا دعویٰ ہے مگر دل سچے ایمان سے خالی ہیں وہاں زندگی کا سارا ڈھنگ ایسا ہے جو اپنی ایک ایک ادا سے دعویٰ ایمان کی تکذیب کرتا ہے۔ لیبل تو ایمان کا لگا رکھا ہے۔ مگر کردار و اخلاق سے اس نمائشی لیبل کی تائید نہیں ہوتی ہے۔ بخلاف اس کے جہاں ایمان اپنی اصل حقیقت کے ساتھ موجود ہے وہاں ایمان اپنی صورت اپنی مہک اپنی خاصیت سے اپنے تقاضے سے ہر آزمائش اور ہر معاملہ میں اپنا کھرا پن ظاہر کر رہا ہے۔ اسلام و ایمان کے عرفی نام نے بظاہر دونوں اہل ایمان اہل نفاق کو ایک امت بنا رکھا ہے مگر فی الواقع منافق مسلمانوں کا اخلاقی مزاج اور رنگ طبیعت کچھ اور ہے اور صادق الایمان مسلمانوں کا کچھ اور۔ اسی لیے منافقانہ خصائل و عادات والے مسلمان معاشرے میں خصوصی علامات سے پہچانے جاتے ہیں مثلاً یاد الٰہی سے غفلت۔ برائی سے دلچسپی۔ نیکی سے بعد اور خیر سے عدم تعاون کی مشترک خصوصیات نے ایک دوسرے سے وابستہ اور اہل ایمان سے عملاً بے تعلق کر دیا ہے۔ اور دوسری جانب سچے مرد و زن ایک دوسرا گروہ ہیں جس کے سارے افراد میں یہ خصوصیات مشترک ہیں کہ نیکی سے وہ دلچسپی رکھتے ہیں بدی سے وہ نفرت کرتے ہیں۔ اللہ کی یاد ان کے لیے غذا کی طرح زندگی کی ناگزیر ضرورت ہے۔ راہ خدا میں خرچ کرنے کے لیے ان کے دل اور ہاتھ کھلے ہیں اور خدا و رسول کی اطاعت ان کی زندگی کا شعار ہے اس مشترک اخلاقی مزاج اور طرز زندگی نے ان میں باہم اتحاد ایتلاف اور امتزاج پیدا کیا ہوا ہے اور منافقین کے گروہ سے ممتاز کر دیا ہے۔

اہلِ ایمان کے لیے اللہ کا وعدہ

(۷۲) اللہ نے مومن مردوں اور مومن عورتوں سے ایسے باغات کا وعدہ کیا ہے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی وہ ان میں سدا رہیں گے اور ان سے ہمیشگی کے باغات میں صاف ستھری رہائش گاہوں کا وعدہ کیا ہے اور سب سے بڑی نعمت رضائے الٰہی ہے یہی سب سے بڑی کامیابی ہے۔ یعنی تمام نعمائے دنیوی و اخروی سے بڑھ کر حق تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی ہے جنت بھی اسی لیے مطلوب ہے کہ وہ رضائے الٰہی کا مقام ہے۔ حق تعالیٰ شانہ مومنین کو جنت میں ہر قسم کی جسمانی و روحانی نعمتیں اور مسرتیں عطا فرمائے گا۔ مگر سب سے بڑی نعمت محبوب حقیقی کی دائمی رضا ہوگی۔ حدیث صحیح میں ہے۔ کہ حق تعالیٰ شانہ اہلِ جنت کو پکاریں گے۔ جنتی لبیک کہیں گے دریافت فرمائے گا هل رضيتم یعنی اب تم خوش ہوگئے جواب دیں گے کہ پروردگار خوش نہ ہونے کی وجہ کیا جبکہ آپ نے ہم پر انتہائی انعام فرمایا ہے ارشاد ہوگا هل اعطيكم افضل من ذالك۔ یعنی جو کچھ اب تک دیا گیا ہے کیا اس سب سے بڑھ کر ایک چیز لینا چاہتے ہو جنتی سوال کریں گے کہ اے پروردگار اس سے افضل اور کیا چیز ہوگی اس وقت فرمائیں گے۔ احل لكم رضواني فلا اسخط عليكم بعده ابداً۔ اپنی دائمی رضا اور خوشنودی تم پر اتارتا ہوں جس کے بعد کبھی خفگی اور ناخوشی نہ ہوگی۔ رزقنا الله وسائر المومنين هذه الكرامة العظيمة الباهرة[1]

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے اہلِ ایمان سے یہ وعدے فرمائے ہیں۔

(۱) باغات جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں۔
(۲) ہمیشگی اور دوام۔
(۳) صاف ستھری رہائش جنت عدن میں۔
(۴) رضائے الٰہی۔

سب سے پہلے جنات تجری من تحتها الانهار ہے۔ آخرت کے خانہ عیش و عشرت کے لیے قرآن حکیم نے عموماً جنت کا لفظ استعمال کیا ہے۔ نادان اس کی وجہ یہ سمجھتے ہیں کہ عرب کے شور و بے حاصل اور خشک صحرا کے بسنے والوں کی انتہائی آرزو چونکہ سرسبز شاداب باغوں ہی کی ہوسکتی ہے اس لیے ان کے لیے یہ لفظ اس مقام آخرت کے لیے قرآن نے استعمال کیا ہے مگر سمجھنا یہ چاہیے کہ قرآن کا مخاطب صرف عرب نہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

بلکہ دنیا کا گوشہ گوشہ ہے اس لیے عرب کی تخصیص بے معنے ہے کیا دنیا کے سرسبز شاداب ملکوں کے بسنے والوں کے تخیل میں باغ و راغ اور رنگ و گل کی بہار پسندیدہ نہیں ہے۔ اصل یہ ہے کہ یہاں بیابان و گلستان کی تخصیص نہیں ہے یہ فطرت انسانی کی تصویر ہے۔ انسان کسی خطہ ارضی میں آباد ہو مگر وہ سرسبز و شاداب قطعات باغ و بہار اور کنار آب و نہر کو عیش و مسرت کا مقام سمجھتا ہے اور ان کو دیکھ کر اندر سے اس کی روح وجد کرتی ہے۔

اس استعارے کے استعمال کا ایک اور نکتہ بھی توجہ کے قابل ہے اہل و عیال اور مال و دولت کے متعلق ہر قسم کی فکریں اس کے دل کے دامن سے لپٹی ہوتی ہیں مگر جب انسان سیر و تفریح کے لیے باغ و چمن کا رخ کرتا ہے تھوڑی دیر کے لیے وہ ہر غم کو بھول جاتا ہے اور ہر تعلق کو دل سے نکال دیتا ہے اور ایسا شاداں و فرحاں بن جاتا ہے کہ غم و الم اس کے ہر گوشہ خاطر سے دور ہو جاتے ہیں۔ قرآن نے اس لفظ کو اس لیے استعمال کیا ہے تاکہ اس سے اخروی عیش و مسرت شادی و خوشی اور فراغ خاطر کی پوری تصویر سامنے آجائے۔

دوسرا وعدہ یہ فرمایا ہے کہ اہل ایمان جنت میں سدا رہیں گے یعنی مکان جنت اور مکین اہل ایمان کو اس زندگی میں بقائے دوام حاصل ہوگا۔ یعنی جنت ہمیشگی کا باغ وہ غیر فانی مملکت ہے۔ جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ابدی، جہاں کی لذت بے انتہا، جہاں کی زندگی غیر منقطع، جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاوداں ہے۔ اس کی تصریح قرآن پاک کی سولہ آیتوں میں مختلف طریقوں سے کی گئی ہے۔

اس تاکید پر تاکید اور پُرزور طریقہ تعبیر پر نظر ڈالیے کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں کیا بلکہ اس کے ساتھ ابداً فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی ظاہر فرمایا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلود جنت کی قطعیت کتنی ہے۔

فنائے راحت اور انقطاع مسرت کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب کا خاتمہ ہو جائے دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے پہلی صورت کی نفی تو قرآن نے فیھا مقیم۔ اکلھا دائم۔ اجر غیر ممنون۔ کہہ کر فرمادی اب رہ گئی دوسری صورت تو اگرچہ خالدین فیھا ابداً میں اس کی نفی بار بار فرمادی مگر ایک جگہ بالتصریح یہ کہہ دیا ہے کہ لایذوقون فیھا الموت۔ ایک تیسری صورت یہی ممکن تھی کہ مسرت کے اسباب بھی رہیں اور اہل جنت کی زندگی بھی دائمی ہو مگر کچھ دنوں کے بعد نکال دیا جائے تو اس کی بھی تصریح فرمادی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا کہ کوئی اہل جنت کو ان کے عیش و آرام کی منزل گاہوں سے نکال سکے فرمایا وما ھم منھا بمخرجین یہ بھی ممکن ہے کہ خود اہل جنت اس سے گھبرا کر نکل آئیں تو فرمایا کہ ان کی جبلت و فطرت ایسی ہوگی کہ وہ خود بھی اس مہمان خانہ الٰہی سے نکلنا پسند نہ

کریں گے خالدین فیہا لا یبغون عنہا حولا۔ اب آخری بات رہ گئی کہ جنت میں ہمیشہ رہیں گے لیکن اس کی ضمانت کیا ہے کہ اللہ سبحانہ اہل جنت سے ہمیشہ راضی رہیں ممکن ہے کہ اللہ سبحانہ ناراض ہو جائیں اور اس کی پاداش میں اس ابدی گھر سے بے گھر ہونا پڑے۔ اس امکان کو حضور اقدس ﷺ نے اس ارشاد کے ذریعے امت کو سمجھایا۔ امام بخاری اور امام مسلم نے حضرت ابو سعید الخدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے بتایا ہے۔

حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ اللہ سبحانہ اہل جنت سے فرمائیں گے کہ اے اہل جنت جنتی کہیں گے لبیک وسعدیک جی جی، اللہ سبحانہ فرمائیں گے کیا تم خوش ہو گئے؟ جنتی کہیں گے اے مولا خوش کیوں نہ ہوں۔ آپ نے ہم پر وہ انعامات نچھاور کیے ہیں جو مخلوقات میں سے کسی کو نہیں ملے۔ اللہ سبحانہ فرمائے گا کیا میں تمہیں اس سے زیادہ اپنی نعمت نہ دے دوں۔ جنتی کہیں گے اے مولا اس سے اونچی نعمت اور کیا ہوگی۔ اللہ سبحانہ فرمائے گا لو میں تم پر اپنی رضا اتارتا ہوں۔ اس کے بعد میں کبھی تم سے ناراض نہ ہوں گا۔

تیسرا وعدہ یہ فرمایا کہ ان کو جنت میں صاف ستھری رہائش گاہیں ملیں گی۔ ومساکن طیبۃ صاف ستھری، رہائش گاہیں کیسی ہوں گی۔ حضور اقدس ﷺ نے ایک سے زیادہ احادیث میں ان مساکن کا چہرہ پیش کیا ہے، یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں ہے۔ مساکن طیبہ کے ساتھ فی جنات عدن کی بھی قید ہے۔ عدن کو بعض علماء علَم قرار دیتے ہیں وہ اس کو جنت میں خاص مقام کا نام بتاتے ہیں اور دلیل میں اس آیت شریفہ کو پیش کرتے ہیں۔

جنات عدن التی وعد الرحمان عبادہ بالغیب۔

کیونکہ یہاں معرفہ کو اس کی صفت لایا گیا۔ نیز بزاز اور دار قطنی اور ابن مردویہ نے حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے یہ روایت کی ہے۔ کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا ہے عدن اللہ سبحانہ کا بنایا ہوا گھر ہے کہ جس کو نہ کسی آنکھ نے دیکھا ہے اور نہ کسی بشر کے دل پر اس کا خیال آیا ہے۔ اس میں انبیاء، صدیقین اور شہداء ان تینوں کے علاوہ کوئی نہ رہنے پائے گا اور اللہ سبحانہ فرمائیں گے اے عدن جو تجھ میں داخل ہوا اس میں خوبی ہے اور جو لوگ عدن کو علم نہیں بلکہ جنت کی صفت بتاتے ہیں وہ کہتے ہیں کہ عدن کے معنے اصل میں استقرار اور ثبات کے ہیں محاورہ ہے عدن بالمکان یعنی اس نے اس جگہ قیام کیا اور عدن سے مراد اقامت علی وجہ الخلود ہے یعنی دائمی طور پر رہنا بسنا اور عدن کے یہی معنے مقام مدح کے مناسب ہیں یعنی جنات اقامت وخلود۔ اس معنے کے اعتبار سے تمام جنتیں جنات عدن ہیں۔ (روح المعانی)

امام قرطبی نے لکھا ہے کہ جنات سات ہیں۔ دارالخلد، دارالجلال۔ دارالسلام۔ جنت عدن۔ جنۃ الماویٰ۔ جنۃ نعیم۔ جنۃ الفردوس۔

امام بغوی نے تفسیر معالم التنزیل میں عدن پر اچھا تبصرہ کیا ہے وہ فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن مسعود فرماتے ہیں کہ عدن جنت کا درمیانی حصہ ہے۔ اور عبداللہ بن عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ جنت میں ایک محل کا نام عدن ہے اور حضرت الحسن البصری کہتے ہیں جنت میں سونے کے محل کا نام عدن ہے اور عطاء ابن السائب کہتے ہیں کہ جنت میں ایک نہر کا نام عدن ہے۔ امام مقاتل کہتے ہیں کہ عدن جنت میں اعلیٰ درجہ کا نام ہے۔ بہرحال آیات واحادیث کے مجموعہ سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ عدن جنت میں ایک اعلیٰ مقام ہے۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی وہ حدیث جسے امام بخاری اور امام مسلم نے روایت کیا ہے۔ اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ ارشاد ہے کہ:

جنت میں سو درجے ہیں جو اللہ سبحانہ نے مجاہدین فی سبیل اللہ کے لیے جنت میں تیار کیے ہیں ہر دو درجہ کی درمیانی مسافت اتنی ہے جتنی آسمان وزمین کے درمیان۔ لہذا جب تم اللہ سے جنت مانگو۔ تو جنت الفردوس مانگا کرو وہ جنت میں بہترین اور اعلیٰ جگہ ہے اسی سے جنت کی نہریں نکلتی ہیں اور اس سے بالا اللہ کا عرش ہے۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فردوس ہی کا نام عدن ہے۔ ویسے علی الاطلاق جنت میں اعلیٰ ترین درجہ کا نام الوسیلہ ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا خصوصی درجہ ہے۔ آپ اذان ختم ہونے پر دعا مانگتے ہیں۔

اللھم رب ھذہ الدعوۃ التامۃ والصلاۃ القائمۃ آت محمد الوسیلۃ والفضیلۃ والدرجۃ الرفیعۃ وابعثہ مقاما محمودن الذی وعدتہ۔

آخر میں چوتھا وعدہ یہ فرمایا ہے ورضوان من اللہ اکبر اور رضائے الٰہی بہت بڑی چیز ہے۔ جنت کے انعامات کی فہرست میں سب سے آخری چیز مقام رضوان ہے یعنی اللہ تعالیٰ کا اپنے بندے سے راضی ہونا ہے کہ اس کے بعد نہ کبھی وہ اپنے اس بندے پر عتاب فرمائے گا نہ اس سے ناراض ہوگا بلکہ اس کو اپنی رضامندی اور خوشنودی کی لازوال دولت عطا فرمائے گا اس سے معلوم ہوا کہ اس سے پہلی آیت میں جس قدر اوصاف اہل ایمان کے بتائے گئے۔ ایمان ولایت، امر بالمعروف، نہی عن المنکر، اقامت صلاۃ، ایتاء زکوٰۃ، اور اللہ ورسول کی بے قید طاعت یہ صرف اوصاف نہیں بلکہ اہل ایمان کے فرائض ہیں۔ ان فرائض کی پابجائی میں اہل ایمان

پیش نہاد صرف اللہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اطاعت کے تصور کے ساتھ اجر کا تصور اس طرح لازم ہے جس طرح سورج کے ساتھ روشنی اور گرمی کا تصور اس لیے اگر دین کا بنیادی تصور اور مسلمان کا فریضہ حیات اللہ کی طاعت ہے تو کوئی شک نہیں کہ اس طاعت سے اس کا مقصد و منشا اللہ سبحانہ سے اجر کا حصول ہوگا۔ پھر چونکہ کسی بالاتر ہستی کی خدمت و طاعت کا اجر حاصل اسی وقت ہوتا ہے جب وہ کار خدمت اور عمل طاعت کو پسندیدہ اور قابل قبول پاکر اس سے خوش ہوگیا ہو اس لیے فطری بات ہے کہ طالب اجر کی نظر اجر سے پہلے اپنے مالک کی خوشنودی پر جمے گی وہ اگر خوش ہوگیا تو گویا اجر حاصل ہو ہی گیا۔ اس حقیقت کے پیش نظر قرآنی انداز بیان کا واضح تقاضا یہ ہوا کہ اہل ایمان کی غرض اللہ سبحانہ کی رضا حاصل کرنا ہے۔ اور اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے ان کی نظر ہر وقت اسی مقصد پر جمی رہتی ہے۔ خود قرآن نے ان کے اعمال کے اس پس منظر کا ذکر کیا ہے۔ یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا اور یہ بھی بتایا ہے کہ وہ جو بھی نیکی کرتا ہے اسی ارادہ سے کرتا ہے کہ اس سے اللہ سبحانہ خوش ہوجائے وما لاحد عندہ من نعمۃ تجزیٰ الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ۔ اور آخری بات یہ بھی فرمادی کہ ہر شخص کو اپنے عمل کا ہدف رضائے الٰہی کو بنانا چاہیے۔ ماکتبنا علیھم الا ابتغاء رضوان اللہ

يَاَيُّهَا النَّبِيُّ جَاهِدِ الْكُفَّارَ وَالْمُنٰفِقِيْنَ وَاغْلُظْ عَلَيْهِمْ ط
وَمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ط وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ ﴿٧٣﴾ يَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ
مَا قَالُوْا ط وَلَقَدْ قَالُوْا كَلِمَةَ الْكُفْرِ وَكَفَرُوْا بَعْدَ
اِسْلَامِهِمْ وَهَمُّوْا بِمَا لَمْ يَنَالُوْا ج وَمَا نَقَمُوْٓا اِلَّآ اَنْ
اَغْنٰىهُمُ اللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ مِنْ فَضْلِهٖ ج فَاِنْ يَّتُوْبُوْا يَكُ
خَيْرًا لَّهُمْ ج وَاِنْ يَّتَوَلَّوْا يُعَذِّبْهُمُ اللّٰهُ عَذَابًا اَلِيْمًا
فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ ج وَمَا لَهُمْ فِي الْاَرْضِ مِنْ
وَّلِيٍّ وَّلَا نَصِيْرٍ ﴿٧٤﴾

اے پیغمبر کافروں اور منافقین سے جہاد کر اور ان سے سختی کا برتاؤ کر۔ ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور یہ بدترین لوٹنے کی جگہ ہے [۷۳] یہ منافق اللہ کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ اُنھوں نے نہیں کہا ہے حالانکہ بلاریب واقعہ یہ ہے کہ اُنہوں نے ضرور کلمہ کفر کہا ہے اور وہ مسلمان ہونے کے بعد پھر راہ کفر پر چلے ہیں [۷۴] اور اُنھوں نے ایسے کام کی منصوبہ بندی کی جسے وہ پا نہیں سکے [۷۵] ان کی یہ انتقامی کارگزاری صرف اس لیے ہوئی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول نے اپنے فضل سے ان کو سرمایہ دار بنا دیا ہے لہٰذا اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہے۔ اگر توبہ نہ کریں گے تو اللہ ان کو دنیا و آخرت میں دردناک سزا دے گا اور رُوئے زمین میں

ان کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہوگا۔ ؎

معانی مفردات

اغلظ۔ یہ امر کا واحد مذکر حاضر ہے غلظۃ سے سختی کرنا۔ یہ قرآن میں لین کی ضد ہے۔ خفض کی ضد بھی کچھ علماء نے بتائی ہے۔ قرآن میں اسے لین کے مقابلہ میں لایا گیا ہے۔ فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولك۔ علامہ قرطبی نے اسے رافت کی ضد بھی لکھا ہے۔

مانقموا۔ جمع مذکر غائب نقم سے نہیں انتقام لیا انھوں نے یہ باب ضرب اور باب سمع دونوں سے آتا ہے۔ اس شعر میں ماضی بالکسر آئی ہے۔

مانقموا من بنی امیۃ الا		انھم یحلمون ان غضبوا

زہیر کے ایک شعر میں مضارع مفتوح العین اور مکسور العین دونوں آئے ہے۔

یوخر فیوضع فی کتاب فیدخر		لیوم الحساب او یعجل فینقم

منافقین سے برتاؤ میں سختی

اس وقت تک منافقین سے زیادہ تر درگذر کا معاملہ ہو رہا تھا اور اس کے دو وجوہ تھے ایک یہ کہ مسلمانوں کی طاقت اتنی مضبوط نہ تھی کہ باہر کے دشمنوں کے ساتھ گھر کے دشمنوں سے بھی لڑائی مول لیتے۔ دوسرے یہ کہ ان میں جو لوگ شکوک و شبہات میں مبتلا تھے ان کو ایمان یقین حاصل کرنے کے لیے کافی موقع دینا مقصود تھا۔ یہ دونوں وجوہ اب باقی نہیں رہے تھے۔ مسلمانوں کی سیاسی طاقت اب تمام عرب کو اپنی گرفت میں لے چکی تھی۔ اور عرب سے باہر کی طاقتوں سے کش مکش کا سلسلہ شروع ہو چکا تھا۔ اس لیے ان آستین کے سانپوں کا سر کچلنا اب ممکن بھی تھا اور ضروری بھی ہو گیا تھا تاکہ یہ لوگ بیرونی طاقتوں سے ساز باز کر کے ملک میں کوئی اندرونی خطرہ کھڑا نہ کر سکیں۔ پھر ان لوگوں کو پورے نو سال تک سوچنے اور سمجھنے اور دین حق کو پرکھنے کا موقع بھی دیا جا چکا ہے جس سے وہ بہرہ اٹھا سکتے تھے۔ اگر ان میں واقعی خیر کی کوئی طلب ہوتی۔ اس کے بعد ان کے ساتھ مزید رعایت کی کوئی وجہ نہ تھی اس لیے حکم ہوا کہ کفار کے ساتھ ان منافقین کے خلاف بھی جہاد شروع کیا جائے اور جو نرم رویہ ان کے بارے میں اب تک رہا ہے اسے ختم کر کے ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا جائے کیونکہ گھر کے اندر ایک

دشمن باہر کے ستر دشمنوں سے زیادہ خطرناک ہے مشہور ہے عدو واحد داخل الباب اشد من سبعین عدوا خارج الباب۔ اور شائد اسی پس منظر میں حضور اقدس ﷺ نے تبوک سے واپسی پر فرمایا تھا کہ اب ہم چھوٹے جہاد سے فارغ ہو کر بڑے جہاد میں مشغول ہو گئے رجعنا من الجھاد الاصغر الی الجھاد الاکبر۔ اور یہ امر واقعہ ہے کہ غیروں سے مقابلہ آسان ہے دشواری تو اپنوں سے مقابلہ میں ہوتی ہے۔ اور اس کے جہاد اکبر ہونے کی وجہ یہ ہے کہ منافقین سے جہاد یہ نہیں کہ ان سے جنگ کی جائے بلکہ مراد یہ ہے کہ ان کی منافقانہ روش سے اب تک جو چشم پوشی برتی گئی ہے اس کو آیندہ کے لیے ختم کر دیا جائے اب جو شخص بھی مسلمانوں میں رہ کر منافقانہ روش اختیار کرے اور جس کے طرز عمل سے بھی یہ ظاہر ہو کہ وہ خدا اور رسول اور اہل ایمان کا مخلص رفیق نہیں ہے اسے کھلم کھلا بے نقاب کیا جائے۔ علانیہ اس کو ملامت کی جائے۔ سوسائٹی میں اس کے لیے کوئی عزت کا مقام باقی نہ رہنے دیا جائے۔ عدالتوں میں اس کی شہادت معتبر نہ ہو۔ عہدوں اور مناصب کا دروازہ اس کے لیے بند رہے۔ محفلوں میں اسے کوئی منہ نہ لگائے۔ ہر مسلمان اس سے ایسا برتاؤ کرے جس سے اس کو معلوم ہو جائے کہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں اس کا کوئی وقار نہیں ہے اور کسی حال میں بھی اس کے لیے کوئی احترام کا گوشہ نہیں ہے۔

اے پیغمبر کافروں اور منافقین سے جہاد کر اور ان سے سختی کا برتاؤ کر ان کا ٹھکانا دوزخ ہے اور یہ بدترین لوٹنے کی جگہ ہے۔ جہاد کے معنے ہیں کسی ناپسندیدہ چیز کے دفع کرنے میں انتہائی کوشش کرنا۔ یہ کوشش کبھی ہتھیار سے ہوتی ہے کبھی زبان سے کبھی قلم سے کبھی کسی اور طریق سے۔ منافقین جو زبان سے اسلام کا اظہار کریں اور دل سے مسلمان نہ ہوں ان کے مقابلہ میں جہاد بالسیف جمہور کے نزدیک مشروع نہیں ہے نہ عہد نبوت میں ایسا واقع ہوا۔ اسی لیے جہاد کا لفظ اس آیت میں عام رکھا گیا ہے یعنی تلوار سے زبان سے قلم سے جس وقت جس کے مقابلے میں جس طرح مصلحت ہو جہاد کیا جائے۔ کچھ علماء کی یہ رائے ہے کہ اگر منافقین کا نفاق بالکل عیاں ہو جائے تو ان پر بھی جہاد بالسیف کیا جا سکتا ہے۔ بہر حال غزوہ تبوک نے چونکہ منافقین کا نفاق بہت کچھ آشکارا کر دیا تھا اس لیے اس آیت میں ان کی نسبت ذرا سخت رویہ اختیار کرنے کی ہدایت کی گئی ہے نبی کریم ﷺ فطری طور پر نہایت نرم خو واقع ہوئے تھے فبما رحمۃ من اللہ لنت لھم ولو کنت فظا غلیظ القلب لانفضوا من حولک۔ پھر حق تعالیٰ شانہ کی طرف سے حکم تھا واخفض جناحک لمن اتبعک من المومنین۔ چونکہ منافقین بھی بظاہر مومنین کے زمرہ میں شامل تھے اس لیے حضور ان کے ساتھ درگذر چشم پوشی اور نرم خوئی کا معاملہ فرماتے تھے۔ تبوک کے موقع پر جب منافقین نے کھلم کھلا بیہائی

عناد اور دشمنی کا انداز اختیار کر لیا تو حکم ہوا کہ اب ان کے معاملے میں سختی اختیار کیجئے۔ یہ شریر خوش اخلاقی اور نرمی سے ماننے والے نہیں ہیں[1]۔ روئے سخن تو بالذات منافقین کی طرف ہے لیکن الکفار کا اضافہ کرکے اشارہ کر دیا کہ یہ مردم شماری کے مسلمان اہل ایمان کے زمرہ کے نہیں بلکہ یہ بھی کفر ہی کے پاسبان ہیں۔ یہاں جہاد سے جاہد آیا ہے جہاد جہد سے نکلا ہے جہاد اور مجاہدہ فعال اور مفاعلۃ کے وزن پر اسی جہد سے مصدر ہیں اور لغت میں اس کے معنے محنت اور کوشش کے ہیں۔ اسی کے قریب قریب اس کے اصطلاحی معنی ہیں یعنی حق کی بلندی اس کی اشاعت کے لیے ہر قسم کی جد و جہد قربانی اور ایثار گوارا کرنا اور ان تمام جسمانی مالی دماغی قوتوں کو جو اللہ کی طرف سے بندوں کو ملی ہیں اس راہ میں صرف کرنا۔ یہاں تک کہ اس کے لیے اپنی اپنے عزیزوں کی، اہل و عیال کی خاندان و قوم کی جان تک کو قربان کر دینا اور حق کے مخالفوں اور دشمنوں کی کوششوں کو توڑنا۔ ان کی تدبیروں کو رائگاں کرنا ان کے حملوں کو روکنا اور اس کے لیے جنگ کے میدان میں اگر ان سے لڑنا پڑے تو اس کے لیے بھی پوری طرح تیار رہنا یہی جہاد ہے یہ اسلام کا ایک رکن اور بہت بڑی عبادت ہے۔

اس آیت میں جہاد کفار اور منافقین سے کرنے کا حکم ہے دونوں کی نوعیت الگ الگ ہے۔ کفار سے جہاد تو قتال کے معنے میں ہے جس کا اس سورت میں پہلے قاتلوا کے ذریعے حکم معلوم ہو چکا ہے اور ان منافقین کے لیے جہاد کی دوسری انواع ہیں۔ ان کا احتساب کرو، دارو گیر کرو۔ عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما نے اس آیت کی تشریح میں یہی بات فرمائی ہے کہ کافروں سے قتال کیا جائے گا۔ منافقین سے قتال نہیں بلکہ زبان اور حجت و برہان سے، احتساب اور دار و گیر سے جہاد کیا جائے گا۔ ان کو کھلم کھلا بے نقاب کیا جائے گا۔ علانیہ ان کو ملامت کی جائے گی۔ معاشرے میں ان کو باعزت مقام نہ دیا جائے گا۔ معاشرتی تعلقات ان سے منقطع کیے جائیں گے۔ اسی تشریح کو جمہور شارحین قرآن نے قبول کیا ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے منافقین سے قتال ثابت نہیں ہے آپ نے منافقین سے قتال نہیں کیا ہے۔ ہاں اگر منافقین کا گروہ اسقدر کھل کر سامنے آجائے کہ خود اسلامی جماعت اور اسلامی نظام کے لیے چیلنج بن جائے تو پھر منافقین سے قتال بھی نہ صرف جائز بلکہ ضروری ہے۔ چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد فتنہ نفاق نے سر اٹھایا اور متعدد قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تو صحابہ کرام نے اسی حکم کی تعمیل کی اور ان سے قتال کرنے پر متفق ہو گئے۔ اس سے معلوم ہوا کہ نفاق مسلمانوں میں اس حد تک پہنچ جائے کہ انکار زکوٰۃ۔ انکار نماز، انکار روزہ، انکار حج، اور انکار ختم نبوت کرے تو اسلامی مملکت کے فرائض میں داخل

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے کہ ان کو سزا دے اگر جماعت کی صورت میں ہوں تو قتال کرے اور اگر افراد کی صورت میں ہوں تو تعزیر ضروری ہے۔ شائد اسی رعایت سے یہاں واغلظ علیھم کی تعبیر اختیار کی گئی ہے۔

یہ قرآن کی ایک نہایت اہم ہدایت ہے جو اس مرحلہ پر جبکہ پورے ملک میں اسلام کا بول بالا ہو چکا ہے ساری سیاسی، قانونی اور معاشی قوتوں پر اسلام کا قبضہ ہو چکا ہے۔ اس کے بغیر اسلامی سوسائٹی کو تنزل وانحطاط کے اندرونی اسباب سے محفوظ نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ کوئی جماعت جو اپنے اندر منافقوں اور غداروں کی پرورش کرتی ہو اور جس میں گھر یلو سانپ عزت وتحفظ کے ساتھ آستینوں میں بٹھائے جاتے ہوں۔ اخلاقی زوال اور بالآخر کامل تباہی سے دوچار ہوئے بغیر نہیں رہ سکتی۔ نفاق کا حال طاعون کی طرح ہے اور منافق وہ چوہا ہے جو اس وبا کے جراثیم لیے پھرتا ہے اس کو آبادی میں چلنے پھرنے کی آزادی دینا گویا پوری آبادی کو خطرے میں ڈالنا ہے۔ ایک منافق کو مسلمانوں کی سوسائٹی میں عزت واحترام کا مرتبہ حاصل ہونے کے معنے یہ ہیں کہ ہزاروں آدمی غداری ومنافقت پر دلیر ہو جائیں اور یہ خیال عام ہو جائے کہ اس سوسائٹی میں عزت پانے کے لیے اخلاص خیر خواہی اور صداقت ایمانی کچھ ضروری نہیں ہے بلکہ جھوٹے اظہار ایمان کے ساتھ خیانت اور بیوفائی کا رویہ اختیار کرکے بھی یہاں پھل پھول سکتا ہے۔ یہی بات ہے جسے حضور اقدس ﷺ نے اس مختصر سے حکیمانہ انداز میں بیان فرمایا ہے جس شخص نے کسی صاحب بدعت کی تعظیم کی وہ اسلام کی عمارت گرانے میں مددگار ہوا۔ اس کے بعد ارشاد ہوا ہے۔ وماواھم جھنم۔ یعنی یہ تو اس دنیا میں ان منافقین کی سزا ہے آخرت میں ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی

یہ منافق اللہ کی قسمیں کھا کر کہتے ہیں کہ انہوں نے نہیں کہا ہے حالانکہ بلا ریب واقعہ یہ ہے کہ انہوں نے ضرور کلمہ کفر کہا ہے اور وہ مسلمان ہونے کے بعد راہ کفر پر چلے ہیں۔ منافقین پیچھے بیٹھ کر حضور اقدس ﷺ اور دین اسلام کی اہانت کرتے جیسا کہ سورہ منافقین میں آئے گا جب کوئی مسلمان حضور تک ان کی بات پہنچاتا تو اس کی تکذیب کرتے اور قسمیں کھا لیتے کہ ہم نے فلاں بات نہیں کہی۔ حق تعالیٰ نے مسلمان راویوں کی تصدیق فرمائی کہ بے شک وہ باتیں انھوں نے زبان سے نکالی ہیں۔ اور دعویٰ اسلام کے بعد مذہب اسلام اور پیغمبر اسلام کی نسبت وہ کلمات کہے ہیں جو صرف منکرین کی زبان سے نکل سکتے ہیں [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

جس کلمہ کفر کو کہہ کر وہ قسمیں کھا کر انکار کرتے تھے وہ کیا تھا قرآن نے متعین نہیں کیا۔ شارحین قرآن نے اس قسم کے ایک سے زیادہ واقعات کی نشاندہی کی حافظ ابن جریر اور حافظ ابن کثیر رحمہما اللہ تعالیٰ نے متعدد واقعات لکھے ہیں۔ عقلاً ممکن ہے کہ اس قسم کے واقعات متعدد ہوئے ہوں جن میں ان کی زبان سے کلمہ کفر نکلا ہو۔ یہ گویا جاھد المنافقین کی دلیل ہوئی اور مطلب یہ ہوا کہ اگر منافقین زبانوں سے کلمہ کفر کہہ دیں تو پھر ان سے جہاد کرنا چاہیے۔

یہاں علامہ قرطبی کی یہ نکتہ آفرینی خوب ہے۔ کہ جیسے ایمان کے ثبوت کے لیے صرف لا الہ الا اللہ کہنا کافی ہے۔ کفر کے ثابت ہونے کے لیے صرف ایمان معرفت کے خلاف کچھ کہنا کافی ہے۔ اگر آپ کے سامنے کسی نے حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی ختم نبوت کا انکار کر دیا تو بس یہ کلمہ کفر ہے اب نہ دیکھا جائے گا۔ کہ اسلامی زندگی عمل میں موجود ہے۔ کلمہ کفر کہنے کے بعد پوری اسلامی زندگی کالعدم ہے۔

اس آیت میں ان کا صرف یہ جرم نہیں بتایا گیا ہے کہ انھوں نے کلمۃ الکفر کہا ہے بلکہ اس میں تین جرائم بتائے گئے ایک یہ کہ انھوں نے کلمہ کفر کہا دوسرے یہ کہ کلمہ کفر کہہ کر جھوٹ بولا۔ تیسرے یہ کہ انھوں نے جھوٹی قسمیں کھائیں۔

منافقین کا منصوبہ اور ناکامی

انھوں نے ایسے کام کی منصوبہ بندی کی جسے وہ پا نہ سکے غزوہ تبوک سے واپسی میں آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم لشکر سے علیحدہ ہو کر ایک پہاڑی راستہ کو تشریف لے جارہے تھے۔ تقریباً بارہ منافقین نے چہرے چھپا کر رات کی تاریکی میں چاہا کہ آپ پر ہاتھ چلائیں اور معاذ اللہ پہاڑی سے گرادیں۔ حضور کے ساتھ حذیفہ اور عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہما تھے۔ عمار کو انھوں نے گھیر لیا تھا مگر حذیفہ نے مار مار کر ان کی اونٹنیوں کے منہ پھیر دیئے چونکہ چہرے چھپائے ہوئے تھے حذیفہ وغیرہ نے ان کو نہ پہچانا۔ آنحضرت صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے نام بنام ان کے پتے بتا دیئے مگر منع فرما دیا کہ کسی پر ظاہر نہ کریں اسی واقعہ کی طرف وھموا بما لم ینالوا میں اشارہ ہے کہ جو ناپاک تصد انھوں نے کیا۔ خدا کے فضل سے پورا نہ ہوا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ کسی موقعہ پر لشکر اسلام میں خانہ جنگی ہو گئی تھی منافقین نے اغوا کر کے مہاجرین و انصار میں پھوٹ ڈالنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے حضرت نے اصلاح فرما دی جیسا کہ سورہ منافقین میں آئے گا[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پورا واقعہ مسند امام احمد میں ابوالطفیل کے حوالہ سے حضرت امام احمد بن حنبل رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اس طرح لکھا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم جب واپس ہوئے تو آپ نے اعلان کرا دیا کہ نبوت گھاٹی سے گذرے گا اس راستہ سے کوئی نہ جائے۔ آپ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو اونٹنی کو آگے سے پکڑنے اور حضرت عمار رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو پیچھے سے ہانکنے کے لیے ساتھ لے لیا۔ پیچھے سے اچانک ایک ٹولی منہ پر ڈھاٹے باندھے ہوئے اونٹوں پر سوار آئی۔ حضرت عمارؓ پیچھے تھے ان کو گھیرے میں لے لیا لیکن عمار ان کی سواریوں کو مارنے لگے۔ حضور اقدس ؐ نے حضرت حذیفہؓ سے کہا کہ چلاؤ چلاؤ۔ حضور اقدس ؐ جب پہاڑ کے نیچے آگئے تو سواری سے اُتر آئے اتنے میں عمار بھی آگئے۔ حضور اقدس نے حضرت عمار سے دریافت کیا عمار پتہ ہے کہ کون تھے ؟ بولے سواریوں کو تو پہچانتا ہوں گر سوار ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے ان کا پتہ نہیں۔ حضرت اقدس ؐ نے فرمایا کہ پتہ ہے کہ کس ارادے سے آئے تھے۔ بولے اللہ ورسول ہی کو پتہ ہو۔ فرمایا اس ارادے سے آئے کہ اللہ کے رسول کو گرادیں۔ حضرت عمار نے ایک شخص سے دریافت کیا تمہیں خدا کی قسم یہ گھاٹی والوں کی تعداد کتنی ہے بولے کہ چودہ تھے۔ یہ روایت ذرا مفصل ہے لیکن امام بیہقی نے دلائل النبوت میں جو واقعہ لکھا ہے وہ ذرا اس سے مختلف ہے۔ حذیفہ کہتے ہیں کہ میں حضور اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم کی اونٹنی کی مہار پکڑے ہوئے اس کو آگے سے کھینچ رہا تھا اور عمار اس کے پیچھے پیچھے تھے یا معاملہ اس کے برعکس تھا کہ میں پیچھے تھا اور عمار آگے تھے۔ یہاں چلتے چلتے جب ایک گھاٹی پر پہنچے تو یکبارگی ہم کیا دیکھتے ہیں کہ بارہ اشخاص اونٹوں پر سامنے سے آرہے ہیں میں نے حضور اقدس کو ان کی آمد سے متنبہ کیا تو وہ پشت پھیر کر بھاگ گئے اس کے بعد آپ نے فرمایا تم نے ان کو پہچانا میں نے عرض کیا جی نہیں یہ لوگ اپنے منہ پر ڈھاٹے باندھے ہوئے تھے لیکن ان کے اونٹوں کو میں نے پہچان لیا ہے فرمایا یہ منافقین تھے جو ہمیشہ منافقین ہی رہیں گے اور تمہیں کچھ یہ بھی پتہ ہے کہ ان کا ارادہ کیا تھا۔ ہم نے عرض کیا جی نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ خدا کے رسول کو اس گھاٹی میں گرانے کے ارادے سے آئے تھے۔ ہم نے عرض کیا کہ آپ ان سب کے قبائل کی طرف کہلا بھیجئے تاکہ وہ ان ہی سے جو اس شرارت میں شریک تھا اس کا سر کاٹ کر آپ کی خدمت میں روانہ کردیں۔ آپ نے فرمایا کہ میں ایسا نہ کروں گا۔ مجھے یہ پسند نہیں کہ میرے بارے میں عرب یہ چہ میگوئیاں کریں کہ محمد صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم نے ایک قوم سے جنگ کی اور جب اللہ نے ان کو غالب کر دیا تو پھر وہ ان کو قتل کرنے لگے اس کے بعد آپ نے یہ بددعا فرمائی کہ خدایا ان کو دبیلہ میں مبتلا فرما۔ ہم نے پوچھا یا رسول اللہ دبیلہ کیا ہے ؟ فرمایا وہ ایک زہریلا پھوڑا ہے جو شعلہ کی طرح دل کی رگوں کو پھونک دیتا ہے اور موت کا باعث ہوتا ہے۔

طبرانی نے مسند حذیفہ میں ان اصحاب عقبہ کے نام پر ایک عنوان قائم کیا ہے۔ اور ان منافقین کے حسب ذیل نام روایت کیے ہیں۔ معتب بن قشیر۔ ودلیعہ ابن ثابت۔ جد بن عبداللہ۔ حارث بن یزید۔ اوس بن قبطی۔ حارث بن سوید۔ سعد بن زرارہ۔ قیس بن فہد۔ سوید۔ دوعش۔ قیس بن عمرو۔ زید بن العصیت سلالۃ بن الحمام۔ (تفسیر ابن کثیر)

ان منافقین کی صحیح تعداد وہ ہے جو امام مسلم نے اپنی صحیح میں حضرت عمار اور حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالہ سے بتائی ہے۔

حضرت قیس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ میں نے عمار سے دریافت کیا فرمائیے کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے معاملہ میں جو روش آپ نے اختیار کی یہ آپ کی ذاتی رائے تھی یا آپ کے پاس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا کوئی حکم تھا۔ فرمایا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہم سے کوئی بات ایسی نہیں فرمائی جو عام مسلمانوں سے نہ کہی ہو لیکن حذیفہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے بتایا ہے کہ میری امت میں بارہ منافق ہوں گے آٹھ ان میں سے ایسے کٹر ہیں کہ اونٹ کا سوئی کے ناکہ سے گذر جانا ممکن ہے۔ لیکن ان کا جنت میں جانا ناممکن ہے ان کی پشت پر ایک زہریلا پھوڑا نکلے گا اور وہی ان کے لیے کافی ہوگا اور چار کے متعلق مجھے یاد نہیں رہا کہ شعبہ راوی نے کیا کہا تھا[1]

بہرحال دو لفظوں میں نہایت بلاغت کے ساتھ قرآن نے ان کی دستاویزی جرم بیان کر دی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ ان منافقین نے ایسی منصوبہ بندی سے سازش تیار کی تھی کہ اگر کامیاب ہو جائے تو ہدایت کا نقشہ ہی الٹ جاتا لیکن اللہ نے ان کو ان کے ارادوں میں کامیاب نہ ہونے دیا۔

منافقین کی ناسپاسی

ان کی یہ انتقامی کارروائی صرف اس لیے ہوئی ہے کہ اللہ و رسول نے اپنے فضل سے ان کو سرمایہ دار بنا دیا ہے۔ لہٰذا اگر وہ توبہ کر لیں تو ان کے حق میں بہتر ہے اور اگر توبہ نہ کریں گے تو اللہ ان کو دنیا و آخرت میں دردناک سزا دے گا۔ اور روئے زمین میں ان کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہوگا۔ حضور کی دعا سے خدا نے دولتمند کر دیا قرضوں کے بار سے سبکدوش ہو گئے۔ مسلمانوں کے ساتھ ملے جلے رہنے کی وجہ سے غنائم میں حصہ ملتا رہا۔ حضور کی برکت سے پیداوار بھی اچھی ہوئی۔ ان احسانات کا بدلہ یہ دیا کہ خدا اور رسول کے ساتھ دغابازی کرنے

[1] صحیح مسلم

گئے اور ہر طرح پیغمبر اسلام اور مسلمانوں کو ستانے پر کمر باندھ لی۔ اب بھی اگر توبہ کر کے شرارتوں اور احسان فراموشیوں سے باز آجائیں تو ان کے حق میں بہتر ہے ورنہ خدا دنیا و آخرت میں سزا دے گا جس سے بچانے والا روئے زمین پر کوئی نہ ملے گا۔ بعض روایات میں ہے کہ جلاس نامی ایک شخص یہ آیات سن کر صدق دل سے تائب ہوا۔ اور آئندہ اپنی زندگی خدمت اسلام میں قربان کر دی[1]۔ حضور اقدس ﷺ کی مدینہ میں تشریف آوری سے پہلے مدینہ عرب کے قصبات میں سے یثرب کے نام سے ایک چھوٹا سا قصبہ تھا اور یہاں کے باشندے مال یا جاہ میں دوسروں کے مقابلہ میں بالکل بے نام تھے۔ لیکن جب کوکبہ نبوت کا اس قصبہ میں نزول ہوا اور انصار نے آپ کا ساتھ دے کر اپنے آپ کو خطرات میں ڈال دیا تو آٹھ نو سال کے اندر اندر یہی معمولی قصبہ تمام عرب کا دار السلطنت بن گیا۔ اور مدینہ کی شہری مملکت اس عرصہ میں روزانہ دو سو چوتھہر مربع میل کی وسعت اختیار کرتی رہی ہے۔ حنین میں تقسیم غنیمت کے موقعہ پر حضور اقدس ﷺ نے انصار کو مخاطب کر کے ایک تقریر میں فرمایا کنتم عالۃ فاغناکم اللہ یعنی تم سب نادار و غریب تھے اللہ نے میرے ذریعے تمہیں مالدار بنا یا یہی یثرب کے اوس و خزرج جو انصار کے قبیلے تھے اور جو کاشتکاری کا کام کرتے تھے اس سلطنت کے اعیان و اکابر بن گئے۔ اور ہر طرف سے فتوحات اور غنائم اور کاروباری برکتیں اس شہر پر بارش کی طرح برسنے لگیں۔

اس آیت میں اسی انعام و احسان پر شرم دلائی جا رہی ہے کہ انعام و احسان کا تقاضا تو انقیاد و محبت تھا لیکن یہاں معاملہ بالکل الٹا ہو رہا ہے کہ احسان کے بدلے میں عداوت کو اپنا لیا گیا۔ عربی میں مثال ہے اتق شر من احسنت الیہ جس سے نیکی کرو اس کی برائی سے بچ کر رہو۔ کیا یہ نیکی کا بدلہ ہے۔ خباثت کی بھی کوئی حد ہے کہ اسلام نے ان کو دنیا میں تول دیا۔ اور وہ اسلام کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا یہ تبصرہ بالکل برموقعہ ہے۔ کہ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے ان کے کمال خبث کو ظاہر کیا ہے۔ اور آخر میں بتایا ہے کہ اگر یہ توبہ کر لیں تو انہی کے حق میں بہتر ہے ورنہ یاد رکھیں کہ خدا انہیں دنیا میں بھی عذاب دے گا اور آخرت میں بھی۔ یہ دنیا میں اس عذاب میں حصہ دار ہوں گے جو کفار و مشرکین کے لیے مقدر ہو چکا۔ اور آخرت میں بھی ان کے ساتھی ہوں گے۔ اور یہ بھی یاد رکھیں کہ اس سرزمین میں وہ بے یار و مددگار ہوں گے۔

یہ بات یہاں سمجھنے کی ہے کہ ملک میں ان کا کوئی حمایتی اور مددگار نہ ہوگا کیونکہ دنیا میں اسباب کی حد تک ان پر سارے دروازے بند ہو چکے ہیں اہل ایمان میں سے ان کا کوئی حمایتی اس لیے نہ ہوگا کہ قرآن نے

[1] افادات شیخ الاسلام

اہل ایمان پر یہ پابندی لگادی ہے کہ ان کی اخوت، مروت اور نصرت کی بنیاد پر تعلقات صرف اہل ایمان سے ہو سکتے ہیں۔ منافقین سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہو سکتا اپنے قبائل اور رشتہ داروں میں سے ان کا کوئی حمایتی نہیں ہو سکتا کیونکہ اسلام نے انسابی عصبیت کو ختم کر دیا ہے۔ باہر کے لوگوں میں سے بھی ان کا کوئی حمایتی نہیں ہو سکتا کیونکہ اسلام نے جاہلیت کے سارے حلف اور جوار کے معاہدے کالعدم کر دیئے۔ اہل کتاب میں سے بھی ان کا کوئی حمایتی نہ ہوگا۔ کیونکہ ان کو جلا وطنی کے ذریعے حجاز بدر کر دیا گیا۔ عرب سے باہر بھی وہ بے یار و مددگار ہوں گے کیونکہ اللہ سبحانہ نے قیصر و کسریٰ کی حکومتوں کے لیے اہل ایمان سے وعدہ کر لیا ہے۔ قرآن نے جیسا بتایا ویسا ہی ہوا۔

اس معنے کے اعتبار سے یہ خبر بھی حضور اقدس ﷺ کا اعجاز ہے۔ یہ مطلب ہے دنیا میں مددگاروں اور حمایتیوں سے ان کے محروم ہونے کا۔

وَمِنْهُم مَّنْ عٰهَدَ اللّٰهَ لَئِنْ اٰتٰنَا مِنْ فَضْلِهٖ لَنَصَّدَّقَنَّ وَلَنَكُوْنَنَّ مِنَ الصّٰلِحِيْنَ ﴿۷۵﴾ فَلَمَّآ اٰتٰهُم مِّنْ فَضْلِهٖ بَخِلُوْا بِهٖ وَتَوَلَّوْا وَّهُم مُّعْرِضُوْنَ ﴿۷۶﴾ فَاَعْقَبَهُمْ نِفَاقًا فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلٰى يَوْمِ يَلْقَوْنَهٗ بِمَآ اَخْلَفُوا اللّٰهَ مَا وَعَدُوْهُ وَبِمَا كَانُوْا يَكْذِبُوْنَ ﴿۷۷﴾

اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ ہمیں اپنے فضل سے نوازے گا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور ہم ضرور نیکوکار بنیں گے۔ پھر جب اللہ نے ان کو اپنے فضل سے نوازا تو وہ اس مال میں کنجوس ہوگئے اور اپنے عہد سے پھر گئے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ہیں ہی روگردانی کرنے والے[۷۶] بعد ازیں اس کے نتیجے میں ان کے دلوں میں نفاق دائمی ہوگیا اس دن تک کے لیے کہ وہ اللہ سے ملیں۔ کیونکہ انھوں نے اللہ سے وعدہ کی خلاف ورزی کی اور کیونکہ ان کا کام جھوٹ بولنا تھا[۷۸]

معانی مفردات

اعقب ماضی کا واحد مذکر غائب اعقاب سے ہے ان میں اثر رکھ دیا وارث بنا دیا۔ عقب کے معنی اصل میں پاؤں کے پچھلے حصے یعنی ایڑی کے ہیں کچھ قاف کے زیر سے اور کچھ سکون سے بولتے ہیں اس کی جمع اعقاب آتی ہے اسی سے عقب یعنی پیچھے کے معنے میں آتا ہے اعقاب، معاقبہ، تعاقب، تعقیب، تعقب سب اسی سے بنائے

گئے ہیں:

اخلفوا۔ جمع مذکر غائب ماضی کا مصدر اخلاف ہے۔ انھوں نے خلاف ورزی کی۔ خلف سے بنا ہے اس کے معنے پیچھے کے ہیں اسی سے خلافت، استخلاف، مختلف وغیرہ الفاظ آتے ہیں۔

انسان کی عجیب و غریب کمزوری

یہ انسان کی عجیب کمزوری ہے کہ جب تک ایک چیز اسے حاصل نہیں ہوتی ہے اس وقت تک تو یہ تمنا کرتا ہے کہ اگر مجھے یہ حاصل ہو جائے تو یہ کروں گا۔ دوسروں کی طرح کسی غلط مصرف میں استعمال نہ کروں گا بڑی بڑی دعائیں کرتا ہے کہ اگر اللہ نے اپنے فضل سے دولت دی تو میں یہ کروں گا وہ کروں گا۔ مگر جب اللہ تعالیٰ دولت دے دیتا ہے تو وہ اپنے سارے وعدے بھول جاتا ہے۔ اور نیکی کے ہر راستے سے منہ موڑ لیتا ہے اور اسے یہ یاد ہی نہیں رہتا ہے کہ اس چیز کے لیے اس نے اپنے رب سے کیا قول و قرار کیا تھا اور کس کس طرح کی تمناؤں کا اظہار کیا تھا بلکہ اس پر دولت کا نشہ ایسا سوار ہو جاتا ہے کہ اسے اپنی محنت کا ثمرہ سمجھتا ہے اور خدا سے زیادہ اسے شیطان کے لیے استعمال کرتا ہے۔ بہت کم خوش نصیب ایسے ہوتے ہیں جو نعمت پا کر منعم کا حق بجا لائیں اور احسان مانیں۔ اس کا سرچشمہ بخل ہے اور بخل ایسی بداخلاقی ہے جس سے بہت سی بداخلاقیاں جنم لیتی ہیں۔ خیانت بددیانتی، بے ایمانی اور بے مروتی۔ بعض دفعہ بے رحمی، بدسلوکی اور دنائت بھی اسی سے پیدا ہوتی ہے۔ حرص، طمع، لالچ تنگ نظری، کم فہمی، پست طبعی اور بہت سی برائیاں اسی شجرہ خبیث کی شاخیں ہیں۔ قرآن آیا۔ جھوٹ کے بعد سب سے پہلے بخل کی جڑ پر کلہاڑا مارا اور بھوکوں کو کھلانا ننگوں کو پہنانا، محتاجوں کو دینا یتیموں کی خبرگیری اور مقروضوں کی امداد کو مسلمانوں پر فرض کیا ان ہی فرائض کے مجموعہ کا نام زکوٰۃ ہے

ان آیات میں اسی بیماری کی نشاندہی کی ہے۔ اس کا دنیوی انجام بتایا ہے کہ اس بخل کی پاداش میں خدا نے ان کے دلوں کے اندر نفاق کی جڑ جما دی اور صدقہ کر کے صالحین میں سے بننے کا جو موقع خدا نے ان کو عطا کیا تھا۔ وہ اس سے محروم ہو گئے۔

(۷۹) اور کچھ ان میں سے ایسے ہیں جنھوں نے اللہ سے عہد کیا تھا کہ اگر اللہ ہمیں اپنے فضل سے نوازے گا تو ہم ضرور خیرات کریں گے اور ہم ضرور نیکوکار بنیں گے۔ پھر جب ان کو اللہ نے اپنے فضل سے نوازا تو اس حال میں کنجوس ہو گئے۔ اور اپنے عہد سے پھر گئے اور واقعہ یہ ہے کہ وہ ہیں ہی روگردانی کرنے والے

ایک شخص ثعلبہ ابن حاطب انصاری نے حضرت سے عرض کیا کہ میرے حق میں دولت مند ہو جانے کی دعا

فرما دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ ثعلبہ تھوڑی چیز جس کا تو خدا کا شکر ادا کرے۔ اس بہت چیز سے اچھی ہے جس کے حقوق ادا نہ کر سکے۔ اس نے پھر وہی درخواست کی آپ نے فرمایا اے ثعلبہ کیا تجھے پسند نہیں ہے کہ میرے نقش قدم پر چلے آپ کے انکار پر اس کا اصرار بڑھتا گیا اس نے وعدہ کیا کہ اگر خدا مجھے مال دے گا میں پوری طرح حقوق ادا کروں گا۔ آخر حضور نے دعا فرمائی۔ اس کی بکریوں میں اس قدر برکت ہوئی کہ مدینہ سے باہر ایک گاؤں میں رہنے کی ضرورت پڑی اور اتنا پھیلاؤ ہوا کہ ان میں مشغول ہو کر رفتہ رفتہ جمعہ و جماعات بھی ترک کرنے لگا۔ کچھ دن بعد حضور کی طرف سے زکوٰۃ وصول کرنے والے محصل پہنچے تو کہنے لگا کہ زکوٰۃ تو جزیہ کی بہن معلوم ہوتی ہے۔ دو ایک دفعہ دے کر بالآخر زکوٰۃ دینے سے صاف انکار کر دیا۔ حضور نے تین مرتبہ فرمایا ویح ثعلبۃ اور یہ آیات نازل ہوئیں۔ جب اس کے بعض اقارب نے اس کی خبر پہنچائی تو بادل ناخواستہ زکوٰۃ لے کر حاضر ہوا۔ حضور نے فرمایا کہ خدا نے مجھے تیری زکوٰۃ قبول کرنے سے منع کر دیا۔ یہ سن کر اس نے بہت ہائے واویلا کیا کیونکہ حضور اقدس کا زکوٰۃ قبول نہ کرنا اس کے لیے بڑی عار کی بات تھی۔ بدنامی کے تصور سے سر پر خاک ڈالتا تھا مگر دل میں نفاق چھپا ہوا تھا۔ پھر حضور کے بعد ابوبکر صدیق کے پاس زکوٰۃ لے کر حاضر ہوا انھوں نے بھی قبول کرنے سے انکار کر دیا۔ پھر حضرت عمر اور ان کے بعد حضرت عثمان ﷛ کی خدمت میں زکوٰۃ پیش کی دونوں نے انکار کر دیا سب یہی کہتے تھے کہ جو چیز نبی کریم ﷺ نے رد کر دی ہم اس کو قبول نہیں کر سکتے۔ آخر اسی حالت نفاق پر حضرت عثمان ﷛ کے زمانے میں اس کا خاتمہ ہوا۔[1]

عام شارحین قرآن کی روش کے مطابق حضرت شیخ الاسلام نے یہ واقعہ درج کیا ہے ورنہ جہاں تک اصول و قواعد حدیث کا تعلق ہے۔ روایتی اور تاریخی حیثیت سے یہ روایت صحیح نہیں بلکہ ضعیف ہے۔ حافظ ابن جریر حافظ ابن کثیر اور دوسرے شارحین قرآن نے اس واقعہ کو اسی طرح پیش کیا ہے واقعہ کو طبرانی، بیہقی، ابن ابی حاتم نے روایت کیا ہے اور سب کا سرچشمہ علی بن یزید الالہانی ہیں۔ ان کے بارے میں علامہ ہیثمی کا کہنا ہے کہ متروک ہیں۔ حافظ عسقلانی نے تخریج احادیث کشاف میں لکھا ہے۔ ھذا اسناد ضعیف۔ حافظ السیوطی نے لباب النقول میں اسے ضعیف قرار دیا ہے مطلب یہ ہے کہ واقعہ کی روایتی حیثیت اس لائق نہیں ہے کہ اسے شہادت کے طور پر موقع استدلال میں پیش کیا جائے آیت قرآنی اپنے معانی اور مطالب کے لیے کسی واقعہ کی محتاج نہیں۔ اس واقعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ زکوٰۃ اس سے پہلے فرض تھی۔ اور سورہ برات کا نزول ۹ھ غزوہ تبوک کے بعد ہوا۔ معلوم ہوا کہ زکوٰۃ ۹ھ میں فرض ہوئی۔ حافظ ابن حجر نے فتح الباری میں اس خیال کو ضعیف قرار دیا اور

[1] افادات شیخ الاسلام

اس واقعہ کے بارے میں لکھا ہے کہ یہ تاریخی طور پر ضعیف ہے اس کو بطور دلیل نہیں پیش کیا جا سکتا۔ حافظ صاحب کے الفاظ یہ ہیں۔ لکنہ حدیث ضعیف لا یحتج بہ۔ زکوٰۃ کی تاریخ پر ہم انشاء اللہ گیارہویں پارے میں بحث کریں گے۔ بہرحال روایتی نقطہ نظر سے یہ واقعہ صحیح نہیں ہے۔

آیت میں ایک نفسیاتی بیماری کا ذکر ہو رہا ہے۔ اس بیماری کے مریضوں کا کھوج لگانا اور بتانا فلاں مریض تھا مفسر کا کام نہیں ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے کہ یہ غریب تھے اس وقت ان کا یہ حال تھا کہ ہر جگہ یہ اپنے اس شوق اور اس تمنا کا اظہار کرتے تھے کہ اگر ہمارے حالات بھی اللہ نے ٹھیک کر دیئے تو ہم بھی اللہ کے راستہ میں خوب خرچ کریں گے اور دین کی بڑی بڑی خدمتیں کر کے صالحین میں اپنا نام کریں گے لیکن جب اللہ نے ان پر اپنا فضل فرمایا اور ان کی تمنا پوری ہو گئی اور دینے کا وقت آیا تو اس طرح منہ پھیر کر چل دیئے ہیں گویا اللہ و رسول سے ان کا کوئی قول و قرار ہی نہ تھا۔ چل دینا کبھی تو اس طرح ہوتا ہے جس کے بعد مڑ کر آنے کی توقع ہوتی ہے لیکن یہاں تولوا کے بعد جملہ حالیہ وھم معرضون آیا ہے اور حال جملہ میں تقید ہوتا ہے اس قید نے واضح کر دیا کہ انفاق کا نام سن کر وہ اس طرح چل دیتے ہیں کہ پھر مڑ کے دیکھتے ہی نہیں ہیں۔ ابو بکر الجصاص نے کچھ باریک قانونی باتیں اس آیت سے استنباط کی ہیں۔

اوّل اگر کوئی شخص کسی قربت کی نذر مان لے تو اس کا پورا کرنا واجب ہے مثلاً یوں کہے کہ اگر اللہ سبحانہ مجھے ایک ہزار روپے دے گا تو میں پانچ سو روپیہ صدقہ کروں گا۔ ایک ہزار ملنے پر پانچ سو کا صدقہ واجب ہے۔

دوم یہ کہ نذر معلق بھی جائز ہے مثلاً یوں کہے کہ اگر فلاں آئے تو اتنے روپے صدقہ کروں گا۔

سوم نذر غیر موجود چیز کی جو ابھی ملک میں نہ آئی ہو مان لینی جائز ہے اگرچہ بالفعل چیز ملک میں نہ ہو۔ حدیث۔ لا نذر فیما لا یملك ابن ادم کا مطلب یہ ہے کہ دوسرے کی ملک کی نذر، نذر نہیں ہے لیکن مستقبل میں اپنی ملک کے موجود ہونے پر نذر کو موقوف کرنا اس میں داخل نہیں ہے۔

نفاق قلب میں کیسے جاگزین ہوتا ہے

(٨٠) بعدازیں اس کے نتیجے میں ان کے دلوں میں نفاق دائمی ہو گیا اس دن تک کے لیے کہ وہ اللہ سے ملیں۔ کیونکہ اللہ سے وعدہ کی خلاف ورزی کی ہے اور کیونکہ ان کا کام جھوٹ بولنا تھا یعنی خدا سے صریح وعدہ خلافی کرنے اور جھوٹ بولتے رہنے کی سزا میں ان کے بخل و اعراض کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہمیشہ کے لیے نفاق کی جڑ ان کے دلوں میں قائم ہو گئی جو موت تک نکلنے والی نہیں اور یہی سنۃ اللہ ہے کہ جب کوئی شخص اچھی یا بری

خصلت خود اختیار کر لیتا ہے تو کثرت ممارست اور مزاولت سے وہ دائمی بن جاتی ہے۔ بری خصلت کے اسی دوام و استحکام کو کبھی کبھی ختم و طبع مہر لگانے سے تعبیر کر دیتے ہیں[1] مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنے نفاق کی پرورش پر ایک مدت صرف کر دی۔ یہ چیز ان میں اتفاقاً پیدا نہیں ہوئی ہے بلکہ ان کے ایک دانستہ نقض عہد طویل جھوٹ اور فریب کاری کا مولود فساد ہے جس سے ان کی جان اب مر کے ہی چھوٹے گی۔ یہ توقع نہ رکھو کہ ان کو توبہ اور اصلاح کی توفیق ہوگی۔ اب تو ان کے دلوں کا یہ کثیف پردہ اسی وقت ہٹے گا جب یہ اصل حقیقت کو سورج کی طرح سامنے دیکھ لیں گے۔ غالباً صحیحین میں جو ارشاد نبوت علامات منافق کے موضوع پر آیا ہے اسی ارشاد ربانی کی ایک روشنی ہے۔ صحیحین میں ہے منافق کی تین نشانیاں ہیں جب بات کرے جھوٹ بولے۔ جب وعدہ کرے خلاف ورزی کرے۔ جب امانت دار بنایا جائے خیانت کرے۔ صحیح مسلم میں یہ بھی ہے اگرچہ وہ نماز پڑھتا ہو اور روزے رکھتا ہو اور اپنے کو مسلمان خیال کرتا ہو۔ صحیحین کی ایک اور حدیث میں ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ چار باتیں جس میں ہوں وہ پکا منافق ہے اور جس میں ان میں سے کوئی ایک ہو اس میں منافق کی ایک نشانی ہے یہاں تک ان کو چھوڑ دے۔ جب امانت دار بنایا جائے خیانت کرے۔ جب بات کرے جھوٹ بولے۔ جب عہد کرے خلاف ورزی کرے۔ جب جھگڑے گالیاں دے۔

حافظ ابن رجب حنبلیؒ فرماتے ہیں کہ نفاق کی صورتیں تو بہت ہیں مگر ان کے اصول صرف پانچ ہیں۔

۱۔ جھوٹ بولنا۔ ۲۔ امانت میں خیانت کرنا۔ ۳۔ وعدہ خلافی کرنا۔ ۴۔ غصہ میں بے قابو ہو جانا۔ ۵۔ عہد کر کے غداری کرنا۔

قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ منافقین نے یہ تمام چالیں جب اللہ سبحانہ اور اس کے رسول سے کیں تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ قیامت تک کے لیے نفاق کا روگ ان کے دلوں میں جاگزیں ہو گیا۔ آیت سے معلوم ہوا کہ جیسے بخل کی شدت ایمان کو برباد کر دیتی ہے ایسے ہی وعدہ خلافی اور جھوٹ کا نتیجہ نفاق ہوتا ہے۔ نیز یہ بھی معلوم ہوا کہ ان جرائم میں زیادہ شدت یہاں اس لیے آئی ہے کہ انھوں نے خدا و رسول کے معاملہ میں بھی ان کا ارتکاب کیا بلکہ اسی کو اپنی عادت بنا لیا۔ اسی طرح ان کی دوسری بداطواریاں اللہ و رسول کے ساتھ تھیں —— دونوں باتوں میں فرق سمجھ لیجئے۔

ایک یہ کہ لوگوں سے جھوٹ بولے۔ لوگوں سے وعدہ کر کے پورا نہ کرے۔ لوگوں کی امانت میں خیانت کرے۔ لوگوں سے معاہدوں میں غداری اور لوگوں سے لڑائی میں گالیوں پر اتر آئے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسرے یہ کہ یہ سارے کام اللہ اور اس کے رسول سے روا رکھے، آیت قرآنی کا رخ پہلی بات کی طرف نہیں دوسری بات کی طرف ہے یعنی خدا اور رسول کی جناب میں یہ باتیں کفر خالص ہیں جب کہ باہم یہ باتیں کفر نہیں بلکہ گناہ ہیں۔

یہ بات اچھی طرح سمجھ لینی چاہیے کہ بات کا مطلب سمجھنے کے لیے اس کے ماحول کو بھی پیش نظر رکھنا چاہیے اس لیے جن احادیث میں علامات نفاق بتائی گئی ہیں اور جن کا تعلق مسلمانوں کی معاشرتی زندگی سے ہے ان کو بھی اس ماحول کی مدد سے سمجھنا چاہیے۔ غور فرمائیے کہ ایک طرف منافقین ہیں جو ان مذموم خصائل میں از سرتا پا غرق ہیں دوسری طرف مخلصین اہل ایمان کی وہ جماعت ہے جو ان کو انتہائی نفرت سے دیکھتی ہے اور ان کے برے اعمال سے اس درجہ بیزار ہے جتنا ان کو اپنے ایمانی تقاضوں کے تحت ہونا چاہیے۔ ان حالات میں ان احادیث کا منشا بالکل واضح اور صاف ہے۔ لیکن دور انحطاط میں جب ایک قدیم العہد مسلمان میں بھی یہ علامات موجود نظر آئیں تو سوچنا پڑا اور نفاق کو دو حصوں میں تقسیم کرنا پڑا ایک نفاق اصلی اور دوسرا نفاق عملی اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ تقسیم پہلے سے موجود نہ تھی بلکہ منشا یہ ہے کہ سلف صالحین کی نظر میں نفاق عملی بھی نفاق اصلی کے برابر تھا۔ وہ اسلام کے خلاف معاشرہ کے اعمال میں ایسی تاویلات سوچنا بھی پسند نہ کرتے تھے۔ ان کے خیال میں اسلام کے ساتھ اسلام کے تقاضے ہونے ناگزیر تھے۔ وہ ایمان کے ساتھ کفر و نفاق کا تصور بھی نہ کرتے تھے اور واقعہ بھی یہی ہے کہ ایک مسلمان کی زندگی میں عملی مظاہر وہی ہونے چاہئیں جو ایمان کا تقاضا ہیں اس لیے ان کے زمانہ میں نفاق اصلی اور نفاق عملی کی کوئی تقسیم نہ تھی وہ مجموعہ اسلام کو اسلام سمجھتے تھے اور اسلامی زندگی میں کفر و نفاق کی ایک ایک علامت سے بیزار تھے۔ نام نہاد مسلمانوں کو بچانے کے لیے تقسیمیں اور تاویلیں کرنا ان کے بلند مذاق کے خلاف تھا وہ اسلام کو بچانے کی فکر میں تھے۔ دراصل ان حدیثوں کا منشا یہ بتانا ہے کہ مسلمان کے لیے ہرگز یہ زیبا نہیں ہے کہ وہ اپنی زبان سے اسلام کا دعویٰ کرے اور اپنی عملی زندگی میں نفاق کی ترجمانی کرے اس کا فرض ہے کہ وہ مسلمان ہو کر نفاق کی ایک ایک علامت سے بیزار ہو۔ اگر وہ اسلام کا مدعی ہے تو ظاہر و باطن میں پوری ہم آہنگی پیدا کرے اور دورنگی سے بچے۔

بہرحال اس دور کے منافقین کی یہ بھی ایک قسم تھی جسے قرآن نے یہاں بیان کیا ہے کہ جب وہ غریب تھے تو بڑے بڑے اللہ سے عہد کرتے تھے خوب وعدے کرتے کہ اگر خدا نے ہمیں اپنے انعامات سے نوازا تو ہم یہ کریں گے وہ کریں گے مگر اللہ تعالیٰ نے جب ان کو اپنی نعمتوں سے مالا مال کیا تو سارے وعدے

بھول گئے اور نیکی کے راستہ سے منہ موڑ لیا۔ اور بخیل بن گئے۔ بخل کا نتیجہ یہ ہوا کہ نفاق نے ان کے دلوں میں گھر کر لیا ہے۔

قرآن جن امراض کی نشانیاں پیش کرتا ہے اور جن بیماریوں کو بیان کرتا ہے ان کو زمان و مکان سے مقید نہیں کیا جا سکتا ہے۔ اس وقت اگر اللہ سے وعدہ کی خلاف ورزی اور جھوٹ بولنے کا خوگر ہونے کا نتیجہ نفاق تھا تو آج بھی اس کا نتیجہ نفاق ہی ہوگا۔ زمان و مکان کی تبدیلی سے اعمال کے خواص و نتائج نہیں بدلتے ہیں۔ سنکھیا اگر زہر ہے تو ہر زمانے اور ہر جگہ زہر ہے نہ افراد و اشخاص کی تبدیلی سے سنکھیا کا اثر بدلے گا اور نہ زمان و مکان بدلنے سے تبدیل ہوگا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس موقعہ پر نکتہ آفرینی خوب ہے۔

چونکہ نفاق عمل اور اس کے مدمقابل اخلاص پوشیدہ تھے اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے نفاق عملی کی علامات بتا دی ہیں۔ نفاق کی کچھ علامتیں اس حدیث میں بتائی ہیں چار باتیں ہیں جس میں ہوں گی پورا منافق ہے اگر ان میں سے ایک ہوگی تو نفاق کی ایک نشانی ہوگی تا آنکہ اسے چھوڑ دے۔ بات میں جھوٹ۔ عہد میں غدر، لڑائی میں گالی، امانت میں خیانت؛ اور اخلاص ایمان کی اس حدیث میں علامات بتائی ہیں تین باتیں جس میں ہوں گی اسے ایمان کی شیرینی محسوس ہوگی۔

اول۔ اسے اللہ اور اللہ کا رسول سب سے محبوب ہوگا۔

دوم۔ جس سے محبت کرے اللہ کی خاطر محبت کرے۔

سوم۔ کفر میں واپسی ایسی ہی ناگوار ہو جیسے آگ میں گرنا اور حضور اقدس کا یہ ارشاد جب تم کسی کو مسجد سے چمٹا دیکھو تو اس کے ایمان کی گواہی دو۔ یا یہ ارشاد کہ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے محبت ایمان کی نشانی ہے یا یہ ارشاد کہ انصار کی محبت ایمان کی نشانی ہے۔

لیکن یہ واضح رہے کہ جس کفر دون کفر ہے اور جس طرح ایمان کامل اور ناقص ہے اسی طرح نفاق کی بھی متعدد قسمیں ہیں۔ انشاء اللہ اس پر تفصیلی تبصرہ گیارہویں جلد میں آرہا ہے۔

أَلَمْ يَعْلَمُوٓا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ سِرَّهُمْ وَنَجْوَىٰهُمْ
وَأَنَّ اللَّهَ عَلَّٰمُ الْغُيُوبِ ﴿٧٨﴾ الَّذِينَ يَلْمِزُونَ
الْمُطَّوِّعِينَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ فِي الصَّدَقَٰتِ وَالَّذِينَ
لَا يَجِدُونَ إِلَّا جُهْدَهُمْ فَيَسْخَرُونَ مِنْهُمْ ۙ سَخِرَ اللَّهُ
مِنْهُمْ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿٧٩﴾

کیا یہ لوگ جانتے نہیں ہیں کہ اللہ ان کے راز دل اور ان کی سرگوشیوں کو جانتا ہے اور کیا ان کو پتہ نہیں کہ اللہ تمام غیبوں کی باتوں سے پوری طرح باخبر ہے[۸۱] یعنی ان لوگوں سے جو رضا و رغبت اہلِ ایمان یعنی وہ لوگ جو برضا و رغبت دی ہوئی اہلِ ایمان کی مالی قربانیوں پر عیب لگاتے ہیں اور جن اہلِ ایمان کو اپنی مشقت کے سوا کچھ میسر نہیں ہے ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ ان کو مذاق کی جزا دے گا اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔[۸۲]

معانی مفردات

سِرّ۔ چھپی ہوئی بات، بھید، راز، دل میں جو بات چھپی ہوا سے سِر کہتے ہیں۔ جمع اسرار آتی ہے۔ کنائی زبان میں لفظ سِر نکاح، جماع کے لیے بھی استعمال ہوتا ہے۔

نجوٰی۔ سرگوشی برائی پر مبنی مشورہ کو کہتے ہیں اسی سے مناجات اور تناجی آتے ہیں۔ باہم سرگوشیاں کرنا۔

علّام الغیوب۔ غیبوں کا خوب جاننے والا ہے۔ علم سے بروزن فعّال مبالغہ کا صیغہ ہے۔ یہاں اس کا استعمال حق تعالیٰ شانہ کے لیے بطور صفت ہوا ہے۔ اس طرح کہ اس نے کوئی پوشیدہ سے

پوشیدہ چیز بھی چھپی ہوئی نہیں ہے، امام ابو بکر البیہقی کتاب الاسماء والصفات میں لکھتے ہیں۔ اس کے معنے ہیں ایسا زبردست جاننے والا جو ہر طرح کی معلومات کا ان کے گونا گون ہونے کے باوجود علم رکھتا ہے جو اب موجود ہے اسے بھی جانتا ہے اور جو آیندہ ہوگا اسے بھی جانتا ہے۔ اسی طرح جو چیز وجود میں نہیں آئی اس کا بھی اسے علم ہے اور اس کا بھی کہ وجود پذیر کیسے اور کیوں ہوگی۔

یلمزون۔ عیب نکالتے ہیں۔ جمع مذکر غائب مضارع لمز سے ہے اسی کے ساتھ ہمز ہے سامنے منہ پر کسی کے عیب نکالنا لمز ہے اور پیٹھ پیچھے نکتہ گیری ہمز ہے بعض علماء ان لفظوں کی تشریح بالعکس کرتے ہیں۔ بہرحال مسخرا پن کسی کے ساتھ کرنا۔ کسی کا ٹھٹھا اڑانا کسی کی نقل بنانی لمز اور ہمز میں یہ سب باتیں داخل ہیں اسی سے ہمزہ اور لمزہ بنے ہیں، منہ پر عیب نکالنے والے کو لمزہ اور پیٹھ پیچھے عیب نکالنے والے کو ھمزہ کہتے ہیں۔

عیب چینی منافقین کا کردار ہے

نفاق کے جراثیم اس قدر ہیں کہ ان کا احاطہ ناممکن نہیں تو دشوار ضرور ہے۔ آدمی اندر سے غلط اور خود کرنے کی توفیق نہ ہو تو دوسروں کو بھی کرتا دیکھ نہیں سکتا۔ نیکیوں سے چڑتا ہے جلے دل سے نیکیوں ہی میں عیب نکالنے لگتا ہے۔ نفاق ایک ایسی رذیلہ ہے جو سینکڑوں رذائل کو جنم دیتی ہے۔ جھوٹ، جھوٹی قسمیں وعدہ خلافی، خیانت، اور بد دیانتی، غداری اور دغابازی، بہتان اور چغلخوری، غیبت اور بد گوئی، مداحی اور خوشامد، بخل اور حرص طمع، بے ایمانی اور چوری، غیظ وغضب اور کینہ، فخر وغرور، ریاکاری اور خود بینی، حسد اور فحش گوئی یہ سب رذائل نفاق کے پستان سے دودھ پی کر پلتے ہیں اور جوان ہوتے ہیں۔

دراصل نفاق اسلام کی نہیں بلکہ اسلامی نظام کی اپوزیشن ہے کیونکہ اسلامی مملکت قائم ہی اس مقصد سے ہوتی ہے کہ شخصیت کے نشوونما اور اجتماعی سیرت کے راستے میں جتنی رکاوٹیں ہو سکتی ہیں انہیں دور کرے اور وہ تمام ترغیبات اور ترہیبات فراہم کرے جو اس مقصد کے حصول میں مددگار ہوں یہی وجہ ہے کہ اسلامی مملکت کا تصور خدا کی ذات وصفات کے مرکزی تصور سے ماخوذ ہے۔ ایسی مملکت میں جس کا مقصود ہی فرد کا اخلاقی ارتقا اور اس کی تکمیل ذات ہے اعلیٰ شخصیتوں کی کسی وقت کمی نہیں ہو سکتی۔ نفاق اسی مقصد کے راستے میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ یہاں قرآن تکرار اسی رکاوٹ کو دور کرنے پر زور دے رہا ہے اور بتا رہا ہے کہ جب تک یہ آہنی دیوار یہاں سے نہ ہٹے گی اسلام کی اجتماعی زندگی کے غنچے کھل

نکھر کر سامنے نہ آئیں گے۔

(۸۱) کیا وہ لوگ جانتے نہیں کہ اللہ ان کے رازوں اور ان کی سرگوشیوں کو خوب جانتا ہے۔ اور کیا ان کو پتہ نہیں کہ اللہ سب غیبوں سے پوری طرح باخبر ہے۔

یہاں دو باتوں پر الگ الگ تنبیہہ مقصود ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کا ہر فرد اپنے سینے میں اسلامی نظام کے خلاف کدر رکھتا ہے۔ سازشیں اور اسکیمیں سوچتا رہتا ہے لیکن ان کا اعلان نہیں کرتا۔ ان کو زبان پر نہیں لاتا ہے۔ زبان پر کچھ ہوتا ہے اور دل میں کچھ۔ اللہ ان سب کے دل کے رازوں اور سینہ کے بھیدوں سے خوب باخبر ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ وہ آپس میں بیٹھ کر اسلامی نظام کے خلاف اجتماعی طور پر خفیہ میٹنگیں کرتے ہیں اور الگ الگ ہو کر جو کچھ سوچا تھا اس کے بارے میں سرگوشیاں کرتے ہیں۔ ان کی سرگوشیوں میں خیر کا کوئی پہلو نہیں ہوتا تھا۔ ان کی سرگوشی گناہ تعدی اور حضور اقدس ﷺ کے خلاف لوگوں کو بغاوت پر ابھارنے کے لیے ہوتی تھی۔ یہ لوگ یہودیوں کے آلہ کار تھے اور ان کی تمام سرگوشیوں کا منتہایہ تھا کہ جماعت میں کوئی ایسا فتنہ پیدا کریں کہ اسلامی نظام کا قیام پروان نہ چڑھ سکے۔ مدینہ طیبہ میں حضور اقدس ﷺ کی تشریف آوری سے پہلے اوس اور خزرج کے قبیلے باہمی خانہ جنگی سے اس قدر تنگ آچکے تھے کہ مجبوراً ان کو اس کے انتظام کے لیے ایک شخص کی قیادت پر متفق ہونا پڑا اور اس بات کی تیاریاں کر رہے تھے کہ کسی کو اپنا بادشاہ بنا کر باقاعدہ اس کی تاج پوشی کریں یہاں تک کہ انہوں نے تاج بھی بنوا لیا تھا۔ اس کے لیے قبیلہ خزرج کے رئیس عبداللہ ابن ابی بن سلول کو چن لیا تھا۔ محمد بن اسحاق کا بیان ہے کہ قبیلہ خزرج میں اس کی عظمت مسلم تھی۔ اور اوس خزرج اس سے پہلے کسی کی قیادت پر جمع نہ ہوئے تھے[1]

صورت حال یہی تھی کہ اسلام ایک نظام کی حیثیت سے قائم ہو رہا تھا اور جیسا کہ البقرۃ میں پڑھ چکے ہو کہ اسلام کا ہر ارتقائی قدم ان کے مرض نفاق میں اضافہ کا ذریعہ بن رہا تھا۔ اس آیت میں ان کے بارے میں بتایا ہے خواہ کیسے ہی وعدے کریں باتیں بنائیں۔ یا مجبور ہو کر مال کی پیش کش کریں اللہ سبحانہ ان کے ارادوں اور نیتوں کو خوب جانتا ہے۔ اور ہم مشربوں کے ساتھ بیٹھ کر جو مشورے کرتے ہیں ان سے پوری طرح آگاہ ہے وہ جانتا ہے کہ لنصدقن ولنکونن من الصالحین کا وعدہ اور گھبرا کر زکوٰۃ پیش کرنا کس دل اور کیسی نیت سے ہے[2]

---

[1] سیرۃ ابن ہشام — [2] افادات شیخ الاسلام

حقیقت میں خدا کا اعتقاد و تصدیق بے معنے ہے اگر اس کی خوشنودی اور ناخوشی اس کی رحمت اور اس کے غضب و انتقام کے اصول انسان پر واضح نہ ہوں جس خدا کی پسند و ناپسندیدگی کا کوئی معیار نہ ہو جس کے متعلق انسان یہ علم نہ رکھتا ہو کہ وہ کس قسم کے عمل سے خوش ہو کر انعام دیتا ہے اور کون سے مسائل اس کے غیظ و غضب کا موجب بنتے ہیں اس کی طرف سے دلوں میں خوف و محبت اور بیم و رجا کے جذبات کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ منافق کی ساری کمزوری یہ ہے کہ وہ خدا کو زبان سے مانتا ہے لیکن جو کچھ وہ کہتا ہے اسے اس کا دل باور نہیں کرتا ہے۔ اس کے ظاہر و باطن میں ہم آہنگی کے فاصلے ہی فاصلے ہوتے ہیں۔

منافقین کی ذہنی پستی

(۸۲) یعنی ان لوگوں سے جو برضا و رغبت اہل ایمان کی مالی قربانیوں پر عیب لگاتے ہیں۔ اور جن اہل ایمان کو اپنی مشقت کے سوا کچھ نصیب نہیں ہوتا ان کا مذاق اڑاتے ہیں۔ اللہ ان کو مذاق کی جزا دے گا۔ اور ان کے لیے دردناک عذاب ہے۔ ایک مرتبہ آنحضرت ﷺ نے مسلمانوں کو صدقہ دینے کی ترغیب دی۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ عنہ نے چار ہزار دینار یا درہم دیئے۔ عاصم بن عدی نے ایک سو وسق کھجوریں جن کی قیمت چار ہزار درہم ہوتی تھی۔ پیش کیں۔ منافقین کہنے لگے کہ ان دونوں نے دکھلاوے اور نام نمود کو دیا ہے۔ ایک غریب صحابی ابوعقیل حجابؓ جو محنت و مشقت سے تھوڑا کما کر لائے تھے اس میں سے ایک صاع صدقہ کیا تو مذاق اڑانے لگے یہ خواہ مخواہ زور آوری سے لہو لگا کر شہیدوں میں داخل ہونا چاہتا ہے۔ بھلا اس کی ایک صاع کھجوریں کیا بنائیں گی۔ غرض تھوڑا دینے والا اور زیادہ دینے والا کوئی ان کی زبان سے نہ بچتا تھا۔ کسی پر طعن کسی پر ٹھٹھا کرتے تھے حق تعالیٰ نے فرمایا سخر اللہ منھم اللہ نے ان سے ٹھٹھا کیا ہے یعنی ان کے طعن و تمسخر کا بدلہ دیا ہے بظاہر تو وہ چند روز مسخرہ پن کرنے کے لیے آزاد چھوڑ دیئے گئے ہیں لیکن فی الحقیقت اندر ہی اندر رشک کی جڑیں کٹتی چلی جا رہی ہیں اور عذاب الیم ان کے لیے تیار ہے [1]

اس سے پہلے آیات میں یہ بتایا گیا تھا کہ منافقین اللہ کے راستہ میں خرچ کرنے میں بخیل ہیں۔ اب اس آیت میں یہ بتایا جا رہا ہے کہ صرف یہی نہیں کہ خود مال خرچ کرنے میں بخیل ہیں بلکہ دوسروں کو

[1] افادات شیخ الاسلام

بھی خرچ کرتے نہیں دیکھ سکتے۔ جس کو راہ خدا میں خرچ کرتے دیکھتے ہیں اس کو اپنے طعنوں اور آوازوں کا نشانہ بناتے ہیں جو فیاض اور مخلص آدمی فیاضی اور خوش طبعی سے راہ خدا میں دیتے ہیں ان پر ریاکاری کی پھبتی کستے ہیں محض دینداری کی نمائش کے لیے دے رہا ہے اور جو بیچارے غریب کچھ رکھتے نہیں جان جوکھوں میں ڈال کر محنت ومزدوری کر کے لاتے ہیں اس میں سے راہ خدا میں دیتے ہیں۔ ان کا بھی مذاق اڑاتے ہیں اور آوازے کستے ہیں کہ لو یہ بھی حاتم طائی کی گور پر لات مارنے آئے ہیں۔

دراصل یہ بخیل کا نفسیاتی تجزیہ پیش کیا گیا ہے کہ بخیل آدمی اپنی بخالت پر پردہ ڈالنے کے لیے چاہتا ہے کہ دوسرے بھی بخیل بن جائیں۔ اندھا دوسروں کو بھی اندھا دیکھنے کا خواہش مند ہوتا ہے تاکہ اسے کوئی اندھا کہنے والا نہ رہے۔ یہی نفسیات ان منافقین کی تھیں اور اسی سے ان کی اسلام دشمنی کے جذبے کی تسکین ہوتی تھی نہ وہ خود اسلام کی خاطر ایثار کرتے تھے اور نہ یہ چاہتے تھے کہ کوئی اسلام کی راہ میں خرچ کرے اس لیے جب وہ اسلام کی خاطر دریا دلی کرتے دوسروں کو دیکھتے تو دل کی جلن ان مخلصین پر آوازے کس کے نکالتے۔ یہاں لفظ ھمز کے استعمال پر بہت گہری معنویت ہے۔ قرآن میں ان ہی منافقین کے بارے میں کھلے لفظوں میں یہ بتایا ہے۔ الذین یبخلون ویامرون الناس بالبخل۔ خود بخل کرتے ہیں اور دوسروں کو بخل کی تلقین کرتے ہیں اور ان ہی سرمایہ داروں کا قرآن نے ایک سورت میں ھمزہ لمزہ سے چہرہ پیش کیا ہے۔ ھمزہ ھمز سے لمزہ لمز سے بنا ہے دونوں میں باریک سا فرق ہے، ایک کے معنے منہ پر عیب نکالنے دوسرے کے معنے پیٹھ پیچھے عیب نکالنے کے ہیں ویل لکل ھمزۃ لمزۃ الذی جمع مالا وعددہ ان لوگوں کی خصوصیت یہ ہے کہ اپنے سے آگے نکل جانے والوں کے سامنے عیب نکالتے ہیں اور جو منہ پر کچھ کہنے کی جرات نہیں رکھتے وہ پس پشت یاوہ گوئی کرتے ہیں۔

سخر اللہ منھم اس قسم کی تعبیر علمائے بلاغت کی زبان میں مشاکلت کہلاتی ہے عربی میں یہ طریقہ عام ہے یعنی اسی لفظ کو الٹ دینا مطلب یہی ہے کہ اللہ ان کو تمسخر کی سزا دے گا یعنی ان کے تمسخر کو ان پر ہی پلٹ دے گا۔ بجازیھم جزاء السخر۔ جیسے سیئہ کی جزا کو مشاکلت کی بنا پر سیئہ کہہ دیا جاتا ہے ایسے ہی تمسخر کی جزاء کو تمسخر کہہ دیا گیا ہے ورنہ اللہ سبحانہ کی ذات اقدس ہر قسم کے تمسخر سے پاک ہے تعالی من ذالک علوا کبیرا۔

آیت قرآنی کا پس منظر

آیئے اب آیت قرآنی کے اس پس منظر کو بھی پڑھ لیجئے جو آپ حضرت شیخ الاسلام کی زبانی سن آئے ہیں

شیخ الاسلام نے جو واقعہ بیان کیا ہے یہ حدیث کی کتابوں میں مختلف الفاظ میں آیا ہے۔ صحیح بخاری میں بحوالہ ابومسعود انصاری یہ واقعہ اس طرح آیا ہے۔ کتاب الزکوٰۃ اور کتاب التفسیر میں ہے۔ کتاب الزکوٰۃ میں اس طرح ہے کہ:۔

حضرت ابومسعود انصاری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ جب آیت صدقہ نازل ہوئی ہم باہم ایک دوسرے کی مزدوری کرتے تھے۔ ایک شخص آیا اس نے بہت زیادہ صدقہ پیش کیا تو منافقین نے کہا کہ دکھاوا کر رہا ہے۔ ایک اور شخص آیا اس نے ایک صاع صدقہ دیا منافقین نے کہا کہ اللہ سبحانہ کی ذات اس سے بے پرواہ ہے قرآن کی یہ آیت نازل ہوئی۔

اور کتاب التفسیر میں اس طرح ہے۔

حضرت ابومسعود بدری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضورؐ نے جب ہمیں صدقہ کا حکم دیا تو ہم ایک دوسرے کی مزدوری کرتے۔ ابوعقیل رضی اللہ تعالیٰ عنہ صرف آدھا صاع لے کر آئے۔ ایک شخص بہت زیادہ لے کر آیا منافقین نے ابوعقیل کے بارے میں کہا کہ اللہ کو اس صدقہ کی کیا پروا ہے اور زیادہ والے کے متعلق کہا کہ یہ تو دکھاوے کے لیے لے کر آیا ہے قرآن کی یہ آیت الذین یلمزون المطوعین من المومنین نازل ہوئی۔

اصل ارشاد کے الفاظ کنا نحامل ہیں حافظ عسقلانی نے اس کے معنے یہ بتائے ہیں کہ باہم ایک دوسرے کا کام مزدوری پر کرتے۔ اور زیادہ صدقہ پیش کرنے والے کا نام عبدالرحمٰن بن عوفؓ لکھا ہے۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ کی پیش کردہ اس سے زیادہ مقدار کی تعیین میں اختلاف ہے بخاری و مسلم میں تو مقدار نہیں بتائی گئی۔ حدیث کی دوسری کتابوں میں اس کی تعیین آئی ہے۔ مسند بزاز میں ابوہریرہؓ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ عبدالرحمٰن نے کہا:۔

یارسول اللہ میرے پاس چار ہزار ہیں دو ہزار میں راہ خدا میں دیتا ہوں اور دو ہزار میں اپنے بال بچوں کے لیے رکھتا ہوں۔

لیکن یہ روایت متصل نہیں ہے یہی روایت عبد بن حمید نے مسند میں ابن ابی حاتم، طبری ابن مردویہ نے دوسری سند سے پیش کی ہے۔ محمد بن اسحاق نے اسی کو بلا سند لکھا ہے۔ ابن جریر طبری اور ابن ابی حاتم نے اس طرح روایت کیا ہے کہ:

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غزوہ تبوک میں صدقہ کی ترغیب دی حضرت عبدالرحمٰن ابن عوف

چار ہزار لے کر آئے اور بولے کہ یا رسول اللہ میرا مال آٹھ ہزار ہے میں نے آدھا آپ کی جناب میں پیش کر دیا اور آدھا میں نے بال بچوں کے لیے رکھ لیا حضورؐ نے دعا فرمائی اور اسی روز عاصم بن عدی نے سو وسق کھجور دی اور ابو عقیل کھجور کا ایک صاع لے کر آئے۔

ابن جریر طبری نے حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے عوفی کے حوالہ سے بھی لکھا ہے لیکن عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے بحوالہ علی ابن طلحہ بتایا ہے کہ عبدالرحمٰن بن عوف رضی اللہ تعالیٰ عنہ چار سو اوقیہ سونا لے کر آئے اور بتایا کہ میری ملک میں آٹھ سو اوقیہ سونا ہے۔ اور عبدالرزاق صاحب مصنف حضرت قتادہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے فرماتے ہیں کہ آٹھ ہزار دینار تھے۔ قاضی عیاض نے شفا میں لکھا ہے کہ نو سو اونٹ پیش کیے۔ بہرحال حضرت عبدالرحمٰن کے صدقہ کی مقدار میں بے حد اختلاف ہے۔ صحیح بات وہی ہے جو بخاری و مسلم میں ہے کہ تصدق بشئ کثیر۔ حضرت عبدالرحمٰن رضؓ نے بہت صدقہ دیا تھا لیکن یہ کتنا تھا تاریخی طور پر اس کی تعیین مشکل ہے۔

اِسْتَغْفِرْ لَهُمْ اَوْ لَا تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ ؕ اِنْ تَسْتَغْفِرْ لَهُمْ سَبْعِيْنَ مَرَّةً فَلَنْ يَّغْفِرَ اللّٰهُ لَهُمْ ؕ ذٰلِكَ بِاَنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِى الْقَوْمَ الْفٰسِقِيْنَ ﴿٨٠﴾

اے پیغمبر ﷺ تم ان کے لیے بخشش مانگو یا بخشش نہ مانگو۔ اور اگر تم ان کے لیے ستر بار بھی بخشش مانگو گے تو اللہ ان کی ہرگز بخشش نہ فرمائے گا۔ یہ اس لیے کہ انھوں نے اللہ ورسول کا کفر کیا ہے اور اللہ تعالیٰ بدکاروں کو راہ نہیں بتاتا ہے[٨٣]

منافقین کا حکم

امام رازی نے تفسیر کبیر میں لکھا ہے کہ منافقین کی متعدد قسمیں ہیں قرآن نے ان قسموں کی طرف ومنھم من یقول۔ منھم الذین یؤذون النبی۔ منھم من عاھد اللہ۔ سے اشارا بھی کیا ہے۔ قرآن نے اسی پارے میں منافقین کے اور طبقوں کا بھی ذکر کیا ہے۔ جس طرح آخری انجام کے اعتبار سے مسلمانوں کے مدارج مختلف ہیں بلکہ ان کے ایمان اور اعمال کے مراتب کے لحاظ سے انہیں مختلف مدارج عطا کیے جائیں گے اسی طرح منافقین سب ایک درجہ میں نہیں ہیں۔ بلکہ ان کے مراتب نفاق کے اعتبار سے ان کی سزاؤں کے بھی مختلف مدارج ہیں۔ جس منافق کے اندر نفاق اپنی پوری شدت سے کارفرما ہوگا اس کے عذاب کی کیفیت اور کمیت کچھ اور ہوگی۔ اور جس کے اندر نفاق کی معمولی اور نسبتاً ہلکی خصوصیات ہوں گی اس کے عذاب کی نوعیت کچھ اور ہوگی یہی فرق ان احکام میں بھی ملحوظ ہے جو عام مسلمانوں کو منافقوں کے بارے میں دیئے گئے ہیں۔ خود اصول جزا کا یہی تقاضا ہے کہ مختلف طبقات منافقین کے درمیان یہ فرق

ملحوظ رکھا جائے۔ قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے مثلاً وہ لوگ جو خدا اور رسول خدا اور آیات قرآنی کے ساتھ استہزأ کرتے ہیں ان کے بارے میں ارشاد ہے۔

لا تعتذروا قد کفرتم بعد ایمانکم ان نعف عن طائفۃ منکم نعذب طائفۃ بانھم کانوا مجرمین۔

منافقو! باتیں نہ بناؤ یقیناً تم نے ایمان لانے کے بعد کفر کیا اگر تم میں سے ایک گروہ کو معاف بھی کردیں تو دوسرے گروہ کو ضرور عذاب دیں گے کیونکہ وہ ہی مجرم ہیں۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ نفاق جو جان بوجھ کر اختیار کیا جائے اس کا مقام اور ہے۔ اور محض جہالت قلت اعتنائی یا ضعف نفس کی بنا پر ہو اس کا مقام اور ہے اور کیا عجب ہے کہ رحمت الٰہی کا دائرہ کسی وقت وہاں تک وسیع ہو جائے۔

منافقین کے طبقات

اس نقطۂ نظر سے جب ہم عام منافقین کے حالات وصفات پر نگاہ ڈالتے ہیں اور ان کی کیفیات نفسی کا عام مطالعہ کرتے ہیں تو منافقین تین بڑے طبقات میں بٹے نظر آتے ہیں۔

منافقین کا طبقہ اول

ایک تو وہ اشرار ازلی ہیں جو اسلام اور کفر دونوں کی حقیقت دونوں کے نظریات اور دونوں کے نصب العین سے بخوبی واقف ہیں۔ پھر اس واقفیت کے بعد ان کا دل اسلام سے پوری طرح برگشتہ اور کفر کا فرانہ نظریات کا سچا عقیدت کیش ہے لیکن اس کے باوجود اس کے مصالح ہیں جو انہیں مجبور کیے ہوئے ہیں کہ اسلام سے علانیہ بے تعلقی کا اظہار نہ کریں بلکہ منافقت کے لباس میں اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرنے کی کوشش کریں یہ منافقانہ طرز عمل خواہ کسی نے اپنی ذاتی اغراض اور مصلحتوں کی خاطر اختیار کیا ہو یا کسی مسلک کفر کے اعتقادات اور نظریات مسلم عوام میں کامیابی کے ساتھ پھیلانے کے لیے چال کے طور پر اختیار کیا ہو۔ یا مسلمانوں کے نظام ملی میں اختلال برپا کرنے کے لیے اور ان کے جماعتی رازوں کی جاسوسی کرنے اور در پردہ ان کی قوتوں کو فنا کردینے کے لیے سیاسی حربے کے طور پر اختیار کیا ہو بہرحال اس قسم تمام منافقین ایک طبقہ ہیں۔

منافقین کا دوسرا طبقہ

دوسرا طبقہ ان لوگوں کا ہے جو گو حالتِ نفاق میں مبتلا ہیں لیکن ان کا باطن اتنا زنگ آلود نہیں ہے جیسا کہ مقدم الذکر طبقہ کا ہے۔ ان کا نفاق یا تو ناواقفیت پر مبنی ہے یعنی ان کے سامنے اسلامی اور غیر اسلامی اصول و معتقدات اچھی طرح ایک دوسرے سے متمیز نہیں ہیں اور اس وجہ سے وہ نادانستہ کفر کی حالت میں مبتلا ہیں یا پھر ان کے نفس کی کمزوری نے انہیں منافقین کی صف میں لا کھڑا کیا ہے۔ اگرچہ یہ لوگ کفر کی بہ نسبت اسلام سے زیادہ قریب ہیں مگر ان کے اسلام میں اتنی قوت نہیں ہے کہ اپنے اصول و مسلک کی خاطر اپنے مادی علائق اپنی طبعی لذات اور اپنی دنیوی مصالح کو قربان کر سکیں۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ نے اسی طبقہ کا حجۃ اللہ البالغہ میں چہرہ پیش کیا ہے۔

> سلف کی زبان میں اسی کا نام نفاق عمل ہے اور یہ اس طرح نشوونما ہوتا ہے کہ طبیعت کی غلط افتاد، رسم و ماحول یا غلط معلومات کا پردہ سامنے آجاتا ہے۔ اس کے نتیجہ میں دنیا کی محبت میں خاندان اور اولاد کی محبت میں ڈوب جاتا ہے اس کے دل میں آخرت میں حساب کا فکر نہیں رہتا اور غیر شعوری طور پر گناہوں پر دلیر ہو جاتا ہے۔ اگرچہ عقلی طور پر وہ سب کچھ مانتا ہے جو ماننا چاہیے۔

پہلا طبقہ نفاق کی آخری سرحد پر ہے۔ اس آیت میں اسی طبقہ کا حکم بیان ہو رہا ہے۔ اس سے پہلے رکوع میں اسی طبقہ کا ذکر ہوا ہے ان کے اعمال اکارت ہو جائیں گے۔ حبطت اعمالھم اور اس کا حبط عمل یہ ہے کہ :۔

> اللہ نے منافق مردوں اور منافق عورتوں سے اور کفار سے نارِ جہنم کا وعدہ کر رکھا ہے۔ جس میں وہ ہمیشہ رہیں گے۔

ان منافقین و کفار کے لیے جہنم کی سزا تو ضرور ہے لیکن منافقین کے بارے میں ہے۔ ان المنافقین فی الدرك الاسفل من النار۔ اور یہ امتیازی سزا بالکل تقاضائے عدل ہے، اس آیت میں عذاب کی اسی سنگینی کو بتایا گیا ہے۔

(۸۳) اے پیغمبر ان منافقوں کے لیے تم خواہ دعائے مغفرت کرو یا نہ کرو تم چاہے ستر بار بھی ان کے لیے دعا مغفرت کرو گے تب بھی اللہ سبحانہ ان کی ہرگز بخشش نہیں فرمائے گا۔ اللہ بدکاروں کو ہدایت نہیں دیتا ہے

یعنی منافقین کے لیے آپ کتنی بار استغفار کیجئے ان کے حق میں بالکل بیکار اور بے فائدہ ہے۔ اللہ سبحانہ ان بدبخت کافروں۔ اور نافرمانوں کو کبھی معاف نہ فرمائے گا۔ واقعہ یہ پیش آیا کہ مدینہ میں رئیس المنافقین عبداللہ بن ابی بن سلول کا انتقال ہوا۔ آپ نے قمیص مبارک کفن میں دی۔ لعاب مبارک اس کے منہ میں ڈالا نماز جنازہ پڑھی اور دعائے مغفرت کی۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ اس معاملہ میں آڑے آتے تھے اور کہتے تھے کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ وہی خبیث تو ہے جس نے فلاں فلاں وقت ایسی نالائق حرکات کیں ہمیشہ کفر و نفاق کا علمبردار رہا کیا حق تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا۔ استغفر لھم او لا تستغفر لھم الخ۔ آپ نے فرمایا اے عمرؓ مجھے استغفار سے منع نہیں کیا گیا بلکہ آزاد رکھا گیا ہے کہ استغفار کروں یا نہ کروں۔ یہ اللہ سبحانہ کا کام ہے کہ اسے معاف نہ کرے یعنی ان کے حق میں میرا استغفار نافع نہ ہو سو ان کے حق میں نہ سہی ممکن ہے دوسروں کے حق میں میرا یہ طرز عمل نافع ہو جائے دوسرے لوگ سب سے بڑے موذی کے حق میں نبی کے اس وسعت اخلاق اور وفور رحمت و شفقت کو دیکھ کر اسلام اور پیغمبر اسلام کے گرویدہ ہو جائیں چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ صحیح بخاری کی ایک روایت میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ اگر میں جانتا کہ ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرنے سے اس کی مغفرت ہو سکتی ہے تو میں ستر مرتبہ سے زیادہ استغفار کرتا۔ گویا اس جملہ میں حضور نے متنبہ فرما دیا کہ حضرت عمرؓ کی طرح آپ بھی اس کے حق میں استغفار کو غیر مفید تصور کرتے تھے فرق اس قدر ہے کہ حضرت عمرؓ کی نظر بغض فی اللہ کے جوش میں اس نقطہ پر تھی اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم میت کے فائدے سے قطع نظر فرما کر عام پیغمبرانہ شفقت کا اظہار اور احیاء کے فائدہ کا خیال فرما رہے تھے لیکن آخر کار وحی الٰہی و لا تصل علیٰ احد منھم مات ابداً۔ نے صریح طور پر منافقین کا جنازہ پڑھنے یا ان کے کفن دفن کے اہتمام میں حصہ لینے کی ممانعت فرما دی۔ کیونکہ اس طرز عمل سے منافقین کی ہمت افزائی اور مومنین کی دل شکستگی کا احتمال تھا اس کے بعد حضورؐ نے کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں پڑھی [1]

اسی قسم کی آیت سورہ منافقون میں آئی ہے۔ سواء علیھم استغفرت لھم ام لم تستغفر لھم لن یغفر اللہ لھم واللہ لا یھدی القوم الفاسقین۔ ترجمہ وہی ہے۔ اور یہ آیت سورہ توبہ سے تین سال پہلے نازل ہو چکی تھی۔ فرق صرف یہ ہے کہ سورہ براءت میں سبعین مرۃ کے اضافہ سے اس میں زور پیدا کر دیا گیا ہے۔ اور اس میں یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ مغفرت نہ کرنے کا سبب اللہ و رسول کا کفر ہے۔ سبعین سے محاورے کی زبان میں عدد نہیں کثرت مراد ہوتی ہے۔ مطلب یہ ہے جس قدر

[1] افادات شیخ الاسلام

اور جتنی بھی زیادہ تم ان کے لیے مغفرت مانگو گے ان کے بارے میں تمہاری درخواست ہرگز قبول نہ کی جائے گی۔ اس آیت میں یہ دو اضافے اول سبعین مرۃ دوسرے ذالك بانھم کفروا باللہ ورسولہ بہت ہی خوبصورت اور برموقعہ ہیں۔ آیت میں خطاب اگرچہ بصورت امر ہے لیکن معنے کے لحاظ سے خبر ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ منافقین کی اس جماعت کے لیے آپ کی دعاء مغفرت کرنا اور نہ کرنا دونوں یکساں ہیں۔ خواہ دعاء مغفرت کی کتنی بہتات ہو ان کے لیے باب رحمت ہرگز نہ کھلے گا۔

دونوں آیتوں کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس ان کی ہدایت کی امید پر ان کے لیے دیر سے دعا کر رہے تھے جیسے آپ مشرکین کے لیے دست بدعاء رہتے تھے۔ اللھم اغفر لقومی فانھم لا یعلمون۔

یہاں یہ سوچ بے محل ہے کہ مشرکین کے لیے دعائے مغفرت سے قرآن میں منع کیا گیا ہے ماکان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین یہ ممانعت اس وقت ہے جب نبی ﷺ کو کسی کا جہنمی ہونا معلوم ہو جائے اور جس کی شرک وکفر ہی پر موت واقع ہو۔ زندہ کافروں کے لیے مغفرت کی دعا منع نہیں ہے۔ جن منافقین کا یہاں ذکر ہو رہا ہے وہ ہیں جن کے کفر کی خبر اللہ سبحانہ نے حضور اقدس ﷺ کو دے دی تھی۔ اور یہ ایک مقررہ تعداد تھی۔ جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ ان کی تعداد بارہ تھی۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ حکم خاص خاص منافقوں کے لیے ہوا تھا اور حضور اقدس ﷺ نے حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو ان کے نام بتا دیئے تھے۔[1]

اسی لیے یہاں عدم مغفرت کا سبب بھی بیان کر دیا۔ ذالك بانھم کفروا باللہ ورسولہ۔ یعنی ان کی مغفرت نہ ہونے کا سبب یہ ہے کہ یہ مسلمان نہیں ہیں بلکہ ان میں اللہ و رسول کا کفر کھل کر سامنے آگیا ہے بالفاظ دیگر مطلب یہ ہوا کہ ان کے نہ بخشے جانے کا سبب یہ نہیں کہ آپ کی استغفار میں قوت فاعلی نہیں ہے بلکہ بنیادی سبب یہ ہے کہ ان میں مغفرت کے لیے قابلیت نہیں ہے۔ اگر ان میں بخشے جانے کی قابلیت ہوتی تو آپ کے استغفار کے موثر ہونے میں کوئی رکاوٹ نہ ہوتی۔ آپ کی دعاء کے لیے رحمت کا دروازہ کشادہ رہتا ہے بشرطیکہ جن کے لیے کی جارہی ہے ان میں اس فیضان کے لینے کی صلاحیت ہو قرآن نے حضور اقدس ﷺ کے لیے یہ ضابطہ بتایا ہے۔

لو انھم اذ ظلموا انفسھم جاءوك فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول

---

[1] فتح الباری

لوجدوا اللہ توابا رحیما۔

اگر وہ اپنی جانوں پر ظلم کر کے یعنی گناہوں کے ارتکاب کے بعد آپ کے پاس آئیں خدا کی جناب میں گناہوں کی معافی مانگیں اور آپ بھی ان کے لیے مغفرت کی درخواست اللہ سے کریں تو ایسے لوگوں کی اللہ توبہ قبول کرتا ہے اور ان پر رحمت کرتا ہے۔

یعنی آپ کی دعاء ان کے لیے کارآمد اور مفید ہوتی ہے جن میں اپنی خطا کاری کا احساس ہو اور گناہوں پر ندامت ہو اور وہ خود بھی اللہ کی جناب میں معافی کی درخواست کریں۔ وہاں ہرگز موثر و مفید نہیں ہوتی جہاں کفر ہی نہیں بلکہ کفر پر اصرار ہو۔ اور ایمان کے دائرے ہی سے نکل چکے ہوں ایسے ناخدا شناس اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت کرنے والوں میں یہ قابلیت ہی نہیں ہے کہ آپ کی قوت فاعلی ان میں مؤثر ہو اللہ کا قانون یہ ہے کہ بدکار و سرکش لوگوں کے لیے جو توبہ و ایمان کی استعداد ہی تج کر بیٹھے ہوں توفیق کا دروازہ ہی نہیں کھلتا توفیق الہی تو بقدر طلب و ارادہ آتی ہے۔

اس آیت میں سبعین مرۃ تعدید کے لیے نہیں تکثیر کے لیے آیا ہے زمخشری لکھتے ہیں لفظ سبعین عربی زبان میں تکثیر کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں استغفار کی ممانعت کے لیے آیا ہے۔ لیکن صحیح بخاری میں ہے کہ :۔

جس وقت حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو عبداللہ ابن ابی سلول پر جنازے کی نماز سے روکا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مجھے اللہ نے اختیار دیا ہے کہ چاہے بخشش مانگو یا نہ مانگو میں ستر سے زیادہ بار مانگوں گا۔ سازیدہ علی السبعین۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ سبعین کی تعبیر تکثیر کے لیے نہیں بلکہ تعدید کے لیے ہے۔ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے بھی اسے تکثیر کے معنے میں سمجھا ہے لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے تعدید کے معنے لیے ہیں زمخشری نے اس پر سوال قائم کر دیا ہے اور سوال اپنی جگہ اہم بھی ہے اور معقول بھی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب افصح العرب اور عربی انداز تعبیر کے سب سے زیادہ رمز شناس ہیں تو آپ پر یہ بات کیسے مخفی رہی ہے۔ کچھ علماء نے اس اشکال کی طاقت سے متاثر ہو کر حدیث کی صحت ہی سے انکار کر دیا ہے چنانچہ امام ابوبکر الباقلانی امام غزالی اور امام داودی نے یہ تصریح کر دی ہے کہ یہ حدیث صحیح نہیں ہے۔ اور امام الحرمین تو یہاں تک کہہ گئے کہ یہ حدیث صحیح بخاری میں نہیں ہے۔ زمخشری نے اس اعتراض کا جواب دیا ہے کہ بلاشبہ ان امور کو آپ سے زیادہ سمجھنے والا کوئی نہ تھا لیکن اس انتہائی دلسوزی کی بنا پر جس کا جوش نبی کے سینے میں ہوتا ہے۔

نبوت ارادۃً الفاظ کی ظاہری گنجائشوں سے فائدہ اٹھالیتی ہے وہ امت کے معاملہ میں تاامکان دوسرے خلاف پہلو کو ذہن میں لاتا ہی نہیں ہے جب تک کہ الفاظ میں اس کے لیے آخری گنجائش بھی ختم نہ ہو جائے ٹھیک اسی طرح جیسے ایک ہمدرد وکیل آئین کی وسعتوں سے آخری حد تک فائدہ اٹھانے کی کوشش کرتا ہے بلکہ اس سے کہیں بڑھ کر۔ چنانچہ اس واقعہ کی جب صراحۃً ممانعت آگئی تو آپ نے پھر کسی کی نماز نہیں پڑھائی ———

لیکن علامہ ابن المنیر نے زمخشری کا یہ کہہ کر تعاقب کیا ہے کہ ایسی بات کی نبوت کی طرف نسبت بھی جائز نہیں۔ کیونکہ جب اللہ سبحانہ نے کافروں کے نہ بخشنے کی اطلاع دے دی تو مغفرت کفار کی ایک امر محال ہو گئی اور ذاتِ نبوت اللہ سے محال کی دعاء کبھی نہیں کر سکتی۔

حافظ عسقلانی نے کچھ علماء کی جانب سے یہ جواب بھی نقل کیا ہے کہ استغفار دو طرح کی ہوتی ہے ایک کہ قبولیت کی امید پر دعا کی جائے دوسرے یہ کہ مردہ کے لیے قبولیت کی امید پر نہیں بلکہ حالات موجودہ میں سازگاری پیدا کرنے کے لیے دعاء مانگی جائے۔ اس دعاء کے نتیجے میں دوسرے لوگ متاثر ہوں گے لیکن حافظ عسقلانی کو یہ جواب بھی پسند نہیں ہے۔

کچھ علماء کہتے ہیں کہ آیت قرآنی میں اللہ سبحانہ نے استغفار اور عدم استغفار میں برابری قائم کر کے عدم قبولیت کی خبر دی تھی۔ لیکن استغفار سے صراحۃً منع نہیں کیا گیا تھا۔ اس سے حضورؐ نے سمجھا کہ مجھے اختیار دیا گیا ہے یہ مطلب نہیں کہ حضور نے حرف عاطف سے تخییر سمجھی۔ اور علامہ الشہاب نے عنایۃ القاضی میں اس سے زیادہ لطیف بات لکھی ہے کہ ان کو فائدہ نہ ہونے میں آپ کی استغفار اور عدم استغفار دونوں برابر ہیں۔ یہ تخییر کے منافی نہیں ہے استغفار اور عدم استغفار دو ضدیں ہیں نہ دونوں کا کرنا جائز ہے اور نہ دونوں کا چھوڑنا جائز ہے۔ ان دونوں میں سے ایک کو اختیار کرنا ضروری ہے اختیار دو طرح سے ہو سکتا ہے کرنے میں یا نہ کرنے میں۔ کرنے میں جیسے سواء علیهم ءانذرتهم ام لم تنذرهم لا یومنون — آخر میں لا یومنون کے باوجود آپ نے انذار کو ترک نہیں کیا یعنی آپ نے دعوت کا کام جاری رکھا اور نفی میں جیسے سواء علیهم استغفرت لهم ام لم تستغفر لهم یہ محتاج تشریح و بیان ہے اسی لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ مجھے اختیار دیا گیا ہے۔ غالباً یہ رخصت و اختیار عبداللہ بن ابی کے لیے کسی حکمت کی بناء پر آپ کو ملی تھی۔

مطلب یہ ہے کہ جیسے انذار و عدم انذار پر مخاطب کے حق میں بے فائدہ تھا ایسے ہی استغفار اور عدم استغفار مخاطب کے حق میں بے فائدہ ہونے کے باوجود آپ کے حق میں یا اسلام کے حق میں بے فائدہ نہ تھا۔ حضور

اقدس ﷺ نے اس فائدہ کا ذکر فرمایا "مجھے تو یہ امید تھی کہ اس عمل سے شائد عبداللہ بن ابی کی قوم کے ایک ہزار افراد مسلمان ہو جائیں گے۔ چنانچہ یہ فائدہ حاصل ہو گیا جب اس کی قوم نے آپ کی شفقت و رحمت کا یہ منظر دیکھا تو ہزار افراد نے اسلام قبول کر لیا۔

سید انور شاہ رحمہ اللہ نے یہاں صحیح بخاری کے درس میں بڑی لطیف بات بتائی۔ فرمایا کہ حضور اقدس ﷺ کا آیت قرآنی سے تخییر کی بات سمجھنا اور سبعین کو تکثیر کے بجائے تحدید پر محمول کر لینا باب بلاغت سے ہے۔ بلاغت میں تلقی المخاطب بما لا یرضیہ المتکلم خاص انداز سے مخاطب کا فائدہ اٹھانے کے لیے کلام میں ایسا مطلب پیدا کر لینا جو متکلم کی مراد نہ ہو۔ حضور اقدس ؐ نے یہ فرما کر میں ستر سے زیادہ بار مغفرت مانگوں گا یہی فائدہ اٹھایا چونکہ صراحۃً ممانعت نہ تھی اس لیے آپ نے موقع سے فائدہ اٹھایا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے بادشاہ کسی مجرم سے کہے لاحملنك على الادهم (میں تجھے بیڑیاں ڈالوں گا) اور مجرم سن کر آگے سے بادشاہ سے کہے۔ الامیر یحمل علی الادھم والاشھب۔ امیر تو سیاہ اور سفید گھوڑے ہی پر سوار کرایا کرتے ہیں حضور اقدس ؐ نے ترحم کی خاطر اسی انداز کو اپنایا۔

اب بات بے غبار ہو کر سامنے آگئی جو بات حضور اقدس ؐ نے اختیار فرمائی وہ آپ کے مقام و منصب کے شایان ہے۔ جن لوگوں کو علوم بلاغت سے مس نہیں اس میں اجنبیت محسوس ہوتی ہے۔ بہر حال اس آیت قرآنی اور حضور اقدس کے عمل کی تطبیق میں شارحین قرآن کو بڑی مشکلوں سے دوچار ہونا پڑا ہے لیکن فی الحقیقت معاملہ بالکل واضح ہے۔

اب تک صرف اس بات کی تشریح کی گئی ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے قرآن میں سبعین مرۃ کے منطوق تکثیر کو تحدید پر کیوں محمول کیا ہے۔ باقی رہا پورا واقعہ جس کا ذکر شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں کیا ہے اس پر تبصرہ انشاء اللہ زیر آیت ولا تصل علی احد منھم ابدا آ رہا ہے۔

یہاں یہ بات ضرور گوش گزار کر لینی چاہیے کہ علامہ آلوسی نے امام رازی کی متابعت میں اس آیت کا سبب نزول یہ بتایا ہے کہ:۔

> حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ جب قرآن کی آیت سخر اللہ منھم نازل ہوئی تو ان آوازہ کسنے والوں اور عیب چینی کرنے والوں نے حضورؐ سے درخواست کی کہ آپ ہمارے لیے مغفرت کی دعا مانگیے۔ حضور اقدس ﷺ نے دعا کرنے کا ارادہ کیا تو یہ آیت استغفر لھم الخ نازل ہو گئی پھر حضورؐ نے ان کے لیے بخشش کی دعا نہیں مانگی۔

یہ نقل کرنے کے بعد امام رازی نے اس پر سوال و جواب کا سلسلہ شروع کر دیا اور علامہ آلوسی بھی جواب الجواب کے میدان میں آگئے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ اس واقعہ کی روایتی و تاریخی حیثیت کیا ہے۔ شارحین قرآن میں سے تو کسی نے اس کا اشارا تک نہیں کیا۔ دونوں بزرگوں نے اس واقعہ کا تاریخی سرا کوئی نہیں بتایا نہ کسی محدث کا نام لیا اور نہ کسی مفسر کا۔ صرف ابن الجوزی نے بتایا ہے کہ یہ ابو صالح کا بحوالہ ابن عباس بیان ہے اور اس کے سوا اس کی کوئی سند ہے نہ کسی روایت کرنے والے محدث کا نام ہے۔

اور پھر یہ روایت بخاری اور مسلم کی ان دونوں روایتوں سے معارض ہے جو بحوالہ ابن عباس اور ابن عمر آئی ہیں اور جن میں صاف بتایا ہے کہ استغفار عبد اللہ ابن ابی کی موت پر جنازے میں ہوئی ہے۔

بہر حال یہ آیت اس سختی اور سخت گیری کی تاکید کے لیے آئی ہے جس کا ذکر جاھد الکفار والمنافقین واغلظ علیھم میں ہوا ہے۔ حضور اقدس ﷺ کی ذات گرامی مجسمہ رحمت و شفقت تھی اس لیے منافقین کی ان شرارتوں اور فتنہ انگیزیوں کے باوجود ان کی اصلاح اور نجات آپ کو اس قدر عزیز تھی کہ جس طرح آپ اپنی تمام امت کے لیے لگاتار اللہ سبحانہ سے بخشش چاہتے رہتے تھے۔ اسی طرح منافقین کے لیے بھی برابر نجات کی دعاء کرتے رہتے تھے۔ لیکن ان کی شقاوت اس درجہ بڑھ گئی تھی کہ یہ اس بات کو بھی گوارا نہ کرتے تھے کہ کوئی دوسرا اسلام کی کوئی خیر خواہی کرے بلکہ ہر خیر خواہ کے حوصلہ کو پست کرنا انھوں نے اپنا پیشہ بنا لیا تھا۔

اب اس آیت میں براہ راست حکم خداوندی سے آپ کو منافقین کے لیے دعاء مغفرت کرنے سے روک دیا گیا۔ کیونکہ اب یہ مستقل پالیسی مقرر کی جا چکی تھی کہ مسلمانوں کی جماعت میں منافقین کو کسی طرح نہ پنپنے دیا جائے۔ اور کوئی ایسا کام نہ کیا جائے جس سے اس گروہ کی ہمت افزائی ہو۔

فَرِحَ الْمُخَلَّفُوْنَ بِمَقْعَدِهِمْ خِلٰفَ رَسُوْلِ اللّٰهِ وَكَرِهُوْٓا
اَنْ يُّجَاهِدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
وَقَالُوْا لَا تَنْفِرُوْا فِي الْحَرِّ ؕ قُلْ نَارُ جَهَنَّمَ اَشَدُّ حَرًّا ؕ
لَوْ كَانُوْا يَفْقَهُوْنَ ﴿۸۱﴾ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا
كَثِيْرًا ۚ جَزَآءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۸۲﴾ فَاِنْ رَّجَعَكَ
اللّٰهُ اِلٰى طَآئِفَةٍ مِّنْهُمْ فَاسْتَاْذَنُوْكَ لِلْخُرُوْجِ فَقُلْ
لَّنْ تَخْرُجُوْا مَعِيَ اَبَدًا وَّلَنْ تُقَاتِلُوْا مَعِيَ عَدُوًّا ؕ اِنَّكُمْ
رَضِيْتُمْ بِالْقُعُوْدِ اَوَّلَ مَرَّةٍ فَاقْعُدُوْا مَعَ الْخٰلِفِيْنَ ﴿۸۳﴾
وَلَا تُصَلِّ عَلٰٓى اَحَدٍ مِّنْهُمْ مَّاتَ اَبَدًا وَّلَا تَقُمْ عَلٰى
قَبْرِهٖ ؕ اِنَّهُمْ كَفَرُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ وَمَاتُوْا وَهُمْ فٰسِقُوْنَ ﴿۸۴﴾

جن لوگوں کو پیچھے چھوڑ دیا گیا وہ اپنے رہ جانے پر حضور اقدس ﷺ کی چاہت
کے خلاف اترائے اور ان کو مالوں اور جانوں کو اللہ کے راستہ میں کھپانا گوارا
نہ ہوا۔[۸۴] اور انھوں نے لوگوں سے کہا کہ اس گرمی میں گھروں سے نہ نکلو۔[۸۵]
اے پیغمبر ان سے فرما دیجئے کہ دوزخ کی آگ کی گرمی اس گرمی سے کہیں
زیادہ ہے۔ اے کاش ان کو اس بات کی سمجھ ہوتی۔[۸۶] ان کو تو اپنی کمائی کی
پاداش میں کم ہنسنا اور زیادہ رونا چاہیئے۔[۸۷] اے پیغمبر بس اگر اللہ تم کو ان میں سے

کسی جماعت کی طرف اس جنگ سے واپس گیا پھر وہ آئندہ کسی جنگ میں تم سے نکلنے کی اجازت طلب کریں تو آپؐ فرما دیجئے کہ تم میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے جنگ کرو گے۔ تم نے پہلی بار بیٹھے رہنا پسند کیا لہٰذا اب بھی پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو ۸۳ اور اے پیغمبرؐ ان میں اگر کوئی مرجائے تو ان کے جنازے کی نماز نہ پڑھنا اور نہ قبر پر کھڑے ہونا۔ کیونکہ انھوں نے اللہ رسول کا کفر کیا اور ایسی حالت میں مرے ہیں کہ ہدایت کے دائرے سے باہر ہیں ۸۴

معانی مفردات

المخلفون۔ مخلف کی جمع وہ جو پیچھے چھوڑ دیا گیا۔ خلف مادہ ہے اگر معنے جانشین ہونے کے ہوں تو مصدر خلافت ہے اور اگر پیچھے آنے کے معنے ہوں تو مصدر خَلَفٌ ہے اس کا باب نصر ہے۔ یہاں خلف ہے جس کے معنے پیچھے آنے کے ہیں۔

خلاف۔ یہ لفظ قرآن میں دو معنے میں استعمال ہوا ہے۔ ایک بے ترتیبی کے معنے میں جیسے تقطع ایدیھم وارجلھم من خلاف ان کے ہاتھ اور پاؤں بے ترتیب کاٹ دیئے جائیں۔ دوسرے بعد اور پیچھے کے معنے ہیں جیسے اذا لا یلبثون خلافك الا قلیلا۔ تو تیرے پیچھے یہ بھی کچھ زیادہ نہ ٹھہریں گے۔ علامہ شہاب لکھتے ہیں کہ لفظ خلاف پیچھے کے معنے میں آتا ہے کہ پیچھا آگے کے مخالف ہوتا ہے آگے کو امام اور پیچھے کو خلاف کہتے ہیں۔ خلاف باب مفاعلت کا مصدر بھی ہے جیسے قتال۔ مخالفت اور خلاف دونوں مصدر آتے ہیں۔ یہاں یہ مفعول فیہ ہونے کی وجہ سے منصوب ہے اگر پیچھے کے معنی ہیں اور مقعد کا مفعول فیہ ہے اور اگر خلاف بمعنے مخالفت ہو اور مصدر ہو تو فرح کا مفعول لہ ہونے کی وجہ منصوب ہے۔

منافقین کے جرائم

یہ منافقین کے طبقہ اول کے جرائم کی داستان ہے۔ اس طبقہ کے بارے میں قرآن کا بنیادی نقطہ نظر یہ ہے کہ اہل ایمان اگر اللہ کی پارٹی ہیں تو اہل نفاق شیطان کی جماعت ہیں اولئک حزب الشیطان۔ اس لیے خواہ یہ لاکھ اظہار ایمان کریں امت اسلامیہ سے ان کا کوئی رابطہ نہیں ہے۔ یہ کبھی بھی جماعت میں شمار نہ کیے جائیں بلکہ ھم العدو فاحذرھم۔ یہ دشمن ہیں ان سے بچ کر رہو۔ کیوں کہ دشمن سے کبھی بھی خیر کی توقع نہیں کی جاسکتی بالخصوص ایسا دشمن جو دوست نما ہو اس کی خطرناکیوں کا پوچھنا ہی کیا ہے۔ ایسے دشمنوں سے کھلے دشمنوں کفار کی بہ نسبت دو چند خبردار اور متنبہ رہنے کی ضرورت ہے ان لوگوں سے کامل علیحدگی اختیار کر لینی چاہیے۔ انہیں اپنے معاشرتی، انتظامی، تعلیمی اور سیاسی معاملات سے بالکل دور رکھنا چاہیے اور ان کا مکمل بائیکاٹ کر کے اپنی جماعت سے الگ کر دینا چاہیے۔ اس بائیکاٹ میں کسی مداہنت کو راہ نہیں دی جاسکتی۔ خصوصاً سیاسی معاملات میں نہ تو ان سے کوئی مشورہ لیا جاسکتا ہے اور نہ اپنی جماعت کے اسرار اور رموز مملکت سے انہیں آگاہ کیا جاسکتا ہے اور کسی معاملہ میں ان کی قیادت اور رہنمائی قبول کرنے کا تو تصور ہی نہیں کیا جاسکتا جب ایک مرتبہ کسی آزمائش میں ان کی منافقت موقع پرستی بے نقاب ہو جائے تو حتی الوسع انہیں کسی جہاد میں عام مسلمانوں کے ساتھ شریک کیا جائے۔ کیونکہ اگرچہ ان کی شرکت سے بظاہر مسلمانوں کی افرادی قوت میں اضافہ ہوگا لیکن دراصل ان کی شرکت اسلامی مفاد میں نہ ہوگی اس لیے کہ وہ میدان میں اپنی شرارتوں سے باز نہ آئیں گے اور اسلامی جماعت کی کمزوری اور پراگندگی ہی کا سبب بنیں گے۔

ان آیات میں جو احکام بیان ہو رہے ہیں وہ ان منافقین کے بارے میں ہیں جو اسلام اور کفر دونوں کی ماہیت سمجھنے کے بعد کفر کی پیروی اختیار کریں اور خفیہ یا علانیہ اسلام کے مقابلہ میں کفر کو تقویت دیں۔ اور اس کے باوجود اپنے آپ کو مسلمان ظاہر کرتے رہیں۔

(۸۱) جن لوگوں کو پیچھے چھوڑ دیا گیا وہ اپنے رہ جانے پر حضور اقدس ﷺ کی چاہت کے خلاف اترائے اور ان کو اپنے مالوں اور جانوں کو اللہ کے راستہ میں کھپانا گوارا نہ ہوا۔ یہ ان منافقین کے متعلق ہے جو غزوہ تبوک کی شرکت سے علیحدہ رہے یعنی منافقین کا حال یہ ہے کہ برائی اور عیب کا کام کر کے خوش ہوتے ہیں نیکی سے گھبرا کر دور بھاگتے ہیں اور جیسا کہ پہلے گذرا کہ نیکی کرنے والوں پر طعن کرتے ہیں اور آوازے کستے ہیں۔ ایسی قوم کو نبی کے استغفار سے کیا فائدہ ہو سکتا ہے یہاں سے بداعتقاد اور گنہگار کے درمیان فرق معلوم ہوتا

ہے۔ گناہ ایسا کونسا ہے جو پیغمبر کے بخشوانے سے نہ بخشا جائے۔ ولو انھم اذ ظلموا انفسھم جاءوك فاستغفروا اللہ واستغفر لھم الرسول لوجدوا اللہ توابا رحیما۔ لیکن بد اعتقاد کو پیغمبر کا ستر بار استغفار بھی فائدہ نہیں دیتا ہے [1]

آیت کا مطلب یہ ہے کہ یہ تبوک میں پیچھے رہ جانے والے اس بات پر خوش ہیں کہ اللہ کا رسول تو اپنے جان نثاروں کے ساتھ میدانِ جنگ میں ہو اور یہ بہانے بنا کر گھروں میں بیٹھے رہیں حالانکہ یہ خوشی کی کوئی بات نہیں ہے بلکہ سوچیں تو ان کی شامت کی دلیل ہے۔ جو بات خوش ہونے کی تھی یعنی اللہ کے راستہ میں جان کھپانا وہ تو ان کو ناگوار ہوئی اور جو بات غمگین ہونے کی تھی اس پر یہ مگن ہو رہے ہیں۔ غرض ان اشقیائے ازل کا یہ بے ضمیر اور بزدل گروہ اسلام اور مسلمانوں کی بیخ کنی میں اپنی کسی تدبیر کے استعمال سے دریغ نہ کرتا تھا لیکن چونکہ خودداری سے قطعاً بے بہرہ تھا اس لیے اپنے دل کے اصلی رجحانات کی پردہ پوشی میں بڑی احتیاط اور تن دہی سے کام لیتا تھا۔ ہاں اللہ سبحانہٗ کی اقشا نیوں کا اس کے پاس کوئی علاج نہ تھا اور ہر لمحہ اسے اس امر کا کھٹکا لگا رہتا تھا کہ کہیں کوئی ایسی سورت نازل نہ ہو جائے جو ہمارے باطن کو عام مسلمانوں کے سامنے کھول کر رکھ دے۔ چنانچہ اس آیت میں ان لوگوں کو بے نقاب کیا گیا ہے جو اپنے اصرار کی وجہ سے لڑائی کے پیچھے چھوڑ دیئے گئے ان کے بارے میں اس آیت میں یہ باتیں بتائی گئی۔

(۱) ان پیچھے رہنے والوں نے پیچھے رہنے پر اصرار کیا تھا اور یہ جنگ میں جانا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے ان کو پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔

(۲) یہ لوگ حضور اقدس ﷺ کے مخالف بن کر رہتے تھے۔

(۳) یہ لوگ جنگ میں نہ جانے پر خوشیاں منا رہے تھے۔

(۴) یہ لوگ اللہ کی راہ میں جان و مال لگانے کو برا سمجھتے ہیں۔

ان جرائم کی موجودگی میں ان کے دعویٰ ایمان کی حقیقت بے نقاب ہو کر لوگوں کے سامنے آگئی۔ ایمان باللہ کا امتحان صرف جہاد میں ہوتا ہے اور یہی وہ کسوٹی ہے جس میں کھرے کھوٹے کی تمیز ہوتی ہے۔ ایمان کا امتحان کرنا چاہتے ہو تو دیکھ لو خدا کی راہ میں تکالیف و مصائب برداشت کرنے کی خواہش کتنی ہے۔ کیونکہ یہی خواہش ایمان کی حقیقی کسوٹی ہے۔ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے۔ من مات ولم یغزو ولم یحدث بہ نفسہ مات علی شعبۃ من النفاق۔ جس شخص کو اس طرح موت آجائے کہ نہ تو اس نے خدا کی

[1] افادات شیخ الاسلام۔

راہ میں جہاد کیا اور نہ اپنے دل میں جہاد کی خواہش کی تو وہ ایک طرح سے نفاق کی حالت میں مرا۔ غور کیجئے آج کتنے مسلمان ہیں جن کے قلوب میں جہاد فی سبیل اللہ کا شوق ہے۔ ایمان و نفاق کا یہی جوہری فرق ہے۔ اللہ سبحانہ ہمیں نفاق کی ہر نوع سے اپنی حفاظت میں رکھے۔

دُوسروں کو ورغلانا نفاق ہے

(۸۵) اور انھوں نے لوگوں سے کہا کہ اس گرمی میں گھروں سے نہ نکلو یا تو منافقین آپس میں ایک دوسرے سے کہتے تھے ـ ـ ـ ـ ـ ـ ـ اور یا کچھ مسلمانوں سے کہتے ہوں گے کہ ان کی ہمتیں پست ہو جائیں [1]

پڑھ چکے ہو کہ ۹ھ میں حضور اقدس ﷺ کو خبر ملی کہ قیصر روم نے مدینہ پر حملہ کرنے کا حکم دے دیا ہے اور عرب کے عیسائی قبائل بھی اس میں شامل ہو گئے ہیں یہ پہلا موقعہ تھا کہ اسلام کو عرب سے باہر ایک بہت بڑی طاقت سے آمادہ پیکار ہونا تھا۔ اس لیے ضروری تھا کہ بروقت مدافعت کا پورا سامان کیا جاتا۔ چنانچہ حضور اقدس ﷺ نے تیاری اور کوچ کا اعلان کر دیا لیکن ایک طرف ضرورت ناگزیر تھی تو دوسری طرف وقت کی ساری باتیں ناموافق ہو رہی تھیں مسلمان چند ماہ پہلے جنگِ حنین و طائف کی لڑائی میں چور ہو چکے تھے۔ اس سے پہلے فتح مکہ کا معاملہ پیش آ چکا تھا۔ پھر اچانک مسلمانوں کی تعداد بہت بڑھ گئی تھی۔ پھر موسم بڑا ہی گرم تھا اور فصل کاٹنے کا موقعہ سر پر آ گیا تھا۔ مدینے کے منافقین میں سے ایک نے نہیں بلکہ متعدد نے کہا کہ اس چلچلاتی گرمی کے موسم میں نہ جانا چاہیے۔ موسم کی ناسازگاری کو راہِ حق میں نکلنے کے لیے بہانہ بنایا اور کہا لاتنفروا فی الحر۔ گرمی بڑی شدید ہے اس وقت لڑائی کے لیے نہ نکلو۔ انھوں نے یہ بات غالباً جنگِ تبوک کے بارے میں مشورہ کے موقعہ پر کہی ہوگی۔ محمد بن یوسف صالحی نے تاریخ میں یہ بھی بتایا ہے کہ یہ بات مشہور جد بن قیس نے جبار بن صخر اور خاندان مسلمہ کے دوسرے ان افراد سے کہی جو اس کے ہمنوا تھے مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ صرف اپنے ہی بیٹھے رہنے پر قانع نہیں ہوئے بلکہ موسم کے ڈراوے سنا کر دوسروں کو بھی ورغلانے کی کوشش کرتے تھے کہ گرمی کا شباب ہے اس آگ میں اس سفر کے لیے نہ نکلو۔

جہنم میں آگ کی گرمی کی شدت

(۸۶) اے پیغمبر ان سے فرما دیجئے کہ دوزخ کی آگ کی گرمی اس گرمی سے کہیں زیادہ ہے اے کاش انہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

اس بات کی سمجھ ہوتی۔ یعنی اگر سمجھ ہوتی تو خیال کرتے کہ یہاں کی گرمی سے بچ کر جس گرمی کی طرف جا رہے ہیں وہ کہیں زیادہ سخت ہے یہ تو وہی مثال ہوئی کہ دھوپ سے بھاگ کر آگ کی پناہ لے حدیث میں ہے کہ دوزخ کی آگ دنیا کی آگ سے ۹۹ درجہ زیادہ ہے[1]۔ دوزخ کی گرمی کی شدت کا کچھ اندازہ کرنا ہو تو حضور اقدس ﷺ کے یہ ارشادات پڑھیئے کہ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں۔ جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ نے دوزخ کو ایک ہزار سال دھکایا دھکتے دھکتے وہ سرخ ہوگئی۔ پھر ایک ہزار سال دہکایا دھکتے دھکتے وہ سپید ہوگئی پھر ایک ہزار سال دھکایا دھکتے دھکتے وہ کالی ہوگئی اب وہ سیاہ رات کی مانند کالی ہے۔ نعمان بن بشیر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ دوزخیوں میں کم سے کم تر عذاب یہ ہے کہ آگ کے دو جوتے اور تسمے ایسے پہنا دیئے جائیں گے کہ دماغ اس طرح کھول جائے گا جیسے ہنڈیا میں کھد اڑتا ہے۔ جس پر حالت بیتے گی وہ خیال کرے گا کہ جہنم میں یہ سب سے سخت عذاب ہے اور واقعہ یہ ہے کہ یہ دوزخ کا کم سے کم تر عذاب ہوگا۔ اخرجاہ فی الصحیحین من حدیث الاعمش[2]۔ خود قرآن نے بھی جو جہنم میں آتشِ جہنم کا چہرہ پیش کیا ہے وہ بھی بے حد دردناک ہے۔ اس آتش اور اس کی شدت کا ذکر بار بار کیا ہے بلکہ النار یعنی آگ گویا دوزخ کا دوسرا نام ہے۔ ان ہی معنوں میں السعیر یعنی جلتی آگ بھی بار ہا استعمال ہوا ہے عذاب الحریق بھی دو تین جگہ آیا ہے اور ایک جگہ یہ ہے تلفح وجوھھم النار ان کے چہروں کو دوزخ کی آگ جھلس دے گی۔ دوزخ کا ایک اور نام سقر ہے جس کے متعلق یہ ہے۔

ما ادراك ما سقر لاتبقی ولاتذر لواحۃ للبشر۔

کیا پتہ ہے کہ سقر کیا ہے نہ وہ رحم کھائے گی نہ چھوڑے گی انسانی چہروں کو جھلس دینے والی ہے۔

اور یہ بھی فرمایا ہے۔ انھا لظی نزاعۃ للشوی۔ وہ شعلہ والی آگ ہے منہ کی کھال ادھیڑنے والی۔ اور یہ بھی فرمایا ہے۔ انھا ترمی بشرر کالقصر کانہ جملت صفر۔ دوزخ محل کے برابر اونچی اتنی بڑی چنگاریاں پھینکے گی جیسے زرد رنگ کے اونٹ۔ وہاں سایہ نہ ہوگا بلکہ حکم یہ ہوگا۔ انطلقوا الی ظل ذی ثلاث شعب لاظلیل ولایغنی من اللھب۔ چلو ایک سائے کی طرف جس کی تین پھانکیں ہوں گی نہ گھن کی چھاؤں اور نہ تپش میں کام۔ وہاں ٹھنڈک نہ ہوگی۔ لایذوقون فیھا بردا ولاشرابا۔ اس میں نہ

[1] افادات شیخ الاسلام [2] ابن کثیر

وہ ٹھنڈک کا مزہ چکھیں گے اور نہ کسی پینے کی چیز کا عذاب دوزخ کی شدت کو ایک سے زیادہ مقامات پر بتایا گیا ہے۔

۱۔ پینے کو گرم پانی ملے گا جس سے آنتیں نکل پڑیں گی۔

سقوا ماً حمیما فقطع امعاء ھم۔ ان کو گرم پانی پلایا جائے گا وہ پانی ان کی آنتوں کے ٹکڑے کر دے گا۔

۲۔ پیپ ان کو پلائی جائے گی۔ الاحمیما وغساقا۔

۳۔ ان کے اوپر سے ان پر گرم پانی چھوڑا جائے گا۔ یصب من فوق رؤسھم الحمیم

۴۔ دوزخ میں کھانے کو سینڈھے کا پھل ملے گا۔ ام شجرۃ الزقوم

۵۔ دوزخی کھانے کو نگل نہ سکیں گے۔ طعاماً ذا غصۃ

۶۔ آگ کے کپڑوں کا ان کا لباس ہوگا۔ قطعت لھم ثیاب من النار

۷۔ ان پر لوہے کے ہتھوڑے پڑیں گے۔ ولھم مقامع من حدید

۸۔ ان کے گلے میں طوق اور زنجیریں ہوں گی۔ الاغلال فی اعناقھم والسلاسل۔

۹۔ کلما ارادوا ان یخرجوا منہا من غم اعیدوا فیھا۔

جب دوزخ سے غم کی وجہ سے نکلنا چاہیں گے واپس دیئے جائیں گے۔

۱۰۔ عذاب سے ان کو چھٹکارا نہ ملے گا۔

۱۱۔ زخموں کا دھون ان کی خوراک ہوگی۔ ولا طعام الا من غسلین۔

اسی ساری تفصیل کو اللہ سبحانہ نے بڑے ہی اچھوتے اور بلیغ انداز میں نار جھنم اشد حرا سے تعبیر کیا ہے۔ آخر میں ارشاد ہوا ہے لو کانوا یفقھون۔ یہاں لو تمنائیہ بھی ہو سکتا ہے اور شرطیہ بھی۔ اگر شرطیہ ہو تو حافظ ابن کثیر نے مطلب یہ بتایا ہے کہ اگر ان میں فقاہت ہوتی تو وہ ضرور اللہ کے رسول کے ساتھ اللہ کے راستہ میں روانہ ہو جاتے۔ اور گرمی کی پرواہ نہ کرتے۔ اور دنیا کی تھوڑی سی وقتی گرمی برداشت کر کے ہمیشہ کی دوزخ کی گرمی سے بچ جاتے۔ لیکن انھوں نے جو کردار پیش کیا ہے وہ تو اس شخص کا کردار ہے جو دھوپ سے بچنے کی خاطر آگ میں کھڑا ہو جائے۔ یا بارش سے بچنے کے لیے پرنالہ کے نیچے جا کھڑا ہو۔ یہی ان کے آخرۃ پر ایمان نہ ہونے کی کھلی شہادت ہے اگر ان کو یقین ہوتا تو وہ یہ موقعہ کبھی ہاتھ سے نہ دیتے۔ جہاد کا میدان قوت ایمانی کی سب سے بڑی کڑی آزمائش ہے جہاں منافق کے لیے

اپنے زنگ باطن کا چھپانا یکسر ناممکن ہوجاتا ہے۔ منافقین کا یہ گروہ جس کا یہاں ذکر ہو رہا ہے ہر موقعہ پر اپنے آپ کو چھپانے میں کامیاب ہوجاتا تھا۔ اسلامی معاملات پر ایمان و اخلاص کا پیکر بن کر آتش بیانی بھی کرتا۔ مسلمانوں کی قومی فلاح کے لیے تجاویز بھی پیش کرتا لیکن جب خدائی احکام ان کی جانوں کا مطالبہ کرتے وہ وقت ان کے لیے بڑا سخت ہوتا جس دنیا کے عشق میں اس نے دین اور اپنے ضمیر کو بیچا تھا اگر اسی کی نذر مانگی جائے تو وہ اس کو کیسے گوارا کر سکتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ ادعائے ایمان کا راز فاش ہوجاتا اور لاکھ زیر نقاب ہونے کے باوجود بے نقاب ہوجاتا۔

مُنافقین کے کَرتُوت کی پَاداش

(۸۷) ان کو اپنی کمائی کی پاداش میں کم ہنسنا اور زیادہ رونا چاہیے یعنی چند روز اپنی حرکات پر خوش ہولو اور ہنس لو پھر ان کرتوتوں کی سزا میں ہمیشہ رونا ہے[1]۔ اصل ارشاد میں فلیضحکوا قلیلا و لیبکوا کثیرا آیا ہے اس میں تھوڑا ہنسنے اور زیادہ رونے کا حکم ان منافقین کو ہوا ہے۔ شارحین قرآن نے اس کی چند صورتیں بتائی ہیں

پہلا یہ کہ ان کو دنیا کی اس زندگی میں تھوڑا سا خوش ہو لینا چاہیے پھر آخرت میں ان کو ہمیشہ ہمیشہ رونا چاہیے یعنی اس کرتوت کا انجام یہ ہے اس صورت میں امر بمعنے خبر ہے۔ دنیا کی زندگی تھوڑی ہے۔ اس لیے ہنسنے کو تھوڑا کہا اور آخرت کی زندگی دائمی ہے اس لیے رونے کو زیادہ فرمایا۔

دوسرا مطلب یہ ہے کہ جس نوع کے کردار کا تم نے مظاہرہ کیا ہے۔ کہ اگر ان کو اس بات کی سمجھ ہو کہ جنگ تبوک میں پیچھے رہ جانے اور حضور اقدس ﷺ کی خلاف ورزی سے کیا کچھ کھویا اور آخرت میں کیا کچھ نتائج رونما ہوں گے تو ان کو اس پر کم ہنسنا چاہیے اور زیادہ ماتم کرنا چاہیئے اس صورت میں بھی امر بمعنی خبر ہے۔

تیسرا مطلب مشہور مفسر ابن عطیہ نے یہ بتایا ہے کہ جو خطرہ اس اقدام سے انہوں نے مول لیا ہے ان کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں کہ دنیا ہی کی زندگی میں ان کو خوشی کا وقت تھوڑا اور رنج و غم سے زیادہ دوچار ہونا پڑیگا۔ مطلب یہ ہے کہ جب یہ موسم کی گرمی سے گھبرا کر دوزخ میں کود رہے ہیں تو اپنی کرتوت کی پاداش میں ان کو ہنسنا کم اور رونا زیادہ چاہیئے۔ کیونکہ عمل اور جزا دونوں سامنے آچکے ہیں۔ اب اگر ان میں کچھ بھی بصیرت ہے تو اندازہ کر لیں کہ جیسا عمل ہے اسی کے مطابق جزا ہوگی۔ اگر عمل کے مطابق جزا ہوگی تو پھر ان کو دنیا میں کم خوش

[1] افادات شیخ الاسلام

ہونا چاہیے اور زیادہ رونا چاہیے۔ وقتی خوشی کے لیے پیمانہ مختصر اور بڑی تکلیف کے لیے پیمانہ کبیرہی ہوتا ہے۔

منافقین کے لیے ایک اور سزا

(۸۸) اے پیغمبر پس اگر اللہ تم کو اس جنگ سے واپس لے گیا پھر وہ آئندہ کسی جنگ میں تم سے نکلنے کی اجازت طلب کریں تو آپ فرما دیجئے کہ تم میرے ساتھ کبھی نہ نکلو گے اور نہ میرے ساتھ ہو کر کسی دشمن سے جنگ کرو گے۔ تم نے پہلی بار بیٹھنا پسند کیا لہٰذا اب بھی پیچھے رہنے والوں کے ساتھ بیٹھے رہو۔ حضور تبوک میں تھے اور منافقین مدینے میں ممکن تھا کہ کچھ منافقین آپ کی واپسی سے قبل مرجائیں اس لیے الی طائفۃ منھم فرمایا مطلب یہ ہے کہ اگر یہ لوگ کسی دوسرے غزوہ میں ساتھ چلنے کی اجازت مانگیں تو فرما دیجئے کہ بس تمہاری ہمت و شجاعت کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹ چکا ہے اور تمہارے دلوں کا حال کھل کر سامنے آچکا ہے نہ تم کبھی ہمارے ساتھ نکل سکتے ہو اور نہ دشمنانِ اسلام کے مقابلہ میں بہادری دکھا سکتے ہو۔ لہٰذا اب تم کو تکلیف کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ عورتوں، بچوں، اپاہج اور ناتواں بڈھوں کے ساتھ گھر میں گھسے بیٹھے رہو۔ اور جس چیز کو پہلی بار تم نے اپنے لیے پسند کیا ہے مناسب ہے کہ اسی حالت پر مرو۔ تاکہ اچھی طرح عذاب الٰہی کا مزہ چکھو[1]

۸۲ آدمی جو دکھاوے کے مسلمان تھے بہانے کرکے اپنے گھروں میں رہ گئے چونکہ مقابلہ بیزنطی شہنشاہی سے تھا جو مشرق میں رومۃ الکبریٰ کی عظمت کی جانشین تھی۔ اور ابھی حال میں ایران کو شکست دے چکی تھی اس لیے منافقوں کو یقین تھا مسلمانوں کے خاتمے کے دن آگئے۔ عبداللہ بن سلول نے جو منافقوں کا سرغنہ تھا۔ لوگوں کو یقین دلایا تھا کہ حضور اقدس ﷺ اس سفر سے لوٹنے والے نہیں ہیں۔ یہ آیتیں خود بتا رہی ہیں کہ ان کا نزول تبوک کے سفر ہی میں ہوا ہے اس لیے فرمایا کہ اگر تمہیں خدا لوٹائے اصل ارشاد میں رجع آیا ہے یہ لازم اور متعدی دونوں آتا ہے لازم ہو تو مصدر رجوع آتا ہے اور متعدی ہو تو مصدر رجع آتا ہے قرآن میں دونوں طرح آیا ہے لازم کی مثال رجع موسیٰ الی قومہ اور متعدی کی مثال فرجعناک الی امک اور پیچھے رہنے والوں کے ذکر میں الی طائفۃ منھم کہہ کر یہ اشارہ کر دیا کہ سارے پیچھے رہنے والے منافق نہ تھے بلکہ ان میں ایک ٹولی تھی۔ غالباً یہی وہ بارہ آدمی ہیں جن کا ذکر جبیر بن مطعم نے کیا ہے۔ ان آیات سے یہ بھی اشارہ معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ ان سے اس درجہ بیزار تھے کہ آپ کو ان کو دیکھنا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بھی گوارا نہ تھا۔ اس لیے فرمایا کہ اگر اللہ آپ کی اس سفر سے واپسی پر کسی جماعت سے ملاقات کرا دے اور یہ جماعت منافقوں کی آپ کے سامنے اپنے نہ جانے کے بہانے تراشے اور اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے آپ کے کسی آیندہ جنگ میں شرکت کی درخواست بھی کرے تو آپ ان کی درخواست رد کر دیں۔ یہ حکم اس وقت اور زیادہ موکد ہو جاتا ہے جب مقابلہ آسان ہو تکالیف کا اندیشہ کم ہو اور نتیجہ جنگ کے طور پر بہت کچھ فوائد حاصل ہونے کی توقع ہو۔ ایسے وقت میں منافق بڑی جاں فروشی کا اظہار کرتا ہے۔ سراپا پیکر اخلاص بن جاتا ہے اور جنگ میں سب سے آگے آگے چلنے کی سعی کرتا ہے۔ حالانکہ یہی ایمان کا جھوٹا مدعی کڑی آزمائشوں اور سخت قربانیوں کے وقت اس سے پہلے ہزاروں حیلے بہانے کر کے گوشہ عافیت میں روپوش ہو چکا ہوتا ہے اس لیے ایسے لوگوں کو جنگ میں ساتھ نہ لے جانا چاہیے۔

مُنافقین کی نمازِ جنازہ اور دُعاء

(۸۷) اور اے پیغمبر ان میں اگر کوئی مر جائے تو ان کے جنازے کی نماز نہ پڑھنا اور نہ قبر پر کھڑے ہونا۔ کیونکہ انھوں نے اللہ و رسول کا کفر کیا ہے اور ایسی حالت میں مرے ہیں کہ ہدایت کے دائرے سے باہر ہیں۔ یہ آیت عبداللہ بن ابی کے واقعہ کے بعد نازل ہوئی جیسا کہ چند آیات پہلے ہم مفصل بیان کر چکے ہیں۔ اس آیت کے نزول کے بعد منافقین کا جنازہ پڑھنا قطعاً ممنوع ہو گیا۔ امیر المؤمنین حضرت عمر فاروق رضی اللہ تعالیٰ عنہ احتیاطاً ایسے شخص کا جنازہ نہ پڑھتے تھے جس کی نماز میں حضرت حذیفہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ نہ ہوں۔ کیونکہ ان کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سے منافقین کا نام بنام علم کرا دیا تھا۔ اسی لیے ان کا لقب صاحب سر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہوا۔ اور لا تقم علی قبرہ کا مطلب ہے کہ دعا و استغفار یا اہتمام دفن کے لیے کھڑے نہ ہوں[1]

شیخ الاسلام نے جس آیت کا مجمل حوالہ دیا ہے اس سے ان کی مراد استغفر لھم ہے۔ اس آیت کے فوائد میں شیخ الاسلام نے عبداللہ ابن ابی کے جنازے کا واقعہ پیش کیا ہے۔ یہ واقعہ حدیث کی مختلف کتابوں میں آیا ہے۔ صحیح بخاری اور صحیح مسلم میں یہ واقعہ دو جلیل القدر صحابہ یعنی عبداللہ بن عمر اور عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالہ سے آیا ہے۔ صحیح بخاری میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما کے حوالے سے یہ واقعہ اس طرح آیا ہے کہ:۔

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو یہ فرماتے

[1] افادات شیخ الاسلام

خود سنا ہے کہ جب عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو حضور اقدس کو ﷺ اس پر نماز جنازہ پڑھنے کے لیے بلایا گیا۔ آپ تشریف لے چلے جب نماز کے ارادہ سے کھڑے ہوئے تو میں آپ کے سامنے آگیا اور میں نے عرض کیا۔ کہ کیا آپ اس کی نماز پڑھائیں گے جس نے فلاں فلاں دن ایسی باتیں کہی تھیں۔ حضرت عمر نے اس کے کفریات گن گن کر بتائے۔ راوی کہتا ہے کہ نبی کریم کھڑے سنتے رہے اور مسکراتے رہے یہاں تک کہ میں نے زیادہ اصرار کیا تو فرمایا کہ عمر جانے بھی دو جب مجھے دو باتوں کا اختیار دیا گیا ہے ان میں جو مناسب تھی وہ میں نے اختیار کر لی۔ میرے سے کہا گیا ہے۔ استغفر لھم او لا تستغفر لھم ان تستغفر لھم سبعین مرۃ اگر مجھے علم ہو جائے کہ میں ستر بار سے زیادہ استغفار کروں گا تو اس کی بخشش ہو جائے گی تو ضرور اس سے زیادہ استغفار کروں گا۔ یہ کہہ کر آپ نے نماز جنازہ پڑھا دی اور اس کے جنازہ کے ساتھ بھی تشریف لے گئے اور اس وقت تک برابر قبر پر کھڑے رہے جب تک اس سے فراغت نہ ہو گئی بخدا تھوڑی سی دیر کے بعد یہ دو آیتیں نازل ہو گئیں۔ لا تصل علی احد منھم مات ابدا ولا تقم علی قبرہ اس کے بعد آپ نے کسی منافق کی نماز جنازہ نہیں پڑھائی حضرت عمرؓ فرماتے ہیں کہ مجھے اس جرات پر بڑی حیرت ہوئی۔

یہ حدیث مسند امام احمد ترمذی اور نسائی میں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے آئی ہے

دوسری حدیث بحوالہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما صحیح بخاری میں اس طرح آئی ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر فرماتے ہیں کہ جب عبداللہ بن ابی کا انتقال ہوا تو عبداللہ کا بیٹا عبداللہ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ آپ نے اس کو اپنی قمیص دی اور حکم دیا کہ اسے کفن میں استعمال کرنا پھر آپ نماز جنازہ پڑھانے لگے تو حضرت عمرؓ نے آپ کا کپڑا پکڑ لیا اور بولے کہ یہ تو منافق ہے آپ اس کی نماز پڑھتے ہیں۔ اللہ نے آپ کو ان کے لیے استغفار سے منع فرمایا ہے حضور اقدس نے فرمایا کہ اللہ نے مجھے اختیار دیا ہے یا اللہ نے مجھے خبر دی ہے کہ استغفر لھم او لا تستغفر لھم ان تستغفر لھم سبعین مرۃ فلن یغفر اللہ لھم۔ آپ نے فرمایا میں ضرور ستر سے زیادہ بار بخشش مانگوں گا راوی کہتا ہے کہ آپ نے نماز جنازہ پڑھائی اور ہم نے بھی نماز جنازہ پڑھی۔ اس کے بعد یہ آیت نازل ہوئی لا تصل علی احد۔

اور مسلم میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں:۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم عبداللہ ابن ابی کی قبر کی طرف آئے۔ ایک روایت میں ہے جب عبداللہ بن ابی کو قبر میں رکھا جا چکا تھا تو آپ تشریف لائے اور آپ نے اس کو قبر سے نکالا۔ نکالنے کے بعد آپ نے دونوں زانوں پر اسے رکھا منہ میں لعاب مبارک ڈالا اور اپنی قمیص اس کو پہنائی۔

اس موضوع پر حدیث کی کتابوں میں اور بھی روایات ہیں۔ ہم نے صرف صحیحین کو ترجیح دی ہے۔ کیونکر ان کی سند صحت کے اعتبار سے بالکل بے غبار ہے۔ حدیث کی سند میں تو قطعاً کوئی کلام نہیں لیکن حدیث کا متن نہ صرف مضطرب ہے بلکہ قرآن کے معارض ہے۔

شراح حدیث میں سے حافظ عسقلانی نے اس پر مبسوط کلام کیا ہے۔ دوسرے اکابر نے جو کچھ کہا ہے حافظ صاحب نے فتح الباری میں سب کچھ یکجا کر دیا ہے آیئے پہلے وہ خدشات گوش گذار فرمایئے جو ان حدیثوں کے بارے میں پیش کیے جاتے ہیں۔

سب سے پہلے سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ حدیثیں بتا رہی ہیں کہ ان آیات کا نزول عبداللہ ابن ابی کے جنازے پر ہوا ہے۔ اور قرآن کا انداز بیان گواہی دے رہا ہے کہ ان آیات کا نزول سفر تبوک میں ہی ہوا ہے اور تبوک کا واقعہ ۸ھ میں پیش آیا ہے جب کہ عبداللہ ابن ابی کا انتقال ۹ھ میں ذی قعدہ کے مہینے میں ہوا ہے جیسا کہ حافظ صاحب نے فتح الباری میں حاکم کے حوالہ سے بتایا ہے۔

دوسری قابل غور یہ بات ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرما رہے ہیں قد نهاك ربك ان تصلی علیہ آپ کے رب نے نماز پڑھنے سے آپ کو منع فرمایا ہے۔ حضرت عمرؓ کا ارشاد بتا رہا ہے کہ اس پر نماز جنازہ کی ممانعت پہلے آچکی تھی۔ اور حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما کا یہ کہنا کہ اس کے بعد آپ نے نماز پڑھائی اور آیت لا تصل نازل ہوئی۔ بتا رہا ہے کہ یہ ممانعت کی آیت جنازہ پڑھانے کے بعد نازل ہوئی۔

تیسری بات یہ بھی سوچنے کی ہے کہ ابن عمر اور ابن عباس دونوں کی حدیثوں میں تعارض ہے۔ ابن عمرؓ کی حدیث میں ہے سازید ہ علی السبعین۔ جب کہ ابن عباس کی حدیث میں ہے لو اعلم انی لو زدت علی السبعین غفر لہ لازدت علیھا۔ ابو بکر الجصاص نے ابن عمرؓ کی روایت کے الفاظ سازید علی السبعین کو راوی کی خطا قرار دیا ہے وہ لکھتے ہیں:۔

تعبیر کا یہ پیمانہ راوی کی غلطی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ نے صاف بتا دیا ہے کہ یہ منافقین کافر ہیں

حضور اقدس ﷺ یہ جان کر کہ یہ کافر ہیں اور اللہ ان کی بخشش نہیں فرمائے گا دعار مغفرت کر ہی نہیں سکتے۔ صحیح روایت یہی ہے کہ لو علمت انی لو زدت علی السبعین غفر لھم لزدت علیھا۔ عادت مبارکہ یہی تھی کہ لوگوں کے ظاہر کے مطابق دعائے مغفرت کرتے تھے۔ لوگ آپ سے میت پر نماز جنازہ کی درخواست کرتے۔ آپ دعار فرما دیتے یہ جانتے ہوئے کہ مسلمان ہیں۔ آپ کو اللہ سبحانہ نے بتایا کہ یہ منافق ہیں ان کو آپ کی دعار مفید نہ ہوگی۔

ابوبکر الجصاص کی اس علمی رائے نے راہ کی بہت بڑی مشکل حل کر دی اس صورت میں اب ، کے عدد میں تکثیر ہی کے معنے ہوں گے تعدید اور تحدید نہ ہوگی۔ اہل علم کا یہ اعتراض کہ حضور نے علم حقیقت کو کیسے برعکس سمجھا غلط ہو جائے گا۔

چوتھی بات یہ بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ حضرت ابن عمر کی حدیث میں ہے کہ حضور اقدس نے عبداللہ کے بیٹے نے قمیص مانگی اور حضور نے قمیص دی مگر جابر کی روایت بتاتی ہے کہ حضور خود قبرستان تشریف لے گئے اور قبر سے لاش نکال کر قمیص پہنائی۔

آیئے حافظ عسقلانی کا ان حدیثوں پر جامع تبصرہ گوش گذار فرمایئے۔

ظاہر تو یہی ہے کہ یہ آیت لا تصل علی احد الخ تمام منافقین کے بارے میں نازل ہوئی ہے لیکن روایات سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی ہے کہ یہ خاص تعداد کے بارے میں ہے سب کا یہ حکم نہیں ہے۔ چنانچہ امام زہری کہتے ہیں کہ حضرت حذیفہ کا بیان ہے کہ میرے سے جناب رسول اللہ ﷺ نے فرمایا میں تجھے ایک راز بتاتا ہوں کسی سے ذکر نہ کرنا پھر آپ نے بتایا کہ مجھے فلاں فلاں منافقوں کی جماعت کی نماز جنازہ پڑھنے سے روک دیا گیا ہے اسی لیے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کسی کی نماز پڑھنے کے لیے یہ دیکھتے کہ حذیفہ جاتے ہیں یا نہیں اگر حذیفہ جاتے تو آپ اس کے جنازے کی نماز پڑھتے ورنہ نہ پڑھتے۔ جبیر بن مطعم رض نے یہ بھی انکشاف کیا کہ ان کی تعداد بارہ تھی۔ حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ کا یہ بیان پہلے آچکا ہے کہ اب ان میں سے ایک کے سوا کوئی نہیں رہا اور غالباً ان بارہ کی تخصیص کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کو ان کی کفر پر موت کا علم تھا برخلاف دوسروں کے کہ انھوں نے نفاق سے توبہ کرلی۔

امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ نے ابن عمر کی اس حدیث کو ایک دوسری سند سے پہلے بھی ذکر کیا ہے یہاں اس میں حضور اقدس کا یہ ارشاد کہ اللہ نے مجھے مغفرت مانگنے اور نہ مانگنے کا اختیار دیا ہے

یا مجھے خبر دی ہے۔ اکثر روایات میں تخییر ہے۔ آیت کی روشنی میں تخییر کا سمجھنا بہت مشکل ہے یعنی قرآن کی آیت اور ارشاد نبوت میں مفاہمت بعید مشکل ہے۔ اسی لیے بڑے بڑے لوگوں کی ایک جماعت نے اس حدیث کی صحت پر اعتراض کیا ہے حالانکہ یہ حدیث کثرۃ طرق سے آئی ہے صرف شیخین ہی کا نہیں بلکہ ان تمام بزرگوں کا جو صحت کا التزام کرتے ہیں اس کی صحت پر اتفاق ہے۔ یہ گویا معترضین کے خلاف ایک کھلا چیلنج ہے کہ ان کی معلومات سطحی ہیں اور حدیث کا پتہ نہیں۔ ابن المنیر کہتے ہیں آیت قرآنی کے سمجھنے میں اچھے اچھوں کے قدم لغزش کھا گئے قاضی ابوبکر الباقلانی نے حدیث کی صحت کا انکار کر دیا اور لکھا ہے کہ یہ حدیث نہ قابل پذیرائی ہے اور نہ یہ صحیح ہے کہ حضور اقدس کی زبان مبارک سے یہ بات نکلے ابوبکر الباقلانی نے تقریب میں لکھا ہے یہ حدیث اخبار احاد میں سے ہے اس کے ثبوت کا پتہ نہیں ہے۔ امام الحرمین نے حدیث کے صحیح بخاری میں ہونے ہی کا انکار کر دیا ہے اور برہان میں فرماتے ہیں کہ یہ حدیث محدثین کے نزدیک صحیح نہیں ہے۔ امام غزالی نے المستصفی میں اس کی صحت کا انکار کر دیا ہے۔ صحیح بخاری کے شارح علامہ داؤدی فرماتے ہیں کہ حدیث محفوظ نہیں ہے ——— ابن المنیر کہتے ہیں کہ یہ بات بالکل بے غبار ہے کہ آیت قرآنی ان تستغفر لهم سبعين مرة میں تعداد اور تخصیص مراد نہیں ہے۔ نیز آیت تعدید کا نہیں مبالغہ کا فائدہ واضح اور صاف ہے لہذا ساز یلہ علی السبعین اس مطلب کی صورت میں بے معنے اور بے فائدہ اور مراد متکلم کے خلاف ہو کر رہ جاتا ہے۔ کچھ متاخرین نے اس گرفت سے بچنے کے لیے یہ راہ نکالی ہے کہ حضور اقدس نے سازید علی السبعین صرف عبداللہ ابن ابی کے خاندان کو اپنانے اور موہنے کے لیے فرمایا ہے ورنہ مقصد یہ نہیں کہ اگر آپ ستر مرتبہ سے زیادہ مغفرت مانگیں گے تو بخشش ہو جائے گی اور اس کی تائید ابن عباس کی حدیث میں آئے ہوئے اس جملہ سے ہوتی ہے لو اعلم ان زدت علی السبعین یغفر لہ۔ اگر مجھے معلوم ہو جاتا کہ اگر میں ستر بار سے زیادہ مانگوں گا تو یہ بخشا جائے گا۔ لیکن اس مطلب کی تائید سازید سے نہیں ہوتی ہے اور جبکہ بعض روایات میں لازیدن بھی تاکید میں مبالغہ آیا ہے۔ کچھ نے یہ جواب دیا ہے کہ دراصل حضور اقدس نے یہ بات بطور یقین کے نہیں بلکہ بطور امکان کے فرمائی ہے۔ لیکن یہ جواب جو کچھ ہے وہ خود ہی بول بول رہا ہے۔ اور یہ بھی جواب دیا گیا ہے کہ استغفار کی حیثیت دعا کی ہے۔ اور دعا کا مقام بندے

کے لیے ذکر کا ہے۔ مغفرت خود ممکن ہے اس سے صرف مدعو کی تعظیم مقصود ہوتی ہے لیکن حافظ عسقلانی فرماتے ہیں یہ بھی قابل پذیرائی نہیں ہے اس لیے کہ اس کے لیے مغفرت کی طلب مقصود ہے جس کی شرعاً مغفرت محال ہے یہاں ایک شبہ اور بھی ہے وہ یہ ہے کہ قرآن کی اس آیت استغفر لھم او لا تستغفر لھم سے حدیث بھی یہ بتائی ہے کہ مجھے بخشش مانگنے اور نہ مانگنے والوں کا اختیار دیا گیا ہے اور ان تستغفر لھم سبعین مرۃ میں عدد مراد لے کر فرمایا ہے کہ میں ضرور ستر سے زیادہ مانگوں گا۔ حالانکہ بہت مدت پہلے قرآن کی یہ آیت ما کان للنبی والذین امنوا ان یستغفروا للمشرکین نازل ہو چکی تھی یہ آیت ابو طالب کے واقعہ میں نازل ہوئی تھی جب حضور اقدس نے فرمایا تھا لاستغفرن لک مالم انہ عنک میں ضرور مغفرت کی دعا کروں گا جب تک مجھے نہ روک دیا جائے۔ ابو طالب کی وفات مکہ میں بالاتفاق ہجرت سے پہلے ہوئی ہے اور عبداللہ ابن ابی کا یہ واقعہ ۹ھ میں ہوا ہے۔ سوچیے کہ اس آیت میں منافقین کے کفر پر مہر لگنے کے باوجود ان کے لیے مغفرت کی دعا کیسے جائز ہو سکتی ہے۔ کچھ لوگوں نے اس کا جواب یہ دیا ہے کہ استغفار دو طرح کا ہوتا ہے ایک وہ جس کی قبولیت کی امید ہو۔ دوسرے جو لوگوں کا دل خوش کرنے کے لیے کی جائے ممنوع پہلی ہے دوسری نہیں حافظ صاحب لکھتے ہیں کہ یہ جواب مجھے پسند نہیں ہے۔

ایک جواب وہ ہے جو علامہ زمخشری نے دیا ہے لیکن اس کا بھی علامہ ابن المنیر نے تعاقب کیا ہے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی نے ایک ہی جواب دیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قرآن میں ذالک بانھم کفروا باللہ ورسولہ کا فقرہ پوری آیت کے ساتھ نازل نہیں ہوا بلکہ بعد میں نازل ہوا ہے لیکن تاریخی شہادت کے بغیر اس کی حیثیت صرف اندازے اور خیال کی ہے اور علمی مباحث میں خیالات کی کوئی قیمت نہیں ہے۔

حافظ عسقلانی کی ساری بحث کا خلاصہ جو کچھ میں سمجھا ہوں یہ ہے کہ قرآن کی اس آیت اور ابن عباس اور ابن عمر کی حدیث میں مفاہمت ممکن نہیں ہے۔ اب حدیث کو مانتے ہیں تو قرآن کا منطوق ساتھ نہیں دیتا۔ اور قرآن کو مانتے ہیں تو حدیث کو پذیرائی کی گنجائش نہیں رہتی ہے۔

جن لوگوں کے نزدیک صحت حدیث کا مدار صرف رجال کی ثقاہت اتقان اور اتصال پر ہے ان کے لیے گنجائش ہے کہ وہ اسے قبول کریں لیکن جن کے نزدیک حدیث کے صحیح ہونے کے لیے اتصال، اتقان اور ثقاہت کے ساتھ یہ بھی ضروری ہے کہ وہ معانی قرآن کے خلاف نہ ہو کیونکہ قرآن قطعی ہے۔ حدیث کی صحت

خواہ کتنی منزلیں طے کر جائے ظنی ہے۔ لہٰذا ایک ظنی پر صحت کی کتنی مہریں لگ جائیں لیکن وہ اس وقت تک قابل قبول نہیں جب تک قطعی سے ہم آغوش نہ ہو۔ ظنی خواہ کسی درجہ کی صحیح ہو لیکن جب قطعی سے متصادم ہو گی تو ترجیح قطعی کو ہو گی۔ یہ کوئی ضروری نہیں ہے جس کی سند صحیح ہو اس کا متن لازماً صحیح ہوتا ہے اور نہ یہ ضروری ہے کہ جس کا متن صحیح ہو تو اس کی سند لازماً صحیح ہو۔ حقیقت یہی ہے کہ آیت قرآنی اور حدیث میں مفاہمت کوہ کندن کاہ برآوردن کا مصداق ہے۔

نماز جنازہ کے جواز کی شرط

کچھ علماء نے اس سے یہ بھی استدلال کیا ہے کہ نماز جنازہ کے جواز کی اہم اور بنیادی شرط میت کا اللہ و رسول پر ایمان ہے۔ کیونکہ آیت میں جنازہ نہ پڑھنے کی علت انہم کفروا باللہ ورسولہ بتائی گئی ہے۔ اگر کفر نہ ہو بلکہ اس کی جگہ اللہ اور رسول پر ایمان کی نعمت سے مالا مال ہو تو اس کی نماز جنازہ پڑھنا چاہیے۔ علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اس آیت سے جنازہ کا وجوب ایسے ہی ثابت ہے جیسے کلا انہم عن ربہم یومئذ لمحجوبون سے اہل ایمان کے لیے قیامت کے دن اللہ سبحانہ کا دیدار ثابت ہے۔ اور یہ بھی علامہ قرطبی نے لکھا ہے کہ اس پر مسلمانوں کا اتفاق ہے کہ کسی مسلمان کا جنازہ چھوڑنا جائز نہیں چاہے وہ نیک ہو یا بد۔ ابوبکر الجصاص نے بھی لکھا ہے کہ یہ آیت اس بات کی دلیل ہے کہ مسلمان مُردوں پر نماز جنازہ پڑھنا چاہیے اور کافروں کے لیے نماز جنازہ نہ پڑھے جمہور علماء کے نزدیک جنازے کی چار تکبیریں ہیں۔ امام بخاری نے اپنی صحیح میں باب التکبیر علی الجنازۃ اربعًا کا عنوان کر کے اپنے مخاطبوں کو سمجھا دیا ہے کہ جنازے میں صرف چار تکبیریں ہوتی ہیں۔ حافظ عسقلانی نے الزین ابن المنیر کے حوالہ سے یہ نکتہ لکھا ہے کہ امام بخاری نے یہ عنوان قائم اس لیے کیا ہے کہ جنازے میں صرف چار ہی تکبیریں ہیں۔ چار سے زائد نہیں ہیں امام بخاری نے یہ بات اس لیے فرمائی ہے کہ حضور اقدس ﷺ کے صحابہ سے تین، چار، پانچ، چھ اور سات منقول ہیں لیکن چونکہ حضرت عمرؓ نے صحابہ کو جمع کر کے چار کا فیصلہ فرما دیا تھا اس لیے اب صرف چار تکبیریں ہیں عسقلانی لکھتے ہیں۔ فجمع عمر الناس علی اربع۔

ان چار تکبیروں میں کیا پڑھا جائے۔ پہلی تکبیر میں اللہ سبحانہ کی حمد و ثنا۔ دوسری میں حضور اقدس پر درود۔ تیسری میں میت کے لیے دعاء اور چوتھی تکبیر میں سلام۔ حمد و ثناء کے موقعہ پر سورہ فاتحہ پڑھی جائے یا نہیں حافظ ابن حجر عسقلانی نے لکھا ہے کہ:۔

یہ اختلافی مسائل میں سے ایک مسئلہ ہے محدث ابن المنذر نے لکھا ہے کہ عبداللہ بن مسعود، الحسن بن علی، عبداللہ ابن الزبیر اور المسور بن مخرمہ جنازے میں سورہ فاتحہ کی مشروعیت کے قائل ہیں یہی امام شافعی، امام احمد اور امام اسحاق رحمۃ اللہ تعالیٰ کا مذہب ہے اور صحابہ میں ابوہریرہ اور عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہما نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ کی قراءت کو نہیں مانتے یہی امام مالک رحمۃ اللہ تعالیٰ اور تمام اہل کوفہ کا مذہب ہے۔

یعنی کوفہ کے تمام صحابہ، تمام تابعین، تمام فقہاء اور تمام محدثین کا مذہب یہی ہے۔ امام بخاری رحمۃ اللہ تعالیٰ بھی جنازے میں سورہ فاتحہ پڑھنے کے قائل ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ جنازہ قراءت کا نہیں دعاء کا مقام ہے جن کی نگاہ سورہ فاتحہ پر دعاء کی حیثیت سے پڑی انھوں نے سورہ فاتحہ کو ضروری بتا دیا اور جن کی نگاہ سورہ فاتحہ کی قرانیت پر ٹھہر گئی انھوں نے جنازے کے لیے سورہ فاتحہ کی ضرورت محسوس نہ کی اسی لیے احناف نے تصریح کی ہے۔ ولو قرأ الفاتحۃ بنیۃ الدعاء لاباس۔ اگر بطور دعاء نماز جنازہ میں سورہ فاتحہ پڑھ لے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے لا تقم علی قبرہ۔ عام شارحین قرآن نے اس کا مطلب یہی بتایا ہے کہ آپ منافقین کے دفن وغیرہ میں شریک ہوں۔ آلوسی لکھتے ہیں لا تتول دفنہ دوسرے شارحین نے بھی یہی لکھا ہے لیکن اس میں کوئی خاص قانونی معنویت نہیں۔ اگر اس کی علت کفر ہے تو کافر کے دفن میں شریک ہونے پر کوئی قدغن نہیں ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے لکھا ہے کہ چونکہ حضور اقدس میت کے دفن کے بعد قبر پر ٹھہرتے اور میت کے لیے دعاء فرماتے۔ اس لیے منافقین کی قبر پر کھڑے ہونے کی ممانعت آئی ہے۔

مشہور مفسر زجاج سے یہی تشریح منقول ہے۔

اس کا مطلب ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم دفن میت کے بعد قبر پر ٹھہرتے اور میت کے لیے دعاء کرتے آیت میں اسی سے منع کیا گیا ہے۔

علامہ سید رشید رضا رحمۃ اللہ تعالیٰ نے اسے المنار میں ذرا وضاحت سے لکھا ہے کہ:

یعنی قبر پر دفن کے وقت تثبیت کی دعاء کے لیے نہ کھڑے ہوں جیسا کہ آپ کی عادت شریفہ دفن کے وقت مسلمانوں کے لیے تھی اور اس ممانعت میں منافقوں کے جنازے کی تشییع بھی داخل ہے۔ ابوداؤد حاکم نے حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے یہ کردار نبوت پیش کیا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب دفن سے فارغ ہو جاتے تو قبر پر کھڑے ہو جاتے اور فرماتے

کر اپنے بھائی کے لیے بخشش طلب کرو اور اس کے جماؤ کا سوال کرو۔ کیونکہ اس سے اب پوچھا جا رہا ہے
فقہاء نے اس حدیث پر عمل بتایا ہے ہمیں قبر پر کھڑے ہونے کے معنے ہیں اس مسنون پیمانہ کے علاوہ اور کچھ معلوم نہیں کچھ لوگوں نے یہاں زیارت قبور کو بھی خواہ مخواہ داخل کر دیا ہے۔ لیکن بظاہر زیارت قبور کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس موضوع پر متعدد حدیثیں زیارت قبور کے عنوان سے آئی ہیں۔ اس کے لیے قیام کا لفظ استعمال نہیں ہوا ہے [1]

اس کی روشنی میں آیت قرآنی کا مطلب واضح ہو کر سامنے آگیا ہے کہ ان منافقین کو جماعت سے علیحدہ کرنے کی ایک اور سخت تر ضرب لگائی استغفار کی ممانعت پہلے آچکی تھی اب یہ ان کے جنازے کی نماز پڑھنے ان کے جنازوں کو اٹھانے۔ ان کو دفن کرنے۔ دفن کرنے کے بعد ان کی قبروں پر دعاء استغفار کے لیے کھڑے ہونے کی ممانعت کر دی گئی۔ گویا زندگی اور موت دونوں میں ان سے قطع تعلقات کا اعلان کر دیا گیا۔ جماعتی زندگی سے آدمی کا آخری رشتہ بھی ہوتا ہے کہ مرنے پر اپنے جماعتی بھائیوں کے ہاتھوں دفن ہو اور ان کی دعاؤں کا زادراہ لے کر اپنے آخری سفر پر روانہ ہو۔ اس ممانعت نے حضور اقدس ﷺ اور مسلمانوں کے ساتھ ان کا یہ آخری رشتہ بھی ختم کر دیا ہے۔

آئیے اب آخری بات بھی گوش گذار فرمایئے۔ یہ تو آپ حضرت عبداللہ بن عمر اور حضرت جابر رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے پہلے سن چکے ہیں کہ عبداللہ بن ابی کے کفن میں حضور اقدس ﷺ نے اپنی قمیص عطا فرمائی تھی۔

یہی قمیص کا واقعہ جو بخاری میں جابر اور عبداللہ بن عمر سے آیا ہے اسے امام رازی نے اپنی تفسیر میں بلا سند حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کے حوالہ سے اس طرح پیش کیا ہے۔ مجھے پوری کوشش کے باوجود اس کی سند نہیں ملی ہے۔ عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ عبداللہ بن ابی جب مرض موت میں مبتلا ہوا تو حضور اقدس ﷺ اس کی عیادت کے لیے تشریف لے گئے۔ اس نے درخواست کی کہ جب وہ مر جائے تو حضور اقدس ﷺ اس کی نماز جنازہ پڑھائیں اور اس کی قبر پر بھی تشریف فرما ہوں۔ پھر اس نے ایک آدمی بھیجا اور عرض کی کہ کفن کے لیے اُسے قمیص مرحمت فرمائی جائے۔ حضور اقدس ﷺ نے اوپر والی قمیص بھیجی۔ اس نے پھر گذارش کی کہ مجھے وہ قمیص دی جائے جو آپ کے جسد اطہر سے لگی ہو۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ پاس بیٹھے تھے بولے یا رسول اللہ آپ اس ناپاک اور گندے آدمی کو اپنی پاک قمیص کیوں دیتے ہیں۔ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا بے شک اس منافق کو میری قمیص کوئی فائدہ نہ دے گی لیکن اس کے دینے میں حکمت یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اس کی وجہ سے ہزار آدمیوں کو اسلام کا حلقہ بگوش بنائے گا۔ منافقوں کا انبوہ کثیر ہر وقت عبداللہ کے پاس رہتا تھا جب انھوں نے یہ دیکھا کہ یہ نابکار ساری عمر مخالفت کرنے کے بعد اپنی بخشش اور نجات کے لیے آپ کی قمیص کا سہارا لے رہا ہے تو ان کی

[1] المنار

آنکھوں سے غفلت کے پردے اُٹھ گئے اور یہ حقیقت عیاں ہوگئی کہ حضور اقدس کی رسالت کے بغیر کسی کی رسائی بارگاہ الٰہی میں ناممکن ہے چنانچہ اسی روز ایک ہزار منافق مسلمان ہوگئے۔ جب عبداللہ کا انتقال ہوگیا تو اس کا بیٹا حضور کی خدمت میں بتانے کے لیے آیا۔ حضور اقدس نے فرمایا جاؤ نماز پڑھو۔ اور دفن کردو۔ بیٹے نے کہا کہ یارسول اللہ اگر آپ نماز نہ پڑھیں گے تو اس کی نماز جنازہ کوئی مسلمان نہ پڑھے گا۔ حضور اقدس ﷺ نماز پڑھنے کے لیے آئے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فوراً کھڑے ہوگئے اور حضورؐ کے اور قبلہ کے درمیان حائل ہوکر نماز میں رکاوٹ بن گئے اور یہ آیت نازل ہوئی اور جبریل علیہ السلام نے آپؐ کا پلہ پکڑ لیا اور کہا لا تصل علی احد منھم

یہ امام رازی کی بیان کردہ روایت ہے لیکن اس کا محدثین نے کہیں ذکر نہیں کیا۔ البتہ ابن جریر نے حضرت انس رضی اللہ عنہ کی ایک روایت کی نشاندہی کی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت جبریل علیہ السلام نے حضور کو نماز سے منع کیا تھا لیکن حافظ ابن کثیر نے اسے ضعیف قرار دیا ہے۔ اور حافظ ابن کثیر نے قمیص ہی کے واقعہ پر مسند امام احمد کے حوالہ سے حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی چند روایات پیش کی ہے کہ جب عبداللہ ابن ابی کا انتقال ہوگیا تو عبداللہ کا صاحبزادہ حضور اقدس کی خدمت میں حاضر ہوا اور بولا کہ یارسول اللہ اگر آپ تشریف نہ لائیں گے تو ہمیشہ کے لیے ہمارے لیے عار کا باعث ہوگا۔ حضور اقدسؐ تشریف اس وقت لے گئے جب عبداللہ کی میت کو قبر میں اتارا جاچکا تھا۔ آپؐ نے فرمایا کیا قبر میں داخل کرنے سے پہلے نہیں بتایا اس کے بعد عبداللہ کی لاش کو قبر سے نکالا اور اپنا لعاب آپؐ نے اس کے سر سے قدم تک تھوکا اور اسے قمیص پہنائی۔ امام نسائی نے بھی اسے روایت کیا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے کہ امام بخاری نے اسی حدیث کو حضرت جابر رضی اللہ عنہ کے حوالے سے پیش کیا ہے اس میں ہے کہ حضور اقدس عبداللہ ابن ابی کے جنازے پر عبداللہ کے قبر میں داخل ہونے کے بعد تشریف لائے۔ آپؐ نے میت کو قبر سے باہر نکالنے کا حکم دیا۔ اس کو نکالا گیا آپؐ نے دونوں زانوں پر رکھ لیا اور لعاب دہن ڈالا اور اپنی قمیص پہنائی۔ صحیح بخاری میں یہ حدیث کتاب الجنائز میں ہے۔

بہرحال واقعہ کے متن میں اصول محدثین کے مطابق اضطراب ضرور ہے اور یہ اضطراب بھی راویوں کی وجہ سے ہے لیکن یہ نہیں کہا جاسکتا کہ اصل واقعہ نہیں ہے۔ اصل واقعہ ضرور ہے۔ نماز جنازہ بھی ضرور پڑھی گئی ہے حضرت عمر رضی اللہ عنہ درمیان میں آڑے بھی آئے ہیں۔ بیٹے نے دعوت بھی دی ہے اور حضور اقدس ﷺ نے کفن کے لیے قمیص بھی دی ہے اور لعاب بھی ڈالا ہے۔ صرف راویوں کی جانب سے تعبیری اختلاف ہے۔

یہ سوال بھی بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس میت کے ساتھ یہ امتیازی

سلوک کیوں کیا ہے۔ حافظ ابن حجر عسقلانی نے کتاب الجہاد میں۔ حافظ ابن کثیر نے تفسیر میں اور امام رازی مفاتیح الغیب میں متعدد روایات دی ہیں۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ:

حضور اقدس ﷺ نے کفن میں قمیص مبارک اس لیے دی ہے کہ بدر کے قیدیوں میں حضرت عباس بن عبدالمطلب آپ کے چچا قید ہو کر آئے تو ننگے بدن تھے قدآور تھے اس لیے کسی کا کرتا ان کو نہ آتا تھا۔ عبداللہ بن ابی بھی طویل القامت تھا۔ اس لیے اس کا کرتہ حضرت العباس کے بدن پر ٹھیک آیا۔ عبداللہ بن ابی کا کرتہ چونکہ حضرت العباس کو اس وقت پہنایا گیا تھا۔ اس لیے حضور اقدس نے بدلہ اتارنے کے لیے کفن میں اپنا کرتہ عبداللہ کو دیا[1]

امام رازی نے اس کے ساتھ اور بھی وجوہ بتائی ہیں مثلاً

۱۔ یہ کہ مشرکین نے حدیبیہ والے روز کہا تھا کہ ہم آپ کا کہا نہیں مانتے ہیں عبداللہ ابن ابی کی بات مانتے ہیں۔ عبداللہ نے جواباً کہا تھا کہ نہیں میرے لیے تو حضور اقدس ہی نمونہ ہیں آپ نے کرتہ عطا فرما کر اس کا بدلہ دیا۔

۲۔ اللہ سبحانہ نے حضور اقدس کو حکم دیا تھا کہ سائل کو رد نہ کرنا۔ عبداللہ نے چونکہ قمیص مانگی تھی اس لیے آپ نے عطا فرما دی۔

۳۔ عبداللہ بن ابی کا صاحبزادہ مخلص مسلمان تھا حضور نے اس کی عزت افزائی کی۔

۴۔ غالباً اللہ سبحانہ نے وحی کے ذریعے اطلاع دی ہو کہ آپ اگر قمیص دیں گے تو آپ کا یہ اقدام ہزاروں منافقوں کے اسلام کا ذریعہ بنے گا۔

۵۔ حضور انور کی ذات اقدس سراپا رحمت تھی اسی جذبہ رحمت کے اظہار کے لیے آپ نے مدارات کا یہ عملی پہلو اختیار فرمایا۔

شارحین بخاری نقل کرتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے اپنی قمیص اتار کر ضرور دی مگر اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرما دیا تھا۔ وما یغنی عنہ قمیصی وصلاتی من اللہ۔ واللہ انی کنت ارجوان یسلم الف من قومہ بارگاہ خدا میں میری قمیص اور نماز اسے کیا فائدہ دے سکتی ہے مجھے تو یہ امید تھی کہ میرے اس عمل سے متاثر ہو کر شائد اس کی قوم کے ایک ہزار افراد اسلام قبول کر لیں گے۔ چنانچہ لکھنے والوں نے لکھا ہے اور بتانے والوں نے بتایا ہے کہ جب اس کی قوم نے رحمت و شفقت کا یہ منظر دیکھا تو ہزار افراد نے اسلام قبول کر لیا۔

---

[1] ابن کثیر

ان تصریحات سے یہ صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا یہ عمل کس جذبے کے تحت تھا آپ ان لوگوں کے اسلام کی آس لگائے بیٹھے تھے یا یہ کہ درحقیقت اس کی مغفرت کے خیال میں تھے۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اصرار پر آپ کا خاموش رہنا اور آخر میں مسکرا دینا گیا اس کی غمازی نہیں کر رہا تھا کہ آپ یہاں ایک اہم مقصد کے پیش نظر محض آئینی وسعتوں سے فائدہ اٹھانا چاہتے تھے۔ عمر کو اپنی طبعی جلادت کی وجہ سے اس طرف مائل ہونا چاہیے تھا۔ لیکن وہ عمیق حکمت تک کہاں پہنچ سکتے تھے۔ جس کا ظہور بعد میں ہوا اور جس کی بدولت ایک جماعت اسلام کے حلقہ بگوش ہوگئی۔ اسی کے قریب جنگ بدر میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کا واقعہ ہے وہ بھی حضور اقدس ﷺ کی حد سے بڑھتی ہوئی الحاح وزاری سے آپ کو روک رہے ہیں اور تسلی دے رہے ہیں مگر نبی کریم ﷺ تھے کہ اپنے پروردگار کے سامنے اتنے بے اختیار ہوئے چلے جاتے تھے کہ آپ کی ردائے مبارک بھی آپ کے شانوں سے گری جا رہی تھی۔ مقام نبوت والے اس اضطراب کو یا اس واقعہ میں ان کے میلان کو پہچان سکتے ہیں۔

وَلَا تُعْجِبْكَ أَمْوَالُهُمْ وَأَوْلَادُهُمْ ۚ إِنَّمَا يُرِيدُ اللَّهُ
أَنْ يُعَذِّبَهُمْ بِهَا فِي الدُّنْيَا وَتَزْهَقَ أَنْفُسُهُمْ وَهُمْ
كَافِرُونَ ﴿٨٥﴾ وَإِذَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ أَنْ آمِنُوا بِاللَّهِ وَ
جَاهِدُوا مَعَ رَسُولِهِ اسْتَأْذَنَكَ أُولُو الطَّوْلِ مِنْهُمْ
وَقَالُوا ذَرْنَا نَكُنْ مَعَ الْقَاعِدِينَ ﴿٨٦﴾ رَضُوا بِأَنْ يَكُونُوا
مَعَ الْخَوَالِفِ وَطُبِعَ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ﴿٨٧﴾
لَٰكِنِ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَاهَدُوا بِأَمْوَالِهِمْ
وَأَنْفُسِهِمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ لَهُمُ الْخَيْرَاتُ ۖ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ﴿٨٨﴾
أَعَدَّ اللَّهُ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ
فِيهَا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿٨٩﴾

ع ١١ ٩ ١٧

اے پیغمبرؐ ان کی دولت اور ان کی اولاد آپؐ کو حیرت میں نہ ڈالے۔ اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ اللہ اس کے ذریعے ان کو دنیا میں سزا دینا چاہتا ہے۔ ان کی جانیں کفر ہی کی حالت میں نکلیں گی[۹۰]۔ اور جب کوئی سورت یہ موضوع لے کر نازل ہوتی ہے کہ اللہ پر ایمان لاؤ اور اس کے رسولؐ کی معیت میں ہو کر جہاد کرو تو ان میں دولت مند لوگ آپ سے جہاد میں نہ جانے کی رخصت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجئے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں[۹۱]۔

انھوں نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ پیچھے رہ جانے والی عورتوں کے ساتھ رہیں اور ان کے دلوں پر مہر لگ چکی ہے اس لیے وہ کچھ نہیں سمجھتے ہیں[۹۲] لیکن اللہ کا رسول اور اس کی ہمرکابی میں اہل ایمان نے اپنی جانوں اور اپنے مالوں سے جہاد کیا ہے اور ان ہی حضرات کے لیے خوبیاں ہیں اور یہی لوگ بامراد ہیں[۹۳] اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں یہ ہمیشہ ان میں رہیں گے یہی عظیم الشان کامیابی ہے[۹۴]

مفردات کے معانی

تزھق وہ نکلے گی واحد مؤنث مضارع زہق یزہق زہوقا باب فتح سے آتا ہے اس کے معنے غم سے جان نکلنا اور کسی چیز کے مٹ جانے کے ہیں۔

سورۃ (سورت) علامہ زمخشری کشاف میں لکھتے ہیں۔ سورۃ قرآن کے مقررہ حصہ کا نام ہے یہ کم سے کم تین آیت ہوتی ہے۔ اور اس کا واو اگر اصلی ہے تو یہ سورۃ المدینۃ سے منقول ہو کر آیا ہے جس کے معنے شہر کی چاردیواری کے ہیں کیونکہ یہ بھی قرآن کے ایک حصہ کو اپنے اندر ایسے ہی گھیرے ہوئے جیسے شہر پناہ شہر کو اور یا اس لیے سورت کہا گیا ہے کہ حقوق علیہ اور انواع و اقسام کے فوائد پر حاوی ہوتی ہے جیسے شہر پناہ اندرون شہر کو گھیرے ہوئے ہوتی ہے۔ اور یا اس سورت سے منقول ہے جس کے معنے مرتبہ اور درجے کے ہیں۔ اور یہ دو طرح ہو سکتا ہے ایک یہ کہ سورتیں بھی بمنزلہ درجہ کے ہیں کہ جن پر قاری قدم بقدم ترقی کرتا جاتا ہے اور یا اس لیے کہ دین میں ان کی رفعت شان اور جلالت مسلم ہے۔

اولوا الطول۔ اولو ذو کی جمع ہے بمعنی والے طول مال دولت تونگری انعام وسعت گنجائش، مقدور، قدرت یہ طال یطول کا مصدر ہے۔ اس کا استعمال دو معنے میں ہوتا ہے۔ ایک درازی اور فضیلت میں غلبہ کرنا دوسرے کسی شخص کے ساتھ احسان کرنا اور اس کو انعام دینا۔ علامہ راغب فرماتے ہیں طول فضیلت و احسان کے معنے میں خاص ہے یہاں معنے ہیں مالدار اور مقدار والے۔

الخوالف۔ خالفۃ کی جمع ہے تیچھے رہنے والیاں۔ خالفۃ اصل میں خیمہ کے پچھلے ستون کو کہتے ہیں۔ اور عورت سے بھی کنایہ ہے کیونکہ وہ کوچ کرنے والوں سے تیچھے رہتی ہے۔

الخیرات۔ نیکیاں، بھلائیاں، خوبیاں، نیک عورتیں، اچھی عورتیں فیھن خیرات حسان بعض علماء کا خیال ہے کہ یہ اصل میں خیّرات ہے۔

نفاق اور ایمان کا تقابلی مطالعہ

قرآن کے آغاز میں بھی انسان کے عقائد و اعمال کی تین حالتیں بتائی ہیں ایمان کفر اور نفاق۔ فی الواقع یہ ایک طبعی تقسیم ہے۔ زندگی کے تمام گوشوں میں یہ تین حالتیں ہیں۔ صرف معانی میں نہیں مادیات اور اجسام میں بھی یہی تین حالتیں ہیں یا تو اصلاح کی حالت ہوگی یا افساد کی یا پھر دونوں کی درمیانی حالت۔ انسان کی جسمانی زندگی بھی ان تین حالتوں سے دوچار ہوتی ہے صحت ہے یا موت ہے اور یا پھر دونوں کے درمیان بیماری ہے۔ پھر جیسے صحت کے مدارج ہیں بیماری کے بھی مدارج ہیں۔ بیماری کو نہ تو زندگی کی صحیح حالت کہہ سکتے ہیں نہ موت ہی قرار دے سکتے ہیں۔ دونوں کے بین بین ہے قلب و روح کا بھی یہی حال ہے ایمان حیات ہے موت کفر ہے اور نفاق بیماری۔ قرآن میں استعارے کی زبان میں ایک سے زیادہ مقامات پر ایمان کو زندگی اور کفر کو موت سے تعبیر کیا ہے جیسے ہر بیماری علامات سے پہچانی جاتی ہے ایسے ہی نفاق کی بیماری کی بھی علامات ہیں جنہیں قرآن نے منافقین کے معاملات بیان کرتے وقت ان کی امتیازی خصوصیت کی حیثیت سے پیش فرمایا ہے۔ یہ علامتیں منافقین کے اعمال اور کیفیات نفسانی ہیں۔ لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر منافق میں یہ علامتیں ساری کی ساری موجود ہوں کسی منافق کے اندر ان میں سے دو چار ہوں گی تو دوسرے میں دس ہو سکتی ہیں۔

(۹۰) اے پیغمبر ان کی دولت اور ان کی اولاد آپ کو حیرت میں نہ ڈالے اس کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ اللہ اس کے ذریعے ان کو دنیا میں سزا دینا چاہتا ہے۔ ان کی جانیں کفر ہی کی حالت میں نکلیں گی چار رکوع پہلے اسی مضمون کی آیت گزری ہے اس کا فائدہ وہاں ملاحظہ کر لیا جائے لہ بتایا ہے کہ ان لوگوں پر جو اموال و اولاد کی بہتات رکھتے ہیں حیرت یا پسند کی نگاہ نہ ڈالیے۔ ان میں مال و اولاد کی بہتات اس لیے نہیں کہ خدا اور خدا کی مرضیات کے ساتھ ان کا تعلق ہے۔ بلکہ جس حد تک وہ خدا اور خدا کی مرضیات سے ٹکراتے ہیں اسی حد تک معیشت کے پیمانہ میں کشادگی پیدا ہو رہی ہے تمرد اور سرکشی کے میدانوں میں ان کے قدم جتنے آگے بڑھتے جاتے ہیں اسی حد تک دنیا اور دنیاوی نعمتیں بھی ان کے قدم چومتی جاتی ہیں تو ایسی حالت میں آپ کو حیرت نہ ہونی چاہیے بلکہ یقین کرنا چاہیے

لہ افادات شیخ الاسلام

دنیاوی انعامات کی جو ٹوپی ان کے سروں پر اس لیے منڈھی گئی ہے تاکہ وہ اندھے ہی ہو کر جئیں اور اندھے ہی بنے ہوئے مر جائیں۔ الاموال اور الاولاد کی یہ کثرت نشانی ہے اس بات کی کہ قدرت ان سے انتقام لینا چاہتی ہے اور ایسا انتقام کہ چونکنے کی ساری راہیں ان پر بند کر دی گئی ہیں مطلب یہ ہے کہ یہ مال و اولاد ان کو انعاماً نہیں بلکہ ان کو سزا اور انتقاماً ان کی مجرمانہ غفلتوں کی وجہ سے دیا جاتا ہے۔ تاکہ ان کی غفلتوں میں اور اضافہ ہو مقصد صرف اور یہ ہے کہ ان کو اندھا بنایا جاتا ہے۔ اور دولت و ثروت کی ڈاٹیں ان کے کانوں میں اسی لیے ٹھونسی جاتی ہیں تاکہ بھٹنے کی راہوں پر ان کی نظر نہ پڑے لیکن اپنی جگہ وہ اس خیال میں مگن ہیں کہ وہی اللہ کے پیارے ہیں۔ قرآن کی اس آیت میں اسی کے متعلق تنبیہ کی گئی ہے کہ ان کا مال کہیں لوگوں کے ایمان کو نہ لرزا دے صاف لفظوں میں اعلان کیا گیا ہے کہ الاموال اور الاولاد کی یہ وہی قسم ہے جس کے ذریعے اللہ سبحانہ ان لوگوں کو سزا دینا چاہتا ہے اور اس سے غرض یہ ہے کہ اسی ناشکری اور کفران کی حالت میں بدن سے ان کی جان نکلے اور اس طرح نکلے کہ چونکنے اور سنبھلنے کا پھر ان کو موقع نہ ملے۔ اس آیت کے تکرار میں بتایا گیا ہے کہ قوموں اور افراد دونوں کا حکم یہی ہے۔ اور یہ سزائی قالب دونوں کے لیے ہے اور اس لیے بھی تکرار کیا گیا ہے کہ ان لوگوں کے ذہن کو صاف کرنا ہے جو ایک طرف تو اللہ کو بھی مانتے ہیں اللہ کے رسول کو بھی مانتے ہیں لیکن اللہ کے باغیوں اور سرکشوں اور رسولوں کے دشمنوں کے انعامات کا انتقامی دروازہ کھلا ہوا دیکھ کر انعام و اکرام کا تمغہ قرار دیتے ہیں۔ انا للہ والی المشتکی۔

جہاد سے گریز نفاق ہے

(۹۱) اور جب کوئی سورت یہ موضوع لے کر نازل ہوتی کہ اللہ پر ایمان لاؤ۔ اور اس کے رسول کی معیت میں ہو کر جہاد کرو تو ان میں سے دولت مند لوگ آپ سے جہاد میں نہ جانے کی رخصت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ہمیں چھوڑ دیجئے کہ ہم بیٹھنے والوں کے ساتھ رہیں۔ یعنی قرآن کی کسی سورت میں جب تنبیہ کی جاتی ہے کہ پوری طرح خلوص و یکسوئی سے ایمان لاؤ جس کا بڑا اثر یہ ظاہر ہونا چاہیے کہ حضور اقدس ﷺ کے ساتھ خدا کے راستہ میں جہاد کریں تو یہ منافقین جان چرانے لگتے ہیں اور ان میں کے استطاعت و مقدور والے بھی جھوٹے عذر تراش کر اجازت طلب کرنے آتے ہیں کہ حضرت! ہمیں تو یہیں مدینے میں رہنے دیجیے [1]

اسی کے ہم معنے قرآن میں سورۂ محمد میں بھی ایک آیت آئی ہے۔ ویقول الذین امنوا لولا نزلت سورۃ۔ فاذا انزلت سورۃ محکمۃ وذکر فیھا القتال رایت الذین فی قلوبھم

[1] افادات شیخ الاسلام

مرض ینظرون الیک نظر المغشی علیہ من الموت فاولیٰ لھم۔

جو لوگ ایمان لائے وہ کہتے ہیں کہ کوئی سورت کیوں نہیں نازل ہوتی جس میں جنگ کا حکم ہو مگر جب ایک محکم سورت نازل کر دی گئی۔ جس میں جنگ کا حکم تھا تو تم نے دیکھ لیا کہ جن کے دلوں میں بیماری تھی وہ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جیسے کسی پر سخت موت چھا گئی ہو بس افسوس ہے ان کے حال پر۔

مطلب یہ ہے کہ جن حالات سے اس وقت مسلمان گذر رہے تھے اور کفار کا جو رویہ اس وقت اور مسلمانوں کے ساتھ تھا اس کی وجہ سے جنگ کا حکم آنے سے پہلے ہی اہل ایمان کی عام رائے یہ تھی کہ اب ہمیں جنگ کی اجازت ملنی چاہیے مگر جو لوگ منافقت کے ساتھ مسلمانوں کے گروہ میں شامل تھے ان کا حال مومنوں کے حال سے بالکل مختلف تھا وہ اپنی جان و مال کو خدا اور اس کے دین سے عزیز تر رکھتے تھے اور اس کے لیے کوئی خطرہ مول لینے کو تیار نہ تھے۔ جنگ کے حکم نے آتے ہی ان کو اور سچے اہل ایمان کو ایک دوسرے سے چھانٹ کر الگ کر دیا۔ جب تک حکم نہ آیا تھا ان میں اور عام اہل ایمان میں بظاہر کوئی فرق و امتیاز نہ پایا جاتا تھا۔ نماز وہ بھی پڑھتے تھے اور یہ بھی ——— روزے رکھنے میں بھی انہیں تامل نہ تھا۔ ٹھنڈا ٹھنڈا اسلام ان کو قبول تھا۔ مگر جب اسلام کے لیے بازی لگانے کا وقت آتا تو ان کے نفاق کا حال کھل جاتا اور نمائشی ایمان کا وہ لبادہ اُتر جاتا جو انھوں نے اوپر سے اُوڑھ رکھا تھا۔ یہاں بھی یہی بات بتائی گئی ہے کہ جب کوئی سورہ نازل یہ مطالبہ لے کر ہوتی ہے کہ آمنوا اپنے ایمان کے تقاضے پورے کر دیا اپنے دعویٰ ایمان کی دلیل پیش کرو۔ ایمان کا سب سے اہم اور بنیادی تقاضا یہ ہے کہ اللہ کی خاطر اللہ کے رسول کی ہمرکابی میں جہاد کرو کہ جہاد ایمان کی کسوٹی ہے تو ان کا طرز کیا ہوتا ہے ——— یہی کہ استاذنک اولوا الطول۔ یہ اور صرف یہ کہ ان کا دولت مند طبقہ حضور اقدس کی خدمت میں آکر جہاد میں نہ جانے کے لیے درخواستیں پیش کرتا جب دولت مندوں کا یہ حال ہے تو غریبوں اور مسکینوں کا کیا ذکر۔ ان میں جو مالدار ہیں تندرست بھی ہیں وسائل بھی رکھتے ہیں اور سامان جنگ فراہم کرنے کا وافر ذریعہ ان کا حال یہ ہے کہ عذر اور بہانہ بنا کر حضورؐ کے پاس رخصت مانگنے آتے ہیں اور کہتے ہیں ذرنا نکن مع القاعدین ہمیں جنگ سے مستثنیٰ کر دیجئے یہ ان کے دل کے ارادوں کو الفاظ کے لبادے میں پیش کیا گیا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ اگرچہ ان منافقین نے پیش تو عذر ہی کیے تھے لیکن ان عذروں کی تہ میں ان کی دلی بیماری یعنی نفاق کام کر رہی تھی۔ وہ اس نفاق کی وجہ سے نکلنے والے غازیوں کے ساتھی نہیں بلکہ بیٹھنے والوں بزدلوں ناکاروں معذوروں کے ساتھی بننا چاہتے

تھے۔ ان کے عذروں اور بہانوں کی اصلی علت کو قرآن نے ان کے قول سے تعبیر کیا ہے۔ اور قرینہ مقام آیت کی پیشانی پر اداہونے کی وجہ سے بتا رہا ہے کہ منافقین کی جہاد کے موقعہ پر بہانے بنانے اور عذر تراشنے کی ہمیشہ کی عادت تھی یہ کوئی وقتی حادثہ نہ تھا۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں۔ اذا یبنبئی التکرار یہ بھی منافقین کی ایک نشانی ہے کہ اسلام پر افتاد کے وقت میں محنت اور جہاد سے جان چراتے ہیں۔ یہ عام منافقین کی علامات میں سے ہے۔ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے حوالہ سے یہی علامت بتائی گئی ہے۔

جو شخص مر گیا اور اس نے اللہ تعالیٰ کے راستہ میں جہاد نہیں کیا اور نہ اس کے دل میں کبھی جہاد کا ولولہ رونما ہوا تو وہ نفاق کے ایک شعبہ پر مرا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اسلام کی خاطر جدوجہد ہی سے ایمان خالص اور نفاق کے درمیان پورا امتیاز ہوتا تھا۔ اہل ایمان و اخلاص تو پروانہ وار آتش جنگ میں کود پڑتے تھے اور جو منافق تھے وہ دم چراتے تھے۔ درحقیقت ایک مومن کی شان یہی ہونی چاہیے کہ وہ خدا اور رسول کی راہ میں اپنی جان قربان کرنے کے لیے بے چین نظر آئے اور یہی اس کا ثبوت ہوگا کہ اللہ و رسول کی محبت اس کے دل میں تمام محبتوں پر غالب آچکی ہے اور اگر بالفرض ایسا کوئی موقعہ اس کے ہاتھ نہ آئے تو کم از کم اس تمنا میں تو اس کا دل تڑپتا رہے۔ اگر ایسا بھی نہیں تو یہ اس کی علامت ہوگی کہ اس کا دعوئ ایمان صرف زبانی ہی زبانی ہے۔ اس کا قلب جذبات محبت سے یکسر خالی ہے۔ یہ ظاہر و باطن کا ایک قسم کا اختلاف ہے اس سے اس کو نفاق ہی کا شعبہ کہا جائے گا۔

نفاق بھی زمان و مکان کے اختلاف سے بدلتا رہتا ہے حافظ ابن رجب حنبلی نے مسند امام احمد سے بروایت حذیفہ اس کو ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

تم آج ایسی باتیں منہ سے نکالتے ہو جن کو ہم زمانہ نبوت میں نفاق سمجھتے تھے۔

اللہ اکبر کتنی جلدی زمانہ کہاں سے کہاں جا پہنچا ہے۔ جو بات کل تک نفاق سمجھی جا رہی تھی آج وہ زبانوں پر بے محابا آرہی ہے۔ بہرحال نفاق کا بیج ایسا شجرہ خبیثہ بنتا ہے جس کی شاخیں ان گنت ہیں۔ پھر شاخوں پر پتے اور پتوں پر پھول اور پھل بھی ان گنت ہوتے ہیں۔

مرد ہو کر عورتوں کا کردار بے غیرتی ہے

(۹۲) انھوں نے اس بات کو پسند کیا ہے کہ پیچھے رہنے والی عورتوں کے ساتھ رہیں۔ اور ان کے دلوں پر مُہر لگ چکی ہے اس لیے وہ کچھ نہیں سمجھتے ہیں۔ گویا کمال بے غیرتی اور نامردی سے اس پر راضی ہیں کہ لڑائی یا خطرہ کا

نام سنتے ہی خانہ نشین عورتوں کے ساتھ گھروں میں گھس کر بیٹھ رہیں۔ ہاں جس وقت جنگ کا خطرہ نہ رہے اور امن وامان کا زمانہ ہو تو باتیں بنانے اور قینچی کی طرح زبان چلانے میں سب سے پیش پیش ہوتے ہیں فاذا جاء الخوف رأیتہم ینظرون الیك تدور اعینہم کالذی یغشی علیہ من الموت۔ فاذا ذھب الخوف سلقوکم بالسنۃ حداد۔ جب ڈر کا وقت آئے گا تو آپ ان کو دیکھیں گے کہ وہ آپ کی طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں کہ ان کی نگاہیں گھوم رہی ہیں اس شخص کی طرح جس پر موت کی بے ہوشی ہو جب ڈر کا وقت نکل جائے تو چڑھ چڑھ کر بولتے ہیں تیز تیز زبانوں سے —— مطلب ہے کہ کذب ونفاق نکول عن الجہاد اور تخلف عن الرسول ﷺ کی شامت سے ان کے دلوں پر مہر کر دی گئی کہ اب موٹے موٹے عیب بھی ان کو عیب نظر نہیں آتے اور انتہائی بے غیرتی و بزدلی پر بجائے شرمانے کے نازاں و فرحاں ہوتے ہیں۔[1]

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ یہ بڑی شرم کی بات ہے کہ اچھے خاصے ہٹے کٹے تندرست صاحب استطاعت لوگ مدعی ایمان ہو کر وقت آنے پر میدان میں نکلنے کے بجائے گھروں میں گھس کر بیٹھ جائیں اور عورتوں میں جا شامل ہوں۔ لیکن چونکہ ان لوگوں نے خود جان بوجھ کر اپنے لیے یہ رویہ پسند کیا تھا اس لیے قانونِ فطرت کے مطابق ان سے وہ پاکیزہ احساسات چھین لیے گئے جن کی بدولت آدمی ایسے ذلیل اطوار اختیار کرنے میں شرم محسوس کیا کرتا ہے۔ یعنی ان کی ایمانی اور اخلاقی موت کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے دلوں پر ٹھپہ لگ گیا نہ اب وہ کوئی صحیح بات سوچتے ہیں نہ کسی عزم و ہمت کے کام کے لیے ان میں کوئی حوصلہ ہوتا ہے۔

یہاں ارشاد ہوا ہے طبع علی قلوبھم فھم لا یفقھون اس قسم کی آیتوں میں یہ بات خوب سمجھ لینی چاہیے کہ انسان کی بد اعمالی مقدم ہے اور اللہ سبحانہ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے مہر لگانا مؤخر ہے اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہ کی جانب سے مہر کا لگنا علت اور انسانوں کا کفر و نفاق معلول نہیں بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی انسان کا نفاق پہلے ہوتا ہے اور اللہ کی جانب سے مہر کا لگنا بعد کو ہوتا ہے یعنی نفاق مہر لگنے کی علت ہے اور یہی طبعی اصول ہے انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے اگر کوئی اس کو اُلٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی یہاں بھی یوں ہی سمجھ لیجئے کہ ان کا رسول کے ساتھ جہاد میں نہ جانے کے لیے بہانے تراشنا اور مرد ہو کر عورتوں کے ساتھ رہ جانا علت ہے ان کے دلوں پر مہر لگنے کی اب ہزار ان کو کوئی سمجھائے ان کی سمجھ میں نہیں آتا ہے۔ گویا عدم فقاہت کی علت طبع ہے اور طبع کی علت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان کا نفاق ہے۔ نفاق پیوست ہونا ہے تو اس کا لازمی نتیجہ طبع ہے۔ اس کی توضیح ان علامات سے ہوتی ہے جو نفاق کے لیے حضور اقدس ﷺ نے بتائی ہیں۔ مثلاً مسند احمد کے حوالہ سے حافظ ابن کثیر نے کہا ہے:۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کہتے ہیں حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے منافقوں کی کچھ نشانیاں ہیں جن کے ذریعے ان کو پہچانا جا سکتا ہے۔

۱۔ سلام کی جگہ ان کی زبانوں پر لعنت ہوتی ہے۔

۲۔ لوٹ مار کا مال ان کی خوراک ہوتا ہے۔

۳۔ خیانت کا مال ان کا مال غنیمت ہوتا ہے۔

۴۔ مساجد کے پاس آتے ہیں تو بیہودہ بکواس کرتے ہیں۔

۵۔ نمازوں میں سب سے بعد میں آتے ہیں اتراتے ہوئے۔

۶۔ نہ خود کسی سے محبت کرتے ہیں اور نہ ان سے کوئی محبت کرتا ہے۔

۷۔ رات کو شہتیر کی طرح بستروں پر دراز رہتے ہیں اور دن میں شور مچاتے ہیں۔

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی کے حوالہ سے امام بخاری رحمہ اللہ نے حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد لکھا ہے کہ:۔

منافق کی تین نشانیاں ہیں۔

۱۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

۲۔ جب وعدہ کرے تو خلاف ورزی کرے۔

۳۔ جب اس کے پاس امانت رکھی جائے خیانت کرے۔

بخاری و مسلم میں حضرت عبداللہ بن عمرو رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حضور اقدس ﷺ کا یہ ارشاد ہے۔

چار نشانیاں ہیں جس میں چاروں ہوں گی پورا منافق ہے اور جس میں ایک ہو گی اس میں نفاق کی ایک عادت ہو گی۔

۱۔ جب امانت رکھی جائے خیانت کرے۔

۲۔ جب عہد کرے غداری کرے۔

۳۔ جب بات کرے تو جھوٹ بولے۔

۴۔ جب جھگڑا کرے گالیوں پر اتر آئے۔

اس سورہ برا رت میں بھی علامتیں بتائی گئی ہیں۔ انشاء اللہ سورہ برا رت کے آخر میں ہم اس پر تفصیلی تبصرہ کریں گے۔

ایمان میں اخلاص والوں کا کردار

(۹۳) لیکن اللہ کا رسول اور اس کی ہمرکابی میں اہل ایمان نے اپنی جانوں اور مالوں کے ساتھ جہاد کیا ہے۔ اور ان ہی حضرات کے لیے خوبیاں ہیں اور یہی لوگ بامراد ہیں۔ منافقین کے بالمقابل مومنین مخلصین کا بیان فرمایا ہے۔ کہ دیکھو یہ ہیں خدا کے وفادار بندے جو اس کے راستے میں نہ جان سے ہٹتے ہیں نہ مال سے۔ کیسا ہی خطرے کا موقعہ ہو۔ اسلام کی حمایت اور پیغمبر اسلام کی معیت میں ہر قربانی کے لیے تیار رہتے ہیں۔ پھر ایسوں کے فلاح و کامیابی نہ ہوگی تو اور کس کے لیے ہوگی[1]
اس آیت میں سچے اور پکے اہل ایمان کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے اور مقصود اس سے اہل ایمان کے اخلاص کی تحسین ہے اور ساتھ ہی ان منافقین پر طنز بھی ہے جو دعویٰ ایمان کے باوجود ایمان کے تقاضے پورے نہیں کرتے ہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ کسی دستور پر عمل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہم اس دستور کی خوبی اور سچائی کا یقین کریں اگر ایسا نہ ہو تو نہ تو ہم اس پر ایمانداری کے ساتھ عمل کر سکتے ہیں اور نہ ہمارے نفس و ضمیر پر اس کا اثر ہو سکتا ہے۔ یہ حقیقت ہر دلیل سے ثابت ہے کہ تمام اعمال دل کے تابع ہیں۔ اس لیے جب تک دل نہ بدلے گا۔ ہمارے اعمال میں تغیر نہیں ہو سکتا یعنی اعمال کی اصلاح تمام تر ہمارے دل کی اصلاح کے زیر اثر ہے اور ایمان کا مقصد دل کی اصلاح ہے کہ اگر درست ہو گیا تو سب کچھ درست ہو گیا یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز ہر نیکی اور خوبی کو ایمان کا خاصہ اور اہل ایمان کا وصف لازم بتاتا ہے۔
ہر اہم موقعہ پر اس نے مسلمانوں کو یَـٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا سے مخاطب کیا ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان احکام پر وہی عمل کر سکتے ہیں جو نعمت ایمان سے مالا مال ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ تمام نیکیاں اور ہر قسم کی بھلائیاں اور خوبیاں جس ایک جڑ کی شاخیں ہیں وہ ایمان ہے یہ نہ ہو تو نیکیوں کی ساری عمارت بے بنیاد ہے۔ نفاق اخلاص کی ضد ہے اس لیے اخلاص کی عدم موجودگی میں عمل کی عمارت کھوکھلی رہتی ہے۔ ظاہری طور پر نظر آتی ہے مگر حقیقت میں اس کا وجود نہیں ہوتا ہے۔

جہاد ایمان کی سب سے بڑی کسوٹی ہے اس سے کھرے اور کھوٹے کا عمل روس الاشہاد سب کو پتہ لگ جاتا ہے۔ محبت الٰہی ایمان کی بہت بڑی علامت ہے والذین آمنوا اشد حبًا للہ مال اور اولاد کے مقابلے میں جب اللہ سے محبت ہوتی ہے تو مومن جان اور مال کی بازی لگا دیتا ہے ایمان کی سب سے بڑی خاصیت اور علامت حبِّ الٰہی ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

اور یہ وہ دولت ہے جو اہل ایمان کی پہلی جماعت کو عملاً نصیب ہو چکی تھی۔ اس نشہ محبت پر باپ۔ ماں۔ اولاد۔ بھائی۔ بیوی۔ جان۔ مال۔ خاندان سب کو انہوں نے نثار اور قربان کر دیا تھا۔ یہ حقیقت ہے اور قرآن نے اس کا بار بار اعلان کیا ہے کہ اگر حُبِ ایمانی اور غیر ایمانی میں مقابلہ ہو جائے تو مومن وہ ہے جس کی حُبِ ایمانی پر دنیا کی کوئی محبت اور علاقہ بھی غالب نہ آسکے۔ قرآن کی یہ آیت گواہی دے رہی ہے کہ محبتِ ایمانی کی اس آزمائش میں صحابہ کرام جس طرح پورے اُترے۔ بلاشائبہ کہا جاسکتا ہے کہ دنیا میں انسانوں کے کسی گروہ نے کسی انسان کے ساتھ اپنے سارے دل اور اپنی ساری روح سے ایسی محبت نہیں کی ہوگی جیسی صحابہ کرام نے اللہ کے رسول کے ساتھ راہِ حق میں کی۔ انہوں نے اس محبت کی راہ میں سب کچھ قربان کر دیا جو انسان کر سکتا ہے اور پھر اسی کی راہ سے سب کچھ پایا جو انسانوں کی کوئی جماعت پاسکتی ہے دنیا میں اللہ نے الخیرات عطا کیں۔ اور اس کے ساتھ ان کو بامراد کامران اور کامیاب ہونے کی خوشخبری دی اور صرف خوشخبری نہیں بلکہ اعلان کیا پہلے اسم اشارہ لائے۔ پھر ضمیر متصل اور اس کے بعد المفلحون کو معرفہ بنا کر لائے۔ اور بتا دیا کہ ان میں الخیرات اور فلاح کے علاوہ کسی اور چیز کا تصور بھی نہیں اور یہ اس میں منفرد ہیں۔

صحابہؓ کی آخرت میں کامیابی

(۹۴) اللہ نے ان کے لیے ایسے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہتی ہیں یہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ یہی عظیم الشان کامیابی ہے۔ یہ عالمِ شہادت میں کامیابی کی بشارت کے بعد عالمِ غیب اور آخرت میں کامران ہونے کی شہادت ہے۔ اگر ذالك الفوز العظيم۔ کا اشارہ مجموعہ کی طرف ہے تو مطلب ہے کہ دنیا و آخرت میں سرخروئی میں سب سے بڑی کامیابی ہے۔ یہودیوں کی طرح نہیں۔ کہ صرف دنیا میں سرخروئی کا نام کامیابی رکھ لیا اور عیسائیوں کی طرح نہیں کہ رہبانیت اختیار کر کے صرف آخرت میں سرخروئی کا نام کامیابی رکھ لیا بلکہ دونوں دنیا اور آخرت میں سرخروئی کا نام الفوز العظیم ہے۔ یہاں اگر الخیرات ان کا استقبال کریں گی تو آخرت میں جنات ان کا استقبال کریں گی۔ اس موجودہ زندگی میں بھی گو لذتیں ہیں۔ مسرتیں اور خیرات ہیں مگر جو چیز یہاں نہیں ہے وہ بقائے دوام ہے یہاں کی ہر لذت عارضی اور مسرت آنی ہے۔ یہاں خوشی کا کوئی ایسا ترانہ نہیں جس کے بعد غم و ماتم کا نالہ نہ ہو۔ یہاں ہر پھول کے ساتھ کانٹے ہیں روشنی کے ساتھ تاریکی۔ ہر وجود کے ساتھ فنا۔ ہر سیری کے بعد بھوک ہر سیرابی کے بعد پیاس اور ہر غنا کے بعد محتاجی ہے غرض اس دنیا کی ہر چیز آنی جانی ہے اور یہی یہاں کی سب سے بڑی کمی ہے لیکن جنت اس مملکت کا نام ہے جہاں کی لذتیں جاودانی اور جہاں کی مسرتیں غیر فانی ہیں جہاں حیات ہے گر موت نہیں۔ راحت ہے مگر تکلیف نہیں لذت ہے گر الم نہیں مسرت ہے مگر غم نہیں جہاں وہ سکون ہے جس کے ساتھ اضطراب نہیں اور وہ شادمانی ہے جس کے بعد رنج و غم نہیں۔ یہ ہمیشگی کے باغات

وہ غیر فانی مملکت ہے جہاں کا آرام دائم اور جہاں کی سلامتی ابدی۔ جہاں کی لذت بے انتہا۔ جہاں کی زندگی غیر منقطع جہاں کا سرور غیر مختتم اور جہاں کا عیش جاودانی ہے۔ قرآن میں سولہ مقامات پر اس کی مختلف طریقوں سے تصریح کی گئی ہے۔ ایک جگہ ہے خالدین فیہا ابداً وعد اللہ حقا ومن اصدق من اللہ قیلا۔ اس تاکید پر تاکید اور پر زور انداز بیان پر غور کیجئے کہ صرف خلود پر اکتفا نہیں فرمایا بلکہ ساتھ ہی ابداً فرما کر اس خلود کو غیر فانی اور قیام کو ابدی بتایا۔ اس پر بھی بس نہیں کی بلکہ یہ بھی اضافہ کیا کہ یہ اللہ کا سچا وعدہ ہے پھر مزید تاکید کا اضافہ کیا کہ اللہ سے زیادہ سچی بات کس کی ہے اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ خلود جنت اور بقائے غیر فانی کی قطعیت کتنی ہے۔

کتابت: محمد نواز عابد کیلانی۔ حضرت کیلیانوالہ۔ ضلع گوجرانوالہ

وَجَآءَ الْمُعَذِّرُوْنَ مِنَ
الْاَعْرَابِ لِيُؤْذَنَ لَهُمْ وَقَعَدَ الَّذِيْنَ كَذَبُوا اللّٰهَ وَ
رَسُوْلَهٗ ؕ سَيُصِيْبُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْهُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ ﴿۹۰﴾
لَيْسَ عَلَى الضُّعَفَآءِ وَلَا عَلَى الْمَرْضٰى وَلَا عَلَى الَّذِيْنَ
لَا يَجِدُوْنَ مَا يُنْفِقُوْنَ حَرَجٌ اِذَا نَصَحُوْا لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ؕ
مَا عَلَى الْمُحْسِنِيْنَ مِنْ سَبِيْلٍ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۹۱﴾
وَّلَا عَلَى الَّذِيْنَ اِذَا مَاۤ اَتَوْكَ لِتَحْمِلَهُمْ قُلْتَ لَاۤ اَجِدُ
مَاۤ اَحْمِلُكُمْ عَلَيْهِ ۪ تَوَلَّوْا وَّاَعْيُنُهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ
حَزَنًا اَلَّا يَجِدُوْا مَا يُنْفِقُوْنَ ﴿۹۲﴾ؕ اِنَّمَا السَّبِيْلُ عَلَى
الَّذِيْنَ يَسْتَاْذِنُوْنَكَ وَهُمْ اَغْنِيَآءُ ۚ رَضُوْا بِاَنْ يَّكُوْنُوْا
مَعَ الْخَوَالِفِ ۙ وَطَبَعَ اللّٰهُ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۹۳﴾

اور اے پیغمبرؐ عرب کے بادیہ نشینوں میں سے عذر پیش کرنیوالے تمہارے پاس آئے تاکہ انہیں بھی (جنگ میں نہ جانے کی) اجازت مل جائے۔ اور جن لوگوں نے اللہ و رسولؐ سے جھوٹ بولا تھا وہ گھروں میں بیٹھے رہے ان میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ضرور دردناک سزا ملے گی۔[۹۰] ان ناتوانوں اور ایسے لوگوں پر جنہیں خرچ کے لیے کچھ میسر نہیں ہے کوئی گناہ نہیں ہے جب ان میں اللہ و رسولؐ

کی خیر خواہی ہو۔ نیکو کاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ سبحانہ بخشنے والا مہربان
ہے ؀۹۱ اور ان لوگوں پر بھی کوئی الزام نہیں ہے جو آپ کے پاس آئیں کہ آپ
ان کے لیے سواری کا انتظام کریں اور آپ ان سے کہہ دیں کہ تمہاری سواری
کا میرے پاس کوئی سامان نہیں ہے وہ آپ سے آنسوؤں سے ڈبڈباتی آنکھوں
کے ساتھ اس رنج میں کہ ان کے پاس خرچ کے لیے کچھ نہیں ہے واپس جائیں ؀۹۲

معانی مفردات

الاعراب۔ گنوار، بدو۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد عرب ہے۔ اور اعراب دراصل اسی کی جمع ہے جو صحرا نشینوں کا علم قرار دیا گیا ہے۔ لیکن صاحب قاموس نے تصریح کی ہے۔ کہ اعراب بادیہ نشین عربوں کو کہتے ہیں۔ اس کا واحد نہیں جمع اعاریب آتی ہے۔ علامہ شوکانی فتح القدیر میں رقم طراز ہیں کہ اعراب وہ ہیں جو صحراؤں میں سکونت گزیں ہوں۔ اس کے برخلاف لفظ عرب کے مفہوم میں وسعت ہے کیونکہ اس کا استعمال تمام انسانوں کے لیے عام ہے جو ریگستان عرب کے باشندے ہوں۔ خواہ وہ صحراؤں میں بستے ہوں یا آبادیوں میں رہتے ہوں۔ اہل لغت کا بیان یہی ہے۔ اسی لیے سیبویہ نے کہا ہے کہ اعراب صیغہ جمع تو ہے مگر لفظ عرب کی جمع نہیں ہے۔ علامہ نیشاپوری فرماتے ہیں کہ اہل لغت رجل عربی اس شخص کو کہتے ہیں جس کا عرب سے نسبی تعلق ہو جس طرح مجوس مجوسی کی یہود یہودی کی جمع آتی ہے اسی طرح عرب عربی کی جمع آتی ہے جب کسی اعرابی کو یا عربی کہا جاتا ہے تو وہ خوش ہو جاتا ہے اور جب کسی عربی کو یا اعرابی کہا جاتا ہے تو وہ غصہ میں آجاتا ہے ایسا کیوں ہے اس لیے کہ عرب کے شہریوں کو عربی اور بادیہ نشینوں کو اعرابی کہتے ہیں [1]

حرج۔ تنگی۔ مضائقہ۔ گناہ۔ تنگ۔ اصل میں تو حرج کے معنے کسی چیز کے مجتمع ہونے کی جگہ کے ہیں اور ایک جگہ جمع ہونے ... میں چونکہ تنگی ہوتی ہے اس لیے تنگی اور گناہ کو حرج کہا جاتا ہے۔

تفیض۔ وہ بہتی ہے وہ جاری ہوتی ہے ——— فیض باب ضرب سے اس کا استعمال جب آنسو اور پانی کے لیے ہوتا ہے تو جاری ہونے اور بہنے کے معنے آتے ہیں یہاں آنکھوں کے لیے اس کا استعمال ہوا ہے۔

[1] فتح القدیر

بادیہ نشین منافق

اب تک جن کا ذکر ہوا وہ سب کے سب یا تو کسی مادی منفعت کی خاطر اپنے کو مسلمان ظاہر کرتے تھے یا اسلام اور مسلمانوں کی در پردہ بیخ کنی کرنے کے لیے مسلمانوں کے گروہ میں شامل تھے۔ لیکن ایک گروہ ایسے منافقوں کا بھی تھا جو اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب اور مسلمانوں کی روز افزوں طاقت و شوکت سے مرعوب ہو کر مجبوراً اپنے اسلام کا اظہار کرتا تھا یعنی جو چیز اندر سے اسلام کا اعلان کرا رہی ہے وہ کوئی یقین و اذعان کا جذبہ نہیں ہے بلکہ ان کی وہ بزدلی ہے جو انہیں دہشت زدہ کر کے مجبور کر رہی ہے کہ اپنے ایمان کا اور اسلامی ملت کی پیروی کا جھوٹا مظاہرہ کریں کیونکہ انہیں خوف ہے کہ اسلامی شوکت کا یہ امنڈتا ہوا سیل بے پناہ جو تمام منکرین اسلام کو بے دست و پا کر رہا ہے ایک روز انہیں بھی اپنی زد میں لے لے گا۔ اسی کا نتیجہ تھا کہ جب کبھی انہیں مسلمانوں کی طاقت کی گرفت سے نکلنے کی کوئی صورت نظر آتی فوراً وہ اسلامیت کا مانگا ہوا گردن سے اتار پھینکتے۔ جیسا کہ پڑھ آئے ہو۔

لو یجدون ملجأ او مغارات او مدخلا لولوا الیہ وھم یجمحون۔ اگر کوئی جائے پناہ پا جائیں یا غار یا گھس بیٹھنے کی کوئی جگہ تو سرکشانہ اس کی طرف دوڑیں۔

یہ اسلام جس کا یہ بدکیش منافق اظہار کیا کرتے تھے غرض اور مجبوری کا اسلام تھا، اعتراف حق اور شرح صدر کا اسلام ہرگز نہ تھا۔ قرآن نے اس کے بارے میں ایک جگہ زیادہ واضح لفظوں میں بتایا ہے۔

قالت الاعراب امنا قل لم تؤمنوا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم۔

بادیہ نشین کہتے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے اے پیغمبرؐ ان سے کہہ دو تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو بلکہ یہ کہو کہ ہم مسلمان ہوئے ایمان کا تو ابھی تمہارے دلوں میں گذر بھی نہیں ہوا۔

گویا ان کے ایمان کی بنا اور علت ان کی بزدلی تھی۔ دل تو صداقت قرآنی کے منکر تھے لیکن طاقت کے ڈر سے زبان اس کی صداقت کا بار بار اقرار کرتی رہتی تھی۔ چونکہ یہ لوگ محض اسلامی سطوت کے دباؤ سے مجبور ہو کر اپنے اوپر مسلمانی کا لبادہ ڈالے ہوئے تھے اس لیے اندر اندر یہ مسلمانوں کے سخت بدخواہ تھے۔ ان کی خوشحالی انہیں ایک آنکھ نہ بھاتی تھی۔ انہیں مسلسل غلبہ اور تمکن حاصل ہوتا دیکھ کر یہ کڑھتے تھے اور یہ رات دن اس تمنا میں رہتے کہ انقلاب کا کوئی جھونکا ان مسلمانوں کی جڑ بنیاد سے اکھاڑ کر پھینک دے تاکہ ہم ان کی قاہرانہ گرفت کے خطرات سے بے خوف ہو کر آزادی کا سانس لے سکیں۔ غزوہ تبوک میں بھی یہی تمنائیں ان کے دلوں میں موجزن تھیں۔

(۹۵) اور اے پیغمبر ان بادیہ نشینوں میں سے تمہارے پاس عذر پیش کرنے والے آئے تاکہ انہیں بھی (جنگ میں نہ جانے کی) اجازت مل جائے۔ اور جن لوگوں نے اللہ و رسول سے جھوٹ بولا تھا وہ گھروں میں بیٹھے رہے۔ ان ہی میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ضرور ان کو دردناک سزا ملے گی یعنی جس طرح مدینہ کے رہنے والوں میں منافقین بھی ہیں اور مخلصین بھی۔ اسی طرح دیہاتی گنواروں میں ہر قسم کے لوگ پائے جاتے ہیں۔ ان میں سے یہاں دو قسموں کا ذکر فرمایا۔ مخلص دیہاتیوں کا ذکر اس رکوع کے خاتمہ پر ومن الاعراب من یومن باللہ والیوم الاخر میں آئے گا۔ یہاں دیہاتیوں کی جن دو جماعتوں کا ذکر کیا ہے۔ معذرون اور قاعدون۔ ان میں سے پہلی جماعت معذرون کے مصداق میں شارحین قرآن کا اختلاف ہے کہ آیا اس سے جھوٹے بہانے بنانے والے منافق مراد ہیں جیسا کہ ترجمہ سے ظاہر ہے یا سچے عذر کرنے والے مسلمان جو واقعی جہاد کی شرکت سے معذور تھے۔ اگر پہلی شق اختیار کی جائے تو آیت میں منافقین کی دو قسموں کا بیان ہوگا۔ معذرون تو وہ ہوئے جو باوجود نفاق کے محض ظاہر داری نباہنے کے لیے جھوٹے حیلے بنا کر حضورؐ سے اجازت طلب کرتے تھے اور قاعدون سے وہ منافق مراد ہوں گے جنہوں نے اول دعویٰ ایمان میں جھوٹ بولا پھر ظاہر داری کی بھی پروا نہیں کی۔ جہاد کا نام سن کر گھروں میں بیٹھے رہے۔ بالکل بے باک اور بے حیا ہو کر عذر کرنے بھی نہیں آئے اس صورت میں سیصیب الذین کفروا منهم۔ دونوں جماعتوں کو ۔ ۔ ۔ ۔ شامل ہوگا اور معنی یہ ہوں گے کہ جو لوگ دونوں جماعتوں میں سے اپنے کفر پر اخیر تک جمے رہیں گے ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔ جن کو توبہ کی توفیق ہو جائے گی۔ وہ اس وعید میں داخل نہیں ہیں۔ اور اگر معذورون سے مراد مومنین صادقین ہوں جو واقعی معذور تھے تو قاعدون سے مراد منافقین ہوں گے۔ اور سیصیب الذین کی وعید صرف ان کے ہی حق میں ہوگی۔ پہلی جماعت کا ذکر گویا قبول عذر کے طور پر ہوگا[۱]

جیسا کہ تمہید میں بتایا جا چکا ہے کہ اب یہاں منافقین کے ایک اور گروہ کا چہرہ پیش ہو رہا ہے اور وہ بادیہ نشینوں کی جماعت ہے اور بتایا ہے کہ ان میں بھی منافقین ہیں۔ بادیہ نشینوں کا بڑا حصہ نیا نیا مسلمان ہوا تھا اور شہر میں نہ رہنے کی وجہ سے ابھی اسلامی زندگی کی تربیت نہیں ملی تھی غزوہ تبوک کے لیے نفیر کا اعلان ہوا تو کچھ لوگ آئے اور عذر پیش کیے۔ کچھ ایسے تھے جو چپکے بیٹھے رہے معذرت کے لیے بھی نہیں آئے بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ عذر پیش کرنے والے عامر بن الطفیل کے قبیلے کے لوگ تھے انہوں نے کہا تھا اگر ہم آپ کے ہمراہ گئے تو قبیلہ طے کے بدو ہمارے مویشی اور اولاد پر آپڑیں گے (ابن جریر) چنانچہ ان کے لیے وعید آئی ——— حافظ ابن جریر نے آیت کا یہ مطلب بتایا ہے۔

[۱] افادات شیخ الاسلام

حضور اقدس ﷺ سے اجازت لینے کی خاطر دیہاتی معذرتیں لے کر حاضر ہوئے اور کچھ گھروں میں بیٹھے رہے۔ جنھوں نے اللہ و رسول ؐ سے جھوٹ بولا اور غلط اعذار پیش کیے ان میں سے جنھوں نے اللہ و رسول کا کفر کیا ان کو دردناک سزا ملے گی۔

اور حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہ نے اس آیت میں پہلے عذر والوں کا ذکر کیا ہے یہ لوگ جہاد میں نہ جانے کے لیے معذرتیں لے کر حضور اقدس ؐ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ یہ مدینہ کے ارد گرد کے بادیہ نشین تھے۔ اس کے بعد بتایا کہ کچھ وہ لوگ بھی ہیں جو گھروں میں بیٹھے رہے اور شریک جہاد نہیں ہوئے اور ان کو معذرت پیش کرنے کی بھی توفیق نہیں ہوئی۔

ان دونوں مفسرین کا رجحان اس آیت کی تشریح میں وہی ہے جو حضرت شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی نے اپنے افادات میں اختیار کیا ہے لیکن آیت میں اس مطلب کی بنیاد حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ کی اس روایت پر ہے کہ آیت میں لفظ معذرون بتشدید الذال نہیں بلکہ بتخفیف ہے یعنی باب تفعیل سے تعذیر نہیں بلکہ باب افعال سے اعذار ہے اور یہ اعذار سے اسم فاعل کی جمع ہے۔

اعذار و تعذیر میں فرق

اعذار اگر واقعی اور حقیقی عذر ہونے کو کہتے ہیں تو تعذیر کے معنے بہانہ سازی اور عذر تراشی کے آتے ہیں۔ ازہری لغوی نے حضرت ابن عباس رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے یہ قول نقل کیا ہے کہ معذرین وہ لوگ ہیں جو عذر شرکھتے ہوں اور عذر پیش کریں۔ علامہ مرتضی زبیدی شارح قاموس لکھتے ہیں ھم الذین لا عذر لھم لکن یتکلفون عذراً۔ جن کا عذر کوئی نہ ہو اور بتکلف عذر بنا دیں۔ اور امام رازی فرماتے ہیں معذر وہ ہے جو بلا عذر کے بہانے بنائے۔ معتذر اور معذر میں بھی یہی فرق ہے کہ معتذر کا عذر ممکن ہے صحیح ہو۔ لیکن معذر کا عذر ہمیشہ غلط اور بناوٹی ہوتا ہے۔ عبداللہ بن عباس ؓ نے اس آیت میں معذرین کی جگہ معذرون پڑھا ہے اور اس کے معنے واقعی عذر رکھنے والوں کے بتائے اس بنیاد پر آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ حضور اقدس ؐ کے پاس واقعی معذور مسلمان بادیہ نشین آئے۔ لیکن اس مطلب کی صورت میں وعید سیصیب الذین کفروا کا تعلق اس طبقے سے بالکل نہ رہے گا اس لیے محققین کے نزدیک معذرون تعذیر میں سے ہے۔ در آیت میں بتایا گیا ہے کہ غزوہ میں پیچھے رہنے والے بادیہ نشین دو قسم کے تھے۔

ایک وہ جنھوں نے بارگاہ نبوت میں جھوٹے بہانے بنا کر رخصت مانگی اور نہیں گئے۔

دوسرے وہ جو اس قدر بے باک تھے کہ ظاہر داری بھی نہ برتی اور جھوٹا عذر بھی کرنے نہیں آئے۔ الجصاص نے یہی مطلب بتایا ہے فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہ نے غزوہ تبوک میں نہ جانے پر رخصت کی درخواست پیش کرنے والوں کی بلا عذر اس آیت میں مذمت کی ہے اور معذورین اہل ایمان کا حال لیس علی الضعفاء اگلی آیت میں بتایا ہے

عبداللہ بن عباس کی وہ روایت جس میں المعذروں بالتشدید کی جگہ معذرون آیا ہے اس بارے میں نحاس لکھتے ہیں کہ اس روایت کا مدار کلبی پر ہے کلبی کا پورا نام ابو النضر محمد بن السائب بن بشیر بن عمرو بن عبد الحارث بن عبد العزی کلبی ہے ۱۴۶ھ ان کی وفات کا سال ہے۔ یہ قبیلہ بنو کلب سے تعلق کی وجہ سے کلبی کہلاتے ہیں۔ کیونکہ کوفہ کے باشندے تھے تاریخ وانساب اور تفسیر میں مشہور ہیں۔ علماء ان کے ضعیف اور ناقابل اعتبار ہونے پر متفق ہیں۔

ان پر سب سے زیادہ سنگین اعتراض جھوٹی روایتیں بیان کرنے کا ہے۔ سلیمان کہتے ہیں کہ کوفہ میں دو کذاب تھے۔ ان میں سے ایک کلبی ہیں۔ تفسیر میں ان کی بیشتر روایات حضرت عبداللہ بن عباس کی بروایت ابوصالح مروی ہیں۔ اور جناب کلبی کا بیان ہے کہ ان کے استاد تفسیر ابو صالح نے قسم کھا کر بتایا کہ میں نے کلبی کو کوئی بات تفسیر کے متعلق نہیں سنائی۔ امام سفیان ثوری فرماتے ہیں کہ کلبی نے خود ایک بار اعتراف کیا کہ میں نے ابوصالح سے ابن عباس کی جو روایتیں بیان کی ہیں وہ جھوٹ ہیں تم ان کو روایت نہ کرو۔

ان پر دوسرا اعتراض یہ ہے کہ یہ انتہائی غالی قسم کے شیعہ تھے۔ حضرت ابوخیر کہتے ہیں کہ میں نے اسے یہ کہتے ہوئے سنا ہے کہ ایک مرتبہ حضرت جبریل علیہ السلام آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی لے کر آئے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کسی کام سے اٹھ کر چلے گئے۔ حضرت علی رضی اللہ عنہ وہاں بیٹھے تھے تو جبریل علیہ السلام نے وہ وحی حضرت علی رضی اللہ عنہ پر نازل کر دی۔ ابوخیر کا یہ قول مشہور محدث یزید بن زریع کے سامنے پیش کیا گیا تو انھوں نے کہا کہ میں نے کلبی سے یہ بات تو نہیں سنی لیکن یہ میں نے خود دیکھا ہے کہ وہ سینہ پیٹ پیٹ کر کہہ رہا تھا کہ میں سبائی ہوں۔ میں سبائی ہوں۔ حافظ ابن حبان کہتے ہیں۔ کلبی سبائی تھا۔ اور ان لوگوں میں سے جو کہتے ہیں کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی وفات نہیں ہوئی۔ دوبارہ واپس آئیں گے۔ حافظ ذہبی اس کا طویل تذکرہ کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ لا یحل ذکرہ فی الکتب فکیف الاحتجاج۔ کتابوں میں اس کا ذکر بھی نہ ہونا چاہیے چہ جائے کہ اس کو استدلال شخصیت بنایا جائے۔

بہر حال اس روایت کے سہارے معذرون بالتشدید کو معذرون باب افعال سے پڑھا گیا ہے۔ اگر باب تفعیل سے

ہو تو مطلب ہے کہ بہانے بنا کر آتے تھے اور واقع میں وہ معذور نہ تھے۔ یہی قرین قیاس ہے اور یہی قراءت متواترہ ہے ابن کثیر نے اسی کو اظہر قرار دیا ہے۔ علامہ نسفی نے اسی کو اپنایا ہے۔ مشہور مفسر ضحاک نے اس کا جو پس منظر بیان کیا ہے کہ:

> عامر بن الطفیل کے قبیلے کے لوگ خدمت گرامی میں حاضر ہوئے اور تبوک میں نہ جانے کے لیے یہ عذر بار پیش کیا کہ ہم اگر آپ کے ساتھ جائیں گے تو ہمیں اندیشہ ہے کہ طے کے بادیہ نشین ہماری بیویوں، بچوں اور مویشیوں پر آپڑیں گے۔ حضور اقدسؐ نے فرمایا تمہارے حالات کی اللہ نے مجھے خبر دے دی ہے۔ اللہ سبحانہ کو تمہاری کوئی ضرورت نہیں ہے۔

یہ بھی اسی مطلب کی تائید کرتا ہے۔ امام رازی نے ابوعمرو بن العلاء کے حوالہ سے لکھا ہے کہ دونوں جماعتیں غلط کار ہیں جنھوں نے بناوٹی عذر پیش کیے اور جو گھر ہی بیٹھے رہے اور معذرت بھی نہیں کی۔ دونوں کورے منافق ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ منافقانہ اظہار ایمان جس کی تہ میں فی الواقع تصدیق۔ تسلیم۔ اخلاص اور اطاعت نہ ہو اور جس کے ظاہری اقرار کے باوجود انسان خدا اور اس کے دین کی بہ نسبت اپنے مفاد اور اپنی دنیوی دلچسپیوں کو عزیز رکھتا ہو اصل حقیقت کے اعتبار سے کفر و انکار ہی ہے۔ اللہ سبحانہ ایسے لوگوں کے ساتھ وہی معاملہ فرمائیں گے جو منکروں اور باغیوں کے ساتھ ہوگا۔ چاہے دنیا میں اس قسم کے لوگ کافر نہ ہوں اور ان کے ساتھ مسلمانوں کا معاملہ ہوتا رہے اس دنیوی زندگی میں جس قانون پر مسلم سوسائٹی کا نظام قائم کیا گیا ہے اور جس ضابطہ کی بنا پر اسلامی حکومت اور اس کے قاضی احکام کی تنفیذ کرتے ہیں۔ اس کے لحاظ سے تو منافقت پر کفر کا اشتباہ کفر کا حکم صرف انہی صورتوں پر لگایا جا سکتا ہے جب کہ انکار و بغاوت یا غداری و بیوفائی کا اظہار صریح طور پر ہو جائے اس لیے منافقت کی بہت سی صورتیں اور حالتیں ایسی رہ جاتی ہیں جو قضائے شرعی میں کفر کے حکم سے بچ جاتی ہیں لیکن قضائے شرعی میں کسی منافق کا حکم کفر سے بچنا ہرگز یہ معنے نہیں رکھتا ہے کہ قضائے خداوندی میں بھی آخرت میں وہ اس حکم اور اس کی سزا سے بچ جائے گا۔

پوری آیت کا مطلب ہے کہ جن بادیہ نشینوں کی اکثریت نے اگرچہ اسلام کی بڑھتی ہوئی طاقت سے مرعوب ہو کر اس کی سیادت تسلیم کر لی تھی لیکن اسلام ان کے اندر رچا بسا نہیں تھا۔ اول تو یہ لوگ اسلام کی طرف اس کی روحانیت کی جاذبیت سے زیادہ اس کی ابھرتی ہوئی طاقت سے زیادہ متاثر ہو کر آئے تھے۔ ثانیاً مرکز سے دور ہونے کی وجہ سے ان کی تعلیم و تربیت کا کماحقہ انتظام نہ تو ممکن تھا اور نہ یہ اپنی معاشی معروفیتوں سے کچھ وقت اس کی

خاطر نکالنے پر آمادہ تھے کہ مرکز میں آکر حضور اقدس ﷺ کی بابرکت صحبت سے فائدہ اٹھائیں۔ ان کی اکثریت ایسے لوگوں پر مشتمل تھی جو اسلام کا تو نام لیتے تھے لیکن اسلامی زندگی کے خطوط سے بالکل بے پروا تھے۔ ابن الوقتی اور مفاد پرستی ان کو اسلام کے مقابلہ میں زیادہ محبوب تھی۔ ان کے اندر کے کچھ بہانہ ساز آئے اور عذر پیش کرنے لگے اور رخصت مانگنے کے لیے آئے اور کچھ جو اللہ و رسول سے سمع و طاعت کا عہد کرنے میں بالکل ہی جھوٹے تھے انھوں نے کوئی جھوٹا سچا عذر پیش کرنے کی بھی زحمت نہیں اٹھائی بلکہ دعوتِ جہاد کی پروا کیے بغیر یوں ہی گھروں میں بیٹھے رہے۔ سیصیب الذین کفروا منھم عذاب الیم۔ چونکہ ان بادیہ نشینوں میں سچے مخلصین بھی تھے اس وجہ سے فرمایا کہ ان بادیہ نشینوں میں سے جن لوگوں نے کفر کیا ہے یعنی اظہارِ اسلام کے باوجود اس کے واجبات و فرائض میں سے جھوٹے بہانے بنا کر یا ان کو دیدہ دلیری سے نظر انداز کر کے گھروں میں بیٹھے رہے ان کو ایک دردناک عذاب پکڑے گا۔ صرف اس سے وہ لوگ مستثنیٰ رہیں گے جو اللہ و رسول سے کیے ہوئے عہد پر قائم ہیں یا وہ واقعی معذور رہیں۔

(۹۶) ان ناتوانوں اور ایسے لوگوں پر جنہیں خرچ کے لیے کچھ میسر نہیں ہے کوئی گناہ نہیں ہے جب کہ ان میں اللہ و رسول کی خیر خواہی ہو۔ نیکوکاروں پر کوئی الزام نہیں ہے اور اللہ سبحانہ بخشنے والا مہربان ہے۔

جھوٹے عذر کرنے والوں کے بعد سچے معذورین کا بیان فرماتے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ عذر کبھی تو شخصی طور پر لازمِ ذات ہوتا ہے مثلاً بڑھاپے کی کمزوری جو عادتاً کسی طرح آدمی سے جدا نہیں ہو سکتی کبھی عارضی ہوتا ہے پھر عارضی یا بدنی ہوتا ہے جیسے بیماری وغیرہ یا مالی جیسے افلاس و فقدان اسبابِ سفر۔ چونکہ غزوۂ تبوک میں مجاہدین کو بہت دور دراز مسافت کر کے پہنچنا تھا اس لیے سواری نہ ہونے کا عذر بھی معتبر و مقبول سمجھا گیا جیسے آگے آتا ہے آخر میں فرمایا واللہ غفور رحیم یعنی جو لوگ واقعی معذور ہیں۔ اگر ان کے دل صاف ہوں اور خدا اور رسول کے ساتھ ٹھیک معاملہ رکھیں مثلاً خود نہ جا سکتے ہوں تو جانے والوں کی ہمتیں پست نہ کریں بلکہ اپنے مقدور کے موافق نیکی کرنے اور اخلاص کا ثبوت دینے کے لیے مستعد رہیں ان پر جہاد کی عدم شرکت سے کچھ الزام نہیں ہے۔ ایسے مخلصین سے اگر بمقتضائے بشریت کوئی کوتاہی ہو تو حق تعالیٰ کی بخشش و مہربانی سے توقع ہے کہ وہ درگذر فرمائے گا۔[1]

اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ اگر دفاع کے لیے نفیرِ عام ہو تو کن کن لوگوں کو معذور تصور کیا جا سکتا ہے فرمایا ناتوان آدمی یعنی جو لوگ جسمانی طور پر مجبور ہوں مثلاً بہت بوڑھے اندھے اپاہج دوسرے بیمار تیسرے ایسے لوگ جو سفر کی لازمی ضروریات کے انتظام کی قدرت نہ رکھتے ہوں۔ ان تینوں میں قید لگا دی۔ اذا نصحوا للہ ورسولہ

[1] افادات شیخ الاسلام

جب کہ اللہ و رسول سے مخلصانہ وفاداری رکھتے ہوں۔ اس سے معلوم ہوا کہ جو لوگ بظاہر معذور ہوں ان کے لیے بھی مجرد ضعیفی و بیماری یا محض ناداری کافی وجہ معافی نہیں ہے بلکہ ان کی یہ مجبوریاں صرف اس صورت میں ان کے لیے معافی کا سبب ہو سکتی ہیں جب کہ وہ اللہ اور اس کے رسول کے سچے وفادار ہوں۔ ورنہ اگر وفاداری موجود نہ ہو تو کوئی شخص صرف اس لیے معاف نہیں کیا جا سکتا کہ وہ ادائے فرض کے موقعہ پر بیمار و نادار تھا۔ اللہ سبحانہ صرف ظاہر کو نہیں دیکھتا ہے۔ کہ ایسے سب لوگ جو بیماری طبی سارٹیفکیٹ پیش کر دیں وہ معذور قرار دیئے جائیں وہ تو ان میں سے ایک ایک شخص کے دل کا جائزہ لے گا اس کے پورے مخفی اور ظاہر برتاؤ کو دیکھے گا اور یہ جانچے گا کہ اس کی معذوری ایک وفادار بندے کی معذوری ہے یا ایک غدار اور باغی کی معذوری ہے۔ ایک شخص ہے کہ جب اس نے فرض کی پکار سنی تو دل میں خوش ہوا کہ بڑے اچھے موقع پر بیمار ہو گیا ورنہ یہ بلا ٹالے نہ ٹلتی۔ اور خواہ مخواہ مصیبت بھگتنی پڑتی دوسرے شخص نے بھی پکار سنی تو تلملا اٹھا کہ ہائے موقع پر اس کم بخت بیماری نے آ پکڑا ہے جو وقت میدان میں نکل کر خدمت انجام دینے کا تھا۔ وہ کس بری طرح یہاں بستر پر ضائع ہو رہا ہے۔ ایک نے اپنے لیے خدمت سے بچنے کا بہانہ پایا ہی تھا مگر اس کے ساتھ اس نے دوسروں کو بھی اس سے روکنے کی کوشش کی۔ دوسرا اگرچہ خود بستر علالت پر تھا مگر وہ برابر اپنے عزیزوں، دوستوں اور بھائیوں کو جہاد کا جوش دلاتا اور اپنے تیمار داروں سے بھی کہتا رہا کہ میرا اللہ مالک ہے۔ میری خاطر تم اس قیمتی وقت کو ضائع نہ کرو جسے دین حق کی خدمت میں صرف ہونا چاہیے۔ یہ دو قسم کے معذور اللہ سبحانہ کی نظر میں کسی طرح یکساں نہیں ہو سکتے۔ خدا کے یہاں معافی اگر ہے تو صرف اس کے لیے جو اذا نصحوا للہ و رسولہ۔ کے پیمانہ پر پورا اتر رہا ہے اور جو اس پیمانہ پر پورا نہیں اترتا وہ معذور ہونے کے باوجود غداری اور بے وفائی کا مجرم ہے۔

نصیحت و خیرخواہی کیا ہے؟

احادیث میں خیرخواہی اور وفاداری کو دین کا خلاصہ بتایا ہے۔ صحیح مسلم میں تمیم داری کے حوالہ سے جناب رسول اللہ ﷺ کا یہ ارشاد ہے۔

تین بار فرمایا کہ نصیحت خیرخواہی وفاداری دین ہے صحابہ کہتے ہیں ہم نے دریافت کیا کہ کس سے وفاداری؟ فرمایا اللہ سبحانہ سے اللہ کے رسول سے۔ اللہ کی کتاب سے مسلمانوں کے سربراہوں سے اور مسلمان عوام سے۔

قرآن کی آیت میں بھی اسی خیرخواہی وفاداری کے جذبے کو اعذار کے قبول ہونے کی بنیادی ضروری اور اہم شرط قرار دیا ہے۔

لغت میں نصحت العسل اس وقت بولا جاتا ہے۔ جب شہد کو موم سے صاف کر لیا جائے۔ امام رازی فرماتے ہیں نصح کے معنی کسی چیز کا کھوٹ نکال دینے کے ہیں یہ معنے نصحت العسل سے لیے گئے۔ محکم میں ہے۔ کہ نصح کھوٹ کی ضد ہے۔ ابن طریف لکھتا ہے کہ نصح قلب الانسان۔ اس وقت بولتے ہیں جب دل میں کوئی کھوٹ باقی نہ رہے۔

اللہ کے لیے نصیحت کے معنے یہ ہیں کہ بندہ اپنے اور خدا کے درمیان کوئی کھوٹ کا معاملہ نہ رکھے۔ سب سے بڑا کھوٹ یہ ہے کہ پرستش یا بندگی میں کسی کو اس کا شریک ٹھہرائے۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ ان اللہ لا یغفر ان یشرك بـه کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہو اور جدی راہ چلے یہ آیت قرآنی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا۔ تو شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے پس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے۔ اگرچہ پوجنے میں شرک کرتے ہوں۔

اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ منافقین پرستش میں اللہ سے تعلقات رکھتے تھے لیکن فوجداری اور دیوانی معاملات مالیاتی مسائل میں اللہ سے قانونی تعلقات نہ رکھتے تھے فرمایا سارے معاملات کے لیے قانون اسلام کا ہے۔ اسلام کے سوا ہر قانون شرک ہے یہی بندگی میں شرک ہے اور سورۃ انعام میں زیر آیت وان اطعتموھم انكم لمشركون پر تشریحی نوٹ میں شاہ صاحب موصوف نے لکھا ہے کہ:

شرک فقط یہی نہیں ہے کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجئے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔

علماء نے لکھا ہے کہ نصیحت للہ کا حاصل اپنے ہی نفس کی نصیحت اور اپنی خیر خواہی ہے کتاب اللہ سے نصیحت و خیر خواہی یہ ہے کہ پورے عزم و ہمت کے ساتھ اس کے اوامر و نواہی کے سامنے اعتراف وطاعت کا سر خم کر دیا جائے پورے آداب کے ساتھ اس کی تلاوت کی جائے بدل وجان اس کے معانی کی تصدیق کی جائے اس کے علوم کی نشر واشاعت کی جائے۔ اس کی پیروی کی تمام عالم کو دعوت دی جائے۔

اللہ کے رسول کے ساتھ نصیحت و خیر خواہی یہ ہے کہ اس کی رسالت کی تصدیق کی جائے۔ جو دین وہ لے کر آیا ہے اس کو پورے طور پر مانا جائے۔ نبی کی مکمل اطاعت کی جائے۔ نبی کی اطاعت شرط ایمان ہے دین و شریعت کے دائرے میں نبی جو کچھ بھی کہتا ہے ایک مومن کا فرض ہے کہ اس کی تعمیل میں چوں نہ کرے خواہ اس کی مصلحت سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔

ائمہ مسلمین کی نصیحت وخیر خواہی یہ ہے کہ ہر حق معاملے میں ان کی اعانت کی جائے۔ ان کے ساتھ جہاد میں شرکت کی جائے۔ ان کے پیچھے نمازیں ادا کی جائیں جو صدقات بیت المال کا حق ہیں وہ سرکاری خزانہ میں داخل کیے جائیں۔ ان کی بغاوت نہ کرے۔ اور ان سے غداری نہ کرے۔

عام مسلمانوں سے خیر خواہی اور نصیحت یہ ہے کہ ان کو ایذا نہ دی جائے۔ ان کے عیوب کی پردہ پوشی کی جائے اور خیر خواہی کا ان کو اپنے برابر سمجھا جائے۔

حافظ ابن رجب فرماتے ہیں کہ حدیث بالا میں نصیحت وخیر خواہی کو دین فرمایا گیا ہے اور حدیث جبریل میں ایمان، اسلام اور اعمال کے مجموعہ کو دین کہا ہے دونوں کو ملا کر نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایمان اسلام اور احسان سب نصیحت ہی کے اجزاء ہیں۔

محمد بن مروزی نے اس آیت گرامی سے یہ بات خوب سمجھی ہے کہ نصح للہ کی دو قسمیں ہیں ایک فرض دوسرے نفل۔ فرض یہ ہے کہ اس کی حرام کردہ چیزوں سے پرہیز کیا جائے اور اس کے احکام کی بجا آوری میں اپنی سعی کی جائے۔ اگر کسی عذر کی وجہ سے ادا نہ کر سکے۔ تو اس کا عزم رکھے کہ جب کبھی موقعہ ملے گا۔ اس کی تلافی کرے گا۔

قرآن کی یہ آیت بتاتی ہے کہ جن لوگوں کے دلوں میں اللہ سبحانہ اور اس کے رسول کی وفاداری ہو وہ جہاد میں شریک نہ ہو کر بھی محسنین کی فہرست سے خارج نہیں ہوتے۔ اور یہ بھی بتا رہی ہے کہ عذر کی بنا پر اعمال جوارح اور فریضہ جہاد جیسا اہم فرض بھی ساقط ہو سکتا ہے مگر نصح للہ کا مطالبہ کسی وقت بھی ساقط نہیں ہوتا۔ ایک معذور شخص سے نماز جیسے اہم فرض کی ادائیگی مؤخر ہو سکتی ہے مگر وفاداری اور قلبی ندامت آیندہ ادائیگی کا عزم اس کے ذمہ سے ساقط نہیں ہو سکتا۔ لہذا نصح للہ کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی رضا کو پیش نہاد بنائے نصیحت نافلہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اپنے اوپر اتنی غالب کرے کہ جب کسی معاملہ میں اپنے نفس اور شریعت کا مقابلہ ہو جائے تو شریعت ہی کو ترجیح دے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اپنی تمام مرضیات کو اللہ سبحانہ کی رضا پر قربان کر دے[1]۔

آئیے اس موضوع پر چند ارشادات نبوت اور سن لیجئے۔

طبرانی محدث نے بحوالہ حذیفہ ابن الیمان یہ ارشاد نبوت نقل کیا ہے۔

جو شخص مسلمانوں کے معاملات کی کوئی پرواہ نہیں کرتا اس کا مسلمانوں سے کوئی تعلق نہیں اور جس شخص نے صبح سے شام تک یا شام سے صبح تک اللہ سبحانہ اس کے رسول اس کی کتاب اور عام مسلمانوں کی خیر خواہی سے غفلت اختیار کی اس کا بھی مسلمانوں سے کوئی رشتہ نہیں۔ (طبرانی)

[1] جامع العلوم والحکم

ایک اور ارشاد ہے۔

ابو امامہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ آپ نے ایک حدیث قدسی میں فرمایا کہ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے کہ وہ سب سے زیادہ پیارا طریقہ جو میرا بندہ میری فرمانبرداری کے لیے اختیار کرتا ہے میری خیر خواہی ہے۔ (مسند احمد)

ایک اور ارشاد ہے۔

جبیر بن مطعم کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ نے منیٰ کی مسجد خیف میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تین باتیں ایسی ہیں جن پر مسلمان کا دل کبھی کھوٹا نہیں ہوتا ہے ایک یہ کہ عمل میں اللہ کے لیے اخلاص دوسرے یہ کہ وقت کے مسلمان حکمرانوں کی خیر خواہی اور تیسرے یہ کہ مسلمان جماعت سے وابستگی۔ (دار قطنی۔ مسند احمد)

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے ایک اور ارشاد ہے کہ:

اللہ سبحانہ تمہارے لیے تین کاموں کو پسند کرتا ہے۔ پہلا کام یہ ہے کہ تم اس کی عبادت کرو کسی کو اس کی عبادت میں شریک نہ کرو۔ دوسرا یہ کہ متحد ہو کر سب اللہ کی رسی کو تھام لو اور اس سے علیحدہ نہ ہو۔ تیسرا یہ کہ اللہ نے جس کو حاکم بنا دیا ہے اس کی خیر خواہی کرتے رہو۔

صحیح مسلم اور صحیح بخاری میں حضرت جابر رضی اللہ تعالیٰ کے حوالہ سے ہے۔

میں نے حضور اقدس ﷺ سے نماز قائم کرنے زکوٰۃ ادا کرنے اور ہر مسلمان کے لیے خیر خواہی پر بیعت کی تھی۔

نفاق کے مقابلے میں ایمان کا مرقع

(۹۷) اور ان لوگوں پر بھی کوئی الزام نہیں ہے جو آپ کے پاس آئے کہ آپ ان کے لیے سواری کا انتظام کریں۔ اور آپ نے ان سے کہا کہ تمہارے لیے سواری کا میرے پاس کوئی انتظام نہیں ہے وہ آپ کے آنسوؤں سے ڈبڈباتی ہوئی آنکھوں کے ساتھ اس رنج میں کہ ان کے پاس خرچ کے لیے کچھ نہیں ہے۔ واپس گئے۔ سبحان اللہ حضور اقدس ﷺ کی صحبت نے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم کے دلوں میں عشق الٰہی کا وہ نشہ پیدا کر دیا تھا جس کی مثال کسی قوم وملت کی تاریخ میں موجود نہیں۔ مستطیع اور مقدور والے صحابہ کو دیکھو تو جان ومال سب کچھ خدا کے راستہ میں لگانے کو تیار ہیں اور سخت سے سخت قربانی کے وقت بڑے ولولہ اور اشتیاق سے آگے بڑھتے ہیں۔ جن کو مقدور نہیں وہ اس غم میں

رورو کر جان کھوئے لیتے ہیں کہ ہم میں اتنی استطاعت کیوں نہ ہوئی کہ اس محبوب حقیقی کی راہ میں قربان ہونے کیلئے اپنے کو پیش کر سکتے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ آپ نے مجاہدین کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تم مدینہ میں ایسی قوم کو اپنے پیچھے چھوڑ آئے ہو جو ہر قدم پر تمہارے اجر میں شریک ہیں۔ تم جو قدم خدا کے راستہ میں اٹھاتے ہو یا کوئی جنگل قطع کرتے ہو یا کسی پگڈنڈی پر چلتے ہو وہ قوم برابر ہر موقع پر تمہارے ساتھ ساتھ ہے۔ یہ وہ لوگ ہیں جنہیں واقعی مجبوریوں نے تمہارے ہمراہ چلنے سے روکا۔ حسن بصری کے مرسل میں ہے کہ یہ مضمون بیان فرما کر آپؐ نے یہ آیت تلاوت کی۔[1]

کوئی بات دنیا میں اس سے زیادہ عجیب نہیں ہو سکتی کہ وحشی اور بہائم صفت انسان اچانک محبت، اخلاص وایثار اور خود فروشی کے فرشتے بن جائیں لیکن قرآن حکیم نے ایسا ہی انقلاب بپا کیا۔ اوپر گذر چکا ہے کہ غزوۂ تبوک بڑے ہی ناموافق حالات میں پیش آیا تھا۔ حتیٰ کہ لوگوں کی افسردگی پر اللہ کا عتاب آیا۔ لیکن اس پر بھی لوگوں کا کیا حال تھا۔ یہ تھا کہ شدت درد و غم سے بے اختیار ہو کر رونے لگتے تھے۔ کس بات پر؟ اس پر کہ عیش و راحت میں ان کو حصہ نہیں ملا —— نہیں بلکہ اس پر کہ راہ حق کی مصیبتوں اور قربانیوں میں شریک ہونے سے رہ گئے۔

اس عہد میں نہ تو سرکاری فوج وجود میں آئی۔ نہ رضا کاروں کی کوئی الگ قسم تھی۔ نہ سپاہیوں کے مصارف کے لیے حکومت کا کوئی خزانہ تھا۔ سبھی رضا کار تھے اور سب کے لیے ضروری تھا کہ اپنا خرچ خود ہی اٹھائیں بلکہ بن پڑے تو دوسروں کے لیے بھی خرچ کریں۔ پس فرمایا کہ جو لوگ مقدور نہیں رکھتے کوئی وجہ نہیں کہ ان پر الزام آئے۔ خصوصاً وہ لوگ جن کے ایمان و اخلاص کا حال یہ ہے کہ جب ان کے لیے سواری کا انتظام نہ ہو سکا اور تیرے ادب و احترام نے اس کی بھی اجازت نہیں دی کہ زیادہ اصرار کریں تو خاموش اٹھ کر لوٹ گئے لیکن آنکھیں جو درد دل کی غماز ہیں خاموش نہ رہ سکیں حسرت و غم کے آنسو بے اختیار بہنے لگے۔

زچشم آستیں بردار و اشکم را تماشا کن

یہ قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔ پہلے بے مقدوروں کا ذکر کیا۔ پھر خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا اور ان کی محبت ایمانی کی تصویر کھینچ دی۔ تاکہ نفاق کے مقابلے میں ایمان کا بھی ایک مرقع سامنے آجائے یعنی یا تو وہ جن کو قدرت رکھنے پر بھی حیلے بہانے نکالتے ہیں۔ یا یہ ہیں کہ مقدرت نہ رکھنے پر بھی دل کی لگن چین سے بیٹھنے نہیں دیتی۔ آنسو بن کر آنکھوں سے ٹپک رہی ہے —— غزوۂ تبوک میں سواریوں کی بڑی قلت تھی۔ اٹھارہ آدمیوں کے حصہ میں ایک اونٹ آیا تھا۔

احادیث سے معلوم ہوتا تھا کہ صحابہ کی ایک جماعت نے جو زاد راہ کی قدرت نہیں رکھتی تھی حضور اقدس

[1] افادات شیخ الاسلام

ﷺ سے عرض کیا ہمارے لیے سواری کا بندوبست کر دیجئے آپ نے فرمایا کہاں سے کروں۔ کوئی سامان نہیں ہے۔ اس پر وہ روتے ہوئے چلے گئے اوران کے درد و غم کا یہ حال تھا کہ البکائین کے نام سے مشہور ہوئے تھے یعنی بہت رونے والے (ابن جریر)

سبحان اللہ ان چند آنسوؤں کی قدر و قیمت جو ایمان کی تپش سے بہے تھے۔ کہ ہمیشہ کے لیے ان کا ذکر کتاب اللہ نے محفوظ کر دیا۔ آج بھی تیرہ صدیاں گذرنے پر ممکن نہیں کہ ایک مومن یہ آیت پڑھے اوران آنسوؤں کی یاد میں خود اس کی آنکھیں بھی اشکبار نہ ہوں[1]

گویا اس آیت نے اہل ایمان کے لیے جو پیمانہ مہیا کر دیا کہ ایسے لوگ جو خدمت دین کے لیے اپنے ایمان کے تقاضے کے تحت بے تاب ہوتے ہیں اور اگر کسی حقیقی مجبوری کے سبب یا ذرائع نہ پانے کی وجہ سے عملاً خدمت نہ کر سکیں تو ان کے دل کو اتنا ہی صدمہ ہو جتنا کسی دنیا پرست کو روزگار چھوٹ جانے یا کسی بڑے نفع کے موقع سے محروم رہ جانے کا ہوا کرتا ہے۔ ان کا شمار خدا کے یہاں خدمت انجام دینے والوں ہی میں ہوگا اگرچہ انھوں نے عملاً کوئی خدمت انجام نہ دی ہو اس لیے وہ چاہے ہاتھ پاؤں سے کام نہ کر سکے ہوں لیکن دل میں ایمانی جذبات کی وجہ سے وہ برسر خدمت ہی رہے ہیں۔ یہی بات ہے جو غزوہ تبوک میں واپسی پر حضور اقدس ﷺ نے اثنائے سفر میں اپنے صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم سے فرمائی تھی۔ ان بالمدینۃ اقواما ما سرتم سیرا ولا قطعتم وادیا الا کانوا معکم۔ مدینہ میں کچھ لوگ ایسے ہیں کہ تم نے کوئی وادی طے نہیں کی اور کوئی کوچ نہیں کیا جس میں وہ تمہارے ساتھ نہ رہے ہوں۔ صحابہ نے تعجب سے کہا کیا مدینہ میں بھی رہتے ہوئے۔ فرمایا ہاں مدینہ میں رہتے ہوئے کیونکہ مجبوری نے ان کو روک لیا تھا۔ ورنہ وہ خود رکنے والے نہ تھے۔

جن رونے والوں کا قرآن نے ذکر کیا ہے اور جن کو تاریخ میں البکائین کہا گیا ہے۔ ان کے نام حافظ ابن حزم نے لکھے ہیں۔ سالم بن عمر، علیہ ابن زید، ابولیلی عبدالرحمٰن بن کعب، عمرو بن الحمام، عبداللہ بن المغفل، ہرمی بن عبداللہ، عرباض بن ساریہ الفزاری۔ بعض نے عبداللہ بن مغفل کی جگہ عبداللہ بن عمرو المزنی کا ذکر کیا ہے[1]۔

کاغذ کے نوسو چوبیس ۹۲۴ صفحات سیاہ ہو چکے ہیں۔ سیاق و سباق کی رعایت سے پارہ دہم کی آخری آیت کی تشریح بالارادہ گیارہویں جلد کے لیے چھوڑ دی ہے۔ الحمد للہ آج مورخہ ۱۰ ربیع الآخر ۱۴۰۶ھ مطابق ۲۳ دسمبر ۱۹۸۵ء بروز دوشنبہ بوقت ۶ بج کر ۳۵ منٹ پر بعد نماز مغرب پارہ دہم کے تشریحی مطالب پورے ہوئے۔ اللہ تعالیٰ سے دعاء ہے کہ اس کو میرے لیے ذخیرۂ آخرت اور میری نجات کا ذریعہ بنائے۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم۔ صلى الله على خير خلقه محمد واله اجمعين

---

[1] ترجمان القرآن

[1] جوامع السیرۃ

معالم القرآن

جلد یازدہم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

ملکیت ——— ادارہ تعلیماتِ قرآن دالعلوم الشہابیّہ

طابع ——— حافظ شبیر احمد عثمانی

تزئین و آرائش ——— السیّد انور حسین نفیس رقم

کتابت ——— محمد نواز عابد کیلانی حضرت کیلیانوالہ

ناشر ——— قاری عبدالرحمٰن ایم اے

صفحات ——— ۶۷۲

تاریخ اشاعت ——— جنوری ۱۹۹۱ء

مطبع ——— عرفان افضل پریس۔ لاہور

قیمت ——— ۱۲۰/- روپے

ملنے کے پتے

ادارہ تعلیماتِ قرآن۔ دارالعلوم الشہابیہ سیالکوٹ

اسلامی اکادمی۔ ۱۷ اردو بازار۔ لاہور

انتساب

میں معالم القرآن کی جلد یازدہم کو جس میں اسلام کی اجتماعی زندگی کا بھرپور چہرہ پیش کرنے کے بعد دنیا میں اسے قائم کرنے، اس کے لیے محنت کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ بلکہ انسانیت کے فکری، اخلاقی، مالیاتی معاشی سیاسی اور روحانی بیماریوں کا یہی واحد علاج ہے۔ اور اسلام کے ماننے والوں کے ایمان باللہ کا یہی حقیقی امتحان ہے۔ قابل صد احترام فضیلت مآب الحاج حافظ عبدالرشید خاقان صاحب کے نام سے منسوب کرتا ہوں جن کی اسلام سے مخلصانہ ہمدردی اور اس کے لیے قربانی دریادلی سے یہ جلد یازدہم زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر ہدیہ ناظرین ہو رہی ہے۔

دعا ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس جذبہ خیر کو تادیر سلامت رکھے اور ان کے اس مخلصانہ جذبہ سخاوت دنیا و آخرت میں ان کی کامیابی کا بہانہ کر دے۔

(آمین)

قَارِیْ عَبْدُالرَّحْمٰن ایم اے
ناظم ادارہ تعلیماتِ قرآن
دارالعلوم شہابیہ۔ سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

حرفِ آغاز

باسمہ سبحانہٗ.........

یہ معالم القرآن کی گیارہویں جلد ہے۔

اگرچہ اس بار کچھ تعلیمی، کچھ انتظامی مصروفیتوں اور کچھ ادھر شعبان کے مہینے میں مجھے عزیز حافظ عبدالرشید خاقان سلمہٗ کی دعوت اہلیہ اور بچی کے ہمراہ کویت کا سفر کرنا پڑا۔ کویت کا یہ سفر پہلے سفروں سے مختلف تھا۔ پہلے کویت کا سفر دارالعلوم الشابیہ کی خاطر ہوتا تھا۔ لیکن اس بار یہ بات بالکل دھیان میں نہ تھی بلکہ مقصد یہ اور صرف یہ تھا کہ اس بہانے حرمین شریفین زادھا اللہ شرفاً کی زیارت کی سعادت حاصل ہو گی۔ عزیز موصوف کا بھی یہی تاثر تھا کہ ہم تینوں عزیز موصوف کی معیت میں اوّل عمرہ کریں اور پھر حرم طیبہ کی زیارت کی سعادت حاصل کریں۔ گھر سے لے کر گھر تک تمام اخراجات کے لیے عزیز موصوف ہی زیر بار ہوئے۔ الحمدللہ مورخہ ۷ رمضان المبارک کو سیالکوٹ واپسی ہوئی۔ دوران سفر عزیز موصوف کے لیے دل کی پہنائیوں سے دعائیں نکلیں۔ اللہ سبحانہٗ ان کو دین و دنیا میں مال و اولاد میں عفو و عافیت سے ہمدوش کرے ان کی کمزوریوں کی پردہ پوشی کرے آگے سے پیچھے سے دائیں اور بائیں سے ان کی حفاظت و نگرانی فرمائے آمین ثم آمین

دوران سفر کچھ طبیعت میں ناہمواری آگئی۔ الحمدللہ اس کے باوجود گیارہویں جلد پایہ تکمیل پہنچ گئی۔

اس جلد میں مجھے جن علمی گہواروں سے استفادہ کرنے کا موقعہ ملا ہے۔ اُن کے نام یہ ہیں۔

علامہ بقاعی	نظم الدرد
علامہ محمد طاہر ابن عاشور	التحریر والتنویر
حافظ ابن حجر	فتح الباری
حضرت شاہ ولی اللہ	ازالۃ الخفاء۔ قرۃ العینین
حافظ ابن تیمیہ	منہاج السنہ
حافظ شمس الدین ذہبی	المنتقی
حافظ ابن القیم	مدارج السالکین

یہ جلد گیارہویں پارے کے مطالب اور تشریحات پر مشتمل ہے۔ گیارہویں پارے میں سورہ برأت کا انجام ہے۔ اور پوری سورہ یونس ہے۔

سورہ برأت کے تمام مطالب اس وقت تک واضح نہیں ہوسکتے۔ جب تک یہ حقیقت پیش نظر نہ ہو کہ یہ اُمت کے نام ایک دوامی اور آخری پیغام ہے۔ اور مقصود مستقبل میں پیش آنے والے حالات ومعاملات کے لیے راہنمائی ہے۔

اجتماعی ڈھانچہ میں جس قدر مخلصین کا تناسب صحیح ہوگا۔ اسی قدر اسلام کا نظام اجتماعی، نظام سیاسی اور نظام قانون مضبوط بنیادوں پر استوار ہوگا۔ مخلصین سے مراد یہ ہے کہ اجتماعی زندگی میں ایسے افراد ہوں جو.......

١ اپنی لغزشوں اور خطاؤں پر نادم ہوکر توبہ کرنے والے ہوں۔
٢ اللہ سبحانہ، سے عابدانہ تعلقات میں سرگرم ہوں۔
٣ زبانیں حمد الٰہی کے ترانوں سے زمزمہ سنج ہوں۔
٤ گھروں میں بیٹھنے والے نہیں، سیر وسیاحت کرنے والے ہوں۔
٥ رکوع وسجود میں اللہ کے سامنے جھکنے والے ہوں۔
٦ پورے عالم میں نیکی کا حکم دینے والے برائی سے روکنے والے ہوں۔
٧ اللہ کی حدبندیوں کی اپنی پوری زندگی میں حفاظت کرنے والے ہوں۔

اجتماعی زندگی میں وہ لوگ ہیں۔ جن کے بارے میں اللہ نے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دے دیا۔ وبشر المومنین، ان مومنوں کو کامیابی کی خوشخبری دے دو۔

اس بات کا بھی مستقبل کے حالات ومعاملات سے تعلق ہے۔ کہ کسی بھی نظام کا دارومدار اس پر ہوتا ہے۔ کہ اس کے ماننے والوں میں اس کے جاننے والوں کی عددی طاقت کتنی ہے۔ اگر سو مانتے ہیں۔ اور ننانوے اس نظام سے آشنا نہیں ہیں۔ تو ایک کے جاننے سے نظام، نظام کی حیثیت سے انسانی زندگی میں قائم نہیں رہ سکتا۔ جیسے نظام کی کامیابی کے لیے قربانی اور فداکاری اہم تقاضا ہے۔ ٹھیک اسی طرح کسی بھی نظام کی کامیابی کے لیے اس کی پشت پر ایک نظام تعلیم وتعلم بھی سب سے اہم اور بنیادی تقاضا ہے۔ گویا۔ فلولا نفر من کل فرقۃ طائفۃ لیتفقھوا فی الدین۔ میں یہ کھلا اشارہ ہے کہ دوسرے نظاموں کی طرح اسلامی نظام کی کامیابی کی اہم اور بنیادی شرط یہ ہے کہ اس کی پشت پر پرائمری اسکول سے لے کر گریجویشن تک اسلامی تعلیم کا مکمل نظام ہو۔ اور اس میں اسلام کے ماننے والوں

کو ہر پہلو سے پہلے اسلام سے آشنا بنایا جائے۔ اور ایک مکمل نظام زندگی کی حیثیت سے......
اسلام کے روحانی نظام، اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام، سیاسی نظام
اور قانونی نظام سے آشنا کیا جائے، یہ اور اس قسم کے مسائل سے سورہ برأت کے انجام
میں بحث کی گئی ہے۔
بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ پوری سورۃ اُمت کے نام بحیثیت اُمت پوری زندگی کے حالات و
معاملات کے لیے اللہ سبحانہ کا دوامی پیغام ہے۔
اس امت کو امت ہونے کی حیثیت میں اس کی عالمی اور جہانی ذمہ داریوں سے آگاہ
کیا گیا ہے۔

انفروا خفافا وثقالا وجاھدوا باموالکم وانفسکم فی
سبیل اللہ ذالکم خیر لکم ان کنتم تعلمون

مسلمانو: ہلکے ہو یا بوجھل گھروں سے نکلو اور اپنی جانیں اور اموال
اللہ کی راہ میں تج کر دو یہی تمہارے حق میں بہتر ہے۔

اور کہا گیا ہے کہ......

ان اللہ اشتری من المومنین انفسھم واموالھم
بان لھم الجنۃ

اس کے بعد البقرہ کی آیت ذیل بھی پڑھیئے۔

وکذالک جعلنا کم امۃ وسطا لتکونوا شھداء
علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا

اس کا صاف اور واضح مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ نبی و رسول ہونے کی حیثیت میں
جو کام نبوت کے سپرد کیا گیا۔ وہ نبوت کے دنیا سے روانہ ہونے کے بعد امت کے سپرد کیا
گیا ہے۔ اب اس نبوت والے کام کو امت کو کرنا ہے۔ اس اعتبار سے اس امت
کی حیثیت دوسرے نبیوں کی امتوں سے الگ ہے۔ پچھلی اُمتیں اگر صرف ایک ذمہ داری
رکھتی رہی ہیں۔ اور وہ یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ پیروی کریں۔ تو امت مسلمہ اس عام ذمہ داری
کے ساتھ ساتھ ایک ذمہ داری یہ بھی رکھتی ہے۔ کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کی اس
طرح گواہی دے جس طرح گواہی دینے کا حق ہے۔
دراصل اس معاملے میں صورت واقعہ ہی یہ اور صرف یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ

علیہ وسلم اگرچہ پوری دنیا کے لیے نبی و رسول تھے۔ اور قیامت تک کے لیے تھے۔ لیکن اس عالمگیر دعوت کے مسلسل جاری رہنے کی عملی شکل اللہ تعالیٰ نے یہ ...... متعین فرمائی تھی اور فطری طور بھی ممکن یہی تھی۔ کہ آپ اپنا قائمقام ایسا گروہ تیار کردیں۔ جو اپنے ایمان میں اتنا پختہ اور اپنے عمل میں اتنا معیاری مسلمان ہو کہ وہ آپ کے بعد آپ ہی کی طرح دنیا میں اسلام کی شہادت کا فرض انجام دے سکے۔ سورہ برأت کے آخر میں قرآن نے اس آیت میں اسی گروہ کا چہرہ پیش کیا ہے۔ والسابقون الاولون من المهاجرين والانصار اور پھر یہ گروہ اپنے بعد کی نسل کو تیار کرے اور یہ سلسلہ آخر تک چلتا رہے۔ قرآن نے والذين اتبعوهم باحسان میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔

اس طرح حقیقت واقعی یہ قرار پائی ہے۔ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثتیں دو ہیں۔ آپ کی بعثت اہل عرب کی طرف تو براہ راست تھی۔ مگر باقی دنیا کی طرف اس گروہ .... السابقون الاولون من المهاجرين والانصار والذين اتبعوهم باحسان کے توسط سے تھی۔ جسے آپ تیار کر گئے تھے۔ اور جو نسلاً بعد نسل تیار ہوتی رہے گی۔ جسے قرآن نے رضی اللہ عنھم ورضوا عنہ کا سرٹیفکیٹ دیا ہے۔

اس فکر سے اب سورہ برأت کا مطالعہ کریں گے تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ امت کے نام وداعی پیغام ہے اور اسے اس کی یہ ذمہ داری بتانے کے لیے ہے کہ یہ ذمہ داری کوئی معمولی ذمہ داری نہیں ہے، بلکہ اتنی بڑی اور ہمہ گیر ذمہ داری ہے کہ یہی اس کے وجود کا کل مقصد ہے۔ اللہ سبحانہ کا یہ ارشاد ان اللہ اشترىٰ من المؤمنين الخ اس امت کی یہ حیثیت صاف طور پر مقرر کر رہا ہے۔

آیئے ذرا سورہ یونس کے موضوع کی تفصیلات پر بھی ایک نظر ڈال لیجیے۔ اس سورۃ میں مخاطب مشرکین ہیں۔ اور سارے مخاطبات کا مرکز توحید، عبادت، وحی، نبوت اور تذکیر بالآخرۃ ہے۔

توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال ہے۔ اس بات کو مختلف طریقوں سے پوری سورۃ میں پیش کیا گیا ہے۔ کہیں ارشاد ہوا ہے۔ ذالكم الله ربكم فاعبدوہ۔ پھر دوسرے رکوع میں اسی بات کو اس طرح پیش کیا ہے۔ ویعبدون من دون اللہ۔ اس کے بعد پھر چوتھے رکوع میں قل من يرزقكم من السماء

والارض۔ آیت ہے۔ اس کی تعبیر بدل کر پھر توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال ہے۔ اس کے بعد ساتویں رکوع میں اسی بات کو ایک نئے انداز میں پیش کیا ہے۔ ما یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکاء ۔ ایک خاص وجدانی دلیل پیش کر کے توحید الوہیت کو ثابت کیا ہے۔ پھر آخری رکوع میں توحید الوہیت یعنی صرف اللہ سبحانہ سے عابدانہ تعلقات قائم رکھنے کو کھول کر پیش کیا ہے۔ استدلال یہ ہے کہ وہ ذات جس کے قبضے میں

تمہاری جان ہے۔ جو تم پر ایسا مکمل حاکمانہ اقتدار رکھتا ہے کہ جب تک اس کی مرضی ہو اسی وقت تک تم جی سکتے ہو۔ میں صرف اسی کی عبادت کرتا ہوں۔

وحی و نبوت کے سلسلے میں مشرکین کے اس استعجاب کا ذکر کیا کہ ایک آدمی اللہ کا رسول ہو کر آیا۔ ایک طرف رسول کی بشریت کی آڑ میں رسالت کا انکار کرے۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھنے کہ یہ آدمی تو ہے۔ مگر اور آدمیوں کی طرح نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ جب کچھ بن نہ پڑتا تو کہتے کہ یہ جادوگر ہے۔

مشرکین عرب نبوت کی صداقت و فضیلت سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اس لیے دوسرے رکوع میں صداقت نبوت کی سب سے زیادہ کھلی اور واضح دلیل پیش کی۔ فقد لبثت عمرا من قبلہ ۔ ساری باتیں چھوڑ کر صرف اس بات پر غور کرو کہ میں تم ہی میں سے ہوں اور دعوئ نبوت سے پہلے پوری عمر تم میں گزار چکا ہوں۔ یعنی چالیس برس تک۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے ہے۔ بتلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی بات بھی تم نے سچائی اور امانت کے خلاف دیکھی ہے۔ تمام علمائے اخلاق و نفسیات اس پر متفق ہیں۔ کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس سال کا زمانہ اس کے اخلاق و خصائل بننے کا زمانہ ہے۔ اگر ایک شخص چالیس سال کی عمر تک صادق و امین رہا ہے۔ تو کیا یہ ہو سکتا ہے۔ کہ چالیس سال گزرتے ہی ایسا کذاب و مفتری ہو جائے کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ اللہ سبحانہ پر افترا کرنے لگے۔ یہ ایک واقعاتی استشہاد ہے

چوتھے رکوع میں نبوت کی صداقت کے لیے اعجاز قرآن سے استدلال کیا ہے اور اس استدلال میں کہا گیا ہے۔ کہ اگر میں اس دعوے میں مفتری ہوں کہ یہ قرآن میرا ساختہ پرداختہ بلکہ لاریب فیہ من رب العالمین تو آؤ تم بھی اس جیسی ایک صورت بنا کر لے آؤ۔ فاتوا بسورۃ من مثلہ ۔

پانچویں رکوع کی آخری آیت میں دعوئ نبوت کی صداقت کو قسم کھا کر پیش کیا ہے۔ ایسے لوگ

پہنچائے جو منکر تو نہ تھے۔ مگر تصدیق میں شامل تھے۔ وہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و امانت کو دیکھتے تو اندر ہی اندر کہتے کہ سچے آدمی کی زبان سے جھوٹی بات نہیں نکل سکتی لیکن جب دیکھتے کہ ان کی دعوت ایسی باتوں کا یقین دلاتی ہے۔ جن سے ان کے آباؤ اجداد یکسر ناآشنا تھے۔ تو حیرت کا شکار ہو کر دریافت کرتے۔ احق ہو۔ کیا فی الواقع ایسا ہی ہے۔ جیسے تم کہہ رہے ہو۔ جواب میں ارشاد ہوا۔ ای وربی انہ الحق۔

قرآن کا عام انداز یہ ہے۔ کہ پہلے وجدانی دلائل بیان کرتا ہے۔ پھر واقعات و شواہد سے استدلال کرتا ہے۔ یہاں بھی قرآن نے نبوت کی صداقت کے لیے حضرت نوحؑ اور حضرت موسیٰؑ کی تاریخی داستان سے استشہاد کیا ہے۔

آخر میں نبوت کے موضوع دو ٹوک فیصلہ سنا دیا۔ قد جاءکم الحق

اس سورۃ میں تیسری بات تذکیر بالآخرۃ ہے۔ پہلے رکوع میں نشاۃ اولیٰ سے نشاۃ ثانیہ پر استدلال کیا گیا ہے اور فرمایا کہ اگر پہلی پیدائش کو مانتے ہو تو دوسری پیدائش پر کیوں حیران ہو؟ اور بتایا کہ دوسری زندگی اس لیے ضروری ہے۔ کہ جزاء عمل کے قانون کا تقاضا ہے۔ کہ جس طرح ایک زندگی آزمائش عمل کے لیے ہو۔ اسی طرح ایک زندگی جزاء عمل کے لیے ہو۔

تیسرے رکوع میں آخرت کی زندگی میں کامیاب اور ناکام کا تقابلی مطالعہ بڑے لطیف انداز میں پیش فرمایا ہے۔ للذین احسنوا الحسنیٰ وزیادۃ۔ بتایا ہے کہ آخرت کی زندگی ایسی زندگی ہے۔ جس میں اس موجود، زندگی میں ہونیوالے اعمال کے نتائج پیش آئیں گے۔ اچھے بُرے نتائج کس شکل میں پیش آئیں گے۔ نیک عمل انسان اصحاب حقیقت میں ان کے لیے بہشتی زندگی کی خوشحالیاں ہیں۔ اور لقاء الٰہی کی دائمی نعمت ان کے چہروں پر نہ تو گرد کی سیاہی ہوگی نہ ذلت کا اثر نمایاں ہوگا۔ بدعمل انسان دوزخ کے باسی ہیں۔ ان کے لیے دوزخی زندگی کی بدحالیاں ہوں گی۔ ان پر خواری چھائی ہوگی۔ ان کے چہروں پر کالک اس طرح چھا جائے گی۔ جیسے اندھیری رات کے ٹکڑے چہرے پر پڑ گئے ہوں۔

یہ سورت یونس کا پیغام اور پیغام کا خلاصہ اور لب لباب

مقدمہ

باسمہ سبحانہٗ

گیارہویں پارے کا آغاز سورہ توبہ کا انجام ہے ! انجام صرف ۴ رکوع پر مشتمل ہے۔
اس سے پہلے ان لوگوں کا ذکر تھا۔ جو وقت کے تقاضوں کا جواب نہ دے سکے۔ یعنی غزوۂ تبوک میں شرکت کی سعادت سے ہمدوش نہ ہوئے۔

درمیان میں بتایا کہ امت کے بہترین طبقے تین ہیں۔

مہاجرین میں سے السابقون الاوّلون

انصار میں سے السابقون الاوّلون

وہ لوگ جنہوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کی اور ان کے قدم بقدم چلے۔

قرآن کا اعلان ہے کہ السابقون الاوّلون مہاجرین اور انصار ...... دونوں میں سے ہیں۔ اس لیے السابقون الاوّلون عقبہ ثالثہ تک کو محیط ہے۔

دعوت کے دو دور ہیں۔ ایک پوشیدہ دوسرا علانیہ۔ پوشیدہ دعوت کا دور وہ ہے جو دار ارقم کے بعد ہے۔

حافظ ذہبی نے سیر اعلام النبلاء میں السابقون الاوّلون کے عنوان میں یہ نام لکھے ہیں۔

۱۔ خدیجہؓ بنت خویلد	۷۔ سعد بن ابی وقاصؓ	۱۳۔ عثمان بن مظعونؓ
۲۔ علیؓ بن ابی طالب	۸۔ طلحہ بن عبداللہؓ	۱۴۔ عبیدۃ ابن الحارثؓ
۳۔ ابوبکر الصدیقؓ	۹۔ عبدالرحمٰن بن عوفؓ	۱۵۔ سعید بن زیدؓ
۴۔ زید بن حارثہؓ	۱۰۔ ابوعبیدہ ابن الجراحؓ	۱۶۔ اسماء بنت ابوبکرؓ
۵۔ عثمان بن عفانؓ	۱۱۔ ابوسلمہ ابن عبدالاسدؓ	۱۷۔ خباب بن الارتؓ
۶۔ الزبیر بن العوامؓ	۱۲۔ الارقم بن الارقمؓ	۱۸۔ عمیر بن ابی وقاصؓ

١٩ - عبداللہ بن مسعودؓ
٢٠ - مسعود بن ربیعہؓ
٢١ - سلیط بن عمروؓ
٢٢ - عیاش بن ربیعہؓ
٢٣ - اسماء بنت سلامہؓ
٢٤ - خنیس بن حذافہؓ
٢٥ - عامر بن ربیعہؓ
٢٦ - عبداللہ بن جحشؓ
٢٧ - جعفر بن ابی طالبؓ
٢٨ - اسماء بنت عمیسؓ
٢٩ - حاطب بن الحارثؓ
٣٠ - فاطمہ عامریہؓ
٣١ - خطاب عامریؓ
٣٢ - فکیہہ بنت یسارؓ
٣٣ - معمر بن الحارثؓ
٣٤ - السائب بن عثمانؓ
٣٥ - المطلب بن ازہرؓ
٣٦ - رملہ بنت ابی عوفؓ
٣٧ - النحام نعیم بن عبداللہؓ
٣٨ - عامر بن فہیرہؓ
٣٩ - خالد بن سعیدؓ
٤٠ - امیمہ بنت خلفؓ
٤١ - حاطب بن عمرو العامریؓ
٤٢ - ابوحذیفہ بن عتبہؓ
٤٣ - واقد بن عبداللہؓ
٤٤ - خالد ابن البکیر
٤٥ - عاقل البکیر
٤٦ - ایاس البکیر
٤٧ - عمار بن یاسرؓ
٤٨ - صہیب بن سنانؓ
٤٩ - ابوذر جندب بن جنادہؓ
٥٠ - ابونجیح عمرو بن عبسہؓ
٥١ - حمزہ ابن عبدالمطلبؓ
٥٢ - عمر بن الخطابؓ
٥٣ - مصعب بن عمیرؓ
٥٤ - عثمان ابن مظعونؓ
٥٥ - قدامہ ابن مظعونؓ
٥٦ - سالم مولی ابی حذیفہؓ

یہ مہاجرین میں سے السابقون الاوّلون کے وہ نام ہیں۔ جن کی تفصیل حافظ ذہبیؒ نے سیر اعلام النبلاء میں ص۱۴۴ سے ص۱۷۱ تک دی ہے۔ ان کے علاوہ انصار ہیں وہ سب السابقون الاوّلون میں داخل ہیں۔ جو عقبہ اولیٰ، عقبہ ثالثہ میں نعمت ایمان سے مالا مال ہوئے ہیں۔ ان کے ناموں کی فہرست حافظ ابن حزم محدث نے جامع السیرۃ میں ص۶۹ سے ص۸۵ تک دی ہے۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ السابقون الاوّلون صرف وہ نہیں ہیں۔ جو دار ارقم میں داخلہ سے پہلے مسلمان ہوئے تھے۔ اس قید کے ساتھ انصار السابقون الاوّلون میں داخل نہ ہوں گے۔ حالانکہ قرآن کا یہ صاف اعلان ہے کہ السابقون الاوّلون مہاجرین و انصار میں سے ہیں۔

انصار کی آمد سنہ ۱۱ نبوی میں شروع ہوتی ہے۔

علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں۔

انصار سے مراد عقبہ اولیٰ والے ہیں۔ یہ سنہ ۱۱ نبوت میں آئے۔ ان کی تعداد سات ہے۔ اور پھر عقبہ ثانیہ والے ہیں۔ یہ سنہ ۱۲ میں آئے۔ یہ تعداد میں ستر مرد اور دو عورتیں ہیں کچھ کے خیال میں عقبہ میں تین بار بیعت ہوئی ہے۔ اور کچھ کی رائے میں ایک عقبہ میں صرف دو بیعتیں ہوئی ہیں۔

اصل میں تو مدینہ والوں کے لیے دعوت کا آغاز عقبہ اولیٰ کی بیعت سے پہلے ہو چکا تھا۔ اس سلسلے میں اوّلین نام سوید بن الصامت کا آیا ہے۔ سوید بن الصامت شجاعت اور شعر گوئی میں اُونچے درجہ کی شخصیت تھی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی آمد کا علم ہوا۔ تو آپ نے اس کے ڈیرے پر پہنچ کر اسے اسلام کی دعوت دی۔

اس کے بعد قبیلہ اوس نے خانہ جنگی کے بعد خزرج سے شکست کھائی تو اوس نے ایک وفد مکۃ المکرمہ روانہ کیا تاکہ قریش سے حلیفانہ روابط ہوں۔ اس وفد کی سربراہی ابوالحیسر انیس بن رافع کر رہا تھا۔ اس وفد میں بنو عبدالاشہل کا ایک نوجوان ایاس بن معاذ بھی شامل تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وفد کو دعوت اسلام دی۔ ایاس بن معاذ وہاں نبوت سے نکلی ہوئی آواز سن کر بول پڑا۔ بھائیو! ہمارے لیے یہ دعوت اس کام سے بہتر ہے۔ جس کے لیے ہم یہاں آئے ہیں۔ ابوالحیسر نے ایاس بن معاذ کو جھڑک دیا۔ ایاس بن معاذ خاموش ہو گیا۔ یہ جنگ بعاث سے پہلے کا واقعہ ہے۔ یہ دونوں واقعے ابتدائی مرحلے سے آگے نہ بڑھے۔

سنہ ۱۱ نبوت کے موسم حج میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم معمول کے مطابق دعوت کے لیے نکلے۔ عقبہ میں پہنچے جو حراتامی پہاڑ اور منیٰ کے درمیان ہے۔ چند افراد سامنے آئے۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ خزرجی ہیں۔ فرمایا۔ آپ لوگ بیٹھ کر میری کچھ باتیں سن سکتے ہیں۔ وہ بیٹھ گئے تو آپ نے اسلام کی دعوت دی۔ ان کی تعداد چھ تھی۔ ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ ابو امامہ اسعد بن زرارہؓ	۳۔ رافع بن مالکؓ	۵۔ عقبہ بن عامرؓ
۲۔ عوف بن حارثؓ	۴۔ قطبہ بن عامرؓ	۶۔ جابر بن عبداللہؓ

ان کے ذریعے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مدینہ میں اوس وخزرج تک پہنچ گیا۔

سنہ ۱۲ نبوت میں اسی گھاٹی میں اوس وخزرج کے بارہ حضرات نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات کی۔ ان بارہ میں پانچ وہی تھے۔ جو گزشتہ سال آئے تھے جابر بن عبداللہؓ کسی وجہ سے نہیں آسکے۔ باقی سات آدمیوں کے نام یہ ہیں۔

۱۔ معاذ بن حارثؓ	۴۔ ابو عبدالرحمٰن یزید بن ثعلبہؓ	۷۔ عویم بن ساعدہؓ
۲۔ زکوان بن عبدقیسؓ	۵۔ عباس بن عبادہؓ	
۳۔ عبادہ ابن الصامت	۶۔ ابوالہیثم مالک بن تیہانؓ	

بیعت کے بعد ان ساتھیوں نے یہ درخواست بھی کی۔ کہ ہمارے ساتھ کوئی معلم روانہ کریجئے چنانچہ حضرت مصعب بن عمیرؓ کو ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔ حضرت مصعب ابوامامہ اسعد بن زرارہ کے گھر فروکش ہوئے۔ ان کی محنت سے گھر گھر اسلام کا چرچا ہو گیا۔ یہاں تک کہ اوس کا ایک قبیلہ بنی عبدالاشہل ایک دن میں مسلمان ہو گیا۔

۱۳ سنہ نبوت کے حج میں مدینہ سے ۷۳ حضرات مکہ مکرمہ آئے۔ ان میں دو عورتیں بھی تھیں، حافظ ابن حزم نے جامع السیر میں ان سب کو نام بنام لکھا ہے۔ اسی موقعہ پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان ہی حضرات میں سے بارہ حضرات کو نقیب مقرر فرمایا۔

۱۔ السعد بن زرارہؓ	۵۔ سعد بن عبادہؓ	۹۔ رافع بن مالکؓ
۲۔ عبداللہ بن رواحہؓ	۶۔ برار بن معرورؓ	۱۰۔ عبداللہ بن عمروؓ
۳۔ اُسید بن الحضیرؓ	۷۔ سعد ابن الربیعؓ	۱۱۔ سعد بن خثیمہؓ
۴۔ ابوالہثیم مالک بن تیہانؓ	۸۔ عبادۃ ابن الصامتؓ	۱۲۔ منذر بن عمروؓ

یہ ہیں۔ السابقون الاوّلون من المہاجرین والانصار

علامہ آلوسیؒ حمید بن زیاد اور مشہور مفسر قرآن محمد بن کعب القرظی کا یہ مکالمہ اسی آیت کی تشریح میں نقل کیا ہے۔

حمید۔ صحابہ کے باہمی تنازعات کو پیش نظر رکھ کر آپ مجھے صحابہ کرام کے بارے میں تناظر ہی بتایئے۔

محمد بن کعب۔ قرآن میں اللہ سبحانہٗ نے سارے صحابہ کرام کو مغفرت کا پروانہ دیا ہے۔ اور سب کے لیے جنتی ہونے کا اعلان بھی کیا ہے۔

حمید بن زیاد۔ کہاں

محمد بن کعب۔ تم نے قرآن میں یہ آیت نہیں پڑھی ہے۔ والسابقون الاولون من المہاجرین والانصار اس آیت میں سارے صحابہ مہاجرین وانصار کے مغفور، مرضی اور جنتی ہونے کا اعلان ہے۔ صحابہ کے بعد آنے والے مسلمانوں کے لیے جنتی ہونے کی شرط بھی اس آیت میں ہے۔

حمید بن زیاد۔ شرط کیا ہے؟

محمد بن کعب۔ قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے جنتی ہونے کی شرط یہ

ہے۔کہ وہ مہاجرین و انصار کی خوبی کے ساتھ پیروکار ہوں۔ یعنی ان کے اعمال حسنہ میں ان کی پیروی کریں۔ یا مطلب یہ ہے کہ گفتار ان کی خوبی سے ذکر کریں۔ برائی سے گریز کریں اور ان کے کردار پر نا قدانہ نظر سے بچ کر رہیں۔

حمید بن زیاد۔ ان کی تقریر سن کر مجھے محسوس ہوا۔ کہ گویا یہ آیت گرامی اس سے پہلے پڑھی ہی نہ تھی آج ہی پڑھی ہے۔

پارہ یازدہم ایک نظر میں

توحید

رسالت

قرآن کا چہرہ

صحابہ کرام کا چہرہ

اجتماعی قوانین

سیاسی قوانین

مالیاتی قوانین

اخلاقی قوانین

دفاعی قوانین

معاشرتی قوانین

دستوری واقعات

اللہ سبحانہٗ کی صفات

آخرت کی زندگی

اصطلاحات قرآنی

قربۃ: اسی کی جمع قربات آتی ہے۔ اسم مصدر ہے مرتبہ کا قرب، خوشنودی، رضاو راغب مراد خوشنودی حاصل ہونے کا ذریعہ۔ جیسے اللہ کی راہ میں مال خرچ کرنا۔ اللہ سبحانہ کی خوشنودی اور رضا حاصل ہونے کا ذریعہ ہے۔ اس سے قربان قربانی کو کہتے ہیں یعنی وہ چیز جو اللہ سے قرب کا ذریعہ ہو۔ قربان الملک وہ شخص جو خدمت کے ذریعے بادشاہ کا قرب حاصل کرے۔ علامہ مجدالدین فیروز آبادی بصائر میں لکھتے ہیں۔

کہ بندے سے اللہ کا قرب یہ ہے کہ بندے اللہ تعالیٰ کی رحمت کا فیضان ہوں یہ قرب روحانی ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں اسی روحانی قرب کی نشاندہی فرمائی ہے اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے۔ کہ جو میرے سے ایک بالشت قریب ہوتا ہے۔ میں اس سے ایک ہاتھ قریب ہوتا ہوں۔ شاہ عبدالعزیزؒ نے سورت مزمل کی تشریحات میں لکھا ہے۔

کہ اللہ سبحانہ جسم اور جسمانیت سے بالکل پاک ہے اس لیے اس کا قرب مکانی نہیں۔

اس لیے بندے کا اللہ سے قرب یہی ہے۔ کہ اسے یاد کرئے۔ جگر مرادآبادی نے کیا خوب کہا ہے۔

نہ غرض کسی سے نہ واسطہ مجھے کام اپنے ہی کام سے
تیرے ذکر سے تیرے فکر سے تیری یاد سے تیرے نام سے

احسان: عربی میں احسان کے معنیٰ اچھا کام کرنے اور کسی کام کو اچھے طریقے سے کرنے کے

ہیں۔ اردو میں جن معنوں میں ہم احسان بولتے ہیں۔ عربی میں جب خاص وہ معنیٰ ہوں گے۔ تو اس کا استعمال الی یا با کے ساتھ ہوگا۔ جیسے وبالوالدین احسانا اور کما احسن اللہ الیک۔ اور جہاں متعدی بغیر صلہ کے آئے گا۔ وہاں معنیٰ ..... حسن کاری کرنے اور حسن پیدا کرنے کے ہوں گے۔ قرآن میں محسن اور محسنین کا لفظ بغیر صلہ کے آیا ہے۔ وہاں معنیٰ یہی ہیں کہ وہ اپنے ایمان وعمل میں حسن کار واقع ہوئے ہیں۔ یعنی ایمان وعمل کے ادنیٰ درجے پر قانع نہیں بلکہ ان کے حسن کا جو درجہ ہے۔ اس کے حصول میں کوشاں ہیں۔ لہٰذا المحسنون اہل ایمان کا وہ طبقہ ہے۔ جو زندگی کے تمام شعبوں میں حسن کاری کو پسند کرتا ہو۔ ان حسن کاروں کو اگر جمال مطلق کی محبوبیت کا مقام اگر حاصل ہو۔ جس کا للذین احسنوا الحسنیٰ و زیادہ میں اعلان کیا گیا ہے۔ تو اپنی محنت ومشقت کی بنیاد پر یقیناً وہ اس کے مستحق ہیں۔

ٹھہر جائیے سرِ راہے معاملہ کے اس پہلو پر بھی غور کیجئے کہ قرآن عزیز نے انسانیت کو عدل واحسان کی تعلیم دی ہے۔ جو کہ اصولی تعلیم ہے۔ عدل کے معنیٰ برابری کے ہیں۔ یعنی جو شخص کسی کے ساتھ برائی کرے اس کی ساتھ اتنی ہی برائی کی جائے۔ یہ عدل ہے اور عدل میں حسن کاری یہ ہے کہ اسے معاف کر دیا جائے۔ دونوں کے مراتب الگ الگ ہیں۔ عدل قانون ہے۔ اور احسان اخلاق ہے۔ قانونِ عدل کو قرآن نے جماعت کے ہاتھ میں دیا ہے، جبکہ احسان ہر شخص کا کام ہے۔ اسلام کی یہی شان جامعیت ہے۔

بیع:۔ اس کے معنیٰ علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے بصائر میں قیمت لے کر دینے کے لکھے ہیں۔ اور چیز لے کر قیمت دینے کو شرا کہتے ہیں..... کبھی بیع شرا کے معنیٰ میں اور کبھی شرا بیع کے معنیٰ میں آتا ہے۔ آیت میں اشتراٰی اور بیع دونوں لفظ آئے ہیں۔ یہ گویا خرید وفروخت والا معاملہ ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اور اہل ایمان کے درمیان میں طے پایا ہے۔ اب نہ بیچنے والا اپنی مایہ واپس لے سکتا ہے۔ نہ خریدنے والا قیمت لوٹائے گا۔ چونکہ مقصود اس اندازِ تعبیر سے اللہ تعالیٰ کے لطف وکرم کا اظہار ہے۔ اس لیے معاملے کو اللہ سبحانہٗ نے۔ ان اللہ اشتریٰ کہہ کر اپنی طرف سے شروع کیا ہے نہ کہ بیچنے والوں کی طرف سے یعنی تعبیر یہ اختیار نہ کی۔ ان المومنین باعوا انفسھم واموالھم بلکہ فرمایا ان اللہ اشتریٰ الخ اس انداز سے اشارہ کر دیا۔ کہ معاملہ کی طلب اللہ سبحانہٗ کی جانب سے

ہوئی ہے۔ حالانکہ اللہ سبحانہٗ کی ذات اقدس ہر قسم کی طلب و احتیاج سے پاک ہے۔

صادق: ۔ صدق سے اسم فاعل صادق سے جمع ہے ۔ سچے، راستباز، نیک نام مصدر صدق ہے۔ صدق یصدق۔ اس کے معنیٰ لغت میں سچ کہنے اور سچ کر دکھانے کے ہیں۔ اور چونکہ یہ ذکر خیر کا سبب ہے۔ اس لیے مجازاً نیک نام کو بھی صادق کہتے ہیں۔ امام راغب فرماتے ہیں۔

صدق اور کذب دونوں کا تعلق قول سے ہے۔ خواہ وہ ماضی ہو یا مستقبل وعدہ ہو یا غیر وعدہ اور مراد اولی میں یہ دونوں قول کے علاوہ اور کسی کے لیے نہیں آتے اور ان میں بھی صرف خبر میں ہی ہوتے ہیں۔ اس کے سوا اصناف کلام میں سے اور کسی میں نہیں ہوتے۔ اسی لیے ارشاد ہے۔ ومن اصدق من اللہ قیلا۔ اور انہ کان صادق الوعد ان بالعرض ضمنی طور پر دیگر انواع کلام میں بھی آتا ہے۔ نیز صدق کے معنیٰ ہیں۔ ضمیر یعنی دل اور مخبر عنہٗ دونوں سے قول کے مطابق ہونا۔ نیز ہر وہ فعل جس میں ظاہری یا باطنی فضیلت ہو۔ اسے صدق سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جو فعل اس صفت سے موصوف ہوتا ہے۔ اس کی اس کی طرف اضافت کر دی جاتی ہے۔ جیسے ان لھم قدم صدق عند ربھم اور ادخلنی مدخل صدق

قرآن میں سچائی کی اہمیت کا اس سے اندازہ ہوتا ہے۔ کہ صرف سچائی اختیار کرنے ہی کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ یہ بھی تاکید آئی ہے۔ کہ ہمیشہ سچوں کا ساتھ دو۔ سچوں ہی کی جماعت سے علاقہ اور رابطہ رکھو۔ اور ان ہی کی صحبت میں رہو۔ سچائی کے معنیٰ عام طور پر سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں۔ مگر قرآن میں اس کے بڑے وسیع معنیٰ ہیں۔ جس کے لحاظ سے اس کے اندر اکیلے قول ہی نہیں۔ بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے۔ امام غزالیؒ نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں۔ اور ہر ایک کے معنیٰ بتائے ہیں۔

بات میں سچائی۔ ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی، اور دینداری کے مقامات اور مراتب میں سچائی۔

لیکن ذرا معنیٰ میں وسعت دیجئے۔ تو اس کی تین ہی قسموں میں ساری سچائیاں آجاتی ہیں۔ یعنی زبان کی سچائی۔ دل کی سچائی اور عمل کی سچائی۔

تفقہ:۔ یہ فقہ سے باب تفعل ہے۔ تفقہ یتفقہ۔ اس باب کا خاصہ مبالغہ ہے۔ فقہ ثلاثی مجرد کے باب سمع سے آتا ہے۔ اس کے معنیٰ سمجھنے کے ہیں۔ راغب اصفہانی کہتے ہیں۔

کہ علم شاہد کے ذریعہ علم غائب تک پہنچنے کا نام فقہ ہے لہذا فقہ علم سے خاص ہے۔

اور اصطلاح میں فقہ احکام شریعت کے علم کو کہتے ہیں۔ سمجھنے کے معنیٰ میں ہو۔ تو باب سمع سے آتا ہے۔ اور مصدر فقہ آتا ہے۔ اور جب دوسرے معنیٰ میں ہو۔ تو مصدر فقاہت آتا ہے۔ اور باب کرم سے استعمال ہوتا ہے۔

فقہا کی اصطلاحی زبان میں عملی زندگی میں قانونی ضوابط کو دلائل کے ساتھ جاننے کا نام فقہ ہے۔ اس معنیٰ کے اعتبار سے فقہ ایک علمی صفت ہے۔ اور اس کا موصوف فقیہ ہے اس کی جمع فقہاء ہے۔ ضوابط سے مراد وہ احکام ہیں۔ جو اوامر و نواہی کی صورت میں انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے لیے صراحۃً یا دلالۃً راہ نبوت سے آئے ہوں۔ عملی زندگی کی قید سے فکری و اعتقادی مسائل نکل گئے۔ ایمان اور اس کے متعلقات کا محل فقہ نہیں علم کلام ہے۔ گویا فقہ کی آغوش میں بیک وقت دو چیزیں ہوتی ہیں۔ ایک احکام دوسرے احکام کا علم جیسے احکام کو فقہ کہتے ہیں۔ ایسے ہی احکام کے علم کو بھی فقہ کہتے ہیں۔ اسی لیے فقہ کی تعریف میں اہل علم میں تعبیری اختلاف ہے۔ مشہور فقیہ علامہ ابن نجیم نے اصولیین کی طرف منسوب کرکے یہ تعریف لکھی ہے۔

فقہ نام ہے۔ احکام شرعیہ عملیہ کو دلائل کے ساتھ جاننے کا۔

علامہ محمد علاء الحصکفی صاحب در مختار بھی علامہ ابن نجیم کے ہمزبان ہیں۔ لیکن امام غزالیؒ نے المستصفیٰ میں اور علامہ آمدی نے احکام الاحکام میں فقہ کا اطلاق صرف شہریوں سے متعلق افعال قانونی احکام کے علم کو کیا ہے اور امام غزالیؒ نے فقہ کو اس طرح سمجھایا ہے۔ ھو معرفۃ القانون قانون کی آشنائی مشہور علم دوست علامہ احمد عبد النبی نے یہ کہہ کر کہ۔۔۔۔

ان احکام کا علم جن کا سرچشمہ نقلی دلائل ہوں۔ اور جن کا شہریوں کی روزمرّہ کی زندگی سے تعلق ہو۔

فقہ کے معنیٰ میں ایک خوبی پیدا کردی ہے۔

تعبیر کے اختلاف سے نظر ہٹا کر آج کی اصطلاحی زبان میں جبکہ اسلام کے قوانین وضوابط منضبط ہیں۔ اگر ہم فقہ کی یہ تعریف کریں تو یہ ایک حقیقت کا اظہار ہوگا۔

فقہ عملی زندگی کے لیے اسلام کے بتائے ہوئے قوانین واحکام کے مجموعے کا نام ہے۔

منازل:۔ نزل کی جمع ہے۔ نزول مصدر ہے۔ نزل ینزل باب ضرب سے آتا ہے۔ چاند کے لیے یکے بعد دیگرے وارد ہونے کی جگہ کو منزل کہا ہے۔ چاند کی ان منزلوں کے لیے ہماری زبان میں بچھتر کا لفظ بولا جاتا ہے۔ چاند زمین کے گرد چکر لگاتا رہتا ہے۔ اور اپنی گردش کو ۲۷ دن سات گھنٹوں اور ۴۳ منٹوں میں پورا کرتا ہے اس دور کو علماء ہیئت چاند کے نجومی دور سے تعبیر کرتے ہیں۔ چاند اپنی گردش کی ہر رات میں کسی ستارہ یا ستاروں کے مجموعے کے پاس ضرور پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ گویا چاند کی گردش کے لیے ہر روز کی ایک منزل بن گیا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک خاص منزل سے سفر شروع کرتا ہے۔ ہر روز کی مقررہ منزل میں نمایاں ہوتا ہے۔ اور پھر وہیں پہنچ جاتا ہے۔ جہاں سے زمین کا چکر شروع کیا تھا۔ اس طرح ۲۷ دن اور ۷ گھنٹے کی مدت نے ۲۸ منزلیں بنا دی ہیں جب ہم ۳۶۰ کے درجوں کو ۲۸ راتوں میں تقسیم کرتے ہیں۔ تو معلوم ہوتا ہے۔ کہ چاند ہر روز تقریباً ۱۳ درجہ مسافت اپنے فلک کی طے کیا کرتا ہے۔ تقریباً اس لیے کہا گیا۔ کہ حساب میں کچھ دقیقے زیادہ ہوتے ہیں حکماء اسلام نے ان منزلوں کو بطلیموس کے نقشہ مندرجہ مجسطی سے تطبیق دی تھی۔ ان منزلوں کے عربی نام یہ ہیں۔

الشرطان، البطین، الثریا، الدبران، الھقعۃ، الھنعہ، الذراع، النثرہ، الطرف، الجبھۃ الزبرہ، الصرفہ، العواء، السماک الاعزل، الغفر، الزبانی، الاکلیل، القلب، الشولہ، النعائم، البلدہ، سعد الذابح، سعد بلع، سعد السعود، سعد الاخبیۃ، الفرغ الاول، الفرغ الثانی، بطن الحوت،

ترجمان القرآن جلد ۲

سلطان:۔ زور، قوت، حجت، برہان، سند، حکومت تاج العروس میں ہے۔ سلطان کے معنی حجت و برہان کے ہیں۔ اور معجزہ کو بھی سلطان اسی لیے کہتے ہیں۔ کہ وہ دعویٰ نبوت

کے لیے دلیل ہوتا ہے۔ اور جب سلطان کے معنی حجت کے ہوتے ہیں۔ تو اس کی جمع نہیں آتی۔ کیونکہ اس صورت میں وہ مصدر کے قائم مقام ہوتا ہے۔ محمد بن یزید کا کہنا ہے۔

کہ یہ سلیط سے ماخوذ ہے۔ جس کے معنی زیتون کے تیل کے ہیں۔ کیونکہ اس سے روشنی ہوتی ہے۔ دلیل بھی ایسی ہونی چاہیئے جو روشن ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ کہ قرآن میں ہر جگہ لفظ سلطان بمعنیٰ دلیل ہے۔ اور دلیل کو سلطان اس لیے کہا جاتا ہے۔ کہ دلوں پر اس کا دباؤ ہوتا ہے۔ بہرحال اس کے معنی غلبہ اور تسلط کے ہیں۔ اور اسی معنوی رعایت سے دلیل کو سلطان کہتے ہیں۔ عربی میں اس کا معنیٰ بادشاہ کے نہیں۔ بلکہ طاقت اور قوّت کے ہیں۔ اور یہ لفظ حکومت اور گورنمنٹ کے مترادف ہے۔ بادشاہ کے معنیٰ میں یہ لفظ غالباً چوتھی صدی میں سلطان محمود کے زمانہ سے بولا جانے لگا ہے۔ احادیث میں بھی یہ لفظ حکومت ہی کے معنیٰ میں ہے۔ السلطان ولی من لاولی له۔ جس کا کوئی ولی نہ ہو۔ حکومت اس کی ولی ہے۔ اسلامی قانون میں اس پر بہت سے مسائل کا مدار ہے۔ یہ ضابطہ ہے۔ اس کے تحت شہریوں کی ان گنت ضرورتیں آتی ہیں۔ اس قسم کی ساری حدیثوں میں لفظ سلطان حکومت اور سرکار کے معنیٰ میں ہے۔ جیسے

السلطان ظل الله فی الارض یاوی الیه کل مظلوم من عباد الله۔

حکومت زمین میں اللہ سبحانہٗ کا امن کا سایہ ہے جس کے دامن میں بندگان الٰہی میں سے ہر مظلوم پناہ لیتا ہے۔

حضرت ابوبکر صدیقؓ کا یہ ارشاد ہے۔

السلطان العادل المتواضع ظل الله ورمحه فی الارض

عادل اور متواضع حکمران زمین میں اللہ سبحانہٗ کا سایہ اور نیزہ ہے۔

یہ دونوں حدیثیں اثر کے طور پر باختلاف الفاظ بروایت ابی ہریرہؓ ابن النجار میں اور بروایت ابن عمر بیہقی اور مستدرک میں اور بروایت ابی بکر الصدیقؓ ابن ابی شیبہ میں ہیں۔ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مرفوع نہیں ہے۔ بظاہر ان صحابہ کرام کے اقوال ہیں۔ اگر یہ آثار روائتی اعتبار سے صحیح ہوں۔ تو معنیٰ یہی ہیں۔ کہ حکومت صالحۃ اللہ کا سایہ ہوتی ہے۔ بتانا یہ ہے۔ کہ جو حکومت سرکاری کاموں کو اخلاق اور نیکی کے ساتھ انجام دے۔ اس کو اپنے اس حسن عمل

کا ثواب اسی طرح ملے گا۔ جس طرح دوسری عبادات کا۔ گویا اسلام کی نظر میں حکومت بھی ایک عبادت ہے۔ حکومت صرف سربراہ ہی کا نام نہیں۔ بلکہ ملک کی دفاعی، انتظامی اور عدلیہ کی قوتیں حکومت ہیں۔ جیسے سربراہ مملکت سلطان ہے۔ فوج کا ہر فرد، عدالت کا ہر جج اور انتظامیہ کا ہر کارکن سلطان ہے یعنی حکومت کا ہر جائز نمائندہ سلطان ہے۔

إِنَّمَا السَّبِيلُ عَلَى
الَّذِينَ يَسْتَأْذِنُونَكَ وَهُمْ أَغْنِيَاءُ ۚ رَضُوا بِأَن يَكُونُوا
مَعَ الْخَوَالِفِ وَطَبَعَ اللَّهُ عَلَىٰ قُلُوبِهِمْ فَهُمْ لَا يَعْلَمُونَ ﴿٩٣﴾

يَعْتَذِرُوْنَ اِلَيْكُمْ اِذَا رَجَعْتُمْ اِلَيْهِمْ ۭ قُلْ لَّا تَعْتَذِرُوْا
لَنْ نُّؤْمِنَ لَكُمْ قَدْ نَبَّاَنَا اللّٰهُ مِنْ اَخْبَارِكُمْ ۭ وَسَيَرَى اللّٰهُ
عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ ثُمَّ تُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ
فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُوْنَ ﴿۹۴﴾ سَيَحْلِفُوْنَ بِاللّٰهِ لَكُمْ
اِذَا انْقَلَبْتُمْ اِلَيْهِمْ لِتُعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ فَاَعْرِضُوْا عَنْهُمْ ۭ اِنَّهُمْ
رِجْسٌ ۡ وَّمَاْوٰىهُمْ جَهَنَّمُ ۚ جَزَاۗءًۢ بِمَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ ﴿۹۵﴾
يَحْلِفُوْنَ لَكُمْ لِتَرْضَوْا عَنْهُمْ ۚ فَاِنْ تَرْضَوْا عَنْهُمْ فَاِنَّ اللّٰهَ لَا
يَرْضٰى عَنِ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ﴿۹۶﴾

الزام تو صرف ان پر ہے جو سرمایہ دار ہو کر جنگ میں شریک ہونے کی آپ سے رخصت مانگتے ہیں۔ ان کو یہ بات پسند ہے کہ پیچھے رہنے والوں کے ساتھ رہیں۔ اور اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے لہذا ان کو علم نہیں ہے۔ ۹۸ یہی لوگ تمہارے سامنے تمہاری واپسی کے وقت بہانے پیش کریں گے آپ ان سے کہہ دیجئے کہ بہانہ سازیاں نہ کرو۔ ہم تمہاری کوئی بات ہرگز نہ مانیں گے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ نے ہمیں تمہارے

حالات سے باخبر کر دیا ہے۔ اور اللہ۔ اللہ کا رسول ضرور تمہارے عمل کا
جائزہ لے گا۔ اس کے بعد تمہیں اللہ عالم الغیب والشہادہ کے حضور پیش کیا
جائے گا وہ ہی تمہیں تمہارے سارے کرتوت بتلائے گا۔[۹۴] مسلمانو! جب تمہاری
ان کی طرف واپسی ہو گی وہ ضرور تمہارے روبرو اس لئے قسمیں کھائیں گے
کہ تم ان سے درگذر کرو۔ ہاں تم ان سے درگذر کرو۔ بلاشبہ یہ لوگ گندے ہیں
اور ان کے کرتوتوں کے بدلے میں ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔[۹۵] وہ تمہیں خوش کرنے
کے لیے تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں۔ اگر تم ان سے خوش ہو ہی جاؤ گے تو
اللہ ان بدکار لوگوں سے خوش نہ ہو گا۔[۹۶]

مفردات کے معانی

اخبار۔ خبر کی جمع ہے ایسی بات جو بتانے سے معلوم ہو۔ اچھی ہو یا بُری۔ سچی ہو یا جھوٹی۔ حال، واقعہ۔ جس میں سچ اور جھوٹ کی گنجائش ہو۔ یہاں علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے بصائر ذوی التمییز میں اخبار کے معنے احوال بتائے ہیں۔ من احوالکم التی یخبر عنھا۔

السبیل۔ اصل میں اس راستہ کو کہتے ہیں جو واضح اور آسان ہو۔ اور سبیل کا استعمال ہر اس چیز کے لیے ہوتا ہے جس کے ذریعے کسی چیز تک پہنچا جا سکے۔ چاہے وہ اچھی ہو یا بُری۔ راستہ کو بھی اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ منزلِ مقصود تک پہنچنے کا ذریعہ ہے۔ جریر کا شعر ہے۔

أَفَبَعْدَ مَقْتَلِكُمْ خَلِيلَ مُحَمَّدٍ ترجو القيون مع الرسول سبيلا

یہ لفظ قرآن میں مذکر اور مونث دونوں طرح آیا ہے ان یروا سبیل الرشد لایتخذوہ سبیلا اور قل ھذہ سبیلی ادعوا الی اللہ۔ یہاں سبیل گناہ کے معنے میں ما علی المحسنین من سبیل کیونکہ گناہ ہی سزا کا ذریعہ ہے۔

رجس ناپاک۔ پلید۔ گندہ۔ عقوبت۔ عذاب، بلا اس کی جمع ارجاس آتی ہے۔ رجس چار طرح کا ہوتا ہے ا۔ طبعی۔ ۲۔ عقلی۔ ۳۔ شرعی۔ ۴۔ ان تینوں سے مرکب یعنی طبعی عقلی اور شرعی ہو، رجس شرعی جوا اور شراب، رجس عقلی شرک اور سور کا گوشت تینوں کا مجموعہ مردار ہے۔ قرآن میں سب کے لیے رجس آیا ہے۔ قاضی بیضاوی نے رجس اور رجز میں ہم آہنگی بتائی ہے۔ لیکن علامہ زمخشری الفائق میں لکھتے ہیں۔ رجز اور رجس کے معنے عذاب کے ہیں۔ ابوتراب کا بیان ہے کہ میں نے ابوالسمیدع حضبی سے سنا ہے وہ کہتے تھے کہ رجز اور رجس وہ سخت مصیبت ہے جو لوگوں پر نازل ہو یہ اہل عرب کے محاورے ارتجزت السماء بالرعد وارتجست سے بنا ہے اور وہ ایسی جنبش ہے جس کے ساتھ شور ہو۔ علامہ مجدالدین فیروزآبادی اپنی کتاب بصائر میں لکھتے ہیں رجز اصل میں اضطراب کو کہتے ہیں۔ اونٹ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھائے اور کمزوری کی وجہ سے قدموں میں اضطراب ہو تو اس وقت بولتے ہیں۔ رجز البعیر اور ناقۃ رجزاء۔ اسی رعایت سے شعر میں اجزاء کے قرب کی وجہ سے ارجوزہ بولتے ہیں۔ بہرحال رجز اور رجس میں بنیادی فرق ہے۔

مجرم تو سرمایہ دار ہیں

اسلامی زندگی دراصل کفر کے مقابلے میں جہد و محنت کا نام ہے اور اسلام کی خاطر جہد و محنت ہی کفر و نفاق میں حد فاصل ہے۔ اگر اسلام کی خاطر محنت نہ ہو تو ایمان کی حیثیت صرف دعویٰ بلادلیل کی ہے قرآن نے یہ بات اپنے مخاطبوں کو بار بار اور کھول کر سمجھائی ہے۔ احسب الناس ان یترکوا ان یقولوا امنا وھم لایفتنون کیا یہ لوگ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ ان کو ایمان کا دعویٰ کرنے کے بعد آزاد چھوڑ دیا جائے گا اور ان کو اسلام کی خاطر کسی آزمائش سے دوچار ہونا نہ پڑے گا محنت ہی کھرے کھوٹے سچے اور جھوٹے کے لیے کسوٹی ہے۔ بلکہ قرآن نے ایک موقعہ پر بڑے زور سے یہ بات فرما کر اہل ایمان کو جھنجھوڑا ہے لنبلونکم بشیٔ من الخوف والجوع ونقص من الاموال والانفس والثمرات اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ اہل ایمان کو اسلام کی خاطر حوادث، مصائب اور تکالیف سے دوچار ہونا پڑے گا۔ غزوہ تبوک اسلامی زندگی میں اسلام کی موت وحیات کا پیمانہ تھا۔ اس میں صرف قریش نہیں بلکہ سارے عرب نے اسلام کے خلاف سنگٹھن قائم کر لیا اور عیسائیوں کی سامراجی طاقت بھی اہل عرب کی ہمنوا بن گئی تھی۔ سفر طویل تھا۔ موسم ناخوشگوار تھا کوئی باقاعدہ فوجی نظام نہ تھا حمل ونقل کا سرکاری انتظام نہ تھا جو کچھ بھی تھا صرف رضاکارانہ تھا۔ اس موقعہ پر کچھ وہ تھے جو واقعی معذور تھے۔ ان کا چہرہ قرآن نے پیش کر دیا ہے نادار ہیں فقیر ہیں زاد راہ پاس نہیں ہے مگر جانے کی تڑپ سے ہر دل

کڑھ رہا ہے آنکھوں سے آنسوؤں کی لڑی ساون کی جھڑی بنی ہوئی ہے۔ ان کے بارے میں قرآن بتا چکا ہے۔ ما علی المحسنین من سبیل۔ اور ان کو اللہ سبحانہ نے مغفرت کا پروانہ بھی سنا دیا ہے۔ ان کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو صحت مند ہیں بہادر ہیں طاقتور ہیں کمزور نہیں۔ دولت مند ہیں فقیر نہیں اس کے باوجود اسلام کی خدمت سے جی چرا رہے ہیں۔ اور اعذار بارده پیش کر کے رخصتیں لے رہے ہیں۔ ان آیات میں ان ہی لوگوں کا بھرپور چہرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ امام رازی نے ان آیات میں اسی تقابلی مطالعہ کو پیش نظر رکھا ہے۔ دونوں پر ذرا گہری نگاہ ڈالیے۔

ایک وہ ہیں جو سب کچھ ہونے اور سب کچھ رکھنے کے باوجود اسلام کے لیے ٹس سے مس نہیں ہوتے۔ ان کے مقابلے میں وہ ہیں جن کے پاس کچھ نہیں ہے نہ جسمانی قوت ہے اور نہ سرمایہ و دولت کی طاقت ہے۔ لیکن اس کے باوجود ایمان کی سرشاری کا عالم یہ ہے کہ سب کچھ نہ ہونے کے باوجود جانے کی قسمیں کھا رہے ہیں نذریں مان رہے ہیں۔ موقعہ نہ ملنے پر رو رہے ہیں نہ جانے میں دونوں برابر ہیں مگر نتائج کے لحاظ سے دونوں الگ الگ ہیں۔ ایک کچھ بھی نہ ہونے کے باوجود ماجور اور عند اللہ مقبول ہے اور دوسرا سب کچھ ہونے کے باوجود مازور و معتوب ہے۔ ایک کا اسلام کے لیے سینہ کھلا ہوا ہے جبکہ دوسرے کا سینہ تنگ ہے ایک کے قلب میں ایمان کی بھرپور روشنی ہے جبکہ دوسرے کا دل بیمار ہے اور تاریکیوں میں گھرا ہے ان آیات میں اسی دوسرے طبقہ کو روشناس کرایا گیا ہے۔

۹۸ الزام تو ان پر ہے جو سرمایہ دار ہو کر جنگ میں شریک ہونے کی آپ سے رخصت مانگتے ہیں۔ ان کو یہ بات پسند ہے کہ پیچھے رہنے والیوں کے ساتھ رہیں۔ اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے لہذا ان کو علم نہیں ہے یعنی باوجود قدرت و استطاعت جہاد سے پہلو تہی کرتے ہیں۔ اور نہایت بے ہمتی سے یہ عار گوارا کرتے ہیں۔ کہ عورتوں کی طرح گھر میں چوڑیاں پہن کر بیٹھ جائیں۔ گناہ کی ممارست (پریکٹس) سے آدمی کا دل ایسا مسخ اور سیاہ ہو جاتا ہے کہ اسے بھلے بُرے اور عیب وغیرہ کی تمیز ہی نہیں رہتی۔ جب بے غیرتی کرتے کرتے کوئی شخص اس قدر پاگل ہو جائے کہ نادم اور متاسف ہونے کی جگہ اس پر الٹا نازاں اور خوش ہو تو سمجھ لو کہ اس کے دل پر خدائی مہر لگ چکی ہے ۹۸ لہ

امام رازی نے مطلب یہ بتایا ہے کہ وہ لوگ جو جہاد میں پیچھے رہنے کے لیے سرمایہ دار ہونے کے باوجود آپ سے رخصت مانگتے ہیں اللہ کے یہاں اصل اور واقعی ملزم و مجرم ہیں یہ خطاب الٰہی میں دنیا میں عتاب ان کو ہی ہے

لہ افادات شیخ الاسلام

اور آخرت میں عذاب کے مستحق بھی وہ ہی ہیں۔ اگرچہ ما علی المحسنین من سبیل فرما کر ان لوگوں کے بارے میں جو واقعی معذور ہیں بتا دیا تھا کہ جو لوگ واقعی معذور ہیں اگر ان کے دل صاف ہوں اور خدا اور رسول سے ان کے معاملات درست ہیں تو ان پر جہاد میں نہ جانے پر کچھ الزام نہیں ایسے مخلصین سے اگر تقاضائے بشریت کوئی کوتاہی ہو جاتے تو حق تعالیٰ کی مغفرت اور رحمت سے توقع ہے کہ وہ درگذر فرمادے گا یہ عام قانون بیان کرنے کے بعد ان محسنین کا ذکر کیا جن کے ایمان و اخلاص کا یہ حال تھا کہ جب ان کے لیے سواری کا انتظام نہ ہو سکا اور حضور اقدس کے ادب و احترام نے اس کی بھی اجازت نہ دی کہ زیادہ اصرار کریں تو خاموش اٹھ کر لوٹ گئے لیکن آنکھیں جو درد دل کی غماز ہوتی ہیں خاموش نہ رہ سکیں حسرت و غم کے آنسو بے اختیار ڈبڈبا آئے قرآن کا خاص انداز بلاغت ہے کہ پہلے معذرون کا ذکر ہو چکا تھا لیکن پھر خصوصیت کے ساتھ ان کا ذکر کیا اور ان کی محبت ایمانی کی تصویر کھینچ دی اب یہاں نفاق کے ذکر میں انما لا کر پھر ان کی طرف اشارا کر دیا کہ مجرم وہ محسنین نہیں مجرم تو وہ سرمایہ دار ہیں جو سب کچھ رکھتے ہوتے نہیں گئے اور رخصتیں مانگتے رہے ہیں۔ یہ نفاق کے مقابلہ میں ضمناً ایمان کا مرقع پیش کر دیا یعنی ایک تو یہ ہیں اصلی مجرم کہ قدرت کے باوجود ہی نہیں نکلے اور بہانے تراشتے رہے یا ایک وہ ہیں کہ قدرت نہ رکھنے پر بھی دل کی لگن چین سے نہیں بیٹھنے دیتی ہے آنسو بن کر آنکھوں میں ٹپک رہی ہے۔

یہاں علامہ آلوسی، خفاجی اور بیضاوی نے یہ بڑی لطیف بات لکھ دی ہے کہ آگے تعبیری انداز رضوا بان یکونوا استیناف بیانی ہے۔ یعنی اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے کہ جب یہ اس قدر اونچا کام ہے کہ معذرت نہ رکھنے والے نہ جانے پر رو رہے ہیں تو پھر معذرت والے کیوں نہیں گئے ہیں. آگے اسی سوال کا جواب ہے۔ آلوسی لکھتے ہیں۔

استیناف بیانی۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں استیناف لبیان ما ھو السبب دوسرے شارحین قرآن میں ابوحیان اندلسی وغیرہ نے بھی یہی بات لکھی ہے، بات بجد فکر انگیز ہے گویا پڑھنے والے کے ذہن میں یہ سوال خود بخود چٹکیاں لینے لگتا ہے کہ جب اس قدر اونچا ہے جس پر اسلام کی زندگی کا مدار ہے۔ اور رکاوٹ بھی کوئی نہیں ہے تو پھر انھوں نے جانے سے کیوں جی چرایا ہے جواب میں ارشاد ہوا ہے کہ اس کی دو وجہ ہیں ایک یہ چونکہ ان کو اجتماعی شرف و مجد اور برتری کی جگہ ذاتی اور انفرادی برتری زیادہ پسند ہے اس لیے ان کو عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھے رہنا، آرام کرنا اور عیش و تنعم سے ہم آغوش رہنا محبوب ہے مرد ہو کر مردانگی کی جگہ شیوہ زنان اختیار کرنا دنائت کمینگی اور بے غیرتی ہے۔ گویا بے غیرت بن کر عورتوں والی

زندگی مردوں کی مجاہدانہ زندگی کے مقابلے میں زیادہ پسند ہے رضوا بان یکونوا مع الخوالف یعنی ان کو عورتوں کے ساتھ گھروں میں رہنا ہی پسند آیا۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ نفاق کی وجہ سے اللہ نے ان کے دلوں پر مہر لگا دی ہے۔ اس کی وجہ سے ان کو اپنے کردار کی خباثت کا اور اس کے نتیجے میں فوری طور پر نتائج کا ان کو پتہ نہیں ہے۔ ابوحیان لکھتے ہیں کہ ان کو دین کی خاطر محنت کرنے کے منافع کا پتہ ہی نہیں ہے حافظ ابن جریر فرماتے ہیں کہ ان کو نہ جانے کے انجام کا پتہ نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ ادائے فرض کے وقت عورتوں کی طرح گھروں میں بیٹھ جانا ایک ایسی نامردی کی بات ہے جسے کوئی خوددار آدمی گوارا نہیں کر سکتا۔ لیکن انہوں نے یہ بھی گوارا کر لیا۔ کیونکہ جہل اور بے حسی کی انتہائی حالت ان پر چھا گئی۔ یہی حالت جو انتہا درجہ کی بے حسی غفلت و انکار کا لازمی نتیجہ ہے۔ قرآن اسے مہر لگنے سے تعبیر کرتا ہے۔ طبع کی تشریح پیچھے تفسیر میں ایک سے زیادہ مقامات پر گذر چکی ہے۔

معذرت کی باتیں نہ بناؤ

۹۹۔ یہی لوگ تمہارے سامنے تمہاری واپسی کے وقت بہانے پیش کریں گے۔ ان سے کہہ دیجئے کہ بہانہ سازیاں نہ کرو۔ ہم تمہاری کوئی بات ہرگز نہ مانیں گے کیونکہ اللہ سبحانہ نے ہمیں تمہارے حالات سے باخبر کر دیا ہے۔ اور اللہ اور اللہ کا رسول ضرور تمہارے عمل کا جائزہ لے گا۔ اس کے بعد تمہیں اللہ عالم الغیب والشہادہ کے حضور میں پیش کیا جائے گا وہی تمہیں تمہارے سارے کرتوت بتلائے گا۔ یعنی جیسے تبوک کی طرف روانہ ہونے کے وقت منافقین نے طرح طرح کے حیلے بہانے بنائے جب تم مدینے واپس آؤ گے اس وقت بھی یہ لوگ اعذار باطلہ پیش کر کے تم کو مطمئن بنانا چاہیں گے اور قسمیں کھائیں گے کہ حضرت ہمارا قصد مصمم تھا کہ آپ کے ساتھ چلیں مگر فلاں فلاں عوائق اور موانع پیش آجانے کی وجہ سے مجبور رہے آپ کہہ دیجئے کہ جھوٹی باتیں بنانے سے کوئی فائدہ نہیں۔ تمہارے سب اعذار لغو اور بیہودہ ہیں۔ ہم کو حق تعالیٰ تمہارے کذب و نفاق پر مطلع کر چکا۔ پھر کس طرح ہم تمہاری لغویات کو باور کر سکتے ہیں۔ اب پچھلے قصہ کو چھوڑو۔ آئندہ تمہارا طرز عمل دیکھا جائے گا کہ اپنے دعوے کو کہاں تک نباہتے ہو۔ سب جھوٹ سچ ظاہر ہو کر رہے گا اور بہرحال اس عالم الغیب والشہادہ سے تو کوئی راز، عمل اور نیت پوشیدہ نہیں رہ سکتی۔ اسی کے یہاں سب کو جانا ہے وہ جزا دینے کے وقت تمہارا چھوٹا بڑا ظاہری باطنی عمل کھول کر رکھ دے گا اور اسی کے موافق بدلہ دیا جائے گا[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اصل ارشاد میں اعتذار سے یعتذرون آیا ہے۔ اس سے پہلے تعذیر سے معذرون آیا ہے۔ اعتذار اور تعذیر میں باریک سا فرق ہے تعذیر نام ہے صرف جھوٹے بہانے تراشنے کا جبکہ اعتذار میں عذر جھوٹا بھی ہو سکتا ہے اور سچا بھی۔ یہاں یعتذرون صرف باتیں بنانے اور جھوٹے عذر تراشنے کے معنے میں ہے۔ یعنی جب تم اس سفر یعنی تبوک سے واپس پلٹو گے تو یہ منافقین اپنے کردار کے بارے میں مسلمانوں کو مطمئن کرنے کے لیے اپنے من گھڑت عذروں کی داستانیں سنائیں گے۔ اصل روئے سخن تو حضور اقدس کی طرف ہے اور جمع کی تعبیر صرف تعظیم کی خاطر ہے۔ اور اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ دونوں کی طرف روئے سخن ہو تو زیادہ اچھا ہی نہیں بلکہ اس میں معنویت بھی ہے کیونکہ عام رواج کے مطابق پیچھے رہ جانے والے ملاقات کے وقت ہر ایک سے معذرت کرتے ہوں گے اور نہ جانے کی شرمندگی کی سیاہی کو چہروں سے جھوٹے اور بناوٹی عذروں کے پانی سے دھوتے ہوں گے۔ کیونکہ یہ لوگ معاشی لحاظ سے دولت مند بھی تھے اور جسمانی طور پر صحت مند اور تندرست بھی تھے۔ ظاہر ہے کہ ایک شخص ہٹا کٹا تندرست اور مالی توانائیاں بھی رکھتا ہو وہ اگر وقت کے تقاضے کا جواب نہیں دیتا ہے تو ہر شخص کے لیے سوالیہ نشان بن جاتا ہے اسلامی اجتماعیت ہی کیلئے نہیں بلکہ دنیا کی ہر جماعت کے لیے یہ افراد اجتماعی زندگی کے وہ جراثیم ہوتے ہیں جو اجتماعیت کی کشتی کے ڈوبنے کا سامان ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ مردم شماری کے مسلمان ہوتے ہیں۔ ان کے ذہن میں اسلام کا ایک محدود تصور رہتا ہے۔ وہ دریا میں نہانے والوں کو دیکھ کر کپڑے تو اتار لیتے ہیں مگر ان میں غوطہ لگانے کی ہمت نہیں ہوتی ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے ان سے کہہ دیجئے کہ بہانہ سازیاں نہ کرو۔ ہم تمہاری کوئی بات ہرگز نہ مانیں گے۔ کیونکہ اللہ سبحانہ نے ہمیں تمہارے حالات سے باخبر کر دیا ہے۔ اس میں صیغہ افراد کے ساتھ حضور اقدس سے کہا گیا ہے کہ آپ ان سے کہہ دیجئے کیونکہ جواب دینے کا سربراہ ہونے کی وجہ سے منصب آپ کا ہی ہے نہ کہ اور کسی کا۔ یہی اجتماعیت ہے کہ امام ایک ہو باقی سب اس کے مقتدی ہوں۔ بولنا امام کا کام ہے مقتدی کا کام صرف خاموش رہنا ہے۔ اگر امام کی موجودگی میں مقتدی بول لیں تو مسئلہ امامت ہی ختم ہو جاتا ہے یعنی ان سے کہہ دیجئے کہ اعذار بارد پیش نہ کرو اور جھوٹی باتیں نہ بناؤ۔ اب کردار کے اس مظاہرے کے بعد ہم تمہاری کوئی بات نہ مانیں گے۔ اصل ارشاد ہے لن نؤمن لکم یہ استیناف بیانی ہے اور اس اٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے کہ معذرت کیوں نہ پیش کریں۔ جواب میں بتایا اس لیے اعذار پیش نہ کرو کہ ہم تمہارے کسی عذر کو شرف پذیرائی نہ دیں گے۔ اس پر پھر سوال ہوا ہے کہ آپ ہمارا کوئی بھی عذر کیوں نہ مانیں گے۔

جواب میں فرمایا کہ ہم اس لیے نہ مانیں گے کہ قد نبأنا الله من اخبارکم اللہ سبحانہ نے وحی کے ذریعے ہم کو تمہارے سارے حالات بتا دیتے ہیں اور تمہارے دلوں کی اندرونی کیفیات سے مطلع کر دیا ہے اس لیے اب تمہاری کسی بات کو بالکل نہ مانیں گے۔

وحی تو صرف ذات نبوت کی طرف آتی ہے پھر اس موقع پر جمع کے صیغے کے ساتھ یہ کہنا کہ اللہ نے ہمیں تمہارے احوال کا پتہ دے دیا ہے اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ اللہ نے پیغمبر کو حکم دیا ہے کہ یہ بات صحابہ کو بھی بتا دیجئے تا کہ ان جھوٹے عذر پیش کرنے والوں کی علی روس الاشہاد رسوائی ہو اور لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ اس معاملہ میں سربراہ پوری جماعت کی نمائندگی کر رہا ہے۔ آپ کا بولنا ہی سب کا بولنا ہے اور پوری جماعت میں کسی کو اس معاملہ میں اختلاف نہیں ہے۔

اس تعبیر سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ ان منافقین کے تمام اعذار بھی باردھ کے ناقابل قبول ہونے کی اصل علت یہ تھی کہ ان کا پردہ خود اللہ سبحانہ نے اٹھا دیا تھا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سوا چونکہ کسی کا یہ درجہ نہیں ہے کہ وہ کسی کے بارے میں اللہ کے بتائے ہوئے علم غیب کا دعویٰ کر سکے اس وجہ سے وہ اس طرح کے معاملات میں صرف حالات اور شرعی دلائل کی بنا پر ہی کوئی حکم لگائیں گے۔ اگر کسی عذر کی کسی بیان کی تردید کے لیے کوئی عقلی یا نقلی دلیل نہیں ہے۔ تو بہرحال تسلیم کیا جائے گا۔ اگرچہ وہ فی الحقیقت کیسا ہی بے سر و پا ہو ہم ہر اس شخص کو مسلمان تسلیم کریں گے جو ایمان و اسلام کا دعویٰ کرتا ہے اگر ہمارے پاس اس کے ایمان و اسلام کا دعویٰ کرتا ہے اگر ہمارے پاس اس کے ایمان و اسلام کے انکار کی کوئی شرعی دلیل نہیں ہے اسی لیے شریعت و قانون میں الہام دلی حجت نہیں ہے مگر مجتہد اور قانون دان کا عقل و نقل پر مبنی اجتہاد حجت ہے

اسلام کی اصلی شہادت عمل ہے

اس کے بعد فرمایا وسیری الله عملکم ورسوله یعنی باتیں بنانے بہانے گھڑنے اور جھوٹی قسموں کو سپر بنانے کی ضرورت نہیں ہے اپنے عمل سے راستبازی اور وفاداری کا ثبوت دو اللہ و رسول تمہارے عمل کو دیکھیں گے یعنی اسلامی نظام اور مملکت تمہارے احوال کا یہاں مطالعہ کرے گی۔ اور آئندہ مملکت میں تمہارے اعمال ہی کے مطابق تم سے معاملہ کیا جائے گا۔ یہ تعبیر قرآن میں اسلامی مملکت کے لیے دی ہے وہ جب بتانا چاہتا ہے کہ اسلامی مملکت کے وفادار اور تابعدار بن کر رہو تو انداز بیان یہی ہوتا ہے اطیعوا الله ورسوله اسلامی مملکت سے بے وفائی اللہ و رسول سے بے وفائی ہے۔ مگر یہ بات ذہن میں رکھئے کہ

اسلامی مملکت اور مسلم مملکت میں جوہری فرق ہے۔ یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ اسلام کوئی جسم و جان رکھنے والی چیز نہیں ہے کہ وہ اپنے اس مطلوبہ اقتدار کو خود اپنی کوششوں سے حاصل کرے گا اور حاصل کرنے کے بعد اسے اپنے ہاتھوں میں رکھے گا بلکہ یہ سب کچھ اپنے پیروؤں کے ذریعے ہی انجام پائے گا۔ وہی اس اقتدار کو حاصل کرنے کی کوشش کریں گے اور وہی اسے حاصل کرنے کے بعد اپنے ہاتھوں میں رکھیں گے اور اس لیے وہ ہی لوگ اسلام کے سچے پیرو ہوں گے مگر بڑا فرق ہے اس اقتدار میں جو مسلمانوں کو اپنے لیے مطلوب ہو اور اس اقتدار میں جو انہیں اصلاً اسلام کے لیے مطلوب ہو۔ پہلی قسم اقتدار حکومت مسلم اقتدار ہوتا ہے اور دوسری قسم اسلامی اقتدار ہوتا ہے۔ قرآن میں وہ اگر دنیا ہے تو یہ دین ہے وہ اگر شر ہے تو یہ سر تا سر خیر ہے، وہ اگر دنیا کا بگاڑ ہے تو یہ دنیا کا سنگار ہے۔ اسی بنا پر اگر ایک طرف قرآن نے اہل ایمان کی یہ تعریف کی لا یریدون علوا فی الارض ولا فسادا وہ زمین میں سربلندی اور فساد نہیں چاہتے ہیں۔ تو دوسری طرف ان کو مخاطب کر کے یہ بھی فرمایا ہے کہ انتم الاعلون ان کنتم مومنین۔ مطلب یہ ہے کہ جو علو اور سربلندی اپنے لیے ہوتی ہے وہ دراصل سرکشی اور جباریت ہوتی ہے۔ دنیا کو خرابیوں سے بھر دیتی ہے اور جو سربلندی اور برتری اسلام کے لیے ہوتی ہے وہ سراپا خیر اور رحمت ہوتی ہے کوئی شک نہیں کہ اقتدار کی یہ دونوں قسمیں مسلم حکومت اور اسلامی حکومت ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ اگرچہ بادی النظر میں دونوں ہی اقتدار ہیں۔ اور دونوں مسلمانوں کے ہاتھوں میں ہوتے ہیں مگر ایک کی حیثیت مقدس امانت کی اور ایک بھاری ذمہ داری کی ہے جبکہ دوسرے کی حیثیت ذاتی ملکیت کی ہے۔ ظاہری نگاہیں سطح کر دیکھ کر دھوکہ کھا سکتی ہیں لیکن اہل نظر پر اتنا بڑا اور بنیادی فرق چھپا نہیں رہ سکتا۔ وہ محسوس کر سکتے ہیں کہ اگرچہ شاہین اور کرگس کی پرواز بظاہر ایک ہی فضا میں ہوتی ہے مگر دونوں کا جہان فی الواقع ایک نہیں ہوتا۔ بتایا یہ جا رہا تھا کہ فسیری اللہ عملکم و رسولہ کا مقصود یہ بتانا ہے کہ اس دنیا میں تمہارے طرز عمل کو اسلامی حکومت دیکھے گی اور اسی کے مطابق تم سے اس دنیا میں سلوک کیا جائے گا دنیا میں ہمیشہ رہنا نہیں ہے۔ جہان سے بہرحال جانا ہے وہاں یعنی آخرت میں کیا ہو گا۔ ثم تردون الی عالم الغیب والشہادۃ فینبئکم بما کنتم تعملون۔ پھر اس کی طرف لوٹائے جاؤ گے جو ظاہر و پوشیدہ ہر طرح کی باتیں جاننے والا وہی تم کو بتلائے گا کہ دنیا کی زندگی میں کیا کرتے رہے ہو۔ ارشاد میں اگر ایک طرف یہ رہنمائی ہے کہ ایسی تمام کوتاہیوں اور گناہوں سے دامن کو داغدار نہ ہونے دو جن کیلئے معذرت پیش کرنی پڑے۔ تو دوسری طرف یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ علم باری اعمال ظاہری اور باطنی جن کا احاطہ کئے ہوئے ہے اس کے علم کی گرفت

سے کوئی چیز باہر نہیں ہے اور غیب کو شہادت سے پہلے شاید اس لیے لاتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کے علم کی نسبت چھپا اور کھلا ایک ہے۔ وجہ بالکل صاف ہے کہ اللہ سبحانہ کا معلومات سے تعلق حصولی نہیں ہے بلکہ ہر چیز کا ہر علم الٰہی میں ہے۔ علامہ آلوسی نے یہاں یہ بات اپنے مخاطبوں کو خوب سمجھائی ہے کہ !

"اشیا سے علم الٰہی کی تحقیق علم و دانش کی درسگاہوں میں مشکل ترین اور پیچیدہ مسائل میں سے ہے اس میدان میں بڑے بڑے شہسواروں کے قدم پھسل گئے ہیں۔"

آخر میں کنتم تعملون لا کر جتا دیا کہ یہ جتنا نہیں ایک بار برائی کرنے کی نہیں بلکہ برائیوں پر مداومت اور تکرار کی ملے گی۔ منشا یہ ہے کہ یہ تمہارے اعمال کا ناگزیر نتیجہ ہے یا بالسببیہ ہے یعنی تمہارے گوناگوں اعمال اور ان پر مداومت اس کا سبب بنے ہیں۔ جب دنیا دار اسباب ہے تو یہ کیوں کر ہو سکتا ہے کہ اعمالِ انسانی اس سے باہر ہوں بما کنتم تعملون کا فقرہ بتا رہا ہے کہ اعمال کے بھی وہ ہی احکام و نتائج ہیں جو اشیا کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ مادیات کے خواص کی طرح معنویات کے بھی خواص ہیں۔ اور خواص و نتائج کا ایک ہی عالمگیر قانون سب جگہ کام کر رہا ہے۔ نفاق۔ کفر۔ اخلاق سیئہ اعمالِ بد کے نتائج کا بھی وہ قانون ہے جو عالم مادیات میں آگ پانی کا ہے آگ کا خاصہ جلانا ہے ایسا کبھی نہیں ہو سکتا کہ آگ روشن ہو اور اس کے شعلوں سے ٹھنڈک نکلے۔ ٹھیک اسی طرح اعمال کے بھی خواص و آثار ہیں اور خواص و نتائج کا ایک ہی عالمگیر قانون یکساں طور پر کام کر رہا ہے

جھوٹی قسمیں کھانے والوں سے اعراض

۱۰۰ مسلمانو! جب تمہاری ان کی طرف واپسی ہوگی وہ ضرور تمہارے روبرو اس لیے قسمیں کھائیں گے کہ تم ان سے درگذر کرو ہاں تم ان سے درگذر کرو بے شک یہ لوگ گندے ہیں۔ ان کے کرتوتوں کے بدلے میں ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ تبوک سے واپسی کے بعد منافقین جھوٹی قسمیں کھا کر جو عذر پیش کرتے تھے اس کی غرض یہ تھی کہ پیغمبر اور مسلمانوں کو اپنی قسموں اور ملمع سازیوں سے راضی و مطمئن کریں تاکہ بارگاہ رسالت سے ان پر کوئی عتاب و ملامت اور دار و گیر نہ ہو۔ سابق کی طرح یوں ہی معاملہ ابہام میں رہے۔ مسلمان اس سے کوئی تعرض نہ کریں۔ حق تعالیٰ نے فرمایا کہ بہتر ہے کہ تم ان سے تعرض مت کرو لیکن یہ اغماض و تغافل تعرض نہ کرنا۔ راضی و مطمئن ہونے کی بنا پر نہیں بلکہ ان کے نہایت پلید اور شریر ہونے کی وجہ سے بھی یہ لوگ اس قدر گندے ہیں کہ ان کے پاک و صاف ہونے کی کوئی توقع نہیں رہی۔

لہذا اس غلاظت کی پوٹ کو دور پھینک دینا اور اس سے علیحدہ رہنا ہی بہتر ہے خدا نخواستہ کہیں وہ تمہیں بھی آلودہ نہ کر دے۔ [1]

آیت میں سب سے پہلی بات یہ جاننے کی ہے کہ اس آیت میں لفظ انقلاب آیا ہے جبکہ پہلی آیت میں رجعتم رجوع سے آیا ہے۔ یہ تعبیرات اس بات کی تائید کر رہی ہیں کہ سورۃ براءۃ کا یہ حصہ تبوک سے واپس ہوتے وقت سفر میں نازل ہوا تھا۔ اس میں ایک بلند آہنگ پیش گوئی ہے جو حرف بحرف پوری ہوئی۔ تبوک سے واپسی ہونے کے وقت ہی راستہ میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو ان تمام واقعات سے مطلع فرما دیا جو کہ اہل نفاق کی جانب سے بطور معذرت پیش آنے والے تھے۔ یہ بات اور زیادہ وزنی ہو جاتی ہے جب اس پس منظر میں اس کا مطالعہ کیا جائے کہ ان منافقین کی ذہنی افتاد یہ تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس سفر سے بخیر و عافیت لوٹنے والے نہیں ہیں۔ اسی لیے سفر سے واپسی کا بار بار ذکر کیا ہے۔

دوسری بات یہ بھی ذہن میں رکھنے کی ہے لتعرضوا عنھم فاعرضوا عنھم کی تعبیر میں اعراض کا تکرار اپنے اندر گہری معنویت رکھتا ہے پہلے اعراض کے معنے یہ ہیں کہ ان سے تعرض نہ کرو۔ دوسرے اعراض کا مطلب ہے کہ صرف درگذر نہ کرو بلکہ تم ان کو منہ ہی نہ لگاؤ۔ کوئی تعلق نہ رکھو اور سمجھ لو کہ وہ تمہارے نہیں اور تم ان کے نہیں ہو مطلب یہ ہے کہ وہ قسمیں اس لئے کھائیں گے کہ تم ان سے تعرض نہ کرو یعنی ان کے نہ جانے پر کوئی ڈانٹ ڈپٹ نہ کرو لیکن تمہیں ان سے واقعی کنارہ کش ہو جانا چاہیے۔ یعنی ان سے ہر قسم تعلقات کو ختم کر دینا چاہیے مقاتل نے یہ بات اسی انداز کلام سے سمجھی ہے لاتجالسوھم ولا تکلموھم نہ ان کے پاس بیٹھو اور نہ ان سے بات کرو۔ گویا اعرضوا عنھم ان کے معاشرتی تعلقات ختم کرنے کی ہدایت ہو رہی ہے۔ اس کی علت یہ بتائی گئی ہے انھم رجس یہ قطعاً ناپاک ہیں۔ نجاست معنوی ہے۔ ان سے تمہیں دور رہنا چاہیے ایسا نہ ہو کہ اس کی گندگی سے تمہارا پاک دامن گندا ہو جائے۔ آخر اگر احتیاط نہ کی جائے تو صاف کپڑے پر کوئی نہ کوئی چھینٹا پڑ ہی جاتا ہے۔ اس تفصیل سے یہی بات سمجھی جا رہی ہے کہ اس آیت میں قرآن اہل ایمان کو ان منافقین کے معاشرتی قطع تعلقات کا حکم دے رہا ہے۔

کچھ بزرگوں نے یہ مطلب بتایا ہے کہ یہ منافقین قسمیں اس لیے کھا رہے ہیں تاکہ اے مسلمانو تم ان سے پوچھ گچھ نہ کرو۔ لہذا اے مسلمانو تم ان سے روگردانی ہی کرو۔ اور ان کو اس معاملہ پر کچھ نہ کہو۔ ان کو کچھ کہنے اور ملامت کرنے سے کوئی فائدہ نہ ہو گا کیونکہ یہ لوگ ناپاک اور گندے ہیں۔ گندگی میں طہارت قبول کرنے کی صلاحیت ہی نہیں

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوتی ہے۔

پہلے مطلب کی صورت میں ان کی روحانی گندگی اور نجاست کی وجہ سے ان سے قطع تعلقات کا حکم ہے اور دوسرے مطلب میں ان کی اصلاح کے خیال سے دست بردار ہونے کی تلقین ہے۔

آیت کے آخر میں ان اعمال کی آخرت میں جزا بتائی ہے کہ بالآخر ان کو اپنے منافقانہ کردار اور اخلاقی رذائل کی سزا ضرور ملے گی۔ مادیات کی طرح معنویات میں بھی تسبیب کا قانون کام کر رہا ہے یعنی جہنم کا سبب ان کے بداعمال ہوں گے بما کانوا یکسبون میں بار سببیہ ہے۔

اصل چیز رضائے الٰہی ہے

۱۰۱ وہ تمہیں خوش کرنے کے لیے تمہارے سامنے قسمیں کھاتے ہیں اگر تم ان سے خوش ہو ہی جاؤ گے تو اللہ ان بدکار لوگوں سے خوش نہ ہوگا بڑی کوشش یہ ہے کہ مکر و فریب اور کذب و دروغ سے خوش کریں فرض کیجئے کہ اگر چکنی چپڑی باتوں سے مخلوق راضی ہو جائے تو کیا نفع پہنچ سکتا ہے جبکہ خدا ان سے راضی نہ ہو۔ خدا کے آگے کوئی چالاکی اور دغا بازی نہیں چل سکتی۔ گویا متنبہ فرمادیا کہ جن لوگوں سے خدا راضی نہ ہو کوئی مومن قانت کیسے راضی ہو سکتا ہے۔ لہذا جھوٹی باتوں سے پیغمبر اور ان کے ساتھیوں کو خوش کر لینے کا خبط انہیں دماغوں سے نکال دینا چاہیے۔ اگر ان کے ساتھ تغافل و اعراض کا معاملہ کیا گیا ہے تو یہ اس کی دلیل نہیں ہے کہ مسلمان ان سے خوش اور مطمئن ہیں۔ حضرت شاہ صاحب کہتے ہیں کہ جس شخص کا حال معلوم ہو کہ منافق ہے اس کی طرف سے تغافل روا ہے۔ لیکن دوستی و محبت و یگانگت روا نہیں ہے۔

نفاق جب طبیعتوں میں جڑیں بنا لیتا ہے تو اس کی ایک خاص علامت یہ بن جاتی ہے کہ وہ اللہ کے بجائے اللہ کے بندوں کی رضا جوئی میں لگ جاتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ یہ منافقین اپنے اعذار باردہ پر قسمیں اس لیے کھاتے ہیں کہ تم ان سے راضی ہو جاؤ اور ان سے جیسا پہلے برتاؤ کرتے تھے ویسے ہی حالات جاری رکھو لیکن مسلمانو تمہیں یہ بات سمجھ لینی چاہیئے کہ تمہارے راضی ہونے سے اللہ سبحانہ راضی نہ ہوگا۔ اس لیے تمہاری رضامندی ان کے لیے سودمند نہیں ہے۔ اور کچھ شارحین قرآن نے رضا کو کنائی زبان میں تلبیس کے معنے میں لے کر مطلب یہ بتایا ہے کہ اگر ان منافقین کے لیے جھوٹی قسمیں کھا کر تمہیں دھوکہ دینا ممکن ہے اور تمہیں اس طرح راضی کر سکتے ہیں تو ان کے لیے اللہ سبحانہ کو دھوکہ دے کر راضی کرنا ممکن نہیں ہے۔ لیکن علامہ آلوسی اس مطلب کو خلاف ظاہر

ؒ افادات شیخ الاسلام

بنایا ہے۔ علامہ نسفی نے اس آیت میں یہ نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ مومنین کی رضامندی اللہ سبحانہ کی رضامندی کو مستلزم نہیں ہے۔ اور الجصاص نے لکھا ہے کہ فقہاء نے اس آیت سے یہ بات سمجھی ہے کہ قسم کے بعد قبول عذر لازمی نہیں ہے۔

یہ انداز تعبیر دراصل اس لیے اختیار کیا گیا ہے کہ مسلمان ان کے جھوٹے عذروں سے دھوکہ میں پڑ کر ان سے راضی نہ ہوں یعنی مسلمانو تم ان سے قطعاً راضی نہ ہو۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں والمقصود من الایۃ النھی عن الرضا عنھم آیت کا مطالبہ صرف یہ ہے کہ مسلمان ان سے راضی نہ ہوں۔ آخر میں فان اللہ لا یرضی عن القوم الفاسقین لا کر بتا دیا کہ راضی نہ ہونے کی علت ان کا فسق اور طاعت نہ کرنا ہے۔ اب جو بھی ان سے راضی ہوگا۔ وہ بھی جادہ طاعت سے ہٹ جائے گا۔ حاصل یہ ہے کہ تمہارا راضی ہونا ان کے لیے سودمند نہیں ہے بلکہ خود تمہارے لیے نقصان ہوگا کہ تم بھی اللہ سبحانہ کی مخالفت کرنے والوں میں ہو جاؤ گے۔

اَلْاَعْرَابُ اَشَدُّ كُفْرًا وَّ
نِفَاقًا وَّاَجْدَرُ اَلَّا يَعْلَمُوْا حُدُوْدَ مَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ عَلٰى رَسُوْلِهٖ ؕ
وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۹۷ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يَّتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ
مَغْرَمًا وَّيَتَرَبَّصُ بِكُمُ الدَّوَآئِرَ ؕ عَلَيْهِمْ دَآئِرَةُ السَّوْءِ ؕ وَ
اللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ۝۹۸ وَمِنَ الْاَعْرَابِ مَنْ يُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ
وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَيَتَّخِذُ مَا يُنْفِقُ قُرُبٰتٍ عِنْدَ اللّٰهِ وَ
صَلَوٰتِ الرَّسُوْلِ ؕ اَلَاۤ اِنَّهَا قُرْبَةٌ لَّهُمْ ؕ سَيُدْخِلُهُمُ اللّٰهُ فِيْ ع ۱۰
رَحْمَتِهٖ ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۹۹

ان دیہاتیوں میں کفر ونفاق (شہریوں کے مقابلے میں) زیادہ ہے اور یہ لوگ اللہ کی نازل کردہ رسول پر قوانین سے زیادہ بے خبر و ناآشنا ہیں اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے (آیت ۹۷)۔ ان میں ایسے لوگ بھی ہیں کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اپنے اوپر تاوان سمجھتے ہیں اور تم پر وقت کے حوادث کا انتظار کر رہے ہیں۔ بری گردش ان پر ہی پڑنے والی ہے۔ اللہ سننے والا جاننے والا ہے (آیت ۹۸)۔ اور کچھ دیہاتی ایسے بھی ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ کو اللہ سے قرب اور نبوت کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ آگاہ رہو کہ یہی چیز ان کے لیے اللہ سے قرب کا ذریعہ ہے۔

اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے

مفردات کے معانی

الاعراب، گنوار، بدو، دیہاتی، علامہ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد عرب ہے اور اعراب دراصل اسی کی جمع ہے جو بادیہ نشینوں کا علم ہو گیا۔ لیکن مجد الدین فیروز آبادی نے قاموس میں تصریح کی ہے کہ اعراب بادیہ نشین عربوں کو کہتے ہیں۔ اس کا واحد نہیں ہے جمع اعاریب آتی ہے۔ اور بصائر ذوی التمیز میں علامہ موصوف رقمطراز ہیں کہ عرب کا اسم نسبت عربی ہے شہریوں کو عربی کہتے ہیں۔ عرب اسم جنس ہے خالص عرب کو العرب العاربہ بولتے ہیں۔ اعراب بادیہ نشینوں کو کہتے ہیں۔ اعراب عرب کی ایسی جمع نہیں ہے جیسے انباط انبط کی جمع ہے۔ اعرب بحجتہ کے معنے ہیں اس نے اپنے موقف کو بڑی بے باکی سے پیش کیا اور کسی سے نہیں ڈرا علامہ شوکانی فتح القدیر میں رقمطراز ہیں کہ اعراب صحراؤں میں سکونت پذیر لوگوں کو کہتے ہیں۔ اس کے برخلاف لفظ عرب عام ہے کیونکہ اس کا استعمال ان تمام انسانوں کے لیے عام ہے جو ریگستان عرب کے باشندے ہوں۔ سیبویہ نے کہا ہے کہ اعراب صیغہ جمع تو ہے مگر لفظ عرب کی جمع نہیں ہے۔ نیساپوری کہتے ہیں کہ اہل لغت رجل عربی اس شخص کو کہتے ہیں جس کا نسب عرب کی طرح ثابت ہو جیسے مجوس مجوسی، یہود سے یہودی ہے ایسے ہی عرب عربی کی جمع ہے۔ جب کسی اعرابی کو یا عربی کہہ کر بلایا جاتا ہے تو وہ خوشی سے پھول جاتا ہے اور کسی عربی کو یا اعرابی کہا جائے تو وہ غصہ سے تپنے لگتا ہے۔

اجدر ۔ جدر سے اسم تفضیل ہے۔ اصل میں جدر کے معنے نمایاں اور ظاہر ہونے کے ہیں درخت پر پتوں کی نمود ہو جانے سے بولتے ہیں جدر الشجر زمین سے گھاس اگ جائے تو اسے جدر کہتے ہیں اور اجدرت الارض بولتے ہیں۔ بچے کے چیچک نکل دے جدر الصبی بولتے ہیں جدر یجدر باب کرم سے آتا ہے اس کے معنے قابلیت میں حسن میں نمایاں ہونے کے آئے ہیں اسی سے جدیر لائق اور قابل کے معنے میں آتا ہے اسی سے یہ اجدر ہے اسی سے فعل تعجب ما اجدرہ واجدر بہ آتا ہے۔

مغرم ۔ غرم سے مفعل کے وزن پر ہے۔ دوام اور ہمیشگی کے معنے میں ہلاکت و عذاب دائمی ہو غرام کہلاتا ہے ان عذابھا کان غراما۔ غرم۔ مغرم اور غرامہ وہ تاوان جس کی ادائیگی لازمی ہو۔ غارم مقروض کو کہتے ہیں۔ مغرم اسیر محبت کو کہتے ہیں۔

دائرۃ یہ لفظ یا تو کاذبۃ اور عافیۃ کے وزن پر مصدر ہے اور مراد دور ہے اسم فاعل ہے۔ علامہ خفاجی لکھتے ہیں کہ نحبت اور اس مصیبت کے معنے میں ہے جو آدمی کی زندگی کا گھیراؤ کرے۔ اسی سے دائرہ خط محیط کو کہتے ہیں۔۔۔۔۔

علامہ مجدالدین فیروزآبادی نے بصائر ذوی التمیز میں یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ جیسے محبوب پسندیدہ حالت کے لیے دولۃ بولا جاتا ہے ایسے ہی ناگوارا ور غیر پسندیدہ کے لیے دائرہ بولا جاتا ہے۔

قربات: یہ قرب یقرب سے قربۃ کی جمع ہے تقرب اور نزدیکی کو بھی کہتے ہیں اور تقرب کے ذریعے اور وسیلے کو بھی کہتے ہیں۔ قاضی بیضاوی نے اسے وسیلے کے معنے میں لیا لیکن عام شارحین قرآن نے قرب کے معنے بتلائے ہیں۔

شہریوں اور بدؤں کا ایمانی موازنہ

ان آیات میں بدوی عربوں سے مراد وہ دیہاتی اور صحرائی عرب ہیں جو مدینے کے اطراف میں آباد تھے۔ یہ لوگ مدینے میں ایک مضبوط اور منظم طاقت کو اُٹھتے دیکھ کر پہلے تو مرعوب ہوئے۔ پھر اسلام اور کفر کی آویزشوں کے زمانے میں ایک مدت تک موقع شناسی اور ابن الوقتی کی روش پر چلتے رہے۔ پھر جب اسلامی حکومت کا اقتدار حجاز اور نجد کے ایک بڑے حصے پر چھا گیا اور مخالف قوتوں کا زور اس کے مقابلہ میں ٹوٹ گیا تو ان لوگوں نے وقت کا تقاضا یہی سمجھا کہ دائرہ اسلام میں داخل ہو جائیں۔ لیکن ان میں کم لوگ ایسے تھے جو اس دین کو دینِ حق سمجھ کر سچے دل سے ایمان لائے ہوں۔ اور مخلصانہ طریقوں سے اس کے تقاضوں کو پورا کرنے پر آمادہ ہوں۔ بیشتر اعراب کے لیے قبولِ اسلام کی حیثیت ایمان و اعتقاد کی نہیں بلکہ محض مصلحت اور پالیسی کی تھی۔ ان کی خواہش یہ تھی کہ ان کے حصے صرف وہ مادی فوائد آجائیں جو جماعت مقتدرہ میں داخل ہونے سے حاصل ہوتے ہیں۔ مگر وہ اخلاقی ذمہ داریاں جو اسلام ان پر عائد کرتا تھا وہ نماز کی پابندی جو اسلام میں داخل ہونے کے بعد ان پر لگ جاتی تھی۔ وہ زکوٰۃ جو باقاعدہ سرکاری انتظام سے ان کے نخلستانوں اور ان کے جانوروں سے وصول کی جاتی تھی وہ جماعتی نظم وضبط حکومت جس کے شکنجے میں وہ اپنی تاریخ میں پہلی مرتبہ کسے گئے تھے۔ وہ جان ومال کی قربانیاں جو اسلام کی برتری کے لیے ان سے طلب کی جا رہی تھیں۔ یہ ساری چیزیں ان کو ناگوار تھیں۔ وہ ان سے پیچھا چھڑانے کے لیے ہر طرح کی چالبازیاں اور بہانہ سازیاں کرتے تھے۔ ان کو اس سے کچھ بحث نہ تھی کہ حق کیا ہے انہیں جو کچھ دلچسپی تھی وہ اپنے معاشی فوائد، اپنی آسائش اپنی زمینوں اپنے اونٹوں اور بکریوں

اور اپنے خیمے کے آس پاس کی محدود دنیا کیلئے تھی وہ ایسے ایمان واعتقاد کے لیے بالکل تیار نہ تھے جوان کی پوری تمدنی معاشی اور معاشرتی زندگی کو اخلاق وقانون کے ضابطہ میں کس دے اور مزید براں ایک عالمگیر اصلاحی مشن کے لیے ان سے جان ومال کی قربانیوں کا بھی مطالبہ کرے ۔

۱۰۲ ان دیہاتیوں میں کفر ونفاق شہریوں کے مقابلے میں زیادہ ہے اور یہ لوگ رسول پر اللہ کے نازل کردہ قوانین سے شہریوں کے مقابلے میں زیادہ بے خبر ہیں۔ اللہ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ یہاں تک مدینہ کے منافقین اور مومنین مخلصین کے حالات بیان ہوتے ہیں۔ اب کچھ حال دیہاتی بدوؤں کا ذکر کرتے ہیں کہ ان میں بھی کئی طرح کے آدمی ہیں کفار، منافقین اور مخلص مسلمان۔ چونکہ دیہاتی لوگ عموماً قدرتی طور پر تندخو اور سخت مزاج ہوتے ہیں۔ جیسا کہ حدیث میں ہے من سکن البادیہ جفا ۔ اور مجالس علم وحکمت سے دور رہنے کی وجہ سے تہذیب وشائستگی کا اثر اور علم وعرفان کی روشنی بہت کم قبول کرتے ہیں اس لیے ان کا کفر ونفاق شہری کفار ومنافقین سے زیادہ ہوتا ہے ان کو ایسے مواقع دستیاب نہیں ہوتے کہ اہل علم و صلاح کی صحبت میں رہ کر دیانت وتہذیب کے وہ قانون اور قاعدے معلوم کریں جو اللہ سبحانہ نے پیغمبر علیہ السلام پر نازل کئے۔ علم ومعرفت ہی وہ چیز ہے جو انسان کے دل کو نرم کرتی ہے اور مہذب بناتی ہے جو لوگ اس قدر جہالت میں غرق ہیں ضرور ہے کہ ان کے سخت دل ہوں اور کفر ونفاق کے جس راستے پر پڑجائیں۔ بہائم اور درندوں کی طرح اندھا دھند پڑتے چلے جائیں۔ اعراب کی سنگدلی کا ذکر متعدد احادیث میں آیا ہے۔ ایک حدیث میں ہے کہ کسی اعرابی نے حضورؐ سے عرض کیا کہ آپ لوگ اپنے بچوں کا پیار لیتے ہیں۔ خدا کی قسم میں نے اپنی اولاد کا کبھی پیار نہیں لیا۔ فرمایا میں کیا کروں! کہ اگر خدا نے تیرے دل میں سے اپنی رحمت کو نکال لیا ہے آخر میں فرمایا ہے واللہ علیم حکیم

یعنی اس کا علم بنی آدم کے تمام طبقات پر محیط ہے۔ وہ اپنی حکمت سے ہر ایک طبقہ کے ساتھ اس کی استعداد وقابلیت کے موافق معاملہ کرتا ہے حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ اعراب کی طبیعت میں بے حکمی غرض پرستی اور جہالت شدید ہوتی ہے۔ سو اللہ حکمت والا ہے ان سے وہ مشکل کام بھی نہیں لیتا ہے اور درجے بھی بلند نہیں دیتا ہے سلہ

اس آیت میں شہریوں اور دیہاتیوں کا ایمانی تقابل پیش کیا گیا ہے اور بتایا ہے کہ ایمان کی حد تک

سلہ افادات شیخ الاسلام

شہریوں کے مقابلہ میں ایمان کی نعمت دیہاتیوں میں کم ہے یعنی کفر و نفاق میں ان کا حصہ زیادہ ہے۔ مطلب یہ ہے کہ شہریوں کی بہ نسبت یہ اعراب دیہاتی اور بدوی لوگ زیادہ منافقانہ رویہ رکھتے ہیں۔ اور حق سے انکار کی کیفیت ان کے اندر زیادہ پائی جاتی ہے۔ اس کی وجہ قرآن میں اللہ سبحانہ نے یہ بتائی ہے کہ شہری لوگ تو اہل علم اور اہل حق کی صحبت سے مستفید ہو کر اللہ کو اور اس کی حدود کو جان لیتے ہیں۔ مگر یہ بدوی چونکہ ساری ساری عمر بالکل ایک معاشی حیوان کی طرح شب و روز رزق کے چکر میں پڑے رہتے ہیں۔ اور حیوانی زندگی کی ضروریات سے بلند تر کسی چیز کی طرف توجہ کرنے کا ان کو وقت ہی نہیں ملتا ہے اس لیے دین اور اس کی حدود سے ان کے ناواقف رہنے کے امکانات زیادہ ہیں۔

دراصل اس سے پہلی آیات میں نفاق کے بارے میں عمومی گفتگو تھی۔ شہری اور دیہاتی کی کوئی تفصیل نہ تھی۔ ان آیات میں خصوصیت کے ساتھ شہریوں کے ساتھ دیہاتیوں کا ذکر کیا ہے اور عام قاعدہ ہے کہ آدمی جس قدر علما اور عقلا کی صحبت سے بیگانہ ہوگا اسی قدر بے علمی میں زیادہ ہوگا۔ آیت میں اعراب سے عربی مراد نہیں بلکہ عرب کے دیہاتی مراد ہیں اور یہ عرب کے دیہاتی کی خصوصیت نہیں بلکہ پوری دنیا کے دیہاتیوں کی یہ خصوصیت ہے۔ ہمارے مشہور مورخ ابن خلدون نے اعراب کو عربی سمجھ کر پورے عرب کی یہ خصوصیت بنا ڈالی کہ وہ تمدن و تہذیب اور شہریت سے بیگانہ ہوتے ہیں۔ گویا بدویت عرب کی کوئی خاص نشانی ہے۔ حالانکہ صورتحال یہ نہیں ہے عرب کا لفظ ہر عربی کے لیے بولا جاتا ہے۔ جبکہ اعراب صرف بدویوں کو کہتے ہیں۔ عرب میں دیہاتی اور شہری ہوتے ہیں جیسے دنیا کی ساری قوموں میں ہوتے ہیں۔ اور دیہاتیوں کے بارے میں جو یہ فرمایا ہے۔ اجدر ان لا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ یہ امر واقعہ کا اظہار ہے۔ شہری زندگی میں بھی جو لوگ اہل علم اور اہل علم کی صحبت سے بیگانہ ہوتے ہیں وہ شہری ہو کر بھی دین سے ویسے ہی بے خبر ہوتے ہیں۔

آیت کے مفہوم سے یہ بات سمجھی جا رہی ہے کہ دین سے باخبر ہونے اور واقف ہونے کیلئے اصل چیز اہل علم کی صحبت ہے۔ علم دراصل اہل علم کی صحبت سے آتا ہے اسی لیے نبوت کے تلامذہ اور مسترشدین کو صحابہ کہا ہے یعنی ان میں علم کے سارے کمالات نبوت کی صحبت سے آئے ہیں۔ الجصاص نے آیت سے یہ بات خوب سمجھی ہے کہ:

لوگ قرآن کو کم سنتے تھے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس رہنے کا ان کو موقع کم ملتا تھا۔ اس لیے دین سے نا آشنا اور بے خبر تھے۔

علامہ آلوسی نے یہ بات بہت خوب لکھی ہے کہ سب کا نہیں۔ کچھ کا حکم ہے اور کچھ بھی وہ کفر و نفاق میں شہریوں سے زیادہ ہیں جن کو علمی مجالس میں آنے کا موقعہ نہیں ملتا ہے۔ یہ ایسا ہی حکم ہے کان الانسان کفورا یعنی کچھ

کی ناشکری ہے یہاں پوری انسانی جنس کو کفور قرار دیا ہے۔ ایسے ہی یہاں بھی ہے آگے دیہاتیوں کی تقسیم اسی کی دلیل ہے۔

اعراب کی اسلام دشمنی

۱۰۳ ان میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں کہ جو کچھ خرچ کرتے ہیں اسے اپنے اوپر تاوان سمجھتے ہیں۔ اور تم پر وقت کے حوادث کا انتظار کر رہے ہیں بُری گردش ان پر ہی پڑنے والی ہے اللہ سننے والا جاننے والا ہے یعنی اعراب منافقین میں وہ لوگ ہی نہیں جنہیں اگر کسی وقت خدا کے راستے میں کچھ خرچ کرنا پڑ جاتا ہے تو ایسی کراہیت سے خرچ کرتے ہیں جیسے کوئی جرمانہ اور تاوان ادا کرتا ہو۔ وہ ابھی تک اس کے منتظر ہیں کہ مسلمان حوادث دہر سے کسی گردش اور آفت میں پھنس جائیں تو ہم خوب شادیانے بجائیں۔ یہ خبر نہیں کہ ان کی بھی قسمت گردش میں رہتی ہے اسلام تو غالب اور فائق ہو کر رہے گا۔ اور یہ منافقین سخت ذلیل و رسوا ہوں گے۔ خدا ہر ایک کی باتیں اور دعائیں سنتا ہے اور جانتا ہے کہ کون عزت و کامیابی کا اہل ہے اور کون لوگ ذلت و رسوائی کے مستحق ہیں [۱]

اس سے پہلے مطلق دیہاتیوں کا تعارف تھا اب ان کی قسمیں بتائی جا رہی ہیں۔ کچھ اعرابی ایسے ہیں جو اگر اسلام کی راہ میں کچھ خرچ کرتے ہیں تو محض اس ڈر سے کہ سمجھتے ہیں کہ اس کے بغیر چارہ نہیں ہے اور یہ خرچ کرنا ان کے لیے ایسا ہے جیسے کوئی ناگواری سے جرمانہ بھرے۔ وہ اس انتظار میں رہتے ہیں کہ مسلمانوں پر کوئی مصیبت آپڑے تو ان پر الٹ پڑیں۔ غزوہ تبوک کے موقعہ پر انھوں نے سمجھا ہوگا کہ رومیوں کے مقابلہ میں مسلمان کب ٹھہر سکتے ہیں اب ان کے دن ختم ہو رہے ہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ جب مدینے میں اسلامی حکومت وجود میں آگئی اور دیہاتی قبائل محض غلبہ سے حلقہ بگوش اسلام ہو گئے اور مسلمان ہونے کے بعد اسلامی حکومت کی جانب سے ان پر فرائض عائد ہوتے۔ ان میں تنہا ان فرائض نماز اور زکوٰۃ تھے اور یہی دونوں اسلام کی اجتماعیت کے ارکان تھے۔ وہ پراگندہ زندگی کے خوگر تھے اجتماعیت اور نظام وفاداری ان کے لیے ناقابل برداشت تھی جب ان سے زکوٰۃ وصول کی جاتی تو اسے یہ ایک جرمانہ سمجھتے مسافروں کی ضیافت اور مہمانداری کے حق کو وہ اپنے لیے چٹی تصور کرتے۔ اگر دفاع کے موقعہ پر کوئی چندہ دینے

[۱] افادات شیخ الاسلام

تو دلی جذبہ سے رضائے الٰہی کی خاطر نہ دیتے بلکہ بادل ناخواستہ اپنی وفاداری کا یقین دلانے کے لیے دیتے ہیں گویا اسلام اور اس کے نظام کے لیے ان کی بدخواہی کا حال یہ ہے کہ اول تو کھلے دل سے اسلامی نظام کی طاعت ہی نہیں کرتے اگر ظاہر یت کی وجہ سے کچھ کرتے ہیں تو ان میں اس کے لیے گرانی ہوتی ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ ان کی ہر وقت تمنا یہ ہے کہ اسلام کے نام پر بنا ہوا یہ سیاسی ڈھانچہ کسی طرح ختم ہو جائے اور ان کی جان چھوٹے علیھم دائرۃ السوء یہ تمہارے لیے وقت کی غلط کروٹ کے منتظر ہیں۔ حالانکہ گردش ان پر ہی پڑنے والی ہے شارحین اس فقرے کی تشریح میں مختلف الرائے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ یہ جملہ انشائیہ ہے اور بددعا ہے اور کچھ کہتے ہیں کہ جملہ خبریہ ہے۔ قاضی بیضاوی، علامہ آلوسی اس کو جملہ انشائیہ بتا رہے ہیں اور بددعاء کہتے ہیں زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ جملہ خبریہ ہے اور ان کے بارے میں مستقبل میں ہونے والے واقعات کی خبر ہے قرآن کی عادت یہی ہے کہ وہ منافقوں اور مجرموں والے الفاظ ان ہی پر الٹ دیتا ہے اور عملاً یہ پیشین گوئی لفظ بہ لفظ پوری ہو کر رہی۔ اسلام کی فتح مندیوں میں وسعت ہوتی گئی۔ منافقین کی حسرتیں دل ہی میں رہیں۔ ہر طرح ذلیل و خوار ہوتے۔ آیت سے یہ پہلو بھی نکلتا ہے کہ حاسد خود ہی گرفتار بلا ہوتے ہیں۔

اعراب میں مخلصین اور راستباز

۱۰۴ اور کچھ دیہاتی ایسے ہیں جو اللہ اور آخرت پر ایمان رکھتے ہیں اور راہ خدا میں خرچ کو اللہ سے قرب اور نبوت کی دعاؤں کا ذریعہ سمجھتے ہیں آگاہ رہو کہ یہی چیز ان کے لیے قرب کا ذریعہ ہے۔ اللہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ بلاشبہ اللہ بخشنے والا مہربان ہے۔ یہاں قرآن حکیم کی معجزانہ تاثیر اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کا حیرت انگیز کرشمہ دکھلایا ہے کہ ان میں درشت مزاج، سنگدل تندخو گنواروں میں جو کفر و نفاق اور جہل و طغیانی کی وجہ سے اس لائق ہی نہ تھے کہ خدا کے بتلائے ہوئے ادب اور قاعدے سمجھ سکیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم اور قرآن کریم کی آواز نے ایسے عارف اور مخلص افراد پیدا کر دیئے جو مبدأ و معاد سب چیزوں پر ایمان رکھتے ہیں اور اللہ سبحانہ کی راہ میں جو کچھ خرچ کرتے ہیں خالص قرب الٰہی حاصل کرنے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعائیں لینے کی غرض سے کرتے ہیں حق تعالیٰ شانہ نے ان کو بشارت دی کہ بے شک وہ اپنی امیدوں میں حق بجانب ہیں۔ یقیناً ان کو وہ چیز مل کر رہے گی جس کی نیت کی ہے۔ یعنی قرب الٰہی اور اللہ سبحانہ ضرور ان کو اپنی رحمت میں جگہ دے گا۔

رہی پیغمبر علیہ السلام کی دعا، اسے تو وہ اپنے کانوں سے سنتے اور آنکھوں سے دیکھتے ہیں کہ جب کوئی صدقہ

وغیرہ لے کر آتا ہے تو حضور اس کو دعائیں دیتے ہیں حضور کی اس دعاء کا ثمرہ بھی وہ ہی رحمت و قرب الٰہی ہے جس کا وعدہ پہلے ہو چکا ہے۔ [1]

عام شارحین قرآن نے تو آیت کی یہی تشریح کی ہے کہ یہ دیہاتی اہل ایمان راہ خدا میں خرچ کرنے کو اللہ کے قرب اور حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعاؤں کے حاصل ہونے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس صورت میں صلوات الرسول کا عطف ماینفق پر نہیں بلکہ قربات پر ہے اور مطلب ہے کہ یہ اہل ایمان راہ خدا میں خرچ کرنے کو اللہ کے قرب اور حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کی دعاؤں کے حاصل ہونے کا ذریعہ بناتے ہیں۔ اس صورت میں لفظ سبب محذوف ماننا پڑے گا۔ گویا ان مومنین کا انفاق دو چیزوں کا ذریعہ ہوتا ہے

ایک اللہ سے قرب کا ذریعہ ہوتا ہے۔

دوسرے رسول کی دعائیں حاصل ہونے کا ذریعہ ہوتا ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ صلوات الرسول کا عطف ماینفق پر کہا جائے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ مومنین اپنے انفاق اور رسول کی دعاؤں کو اللہ سبحانہ کے قرب کا ذریعہ بناتے ہیں۔ مطلب دونوں صحیح ہیں اور مآل دونوں کا ایک ہے لیکن انداز تعبیر دوسری صورت سے زیادہ ہم آہنگ ہے۔ اہل تراجم نے بھی پہلی صورت کو شرف پذیرائی دیا ہے اور ہم نے بھی ترجمہ میں اس کی رعایت کی ہے۔

بہر حال اس آیت میں بتا دیا گیا ہے کہ ان اعراب میں سے وہ بھی تھے۔ جن کا ذکر ہو چکا ہے اور یہ بھی ہیں جن کا چہرہ اس آیت میں پیش ہو رہا ہے فرمایا کہ ان اعراب میں سچے اور پکے مسلمان بھی ہیں جو اللہ اور یوم آخرت پر مضبوط ایمان رکھتے ہیں۔ اللہ سبحانہ کی راہ میں خرچ کرنے کو وہ منافقین کی طرح تاوان نہیں سمجھتے بلکہ اپنے انفاق کو اللہ سبحانہ کے قرب اور رسول کی دعاؤں کے ملنے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔ اس سے پہلی آیات یعنی پارہ دہم میں حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) کو منافقین کے لیے دعاء کرنے سے منع کر دیا ہے۔ اس آیت میں اشارۃ بتا دیا گیا کہ ایمان میں جس کھوٹ کی وجہ سے ان کے لیے دعاء سے روکا گیا تھا۔ ایمان میں وہ کھوٹ ان میں بالکل نہیں ہے بلکہ یہ سچے اور پکے مومن ہیں۔ ان میں طاعت رسول کی بھرپور سرشاریاں ہیں اور اللہ سے قرب حاصل کرنے کے لیے وہ راہ خدا میں جان و مال کی بازی لگاتے ہیں۔ ان کے یہی اعمال ان کے لیے رسول کی دعاؤں کو اپنی طرف کھینچ لاتے ہیں۔ اور رسول کی دعاؤں سے مالا مال ہیں۔ ان لوگوں نے اسلام کے سیاسی نظام کو دل و جان سے قبول کیا ہے اور اسلامی حکومت کے واجبات کو خوشدلی اور ایمانی امنگ کے ساتھ ادا کرتے ہیں اور زندگی کے کسی گوشہ میں اسلامی نظام سے سرکشی نہیں کرتے ہیں ایسا نہیں ہے کہ مانتے ہیں قرآن کو خدا کی کتاب اور محمد مصطفےٰ (صلی اللہ علیہ وسلم) کو اللہ کا رسول اور مقدمات

[1] افادات شیخ الاسلام

کے فیصلے کے لیے جاتے ہیں طاغوت کی عدالت میں یریدون ان یتحاکموا الی الطاغوت اور نہ ایسا ہے کہ مانتے ہیں اسلام کو مگر اسلام کے سیاسی نظام کے عائد کردہ مالی واجبات کو تاوان اور جرمانہ سمجھتے ہیں۔ بلکہ ان کے ایمان میں بھرپور اخلاص ہے۔ ان کو اللہ کا قرب حاصل ہے اور انکے لیے اللہ کے رسول کی دعائیں ہیں۔ گویا ان کی اسلام کے لیے وفاداریاں ہر قسم کے شک و شبہ سے بالاتر ہیں۔ آیت میں ایمان نفاق کا مقابل ہونے کی وجہ سے بمعنے تصدیق نہیں بلکہ بمعنے اخلاص ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے الا انھا قربۃ لھم عام شارحین قرآن نے ضمیر کا مرجع ینفق میں انفاق بتایا ہے لیکن علامہ خازن نے ضمیر کا مرجع صلوات کو قرار دیا ہے مطلب یہ ہے کہ حضور کی دعائیں ان کے لیے قرب الٰہی کا ذریعہ ہیں۔ اگر ضمیر کا مرجع ان کا اللہ کی راہ میں جان مال کا خرچ کرنا ہو۔ تو اس صورت میں یہ ان کے اخلاص اسلام سے وفاداری اور اسلام کے سیاسی نظام کی مخلصانہ طاعت کے لیے اللہ سبحانہ کی شہادت ہے۔ سب اعمال ایمانی کا حاصل اور لب لباب اللہ کا قرب ہے اللہ سے قرب مکانی اور جسمانی نہیں ہوتا اللہ کی ذات جسم و مکان سے پاک ہے اللہ سے قربت اور صرف یہ ہے کہ بندہ اس کی بندگی کرے پرستش کرے عبادت کرے طاعت کرے۔ اس کو یاد کرے۔ اسلام میں ساری عبادات کا مآل قرب الٰہی ہے۔ بندے کی جانب سے عبادت ہو طاعت ہو یاد ہو تو اللہ کی جانب سے بندے پر یہ انعام ہوتا ہے۔ سیدخلھم اللہ فی رحمتہ ان اللہ غفور رحیم اللہ ان کو ضرور اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ اللہ کی رحمت میں داخل کرنے کا مطلب نہیں ہے کہ صرف آخرت میں جنت کی نعمتوں سے نوازا جائے گا بلکہ فاتاھم اللہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الاخرۃ کے مطابق اہل ایمان کو دنیا کے انسانوں کی ہدایت کا ذریعہ بنایا جائے گا اور ان سے امامت کا کام لیا جائے گا پارہ دس میں پڑھ چکے ہو یبشرھم ربھم برحمۃ منہ رحمت میں داخل کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ تمہیں صرف انفرادی زندگی میں نہیں بلکہ تمہیں قانونی اخلاقی سیاسی اور عائلی زندگی کے تمام گوشوں اجتماعی طور پر رحمت میں داخل کرے گا۔

پہلی آیت میں وعید کو واللہ سمیع علیم یعنی اللہ سبحانہ ان کے ارادوں کو جانتا ہے اور ان کی باتوں کو سن رہا یہاں فرمایا کہ ان اللہ غفور رحیم۔ رحمت میں اس لیے داخل کرے گا کہ اللہ سبحانہ کی ذات غفور رحیم ہے۔ غفور پہلے یہ بتلانے کے لیے آیا ہے کہ اولاً تمہارے گناہوں کو بخشے گا پھر تم پر اپنی رحمت نازل فرمائے گا یا یہ بتانے کے لیے پہلے لایا گیا ہے کہ رحمت کے راستہ میں جس قدر رکاوٹیں ہیں ان سے تمہاری حفاظت فرمائے گا اور تمہیں اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔ اللھم اجعلنا منھم۔

پارہ نمبر ۱۱

تقابلی مطالعہ

یہاں بھی اعراب کا تذکرہ ہے اور سورہ فتح میں بھی اعراب کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہاں ان کا تذکرہ غزوہ تبوک کے سلسلے میں ہوا ہے اور سورہ فتح میں ان کا قصہ صلح حدیبیہ کے پیش نظر بیان کیا گیا ہے اور دونوں جگہ منافقین کے تذکرے کے بعد مخلصین اہل ایمان کا تفصیلی تذکرہ کیا ہے۔ یہاں عنوان ہے السابقون الاولون اور وہاں عنوان ہے لقد رضی اللہ عن المومنین اور پورے دو رکوع سورت کے آخر تک ان مخلصین اہل ایمان کا چہرہ پیش کرنے ان کے مناقب بیان کرنے ان کے مقام تقویٰ اور نظام محبت کو واضح کرنے کے بعد تورات وانجیل تمثیلات کے ذریعے ان کا تعارف پیش کیا ہے۔

یہاں اعراب کی دو قسمیں بتائی ہیں ایک وہ ہیں جو راہ مولیٰ میں خرچ کرنے کو تاوان سمجھتے ہیں اور اپنی بزدلی کی وجہ سے مسلمانوں پر زمانے کی گردش کا انتظار کر رہے ہیں۔ اس کے ساتھ ان اعراب میں وہ بھی ہیں جو صحیح معنے میں اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتے ہیں۔ اور اس وجہ سے وہ ذکر الٰہی اور فکر آخرت کی نعمت سے مالا مال ہیں۔ وہ راہ خدا میں جو کچھ بھی خرچ کرتے ہیں اسے حق سبحانہ سے قرب ورضا کا اور حضور اقدس (صلی اللہ علیہ وسلم) سے دعائیں حاصل ہونے کا ذریعہ سمجھتے ہیں۔

بلاریب راہ خدا میں دی گئی چیز جسے دینے والا اللہ کے قرب کا ذریعہ بنا کر دے وہ اللہ سبحانہ سے قرب کا بہت بڑا مضبوط اور پائیدار ذریعہ ہے اس کے نتیجے میں اللہ سبحانہ ان کو ضرور اپنی رحمت میں داخل کرے گا۔

یہاں یہ نکتہ خاص طور پر سمجھنے کا ہے کہ اعراب کی کمزوریوں اور خوبیوں کے ذکر سے پہلے یہ لطیف بات بتائی ہے کہ اعراب میں جس قدر برائی دیکھی جارہی ہے اور ان برائیوں میں جس قدر شدت محسوس ہو رہی ہے اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ اعراب کا یہ طبقہ اپنی بدوی زندگی کی وجہ سے اسلام کے فکری، روحانی، معاشی اور سیاسی نظام سے قطعاً بے خبر ہے اور یہ بے علمی ان میں کمزوریوں کو جنم دیتی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ عمل علم کی پستانوں سے دودھ پی کر پلتا اور جوان ہوتا ہے بے خبر اور بے علم طبقے سے عمل کی محنت کی اور قربانیوں کی توقع بے معنے ہے۔ اشارۃً ارشادوں میں بتا دیا کہ کسی بھی نظام کیلئے قربانی کی پہلی شرط اس نظام کا نظام ماننے والوں میں علم ہے۔ آج بھی ہماری کمزوریوں، نافرمانیوں اور رسم ورواج کی بندگی کی اصل علت یہی ہے کہ ہم میں سے ... اگر اسلام کو مانتے ہیں تو ۹۹۹ اسلام کو جانتے ہی نہیں ہیں اس کے نتیجے میں آج بھی اگر ہم زکوٰۃ کو تاوان اور کار خیر میں خرچ کو ڈنڈ، نماز پڑھنے کو وقت کی اضاعت رمضان کے روزے

فاقہ اور حج بیت اللہ کو پکنک سمجھتے ہیں تو اس پر حیرت نہیں ہے لجدر ان لا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ کا ناگزیر تقاضا ہے اشد کفرا و نفاقا۔ اسلام ناآشنائی ناخدا شناسی اور خدا کی بغاوت کی جڑ اور اساس ہو تو اس اساس پر جو عمارت اٹھے گی۔ اس میں کفر و نفاق کی شدت ہی شدت ہو گی گذشتہ صدیوں سے مسلمانوں پر جو پست ہمتی بے حسی اور مرعوبیت چھائی ہوئی ہے جس نے مسلمانوں کی عملی قوتوں کو بری طرح مجروح کر دیا ہے اگر اس زمانے پر صرف کفر و نفاق کی طاقتوں کا غلبہ ہے اور اسلام و ایمان کا درخت مرجھا رہا ہے تو اس کی علت اسلام ناآشنائی کے سوا کیا ہے یہ اسلام ناآشنائی ہے کہ مسلمانوں کے عوام اور رہنماؤں میں سے مجاہدانہ زندگی کا ذوق اور راہ حق میں صعوبتیں برداشت کرنے کا حوصلہ کم ہونا شروع ہوا۔

قومی عروج و ترقی اور اجتماعی کامیابیوں کے اسباب کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مقصد کا شعور نظام سے آشنائی اور اس کے حصول کی طلب و آرزو وہ اصلی قوت ہے جو اقوام ملل کو کامیابی اور عظمت کی راہ پر لگاتی ہے۔ جماعت ہو یا فرد مقاصد کی آشنائی کی کشش اور اس کی جد و جہد کا جذبہ محرک ہے۔ مقصد ہی حیات ہے۔ انفرادی زندگی میں ہم روزانہ اس حقیقت کا مطالعہ کرتے ہیں کہ کامیابی اور عزت انہیں افراد کے حصے میں آتی ہے جو ابتداء سے کسی مقصد کا شعور رکھتے ہیں اور اس کے حصول کی خاطر زندگی کی دوسری دلچسپیوں کو قربان کرنے پر آمادہ رہتے ہیں وہ شخص جو مقصد سے آشنا نہیں اور اپنے مقصد کا پورا شعور نہیں رکھتا کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔

یہاں قرآن نے ان لا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ کہہ کر اس طرف اشارہ کیا ہے اور اپنے مخاطبوں کو سمجھایا ہے کہ جب تک اسلام کے ماننے والوں میں اسلامی شعور کی آبیاری نہ ہو گی ان سے اسلام کی برتری کی امید رکھنا عبث ہے۔

وَالسّٰبِقُوْنَ الْاَوَّلُوْنَ
مِنَ الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ وَالَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُمْ بِاِحْسَانٍ

پارہ نمبر ۱۱

رَّضِيَ اللَّهُ عَنْهُمْ وَرَضُوا عَنْهُ وَأَعَدَّ لَهُمْ جَنَّاتٍ تَجْرِي تَحْتَهَا
الْأَنْهَارُ خَالِدِينَ فِيهَا أَبَدًا ۚ ذَٰلِكَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١٠٠﴾ وَمِمَّنْ
حَوْلَكُم مِّنَ الْأَعْرَابِ مُنَافِقُونَ ۖ وَمِنْ أَهْلِ الْمَدِينَةِ ۖ
مَرَدُوا عَلَى النِّفَاقِ لَا تَعْلَمُهُمْ ۖ نَحْنُ نَعْلَمُهُمْ ۚ سَنُعَذِّبُهُم مَّرَّتَيْنِ
ثُمَّ يُرَدُّونَ إِلَىٰ عَذَابٍ عَظِيمٍ ﴿١٠١﴾ وَآخَرُونَ اعْتَرَفُوا بِذُنُوبِهِمْ
خَلَطُوا عَمَلًا صَالِحًا وَآخَرَ سَيِّئًا عَسَى اللَّهُ أَن يَتُوبَ عَلَيْهِمْ ۚ
إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿١٠٢﴾

اور وہ مہاجرین اور انصار جنھوں نے ایمان کی دعوت پر لبیک کہنے میں سب سے پہلے سبقت کی ہے۔ اور وہ لوگ جنھوں نے ان کی راست بازی کے ساتھ پیروی کی۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا۔ اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے۔ اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کیے ہیں جن کے نیچے نہریں بہہ رہی ہیں۔ وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے اور تمہارے اردگرد جو اعرابی رہتے ہیں ان میں سے خود مدینہ شہر کے کچھ منافق نفاق پر اڑے ہوئے ہیں تم ان کو نہیں جانتے ہو مگر ہم ان کو خوب جانتے ہیں۔ ہم ان کو دو بار سزا دیں گے۔ پھر ان کو سنگین عذاب کی

طرف لوٹایا جائے گا۔ اور کچھ اور بھی ہیں جنھوں نے اپنی غلطی کو مان لیا ہے انھوں نے ملے جلے کام کیے۔ کچھ اچھے، کچھ بُرے۔ ہو سکتا ہے کہ اللہ سبحانہ ان کی توبہ قبول فرمائے۔ اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے ؀۱۰

مفردات کے معانی

السابقون یہ سبق سے اسم فاعل کی جمع مذکر ہے اس کے معنے آگے پہنچنے والے آگے بڑھنے والے مجدالدین نے بصائر میں لکھا ہے۔ ضرب اور نصر دونوں سے آتا ہے چلنے میں آگے ہونے کے معنے میں سبق سے استباق اور تسابق ہے جس کے معنے مقابلہ میں ایک دوسرے سے آگے ہونے کے ہیں۔

الاولون یہ اول کی جمع مذکر سالم ہے۔ خلیل کی رائے میں اس کا مادہ ہمزہ واؤ اور لام ہے۔ اور کچھ کی رائے میں دو واو اور ایک لام ہے۔ پہلی صورت میں یہ اول سے مشتق ہوگا آل یؤول کے معنے لوٹنے کے ہیں اس کی اصل صفت ہے اوّل ادغام سے اول ہوگیا۔ یہ اصل میں صفت ہے مونث اولیٰ آتا ہے۔ امام راغب رح مفردات میں لکھتے ہیں لفظ اول کئی طرح استعمال ہوتا ہے تقدم زمانی جیسے عبدالملک اولاثم منصور تقدم رتبی جیسے الامیر اولاثم الوزیر تقدم نسبتی عراق سے مکہ کی طرف جانے والے سے آپ کہیں القادسیۃ ثم فید جیسے الاساس اولاثم البناء۔ حافظ ابن تیمیہ نے الاکلیل میں اس کی لطیف تحقیق فرمائی ہے کہ آل یؤول کے معنے لوٹنے کے ہیں۔ اسی سے مآل ہے اشتقاق کبیر میں لفظ موئل بھی بنا ہے۔ موئل کے معنے بھی لوٹنے کی جگہ کے ہیں۔ اور اشتقاق صغیر میں لفظ آل بھی اسی سے بنا ہے۔ اسی آل کے لیے ضروری ہے کہ مضاف الیہ مضاف سے زیادہ عظیم ہو۔ اسی سے اول افعل کے وزن پر ہے۔ اس کا مونث اولیٰ آتا ہے۔

اُمت کے بہترین طبقے

پہلے چونکہ اعراب میں مطلق اہل ایمان کا تذکرہ کیا تھا اس لیے اب ان مومنین کی فرق مراتب کے اعتبار سے قسمیں بتائی جارہی ہیں۔ اور یہ تقسیم ان کے ناموں اور اشخاص کے لحاظ سے نہیں بلکہ ان کے کاموں اور کردار سے۔

قرآن کا عام اسلوب یہ ہے کہ وہ اعیان واشخاص سے نظر ہٹا کر اعمال افکار اور اخلاق کو پیش کرتا ہے جن کے سہارے یہ اشخاص شخصیتیں بنتے ہیں اشخاص واعیان میں تو وہ صرف انبیاء و رسل کا ذکر کرتا ہے۔ باقی کے اشخاص کا نہیں بلکہ اعمال کا ذکر کرتا ہے۔ یہاں بھی ایمان، ہجرت، نصرت اور جہاد میں سبقت کرنے والوں اور ان کاموں میں اولیت کا شرف حاصل کرنے والوں کا ذکر کیا ہے۔ علامہ بقاعی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ

> اس سے پہلی امت میں چونکہ عام اہل ایمان کا تذکرہ تھا اور ان میں اولیت اور سبقت کے اعتبار سے فرق مراتب تھا۔ اس لئے پہلے یہاں سابقین کا اس انداز سے ذکر کیا ہے کہ شہری اور دیہاتی سب کو شامل ہو جائے۔

ایمان میں اگر صرف ایک ذمہ داری ہے اور وہ یہ کہ اپنے دین کی مخلصانہ طاعت کریں تو ہجرت میں اس عام ذمہ داری کے ساتھ اور ایک ذمہ داری کا بھی ذکر کر دیا ہے۔ اور وہ یہ کہ بیرونی دنیا کے سامنے اسلام کو پیش کرنا اس زندگی کا نصب العین ہے۔ اور یہ پیش کرنا اس طرح ہے جس طرح پیش کرنے کا حق ہے اور جس کا عملی نمونہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سامنے رکھا تھا۔ دراصل اس معاملہ میں صورت واقعہ ہے ہی یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اگرچہ پوری دنیا کے لیے اور قیامت تک کے لیے رسول ہو کر آئے تھے۔ لیکن اس عالمگیر دعوت کے دنیا میں قائم ہونے کی صورت اللہ سبحانہ نے یہ متعین فرمائی کہ آپ اپنا قائم مقام ایک ایسا گروہ بنا کر جائیں جو اپنے ایمان میں اتنا پختہ اور اپنے عمل میں اتنا معیاری ہو کہ رضائے الٰہی کے پیمانے پر پورا اتر سکے اور وہ آپ کے بعد آپ ہی کی طرح نبوت کے کام کو چلا سکے۔ چنانچہ جب عرب فوج در فوج دین کے حلقے میں داخل ہو گئے اور حضور اقدس کے صحابہ کا وہ مقدس گروہ وجود میں آگیا جو علم وعمل کے اعتبار سے رضائے الٰہی کا معیاری پیمانہ بنا تو آپ رحلت فرمائے دار بقا ہو گئے صلی اللہ علیہ وعلی آلہ و بارک وسلم۔ اور وہ مہاجرین و انصار جنہوں نے دعوت ایمان پر لبیک کہنے میں سب سے پہلے سبقت کی ہے۔ اور وہ لوگ جنہوں نے ان کی راستبازی کے ساتھ پیروی کی ہے۔ اللہ ان سے راضی ہو گیا اور وہ اللہ سے راضی ہو گئے اور اللہ نے ان کے لیے ایسے باغات تیار کئے ہیں جن کے نیچے نہریں بہ رہی ہیں وہ ہمیشہ ان میں رہیں گے۔ اور یہی بہت بڑی کامیابی ہے۔ اعراب مومنین کے بعد مناسب معلوم ہوا کہ زعماء اور داعیان مومنین کا کچھ ذکر کیا جائے۔ یعنی جن مہاجرین نے ہجرت میں سبقت واولیت کا شرف حاصل کیا اور جن انصار نے نصرت و اعانت میں پہل کی۔ غرض جن لوگوں نے قبول حق اور خدمت

اسلام میں جس قدر آگے بڑھ کر حصے لیے۔ پھر جو لوگ نکوکاری اور حسن نیت سے ان پیشروان اسلام کی پیروی کرتے رہے ان سب کو درجہ بدرجہ خدا کی خوشنودی اور حقیقی کامیابی حاصل ہو چکی ہے جیسے انہوں نے پوری خوشی اور انشراح قلب کے ساتھ حق تعالیٰ کے احکام تشریعی اور قضائے تکوینی کے سامنے گردیں جھکا دیں۔ اسی طرح خدا نے ان کو اپنی رضا و خوشنودی کا پروانہ دے کر غیر محدود انعام واکرام سے سرفراز فرمایا (تنبیہ) مفسرین سلف کے اقوال السابقون الاولون کی تعیین میں مختلف ہیں بعض نے کہا ہے کہ وہ مہاجرین وانصار مراد ہیں جو ہجرت سے پہلے مشرف باسلام ہوئے۔ بعض کے نزدیک وہ مراد ہیں جنہوں نے دونوں قبلوں کعبہ و بیت المقدس کی طرف نماز پڑھی۔ بعض کہتے ہیں کہ جنگ بدر تک مسلمان سابقین اولین ہیں۔ بعض حدیبیہ تک اسلام لانے والوں کو اس کا مصداق قرار دیتے ہیں اور بعض مفسرین کی رائے ہے کہ تمام مہاجرین وانصار اطراف کے مسلمانوں اور پیچھے آنے والی نسلوں کے اعتبار سے سابقین اولین ہیں۔ ہمارے اور پیچھے آنے والی نسلوں کے اعتبار سے سابقین اولین ہیں۔ ہمارے نزدیک ان اقوال میں تعارض نہیں ہے۔ سبقت و اولیت اضافی چیزیں ہیں۔ ایک ہی شخص یا جماعت جس درجہ میں سابق و اوّل ہوگی اسی قدر رضائے الٰہی اور حقیقی کامیابی سے حصہ پالے گی۔ کیونکہ سبقت و اوّلیت کی طرح رضا و کامیابی کے بھی بہت بہت مدارج بہت سے ہو سکتے ہیں[1]۔

جیسا کہ محشی علام نے بتایا ہے کہ شارحین قرآن السابقون الاولون کا خارج میں مصداق مقرر کرنے میں مختلف الخیال ہیں قتادہ کہتے ہیں وہ سب جنہوں نے قبلتیں کی طرف منہ کر کے نماز پڑھی عطار ابن ابی رباح کی رائے ہے وہ ہیں جو بدر میں شریک ہوئے اور شعبی کا خیال ہے کہ بیعت رضوان والے ہیں یہ تو مہاجرین کی حد تک اختلاف ہے۔ یہی حال انصار کے بارے میں ہے کچھ کہتے ہیں عقبہ اول میں بیعت کرنے والے ہیں یہ بعثت کے گیارہویں سال میں سات آدمیوں نے کی تھی۔ اور عقبہ ثانیہ میں بیعت والے ہیں ستر افراد پر مشتمل جماعت تھی اور یہ بیعت بعثت کے بارہویں سال ہوئی اور یا وہ لوگ مراد ہیں جو مصعب بن عمیر کی دعوت پر مسلمان ہوئے تھے۔

ہمیں یہاں امام رازی کی بات پسند آئی ہے کہ قرآن نے جس سبقت اور اولیت کا ذکر کیا ہے اس کا تعلق جب خود قرآن میں بطور وصف موجود ہے تو قرآن سے باہر اس کا متعلق تلاش کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن نے نمایاں طور پر دو وصف بتائے ہیں ایک ہجرت میں پیش پیش ہونے والے اور نصرت میں سبقت کرنے والے۔ یہ دونوں اسلام کی سربلندی کی تاریخ میں اساس کی حیثیت رکھتی ہیں۔

دنیا کی نظروں میں اسلام کے ظہور و اقبال کا دور مدینہ کی زندگی ہے لیکن قرآن کی نظر میں اس کی زندگی کا اصلی دور ہجرت اور نصرت سے وابستہ ہے۔ کیونکہ اس کی ساری قوتوں کی بنیادیں ہجرت و نصرت سے استوار ہوئی ہیں۔ بلاشبہ بدر کے ہتھیاروں نے اپنی غیر مسخر طاقت کا دنیا میں اعلان کر دیا لیکن جو ہاتھ ان ہتھیاروں کے قبضوں پر جمے تھے ان کو طاقت تو ہجرت و نصرت ہی نے فراہم کی تھی بلاشبہ مکہ کی فتح کی راہ کیسے ہموار ہوتی۔ یہ صحیح ہے کہ مکہ ہتھیاروں سے فتح ہوا ہے لیکن مدینہ ہتھیاروں سے نہیں بلکہ ہجرت اور نصرت کے مقدس اعمال سے ہوا ہے۔ لہذا اسلامی تاریخ کے سارے مظاہر کی روح ہجرت اور نصرت میں اسلامی ترقیوں کے سارے مظاہر اگر برگ و بار ہیں تو ہجرت و نصرت اسی کا تخم ہے مظاہر اگر ستون و محراب ہیں تو ہجرت و نصرت بنیادیں ہیں مظاہر کی حیثیت اگر صورت جسم کی ہے تو ہجرت و نصرت کی حیثیت حقیقت اور روح کی ہے مظاہر خواہ کتنے شاندار ہوں لیکن ہجرت و نصرت کو اولین بنیاد و استعداد کی عظمت حاصل ہے۔

مہاجرین میں سے السابقون الاولون یعنی مکہ کے وہ حق پرست جنہوں نے دعوت حق کی قبولیت میں سبقت کی اور سب سے پہلے ایمان لائے پھر صلح حدیبیہ سے پہلے اپنا گھر بار چھوڑ کر ہجرت کی۔ روایات میں ایمان کی بھی اولیت کی حد تک ایک سے زیادہ نام آئے ہیں کسی روایت میں ہے کہ خدیجۃ الکبریٰ سب سے پہلے ایمان لائی ہیں کسی میں ہے کہ علی مرتضیٰ سب سے پہلے ایمان لائے کسی روایت میں ہے کہ زید بن حارثہ نے پہل کی اور کسی میں ہے کہ ابوبکر سب سے پہلے مومن ہیں۔ تعارض کی صورت میں دو ہی صورتیں ہیں ترجیح دی جائے یا پھر مفاہمت کر دی جائے۔ حافظ ابن کثیر نے البدایہ میں لکھا ہے کہ امام ابوحنیفہ نے ان چاروں میں اس طرح مفاہمت کی ہے کہ مردوں میں سب سے پہلے ابوبکر عورتوں میں سب سے پہلے خدیجۃ الکبریٰ نوکروں میں سب سے پہلے زید بن حارثہ اور بچوں میں سب سے پہلے علی مرتضیٰ ایمان لائے یاد رہے کہ حضرت علی کی عمر دس سال سے زیادہ نہ تھی۔

حضرت ابوبکر ہجرت مدینہ میں ہی اسبق نہیں۔ جب حضور اقدس کو ہجرت کا حکم ہوا تب حضرت ابوبکر کو ساتھ لے کر غار ثور پہنچ گئے جو کہ مکہ سے تقریباً چند میل کے فاصلہ پر ایک پہاڑ ہے۔ یہاں آپ نے تین راتیں بسر کیں اور پھر مدینے روانہ ہو گئے۔ یہ تین راتیں حضرت ابوبکر نے کہ شمع نبوت کے پروانے جس عالم میں بسر کی ہونگی اس کا اندازہ وہی کر سکتا ہے جس نے عشق و محبت کا کچھ بھی ذائقہ چکھا ہو اللہ کا رسول غار میں پوشیدہ تھا دشمن سراغ میں تھا۔ ہر لحہ اندیشہ تھا کہ کہیں دشمن سراغ نہ پالے۔ ایسی حالت میں ظاہر

ہے کہ ابوبکر کے دل کے حزن و اضطراب کا کیا حال ہوگا۔ حضرت ابوبکر کو انفاق مال میں بھی اولیت کا شرف حاصل ہے تفصیل دیکھنی ہو تو ازالۃ الخفا کا مطالعہ کرو۔

آیت میں یہ اولیت اور اسبقیت حقیقی نہیں اضافی ہے سارے ہی مہاجرین کو ایمان و ہجرت میں سبقت حاصل ہے من تبعیضیہ نہیں بلکہ بیانیہ ہے انصار میں سے نصرت میں سابقون اولون مدینہ کے وہ حق شناس ہیں جنہوں نے علی الاعلان اس وقت جب کہ تمام جزیرہ عرب حضور اقدس کو جھٹلا رہا تھا اور خود اس کے اہل وطن اس کے قتل و ہلاکت کے درپے تھے۔ دعوت حق قبول کی اور عقبہ اولی ثانیہ میں بیعت کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ پہلی بیعت میں سات مرد تھے دوسری میں ستر مرد اور دو عورتیں تھیں۔ دوسری بیعت پہلی سے ایک برس بعد ہوئی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دوسری بیعت والوں کے ساتھ ابو زرارہ ابن مصعب کو بغرض تعلیم بھیج دیا تھا۔ کہ لوگ ان کے جانے پر ایمان لائے اور کچھ اس وقت جب خود آنحضرت نے ہجرت فرمائی۔

ان مہاجرین و انصار کے بعد وہ لوگ جو ان دونوں جماعتوں کے قدم بقدم چلے اگرچہ بعد میں آئے لیکن ان کا شمار بھی ان میں ہی ہوا چونکہ بعد کو ایمان لانے والوں میں بعض منافق اور کچے دل کے آدمی بھی تھے اس لیے باحسان کی قید لگا دی یعنی جنہوں نے راست بازی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔

دنیا میں جب کبھی سچائی کا ظہور ہوا ہے تو اس کا پہلا عہد ہمیشہ غربت و بے کسی کا رہا ہے اور ان ساری دنیوی ترغیبوں سے خالی رہا ہے جو کسی انسان کے دل کو مائل کر سکتی ہیں۔ پس جو نفوس قدسی اس وقت حق کا ساتھ دیتے ہیں ان کی حق شناسی حق پرستی کے درجہ تک کوئی نہیں پہنچ سکتا۔ کیونکہ وہ داعی حق کا پہلے پہل ساتھ دے کر خود بھی داعیان حق کے گروہ میں داخل ہو جاتے ہیں اور ان کی حق پرستی دنیا کے ہر طرح کے تاثرات سے یک قلم منزہ ہوتی ہے۔

تاریخ اسلام میں مہاجرین و انصار کا یہی مقام ہے اسی لیے السابقون الاولون سے زیادہ ان کے وصف میں کچھ کہنا ضروری نہ ہوا۔ کیونکہ یہاں اسبقیت و اولیت سے بڑھ کر اور کوئی بات نہیں ہو سکتی۔

یہی وجہ ہے کہ یہاں ان کا معاملہ ایسے پیرایہ میں بیان فرمایا جس سے بڑھ کر پیرایہ بیان عشاق حق کے لیے نہیں ہو سکتا رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ اللہ ان سے خوشنود ہوا وہ اللہ سے خوشنود ہوئے۔ سورہ مائدہ میں ان ہی کے لیے یہ پیش گوئی ہے یحبھم و یحبونہ اللہ ان سے محبت کرے گا وہ اللہ سے محبت کریں گے۔

آیت میں سبقت سے صرف یہ مراد نہیں ہے کہ زمانہ سابق میں ایمان لائے محض زمانہ کا مقدم ہونا شرعاً کوئی فضیلت نہیں رکھتا بلکہ سبقت سے مراد یہ ہے کہ شخص سابق بعد میں ایمان لانے والوں کے لیے سبب بنا ہے اور پورا اسلام کی علمی اور عملی زندگی ان کی وساطت اور نقل و روایت سے بعد میں آنے والوں کو حاصل ہوئی ہے۔ یہ صفت خصوصاً مہاجرین و انصار میں نمایاں ہے وہ تمام دنیا میں اسلام کی اشاعت کا سبب بنے۔ اسلامی تعلیمات انہیں کی نقل و روایت سے مابعد والوں کو ملیں بلکہ اصلی بات یہ ہے کہ بعد میں جس نے بھی اسلام قبول کیا۔ اس کے ایمان کی بنیاد انہی حضرات کی چشم دید گواہی پر ہے۔ ان ہی بزرگوں نے تمام دنیا میں اعلان کیا کہ ہم نے اپنی آنکھوں سے رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھا ان کے معجزات و دلائل کا مشاہدہ کیا ہے اور اسلام کو بلا واسطہ ان سے لیا ہے۔

اس آیت میں اور سورہ حشر کی آیت فیئ میں بہت زیادہ ہم آہنگی ہے آیئے پہلے آیت پڑھ لیجئے پھر دونوں کا تقابلی مطالعہ فرمایئے۔

للفقراء المهاجرين الذين اخرجوا من ديارهم واموالهم يبتغون فضلا من الله ورضوانا وينصرون الله ورسوله. اولئك هم الصادقون والذين تبوؤا الدار والايمان من قبلهم يحبون من هاجر اليهم ولا يجدون في صدورهم حاجة مما اوتوا ويؤثرون على انفسهم ولو كان بهم خصاصة ومن يوق شح نفسه فاولئك هم المفلحون.

یہ مال فیئ ان فقراء مہاجرین کے لیے جن کو اپنے گھروں اور سرمائے سے محروم کر دیا گیا۔ حالانکہ یہ لوگ اللہ کے فضل اور اس کی رضا کے متلاشی ہیں۔ ان کا مقصد زندگی اللہ و رسول کی مدد کرنا ہے یہی لوگ اپنے دعویٰ ایمان میں سچے ہیں —— اور یہ مال فیئ ان لوگوں کے لیے ہے جو اس گھر میں اور ایمان میں مہاجرین کی آمد سے پہلے جاگزین تھے۔ وہ ہر اس شخص سے محبت کرتے ہیں جو ان کے پاس ہجرت کر کے آئے اور نہیں پاتے اپنے دلوں میں کوئی خواہش اس چیز کی جو ان کو دی گئی اور ترجیح دیتے ہیں دوسروں کو اپنی جانوں پر اور اگرچہ خود ان کو تکلیف ہو۔ اور جو بھی اپنے آپ کو حرص سے بچا لیے جائیں وہ ہی بامراد اور کامیاب ہیں اور یہ مال فیئ ان لوگوں کے لیے ہے جو ان کے بعد آئیں کہیں اے ہمارے پروردگار بخش دے

ہم کو اور ہمارے ان بھائیوں کو جو ایمان میں ہم سے سابق تھے اور نہ یہ کہ ہمارے
دلوں میں کھوٹ ایمان والوں کے لیے اے ہمارے رب تو ہی نرمی کرنے والا
مہربان ہے۔

دونوں آیتوں کا تقابلی مطالعہ کیجئے۔

جن کو یہاں المہاجرون کہا ہے سورہ حشر میں ان کا تعارف للفقراء المہاجرین الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم یبتغون فضلا من اللہ ورضوانا وینصرون اللہ ورسولہ اُولائک ھم الصادقون کے ذریعے کرایا ہے اور جن کو یہاں الانصار کہا ہے سورۂ حشر میں ان کا چہرہ والذین تبوؤا الدار والایمان سے فاولٰئک ھم المفلحون کے ذریعے پیش کیا ہے ـــــ اور جن کا ذکر یہاں والذین اتبعوھم باحسان کے الفاظ میں کیا ہے سورۂ حشر میں ان کا تذکرہ والذین جاؤا من بعدھم سے ربنا انک رؤف رحیم تک کیا ہے۔

ان دونوں آیتوں کی ہم آہنگی سے دین اسلام کی چند بنیادی حقیقتیں بے غبار ہو کر سامنے آتی ہیں صحابہ کرام میں عدالت ہے۔ صحابہ کرام دنیا میں حق کا معیار اور کسوٹی ہیں۔ صحابہ کرام حضور اقدس کی نبوت کی دلیل ہیں۔

پیش نظر آیت میں اگر اجمال ہے تو سورہ حشر کی آیات میں اسی کی تفصیل ہے اس آیت میں جن کا تعارف السابقون الاولون فرمانے کے بعد صرف من المہاجرین سے کرایا ہے ان ہی کا چہرہ سورہ حشر میں اس طرح پیش کیا گیا ہے للفقراء اس کے ذریعے صرف یہی نہیں بتایا گیا ہے کہ یہ اموال غنیمت کے مستحق ہیں بلکہ یہ وصف اس لیے لائے تاکہ سننے والوں کو علم ہو جائے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو راہ محبوب میں سب کچھ تج کر چکے ہیں اس کی قدر وہی لوگ کر سکتے ہیں جن کا دل ذوق محبت سے آشنا ہو وہی جانتے ہیں کہ کوئی محبوب اپنے عاشق کو فقیر کہہ کر بلا دے تو اس میں کیا لذت ہے۔ پھر فقرا کہنے کے بعد فرمایا المہاجرین یعنی یہ وہ لوگ ہیں جنہوں نے راہ محبت میں قدم رکھنے کے بعد وہ سب کچھ چھوڑ دیا جو اس راہ میں رکاوٹ ہو سکتا تھا۔ صرف وطن نہیں چھوڑا اقتدار چھوڑا وقار چھوڑا کاروبار چھوڑا زندگی کا سکون چھوڑا۔ اس کے بعد فرمایا الذین اخرجوا من دیارھم واموالھم ان کو ان کے گھروں سے نکال کر ظالموں نے بے گھر بنا دیا اور ان کے سارے اموال سے ان کو محروم کر دیا گیا۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں ان مہاجرین نے گھر چھوڑے دولت و سرمائے

پرلات ماری۔ بیوی بچوں اور خاندان کو چھوڑ کر اللہ و رسول کی محبت میں قربانیاں دیں وقت کی ساری ناہمواریوں کے باوجود اسلام کو اپنایا۔ بھوک سے بے تاب ہوتے تو پیٹھ سیدھی رکھنے کے لیے پیٹ پر پتھر باندھ لیتے۔ سردی سے بچنے کے لیے گڑھوں میں پناہ لیتے ـــــ گویا یہ فقرہ لاکر بتادیا کہ وہ فقیر نہ تھے اگر وہ اسلام کے شیدائی نہ ہوتے تو ان کو کوئی گھر سے بے گھر نہ کرتا وہ فقیر نہ ہوتے مالدار اور سرمایہ دار ہوتے ان کے پاس گھر بھی تھا مال بھی تھا۔ یہ تو سب کچھ راہ عشق میں قدم رکھنے کے نتیجے میں ہوا کیونکہ ان کا پیش نہاد یہ اور صرف یہ تھا کہ یبتغون فضلا من اللہ و رضوانا یہ اللہ سبحانہ کی جانب سے گواہی ہے کہ ان مہاجرین کا نصب العین، ان کا مقصود صرف رضائے الٰہی کی جستجو اور تلاش تھی ترکیب نحوی کے لحاظ سے یہ جملہ حالیہ ہے مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ جو اپنے گھروں سے نکالے گئے ان کا جرم اس کے سوا کچھ نہ تھا کہ یہ اللہ سبحانہ کی رضا کے طالب تھے۔ اس کے بعد فرمایا وینصرون اللہ و رسولہ یہ لوگ کسی اقتدار کے خواہاں ہو کر کسی حکومت کی مدد کے لیے نہیں نکلے تھے دنیا کی علمی و تمدنی ترقیاں ان کا نصب العین نہ تھا۔ حیرت انگیز انکشافات اختراعات ایجادات دولت کی فراوانی، تجارت کی عالمگیری، نئی آبادیوں کا قیام ان کا پیش نہاد نہ تھا۔ ان کے پیش نظر یہ اور صرف یہ تھا کہ دنیا میں وہ نظام زندگی قائم ہو جو اللہ کی جانب سے اللہ کا رسول پیش کر رہا ہے۔ آخر میں قرآن نے ان مہاجرین کی زندگیوں کے ہر موڑ کے بارے میں یہ اعلان کیا کہ اولئک ھم الصادقون ان کی زندگی کی کسی شاخ میں صداقت کے سوا کچھ نہیں۔ ان کی روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی، معاشی سیاسی اور قانونی زندگی میں صداقت ہی صداقت ہے۔ صداقت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

آیت زیر تشریح میں الانصار فرما کر مہاجرین کے ساتھ انصار کا تعارف بھی کرایا تھا۔ سورہ حشر کی آیت میں الانصار کا جو چہرہ پوری قوت کے ساتھ پیش کیا گیا ہے وہ بھی گوش گذار فرمائیے۔ والذین تبوؤ الدار والایمان من قبلھم اور وہ لوگ جو ان مہاجرین کی آمد سے پہلے ہی مدینہ میں مقیم تھے۔ اس فقرے میں دار کے ساتھ الایمان لاکر بتا دیا کہ ان کے ایمان میں جماؤ اور مضبوطی تھی آگے فرمایا یحبون من ھاجر الیھم یہ لوگ آنے والے مہاجرین سے محبت کرتے ہیں ان میں باہم کوئی چشمک نہیں اس کے بعد فرمایا کہ ولا یجدون فی صدورھم حاجۃ مما اوتوا یعنی جناب رسالت سے مہاجرین کو جو کچھ دیا جاتا ہے اس سے انصار کے دل تنگ نہیں ہوتے بلکہ وہ نہایت سیر چشمی سے اپنی ضروریات پر ان کو ترجیح دیتے۔

پارہ نمبر ۱۱

آگے فرمایا دیوثرون علی انفسھم ولو کان بھم خصاصۃ وہ اپنی ذات پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں خواہ وہ اپنی جگہ محتاج ہوں اس کے بعد آخر میں ارشاد ہے ومن یوق شح نفسہ فاولئک ھم المفلحون اور واقعہ یہ ہے کہ جن کو دل کی تنگی سے بچا لیا جاتا ہے بس وہی بامراد اور کامیاب ہیں اس میں انصار کو زندگی کی ہر شاخ میں فلاح کی بشارت ہے۔

اس آیت میں انصار کا چہرہ پیش کیا ہے مہاجرین جب مکہ اور دوسرے مقامات سے ہجرت کر کے ان کے شہر میں آئے تو انہوں نے رسول اللہ کی خدمت میں یہ پیش کش کی کہ ہمارے باغ اور نخلستان حاضر ہیں آپ ان کو ہمارے اور ان مہاجر بھائیوں کے درمیان تقسیم کر دیجئے۔ حضور اقدس نے فرمایا کہ یہ لوگ تو باغبانی نہیں جانتے یہ اس علاقے سے آئے ہیں جہاں باغات نہیں ہیں۔ کیا ایسا نہیں ہو سکتا کہ اپنے ان باغوں میں کام تم کرو اور پیداوار میں سے حصہ ان کو دو۔ انہوں نے کہا سمعنا واطعنا اس پر مہاجرین نے کہا" ہم نے کبھی ایسے لوگ نہیں دیکھے جو اس درجہ ایثار کرنے والے ہوں۔ یہ کام خود کریں گے اور حصہ ہم کو دیں گے ہم تو سمجھتے ہیں کہ سارا ثواب یہی لے لینگے حضور نے فرمایا نہیں جب تک تم ان کی تعریف کرتے رہو گے۔ اور ان کے حق میں دعائیں کرتے رہو گے تم بھی برابر کے اجر و ثواب میں حصہ دار رہو گے۔ پھر جب بنی نضیر کا علاقہ فتح ہوا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اب ایک انتظامی شکل سامنے آگئی وہ یہ کہ تمہاری املاک اور یہودیوں کے چھوڑے ہوئے باغات اور نخلستانوں کو ملا کر ایک کر دیا جائے اور پھر اس پورے مجموعہ کو تمہارے اور مہاجرین کے درمیان تقسیم کر دیا جائے اور دوسری صورت یہ ہے کہ تم اپنی جائدادیں اپنے پاس رکھو اور یہ متروکہ املاک مہاجرین میں تقسیم کر دی جائیں۔ انصار نے عرض کیا کہ یہ جائدادیں آپ ان میں تقسیم کر دیں۔ اور ہماری جائدادوں میں سے بھی جو کچھ آپ چاہیں ان کو دے دیں۔ اس پر حضرت ابوبکرؓ نے کہا جزاکم اللہ خیرا یا معشر الانصار۔ اس طرح انصار کی رضامندی سے یہودیوں کے چھوڑے ہوئے اموال یوں تقسیم کیے گئے۔ اور انصار میں سے صرف حضرت ابودجانہ، حضرت سہل بن حنیف اور ایک روایت کے مطابق حضرت حارث بن الصمہ کو حصہ دیا گیا۔ کیونکہ یہ حضرات بہت غریب تھے اسی ایثار کا ثبوت انصار نے اس وقت دیا جب بحرین کا علاقہ اسلامی حکومت میں شامل ہوا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے تھے کہ اس علاقے کی مفتوحہ اراضی انصار کو دی جائیں۔ مگر انہوں نے عرض کیا کہ ہم ان میں سے کچھ نہ لیں گے۔ جب تک اتنا ہی ہمارے مہاجر بھائیوں کو نہ دیا جائے۔ انصار کا یہی وہ ایثار ہے جس پر اللہ سبحانہ

نے ان کی تعریف کی ہے اور صرف تعریف نہیں کی بلکہ ان کو مفلحون قرار دیا ہے۔

آپئے زیر تشریح آیت میں ان دو طبقوں مہاجرین وانصار کے بعد والذین اتبعوھم باحسان کا ذکر کیا ہے یعنی وہ لوگ جو ان دونوں جماعتوں کے قدم بقدم چلے اور اگرچہ بعد میں آئے لیکن ان کا شمار بھی پہلوں میں ہوا۔ سورہ حشر میں ان بعد میں آنے والوں کا بھرپور چہرہ اس طرح پیش کیا ہے والذین جاء و امن بعد ھم اور وہ لوگ جو ان مہاجرین وانصار کے بعد آئے یقولون ربنا اغفر لنا ولاخواننا الذین سبقونا بالایمان وہ کہتے ہیں اے ہمارے مالک ہمیں اور ہمارے ان سب بھائیوں کی بخشش فرمادے جو ہم سے پہلے ایمان لائے ہیں لا تجعل فی قلوبنا غلا للذین امنو اور ہمارے دلوں میں اہل ایمان کے لیے کوئی کھوٹ نہ رکھ۔

تفصیلات تو آپ انشاء اللہ معالم القرآن کی اٹھائیسویں جلد میں پڑھیں گے بحث کو سمیٹتے ہوئے صرف اتنی بات گوش گذار فرمالیجئے کہ

اولا مہاجرین کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ

(الف) وہ اللہ سبحانہ کے نہایت خالص اور مخلص بندے تھے ان کا اخلاص قطعاً بے غبار تھا۔ ان کا مقصد زندگی محض اللہ سبحانہ کی رضا و خوشنودی کی طلب وجستجو تھا۔ اور اس مقصد کی بجائی کی خاطر وہ ہر قسم کے نوازل، حوادث اور مصائب کا نشانہ بنے لیکن ہر حال میں وہ ثابت قدم رہے۔

(ب) یہ کہ وہ اللہ سبحانہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے مددگار تھے۔

(ج) یہ کہ وہ اپنے افکار اعمال اور اخلاق میں سرتاسر پیکر صدق تھے۔

ثانیا انصار کے بارے میں بھی تین باتوں کو واضح کیا گیا ہے۔

اول یہ کہ وہ مہاجرین سے محبت کرتے تھے۔

دوسرے یہ کہ وہ قلب کی طہارت اور صفائی کی ایسی تصویر تھے کہ حرص و حسد انکے قرب وجوار میں بھی نہ تھا۔

تیسرے یہ کہ وہ فلاح یاب اور بامراد تھے۔

مہاجرین وانصار کے بعد قیامت تک آنے والے مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ

(۱) وہ ان مہاجرین وانصار کا اتباع کریں اور بلا قید زندگی کے ہر گوشہ میں ان کے نقش قدم پر چلیں۔

(۲) مہاجرین وانصار کے مشکور ہوں کہ وہ دنیا میں ان کے لیے ذریعہ ہدایت بنے ہیں سب سے بڑا شکر یہ ہے کہ ان کے لیے دعا کریں۔

(۳) ایمان وعمل میں ان کی اقدمیت واسبقیت کو سراہیں اور اسلامی زندگی میں ان کی کاپی کریں۔

اسی لیے اہل السنۃ والجماعت کی عقائد کی کتابوں میں یہ بات بطور اساسی عقیدہ بتائی گئی ہے

ہم صحابہ کرام سے محبت کرتے ہیں اور کسی کی محبت میں نہ حد سے بڑھتے ہیں اور نہ کسی سے تبرا کرتے ہیں ہم ہر اس شخص سے دشمنی کرتے ہیں جو صحابہ کرام سے دشمنی کرتا ہے اور جو صحابہ کرام کا ذکر خیر نہیں کرتا۔ ہم صحابہ کرام کا ذکر خیر ہی کرتے ہیں۔ صحابہ کی محبت دین بھی ہے ایمان بھی اور احسان بھی اور ان سے بغض کفر نفاق اور طغیان ہے [۱]

اس عقیدے کی اساس قرآن کی یہی آیت ہے۔ حافظ ابن تیمیہ نے منہاج السنۃ میں یہ آیت اور سورۃ حشر کی آیات نقل کرنے کے بعد لکھا ہے کہ

یہ آیات مہاجرین وانصار اور ان لوگوں کی تعریف پر مشتمل ہیں جو مہاجرین وانصار کے بعد آئیں اور ان کے لیے استغفار کریں اور اللہ سے یہ دعا مانگیں کہ ہمارے دلوں میں کینہ نہ ہو ان آیات میں یہ تعریف ہے صحابہ کرام اور اہل السنۃ والجماعت کی جو صحابہ سے محبت کرتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے تین شرف

قرآن عزیز کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ صحابہ کرام میں سے مہاجرین وانصار کو ایمان میں جو اولیت اور اقدمیت کا شرف حاصل ہوا ہے۔ پوری امت کے اعمال حسنہ اور ایمان کو جمع کر لیا جائے تو اس کے گرد پا کو نہیں پہنچ سکے۔ اس آیت میں قرآن نے صرف اسی شرف کا ذکر نہیں کیا کہ یہ ایمان میں اولیت کا مقام رکھتے ہیں یہ تو منطوق قرآن سے ہے بلکہ یہ بھی اشارہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور مصاحبت کا جو شرف ان کو حاصل ہوا ہے۔ پوری امت کے اعمال حسنہ مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ ذرا سوچئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی نماز کی دو رکعتیں جن میں صحابہ کرام کو شرکت کی سعادت حاصل ہوئی کیا پوری امت کی نمازیں مل کر بھی ان دو رکعتوں کے ہم وزن ہو سکتی ہیں حضور اقدس صلی اللہ

[۱] عقیدہ طحاوی

علیہ وسلم کی دعوت پر جو کسی صحابی نے ایک سیر جو اللہ سبحانہ کے راستہ میں دیئے۔ اور بارگاہ نبوت سے اسے شرف پذیرائی ملا بعد میں آنے والے مسلمان اگر پہاڑ برابر بھی سونا خرچ کریں تو ان کو یہ شرف حاصل نہیں ہو سکتا۔ حضرت شیخ مجدد الف ثانیؒ نے اسی صورت حال کو اس طرح پیش کیا ہے۔

کوئی ولی کسی صحابی کے مرتبے کو نہیں پہنچ سکتا۔ اویس قرنی اپنی تمام تر بلندی شان کے باوجود چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے شرف صحبت سے مشرف نہیں ہیں اس لئے کسی ادنی صحابی کے مرتبہ کو نہیں پہنچ سکے کسی شخص نے امام حضرت عبداللہ بن مبارک سے دریافت کیا کہ حضرت معاویہ افضل ہیں یا حضرت عمر بن عبدالعزیز۔ فرمایا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی معیت میں حضرت معاویہ کے گھوڑے کی ناک میں جو غبار داخل ہوا وہ بھی عمر بن عبدالعزیز سے کئی گنا بہتر ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے رضی اللہ عنہم و رضوا اللہ سبحانہ ان سے راضی ہو گیا وہ اللہ سبحانہ سے راضی ہو گئے۔ اس میں بتایا ہے کہ ان مہاجرین وانصار کو ایک تو ایمان میں سبقت اور اولیت کا شرف حاصل ہے اور دوسرے ان کو حضور اقدس کی صحبت کا شرف حاصل ہے یہاں آخر میں بتایا جا رہا ہے کہ ان کو مقام رضوان حاصل ہے۔

مقام رضوان کیا ہے؟ یہی سمجھنے کی بات ہے ایمان وعمل میں ان کو اولیت حاصل ہے اور حضور اقدس کی رفاقت ومعیت کا ان کو شرف حاصل ہے اس شرف صحبت اور شرف اولیت سے بڑھ کر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ مدرسہ نبوت کے ایسے طالب علم تھے جن کے معلم وہادی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جن کا نصاب تعلیم ملاء اعلیٰ میں مرتب ہوا تھا جن کی تعلیم وتربیت کی نگرانی براہ راست وحی آسمانی کر رہی تھی۔ اور جن کا امتحان علام الغیوب نے لیا جب ان کی تعلیم وتربیت کا ہر پہلو سے امتحان ہو چکا تو حق تعالیٰ شانہ نے انہیں رضی اللہ عنہم کی بشارت دے کر آنے والی پوری انسانیت کی تعلیم وتربیت اور تلقین وارشاد کا منصب تفویض فرما دیا۔ اب شائد آپ کے ذہن میں یہاں یہ خلش ہو کہ یہ مقام تو صحابہ کو رضی اللہ عنہم کے ذریعہ حاصل ہو گیا لیکن اس کے بعد و رضوا عنہ میں کیا معنویت ہے یعنی اللہ کے خوش ہونے کا مطلب تو واضح ہو گیا مگر صحابہ کے خوش ہونے کا مطلب واضح نہیں ہوا۔ اس کا جواب حضرت مولانا ابوالکلام کی زبانی سنئے۔

شرح مقام ورضوا عنہ

آیت میں فرمایا رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ اللہ ان سے راضی ہو گیا وہ اللہ سے راضی ہو گئے اس آیت میں ورضوا عنہ قابل غور ہے اس پر کیوں زور دیا گیا۔ صرف یہ کہہ دینا کافی تھا کہ اللہ ان سے راضی ہوا یہ بات خصوصیت سے کیوں کہی گئی کہ وہ بھی اللہ سے راضی ہو گئے۔

اس لیے کہ ان کے ایمان واخلاص کا اصلی مقام بغیر اس کے نمایاں نہیں ہو سکتا تھا۔

انسان جب کبھی کسی مقصد کے لیے قدم اٹھاتا ہے اور مصیبتوں سے دوچار ہوتا ہے تو دو طرح کی حالتیں پیش آتی۔ کچھ لوگ جوان مرد اور باہمت ہوتے ہیں وہ بلا تامل ہر طرح کی مصیبتیں جھیل لیتے ہیں۔ لیکن ان کا جھیلنا جھیلنا ہی ہوتا ہے۔ یہ بات نہیں ہوتی کہ مصیبتیں ان کے لیے مصیبتیں نہ رہی ہوں، عیش وراحت ہو گئی ہوں کیونکہ مصیبت بہر حال مصیبت ہے۔ باہمت آدمی کڑوا گھونٹ بغیر کسی جھجک کے پی لیتا ہے لیکن اس کی تلخی کو ضرور محسوس کرے گا اور کچھ لوگ ایسے ہوتے ہیں جن کو صرف باہمت ہی نہ کہنا چاہیے بلکہ اس سے بھی کچھ زیادہ سمجھنا چاہیے۔ ان میں صرف ہمت وجواں مردی ہی نہیں ہوتی بلکہ عشق وشیفتگی کی حالت پیدا ہو جاتی ہے وہ مصیبتوں کو مصیبتوں کی طرح نہیں جھیلتے بلکہ عیش وراحت کی طرح ان سے لذت یاب ہوتے ہیں۔ راہ محبت کی ہر مصیبت ان کے لیے عیش وراحت کی ایک نئی لذت بن جاتی ہے۔ اگر اس راہ میں کانٹوں پر لوٹنا پڑے تو کانٹوں کی چبھن میں ان کو ایسی راحت ملے جو کسی کو پھولوں کی سیج پر لیٹ کر نہیں مل سکتی حتیٰ کہ اس راہ میں جس قدر مصیبتیں بڑھتی جاتی ہیں۔ اتنی ہی زیادہ ان کے دل کی خوشحالیاں بھی بڑھتی جاتی ہیں ان کے لیے صرف اس بات کا تصور کہ یہ سب کچھ راہ محبوب میں پیش آ رہی ہے اور اس کی نگاہیں ہمارے حال سے بے خبر نہیں ہیں عیش وسرور کا ایک ایسا بے پایاں جذبہ پیدا کرتا ہے کہ اس کی سرشاری میں جسم کی کوئی کلفت اور ذہن کی کوئی اذیت محسوس ہی نہیں ہوتی۔

سابقون الاولون کی محبت ایمانی کا یہی حال تھا۔ ہر شخص جوان کی زندگی کی سوانح کا مطالعہ کرے گا بے اختیار تصدیق کرے گا کہ انہوں نے راہ حق کی صرف مصیبتیں جھیلی نہیں بلکہ دل کی پوری خوشحالی اور روح کے کامل سرور کے ساتھ اپنی پوری زندگیاں ان میں بسر کر ڈالیں۔ ان میں سے جو لوگ اول دعوت میں ان پر شب وروز کی جانکاہیوں اور قربانیوں کے پورے ۲۳ سال گزر گئے لیکن اس تمام مدت میں کہیں سے بھی یہ بات دکھائی نہ دی کہ مصیبتوں کی کڑواہٹ ان کے چہروں پر کبھی نظر آئی ہو۔

انہوں نے مال و علائق کی ہر قربانی اس جوش و مسرت سے کی گویا دنیا جہاں کی تمام خوشیاں اور راحتیں ان کے لیے فراہم ہوگئی ہیں اور جان کی قربانیوں کا وقت آیا تو اس طرح خوش خوش گردنیں کٹوائیں۔ گویا زندگی کی سب سے بڑی خوشی زندگی میں نہیں بلکہ موت میں تھی۔ ان میں ایک بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنہوں نے اتنی عمریں نہیں پائیں کہ اسلام کی غربت کے ساتھ اسلام کا عروج و اقبال بھی دیکھ لیتے ——— تاہم جب دنیا سے گئے تو اس عالم میں گئے کہ ان سے زیادہ عیش و خوش حالی میں شاید ہی کسی نے دنیا چھوڑی ہو۔ بدر اور احد کے شہیدوں کے حالات پڑھو ایمان لانے کے بعد جو کچھ بھی ان کے حصہ میں آیا وہ بجز رات دن کی کاوشوں اور مصیبتوں کے اور کیا تھا اور پھر اس سے پہلے کہ اسلام کی فتح و کامرانیوں میں شریک ہونے کا موقعہ ملتا دشمنوں کی تلواروں سے مقتول میدان جنگ میں دم توڑ رہے تھے لیکن اس کے باوجود ان کے دل کی شادمانیوں کا کیا حال تھا۔ ایسے اطمینان و سکون کے ساتھ عیش و نشاط بستروں پر کسی نے جان نہ دی ہوگی جس طرح انہوں نے میدان جنگ کی ریتلی زمین پر لوٹ لوٹ کر دی۔ ورضوا عنہ میں اشارا اسی طرف ہے کہ اللہ اور اس کے کلمہ حق کی راہ میں جو کچھ بھی پیش آیا انہوں نے اسے جھیلا ہی نہیں بلکہ کمال محبت ایمانی کی وجہ سے خوشحال اور خوشنود ہے۔ اور یہی مقام ہے جو ان کے درجہ کو تمام مدارج و عمل میں ممتاز کرتا ہے۔

آئیے اس آیت پر شارحین قرآن کے علوم سے بھی استفادہ فرمایئے۔

حضرت مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں :

السابقون الاولون میں سب مہاجرین والانصار آگئے اور والذین اتبعوھم باحسان میں بقیہ اہل ایمان۔ جن میں اول درجہ تو ان کا ہے جو صحابہ ہیں گو مہاجرین والانصار نہیں۔ کیونکہ آخر میں ہجرت فرض نہ رہی تھی مسلمان ہو کر اپنے گھر رہنے کی اجازت تھی اور دوسرا درجہ تابعین بالمعنے الاصطلاحی کا ہے۔ پھر غیر صحابہ اور غیر تابعین کا پھر خود اس آخری درجہ میں تفاوت ہے کہ تبع تابعین افضل ہیں اور ان سے مقدم ہیں جس طرح صحابہ میں مہاجرین والانصار دوسرے صحابہ سے افضل ہیں۔ اور اولیت کا موجب فضل ہونا معاصرین سے تو اس لیے کہ معاصرین باوجود قدرت کے متاخر رہے اور غیر معاصرین سے اس لیے کہ وہ حضرات بانی اور ہادی ہو کر مصداق من سن سنۃ حسنۃ اور الدال علی الخیر کفاعلہ کے ہوئے۔ گو یہ غیر معاصرین زمانہ متقدمہ میں نہ ہونے کی وجہ سے ایمان پر قادر نہ تھے۔ اور جب فرق مراتب میں ہے ایسا ہی جزا میں بھی ہے مثلاً رضوان وجنت سابقین کے لیے اوروں سے اعلیٰ ہوگی۔ اور السابقون میں باحسان کی قید اس لیے نہیں لگائی کہ

ان کا مہاجر اور ناصر ہونا خود دلیل ہے ان میں احسان پائے جانے کی[1]

مولانا مفتی محمد شفیع صاحب فرماتے ہیں :

محمد بن کعب قرظی سے کسی نے دریافت کیا کہ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے۔ انہوں نے فرمایا کہ صحابہ کرام سب کے سب جنت میں ہیں۔ اگرچہ وہ ہوں جن سے دنیا کی زندگی میں کچھ غلطیاں ہوئی ہیں۔ اس شخص نے کہا کہ یہ بات آپ نے کہاں سے کہی ہے۔ فرمایا کہ قرآن کی یہ آیت پڑھو السابقون الاولون اس میں تمام صحابہ کے بارے میں بلا شرط کے رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ فرمایا۔ البتہ تابعین کے بارے میں اتباع باحسان کی قید لگائی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ صحابہ کرام بلا کسی قید و شرط کے سب کے سب بلا استثنا رضوان الہٰی سے سرفراز ہیں[2]

مولانا محمد ادریس فرماتے ہیں۔

والذین اتبعوھم باحسان سے مراد وہ لوگ ہیں جو سابقین اولین کے بعد آئے اور ان کے نقش قدم پر چلے خواہ وہ صحابہ ہوں یا تابعین یا اتباع تابعین یا ان سے بھی بعد۔ غرض یہ کہ والذین اتبعوھم سے وہ تمام لوگ مراد ہیں جو مہاجرین وانصار کی پیروی کریں۔ خواہ وہ کسی زمانے میں ہوں۔ وہ سب جنت کے مستحق ہیں اور اللہ سبحانہ ان سے خوش اور وہ اللہ سبحانہ سے خوش ہیں۔ یہ آیت قیامت تک جملہ مسلمانوں کو شامل ہے جو صحابہ کے طریق پر ہوں اور اقوال و افعال میں ان کے پیروکار ہوں بغیر صحابہ کی اتباع اور پیروی کے اللہ سبحانہ کی رضا اور جنت نہیں مل سکتی ہے۔ اور اہل السنۃ والجماعۃ کا یہی طریقہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت اور جماعت صحابہ کے طریقہ پر چلتے ہیں اسی لیے ان کو اہل السنۃ والجماعت کہتے ہیں[3]

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو یہی سوچتا ہوں کہ وہ حدیث افتراق جسے عام لوگ ضعیف کہتے ہیں، سند کے اعتبار سے۔ اگر ضعیف بھی ہو مگر معنی کے اعتبار سے قرآن کی یہی آیت اس کا ماخذ ہے اور حدیث کو ضعیف وہ ہی کہتے ہیں جو فن حدیث سے نا آشنا ہیں۔ میری مراد ترمذی کی یہ حدیث ہے۔

---

[1] بیان القرآن

[2] معارف القرآن

[3] معارف القرآن مولانا محمد ادریس

بنی اسرائیل کے بہتر فرقے ہوئے اور میری امت میں تہتر فرقے ہوں گے۔ سارے ہی دوزخی ہیں سوائے ایک کے صحابہ نے کہا وہ کونسا۔ فرمایا جس طریقہ پر میں اور میرے صحابہ ہیں اس پر چلنے والا فرقہ ناجیہ ہے۔

الفاظ یہ ہیں ما انا علیہ واصحابی۔ اس میں ما سے مراد طریقہ ہے جسے حضور اقدس اور صحابہ کی طرف منسوب کیا گیا ہے اسی معنوی مناسبت سے فرقہ ناجیہ کا نام اہل السنۃ والجماعت ہو گیا۔ حدیث کا ماخذ اگر قرآن کی یہ آیت گرامی ہے تو نام کا ماخذ ارشاد نبوت ہے۔

آیت میں اتباع صحابہ کا ذکر کر کے ایک بہت اہم بات کی طرف اشارہ کر دیا ہے اور یہی بات اہل حق کے جسم کے لیے بمنزلہ روح ہے گویا یہ اعلان کر دیا کہ اہل حق ہونے کی کسوٹی یہ ہے کہ پیغمبر کی سنتوں کو صرف الفاظ حدیث سے نہ لیا جائے بلکہ الفاظ کے ساتھ صحابہ کی شخصیتوں کو ملا کر معانی لیے جائیں۔

یہاں حضرت قاری محمد طیب کی یہ بات بڑی ہی خوشگوار ہے کہ اہل السنۃ والجماعت کہنے والے گویا یہ اعلان کرتے ہیں کہ ہم سنن نبوی کو محض الفاظ حدیث سے اخذ نہیں کرتے بلکہ الفاظ کے ساتھ صحابہ کی شخصیات کو ملا کر معانی لیتے ہیں اس سے اہل السنۃ والجماعۃ کا عنوان ایسا جامع عنوان ہے کہ اس میں دینی تربیت کے دونوں بنیادی اصولوں میں یکجائی کر دی گئی ہے کتاب اور شخصیت جن سے ایک سچی جماعت کی تشکیل ہوتی ہے۔

صحابہ کرام دلیل نبوت ہیں

قرآن کی یہ آیت مہمات معارف میں سے ہے۔

قرآن نے صداقت نبوت کی دو دلیلیں پیش کی ہیں ایک علمی دوسری عملی۔ علمی دلیل کے بارے میں تو سب جانتے ہیں کہ قرآن عزیز ہے اس میں دو رائیں نہیں ہیں۔ لیکن عملی دلیل پر بطور دلیل کم ہی لوگوں نے غور کیا ہے۔ قرآن عزیز نے عملی دلیل کے طور پر صحابہ کی جماعت کو پیش کیا ہے۔

قرآن کے اوراق آپ کے سامنے کھلے ہوئے ہیں آپ دیکھ سکتے ہیں کہ صحابہ کرام کا چہرہ پیش کرتے ہوئے کیا انداز اختیار کیا ہے۔ نبی شناسی کا انداز بااس سے کچھ مختلف۔ اگر دونوں ہم آہنگی ہے تو بلاریب صحابہ کرام صداقت نبوت کی عملی دلیل ہیں۔ اور اس میں شک ہی کیا ہے جب آپ ڈاکٹر اور حکیم کی صداقت کے لیے ڈاکٹر کے نسخے اور اس کے ہسپتال سے نکلے ہوئے تندرست بیماروں کو ڈاکٹر کی صداقت، مہارت اور شرافت کی دلیل سمجھتے ہیں تو پھر قرآن (نسخہ) کے ساتھ صحابہ کرام کو صداقت

نبوت کی دلیل ماننے میں کیوں پس وپیش کرتے ہیں ۔

درخت اگر اپنے پھل سے استاد اپنے شاگردوں سے ڈاکٹر اپنے ہسپتال سے نکلے ہوئے شفایاب مریضوں سے پہچانا جاتا ہے تو محمد رسول اللہ بھی صحابہ کرام سے پہچانے جاسکتے ہیں ۔ قرآن نے صحابہ کو حضور کے تلامذہ نہیں کہا بلکہ صحابہ کہا ہے اس کی وجہ یہ اور صرف یہ ہے کہ ان کا علم کتابی نہیں بلکہ صحبت کا رہین منت ہے ۔

سید سلیمان ندوی نے بڑے پیارے اور اچھوتے انداز میں بتایا ہے ۔

دنیا میں دو قسم کی تعلیم گاہیں ہیں ایک وہ جہاں صرف ایک فن سکھایا جاتا ہے دوسری وہ تعلیم گاہیں ہیں جو اپنی وسعت کے مطابق ہر قسم کی تعلیم کا انتظام کرتی ہیں ۔ ان کے احاطہ میں مختلف علوم وفنون کی تعلیم ہوتی ہے ۔ طلبہ اپنے اپنے ذوق اور اپنی اپنی صلاحیت کے مطابق استفادہ کرتے ہیں ۔ پھر وہاں سے فوجوں کے جنرل عدالتوں کے جج اور قانون دان کاروبار کے تاجر اور انجینئر ، ہسپتالوں کے ڈاکٹر اور ماہر سب ہی پیدا ہوتے ہیں ۔

آیئے اس جامعہ کے طلبہ پر ایک طائرانہ نگاہ ڈال لیجیے تاکہ آپ جان سکیں کہ یہ جامعہ قومی نہیں بلکہ بین الاقوامی ہے ۔

یہ ابوبکر و عمر ، عثمان و علی ، طلحہ و زبیر مکہ کے قریشی ہیں ۔ یہ ابو ذر اور انیس مکہ سے باہر تہامہ کے غفار قبیلہ کے ہیں ۔ ابوہریرہ اور الطفیل بن عمرو یمن سے آئے ہیں اور دوسی قبیلہ سے تعلق رکھتے ہیں ۔ ابوموسیٰ اشعری اور معاذ بن جبل بھی یمن سے آئے ہیں ۔ یہ ضماد بن ثعلبہ ہیں ۔ قبیلہ ازد کے ہیں خباب بن الارت قبیلہ تمیم کے ہیں منقذ بن حبان اور منذر بن حبان عبدالقیس کے قبیلہ سے ہیں بحرین سے آئے ہیں ۔ عبید بن جعفر عمان کے رئیس ہیں ۔ فروہ معان کے رہنے والے ہیں ۔ بلال افریقہ سے آئے ہیں صہیب رومی کہلائے ہیں ۔ سلمان ایران کے فارسی فیروز دیلمی بن عمرو دیلمی یہ حضرت موسیٰ کی درسگاہ نہیں جہاں صرف فوجی سپاہی اور یوشع جیسے فوجی اور قاضی اور کچھ مذہبی عہدہ دار پائے جاتے ہیں ۔ یہ حضرت عیسیٰ کی خانقاہ نہیں جہاں زہد پیشہ فقرا فلسطین کی گلیوں میں پھرتے ہیں یہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ایک جامع اور عمومی درسگاہ اور عظیم الشان یونیورسٹی ہے جس میں ایک طرف اصحمہ حبش کا نجاشی بادشاہ فروہ معان کا رئیس ذوالکلاع حمیر کا رئیس ۔ عامر بن شہر قبیلہ ہمدان کا رئیس ، فیروز دیلمی اور مرکبود یمن کے رئیس عبید و جعفر عمان کے رئیس دوسری طرف بلال ، یاسر ، صہیب ، خباب ، عمار اور ابو فکیہہ کے غلام امیر غریب شاہ و گدا آقا و غلام سب ایک صف میں کھڑے اور سب اس جامعہ کے طالب ہیں ۔

پارہ نمبر ۱۱

ان طلبہ کو غور سے دیکھو کہ ایک استاد سے ایک کتاب پڑھنے والوں میں ایک طرف عقلائے روزگار، اسرار فطرت کے محرم دنیا کے سربراہاں مملکت اس درسگاہ سے تعلیم پا کر نکلے ہیں ابوبکر الصدیق، عمر فاروق، عثمان غنی علی مرتضیٰ ہیں۔ معاویہ ابن ابی سفیان ہیں جنہوں نے مشرق سے مغرب تک افریقہ سے ہندوستان کی سرحد تک فرمانروائی کی اور ایسی فرمان روائی جو دنیا کے بادشاہوں حکمرانوں اور سیاست دانوں کی سیاسی تدبیر اور نظم ونسق کے کارناموں پر پانی پھیر گئی۔ ان کے عدل وانصاف کے فیصلوں نے ایرانی دستور اور رومن لا کو بے اثر کر دیا۔

دوسری طرف خالد بن ولید، سعد بن ابی وقاص ابو عبیدہ بن الجراح اور عمرو بن عاص اسی درسگاہ کے طالب علم ہیں جو مشرق ومغرب کی دو ظالم سلطنتوں کا چند سالوں میں تختہ الٹ دیتے ہیں اور دنیا کے فاتح اعظم اور سپہ سالار اکبر ثابت ہوئے ہیں جن کے فاتحانہ کارناموں کی دھاک آج بھی دنیا مانتی ہے۔

تیسری طرف باذان بن ساسان۔ خالد بن سعید مہاجرین امیر زیاد بن لبید، عمرو بن حزم یزید بن ابی سفیان علاء ابن حضرمی یمن صنعاء کندہ حضرموت، بحران، یمامہ بحرین صوبوں کے گورنر ہیں اور کامیاب حکومت کر رہے ہیں۔

چوتھی طرف ان طلبہ میں دانشوروں اور قانون دانوں کی صف ہے۔ عمر بن الخطاب علی ابن طالب، عبداللہ بن عباس، عبداللہ بن مسعود، عبداللہ بن عمرو بن العاص حضرت عائشہ حضرت ام سلمہ ابی بن کعب معاذ بن جبل زید بن ثابت وغیرہ جنہوں نے اسلامی قانون کی بنیادیں استوار کیں اور دنیا کے دانشوروں اور قانون دانوں میں خاص مقام پایا۔

پانچویں طرف ان طلبہ میں مؤرخین اور ارباب روایت ہیں۔ حضرت ابوہریرہ حضرت ابو موسیٰ اشعری، حضرت ابوسعید خدری، حضرت عبادہ ابن الصامت، حضرت جابر اور حضرت براء بن عازب وغیرہ صحابہ ہیں جو احکام ووقائع کے ناقل اور راوی ہیں۔

چھٹی جماعت ان طلبہ میں ارباب زہد کی ہے ابوذر غفاری، سلمان فارسی، عبداللہ بن عمر، مصعب بن عمیر، عثمان بن مظعون، محمد بن مسلمہ اور ابوالدرداء ہیں جن کی راتیں نمازوں میں اور دن روزوں میں گذرتے تھے۔ تفصیل دیکھنی ہو تو شاہ ولی اللہ کی ازالۃ الخفاء پڑھو پتہ لگ جائے گا کہ قرآن نے صحابہ کرام کو صداقت نبوت کی دلیل کیونکر بنایا ہے۔

علامہ شاطبی غرناطی نے الموافقات کی دوسری جلد میں یہ بات پوری قوت سے بتائی ہے کہ

قرآن نے صحابہ کرام کا چہرہ وہی کچھ پیش کیا ہے جو خود نبوت کا پیش کیا ہے مثلاً حضور اقدس کے بارے میں اگر قرآن نے بتایا ہے کہ ان اللہ وملائکتہ یصلون علی النبی تو صحابہ کے متعلق بھی ارشاد ہوا ہے۔ ھو الذی یصلی علیکم وملائکتہ اور اولائک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ۔ حضور اقدس سے اگر کہا گیا ہے ولسوف یعطیک ربک فترضیٰ اللہ پاک آپ کو وہ کچھ عطا کرے گا کہ آپ خوش ہو جائیں گے تو صحابہ کے بارے میں ارشاد ہوا ہے لیدخلنھم مدخلاً یرضونہ ان کو ایسا مقام عطا کرے گا جس سے وہ راضی ہو جائیں گے۔ ایک طرف اگر حضور اقدس کے لیے غفران کی بشارت دی گئی ہے۔ لیغفر لک اللہ تو ساتھ ہی صحابہ کو بھی یہ خوشخبری سنائی گئی ہے لیدخل المومنین والمومنات جنات تجری من تحتھا الانھار خالدین فیھا ویکفر عنھم حضور اقدس کو اگر تمام نعمت کی بشارت دی گئی ہے ویتم نعمتہ علیک ویھدیک صراطا مستقیما تو صحابہ کرام سے یہی بات کہی گئی ہے ولکن یرید لیطھرکم ویتم نعمتہ علیکم حضور اقدس سے اگر کہا گیا ہے الم نشرح لک صدرک تو صحابہ کو بھی بتایا گیا ہے افمن شرح اللہ صدرہ للاسلام فھو علی نور من ربہ۔ حضور اقدس اگر ترمذی کی روایت کے مطابق حبیب اللہ ہیں تو صحابہ کرام کو بھی یحبھم ویحبونہ کی نوید سنائی گئی ہے۔ حضور اقدس کی ذات گرامی اگر اکرم الاولین والآخرین ہے تو صحابہ کرام کو قرآن نے خیر امۃ اور امۃ وسطا کا لقب دیا ہے۔ حضور انور کا فریضہ اگر شہادت ہے تو صحابہ کرام کا بھی یہی فریضہ بتایا گیا ہے۔ لتکونوا شھداء علی الناس ویکون الرسول علیکم شھیدا۔ حضور اقدس کی ذات گرامی نبی ہونے کی وجہ سے مجتبیٰ اور مصطفےٰ ہے صحابہ کرام کو بھی قرآن نے مجتبیٰ اور مصطفےٰ بتایا ہے ھو اجتباکم اور ثم اورثنا الکتاب الذین اصطفینا من عبادنا۔ نہ ختم ہونے والے اجر کی حضور کو بشارت ہے ان لک لاجرا غیر ممنون اور صحابہ کو بھی اسی بات کی خبر دی گئی ہے۔ فلھم اجر غیر ممنون۔ حضور اقدس کی ذات کو اگر قرآن میں رحیم کہا ہے تو صحابہ کرام کو بھی رحماء کہا ہے حضور انور کی ذات گرامی اگر معصوم ہے تو زبان نبوت نے صحابہ کو من حیث الجماعۃ معصوم بتایا نبوت اور آپ کے صحابہ میں اوصاف کی یہ ہم آہنگی بتا رہی ہے کہ صحابہ کی جماعت صداقت نبوت کی دلیل ہے بلکہ حضرت شاہ ولی اللہ نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ جیسے فرد ہونے کی حیثیت میں حضور اقدس کی بعثت ہوئی ہے ایسے ہی من حیث الجماعۃ صحابہ بھی مبعوث ہوئے ہیں قرآن میں اخرجت للناس کی تعبیر ہی اس طرف اشارہ کر رہی ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ

نے اخرجت للناس پر ازالۃ الخفا میں لکھا ہے،

کنتم خیر امۃ کے دو مطلب ہیں ایک یہ کہ تم اس صفت سے موصوف ہو۔ دوسرے یہ کہ تم اس صفت سے علم الٰہی میں موصوف تھے اور اخرجت للناس میں نکالنے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ عدم سے وجود میں آگئے ہیں اور نہ یہ کہ کسی تنگنائی سے نکالے گئے بلکہ مطلب یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں لوگوں کی اصلاح کا داعیہ پیدا ہوا اور اسی داعیہ کے ذریعے اندر سے باہر آکر انسانی جماعت کے اس طبقہ کو اس دولت سے سرفراز کیا اور اس نعمت سے مالا مال کیا اس لحاظ سے یہ جماعت اللہ سبحانہ کی جانب سے نکالی گئی ہے اور مبعوث ہوئی ہے اور للناس کا اضافہ یہ بتانے کے لیے ہے کہ اللہ سبحانہ کی جانب سے اس جماعت کو مبعوث کرنے کی علت بندگان خدا کی اصلاح ہے تاکہ دنیا اس گروہ کے ذریعے ہدایت کے نور سے منور ہو۔ ازالۃ الخفا ص ۲۷

یہی وجہ ہے کہ خلافت راشدہ کا مقام ما دون التشریع اور ما فوق الاجتہاد ہے۔ اسی کو حکیم الامت نے اس طرح پیش کیا ہے:

صحابہ کی اجتماعی زندگی کا فیصلہ دین میں حجت ہے حجت ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مسلمانوں کی رائے عامہ ان کی تقلید کرے کیونکہ یہ مقام تو ائمہ اجتہاد کو حاصل ہے اور یہ معنی بھی نہیں کہ خلیفہ خود ہی واجب الاطاعت ہے یہ مقام نبوت ہے بلکہ یہاں مراد ان دونوں کے درمیان درمیان ہے

منزلتے است بین المنزلتین

اسی لیے شاہ صاحب ہی نے بتایا ہے کہ،

ہر نماز، ہر زکوٰۃ، معروف، نہی عن منکر جو بھی صحابہ کی اجتماعی زندگی میں موجود ہو گی وہ یقیناً محمود اور سبیل رضائے الٰہی ہے۔

بلکہ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں آیت نسخ ماننسخ من ایۃ او ننسہا نات بخیر منہا او مثلہا ہم کسی آیت کو جو منسوخ کر دیتے یا اسی کو فراموش کرا دیتے تو ہم اس آیت سے بہتر یا اس جیسی لے آتے ہیں۔ شاہ صاحب کے خیال مبارک میں اس آیت میں نسخ سے نسخ شرائع اور نبوت مراد ہے اور آیت کا مطلب یہ بتانا ہے کہ عام نبوت سے وہ نبوت بہتر ہے

جس کی آغوش میں خلافت ہو اور یہ شرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ہے چنانچہ حجۃ اللہ کے دوسرے مقام پر لکھتے ہیں :

نبیوں میں سب سے عظیم الشان وہ نبی ہے جس کی بعثت کسی دوسری بعثت کا ذریعہ بن جائے ۔ اور یہ اس طرح ہوتا ہے کہ حضور کی نبوت کو ذریعہ بنایا ہے لوگوں کے تاریکیوں سے ہٹ کر روشنی میں آنے اور اس بات کا کہ آپ کی قوم بہترین امت ہو جو لوگوں کے لیے مبعوث ہو اس طرح آپ کی بعثت ایک دوسری اجتماعی بعثت کا ذریعہ بن گئی قرآن میں دونوں بعثتوں کی طرف اشارہ ہے ھو الذی بعث فی الامیین میں اگر آپ کی بعثت کی طرف اشارہ ہے تو کنتم خیر امۃ اخرجت للناس میں صحابہ کی بعثت کی طرف اشارہ ہے ۔ اور حضور اقدس کا یہ ارشاد بھی اسی کی نشاندہی کر رہا ہے فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین تم اللہ کی جانب سے آسانیاں لے کر مبعوث ہوئے ہو سختیاں اور دشواریاں دے کر نہیں روانہ کیئے گئے ہو ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم وحی الہام کے سارے علوم کے جامع تھے اسی کے تقاضے میں دونوں بعثتیں مکمل ہوتی ہیں ۔ آپ سے پہلے وحی والہام کے علوم میں ایک یا دو علم سے مشرف ہوتے تھے ۔

اسی لیے علماء نے صحابہ کی سنۃ کو سنۃ کہا ہے ۔ علامہ شاطبی غرناطی الموافقات لکھتے ہیں :

سنۃ الصحابۃ سنۃ یرجع الیھا ویعمل علیھا

صحابہ کی سنت بھی سنت ہے قابل استدلال بھی اور قابل عمل بھی

علامہ شاطبی اپنے دعوٰے پر چار دلیلیں پیش کی ہیں ۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے صحابہ کرام کو بلا استثنا مدح وثنا پر مشتمل کارکردگی کا سرٹیفکیٹ دیا ہے ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان کی اتباع کا حکم دیا ہے ۔ امت کے علما نے ترجیح اقاویل میں صحابہ کو مقدم کہا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کی محبت کا حکم دیا ہے ۔ خود علامہ شاطبی نے سنت کے اطلاقات کی نشاندہی کرتے ہوئے لکھا ہے ۔

نیز لفظ السنۃ صحابہ کرام کے عمل پر بھی بولا جاتا ہے چاہے کتاب وسنت میں ہو یا نہ ہو ۔ یہ یا تو ایسی سنت کی پیروی ہوتی ہے جو ان کو معلوم ہے اور روایتی وتاریخی طور پر ہم تک نہیں پہنچی یا صحابہ کا اجتماعی اجتہاد ہوتا ہے یا پھر خلفائے راشدین

کا فیصلہ ہوتا ہے یہ بھی صحابہ کا اجماع ہے۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں فرقہ ناجیہ کی جو تعریف کی ہے اس میں بھی حقیقت جھلک رہی ہے:

"فرقہ ناجیہ وہ ہے جو عقیدہ و عمل دونوں میں ان واضح اور صاف کتاب و سنت کے احکام کو اپنائے جس پر جمہور صحابہ و تابعین چلے ہوں"۔

اسی لیے علمائے صحابہ کرام کی عدالت کا اعلان کیا ہے، اعلان عدالت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اچھے ہونے کے لیئے کسی انسانی رائے کے محتاج نہیں عدالت محدثین کی اصطلاح میں نام ہے حالت ایمان میں فسق کے اسباب سے دور رہنے کا اور مروائت کے خلاف کام نہ کرنے کا عبداللہ بن المبارک سے دریافت کیا گیا کہ عدالت کیا ہے؟ فرمایا جس میں پانچ باتیں ہوں۔ نماز با جماعت کا پابند ہو، پینے کا خوگر نہ ہو، دین میں کوئی خرابی نہ ہو۔ جھوٹ نہ بولتا ہو اور عقل میں کوئی فتور نہ ہو۔

قرآن کی متعدد آیات میں صحابہ کرام کی عدالت ثقاہت صداقت اور دیانت کی کھلی شہادت ہے اور یہ ایک ایسی حقیقت ہے کہ جس پر مدار اسلام ہے اور ان پر جرح کرنا دین کی پوری عمارت گرا دینے کے مترادف ہے۔ حافظ ابن حزم ظاہری نے الاحکام فی اصول الاحکام میں یہ بات واشگاف لکھی ہے۔

"سارے صحابہ بلا استثنا، عادل مرتضی اور صاحب فضیلت ہیں۔ ان کی توقیر و تعظیم ہمارا ایمانی تقاضا ہے۔ ان سے محبت کرنا اور ان کیلئے اللہ سے مغفرت کی درخواست ہمارا فرض ہے راہ خدا میں ان کا ایک کھجور کا صدقہ ہماری پوری زندگی کے صدقہ سے افضل ہے خواہ ان میں کوئی حضور کے زمانے میں بچہ ہو یا بالغ ہو سب کا حکم یہی ہے۔ یہ سب صحابہ ہیں"۔

ملا علی فرماتے ہیں:

تمام صحابہ بلا قید عادل ہیں۔ قرآن و سنت اور امت کی اجماعی قوت کا یہی تقاضا ہے۔ (مرقات)

امام ابن الاثیر عز الدین فرماتے ہیں:

حدیث میں صحابہ کی جرح و تعدیل سے بحث نہیں کی جا سکتی ہے۔ یاد رہے کہ عدالت اصطلاح محدثین ہے۔ اور یہ افراد کے لیے ہے ورنہ جماعت کے لیے تو عصمت ثابت ہے یعنی صحابہ کے افراد

کا مجموعہ معصوم ہے اور افراد میں سے ہر فرد کا دامن عدالت سے مالا مال ہے۔ علامہ شاطبی نے اس پر بھی بحث کی ہے۔

ذرا اس پر غور فرمایئے کہ پوری جماعت من حیث الجماعۃ معصوم ہے اور جماعت کا ہر فرد عادل ہے۔ اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ صحابہ کی جماعت کے ایک ایک فرد کا دامن کبائر سے صغائر پر اصرار سے پاک ہے۔ آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے۔

اس لیے کہ صحابہ کرام کو حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی رفاقت اور مصاحبت کا جو شرف حاصل ہوا ہے۔ پوری امت کے اعمال حسنہ مل کر بھی اس کا مقابلہ نہیں کر سکتے۔ اور رفاقت کے شرف سے بڑھ کر صحابہ کو یہ شرف حاصل ہے کہ وہ مدرسہ نبوت کے ایسے طالب علم تھے جن کے معلم ہادی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے۔ جن کا نصاب تعلیم ملاء اعلیٰ میں مرتب ہوا تھا۔ جن کی تعلیم و تربیت کی نگرانی براہ راست آسمانی وحی کر رہی تھی۔ اور جن کا امتحان اللہ سبحانہ نے لیا۔ اور امتحان لینے کے بعد جب وہ کامیاب ہو گئے تو ان کو رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ کی ڈگری عطا فرمادی اور ڈگری پر ذالك هو الفوز العظيم لکھ کر پوری انسانیت کی تعلیم و تربیت اور تلقین و ارشاد کا ان کو منصب عطا کر دیا۔ اگر آپ غور کریں گے تو معلوم ہو گا کہ انبیاء علیہم اسلام کے بعد صرف صحابہ کرام کی ایسی جماعت ہے جن کی تعلیم و تربیت بھی وحی الہٰی کی نگرانی میں ہوئی اور ان کو سند فضیلت بھی اللہ سبحانہ نے دی۔

اس لیے دین وہی ہے جو صحابہ نے اپنایا ہے۔ ان کا ہی دین اللہ کا پسندیدہ ہے ليمكنن دينهم الذى ارتضى لهم۔ دین کی صحابہ کی طرف نسبت اس بات کی نشاندہی کر رہی ہے۔ کہ اسلام جس دین کا نام ہے، اس کی شناسائی ہیں صحابہ اور صرف صحابہ معیار حق ہیں۔

اوروں کا پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سمجھتا ہوں کہ حدیث کی قبولیت کے لیے امام ابو حنیفہ نے جو یہ شرط لگائی ہے کہ وہ حدیث اس شاہراہ کے خلاف نہ ہو جس پر معاشرہ صحابہ چل رہا تھا اس کا سرچشمہ یہی ہے۔ امام اعظم اخبار آحاد کو اسی پیمانے میں تولتے تھے اور ایسی حدیث کو معلول قرار دیتے جو اس شاہراہ کے خلاف ہو جو صحابہ سے متوارث ہے۔ اسی توارث کو السنہ اور ماعلیہ الجماعۃ کہتے ہیں۔ اور اس موضوع پر امام اعظم کو دوسری صدی کے مولفین کی حمایت بھی حاصل ہے چنانچہ مصر کے مشہور محدث و فقیہ لیث بن سعد نے امام مالک کے نام جو خط لکھا ہے اس میں امام موصوف نے اس معیار کو واضح لفظوں میں پیش کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں:

جب کوئی ایسا مسئلہ سامنے آجائے جس پر مصر شام عراق میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ نے زمانہ ابوبکر و عمر و عثمان میں عمل کیا ہو اور اسی پر تا آخر حیات رہے ہوں تو ہماری ایسے مسئلہ کے بارے میں رائے یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کی ہرگز ہرگز اجازت نہ دی جائے گی کہ وہ کوئی ایسا کام کریں جو ان کے اسلاف کے خلاف ہو۔ اعلام الموقعین ج ۳ صہ ۹۰

امام مالک جو عمل اہل مدینہ کی حجت کے قائل ہیں۔ اس کا مبنی بھی یہی ہے حافظ ابن القیم اسی کو عمل مستمر کہتے ہیں۔ ان کے نزدیک بھی یہ قابل اتباع حجت ہے۔ چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

یہ نقل اور یہ عمل واجب الاتباع حجت اور ایک ایسی سنت ہے جسے تلقی بالقبول حاصل ہے۔ (اعلام)

دوسری صدی میں تعامل و توارث کی طاقت اس درجہ مسلم تھی کہ اس دور کے مصنفین اپنی کتابوں میں صرف ان حدیثوں کو پذیرائی دیتے تھے جن کی پشت پر تعامل کی قوت ہوتی تھی۔ چنانچہ قاضی ابویوسف فرماتے ہیں:

علیک من الحدیث ما تعرفہ العامۃ

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ حدیث کی مقبولیت کی شرط یہ ہے کہ وہ اس محسوس عملی شاہراہ کے خلاف نہ ہو جو صحابہ کرام سے وراثت میں امت کو ملی ہے۔ امام ابوحنیفہ اخبار آحاد کے مقبول ہونے کے لیے تعامل کے ہمنوا ہونے کی شرط لگاتے تھے۔ اور اسی معیار پر اخبار آحاد کو جانچتے تھے۔ چنانچہ ایک سے زیادہ مسائل میں اسی پیمانہ سے اخبار آحاد کو ناپا گیا ہے۔ نماز میں بسم اللہ پڑھنے کے موضوع پر ایک سے زیادہ حدیثیں آئی ہیں۔ حافظ زیلعی نے توارث اور تعامل کا ہی سہارا لے کر یہ فیصلہ کیا ہے کہ:

"بسم اللہ کا نماز میں آہستہ پڑھنا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کی وہ میراث تھی جس پر لوگ چل رہے تھے اور صرف اتنی ہی بات اس مسئلہ میں اطمینان کے لیے کافی ہے۔"

اسی پیمانہ سے امام اعظم نے رفع یدین کے موضوع پر اخبار آحاد کو ناپا ہے تکبیر تحریمہ کی حد تک تو رفع یدین کا مسئلہ امت میں اتفاقی ہے۔ چنانچہ حافظ ابن حجر عسقلانی فرماتے ہیں:

"تکبیر تحریمہ کے موقعہ پر رفع یدین میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔"

اگرچہ حافظ ابن حزم نے مطلق رفع یدین میں تواتر کا یہ کہہ کر دعوی کیا ہے کہ احادیث رفع یدین متواتر ہیں لیکن ان کا اس فیصلہ سے دوسرے علماء کو اتفاق نہیں ہے۔ ان کا کہنا کہ صرف تکبیر افتتاح کے وقت رفع یدین متواتر ہے چنانچہ حافظ محمد بن ابراہیم الوزیر نے تنقیح الانظار میں علامہ محمد بن اسماعیل یمانی

نے توضیح الافکار میں اور حافظ زین الدین عراقی نے تصریح کی ہے کہ تکبیر تحریمہ کے وقت رفع یدین تواتر سے تکبیر تحریمہ کے علاوہ دوسرے مواقع پر رفع یدین اخبار احاد سے ثابت ہے اس سلسلے کی سب سے زیادہ مشہور روایت حضرت عبداللہ بن عمر کی ہے یہ روایت خود مواقع رفع یدین میں مختلف ہے۔ چنانچہ ابن عمر کی روایت بطریق سالم میں تین مواقع کا تذکرہ ہے تکبیر تحریمہ عندالرکوع اور رکوع سے اٹھتے وقت اور بطریق نافع میں قعدہ اولی سے اٹھتے وقت بھی رفع یدین مذکور ہے اور دونوں بخاری کی روایات ہیں۔ نیز طبرانی کی روایات میں ایک پانچواں رفع یدین سجدے میں جاتے وقت بھی مذکور ہے د عند التکبیر حین یھوی ساجدا اور علامہ ابن دقیق العید نے شرح العمدہ دونوں سجدوں کے درمیان رفع یدین کو قانونی قرار دیا ہے۔

امام اعظم نے ان اخبار آحاد کو توارث سے معارض ہونے کی وجہ سے معلل قرار دیا۔ اور ان تمام مواقع میں صرف اس رفع یدین کو اختیار فرمایا جو اسناداً متواتر ہے اور جسے توارث کی تائید حاصل ہے یعنی تکبیر تحریمہ کے وقت۔ انہوں نے ان روایات کا جس روشنی میں مطالعہ فرمایا وہ امت کا متوارث عمل ہے کیونکہ کوفہ میں اصحاب امیر المومنین علی مرتضیٰ اور اصحاب عبداللہ بن مسعود رفع یدین نہ کرتے تھے۔ حافظ ابن عبدالبر نے کوفہ کی پوری آبادی کے بارے میں مشہور محدث محمد بن نصر روزی کے حوالہ سے یہ عظیم انکشاف کیا ہے کہ

> کوفہ کے سوا تمام شہروں میں ایسا کوئی شہر ہمیں معلوم نہیں جس کی آبادی نے بالاتفاق رکوع میں جاتے اور اٹھتے وقت رفع یدین کیا ہو۔

اور یہی حال زمانہ امام مالک میں مدینہ طیبہ کا ہے۔ چنانچہ ابن رشد نے بدایہ میں امام مالک کے روایت عدم رفع کو اختیار کرنے کی بنیاد بتایا ہے وہ فرماتے ہیں:

> امام مالک سے ترک رفع یدین کی روایت آنے کا سبب عمل اہل مدینہ ہے۔ بدایۃ المجتہد

مکہ میں رفع یدین عبداللہ بن الزبیر کے زمانہ میں شروع ہوا اس سے پہلے اہل مکہ کا عمل بھی ترک رفع یدین ہے جیسا کہ میمون مکی کے سوال پر ابن عباس کے اس انداز بیان سے لسوا را حلا الصلیھا ظاہر ہے جب کوفہ مدینہ اور مکہ کے اہل علم و ایمان اس پر عمل کر رہے ہیں تو یہ تعامل و توارث نہیں تو اور کیا ہے۔ بس اسی پیمانہ پر احادیث رفع یدین کو ناپ کر امام اعظم نے صرف تکبیر تحریمہ والے رفع یدین کو اختیار کر لیا اور باقی کو خلاف اولیٰ قرار دیا۔

بہر حال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ امام ابوحنیفہ نے حدیث کی مقبولیت کی راویوں کی ثقاہت اور

سند کے اتصال کے ساتھ یہ شرط جو لگائی کہ علیہ العامہ کے خلاف نہ ہو تو اس کی بنیاد یہی ہے کہ یہ جماعت صحابہ کا ورثہ ہے۔ اور صحابہ صداقت نبوت کی دلیل ہی نہیں بلکہ بطور جماعت نبوت کے مقام پر فائز ہیں۔ زندگی کے کسی گوشہ میں ان سے ہٹ جانا ایمان کی بربادی کے سوا کچھ نہیں ہے اسی لیے حافظ ابن رجب حنبلی نے یہ انکشاف فرمایا ہے ۔

> ائمہ مجتہدین اور فقہا محدثین حدیث صحیح کی پیروی کرتے ہیں بشرطیکہ وہ حدیث صحابہ اور تابعین میں معمول بہ ہو (فضل علم السلف)

اسی لیے محدثین اور فقہا کے یہاں صحابہ کے اقوال اعمال اور فتاوی سب حجت ہیں۔ حافظ ابن عبدالبر نے امام ابوحنیفہ کے بارے میں لکھا ہے۔

> امام ابوحنیفہ فرماتے ہیں کہ اگر مجھے کتاب و سنت میں کوئی مسئلہ نہیں ملتا تو میں اقوال صحابہ پر عمل کرتا ہوں جس کا قول چاہتا ہوں لے لیتا ہوں لیکن ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ ان کے اقوال سے تجاوز کرکے کسی اور کی بات اختیار کروں (الانتقاء)

امام مالک تو صحابہ کے اعمال و اقوال کو سنت کا درجہ دیتے ہیں وہ فتوی صحابی اور حدیث کے درمیان موازنہ کرتے تھے چونکہ ان اکابر کے یہاں صحابہ کے اعمال و اقوال کا یہ وزن ہے اس لیے ان کے یہاں احادیث کی صحت اور مختلف احادیث میں ترجیح کا معیار بھی یہی ہے۔

بیان تفصیل کا موقعہ نہیں۔ اس پر تفصیلی مباحث امام اعظم اور علم الحدیث میں پڑھتے۔ بتانا یہ ہے کہ اسلام کے روحانی، قانونی معاشی اور سیاسی نظام میں مطاعن اور معیار حق صحابہ کرام ہیں اور صحابہ سے روگردانی قرآن و سنت کے محکمات سے بے رخی ہے۔ یہ روگردانی خواہ حب ال رسول کے شوق میں ہو یا حب طاعت رسول کے پردے میں ہو، اور یا حب اجر و ثواب کے ولولے کی وجہ سے ہو اور یا پھر علم و تحقیق کا شوق اس کا محرک ہو۔

بیان تفصیل کا موقعہ نہیں جب اہل بیت کو بہانہ بناکر صحابہ کے ایمان اور صحابیت کا انکار یا طاعت رسول کے شوق میں صحابہ کی عدالت اور ان کی سنت کا اور ان کی عملی زندگی کے دین میں حجت ہونے کا انکار یا حب رسول کے پردے میں دین کے نام پر ایسی تمام ایجادیں، رسمیں جن سے صحابہ کی ساری زندگیاں خالی ہیں۔ اور تلاش و تحقیق کے نام پر صحابہ کو مطاعن اور تنقیدات کا نشانہ بنانا یہ سب بے راہ روی اور فکری آوارگی کی نخلیقات نہیں۔

یاد رکھو قرآن میں صحابہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا آئینہ ہیں۔ اس آئینے میں نبوت محمدیہ

کا چہرہ قرآن نے دکھایا ہے۔ ان پر تنقید کرنا۔ جرح کرنا نبوت پر تنقید و جرح ہے صحابہ پر تنقید و تجریح کے بعد آپ قرآن کو اللہ کی کتاب محمد رسول اللہ کو اللہ کا رسول بھی ثابت نہیں کر سکتے۔ جو شخص مقام صحابہ کی رفعتوں سے ناآشنا ہے وہ بلاریب بارگاہ نبوت کا ادب ناشناس ہے صحابہ سے اعتماد ہٹ جانے کے بعد سب کچھ ناقابل اعتماد ہے۔

ایک بار قرآن عزیز کا اس فکر سے مطالعہ کریں کہ قرآن میں نبوت کے دلائل کیا ہیں؟ آپ کو محسوس ہوگا کہ قرآن نے چار قسم کے دلائل بیان کئے ہیں۔

ایک قسم وہ ہے جس قرآن نے آپ کو نبیوں کو ترازو میں رکھ کر تولا ہے اور اس نوعی پیمانے کے ذریعے آپ کی نبوت کو ثابت کیا ہے۔

دوسرے یہ کہ معجزات کے ذریعے آپ کی نبوت کو ثابت کیا ہے۔

تیسرے یہ کہ ذاتی کمالات کو نبوت کی دلیل بنا کر پیش کیا ہے۔

چوتھے یہ کہ صحابہ کرام کے کمالات کو آپ کی نبوت کے لیے بطور دلیل پیش کیا ہے۔

اس قسم کو قرآن میں اللہ سبحانہ نے اس تکرار کے ساتھ پیش کیا ہے کہ عقل انسانی حیران رہ جاتی ہے۔ یہ ایک ایسی زبردست دلیل ہے جس کے سامنے بے انصاف مخالفوں کے بھی سر جھک جاتے ہیں۔ حقیقت بیں نگاہوں سے دیکھو کہ اسلام کی علمی اور عملی قوتوں کی کامیابی کا راز اسی میں سمٹا ہوا۔ قرآن کھولتے ہی یہ آیت ملتی ہے کہ اولٓئك علی ھدی من ربھم واولٓئك ھم المفلحون یہی وہ جوہری قوت ہے جو اسلام کی پشتیبانی نصرت کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ارد گرد صحابہ کی شکل میں اللہ سبحانہ کی جانب سے جمع کر دی گئی تھی۔

یہ کوئی راز نہیں کہ اسی اللہ سبحانہ کی اصطفائی و اجتبائی قوت نے حضور اقدس کی زندگی میں دس لاکھ مربع میل اور آپ کے بعد چند ہی سالوں میں روئے زمین کی سب سے بڑی سیاسی طاقت بن کر اسلام کے نام پر ابھری۔ تشیع ہو یا انکار حدیث، ابتداع ہو یا صحابہ کی عدالت کے معیار حق ہونے کا انکار یہ سب اسی قوت کے خلاف سازش ہے جس کے بعد اسلام کا دینی سرمایہ ہو یا دنیوی خود بخود صفر ہو کر رہ جائے گا۔ انا للہ فالی اللہ المشتکی

بات ادھوری رہ جائے گی اگر ہم یہاں یگانہ علم و تحقیق حافظ ابن تیمیہ کے صحابہ کے حوالہ سے تاثرات کو نظر انداز کر دیں۔ ان کی محققانہ کتاب منہاج السنہ ہمارے پیش نظر ہے۔ موصوف صحابہ کی عدالت کو اسلام کی ایک اہم بنیاد مانتے ہیں۔ اور ان کو صحابہ کی صداقت اور ثقاہت پر بڑا یقین

ہے وہ صحابہ کو اسلام کی تعلیمات کا سچا نمونہ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تربیت اور فیض صحبت کا بہترین نتیجہ تسلیم کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک صحابہ کرام کے فضائل ایسے قطعی اور متواتر ہیں۔ اور قرآن حکیم کی ایسی صریح نصوص و آیات اور ایسی صحیح احادیث سے ثابت ہیں کہ وہ کسی تاریخی روایت سے مشکوک نہیں ہو سکتے وہ لکھتے ہیں ؛

> جب کتاب و سنت اور نقل متواتر سے صحابہ کرام کے محاسن و فضائل ثابت ہو چکے ہیں تو یہ درست نہیں کہ وہ ایسی منقولات سے رد ہو جائیں جن میں سے کچھ منقطع اور کچھ محرف ہیں اور بعض ایسی روایات ہیں جن سے ان ثابت شدہ حقائق پر کوئی اثر نہیں پڑتا اس لیے کہ یقین شکوک و شبہات سے زائل نہیں ہوتا۔ ہم کو کتاب و سنت اور اپنے پیشروؤں کے اجماع اور ان کی مؤید متواتر روایات اور عقلی دلائل سے اس بات کا یقین ہو چکا ہے کہ صحابہ کرام انبیاء کرام کے بعد افضل الخلق تھے اس یقینی اور متواتر چیز پر ان امور کا اثر نہیں پڑ سکتا جو خود مشکوک و مشتبہ ہیں چہ جائے کہ جن کا باطل ہونا ظاہر ہو چکا ہے[1]

بلاشبہ صحابہ کرام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح معصوم نہ تھے کہ ان سے گناہوں کا صدور ہی نہیں ہو سکتا تھا لیکن اس کے ساتھ یہ ماننا بھی ضروری ہے کہ امت کے تمام لوگوں میں وہ سب سے زیادہ عادل، خدا ترس صادق القول امین اور راست باز تھے۔ اگر ان سے غلطیاں اور گناہ ہوئے تو اس کے مقابلے میں ان سے ایسے اعمال حسنہ اور خدا و رسول کو راضی کرنے والے کام ہوئے جو ان سیئات کا کفارہ بن گئے۔ اور بہر حال ان کے حسنات اور اعمال صالحہ کا پلڑا ان کی تقصیرات پر بھاری ہے۔ حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں ؛

> ہم پہلے لکھ چکے ہیں کہ ہم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد کسی کے بھی گناہوں سے معصوم ہونے کے قائل نہیں چہ جائے کہ خطاء فی الاجتہاد کے بھی قائل نہ ہوں اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے :
>
> والذی جاء بالصدق وصدق به اولئك هم المتقون لهم ما يشاؤن عند ربهم ذالك جزاء المحسنين ليكفر الله

---

[1] منہاج السنہ جلد ۳ ص ۲۰۹

عنھم اسوأ الذی عملوا ویجزیھم اجرھم باحسن الذی کانو یعملون۔

اور جو سچی بات لایا۔اور جس نے اس کی تصدیق کی وہی پرہیز گار ہیں۔ان کے لیے جو کچھ وہ چاہیں گے ان کے رب کے پاس موجود ہوگا۔حسن کاروں کا یہی بدلہ ہے تاکہ اللہ ان سے وہ برائیاں دور کردے جو انہوں نے کی تھیں اور اللہ ان کو ان کا اجر دے ان نیک کاموں کے بدلے میں جو وہ کیا کرتے تھے"۔

دوسری جگہ ہے۔

اولٓئك الذین نتقبل عنھم احسن ما عملوا ونتجاوز عن سیأتھم فی اصحاب الجنہ وعد الصدق الذی کانو یوعدون۔

یہی وہ لوگ ہیں جن سے ہم وہ نیک عمل قبول کرتے ہیں جو انہوں نے کیے اور بہشتیوں میں شامل کرکے ان کے گناہوں سے درگذر کرتے ہیں۔یہ اس سچے کے وعدے کے مطابق ہوگا جو ان سے کیا گیا۔

صحابہ کرام کی نظیر تاریخ میں نہیں ہے

حافظ ابن تیمیہ فرماتے ہیں کہ ان بشری لغزشوں اور کوتاہیوں کے باوجود جو انسانیت کا لازمہ ہیں مجموعی حیثیت سے انبیاء علیہم السلام کے علاوہ افراد انسانی کا کوئی مجموعہ اور انسانوں کی کوئی نسل صحابہ کرام سے بہترین سیرۃ و کردار کی نظر نہیں آتی۔اگر ان کی زندگی میں کہیں کہیں کچھ ہلکے سے دھبے اور داغ نظر آتے ہیں تو اس کی مثال ایسی ہے جیسے سفید کپڑے میں کہیں تھوڑی سی سیاہی نظر آجائے۔یہ عیب چینوں کا قصور ہے کہ ان کو اس کپڑے میں سیاہی کا نقطہ تو نظر آیا ہے اور اس کپڑے کی ساری سفیدی نظر نہ آئی۔ دوسری جماعتوں کا تو حال یہ ہے کہ ان کا سارا نامہ اعمال سیاہ نظر آتا ہے کہیں کہیں سفیدی نظر آتی ہے وہ لکھتے ہیں،

صحابہ کرام اخیار امت ہیں۔امت محمد میں کوئی ایسا گروہ نہیں ہے جو ان سے زیادہ ہدایت اور دین حق پر مجتمع اور تفرق و اختلاف سے دور ہو۔ان کی زندگی میں کوئی نقص کی بات بھی نظر آتی ہے تو اگر اس کا کسی دوسری امت کے حالات سے مقابلہ کیا جائے تو اس کے مقابلے میں اس کی حقیقت نہیں معلوم ہوتی۔غلطی اس شخص کی ہے جس کو سفید کپڑے

کی تھوڑی سی سیاہی تو نظر آتی ہے اور کپڑے کی ساری سفیدی نظر نہیں آتی ہے یہ بڑی نادانی اور بڑا ظلم ہے۔ اگر ان اکابر کا اپنے ہم مرتبہ لوگوں سے مقابلہ کیا جائے تو پھر ان کی ترجیح اور برتری معلوم ہو۔ باقی یہ کہ کوئی شخص اپنے دل میں کوئی خیالی تصویر بنا لے ——— یا کوئی معیار تجویز کرے جس کو اللہ تعالیٰ نے پیدا ہی نہ کیا ہو۔ تو اس کا کوئی اعتبار نہیں۔ ایک اپنے دل میں ایک امام معصوم کا تصور قائم کر لیتا ہے۔ ایک شخص ایک اور ایسے امام کا تصور قائم کرتا ہے جس میں اور معصوم میں کوئی فرق نہیں اگرچہ اسے صاف صاف معصوم نہیں کہتا اور وہ تجویز کرتا ہے کہ امام کو یا شیخ کو یا امیر کو یا بادشاہ کو ایسا ہی ہونا چاہیے خواہ وہ کیسا ہی کثیر العلم، کیسا ہی دیندار صاحب محاسن ہو۔ اور اس کے ہاتھ سے اللہ سبحانہ نے کیسے ہی خیر کے کام کرائے ہوں۔ لیکن یہ تجویز کرتا ہے کہ اس کو ایسا کامل العلم ہونا چاہیے کہ اس پر کوئی چیز پوشیدہ نہ ہو اور وہ کسی بھی مسئلہ میں غلطی نہ کرے وہ بشریت کے لوازم و خصائص سے پاک ہو۔ کبھی اس کو غصہ نہ آیا ہو اس کا کوئی علاج نہیں۔

یہ امر واقعہ ہے کہ جس شخص کی نظر پوری تاریخ پر ہو گی اور اس نے مختلف امتوں اور قوموں کے حالات پڑھے ہوں گے اور مختلف انسانی جماعتوں کا تجزیہ کیا ہو گا اس کو اس بات کا یقین ہو گا کہ صحابہ کرام سے زیادہ متحد، حق کا پیرو فتنہ اور افتراق سے نفور، نفسانیت و دنیاداری سے دور کوئی جماعت نہیں گذری۔ حافظ ابن تیمیہ لکھتے ہیں :

جس شخص نے دنیا کے تمام فرقوں کے حالات و واقعات کا اہتمام سے مطالعہ کیا ہے اور ان کے حالات کا تتبع کیا ہے وہ جانتا ہے کہ کوئی گروہ ایسا نہیں گذرا جو ہدایت و رشد پر صحابہ کرام سے زیادہ مجتمع ہو اور تفرق و اختلاف سے دور ہو۔ ان کے متعلق اللہ سبحانہ نے شہادت دی ہے کہ وہ اس مخلوق میں سب سے بہتر ہیں وہ فرماتا ہے کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر وتومنون باللہ

اسلامی اجتماعیت میں خیر

اس وقت مسلمانوں میں جو کچھ خیر ہے اور علم و عمل کا جو بھی سرمایہ ہے برکت و رحمت کا جو کچھ

ذخیرہ ہے۔ شعائر اسلام کی بلندی اسلام کی اشاعت، عمل خیر کے جو کچھ محرکات اور جو کچھ توفیق خیر ہے اور سچ پوچھئے تو عالم میں اس وقت جو کچھ خیر و صلاح نظر آ رہی ہے وہ سب صحابہ کرام کی جان فشانیوں، انکی علو ہمت، ایثار اور قربانیوں کا نتیجہ اور ان کے نفوس قدسیہ کی برکت و نورانیت ہے حافظ ابن تیمیہ بڑے جوش سے لکھتے ہیں:

> خلافت راشدہ اور زمانہ صحابہ سے لے کر مسلمانوں کے پاس جو کچھ خیر ہے ایمان، اسلام، قرآن، علوم و معارف عبادات، جنت میں جانا، جہنم سے بچنا۔ کفار پر غلبہ اعلاء کلمۃ اللہ وہ سب صحابہ کرام کی محنتوں کا نتیجہ اور ان کی کوششوں کی برکت ہے جنہوں نے دین کی تبلیغ اور اللہ کے راستہ میں جہاد کیا۔ جو مومن بھی اللہ پہ ایمان لایا اس پر صحابہ کرام کا احسان قیامت تک رہے گا۔

آخر میں لکھتے ہیں:

> وخير الصحابة تبع لخير الخلفاء الراشدين فهم كانوا اقوم بكل خير في الدين والدنيا من سائر الصحابة

زعماء منافقین کی نشاندہی

۱۰۱ اور تمہارے اردگرد جو اعرابی رہتے ہیں ان میں سے کچھ اور مدینہ شہر کے کچھ منافق نفاق پر اڑے ہوئے ہیں تم ان کو نہیں جانتے ہو ہم ان کو خوب جانتے ہیں۔ ہم ان کو دوبار سزا دیں گے۔ پھر ان کو سنگین عذاب کی طرف لوٹایا جائے گا۔ پہلے سے دیہاتی عربوں کا ذکر ہے۔ درمیان میں اعراب مومنین کے تذکرہ سے مہاجرین و انصار کی طرف کلام منتقل ہو گیا۔ اب اس آیت میں خاص مدینہ اور اس کے آس پاس رہنے والوں کا بیان ہے یعنی کچھ اہل مدینہ اور گردوپیش کے رہنے والے نفاق کے خوگر ہو چکے ہیں اور اسی پر اڑے ہوئے ہیں لیکن یہ نفاق اس قدر غرلق و عمیق ہے کہ ان کے قرب مکانی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی کمال فطانت و فراست کے باوجود آپ بھی بالتعیین اور قطعی طور پر محض علامات و قرائن سے ان کے نفاق پر مطلع نہ ہو سکے۔ ان کا ٹھیک ٹھیک یقین صرف خدا کے علم میں ہے جس طرح عام منافقین کا پتہ چہرہ لب ولہجہ اور بات چیت سے لگ جاتا تھا جیسا کہ ارشاد ہے:

> ولو نشاء لاريناكهم فلعرفتهم بسيماهم ولتعرفنهم في لحن القول

اور ہم اگر چاہتے تو آپ کو ان کا پورا پتہ بتا دیتے سو آپ ان کو ان کے حلیے سے پہچان لیتے۔ اور آپ ان کو ان کے طرز کلام سے ضرور پہچان لیں گے۔

لیکن ان کا نفاق اس قدر گہرا ہے کہ اس قسم کی ظاہری علامات بھی ان کا پردہ فاش نہیں کرتی ہیں۔ فرمایا ہم انکو دوبارہ عذاب دیں گے بڑا عذاب دوزخ کا ہے۔

ان المنافقین فی الدرک الاسفل من النار

بلاشبہ منافقین دوزخ کے سب سے نچلے طبقے میں ہوں گے

اس عذاب سے پہلے کم از کم دو بار ضرور عذاب میں مبتلا کیے جائیں گے ایک عذاب قبر دوسرا وہ عذاب جو اسی دنیوی زندگی میں پہنچ کر رہے گا۔ مثلاً ابن عباس کی ایک روایت کے موافق حضور اقدس نے جمعہ کے روز ممبر پر کھڑے ہو کر تقریباً ۲۶ آدمیوں کو نام بنام پکار کر فرمایا اخرج فانک منافق یعنی تو منافق ہے مسجد سے نکل جا یہ رسوائی بھی ایک قسم کا عذاب تھی۔ یا پہلے اسی سورت میں گذرا کہ ان کے اموال و اولاد کو حق تعالیٰ نے ان کے حق میں عذاب بنا دیا۔

فلا تعجبک اموالھم ولا اولادھم انما یرید اللہ لیعذبھم بھا فی الحیاۃ الدنیا۔

یا ان میں سے کچھ بھوک وغیرہ آفات ارضی و سماوی میں مبتلا ہو کر ذلت کی موت مرے یا اسلام کی ترقی و عروج کو دیکھ کر چڑنا اور دانت پیسنا بھی ان کے حق میں سوہان روح تھا۔ میرے نزدیک یہ سب قسم کے عذاب مرتین کے احاطہ میں داخل ہیں۔ اور دو کا عدد یا تو مطلق تعدد کے لیے ہے جیسے ثم ارجع البصر کرتین میں اور یا دو بار سے مراد نوعی اثنینیت ہے یعنی عذاب قبر اور عذاب قبل الموت۔[1]

مردعلی النفاق کے معنی نفاق میں ماہر اور فن کار ہو گیا۔ نفاق کی فن کاری کی وجہ سے وہ اہل ایمان کو بڑی کامیابی سے دھوکہ دے سکتے ہیں یعنی منافقانہ زندگی گذارتے گذارتے اس کی ایسی مشق اور مہارت ہو گئی کہ نو آموزوں کی طرح پکڑے نہیں جا سکتے۔ یہ لوگ اس بناء میں ایسے فن کار ہو گئے ہیں کہ ممکن نہیں کہ آپ ان کو پہچان سکیں۔ لا تعلمھم نحن نعلمھم میں مسلمانوں کو بھی تنبیہ ہے اور ان منافقین کو بھی۔ مسلمانوں کو یہ تنبیہ ہے کہ ان کے معاملے میں بڑی زیرکی اور ہوشیاری

[1] افادات شیخ الاسلام

سے کام لو اور برابر چوکتے رہو یہ ایسی عیاری سے کام لیتے ہیں کہ ہر شخص ان کو پہچان نہیں سکتا اور تو اور حضور اقدس بھی ان کو نہیں جانتے اور منافقین کو یہ تنبیہ ہے کہ تم کیسی ہی عیاری اور چالاکی کرو دوسرے تمہیں پہچاننے میں دھوکہ کھا سکتے ہیں لیکن اللہ تم کو اچھی طرح جانتا ہے سنعذبھم مرتین کی تشریح شارحین قرآن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے ۔ شیخ الاسلام کی تشریح آپ سن چکے ۔ کچھ علماء کہتے ہیں کہ دو بار کا مطلب یہ ہے کہ ایک سزا نفاق کی دوسری کمال نفاق کی وجہ سے دہرے عذاب کے مستحق ہو گئے ۔ پہلی استعداد یہ کہ منافق ہوئے دوسری یہ کہ اس میں ماہر اور فن کار ہو گئے ۔

قرآن بار بار یہ بتاتا ہے کہ اعمال کے نتائج ٹھیک ٹھیک ان کی حالت اور درجہ کے مطابق رونما ہوتے ہیں اگر ایک شخص نے زہر کھا لیا معمولی قسم کا ہو تو نتیجہ بھی معمولی قسم کا ہو گا اگر زہر قاتل ہو تو نتیجہ بھی قاتل ہی ہو گا ۔ یہی قانون مادی زندگی کی طرح روحانی زندگی میں بھی کام کر رہا ہے اچھائیوں کی طرح برائیوں سے بھی درجات و اقسام ہیں ۔

یہاں علامہ بقاعی بڑی ہی لطیف بات فرما گئے ہیں ۔ ان کی یہ بات واقعات و حالات سے ہم آہنگ ہے اس لیے زیادہ اہم ہے ۔ منافقین کو دوبار عذاب کی واقعاتی صورت یہ ہے کہ

پہلی بار اس طرح وہ عذاب میں مبتلا ہوں گے کہ آپ بخیر و عافیت اور صحیح و سالم تبوک سے مدینے واپس تشریف لائیں گے ۔ مدینہ میں آپ کا نظام حکومت مضبوط ہو گا ۔ آپ کی شان بلند ہو گی اطراف و اکناف آپ کا آوازہ ہو گا ۔ نبوت کا آفتاب تاباں ہو گا کیونکہ تبوک جاتے وقت ان منافقین کو یقین تھا کہ آپ اس سفر سے واپس نہ آئیں گے کیوں ؟ اس لیے کہ ان کے خیال میں آپ کے مدمقابل طاقت زبردست تھی ۔ آپ کا بہادر شیروں سے مقابلہ تھا ۔ رومیوں کی عظمت اور برتری سے وہ ذہنی طور پر مرعوب تھے ان کی فوجی طاقت ان کی افرادی قوت کا بھوت ان کے دماغوں پر مسلط تھا لیکن ان کو پتہ نہ تھا کہ مخلوق کی خالق کے مقابلے میں کوئی حقیقت نہیں ۔ آپ کی واپسی ان کے لیے دکھ تکلیف اور عذاب بن گئی ۔ یہ عذاب کی پہلی باری ہے ۔

عذاب کی دوسری باری اس وقت سامنے آئی جب آپ رحلت فرمائے دار بقا ہوئے مدینہ اور مدینہ کے اردگرد آبادی نے آپ کے لگائے ہوئے باغ کو نذر آتش کرنے کی کوشش کی صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے دل سوزی بہادری اور دلیری کے ساتھ اس کا مقابلہ کیا ۔ اور منافقین کا امیدوں پر پانی پھر گیا ۔

مدینہ کے اردگرد جن قبائل نے حضور اقدس کی مخلصانہ طاعت اپنالی تھی وہ یہ قبائل تھے

جہینہ، اسلم، اشجع، غفار، لحیان، اور عصیہ۔ اللہ سبحانہ نے حضور اقدس کو بتایا ہے کہ ان میں کچھ بناوٹی طور پر مسلمانی کا لبادہ پہنے ہوئے ہیں۔ سارے ہی مخلص نہیں ہیں خود اہل مدینہ میں مخلصین تھے جنہوں نے فی الواقع اسلام کو ایک دین سمجھ کر قبول کیا تھا۔ لیکن ان میں بھی کچھ منافقین کا بقیہ موجود تھا اہل مدینہ ہوں یا مدینہ کے ارد گرد کے باشندے ہوں ان میں کچھ منافق تھے۔ اسی لیے آیت میں من تبعیضیہ لائے ہیں۔ یعنی ایک چھوٹی سی ٹولی ہے۔ جس کا نفاق اس حد کمال کو پہنچا ہوا ہے اس قدر خفی ہے کہ آپ کو بھی فطانت و ذکاوت اور کمال فراست کے باوجود ان کے منافق ہونے کا علم نہیں ہے۔ صرف اللہ ہی کو ان کے منافق ہونے کا علم ہے مولانا اشرف علیؒ نے مسائل السلوک میں لکھا ہے۔

"یہ آیت گرامی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے علم غیب کی نفی میں تصریح ہے۔"

یعنی یہ آیت گرامی اس بات کی صاف اور واضح دلیل ہے کہ ان منافقوں کو جن کا نفاق حد کمال کو پہنچا ہوا تھا اور جو نفاق پر اڑے ہوئے اور بضد تھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نہیں جانتے تھے۔ ان کا علم صرف اللہ سبحانہ کو تھا۔ اگر آپ دانائے غیب ہوتے تو بلا ریب آپ کو ان منافقوں کے حالات کا پتہ ہوتا اور اللہ سبحانہ یہ نہ فرماتے کہ آپ ان کو نہیں جانتے ہیں اللہ سبحانہ ہی جانتا ہے۔

حضورؐ کی غیب دانی پر استدلال

چونکہ اس آیت گرامی میں کچھ لوگوں نے معنوی تحریف کر دی ہے اس لیے مناسب معلوم ہوتا ہے کہ شارحین قرآن کی زبانی اس آیت کی تشریح پیش کر دی جائے۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں،

آپ ان منافقوں کی شخصیتوں کو نہیں جانتے۔ اس فقرے میں یہ بات بتائی ہے کہ وہ اپنے نفاق کو چھپانے میں اتنے ماہر ہیں کہ آپ پر بھی انکے حالات پوشیدہ ہیں حالانکہ آپ کا کمال فراست و ذکاوت مثالی ہے نحن نعلمھم ہم ہی ان کو جانتے ہیں اور ان کے اندرون سے واقف ہیں۔ بیضاوی ص۱۸۶

علامہ نسفی لکھتے ہیں،

لا تعلمھم آپ ان کو نہیں جانتے یعنی وہ آپ پر باوجود آپ کی کمال فطانت اور صدق فراست کے مخفی ہیں کیونکہ آپ ایسے حالات سے بے حد پرہیز کرتے ہیں جو ان کے بارے میں آپ کو شک میں ڈال دے نحن نعلمھم ہم ہی ان جانتے ہیں یعنی اللہ سبحانہ

کے سوا ان کو کون نہیں جانتا ہے اور نہ ان کے بھید سے اللہ کے سوا کوئی واقف ہے۔
کیونکہ وہ کفر تو دل میں چھپائے رکھتے ہیں اور آپ کے سامنے وہ مخلص مسلمانوں کی طرح
ظاہر ہوتے ہیں۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی لکھتے ہیں:

"لا تعلمھم یعنی آپ باوجود فطانت اور صحیح فراست کے ان کا منافق ہونا نہیں جانتے ہیں۔ قرآن نے یہ کہہ کر منافقین کی نفاق میں مہارت اور فن کاری بتائی ہے۔ ان کی مہارت یہ ہے کہ وہ ایسے حالات ہی پیدا نہیں ہونے دیتے جن سے ان کا منافق ہونا آپ جان سکیں۔ نحن نعلمھم ہم ہی ان کو خوب جانتے ہیں۔ اگر آپ کے سامنے تلبیس سے کام لے سکتے ہیں تو ہمارے سامنے ان کو تلبیس پر قدرت نہیں ہے۔

علامہ محمود آلوسی لکھتے ہیں:

لا تعلمھم کہ آپ ان کو نہیں جانتے ہیں اس میں اللہ سبحانہ نے منافقین کی سرکشی کو بتایا ہے کہ وہ نفاق میں اتنے کھرے ہیں کہ ان کو عنوان نفاق سے نہیں جانتے ہیں مطلب یہ ہے کہ آپ کو ان کے نفاق کا علم نہیں ہے۔

ظاہر ہے کہ مدینہ طیبہ کے جن منافقین کا یہاں ذکر کیا گیا ہے ان کا نفاق اور ان کے دوسرے ظاہری اور باطنی احوال سب ہی علم غیب ہیں لیکن اس آیت میں اس کی تصریح ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو ان کی منافقت اور منافقانہ چالوں اور ریشہ دوانیوں کا علم نہ تھا۔

ملا علی نے موضوعات کبیر میں جلال الدین سیوطیؒ سے نقل کیا ہے کہ ایک فرقہ کا خیال ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا اور اللہ سبحانہ کا علم برابر ہے جو کچھ اللہ سبحانہ جانتے ہیں حضور بھی جانتے ہیں یہ بتا کر لکھتے ہیں کہ:

حالانکہ اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے ومن حولکم من الاعراب منافقون ومن اھل المدینۃ مردوا علی النفاق لا تعلمھم نحن نعلمھم یہ ارشاد گرامی سورہ برارت میں ہے جو قرآن کریم کی نزول میں آخری سورت ہے اور منافق بھی دور نہ تھے۔ آپ کے پڑوس میں مدینہ کے اندر رہتے تھے اور جس نے یہ اعتقاد کر لیا کہ اللہ سبحانہ کا اور اس کے رسول کا علم برابر ہے تو وہ اجماع امت کی رو سے کافر ہے (موضوعات کبیر)

ایک شارح قرآن کی تفسیر

حیرت ہے کہ ایک معاصر مفسر قرآن نے قرآن کی اس آیت کی ضرب کاری سے بچنے کے لیے اس آیت کو ولتعرفنھم فی لحن القول سے منسوخ کر دیا ہے۔ حالانکہ ایسا خیال قرآن کی شرح و تفسیر نہیں ہے کیونکہ اولاً سورۃ توبہ قرآن کی آخری سورت ہے اور یہ آیت لا تعلمھم اسی میں آتی ہے۔ متقدم سے متاخر کو منسوخ کرنا ہرگز صحیح نہیں ہے۔ ثانیاً لا تعلمھم کا درجہ خبر ہے انشا نہیں ہے نسخ انشا میں ہوتا ہے۔ خبر میں نہیں ہوتا ہے۔ علامہ نسفی لکھتے ہیں،

"محققین علماء کا مسلک ہے کہ نسخ احکام میں ہوتا ہے اخبار میں نہیں ہوتا۔" مدارک ج ۱

ثالثاً ان دو آیتوں کا محل بھی الگ الگ ہے نہ ان میں تعارض کا سوال پیدا ہوتا ہے اور نہ نسخ کا۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں:

> حق سبحانہ و تعالیٰ شانہ کا یہ ارشاد لا تعلمھم اس کے اس ارشاد ولو نشاء لاریناکھم فلعرفتھم بسیماھم ولتعرفنھم فی لحن القول کے منافی نہیں ہے جس کے معنی یہ ہیں کہ اگر ہم چاہیں تو آپ کو وہ منافق دکھا دیں تو آپ ان لوگوں کو ان کے چہرے بشرے کی نشانیوں سے پہچان سکتے ہیں اور ان کو بات کے ڈھب سے پہچان سکتے ہیں کیونکہ یہ تو ان علامات سے پہچاننا مراد ہے جو ان کے چہرے پر نمایاں ہوں جن سے وہ پہچانے جا سکتے ہیں آیت کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نفاق و شک کے سارے لوگوں کو پہچانتے تھے۔ (تفسیر ابن کثیر ج ۲ صفحہ ۲۸۴)

اور یہی حافظ ابن کثیرؒ ولو نشاء الخ کی تفسیر میں لکھتے ہیں:

> اے محمد صلی اللہ علیہ وسلم اگر ہم چاہیں تو منافقین کو باشخاصہم معین کرکے آپ کو دکھا دیں اور نام بنام مطلع کر دیں۔ لیکن اللہ تعالیٰ نے تمام منافقوں کے بارے میں از راہ تستر اور امور کو ظاہری سلامت روی پر رکھتے ہوئے اور بھیدوں کو ان کے جاننے والے کے حوالہ کرتے ہوئے ایسا نہیں کیا اور آپ ان کو ان کے ظاہری کلام جو ان کے مقاصد پر دال ہے اور متکلم کی حقیقت کو ظاہر کرتا ہے پہچان سکتے ہیں کہ وہ کس گروہ سے تعلق رکھتے ہیں کیونکہ اس کی بات کے الگ ڈھنگ سے اس کو پہچانا جا سکتا ہے اور لحن القول سے یہی مراد ہے۔ ابن کثیر ج ۴ صفحہ ۱۸۰

اس سے معلوم ہوا کہ لا تعلمھم نحن نعلمھم میں حقیقی علم آپ کو نہیں وہ صرف ہمیں کو ہے اور لو نشاء الایہ میں چہرے بشرے اور انداز کلام سے پہچاننا مراد ہے جو صرف ظاہری قرائن اور شواہد کے تحت ہے اور یہ ظن کے درجے اوپر نہیں مانا جاتا کیونکہ منافق اور مخلص کی بات کا ڈھنگ الگ الگ ہوتا ہے۔ جو زور شوکت پختگی اور خلوص کا رنگ مخلص کی باتوں میں جھلکتا ہے۔ منافق کتنی ہی کوشش اور تصنع سے کام لے وہ اپنے کلام میں پیدا نہیں کر سکتا۔ اور علامہ محمود آلوسی الحنفی ارقام فرماتے ہیں۔

صرف پیشانیوں پر منافق کے لفظ کا ہونا ہی علامت نہیں ہے بلکہ اس کے علاوہ بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم منافقین کو دوسری علامات سے پہچان لیتے تھے ٹھیک اس طرح جیسے قیافہ شناس کسی شخص کے ظاہری حالات اور علامات کو دیکھ کر اس کا حال معلوم کر لیتا ہے۔ اور نظر بھی اس کے دل کی ترجمانی کر دیتی ہے۔ اور ہم نے متعدد حضرات کو دیکھا ہے کہ وہ چہرے پر علامات کو دیکھ کر سنی اور شیعہ بتا دیتے ہیں اور اگر یہ صحیح ہے کہ کچھ اولیاء کرام نیک و بد اور مومن و کافر کو پہچان لیتے ہیں اور یہ بتاتے ہیں کہ مجھے فلاں سے طاعت کی اور فلاں سے معصیت کی بو آتی ہے۔ اور فلاں سے ایمان کی خوشبو اور فلاں سے کفر کی بدبو محسوس ہوتی ہے تو اس سے اس کی مزید تائید ہوتی ہے۔ روح المعانی ج ۲۶ ص۷۸

بہر حال اس آیت کو فلعرفتھم بسیماھم والی آیت سے منسوخ بتانا قرآن کی شرح و تفسیر کا منہ چڑانا ہے۔

اس آیت میں منافقوں کے موضوع پر یہ باتیں پوری وضاحت سے بتائی گئی ہیں۔

اوّل یہ کہ منافقین کی دو قسمیں ہیں ایک اعرابی اور بدوی جو مدینہ کے ارد گرد رہتے تھے یعنی مدینہ سے قریب بستیوں میں جن کی سکونت تھی۔

دوسرے خاص مدینہ کے باشندے ان میں سب کو منافق نہیں کہا بلکہ کچھ کو ایسے ہی بدوؤں میں بھی سب منافق نہ تھے بلکہ کچھ منافق تھے اور کچھ کے بارے میں آپ پڑھ چکے ہیں من الاعراب من یومن باللہ والیوم الاخر و یتخذ ما ینفق قربات عند اللہ الخ اور جو کچھ منافق تھے وہ نفاق عمل تھا۔ نفاق واقعی نہ تھا اور نفاق کی وجہ بھی یہ تھی کہ صحبت نبوت اور اہل علم سے دور ہونے کی وجہ سے اسلام آشنائی کے اس مقام پر نہ تھے جو ایمان کے تقاضے پورا کرنے کے لیے

ضروری ہے ان لا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ۔
اس سے واضح ہوا کہ مہاجرین و انصار میں سے کوئی منافق نہ تھا کیونکہ جن کا چہرہ رضی اللہ عنہم و رضوا عنہ کے ذریعہ پیش کیا جا چکا ہے وہاں نفاق کا شائبہ بھی ممکن نہیں ہے اس لیے مہاجرین و انصار پر نفاق کا شبہ کرنا اس آیت کی بغاوت ہے بلکہ صریح قرآن کی تکذیب ہے۔
دوم یہ کہ ان کچھ منافقوں کا نفاق شاہراہ عام پر نہ تھا کہ ہر کہ ومہ دیکھ کر فیصلہ کر دے کہ یہ منافق ہے بلکہ اس قدر پوشیدہ تھا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم باوجود فراست کاملہ اور باوجود اس روشن ضمیری کے ان کے نفاق سے بے خبر تھے۔ معلوم ہوا کہ اہل تشیع جن کو منافق کہتے ہیں کیونکہ بقول ان کے ان کا نفاق اس قدر نمایاں تھا کہ حضور اقدس کو اول روز ہی سے ان کے نفاق کا پتہ تھا۔ سفر ہجرت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو صرف اس لیے ہمراہ لیا تھا کہ وہ کہیں افشائے راز نہ کر دیں (معاذ اللہ) ثم معاذ اللہ
ثالثاً یہ کہ منافقوں کو عذاب آخرت سے پہلے دو مرتبہ دنیا میں عذاب ہونا ضروری ہے۔ کیونکہ عذاب عظیم سے مراد بلاشبہ آخرت کا عذاب ہے پس اس سے پہلے جو دو مرتبہ عذاب کرنے کو فرمایا بلاشبہ وہ دنیا میں ہے اس کی تصریح بھی دوسری آیات میں آتی ہے یعذبھم اللہ عذابا الیما فی الدنیا والآخرۃ۔ شارحین قرآن نے تصریح کی ہے کہ دو مرتبہ عذاب کرنے سے مراد یہ ہے کہ ایک بار ان کا نفاق ظاہر کر کے ان کو رسوا کیا جائے گا اور دوسری مرتبہ ان کو قتل کیا جائے گا۔

عفو و درگذر کی شان عظیم

۱۰۲ اور کچھ اور بھی ہیں جنہوں نے اپنی غلطی کو مان لیا ہے۔ انہوں نے ملے جلے کام کیے، کچھ اچھے اور کچھ برے ہو سکتا ہے کہ اللہ سبحانہ ان کی توبہ قبول کرے اللہ بڑا ہی بخشنے والا مہربان ہے۔
اہل مدینہ میں اگر ایک طرف یہ منافقین متمردین ہیں جو اپنی شرارتوں اور جرموں کو پردۂ نفاق میں چھپاتے اور ان پر سختی سے اڑے رہتے ہیں تو دوسری جانب کچھ وہ مسلمان ہیں جن سے بتقاضائے بشریت کوئی خطا و قصور سرزد ہو جائے تو نادم ہو کر بے تامل اپنے گناہوں کا اقرار کرتے ہیں ان کی بھلائی اور برائی رلی ملی ہے۔ برائی تو مثلاً یہی ہے کہ نفیر عام کے باوجود نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت پر غزوہ تبوک میں حاضر نہ ہوئے بعدہ اس غیر حاضری پر دل سے پشیمان و متاسف

ہونا اور ظاہرا و باطنا توبہ کرنا اور دوسرے اعمال صالحہ نماز، روزہ، زکوٰۃ، حج یا دوسرے غزوات کی شرکت وغیرہ بجالانا۔ یہ سب ان کی بھلائیوں کی فہرست میں داخل ہے ایسے حضرات کو حق تعالیٰ نے معافی کی امید دلائی ہے۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ یہ آیت حضرت ابو لبابہ اور ان کے چند ہمراہیوں کے حق میں نازل ہوئی جو محض کسل اور تن آسانی کی وجہ سے تبوک میں حاضر نہ ہوئے لیکن جب تبوک سے حضرت کی واپسی معلوم ہوئی تو غایت ندامت سے ان سب نے اپنے کو مسجد کے ستونوں سے باندھ دیا اور قسم کھائی کہ جب تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے ان مجرموں اور قیدیوں کو معاف کر کے اپنے ہاتھ سے نہ کھولیں گے۔ اسی طرح بندھے کھڑے رہیں گے۔ آپ نے یہ حال دیکھ کر فرمایا۔ واللہ جب تک خدا ان کے کھولنے کا حکم نہ دے میں ان کو نہیں کھول سکتا۔ آخر یہ آیات نازل ہوئیں۔ تب آپ نے کھولا اور قبول توبہ کی بشارت دی کہتے ہیں کہ یہ لوگ کھلنے کے بعد تکمیل توبہ کے طور پر کچھ مال لے کر حاضر ہوئے کہ اللہ کی راہ میں تصدق کریں۔ اس پر اگلی آیت نازل ہوئی [1]

شارحین قرآن نے امام مجاہد اور حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے یہ انکشاف کیا ہے کہ ان آیات کا پس منظر وہی ہے جو حضرت شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں بتایا ہے اس واقعہ سے یہ بات پوری قوت کے ساتھ واضح ہو جاتی ہے کہ یہ لوگ غزوہ تبوک میں شرکت سے اس لیے محروم نہ ہوئے تھے کہ جنگ میں جانا نہ چاہتے یا ان کو نبوت میں کوئی شک تھا بلکہ ان کے شریک نہ ہونے کا سبب صرف طبعی تکاسل تھا۔ جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے بتایا ہے کیونکہ ابو لبابہ ان لوگوں میں تھے جو بیعت عقبہ کے موقعہ پر ہجرت سے پہلے اسلام سے مشرف ہوئے تھے۔ پھر جنگ بدر، جنگ احد اور دوسرے اہم مواقع پر موجود تھے مگر غزوہ تبوک کے موقع پر ایمان کی کمزوری سے نہیں بلکہ طبیعت کی افتاد کے غلبہ کی وجہ سے بغیر کسی عذر شرعی کے بیٹھے رہ گئے یہ صرف اکیلے نہ تھے بلکہ ان کے کچھ اور بھی ساتھی تھے جد بن قیس، کردم، اوس بن ثعلبہ، ودیعہ ابن حزام، مرداس، ابو قیس اور ابو لبابہ یہ دس حضرات تھے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم غزوہ تبوک سے واپس آئے اور ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ پیچھے رہ جانے والوں کے متعلق اللہ و رسول کی کیا رائے ہے تو ان میں سے ہر شخص سچائی کے ساتھ اپنی غفلت پر شرمندہ ہوا اور کوئی نہ تھا جس کا دل حسرت و ندامت کے زخموں سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہ ہو رہا قبل اس کے کہ کوئی باز پرس ہوئی۔ انہوں نے خود ہی اپنے آپ کو ایک ستون سے باندھ لیا اور کہا کہ ہم پر خواب و خور حرام ہے جب تک ہم معاف نہ کر دیئے جائیں یا پھر ہم مر جائیں چنانچہ وہ کئی روز اسی طرح بے آب و دانہ اور بے خواب بندھے رہے حتیٰ کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔ آخر کار جب ان کو بتایا گیا کہ اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی اور ان کو معاف کر دیا کیونکہ اسکی بخشش و رحمت کا دروازہ کبھی بند نہیں ہو سکتا شرط صرف یہ ہے کہ ہم خود اپنے دلوں کا دروازہ اپنے ہاتھوں نہ بند کر دیں ؎

نہ پہنچی ضعف سے لب تک دعا ہی، ورنہ سدا
در قبول تو اس آرزو میں باز رہا

فرمایا انہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کیا اور ان کا یہ اعتراف دل کا اعتراف ہے کوئی وجہ نہیں کہ ان کی توبہ قبول نہ ہو اور جو سر اعتراف گناہ میں جھک گیا پھر اس کے لیے محرومی ہو نہیں سکتی

ع کہ مستحق کرامت گنہ گار انند

عسی اللہ ان یتوب علیھم کا شاہانہ انداز اختیار کر کے ان کو قبولیت کی بشارت دی گئی۔ اور بشارت سے پہلے ان کے گناہوں کے اعتراف کی وجہ بتائی گویا ذہنوں میں یہ سوال ابھرا کہ انہوں نے گناہوں کا اعتراف کیوں کیا۔ فرمایا کہ یہ لوگ صرف برائیوں میں نہیں پلے ہیں بلکہ اس موجود برائی کے ساتھ ان کی زندگی میں عمل صالحہ کا سرمایہ بھی ہے نیکی کی راہ پر چلتے اگر غلطی ہو جاتی ہے تو نیکی کی برکت سے فوراً تنبہ ہوتا ہے اور اعتراف گناہ کے بعد سر ندامت سے جھک جاتا ہے خلطوا عملا صالحا و آخر سیئا۔

مفسرین کے نزدیک اگرچہ آیت کا مورد خاص ہے مگر حکم عام ہے ابو عثمان النہدی کہتے ہیں کہ میرے نزدیک قرآن کی یہ آیت اہل ایمان کے لیے بہت بڑی ڈھارس ہے۔ امام بیہقی نے حضرت مطرف کے حوالہ سے بتایا ہے وہ فرماتے ہیں کہ میں رات کو بستر پر لیٹتا ہوں اور قرآن پر غور کرتا ہوں اور قرآن کی روشنی میں اپنا جائزہ لیتا ہوں تو میں محسوس کرتا ہوں کہ قرآن نے اہل جنت کا جو چہرہ پیش کیا ہے اس پر میں پورا نہیں اترتا ہوں۔ جہنمیوں کی بات جو قرآن نے بتائی اس پر جب اپنے کو پیش کرتا ہوں تو اپنے آپ کو ان میں بھی نہیں پاتا ہاں جب قرآن کی اس آیت کو پڑھتا ہوں و آخرون اعترفوا بذنوبھم الخ تو میں اپنے آپ کو اس کے مطابق دیکھتا ہوں اور مجھے امید ہے کہ میں اس آیت کا مصداق ہوں گا۔

اس آیت سے محققین نے یہ بات بھی خوب سمجھی ہے کہ گنہ گار کے لیے مایوسی جائز نہیں ہے اور قبول وعفو کی امید اس وقت تک قائم ہے جب تک زندگی میں بدی کے ساتھ نیکی کی امیزش ہے۔ آج بھی اگر ایک مسلمان سے نیکیوں کے ساتھ کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو اسے رحمت حق سے مایوس نہ ہونا چاہیے عسی اللہ ان یتوب علیھم اور لا تقنطوا من رحمۃ کا یہی مطلب ہے۔ گویا یہ آیت ارحم الراحمین کی بے پایاں رحمت اور عفو و درگذر کی شان عظیم کا اعلان کرتی ہے اور سخت سے سخت مایوس بیماروں کے حق میں اکسیر شفا کا حکم رکھتی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ بندے کی توبہ قبول کرلیتا ہے۔ اللھم اغفرلی ذنوبی جمیعًا انہ لا یغفر الذنوب الا انت۔ رب رحمتک ارجی عندی من عملی و مغفرتک اوسع من ذنوبی۔

خُذْ مِنْ اَمْوَالِهِمْ صَدَقَةً تُطَهِّرُهُمْ
وَتُزَكِّيْهِمْ بِهَا وَصَلِّ عَلَيْهِمْ ۭ اِنَّ صَلٰوتَكَ سَكَنٌ لَّهُمْ ۭ وَاللّٰهُ
سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۱۰۳﴾ اَلَمْ يَعْلَمُوْٓا اَنَّ اللّٰهَ هُوَ يَقْبَلُ التَّوْبَةَ عَنْ
عِبَادِهٖ وَيَاْخُذُ الصَّدَقٰتِ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۰۴﴾
وَقُلِ اعْمَلُوْا فَسَيَرَى اللّٰهُ عَمَلَكُمْ وَرَسُوْلُهٗ وَالْمُؤْمِنُوْنَ ۭ وَ
سَتُرَدُّوْنَ اِلٰى عٰلِمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ فَيُنَبِّئُكُمْ بِمَا كُنْتُمْ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۰۵﴾ وَاٰخَرُوْنَ مُرْجَوْنَ لِاَمْرِ اللّٰهِ اِمَّا يُعَذِّبُهُمْ وَ
اِمَّا يَتُوْبُ عَلَيْهِمْ ۭ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۰۶﴾

اے پیغمبر ان کے مالوں سے زکوٰۃ لو، اس کے ذریعے تطہیر اور تزکیہ کرو گے اور ان کو دعا دو۔ بلاشبہ آپ کی دُعا ان کیلئے سامان سکینت ہے اور اللہ سب کچھ سننے اور جاننے والا ہے[۱] کیا ان کو خبر نہیں ہے کہ اللہ ہی کی ذاتِ گرامی اپنے بندوں کی توبہ کو شرف قبول عطا کرتی ہے اور اللہ ہی صدقات کو پذیرائی دیتا ہے اور اللہ ہی زیادہ سے زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور بڑا ہی رحمت کرنے والا ہے[۲] اور اے پیغمبر ان سے کہدو کہ عمل کئے جاؤ اللہ تمہارے

اللہ کا رسول اور سارے مسلمان تمہارے اعمال دیکھیں گے اور ضرور تمہیں عالم الغیب والشہادۃ کی عدالت میں پیش کیا جائے گا وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کرتے تھے[۱۰۵] اور کچھ اور بھی ہیں جن کے معاملے میں تا حکم الٰہی مہلت دی گئی ہے وہ ان کو عذاب دے اور یا اپنی رحمت سے ان کو معاف کر دے اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے[۱۰۶]

مفردات کے معانی

صدقہ خیرات، زکوٰۃ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔ صدقہ وہ ہے جس کو اپنے مال میں سے بطور عبادت نکالتا ہے جیسے کہ زکوٰۃ لیکن صدقہ اصل میں نفلی خیرات کے لیے بولا جاتا ہے اور زکوٰۃ واجب کے لیے اور کبھی واجب کو صدقہ سے موسوم کیا جاتا ہے جب کہ اس کا ادا کرنے والا اپنے فعل میں صدق کا ارادہ کرے ارشاد ہے خذ من اموالھم صدقۃ اور انما الصدقات للفقراء اور صدقہ دال کے پیش کے ساتھ مہر ہے۔ فقہاء کی زبان میں صدقہ کی حیثیت بالکل ہبہ کی ہے۔ جیسے ہبہ قبض کے اور تملیک کے بغیر ہبہ نہیں ایسے ہی صدقہ بھی قبض اور تملیک کے بغیر درست نہیں ایک مثال سے سمجھئے چند فقیروں کو بلا کر گھر میں کھانا کھلایا یہ طعام اباحت اور خیرات ہے لیکن صدقہ نہیں ہے اگر ان کو مالک بنا دیا تو یہ صدقہ ہے درمختار میں ہے الصدقۃ کالھبۃ بجامع التبرع تطھر یطھر سے تطہیر باب تفعیل ہے اس کے معنی خوب پاک کرنا ہیں اس میں غالب پہلو ظاہری اور باطنی نجاستوں اور رذائل سے پاک کرنے کا ہے قرآن میں وطھر شاید آیا ہے حضرت ابراہیم واسماعیل کو حکم طھرا بیتی میرے گھر کو پاک کرو۔ عام شارحین قرآن نے اس کا متعلق ذنوب بتایا ہے مطلب یہ ہے کہ صدقہ کے ذریعے آپ ان کے دامنوں سے گناہوں

کے داغ ہٹا دیں۔ یہ گویا تخلیہ یعنی صفائی اور منجھائی ہے۔

تزکی زکو سے نکلا ہے تزکیہ اس کا مصدر ہے۔ اصل میں زکوٰۃ کے معنی بڑھوتری کے آتے ہیں امام راغب فرماتے ہیں وہ افزونی جو اللہ تعالیٰ کی برکت سے حاصل ہوتی ہے زکوٰۃ ہے جب کھیتی میں افزونی و برکت حاصل ہو اسے کہا جاتا ہے زکا الزرع قرآن میں ایھا ازکی طعاما اسی سے آیا ہے اور اسی سے زکوٰۃ اس شے کو کہتے ہیں جسے انسان فقیروں کے لیے نکالتا ہے اور اس لیے کہا گیا کہ اس میں برکت کی امید ہوتی ہے یا اس لیے کہ نفس کا تزکیہ ہوتا ہے یعنی خیرات و برکات کے ذریعے اس میں ترقی ہوتی ہے۔ دراصل نفس تزکیہ اور طہارت کی بدولت انسان اس حیثیت میں ہو جاتا ہے کہ دنیا میں اوصاف حمیدہ کا گہوارہ بن جائے اس کی صورت یہ ہوتی ہے کہ انسان اس کوشش میں لگ جاتا ہے جس میں اس کی پاکیزگی ہوتی ہے۔

تزکیہ کی نسبت کبھی بندہ کی طرف ہوتی ہے کیونکہ وہ اکتساب کرتا ہے جیسے قد افلح من زکھا اور کبھی اللہ سبحانہ کی طرف ہوتی ہے کیونکہ فی الواقع وہ ہی فاعل ہے اللہ یزکی من یشاء اور کبھی اس کی نسبت نبی کی طرف ہوتی ہے کیونکہ خدا کی جانب سے آنے والے تزکیہ میں وہ ہی واسطہ ہوتا ہے تطھرھم و تزکیھم بہا اور یتلوا علیکم آیاتنا ویزکیکم

صلّ علیھم ۔ اس کا مصدر تصلیۃ ہے اور اس کا اسم مصدر صلوۃ ہے۔ امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں۔ بہت سے اہل لغت کا بیان ہے کہ صلوۃ کے معنی دعا کرنے، برکت مانگنے اور بزرگی سے یاد کرنے کے ہیں۔ بولا جاتا ہے۔ صلیت علیہ یعنی میں نے اس کے دعا کی اور بزرگی سے یاد کیا۔ حدیث میں ہے اذا دعی احدکم الی الطعام فلیجب وان کان صائما فلیصل جب تم میں سے کسی کو کھانے کی دعوت دی جائے تو قبول کرے اگر روزہ ہو تو دعا دے دے۔ صل علیھم ان صلوٰتک سکن لھم ان کو دعا دو بے شک تمہاری دعا ان کے لیے سکون کا سامان ہے یصلون علی النبی یا ایھا الذین آمنوا صلوا علیہ رحمت بھیجتے ہیں پیغمبر پر اے ایمان والو تم بھی رحمت کی دعا کرو صلوات الرسول پیغمبر کی دعائیں۔ اللہ سبحانہ کی طرف سے مسلمانوں پر صلوٰۃ کا مطلب حقیقت میں ان کو سراہنا ہے ارشاد ہے اولئک علیھم صلوات من ربھم و رحمۃ ایسے لوگوں پر شاباشیں ہیں ان کے رب کی جانب سے اور مہربانی۔ علامہ عینی فرماتے ہیں صلوٰۃ کے معنی لغت میں دعا کے آتے ہیں۔ لفظ صلوٰۃ اسم مصدر ہے اور اس کے معنی اللہ کی جانب سے ہو تو رحمت کے ہیں فرشتوں اور اہل ایمان کی جانب سے ہو تو دعا کے ہیں

حضور اقدس کے حق میں صلاۃ کے شرعی معنے یہ ہیں کہ اے اللہ حضور اقدس کی بات کو دنیا میں اونچا کر اور آپ کی شریعت کو زندہ کر کے حضور کو بڑا بنا دے، اور آخرت میں رفع درجات اور مقام شفاعت عطا فرما کر آپ کو اونچا کر دے یہی معنے میں نے اپنے عظیم اساتذہ سے سنے ہیں۔

زکوٰۃ کے لیے اجتماعی نظام کی ضرورت

زکوٰۃ کے ضروری احکام پارہ دہم میں بیان ہو چکے ہیں۔ اس آیت میں ایک اہم اور ضروری چیز بتائی جا رہی ہے۔ وہ یہ ہے کہ اسلام میں سارے کام نظام جماعت کے ساتھ ہوتے ہیں۔ انفرادیت کو اسلام پسند نہیں کرتا۔ آپ مسجد سے دور ہوں اور الگ نماز پڑھ لیں نماز تو ہو جائے گی مگر اسلام یہی چاہتا ہے کہ نماز کی ادائیگی باجماعت ہو۔ اسی طرح نظام جماعت نہ ہو الگ زکوٰۃ نکالنا اور خرچ کرنا ہو، زکوٰۃ تو ہو جائے گی مگر ایسی ہوگی جیسے نماز بغیر جماعت کے۔

شائد آپ کے ذہنوں میں یہ خلش ہو کہ زکوٰۃ کے موضوع پر نظام جماعت سے کیا مقصود ہے؟

اسلام جماعت سے مقصود افراد کا ایسا مجموعہ ہے جس میں اتحاد، ایتلاف امتزاج اور نظم ہو۔

اتحاد کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اعمال حیات میں منتشر نہ ہوں ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہوں اور ان کے تمام اعمال مل جل کر انجام پائیں کسی گوشہ عمل میں بھی پھوٹ اور بیگانگی نہ ہو۔

ایتلاف کا مرتبہ اتحاد سے بلند تر ہے۔ اتحاد صرف باہم مل جانا ہے ضروری نہیں کہ کسی تناسب کے ساتھ باہم ملے ہوئے ہوں لیکن ایتلاف سے ایسا اتحاد مراد ہے جو محض اتحاد نہ ہو بلکہ ایک صحیح اور مناسب ترکیب کے ساتھ ہو۔ یعنی منتشر افراد اس طرح باہم ملے ہوں کہ جس فرد کو اس کی صلاحیت و اہمیت کے مطابق جو جگہ ملنی چاہیے وہی جگہ اسے ملی ہو اور ہر فرد کی انفرادی قوت کو جماعتی ترکیب میں اتنا ہی دخل دیا جائے جتنی اس میں استعداد ہو۔

امتزاج ترکیب کا تیسرا درجہ ہے اس میں کمیت سے زیادہ کیفیت کا اتحاد ہونا چاہیے یعنی مختلف افراد کو باہم اس طرح ملایا جائے کہ جس فرد کا اجتماعی مزاج جس قسم کے مزاج کے ساتھ مل کر ایک متحدہ کیفیت حاصل کر سکتا ہے ویسا ہی مزاج اس کے ساتھ ملایا جائے۔

نظم سے مقصود جماعت کی وہ ترتیبی اور تفویمی حالت ہے کہ اس کے تمام افراد اپنی اپنی جگہوں میں قائم اپنے اپنے دائرہ میں محدود اور اپنے اپنے فرائض و اعمال کے انجام دینے میں سرگرم ہوں۔

اجتماعی زندگی کے یہ خواص نہ تو حاصل ہو سکتے ہیں اور نہ قائم رہ سکتے ہیں جب تک کوئی بالاتر فعال

دمد بر طاقت موجود نہ ہو لہذا ایک امام کا وجود ناگزیر ہے اور اسی لیے ضروری ہے کہ سب سے پہلے اپنا امام وسربراہ بنائیں۔ جماعتی طاقت کا اصل مرکز امام ہے اس اجمالی تمہید کے بعد سب سے زیادہ اہم مسئلہ سامنے آتا ہے یعنی اسلام کا نظام شرعی یہ ہے کہ ہر مسلمان خلیفہ وقت اور سربراہ مملکت کی اطاعت کرے جب تک وہ مسلمان ہے اور اللہ ورسول کے خلاف کوئی حکم نہیں دیتا ہے یہی اسلام کی جماعت ہے اور اسی کا نام اسلام کا اجتماعی نظام ہے اِس اجتماعی نظام کی ہیئت ترکیبی پر ہم پانچویں پارے میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔

۱۰۸ اے پیغمبر ان کے مالوں سے زکوٰۃ لو اس کے ذریعے تم ان کی تطہیر اور تزکیہ کرو گے اور ان کو دعا دو۔ بلا شبہ آپ کی دعا ان کے لیے سامان سکینت ہے اور اللہ سب کچھ سننے والا اور جاننے والا ہے۔

صدقہ کا ترجمہ حضرت شیخ الہند نے زکوٰۃ کیا ہے لیکن اگر لفظ صدقہ کو عام رکھا جائے تو زکوٰۃ اور صدقات نافلہ سب کو شامل ہو جائے تو بہتر ہے کیونکہ اکثر روایات کے موافق یہ آیت ان ہی لوگوں کے حق میں نازل ہوئی ہے جو بعد معافی تکمیل توبہ کے طور پر صدقہ لے کر حاضر ہوئے تھے جیسا کہ ابھی پچھلے فائدے میں نقل کیا جا چکا ہے ہاں عموم الفاظ کو دیکھتے ہوئے حکم کو مورد نص پر مقصور رکھنے کی ضرورت نہیں اسی لیے سلف رحمہم اللہ مسئلہ زکوٰۃ میں اس آیت کو پیش کرتے ہیں۔ توبہ سے گناہ معاف ہو جاتا ہے یعنی اس پر مواخذہ باقی نہیں رہتا لیکن ایک قسم کی روحانی کدورت وظلمت وغیرہ جو گناہ کا طبعی اثر ہے وہ ممکن ہے باقی رہ جاتی ہو جو بالخصوص صدقہ اور عموماً حسنات کی مباشرت سے زائل ہوتی ہے بایں لحاظ کہہ سکتے ہیں کہ صدقہ گناہوں کے اثرات سے پاک وصاف کرتا اور اموال میں حرکت برکت بڑھاتا ہے۔ زکوٰۃ کے لغوی معنی بھی بڑھنے کے ہیں۔ اور ایک بڑا فائدہ صدقہ کرنے میں یہ تھا کہ صدقہ کرنے والوں کو حضور دعائیں دیتے تھے جن سے دینے والوں کا دل بڑھتا تھا اور سکون حاصل ہوتا تھا بلکہ آپ کی دعا کی برکت دینے والے کی اولاد در اولاد تک پہنچتی تھی۔ اب بھی ائمہ کے نزدیک مشروع ہے کہ جو شخص صدقہ لائے امام مسلمین بحیثیت وارث نبی ہونے کے اس کے لیے دعا کرے۔ البتہ جمہور کے نزدیک لفظ صلاۃ کا استعمال نہ کرے جو حضور کا مخصوص حق تھا[۱]۔ واقعی شارحین قرآن نے اس آیت کے پس منظر میں یہ بات لکھی ہے اور ایک نے نہیں بلکہ

[۱] افادات شیخ الاسلام

بہت سے شارحین نے حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے بتایا ہے کہ جب ان لوگوں کو جنہوں نے تبوک میں شرکت نہ کرنے کی سنگینی کو خود ہی محسوس کرکے اپنے آپ کو ستون سے باندھ دیا اور کہا ہم پر کھانا پینا حرام ہے جب تک ہمیں معافی کا پروانہ نہ مل جائے۔ بالآخر جب ان کو بتایا گیا کہ اللہ و رسول نے ان کو معاف کر دیا تو انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی جناب میں عرض کیا کہ ہماری توبہ میں یہ بھی شامل ہے کہ جس گھر کی آسائش نے ہمیں وقت کے تقاضے سے غافل کیا اسے اپنے تمام مال کو اللہ سبحانہ کی راہ میں دے دیں مگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ سارا مال دینے کی ضرورت نہیں صرف ایک تہائی کافی ہے۔ چنانچہ وہ اسی وقت فی سبیل اللہ وقف کر دیا۔

اس میں سوچنے کی بات یہ ہے کہ یہ سب حضرات مخلصین میں سے تھے ان کا ماضی ان کے اخلاص ایمانی کی منہ بولتی شہادت تھا۔ ان میں سے کسی نے کوئی بہانہ پیش نہیں کیا بلکہ اپنے قصور کو خود ہی قصور مان لیا۔ انہوں نے اعتراف قصور کے ساتھ اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا کہ واقعی وہ نہایت نادم اور اپنے اس گناہ کی تلافی کے لیے سخت بے چین ہیں۔

کچھ شارحین قرآن نے یہاں یہ لطیف بات لکھی ہے کہ جہاد تبوک سے ان کا رہ جانا دو باتوں کو دامن میں سمیٹے ہوئے تھا ایک جان کر جہاد میں شرکت نہ کرنا دوسرے جہاد میں مال خرچ نہ کرنا اس آیت میں دونوں میں سے ایک کے تدارک کا طریقہ بتایا ہے پہلے کا تدارک توبہ سے ہوا اور دوسرے کا تدارک انفاق مال سے ہوا پہلے تدارک کو عسی اللہ ان یتوب علیھم کے ذریعہ قبول کیا گیا ہے تو دوسرے تدارک کو خذ من اموالھم صدقۃ کے ذریعے شرف پذیرائی عطا ہوا۔ علامہ بقاعی نے اس سے زیادہ لطیف بات لکھی ہے کہ رضائے الٰہی کا پیمانہ چونکہ راہ الٰہی میں قربانی کا قبول ہوتا ہے اس لیے ان کی تطہیر اور ان کو خوش کرنے کے لیے حضور کو ان سے صدقہ لینے کا حکم ہوا ہے۔

یہاں یہ سوال مخاطبوں کے ذہنوں میں ضرور چٹکیاں لیتا ہے کہ جب توبہ سے گناہ معاف ہو گیا تو صدقہ کے تطہیر و تزکیہ ہونے کے کیا معنے؟ ایک جواب تو حضرت شیخ الاسلام نے دیا ہے کہ وجہ اس کی یہ ہے کہ توبہ سے گناہ ضرور معاف ہو جاتا ہے لیکن گاہے اس کی ظلمت و کدورت کا اثر باقی رہ جاتا ہے اگرچہ اس پر مواخذہ نہیں ہے لیکن اس سے آئندہ اور گناہوں کے ہونے کا احتمال ہوتا ہے بس صدقہ سے اس کا انتظام کر دیا گیا ہے یہی بات حضرت تھانوی نے بھی لکھی ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ صدقہ سے خواہشیں ضعیف ہو جاتی ہیں اور قوائے نفس ڈھیلے پڑ جاتے ہیں

مادہ شہوت کی اصلاح ہو جاتی ہے۔ آیت کی یہ تشریح جس پس منظر کے تحت ہے اس صورت میں صدقہ سے صدقہ نافلہ مراد ہے۔ اور کچھ علماء کی رائے میں آیت میں حکم عام ہے اور صدقہ سے زکوٰۃ مراد ہے پہلے یہ بات گذر چکی ہے کہ منافقوں کی زکوٰۃ قبول نہ کرو اور نہ ان کی نماز جنازہ پڑھو۔ یہاں فرمایا ہے کہ جن لوگوں نے اپنی خطاؤں کا اقرار کر لیا ہے اور توبہ کر لی ہے تو وہ جو کچھ ازخود ابین نکالیں اسے قبول کرلو اور ان کے حق میں دعائے خیر کرو۔

محققین نے اس سے یہ بات بھی سمجھی ہے کہ تقسیم صدقات امام مسلمین اور مسلمان سربراہ حکومت کا کام ہے۔ اس لیے کسی شخص کو بطور خود زکوٰۃ ادا کر دینا جائز نہیں کہ اس سے حق سرکار کا اتلاف لازم آتا ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ:

> یہ آیت اس کی واضح دلیل ہے کہ زکوٰۃ وصول کرنا مسلمان سربراہ مملکت کا کام ہے۔ اگر کسی شخص نے اپنی زکوٰۃ خود ہی دے دی تو یہ جائز نہ ہوگا کیونکہ زکوٰۃ لینا حکومت کا کام ہے۔ حکومت کے اس حق کو ساقط کرنے کا کسی کو حق نہیں ہے۔

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ:

> یہ آیت عام ہے۔ اگرچہ لوگوں نے ضمیر کا مرجع ان لوگوں کو بنایا ہے جنہوں نے گناہوں کا اعتراف کیا تھا۔ اسی لیے عرب قبائل میں سے بعض زائغین نے سرکار کو زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا تھا اور کہا تھا کہ یہ صرف جناب رسالت کی خصوصیت تھی۔ ان کا استدلال اسی آیت سے تھا۔ لیکن حضرت ابوبکر الصدیقؓ نے ان کی اس تاویل فاسد کو بالکل قبول نہیں کیا۔ ان کے اس اقدام کو بغاوت قرار دیا اور ان سے جنگ کی۔ یہاں تک انہوں نے سرکار کو زکوٰۃ دینا قبول کر لیا۔

زکوٰۃ کے بارے میں اصل قانون زمانہ نبوت میں یہی تھا کہ زکوٰۃ لینا مسلمان سربراہ مملکت کا حق ہے بلکہ عہد شیخین میں بھی اسی پر عمل رہا۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ اس میں جدید اسلامی نظام زندگی کی جو شادابی اور تر و تازگی عہد نبوت اور عہد صحابہ میں تھی وہ بعد کو باقی نہ رہی۔

زکوٰۃ کے نظام میں تاریخی تغیر

زکوٰۃ کے اس نظام کی پہلی اینٹ حضرت عثمان کے زمانے میں اپنی جگہ سے ہٹ گئی، آپ نے زکوٰۃ کی اور تمام مدوں کو تو باقی رکھا لیکن روپے اشرفی سونا چاندی کی زکوٰۃ کو بجائے سرکار لوگوں

کو انفرادی طور پر دینے کی اجازت دے دی۔ اوروں کا پتہ نہیں الجصاص نے لکھا ہے۔

الاموال سونا چاندی کی زکوٰۃ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر عمر اور عثمان کے زمانہ میں سرکاری طور پر وصول کی جاتی تھی حکومت کے خزانے میں داخل ہوتی تھی پھر حضرت عثمان نے ایک روز خطبہ دیا اور فرمایا کہ رمضان کا مہینہ تمہاری زکوٰۃ ادا کرنے کا مہینہ ہے بس دین پر کوئی باقی ہو وہ ادا کردے اور اپنے بقیہ مال کو چھوڑ دے۔

سوال یہ ہے کہ جب یہ قرآنی قانون ہے اور سب لکھ رہے ہیں کہ یہ قرآنی قانون ہے چنانچہ علامہ عبداللہ بن محمود بن مودود الموصلی الاختیار میں لکھتے ہیں۔

جو شخص زکوٰۃ کی ادائیگی سے انکار کرے مسلمانوں کا سربراہ مملکت اس سے جبراً لے گا اور اسے استعمال کرے گا۔ قرآن میں ہے خذ من اموالھم۔

دوسرے علماء نے بھی یہی لکھا ہے۔ لیکن اس کے باوجود لکھتے ہیں کہ

سربراہ مملکت اموال باطنہ کی زکوٰۃ لینے کا حقدار نہیں یہ مال کے مالکوں کے صوابدید پر موقوف ہے کہ اموال باطنہ کی زکوٰۃ خود دیں۔

یہ الماوردی کی تصریح ہے۔ ابویعلی الموصلی نے بھی الاحکام السلطانیہ میں یہی بات لکھی ہے سوال یہ ہے کہ ایسا کیوں کہا گیا ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ

حضرت عثمان نے زکوٰۃ دینے والوں کو اختیار دے دیا کہ خود براہ راست مسکینوں کو دے دیا کریں۔

جب یہ قرآنی قانون ہے اور تنظیم جو قرآن نے قائم کی تھی اس کا تقاضا بھی یہی ہے تو سمجھ میں نہیں آتا کہ حضرت عثمان کے قول سے یہ کیسے سمجھ لیا گیا کہ آئندہ ہمیشہ کے لیے مالی زکوٰۃ کی حد تک یہ قانون منسوخ ہو گیا۔ حضرت عثمان کے ارشاد سے زیادہ سے زیادہ ثابت ہوتا ہے کہ خاص طور پر اس سال حضرت عثمان نے کسی خاص وجہ سے اموال باطنہ کی زکوٰۃ کا اختیار خود مالکوں کو عطا فرما دیا۔ اور یہ ہو سکتا ہے کہ امام کسی سال اپنی مرضی سے اپنے کسی اختیار کو دوسرے کے سپرد کر دے لیکن اس کو دوامی قانون بنا دینا اور حضرت عثمان کے بعد ہر سربراہ مملکت سے اس حق کو چھین لینا جو قرآن کا عطا کیا ہوا ہے بلکہ سپرد کی ہوئی خدمت ہے آخر کس بنا پر جائز ہو سکتا ہے۔

زکوٰۃ کا نظم شرعی

اس موقعہ پر حضرت مولانا آزاد کی یہ بات بالکل برمحل ہے کہ قرآن نے زکوٰۃ کا معاملہ ایک خاص نظام سے وابستہ کیا ہے اور اسی نظام کے قیام پر اس کے تمام مقاصد و مصالح کا حصول موقوف ہے زکوٰۃ ایک ٹیکس ہے بالکل اسی طرح کا ٹیکس جس طرح آج کل انکم ٹیکس وصول کیا جاتا ہے۔ پس اس کی ادائیگی کا یہ طریقہ نہ تھا کہ ہر شخص خود ہی اپنا ٹیکس نکالے اور خود ہی خرچ بھی کر ڈالے۔ بلکہ یہ تھا کہ حکومت اپنے کلکٹروں کے ذریعے ہر شخص سے وصول کر کے بیت المال میں جمع کرے اور پھر ضروریات وقت کے مطابق جس مصرف کو مقدم سمجھے اس میں خرچ کرے۔ جب ایک شخص نے حکومت کے مقرر کردہ عامل کو اپنی زکوٰۃ دے دی۔ اس کی زکوٰۃ ادا ہو گئی چنانچہ اسی لئے عاملوں اور کلکٹروں کی تنخواہ کا بوجھ بھی زکوٰۃ پر ڈال دیا۔ اور صاف صاف لفظوں میں کہہ دیا العاملین علیہا جو کارندے زکوٰۃ کی وصولی کے لیے مقرر ہوں ان کے ضروری مصارف اگر ادائیگی کے لیے یہ بات ضروری نہ ہوتی تو کوئی وجہ نہ تھی کہ مصارف کی رو میں مستقلاً عمال حکومت کا ذکر کیا جاتا۔

اور پھر یہی وجہ ہے کہ صاف و صریح لفظوں میں مسلمانوں کو حکم دیا گیا کہ اس باب میں عمال حکومت کی اطاعت کریں۔ اور بلاعذر زکوٰۃ ان کے حوالے کر دیں حتیٰ کہ اگر عمال ظالم ہوں۔ یا بیت المال کا مال ٹھیک طور پر صرف نہ ہوتا ہو جب بھی اصلاح مال کی سعی کے ساتھ ادائیگی کا سلسلہ جاری رکھنا چاہیئے۔ یہ نہیں کرنا چاہیئے کہ زکوٰۃ کو بطور خود خرچ کریں بشیر بن خصاصیہ کی روایت میں ہے کہ لوگوں نے کہا ان قوما من اصحاب الصدقۃ یعتدون علینا عمال کا ایک طبقہ صدقہ لینے میں ہم پر زیادتیاں کرتا ہے کیا اس کا مقابلہ کریں ؟ فرمایا نہیں۔ سعد بن ابی وقاص کی روایت میں ہے۔ ارفعوا الیہم ما صلوا جب تک نماز پڑھیں زکوٰۃ ان کو دیتے رہو۔

بنو امیہ کے زمانے میں جب نظام خلافت بدل گیا اور حکام ظلم و تشدد پر اتر آئے تو بعض لوگوں کو خیال ہوا ایسے لوگ ہماری زکوٰۃ کے کیوں امین سمجھے جائیں ؟ لیکن تمام صحابہ نے یہی فیصلہ کیا کہ زکوٰۃ انہیں کو دینی چاہیے۔ یہ کسی نے نہیں کہا کہ خود اپنے ہاتھ سے خرچ کر ڈالو۔ حضرت عبداللہ بن عمر سے ایک شخص نے پوچھا کہ اب زکوٰۃ کسے دیں کہا کہ وقت کے حاکموں کو اس نے کہا کہ وہ تو زکوٰۃ کا روپیہ اپنے کپڑوں اور عطروں میں صرف کر ڈالتے ہیں۔ فرمایا "اگرچہ ایسا کرتے ہوں مگر دو انہیں کو۔" (ابن ابی شیبہ) کیونکہ زکوٰۃ کا معاملہ بغیر نظام کے قائم نہیں

رہ سکتا۔

صدر اول سے لے کر آخر عہد عباسیہ تک یہ نظام بلا انتشار قائم رہا لیکن ساتویں صدی ہجری میں جب تاتاریوں کا سیلاب۔ تمام اسلامی ممالک میں امنڈ آیا اور نظام خلافت معدوم ہو گیا تو سوال پیدا ہوا اب کیا کرنا چاہیے۔ فقہاء احناف کے جس قدر شروح و متون اور کتب فتاوی آج کل متداول ہیں زیادہ تر اسی دور میں یا اس کے بعد لکھے گئے۔ اس وقت پہلے پہل اس بات کی تخم ریزی ہوئی کہ زکوٰۃ کی رقم بطور خود خرچ کر ڈالی جائے کیونکہ غیر مسلم حاکموں کو نہیں دی جا سکتی مگر ساتھ ہی فقہاء نے اس پر زور دیا کہ جن ملکوں میں اسلامی حکومت قائم نہیں رہی ہے۔ اور اعادہ حالت فوراً ممکن نہیں ہے وہاں مسلمانوں کے لیے ضروری ہے کہ کسی اہل مسلمان کو اپنا امیر مقرر کر لیں تاکہ اسلامی زندگی کا نظام قائم رہے معدوم نہ ہو جائے۔ لیکن افسوس ہے کہ بعد کو بتدریج اس نظام کی اہمیت سے مسلمان غافل ہو گئے۔ اور رفتہ رفتہ یہ حالت ہو گئی کہ لوگوں نے سمجھ لیا کہ زکوٰۃ نکالنے کا معاملہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ خود حساب کر کے ایک رقم نکال لیں اور پھر جس طرح چاہیں خرچ کر ڈالیں۔ حالانکہ جس زکوٰۃ کی ادائیگی کا قرآن نے حکم دیا ہے اس کا قطعاً یہ طریقہ نہیں ہے اور جو مسلمان اپنی زکوٰۃ کسی بیت المال کو حوالہ کرنے کی جگہ خود خرچ کر ڈالتا ہے وہ دیدہ دانستہ حکم شریعت سے انحراف کر رہا ہے وہ یقیناً عند اللہ اس کے لیے جوابدہ ہو گا۔

اجتماعی زندگی کا پورا نقشہ

اسلام نے اجتماعی زندگی کا ایک پورا نقشہ بنایا تھا جہاں اس کے چند خانے بگڑ گئے سمجھ لو کہ پورا نقشہ بگڑ گیا۔ چنانچہ اس ایک نظام کے فقدان نے مسلمانوں کی پوری اجتماعی زندگی مختل کر دی ہے لوگ اصلاح کے لیے طرح طرح کے ہنگامے بپا کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ انجمنوں اور قومی چندوں کے ذریعے وقت کی مشکلوں اور مصیبتوں کا علاج ڈھونڈھ نکالیں گے۔ حالانکہ مسلمانوں کے لیے اصل سوال یہ نہیں ہے کہ کوئی نیا طریقہ نکالیں سوال یہ ہے کہ اپنے گم گشتہ طریقہ کا کھوج لگائیں۔

درازی شب و بیداری من این ہمہ نیست
زبخت من خبر آرید تا کجا خفت است

داماں تحریر دراز ہو رہا ہے ہو سکتا ہے کہ دامن کی درازی ناظرین معالم القرآن کے لیے بار خاطر کا ساماں ہو جائے۔ مگر موضوع کی اہمیت کا تقاضا ہے کہ اسے کھول کر بیان کر دیا جائے۔ بلا شبہ

موضوع ہمارے موجودہ حالات میں شدید توجہ طلب اور مشکل ترین مسائل میں سے ہے یہ دعویٰ نہیں ہے کہ میں جو کچھ لکھ رہا ہوں وہ ہی صحیح ہے بلکہ اہل علم کی خدمت میں اس لیے پیش کر رہا ہوں کہ وہ اس موضوع پر پوری متانت سے غور فرما کر وقت کے تقاضے کا جواب دیں۔

اس موضوع پر مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا مناظر گیلانی کے علاوہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے ریڈر جناب مولانا عبدالرحمٰن طاہر سورتی نے مفید معلومات پیش کی ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ معالم القرآن پڑھنے والے احباب بھی زیر نظر آیت کی تفسیر میں اس سے استفادہ کریں۔

تاریخ بتاتی ہے کہ یہ نظام جب تک قوت سے جاری رہا مسلمانوں میں افتراق کے جراثیم کو نشوونما پانے کا موقع نہ ملا۔ ہمیں حضرت عثمان کے عہد تک مملکت اسلامی میں حکومت اور رائے عامہ میں دوری اور بیگانگی کا پتہ ملتا ہے اختلافات ہوتے تھے لیکن نظام صلوٰۃ و زکوٰۃ انہیں بڑھنے نہیں دیتا تھا بلکہ جلد ہی ان کا حل تلاش کر لیتا حضرت ابوبکر کے زمانہ خلافت میں جب کچھ قبائل نے نظام زکوٰۃ میں خلل اندازی کرنے کی کوشش کی اور یہ خواہش ظاہر کی کہ وہ اپنی زکوٰۃ بجائے بیت المال میں داخل کرنے کے نجی طور پر تقسیم کریں گے اور بقول حافظ ابن کثیر انہوں نے اسی آیت خذ من اموالھم سے استدلال کیا تو حضرت ابوبکر نے شدت سے ان کا یہ مطالبہ رد کر دیا اور نہ صرف رد کیا بلکہ ان کے خلاف کارروائی کر کے انہیں مجبور کر دیا کہ وہ زکوٰۃ سرکاری خزانہ میں داخل کریں اور اس طرح اسلامی تعلیمات کے اس دانائے راز نے اپنی اصابت رائے اور حکمت عملی سے مسلمانوں کی امامت و جماعت کا نظام درہم برہم ہونے سے بچا لیا اور اس گروہ کو جس نے زکوٰۃ نجی طور پر ادا کرنا چاہی اسلامی مملکت کا باغی تصور کیا۔

زکوٰۃ اور اس کا نظام

اس آیت میں نظام زکوٰۃ کی طرف رہنمائی کی گئی ہے یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بحیثیت سربراہ مملکت کہا گیا ہے خذ من اموالھم صدقۃ۔ صدقہ کی تعریف میں ابو عبید نے کتاب الاموال میں تصریح کی ہے۔

> صدقہ مسلمانوں کے مال کی وہ زکوٰۃ ہے جو سونے چاندی اونٹ گائے بیل بھیڑ بکریاں غلہ اور پھلوں سے لی جاتی ہے وہ ان آٹھ اصناف میں خرچ ہو گی جو اللہ سبحانہ نے بنائی ہیں۔

یہ وہ اموال ہیں جن کی زکوٰۃ مسلمان سربراہوں کے ذریعے وصول کی جاتی تھی اور ان ہی کے ذریعے خرچ ہوتی تھی چنانچہ وہ لکھتے ہیں:

وہ اموال جن کی نگرانی مسلمان سربراہ کرتے تھے یہی وہ تین ہیں جنہیں حضرت عمرؓ نے بیان کیا ہے اور کتاب اللہ سے انہوں نے اس کی تاویل کی ہے یعنی فئی خمس اور صدقہ

ظاہر ہے کہ یہ قرآنی حکم خذ من اموالھم صرف رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے خاص نہیں ہے بلکہ آپ کے خلفا اور اسلامی مملکت کے سربراہ بھی اس حکم میں داخل ہیں۔ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔

توخذ من اغنیائھم وترد الی فقرائھم

زکوٰۃ مالداروں سے لی جائے اور غریبوں کو دی جائے

بات صاف ہے کہ حکومت سرمایہ داروں سے زکوٰۃ لے گی اور حکومت ہی غریبوں کو دے گی۔ یہ نہیں فرمایا کہ سرمایہ دار اپنی زکوٰۃ غریبوں کو دیں۔ لینے اور دینے کے موضوع پر اغنیا، اور سرمایہ داروں کا ذکر نہیں فرمایا۔ حافظ ابن حجر عسقلانی اسی ارشاد نبوت کی شرح میں لکھا ہے:

یہ ارشاد نبوت اس بات کی واضح دلیل ہے کہ امام اور سربراہ مملکت ہی زکوٰۃ کی وصولیابی اور اس کی تقسیم کا ذمہ دار ہے یا تو بذات خود یا اپنے کارندوں کے ذریعے اور جو حکومت کو زکوٰۃ نہ دے اس سے جبراً وصول کی جائے[1]

معلوم ہوا کہ زکوٰۃ ایسا مالی نظام ہے جسے اسلامی مملکت اس سے قائم کرتی ہے کہ معاشرے سے غریبی اور فقیری کو ختم کرکے عوام کو زیادہ سے زیادہ خوش حال بنائے۔ اگر اسلامی مملکت میں رہتے ہوئے حکومت کے تحت یہ نظام چلانے کے لیے کسی وجہ سے مسلمان پہلوتہی کریں تو حکومت کی ذمہ داری ہے کہ ان مسلمانوں کو اس نظام کا جبراً پابند کرے کیونکہ زکوٰۃ کا نظام ہی اسلامی کی اجتماعی زندگی کے لیے ریڑھ کی ہڈی ہے۔ اور جب کسی بھی امت کا اجتماعی نظام نہ ہو اس کی حیثیت حیوانوں کے ریوڑ کی ہو جاتی ہے۔

صدقات کا جو نظام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے قائم فرمایا اور آپ کے بعد سرکاری طور پر جیسے حضرت ابوبکر، حضرت عمر، حضرت عثمان نے باقی رکھا وہ ہی مسلمانوں کی اجتماعیت کا نشان اور

---

[1] فتح الباری

سنگ میل ہے یعنی جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اور آپ کے بعد خلافت راشدہ میں زکوٰۃ سرکاری طور پر لیجاتی تھی اسی طرح یہ نظام حضرت عثمان کے عہد تک برقرار رہا۔

امام محمد بن سیرین فرماتے ہیں کہ زکوٰۃ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لائی جاتی یا اسے دی جاتی جسے آپ نے وصولی کے کام پر لگایا ہوتا۔ آپ کے بعد حضرت ابوبکر کو دی جاتی یا جسے وصولی کے کام پر لگاتے۔ بعد ازاں حضرت عمر کو دی جاتی یا جسے وہ اس کام پر لگاتے۔ اس کے بعد حضرت عثمان کو دی جاتی یا وہ وصولی کے کام کا حکم دیتے حضرت عثمان کی شہادت پر صدقہ دینے کے بارے میں لوگوں میں اختلاف ہو گیا۔ کچھ لوگ تو پہلے کی طرح امراء و حکام ہی کو دیتے رہے اور کچھ لوگ اپنے طور پر اسے تقسیم کرنے لگے۔ جو لوگ حکام کو دیتے تھے ان ایں بھی حضرت عبداللہ بن عمر ہی تھے[1]

بلا شبہ حضرت عثمان کے بعد سیاسی انتشار کا اثر صدقات پر بھی پڑا اور لوگوں نے یہ بات کہنی شروع کر دی کہ اب سیاسی عدم استحکام کی صورت میں ہم کیا کریں؟ اس وقت بھی صدقات کی اہمیت سے باخبر اور سیاسی شعور رکھنے والوں کا فیصلہ یہی تھا کہ صدقات حکمرانوں کو ہی دیئے جائیں۔ خواہ وہ اسے خرچ کرنے میں کیسی بے اعتدالی کریں جن حضرات کا یہ موقف تھا ان سے جب دریافت کیا گیا کہ سیاسی عدم استحکام کا حال یہ ہے کہ ایک بار ہمارے علاقہ پر اہل شام کی حکومت ہوتی ہے اور ایک بار اہل عراق کی تو زکوٰۃ کا کیا کریں تو ان کا جواب یہ تھا کہ غالب کو زکوٰۃ دی جائے یا جس سے تم نے بیعت کر لی ہے اسے صدقات دو دیکھئے کتاب الاموال باب دفع الصدقۃ الی الامراء و اختلاف العلماء فی ذالک۔

اس سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ جب سیاسی استحکام ہو اور مسلمانوں پر ایک اسلامی حکومت کا غلبہ ہو تو اس وقت صدقات کا نظام بہر حال حکومت کے ہاتھ میں ہونا چاہیئے اور یہ اسلامی حکومت کے فرائض میں سے ہے کہ وہ زکوٰۃ کی قانونی تنظیم کرے۔ کسی کو یہ اختیار نہیں کہ وہ حکومت کو مانتے ہوئے نجی طور پر زکوٰۃ کو تقسیم کرے جو لوگ کسی جگہ مسلمانوں کے مستحکم سیاسی نظام کی موجودگی میں زکوٰۃ اسلام کے سیاسی نظام کو نہیں دیتے وہ اسلام کے اس عظیم رکن کو بے جان بنا کر اسلامی معاشرہ کو پست حال اور پس ماندہ بنانے کے جرم کا ارتکاب کر رہے ہیں۔

اقامت صلوٰۃ کے بعد نظام زکوٰۃ قائم کرنا اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے یہ قرآن کی حیثیت

---

[1] کتاب الاموال

ہوئی آواز ہے۔

الذین ان مکنا ھم فی الارض اقاموالصلوۃ واتوالزکوۃ۔ وامروا بالمعروف ونھواعن المنکر

اس کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ نماز اور زکوٰۃ مسلمانوں کی اجتماعی زندگی کا نشان ہیں۔ ان کے بغیر اسلام کی اجتماعی زندگی کا وجود ہی نہیں۔ ہونے کو انفرادی طور پر تو نماز بھی ہو جاتی ہے۔ سوال ہونے نہ ہونے کا نہیں ہے سوال تو یہ ہے کہ جن اجتماعی مقاصد کے لیے قرآن نے نماز اور زکوٰۃ کو اسلام کے نظام حکومت کے مقاصد میں داخل کیا ہے وہ بھی اس دنیا کی زندگی میں پورے ہو رہے ہیں۔ ہماری نمازیں اجتماعیت سے بیگانہ ہو کر اگر ہماری تفریقات کا سامان بن رہی ہیں تو ہماری زکوٰتیں اجتماعیت سے بیگانہ ہو کر مسلمانوں میں پیشہ ور فقرا اور گداگر پیدا کر رہی ہیں۔ زکوٰۃ کا نظام اگر اجتماعی ہو تو اس سے ایک طرف ہمارے معاشرے کے پس ماندہ اور معیاری زندگی سے محروم افراد کی حالت تیزی سے سدھرے گی دوسری طرف وہ افراد اور جماعتیں جو مختلف بھیسوں میں اس نظام سے ناجائز فائدہ اٹھا کر عوام کو منتشر اور مرکز سے متنفر کرنے میں کوشاں ہیں بے قوت ہو جائیں گے اور عوام کا تعلق اجتماعیت سے مستحکم ہو گا۔

یہ ہماری شومیٔ قسمت ہے کہ نظام صدقات کا منشا یہ سمجھا جانے لگا ہے کہ معاشرے میں مستقل طور پر گداگروں اور فقیروں کا طبقہ باقی رہے تاکہ ان کے لیے امیروں سے صدقات فراہم کرنے کا جواز پیدا ہوتا رہے حالانکہ یہ زکوٰۃ کے اس مقصد کے بالکل برعکس ہے جس کے لیے زکوٰۃ وجود میں آئی زکوٰۃ کا بنیادی مقصد فقر کو ختم کرنا ہے فقر کو پرورش کرنا نہیں ہے۔

زکوٰۃ ایک ایسا مالی فریضہ ہے جس کا پہلا مصرف محتاج و ضرورت مند ہیں یہ جس علاقے کے امیروں سے لیا جائے اسی علاقہ کے غریبوں میں تقسیم کیا جائے گا اور جب تک ان میں ایک بھی ضرورت مند اور بے روزگار رہے گا اس علاقہ کے صدقہ و زکوٰۃ کا زیادہ مستحق وہی ہوگا ایک علاقہ سے لی ہوئی زکوٰۃ دوسرے علاقہ میں اسی وقت جا سکتی ہے جب کہ اس علاقہ میں کوئی اس کا مستحق باقی نہ رہا ہو۔

تاریخ بتاتی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ اقدس میں لوگ صدقات کی وجہ سے اتنے خوش حال ہو گئے تھے کہ ان کو صدقات کی ضرورت باقی نہ رہی تھی۔ اور وہ اپنے صدقات حضور اقدس کی خدمت میں پیش کرتے تھے دیکھو عیون الاثر لابن سید الناس

اسی طرح دوسرے علاقوں میں بھی یہی صورت حال تھی حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ جن کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سنہ ھ میں یمن کا عامل مقرر کیا تھا اور آپ کے وصال مبارک کے

بعد حضرت ابوبکرؓ نے ان کو وہیں بحال رکھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت میں مدینہ تشریف لائے۔ حضرت عمرؓ نے دوبارہ ان کو یمن واپس بھیج دیا۔ ان کا حضرت معاذ نے پہلے سال حضرت عمرؓ کی خدمت میں اپنے علاقہ سے جمع ہونے والی زکوٰۃ کا ایک تہائی روانہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے ان پر اعتراض کیا اور ان ہی سے جواب طلبی کی اور لکھا کہ میں نے تمہیں مال جمع کرنے روانہ نہیں کیا بلکہ اس لیے روانہ کیا ہے کہ وہاں کے امراء سے مال لے کر وہاں کے فقراء میں تقسیم کرو۔ حضرت معاذ نے جواب دیا جو کچھ میں نے آپ کو روانہ کیا ہے یہاں اسے لینے والا کوئی مجھے حقدار نہیں ملا ہے۔ دوسرے سال بھی حضرت معاذ نے اپنے علاقے کی آدھی زکوٰۃ مرکزی گورنمنٹ کو بھیج دی۔ اس بار بھی حضرت عمرؓ نے وہی بات کہی اور حضرت معاذ نے وہی جواب دیا۔ تیسرے سال حضرت معاذ نے ساری جمع شدہ زکوٰۃ مرکزی حکومت کو روانہ کر دی۔ اس بار حضرت عمرؓ نے پھر وہی بات کہی حضرت معاذ کا جواب یہی تھا کہ اب مجھے یہاں ایک شخص زکوٰۃ لینے کا حق دار نہیں ملتا۔

اس سے یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے کہ زکوٰۃ کا بنیادی مقصد علاقہ سے فقر و محتاجی غریبی اور مفلسی کو ختم کرنا ہے۔ اور ان ذہنوں کی صاف تردید ہو رہی ہے جو یہ خیال کرتے ہیں کہ زکوٰۃ کا نظام مستقل طور پر معاشرے میں فقراء و مساکین کے باقی رکھنے کا نام ہے۔

زکوٰۃ عبادت ہے یا ٹیکس

آپ پیچھے کچھ بزرگوں کی زبانی سن چکے ہیں کہ زکوٰۃ ٹیکس ہے اس لیے یہ بات سمجھ لیجئے کہ اللہ کے احکام کے مطابق زندگی گذارنے کا نام عبادت ہے مسلمان کا ہر عمل اللہ کے حکم کے مطابق عبادت ہے۔ اعمال مختلف ہوتے ہیں کچھ اعمال روح کو پاک کرنے اور اسے قوی بنانے والے ہوتے ہیں اور کچھ جسمانی تطہیر کا کام دیتے ہیں۔ نماز اور زکوٰۃ دونوں عبادتیں ہیں لیکن دونوں کے احکام میں جوہری فرق ہے۔ اگرچہ دونوں کا مقصد آخرت کی کامیابی اور دنیا کی فلاح و بہبود ہے۔

اللہ سبحانہ نے اسلامی معاشرے کو باطنی و ظاہری پلیدیوں سے پاک کرنے کے لیے جو عبادتیں مقرر کی ہیں ان میں سے ایک اہم اور بنیادی عبادت زکوٰۃ ہے۔ معاشرے میں دولت کی محبت، معاشی لوٹ کھسوٹ دولت کی دولت مندوں میں گردش۔ حاجت مندوں سے ناجائز فائدہ اٹھانا۔ حاجت مندوں اور غریبوں کا ایک مستقل طبقہ موجود رکھنا یہ وہ پلیدیاں ہیں جن کی موجودگی میں کسی معاشرے کا اسلامی معاشرہ ہونا ناممکن ہے۔ اور زکوٰۃ ان بیماریوں کا مکمل علاج ہے۔ زکوٰۃ مالی عبادت ہونے کے ساتھ جہاد

المال بھی ہے اور جہاد کی کامیابی کا دارومدار نظام کے تحت ہوتا ہے
یہ امر واقعہ ہے کہ اللہ سبحانہ کسی کام میں بگاڑ کو پسند نہیں کرتا واللہ لا یحب الفساد
وہ ہر کام کو صحیح طریقہ سے انجام دینے کی تعلیم دیتا ہے واتوا البیوت من ابوابہا معاشرے سے
دولت کے شیطان کی بے اعتدالیاں دور کرنے کے لیے نہایت مضبوط و منظم مہم چلانی پڑتی ہے۔
حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے خلفاء نے یہ مہم زکوٰۃ و صدقہ کے نام سے حکومت کی
نگرانی میں چلائی اور اسے افراد یا پارٹیوں کے رحم و کرم پر نہیں چھوڑا۔ آج بھی یہ نظام زکوٰۃ اپنے
صحیح اور خوشگوار نتائج اسی صورت میں پیدا کرے گا جب وہ حکومت اسلامی کے زیر نگرانی قائم کیا جائے
گا۔ زکوٰۃ اس قسم کی عبادت نہیں جسے اسلامی مملکت میں افراد کے حوالہ کر دیا جائے بلکہ ایک ایسی مالی
عبادت ہے جس کے نظام کو اسلامی حکومت ان خطوط پر چلائے گی جن کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ
وسلم نے قائم کیا اور خلفائے راشدین نے عمل کر کے دکھایا۔ اب یہ آپ کو اختیار ہے کہ آپ اسے
زکوٰۃ صدقہ کہہ دیجئے یا محصول ٹیکس۔ اس اعتبار سے کہ زکوٰۃ صدقہ کی ادائیگی اللہ کے حکم کے تحت
ہوتی ہے یہ عبادت ہے اور اس لحاظ سے کہ وہ ایک مالی فریضہ ہے اور اسلامی حکومت باقاعدہ
حساب و کتاب کے ساتھ اسے مقررہ مقدار میں اس کے مستحقین میں خرچ کرتی ہے بلاشبہ اسلامی
مملکت کے مداخل میں سے ایک آمدنی کی بڑی مد ہے اور اس لحاظ سے اسے ٹیکس کا نام دیا جاسکتا ہے
مگر اصل میں بات عبادت یا ٹیکس کی نہیں ہے بلکہ اصل فیصلہ طلب یہ بات ہے کہ اسلامی حکومت
میں یہ عبادت نجی طور پر ادا کی جائے گی یا حکومت کی نگرانی میں مقدم الذکر صورت قرآن وسنت
کے خلاف ہے بلکہ معاشرے کی تمام اقتصادی بے اعتدالیوں کا ذریعہ ہے۔

اسلام کا اجتماعی نظام

یہ آیت جہاں واضح طور پر یہ بات بتا رہی ہے کہ صدقہ اور زکوٰۃ کا نظم مسلمانوں میں انفرادی
نہیں بلکہ اجتماعی ہونا چاہیے۔ وہاں یہ بھی بتا رہی ہے کہ اجتماعیت کو قائم کرنا اہل ایمان کے
فرائض میں سے ہے اسلام میں اجتماعیت سے مقصود پارٹیاں نہیں بلکہ اجتماعیت سے مقصود مسلمانوں
کا وہ سیاسی نظام ہے جو ایک امیر کے تحت ہو ایسی اجتماعیت جس میں امیر کی طاعت ہو یہی احادیث
میں اسلامی زندگی ہے اور اس کا عکس جاہلیت ہے۔ اسی سیاسی نظام کے بارے میں احادیث
میں واشگاف لفظوں میں یہ حقیقت واضح کی گئی ہے کہ جو شخص جماعت اور طاعت امام سے الگ

ہو گیا گویا وہ اسلام سے خارج ہو گیا اس کی موت اسلام پر نہیں بلکہ جاہلیت پر ہو گی اگرچہ نماز پڑھتا ہو روزہ رکھتا ہو اور اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔ مسند امام احمد میں حضرت حارث اشعری کی حدیث میں اسلام کا سیاسی نظام عملی بتایا گیا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا مسلمانو! میں تم کو پانچ باتوں کا حکم دیتا ہوں جن کا مجھے اللہ نے حکم دیا ہے جماعت سمع، طاعت، ہجرت اور اللہ کی راہ میں جہاد یقین کرو جو مسلمان جماعت سے ایک بالشت بھر بھی باہر ہوا تو اس نے اسلام کا حلقہ اپنی گردن سے نکال دیا اور جس نے اسلام کی جماعتی زندگی کی جگہ جاہلیت کی بے قیدی کی طرف بلایا تو اس کا ٹھکانا جہنم ہے لوگوں نے عرض کیا کیا وہ شخص جہنمی ہوگا اگرچہ روزہ رکھتا ہو اور نماز پڑھتا ہو۔ فرمایا۔ ہاں اگرچہ روزہ رکھتا ہو نماز پڑھتا ہو اور اپنے کو مسلمان سمجھتا ہو۔

جماعت اور التزام جماعت کے موضوع پر قرآن و سنت میں جو تصریحات آئی ہیں ان سے مقصود اسلام کا یہی سیاسی نظام ہے مثلاً صحیحین میں ابو ہریرہ کی حدیث میں ہے۔

'جس نے میری اطاعت کی اس نے اللہ کی اطاعت کی اور جس نے میرے امیر کی اطاعت کی اس نے خود میری اطاعت کی۔ اور جس نے امیر سے روگردانی کی اس نے میری اطاعت سے انکار کیا یعنی مسلمان سربراہ مملکت کی اطاعت عین رسول کی اطاعت ہے۔

مسلم کی ایک روایت میں امیری کی جگہ الامیر ہے یعنی جو شخص مسلمان مسلمانوں کی مملکت کا سربراہ ہو اس کی طاعت ضروری ہے صحیحین میں حضرت انس کی حدیث ہے کہ

اگر ایک حقیر صورت حبشی غلام بھی تمہارا امیر بنا دیا جائے تو چاہیے اس کی سنو اور اطاعت کرو۔

معلوم ہوتا ہے کہ یہ جملہ آپ بار بار اور بڑی ہدایات کے ساتھ اپنی تقریروں میں فرماتے تھے اسی لیے مختلف لفظوں میں اور مختلف مواقع میں نقل کیا گیا ہے۔

حجۃ الوداع کے عظیم الشان اور یادگار موقعہ پر جب کہ دو تین ماہ کے بعد آپ رحلت فرمانے دار بقا سونے والے تھے اور ایک آخری پیغام دنیا کو سنا رہے تھے فرمایا کہ

اگر ایک حبشی غلام بھی تم پر امیر بنا دیا جائے اور وہ کتاب اللہ کے ساتھ تم پر حکومت

کرے تو اس کی سنو اور طاعت کرو۔

صحیحین میں حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

اگر کوئی اپنے امیر کو ایسی بات کرتے دیکھے جو اسے پسند نہ ہو تو اسے صبر کرنا چاہیے اس کی اطاعت سے باہر نہ ہو کیونکہ جو شخص مسلمان حکمران کی اطاعت سے بالشت بھر بھی باہر ہوا اور اسی حالت میں مرگیا تو اس کی موت جاہلیت پر ہوئی۔

حضرت عبداللہ بن عمر کے حوالہ سے ارشاد ہے:

جس نے مسلمان حکمران کی اطاعت سے ہاتھ کھینچ لیا تو قیامت کے روز وہ اللہ کے دربار میں حاضر ہوگا اور اس کے لیے کوئی بچاؤ نہ ہوگا اور جو مسلمان دنیا سے اس حالت میں گیا کہ مسلمان حکمران کی طاعت سے اس کی گردن خالی ہوئی تو یقین کرو اس کی موت جاہلیت کی موت ہے۔

اس کے علاوہ بے شمار حدیثیں ہیں جن میں اسلام کے سیاسی نظام یعنی جماعت اور التزام جماعت پر زور دیا گیا ہے۔ اور سیاسی نظام کی زندگی کو اسلامی زندگی قرار دیا ہے۔

شائد یہاں آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ آج کے دور میں اسلام کے سیاسی نظام کی تشکیل کیونکر ہو؟

قرآن وسنت اور اجماع اُمت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلام نے سیاسی نظام کے بارے میں دو صورتیں اختیار کی ہیں

پہلی صورت یہ ہے کہ امت کی صائب الرائے جماعت اور اہل حل وعقد ایک شخص کو اہلیت وصلاحیت کے مطابق سربراہ مملکت مقرر کریں اور اس اہل حل وعقد سے مراد یہ لوگ ہیں۔

(۱) عدلیہ کے سربراہ

(۲) انتظامیہ کے سربراہ

(۳) فوج کے سربراہ

(۴) اہل علم و دانشور

حکیم الامت شاہ ولی اللہ ازالہ الخفا میں فرماتے ہیں۔

از علماء و قضاۃ و امراء و وجوہ ناس کہ حضور ایشان میسر شود

یہ ہے اسلام میں طریق انتخاب اور یہ ہے امرھم شوری بینھم پر عمل کی صورت اد

یہی صحیح نظام شرعی ہے۔ یاد رہے کہ امر اصل میں فوجی سربراہوں کو اور ولاۃ انتظامی سربراہوں کو کہتے ہیں اور تغلیباً دونوں کو کہا جاتا ہے۔

قرآن نے انتخاب کرنے والوں کو جو ہدایات دی ہیں وہ بھی گوش گذار کرلیجیے مثلاً ارشاد ہے:

ان اللہ یامرکم ان تودوا الامانات الی اھلھا

اللہ سبحانہ تمہیں حکم دیتا ہے کہ امانتیں ان کے سپرد کرو جو امانتوں کی اہلیت رکھتے ہیں۔

ارشاد ہے:

یا ایھا الذین امنوا لا تخونوا اللہ والرسول وتخونوا اماناتکم وانتم تعلمون

مسلمانو! اللہ سے اللہ کے رسول سے خیانت کرو اور اپنی امانتوں میں خیانت نہ کرو حالانکہ تم جانتے ہو۔

صحیح بخاری میں ہے۔ حضرت ابو ہریرہ کہتے ہیں کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کچھ لوگوں سے باتیں کر رہے تھے کہ ایک دیہاتی نے دخل در معقولات کرتے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ لیا کہ قیامت کب آئے گی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم باتوں میں مشغول رہے۔ حاضرین میں سے کچھ نے خیال کیا کہ آپ نے سوال سنا ہے لیکن آپ کو اس کی بات ناگوار ہوئی۔ کچھ نے کہا کہ آپ نے دیہاتی کی بات ہی نہیں سنی ہے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم گفتگو ختم کر چکے فرمایا ہاں وہ قیامت کے بارے میں پوچھنے والا کہاں ہے وہ بولا حاضر ہوں یا رسول اللہ۔ فرمایا جب امانت ضائع کر دی جائے گی قیامت کا انتظار کرو دیہاتی بولا کہ امانت کی اضاعت کیا ہے۔ فرمایا جب امانت نااہلوں کے سپرد کر دی جائے گی تو قیامت کا انتظار کرنا۔

یہ ہدایات اگرچہ صرف ہدایات ہیں۔ لیکن ان ہدایات کو عملی جامہ پہنانے کے لیے مناسب عملی تدابیر کرنا وقت کے نظام کا کام ہے۔ جس سے دیانتدار اور حکومت چلانے کی اہلیت رکھنے والے لوگ آگے آئیں۔

بہر حال اسلام کے سیاسی نظام کو بروئے کار لانے کی یہ پہلی صورت ہے اسے آپ جمہوری کہہ

لیجئے یا پھر اور۔ جمہوری اس معنی کے لحاظ کہ یہ مسلط نہیں بلکہ ارباب بست وکشاد کا منتخب ہوتا ہے خلافت راشدہ کا عمل اسی پر تھا خلیفہ اول کا انتخاب عام جماعت میں ہوا خلیفہ دوم کو خلیفہ اول نے نامزد کیا اور اہل حل وعقد نے منظور کیا خلیفہ سوم کو مجلس شوریٰ نے منتخب کیا خلیفہ چہارم کے ہاتھ پر خود تمام جماعت نے بیعت کی۔ بہر حال اسلام میں جمہوری سیاسی نظام کی یہ پہلی صورت ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ اگر یہ نظام باقی نہ رہا۔ قوم کے رہنماؤں اور ارباب بست وکشاد کی رائے کو اس میں دخل نہ ہو۔ محض طاقت اور تسلط کی بنا پر کوئی خاندان یا کوئی طاقتور فرد تخت حکومت پر قابض ہو جائے تو اس صورت میں مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے اس کی طاعت کرنی چاہیے یا اسے ہٹانے کے لیے عوامی بحران کے ذریعے کوئی تحریک اٹھانی چاہیے۔ وہ شرعاً مسلمانوں کا سربراہ حکومت ہو سکتا ہے یا نہیں۔ اس کے تحت وہ تمام احکام انجام پا سکتے ہیں یا نہیں جو از روئے قرآن وسنت مسلمان سربراہ مملکت کے ہونے پر موقوف ہیں۔ اس کو زکوٰۃ دینی چاہیے یا نہیں جمعہ وعیدین صحیح ہیں یا نہیں۔ اس کی عدالت کے فیصلے نکاح وطلاق کے موضوع پر درست ہیں۔ دفاع کے لیے اگر وہ جہاد کی دعوت دے تو اس کی قیادت میں دفاع جہاد ہے کہ نہیں۔ رمضان وعیدین کے ہونے میں اس کا فیصلہ شرعاً نافذ ہے کہ نہیں۔

یہ مسئلہ امت کی اجتماعی زندگی کا بنیادی مسئلہ تھا اور ممکن نہ تھا کہ قرآن وسنت میں اس کی پوری پوری توضیح نہ ہوتی اس موضوع قرآن وسنت کی تصریحات بے شمار ہیں۔ اسی لیے خلافت راشدہ کے بعد بنو امیہ نے فوجی قوت کے ذریعہ حکومت پر قبضہ کر لیا تو صحابہ کرام کو اپنے طرز عمل کے فیصلے میں ذرا بھی تامل نہ ہوا۔ فوراً یکسوئی کے ساتھ فیصلہ کر لیا۔ جو کچھ انہوں نے بتلایا اور کہا اسی پر پوری امت کے اجماع کی مہر لگ گئی اور چودہ صدیوں سے اسلام کا یہی متفقہ اعتقاد وعمل رہا ہے۔

پہلی صورت میں اسلام نے اہلیت وصلاحیت کی وہ تمام شرطیں رکھیں ہیں جو ایک مرکزی منصب کے لیے ضروری ہیں لیکن دوسری صورت میں یعنی اگر نظام شرعی کی جگہ ملکی قبضہ وتسلط کی صورت پیدا ہو جائے اور جمہور کی جانب سے اہل حل وعقد کو موقع نہ ملے تو اس صورت میں از روئے شرع مسلمانوں کو کیا کرنا چاہیے سو اس کی نسبت چونکہ خود احادیث صحیحہ اور اجماع بالکل صاف صاف موجود تھا اس لیے تمام امت بلا اختلاف اس پر متفق ہو گئی کہ جب ایک مسلمان تخت حکومت پر قابض ہو جائے اور اس کی حکومت جم جائے تو ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اسی کو حکمران

تسلیم کرے اس کے سامنے گردن طاعت جھکائے بالکل اسی طرح جیسا ایک اہل اور مستحق کے آگے جھکنا چاہیے اطاعت واعانت کی وہ تمام باتیں جو حکمرانی کے شرعی حقوق میں سے ہیں ایسے سربراہ کو حاصل ہو جاتی ہیں۔ اس سے روگردانی کسی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ اس کے مقابلے میں حزدح اور دعوے کا حق کسی کو نہیں پہنچتا۔ اگرچہ کیسا ہی افضل اور جامع الشروط کیوں نہ ہو۔

دوسری صورت میں ایسا کیوں حکم دیا اس کی علت و مصلحت اس قدر واضح ہے کہ شرح و تفصیل کی ضرورت نہیں چونکہ یہ بات آج کے ناہموار سیاسی دور میں عام محسوسات کے خلاف ہے اس لئے اس کی قدرے تفصیل ضروری تھی۔ شریعت اور اُمت کا باقی رہنا حکومت کے وجود پر موقوف تھا ساری باتیں نشاخیں ہیں۔ جو بہتر سے بہتر ہو سکتا ہے یعنی اسلامی حکومت کی بنیاد ارباب بست وکشاد کے انتخاب پر رکھی اور ساتھ ہی اس منصب کی ضروری شرطیں بھی بتادیں۔ اور پوری قوت سے یہ اعلان بھی کر دیا کہ لوگوں کو خود سربراہ مملکت بننے اور امارت کا خواہش مند نہ ہونا چاہیے نہ دعویٰ دار بن کر دوسروں سے لڑنا چاہیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہمیشہ اس عہد پر لوگوں سے عہد لیتے لاینازع الامر اھلہ سربراہی کو جو اہل ہو اسی پر سربراہی چھوڑ دیں گے۔ دنیا اگر اس چھوٹے سے جملے پر عمل کرے تو روئے زمین کے سارے جھگڑے ختم ہو جائیں حضرت امام بخاری نے کتاب الاحکام میں باب باندھا ہے باب مایکرہ من الحرص علی الامارۃ۔ اور حضرت ابوموسیٰ اشعری کی روایت لائے ہیں کہ حضور نے فرمایا ہے:

جو شخص خود اس کی حرص رکھتا ہو اور طالب ہو ہم یہ کام اس کے ہرگز سپرد نہ کریں گا۔

اس کا مقصد صرف یہ تھا کہ جب لوگ خود طلب وحرص نہ کریں گے تو مقابلہ اور کش مکش بھی نہ ہو گی۔ اور امت کے ارباب بست وکشاد کے لیے اہل کا انتخاب آسان ہو جائے گا۔

مسئلہ حکومت کا اصلی نظام قرآن وسنّت کا پیش کردہ یہ اور صرف یہ ہے لیکن سب جانتے ہیں کہ یہ نظام تیس سال سے زیادہ قائم نہیں رہا اس لیے شرع و ملت کی حفاظت کے لیے ضروری تھا کہ اصلی نظام پر زور دینے کے ساتھ ان دقتوں کے لیے بھی صاف صاف احکام دے دیئے جائیں جب اسلامی حکومت کے بارے میں اسلام کا بنایا ہوا طریقہ باقی نہ رہے اور شورائی حکومت کی جگہ شخصی اور استبدادی طریقہ قائم ہو جائے۔

ظاہر ہے کہ اس صورت میں دو ہی راہیں سامنے آتی تھیں اگر ایسے لوگوں کی حکومت تسلیم

کر لی جائے تو اس سے امت کی جمعیت جان و مال کا امن ملک کی حفاظت احکام شرع کا اجرا جماعت کا قیام و بقا اور اس طرح کے بے شمار مصالح و فوائد حاصل ہو جاتے ہیں کیونکہ بلا کسی نزاع کے اسلامی حکومت قائم ہو جاتی ہے اور مزید جنگ و جدال اور کشت و خون کا سدباب ہو جاتا ہے مگر ساتھ ہی غیر شرعی حکومت قائم ہونے سے بہت سی خرابیاں بھی پیدا ہو جاتی ہیں —— لیکن اگر حکومت تسلیم نہ کی جائے ان کی بغاوت کرنے کی اجازت دے دی جائے تو پھر دائمی سیاسی بحران کشت و خون جنگ و جدال، دعووں میں تصادم، قوتوں میں تزاحم، ہمیشگی کی بدامنی امت کی تباہی ملکوں کی خرابی نظام جماعت کا اختلال احکام شرع کی تعطیل مسلمانوں کی جان و مال کی بدامنی اندرونی خانہ جنگی کی وجہ سے دشمنوں کا حملہ و تسلط اور اسی طرح کی بے شمار ہلاکتوں اور بربادیوں کے بعد شرعی اسلامی حکومت قائم ہو جائے۔

پہلی صورت میں صالح کا بقاء و حصول مگر خرابیوں کا امکان ہے دوسری صورت میں خرابیوں کا وقوع مگر مصالح کا امکان تھا۔

اسلام نے پہلی صورت اختیار کی اور پوری قوت کے ساتھ دوسری صورت پر قدغن قائم کر دی یعنی مصالح کے امکان پر ان کے وقوع کی ترجیح دی۔ اس پر تفصیل بحث انشاء اللہ پارہ ۱۸ میں آیت وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض کے تشریحی نوٹ میں آ رہی ہے۔

بہر حال یہ آیت گرامی اسلام کے اجتماعی نظام کی ضرورت کی طرف رہنمائی کر رہی ہے۔ شیخ الاسلام نے لفظ صدقہ کے بارے میں لکھا ہے کہ صدقہ کا ترجمہ حضرت شیخ الہند نے زکوٰۃ کیا ہے صرف شیخ الہند ہی نے نہیں بلکہ دوسرے اکابر نے بھی صدقہ سے زکوٰۃ مراد لی ہے۔ جنہوں نے صدقہ نافلہ کر اس کا محمل قرار دیا ہے ان کے پیش نظر صرف ابی لبابہ کا واقعہ ہے۔

صدقہ کی ضروری تشریح

اس لفظ کے لغوی معنی سچائی کے ہیں۔ بات کا اعتقاد و ضمیر کے مطابق ہونا، ظاہر و باطن کا یکساں ہونا نیز کسی چیز سے جو توقع کی جائے اس پر اس کا پورا اترنا (مفردات القرآن) اسی لیے ہر اس عمل کو جو اللہ پر ایمان کی تصدیق کرتے ہوئے انجام دیا جائے صدقہ کہا جاتا ہے (تاج العروس) اور چونکہ اللہ سبحانہ رفاہ عامہ ہمہ گیر اصلاح خیر اور اخلاق فاضلہ کو پسند کرتا ہے اس

لیے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام کاموں کے لیے جو رذائل بخلی دور کرتے ہیں یا جن سے نفس کو مہذب و شائستہ بنایا جاتا ہے یا جن سے اجتماعی الفت و محبت اور انسانوں میں ہمدردی پیدا ہوتی ہے صدقات کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ اہل لغت نے ہر اس چیز کو جو رضائے الٰہی کے حاصل کرنے کے لیے اہل حاجت کو دی جائے صدقہ کہا ہے علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں علامہ جوہری نے صحاح میں یہی موقف اختیار کیا ہے علامہ راغب اصفہانی نے صدقہ کی تعریف اس طرح کی ہے۔ الصدقة ما يخرجه الانسان من ماله على وجه القربة كالزكوٰة صدقہ وہ چیز ہے جو انسان اپنے مال میں سے قرب الٰہی کے حصول کی خاطر نکالتا ہے جیسے زکوٰۃ، قرآن میں اسی سورت میں مصارف زکوٰۃ کے سلسلے میں زکوٰۃ کے لیے صدقات ہی کی تعبیر اختیار کی ہے دراصل چونکہ نماز و زکوٰۃ اسلام کے اجتماعی نظام کے وہ ستون ہیں جن پر اجتماعیت کی ساری عمارت کھڑی ہے اس لیے یہاں جن لوگوں نے اجتماعی تقاضے میں اہل ایمان کا ساتھ نہیں دیا تھا ان کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ توبہ قبول ہونے کے بعد اب مسلمانوں کی جماعت کے فرد ہیں اور ان سے زکوٰۃ لی جا سکتی ہے آگے ارشاد ہوا ہے تطهرهم وتزكيهم بها۔ اس میں تطہیر سے تطہیر اور تزکیہ سے تزکی آیا ہے۔ تطہیر کے معنی ظاہری باطنی نجاستوں سے پاک صاف کرنے کے ہیں ارشاد باری ہے وثيابك فطهر اور ارشاد ہے وينزل عليكم من السماء ماء ليطهركم به اور ارشاد ہے ويطهركم تطهيرا۔ الغرض جسمانی و روحانی نجاستوں سے پاک کرنے کا نام تطہیر ہے۔ اور صدقہ وہ پانی ہے جو دینے والوں کے قلوب و نفوس کے سارے میلوں کو دور کر دیتا ہے۔ اور تزکیہ کے معنی بڑھوتری اور برکت کے ہیں یعنی رذائل دور کرنے کے ساتھ صلاحیتوں اور خوبیوں کو نشو و نما دینے اور فضائل اخلاق سے آراستہ کرنے کے ہیں۔

ان دونوں کی تشریح میں شارحین قرآن نے لکھا ہے کہ یہ دونوں فقرے یا تو خذ میں ضمیر سے حال ہیں اور یا دونوں صدقہ کی صفت میں قرطبی نے پہلی صورت کو بہترین قرار دیا ہے اور لکھا ہے کہ وان جو دان تكون المخاطبة للنبی صلی اللہ علیہ وسلم اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ یا رسول اللہ آپ ان سے صدقہ لیجیے اور اس کے ذریعے آپ ان کے رذائل دور کیجیے اور ان کو محاسن اخلاق کے زیور سے آراستہ کیجیے اور صل علیھم ان کو دعا دیجیے۔ اور دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ صدقہ ان کو فضائل اخلاق سے آراستہ کرے گا۔ اس صورت میں بھی

کے لانے میں کوئی معنوبت نہیں رہتی ہے۔ دونوں میں سے کوئی ہو دونوں کا حاصل یہ ہے کہ صدقہ دو کام کرتا ہے ایک یہ کہ رذائل کو دور کرتا ہے دوسرے یہ کہ فضائل و محاسن کی تخلیق کرتا ہے پہلا اگر تخلیہ ہے تو دوسرا تحلیہ ہے پہلے منجھائی ہوتی ہے پھر اس میں چمک دمک پیدا ہوتی ہے۔ اس سے یہ بات تو فقہاء کرام نے سمجھی ہے کہ آیت کی رو سے زکوٰۃ وصول کرنا مسلمان سربراہ مملکت کا کام ہے۔ الجصاص نے لکھا ہے کہ —— یہ آیت واضح دلیل ہے اس کی کہ زکوٰۃ لینا سربراہ مملکت کا حق ہے لیکن زمانہ ارتداد میں حضرت ابو بکر کے خلاف جن لوگوں نے شورش نے بپا کی تھی۔ ان میں ایک طبقہ مسلمانوں کا ایسا بھی تھا جنہوں نے اس آیت کا سہارا لے کر سربراہ مملکت کے اس حق کا انکار کر دیا تھا۔ ان کا موقف جیسا کہ قرطبی نے لکھا ہے یہ تھا کہ اس آیت میں حضور کو زکوٰۃ لینے کا حکم تھا اور حضور اقدس اس زکوٰۃ لینے کے بدلہ میں تطہیر، تزکیہ اور دعا دیتے تھے اور یہ تینوں کام کسی دوسرے کا منصب نہیں ہے اس لیے ہم زکوٰۃ سربراہ مملکت کو نہ دیں گے ان کے ہی بارے میں حضرت ابو بکر نے فرمایا تھا واللہ لا قاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ۔

صحابہ کی پوری اجتماعی قوت نے ان کے اس موقف کو رد کر دیا تھا ان کی یہ سوچ قرآن سے بے خبری، شریعت کے ماخذ سے ناآشنائی اور دین سے مذاق کے مترادف ہے۔ کچھ ہو اس واقعہ سے یہ بات تو واضح ہو رہی ہے کہ سربراہ مملکت کا زکوٰۃ وصول کرنا صحابہ کرام کا اجتماعی موقف ہے۔ اس اجتماعی موقف میں امت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ ابن العربی نے لکھا ہے کہ حضرت ابو بکر کے خلاف شورش کرنے والوں میں یہ طبقہ سب سے اچھا تھا۔ حضرت ابو بکر کے ارشاد کا منشا ذرا گہرائی میں جا کر سوچیئے کہ کیا فرما رہے ہیں یہی نا کہ جیسے نماز باجماعت امام کے تحت ادا ہوتی ہے ان میں تفریق اس کے سوا کیا ہے کہ نماز با جماعت ادا ہو اور زکوٰۃ بے جماعت ہو۔ وہ زکوٰۃ کی ادائیگی کا انکار نہیں کر رہے تھے۔ وہ تو صرف سرکار کو زکوٰۃ دینے کے منکر تھے۔ ان بے جماعت زکوٰۃ ادا کرنے والوں کے بارے میں حضرت ابو بکر نے فرمایا واللہ لا قاتلن من فرق بین الصلوٰۃ والزکوٰۃ بخدا میں ضرور ان لوگوں سے جنگ کروں گا جو نماز اور زکوٰۃ کے درمیان فرق کریں گے۔

زکوٰۃ کے مقاصد

قرآن کی یہ آیت زکوٰۃ کے مقاصد کی طرف اشارہ کر رہی ہے۔ زکوٰۃ کے معنی پاکی اور صفائی کے ہیں یعنی گناہ اور دوسری روحانی قلبی اور اخلاقی برائیوں سے پاک وصاف ہونا اور فضائل اخلاق سے آراستہ ہونا۔ قرآن پاک میں یہ لفظ اسی معنے میں بار بار آیا ہے۔

قد افلح من زکٰھا　: مراد پائی اس شخص نے جس نے اس کو پاک کیا

ایک اور جگہ ہے:

قد افلح من تزکی　: مراد پائی اس نے جو پاک وصاف ہوا

یہ تزکیہ اور پاکی وصفائی نبوت کے ان تین عظیم الشان خصوصیتوں میں سے ایک ہے جن کا ذکر قرآن نے کیا ہے یتلوا علیہم ایاتہ ویزکیہم

تزکیہ کے معنی پاک کرنے کے ہیں یہ دل کی پاکی روح کی صفائی اور نفس کی طہارت مذہب کی اصل غایت اور نبوتوں کا اصل مقصد ہے۔ انسانوں کی روحانی ونفسیاتی بیماری کے بڑے حصے کا سبب تو اللہ سبحانہ سے خوف ورجا اور تعلق ومحبت نہ ہونا ہے۔ اور اس کی اصلاح نماز سے ہوتی ہے لیکن دوسرا بڑا سبب غیر اللہ کی محبت اور مال ودولت سے دل کا لگاؤ ہے اس کی اصلاح زکوٰۃ سے کی ہے۔ غزوۂ تبوک کے موقع پر جب کچھ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے غزوہ میں شرکت نہ کرنے کی غلطی ہوئی اور پھر اللہ سبحانہ نے ان کی سچائی اور صداقت کی وجہ سے ان کو معاف کر دیا حضور اقدس کو حکم ہوا:

خذ من اموالہم صدقۃ تطہرہم وتزکیہم بہا

اس سے معلوم ہوا کہ اپنے محبوب مال میں سے کچھ نہ کچھ خدا کی راہ میں دیتے رہنے سے انسانی نفس کے آئینے کا سب سے بڑا زنگ جس کا نام محبت مال ہے دور ہو جاتا ہے۔ بخل کی بیماری کا اس سے علاج ہوتا ہے مال کی حرص بھی کم ہو جاتی ہے دوسروں کے ساتھ ہمدردی کا جذبہ پیدا ہوتا ہے شخصی مفادات کی جگہ جماعتی تقاضوں کی خاطر اپنے اوپر ایثار کرنا انسان سیکھتا ہے اور یہی وہ دیواریں ہیں جن پر جماعتی زندگی کا نظام مبنی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ وصل علیہم یعنی ان کو دعا دو ایک معنی تو یہی ہیں کہ جو زکوٰۃ دیتے ہیں ان کے حق میں دعا کرو لیکن اس سے پہلے حکم گذر چکا ہے کہ منافقین کے صدقات قبول نہ کرو

اور ان کی بخشش کی دعا نہ کرو۔ یہاں ارشاد ہوا کہ جن لوگوں نے اپنی خطاؤں کا اقرار کر لیا ہے اور توبہ کر لی ہے تو وہ جو کچھ راہ حق میں نکالیں ان سے قبول کر لو ان کے حق میں دعائے خیر کرو اگر وہ مر جائیں تو ان کی نماز جنازہ پڑھو۔

شارحین قرآن نے اس سے یہ مسئلہ بھی نکالا ہے کہ جب کوئی مسلمان شہری زکوٰۃ سرکار کے حوالہ کرے تو سربراہ مملکت کو اس کے لیے دعا کرنی چاہیے۔ علامہ بغوی فرماتے ہیں کہ اس موضوع پر اہل علم کا اختلاف ہے کچھ کہتے ہیں کہ دعا کرنا واجب ہے، کچھ کہتے ہیں کہ مستحب ہے، کچھ کی رائے ہے کہ شہریوں کی جانب سے زکوٰۃ آئے تو سربراہ مملکت کو دعا کرنی واجب ہے اور اگر صدقات نافلہ ہوں تو دعا مستحب ہے صحیح بخاری میں ہے عبداللہ بن ابی اوفی کہتے ہیں کہ لوگ حضور اقدس کی خدمت میں صدقات لاتے تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ان کو اللھم صل علیھم کہہ کر دعا دیتے میرے والد صاحب نے بھی صدقہ کی پیش کش فرمائی آپ نے فرمایا اللھم صل علی آل ابی اوفی۔

عربی میں صلوٰۃ کے معنی دعا، استغفار اور رحمت کے آتے ہیں صلوٰۃ تصلیہ سے اسم ہے نماز کو بھی صلاۃ اس لیے کہتے ہیں کہ وہ دعا پر مشتمل ہوتی ہے امام راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ بہت سے اہل لغت کا بیان ہے کہ صلوٰۃ کے معنی دعا کرنے برکت مانگنے اور بزرگی سے یاد کرنے کے ہیں بولا جاتا ہے صلیت علیہ میں نے اس کے لیے دعا کی حضور اقدس کا ارشاد ہے جب تم میں سے کسی کو کھانے کی دعوت دی جائے تو قبول کر لینا چاہیے اور اگر روزہ دار ہو تو دعا کرنا چاہیے ان کان صائما فلیصل۔ اہل ایمان اور ملائکہ کی جانب صلوٰۃ کی نسبت ہو تو معنی دعا کے ہیں اور اللہ سبحانہ کی طرف نسبت ہو تو معنی رحمت اور شاباش کے ہیں ارشاد ہے اولٰئک علیھم صلوات من ربھم ان پر ان کے رب کی جانب سے شاباشیں ہیں۔ یہاں صل علیھم کے معنے دعا دینے کے ہیں اور صلوٰۃ کے معنے دعا کے ہیں معنی یہ ہیں کہ تو ان کو دعا دے تیری دعا ان کے لیے سکون کا سامان ہے۔ سکن کے معنی سکون و اطمینان والی چیز کے ہیں۔ اسی سے رات کو سکون کا ذریعہ بنایا ہے۔ حضور کی دعا ان میں صلاح و رشگی کا ذریعہ اور ان میں خوبیوں کی طرف میلان کی راہ ہموار کرے گی اس لیے سرتاسر سکون بنے گی۔ جیسے مصیبت میں اضطراب اور بے چینی ہوتی ہے ایسے ہی طاعت میں اطمینان سکون ملتا ہے۔ آخر میں دعا کے حوالے سے واللہ سمیع علیھم فرمایا ہے۔ یہاں سمیع کے معنی دعا قبول کرنے کے ہیں

اس میں اشارہ ہے کہ ان کے حق میں حضور اقدس کی دعا قبول ہو گی اور علیہم لاکر یہ بات بتائی ہے کہ دعا کا حکم حضور کو ان کے لیے صرف اسلئے دیا ہے دعا میں ان کے لیے خیر عظیم ہے اور دنیا کی زندگی میں سارے کاموں کی درستگی کی اس میں ضمانت ہے۔

توبہ وانفاق کی ترغیب

۱۰۴؀ کیا ان کو خبر نہیں ہے کہ اللہ ہی کی ذات گرامی اپنے بندوں کی توبہ کو شرف قبول عطا کرتی ہے۔ اور اللہ ہی صدقات کو پذیرائی دیتا ہے اور اللہ ہی زیادہ سے زیادہ توبہ قبول کرنے والا اور بڑا ہی رحمت کرنے والا ہے یعنی توبہ وصدقات کا قبول کرنا صرف اللہ سبحانہ کے اختیار میں ہے کیونکہ وہ ہی جانتا ہے کہ کس نے اخلاص سے اور شرائط توبہ کی رعایت کے ساتھ توبہ کی یا صدقہ دیا چنانچہ پہلے بعضوں پر عتاب ہو چکا کہ ہمیشہ کے لیے ان کی زکوٰۃ یعنی موقوف ہوئی اور منافقین کے صدقات کو مردود ٹھہرایا گیا۔ اور ان کے حق میں دعا و استغفار کو بھی بے سود بتلایا بلکہ جنازہ پڑھنے کی ممانعت کر دی جن لوگوں کا یہاں ذکر ہے ان کی توبہ قبول کی اور صدقات قبول کرنے کا حکم دیا اور یہ ہی کہ حضور ان کے حق میں (حیاً و میتاً) دعا کریں [۱]

اوپر والی آیت میں مخاطب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تھے آپ کو یہ بتایا گیا تھا کہ جب انہوں نے اپنے گناہوں کا اعتراف کر لیا ہے تو ان کی ساتھ اجتماعی زندگی میں بالکل مسلمان شہریوں کا سلوک کیا جائے۔ اس آیت میں خود مسلمانوں کو توبہ اور انفاق میں سرگرم ہونے پر ابھارا جا رہا ہے کیونکہ نفاق کی بیماری کا سب سے موثر علاج اللہ کی راہ میں خرچ کرنا ہے یہ بیماری اصلاً اپنے مفادات کی محبت سے پیدا ہوتی ہے جو انفاق سے اس بیماری کی جڑ کٹ جاتی ہے اور جب جڑ پر ضرب لگتی ہے تو ایک طرف رذائل ختم ہوتے ہیں دوسری طرف مکارم و فضائل پروان چڑھتے ہیں۔ یہ فرما کر کہ اللہ سبحانہ اپنے بندوں کی توبہ اور صدقات قبول کرتا ہے انفاق اور توبہ کی ترغیب دی ہے۔ لہذا جو لوگ اللہ سبحانہ کی رضا اور قرب کے طالب ہوں تو ان کو چاہیے کہ وہ اللہ سبحانہ کی پسند کے یہ کام زیادہ سے زیادہ کریں۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ توبہ اور اصلاح کا کام کوئی وقتی کام نہیں ہے بلکہ اس میں دوام اور استمرار مطلوب ہے۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں ضمیر فصل لاکر جو تخصیص پیدا کی گئی ہے اس سے بھی شارحین قرآن نے یہ نکتہ اخذ کیا
کی ہے کہ توبہ قبول کرنا صرف اللہ سبحانہ کا کام ہے کسی بندے کا کام نہیں خواہ وہ نبی ہو یا ولی علامہ
نسفی حنفی صاحب مدارک لکھتے ہیں۔ ان ذالک لیس الی رسول اللہ انما اللہ ھو یقبل التوبہ
توبہ قبول کرنا صرف اللہ سبحانہ کا کام ہے رسول کا کام نہیں ہے۔ علامہ قرطبی نے بھی علامہ نسفی کی
ہمنوائی کی ہے۔ یہی صدقات کا بھی حکم ہے قرطبی لکھتے ہیں یہ آیت اس موضوع پر صاف ہے کہ
صدقات قبول کرنا اور اس پر ثواب دینا اللہ کا کام ہے حضور اقدس کی ذات گرامی واسطہ ہے۔

علامہ آلوسی نے اس انداز بیان کی بلاغت سے کچھ لوگوں کی طرف نسبت کر کے یہ بات نکالی ہے
کہ پہلی آیت میں حضور اقدس کو مخاطب کر کے فرمایا خذ من اموالھم اور اس آیت میں
یاخذ الصدقات ارشاد ہوا ہے یعنی پہلے لینے کی نسبت حضور اقدس کی طرف ہوئی ہے اور
اس آیت میں لینے کی نسبت اللہ سبحانہ کی طرف ہوئی ہے اس میں اشارہ ہے کہ حضور اقدس کا
لینا اللہ سبحانہ کے لینے کی نیابت ہے جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بیعت کو اللہ پاک کی
بیعت بتایا ہے ایسے ہی حضور کا صدقہ لینا بھی اللہ کا لینا ہے۔ اس میں شان نبوت کی برتری ہے
لیکن دوسرے شارحین قرآن نے بتایا ہے کہ دونوں آیتوں میں اخذ کے معنی لینا نہیں ہے پہلی آیت
میں حضور کے خطاب میں اخذ اگر لینے کے معنی میں ہے تو دوسری آیت میں اخذ قبول کے معنی میں ہے
اس اعتبار سے وہ معنوی ملائمت نہیں رہتی ہے اسی لیے علامہ آلوسی نے اس بلاغت کے حسن کے
اقرار کے ساتھ یہ بھی لکھ دیا ہے۔ الا ان فی دعوی الحقیقۃ مالا یخفی اس آیت کی
تشریح کرتے ہوئے شارحین قرآن نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات پیش کیے
ہیں ان کی روشنی میں بھی یہ بات وضاحت سے کھل کر سامنے آتی ہے کہ آیت قرآنی الم یعلموا ان
اللہ ھو یقبل التوبۃ عن عبادہ و یاخذ الصدقات میں یاخذ قبول کرنے کے
معنی میں ہے۔ حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں:

> اس آیت میں توبہ اور صدقہ کی ترغیب دی جا رہی ہے۔ یہ دونوں چیزیں گناہوں
> کو کالعدم کر دیتی ہیں۔ اللہ سبحانہ نے اعلان کیا ہے جو اللہ کی بارگاہ میں توبہ کرتا ہے
> اللہ سبحانہ اس کی توبہ کو شرف پذیرائی دیتا ہے۔ اور جو شخص مال حلال سے صدقہ
> کرتا ہے اللہ سبحانہ اس کو قبول کر کے اس کو بڑھاتا ہے اتنا بڑھاتا ہے کہ
> ایک کھجور کا دانہ جبل احد کے برابر ہو جاتا ہے۔

ارشادِ نبوت ہے حضرت ابوہریرہ کہتے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ سبحانہ صدقہ کو قبول کرتا ہے اس کو اپنے دامن میں لے کر اس کی پرورش کرتا ہے ایسے ہی جیسے تم گھوڑے کے بچے کو پالتے ہو۔ اس پرورش کے ذریعے ایک لقمہ بھی صدقہ کیا ہوا اُحد پہاڑ کے برابر ہو جاتا ہے اس کی تصدیق چاہتے ہو تو قرآن کی یہ آیت پڑھو الم یعلموا الخ۔

عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے صدقہ کی قبولیت کو اس طرح سمجھایا ہے کہ صدقہ محتاج کے ہاتھ میں جانے سے پہلے اللہ کے ہاتھ میں جاتا ہے۔ پھر یہی آیت تلاوت فرمائی۔ علامہ بقاعی نے نظم الدرر میں بھی بڑی لطیف بات لکھی ہے کہ اس انداز بیان میں ان لوگوں پر ایک لطیف طنز ہے جنہوں غزوہ تبوک میں شرکت نہ کرنے کے گناہ کی سنگینی کو محسوس نہیں کیا اور توبہ نہیں کی اور اپنے گناہوں کا ان کی طرح اعتراف نہیں کیا جن کی توبہ اللہ سبحانہ نے قبول فرمائی۔

آیت قرآنی کا خلاصہ یہ ہے کہ گناہوں سے توبہ کرنی چاہیے بطور کفارہ کچھ مال بھی صدقہ کرنا چاہیے یہ ایمان کی علامت ہے۔ صدقہ دینے سے گناہ معاف ہوتے ہیں۔ روح پاک ہوتی ہے دل گناہوں کی کدورت سے صاف ہوتا ہے گویا اس طرف اشارا ہوا کہ اسلام قربانیوں کا نام ہے جان کی قربانی ہو یا مال کی قربانی۔ ایمان کے کھرے ہونے کے لیے قربان ناگزیر ہے، توبہ اور قربانی ایمان کی جان ہے۔ اگر جان کی قربانی کا موقعہ نہ ہو تو مال کی قربانی کرے۔

آئندہ کے لیے ہدایت

۱۰۵ اور اے پیغمبر ان سے کہہ دو اللہ سبحانہ، اللہ کا رسول اور سارے مسلمان تمہارے اعمال دیکھیں گے۔ اور ضرور تمہیں عالم الغیب والشہادہ کے حضور میں پیش کیا جائے گا وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا کرتے تھے یعنی توبہ وغیرہ سے گناہ معاف ہو گئے لیکن آگے دیکھا جائے کہ تم کہاں تک صدق و استقامۃ کا عملی ثبوت پیش کرتے ہو اس جہاد میں قصور ہوا تو آئندہ اور جہاد ہوں گے پیغمبر علیہ اسلام کے یا خلفا کے روبرو ان میں امتحان ہوگا کہ کیا عمل کرتے ہو پھر خدا کے یہاں جا کر ہر عمل کا پورا بدلہ مل جائے گا کیونکہ وہ تمام کھلی چھپی چیزوں اور ظاہری عمل اور باطنی نیتوں پر مطلع ہے ہر ایک کے ساتھ واقعی حالت کے موافق معاملہ کرے گا۔ آیت کی یہ تقریر حضرت شاہ کے مذاق کے مطابق کی گئی ہے۔ کیونکہ سیاق قرآنی کے زیادہ مطابق ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جو تشریح حضرت شیخ الاسلام نے حضرت شاہ صاحب کے حوالہ سے اختیار فرمائی ہے آیت کا یہی مطلب کچھ شارحین نے اختیار کیا ہے یہی علامہ بقاعی نظم الدرر میں اختیار کیا ہے لیکن دوسرے شارحین قرآن نے وہ تشریح اپنائی ہے جو مجاہد امام سے منقول ہے وہ فرماتے ہیں کہ یہ بات ڈانٹ اور دھمکی ہے اور اس کے مخاطب وہ لوگ ہیں جو غزوہ تبوک میں شریک نہیں ہوئے اور تاحال انہوں نے اپنے اس جرم پر ندامت محسوس کر کے توبہ نہیں کی حافظ ابن کثیر کا میلان بھی اس طرف ہے اور کچھ شارحین قرآن کی رائے ہیں اس کے مخاطب سب ہیں وہ بھی جنہوں نے توبہ کر لی ہے اور وہ بھی جنہوں نے توبہ نہیں کی ہے۔ قرطبی کی رائے یہی ہے۔ تشریح میں اس اختلاف کا سرچشمہ یہ ہے کہ آیت میں وعدہ اور وعید دونوں ہیں جن کی نظر وعدہ پر ہے۔ انہوں نے بقاعی کی تشریح کو اپنا لیا اور جن کی نظر وعید پر ہے جم گئی انہوں نے مجاہد کی تشریح کو اختیار کیا اور جن کی نظر میں وعدہ وعید دونوں یکساں تھے۔ انہوں نے آیت قرآنی کا مخاطب سب کو قرار دیا ہے۔ لیکن میری ناچیز رائے میں سیاق قرآنی کے زیادہ مطابق یہی ہے کہ مخاطب وہی لوگ ہیں جنہوں نے توبہ کی ہے اور مال صدقہ کیا ہے اور اللہ سبحانہ نے ان کا صدقہ قبول اور ان کی توبہ کو شرف پذیرائی دیا ہے۔ انہوں نے اپنے قصور کے لیے جھوٹے عذر پیش نہیں کئے بلکہ جو قصور ہوا ہے اسے صاف صاف مان لیا۔ محدثین نے ان آیات کے شان نزول میں جو واقعہ بیان کیا ہے اس سے یہ بات روز روشن کی طرح واضح ہو جاتی ہے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں معافی کس قسم کی کمزوریوں کے لیے ہے یہ سب حضرات عادی غیر مخلص نہ تھے بلکہ ان کا پچھلا زمانہ زندگی ان کے اخلاص ایمان کی دلیل تھا۔ ان میں سے کسی نے عذر نہیں تراشا بلکہ اپنے قصور کو خود ہی مان لیا انہوں نے اعتراف قصور کے ساتھ اپنے طرز عمل سے ثابت کر دیا کہ وہ واقعی نادم اور اپنے اس گناہ کی تلافی کے لیے سخت بے چین ہیں ان سے ہی کہا جا رہا ہے کہ ہر چند اس وقت تمہیں معافی کا پروانہ مل گیا ہے۔ لیکن اس معافی پر مطمئن نہ ہو جانا بلکہ مستقبل میں اپنے عمل سے بھی تمہیں ثابت کرنا ہوگا اللہ، اس کا رسول اور اہل ایمان سب تمہارے رویہ کو دیکھیں گے۔ آخر میں فرمایا وستردون الی عالم الغیب والشہادہ۔ علامہ بقاعی نے یہاں یہ لطیف نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ منافقین کے بارے میں جب بھی بات فرمائی تو ارشاد ہوا ثم تردون الی عالم الغیب والشہادہ لیکن یہاں چونکہ ان مخلص اہل ایمان کا ذکر ہو رہا ہے جن سے وقتی طور پر غلطی ہو گئی ہے اس لیے تعبیر بدل کر فرمایا وستردون الی عالم الغیب مطلب یہ ہے کہ آخر کار معاملہ اس خدا کے ساتھ ہے جس سے کوئی چیز چھپ نہیں سکتی اس لیے بالفرض اگر کوئی شخص دنیا میں

اپنا نفاق چھپانے میں کامیاب ہو جائے اور انسان جن جن معیاروں پر کسی کے ایمان و اخلاص کو پرکھ سکتا ہے ان سب پر بھی پورا اتر جائے تو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ وہ نفاق کی سزا پانے سے بچ گیا ہے۔

خاص لوگوں کا ذکر

۱۱۱ اور کچھ اور بھی ہیں جن کے معاملے میں تا حکم الٰہی مہلت دی گئی ہے وہ ان کو عذاب دے یا اپنی رحمت سے ان کو معاف کر دے اللہ سب کچھ جاننے والا اور حکمت والا ہے۔ مدینہ والوں میں سے یہاں ایک اور چھوٹی سی جماعت کا ذکر فرمایا ہے اصل یہ ہے کہ متخلفین عن تبوک یعنی تبوک میں نہ جانے والوں میں تین قسم کے لوگ تھے ایک منافقین از راہ شک و نفاق تبوک نہ گئے دوسرے کچھ اہل ایمان جو محض سستی اور تن آسانی کی وجہ سے شریک جہاد نہ ہوئے۔ پھر ان میں دو قسمیں تھیں اکثر وہ ہیں جنہوں نے واپسی کی اطلاع پا کر اپنے کو مسجد کے ستونوں سے باندھ لیا تھا ان کا ذکر پچھلی آیات میں گزر گیا صرف تین شخصوں کی وہ جماعت تھی جنہوں نے نہ اپنے کو ستونوں سے بندھوایا نہ کوئی عذر تراشا جو واقعہ تھا اور جو قصور ہوا تھا صاف صاف بلا کم و کاست حضور اقدس کے سامنے عرض کر دیا۔ ان کے بارے میں یہ آیت واخرون مرجون الخ اتری یعنی ان کا معاملہ ابھی ڈھیل میں ہے چند روز اللہ سبحانہ کے حکم کا انتظار کرو خواہ ان کو سزا دے یا معاف کر دے جو اس کے علم و حکمت کا تقاضا ہوگا کیا جائے گا۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تا نزول حکم الٰہی ادب دینے کے لیے مسلمانوں کے تعلقات ان تینوں سے منقطع کرا دیے پچاس دن تک یہی معاملہ رہا۔ پھر معافی ہوئی ان واقعات کی تفصیل آگے رکوع میں آ رہی ہے[۱] مطلب یہ ہے کہ ان مخلصین کے علاوہ کچھ اور لوگ بھی ہیں جو اللہ سبحانہ کے فیصلہ کا انتظار کر رہے ہیں یعنی ان کی توبہ کی قبولیت اور عدم قبولیت کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا یہ کل تین آدمی تھے مرارہ ابن الربیع، ہلال ابن امیہ، کعب بن مالک انہوں نے واپسی پر کوئی معذرت نہیں کی اور کہا کی سچی بات یہ ہے کہ کوئی عذر نہ تھا محض کاہلی اور سستی تھی جس نے نکلنے نہیں دیا اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔ اللہ کے حکم کا انتظار کرو۔ ان لوگوں کا اپنی کوتاہی پر نادم ہونا تو ظاہر ہے لیکن آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ قبول توبہ کے لیے صرف پشیمانی کافی نہیں ہے جب

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ف امکانی تدارک کا بھی سامان نہ ہو۔ امام رازی فرماتے ہیں ذالك يدل على ان الله امة وحد لا يكون كافيا في صحة التوبة. لفظ اما آیت میں کلمہ تردد ہے لیکن ظاہر ہے کہ یہ تردد حق سبحانہ کی جانب کیسے وہاں تو ہر فیصلہ قطعی ہوتا ہے لفظ اما کا استعمال محاورہ انسانی کے مطابق ہے اور بندوں کو یہ تعلیم مل رہی ہے کہ وہ صرف حالت امید میں رہیں یہ نکتہ علامہ قرطبی نے پیش کیا ہے۔ اسی بات کو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ ان کا معاملہ عام نگاہوں میں مشکوک تھا ان کے ماضی کے پیش نظر نہ ان پر نفاق کی تہمت کی گنجائش تھی اور اسلام کی زندگی کی خاطر محنت سے جی چرانے کی موجودگی ان کا اخلاص واضح تھا اس لیے اللہ تعالیٰ نے ان کے معاملہ کو معرض التواء میں رکھا اس لیے نہیں کہ فی الواقع علم الٰہی میں معاملہ مشکوک تھا بلکہ اس لیے کہ مسلمانوں کو کسی مسلمان کے معاملے میں اپنا طرز عمل اس وقت تک متعین نہ کرنا چاہیے جب تک اس کی پوزیشن واضح ہو کر سامنے نہ آجائے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ جب ان لوگوں کا ماضی بظاہر بے داغ تھا ان پر اس قدر عتاب کیوں ہوا ؟

اس کی ایک سے زیادہ وجہ ہو سکتی ہیں

ایک وجہ یہ ہو سکتی ہے کہ کسی پر عتاب اس نسبت سے ہوتا ہے جس نسبت سے اس پر اعتماد اور اس سے حسن ظن ہوتا ہے۔ بیگانے اگر غلطی کریں تو ان کی کمزوریوں کی وجہ سے ان سے بعید نہیں لیکن ان لوگوں نے جو غلطی کی اس سے اپنے پچھلے بے داغ ریکارڈ کو بھی انہوں نے داغدار بنا لیا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اس اعتماد اور حسن ظن کو بھی ٹھیس پہنچائی جو ہر مسلمان کا سب سے بڑا قیمتی سرمایہ ہے۔

دوسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ ان بزرگوں نے غالباً اس اعتماد کی وجہ سے جو ان کو اپنے ماضی پر تھا اپنی اس غلطی کا شدت سے احساس نہیں کیا جیسا کہ ان کو کرنا چاہیے۔ اس لئے تربیت الٰہی کی حکمت نے چاہا کہ ان کی توبہ کی قبولیت اس عرصہ تک ملتوی رہے کہ ان میں وہ بیقراری نہ پیدا ہو جائے جو توبہ کی قبولیت کے لیے اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں ضروری ہے۔

تیسری وجہ یہ بھی ہو سکتی ہے کہ اس طرح اہل ایمان میں نفاق کے خلاف وقتی نفرت پیدا کر دی جائے کہ وہ نفاق کی کسی قسم کو بھی اپنے اندر گوارا کرنے پر راضی نہ ہوں۔

یہاں یہ سوال بھی قرآن کے قاری کے ذہن میں خلش پیدا کرتا ہے کہ تبوک کی جنگ دفاعی نہیں

ہجومی تھی۔ یعنی مسلمان حملہ آور تھے مسلمانوں پر کہیں سے حملہ نہیں ہوا تھا اور سب جانتے ہیں کہ ہجومی حالت میں جنگ میں شرکت فرض کفایہ ہے جب کہ دفاع میں فرض عین ہے فرض کفایہ کا حکم یہی ہے کہ کچھ کے کرنے سے سب سے ذمہ داری کا بوجھ ہٹ جاتا ہے معلوم ہوتا ہے کہ اس جہاد میں شرکت فرض کفایہ تھی فرض کفایہ کے ترک پر اس قدر عتاب کیوں ہو۔

حافظ ابوالقاسم السہیلی نے الروض الانف میں حافظ ابن بطال کے حوالہ سے یہ جواب دیا ہے کہ انصار پر جہاد فرض عین تھا کیونکہ انہوں نے جہاد کے لیے حضور اقدس کے دست مبارک پر بیعت کی تھی۔ غزوہ خندق میں وہ یہ رجز بڑی لے سے پڑھ رہے تھے۔

نحن الذین بایعوا محمدا
علی الجہاد مابقینا ابدا

ہم ہی تو وہ ہیں جنہوں نے زندگی بھر جہاد کرنے کی حضورؐ سے بیعت کی ہے۔

وَالَّذِيْنَ اتَّخَذُوْا
مَسْجِدًا ضِرَارًا وَّكُفْرًا وَّتَفْرِيْقًا بَيْنَ الْمُؤْمِنِيْنَ وَاِرْصَادًا
لِّمَنْ حَارَبَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ مِنْ قَبْلُ ؕ وَلَيَحْلِفُنَّ اِنْ اَرَدْنَآ
اِلَّا الْحُسْنٰى ؕ وَاللّٰهُ يَشْهَدُ اِنَّهُمْ لَكٰذِبُوْنَ ﴿۱۰۷﴾ لَا تَقُمْ فِيْهِ
اَبَدًا ؕ لَمَسْجِدٌ اُسِّسَ عَلَى التَّقْوٰى مِنْ اَوَّلِ يَوْمٍ اَحَقُّ
اَنْ تَقُوْمَ فِيْهِ ؕ فِيْهِ رِجَالٌ يُّحِبُّوْنَ اَنْ يَّتَطَهَّرُوْا ؕ وَاللّٰهُ
يُحِبُّ الْمُطَّهِّرِيْنَ ﴿۱۰۸﴾ اَفَمَنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى تَقْوٰى
مِنَ اللّٰهِ وَرِضْوَانٍ خَيْرٌ اَمْ مَّنْ اَسَّسَ بُنْيَانَهٗ عَلٰى
شَفَا جُرُفٍ هَارٍ فَانْهَارَ بِهٖ فِيْ نَارِ جَهَنَّمَ ؕ وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي
الْقَوْمَ الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۰۹﴾ لَا يَزَالُ بُنْيَانُهُمُ الَّذِيْ بَنَوْا رِيْبَةً ۱۴
فِيْ قُلُوْبِهِمْ اِلَّآ اَنْ تَقَطَّعَ قُلُوْبُهُمْ ؕ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۱۱۰﴾ ع ۱۱ ۲

اور وہ لوگ جنہوں نے اہلِ ایمان کو نقصان پہنچانے، کفر کرنے اور اہلِ ایمان میں پھوٹ ڈالنے اور اللہ و رسول سے جنگ کرنے والوں کے لیے کمین گاہ قائم کرنے کی خاطر مسجد بنائی ہے اور وہ ضرور قسمیں کھا کر کہیں گے کہ مسجد کی تعمیر سے ہمارا مقصد بھلائی کے سوا کچھ

نہیں ہے اللہ کی گواہی یہ ہے کہ یہ لوگ جھوٹے ہیں[۱] اے اللہ کے
رسول تم اس مسجد میں کبھی نہ کھڑے ہونا وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے
دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اس کی حقدار ہے کہ آپ اس میں
قیام کریں۔ اس میں ایسے لوگ آتے ہیں جو پسند کرتے ہیں پاک و
صاف رہنے کو۔ اور اللہ بھی پاک وصاف رہنے والوں کو پسند
کرتا ہے[۲] کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ
کے ڈر اور اس کی رضا پر رکھی ہو یا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی
عمارت کی بنیاد ایک کھائی کے گرے ہوئے کنارے پر رکھی ہو
اس کے نتیجے میں وہ عمارت کے ساتھ جہنم کی آگ میں گر گیا ہو۔ اور
اللہ سبحانہ ان کو راہ حق نہیں دکھاتا جو ظلم کا وطیرہ اپناتے ہوں[۳]
جو عمارت انہوں نے بنائی ہے وہ ان کے دلوں میں ہمیشہ
شک وشبہ کی آبیاری کرتی رہیگی مگر یہ کہ ان کے دلوں کے
ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت
والا ہے[۴]

مفردات کے معانی

ضرار یہ ضار یضار باب مفاعلۃ کا فعال کے وزن پر مصدر ہے جس کے معنی باہم ایک دوسرے کو نقصان پہنچانے کے ہیں۔ یہ ضرر سے بنا ہے بمعنے بدحالی ہے خواہ اپنے اندر میں ہو علم و فضل اور عفت کی کمی کی وجہ سے یا اپنے بدن میں ہو کسی عضو کے نہ ہونے کی وجہ سے یا کسی اور بیرونی سبب سے مثلاً مال وغیرہ کی قلت کی وجہ سے۔

ارصاد یہ رصد سے باب افعال ہے۔ اس کے معنی چوکیدارہ دینا گھات میں رہنا گھات میں رہنے کی تیاری کو کہتے ہیں۔ اسی سے رصد اور مرصاد کمین گاہ کے معنی میں ہے۔

شفا اصل میں کنوئیں یا نہر کے معنی میں آتا ہے۔ اس کی جمع اشفا ہے ہلاکت سے قریب ہونے کے لیے ضرب المثل ہے کنتم علی شفا حفرۃ میں اسی معنے میں ہے بطور استعارہ تھوڑے کے معنی میں بھی آتا ہے۔ جب کہنا ہو کہ تھوڑا سا رہ گیا ہے تو بولتے ہیں ما بقی من کذا الا شفا۔ تثنیہ شفوان ہے۔ جرف یہ جرفۃ کی جمع ہے۔ اصل میں نہر کا وہ کنارہ جسے پانی کے بہاؤ نے کاٹ دیا ہو اسی سے جرف اللہ ھر مالہ زمانہ اس کے مال کو بہا لے گیا۔

ھار یہ ھور سے اسم فاعل ہے ھار النہار کے معنی ہیں عمارت کا پھٹ کر گرنے کے قریب ہو جانا۔ اسی سے فاعل ہائر آتا ہے مگر کبھی ھار بھی بولا جاتا ہے جیسے شائک السلاح کو شاکی السلاح بولتے ہیں۔ انہیار بھی اسی سے باب انفعال ہے جس کے معنی گرنا ہیں۔

مسجد ضرار کی تاریخی حیثیت

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مدینہ میں آنے سے پہلے قبیلہ خزرج میں ایک شخص ابو عامر نامی شخص تھا۔ زمانہ جاہلیت میں عیسائی ہو گیا تھا اور عیسائی بنتے ہی بعد عیسائی مذہب کی تعلیم حاصل کر کے راہب بن گیا تھا۔ اس کا شمار صرف عیسائی علماء میں نہیں بلکہ مشائخ میں ہوتا تھا یعنی اس کی علمیت کے ساتھ اس کی بزرگی کا سکہ بھی مدینہ اور اطراف مدینہ کے جاہل عربوں میں بیٹھا ہوا تھا جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ طیبہ تشریف لائے تو ابو عامر کی بزرگی کا بہت چرچا تھا مگر یہ علم اور بزرگی اس کے اندر حق شناسی اور حق جوئی پیدا کرنے کی جگہ الٹی اس کے لیے ایک زبردست حجاب بن کر رہ گئی۔ اس نے حضور اقدس کی ذات گرامی کو اپنی عالمانہ شان اور اپنی بزرگی کے لیے حریف

سمجھ کر آپ کی مخالفت کا بیڑا اٹھا لیا۔ شروع کے دو سال تک تو یہ اس امید پر جیتا رہا کہ کفار قریش کی طاقت ہی اسلام کو مٹا دے گی۔ لیکن جنگ بدر میں جب کفار قریش کو شکست ہوئی تو اس کی امیدوں پر اوس پڑ گئی۔ اسی سال وہ مدینے سے نکل پڑا اور اس نے قریش اور دوسرے عرب قبائل میں اسلام کے خلاف ہرزہ سرائی شروع کر دی۔ جنگ احد جن لوگوں کی کوششوں کے نتیجے میں بپا ہوئی ان میں یہ شامل تھا اور غزوۂ احزاب میں جو لشکر ہر طرف سے مدینہ پر چڑھائی کر کے آیا تھا۔ اس کے لانے میں بھی اس کا حصہ تھا اس کے بعد جنگ حنین تک جس قدر لڑائیاں مشرکین عرب اور مسلمانوں کے درمیان ہوئی تھیں ان سب میں یہ عیسائی درویش اسلام کے خلاف شرک کا سب سے بڑا حامی رہا۔ آخر کار اسے اس بات سے مایوسی ہو گئی کہ عرب کی کوئی طاقت اسلام کے سیلاب کو روک سکے گی۔ اس لیے عرب کو چھوڑ کر اس نے روم کا رخ کیا تاکہ قیصر کو اس خطرے سے آگاہ کرے۔ یہ وہ ہی موقع تھا جب مدینے میں یہ اطلاعات پہنچیں کہ قیصر عرب پر چڑھائی کی تیاریاں کر رہا ہے۔

ابو عامر کی ان تمام سرگرمیوں میں مدینے کے منافقین کا ایک گروہ اس کے ساتھ سازش میں شریک تھا۔ اور اس آخری تجویز میں یہ لوگ اس کے ہمنوا تھے کہ وہ اپنے مذہبی اثر کو استعمال کر کے اسلام کے خلاف قیصر روم اور شمالی عرب کے عیسائی ریاستوں سے فوجی امداد حاصل کرے۔ جب وہ روم کی طرف روانہ ہونے لگا تو ان سب نے باہم یہ فیصلہ کیا کہ مدینہ میں یہ لوگ اپنی ایک مسجد بنائیں گے تاکہ عام مسلمانوں سے بچ کر منافقوں کی علیحدہ تنظیم ہو سکے اور وہاں نہ صرف یہ کہ منافقین منظم ہو سکیں اور آئندہ کارروائیوں کے لیے مشورے کر سکیں بلکہ ابو عامر کی جانب سے جو جاسوس خبریں اور ہدایات لے کر آئیں وہ بھی فقیروں اور مسافروں کے بھیس میں اس مسجد میں ٹھہر سکیں یہ تھی وہ ناپاک سازش جس کے تحت مسجد تیار کی گئی۔ اس کی تعمیر کا زمانہ وہ ہے جب حضور اقدس قیصر روم کے مقابلے کے لیے سفر تبوک کی تیاریاں کر رہے تھے۔

بظاہر مسجد بباطن دار حرب

۱۱۲ اور وہ لوگ جنہوں نے اہل ایمان کو نقصان پہنچانے کفر کرنے اہل ایمان میں پھوٹ ڈالنے، اللہ و رسول سے جنگ کرنے والوں کے لیے کمین گاہ قائم کرنے کی خاطر مسجد بنائی وہ مزور تم سے قسمیں کھا کر کہیں گے کہ مسجد کی تعمیر سے ہمارا مقصد بھلائی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اللہ کی گواہی یہ ہے کہ

یہ لوگ جھوٹے ہیں۔

پہلے ان لوگوں کا ذکر تھا جن سے بظاہر ایک بُرا کام ہو گیا یعنی متخلف عن الجہاد۔ مگر صحت اعتقاد اور اعتراف خطا کی بدولت معافی مل گئی۔ یہاں ایسی جماعت کا بیان ہے جنہوں نے بظاہر اچھا کام کیا یعنی تعمیر مسجد لیکن بد اعتقادی کی وجہ سے وبال بن گیا۔

واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مکہ سے ہجرت کر کے آئے تو اول مدینے سے باہر بنی عمرو بن عوف کے محلہ میں فروکش ہوئے پھر چند روز بعد مدینہ شہر میں تشریف لائے اور مسجد نبوی کی تعمیر کی اس محلہ میں جہاں آپ بیشتر نماز پڑھتے تھے وہاں کے لوگوں نے مسجد تیار کر لی جو مسجد قبا کے نام سے مشہور ہے حضرت اکثر ہفتہ کے روز وہاں جا کر دو رکعت نماز پڑھتے تھے اور اس کی بڑی فضیلت بیان فرماتے تھے کچھ منافقین نے چاہا کہ پہلوں کی ضد پر اسی کے قریب ایک اور مکان مسجد کے نام سے تعمیر کریں اپنی جماعت جدا ٹھہرائیں۔ اور بعض سادہ دل مسلمانوں کو مسجد قبا سے ہٹا کر ادھر لے آئیں۔ فی الحقیقہ اس ناپاک تجویز کا محرک اصل میں ایک شخص ابو عامر راہب خزرجی تھا۔ ہجرت سے پہلے اس نے نصرانی بن کر راہبانہ زندگی اختیار کر لی تھی۔ مدینہ اور اس کے پاس کے لوگ خصوصاً قبیلہ خزرج اس کے زہد و درویشی کے معتقد تھے اور بڑی تعظیم کرتے تھے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قدوم میمنت لزوم سے جب مدینے میں ایمان و عرفان کا آفتاب چمکا تو اس طرح کے درویشوں کا بھرم کھلنے لگا۔ بھلا نور آفتاب کے سامنے چراغ مُردہ کو کون پوچھتا ہے؟ ابو عامر یہ دیکھ کر چراغ پا ہو گیا۔ حضورؐ نے اس کو اسلام کی دعوت دی اور فرمایا کہ میں ٹھیٹھ ملت ابراہیمی لے کر آیا ہوں کہنے لگا کہ میں پہلے سے اس پر قائم ہوں لیکن تم نے اپنی طرف سے ملت ابراہیمی میں اس کے خلاف چیزیں داخل کر دی ہیں حضور اقدس نے بہت زور سے اس کی تردید فرمائی آخر اس کی زبان سے نکلا کہ جو ہم میں سے جھوٹا ہو خدا اس کو وطن سے یکہ و تنہا غربت دے بے کسی کی موت مارے آپ نے فرمایا آمین اللہ سبحانہ ایسا ہی کرے جنگ بدر کے بعد جب اسلام کی جڑیں مضبوط ہو گئیں اور مسلمانوں کا عروج و فروغ حاسدوں کی نگاہوں کو خیرہ کرنے لگا۔ ابو عامر کو تاب نہ رہی بھاگ کر مکہ پہنچا تاکہ کفار مکہ کو حضور کے مقابلے کے لیے ابھارے چنانچہ معرکہ احد میں قریش کے ساتھ خود آیا۔ جنگ شروع ہونے سے پہلے آگے بڑھ کر انصار مدینہ کو جو عہد جاہلیت میں اس کے بڑے معتقد تھے خطاب کر کے اپنی طرف مائل کرنا چاہا۔ احمق یہ نہ سمجھا کہ پیغمبرانہ تصرف کے سامنے اب وہ پرانا جادو کیسے چل سکتا ہے۔ آخر انصار نے جو اسے پہلے راہب کہہ کر پکارتے تھے جواب دیا او فاسق دشمن خدا تیری آنکھ خدا کبھی ٹھنڈی نہ

کرے کیا رسول خدا کے مقابلہ میں ہم تیرا ساتھ دیں گے ؟ انصار کا مایوس کن جواب سن کر کچھ حواس درست ہوتے اور غصہ میں آکر بولا کہ اے محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) آئندہ جو قوم بھی تیرے مقابلہ کے لیے اٹھے گی۔ میں برابر اس کے ساتھ رہوں گا۔ چنانچہ جنگ حنین تک ہر معرکہ میں کفار کے ساتھ ہو کر مسلمانوں سے لڑتا رہا۔ احد میں اس کی شرارت سے حضور کو چشم زخم پہنچا۔ دونوں صفوں کے درمیان اس نے پوشیدہ طور پر کچھ گڑھے کھدوائے تھے اس چہرہ مبارک کے زخمی ہونے اور دندان مبارک کے شہید ہونے کا واقعہ پیش آیا۔

حنین کے بعد جب ابو عامر نے محسوس کر لیا کہ اب عرب کی کوئی طاقت اسلام کو کچلنے میں کامیاب نہیں ہو سکتی تو بھاگ کر ملک شام چلا گیا اور منافقین مدینہ کو خط لکھا کہ میں قیصر روم سے مل کر ایک لشکر جرار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے میں لانے والا ہوں جو چشم زدن میں ان کے سارے منصوبے خاک میں ملا دے گا اور مسلمانوں کو بالکل پامال کر کے چھوڑے گا العیاذ باللہ تم فی الحال ایک عمارت مسجد کے نام سے بنالو جہاں نماز کے بہانے سے جمع ہو کر اسلام کے خلاف ہر قسم کے سازشی مشورے ہو سکیں اور قاصد تم کو وہیں میرے خطوط وغیرہ پہنچا دیا کرے اور میں بذات خود آؤں تو ایک موزوں جگہ ٹھہرنے اور ملنے کی ہو یہ خبیث مقاصد تھے جن کے لیے مسجد تعمیر ہوئی۔ اور حضور کے روبرو بہانہ یہ کیا کہ یا رسول اللہ ! خدا کی قسم ہماری نیت بری نہیں ہے بلکہ بارش اور سردی وغیرہ میں بالخصوص جاڑوں میں ناتوانوں اور ارباب حوائج کو مسجد قبا تک جانا دشوار ہوتا ہے اس لیے یہ مسجد بنالی گئی تاکہ نمازیوں کو سہولت ہو اور مسجد قبا میں جگہ کی تنگی کی شکایت نہ رہے۔ حضور اقدس ایک مرتبہ وہاں چل کر نماز پڑھ لیں تو ہمارے لیے موجب برکت و سعادت ہو۔ یہ اس لیے کہ حضور اقدس کا طرز عمل دیکھ کر کچھ سادہ دل مسلمان حسن ظن کی بنا پر ان کے جال میں پھنس جائیں اب اس وقت تبوک جانے کے لیے پابرکاب تھے فرمایا اللہ نے چاہا تو واپسی پر ایسا ہو سکے گا جب حضور تبوک سے واپسی پر بالکل مدینہ کے قریب پہنچے تب جبرئیل یہ آیات لے کر آئے جن میں منافقین کی ناپاک اغراض پر مطلع کر کے مسجد ضرار کا پول کھول دیا گیا آپ نے مالک بن دخشم اور معن بن عدی کو حکم دیا کہ اس مکان کو جس کا نام ازراہ خداع و فریب مسجد رکھا ہے گرا کر پیوند زمین کر دو۔ انہوں نے فوراً حکم کی تعمیل کی اور جلا کر خاک سیاہ کر دیا اس طرح منافقین اور ابو عامر فاسق کے سب ارمان دل کے دل میں رہ گئے اور ابو عامر اپنی دعا اور حضور اقدس کی آمین کے موافق مقام قنسرین ملک شام میں تنہا سخت بے کسی کی موت مرا فقطع دابر القوم الذین ظلموا الحمد للہ

رب العالمین آیت میں من حارب اللہ ورسولہ سے ابوعامر فاسق مراد ہے۔[1]

آیت قرآنی کا انداز تعبیر خود بول رہا ہے کہ منافقین میں ایک گروہ منظم تھا جو اسلام کے خلاف سازشیں کر رہا تھا اور ایک شخص کی قیادت میں ان کی اجتماعی تنظیم تھی اور اس اجتماعی تنظیم کے کچھ خاص مقاصد تھے الذین اتخذوا سے ان کی اجتماعیت کی طرف اشارہ کیا ہے اور لمن حارب اللہ سے اس اجتماعیت کی قیادت کو ظاہر کیا ہے اور ضرار کفر، تفریق اور ارصاد لاکر اس اجتماعیت کے مقاصد بتائے ہیں۔ یہ مردم شماری کے مسلمان جنہوں نے دھوکہ دینے کے لیے مسلمانوں کا لباس پہنا ہوا تھا۔

تنظیم کے اراکین

ان کی تعداد شارحین قرآن نے بارہ بتائی ہے ان کے نام یہ ہیں۔

۱۔ حذام بن خالد
۲۔ معتب بن قشیر
۳۔ ابوحبیبہ ابن الازعر
۴۔ عباد بن عفیف
۵۔ جاریہ ابن عامر
۶۔ مجمع بن جاریہ
۷۔ زید بن جاریہ ابن عامر
۸۔ نبتل بن الحارث
۹۔ بجاد بن عثمان
۱۰۔ بحزج
۱۱۔ ودیعہ ابن ثابت
۱۲۔ ثعلبہ ابن حاطب

حافظ ابن کثیر نے بھی فہرست دی ہے لیکن حافظ ابن حزم نے ثعلبہ ابن حاطب کے متعلق

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تصریحاً لکھا ہے کہ ان کا نام اس فہرست میں شامل کرنا مناسب نہیں ہے وہ بدری ہیں[1]

مولانا عبدالرؤف مرحوم داناپوری نے اس کی تصدیق کی لیکن وہ لکھتے ہیں کہ یہ ثعلبہ بدری نہیں بلکہ دوسرا شخص ہے اصل شخص اور والد کے نام کی یکسانی کے باعث اشتباہ ہوا ثعلبہ ابن حاطب بدری جنگ احد میں شہید ہو گئے تھے[2] لیکن مجھے شہدائے احد کی کسی فہرست میں ثعلبہ کا نام نہیں ملا ہے اس فہرست کا پہلا شخص خذام بن خالد وہ ہے جس نے اپنے گھر سے زمین کا ایک ٹکڑا الگ کر کے مسجد کے لیے دیا گویا مسجد ضرار اس کے گھر کے پاس تھی۔ جاریہ ابن عامر کے دو بیٹے اصل کام میں شریک تھے مگر بعد میں انہوں نے عذر پیش کیا کہ وہ عمر میں چھوٹے تھے اور انہیں کچھ معلوم نہ تھا کیا ہو رہا ہے اور کس غرض سے ہو رہا ہے۔ باپ جو کچھ کرتا رہا ہم بھی حالت نادانی میں اس کے ساتھ شامل رہے یہ عذر تسلیم کر لیا گیا زید ابن جاریہ مسجد ضرار کا امام تھا کیونکہ قرآن اچھا پڑھتا تھا مگر اس کا قصور معاف ہو گیا۔ زید بن جاریہ کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خیبر کے مال میں سے حصہ دیا تھا اور اس نے جنگ صفین میں حضرت علی کا ساتھ دیا تھا۔

تنظیم کے قائد

اس تنظیم کے قائد کے بارے میں آپ پہلے کچھ اشارات پڑھ چکے ہیں یہ شخص قبیلہ خزرج سے تعلق رکھتا تھا۔ اسی کی قیادت میں مسجد ضرار کا منصوبہ تیار کیا گیا تھا۔ بہ ظہور اسلام سے پیشتر ہی عیسائی ہو چکا تھا جب حضور اقدس مدینہ تشریف لائے تو کلمہ اسلام کا عروج اس پر شاق گذرا اور اسلام کے خلاف سازشوں میں سرگرم ہو گیا۔ پہلے قریش مکہ کا ساتھ دیا پھر شہنشاہ روم کے پاس پہنچا اور اسے مسلمانوں پر حملے کی ترغیب دی قبا کے کچھ منافقین میں اور اس میں پرانی راہ و رسم تھی۔ یہ انہیں اسلام کے خلاف اکساتا رہتا اور رومیوں کے حملے کا یقین دلاتا آیت میں من حارب اللہ و رسولہ سے اس گروہ کا یہی قائد مراد ہے۔

تنظیم کے مقاصد

آیئے اب اس منافقانہ تنظیم کے مقاصد جو قرآن نے اس آیت میں بتائے ہیں وہ بھی پڑھ لیجیے۔

---

[1] جوامع السیرۃ
[2] اصح السیر

اس تنظیم کے پیش نظر مسجد بنانے سے یہ مقاصد تھے۔
اضرار۔ یہ باب مفاعلت کا مصدر ہے اس کے معنی نقصان پہنچانے کے ہیں علامہ آلوسی لکھتے ہیں
والضرار طلب الضرر ومحادۃ اللہ یعنی اسلام کے مقاصد اور مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے یہ مطلب
یہ ہے کہ ان کا مقصد مسجد بنانے سے قبا کے مسلمانوں کو نقصان پہنچانا ہے کیونکہ مسجد قبا کی وجہ سے
مسلمانوں کو ایک خاص عزت حاصل ہو گئی ہے۔ یہ حسد وعناد سے چاہتے ہیں، کہ ان کی یہ خصوصیت باقی نہ
رہے۔ یہاں ضرار کا متعلق محذوف یعنی ضرارا بالمسجد اور مسجد کا خود ضرار مقصود نہیں بلکہ مسجد والوں کا
ضرار مراد ہے اس سے بطور عبارۃ النص یہ بات تو واضح طور پر معلوم ہو رہی ہے کہ مسلمانوں کو نقصان پہنچانا
حرام ہے۔ چاہے اس مکروہ عزم پر ریاء منافقت کا پردہ اس خوش اسلوبی سے تانا گیا ہو کہ کسی کو اول
نظر میں اصل معاملے کی تحقیق و تفتیش کا خیال ہی نہ آئے اور اشارۃ النص سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی
ہے کہ مسجد کے قرب وجوار میں کمہار کی بھٹی کا ہونا، نائی کے حمام کا ہونا، گندم کا بیدر ہونا اور سنار
وغیرہ ہونا بھی ناجائز ہے کیونکہ یہ بھی مسلمانوں کو نقصان پہنچانے کے مترادف ہے مولانا آزاد رحمہ اللہ
نے یہاں یہ بات خوب لکھی ہے کہ قریب اگر مسجد موجود ہو تو بلا ضرورت دوسری مسجد اس کے قریب محض
پہلی مسجد والوں کو نقصان پہنچانے کے لیے تعمیر کرنا ناجائز ہے اس سے مسلمانوں کی اجتماعیت کو نقصان پہنچا
ہے۔ یہی وجہ ہے کہ تمام ائمہ اعلام کا اس پر اتفاق ہے کہ ہر شہر میں جمعہ کی جماعت ایک ہونی چاہیے
ہاں اگر آبادی اتنی زیادہ ہو جائے کہ ایک جگہ کافی نہ ہو تو بقدر ضرورت ایک سے زیادہ مساجد میں
جمعہ قائم کیا جا سکتا ہے۔

۲۔ کفر یہ منافقین کی تعمیر مسجد کا دوسرا مقصد یہ ہے کفر کے مقاصد کے پورے ہوں یعنی اپنی ایک
الگ مسجد بنائی جائے گی تو مسجد قبا میں جانے کی ضرورت باقی نہ رہے گی اور اس طرح نماز چھوڑنے
کا موقع مل جائے گا کیونکہ لوگ سمجھیں گے کہ انہوں نے اپنی مسجد میں نماز پڑھ لی ہے۔ اس سے معلوم
ہوا کہ ترک صلاۃ کی حالت بھی ایک ایسی حالت ہے جسے قرآن کفر کی حالت سے تعبیر کرتا ہے نیز
معلوم ہوا کہ نیک کاموں کا نیک ہونا مقصد و نیت پر موقوف ہے ورنہ مسجد بنانے جیسا نیک کام بھی کفر
کے لیے ہو سکتا ہے۔

ایک معنی شارحین قرآن نے یہ بھی بتائے ہیں کہ ان کے اس عمل کے منشا کفر کو طاقت ور بنانا ہے
یعنی خود مسجد کو بنانا تو کفر نہیں ہے لیکن ان کا یہ کردار اپنے اندرونی کفر کو طاقتور بنانے کے لیے۔
بہر حال خود کفر ہو یا کفر کو طاقتور بنانا ہو حاصل دونوں کا ایک ہے اور قرطبی نے علامہ ابن العربی سے

نقل کیا ہے کہ چونکہ ان کے ذہن میں اس کردار سے مسجد قبا اور مسجد نبوی کا کوئی احترام باقی نہیں رہا تھا۔ اس لیے وہ اس اعتقاد کی وجہ سے راہ کفر اختیار کر رہی ہے۔

۳۔ تفریق بین المومنین مسجد بنانے سے ان کا ایک مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں تفرقہ ڈالا جائے کیونکہ قبا کی تمام آبادی ایک ہی مسجد میں نماز پڑھتی تھی اب بالکل اس کے پاس دوسری مسجد بننے کی تو جماعت بٹ جائے گی کچھ لوگ پہلی مسجد میں جائیں گے اور کچھ نئی میں اور جب ایک جماعت نہ رہی تو مسلمانوں کے باہمی اجتماع و تعارف کا وہ مقصد بھی فوت ہو گیا جو قیام جماعت کے ایک اہم مقاصد میں سے ہے۔ قرطبی نے یہاں یہ لطیف نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ یہ اس بات کی واضح اور صاف دلیل ہے کہ مساجد میں اجتماع سے بلند ترین مقصد دلوں میں ہم آہنگی اور طاعت پر اتحاد ہے اس سے دلوں میں محبت ہو گی۔

اس آیت سے امام مالک نے یہ بات خوب سمجھی ہے کہ ایک مسجد میں دو اماموں کی اقتدا میں دو جماعتیں الگ الگ نہ کی جائیں۔ اگرچہ دوسرے علما کو امام مالک کے اس نقطہ نظر سے اتفاق نہیں ہے۔

علامہ بقاعی نے تفریق بین المومنین کا یہ مطلب بتایا ہے کہ وہ یہ مسجد تعمیر کر کے مسلمانوں کی اجتماعیت کے خلاف سازشیں کر رہے ہیں اور دھوکہ سے مسلمانوں کو اصل مسجد سے ہٹا رہے ہیں یہی مسلمانوں میں تفریق ڈالنا ہے۔

۴۔ اللہ و رسول سے محاربہ کے لیے کمین گاہ بنانا اس مسجد کی تعمیر کا بنیادی مقصد ہے۔ ان منافقین کے متعلق یہ بات پہلے واضح ہو چکی ہے کہ ان کی تمام ہمدردیاں اسلام سے برسر پیکار طاقتوں کے ساتھ تھیں یہ رات دن ان ہی کی کامیابی کے متمنی رہے اور مسلمانوں کے اندر ان کے ہی ایجنٹ کی حیثیت سے کام کرتے تھے اس مرحلے میں آکر انھوں نے یہ سوچا کہ مسجد کے نام سے ایک اڈا بھی بنایا جائے تاکہ ان کی معاندانہ سرگرمیوں پہ پردہ بھی پڑا رہے اور اس پردے میں وہ مسلمانوں کے عین مرکز میں بیٹھ کر اسلام کے دشمنوں کے لیے ایک کمین گاہ بھی فراہم کر دیں۔

بہرحال مسجد کی تعمیر انھوں نے ان گھناؤنے اور گندے مقاصد کے لیے کی تھی اس سے یہ بات پوری وضاحت سے سامنے آئی ہے کہ کام خواہ کتنا ہی اچھا ہو اور خواہ وہ کتنی بڑی نیکی ہو اگر اسے برے مقاصد کے لیے کیا جائے تو وہ نیکی نیکی نہیں برائی بن جاتی ہے اور اس کا استیصال اسلامی حکومت کے فرائض میں داخل ہے کیونکہ نیک اعمال کے نیک ہونے کا مدار نیت پر ہے۔ اگر نیت اور مقصد غلط ہے تو وہ نیکی خود نیکی نہیں رہے گی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں اسی کی طرف

رہنمائی ہے۔

ابوبکر الجصاص نے یہیں سے یہ نکتہ نکالا ہے کہ کام پر اچھے اور برے ہونے کا حکم کام کے مقصد اور کام کرنے والے کے ارادے کے لحاظ سے لگایا جائے اور علامہ قرطبی نے بھی الجصاص کی یہ کہہ کر ہمنوائی کی ہے الاعمال مختلف بالمقصود والارادات۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد کے ذریعے بھی یہی رہنمائی فرمائی ہے۔

انما الاعمال بالنیات و لکل امری مانوی

اعمال کا دارومدار مقاصد پر ہے۔ ہر آدمی کے عمل کا مقصد سے تعلق ہے۔

اس حدیث کی تشریح کرتے ہوئے شارحین حدیث کام میں نیت ہونے یا نہ ہونے کی بحث میں الجھ کر رہ گئے یعنی کام میں نیت ہو تو عمل ہے اور نیت نہ ہو تو عمل نہیں ہے۔ شارحین حدیث میں علامہ طیبی کی ژرف نگاہی نے اس الجھاؤ کو یہ کہہ کر ختم کیا۔

"میری رائے یہ ہے واقعی علم تو اللہ ہی کو ہے حدیث میں الاعمال اور النیات دونوں پر لام استغراق ہے۔"

اس لیے حدیث میں عمل کی ہر نوع ہر جنس اور ہر قسم مراد ہے دراصل ارشاد نبوت کے ذریعے جو بات امت کو بتائی جارہی ہے وہ یہ نہیں ہے کہ نیت ہو تو عمل ہوتا ہے نیت نہ ہو تو عمل نہیں ہوتا۔ یہ تو عمل کی خود لغوی حقیقت ہے اور معلوم ہے کہ نبوت کی ذات گرامی مدلولات لغوی بتانے نہیں آئی ہے بلکہ شرعی حقائق سمجھانے کے لیے آئی ہے۔ اور پھر از روئے بلاغت ان معنی کے ساتھ بات بے جان ہو کر رہ جاتی ہے۔ یہاں جملہ کی پیشانی پر انما لگا ہوا ہے جس کا کام ہی یہ ہے کہ خطأ و صواب اور درست و نادرست اگر ملے جلے ہوں تو ان کو نکھار دے۔ اگر عمل میں ارادہ و نیت خود لغوی حقیقت ہے تو پھر انما کا استعمال بے معنی ہے یہ تو ایک زبان دان سے توقع نہیں ہو سکتی من کان عارفا باللغۃ لا یخطئی فی استعمال اللغۃ اور معاذ اللہ ثم معاذ اللہ حضور اقدس کی ذات گرامی۔

حافظ ابن رجب حنبلی فرماتے ہیں کہ انما لکل امری مانوی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حکم شرعی بتارہے ہیں یعنی یہ کہ عامل کا اپنے عمل میں نیت ایک مستقل حصہ ہے اگر نیت اچھی ہو تو عمل صالح ہے اور اللہ کے یہاں مقبول ہے اور اگر نیت بد ہو تو عمل عمل فاسد ہے اور مقبول ہونے کی جگہ خود وبال جان اور سامان عذاب ہے۔ اس لیے نہ تو بے نیت عمل سے بحث ارشاد نبوت کا

منشا ہے اور نہ ہی عبادات میں شرط بتانا اس کا مقصود ہے۔ بلکہ منشا رنبوت صرف یہ بتانا ہے کہ عمل صالح کے اچھا اور بُرا ہونے کا اصلی معیار مالوی ہے۔ اگر کام سے مقصود رضائے الٰہی ہے تو عمل عمل صالح ہے اور اگر غرض فاسد ہے تو عمل عمل صالح نہیں ہے۔ پیش نظر آیت میں مسجد کی تعمیر سے مقصود اگر اللہ کی رضا ہوتی تو یہ مسجد بیانہ تقویٰ ہوتی۔ چونکہ بنانے والوں کی نیت مقصد اور غرض مسجد کی تعمیر سے ضرار، تفریق بین المومنین ارصاد لمن حارب اللہ ورسولہ تھا اس لیے مسجد نیک کام ہونے کے باوجود نیت اور غرض فاسد کی وجہ سے عمل فاسد ہو کر رہ گئی اور اس غرض فاسد کی وجہ سے نبوت نے اس مسجد کو مسمار کرنے کا حکم دیا۔

ارشاد نبوت کی اسی معنویت کی وجہ سے حضرت امام بخاریؒ الجامع الصحیح کے آغاز میں لے کر آئے ہیں اور اپنے مخاطبوں کے ذہن میں یہ بات اتارنا چاہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے جو فرائض، جو اوامر اور جو نواہی لے کر آئے وہ اعمال کے مظاہر ہیں۔ مظاہر کا کوئی مقام نہیں اور اللہ کے یہاں مقبول نہیں جب اعمال کے مظاہر درست ہونے کے ساتھ ان کے مصادر بھی درست نہ ہوں مصادر کی درستگی یہ ہے کہ رضائے الٰہی کے لیے ہوں اور مظاہر کی درستگی یہ ہے کہ نبوت کی رہنمائی اور اس کے پیش کردہ نمونہ کے مطابق ہوں مصادر کا کھوٹ اگر نفاق کہلاتا ہے تو مظاہر کی تبدیلی بدعت کہلاتی ہے۔ بہرحال قرآن کی آیت کا مدلول اور ارشاد نبوت کا منطوق دونوں میں ہم آہنگی ہے۔

اس کے بعد اللہ سبحانہ نے ان کے بارے میں یہ انکشاف فرمایا ہے کہ ولیحلفن ان اردنا الا الحسنی یہ مسجد تعمیر کرنے والے آپ کو قسمیں کھا کر بتائیں گے کہ اس کام سے ہماری نیت ہماری غرض اور ہمارا مقصد اس مسجد کی تعمیر سے صرف اچھائی تھی یعنی اس نام نہاد مسجد کی تعمیر سے مقاصد کردہ پیش نظر ہیں جو پہلے واضح کر دیے لیکن یہ منافقین آپ کو قسمیں کھا کر اطمینان دلانے کی کوشش کریں گے کہ یہ کام انہوں نے محض اسلام اور مسلمانوں کی بہبود پیش نظر رکھ کر کیا ہے کہ عبادت کے لیے ایک مسجد کا اضافہ ہو جائے اللہ کی بندگی اور اس کے ذکر کا ایک گھر تعمیر ہو جائے جو مسلمان اندھیری راتوں یا سردی اور بارش میں مسجد قبا کی دوری کے سبب سے جماعت کی حاضری سے محروم رہ جاتے ہیں، ثواب جماعت سے محروم نہ رہیں فرمایا کہ یہ قسمیں کھا کر تمہیں یقین دلائیں گے لیکن اللہ کی گواہی یہ ہے کہ یہ منافق جھوٹے ہیں۔ انہوں نے مسجد کو اپنے ناپاک عزائم اور مکروہ سازشوں کو کامیاب کرنے کے لیے نیکی کا یہ لبادہ اوڑھا ہے۔ ان کی ہی خصوصیت نہیں ہے ہر دور میں اپنے اغراض فاسدہ کو

حاصل کرنے کی خاطر اسی قسم کی ملمع کاری کرتے ہیں مقصد پیش نظر کفر کو پروان چڑھانا ہوتا ہے لیکن زبان پر اسلام قرآن ذات نبوت ہوتی ہے۔ دوسرے پارے میں آپ اسی طبقے کا بھرپور چہرہ دیکھ چکے ہیں اس کے لیے دوسری جلد میں آیت ۲۰۴، ۲۰۵، ۲۰۶ اور ان کے تشریحی نوٹ ۵۸۷، ۵۸۸، ۵۸۹، ۵۹۰ اور ۵۹۱ ضرور پڑھیے۔

مسجد کی بنیاد تقویٰ پر

۱۱۲ اے اللہ کے رسول تم اس مسجد میں کبھی کھڑے نہ ہونا وہ مسجد جس کی بنیاد پہلے دن سے تقویٰ پر رکھی گئی ہے اس کی حقدار ہے کہ آپ اس میں قیام کریں۔ اس میں ایسے لوگ آتے ہیں جو پسند کرتے ہیں پاک وصاف رہنے کو اللہ سبحانہ پاک وصاف رہنے والوں کو پسند کرتا ہے یعنی اس مسجد میں جس کی بنیاد محض ضد کفر نفاق عداوت اسلام اور خدا ورسول کی مخالفت پر رکھی گئی ہے اب کبھی نماز کے لیے کھڑے نہ ہوں۔ آپ کی نماز کے لائق وہ مسجد ہے جس کی بنیاد اول دن سے تقویٰ پرہیزگاری پر قائم ہوئی (خواہ مسجد قبا ہو یا مسجد نبوی) اس کے نمازی گناہوں اور شرارتوں اور ہر قسم کی نجاستوں سے اپنا ظاہر وباطن پاک وصاف رکھنے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اسی لیے خدائے پاک ان کو محبوب رکھتا ہے حدیث میں ہے کہ حضور نے اہل قبا سے دریافت کیا کہ تم طہارت وپاکیزگی کا کیا خاص اہتمام کرتے ہو جو حق تعالیٰ نے تمہاری تطہیر کی مدح فرمائی۔ انہوں نے کہا کہ ہم پانی سے استنجا کرتے ہیں یعنی عام طہارت ظاہری وباطنی کے علاوہ وہ لوگ اس چیز کا معتاد سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آیت میں مسجد قبا کا ذکر ہے لیکن بعض روایات صریح ہیں کہ مسجد اسس علی التقوی سے مسجد نبوی مراد ہے۔ علماء نے اس پر بہت کچھ کلام کیا ہے۔ ہم نے شرح مسلم میں اس کے متعلق اپنا ناقص خیال ظاہر کر دیا ہے اور روایات میں تطبیق دی ہے یہاں اس کے بیان کا موقع نہیں ہے اس آیت میں چند باتیں تشریح طلب ہیں۔

اول یہ کہ مسجد اسس علی التقوی سے کون سی مسجد مراد ہے مسجد قبا یا مسجد نبوی۔ قرآن کا سیاق اور واقعہ کی روداد تو یہی بتا رہی ہے کہ مسجد قبا مراد ہے کیونکہ مسجد قبا ہی کے مقابلے میں قبا میں ابوعامر نے اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کی خاطر مسجد تعمیر کی تھی۔ اسی مسجد سے مسلمانوں کو دور رکھنے کے لیے منافقین نے

لہ افادات شیخ الاسلام

یہ بہانہ سازی کی تھی کہ بارش وغیرہ کے دنوں میں یہاں آتے ہوئے تکلیف ہوتی ہے۔ مسجد قبا ہی میں نماز کو عمرے کے برابر بتایا گیا ہے یہی عبداللہ بن عباس، امام ضحاک اور الحسن کی رائے ہے۔ امام شعبی اور امام بخاری کا یہی مختار ہے۔ یہی بات من اول یوم کے مطابق ہے۔ ہجرت کے موقعہ پر پہلا روز تشریف آوری کا قبا ہی میں ہے۔ ارباب تاریخ وسیر نے اس موقعہ پر قبا میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے قیام کی مدت صرف چار روز بتائی ہے۔ آپ دوشنبہ کو بعد دوپہر پہنچے تھے۔ ۸ ربیع الاول سہ شنبہ چہار شنبہ اور پنجشنبہ گذار کر جمعہ ۱۲ ربیع الاول مطابق ۲۴ ستمبر ۶۲۲ء کو وہاں سے روانہ ہو گئے صحیح بخاری میں قیام کی مدت اس روز سے کچھ زیادہ بتائی گئی ہے (بضع عشرۃ لیلۃ) چونکہ اس روایت کے مطابق بھی روانگی جمعہ کے دن ہوئی اس لیے کل مدت بارہ روز تھی۔ دوران قیام قبا میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے سب سے پہلے مسجد کی تعمیر کا انتظام فرمایا۔ تکمیل ہجرت کے بعد یہ پہلی مسجد تھی جس کی بنیاد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دست مبارک سے رکھی۔ اس مسجد کی عمارت بالکل سادہ تھی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس اس میں شریک رہے ۱۲ ربیع الاول کو بروز جمعہ آپ دوپہر سے پہلے قبا سے روانہ ہوئے۔

تاریخ اسلام میں پہلا جمعہ

بنی سالم بن عوف کے محلہ میں پہنچے تو نماز کا وقت ہو گیا تھا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی جگہ جمعہ کی نماز پڑھی۔ اس موقعہ پر آپ نے خطبہ دیا۔

حمد وستائش صرف خدا کے لیے ہے میں اسی کی حمد کرتا ہوں اسی سے مدد مانگتا ہوں، اسی سے بخشش اور ہدایت کا طلبگار ہوں میرا ایمان اسی پر ہے میں اس کی نافرمانی نہیں کرتا۔ اس کی نافرمانی کرنے والوں سے میری عداوت ہے میں گواہی دیتا ہوں کہ اس کے سوا عبادت کے کوئی لائق نہیں ہے وہ یگانہ ہے اس کا کوئی شریک نہیں ہے محمد اس کا بندہ اور رسول ہے۔ اللہ نے محمد کو ہدایت اور نور وموعظت دے کر روانہ کیا ہے اور ایسے وقت میں روانہ کیا ہے جب کہ مدتوں سے کوئی رسول دنیا میں نہیں آیا ہے، علم میں کمی سے گمراہی بڑھ گئی ہے اسے آخری زمانے میں قیامت کے قریب اور اجل موعود کے نزدیک روانہ کیا ہے جس نے اللہ ورسول کی اطاعت کی وہی کامیاب ہے اور جس نے ان کی نافرمانی کی وہ راستہ سے بھٹکا ہوا ہے بیں تمہیں

اللہ سے ڈر کی وصیت کرتا ہوں۔ بہترین نصیحت جو ایک مسلمان دوسرے مسلمان کو کر سکتا ہے یہی ہے کہ اسے آخرت کی زندگی کی ترغیب دے اور اللہ سے ڈرنے کو بتائے لوگو! جن باتوں سے خدا نے دور رہنے کا حکم دیا ہے ان سے بچو نہ اس سے بڑھ کر کوئی نصیحت ہے اور نہ اس سے بڑھ کر کوئی ذکر ہے آخرت والے کاموں میں جس کا دل اللہ کے خوف سے معمور ہو تقوی اس کے لیے بہترین مددگار ہے۔ اور جب کوئی شخص خلوص نیت سے خدا اور اپنے درمیان معاملات کو درست کرے گا معاملات کھلے ہوں یا پوشیدہ تو ایسا کرنا اس کے لیے ذخیرے کا کام دے گا جو انسان کو اس وقت کام دے گا جب اسے اعمال کی ضرورت پیش آئے گی اپنا اپنا کام کرو اللہ کے حقوق میں فروگذاشت نہ ہونے دو اس نے تمہیں اپنی کتاب سکھائی ہے، اپنا راستہ بتایا ہے تاکہ سچے اور جھوٹوں میں امتیاز ہو جائے۔ تم بھی اللہ سے اپنے اعمال میں حسن کاربنکر رہو جیسے اس نے تمہارے ساتھ حسن کاری کی ہے۔ سب کچھ اللہ کی مدد سے ہو۔ اللہ کو بہت یاد کرو۔"

یہ ہے بنی عمرو بن عوف میں جمعہ کا خطبہ ۔ نماز جمعہ سے فراغت ہوئی تو آپ مدینہ طیبہ کی طرف روانہ ہوئے۔

اگرچہ کچھ لوگوں نے صحیح مسلم کی حدیث کی وجہ سے لمسجد اسس علی التقوی کا مصداق مسجد نبوی کو قرار دیا ہے۔ حدیث یہ ہے کہ

"دو شخصوں کا اس موضوع پر اختلاف ہو گیا کہ وہ مسجد کونسی ہے جو اسس علی التقوی کا مصداق ہے ایک نے کہا قبا کی مسجد ہے دوسرا بولا کہ مسجد نبوی ہے۔ دونوں خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور آپ سے دریافت کیا حضور نے فرمایا کہ وہ مسجد میری ہے۔"

روایت سہل بن سعد الساعدی کے حوالہ سے آئی ہے۔ اسی قسم کی روایت سعید بن ابی سعید الخدری سے متعدد طرق سے آئی ہے۔ اس لیے کچھ بزرگوں نے مسجد نبوی کو اس کا مصداق بتایا ہے لیکن میری ناقص رائے میں دونوں میں تضاد نہیں ہے۔ واقعی اور اصلی مصداق تو مسجد قبا ہی ہے وجود کے لحاظ سے اولیت اسی کو حاصل ہے قرآن کا سیاق و لحاق اسی کے موافق ہے انہ الاوفق بالسیاق واللحاق اور جیسا کہ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے والسیاق انما ھو فی مسجد قبا ارشاد نبوت

کا مطلب یہ نہیں ہے کہ آیت کا مصداق مسجد قبا نہیں بلکہ میری یہ مسجد ہے ۔ منشاء نبوت یہ ہے کہ سائل کے ذہن میں پیدا شدہ خیال کا جواب دیا ہے پوچھنے والے کا ذہن یہ تھا کہ تاسس علی التقوی کی صفت صرف مسجد قبا سے مخصوص ہے۔ حضور نے اسی ذہن کو پڑھ کر جواب دیا ہے کہ میری مسجد بھی اس صفت سے موصوف ہے یہ صرف قبا ہی کی صفت نہیں ہے۔ الشریف السمہودی اور ابوالقاسم سہیلی کا یہی موقف ہے اگرچہ علامہ آلوسی کو الفاظ روایت میں اس کی ہمنوائی نہ ہونے کی شکایت ہے۔ مگر ہمنوائی نہ ہونے کی شکایت کا وزن اس وقت ممکن ہے جب کہ حدیث میں روایت بالفظ ہو۔ احادیث کا بیشتر ذخیرہ روایت بالمعنے ہے۔

اسلام میں سنہ ہجری کا آغاز

اسلام کے ظہور سے پہلے دنیا کی متمدن قوموں میں متعدد سنہ جاری تھے۔ زیادہ مشہور یہودی، رومی اور ایرانی سنہ تھے عرب جاہلیت کی زندگی اس قدر متمدن نہیں تھی کہ حساب و کتاب کی کسی وسیع پیمانے کی ضرورت ہوتی۔ اوقات شناسی اور موسموں کی حفاظت کے لیے ملک کا کوئی مشہور واقعہ لے لیتے۔ اس سے وقت کا حساب لگا لیتے جیسا کہ عام الفیل ہے یعنی شاہ حبشہ کے عرب پر حملہ کرنے کا سال عرصہ تک یہی واقعہ عرب کے حساب و کتاب میں بطور سنہ کے استعمال ہوتا رہا ظہور اسلام کے بعد سے صحابہ کی عام عادت یہ ہو گئی تھی کہ زمانہ اسلام کے واقعات میں سے کوئی اہم واقعہ لے لیتے اور اسی سے حساب لگاتے کچھ عرصہ تک اجازت قتال کا سنہ استعمال ہوتا رہا لوگ اسے سنہ اذن بولتے۔ اسی طرح سورہ برارت کے نزول کے بعد بول چال میں سنہ برات کا بھی رواج رہا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے آخری حج سے سنۃ الوداع بولا جانے لگا بعض روایات سے اس طرح کے متعدد سنوں کا پتہ چلتا ہے مثلاً سنۃ التمحیص، سنۃ الترفئہ، سنۃ الزلزال، سنۃ الاستیناس۔ بیرونی نے الآثار الباقیہ میں اس طرح کے متعدد سنوں کا ذکر کیا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وصال مبارک کے بعد کچھ عرصے تک یہی حالت جاری رہی حضرت عمر کی خلافت کا زمانہ آیا تو دفاتر حکومت کے قیام سے حساب و کتاب کے معاملات زیادہ وسیع ہو گئے اور ضرورت پیش آئی کہ سرکاری طور پر ایک قومی سنہ مقرر کیا جائے چنانچہ اس معاملے پر غور کیا گیا اور سنہ ہجری کا تقرر عمل میں آیا۔ اس وقت تک واقعہ ہجرت کے سولہ سال گذر چکے تھے۔ سنہ ہجری کا تقرر عمل میں آیا تو کیوں حضرت عمر اور تمام صحابہ کرام کا ذہن اس طرف گیا کہ

اسلامی سنہ کی ابتدا واقعہ ہجرت سے کی جائے یہ تاریخ اسلام کی ایک ضروری اور نتیجہ خیز بحث ہے۔ اس پر دسویں جلد سورہ برات کے تشریحی نوٹ نمبر ۴۲ میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں۔ تکرار سے بچتے ہوئے یہ بتانا چاہتا ہوں کہ ان کا یہ فیصلہ کہ سال کا آغاز ہجرت سے کیا جائے کیوں ہوا۔

اصل یہ ہے کہ نبوت کی تعلیم و تربیت نے صحابہ کرام کا ذہن جس سانچے ڈھال دیا تھا وہ ایسا سانچہ تھا جس میں قرآن وسنۃ سے ہٹ کر دوسرے درجہ کا خیال ہی نہ آسکتا تھا۔ بہت ممکن ہے دنیا کے تمدنی علوم وفنون رائج نہ ہونے کی وجہ سے وہ کوئی بات علمی طریقوں اور مصطلح زبان میں ادا نہ کر سکتے ہوں۔ یہ بھی ممکن ہے کہ بعض اوقات وہ ایک بات کی علت اس شکل وصورت میں نہ دیکھتے ہوں جس صورت میں آج دنیا دیکھ رہی ہے لیکن ان کی طبیعت کی افتاد اور ذہنیت کی روش کچھ اس طرح بن گئی تھی کہ جب کسی معاملہ پر سوچ وبچار کرتے تو ارادی اور غیر ارادی طور پر ذہن اسی طرف جاتا جو قرآن کے روح سے موافقت رکھتا اور جو علم وحکمت کے لیے بہتر سے بہتر اور بلند سے بلند پہلو ہو سکتا ہے۔ ہجرت سے سال مقرر کرنے میں بھی ان کا فیصلہ قرآن کی روح کے موافق تھا۔ حافظ ابوالقاسم السہیلی نے الروض الانف میں جو بات لکھی ہے اور جسے علامہ خفاجی نے عنایۃ القاضی میں نقل کیا ہے وہ اس قابل ہے کہ ہدیہ ناظرین کی جائے۔

اس آیت لمسجد اسس علی التقوی من اول یوم میں نقہ یہ ہے کہ ہجرت سے سال کا آغاز کرنے کے موضوع پر صحابہ کرام کے موقف کی صحت واضح اور صاف معلوم ہو رہی ہے جضرت عمر نے صحابہ کرام سے تاریخی سنہ کے بارے میں مشورہ کیا فیصلہ یہ ہوا کہ ہجرت سے تاریخ کا آغاز ہو کیونکہ ہجرت ہی سے اسلام معزز ہوا یہی وہ وقت ہے جس میں حضور اقدس کو ان سے دوچار ہوئے مسجدیں بنائی گئیں اللہ کی پسند کے مطابق اللہ کی عبادت کا نظام قائم ہوا صحابہ کا یہ فیصلہ ظاہر قرآن من اول یوم کے موافق ہے اور ہمیں ان کے بھی فیصلہ سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ان کو یہ رہنمائی ملی ہے کہ سال تاریخ کے تقرر میں روز اول ہی ہے۔ اگر صحابہ نے اسی آیت کی روح کی روشنی میں یہ زریں فیصلہ کیا ہے تو اس پر کوئی حیرانی کی بات نہیں وہ کتاب اللہ کے سب سے بڑے عالم اور قرآن فہمی میں امت کے رہنما ہیں اور اگر انہوں نے یہ فیصلہ رائے سے کیا ہے تو یہ اللہ کا انعام ہے کہ ان کے اجتہاد کا رخ اللہ سبحانہ نے قرآن کی طرف کر دیا ہے۔ جب بھی کوئی

کہے گا غلطۃ اول یوم تو اس سے ہر سمجھ دار کا ذہن مقرر سال مقرر ماہ اور مقرر تاریخ کی طرف جائے گا۔"

غرض فاسد پر مبنی عمل کی تمثیل

۱۰۹ کیا وہ شخص بہتر ہے جس نے اپنی عمارت کی بنیاد اللہ کے ڈر اور اس کی رضا پر رکھی ہو یا وہ شخص بہتر ہے جس نے عمارت کی بنیاد ایک کھائی کے گرے ہوئے کنارے پر رکھی ہو۔ اس کے نتیجے میں وہ عمارت کے ساتھ جہنم کی آگ میں گر گیا ہو۔ اور اللہ سبحانہ ان کو راہ حق نہیں دکھاتا جو ظلم کا وطیرہ اپناتے ہیں یعنی جس کام کی بنیاد تقوی یقین واخلاص اور خدا کی رضا جوئی پر ہو وہ نہایت مستحکم اور پائیدار ہوتا ہے برخلاف اس کے کہ جس کام کی بنیاد شک ونفاق اور مکر وخداع پر ہو۔ بودے اور انجام بد کے لحاظ سے ایسا ہے جیسے کوئی عمارت ایک کھائی کے کنارے پر کھڑی کی جائے کہ ذرا زمین سرکی یا پانی کی تھپیڑ کنارے کو لگی۔ ساری عمارت دھڑام سے نیچے آ رہی اور آخر کار دوزخ کے گڑھے میں جا پہنچی۔ اللہ ظالم کو راہ حق نہیں دکھاتا یعنی بظاہر کوئی نیک کام بھی کریں جیسے مسجد بنانا ظلم وناانصافی کی شامت سے بن نہیں پڑتا۔[1]

یہ تمثیل بیان ہوئی ہے ان لوگوں کی جو اپنے عمل کی بنیاد تقوی اور رضائے الہی کی جگہ کسی غرض فاسد پر رکھتے ہیں فرمایا کہ ان کی مثال ایسی کہ ایک شخص اپنی عمارت ایک کھوکھلی گرتی ہوئی گگر پر بنائے جو بالآخر اس کے ساتھ جہنم میں جا گرے۔ ثبات وقرار اور اخروی فوز وفلاح صرف اسی عمل کے حصے میں ہے جو اللہ کے احکام کے مطابق کیا جائے۔

یہ ایک بے نظیر تشبیہ ہے جس سے زیادہ بہتر طریقے پر اس صورت حال کی نقشہ کشی نہیں ہو سکتی۔ اس کی پوری معنویت کے لیے یوں سمجھیے کہ دنیوی زندگی کی وہ ظاہری سطح جس پر مومن و منافق صالح وفاسق غرض تمام انسان کام کرتے ہیں مٹی کی اس تہ کی مانند ہے جس پر دنیا میں ساری عمارتیں بنائی جاتی ہیں۔ یہ اپنے اندر کوئی خوبی نہیں رکھتی بلکہ اس کی خوبی کا دار ومدار اس پر ہے کہ اس کے نیچے ٹھوس زمین موجود ہو اگر کوئی عمارت ایسی ہو جس کے نیچے کی زمین کسی چیز مثلاً دریا کے پانی سے کٹ چکی ہو تو جو ناواقف انسان اس کی ظاہری حالت سے دھوکا کھا کر اس پر مکان بنالے اسے وہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کے مکان سمیت لے بیٹھے گی اور وہ نہ صرف خود ہلاک ہوگا بلکہ اس ناپائیدار بنیاد پر اعتماد کرکے اپنا جو کچھ سرمایہ زندگی وہ اس عمارت میں جمع کرے گا وہ بھی برباد ہوجائے گا۔ بالکل اسی مثال کے مطابق حیات دنیا کی وہ ظاہری سطح بھی جس پر ہم سب اپنے کارنامہ زندگی کی عمارت اٹھاتے ہیں۔ بجائے خود کوئی ثبات و قرار نہیں رکھتی بلکہ اس کی مضبوطی اور پائیداری کا انحصار اس پر ہے کہ اس کے نیچے خدا کا خوف اس کے حضور جوابدہی کا احساس اور اس کی رضا کی اتباع کی ٹھوس چٹان موجود ہو جو نادان آدمی صرف دنیوی زندگی کے ظاہری پہلو پر اعتماد کر لیتا ہے اور دنیا میں خدا سے بے خوف اور اس کی رضا سے بے پروا ہو کر کام کرتا ہے دراصل خود اپنی تعمیر زندگی کے نیچے سے اس کی بنیاد کھوکھلی کرتا ہے اور اس کا آخری انجام اس کے سوا کچھ نہیں ہوتا کہ یہ بے بنیاد سطح جس پر اس نے اپنی عمر کا سرمایہ عمل جمع کیا ہے ایک دن یکایک گر جائے اور اسے اس کے پورے سرمائے سمیت لے بیٹھے۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ جس کام کی ابتداء اللہ کی رضا جوئی اور اخلاص نیت سے کی جائے اسے پائداری نصیب ہوتی ہے اور اس میں برکت ہوتی ہے

امام رازی فرماتے ہیں کہ مجھے پوری کائنات میں اس سے بڑھ کر منافقوں کے حالات پر کوئی مثال نہیں ملی ہے جیسے یہ مومن مخلص اور منافق کے درمیان خط امتیاز واضح کر رہی ہے ایسے ہی مخلص اور منافق کے کردار کا بھی تقابلی مطالعہ پیش کر رہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ قرآن یہ آیت بتا رہی ہے کہ کردار دو ہیں ایک کردار یہ ہے کہ بنانے والے نے عمارت بنائی ہے اس کے پیش نظر اللہ سبحانہ کی نافرمانی سے بچنا اور اللہ سبحانہ کی خوشنودی حاصل کرنا ہے۔ اس نے عمارت صرف اس لیے بنائی ہے کہ کفر کی بیخ کنی ہو اور اللہ راضی ہو۔

دوسرا کردار یہ ہے کہ عمارت بنائی ہے مگر عمارت کی بنیاد سرتاسر فساد پر ہے اس نے گہرے گڑھے کے بالکل کمزور کنارے پر عمارت کی بنیاد رکھی یعنی اس کی نسبت میں نفاق و معصیت ہے۔ ظاہر ہے کہ پہلے شخص کی عمارت اچھی اور افضل ہوگی اور دوسرے کی عمارت کمزور، بودی اور گر جانے والی ہوگی۔ یہی حال مومن و منافق کے کردار کا ہے چونکہ مومن کا مسجد کے بنانے میں کردار خلوص پر مبنی ہے اس لیے افضل اور مقبول اور منافق کا مسجد بنانے میں کردار نفاق پر مبنی ہے گویا وہ دوزخ کے گڑھے کے کنارے پر بنائی گئی ہے۔

حاصل یہ ہے کہ دو عمارتیں ہیں ایک کی بنیاد تقوی و رضائے الہی پر ہے اور دوسری کی معصیت و کفر پر پہلی معزز ہے اور باقی رکھنے کے قابل دوسری ذلیل اور گرا دینے کے لائق۔

یہاں علامہ خفاجی نے ایک لطیف نکتہ بلاغت پیش کیا ہے فرماتے ہیں کہ آیت میں اصلی تقابل یوں ہونا چاہیے تھا۔ افمن اسس بنیانہ علی تقوی من اللہ و رضوان ام من اسس بنیانہ علی الباطل لیکن اس انداز کو چھوڑ کر وہ انداز اختیار کیا ہے جو آپ قرآن میں پڑھ رہے ہیں وجہ اس کی یہ ہے کہ باطل کو ناپائیداری میں شفا جرف سے بطور استعارہ تشبیہ دی ہے۔ اور مسجد کی بنیاد کے لیے تقوی کنایہ ہے۔ اس طرح مومن کے کردار کے لیے کنایہ اور منافق کے کردار کے استعارہ لاکر حق بلاغت ادا کر دیا۔

اس آیت سے سرسری نہ گذر جائیے یہ آیت حق و باطل کی آویزش کے موضوع پر مہات معارف میں سے ہے۔ علامہ مراغی لکھتے ہیں کہ ایمان اور اس کے لوازم میں ثبات و جماؤ ہوتا ہے جب کہ نفاق اور اس کے لوازم میں بے ثباتی اور ناپائیداری ہوتی ہے، ایمان حق ہے اور اپنے وجود کے لحاظ سے انسانیت کے لیے مفید اور نافع ہے جب کہ نفاق باطل ہے اور اپنے مفاسد کی وجہ سے معاشرے کے لیے ضرر رساں ہے قانون اجتماع کی رو سے نافع کو بقا ہے جب کو فاسد کو فنا ہے مسئلہ کتنا دقیق ہے لیکن قرآن نے اجتماعیات کے اس دقیق مسئلہ کو کیسے عامہ الورود مثال سے مخاطبوں کے ذہنوں کو جھنجھوڑا ہے فرمایا جب عمارت بنتی ہے اور رہنے والوں کے لیئے قیام اور آسائش کا سامان ہونے لگتا ہے تو تم دیکھتے ہو کہ ہر عمارت بنانے والا عمارت کے سخت زمین تلاش کرتا ہے اور سخت زمین میں گہری بنیاد کھود کر اس کو مضبوط بناتا ہے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا شخص جو بغیر بنیاد کے نہر کے گرے ہوئے کنارے پر مکان تعمیر کرتا ہے۔ پہلا مکان قائم رہتا ہے دوسرا مکان ہوا کے جھونکے سے گر جاتا ہے۔ ایسا کیوں ہوتا ہے؟ اس لیے کہ یہاں پائیداری کو بقا ہے ناپائیداری کو فنا ہے، جن کی نظریاتی اساس مضبوط نہیں ہوتی ہے محض وقتی طور پر جوش و ولولہ سے اجتماعی زندگی کا گھروندا بناتے ہیں وہ اس کے لائق ہے اور جن کی نظریاتی اساس مضبوط ہوتی ہے۔ اور اعمال و اخلاق صالحہ کی دیواریں کھڑی ہوتی ہیں تو یہ قائم رہتی ہے۔ اس سے لوگوں کا نفع ہوتا ہے۔

نفاق کا دائمی اثر

سے جو عمارت انہوں نے بنائی ہے وہ ان کے دلوں میں ہمیشہ شکوک و شبہات کی آبیاری کرتی رہے گی۔ مگر یہ ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے ہو جائیں اور اللہ سب کچھ جاننے والا حکمت

والا ہے ریبہ کا ترجمہ کیا ہے شبہ جس سے مراد نفاق ہے یعنی اس عمل بد کا اثر یہ ہوا کہ ہمیشہ ان کے دلوں میں جب تک موت انہیں پارہ پارہ نہ کر ڈالے نفاق قائم رہے گا جیسے اس سورت میں پہلے گذر چکا ہے۔

فاعقبھم نفاقا فی قلوبھم الی یوم یلقونہ بما اخلفوا اللہ ما وعدوہ وبما کانوا یکذبون۔

بعد ازیں ان کے دلوں میں اس کے نتیجے میں نفاق دائمی ہو گیا اس دن تک کے لیے کہ وہ اللہ سے ملیں کیونکہ انہوں نے اللہ سے وعدہ کی خلاف ورزی کی اور کیونکہ ان کا کام جھوٹ بولنا تھا۔

بعض مترجمین نے ریبہ کا ترجمہ کھٹکا کیے ہیں یعنی جو عمارت انہوں نے ناپاک مقاصد کے لیے بنائی تھی مگر حق تعالیٰ نے اپنے پیغمبر کو مطلع کر کے ان تمام پلید مقاصد کا خاتمہ کر دیا اس کا خیال ان کے دلوں میں ہمیشہ کانٹا سا کھٹکتا رہے گا۔ الراجح عند السلف الاول کما حکی ابن کثیر[1]

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن کا کچھ اختلاف ہے۔

ایک تشریح تو وہ ہے جو مولانا عثمانی نے پیش کی ہے یہ حضرت عبداللہ بن عباس کی پیش کردہ تفسیر ہے یعنی وہ مسجد ضرار جو انہوں نے بنائی ہے مرنے دم تک ان کے دلوں کو نفاق کی آماجگاہ بنائے رکھے گی اور ان کے دلوں سے نفاق دور نہ ہو گا بغیر موت کے۔ قاضی بیضاوی نے اسی کو اپنایا ہے وہ فرماتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ ان کی یہ بنائی ہوئی عمارت ہمیشہ ان میں شکوک و شبہات کا سبب اور نفاق میں اضافہ ہی کرتی رہے گی۔

اس تشریح کا منشا یہ ہے کہ یہ نام نہاد مسجد بنا کر ان منافقین نے اپنے دلوں کے اندر نفاق کی جڑ اتنی مستحکم کر دی ہے کہ اب یہ ان کے دلوں کے ساتھ ہے ان کا نفاق اس طرح ایک ایک رگ میں جڑ پکڑ چکا ہے اب اس کو اکھاڑنا دلوں کے پاش پاش کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔

دوسری تشریح یہ کی گئی ہے کہ جو عمارت انہوں نے بنائی ہے اس کا خیال ان کے دلوں میں ہمیشہ کانٹے کی طرح کھٹکتا رہے گا۔ یہ تفسیر بھی کچھ شارحین قرآن نے اختیار کی ہے۔ اردو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شارحین ہیں مولانا اشرف علی، مولانا ابوالکلام آزاد، مفتی محمد شفیع صاحب لیجئے ہر ایک کی زبانی سن لیجئے۔

مولانا تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں :

اُن کی یہ عمارت یعنی مسجد جو انہوں نے بنائی ہے ہمیشہ ان کے دلوں میں کانٹا سا کھٹکتی رہے گی کیونکہ جس غرض کیلئے مسجد بنائی وہ پوری نہ ہوئی۔ اور قلعی کھل گئی سو الگ اور پھر اوپر سے منہدم کر دی گئی غرض کوئی ارمان نہ نکلا اس لیے ساری عمر اس کا افسوس اور ارمان باقی رہے گا۔" (بیان القرآن)

مفتی شفیع صاحب نے بھی یہی انداز اختیار کیا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد لکھتے ہیں :

جو عمارت انہوں نے بنائی تھی مسجد ضرار ہمیشہ ان کے دلوں کو شک و شبہ سے مضطرب رکھے گی یہ کانٹا نکلنے والا نہیں ہے مگر یہ کہ ان کے دلوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں کیونکہ یہ ان کے نفاق کی ایک بہت بڑی شرارت تھی جو چلی نہیں اس لیے ہمیشہ ان کی وجہ سے خوف و ہراس کی حالت میں رہیں گے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے اس تشریح کی سدی کی طرف نسبت کی ہے جب کہ حافظ ابن کثیر نے پہلی تشریح کی عبداللہ ابن عباس، مجاہد، قتادہ، زید بن اسلم اسدی، حبیب بن ابی ثابت، ضحاک عبدالرحمن بن زید اور بے شمار علمائے سلف کی طرف کی ہے۔ پہلی تشریح ہی راجح ہے۔ اس کا لب لباب یہ ہے کہ ان منافقین نے مکر و دغا کے اتنے بڑے جرم کا ارتکاب کر کے اپنے دلوں کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ایمان کی صلاحیت سے محروم کر لیا ہے اور بے ایمانی کا روگ اس طرح ان کے دلوں کے ریشے ریشے میں پیوست ہو گیا ہے کہ جب تک ان کے دل باقی ہیں یہ روگ ان میں موجود رہے ۔ اللہ سبحانہ سے کفر کرنے کے لیے جو شخص علانیہ بت خانہ بنائے اس کے دین سے لڑنے کے لیے کھلم کھلا مورچے اور دمدمے تیار کرے اس کی ہدایت تو کسی نہ کسی وقت ممکن ہے کیونکہ اس کے اندر راستبازی اخلاص اور اخلاقی جرات کا وہ جوہر تو بنیادی طور پر محفوظ رہتا ہے جو حق پرستی کے لیے بھی اسی طرح کام آسکتا ہے جس طرح باطل پرستی کے کام آتا ہے۔ لیکن جو بزدل جھوٹا اور مکار انسان کفر کے لیے مسجد بنائے اور خدا کے دین سے لڑنے کے لیے خدا پرستی کا پُر فریب لبادہ اوڑھے اس کی سیرت کو تو نفاق کی دیمک کھا چکی ہوتی ہے اس میں یہ طاقت کہاں رہتی ہے کہ مخلصانہ ایمان کا بوجھ اٹھا سکے۔

دوسرے معنی آیت کے جن بزرگوں نے اختیار کئے یعنی مسجد کی تعمیر کا خیال ان کے دلوں میں کانٹے کی طرح کھٹکتا رہے گا اس تشریح کے لیے معانی و مطالب کی چار صورتیں پیش کی ہیں۔ علامہ آلوسی نے ان چار صورتوں کو نقل کیا ہے اور علامہ خفاجی نے عنایۃ القاضی میں اس کو نمایاں جگہ دی ہے۔

اول صورت یہ ہے کہ مسجد کی تعمیر سے منافقین کو بے پایاں خوشی ہوئی تھی لیکن جب ان کے سامنے مسجد کے گرانے کا حکم ہوا تو ان کو اس سے بے پایاں تکلیف ہوئی اور اس شدت احساس سے ان کی گھٹن اور جلن میں اضافہ ہوا اور حضور اقدس کی نبوت ان کے ذہنوں میں اور مشکوک ہوگئی۔

دوسری صورت یہ ہے کہ جب مسجد کے گرانے کا حکم ہوا تو ان کو یہ خیال ہوا کہ یہ قدم ان کے خلاف اٹھایا گیا ہے اس کے معنے ہیں حضور اقدس سے اعتماد اٹھ گیا اور خوف میں اضافہ ہوگیا اپنا مستقبل اس کو مشکوک نظر آنے لگا کہ ان کو اپنے حال پر چھوڑا جائے گا یا اس کے نتیجے میں ان کو قتل کی سزا ملے گی۔

تیسری صورت یہ ہے کہ وہ اپنے خیال میں مسجد بنانے میں حسن کار رہوں لیکن جب مسجد کے گرانے کا حکم ہوا تو وہ شک و شبہ کا شکار ہو کر رہ گئے کہ پتہ نہیں مسجد کیوں گرائی گئی ہے۔

علامہ آلوسی نے پہلے کو صحیح قرار دیا ہے جب کہ علامہ طیبی دوسرے کو ترجیح دیتے ہیں۔ خلاصہ یہ ہے کہ مسجد کا گرانا ہمیشہ ان کے دلوں کی بے چینی اور ان کے اندرونی اضطراب کا سامان بنا رہے گا۔

إِنَّ
اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُم بِأَنَّ لَهُمُ
الْجَنَّةَ ۚ يُقَاتِلُونَ فِي سَبِيلِ اللَّهِ فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ ۖ وَعْدًا
عَلَيْهِ حَقًّا فِي التَّوْرَاةِ وَالْإِنجِيلِ وَالْقُرْآنِ ۚ وَمَنْ أَوْفَىٰ
بِعَهْدِهِ مِنَ اللَّهِ ۚ فَاسْتَبْشِرُوا بِبَيْعِكُمُ الَّذِي بَايَعْتُم بِهِ ۚ
وَذَٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْعَظِيمُ ﴿١١١﴾

بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں خرید لی ہیں اور ان کے مال بھی۔ اور اس قیمت پر خریدی ہیں کہ ان کے لیے جنّت ہو گی[1] وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں پس وہ قتل بھی کرتے ہیں اور ان کو قتل بھی کیا جاتا ہے۔ یہ اللہ کا وعدہ ہے پکّا اس کے ذمہ ہے تورات و انجیل اور قرآن میں یہ وعدہ ہے[2] اور اللہ سے بڑھ کر اپنا عہد پورا کرنے والا کون ہے؟ لہذا مسلمانو! تم اپنے سودے پر جو تم نے اللہ سے کیا ہے خوشیاں مناؤ اور یاد رکھو یہی بڑی کامیابی ہے[3]

اسلامی زندگی میں ایمان کے تقاضے

ان آیات میں بتایا جا رہا ہے کہ دین کا اسلامی تصور اس راہبانہ طرز فکر کے بالکل منافی ہے جس میں محض عبادات ریاضات اور کشف و مراقبہ سے انسان اپنی شخصی نجات حاصل کرنا چاہتا ہے کیونکہ شخصی نجات کے حصول کا یہ طریقہ انسان کو کائنات خارجی میں تبدیل کرنے کی جدوجہد سے بے نیاز کر دیتا ہے۔ لیکن اسلام انفس و آفاق دونوں کو مرضی الٰہی کے مطابق بدلنا چاہتا ہے کیونکہ ظاہر و باطن کائنات خارجی اور نفس انسانی دونوں ایک ہی اصل کی شاخیں ہیں جنہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جا سکتا اور جب کسی ایک کو دوسرے سے جدا کرنے کی کوشش کی جاتی ہے نتیجہ ہمیشہ مہلک ہوتا ہے۔ انسان کے اخلاقی امراض اس کے نفس اور ماحول کے تعامل سے پیدا ہوتے ہیں نہ کہ ان میں سے کسی ایک سے۔ اس لیے صرف ایک کو چھیڑنے اور دوسرے سے تغافل برتنے سے اسباب مرض کبھی رفع نہیں ہو سکتے۔ جب کبھی انسان عبادات و ریاضات میں مشغول ہو کر خارجی ماحول میں تبدیلی کی ضرورت سے بے خبر ہو جاتا ہے اس کی سوسائٹی میں بد اخلاقی، بدعملی کی وبا پھوٹ پڑتی ہے جس سے بالاخر وہ خود اپنا دامن محفوظ نہیں رکھ سکتا خواہ وہ راہبانہ اتقا اور زاہدانہ پارسائی سے کتنا ہی بلند ہو۔ اسی طرح جب وہ بیرونی دنیا پر نظر جما کر محض خارجی ماحول کی تبدیلی میں معاشرتی امراض کی دوا ڈھونڈتا ہے اور اپنی باطنی اخلاقی زندگی سے غفلت برتتا ہے۔ بدی کی قوتیں بالکل غیر محسوس طور پر اس کے نفس میں پرورش پاتی ہیں۔ بالآخر اپنے زور طاقت کے ساتھ خارج پر حملہ آور ہوتی ہیں۔ یہاں تک اس کی معاشرت اس کی سیاست اور اس کی معیشت کا گوشہ گوشہ ان کے اثرات سے مغلوب ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ اسلام نے صرف عبادات و ریاضات پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ اصلاح نفوس اور تزکیہ قلوب کے ساتھ کل نظام زندگی میں اصلاح کرنے کی کوشش کی ہے اور جب کفار و مشرکین کی جانب سے مخالفت شروع ہوئی تو اسلام نے اجتماعی قوت سے ان کا مقابلہ کیا اور بتا دیا کہ اسلام صرف ایک نظری عقیدہ یا فلسفہ نہیں ہے بلکہ وہ ایک عظیم الشان انقلابی قوت ہے جو اگر ایک طرف باطن میں نفس انسانی کی شرارتوں اور انسانی خواہشات کی بے قیدیوں کا مقابلہ کرتی ہے تو دوسری طرف ظاہر میں اپنی خارجی ماحول اور اپنی معاشرتی سیاسی اور عمرانی زندگی کے امراض و مفسدات سے آمادہ بہ پیکار رہتی ہیں۔

اسلام سے عہد وفاداری

لہ بلاشبہ اللہ نے مومنوں سے ان کی جانیں خرید لی ہیں اور ان کے مال بھی اور اس قیمت پر خریدے ہیں کہ اس کے بدلے میں ان کے لیے جنت ہوگی۔ اس سے زیادہ سودمند تجارت اور عظیم الشان کامیابی کیا ہوگی کہ ہماری حقیر سی جانوں اور فانی اموال کا خداوند قدوس خریدار بنا ہماری جان و مال جو فی الحقیقت اسی کی مملوک ومخلوق ہے محض ادنی ملابست سے ہماری طرف نسبت کر کے "مبیع" قرار دیا جو "عقد بیع" میں مقصود بالذات ہوتی ہے اور جنت جیسے اعلی مقام کو اس کا عقد بیع بتلایا جو مبیع تک پہنچنے کا وسیلہ ہے۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جنت میں وہ نعمتیں ہوں گی جن کو نہ آنکھوں نے دیکھا اور کسی بشر کے قلب پر ان کی کیفیات کا خطور رہوا۔ اب خیال کرو کہ جان و مال جو برائے نام ہمارے کہلاتے ہیں انہیں جنت کا ثمن نہیں بنایا نہ یہ کہ حق تعالی بائع اور ہم مشتری ہوئے تعطف اور نوازش کی حد ہوگئی کہ اس اسی چیز کے (حالانکہ وہ بھی فی الحقیقت اسی کی ہے) معاوضہ میں جنت جیسی لازوال اور قیمتی چیز کو ہمارے لیے مخصوص کر دیا۔ جیسا کہ بالجنہ کی جگہ بان لهم الجنہ فرمانے سے ظاہر ہوتا ہے۔

نیم جان بستاند و صد جان دہد　　انچہ در وہمت بناید آں دہد

پھر یہ نہیں کہ ہمارے جان و مال خرید لیے گئے تو فوراً ہمارے قبضہ سے نکال لیے جائیں۔ صرف اس قدر مطلوب ہے کہ جب موقع پیش آئے جان و مال اللہ سبحانہ کے راستے میں پیش کرنے کے لیے تیار رہیں دینے سے بخل نہ کریں خواہ وہ لیں یا نہ لیں اسی کے پاس چھوڑے رکھیں لہ

اس ارشاد میں حب ایمانی کی حقیقت واضح کی ہے فرمایا جو لوگ اللہ پر ایمان لائے تو ایمان کا معاملہ یوں سمجھو کہ انہوں نے سب کچھ اللہ کے ہاتھ بیچ ڈالا جان بھی اور مال و متاع بھی۔ اب ان کی کوئی چیز ان کی نہیں رہی۔ اللہ اور اس کی سچائی ہوگئی۔

بندگان تو کہ در عشق خداوندانند
دو جہاں را بہ تمنائے تو بفروختہ اند

اور پھر اللہ کی طرف سے اس کے معاوضہ میں کیا ہوا یہ ہوا کہ نعیم ابدی کی کامرانیاں انہیں عطا فرمائیں۔

لہ افادات شیخ الاسلام

یہ گویا خرید و فروخت کا ایک معاملہ تھا جو اللہ سبحانہ اور عشاق حق میں طے پا گیا۔ اب نہ بیچنے والا اپنی متاع واپس لے سکتا ہے نہ خریدنے والا قیمت لوٹائے گا۔

اثامن بالنفس النفیسہ ربہا؟
فلیس لہا فی الخلق کلھم ثمن
اذا ذھبت نفسی بدنیا اصبتہا
فقد ذھبت منی وقد ذھب الثمن

اور چونکہ مقصود اللہ سبحانہ کے لطف و کرم کا اظہار تھا۔ اس لیے معاملہ کو اپنی طرف سے شروع کیا نہ کہ بیچنے والوں کی طرف سے یعنی یہ نہیں کہا کہ مومنوں نے بیچ ڈالی بلکہ کہا کہ اللہ نے مومنوں سے خرید لی۔ گویا معاملہ کے طالب اللہ سبحانہ ہیں حالانکہ وہ ہر طرح کی احتیاج سے منزہ ہیں اور جو متاع اس نے قبول کی وہ بھی اسی کی تھی اور جو کچھ معاوضہ میں بخشا وہ بھی اس کے سوا کس کا ہو سکتا ہے؟[1]

دراصل یہ بیع اس معنے میں نہیں ہے کہ جو چیز انسان کی ہے اللہ سبحانہ اسے خریدنا چاہتا ہے بلکہ اس معاملہ کی صحیح نوعیت یہ ہے کہ جو چیز اللہ سبحانہ کی ہے اور جسے اس نے امانت کے طور پر انسان کے حوالے کیا ہے اور جس میں امین رہنے یا خائن بن جانے کی آزادی اس نے ذمے رکھی ہے اس کے بارے میں وہ انسان سے مطالبہ کرتا ہے کہ برضا و رغبت میری چیز کو میری مان لے اور زندگی بھر اس میں خود مختار مالک کی حیثیت سے نہیں بلکہ امین ہونے کی حیثیت سے تصرف کرنا قبول کرے اور خیانت کی جو آزادی میں نے تجھے دی ہے اس سے خود بخود دست بردار ہو جا اس طرح اگر تو دنیا کی موجودہ زندگی میں اپنی خود مختاری کو میرے ہاتھ فروخت کر دے گا تو میں پھر اس زندگی کے بعد جاودانی زندگی میں اس کی قیمت بصورت جنت ادا کروں گا۔ جو انسان اللہ سبحانہ کے ساتھ بیعت کا یہ معاملہ کرے وہ وفادار مومن ہے اور ایمان اسی بیع کا دوسرا نام۔ اور جو شخص اقرار کرنے کے باوجود ایسا رویہ اختیار کرے جو بیع نہ کرنے کی صورت ہی میں اختیار کیا جا سکتا ہے وہ وفادار نہیں ہے۔

آیت قرآنی میں بیع ایمان کی زندگی میں عہد وفاداری کا دوسرا نام ہے امام الحسن البصری سے حافظ ابن تیمیہ نقل کرتے ہیں کہ

[1] ترجمان قرآن

"ایمان صرف ظاہری ٹیپ ٹاپ اور آرزؤں کا نام نہیں ہے ایمان تو اسے کہتے ہیں جو دل میں سرایت کر جائے اور اعمال اس کی تصدیق کریں"

اسی عہد وفاداری اور التزام طاعت کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں سے بیعت لیتے تھے۔ آیت میں ایمان ہونے اور نہ ہونے کا ذکر نہیں ہے بلکہ ایمان لانے کے بعد اسلام سے وفاداری کرنے اور نہ کرنے کا پیمانہ بتایا جا رہا ہے اور بس۔ قرآن کا سیاق بھی اسی کا مقتضی ہے اس سے پہلے ان لوگوں کا ذکر ہو رہا تھا جن سے غزوہ تبوک کے موقعہ پر ایمان کا تقاضا پورا کرنے کی کوتاہی ہوئی جن کو اپنی غلطی کا شدید احساس ہوا۔ ان کو سمجھایا جا رہا ہے کہ ایمان کے درخت پر پھول اور پھل اس وقت تک نہیں آتے جب تک وفاداری کا بھرپور مظاہرہ نہ ہو۔ کیونکہ انقیاد باطن، التزام طاعت عہد وفاداری یہ وہ اوصاف ہیں جن کے بغیر تصدیق علم ہی کا ایک مرتبہ رہتا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ ایمان صرف تصدیق نہیں ہے بلکہ انقیاد قلبی اور التزام طاعت بھی اس کا اہم حصہ ہے۔ اگر ایک شخص صرف تصدیق رکھتا ہے مگر عہد وفاداری نہیں کرتا تو وہ مومن نہیں کہلا سکتا۔ اسی طرح اگر فرمان برداری کے لیے تو آمادہ ہے مگر قلب و زبان سے تصدیق کے لیے آمادہ نہیں ہے وہ بھی مومن نہیں ہے۔ ایمان صرف اس صورت کا نام ہے کہ قلب و زبان تصدیق سے مزین ہوں اور قانون پر عمل پیرا ہونے کا عزم مصمم بھی ہو

ایمان میں وفاداری کا اہم تقاضا

۱۱۵ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کرتے ہیں۔ بس وہ قتل کرتے ہیں اور ان کو قتل بھی کیا جاتا ہے یہ اللہ کا وعدہ ہے پکا اس کے ذمہ ہے تورات انجیل اور قرآن میں یعنی مقصود اللہ سبحانہ کی راہ میں جان و مال حاضر کر دینا ہے بعد ازیں ماریں یا مارے جائیں دونوں صورتوں میں عقد بیع پورا ہو گیا۔ اور یقینی طور پر ثمن کے مستحق ہو گئے ممکن ہے کہ کسی کو وسوسہ گذرتا کہ معاملہ تو بے شک بہت سود مند اور فائدہ بخش ہے لیکن ثمن نقد نہیں ملتا اس کا جواب دیا وعدا علیه حقا فی التوراة والانجیل والقرآن یعنی زر ثمن کے مارے جانے کا کوئی خطرہ نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہت تاکید و اہتمام سے پختہ دستاویز لکھ دی ہے جس کے خلاف ممکن نہیں کیا اللہ سبحانہ سے زیادہ صادق القول راستباز اور وعدہ کا پکا کوئی ہو سکتا ہے ہرگز نہیں لہذا اس کا ادھار بھی دوسروں کے نقد سے ہزار درجہ

درجہ پختہ اور بہتر ہو گا [1]

یقاتلون فی سبیل اللہ یہ استیناف بیانی ہے یعنی اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے سوال کیا ہے ؟ کچھ کہتے ہیں کہ اللہ سبحانہ نے جب خبر دی کہ ان اللہ اشتری اللہ سبحانہ نے مسلمانوں سے ان کی جانوں اور مالوں کو خرید لیا ہے سوال پیدا ہوا کہ کیوں خریدا ہے جواب دیا کہ اس لیے خریدا ہے کہ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کریں۔ جانیں لڑائیں اور کھپائیں کچھ کہتے ہیں کہ سوال یہ ہے کہ جن سے خریدی گئی ہے وہ کیسے بچیں گے ؟ جواب میں ارشاد ہوا کہ وہ اللہ کی راہ میں جنگ کریں گے بہر حال سوال کچھ ہو۔ بتایا جا رہا ہے کہ اس بیع و شرا کے بعد کوئی راستباز مسلمان اپنی جان کو اللہ سبحانہ کی راہ میں خرچ کرنے میں کوتاہی نہ کرے گا۔

صحابہ کی زندگی اس کے مظاہرے سے درخشاں ہے۔ اس بیعنامے نے ان کی اسلامی زندگی کو وفادارانہ زندگی کا نمونہ بنا دیا تھا۔ گویا یہ معاہدہ اسلام سے وفادارانہ رویہ اور بے وفائی کے انداز میں ایک حد فاصل تھا۔ مسلمان جو صحیح معنے میں ایمان کے تقاضوں کو جانتا ہوا اپنی زندگی کے ہر گوشہ میں رضائے الٰہی کا جویا ہو کر کام کرتا ہے اور اس کی زندگی میں کہیں بھی بیوفائی کا نام نہیں ہوتا ہاں یہ کہ عارضی طور پر کسی وقت اس پر غفلت طاری ہو جائے اور وہ اللہ سبحانہ کے ساتھ اس معاہدے کو بھول کر وفاداری کے خلاف کوئی حرکت کرے۔ اسی طرح مسلمان اس معاہدے کی رو سے اپنی اجتماعی زندگی میں کوئی پالیسی کوئی سیاست کوئی طرز تمدن و تہذیب کوئی طریق معیشت اور کوئی بین الاقوامی معاملہ اللہ سبحانہ کی مرضی اور اس کے قانون شرعی کی پابندی سے آزاد ہو کر اختیار نہیں کر سکتا اور اگر کسی عارضی غفلت کی بنا پر اختیار کر بھی جائے تو جس وقت اسے تنبیہ ہو گا اسی وقت وہ بے وفائی کا رویہ چھوڑ کر وفاداری کے رویے کی طرف پلٹ آئے گا۔

یہ اس معاہدے کے ناگزیر تقاضے ہیں۔ ان کو سمجھ لینے کے بعد یہ بات بھی سمجھ میں آجاتی ہے کہ اس معاملہ میں قیمت یعنی جنت کو موجودہ زندگی کے خاتمہ پر کیوں موخر کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ جنت صرف اقرار کا معاوضہ نہیں ہے بلکہ وہ اس عمل کا معاوضہ ہے کہ بائع اپنی اس زندگی میں غیر وفادارانہ رویہ چھوڑے اور اللہ سبحانہ کا امین بن کر اس کی مرضی کے مطابق کرے لہذا یہ بیع

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مکمل بھی اس وقت ہو گی جب بائع کی زندگی ختم ہو جائے گی۔
یہاں یہ بات بھی ذہن نشین کر لینی چاہیے کہ اس سلسلہ بیان میں یہ مضمون کس مناسبت سے آیا ہے۔
علامہ آلوسی فرماتے ہیں کہ تبوک میں رہ جانے والوں کا ذکر کر لے کے بعد مومنین کو جہاد کی ترغیب کے لیے یہ لطیف انداز اختیار کیا ہے۔ علامہ خفاجی فرماتے ہیں کہ جہاد کی ترغیب کے موضوع پر رغبت دلانے کے لیے اس سے زیادہ حسین اور بلیغ انداز کوئی نہیں۔
علامہ بقاعی نے اس سے زیادہ لطیف نکتہ آفرینی کی ہے فرماتے ہیں،
تبوک میں جو نہیں گئے تھے ان کو تہدیدی انداز میں کہا تھا مالکم اذا قیل لکم انفروا پھر اہل ایمان کو جہاد کا حکم دیا انفروا خفافا و ثقالا۔ صادق الایمان مسلمان کے لیے اتنا ہی کہنا کافی تھا۔ لیکن پھر کچھ لوگوں نے اس وقت تکاسل کا مظاہرہ کیا۔ ان کو اللہ سبحانہ نے اہل ایمان میں بے نقاب کیا اور حضور اقدس کو حکم دیا یا ایھا النبی جاھد الکفار والمنافقین اس کے نتیجے میں ان کی بنی ہوئی مسجد کو گرایا گیا۔ ان کے جنازے کی نماز سے روکا گیا۔ اس طویل داستان کے بعد یہ سوال خود بخود ذہن میں چٹکیاں لینے لگا کہ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی تو ستار العیوب ہے۔ پھر رسوائیوں اور برائیوں کے اعلان اور بے ابروئی اور بے عزتی کے لیے یہ انداز کیوں اختیار کیا ہے جواب میں ارشاد ہوا ان اللہ اشتری من المومنین مطلب یہ ہے کہ شروع سے جو بات چل رہی تھی اس میں ان لوگوں کا تذکرہ ہو رہا تھا جو مسلمان تھے مگر امتحان کے موقع پر ان میں سے کچھ نے تساہل کی بنا پر کچھ نے اخلاص کی وجہ سے اور کچھ نے نفاق کی وجہ سے اسلام کی خاطر اپنے وقت اپنے مال اپنے مفاد اور اپنی جان کو قربان کرنے میں دریغ کیا۔ لہٰذا ان مختلف اشخاص اور طبقوں کے رویہ پر تنقید کرنے کے بعد اب ان کو صاف صاف بتایا جا رہا ہے کہ وہ ایمان جسے قبول کرنے کا تم نے اقرار کیا ہے یہ محض جاننے کی چیز نہیں ہے کہ اللہ ہے اور وہ ایک ہے بلکہ وہ دراصل اس امر کا یقین اور زبان سے اقرار کا نام ہے کہ اللہ سبحانہ تمہاری جان اور مال کا مالک ہے لہٰذا اگر اس اقرار یقین کے بعد اگر مال و جان کو اللہ سبحانہ کے حکم پر قربان کرنے سے جی چراتے ہو تو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم اپنے اقرار میں جھوٹے ہو سچے اہل ایمان صرف وہ لوگ ہیں جو واقعی اپنے جان و مال کو خدا کے ہاتھ میں بیچ چکے ہیں۔ یہی وفاداری کا پیمانہ ہے۔
آیت کی تشریح میں ایک بات باقی رہ گئی ہے کہ اس معاہدے کی تاریخی حیثیت قرآن

نے بتاتے ہوئے تورات و انجیل کا نام لیا ہے۔ لوگ کہتے ہیں کہ جس وعدے کا یہاں ذکر ہے وہ تورات و انجیل میں موجود نہیں ہے۔ اس سلسلے میں مولانا عبدالماجد دریابادی، مولانا امین احسن اصلاحی نے جو بحث کی ہے وہ قابل قدر ہے لیکن مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں پوری وضاحت سے سمجھایا ہے وہ فرماتے ہیں :

اس بات پر بہت اعتراضات کیے گئے ہیں کہ جس وعدے کا یہاں ذکر ہے وہ تورات و انجیل میں موجود نہیں ہے مگر جہاں تک انجیل کا تعلق ہے یہ اعتراضات بے بنیاد ہیں۔ جو اناجیل اس وقت موجود ہیں ان میں حضرت مسیح علیہ السلام کے متعدد اقوال ہم کو ایسے ملتے ہیں جو اس آیت کے ہم معنے ہیں مثلاً

مبارک ہیں وہ جو راستبازی کے سبب ستائے گئے ہیں کیونکہ آسمان کی بادشاہت انہیں کی ہے۔ متی ۵ - ۱۰

جو کوئی اپنی جان بچاتا ہے اسے کھوئے گا اور جو کوئی میرے سبب اپنی جان کھوتا ہے اسے بچائے گا۔ متی ۱۰ ، ۳۹

جس کسی نے گھروں یا بھائیوں یا بہنوں یا باپ یا ماں یا بچوں یا کھیتوں کو میری خاطر چھوڑ دیا ہے اس کو سو گنا ملے گا اور ہمیشہ کی زندگی کا وارث ہو گا۔ متی : ۱۹ : ۲۹

البتہ تورات جس صورت میں اس وقت موجود ہے اس میں بلاشبہ یہ مضمون نہیں پایا جاتا۔ اور یہی مضمون کیا وہ تو حیات بعد الموت اور یوم الحساب اور اخروی جزا و سزا کے تصور ہی سے خالی ہے۔ حالانکہ یہ عقیدہ ہمیشہ سے دین حق کا جزو لاینفک رہا ہے لیکن موجودہ تورات میں اس مضمون کے نہ پائے جانے سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ واقعی تورات اس سے خالی تھی حقیقت یہ ہے کہ یہود اپنے زمانہ تنزل میں کچھ ایسے مادہ پرست اور دنیا کی خوشحالی کے بھوکے ہو گئے تھے کہ ان کے نزدیک نعمت اور انعام کے کوئی معنی اس کے سوا نہ رہے تھے کہ وہ اسی دنیا میں حاصل ہو۔ اسی لیے کتاب الٰہی میں بندگی و طاعت کے بدلے جن جن انعامات کے وعدے ان سے کئے گئے تھے ان سب کو وہ دنیا ہی میں اتار لائے اور جنت کی ہر تعریف کو انہوں نے فلسطین کی سرزمین پر چسپاں کر دیا جس کے وہ ابد وارث تھے۔ مثال کے طور پر تورات میں متعدد مقامات پر ہم کو یہ مضمون ملتا ہے۔

"سن اے اسرائیل خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے تو اپنے سارے دل اور اپنی ساری جان اور اپنی ساری طاقت سے خداوند اپنے خدا سے محبت کر۔"
استثنا ۶ : ۴، ۵

اور یہ کہ
"کیا وہ تمہارا باپ نہیں جس نے تم کو خریدا ہے اسی نے تم کو بنایا اور بخشا"
استثنا ۳۲ ، ۶

لیکن اس تعلق باللہ کی جو جزا بیان ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ تم اس ملک کے مالک ہو جاؤ گے جس میں دودھ اور شہد بہتا ہے یعنی فلسطین ۔ اس کی اصل وجہ یہ ہے کہ تورات جس صورت میں اس وقت پائی جاتی ہے اول تو وہ پوری نہیں ہے اور پھر وہ خالص کلام الٰہی پر ہی مشتمل نہیں ہے بلکہ اس میں بہت سا تفسیری کلام اللہ سبحانہ کے کلام کے ساتھ ساتھ شامل کر دیا گیا ہے ۔ اس کے اندر یہودیوں کی قومی روایات ان کے نسلی تعصبات ان کے اوہام ان کی آرزوؤں اور تمناؤں ، ان کی غلط فہمیوں اور ان کے فقہی اجتہادات کا ایک معتدبہ حصہ ایک ہی سلسلہ عبارت میں کلام الٰہی کے ساتھ کچھ اس طرح رل مل گیا ہے ۔ کہ اکثر مقامات پر اصل کلام کو ان زوائد سے ممیز کرنا قطعاً ناممکن ہو جاتا ہے[1]

ایمان کے امتیازی تقاضے

۱۱۲ اور اللہ سبحانہ سے زیادہ اپنا عہد پورا کرنے والا کون ہے لہٰذا مسلمانو! تم اس سودے پر جو تم نے اللہ سبحانہ سے کیا ہے خوشیاں مناؤ اور یاد رکھو یہی بڑی کامیابی ہے مومنوں کے خوش ہونے اور اپنی قسمت پر نازاں ہونے کا اس سے بہتر کون سا موقع ہوگا کہ خود رب العزت ان کا خریدار ہے اور اس شان سے ہے ۔ سچ فرمایا عبداللہ نے کہ یہ وہ بیع ہے جس کے بعد اقالہ کی کوئی صورت ہم باقی رکھنا نہیں چاہتے حق تعالیٰ اپنے فضل سے ہم ناتوانوں کو ان مومنین کے زمرے میں محشور فرمائے[2]

دو چیزیں ہیں اور دونوں مزاج کے اعتبار سے الگ الگ ہیں ایک مسلمان ہونا ہے اور دوسرے مسلمان ہونے کے بعد دین کی برتری کے لیے محنت کرنا ، جان کھپانا مال خرچ کرنا قربانیاں

---

[1] تفہیم [2] افادات شیخ الاسلام

دینا ایمان کا اولین تقاضا ہے اس کے بغیر ہر مسلمان کی اسلامی زندگی نامکمل ادھوری اور ناقص ہے۔
اس آیت میں اہل ایمان کو اسی کے لیے ابھارا گیا ہے کہ اللہ کی راہ میں یعنی اللہ کے دین کو برتر کرنے کے لیے بے خوف وخطر جان ومال کی قربانیاں پیش کرو۔ اسی کا نام اسلام کی نصرت ہے۔ یہ ایمان کی اولین کسوٹی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب شرف نبوت سے مشرف ہونے کے بعد ورقہ ابن نوفل کو غار حرا کی روداد سنائی ورقہ نے نبوت کی پہلے ان لفظوں میں تصدیق کی ھذا ھو الناموس الذی نزل علی موسیٰ یہی وہ ناموس ہے جو حضرت عیسیٰ پر نازل ہوا تھا اور پھر جو بات کہی وہ ہی بات ہر مسلمان کے سننے کی ہے فرمایا۔ کاش میں اس وقت طاقتور ہوں کاش میں بقید حیات ہوں جس وقت تمہاری قوم تمہیں گھر سے بے گھر کرے گی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حیرت سے دریافت کیا کیا لوگ مجھے گھر سے بے گھر کر دیں گے۔ ورقہ نے جواب دیا جی ہاں اس میدان کے ہر راہ رو کے ساتھ یہی سلوک ہوا ہے۔ آگے جو بات فرمائی ہے وہ اس لائق ہے کہ ہر مسلمان گوش ہوش سے سنے اور یاد رکھے کہ ایمان کا پہلا تقاضا کیا ہے فرمایا۔ وان یدرکنی یومک انصرك نصرا موزرا اگر میں بقید حیات رہا تو میں تمہاری پامردی مدد کروں گا اس کا مطلب یہی ہے کہ ایمان لانے کے بعد اولین تقاضا اللہ کے دین کی مدد کرنا ہے۔ اسی لیے نبوت کے ابتدائی دور میں جب ہجرت سے ۳ سال پہلے ستر شرفاء مدینہ نے مکہ میں آکر اسلام قبول کیا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ان سے بیعت لی اس بیعت کا نام بیعت عقبہ ثانیہ ہے اور ان کے ایک لیڈر عبداللہ بن رواحہ نے عرض کیا کہ آپ نے اور اپنے رب کی جانب سے شرطیں بیان فرمائی۔ آپ نے فرمایا کہ میرے رب کی طرف سے تو یہ ہے کہ اس کی عبادت کرو کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور میری طرف سے شرط یہ ہے کہ جس طرح اپنے جان ومال کی حفاظت کرتے ہو میری بھی حفاظت کرو وہ بولے کہ اس پر ہمیں کیا ملے گا؟ فرمایا "جنت" وہ لوگ بول پڑے ربح البیع لا نقیل ولا نستقیل یہ سودا تو بڑے نفع کا ہوا ہم نہ اس سودے کو توڑیں گے اور نہ توڑنے کی درخواست کریں گے۔

یہ آیت پکار پکار کر بتا رہی ہے کہ ضرورت پڑنے پر مسلح جہاد کرنا ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے۔ اور ساتھ یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اللہ سبحانہ کے راستہ میں لڑنے کا جذبہ اور عزم وارادہ رکھنا ایمان کی ایک کبھی نہ الگ ہونے والی صفت ہے۔ یہ ایک الگ سوال ہے کہ اس کا موقع کب آتا ہے اور اس کی ضروری شرطیں کب پوری ہوتی ہیں۔ مومن کا عمل تو اس موقع کا اور شرائط کا

ضرور انتظار کرے گا مگر اس کا جذبہ ایمان ایسا کوئی انتظار ہرگز نہیں کر سکتا وہ تو اس کام کے لیے ہر وقت چلتا ہی رہے گا۔ مومن اگر مومن ہے تو اس کی ذہنی کیفیت فطری طور پر ہمیشہ یہی رہے گی۔ جہاں ضرورت نے اسے پکارا اور ضروری شرطوں نے ہری جھنڈی دکھائی وہ اپنی جگہ بیٹھا نہیں رہ سکتا نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ایمان اور جہاد کے فطری تعلق کو پوری طرح بے نقاب کرتا ہے۔

من مات ولم یغز بہ ولم یحدث بہ نفسہ مات علی شعبۃ من النفاق۔

جو شخص اس حال میں مرا ہو کہ اس نے نہ تو دین کی خاطر جنگ کی نہ اپنے جی میں اس جنگ کا خیال لایا ہو وہ کسی نہ کسی حد تک نفاق کی حالت میں مرا۔

اور وجہ اس کی بالکل ظاہر ہے مسلمان نام کا گروہ اس لیے پیدا ہی نہیں ہوا کہ دوسرے لوگوں کی طرح وہ بھی اپنی مرضی کی زندگی گذارے بلکہ وہ ایک خاص کام کیلئے پیدا کیا گیا ہے۔ یہ کام اتنا بڑا اور اتنا اہم ہے کہ ٹھیک طور سے انجام پانے کے لیے مسلمان کا سب کچھ مانگتا ہے اس لیے اس فرض سے سبکدوش صرف وہی شخص ہو سکتا ہے جو اس کے مقابلے میں دنیا کی کسی چیز کو عزیز نہ رکھتا ہو۔ اور حقیقی امت مسلمہ ایسے ہی افراد کے مجموعہ کا نام ہے جن کے اندر قربانی کا یہ جذبہ موجود ہو۔

اللہ تعالیٰ کو اپنے دین کے لیے جس قسم کے افراد مطلوب ہیں ان میں جہاد فی سبیل اللہ کی صفت ضروری ہے جو لوگ اس صفت سے خالی ہوں وہ دین کی خدمت دعوت شہادت کا فریضہ انجام دے ہی نہیں سکتے ہیں اور جو مسلمان یہ کام نہیں کر سکتا وہ گویا

کذالک جعلنٰکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس۔

کے منصب شہادت کا اہل نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جہاد سے فرار کی راہ اختیار کرنے کو کچھ آیات قرآنی میں دین کی راہ سے پھر جانا قرار دیا ہے یہی بات ہے سورہ توبہ کی اس آیت میں غزوہ تبوک کا ذکر کا آغاز کرتے ہوئے فرمائی گئی تھی۔

مالکم اذا قیل لکم انفروا فی سبیل اللہ اثاقلتم

فی الارض۔

اور بتایا گیا تھا۔

ان لا تنفروا یعذبکم عذابا الیما ویستبدل قوما غیرکم۔

ظاہر ہے کہ کسی شخص یا گروہ کو اس کی جگہ سے اسی وقت ہٹایا جاتا ہے جب اس میں اس کی اہلیت نہ رہی ہو اور وہ کام انجام نہ دے رہا ہو جس کے لیے اسے یہ مقام دیا گیا تھا۔

اَلتَّآئِبُوْنَ الْعٰبِدُوْنَ الْحٰمِدُوْنَ السَّآئِحُوْنَ الرّٰكِعُوْنَ السّٰجِدُوْنَ الْاٰمِرُوْنَ بِالْمَعْرُوْفِ وَ النَّاهُوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَالْحٰفِظُوْنَ لِحُدُوْدِ اللّٰهِ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۱۲﴾

(ان کے اوصاف یہ ہیں) توبہ کرنے والے ہیں، عبادت کرنے والے، اللہ سبحانہ کی حمد کرنے والے، سیاحت کرنے والے، جناب الٰہی میں رکوع کرنے والے، سجدہ کرنے والے نیکی کا حکم کرنے والے اور برائی کو روکنے والے اور اللہ کے حدود کی حفاظت کرنے والے اور اے پیغمبر آپ ان اہل ایمان کو خوشخبری دے دیجئے۔

مفردات کے معانی

سائحون اس کا مصدر سیاحت ہے ساح یسیح اس کے معنے لغت گھومنے پھرنے کے آتے ہیں ان ہی معنی ہیں اس صورت کے آغاز میں اس سے فعل آیا ہے فسیحوا فی الارض الخ چونکہ زمین میں گھومنے والا اقرباء سے دور رہتا ہے اس لیے اس کے مجازی معنے تعلق نہ رہنے کے لیے جانے لگے پھر چونکہ حالت سیاحت میں سیاحت کرنے والا کھانے پینے سے بے تعلق ہو جاتا ہے اس لیے اس کے معنی روزہ دار کے کرتے ہیں، ہجرت میں آدمی گھر سے بے گھر ہوتا ہے اس لحاظ سے ہجرت جہاد اور طلب علم بھی اس کے مجازی معنے ہو گئے۔ اصل معنے لغت میں گھومنے اور پھرنے کے ہیں۔

علامہ زمخشری کہتے ہیں سائح کے معنے صائم کئے گئے کیونکہ اس کے پاس توشہ نہیں ہوتا اس لیے جب تک کھانے کو نہیں ملے گا رکا رہتا ہے لہذا روزہ دار کو افطار کا وقت آجانے تک رک جانے میں اس سے تشبیہ دی گئی ہے۔

صحابہ کرام کا انفرادی چہرہ

ان اولین مسلمانوں کی جن کے بارے میں بتایا گیا ہے کہ اللہ سبحانہ نے ان کی جانوں اور مالوں کو جنت کے بدلے میں خرید ایا ہے یہاں ان کی ایمانی تربیت کی ان منزلوں کو بے نقاب کیا جارہا ہے۔ ان کی منزلوں سے گذر کر ان کے ایمان کی تکمیل ہوتی ہے۔ اسی سے اسلام کا روحانی نظام کا چہرہ مہکتا اور چمکتا ہے۔ روحانی نظام سے مقصد یہ ہے کہ انسانی روح نفس کی غلامی سے آزاد اور دنیا پرستی کی آلودگی سے پاک ہو اور ان چیزوں سے آزاد اور بے رخ ہو کر اللہ سبحانہ کی طاعت اس کی محبت اور اس کی رضا کی طرف جذبات سے سرشار ہو جائے۔ اس پاکیزگی کا انفرادی معیار یہ ہے کہ انسان وہی کچھ پسند کرنے لگے جو اس کے اللہ کو پسند ہے اور ہر اس چیز کو نفرت کی نگاہ سے دیکھنے لگے جو اس کے اللہ کو ناپسند ہے۔ اپنے حقیقی آقا کے حکموں پر اس طرح عمل کرنے لگے گویا وہ اسے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اس کی رضا کی طرف لپکتا رہے جیسے پیاسا ٹھنڈے پانی کی طرف لپکتا ہے اس کے اشاروں پر اپنی جان و مال قربان کر دینے کے لیے اس طرح تیار رہے جیسے ان چیزوں کی اس کی نگاہ میں کوئی قیمت نہیں ہے روحانیت کے اس سب سے اونچے مقام کا نام اسلام کی زبان میں احسان ہے اور اصطلاح میں اسے تصوف کہتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت مقدسہ میں صحابہ کی روحانی تربیت کا سلسلہ جاری رہا۔ قرآن برابر ان کو طاقت اور گرمی بخشتا رہا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مجالس سے ان کو استحکام خواہشات نفس پر قابو رضائے الہٰی کی سچی طلب اور اس کی راہ میں اپنے کو مٹانے کی عادت جنت سے عشق، علم کی حرص دین کی سمجھ اور احتساب نفس کی ساری کردوں کی اللہ سبحانہ نگرانی فرمارہے تھے اسی نگرانی کا نتیجہ ہے کہ ان کی نفسیات میں عجیب وغریب تبدیلی آگئی جب بھی کوئی لا الہ الا اللہ پر ایمان لاتا اس کی زندگی میں عظیم الشان انقلاب رونما ہو جاتا۔ ایمان اس میں پیوست ہو جاتا ہے یاد الہٰی میں اس کا جی لگتا اسی کو نشاط ایمان کہتے ہیں اور اللہ کی راہ میں قتل ہونے میں اسے لذت آتی اسی کو حلاوت ایمان کہتے ہیں۔ اگر کسی وقت بھول چوک ہو جاتی تو ایمان سراپا سوال بن کر دربار نبوت میں حاضر ہو جاتا دل کی پیاس چین نہ لیتی، پریشان کن خیالات کا سیلاب امنڈ آتا۔ مورخین نے اسلامی

تاریخ کے ایسے محیر العقول واقعات پیش کیے ہیں جن کی نظیر اسلامی تاریخ کے علاوہ کہیں نہیں ملتی ہے۔

سلا توبہ کرنے والے ہیں عبادت کرنے والے، اللہ سبحانہ کی حمد کرنے والے سیاحت کرنے والے۔
پھر سیاحت کرنے والوں سے روزے دار مراد لئے ہیں کیونکہ روزہ دار کھانے پینے لذائذ سے بے تعلق ہوکر روحانی مدارج ملکوتی مقامات کی سیر کرتا ہے بعض کے نزدیک اس لفظ کا مصداق مہاجرین جو گھر بار سے بے تعلق ہو کر دارالاسلام میں سکونت رکھتے ہیں بعض نے مجاہدین کا ارادہ کیا ہے کہ مجاہد اپنی جان تک سے بے تعلق خدا کے راستہ میں قربان ہونے کے لیے نکلتا ہے۔ اور بعض کی رائے میں یہ لفظ طلبہ علم کے لیے ہے جو وطن کنبہ راحت و آسائش کو خیرباد کہہ کر طلب علم کے لیے نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ بہرحال مترجم محقق نے جو ترجمہ کیا اس میں سب اقوال کی گنجائش ہے مگر اکثر سلف کے نزدیک پہلی تفسیر مختار ہے واللہ اعلم حضرت شاہ صاحب نے فرمایا کہ شاید بے تعلق رہنے سے مراد یہ ہو کہ دنیا میں دل نہ لگائے[1]

اس آیت میں ایمانی تربیت کی منزلیں بتائی گئی ہیں ان میں پہلی منزل توبہ ہے۔

توبہ ایمانی تربیت کی منزل

توبہ روحانی تربیت میں سب سے پہلی منزل ہے۔ یہی ساری روحانی ترقیوں کی واقعی اور حقیقی اساس ہے اسی پر روحانی زندگی کی پوری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ تصوف میں بھی ساری ترقیاتی منزلوں میں پہلی منزل ہے حافظ ابن القیم منازل السائرین کی شرح میں لکھتے ہیں۔

فالتوبة هي بداية العبد ونهايته

توبہ بندے کی ابتدا بھی اور انتہا بھی۔ کیونکہ انسان میں اصل چیز دل ہے دل پاک ہے تو انسان پاک ہے، دل ناپاک ہے تو آدمی ناپاک ہے۔ انسان کا دل اگر خلوص سے کسی وقت اللہ سبحانہ کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگذاشتوں پر اس کی بارگاہ میں شرمندہ ہو کر اپنی بدکرداری و بدعنوانی سے بیزار ہو کر آئندہ کے لیے نیکوکاری کا اللہ سبحانہ سے مستحکم وعدہ کرے اس کا نام توبہ ہے یہ توبہ گنہ گار سے گنہ گار انسان کو بھی اللہ سبحانہ کی محبت کی آغوش میں لا کر ڈال دیتی ہے آدم علیہ السلام کا تصور اور پھر ان کی توبہ اور رحمت الٰہی کا رجوع واقعہ کے علاوہ اس بات کی ایک مثالی صورت ہے کہ اللہ تعالیٰ کی آغوش

[1] افادات شیخ اسلام

رحمت کس طرح گنہ گار انسان کو واپس لینے کے لیے ہمیشہ وا رہتی ہے۔ رحمت الٰہی کے اس پرجوش نظارے کی جو کیفیت قرآن میں نظر آتی ہے وہ کہیں نہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کیفیات اور اصول و شرائط جس شرح و بسط کے ساتھ بیان فرمائے وہ آپ کا خاص حصہ تھا۔

گناہ اگر بندے کی طبیعت ہے تو پھر توبہ ضرور اس کی صفت ہونی چاہیئے لہٰذا اگر وہ غلط علم غلط افتاد طبع اور غلط ماحول سے طرح طرح کے فتنوں کا شکار ہو جاتا ہے مگر کبھی اپنی توبہ کی صفت کو فراموش نہیں کرتا تو وہ ارحم الرحمٰن کی نظر میں کیوں نہ پیارا ہو۔ یہاں بحث بندے کی صفت توبہ پر ہے۔ آیت میں یہاں صحابہ کے لیے توبہ کا فعل نہیں بلکہ اسم فاعل تائبون لایا گیا ہے اور وہ بھی الف لام کے ساتھ جملہ اسمیہ کی صورت میں لایا گیا ہے صرف یہ بتانے کے لیے کہ وہ ایک ہی بار توبہ نہیں کرتے ہیں بلکہ توبہ کرنا ان کی صفت ہے اور وہ ہمیشہ توبہ کرتے رہتے ہیں۔ اسم فاعل نے اگر توبہ کو ان کی صفت بنایا ہے تو جملہ اسمیہ نے توبہ کے دوام اور ہمیشگی کو بتایا ہے اصل میں بمبتدائے محذوف کی خبر ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ایسا کیوں کہا گیا ہے :

اس لیے کہ مومن اگرچہ اپنے پورے شعور اور ارادے کے ساتھ اللہ سبحانہ سے اپنی جان و مال کا معاملہ کرتا ہے لیکن ظاہر حال کے لحاظ سے محسوس یہی ہوتا ہے کہ جان اس کی اپنی ہے اور مال اس کا اپنا ہے اور یہ بات کہ اس کی جان اور مال کا اصلی مالک اللہ سبحانہ ہے محسوسات میں سے نہیں بلکہ معقولات میں سے ہے۔ اس لیے مومن کی زندگی میں بارہا ایسے مواقع پیش آتے رہتے ہیں جب کہ وہ عارضی طور پر اللہ کے ساتھ اپنے معاملہ بیع کو بھول جاتا ہے اور اس سے غافل ہو کر کوئی معاہدے کے خلاف طرز عمل اختیار کر لیتا ہے مگر ایک حقیقی مومن کی صفت یہ ہے کہ جب بھی اس کی یہ عارضی بھول دور ہوتی ہے اور وہ اپنی غفلت سے چونکتا ہے اور اس کو یہ محسوس ہوتا ہے کہ غیر شعوری طور پر وہ اپنے عہد کی خلاف ورزی کر بیٹھا ہے تو اسے ندامت لاحق ہوتی ہے شرمندگی کے ساتھ وہ جناب الٰہی میں ہاتھ اٹھاتا ہے معافی مانگتا ہے اور اپنے عہد کو پھر سے تازہ کر لیتا ہے۔ یہ بار بار کی توبہ اور رہ رہ کر اللہ سبحانہ کی طرف پلٹنا اور ہر لغزش کے بعد وفاداری کی راہ پر واپس آنا توبہ کا دوام و ثبات ہے۔

یہ تو ہے نسبت کی تشریح مگر یہاں شارحین قرآن کی تشریحات میں دو باتیں اور بھی پیش کی جاتی ہیں۔

اوّل یہ کہ آیت میں تائبون سے کون لوگ مراد ہیں عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ یہ مجاہدین کی صفات ہیں اللہ کے راستہ میں شہید وہ شخص کہلائے گا جس میں یہ نو صفات ہوں اس طور

میں مبتدا محذوف ہوگا یعنی ھم التائبون قاضی بیضاوی نے اسی کو ترجیح دی ہے اور امام حسن اور قتادہ کہتے ہیں کہ تائبین سے مراد وہ لوگ ہیں جو شرک سے توبہ کر چکے ہوں اور ان کے دامن پر نفاق کا داغ نہ ہو اور ضحاک کی رائے ہے کہ اس سے مقصود وہ لوگ ہیں جو شرک اور گناہوں سے توبہ کریں۔ لیکن کافر منافق عاصی ہر ایک کی توبہ الگ الگ ہے کافر کی توبہ یہ ہے کہ کفر و شرک سے توبہ کرے منافق کی توبہ یہ ہے کہ نفاق سے توبہ کرے اور عاصی کی توبہ یہ ہے کہ معاصی سے توبہ کرے۔ کئے پر پشیمان ہوا اور آئندہ پھر نہ کرنے کا پختہ عزم کرے۔

عبادت روحانی تربیت کی منزل

دوسرا اہم بنیادی اور جامع وصف روحانی تربیت کے سلسلے میں عبادت کو پیش کیا ہے۔ علامہ بقاعی فرماتے ہیں کہ عبادت کی آغوش میں دین کی ساری انواع سمٹی ہوتی ہیں۔ عبادت کے معنی اہل لغت نے یہ بتائے ہیں العبادۃ غایۃ التذلل کسی کے حضور میں پوری پستی (مفردات) العبادۃ فی اللغۃ الطاعۃ مع الخضوع عبادت کے معنی اس طاعت و فرمان برداری کے جس میں خضوع ہو (لسان العرب) حافظ ابن القیم الجوزی نے مدارج السالکین میں سب سے زیادہ خوبصورت بات لکھی ہے۔

عبادت دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے بہت زیادہ محبت بہت زیادہ پستی اور ادھکاڈ کے ساتھ عرب والے پامال راستہ کو طریق معبد بولتے ہیں۔ ان تصریحات سے جو بات حقیقت بن کر نمودار ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ عبادت اللہ کے حضور ظاہر اور باطن ہر حیثیت سے پوری طرح جھک جانے اور اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں اپنی بندگی اور عبودیت کا نذرانہ پیش کرنا اور اس کے احکام کو بجا لانے کا نام ہے۔ اسی لیے قرآن میں عبادت کا مقابل استکبار آیا ہے۔

اس آیت نے وضاحت کی ہے کہ صحابہ کی زندگی کے تمام احوال، معاملات خالصًا عابدانہ تھے اور عبادت ان کی وقتی اور ہنگامی نہ تھی بلکہ عبادت ان کا ایک دائمی وصف تھا اسی سے حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔

"یہ ان لوگوں کا چہرہ ہے جو اپنے سارے اوقات میں اللہ کی عبادت کرتے تھے یہ مہینہ دو مہینہ سال دو سال کی بات نہ تھی۔"

عابد و ہبع کے بعد العابدون کہنے کا مطلب بھی یہ ہے کہ ایک مومن اللہ سبحانہ کا ایسا عبد ہے جس کی

صرف قوت کارکردگی ہی نہیں بلکہ اس کا سب اللہ ہی کا ہے وہ اللہ کا پیدا کیا ہوا ہے اور اس کا خریدا ہوا ہے اور خرید و فروخت کا معاملہ اس کی آزاد مرضی سے ہوا ہے۔ ایسا پیدائشی غلام اور اپنے وجود کو بیچ چکنے والا ایسا عبد کامل اپنے آقا کی تابعداری میں جو کچھ بھی کریگا اس کا کوئی جزو بھی اس کی غلامانہ حیثیت سے الگ اور بے تعلق نہیں ہوسکتا۔ جب غلامی اور عبدیت کے سوا اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں ہے تو لازماً اس کا ایک ایک فعل عبدیت اور عبادت ہی کا فعل ہوگا حتیٰ کہ اگر وہ کھانے اور پینے سونے اور جاگنے کے کام بھی اپنے آقا کے حکموں کے تحت کرتا ہے تو یہ سارے کام بھی قطعاً عبادت ہی کے کام ہوں گے۔

حمد الٰہی روحانی تربیت کی منزل

روحانی تربیت کی منازل میں ایک منزل حمد الٰہی ہے۔ حمد الٰہی کا مطلب یہ ہے کہ حسن و جمال کی ساری خوبیوں کو اللہ تعالیٰ کے لیے ثابت کیا جائے اوصاف جلال اور نعوت کمال کا حقدار اسی کو قرار دیا جائے۔

حمد کے دو معنے ہیں ایک معنے تو یہی ہیں کہ حسن و جمال اور اللہ سبحانہ کے کمالات کا ہر حال میں اعتراف کرنا اور اس کے گن گانا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم حمد الٰہی میں بہترین نمونہ ہیں۔ دوسرے معنے حمد کے اللہ کی نعمتوں پر اللہ سبحانہ کا شکر ادا کرنا۔ ارشاد نبوت ہے راس الشکر الحمد للہ مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ سبحانہ کی نعمتوں پر اللہ کا شکر کرتے ہیں۔ پہلے معنے زیادہ اچھے ہیں اور بزرگوں سے منقول ہیں۔

اللہ کی معرفت کا ذریعہ بزرگوں نے حمد الٰہی کو تسبیح کی پیوندکاری کے ساتھ بتایا ہے تسبیح یہ ہے کہ اللہ سبحانہ سے ساری عیوب ساری کمیوں سارے نقصانوں اور ساری کمزوریوں کی نفی کی جائے اور تحمید یہ ہے کہ اس کے لیے حسن و جمال کے سارے کمالات کا اقرار کیا ہے اس لیے زبان نبوت میں یہ دونوں ملے چلے آتے ہیں۔ فرشتوں کے قرب الٰہی کے بارے میں ہے نحن نسبح بحمدك نمازی نماز کا آغاز کرتا ہے سبحانك اللھم و بحمدك کہہ کر۔ ایمان جس کی دعوت نبوت لے کر آئی اس میں معرفت الٰہی کی اساس تسبیح و تحمید ہے اسی لیے احادیث میں سبحان اللہ وبحمدہ کی اذکار میں زیادہ فضیلت آئی ہے۔

روحانی تربیت کی ایک اور منزل

السائحون یعنی سیاحت کرنے والے عام شارحین قرآن نے السائحون سے صائمون روزہ دار مراد لیا ہے اور اس کی بنیاد روایات پر ہے روایات بھی موقوف ہیں اور مرفوع روایات کی روایتی حیثیت ناپائدار ہے اور موقوف روایات میں صحت کی پوری ضمانت کسی روایت کی نہیں ہے۔ دوسری رائے سائحون کی تفسیر میں یہ ہے کہ اس سے مجاہدین مراد ہیں یہ حضرت عطاء ابن ابی رباح کی رائے ہے تیسری رائے مشہور مفسر عکرمہ کی ہے کہ اس سے مراد طلبہ علم ہیں، چوتھی رائے اس موضوع عبدالرحمٰن بن زید ابن اسلم کی ہے کہ اس سے مراد مہاجرین ہیں ان تمام تشریحات کا مطلب میں یہ سمجھا ہوں کہ سیاحت سے مراد ایسے مقاصد کے لیے زمین میں چلنا ہے جو اللہ کے دین کی برتری کے لیے ہوں اور جن میں اللہ سبحانہ کی رضا مطلوب ہو۔ مثلاً دین کو بلند کرنے کے لیے جہاد، کفر زدہ علاقوں سے ہجرت، دعوت دین اصلاح خلق علم دین کی طلب وغیرہ وغیرہ اور جن لوگوں نے سیاحت کے مفہوم میں روزے کو داخل کیا ہے اس کی معنویت یہ ہے کہ سیاحت قدیم زمانے سے مذاہب کی ایک خاص اصطلاح ہے جس کا مطلب علامہ منظور افریقی نے یوں پیش کیا ہے۔

عبادت و ریاضت کے لیے زمین میں جانا۔

ظاہر ہے کہ سفر بھی ہو اور روزہ بھی ہو تو اس سے بڑی ریاضت کیا ہو گی آپ غور کریں کہ جہاد میں جا رہے ہیں یا آپ سفر ہجرت کر رہے ہیں یا آپ طلب علم کی خاطر گھر سے نکلے ہیں اور روزہ رکھے ہوئے ہیں تو اس سیاحت سے مقدس اور کونسی سیاحت ہو سکتی ہے۔

اس آیت سے یہ بات واضح ہو گئی کہ نیک مقصد سے سیر و سیاحت کرنا سچے اہل ایمان کا بہترین عمل ہے۔ اور ان اعمال میں سے ہے جن کے ذریعے وہ ایمان کے مدارج طے کرنے اور خصائص ایمانی میں کامل ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جس تیزی سے صدر اول کے مسلمان تمام دنیا میں پھیلے اس کی کوئی نظیر تاریخ میں نہیں ملتی ہے اور جب تک اسلام کی عملی روح ان کے اندر رہی ان سے بڑھ کر زمین کی مسافتیں قطع کرنے والی کوئی قوم نہ تھی وہ سیاحت کو سیاحت سمجھ کر نہیں کرتے بلکہ اللہ کی عبادت سمجھتے تھے اور فی الواقع سیاحت نہ صرف ایک تنہا عبادت ہے بلکہ کتنی ہی عبادتوں کا مجموعہ ہے گھر بار چھوڑنا، عزیز و اقارب کی جدائی برداشت کرنی۔ سفر کی مشقتوں میں پڑنا قدم قدم پر مال خرچ کرنا، آب و ہوا کی ناموافقت، اجنبیوں سے صحبت اور پھر ان تمام موانع

ومشکلات میں عزم وعمل کا استوار رہنا، ایثار وتحمل کے کتنے مرحلے طے کرنے پڑتے ہیں تب کہیں جاکر یہ عمل انجام پاتا ہے۔

سورۂ تحریم میں یہی وصف مسلمان عورتوں کے لیے بھی فرمایا مومنات قانتات تائبات عابدات سائحات اور روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ نہ صرف صحابہ کرام کی بیبیاں بلکہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج مطہرات بھی جنگ میں جاتی تھیں اور مجاہدین کی خدمت کرتی تھیں بعد کو اس بارے میں جو حال رہا وہ معنی سے مستغنی ہے۔

کچھ شارحین قرآن کو اس پر تعجب ہوا کہ سیر وسیاحت کا شمار بھی ایمانی خصائص میں ہو اس لیے السائحون کے لغوی اور اصطلاحی معنے سے گریز کرنے لگے لیکن فی الواقع ان کا تعجب خود محل تعجب ہے قرآن نے ہجرت کو ایمان کا بہترین عمل قرار دیا ہے جو گھر بار چھوڑ کر نکلنا ہے اور جہاد فی سبیل اللہ کیلئے نفر کا حکم دیا انفروا خفافا وثقالا اور حج ہر مستطیع مسلمان پر مرد ہو یا عورت فرض کر دیا جو باشندگان مکہ کے علاوہ سب کے لیے بڑی سے بڑی سیاحت ہے نیز جابجا ارشاد دیا کہ ملکوں کی سیر کرو۔ پہلی قوموں کے آثار وباقیات سے عبرت حاصل کرو۔ ان کے عروج وزوال کے حالات دبواعث کا کھوج لگاؤ۔

بہرحال سیاحت اسلام میں صرف سیاحت نہیں بلکہ عبادات کا ایک جامع پیمانہ ہے۔ اسی سورۃ کے آخر میں ہم سیاحت علمی پر تبصرہ کریں گے انشاء اللہ

نماز ایمانی تربیت کی منزل

نماز ایمانی تربیت کے لیے ایک تریاق مجرب ہے اس کے لیے قرآن میں رکوع وسجود کی تعبیر اختیار فرمائی ہے۔ یہ دونوں نماز کے فرائض میں داخل ہیں اسلام میں جو نماز کا مقام ہے وہ کسی بھی دوسرے عمل کا نہیں ہے۔ مومن کا ہر کام اللہ کی بندگی کا کام ہوتا ہے مگر نماز جیسی بندگی کی شان کسی کام کی نہیں ہوتی ان کا باطن ہی نہیں ظاہر بھی سراپا بندگی ہوتا ہے۔ نماز کی قراءتوں کو دیکھو اور اس کی دعاؤں تسبیحوں اور قراءتوں پر غور کرو۔ عاجزی اور سرافگندگی کے اظہار کی کوئی ممکن شکل نہیں جو نماز کے ظاہر اور اس کے باطن میں موجود نہ ہو یہ سینے کے نیچے ہاتھ باندھے اور آنکھیں جھکائے ادب سے کھڑا ہونا۔ یہ کمر کا خم کرنا یہ زمین پر اپنی پیشانی کا ڈال دینا اور زبان پر اللہ سبحانہ کی حمد کے، تسبیح کے تکبیر کے توحید کے کلمات کا مسلسل جاری رہنا اور یہ دل کا اللہ سبحانہ کی خشیت عظمت اور محبت

سے معمور رہنا۔ آخر بندگی کی کونسی ادا ہے جس سے یہ نماز خالی ہے۔

قرآن و حدیث کا مطالعہ کیجئے تو نماز کی اہمیت اور فضیلت سے ان کے صفحات بھرے نظر آئیں گے نماز ہی ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہے۔ احادیث میں شہادتین کے بعد سب سے پہلے نماز کا ذکر ہے۔ یہ گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ اگر انسان کے اندر ایمان موجود ہے اور اللہ کی معبودیت اور اپنی عبدیت پر اسے یقین ہو تو یہ یقین سب سے پہلے نماز کی صورت میں نمایاں ہوتا ہے قرآن کی آیات اور ارشادات نبوت آپ پڑھیں تو آپ کو محسوس ہوگا کہ ایمان کے بعد سب سے اولیت نماز کو ہے اس انداز بیان سے ہی معلوم ہوتا ہے کہ دل میں اگر ایمان کا بیج پڑ گیا ہو تو اس سے عمل کا جو پہلا پودا نکلے گا وہ نماز کا پودا ہوگا۔

یہاں یہ بات بھی سمجھنے کی ہے کہ جب قرآن نے دوسرے مقامات پر نماز کے لیے اقامت صلاۃ کی تعبیر اختیار کی ہے تو یہاں اقامت کی تعبیر کو چھوڑ کر رکوع و سجود کی تعبیر کیوں اختیار کی ہے۔ اور دل کا پتہ نہیں مگر میرا اپنا خیال یہ ہے کہ یہاں صرف فرض نماز ہی مراد نہیں بلکہ نوافل اور خصوصاً تہجد کی خلوت میں نماز مراد ہے۔ روحانی تربیت کا آغاز اسی نماز سے ہوا ہے۔

امر بالمعروف ونہی عن المنکر

روحانی تربیت کی منازل میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر بھی اہم ترین منزلیں ہیں۔ اب تک جن باتوں کا ذکر ہوا ہے ان کا بیشتر تعلق اپنی ذاتی اصلاح سے ہے اب یہ ان کا تعلق قوم اور جماعت سے ہے یعنی وہ دوسروں کے خیر و شر سے بے تعلق رہ کر زندگی نہیں گذارتے بلکہ دوسروں کی اصلاح کے لیے بھی اپنے اندر تڑپ رکھتے ہیں اور اپنی طاقت و صلاحیت کے مطابق اصلاح منکر کا فرض انجام دیتے ہیں۔

دنیا درحقیقت کش مکش اور جد و جہد کا ایک میدان ہے جس میں تمام انسان باہمی معاونت سے اپنا اپنا راستہ طے کر رہے ہیں۔ راستہ میں سب لوگوں کے ساتھ چلنے میں یقیناً بہت کچھ تکلیفیں ہیں ہر ایک کو دوسرے کی تکلیف و آرام کا لحاظ اور خیال کرنا پڑتا ہے اسی لیے وہ شخص جو ان جماعتی مشکلات سے گھبرا کر الگ ہو جاتا ہے اور صرف اپنا بوجھ اپنے کندھے پر رکھ کر چل کھڑا ہوتا ہے دنیا کے معرکہ کا نامرد سپاہی ہے گوشہ نشینی اور جماعت سے علیحدگی کی اجازت اسلام نے صرف ایک ہی موقع پر دی ہے کہ جماعتی قوام اتنا بگڑ جائے کہ مرکز نظام باقی نہ رہے اور فتنہ فساد کے شعلے

اتنے بھڑک چکے ہوں کہ ان کا بجھانا قابو سے باہر ہو جائے۔ اسی لیے جماعت کے افراد پر انکی طاقت کے مطابق جماعت کے دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ اسی اخلاقی فریضہ کا نام امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہے۔ لیکن یہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر ہر ان پڑھ کا کام نہیں ہے کیونکہ اگر ایسا ہو تو وہ اس کے بہانہ سے فتنہ و فساد پیدا کریں گے۔ سب سے پہلے یہ اس شخص کا کام ہے جو دین کا صحیح علم رکھتا ہو اور جو نصیحت و فہمائش خوش اسلوبی نرمی اور مصلحت کے ساتھ کر سکے یہ تمام احتیاطیں اور تاکیدیں اس لیے کہ لوگوں میں کد اور ضد نہ ہونے پائے اور نیکی کی بجائے برائی کا اندیشہ نہ پیدا ہو جائے۔

اس سے یہ نکتہ بھی خود بخود معلوم ہو رہا ہے کہ جب الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر ہر مسلمان کا ایمانی تقاضا ہے تو اسلام کا علم حاصل کرنا بھی ہر مسلمان کی ایمانی ذمہ داری ہے یہی معنے ہیں کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنھون عن المنکر کے۔

یہاں یہ نکتہ بھی ذہن میں رکھنا چاہیے کہ ان موصوفین کی جس قدر صفات کے ذریعے ان کا چہرہ پیش کیا گیا ہے ان میں توبہ، عبادت، حمد، سیاحت، رکوع وسجود، امر بالمعروف کو بغیر کسی رابطہ اور عطف کے پیش کیا ہے لیکن الناھون عن المنکر کو بذریعہ عطف ذکر کیا گیا ہے؟

شارحین قرآن نے اس پر مختلف گوشوں سے بحث کی ہے۔

قاضی بیضاوی اور قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں کہ واؤ یہ بتانے کے لیے لائے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر دونوں کا مجموعہ اصل میں ایک ہی چیز کے دو عنوان ہیں۔ علامہ خفاجی نے قاضی صاحب موصوف کے ارشاد کی وضاحت اس طرح کی ہے کہ امر بالمعروف جو کرتا ہے وہ ساتھ ہی نہی عن المنکر بھی کرتا ہے اور جو نہی عن المنکر کرتا ہے وہ ساتھ ہی امر بالمعروف بھی کرتا ہے مثلاً نماز پڑھنا ایک معروف ہے تو نماز نہ پڑھنا منکر ہے جب آپ کسی کو نماز کے لیے کہتے ہیں تو یہ اگر ایک طرف امر بالمعروف ہے تو ساتھ ہی یہ نہی عن المنکر بھی ہے۔ کچھ علما نے بتایا ہے کہ عام زبان سے متعلق ہے اس میں کوئی حکمت و علت نہیں ہے عربی زبان میں جب ایک سے زیادہ پیش کرتے ہیں تو ان میں سے کچھ کو عطف کے ذریعے اور کچھ کو بغیر عطف پیش کرتے ہیں جیسے تنزیل الکتاب من اللہ العزیز العلیم غافر الذنب وقابل التوب یہ بات علامہ قرطبی نے بتائی ہے۔

اس موضوع پر سب سے اچھی بات علامہ بقاعی کی تحقیق ہے اس کا تعلق مضمون کی اہمیت

سے ہے وہ فرماتے ہیں:

وہ تمام اوصاف جو بغیر عطف کے پیش کئے گئے ہیں ان میں منشا الٰہی صرف یہ ہے کہ جس قدر کر سکتے ہو کرو۔ اور جن اوصاف کو عطف کے ذریعے پیش کیا ہے ان میں مقصود یہ امر بالمعروف نہی عن المنکر حفظ حدود ہے کہ ان کو بھرپور طریقے پر پوری لگن سے انجام دیا جائے ان میں کوتاہی کرنے والا عمارت اسلام کو گرانے پر راضی ہے کیونکہ نہی عن المنکر عبادت کی ساری قسموں میں سے دشوار ترین عبادت ہے کیونکہ اس کا تعلق اپنے سے کم اور دوسروں سے زیادہ ہے

روحانی تربیت کی آخری منزل

روحانی تربیت کے سلسلے میں آخری منزل یہ ہے والحافظون لحدود اللہ حدود حد کی جمع ہے اس کے معنی لغت میں روک کے آتے ہیں اس سے مراد اللہ سبحانہ کے قوانین ضوابط اور احکام ہیں۔ علامہ آلوسی نے بعض محققین کی طرف نسبت کر کے لکھا ہے کہ حفظ حدود سے مراد یہاں فوجداری قوانین کو نافذ کرنا ہے اور علامہ بقاعی نے اس فقرے کی تشریح اس طرح کی ہے۔

"وہ قوانین جن کو شہنشاہ اعظم نے اس کتاب و شریعت میں بیان کیا ہے"۔

اصل یہ ہے کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو دین اللہ سبحانہ کی جانب سے لے کر آئے ہیں وہ ایک ایسا مکمل نظام ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی فکری اخلاقی اور عمل تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے کچھ اسی طرح جیسے ہوا کا کرہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے۔ اسلام صرف چند رسوم کا نام نہیں ہے اور انسان کی انفرادی زندگی تک محدود نہیں ہے بلکہ یہ ایک مکمل ضابطہ حیات ہے اس میں روحانی نظام کے ساتھ ساتھ اخلاقی نظام، عائلی نظام، معاشرتی نظام، معاشی نظام سیاسی نظام اور قانونی نظام بھی موجود ہے۔ مطلب یہ ہے کہ زندگی کے سارے گوشوں میں اللہ کے قوانین کی حفاظت کرنے والے ہیں ان کی زندگی کا کوئی پہلو بھی قانون الٰہی کی گرفت سے خالی نہیں ہے وہ اول و آخر، خلوت و جلوت، اخلاق، معاشرت معاش، خاندان، قانون، حکومت اور سیاست میں اللہ کے احکام و قوانین کے پابند رہتے ہیں، ان کی معاملات اخلاق کاروبار رہن سہن، نظام حکومت قوانین عدالت سب میں اللہ کے قوانین کی بھرپور نگہداشت ہوتی ہے۔

ایمان کامل کا چہرہ

یہ اوصاف جن کے ذریعے ایک مومن کا چہرہ قرآن نے پیش کیا ہے علامہ بقاعی نے ان اوصاف میں ایک خاص طبعی ترتیب کی نشاندہی کی ہے بیجئے آپ بھی پڑھ لیجئے۔

توبہ کی صفت یہ بتانے کیلئے ہے کہ شرک جیسی معصیت کے داغ سے ان کا دامن ایمان آلودہ نہیں ہے اور عبادت کا وصف یہ بتا رہا ہے کہ یہ ایمان کی زندگی میں رسوم و رواج سے آزاد ہو کر اللہ سے مخلصانہ عابدانہ تعلقات رکھتے ہیں اور حمد یہ بتانے کے لیے ہے کہ ان کا قالب بھی قلب کے ساتھ اللہ کے گن گا کر شائستگی حاصل کر چکا ہے اور السائحون لاکر اشارہ کیا ہے کہ ان کی ایمانی زندگی میں وسعت اور فراخی ہے الراکعون الساجدون سے یہ ظاہر کیا ہے کہ ان میں ظاہر و باطن کے کمالات جمع ہو گئے ہیں الامرون بالمعروف والناھون عن المنکر میں بتایا جا رہا ہے کہ ان کا نیکیوں کا کردار اور برائیوں سے اجتناب صرف ان کی ذات تک محدود نہیں ہے بلکہ ان کی جانب سے اس کا فیضان سوسائٹی میں بھی پہنچ رہا ہے الحافظون لحدود اللہ سے اشارا ہے کہ ان کے اعمال و افکار ہنگامی نہیں بلکہ دائمی ہیں۔ اسی طرح اس آیت کا مقصود انسان کو جسمانی پستی سے اٹھا کر روحانی بلندی کی طرف لے جانا ہے۔

آخر میں وبشر المومنین ہے اس کے معنی ہیں اور اہل ایمان کو خوشخبری دیجیے اور اس سے پہلے جملہ محذوف ہے وبشر المومنین کے بعد مبشر بہ محذوف ہے۔ آلوسی، رازی، قرطبی، ابوحیان اور بیضاوی پہلی بات کو نظر انداز کر گئے لیکن علامہ بقاعی نے خوبصورتی سے معطوف علیہ کی نشاندہی کی ہے فرماتے ہیں کہ پوری بات اس طرح ہے کہ

> آپ ان لوگوں کو جو ان اوصاف سے خالی دامن ہوں ڈرائیے اور جو ان اوصاف سے آراستہ ہوں ان کو خوشخبری دیجیے۔

بشر فعل ہے یہ دو مفعول چاہتا ہے ایک بشارت دوسرے جسے بشارت دی جائے یہاں دوسرا مفعول مومنین کی صورت موجود ہے مگر پہلا مفعول مذکور نہیں ہے شارحین قرآن نے اپنے اپنے انداز میں پیش کیا ہے آلوسی فرماتے ہیں کہ مبشر بہ کو اس لیے حذف کر دیا گیا ہے کہ اس کے بیان کرنے کی الفاظ میں تاب نہیں ہے یعنی جلالت قدر اور عظمت شان کی وجہ سے قاضی بیضاوی نے بھی آلوسی

سے پہلے ہی بات بنائی تھی اور کچھ نے جنت محذوف مانا ہے۔

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ تعبیر میں مومنین کی صراحت فرمائی ہے حالانکہ تقاضائے تعبیر یہ ہے کہ مومنین کی جگہ اسم ضمیر لائی جائے اور بات اس طرح ہو کہ ان کو بشارت دے دیجئے اس صراحت میں کیا راز ہے ؟

شارحین قرآن بتاتے ہیں کہ بتانا یہ ہے کہ ان اوصاف کی قیمت اس وقت ہے جب ایمان کی زمین پر ہوں۔ ان سے ایمان میں حسن و جمال اور کمال اس وقت ہوتا ہے جب اس میں یہ اوصاف ہوں۔ اور مزہ یہ ہے کہ آیت گرامی کا ایمان سے آغاز کر کے ایمان پر خاتمہ کر دیا ہے تاکہ پتہ لگ جائے کہ ایمان میں رسوخ ان اوصاف سے حاصل ہوتا ہے البقاعی لکھتے ہیں کہ اشارہ ہے کہ یہ وہ دسترخوان ہے جس میں طفیلی بھی محروم نہیں جاتا ہے۔ اور یہ بھی بتا دیا کہ روئے سخن راسخین کی طرف ہے جن کو ایمان میں رسوخ نہیں ہے وہ قابل خطاب نہیں ہیں یہ میٹھی سی ان لوگوں پر طنز ہے جو نفاق کی آغوش میں ہیں۔

آیئے آیت کے آخر میں حضرت مولانا اشرف علی رحمہ اللہ کا ایک اچھوتا افادہ بھی پڑھ لیجئے وہ اس پوری آیت پر نوٹ لکھتے ہیں۔

ان صفات کی قید لگانے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کے بغیر جہاد کا ثواب نہیں ملتا کیونکہ نصوص کثیرہ میں صرف جہاد پر بشارات وارد ہیں البتہ ایمان ایک ضروری شرط ہے بلکہ مطلب یہ ہے کہ ان سب کے اجتماع پر ثواب اور فضیلت میں اور کثرت اور قوت زیادہ ہو جاتی ہے تاکہ کرے جہاد پر نہ بیٹھ جاویں بلکہ ان عبادات کو بھی ہمیشہ بجا لاویں اور چونکہ جہاد میں اکثر مال بھی خرچ ہوتا ہے اور جان کا خرچ کرنا زیادہ اہم ہے اس لیے شروع آیت میں تو انفس واموال دونوں کا ذکر فرمایا اور اس کی تفصیل میں صرف جانوں کے خرچ یعنی قتال پر اکتفا فرمایا۔ اور جان خرچ کرنے سے مراد قتال ہے یہ ضروری نہیں ہے کہ مقتول بھی ہو۔ اس سے یہ شبہ جاتا رہا کہ جان تو مرنے کے بعد بھی باقی رہتی ہے پھر اس کو خرچ کرنے کے کیا معنے ہیں [1]

بات ادھوری رہ جائے گی اگر اس موقعہ پر حضرت مولانا ابوالکلام کے تشریحی نوٹ کو نظر انداز کر دیا جائے یہ تشریح اس لائق ہے کہ اسے بار بار پڑھا جائے۔

---

[1] بیان القرآن

یہ بحث اس سورت کے مہمات معارف میں سے ہے فرمایا سچے مومنوں کے اوصاف و مدارج یہ ہیں۔

(ا) التائبون یعنی وہ جو اپنی توبہ میں سچے اور پکے ہوتے ہیں اور بہرحال اللہ کی طرف رجوع کرتے اور اپنی غفلتوں اور لغزشوں پر نادم ہوتے ہیں۔

(ب) العابدون یعنی وہ جو اللہ کی عبادت میں سرگرم رہتے ہیں اور ان کی ساری بندگیاں اور نیاز مندیاں صرف اسی کے لیے ہوتی ہیں۔ عبادت سے مقصود عبادت خاص بھی ہے اور عام بھی خاص یہ کہ خاص وقتوں اور خاص شکلوں میں عبادت جو دین حق نے قرار دیدی ہے اسے پورے اخلاص اور خشوع و خضوع کے ساتھ ادا کرے۔ عام یہ کہ انسان کی فکری حالت عبادت گزارانہ ہو جائے۔ اور پھر وہ جو کچھ سنے جو کچھ بھی کہے جو کچھ بھی کرے سب میں ایک عابدانہ روح کام کر رہی ہو۔

(ج) الحامدون یعنی وہ جو اپنے فکر سے اور اپنے قول سے اللہ کی حمد و ستائش کرنے والے ہیں فکر سے حمد و ستائش یہ ہوئی کہ بحکم ویتفکرون فی خلق السماوات والارض۔ آسمان و زمین کی تخلیق میں غور و فکر کرنا اور ان تمام کارفرمائیوں کی معرفت حاصل کرنا جو اس کی محمودیت و جمال پر دلالت کرتی ہیں۔ قول سے حمد و ستائش اس فکری حالت کا قدرتی نتیجہ ہے کیونکہ جس ہستی کی محمودیت دل و دماغ میں بس جائے گی ضروری ہے کہ زبان سے بھی بے اختیار اس کی حمد و ثنا کے ترانے نکلنے لگیں

(د) السائحون وہ جو راہ حق میں سیر و سیاحت کرتے ہیں یعنی بحکم قد خلت من قبلکم سنن فسیروا فی الارض زمین میں عبرت و نظر کے لیے گردش کرتے ہیں۔ علم کی ڈھونڈھ میں نکلتے ہیں۔ راہ حق میں جدوجہد کرتے ہوئے ایک گوشہ سے دوسرے گوشہ کا رخ کرتے ہیں حج کے لیے خشکی و تری کی مسافتیں طے کرتے ہیں۔

(ہ) الراکعون الساجدون جو اللہ کے آگے جھک جاتے ہیں اور رکوع و سجود سے کبھی نہیں تھکتے۔ یہ رکوع و سجود کی حالت جسم پر بھی طاری ہوتی ہے۔ قلب پر بھی طاری ہوتی ہے زبان پر بھی طاری ہوتی ہے۔

(و) الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر وہ جو نیکی کا حکم اور برائیوں سے روکتے ہیں یعنی صرف اپنے ہی نفس کی اصلاح پر قانع نہیں ہو جاتے بلکہ دوسروں کو بھی اصلاح کرنے اور دنیا میں حق و عدالت کے نشر و قیام کو اپنا فرض سمجھتے ہیں۔

(ز) الحافظون لحدود اللہ یہ آخری وصف اور آخری مقام ہے یعنی وہ ان تمام حدود کی حفاظت کرتے ہیں جو اللہ نے انسان کے لیے ٹھہرا دی ہیں۔ قرآن کی اصطلاح یہ ہے کہ تمام واجبات و حقوق کو خواہ افراد کی زندگی سے تعلق رکھتے ہیں یا جماعت سے وہ حدود اللہ سے تعبیر کرتا ہے یعنی یہ حدیں ہیں جو مقرر کر دی گئی ہیں ان کے ٹوٹنے میں انسانی امن و سعادت کی بنیادوں کا ٹوٹ جانا ہے۔

یہ کل سات وصف ہوئے اور جس ترتیب سے بیان کئے گئے ہیں وہ قابل غور ہے یہ گویا نفس انسانی کے تزکیہ و ترقی کے سات درجے ہیں یا سات طبقے۔ جو یکے بعد دیگرے ٹھیک اسی ترتیب سے سلوک ایمانی میں پیش آتے ہیں۔

جب کوئی شخص معاصی و ہدایت کی راہ میں قدم اٹھائے گا تو قدرتی طور پر پہلا مقام توبۂ انابت ہی کا ہوگا یعنی پچھلی غفلتوں اور گمراہیوں سے خواہ وہ کفر کی ہوں خواہ نفاق کی خواہ معاصی و زلات کی باز آئے گا اور آئندہ کے لیے ان سے بچنے کا عہد کرے گا اور اپنے سارے دل اور ساری روح سے اللہ کی طرف رجوع کرے گا اور یہی توبہ کی حقیقت ہے پھر اگر توبہ سچی ہوگی تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ اللہ کی بندگی و نیاز مندی کی سرگرمی پیدا ہو جائے بس یہ دوسری منزل ہوئی یا سلوک ایمانی کا دوسرا درجہ۔ پھر چونکہ عبادت گذاری کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ فکر اور ذکر کا مقام حاصل ہو جائے اور ملکوت السماوات والارض کے مشاہدہ و معرفت کا دروازہ کھل جائے اس لیے تیسری منزل تسبیح و تحمید کی منزل ہوئی یعنی اللہ کی حمد و ثنا کے جوش سے معمور ہو جانے کی منزل ربنا ما خلقت ھذا باطلا۔ پھر اگر توبہ و انابت کا تنبہ عبادت کا ذوق اور تحمید و تسبیح کا عرفانی درجہ کمال کا ہے تو یہ ممکن نہیں کہ وطن و مکان کی الفت کی زنجیریں نہ ٹوٹیں اور سیر و سیاحت میں قدم سرگرم نہ ہو جائیں یہ چوتھی منزل ہوئی۔ اور السائحون کا طبقہ چوتھا ہوا۔

ان چار منزلوں سے جو کارواں گذر جائے گا اس نے اصلاح نفس کی مسافت طے کر لی۔

بس اب پانچویں منزل الراکعون الساجدون کی ہوئی یعنی بندگی و نیاز مندی میں پورے ہو گئے اور اللہ کے آگے سر نیاز ہمیشہ کے لیے جھک گیا اب الآمرون بالمعروف والناھون عن المنکر کا ان کو مقام حاصل ہو گیا ہے یعنی اپنی تعلیم و تربیت کا کورس پورا کر کے دوسروں کے لیے معلم و مربی ہو جائیں گے چنانچہ چھٹی منزل یہی ہوئی اور

اسی سے آخری منزل کے ڈانڈے مل گئے کہ الحافظون لحدود اللہ کا مقام ہے جہاں
پہنچ کر ان کے تمام اعمال حدود الٰہی کے سانچے میں ڈھل جاتے ہیں وہ خود اپنے اعمال میں بھی
حدود اللہ کی کامل نگہداشت رکھتے ہیں اور اپنے وجود سے باہر بھی ان کے نفاذ و قیام
نگہبانی کرتے ہیں۔[1]

---

[1] ترجمان قرآن

مَا كَانَ لِلنَّبِيِّ وَالَّذِينَ آمَنُوا أَن يَسْتَغْفِرُوا
لِلْمُشْرِكِينَ وَلَوْ كَانُوا أُولِي قُرْبَىٰ مِن بَعْدِ مَا تَبَيَّنَ لَهُمْ
أَنَّهُمْ أَصْحَابُ الْجَحِيمِ ﴿١١٣﴾ وَمَا كَانَ اسْتِغْفَارُ إِبْرَاهِيمَ
لِأَبِيهِ إِلَّا عَن مَّوْعِدَةٍ وَعَدَهَا إِيَّاهُ فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَهُ
أَنَّهُ عَدُوٌّ لِّلَّهِ تَبَرَّأَ مِنْهُ ۚ إِنَّ إِبْرَاهِيمَ لَأَوَّاهٌ حَلِيمٌ ﴿١١٤﴾
وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ قَوْمًا بَعْدَ إِذْ هَدَاهُمْ حَتَّىٰ يُبَيِّنَ لَهُم
مَّا يَتَّقُونَ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿١١٥﴾ إِنَّ اللَّهَ لَهُ مُلْكُ
السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ يُحْيِي وَيُمِيتُ ۚ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ
اللَّهِ مِن وَلِيٍّ وَلَا نَصِيرٍ ﴿١١٦﴾

اللہ کے پیغمبر اور اہلِ ایمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ مشرکین کے
لیے مغفرت کی دعا کریں چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہوں۔ باوجود
یکہ ان پر واضح ہو گیا ہے کہ یہ دوزخ والے ہیں[1] اور حضرت
ابراہیم کی اپنے باپ کے لیے دعا ءمغفرت صرف اس لیے
تھی کہ ابراہیم نے باپ سے دعائے مغفرت کا وعدہ کر لیا تھا

جب حضرت ابراہیمؑ کے سامنے یہ بات کھل کر آگئی کہ وہ اللہ
کا دشمن ہے تو اس سے حضرت ابراہیمؑ نے بیزاری کا اعلان
کر دیا۔ حضرت ابراہیمؑ بڑے ہی درد مند اور بردبار تھے ۲
اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ کسی گروہ کو ہدایت دے کر
پھر اسے بے راہ کر دے تا آنکہ ان کے سامنے ان سب باتوں
کو کھول دے جن سے ان کو بچنا ہے۔ بلاشبہ اللہ سب کچھ جانتا
ہے ۳ یقیناً آسمان و زمین کی بادشاہت اللہ کی ہے وہ
ہی مارتا ہے وہ ہی جلاتا ہے۔ مسلمانو! اللہ کے سوا تمہارا کوئی
کارساز اور کوئی مددگار نہیں ہے ۴

مفردات کے معانی

اواہ اوہ ہے جس کے معنی آہیں بھرنے کے ہیں مبالغہ کا صیغہ بروزن فعال بہت زیادہ آہیں بھرنے والا۔ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں اس کے ایک سے زیادہ مرادی معنے لکھے ہیں مثلاً بہت زیادہ دعا کرنے والا، مومن، رحمدل، فقیہ تسبیح میں مشغول رہنے والا، اللہ کو زیادہ یاد کرنے والا، کتاب اللہ کی بہت زیادہ تلاوت کرنے والا۔ اللہ کے ڈر سے زیادہ آہ آہ کرنے والا بارگاہ الٰہی میں زیادہ گڑگڑانے والا حبشی زبان میں مومن معلم خیر، وعدہ کو پورا کرنے والا۔ گناہوں کو یاد کرتے وقت استغفار کرنے والا۔ مہربان، ہر بری بات سے پلٹ جانے والا۔ شوکانی لکھتے ہیں

لغت کے اعتبار سے اداہ کے زیادہ مناسب معنے اپنے گناہوں پر بہت زیادہ آہ آہ کرنے کے ہیں فراء کی بھی یہی رائے ہے حلیمہ بردبار، تحمل کرنے والا. باد فار حلم سے جس کے معنے جوش غضب سے نفس اور طبیعت کو روکنے یعنی بردباری اور تحمل کرنے کے ہیں بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ ہے۔

مشرکین کے لیے دعائے مغفرت نہیں

زمانہ نبوت کے مسلمانوں نے اللہ کے دین کی خاطر دنیا کے سارے مفادات قربان کر دیئے انہیں اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے لڑنے میں لمحہ کے لیے بھی تامل نہیں ہوا۔ جنہوں نے اسلام کے خلاف تلوار اٹھائی تھی۔ اور اس وقت حالت ہی ایسی ہو گئی تھی کہ کلمہ حق کا ساتھ دینا۔ دنیا کے تمام رشتوں علاقوں کو خیر باد کہہ دینا تھا لیکن اسلام کے جو دشمن لڑتے ہوئے قتل ہو گئے یا اپنی موت مر گئے۔ ان کی حالت زندوں سے مختلف ہو گئی۔ کیونکہ اب وہ زندہ نہ تھے کہ مسلمانوں پر ظلم وستم کرتے یا ان کے خلاف لڑتے۔ کچھ لوگوں کو خیال ہوا کہ جب اللہ کے رسول کی دعا مقبول ہے تو کیوں نہ ہم اپنے ان عزیزوں کے لیے دعا مغفرت کی التجا کریں جو مر چکے ہیں۔ قرآن میں حضرت ابراہیم کے متعلق ہے کہ انہوں نے اپنے باپ کے لیے دعا مغفرت کی تھی حالانکہ وہ مشرک تھا واغفر لابی انہ کان من الضالین۔

کسی شخص کے لیے دعائے مغفرت کے معنی یہ ہیں کہ اول تو ہم اس کے ساتھ ہمدردی رکھتے ہیں دوسرے یہ کہ ہم اس کے قصور کو قابل معافی سمجھتے ہیں۔ یہ دونوں باتیں اس شخص کے معاملہ میں تو درست ہیں جو وفاداروں کے زمرے میں شامل ہو اور صرف گنہ گار ہو۔ لیکن جو شخص کھلا ہوا باغی ہو، اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جرم کو قابل معافی سمجھنا نہ صرف یہ کہ اصولاً غلط ہے بلکہ اس سے خود ہماری وفاداری بھی مشتبہ ہو جاتی ہے۔ اور اگر ہم محض اس بنا پر کہ وہ ہمارا رشتہ دار ہے یہ چاہیں کہ اسے معاف کر دیا جائے تو اس کے معنے یہ ہیں کہ ہمارے نزدیک رشتہ داری کا تعلق اللہ سبحانہ کی وفاداری سے زیادہ قیمتی ہے اور یہ کہ اسلام کے ساتھ ہماری محبت بے لاگ نہیں ہے یہ تمام باتیں غلط ہیں اخلاص و وفاداری کے خلاف ہیں اور اس ایمان کے منافی ہیں۔

۱۱۸ اللہ کے پیغمبر اور اہل ایمان کو یہ زیب نہیں دیتا کہ مشرکین کے لیے دعا مغفرت کریں چاہے وہ ان کے رشتہ دار ہوں باوجودیکہ ان پر واضح ہو چکا ہے کہ یہ لوگ دوزخ والے ہیں مومنین جب جان و مال سے اللہ سبحانہ کے ہاتھ بیع ہو چکے تو ضروری ہے کہ تنہا اسی کے ہو کر رہیں۔ اعداء اللہ سے جن کا

دشمن خدا اور جہنمی ہونا معلوم ہو چکا ہو محبت و مہربانی کا واسطہ نہ رکھیں خواہ یہ دشمنان خدا ان کے ماں باپ چچا تایا اور خاص بھائی بند کیوں نہ ہوں جو خدا کا باغی اور دشمن ہے وہ ان کا دوست کیسے ہو سکتا ہے پس جس شخص کی بابت پتہ چل جائے کہ بالیقین دوزخی ہے خواہ وحی الہی کے ذریعے سے یا اس طرح کہ علانیہ کفر و شرک پر اس کی موت ہو چکی ہو اس کے حق میں استغفار کرنا اور بخشش مانگنا ممنوع ہے۔

بعض روایات میں ہے کہ یہ آیت آنحضرت کی والدہ حضرت آمنہ کے بارے میں نازل ہوئی۔ کچھ حدیثوں میں ہے کہ آپ کے چچا ابوطالب کے حق میں اتری اور بعض نے نقل کیا ہے کہ مسلمانوں نے چاہا اپنے آبا مشرکین کے لیے جو مر چکے تھے مغفرت کی دعا کریں اس آیت ان کو منع کیا گیا۔ بہر حال شان نزول کچھ ہو حکم یہ ہے کہ کفار و مشرکین کے حق میں جن کا خاتمہ کفر پر ہو چکا ہے استغفار جائز نہیں ہے[1]

استغفار کی ممانعت کی وجہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے باغیوں کے لیے مغفرت کی دعا کرنا اس ایمان کے منافی ہے کہ اللہ سبحانہ اور ان کے دین کے ساتھ ہماری محبت بالکل بے لاگ ہو۔ اللہ کا دوست ہمارا دوست ہو اور اللہ کا دشمن ہمارا دشمن۔ اسی لیے اللہ سبحانہ نے یہ نہیں فرمایا کہ مشرکین کے لیے دعائے مغفرت نہ کرو بلکہ یوں فرمایا کہ تمہارے لیے یہ زیبا نہیں ہے کہ تم ان کے لیے مغفرت کی دعا کرو یعنی ہمارے منع کرنے سے اگر تم باز رہے تو کچھ بات نہیں تم میں تو خود وفاداری کی حس اتنی تیز ہونی چاہیے کہ جو ہمارا باغی ہے اس کے ساتھ ہمدردی رکھنا اور اس کے جرم کو قابل معافی سمجھنا تم کو اپنے لیے نازیبا محسوس ہو۔

یہ آیت بتا رہی ہے مرنے کے بعد مرنے والے کے حق میں دعا کرنا ایک بڑا حق ہے جو مرنے والے کا زندوں پر رہ جاتا ہے۔ پوری سورت میں کافروں سے ترک تعلقات کے احکام ہیں۔ اب حکم یہ ہو رہا ہے کہ کافروں کی حد تک اس بڑے حق سے دست بردار ہو جائیں جرم شرک ان کے اس حق کو بالکل مٹا دیتا ہے ولو کانوا اولی قربی اس سے معلوم ہوا کہ کفر کی موجودگی میں نجات کے لیے قرابت شرعی سبب نہیں۔ اور تو اور نبی کی قرابت بھی مفید نہیں۔ بیٹا نبی ہو باپ کافر ہو باپ نبی ہو بیٹا کافر ہو چچا کافر ہو بھتیجا نبی ہو بیوی کافرہ ہو شوہر نبی ہو یہ تمام قرابتیں کفر کی موجودگی میں سامان نجات نہیں اگرچہ نبی سے ہوں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علامہ بقاعی اور علامہ قرطبی نے من بعد ما تبین سے یہ نکتہ خوب معلوم کیا ہے کہ کافر زندہ کی ہدایت و مغفرت کے لیے دعا کرنی جائز ہے کیونکہ جہنمی ہونا ہمیں معلوم نہیں ہے ہاں وہ کافر جو مرچکا ہے اور کفر ہی پر جس کی موت ہوئی ہے اس کے لیے مغفرت کی دعا جائز نہیں ہے ۔

آیت کا سبب نزول

شارحین قرآن نے اس آیت کا پس منظر متعین کرنے میں ایک سے زیادہ واقعات لکھ دیے ہیں۔ سب سے پہلے صحیح بخاری کے حوالہ سے بتایا ہے کہ یہ آیت ابوطالب کی وفات کے وقت اس موقع پر نازل ہوئی جب وہ دم والپسیں میں تھے اور حضور ان کو دعوت اسلام دے رہے تھے انہوں نے آپکی دعوت قبول نہیں کی تو یہ آیت گرامی نازل ہوئی۔ آلوسی لکھتے ہیں والآیۃ علی الصحیح نزلت فی ابی طالب مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ ابوطالب کا انتقال ہجرت سے تین سال پہلے ہوا ہے اور سورہ برات کا نزول سنہ ۹ھ میں ہوا ہے یہ امت کے نام ایک وداعی پیام ہے۔ حافظ عسقلانی نے فرمایا ہے کہ حضور اقدس ابوطالب کی وفات سے سنہ ۹ھ تک یعنی پورے بارہ سال تک استغفار کرتے رہے ہوں گے مدت کے بعد مدینہ میں ممانعت کی بات بتائی ہے مگر بات بنی نہیں ہے۔ آلوسی نے اعتراض کی گرفت سے بچنے کے لیے یہ بات بنائی ہے کہ آیت کا نزول دو بار ہوا ہے۔ قرطبی الحسین الفضل کے حوالہ سے لکھتے ہیں کہ یہ کہانی بعید از عقل ہے کیونکہ سورہ برات نزول میں آخری سورت ہے جب کہ ابوطالب کا انتقال آغاز اسلام میں مکہ میں ہوچکا تھا۔ اور اس کا قرطبی نے کوئی جواب نہیں دیا ہے۔ اس موضوع پر یہ سب سے زیادہ صحیح روایت کا حال ہے۔ باقی روایات وہ ہیں جن کی محدثین نے تضعیف کی ہے ۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ استیناف بیانی ہے چونکہ پوری سورت میں اس پر زور دیا گیا ہے کہ دشمنوں سے اعانت و رفاقت کے تعلقات نہ رکھو اگرچہ وہ تمہارے قرابت دار ہی کیوں نہ ہوں یہاں یہ سوال خود بخود چٹکیاں لینے لگا کہ زندوں سے تعلقات تو منقطع ہیں کیا مرنے کے بعد بھی ایسے لوگوں کے لیے اللہ سے مغفرت کی دعا نہ کرنی چاہیئے۔ فرمایا کہ جب تمہیں پتہ ہے کہ ان کی زندگیوں کا خاتمہ کن اعمال پر ہوا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ بیس برس تک داعی حق اور دعوت حق کے جانی دشمن رہے اور کفر و جحود اور ظلم و جور کی کوئی شرارت بھی ایسی نہیں ہے جو انسان کرسکتا ہو اور انہوں نے نہ کی ہو پھر ان کی زندگی کا خاتمہ بھی اسی عالم میں ہوا اور اپنے اعمال پر ایک منٹ بھی شرمندہ نہیں ہوئے۔

جن لوگوں کی حالت ایسی ہو چکی ہو ان کے دوزخی ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے۔ ایسے لوگوں کے لیے مغفرت مانگنا ایمان سے وفاداری کے خلاف ہے اور ایسا کرنا نہ پیغمبر کی شان ہے اور نہ تمہیں زیبا دیتا ہے

حضرت ابراہیم کی دُعا باپ کیلئے

۱۱۹ اور حضرت ابراہیم کی اپنے باپ کے لیے دعائے مغفرت صرف اس لیے تھی کہ ابراہیم نے اپنے باپ سے دعائے مغفرت کا وعدہ کر لیا تھا جب حضرت ابراہیم کے سامنے یہ بات کھل کر آگئی کہ وہ اللہ کا دشمن ہے تو اس سے حضرت ابراہیم نے بیزاری کا اعلان کر دیا حضرت ابراہیم بڑے ہی دردمند اور بردبار تھے۔ سورہ مریم میں ہے کہ جب ابراہیم کے باپ نے قبول حق سے اعراض کیا۔ اور ضد وعناد سے حضرت ابراہیم کو قتل کی دھمکیاں دینے لگا تو آپ نے والدین کا ادب ملحوظ رکھتے ہوئے فرمایا سلام علیک ساستغفر لک ربی انہ کان بی حفیا میں اللہ سے تیرے لیے استغفار کروں گا۔ اس وعدہ کے مطابق آپ برابر استغفار کرتے رہے چنانچہ دوسری جگہ فرمایا اغفر لابی اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ ابراہیم علیہ السلام ایک مشرک کی حالت شرک پر قائم رہتے ہوئے مغفرت چاہتے تھے۔ نہیں غرض یہ تھی کہ اس کو توفیق دے کہ حالت شرک سے نکل کر آغوش اسلام میں آجائے اور قبول اسلام اس کی خطاؤں کے معاف ہونے کا سبب بنے ان الاسلام یھدم ما کان قبلہ ابراہیم علیہ السلام کے استغفار کو قرآن میں پڑھ کر بعض صحابہ کے دلوں میں خیال آیا کہ ہم بھی اپنے مشرک والدین کے حق میں استغفار کریں اس کا جواب حق تعالیٰ شانہ نے دیا کہ ابراہیم نے وعدہ کی بنا پر صرف اس وقت تک اپنے باپ کے لیے استغفار کیا جب تک یقینی طور پر یہ واضح نہیں ہوا تھا کہ اسے کفر و شرک اور خدا کی دشمنی پر مرنا ہے کیونکہ مرنے سے پہلے احتمال تھا کہ توبہ کر کے مسلمان ہو جائے اور بخشا جائے پھر جب کفر و شرک پر خاتمہ ہونے سے صاف کھل گیا کہ وہ حق کی دشمنی سے باز آنے والا نہ تھا تو ابراہیم اس سے بالکلیہ بیزار ہو گئے اور دعا استغفار وغیرہ ترک کر دیا پہلے نرم دلی اور شفقت سے دعا کرتے تھے جب توبہ رجوع کے احتمالات ختم ہو گئے تو آپ نے اس کی خیر خواہی سے ہاتھ اٹھا لیے اور اس حادثہ کو پیغمبرانہ صبر و تحمل سے برداشت کیا۔

حدیث میں ہے کہ میدان حشر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام عرض کریں گے کہ خداوندا تیرا وعدہ ہے کہ مجھے رسوا نہ کرے گا اور اس سے زیادہ کیا رسوائی ہو گی کہ آج میرا باپ سب کے سامنے دوزخ میں

پھینکا جائے۔ اسی وقت ان کے باپ کی صورت مسخ ہو کر ضبع کفتار کی سی ہو جائے گی اور فرشتے گھسیٹ کر دوزخ میں پھینک دیں گے۔ شاید یہ اس لیے ہو کہ لوگ اسے پہچان نہ سکیں کیونکہ رسوائی کا دارومدار شناخت پر ہے جب شناخت نہ رہے گی کیا چیز دوزخ میں پھینکی گئی ہے۔ پھر بیٹے کی رسوائی کا کچھ مطلب نہیں ہے [1]

یہاں علامہ بقاعی نے یہ بلیغ نکتہ لکھا ہے کہ وما کان استغفار کا معطوف علیہ محذوف ہے پوری عبارت یوں تھی فما استغفر لھم بعد العلم احد من المومنین وما کان استغفار ابراھیم الخ یعنی اللہ کی جانب سے استغفار کی ممانعت معلوم ہو جانے کے بعد اہل ایمان میں سے کسی نے مغفرت کی دعا نہیں کی اور حضرت ابراہیم کی استغفار تو وعدہ کی وجہ سے تھی۔ وما کان استغفار سے اس شبہ کا ازالہ کر دیا جو بعض طبیعتوں کو ہوا تھا فرمایا اور حضرت ابراہیم نے جو اپنے باپ کے لیے مغفرت کی دعائیں کی تھیں تو صرف اس لیے کہ جب تک آدمی میں زندگی کے انفاس جاری ہیں اسکی ہدایت واصلاح سے قطعی مایوسی نہیں ہوتی اگرچہ کتنا ہی گمراہی و شقاوت میں ڈوبا ہوا ہو کیونکہ ہو سکتا ہے کہ مرنے سے پہلے باز آجائے کیونکہ جب تک ان کا باپ زندہ رہا وہ مایوس نہ ہوئے اور برابر دعائیں کرتے رہے۔ یہ بات انہوں نے اپنے باپ سے کہہ دی تھی جب اس سے الگ ہوئے تھے اور وہ اپنی بات کے پکے تھے لیکن جب وہ کفر و جحود کی حالت میں مر گیا تو ان پر واضح ہو گیا کہ وہ اپنی روش سے باز آنے والا نہ تھا لہذا وہ اپنی دعا سے دست بردار ہو گئے۔

چنانچہ قرآن نے سورہ مریم اور ممتحنہ میں ان کے اس وعدے کا ذکر کیا ہے سورہ مریم میں ہے کہ جب ان کے باپ نے غصہ میں آکر انہیں نکال دیا اور کہا کہ اگر تو اپنی روش سے باز نہ آیا تو سنگسار کردوں گا تو انہوں نے کہا سلام علیک ساستغفر لک ربی انہ کان بی حفیا اچھا میں جاتا ہوں۔ تجھ پر سلامتی ہو۔ اب میں اپنے پروردگار سے تیری بخشش کی دعا کروں گا وہ مجھ پر بہت مہربان ہے۔ اور سورہ ممتحنہ میں ہے کہ حضرت ابراہیم نے اپنے خاندان سے تمام تعلقات منقطع کر لیے تھے مگر صرف اتنا واسطہ اپنے باپ سے رکھا کہ لاستغفرن لک وما املک لک من اللہ من شئ میں ضرور تیری بخشش کا طلب گار رہوں گا اس سے زیادہ تیرے لیے میرے اختیار میں کچھ نہیں ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہی حال رہا کہ دشمنان حق کے لیے ان کی زندگی میں برابر طلبگار

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بخشش رہے کہ ابھی منقطع نہیں ہوئی تھی جنگ احد میں جب آپ کا چہرہ مبارک زخمی ہو گیا تھا تو زبان مقدس پر یہی دعا طاری تھی رب اغفر لقومی فانھم لا یعلمون۔

آخر میں حضرت ابراہیم کا جوہر پیش کرتے ہوئے فرمایا ان ابراھیم لاواہ حلیم یہ حضرت ابراہیم کی تعریف اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اللہ سبحانہ کو حضرت ابراہیم کی باپ کے معاملے میں دردمندی اور بردباری بہت پسند آئی۔ ادھر سورہ مریم کی آیت کا جو حوالہ ہم نے دیا ہے اس کے سیاق وسباق کو قرآن میں پڑھئے تو معلوم ہوتا ہے کہ آذر نے اس موقع پر حضرت ابراہیم کے ساتھ نہایت سنگدلی کا برتاؤ کیا تھا مگر سعادتمند بیٹے نے حلم و بردباری سے نہ صرف باپ کی جھڑکی اور دھمکی برداشت کی بلکہ بہت زیادہ دردمندی اور دلسوزی کے ساتھ اس کے لیے دعا واستغفار کا بھی وعدہ کیا۔ غور فرمایئے کہ ایسے دردمند بیٹے نے جب باپ سے اعلان برأت کیا ہو گا تو جگر پر کتنا بھاری پتھر رکھ کر کیا ہو گا لیکن چونکہ حضرت ابراہیم کے قلب میں اللہ کی محبت تھی اس لیے اپنے قرابت پدری کو قرب خداوندی پر قربان کر دیا۔ اللہ کو یہ پسند ہے کہ بندہ اس کی محبت میں موم بھی ہے اور پتھر بھی اس لیے حضرت ابراہیم نے یہ دونوں پہلو نمایاں کر دیئے۔

یہاں حضرت مولانا اشرف علیؒ کا یہ افادہ بہت ہی خوبصورت ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن میں جو ابراہیم کی دعا آئی ہے واغفر لابی اس کے معنی یہ ہیں واھد ابی (میرے باپ کو ہدایت دے) اور انہ کان من الضالین اس کے بہت ہی مناسب ہے اور ایک آیت میں جو والدین کے لیے مغفرت کی دعا ہے یوم یقوم الحساب فرمایا ہے وہاں یہ مطلب ہے اھدھما للتدخلا یوم یقوم الحساب اور حدیث بخاری میں جو آیا ہے کہ ابراہیم علیہ السلام قیامت کے دن فرمائیں گے انک وعدتنی ان لا تخزنی یوم یبعثون اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہو گا انی حرمت الجنۃ علی الکافرین اور پھر ارشاد ہو گا ما تحت رجلیک اور ان کو وہ بشکل کفتار نظر آئے گا پھر دوزخ میں پھینک دیا جائے گا۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں کہ آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ قیامت کی رسوائی سے بچا دوں گا اور اس میں ایک طرح کی رسوائی ہے کہ میرا باپ اس حالت میں ہو تو اس سے مجھ کو بچایئے اور اللہ تعالیٰ کے ارشاد کا حاصل یہ ہو گا کہ رسوائی سے بچانے کا ایک ہی طریق تو نہیں ہو سکتا کہ اس کی مغفرت کر دی جائے ہم دوسری صورت تجویز کرتے ہیں کہ اس کو مسخ کرتے ہیں کہ کوئی اسے پہنچانتے نہیں۔ اور تم کو شرمندگی نہ ہو۔ خوب سمجھ لو اور یہ بھی یاد رکھو کہ حضرت ابراہیم کا استغفار کرنا جس طرح پر واقع ہے اس طرح اوروں کے لیے بھی جائز ہے لہ

(حاشیہ اگلے صفحہ پر)

سعادت وشقاوت کا قانون

۲۰لے اور اللہ کی یہ شان نہیں ہے کہ کسی گروہ کو ہدایت دے کر پھر اسے بے راہ کر دے تا آنکہ ان کے سامنے ان سب باتوں کو کھول دے جن سے ان کو بچنا ہے بلاشبہ اللہ سب کچھ جانتا ہے یعنی اتمام حجت اور اظہار حق سے پہلے خدا کسی کو گمراہ نہیں کرتا۔ گمراہی یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہ اپنے احکام صاف کھول کر بیان کر چکا ہو پھر امتثال نہ کیا جائے گویا اشارہ کر دیا کہ جو لوگ ممانعت سے پہلے مشرکین کے لیے استغفار کر چکے ہیں ان پر مواخذہ نہیں لیکن اب اطلاع پانے کے بعد ایسا کرنا گمراہی ہے لے یعنی اللہ پہلے یہ بتا دیتا ہے کہ کن لوگوں کو کن خیالات کن اعمال اور کن طریقوں سے بچنا چاہیے پھر جب وہ باز نہیں آتے اور غلط فکری و غلط کاری پر اصرار کیے چلے جاتے ہیں تو اللہ تعالیٰ بھی ان کی ہدایت و رہنمائی سے ہاتھ کھینچ لیتا ہے اور اسی غلط راہ پر انہیں دھکیل دیتا ہے جس پر وہ خود جانا چاہتے ہیں۔ جس سے یہ ارشاد ایک قاعدہ کلیہ بیان کرتا ہے جس سے قرآن حکیم کے وہ تمام مقامات اچھی طرح سمجھ میں آسکتے ہیں جہاں ہدایت دینے گمراہ کرنے کو اللہ تعالیٰ نے اپنا فعل بتایا ہے۔ اللہ سبحانہ کا گمراہی میں ڈالنا یہ ہے کہ جو صحیح طریق فکر و عمل اس نے بتا دیا ہے اگر اس کے خلاف چلنے ہی پر اصرار کرے اور سیدھا نہ چلنا چاہے تو اللہ سبحانہ اس کو زبردستی سیدھے راستہ پر نہیں چلاتا بلکہ جدھر وہ خود جانا چاہتا ہے اسی طرف اس کو جانے کا سامان فراہم کر دیتا ہے۔

اصل میں تو یہ آیت قانون سعادت وشقاوت بتا رہی ہے لیکن اس آیت میں بعد از ہدا ھم جس لطیف انداز میں آیا ہے اس میں اہل ایمان کو ایک بلیغ تنبیہ بھی ہے کہ اللہ سبحانہ نے تمہیں ہدایت دینے کے بعد ان خطرات سے بھی آگاہ کر دیا ہے جن سے صراط مستقیم کے مسافر کو دو چار ہونا پڑتا ہے اب یہ تمہارا فرض ہے کہ صراط مستقیم پر چلتے ہوئے دامن ایمان کو ان خطرات سے بچا کر رکھو۔ اگر تم نے دامن ایمان کو نہ بچایا تو راہ حق سے بھٹکنے کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ آخر میں فرمایا ان اللہ بکل شئی علیم یہ بھی اس کی علت ہے کیونکہ اللہ سبحانہ ظاہر و باطن ہر چیز سے آگاہ ہے۔

(پچھلے صفحہ کا حاشیہ) لے بیان القرآن پارہ نمبر ۱۱

سے افادات شیخ الاسلام

کائنات میں بادشاہت اللہ کی ہے

۱۲۱ یقیناً آسمان وزمین کی بادشاہت اللہ کی ہے وہ ہی مارتا ہے وہ ہی جلاتا ہے مسلمانو! اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز اور کوئی مددگار نہیں ہے جب اس کی سلطنت ہے تو اسی کا حکم چلنا چاہیے وہ علم محیط اور قدرت کاملہ ہے جو احکام نافذ کرے بندوں کا کام ہے کہ بلا خوف وخطر اس کی تعمیل کریں کسی کی رو رعایت کو دخل نہ دیں کیونکہ اللہ کے سوا کوئی کام آنے والا نہیں ہے[1]

علامہ بقاعی نے نظم الدرر میں آیت کی تشریح میں بڑا ہی لطیف انداز اختیار کیا ہے۔

اللہ سبحانہ اس کائنات کا ملک اعظم ہے۔ کائنات پر اقتدار اسی کا ہے اس پر سب کچھ ظاہر ہے وہ ہی جانتا ہے نہیں نقصان وہ با نفع رساں کیا ہے۔ وہ ہی زندگی اور موت دیتا ہے جسمانی زندگی بھی اور ایمانی زندگی بھی اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز اور مددگار نہیں ہے۔ یہاں جسمانی موت وحیات کا ذکر نہیں۔ مقصود یہ ہے کہ نجات وبخشش کا رشتہ اسی کے ہاتھ میں ہے اور جس طرح اجسام کی موت وحیات اس کے حکم سے ہے اسی طرح روح کی ہدایت وضلالت کا معاملہ بھی اسی کے حکم پر موقوف ہے اور اس کے حکم سے مقصود اس کے ٹھہرائے ہوئے قوانین ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لَقَدْ تَّابَ اللّٰهُ عَلَى النَّبِيِّ وَ
الْمُهٰجِرِيْنَ وَالْاَنْصَارِ الَّذِيْنَ اتَّبَعُوْهُ فِيْ سَاعَةِ الْعُسْرَةِ
مِنْۢ بَعْدِ مَا كَادَ يَزِيْغُ قُلُوْبُ فَرِيْقٍ مِّنْهُمْ ثُمَّ تَابَ عَلَيْهِمْ ؕ
اِنَّهٗ بِهِمْ رَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۱۷﴾ وَّعَلَى الثَّلٰثَةِ الَّذِيْنَ خُلِّفُوْا ؕ
حَتّٰۤى اِذَا ضَاقَتْ عَلَيْهِمُ الْاَرْضُ بِمَا رَحُبَتْ وَضَاقَتْ
عَلَيْهِمْ اَنْفُسُهُمْ وَظَنُّوْۤا اَنْ لَّا مَلْجَاَ مِنَ اللّٰهِ اِلَّاۤ اِلَيْهِ ؕ ثُمَّ
تَابَ عَلَيْهِمْ لِيَتُوْبُوْا ؕ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ التَّوَّابُ الرَّحِيْمُ ﴿۱۱۸﴾ ع ۸ ۱۴ ۳

بلاشبہ اللہ سبحانہ اپنی رحمت سے اپنے نبی پر متوجہ ہو گیا اور نبی
کے ان مہاجرین وانصار ساتھیوں پر جنہوں نے نبی کی تنگی کے
وقت میں پیروی کی باوجودیکہ حالت ایسی ہو چکی تھی کہ قریب تھا
کہ ان میں سے کچھ کے دل ڈگمگا جائیں وہ اپنی رحمت سے
سب پر متوجہ ہو گیا[1] بلاشبہ وہ ان پر بڑا ہی شفقت کرنے
والا مہربان ہے[2] اور ان تین پر بھی اللہ کی رحمت متوجہ
ہوئی جو انتظار میں پیچھے چھوڑ دیے گئے تھے[3] اور اس وقت

متوجہ ہوئی) جب کہ زمین اپنی ساری کشائشوں کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی تھی اور وہ خود بھی اپنے سے تنگ آگئے تھے اور ان کو پتہ لگ گیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر ان کے لیے کہیں کوئی پناہ نہیں ہے اللہ ان پر اپنی رحمت سے لوٹ آیا تاکہ وہ رجوع کریں بلاشبہ اللہ بڑا ہی توبہ قبول کرنیوالا بڑا ہی مہربان ہے ۞

مفردات کے معانی

تاب توب سے ہے مصدر توبہ بھی آتا ہے توبہ کرنا۔ گناہ سے باز آنا توبہ کی توفیق دینا۔ توبہ قبول کرنا۔ لازم اور متعدی دونوں آتا ہے۔ بغیر صلہ کے بھی آتا ہے اور صلہ علی اور الی بھی آتا ہے علی صلہ آئے تو یہ قبول کرنا اور بندے کو توبہ کی توفیق دینا ہوتے ہیں تاب اللہ علیہ اور بغیر صلہ کے آئے جیسے تاب العبد تو توبہ قبول کرنے کے معنی آتے ہیں اور اگر صلہ الی آئے تو اس کے معنے بھی توبہ کرنا اللہ کی طرف توجہ کرنا ہوتے ہیں توبوا الی اللہ جمیعاً غرض جب علی کے ساتھ استعمال ہوتا ہے تو متعدی ہوتا ہے اور توبہ کی توفیق دینے کے معنی میں آتا ہے اور بغیر علی کے آتا ہے تو لوٹنے اور تائب ہونے کے معنی میں آتا ہے۔ امام خطابی فرماتے ہیں کہ توبہ کے معنے گناہ کے بعد طاعت کی طرف لوٹنے کے ہیں۔

یزیغ یہ زیغ سے زاغ یزیغ ہے امام راغب فرماتے ہیں کہ اس کے معنی اعتدال سے ہٹنے کے ہیں فی قلوبھم زیغ میں یہی معنے ہیں۔

عسرۃ تنگی، تنگدستی، مفلسی اسم ہے قاضی محمد بن الشوکانی لکھتے ہیں کہ عسرۃ مال نہ

ہونے کے سبب حالت کی تنگی کو کہتے ہیں ساعۃ العسرۃ مشکل کی گھڑی اس سے مراد غزوہ تبوک کی سختی کا زمانہ ہے۔ کیونکہ اس وقت سخت قحط اور شدت کی گرمیاں تھیں۔ پھر کھجور کا موسم اور سفر بہت لمبا ہے بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ ایک ایک کھجور پر دو دو سپاہیوں نے گذر کیا بلکہ بہت سے مجاہدین نے تو صرف ایک ہی کھجور کو باری باری چوس کر اوپر سے پانی پی لیا اور اللہ کا شکر کیا۔ پانی کی قلت بھی ہو گئی تھی ادھر سواری کی کمی کا حال یہ تھا کہ دس دس آدمی ایک ایک اونٹ پر باری باری سوار ہوتے تھے۔ ان مشکلات کی وجہ سے اس غزوہ کو غزوۃ العسرہ اور جیش العسرہ کہتے ہیں یہ غزوہ ماہ رجب ۹ھ ہجری میں پیش آیا تھا۔

ایمان کی اصلی کسوٹی

آغاز اسلام میں جن لوگوں نے اسلام کی دعوت کو شرف پذیرائی دیا تھا اور انہوں نے اپنی زندگی کی راہیں جس دعوت پر استوار کی تھیں وہ ایک جاندار انقلاب انگیز اور متحرک نظام فکر و عمل تھا جس کا خمیر جہاد و صبر کی ولولہ انگیزیوں سے تیار ہوا تھا جس میں ایثار و قربانی کی ایک دنیا آباد تھی اور جس میں افراد کی شخصی نجات کا ہی نہیں بلکہ پوری انسانیت کی نجات کا تصور اور جذبہ کارفرما تھا جہاد فی سبیل اللہ ان کے اخلاص و انقیاد کا پیمانہ تھا۔ اسلامی نصب العین کی ترقی اور اسلامی نظام تمدن اور طرز فکر کی تبلیغ ان کی زندگی کا اتنا عظیم سرمایہ تھا کہ اگر کبھی ان سے اس کام میں کوتاہی ہو جاتی تو ساری ریاضتیں اور محنتیں ان کی نگاہ میں ہیچ ہو جاتیں۔

ذرا غور فرمایئے یہ مخاطبت کن لوگوں سے ہو رہی ہے ان سے جن کی نمازیں اور عبادتیں یکسر خلوص و للہیت سے معمور تھیں جن کے اعمال صالحہ اور فضائل اخلاق دنیا کی ساری تاریخ میں اپنی نظیر نہیں رکھتے جن کے درجات اور علو مرتبت پر خود قرآن گواہی دے رہا ہے اس کے باوجود ان سے کہا جا رہا تھا اخرون مرجون من امر اللہ اما ان یعذبھم و اما ان یتوب علیھم۔ اب ان کی توبہ کو نقل تاب اللہ کے ذریعے شرف قبول عطا ہونے کا اعلان کیا جا رہا ہے۔ آج جو لوگ یہ خیال کرتے ہیں ہمارا دعوی ایمان اسلامی نام کافی ہے غور کرنا چاہیے کہ صحابہ کرام کا اس میدان میں مقام یہ ہے تو ہم کس شمار و قطار میں ہیں جب کہ اللہ کے دین کو بلند کرنے اور اسلام کو دنیا میں غالب کرنے کے لیے ادنی ترین قربانی دینے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں بلکہ ہمارے دل بھی اس کی تمنا سے خالی ہو چکے ہیں۔

۱۱۲؎ بلاشبہ اللہ سبحانہ اپنی رحمت سے اپنے نبی پر متوجہ ہو گیا اور نبی کے ان مہاجرین وانصار ساتھیوں پر جنہوں نے نبی کی پیروی کی تنگی کے وقت میں باوجودیکہ حالت ایسی ہوگئی تھی کہ قریب تھا کہ ان میں سے کچھ کے دل ڈگمگا جائیں وہ رحمت سے ان سب پر متوجہ ہوگیا۔ تنگی کی گھڑی سے مراد غزوۂ تبوک کا زمانہ ہے جس میں کئی مشکلات جمع تھیں سخت گرمی طویل مسافت، کھجور کا موسم۔ اس وقت کی عظیم الشان سلطنت کے مقابلہ پر فوج کشی پھر ظاہری بے سروسامانی ایسی کہ ایک کھجور دو سپاہیوں پر تقسیم ہوتی تھی۔ آخر میں یہ نوبت آگئی کہ بہت سے مجاہدین ایک کھجور کو چوس کر پانی پی لیتے تھے۔ پھر پانی کے نہ ہونے کی وجہ سے اونٹوں کی آلائش نچوڑ کر پینے کی نوبت آگئی، سواری کا اتنا قحط تھا کہ دس دس آدمی ایک ایک اونٹ پر اترتے چڑھتے جارہے تھے وہ جذبہ ایثار وفداکاری تھا جس نے مٹھی بھر جماعت کو تمام دنیا کی قوموں پر غالب کر دیا؎

اب قبولیت توبہ کی عام بشارت کا اعلان ہے یہ پیچھے پڑھ آئے ہو کہ سورہ برات امت کے نام ایک وداعی پیام ہے اس نے اسلامی معاشرے کو خس وخاشاک سے غزوہ تبوک کے ذریعے بالکل پاک کر دیا۔ اس تنقید کے بعد تمام عناصر الگ ہو گئے صرف وہ لوگ بچ رہے جن کی حیثیت خالص سونے کی ہے۔ ان میں سے اگر کسی کے دل پر وقتی طور پر کوئی غبار آیا تو اس کو لقد تاب اللہ کی منادی نے بالکل صاف کر دیا ہے۔ جو طبقہ اس غزوہ کے بعد اسلامی معاشرہ میں نکھر کر سامنے آیا ہے وہ قرآن کے لفظوں میں بلا استثناء مہاجرین وانصار کا ہے اور ان کو نکھارنے والے اور زر خالص بنانے والی کسوٹی قرآن نے یہ بتائی ہے الذین اتبعوہ فی ساعۃ العسرۃ یعنی وہ مہاجرین وانصار جنہوں نے ساعۃ العسرۃ یعنی پر آشوب حالات میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کی ہے۔

اس نکھار میں مہاجرین وانصار کی تشریف اور قدر افزائی کی خاطر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کیا ہے اور اس لیے بھی یہاں حضور اقدس کا شروع میں ذکر آیا ہے کہ آپ کی ذات گرامی توبہ کی صورت میں مہاجرین وانصار پر رحمت کی بارش بن کر آنے کا ذریعہ ہے۔ علامہ بقاعی کی یہ بات بے حد لطیف ہے۔

اس طریق سے اللہ سبحانہ نے حضور اقدس کے مرتبہ کی برتری اور مراتب کمالات میں بے نہایت ترقی کا اعلان کیا ہے۔ کمالات میں یہ برتری ہی اہل ایمان میں توبہ

؎ افادات شیخ الاسلام

کی انگیخت کا واسطہ ہے۔

مطلب یہ ہے کہ اس انداز بیان میں آپ کے ذکر کی وجہ یہ نہیں ہے کہ آپ سے کوئی غلطی ہوئی تھی جیسا کہ کچھ شارحین قرآن نے سمجھا ہے۔

دوسرے درجہ میں اس موقعہ پر مہاجرین والانصار کا ذکر ہے اس سے اگر یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ اسلامی معاشرے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بعد سب سے اونچا درجہ مہاجرین کا ہے اس کے بعد انصار کا ہے تو یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اسلامی معاشرے میں بزرگی اور برتری کی بنیاد خاندان، نسب نامہ یا مال و جاہ نہیں بلکہ نبوت کی اتباع اور اسلام کی خاطر قربانی ہے یہ بات مہاجرین والانصار کے لیے الذین اتبعوہ فی ساعۃ العسرۃ کی صفت سے معلوم ہو رہی ہے۔

یہاں الجصاص نے یہ بات بڑی اچھی لکھی ہے یہ آیت قرآنی صحابہ کے مناقب وفضائل میں بالکل شافی اور کافی ہے۔

آیت سے یہ بات معلوم ہوئی تھی کہ نسبی تعلق اور قرابت نبیوں سے نجات کے لیے بغیر ایمان کے کافی نہیں ہے ما کان للنبی والذین آمنوا ایسے نبیوں اور بزرگوں سے نسبی نسبت اور قرابت ایمان کی موجودگی میں بغیر اتباع کے مقبولیت کی سند اور بزرگی کی ضمانت نہیں ہے ولایت اور بزرگی کی لازمی شرط اتباع ہے۔ جو لوگ اتباع نبوت کے وصف سے مالا مال ہوئے وہ معاشرہ اسلامی میں سب سے اونچے اور برتر ہوئے۔

ہجوم خواطر میں اللہ کی مدد

۱۲۳ من بعد ما کاد یزیغ قلوب فریق منھم ثم تاب علیھم باوجودیکہ حالت ایسی ہو چکی تھی کہ قریب تھا کہ کچھ کے دل ڈگمگا جائیں لیکن پھر اللہ نے ان پر رحمت کے ساتھ رجوع فرمالیا۔ اس سے یہ بات کھل کر سامنے آگئی کہ مہاجرین والانصار کی اکثریت ہر قسم کے مصائب اور ہجوم شدائد میں حق پر ثابت قدم رہی ہے۔ ان میں سے صرف ایک مختصر سی ٹولی سے تبوک کے موقعہ پہ کچھ کمزوری ظاہر ہوئی لیکن تنبیہ کے بعد وہ بھی متنبہ ہو گئے اور انہوں نے اللہ کی طرف رجوع کر لیا۔ اور اللہ سبحانہ نے ان کی توبہ قبول فرمائی۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کی مہربانیاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پہ بے شمار ہیں اور آپ کی برکت سے مہاجرین والانصار پر بھی مخصوص توجہ اور مہربانی ہو رہی ہے کہ ان کو ایمان وعرفان سے مشرف فرمایا۔ اتباع نبی جہاد فی سبیل اللہ اور عزائم امور کے

سرانجام دینے کی ہمت و توفیق بخشی پھر ایسے مشکل وقت میں جب کچھ مومنین کے قلوب بھی مشکلات اور صعوبتوں کا ہجوم دیکھ کر ڈگمگانے لگے تھے اور قریب تھا کہ رہ جائیں حق تعالیٰ نے دوبارہ مہربانی فرمائی کہ ان کو اس قسم کے خطرات و وساوس پر عمل کرنے سے محفوظ رکھا اور مومنین کی ہمتوں کو بلند کیا [1]

شرح وعلی الثلاثۃ الذین خلفوا

ف[2] اور ان تین پر بھی اللہ کی رحمت متوجہ ہوئی جو پیچھے چھوڑ دیئے گئے تھے۔ یہ تین شخص کعب بن مالک، ہلال بن امیہ اور مرارہ ابن الربیع ہیں جو باوجود مومن مخلص ہونے کے محض تن آسانی اور سہل انگاری کی بنا پر بدون عذر شرعی کے تبوک کی شرکت سے محروم رہے جب حضور اقدس سے واپس تشریف لائے تو انہوں نے منافقین کی طرح جھوٹے عذر پیش کیے اور نہ بعض صحابہ کی طرح اپنے کو ستونوں سے باندھا جو واقعہ تھا صاف صاف عرض کر دیا اور اپنی کوتاہی اور تقصیر کا علانیہ اعتراف کر لیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ منافقین کی طرف سے بظاہر اغماض کر کے انکے بواطن کو اللہ کے سپرد کر دیا گیا اصحاب سواری کی یعنی جو مسجد کے ستونوں سے بندھے ہوئے تھے تو بہ قبول کر لی گئی اور ان تینوں کا فیصلہ تا دیباً کچھ مدت کیلئے ملتوی رکھا گیا پچاس دن گذرنے کے بعد ان کی توبہ قبول ہوئی پیچھے رکھے گئے کا مطلب یہی ہے جیسا کہ خود کعب بن مالک کی زبانی بخاری میں ہے [2]

بتانا یہ چاہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب تبوک سے واپس مدینہ تشریف لائے تو وہ لوگ معذرت کرنے کے لیے حاضر ہوئے جو پیچھے رہ گئے ان میں ۸۰ سے کچھ زیادہ منافق تھے اور تین سچے مومن بھی تھے۔ منافقین جھوٹے عذرات پیش کرتے گئے اور حضور ان کی معذرت قبول کرتے گئے۔ جب ان تینوں کی باری آئی اور انہوں نے صاف صاف اپنے اپنے قصور کا اعتراف کر لیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تینوں کے معاملہ میں فیصلے کو ملتوی کر دیا۔ اور عام مسلمانوں کو حکم دے دیا کہ جب تک خدا کا حکم نہ آئے ان سے کسی قسم کا معاشرتی تعلق نہ رکھا جائے۔

دراصل اس آیت میں جن لوگوں کو توبہ کی قبولیت کی بشارت دی گئی ہے یہ وہ لوگ ہیں جن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

[2] افادات شیخ الاسلام

کے بارے میں ارشاد ہوا ہے واٰخرون مرجون لامر اللہ کچھ اور بھی ہیں جن کا معاملہ اس انتظار میں کہ اللہ کا کیا حکم ہوتا ہے مؤخر کر دیا ہے باقی کا فیصلہ کر دیا گیا تھا اور ان کو پیچھے چھوڑ دیا گیا تھا۔

چونکہ قبولیت کا مقتضا یہ تھا کہ دلوں کے زخم دھوئے جائیں اور رحمت واکرام کے مرہموں سے تسکین پائیں۔ اس لیے پیرایہ بیان ایسا اختیار کیا گیا کہ ان کے سارے دکھوں کا مداوا ہو گیا۔ انہوں نے لغزش کی وجہ سے اپنی جگہ کھو دی تھی یعنی جن مقبولین کے ساتھ ان کا شمار تھا ان کی صف سے باہر ہو گئے تھے قبولیت توبہ کا جب مژدہ سنایا گیا تو اس طرح پہلے خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا پھر مہاجرین والانصار کا اور پھر اسی کے ضمن میں ان لوگوں کا بھی ذکر کر دیا گیا اور رحمت الٰہی کی توجہ سب کے لیے یکساں کہی گئی تاکہ اب کوئی رحمت کے حلقہ سے باہر نہ رہے جن سے قصور ہوا تھا وہ بھی محسوس کرنے لگیں کہ رحمت وقبولیت کی ایک ہی صف میں کھڑے ہو گئے۔

عبرت خیز اور دردانگیز واقعہ کی قرآنی تعبیر

۲۵لے اور اس وقت رحمت متوجہ ہوئی جب کہ زمین اپنی ساری کشائشوں کے باوجود ان پر تنگ ہو گئی تھی اور وہ خود ہی اپنے سے تنگ آ گئے تھے اور ان کو پتہ لگ گیا تھا کہ اللہ سے بھاگ کر ان کے لیے کہیں پناہ نہیں ہے اللہ ان پر اپنی رحمت سے لوٹ آیا تاکہ وہ رجوع کریں بلاشبہ اللہ ان پر بڑا ہی توبہ قبول کرنے والا بڑا ہی مہربان ہے۔

اس آیت کی تشریح سے پہلے ان تین صحابہ کرام کی واقعاتی داستان خود حضرت کعب بن مالک کی زبانی سن لیجیے۔ اردو زبان میں شارحین قرآن نے حضرت مولانا اشرف علی حضرت مولانا شبیر احمد عثمانی، حضرت مولانا ابوالکلام آزاد، حضرت مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اس پر تاریخی طور پر بڑی تفصیل سے لکھا ہے آیئے پہلے مولانا عثمانی کا بیان پڑھیے۔

ان تین میں سے حضرت کعب بن مالک رضی اللہ عنہ نے اپنا واقعہ نہایت شرح وبسط کے ساتھ عجیب مؤثر طرز میں بیان فرمایا ہے صحیح بخاری وغیرہ میں دیکھا جائے۔ یہاں اس کے بعض اجزا نقل کئے جاتے ہیں۔ کعب بن مالک فرماتے ہیں کہ

تبوک کی مہم چونکہ سخت اور دشوار گذار تھی۔ حضور اقدس نے صحابہ کرام کو عام تیاری کا حکم دیا۔ لوگ مقدور واستطاعت کے مطابق سامان سفر درست کرنے میں مشغول تھے۔ مگر میں بے فکر تھا کہ جب چاہوں گا خود تیار ہو کر ساتھ چلا جاؤں گا کیونکہ بفضل ایزدی اس وقت ہر طرح کا سامان مجھ کو میسر تھا۔

ایک چھوڑ دو سواریاں میرے پاس موجود تھیں۔ میں اسی غفلت کے نشہ میں رہا ادھر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تیس ہزار مجاہدین اسلام کو کوچ کا حکم دے دیا۔ مجھے اب بھی یہی خیال تھا کہ حضور روانہ ہو گئے تو کیا بات ہے۔ اگلی منزل پر آپ سے جا ملوں گا آج چلوں کل چلوں۔ اسی لا امروز و فردا میں گذر گیا۔ حضور نے تبوک پہنچ کر فرمایا مافعل کعب ؟ کعب کو کیا ہوا۔ بنی مسلمہ کا ایک شخص بولا کہ یا رسول اللہ اس کی عیش پسندی اور اعجاب وغرور نے نکلنے کی اجازت نہیں دی۔ معاذ بن جبل نے کہا کہ تو نے بہت بری بات کہی۔ خدا کی قسم ہم نے اس میں بھلائی کے سوا کچھ نہیں دیکھا۔ حضور یہ سن کر خاموش رہے۔ کعب کہتے ہیں کہ آپ کی تشریف بری کے بعد بہت زیادہ وحشت اس سے ہوتی تھی کہ سارے مدینے میں پکے منافق یا معذور مسلمانوں کے سوا مجھے کوئی نظر نہ پڑتا تھا۔ بہر حال اب دل میں طرح طرح کے منصوبے گانٹھنے شروع کئے کہ آپ کی واپسی پر فلاں عذر کر کے جان بچالوں گا۔ مگر جس وقت معلوم ہوا کہ حضور اقدس بخیر و عافیت واپس تشریف لے آئے۔ دل سے سارے جھوٹ فریب محو ہو گئے اور طے کر لیا کہ سچ کے سوا کوئی چیز اس بارگاہ میں بچانے والی نہیں ہے۔ حضور مسجد میں رونق افروز تھے۔ اصحاب کا مجمع تھا منافقین جھوٹے حیلے بہانے بنا کر ظاہری گرفت سے چھوٹ رہے تھے کہ میں حضور کے سامنے آیا۔ میرے سلام کرنے پر آپ نے غضب آمیز تبسم فرمایا اور غیر حاضری کی وجہ دریافت کی۔ میں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ اگر میں اس وقت کسی دنیا داروں میں سے کسی کے سامنے ہوتا تو آپ دیکھتے کہ کس طرح زبان آوری اور چرب زبانی سے جھوٹے حیلے حوالے کر کے اپنے کو صاف بچا لیتا۔ مگر یہاں تو معاملہ ایک ایسی ذات مقدس سے ہے جسے جھوٹ بول کر اگر میں راضی بھی کر لوں تو تھوڑی دیر کے بعد اللہ سبحانہ اس کو سچی بات پر مطلع کر کے مجھ سے ناراض کر دے گا برخلاف اس کے سچ بولنے میں گو تھوڑی دیر کے لیے آپ کی خفگی برداشت کرنی پڑے گی لیکن امید کرتا ہوں کہ خدا کی طرف سے اس کا انجام بہتر ہو گا اور آخر کار سچ بولنا ہی مجھے خدا و رسول کے غصہ سے نجات دلائے گا۔ یا رسول اللہ واقعہ یہ ہے کہ میرے پاس اس غیر حاضری کا کوئی سبب نہیں جس وقت حضور کی ہم رکابی کے شرف سے محروم ہوا اس وقت سے زیادہ فراخی اور مقدرت مجھے کبھی حاصل نہیں ہوئی۔ میں مجرم ہوں آپ کو اختیار ہے جو فیصلہ چاہیں میرے حق میں کریں آپ نے فرمایا یہ شخص ہے جس نے سچی بات کہی اچھا جاؤ اور خدائی فیصلہ کا انتظار کرو میں اٹھا اور تحقیق سے معلوم ہوا کہ ہلال بن امیہ اور مرارہ ابن الربیع بھی میرے جیسے ہیں۔ ہم تینوں کے متعلق آپ نے حکم دے دیا کہ کوئی ہم سے بات نہ کرے سب علیحدہ رہیں۔ چنانچہ کوئی مسلمان ہم سے بات

نہ کرتا تھا نہ سلام کا جواب دیتا تھا۔ وہ دونوں تو گھر میں بیٹھ گئے دن رات گھر میں روتے رہتے میں ذرا سخت اور طاقتور تھا مسجد میں نماز کے لیے حاضر ہوتا حضور اقدس کو سلام کرکے دیکھتا تھا کہ جواب میں لب مبارک کو حرکت ہوئی یا نہیں۔ میں جب حضور کی طرف دیکھتا آپ میری طرف سے منہ پھیر لیتے۔ خاص رشتہ دار اور محبوب ترین عزیز بھی مجھ سے بیگانہ ہو گئے۔ اسی عرصہ میں ایک شخص نے بادشاہ غسان کا خط مجھے دیا جس میں میری مصیبت پر اظہار ہمدردی کرنے کے بعد دعوت دی تھی کہ میں اس کے ملک میں آجاؤں وہاں میری بہت آؤ بھگت ہو گی میں نے پڑھ کر کہا کہ یہ بھی ایک مستقل امتحان ہے۔ آخر وہ خط میں نے نذر آتش کر دیا۔

چالیس دن گزرنے کے بعد بارگاہ رسالت سے جدید حکم پہنچا کہ میں اپنی عورت سے بھی علیحدہ رہوں چنانچہ اپنی بیوی کو کہہ دیا کہ اپنے میکے چلی جائے اور جب تک اللہ سبحانہ کے یہاں سے میرا کوئی فیصلہ نہ ہو وہیں ٹھہری رہے۔ سب سے بڑی فکر یہ تھی کہ اگر اسی حالت میں موت آگئی تو حضور میرا جنازہ نہ پڑھیں گے اور فرض کیجیے کہ اگر ان دنوں میں آپ کی وفات آگئی تو مسلمان ہمیشہ یہ ہی معاملہ مجھ سے رکھیں گے میری میت کے قریب بھی کوئی نہ آئے گا۔ غرض پچاس دن اسی حالت میں گذرے کہ خدا کی زمین مجھ پر باوجود فراخی کے تنگ ہوگئی بلکہ عرصہ حیات تنگ ہو گیا تھا۔ زندگی موت سے زیادہ سخت معلوم ہوتی تھی کہ یکایک جبل سلع سے آواز آئی یا کعب بن مالک ابشر میں سنتے ہی سجدہ میں گر پڑا معلوم ہوا کہ آخر شب میں حق تعالیٰ شانہ کی جانب سے پیغمبر علیہ السلام کو خبر دی گئی کہ ہماری توبہ مقبول ہے آپ نے بعد نماز فجر صحابہ کو بتایا کہ ایک سوار میری طرف دوڑا کہ بشارت سنائے مگر دوسرے شخص نے پہاڑ پر زور سے للکارا اس کی آواز سوار سے پہلے پہنچی بنے اپنے کپڑے اتار کر آواز لگانے والے کو دیے پھر حضور کی جناب میں حاضر ہوا۔ لوگ جوق جوق آتے اور مجھے مبارک باد دیتے۔ مہاجرین میں سے حضرت طلحہ نے کھڑے ہو کر مصافحہ کیا۔ حضور کا چہرۂ اقدس چاند کی طرح خوشی سے چمک رہا تھا آپ نے فرمایا کہ اللہ سبحانہ نے تیری توبہ قبول فرمائی۔ میں نے عرض کیا کہ اس توبہ کا نتیجہ یہ ہے کہ میں کل مال و جائیداد اللہ کی راہ میں صدقہ کرتا ہوں۔ آپ نے فرمایا سب نہیں کچھ اپنے لیے رکھنا چاہیے۔ چنانچہ میں نے خیبر کا حصہ الگ کر لیا باقی مال صدقہ کر دیا۔ چونکہ مجھے صرف سچ بولنے سے نجات ملی تھی اس لیے عہد کیا کہ خواہ کچھ ہی کیوں نہ ہو آئندہ کبھی جھوٹ نہ بولوں گا۔ اس کے بعد بڑے سخت امتحانات آئے مگر الحمد للہ میں سچ سے کبھی نہ ہٹا۔ اور نہ انشاء اللہ تا زیست ہٹوں گا۔ یہ واقعہ ہے جس کی طرف ان آیات میں اشارہ ہوا ہے۔ گویا ان تینوں پر پہلی مہربانی یہ ہوئی کہ ان کو ایمان و اخلاص بخشا اتفاق

سے بچایا اب نئی مہربانی یہ ہوئی کہ توبہ نصوح کی توفیق دے کر پھر اپنی طرف کھینچ لیا اور کوتاہیوں کو معاف کر دیا[۱]

کعب بن مالک یہ بھی فرماتے ہیں کہ

ایک دن شہر سے باہر نکلا تو قتادہ کے باغ تک پہنچ گیا یہ میرا چچازاد بھائی تھا اور اپنے تمام عزیزوں میں اسے زیادہ محبوب رکھتا۔ میں نے سلام کیا مگر اس نے کوئی جواب نہ دیا میں نے کہا ابو قتادہ! کیا تم نہیں جانتے کہ میں مسلمان ہوں اللہ اور اس کے رسول کی دل میں محبت رکھتا ہوں اس پر بھی اس نے میری طرف رخ نہیں کیا لیکن جب میں نے یہی بات بار بار دہرائی تو صرف یہ کہا اللہ ورسولہ اعلم تب مجھ سے ضبط نہ ہو سکا اور بے اختیار آنکھیں اشکبار ہو گئیں۔

یہ واقعہ بڑا عبرت آموز ہے امام احمد کے متعلق آتا ہے کہ قرآن کی کوئی آیت انہیں نہیں رلاتی تھی جس قدر یہ آیت اور کعب بن مالک کی روایت

یہ واقعہ بتاتا ہے کہ

(الف) کفر واسلام کی کش مکش کا معاملہ کس قدر اہم اور اس میں کتنی نزاکت ہے کہ کفر واسلام میں مقابلہ ہو تو کفر کا ساتھ دینا تو درکنار جو شخص اسلام کا ساتھ دینے میں کسی ایک موقع پر بھی کوتاہی کرتا ہے اس کی زندگی بھر کی عبادتیں اور دینداری کی زندگی خطرے میں پڑ جاتی ہے، آپ یہ دیکھیں یہ خطاب کن سے ہو رہا ہے۔ وہ جو بدر اور احد کے سخت معرکوں میں جانبازیوں کے جوہر دکھا چکے ہیں اور جن کا ایمانی اخلاص ہر قسم کے شبہ سے بالاتر تھا۔

(ب) یہ واقعہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ ادائے فرض میں تساہل کوئی معمولی بات نہیں بسا اوقات تساہل ہی تساہل میں کسی ایسے قصور کا مرتکب ہو جاتا ہے جس کا شمار بڑے گناہوں میں ہوتا ہے۔ سزا کے وقت یہ نہیں دیکھا جاتا ہے کہ جرم نیک نیتی سے کیا ہے یا بدنیتی سے۔ نیت خواہ کیسی اچھی اور خوبصورت ہو مگر جرم کے وزن کو ہلکا نہیں کرتی۔ اور مجرم کا ماضی چاہے کیسا ہی شاندار پاکبازی اور پارسائی کا ہو جرم بہرحال جرم ہے۔

(ج) اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس دور میں اسلامی معاشرہ میں طاعت و فرمانبرداری کیسی تھی کہ جوں ہی انقطاع تعلقات کا اعلان ہوا سارے مسلمانوں نے ایک دم منہ موڑ لیا چوری چھپے

[۱] افادات شیخ الاسلام

بھی کسی نے اس کے خلاف نہیں کیا تا آنکہ ان کے محبوب سے محبوب عزیزوں کو یہ خیال نہ آیا کہ ایک لمحہ کے لیے اس پر عمل نہ کریں۔ ابو قتادہ کا حال خود حضرت کعب کی زبانی سُن چکے ہو۔ اس زمانہ کے مسلمانوں کی ذہنیت کی پوری تصویر بول رہی ہے۔ پھر اس طاعت کے لیے نہ تو کوئی مادی قوت کام میں لائی گئی نہ عمال حکومت کا ڈر نہ قانون وعدالت کا اندیشہ صرف ذات نبوت کے مبارک لبوں کی حرکت تھی اور یہ بات سب کو معلوم تھی کہ آپ کی مرضی یہی ہے بس اتنی بات کا معلوم ہو جانا اس کے لیے کافی ہو گیا کہ سب سراپا اطاعت و انتثال ہو گئے۔

(د) یہ واقعہ صرف اطاعت و امتثال کو نہیں بلکہ یہ بھی بتا رہا ہے کہ اس دور کے مسلمانوں کی باہمی اخوت و محبت کا کیا حال تھا۔ اس سختی کے ساتھ حکم کی تعمیل تو سب نے کی لیکن ساتھ ہی ان کی مصیبت کے غم سے کوئی دل خالی نہ تھا۔ سب کے دلوں کو لگی تھی کہ ان کی توبہ قبول ہو جائے جونہی قبولیت کا اعلان ہوا ایک پر ایک دوڑنے لگا کہ ان سختی کشان عشق کو سب سے پہلے میری زبانی مژدہ قبولیت ملے۔ کوہ سلع پر سب سے پہلے جس نے پکار کر سب سے پہلے بشارت سنائی تھی۔ حدیث بخاری میں حضرت کعب نے گو کسی کا نام نہیں لیا مگر حافظ ابن حجر عسقلانی نے فتح الباری میں واقدی کے حوالہ سے بتایا ہے کہ یہ آواز دینے والے حضرت ابو بکر تھے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ ٱتَّقُوا۟ ٱللَّهَ وَكُونُوا۟ مَعَ ٱلصَّٰدِقِينَ ﴿١١٩﴾
مَا كَانَ لِأَهْلِ ٱلْمَدِينَةِ وَمَنْ حَوْلَهُم مِّنَ ٱلْأَعْرَابِ أَن
يَتَخَلَّفُوا۟ عَن رَّسُولِ ٱللَّهِ وَلَا يَرْغَبُوا۟ بِأَنفُسِهِمْ عَن نَّفْسِهِۦ ۚ
ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ لَا يُصِيبُهُمْ ظَمَأٌ وَلَا نَصَبٌ وَلَا مَخْمَصَةٌ
فِى سَبِيلِ ٱللَّهِ وَلَا يَطَـُٔونَ مَوْطِئًا يَغِيظُ ٱلْكُفَّارَ وَ
لَا يَنَالُونَ مِنْ عَدُوٍّ نَّيْلًا إِلَّا كُتِبَ لَهُم بِهِۦ عَمَلٌ صَٰلِحٌ ۚ
إِنَّ ٱللَّهَ لَا يُضِيعُ أَجْرَ ٱلْمُحْسِنِينَ ﴿١٢٠﴾ وَلَا يُنفِقُونَ
نَفَقَةً صَغِيرَةً وَلَا كَبِيرَةً وَلَا يَقْطَعُونَ وَادِيًا إِلَّا
كُتِبَ لَهُمْ لِيَجْزِيَهُمُ ٱللَّهُ أَحْسَنَ مَا كَانُوا۟ يَعْمَلُونَ ﴿١٢١﴾

اہلِ ایمان اللہ کی نافرمانی سے بچو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ [1]
مدینے کے باشندوں اور ان کے اردگرد رہنے والے دیہاتیوں کو
یہ لائق نہ تھا کہ دفاع کے موقعہ پر اللہ کے رسول سے پیچھے رہ جائیں
اور نہ یہ بات ان کے لائق تھی کہ حضور اقدس کی ذات گرامی کو نظر
انداز کر کے اپنی جانوں کی فکر میں پڑ جائیں [2] اس لیے کہ اللہ کے راستہ

میں آئی ہوئی ہر پیاس ہر محنت اور ہر بھوک اور ہر وہ چلنا جو کافروں کے غیظ و غضب کا باعث ہو اور دشمن کی جانب سے آئی ہوئی ہر چیز ان کے نامہ اعمال میں عمل صالح بنا کر لکھ دی گئی ہے۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ نیکوکاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا[۳] اسی طرح اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چھوٹا ہو یا بڑا اور وادی کا قطع کرنا ان کے لیے نیکی بنا کر لکھا گیا ہے تاکہ اللہ ان کو ان کے کاموں کا بہتر سے بہتر اجر عطا فرمائے[۴]

مفردات کے معانی

ظمئ پیاس تشنگی، یہ اصل میں ظمئ یظمآن کا مصدر ہے جس کے معنی پیاس لگنے کے ہیں اسی سے یظمٔا فعلان کے وزن پر پیاسے کے معنے میں آتا ہے۔

نصب: محنت، مشقت اور تھکاوٹ کو کہتے ہیں اذا فرغت فانصب اسی معنی میں ہے۔

المخمصۃ: اس کے معنی بھوک کے آتے ہیں۔

راستبازوں کی معیت

راستی اور سچائی کے معنے صرف سچ بولنے کے سمجھے جاتے ہیں مگر قرآن کی نگاہ میں اس کے بڑے وسیع معنی ہیں اس لحاظ سے اس کے اندر اکیلے قول ہی نہیں بلکہ عمل کی بھی ہر سچائی داخل ہے۔ امام غزالی

نے احیاء العلوم میں بڑی باریک بینی سے اس کی چھ قسمیں کی ہیں اور قرآن و حدیث سے ہر ایک کے معنی بتائے ہیں۔ بات میں سچائی۔ ارادہ اور نیت میں سچائی، عزم میں سچائی، عزم کو پورا کرنے میں سچائی، عمل میں سچائی لیکن ذرا غور کیجئے تو اس کی تین ہی قسمیں ہیں زبان کی سچائی، دل کی سچائی اور عمل کی سچائی۔

زبان کی سچائی یعنی زبان سے جو کچھ بولا جائے سچ ہو اور منہ سے کوئی بول صداقت کے خلاف نہ ہو۔ یہ ایمان و اسلام کی سب سے بڑی نشانی ہے۔ اس کے برعکس ہر قسم کا جھوٹ دل کے نفاق کے ہم معنے ہے سورہ احزاب کی ایک آیت میں صادق کا مقابل منافق اور صدق کا نفاق قرار دیا ہے

لیجزی الصادقین بصدقھم ویعذب المنافقین ان شاء

اس سے معلوم ہوا کہ صدق ایمان کا اور جھوٹ نفاق کا سرمایہ ہے۔ اسی لئے صدق اور اخلاص دونوں ایک چیز ہیں کیونکہ بعض موقعوں پر زبان سے سچ کا اظہار اس لیے جھوٹ ہو جاتا کہ وہ نہائے قلب سے نہیں نکلتا ہے۔ منافق حضور اقدس کی جناب میں حاضر ہو کر آپ کی رسالت کا زبانی اقرار کرتا ہے اور آپ کی رسالت ایک حقیقت ہے لیکن چونکہ ان کا یہ اقرار ان کے ضمیر کے خلاف تھا اس لیے قرآن کا فتویٰ ہے۔

واللہ یشھد ان المنافقین لکاذبون

اس سے معلوم ہوا کہ سچائی اس کا نام ہے کہ زبان سے دل کی صحیح ترجمانی کی جائے اگر ایسا نہ ہو تو اس کا نام نفاق ہے۔ اسی لیے صداقت فی الحقیقت ایمان کی صداقت ہے جس کے ایمان میں صداقت نہیں ہے وہ نفاق کی آماجگاہ ہے اور یہی اصل نفاق ہے قرآن نے یہاں صحابہ کرام کے ایمان کی صداقت کا اعلان کیا ہے۔ ایمان میں صداقت ہی طمانیت و سکون کی ضمانت ہے اور ایمان کی ہی صداقت جب اعمال میں رونما ہوتی ہے تو اس کا نام حلاوہ ایمان ہے حدیث میں ہے۔

ثلاث من کن فیہ وجد حلاوۃ الایمان ان یکون اللہ ورسولہ احب الیہ مما سواھما وان یحب المرأ لا یحبہ الا للہ وان یکرہ ان یقذف الکفر کما یکرہ ان یقذف فی النار۔

جس شخص میں یہ تین باتیں ہوں گی اسے ایمان کی حلاوت محسوس ہوگی ایک یہ کہ اللہ اور اس کا رسول اس کو سب سے زیادہ محبوب ہو دوسرے یہ کہ جس سے محبت کرے اللہ کے لیے کرے تیسرے یہ کہ کفر میں واپسی کو ایسا برا سمجھے جیسے آگ

میں گرائے جانے کو۔

۱۲۵ لے اے اہل ایمان اللہ کی نافرمانی سے بچو اور سچوں کے ساتھ ہو جاؤ یعنی سچوں کی صحبت اختیار کرو اور انہی جیسے کام کرو دیکھ لو یہ تین شخص سچ کی بدولت بخشے گئے اور مقبول ٹھہرے۔ منافقین نے جھوٹ بولا اور خدا کا ڈر دل سے نکال دیا تو درک اسفل کے مستحق ہوئے لے

آیت میں صادقین منافقین کے مقابلہ پر آیا ہے۔ جیسے اخلاص کی اساس صدق و صداقت ہے ایسے ہی نفاق کی پوری عمارت جھوٹ پر اٹھتی ہے۔ ان لوگوں کے مقابلے میں جن میں نفاق اور جھوٹ ہو ان کی صحبت اختیار کرنے کا حکم ہو رہا ہے جن کے ایمان میں سرتا سر اخلاص و راستی ہے یہ نفاق کے مقابلے میں صحابہ کے ایمان میں صداقت کا اعلان ہے دوسری جگہ اسی بات کو حصر کے ساتھ کہا گیا ہے۔

انما المومنون الذین آمنوا ثم لم یرتابوا وجاھدوا
باموالھم وانفسھم فی سبیل اللہ اولئک ھم الصادقون

اہل ایمان تو فی الواقع وہی ہیں جو ایمان لائے اور ان کے ایمان میں شک کا کوئی کانٹا نہیں چبھا اور انہوں نے اپنی جانوں اور مالوں کو راہ خدا میں تج کر دیا۔ یہی لوگ اپنے ایمان میں سچے ہیں۔

انہوں نے ایمان پر اپنی زندگی کی بنیادیں استوار کی تھیں۔ ان کے ایمان کا ضمیر عشق کی ولولہ انگیزیوں اور جنوں نوازیوں سے تیار ہوا تھا جس میں ایثار قربانی اور سرفروشیوں کی دنیا آباد تھی۔ ان کے اعمال کی حدود اسی نسبت سے متعین کی جاتی تھی جس نسبت سے وہ ایمان کی تقویت کا باعث بنتے تھے جہاد فی سبیل اللہ ان کے اخلاص ایمانی اور ان کے اتقا کا پیمانہ تھا اور اللہ کے یہاں ان کی مقبولیت کا مدار یہی پیمانہ تھا۔ قرآن نے اسی پیمانہ کی طرف کھل کر اشارہ کیا ہے۔

یہاں انصار و مہاجرین دونوں کو صادقین کا سرٹیفکیٹ ملا ہے اور اس کی بنیاد الذین اتبعوہ کو بنایا ہے۔

اسی لیے قرآن نے صحابہ کرام کو نبوت کی دلیل بنا کر پیش کیا ہے اور پوری دنیا سے کہا ہے :

لے افادات شیخ الاسلام

ما آعنتم فان آمنوا بمثل ما آنتم بہ فقد اھتدوا

یعنی ایمان میں صحابہ کی مماثلت ہی سے پوری دنیا کو ہدایت کی ضمانت دی جاسکتی ہے۔ اس آیت کا منطوق تو یہی ہے کہ الصادقین سے مراد صحابہ کرام ہیں مگر آیت کے مدلول میں یہ بات بھی ہے کہ مسلمانوں کو حکم دیا جارہا ہے کہ ایمان میں کمال پیدا کرنا چاہتے ہو تو ان لوگوں کی محبت اور صحبت اختیار کرو جن کے کردار اور گفتار میں ہم آہنگی ہو یا جن کا ظاہر و باطن یکساں ہو یا جن میں علم و ذکر کی ہم آہنگی ہو۔ صحبت و محبت کو آدمی کے بناؤ اور بگاڑ میں بڑا دخل ہے۔ اللہ سبحانہ کا خوف دل کا پاسبان ہوتا ہے وہ اندر سے انسان کی حفاظت کرتا ہے اور صادقین کی صحبت باہر سے اس کی شیطان سے حفاظت کرتی ہے۔ کیونکہ صادقین وہ ہوتے ہیں جن کے قول اور عمل میں مطابقت ہو۔

کچھ علما نے اس آیت سے اجماع کی قانون اسلامی میں حجیت پر ہی استدلال کیا ہے۔

ایمان کا تقاضا پورا کرنا ضروری ہے

۱۲۰ [۱] مدینے کے باشندوں اور انکے اردگرد رہنے والے دیہاتیوں کو یہ لائق نہ تھا کہ دفاع کے موقعہ پر اللہ کے رسول سے پیچھے رہ جانے اور نہ یہ بات انکے لائق تھی کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی کو نظر انداز کر کے اپنی جانوں کی فکر میں پڑ جائیں یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تو تکلیفیں اٹھائیں اور ہم آرام سے بیٹھے رہیں ایسا نہیں چاہیے۔ حدیث میں ہے کہ ابو خیثمہ رضی اللہ عنہ بھی غزوہ تبوک میں پیچھے رہ گئے تھے۔ حضور کی روانگی کے بعد باغ میں گئے وہاں خوشگوار سایہ تھا حسین و جمیل بیوی سامنے تھی اس نے پانی چھڑک کر زمین کو خوب ٹھنڈا کیا تھا۔ چٹائی کا فرش تھا۔ تازہ کھجور کے خوشے سامنے رکھے تھے اور سرد و شیریں پانی پیش کیا۔ یہ سامان عیش دیکھ کر ابو خیثمہ کے دل میں بجلی سی دوڑ گئی۔ بولے تف ہے اس زندگی پر کہ میں تو خوشگوار سائے ٹھنڈے پانی اور باغ و بہار کے مزے لوٹ رہا ہوں۔ اور خدا کا محبوب پیغمبر ایسی سخت لو اور گرمی و تشنگی کے عالم میں کوہ بیاباں طے کر رہا ہے یہ خیال آتے ہی سواری منگائی تلوار حمائل کی، نیزہ سنبھالا اور حضور کے نقش قدم پر چل پڑے۔ اونٹنی تیز جا رہی تھی۔ آخر لشکر کو جا پکڑا حضور نے دور سے دیکھ کر کوئی اونٹنی سوار ریت کے ٹیلے طے کرتا آرہا ہے فرمایا کن ابا خیثمہ (ہو جا ابو خیثمہ) تھوڑی دیر میں سب نے دیکھ لیا کہ وہ ابو خیثمہ ہی تھے۔

[۱] افادات شیخ الاسلام

اس میں ان لوگوں پر عتاب ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تبوک نہیں گئے۔ بظاہر جملہ خبریہ ہے لیکن حقیقت میں نہی ہے۔ چونکہ غزوہ تبوک میں مدینہ اور حوالی مدینہ کو دعوت دی گئی تھی دور کے رہنے والے مسلمانوں کو دعوت نامے نہیں پہنچے گئے تھے اس لیے خصوصیت کے ساتھ مدینہ اور اطراف مدینہ کا ذکر کیا ہے مطلب یہ ہے کہ مدینہ والوں اور اطراف مدینہ والوں کے لیے کسی طرح جائز نہ تھا کہ اپنی جانیں بچا کر لیٹے رہیں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ نہ دیں یعنی اپنی جان کو بھاری سمجھنا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساتھ چھوڑ دینا کیسے روا ہوسکتا ہے جب کہ حضور اقدس بنفس نفیس جہاد کے لیے جا رہے ہیں اور راہ خدا میں اپنی جان کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں تو پھر کسی اور کی جان کب اتنی گراں پایہ ہوسکتی ہے ؟

کچھ علما نے آیت کے انداز بیان سے یہ استدلال کیا ہے کہ حضورؐ کے زمانے میں جہاد فرض عین تھا۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں :

> آیت کا ظاہر ہی بتا رہا ہے کہ جہاد کے لیے جب حضور تشریف لے جائیں تو جہاد میں جانا فرض ہے۔

جو لوگ سفر تبوک میں ساتھ نہیں گئے اور پیچھے رہ جانے کی وجہ سے متخلفین کہلائے۔ ان کو تین گروہوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے۔

۱۔ منافقین جو بے بنیاد عذر تراش کر گھروں میں بیٹھے رہے۔
۲۔ وہ مخلص اور جاں نثار مساکین جن کے پاس سواری کا انتظام نہ تھا۔
۳۔ کچھ مخلصین سے بھی سہل انگاری ہوئی یعنی وہ آج جاتے ہیں کل جاتے ہیں کے منصوبے بناتے رہے جیسے ابولبابہ اور ان کے چھ ساتھی۔ کعب بن مالک بلال ابن امیہ اور مرارہ ابن الربیع۔

ان پیچھے رہ جانے والوں میں وہ مخلص بھی جن کے اخلاص کے ایمان افروز نمونے بھی اس وقت سامنے آئے۔ حضرت ابوذر غفاری کا راستہ میں اونٹ سست ہوگیا اور وہ پیچھے رہ گئے ان کا اونٹ بیٹھ گیا اور وہ رک گئے۔ اونٹ کی قوت رفتار سے مایوسی ہوگئی۔ تو سامان خود اٹھا لیا اور لشکر کے نقش قدم پر چل دیئے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایک منزل پر قیام پذیر ہوئے تو کسی نے دیکھا کہ کوئی شخص پیدل چلا آ رہا ہے۔ حضور اقدس سے عرض کیا گیا۔ فرمایا ابوذر ہوں گے۔ چنانچہ وہی نکلے۔

حضرت ابوخیثمہ کا واقعہ اس سے بھی زیادہ عجب ہے جیسا کہ آپ شیخ الاسلام کے افادات میں پڑھ چکے ہیں۔

جہاد میں ہر تکلیف عمل صالح ہے

۱۲۰ یہ اس لیے کہ اللہ کے راستہ میں آئی ہوئی ہر پیاس، ہر محنت اور ہر بھوک اور ہر وہ چلنا جو کافروں کے غیظ و غضب کا باعث ہو اور دشمن کی جانب سے ملی ہوئی ہر چیز ان کے نامہ اعمال میں عمل صالح بنا کر لکھ دی گئی ہو بلاشبہ اللہ سبحانہ نیکو کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے یعنی باوجودیکہ ان میں سے اکثر چیزیں مثلاً بھوک پیاس لگنا یا تکلیف پہنچنا اختیاری کام نہیں ہیں۔ تاہم نیت جہاد کی برکت سے ان غیر اختیاری چیزوں کے مقابلے میں اعمال صالحہ ان کے فرد حسنات میں درج کر دیئے جائیں گے۔ جن پر خدا نیک اجر عطا فرمائے گا۔[1]

علامہ بقاعی کی رائے میں یہ علت ہے اس ممانعت کی ہو۔ پہلی آیت میں جہاد میں رہ جانے سے منع کیا تھا اب اسکی وجہ بتائی جا رہی ہے کہ اس راہ میں کوئی تکلیف تکلیف نہیں بلکہ عمل صالح ہے اور یہ بھی لکھا ہے کہ پیاس، محنت اور بھوک میں ایک ترتیب ہے اس ترتیب سے یہاں تینوں کا ذکر کیا ہے۔ جو اللہ کی راہ میں نکلتا ہے حرکت سے حرارت اٹھتی ہے، حرارت سے پیاس بھڑکتی ہے اور اس تسلسل سے تھکاوٹ رونما ہوتی ہے اور تھکاوٹ کے احساس کو بھوک اجاگر کرتی ہے۔
اس آیت میں دراصل کمزور مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ ہرچند جہاد فی سبیل اللہ میں آزمائشیں مشکلات اور خطرات ہیں لیکن جہاد میں جس خطرے اور مشکل سے بندہ گذرتا ہے جو چوٹ بھی بندہ کھاتا ہے جو وہ دشمن کو لگاتا ہے یا دشمن اسے لگاتا ہے ہر ایک کے بدلے میں اس کے کھاتے میں عمل صالح درج ہوتا ہے اور جزا کے دن ہر شخص اپنے ہر عمل کا بہتر سے بہتر بدلہ پائے گا۔
آخر میں ان اللہ لا یضیع اجر المحسنین فرما کر ایک طرف یہ اشارہ کر دیا کہ اس غزوہ میں شرکت کرنے والے صرف جہاد کرنے والے نہیں بلکہ جہاد میں حسن کاری کرنے والے ہیں دوسری طرف یہ بھی بتا دیا کہ اللہ کے ہاں اعمال کی مقبولیت کے لیے ضروری شرط یہ ہے کہ یہ اعمال پوری خوبی کے ساتھ صرف اللہ کی رضا اور خوشنودی کے لیے انجام دیئے جائیں کسی اور غرض کا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شائبہ اس میں شامل نہ ہو اور خالصۃً اللہ کی رضا کے لیے کیئے جائیں ۔

اللہ کی راہ میں خرچ کرنا

۱۲۸ اسی طرح اللہ کی راہ میں خرچ کرنا چھوٹا ہو یا بڑا اور وادی کا قطع کرنا ان کے لیے نیکی بنا کر لکھ دیا گیا ہے تاکہ اللہ سبحانہ ان کو ان کے کاموں کی بہترین جزا دے۔ خرچ کرنا اور میدان طے کرنا خود عمل صالح اور اختیاری اعمال ہیں اس لیے یہاں الا کتب لھم فرمایا گذشتہ کی طرح الا کتب لھم بہ عمل صالح نہیں فرمایا نبہ علیہ ابن کثیر[له] چھوٹا اور بڑا یعنی کم اور زیادہ کی تعبیر میں پا افادہ حالات کی نشان دہی کے لیے ہے ۔

مختلف اصحاب نے انفاق میں جہاں بڑی فراخ حوصلگی کا مظاہرہ کیا وہاں وہ بھی تھے جنہوں نے دن بھر کی کمائی سے تھوڑا سا دیا حضرت عقیل انصاری نے رات بھر کنوئیں سے پانی نکال کر ایک کھیت سیراب کیا۔ اور مزدوری میں چار سیر کھجوریں پائیں ۔ دو سیر اہل وعیال کو دیں اور دو سیر بارگاہ رسالت میں لا کر پیش کر دیں ۔حضور نے حکم دیا کہ ان کو پورے مال پر بکھیر دیا جائے ۔ شائد صغیرہ کو اول لانے میں ایسے حضرات کی حوصلہ افزائی ہے اور ممکن ہے ان کی تعداد زیادہ ہو ۔کیونکہ سورۃ انفاق سے اس وقت خشک سالی کے باعث قحط کی سی حالت نمودار تھی ۔پھل پکنے والے تھے ۔ لفظ کبیرہ والے خاص خاص حضرات تھے مثلاً

حضرت ابو بکرؓ نے پورا مال بارگاہ رسالت میں پیش کر دیا یہاں تک کرتہ کے بٹن بھی پیش کر دیئے ۔

حضرت عمرؓ نے پورے مال کے دو حصے کیئے اور ایک حصہ حضور کی خدمت میں پیش کر دیا۔

حضرت عثمانؓ نے تین سو اونٹ ساز و سامان کے ساتھ حاضر کر دیئے اور ایک ہزار دینار نقد دیئے اور مجہز جیش العسرۃ کا بارگاہ رسالت سے لقب پایا۔

حضرت عبد الرحمن بن عوف نے چالیس ہزار درہم دیئے ۔

آیت میں لطیف بلاغت

اس آیت میں جب پیاس مشقت اور بھوک کا ذکر کیا تو فرمایا الا کتب لھم بہ

[له] افادات شیخ الاسلام

عمل صالح خرچ کرنے اور مسافت طے کرنے کا ذکر کرکے صرف الا کتب لھم فرمایا۔ اس کی ایک وجہ تو وہ ہے جو شیخ الاسلام نے حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے بتائی ہے کہ خرچ کرنا اور مسافت طے کرنا ارادی اور اختیاری کام ہیں اس لیے وہ تو خود عمل صالح ہیں اور قابل جزا ہیں لیکن چونکہ بھوک پیاس اور مشقت غیر ارادی اور غیر اختیاری ہیں اس لیے ان کے عمل صالح ہونے اور قابل جزا ہونے کی تصریح فرمائی ہے اور علامہ بقاعی نے ابو حیان اندلسی کے حوالہ سے وجہ یہ بتائی ہے کہ بھوک پیاس میں چونکہ مشقت اور نفع زیادہ ہوتا ہے اس لیے وہاں کھول کر بتا دیا کہ یہ اعمال صالحہ ہیں۔

آخر میں فرمایا لیجزیھم اللہ احسن ما کانوا یعملون اس کے شارحین قرآن نے دو معنے بتائے ہیں ایک معنی تو یہ ہیں کہ ان کو بہترین کاموں کی اللہ جزا دے گا۔ دوسرے معنی یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ ان کے کاموں کی ان کو بہترین جزا دے گا اور دونوں ہی معنی صحیح ہیں۔ مولانا اشرف علی نے دوسرے معنی لیے ہیں فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ ان کو ان کے کاموں کا اچھے سے اچھا بدلہ دے گا۔ مولانا آزاد نے بھی ان کی ہمنوائی کی ہے۔ لیکن مولانا مودودی نے پہلے معنے لیے ہیں فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ ان کے اس اچھے کارنامے کا صلہ انہیں عطا کرے گا۔ علامہ خفاجی نے عنایۃ القاضی میں لطیف بحث کی ہے اور امام رازی نے بھی اس موقعہ پر خوب داد تحقیق دی ہے۔ باتیں دو ہیں ایک یہ کہ ان کو جزا جو ملے گی وہ اچھی ہوگی دوسرے یہ کہ ان کو ان کے اچھے اعمال کی جزا ملے گی۔ میری رائے میں اعمال کا یہاں ذکر موضوع بحث نہیں ہے کیونکہ جن اعمال کا ذکر ہوا ہے وہ تو اچھے ہی ہیں۔ سوال تو صرف جزا کا ہے کہ وہ کیسے ہوگی جواب میں ارشاد ہوا ہے کہ جزا بہترین ہوگی اور خوبصورت ہوگی۔

مَا كَانَ الْمُؤْمِنُونَ لِيَنْفِرُوا كَآفَّةً ؕ فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ
كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَآئِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوْا فِي الدِّيْنِ وَلِيُنْذِرُوْا
قَوْمَهُمْ إِذَا رَجَعُوْا إِلَيْهِمْ لَعَلَّهُمْ يَحْذَرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾

ع ۱۵ ۴

اہلِ ایمان کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ سب ہی نکل جائیں ۱؎
لہٰذا ایسا کیوں نہیں ہوا ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکلیں تاکہ دین میں
سوجھ بوجھ پیدا کریں ۲؎ اور تاکہ واپسی پر اپنی قوم کو ڈرائیں تاکہ
لوگ خلافِ دین سے بچ کر رہیں ۳؎

الربع

مفردات کے معانی

فرقۃ فرق ہے فعلۃ کے وزن پر بنا ہے بڑی جماعت میں سے ٹولی کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع فرق آتی ہے اسی سے افتراق۔ مفارقہ، تفریق اور تفرق ابواب آتے ہیں۔ فرقہ چھوٹا اور فرق ذرا بڑا ہوتا ہے۔

طائفۃ گروہ، جماعت، کچھ، ایک اور ایک سے زیادہ سب کے لیے طائفہ بولا جاتا ہے طوف سے اسم فاعل کا صیغہ واحد مؤنث۔ علامہ عینی رقم طراز ہیں لغت میں طائفہ کے معنے کسی ایک ٹکڑے کے ہیں۔ عباب میں ہے الطائفۃ من الشئ القطعۃ۔ علامہ فیروز آبادی کہتے ہیں کہ حضرت عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں۔ ایک اور ایک سے زیادہ کو طائفہ کہتے ہیں الواحد فما فوقہ۔ امام مجاہد فرماتے ہیں کہ ایک سے لے کر ہزار تک کو طائفہ

کہتے ہیں۔ عطا کہتے ہیں کہ طائفہ کم سے کم دو آدمی ہیں لیتفقھوا۔ اس کا مادہ فقہ ہے اس کے معنی سمجھنے اور دریافت کرنے کے ہیں۔ راغب اصفہانی لکھتے ہیں کہ علم شاہد کے ذریعے علم غائب تک پہنچ کا نام فقہ ہے اس اعتبار سے علم سے خاص ہے فقہ کے اصطلاحی معنی اور ہیں تفقہ اسی سے باب تفعل ہے اس کے معنی میں مبالغہ ہے۔ یہ دو بابوں سے سمع اور کرم سے آتا ہے

اسلام کا نظام تعلیم و تربیت

سورۃ توبہ کا اصل موضوع جہاد ہے۔ اور جہاد یہ ہے کہ اللہ دین کو برتر کرنے دوسروں تک پہنچانے اور اپنوں کو جاننے کے لیے ذاتی اغراض سے بالا ہو کر خوب محنت کی جائے جان کھپائی جائے وقت قربان کیا جائے مال لگایا جائے۔ اور اس راہ میں اگر رکاوٹ ہو خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی کوشش کی جائے جہاد کے لفظی معنی یہ ہیں کہ کسی کام کے لیے اپنی کوششیں صرف کر ڈالی جائیں اور مقصد تک پہنچنے کے لیے اپنی ساری طاقت نچوڑ دی جائے۔ اس لیئے جہاد فی سبیل اللہ کا مفہوم یہ ہوا کہ صرف اللہ کی رضا کی خاطر اس کے دین کی پیروی کا حق ادا کرنے کے لیے وہ سب کچھ کر ڈالا جائے جو بس میں ہو۔

ظاہر ہے کہ کسی مقصد کی خاطر جو محنت کی جاتی ہے اس کا حالات سے گہرا تعلق ہوتا ہے جیسے حالات ہوتے ہیں ان ہی کی مناسبت سے جدوجہد کی شکلیں بھی اختیار کی جاتی ہیں یہ موقع پرستی نہیں ہے بلکہ عین اصول پسندی ہے کیونکہ جدوجہد محض جدوجہد کی خاطر نہیں ہوتی ہے بلکہ کسی مقصد کی خاطر ہوتی ہے اور کسی کی واقعی خدمت اسی وقت ہو سکتی ہے جب اس کے لیے جدوجہد کا طریقہ وقت اور ماحول کو سامنے رکھ کر مقرر کیا گیا ہو۔ اس لیے جہاد فی سبیل اللہ کی شکل کب کیا ہو اس کا تعین حالات ہی کرتے ہیں۔ اسلام نے اصولی طور پر مختلف حالات کے لیے اس کی جو مختلف شکلیں اور قسمیں مقرر کر دی ہیں وہ دو ہیں ۔

(۱) تعلیمی جہاد (۲) مسلح جہاد

اب تک دوسری قسم کو بیان کیا ہے۔ اس آیت میں پہلی قسم کو بتایا جا رہا ہے۔ المراغی نے صحیح لکھا ہے۔ تعلیم و تربیت ہی ایمان کی دعوت میں اصلی اور بنیادی اہمیت کی چیز ہے۔ دین کو جاننا اور جانتے ہوئے دین کی پوری انسانیت کو دعوت دینا ہی اصل کام ہے اس کام میں اگر رکاوٹ ہو تو اس کو دور کرنے کا نام مسلح جہاد ہے۔

ایک نہایت اہم بات ہے جو اسلامی دعوت کو مضبوط و طاقتور بنانے کی خاطر بیان کی گئی ہے۔ آغاز میں جب کہ اسلام عرب میں بالکل نئی دعوت تھی اور مخالفتوں کے طوفان میں آہستہ آہستہ پھیل رہا تھا۔ اس ہدایت کی کوئی ضرورت نہ تھی کیونکہ اس وقت تو دعوت اسلامی کو قبول ہی وہ کرتا تھا جو اس کو پوری طرح سمجھ لیتا تھا مگر جب دعوت اسلامی جوان ہو گئی اور اس کا زمین کے ایک گوشہ میں اقتدار قائم ہو گیا تو آبادیاں جوق در جوق اسلام میں داخل ہونے لگیں۔ نو مسلم آبادی کی یہ تیز رفتاری اس کو مقتضی تھی کہ ان کی اسلام آشنائی کا مستحکم انتظام کیا جائے۔ اس لیے بر وقت اللہ سبحانہ نے یہ ہدایت دی کہ دعوت اسلامی جس انداز سے وسیع سے وسیع تر ہو رہی ہے اس کے مطابق اس کے استحکام کی تدبیر یہ ہے کہ ہر حصہ آبادی میں سے کچھ لوگوں کی تعلیم و تربیت کا انتظام کریں تاآنکہ مسلمانوں کی پوری آبادی میں اسلام کا شعور اور اسلام کا علم عام ہو جائے۔

[1] اہل ایمان کو یہ زیب نہیں دیتا ہے کہ سب ہی نکل جائیں۔ گذشتہ رکوعات میں جہاد میں نکلنے کی فضیلت اور نہ نکلنے پر ملامت تھی ممکن تھا کہ کوئی سمجھ بیٹھے کہ ہمیشہ ہر جہاد میں تمام مسلمانوں پر نکلنا فرض عین ہے اس میں بتا دیا کہ نہ ہمیشہ یہ ضروری ہے نہ مصلحت ہے کہ سب مسلمان جہاد کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ مناسب یہ ہے کہ ہر قوم اور ہر قبیلہ سے ایک جماعت نکلے باقی لوگ دوسری ضروریات میں مشغول ہوں [1]

اس آیت نے یہ بات سب سے پہلے کھول دی کہ اجتماعی فرائض کی دو قسمیں ہیں فرض کفایہ اور فرض عین۔ یہ وہی انسانی اعمال کی دو قسمیں ہیں جن کو ہم جماعتی فرائض اور شخصی فرائض کہتے ہیں۔ فرض کفایہ سے مقصود وہ احکام ہیں جو بحیثیت جماعت و اجتماع قوم پر فرض ہیں نہ کہ بحیثیت فرد و انفراد یعنی ایسے فرائض جو مسلمان جماعتوں اور آبادیوں کے ذمے لگا دیے گئے ہیں کہ ان کا انتظام کریں۔ اس کا انتظام ہونا چاہیے یہ ضروری نہیں کہ ہر فرد بذات خاص اس میں حصہ لے۔ اگر ایک گروہ نے ایک وقت انجام دے دیا تو باقی مسلمانوں سے اس وقت کی ذمہ داری ختم ہو گئی جیسے تجہیز و تکفین میت اور نماز جنازہ۔ البتہ ایک مسلمان کے لیے عزیمت اسی میں ہے کہ ادائے فرض کفایہ میں شخصاً حصہ لے۔

فرض کفایہ کے مخاطب افراد و اشخاص نہیں بلکہ جماعت ہوتی ہے اس لیے ہر مسلمان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جماعت اور آبادی کو اس کی پابجائی کا انتظام کرنا چاہیے۔

دوسری قسم فرض عین کی ہے یعنی وہ فرائض جن کی پابجائی جماعت پر نہیں بلکہ فرداً فرداً ہر مسلمان سے مطلوب ہے اور ایک کے کرنے سے دوسرا بری الذمہ نہیں ہوتا ہے جیسے پانچ وقت کی نماز روزہ حج اور زکوٰۃ۔

شرعاً مسلح جہاد یعنی قتال کی صورت اس آیت کی روشنی میں فرض کفایہ ہے۔ ضروری نہیں ہے کہ ہر مسلمان ہر یک وقت اس میں حصہ لے۔ ہر عہد اور ہر زمانہ میں مسلمانوں کی ایک جماعت ضرور ایسی ہونی چاہیے جو یہ فرض انجام دیتی رہے۔ اگر ایک جماعت انجام دے رہی ہے تو کافی ہے جو مسلمان شریک ہوگا اس کے لیے بڑا اجر ہے اور جو شریک نہ ہوگا۔ اس پر کوئی گناہ نہیں۔ ہدایہ میں ہے جہاد فرض کفایہ ہے جب مسلمانوں کی کوئی جماعت اس فرض کو انجام دے دے

تو باقی مسلمان ذمہ داری سے سبکدوش ہو جاتے ہیں۔ اگر کوئی بھی فرض انجام نہ دے تو ترک فرض کی وجہ سے سب گنہ گار ہوں گے کیونکہ فرض سب پر ہے۔

یاد رہے کہ جماعت سے مقصود تمام دنیا کے مسلمانوں کی مجموعی جماعت نہیں بلکہ ہر ملک کے مسلمانوں کی جماعت ہے۔ سعدی چلپی نے عنایہ میں یہ بات کھولکر سمجھائی ہے۔

ہدایہ کی عبارت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر ایک ملک کے مسلمانوں نے یہ فرض ادا کر دیا تو دوسرے ملک کے مسلمانوں سے فرض کی ذمہ داری کا بوجھ ختم ہو گیا مثلاً اگر روم کے ترکوں نے جہاد قائم رکھا تو ہندوستان کے مسلمانوں سے ساقط ہو گیا۔ کیونکہ قیام جہاد کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں سے دشمن کے حملوں اور شر کو ہٹایا جائے۔ ظاہر ہے کہ رومی مسلمانوں کے جہاد کرنے سے ہندوستان کے مسلمان محفوظ نہیں ہو سکتے وہ تو اسی وقت ہوں گے جب خود اپنے ملک میں انتظام کریں۔

مطلب یہ ہے کہ ہر ملک کے مسلمانوں پر فرض کفایہ ہے اگر اس ملک کے مسلمانوں میں سے ایک جماعت یہ فرض انجام دیتی رہی تو وہاں کے بقیہ مسلمانوں سے یہ فرض ساقط ہو جائے گا لیکن دوسرے ملکوں کے مسلمانوں پر فرضیت باقی رہے گی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اس فرض میں خطاب تمام مسلمانان عالم سے نہیں ہے بلکہ ہر جماعت اور ہر ملک کے مسلمانوں سے ہے۔ اور فرض کفایہ ہونے کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تمام دنیا کے مسلمانوں میں سے اتنے مسلمانوں کو انجام دینا چاہیے

جو حصول مقصد کے لیے کافی ہو۔ لہٰذا ایک ملک میں سلسلہ جہاد کے بقا سے دوسرے ملک کے مسلمان بری الذمہ نہیں ہو سکتے ان پر بدستور اس کا وجوب باقی رہے گا۔

فرض کفایہ کی صورت اس قتال کی ہے جس کی صورت حملہ وہجوم کی ہو

دوسری قسم دفاع ہے یعنی جب کوئی غیر مسلم جماعت مسلمانوں کی آبادیوں اور حکومتوں پر حملہ کر دے تو اس حملہ کو ہر طرح سے مقابلہ کر کے روکنا اور اسلامی ملک کی حفاظت کرنا۔ یہ فرض کفایہ نہیں بلکہ بالاتفاق نماز روزہ کی طرح ہر مسلمان پر فرض عین ہے ہدایہ میں ہے۔

"نفیر عام کی صورت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔"

شیخ ابن الہمام نے نفیر عام کی صورت یہ بتائی ہے کہ

اسلامی ملک پر غیر مسلم حملہ کر دے تو اس صورت میں جہاد فرض عین ہو جاتا ہے خواہ سربراہ مملکت نیک ہو یا بد۔

دین میں فقاہت فرض کفایہ ہے

۱۲۹ لہٰذا ایسا کیوں نہیں ہوا کہ ہر گروہ میں سے کچھ لوگ نکلیں تاکہ دین میں سمجھ بوجھ پیدا کریں۔ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بنفس نفیس جہاد کے لیے تشریف لے جا رہے ہوں تو ہر قوم میں سے جو جماعت آپ کے ہمراہ نکلے گی وہ حضور کی صحبت میں رہ کر اور سینکڑوں حوادث و واقعات سے گذر کر دین اور احکام دینیہ کی سمجھ حاصل کریں اور واپس آکر اپنی باقی قوم کو مزید علم و تجربہ کی بنا پر بھلے برے سے آگاہ کرے گی اور فرض کیجئے کہ اگر حضور خود مدینہ میں رونق افروز ہیں تو باقی ماندہ لوگ جو جہاد میں نہیں گئے حضور اقدس کی خدمت سے مستفید ہو کر دین کی باتیں سیکھیں گے اور مجاہدین کی غیبت میں جو وحی معرفت کی باتیں سنیں گے ان سے واپسی کے بعد مجاہدین کو خبردار کریں گے آیت کے الفاظ میں عربی ترکیب کے اعتبار سے دونوں احتمال ہیں۔ کما فی روح المعانی وغیرہ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ہر قوم میں سے چاہیے بعضے لوگ پیغمبر کی صحبت میں رہیں تاکہ علم دین سیکھیں اور پچھلوں کو سکھائیں لے

اس آیت کی دو طرح سے تشریح کی گئی ہے اور دونوں اپنی جگہ درست ہیں حضرت مولانا اشرف علی

لے افادات شیخ الاسلام

نے لکھا ہے کہ :

کہ ان کی ہر ہر بڑی جماعت میں سے ایک ایک چھوٹی جماعت جہاد میں جایا کرے اور کچھ اپنے وطن میں رہ جائیں تاکہ یہ باقی ماندہ لوگ دین کی سمجھ بوجھ حاصل کرتے رہیں۔

حضرت مولانا ابوالکلام نے یہ مطلب بتایا ہے :

ایسا کیوں نہ کیا گیا کہ ان کے ہر گروہ میں سے ایک جماعت نکل آئی ہوتی کہ دین میں دانش و فہم پیدا کرے۔

مولانا اشرف علی کا رجحان یہ ہے کہ آیت قرآن کا اصل موضوع مسلح جہاد ہے جب کہ مولانا آزاد کا میلان یہ بتلا رہا ہے کہ آیت کا اصل موضوع اللہ کے دین میں فقاہت ہے۔ اس میں شک نہیں کہ دونوں جہاد ہیں اور دونوں ہی امت کی ضرورت ہیں۔ زیادہ قرین قیاس یہی ہے کہ آیت کا موضوع دین میں فقاہت ہے۔ اسلام کے عام لوگوں میں پھیل جانے کے بعد اللہ سبحانہ نے اسلام کے استحکام کی تدبیر یہ بتائی ہے کہ ہر حصہ آبادی سے کچھ لوگ لے کر تعلیم و تربیت کا انتظام کیا جائے تاکہ مسلمانوں میں اسلام کا شعور عام ہو جائے۔ منشا یہ ہے کہ ایسا انتظام ہونا چاہیے کہ آبادی کا ایک حصہ دین سے واقفیت کے لیے وقف ہو جائے۔ فقہاء نے لیتفقھوا فی الدین سے دینی تعلیم کا وجوب نکالا ہے۔

دراصل اس سے پہلے آیت

الاعراب اشد کفرا و نفاقا و اجدر ان لا یعلموا حدود ما انزل اللہ علی رسولہ۔

میں یہ بات بتائی تھی کہ احکام دین سے بے خبری دیہاتی زندگی میں زیادہ ہے کیونکہ وہ شہری زندگی سے دور ہونے کی وجہ سے تعلیم و تربیت سے محروم رہتے ہیں اب یہاں بتایا جا رہا ہے کہ تعلیم کا عمومی نظم قائم ہونا چاہیے یہ تو ہو نہیں سکتا کہ تمام مسلمان گھر بار چھوڑ کر علم حاصل کرنے کے لیے نکل کھڑے ہوں۔ لہذا ایسا کرنا چاہیے کہ ہر بستی اور ہر گروہ میں سے کچھ لوگ اس کام کے لیے وقف ہو جائیں وہ تعلیم و تربیت کے مرکز میں رہ کر دین میں بصیرت حاصل کریں۔

قرآن سے اشارۃً معلوم ہو رہا ہے کہ مدینہ میں اس کام کے لیے باقاعدہ درسگاہ موجود تھی۔ اسی تعلیم گاہ کا نام صفہ تھا جس میں طلبہ کی تعداد ایک ایک وقت میں اسّی تک ہوتی تھی۔ اگر

انتظام نہ ہوتا تو اس کے لیے نفر کا حکم نہ ہوتا۔ یہ مدرسہ نبوت کی سرپرستی میں قائم تھا۔ اس مدرسہ میں تعلیم دینے کا کام حضرت ابوہریرہ، حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت زید بن ثابت، حضرت ابی بن کعب انجام دیتے تھے۔

نصاب تعلیم

آیت میں لیتفقھوا فی الدین سے مدرسہ میں نصاب تعلیم کی طرف اشارہ ملتا ہے تفقہ فی الدین کیلئے جن باتوں کی ضرورت ہے انکی باضابطہ تعلیم دی جاتی تھی۔ احادیث میں اس کا تفصیلی ذکر ہے۔ فردہ ابن ملیک جو یمن سے مدینہ منورہ آئے تھے۔ ان کے ذکر میں ہے۔

یمن سے آئے قرآن، فرائض اور قوانین اسلام کی تعلیم انہوں نے حاصل کی۔ (ابن سعد)

قرآن کے ساتھ شرائع الاسلام یعنی قرآنی احکام کی عملی شکلیں جو صحابہ کو حضور اقدس خود بتاتے تھے یہی مستقل علم تھا اور یہی ان کا نصاب تعلیم تھا۔

قرآن کی اسی پکار نے مسلمانوں میں اول دن سے تحصیل علم کا ولولہ پیدا کر دیا تھا۔ اور قرآن کے نفر کے مطالبہ نے مسلمانوں کو تحصیل علم کی طرف اس قدر مائل کر دیا تھا کہ لفظ رحلت اس مقدس سفر کا نام پڑ گیا جو تحصیل علم کے لیے کیا جائے۔ فرائض اور قوانین اسلام کے سیکھنے کے لیے گھر بار چھوڑنا اور دور دراز ممالک کا سفر کرنا مسلمانوں کا خصوصی شعار تھا۔ علمائے سلف کو اس خصوصی سفر کے ساتھ جو غیر معمولی شغف تھا آج اس کا اندازہ لگانا بھی مشکل ہے۔ محدثین کے حالات پڑھنے سے لفظ رحلت کے تقدس کا اندازہ ہوتا ہے۔

صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہ کی زبانی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ مبارک ارشاد منقول ہے۔

جو شخص علم کی تلاش میں کسی راستہ پر چلتا ہے اللہ سبحانہ اس کے صلہ میں اس کے لیے جنت کا راستہ آسان کر دیتا ہے۔

اور جامع ترمذی، سنن دارمی میں حضرت انس رضی اللہ عنہ کے حوالہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد آیا ہے۔

جو شخص علم کی تلاش میں نکلا وہ جب تک لوٹ کر نہ آئے اللہ کے راستہ میں ہے۔

محدثین نے اس عنوان پر اپنی تصانیف میں مستقل ابواب قائم کیے ہیں چنانچہ امام بخاری نے اپنی

صحیح میں کتاب العلم میں دو باب باندھے ہیں پہلا باب ہے باب الخروج فی طلب العلم اور ترجمۃ الباب میں لکھا ہے کہ

حضرت جابر بن عبداللہ نے حضرت عبداللہ ابن انیس سے ایک حدیث سننے کی خاطر ایک ماہ کا سفر کیا تھا۔

اور دوسرے باب کا عنوان ہے باب الرحلۃ فی المسئلۃ النازلۃ یعنی جو مسئلہ پیش آئے اسے دریافت کرنے کے لیے سفر کرنا۔ اور امام دارمی نے اپنی سنن میں باب باندھا ہے باب الرحلۃ فی طلب العلم والعناء فیہ یعنی طلب علم کی خاطر سفر کرنا اور مشقت اٹھانا۔

دینی تعلیم کا مقصد

نسٰلہ اور تاکہ واپسی پر اپنی قوم کو ڈرائیں تاکہ لوگ خلاف دین سے بچ کر رہیں طلب علم فرض کفایہ ہے اور جہاد بھی فرض کفایہ ہے۔ البتہ اگر کسی وقت امام کی طرف سے نفیر عام ہو جاتا ہے۔ تبوک میں یہی صورت تھی اس لیے پیچھے رہنے والوں سے باز پرس ہوئی۔ واللہ اعلم ابو حیان اندلسی کے نزدیک یہ آیت جہاد کے لیے نہیں طلب علم کے بارہ میں ہے۔ جہاد اور طلب علم کی آیات میں مناسبت یہ ہے کہ دونوں میں خروج فی سبیل اللہ ہے اور دونوں کی غرض احیائے واعلائے دین ہے ایک میں تلوار سے دوسرے میں زبان وغیرہ سے [1]

اس میں اسلامی تعلیم کا مقصد یہ بتایا گیا ہے کہ لوگ علم سیکھیں اور سیکھنے کے بعد جا کر دوسروں کو سکھائیں۔ خود مستفید ہو کر دوسروں کو بھی مستفید کریں۔ اس طرح دیہات کے لوگ اپنے مال اور مویشی کی بھی دیکھ بھال کر سکیں گے اور اسلامی تعلیمات سے بھی استفادہ کر سکیں گے۔ صحابہ نے اس مقصد کی خاطر باریاں مقرر کر رکھی تھیں۔ آیت میں طلب علم کے لیے تفقہ کا لفظ آیا ہے جس کے معنے ہیں دین میں بصیرت حاصل کرنا اور تعلیم دینے کے لیے انذار کا لفظ آیا ہے جس کے معنے ڈرانے کے ہیں اور خاص طور پر آخرت کی زندگی کی تیاری کی خاطر آگاہ کرنے کے ہیں۔ یہ دو لفظ اسلام میں جو تعلیم کا بنیادی مقصد ہے اس کے لیے استعمال ہوئے ہیں اسلام میں تعلیم کا بنیادی مقصد دین میں بصیرت حاصل کرنا اور آخرت کی کامیابی کے لیے اپنی اور دوسروں کی تربیت کرنا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ تعلیم عمومی کے جس انتظام کا اس میں حکم دیا گیا ہے اس کا اصل اور بنیادی مقصد مسلمانوں کو محض ناخواندہ سے خواندہ بنانا نہیں بلکہ واضح طور پر اس کا مقصد یہ ہے کہ لوگوں میں دینی شعوری ہو اور ان کو اس حد تک دین سے آگاہی حاصل ہو جائے کہ وہ غیر مسلمانہ انداز زندگی اور مسلمانہ زندگی میں امتیاز کر سکیں اور غیر مسلمانہ زندگی سے بچ کر رہ سکیں یہ اسلامی تعلیم کا وہ مقصد ہے جو خود اللہ سبحانہ نے مقرر کر دیا ہے تعلیم و تعلم ہی کے موضوع پر یہاں اگر قرآن کی یہ آیت بھی پیش نظر رہے جس میں حصول کمال کا تیر بہدف نسخہ اسی تعلیم و تعلم کو بنایا ہے۔

کونوا ربانیین بما کنتم تعلمون الکتاب و بما کنتم تدرسون

ربانی بن جاؤ کتاب الٰہی کے پڑھانے اور پڑھنے کے ذریعے

ربانی اسم نسبت ہے رب کی طرف جیسے لحیانی، رقبانی وغیرہ یعنی بہت زیادہ یا خدا، بہت زیادہ خدا رسیدہ۔ آیت میں صرف یہ نہیں بتایا کہ ربانی بن جاؤ بلکہ ربانی بننے کا طریقہ بھی بتا دیا ہے اور وہ یہ ہے بما کنتم تعلمون الکتاب و تدرسون یعنی تم کتاب الٰہی کے تعلیم و تعلم کے ذریعے ربانی بن سکتے ہو۔ جو بات زیر تشریح آیت میں تفقہ اور انذار کے عنوان سے پیش کی ہے اسی کو اس آیت میں درس تعلیم سے تعبیر کیا ہے۔ اگر یہ حقیقت ہے تو سمجھ لینا چاہیے کہ قرآن کی نظر میں ربانی وہ ہے جو تعلیم و تعلم کا مشغلہ رکھتا ہو۔ گویا قرآن نے امت کو قیامت تک کے لیے حصول کمال کا بہ تیر بہدف نسخہ بتا دیا ہے کہ اگر کمال چاہتے ہو تو درس و تعلیم یا تفقہ و انذار کو اپناؤ۔

یہاں تفقہ اور انذار پر سرسری نگاہ ڈال کر نہ گذر جائیے ذرا اس کی معنویت پر غور کیجیے،

تفقہ کے معنے صرف سمجھنے کے نہیں بلکہ اس میں زیادتی اور محنت کا مفہوم بھی داخل ہے، ایسے ہی انذار کے معنے صرف آگاہ کرنا نہیں بلکہ وہ آگاہی جس میں رحم، ہمدردی کی آمیزش ہو۔ اسلام آشنائی میں معرفت حاصل کرنے کے لیے خوب محنت مشقت اٹھا کر اور پورا فن کار بن کر شفقت اور محبت کے جذبات سے سرشار ہو کر اسلامی علوم کی سوغات پیش کرنا قرآن کا مطالبہ ہے۔

مسلم کے کمال کی ایک شرط یہ ہے کہ اس کی تعلیم میں یہ تاثر ہو کہ وہ دوسروں کو اپنے فیض سے بہرہ ور کر سکے یعنی وہ خود کامل ہو اور دوسرے ناقصوں کو بھی کامل بناتا ہو۔ وہ خود پاک ہو دوسرے ناپاکوں کو پاک وصاف کر دیتا ہو۔ وہ علم جو انسان میں ابھار پیدا نہیں کرتا وہ علم صحیح نہیں ہے علم کی صحت کا دارومدار اس پر ہے کہ علم عالم میں صفت اور ملکہ کا درجہ حاصل

کرے۔ عمل صفت اور ملکہ ہی کے نتیجے کو کہتے ہیں۔ اگر کسی شخص کو صرف کتاب الہٰی کے نقوش ذہن میں مستحضر ہیں اور اس کا کوئی اثر اس کے عمل میں نہیں ہے وہ علمی فیضان کا دوسروں کے لیے کبھی ذریعہ نہیں بن سکتا۔ چونکہ تفقہ کا لازمہ عمل ہے اس لیے آیت میں عمل کی تصریح نہیں ہے جیسے جزا کے موقعہ پر صرف عمل کا ذکر کیا جاتا ہے کیونکہ عمل کے لیے علم لازم ہے۔ علم و عمل میں لازم و ملزوم کی نسبت ہے کہیں لازم کا ذکر کر دیا جاتا ہے اور کہیں صرف ملزوم کو۔

غِلْظَةً ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿١٢٣﴾ وَإِذَا مَا
أُنْزِلَتْ سُورَةٌ فَمِنْهُمْ مَنْ يَقُولُ أَيُّكُمْ زَادَتْهُ هَٰذِهِ إِيمَانًا ۚ
فَأَمَّا الَّذِينَ آمَنُوا فَزَادَتْهُمْ إِيمَانًا وَهُمْ يَسْتَبْشِرُونَ ﴿١٢٤﴾
وَأَمَّا الَّذِينَ فِي قُلُوبِهِمْ مَرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا إِلَىٰ
رِجْسِهِمْ وَمَاتُوا وَهُمْ كَافِرُونَ ﴿١٢٥﴾ أَوَلَا يَرَوْنَ أَنَّهُمْ يُفْتَنُونَ
فِي كُلِّ عَامٍ مَرَّةً أَوْ مَرَّتَيْنِ ثُمَّ لَا يَتُوبُونَ وَلَا هُمْ
يَذَّكَّرُونَ ﴿١٢٦﴾ وَإِذَا مَا أُنْزِلَتْ سُورَةٌ نَظَرَ بَعْضُهُمْ إِلَىٰ
بَعْضٍ هَلْ يَرَاكُمْ مِنْ أَحَدٍ ثُمَّ انْصَرَفُوا ۚ صَرَفَ اللَّهُ
قُلُوبَهُمْ بِأَنَّهُمْ قَوْمٌ لَا يَفْقَهُونَ ﴿١٢٧﴾

اے اہلِ ایمان ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس ہیں [1] اور ان کو تمہارے اندر سختی محسوس ہونی چاہیئے [2] اور خوب جان لو کہ اللہ سبحانہ متقیوں کے ساتھ ہے [3] اور جب قرآن کی کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے کچھ کہتے ہیں اس سورت کے ذریعے تم میں سے کس کے ایمان میں

زیادتی ہوئی ہے؟ سو سُن لو اہلِ ایمان کے ایمانوں میں یہ
سورت زیادتی کرتی ہے اور وہ اس پر خوشیاں منا رہے
ہیں اور لیکن وہ لوگ جن کے دل روگی ہیں تو بلاشبہ ان میں
اس سورت کے ذریعے گندگی پر گندگی کا اضافہ ہوتا ہے
اور وہ دنیا سے ایسی حالت میں گئے کہ ایمان سے محروم تھے[۲]
کیا ان لوگوں کو نظر نہیں آتا ہے کہ کوئی سال اس سے خالی نہیں
جاتا ہے کہ وہ ایک بار یا دو بار آزمائش کی بھٹی میں نہ پڑے
ہوں پھر بھی ان کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی ہے اور نصیحت
یاب نہیں ہوتے ہیں[۵] اور جب ان کے بارے میں کوئی
سورت نازل ہوتی ہے تو وہ اس میں ایک دوسرے
کو دیکھنے لگتے ہیں کیا تم پر کسی کی نگاہ تو نہیں پھر منہ پھیر کر
چل دیتے ہیں[۶] اللہ ہی نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے
کیونکہ وہ سمجھ ہی نہیں رکھتے ہیں[۷]

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا قَاتِلُوا الَّذِيْنَ يَلُوْنَكُمْ مِّنَ الْكُفَّارِ وَلْيَجِدُوْا فِيْكُمْ

مفردات کے معانی

یلون ولی سے مضارع کا جمع مذکر غائب باب حسب یحسب ولی یلی آتا ہے اس کے دو مصدر آتے ہیں ولی اور ولایۃ۔ ولی کے معنی لگنا اور قریب ہونا اور ولایۃ کے معنی ریاست اور سیاست کے ہیں۔ ولی سے اولیٰ اسم تفضیل کا مذکر ہے بمعنے اقرب آتا ہے یاد رہے کہ اُولیٰ ہمزہ کے پیش کے ساتھ ہی اسم تفضیل ہے مگر یہ ولی سے نہیں بلکہ اول سے اسم تفضیل کا واحد مونث ہے جو اُخریٰ کے مقابلہ پر آتا ہے اس کا مذکر اول ہے۔ ولی سے مولیٰ آتا ہے اور ایک سے زیادہ معنی میں استعمال ہوتا ہے۔

غلظۃ اس کے معنی سختی اور ترشی کے ہیں غلظ یغلظ باب نصر سے آتا ہے۔ زمخشری نے لکھا ہے کہ یہ لفظ جرأت سے جنگ میں ڈٹنا اور دشمن پر قید اور قتل میں سختی کا جامع لفظ ہے۔ حجازی اسے بکسر الغین پڑھتے ہیں جب کہ بنو تمیم بضم الغین غلظہ اور مشہور قاری عاصم غلظہ بفتح الغین پڑھتے ہیں۔

رجس ناپاک، پلید، گندہ۔ عقوبت عذاب بلا جمع ارجاس آتی ہے۔ رجس چار طرح سے ہوتا ہے طبعی، عقلی شرعی اور تینوں کا مجموعہ رجس شرعی جوا اور شراب رجس عقلی شرک لحم خنزیر تینوں کا مجموعہ مردار قرآن میں سب کے لیے رجس بولا گیا ہے۔

جنگ کی ترتیب

میدان جنگ میں بھی دعوت ہی کی ترتیب قائم رکھی دعوت میں ترتیب یہ بتائی تھی کہ انذر عشیرتک الاقربین پہلے قریب ترین لوگوں کو دعوت دو پھر عمومی دعوت دو جنگ میں بھی ترتیب بتائی کہ پہلے آس پاس کے لوگوں کی جانب سے راہ دعوت میں جو رکاوٹ اسے ہٹاؤ پھر دور کی طرف توجہ کرو۔ اور اس ہدایت کی وجہ یہ ہے کہ پہلے عمومی حکم دیا تھا کہ قاتلوا المشرکین کافۃ کما یقاتلونکم کافۃ۔ اب خصوصی حکم کے ذریعے ترتیب بتائی۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام نے اسی پر عمل کیا ہے پہلے اپنی قوم کو دعوت دی وہ دعوت میں رکاوٹ بنے جنگ کے ذریعے رکاوٹ کو دور کیا پھر اہل عرب کو دعوت دی ان کی جانب سے رکاوٹ ہوئی اسے جنگ کرکے دور کیا۔ پھر اہل شام کو دعوت

کو دعوت دی اور آپ کے بعد صحابہ کرام نے بھی اسی ترتیب کو قائم رکھا۔
ہر دعوت کی راہ میں رکاوٹیں آتی رہی ہیں کیونکہ یہ دنیا خیر و شر کا مسکن ہے یہاں خیر کی بھی طاقت ہے اور شر کی بھی۔ اور دونوں کو اپنے اپنے طور پر کام کرنے کی پوری پوری آزادی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ یہ دونوں باہم ٹکراتی رہتی ہیں اور ایک دوسرے کو نیچا کرنے کے لیے زور لگاتی رہتی ہیں اس لیے یہ ایک فطری سی بات ہے کہ نبوت کی دعوت کی راہ بھی روکی جائے اور نہ صرف یہ کہ دعوت کو قبول نہ کیا جائے بلکہ سرے سے دعوت کو برداشت بھی نہ کی جائے۔ اس ملئے قدرتی طور پر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ان رکاوٹوں کے بارے میں نبوت کا رویہ کیا ہونا چاہیے۔ قرآن اس سوال کے جواب میں ہدایت دیتا ہے کہ رکاوٹ خواہ کوئی ہو اسے ہٹانے کی جان توڑ کوشش کرنی چاہیے مسلسل کرنی چاہیے اور آخر تک کرنی چاہیے لیکن اس دفاع میں ترتیب ہونی چاہیے۔ ترتیب یہی ہے کہ پہلے پاس کی رکاوٹ کو دور کیا جائے۔
لہ اے اہل ایمان ان کافروں سے جنگ کرو جو تمہارے آس پاس ہیں۔ جہاد فرض کفایہ ہے جو ترتیب طبعی کے مطابق اول ان کفار سے ہونا چاہیے جو مسلمانوں سے قریب تر ہوں۔ بعدہ ان کے قریب رہنے والوں سے۔ اسی طرح درجہ بدرجہ حلقہ جہاد کو وسیع کرنا چاہیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے جہاد اسی ترتیب سے ہوئے ہیں دفاعی جہاد میں بھی فقہاء نے یہی ترتیب رکھی ہے کہ جس اسلامی ملک پر کفار حملہ آور ہوں سو وہاں کے مسلمانوں پر دفاع واجب ہے اگر وہ کافی نہ ہوں یا سستی کریں تو ان کے متصل رہنے والوں پر وہ کافی نہ ہوں تو پھر جو ان سے اقربا ہوں۔ اسی طرح اگر ضرورت پڑے تو درجہ بدرجہ مشرق سے مغرب تک جہاد فرض ہوتا چلا جائے گا۔لہ

اسلام نے اپنے پورے نظام اس قرب کو خاص اہمیت دی ہے دین کی دعوت سے لے کر کھانے کی دعوت تک میں قرب کو ملحوظ رکھا ہے دین کی دعوت کا آغاز اقربا سے ہوا۔ انذر عشیرتك الاقربین نفقات میں والدین، اولاد اور بیوی کے اخراجات میں قرابت ہی کو اولیت حاصل ہے میراث میں بھی قرب ہی کو مدار بنایا ہے۔ صدقات میں بھی اول خویش بعد درویش کو قائم رکھا۔ اداب مجلس میں بھی قرب ہی کی رعایت رکھی کھانا پکاتے وقت

لہ افادات شیخ افادات

قرب ہی کے متعلق ارشاد ہوا ہے۔

کل ما یلیک ولنا کل مما لا یلیک

نماز میں قریب قریب کھڑے ہونے کی ہدایت اور امام سے قریب ہونے کی ترغیب ہے غرض اسلام کے پورے نظام حیات میں قرب ہی کی روح کار فرما ہے۔ جنگ میں قریب والوں کی رکاوٹ کو ہٹانے میں اخراجات کی کمی، حمل ونقل کے وسائل کی کم ضرورت، نزدیک دشمن کی قوت کا صحیح اندازہ ممکن ہے، بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کی جانب سے اطمینان ہوتا ہے۔ جہاد تو دراصل اچھائی کے راستہ سے رکاوٹوں کے ہٹانے کا نام ہے۔ اسی لیے جہاد کو سب سے بڑی نیکی بتایا گیا ہے اور نیکیوں کے زیادہ حقدار وہ ہی ہوتے ہیں جو قریب ہوں۔ بقاعی نے لکھا ہے کہ جہاد میں یہ ترتیب اگر قائم کرو گے تو تم دو گونہ فائدوں سے دوچار ہو گے ایک یہ کہ تمہیں پیچھے سے کسی سازش کا کوئی اندیشہ نہ رہے دوسرے یہ کہ تم دو جہادوں کے علمبردار ہو جاؤ گے ایک دین میں تفقہ کا جہاد دوسرے تلوار کا جہاد۔

اس میں ایک لطیف نکتہ بھی ہے کہ یہ ایک کسوٹی ہے جس کے ذریعے کھرے کھوٹے کا پتہ لگ جائے گا۔ منافقین کے آس پاس والے کفار ومشرکین سے عزیزانہ روابط اور دوسرے کاروباری مفادات وابستہ تھے۔ وہ اس کے لیے تیار نہ تھے کہ ان سے جنگ کریں اس سے منافقت کا بھانڈا چوراہے میں پھوٹنے کا اندیشہ تھا یہ دین کا اصل مطالبہ ان کے سامنے رکھ دیا خطاب اگرچہ عام ہے لیکن قرینہ بتا رہا ہے روئے سخن ان کی ہی طرف ہے۔ مطلب یہ ہے کہ گردوپیش کے کفار جس طرح تمہاری دعوت ایمان وہدایت کے سب سے زیادہ حقدار تھے اسی طرح اب اللہ ورسول کی جانب سے اتمام حجت اور اعلان جنگ کے بعد تمہاری تلواروں کے بھی سب سے زیادہ سزاوار یہی ہیں۔ جو لوگ قرابت داری دوستی اور اپنے دنیوی مفاد کی خاطر ان کے معاملے میں مداہنت برتیں گے ان کا ایمان مشکوک ہے۔ اہل ایمان کو پہلے ہدایت کی گئی تھی کہ منافقین کا استیصال کرنے کے لیے باقاعدہ جہاد کیا جائے وہی بات زوردار طریقے پر پھر دہرائی گئی ہے یہاں کھول کر کہا گیا ہے۔ قاتلوا تاکہ اہل ایمان اس کی اہمیت محسوس کریں اور ان منافقوں کے معاملے میں ان نسلی ونسبی اور معاشرتی تعلقات کا لحاظ نہ کریں جو ان کے اور ان کے درمیان وابستگی کا موجب بنے ہوئے تھے۔

ایمان کو کفر کے مقابلے میں سخت ہونا چاہیئے

۱۲۳ اور ان کو تمہارے اندر سختی محسوس ہونی چاہیے مومن کی شان یہ ہے کہ اپنے بھائی کے حق میں نرم اور دشمنان خدا و رسول کے معاملہ میں سخت اور شدید ہو تاکہ اس کی نرمی اور ڈھیلا پن دیکھ کر دشمن جری نہ ہو جائے اذلة علی المومنین اعزة علی الکافرین والذین معه اشداء علی الکفار رحماء بینهم اور جاهد الکفار والمنافقین واغلظ علیهم وفی الحدیث انه صلی اللہ علیه وسلم قال انا الضحوك القتال [1] علامہ آلوسی لکھتے ہیں دراصل اس میں مسلمانوں کو ہدایت کی گئی ہے کہ وہ ایسے بن کر رہیں کہ کفار ان کو اپنے حق میں سخت گیر سمجھیں شریعت کا قانون جس سختی کا مطالبہ کرتا ہے اس کا موقعہ یہی ہے کہ جب کوئی فرد یا جماعت حدود الٰہی کو توڑے اور اسلامی زندگی کو نقصان پہنچائے یا پہنچانے کے درپے ہو جیسے منافقین و کفار جب سمجھانے پر نہ سمجھیں اور اپنی ضد پر اڑے رہیں بلکہ مسلمانوں کو آزار پہنچانے کے درپے ہوں تو ان کے شر کو روکنے اور ان کی سازشوں کا قلع قمع کرنے کے لیے ان پر پوری سختی کرنا قرآن کا مسلمانوں سے مطالبہ ہے مطلب یہ ہے کہ اب ان منافقین سے نرم سلوک ختم ہو جانا چاہیئے اور ان پر سختی کرنی چاہیے۔ بہرحال ولیجدوا فیکم غلظة کا مطالبہ یہ ہے کہ اب وہ تمہارے طرز عمل سے یہ محسوس کریں کہ تمہارے اندر ان کے لیے موالات دوستی اور محبت کی کوئی جگہ باقی نہیں ہے بلکہ وہ جس طرح من حیث القوم تمہارے اور تمہارے دین کے دشمن ہیں۔ اسی طرح تم بھی من حیث الجماعة ان کے اور ان کے دین کے دشمن ہو۔ اب تک وہ تمہارے دل میں اپنے لیے نرم گوشہ پاتے تھے اس وجہ سے ان کو توقع تھی کہ وہ اپنے مقاصد کے لیے تمہیں برابر استعمال کرتے رہیں گے اب یہ حالت بالکل ختم ہونی چاہیے۔

اللہ کی معیت کے لیے تقویٰ شرط ہے

۱۲۳ اور خوب جان لو کہ اللہ سبحانہ متقیوں کے ساتھ ہے یعنی اللہ سبحانہ سے ڈرنے والے کو کسی کافر قوم سے ڈرنے اور دبنے کی کوئی وجہ نہیں۔ جب تک اور جس قدر مسلمان اللہ سے

---

[1] افادات شیخ اسلام

ڈرتے رہے اسی وقت اور اسی قدر ان کو کفار پر غلبہ حاصل ہوتا رہا حق تعالیٰ ہمارے دلوں میں اپنا ڈر پیدا کر دے آمین[1] یعنی جہاد اور قتال کی بنیاد ہی تقویٰ اور صرف تقویٰ ہونا چاہیے" یہاں اگر ایک طرف تقویٰ پر زور دے کر جہاد میں اخلاص کی تعلیم دی ہے اور مال کی طمع شہرت کی آرزو کا راستہ بند کر دیا ہے تو دوسری طرف اہل ایمان کا علاقہ معیت اللہ سبحانہ سے جوڑ کر یہ بتلا دیا کہ اب تمہیں خوف و ہراس کی ضرورت نہیں ہے تمہاری نصرت و اعانت کے لیے اللہ سبحانہ موجود ہے۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے کہ جن مسلمان سلاطین نے تقویٰ کی پوری پوری کی ان کے زمانے میں فتوحات بھی ہوتی رہیں اور جس قدر وہ تقویٰ سے ہٹتے رہے فتوحات بھی ان سے کنارہ کرتی گئی ہیں۔ اس ایک فقرے میں اگر ایک طرف مسلمانوں کی حوصلہ افزائی ہے کہ تم ان سے جنگ کرنے میں کوئی کمزوری نہ دکھاؤ اللہ کی معیت و نصرت تمہارے ساتھ ہے اگر تم متقی ہو دوسری طرف اہل ایمان کو تنبیہ بھی کر دی کہ تمہیں ان سے جو جنگ کرنے کی ہدایت کی گئی ہے تو اس میں بھی تم اللہ کے قوانین کی پوری پابندی کرنا کسی مرحلہ پر بھی حدود الٰہی سے تجاوز نہ کرنا۔ اللہ صرف ان لوگوں کا ساتھ دیتا ہے جو اللہ سے ڈرتے اور اس کی نافرمانی نہیں کرتے ہیں۔

دراصل تقویٰ پوری اسلامی زندگی کی روح ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ اسلام کی ہر تعلیم کا بنیادی مقصد ہر عمل کے قالب میں تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے۔ اسلام کی ساری عبادتوں کا مرکز اسی تقویٰ کا حصول ہے نماز ہو یا روزہ حج ہو یا زکوٰۃ قربانی ہو یا مساجد کی تاسیس ازدواجی زندگی ہو یا معاملات اخلاقی نظام ہو یا سیاسی سب کا مقصد تقویٰ ہے آخرت میں ہر قسم کی نعمتوں کے مستحق بھی اہل تقویٰ ہیں اور دنیا میں زندگی کے ہر گوشہ میں کامیاب اہل تقویٰ ہیں اہل تقویٰ ہی اللہ سبحانہ کے محبوب ہیں۔ قرآن نے تقویٰ والوں کا نہ صرف حلیہ عام بلکہ ایک ایک خط و خال نمایاں کر کے پیش کیا ہے اور بنایا ہے۔

عربی زبان میں اس کے معنی بچنے کے ہیں لیکن اصطلاح میں دل کی اس کیفیت کا نام ہے جو اللہ تعالیٰ کے ہمیشہ حاضر و ناظر ہونے کا یقین پیدا کر کے دل میں خیر و شر کی تمیز کی خلش اور خیر کی طرف رغبت اور شر سے نفرت پیدا کر دیتی ہے دوسرے لفظوں میں ہم یوں کہہ سکتے ہیں کہ تقویٰ ضمیر کے اس احساس کا نام ہے جس کی وجہ سے ہر کام میں اللہ سبحانہ کے حکم کے مطابق

---

[1] افادات شیخ الاسلام

زندگی بسر کرنے کی شدید رغبت اور اس کی مخالفت سے شدید نفرت پیدا ہو جائے۔

آیئے اب پوری آیت کا ایک بار پھر مطالعہ کر لیجیے اس پوری آیت میں غالباً اس طرف اشارہ ہے کہ اگرچہ تبوک میں رومیوں سے مقابلہ نہیں ہوا کیونکہ انہوں نے حملہ کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا لیکن وہ پھر تیاریاں کرنے والے ہیں اور ضروری ہے کہ مسلمان جنگ کے لیے مستعد رہیں۔ اس صورت میں الذین یلونکم کا مطلب یہ ہوگا کہ جو دشمن تمہاری سرحد سے متصل ہیں یعنی شام کے رومی اور عرب کے عیسائی قبائل۔ چنانچہ چند سالوں کے بعد ایسا ہی ہوا اور یرموک کا معرکہ پیش آیا۔ چونکہ رومیوں کا مقابلہ اس عہد کی سب سے زیادہ طاقتور اور متمدن شہنشاہی کا مقابلہ تھا اس لیے فرمایا کہ اس قوت سے لڑو کہ وہ تمہاری سختی محسوس کریں۔ مسلمانوں نے اس حکم کی جس طرح تعمیل کی اس کا اندازہ صرف اس بات سے کیا جا سکتا ہے کہ ہرقل کی فوج بالاتفاق دو لاکھ سے زیادہ تھی اور مسلمان زیادہ سے زیادہ چوبیس ہزار تھے لیکن نتیجہ یہ نکلا کہ ہمیشہ کے لیے رومی حکومت کا شام میں خاتمہ ہو گیا۔

قرآن پر طنز نفاق

۱۲۴ اور جب قرآن کی کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو ان میں سے کچھ کہتے ہیں اس سورت کے ذریعے تم میں سے کس کے ایمان میں زیادتی ہوتی ہے سو جو لوگ اہل ایمان کے ایمانوں میں یہ سورت زیادتی کرتی ہے اور وہ اس پر خوشیاں مناتے ہیں۔ اور لیکن وہ لوگ جن کے دل روگی ہیں تو بلاشبہ ان میں اس سورت کے ذریعے گندگی پر گندگی کا اضافہ ہوتا ہے اور وہ دنیا سے ایسی حالت میں گئے کہ ایمان سے محروم تھے جب کوئی قرآنی سورت نازل ہوتی تو منافقین باہم یا سادہ دل مسلمانوں سے ازراہ تمسخر و استہزاء کہتے کہ کیوں صاحب تم میں سے کس کس کا ایمان اس سورت نے زیادہ کیا ہے مطلب یہ تھا کہ معاذ اللہ اس سورت میں رکھا ہی کیا ہے۔ کون سے حقائق و معارف ہیں جو ایمان و یقین کی ترقی کا باعث ہوں۔ حق تعالیٰ شانہ نے جواب دیا ہے کہ بے شک کلام الٰہی سن کر مومنین کے ایمان میں تازگی و ترقی ہوتی ہے اور قلوب مسرور و شاداں ہوتے ہیں۔ ہاں جن کے دلوں میں کفر و نفاق کی بیماری ہو ان کی بیماری اور گندگی میں اضافہ ہو جاتا ہے حتی کہ یہ بیماری ان کی جان لے کر چھوڑتی ہے۔

ے باراں کہ در لطافت طبعش خلاف نیست
در باغ لالہ روید ودر شورہ بوم خس

حضرت شاہ صاحب نے دوسرے انداز میں اس آیت کی تشریح کی ہے یعنی کلام الٰہی جس مسلمان کے دل کے خطرے کے موافق پڑتا وہ خوش ہو کر بول پڑتا کہ سبحان اللہ اس آیت نے میرا ایمان ویقین اور زیادہ کر دیا۔ اسی طرح جب کسی سورت میں منافقین کے پوشیدہ عیوب ظاہر کئے جاتے تو وہ بھی شرمندگی سے کھسیانے ہو کر کہتے کہ بے شک اس کلام نے ہمارے یقین و ایمان کو بڑھا دیا۔ لیکن یہ کہنا چونکہ خوشی اور انشراح سے نہ تھا محض رفع خجالت کے لیے کہہ دیتے تھے اس لیے یہ توفیق نہ ہوتی کہ آئندہ توبہ کر کے سچے دل سے حق کی پیروی کریں بلکہ پہلے سے زیادہ اپنے عیب چھپانے کی فکر و تدبیر کرتے تھے۔ یہ ہی ہے گندی پر گندگی۔ عیب دار کو لازم ہے کہ نصیحت سن کر اپنی اصلاح کرے نہ یہ کہ الٹا ناصح سے چھپانے لگے۔[1]

اہل ایمان کے ایمان میں درجہ بدرجہ زیادتی محض استعادہ نہیں بلکہ ایک حقیقت ہے قرآن کا ہر حکم اہل ایمان کے لیے میدان مسابقت کھولتا ہے اور جب وہ اس میدان کی بازی جیت لیتے ہیں تو ان کی قوت ایمانی میں مزید دوسرے میدان جیتنے کے لیے عزم و حوصلہ پیدا ہو جاتا ہے یہاں تک درجہ بدرجہ سعادت کی آخری منزل پر پہنچ جاتے ہیں۔ بالکل یہی حال کفر و نفاق کا بھی ہوتا ہے وہ ایک محرومی کے بعد دوسری محرومی کی اذیتیں سہتے سہتے ایمان کی آخری رمق سے بھی بالکل خالی ہو جاتے ہیں۔

اس سے معلوم ہوا کہ ایمان کوئی ساکن و جامد چیز نہیں ہے اور تصدیق و عدم تصدیق کا ایک ہی مرتبہ نہیں ہے۔ نہیں بلکہ تصدیق اور انکار دونوں میں انحطاط اور نشو و نما کی صلاحیت ہے ہر انکار کی کیفیت گھٹ بھی سکتی ہے اور بڑھ بھی سکتی ہے اور اس طرح ہر اقرار و تصدیق میں ارتقا بھی ہو سکتا ہے اور تنزل بھی۔ ہاں قانونی احکام کے اعتبار سے نظام تمدن میں حقوق اور حیثیات کا جب تعین کیا جائے گا تو تصدیق اور عدم تصدیق دونوں کے ایک ہی مرتبے کا اعتبار ہو گا۔ اسلامی معاشرے میں تمام ماننے والوں کے قانونی حقوق برابر ہوں گے خواہ ان

[1] افادات شیخ الاسلام

کے درمیان ماننے کے مراتب کتنا ہی تفاوت ہو اور سب نہ ماننے والے ایک ہی مرتبے میں ذمی، حربی، معاہد اور مسالم قرار دیئے جائیں گے خواہ کفر کے اعتبار سے مراتب کا کتنا ہی فرق ہو۔

ایمان جب ترقی کرتا ہے کبھی آیات قرآنی کا تدبر و غور ایمان کی تر و تازگی کا باعث بن جاتا ہے کبھی محض موہبت الٰہی کشاں کشاں ایمان حقیقی تک لے آتی ہے۔ اچانک وہ دیکھتا ہے کہ پہلے جو قلب ظلمت کدہ تھا اب نور ایمانی سے وادی ایمن بن گیا ہے۔ حقائق ایمانیہ آناً فاناً منکشف ہونے لگتی ہیں۔ راہ اسلام میں ہر ضرب ایک نئی تازگی بخشتی ہے، طبل جنگ کی آواز صدائے سرود سے زیادہ سہانی اور مستانی معلوم ہوتی ہے۔ آیات قرآنیہ کی تلاوت وہ کام کرتی ہے جو کھیتوں پر باران رحمت کے قطرے گرتے ہیں۔

کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ اس زیادتی سے مراد صرف تصدیق ہے ہرگز نہیں بلکہ جب کوئی مومن گوش انقیاد و طاعت سے کلام پاک سنتا ہے تو ہر بار معانی پر غور و تفکر اس کے قلب میں جنت کی نئی رغبت اور آخرت کا نیا خوف اللہ سبحانہ کی ایک نئی محبت اور اس کی طاعت کا ایک نیا جذبہ پیدا کرتا ہے اسی کا نام قرآن کی زبان میں ایمان کی زیادتی ہے۔

آیت میں انداز تعبیر بتا رہا ہے کہ صحابہ کرام کا دن رات کا یہی مشغلہ تھا کہ وہ ایمان کا جائزہ لیتے رہتے تھے جب کوئی آیت اترتی تو اپنی روح میں ایک نئی ایمانی تازگی محسوس کرتے اس کے برعکس کفار کا مشغلہ یہ تھا کہ وہ اس جذبہ کا تمسخر اڑاتے اور مذاق کرتے۔

معنوی سعادت و شقاوت کا قانون

۱۲۶ کیا ان لوگوں کو نظر نہیں آتا ہے کہ کوئی سال اس سے خالی نہیں جاتا ہے کہ وہ ایک یا دو بار آزمائش کی بھٹی میں نہ پڑتے ہوں، پھر ان کو توبہ کی توفیق نہیں ہوتی ہے اور نصیحت یاب نہیں ہوتے ہیں یعنی ہر سال کم از کم ایک دو مرتبہ ان منافقین کو فتنہ و آزمائش میں ڈالا جاتا ہے مثلاً قحط، بیماری وغیرہ کسی آفت ارض و سماوی میں مبتلا ہوتے ہیں یا پیغمبر علیہ السلام کی زبانی ان کا نفاق علانیہ ظاہر کر کے رسوا کیا جاتا ہے یا جنگ و جہاد ان کی بزدلی اور بد باطنی بے نقاب کر دی جاتی ہے مگر وہ ایسے بے حیا اور بد باطن واقع ہوئے ہیں کہ تازیانے کھا کر بھی ٹس سے مس نہیں ہوتے نہ پچھلی غلطاؤں سے توبہ کرتے ہیں نہ آئندہ کو نصیحت پکڑتے ہیں[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ غور نہیں کرتے کہ ان کی بیماری اس حد کو پہنچ گئی کہ ان کے لیے توبہ کے دروازہ بند ہو چکے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چونکہ اپنے ہر بندے پر رحمت کرنا چاہتا ہے اس وجہ سے اس نے اس دنیا کا انتظام اس طرح رکھا ہے کہ ہر شخص خواہ چھوٹا ہو یا بڑا سال میں ایک دو بار کسی نہ کسی ایسی آزمائش میں ڈالا جاتا ہے جو اس کو توبہ اور اصلاح حال کی طرف متوجہ کر دے جو صاحب توفیق ہیں وہ ان آزمائشوں سے سبق حاصل کرتے ہیں لیکن جو لوگ اپنے اعمال کی پاداش میں توفیق سے محروم ہو جاتے ہیں۔ یہ لوگ اسی حالت کو پہنچ گئے ہیں۔ اب کوئی تنبیہ بھی ان کو کام نہیں دیتی ہے۔ ان کے دل قساوت کا اور ان کی عقل غباوت کا نشانہ بن چکی ہے۔ اور یہ نتیجہ ہے ان کے اعمال کا۔

آپ اس بات کو اس طرح بھی کہہ سکتے ہیں کہ ان پر کوئی سال ایسا نہیں گذرتا ہے جب کہ ایک دو مرتبہ ایسے حالات سے دوچار نہ ہوتے ہوں جن میں ان کا دعویٰ ایمان آزمائش کی کسوٹی پر نہ کسا جاتا ہو اور اس کا کھوٹا پن ظاہر نہ ہو جاتا ہو۔ کبھی قرآن میں کوئی ایسا حکم آجاتا ہے جس سے ان کی خواہشات نفس پر کوئی نئی پابندی عائد ہو جاتی ہے۔ کبھی دین کا کوئی ایسا مطالبہ سامنے آجاتا ہے جس سے ان کے مفاد پر ضرب پڑتی ہے کبھی کوئی اندرونی قضیہ ایسا رونما ہو جاتا ہے جس میں یہ امتحان مضمر ہوتا ہے کہ ان کو اپنے دنیوی تعلقات اور اپنے شخصی و خاندانی مفادات کی بہ نسبت خدا اور اس کا رسول اور اس کا دین کس قدر عزیز ہے ہر موقعہ پر جب یہ لوگ ایمان کے تقاضوں سے منہ موڑتے ہیں ان کے اندر کی گندگی پہلے سے زیادہ نمایاں ہوتی ہے۔

شارحین قرآن نے یفتنون کا خارجی مصداق مقرر کرنے میں ایک سے زیادہ مصداق بتائے ہیں مجاہد کہتے ہیں کہ وہ قحط سالی کا شکار ہوتے ہیں قتادہ کہتے ہیں غزوات اور جہاد کی سرگرمیاں ان کے لیے پرچہ امتحان بنتی ہیں مقاتل کہتے ہیں کہ ان کا نفاق ظاہر کرکے ان کی رسوائی کا سال میں ایک بار دو بار سامان ہو جاتا ہے۔ عطیہ کہتے ہیں بیماریوں اور تکلیفوں کے ذریعے ان کو آزمایا جاتا ہے۔ علامہ آلوسی نے مطلب یہ بتایا ہے کہ۔

> کیا ان کو نظر نہیں آتا کہ حضور اقدس کے ساتھ جہاد کی سرگرمیوں کے ذریعہ ان کا امتحان لیا جاتا ہے اور اپنے بارے میں نازل شدہ کھلے بند دل وہ دیکھتے ہیں پھر بھی وہ توبہ نہیں کرتے ہیں۔

دراصل آیت میں افراد کی معنوی سعادت اور شقاوت کا قانون بتایا ہے۔ کہ افراد کی زندگی ہو یا جماعتوں کی لیکن ہر ہلاکت اور بربادی کے تم جستجو کرو گے تو معلوم ہو جائے گا کہ ان کی ہلاکت اچانک نہیں ہوئی۔ بلکہ وہ مدتوں تک ان پر منڈلاتی رہی ہے لیکن آئی نہیں۔ اس کی آمد کی علامات ظاہر ہوتی رہی ہیں۔ ان کی زندگی کا کوئی برس کوئی مہینہ بلکہ کوئی دن ان سے خالی نہیں گیا لیکن جب یہ ساری تنبیہیں بیکار ہوگئیں اور وہ غفلت و گمراہی سے باز نہ آئے تو پھر تباہی آئی۔

اللہ سبحانہ کے روحانی قوانین بھی ان کے جسمانی قوانین کی طرح ہیں آپ بدپرہیزی کرتے ہیں فوراً نہیں مرجاتے۔ البتہ موت کا پیام آنا شروع ہو جاتا ہے۔ موت کا پیام کیا ہے؟ یہ بیماریاں ہیں جو موت کا پیام بن کر رونما ہوتی ہیں تاکہ تمہیں ہر وقت ہوشیار کردیں۔ اگر تم ہوشیار ہوگئے تو وہ رک جائے گی نہ ہوئے تو پھر تمہارے سرہانے کھڑی ہو جائے گی بالکل اسی صورت حال سے جماعتوں اور قوموں کو دوچار ہونا پڑتا ہے۔ اور ایسا ہی معاملہ افراد کی معنوی سعادت و شقاوت کا بھی ہے جو نصیحت پکڑتے ہیں یعنی کہ دن اور باز آجاتے ہیں یعنی توبہ وہ سنت الٰہی کے مطابق ہلاکت سے بچ جاتے ہیں جو اڑے رہتے ہیں ہلاک ہوتے ہیں اور بس یہی زبان قرآن میں تربص و امہال ہے۔

مجلس نبوت سے نفاق کا تنفر

۱۲۵ اور جب ان کے بارے میں کوئی سورت نازل ہوتی ہے تو وہ آپس میں ایک دوسرے کو دیکھتے ہیں کہ کیا تم پر کسی کی نگاہ نہیں ہے پھر منہ پھیر کر چل دیتے ہیں یعنی جس وقت وحی نازل ہوتی ہے اور منافقین مجلس میں موجود ہوتے ہیں تو کلام الٰہی کا سننا ان پر بہت شاق گذرتا تھا خصوصاً وہ آیات جن میں ان کے عیوب کھولے جاتے تھے۔ اس وقت ایک دوسرے کی طرف کن آنکھیوں سے اشارے کرتے اور ادھر ادھر دیکھتے کہ مجلس میں کسی مسلمان نے ہم کو دیکھا نہ ہو پھر نظر بچا کر شتاب مجلس سے کھسک جاتے[1]

یہ ایسے وقت کا منظر ہے جب کہ منافقین مجلس نبوت میں حاضر ہیں اور اس موقعہ پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر کسی سورت کی وحی اتری ہے اور وہ مجلس سے جانا چاہتے ہیں تو اٹھتے

[1] افادات شیخ الاسلام

وقت ایک دوسرے کو دیکھنے لگتے ہیں کہ مومن تو انہیں اٹھتا ہوا نہیں دیکھ رہا ہے۔ گویا پہلے آیت میں ان کے تمسخر کا ذکر تھا اس آیت میں ان ہی کے تنفر کا ذکر ہے۔

دراصل اہم اجتماعی مواقع جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کی نئی مہم کی تیاری اور اس سے متعلق قرآن کی تازہ ہدایات سے آگاہ کرنے کے لیے بلاتے تو آنے کو تو منافقین بھی آ جاتے لیکن جب دیکھتے کہ کوئی مشکل مہم درپیش ہے بیٹھے رہے تو ذمہ داریوں میں ہاتھ بٹانا پڑے گا تو مجلس سے اٹھنے کے لیے آپس میں آنکھیں مارتے یعنی اگر مسلمانوں میں سے کوئی دیکھ نہ رہا ہو تو یہاں سے چل دو۔ پھر نظر بچا کر یکے بعد دیگرے اٹھ جاتے قاعدہ یہی تھا کہ جب کوئی سورت نازل ہوتی تھی تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مسلمانوں کو اجتماع کی دعوت دیتے۔ پھر اجتماع عام میں نازل شدہ سورت کو سناتے۔ اس مجلس میں اہل ایمان کا حال تو یہ ہوتا کہ سراپا گوش ہو کر اس کو سنتے اور اسی میں محو ہو جاتے۔ لیکن منافقین کا رنگ کچھ اور ہی ہوتا وہ آنے کو اجتماع میں آجاتے مگر حضور اقدس کے اجتماع میں خطاب سے ان کو کوئی دلچسپی نہ ہوتی بڑی بددلی کے ساتھ اکتائے ہوئے بیٹھے رہتے مگر اس فکر میں رہتے کہ کسی طرح جلدی سے یہاں سے نکل جائیں ان کی اسی حالت کی تصویر اس آیت میں پیش کی گئی ہے۔

ایمان وعرفان سے محرومی

۱۲۷ اللہ ہی نے ان کے دلوں کو پھیر دیا ہے کیونکہ وہ سمجھ ہی نہیں رکھتے ہیں یعنی مجلس نبوت سے اللہ سبحانہ نے ان کے دلوں کو پھیرا ہے کیونکہ وہ اپنی جہل وحماقت سے ایمان وعرفان کی باتوں کو سمجھنا اور قبول کرنا نہیں چاہتے ہیں[۱] مطلب یہ ہے کہ یہ بیوقوف خود اپنے فائدے کو بھی نہیں سمجھتے ہیں۔ اپنی فلاح سے بے خبر اور اپنی اصلاح سے بے پرواہ ہیں ان کو یہ احساس نہیں ہے کہ کتنی بڑی نعمت ہے جو اسلام کے ذریعے ان کو مل رہی ہے۔ اس حقیر دنیا کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں کہ عظیم نعمت کی قدر وقیمت ان کی سمجھ میں نہیں آتی ہے جس کے صدقے میں ان کو اس دنیا میں پوری انسانیت کی پیشوائی اور آخرت میں ہمیشہ ہمیشہ کی سرفرازی ملنے والی ہے۔ اس نادانی کا نتیجہ یہ ہے صرف اللہ قلوبھم کہ اللہ نے ان کو استفادے کی

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کی توفیق سے محروم کر دیا ہے۔

اس حالت کو پہنچ جانے کے بعد آدمی کے دل پر مہر لگ جاتی ہے اور یہ ہر آدمی کے خود اپنے اعمال کا نتیجہ ہوتی ہے۔ فلما زاغوا ازاغ اللہ۔ ان کی جانب سے انحراف ہوا تو اس کے نتیجہ صرف ہوا۔

لَقَدْ جَآءَكُمْ
رَسُولٌ مِّنْ أَنفُسِكُمْ عَزِيزٌ عَلَيْهِ مَا عَنِتُّمْ حَرِيصٌ عَلَيْكُم
۱۶ ع ۵ بِالْمُؤْمِنِينَ رَءُوفٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۲۸﴾ فَإِن تَوَلَّوْا فَقُلْ حَسْبِيَ
اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَهُوَ رَبُّ الْعَرْشِ الْعَظِيمِ ﴿۱۲۹﴾

لوگو! تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک عظیم الشان رسول آ گیا ہے[1]

۱۔ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بڑا ہی شاق ہے[2]

۲۔ وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے[3]

۳۔ وہ اہلِ ایمان سے نہایت شفقت والا اور بڑا ہی مہربان ہے[4]

اے اللہ کے رسول اگر اس کے باوجود آپ کے مخاطب سرتابی کریں تو آپ ان سے کہہ دیں میرے لیے اللہ کا آسرا کافی ہے، اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں میرا اسی پر بھروسہ ہے وہی عرش عظیم کا مالک ہے[5]

مفردات کے معانی

عزیز۔ عزت سے فعیل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے راغب اصفہانی لکھتے ہیں عزیز وہ ہے جو غالب ہو مغلوب نہ ہو اور سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں رقم طراز ہیں۔ اللہ سبحانہ کو عزیز کہنے کا مطلب ہے اس کے قدیم ہونے کا اعتراف کرنا اس طرح کہ جس قدرت اور جس قوت کے ساتھ وہ ہمیشہ سے ہے اس میں ذرا تبدیلی کی گنجائش نہیں ہے جس کا نتیجہ ہے اللہ سبحانہ کو پاک سمجھنا ان تمام باتوں سے جو مخلوق میں ہو سکتی ہیں۔

امام خطابی معالم السنن میں لکھتے ہیں عزیز ایسا غالب ہے جو مغلوب نہ ہو عز کے معنی کبھی تو غلبہ کے آتے ہیں باب نصر سے عز یعز اسی معنے میں آتا ہے اور باب فتح سے عز یعز کے معنے شدت اور قوت کے آتے ہیں اور باب ضرب سے عز یعِز کے معنے گرامی قدر ہونے کے ہیں لہذا عزیز کے معنے ہیں وہ ذات جس کا عدیل اور مثیل نہ ہو اور جب اس کا صلہ علی آئے تو اس کے معنی شاق اور دشوار ہونے سے عز علی کذا کے معنی ہیں صَعُب یہاں یہی معنی ہیں۔

عنتم عنت سے ماضی کا صیغہ ہے ابن الاثیر نے اس کے حسب ذیل معانی لکھے ہیں مشقت، فساد ہلاکت، گناہ، غلطی، خطا، زنا، باب سمع سے عَنِت یعنت آتا ہے ابوالسعود عمادی ارقام فرماتے ہیں کہ عنت اصل میں ہڈی کے جڑنے کے بعد ٹوٹ جانے کو کہتے ہیں مگر بعد کو ہر اس مشقت اور ضرر کے لیے جو حالت سنورنے کے بعد انسان کو لاحق ہو اس کا استعارہ کر لیا گیا عنتم کے معنے ہیں تمہیں مضرت پہنچی تم کو ایذا پہنچی۔

سورہ برات ایک وداعی پیام ہے

حضرت امام بخاری نے برا ابن عازب سے روایت کی ہے کہ آخری سورت جو نازل ہوئی سورہ برات ہے۔ اور حاکم وغیرہ نے ابی بن کعب اور ابن عباس کا قول نقل کیا ہے کہ سب سے آخری آیات برات کی آخری آیتیں ہیں لیکن تمام روایتوں کو جمع کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ برات سب سے آخری نہیں ہو سکتی ہے کم از کم واتقوا یوما ترجعون فیہ الی اللہ اور سورہ نصر کے بعد ضروری نازل ہوئی ہے۔ بہرحال آخری کلام میں سے ضرور ہے۔ اسی لیے بحیثیت

مجموعی پوری سورت میں اور آخری دو آیتوں میں خصوصیت کے ساتھ اس طرح کا طرز خطاب پایا جاتا ہے جیسے امت کو آخری پیام دیا جا رہا ہے یا آخری موعظت کا پیام ہو۔ چنانچہ آخری ان دو آیتوں میں عرب کی اس نسل سے خطاب ہے جو اس وقت مخاطب تھی۔

یہ پیام موعظت یہاں کیوں ضروری ہوا اس کے سمجھنے کے لیے ضروری ہے دو باتیں سامنے رکھ لی جائیں۔ سورت کے نزول کا وقت اور سورت کے مطالب، یہ سورت اس وقت نازل ہوئی جب تمام عرب میں کلمہ حق سربلند ہو چکا تھا اور گو قرآن نے دعوت حق کی فیروز مندیوں کی خبر دے دی تھی تاہم ان لوگوں کے لیے جو کل تک غربت و بے کسی کی انتہائی مصیبتوں میں رہ چکے تھے۔ تمام عرب کا مسلمان ہو جانا بڑی سے بڑی کامرانی تھی اور اس لیے ناگزیر تھا کہ ایک طرح کی فارغ البالی اور بے پروائی طبیعتوں میں پیدا ہو جائے۔ غزوہ تبوک کی تیاریوں میں جو بعضوں سے تساہل ہوا تو اس کی تہ میں اس حالت کی جھلک صاف دکھائی دے رہی ہے اور یہی وجہ ہے کہ اس سورت میں اس تفصیل اور شدت کے ساتھ استعداد کار اور عزم و ہمت کی تلقین کی گئی کہ اس کی نظیر کسی دوسری سورت میں نہیں ملتی۔

پس یہاں اس آخری موعظت کا مطلب یہ ہے کہ اہل عرب پر دو باتیں واضح کر دی جائیں۔

ایک یہ کہ جو کچھ ہو چکا ہے یہ معاملہ کی تکمیل نہیں ہے بلکہ محض ابتدا ہے اس لیئے ادائے فرض کا مطالبہ بدستور باقی ہے۔

دوسری یہ کہ کلمہ حق اپنے عروج کے لیے تمہارا محتاج نہیں ہے اگر آئندہ تم نے کوتاہی کی تو نقصان اٹھاؤ گے دعوت حق کا کچھ نہیں بگڑے گا۔[1]

مندرجہ بالا سطور سے وہ تمام الجھاد دور ہو گئے جو ان دو آیتوں کے بارے میں پیدا ہو گئے تھے۔ چونکہ ان دو آیتوں میں اہل عرب سے خطاب ہے اور اعراض کی صورت میں توکل علی اللہ کی تلقین کی گئی ہے۔ اور یہ انداز بیان زیادہ تر مکی سورتوں میں ہے اس لیے مفسرین قرآن نے خیال کیا کہ یہ مدنی آیتیں نہیں ہو سکتی ہیں اور سورہ برات میں ان کا ہونا تعجب انگیز ہے۔

---

[1] ترجمان القرآن

رسول کی بشریت کا انعام

۱۲۸ تمہارے پاس تم ہی میں سے ایک عظیم الشان پیغمبر آگیا ہے جس کے حسب ونسب اخلاق واطوار اور دیانت وامانت سے تم خوب واقف ہو۔[۱]

یعنی اللہ کا رسول تم میں آگیا اور اس نے فرض رسالت ادا کر دیا۔ وہ کسی دوسری جگہ سے نہیں آیا سنت الہٰی کے مطابق خود تم ہی میں پیدا ہوا اور چونکہ وہ تم ہی میں سے ہے اس لیے اول سے آخر تک اس کی ساری باتیں تمہاری نگاہوں کے سامنے رہی ہیں۔ اس کا لڑکپن بھی تم میں گذرا۔ اس کی جوانی کے دن بھی تم میں بسر ہوئے۔ پھر اس نے نبوت کا اعلان کیا تو تم سے کہیں چھپ کر زندگی نہیں بسر کی۔ اس کی ساری باتیں تم اپنی آنکھوں سے دیکھتے رہے ہو پھر جو کچھ گذرنا تھا گذر گیا اور تم نے مظلومی و بے کسی کے اعلان بھی سن لیے فتح و کامرانی میں ان کی تصدیق بھی کر لی۔ تم میں کوئی نہیں جو اس کے لیے بے داغ زندگی کا شاہد نہ ہو۔ اور کوئی نہیں جس نے اس کی ایک ایک بات کی سچائی نہ آزمائی ہو۔

حضرت عبداللہ بن عباس اور امام زہری نے انفسکم کو فا کے زبر سے بھی پڑھا ہے۔ اس صورت میں یہ نفاست سے اسم تفضیل ہے اس کے معنی ہیں تم میں زیادہ نفیس اور عمدہ یعنی تمام عرب میں خاندان کے اعتبار سے سب سے شریف۔

قیادت کیلئے سب سے ضروری صفت

۱۲۸ تمہارا رنج و کلفت میں پڑنا اس پر بڑا ہی شاق ہے یعنی جس چیز سے تم کو تکلیف یا سختی پہنچے وہ حضور اقدس پر بہت بھاری ہے۔ ہر ممکن طریقہ سے آپ یہی چاہتے ہیں کہ امت پر آسانی ہو اور دنیوی اور آخروی عذاب سے محفوظ رہے۔ اسی لیے جو دین آپ لائے وہ بھی سہل اور نرم ہے اور عمال کو آپ یہی نصیحت فرماتے تھے یسروا ولا تعسروا آسانی کرو سختی نہ کرو[۲] مطلب یہ ہے کہ ہر وہ چیز جو تم کو مصیبت اور ہلاکت میں ڈالنے والی ہو آپ کے دل پر بہت شاق

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

[۲] افادات شیخ الاسلام

ہے وہ تمہیں دنیا و آخرت دونوں کی کلفتوں اور ہلاکتوں سے محفوظ اور دونوں کی سعادتوں سے بہرہ ور دیکھنا چاہتے ہیں۔ اور ان کی ساری بھاگ دوڑ اور تمام تعلیم و تبلیغ اسی مقصد کے لیے ہے۔

دراصل یہ آپ کے ایک ایسے وصف کی رونمائی کی گئی ہے جو منصب رسالت کے لیے اور ہر اس انسان کے لیے جو قوم کی رہنمائی و قیادت کا مقام رکھتا ہو سب سے زیادہ ضروری ہے یعنی ابنائے جنس کے لیے شفقت و رحمت۔ فرمایا کہ اس سے زیادہ تمہارے لیے کوئی بات یقینی نہیں ہو سکتی کہ وہ سرتا پا شفقت و رحمت ہے۔ وہ تمہارا دکھ برداشت نہیں کر سکتا۔ تمہاری ہر تکلیف خواہ جسم کے لیے ہو خواہ روح کے لیے ان کے دل کا درد و غم بن جاتی ہے۔

نبوت کی سب سے بڑی آرزو

۱۳۹ے وہ تمہاری بھلائی کا بڑا ہی خواہش مند ہے یعنی تمہاری نفع رسانی اور خیر خواہی کی خاص تڑپ ان کے دل میں ہے۔ لوگ دوزخ کی طرف بھاگتے ہیں آپ ان کی کمریں پکڑ پکڑ کر ادھر سے ہٹاتے ہیں۔ آپ کی بڑی کوشش اور آرزو یہ ہے کہ خدا کے بندے اصلی بھلی اور حقیقی کامیابی سے بہرہ ور ہوں۔ جہاد کا مقصد بھی خونریزی نہیں بلکہ بحالت مجبوری سخت اپریشن کے ذریعے بنی نوع انسان کے فاسد و مسموم اعضاء کو کاٹ کر اور خراب جراثیم کو ہٹا کر امت کے مزاج عمومی کو صحت و اعتدال پر رکھنا ہے لے یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا قلب مبارک تمہاری بھلائی کی خواہش سے لبریز ہے وہ اس کے لیے ایسا قلب مضطرب رکھتے ہیں کہ اگر انکی بن پڑے تو ہدایت و سعادت کی ساری پکیاں پہلے ہی دن گھونٹ بنا کر پلا دیتے جس طرح ایک شفیق باپ اپنی اولاد کے لیے ہر خیر کا متمنی اور حریص ہوتا ہے اور اس سے کبھی اس کا جی نہیں بھرتا اسی طرح اللہ کا رسول تمہارے لیے دنیا و آخرت دونوں میں ہر خیر کا حریص ہے۔

اہلِ ایمان کے لیے نبوت کے جذبات

۱۴۰ے وہ اہل ایمان سے نہایت شفقت والا اور بڑا ہی مہربان ہے یعنی جب سارے جہان کے اس قدر خیر خواہ ہیں تو خاص اہل ایمان کے حال پر ظاہر ہے کہ کس قدر شفیق و مہربان ہوں گے۔[۲]

لے افادات شیخ الاسلام
۲ے افادات شیخ الاسلام

یعنی آپ کی یہ شفقت ورحمت صرف تمہارے ہی لیے نہیں بلکہ تمام مومنوں کے لیے ہے خواہ عرب کے ہوں یا عجم کے رأوف رافت سے ہے اور اس کا اطلاق ایسی رحمت پر ہوتا ہے جو کسی کی کمزوری ومصیبت پر جوش میں آئے۔ رافت رحمت کی ایک خاص صورت ہے اور رحمت عام ہے دونوں کے جمع کر دینے سے رحمت کے مفہوم میں زیادہ قوت آگئی۔ یہ دونوں اللہ سبحانہ کی صفتیں ہیں یہاں دونوں حضور اقدس کے لیے بولی گئی ہیں۔ یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ انسانوں کے ساتھ رافت ورحمت کے معاملہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی صفات کا مظہر ہیں۔

یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تین وصف بتائے گئے ہیں ایک عزیز یعنی انسانوں کی تکلیف کا آپ پر شاق ہونا۔ دوسرا انسانوں کی بھلائی اور سعادت کے لیے خواہش مند ہونا تیسرے اہل ایمان کے لیے سراپا رافت ورحمت ہونا۔ پہلا وصف کمال دوسرا وصف جمال اور تیسرا جودوسخا کی نشاندہی کر رہا ہے۔ ان تین اوصاف کا تقاضا آپ کی ذات سے محبت ہے۔ علامہ بدرالدین عینی لکھتے ہیں کہ محبت کے تین اسباب ہیں کمال جمال، جودوسخا یہ تینوں اوصاف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات سے زیادہ کسی کی ذات میں موجود نہیں آپ کا کمال آپ کے پیش کئے ہوئے نظام حیات سے ظاہر ہے۔ آپ کا جمال احادیث شمائل میں موجود ہے آپ کی روحانی وجسمانی جودوسخا کا تو اندازہ ہی نہیں ہے اس لیے آپ کی محبت تمام مخلوقات سے زیادہ ہونی چاہیے۔ والدین کی محبت طبعی ہے اور حضور اقدس کی محبت محبت عقلی ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کمال ایمان یہ ہے کہ تقاضائے عقل تقاضائے طبیعت پر غالب آجائے۔ ایمان صرف عقیدہ وعمل کا نام نہیں ہے بلکہ ان کیفیات کا نام ہے جن سے مومن کا قلب مزین اور رنگین ہوتا ہے۔

اللہ پر اعتماد اور حالات سے بے نیازی

۱۲۹ اے اللہ کے رسول اگر اس کے باوجود آپ کے مخاطب سرتابی کریں تو آپ ان سے کہہ دیں کہ میرے لیے اللہ کا آسرا کافی ہے۔ اس کے سوا کوئی بندگی کے لائق نہیں ہے۔ میرا اسی پر بھروسہ ہے وہی عرش عظیم کا مالک ہے اگر آپ کی عظیم الشان شفقت خیرخواہی اور دلسوزی کی لوگ قدر نہ کریں تو کچھ پروا نہیں۔ اگر فرض کیجئے کہ ساری دنیا آپ سے منہ موڑلے تو

فقط اللہ سبحانہ آپ کو کافی ہے جس کے سوا نہ کسی کی بندگی ہے نہ کسی پر بھروسہ ہو سکتا ہے کیونکہ زمین و آسمان کی سلطنت اور عرش عظیم کا مالک وہ ہی ہے۔ سب نفع و ضرر ہدایت و ضلالت اسی کے ہاتھ میں ہے سنن ابو داؤد میں حضرت ابو الدرداءؓ سے روایت ہے کہ جو شخص صبح و شام سات بار حسبی اللّٰہ الخ پڑھا کرے اللہ سبحانہ اس کے تمام ہموم و غموم کو کافی ہو جائے گا۔ باقی عرش کی عظمت کے متعلق اگر تفصیل دیکھنا ہو تو روح المعانی میں زیر آیت ھاذہ ملاحظ کیجئے تمت سورۃ التوبہ بفضل اللّٰہ وحسن توفیقہ۔ اللّٰھم تب علی واجعل لی براءۃ من النار انک انت التواب الرحیم[۱]

اس سورت کے تمام مطالب اپنی اصلی حیثیت میں اس وقت تک واضح نہیں ہو سکتے جب تک یہ حقیقت پیش نظر نہ ہو کہ یہ تمام ترامت کیلئے ایک وداعی پیام ہے اور احکام مواعظ سے اصل مقصود مستقبل میں آنے والے واقعات تھے نہ کہ موجودہ۔ یہ اصل پیش نظر رکھ کر سورت کے تمام مواعظ و احکام پر دوبارہ نگاہ ڈالیے صاف ہو جائے گا کہ آئندہ مرحلوں کے لیے مخاطبوں کو تیار کیا جا رہا ہے۔

۱۔ اب چونکہ عرب کا نظم و نسق بالکل اہلِ ایمان کے ہاتھ میں آگیا تھا اور تمام متزاحم طاقتیں بے بس ہو چکی تھیں اس لیے وہ پالیسی واضح طور پر سامنے آجانی چاہیے تھی۔ جو عرب کو مکمل دارالاسلام بنانے کے لیے اختیار کرنی ضروری تھی۔ چنانچہ بتایا گیا کہ عرب سے شرک کا قطعاً نام و نشان مٹا دیا جائے اور قدیم مشرکانہ نظام کا کلی طور پر استیصال کیا جائے کعبہ کا انتظام و تولیت بالکلیہ اہل ایمان کے ہاتھ میں ہو۔ عرب کی تمدنی زندگی میں رسوم جاہلیت کے جو آثار ابھی تک باقی تھے ان کو جدید اسلامی دور میں بالکل ختم کر دیا جائے۔

۲۔ عرب میں اسلام کا مشن پایہ تکمیل کو پہنچ جانے کے بعد دوسرا اہم مرحلہ جو سامنے تھا وہ یہ تھا کہ عرب کے باہر اسلام کا دائرہ اثر پھیلایا جائے اس معاملہ میں روم و ایران کی سیاسی قوت سب سے بڑی سد راہ تھی۔ اور ناگزیر تھا کہ عرب کے کام سے فارغ ہوتے ہی اس سے تصادم ہو۔ نیز آگے چل کر دوسرے کافرانہ سیاسی و تمدنی نظاموں سے بھی سابقہ پیش آنا تھا اس لیے مسلمانوں کو ہدایت کی گئی کہ عرب کے باہر جو لوگ دین حق کے پیرو نہیں ان کی خود مختارانہ

[۱] افادات شیخ الاسلام

فرماں روائی کو بزورِ شمشیر ختم کر دو تا آنکہ وہ اسلامی اقتدار کے تابع ہو کر رہنا قبول کر لیں جہاں تک دین پر ایمان لانے کا تعلق ہے ان کو اختیار ہے کہ ایمان لائیں یا نہ لائیں لیکن ان کو یہ حق نہیں ہے کہ خدا کی زمین پر اپنا حکم جاری کریں اور انسانی زندگی کی زمام کار اپنے ہاتھ میں رکھ کر اپنی گمراہیوں کو اللہ کے بندوں پر مسلط کریں۔

۳۔ تیسرا اہم مسئلہ منافقین کا تھا جن کے ساتھ اب تک وقتی مصالح کے تحت چشم پوشی ودرگزر کا معاملہ کیا جا رہا تھا۔ اب چونکہ بیرونی خطرات کا دباؤ کم ہو گیا تھا اس لیے حکم دیا گیا کہ آئندہ ان کے ساتھ کوئی نرمی نہ کی جائے اور وہی سخت برتاؤ کیا جائے جو کھلے منکرین حق کے ساتھ ہوتا ہے۔

۴۔ مومنین صادقین میں اب تک جو تھوڑا ضعف عزم باقی تھا اس کا علاج بھی ضروری تھا کیونکہ اسلام عالمگیر جدوجہد کے مرحلے میں داخل ہونے والا تھا۔ اور اس مرحلے میں جب کہ اکیلے مسلم عرب کو پوری غیر مسلم دنیا سے ٹکرانا تھا۔ ضعف عزم سے بڑھ کر کوئی اندرونی خطرہ اسلام کے اجتماعی زندگی کے لیے نہ تھا۔ اس لیے جن لوگوں نے تبوک کے موقعہ پر سستی وکمزوری دکھائی تھی ان کے ساتھ سخت برتاؤ کیا گیا۔ پیچھے رہ جانے والوں کے اس فعل کو کہ وہ بلا عذر پیچھے رہ گئے تھے بجائے خود ایک سنگین جرم قرار دیا گیا اور آئندہ کے لیے پوری صفائی کے ساتھ یہ بات واضح کر دی گئی کہ اعلائے کلمۃ اللہ کی جدوجہد اور کفر واسلام کی کش مکش ہی وہ اصلی کسوٹی ہے جس پر مومن کا دعویٰ ایمان پرکھا جائے گا جو اس آویزش میں اسلام کے لیے جان و مال اور وقت ومحنت صرف کرنے سے جی چرائے گا اس کا ایمان بھی معتبر نہ ہو گا اور اس کی کسر کسی دوسرے عمل سے پوری نہ ہو سکے گی۔

سورہ یونس

۱۰

آیات —— ۱۰۹

سورہ یونس

اس سورت کا نام سورہ یونس ہے کیونکہ اس میں حضرت یونس کا ذکر آیا ہے۔ اس میں کل ایک سو نو آیات ہیں۔

یہ سورت پوری کی پوری آیات ۴۰، ۹۴، ۹۵، ۹۶ کے علاوہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر آپ کی مکی زندگی کے دور میں نازل ہوئی ہے۔

زمانہ نزول

یہ سورت سورہ بنی اسرائیل کے بعد نازل ہوئی اور بنی اسرائیل میں واقعہ اسرار کا ذکر ہے یہ واقعہ اس وقت پیش آیا جب حضور اقدس کی عمر ۵۱ برس نو مہینے کی ہو لی، قاضی سلیمان نے تاریخ ۲۷ رجب سلہ نبوت بتائی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ سورہ یونس کا زمانہ نزول سلہ نبوت ہے یہ آپ کی زندگی کا بڑا ہی پرآشوب دور تھا۔ حوادث و مصائب کا ہر طرف سے ہجوم تھا اپنی صداقت بتانے کے لیے آپنے فرمایا فقد لبثت فیکم عمرا من قبله افلا تعقلون جو دعوت پیش کی جا رہی ہے اس کا مصنف میں نہیں ہوں۔ بہرحال اسی تاریخی پس منظر میں یہ سورت نازل ہوئی۔ اس طرح سورت کا نزول ہجرت سے تین سال پہلے ہوا۔ کیونکہ آپ نے ہجرت ۲۷ صفر المظفر ۱۳ نبوت مطابق ۱۰ ستمبر ۶۲۲ء کو کی ہے۔

موضوع سورت

سورت کا موضوع خطاب مشرکین سے ہے اور مرکزی موضوع توحید، نبوت اور آخرت کی زندگی ہے۔ سلسلہ بیان منکرین نبوت۔ سے شروع ہوا ہے منکرین نبوت، ایک طرف انکار نبوت کرتے تھے اور یہ بھی دیکھتے تھے کہ یہ شخص ان کی طرح نہیں ہے سوچتے کہ کوئی بات ضرور ہے جب کوئی بات بن نہ پڑتی تو کہتے کہ جادو ہے توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال کیا ہے۔ مشرکین نبوت آپ کی صداقت کا انکار نہیں کر سکتے تھے۔ صداقت نبوت کی واضح وجدانی دلیل پیش کی ہے۔ دینوی علائق کا سہارا انسان کے وجدان کی بیداری

میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ قرآن کا چہرہ ۔ نزول قرآن سے پہلے اقوام عالم کی عالمگیر گمراہی۔
نبوت کی صداقت کی بہت بڑی دلیل ان کا اللہ کا رسول ہونے کا یقین ہے۔ انسانی طبیعتوں
کا اختلاف فطری ہے۔ دین و ایمان میں جبر واکراہ نہیں ہے۔ جابجا نبوت کا مقام اس
کی حیثیت اس کے فرائض اور اس کی ذمہ داریوں کو بتایا ہے۔ آخر میں نبوت کی زبان سے یہ
اعلان کیا ہے کہ حق تمہارے پاس تمہارے رب کی جانب سے آچکا ہے میں تم پر نگہبان
نہیں ہوں۔

سُوْرَةُ یُوْنُسَ مَکِّیَّۃٌ (۵۱) (۱۰) آیاتہا ۱۰۹ رکوعاتہا ۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْحَكِيْمِ ﴿۱﴾ اَكَانَ لِلنَّاسِ عَجَبًا

اَنْ اَوْحَيْنَآ اِلٰى رَجُلٍ مِّنْهُمْ اَنْ اَنْذِرِ النَّاسَ وَبَشِّرِ وقف النبی صلی اللہ علیہ وسلم

الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اَنَّ لَهُمْ قَدَمَ صِدْقٍ عِنْدَ رَبِّهِمْ ؕ قَالَ

الْكٰفِرُوْنَ اِنَّ هٰذَا لَسٰحِرٌ مُّبِيْنٌ ﴿۲﴾

الف لام را یہ کتاب حکیم کی آیتیں ہیں [۱] کیا لوگوں کو اس پر حیرت ہے کہ ان ہی میں سے ہم نے ایک ذات گرامی کو وحی کی نعمت سے اس مقصد کے لیے سرفراز کیا ہے [۲] کہ لوگوں کو خبردار اور اہلِ ایمان کو اس بات کی خوش خبری دے کہ اللہ سبحانہ کی بارگاہ عالی میں ان کا سچا مقام ہے انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے [۳]

مفردات کے معانی

قد مصدق۔ یصدق کے معنی درستی، سچائی، کام نیک۔ ثنا سچی بات صدق صدق کا مصدر ہے اس کے معنی لغت میں سچ کہنے اور سچ کر دکھانے کے ہیں اور چونکہ یہ ذکر خیر کا سبب ہوتا ہے اس لیے مجازاً نام نیک ثنا اور ذکر کے معنے میں بھی استعمال ہوتا ہے نیز ہر وہ فعل جس میں ظاہری یا باطنی فضیلت ہو اسے بھی صدق سے تعبیر کیا جاتا ہے چنانچہ جو فعل اس صفت سے موصوف ہوتا ہے اس کو اس کی طرف مضاف کر دیا جاتا ہے جیسے فی مقعد صدق سچی مجلس میں اور اسی طرح ان لهم قدم صدق عند ربهم ان کا سچا پایہ ہے ان کے رب کے پاس اور ارشاد ہے اخرجنی مدخل صدق و ادخلنی مخرج صدق اجعل لی لسان صدق فی الآخرین۔

قرآن میں رسول کا تصور

قرآن میں اللہ سبحانہ کے تصور کی طرح رسول کا تصور بھی تمام مذاہب کے تصورات سے جداگانہ ہے۔ انسان کامل کی آخری سرحد اور لاہوت کے ابتدائی تصور میں کوئی لفظی اشتراک نہیں ہے۔ ایک انسان اپنی فطری اور وہبی استعداد کا ہر کمال بالفعل حاصل کر لینے کے بعد بھی الوہیت کے کسی ادنی سے ادنی تصور کے بھی قابل نہیں ہو سکتا۔ قرآن میں اللہ کا تصور اتنا بلند ہے کہ وہ حلول و اتحاد ولادت و قرابت اور اس طرح کی تمام نسبتوں میں سے کسی بھی نسبت کی صلاحیت نہیں رکھتا اور اسی معنے سے اس کی ذات اقدس احد اور صمد ہے۔

اس لیے رسول نہ خدا کا اوتار ہو سکتا ہے اور نہ خود خدا ہو سکتا ہے کہ انسانی صورت میں رونما ہو۔ رسول کے متعلق خدائی کا تصور عیسائیت ہے اور اللہ سبحانہ کے بارے میں یہ عقیدہ کہ وہ رسول کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے براہمہ کا عقیدہ ہے۔ قرآن کی تعلیم ان دونوں سے علیحدہ ہے۔ یہ دونوں تصور قرآنی نقطہ نظر سے بے مصداق ناممکن اور محال ہیں۔

ذرا غور فرمائیے کہ قدرت نے حیوانات میں سے ہر ہر نوع کی خصوصیات اور صورتیں الگ الگ بنائی ہیں۔ اور اس طرح ہر نوع کے درمیان ایک ایسا خط فاصل کھینچ دیا ہے کہ ہزار ترقی کرنے کے بعد بھی ایک نوع دوسری نوع کی سرحد میں قدم نہیں رکھ سکتی بلکہ ہر نوع

اپنے ان قدرتی حدود کے درمیان گردش کرتی رہتی ہے اور اسی حد بندی سے پورے عالم کا نظام قائم ہے۔

جب مخلوقات کے دائرے کی یہ سرحدیں اتنی مضبوط ہیں تو خالق کے متعلق یہ گمان کرنا کہ کوئی انسان اپنے دائرے سے ترقی کر کے اس کی سرحد میں قدم رکھ سکتا ہے۔ سفیہانہ خوش عقیدگی کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ رسول ایک انسان ہوتا ہے اور عام انسانوں پر اس کی برتری کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اللہ سبحانہ کا رسول ہے۔ اس کی جانب سے منصب اصلاح پر کھڑا کیا گیا ہے اس لیے رسول کا کمال ہی یہ ہے کہ وہ ایک انسان ہے کیونکہ اصلاح کے لیے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غمزدہ کی پوری تسلی بھی نہیں کر سکتا۔ جو بھوک سے آزاد ہے وہ ایک بھوکے کے ساتھ صحیح دلسوزی بھی نہیں کر سکتا۔ اور جو فطرت انسانی کی کمزوریوں سے آشنا نہیں وہ ان کمزوریوں پر اغماض بھی نہیں کر سکتا۔ اسی لیے قرآن حکیم نے جابجا بعثت کے ساتھ رسولوں کا انسان ہونا ایک مستقل انعام قرار دیا ہے۔

لہ: یہ کتاب حکیم کی آیتیں ہیں۔ آیتیں ایسی مضبوط و محکم کتاب کی ہیں جس کی ہر بات پکی ہے۔ الفاظ اس لیے کہ ہمیشہ تبدیل و تحریف سے محفوظ رہیں گے۔ علوم اس لیے کہ تمام تر عقل و حکمت کے موافق ہیں احکام اس وجہ سے کہ آئندہ کوئی ناسخ کتاب آنے والی نہیں۔ اخبار و قصص اس طرح کہ ٹھیک ٹھیک واقعہ کے مطابق ہیں اور ایسا کیوں نہ ہو جب کہ خدا ئے علیم و حکیم نے اس کو اپنے علم کامل کے زور سے اتارا ہے لہ

آیت میں کتاب کی صفت حکیم آئی ہے حکیم اگر حکمت سے ہے تو حکیم کے معنی حکمت والی کتاب ہے حکمت عقل و فہم کی اس کامل ترین حقیقت کا نام ہے جس سے صحیح و غلط، صواب و خطا، حق و باطل اور خیر و شر کے درمیان تمیز و فیصلہ بذریعہ غور و فکر دلیل و برہان اور تجربہ و استقرار سے نہیں بلکہ منکشفانہ طور سے ہو جاتا ہے اور اسی کے مطابق صاحب حکمت کا قول بھی ہوتا ہے۔ دوسری ربانی بخششوں کی طرح حکمت کا حصہ انکو یکساں نہیں ملتا ہے بلکہ حسب استعداد و قابلیت یہ نعمت ملتی ہے مگر یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ جس طرح اس ربانی عطیہ، اسمانی فہم

لہ افادات شیخ الاسلام

دینی عقل اور نورانی قوت پر حکمت کا اطلاق ہوتا ہے۔اسی طرح حکمت کے آثار و نتائج اور اس کی تعلیمات پر اس کا اطلاق ہوتا ہے۔حکمت آثار و نتائج وہی باتیں ہوتی ہیں جن کی عالمگیر صداقت اور سچائی کو خود فطرت انسانی اور حسن اخلاقی تسلیم کرتی ہے۔یہی وجہ ہے کہ حکمت کا اطلاق زبور اور انجیل پر بھی ہوا ہے۔اور اس آیت میں قرآن کی بھی صفت حکمت والا قرآن بنائی ہے۔یہ صفت اشارا کر رہی ہے کہ قرآن اپنے ہر دعوی پر دلیل و حجت سے اس طرح آراستہ ہے کہ اپنی صداقت کی کسوٹی خود ہی ہے اس کے لیے بیرونی شہادت کی ضرورت نہیں ہے اور اس میں یہ بھی اشارا ہے کہ قرآن کے نام سے جو کتاب آئی ہے وہ شکلم کی زبان کی جادوگری نہیں شاعرانہ پرواز تخیل نہیں یہ تو کتاب حکیم کی آیات ہیں ان پر غور نہ کرو گے تو حکمت سے محرومی کے سوا کچھ ہاتھ نہ آئے گا ——— اور اگر حکیم محکم کے معنی میں ہو جسے الیء موله کے معنی میں آتا ہے جیسا کہ ابن جریر نے سمجھا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ایسی کتاب جو پختہ اور سچی اپنے الفاظ و معانی، علوم و احکام اخبار قصص ہر لحاظ اور ہر اعتبار سے ہے اور ہر طرح کلام الہی مانے جانے کے لائق ہے اور حکیم اگر بمعنے حاکم ہو تو مطلب یہ ہے کہ یہ کتاب اصول و فروع دستوری ضوابط، اور قوانین میں حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن ہے اور ہر معاملہ میں عدل و انصاف کی علمبردار ہے۔

نبی کی بشریت پر استعجاب

؎ کیا لوگوں کو اس پر حیرت ہے کہ ان ہی میں سے ہم نے ایک ذات گرامی کو وحی کی نعمت سے اس مقصد کی خاطر سرفراز کیا ہے یعنی اس میں تعجب کی کیا بات ہے کہ انسانوں کی اصلاح کے لیے حق تعالیٰ ایک انسان کو مامور فرمادے اور اس کی طرف وہ پیغام بھیجے جس کی دوسروں کو بلا واسطہ خبر نہ ہو۔ وہ تمام لوگوں کو اللہ سبحانہ کی نافرمانی کے مہلک نتائج و عواقب سے آگاہ کرے اور اللہ کی بات ماننے والوں کو بشارت دے کہ رب العزت کے یہاں اعمال صالحہ کی بدولت ان کا کتنا اونچا مقام ہے اور کیسا بلند پایہ ہے اور کیسی سعادت و فلاح ازل سے ان کے لیے لکھی جا چکی ہے[1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں نبوت کی حقیقت، اور نبی کی بشریت پر اجمالی تبصرہ کیا گیا ہے بتایا ہے کہ نبی انسانوں میں سے وہ گرامی قدر شخصیت ہے جس کا علمی ذریعہ اللہ کی وحی ہو اور نبی کا کام یہ ہے کہ لوگوں کو انکار و بد عملی کے نتائج سے آگاہ کرے اور ایمان والوں کو ان کے عند اللہ مقام کی خوشخبری دے۔

سب سے اہم اور بنیادی مسئلہ نبی کی بشریت کا ہے۔ یہ مسئلہ بھی ان مسائل میں سے ہے جن کی اصل حقیقت قرآن سے پہلے افراط و تفریط کی تاریکی میں گم تھی۔ قرآن سے پہلے یہودیوں کی طرح ایسے مذاہب موجود تھے جو نبی کو ایک پیش گوئی کی صفت کے علاوہ ہر حیثیت سے معمولی انسان سمجھتے تھے۔ وہ ہر قسم کے گناہ بھی کرتے تھے۔ وہ بداخلاقیوں کے مرتکب ہوتے تھے وہ کفر بھی کرتے تھے تاہم پیغمبر کہے جاتے تھے دوسری طرف عیسائی تھے جو اپنے نجات دہندہ کو انسانیت سے پاک خود خدا یا خدا کا یا ناسوت و لاہوت کا ایک مجموعہ سمجھتے تھے۔

قرآن نے ان دونوں کے درمیان راہ پیش کی۔ وہ ایک طرف رسولوں کو مخلوق صرف انسان اور پورا بندہ اور اللہ کے حکم کے سامنے عاجز و درماندہ بتاتا ہے لیکن دوسری طرف وہ ان کو اللہ سبحانہ کا برگزیدہ، معصوم نیک اور اللہ سبحانہ کی قدرت سے فیض پاکر برکتوں، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اللہ کے حکم سے عجیب و غریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے اور بے اعتدالی کے ان دونوں نظریوں کی علانیہ تردید کرتا ہے۔ اہل عرب یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی رہنمائی کے لیے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیے اور وہ ہستی صرف فرشتوں کی ہے قرآن نے ان کے اس خیال کی بار بار تکذیب کی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ انبیاء کے دو رخ ہوتے ہیں ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں اور انسانوں کی طرح وہ کھاتے پیتے چلتے پھرتے سوتے جاگتے، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے اور مرتے ہیں۔ دوسری طرف وہ اپنی روحانیت بے گناہی پاکدامنی اور اختصاص نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہیں۔ وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق بشری خصوصیات کی وجہ سے فوق البشر ہوتے ہیں۔ مشرکین کو نبی کے بارے میں بھی مغالطہ تھا۔ نبی جب ان کے سامنے اپنی نبوت اور اللہ سبحانہ کی جانب سے آنے کا دعویٰ پیش کرتا تو وہ اس کی بشری خصوصیتوں کو دیکھ کر کہتے کہ تم تو ہماری طرح کے آدمی ہو تم خدا کے رسول کیسے ہو سکتے۔ کفار نے بار بار

کہا کہ ابعث اللہ بشرا رسولاً کیا خدا نے انسان کو نبی بنا کر روانہ کیا ہے ؟ وہ بشریت کو رسالت کے منافی سمجھتے تھے یہاں بھی ان کے اسی استعجاب کو قرآن نے نقل کیا ہے اکان للناس عجبًا ان اوحینا الی رجل منہم ۔

نبوت کی حقیقت اس آیت میں یہ بتائی گئی ہے کہ نبوت عطیہ خداوندی ہے۔ نبی وہ عظیم المرتبت انسان ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آئے۔ امام بخاری نے صحیح بخاری کے آغاز میں قرآنی آیت انا اوحینا الیہ تلاوت کر کے اسی طرف اشارہ کیا ہے کہ نبی وہ انسان ہے جس کے پاس اللہ کی وحی آئے امام غزالی فرماتے ہیں ۔

نبوت انسانیت کے مرتبہ سے بالاتر ہے جس طرح انسانیت حیوانیت سے بالاتر ہے وہ عطیہ الٰہی اور موہبت ربانی ہے ۔سعی و محنت اور کسب و تلاش سے نہیں ملتی ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ اگرچہ نبی عام انسانوں کے ساتھ بشریت میں شریک ہوتا ہے مگر عقلیت و معنویت میں ان سے بالکل الگ ہوتا ہے کیونکہ اس میں وحی کے قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی اسی مفہوم کو قرآن نے یہاں ان اوحینا الی رجل منہم کے ذریعہ پیش کیا ہے ۔

نبوت کی غرض و غائیت کو اس آیت میں واضح طور پر پیش کیا گیا ہے ان انذر الناس وبشر الذین آمنوا وعملوا الصالحات ان لہم قدم صدق عند ربہم یعنی نبوت کی غرض انذار اور تبشیر ہے انذار برائیوں کے نتائج سے آگاہ کرنے اور تبشیر نیکیوں کے ثمرات سے مطلع کرنے کا نام ہے۔ یہاں انذار کو پہلے لا کر اشارہ کیا ہے کہ انسانی زندگی سے برائیوں کو ہٹانا مقدم ہے اور یہ بات اصولی اور فطری ہے کہ مفاسد کو پہلے دور کیا جائے پھر مصالح کے لیے محنت کی جائے اسی کو فقہاء کی زبان میں درأ المفاسد اولی من جلب المصالح کہتے ہیں اس سے معلوم ہوا کہ پہلے تخلیہ ہونا چاہیے پھر تحلیہ۔ یعنی پہلے گناہوں سے صفائی ہونی چاہیے بعد ازیں اچھائیوں اور خوبیوں کے ذریعے سجاوٹ ہونی چاہیے اسی انذار و تبشیر کے مجموعہ کا نام ہدایت ہے۔ انک تہدی الی صراط مستقیم اور اسی کو قرآن نے اخراج من الظلمات الی النور کہا ہے۔ لیخرجکم من الظلمات الی النور۔

پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ جب یہ کتاب الٰہی بجائے خود حجت و برہان ہے تو صرف یہ بات اس کے نہ ماننے کی دلیل کیونکر ہو سکتی ہے کہ اس کتاب کی وحی ان ہی میں سے ایک شخص پر آئی ہے یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ آخر انسانوں میں انذار و تبشیر کے کام کے لیے انسان نہ مقرر کیا جاتا تو اور کسے مقرر کیا جاتا۔ اس پر تعجب نہیں بلکہ ان کو خوش ہونا چاہیے کہ اللہ سبحانہ کا ان پر احسان عظیم ہے کہ اس نے ان پر ان ہی کے آدمی کے ذریعے یہ کتاب اتاری ہے جس کے ماضی و حاضر اور جس کے اخلاق و کردار سے وہ خوب واقف ہیں اور جس کی امانت و دیانت کا ان کو اعتراف ہے یہ اچھا ہوتا کہ کوئی غیر آتا اور یہ کام کرتا یا یہ اچھا ہے کہ اللہ نے ان ہی کے ایک شخص کو اس کام کو کرنے کے کا حکم دیا۔ یہ بات بھی کسی پہلو سے معقول نہ ہوتی کہ اس کام کے لیے کوئی فرشتہ یا جن منتخب کیا جاتا۔ انسانوں کے لیے منذر و بشر انسان ہی ہو سکتا ہے۔

قرآن کا حیرت انگیز اثر

۳ کہ لوگوں کو خبردار کر اور اہل ایمان کو اس بات کی خوش خبری دے کہ اللہ سبحانہ کی بارگاہ عالی میں ان کا سچا مقام ہے انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ تو کھلا جادو ہے یعنی وحی قرآنی کو فوق العادت مؤثر اور بلیغ ہونے کی وجہ سے جادو اور اس کے لانے والے کو جادوگر کہتے ہیں[۱] منکرین قرآن ایک طرف تو وحی و نبوت کا انکار کرتے ہیں دوسری طرف یہ بھی دیکھتے تھے کہ یہ آدمی اور آدمیوں کی طرح نہیں ہے کوئی نہ کوئی تو بات ضرور ہے۔ پھر جب اس کی کوئی توجیہ ان کی سمجھ میں نہ آئی تو کہتے ہو نہ ہو یہ جادوگری ہے۔ ان کی یہ بات قرآن کی حیرت انگیز تاثیر کی سب سے بڑی دلیل ہے یعنی اس کا اثر اس درجہ نمایاں اور قطعی تھا کہ باوجود انکار و جحود کے اس کا انکار نہیں کر سکتے اسے جادوگری سے تعبیر کرنے پر مجبور تھے۔

قرآن کی اس اثر انگیزی کو تاریخ و حدیث کی کتابوں میں پڑھئے۔ صحیح مسلم میں ہے۔ رئیس قبیلہ غفار کے شاعر تھے۔ انہوں نے جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا چرچا سنا تو چھپ کر مکہ آئے اور حضور اقدس کی زبان مبارک سے کلام ربانی کی کچھ آئتیں سنیں۔ سن کر واپس گئے

[۱] افادات شیخ الاسلام

ان کے بھائی نے پوچھا کہ تم نے کیا پایا انہوں نے جواب دیا کہ قریش کہتے ہیں وہ شاعر ہیں ساحر ہیں کاہن ہیں۔ ہم نے کاہنوں کا کلام سنا ہے پر ان کی بولی نہیں ہم نے شعر کے ایک ایک وزن کو دیکھا ہے وہ شعر بھی نہیں خدا کی قسم محمد سچے اور قریش جھوٹے ہیں۔

ضماد ازدی ایک صاحب تھے جو جھاڑ پھونک کا کام کرتے تھے وہ یہ سن کر کہ معاذ اللہ حضور اقدس دیوانے ہو گئے ہیں۔ علاج کے لیے آئے آپ نے مختصر سی حمد اور کلمہ شہادت پڑھا وہ سن کر حیران رہ گئے۔ تین بار پڑھوا کر سنا پھر بولے خدا کی قسم میں نے کاہنوں کی بولی جادو گروں کے منتر اور شاعروں کے قصیدے سنے لیکن تمہارا کلام کچھ اور ہی ہے۔ یہ تو سمندر تک میں اثر کر جائے گا[۱]

ولید بن مغیرہ قریش میں سربرآوردہ اور صاحب اثر شخصیت کے مالک تھے وہ ایک بار خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ کچھ پڑھ کر سنائیے آپ نے قرآن کی کچھ آیتیں پڑھیں۔ اس نے مکرر کی درخواست کی اور آیات قرآنی سنیں۔ آخر از خود رفتہ ہو کر بولا خدا کی قسم اس میں کچھ عجیب شیرینی ہے۔ اس نخل کی شاخوں میں پھل اور اس کا تنا بھاری ہے یہ کسی انسان کا کلام نہیں ہے[۲]

نجاشی کے دربار میں حضرت جعفر نے جب سورہ مریم کی تلاوت کی تو اس پر رقت طاری ہو گئی اور اس کی دونوں آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ پھر کہا کہ خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں۔

اس قسم کے اور بھی بہت سے واقعات سیرۃ و رجال کی کتابوں میں موجود ہیں۔ کہ لوگ کیونکر آیات سن کر متاثر ہوتے تھے۔ قرآن کی اس شیرینی، نمکینی اور تاثیر کی جب کوئی توجیہ ان کی سمجھ میں نہ آتی تھی تو مبہوت ہو کر کہتے کہ یہ کلام جادو ہے اور کبھی کہتے کہ اس کا متکلم جادوگر ہے اور یہ اس کی جادوگری اور شعبدہ بازی ہے یعنی اس کتاب کے زور اس کے اثر اور اس کی فصاحت و بلاغت کا لوہا مانتے ہیں۔ گویا یہ قرآن کے کلام الٰہی ہونے کی بیگانے شہادت دے رہے ہیں۔

۱؎ صحیح مسلم باب تخفیف الصلاۃ

۲؎ مصنف عبدالرزاق

۳؎ مسند احمد

إِنَّ رَبَّكُمُ اللَّهُ الَّذِي
خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْأَرْضَ فِي سِتَّةِ أَيَّامٍ ثُمَّ اسْتَوٰى عَلَى
الْعَرْشِ يُدَبِّرُ الْأَمْرَ ۖ مَا مِنْ شَفِيعٍ إِلَّا مِنْ بَعْدِ إِذْنِهٖ ۚ
ذٰلِكُمُ اللَّهُ رَبُّكُمْ فَاعْبُدُوهُ ۚ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ ﴿۳﴾ إِلَيْهِ
مَرْجِعُكُمْ جَمِيعًا ۖ وَعْدَ اللَّهِ حَقًّا ۚ إِنَّهٗ يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيدُهٗ
لِيَجْزِيَ الَّذِينَ اٰمَنُوا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ بِالْقِسْطِ ۚ وَالَّذِينَ
كَفَرُوا لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ وَّعَذَابٌ اَلِيمٌ بِمَا كَانُوا
يَكْفُرُونَ ﴿۴﴾

لوگو! تمہارا مالک تو وہ اللہ ہے جس نے آسمان وزمین کو چھ یوم میں بنایا ہے[4] پھر اپنے تخت حکومت پر متمکن ہو گیا وہی ساری حکومت چلا رہا ہے[5] اس کی بارگاہ میں اس کے حکم کے بغیر کوئی سفارشی نہیں ہے[6] یہی اللہ تمہارا مالک آقا ہے صرف اسی سے عابدانہ تعلقات قائم کرو کیا اتنی سی بات پر تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے[7] اسی کی بارگاہ میں تم سب کو پیش ہونا ہے یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے بلاشبہ وہی تو ہے جو آفرینش

کا نقطہ آغاز ہے اور وہی اس کا اعادہ کرے گا اور یہ اعادہ اس لیے ہو گا کہ جو لوگ ایمان کی نعمت سے مالا مال ہوئے اور انہوں نے عمل صالح کیے انہیں انصاف کے ساتھ ان کی جزا دے۸ اور وہ لوگ جنہوں نے راہ کفر اختیار کی تو انہیں کفر کی وجہ سے کھولتی ہوئی پینے والی چیز ملے گی اور ان کو دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا۹

مفردات کے معانی

استوی علی العرش استوٰی استوار سے ماضی کا صیغہ ہے استوار کے جب دو فاعل ہوں تو معنے دونوں کے برابر ہونے کے ہوتے ہیں جیسے لا یستوی الخبیث والطیب اور اگر فاعل دو نہ ہوں تو معنے سنبھلنے درست ہونے اور سیدھے رہنے کے ہوتے ہیں فاستوی وھو بالافق الاعلٰی اس صورت میں استوار کے معنے ہیں کسی چیز کا اعتدال مراد ہوتا ہے اور جب استوا علی کے ساتھ آئے تو اس کے معنے چڑھنے، قرار پکڑنے اور قائم ہونے کے آتے ہیں واستوت علی الجودی اور جب استواء الی کے ساتھ آئے تو اس کے معنے قصد کرنے اور پہنچنے کے ہوتے ہیں الی السماء ثم استوی علی العرش اللہ سبحانہ کے بارے میں آیا ہے تو یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ قرآن و سنت میں بہت سے الفاظ ایسے ہیں جو اللہ سبحانہ کی صفات میں بیان کیے گئے ہیں اور مخلوق کے اوصاف میں بھی آئے ہیں جیسے حی، سمیع۔ بصیر کہ یہ الفاظ اللہ سبحانہ کے لیے بھی بولے گئے ہیں اور بندوں کے لیے بھی۔ لیکن ان دونوں جگہ ان کے استعمال کی حیثیت بالکل جداگانہ ہے

کسی مخلوق کو سمیع وبصیر کہنے کا یہ مطلب ہے کہ اس کے پاس دیکھنے والی آنکھ اور سننے والا کان ہے۔ اب یہاں دو چیزیں ہیں ایک تو وہ آلہ جو سننے اور دیکھنے کا مبدا اور ذریعہ ہے یعنی آنکھ اور کان دوسرا اس کا نتیجہ اور غرض وغایت یعنی وہ خاص علم جو کان کے سننے اور آنکھ کے دیکھنے سے حاصل ہوتا ہے۔ لہذا جب مخلوق کو سمیع وبصیر کہا جائے گا تو اس کے حق میں یہ مبدا اور غایت دونوں چیزیں مراد ہوں گی جن کیفیات کا ہمیں علم ہے لیکن یہی الفاظ جب اللہ سبحانہ کے لیے بولے جائیں گے تو ان سے یقیناً وہ مبادی اور کیفیات مراد نہیں ہوں گی جو مخلوق کے خواص میں داخل ہیں اور جن سے اللہ سبحانہ قطعاً پاک ہے۔ البتہ یہ عقیدہ رکھنا ضروری ہے کہ سمع وبصر اس ذات اقدس میں بدرجہ اتم موجود ہے اور اس کا نتیجہ یعنی وہ علم جو رویت وسماع سے حاصل ہوتا ہے اس کو بدرجہ کمال حاصل ہے رہی یہ بات کہ وہ مبدا رکیا ہے اور دیکھنے اور سننے کی کیا کیفیت ہے تو ظاہر ہے کہ اس سوال کے جواب میں بجز اس کے کیا کہا جا سکتا ہے کہ اس کا دیکھنا اور سننا مخلوق کی طرح نہیں ہے۔ اسی طرح اس کی ساری صفات کو سمجھنا چاہیے کہ صفت باعتبار اپنے اصل مبدا کے ثابت ہے مگر اس کی کوئی کیفیت نہیں بیان کی جا سکتی ہے اور نہ کسی آسمانی شریعت نے کبھی انسان کو اس پر مجبور کیا ہے کہ وہ خواہ مخواہ ان حقائق پر غور کرے جو اس کی عقل وادراک کی دسترس سے باہر ہے اپنی عقل کو پریشان کرے دو صورتیں ہیں اور دونوں کا حکم الگ ہے ایک یہ کہ کوئی بات عقل کے خلاف ہو ایک یہ کہ کوئی عقل سے بالاتر ہو۔ بہت سی باتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کا عقل انسانی ادراک نہیں کر سکتی اسی قاعدے کی روشنی میں استوا علی العرش کو بھی سمجھ لیجیے۔

عرش کے معنے تخت اور بلند مقام کے ہیں اور استواء کا ترجمہ اکثر محققین نے تمکن واستقرار یعنی قرار پکڑنے اور قائم ہونے کے کئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ تخت حکومت پر اس طرح قابض ہونا کہ کوئی حصہ اور کوئی گوشہ حیطہ اقتدار سے باہر نہ ہو اور نہ قبضہ وتسلط میں کسی قسم کی کوئی مزاحمت ہو غرض سب کام اور انتظام درست ہو۔ اب دنیا میں بادشاہوں کی تخت نشینی کا ایک تو مبدا اور ظاہری صورت ہوتی ہے اور ایک حقیقت یا غرض وغایت یعنی ملک پر پورا تسلط اور نفوذ وتصرف کی قدرت حاصل ہونا لہذا اللہ سبحانہ کے استوا علی العرش میں یہ حقیقت اور غرض بدرجہ کمال موجود ہے کہ تمام مخلوقات اور ساری کائنات پر پورا پورا تسلط واقتدار اور مالکانہ اور شاہانہ تصرف ونفوذ بے روک ٹوک صرف اسی کو حاصل ہو۔

اس آیت ثم استوی علی العرش یدبر الامر سے بخوبی یہ بات کھل کر سامنے آتی ہے۔ رہا استواء علی العرش کا مبدا اس کی ظاہری صورت و کیفیت دیگر صفات سمع وبصیر کی طرح یقیناً اس کی کوئی ایسی صورت نہیں ہوسکتی ہے کہ اس میں مخلوق کی صفت اور حدوث کا ذرا سا بھی شائبہ ہو پھر وہ کیونکر ہے اور کیسے ہے تو اس کی کوئی ایسی صورت نہیں ہوسکتی ہے کہ اس میں مخلوق کی صفت اور حادث کا ذرا سا بھی شائبہ ہو پھر وہ کیونکر ہے اور کیسے ہے تو اس کی کیفیت کے لیے اس کے سوا کیا کہا جاسکتا ہے لیس کمثلہ شئ ہمارا کیا یہ علمی کہ اس کی کیفیت بیان کرسکیں لایحیطون بہ علما حضرت ام سلمہ فرماتی ہیں الاستواء غیر مجہول والکیفت غیر معقول والاقرار بہ ایمان والجحود بہ کفر[1] استواء معلوم ہے اس کی کیفیت عقل سے بالا ہے اس کا اقرار ایمان ہے اس کا انکار کفر ہے۔ قاضی ابوالعلاء صاعد بن محمد نے کتاب الاعتقاد میں امام ابو یوسف کی روایت سے حضرت امام اعظم ابو حنیفہ کا ارشاد نقل کیا ہے:

> کسی کو یہ زیب نہیں دیتا کہ وہ اللہ سبحانہ کے بارے میں اس کی ذات کے متعلق ذرا بھی زبان کھولے بلکہ اسی طرح بیان کرے جس طرح خود اللہ سبحانہ نے اپنے لیے بیان فرمایا ہے اپنی رائے سے کچھ نہ کہے تبارک اللہ تعالیٰ رب العالمین (روح المعانی)

اے برتر از خیال و قیاس و گمان و وہم
وز ہر چہ گفتہ اند شنیدیم و خواندہ ایم
دفتر تمام گشت و بپایان رسید عمر
ما ہمچناں در اول وصف تو ماندہ ایم

اللہ کی خالقیت سے الوہیت پر استدلال

قرآن حکیم میں لفظ عبادت مختلف صیغوں کی صورت میں بے شمار مواقع پر استعمال کیا گیا ہے ان میں سے کچھ آیات یہ ہیں۔

ما تعبدون من دونہ الا اسماء سمیتموھا انتم وآباؤکم

---

[1] فتح البیان

تم لوگ تو اللہ سے ڈرے بس ایسے کچھ ناموں کی عبادت کرتے ہو جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے ٹھہرایا ہے۔

قالوا نعبد اصناما فنظل لها عاکفین۔

انہوں نے کہا ہم اپنے بتوں کی عبادت کرتے ہیں اور دن بھر ان سے لگے بیٹھے رہتے ہیں۔

یہ آئتیں بتا رہی ہیں کہ کسی کے ساتھ پوجا و پاٹ اور پرستش کا رویہ اختیار کرنا اس کی دہائی دینا۔ اس کے نام کے چڑھاوے چڑھانا۔ اس کی پوری رکھنا اس کے نام کے جانور چھوڑنا اس سے حاجات طلب کرنا اس کی عبادت ہے کیونکہ مشرکین اپنے بزرگوں کی مورتیوں کے ساتھ جو کچھ کیا کرتے تھے اسے ان آیتوں میں عبادت کہا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ مشرکین کا تعلق اپنے بتوں کے ساتھ پوجا و پاٹ اور پرستش ہی کا ہوا کرتا تھا۔

آیئے تصویر کا ایک اور رخ بھی پڑھ لیجئے۔

والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوها وانابوا الی اللہ لهم البشریٰ۔

جو لوگ طاغوت کی عبادت سے دور رہے اور اللہ کی طرف جھکے ان کے لیے خوش خبری ہے۔

لقد بعثنا فی کل امۃ رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت۔

بلاشبہ ہم نے روانہ کیا رسول ہر امت میں کہ عبادت کرو اللہ کی اور بچ کر رہو طاغوت سے۔

ایک اور آیت ہے۔

من لعنه اللہ وغضب علیه وجعل منهم القردة والخنازیر وعبد الطاغوت۔

وہ جن پر اللہ نے لعنت کی۔ اس کا غضب گرا اور ان میں سے کتنوں ہی کو اس نے بندر اور سور بنا دیا اور جنہوں نے طاغوت کی عبادت کی۔

شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں کہ طاغوت وہ جو ناحق سرداری کا دعوی کرے کچھ سند نہ رکھے۔ ان

آیتوں سے معلوم ہوا کہ کسی کو مطاع مطلق مان کر اپنے ارادے اور مرضی سے اس کے احکام پر چلنا اس کی عبادت کرنا ہے کیونکہ ان آیتوں میں اس طرز عمل کو عبادت کہا گیا ہے جو طاغوت کے ساتھ اس کی پیروی اختیار کرتے ہیں۔

بتوں والی عبادت کو پرستش اور طاغوت والی عبادت کو بندگی کہتے ہیں دونوں ہی شرک ہے آیئے دونوں کی وضاحت حضرت شاہ عبدالقادر کی زبانی سن لیجئے شاہ صاحب پرستش میں شرک کی وضاحت کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

> شرک یہ کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے یا وہ جو چاہے کر سکتا ہے یا ہمارا بھلا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے مثلاً کسی کو سجدہ کرے اور اس سے حاجت مانگے مختار جان کر۔

اور بندگی میں شرک کی توضیح کرتے ہوئے سورہ نساء میں زیر آیت ان اللہ لا یغفر ان یشرك به تحریر فرماتے ہیں؛

> اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہوئے اور ضدی راہ چلے یہ آیت فرمائی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے۔ بس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔

اور سورہ انعام میں زیر آیت وان اطعتموھم انکم لمشرکون فرماتے ہیں۔

> شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔

پرستش اور بندگی دونوں عبادت ہیں۔ یہ بات کہ پرستش کی طرح کسی کی بندگی بھی عبادت ہے قرآن ہی سے معلوم ہوتی ہے۔

> فقالوا انؤمن لبشرين مثلنا وقومهما لنا عابدون
>
> تو فرعونیوں نے کہا کہ ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں کی بات مان لیں حالانکہ ان کی قوم ہماری عبادت کر رہی ہے۔
>
> وتلك نعمة تمنها علی ان عبدت بنی اسرائیل

حضرت موسیٰ نے فرعون سے کہا اور یہ ہے تیرا وہ احسان جو تو مجھ پر دھر رہا ہے کہ تو نے بنی اسرائیل کو اپنا عابد بنا لیا ہے۔

یہ آیتیں اس بات کا ثبوت ہیں کہ صرف وہی اطاعت عبادت نہیں ہے جس کے پیچھے ارادہ دل کی آمادگی اور جس کی اطاعت کی جا رہی ہو اس کے بارے میں بے قید و شرط اطاعت کے مستحق ہونے کا خیال یہ تینوں چیزیں موجود ہوں بلکہ اس سے آگے بڑھ کر وہ اطاعت بھی عبادت ہی ہے جو اگرچہ اپنی مرضی کے خلاف کرنی پڑ رہی ہو مگر شعور اور ارادے کے ساتھ اور بلا چون و چرا کی جاری ہو اور جس کی اطاعت کی جا رہی ہو وہ خود کو کسی بالاتر قانون کا پابند نہ سمجھتا ہو بہرحال آیات میں پرستش اور بندگی دونوں معنے عبادت کا حکم ہو رہا ہے۔

اے لوگو! تمہارا مالک تو وہ اللہ ہے جس نے آسمان و زمین کو چھ یوم میں بنایا ہے یعنی اتنے وقت میں جو چھ دن کے برابر تھا اور ایک دن ابن عباس کی روایت کے مطابق ایک ہزار سال کا لیا جائے گا گویا چھ ہزار سال میں زمین و آسمان وغیرہ تیار ہوئے۔ بلاشبہ حق تعالیٰ قادر تھا کہ آن واحد میں ساری مخلوق کو پیدا کر دیتا۔ لیکن حکمت اسی کو مقتضی ہوئی کہ تدریجاً پیدا کیا جائے۔ شائد بندوں کو سبق دینا ہو کہ قدرت کے باوجود ہر کام سوچ سمجھ کر تانی اور متانت سے کیا کریں نیز تدریجی تخلیق میں بہ نسبت دفعۃً پیدا کرنے کے اس بات کا زیادہ اظہار ہوتا ہے کہ حق تعالیٰ فاعل بالاضطرار نہیں ہے بلکہ ہر چیز کا وجود بالکلیہ اس کی مشیت و اختیار سے وابستہ ہے جب چاہے جس طرح چاہے پیدا کرے [۱]

چھ یوم میں کائنات کی تخلیق

فرمایا کہ ان ربکم اللہ الذی خلق السماوات والارض فی ستۃ ایام تمہارا مالک وہی اللہ ہے جس نے چھ یوم میں آسمان و زمین بنائے اسی قسم کی آیت سورہ اعراف میں گذر چکی ہے ان ربکم اللہ الذی خلق السماوات والارض فی ستۃ ایام یغشی اللیل النہار الخ اور وہاں اس پر کچھ بحث آ چکی ہے اور چھ ایام کا مطلب واضح کر دیا گیا ہے۔ یہاں وہ تمام اشارات ذہن میں محفوظ کر لیجئے جو قرآن میں

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

جابجا زمین و آسمان کی پیدائش کے بارے میں کیے گئے ہیں۔

۱۔ آسمان و زمین کی پیدائش ایسے مادے سے ہوئی جسے قرآن نے دخان کے لفظ سے تعبیر کیا ہے ثم استوی الی السماء وھی دخان۔ دخان کے معنے دھوئیں کے یا ایسی بھاپ کے جو اوپر چڑھی ہوئی ہو۔

۲۔ یہ مادہ دخانیہ ابتدا میں الگ الگ نہیں بلکہ ملا ہوا تھا پھر اس کے مختلف حصے جدا جدا کیے گئے۔ اور ان سے اجرام سماویہ کی پیدائش ظہور میں آئی۔ ان السماوات والارض کانتا رتقا ففتقنا ھما

۳۔ یہ تمام کائنات بیک بارگی ظہور میں نہیں بلکہ تخلیق کے چھ دور یکے بعد دیگرے ظہور میں آئے یہ دور چھ یوم تھے۔

۴۔ سارے سیاروں کی تکمیل دو دوروں میں ہوئی جن کو قرآن دو یوم کہتا ہے فقضاھن سبع سماوات فی یومین۔

۵۔ زمین کی پیدائش دو دوروں میں ہوئی خلق الارض فی یومین۔

۶۔ زمین کی سطح کی درستگی اور پہاڑوں کی نمود اور قوت نشوونما کی تکمیل بھی دو یوم یعنی دو دو دوروں میں ہوئی اور اس طرح یہ چار دور ہوئے وجعل فیھا رواسی من فوقھا وبارک فیھا وقدر فیھا اقواتھا فی اربعۃ ایام۔

۷۔ تمام حیوانی اجسام کی پیدائش یعنی نباتات و حیوانات پانی سے ہوئی وجعلنا من الماء کل شیء حی۔

۸۔ انسان کے وجود پر بھی یکے بعد دیگرے مختلف حالتیں گذری ہیں وخلقکم اطوارا۔

ان تمام اشارات کا خلاصہ یہ ہے کہ ابتدا میں مادہ دخانی تھا پھر اس میں انضمام ہوا یعنی بہت سے ٹکڑے ہو گئے۔ ہر ٹکڑے نے ایک کرہ کی شکل اختیار کر لی اور اسی ایک ٹکڑے سے زمین بنی۔ پھر زمین میں کوئی ایسی تبدیلی آئی کہ دخانیت نے مائیت کی شکل اختیار کر لی۔ پھر خشکی کے قطعات درست ہو گئے۔ بعد ازیں پہاڑوں کے سلسلے نمودار ہوئے پھر زندگی نمایاں ہوئی اور نباتات ظہور میں آ گئے۔

موجودہ زمانے میں اجرام سماوی کی ابتدائی تخلیق اور زمین کی ابتدائی نشوونما کے جو نظریے تسلیم کر لیے ہیں۔ یہ اشارات بظاہر ان کی تائید کرتے ہیں۔ اور اگر ہم چاہیں تو ان اشارات

ہی پر تفصیلات کی بڑی عمارتیں اٹھا سکتے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے کہ ایسا کرنا صحیح نہ ہوگا یہ نظریے کتنے ہی مستند ہوں لیکن بہرحال نظریے ہیں۔ اور نظریات جزم و یقین کے ساتھ حقیقت کا فیصلہ نہیں کر سکتے۔ پھر اس سے کیا فائدہ کہ ان کی روشنی میں قرآن کے مجمل اشارات کی تفسیر کی جائے

فرض کرو آج کل ہم نے دخان اور انقسام کا مطلب اسی روشنی میں لے لیا لیکن کل کو کیا کریں گے جب ان نظریوں کی جگہ دوسرے نظریے لے لیں گے صاف بات یہی ہے کہ یہ معاملہ سارا عالم غیب سے تعلق رکھتا ہے جس کی حقیقت ہم اپنے علم و ادراک کے ذریعے معلوم نہیں کر سکتے اور قرآن کا مقصود ان اشارات سے تخلیق عالم کی شرح و تحقیق نہیں ہے بلکہ اللہ سبحانہ کی قدرت وحکمت کی طرف توجہ دلانا ہے [1]

اللہ سبحانہ کی حکومت

۵ پھر اپنے تخت حکومت پر متمکن ہو گیا وہی ساری حکومت چلا رہا ہے یعنی مخلوق کے تمام کاموں کی تدبیر و انتظام اسی کے ہاتھ میں ہے یعنی پیدا کر کے وہ معطل نہیں ہو گیا بلکہ اپنی پیدا کی ہوئی کائنات کے تخت سلطنت پر وہ خود جلوہ فرما ہوا اور اب سارے جہان کا انتظام عملاً اسی کے ہاتھ میں ہے۔ نادان سمجھتے ہیں اللہ سبحانہ نے کائنات کو پیدا کر کے یوں ہی چھوڑ دیا ہے کہ خود جس طرح چاہے چلتی رہے۔ یا دوسروں کے حوالہ کر دیا ہے کہ وہ اس میں جیسے چاہیں تصرف کریں۔ قرآن اس کے برعکس یہ حقیقت پیش کرتا ہے کہ اللہ سبحانہ اپنی تخلیق کی اس پوری کائنات پر بلا شرکت آپ ہی حکمرانی کر رہا ہے، تمام اختیارات اس کے اپنے ہاتھ میں ہیں۔ ساری زمام اقتدار پر وہ خود قابض ہے۔ کائنات کے گوشے گوشے میں ہر وقت ہر آن جو کچھ ہو رہا ہے براہ راست اس کے حکم سے ہو رہا ہے۔ اس جہان ہستی کے ساتھ اس کا تعلق صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ کبھی اسے وجود میں لایا تھا بلکہ ہمہ وقت وہی اس کا مدبر و منتظم ہے اسی کے قائم رکھنے سے یہ قائم ہے اسی کے چلانے سے یہ چل رہا ہے۔ یدبر الامر میں اس بات کی طرف اشارا ہے کہ اللہ سبحانہ صرف خالق ہی نہیں بلکہ آمر اور حاکم بھی ہے۔ اس نے اپنی خلق کو پیدا کر کے نہ تو دوسروں کے حوالہ کر دیا ہے کہ وہ اس میں حکم چلائیں اور نہ پوری خلق کو یا اس کے کسی حصے کو خود مختار بنا دیا ہے کہ جس طرح

---

[1] ترجمان القرآن

چاہے خود کام کرے بلکہ عملاً تمام کائنات کی تدبیر اللہ سبحانہ کے اپنے ہاتھ میں ہے۔ اور یہ حقیقت بھی اس آیت نے پوری قوت سے واضح کر دی ہے کہ آسمان و زمین میں بادشاہت صرف اللہ سبحانہ کی ہے اور حاکمیت جس چیز کا نام ہے وہ اللہ سبحانہ کے لیے خاص ہے اور یہ نظام کائنات کامل ایک مرکزی نظام ہے جس میں تمام اختیارات کو وہی ایک ذات استعمال کر رہی ہے لہٰذا اس نظام میں جو شخص یا گروہ اپنی یا کسی اور کی جزئی یا کلی حاکمیت کا مدعی ہے وہ محض فریب میں مبتلا ہے۔ نیز یہ کہ اس نظام میں رہتے ہوئے انسان کے لیے اس کے سوا کوئی دوسرا رویہ صحیح نہیں ہو سکتا کہ اسی ایک ذات کو پرستش کے معنوں میں معبود جانے اور بندگی کے معنوں میں سیاسی تمدنی زندگی میں واحد سلطان بھی تسلیم کرے۔ قرطبی نے امام مجاہد سے یدبر الامر کی تشریح یہ نقل کی ہے یقضیہ ویقدرہ وحدہ خالق کل ہونے کے ساتھ وہ حاکم بھی ہے چھوٹے بڑے ہر کام کا فیصلہ بھی وہی کرتا ہے اور عبداللہ بن عباس فرماتے ہیں کہ اس تدبیر میں اس کا شریک نہیں ہے۔

بارگاہ حق میں شفاعت

[1] اسکی بارگاہ میں اس کے حکم کے بغیر کوئی سفارشی نہیں ہے یعنی شریک اور حصہ دار تو اس کی خدائی میں کیا ہوتا۔ سفارش کے لیے بھی اس کے اذن کے بغیر لب نہیں ہلا سکتا [1] یعنی اللہ سبحانہ کے انتظام میں کسی دوسرے کا دخیل ہونا تو درکنار کوئی اتنا اختیار بھی نہیں رکھتا کہ اللہ سے سفارش کرکے اس کا فیصلہ بدلوا دے۔ زیادہ سے زیادہ کوئی جو کچھ کر سکتا ہے وہ بس اتنا ہے کہ دعا کرے مگر دعا کا قبول ہونا نہ ہونا بالکل اللہ سبحانہ کی مرضی پر منحصر ہے شفیع شفاعت سے بنا ہے سفارش کرنا اور شفاعت کرنا۔ مولانا اسماعیل الشہید نے شفاعت کے مسئلہ پر بڑی مبسوط اور سیر حاصل بحث کی ہے۔ جی چاہتا ہے کہ بطور رگلے از گلزار ناظرین معالم القرآن کی ضیافت طبع کے لیے یہ سوغات بھی پیش کی جائے مولانا نے شفاعت کی تین قسمیں بتائی ہیں شفاعت وجاہت شفاعت محبت اور شفاعت بالاذن۔ اس آیت میں پہلی دو کی نفی اور تیسری کا اثبات ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شفاعت وجاہت یہ ہے کہ بادشاہ کے دربار میں کسی چور کی چوری ثابت ہوگئی اور وہ آئین قانون کے اعتبار سے اسے سزا دینا چاہتا ہے لیکن کوئی امیر یا وزیر اس کی سفارش کرتا ہے بادشاہ کا جی تو آئین حکومت کی وجہ سے اسے سزا دینے کو چاہتا ہے مگر اس امیر سے دب کر سفارش مان لیتا ہے اور اس چور کا قصور معاف کر دیتا ہے۔ کیونکہ وہ امیر اس کی حکومت کی بڑی شخصیت ہے اور اس کی بات نہ ماننے سے حکومت میں گڑبڑی کا اندیشہ ہے۔ بادشاہ سمجھتا ہے کہ چور سے درگزر کر جانا اچھا ہے بمقابلہ اتنے بڑے امیر کے ناخوش ہو جانے کے چور کی سزا چور کی سزا ہے مگر امیر کی ناراضگی سے حکومت میں فساد اور بغاوت کا اندیشہ ہے اس کو شفاعت وجاہت کہتے ہیں یعنی دربار میں اس امیر کی وجاہت کی وجہ سے اس کی سفارش قبول کی جاتی ہے۔ اس قسم کی شفاعت اللہ کی جناب میں ہرگز نہیں ہے یہ مشرکین کا نظریہ شفاعت ہے اور یہ اللہ کی جناب سے جاہل ہونے کی علامت ہے۔

دوسری صورت یہ ہے کہ چور کی سفارش بادشاہ سے کوئی شاہزادہ یا بادشاہ کا کوئی محبوب کرتا ہے بادشاہ اس کی محبت سے لاچار ہو کر اس چور کو سزا نہیں دیتا یہ شفاعت محبت ہے۔ بادشاہ کو اندیشہ ہے کہ اگر اس کی سفارش نہ مانی گئی تو وہ روٹھ جائے گا اور اس روٹھ جانے کا غم مجھ سے برداشت نہ ہوگا اس قسم کی شفاعت بھی جناب الٰہی میں ممکن نہیں ہے یہ عیسائیوں کا نظریہ شفاعت ہے۔

تیسری شفاعت کی صورت یہ ہے کہ چور پر چوری ثابت ہوگئی مگر وہ پیشہ ور چور نہیں۔ اتفاقیہ اس سے قصور ہوگیا۔ چور قصور پر شرمندہ ہو اس پر بادشاہ کو رحم آتا ہے مگر قانون حکومت کی وجہ سے بے سبب درگزر نہیں کرتا ہے۔ کوئی وزیر بادشاہ کی مرضی پاکر اس چور کی سفارش کرتا ہے بادشاہ وزیر کی عزت افزائی کے لیے ظاہر میں اس کی سفارش قبول کر کے چور کو معاف کر دیتا ہے۔ امیر چور کی سفارش اس لیے نہیں کر رہا ہے کہ اسے چور سے یا چور کے جرم سے کوئی ہمدردی ہے بلکہ محض بادشاہ کی مرضی تاڑ کر سفارش کر رہا ہے کیونکہ وہ چور کا حمایتی نہیں بلکہ بادشاہ کا امیر ہے اس کو شفاعت بالاذن کہتے ہیں یعنی یہ شفاعت خود مالک کے حکم اور اجازت سے ہوگی۔ اللہ کی جناب میں یہی شفاعت ہوگی یہی اسلام کا نظریہ شفاعت ہے۔ اس پر انشاء اللہ تفصیلی بحث آئندہ ہوگی۔

پرستش اور بندگی صرف اللہ کی کرو

ف۵ اللہ ہی تمہارا مالک و آقا ہے لہٰذا صرف اسی سے عابدانہ تعلقات قائم کرو کیا تم اتنی سی بات پر غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہو یعنی دھیان کرو کہ ایسے رب کے سوا جس کی صفات اوپر بیان ہوئی ہیں دوسرا کون ہے جسکی بندگی اور پرستش کی جا سکے۔ پھر تم کو کیسے جرأت ہوتی ہے کہ اس خالق و مالک شہنشاہ مطلق اور حکیم برحق کے پیغاموں اور پیغامبروں کو محض اوہام و ظنون کی بنا پر جھٹلانے لگو۔[1]

یہاں توحید الوہیت پر توحید ربوبیت سے استدلال کیا ہے یعنی جب تم مانتے ہو کہ اس کائنات کا بنانے والا اور چلانے والا اللہ ہے تو کیوں نہیں مانتے کہ تمہاری پرستش اور بندگی کا بھی مستحق اللہ ہے۔ پرستش اور بندگی کے مجموعہ کا نام عبادت ہے یہی عقل کا صریح تقاضا اور یہی قرآن کا واضح فیصلہ ہے شارحین قرآن نے فاعبدوہ کی شرح افردوہ بالعبادہ وحدہ تنہا صرف اسی کی عبادت کرو (ابن کثیر) وحدوہ واخلصوالہ العبادہ اکیلے کی عبادت اور عبادت میں ملاوٹ نہ کرو (قرطبی) عقل کا صریح تقاضا یہ اس لیے ہے کہ جو ذات گرامی انسان کی خالق اور مالک رازق محسن سبھی کچھ ہے اسے ہی سبھی طرح کی عبادتوں کا مستحق ہونا چاہیے۔ قرآنی فیصلہ یہ اس طرح ہے کہ اس کی آیتیں اپنے ماننے والوں سے اللہ سبحانہ کی پرستش اور بندگی دونوں ہی کا یکساں طور پر مطالبہ کرتی ہیں پرستش کی حد تک جہاں قرآن یہ کہتا ہے کہ اللہ ہی کو سجدہ کرو اسی کے نام کی پاکی بیان کرو اسی سے دعائیں مانگو اسی کی بڑائی کا اعلان کرو۔ اسی کو مدد کے لیے پکارو وہیں قرآن یہ بھی بندگی کی حد تک کہتا ہے اور بار بار کہتا ہے کہ اللہ ہی کو بلا قید اور بلا شرط اطاعت کا مستحق اور حقیقی فرماں روا مانو۔ اسی کو مستقل بالذات قانون ساز تسلیم کرو۔ اسی کے احکام کی اطاعت کرو۔ اسی کے قوانین کے مطابق فیصلے کرو۔ اسی کے ضابطوں کو زندگی کے ضابطے بناؤ اسی کے حلال کو حلال اور اسی کے حرام کو حرام جانو۔ اس لیے اس عبادت کا مفہوم پرستش بمعنے پوجا اور بندگی بمعنے طاعت دونوں کا مجموعہ ہے افلا تذکرون یعنی جب یہ حقیقت تمہارے سامنے کھل کر آگئی ہے اور تم کو صاف طور پر بتا دیا گیا ہے کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ اس حقیقت کی موجودگی میں تمہارے لیے صحیح طرز عمل کیا ہے کیا اب بھی تمہاری آنکھیں نہ کھلیں گی اور ان ہی غلط فہمیوں میں پڑے رہو گے جن کی بنا پر تمہاری زندگی کا پورا رویہ اب تک حقیقت سے دور رہا ہے۔

ایمان بالیوم الآخر

ف۸ اسی کی بارگاہ میں تمہیں پیش ہونا ہے یہ اللہ کا پکا وعدہ ہے بلاشبہ وہی تو ہے جو آفرینش کا نقطۂ آغاز ہے اور وہی اس کا اعادہ کرے گا۔ اور یہ اعادہ اس لیے ہوگا کہ جو لوگ ایمان کی نعمت سے مالا مال ہوئے۔ اور انہوں نے عمل صالح کیے انہیں انصاف کے ساتھ ان کی جزا دے یعنی اسی سے سب کا آغاز ہوا اور اسی کی طرف انجام کار سب کو جانا ہے پھر اس کے احکام وسفراء سے سرتابی کیسے ادا ہو سکتی ہے۔

قرآن کی دعوت ایمان باللہ اور ایمان بالیوم الاخر ہے اب تک اصلی طور پر ایمان باللہ کو بیان کیا ہے اور اس کے ضمن میں ایمان بالرسالت کا تمہید میں ذکر کیا اب یہاں سے ایمان بالیوم الآخر کا ذکر شروع ہے مبدا ذکر نے کے بعد معاد کا ذکر کیا ہے ایمان بالیوم الاخر اسلام کے بنیادی عقائد میں دوسرا عقیدہ ہے۔

ایمان بالیوم الآخر کا مطلب یہ ہے کہ حسب ذیل حقیقتوں کو سچے دل سے تسلیم کیا جائے۔

۱۔ انسان کی پیدائش ایک متعین مقصد کے لیے ہوئی ہے انسان ایک ذمہ دار اخلاقی ہستی ہے اسے پیدا کرنے والے نے اسے زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل ہدایت نامہ دے کر پیدا کیا ہے اس کے مطابق عمل کرنا ہی حق اور نیکی ہے اور اسے چھوڑ کر من مانا طریقہ اختیار کرنا گمراہی اور برائی ہے۔

۲۔ انسان کی زندگی موت کی ساتھ ہی ختم نہیں ہو جاتی بلکہ اس کے بعد مسلسل قائم رہنے والی ہے اور اس دنیا کی زندگی میں وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے مادی نتائج کے اعتبار سے اگرچہ اسی جگہ ختم ہو جاتا ہے مگر اپنے اخلاقی نتائج کے اعتبار سے سب کا سب باقی رہنا ہے ایک دن ایسا آئے گا جب اللہ سبحانہ کی حکمت اور مشیت کے مطابق زمین و آسمان کا یہ سارا کارخانہ تہ و بالا کر دیا جائے گا اور اس زمین پر ایک جاندار بھی زندہ نہ رہ جائے گا سب موت کی نیند سلا دیئے جائیں گے قرآن کی اصطلاح میں اسے قیامت کہتے ہیں۔

۳- قیامت کے بعد وہ سارے جاندار جو دنیا کی ابتدا سے آج تک پیدا ہو کر مر چکے ہیں۔ اور ابھی اس دن کے آنے تک پیدا ہو کر مر جانے والے ہیں دوبارہ جسم و جان کے ساتھ زندہ کر کے اٹھا کر کھڑے کیے جائیں گے۔ ثم یعیدہ کا مطلب یہی ہے اسی کو حشر کہتے ہیں۔

۴- اعادہ حیات کے بعد زندگی کا دوسرا دور شروع ہو گا اس دور کی ابتدا اس بات سے ہو گی کہ سب کے سب اللہ سبحانہ کی عدالت میں پیش ہوں گے اور وہ ہم سے ہماری زندگی کے پہلے دور کا حساب لے گا اس وقت ہمارے ذرے ذرے کی نیکی اور بدی کا ریکارڈ ہمارے سامنے رکھ دیا جائے گا۔ انصاف کی ترازو نصب ہو گی۔ ہر شخص کے عمل کانٹے کی تول تلیں گے جس خوش نصیب کا عمل یا وزن ثابت ہو گا اور اعمال نامہ نیکیوں کا اعمال نامہ نکلے گا اس کو زندگی کا یہ دور بسر کرنے کے لیے نعمتوں بھری جگہ عطا ہو گی یہ نعمتیں بے حد و بے حساب ہوں گی کبھی ختم نہ ہوں گی اور ایسی ہوں گی جن کا اس دنیا میں رہتے ہوئے تصور بھی نہیں ہو سکتا اور جن کے بعد انسان کو کسی اور چیز کی آرزو نہ ہو گی یہ ہے مطلب یجزی الذین امنو وعملوا الصالحات بالقسط کا اور اس جگہ کا نام جنت ہے۔

اعمال بد کی سزا

ف اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا تو انہیں کفر کی وجہ سے کھولتی ہوئی پینے کی چیز ملے گی۔ اور ان کو دردناک عذاب سے دوچار ہونا پڑے گا یہ اولین سامان ضیافت کی حیثیت سے ہے یعنی ان کی اول تو اضع ان کے اترتے ہی کھولتے پانی سے ہو گی۔ پھر ان کے لیے دردناک عذاب کے دروازے کھول دیئے جائینگے مطلب یہ ہے کہ جن بدنصیبوں کا معاملہ اس زندگی میں کا فرانہ ہو گا۔ جن کا اعمال نامہ برائیوں کا اعمال نامہ ہو گا جو اپنی زندگی کا پہلا دور غفلت اور کفر کے ساتھ گذار کر اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں حاضر ہوں گے۔ ان کو یہ زندگی کا دوسرا دور بسر کرنے کے لیے ایک ایسی جگہ دی جائے گی جو ناقابل بیان تکلیفوں اور اذیتوں کی جگہ ہو گی جو ختم ہونے والی نہیں اسی جگہ کا نام جہنم ہے۔

یہ وہ ضرورت ہے جس کی خاطر اللہ سبحانہ انسان کو دوبارہ زندہ کرے گا۔ گویا یہ بتایا گیا ہے کہ یہ اعادہ خلق عقل و انصاف کی رو سے ضروری ہے۔ اور یہ ضرورت اعادہ خلق کے سوا

کسی دوسرے طریقے سے پوری نہیں ہو سکتی ہے۔ اللہ سبحانہ کو اپنا واحد رب مان کر جو لوگ اللہ سے عابدانہ تعلقات استوار کرینگے وہ اس کے مستحق ہیں کہ ان کو اپنے اس بجا طرزعمل کی بھرپور جزا ملے۔ اور جو لوگ حقیقت سے انکار کر کے اس کے خلاف زندگی بسر کریں گے وہ بھی اس کے مستحق ہیں کہ وہ اپنے اس بیجا طرزعمل کا خمیازہ بھگتیں۔ یہ ضرورت اگر موجودہ زندگی میں پوری نہیں ہو رہی ہے تو اسے پورا کرنے کے لیے یقیناً دوبارہ زندگی ناگزیر ہے۔

هُوَ الَّذِیْ جَعَلَ الشَّمْسَ ضِیَآءً وَّالْقَمَرَ
نُوْرًا وَّقَدَّرَهٗ مَنَازِلَ لِتَعْلَمُوْا عَدَدَ السِّنِیْنَ وَالْحِسَابَ ؕ
مَا خَلَقَ اللّٰهُ ذٰلِكَ اِلَّا بِالْحَقِّ ۚ یُفَصِّلُ الْاٰیٰتِ لِقَوْمٍ
یَّعْلَمُوْنَ ﴿۵﴾ اِنَّ فِی اخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ وَمَا خَلَقَ
اللّٰهُ فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّتَّقُوْنَ ﴿۶﴾
اِنَّ الَّذِیْنَ لَا یَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا وَرَضُوْا بِالْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَ
اطْمَاَنُّوْا بِهَا وَالَّذِیْنَ هُمْ عَنْ اٰیٰتِنَا غٰفِلُوْنَ ﴿۷﴾ اُولٰٓئِكَ
مَاْوٰىهُمُ النَّارُ بِمَا كَانُوْا یَكْسِبُوْنَ ﴿۸﴾ اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَ
عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یَهْدِیْهِمْ رَبُّهُمْ بِاِیْمَانِهِمْ ۚ تَجْرِیْ مِنْ
تَحْتِهِمُ الْاَنْهٰرُ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ ﴿۹﴾ دَعْوٰىهُمْ فِیْهَا سُبْحٰنَكَ
اللّٰهُمَّ وَتَحِیَّتُهُمْ فِیْهَا سَلٰمٌ ۚ وَاٰخِرُ دَعْوٰىهُمْ اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰهِ
رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ ﴿۱۰﴾ ع ۱ ۶

اسی کی ذات گرامی ہے جس نے سورج میں چمک بنائی اور چاند
میں روشنی [۱] اور چاند کی منزلوں کا ایک اندازہ قائم کیا [۱] تاکہ
تمہیں اپنے حساب کا اور سالوں کی گنتی یعنی تاریخ کا علم ہو جائے [۲]

اللہ سبحانہ نے یہ سب کچھ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ اہل علم کے لیے دلائل کھول کر بیان کرتا ہے [5] بلاشبہ رات دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں اور ان تمام چیزوں میں جو اللہ سبحانہ نے آسمان و زمین میں پیدا فرمائی ہیں اہلِ تقویٰ کے لیے دلائل ہیں [6] یقیناً جو لوگ ہمارے سے ملنے کی امید نہیں رکھتے ہیں اور صرف دنیا کی زندگی میں مگن ہیں اور اسی پر اطمینان کا سانس لے رہے ہیں اور جو لوگ ہمارے دلائل سے غافل ہیں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی پاداش میں دوزخ ہے [8] جو واقعی اس زندگی میں ایمان و عمل صالح کی نعمت سے ہمدوش ہوئے تو ان کی ان کا مالک ان کے ایمان کی وجہ سے رہنمائی فرمائے گا یعنی ایسے آرام کے باغات ان کو ملیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی [9] ان باغات میں ان کی پکار یہ ہوگی اے اللہ تیری ذات پاک ہے ان کی دعا یہ ہوگی کہ سلامتی ہو اور ان کی دعاؤں کا خاتمہ یہ ہوگا کہ ہر طرح کی ستائش اس اللہ کے لیے جو کائنات کا مالک ہے [10]

پارہ نمبر ۱۱

مفردات کے معانی

ضیاء چمک، روشنی یہ اجوف وادی اور مہموز اللام ہے مادہ ضوء ہے یہ اصل ضواء ہے واو کسرہ کے بعد ہونے کی وجہ سے ضیاء بن گیا۔ ابوعلی فارسی کا بیان ہے کہ ضیاء دو حال سے خالی نہیں ہے یا تو یہ ضوء کی جمع ہے جیسے سوط کی جمع سیاط اور حوض کی جمع حیاض آتی ہے اور یا مصدر ہے ضاء یضوء ضیاء جیسے صام یصوم صیاماً قام یقوم قیاماً ہے اور ابوعلی نے اس کے جمع ہونے ہی کو زیادہ قرین قیاس بتایا ہے لیکن قرآن کی یہ آیت ھو الذی جعل الشمس ضیاء والقمر نورا میں نور کے مقابلہ میں ضیاء کا آنا مصدر ہونے کی علامت ہے۔ نیز مصدر ہونے کی صورت میں ضیاء بمعنی اسم فاعل بمعنے مضیئۃ بھی ہوسکتا ہے اور زید عدل کے انداز پر مصدر مبالغہ کے لیے بھی ہوسکتا ہے۔

توحید ربوبیت سے آخرت پر استدلال

توحید چار ہیں توحید وجود، توحید خالقیت توحید ربوبیت توحید الوہیت۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔

توحید وجود اور توحید خالقیت کے موضوع پر مشرکین، یہودی اور عیسائیوں کا نبوت سے کوئی اختلاف نہیں ہے۔ بلکہ یہ بھی دعوی کیا ہے کہ قرآن کا اعلان ہے کہ توحید کے یہ دونوں درجے ان مقدمات میں سے ہیں جو ان سب کے مسلمات میں سے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن کے مخاطبوں کا قرآن سے توحید وجود اور توحید خالقیت کے موضوع پر کوئی اختلاف نہ تھا۔ ایسے ہی توحید ربوبیت کا بھی ان کو کھلا اعتراف تھا ان کا اگر انکار تھا تو صرف توحید عبادت سے یعنی یگانہ اللہ کی عبادت سے پہلی آیت میں توحید ربوبیت سے توحید عبادت پر استدلال کیا ہے ربوبیت کے سلسلے میں سورج چاند دن رات کا ذکر کیا ہے۔ بتانا یہ ہے کہ جب تم مانتے ہو کہ اس کائنات کا بنانے والا اور بنالے کے بعد چلانے والا ایک اللہ ہے تو پھر یہ کیوں نہیں مانتے کہ تمہارے عابدانہ نیاز مندیوں ہونے کی حیثیت سے وفاداریوں کا بھی وہی مستحق ہے۔ اسی لیے ہر نبی کی دعوت کا شاہکار توحید عبادت ہے۔ عقیدہ توحید عبادت کی حیثیت صرف دعوے اور نعرے کی نہیں ہے بلکہ اس کے کچھ اہم اور بنیادی تقاضے بھی ہیں۔

۱۔ صرف اللہ ہی ہے جس کی رضا جوئی کی انسان کو فکر کرنی چاہیے یہی اسکے سارے اعمال کا اصلی محرک بھی ہونا چاہیے اور اصل مقصد بھی۔

۲۔ سارے اعمال و حرکات صرف اللہ ہی کے لیے مخصوص رکھنے چاہئیں جو اپنی حقیقت یا اپنی صورت کے اعتبار سے پرستش کی قسم کے ہوں سجدہ صرف اسی کو کیا جا سکتا ہے۔ نذر صرف اسی کے نام کی مانی جا سکتی ہے دعا صرف اسی سے کی جا سکتی ہے۔ نادیدہ پناہ صرف اسی کی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ غیبی امداد کے لیے صرف اسی کو پکارا جا سکتا ہے۔

۳۔ وہ جذبات و احساسات بھی اللہ کے لیے خاص کر دینے چاہئیں جن کے اندر بندگی کی روح پائی جاتی ہو توکل صرف اسی پر کیا جائے۔ امیدیں صرف اسی سے باندھی جائیں خوف اسی کا رکھا جائے حقیقی محبت صرف اس سے کی جائے۔

۴۔ اس پوری کائنات کا جس کا ہماری یہ دنیا بھی چھوٹا سا حصہ ہے مقتدر اعلیٰ اللہ سبحانہ ہے حکم دینے منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا اصل مستحق صرف اللہ ہی ہے حقیقی شارع اور قانون ساز بھی وہی ہے۔

۵۔ اللہ سبحانہ کے سوا کوئی نہیں جو اپنے اندر شان معبودیت رکھتا ہو جو پوجے جانے کا مستحق ہو جس کی رضا چاہی جائے۔ کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں نذر پیش کی جائیں اعتراف نعمت کیا جائے۔ کوئی اور نہیں جسے ولی اور کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے۔ کوئی اور نہیں جس پر توکل کیا جائے۔ دل میں جس کا خوف اور تقوی رکھا جائے جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں اور جس سے حقیقی محبت کی جائے۔ کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا ذرہ بھی ہو۔ جو بال برابر بھی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکتا ہو جو کسی کے لیے قانون بنانے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔

توحید کے یہ بنیادی تقاضے اتنی اہمیت رکھتے ہیں کہ ان میں سے ایک کا انکار بھی اللہ پر ایمان رکھنے کے دعوی کو بے معنی کر دیتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ ساری باتیں عقیدہ توحید عبادت کے اصل مفہوم میں شامل ہیں اور کوئی شخص صحیح معنوں میں مسلمان نہیں ہو سکتا جب

تک کہ یہ عقیدہ اپنے اس پورے مفہوم کے ساتھ اس کے دل میں نہ اتر چکا ہو۔

نلہ اسی کی ذات گرامی ہے جس نے سورج میں چمک بنائی اور چاند میں روشنی بعض کے نزدیک نور عام سے ضیا ہے۔ ضیا خاص اس نور کو کہتے ہیں جو زیادہ تیز اور چمکدار ہو۔ بعض نے کہا جس کی روشنی ذاتی ہو۔ وہ ضیا ہے اور جس کی دوسرے سے مستفاد ہو وہ نور ہے۔ سورج کی روشنی عالم اسباب میں کسی دوسرے کرے سے حاصل نہیں ہوئی چاند کی روشنی البتہ سورج سے مستفاد ہے اور بعض محققین نے دونوں میں یہ فرق بتلایا ہے کہ نور مطلق روشنی کو کہتے ہیں ضیا اور ضو راس کے انتشار اور پھیلاؤ کا نام ہے۔ سورج کی روشنی کا پھیلاؤ چونکہ زیادہ ہوتا ہے اس لیے ضیا سے تعبیر کیا واللہ اعلم بمرادہ لے

یہ توحید عبادت کی بھی دلیل ہے اور نظر یہ آخرت کی بھی۔ اور زیادہ زور دوسری بات پر ہے ماخلق اللہ ذالک الا بالحق اس کی دلیل ہے کہ انداز بیان آخرت کے لیے بطور دلیل اختیار کیا گیا ہے فرمایا ہے کہ اس کارگاہ ہستی میں جو کام ہر طرف نظر آرہے ہیں جن کے بڑے بڑے نشانات سورج چاند ہیں۔ ان سے ایک طرف اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ یہ کارخانہ جس کے ہر کام میں نظم ہے حکمت ہے اس کے ذرے کی پیدائش میں ایک گہری مقصدیت پائی جاتی ہے بلاشبہ جب وہ حکیم ہے اور اس کی علامتیں تمہارے سامنے موجود ہیں تو اس سے یہ کیسے توقع رکھتے ہو کہ وہ انسان کو دانا اور ذمہ دار اخلاقی وجود بنانے کے بعد اس کے کارنامہ زندگی کا حساب کبھی نہ لے گا اور عقلی واخلاقی ذمہ داری کی بنا پر جزا وسزا نہ ہوگی۔

دوسری طرف یہ توحید عبادت کی بھی دلیل ہے جس کی ربوبیت نے تمہاری اجسام کی پروردگاری کا بلاشرکت غیر اتنا اہتمام کیا ہے کیا اس کے علاوہ کوئی اور بھی تمہارے نیازمندانہ اعمال اور عبادتوں کا مستحق ہو سکتا ہے، نہیں ہرگز نہیں۔ لا الہ الا ھو سبحانہ عما یشرکون کیا تمہیں نظر نہیں آتا کہ سورج معین نظام الاوقات کے ساتھ نکلتا اور اپنی تابانیوں سے سارے جہاں کو روشن کرتا ہے۔ اس کے ذریعے تمہاری پروردگاری کی خاطر گرمی، سردی خزاں اور بہار کے مختلف موسم پیدا ہو جاتے ہیں جس میں سے ہر ایک دنیا کی زندگی اور اس کی بقا کے لیے ضروری ہے۔ چاند اس سے نور کا استفادہ کر کے اپنی معین منزلیں طے کرتا اور تاریک راتوں میں مختلف زاویوں

لے افادات شیخ الاسلام

شمع برداری کرتا ہے۔ کون کہہ سکتا ہے کہ یہ دنیا خیر و شر اور نیکی و بدی کے امتیاز کے بغیر یوں ہی چلتی رہے گی یا یوں ہی ختم ہو جائے گی۔

چاند کے لیے تقدیر منازل

لہ اور چاند کی منزلوں کا ایک اندازہ قائم کیا یعنی روزانہ بتدریج گھٹتا اور بڑھتا ہے والقمر قدرنٰہ منازل حتی عاد کالعرجون القدیم علمائے ہیئت نے اس کے دورے کی تقسیم کر کے اٹھائیس منزلیں مقرر کی ہیں جو بارہ برجوں پر تقسیم ہیں۔ قرآن میں خاص ان کی مصطلحات مراد نہیں مطلق سیر و سیاحت کے مدارج مراد ہیں لہ مطلب یہ ہے کہ نظام خلقت اس کی شہادت دے رہا ہے کہ یہاں کوئی بات بغیر حکمت و مصلحت نہیں ہے۔ سورج کو دیکھو جس کی درخشندگی سے تمام ستارے روشنی حاصل کرتے ہیں چاند کو دیکھو جس کی گردش ۲۸ منزلیں مقرر کر دی ہیں۔ یعنی چاند کے لیے یکے بعد دیگرے وارد ہونے کی منزلیں اندازہ کر کے ٹھہرا دی ہیں۔ سورہ یٰسین کی آیت ۳۹ ان منزلوں کی طرف اشارا ہے مختصر ان منازل کا مطلب سمجھ لینا چاہیے۔

چاند زمین کے گرد گردش میں رہتا ہے اور اپنی گردش کے فلک کو ۲۷ دن ۷ گھنٹوں اور ۴۳ منٹ میں پورا کرتا ہے۔ اس دور کو علمائے ہیئت چاند کے نجومی دورے یا نجومی مہینہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ کیونکہ اس دورے کے ختم ہونے پر چاند پھر اسی ستارہ کے قریب دکھائی دیتا ہے جس کے پاس سے اس کی گردش شروع ہوئی تھی۔ نیز اپنی گردش کی ہر رات میں وہ کسی نہ کسی ستارے یا ستاروں کے مجموعہ کے پاس ضرور پہنچ جاتا ہے۔ اور وہ گویا اس کی گردش کے لیے ہر روز کی ایک منزل بن گیا ہے۔ وہ ہمیشہ ایک خاص منزل سے سفر شروع کرتا ہے ہر روز کی مقررہ منزل میں نمایاں ہوتا ہے اور پھر وہیں پہنچ جاتا ہے جہاں زمین کا چکر شروع کیا تھا۔

اس طرح ۲۷ دن ۷ گھنٹے کی مدت نے ۲۸ منزلیں بنا دیں جب ہم ۳۶۰ کے درجوں کو جو کامل دور کی مقررہ مقدار ہے ۲۸ راتوں پر تقسیم کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ چاند ہر دن میں تقریباً ۱۳ درجہ مسافت اپنے فلک کی طے کرتا ہے۔ تقریباً اس لیے کہا گیا ہے کہ حساب میں کچھ دقیقے زیادہ ہوتے ہیں۔

لہ افادات شیخ الاسلام

معلوم ہوتا ہے کہ مطالعہ اور ضرورت کی یکساں حالت نے مختلف قوموں کو اس نتیجے تک پہنچا دیا تھا۔ ہندوستان میں ان منازل کے لیے نچھتر کا لفظ اختیار کیا تھا اور ستائیس نچھتر قرار دیئے گئے تھے جو اسونی سے شروع ہوتے اور ریونی پر ختم ہوتے ہیں۔ جنہوں نے اٹھائیس منزلیں بتائی تھیں اور اسے سیو کہتے تھے۔ بابل و آشور کے باشندوں نے شاید سب سے پہلے اس کا سراغ لگایا۔ اور مجوسیوں کی ایک مذہبی کتاب سے معلوم ہوتا ہے کہ ایرانی بھی اس سے بے خبر نہ تھے۔

یہ نہیں کہا جا سکتا کہ عرب جاہلیت نے مجاور قوموں سے یہ حساب معلوم کیا یا بطور خود اس نتیجہ تک پہنچے تھے۔ حکمار اسلام نے ان منزلوں کو بطلیموسی کے نقشہ مندرجہ مجسطی سے تطبیق دی تھی۔
ان منزلوں کے عربی نام یہ ہیں۔

الشرطان[۱] - البطین[۲] - الثریا[۳] - الدبران[۴] - الھقعہ[۵] - الھنعہ[۶] -
الذراع[۷] - النثرہ[۸] - الطرف[۹] - الجبھہ[۱۰] - الزبرہ[۱۱] - الصرفہ[۱۲] - العواء[۱۳] -
السماک الاعزل[۱۴] - الغفر[۱۵] - الزبانی - الاکلیل[۱۶] - القلب[۱۷] - الشولہ[۱۸] - النعائم[۱۹] -
البلدہ[۲۰] - سعد الذابح[۲۱] - سعد بلع[۲۲] - سعد السعود[۲۳] - سعد الاخبیہ[۲۴] -
الفرغ الاول[۲۵] - الفرغ الثانی - بطن الحوت[۲۶] -

الفرغ الاول اور الثانی فرغ الدلو المقدم اور فرغ الدلو الموخر کہتے ہیں اور بطن الحوت کو الرشا بھی کہتے ہیں [۱]

اوقات شناسی کا پیمانہ

[۲] تاکہ تمہیں اپنے حساب کا اور سالوں کی گنتی یعنی تاریخ کا علم ہو جائے۔ یعنی برسوں کی گنتی اور مہینوں اور دنوں کے چھوٹے موٹے حساب سب چاند سورج کی رفتار سے وابستہ کر دیئے ہیں۔ اگر چاند سورج نہ ہوں تو دن رات قمری اور شمسی مہینے اور سال وغیرہ کیسے متعین ہوں۔ حالانکہ علاوہ دنیوی زندگی اور معاشی کاروبار کے بہت سے احکام شرعیہ میں بھی تعین اوقات کی ضرورت ہے [۲] انسان کی نگاہ کے لیے آسمان کی کوئی چیز بھی اس درجہ نمایاں اور پرکشش نہیں جس قدر سورج

---

[۱] ترجمان قرآن
[۲] افادات شیخ الاسلام

اور چاند کا طلوع و غروب ہے۔ کیونکہ ان ہی ستاروں نے بغیر کسی کاوش و پیچیدگی کے اسے اوقات شماری کا راز بتلا دیا۔ اس نے سورج دیکھا کہ سورج نکلتا ہے اور پھر گھٹتے گھٹتے چھپ جاتا ہے بس اسے بر اندازہ مقرر کر لینے میں ذرا بھی دیر نہیں لگی کہ یہ ایک معین وقت ہے جس میں کبھی خلل واقع نہیں ہو سکتا اور اسے ایک دن ٹھیرا لینا چاہیے۔ پھر اس نے چاند دیکھا اور فوراً معلوم کر لیا کہ اس کے طلوع و غروب کا بھی ایک اندازہ مقرر ہے وہ ایک خاص زمانے تک دکھائی دیتا ہے پھر غائب ہو جاتا ہے۔ پھر نمایاں ہو کر بڑھنے گھٹنے لگتا ہے اس سے اوقات شماری کا دوسرا پیمانہ بھی اسے معلوم ہو گیا اور اس نے چاند کے چھپنے اور نکلنے کی مدت کو مہینہ ٹھیرا لیا۔ یہی مطالعہ جب آگے بڑھا تو معلوم ہوا ہر رات چاند آسمان کے کسی نہ کسی ستارے کے پاس دکھائی دیتا ہے اور یہ نظارہ ایسا ہے جس میں کبھی فرق نہیں پڑتا۔ ان ہی ستاروں سے اس کی روزانہ کی منزلیں بن گئیں۔

اس آیت کی پہلی آیت سے پیوندکاری یعنی لتعلموا عدد السنین کو قدرہ کے متعلق بنانے سے یہ نشاندہی ہوتی ہے کہ امت اسلامیہ اپنے معاملات اور احوال قمری مہینوں سے وابستہ رکھے۔ اور دن کا پتہ نہیں مگر میرا اپنا خیال یہی ہے کہ قرآن کے اسی اشارے سے دب کر حضرت عمر اور صحابہ کرام نے شمسی مہینوں کو نظر انداز کر کے قومی سنہ کی ضرورت کے موقعہ پر قمری حساب اختیار کیا تھا۔ حالانکہ ان کے سامنے رومی، ایرانی حساب تاریخ کا موجود تھا۔ علامہ مقریزی نے رومی اور ایرانی تاریخوں کو نظر انداز کرنے کی عجیب توجیہ کی ہے وہ لکھتے ہیں کہ:

> حضرت عمر اور صحابہ کرام نے ایرانی اور رومی تاریخ پسند نہیں کی کیونکہ دونوں کے حساب میں کبیسہ تھا یعنی دورہ ارضی کی کسر پوری کرنے کے لیے چند سال کے بعد مہینوں کے دنوں میں کمی بیشی جس طرح کہ تقویم گریگوری میں ہر چوتھے سال ایک دن کی کمی بیشی کر دی گئی ہے۔ چونکہ اسلام نے نسی سے روکا تھا اور کبیسہ پر نسی کا شبہ ہو سکتا تھا اس لیے مناسب نہ تھا کہ ایسا طریقہ اختیار کیا جاتا۔

مورخ موصوف کو یہ دور از کار دقیقہ سنجی اس لیے کرنی پڑی کہ قومی تقویم کی ضرورت کے لیے ان کے ذہن میں کوئی جگہ نہ تھی اور قدرہ منازل لتعلموا کے اشارے کی طرف ان کا ذہن نہیں گیا۔ اگر ان کے ذہن میں قرآن کا یہ اشارا ہوتا تو وہ کہہ دیتے کہ رومی اور ایرانی تاریخ

کا تعلق شمسی مہینوں سے تھا اور قرآن کا اشارا قمری مہینوں کی طرف تھا اس لیے صحابہ نے رومی اور ایرانی تاریخ سے اجتناب کیا۔ علامہ مقریزی کا ذہن چونکہ اس تعلیل سے خالی تھا اس لیے ناچار نسی کی شرعی ممانعت کی وادی میں پہنچ گئے حالانکہ کسی اعتبار سے یہ تعلیل لائق اعتنا نہیں ہے کیونکہ نسی مصطلحہ جاہلیت اور کبیسہ مصطلحہ حساب قطعاً دو مختلف چیزیں ہیں۔

کبیسہ اور نسی میں فرق

جس نسی کو قرآن نے حرام قرار دیا اور کفر کی زیادتی سے تعبیر کیا وہ بلاشبہ قمری مہینوں کی طبعی ترتیب کو اس طرح درہم برہم کر دیتا تھا کہ کبھی شعبان محرم بن جاتا اور کبھی رمضان ذوالحجہ قرار دیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ تھا کہ فرائض و عبادات کے مقررہ اوقات الٹ پلٹ ہو جاتے اور ان کے تعین و تقرر کی اہمیت و مصلحت باقی نہیں رہتی تھی لیکن کبیسہ بالکل دوسری چیز ہے اس کا مقصد دوسرا ہے اس کے اجزاء کے نتائج دوسرے ہیں اس کا کوئی اثر اس طرح کا مرتب نہیں ہوتا وہ محض اس لیے ہے کہ سال بھر کے تین سو ساٹھ دن قرار دے دینے کے بعد جو کسر رہ جاتی ہے اسے کچھ عرصہ کے بعد پورا کر دیا جائے تاکہ زیادہ مدت گذر جانے کے بعد مہینوں اور برسوں کا فرق نہ پڑ جائے۔ لہٰذا کسی طرح بھی یہ بات تسلیم نہیں کی جا سکتی ہے کہ حضرت عمر اور صحابہ نسی کی حقیقت سے بے خبر ہوں کہ شمسی تقویم کے کبیسہ کو قمری تقویم کا نسی سمجھ لیں حضرت عمر کے بارے میں تو امام شعبی نے صرف یہ بات بتائی تھی ولم یعجب التاریخات القدیمۃ یعنی حضرت عمر ایک تاریخ کے تعین کی ضرورت محسوس کر رہے تھے مگر پسند نہیں کرتے تھے کہ قدیم تاریخیں اختیار کریں اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ ایرانی اور رومیوں کی شمسی تقویم کو پسند نہ کرتے تھے۔ اس ناپسندیدگی کی وجہ میرے خیال میں اس کے سوا کچھ نہ تھی کہ انہوں نے قرآن کے اشارے سے قمری تقویم کا رجحان معلوم کر لیا تھا۔

بہر حال حضرت عمر نے تقویم شمسی کو چھوڑ کر تقویم قمری کو اختیار کیا اور تقویم قمری میں قومی تاریخ کی تعیین کے لیے واقعہ ہجرت کو مبدا بنایا واقعہ ہجرت کو قومی اور اسلامی تاریخ بنانے کی اہمیت پر معالم القرآن کی جلد عاشر میں تفصیلی تبصرہ آ چکا ہے۔ اس موضوع پر باقی مباحث انشاء اللہ معالم القرآن کی جلد ۱۴ میں آئے گی۔

کائنات کی تخلیق بامقصد ہے

ملہ اللہ سبحانہ نے یہ سب کچھ حق کے ساتھ پیدا کیا ہے وہ اہل علم کے لیے دلائل مفصل بیان کرتا ہے یعنی فلکیات کا سلسلہ یوں ہی کیف ما اتفق نہیں بلکہ عظیم الشان نظام و تدبیر کے ماتحت اور ہزار ہا فوائد و حکم پر مشتمل ہے اور سمجھ دار لوگ مصنوعات کے اس نظام کو دیکھ کر خداوند قادر و حکیم کی ہستی کا سراغ پا لیتے ہیں۔ اور مادیات کے انتظام سے روحانیات کے متعلق بھی اندازہ کر لیتے ہیں کہ وہاں کی دنیا میں کیسے کیسے چاند سورج اللہ نے پیدا کئے ہیں ان کو ہی انبیاء و مرسلین کہہ دیجیے۔[له] مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اس پوری کائنات کو بے مقصد نہیں پیدا کیا بلکہ بامقصد بنایا ہے۔ ہر کام میں نظم ہے حکمت ہے مصلحتیں ہیں۔ ذرے ذرے کی پیدائش میں ایک مقصدیت پائی جاتی ہے یہ صحیح انسانی فطرت کا اعتراف ہے کہ جو عاقل اس نظام کائنات پر غور کرتا ہے وہ پکار اٹھتا ہے ربنا ما خلقت هذا باطلا کہ یہ کارخانہ بے مقصد اور باطل نہیں ہے بلکہ ایک عظیم غایت کے ساتھ وجود میں آیا ہے اور یہ غایت مقتضی ہے کہ یہ ایک ایسے انجام پر منتج ہو جو حق اور باطل کے درمیان پورے انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دے اور ہر ایک کو اس کے اعمال کے مطابق جزا یا سزا دے۔

خلق السماوات والارض بالحق کی تعبیر اس لیے اختیار کی گئی ہے کہ نزول قرآن سے پہلے تمام پیروان مذاہب نے دنیا کی پیدائش کا جو نقشہ کھینچا تھا وہ حکمت و مصالح کے تصور سے خالی تھا۔ لوگ خیال کرتے تھے کہ طاقت و اختیار کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں سے ہم آہنگی نہیں ہو سکتی ہے حکمتوں اور مصلحتوں کی پابندی وہی کرے گا جو کسی کے آگے جوابدہ ہو گا اللہ سبحانہ جو سب سے بڑا اور سب پر حکمران ہے اس کے کام مصالح سے کیوں وابستہ ہوں؟ وہ مطلق العنان بادشاہوں کو دیکھتے تھے کہ جو جی میں آتا ہے کر گزرتے ہیں۔ اور ان کے کاموں میں چوں و چرا کی گنجائش نہیں ہوتی۔ ان کا خیال تھا کہ اللہ سبحانہ کے کاموں کا بھی یہی حال ہے۔ ہندوستان، مصر، بابل اور یونان کی تمام علم الاصنامی روایات اسی تخیل کا نتیجہ ہیں۔ دیوتاؤں نے عشق بازی میں رنگ رلیاں منائیں اور ستارے پیدا ہو گئے۔ کسی دیوتا نے شکار کھیلتے ہوئے تیر مارا پہاڑ پیدا ہو گیا ایک

له افادات شیخ الاسلام

دیوتا نے اپنی جٹا کھول دی دریا وجود میں آگیا۔ اصنام پرست قوموں کے علاوہ یہودیوں اور عیسائیوں کے خیالات بھی اس بارے میں عقلی تصورات سے خالی تھے۔ یہودیوں کا خیال تھا کہ ایک مطلق العنان اور مستبد بادشاہ کی طرح اللہ سبحانہ کے افعال بھی حکمتوں اور مصلحتوں کی جگہ محض جوش وہیجان کا نتیجہ ہیں۔ وہ غصہ میں آ کر قوموں کو ہلاک کر دیتا ہے اور جوش محبت میں آ کر کسی خاص قوم کو اپنی چہیتی بنا تا ہے۔ بلاشبہ عیسائی قوم کا مایہ ضمیر رحم ومحبت ہے لیکن حکمتوں اور مصلحتوں کے لیے اس میں جگہ نہ تھی کفارہ کے اعتقاد کے ساتھ حکمتوں اور مصلحتوں کا اعتقاد نشوونما نہیں پاسکتا۔

قرآن تاریخ مذاہب میں پہلی کتاب ہے جس نے اللہ سبحانہ کی صفات وافعال کے لیے عقلی تصور قائم کیا۔ اور یہ حقیقت واضح کی حکمتوں اور مصلحتوں کی رعایت منافی قدرت نہیں بلکہ محاسن قدرت میں سے ہے بلاشبہ اللہ سبحانہ جو چاہے کر سکتا ہے لیکن اس کی حکمت وعدالت کا تقاضا یہی ہے کہ جو کچھ کرتا ہے حکمت ومصلحت کے ساتھ کرتا ہے۔

اسی اصل کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ سبحانہ نے تخلیق کائنات کا جو نقشہ بنایا وہ سرتاسر عقلی نقشہ ہے یعنی حکمت وعلت اور نظم واتقان کا نقشہ ہے اور اسی لیے اللہ سبحانہ نے جا بجا تخلیق بالباطل کے خیال کو کفر قرار دیا ہے۔

وما خلقنا السماء والارض وما بینهما باطلا ذالك ظن الذین کفروا۔

ہم نے آسمان وزمین کو اور جو کچھ اس کے درمیان ہے بغیر حکمت ومصلحت کے نہیں بنایا۔ یہ خیال کہ ہم نے بغیر حکمت پیدا کیا۔ ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے راہ کفر کو اپنایا ہے۔

دن اور رات کے اختلاف کی رہنمائی

۶ بلاشبہ رات دن کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے میں اور ان تمام چیزوں میں جو اللہ سبحانہ نے آسمان وزمین میں بنائی ہے اہل تقویٰ کے لیے دلائل ہیں بلاشبہ دنیا کی ہر چیز چھوٹی یا بڑی میں خدا کی ہستی اور وحدانیت کے دلائل موجود ہیں۔

وفی کل شیء له آیة تدل علی انه واحد

سورۃ بقرہ میں سیقول کے ربع کے قریب ایک آیت گذر چکی جس میں زیادہ بسط کے ساتھ

ان نشانہائے قدرت کا بیان ہوا ہے۔
یہ آیت بھی جیسے توحید عبادت کے لیے دلیل ہے ایسے ہی عقیدہ آخرت کے لیے بھی دلیل ہے
توحید کی یہ آیت اس طرح دلیل ہے کہ یہ اللہ کی ذات ہے کہ جس نے رات دن کا نظام قائم کیا ہے۔ کبھی رات بڑی ہے دن چھوٹا ہے کبھی رات چھوٹی ہے اور دن بڑا ہے۔ گویا تاریکی اور روشنی ہی کا اختلاف نہیں بلکہ تاریکی اور روشنی کی کیت کا اختلاف اور اس اختلاف کے نتیجے میں موسمیاتی اختلاف بھی اسی کا قائم کردہ ہے اس اختلاف میں حکمت الٰہی کی کتنی ہی نشانیاں موجود ہیں یہ بات کہ شب و روز کی آمد و شد کی دو مختلف حالتیں ٹھہرادی گئی ہیں اور وقت کی نوعیت ہر معین مقدار کے بعد بدلتی رہتی ہے زندگی کے لیے بڑی ہی تسکین و دلجمعی کا ذریعہ ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا اور وقت ہمیشہ ایک ہی حالت پر رہتا۔ تو زندگی دشوار ہوجاتی قطبین کے اطراف میں جہاں شب و روز کے اختلاف کا کوئی نام و نشان نہیں وہاں اس اختلاف کی قدر و قیمت کا اندازہ ہوتا ہے الغرض دن رات کا یہ اختلاف منہ بولتی گواہی ہے اس بات کے لیے کہ اس کائنات میں اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے۔

عقیدہ آخرت کی یہ دلیل اس طرح ہے کہ کائنات میں اللہ سبحانہ کے جو ہر طرف نظر آتے ہیں جن میں لیل و نہار کی گردش بھی ہے۔ اس سے اس بات کا واضح ثبوت ملتا ہے کہ دن رات کی یہ گردش بے غایت و بے مقصد نہیں ہے بلکہ ایک عظیم نتیجہ پر ختم ہونے والی ہے۔ اس طرح ان آیات میں عقیدہ آخرت پیش کرنے کے ساتھ تین دلیلیں منطقی ترتیب سے پیش کردی گئی ہیں پہلی یہ کہ دوسری زندگی ممکن ہے کیونکہ پہلی زندگی واقعہ کی صورت میں موجود ہے۔ جیسے دن کے ساتھ رات ہے ایسے ہی پہلی زندگی کے ساتھ دوسری زندگی بھی ہے اسے قرآن نے تزویج سے تعبیر کیا ہے ہم اسے قانون تثنیہ بھی کہتے ہیں یعنی ہر چیز کے دو دو ہونے یا متقابل و متماثل ہونے کی حقیقت کام کررہی ہے۔ یا یوں کہا جائے اپنا کوئی نہ کوئی مثنی رکھتی ہے رات کے لیے دن ہے صبح کیلئے شام ہے نر کے لیے مادہ ہے مرد کے لیے عورت ہے زندگی کے لیے موت ہے جب دنیا میں ہر چیز اپنا کوئی نہ کوئی متقابل رکھتی ہے ضروری ہے کہ دنیوی زندگی کے لیے بھی کوئی متقابل اور مثنی زندگی ہو۔ دنیا کی زندگی کے لیے متقابل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔

منکرین آخرت کی چار حالتیں

۷ یقیناً جو لوگ ہمارے سے ملنے کی امید نہیں رکھتے ہیں اور صرف دنیا کی زندگی میں مگن ہیں اور

اسی پر اطمینان کا سانس لے رہے ہیں اور جو لوگ ہمارے دلائل سے غافل ہیں ایسے ہی لوگوں کا ٹھکانا ان کے اعمال کی پاداش میں دوزخ ہے یعنی دنیا کی زندگی میں ایسا دل لگایا کہ آخرت کی اور خدا کے پاس جانے کی کچھ خبر ہی نہیں رہی۔ اسی چند روزہ زندگی کو مقصود و معبود بنا لیا اور قدرت کی جو نشانیاں اوپر بیان ہوئیں۔ ان میں کبھی غور و تامل نہیں کیا کہ ایسا مضبوط اور حکیمانہ نظام یوں ہی بیکار نہیں بنایا گیا۔ ضرور اس سارے کارخانہ کا کوئی مقصد ہو گا پھر جس نے پہلی مرتبہ ایسی عجیب و غریب مخلوقات پیدا کر دی اس کو دوبارہ کرنا کیا مشکل ہے اب ان کو دل و دماغ سے زبان سے ہاتھ پاؤں سے جو کچھ انہوں نے کمائی کی اس کا بدلہ دوزخ کی آگ ہے [1]

اس آیت میں چند گنے چنے لفظوں میں حقیقت حال کی پوری تصویر آگئی ہے کوئی گوشہ بھی باقی نہیں رہا۔ ساتھ ہی وجود آخرت کے تمام دلائل بھی نمایاں ہو گئے۔ منکرین آخرت کی ذہنیت کی چار حالتیں ہیں۔ انہیں اللہ سے ملنے کی کوئی توقع نہیں۔ یہ صرف دنیوی زندگی میں مگن ہیں۔ انہیں اس حالت کے خلاف ان میں کوئی خلش نہیں ہوتی ہے اس پر مطمئن ہیں۔ ان کا ذہن اس درجہ ماؤف ہو گیا کہ اللہ سبحانہ کی قدرت کی جو نشانیاں چاروں طرف پھیلی ہوئی ہیں۔ ان کو بیدار نہیں کر سکتی ہیں وہ یک قلم غافل ہو گئے ان میں سے ہر بات نہ صرف بیان حال ہے بلکہ بجائے خود ایک دلیل بھی ہے۔ یہی قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ انسان کا اس زندگی میں انفرادی انداز زندگی اور اجتماعی کبھی اس وقت تک درست نہیں ہو سکتا جب تک یہ شعور اور یہ یقین انسانی سیرت کی بنیاد میں استوار نہ ہو کہ ہم اللہ سبحانہ کے سامنے اس زندگی میں کئے ہوئے اعمال کے لیے جواب دہ ہیں سوچنے کی بات یہ ہے کہ آخر اس کی وجہ کیا ہے؟ کہ اس شعور و یقین کے غائب یا کمزور ہوتے ہی انسانی کردار برائی کی راہ پر چل پڑتا ہے۔ اگر عقیدہ آخرت واقعہ نہ ہوتا اور اس کا انکار حقیقت کے خلاف نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس اقرار و انکار کے یہ نتائج ایک لزوما شان کے ساتھ مسلسل ہمارے تجربہ میں آتے۔ ایک ہی چیز سے بہم صحیح نتائج کا ظاہر ہونا اور اس کے نہ ہونے سے نتائج کا ہمیشہ غلط ہونا اس بات کا قطعی ثبوت ہے کہ عقیدہ آخرت بجائے خود صحیح ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایمان بالیوم الآخر

قرآن میں ایمان باللہ کے بعد ایمان بالیوم الآخر ایک بنیادی عقیدہ ہے لیکن قرآن نے مذاہب کی عام شاہراہ سے ہٹ کر ایمان بالیوم الآخر کا تصور پیش کیا ہے۔ قرآن ایمان بالیوم الآخر کو اس کائنات کے عالمگیر قوانین سے الگ نہیں بلکہ اسی کے ماتحت کر کے پیش کرتا ہے۔

قرآن کا موقف ہے کہ جیسے دنیا میں ہر چیز کے خواص اور ہر حادثہ کے نتائج ہیں ایسے ہی انسانی اعمال کے بھی خواص و نتائج ہیں۔ اور مادیات کی طرح معنویات کے قوانین بھی کام کر رہے ہیں۔ دنیا اگر ایک مادی مقام ہے اور یہاں مادہ ہی ارتقا کی منزلیں طے کر رہا ہے تخلیق بر تخلیق ہو رہی ہے۔ دانہ گندم زمین میں ڈالا جاتا ہے گندم سے اجسام چل رہے بڑھ رہے ہیں۔ ضروری ہے کہ اعمال سے بھی اجسام کی تخلیق ہو۔ اعمال کی تخلیقات کا نام جنت و دوزخ ہے اچھے اعمال سے جنت کی اور بُرے اعمال سے جہنم کی۔ پھر دونوں طرح کی زندگیوں کے احوال و واردات ہیں جنہیں جابجا قرآن میں مختلف اسلوبوں سے بیان کیا گیا ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ یہ کیونکر اور کیسے ہوگا؟

اس بارے میں ہم اپنی عقل سے کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے کیونکہ عالم آخرت ہمارے ادراک کی سرحد سے باہر ہے جس مقام کا ہم ادراک ہی نہیں کر سکتے۔ وہاں کے حالات کے بارے میں حکم کیسے لگائیں۔

اب آپ کے ذہن میں یہ سوال خود بخود چٹکیاں لے گا کہ پھر اس پر ہم یقین کیوں کریں؟ اس لیے کہ ہم وجدانی طور پر محسوس کرتے ہیں کہ ہمارے محسوسات کے دائرے سے باہر بھی ایک حقیقت موجود ہے۔ اگر اس حقیقت کا انکار کریں تو اس کائنات کے مسئلہ کا کوئی حل باقی نہیں رہتا اور خود ہماری عقل کہتی ہے کہ ایسا نہ ہونا چاہیے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ اس زندگی کے لیے اگر اللہ سبحانہٗ کی ہستی کو مبدا اور آخرت کی زندگی کو معاد تسلیم نہ کیا جائے تو اس زندگی کے سارے سوالات لاینحل ہو جاتے ہیں لیکن جونہی زندگی کے اسی کے دونوں سرے ہم مانتے ہیں تو سارے سوالات حل ہو جاتے ہیں۔ اور مجہولیت کی تاریکی کی جگہ عرفان و بصیرت کی روشنی ہر طرف نمایاں ہو جاتی ہے۔ لہذا ہمیں ماننا پڑتا ہے کہ یہ نقطہ بنیادی نہیں حقیقی ہے۔

لطف و مسرت کی اعلیٰ ترین منزل

ل۶ے واقعی اس زندگی میں جو ایمان و عمل صالح کی نعمت سے ہمدوش ہوئے تو ان کی ان کا مالک ان کے ایمان کی وجہ سے رہنمائی فرمائے گا یعنی ایسے آرام کے باغات ان کو ملیں گے جن کے نیچے نہریں بہتی ہوں گی۔ یعنی اللہ سبحانہ ان کے ایمان کی بدولت جنت تک اصل رہنمائی کرنے والی ایمان ہے نقطہ آغاز بھی ہے۔ اعمال صالحہ مراتب و مقامات کا ذریعہ ہیں اسی لیے یہاں یہ جو کے ساتھ صرف ایمان کا ذکر کیا ہے دوسری آیتوں میں ایمان اور عمل صالح کے بالمقابل جنت اور اس کی نہروں کا ذکر پابندی سے آتا ہے اس سے خیال ادھر جاتا ہے کہ ان دونوں میں کوئی تمثیلی تعلق ہے یہ ظاہر ہے کہ درخت میں اصلی چیز جڑ ہے جس کی ترقی اور نشوونما پانی سے ہوتی ہے بعینہ اسی طرح ایمان اصل ہے جس کی جڑوں کی سیرابی اعمال صالحہ کی آبیاری سے ہوتی ہے اگر ایمان ہو اور اعمال صالحہ نہ ہوں تو وہ ایک ایسا درخت ہوگا جس کی ترقی و نشوونما کی امید نہیں اور اگر صرف عمل صالح ہو اور ایمان نہ ہو تو دیگ میں پانی کی روانی ہے جس کا ہونا نہ ہونا دونوں برابر ہیں۔

آلوسی لکھتے ہیں کہ آیت میں ایمان سے مراد وہ ایمان ہے جس کی آغوش میں عمل صالح ہو الایمان الخاص المشفوع بالاعمال الصالحات لا المجرد عنها۔ اور آگے فرماتے ہیں کہ اس موضوع پر دو رائیں نہیں ہیں۔ اور آیت کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں کا ابھی چہرہ پیش کیا جا چکا ہے یعنی لیجزی اللہ الذین امنوا و عملوا الصالحات بالقسط۔ یہی لوگ ہیں جن کی ان کا رب جنت کی طرف ان کے ایمان کی وجہ سے رہنمائی فرمائے گا۔ قاضی بیضاوی نے خواہ مخواہ زمخشری کے منہ سے نکلی ہوئی اس بات پر کہ آیت میں ایمان سے مراد وہی ایمان جو عمل صالح کی ہمرکابی میں ھو المقید بالعمل الصالح اعتزال کی پھبتی کس دی خدا بھلا کرے علامہ آلوسی اور علامہ خفاجی کا کہ انہوں نے قاضی صاحب کی پھبتی کو بے جان بنا دیا۔ بہرحال یہ نتائج جو اس آیت میں بیان ہوئے ہیں اس ایمان کے نہیں جو محض مان لینے کے معنی میں ہوتا ہے بلکہ اس ایمان کے جو سیرت و کردار کی روح بن جائے اور جس کی طاقت سے اخلاق و اعمال میں صلاح کا ظہور ہونے لگے۔ اپنی جسمانی زندگی میں آپ خود دیکھتے ہیں کہ بقائے حیات تندرستی قوت کار اور لذت زندگانی کا حصول صحیح قسم کی غذا پر موقوف ہوتا ہے لیکن یہ نتائج اس تغذیہ کے نہیں ہوتے جو محض کھا لینے کے معنی میں ہو بلکہ اس تغذیہ کے ہوتے ہیں جو ہضم ہو کر خون بنے اور رگ رگ میں پہنچ کر ہر

حصہ جسم کو وہ طاقت بخشے جس سے وہ اپنے حصے کا کام ٹھیک کرنے لگے۔ بالکل اسی طرح اخلاقی زندگی میں بھی ہدایت راستبازی راست روی اور بالآخر فلاح و کامیابی کا حصول صحیح ایمان پر موقوف ہے مگر یہ نتائج ان ایمان کے نہیں ہیں جو محض اقرار کے درجے میں ہو بلکہ اس ایمان کے ہیں جو نفس کے اندر جذب و پیوست ہو کر انداز فکر اور مذاق طبع اور افتاد مزاج بن جائے اور سیرۃ وکردار اور رویہ زندگی کی صورت میں نمایاں ہو۔ اللہ سبحانہ کے قانون طبیعی ہیں وہ شخص جو کھا کر نہ کھانے والے کی طرح رہے ان انعامات کا مستحق نہیں ہوتا جو کھا کر ہضم کرنے والے کے لیے رکھے گئے ہوں پھر کیوں توقع کی جائے کہ اس کے قانون اخلاقی میں وہ شخص جو مان کر نہ ماننے والوں کی طرح رہے ان انعامات کا مستحق ہو سکتا ہے جو مان کر صالح بننے والے کے لیے رکھی گئی ہیں۔

جنتیوں کی بے مثال زندگی

ان باغات میں اہلِ جنت کی پکار یہ ہوگی اے اللہ تیری ذات پاک ہے ان کی دعا بوقت ملاقات یہ ہوگی کہ سلامتی ہو اور ان کی دعاؤں کا خاتمہ یہ ہوگا کہ ہر طرح کی ستائش اس اللہ کے لیے جو کائنات کا مالک ہے یعنی جنت کی نعمتوں اور اللہ سبحانہ کے فضل واحسان کو دیکھ کر سبحان اللہ پکار اٹھیں گے اور جب اللہ سبحانہ سے کچھ مانگنے کی خواہش ہوگی مثلاً کوئی پرندہ یا پھل دیکھا اور ادھر رغبت ہوئی تو سبحانک اللہم کہیں گے۔ اتنا سنتے ہی فرشتے وہ چیز فوراً حاضر کر دیں گے۔ گویا یہی ایک لفظ تمام دعاؤں کے قائم مقام ہوگا۔ دنیا میں بھی بڑے آدمیوں کے یہاں دستور ہے کہ مہمان اگر کسی چیز کو پسند کر کے صرف تعریف کرے تو غیور میزبان کوشش کرتا ہے کہ وہ چیز مہمان کے لیے مہیا کر دے اور جنتی ملاقات کے وقت ایک دوسرے کو سلام کہیں گے جیسے دنیا میں مسلمانوں کا دستور ہے نیز فرشتوں کا جنتیوں کو سلام کرنا بلکہ خود اللہ سبحانہ کی طرف سے تحفہ سلام کا قرآن میں منصوص ہے سلٰم قولا من رب رحیم اور والملائکۃ یدخلون علیهم من کل باب سلٰم علیکم بما صبرتم اور جب جنت میں پہنچ کر دنیوی تفکرات وکدورات کا خاتمہ ہو جائے اور محض سبحانك اللهم کہنے پر ہر چیز حسب خواہش ملتی رہے تو ان کی ہر دعا کا خاتمہ الحمد لله رب العالمین پر ہوگا[1] حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں کہ سبحانك اللهم کا نعرہ بے اختیار اس وقت زبانوں پر آئے گا جب وہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

عجائبات جنت کا دفعۃً معائنہ کریں گے اور تحیت وسلام اس وقت ہوگا جب وہ ایک دوسرے کو دیکھیں گے اور ملیں گے اور باہم مخاطب ہوں گے اور الحمد للہ رب العالمین اس وقت کہیں گے جب وہ اطمینان سے بیٹھیں گے اور دنیا کی فانی لذتوں کا مقابلہ وہاں کے دائمی عیش و سرور سے کریں لفظ دعوی دونوں جگہ دعا یا پکار کے معنی میں ہے۔

یہاں یہ بات ضرور سمجھ لینی چاہیے کہ جب جنت اور دوزخ کے شہریوں کے احوال و واردات سنتے ہیں تو قدرتی طور پر ان کی وہی شکل سامنے آتی ہے جو اس موجودہ زندگی کے محسوسات کے لحاظ سے ہوسکتی ہے لیکن خود قرآن وسنت کی تصریحات نے ہمیں بتا دیا ہے کہ جنت و دوزخ کے معاملات کو اس دنیا کی طرح نہ سمجھنا چاہیے۔ سورہ سجدہ میں ہے۔ فلا تعلم نفس ما اخفی لهم من قرۃ اعین کوئی جان نہیں جانتی ہے کہ اس کی نیک عملیوں کی جزا میں نگاہ کا کیا سرور پردۂ غیب میں پوشیدہ ہے اس سے معلوم ہوا کہ جنت کی راحت وسرور کی حقیقت کا ہم اس دنیا میں تصور بھی نہیں کر سکتے۔ ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جنت کی یہ حقیقت بتلائی ہے لاعین رات ولا اذن سمعت ولا خطر بیال بشر نہ تو کسی آنکھ نے دیکھی نہ کسی کان نے سنی نہ کسی فرد بشر کے خیال میں گذری۔ حضرت عبداللہ بن عباس سے مروی ہے کہ جنت کی نعمتیں دنیا سے کوئی مشابہت نہیں رکھتیں بجز اس کے نام میں مشارکت ہے (ابن کثیر) رہی یہ بات کہ اگر عالم آخرت کے یہ معاملات دنیا کے معاملات کے مثل نہیں ہوں گے تو پھر ان کی حقیقت کیا ہوگی واقعیت اور حقیقت تو ضرور ہے مگر اس موضوع پر ہماری عقلی کاوش کچھ نہیں کر سکتی۔ اصل یہ ہے کہ اس مادی زندگی کے احساسات ومحسوسات کی زنجیروں میں کچھ اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان سے آزاد ہو کر جمال حقیقت کا تصور ہی نہیں کر سکتے۔ پس اس کے سوا چارہ نہیں کہ جو کچھ بتلا دیا گیا ہے اس پر یقین کریں۔ اور جو کچھ نہیں پا سکتے اس کے درپے نہ ہوں۔ اگر درپے ہوں گے تو تہ کو تو نہ پہنچیں گے البتہ نئے دھوکوں میں مبتلا ہو جائیں گے۔

یہ ایک لطیفہ بھی ان آیات میں ہے کہ دنیا کے دارالامتحان سے کامیاب ہو کر نکلنے اور نعمت بھری جنت میں پہنچ جانے کے بعد یہ نہیں ہوگا کہ جنتی جنت میں پہنچنے کے بعد فوراً سامان عیش پر ٹوٹ پڑیں گے جیسا کہ بعض کج فہم حضرات کے ذہن میں اس کا نقشہ گھومنے لگتا ہے بلکہ صالح اہل ایمان دنیا میں افکار عالیہ اور اخلاق فاضلہ اختیار کر کے اپنے جذبات کو سنوار کر اپنی خواہشات کو سدھار کر اور اپنی سیرت و کردار کو پاکیزہ بنا کر جس قسم کی بلند ترین شخصیتوں میں اپنی ذات میں

ہم پہنچائیں گے وہی دنیا کے ماحول سے مختلف جنت کے پاکیزہ دین ماحول میں اور زیادہ نکھر کر ابھر آئیں گے اور ان کے وہی اوصاف جو دنیا میں انہوں پرورش کئے تھے وہاں اپنی پوری شان کے ساتھ ان کی سیرۃ میں جلوہ گر ہوں گے ان کا محبوب ترین مشغلہ اللہ کی حمد و تقدیس ہوگا۔ ان کی سوسائٹی میں وہی ایک دوسرے کی سلامتی چاہنے کا جذبہ کارفرما ہوگا جسے دنیا میں انہوں نے اپنایا تھا۔

بتانا یہ ہے کہ موجودہ دنیا کی زندگی آلودگیوں اور نجاستوں سے بھری ہے لیکن جنت وہ مقام ہے جو پاکی ستھرائی لطافت اور نفاست کا منظر ہے اس میں وہی داخل ہوں گے جو گناہوں سے پاک ہوں گے۔ جو زندگی وہاں ملے گی وہ بھی پاک وصاف اور ستھری اور ہر جسمانی و روحانی آلائش سے بری ہوگی غرض کہ ہر چیز وہاں پاک وصاف طیب و طاہر اور تمام روحانی و جسمانی آلودگی سے منزہ ہوگی۔ اہلِ جنت کی روحانی لذت اللہ سبحانہ کی حمد و ثنا اور تسبیح و تحمید ہوگی۔ یہ ان کی روحانی غذا ہوگی وہ عالم جہاں نورِ الٰہی کی بارش ہر طرف ہوگی۔ جہاں صفائی اور ستھرائی کے سوا کوئی منظر نہ ہوگا۔ جہاں ونزاہت کی ہر طرف صورتیں نظر آئیں گی۔ وہاں حمد و ثنا کے روح افزا ترانے ہر طرف ہوں گے دعواهم فيها سبحانك اللهم وتحيتهم فيها سلام وآخر دعواهم ان الحمد لله رب العالمين۔

وَلَوْ يُعَجِّلُ اللّٰهُ لِلنَّاسِ الشَّرَّ اسْتِعْجَالَهُمْ
بِالْخَيْرِ لَقُضِيَ اِلَيْهِمْ اَجَلُهُمْ ؕ فَنَذَرُ الَّذِيْنَ لَا يَرْجُوْنَ
لِقَآءَنَا فِيْ طُغْيَانِهِمْ يَعْمَهُوْنَ ﴿۱۱﴾ وَاِذَا مَسَّ الْاِنْسَانَ
الضُّرُّ دَعَانَا لِجَنْۢبِهٖٓ اَوْ قَاعِدًا اَوْ قَآئِمًا ۚ فَلَمَّا كَشَفْنَا
عَنْهُ ضُرَّهٗ مَرَّ كَاَنْ لَّمْ يَدْعُنَآ اِلٰى ضُرٍّ مَّسَّهٗ ؕ كَذٰلِكَ
زُيِّنَ لِلْمُسْرِفِيْنَ مَا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲﴾ وَلَقَدْ اَهْلَكْنَا
الْقُرُوْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَمَّا ظَلَمُوْا ۙ وَجَآءَتْهُمْ رُسُلُهُمْ بِالْبَيِّنٰتِ
وَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا ؕ كَذٰلِكَ نَجْزِي الْقَوْمَ الْمُجْرِمِيْنَ ﴿۱۳﴾ ثُمَّ
جَعَلْنٰكُمْ خَلٰٓئِفَ فِي الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِهِمْ لِنَنْظُرَ كَيْفَ
تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾

انسان جیسے خیر کے مانگنے میں جلد باز ہے اگر اللہ بھی انسانوں کو نقصان پہنچانے میں جلد باز ہوتا تو اس کا وقت کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا۔ لہذا جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ہیں ہم ان کو ان کی سرکشیوں میں سرگرداں چھوڑ دیتے ہیں ۸ اور جب کبھی انسان کو تکلیف لگتی ہے تو لیٹے بیٹھے اور کھڑے اللہ کو پکارنے لگتا ہے

پھر جب ہم اس سے تکلیف کو ہٹا دیتے ہیں تو اس طرح ہو جاتا ہے کہ گویا لگی ہوئی تکلیف کے لیے اس نے ہمیں پکارا ہی نہیں تھا۔ بے باک لوگوں کے لیے اسی طرح ان کے کام خوشنما بنا دیئے جاتے ہیں ۹ تم سے پہلے ہم بہت سی قوموں کو ظلم کی پاداش میں میں ہلاک کر چکے ہیں۔ ان کے پاس ان کے پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے لیکن لوگ ایمان لانے کیلئے آمادہ نہ تھے جرائم پیشہ لوگوں کو ہم جرموں کی سزا اسی طرح دیتے ہیں ۱۳ پھر ان امتوں کی جگہ اب تم نے لی ہے اور ہم نے تمہیں ان کے بعد ملک میں جانشین بنایا ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ تمہارے کام کیسے ہیں ۱۴

مفردات کے معانی

طغیان ۔ سرکشی، شرارت نافرمانی، گمراہی اصل میں طغیان کے معنے نافرمانی اور معصیت کوشی میں حد سے بڑھ جانے کے ہیں یہ مصدر ہے اس کا فعل جب واوی ہو تو باب نصر سے طغا یطغو طغیانا آتا ہے اور جب یائی ہوتا ہے تو فتح اور سمع دونوں سے آتا ہے طغیٰ یطغیٰ طغیانا اور طغیٰ یطغیٰ طغیانا اور طغِی یطغی اور قرآن میں باب فتح سے آیا ہے۔

خلائف خلیفہ کی جمع ہے خلفاء بھی جمع آتی ہے۔ خلف یخلف باب نصر سے آتا ہے جانشین ہونا اور پیچھے آنا پہلے معنے کے اعتبار سے مصدر خلافۃ آتا ہے دوسرے معنے کے اعتبار

ہے مصدر خلف آتا ہے۔ لفظ خلف لام کے سکون کے ساتھ بترے جانشین امام بغوی لکھتے ہیں خلف اس نسل کو کہتے ہیں جو دوسرے قرن کے بعد آتی ہے۔ ابوحاتم کا بیان ہے کہ خلف بسکون لام یعنی اولاد ہے واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے اور خلف لام کے زبر سے بمعنی بدل چاہے اولاد ہو یا کوئی اور۔ ابن الاعرابی کہتے ہیں کہ خلف لام کے زبر کے ساتھ نیک کے لیے آتا ہے اور بسکون لام بد کے لیے آتا ہے مشہور محدث لغوی امام نضر بن شمیل کہتے ہیں کہ خلف لام کے فتحہ اور سکون کے ساتھ بری نسل کے آتا ہے لیکن اچھی نسل کے لیے بغیر لام کی حرکت کے نہیں آتا ہے۔ امام محمد بن جریر کی تصریح ہے کہ اکثر مدح میں تو لام کا زبر آیا ہے اور برائی میں لام کا سکون اور کبھی اس کا عکس ہوتا ہے۔

تاجیل و تدریج کا قانون

اللہ سبحانہ کے قوانین کا عمل کبھی فوری اور اچانک نہیں ہوتا وہ جو کچھ کرتا ہے آہستہ آہستہ بتدریج کرتا ہے، اسی تدریجی عمل نے مہلت اور ڈھیل کا قاعدہ بنایا ہے یعنی اس کا ہر قانون عفو و درگذر رحمت دیتا ہے اس کا ہر فعل عفو و درگذر کا دروازہ آخر تک کھلا رکھتا ہے۔ بلاشبہ اس کے قوانین اپنے نفاذ میں اٹل ہیں ان میں رد و بدل کا شائبہ نہیں ہے لیکن جو قوانین اپنے نفاذ میں اس درجہ قطعی اور اٹل ہیں وہی اپنی نوعیت میں کس درجہ عفو و درگذر اور مہلت بخشی و اصلاح کوشی کی روح رکھتے ہیں۔ اللہ سبحانہ اگر چاہتے تو ہر حالت بیک وقت ظہور میں آجاتی اور ان کے قوانین کا نفاذ فوری اور ناگہانی ہوتا لیکن ایسا نہیں ہے بلکہ ہر حالت ہر تاثیر ہر انفعال کے ظہور کے لیے ایک خاص مدت مقرر کر دی گئی ہے اور ضروری ہے کہ بتدریج درجہ بدرجہ مختلف منزلیں پیش آئیں۔ پھر ہر منزل میں اس کے آثار ہوں جو آنے والے نتائج سے خبردار کریں۔ زندگی اور موت کے قوانین کو دیکھ لو۔ کس طرح زندگی بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور درجہ بدرجہ مختلف منزلوں سے گذرتی ہے اور کس طرح کمزوری و فساد کا ایک طویل سلسلہ ہے جو اپنے ابتدائی نقطوں سے شروع ہوتا ہے اور یکے بعد دیگرے مختلف منزلیں طے کرتا ہوا آخری نقطہ بلوغ تک پہنچتا ہے بد پرہیزی ہوتی ہے مگر فوراً ہلاکت نہیں آتی ہے بلکہ بتدریج موت کی طرف بڑھنے لگتے ہیں اور بالآخر ایک خاص مدت کے اندر جو ہر صورت حال کیلئے یکساں نہیں ہوتی ہے درجہ بدرجہ اترتے ہوئے موت کی آغوش میں جا گرتے ہیں۔ نباتات کو دیکھو درخت اگر آبیاری سے محروم ہو جاتا ہے یا نقصان و فساد کا کوئی دوسرا سبب ہوتا ہے تو یہ نہیں ہوتا کہ ایک ہی دفعہ مرجھا کر گر جائیں بلکہ بتدریج شادابی

کی جگہ پژمردگی کی حالت طاری ہوتی ہے۔ یہی حال کائنات خلقت کا ہے کوئی تغیر ایسا نہیں ہے جو اپنا تدریجی دور نہ رکھتا ہو ہر چیز بتدریج بنتی ہے اور اسی طرح بتدریج بگڑتی ہے۔ بناؤ ہو یا بگاڑ ممکن نہیں کہ ایک خاص مدت گذرے بغیر کوئی حالت بھی اپنی کامل صورت میں ظاہر ہو سکے یہ مدت جو ہر حالت کے ظہور کے لیے اس کی "اجل" یعنی مقررہ وقت مختلف گوشوں اور مختلف حالتوں مختلف مقدار رکھتی ہے اور بعض حالتوں میں تو اس کی مقدار اتنی طویل ہوتی ہے کہ ہم اپنے نظام اوقات سے اس کا حساب بھی نہیں لگا سکتے۔

اگر تدریج و تاجیل کی یہ فرصتیں نہ ہوتیں تو دنیا میں ایک وجود بھی فرصت حیات سے فائدہ نہ اٹھا سکتا۔

ﷺ انسان جیسے خیر کے مانگنے میں جلد باز ہے اگر اللہ بھی انسانوں کو نقصان پہنچانے میں جلد باز ہوتا تو انسان کا وقت کبھی کا پورا ہو چکا ہوتا۔ لہذا جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ہیں ہم ان کو ان کی سرکشیوں میں سرگرداں چھوڑ دیتے ہیں۔ دو آیت پہلے فرمایا تھا کہ والذین ھم عن آیاتنا غافلون جو لوگ غفلت میں پڑے ہیں اور ہمارے ملنے کی امید نہیں رکھتے ہیں ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔ یہاں یہ بتلانا ہے کہ اللہ سبحانہ ایسے مجرموں کو فوراً سزا نہیں دیتا بلکہ مہلت دیتا ہے۔ حالانکہ لوگوں کا حال یہ ہے کہ کبھی بیباک و بے حیا بنکر خود اپنے لیے جلد عذاب کا مطالبہ کرتے ہیں مثلاً کہتے ہیں۔

اللھم ان کان ھذا ھو الحق من عندک فامطر علینا حجارۃ من السماء او ائتنا بعذاب الیم۔

کبھی دنیوی حوادث سے تنگ آکر اپنی یا اپنی اولاد کے حق میں بد دعا کرتے ہیں جیسا کہ تجربہ سے ظاہر ہے اب اگر اللہ سبحانہ ان کی درخواست اور دعا کے موافق فوراً ہاتھوں ہاتھ کوئی عذاب یا برائی اس قدر جلد ان کو پہنچا دے جتنی جلد وہ بھلائی کے پہنچنے کی خواہش رکھتے ہیں تو بدی کے وبال سے ایک منٹ بھی فرصت نہ پائیں۔ اور رشتہ حیات اسی وقت منقطع ہو جائے مگر اللہ سبحانہ کے یہاں نیکی و بدی دونوں میں حسب مصلحت تاخیر و تاجیل ہوتی ہے تاکہ نیک لوگ تربیت پائیں اور بدکار غفلت میں پڑے رہ کر پیمانہ شرارت لبریز کریں لہ

لہ افادات شیخ الاسلام

آیت میں یعجل کا معقول مطلق استعجال کیوں آیا ہے۔ قاعدہ تو یہی ہے کہ فعل کا مصدر ہی مفعول مطلق ہوتا ہے مگر یہاں بجائے یعجل اللہ الشر تعجیلهم بالخیر کے لو یعجل اللہ للناس الشر استعجالهم بالخیر فرمایا یعنی فعل باب تفعیل سے آیا ہے اور مصدر باب استفعال سے ہے ہونا تو یہ چاہیے کہ فعل اگر باب تفعیل ہو تو مصدر بھی تفعیل ہو فعل باب استفعال ہو تو مصدر بھی باب استفعال ہو۔ قرآن میں اگر ایسا کہیں ہوا ہے تو اس میں گہری معنویت کی طرف اشارا ہوتا ہے مثلاً واذکر اسم ربك وتبتل الیه تبتیلا اس میں فعل باب تفعیل مبالغہ اور مصدر باب تفعیل ہے۔ اس میں معنویت یہ ہے کہ باب تفعیل مبالغہ کے لیے آتا ہے جب کہ باب تفعیل تدریج کے لیے آتا ہے یہ بتانا مقصود ہے کہ ذکر اسم رب بہت زیادہ ہو اور دیرینک ہو تو نتیجہ خیز ہوتا ہے ایسے ہی یہاں بھی یعجل فعل کا معقول مطلق استعجال لانے میں کوئی معنویت ہونی چاہیے۔ اس موضوع پر علامہ زمخشری، علامہ طیبی اور علامہ خفاجی نے خوب جی کھول کر داد تحقیق دی ہے افسوس کہ تفصیل کا محل نہیں اور یہ باتیں ناظرین معالم القرآن کے لیے کچھ زیادہ مفید نہیں ہیں۔

یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ جیسے مادیات میں تاجیل و تدریج کا قانون نافذ ہے۔ اور عالم مادیات ہو یا معنویات اللہ سبحانہ کا قانون ایک ہے اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ دنیا میں کوئی انسانی جماعت اپنی بدعملیوں کے ساتھ مہلت حیات پا سکتی۔ اور پھر جس طرح معنویات میں ہر حالت بر تدریج نشو و نما پاتی اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار اوقات کے احکام مقرر ہیں۔ اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشو و نما کے بعد ظہور میں آئے۔ نتیجہ یہ ہے کہ اس تدریج و امہال سے عمل حق اور عمل باطل۔ دونوں کے لیے تاجیل کی حالت پیدا ہو گئی ہے یعنی دونوں کے نتائج فوراً ظاہر نہیں ہوتے اپنی مقررہ اجل یعنی وقت ہی پر ظاہر ہو سکتے ہیں۔ البتہ حق کے لیے تاجیل اس لیے ہوتی ہے تاکہ اس کی فاتحانہ قوت ظاہر ہو جائے اور باطل کے لیے اس لیے ہوتی ہے تاکہ اس کی فنا پذیر کمزوری تکمیل تک پہنچ جائے اس تاجیل کے لیے کوئی ایک ہی مقررہ مدت نہیں ہے۔

اس آیت میں فکر انسانی کی جس گمراہی کو استعجال بالعذاب سے تعبیر کیا گیا ہے وہ صرف انہی منکرین حق کی گمراہی نہ تھی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی مخالفت پر کمربستہ تھے بلکہ ہر زمانے

میں انسان کی ایک عالمگیر کج اندیشی رہی ہے۔ وہ بسا اوقات اللہ سبحانہ کی اس مہلت بخشی سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اور زیادہ شر و فساد میں نڈر اور جری ہو جاتا ہے۔

پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ لوگوں پر رحم و کرم فرمانے میں جتنی جلدی کرتا ہے ان کو سزا دینے اور ان کے گناہوں پر پکڑ لینے میں اتنی جلدی نہیں کرتا تم چاہتے ہو جس طرح اس نے تمہاری دعائیں سن کر بلائیں دور کر دی ہیں اسی طرح وہ تمہارے چیلنج سن کر اور تمہاری سرکشیاں دیکھ کر عذاب بھی فوراً بھیج دے لیکن اللہ سبحانہ کا یہ قانون نہیں ہے۔ لوگ خواہ کتنی سرکشیاں کیے جائیں وہ ان کو پکڑنے سے پہلے کا موقعہ دیتا ہے۔ پیہم تنبیہات روانہ کرتا ہے اور رسی ڈھیلی چھوڑے رکھتا ہے یہاں تک کہ جب قانون کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے تب نتائج کا ظہور ہوتا ہے یہ ہے اللہ کا قانون۔

انسانی فطرت کا اندرونی ادراک

۱۹ اور جب کسی انسان کو تکلیف لگتی ہے تو لیٹے بیٹھے اور کھڑے اللہ کو پکارنے لگتا ہے۔ پھر جب اس سے تکلیف کو ہٹا دیتے ہیں تو اس طرح ہو جاتا ہے کہ گویا لگی ہوئی تکلیف کے لیے اس نے ہمیں پکارا ہی نہیں ہے بے باک لوگوں کے لیے اسی طرح ان کے کام خوشنما بنا دیئے جاتے ہیں یعنی انسان اول بے باکی سے خود عذاب طلب کرتا ہے اور برائی اپنے منہ سے مانگتا ہے مگر کمزور اور بودا اتنا ہے کہ جہاں خدا کی جانب سے تکلیف پہنچی گھبرا کر ہمیں پکارنا شروع کر دیا۔ جب تک مصیبت رہی کھڑے بیٹھے اور لیٹے ہر حالت میں اللہ سبحانہ کو پکارتا رہا۔ پھر جہاں تکلیف ہٹالی گئی سب کہا سنا بھول گیا گویا اللہ سبحانہ سے کبھی کوئی واسطہ نہ تھا۔ وہی غرور و غفلت کا نشہ وہی اکڑ فوں رہ گئی جس میں پہلے مبتلا تھا۔ حدیث میں ہے تو اللہ سبحانہ کو اپنے عیش و آرام میں یاد رکھ۔ اللہ سبحانہ تجھ کو تیری سختی میں یاد رکھے گا۔ مومن کی شان یہ ہے کہ کسی وقت اللہ سبحانہ کو نہ بھولے سختی پر صبر اور فراخی پر اللہ کا شکر ادا کرتا رہے۔ یہی وہ چیز ہے جس کی توفیق مومن کے سوا کسی کو نہیں ملتی ہے۔[۱]

اس آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارا کیا ہے کہ رنج و مصیبت کی حالت میں انسان

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کے اندر وجدانی طور پر یہ ولولہ اٹھتا ہے کہ ایک بالاتر ہستی موجود ہے جو میرا دکھ درد دور کر سکتی ہے اور اسی کو پکارنا چاہیے لیکن جب مصیبت دور ہو جاتی ہے تو پھر عیش و راحت کی سرشاریوں میں پڑ کر اسے بھول جاتا ہے گویا کبھی اس نے کسی کو پکارا ہی نہ تھا۔

قرآن نے جا بجا انسان کی اس فطری حالت سے استشہاد کیا ہے کیونکہ مصیبت اور بے بسی کی حالت میں بے اختیار اس ولولہ کا اٹھنا اس امر کا ثبوت ہے کہ انسانی فطرت اپنے اندرونی ادراک میں اللہ سبحانہ کی ہستی کا اعتقاد رکھتی ہے۔ اور اعراض و غفلت کی حالت وجدانی نہیں خارجی اثرات کا نتیجہ ہے۔

اس موقعہ پر حضرت مولانا اشرف علیؒ نے بڑی دقیق اور نازک بات ارشاد فرمائی ہے۔ اس آیت کا مضمون قرآن کی چند آیتوں میں مختلف عنوانوں سے آیا ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اچھی حالت میں انسان میں یہ باتیں ہوتی ہیں۔ اعراض، نسیان ترک دعا، فرح اور فخر یہ سب باتیں یک جا ہو سکتی ہیں۔ اور بری حالت میں یہ باتیں ہوتی ہیں۔ مایوسی۔ ناشکری۔ دعا۔ ان تینوں میں سے مایوسی اور ناشکری میں ہم آہنگی ہو سکتی ہے لیکن دُعا اور مایوسی میں ہم آہنگی اور مفاہمت مشکل ہے۔ کیونکہ دعا تو امید ہی میں کی جاتی ہے۔ اس کا حل یہ ہے کہ یہ کہا جائے کہ زبان سے دعا کرتا ہے مگر دل میں مایوسی ہے۔ یا یوں کہا جائے کہ اول تو دعا ہی کرتا ہے مگر پھر مایوس ہو کر چھوڑ دیتا ہے [1]

غور کرو کہ طبیعت انسانی کی اس آیت میں کیسی سچی تصویر ہے انسان جب اپنی کوششوں میں کامیاب ہوتا ہے تو خوش حالی کا گھمنڈ اسے غافل و سرشار بنا دیتا ہے وہ سمجھنے لگتا ہے کہ اب میرے لیے کوئی کھٹکا نہیں ہے۔ حالانکہ نہیں جانتا کتنا ہی خوش حال ہو جائے اگر غفلت میں پڑ گیا ہے تو اس کے لیے کھٹکا ہی کھٹکا ہے۔ اس کی خوشحالیاں کبھی پائیدار نہیں ہو سکتی ہیں۔ پھر جب ایسا ہوتا ہے کہ اس کی کوششیں کامیاب نہیں ہوتی ہیں تو بجائے اس کے کہ اس کی طلب و سعی میں اور زیادہ سرگرم ہو جائے یک قلم مایوس ہو جاتا ہے اور سمجھنے لگتا ہے کہ اب میرے لیے کوئی نہیں رہا اور کچھ نہیں رہا اس وقت اس کا اندر جاگتا ہے اور اٹھتے بیٹھتے ایک ان دیکھی طاقت کو پکارنے لگتا ہے یہ اس کے اندر کی پکار ہی اللہ کے بارے میں اعتقاد ہے

---

[1] بیان القرآن

حالانکہ نہیں جانتا کہ اس کے لیے سب کچھ ہے بشرطیکہ اللہ کے فضل وکرم سے بغاوت نہ کرے۔

قریش کو عذاب کی دھمکی

۲۰ تم سے پہلے ہم بہت سی قوموں کو ظلم کی پاداش میں ہلاک کر چکے ہیں۔ ان کے پاس ان کے پیغمبر کھلی نشانیاں لے کر آئے تھے لیکن ایمان لانے کے لیے آمادہ نہ تھے جرائم پیشہ لوگوں کو ہم جرائم کی سزا اسی طرح دیتے ہیں۔ یعنی اگر ان کی درخواست کے مواقف جلدی عذاب نہ آئے یا تکلیف ومصیبت اگر ٹل جائے تو بے فکر نہ ہونا چاہیے، ظلم وشرارت اور بے ایمانی کی سزا جلد یا دیر مل کر رہے گی۔ سنۃ اللہ قدیم سے یہی ہے کہ جب لوگ انبیاء ومرسلین کے کھلے نشان دیکھنے کے بعد بھی ظلم وتکذیب پر کمربستہ رہے اور کسی طرح ایمان وتسلیم کی طرف نہ جھکے تو آسمانی عذاب نے ان کو ہلاک کر ڈالا ہمیشہ مجرموں کو کسی نہ کسی رنگ میں سزا ملتی رہی ہے[1] یہ پیچھے سن آئے ہو کر سورہ یونس مکی زندگی میں ہجرت سے پہلے نازل ہوئی۔ آپ نے مکہ میں تیرہ سال تک دعوت دی اور ان تیرہ سالوں کے اندر اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور آیات ہدایت کے مختلف نمونے ان کو دکھائے بالآخر شق القمر کا معجزہ بھی ان کی نگاہوں کے سامنے سے گذرا اور آخر وہ وقت آیا جو اپنے پیغمبروں کے سامنے دوسری قوموں پر آچکا تھا۔ کفار قریش کو معجزہ عذاب دیکھنے کی جلدی کا ذکر اس سے پہلے آیت ہو چکا ہے کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ پیشن گوئی سراسر جھوٹ ہے۔ اللہ سبحانہ نے فرمایا کہ جب تک پیغمبر کی مدت دعوت ختم نہ ہو جائے یعنی تمام افراد صالحہ الگ نہ ہو جائیں عذاب نہیں آئے گا۔ یہاں اللہ سبحانہ نے عذاب کے بارے میں قانون کا ذکر کیا ہے اور بتایا ہے کہ قوموں کی ہلاکت سے پہلے ان کے اندر ایک ڈرسنانے والا آتا ہے قریش میں بھی ایک ڈر سنانے والا آچکا ہے اگر وہ اس کی نہ سنیں گے تو پچھلی قوموں کی طرح ان کو بھی نیست ونابود کر دیا جائے گا۔ تم بھی ظالمانہ روش اختیار کرتے ہو تم بھی رسول کی کھلی نشانیوں کو دیکھ کر ایمان نہیں لائے ہو تمہارے بھی جرائم آسمان سے باتیں کر رہے ہیں اب تمہارا بھی دن موعود آچکا ہے۔

اصل میں لفظ قرن استعمال ہوا ہے جس سے مراد عموماً عربی زبان میں ایک دور ہوتا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

لیکن یہاں قرن سے وہ قوم مراد ہے جو اپنے زمانہ میں برسراقتدار تھی اور تہذیب و تمدن کی چابیوں پر قابض تھی۔ قوم کی ہلاکت کے لازماً یہ معنی نہیں کہ نسل ہی ختم کردی ہے بلکہ اس کا اقتدار سے محروم کر دینا اس کی تہذیب و تمدن کا ملیا میٹ ہو جانا بھی اس کی ہلاکت ہے۔

علامہ بقاعی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ قوموں کی ہلاکت کی خبر والی بات جب ختم ہوئی تو دماغ میں یہ سوال ابھرا کہ کیا یہ معاملہ ان کے ساتھ ہی خاص تھا فوراً ارشاد ہوا کذٰلک نجزی القوم المجرمین سب جرائم پیشہ قوموں کے ساتھ ہمارے قانون جزا کا معاملہ یکساں ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ ہم ہر مجرم کو بھی سزا دیں یا تمہیں بھی یہی سزا ملے گی یعنی جب تم بھی وہی جرم کروگے تو پھر سزا سے کیسے بچ سکوگے۔ شر اور عذاب تو جرائم کا نتیجہ ہے جب علت موجود ہے تو معلول کیسے نہ ہوگا۔

خلافت کا قانون

۱۴؎ پھر ان امتوں کی جگہ اب تم نے لی ہے اور ہم نے تمہیں ان کے بعد ملک میں جانشین بنایا ہے تاکہ ہم دیکھیں کہ تمہارے کام کیسے ہیں یعنی پہلوں کی جگہ اب تم کو زمین پر بسایا تاکہ دیکھا جائے کہ تم کہاں تک خالق و مخلوق کے حقوق پہچانتے ہو اور اللہ کے پیغمبروں کے ساتھ کیا معاملہ کرتے ہو نیک و بد جیسے عمل کروگے اسی کے مناسب تم سے برتاؤ کیا جائے گا آگے اس معاملہ کا ذکر ہے جو قرآن حضور اقدس اور سبحانہ کے ساتھ انہوں نے کیا۔[1]

اہلِ عرب سے خطاب ہو رہا ہے اور ان سے یہ کہا جا رہا ہے کہ پچھلی قوموں کو اپنے اپنے زمانے میں کام کرنے کا موقع دیا گیا تھا۔ مگر انہوں نے آخر کار ظلم و بغاوت کی روش اختیار کی اور جس قدر اللہ کے رسول ان کے پاس زندگی گذارنے کا ہدایت نامہ لے کر آئے ان کی بات انہوں نے نہ مانی۔ اس لیے وہ اللہ سبحانہ کے امتحان میں ناکام ہو گئیں اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کو میدان سے ہٹا دیا۔ اب اے اہل عرب تمہاری باری آئی تمہیں ان کی جگہ کام کرنے کا موقعہ دیا جاتا ہے تم اس امتحان گاہ میں کھڑے ہو جس میں تمہارے پیشرو ناکام ہو کر نکالے جا چکے ہیں۔ اگر تم نہیں چاہتے ہو کہ تمہارا انجام بھی وہی ہو جو ان کا ہوا تو اس موقع سے جو تمہیں دیا جا رہا ہے صحیح فائدہ اٹھاؤ پچھلی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قوموں سے سبق لو اور ان غلطیوں کا اعادہ نہ کرو جن کی وجہ سے وہ تباہ ہوئے۔ دنیا کی اور قومیں اصلاح عالم کے منصب پر باری باری ممتاز ہو چکی تھیں۔ ایک زمانہ تھا جب بنی اسرائیل جیسی قوم اس کا تاج پہن چکی تھی لیکن اب تمام قوموں میں صلاحیت کا مادہ ناپید ہو چکا تھا۔ ایران تین ہزار برس تک ناز و نعمت میں پل کر ترقی کی روح فنا کر چکا تھا۔ رومیوں کے تمام قوائے عمل بوسیدہ ہو چکے تھے ہندوں کا دل و دماغ صرف وہم پرستی کا کام دینے کے قابل رہ گیا تھا۔ صرف ایک عرب تھے جو بن جوتی زمین کی طرح نشوونما کی صلاحیت رکھتے تھے اللہ سبحانہ نے خلافت کے کام کے لیے ان کو بھی منتخب کیا ان ہی کو سمجھایا جا رہا ہے کہ اب خلافت نہیں ملنے والی ہے۔ تمہارے ساتھ بھی وہ ہی معاملہ ہو گا جو تم سے پہلوں کے ساتھ ہو چکا ہے ان کو ہٹا کر اللہ نے تمہیں ان کی جگہ اس لیے دی ہے کہ دیکھے تم کیسے کام کرتے ہو۔

وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِمْ اٰيَاتُنَا بَيِّنٰتٍ ۙ قَالَ الَّذِيْنَ لَا
يَرْجُوْنَ لِقَآءَنَا ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ۭ قُلْ مَا يَكُوْنُ
لِيْٓ اَنْ اُبَدِّلَهٗ مِنْ تِلْقَاۗئِ نَفْسِيْ ۚ اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَيَّ ۚ
اِنِّىْٓ اَخَافُ اِنْ عَصَيْتُ رَبِّيْ عَذَابَ يَوْمٍ عَظِيْمٍ ﴿۱۵﴾ قُلْ
لَّوْ شَاۗءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ڮ فَقَدْ لَبِثْتُ
فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ۭ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ﴿۱۶﴾

اور جب ان کے سامنے ہماری واضح اور صاف آیتیں پڑھی جاتی ہیں تو جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے ہیں وہ کہتے ہیں اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ۔ یا اس کو تبدیل کر لو[۲۲] آپ فرما دیجیے کہ اس قرآن کو اپنی جانب سے بدلنا میرا مقدور نہیں ہے میرا کام تو صرف یہ ہے کہ اس حکم کا تابع بن کر رہوں جس کی مجھ پر وحی آتی ہے۔ اگر میں اپنے مالک کی نافرمانی کروں تو مجھے بہت بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے[۲۳] آپ فرما دیجیے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن کی تمہارے سامنے

تلاوت ہی نہ کرتا اور نہ اللہ اس سے تم کو خبردار ہی کرتا کیونکہ میں اس سے پہلے تم میں رہ چکا ہوں کیا تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں ہے ۲۴؎

دعوت کی راہ میں مشکلات

ہر قوم کی اصلاح و ہدایت میں اول سخت اور متعدد مشکلات پیش آتی ہیں۔ لیکن انکی نوعیت ایک دو سے زیادہ نہیں ہوتی ہے۔ مگر عرب کی اصلاح میں ہر نوع ہر حیثیت ہر قسم کی گوناگون اور لاعلاج مشکلات تھیں۔ اور ایسی تھیں جن میں سے ایک کا حل کرنا بھی قدرت انسانی سے بالاتر تھا۔ بنو اسرائیل ایک مدت سے مصر میں قبطیوں کی غلامی کر رہے تھے اور قبطیوں کے جور و ظلم کا طوفان ان کے سر سے گذر چکا تھا حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان پر یہ احسان عظیم کیا کہ فرعون کے پنجۂ ستم سے ان کو چھڑا کر مصر سے نکال لائے لیکن غلامی میں رہتے رہتے ان کی طبیعت میں اس قدر ذلت پسندی آگئی تھی کہ جب ان سے کہا گیا کہ آگے کنعان کی زمین ہے اس کو لڑ کر لو اور اسی پر تخت بچھاؤ تو انہوں نے حضرت موسیٰ سے صاف کہہ دیا کہ تو اور تیرا رب دونوں جاکر لڑو ہم تو یہاں سے آگے قدم نہیں بڑھاتے یہ ایک امتداد معاشرت کا اثر تھا جو مرتے مرتے ان لوگوں کی طبیعت سے نہیں گیا اور جب تک یہ نسل پوری اپنی موت کی آغوش میں نہیں چلی گئی بنی اسرائیل کو کنعان کی زمین میں قدم رکھنا نصیب نہیں ہوا۔ یہ صرف ایک مشکل کی مثال تھی اب عرب کی مشکلات کا اندازہ کرو۔ عرب کی سب سے بڑی مشکل جہالت تھی۔ عرب کی قوم محض امی تھی، الوہیت رسالت معاد عبادت ان میں سے کوئی چیز ایسی نہ تھی جس سے ان کے کان آشنا ہوں اسلام کا ہر لفظ جو ان کے کان میں پڑتا تھا ان کو ایک تعجب انگیز اور بالکل بیگانہ انداز معلوم ہوتی تھی۔ قرآن عزیز نے ان کی اس جاہلانہ حیرت و استعجاب کا ایک سے زیادہ جگہ ذکر کیا ہے۔ صفات الٰہی آثار نبوت احوال معاد ان میں سے ہر بات کو سن کر وہ اسی طرح سراپا حیرت بن جاتے تھے نبوت کے متعلق وہ سمجھتے تھے کہ انسان تو اس کے لائق نہیں کہ اس منصب

پر تو فرشتوں کو ہونا چاہیے۔ نبی کا تخیل اگر کبھی ان کے ذہن میں آتا تو بشریت سے ماورا صورت میں غرض ایک آسمانی پکار کی کیفیت سے بالکل بے خبر ہے۔ اس وجہ سے عرب کو ایک مدت تک صدائے نبوت سے آشنا ہونے کی ضرورت تھی اس میں کئی برس صرف ہوگئے۔ ان آیات میں جو بات کہی گئی ہے ان میں بھی ان کے اسی جاہلانہ ذہن کی عکاسی ہو رہی ہے۔

۱۵ اور جب ان کے سامنے ہماری واضح اور صاف آیات پڑھی جاتی ہیں تو جو لوگ ہم سے ملنے کی توقع نہیں رکھتے وہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے علاوہ کوئی اور قرآن لاؤ یا اس کو تبدیل کرلو۔ قرآن کی عام پند و نصیحت تو بہت سے پسند کرتے ہیں لیکن بت پرستی یا ان کے مخصوص عقائد و رسوم کا رد ہوتا ہے تو ان کو وحشت ہوتی ہے اور ناک بھوں چڑھا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے ہیں کہ اپنے خدا سے کہہ کر یا تو دوسرا قرآن لاؤ جس میں یہ مضامین نہ ہوں اور اگر یہی قرآن رہے تو اتنے حصہ میں ترمیم کر دیجئے جو بت پرستی سے متعلق ہے۔ جن لوگوں نے پتھر کی مورتیوں پر اختیارات تقسیم کر رکھے تھے ان کی ذہنیت سے کچھ مستبعد نہیں کہ ایک پیغمبر کو اس طرح کے تصرفات واختیارات کا مالک تصور کرلیں۔ یا یہ کہنا ہی محض الزام و استہزا کے طرز پر ہوگا بہرحال اس کا تحقیقی جواب آگے آرہا ہے[1]

ہر نئی تحریک کو غور سے دیکھو تو معلوم ہوگا کہ اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے رکاوٹ بن کر کھڑی ہوتی ہے وہ قومی رسم و رواج اور آبائی دین و مذہب کی پابندی ہے۔ انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی چیز نہیں ہے۔ دوست و آشنا چھوٹنا ماں باپ سے علیحدگی اہل و اولاد سے کنارہ کشی، مال و جائداد سے دست برداری جماعت کی مخالفت قوم سے انقطاع وطن سے دوری ایسی چیزیں نہیں ہیں جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کرسکے۔ ملکی رسم و رواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش و آئین کی موروثی الفت حق و باطل کی تمیز اور نیک و بد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے۔ عام دنیا کی فطری حالت کے علاوہ عرب کی قوم قدامت پرستی اور قدیم حالت پر بقاء و استحکام میں خاص شہرت رکھتی ہے۔ دنیا کہاں سے کہاں چلی گئی۔ پرانی سامی نسل کی ہر وہ یادگار خصوصیتیں جو تورات میں پڑھتے ہیں تمام سامی قوموں سے مٹ گئیں مگر عرب میں اس وقت بھی نمایاں نہیں۔ ان کا یہ کہنا اس قرآن کی جگہ اور کوئی قرآن لا دیا اس میں ترمیم

[1] افادات شیخ الاسلام

کردو ان کے اسی ذہن کی عکاسی کر رہا ہے وہ بہ مطالبہ اس مفروضے پر کر رہے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے نام سے جو کچھ پیش کر رہے یہ اللہ سبحانہ کی جانب سے نہیں بلکہ حضور اقدس کا اپنا ساختہ پرداختہ ہے اور اس کو خدا کے نام سے صرف اس لیے پیش کر رہے ہیں کہ اس سے ان کی بات کا وزن بڑھ جائے۔ دوسرے ان کا یہ مطلب تھا کہ یہ تم نے توحید آخرت کی بحث کیا چھیڑ دی ہے یہ تو ہمارے رسوم اور آبائی دین سے بغاوت ہے اگر تمہیں کچھ کرنا ہے تو ایسا کام کرو جس سے قوم کا بھلا ہو۔ اور اگر تم اپنی دعوت کو بالکل بدلنا نہیں چاہتے ہو تو کم از کم اس میں اتنی لچک تو پیدا کر لو کہ ہمارے اور تمہارے درمیان مصالحت ہو سکے کچھ ہم تمہاری باتیں اور کچھ تم ہماری مان لو۔ تمہاری دعوت میں کچھ ہمارے آبائی ورثہ کے لیے گنجائش نکل آئے اس میں کچھ ہمارے رسم رواج کے لیے کچھ ہماری شخصی اور قومی اغراض کے لیے بھی جگہ ہونی چاہیے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب مکہ میں دین حق کی منادی شروع کی تو اس کی شدید مخالفت جس بنا پر سب سے زیادہ کی گئی وہ دین آبائی کو چھوڑنے کا مسئلہ تھا اور یہی دین جدید کے بطلان کی سب سے مستحکم دلیل ان کے پاس تھی۔ اس آیت میں جو مطالبہ کیا گیا ہے اس میں ان کا یہی ذہن جھلک رہا ہے قرآن کے علاوہ اور قرآن یا قرآن میں ایسی تبدیلی جو ان کی امنگوں سے ہم آہنگ ہو جائے یہ کہنے والے وہ لوگ ہیں جن کو اللہ سبحانہ سے ملنے کی کوئی توقع نہیں ہے۔ الذین لا یرجون لقاءنا قرآن آخرت کے معاملہ کو ہر جگہ لقاء الٰہی سے تعبیر کرتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ قرآن کی نظر میں مومن وہ ہے جو لقاء الٰہی کی طلب رکھتا ہے کافر وہ ہے جو دنیوی زندگی ہی پر قانع ہو اور لقاء الٰہی کی اس میں کوئی طلب نہ ہو۔ چنانچہ اس سے پہلے پڑھ چکے ہو۔

ان الذین لا یرجون لقاءنا ورضوا بالحیاۃ الدنیا واطمانوا بها والذین هم عن ایاتنا غافلون۔

جو لوگ ہماری ملاقات کے متوقع نہیں ہیں اور صرف دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے ہیں اور اس کے خلاف ان کے دل میں کوئی خلش نہیں ہے اور جو ہماری آیات سے یک قلم غافل ہیں۔

نبی کا کام وحی بنانا نہیں اسکی پیروی کرنا ہے

۲۳ آپ فرما دیجئے اس قرآن کو اپنی جانب سے بدلنا میرا مقدور نہیں ہے میرا کام تو صرف یہ ہے کہ اس حکم کا تابع بن کر رہوں جس کی وحی مجھ پر آتی ہے اگر میں اپنے مالک کی نافرمانی کروں تو مجھے بہت بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ ہے یعنی کسی فرشتہ یا پیغمبر کا یہ کام نہیں ہے کہ اپنی طرف سے کلام الٰہی میں ترمیم کر کے ایک شوشہ بھی تبدیل کر سکے۔ پیغمبر کا فرض یہ ہے کہ جو وحی اللہ سبحانہ کی طرف سے آئے بلا کم و کاست اس کے حکم کے موافق چلتا رہے۔ وہ اللہ سبحانہ کی وحی کا تابع ہوتا ہے۔ اللہ اس کا تابع نہیں ہوتا کہ جیسا کلام تم چاہو اللہ کے یہاں سے لے کر پیش کر دوں۔ وحی الٰہی میں ادنیٰ سے ادنیٰ تصرف اور قطع و برید کرنا بڑی بھاری معصیت ہے۔ پھر جو معصوم بندے سب سے زیادہ اللہ سبحانہ کا ڈر رکھتے ہیں یعنی حضرات انبیاء علیہم السلام وہ ایسی معصیت و نافرمائی کے قریب کہاں جا سکتے ہیں انی اخاف ان عصیت ربی عذاب یوم عظیم میں گویا ان بیہودہ فرمائش کرنے والوں پر تعریض ہو گئی کہ ایسی سخت نافرمانی کرتے ہوئے تمہیں بڑے دن کے عذاب سے ڈرنا چاہیے [1]

یہ اوپر کی دونوں باتوں کا جواب ہے اور اشاروں اشاروں میں یہ بھی بتا دیا کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں یہ میری کتاب نہیں ہے بلکہ یہ اللہ کی کتاب ہے اور وحی کے ذریعے میرے پاس اللہ کی جانب سے آتی ہے۔ اس میں کوئی رد و بدل کرنا میرے اختیار سے باہر ہے اور یہ بھی بتایا ہے کہ اس موضوع پر مصالحت کا قطعاً کوئی امکان نہیں ہے۔ قبول کرنا ہو تو اس پورے دین کو جوں کا توں قبول کرو ورنہ پورے کو رد کر دو۔ بالفاظ دیگر یہ میرے جی کی من گھڑت نہیں ہے کہ تمہاری فرمائش کے مطابق بنا دوں میں تو خود اللہ سبحانہ کی وحی کا تابع ہوں۔ جو کچھ مجھ پر وحی آتی ہے وہ تمہیں سنا دیتا ہوں۔ اگر میں اس کے حکم کی نافرمانی کروں تو اس کی پکڑ سے مجھے بچانے والا کون ہے؟ انی اخاف ان عصیت ربی فرما کر یہ بھی اشارہ کر دیا ہے جیسا کہ قاضی بیضاوی نے لکھا ہے کہ اگر میرا یہ اقدام اللہ کے عذاب کو دعوت دیتا ہے جس سے میرا دامن پاک ہے تو پھر تمہارے اس مطالبہ کا کیا بنے گا بلا شبہ تمہارا یہ مطالبہ اللہ کے عذاب کو للکارنا ہے۔ اگر باز نہ آوگے تو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وہ آکر رہے گا۔

صداقت نبوت کی واضح دلیل

۱۶؎ آپ فرما دیجیے کہ اگر اللہ چاہتا تو میں قرآن کی تمہارے سامنے تلاوت ہی نہ کرتا اور نہ اللہ سبحانہ تم کو اس کی خبر دیتا۔ کیونکہ میں اس سے پہلے عمر کا ایک حصہ تم میں رہ چکا ہوں کیا تمہیں اتنی بھی عقل نہیں ہے یعنی جو اللہ سبحانہ جانتا ہے وہی تمہارے سامنے پڑھ دیتا ہوں اور جتنا چاہتا ہے میرے ذریعے سے تمہیں خبردار کر دیتا ہے۔ اگر وہ اس کے خلاف چاہتا تو میری کیا طاقت تھی کہ خود اپنی طرف سے ایک کلام بنا کر اس کی طرف منسوب کر دیتا آخر میری عمر کے چالیس سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گذرے۔ اس قدر طویل مدت میں تم کو میرے حالات کے متعلق ہر قسم کا تجربہ ہو چکا میرا صدق وعفاف امانت و دیانت وغیرہ اخلاق حسنہ تم میں ضرب المثل ہے میرا امی ہونا اور کسی ظاہری معلم کے سامنے زانوئے تلمذ طے نہ کرنا ایک معروف و مسلم واقعہ ہے۔ پھر چالیس برس تک جس نے نہ کوئی قصیدہ لکھا ہو نہ شاعروں میں شریک ہوا ہو نہ کبھی کتاب کھولی ہو نہ قلم ہاتھ میں لیا ہو نہ کسی درسگاہ میں بیٹھا ہو دفعتہ ایسا کلام بنا لائے جو اپنی فصاحت و بلاغت شوکت و جزالت جدت اسلوب اور سلامت و روانی سے جن و انس کو عاجز کر دے اس کے علوم و حقائق کے سامنے تمام دنیا کے معارف و علوم ماند پڑ جائیں۔ ایسا مکمل اور عالمگیر قانون ہدایت نوع انسانی کے ہاتھوں میں پہنچا دے جس کے آگے سب پچھلے قانون ردی ہو جائیں۔ بڑی بڑی قوموں اور ملکوں کے مردہ قالب میں روح تازہ پھونک کر ابدی حیات اور نئی زندگی کا سامان بہم پہنچائے یہ بات کس کی سمجھ میں آسکتی ہے تم کو سوچنا چاہیے کہ جس پاک سرشت انسان نے چالیس برس تک کسی انسان پر جھوٹ نہ لگایا ہو کیا وہ ایک دم ایسی جسارت کر سکتا ہے کہ معاذ اللہ اللہ سبحانہ پر جھوٹ باندھنے اور افترا کرنے لگے۔ ناچار ماننا پڑے گا کہ جو کلام تم کو سناتا ہوں اس کے بنانے اور پہنچانے میں مجھے اصلا اختیار نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ جو کچھ جانتا ہے میری زبان تمہیں سناتی ہے ایک لفظ یا زبر زیر بدلنے کا کسی مخلوق کو حق حاصل نہیں ہے ۔ ؎۱

ولا ادراکم میں لفظ ادریٰ باب افعال سے ماضی کا صیغہ واحد مذکر غائب ہے

؎۱ افادات شیخ الاسلام

اس کا مجرد درایۃ باب ضرب سے دری یدری جاننے کے معنے میں آتا ہے لا ادراکم کو شارحین قرآن نے لا اعلمکم کے معنی میں بنایا یعنی نہیں تبلایا تم کو اللہ نے۔ بعض مترجین قرآن نے اس کے معنے واحد متکلم کے بسبقت قلم سے کر دیئے ہیں۔ صحیح معنے وہی ہیں جو ہم نے تبلا دیئے۔ قاضی بیضاوی، قرطبی، آلوسی نے یہی لکھا ہے۔

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں۔

اس آیت میں صداقت نبوت کی سب سے زیادہ واضح اور وجدانی دلیل بیان کی ہے جس کی حقیقت افسوس ہے مفسرین نے پوری طرح واضح نہیں کی ہے فرمایا۔ ساری باتیں چھوڑ دو۔ صرف اسی بات پر غور کرو کہ میں تم میں کوئی نیا آدمی نہیں ہوں جس کے خصائل و عادات کی تمہیں خبر نہ ہو۔ تم ہی میں سے ہوں اور اعلان وحی سے پہلے ایک پوری عمر تم میں بسر کر چکا ہوں یعنی چالیس برس تک کی عمر کہ انسانی عمر کی پختگی کی پوری مدت ہے۔ اس تمام مدت میں میری زندگی تمہاری آنکھوں کے سامنے رہی ہے۔ تبلاؤ اس تمام عرصہ میں کوئی بات بھی تم نے سچائی اور امانت کے خلاف مجھ میں دیکھی۔ پھر اگر اس تمام مدت میں مجھ سے یہ نہ ہو سکا کہ کسی انسانی معاملہ میں جھوٹ بولوں تو کیا ایسا ہو سکتا ہے کہ اب اللہ سبحانہ پر بہتان باندھنے کے لیے تیار ہو جاؤں اور جھوٹ موٹ کہنے لگوں کہ مجھ پر اس کا کلام نازل ہوا ہے کیا تم اتنی موٹی سی بات بھی پا نہیں سکتے۔ تمام علمائے اخلاق و نفسیات متفق ہیں کہ انسان کی عمر میں ابتدائی چالیس برس کا زمانہ اس کے اخلاق و خصائل کے ابھرنے اور بننے کا اصلی زمانہ ہے جو سانچہ اس عرصہ میں بن گیا پھر بقیہ زندگی میں بدل نہیں سکتا بس اگر ایک شخص چالیس برس کی عمر تک صادق و امین رہا ہے تو کیونکر ممکن ہے کہ اکتالیسویں برس میں قدم رکھتے ہی ایسا کذاب و مفتری ہو گیا کہ انسانوں پر ہی نہیں بلکہ خاطر السماوات والارض پر افترا کرنے لگے۔

مولانا دریابادی فرماتے ہیں۔

روشن خیالان عرب کی اسی فرمائشی ترمیم کے جواب میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے جواب کا خلاصہ حسب ذیل ہے۔

۱۔ اپنی عمر ۴۰ - ۴۵ سال تمہاری آنکھوں کے سامنے گذار چکا ہوں میرے تدین راست بازی صداقت شعاری پر تم سب گواہ ہو کبھی کسی خفیف معاملہ میں بھی کذب و افترا سے مجھ کام لیتے تم نے دیکھا ہے یا سنا ہے پھر جب یہ نہیں تو اتنے بڑے افترا کی اپنے کلام کو اللہ کا کلام

کہہ کر پکاروں آخر مجھے جرات ہی کیسے ہو سکتی ہے ؟ تمہاری عقلیں اس احتمال ہی کو کیسے تسلیم کر رہی ہیں۔

۲۔ تمہارے درمیان اپنی عمر کا بڑا حصہ گذار چکا ہوں میری ایک خو بو سے تم واقف ہو چکے ہو۔ میری بولی میرے انداز کلام کو تم خوب اچھی طرح جان چکے پہچان چکے۔ تہیں قرآن اور میرے کلام میں کوئی فرق نظر نہیں آتا۔ میں چاہوں بھی تو قرآن جیسی ممتنع النظیر کلام پر کب تک قادر ہو سکتا ہوں۔ اب تک میرا کوئی کلام اس طرح کا جب نہ ہوا تو آج کیسے ہو سکتا ہے قرآن کا یہ استدلال کلام الٰہی ہونے پر وزن دار اس وقت بھی تھا پھر جس وقت سے احادیث رسول مدون ہو گئیں اس وقت اسے اسکی دلیل ہیں اور زیادہ جان پڑ گئی ہے حدیثوں کے چھوٹے بڑے مجموعے ایک دو نہیں بیسیوں کی تعداد میں آج سے صدیوں سے شائع چلے آ رہے ہیں۔ کیا عقل کے اندھوں کو اتنا نظر نہیں آتا کہ جو زبان بخاری مسلم ترمذی وغیرہ ہیں اور ارشادات نبوت کی ہے وہ قرآن کی ہے یا ہو سکتی ہے۔ زبان انداز بیان، اسلوب کلام نوعیت تراکیب کا اتنا نمایاں واضح فرق بھی کیا شام، مصر، فلسطین، عراق وغیرہ کے اہل زبان کو سجھائی نہیں دیتی۔

مولانا مودودی فرماتے ہیں۔

یہ ایک زبردست دلیل ہے ان کے اس خیال کی تردید میں کہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کو خود اپنے دل سے گھڑ کر اللہ سبحانہ کی طرف منسوب کر رہے ہیں۔ اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دعوے کی تائید میں کہ وہ خود اس کے مصنف نہیں بلکہ یہ اللہ سبحانہ کی جانب سے بذریعہ وحی ان پر نازل ہو رہا ہے۔ دوسرے تمام دلائل تو پھر نسبتاً دور کی چیز تھے مگر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی تو ان لوگوں کے سامنے کی چیز تھی۔ آپ نے نبوت سے پہلے پورے چالیس سال ان کے درمیان گذارے تھے ان کے شہر میں پیدا ہوئے تھے۔ ان آنکھوں کے سامنے بچپن گذرا۔ جوان ہوئے ادھیڑ عمر کو پہنچے، رہنا سہنا، ملنا جلنا، لین دین، شادی بیاہ غرض ہر قسم کا معاشرتی تعلق انہی کے ساتھ اور آپ کی زندگی کا کوئی پہلو ان سے چھپا ہوا نہ تھا۔ ایسی جانی بوجھی اور دیکھی بھالی چیز سے زیادہ کھلی شہادت اور کیا ہو سکتی تھی۔

آپ کی اس زندگی میں دو باتیں بالکل عیاں تھیں جنہیں مکہ کے لوگوں میں سے ایک ایک شخص جانتا تھا۔

ایک یہ کہ نبوت سے پہلے کی پوری چالیس سالہ زندگی میں آپ نے ایسی کوئی تعلیم تربیت اور

مہت نہیں پائی جس سے آپ کو وہ معلومات حاصل ہوتیں جن کے چشمے یکایک دعویٰ نبوت کے ساتھ ہی آپ کی زبان سے پھوٹنے شروع ہو گئے۔ اس سے پہلے کبھی ان مسائل سے دلچسپی لیتے ہوئے۔ ان مباحث پر گفتگو کرتے ہوئے اور ان خیالات کا اظہار کرتے ہوئے نہیں دیکھے گئے جو اب قرآن کی ان پے درپے سورتوں میں زیر بحث آرہے تھے۔ حد یہ ہے کہ اس پورے چالیس کے دوران میں کبھی آپ کے کسی گہرے دوست اور کسی قریب ترین رشتہ دار نے بھی آپ کی باتوں اور آپ کی حرکات وسکنات میں کوئی ایسی چیز محسوس نہیں کی جسے اس عظیم الشان دعوت کی تمہید کہا جا سکتا ہو۔ جو آپ نے اچانک چالیسویں سال کو پہنچ کر دینی شروع کر دی یہ اس بات کا صریح ثبوت تھا کہ قرآن آپ کے اپنے دماغ کی پیداوار نہیں ہے بلکہ خارج سے آپ کے اندر آئی ہوئی چیز ہے اس لیے کہ انسانی دماغ اپنی عمر کے کسی مرحلے میں بھی ایسی کوئی چیز پیش نہیں کر سکتا جس کے نشوونما اور ارتقاء کے واضح نشانات اس سے پہلے کے مرحلوں میں نہ پائے جاتے ہوں یہی وجہ ہے کہ مکہ کے بعض چالاک لوگوں نے خود بھی جب محسوس کر لیا کہ قرآن کو آپ کے دماغ کی پیداوار قرار دینا صریح طور پر ایک لغو الزام ہے تو آخر کار انہوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ کوئی اور شخص ہے جو محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ باتیں سکھا دیتا ہے لیکن یہ دوسری بات پہلی بات سے زیادہ لغو تھی کیونکہ مکہ تو درکنار پورے عرب میں بھی اس قابلیت کا آدمی نہ تھا جس پر انگلی رکھ کر کہہ دیا جاتا کہ یہ اس کلام کا مصنف ہے یا ہو سکتا ہے۔ ایسی قابلیت کا آدمی کسی سوسائٹی میں چھپا کب رہ سکتا ہے۔

دوسری بات جو آپ کی سابق زندگی میں بالکل نمایاں تھی وہ یہ تھی کہ جھوٹ، فریب، جعل، مکاری، عیاری اور اس قبیل کے دوسرے رذائل میں سے کسی کا ادنیٰ شائبہ تک آپ کی سیرۃ میں نہ پایا جاتا تھا۔ پوری سوسائٹی میں کوئی ایسا نہ تھا جو یہ کہہ سکتا ہو کہ اس چالیس سال کی یکجائی معاشرت میں آپ سے کسی ایسی صفت کا تجربہ اسے ہوا ہے۔ برعکس اس کے کہ جن جن لوگوں کو بھی آپ سے سابقہ پڑا وہ آپ کو ایک نہایت سچے بے داغ اور قابل اعتماد امین انسان کی حیثیت ہی سے جانتے تھے۔ نبوت سے پانچ ہی سال پہلے تعمیر کعبہ کے سلسلے میں وہ مشہور واقعہ پیش آیا تھا جس میں قریش پکار اٹھے تھے هذا الامين. رضينا. هذا محمد یہ بالکل راستباز ہیں ہم ان پر راضی ہیں یہ تو محمد ہیں۔ اس طرح آپ کو نبی مقرر کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ پورے قبیلہ قریش سے بھرے مجمع میں آپ کے امین ہونے کی شہادت لے چکا تھا۔ اب یہ گمان کرنے کی کیا گنجائش تھی کہ جس شخص نے تمام عمر کبھی اپنی زندگی میں کسی چھوٹے سے چھوٹے معاملہ میں بھی جھوٹ اور فریب سے

کام نہیں لیا تھا وہ یکایک اتنا بڑا جھوٹ اور ایسا عظیم الشان فریب لے کر اُٹھے کہ اپنے ذہن سے کچھ باتیں تصنیف کرے اور ان کو پورے زور اور تحدی سے اللہ سبحانہ کی طرف منسوب کرے اسی لیے اللہ تعالیٰ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے فرماتا ہے کہ ان کے اس بیہودہ الزام کے جواب میں ان سے کہہ دو کہ اے اللہ کے بندو کچھ تو عقل سے کام لو میں کوئی باہر سے آیا ہوں تمہارے درمیان اس سے پہلے عمر کا ایک حصہ گذار چکا ہوں۔ میری سابق زندگی کو دیکھتے ہوئے تم مجھ سے یہ کیسے توقع رکھتے ہو کہ میں اللہ سبحانہ کی تعلیم اور اس کے حکم کے بغیر قرآن تمہارے سامنے پیش کر سکتا تھا۔

اس آیت پاک میں درحقیقت وحی الٰہی نے خود اپنے رسول کی سوانح عمری اور سیرت اس کی نبوت کے ثبوت میں پیش کیا ہے۔

قرآن نے اس آیت میں صرف آپ کی زندگی کے تاریخی پہلو ہی کو پیش نہیں کیا ہے بلکہ آپ کی لائی ہوئی ہدایت کی قابلیت اور جامعیت کے ساتھ ساتھ عملیت کی طرف بھی اشارہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ انسانیت کی تکمیل صرف محمد رسول اللہ کی سیرۃ سے ہو سکتی ہے کیونکہ نمونہ عمل صرف آپ کی زندگی ہے اس کی پشت پر بھرپور تاریخ کے ساتھ پورا پورا عمل ہے یہ جمال اور جلال دونوں کا مجموعہ ہے۔ جامعیت اور اجتماعیت اس زندگی کے دو امتیازی پہلو ہیں۔

فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰی عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ ؕ اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۱۷﴾
وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهُمْ وَلَا يَنْفَعُهُمْ وَيَقُوْلُوْنَ
هٰٓؤُلَآءِ شُفَعَآؤُنَا عِنْدَ اللّٰهِ ؕ قُلْ اَتُنَبِّـُٔوْنَ اللّٰهَ بِمَا لَا يَعْلَمُ
فِى السَّمٰوٰتِ وَلَا فِى الْاَرْضِ ؕ سُبْحٰنَهٗ وَتَعٰلٰى عَمَّا يُشْرِكُوْنَ ﴿۱۸﴾

پس اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ سبحانہ پر جھوٹ کا بہتان باندھے اور اس سے زیادہ ظالم کون ہو گا جو اللہ سبحانہ کی آیات کو جھٹلائے یقیناً جرائم پیشہ لوگ کبھی کامیابی سے ہمدوش نہیں ہو سکتے [۲۵] اور یہ لوگ تو اللہ سے ورے ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو نقصان دیتی ہیں نہ فائدہ اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے حضور ہمارے سفارشی ہیں [۲۶] اے پیغمبر تم ان سے کہہ دو کیا تم اللہ کو ایسی بات بتلانا چاہتے ہو جو خود آسمانوں اور زمین میں معلوم نہیں ہے پاک ہے اس کی ذات اور برتر ہے ان اعمال شرکیہ سے جو وہ کر رہے ہیں [۲۷]

دوٹوک فیصلہ کے لیے دعوت

قرآن نے دعوت کا جو انداز اختیار کیا ہے اس کا لازمی نتیجہ یہ ہونا چاہیے کہ وہ ایک استدلالی اور عقلی دعوت ہو کر بغیر اس کے حکمت دانشمندی وعظ و نصیحت پروان نہیں چڑھ سکتی۔ اس بنا پر نبوت محمدیہ سب سے پہلی ربانی آواز ہے جس نے جابرانہ قانون کے بجائے عقل انسانی کو مخاطب کیا۔ غور و فکر کی دعوت دی، فہم و تدبر کا مطالبہ کیا۔ اس لیے ہر تعلیم کے ساتھ تعلیم کی خوبی اور حکمت ظاہر کی اللہ سبحانہ کی ہستی، توحید، رسالت، قیامت، جزاو سزا عبادت نماز، روزہ، زکوۃ، حج اخلاق وغیرہ ہر تعلیم کی تلقین کرتے وقت اس نے اس کی صداقت کی عقلی دلیلیں پیش کی ہیں اور ہر مسئلہ کی مصلحتیں اور حکمتیں علی الاعلان بتائی ہیں۔ اسی مقام میں قرآن نے نبوت کا دوٹوک فیصلہ کے لیے یہ ٹھیٹھ عقلی رہنمائی کی کہ دو باتوں سے تم انکار نہیں کر سکتے جو شخص اللہ پر افترا کرے اس سے بڑھ کر کوئی شریر نہیں اور شریر و مفتری کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا۔ صورت حال نے دو فریق پیدا کر دیئے ہیں اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام و نامراد ہونا پڑے گا اور اگر تم سچائی کے مکذب ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ بھگتنا پڑے گا۔ فیصلہ اللہ کے ہاتھ میں ہے اور اس کا قانون ہے کہ مجرموں کو فلاح نہیں دیتا چنانچہ اللہ کا فیصلہ صادر ہو گیا جو مکذب تھے ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں رہا جو صادق تھا اس کا کلمہ صدق آج تک قائم ہے اور قائم رہے گا۔

یہ وہ حقیقت ہے جس کی صدا ہر در و دیوار سے آرہی ہے اور قرآن یہاں اسی حقیقت کا اعلان کر رہا ہے۔ ظاہر ہے کہ جو دعوت عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کا ہر معاملہ میں مطالبہ کرتی ہو۔ ہر قوم پر عقلی استدلال ظاہر کرتی ہو وہ اپنے منوانے کے بارے میں جبر اور زبردستی کا طریقہ کیسے اختیار کر سکتی ہے۔

۲۵ پس اس سے بڑھ کر کون ظالم ہو سکتا ہے جو اللہ سبحانہ پر جھوٹ کا بہتان باندھے اور اس سے زیادہ ظالم کون ہوگا جو اللہ سبحانہ کی آیات کو جھٹلائے یقیناً جرائم پیشہ لوگ کامیابی سے ہمدوش نہیں ہونے یعنی گنہ گاروں اور مجرموں کو حقیقی کامیابی اور بھلائی حاصل نہیں ہو سکتی ہے اب تم خود فیصلہ کر لو کہ ظالم و مجرم کون ہے۔ اگر بفرض محال میں جھوٹ بنا کر اللہ سبحانہ کی طرف منسوب کر رہا ہوں تو مجھ سا ظالم کوئی نہیں ہو سکتا لیکن گذشتہ آیت میں جو دلیل بیان کی گئی ہے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ احتمال بالکل باطل ہے پھر جب میرا سچا ہونا ثابت

ہو گیا اور تم جہل وعناد سے خدا کے کلام کو جھٹلا رہے ہو تو اب زمین کے پردہ پر تم سے بڑا ظالم کوئی نہیں ؎ خلاصہ یہ کہ اگر یہ آیات اللہ سبحانہ کی نہیں ہیں اور میں انہیں خود تصنیف کر کے آیات الہٰی کی حیثیت سے پیش کر رہا ہوں تو مجھ سے بڑا ظالم کوئی نہیں۔ اور اگر یہ واقعی اللہ کی آیات ہیں اور تم ان کو جھٹلا رہے ہو تو پھر تم سے بڑا بھی کوئی ظالم نہیں۔

یہ جو فرمایا کہ انہ لا یفلح المجرمون تو اس کا مطلب یہ قانون بتانا ہے کہ جرائم پیشہ جب اہل حق کے مقابلے پر ہوں تو جرائم کو کامیابی فلاح نہیں ہوتی یہ مطلب نہیں کہ کفر ظلم اور جرم کامیاب نہیں ہوتے ان کو ناکامی اس وقت ہوتی ہے جب جرائم کے مقابلہ میں اعمال صالحہ ظلم کے مقابلے میں عدل کفر کے مقابلے میں ایمان ہو اور اس مقابلے میں ایمان عدل اور عمل صالح کامیابی کے وسائل اختیار کرے۔ یہ بات کہ ایمان، ایمان کے تقاضوں کے ساتھ کفر کے مقابلے پر نہ ہو اور کفر لازماً ناکام ہو اپنے میں کوئی معنویت نہیں رکھتی ہے۔

اس فقرے سے یہ نتیجہ نکالنا بھی صحیح نہیں ہے کہ جو شخص نبوت کا دعویٰ کر کے جیتا ہے یا دنیا میں پھلے یا اس کی دعوت کو فروغ نصیب ہو وہ یقیناً نبی ہے کیونکہ اس نے فلاح پائی ہے یہ احمقانہ استدلال صرف وہ شخص کر سکتا ہے جو نہ تو قرآنی اصطلاح فلاح کا مفہوم جانتا ہو نہ اس کے قانون امہال سے واقف ہو جو قرآن کے بیان کے مطابق اللہ سبحانہ نے مجرموں کیلئے مقرر فرمایا ہے یہاں یہ فقرہ انہ لا یفلح المجرمون جس سیاق میں بولا گیا ہے وہ صرف یہ ہے کہ میں یقین کے ساتھ جانتا ہوں کہ مجرموں کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی اس لیے خود تو یہ جرم نہیں کر سکتا کہ نبوت کا جھوٹا دعویٰ کروں البتہ تمہارے متعلق مجھے یقین ہے کہ تم مجھے جھٹلانے کا جرم کر رہے ہو اس لیے تمہیں فلاح نصیب نہ ہو گی۔

مشرکین کی مجرمانہ زندگی کا حوالہ

۲۶؎ اور یہ لوگ تو اللہ سے ورے ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں جو نہ ان کو نقصان دیتی ہیں نہ فائدہ اور کہتے ہیں کہ یہ اللہ کے حضور میں ہمارے سفارشی ہیں۔ وہ معاملہ تو اللہ کے پیغمبر کے ساتھ تھا اب ان کی خداپرستی کا حال سنئے کہ اللہ سبحانہ کو چھوڑ کر ایسی چیزوں کی پرستش کرتے ہیں۔

؎ الافادات شیخ الاسلام

جن کے قبضہ قدرت میں نفع و ضرر کچھ بھی نہیں جب پوچھا جاتا ہے تو کہتے ہیں کہ بیشک بڑا خدا تو ایک ہے جس نے آسمان و زمین پیدا کئے مگر ان اصنام بتوں وغیرہ کو خوش رکھنا اس لیے ضروری ہے کہ یہ سفارش کر کے بڑے خدا سے دنیا میں ہمارے اہم کام درست کرا دیتے ہیں۔ اور اگر موت کے بعد دوسری زندگی ہوگی تو وہاں بھی ہماری سفارش کریں گے باقی چھوٹے موٹے کام جو خود ان کے حدود اختیار میں ہیں ان کا تعلق تو صرف ان ہی سے ہے بنا بریں ہم کو ان کی عبادت کرنی چاہیئے[1]

اس آیت کی تشریح میں چند ضروری باتیں وضاحت طلب ہیں۔ (۱) یعبدون من دون اللہ مالا یضرھم وہ ان چیزوں کی عبادت کرتے ہیں جو ان کو نہ نقصان دیتی اور نہ نفع ان چیزوں کو قرآن نے اصنام، تماثیل اور اوثان کہا ہے۔ ان میں باہم فرق کیا ہے عام شارحین قرآن نے ان کا ترجمہ بتوں اور مورتیوں سے کیا ہے حضرت ابراہیم کے ایک سوال کے جواب میں قوم نے ان کو جواب دیا نعبد اصناما فنظل لھا عاکفین ہم پوجتے ہیں مورتوں کو سارے دن ان ہی میں لگے رہتے ہیں اور جب حضرت ابراہیم نے یہ سوال کیا ما ھذہ التماثیل التی انتم لھا عاکفون یہ مورتیں کیا ہیں جن پر تم مجاور بنے بیٹھے ہو اور حضرت ابراہیم ہی نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا انما اتخذتم من دون اللہ اوثانا تم نے اللہ کو چھوڑ کر بتوں کے تھان بنا لیئے۔ ان تینوں میں بہت بڑا معنوی فرق ہے۔ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں ان میں فرق بتایا ہے مشہور امام لغت جوہری کے بیان سے معلوم ہوتا ہے کہ وثن اور صنم دونوں مترادف ہیں۔ لیکن ہشام کلبی نے کتاب الاصنام میں یہ فرق بتایا ہے کہ تصویر لکڑی یا سونے چاندی کی ہو تو صنم ہے اور اگر پتھر سے تو وثن ہے۔ اور کچھ کی رائے ہے کہ جس کا ڈھانچہ سونے چاندی کا ہو وہ وثن ہے اور جس کی صورت بھی نمایاں ہو وہ صنم ہے۔ اور کچھ کے خیال میں صنم شمن کا معرب ہے بہر حال صنم ہو یا وثن ہو عرب ان کی پوجا کرتے تھے ان کو سجدہ کرنا ان کے نام پر جانوروں کا ذبح کرنا ان کا طواف کرنا ان کے نام کی نذر و نیاز چڑھاوے چڑھانا ان کے اعمال عبادت تھے۔

یہ مورتیاں اور یہ بت اشخاص تھے اور ان اشخاص کے باقاعدہ نام تھے، ان اشخاص کے ناموں کے پیچھے ان کی شخصیتیں تھیں۔ یہ شخصیتیں کچھ ملائکہ کی تھیں اور کچھ بزرگوں کی تھیں۔ اہل عرب اتنے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بلید الذہن نہ تھے کہ صرف ہاتھوں کے تراشے ہوئے ڈھانچوں سے عابدانہ تعلقات رکھتے ہوں نہیں ہرگز نہیں بلکہ دنیا کی مشرک قوموں کی طرح وہ اپنی عبادات کی ایک فلاسفی رکھتے تھے حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے ان کے مشرکانہ اعمال کا فلسفہ یہ بتایا ہے۔

ان کا موقف یہ تھا کہ اب سے پہلے کچھ نیکوکار اور بزرگ شخصتیں ایسی ہوئی ہیں جنہوں نے اللہ سبحانہ کی بہت عبادت کی ہے اور عبادت گذاری کے ذریعے اللہ کا اتنا قرب حاصل کرلیا ہے کہ اللہ نے ان کو خلعت الوہیت عطا فرما دیا ہے، اس وجہ سے وہ ہماری عبادتوں اور نیازمندانہ اعمال کے حقدار ہو گئے ہیں یہ بالکل ایسا ہے جیسے کسی بادشاہ کی کوئی نوکر بہت خدمت گذاری کرے اور اپنی خدمت گذاری میں اتنا حسن پیدا کرے کہ بادشاہ خوش ہو کر اس کو خلعت شاہی عطا فرما دے اور ملک کے کچھ حصہ کا سارا کاروبار اس کے سپرد کر دے۔ جیسے شہر والوں کی اس نوکر کی اطاعت فرماں برداری بادشاہ کی مرضی و خوشنودی ہے ایسی ہی ان بزرگوں کی عبادت بھی رضائے الٰہی کا پیمانہ ہے بلکہ اس سے بھی بڑھ کر یہ کہ اللہ کی کسی عبادت کو شرف پذیرائی حاصل نہیں ہو سکتا جب تک اللہ کی عبادت میں ان بزرگوں کی عبادت کی ملاوٹ نہ ہو بلکہ اس پر بھی یہ اضافہ کرتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی تو بالا و بالاتر ہے قرب کے لیے اس کی عبادت سودمند نہیں ہے ضروری ہے کہ ان بزرگوں کی عبادت کی جائے تاکہ ان کے ذریعے اللہ تک رسائی ہو جائے۔ یہ شخصیتیں سنتی ہیں دیکھتی ہیں اپنے پرستاروں کی سفارش کرتی ہیں سارے کام بناتی اور چلاتی ہیں ان شخصیتوں کے ناموں پر پتھروں کے اشخاص مورتیاں اور بت بناتے تھے۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں ان اشخاص کے پیچھے شخصیتوں کا ذکر کیا ہے۔

اہل عرب نے یہ اصنام اور اوثان اپنے نبیوں اور بزرگوں کی تصاویر کی صورت میں بنائے تھے اور ان کا تصور یہ تھا کہ جب ان تصویروں کی عبادت کی جائے گی تو وہ شخصتیں جن کے یہ اشخاص ہیں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں ان کی سفارش کریں گے گے۔ تفسیر کبیر

اب بات کھل کر سامنے آگئی کہ یہ اشخاص جن کی مشرکین عبادت کرتے ہیں صرف اشخاص نہیں بلکہ

شخصیتوں کی جاتی ہے۔

قرآن نے شرک کی تردید میں جو انداز اختیار کیا ہے اس میں اس کے پیش نظر دونوں ہیں اشخاص بھی یعنی بت اور مورتیاں اور وہ شخصیتیں بھی جن کی یہ مورتیں ہیں حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہ کبھی شرک کی تردید یہ کہہ کر کرتا ہے کہ حکومت اور فرمان روائی صرف اللہ کی ہے اور کبھی یہ کہہ کر تردید کرتا ہے کہ یہ تو جمادات ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ کبھی شخصیتوں کو سامنے رکھ کر شرک کی تردید کی جاتی ہے اور کبھی اشخاص کو پیش نظر رکھ کر تردید کی جاتی ہے جب اشخاص پیش نظر ہوتے ہیں تو انداز تعبیر میں وہ الفاظ استعمال کرتا ہے جو غیر ذوی العقول کے لیے بولے جاتے ہیں جیسے پیش نظر آیت میں ما یعبدون ہے اور جب شخصیتیں پیش نظر ہوتی ہیں تو اندازہ تعبیر وہ ہوتا ہے جو ذوی العقول کے لیے ہوتا ہے جیسے قل انی نہیت ان اعبد الذین تدعون من دون اللہ۔

شرک کی گوناں گوں صورتیں پرستش اور بندگی کی دنیا میں جو رائج تھیں وہ سب عرب میں موجود تھیں قرآن نے ان سب کے خلاف صدائے احتجاج بلند کی ہے۔

شرک کا اصلی نقصان یہ ہے کہ اللہ سبحانہ سے انسان کو جس درجہ کا تعلق جس قسم کا عجز و نیاز جس مرتبہ کی محبت جس درجہ کی التجا درکار ہے اس کا رخ دوسری جانب بدل جاتا ہے۔ ہزاروں لاکھوں آدمی ہیں جو اچھی طرح جانتے ہیں کہ دیوتا کائنات اور زمین و آسمان کے خالق نہیں ہیں تاہم وہ ہر قسم کی حاجتیں اور مرادیں ان ہی دیوتاؤں اور معبودوں سے مانگتے ہیں ان ہی کو حاجت روا جانتے ہیں۔ اٹھتے بیٹھتے ان ہی کا نام لیتے ہیں ان ہی کی نذر و نیاز چڑھاتے ہیں غرض براہ راست ان کو جو تعلق ہوتا ہے ان ہی معبودوں سے ہوتا ہے۔ خود مسلمانوں میں ہزاروں لاکھوں آدمیوں کا طرز عمل انبیاء صلحاء اور اولیاء بلکہ مزارات کی نسبت اس کے قریب قریب ہے۔ اس لیے سب سے اہم اور بنیادی کام یہ ہے کہ معبودوں کی نسبت اس قسم کا خیال نہ پیدا ہونے پائے بلکہ صاف صاف جتا دیا جائے کہ اللہ سبحانہ کے سوا کسی کی نہیں چلتی اور اس کی مرضی میں کوئی دست اندازی نہیں کر سکتا اللہ سبحانہ کے سوا کوئی نفع اور نقصان نہیں پہنچا سکتا۔

خود ساختہ شفاعت

۲۷ ے اے پیغمبر تم ان سے کہہ دو کیا تم اللہ کو ایسی بات بتاتے ہو جو خود اللہ سبحانہ کو آسمان و زمین میں معلوم نہیں ہے پاک ہے اللہ کی ذات اور برتر ہے ان اعمال شرکیہ سے جو وہ کر رہے ہیں یعنی بتوں کا شفیع ہونا اور شفیع کا مستحق عبادت ہونا دونوں دعوے غلط اور بے بنیاد ہیں اور ظاہر ہے کہ اللہ کے علم میں وہ ہی چیز ہوگی جو واقعی ہو۔ لہذا تعلیم الٰہی کے خلاف ان غیر واقعی اور خود تراشیدہ اصول کو حق بجانب ثابت کرنا گویا اللہ تعالیٰ کو ایسی چیزوں کے واقعی ہونے کی خبر دینا ہے جن کا ہونا آسمان و زمین میں کہیں بھی اسے معلوم نہیں ہے یعنی کہیں بھی اس کا وجود نہیں ہے ہوتا تو اس کے علم میں ضرور ہوتا۔ پھر اس سے منع کیوں کرتا لہ مطلب یہ ہے کہ کسی چیز کا اللہ کے علم میں نہ ہونا یہ معنی رکھتا ہے کہ وہ سرے سے موجود نہیں کیونکہ ہر چیز اپنے موجود ہونے کے لیے علم الٰہی کی محتاج ہے اور اللہ کی ذات اپنے علم کے چیز کے وجود کا محتاج نہیں ہے اس لیے سب کچھ جو موجود ہے اللہ کے علم میں ہے بس سفارشوں کے معدوم ہونے کے لیے یہ ایک نہایت لطیف انداز ہے کہ اللہ تعالیٰ تو جانتا نہیں کہ زمین و آسمان میں کوئی اسکی بارگاہ میں تمہاری سفارش کرنے والا ہے پھر یہ تم کن سفارشیوں کی اسے خبر دے رہے ہو۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے یہ بات کیونکر سمجھائی ہے کہ مشرک غیر اللہ کی پوجا کرتے ہیں لیکن ان کی پوجا کی اصلی علت ان کا یہ باطل نظریہ ہے کہ یہ اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں ہمارے سفارشی ہیں۔ اور سفارش سے اسباب کی زنجیر سے باہر سفارش مراد ہے کہ دور دراز سے غائبیں کو پکارا جائے اور سفارشی بنایا جائے کیونکہ ایسا کرنے سے شفیع میں علم غیب اور حاضر و ناظر کی صفت ماننی پڑتی ہے اور یہ خالص شرک ہے۔ اب غور کرنا چاہیے کہ مشرک کن کن لوگوں کو سفارشات کی مدعی اپنا سفارشی جانتے تھے۔ سن رہے ہو کہ عرب مشرکین نے انبیاء اور اکابر کی تصاویر کو اصنام داوثان کو شکل سے رکھے تھے ان کے خیال میں جیسا کہ امام رازی نے تفسیر میں بھی اکابر و اولیاان کے شفعار تھے آگے امام رازی کی بات سننے کے لائق ہے۔

اس زمانہ میں اس کی نظیر یہ ہے کہ بہت سے لوگ اکابر کی قبور کی تعظیم میں مشغول

لہ افادات شیخ الاسلام

ہیں اس اعتقاد سے کہ وہ اکابر کی قبروں کی تعظیم کریں گے تو وہ ان کے لیے اللہ کی بارگاہ میں سفارش کریں گے۔

یہاں یہ بات سمجھنے کی ہے کہ اگر ان مشرکین کا یہ عقیدہ ہوتا کہ یہ اکابر ہی سب کچھ کرنے والے ہیں تو پھر بارگاہ الٰہی میں ان کی شفاعت میں کوئی معنویت نہیں ہے بت پرست عورتوں کا عقیدہ یہی تھا کہ یہ ہستیاں جن کی یہ مورتیاں ہیں اللہ کی طرف سے عالم میں مختار کل ہیں وہ سب کچھ جانتے ہیں اسی عقیدہ کا نام انہوں نے شفاعت رکھا تھا اور یہ اکابر ان کے شفیع تھے۔ قرآن نے اس آیت میں اس مشرکانہ شفاعت کی بھرپور تردید کی ہے اور بتا دیا کہ اس قسم کی شفاعت کا کوئی وجود نہیں ہے۔

شارحین قرآن اس گتھی کے سلجھانے میں پریشان ہیں کہ شفاعت سے یہاں کونسی شفاعت مراد ہے۔ آخرت میں ہونے والی شفاعت یا اس مادی دنیا میں معاشی مشکلات کے حل کے لیے شفاعت۔

ظاہر یہی ہے کہ مشرک کا شرکیہ اعمال میں پس منظر اس دنیا میں معاشی مشکلات ہوتی ہیں۔ عزت وجاہ کے لیے کاروبار میں فروغ کے لیے اور اولاد کے لیے مصائب وآفات سے بچنے کے لیے۔ امام حسن نے آیت قرآنی سے یہی بات سمجھی ہے کہ شفاعت سے مراد اس مادی دنیا میں شفاعت ہے۔ اور جن لوگوں نے آخرت میں شفاعت کو آیت قرآنی کا مدلول بنایا ہے ان کو بھی قیامت کے بارے میں مشرکین کی ذہنی اقتاد کو دیکھتے ہوئے بات بنانی پڑی ہے کہ اگر بالفرض قیامت آتی ہے اور ہمارا حساب وکتاب ہوتا ہے تو یہ ہستیاں ہماری شفاعت کریں گی۔

وَمَا كَانَ النَّاسُ إِلَّآ أُمَّةً وَّاحِدَةً فَاخْتَلَفُوْا ۭ وَلَوْلَا كَلِمَةٌ
سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ فِيْمَا فِيْهِ يَخْتَلِفُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَ
يَقُوْلُوْنَ لَوْلَآ أُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيَةٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ۚ فَقُلْ إِنَّمَا الْغَيْبُ
لِلّٰهِ فَانْتَظِرُوْا ۚ إِنِّيْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِيْنَ ﴿۲۰﴾

ع ۱۰

پوری انسانیت تو ایک ہی امت تھی پھر وہ الگ الگ ہو گئے ۲۶؎ اور اگر تیرے رب کی جانب سے پہلے ہی ایک بات نہ ہوئی ۲۸؎ ہوتی تو ان کے باہمی کا اختلاف کا فیصلہ ہو چکا ہوتا ۲۹؎ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں اس پیغمبر پر اس کے رب کی جانب سے کوئی نشانی نہیں اتاری گئی ہے تو اے پیغمبر کہدو کہ غیب کا علم تو صرف اللہ ہی کو ہے بس انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں ۳۰؎

مفردات کے معانی

امۃ جماعت، مدت طریقہ دین، ہر وہ جماعت جس میں کسی قسم کا رابطہ اشتراک ہوا ہے

امت کیا جاتا ہے اخفش نے تصریح کی ہے کہ امت باعتبار لفظ کے واحد ہے اور باعتبار معنی کے جمع ہے۔ نیز حیوان کی ہر جنس ایک امت ہے ابن درستویہ کا بیان ہے جہاں بھی امت کے معنے مدت کے ہوں وہاں اس کا مضاف محذوف ہو گا اور مضاف الیہ مضاف کے قائمقام ہوگا امت کے مجازی معنی طریقہ اور دین کے بھی آتے ہیں عرب والے بولتے ہیں کہ فلان لا امۃ لہ فلانے کا کوئی دین اور طریقہ نہیں ہے۔

سبقت سبق سے ماضی کا واحد مؤنث غائب ہے اس کا باب ضرب ہے اسی سے مسابقہ۔ استباق آتے ہیں پہلے ہونا۔ پہلے گذر جانا یعنی اللہ کی طرف سے بات پہلے ہو چکی ہے۔ اصلی معنے چلنے میں آگے ہونے کے ہیں۔

آیۃ نشانی۔ حکم خداوندی پیغام الٰہی، دلیل، اور معجزہ۔ آیت کے اصل معنی ظاہری نشانی کے ہیں۔ اور اسی معنی کے اعتبار سے قرآن عزیز کی آیت کو آیت کہتے ہیں کہ وہ گویا بات کے ختم ہونے کی نشانی ہے اور بعض اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ چونکہ آیت کے معنے جماعت کے ہیں اور آیت قرآنی میں حروف کا مجموعہ ہوتا ہے اس لیئے اس کو آیت کہتے ہیں۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ چونکہ یہ اعجاز قرآنی کی نشانی ہے اس لیے آیت کہہ دیا گیا ہے۔

توحید کے لیے تاریخی شہادت

ابتدا میں انسانی جمعیت کا یہ حال تھا کہ لوگ قدرتی زندگی بسر کرتے تھے ان میں نہ تو کسی طرح کا باہمی اختلاف تھا نہ کسی طرح کی مخاصمت سب کی زندگی ایک ہی طرح کی تھی اور سب اپنی قدرتی سادگی پر قانع تھے پھر ایسا ہوا کہ نسل انسانی کی کثرت اور ضروریات معیشت کی وسعت سے طرح طرح کے اختلافات پیدا ہو گئے اور اختلافات نے تفرقہ و انقطاع اور ظلم و فساد کی صورت اختیار کر لی۔ ہر گروہ دوسرے گروہ سے نفرت کرنے لگا۔ اور ہر زبردست زیردست کے حقوق پامال کرنے لگا جب یہ صورت حال ہوئی تو ضروری ہوا کہ نوع انسانی کی ہدایت اور عدل وصداقت کے قیام کے لیے وحی الٰہی کی روشنی رونما ہو۔ چنانچہ روشنی نمودار ہوئی اور اللہ کے رسولوں کی دعوت و تبلیغ کا سلسلہ شروع ہو گیا وہ تمام رہنما جن کے ذریعے اللہ کی جانب سے ہدایت آئی ہے ان کو اللہ کا رسول کہا گیا۔

یہ ہدایت کسی خاص ملک و قوم یا عہد کے لیے مخصوص نہ تھی بلکہ تمام نوع انسانی کے

یہ تھی۔
اللہ سبحانہ کی وحی کی رہنمائی سب جگہ ایک ہی ہے وہ ایک سے زیادہ نہیں ہو سکتی ایک
ہی ہے اور ایک ہی طرح تمام انسانوں کو مخاطب کرتی ہے۔ اللہ سبحانہ کے جس قدر فرستادے
آئے ہیں خواہ وہ کسی گوشے اور کسی زمانے میں سب کی راہ ایک تھی سب کی پکار ایک تھی اور سب
اللہ سبحانہ کے ایک ہی عالمگیر قانون سعادت کی تعلیم دینے والے تھے۔ قانون صرف یہ بتانے
آئے تھے کہ ایمان اور عمل صالح سے ہمدوش ہو اور ایک پروردگار عالم سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو
اس کے علاوہ اور اس کے خلاف جو کچھ بھی دین کے نام سے کہا جاتا ہے وہ دین حقیقی نہیں بناوٹی ہے
۲۸ لے پوری انسانیت تو ایک ہی امت تھی وہ الگ الگ ہو گئے ممکن تھا کہ مشرکین
کہتے کہ اللہ نے تمہارے دین میں منع کیا ہو گا ہمارے دین میں منع نہیں کیا گیا۔ اس کا جواب دے
دیا کہ اللہ کا دین ہمیشہ سے ایک ہے اعتقادات حقہ میں کوئی فرق نہیں۔ درمیان میں جب لوگ
بہک گئے اور جدا جدا ہو گئے۔ اللہ سبحانہ نے ان کو سمجھانے اور دین حقیقی پر لانے کے لیے انبیاء
روانہ کیے۔ کسی زمانہ اور کسی ملت میں اللہ نے شرک کو جائز نہیں رکھا لہ قرآن بتانا یہ چاہتا
ہے کہ اللہ سبحانہ نے تمہیں ایک ہی جامہ انسانیت دیا تھا لیکن طرح طرح کے بھیس اور نام
اختیار کر لیے اور رشتہ انسانیت کی وحدت سینکڑوں ٹکڑوں میں بکھر گئی۔ تمہاری نسلیں
بہت سی ہیں اس لیے تم نسل کے نام پر ایک دوسرے الگ ہو گئے۔ تمہارے وطن بہت
بن گئے ہیں اس لیے اختلاف وطن کے نام پر ایک دوسرے سے لڑ رہے ہو۔ تمہاری قومیتیں
بے شمار ہیں اس لیے ہر قوم دوسری قوم سے دست و گریبان   ہو رہی ہے ہو۔ تمہارے
رنگ یکساں نہیں یہ بھی باہمی نفرت و عناد کا ایک بہت بڑا ذریعہ ہے تمہاری بولیاں مختلف
ہیں اور یہ بھی ایک دوسرے سے جدا ہونے کی بہت بڑی حجت بن گئی۔ ان بے شمار اختلافات
کی دلدل میں تم پھنسے ہوئے   ہو اور ایک دوسرے سے نفرت کرتے ہو ایسی حالت میں بتلاؤ
وہ رشتہ کونسا رشتہ ہے جو اختلافات کے اس ہجوم میں انسانوں کو ایک دوسرے سے
جوڑ دے اور انسانیت کا بکھرا ہوا گھرانہ پھر از سر نو آباد ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ وہ
صرف ایک رشتہ ہے وہ اللہ سے عابدانہ تعلقات کا رشتہ ہے آؤ سب اس ایک رشتہ

لہ افادات شیخ الاسلام

بڑھ جاؤ تم کتنے ہی الگ الگ ہو گئے ہو لیکن تمہارے لیے اللہ سبحانہ کی ذات الگ نہیں ہو سکتی تم سب ایک ہی رب کے بندے ہو تم سب کی پرستش اور بندگی کے لیے ایک ہی معبود کی چوکھٹ ہو قرآن نے یہی بات کہی ہے ذالکم اللہ ربکم فاعبدوہ اور یہودیوں اور عیسائیوں سے کہی ہے تعالوا الی کلمۃ سواء بیننا و بینکم ان لا نعبد الا اللہ۔ بے شمار اختلافات رکھنے پر بھی ایک ہی رشتہ عبودیت میں جکڑے ہوئے ہو تمہاری کوئی نسل ہو تمہاری کوئی قومیت ہو تمہارا کوئی وطن ہو اور تمہاری کوئی زبان ہو لیکن ایک اللہ کے آگے سر نیاز جھکا دو گے تو یہ آسمانی رشتہ تمہارے زمینی اختلافات مٹا دے گا۔ تم محسوس کرو گے کہ تمام دنیا تمہارا وطن ہے تمام نسل انسانی تمہارا گھرانا اور تم ایک رب العالمین کے بندے ہو۔ سب نبیوں کی یہی تعلیم تھی کہ اللہ سبحانہ سے عابدانہ رشتے پر قائم رہو اور اس میں ایک دوسرے سے الگ الگ نہ ہو جاؤ۔

ہجوم اختلافات میں آخری فیصلہ

۲۹ اور اگر تیرے رب کی جانب سے پہلے ہی ایک بات نہ ہو ئی ہوتی تو ان کے باہمی اختلاف کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ یعنی لوگوں کے باہمی اختلافات کا فیصلہ زبردستی اس لیے نہیں کیا کہ پہلے سے اللہ سبحانہ کے علم میں یہ بات طے شدہ تھی کہ یہ دنیا دار عمل موقع واردات ہے قطعی اور آخری فیصلہ کی جگہ نہیں ہے یہاں انسانوں کو کسب و اختیار دے کر قدرے آزاد چھوڑ دیا گیا ہے کہ وہ جو راہ عمل چاہیں اختیار کریں۔ اگر یہ بات پہلے طے نہ ہو چکی ہوتی تو سارے اختلافات کا فیصلہ مکدم کر دیا جاتا[1] حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ

> اگر اللہ سبحانہ کی جانب سے پہلے یہ بات طے شدہ نہ ہوتی کہ اللہ سبحانہ کسی کو قیام حجت کے بغیر اور ہر کام کے لیے تاجیل کا قانون نہ ہوتا تو ان کے اختلافات کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔

بتانا یہ ہے کہ اگر اللہ سبحانہ کا نظام قانونی نہ ہوتا بلکہ ہنگامی اور وقتی حالات کے تابع ہوتا تو ان کے اختلافات کو بزور مٹا دیا جاتا اس کا قانون ان کو فرصت پر فرصت دیتا ہے اور اسپر فضل و عفو

[1] افادات شیخ الاسلام

درگذر کا دروازہ آخر تک کھلا رکھتا ہے بلاشبہ اس کے قوانین اپنے نفاد میں اٹل ہیں ان میں رد و بدل کا امکان نہیں۔ اللہ سبحانہ کی اگر مشیت ہوتی تو ہر حالت بیک دفعہ ظہور میں آجاتی اور اس کے قوانین کا نفاذ فوری اور ناگہانی ہوتا لیکن اللہ سبحانہ نے ہر حالت ہر تاثیر کے ظہور کے لیے ایک خاص مدت مقرر کر دی ہے اور ضروری ہے کہ بتدریج درجہ بدرجہ مختلف منزلیں پیش آئیں اس کا قانون یہ ہے کہ وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا۔

اہلِ ایمان معجزات طلب نہیں کرتے

۲۰؎ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اس پیغمبر پر اس کے رب کی جانب سے کوئی نشانی نہیں اتاری گئی ہے تو اے پیغمبر کہہ دو کہ غیب کا علم تو صرف اللہ کو ہے بس انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں یعنی جن نشانیوں کی وہ فرمائش کرتے تھے ان میں سے کوئی نشانی کیوں نہیں اتاری گئی۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ صداقت کے نشان پہلے بہت دیکھ چکے ہو فرمائشی نشان دکھلانا ضروری نہیں ہے نہ چنداں مفید ہے آئندہ جو اللہ سبحانہ کی مصلحت ہوگی وہ نشان دکھلائے گا اس کا علم خدا ہی کو ہے کہ مستقبل میں کس شان اور نوعیت کا نشان ظاہر کرے گا سو تم منتظر رہو۔ ہم بھی انتظار کرتے ہیں موضح القرآن میں ہے یعنی اگر کہیں کہ ہم کاہے سے جانیں کہ تمہاری بات سچ ہے فرمایا کہ آگے دیکھو حق تعالیٰ اس دین کو روشن کرے گا اور مخالف ذلیل ہوں گے برباد ہو جائیں گے سو ایسا ہی ہوا سچ کی نشانی ایک بار کافی ہے اور ہر بار مخالف ذلیل ہوں تو فیصلہ ہو جائے حالانکہ فیصلہ کا دن دنیا میں نہیں ہے[1] دوسرے لفظوں میں اس کی وضاحت یہ ہے کہ اس بات کی نشانی کہ آپ واقعی نبی ہیں اور اللہ سبحانہ کی جانب سے جو کچھ پیش فرما رہے ہیں بالکل درست ہے حضور اقدس کے مخاطبوں کا یہ مطالبہ کچھ اس لیے نہ تھا کہ وہ سچے دل سے دعوت حق کو قبول کرنے اور اس کے تقاضوں کے مطابق اپنی پوری زندگی کو ڈھال لینے کے لیے تیار تھے بلکہ نشانی کا مطالبہ محض ایمان نہ لانے کے لیے ایک بہانہ کے طور پر پیش کر رہے تھے جو نشانی بھی پیش کی جاتی اس کے بعد یہی کہتے کہ کوئی نشانی تو پیش نہیں کی گئی۔ کیونکہ وہ ایمان ہی لانا نہیں چاہتے تھے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مادی آسائشوں کو چھوڑ کر وہ ایسی غیبی حقائق کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے جنہیں مان لینے کے بعد ان کو سارا نظام زندگی تبدیل کرنا پڑتا۔

آیات نبوت کی دو قسمیں

اصل یہ ہے کہ آیات نبوت دو قسم کی ہوتی ہیں ایک ظاہری اور مادی دوسری باطنی و روحانی۔ ظاہری تو وہ دلائل ہیں جنکو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں شلاً مردہ کا زندہ کرنا عصا کا سانپ بن جانا اور باطنی دلائل مدعی نبوت کی صداقت، معصومیت تزکیہ تاثیر، تعلیم، ہدایت ارشاد فلاح اور تائید ہے اہل نظر اور حقیقت شناسوں کے لیے یہی باطنی آثار و آیات نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں۔ باقی ظاہری نشانیاں صرف سطحی اور ظاہر بین نگاہوں کے لیے ہیں جو ہر چیز کو ان ظاہری آنکھوں سے دیکھ کر پہچانتی ہیں امام بخاری نے اپنی صحیح کے دیباچہ میں نبی کی تعریف کرنے کے بعد جو نبی شناسی کے پیمانے بتائے ہیں وہ سب باطنی نشانیاں ہیں اور یہ بتایا ہے کہ حقیقت شناس صرف باطنی نشانیوں کے طلب گار ہوتے ہیں ان باطنی نشانیوں میں سب سے پہلے خدیجۃ الکبری کی یہ شہادت نقل کی ہے۔

آپؐ تو صلہ رحمی کرتے ہیں۔ آپؐ تو معاشرے میں گھرے ہوئے افراد کو اٹھاتے ہیں۔ آپ تو فقراء کے لیے کماتے ہیں آپ تو مہمان نوازی کرتے ہیں آپ تو حق پر آنے والے مصائب پر لوگوں کا ہاتھ بٹاتے ہیں یہ حضرت خدیجہ کا بتایا ہوا اخلاقی پیمانہ ہے۔ اس کے بعد حضرت خدیجہ حضور اقدس کو ورقہ ابن نوفل کے پاس لے گئیں، ورقہ نے غار حرا کی داستان سن کر کہا کہ هذا هو الناموس الذی نزل الله علی موسیٰ یہ تو وہی ناموس ہے جو حضرت موسیٰ پر وحی لے کر آتا تھا۔ یہ ورقہ کا بتایا ہوا نوعی پیمانہ ہے اس کے بعد امام بخاری نے بادشاہ روم کا پیش کیا ہوا پیمانہ پیش کیا ہے جس میں بادشاہ روم نے حضور کے شدید ترین مخالف سے سوالات کیے ہیں جس کے جوابات ابوسفیان نے دیئے ہیں مثلاً

قیصر: مدعی نبوت کا خاندان کیسا ہے؟	ابوسفیان	شریف ہے
″ خاندان میں کسی نے نبوت کا دعویٰ کیا ہے؟	″	نہیں
″ خاندان میں کوئی بادشاہ ہوا ہے؟	″	نہیں
″ اس کے پیروکار کون لوگ ہیں؟	″	کمزور ہیں

قیصر: وہ بڑھ رہے ہیں گھٹ رہے ہیں؟	ابوسفیان:	بڑھ رہے ہیں
" کبھی اس کے جھوٹ کا تجربہ کیا ہے؟	"	نہیں
" عہد کی خلاف ورزی کبھی کی ہے؟	"	ابھی تک تو نہیں
" کبھی اس سے جنگ کی ہے؟	"	ہاں
" نتیجہ کیسا رہا؟	"	کبھی وہ غالب اور کبھی ہم
" وہ کیا سکھاتا ہے	"	کہتا ہے کہ ایک اللہ کی عبادت کرو کسی کو شریک نہ بناؤ، نماز پڑھو پاکدامنی اختیار کرو، سچ بولو، صلہ رحمی کرو۔

یہ تمام سوالات صرف پیغمبر کے حقیقی آثار سے متعلق ہیں اور یہ علمی وعقلی پیمانہ ہے۔ امام بخاری بتانا چاہتے ہیں یہ نبی شناسی کے اصلی پیمانے ہیں۔ الغرض نبوت کی حقیقت ظاہری اور مادی نشانی نہیں بلکہ باطنی اور روحانی خوبیاں نبوت کی نشانیاں ہیں۔

ظاہری اور مادی نشانیاں صرف وہ معاندین طلب کرتے ہیں جن کے دل کی آنکھیں اندھی ہوتی ہیں اور جو تعصب وعناد اور جہل کے باعث حق کے ماننے کے لیے تیار نہیں ہوتے اس دور کے اہل ایمان کے حالات پر غور کرو کہ معجزات کی طلب نیکوکاروں نے نہیں کی۔ حضور اقدس سے ابوبکر و عمر نے نہیں بلکہ ابوجہل والولہب نے معجزہ مانگا۔ قرآن عزیز نے اس حقیقت کو پوری طرح الم نشرح کیا ہے اور طلب معجزہ کے سوال کو ہمیشہ کفار کی طرف منسوب کیا ہے۔

ایک خلش اور اس کا ازالہ

کفار کا یہ مطالبہ لولا انزل علیہ اٰیۃ من ربہ پڑھ کر بعض نادان یہ سمجھتے ہیں کہ حضور اقدس نے ان کو کوئی معجزہ نہیں دکھایا اگر وہ کوئی معجزہ دیکھ لیتے تو بار بار معجزہ کے لیے اصرار کیوں کرتے؟ لیکن یہ استدلال سرتاسر غلط ہے ان کو نفس معجزہ طلب کرنے پر نہیں بلکہ مادی اور ظاہری معجزہ طلب کرنے پر تنبیہ کی گئی ہے۔ اور بتایا گیا ہے کہ نشانیوں کے ظاہر ہونے پر بھی یہ عناد سے طلب معجزہ پر مصر ہیں۔ چنانچہ ان تمام مقامات پر جہاں کفار کے اس طلب معجزہ کا ذکر ہے یہ تصریح موجود ہے اور انہیں یہ ہدایت کی گئی ہے کہ ان کو چاہیے کہ نبوت کے اصلی آثار و

علامات کی طرف توجہ کریں کہ سعادت مند دلوں کی تسلی ان ہی سے ممکن ہے۔

معجزات مادی تو بہر حال کسی نہ کسی آنی زمانہ اور مخصوص وقت میں ظاہر ہوتے ہیں اور اس دنیا کے دوسرے حوادث کی طرح فنا ہو جاتے ہیں اس بنا پر اگر ہر معاند کے سوال پر نبوت معجزہ ہی دکھاتی رہے تو یہ تسلسل شائد کبھی ختم نہ ہو۔ اور نبوت کی ساری زندگی ایک مداری کی حیثیت اختیار کرے۔ اس نے ظاہری معجزہ طلب کرنے والوں کو دائمی اور مسلسل معجزہ کی طرف ملتفت ہونے کی تاکید کی جاتی ہے۔

اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتاب یتلی علیھم

کیا ان کو یہ کافی نہیں ہے کہ ہم نے تجھ پر کتاب نازل کی جو انکو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

نفسیات انسانی کا خاصہ ہے کہ جب کسی کی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حسن ظن پر محمول نہیں کر سکتا اور اس کو اس کی ہر چیز میں شر، خبث اور بدی نظر آتی ہے جلی سے جلی اور واضح سے واضح برہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دور نہیں کر سکتے۔ معاندین جو انبیاء کے مکارم اخلاق حسن تعلیم اور دیگر علمی و عملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعوؤں کو تسلیم کرنے کے لیے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کو سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لاعلاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو آخر الحیل کے طور پر وہ نبی سے خارق عادت معجزے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور چونکہ ان کو بدگمانی سے یہ یقین ہوتا ہے کہ ہماری ہی طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسی عجیب و غریب چیز پر قادر نہیں ہوتا اس لیئے وہ کبھی کوئی خارق عادت امر پیش نہ کرے گا اور اس طرح اس کی رسوائی ہو جائے گی لیکن اللہ سبحانہ آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے معجزات اور خوارق بھی پیش کر دیتا ہے تاہم ان کو دیکھ کر بھی معاندانہ روح ان کے دلوں میں پیغمبر کی سچائی کا اعتبار نہیں پیدا ہونے دیتی اور بدگمانی ان کو بتاتی ہے کہ خدائی کارنامہ نہیں بلکہ یہ سحر اور جادو ہے۔

عقیدہ معجزات کی اصلاح

اس آیت کا بنظر غور مطالعہ کرنے سے یہ حقیقت واضح اور نمایاں ہو جاتی ہے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں ان ظاہری معجزات کی چنداں وقعت نہیں وہ لوگوں کو ہمیشہ اصل روح نبوت کی طرف متوجہ کرتا ہے ان ظاہری معجزات نے گزشتہ قوموں میں بہت سے فاسد عقیدے پیدا کر

دیئے تھے جن انبیاء سے بکثرت معجزات صادر ہوئے ان میں الوہیت اور کارسازی کا تصور قائم کر لیا گیا اور اس طرح توحید و نبوت کی اصل حقیقت آنکھوں سے اوجھل ہو گئی قرآن عزیز نے نہایت وضاحت اور پوری قوت سے ان غلطیوں کا پردہ چاک کیا اور دنیا میں توحید و نبوت کی اصل حقیقت اس استواری اور مضبوطی کے ساتھ قائم کر دی کہ آئندہ فساد اور سوء عقیدہ کے سیلاب سے اس کو گزند پہنچنے کا خطرہ باقی نہ رہے۔

سب سے پہلے اس نے یہ حقیقت واضح کی کہ نبوت اور ظاہری معجزات میں کوئی تلازم نہیں ہے اور یہ آثار و دلائل اصل نبوت سے خارج ہیں نبوت کے اصل لوازم وحی، مخاطبہ الٰہی تزکیہ، انذار، تبشیر تعلیم اور ہدایت ہیں جیسا کہ ان کی تفصیل اس سورت میں پہلے گذر چکی ہے اس بنا پر معاندین نے معجزہ طلب کیا تو قرآن حکیم نے اس کے جواب میں نبوت کی اصل حقیقت کی طرف ان کو متوجہ کیا ہے کہیں فرمایا انما الآیات عند اللہ و انما انا نذیر مبین اور ارشاد ہوا انما انت منذر۔ قرآن عزیز نے نہایت وضاحت اور تکرار سے اس حقیقت کو کھول کر پیش کیا کہ اللہ کا نبی انسان اور خالص انسان ہوتا ہے اس میں الوہیت کا کوئی شائبہ نہیں ہوتا ہے انما انا بشر مثلکم یوحی الی۔ یہاں بھی قرآن نے اسی حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے فقل انما الغیب للہ میں غیب دان نہیں ہوں غیب دانی اور قدرت کاملہ خاصہ الوہیت ہیں اسی فقرے میں نبوت کے بارے میں اس غلط عقیدے کی بھی اصلاح کر دی کہ نبی براہ راست عالم کائنات میں تصرف پر قادر ہے موجودہ اناجیل کے مصنفین نے حضرت عیسٰی کے معجزات کو جس انداز میں پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ یہ ساری کائنات حضرت عیسٰی کے قبضہ و قدرت میں ہے جو چاہیں وہ کر سکتے ہیں یہی بنیادی چیز ہے جس پر ان کے سارے دین کی عمارت کھڑی ہے قرآن نے انما الغیب للہ کہہ کر نہایت شدت اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادے سے نہیں بلکہ اللہ سبحانہ کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتے ہیں۔ انجیل میں حضرت عیسٰی کے معجزات جس انداز میں پیش کئے گئے ہیں ان کا صاف منشا یہ ہے کہ گویا حضرت عیسٰی کو ساری کائنات کی بادشاہی سپرد ہے لیکن قرآن نے یہاں انما الغیب للہ کہہ کر اس عقیدہ کی تردید کی ہے۔ قرآن عزیز کی اس تصریح اور اظہار حقیقت کا اثر ہے کہ اسلام میں توحید اور نبوت کی حقیقتیں کھلی اور واضح ہیں اور حضور اقدس صلی اللہ

علیہ وسلم میں الوہیت کا کوئی ادنی سا شائبہ بھی مسلمانوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔

ٹھہر جائیے مخالبوں کے معجزے کے مطالبہ کے جواب میں انما الغیب للہ کی گہرائی پر غور کیجئے۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے اس میں لفظ انما جملہ کی پیشانی پر لگا ہوا ہے اس کا کام قصر ہے یعنی یہ صفت اس موصوف کے سوا کہیں نہیں پائی جاتی ہے جیسے انما اللہ الہ یعنی الوہیت کی صفت صرف اللہ میں ہے اللہ کے سوا کسی میں نہیں ہے مطلب یہ ہے کہ غیب کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں ہے، جیسے انما کے ذریعے عربی زبان میں قصر ہوتا ہے ایسے ہی لا اور الا کے ذریعے بھی قصر ہوتا ہے جیسے لا الہ الا اللہ یعنی الوہیت کی صفت اس کائنات میں اللہ کے سوا کسی میں نہیں ہے یہ انداز تعبیر بھی غیب کی نفی میں قرآن میں موجود ہے لا یعلم من فی السماوات والارض الغیب الا اللہ یعنی اللہ کے سوا دانائے غیب کوئی نہیں ہے مخلوق تو صرف اس قدر جانتی ہے جتنا اللہ سبحانہ اپنے علم غیب سے جس قدر بتانا ناپسند کرتا ہے اور مصلحت سمجھتا ہے اور لیس لا یحیطون بشیئ من علمہ الا بما شاء وہ ان کو بذریعہ وحی واقف کرتا ہے عقل کا تقاضا بھی یہی ہے غیب نام ہے اس علم کا جو دلائل وسائل اور قرائن سے نہیں بلکہ خود بخود ہو ظاہر ہے کہ خود بخود علم اسی کا ہوگا جس کی ذات خود بخود ہو۔ اللہ سبحانہ کی ذات خود بخود ہے اس کا علم خود بخود ہے۔ انسانی علم کے طبعی ذرائع وجدان، حواس عقل اور استدلال وغیرہ ہیں ان طبعی ذریعوں سے جو علم حاصل نہیں ہوتا ہے وہی علم غیب ہے غیب کا متقابل شہادت ہے جس کے معنے حاضر ہونے کے ہیں یعنی وہ اشیاء جو ہر انسان کے حواس اور قوائے دماغی کے سامنے ہیں اسی لئے اللہ سبحانہ نے اپنے آپ کو بار بار عالم الغیب والشہادۃ کہا ہے یعنی انسانوں کے طبعی ذرائع علم کیلئے جو کچھ حاضر ہے اور جو کچھ غائب ہے ان سب کا عالم اور واقف کل ہے۔ الغرض اجمالاً علم غیب اسی غیبی طریقہ علم کا نام ہے جو عام انسانوں کی دسترس سے بالا ہے۔

قرآن میں غیب چار چیزوں کے لیے بولا گیا ہے۔

اولاً ماضی کے واقعات جیسے حضرت نوح کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا تلک من انباء الغیب نوحیہا الیک یہ غیب کی خبریں ہیں جن کی ہم آپ کو بذریعہ وحی اطلاع

دے رہے ہیں حضرت مریم کا واقعہ بیان کرنے کے بعد فرمایا ذالك من انباء الغیب
نوحیه الیك یہ غیب کی خبریں ہیں جو بذریعہ وحی ہم آپ کو تبا رہے ہیں۔
ثانیاً مستقبل میں ہونے والے واقعات کی اطلاع کو بھی غیب کہا گیا ہے جیسے زیر تشریح
آیت میں ہونے والے معجزات کے بارے میں فرمایا فقل انما الغیب للہ مستقبل کے
منتظرہ واقعات کو اس آیت میں غیب کہا ہے ۔

ثالثاً ان چیزوں پر بھی غیب بولا گیا ہے جو اگرچہ ماضی اور مستقبل نہیں بلکہ زمانہ حال میں موجود
ہیں تاہم انسان کو حواس خمسہ اور عقل کی محدود طاقت سے ان کا علم نہیں ہو سکتا حاملہ عورت
سامنے موجود ہے مگر پیٹ میں کیا ہے مذکر یا مونث۔

رابعاً عالم غیب کی آخری چیز وہ امور ہیں جو غیر مادی ہونے کی وجہ سے ہمارے حواس اور
عقل کے دائرہ عمل سے باہر ہیں۔ ہم فرشتوں کو نہیں دیکھتے اللہ سبحانہ کے دیدار کی ہم صلاحیت
نہیں رکھتے جنت، دوزخ ہم کو نظر نہیں آسکتی۔ یہ تمام امور غیب ہیں۔
نبوت کو اللہ سبحانہ غیب کی جن باتوں سے آگاہ کرتا ہے وہ ان چاروں قسموں سے
متعلق ہوتے ہیں۔

خلاصہ یہ ہے کہ قرآن نے حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں کو بتایا ہے کہ آپ ان
سے فرما دیجئے کہ معجزہ لانا میرا کام نہیں ہے میں تو خبردار کرنے والا ہوں رہی یہ بات کہ نشانی کب
اور کس شکل میں آئے گی تو یہ امور غیب ہیں ان کا علم صرف اللہ سبحانہ کو ہے فانتظروا انی
معکم من المنتظرین اگر تم اس کے طلب گار ہو تو انتظار کرو میں بھی انتظار میں ہوں
میں بھی انتظار میں ہوں کا مطلب یہ ہے کہ میں بھی دیکھوں گا کہ تمہاری یہ ضد پوری کی جاتی ہے
یا نہیں۔ جو کچھ اللہ سبحانہ نے نازل کیا ہے وہ تو میں پیش کر چکا ہوں اور جو نہیں اتارا وہ میرے
اور تمہارے لیے غیب ہے جس پر اللہ سبحانہ کے سوا کسی کا اختیار نہیں ہے وہ چاہے تو
اتارے نہ چاہے تو نہ اتارے اب اگر تمہارا مجھے نبی ماننا اسی پر موقوف ہے کہ جو کچھ
اللہ سبحانہ نے نہیں اتارا ہے وہ اترے تو اس کا انتظار کرو۔ میں اس میں تمہارا
مخالف نہیں ہوں اگر کوئی نشانی ایسی ظاہر ہو جائے جو تمہاری ہدایت کا ذریعہ
بنے تو میں بھی تمہارے ساتھ ہوں۔ اور کچھ محققین سے علامہ آلوسی نے یہ بات لطیف نقل
کی ہے کہ

نشانی پر تمہارا اصرار اور یہ خیال کہ آیت و نشانی لوازم نبوت سے ہے اور اس
کے ہونے پر تمہارا اپنے ایمان کو موقوف کرنا اس کا مجھے تو کوئی پتہ نہیں
ہے تم تو نشانی کے اترنے کا انتظار کرو میں تمہاری اس بے باکی اور جرأت پہ
اللہ کی جانب سے تم سے ہونے والے سلوک کا انتظار کرتا ہوں۔

وَإِذَآ أَذَقْنَا
النَّاسَ رَحْمَةً مِّنۢ بَعْدِ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُمْ إِذَا لَهُم مَّكْرٌ فِىٓ
ءَايَاتِنَا ۚ قُلِ اللَّهُ أَسْرَعُ مَكْرًا ۚ إِنَّ رُسُلَنَا يَكْتُبُونَ مَا تَمْكُرُونَ ﴿٢١﴾
هُوَ الَّذِى يُسَيِّرُكُمْ فِى الْبَرِّ وَالْبَحْرِ ۖ حَتَّىٰٓ إِذَا كُنتُمْ فِى الْفُلْكِ ۚ
وَجَرَيْنَ بِهِم بِرِيحٍ طَيِّبَةٍ وَفَرِحُوا۟ بِهَا جَآءَتْهَا رِيحٌ عَاصِفٌ
وَجَآءَهُمُ الْمَوْجُ مِن كُلِّ مَكَانٍ وَظَنُّوٓا۟ أَنَّهُمْ أُحِيطَ بِهِمْ ۙ
دَعَوُا۟ اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۚ لَئِنْ أَنجَيْتَنَا مِنْ هَٰذِهِۦ
لَنَكُونَنَّ مِنَ الشَّٰكِرِينَ ﴿٢٢﴾ فَلَمَّآ أَنجَىٰهُمْ إِذَا هُمْ يَبْغُونَ
فِى الْأَرْضِ بِغَيْرِ الْحَقِّ ۗ يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِنَّمَا بَغْيُكُمْ عَلَىٰٓ أَنفُسِكُم ۖ
مَّتَٰعَ الْحَيَوٰةِ الدُّنْيَا ۖ ثُمَّ إِلَيْنَا مَرْجِعُكُمْ فَنُنَبِّئُكُم بِمَا كُنتُمْ
تَعْمَلُونَ ﴿٢٣﴾

اور جب ہم لوگوں کو تکلیف کے بعد اپنی رحمت کا مزہ چکھا
دیتے ہیں تو فوراً ہماری قدرت کی نشانیوں میں اپنی دقیقہ
سنجیوں سے کام لینے لگتے ہیں آپ فرما دیجئے اللہ سبحانہ ان

دقیقہ سنجیوں میں سب سے زیادہ تیز ہے۔ ہمارے فرشتے تمہاری دقیقہ سنجیوں کو قلم بند کر رہے ہیں [۳۱] وہی تو ہے جس نے خشکی اور تری میں تمہارے چلنے کا سامان کر دیا ہے تاآنکہ جب تم سمندر میں جہازوں میں سفر کرتے ہو اور جہاز ان کو موافق ہوائیں لے کر جا رہے ہوتے ہیں، جانے والے ہوائیں شاداں ہوتے ہیں کہ کچھ تیز و تند ہوا کے جھونکے نمودار ہو جاتے ہیں اور ہر طرف سے موجیں ہجوم کرنے لگتی ہیں اور مسافر خیال کرتے ہیں کہ وہ گھیرے میں آگئے ہیں تو اس وقت پورے طاعت کیے اخلاص کے ساتھ اللہ سبحانہ کو پکارنے لگتے ہیں۔ کہ یا اللہ اگر تو نے ہمیں اس سے بچا لیا تو ہم ضرور تیرے شکر گذار ہوں گے پھر جب اللہ سبحانہ ان کو بچا دیتا ہے تو وہ ملک میں ناحق سرکشی و بغاوت کرنے لگتے ہیں [۳۲] اے لوگو! تمہاری سرکشی اور باغیانہ روش کا نقصان تمہیں ہی ہوگا۔ دنیا کی زندگی سے خوب فائدہ اٹھا لو پھر تمہیں ہمارے حضور میں پیش ہونا ہے ہم تمہیں تمہارے

کرتوت بتائیں گے ۳۲

معانی مفردات

الدین اس کے متعدد معنے آتے ہیں اصلی معنے طاعت اور جزا کے آتے ہیں ملت کو بھی دین اسی لیے کہا جاتا ہے کہ اس کی طاعت کی جاتی ہے ومن احسن دینا میں لفظ دین طاعت ہی کے معنے میں ہے اور مالک یوم الدین میں لفظ دین جزا کے معنی میں ہے

بغی زیادتی، سرکشی مصدر ہے جہاں میانہ روی چاہیے وہاں میانہ روی سے بڑھنے کی خواہش کو بغی کہتے ہیں خواہ میانہ روی سے تجاوز عمل میں آیا ہو یا نہ آیا ہو بغی کیفیت اور کمیت یعنی مقدار و وصف دونوں سے تعلق رکھتا ہے. یعنی دو طرح کا ہوتا ہے ایک محمود جیسے عدل سے بڑھ کر احسان کرنا مزدور کو مزدوری دیتے رہے ہو تو اصل اجرت سے بڑھ کر اور زیادہ دو اور عبادات میں فرض کے مطالبہ سے بڑھ کر نوافل ادا کرنا دوسرا مذموم جیسے حق سے تجاوز کر کے باطل اختیار کرو۔ مزدور کو مزدوری کی جگہ گالیاں دینا یا فرائض عبادت میں بدعات کا اضافہ کرنا۔ قرآن میں لفظ بغی پانچ معنے میں آتا ہے ظلم. گناہ. حسد۔ زنا اور طلب و تلاش

زندگی کی کشتی آس اور یاس ہے

جب تک دنیوی زندگی میں اسباب وعلائق کا کوئی ادنیٰ سا اسرا بھی باقی رہتا ہے انسان کا وجدان بیدار نہیں ہوتا اسی حقیقت کو ایک عامۃ الورود واقعہ سے مثال دے کر سمجھایا ہے کہ جس طرح ایک کشتی کے مسافر سفر پر روانہ ہوتے ہیں جب ہوا موافق ہوتی ہے اور کشتی نہایت سکون سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتی تو سب کو آس ہوتی ہے اور سب سمجھتے ہیں کہ اب ان کی خوشی میں کوئی رخنہ اندازی نہیں کر سکتا۔ لیکن جونہی کسی گوشہ سے طوفانی ہوا اٹھتی ہے اور موجوں کے تھپیڑوں سے کشتی درخت میں لٹکا ہوا جھولا بن جاتی ہے اور آس یاس بن کر رہ جاتی ہے اور ہر ایک کا خیال ہو جاتا ہے کہ کشتی اب ڈوبی آس یاس کے وقت میں اللہ سبحانہ یاد آتا ہے اور سارے مشرکانہ اعمال سے الگ ہو کر سب اللہ سبحانہ سے دعا و فریاد کرتے ہیں اور یہ

عہد کرتے ہیں کہ اگر موت کے اس چکر سے نکل گئے تو ہم اللہ ہی کے ہوکر رہیں گے اور اس کے شکر گذار اور فرماں بردار رہیں گے لیکن جونہی زندگی کی جھلک نظر آتی ہے اور گرداب کے چکر سے بچتے ہیں تو پھر زندگی کو سرمستیوں اور شرارتوں کا محور بنا لیتے ہیں۔

معجزوں کے مطالبہ کرنے والوں کا اب یہی حال ہے اس وقت ان کی زندگی کی کشتی نہایت سکون سے چل رہی ہے حالات میں سازگاری ہے اس لیے شرارتوں میں مگن ہونے کی وجہ سے نشانیاں مانگ رہے ہیں۔

اللہ کا رسول ان کو اللہ سبحانہ کی گرفت سے ڈراتا ہے تو یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی ہے کہ اللہ سبحانہ کی گرفت کیسے آئے گی۔ بڑی دلیری سے نبوت کے منہ آرہے ہیں اور کہہ رہے ہیں لولا انزل علیہ ایۃ من ربہ لیکن جب اللہ کی گرفت آجائے گی تو ہم تو بہ توبہ کی چیخ و پکار سے فضا گونج اٹھے گی اور گرفت کی ڈوری ڈھیلی ہوتے ہی پھر وہی حالت ہو جائے گی۔

۲۱ے اور جب ہم لوگوں کو تکلیف کے بعد اپنی رحمت کا مزہ چکھا دیتے ہیں تو فوراً ہماری قدرت کی نشانیوں میں اپنی دقیقہ سنجیوں سے کام لینے لگتے ہیں آپ فرما دیجیے کہ اللہ ان دقیقہ سنجیوں میں سب سے زیادہ بہتر ہے ہمارے فرشتے تمہاری دقیقہ سنجیوں کو قلم بند کر رہے ہیں۔ اہل مکہ پر حق تعالیٰ شانہ نے سات سال کا قحط مسلط کیا سب ہلاکت کے قریب پہنچ گئے تو گھبرا کر حضور اقدس سے دعا کی درخواست کی اور وعدہ کیا کہ یہ عذاب اٹھ جائے تو ہم ایمان لے آئیں گے۔ آپ کی دعا سے اللہ سبحانہ نے آسان کر دیا۔ قحط کی بلا دور ہوئی تو پھر وہی شرارتیں کرنے لگے۔ اللہ سبحانہ کی آیتوں کو جھٹلاتے۔ اس کی قدرت و رحمت پر نظر رکھنے بلکہ انعامات الٰہیہ کو ظاہری اسباب و حیل اور محض بے اصل خیالات و اوہام کی طرف منسوب کرتے اس کا جواب دیا کہ اچھا تم کو اچھا تم خوب فریب اور حیلہ سازی کر لو مگر یہ یاد رہے کہ تمہاری حیلہ بازیاں ایک ایک کر کے لکھی جا رہی ہیں وہ سارا دفتر قیامت کے دن تمہارے سامنے ہوگا۔ پھر جب تمہاری کوئی حیلہ بازی فرشتوں سے مخفی نہیں ہے اللہ سبحانہ کے علم محیط سے کہاں باہر رہ سکتی ہے۔ تم اپنے مکر و حیلہ سازی پر مغرور رہو حالانکہ اللہ سبحانہ کا جوابی مکر خفی تدبیر تمہارے مکر و فریب سے کہیں زیادہ تیز ہے۔ وہ مجرم کی باگ اتنی ڈھیلی چھوڑ دیتا ہے کہ مجرم کو نشۂ غفلت میں چور ہو کر سزا کا تصور بھی نہیں آتا۔ جب پیمانہ شقاوت لبریز

ہو جاتا ہے تو دفعتہً پکڑ لیتا ہے، لہذا عقل مندی کا تقاضا یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی نرمی بردباری اور خوش کن حالات کو دیکھ کر مغرور نہ ہو نہ معلوم نرمی کے بعد کیسی سختی کے وقت آدمی کی نظر اسباب سے ہٹ کر صرف اللہ پر رہتی ہے جہاں سخت گھڑی گذری اور کام بن گیا پھر اللہ سبحانہ کو بھول کر اسباب پر آجاتا ہے ڈرتا نہیں کہ پھر اللہ سبحانہ ویسی ہی تکلیف اور سختی کا ایک سبب رونما کردے گا۔ اسی کے قبضہ قدرت میں سب اسباب کی باگ ہے چنانچہ آگے دریائی سفر کی مثال میں اس کی ایک صورت بیان کی ہے لہ

جس واقعہ کا شیخ الاسلام نے ذکر کیا ہے کہ اہل مکہ پر حق تعالیٰ شانہ نے سات سال کا قحط مسلط کردیا۔ یہ واقعہ صحیح بخاری اور صحیح مسلم حضرت عبداللہ بن مسعود کی زبانی اس طرح آیا ہے کہ جب قریش کی مخالفت بھرپور طریقہ پر سامنے آگئی اور دعوت کی ساری منزلیں ختم ہوگئیں تو آپ نے قریش کو بددعا دی کہ اے اللہ قریش کو سات سال تک قحط میں مبتلا رکھ جیسے تو نے حضرت یوسف کے زمانے میں سات سال تک مستقل قحط کو قائم رکھا تھا چنانچہ ان پر ایسا سخت قحط پڑا کہ لوگوں نے بھوک کے مارے مردار اور چمڑے کھائے یہاں تک کہ جب لوگ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو وہ ان کو دھوئیں کی طرح لگتا تھا۔ یہ حالت دیکھ کر ابو سفیان آپ کی خدمت میں آئے اور کہا کہ اے محمد تم اللہ سبحانہ کی اطاعت اور صلہ رحمی کا حکم دیتے ہو۔ حالانکہ تمہاری قوم تباہ ہو رہی ہے۔ اس کے لیے اللہ سبحانہ سے دعا کرو آپ نے دعا فرمائی اور بارش ہوئی جس نے قحط کی مصیبت کو دور کردیا۔ اس کے بعد پھر قریش نے حسب دستور آپ کی مخالفت شروع کی تو قیام مکہ کے زمانے میں اللہ نے آپ کی زبان سے یہ پیش گوئی قریش کو سنائی کہ آئندہ اس کا انتقام ایک اور سخت گرفت سے لیا جائے گا وہ گرفت بدر کی لڑائی کی صورت میں نمودار ہوئی۔ سورۃ دخان کی آیات اس قحط والے واقعہ کی طرف اشارہ ہے فارتقب یوم تاتی السماء بدخان مبین الخ یہ واقعہ ہجرت سے پہلے کا ہے۔ اور یہ ہجرت کی تمہید ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعا سے قحط سالی دور ہوئی مگر اس کے باوجود قریش کی سرگرانی کا وہی عالم ہوگیا تو ان کے لیے معجزہ عذاب کے سوا کوئی طریقہ علاج باقی نہیں رہا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بدر ان کے لیئے ہلاکت کی نشانی بن کر آیا۔ قرآن

لہ افادات شیخ الاسلام

نے ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں یہ اعلان سنا دیا تھا ضرار قحط سالی زمانے کے بعد رحمت خوش حالی آئی۔ خدا کا شکر کرنے کی جگہ تم بلا کے آنے اور دور ہونے کی متعلق قسم قسم کی توجیہیں اور تاویلیں کرنے لگے تاکہ راہ ایمان سے گریز پائی کے لیے موقعہ مل جائے یہی مطلب ہے اذا لھم مکر فی آیاتنا وہ ہماری نشانیوں میں چالبازیاں دکھا رہے تھے اور آگے اللہ اسرع مکرا اللہ سبحانہ ان باریکیوں میں زیادہ تیز ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر تم حقیقت کو نہیں مانتے اور اس کے مطابق اپنا رویہ درست نہیں کرتے تو وہ تمہیں اسی باغیانہ روش کے نتیجے میں بہت جلدی اور بڑی تیزی سے ایسے عذاب سے دوچار کرے گا کہ تمہارا نشہ اقتدار ہرن ہو کر رہ جائے گا یہ رؤسائے قریش کو بدر میں عذاب کی دھمکی دی ہے بدر رؤسائے قریش کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے جو فرعون کے لیے غرق بحر کی حیثیت تھی جو کچھ اقتدار کے نشہ میں مستی کرتی ہے کر و سب کچھ اللہ سبحانہ کے فرشتے خاموشی کے ساتھ بیٹھے لکھ رہے ہیں حتیٰ کہ وہ عذاب آجائے گا اور تم کرتوتوں کی پاداش میں دھر لیے جاؤ گے۔

جب غزوہ بدر کے لیے آپ مسلمانوں کے ساتھ اس وقت نکلے جیسا کہ سورہ انفال کی تفسیر میں پڑھ چکے ہو مسلمانوں کے سامنے قریش کی دو جماعتیں تھیں ایک قریش کا شامی قافلہ جو مدینہ کی راہ سے گذر کر مکہ جا رہا تھا دوسرا رؤسائے قریش کا جنگی لشکر جو مسلمانوں سے لڑنے کے لیے نکلا تھا۔ اللہ سبحانہ نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ دو جمعیتوں میں سے ایک ان کے ہاتھ لگے گی عام مسلمان یہی سمجھتے تھے کہ تجارتی قافلہ ان کے ہاتھ آئے گا لیکن حضور اقدس کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آج اللہ اسرع مکرا کی تفسیر کا دن ہے جس کا بارگاہ الٰہی میں مدت سے وعدہ تھا۔ اسی پڑاؤ پر جب رات کو مسلمان یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ قریش کا تجارتی قافلہ کہاں ہے تو ادھر ادھر مخبر روانہ کیے۔ کچھ مسلمان ایک چرواہے کو پکڑ کر لے آئے اور اس قریش کے قافلہ کا حال پوچھنے لگا اس نے جواب دیا کہ قافلہ کا تو مجھے علم نہیں ہے البتہ قریش کے لشکر کا مجھے پتہ ہے وہ یہاں پڑا ہے یہ سن کر مسلمانوں نے اسے مارا کہ صحیح بات نہیں بتاتا مار کھانے پر اس نے کہا کہ اچھا چھوڑ دو بتاتا ہوں۔ لوگ چھوڑتے تو پھر وہی کہتا کہ قافلہ کا مجھے پتہ نہیں البتہ لشکر ادھر ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نماز پڑھ رہے تھے سلام پھیر کر فرمایا کہ جب وہ جھوٹ کہتا ہے تو چھوڑ دیتے ہو سچ بولتا ہے تو مارتے ہو اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ یہ قریش کی تباہی کا دن ہے۔ یہ ابوجہل کا مقتل ہے یہ عتبہ کا ہے یہ ابولہب

کا ہے۔ راوی کہتا ہے کہ آپ نے جس کا مقتل جہاں متعین فرمایا تھا ایک بھی سر مو فرق نہ آیا غرض یہی
اللہ اسرع مکرا کی تفسیر ہے۔ اور ہجرت سے پہلے قریش کو ان لفظوں میں اسی عذاب سے
آگاہ کیا گیا تھا۔

عام شارحین قرآن نے قحط کی بات کی لیکن آیت کی تشریح واقعات کی روشنی میں نہ
کر سکے۔ اور کچھ شارحین قرآن نے واقعہ قحط کو بالکل نظر انداز کر دیا۔

آیت کے مطالب کا خلاصہ یہ ہے کہ ان نشانیاں مانگنے والوں سے کہا جا رہا ہے کہ
ہماری نشانیاں تو موجود ہیں مگر تم ہماری نشانیوں کی تاویلیں کر رہے ہو اور چالبازیوں سے
ان نشانیوں سے منہ موڑ رہے ہو۔ چالاکیاں یہ کہ وہ نبوت کا استہزاء کرتے تھے جیسا کہ دوسری
قومیں اپنے پیغمبروں کا استہزاء کرتی رہی ہیں۔ کفار قریش حضور اقدس سے کہتے تھے جس عذاب
کی دھمکی دی جاتی ہے وہ کیوں نہیں آتا اگر تم میں قدرت ہے تو وہ عذاب لاؤ اور اپنی صداقت
کی یہ آخری نشانی بھی دکھا دو قرآن نے بتایا کہ اے لوگو انما الغیب للہ غیب کی بات تو اللہ
کے پاس ہے فانتظروا تم اس کے ظہور کا انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ منتظر ہوں۔
کفار کو معجزہ عذاب کے دیکھنے کی جلدی تھی کیونکہ وہ سمجھتے تھے کہ یہ جھوٹ ہے قرآن نے بتایا
کہ جب تک نبوت کی آمد کی برکات ختم نہ ہو جائیں یعنی تمام افراد صالحہ الگ نہ ہو جائیں گے
عذاب نہیں آئے گا۔

آخر میں قحط کے حوالہ سے فرمایا کہ نشانات تو تمہارے ارد گرد ہیں مگر تمہاری باغیانہ
زندگی ان نشانوں کے تحت نئے پس منظر گھڑ کر اپنے کو مطمئن کر رہی ہے تم چالاکیوں ؟
ہوشیاریوں سے کام لے رہے ہو تو اللہ کی ذات تدبیریں تم سے زیادہ تیز ہے وہ دن قریب
آ رہا ہے تمہاری ساری حرکتیں تمہاری عیاریاں اور چالبازیاں اور تمہارے اعمال
کے نتائج جلدی رونما ہو کر رہیں گے۔

ایک واقعاتی حقیقت

۲۲ وہی تو ہے جس نے خشکی اور تری میں تمہارے چلنے کا سامان کر دیا ہے تا آنکہ جب
تم سمندر میں جہازوں کے ذریعے سفر کرتے ہو اور جہاز ان کو موافق ہوا میں لے کر جا رہے
ہوتے ہیں کہ تیز و تند ہوا کے جھونکے نمودار ہو جاتے ہیں اور ہر طرف سے موجیں ہجوم کرنے

لگتی ہیں اور مسافر خیال کرتے ہیں کہ وہ گھیرے میں آ گئے تو اس وقت پوری طاعت کے اخلاص کے ساتھ اللہ سبحانہ کو پکارنے لگتے ہیں کہ یا اللہ اگر تو نے ہمیں اس سے بچالیا تو ہم ضرور ہی تیرے شکر گزار ہونگے۔ پھر جب اللہ سبحانہ ان کو بچا دیتا ہے تو وہ ملک میں ناحق سرکشی اور بغاوت کرنے لگتے ہیں یعنی ابتدا میں ہوا خوشگوار اور موافق تھی۔ مسافر ہنستے کھیلتے آرام سے چلے جا رہے تھے کہ یکایک ایک زور کا طوفانی جھکڑ چلنے لگا اور چاروں طرف سے پانی کے پہاڑ اٹھ کر جہاز سے ٹکرانے لگے جب سمجھ لیا کہ ہر طرف سے موت کے منہ میں گھر ہوئے ہیں۔ بھاگنے اور نکلنے کی کوئی سبیل نہیں ہے تو سارے فرضی معبودوں کو چھوڑ کر اللہ سبحانہ واحد کو پکارنے لگے جو اصل فطرت انسانی کا تقاضا ہے۔ ہر چیز سے مایوس ہو کر خالص اللہ سبحانہ کی بندگی اختیار کی اور بڑے پکے عہد و پیماں باندھے کہ اگر اس مصیبت سے اللہ سبحانہ نے نجات دی تو ہمیشہ اس کے شکر گذار رہیں گے کوئی بات کفران نعمت کی نہ کریں گے لیکن جہاں ذرا امن نصیب ہوا ساحل پر قدم رکھتے ہی شرارتیں اور ملک میں اودھم مچانا شروع کر دیا۔ تھوڑی دیر بھی عہد پر قائم نہ رہے۔

تنبیہ

اس آیت میں ان مدعیان اسلام کے لیے بڑی عبرت ہے جو جہاز کے طوفان میں گھر جانے کے وقت بھی اللہ سبحانہ کو چھوڑ کر غیر اللہ کو مدد کے لیے پکارتے ہیں۔ فتح مکہ کے بعد ابوجہل کا بیٹا عکرمہ مسلمان نہ ہوا تھا۔ مکہ سے بھاگ کر بحری سفر اختیار کیا۔ تھوڑی دور جا کر کشتی کو طوفانی ہواؤں نے گھیر لیا۔ ناخدا نے مسافروں سے کہا کہ ایک اللہ کو پکارو یہاں تمہارے معبود کچھ کام نہ آئیں گے عکرمہ نے کہا کہ یہی تو وہ اللہ ہے جس کی طرف محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہم کو بلاتے ہیں۔ اگر سمندر میں رب محمد کے بغیر نجات نہیں مل سکتی تو خشکی میں بھی اس کی دستگیری اور اعانت کے بغیر نجات پانا محال ہے اے اللہ اگر تو نے اس مصیبت سے نکال لیا تو میں واپس ہو کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ میں ہاتھ دوں گا مجھے امید ہے کہ وہ اپنے اخلاق کریمہ سے میری تقصیرات معاف فرما دیں گے چنانچہ حضور کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف با سلام ہوئے[1] جو بات پہلی آیت میں بتائی گئی تھی اسی کو ایک عمومی واقعہ سے مثال دے کر سمجھایا ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ جیسے ایک جہاز کے مسافر سفر پہ روانہ ہوتے ہیں تو جب ہوا سازگار ہوتی ہے اور جہاز امن و سکون سے اپنی منزل کی طرف رواں دواں ہوتا ہے تو سب مگن ہوتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اب ان کی خوشی میں کوئی بدمزگی نہ ہوگی۔ لیکن تھوڑی دیر کے بعد ایک طوفانی جھکڑ اٹھ کر آتا ہے اور موجوں کے تھاٹے جہاز کو زبر و زیر کرنے لگتے ہیں تو ہر مسافر خیال کرنے لگتا ہے کہ بس اب تو پھنس گئے ہیں نہ پائے رفتن نہ جائے ماندن اس سخت ترین گھڑی میں سب کے ہاتھ دعا و طلبگاری کے لیے اللہ سبحانہ کی جناب میں اٹھ جاتے ہیں کہ بارالہا! کہ اب اگر اس ورطہ ہلاکت سے تو ہمیں بچالے تو ہم آئندہ تیرے ہی ہو کر رہیں گے اور تیرے فرماں بردار بن کر رہیں گے لیکن جب اللہ سبحانہ ان کو اس بلائے بے درماں سے بچا لیتا ہے تو اپنے سارے عہد و پیمان بھول کر پھر وہی اٹھکیلیاں وہی سرمستیاں اور شرارتیں عود کر آتی ہیں مطلب یہ ہے کہ یہی حال اس وقت ان لوگوں کا ہے جو عذاب کی نشانی مانگ رہے ہیں۔ اس وقت زندگی کی کشتی سکون سے چل رہی ہے حالات سازگار ہیں۔ اس وجہ سے اپنی شرارتوں میں چھوٹ ہیں۔ ان حالات میں یہ بات ان کی سمجھ میں آتی نہیں ہے کہ ان کی کشتی حیات طوفان سے کیسے دوچار ہو سکتی ہے یعنی عذاب کیسے آسکتا ہے۔

اس آیت میں گہری معنویت ہے یہ بتا رہی ہے کہ جب تک دینوی علائق و اسباب کا ادنیٰ سا کوئی سہارا بھی باقی رہتا ہے۔ انسان کا وجدان بیدار نہیں ہوتا۔ اور ایک تنکے کا بھروسہ بھی اس کے لیے کافی ہوتا ہے کہ وہ اللہ سبحانہ کی طرف سے غافل ہو جائے لیکن جونہی اسباب و علائق کے رشتے ٹوٹے اور یاس و قنوط کی کامل حالت طاری ہوئی اور اس نے دیکھا کہ اب دنیا کا کوئی ہاتھ اسے بچا نہیں سکتا تو اچانک اس کا سویا ہوا وجدان بیدار ہو جاتا ہے اور اللہ سبحانہ کی پرستش کا جوش اپنے سارے اخلاص کے ساتھ اس کے اندر ابھر آتا ہے اس وقت وہ اللہ سبحانہ کے سوا کسی کو نہیں پکارتا۔ سارے رشتے سارے بھروسے، ساری ہستیاں یک قلم نابود ہو جاتی ہیں۔ وہ بے اختیار اللہ سبحانہ کو پکارنے لگتا ہے اور اس کی یہ پکار اس کے دل کی ایک ایک ریشہ کی پکار ہوتی ہے لیکن اس کے بعد پھر کیا ہوتا ہے۔ کیا یہ حالت قائم رہتی ہے۔ نہیں جونہی اس کی ڈوبتی کشتی اچھلی اور امید و مراد کی گم شدہ صورت واپس آگئی۔ پھر وہی اس کی غفلتیں ہوتی ہیں اور وہی سرکشیاں۔

اس حالت کی مثالیں خود ہماری زندگی کے ہر گوشہ میں موجود ہیں کیا کبھی ایسا ہوا ہے

کہ آپ بیمار ہوئے اور ڈاکٹروں نے جواب دے دیا۔ یا کسی دوسری مصیبت میں پڑے اور دنیا کے سارے سہارے ہاتھ سے نکل گئے اگر ایسا ہوا ہے تو یاد کرو کہ ایسے موقع پر آپ کی خدا پرستی اور پرستش میں اخلاص کا کیا حال تھا۔

قرآن نے جا بجا اس حالت کے بیان کے لیے بحری سفر کی مثال دی ہے کیونکہ انسان کی بے بسی اور بے کسی اور مایوسی کے لیے اس سے بہتر مثال کوئی نہیں چنانچہ اس آیت میں اسی کی طرف اشارا اور سورہ عنکبوت اور سورہ لقمان بھی ان ہی مطالب پر مشتمل آیات اور بھی ہیں۔

دین اسلام کی تعلیم و تزکیہ کا مقصد یہی ہے کہ اس حالت سے انسان کو نجات دلا دے اور اس کا وجدان اس طرح بیدار کر دے کہ توحید عبادت کا جو اخلاص خاص خاص حالتوں میں ابھرتا ہے وہ اس کی پوری زندگی میں ایک دائم مستقر حالت ہو جائے یہی وجہ ہے کہ ایمان کی حالت یہ فرمائی کہ مصیبت کی گھڑی ہو یا راحت و سرور کا عالم لیکن اللہ سبحانہ کی یاد سے دل پر غفلت طاری نہ ہو۔ صوفیا کی زبان میں اسی دائمی حالت کا نام نسبت ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

> نسبت کی حقیقت وہ کیفیت ہے جو نفس انسانی میں حلول کر جاتی ہے از قسم تشبیہ ملائکہ یا عالم جبروت کی طرف اطلاع۔ تفصیل اس کی یہ ہے کہ بندہ جب طاعت طہارت اور اذکار پر مداومت کرتا ہے تو اس میں ایک صفت نفس میں پیدا ہو جاتی ہے اور ایک دائمی ملکہ حاصل ہو جاتا ہے۔ (القول الجمیل)

اور مولانا اشرف علی رحمہ اللہ فرماتے ہیں۔

> ولایت کا دوسرا درجہ یہ ہے کہ صحت عقائد، فرائض کی ادائیگی اور محرمات سے بچنے کے ساتھ ظاہر کو نفلی عبادتوں میں اور باطن کو اللہ تعالیٰ کی یاد میں ہمیشہ مشغول رکھے اسی کو نسبت کہتے ہیں (قصد السبیل)

منقول ہے کہ امام جعفر صادق کی خدمت میں کسی نے آکر عرض کیا کہ اللہ سبحانہ کے بارے میں مجھے کچھ بتائیے۔ آپ نے فرمایا کیا کرتے ہو؟ اس نے کہا کہ ایک بار عین دریا میں میری کشتی ٹوٹ گئی اور میں ایک تختہ پر بیٹھا ہوا بہا جا رہا تھا کہ تیز و تند ہوا کا تھپیڑا آیا آپ نے فرمایا اچھا یہ بتاؤ اس وقت تمہارے دل میں خشوع و خضوع کی کیفیت پیدا ہوئی تھی اس نے کہا ہاں آپ نے فرمایا جس کی طرف اس وقت تمہاری تضرع و شکستگی نے رخ کیا تھا وہ ہی تو

اللہ سبحانہ ہے۔ (تفسیر کبیر)
علامہ آلوسی نے اس مقام پر مسلمانوں کے حال زار پر نوحہ کیا ہے کہ مشرکین تک ایسے مواقع پر توحید عبادت کا مظاہرہ کرتے تھے اور نیازمندانہ دعاؤں میں واحد وقدوس کو پکارتے لیکن مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ کوئی خضر والیاس کو پکار رہا ہے اور کوئی ابو خمیس اور عباس کی وہائی دے رہا ہے اور کوئی کسی امام سے استغاثہ کر رہا ہے اور کوئی مشائخ میں سے کسی سے استعانت کر رہا ہے۔ ان میں کوئی بھی اپنی دعاء لفرع میں اللہ سبحانہ کو نہیں پکارتا اور اس کا اسے خیال بھی نہیں آتا بتاؤ ان مسلمانوں اور ان مشرکین میں دعاؤں میں کون توحید عبادت کا علمبردار ہے۔ وہ مشرکین جو دعو اللہ مخلصین لہ الدین کا مصداق ہیں یا یہ مسلمان الی اللہ المشتکی اللہ ہی سے اس دور کی شکایت ہے جس میں جہالت کی ہوائیں چل رہی ہیں اور گمراہی کی موجیں ٹھاٹھیں مار رہی ہیں۔ ہمارے ملک میں یا علی یا غوث کا نعرہ لگانے والے ذرا اپنے انجام پر غور کریں۔

نشہ اقتدار میں اللہ سے باغیانہ تعلقات

۲۳ اے لوگو تمہاری سرکشی اور باغیانہ روش کا نقصان تمہیں ہی ہوگا دنیا کی زندگی سے خوب فائدہ اٹھاؤ پھر تمہیں ہمارے حضور میں پیش ہونا ہے ہم تمہیں تمہارے کرتوت بتائیں گے یعنی تمہاری شرارت کا وبال تمہیں پر پڑے گا اگر چند روز شرارتیں کرکے فرض کرو کہ دنیا کا نفع حاصل کر ہی لیا تو انجام کار پھر اللہ سبحانہ کی طرف لوٹنا ہے وہاں سب کیا دھرا سامنے آجائے گا اللہ رب العزت سزا دے کر بتلا دے گا کہ تمہارے کرتوت کیسے تھے ۔[1]
بغی کے معنی سرکشی کے ہیں اور اس میں ہر طرح کی سرکشی داخل ہے لیکن جب فی الارض کے ساتھ آئے تو اس سے مقصود وہ لوگ ہوتے ہیں جو برسر اقتدار ہوں اور طاقت کے نشہ میں اگر ظلم وفساد اور برائیوں کو شیوہ اور فیشن بنا لیتے ہیں قرآن نے رذائل کو تین میں منحصر کیا ہے فحشاء منکر اور بغی۔ صفات ذمیمہ فحشاء یعنی حد درجہ قبیح اور بے حیائی کے کام اور ایسی باتیں جن کو سارے انسان فطرۃً ناپسند کرتے ہیں اور ان کے جائز کرنے سے انسانی آبرو خطرہ میں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

پڑھ جاتی ہے منکر جو کام ہر طبقہ میں ناپسند کیا جاتا ہے اور اس کا کرنے والا سب کی نگاہ سے گر جاتا ہے۔ بغی کے معنے لغت میں تجاوز کر جانے کے ہیں فحشاء منکر میں آگے بڑھ جانا بغی ہے قرآن نے بغی کو رذائل میں آخری درجہ دیا ہے۔ رذائل کی اگر تحلیل کی جائے تو معلوم ہوگا کہ وہ بے حیائی اور برائی کے کام ہیں اور دین و شرافت کی نگاہ میں گناہ اور ناپسندیدہ ہیں اگر ان کو جائز قرار دیا جائے تو معاشرے کے افراد کے باہمی حقوق سے امن اٹھ جائے اور کسی کی جان و مال اور عزت و آبرو سلامت نہ رہے۔

ان رذائل کی ترتیب دو نظریوں کے مطابق دی جاسکتی ہے۔ ایک یہ کہ کسی برائی کے اثر کا دائرہ کتنا وسیع ہے اور دوسرا یہ کہ اللہ تعالیٰ کی ناپسندیدگی اور عدم رضا سے کس کو کتنا لگاؤ ہے قرآن میں ترتیب کے ساتھ رذائل کو تین بڑے عنوانوں میں تقسیم کر دیا گیا ہے سب سے پہلے فحشاء پھر منکر اور آخر میں بغی۔

فحشاء میں برائی کی طرف اشارہ ہے وہ انسان میں ایک فرد کی ذات تک محدود رہتی ہے جیسے ننگے رہنا بدکاری میں مبتلا ہونا منکر ہے معاشرے کے تمام افراد کی معاشرتی زندگی متاثر ہوتی ہے جیسے شوہر کا ظلم باپ کی سنگدلی۔ اولاد کی نالائقی اور بغی کا تعلق چونکہ طاقت اور اقتدار سے ہے اس لیے جماعت سے بڑھ کر پورے ملک و ملت کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے جیسے چوری، ڈاکہ، قتل وغیرہ۔ یہ تو ایک نظریہ کے مطابق رذائل کی ترتیب ہوئی دوسرے نظریہ کی رو سے پہلے فحشا ہے جس سے اللہ کی رحمت چھن جاتی ہے پھر وہ منکر ہے جو اللہ سبحانہ کی محبت سے محروم کر دیتی ہے اور پھر بغی جو رضائے الٰہی سے خالی ہے۔ قرآن میں تینوں کی ترتیب یہی ہے

ان اللہ یامر بالعدل والاحسان وایتاء ذی القربیٰ وینھیٰ عن الفحشاء والمنکر والبغی۔

بلاشبہ اللہ حکم دیتا ہے کہ ہر معاملہ میں عدل و انصاف کرو سب کے ساتھ حسن کاری کرو اور قرابت داروں کے ساتھ سلوک کرو اور اللہ منع کرتا ہے بے حیائی کے کاموں سے اور ہر طرح کی بری بات سے اور ظلم و زیادتی کے کاموں سے شارحین قرآن نے اس آیت کو جوامع آیات میں شمار کیا ہے یہ گویا انسانی شرافت کا ربانی منشور ہے۔

آیت میں قریش کے ارباب اقتدار سے خطاب ہے اور اپنے اندر نہایت سخت وعید

اور تہدید رکھتا ہے کہ تمہاری اس سرکشانہ زندگی کے نتائج سے تمہیں بھی دوچار ہونا پڑے گا۔ تمہاری ہر سرکشی تم پر خدا کی حجت پوری کرے گی تم جتنے قدم اس راہ میں بڑھوگے۔ اتنے ہی اللہ سبحانہ کے فیصلہ کن عذاب سے قریب سے قریب تر ہوگے جس سامان دنیا کے نشہ میں مخمور ہوکر ظلم و فساد کر رہے ہو یہ وقتی ہے۔ اس سے فائدہ چند روزہ ہے۔ لیقضی اللہ امرا کان مفعولا یاد رکھو کہ تمہیں ہمارے ہی حضور پیش ہوتا ہے۔ تمہاری زندگی کا سارا کچا چٹھا تمہارے سامنے ہوگا۔

اس دنیا میں باری باری قومیں وجود میں آتی رہی ہیں اور قوانین الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی زور و طاقت مالی وسعت اجتماعی اور تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی۔ بڑی بڑی عمارتیں بنائیں۔ عظیم الشان تمدن کی بنیاد ڈالی قوموں کو اپنا محکوم بنا کر حکومت قائم کی۔ پھر جب انہوں نے نخوت و غرور کے نشے میں بغی کی راہ اختیار کی تو ان کا کیا خود ان کے ہی سامنے آیا اور نتیجہ میں وہ فنا کر دی گئی اور ان کا نام و نشان ہی صفحہ ہستی سے مٹ گیا۔

الغرض جیسے افراد جی کر مر جاتے ہیں جماعتیں بھی وجود میں آکر مٹ جاتی ہیں قومیں پیدا ہوکر فنا ہو جاتی ہیں اسی طرح پوری دنیائے مخلوقات کا ایک دن آئے گا جب قانون الٰہی کے مطابق معدوم ہو جائے گی۔ قوموں کو بغیکم علی انفسکم ہی کے نتائج سے دوچار ہونا پڑا ہے دنیا اور اس کا سامان صرف ایک وقتی حادثہ ہے۔ اس میں کسی کے لیے دوام نہیں ہے متاع الحیاۃ الدنیا پھر ایک دن آئے گا جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہوکر فنا ہو جائے گی کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا اس موجودہ عالم کا قانون مادی دوسری قانون سے نسوخ ہو جائے گا نئی زمین نئے آسمان کی موجود دنیا کے اعمال سے تخلیق ہوگی۔ نئی تخلیقات کی نمائش الینا مرجعکم اسی کا نام حشر ہے۔ زندگی یہاں بھی جسمانی ہے وہاں بھی جسمانی ہوگی مگر دونوں میں ایک جوہری فرق ہے یہاں جسمانی زندگی کی تخلیق عناصر کی رہین منت ہے وہاں کے جسمانی زندگی کی تخلیق افکار اعمال، اخلاق اور احوال کی رہن منت ہوگی۔ اللھم اعذنا من شرور انفسنا ومن سیئات اعمالنا۔

إِنَّمَا مَثَلُ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا كَمَآءٍ أَنْزَلْنٰهُ مِنَ
السَّمَآءِ فَاخْتَلَطَ بِهٖ نَبَاتُ الْأَرْضِ مِمَّا يَأْكُلُ النَّاسُ وَالْأَنْعٰمُ
حَتّٰٓى إِذَآ أَخَذَتِ الْأَرْضُ زُخْرُفَهَا وَازَّيَّنَتْ وَظَنَّ أَهْلُهَآ أَنَّهُمْ
قٰدِرُوْنَ عَلَيْهَآ أَتٰىهَآ أَمْرُنَا لَيْلًا أَوْ نَهَارًا فَجَعَلْنٰهَا حَصِيْدًا
كَأَنْ لَّمْ تَغْنَ بِالْأَمْسِ كَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ لِقَوْمٍ
يَّتَفَكَّرُوْنَ ۝۲۴

دنیوی زندگی تو صرف بارش کے اس پانی کی طرح ہے جسے ہم نے برسایا اس پانی سے رل مل کر زمین کی وہ پیداوار ہوئی جسے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں[۳۴] جب زمین میں خوب رونق ہو گئی اور زمین پیداوار سے لہرانے لگی تو زمین کے مالکوں نے خیال کیا کہ زمین کی پیداوار پر ہمارا پورا قابو ہے[۳۵] تو رات یا دن میں اچانک ہمارا حکم آگیا اور ہم نے زمین کی ساری پیداوار کو کاٹ کر رکھ دیا گویا کل گذشتہ یہاں کچھ بھی نہ تھا غور و فکر اور سوجھ والوں کے لیے ہم اسی طرح تو بات کو کھول کر پیش کرتے ہیں[۳۶]

زخرف رونق، چمک، سنگار ملمع، سنہرا، آراستہ اور کسی چیز کے کمال حسن کو کہتے ہیں۔ اور اسی اعتبار سے سونے کو زخرف کہتے ہیں لیکن قول کے لیے جب اس کا استعمال ہو تو جھوٹ سے آراستہ کرنے اور ملمع کی باتیں کرنا ہوتے ہیں۔ زخرف القول اسی معنے میں ہے۔

حصید کٹی ہوئی کھیتی۔ جڑ سے کٹا ہوا حصاد سے بروزن فعیل جمع حصائد آتی حدیث میں ہے ما للنار الا حصائد السنتکم دوزخ نام ہی تمہاری زبانوں کی کٹی ہوئی کھیتوں کا ہے یعنی زبان کی غلط کاریوں کی سزا دوزخ ہے لم تغن غنی یغنیٰ باب سمع سے ناقص ہے آباد ہونا اسی سے مغنی مکان معنی میں ہے اسکی جمع مغانی آتی ہے دوسرے معنے بے پرواہ ہونا با اور مع صلہ آئے شادی شدہ لڑکی کو غانیہ کہتے اغنیۃ گانے کو کہتے ہیں اس میں لگ کر سب سے بے پروا ہو جاتا ہے جمع اغانی غنا بالکسر گانے کو کہتے ہیں اور غنی مقصود مالداری کو کہتے ہیں اور غناء ممدود بالفتح فائدہ کو کہتے ہیں اسی سے استغنا تغنی کہتے ہیں۔

دنیوی زندگی کی بے ثباتی

قرآن میں دنیا کی بے ثباتی کو مختلف عنوانوں سے بیان کیا ہے جن کا مقصد یہ بتایا ہے کہ دنیا ناپائیدار ہے وقتی اور ہنگامی ہے یہ آخرت کے لیے صرف تیاری کی جگہ ہے۔ آخرت کے مقابلہ میں ناقابل التفات ہے۔ اس میں مشغول ہو کر خدا فراموشی خود فراموشی ہے اس موضوع پر پچاس سے زیادہ آیات ہیں۔

اگر انسان عقل و بصیرت سے کام لے تو اس پر سب سے پہلے یہ حقیقت نمودار ہو گی کہ کائنات اور اس کی ہر چیز کی بناوٹ کچھ اس طرح واقع ہوئی ہے کہ ہر چیز ضبط و ترتیب کے ساتھ ایک خاص نظام و قانون میں منسلک ہے اور کوئی چیز نہیں جو حکمت و مصلحت سے خالی ہو اور بقائے دوام لے کر آئی ہو۔ ایسا نہیں کہ ساری تخلیقات باطل ہوں یعنی کسی معین مقصد کے بغیر وجود میں آگئی ہوں کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ تخلیق بالحق نہیں بلکہ بالباطل ہوتی۔ اس میں نظم اور یکسانیت نہ ہوتی اور یہ کے بغیر ہوتا یعنی تخلیق کھیل کود کی طرح بغیر کسی معقول غرض و مدعا کے ہوتا۔ نزول قرآن سے پہلے پچھلی مذہبنے دنیا کی پیدائش کا جو نقشہ پیش کیا تھا وہ حکمت و مصالح کے تصور سے بالکل خالی تھا لوگ خیال کرتے تھے کہ طاقت و اختیار کے ساتھ حکمت اور مصلحت سے مفاہمت نہیں ہو سکتی۔

حکمت و مصلحت کی پابندی وہی کرے گا جو کسی کے آگے جوابدہ ہو۔ اللہ سبحانہ جو سب سے بڑا اور سب پر حکمران ہے۔ قرآن پہلی کتاب ہے جس نے اللہ سبحانہ کی صفات و افعال کیلئے عقلی تصور قائم کیا اور یہ حقیقت واضح کی کہ حکمت و مصلحت کی رعایت منافی قدرت نہیں بلکہ محاسن قدرت میں سے ہے بلاشبہ اللہ سبحانہ جو کچھ چاہے کر سکتا ہے لیکن اس کے حکیم اور عادل ہونے کا تقاضا یہی ہے کہ جو کچھ کرے حکمت کے ساتھ کرے۔

اس اصل کا نتیجہ ہے کہ اس نے تخلیق کا بھی جو نقشہ کھینچا وہ سرتاسر عقلی نقشہ ہے یعنی حکمت و علت اور نظم و اتقان کا نقشہ ہے اسی لیے قرآن نے تخلیق بالباطل کے خیال کو کفر کی طرف نسبت دی ہے ذالك ظن الذين كفروا اس تخلیق بالحق کا تقاضا قانون مجازات ہے ٹھیک اسی طرح اس کا تقاضا یہ بھی ہے کہ جب کائنات کی ہر چیز کوئی نہ کوئی مقصد اور رکھتی ہے تو ضروری ہے کہ انسانی وجود کے لیے بھی کوئی نہ کوئی مقصد اور منتہی ہو یہی منتہی آخرت کی زندگی ہے کیونکہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ کائنات ارضی کی یہ بہترین مخلوق صرف اس لیے پیدا کی گئی ہو کہ پیدا ہو اور چند دن جی کر مر جائے آخرت دار بقا ہے اس کے مقابلے میں دنیا دار فنا ہے۔ آخرت کی ہر چیز میں دوام ہے دنیا کی ہر چیز فنا پذیر ہے۔

۲۴ ؎ دنیوی زندگی تو صرف بارش کے اس پانی کی طرح ہے جسے ہم نے برسایا اس پانی سے رل مل کر زمین کی وہ پیداوار ہوتی جسے انسان اور چوپائے کھاتے ہیں۔ بعض نے فاختلط بہ نبات الارض کے معنے کثرت پیداوار کے لیئے ہیں کیونکہ جب زمین کی پیداوار زیادہ قوی ہوتی ہے تو گنجان ہو کر ایک جزو دوسرے جز سے مل جاتا اور لپٹ جاتا ہے بعض نے اسکی باکو مصاحبت کے لیے لے کر یہ معنی کئے ہیں کہ زمین کا سبزہ پانی کے ساتھ رل مل جاتا ہے کیونکہ نباتات اجزائے مائیہ کو جذب کرتے ہیں۔ جس طرح کھانا انسان کا جزو بدن بنتا ہے ایسے ہی پانی گویا نباتات کی غذا بنتا ہے۔ حضرت شیخ الہند کے ترجمہ سے ترشح ہوتا ہے کہ اختلاط سے یہ مراد لے رہے ہیں کہ زمین اور پانی کے ملنے سے جو سبزہ نکلتا ہے اس میں آدمی اور جانور کی خوراک مخلوط (رلی ملی) ہوتی ہے مثلاً گیہوں کے درخت میں دانہ انسان کی غذا اور بھوسہ جانور کی خوراک ہے اسی طرح درختوں میں پھل اور پتے لگتے ہیں جن میں سے ہر ایک کے کھانے والے الگ ہیں ؎

؎ افادات شیخ الاسلام

اس دنیوی زندگی کے لیے ایک تمثیل ہے جس کی طرف متاع الحیاۃ الدنیا میں اشارا ہوا ہے، جس سامان دنیا پر کفر پیشہ لوگ مست ہو رہے تھے اور اس کو اس قدر دائمی اور محفوظ سمجھے ہوئے تھے کہ اس کے تہ ہونے اور ختم ہوجانے کے امکان کو بھی قبول نہ کرتے تھے۔ اختلاط کے معنی کسی چیز کے مل جانے کے ہیں یہ فصلوں اور نباتات کے خوب زیادہ ہونے کی تعبیر ہے کیونکہ سازگار بارش سے جب فصل نشو و نما پاتی ہے تو وہ باہم مل کر خوب گھنی ہوجاتی ہے اور یہ انسانوں اور جانوروں دونوں کی خوراک بنتی ہے۔ علامہ بقاعی لکھتے ہیں کہ وہ دنیا جس پر تم ریجھ رہے ہو اور جس پر لٹو ہو رہے ہو جلدی ختم ہونے مٹ جانے اور فنا ہونے میں بارش سے اگ کر لہلہاتی اور شاداب کھیتی کی طرح ہے جس کی شادابی اور سرسبزی میں دوام نہیں ہوتی ابھی سوکھ کر کٹ جائے گی اور زمین ساری شادابیوں سے محروم ہوجائے گی۔ اور کچھ بھی باقی نہ رہے گا

زمین میں کھیتوں کی شادابی

۵۳ جب زمین میں خوب رونق ہوگئی اور زمین پیداوار سے لہلہانے لگی تو زمین کے مالکوں نے خیال کیا کہ زمین کی پیداوار پر ہمارا پورا قابو ہے یعنی مختلف الوان اشکال کے نباتات نے زمین کو پر رونق اور مزین کر دیا اور کھیتی وغیرہ ایسی تیار ہوگئی کہ مالکوں کو کامل بھروسہ ہوگیا کہ اب اس سے پورا فائدہ اٹھانے کا موقعہ آگیا ہے [۱] یعنی اس کی خوشنمائی کمال کو پہنچ گئی ہر بالیاں اور کھیتیاں لہلہا اٹھتی ہیں اور ہر طرف شادابی کا منظر ہوتا ہے اور تمام نباتی نمائشوں سے کسان لذت گیر ہوتا ہے اور سمجھتا کہ بس اب ہمیں پوری قدرت ہے اب اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا ہے۔ اسی کے بل بوتے میں مقابلہ کا بازار گرم ہوتا ہے عملی میدان میں اس زندگی میں دولت و ثروت کا مقابلہ کیا جاتا ہے اور پیداوار کی آمدنی کا موازنہ کر کے اندر ہی اندر ہر ایک دوسرے کے مقابلہ میں آگے بڑھ جانے کی فکر اور کوشش میں لگ جاتا ہے۔ اللہ اللہ یہ سارے معاشی جھگڑے معاشیاتی مقابلے جو افراد سے گذر کر اقوام تک کو میدان میں لے آئے اس کے نتیجہ میں اس قدر خدا فراموشی جنم لیتی ہے کہ زمین انسانی رگوں کے خون سے لالہ زار بنی ہوئی ہے۔ آسمان آگ برسا رہا ہے فتنہ و فساد سے کائنات کی ساری فضا بھر گئی ہے جسنے

[۱] افادات شیخ الاسلام

والے چیخ رہے ہیں ازالہ کی ساری کوششیں ختم ہو چکی ہیں نبوت اس کا حل بتاتی ہے کہ الدنیا کا الدین سے رشتہ جوڑ کر صرف یہ تدبیر کی جائے کہ مقابلے کے سارے جذبات کا سارا رخ الحیوٰۃ الدنیا سے ہٹا کر الحیاۃ الاخری کی بلند دائمی زندگی کی طرف پھیر دیا جائے، مگر جن کی نگاہوں میں بناوٹی نمائشیں رچی بسی ہوئی ہیں وہ اس سے دھوکہ میں پڑے ہوئے ہیں اور اسی پر ریجھ رہے ہیں۔

فکرو تدبر کی دعوت

۲۴ـ تو رات یا دن میں اچانک ہمارا حکم آگیا اور ہم نے ساری زمین کی پیداوار کو کاٹ کر رکھ دیا گویا گذشتہ کل یہاں کچھ تھا ہی نہیں غور و فکر اور سوجھ بوجھ والوں کے لیے ہم اسی طرح آیات کو کھول کر پیش کرتے ہیں یعنی ناگہاں اللہ سبحانہ کے حکم سے دن یا رات میں کوئی آفت آپہنچی مثلاً بگولا آگیا یا اولے پڑ گئے یا ٹڈی دل پہنچ گیا وعلی ہذا القیاس اس نے تمام زراعت کا صفایا کر ڈالا گویا کبھی یہاں ایک تنکا بھی نہ اگا تھا ٹھیک اسی طرح حیات دنیا کی مثال سمجھ لو کہ خواہ کتنی ہی حسین و جمیل اور تر و تازہ نظر آئے حتیٰ کہ بے وقوف لوگ اس کی رونق و دلربائی پر مفتوں ہو کر اصل حقیقت کو فراموش کر دیں۔ لیکن اس کی یہ شادابی اور زینت و بہجت محض چند روزہ ہے جو بہت جلد زوال و فنا کے ہاتھوں نیاً منیا ہو جائے گی لیلاً او نہارا رات یا دن کو شاید اس لیے فرمایا کہ رات کا وقت غفلت کا ہے اور دن میں لوگ عموماً بیدار ہوتے ہیں مطلب یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہ کا حکم پہنچے پھر سوتا ہو یا جاگتا غافل ہو یا بیدار کوئی شخص کسی حالت میں اس کو روک نہیں سکتا۔[1]

اس آیت دنیا کی بے ثباتی کو ایک مثال کی صورت میں یوں پیش کیا جیسے آسمان سے خوب زور کی بارش ہو ہر قسم کے نباتات کی روئیدگی خوب ہو آدمی کے کھانے کے قابل پھل پھلواری میوہ غلہ اور جانوروں کے کھانے کے قابل چارہ وغیرہ کی خوب پیداوار ہو، پھر جب ہر طرف خوب سرسبزی شادابی پھیل جائے لہلہاتا کھیت سرسبز درخت شاداب باغ ہر طرف پورے زیب و زینت کے ساتھ نظر آنے لگیں۔ اور انسان سمجھنے لگے کہ بس ہم ان تمام لذتوں اور نعمتوں سے

[1] افادات شیخ الاسلام

لطف اٹھانے کے پوری پوری طرح مالک و مختار ہیں کہ یک بیک حکم الٰہی سے کوئی ایسا آسمانی یا زمینی حادثہ پیش آجائے کہ سارا گل و گلزار تھس نہس ہو کر رہ جائے اور حالت یہ ہو جائے کہ گویا یہاں کل کچھ تھا ہی نہیں - یہ مرقع ہے انسانی زندگی کا کہ بڑے بڑے نامور با اقبال کا بھی خاتمہ دفعۃً موت پر ہو کر رہ جاتا ہے اور یہ حال ہے دنیا کا جس میں غافل انسان ہمہ تن معروف رہتا ہے

دنیوی زندگی کی مثال تو بالکل ایسی ہے جیسے کاشتکاری کا معاملہ آسمان سے پانی برستا ہے اور تمہارے کھیت لہلہانے لگتے ہیں پھر جب وہ وقت آتا ہے کہ تم سمجھتے ہو کہ اب فصل پک گئی اور ہماری محنت کی کمائی ہمارے قبضہ میں ہے تو اچانک کوئی حادثہ پیش آجاتا ہے اور ساری فصل اس طرح تباہ ہو جاتی ہے گویا اس کا نام و نشان بھی نہ تھا یعنی دنیوی زندگی کی ساری کامرانیاں اور دلفریبیاں بے ثبات اور ہنگامی ہیں - تم یہاں کسی چیز پر اعتماد نہیں کر سکتے کہ یہ ضرور ایسی ہی رہے گی اول تو زندگی ہی چند روزہ ہے پھر اس کا بھی ٹھکانا نہیں ہے پھر زندگی کے عیش و تنعم کی جتنی دلفریبیاں ہیں سب کا حال یہ ہے کہ صبح ہیں تو شام نہیں شام کو نہیں تو صبح کو نہیں ایسی حالت میں اس سے بڑھ کر غفلت و گمراہی کی اور کیا بات ہو سکتی ہے کہ انسان حق و راستی کی راہ چھوڑ کر سرکشی پر اتر آئے اور کس چیز کے بھروسے پر اس زندگی کے سروسامان اور اقتدار کے بھروسہ پر جسے چند لمحوں کے لیے بھی قطعی اور برقرار نہیں کہہ سکتا لیکن انسانی غفلت کے حجابات کا بھی حال ہے کوئی نہیں جو اس غرور باطل کی سرگرانیوں سے اپنی نگہداشت کر سکے - یہی غفلت ہے جسے قرآن دور کرنا چاہتا ہے وہ دنیا اور اس کی کامرانیوں سے نہیں روکتا مگر ان کے غرور باطل اور بے اعتدالانہ انہماک کی راہیں بند کر دینا چاہتا ہے کیونکہ انسان کی انفرادی اور اجتماعی زندگی کے سارے فتنوں کا اصلی سرچشمہ یہی غرور باطل ہے[1]

شاہ عبدالقادر کی لطیف تشریح

شاہ صاحب نے اس مثال کو نہایت لطیف انداز میں خاص انسانی زندگی پر منطبق کیا ہے پانی کی طرح روح عالم بالا سے آئی - کالبد خاکی میں مل کر قوت پکڑی - دونوں کے ملنے سے آدمی بنا - پھر کام کیے - انسانی اور حیوانی دونوں طرح کے کام کیے - جب بہ ہیئت کامل اور

---

[1] ترجمان قرآن

ماہر ہوگیا اور اس کے متعلقین کو اس پر بھروسہ ہوگیا۔ ناگہاں موت آپہنچی جس نے ایک دم میں سارا بنا بنایا کھیل بگاڑ کے رکھ دیا۔ پھر ایسا بے نام و نشان ہوا گویا کبھی زمین پر آبادہی نہ ہوا تھا۔[1] منشا یہ بتانا ہے کہ انفرادی زندگی ہو جیسا کہ شاہ صاحب کی رائے ہے یا پوری دنیا کی اجتماعی زندگی ہو انفرادی زندگی میں ہر شخص اپنی تندرستی صحت اور قوت پہ نازاں ہوتا ہے جب کہ اجتماعی زندگی میں اقتدار اور تمدن و تہذیب پہ فخر کرتا ہے انفرادی زندگی کو موت آکر ختم کر دیتی ہے اور اجتماعی زندگی پر قہر الٰہی کا کوئی جھونکا آکر سب کچھ کو خس و خاشاک میں تبدیل کر دیتا ہے دونوں کی مثال لگی ہوئی سرسبز و شاداب کھیتی اور باغ کی ہے کھیتی ساری شادابیوں کے ساتھ یکبارگی ختم ہو جاتی ہے ایسے ہی شخصی زندگی ساری صحت مندیوں کے باوجود اور اجتماعی زندگی ساری ترقیوں کے باوجود قہر خداوندی کا نشانہ بن جاتی ہے۔ اجتماعی زندگی کی حد تک اس تمثیل سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے کہ جن قوموں پر اللہ کی حجت پوری ہو جاتی ہے ان کو وہ عین دور عروج میں پکڑ لیتا ہے۔ اس لیے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں اہمیت عقائد و اعمال کی ہے نہ کہ مادی اسباب و رسائل کی۔ اگر ایک قوم اخلاقی اعتبار سے گر چکی ہے تو اسباب و وسائل کی فراوانی اس کو سہارا دینے کے بجائے اس کے زوال کی رفتار کو اور تیز کر دیتی ہے۔

---

[1] موضح القرآن

وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلٰى دَارِ السَّلٰمِ ۭ وَيَهْدِيْ مَنْ
يَّشَاۗءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ ۝۲۵ لِلَّذِيْنَ اَحْسَنُوا الْحُسْنٰى وَ
زِيَادَةٌ ۭ وَلَا يَرْهَقُ وُجُوْهَهُمْ قَتَرٌ وَّلَا ذِلَّةٌ ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ
الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۶ وَالَّذِيْنَ كَسَبُوا السَّيِّاٰتِ
جَزَاۗءُ سَيِّئَةٍۢ بِمِثْلِهَا ۙ وَتَرْهَقُھُمْ ذِلَّةٌ ۭ مَا لَھُمْ مِّنَ اللّٰهِ
مِنْ عَاصِمٍ ۚ كَاَنَّمَآ اُغْشِيَتْ وُجُوْهُهُمْ قِطَعًا مِّنَ الَّيْلِ
مُظْلِمًا ۭ اُولٰۗىِٕكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ۝۲۷

اور اللہ سبحانہ سلامتی کے گھرانے کی طرف بلا رہا ہے اور
اللہ ہی جسے چاہتا ہے صراطِ مستقیم کی راہ پر لگا دیتا ہے[۳۷]
ان لوگوں کے لیے جو اپنی زندگی میں حسن کار بن کر رہے اچھی
اور شاندار زندگی ہے اور کچھ زیادہ بھی ہے[۳۸] ان کے چہروں
پر نہ تو مجرمانہ سیاہی ہوگی اور نہ ذلت یہی لوگ جنت کے باسی
ہیں اور اس میں ان کا بسیرا ہمیشہ ہوگا[۳۹] اور جو لوگ زندگی میں
برائیوں کی کمائیاں کرتے رہے ہیں ان کے لیے برائی کا بدلہ

برائی ہے ان پر ذلت چھائی ہو گی اللہ سبحانہ کی گرفت سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ ان کے چہرے ایسے کالے ہوں گے گویا ان کے چہروں کو تاریک رات کے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ یہی دوزخی ہیں ان کو دوزخ ہی میں رہنا ہے ۔

مفردات کے معانی

. دارالسلام یہ جنت کے ناموں میں سے ایک نام ہے۔ اس کے معنے ہیں سلامتی اور بچاؤ کا گھر۔ اس نام کی وجہ تسمیہ علامہ آلوسی نے یہ بتائی ہے کہ اس کے مکین کو ہر قسم کی تکلیف اور آفت سے سلامتی ہو گی۔

الحسنی واحد مؤنث اسم تفضیل حسن سے فعلی باب کرم سے اس کی ضد سوائی۔ ساء یسوء مؤنث باب نصر سے اجوف داری۔ الحسنی صفت ہے موصوف محذوف ہے جیسے الحیاۃ الحسنی، الدرجۃ الحسنی المنزلۃ الحسنی۔

لا یرھق واحد مذکر غائب مضارع رَھِقَ یرھق اصل میں اس کے معنے ایک چیز کے دوسری چیز پر زبردستی چھا جانے کے ہیں اور چونکہ اس کا لازمی نتیجہ تباہی ہے اس لیے تباہ ہونے کے معنی میں اس کا استعمال ہوتا ہے مبرد نے تصریح کی ہے کہ جب کسی کے متعلق کہا جائے فیہ رھق تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اس میں عقل کی کمی ہے جس کی بنا پر وہ شر میں گھرا ہوا ہے اور برائی ہر طرف سے اس پر چھا رہی ہے۔ اسی لیے اس کے معنے ڈھانپنے کے ہیں۔

قتر۔ جلن اور لکڑی کے دھوئیں کو کہتے ہیں، ہر غبار جس میں سیاہی ہو اسے قتر کہتے ہیں۔

سیئۃ یہ ساء یسوء سے صفت مشبہ کا فیعلۃ کے وزن پر صیغہ ہے اس کے معنے برائی کے ہیں۔

اغشیت یہ اغشار ہے ماضی کا واحد مونث غائب ناقص یائی مجرد غشی یغشی باب سمع سے آتا ہے اوپر سے ڈھانکنا۔ اسی سے غشاوۃ ہے۔

آخرت پر ایمان لانے کی اہمیت

مومن ہونے کے لیے بالکل ناگزیر ہے کہ جس طرح اللہ سبحانہ پر ایمان لایا جائے اسی طرح آخرت پر بھی ایمان لایا جائے اس کے بغیر آدمی مومن اور مسلم نہیں ہو سکتا اور اس کی عدم موجودگی میں اللہ پر ایمان رکھنا بھی کوئی معنے اور کوئی فائدہ نہیں رکھتا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آخرت کا آنا بھی دراصل اللہ تعالیٰ ہی کی بہت سی صفتوں کا تقاضا ہے مثلاً اس کی صفت عدل اس کی صفت رحمت کا اس کی صفت قدر شناسی کا اور اس کی صفت حاکمیت کا۔ قیامت کے نہ آنے اور انسانی عمل کی جزا نہ ملنے کی شکل میں یہ بات محض ایک بے بنیاد دعویٰ بن کر رہ جاتی ہے کہ اس دنیا کا پیدا کرنے والا ایک عادل اور حکیم ہے رحیم اور شکور ہے مالک و فرماں روا ہے کیونکہ اعمال کے اخلاقی نتائج اس دنیا میں تو جیسے چاہئیں جاتے آتے دیکھے نہیں جاتے۔ ظالم پھلتا اور پھولتا ہے اور حق پسند مصیبتیں اٹھاتا رہتا ہے اس لیے اس زندگی کے بعد اگر اس کا موقع نہیں ملتا کہ ہر شخص اپنے کیے کا بدلہ پائے تو یہ ایک عجیب و غریب صورت حال ہو گی جو اللہ سبحانہ کے عدل و حکمت اور اس کی رحمت و حاکمیت کی صریح نفی ہو گی اس لیے اللہ تعالیٰ پر یقین رکھنا اور جزا و سزا کا انکار کرنا دونوں باتیں الفاظ کی حد تک تو جمع ہو سکتی ہیں مگر حقیقت میں کبھی جمع نہیں ہو سکتی ہیں۔

جب قرآن لفظ الاخرہ بولا جاتا ہے تو اس سے الدار الاخرہ یا الحیاۃ الاخرہ مراد ہوتا ہے۔ الدار الاخرہ برزخ قیامت حشر، جزائے اعمال جنت اور دوزخ کے مجموعہ کا نام ہے، برزخ کے بھی مختلف نام ہیں قیامت کے ایک سے زیادہ نام ہیں جنت کو بھی مختلف ناموں سے پکارا گیا ہے اور دوزخ کے لیے مختلف تعبیرات ہیں جیسے قیام یا رکوع اور سجود بول کر ساری نماز مراد ہوتی ہے ایسے ہی آخرت سے متعلق کسی ایک نام کو بول کر آخرت کی پوری دنیا مراد ہوتی ہے۔

۲۷ اور اللہ سبحانہ سلامتی کے گھرانے کی طرف بلا رہا ہے اور اللہ ہی جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی راہ پر لگا دیتا ہے یعنی دنیا کی زائل و فانی زندگی پر مت ریجھو دار السلام جنت کی طرف آؤ اللہ تم کو سلامتی کے گھر کی طرف بلا رہا ہے اور وہاں تک پہنچنے کا راستہ بھی دکھلاتا

رہا ہے وہی گھر ہے جہاں کے رہنے والے ہر قسم کے رنج و غم پریشانی تکلیف نقصان و دقت اور فنا و زوال وغیرہ سے صحیح و سالم رہیں گے فرشتے ان کو سلام کریں گے۔ خود رب العزت کی طرف سے سلام کا تحفہ پہنچے گا ۔[1]

اس مقام کا نام جو الدار الآخرہ میں نیکوکار انسانوں کو ملے گا اور ان کا دائمی گھر ہوگا قرآن پاک میں بالعموم الجنۃ آیا ہے اور کبھی اس کو مختلف اضافتوں سے بھی تعبیر کیا گیا ہے مثلاً جنۃ النعیم جنۃ الخلد، جنات عدن جنۃ الماویٰ، فردوس، روضۃ۔ دار الخلد دار المقامہ دار السلام۔ اس آیت میں جنت کا نام یہی ہے اور اللہ کی وہ شریعت بھی یہی ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اسلام کے نام سے اللہ سبحانہ کی جانب سے لے کر آئے ہیں وہ فی الواقع امن و سلام کی نوید و بشارت ہے اور اسی کے مطابق اس دنیا میں زندگی گذار لے پر جنت یعنی دار السلام آخرت کی زندگی میں ملے گا۔ انسان امن و سلامتی کا بھوکا ہے لیکن وہ اس امن و سلامتی کو دنیا کے اسباب راحت کے انبار یعنی متاع الحیاۃ الدنیا میں تلاش کرتا ہے اور نہیں پاتا وہ دنیا میں امن کا گوشہ ڈھونڈتا ہے اور اسے نہیں ملتا ہے کیونکہ یہ دنیا فانی ہے اور اس کی مثال لگی ہوئی شاداب کھیتی کی ہے لیکن آخرت کی زندگی میں نہ صرف امن کا گوشہ بلکہ امن و سلامتی کی پوری دنیا ملے گی اہل جنت کے متعلق ارشاد ہے لھم دار السلام عند ربھم۔ اللہ سبحانہ نے جس اسلام کو دین و قانون بنا کر قرآن کے ذریعے پیش کیا ہے وہ بھی امن و سلامتی کی بشارت ہے اسی کی اس آیت میں دعوت دی گئی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم جب مدینہ منورہ تشریف لائے تو سب سے پہلے اس امن و سلامتی کے گھر کی دعوت پیش فرمائی۔ عبد اللہ ابن سلام ایک یہودی عالم تھے حضور اقدس کی جس صدائے بلوت نے سب سے پہلے ان کے دل میں گھر کیا وہ یہ تھی لوگو سلامتی پھیلاؤ۔ بھوکوں کو کھانا کھلاؤ جب دنیا غفلت کی نیند سو رہی ہو تم اٹھ کر اللہ سبحانہ کی عبادت کرو امن و سلامتی کے گھر میں تمہیں رہنا نصیب ہوگا۔

واللہ یدعوا الی دار السلام کا مطلب ہے کہ اللہ سبحانہ تمہیں دنیا میں زندگی بسر کرنے کے اس طریقے کی دعوت دے رہا ہے جو آخرت کی زندگی میں تمہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

دارالسلام کا مستحق بنا دے قرطبی نے اس فقرے کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اللہ سبحانہ تمہیں دینا سمیٹنے کی نہیں بلکہ اپنی طاعت وعبادت کی دعوت دیتا ہے تاکہ تم میں دارالسلام تک پہنچنے کی صلاحیت ہو جائے۔

واللہ یھدی من یشاء الی صراط مستقیم اللہ سبحانہ جسے چاہتا ہے صراط پر چلنے کی توفیق دیتا ہے یہاں دو باتیں سمجھنے کی ہیں ایک یہ کہ اللہ سبحانہ کی مشیت کیا ہے؟ دوسرے یہ کہ صراط مستقیم کیا مقصود ہے؟

اللہ سبحانہ کی مشیت کیا ہے۔ اکثر متکلمین کے نزدیک مشیئۃ اور ارادہ میں کوئی فرق نہیں دونوں ایک ہیں اور کچھ کی رائے میں مشیئۃ نام ہے کسی چیز کے ایجاد کرنے اور چاہنے کا اگرچہ عرف میں اس کا استعمال ارادہ ہی کی جگہ میں ہوتا ہے لہذا اللہ سبحانہ کی جانب سے مشیئۃ کے معنی ایجاد کرنے اور لوگوں کی جانب سے شیئۃ کے معنے چاہنے کے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی چیز کے متعلق اللہ سبحانہ کی مشیت ہونا اس امر کا مقتضی ہے کہ اس چیز کا وجود عمل میں آئے اور اللہ کے ارادہ ہونے کا یہ تقاضا نہیں ہے کہ مراد یقینا وجود میں آئے۔

یہ لوگ ان دونوں کے درمیان یہ فرق بتاتے ہیں کہ انسانی ارادہ کبھی بغیر ارادہ کے متقدم کے بھی حاصل ہو جاتا ہے چنانچہ انسان کا ارادہ ہوتا ہے کہ اسے موت نہ آئے اور اللہ تعالیٰ کا ارادہ نہیں ہوتا لیکن مشیت انسانی بغیر مشیت الہی کے وجود میں نہیں آتی کیونکہ ارشاد ہے وما تشاءون الا ان یشاء اللہ۔

دراصل یہاں دو چیزیں ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ایک یہ کہ اللہ سبحانہ کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت ارادہ ہر جزو کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل پر کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے وہ اپنے فعل کا ذمہ دار بنتا ہے نیکی کے کاموں کے کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اسی وجہ سے وہ آخرت کی زندگی میں اپنے کام کی جزا اور سزا کا مستحق ہوگا اور اسی کی خاطر اللہ سبحانہ کی طرف سے اس کے پاس کتاب ہدایت اور اللہ کے رسول آتے ہیں۔

قرآن پہلی اور آخری کتاب ہے جس نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل اور وضاحت سے اپنی اپنی جگہ تسلیم کیا ہے اور ان کی تبلیغ کی ہے ایک طرف قرآن کہتا ہے

کہ اللہ سبحانہ کے علم کے بغیر ایک پتا بھی گر نہیں سکتا اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ ہر جاندار اپنے کاموں کے ہاتھوں گروی ہے یعنی اللہ سبحانہ کی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور ناقابل رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادہ کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی چلانے کی مشروط طاقت بخشی ہے یہی ارادہ اور اعضاء کو اس کے مطابق حرکت دے سکنے کی محدود طاقت اس کی ذمہ داری تکلیف باز پرس اور مواخذے کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال اخلاق معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے اس سے انسانؔ اس کے کسی ایسے عمل کی ذمہ داری قانوناً اور شرعاً نہیں جو اس کے ارادے اور نیت سے صادر نہ ہوئی ہو بلکہ اسکو کرنے یا نہ کرنے میں وہ مجبور و بے اختیار ہو یہاں جسے چاہتا ہے صراط مستقیم کی رہنمائی کر دیتا ہے کا مطلب یہ کہ جو بھی صراط مستقیم پر چلنے کا ارادہ کرتا ہے اور اس کے لیے اللہ کے دیئے ہوئے اختیار کو استعمال کرتا ہے اللہ سبحانہ اس کی صراط مستقیم کے لیے رہنمائی فرما دیتا ہے۔ اللہ کی مشیت کو اپنی طرف متوجہ کرنے کے لیے اصل چیز بندے کا ارادہ و اختیار ہے اب ارادہ نہ کریں اور اللہ کے دیئے ہوئے اختیار کو کام میں نہ لائیں تو اللہ سبحانہ زبردستی اور جبر سے کام نہیں کراتا۔ زبردستی کافر کو مومن بنانا اور بد کو نیک بنانا اللہ سبحانہ کے جاری قانون کے خلاف ہے۔

حضرت مولانا اشرف علیؒ ارادہ و اختیار کے موضوع پر اچھی اور لطیف تشریح پیش کی ہے۔ جن کو دیکھنے کا شوق ہو وہ مولانا کے مکتوب اسبیل لجاری السبیل کا مطالعہ کریں جو قصد السبیل کے ساتھ طبع ہوا ہے۔

صراط مستقیم کیا ہے

لغت میں صراط سیدھے اور آسان راستہ کو کہتے ہیں حافظ ابن القیم فرماتے ہیں:
صراط اصل میں اس راستہ کو کہتے ہیں جس میں پانچ باتیں ہوں ایک سیدھا ہو دوسرے منزل تک جاتا ہو تیسرے سب سے قریب ہو چوتھے کشادہ ہو پانچویں مقصد تک پہنچنے کے لیے اس کے سوا راستہ کوئی نہ ہو۔

مستقیم استقامت سے بنا ہے اس کے معنے ٹھیک اور سیدھا ہونے کے ہیں سورۃ

فاتحہ میں صراط مستقیم ان انعام یافتہ بزرگوں کے راستہ کو کہا جن میں مغضوبیت اور علم میں ضلالت نہ ہو۔ قرآن نے علم و عمل کا عملی نمونہ انبیاء صدیقین شہداء اور صالحین کو قرار دیا ہے علم و عمل کا یہ مجموعہ ہی نعمت ہے اور اس نعمت کے حامل بزرگوں کا راستہ صراط مستقیم ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے کہ قرآن تمام کی ہدایات کا مجموعہ ہے تو پھر یہ بھی بے غبار حقیقت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کمال علم اور کمال عمل لے کر تشریف لائے ہیں۔ آپ کے کمال علم اور آپ کے کمال عمل کا مجموعہ ہی صراط مستقیم ہے۔ اسی کا نام اسلام ہے اب آیت کا مطلب یہ ہوا کہ اللہ سبحانہ نے آخرت کی زندگی میں پہلے جنت کی دعوت دی اور ساتھ ہی جنت میں پہنچنے کا راستہ بھی بتا دیا یعنی جنت میں پہنچنے کے لیے تمہیں ارادے اختیار اور ہمت سے کام لینا ہوگا۔ کسی کو جنت میں نہیں پہنچایا جائے گا۔ جو ہمت اور اختیار ہے یہاں صراط مستقیم پر چلنے کا ارادہ کرے گا اللہ سبحانہ کی جانب سے اس کے لیے توفیق کی راہیں کھلی ہونگی جیسے پیاس کے لیے پانی پیٹ بھرنے کے لیے روٹی ناگزیر ہے ایسے ہی جنت کے لیے بھی ایمان و عمل ضروری شرط ہے۔

زندگی میں حسن کاری

۸؎ ان لوگوں کے لیے جو اپنی زندگی میں حسن کار بن کر رہے ہیں اچھی اور شاندار زندگی ہوگی اور کچھ زیادہ ہی ہوگا یعنی اچھے کام کرنے والوں کو وہاں اچھی جگہ ملے گی یعنی جنت اور اس سے زیادہ بھی کچھ ملے گا یعنی حق تعالیٰ کی رضا اور اس کا دیدار زیادہ کی تفسیر دیدار مبارک سے کئی احادیث صحیحہ میں آتی ہے اور بہت سے صحابہ و تابعین رضی اللہ عنہم سے منقول ہے حضرت صہیب رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ آیت پڑھی اور فرمایا جب جنتی جنت میں اور دوزخی دوزخ میں داخل ہو جائیں گے تو ایک پکارنے والا پکارے گا اے اہل جنت تمہارے لیے اللہ سبحانہ کا ایک وعدہ باقی ہے جسے اب پورا کرنا چاہتا ہے جنتی کہیں گے کہ وہ کیا ہے؟ کیا اللہ سبحانہ نے اپنے فضل سے ہمارا حسنات کا پلہ بھاری نہیں کر دیا کیا اس نے ہمارے چہروں کو سفید اور نورانی نہیں کر دیا کیا اس نے ہمیں دوزخ سے بچا کر جنت میں نہیں پہنچایا۔ یہ سب کچھ تو ہو چکا آگے کونسی چیز باقی ہے اس پر حجاب اٹھا دیا جائے گا اور جنتی حق تعالیٰ شانہ کی طرف نظر کریں گے بس اللہ سبحانہ کی قسم کوئی نعمت جو ان کو عطا ہوئی ہے دولت دیدار سے

سے زیادہ محبوب نہ ہوگی نہ اس سے بڑھ کر کوئی چیز ان کی آنکھیں ٹھنڈی کر سکے گی رزقنا اللہ سبحانہ وتعالیٰ بمنتہ وفضلہ لہ

اس آیت کی تشریح میں زیادہ اہمیت احسنوا کی ہے۔ یہ احسان سے ہے احسان کے معنے حسن کار بننے اور حسن کاری کرنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو لوگ اپنے ایمان وعمل میں حسن کار واقع ہوئے یعنی ایمان وعمل کے ادنیٰ درجے پر ہی قناعت نہیں کرتے بلکہ ان کے حسن کا جو درجہ ہے اس کے حصول میں کوشاں رہتے ہیں۔ گویا الذین احسنوا مسلمانوں کا طبقہ ہے جو زندگی کے تمام مطلوبہ شعبوں میں حسن کار ہو یعنی سر کا بوجھ اتارنے کے لیے جو کام کئے جاتے ہیں ان میں نہ زیادہ مشقت ہوتی ہے نہ زیادہ وقت لگتا ہے نہ زیادہ محنت ہوتی ہے لیکن جو کام پورے حسن وسلیقہ کے ساتھ کیا جائے گا اس کیلئے بھی سب کچھ اور بہت کچھ کرنا پڑے گا۔ پھر ان حسن کاروں کو جمال مطلق کی محبوبیت کا مقام اگر حاصل ہو جس کا اس آیت میں ذکر ہے تو اپنی محنت ومشقت کی بنیاد پر یقیناً وہ اس کے مستحق ہیں۔ یہاں الذین احسنوا سے مراد وہی لوگ ہیں جن کی زندگی خالق ومخلوق کے باہمی تعلقات کی تصحیح میں حسن کارانہ مجاہدوں کے ساتھ بسر ہوتی ہے خواہ اس کا تعلق اللہ کی پرستش سے یا اللہ سبحانہ کی بندگی سے ہو۔ حدیث جبرئیل میں احسان کی جو شرح ان الفاظ میں کی گئی ہے۔ ان تعبد اللہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک (اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو اس طریقہ سے کہ گویا تم اسے دیکھ رہے ہو پس اگر تم اسے دیکھ نہ پاؤ تو اتنی بات تو یقینی ہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے) اس سے بھی اسی خیال کی تائید ہوتی ہے۔ بہر حال اس آیت میں بتایا گیا ہے کہ حسن کاروں کو جو جزا اس حسن کاری کی ملے گی وہ بھی الحسنیٰ شاندار خوبصورت ہوگی کیونکہ ھل جزاء الاحسان الا الاحسان اس جزاء کے سوا ان حسن کاروں کو کچھ اور بھی ملے گا۔ کچھ اور کے لیے قرآن کی تعبیر وزیادہ ہے اس کی تشریح میں شارحین قرآن نے دو راہیں اختیار کی ہیں۔ ایک وہ ہیں جن پر عقلیت غالب ہے ان میں زمخشری صف اول میں بیضاوی اسی کے ہمنوا ہیں قاضی صاحب زیادہ کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ ان کو مزید

لہ افادات شیخ الاسلام

ثواب اپنے فضل سے عطا کریں گے۔
دوسرے وہ ہیں جنہوں نے زیادہ کی تشریح ارشاد نبوت کی روشنی میں کی ہے علامہ آلوسی، علامہ قرطبی کی یہی رائے ہے کہ زیادہ سے مراد دیدار الٰہی ہے۔ یہ تفسیر صحیح مسلم میں حضرت صہیب صحابی کے حوالہ سے خود جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے جیسا کہ آپ شیخ الاسلام کی زبانی سن آئے امام بخاری نے صحیح میں اگرچہ صہیب کی روایت میں نہیں لی ہے لیکن ترجمۃ الباب میں قال غیرہ النظر الی وجھہ کہہ کر اس تشریح کو پیش کیا ہے اور اس سے پہلے مغفرہ اور رضوان سے بھی اس کی تشریح کی ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ امام بخاری کے نزدیک دونوں تشریحیں یعنی رضوان اور نظر الی لوجہہ صحیح ہیں۔ دراصل دونوں کا ذکر کر کے امام بخاری بتا رہے ہیں کہ جنت کے انعامات کی فہرست میں رضوان بھی ہے اور دیدار الٰہی بھی رضوان یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اپنے بندے سے راضی ہوتا کہ کبھی وہ اپنے بندے پر عتاب نہ فرماتے نہ اس سے ناراض ہو سورہ توبہ میں اس کی تفصیل آچکی ہے اور جنت میں سب سے آخری نعمت اللہ سبحانہ کی تجلی کا نظارہ ہے کون ہے جو اس مطلع انوار کے دیدار کی تاب لا سکے قرآن کا اعلان ہے وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ اور حضور اقدس کا اپنا ارشاد ہے فواللہ ما اعطاھم شیئا احب الیھم النظر الی وجہ اللہ الکریم اس آیت کی تشریح میں حضرت جریر بن عبداللہ صحابی روایت کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ تم اپنے رب کو بالمشاہدہ دیکھو گے سو دوسری روایتوں میں ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جیسے تم چاند کو دیکھ رہے ہو ایسے ہی تم اپنے پروردگار کو دیکھو گے اس دیدار میں کوئی دوسرا مزاحم نہ ہوگا۔

ارشاد کا منشا یہ ہے کہ حسن کار اور حسن کردار والوں کو حسنی اچھا خوبصورت اور شاندار مقام ملے گا حسن کار والوں کو صرف حسنی ہی نہیں ملے گا بلکہ حسن کاروں سے اللہ سبحانہ محبت کرتا ہے احسنوا ان اللہ یحب المحسنین اور حسن کاروں کو اللہ سبحانہ کی محبت حاصل ہوگی یہ قانون الٰہی ہے کہ اللہ کی نصرت ان کا ساتھ دیتی ہے جو برائیوں سے بچتے ہیں اور جن کی زندگیوں میں حسن کاری ہو۔

یہ بات ذہن میں رکھ لیجئے کہ صحابہ کرام کی ساری جماعت مہاجرین ہوں یا انصار سب کے سب حسن کار تھے۔ ان کی حسن کاری میں قیامت تک جو ان کی پیروی کریں گے اللہ سبحانہ

نے ان کو رضی اللہ عنھم و رضوا عنہ کا شہادت نامہ دیا ہے۔

حسن کار لوگ کے چہروں کی چمک

۲۶ له ان کے چہروں پر نہ تو مجرمانہ سیاہی اور نہ ذلت۔ یہی لوگ جنت کے باسی ہیں اور اس میں ہمیشہ ان کا بسیرا رہے گا یعنی میدان حشر میں جس طرح کفار فجار کے چہروں پر سخت ذلت وظلمت چھائی ہو گی جنتیوں کے چہرے اس کے خلاف ہوں گے سیاہی اور رسوائی کیسی وہاں تو نور ہی نور اور رونق ہی رونق ہو گی له مطلب یہ ہے کہ ان کے چہرے اپنی کامیابی پر بشاش و بشاش ہوں گے اور ہر قدم پر ان کے ساتھ اعزاز و اکرام کا معاملہ ہو رہا ہو گا یہاں قرآن نے منفی پہلو بتایا ہے کہ ان کے چہروں پر سیاہی نہ ہو گی اور ذلت نہ ہو گی دوسری جگہ قرآن نے مثبت پہلو پیش کیا ہے۔

واما الذین ابیضت وجوھھم ففی رحمۃ اللہ ھم فیھا خالدون

جن کے چہرے چمک رہے ہوں ہوں گے وہ ہمیشہ اللہ کی رحمت میں ہوں گے

یہ ان کے مقام رحمت میں ہونے کا اعلان ہو رہا ہے۔ اللہ سبحانہ کی رحمت کہاں نہیں اور کب نہیں لیکن وہ عالم وہ ہے جہاں اس کی رحمت کے سوا اس کے قہر و غضب کا نام ونشان نہ ہو گا۔ وہاں ہر طرف اس کی رحمت اور فیض و کرم کی بارش ہو گی اور اس کی رحمت کے سوا وہاں کوئی اور منظر کہیں اور کبھی دکھائی نہ دے گا۔ اہل جنت کو جن کے چہرے خوشی سے چمکتے ہوں گے ان کو بشارت کی آواز سنائی دے گی۔

لا یرھق وجوھھم کا مدلول یہ بھی ہے کہ ان کے چہرے نور سے چمک رہے ہوں گے اس میں بھی ان کے جنت میں مقام نور میں ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ جنت کا مقام نور وہ ہے جہاں ظلمت و تاریکی کا نام ونشان نہ ہو گا جنتیوں کے چہرے روشن ہوں گے کوئی ستاروں کی طرح چمکے گا کوئی چاند کی طرح ان کے ہر طرف انوار کی بارش ہو گی آگے پیچھے ہر طرف سے نور درخشاں ہو گا نورھم یسعی بین ایدیھم وبایمانھم۔

له افادات شیخ الاسلام

سزا اور جرم میں توازن

۲۷۔ اور جو لوگ زندگی برائیوں کی کمائیاں کرتے رہے ہیں ان کے لیے برائی کا بدلہ برائی
ہے۔ ان پر ذلت چھائی ہوگی۔ ان کو اللہ سبحانہ کی گرفت سے بچانے والا کوئی نہ ہوگا۔ ان کے
چہرے ایسے کالے ہوں گے گویا ان کے چہروں کو تاریک رات کے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیا
گیا ہے یہی دوزخی ہیں ان کو دوزخ ہی میں رہنا ہے۔

اس آیت میں ضروری باتیں سمجھنے کی یہ ہیں۔

۱۔ برائیوں کو کمانے والے

۲۔ برائی کا بدلہ اسی جیسا

۳۔ ان کے چہروں کی کالک اور ان کی روسیاہی

قرآن یہاں احسان کے مقابلہ میں کسب لایا ہے ہونا یہ چاہیئے تھا والذین اساؤا وہ لوگ جنہوں نے حسن کاری جگہ بدکاری میں زندگی گذاری۔ علامہ آلوسی نے صرف یہ بات بتائی ہے کہ حسن کاروں اور بدکاروں میں بھرپور تباین کو ظاہر کرنے کے لیے انداز بیان میں فرق کیا ہے لیکن اساؤا کی جگہ کسبوا لاکر بتاتا یہ ہے کہ برائی انسان کی طبیعت نہیں نیکی اصل طبیعت ہے۔ بدکار جو کچھ کرتا ہے یہ اس کی طبیعت اور اللہ کی فطرت نہیں بلکہ یہ اس کی محنت اور کمائی ہے ورنہ اصل تو انسان میں نیکی ہے۔ برائی میں تکلف ہے نیکی بے تکلفی کا نام ہے راستی اور سچ اصل ہے اس کے لیے آپ کو محنت کی اور تکلف کی ضرورت نہیں جھوٹ بناوٹ ہے اس کے لیے آپ کو تکلف اور محنت کی ضرورت ہے اس لیے جھوٹ آپ کی کمائی ہے سچ کمائی نہیں وہ آپ کی فطرت ہے اس لیے اساؤا کی تعبیر چھوڑ کر کسبوا فرمایا اور نیکو کاروں کے بارے میں کسبوا کی تعبیر چھوڑ کر احسنوا فرمایا۔

دوسری بات برائی کا بدلہ اسی جیسا ہوگا یعنی بدی سے زیادہ نہ ہوگا کم سزا دیں یا برائیوں کو بالکل معاف کر دیں ان کو اختیار ہے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

برائی کا بدلہ برائی قرآن نے خالق ومخلوق دونوں کے لیے دُنیا و آخرت میں جیسے گناہ کی سزا گناہ جیسی ہے اس میں زیادتی اور اضافہ نہیں ایسے ہی دنیا میں ہی اسلام نے یہی قانون رکھا ہے کہ جرم اور سزا میں توازن رہنا چاہیے اللہ سبحانہ نے جیسے موجودہ عالم کو اپنے خاص نظام اور قانون کے تحت بنایا ہے جس کو فلاسفہ قانون قدرت اور اہل مذاہب تقدیر کہتے ہیں۔ اسی طرح اس نے ہر عالم کے لیے ایک نظام اور تقدیر قائم کی ہے جس کے مطابق اس عالم کا کاروبار چلتا ہے انسان غلطی سے یہ سمجھ بیٹھا ہے کہ یہ اصول وقوانین صرف مادیات تک محدود ہیں۔ حالانکہ مادیات ہوں یا روحانیات ذہنیات ہوں یا عملیات ہر ایک میں یہ یکساں جاری وساری ہیں۔

تیسری بات کہ ان کے چہرے ایسے کالے ہوں گے گویا ان کے چہروں کو تاریک رات کے ٹکڑوں سے ڈھانپ دیا گیا ہے۔ یعنی ان کے چہرے اس قدر تاریک ہوں گے گویا اندھیری رات کی تہیں ان پر جما دی گئی ہیں۔

اس سے یہ بات صاف ہوگئی کہ سیاہی جرائم کی ہوگی اور چونکہ یہ ابدی مایوسی کی سیاہی ہوگی اس وجہ سے ایسا معلوم ہوگا کہ گویا ان کے چہروں پر شب تاریک کے ٹکڑے کاٹ کاٹ کر ڈال دیئے گئے ہیں۔ قرآن نے ہر جگہ ایمان کو روشنی سے اور کفر کو تاریکی سے تشبیہ دی ہے اللہ ولی الذین آمنوا یخرجھم من الظلمات الی النور اور اہل ایمان کی پہچان یہ فرمائی ہے کہ ان کے لیے سرخروئی اور شادمانی ہوگی دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی وجوہ یومئذ ناضرۃ الی ربھا ناظرۃ، تعرف فی وجوھھم نضرۃ النعیم وجوہ یومئذ ناعمۃ اور کفر کے لیے سیاہی اور خواری ہے وجوہ یومئذ باسرۃ ـــ وجوہ یومئذ خاشعۃ عاملۃ ناصبۃ۔ آل عمران میں گذر چکا ہے یوم تسود وجوہ۔ ان آیات میں بھی بات بیان کی ہے خوشحالی وکامرانی سے چہروں کا چمک اٹھنا اور نامرادی وخواری سے سیاہ پڑ جانا ایک طبعی حالت ہے اس لیے فرمایا کہ اس روز حسن کاروں کے چہرے چمک اٹھیں گے اور بدکاروں کے چہرے سیاہ پڑ جائیں گے اور سیاہ چہروں کا حال یہ ہوگا، گویا پردہ شب نے ان کے چہرے ڈھانپ لیے ہیں۔

لہ افادات شیخ الاسلام

وَيَوْمَ نَحْشُرُهُمْ جَمِيعًا ثُمَّ نَقُولُ لِلَّذِينَ أَشْرَكُوا مَكَانَكُمْ
أَنتُمْ وَشُرَكَاؤُكُمْ فَزَيَّلْنَا بَيْنَهُمْ وَقَالَ شُرَكَاؤُهُم مَّا كُنتُمْ
إِيَّانَا تَعْبُدُونَ ﴿۲۸﴾ فَكَفَىٰ بِاللَّهِ شَهِيدًا بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ إِن كُنَّا
عَنْ عِبَادَتِكُمْ لَغَافِلِينَ ﴿۲۹﴾ هُنَالِكَ تَبْلُو كُلُّ نَفْسٍ مَّا أَسْلَفَتْ
وَرُدُّوا إِلَى اللَّهِ مَوْلَاهُمُ الْحَقِّ وَضَلَّ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَفْتَرُونَ ﴿۳۰﴾

ع ۱۰

اور جس روز یک جا کر لیں گے ان سب کو پھر شرک سازیاں کرنے والوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شرکا ٹھہر جاؤ [۱۱] پھر ہم ان عابدوں اور ان کے معبودوں کے درمیان امتیاز قائم کر دیں گے تب وہ لوگ جن کو اللہ کی عبادت میں شریک کیا گیا تھا اپنے عابدوں سے کہیں گے تم ہماری عبادت ہی نہ کرتے تھے [۱۲] ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ ہمیں تمہاری پرستاریوں کا کچھ بھی پتہ نہ تھا [۱۳] وہیں ہر آدمی جانچ لے گا کہ جو کچھ پہلے کر چکا ہے وہ کیا ہے اور سب کو بارگاہ الٰہی میں پیش کیا جائے گا جو واقعی ان کا مالک ہے

اور واقعہ کے خلاف جو کچھ وہ افترا پردازیاں کرتے رہے ہیں سب ان سے گم ہو جائیں گے ۴۴

مفردات کے معانی

نحشر حشر سے مضارع کا جمع متکلم ہے باب نصر اور ضرب سے آتا ہے اس کے معنی جماعت کے اکٹھا کرنے کے ہیں اور میدان جنگ میں لے جانے کے ہیں چونکہ قیامت آنے پر سب کو قبروں سے اٹھا کر اکٹھا کیا جائے گا اس لیے اس دن کو یوم الحشر اکٹھا کرکے جانے کی رعایت سے کہتے ہیں اس کے دوسرے نام بھی ہیں یوم معلوم، یوم عسیر یوم عظیم۔ یوم البعث، یوم التلاق، یوم الجمع، یوم الخروج اور بہت سے نام ہیں جن کی تفصیل کسی موقعہ پر انشاء اللہ آ جائے گی۔

زیلنا تزییل سے ماضی کا جمع متکلم ہے اس کے معنے متفرق اور پراگندہ کرنے کے ہیں اس کا مادہ زوال ہے اسی میں مبالغہ کے معنے پیدا کرنے کے لیے مجرد میں ذلت بروزن بعت آتا ہے زیل، تزیل اسی سے آتے ہیں تبلو بلاء سے مضارع کا واحد مونث بلا، یبلو بلاء باب نصر سے آنا آزمانا اسلفت اسلاف باب افعال سے ماضی کا واحد مونث غائب ہے اس کا مادہ سلف ہے وہ پہلے کر گذری وہ گذر گیا۔

مولیٰ ولی ہے اس کے دو مصدر ہیں ولی اور ولایۃ ولی کے معنے قرب ہونا اسی سے نکاح اور جنازے میں ولی ہوتا ہے اور ولایت بمعنی ریاست آتا ہے اسی سے والی ہے اس کی جمع ولاۃ آتی ہے ولی بمعنی قریب ہونا ہے ولاء آتا ہے ولاء جگہ سے قرب ہونے کی وجہ سے لگاؤ کو بھی کہتے، نسبی قرب کو بھی کہتے دوستی اور بھائی چارے کے معنی میں آتا ہے ولایت بمعنی نصرہ آتا ہے اس سے ولی اور مولی دونوں استعمال ہوتے ہیں۔ اللہ سبحانہ کے لیے بھی ولی آتا ہے اللہ ولی الذین امنوا اور اہل ایمان کو بھی ولی اللہ بولا جاتا ہے۔ اسی معنے کی رعایت سے لفظ مولی ۹ معنے میں آتا ہے غلام آزاد کرنے والا۔ مالک

غلام۔ ساتھی۔ مددگار۔ رشتہ دار۔ پڑوسی۔ دوست۔ بیٹا۔ چچا۔ مہمان۔ ساجھی۔ بھانجا۔ قریبی رشتہ دار وارث۔ احسان کنندہ، جس پر احسان کیا جائے، داماد۔ یہ لفظ اب سب معانی کی رعایت سے بولا جاتا ہے اللہ سبحانہ کو اہل ایمان کا مولی مالک اور ناصر ہونے کی وجہ سے بولا جاتا ہے نکل جعلنا موالی میں موالی وارث کے معنے میں ہے فاخوانکم فی الدین وموالیکم میں لفظ ساتھی اور رفیق کے معنے میں ہے اور ان اللہ ھو مولاہ وجبریل وصالح المومنین میں اللہ سبحانہ، جبریل نیکوکار اہل ایمان کو حضور کا رفیق بتایا گیا ہے اور مسلمان اسی معنی میں علماء کو مولانا کہہ کر پکارتے ہیں یہ تو لفظ مولی کی لغوی اور معنوی حد تک تحقیق ہے ورنہ لفظ مولانا کی پشت پر ایک تاریخی تجزیہ بھی ہے۔ اس کی تفصیل کا یہ محل نہیں ہے۔

اعمال کے لوازم ونتائج

جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے وہ جب یہاں لبادہ وجود پہنتی ہے تو اس کے ساتھ اس کے خواص وآثار بھی پیدا ہوتے ہیں ٹھیک اسی طرح انسان کی اندرونی کیفیات واعمال کے بھی کچھ آثار ولوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے، غرور وخاکساری بخل وفیاضی، انتقام وعفو، شجاعت وبزدلی تقویٰ وفسق ایمان وکفر توحید عبادت اور شرک ہر ایک کا الگ اثر ونتیجہ ہے اور ہر ایک کے کچھ نہ کچھ خصائص ہیں۔ جو اس سے اسی طرح جدا نہیں ہو سکتے جس طرح سنکھیا سے موت شکر سے میٹھاس اور آگ سے حرارت جدا نہیں ہو سکتی۔ اور ان معنوی روحانی اور نفسیاتی چیزوں میں علت ومعلول کا وہی لزوم ہے جو جسمانی مادی طبعیاتی اشیاء میں ہے۔ افراد کی نیکی اور بدی، سعادت وشقاوت کے جو اصول ہیں وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح وفساد اور سعادت وشقاوت پر بھی حاوی ہیں۔ جس طرح ایک حکیم کا کام ان مادی فزیکل اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی تعلیم کا نام ہماری زبان میں حکمت ہے اسی طرح ان روحانی اسباب وعلل اور آثار ونتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء کا کام ہے انبیاء کی تعلیم کے مطابق ہمیں اعمال کے روحانی آثار ونتائج کا وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی آثار وخواص کا ہوتا ہے۔ الغرض یہ مادی وجسمانی دنیا علت ومعلول عمل رد عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر قول ہر عمل داخل ہے۔ یہی وجہ ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام عقاب اور نیکی کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب ہے۔ اس

بات کو اگر اچھی طرح سمجھ لیا جائے تو حشر و نشر اور جزا و سزا کے اصول سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو سکے اور جس روز ہم ان کو یک جا کر لیں گے۔ پھر شرک سازیاں کرنے والوں سے کہیں گے کہ تم اور تمہارے شرکاء ٹھہر جاؤ، یعنی تم نے اپنے خیال میں اللہ سبحانہ کی عبادت میں شریک بنا رکھا تھا یا جن کو اللہ سبحانہ کی بیٹیاں اور بیٹے کہتے تھے مثلاً مسیح علیہ السلام جو نصاریٰ کے نزدیک اللہ کے بیٹے تھے بلکہ عین اللہ تھے یا اللہ کے فرشتے مشائخ اور علماء کہ انہیں بھی ایک حیثیت سے الوہیت کا مقام دے رکھا تھا یا اصنام و اوثان جن پر مشرکین مکہ نے الوہیت کو تقسیم کر رکھا تھا سب کو حسب مراتب اپنی اپنی جگہ کھڑا ہونے کا حکم ہوگا۔

شرک ایک کلی ہے اس کی جزئیات ہر دور میں مختلف قالبوں میں رونما ہوتی رہتی ہیں۔ دنیا کی مشہور قوموں میں یہودی، عیسائی اور مجوسی شرک کرتے تھے ہندو بھی اسی کے قریب قریب تھے۔ حکیم الامت شاہ ولی اللہ نے لکھا ہے کہ[1] اشباح و قوالب شرک کی تشکیل صورتیں اور مظاہر مختلف ہیں اور قانون نبوت کی ضرب ان مظاہر ہی پر ہوتی ہے شرک کا ایک مظہر شخص پرستی ہے حضرت عیسیٰ، رام چندر، کرشن کو اسی شخص پرستی نے معبود بنا دیا ہے شرک کے عمومی قوالب کا تعلق اشخاص ہی سے ہے۔ اہل عرب بھی اسی بیماری کا شکار تھے۔ یہ لات، مناۃ، عزیٰ، سواع، یعوق۔ ود سب اشخاص تھے ان ہی اشخاص کے اصنام اوثان تماثیل اور انصاب لکڑی کے سونے کے تانبے کے بنا رکھے تھے۔ یہ سب کے سب اسماء رجال صالحین بزرگوں کے نام تھے۔ غرض کوئی نہیں خواہ تصویر بنا کر سامنے رکھ لو یا قبر میں دفن کر کے قبر کے سامنے کھڑے ہو کر ان سے نیاز مندانہ اور عابدانہ تعلقات پیدا کر لو عیسائی حضرت عیسیٰ کو پکارے یہودی حضرت عزیر کو پکارے ہندو رام چندر یا کرشن کو پکارے سکھ گرونانک کو پکارے اور مسلمان حضرت علی اور شیخ جیلانی کو پکارے قالب مختلف ہیں روح شرک سب میں ایک ہے سب کے بارے میں قرآن کا ناطق فیصلہ ہے اموات غیر احیاء نے ناموں کی تبدیلی سے حقائق تبدیل نہیں ہوتے۔ جن جن سے دنیا کی زندگی میں عابدانہ تعلقات قائم کئے جائیں گے یہ سب شرکاء ہیں ان کے اور ان سے عابدانہ تعلق رکھنے والوں سے کہا جائے گا مکانکم انتم و شرکاؤکم تم سب

[1] افادات شیخ الاسلام

ٹھہر جاؤ۔ قرآن نے حضرت عیسیٰ جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کا نام لے کر کہا ہے۔
انت قلت للناس اتخذونی وامی الھین من دون اللہ۔
اے عیسیٰ کیا تو لوگوں سے کہہ کر آیا تھا کہ اللہ سبحانہ سے ورے مجھ سے اور میری والدہ سے عابدانہ تعلقات قائم کر لینا۔

یہاں اصل تعبیر مکانکم انتم وشرکاءکم ہے اس کے معنے ہیں تم اور وہ سب جن کو تم دنیا میں شریک عبادت حق سبحانہ کرتے تھے ذرا ٹھہر جاؤ مکانکم سے فعل محذوف ہے الزموا قاضی بیضاوی فرماتے ہیں یعنی یہ ہیں کہ ٹھہر جاؤ تاکہ اپنے اعمال شرکیہ کے نتائج اپنی آنکھوں سے دیکھ لو شرکاء سے مراد یہاں ہر وہ شخصیت ہے جس سے اس دنیا میں اللہ کے سوا عابدانہ تعلقات قائم کیے گئے ہوں گے۔

شرکاء کا اعلان برارت

۲۸ پھر ہم ان عابدوں اور ان کے معبودوں کے درمیان امتیاز قائم کر دیں گے تب وہ لوگ جن کو اللہ کی عبادت میں شریک کیا تھا اپنے عابدوں سے کہیں گے تم ہماری عبادت ہی نہ کرتے تھے۔ یہ معبودوں کی جانب سے عابدوں کی عبادت کا انکار ہی نہیں بلکہ ان کے اس کردار پر اظہار بیزاری ہے زیلنا کے معنے لغت میں جدائی ڈالنے کے ہیں۔ یہاں جدائی کا مطلب یہ ہے کہ دونوں عابدوں اور ان کے معبودوں کو ممتاز کر کے ایک دوسرے کے آمنے سامنے کر دیں گے اور معبود اپنے عابدوں سے ان کی عبادت کا صاف اور کھلا انکار کر دیں گے یہ وہی اعلان برارت اور اظہار بیزاری ہے جو قرآن کے ایک سے زیادہ مقام پر مذکور ہے۔ ماکنتم ایانا تعبدون یہ اعلان برارت ہے۔ عابدوں کا تو شائد یہ خیال ہو کہ ساری زندگی جن کو شفیع سمجھ کر عبادت کی ہے آج وہ کام آئیں گے لیکن یہ دیکھ کر ان کو یاس و مایوسیوں کا شکار ہونا پڑے گا کہ وہ ان کی عبادتوں کا انکار کر رہے ہیں۔ ساری زندگی جن کی پرستش کی ہے اور جن کی نیازیں نذریں اور چڑھاوے چڑھاتے رہے جن کے انصاب کو مقدس سمجھتے ہوئے جن کی مورتیوں کو ثواب سمجھ کر غسل دیتے رہے جن اوثان کے سامنے ماتھا ٹیکتے رہے اور جن تماثیل کے سامنے دھرنے مار کر بیٹھے اور جن قبروں کا طواف کرتے رہے اور نت نئی چادریں چڑھاتے رہے وہ صاف اعلان

بیزاری کریں گے۔ قرآن میں دوسری جگہ اس انداز میں پیش کیا گیا ہے

اذ تبرأ الذین اتبعوا من الذین اتبعوا وراوا العذاب
وتقطعت بھم الاسباب

مطلب یہ ہے کہ مشاہدہ عذاب کا وقت وہ ہو گا جب کہ تمام ذی اثر اور صاحب اقتدار ہستیاں جن کی دنیا میں اوثان۔ اصنام اور تماثیل کی صورت میں عبادت کی جاتی تھی ان سب لوگوں سے بیزار ہو جائیں گے جو ان کی پیروی کرتے تھے اور ان کی پرستش کرتے تھے یہ سب عابد و معبود عذاب الٰہی کا مشاہدہ کریں گے اور ان کے عابدانہ رشتوں کا تمام سلسلہ ختم ہو جائے گا مطلب یہ ہے کہ تابع و متبوع، عابد و معبود راعی ورعیت زعیم اور شہری کے درمیان جو دنیا میں طاعت، عبادت، شفاعت کے من گھڑت روابط تھے وہ سب ختم ہو جائیں گے مطاع طاعت کا معبود عبادت کا انکار کر دیں گے آخرت میں جو حقائق کے مشاہدے کا وقت ہو گا سب ایک دوسرے سے بے تعلق ہو جائیں گے۔ شرکاءھم اضافت کے ساتھ فرمایا کیونکہ یہ لوگوں کے خود تراشے ہوئے عبادت میں شرکا تھے۔ ایسا کرنے کا ان حکم نہ ہوا تھا۔

بے حقیقت عبادت اور من گھڑت معبود

۲۹ ہمارے اور تمہارے درمیان اللہ کی گواہی کافی ہے کہ ہمیں تمہاری پرستاریوں کا کوئی بھی پتہ نہ تھا یعنی اس وقت عجیب افراتفری اور نفسی نفسی کا عالم ہو گا۔ عابدین و معبودین میں جدائی ہو جائے گی اور دنیا میں اپنے اوہام و خیالات کے موافق جو رشتے جوڑ رکھے تھے سب توڑ دیئے جائیں گے۔ اس ہولناک وقت میں جب کہ مشرکین کو اپنے فرضی معبودوں سے بہت کچھ توقعات تھیں وہ صاف جواب دے دیں گے کہ تمہارا ہم سے کیا تعلق تم جھوٹ بکتے ہو کہ ہماری بندگی کرتے تھے تم اپنے عقیدے کے موافق جس چیز کو پوجتے تھے اس کے لیے وہ خدائی صفات تجویز کرتے تھے وہ فی الواقع اس میں موجود نہ تھیں تو حقیقت میں وہ عبادت واقعی مسیح یا ملائکہ کی نہیں اور وہ حقیقت میں بے جان مورتیوں کی پوجا تھی محض اپنے خیال اور وہم یا شیطان لعین کی پرستش کو فرشتے نبی یا نیک انسان یا کسی تصویر وغیرہ کے نام پر کرتے تھے اللہ گواہ ہے کہ ہمارے اذن سے تم نے یہ حرکت نہیں کی ہم کو کیا خبر تھی کہ انتہائی حماقت و سفاہت سے اللہ سبحانہ کے مقابلے میں ہمیں معبود بنا ڈالا

گئے لے مطلب یہ ہے کہ وہ تمام فرشتے جن کو دنیا میں دیوی اور دیوتا قرار دے کر پوجا گیا اور وہ تمام ارواح اسلاف اجداد انبیا اولیا شہدا جن کو دانائے غیب اور مختار کل بناکر وہ حقوق انہیں دیئے گئے جن کا حقدار اللہ سبحانہ ہے جن کی نذریں نیازیں دی گئیں، جن کو دور دراز سے پکارا گیا جن کے ناموں پر بکرے قربان کئے گئے جن کے لیئے چوٹیاں رکھی گئیں جن کے چڑھاوے پکائے گئے۔ جن سے دعائیں کی گئیں جن کے طواف کئے گئے وہ سب اپنے پرستاروں سے کہیں گے کہ ہمیں تو تمہارے کرتوتوں کی خبر تک نہیں تھی کہ تم ہماری عبادت کر رہے ہو۔ تمہاری کوئی دعا کوئی پکار کوئی التجا اور فریاد کوئی نذر و نیاز کوئی چڑھاوے کی چیز کوئی تعریف و مدح اور نام کا جپنا اور کوئی سجدہ ریزی و استانہ بوسی و درگاہ گردی ہم تک نہیں پہنچی ہمیں اس کا کوئی پتہ نہیں۔

حقائق سب کے سامنے آجائیں گے

کلے وہیں ہر آدمی جانچ لے گا کہ جو کچھ پہلے کر چکا ہے وہ کیا ہے؟ اور سب کی بارگاہ الٰہی میں پیشی ہو گی جو واقعی ان کا حقیقی مالک ہے اور واقعہ کے خلاف جو کچھ وہ افترپردازیاں کرتے رہے ہیں سب ان سے بیوفائی کر جائیں گی یعنی جھوٹے اور بے اصل توہمات سب رفوچکر ہو جائیں گے۔ ہر شخص برائی العین مشاہدہ کرے گا کہ اس سچے مالک کے سوا رجوع کرنے کا کوئی ٹھکانا نہیں ہے ہر ایک انسان کو اپنے تمام بھلے برے اعمال کا اندازہ ہو جائے گا کہ کتنا وزن دیتے ہیں لے

پہلی آیت میں اس حقیقت کی طرف اشارا تھا کہ تم جن پیشواؤں کو اپنی حاجت روائی کیلئے پکارتے ہو ان تک نہ تو تمہاری پکار پہنچتی ہے اور نہ تمہاری پرستاریوں کی انہیں کچھ خبر ہے وہ تمہاری حاجت روائی کیا کریں گے۔ روز قیامت اللہ سبحانہ تابع و متبوع اور عابد و معبود کو ایک صف میں کھڑا کر دیں گے لیکن وہ مشرکوں کا ساتھی ہونا پسند نہ کریں گے اور صاف کہہ دیں گے ہمارا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ یہ اگرچہ ہمارا نام لیتے ہیں لیکن فی الواقع ہیں

لے افادات شیخ الاسلام

کلے افادات شیخ الاسلام

نہیں پوجتے بلکہ اپنی سوائے نفس کے پجاری ہیں ہیں توان کی پوجا دپاٹ کا پتہ بھی نہیں ہے اب بتا یا جا رہا ہے کہ ان تابعوں اور عابدوں کے سامنے اپنے عابدانہ اعمال کی حقیقت کھلکر سامنے آجائیگی اور انکو پتہ لگ جائے گا کہ عبادت کے نام کو وہ جس قدر اعمال کرتے تھے اور جن کو انہوں نے اپنے عابدانہ اعمال کا حق دار بنا رکھا تھا یہ سب ان کے توہمات کی تخلیقات ہیں۔ ان کا واقعہ اور حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

قرآن کی یہ آیت بتا رہی ہے کہ مشرکین کی شرکی عبادتیں اور اعمال وافعال اور شرکین کے بنائے ہوئے شرکا ر یہ سب مشرکین کی وہمی تخلیقات ہیں حقائق سے ان کا دور کا بھی واسطہ نہیں ان کی پشت پر کوئی دلیل نہیں ہے شرک کرنے والوں کے سامنے اپنے علم وعمل کے تناقض کا یہ سوال ہمیشہ سے ہے کہ خود جانتے ہیں کہ پیدا کرنے کے عمل کا اپنے ہاتھوں سے بنائی ہوئی یادگاروں تصویروں ستھانوں اور فقیروں سے کوئی تعلق نہیں ہے اور سمجھتے ہیں کہ یہ سب ان کے ہی ہاتھوں کی بنائی ہوئی ہیں اور جن سے ان کی یادیں وابستہ ہیں وہ اللہ کے بنائے ہوئے ہیں مگر باوجود اس کے پھر بھی جو پیدا کر رہا ہے اس سے نہیں بلکہ ان ہی سے مانگ رہے ہیں نذریں مان رہے ہیں۔ پھول چڑھا رہے ہیں دہائیاں دے رہے ہیں چونکہ ایک غلطی دوسری غلطی کو جنم دیتی ہے کچھ اپنی قومی روایات کی پیچ رسم ورواج کا دباؤ ان کو مجبور کرتا ہے کہ علم وعمل کے اس تضاد میں مفاہمت پیدا کی جائے۔ تاویلوں اور توجیہات کا سہارا ڈھونڈھا جاتا ہے حد ہوگئی کہ مشرکین کو تمثیل کے مغالطہ میں مبتلا کیا گیا اللہ سبحانہ کو انسانی بادشاہ فرض کر کے باور کرایا گیا کہ اگرچہ سارے حکم احکام بادشاہ کے چلتے ہیں لیکن بادشاہ سے کوئی چیز اسی وقت حاصل ہو سکتی ہے جب ماتحتوں کو خوشامدوں سے راضی کر لیا جائے ان کے پاس کچھ تحائف کی ڈالیاں پیش کی جائیں۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ سب من گھڑت افسانے ہیں یہ سب ان کی قوت واہمہ کی کارستانیاں ہیں۔ ان کا حقیقت سے دور کا بھی کوئی واسطہ نہیں ہے۔ یہ تو صرف منہ سے بولے ہوئے نام ہی نام ہیں اور نام بھی تمہارے اور تمہارے باپ دادوں کے رکھے ہوئے ہیں۔ ان کی پشت پر کوئی دلیل نقلی اور عقلی نہیں ہے ما انزل اللہ بھا من سلطان۔ یہ حقائق نہیں تمہارے افترات ہیں جو تمہارے گمانوں اور خیالوں کے نگران میں پک کر تیار ہوئے ان تتبعون الا الظن روز جزا میں یہ افترات خس و خاشاک ہو جائیں گے بتانا یہ چاہتا ہوں کہ ان ہی توہمات کی وجہ سے قوموں اور امتوں نے غیر سلطانی

بلکہ افترائی قوانین کی جکڑ بندیوں میں پہننا پڑا ہے اور کتنے بن جوان ہی زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں آخر ان ہی انسانوں میں کتنے ہیں جنہیں قبر حلیہ پہننا چڑی، تعزیہ علم شدہ امام قاسم کی اور شیخ عبد القادر کی گیارہویں اور شیخ نظام الدین کی سترہویں کے طوفان میں پڑے ہوئے ہیں، بے چارے شہید کے نام کا طاق نشان، توپ جس پر بکرا چڑھایا جاتا ہے اور سبیلاتی کا بابوانی کا نیا کالی کلکتہ والی۔ کا یا کانکا کا چار ابروانہی سلاسل میں پڑے ہیں یہ سب غیر سلطانی اور افترائی ضوابط توہمات ہی کی مخلوق ہیں۔ کوئی کسی کے نام کی سر پر چوٹی رکھتا ہے کوئی کسی کے نام پر ناک یا کان میں سوراخ کرتا ہے کوئی چار ابرو صاف ہے الی غیر ذالك من الخرافات والاوھام۔ انا لله فالی الله المشتکی من ھذہ الرزیة التی رزی بہا المسلمون الیوم۔

قُلْ مَنْ يَّرْزُقُكُمْ مِّنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ اَمَّنْ يَّمْلِكُ السَّمْعَ وَ
الْاَبْصَارَ وَمَنْ يُّخْرِجُ الْحَيَّ مِنَ الْمَيِّتِ وَيُخْرِجُ الْمَيِّتَ مِنَ
الْحَيِّ وَمَنْ يُّدَبِّرُ الْاَمْرَ ؕ فَسَيَقُوْلُوْنَ اللّٰهُ ۚ فَقُلْ اَفَلَا
تَتَّقُوْنَ ﴿۳۱﴾ فَذٰلِكُمُ اللّٰهُ رَبُّكُمُ الْحَقُّ ۚ فَمَاذَا بَعْدَ الْحَقِّ
اِلَّا الضَّلٰلُ ۚۖ فَاَنّٰى تُصْرَفُوْنَ ﴿۳۲﴾ كَذٰلِكَ حَقَّتْ كَلِمَتُ
رَبِّكَ عَلَى الَّذِيْنَ فَسَقُوْۤا اَنَّهُمْ لَا يُؤْمِنُوْنَ ﴿۳۳﴾ قُلْ هَلْ
مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ ؕ قُلِ اللّٰهُ
يَبْدَؤُا الْخَلْقَ ثُمَّ يُعِيْدُهٗ فَاَنّٰى تُؤْفَكُوْنَ ﴿۳۴﴾ قُلْ هَلْ
مِنْ شُرَكَآئِكُمْ مَّنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ ؕ قُلِ اللّٰهُ يَهْدِيْ
لِلْحَقِّ ؕ اَفَمَنْ يَّهْدِيْۤ اِلَى الْحَقِّ اَحَقُّ اَنْ يُّتَّبَعَ اَمَّنْ
لَّا يَهِدِّيْۤ اِلَّاۤ اَنْ يُّهْدٰى ۚ فَمَا لَكُمْ ۟ كَيْفَ تَحْكُمُوْنَ ﴿۳۵﴾ وَ
مَا يَتَّبِعُ اَكْثَرُهُمْ اِلَّا ظَنًّا ؕ اِنَّ الظَّنَّ لَا يُغْنِيْ مِنَ الْحَقِّ
شَيْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۳۶﴾

اے اللہ کے رسول ان سے دریافت کرو کہ کون ہے جو تمہیں

آسمان و زمین کی راہوں سے روزی دے رہا ہے؟ یا بتاؤ وہ
کون ہے جس کا تمہاری قوت شنوائی اور بینائی پر مالکانہ قبضہ ہے[۴۵]
وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو
زندہ سے؟ اور کون ہے جو تمام نظام حکومت چلا رہا ہے
سب ضرور جواب میں کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ کر رہا ہے
آپ فرما دیجئے کہ اگر سب کچھ اللہ ہی کر رہا ہے تو پھر تم اس
سے ڈرتے کیوں نہیں ہو[۴۶] یاد رکھو یہی اللہ تمہارا فی الحقیقت
مالک و آقا ہے اب بتاؤ حقیقت ظاہر ہو جانے کے
بعد اسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے؟ تم حقائق سے
منہ پھیر کر کدھر جا رہے ہو[۴۷] ایسے ہی تیرے رب کی
بات واقعہ بن کر سامنے آگئی کہ وہ لوگ ایمان لائیں گے
جو بدکردار ہو گئے ہیں (یعنی ان کو بدکرداری ایمان سے روک
رہی ہے[۴۸]) اے اللہ کے رسول ان سے پوچھو کہ تمہاری
من گھڑت اللہ کی عبادت میں شریک ہستیوں میں سے
کوئی ہے جو آفرینش کا آغاز کرے اور پھر اس کا اعادہ کرے

آپ اعلان کر دیجئے یہ تو صرف اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے
جو آفرینش کا آغاز بھی کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرے گا
پھر کدھر غلط راہ پر چلتے جا رہے ہو [۴۹] ان سے دریافت
کرو کہ تمہارے بنائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ایسا
ہے جو راہ حق کی رہنمائی کرتا ہے آپ بتا دیجئے کہ صرف
اللہ ہی حق کی رہنمائی کرتا ہے۔ لہذا بتاؤ جو ذات گرامی رہنمائے
حق ہے وہ اس کی حقدار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جسے
خود ہی راہ کا بغیر دوسرے کی رہنمائی کے علم نہیں ہے تمہیں
کیا ہو گیا ہے افسوس تم کیسے فیصلے کر رہے ہو [۵۰] امر
واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت صرف وہم گمان کی گود
میں پل رہی ہے اور معلوم ہے کہ وہم و گمان کا حقیقت
و واقعہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے وہ جو کچھ کر رہے
ہیں اللہ اس سے پوری طرح باخبر ہے [۵۱]

مفردات کے معانی

یدبّر مضارع کا واحد مذکر تدبیر کرتا ہے باب تفعیل اصل دبر سے ہے دبر پیچھے کو اور پیٹھ کو کہتے ہیں جمع ادبار آتی ہے اسی سے پیچھا دکھانے کو ادبار کہتے ہیں باب افعال اسی سے تدابر ایک دوسرے سے پیٹھ پھیرنا اور منہ پھیرنا ہے حدیث میں ہے لا تباغضوا ولا تحاسدوا ولا تدابروا ولا تقاطعوا وکونوا عباد اللہ اخوانا. باہم دشمنی نہ کرو. ایک دوسرے سے منہ نہ پھیرو، باہم تعلقات نہ کاٹو اے اللہ کے بندو بھائی بھائی ہو جاؤ۔

الظن خیال، تخمین، گمان، اٹکل امام راغب فرماتے ہیں الظن اسم لما یحصل عن امارۃ ومتی قویت ادت الی العلم ومتی ضعفت جدا لم تجاوز حد الوھم۔ ظن اس خیال کو کہتے ہیں جو علامات دیکھ کر دماغ میں پیدا ہوتا ہے اب اگر قوی ہو گیا تو علم بن جاتا ہے اور اگر بہت کمزور رہا تو وہم کے مرتبہ میں رہ جاتا ہے اور یہ سب سے کمزور مرتبہ ہے۔ لغت کے لحاظ سے ظن یقین اور شک کے خلاف کسی حالت کا نام نہیں بلکہ انسان کے اپنے ہی ایک تخمینہ کا نام ہے۔ اس کے بعد واقعات کے لحاظ سے وہ یقین اور وہم دونوں حالتوں میں جمع ہو سکتا ہے۔ انسان میں یہ ایک ممتاز صفت ہے اور اس کی فطرت کی سلامتی اور کجی بہت بڑی دلیل ہے سلیم الفطرت انسان اکثر واقع کے مطابق ظن کیا کرتا ہے اور کج فطرت ہمیشہ اٹکل کے تیر لگاتا ہے قرآن میں ان دونوں قسموں کا ذکر ہے خاشعین کی صفت میں ہے الذین یظنون انھم ملاقوا ربھم۔ اور کفار کے حق میں ہے الا یظن اولئک انھم مبعوثون جن خاشعین کا ذکر ہے انہیں قیامت کا ظن نہیں بلکہ یقین حاصل تھا اور کفار کو قیامت کے متعلق ایک ذرہ برابر بھی یقین نہ تھا ان نظن الا ظنا وما نحن بمستیقنین چونکہ ظن یقین کے ساتھ جمع نہیں ہو سکتا تھا اس لیے کفار نے یہ تصریح کر دی کہ ہمارا یہ ظن وہ ظن نہیں جس کے بعد یقین پیدا ہو سکے بلکہ یہ اوہام میں سے ہے۔

اصل یہ ہے کہ آخرت ایک غیبی حقیقت ہے صرف نبوت کی رہنمائی میں اسے ماننا فرض ہے اور اللہ سے ملنا انسانی فطرت کی آواز ہے صرف ایک غیبی حقیقت نہیں

وہ از خود ہر انسان کے دل میں ہونی چاہیے امام بخاری نے کتاب الفرائض میں عقبہ بن عامر کے قول کی شرح کرتے ہوئے لکھا ہے الظانین یعنی الذین یتکلمون بالظن ظانین وہ لوگ ہیں جو صرف اپنے تخمینہ سے باتیں کرتے ہیں۔

مشرکین کے مسلمات سے توحید پر استدلال

مشرکین عرب شرک ضرور کرتے تھے، مگر اللہ سبحانہ کے وجود کے منکر نہ تھے اور مشرکین وجود باری میں شرک نہ کرتے تھے۔ مشرکین تو کیا کوئی بھی وجود باری میں شرک کا قائل نہیں ہے شاہ عبدالعزیز نے یہ بات پوری قوت سے لکھی ہے تفسیر عزیزی میں ہے۔

دریں جا باید دانست کہ ہیچ کس در عالم نیست کہ برائے خدا شریکے در وجود وجوب وجود و علم و قدرت و حکمت اعتقاد کند۔

اس کا مطلب تو واضح طور پر یہی ہے کہ اللہ کے وجود اللہ کے علم میں اللہ کی قدرت اور اللہ کی حکمت میں شرکت کا کوئی بھی معتقد نہ تھا اور امام رازی نے تفسیر کبیر میں یہ بات لکھی ہے۔

دنیا میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے جو اللہ تعالیٰ کے لیے ایسا شریک ثابت کرتا ہو جو وجود قدرت علم اور حکمت میں اس کے برابر ہو۔

شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں توحید کے چار درجے بتائے ہیں ایک توحید وجود دوسرے توحید خالقیت اور لکھا ہے کہ

ان دونوں کو آسمانی کتابوں میں موضوع بحث نہیں بنایا ہے اور اس موضوع پر مشرکین عرب یہودیوں اور عیسائیوں کا ثبوت اور قرآن سے کوئی اختلاف نہیں بلکہ قرآن کی تصریح کہ یہ دونوں توحیدیں ان کے یہاں مسلمات میں سے ہیں۔

توحید کا تیسرا درجہ توحید تدبیر ہے یعنی اس کائنات کے بنانے کے بعد اسے چلا کون رہا ہے۔

توحید کا چوتھا درجہ توحید عبادت ہے۔ اس میں نبوت کا مشرکین سے اختلاف ہے۔ مشرکین کچھ اشخاص کی تقرب کو بنیاد بنا کر عبادت کرتے ہیں اور نبوت عبادت کی ہر نوع کو اللہ کے

پے خاص کرتی ہے۔ مشرکین عرب کے یہی عقائد تھے کہ وہ اپنے معبودوں کو کائنات کا نظم و نسق کا اصل سرچشمہ نہیں سمجھتے تھے کہ جس طرح ایک بادشاہ اپنے مقربین کو کچھ اختیارات و ذائف سونپ دیتا ہے اسی طرح کے کچھ اختیارات خاص طور پر رزق و اولاد وغیرہ سے متلق ان کے مزعومہ شرکا کو بھی حاصل ہیں۔

ان آیات میں ان کے مسلمات یعنی توحید وجود، توحید خالقیت توحید تدبیر سے توحید عبادت پر استدلال کیا ہے۔ توحید عبادت یہ ہے کہ نہ صرف اللہ سبحانہ کو مانا جائے بلکہ جو کچھ مانا جائے اس میں کسی دوسری ہستی کو شریک نہ کیا جائے، ہر طرح کی بندگی و نیاز کی مستحق صرف اسی کی ذات ہے، دعا، استعانت، رکوع سجود، عجز و نیاز، اعتماد و توکل اور اسی طرح کے تمام عبادت گذارانہ اور نیازمندانہ اعمال جو اللہ سبحانہ اور اس کے بندوں کا رشتہ استوار کرتے ہیں صرف اللہ کے لیے ہیں اسی طرح عظمتوں کبریائیوں کارسازیوں اور بے نیازیوں کا جو تصور اللہ سبحانہ کا اعتقاد پیدا کرتا ہے وہ صرف اللہ سبحانہ کے لیے مخصوص ہونا چاہیے۔ بس یہی توحید عبادت ہے جس میں نبوت اور مشرکین کا اختلاف ہے۔

[۳۱] اے اللہ کے رسول ان سے دریافت کرو کہ کون ہے جو تمہیں آسمان و زمین کی راہوں سے روزی دیتا ہے یا بتاؤ وہ کون ہے جس کا تمہاری قوت شنوائی اور بینائی پر مالکانہ قبضہ ہے آسمان کی طرف سے بارش اور حرارت شمسی پہنچی ہے اور زمینی مواد اس کے ساتھ ملتے ہیں تب انسان کی روزی ملتی ہے اور ایسے محیر العقول اور عجیب و غریب طریقہ سے کس نے کان اور آنکھ پیدا کی پھر ان کی حفاظت کا سامان کیا۔ کون ہے جو ان تمام قوی انسانی کا حقیقی مالک ہے کہ جب چاہے عطا فرما دے اور جب چاہے چھین لے [۱] یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ مشرکین عرب اس کائنات کا خالق مالک اور مدبر اصلاً اللہ سبحانہ کو مانتے تھے ان کا شرک یہ نہیں تھا کہ کائنات کا خالق اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی ہے یا اس کائنات کی حکومت کو اللہ کے ساتھ کوئی اور بھی چلا رہا ہے۔ جن بتوں تماثیل اور اوثان سے ان کے عابدانہ تعلقات تھے ان کے بارے میں ان کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ یہ آسمان و زمین کے خالق ہیں یا ابر و ہوا اور سورج و چاند کے موجد ہیں یا زندگی اور موت پر متصرف ہیں یا نظام کائنات کا سررشتہ ان کے ہاتھ میں ہے بلکہ صرف یہ مانتے تھے کہ یہ جن کی تصویریں ہیں وہ اللہ سبحانہ کے چہیتے ہیں

[۱] افادات شیخ الاسلام

اللہ سبحانہ ان کی سنتا ہے جو کام اللہ سبحانہ سے کرانا چاہیں کرا سکتے ہیں ان کو اگر راضی رکھا جائے
تو اللہ سبحانہ ان کی سنتا ہے جو کام اللہ سبحانہ سے کرانا چاہیں کرا سکتے ہیں ان کو اگر راضی رکھا جائے
تو یہ اللہ سے سفارش کرا کے دنیا کی نعمتیں دلواتے ہیں۔ قرآن نے یہاں ان ہی اصولی مسلمات کو بنیاد قرار دے کر ان سے دریافت کیا ہے کہ اگر یہ سارے کام اللہ کے ہیں جیسا کہ تم خود مانتے ہو تو پھر تمہیں عبادت میں اللہ سبحانہ کا شریک ٹھہرانے کا پروانہ کہاں سے ملا ہے مطلب یہ ہے کہ عبادت میں تمہارا یہ کردار خود تمہارے مسلمات کے خلاف ہے۔

مشرکین کا فکری تضاد

۳۱؎ اور وہ کون ہے جو زندہ کو مردہ سے نکالتا ہے اور مردہ کو زندہ سے اور کون ہے جو تمام نظام حکومت چلا رہا ہے سب ضرور جواب میں کہیں گے کہ یہ سب کچھ اللہ سبحانہ کر رہا ہے تو پھر تم اس سے ڈرتے کیوں نہیں ہو مثلاً نطفہ اور بیضہ سے جاندار کو پھر جاندار سے نطفہ اور بیضہ کو نکالتا ہے یا روحانی اور معنوی طور پر جو قوم یا شخص مردہ ہو چکا اس میں زندہ افراد کو پیدا کرتا ہے اور زندہ قوموں کے اخلاف پر ان کی بدبختی سے موت طاری کر دیتا ہے اور دنیا کے تمام کاموں کی تدبیر و انتظام کرتا ہے لے

یہ بھی مشرکین کے مسلمات ہیں وہ مانتے ہیں کہ احیاء اماتت اللہ سبحانہ کا کام ہے اور یہ بھی ان کے مسلمات میں سے ہے کہ کائنات کے انتظام و انصرام پر اللہ سبحانہ کا قبضہ ہے نجومی کہتے ہیں کہ تدبیر مملکت ستاروں کے ذریعے ہو رہی ہے اور نبوت کا دعویٰ ہے کہ ان کے ذریعے اللہ سبحانہ تدبیر کر رہا ہے یہی حیثیت ملائکہ کی بھی ہے کہ اللہ سبحانہ ان کے ذریعے نظام مملکت چلا رہا ہے کہنا یہ ہے کہ آسمان و زمین کے نظام اور ان کے باہمی تعلقات سے رزق یا معاشی فوائد کو کون پیدا کر رہا ہے۔ یہ تو باہر کا سوال ہوا اس سے بھی آگے بڑھ کر خود یہ حیات اور زندگی جو ہماری تمام اندرونی قوتوں کا سرچشمہ ہے دونوں کو ملا کر من یدام کے سوال کا مطلب یہ ہے کہ اندرونی قوتوں سے یا باہر کی طاقتوں سے ہر چھوٹے بڑے کاروبار کو قرآن نے سوالنامے میں داخل کر کے یہ دریافت کیا ہے کہ

لے افادات شیخ الاسلام

یہ سب کس کے حکم اور کس کے ارادے سے ہو رہا ہے جواب میں جو بات بتائی ہے کہ فسیقولون اللہ تو اس کا مطلب بالکل واضح ہے کہ یہ اقرار انسانی فطرت میں کس طرح گھر کئے ہوئے ہے کہ کٹے سے کٹا مخالف بھی اس ایقان وایمان پر مجبور ہوتا ہے صرف یہی نہیں بلکہ یہ بھی حقیقت ہے کہ ہر فطرت میں اس اقرار کا علم اور یقین بھی پیوستہ سربستہ ہے آخر میں ارشاد ہوا ہے افلا تتقون ؟ اگر صورت واقعہ یہی ہے تو پھر اس سے ڈرنے کیوں نہیں ہو اس کی نافرمانیوں سے بچنے کیوں نہیں ہو اپنی استطاعت کے مطابق اسکے خلاف مرضی باتوں سے کیوں نہیں بچتے ہو اس کی مرضی پر چلنے میں غلطی ہو جائے تو معافی کیوں نہیں مانگتے پھر در بدر پھرنے کے بجائے اس کی مرضی کی طرف کیوں نہیں پلٹتے۔ ایمان عمل صالح تقویٰ توبہ واستغفار دعا والحاح کیوں نہیں اپناتے ہو مطلب یہ سب کچھ جانتے ہو پھر بھی اس سے نہیں ڈرتے ہو یا یہ مطلب ہے کہ اس کو چھوڑ کر دوسروں کے دروازے پر جانے کے عذاب سے نہیں ڈرتے ہو تمہیں اس ذات گرامی کے ساتھ اپنے معاملات پر شرم محسوس نہیں ہوتی ہے البقاعی نے یہ بات بالکل برموقعہ لکھی ہے کہ ایک طرف ربوبیت میں اس کی توحید کو مانتے ہو اور پھر الوہیت میں شرک سازی کرتے ہو اس جرم کے لیے تمہارے پاس اپنے بچاؤ کا سامان کیا ہے ؟

توحید عبادت پر استدلال

یاد رکھو یہی اللہ تمہارا فی الواقع مالک و آقا ہے اب بتاؤ حقیقت ظاہر ہو جانے کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی ہی نہیں تو اور کیا ہے تم حقائق سے منہ پھیر کر کدھر جا رہے ہو۔ مشرکین کو بھی اعتراف تھا کہ یہ امور کلیہ اور عظیم الشان کام اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا اس لیے فرمایا کہ جب اصلی خالق و مالک اور تمام عالم کا مدبر اسی کو مانتے ہو پھر ڈرتے نہیں ہو کہ اس کے سوا دوسرے کو معبود بناؤ۔ معبود تو وہی ہو سکتا ہے جو خالق کل مالک الملک رب مطلق اور متصرف علی الاطلاق ہو اس کا اقرار کرکے کہاں الٹے پاؤں واپس جا رہے ہو جب سچا وہی ہے تو سچ کے بعد بجز جھوٹ کے کیا رہ گیا سچ کو چھوڑ کر جھوٹے اوہام میں بھٹکنا عاقل کا کام نہیں ہو سکتا [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ ان سوالات میں ہر سوال ایک مستقل دلیل ہے کیونکہ ان میں سے ہر سوال کا ایک ہی جواب ہو سکتا ہے اور وہ فطرت انسانی کا عالمگیر اور مسلمہ اذعان ہے ہمارے علم کلام کے طالب علموں کی نظر اس پہلو پر نہ تھی اس لیے قرآن کا انداز استدلال ان پر واضح نہیں ہو سکا۔ قرآن کا انداز بیان یہ نہیں ہے کہ نظری مقدمات اور ذہنی مسلمات کی تشکیل ترتیب دے اور پھر اس پر بحث و تقریر کر کے مخاطب کو رد و تسلیم پر مجبور کرے اس کا تمام تر خطاب انسان کے فطری وجدان و ذوق سے ہوتا ہے اللہ تعالیٰ کی پرستش کا جذبہ انسانی فطرت کا خمیر ہے۔ اگر ایک انسان اس کا انکار کرتا ہے تو یہ اس کی غفلت ہے اور ضروری ہے کہ اسے غفلت سے چونکا دینے کے لیے دلائل پیش کیے جائیں لیکن یہ دلیل ایسی نہیں ہونی چاہیے جو محض اس کے ذہن و دماغ میں کاوش پیدا کرے بلکہ ایسی ہونی چاہیے جو اس کے نہاں خانہ دل پر دستک دے اور اس کا فطری وجدان بیدار کرے اگر وجدان بیدار ہو گیا تو پھر اثبات مدعا کے لیے بحث و تقریر کی ضرورت نہیں ہے خود اس کا وجدان ہی اسے مدعا تک پہنچا دے گا

ان آیات میں اس کے استدلال کی روح یہ ہے کہ جو تمہیں روزی دے رہا ہے اور تمہاری پروردگاری کر رہا ہے اور جس کی ربوبیت کا اعتراف تمہارے دل کے ایک ایک ریشہ میں موجود ہے اس کے سوا کون اس کا مستحق ہے کہ اس کی عبادت کی جائے اسی بات کو کیسے بلیغ اور انوکھے انداز میں پیش کیا ہے۔

یہ اللہ ہی تمہارا پروردگار برحق ہے اور جب یہ حق ہے تو حق کے ظہور کے بعد اسے نہ ماننا گمراہی نہیں تو اور کیا ہے افسوس تمہاری عقل پر تمہیں حقیقت سے کہاں پھیرا جا رہا ہے۔

آخر میں فرمایا فانی تصرفون یہ مجہول کا صیغہ ہے یہ بتا رہا ہے کہ جہاں تک عقل اور منطق کا تعلق ہے وہ تمہارا ساتھ نہیں دے رہی ہے اب تم خود سوچو کہ تمہاری قیادت کون کر رہا ہے۔ تصرفون کے معنی یہ نہیں کہ تم کدھر پھرے جاتے ہو بلکہ معنی یہ ہیں کہ تم کدھر پھرائے جا رہے ہو۔

علامہ آلوسی نے لکھا ہے کہ یہاں فاعل کو انتہائی شناخت اور برائی کی وجہ سے حذف کر دیا گیا فعل معروف نہیں مجہول لے کر آئے ہیں۔

اس سے صاف ظاہر ہے کہ کوئی گمراہ لیڈر یا پارٹی وہاں موجود ہے جو لوگوں کو صحیح رخ سے ہٹا کر غلط رخ پر پھیر رہا ہے۔ اسی لیے لوگوں سے کہا جا رہا ہے کہ تم اندھے بن کر غلط رہنماؤں کے پیچھے کیوں چل رہے ہو۔ اپنی عقل سے کام لے کر کیوں نہیں سوچتے ہو کہ جب حقیقت یہ ہے تو آخر تمہیں کدھر لے جایا جا رہا ہے یہ انداز سوال قرآن میں ایسے مواقع پر آیا ہے اور ہر جگہ لیڈروں اور رہنماؤں کا نام لیے بغیر ان کی طرف صیغہ مجہول سے اشارا کیا گیا تا کہ ان کے عقیدتمند اس پر ٹھنڈے دل سے غور کریں اور یہ نہ کہہ سکیں کہ دیکھو فلاں پر حملہ کیا گیا ہے۔ یہ دعوت کا خاص انداز ہے

ہدایت وضلالت کا قانون

۳۳ ایسے ہی تیرے رب کی بات واقعہ بن کر سامنے آگئی کہ وہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے جو بدکردار ہو گئے ہیں یعنی ان کی بدکرداری ان کو ایمان سے روک رہی ہے یعنی اللہ تعالیٰ نے ازل سے ان متمرد اور سرکشوں کی قسمت میں ایمان نہیں لکھا جس کا سبب علم الٰہی میں ان کی سرکشی اور نافرمانی ہے اس طرح اللہ کی لکھی ہوئی بات ان پر فسق و نافرمانی کی وجہ سے راست آئی [1]

آیت میں کلمۃ ربک سے مراد وہ قانون الٰہی ہے جو اللہ سبحانہ نے ہدایت وضلالت کے لیے مقرر کیا ہوا ہے یعنی اللہ سبحانہ ایمان و ہدایت کی راہ صرف ان لوگوں کے لیے کھولتا ہے جو اللہ کی دی ہوئی صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں جو لوگ اپنی خواہشوں کے پیچھے پڑ کر فاسقانہ رویہ اپناتے ہیں تو ان پر ہدایت نہیں بلکہ ضلالت ہی کی راہ کھول دی جاتی ہے اور وہ نعمت ایمان سے محروم رہتے ہیں وما یضل بہ الا الفاسقین میں ہی آغاز قرآن میں بھی قانون بتایا تھا۔ دنیا کی زندگی میں ہر گوشہ کی طرح ہدایت وضلالت کا بھی ایک قانون ہے ہر عہد ہر ملک میں ایک جیسے نتائج رکھتا ہے۔ اس کے احکام میں کبھی تبدیلی نہیں ہے۔ طالبین ضلالت کیلئے ضلالۃ کے دروازے اور ہدایت کے طلب گاروں کے لیے ہدایت کی راہیں کھولنا اللہ سبحانہ کا قانون ہے گمراہی، بے ایمانی صرف ان کے حصے میں آتی ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

جو خود گمراہی کو پسند کرتے ہیں۔ اللہ سبحانہ کسی پر گمراہی کو چپکاتا نہیں ہے بار بار کی نافرمانیوں اور عدول حکمیوں سے اندر کا نور بجھ جاتا ہے اور طبیعت میں حق کی طلب اور صداقت کی تلاش جاتی رہتی ہے۔

شیخ الاسلام کی اس تعبیر سے کہ

اللہ تعالیٰ نے ازل سے ان متمرد اور سرکشوں کی قسمت میں ایمان نہیں لکھا

یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ خود اللہ سبحانہ ہی ہے جو ان کافروں کو ہدایت سے روکے ہوئے ہے۔ حالانکہ آیت کا منشا یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی عادت نہیں کہ وہ کسی کے ارادے اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت دے یہ بات ایک نہیں متعدد آیتوں میں بار بار بتائی گئی ہے۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ کی جانب سے گمراہی اور ہدایت دونوں اللہ کی جانب سے ہیں مگر گمراہی کن کے لیے ہے صراحت کے ساتھ فرمایا ہے وما یضل بہ الا الفاسقین۔ فلما زاغوا ازاغ اللہ قلوبھم و اللہ لا یھدی القوم الفاسقین اور یطبع اللہ علیھا بکفرھم۔ انصرفوا صرف اللہ قلوبھم اور یطبع اللہ علی قلوب الکافرین ان آیات میں سے ہر ایک پر غور کرو ہر ایک سے یہ بات واضح طور پر معلوم ہورہی ہے کہ انسان کی بدعملی مقدم ہے اور اللہ تعالیٰ کا اس کے جوابی اقدام کو اپنی طرف سے ضلالت اور گمراہی فرمانا موخر ہے جیسے یہاں الذین فسقوا مقدم ہے اور لا یومنون موخر ہے۔ اس سے ثابت ہوا کہ اللہ سبحانہ کی جانب سے ایمان نہ لانے کا حکم علت اور فسق وکفر معلول نہیں ہے بلکہ حقیقت اس کے برعکس ہے یعنی فسق وکفر انسان کی جانب سے پہلے ہوتا ہے اور اللہ سبحانہ کی جانب سے ایمان نہ لانے کی علت ہے اور یہی طبعی اصول ہے انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے اور غمگین ہوتا ہے آنسو کے قطرے برستے ہیں اگر کوئی اسے الٹ کر بیان کرے تو یہ کیسی سخت نادانی ہوگی۔ ہدایت وضلالت کے اس الٰہی قانون کو تقدیر بھی کہہ سکتے ہیں۔ تقدیر کے معنے اندازہ ٹھہرا دینے کے ہیں یعنی کسی کے لیے ایک خاص طرح کی حالت ٹھہرا دینے خواہ یہ ٹھہراؤ کمیت میں ہو یا کیفیت میں وخلق کل شئ فقدرہ تقدیرا مادیات کی طرح معنویات کی بھی تقدیر ہے جیسے دانہ گندم کے بولے کا ایک قانون ہے ایسے ہی ایمان وہدایت کے پودہ اُگنے کا بھی ایک قانون ہے وہاں بھی زمین کی صلاحیت اور دانہ کی قابلیت

اور گردو پیش کی سازگاری شرط ہے یہاں بھی صالح زمین کا ہونا ناگزیر ہے صرف فاعل کی قوت فاعلی کام نہیں کرتی ہے جب تک مفعول میں قوت انفعال نہ ہو۔ یہی راز ہے آیت میں دبلہ کی ضمیر خطاب کی تعبیر ہیں۔

مبدأ و معاد اللہ سے ہے

وا‌له اے اللہ کے رسول ان سے پوچھو کہ تمہاری من گھڑت اللہ کی عبادت میں شریک ہستیوں میں سے کوئی ہے جو آفرینش کا آغاز کرے اور پھر اس کا اعادہ کرے آپ اعلان کر دیجئے کہ یہ تو صرف اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے جو آفرینش کا آغاز کرتا ہے اور پھر اس کا اعادہ کرے گا پھر کدھر غلط راہ پر چلے جا رہے ہو لے یہاں یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے کہ پہلی آیات میں سوالات کے جواب میں یہ کہا گیا ہے۔ فسیقولون اللہ وہ ضرور کہیں گے کہ یہ کام اللہ سبحانہ کرتا ہے مگر اس جگہ اس جواب کو چھوڑ کر فرمایا کہ اس سوال کے جواب میں کہ مبدا اور معاد کس کے قبضہ و دسترس میں ہے فرمایا آپ فرما دیجئے کہ اللہ سبحانہ کے قبضہ و قدرت میں ہے کہ آغاز آفرینش کرے اور پھر اس کا اعادہ کرے کیونکہ تخلیق کی ابتداء کے متعلق تو مشرکین مانتے تھے کہ یہ صرف اللہ کا کام ہے ان کے شرکاء میں کسی کا اس کام میں کوئی حصہ نہیں ہے باقی تخلیق کا اعادہ تو یہ بات کھلی اور واضح ہے جو آفرینش کا آغاز کرنے والا ہے یہی اس کا اعادہ بھی کر سکتا ہے اور جو آغاز ہی میں پیدائش نہ کر سکے وہ اعادہ پر کیسے قدرت رکھ سکتا ہے۔ یہ بات بالکل بدیہی اور معقول ہے اور خود مشرکین بھی اندر سے مانتے تھے لیکن انہیں اس کے اقرار میں اس لیے پس و پیش تھا کہ اسے مان لینے کے بعد انکار آخرت مشکل ہو جاتا ہے۔ اسی لیے اوپر کے سوالات کے جواب کا انداز بدل کر فرمایا کہ آپ اعلان کر دیجئے کہ ابتدائے خلق اور اعادہ خلق کا کام صرف اللہ کا ہے۔ اللہ کے سوا کوئی نہیں کر سکتا۔ آخر میں فرمایا فانی تؤفکون ؟ پھر تم کس الٹی راہ پر چلائے جا رہے ہو یعنی جب تمہاری ابتدا کا سرا بھی اللہ سبحانہ کے قبضہ میں ہے اور انتہا کا

لے افادات شیخ الاسلام

سرا بھی اسی کے ہاتھ میں ہے تو خود اپنے خیر خواہ بن کر غور کرو کہ آخر تمہیں یہ کیا باور کرایا جارہا ہے کہ ان دونوں سروں کے بیچ میں اللہ کے سوا کسی اور کو تمہاری پرستشوں اور نیاز مندیوں کا بھی حق ہے۔

قرآن میں آخرت میں دوبارہ زندگی کو اعادہ خلق سے تعبیر کیا ہے یعنی دوسری زندگی میں زندگی کی ابتدا نہیں ہوگی بلکہ زندگی کا اعادہ سوال یہ ہے کہ اگر آغاز میں زندگی عدم حقیقی سے وجود میں آسکتی ہے تو کیا ایک مرتبہ وجود میں آکر پھر دہرائی نہیں جا سکتی۔ اگر کمہار بنی مٹی سے برتن بنا سکتا ہے تو یقیناً ٹوٹے ہوئے برتن کے ٹکڑوں کو دوبارہ جوڑ کر بنا سکتا ہے۔

آیت میں بدء خلق اور اعادہ خلق سے بھی توحید عبادت پر استدلال کیا ہے۔ اور بتایا ہے کہ زندگی کا پہلا اٹھان اور زندگی کا دوسرا اٹھان دونوں کس کے قبضے میں ہیں تم بھی مانتے ہو اور ہر عقل مند پہلے اٹھان کو دیکھ کر دوسرے کو سمجھ سکتا ہے۔ اس میں صرف اللہ سبحانہ کی کارسازی کام کر رہی ہے اگر اس میں کسی کی شرکت نہیں ہے تو تمہاری عبادتوں میں شرکت کا جواز کیوں ہے۔

نشہ ان سے دریافت کرو کہ تمہارے بنائے ہوئے شریکوں میں سے کوئی ایسا ہے جو راہ حق کی رہنمائی کرتا ہو آپ بتا دیجئے کہ اللہ ہی حق کی رہنمائی کرتا ہے لہذا بتاؤ جو ذات گرامی رہنمائے حق ہے وہ اس کی حقدار ہے کہ اس کی پیروی کی جائے یا وہ جسے خود بھی راستہ کا دوسرے کی رہنمائی کے بغیر پتہ نہیں ہے تمہیں کیا ہو گیا ہے افسوس تم کیسے فیصلے کر رہے ہو مبدا و معاد کے بعد درمیانی وسائط کا ذکر کرتے ہیں۔ یعنی جس طرح اول پیدا کرنے والا اور دوبارہ چلانے والا وہ ہی خدا ہے ایسے ہی معاد کی صحیح راہ بتانے والا کوئی دوسرا نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ ہی بندوں کی سچی اور صحیح رہنمائی کر سکتا ہے مخلوق میں کوئی بڑا ہو یا چھوٹا سب اسی کی رہنمائی کے محتاج ہیں سب کو اسی کی ہدایت و رہنمائی میں چلنا چاہیے۔ رہت مسکین تو کس شمار میں ہیں جو کسی کی رہنمائی سے بھی چلنے کی قدرت نہیں رکھتے ہیں۔ بڑے بڑے مقربین انبیاء و ملائکہ بھی برابر یہ اقرار کرتے آئے ہیں کہ اللہ سبحانہ کی ہدایت و دستگیری کے بغیر ہم ایک قدم نہیں اٹھا سکتے ان کی رہنمائی اس لیے بندوں کے حق میں قابل قبول ہے کہ اللہ سبحانہ ان کی رہنمائی فرماتا ہے پھر یہ کس قدر

ناانصافی ہے کہ انسان اس ہادی مطلق کو چھوڑ کر باطل اور کمزور سہارے یا مثلاً احبار و رہبان برہمنوں اور مہنتوں کی رہنمائی پر اندھا دھند چلنے لگے لہ

اس آیت کی تشریح شارحین قرآن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق کی ہے آیئے آپ بھی اس گلزار سے اپنی جھولی میں کچھ گل ڈال لیجیے۔

شارحین قرآن میں سے ارباب تفسیر اور ارباب تاویل دونوں نے اس پر داد تحقیق دی ہے۔ حافظ ابن جریر فرماتے ہیں۔

اے اللہ کے رسول آپ ان مشرکین سے پوچھئے کہ جن شرکاء کے بارے میں تمہارا دعویٰ ہے کہ وہ عبادت میں اللہ کے شریک ہیں خواہ وہ تمہارے معبود ہیں یا معبودوں کے سستھان کیا ان میں کوئی کسی گم کردہ راہ کو راہ بتا سکتا ہے اور یہ ہدایت کے درماندے کو کسی درستگی کی طرف دعوت دے سکتا ہے اگر نہیں اور یقیناً نہیں تو پھر ان کو بتا دیجئے کہ اللہ کی ذات راہ حق سے بھٹکے ہوئے کو ہدایت کا سامان کرتی ہے اب فیصلہ کرو کہ کہنے پر اس کے چلنا چاہیے جو گمراہ کو ہدایت کرے یا اس کے کہے پر چلے جسے خود ہی راستہ کا پتہ نہیں ہے جب تک دوسرا اسے نہ بتائے۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں:

لوگو! تمہیں پتہ ہے کہ جن کو شرکا کہتے ہیں ان میں سے کسی کے بس میں بے راہ کو راہ پر لگا دینا اور راہ بتا دینا نہیں ہے بے راہ کو راہ بتانا اور گمراہ کو گمراہی سے نکال کر صراط مستقیم بتانا صرف اللہ سبحانہ کا کام ہے اب فیصلہ کرو کہ ایک طرف وہ ہے جو راہ حق بتا رہا ہے اور دوسری طرف وہ ہے جو اندھے ہونے کی وجہ سے خود بھی راستہ نہیں جانتا ہے دونوں میں سے کس کے پیچھے چلو گے۔ کیا تمہاری عقلیں بالکل جواب دے چکی ہیں کہ تم خالق و مخلوق کے درمیان برابری کے فیصلے کر رہے ہو۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

لہ افادات شیخ الاسلام

کیا تمہارے شرکا میں سے کوئی ہے جو دین اسلام کے لیے رہنمائی کرے اس کا جواب وہ ضرور نفی میں دیں گے اب فرما دیجئے کہ اللہ سبحانہ دین اسلام کا رہنما ہے اب بتاؤ کہ راہ بتانے والے کی پیروی کی جائے یا اس کی جو خود ہی گم کردہ راہ ہے۔

امام رازی فرماتے ہیں:

یہ تیسرا استدلال ہے تخلیق وہدایت سے وجود باری پر استدلال قرآن میں عام ہے حضرت ابراہیم نے الذی خلقنی فھو یھدین حضرت موسیٰ نے ربنا الذی اعطی کل شئی خلقہ ثم ھدی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ حکم الذی خلق فسویٰ والذی قدر فھدی میں اسی استدلال کو اپنایا گیا ہے۔ یہ ایک شاندار استدلال ہے کیونکہ انسان دو چیزوں کے مجموعہ کا نام ہے جسمانیت اور روحانیت پہلے انسان کی جسمانیت سے استدلال تھا اب ہدایت سے توحید پر استدلال ہے۔ انسان کی جسمانیت کا مقصد روحانی ہدایت ہے یہ اس بات کی تصریح ہے کہ اللہ نے جسم کی تخلیق فرمائی اور اسے سمع وبصر اور عقل نوازا ہے تاکہ ان کے ذریعے معارف وعلوم حاصل کیے جائیں۔ روحانی کمالات جسمانی تقاضوں کے مقابلے میں دائمی ہیں اس سے معلوم ہوا کہ تخلیق ہدایت کے تابع ہے۔ مقصد اعلیٰ ہدایت ہے اب یہ بات صاف ہے کہ انسانی عقلیں اگر ایک طرف حق شناسی کے لیے اپنے اندر تڑپ رکھتی ہیں تو دوسری طرف حق ایک دشوار راہ ہے نیز انسانی غلطیوں کا شکار رہتا ہے ضرورت ہے کہ حق آشنائی ہو۔ اور یہ اللہ سبحانہ کی مدد کے بغیر ہو نہیں سکتی ہے۔

ابوحیان اندلسی بھی البحر المحیط میں امام رازی کے ہمنوا ہیں۔ قاضی بیضاوی علامہ زمخشری کے ہمزبان ہو کر فرماتے ہیں۔

کیا تمہارے شرکاء میں سے کوئی ہے جو لوگوں کی دلائل کے ذریعے اور انبیاء روانہ کرکے اور فکر وغور کی توفیق دے کر راہ حق بتاتا ہو آپ فرما دیجئے کہ ہدایت تو بس اللہ ہی دیتا ہے۔ اب بتاؤ دونوں میں سے کون اس لائق

ہے کہ اس کی بات مانی جائے جو خود آشنائے راہ ہے اور دوسروں کو راہ بتاتا ہے یا وہ جسے خود بھی راہ کا پتہ نہیں اور دوسروں کا محتاج ہے۔

علامہ آلوسی بغدادی فرماتے ہیں:

مطلب یہ ہے کہ انسانوں کو عقل کی نعمت دے کر، انبیاء روانہ کر کے کتابیں نازل کر کے فکر و غور کی آفاق میں توفیق دے کر کون رہنمائی کر رہا ہے۔ اللہ سبحانہ یا تمہارے شرکاء۔ آپ بتا دیجئے کہ یہ کام صرف اللہ کر رہا ہے۔ اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے بتاؤ کہ کس کی بات مانی جائے اس کی جو راہ پر بھی ہے اور راہ آشنا بھی یا اس کی جو راہبر تو کیا راہ آشنا ہی نہیں ہے اور دوسروں کا محتاج ہے۔

آیئے اب ذرا اردو شارحین قرآن کی تشریحات سے استفادہ فرمایئے حضرت شیخ الاسلام کی تشریح تو آپ ان کے افادات میں پڑھ چکے ہیں حضرت مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں۔

ان سے کہہ دیجئے کہ کیا تمہارے تجویز کئے ہوئے ذوی العقول شرکاء میں کوئی ایسا ہے کہ امر حق کا راستہ بتلاتا ہو آپ کہہ دیجئے کہ اللہ ہی امر حق کا راستہ بتاتا ہے چنانچہ اس نے عقل دی انبیاء روانہ کئے برخلاف شیاطین کے کہ اولاً وہ اس پر قادر نہیں اور محض تعلیم جس کی قدرت ان کو دی گئی ہے وہ اس کو اضلال و اغوا میں صرف کرتے ہیں تو پھر ان سے کہیئے کہ بتلاؤ کہ آیا جو شخص امر حق کا راستہ بتلاتا ہے وہ زیادہ اتباع کے لائق ہے یا وہ شخص جس کو بے بتلائے خود ہی راستہ نہ سوجھے اور اس سے بڑھ کر یہ کہ سمجھانے پر بھی اس پر نہ چلے جیسے شیاطین تو پھر جب یہ اتباع کے بھی قابل نہ ہوں تو عبادت کے لائق کیونکر ہو سکتے ہیں۔

مفتی محمد شفیع نے بھی معارف میں مولانا موصوف ہی کی ترجمانی کی ہے اور مولانا محمد ادریس نے اپنے معارف میں قرطبی کی بات نقل کی ہے۔ مولانا پیر کرم شاہ نے قاضی صاحب کی تفسیر سے ہمنوائی کی ہے۔ مولانا عبدالماجد دریابادی نے اپنی تشریحی نوٹ میں کچھ جدت پیدا کی ہے فرماتے ہیں:

مشرکوں سے سوال ہے کہ جو خالق راستہ دکھا اور بتلا رہا ہے وہ پیروی

کئے جانے کا اہل ہے یا وہ مخلوق جسے خود ہی راستہ معلوم نہیں ہے اور اپنی راہ یابی میں دوسروں کا محتاج ہے۔

تدبر قرآن کے مصنف نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے۔

سوچو کہ اس دنیا میں تمہیں ان شرکاء سے کیا فیض پہنچتا ہے مخلوق کی ایک بہت بڑی ضرورت خالق سے یہ وابستہ ہوتی ہے کہ وہ زندگی کے معاملات میں رہنمائی فرماتا ہے کہ کیا حق ہے اور کیا باطل؟ کیا تم کہہ سکتے ہو کہ تمہارے ان معبودوں سے تمہیں اس طرح کی کوئی رہنمائی ملی ہے کیا عقل جو تمہارے اندر رہنمائی کا چراغ ہے یہ ان کی بخشی ہوئی ہے کیا یہ تمہاری ہدایت کے لیے کوئی وحی بھیجتے ہیں کیا انہوں نے تمہاری تربیت و تزکیہ کے لیے کوئی کتاب اتاری ہے کوئی رسول بھیجا ہے کوئی شریعت نازل کی کوئی قانون اتارا اگر ان کاموں میں سے کوئی کام بھی انہوں نے نہیں کیا نہ کرتے ہیں نہ کریں گے تو آخر کس غرض سے ان کے پیچھے لگے ہو۔

صاحب تفہیم فرماتے ہیں:

دنیا میں ضروریات کا دائرہ صرف اتنا ہی نہیں ہے کہ کھانے پینے اور پہننے وغیرہ کا سامان دستیاب ہو بلکہ انسان کی سب سے بڑی ضرورت یہ بھی ہے کہ دنیا میں بسر کرنے کا صحیح طریقہ معلوم ہو اور وہ جانے کہ اپنی ذات کے ساتھ اپنی قوتوں اور قابلیتوں کے ساتھ اجتماعی زندگی کی گاڑی میں وہ کیا اور کس طرح معاملہ کرے۔ اسی صحیح طریق کا نام حق ہے اور جو رہنمائی اس طریقہ کی طرف انسان کو لے جائے وہی ہدایت حق ہے قرآن تمام مشرکین سے یہ سوال کرتا ہے کہ تم خدا کے سوا جن سے عابدانہ تعلقات رکھتے ہو ان میں کوئی ہے جو تمہارے لیے ہدایت حق حاصل کرنے کا ذریعہ بنتا ہو یا بن سکتا ہو۔ ظاہر ہے کہ اس کا جواب نفی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اس لیے قرآن یہ سوال کرتا ہے کہ ان شرکا میں کوئی ایسا بھی ہے جو راہ راست کی طرف تمہاری رہنمائی کرتا ہو اس سوال نے یہ فیصلہ کر دیا کہ وہ صرف اللہ ہے اس کے بعد ضد اور ہٹ دھرمی کے سوا کچھ نہیں ہے جس کی وجہ

ہے انسان مشرکانہ طور طریقوں سے وابستہ رہے (ملخصا)

اور مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں:

تم نے جن ہستیوں کو اللہ کا شریک ٹھہرا لیا ہے ان میں کوئی ہے جو زندگی و معیشت کے ٹھیک راستہ پر انسان کو چلاتا ہو یعنی جو دیکھنے سننے اور سمجھنے کی قوتیں بخشتا ہو۔ تم جانتے ہو کہ یہ کوئی نہیں کر سکتا یہ صرف اللہ ہی کی کارفرمائی ہے کیونکہ مشرکا، کو اللہ کی ہستی اور اس کے خالق کل ہونے سے انکار نہیں تھا البتہ وہ سمجھتے تھے کہ ہمیں ان ہستیوں کی پرستش بھی کرنی چاہیے جو اللہ کے حضور مقرب ہیں اور جنہیں دنیا میں حکم و تصرف کی قوتیں حاصل ہو گئی ہیں۔

پھر جب یہ بات واضح ہو گئی تو فرمایا کہ جب تمہیں اس بات سے انکار نہیں ہے تو غور کرو انسان کو اس کی پیروی کرنی چاہیے جو ہدایت کرنے والا ہے یا اس کی جو خود کسی دوسرے کی ہدایت کا محتاج ہے تمہیں کیا ہو گیا ہے تم کیسے فیصلے کر رہے ہو۔

مولانا آزاد کی یہ تشریح قرآن کے سیاق و سباق کے بالکل مطابق ہے کیونکہ آیت قرآنی کا انداز کہہ رہا ہے کہ یہاں پہلے ایک بات بطور مسلمہ عقیدہ کے بیان کی گئی جس سے مخاطب انکار نہیں کرتا یا کر نہیں سکتا جب اس کا مسلم ہونا واضح ہو گیا تو اسی کو استدلال کی اساس بنا کر کہا گیا ھل من شرکائکم من یھدی الی الحق ؟ تمہارے بنائے ہوئے شرکوں میں کوئی ہے جو حق کی رہنمائی کرتا ہو پھر فرمایا گیا قل اللہ یھدی للحق یعنی تم اس سے انکار نہیں کر سکتے کہ وہ اللہ کی ہستی ہے پھر جب یہ مسلمہ واضح ہو گیا تو اس سے استدلال کیا گیا افمن یھدی الی الحق احق ان یتبع لہٰذا ضروری ہے کہ یہاں ہدایت سے مقصود کوئی ایسی ہدایت ہو جس سے مخاطبوں کو انکار کی مجال نہ تھی اب اگر ہدایت کا مطلب ہدایت وحی قرار دیا جاتا ہے تو سارا مطلب بگڑ جاتا ہے کیونکہ سب جانتے ہیں کہ مخاطبوں کے لیے یہ بات مسلمہ نہ تھی وہ سرے سے وحی کا انکار کرتے تھے۔

اگرچہ امام رازی، ابوحیان اندلسی، آلوسی نے بھی اسی کے قریب تشریح کی ہے مگر وہ بات کو پوری آخر تک اس طرح پیش نہیں کر سکے جیسے بات کا آغاز کیا تھا۔

وہم گمان کی بنیاد پر حقائق کا انکار

۳۶ امر واقعہ یہ ہے کہ لوگوں کی اکثریت صرف وہم وگمان کی گود میں پل رہی ہے اور معلوم ہے کہ وہم وگمان کا حقیقت اور واقعہ سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس سے باخبر ہے۔ جب معلوم ہو چکا کہ مبدی، معید اور ہادی وہی اللہ ہے تو اس کے خلاف شرک کی راہ اختیار کرنے والوں کو سوچنا چاہیے کہ ان کے ہاتھ میں کون سی دلیل و برہان ہے جس کی بنا پر توحید کے مسلک قدیم کو چھوڑ کر ضلالت کے گڑھے میں گرے جا رہے ہیں سچ تو یہ ہے کہ ان کے پاس سوا ظنوں وا وہام اور اٹکل پچو باتوں کے کوئی چیز نہیں بھلا اٹکل کے تیر حق و صداقت کی بحث میں کیا کام دے سکتے ہیں لہ یعنی تمہارے ماننے اور تمہارے جھٹلانے کا مدار ظن و گمان پر ہے تم جو باتیں مان رہے ان کے لیے بھی تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے اور جس بات کے جھٹلانے میں اس قدر جلدی کی ہے اس کے لیے تمہارے پاس یقین نہیں ہے حالانکہ سچائی کی راہ یہ ہے کہ جو کچھ کرو علم وبصیرت کے ساتھ کرو محض اٹکل پر نہ چلو۔ اگر ایک شخص علم و یقین اور اذعان وبصیرت کے ساتھ ایک بات پیش کر رہا ہے اور جتنی باتیں کسی بات کے درست ہونے اور معقولیت کی ہو سکتی ہیں سب اس کے ساتھ ہیں اور تمہارے پاس اس کے خلاف ظن وگمان کے سوا کچھ نہیں تو تمہارے لیے کب جائز ہو سکتا ہے کہ جھٹ جھٹلانے پر آمادہ ہو جاؤ۔ تم ظن کی بنا پر یقین کی دعوت جھٹلانے ہو حالانکہ ظن کا بھروسہ انسان کو یقین سے بے نیاز نہیں کر سکتا۔ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ علم ثابت وصحیح اور حق واضح ومعروف کے بجائے محض اپنے گمان کے پیچھے چل رہے ہو۔ اور ظاہر ہے کہ محض اٹکل کے تیر حقیقت سے بے نیاز نہیں کر سکتے۔ حقیقت جب سامنے آئے گی تو انہیں معلوم ہو جائے گا کہ انہوں نے اپنی عمارت بالکل ریت پر بنائی تھی آخر میں ان کو دھمکی دی ہے ان اللہ علیم بما یفعلون اللہ سبحانہ ان کے کرتوت سے باخبر ہے اور وقت آ رہا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ سب کچھ ان کے سامنے رکھ دے گا یہ تو مشرکین

لہ افادات شیخ الاسلام

عرب کا حال ہے اب بھی دنیا میں جن کو اللہ کی عبادت میں شریک بنایا جا رہا ہے اور ان کے لیے عبادات کے جو جو انداز اور جو جو صورتیں رائج ہیں ان سب کی عمارت بھی وہم و گمان کی بنیاد پر قائم ہے جن کے متعلق کہتے ہیں کہ فلاں آستانے کی نیاز تیر بہدف ہے اور فلاں درگاہ پر چڑھاوا چڑھانے کی دیر ہے کہ مراد بر آتی ہے، فلاں حضرت کے مزار پر جاڑو دینے سے مستے چاہے کیسے ہوں مٹ جاتے ہیں۔ ان سب کی یعنی طالب اور مطلوب دونوں کو گھروندہ وہم و گمان پر بنایا گیا ہے۔

وَمَا كَانَ هٰذَا
الْقُرْاٰنُ اَنْ يُّفْتَرٰى مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ وَلٰكِنْ تَصْدِيْقَ الَّذِيْ
بَيْنَ يَدَيْهِ وَتَفْصِيْلَ الْكِتٰبِ لَا رَيْبَ فِيْهِ مِنْ رَّبِّ
الْعٰلَمِيْنَ ۝ اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ
وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ۝ بَلْ كَذَّبُوْا بِمَا لَمْ يُحِيْطُوْا بِعِلْمِهٖ وَلَمَّا
يَاْتِهِمْ تَاْوِيْلُهٗ ؕ كَذٰلِكَ كَذَّبَ الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِهِمْ فَانْظُرْ
كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الظّٰلِمِيْنَ ۝ وَمِنْهُمْ مَّنْ يُّؤْمِنُ بِهٖ
وَمِنْهُمْ مَّنْ لَّا يُؤْمِنُ بِهٖ ؕ وَرَبُّكَ اَعْلَمُ بِالْمُفْسِدِيْنَ ۝ ع ۱۰

اور دیکھو یہ قرآن کہ اللہ کے سوا کسی اور کا بناوٹی کلام نہیں
ہے وہ تو ان سب کتابوں کی تصدیق ہے جو اس کے آگے
ہیں اور ان تمام چیزوں کو کھول کر بیان کرتا ہے جو اللہ کی
جانب سے تم پر لکھی گئی ہیں۔ اس کے رب العالمین کا کلام ہونے
میں کوئی شبہ نہیں ہے ۔ کیا کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ اس

قرآن کو پیش کرنے والے نے خود بنالیا ہے یعنی یہ کلام افترائی ہے اے پیغمبر ان کہنے والوں سے کہہ دو کہ اگر ایسا ہی ہے تو تم بھی اس جیسی ایک سورت لے کر آؤ۔ اگر تمہارے اس دعوے میں کچھ صداقت ہے تو اللہ کے سوا جس کو اس کام میں مدد کے لیے بلا سکتے بلا لو ۵۳ نہیں یہ کلام افترائی نہیں بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن کو ان باتوں کی وجہ سے جھٹلا رہے ہیں جو ان کی علمی دسترس میں نہیں آسکتی ہیں اور ابھی ان کی حقیقت سامنے نہیں آئی ہے ۵۴ ایسے ہی ان لوگوں نے بھی تکذیب کی تھی جو ان سے پہلے تھے۔ دیکھو ظلم کار لوگوں کا انجام کیا ہوا۔ اے اللہ کے رسول کچھ آپ کے مخاطبوں میں سے وہ ہیں جو قرآن کو اللہ کا کلام مانتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو قرآن کو اللہ کا کلام نہیں مانتے۔ اور تیرا پروردگار شورش پسندوں کو خوب جانتا ہے ۵۵

مفردات کے معانی

تاویل یہ باب تفعیل کا مصدر ہے اس کی لغوی حیثیت اور صرفی حقیقت پر حافظ ابن تیمیہ نے اکلیل میں مبسوط بحث کی ہے۔ اس میں اختلاف ہے کہ اس کا مادہ اول ہے اول سے یا دائل تفعیل سے اس کے معنے لوٹنے کے ہیں اسی سے اسم تفضیل اول آتا ہے جس کا مونث اُولیٰ ہے ہمزہ کے زبر کے ساتھ اولیٰ اسم تفضیل کا واحد مذکر ہے اور اس کا مادہ ولی ہے چونکہ سارے اعداد کا مرکز ایک ہے اس لیے اس کو اول کہتے ہیں کسی بات کے نتیجہ اور مطلب کو تاویل کہتے ہیں اور چونکہ الفاظ کے معانی بھی ان کی دلالت کا مال ہوتے ہیں اس لیے مطالب و معانی کو بھی تاویل کہتے ہیں اور تاویل ایک سے زیادہ اصطلاحی معانی میں بھی استعمال ہوتی ہے۔ علم اصول میں تفسیر کے مقابلے میں تاویل علم کلام میں تفویض کے مقابلے تاویل کی اصطلاح بولی جاتی ہے۔ قرآن میں لفظ تاویل لغوی معنے میں آیا ہے تشریح قرآنی کے لیے اصول تفسیر میں تاویل و تفسیر بولا جاتا ہے۔ کچھ شارحین قرآن ارباب تفسیر ہیں جیسے ابن کثیر، ابن جریر، قرطبی اور کچھ ارباب تاویل ہیں جیسے رازی بیضاوی وغیرہ۔ قرآن میں یہ لفظ نہ اصطلاح اصولیین کے معنے میں آیا ہے نہ اصطلاح متکلمین ہیں اور نہ اصطلاح مفسرین ہیں قرآن یہ لفظ لغوی معنے میں استعمال ہوا ہے۔

قرآن کا اعجاز نبوت ہونا

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اللہ سبحانہ کی جانب سے جو معجزات عطا ہوئے ان میں سب سے بڑا معجزہ خود قرآن عظیم ہے۔ خود ہی حضور اقدس نے دوسرے نبیوں کے معجزات کے مقابلے میں قرآن ہی کو سب سے بڑا معجزہ قرار دیا ہے ارشاد ہے۔

> انبیاء میں سے ہر نبی کو اللہ سبحانہ نے معجزات اس قدر عطا فرمائے جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے لیکن جو معجزہ مجھے عطا ہوا ہے وہ قرآن ہے جس کی اللہ سبحانہ نے مجھ پر وحی فرمائی ہے مجھے امید ہے کہ روز قیامت میرے پیروؤں کی تعداد زیادہ ہوگی۔

لیکن دونوں میں ایک جوہری فرق ہے چونکہ آپ سے پہلے انبیاء کی نبوت وقتی تھی اس لیے

معجزات بھی وقتی اور عارضی تھے ۔ ہوئے اور ہو کر مٹ گئے اور حضور اقدس کی نبوت دائمی اور تاقیام قیامت تھی اس لیے آپ کو قرآن عظیم کا ربانی معجزہ اعظم دیا گیا جو قیامت تک دنیا میں قائم اور باقی رہے گا۔ چونکہ دوسرے انبیاء کے معجزات وقتی تھے اس لیے ان سے جو اثر پیدا ہوا وہ بھی وقتی تھا۔ برخلاف اعجاز قرآنی کے کہ یہ چونکہ ہمیشہ رہنے والا ہے اس لیے اس کا اثر بھی دائمی اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے اور قیامت تک لوگوں کو متاثر کرتا رہے گا۔ حضور اقدس کے سارے معجزات میں صرف قرآن ہی ایک ایسا معجزہ ہے جس کی اللہ سبحانہ نے تحدی کی ہے اور اعلان عام کیا ہے کہ کوئی اس کی مثال پیش کرے اور پھر خود ہی اس کی پیشین گوئی بھی کر دی کہ دنیا ہمیشہ اس کی مثال پیش کرنے سے عاجز رہے گی۔

اس پر تو اتفاق ہے اور اس میں کبھی مسلمانوں کی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں لیکن اس میں اختلاف ہے کہ قرآن کس حیثیت سے معجزہ ہے؟ معتزلہ کے خیال میں قرآن کا نظم کلام معجزہ ہے معتزلہ ہی کی طرح جاحظ اور تمام اشاعرہ قرآن کو فصاحت و بلاغت کی حیثیت سے معجزہ بتاتے ہیں۔ نظام معتزلی اور ظاہریہ میں حافظ ابن حزم ظاہری کہتے ہیں کہ اعجاز یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے اپنی قدرت کاملہ سے تمام بلغائے عرب کی زبانیں گنگ کر دی ہیں کہ وہ اس کا جواب ہی نہیں دے سکتے امام رازی بھی اسے بالکل درست تو نہیں مگر اس کے قریب قریب بتاتے ہیں۔ کچھ متکلمین کے خیال میں اظہار غیب اعجاز ہے اور کچھ کہتے ہیں شان اعجاز یہ ہے کہ دل کے پوشیدہ اسرار کو ظاہر کرتا ہے کسی نے وجہ اعجاز یہ بتائی ہے کہ انسانی کلام بلند و پست کامل و ناقص ہوتا ہے قرآن میں کمال ہی کمال ہے۔ اور کچھ کی رائے میں ایک امی کی زبان سے ایسا کلام بلاغت ہونا اعجاز ہے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ قرآن اعجاز اس کے احکام تعلیمات میں ہے ۔ ایک رائے کے مطابق قرآن کی بے مثال تاثیر اعجاز ہے۔

سچ یہ ہے کہ ان تمام باتوں میں کوئی تضاد نہیں ہے۔ قرآن عزیز کے وجوہ اعجاز اس قدر زیادہ ہیں کہ ان کا احاطہ نہیں ہو سکتا ہے جیسے بصیرت متکلم کا ادارک نہیں کر سکتی ایسے ہی اس کے کلام کے وجوہ اعجاز کا احاطہ نہیں کر سکتی جس شخص کو جو بات اپنے مذاق کے مطابق نمایاں نظر آتی ہے اسی کو اس نے وجہ اعجاز قرار دے دیا ہے۔ کیونکہ قرآن نے خود کہیں تو اپنی تعلیم و ارشاد کی مدح کی ہے کہیں اپنی تاثیر اور قوت جذب کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہیں اسی یکسانی اور عدم اختلاف کو خدا کی طرف سے ہونے کی نشانی بتایا

ہے۔ کہیں اس نے اپنی عربیت اور حسن کلام کو ظاہر کیا ہے کہیں ایک امی کا پیغام ہونا
اپنا معجزہ بتایا ہے ایک موقع پر اپنی ہدایت و رہنمائی کو مخصوص ترین وصف قرار دیا ہے
کہیں وہ خود کو نور۔ ھدیً۔ حکمة، بینہ اور دیگر مختلف اوصاف معنوی کا
پیکر کہتا ہے۔

۳۷ اور دیکھو یہ قرآن کہ اللہ سبحانہ کے سوا کسی اور کا تراشیدہ کلام نہیں ہے
وہ تو ان سب کتابوں کی تصدیق کرتا ہے جو اس کے آگے ہیں اور ان تمام باتوں کو کھول
کر بیان کرتا ہے جو اللہ کی جانب سے لکھی گئی ہیں اس کے رب العالمین کا کلام ہونے
میں کوئی شبہ نہیں ہے پچھلی آیات میں فرمایا تھا کہ مشرکین محض ظن و تخمین کی پیروی کرتے
ہیں حالانکہ پیروی کے قابل صرف اس کی بات ہے جو صحیح راستہ بتلائے اسی مناسبت
سے یہاں قرآن کریم کا ذکر شروع کیا کہ آج دنیا میں وہی ایک کتاب صحیح راستہ بتلانے
والی اور ظنوں و اوہام کے مقابلہ میں سچے حقائق پیش کرنے والی ہے اس کے علوم و معارف
احکام و قوانین اور معجزانہ فصاحت و جزالت پر نظر کر کے کہنا پڑتا ہے کہ یہ کتاب وہ
نہیں جو خداوند قدوس کے سوا کوئی دوسرا شخص بنا کر پیش کر سکے۔ پورا قرآن تو بجائے
خود رہا اس کی ایک سورت کا مثل لانے سے تمام جن و انس عاجز ہیں۔ اس کا کلام اللہ ہونا
اس سے ظاہر ہے کہ وہ تمام کتب سماویہ کی سچائی پر مہر تصدیق ثبت کرتا ہے ان کے
اصل مضامین کی حفاظت کرتا اور ان کی پیشین گوئیوں کی صداقت کا علانیہ اظہار کرتا ہے
اور ان حقائق و معارف کو جو پچھلی کتابوں میں نہایت اجمالی طور پر مذکور تھیں تفصیل سے
بیان کرتا ہے سچ تو یہ ہے کہ اس کتاب میں عاقل کے لیے شک و شبہ کی قطعاً کوئی گنجائش
نہیں ہے ایسا جامع بلیغ پر حکمت اور نور صداقت سے بھرا ہوا کلام رب العالمین ہی کا
ہو سکتا ہے لہ

اس آیت میں چار باتیں سمجھنے کی ہیں۔

اول یہ قرآن اپنی شان و شوکت کے اعتبار سے کبھی انسانی بناوٹ نہیں ہو سکتا۔

ان یفتری من دون اللہ

لہ افادات شیخ الاسلام

دوسرے یہ کہ یہ قرآن تمام اللہ کی جانب سے آئے ہوئے پیغاموں کا مصدق ہے
تصدیق الذی بین یدیہ۔
تیسرے یہ کہ قرآن میں انسانی زندگی کے لیے احکام کی جامعیت ہے تفصیل الکتاب
چوتھے یہ قرآن بلاریب رب العالمین کی جانب سے ہے لا ریب فیہ من رب العالمین

قرآن انسانی بناوٹ نہیں ہے

اس کتاب کے پیش کرنے والے اللہ سبحانہ کی جانب سے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ ان کا دعوی ہے کہ یہ اللہ سبحانہ کی کتاب ہے آپ کے مخالف کہتے تھے کہ یہ اللہ کا کلام نہیں بلکہ خود ان کا تراشیدہ ہے اور یہ اللہ کے نام جھوٹ اور غلط لگا رہے ہیں اسی لیے مخالفین کا آپ سے یہ مطالبہ تھا ائت بقران غیر ھذا او بدلہ یہ اس قرآن کے علاوہ اور قرآن کی طلب اور قرآن کو تبدیل کرنے کا مطالبہ انکی ذہنی کیفیت کی پوری عکاسی کر رہا ہے۔ حافظ ابن حجر کے حوالہ سے علامہ آلوسی نے نقل کیا ہے کہ یہ آیت ان لوگوں کے مطالبہ کے جواب میں ہے کہ یہ قرآن انسانی بناوٹ نہیں ہے اور سوچنے کی بات ہے کہ اس قرآن کے بنانے میں آپ کو دخل کیسے ممکن ہے ایک امی محض جو امیوں ہی گود میں پلا ہوا اور پل کر جوان ہوا ہو۔ اس نے ہوش سنبھالا تو گرد وپیش میں تاریکیوں اور ظلمتوں کے سوا اسے کچھ نظر نہ آیا علوم و فنون اور تہذیب وتمدن سے ایک عاری ملک عاری شہر اور عاری خاندان کے اندر نشو و نما پائی جہاں اہل فکر اور ارباب علم کا وجود نہ تھا وہ خود اس کا خاندان اور اس کا وطن نوشت وخواند کے نقوش وحروف سے آشنا نہ تھا گذشتہ صحف انبیاء اور افکار عالیہ کا ایک حرف اس کے کان میں کبھی نہیں پہنچا۔ علما اور دانشوروں کی صحبت اس نے کبھی نہیں اٹھائی۔ اصول قانون مبادی اخلاق محاسن علم وعمل کی کوئی ظاہری تعلیم اس کو نہیں ملی بلکہ مدرسہ علم وحکمت کے سایہ دیوار تک کبھی اس کا گذر نہیں ہوا اور اسی طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس دور پورے کرتا ہے کہ دفعۃً غار حرا کے ایک دہانے سے اجالا ہوتا ہے علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا سرچشمہ ابلتا ہے ظاہری نوشت وخواند کا سرچشمہ ابلتا ہے۔ ظاہری نوشت وخواند کے نقوش وحروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ صحف انبیاء اور افکار عالیہ کے اوراق اس کی زبان پر جاری ہوتے ہیں اس کے

پھر تو صحبت سے امی اور جاہل علمائے دہر اور دانشوران روزگار بن کر نکلتے ہیں اس سے زیادہ قرآن عزیز کے معجزی نہ ہونے کی اور کیا دلیل ہو سکتی ہے۔ علامہ آلوسی کی یہ بات بالکل برمحل اور بر موقعہ ہے۔

یہ بات نہ درست ہے اور نہ ہی ٹھیک ہے کہ یہ قرآن جو ہدایات و رہنمائیوں کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے اللہ کے سوا کسی اور کا گھڑا ہوا ہو۔

اور علامہ بقاعی نظم الدرر میں فرماتے ہیں۔

اس قرآن کے لیے انسانی بناوٹ ہونا ممکن ہی نہیں ہے جب کہ اس میں حکیمانہ انداز میں ہر خبر موجود ہے۔

قرآن تمام گذشتہ کتابوں کا مصدق ہے

قرآن کے مصدق ہونے کا مطلب یہ ہے کہ از آدم تا محمد رسول اللہ جس قدر ربانی پیغام مختلف وقتوں مختلف نبیوں کے ذریعے آتے رہے وہ سب سچے ہیں پیغام اللہ کے پیغام ہیں اور پیغام لانے والے بھی اللہ کے پیغامبر ہیں قرآن اس بات کو بھی جیسے قرآن کے کلام الٰہی ہونے کے لیے بطور دلیل پیش کرتا ہے ایسے ہی وہ اس بات کو محمد رسول اللہ کی صداقت کی بھی دلیل بنا کر پیش کرتا ہے یعنی ان کی ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے اور جب ہر تعلیم دوسری تعلیم کی تصدیق کرتی ہے تو اس سے معلوم ہوا کہ تمام تعلیمات کا سرچشمہ ایک ہی ذات گرامی ہے۔ کیونکہ اگر مختلف وقتوں مختلف گوشوں مختلف قوموں مختلف ناموں مختلف پیرایوں اور مختلف زبانوں میں کوئی بات کہی گئی ہے اور باوجود ان تمام اختلافات کے بات ہمیشہ سے ایک ہو اور ایک ہی مقصد پر زور دیتی ہو تو قدرتی پر ماننا پڑے گا کہ کہنے والا ایک ہے قرآن نے اپنا وصف تصدیق الذی بین یدیہ بنا کر دعویٰ کیا ہے کہ اس پر یقین کیا جائے کہ وحی کے آغاز سے آج تک ایک ہی پیغام تھا جو آتا رہا ایک ہی دین تھا جو سکھایا جاتا رہا ہے اور ایک ہی حقیقت تھی جو دہرائی جاتی رہی ہے لیکن وہ بار بار انسانوں کے نسیان و تغافل اور تصرف و تحریف سے بدلتی رہی گم ہوتی رہی اور آخری بار دنیا کے

کمال بلوغ کے زمانہ میں قرآن پوری حفاظت کے وعدے کے ساتھ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے مفصل اور کامل ہو کر نازل ہوا ہے۔ اور اس تصدیق کا لازمی تقاضا یہ بھی ہے کہ قرآن کو قبول کرنا سب اللہ کے پیغاموں کو قبول کرنا ہے کیونکہ قرآن سب کا مصدق ہے اور سب کا محافظ ہے۔

قرآن میں شان جامعیت

اس بات کی تعبیر ایت قرآن میں تفصیل الکتاب کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ قرآن ایک جامع کتاب ہے اس میں شان جامعیت پائی جاتی ہے جامعیت تین طرح کی ہوتی ہے جامعیت ہدایت، جامعیت احکام اور جامعیت ثمرات احکام۔

جامعیت ہدایت یعنی انسانی زندگی کے سارے لوازم، عوارض اور حوائج کے لیے قرآن ہدایت نامہ ہے۔ زندگی کی کوئی شاخ نہیں جو قرآن کی رہنمائی و ہدایت سے ہمدوش نہ ہو۔

جامعیت احکام یہ کہ تمام احکام خود اپنی ذات سے اتنے جامع ہیں کہ نہ ان میں ترمیم کی گنجائش ہے نہ تنسیخ کی جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کے ہر حکم میں سارے پہلوؤں کی رعایت موجود ہے۔

جامعیت ثمرات یہ کہ قرآنی احکام بلحاظ نوعیت اور بلحاظ آثار و نتائج اس قدر جامع ہیں کہ ان سے صرف روحانی واخروی فوائد ہی حاصل نہیں ہوتے بلکہ جسمانی و مادی اور تمدنی ثمرات بھی حاصل ہوتے ہیں۔

قرآن میں ہدایت کی جامعیت

قرآن میں اولین جامعیت ہدایت کی ہے۔ غور کرو کہ زندگی کا گوشہ قرآنی ہدایت سے بیگانہ نہیں ہے۔ خلوت، جلوت، عادت، عبادت تمدن و تہذیب اور معاشرت دیانت و سیاست، صلح و جنگ، حب اور بغض احوال انسانی میں غربت و امارت، مرض و صحت مروت و استغناء غم و مسرت خوف اور رغبت، سب کے بارے میں ہدایات موجود ہیں بتانا یہ چاہتا ہوں کہ انسانی زندگی کے ہر کھلے اور چھپے گوشہ کے متعلق مفصل ہدایات کا ایک قانون خاکہ قرآن کی خصوصیت ہے۔

انسانی زندگی میں اگر ہم تین پہلو دیکھتے ہیں اللہ سے تعلق۔ اللہ کے بندوں سے تعلق۔ خود اپنی ذات سے تعلق۔ قرآن ان تینوں کے متعلق جامع ہدایات دی ہیں۔

اللہ سے تعلق کے موضوع پر سب سے اہم اور بنیادی چیز یہ ہے کہ ہمارا مبدا کیا ہے اور بالآخر کہاں جاتا ہے یعنی ہماری بدایت و نہایت اور ابتدا و انتہاء کا مرجع کون ہے قرآن بتاتا ہے کہ ابتدا و انتہاء کا مرکز اللہ سبحانہ کی ایک ذات ہے الٰہی وحدت سے یہ ساری کثرتیں نمایاں ہوئی ہیں۔ اسی تصور سے عبادت جنم لیتی ہے اور کیم انسانی زندگی کا کوئی لمحہ عبادت سے خالی نہ ہونا چاہیے اسی لیے مختلف مذاہب نے رہبانیت کو اپنایا لیکن قرآن نے انسانی قوی اور مصالح کے پیش نظر ترک رہبانیت کا اعلان کیا اور تمام تعلقات اور لذات کے ہجوم میں انسان کو چوبیس گھنٹے مصروف عبادت رہنے کا طریقہ سکھایا عبادات کی کنجی تو فرائض کو قرار دیا۔ روزانہ پانچ وقت نمازیں۔ سال بھر میں ایک ماہ روزے۔ عمر میں ایک بار حج سال میں بشرط غنا ایک بار زکوٰۃ۔ ارکان اسلام ہیں۔ ان کا جو بھی بنظر غائر مطالعہ کرے گا وہ محسوس کرے گا کہ یہ اعمال صرف چند نیکیاں اور عبادتیں نہیں ہیں بلکہ نیکی اور عبادت کے سرچشمے بھی ہیں۔ ان میں سے ہر ایک انسان کے اندر بندگی کا احساس اور اسے مکمل کرنے میں بڑا اہم حصہ لیتا ہے اور ایسا حصہ لیتا ہے جو اسی کے لیے مخصوص ہے کوئی دوسرا عمل اس کی قائمقامی نہیں کرسکتا پھر یہ سب ملکر مومن کو ایسا ذہن عطا کر دیتے ہیں جو اللہ سبحانہ کے بارے میں پوری طرح مطمئن ہو جاتا ہے۔ ایک ایسا دل عطا کرتے ہیں جو رضائے الٰہی کی طلب سے سرشار رہتا ہے اس طرح وہ جذبہ محبت کے تحت اللہ سبحانہ کی طاعت گذاری کے لیے ایسا تیار ہو جاتا ہے کہ اس کی جناب سے جو حکم بھی ملے اس کی تعمیل کے لیے دوڑ پڑے اس کے دل کی زمین محبت کی سرشاری سے اس طرح ہو جاتی ہے کہ اللہ سبحانہ کی ہدایات جو بھی اس کے سامنے آتی ہیں ان کو فوراً والہانہ انداز میں قبول کر لیتا ہے۔ اسی وجہ سے ان عبادات کو اسلامی زندگی کی قرآن نے اساس قرار دیا ہے یعنی پوری دین کے لیے مدار حیات قرار دیا گیا ہے۔ یہ تو ہوا اللہ سے تعلق آیئے اب اللہ کے بندوں سے تعلقات میں قرآنی ہدایات کی جامعیت پر غور کیجیے۔

سب جانتے ہیں کہ قرآن نے دین کا جو تصور پیش کیا ہے وہ صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں ہے۔ اگر ایسا ہوتا تو پھر رہبانیت ہوتی قرآن کا مزاج رہبانیت کو برداشت

نہیں کرتا۔ قرآن کی مسند ارشاد عبادت گاہ اور زندگی کے انفرادی دائرے ہی میں بچھی ہوئی نہیں ہے بلکہ وہ بازاروں کاروباری اداروں معاشی میدانوں، تمدن کے دائروں۔ سیاست اورحکومت کے ایوانوں غرض زندگی کے ایک ایک شعبے میں ہدایات دیتا ہے کچھ باتوں سے روکتا اور کچھ باتوں کا حکم کرتا ہے مثلاً قرآن حکم دیتا ہے کہ زانی کو سو کوڑے لگاؤ۔ اس کا یہ حکم صریح طور پر ایسا حکم ہے جس کا تعلق پولیس اور عدالت سے ہے، اس لیئے یہ ہدایت اجتماعی زندگی کا معاملہ ہے۔

قرآن نے پورے اجتماعی نظام کے لیے ہدایات دی ہیں وہ صرف روحانی اور اخلاقی نظام ہی کے موضوع پر ہدایات نہیں دیتا بلکہ اس کی ہدایات کا دائرہ زندگی کے سارے شعبوں کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے اس کی ہدایات عائلی نظام، معاشرتی نظام کے ساتھ ساتھ معاشی نظام سیاسی نظام اور قانونی نظام تک پھیلی ہوئی ہیں۔

خود اپنی ذات سے تعلق کی حد تک قرآن تہذیب نفس و اخلاق اور ریاضت مجاہدات کی تعلیم دیتا ہے۔ فضائل اخلاق کا حکم دیتا ہے اور رذائل سے دور رہنے کی تلقین کرتا ہے تفریحات و مزاح کی اجازت دیتا ہے مگر تمسخر اور استہزا سے روکتا ہے۔ سکوت و تکلم کے آداب بتاتا ہے۔ سفر سے طبیعت میں نشاط پیدا ہوتا ہے، اس کی ترغیب دیتا ہے قرآن میں اس موضوع پر بھرپور ہدایات ہیں۔

قرآن میں احکام کی جامعیت

اس موضوع پر زیادہ کچھ بتانے کی ضرورت نہیں ہے قرآنی احکام میں اسقدر جامعیت اور ہمہ گیری ہے کہ کوئی قانون اس کی ہمہ گیری کا ہم پلہ نہیں ہے۔

یہ قرآن کی جامعیت ہی ہے کہ قرآن کے سوا کسی اور آسمانی کتاب نے تکمیل دین کا اعلان نہیں کیا جامع ہے تو کامل بھی ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ وہ مکمل ہے اور اس کے ذریعہ سے انسانی زندگی کی ساری ضرورتوں کے اصول و فروع پایۂ تکمیل کو پہنچ گئے۔ اسی تکمیل کا یہ اثر تھا کہ اس نے بعض سخت فقہی احکام کو جو ان کی سخت گیری کے لیے ان پر عائد تھے اور اصل دین ابراہیم میں داخل نہ تھے یا انسانوں کے اضافے اور تصرفات تھے بدل کر ایسے مناسب اور آسان احکام دیئے جو ہر زمانے کے لیے موزوں ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے قرآن نے

کسی آنے والے پیغمبر کی خبر نہیں دی اور نہ کسی نئے کلام کے نزول کی پیشین گوئی کی کہ جامعیت اور کمال کے بعد کسی نئے آنے والے کسی نئے کلام اور کسی نئی شریعت کی ضرورت ہی کیا ہے۔

اس پر بھی غور فرمایئے کہ قرآن کی جامعیت اور کمال ہی کی وجہ سے جیسے قرآن نے علم کے اعتبار سے اپنے بارے میں لوگوں کو چیلنج دیا جیسا آگے آرہا ہے ایسے ہی قرآن نے عمل کے اعتبار سے اپنے پیغمبر کی زندگی کو تحدی اور اعلان کیساتھ اسکے ہمعصروں کے سامنے پیش کیا ہے لبثت فیکم عمرا من قبلہ۔ قرآن کی اثر انگیزی کے واقعات سے اگر تاریخ بھری ہوئی ہے تو خود ان کے پیش کرنے والے کے بارے میں قرآن نے بتایا ہے کہ اس کی قرآن پر مبنی تعلیم کی یہ تاثیر ہے کہ وہ دوسروں کو بھی اپنے فیض صحبت سے مندکر سکتا ہے یعنی قرآن بھی کامل ہے اور قرآن کا پیش کرنے والا اللہ کا رسول بھی کامل ہے وہ خود پاک ہے دوسروں کو پاک صاف بنا دیتا ہے۔

الغرض قرآن میں ہر پہلو سے جامعیت ہے تورات قانون و شریعت ہے لیکن اخلاق و موعظت نہیں انجیل اخلاق و موعظت ہے لیکن قانون و شریعت نہیں ہے۔ زبور مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا مجموعہ ہے لیکن دیگر صفات سے خالی۔ مسیح کے صحیفے میں خطابت کی ہنگامہ آرائیاں ہیں مگر استدلال اور فکر و نظر کی دعوت نہیں صحف بنی اسرائیل میں پیشین گوئیاں ہیں مگر دقائق حکمت اور اسرار ایمان و عمل سے خالی ہیں دنیا میں قرآن ایک ہی جامع کتاب ہے جو قانون و شریعت بھی ہے اور اخلاق موعظت بھی مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی ہے اور دیگر کتب الٰہی کی مجموعی صفتوں کی حامل بھی۔ خطابت بھی ہے اور استدلال و فکر بھی۔ اظہار غیب اور پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے اور دقائق حکمت و اسرار ایمان و عمل سے معمور بھی اور ان سب کے ساتھ عین اس وقت جب اور کتب الٰہی تحریف و تغیر و تعبیر اپنی اصلی زبان اور تراجم و تعبیریں کھو چکی تھیں قرآن نازل ہوا۔

بہر حال قرآن عزیز میں جامعیت اور کاملیت کی دونوں شانیں بھرپور انداز میں موجود ہیں اور یہی تفصیل الکتاب ہے۔

قرآن بلاریب کلام الٰہی ہے

چوتھی بات لاریب فیہ من رب العالمین فرمائی ہے یعنی قرآن بلاریب کلام الٰہی ہے اور معانی کے ساتھ اپنے الفاظ، کلمات اور عبارت میں بلا شبہ اللہ سبحانہ کی جانب سے ہے اور اس کی فصاحت و بلاغت کے اعجازی کمال میں اللہ سبحانہ کی جانب سے ہونے میں کوئی دوسری کتاب اس کی حریف نہیں ہے کیونکہ دوسری آسمانی کتابیں اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے معنے کے اللہ کی جانب سے ہونے کا دعویٰ ہے چنانچہ قرآن کا حرف حرف لفظ لفظ وحی ہے اور وہی ہے جو محمد رسول کی زبان سے ادا ہوا وہ ہر قسم کی تحریف و تغیر سے محفوظ ہے اسلئے اس کے الفاظ کلمات اور عبارت اللہ سبحانہ کی جانب سے ہیں اور اس صفت میں دنیا کی کوئی آسمانی کتاب اس کتاب کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی ہے

اس تعبیر کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ بے شک یہ اللہ کی کتاب ہے اور اس کے اللہ کی کتاب ہونے میں کوئی شبہ نہیں ہے دنیا میں جس قدر کتابیں امور مابعد الطبیعت اور حقایق ماوراء ادراک سے بحث کرتی ہیں ان سب کا علمی سرمایہ انسانی گمان، خیال اور قیاس کی تخلیق ہے اس لیئے وہ شک سے پاک نہیں ہو سکتے لیکن قرآن ایسی کتاب ہے جو سر تا سر علم و حقیقت پر مبنی ہے اس کا مصنف رب العالمین ہے جو تمام حقائق کا علم رکھتا ہے اس لیئے فی الواقع اس میں شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔

قرآن افترائی کلام نہیں

۳۸ کیا کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ اس قرآن کے پیش کرنے والے نے خود بنا لیا ہے یعنی یہ کلام افترائی ہے اے پیغمبر ان کہنے والوں سے کہہ دو کہ اگر ایسا ہی ہے تو تم بھی اس جیسی ایک سورت لے کر آؤ۔ اگر تمہارے اس دعوے میں کچھ بھی صداقت ہے تو اللہ کے سوا جس کو اس کام میں مدد کے لیے بلا سکتے ہو بلا لو۔ یعنی اگر میں بنا لایا ہوں تو تم بھی میری طرح بشر ہو سب مل کر اس جیسی سورۃ بنا لاؤ۔ ساری مخلوق کو دعوت دو جن و انس کو جمع کر لو تمام جہان کے فصیح و بلیغ پڑھے لکھے اور ان پڑھ اکٹھے ہو کر ایک چھوٹا سا کلام قرآن کی مانند پیش کرو تو سمجھ لیا جائے گا کہ قرآن بھی کسی بشر کا کلام ہے جس کا مثل دوسرے لوگ لا

سکتے ہیں مگر محال ہے کہ ابدالا باد تک کوئی مخلوق ایسا حوصلہ کرسکے۔قرآن کریم ہی وہ کتاب ہے جس میں تہذیب اخلاق تمدن و معاشرت حکومت وسیاست معرفت وروحانیت تزکیہ نفوس تنویر قلوب غرضیکہ وصول الی اللہ اور تنظیم ورفاہیت خلائق کے وہ تمام قوانین وطرق موجود ہیں جن سے افرینش عالم کی غرض پوری ہوتی ہے اور جن کی ترتیب وتدوین کی ایک امی قوم کے امی فرد سے کبھی ابد نہیں ہوسکتی ہے۔پھران علوم وہدایات کا تکفل کرنے کے ساتھ اس کتاب کی ولولہ انگیز فصاحت وبلاغت جامع مؤثر دلربا طرز بیان دریا کا سا تموج سہل ممتنع سلاست وروانی اسالیب کلام کا تنوع اور اس کی لذت وحلاوت اورشہنشاہانہ شان وشکوہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں جنہوں نے بڑے زور شور اور بلند آہنگی سے سارے جہاں کو مقابلہ کا چیلنج دے دیا ہے جس وقت سے قرآن کے جمال جہاں آراء نے غیب کی نقاب الٹی اور اولاد آدم کو اپنے سے روشناس کرایا اس کا برابر یہی دعوی رہا کہ میں اللہ سبحانہ کا کلام ہوں۔ اور جس طرح اللہ سبحانہ کے آسمان جیسا آسمان پیدا کرنے سے دنیا عاجز ہے ایسے ہی اللہ سبحانہ کے کلام جیسا کلام بنانے سے بھی دنیا عاجز رہے گی قرآن کے مٹانے کی لوگ سازشیں کریں گے مگر گانٹھیں گے ۔مقابلہ کے جوش میں کٹ مریں گے۔اپنی مدد کے لیے دنیا کی بڑی بڑی طاقتوں کو دعوت دیں گے کوئی حیلہ، کوئی تدبیر کوئی داؤ پیچ اٹھا نہ رکھیں گے۔اپنے کو اور دوسروں کو مصیبت میں ڈالیں گے۔سارے مصائب اور دوا ہی کا تحمل ان کے لیے ممکن ہوگا مگر قرآن کی چھوٹی سی سورت کا مثل لانا ممکن نہ ہوگا۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القران لا یاتون بمثله ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا۔

آپ اعلان کردیں کہ اگر تمام انسان اور جن اکٹھے ہوجائیں اور چاہیں کہ اس قرآن کی مانند پیش کردیں تو کبھی پیش نہ کرسکیں گے اگرچہ باہم ایک دوسرے کے مددگار ہوجائیں۔

اس مسئلہ پر ہم نے اعجاز القرآن کے نام سے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے جسے شوق ہو ملاحظہ کرے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن حضور اقدس کے معجزات میں ایک علمی معجزہ ہے جب کہ دوسرے معجزات عملی ہیں اسی معجزے کے بارے میں قرآن میں اللہ سبحانہ نے تحدی کی ہے اور اعلان عام کیا ہے کہ کوئی اس کی مثال پیش کرے اور پھر خود یہ بھی اعلان کر دیا کہ پوری دنیا مل کر مثال پیش کرنے سے ہمیشہ عاجز ہو اور سب سے پہلے مکہ میں سورہ الاسراء میں پورے قرآن کی مثال لانے کا مطالبہ کیا۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یاتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولو کان بعضھم لبعض ظھیرا

اے اللہ کے رسول اعلان کر دو کہ اگر پورے انسان اور جن اس بات پر ایکا کریں کہ اس قرآن کی مثال پیش کریں تو اس جیسا قرآن نہیں لا سکتے اگرچہ وہ باہم ایک دوسرے کی مدد کریں۔

اس کے بعد سورۂ ہود میں قرآن نے اس اعلان کو یہ کہہ کر دہرایا کہ بجائے پورے قرآن کے دس ہی سورتیں لے آؤ۔

ام یقولون افتراہ قل فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات

کیا وہ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کو اپنے جی سے بنا لیا ہے اب کہہ دیں کہ تم بھی ایسی بنائی ہوئی دس سورتیں لے آؤ۔

اس کے بعد مکہ ہی میں ایک سورت کا اعلان کیا۔ سورہ یونس کی یہ آیت اسی اعلان کے بارے میں ہے جس کی تشریح ہو رہی ہے پھر اس کے بعد مکہ ہی میں اعلان ہوا کہ سورت نہیں لا سکتے تو ایک بات ہی لاؤ چنانچہ سورہ طور میں ہے۔ فلیاتوا بحدیث مثلہ۔

مدینہ پہنچ کر پھر مشرکین عرب سے ہٹ کر پوری کائنات انسانی کو چیلنج دیا چنانچہ البقرہ میں ہے۔

وان کنتم فی ریب مما نزلنا علی عبدنا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شھداءکم من دون اللہ ان کنتم صادقین

اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ:

فان لم تفعلوا ولن تفعلوا فاتقوا النار التی وقودھا الناس والحجارۃ اعدت للکافرین۔

اگر تم یہ نہ کر سکے اور ہرگز نہ کر سکو گے تو پھر اس آگ سے ڈرو جس کا ایندھن آدمی اور پتھر ہیں۔

اس آیت میں جو تحدی کی گئی ہے اس کے مخاطب یاایھا الناس کے ماتحت سارا عالم ہے صرف قریش یا اہل عرب نہیں ہیں۔

پہلے یہ بات بتائی تھی کہ قرآن اس شان کی کتاب ہے کہ کسی انسان کی ساختہ پر داختہ ہونا اس کا ممکن ہی نہیں ہے۔ یہ اللہ کی وحی ہے اس کو کلام الٰہی جاننے کے لیے اللہ کی جانب سے آئی ہوئی کتابوں کی ترازو میں تول کر دیکھو۔ اگر دیکھو گے تو ورقہ ابن نوفل کی طرح بول پڑو گے ھذا ھو الناموس الذی نزل اللہ۔ یہ قرآن تمام وحیوں کی تصدیق کرتا ہے ہر شک سے بالاتر ہے اب یہ بتایا جا رہا ہے کہ ان حقائق کو جان لینے کے بعد بھی اگر وہ اپنی ضد پر اڑے ہوئے ہیں اور یہی کہے جا رہے ہیں کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب نہیں بلکہ محمد رسول اللہ کی من گھڑت ہے تو اے اللہ کے رسول آپ ان سے کہہ دیجیے کہ اگر یہ کتاب میں نے بنائی ہے اور اللہ کی کتاب نہیں ہے تو اس کا حل بہت ہی آسان ہے۔

اول اس طرح اگر میرا بنایا ہوا ہے تو یہ کیسے ممکن ہے میں تو اُمی ہوں میری اُمیّت محتاج دلیل نہیں ہے۔ اس کے بنانے کے تین ہی ذریعے ممکن ہیں۔

ایک یہ کہ جو کچھ اللہ کی جانب سے پیش کر رہا ہوں اور انبیاء کے واقعات قرآن بیان کر رہا ہے اس وقت میں خود موجود ہوں۔

دوسرا یہ کہ ان کو میں نے کتابوں میں پڑھا ہو۔

تیسرا یہ کہ میں نے کسی سے یہ باتیں سنی ہوں۔

ظاہر ہے کہ اطلاع کے یہ تینوں ذرائع مجھ میں مفقود ہیں اول اس لیے کہ از آدم تا انبیدم قرآن میں جو واقعات بیان ہوئے یہ واقعات میری پیدائش سے پہلے وقوع پذیر ہوئے ہیں اور میرے پاس ان کے علم کا کوئی ذریعہ نہیں ہے۔

علم کا دوسرا ذریعہ یہ ہے کہ میں نے کتابوں سے پڑھ کر یہ سب کچھ بنالیا ہو میں خود پڑھنے لکھنے سے عاری ہوں نہ خود پڑھ سکتا ہوں اور نہ لکھ سکتا ہوں یہ کیسے ممکن ہے۔

علم کا تیسرا ذریعہ یہ کہ دوسروں کے سامنے زانوے ادب طے کر کے میں نے علم حاصل کیا ہو تم سب جانتے ہو کہ نبوت سے پہلے میری ساری زندگی مکہ میں گذری ہے اور خود مکہ معظمہ میں نہ خود ان واقعات وحقائق کا کوئی عالم تھا اور نہ قریش کو ان سے آگاہی تھی۔

قریش نے بہت سے اعتراضات کیے مگر یہ اعتراض انہوں نے کبھی نہیں کیا کہ حضور اقدس نے چپکے سے پڑھنا لکھنا سیکھ لیا ہے اور دوسری آسمانی کتابیں پڑھ کر یہ قرآن بنالیا ہے بس اس سے ثابت ہوا کہ حضور کی امیت پر ان کو یقین تھا اور امی ہونے کی حالت میں قرآن بنانا تو درکنار پڑھنا بھی ممکن نہیں۔

دوسرا حل یہ ہے کہ اگر باوجود امی ہونے کے میں نے ہی یہ قرآن بنایا ہے تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تو تم بھی قرآن جیسی ایک سورت بنا کر لاؤ اور اگر ایک انسانی دماغ کی قرآن محنت ہے تو بہت سے انسانی دماغ ملکر تو ضرور ایک سورۃ اس جیسی بنا سکتے ہیں۔ اگر تم اپنے اس دعویٰ میں سچے ہو کہ یہ انسانی دماغ کی محنت کا نتیجہ ہے تو تم بھی یہ کام کر کے دیکھ لو۔

یہ جو آیت میں کہا گیا ہے کہ اس جیسی ایک سورۃ مماثلت لاؤ اس مماثلت سے کیا مقصود ہے؟ کس بات میں مماثلت کا مطالبہ ہے۔

اس موضوع پر آپ پہلے مختلف خیالات سن چکے ہیں۔ ان کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے

قرآن کے وجوہ اعجاز

قرآن حکیم کی ان آیتوں کو اگر یکجا کیا جائے جن میں قرآن کے وجوہ اعجاز کی طرف اشارہ ہے تو خود مختلف نظر آتی ہیں جس سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن کے وجوہ اعجاز اس قدر متعدد ہیں کہ ان کو کسی ایک میں محدود نہیں کیا جا سکتا ہے قرآن نے خود کہیں تو اپنی تعلیم وہدایت کو سراہا ہے اور کہیں اپنی قوت تاثیر اور قوت جذب کی طرف اشارا کیا ہے۔ کہیں اپنی یکسانی اور عدم اختلاف کو اللہ سبحانہ کی طرف سے ہونے کی نشانی قرار دیا ہے کہیں اس نے اپنی عربیت اور حسن کلام کو ظاہر کیا ہے کہیں ایک امی کی زبان سے پیغام کا پیش ہونا اپنا معجزہ بتایا ہے۔ ایک موقعہ پر اپنی ہدایت و رہنمائی کو مخصوص وصف قرار دیا ہے

کثرت سے شارحین قرآن کی رائے ہے کہ قرآن اپنی فصاحت و بلاغت اور اپنے انداز بیان کے مناظر میں بے مثال ہے اور یہی اس کا اعجاز ہے مگر یہ کہنا کہ یہی اعجاز ہے جیسا کہ امام رازی کی رائے ہے صحیح نہیں ہے ہاں یہ درست ہے کہ فصاحت و بلاغت بھی اعجاز قرآن کا ایک گوشہ ہے۔ ابوبکر الباقلانی الخطابی الرمانی، عبدالقاہر الجرجانی جیسے بزرگوں نے اعجاز قرآن پر جب قلم اٹھایا تو اس وقت کے رجحان اور عربوں کے ادبی ذوق کی وجہ سے

ان کے سامنے زیادہ تر اعجاز قرآن کا یہی گوشہ رہا اور بہ حقیقت بالکل بے غبار ہے کہ اس میدان میں ان بزرگوں نے جس نکتہ دانی اور حسن ذوق کا ثبوت دیا ہے بہت زیادہ قدر دانی کے لائق ہے۔

علامہ مجد الدین فیروز بادی نے بصائر ذوی التمیز میں اس موضوع پر اہل السنۃ کا مذہب یہ بتایا ہے۔

اہل السنۃ کا مذہب یہ ہے کہ قرآن ان سب میں معجزہ ہے نظم میں معنے میں الفاظ میں۔ کسی مخلوق کا کوئی کلام قرآن کے ہم پلہ نہیں ہو سکتا ہے۔ قرآن خطبا کی خطابت شاعروں کے اشعار سے بارہ وجوہ سے ممتاز ہے۔

ایجاز تشبیہ، استفادہ، حروف کا تناسب کلمات کی ہم آہنگی، فواصل و قواطع کی یکسانی صیغوں اور الفاظ کا تجانس، احوال و قصص کی تعریف، حکم و اسرار کی فراوانی، امر و نہی میں ندر بیان مقاصد میں دلربائی مصالح و اسباب کی رعایت ماضی اور مستقبل پر معلوماتی تبصرہ تنگنائی

اس کا دوسرے لفظوں میں مطلب یہ ہے کہ قرآن کا اعجاز فی الواقع قرآن کی شان جامعیت ہے۔ کلام کی جامعیت میں اس وقت کمال ہوتا ہے جب اولاً وہ ماتحت افراد و انواع کو اتنا حادی ہو کہ جب ان کی تفصیل کی جائے تو اس کا کوئی فرد اس سے باہر نہ رہے ثانیاً اس میں الفاظ کی ایسی تنگنائی نہ ہو کہ مراد کے خلاف کوئی احتمال ہو سکے وہ کلام جس میں مراد متکلم کے خلاف احتمالات کی گنجائش ہو جامع نہیں ہوتا ثالثاً یہ کہ الفاظ اپنے مبہم نہ ہوں کہ جب مطلب ان کا بتایا جائے وہ ظاہر نہ ہو۔ جامعیت کا کمال یہ ہے کہ پورے اختصار کے باوجود اس کے الفاظ اتنے صاف ہوں کہ جب ان کی تفصیل کی جائے تو ہر ہر تفصیل پر وہ ایسا ہی صادق رہے گویا اسی کے لیے وضع کیے گئے تھے ان اوصاف کو پیش نظر رکھ کر کسی بھی بڑے بڑے مصنف کے کلام کا مطالعہ کریں تو ہر ایک کے کلام ایک خامی ضرور ہو گی کہ ابہام ضرور ہو گا اگر واضح اور صاف ہو گا تو جامعیت نہ ہو گی ان دو صفتوں کا اجتماع اب آیات قرآنیہ دیکھیں گے کہ واضح اور صاف بھی نہیں اور اغلاق و ابہام کا بھی داغ نہیں شان جامعیت بھی اعجاز کا شعبہ ہے خلاصہ یہ ہے کہ جامعیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس کے بعد تفصیل کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کا مفہوم یہ ہے کہ وہ خدا شناسی اور آداب عبدیت کے اصولوں پر حاوی ہے جیسے جہان بانی اور فرمانروائی کے ایک ایک نکتہ

اور ایک ایک شوشہ کے لیے مکمل آئین ہے ایسے ہی ایک بے کس نادار اس پر عمل کر کے عارف کامل ہو سکتا ہے اور ایک فقیر بے نوا اس کی اتباع کے صدقے تاج شاہی پہن سکتا ہے۔ شاہی اور گدائی کے عمیق و دقیق اصول قرآن نے ایسے جامع الفاظ میں پیش کئے ہیں کہ مختلف زمانوں کی مختلف ضروریات کی کفالت پورے اور بھرپور انداز میں کی ہے جو کچھ کہا گیا ہے اس کا مطلب دوسرے لفظوں میں یہ ہے کہ دنیا میں امن وامان اور عدل وانصاف کے قیام اور فتنہ وفساد اور برائیوں کی انسداد کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔ قانون اور اخلاق اگرچہ دونوں کی منزل ایک ہے مگر دونوں کے راستے مختلف ہیں اور تنہا ان میں سے ہر ایک میں کچھ نہ کچھ کمی ہے جس کی تلافی دوسرے سے ہوتی ہے۔ قانون برائیوں کو تو روکتا ہے مگر دل میں اس برائی کی طرف سے کراہت کا کوئی روحانی کیف پیدا نہیں کرتا جو انسانیت کی جان ہے اور اخلاق پر عمل پیرا ہونے کے لیے ہر شخص کو بزور مجبور نہیں کیا جا سکتا ہے اس لیے صرف اخلاق کے زور پر عدل وانصاف کا قیام اور برائیوں کا استیصال نہیں ہو سکتا۔ توراۃ محض قانون ہے اور انجیل محض اخلاق قرآن ایک جامع کتاب ہے جس میں عدل واحسان اور قانون واخلاق دونوں موجود ہیں۔

اس جامعیت کا اصول قرآن میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے ایک تو یہ کہ اُس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو بھی قانون کی شکل دے دی اور نہ عیسائیت کی طرح قانون کو مذہب کی گرفت ہی سے خارج کر دیا بلکہ قرآن نے قانون واخلاق دونوں کے درمیان حدفاصل قائم کر کے ہر ایک کی حد مقرر کر دی اور قانون کو قانون اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھکر انسانیت کو کمال تک پہنچا دیا بہرحال مجدالدین فیروزآبادی نے اعجاز قرآن کے سلسلے میں جس جامعیت کی طرف اشارا کیا ہے اس کا خلاصہ یہی ہے اور قاضی عیاض نے شفا میں لکھا ہے کہ

قرآن اپنی حکیمانہ ہدایت کے لحاظ سے بے مثال اور معجزہ ہے۔

یہ بات بھی جامعیت ہی کے ہم معنے ہے اور یہ قرآن کے اشارات کے لفظوں میں زیادہ ہم آہنگ ہے۔ قرآن نے جس قدر اپنے ہدایت ہونے پر زور دیا ہے وہ محتاج بیان نہیں ہے کہیں فرمایا ہے ھدًی للمتقین یعنی یہ کتاب الٰہی سراپا ہدایت ہے۔ کہیں ارشاد ہے۔

ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم

اس قرآن کی ہدایت و رہنمائی سب سے زیادہ پائدار ہے۔

قرآن نے اپنے جس قدر اوصاف بیان کئے ہیں ان سب میں جامع ترین وصف یہی ہے۔ زندگی اور سعادت کے لیے اس کی ہدایت سب سے زیادہ پائدار سب سے زیادہ سیدھی ہے کسی طرح کی کجی کسی طرح کا پیچ وخم کسی طرح کا الجھاؤ کسی طرح کی افراط وتفریط اس کی ہدایت میں نہیں ہے۔ یعنی صلاح وفلاح دارین دینوی واخروی غوز وکامرانی کی راہیں اسی کتاب حقیقت ترجمان سے وابستہ ہیں جب کہ پہلی کتابوں کی بتائی ہوئی راہیں بھی اپنی اپنی جگہ سیدھی ہیں لیکن یہ قرآن والی ہدایت سب سے بڑھ کر اور سب سے جامع ہے۔ کہیں ہدایت کے ساتھ قرآن کو شفاء اور کہیں رحمت فرمایا ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ یہ کتاب الٰہی ہدایت میں اتنی جامع ہے کہ یہ دل کی تمام بیماریوں کے لیے نسخہ شفاء اور ظلم وفسادات اور بغض تنفر سے دنیا کو نجات دلانا اور رحم ومحبت اور امن وسلامتی کی روح سے معمور کرنا اس کی رہنمائی کا خاصہ ہے

یہاں اعجاز قرآن پر بحث مقصود نہیں ہے یہ مباحث مفصل آئندہ کسی جلد میں آئیں گے۔ یہاں محض اعجاز قرآن کا تذکرہ مقصود تھا۔

اعجاز قرآن اور اس کی وہ وجوہ جو شارحین قرآن نے پیش کی ہیں خود شارحین کی زبانی انشاءاللہ سورۃ الاسراء میں آرہی ہیں۔

ماورائے عقل اور خلاف عقل میں فرق ہے

جھٹلایا

۳۹ کچھ نہیں یہ کلام افترائی بلکہ امر واقعہ یہ ہے کہ یہ قرآن کو ان باتوں کی وجہ سے جو ان کی علمی دسترس میں نہیں آسکتی ہیں اور ابھی ان کی حقیقت سامنے نہیں آئی ہے یعنی قرآن کو مفتریٰ کہنا سمجھ کر نہیں محض جہل وسفاہت اور قلت تدبر سے ہے۔ تعصب وعناد انہیں اجازت نہیں دیتا کہ ٹھنڈے دل سے قرآن پاک کے دلائل وعجائب کو پوری طرح سمجھ سکیں تو جھٹلانا شروع کر دیا۔ بعض مفسرین نے تاویل کے معنی تفسیر کے لیے ہیں یعنی مطالب قرآن ان کے دماغ میں نہیں اترے اور بعض نے قرآنی پیشگوئیاں مراد لی ہیں یعنی تکذیب کی۔ ایک وجہ بعض سادہ لوگوں کے حق میں یہ بھی ہے کہ مستقبل کے متعلق قرآن نے جو خبریں دی ہیں ان کے وقوع کا ابھی وقت نہیں آیا لہٰذا وہ منتظر ہیں کہ ان کا ظہور کب ہوتا ہے مگر سوچنا چاہیے کہ یہ وجہ تکذیب کی کیسے ہوسکتی ہے زیادہ سے زیادہ توقف کی وجہ ہو تو ہو[۱]

[۱] افادات شیخ الاسلام

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن نے بھرپور محنت کی ہے اور بحث ونظر کے ایک سے زیادہ گوشوں میں نکل گئے ہیں۔ اس گلستان علم سے کچھ علمی شگوفے ہم ناظرین معالم کے لیے بھی پیش کرتے ہیں۔

پہلے اہل تفسیر کی زبانی سنئے حافظ ابن کثیر فرماتے اور بڑے سادہ انداز میں فرماتے ہیں:

بلکہ ان قرآن کے مخاطبوں نے قرآن کی تکذیب کی اور انہوں نے نہ اسے سمجھا اور نہ ان کو اس کی معرفت حاصل ہوئی ولما یاتھم تاویلہ یعنی ان کو قرآن سے کوئی ہدایت حاصل نہیں ہوئی ہے جہالت اور نادانی کی وجہ سے قرآن کی تکذیب کے وقت تک۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں:

انہوں نے قرآن کے معانی اور تفسیر سے بے خبر ہوکر قرآن کی تکذیب کی ان کی ذمہ داری تھی کہ مطالب کی تحقیق کریں اور اس کے متعلق پوچھیں تا حال ان کی تکذیب کا انجام ان کے سامنے نہیں آیا ہے یا مطلب یہ ہے کہ جنت و دوزخ اور قیامت کا قرآن میں ذکر سن کر وہ قرآن کی تکذیب کر رہے ہیں اور ابھی قرآن میں مذکور ان چیزوں کی واقعاتی حقیقت ان کے سامنے بے نقاب ہو کر نہیں آئی ہو۔

اور مشہور مفسر قرآن حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

اللہ سبحانہ فرماتے ہیں کہ اے اللہ کے رسول یہ مشرکین آپ کی تکذیب نہیں کر رہے ہیں بلکہ ان باتوں کی تکذیب کر رہے ہیں جو قرآن میں بیان شدہ ان کی علمی دسترس سے بالا ہیں جن کی واقعاتی حقیقت ابھی کھل کر سامنے نہیں آئی ہے۔

یہ تو نمونہ ہے ارباب تفسیر کا۔ باقی رہے ارباب تاویل ان میں علامہ زمخشری ابوحیان اندلسی قاضی بیضاوی، علامہ الوسی بغدادی سب کی تشریحات مختلف ہیں۔ ان ہی کا خلاصہ شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں سمیٹ دیا ہے۔ ان میں اچھی بات نظم الدرر میں علامہ بقاعی نے فرمائی ہے لکھتے ہیں:

چونکہ ان کا یہ کہنا کہ یہ قرآن انسانی بناوٹ ہے کسی دلیل سے نہیں بلکہ عناد

سے تھا اللہ سبحانہ نے اس آیت میں اس پر متنبہ کیا اور بتایا کہ دلیل صرف ان کے عناد کو نمایاں کرنے کے لیے بیان ہو رہی ہے اس لیے نہیں کہ فی الواقع قرآن کے کلام الٰہی ہونے میں ان کو کوئی شبہ ہے فرمایا کہ انہوں نے قرآن کو افترائی کلام کسی عقیدے اور یقین کی بنیاد پر نہیں کہا بلکہ انہوں نے اس قرآن کی تکذیب صرف اس لیے کی ہے کہ وہ قرآن کی گہرائی تک پہنچنے کی وجہ سے اپنے دین کے مخالف ہونے کے باعث جلد بازی سے کام لے رہے ہیں اور جو باتیں ان کے ادراک میں نہیں آئی ہیں ان کی واقعاتی حقیقت ابھی رونما نہیں ہوئی ہے تاکہ ان کو پتہ لگ جائے کہ قرآن حق ہے۔"

امام رازی نے تفسیر کبیر میں آیت کے مطالب و معانی کے لیے ایک سے زیادہ احتمالات بیان کئے ہیں۔ اور اب اردو شارحین قرآن کی تشریحات بھی پڑھ لیجئے۔

حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں:

"دلائل سے وہ مستفید ہوتا ہے جو سمجھنا بھی چاہے انہوں نے تو کبھی سمجھنا ہی نہیں چاہا بلکہ ایسی چیز کی تکذیب کرنے لگے جس کے صحیح و سقیم ہونے کو اپنے احاطہ علمی میں نہیں لائے اور اس کی حالت سمجھنے کا ارادہ نہیں کیا تو ایسوں سے سمجھنے کی کیا امید ہو سکتی ہے اور ان کی اس بے فکری اور بے پروائی کی وجہ یہ ہے کہ ہنوز ان کو اس قرآن کی تکذیب کا آخری نتیجہ نہیں ملا یعنی عذاب نہیں آیا۔"

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع نے بھی اسی کی ہم نوائی کی ہے اور تشریح میں یہ اضافہ کیا ہے:

"ولما یاتھم تاویلہ تاویل سے مراد اس جگہ مال اور انجام ہے مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں نے اپنی غفلت اور بے فکری سے قرآن میں غور نہیں کیا اور اس کی تکذیب کے انجام بد کو نہیں پہچانا اس لیے تکذیب میں لگے ہوئے ہیں"

مولانا محمد ادریس کاندھلوی فرماتے ہیں:

ان لوگوں نے قرآن کی عظمت شان کو پہچانا نہیں ہے اور اس کی دلیل و برہان کو سمجھا نہیں ہے اور اس کے علم تک ان کی رسائی نہیں ہوتی ہے۔ قرآن کو سنتے ہی بجائے اس کے کہ اس کے علوم و معانی کو سمجھیں اس کو جھٹلانے لگے غرض یہ کہ انہوں نے قرآن کے علوم و دلائل و براہین میں غور و فکر سے کام

نہیں لیا اور بے سوچے سمجھے جلدی میں جھٹلا دیا۔"

پیر محمد کرم شاہ ایم۔ اے کا تشریحی نوٹ اس قابل ہے کہ اسے پڑھا جائے۔

"قرآن حکیم کے بارے میں ان کا معاندانہ رویہ اور اس کو کلام الٰہی ماننے سے انکار کسی تحقیق و تفحص اور غور و فکر کا نتیجہ نہیں کہ انہوں نے قرآن کو پڑھا ہو۔ اس پر غور و فکر کیا اس کو عقل سلیم کی ترازو میں تولا ہو اور پھر وہ اس نتیجہ پر پہنچے ہوں کہ اس میں فلاں عیوب اور خامیاں موجود ہیں اس لیے یہ کلام الٰہی نہیں ہو سکتا ہے بلکہ اس انکار کی پہلی وجہ یہ ہے کہ انہوں نے قرآن کے معارف پر آگاہی حاصل نہیں کی۔ انہوں نے علم و دانش کے اس بحر بیکراں میں غواصی ہی نہیں کی۔ اور اس میں غور و فکر کرتے اور اگر وہ قرآن کے آئینے میں منعکس ہونے والے حسن حقیقی کے ایک جلوہ ہی دیکھ لیتے تو ہزار جان سے اس پر قربان ہو جاتے انکار کی دوسری وجہ یہ ہے کہ قرآن نے نیکوں کے لیے جس اجر و ثواب اور نافرمانوں کو جس عذاب الیم کی دھمکی دی ہے اور مستقبل میں ہونے والے جن واقعات کی خبر دی ہے وہ ابھی تک پردہ غیب میں مستور ہیں۔ ابھی ان کا وقوع نہیں ہوا وہ ان وعدوں اور وعیدوں کو صرف دھمکیاں تصور کرتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ اللہ نے ہر چیز کے ظہور کے لیے وقت مقرر کیا ہوا ہے اس سے پہلے ان کو سوچنے سمجھنے اور حق کو قبول کرنے کی مہلت دی گئی ہے۔"

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم میں اس آیت کی تشریح میں اور ہی وادی میں دُور نکل گئے اس تشریح کے مطالب کا قرآن سے کوئی ربط نہیں اس لیے ان کی تشریح کو نقل کرنا بے محل ہے۔

مولانا امین احسن اصلاحی کی تشریح مطالب قرآنی کے قریب قریب ہے فرماتے ہیں:

"اصل وجہ تکذیب یہ ہے کہ قرآن ان کو تکذیب رسول کی صورت میں جس عذاب کی دھمکی دے رہا ہے وہ ان کے علم کی گرفت میں نہیں آ رہی ہے اس لیے کہ اس کی حقیقت ان کے سامنے ابھی ظاہر نہیں ہوئی۔"

مولانا ابوالکلام آزاد ترجمان قرآن میں فرماتے ہیں:

"نہیں یہ بات نہیں ہے اصل حقیقت یہ ہے کہ جس بات پر یہ اپنے علم سے

احاطہ نہ کر سکے اور جس بات کا نتیجہ ابھی پیش نہیں کیا اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے ہیں۔"

مولانا موصوف نے یہاں مزید تشریح فرمائی ہے اب تک ارباب تفسیر اور اہل تاویل کی زبانی آپ نے جو کچھ سنا ہے اس کا تعلق حضور اقدس کے ان مخاطبوں سے ہے جو قرآن کی تکذیب کر رہے تھے اور مولانا کے تشریحی نوٹ سے آپ کو معلوم ہو گا کہ اس کا تعلق جیسے ماضی سے تھا ویسا ہی حال اور مستقبل سے بھی ہے فرماتے ہیں :

"قرآن نے بیک وقت دونوں باتوں کی مذمت کی ہے اس کی بھی کہ بغیر علم وبصیرت کے کوئی بات مان لی جائے۔"

اس کی بھی کہ محض عدم ادراک کی بنا پر کسی بات کو جھٹلا دیا جائے آیت قرآنی ان الظن لا یغنی من الحق شیئا میں بتایا گیا ہے کہ منکرین حق علم ولقین کی روشنی سے محروم ہیں ان کا سرمایہ علم وعمل محض ظن وگمان ہے اب اس آیت بل کذبوا بما لم یحیطوا بعلمہ میں بتایا ہے کہ جس بات کا وہ علمی طور پر احاطہ نہ کر سکے اس کے جھٹلانے پر آمادہ ہو گئے اگرچہ بظاہر یہ دو باتیں الگ الگ معلوم ہوتی ہیں لیکن فی الحقیقت ایک ہی ہیں اور دونوں کی بنیاد اس اصل عظیم پر ہے کہ نہ تو ظن وگمان کی بنیاد پر تصدیق کرنی چاہیے اور نہ ظن وگمان کی بنا پر تکذیب کرنی چاہیے۔ جو کچھ کرنا چاہیے علم وبصیرت کی بنیاد پر کرنا چاہیے۔

منکرین قرآن نے کونسی بات جھٹلائی تھی۔ یہی کہ ان ہی میں سے ایک شخص پر اللہ کی وحی نازل ہوتی ہے۔ یہ بات ان کو عجیب معلوم ہوئی اس لیے تکذیب پر تیار ہو گئے۔ قرآن نے بتایا کہ تمہارے ماننے اور تمہارے جھٹلانے دونوں کا مدار ظن وگمان پر ہے تم جو باتیں مان رہے ہو کہ ھولاء شفعاؤنا عند اللہ کہ یہ بزرگ ہستیاں جن کی یہ تماثیل اصنام اور اوثان میں بارگاہ الہٰی میں ہمارے شفعاء ہیں اس لیے ہم ان کی عبادت کرتے ہیں اس کے لیے بھی تمہارے پاس کوئی علم نہیں ہے یہ باتیں محض وگمان کی بنا پر مان رہے ہو اور جس بات کے جھٹلانے میں اس قدر جلدی کی کہ یہ قرآن اللہ کی کتاب نہیں اس کے لیے بھی تمہارے پاس کوئی یقین نہیں ہے۔ حالانکہ درست راستہ یہ ہے کہ جو کچھ کرو علم و بصیرت کے ساتھ کرو محض اٹکل پر نہ چلو۔

جہل وکوری کی دو حالتیں

اگر ایک شخص علم ویقین کے ساتھ ایک بات پیش کر رہا ہے اور قسم کھا کر کہہ رہا ہے اور جتنی باتیں کسی بات کی درستگی اور معقولیت کی ہو سکتی ہیں سب اس کے ساتھ ہیں اور تمہارے پاس اس کے خلاف ظن وگمان کے سوا کچھ نہیں تو تمہارے لیے کیونکر جائز ہو سکتا ہے کہ فوراً تکذیب پر آمادہ ہو جاؤ اس سے پہلے ایت ان الظن لا یغنی من الحق شیئا میں بھی بات کہی جا چکی ہے کہ تم ظن کی بنا پر یقین کو جھٹلانے لگے حالانکہ ظن وگمان کا بھروسہ انسان کو یقین سے بے نیاز نہیں کر سکتا ہے۔ اگر غور کرو گے تو پتہ لگ جائے گا کہ انسان کی ساری فکری گمراہیوں کا اصل سرچشمہ یہی بات ہے یا تو وہ عقل وبینش سے ہے اس قدر کورا ہو جاتا ہے کہ ہر بات بے سمجھے بوجھے مان لیتا ہے اور ہر راہ میں آنکھیں بند کر کے چل دیتا ہے یا پھر سمجھ بوجھ کا اس طرح غلط استعمال کرتا ہے کہ جہاں کوئی حقیقت اس کی شخصی سمجھ سے بالاتر ہوتی اسے فوراً جھٹلا دیا گویا حقیقت کے اثبات و وجود کا سارا دار و مدار صرف اسی بات پر ہے کہ ایک خاص شخص کی سمجھ میں آتا ہے یا نہیں۔ یہ دونوں حالتیں علم وبصیرت کے خلاف ہیں اور دونوں کا نتیجہ عقل وبینش سے محرومی اور عقلی ترقی کا فقدان ہے جس عقل وبصیرت کا یہ تقاضا ہوا کہ حقیقت اور وہم میں امتیاز کریں وہی چاہتی ہے کہ کوئی بات محض اس لئے نہ جھٹلا دیں کہ ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔ عقل کا پہلا تقاضا ہمیں وہم پرستی اور جہل سے روکتا ہے دوسرا شک والحاد سے قرآن دونوں حالتوں کو جہل وکوری کی حالتیں قرار دیتا ہے اور اہل علم وعرفان وہ ہیں جو نہ تو جہل وہم کی راہ چلتے ہیں نہ شک والحاد کی۔

خلافِ عقل اور ماورائے عقل

یہاں سے یہ بات بھی معلوم ہو گئی کہ دو صورتیں ہیں اور دونوں کا حکم مختلف ہے ایک یہ کہ کوئی بات عقل کے خلاف ہو اور دوسری یہ کہ کوئی بات عقل سے بالاتر ہو۔ بہت باتیں ایسی ہو سکتی ہیں جن کا تمہاری عقل ادراک نہیں کر سکتی لیکن تم یہ فیصلہ نہیں کر سکتے کہ وہ سرے سے خلاف عقل ہیں اول تو تمام افراد کی قوت عقل برابر نہیں ہے ایک آدمی موٹی سی بات بھی نہیں سمجھ سکتا دوسرا باریک سے باریک نکتے حل کر لیتا ہے۔ ثانیاً عقل انسانی برابر نشوونما میں ہے ایک ہے

دور کی عقل جن باتوں کا ادراک نہیں کر سکتی تھی دوسرے دور کے لیے وہ عقلی مسلمات بن گئے تاہم انسانی عقل کے ادراک کی سرحدیں مقرر ہیں اور یہ عقل ہی کا فیصلہ ہے کہ حقیقت اسی حد پر ختم نہیں ہوتی ہے مذہب کے میدان سے باہر اور غور کرو کہ قرآن نے ان چند لفظوں میں جو بات کہہ دی وہ انسانی علم و عقل کی ترقیوں کے لیے کس طرح اصل و اساس ثابت ہو رہی ہے۔ کون سی بات ہے جس نے علمی ترقی کی۔ غیر محدود اور لاانتہا امکانات کا دروازہ نوع انسانی کے لیے کھول دیا اور علم و ادراک کی سینکڑوں ناممکن باتوں کو نہ صرف ممکن بلکہ واقعہ بنا دیا۔

کیا یہی بات نہیں ہے کہ کسی بات کے احاطہ نہ کر سکنے سے اس کا انکار لازم نہیں آتا؟ اگر اصحاب علم و انکشاف نے اس کا انکار کر دیا ہوتا تو کیا ممکن تھا کہ عقلی ترقیوں کے قدم یہاں تک پہنچ سکتے اور آئندہ کے لیے اس قدر ممکنات سامنے آجاتے۔ بلاشبہ علم و انکشاف کے ہر عہد میں ایسی جلد باز طبیعتیں بھی ہوتی ہیں جنہوں نے محض عدم ادراک کی بنا پر انکار کر دیا لیکن علم نے کچھ پروا نہ کی اور اس کا نتیجہ ہے کہ اس کا سفر برابر جاری رہا اور کوئی نہیں کہہ سکتا کب تک جاری رہے گا۔

ایک اور بات بھی یہاں سمجھ لینی چاہیے کہ جہاں تک عقل اور ماورائے عقل کا تعلق ہے۔ قرآن کے بعد تین دور گذر چکے ہیں ایک دور حکمائے متکلمین اسلام کا جنہوں نے عقلی طریقہ پر اسلامی عقائد کا اثبات کیا۔ دوسرا یورپ کی نشاۃ ثانیہ کا جب اسی طرح مسیحی علم کلام مدون ہوا تیسرا علوم عصریہ کا جس نے بحث و نظر کے تمام گوشوں میں ایک نئی روح پیدا کر دی۔ تاہم یہ واقعہ ہے کہ قرآن نے یہاں سیدھے سادھے لفظوں میں جو بات کہہ دی ہے اس پر کوئی اضافہ نہ ہو سکا۔ بلاشبہ بحث و نظر کی کاوشیں دور دور تک گئیں لیکن ہمیشہ ناکامیاب ہوئیں اور ہمیشہ اصحاب عرفان و تحقیق کو اقرار کرنا پڑا کہ اس سے بہتر اور فیصلہ کن بات اور کوئی نہیں کہی جاسکتی۔

۵۵ ایسے ہی ان لوگوں نے بھی تکذیب کی تھی جو ان سے پہلے تھے دیکھو ظلم کاروں کا انجام کیا ہوا اے اللہ کے رسول کچھ آپ کے مخاطبوں میں سے وہ ہیں جو قرآن کو اللہ کا کلام مانتے ہیں اور کچھ وہ ہیں جو قرآن کو اللہ کا کلام نہیں مانتے تیرا پروردگار شورش پسندوں کو خوب جانتے ہیں یعنی آگے چل کر ان میں کچھ لوگ مسلمان ہونے والے ہیں انہیں چھوڑ کر جو باقی لوگ ہیں فسارت پر قائم رہیں گے اللہ سب کو خوب جانتا ہے موقع پر مناسب سزا دے گا۔[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی ہے فرمایا کہ آپ کے مخاطب جس انداز سے آپ کی تکذیب کر رہے ہیں یہ کوئی آپ کی ہی خصوصیت نہیں ہے آپ سے پہلے بھی رسولوں کے ساتھ ایسا ہی ہوتا رہا ہے تو جو انجام ان کا ہوا وہی انجام ان کا بھی ہوگا ان ہی میں سے کچھ لوگ ایسے بھی ہیں جو مستقبل میں نعمت ایمان سے مالا مال ہوں گے مطلب یہ ہے جب ان کے اندر سے ایسے لوگ نکل رہے ہیں جو قرآن پر ایمان لا رہے ہیں تو معلوم ہوا کہ ان میں کچھ میں ایمان قبول کرنے کی صلاحیت ہے اس کا تقاضا یہ ہے کہ ان پر اس حد تک کام کیا جائے محنت کی جائے کہ ان میں جوہر قابل نمایاں ہو کر سامنے آجائے۔

ایمان نہ لانے والوں کے متعلق فرمایا وربك اعلم بالمفسدين اللہ سبحانہ ان شرارتوں کو خوب جانتا ہے یعنی وہ دنیا کا منہ تو اپنی چرب زبانی سے بند کر سکتے ہیں کہ بات ہماری سمجھ میں نہیں آتی اسلئے ہم نہیں مانتے۔ لیکن اللہ سبحانہ جو قلب وضمیر کے ایک ایک وسوسہ سے بھی باخبر ہے وہ ان میں سے ایک ایک شخص کے متعلق خوب جانتا ہے کہ کس کس طرح اس نے اپنے دل ودماغ پر قفل لگا رکھے ہیں اپنے آپ کو غفلتوں کی آماجگاہ بنایا، اپنے دل کی آواز کو دبایا اپنے اندر کی حق کی شہادت کو ابھرنے سے روک لیا اپنے ذہن سے قبول حق کی صلاحیت کو پامال کیا سن کر نہ سننے والا بن گیا سمجھ کر نا سمجھ بنا اور حق کے مقابلے میں اپنے دبڑے کے تعصبات کو اپنے مفادات کو اپنی اغراض دنیوی کو اور اپنی خواہشوں کو ترجیح دی اسی لیے وہ بے گناہ نہیں بلکہ فی الواقع مفسد ہیں۔ معاند ہیں۔ ان کا عناد ایمان کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔ حافظ ابن کثیر نے یہ بات خوب لکھی ہے۔

> "تیرا رب خوب جانتا ہے کہ ہدایت کا مستحق کون ہے جس کو ہدایت کی نعمت ملے اور گمراہی کا حقدار کون ہے گمراہی میں بھٹکتا رہے وہ دین میں عدل کی ترازو رکھتا ہے وہاں ظلم نہیں ہے بلکہ ہر ایک کو اس کے استحقاق کے مطابق دیتا ہے۔"

علامہ نظام الدین حسن بن محمد نیشاپوری فرماتے ہیں:

> "مفسدین کو جاننے کا مطلب یہ ہے کہ ان میں سے ہر ایک کو جزا تکذیب کے درجات کے مطابق دے گا تکذیب میں جس کا جو مقام ہوگا اس کو جزا بھی ویسے ہی ملے گی۔"

معلوم ہوا جیسے اعمال صالحہ اخلاق، اور افکار صحیحہ کے درجات و مراتب ہیں ایسے ہی گناہوں کے بھی درجات ہیں ایک شخص بات نہ سمجھنے کی وجہ سے تکذیب کر رہا ہے دوسرا سمجھ رہا ہے مگر عناد کی وجہ سے تکذیب کر رہا ہے۔ ایک شخص بات سن رہا ہے مگر گرد و پیش اور ماحول کے غلط ہونے کی وجہ سے تقلیداً تکذیب کر رہا ہے۔ ایک سمجھ رہا ہے مگر مفادات کی وجہ سے تکذیب کر رہا ہے دوسرا اپنی نفسانی رغبتوں اور خواہشوں سے دب کر تکذیب کر رہا ہے۔

قرآن نے کفر کا لفظ انکار کے معنے میں استعمال کیا ہے

اور انکار دو طرح کا ہوتا ہے ایک یہ کہ انکار محض سے ایک یہ کہ جارحانہ ہو۔ انکار محض سے مقصود یہ ہے کہ ایک شخص تمہاری تعلیم قبول نہیں کرتا اس لیے کہ اس کی سمجھ میں نہیں آئی یا اس لیے کہ اس میں طلب صادق نہیں ہے یا اس لیے کہ جو راہ وہ چل رہا ہے اسی پر قانع ہے بہرحال کوئی وجہ ہو لیکن وہ تم سے متفق نہیں ہے جارحانہ انکار سے مقصود وہ حالت ہے جو صرف اتنے ہی پر قناعت نہیں کرتی بلکہ اس میں تمہارے خلاف ایک طرح کی کد اور ضد پیدا ہو جاتی ہے اور پھر یہ ضد بڑھتے بڑھتے بغض و عناد اور ظلم و شرارت کی سخت سے سخت صورتیں اختیار کر لیتی ہے اس طرح کا مخالف صرف یہی نہیں کرتا کہ تم سے اختلاف رکھتا ہے بلکہ اس کے اندر تمہارے لیے بغض و عناد کا ایک عجیب محدود جوش پیدا ہو جاتا ہے وہ اپنی زندگی اور زندگی کی ساری قوتوں کے ساتھ تمہاری بربادی و ہلاکت کے درپے ہو جائے گا تم کتنی ہی اچھی بات کہو وہ تمہیں جھٹلائے گا۔ تم کتنا ہی اچھا سلوک کرو وہ تمہیں اذیت پہنچائے گا۔ تم اگر کہو کہ روشنی تاریکی سے بہتر ہے تو وہ کہے گا تاریکی سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے۔

بہرحال کفر و تکذیب کے بھی درجات مراتب ہیں ان کی سزا ان کے مراتب کے مطابق ملے گی۔

وَاِنْ كَذَّبُوْكَ فَقُلْ لِّيْ عَمَلِيْ وَلَكُمْ عَمَلُكُمْ ۚ اَنْتُمْ بَرِيْٓـُٔوْنَ
مِمَّآ اَعْمَلُ وَاَنَا بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۴۱﴾ وَمِنْهُمْ مَّنْ
يَّسْتَمِعُوْنَ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تُسْمِعُ الصُّمَّ وَلَوْ كَانُوْا لَا يَعْقِلُوْنَ ﴿۴۲﴾
وَمِنْهُمْ مَّنْ يَّنْظُرُ اِلَيْكَ ۭ اَفَاَنْتَ تَهْدِي الْعُمْيَ وَلَوْ كَانُوْا
لَا يُبْصِرُوْنَ ﴿۴۳﴾ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَظْلِمُ النَّاسَ شَيْـًٔا وَّلٰكِنَّ
النَّاسَ اَنْفُسَهُمْ يَظْلِمُوْنَ ﴿۴۴﴾ وَيَوْمَ يَحْشُرُهُمْ كَاَنْ لَّمْ
يَلْبَثُوْٓا اِلَّا سَاعَةً مِّنَ النَّهَارِ يَتَعَارَفُوْنَ بَيْنَهُمْ ۭ قَدْ خَسِرَ
الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِلِقَاۗءِ اللّٰهِ وَمَا كَانُوْا مُهْتَدِيْنَ ﴿۴۵﴾

اور اگر یہ لوگ اس کے باوجود بھی آپ کی تکذیب کریں تو آپ
کہہ دیجئے میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے
میرے عمل کے تم ذمہ دار نہیں اور تمہارے اعمال کا میں ذمہ دار
نہیں ہوں ۵۶ اور اے اللہ کے رسول ان میں سے کچھ ایسے ہیں
جو تیری باتیں کان لگا کر سنتے ہیں (اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سن
رہے ہیں لیکن فی الواقع وہ سنتے نہیں ہیں) تو کیا آپ پھر ان کو

بات سنائیں گے خواہ وہ بات کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں۔ اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں (اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ آپ کو دیکھ رہے ہیں حالانکہ فی الواقع نہیں دیکھتے) تو کیا آپ نابیناؤں کو راہ بتائیں گے خواہ ان کو کچھ بھی نہ سوجھتا ہو ۵۷ بلاشبہ اللہ سبحانہ انسانوں پر ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے لیکن وہ خود ہی اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں ۵۸ اور جس روز اللہ سبحانہ ان سب کو اپنے حضور کرے گا ان کو ایسا محسوس ہو گا کہ گو دنیا میں صرف ایک گھڑی ٹھہرے ہیں لوگ باہم ایک دوسرے سے متعارف ہوں گے۔ بلاشبہ وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنہوں نے قیامت کے آنے کی تکذیب کی اور وہ کامیابی کے راستہ پر نہ تھے ۵۹

مفردات کے معانی

ساعۃ۔ گھڑی، وقت رات یا دن کا کوئی سا وقت ہو۔ ساعت کہلاتا ہے اہل عرب اس کا استعمال وقت ہی کے معنے میں کرتے ہیں چاہے ذرا دیری کے لیے ہو۔ قرآن میں الساعۃ کا لفظ جہاں کہیں بھی استعمال ہوا ہے اس سے کہیں تو قیامت مراد ہے کہیں ایک ایسے فیصلہ کن دن کے لیے جو دعوت حق اور اس کے مخالفوں کے درمیان فیصلہ کرے امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔ زمانہ کے حصوں میں سے کوئی سا حصہ ہو ساعت کہلاتا ہے اور قیامت بھی اس سے

مراد لی جاتی ہے ارشاد ہے اقتربت الساعۃ وانشق القمر اور یسئلونك عن الساعۃ اور عندہ علم الساعۃ اب یا تو حق تعالیٰ شانہ کے جلد حساب لینے کی وجہ سے اس کو قیامت سے تشبیہ دی گئی ہے یا اس وجہ سے کہ جس پر یہاں متنبہ کیا ہے یوم یحشرھم کان لم یلبثوا الا ساعۃ من النہار لیس ساعت اولیٰ قیامت ہے اور ساعت ثانیہ زمانہ ہے اور کچھ کی رائے میں وہ ساعات جو قیامت کے معنی دیتی ہیں تین ہیں (۱) الساعۃ الکبریٰ یعنی لوگوں کا حساب دینے کے لیے اٹھنا اسی کی طرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ارشاد میں اشارہ فرمایا ہے لاتقوم الساعۃ حتی یظھر الفحش والتفحش وحتی یعبد الدرھم والدینار قیامت اس وقت تک قائم نہ ہو گی کہ یہاں تک فحش اور بے حیائی کھلم کھلا ہونے لگے اور یہاں تک کہ روپے اور اشرفی کو معبود بنالیا جائے۔ الساعۃ الوسطیٰ یہ ایک دور کے لوگوں کا ختم ہو جانا ہے۔ حضور اقدس نے عبداللہ بن انیس کو دیکھ کر فرمایا ان یطل عمر ھذا الغلام لم یمت حتی تقوم الساعۃ اگر اس لڑکے کی عمر دراز ہوئی تو اس وقت تک نہیں مرے گا جب تک قیامت قائم نہ ہو۔ یہ صحابہ میں سب سے آخر مرنے والے ہیں۔ الساعۃ الصغریٰ ہر انسان کی ساعت اس کی موت ہے قرآن کی اس آیت میں اسی طرف اشارہ ہے قد خسر الذین کذبوا بلقاء اللہ حتی اذا جاءتھم الساعۃ بغتۃ اور اسی قسم کی دوسری آیات میں ساعت سے مراد خود آدمی کا مر جانا ہے۔

خسر نقصان میں ہوا خسر یخسر مصدر خسر خسار اور خسران آتا ہے تینوں کے معنی خسارہ کے ہیں یعنی پونجی گھٹ جانا اور سرمائے میں گھاٹا اور ٹوٹا پڑ جانا۔ یہ بھی بات سمجھنے کی ہے کہ کبھی تو نقصان اور گھاٹا کی نسبت انسان کی طرف ہوتی ہے جیسے فلانے کو گھاٹا ہو گیا ہے اور کبھی فعل کی طرف جیسے بولتے ہیں کہ اس کی تجارت گھٹ گئی اور کبھی خارجی چیزوں کی طرف جیسے مال جاہ وغیرہ اور خسارہ کا استعمال بیشتر ان ہی خارجی اشیاء کے متعلق ہوتا ہے اور کبھی نفیس اور گراں قدر نعمتوں شلاً صحت عقل ایمان وجزا کی طرف خسارہ کی نسبت ہوتی ہے قرآن میں خسران مبین اسی کو کہا ہے۔

جہالت و تعصب کے نتائج

قرآن میں جا بجا یہ حقیقت بیان کی گئی ہے کہ جہالت اور تعصب سے ایسی حالت پیدا

ہوجاتی ہے جس سے انسان کی عقل و بصیرت یک قلم معطل ہوجاتی ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا کہ سچائی اور حقیقت کا ادراک کر سکے۔ اللہ کا مقررہ قانون یہ ہے کہ اگر تم آنکھیں نہیں کھولو گے تو تمہارے سامنے ایک سیاہ پردہ حائل ہوجائے گا۔ اگر تم سننا نہیں چاہو گے تو کان بہروں کے کان ہوجائیں گے اگر سوچنے سے انکار کر دو گے تو عقل پر پردے پڑجائیں گے اس کی روشنی کام نہ دے سکے گی قرآن نے انکار و اعراض کی یہ حالت بتکرار بتلائی اور ان آیات میں بھی اسی کی طرف اشارہ ہے۔ منکروں کی یہ حالت خود ان کی پسند کی ہوئی حالت ہے یہ قانون اللہ سبحانہ کا ہے کہ نہ دیکھنے والے کی آنکھوں پر پردہ پڑ جاتا ہے وہ بینا ہونے کے باوجود نابینا بن جاتا ہے لیکن پردہ اسی وقت پڑتا ہے جب دیکھنے والا دیکھنے سے انکار کر دیتا ہے۔

وہ شخص جو بینا ہو کر نابینا بن جاتا ہے اور شنوا ہو کر بہرا بن جاتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے۔ اللہ سبحانہ اس کو اندھے اور بہرے ہونے کی حالت میں اس کو دیکھنے اور سننے کی تکلیف نہیں دیتا ہے اگر وہ ایسا کرتا تو یہ اس کا ظلم ہوتا اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام بری ہے۔

ـــ اور اگر یہ لوگ اس کے باوجود آپ کی تکذیب کریں تو آپ کہہ دیجئے میرے لیے میرا عمل ہے اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے میرے عمل کے تم ذمہ دار نہیں ہو اور تمہارے عمل کا میں ذمہ دار نہیں ہوں یعنی اگر ایسے دلائل و براہین سننے کے باوجود بھی یہ لوگ آپ کی تکذیب کریں تو کہہ دیجئے کہ میں اپنا فرض ادا کر چکا ہوں تم سمجھانے پر بھی نہیں مانتے تو اب میرا اور تمہارا راستہ الگ ہے تم اپنے عمل کے ذمہ دار ہو اور میں اپنے عمل کا ہر ایک کو اس کے عمل کا ثمرہ ملے گا حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ معاذ اللہ اگر اللہ کا حکم میں غلط پہنچاؤں تو میں گنہ گار ہوں اور میں اگر سچ لاؤں تم نہ مانو تو گناہ تم پر ہے بہر حال ماننے میں کسی طرح تمہارا نقصان نہیں ہے [1] پہلی بات سے ماضی میں ان کی تکذیب کا حال جب کھل کر سامنے آگیا تو ماضی پر حرف شرط لگا کر مستقبل میں تکذیب کے بارے میں بتایا جا رہا ہے یعنی اگر اسی تکذیب کے عمل کو تم نے مستقبل میں جاری رکھا تو سن لو کہ، لی عملی ولکم عملکم میرے لیے میرا عمل اور تمہارے لیے تمہارا عمل ہے یہ اعلان متاطعہ ہے۔ مجھے میرے ہی عمل کا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نتیجہ ملے گا اور تمہیں تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ملے گا۔ یہ تعبیر عربی زبان میں مشارکت کے موقع پر ضرب الامثال میں سے ہے یہ نہیں فرمایا کہ لی ما اعمل ولکم ما تعملون بلکہ دوام اور ہمیشگی کو ظاہر کرنے کے لیے فعلی تعبیر چھوڑ کر اسمی تعبیر اختیار کی ہے مطلب یہ ہے کہ تمہاری تکذیب کا کردار اس قدر گھناونا اور مکروہ ہو چکا ہے کہ چونکہ مستقبل میں تم سے اس موضوع پر خیر کی کوئی توقع نہیں ہے۔ اس لیے میری جانب سے اعلان مقاطعہ ہے اسی اعلان مشارکت کو زیادہ طاقتور بنانے کے لیے کنائی زبان میں دہرایا۔ انتم بریئون مما اعمل وانا بریئ مما تعملون یہ جملہ پہلے ہی بات کا بیان ہے۔ برات کا اعلان نبوت کی جانب سے جھٹلانے والوں کے عذاب کا پیش خیمہ ہوتا ہے۔ رسول جب تک اپنی قوم کے اندر ہوتا ہے وہ اس کے لیے امان اور سپر ہوتا ہے اور جب وہ ان سے اعلان براءت کر دیتا ہے تو یہ امان اٹھ جاتی ہے اس منزل پر پہنچ کر رسول کو مومنین کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم ہوتا ہے۔ حضرت نوح کو مع رفقا کے کشتی پر چڑھا کر کفار سے الگ کیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم اسی اعلان براءت کے بعد اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں۔

ایمان سے محرومی کی وجہ

۴۲ اور اے اللہ کے رسول ان میں سے کچھ ایسے ہیں جو آپ کی باتیں کان لگا کر سنتے ہیں اور آپ سمجھتے ہیں کہ یہ سن رہے ہیں لیکن فی الواقع یہ سنتے نہیں ہیں۔ تو کیا آپ ان کو بات سنائیں گے خواہ وہ بات کچھ بھی نہ سمجھتے ہوں اور ان میں کچھ ایسے ہیں جو آپ کی طرف دیکھتے ہیں اور آپ سمجھ رہے ہوں کہ یہ دیکھ رہے ہیں حالانکہ فی الواقع نہیں دیکھتے تو کیا آپ نابیناؤں کو راہ بتائیں گے خواہ ان کو کچھ بھی نہ سوجھتا ہو۔ یعنی لوگ بظاہر قرآن اور آپ کا کلام مبارک سنتے ہیں اور آپ کے معجزات و کمالات دیکھتے ہیں مگر دیکھنا سننا وہ نافع ہے جو دل کے کانوں اور دل کی آنکھوں سے ہو یہ آپ کے اختیار میں نہیں کہ آپ دل کے بہروں کو اپنی بات سنا دیں بحالیکہ وہ سخت بہرہ پن کی وجہ سے قطعاً کسی کلام کو نہ سمجھ سکتے ہوں یا دل کے اندھوں کو راہ حق دکھا دیں جب کہ انہیں کچھ بھی نہ سوجھتا ہو۔ موضح القرآن میں ہے یعنی کان رکھتے ہیں یا نگاہ کرتے ہیں اس توقع پر کہ آپ ہمارے دل پر تصرف کر دیں جب کہ بعضوں پر ہو گیا سو یہ بات اللہ سبحانہ کے ہاتھ ہے بعض مفسروں نے لا یعقلون سے مطلق عقل کی اور لا یبصرون سے بصیرت کی نفی مراد

لی ہے مطلب یہ ہے کہ ایسے اندھے بہرے جو علاوہ نہ سننے اور نہ دیکھنے کے ہر قسم کی سمجھ بوجھ سے محروم ہیں ان کو اب کس طرح سنا اور دکھا کر منور کر سکتے ہیں لے

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں جیسے بہرے کو سنانا آپ کے بس میں نہیں ایسے ہی ان کو راہ حق پر لگا دینا بھی آپ کے قابو کی بات نہیں ہے۔ اور علامہ قرطبی لکھتے ہیں۔ اس میں مخاطبوں کی بے راہ روی پر حضور اقدس کو جو بے چینی ہو رہی ہے۔ اس پر اللہ سبحانہ آپ کو تسلی دے رہا ہے کہ معنویات میں بھی مادیات کی طرح قانون ہے ۔ اگر آپ مادیات میں کسی بہرے کو سنانے پر قادر نہیں ہیں اور اندھے کو دکھا نہیں سکتے تو معنویات میں ایمان کی توفیق فراہم کر دینا بھی آپ کے بس کی بات نہیں ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں ایک سننا تو وہ ہوتا ہے جو جانور سنتے ہیں دوسرا سننا وہ ہوتا ہے جس میں معنے کی طرف توجہ ہوا اور آمادگی بھی ہو کہ اگر بات معقول ہوئی تو مان لی جائے گی جو لوگ کسی تعصب میں مبتلا ہوں اور جنہوں نے پہلے سے فیصلہ کر لیا ہو کہ اپنے موروثی عقیدوں اور طریقوں کے خلاف اور اپنے نفس کی کی رغبتوں اور دلچسپیوں کے خلاف کوئی بات خواہ وہ کیسی ہی معقول ہو مان کر نہ دیں گے وہ سب کچھ سن کر نہیں سنتے ایسے وہ لوگ ہیں جن کی آنکھیں کھلی ہوں اور تک رہے ہوں کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے آنکھیں تو جانوروں کی بھی ہوتی ہیں اور وہ بھی آنکھوں سے دیکھنے ہی کا کام لیتے ہیں۔ اصل چیز تو دل کی آنکھوں کا کھلا ہونا ہے یہ چیز اگر کسی شخص کو حاصل نہ ہو تو وہ سب دیکھ کر بھی نہیں دیکھتا۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ قرآن کی دعوت سر تا سر تعقل و تفکر کی دعوت ہے جو شخص اپنے حواس و عقل سے کام نہیں لیتا وہ اس کے نزدیک انسان نہیں بدترین چارپایہ ہے۔ نیز قرآن فکر و عمل کی جس حالت کو کفر کی حالت قرار دیتا ہے اس کا سرچشمہ بھی یہی عقل و حواس کو معطل کر دینا ہے۔ جو لوگ خدا کی دی ہوئی عقل اور حواس سے کام نہیں لیتے نفس کی قوتیں اور خواہشوں سے اس درجہ مغلوب ہو جاتے ہیں کہ ذہن و ادراک معطل ہو کر رہ جائیں وہ کبھی ہدایت نہیں پا سکتے یہاں انسان کی دماغی منقادت کی اسی حالت کی طرف اشارہ کیا ہے جب بڑے بوڑھوں کی تقلیدی اثرات سے یا ہوائے نفس کے غلبہ سے یا ذاتی طمع و تعصب سے وہ اس درجہ مغلوب ہو جاتا ہے کہ عقل و حواس کی ساری روشنیاں اس کے لیے بیکار ہو جائیں تو نبوت بھی ایسے لوگوں کے لیے سامان ہدایت بہم نہیں پہنچا سکتی۔ بظاہر ان دونوں میں مخاطب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ہیں مگر روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جن کی اصلاح کے آپ درپے تھے

اور اس رد ئے سخن کی غرض بھی محض ملامت کرنا نہیں ہے بلکہ ان کی سوئی ہوئی انسانیت کو بیدار کرنا ہے۔ یہ انداز بیان کچھ اس طرح کا ہے جیسے کوئی نیک آدمی بگڑے ہوئے لوگوں کو نصیحت کر رہا ہو۔ اس حالت میں عین اس وقت جب کہ وہ ان لوگوں کو سمجھانے میں مشغول ہو اس کا کوئی دوست اگر اس سے کہے کہ یہاں تم کن بہروں کو سنا رہے ہو اور کن اندھوں کو راستہ دکھا رہے ہو ان کے تو دلوں کے کان بند ہیں ان کے اندر کی آنکھیں اندھی ہیں۔ یہ بات کہنے سے دوست کا منشا یہ نہیں ہوتا کہ یہ نیک آدمی اصلاح کا کام چھوڑ دے بلکہ دراصل اس کی غرض یہ ہوتی ہے کہ شاید اس طنز اور ملامت ہی سے ان بے ہوشوں کو کچھ ہوش آجائے۔

اس موقعہ پر قاضی بیضاوی نے یہ بات بڑی پتے کی لکھی ہے کہ یہ آیات پہلی آیت میں آئے ہوئے اعلان برارت و مقاطعہ کے لیے بطور علت پیش کی گئی ہیں یعنی اعلان برارت کی وجہ یہ ہے کہ مخاطب عناد و کد میں اس قدر اندھا اور بہرا ہو چکا ہے کہ وہ ایمان لانا درکنار ایمان لانے کے وسائل کو بھی کام میں لانا گوارا نہیں کر رہا ہے۔

ایمان و کفر ارادی و اختیاری ہیں

۸۵ بلاشبہ اللہ سبحانہ انسانوں پہ ذرہ برابر ظلم نہیں کرتا ہے بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے ہیں یعنی جن کے دل میں اثر نہیں ہوتا ہے یہ ان ہی کی تقصیر ہے خود اپنی بے اعتدالیوں اور غلط کاریوں سے انہوں نے قوائے ادراک کو تباہ کیا ہے ورنہ اصل فطرت سے اللہ سبحانہ ہر آدمی کو سمجھنے اور قبول کرنے کی استعداد بخشی ہے [۱] یعنی یہ حالت اس لیے پیش نہیں آئی کہ اللہ سبحانہ نے اس پر کسی کو مجبور کر دیا ہے کیونکہ اگر ایسا ہوتا تو یہ ظلم ہوتا اور اللہ سبحانہ کا یہ قانون نہیں ہے کہ کسی پہ رائی برابر بھی ظلم ہو یہ تو خود انسان ہی ہے جو اللہ سبحانہ کی دی ہوئی روشنی ضائع کر کے اندھا بہرا بن جاتا ہے ورنہ اللہ نے تو سننے کے کان بھی دیے دیکھنے کے لیے آنکھیں بھی دی ہیں اور سمجھنے کے لیے دل بھی۔ اللہ نے ان نعمتوں کے دینے میں اپنی طرف کوئی بخل نہیں کیا ہے جو حق و باطل کا فرق دیکھنے اور سمجھنے کیلئے ضروری ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر اللہ سبحانہ نے ان کو استعمال کے لیے انسان کو ارادہ و اختیار بھی دیا ہے مگر لوگوں نے خواہشات کی بندگی اور

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

دنیا کے عشق میں پڑ کر آپ ہی اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں اپنے کان بہرے کر لیے ہیں اور اپنے دل کو اس قدر مسخ کر لیا ہے کہ ارادہ واختیار کی باگیں خواہشوں اور رغبتوں کے ہاتھ میں دے کر اچھے اور برے صحیح اور غلط کی تمیز سے محروم ہو گئے۔ مطلب یہ ہے کہ ان کے ایمان سے محروم ہونے کی وجہ یہ نہیں ہے کہ اللہ نے ان پر ظلم کیا ہے۔ اللہ نے تو انسانوں کو بہترین صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے اگر وہ ان سے کام لے تو اللہ رسول کی بات اسے اپنے دل کی آواز معلوم ہو حاصل یہ ہے کہ ایمان کا معاملہ جبری نہیں بلکہ ارادی اور اختیاری ہے۔ اگر ایمان وکفر کا معاملہ اللہ کی جانب سے ارادی واختیاری نہ ہوتا بلکہ جبری ہوتا تو یہ ظلم ہوتا۔ ایمان اور کفران دو میں سے کسی کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ عقل وتدبر اور فہم وبصیرت کا فیضان سب کے لیے ہے ایمان زبردستی کی چیز نہیں۔ یہ تو ارادی واختیاری ہے۔ اگر یہ خدا کی جانب سے جبری ہوتا تو یہ عدل نہ ہوتا بلکہ ظلم ہوتا یعنی پھر ایمان وکفر قابل جزا اور سزا نہ ہوتے۔

تکذیب کرنے والوں کو دھمکی

۴۵ اور جس روز اللہ سبحانہ ان سب کو اپنے حضور میں جمع کرے گا ان کو ایسا محسوس ہوگا کہ گویا دنیا میں صرف ایک گھڑی ٹھہرے ہیں لوگ باہم ایک دوسرے سے متعارف ہوں گے بلاشبہ وہ لوگ گھاٹے میں رہے جنہوں نے قیامت کے آنے کی تکذیب کی اور کامیابی کے راستہ پر نہ چلے۔ محشر میں ہولناک احوال وحوادث کو دیکھ کر عمر بھر کا عیش وآرام اس قدر حقیر وقلیل نظر آئے گا گویا دنیا میں ایک گھڑی سے زیادہ ٹھہرے ہی نہ تھے اور افسوس کریں گے کہ ساری عمر کیسی فضول اور بیکار گذری جیسے آدمی گھنٹہ دو گھنٹہ یوں ہی گپ شپ میں گذار دیتا ہے نیز وہاں کی زہرگداز مصائب کو دیکھ کر خیال کریں گے کہ گویا دنیا میں کچھ مدت قیام ہی نہ ہوا جو یہ وقت آ گیا گھڑی دو گھڑی ٹھہرے اور یہاں آ پہنچے کاش کہ وہاں کی مدت قیام کچھ طویل ہوتی تو یہ دن اسقدر جلدی نہ دیکھنا پڑتا۔ بعض مفسرین نے کہا کہ برزخ وقبر میں ٹھہرنے کی مدت کو ایک گھڑی کے برابر سمجھیں گے واللہ اعلم وہاں پہچانیں گے تو مگر کچھ مدد نہ کر سکیں گے۔ نفسی نفسی پڑی ہو گی بھائی بھائی اور بیٹا باپ کے کام نہ آئے گا فلا انساب بینھم یومئذ ولا یتساءلون اور یوم یفر المرء من اخیہ وامہ وابیہ وصاحبتہ وبنیہ۔ اس دن ناکام اور گھاٹے میں اللہ سے ملنے کی تکذیب کرنے والے ہوں گے باقی جنہوں نے اللہ کی تصدیق کی

اور سیدھی راہ پر چلے وہ سرتاسر فائدے ہیں ہیں لے
آیت میں اس طرف اشارہ ہے کہ آخرت کی زندگی جب انسان پر طاری ہوگی تو وہ تمام مدت جو مرنے کے بعد سے لے کر نشاۃ ثانیہ تک گذرتی ہے اسے ایسی محسوس ہوگی جیسے ایک بہت ہی قلیل مدت کا درمیانی وقفہ گذرا ہو۔ اس حالت کی مثال یوں سمجھو جیسے کبھی دن میں سو کر ذرا اٹھتے ہو اور یوں سمجھتے ہو کہ ذرا سا سوئے ہیں۔ یہ حقیقت قرآن میں مختلف تعبیرات میں بیان کی ہے اور سب کا ماحصل یہ ہے کہ وہ عظیم مدت جو انسان پر مرنے کے بعد گذرے گی اس دن بہت ہی قلیل محسوس ہوگی سورہ روم میں ہے مالبثوا غیر ساعۃ اور سورۂ احقاف میں ہے لم یلبثوا الا ساعۃ من نھار اور سورہ نازعات دن کے اوقات کی بھی نشاندہی کی ہے لم یلبثوا الا عشیۃ او ضحاھا۔ سورہ روم کی آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اس قسم کا سب کہ ہوگا مگر اہل علم وایمان کے دلوں میں یوم آخرت کا یقین تھا اسلئے اس احساس سے مغلوب نہ ہوں گے وہ جان لیں گے کہ یہ تمام مدت جو گذر چکی ہے دنیوی زندگی اور آخری زندگی کی درمیانی مدت تھی اور اب قیامت کا دن سامنے ہے۔ شارحین قرآن کے دونوں خیال ہیں یہ بھی کہ اٹھنے کے بعد دنیا کی زندگی قلیل ہوگی اور یہ بھی کہ اٹھنے کے بعد قبر میں رہنے کی مدت قلیل محسوس نہیں ہوگی. ابن کثیر نے پہلی کو اور قرطبی نے دوسری کو بیضاوی نے دونوں کو اپنایا ہے۔ علامہ آلوسی نے یہاں مفید بحث کی ہے۔ اور علامہ ابوحیان نے جملہ کے اعرابی مقام پر طویل بحث کی ہے۔ اکثر شارحین قرآن کا میلان دنیا کی زندگی کی طرف ہے مطلب یہ ہے کہ جب ایک طرف آخرت کی ناپیدا کنار زندگی ان کے سامنے ہوگی اور دوسری طرف اپنی دنیا میں گذاری ہوئی زندگی کو دیکھیں گے تو ان کو مستقبل کے مقابلہ میں اپنا ماضی حقیر معلوم ہوگا۔ لیکن پہلا مطلب زیادہ واضح اور صاف ہے اور ساعۃ من نھار کے زیادہ مطابق ہے۔

حشر جسمانی ہوگا نہ کہ روحانی

قیامت کے متعلق ان آیات پر غور کرو۔
اذا متنا وکنا ترابا ذالك رجع بعيد۔

لے افادات شیخ الاسلام

"کیا ہم مرجائیں گے اور مٹی ہو جائیں گے یہ لوٹنا تو بعید از عقل ہے"۔
"ءاذا کنا عظاما ورخاتا ءانا لمبعوثون خلقا جدیدا"۔
"کیا جب ہم ہڈی اور چورا ہو جائیں گے تو پھر نئے بنا کر اٹھائے جائیں گے"۔
"من یحیی العظام وھی رمیم"
بھربھری ہڈیوں میں جان کون ڈالے گا۔

یہ آیات بتاتی ہیں کہ حضور کے مخاطبوں کو حیرت اور تعجب ہے کہ کیا ہمارا یہ جسم مرکر پھر جیئے گا کیا ان سڑی گلی ہڈیوں میں دوبارہ جان پڑے گی اور قبروں سے نکل کر پھر اٹھ کھڑے ہوں گے اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جسمانی زندگی کے علاوہ زندگی کا کوئی دوسرا مفہوم ان کے حاشیۂ خیال میں بھی نہ تھا اس لیے جو بات ان کو بتائی جا رہی تھی اس کا تعلق ان کی جسمانی زندگی سے ہے۔

بات یہ ہے کہ ہم ان ہی باتوں کو سمجھ سکتے ہیں جن کی مثالیں اور نظیریں اس مادی دنیا میں ہماری نگاہوں سے گذرتی رہتی ہیں اور وہ عالم جو نگاہوں سے مستور ہے اس کی باتوں کو اس طرح سمجھنا کہ ہر سوال اور تکرار سوال سے ہم بے نیاز ہو جائیں تقریباً ناممکن ہے ان کے متعلق جو کچھ کہا جا سکتا ہے وہ یہ ہے کہ اس دیدہ شہرستان وجود یعنی دنیا کے قیاس پر اس نادیدہ شہر یعنی آخرت کا ہر نقشہ اور خاکہ بنایا اور سمجھایا جائے قرآن کی تعلیم نے بھی کام کیا ہے۔

وَ اِمَّا
نُرِيَنَّكَ بَعْضَ الَّذِىْ نَعِدُهُمْ اَوْ نَتَوَفَّيَنَّكَ فَاِلَيْنَا مَرْجِعُهُمْ

ثُمَّ اللّٰهُ شَهِيْدٌ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ ﴿۴۶﴾ وَلِكُلِّ اُمَّةٍ رَّسُوْلٌ
فَاِذَا جَآءَ رَسُوْلُهُمْ قُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا
يُظْلَمُوْنَ ﴿۴۷﴾ وَيَقُوْلُوْنَ مَتٰى هٰذَا الْوَعْدُ اِنْ كُنْتُمْ
صٰدِقِيْنَ ﴿۴۸﴾ قُلْ لَّآ اَمْلِكُ لِنَفْسِيْ ضَرًّا وَّلَا نَفْعًا اِلَّا مَا
شَآءَ اللّٰهُ ۭ لِكُلِّ اُمَّةٍ اَجَلٌ ۭ اِذَا جَآءَ اَجَلُهُمْ فَلَا يَسْتَاْخِرُوْنَ
سَاعَةً وَّلَا يَسْتَقْدِمُوْنَ ﴿۴۹﴾ قُلْ اَرَءَيْتُمْ اِنْ اَتٰىكُمْ
عَذَابُهٗ بَيَاتًا اَوْ نَهَارًا مَّاذَا يَسْتَعْجِلُ مِنْهُ الْمُجْرِمُوْنَ ﴿۵۰﴾ اَثُمَّ
اِذَا مَا وَقَعَ اٰمَنْتُمْ بِهٖ ۭ اٰلْـٰٔنَ وَقَدْ كُنْتُمْ بِهٖ تَسْتَعْجِلُوْنَ ﴿۵۱﴾
ثُمَّ قِيْلَ لِلَّذِيْنَ ظَلَمُوْا ذُوْقُوْا عَذَابَ الْخُلْدِ ۚ هَلْ تُجْزَوْنَ
اِلَّا بِمَا كُنْتُمْ تَكْسِبُوْنَ ﴿۵۲﴾

اور اگر ہم آپ کو کچھ وہ باتیں جن کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں دکھلا دیں یا ان کے ظہور سے پہلے آپ کا وقت پورا کردیں۔ خواہ کچھ ہو بہر حال ان کو ہمارے حضور پیش ہونا اور یہ جو کچھ کر رہے ہیں اس پر اللہ گواہ ہے ۴۶ اور ہر امت کے

لیے ایک رسول ہے پھر جب کسی امت میں رسول آجاتا ہے
تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور
ان پر ظلم نہیں کیا جاتا ہے [۶۱] اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے
ہو یہ عذاب کی دھمکی والی بات کب واقع ہو گی [۶۲] آپ فرما
دیجئے کہ اللہ سبحانہ کی مشیت سے الگ ہو کر مجھے تو اپنے
نفع ونقصان پر بھی قابو نہیں ہے وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا
ہے ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت
آجاتا ہے تو پھر نہ تو وہ ایک گھڑی پیچھے ہو سکتے ہیں اور نہ
آگے [۶۳] اے اللہ کے رسول آپ ان سے کہہ دیجئے بتاؤ
تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر وہ عذاب رات کو یا دن کو آ
جائے تو جرائم پیشہ لوگ جلدی میں کیا کر لیں گے [۶۴] کیا جب
عذاب آجائے گا تم مان جاؤ گے۔ اس وقت ماننا بے سود
ہو گا اس وقت کہا جائے گا اب تم نے مانا ہے اور تم اسی
عذاب کی طلب کی جلد بازی کرتے تھے۔ ہر ظلم کاروں سے کہا
جائے گا اب دائمی عذاب کا مزہ چکھو صرف تمہیں تمہارے

اعمال کا بدلہ دیا جائے گا ۴۵

مفردات کے معانی

نتوفینك یہ توفی باب تفعل سے مضارع کا جمع متکلم ہے توفی کے معنے اصل میں کسی چیز کو پورا لینے کے ہیں۔ توفی باب تفعل سے ہے اور باب تفعل کی خاصیت باب تفعیل کی اثر پذیری اور مطاوعت ہے تکسر تہ فتکسر لیتے توڑ دیا وہ ٹوٹ گیا ارباب لغت نے تصریح کی ہے کہ وفا ثلاثی مجرد سے ثلاثی مزید توفی آیا ہے وہ اسی غرض کے لیے ہے اب دیکھنا چاہیے کہ مجرد میں اس کے حقیقی معنے کیا ہیں۔ کیونکہ علم صرف کا مسلمہ قانون یہ ہے کہ مجرد کو مزید کے کسی وزن پر بھی نقل کیا جائے اس میں مجرد کے اصلی معنی بہر نوع ملحوظ ہوں گے واضح رہے کہ مجرد ہو یا مزید سب کا مادہ اشتقاق وفار ہے جس کے معنی ہیں پورا ہونا اور پورا کرنا مجرد میں یہ اسی معنے میں باب ضرب سے آتا ہے۔ اور مصدر وفار اور وفی ہے۔ وعدہ کے متعلق وفا اور غدر بولے جاتے ہیں یہ دونوں الفاظ ایک دوسرے کی ضد واقع ہوتے ہیں۔ اب جتنے بھی وزن مزید کے اس سے آتے ہیں توفیۃ باب تفعیل۔ ایفاء باب افعال موافاۃ باب مفاعلہ توافی باب تفاعل اور توفی باب تفعل استیفا رباب استفعال سب میں یہ معنی ملحوظ رہیں گے۔ امام راغب توفیۃ کے متعلق لکھتے ہیں توفیۃ الشئی بذلہ وافیاً کسی چیز کا پورے طور پر صرف کرنا۔ قرآن عزیز میں جہاں بھی توفیہ آیا ہے پورا دینے اور پورا کرنے کے معنی میں ہے۔ اب غور کیجیے کہ باب تفعل کی خاصیت باب تفعیل کی مطاوعت ہے اور تمام اہل لغت کی تصریح کے مطابق یہاں مجرد کو باب تفعل میں اسی غرض کے لیے استعمال کیا گیا ہے جس سے صاف ظاہر ہے کہ جس طرح تعلیم کے معنے سکھانا اور تعلم کے معنے ہیں سیکھنا یعنی اس کا اثر قبول کرنا۔ اسی طرح توفیۃ کے معنے پورا دینا اور توفی کے معنی اس کی اثر پذیری کے اعتبار سے پورا لینے اور پورا ہونے کے ہیں۔ اس لیے موت اور نیند کے لیے جو توفی کا لفظ آتا ہے وہ اسی اعتبار سے ہے کہ ان دونوں حالتوں میں اس کی روح قبض کی جاتی ہے ورنہ توفی کے معنی حقیقۃً موت کے نہیں ہیں۔

امتوں کیلئے قانون تاجیل

ان آیات میں فکر انسانی کی جس گمراہی کو ماذا یستعجل منہ المجرمون سے تعبیر کیا گیا ہے وہ صرف ان ہی مکذبین کی گمراہی نہ تھی جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب تھے بلکہ ہر زمانے میں اور ہر نبوت کے مخاطبوں میں انسان کی ایک عالمگیر کج اندیشی رہی ہے وہ بسا اوقات اللہ سبحانہ کی اس مہلت بخشی سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اور زیادہ شر و فساد میں جری اور بے باک ہو جاتا ہے اور کہتا ہے کہ اگر فی الواقع حق و باطل کے عواقب و نتائج کا قانون ہے تو وہ کب ہے متی ھذا الوعد ان کنتم صادقین اور فوراً کیوں ظاہر نہیں ہوتے قرآن نے جا بجا نبوت کے مخاطبوں کا یہ خیال نقل کیا ہے اور بتایا ہے کہ اگر یہاں امتوں کے لیے تاجیل اور مہلت بخشی کا قانون نہ ہوتا اور اس کا تقاضا یہی ہے کہ حق کی طرح باطل کو زندگی و معیشت کی مہلتیں ملیں اور توبہ رجوع اور عفو و درگذر کا دروازہ ہر حال میں کھلا رہے۔

جس طرح اللہ سبحانہ نے کائنات کے تمام کاموں میں تدریج و امہال کا قانون نافذ کیا ہے اسی طرح امتوں اور جماعتوں کے معاملہ میں بھی قانون کام کر رہا ہے جو کچھ ہونا ہے بتدریج ہوتا ہے اور اصلاح و درستگی اور رجوع انابت کا دروازہ آخر وقت تک کھلا رہتا ہے۔ دعوت حق کی فتح مندیوں اور منکروں کی نامرادیوں کا جو قانون بنایا گیا ہے اس کا رسول کی موجودگی اور عدم موجودگی سے کوئی تعلق نہیں ہے جو کچھ ہونا ہے وہ ہو کر رہے گا خواہ رسول کی زندگی میں یا رسول کے وصال کے بعد، ہو یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ قانون کا مدار رسول کی زندگی پر ہے آپ نہ ہوں گے تو کچھ نہ ہو گا آپ دنیا میں ہوں یا نہ ہوں قانون کو پورا ہو کر رہنا ہے چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

ف اور اگر ہم آپ کو کچھ وہ باتیں جن کا ہم ان سے وعدہ کر رہے ہیں دکھلا دیں یا ان کے ظہور سے پہلے آپ کو پورا پورا لے لیں خواہ کچھ ہو ان کو بہرحال ہمارے حضور پیش ہونا ہے اور وہ جو کچھ کر رہے ہیں اللہ اس پر گواہ ہے۔ یعنی ہم نے کفار کو عذاب دینے اور اسلام کو غالب و منصور کرنے کے جو وعدے کئے ہیں خواہ ان میں سے بعض وعدے کسی حد تک آپ کی موجودگی میں پورا کر کے دکھلا دیں جیسے بدر وغیرہ میں دکھا دیا گیا یا آپ کی وفات ہو

جائے اس لیے آپ کے سامنے ان میں سے بعض کا ظہور نہ ہو۔ بہر صورت یہ یقینی ہے کہ وہ سب پورے ہو کر رہیں گے اگر کسی مصلحت سے دنیا میں ان کفار کو سزا نہ دی گئی تو آخرت میں ملے گی۔ ہم سے بچ کر کہاں بھاگ سکتے ہیں۔ سب کو ہماری طرف لوٹ کر آنا ہے اور ان کے تمام اعمال ہمارے سامنے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ غلبہ اسلام کچھ حضرت کے روبرو ہوا اور باقی آپ کی وفات کے بعد خلفا کے ہاتھوں سے گویا نتوفینک میں اس طرف اشارہ ہے[1]

آیت میں اصلاً تو مخالفوں کی نامرادی، ناکامی کی خبر دی گئی ہے اور ضمناً نبوت کی فتح مندی اور کامیابی کی بشارت سنائی گئی ہے۔ ایک آیت کا منطوق ہے اور دوسرا آیت کا مدلول ہے اور مدلول کی حیثیت بھی تضمن کی نہیں بلکہ لزوم کی ہے کیونکہ مخالفوں کی ناکامیوں اور نامرادیوں کا لازمی نتیجہ نبوت کی فتح مندی ہے۔

رسول کے مخاطبوں کی ہلاکت اس وقت تک نہیں ہوتی جب تک آیات ہدایت سے قوم کے تمام صالح اجزا اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے اور مومنین و کافرین ایک دوسرے سے پھٹ کر جدا نہیں ہو جاتے اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی نہیں ہو جاتی اسی علیحدگی کا پہلی آیت میں لی عملی و لکم عملکم انتم بریئون مما اعمل و انا بریئ مما تعملون میں اعلان ہوا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں قریش کو ۱۳ سال تک دعوت دی اور ان تیرہ سالوں میں اس راہ میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور آخر وہ وقت آیا جو اپنے رسولوں کے سامنے دوسری قوموں پر آچکا تھا یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افراد صالحہ جو بے خوف و خطر حق کو قبول کر سکتے تھے انہوں نے حق کو قبول کر لیا اور صرف وہ رؤسائے قریش رہ گئے جو قبول حق کی بالکل صلاحیت نہ رکھتے تھے یا وہ ضعفا تھے جو ان رؤسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی طاقت نہیں رکھتے تھے اور اس لیے ضرورت ہوئی کہ ان رؤسا کے وجود سے ارض حرم کو پاک کیا جائے۔ چنانچہ گذشتہ قوموں کے قانون کے پورے ہونے کے دن آگئے یعنی رسول اور مومنین کو گنہ گار اور مجرموں کی آبادی کے اندر سے نکل جانے کی اجازت ملی۔ جس طرح دوسری قوموں کے لیے مختلف معجزات ہلاکت رہے اسی طرح قریش کے لیے غزوہ بدر معجزہ عذاب تھا۔ قرآن نے بدر کو البطشۃ الکبری

[1] لہ

کہا ہے اور یہ قریش کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے فرعون کیلئے بحر کی حیثیت تھی جب غزوہ بدر کے لیے آپ مسلمانوں کو ساتھ لے کر نکلے تو اس وقت جیسا کہ آپ نویں اور دسویں جلد میں پڑھ چکے ہیں مسلمانوں کے سامنے قریش کی دو جمعیتیں تھیں نہیں ایک قریش کا شامی قافلہ جو مدینہ کی راہ سے گذر کر مکہ جا رہا تھا دوسرا رؤساے قریش کا جنگی لشکر جو مسلمانوں سے لڑنے آیا تھا۔ اللہ سبحانہ نے مسلمانوں سے وعدہ کیا تھا کہ ان دو جمعیتوں میں سے ایک ان کے ہاتھ لگے گی۔ عام مسلمان یہی سمجھتے تھے کہ تجارتی قافلہ ان کے ہاتھ لگے گا لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اچھی طرح معلوم تھا کہ آج معمولی فتح و شکست کا دن نہیں بلکہ اس بطشہ کبریٰ کا دن ہے جس کا بارگاہ الٰہی سے مکہ ہی میں وعدہ تھا۔ سورۃ انفال میں بدر کے تمام واقعات کا ذکر ہے اس میں اللہ سبحانہ نے ظاہر کر دیا ہے کہ یہی وہ فیصلہ کا دن تھا جس کا مدت سے انتظار تھا بدر کا واقعہ بتا کر قرآن میں ہے۔

كدأب آل فرعون والذين من قبلهم كفروا بآيات الله فأخذهم الله بذنوبهم۔

یہ تشبیہ یہی بتانے کے لیے کہ یہ بدر میں اللہ کی سنت کے مطابق ہوا ہے اور اس لیے ہوا ہے لیقضی اللہ امرًا کان مفعولا۔ یہ قریش کی وہ ہلاکت ہے جو آپ کی زندگی میں ہوئی۔ رہی سہی کسر فتح مکہ نے پوری کر دی۔

محیر العقول معجزہ

آیئے تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھ لیجئے۔ تفصیل کا موقعہ نہیں صرف دو شہادتوں پر اکتفا کرتا ہوں۔

ڈاکٹر محمد حمید اللہ لکھتے ہیں:

چند محلوں پر مشتمل شہری حکومت سے جو آغاز ہوا ہے وہ روزانہ دو سو چوہتر سے بھی زیادہ مربع میل کے اوسط سے وسعت اختیار کرتی ہے اور دس سال میں جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک ہوا تو دس لاکھ سے بھی زیادہ مربع میل کا رقبہ آپ کے زیر اقتدار آچکا تھا۔ یہ ہندوستان کے برابر وسیع علاقہ جس میں یقیناً لاکھوں آبادی تھی۔

ڈاکٹر فلپ ہٹی اپنی تاریخ عرب میں لکھتا ہے۔

اگر کوئی شخص ساتویں صدی عیسوی کے ثلث اول میں ایسی پیشین گوئی کی جسارت کرتا کہ دس سال کے اندر اندر عرب کی سراسر غیر متمدن اور غیر متعارف سرزمین سے ایک نادیدہ قوت کا ظہور ہونے والا ہے جو وقت کی دو عالمی طاقتوں سے ٹکرا جائے گی ایک طرف ساسانیوں کی پوری میراث سنبھال لے گی اور دوسری طرف بیز نطینیوں کے بہترین صوبوں پر قبضہ جمالے گی تو لاریب اسے پاگل قرار دیا جاتا۔ لیکن یہی صورت حال پیش آئی۔ رسول اللہ کی وفات کے بعد عرب کی بنجر اور بے آب زمین جادو کی چھڑی سے ایسے سورماؤں کی پرورش گاہ بن گئی جن کی مثال کمیت و کیفیت دونوں کے اعتبار سے کسی دوسری جگہ بہت مشکل ہے۔

یہ ایک مسیحی کے الفاظ ہیں جو اصلاً شامی ہے لیکن عرصہ دراز سے امریکہ میں متوطن ہے۔ عربی مصادر کے تحقیقی مطالعہ کے بعد اس نے جو رائے قائم کی۔ وہ بے کم و کاست پیش کر دی۔

پھر اس آیت میں آپ کی زندگی اور آپ کے وصال مبارک کے بعد علیہ اسلام اور دشمنان اسلام کی ہلاکت کی اس میں انذار و تبشیر کی گئی اس انذار و تبشیر کے دونوں پہلو ہیں۔ البقاعی نے خوب تشریح کی ہے کہ

> ہم آپ کو آپ کی وفات سے پہلے دنیا میں کچھ اپنے وعدوں کی وہ جھلک دکھائیں گے جس سے آپ کی آنکھیں ٹھنڈی ہو جائیں گی اور آپ کی وفات کے بعد آخرت میں آپ کو آپ کے مخالفین کا وہ انجام دکھائیں گے جس سے آپ کا دل خوش ہو جائے گا۔

اس طرح بقول بقاعی آیت قرآنی میں صنعت احتباک پیدا ہو گئی ہے۔

قضاء بالحق کا ضابطہ

اللہ اور ہر امت کے لیے ایک رسول ہے پھر جب کسی امت میں رسول آجاتا ہے تو ان کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جاتا ہے اور ان کو ظلم کا نشانہ نہیں بنایا جاتا ہے پہلے اس امت اور اس کے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر تھا اب عام اقوام و امم کا ضابطہ بتلاتے ہیں کہ ہر جماعت اور فرقہ کے پاس اللہ سبحانہ کے احکام پہنچانے والے بھیجے گئے ہیں تبکو رسول کہتے ہیں تاکہ حجت تمام ہو اتمام حجت سے پہلے کسی کو عذاب نہیں دیا جاتا۔ لوگ عمل پہلے سے کرتے ہیں مگر دنیا میں ان کو سزا رسول روانہ کرنے کے بعد دی جاتی ہے اللہ سبحانہ

کے یہاں یہ ظلم اور اندھیر نہیں ہے کہ بدوں پیشتر آگاہ کرنے اور ملزم ثابت ہونے کے مجرموں کو فیصلہ سنا دیا جائے۔ قیامت میں بھی باقاعدہ پیشی ہوگی فرد جرم لگائی جائے گی۔ گواہ پیش ہوں گے ہر قوم کے ساتھ ان کے پیغمبر ہوں گے۔ ان کے بیانات کے بعد نہایت انصاف سے فیصلہ ہوگا۔ واشرقت الارض بنور ربها و وضع الکتاب وجیئ بالنبیین والشھداء و قضی بینھم بالحق وھم لا یظلمون مجاہد وغیرہ نے آیت کو قیامت کے احوال پر محمول کیا ہے[1] حافظ ابن جریر، حافظ ابن کثیر اور علامہ قرطبی نے امام مجاہد کی رائے کو اپنا کر آیت کو احوال قیامت سے متعلق بتایا ہے علامہ آلوسی نے بھی اسی کو راجح قرار دیا ہے جب کہ ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں قاضی بیضاوی نے انوار التنزیل میں اور امام رازی نے مفاتیح الغیب میں دوسرا مطلب بتایا ہے جو شیخ الاسلام نے افادات میں اختیار کیا ہے۔ اور واقع بھی یہ ہے کہ حال میں حضور اقدس کی قوم کا حال بیان کرنے کے بعد بتانا ضروری ہے کہ جو کچھ اب ہو رہا ہے وہ تمہارے ساتھ مخصوص نہیں ہے اللہ کا قانون ایک ہے ماضی میں بھی رسول آتے رہے ہیں ان کی امتیں بھی تکذیب کرتی رہی ہیں اور تکذیب کے نتائج سے اسی طرح دوچار ہوئی ہیں جس طرح حضور اقدس کے مخاطب دوچار ہوں گے۔ نہ ان پر ماضی میں ظلم ہوا ہے اور نہ تم پر ظلم ہوگا یعنی اللہ سبحانہ کا قانون یہ ہے کہ جب کسی قوم کی ہدایت کے لیے اس کا رسول ظاہر ہوا اور لوگوں نے چاہا کہ ظلم و تشدد کے ذریعے اس کی دعوت روک دیں تو اللہ سبحانہ نے ان دونوں فریقوں کے درمیان فیصلہ کر دیا ہے یعنی حق فتح مند ہوتا ہے باطل کو ناکامی کا منہ دیکھنا پڑتا ہے اسی کا نام قانون قضا بالحق ہے۔ کیا قضا بالحق کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ہر باطل عمل فوراً نابود ہو جائے اور ہر عمل حق فوراً فتح مند ہو جائے نہیں ایسا نہیں ہوسکتا ہے جیسے موجبات میں قانون تدریج و امہال کام کر رہا ہے ایسے ہی معنویات میں بھی تدریج و امہال کا قانون کام کر رہا ہے جس طرح اجسام کے ہر تغیر کے لیے اللہ سبحانہ نے اسباب و علل کی ایک خاص مقدار اور مدت مقرر کر دی اسی طرح اقوام اور امتوں کی ہلاکت اور تباہی کے لیے بھی موجبات ہلاکت کی ایک خاص مقدار اور مدت مقرر ہے اور یہ انکی اجل ہے جب تک یہ اجل نہیں آ جاتی قانون الٰہی انہیں تنبہ و اعتبار کی مہلتیں دیتا رہتا ہے۔

[1]

اولا یرون انھم یفتنون فی کل عام مرۃ او مرتین ثم لا یتوبون ولا ھم یذکرون۔

کیا لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ان پر کوئی برس ایسا نہیں گذرتا کہ ہم انہیں ایک بار یا دو بار آزمائشوں میں نہ ڈالتے ہوں پھر بھی یہ توبہ نہیں کرتے اور حالات سے نصیحت یاب نہیں ہوتے ہیں۔

بلکہ اگر تنبیہ کی یہ تمام مہلتیں رائگاں گئیں اور ان سے فائدہ نہیں اٹھایا گیا تو پھر فیصلہ امر کا آخری وقت نمودار ہو جاتا ہے اور جب وہ آجاتا ہے تو پھر یہ اللہ سبحانہ کا آخری اور اٹل فیصلہ ہوتا ہے نہ اس میں ایک لمحہ کی تاخیر ہو سکتی ہے اور نہ یہ اپنے وقت مقررہ سے ایک لمحہ پہلے ہوتا ہے۔

عذاب الٰہی کا مطالبہ

۴۸ اور یہ لوگ کہتے ہیں کہ اگر تم سچے ہو تو یہ عذاب کی دھمکی والی بات کب واقع ہو گی یعنی عذاب آنے کی جو دھمکیاں دیتے ہو محض جھوٹ اور بے اصل ہے اگر تم واقعی سچے ہو تو لے کیوں نہیں آتے ہو آخر یہ وعدہ کب پورا ہو گا[1] اللہ سبحانہ کی اس مہلت بخشی سے فائدہ اٹھانے کی جگہ اور زیادہ شر و فساد میں نڈر اور جری ہو کر کہتے ہیں کہ اگر فی الحقیقت حق و باطل کے لیے ان کے نتائج و عواقب ہیں تو وہ نتائج کہاں ہیں اور کیوں فوراً ظاہر نہیں ہوتے قرآن نے جابجا مکذبین کا یہ خیال نقل کیا ہے۔

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ اس قدر مہلت کیوں دی جاتی ہے جو بار بار مطالبہ کی نوبت آتی ہے۔ اصل یہ ہے کہ جس طرح عالم اجسام میں اللہ سبحانہ نے ہر کمزوری فساد کے لیے ایک لازمی نتیجہ ٹھہرا دیا ہے لیکن پھر اصلاح حال کا دروازہ کھلا رہتا ہے اور مہلتوں پر مہلتیں ملتی رہتی ہیں اگر بروقت اصلاح ظہور میں آجائے تو اسے قبول کر لیا جاتا ہے ٹھیک اسی طرح یہاں بھی اس نے توبہ و انابت کا دروازہ کھلا رکھا ہے کوئی بدعملی کوئی گناہ کوئی جرم کوئی فساد ہو اور اپنی نوعیت میں کتنا ہی سخت اور اپنی مقدار میں کتنا ہی عظیم ہو لیکن یوں ہی افراد میں توبہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وانابت کا احساس جنبش میں آتا ہے رحمت حق قبولیت کا دروازہ کھول دیتی ہے اور اشک ندامت کا ایک قطرہ بدعملیوں گناہوں کے بے شمار داغ دھبے اس طرح دھو دیتا ہے گویا اس کے دامن عمل پر کوئی گناہ کا دھبہ ہی نہیں تھا۔ چنانچہ اس مطالبہ کا جواب اللہ سبحانہ نے زبان نبوت میں دیا ہے۔

عذاب کے مطالبہ کا جواب

^۱^ آپ فرما دیجئے کہ اللہ سبحانہ کی مشیت سے الگ ہو کر مجھے تو اپنے نفع اور نقصان پر بھی قابو نہیں ہے وہی ہوتا ہے جو اللہ چاہتا ہے ہر امت کے لیے ایک وقت مقرر ہے جب وہ وقت آجاتا ہے تو پھر نہ تو ایک گھڑی پیچھے رہ سکتے ہیں اور نہ آگے۔ یعنی عذاب وغیرہ پہنچانا اللہ سبحانہ کا کام میرے قبضہ و اختیار میں نہیں ہیں خود اپنے نفع و نقصان کا صرف اسقدر مالک ہوں جتنا اللہ چاہے پھر دوسروں پر بھلائی و برائی وارد کرنے کا مستقل اختیار مجھے کہاں سے ہو سکتا ہے۔ ہر قوم کی ایک مدت اور میعاد اللہ کے علم میں مقرر ہے جب میعاد پوری ہو کر اس کا وقت آپہنچے گا ایک سیکنڈ کا تخلف نہ ہو سکے گا۔ غرض عذاب کے لیے جلدی مچانے سے کچھ فائدہ نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ کے علم میں جو وقت طے شدہ ہے اس سے ایک منٹ آگے پیچھے نہیں سرک سکتے زمخشری کے نزدیک لا یستاخرون ساعۃ ولا یستقدمون اس سے کنایہ ہے کہ عذاب کا اپنے وقت پر آنا اٹل ہے۔ کنایہ میں حقیقت تقدیم و تاخیر کا نفیاً یا اثباتاً اعتبار نہیں لہ

یہاں متی ھذا الوعد کے دو جواب دیئے ہیں۔ ایک واقعاتی دوسرا اصولی واقعاتی جواب میں مخاطبوں کے اس غلط عقیدے کی اصلاح کی گئی ہے کہ نبی و رسول براہ راست عالم کائنات میں تصرف کر سکتا ہے وہ دانائے غیب اور مختار کل ہوتا ہے چنانچہ موجودہ انجیل کے مصنفوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جس طریقہ سے پیش کیا ہے اس نے عیسائیوں کے دلوں میں یہ یقین پیدا کر دیا ہے کہ تمام کائنات حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے قبضہ قدرت میں تھی وہ اس میں جس طرح چاہتے تھے تصرف کر سکتے تھے۔ یہی وہ بنیادی بہتر ہے جس پر انجیل کے مصنفوں نے پورے دین کی دیوار کج کھڑی کی ہے اور اسی کے نتیجے میں تثلیث اور

لہ افادات شیخ الاسلام

کفار چپے عقائد پیدا ہو گئے۔
قرآن عزیز نے نہایت شدت اور اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے وہ اللہ سبحانہ کی مشیت اور ارادہ سے ہوتا ہے پیغمبر کے ارادے تصرف اور مشیت کو اس میں ذرہ برابر دخل نہیں ہوتا ہے اسی غلط عقیدے کی اصلاح یہ کہہ کر فرمائی کہ قل لا املک الخ آپ اعلان کر دیجئے کہ اللہ کی مشیت ہی کائنات میں کارفرما ہے اس کی مشیت سے الگ ہو کر میں خود اپنے نفع و نقصان کی بھی قدرت نہیں رکھتا ہوں یہ بات کہ یہ کب ہو گا کہ یہ اللہ سبحانہ کی بات تھی جو میں نے تمہیں سنا دی رہا یہ امر کہ یہ بات کب واقع ہو گی تو نہ تو میں غیب جانتا ہوں اور نہ خود اپنے معاملے میں کسی نقصان یا نفع پر اختیار رکھتا ہوں یعنی نہ میں دانائے غیب داں اور نہ مختار کل یہ چیز اللہ سبحانہ کے قبضہ و اختیار میں ہے۔

انجیل میں حضرت عیسیٰ کے معجزات جس عبارت اور لب و لہجہ میں پیش کئے گئے ہیں ان کا ماحصل منشا یہ ہے کہ گویا حضرت عیسیٰ کو تمام کائنات کی بادشاہی سپرد کی گئی ہے اس لیے وہ خاص اپنے ارادہ و اختیار سے جو چاہتے تھے کرتے تھے لیکن قرآن عزیز فکر کی اس گمراہی کو تسلیم نہیں کرتا ہے اس نے حضرت عیسیٰ کے معجزات کو قرآن میں بیان کیا ہے مگر اس عقیدہ باطلہ کی تردید کی ہے۔ یہاں قرآن نے اپنی مخاطبوں کے فکر کی اسی گمراہی کی اصلاح کی ہے کہ اے پیغمبر اعلان کر دو لا املك لنفسی ضرا ولا نفعا۔ یعنی میں نے کب کہا تھا کہ یہ فیصلہ میں کروں گا اور نہ ماننے والوں کو میں عذاب دوں گا اس لیے مجھ سے کیوں پوچھتے ہو کہ یہ دھمکی کب پوری ہو گی۔ دھمکی تو اللہ نے دی ہے وہی فیصلہ کرے گا۔ اور اسی کے اختیار میں ہے کہ فیصلہ کب کرے اور کس صورت میں اس کو تمہارے سامنے لائے۔
قرآن عزیز کی اسی تعلیم کا اثر ہے کہ عیسائیت کی طرح اسلام میں توحید و نبوت کی حقیقتیں ہمیشہ ممتاز رہی ہیں۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں الوہیت کا ادنیٰ شائبہ بھی مسلمانوں نے کبھی تسلیم نہیں کیا۔ اہل تشیع اور مسلمانوں کو ان فرقوں کو چھوڑ کر جن کی تخلیق ہی جذباتی ہے مسلمانوں میں اس فکری گمراہی کو پہنچنے کا موقعہ نہیں ملا ہے۔

مخاطبوں کو نبوت کا اصولی جواب

اصولی جواب یہ دیا ہے کہ لکل امۃ اجل یعنی اللہ کا قانون یہ ہے کہ اپنا پیغام

پہنچانے کے بعد وہ گروہ اور قوم کو اس کی اجتماعی حیثیت کے مطابق سوچنے سمجھنے اور سنبھلنے کے لیے کافی مہلت دیتا ہے۔ اور اس بات کو اللہ ہی بہتر جانتا ہے۔ کہ کس کو کس قدر مہلت ملنی چاہیے جب وہ مہلت جو سراسر انصاف کے ساتھ اس کے لیے رکھی گئی تھی پوری ہو جاتی ہے اور وہ جماعت اپنی باغیانہ روش سے باز نہیں آتی تب اللہ تعالیٰ اس پر اپنا فیصلہ نافذ کر دیتا ہے یہ فیصلہ اللہ سبحانہ کا قانون مدت سے نہ ایک گھڑی پہلے آسکتا ہے اور نہ وقت آنے کے بعد ایک لمحہ ٹل سکتا ہے۔ یہی اللہ سبحانہ قانون تاجیل ہے یعنی جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشوونما پاتی ہے اور نتیجہ ظاہر ہونے کے لیے ایک خاص مقدار ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے احکام مقرر ہیں اور ہر نتیجہ ایک خاص مدت اور ایک خاص مقدار کی نشوونما کے بعد ظہور میں آتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس تدریج سے حق اور باطل دونوں کے لیے ایک اجل مقرر ہو گئی۔ یعنی دونوں کے نتائج یکبارگی ظاہر نہیں ہوتے ہیں اپنی مقررہ مدت پر ظاہر ہوتے ہیں۔ البتہ حق سے وابستہ جماعتوں کے لیے تاجیل اس لیے ہوتی ہے تاکہ اس کی فاتحانہ قوتیں نمودار ہوں اور باطل پسند جماعتوں کے تاجیل اس لیے ہوتی ہے تاکہ ان کی فناپذیری درجہ کمال کو پہنچ جائے اس تاجیل کے لیے کوئی ایک ہی مدت مقرر نہیں ہے ہر حالت کا ایک خاصہ ہے اور ہر ماحول اپنا ایک خاص مزاج رکھتا ہے ممکن ہے کہ ایک خاص حالت کے لیے مقررہ مدت تھوڑی ہو اور ہو سکتا ہے کہ زیادہ ہو۔

ایمان کیلئے وقت کب ملے گا

۵۰ اے اللہ کے رسول آپ ان سے کہہ دیجئے کہ بتاؤ کہ تمہارا کیا خیال ہے کہ اگر وہ عذاب رات کو یا دن کو جائے تو جرائم پیشہ جلدی میں کیا کر لیں گے یعنی رات کو سوئے ہوئے یا دن میں جب دنیا کے دھندوں میں مشغول ہو۔ اگر اچانک اللہ سبحانہ کا عذاب آجائے تو مجرم جلدی کر کے کیا بچاؤ کر سکیں گے جب بچاؤ نہیں کر سکتے پھر وقت پوچھنے سے کیا فائدہ مترجم رحمہ اللہ نے ماذا یستعجل منه المجرمون کا ترجمہ حضرت شاہ صاحب کے مذاق کے مطابق کیا ہے عموماً مفسرین نے یہ مطلب لیا ہے کہ عذاب الٰہی کے آنے میں

کون سی ایسی خوشی اور مزے کی بات ہے جس کی وجہ سے مجرمین جلدی طلب کر رہے ہیں یا یہ کہ تعجب کا مقام ہے کہ مجرمین کیسی خوفناک چیز کے لیے جلدی مچا رہے ہیں حالانکہ ایک مجرم کے لائق تو یہ تھا کہ وہ آنے والی سزا کے تصور سے کانپ اٹھے اور ڈر کے مارے ہلاک ہو جائے[1]

متی ھذا الوعد کا اصولی جواب دینے کے بعد ایک اور جواب دیا جا رہا ہے ان کا سوال اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے کہ وعدہ کی نمائش ہو جائے تو پھر ہم ایمان لے آئیں گے جیسے قرآن میں ان ہی کی زبانی دوسرے موقعہ پر ہے۔

لن نومن لک حتی تفجر لنا من الارض ینبوعًا

ہم ہرگز ایمان نہ لائیں گے تا آنکہ تم ہمارے لیے زمین سے چشمہ نکال دو۔

جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تمہارا یہ مطالبہ منظور بھی ہو جائے اور تمہارے لیے عذاب کا وقت موعود بتا بھی دیا جائے تو پھر عذاب آجانے کے وقت تمہیں فائدہ ہی کیا ہوگا اگر عذاب آنے پر ایمان لاؤ گے تو کیسے لاؤ گے عذاب کی لپیٹ میں آنے کے بعد تو ہلاکت یقینی ہے ایمان کیسے لاؤ گے یہ تو بالکل ایسا ہے جیسے کوئی کہے توبہ کے بغیر مرنا نہیں چاہتے اور مریں گے تو توبہ کریں گے کیسی بے عقلی اور حماقت ہے مطلب یہ ہے کہ جب ظہور عذاب کے بعد ایمان کا موقعہ ہی نہ ہوگا تو پھر عذاب کے لیے اس جلد بازی سے تمہیں کیا ملے گا اور عذاب بھی اتنا ہولناک ہوگا کہ رات کی تنہائی اور تاریکی میں یا دن میں تمہاری مشغولیتوں میں آ جائے اور دونوں صورتوں میں تمہیں ایمان لانے کا موقعہ ہی کب ملے گا۔ یہ عذاب میں تاخیر اور دیری نہیں بلکہ ایمان لانے کیلئے اللہ سبحانہ کی جانب سے مہلت بخشی ہے اور یہ اس کی رحمت کا تقاضا ہے اس تاخیر سے دھوکہ نہ کھاؤ۔

جلد بازوں سے ایک سوال

۶۵ کیا جب عذاب آجائے گا تو مان جاؤ گے اس وقت ماننا بے سود ہوگا اس وقت کہا جائے گا کہ اب تم نے ماننا ہے حالانکہ تم اسی عذاب کی طلب میں جلد بازی مچا رہے تھے پھر ظلم کاروں سے کہا جائے گا اب دائمی عذاب کا مزہ چکھو اب صرف تمہیں تمہارے ہی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اعمال کا بدلہ دیا جائے گا۔ یعنی عذاب کی جلدی کرنا اس بنا پر ہے کہ آپ کو اس کے آنے کا یقین نہیں ہے اس وقت یقین ہوتا تو فائدہ ہو سکتا تھا کہ بچنے کی کوشش کرتے عذاب آنے کے بعد یقین آیا تو کیا فائدہ ہو گا اس وقت اللہ سبحانہ کی طرف سے کہہ دیا جائے گا کہ اچھا اب قائل ہوئے ہو اور پہلے جھٹلاتے رہے کیونکہ عذاب کا تقاضا کرنا بھی جھٹلانے اور مذاق اڑانے کی نیت سے تھا۔ اس وقت اقرار کرنے سے کوئی فائدہ نہیں جیسے کہ سورہ مومن میں ہے۔

فلما راوا باسنا قالوا امنا باللہ وحدہ وکفرنا بما کنا بہ مشرکین فلم یک ینفعھم ایمانھم لما راوا باسنا سنۃ اللہ قد خلت فی عبادہ وخسر ھنالک الکافرون۔

اس سے پہلے کفر و شرک کرتے رہے اب ہمیشہ کے عذاب کا مزہ چکھتے رہو یہ قیامت میں کہا جائے گا لہ مطلب یہ ہے کہ کیا اتنی دیر میں عذاب کے آنے پر تم نے مانا ہے جب کہ عذاب کے سارے مقدمات کی رونمائی پہلے ہو چکی۔ اب ہلاکت اور تباہی آنے پر اور عذاب کے پنجہ میں دب کر ایمان لائے ہو۔ اب یہ مشاہدہ کا ایمان ہے اور یہ ایمان معتبر نہیں ہے ایمان تو بالغیب معتبر ہے۔ اسی کے لیے جلد بازی کر رہے تھے۔ اگر عذاب کی علامات دیکھ کر پہلے مان لیتے تو عذاب سے بچ جاتے۔ پہلے اسے صرف دھمکی سمجھ کر مذاق اڑاتے رہے ہو اور اب سب کچھ آنکھوں سے دیکھ کر کانوں سے سن کر کہتے ہو یہ تو دنیا کی زندگی میں عذاب عاجل ہے جب آخرت کا مرحلہ آئے گا تو ان ظالموں سے کہا جائے گا کہ اب دائمی عذاب کا مزہ چکھو یہ تمہارے ہی اعمال کا نتیجہ ہے تمہارے ہی کرتوتوں کا مزہ ہے

یہ مادی و جسمانی دنیا علت و معلول اور عمل رد عمل کے جس اصول پر مبنی ہے اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر عمل اور ہر قول داخل و شامل ہے یہی وجہ ہے کہ قرآن میں گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام عقاب ہے اور عمل صالح کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب ہے قرآن نے ان دونوں اصطلاحوں کو بار بار استعمال کیا ہے عقاب کا لفظ عقب سے نکلا ہے جس کے معنی پیچھے کے ہیں اس لیے عقاب اس اثر کو کہتے ہیں جو کسی کام کرنے کے بعد لازم آتا ہے۔ عذاب اور عقاب میں فرق یہ ہے کہ عقاب سزا کے استحقاق کو تبلاتا ہے اور عذاب استحقاق اور بغیر استحقاق دونوں پر بولا جاتا ہے۔

لہ افادات شیخ الاسلام

یہاں بما کنتم بہ تکسبون میں بار مقابلہ لا کر بتایا ہے کہ یہ عذاب استحقاق کی وجہ سے ہوگا۔ عقاب کا صحیح ترجمہ پاداش ہے جب کہ عذاب صرف سزا ہے اور ثواب کا لفظ ثوب سے نکلا ہے جس کے معنے لوٹنے کے ہیں اس لیے یہ کسی اچھے کام کے لوٹنے والے نتیجہ کے معنے میں ہے۔

اسی ایک مسئلہ کو سمجھ لیا جائے تو جزا و سزا کے قانونی اصول سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو قرآن میں یہ بات مختلف پیرایوں میں دہرائی گئی ہو یہاں هل تجزون الا بما کنتم تکسبون بار مقابلہ لا کر قصر کے ساتھ فرمایا ہے کہ یہ صرف تمہارے کمائے ہوئے اعمال کا بدلہ ہے اس میں یہ صاف تصریح ہے کہ یہ جزا تمہارے دنیوی اعمال کے آثار و لوازم ہیں غرض جزا اعمال کے نتائج کا دوسرا نام ہے۔

وَيَسْتَنْۢبِـُٔوْنَكَ اَحَقٌّ هُوَ ؕ قُلْ اِيْ وَ
رَبِّيْٓ اِنَّهٗ لَحَقٌّ ؔۚ وَمَآ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝۵۳ وَلَوْ اَنَّ لِكُلِّ نَفْسٍ
ظَلَمَتْ مَا فِي الْاَرْضِ لَافْتَدَتْ بِهٖ ؕ وَاَسَرُّوا النَّدَامَةَ لَمَّا رَاَوُا
الْعَذَابَ ۚ وَقُضِيَ بَيْنَهُمْ بِالْقِسْطِ وَهُمْ لَا يُظْلَمُوْنَ ۝۵۴ اَلَآ
اِنَّ لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ اَلَآ اِنَّ وَعْدَ اللّٰهِ حَقٌّ
وقف النبی علیہ السلام ۵ ع ۱۳ ۱۰ وَّلٰكِنَّ اَكْثَرَهُمْ لَا يَعْلَمُوْنَ ۝۵۵ هُوَ يُحْيٖ وَيُمِيْتُ وَاِلَيْهِ
تُرْجَعُوْنَ ۝۵۶

اور لوگ آپ سے دریافت کرتے ہیں کیا یہ بات واقعی
سچی بات ہے آپ فرما دیجئے قسم ہے میرے رب کی
یہ فی الواقع سچی بات ہے اور تم مجھے اس میں کبھی ہرا نہیں
سکو گے[46] اور دیکھو روز قیامت ہونے والا عذاب اس
بات کی تکذیب کے نتیجے میں اس قدر ہولناک ہوگا) کہ اگر ہر
ظالم شخص ساری روئے زمین پر قابض ہو جائے تو اس کو عذاب
سے بچنے کے لیے فدیہ میں دے دے۔ اور جب وہ عذاب
کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو اپنے کئے پر چھپے چھپے پچھتائیں

گے اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ ہو گا اور ان پر ظلم نہ ہو گا۵۴ خوب یاد رکھو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے اس میں کسی کا ساجھا نہیں ہے۔ خوب سمجھ لو کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے لیکن اکثر کو پتہ نہیں ہے اللہ ہی جلاتا اور مارتا ہے اور تم سب کو اسی کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے۵۶

مفردات کے معانی

العذاب سخت سزا۔ دکھ کی مار علامہ فیومی المصباح المنیر میں لکھتے ہیں عذاب تعذیب سے حاصل مصدر ہے اصل میں اس کے معنے مارنے کے ہیں بعد میں ہر دردناک سزا کے لیے استعمال کیا جانے لگا۔ اور استعارے کے طور پر امور شاقہ کو بھی عذاب کہتے لگے چنانچہ محاورہ ہے السفر قطعة من العذاب (سفر تو عذاب کا ایک ٹکڑا ہے) اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں۔ عذاب کے معنی دکھ دینے کے ہیں اور اس میں اختلاف ہے کہ اس کی اصل کیا ہے۔ بعض کہتے ہیں عذب الرجل فهو عاذب وعذوب سے ماخوذ ہے جس کا استعمال کھانا اور سونا چھوڑ دینے کے لیے ہوتا ہے لہذا تعذیب کے اصل میں معنی یہ ہوئے کہ انسان کو بھوکا رہنے اور جاگنے پر مجبور کیا جائے۔ اور بعض کہتے ہیں کہ اس کی اصل عذامت بشر نفی اور گوارا کے ہیں۔ لہذا عذبته کے معنی ہیں اذلت عذب حياته یعنی میں نے اس کی زندگی کی شیرینی کو زائل کر دیا جیسے مرضته میں نے اس کی بیماری دور کر دی۔ اور بعض یہ کہتے ہیں کہ تعذیب کے معنی اصل میں کثرت سے تعذیبه السوط یعنی کوڑے کے پھندے سے مارنے کے ہیں اور بعض اہل لغت کا بیان ہے کہ تعذب کے معنی خود مارنے کے ہیں اور بعض

کا قول ہے کہ عرب کے قول ماء عذب سے ماخوذ ہے ماء عذب اس پانی کو کہتے ہیں جس میں کوڑا کرکٹ ہو اور گدلا ہو گیا ہو اس صورت میں عذبتہ کے معنی ہوں گے کدرت علیہ عیشہ میں نے اس کی زندگی مکدر کر دی۔ اور علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں کہ ابوالطیب فاسی اہل اشتقاق سے ناقل ہیں کہ عذاب کلام عرب میں عذب سے ماخوذ ہے جس کے معنے روکنے کے ہیں۔ چنانچہ عذبتہ عنہ کے معنی ہیں میں نے اس کو اس سے روک دیا اور عذب عذوبا کے معنے ہیں وہ رک گیا اور آب شیریں کو عذاب اس لیے کہتے ہیں کہ وہ پیاس کو روک دیتا ہے اور عذاب کو بھی عذاب اس لیے کہتے ہیں کہ مجرم کو دوبارہ ارتکاب جرم سے روک دیتا ہے۔ علامہ زبیدی اس رائے کے بارے میں فرماتے ہیں وھو کلام حسن یہ عمدہ بات ہے۔ علامہ زمخشری نے بھی کشاف میں اس پر داد تحقیق دی فرماتے ہیں۔

"عذاب نکال کی طرح ہے وزن اور معنی دونوں میں جب کوئی شخص کسی چیز سے رک جائے تو بولتے ہیں اعذب عن الشئی اسی سے معنے پانی کے لیے عذب ہے کیونکہ وہ پیاس کو روکتا ہے آب شیریں کو نقاح بھی بولتے ہیں کیونکہ وہ تشنگی کو توڑتا ہے اور فرات بھی کہتے ہیں کیونکہ وہ دل سے پیاس مٹاتا ہے بعد میں لفظ عذاب میں وسعت پیدا ہو گئی اور سخت درد تکلیف کو عذاب کہنے لگے ورنہ اصل میں اس کے معنے اس سزا کے ہیں جو ارتکاب جرم سے باز رکھے لیکن بعد میں کثرت استعمال کی وجہ سے اس کے معنی سخت دکھ اور درد کے ہو گئے ہیں۔"

نبوت کی دعوت حق ہے

انسانوں کی عمدہ معاشرت، صحیح تمدن اور اعلیٰ مسرت کی تکمیل اور کائنات میں اس کو اشرف المخلوقات کا مرتبہ حاصل کرانے میں بلاشبہ تمام کارکن طبقات انسانی کا حصہ ہے۔ ہیئت دانوں نے ستاروں کی چالیں بتائیں حکمائے چیزوں کے خواص ظاہر کیے طبیبوں نے بیماریوں کے نسخے ترتیب دیئے۔ ہندسوں نے تعمیرات کا فن نکالا۔ صناعوں نے ہنر اور فن پیدا کیے۔ ان سب کوششوں سے مل کر یہ دنیا تکمیل کو پہنچی مگر ان کے تمام علوم وفنون کا

بنیاد ان کے تجربے۔ ان کے خیالات، عقلی قیاسات ہیں۔ ان کے مقابلے میں وہ ہستیاں جنہوں نے انسانوں کی اندرونی دنیا آباد کی جنہوں نے حرص و ہوا کی چالیں درست کیں۔ روحانی بیماریوں کے لئے ترتیب دیئے۔ جذبات، احساسات اور ارادوں کے نقشے درست کئے۔ نفوس و قلوب کے عروج و تنزل کا فن ترتیب دیا جس سے دنیا کے صحیح تمدن اور صحیح معاشرت کی تکمیل ہوئی، اخلاق و سیرت انسانیت کا جوہر قرار پایا۔ نیکی اور بھلائی، جو ان عمل کے نقش و نگار قرار پائے خدا و بندہ کا باہم رشتہ مضبوط ہوا۔ سب نے اپنے نظریات، اپنے افکار کی بنیاد قیاس و گمان رائے اور خیال پر رکھی جب کہ ان ہستیوں نے اپنے نظریات کی اساس علم و بصیرت اور یقین و اذعان پر رکھی اور دعویٰ کیا ادعوا الی اللہ علی بصیرۃ اور صرف یہی دعویٰ نہیں بلکہ اعلان کیا کہ یہی حق ہے اور جس کی طرف سے کہہ رہا ہوں اس کی ذات حق ہے۔ ذلکم اللہ ربکم الحق اور جو کچھ لے کر آیا ہوں وہ حق ہے یا ایھا الناس قد جاءکم الحق من ربکم جو بات ثابت ہو اپنی جگہ اٹل ہو انمٹ ہو اسے حق کہیں گے یہاں نبوت کے نور　　کے لیے حق کا لفظ اختیار کر کے حقیقت ظاہر کر دی ہے کہ نبوت کی دعوت سرتاسر حق ہے اٹل ہے جمنے والی ہے اس کی اساس انسانی رائے پر نہیں علم الٰہی پر ہے۔ اسی لیے نبوت نے اس پر قسم کھائی ہے یعنی اس کی صداقت کے لیے اللہ کی گواہی کافی ہے ای و ربی انہ لحق۔

لطلہ اور لوگ آپ سے دریافت کرتے کیا یہ بات واقعی سچی بات ہے آپ فرما دیجئے قسم ہے میرے رب کی یہ فی الواقع سچی بات ہے اور تم مجھے اس میں ہرا نہ سکو گے یعنی غفلت کے نشہ میں چور ہو کر تعجب سے پوچھتے ہیں کہ کیا یہ سچ ہے کہ ہم موت کے بعد دوبارہ زندہ کئے جائیں گے اور دائمی عذاب کا مزہ چکھیں گے کیا واقعی ریزہ ریزہ ہو کر اور خاک میں مل کر پھر ہم کو از سر نو موجود کیا جائے گا۔ آپ فرما دیجئے کہ تعجب کی کیا بات ہے۔ یہ چیز تو یقیناً ہونے والی ہے تمہارا مٹی میں مل جانا اور پارہ پارہ ہو جانا خدا کو اس سے عاجز نہیں کر سکتا کہ پہلے کی طرح تمہیں دوبارہ پیدا کر دے اور شرارتوں کا مزہ چکھائے۔ ممکن نہیں کہ اس کے قبضہ سے نکل بھاگو اور فرار ہو کر معاذ اللہ اسے عاجز کر سکو۔ اس آیت کے مشابہ دو آیتیں قرآن کریم میں ہیں۔ ایک سورۃ سبا میں ہے۔

قال الذین کفروا لا تاتینا الساعۃ قل بلی و ربی لتاتینکم۔

دوسری سورۃ تغابن میں ہے

زعم الذین کفروا ان لن یبعثوا قل بلی وربی لتبعثن ثم لتنبؤن بما عملتم و ذالک علی اللہ بصیر ۔

یہ دونوں قیامت اور معاد کے متعلق ہیں ان ہی کی مناسبت سے حافظ ابن کثیر نے اس آیت کو بھی معاد کے متعلق رکھا ہے [1]

اس آیت کی تشریح ایک تو وہ ہی ہے جو شیخ الاسلام نے حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے پیش کی ہے۔ اس صورت میں ضمیر کا احق ھو میں عذاب الخلد ہوگا اور سوال کا تعلق قیامت سے ہوگا۔ لیکن ابوحیان اندلسی نے بتایا ہے کہ آیت میں ضمیر مرجع عذاب بھی ہوسکتا ہے قرآن و شرع ہوسکتا ہے اور وعدبھی ہوسکتا ہے۔ قاضی بیضاوی فرماتے ہیں کہ ضمیر کا مرجع وعدبھی ہوسکتا ہے اور دعوت نبوت بھی ہوسکتا ہے۔ علامہ آلوسی نے وعدہ عذاب کو ترجیح دی ہے نیشاپوری نے بھی نظام القرآن میں اسی کو راجح قرار دیا ہے احق ھو میں حق خبر مقدم ہے اور ھو مبتدا ہے اور استفہام انکاری ہے زمخشری کی رائے ہے کہ استہزاء کے لیے تعریضی انداز ہے مطلب سوال کا یہ ہے کہ آپ جو عذاب کی بات کر رہے ہیں اس میں کوئی واقعیت ہے یا ویسے ہی گرمی مجلس کے لیے بات ہو رہی ہے اور ویسے شیخی بگھار رہے ہو۔ اس صورت میں جواب کا حاصل یہ ہوگا کہ قسم ہے میرے رب کی یہ حقیقت ہے اور جب یہ عذاب آئے گا تم اس کی گرفت سے نہ بچ سکو گے۔

اگر ضمیر کا مرجع قرآن اور دعوت ہو تو اس صورت میں حق حقیقت کے معنے میں نہیں اور انداز کلام استہزائی نہیں بلکہ واقعی ہے اور مطلب یہ کہ جو دعوت آپ نبوت کے نام پر پیش کر رہے ہیں حق ہے اور قسر کے ساتھ پوچھ رہے ہیں کہ یہی حق ہے اور اس کے سوا سب کچھ باطل ہے احق ھو میں زور کا تقاضا یہی ہے اس کے جواب میں آپ قسم کھا کر فرما رہے ہیں کہ جو کچھ کہہ رہا ہوں یہی اور صرف یہی حق ہے اور اس کے سوا سب باطل ہے۔ تم مجھے اس معاملہ میں اللہ کی جانب سے ہونے کی وجہ سے کبھی ہرا نہیں سکتے۔ تمام روئے زمین میں مجھے اس معاملہ میں کوئی ہرا نہیں سکتا۔ قرآن نے یہ بات بار بار مخاطبوں کے بارے میں دہرائی

[1] افادات شیخ الاسلام

بے فرمایا کہ جو لوگ حق کی راہ میں روکاوٹیں ڈال رہے ہیں وہ تمام روئے زمین میں دعوت حق کو دنیا میں اقتدار ملنے کی بشارت دی گئی لیکن ساتھ ہی منکرین حق کے بارے میں حضور اقدس کو مخاطب کرکے فرمایا لاتحسبن الذین کفروا معجزین فی الارض آپ یہ خیال نہ کریں کہ یہ منکرین حق اس معاملہ میں ہرا دیں گے۔ کہیں ان منکرین حق کے بارے میں فرمایا کہ جو لوگ حق کے خلاف دعوت حق کو ہرانے کی کوشش کر رہے ہیں ان کو دردناک عذاب ہوگا والذین سعوا فی آیاتنا معاجزین اولئك لهم عذاب من رجز الیم اور کہیں فرمایا ہے جو لوگ ہماری آیات کو ہرانے کی کوشش کر رہے ہیں وہ ضرور عذاب میں پڑیں گے والذین یسعون فی آیاتنا معاجزین اولئك فی العذاب محضرون یہ آیات بتا رہی ہیں کہ آیت قرآن کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ میں اسلام کے نام پر پیش کر رہا ہوں وہ ہی حق ہے اس کے سوا جو کچھ ہے وہ باطل ہے اس کی کامیابی بالکل حتمی اور یقینی ہے اور تم سب مل کر اس کی راہ روک نہیں سکتے اور مجھے ہرا نہیں سکتے چونکہ دعوت کی اساس علم قطعی اور یقینی ہے لا ریب فیه من رب العالمین اور وانه لکتاب عزیز لا یاتیه الباطل من بین یدیه ولا من خلفه تنزیل من حکیم حمید اس لیے آپ قسم کھا کر فرما رہے ہیں ای وربی انه لحق کیونکہ اس دعوت کا سرچشمہ علم الٰہی ہے اور اس کے نزول کا ذریعہ وحی ہے۔ یہ سرچشمہ ہر قسم کے عیب و نقصان شک و اشتباہ، ظن و تخمین، تدریج و ترقی اور تعارض و اختلاف سے پاک ہے اس میں جو کچھ ہے وہ یقینی اور قطعی ہے شاہد اور مرئی ہے یکساں اور آخری ہے۔ اللہ کا علم تدریجی اور ترقی پذیر نہیں ہے اس کا علم اس کی دوسری صفات کی طرح ابدی اور دائمی ہے اس لیے یہی حق ہے اس کے سوا جو کچھ ہے باطل ہے۔

تعبیر کا انداز بتا رہا ہے کہ یہ بات دریافت کرنے والے وہ لوگ ہیں جو منکر و جاحد نہ تھے مگر تصدیق میں متامل تھے وہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت و دیانت پر غور کرتے جو تمام لوگوں میں اول روز سے مسلم تھی تو ان کا دل کہتا سچے آدمی کی زبان سے جھوٹی بات نہیں نکل سکتی ہے لیکن پھر جب دیکھتے کہ ان کی دعوت ایسی باتوں کا یقین دلاتی ہے جن سے وہ اور ان کے آباؤ اجداد یکسر ناآشنا تھے تو طبیعت ٹکتی نہیں۔ شک و حیرت کی حالت میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور پوچھنے لگتے ہیں کیا تم جو کہہ رہے ہو بس یہی حق ہے

فرمایا جب تمہیں آج تک میری سچائی میں شبہ نہیں ہوا تو آج کیوں ہو رہا ہے میں جو کچھ کہتا ہوں بھی حق ہے اور اس پر میرا پروردگار شاہد ہے۔

صحیح مسلم، صحیح بخاری اور مسند احمد میں حضرت انس کے حوالہ سے یہ واقعہ آیا ہے کہ ہم مسجد میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں بیٹھے تھے کہ ایک شخص ایک اونٹ پر سوار آیا مسجد ہی میں اونٹ بٹھا دیا اور باندھ دیا پھر بولا تم میں محمد کون سے ہیں ہم نے جواب میں بتایا یہ ڈھاسنا لگائے سپید رنگ والے جو تشریف فرمائیں بولا میں عبدالمطلب کے صاحبزادے کا متلاشی ہوں حضور نے فرمایا جی ہاں میں ہی ہوں بولا میں آپ سے کچھ سوال کروں گا برا نہ مانئے ذرا میں سوال میں لب و لہجہ سخت کرتا ہوں۔ فرمایا جو جی چاہے پوچھو بولا میں آپ کو آپ کے رب کی قسم دے کر پوچھتا ہوں کیا واقعی اللہ نے آپ کو پوری انسانیت کے لیے رسول بنا کر روانہ کیا ہے فرمایا ہاں اللہ گواہ ہے۔ بولا میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کیا واقعی اللہ نے آپ کو دن رات میں پانچ نمازوں کا حکم دیا ہے فرمایا اللہ گواہ ہے ہاں۔ بولا میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کیا واقعی آپ کو اللہ نے رمضان کے روزے رکھنے کا حکم دیا ہے فرمایا اللہ گواہ ہے ہاں۔ بولا کہ میں آپ کو اللہ کا واسطہ دے کر پوچھتا ہوں کہ کیا واقعی اللہ نے حکم دیا ہے کہ آپ زکوٰۃ ہم سے وصول کر کے فقرا میں تقسیم کریں۔ آپ نے فرمایا اللہ گواہ ہے ہاں۔ بولا میں آپ کی دعوت کو مان لیا میں اپنی قوم کا نمائندہ ہوں میرا نام ضمام بن ثعلبہ ہے۔

مسند احمد میں یہ بھی اضافہ ہے کیا اللہ نے آپ کو حکم دیا ہے کہ آپ ہم کو حکم دیں کہ ہم اللہ کی عبادت کریں اس کی عبادت میں قطعاً شرک نہ کریں اور ان شرکا کو جن کی ہمارے باپ دادا اللہ کے ساتھ عبادت کرتے تھے چھوڑ دیں۔ اپنے فرمایا ہاں آگئے والا بالوں والا اور مینڈھیاں رکھے ہوئے تھا جب وہ واپس ہوا تو حضور نے فرمایا مینڈھیوں والا اگر سچ بولا تو جنت میں جائے گا۔ لکھا ہے یہی شخص جب اپنی قوم میں واپس آیا تو آتے ہی سب سے پہلی بات جو کی یہ تھی۔ لات و عزیٰ کا خانہ خراب ہو۔ لوگوں نے شور مچا دیا ضمام چپ چپ۔ تجھے برص کی بیماری ہو جائے گی۔ تو کوڑھی ہو جائے گا تو پاگل ہو جائے گا۔ ضمام بولا ارے کیا کہہ رہے ہو کچھ بھی نہ ہو گا بخدا یہ نفع دیتے ہیں اور نہ نقصان۔ اللہ سبحانہ نے پیغمبر روانہ کیا ہے اور اس پر ایک کتاب نازل کی ہے اس کے ذریعے تم کو ساری

برائیوں سے بچا لیا ہے۔ سُن لو میں اعلان کرتا ہوں کہ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں وہ یگانہ ہے عبادت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے اور میں اعلان کرتا ہوں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے بندے اور اس کے رسول ہیں میں تمہارے پاس ان کی جانب سے اوامر اور نواہی کی سوغات لے کر آیا ہوں۔ خدا کی قسم اسی روز پوری آبادی میں ہر مرد اور عورت اسلام کی نعمت سے ہمدوش ہو گیا۔

نتائج کفر کی ہولناکی

لے اور دیکھو روز قیامت ہونے والا عذاب اس بات کی تکذیب کے نتیجے میں اس قدر ہولناک ہوگا۔ کہ اگر ہر ظالم شخص ساری روئے زمین پر قابض ہو جائے تو اس عذاب سے بچنے کے لیے فدیہ میں پیش کر دے وہ سب عذاب کو آنکھوں سے دیکھ لیں گے تو اپنے کئے پر چھپے چھپائیں گے اور ان کے درمیان انصاف سے فیصلہ ہوگا اور ان پر ظلم نہ ہوگا یعنی اگر روئے زمین کے خزانے فرض کر و اس کے قبضے میں ہوں تو کوشش کرے کہ یہ سب دے کر اپنے کو خدا کے عذاب سے بچالے تو بچ نہیں سکے گا بلکہ دل میں اپنی حرکتوں پر پشیمان ہوگا اور چاہیں گے کہ لوگوں پر پشیمانی کا اظہار نہ ہو مگر ناسمجھے کچھ دیر آثار ندامت ظاہر نہ ہونے دیں گے آخر بے اختیار ظاہر ہو کر رہیں گے اس وقت کہیں گے یاحسرتنا علی ما فرطت فی جنب اللہ اور یا ویلنا قد کنا فی غفلۃ من ھذا الخ مطلب یہ ہے کہ جس چیز کو عمر بھر جھٹلاتے رہے جسے جھوٹ سمجھ کر ساری زندگی غلط کاموں میں لگے رہے اور جس کی خبر دینے والے انبیاء کا مذاق اڑاتے رہے وہی چیز جب ان کے سامنے توقعات کے خلاف اچانک سامنے آجائے گی تو ان کے ہوش اڑ جائیں گے اور پاؤں کے نیچے سے زمین نکل جائے گی ان کا اندر خود ان کو بتائے گا کہ جب یہ حقیقت تھی تو جو کچھ وہ دنیا میں کرتے رہے ہیں اس کا انجام اب کیا ہونا چاہیے زبانیں بند ہوں گی منظر کو دیکھ کر ہکے بکے رہ جائیں گے بیضاوی نے اسروا الندامۃ کی یہی تشریح کی ہے بھتوا بما عاینوا اور ندامت وحسرت سے دل اندر ہی اندر بیٹھ

لے افادات شیخ الاسلام

رہے ہوں گے جن لوگوں نے قیاس و گمان کے سوفیے پر اپنی عمر کی ساری مایہ لگا دی ہو اور کسی خیر خواہ کی بات نہ سنی ہو اور نہ مانی ہو وہ دیوانہ نکلنے کے بعد خود اپنے سوا اور کس کی شکایت کر سکتا ہے۔ آخر میں فرمایا قضی بینھم الخ فیصلہ انصاف سے کیا جائے گا یعنی ہر ایک کے جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی نتائج سامنے آجائیں گے۔ یہ فیصلہ دو کے درمیان نہیں ہوگا بلکہ ہر ایک کو اپنے اعمال کے نتائج سے ہمدوشی کا نام ہے یا یہ مطلب ہے کہ ان کے مرادوں اور مریدوں مطاعوں اور مطیعوں فرمان برداروں اور فرمان رواؤں کے درمیان انصاف کے ساتھ فیصلہ کر دیا جائے گا۔ کسی قسم کا ظلم نہ ہوگا جو کچھ انہوں نے کمایا ہوگا وہی ان کے سامنے رہے گا ان پر کوئی زیادتی نہ ہوگی۔ اس میں اشارہ ہے کہ انہوں نے اپنے شفعا متبوعین اور مطاعون سے جو امیدیں وابستہ کر رکھی تھیں وہ سب بے حقیقت ثابت ہوں گی۔ قرطبی نے لکھا ہے بین الرؤساء والسفل۔

پوری کائنات میں صرف اللہ کی حکومت ہے

۵۵ خوب یاد رکھو کہ آسمانوں اور زمین میں جو کچھ ہے وہ اللہ کا ہے اس میں کسی کا ساجھا نہیں ہے خوب سمجھ لو کہ اللہ کا وعدہ برحق ہے لیکن اکثر کو پتہ نہیں ہے اللہ ہی جلاتا ہے اور مارتا ہے اور تم سب کو اسی کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے یعنی سارے جہاں میں حکومت صرف اللہ کی ہے انصاف ہو کر رہے گا کوئی مجرم کہیں نہیں بھاگ سکتا ہے نہ رشوت دے کر چھوٹ سکتا ہے۔ اکثر لوگ سوء استعداد بدفہمی اور غفلت سے ان حقائق کو سمجھتے نہیں ہیں اسی لیے جو زبان پر آئے بک دیتے ہیں اور جو جی میں آئے کرتے ہیں سوچنا چاہیے کہ جب جلانا اور مارنا اسی کا کام ہے تو دوبارہ زندہ کرنا کیا مشکل ہے[1] یہ اگرچہ پہلی بات ہی کی تاکید ضرور ہے، پیشانی پر الاحرف تنبیہ لگایا گیا ہے اور خبر کو زوردار بنانے کے لیے ان حرف تحقیق لگایا اور پھر قصر کی خاطر خبر کو پہلے لائے مطلب یہ ہے خبردار کان کھول کر سن لو آسمانوں اور زمین میں جو کچھ جتنا کچھ اور جیسا کچھ بھی ہے وہ صرف اور صرف اللہ ہی کا بلاشرکت غیر مالکانہ تعلق ہے اس سے کسی کا کوئی حصہ اور ساجھا

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں ہے اگر کسی نے یہ خیال رکھا ہے کہ اس کے شرکا ءاور شفعا کا بھی کوئی حصہ ہے اور وہ بھی کچھ کرتے ہیں تو یہ اس کی قوت واہمہ کی تخلیق ہے اسے اپنی اصلاح کرنی چاہیے۔

یہاں علامہ بقاعی نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ ظلم تو وہ کرتا ہے جس کی ملکیت میں کوئی کمی ہو اور جو سب کچھ کا مالک ہو اور سب کچھ اس کی ملکیت ہو تو اس کا ہر فیصلہ عین عدل و انصاف ہوگا کیونکہ تمام کائنات کا تعلق اللہ سبحانہ سے یکساں اور برابر ہے۔ وعدہ کی خلاف ورزی بھی نقصان قدرت کی وجہ سے ہوتی ہے جس کا ہر چیز سے مالکانہ تعلق ہو اور ہر چیز پر اسے پوری پوری دسترس ہو وہاں وعدہ کی خلاف ورزی کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ آخر میں فرمایا ہے۔ ھو یحیی و یمیت یعنی اس دنیا میں احیاء و اماتت کا کام صرف اسی کی ذات قدوس کر رہی ہے۔ اس میں کسی کا کوئی دخل نہیں ہے۔

قرآن انسانوں کو اس ایمان و ایقان کی دعوت دیتا ہے کہ سب کچھ اللہ سبحانہ کر رہا ہے صرف یہی نہیں بلکہ ہر انسان کی فطرت میں اس کا یقین و علم بھی ہے۔ پھر جن راہوں اور قدرت کے جن قوانین کے تحت احیاء و اماتت کا سلسلہ جاری ہے جب یہ اقرار موجود ہے تو پھر خاص احیاء و اماتت کے لیے کسی اور کو سہارا بنانا نادانی اور جہل نہیں تو اور کیا ہے؟ اور اس سے بھی بڑی نادانی یہ ہے کہ جن راہوں سے چیزیں آرہی ہیں ان راہوں سے چیزیں حاصل کرنا تو عقل کا تقاضا ہے لیکن جو لانے والا ان راہوں سے چیزیں لا رہا ہے اس سے ان پیداوار کو حاصل کرنے کے لیے گڑگڑا کر اس سے نہ مانگنا خود اپنے خود ساختہ شرکا سے مانگنا جہالت اور نادانی نہیں تو اور کیا ہے مانگنا اور صرف اسی سے مانگنا عقل کا تقاضا ہے فابتغوا عند اللہ الرزق اور واسئلوا اللہ من فضلہ کا بھی مطالبہ ہے۔

آخر میں فرمایا کہ والیہ ترجعون تمہیں اسی کے حضور میں پیش ہونا ہے یعنی تمہیں اپنے اعمال کا حساب دینے کے لیے صرف اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے کسی اور کے حضور میں تمہیں نہیں جانا ہے۔

يَٰٓأَيُّهَا ٱلنَّاسُ قَدْ جَآءَتْكُم مَّوْعِظَةٌ مِّن
رَّبِّكُمْ وَشِفَآءٌ لِّمَا فِى ٱلصُّدُورِ وَهُدًى وَرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿۵۷﴾
قُلْ بِفَضْلِ ٱللَّهِ وَبِرَحْمَتِهِۦ فَبِذَٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوا۟ هُوَ خَيْرٌ
مِّمَّا يَجْمَعُونَ ﴿۵۸﴾ قُلْ أَرَءَيْتُم مَّآ أَنزَلَ ٱللَّهُ لَكُم مِّن
رِّزْقٍ فَجَعَلْتُم مِّنْهُ حَرَامًا وَحَلَٰلًا قُلْ ءَآللَّهُ أَذِنَ لَكُمْ أَمْ عَلَى
ٱللَّهِ تَفْتَرُونَ ﴿۵۹﴾ وَمَا ظَنُّ ٱلَّذِينَ يَفْتَرُونَ عَلَى ٱللَّهِ ٱلْكَذِبَ
يَوْمَ ٱلْقِيَٰمَةِ إِنَّ ٱللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى ٱلنَّاسِ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَهُمْ
لَا يَشْكُرُونَ ﴿۶۰﴾ ع

اے انسانو! تمہارے مالک کی جانب سے ایک عظیم الشان
نصیحت اور دلوں کے روگ کے لیے نسخہ شفا اور اہل ایمان کے
لیے ہدایت و رحمت قرآن کی صورت میں آچکا ہے ۵۷ آپ
فرما دیجئے کہ اللہ ہی کے فضل اور اس کی رحمت پر بس ان کو
خوشی منانی چاہیے یہ ان ساری چیزوں سے اچھی ہے جن کو وہ ذخیرہ
کرتے رہتے ہیں ۵۸ اے اللہ کے رسول ان سے کہو لوگو کیا
تم نے اس پر غور کیا ہے کہ جو روزی اللہ نے تمہارے لیے

اتاری پھر تم نے اس میں حلال اور حرام بنالیا ہے اے اللہ کے رسول ان سے دریافت کرو کہ ایسا کرنے کا اللہ نے تم کو حکم دیا ہے یا تم اللہ پر بہتان باندھ رہے ہو؟[۱] اور ان لوگوں کا کیا خیال ہے قیامت کے بارے میں جو اللہ پر جھوٹ بول کر افترا پردازی کرتے رہتے ہیں بلاشبہ اللہ سبحانہ لوگوں پر بڑا ہی مہربان ہے لیکن لوگوں کی اکثریت ناشکرگذار ہے[۲]

معانی مفردات

رحمۃ بخشش مہربانی رحم یرحم کا مصدر ہے امام راغب لکھتے ہیں رحمت وہ رحم ہے جو مرحوم کی طرف احسان کی مقتضی ہو۔ اور کبھی اس کا استعمال محض رقت کے معنے میں ہوتا ہے اور کبھی صرف احسان کے معنے ہیں جو رقت سے خالی ہو جیسے رحم اللہ فلانا فعل کی صورت میں متعدی بنفسہ ہوتا ہے رحمہ اللہ لیکن مصدر کی صورت میں صلہ علی آتا ہے جیسے رحمۃ اللہ علیہ جب اس سے اللہ سبحانہ کو موصوف کیا جائے گا تو صرف احسان مراد ہوگا رقت مراد نہ ہوگی۔ رحمت کے دو معنے ہوئے رحمت اور احسان رقت کا مقام اگر انسانی طبیعت ہے تو احسان کا مرکز اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے جس طرح لفظ رحم رحمت سے ہے اسی طرح اس کے جو معنے لوگوں میں ہیں وہ اس رحمت سے ہیں جو اللہ سبحانہ کے لیے ہیں ان دونوں کے معنے میں بھی وہی تناسب ہے جو ان دونوں کے لفظوں میں ہے۔

رزق روزی راغب لکھتے ہیں کہ رزق کبھی تو عطاء جاری کو کہا جاتا ہے خواہ دنیوی

ہو یا اخروی اور کبھی حصہ کو اور کبھی جو پیٹ میں پہنچ کر غذا بن جاتی ہے اس کو دنیوی عطا کی مثال وفی السماء رزقکم اور عطاء اخروی کی مثال جیسے ولھم فیھا رزقھم اور حصہ کی مثال وتجعلون رزقکم انکم تکذبون اور غذا کی مثال فلیاتکم برزق منہ جمع ارزاق ہے۔ اسی سے رزاق بروزن فعال مبالغہ کا صیغہ ہے امام حلیمی کہتے ہیں کہ رزق پر رزق کثرت سے اور وسعت کے ساتھ دینے والا رزاق ہے اور امام خطابی فرماتے ہیں کہ رزاق وہ ذات ہے جو رزق کی متکفل ہے اور ہر جان کے لیے جس قدر قوت کی ضرورت ہے اس کو بہم پہنچانے والی ہے۔ یاد رہے کہ اس لفظ کا اطلاق بجز ذات باری کے غیر پر جائز نہیں ہے۔

قرآن کا بنیادی تصوّر

ہر مجموعہ قانون کا بنیادی تصور ہوتا ہے جس پر اس مجموعہ کے ایک ایک چیز کی اساس ہوتی ہے۔ یہ بنیاد کہیں قومی برتری کہیں وطنی افادیت کہیں نسلی امتیاز کہیں تجارتی مفاد قرار پاتی ہے اس لیے اس مجموعہ قوانین میں اسی بنیادی نقطہ نگاہ کی لکیریں ابھرتی نظر آتی ہیں۔ جہاں قانون کی بنیاد قومی برتری ہے وہاں کالے گورے یورپین اور نیٹو کے اصول برکار فرمائی ہے جہاں وطن قانون کی اساس ہے وہاں جغرافی انقطاع ارضی قانون کے اختلاف کا باعث ہوتے ہیں اور رومی غیر رومی یونانی اور غیر یونانی، مصری اور غیر مصری ملکی اور غیر ملکی نزاعات جنم لیتے ہیں اسی جذبہ سے صوبائی اختلاف کی تخلیق ہوتی ہے پاکستانی ہونے کے باوجود پنجابی سندھ میں بیگانہ ہے بہاری سندھ میں جگہ نہیں پاسکتا۔ اور بلوچستان والوں پر سرحد کی وسعت تنگ ہے۔

اللہ سبحانہ کے نازل کردہ قانون کی بنیاد صرف انسانوں کے لیے موعظت شفاء اور یقین کرنے والوں کے ہدایت ورحمت ہے یعنی سارے انسانوں کو رذائل سے بچا کو فضائل سے خوگر کرنا اور عدل وانصاف اور امن وامان کو قائم کرنا ہے اور اہل ایمان کے لیے پوری زندگی میں رہنما بن کر ظلم وفساد اور بغض و[illegible] سے نجات دلانا اور رحم ومحبت اور امن وسلامتی کی روح سے معمور کرنا ہے۔ اس میں رنگ ونسل کا کوئی اختلاف زبان اور لغت اور تہذیب وتمدن کا کوئی فرق اور ملک واقلیم کا کوئی امتیاز نہیں ہے یہ

قانون اللہ سبحانہ کا ہے اور اللہ سبحانہ کے سارے بندوں کے لیے آیا ہے وہ چاہے کالے ہوں یا گورے آریائی ہوں یا سامی۔ یورپی ہوں یا ایشیائی، پاکستانی ہوں یا ہندوستانی عربی ہوں یا عجمی سب کے لیے یکساں اور برابر ہے۔

بلاشبہ اللہ سبحانہ کے قانون میں ایک فرق رکھا گیا ہے کہ اس قانون کو چلانے والے قانون الٰہی کو ماننے والے ہوں ھدی و رحمۃ للمومنین لیکن جمہوری نظام کی طرح ملکی غیر ملکی، قوم اور غیر قوم، امیر غریب سرمایہ دار اور مزدور تجارت پیشہ اور زمیندار کی دیواریں حائل نہیں ہیں۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے قرآن کا قانون ہونے کی حیثیت میں بھی چہرہ پیش کیا ہے۔

۵۷ اے انسانو! تمہارے مالک کی جانب سے ایک عظیم الشان نصیحت اور نسخہ شفا اور اہل ایمان کے لیے سامان ہدایت و رحمت آچکا ہے۔ یہ سب صفات قرآن کریم کی ہیں۔ قرآن اول سے آخر تک نصیحت ہے جو لوگوں کو مہلک اور مضر باتوں سے روکتا ہے۔ دلوں کی بیماریوں کے لیے نسخہ شفا ہے۔ وصول الی اللہ اور رضائے الٰہی کا راستہ بتاتا ہے اور اپنے ماننے والوں کو دنیا و آخرت میں رحمت الٰہیہ کا مستحق ٹھہراتا ہے بعض محققین کے نزدیک اس آیت میں نفس انسانی کے مراتب کمال کی طرف اشارا کیا ہے یعنی جو شخص قرآن حکیم سے تمسک کرے ان تمام مراتب پر فائز ہو سکتا ہے۔

(۱) اپنے ظاہر کو نالائق افعال سے پاک کرنا لفظ موعظت میں اس طرف اشارہ ہے۔

(۲) باطن کو عقائد فاسدہ اور ملکات ردیہ سے خالی کرنا جو شفاء لما فی الصدور سے مفہوم ہوتا ہے۔

(۳) نفس کو عقائد حسنہ اور اخلاق فاضلہ سے آراستہ کرنا جس کے لیے لفظ ہدی زیادہ مناسب ہے۔

ظاہر و باطن کی درستگی کے بعد انوار رحمت الٰہیہ کا نفس پر فائض ہونا جو لفظ رحمت کا مدلول ہے۔ امام فخرالدین رازی نے جو تقریر کی ہے اس میں ان چار لفظوں سے شریعت طریقت حقیقت اور نبوت و خلافت کی طرف اشارا کیا ہے۔ یہاں اس کی تفصیل کا موقعہ نہیں اور نہ اس قسم کے مضامین خالص تفسیر کی مد میں آسکتے ہیں [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

یہ آیت قرآن کے مہمات دلائل میں سے ہے۔ ضروری ہے کہ اسے اچھی طرح سمجھ لیا جائے چونکہ اس آیت میں موعظت، شفا ہدایت اور رحمت کے الفاظ آئے ہیں اس لیے مفسرین نے اپنے مذاق کے مطابق تشریح کی ہے۔ نتیجہ یہ نکلا کہ سیاق وسباق سے ہٹ کر استدلال کی ساری حقیقت گم ہوکر رہ گئی اور آیت کی جامعیت مفقود ہوگئی۔ اس قسم کے مقامات دیکھ کر حیرت ہوتی ہے کہ نظر و تحقیق کا معیار اس قدر کیوں گر گیا تھا کہ قرآن کے صاف وصریح مطالب بھی نگاہوں سے اوجھل ہو گئے۔

یہ بات بالکل صاف اور ظاہر ہے کہ آیت کا آغاز یا ایہا الذین امنوا سے نہیں بلکہ یا ایہا الناس کہہ کر قرآن پوری انسانیت سے خطاب کر رہا ہے۔ سباق میں یہ بات بتائی گئی ہے کہ مخالفین قرآن اور دعوت نبوت کی حقیقت کے بارے میں سوال کر رہے ہیں اور نبوت قرآن کی حقیقت ہونے کی قسم کھا کر بیان کر رہی ہے انہ لحق اور مخاطبوں کو چیلنج کر رہا ہے کہ وما انتم بمعجزین یعنی قرآن اور دعوت بہرحال کامیابی سے ہمدوش ہوگی اور تمہاری کوئی ریشہ دوانی۔ کوئی سازش کوئی طاقت اسے ہرا نہیں سکتی اور سیاق یہ ہے کہ ہماری دی ہوئی نعمتوں میں اللہ سے بے نیاز ہوکر حلت وحرمت کی قانون سازی کر رہے ہو خود ہی اپنے لیے قوانین بنا رہے ہو۔ تم اللہ پر جھوٹ کی افترا پردازی کر رہے ہو۔ غور فرمایئے کہ اس سیاق وسباق میں اس قرآن کے بارے میں جس کے اللہ کی جانب ہونے پر ابھی چند قدم پہلے یہ چیلنج دیا فاتوا بسورۃ من مثلہ وادعوا شہداء کم اور جس کی حقیقت پر ابھی قسم کھائی تھی اسی قرآن کا جو چہرہ اس آیت میں پیش کیا جارہا ہے اس کا صرف یہ مطلب ہو سکتا ہے کہ یہ قرآن قانون ہونے کی حیثیت سے جامع ہے اور کامل بھی ہے اس کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ سمجھ لینا چاہیے کہ انسانیت کا کوئی مسئلہ ایسا نہیں جو قرآن کے دائرے سے باہر ہو وہ ایک ایسا قانون ہے جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتا ہے اور وہ جو بھی قدم اٹھاتا ہے اس کی ہدایت کو سامنے موجود پاتا ہے مختصر یہ کہ قرآن ایک ایسا جامع اور مکمل قانون ہے جو انسانی زندگی کے اعتقادی، فکری اخلاقی اور عملی تمام پہلوؤں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے کچھ اسی طرح جس طرح کہ ہوا کا کرہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لئے ہوئے ہے۔

یہ میرا کوئی ذاتی خیال نہیں ہے بلکہ امام شاطبی نے الموافقات میں اسی آیت سے قرآن

کی ہمہ گیری اور جامعیت پر استدلال کیا ہے فرماتے ہیں۔
"اگر قرآن قانون کی حیثیت میں کامل نہ ہوتا تو قرآن میں یہ دعویٰ نہ ہوتا ان هذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم - یہ قرآن وہ راہ دکھاتا ہے جو سب سے زیادہ سیدھی راہ ہے یعنی خالق و مخلوق کے معاملات میں کامل نظام ہے اور قرآن اپنے بارے میں ھدی اور شفاء لما فی الصدور کا اعلان نہ کرتا قرآن کے شفاء لما فی الصدور کا مطلب یہی ہے کہ یہ کامل نظام حیات ہے (الموافقات)

اور یہ بھی علامہ شاطبی نے لکھا ہے کہ حافظ ابن حزم ظاہری کہتے ہیں کہ قرآن میں اس قدر جامعیت اور کمال ہے کہ سارے قانونی تقاضوں کا اس میں بھرپور جواب ہے ہاں قراض کے بارے میں کوئی اصل معلوم نہیں ہوئی ہے شاطبی کہتے ہیں کہ قراض کا تعلق اجارہ سے ہے اور اجارہ کی اصل قرآن میں موجود ہے۔

قرآن کے بحیثیت قانون جامع اور کامل ہونے کے موضوع پر یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیئے کہ قانون کے مختلف حصے اس میں مضبوطی سے جڑے ہوئے ہیں جس طرح مشین کے مختلف پرزے باہم جڑے ہوتے ہیں اس لیے نظری طور پر سمجھنے کے لیے تو انہیں الگ الگ قانون میں تقسیم کیا جا سکتا ہے مگر عملی طور پر ان کا الگ الگ وجود تقریباً ناممکن ہے۔ اپنی کارکردگی کے اعتبار سے یہ سارے اجزا دراصل ایک وحدت ہیں۔ ان میں کوئی بھی جز اپنا عملی جوہر اسی وقت دکھا سکتا ہے جب یہ پورا نظام کل کا کل حرکت میں ہو۔ نہ صرف یہ بلکہ کسی جز کو ٹھیک ٹھیک سمجھا ہی اس وقت جا سکتا ہے جب کہ دوسرے سارے اجزا نظروں کے سامنے ہوں۔

یہ بات بھی خوب یاد رکھنی چاہیئے کہ قرآن کی بطور قانون کارفرمائی ایسے معاشرے کے وجود پر موقوف ہے جو مسلم ہو جس کا اللہ سبحانہ اور اس کی صفات پر گہرا یقین ہو، جو آخرت پر سچا یقین رکھتا ہو اور جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دل سے اللہ کا نبی اور آخری نبی مانتا ہو۔ مختصر یہ کہ جو اسلام کا صحیح معنی میں پیروکار ہو۔ اس لیے قرآن کی قانونی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کے لیے یہ بھی ضروری ہے کہ ایک ایسے ہی معاشرے کے ساتھ وابستہ کر کے دیکھا جائے ورنہ جس طرح ایک ماہر فن ہاتھ کے تصور کے بغیر کسی اچھی سے

اچھی تلوار کی کاٹ کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا اسی طرح ایک اچھے مسلم معاشرے کے تصور کے بغیر قرآنی قانون کی عملی قدر و قیمت کا صحیح اندازہ بھی تقریبًا ناممکن ہے۔

ان اصولی باتوں کو ذہن نشین کر لینے کے بعد اب آیئے آیت قرآنی کا مطالعہ کیجئے۔

آیت کا آغاز یا ایھا الناس سے ہُوا ہے یہ اندازِ خطاب اول یہ بات بتا رہا ہے کہ قرآن پوری انسانیت کے لیے اللہ کا قانون ہے اور ثانیا لفظ الناس بول کر سمجھا دیا ہے قرآن کی دعوت بلا امتیاز رنگ و نسل وطن قوم زبان اور طبقہ سب کے لیے یکساں ہے اور من ربکم کا اضافہ کر کے یہ بات مجلہ دماغ میں اتار دی ہے کہ جیسے تمہارا پروردگار مالک اور آقا ایک ہے وہی تمہاری مادی پروردگاری کر رہا ہے اور اس پروردگاری میں ماں کے پیٹ سے لے کر قبر کے پیٹ تک اس کا کوئی شریک نہیں ہے ایسے ہی تمہاری معنوی پروردگاری بھی کرنا اسی کا کام ہے یہ فرما کر قرآن کی قانون کی حیثیت سے ہمہ گیری اور جامعیت کا چہرہ پیش کیا ہے۔

قرآن میں عائلی معاشرتی اور اخلاقی نظام

سب سے پہلے قرآن کی قانونی حیثیت یہ ہے کہ قرآن موعظت یعنی قرآن دل میں اتر جانے والی دلیلوں اور روح کو متاثر کرنے والے طریقوں سے ان تمام باتوں کی ترغیب دیتا ہے جو خیر و حق کی باتیں ہیں اور ان تمام باتوں سے روکتا ہے جو شر و بطلان کی باتیں ہیں۔ ایک واعظ کی طرح وہ ترہیب بھی دیتا ہے اور ترغیب بھی۔ عربی میں وعظ کا مفہوم صرف نصیحت ہی نہیں ہے بلکہ ایسی مؤثر نصیحت جو مؤثر دلائل اور دلنشین اسلوبوں کے ساتھ کی جائے جس سے انسان کے اخلاق صحیح ہوں معاشرت درست ہو اور خانگی زندگی میں سکون و اطمینان اس طرح اس ایک لفظ کے ذریعے قرآن نے اپنے مخاطبوں کو سمجھا دیا کہ قرآن جو قانون نظام لے کر آیا ہے اس میں اخلاقی نظام عائلی نظام اور معاشرتی نظام پورا موجود ہے اخلاقی نظام معاشرت اور خانگی زندگی کے لیے بنیاد ہے۔ تورات محض سیاسی قانون ہے اور انجیل محض اخلاق ہے۔ قرآن عزیز اخلاق اور سیاسی قانون دونوں کا جامع ہے اس جامعیت کا اصول قرآن میں دو حیثیتوں سے پایا جاتا ہے ایک تو یہ کہ اس نے نہ تو یہودیت کی طرح اخلاق کو قانون کی شکل دے دی اور نہ عیسائیت کی طرح سیاسی قانون کو دین کے حصے

خارج کر دیا بلکہ قرآن نے سیاسی قانون اور اخلاق کے درمیان حد فاصل مقرر کر دی اور قانون سیاسی کو قانون کی جگہ اور اخلاق کو اخلاق کی جگہ رکھ کر انسانیت کو تکمیل تک پہنچا دیا۔ یہاں اس تقابلی مطالعہ کی تفصیلات کا محل نہیں۔ عائلی زندگی یا معاشرتی دونوں کا بنیادی تعلق اخلاق سے ہے،

عائلی نظام میں انسانی تمدن کی بنیاد ایک مرد اور ایک عورت کی باہمی رفاقت سے شروع ہوتی ہے اور ایک گھر کی محدود اجتماعیت سے باہر جو ایک وسیع اجتماعیت ہوتی ہے اسے معاشرہ کہا جاتا ہے اس کے بارے میں قرآن کی جو ہدایات ہیں ان کا سرچشمہ بھی قرآن کا نظام اخلاق ہے مثلاً یہ ہدایت یوثرون علی انفسہم ولو کان بہم خصاصۃ وہ تنگی کی حالت میں اپنے پر دوسروں کو ترجیح دیتے ہیں یا یہ ہدایت لا یسخر قوم من قوم کوئی ایک دوسرے کا مذاق نہ اڑائے ولا تلمزوا انفسکم ایک دوسرے پر عیب نہ لگاؤ ولا تنابزوا بالالقاب ایک دوسرے کے نام نہ ڈالو۔

بہرحال موعظۃ من ربکم نے قرآن نے اخلاقی نظام عائلی نظام اور معاشرتی نظام کی نشاندہی کی ہے۔

قرآن کا روحانی نظام

اس ارشاد میں شفاء لما فی الصدور سے قرآن نے روحانی نظام کی طرف رہنمائی کی ہے یعنی قرآن دل کی ساری بیماریوں کے لیے نسخہ شفا ہے۔ دل کا بیماریوں سے صحت یاب ہو جانا ہی روحانیت ہے اس کا مقصد یہ ہے کہ نفس انسانی رذائل سے پاک اور فضائل سے آراستہ ہو جائے ما فی الصدور سے رذائل کی طرف اشارہ کیا ہے۔ رذائل کا ذکر بنیاد ہے اور یہی تخلیہ ہے جب تک نفس انسانی رذائل سے آزاد اور پاک نہ ہو گا تو فضائل کی عمارت قائم نہ ہو گی یعنی تخلیہ نہ ہو گا۔

رذائل کیا ہیں فحش گوئی حسد خود بینی و خود نمائی۔ ریاکاری، فخر و غرور، بغض و کینہ۔ غیظ و غضب حرص و طمع بخل خوشامد بدگمانی دغابازی۔ بہتان، غیبت۔ دورخا پن خیانت بدعہدی یا تیں ان سے آزاد ہو کر یہ فضائل پیدا کرے اللہ کی محبت اللہ کی طاعت اور اس کی رضا جوئی۔ زبان کی سچائی دل کی سچائی، عمل کی سچائی۔ سخاوت عفت و پاکبازی دیانتداری امانت، شرم و حیا رحم عدل و انصاف عفو و درگذر احسان۔ حلم و بردباری رفق و لطف

خوش کلامی ایثار تواضع وخاکساری، اعتدال ومیانہ روی خود داری اور عزت نفس حق گوئی استقامت اور استغنا۔ رذائل سے پاک ہوکر فضائل سے آراستہ ہوجانا روحانیت ہے۔ اس روحانیت کا معیار مطلوب یہ ہے کہ انسان وہ ہی کچھ پسند کرنے لگے جو اللہ کو پسند ہے اور ہر اس چیز سے نفرت کرنے لگے جو اللہ سبحانہ کو ناپسند ہے اپنے حقیقی آقا اور محبوب کے حکموں پر اس طرح عمل کرنے لگے گویا وہ اسے اپنے سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہے اس کی ناراضگی سے اس طرح ڈرتا رہے گویا اس کے تخت جلال کے سامنے کھڑا ہے۔ اس کی رضا کے لیے اس طرح لپکتا رہے جیسے پیاسا ٹھنڈے پانی کی طرف لپکتا ہے۔

روح میں پاکیزگی اور شفا لمافی الصدور کی یہ کیفیت پیدا کرنے کیلئے قرآن نے جو بنیادی اور راست تدبیریں مقرر فرمائی ہیں وہ وہی ہیں جن کو افکار و اعمال اور اخلاق کہاجاتا ہے اور جن کے تذکرہ سے قرآن کا کوئی صفحہ خالی نہیں ہے۔ دل کی شفا کا مطلب یہ ہوا کہ انسان کی فکری، عملی اور اخلاقی حالت کے جس قدر رذائل ہیں ان سب کے لیے قرآن نسخہ شفا ہے۔ روحانی نظام قرآن کا سب سے اہم اور مرکزی حصہ ہے جس کا تعلق انسان کے اندرون سے اور جسے عرف عام میں طریقت، ولایت اور تصوف کہتے ہیں۔

قرآن میں سیاسی وقانونی نظام

اس آیت میں قرآن نے اپنے سیاسی اور قانونی نظام کی طرف ھدی و رحمۃ للمومنین کہہ کر اشارا کیا ہے۔ یہاں قرآن نے اپنے سیاسی اور قانونی نظام کے لیے ایمان کی شرط لگائی ہے یعنی اس نظام کے چلانے والوں کے لیے ضروری ہے کہ مومنین ہوں جب کہ دوسری جگہ یہ شرط لگائی ہے کہ سیاسی نظام کو چلانے والے صرف مومن ہی نہیں بلکہ ارباب تقوی ہوں ھدی للمتقین یعنی قرآن نے دوسرے نظاموں کی طرح ملکی اور غیر ملکی، قوم اور غیر قوم امیر غریب سرمایہ دار اور مزدور تجارت پیشہ اور زمیندار طبقہ اور غیر طبقہ، پارٹی غیر پارٹی جیسے حجابات اور دیواریں ہٹا کر صرف یہ قید لگائی کہ اس کے چلانے والے اسے ماننے والے اتقیا ہوں. قرآن نے اپنے سیاسی نظام کے بنیادی خطوط یہ بتائے ہیں۔

(۱) اقتدار اعلیٰ اور حاکمیت صرف اللہ کے لیے ہے۔
(۲) اللہ کا رسول دنیا میں اس کی مرضی کا نمائندہ اور اس کے احکام کا مبین اور شارح ہے۔ قرآن کے سیاسی نظام کے بنیادی مقاصد یہ ہیں۔

معاشرے میں انصاف قائم کرنا، معاشرے کو نماز قائم کرنے والا زکوٰۃ دینے والا معروف سے خود محبت رکھنے اور دوسروں کو اس کا حکم دینے والا۔ منکر سے خود رکنے والا دوسروں کو روکنے والا بنایا جائے یہ وہ مقصد ہے جو اسلامی حکومت کا خاص اور امتیازی مقصد ہے جو کسی اور جگہ لفظوں کی حد تک بھی موجود نہیں ذرا غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ یہ دراصل پورے دین کے قائم رکھنے اس کی برکتوں کے دائرے کو بڑھاتے رہنے اور معاشرے کو صحیح اسلامی معاشرہ بنائے رکھنے کی ایک بھاری ذمہ داری کا نام ہے۔

قرآن نے اس آیت میں ھدی سے سیاسی نظام کی طرف اشارا کیا ہے اسی سیاسی نظام کو قرآن نے دوسرے سیاسی نظاموں کے مقابلے میں سب سے زیادہ ٹھیک سب سے زیادہ عادلانہ اور سب سے زیادہ مضبوط اور پائدار بتایا ہے۔

ان ھذا القرآن یھدی للتی ھی اقوم

یہ قرآن رہنمائی کرتا ہے ایسی جو سب سے زیادہ پائدار ہے۔

اس کے بعد لفظ رحمت لاکر قرآن نے اپنے قانونی نظام کی طرف اشارا کیا ہے خود قرآن بھی اللہ کی رحمت ہے، نبی کا وجود بھی اللہ کی رحمت ہے ھذا البصائر من ربکم وھدی ورحمۃ اور وما ارسلناک الا رحمۃ للعالمین۔ اور اس کے ساتھ قرآن وسنت سے قوانین کا استنباط بھی اللہ کی رحمت ہے لعلمہ الذین یستنبطونہ منھم ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ لاتبعتم الشیطان الا قلیلا۔

قرآن خود کتاب الٰہی ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس کے مبین اور شارح ہیں اور اولی الامر ان دونوں کی مدد سے پیش افتادہ حالات کے لیے قانون کے تقاضے پورے کرتے ہیں یہ سب اللہ سبحانہ کی رحمت ہے۔

قرآن پر عمل پیرا ہو کر کامیابیوں سے ہمدوش ہونا بھی رحمت ہے سیدخلھم اللہ فی رحمۃ اور ادخلنا ھم فی رحمتنا۔ اللہ سبحانہ کی رحمت بے پایاں ہے۔ وہ تمام مقامات جن میں کائنات کے افادہ و فیضان زینت وجمال، موزونیت

واعتدال تسویہ قوام اور خوبی و اتقان کا ذکر ہے سب مظاہر رحمت ہیں جس چیز کو ہم جمال کہتے ہیں اس کی حقیقت کیا ہے ؟ موزونیت اور تناسب، یہی موزونیت و تناسب سے جو بناؤ اور خوبی کے تمام مظاہر کی اصل ہے اور اس کا مرکز رحمت ہے ۔

بہرحال قرآن نے اس آیت میں اپنی جامعیت اور کاملیت کا یہ کہہ کر اعلان کیا ہے کہ قرآن ایسا جامع قانون ہے کہ اس میں ایک طرف اگر روحانی و اخلاقی نظام ہے تو ساتھ ہی عائلی اور معاشرتی نظام بھی موجود ہے اور اس کے ساتھ قرآن سیاسی اور قانونی نظام بھی لے کر آیا ہے ۔ دنیا کے تمام نظاموں سے اس کا مقابلہ کرو تو تمہیں معلوم ہو گا کہ دنیا کے کسی نظام حیات میں یہ جامعیت نہیں ہے ۔

یہ محض قرآن کا مدعیانہ اعلان نہ تھا بلکہ اس کی صداقت کی سب سے مؤثر دلیل بھی تھی اگر ایک شخص دعویٰ کرے کہ وہ طبیب ہے تو سب سے زیادہ اور آسان طریقہ اس کے دعوے کی جانچ کا یہ ہے کہ دیکھا جائے کہ اس کے علاج سے بیماروں کو شفا ملتی ہے یا نہیں اگر تم دیکھو کہ موت کی آغوش میں پہنچے ہوئے بیمار اس کے ہسپتال میں داخل ہوئے اور تندرست ہو کر نکلے تو تم یقیناً تسلیم کر لو گے کہ اپنے دعوے میں سچا ہے قرآن نے بھی جا بجا یہی جانچ منکروں کے سامنے پیش کی ہے اس نے کہا کہ میں جامع قانون ہوں اور ثبوت میں اہل ایمان کی جماعت پیش کر دی جن کو اس نے تیار کیا تھا کہ دیکھ لو یہ تندرست ہو گئے ۔

آؤ قرآن کی جامعیت کا واقعاتی طور پر مطالعہ کرو دیکھو قرآن پڑھنے والوں میں قرآن کی تعلیم نے کیا کام کیا ہے ۔ کیا تورات کی طرح صرف فوجی افسر اور قاضی بنائے ہیں یا انجیل کی طرح صرف چند زہد پیشہ فقرا کی سوغات دی ہے ،

قرآن کی تعلیم نے سربراہان مملکت عقلائے زمانہ اسرار فطرت کے محرم ۔ دنیا کے جہانبان اور ملکوں کے سربراہ بنائے ابو بکر الصدیق ، عمر فاروق ، عثمان غنی ، علی مرتضیٰ ہیں معاویہ ابن ابی سفیان ہیں جنہوں نے مشرق سے مغرب تک افریقہ سے ہندوستان کی سرحد تک فرمان روائی کی ۔ اور ایسی فرمان روائی جو دنیا کے بڑے بڑے شہنشاہوں اور حکمرانوں کی سیاست و تدبیر اور نظم و نسق کے کارناموں کو منسوخ کر دیتی ہے ۔

دوسری طرف قرآن کی تعلیم سے خالد بن الولید ، سعد بن ابی وقاص ابو عبیدہ

ابن الجراح عمرو بن العاص جیسے فاتح اعظم اور سپہ سالار اکبر پیدا ہوتے ہیں جنہوں نے مشرق و مغرب کی دو وسیع حکومتوں کا نشان دنیا سے مٹا دیا۔ تیسری طرف صوبوں اور ضلعوں کے انتظامی سربراہ قرآن ہی کی تعلیم سے پیدا ہوئے جنہوں صوبوں اور شہروں میں کامیاب انتظام کیا۔ جیسے علاء ابن الحضرمی (بحرین) یزید ابن ابی سفیان تیماء میں عمرو بن حزم نجران میں زیاد بن بصد حضر موت میں۔ مہاجر بن امیر کندہ صنعاء میں خالد بن سعید صنعاء میں چوتھی طرف قرآن ہی کی تعلیم سے فقہاء علماء کی جماعت منصۂ شہود پر آئی ہے جیسے عمر بن الخطاب علی ابن ابی طالب عبداللہ بن مسعود حضرت عائشہ معاذ بن جبل زید بن ثابت جنہوں قرآن کی روشنی میں فقہ و قانون کی بنیاد ڈالی۔ اور دنیا کے مقننین میں نام پایا پانچویں طرف قرآن ہی کی تعلیم نے مورخین اور ارباب روایت پیدا کئے جیسے ابو ہریرہ۔ ابو سعید خدری۔ ابو موسیٰ اشعری عبادہ ابن الصامت جابر بن عبداللہ۔ چھٹی جماعت قرآن نے صوفیا اور دنیا سے بے رخ زہاد کی پیدا کی جن کے نزدیک آج کا کھانا کل کیلئے رکھنا شان توکل کے خلاف تھا۔ اسی پر بس نہیں قرآن کی تعلیم نے مدبرین کی جماعت پیدا کی ہے جیسے طلحہ، زبیر، مغیرہ، مقداد، عبدالرحمٰن بن عوف۔

اس پوری جماعت صحابہ پر غور کرو اور سوچ کر بتاؤ کہ انہوں نے قرآن کے سوا کیا پڑھا ہے یہ قرآن ہی کی جامعیت کی نیرنگیاں ہیں۔

کیا آپ قرآن کی جامعیت کی ان جلوہ آرائیوں کا انکار کر سکتے ہیں آیئے ذرا شارحین کی زبانی بھی آیت کی تشریح سن لیجئے۔

حافظ ابن جریر نے اس طرح داد تحقیق دی ہے۔

"اللہ سبحانہ لوگوں سے فرماتا ہے کہ لوگو تمہارے رب کی جانب سے تمہاری پاس نصیحت آچکی ہے یعنی یہ قرآن تمہیں اللہ کا عذاب یاد کرائے گا اور تمہیں تمہارے رب کی وعید سے ڈرائے گا اور یہ بتائے گا کہ یہ قرآن تمہارے رب کی جانب سے محمد رسول اللہ کا بنایا ہوا نہیں ہے یہی اللہ کی جانب سے موعظت ہے اور شفا لما فی الصدور کا مطلب یہ ہے کہ جاہلوں کی جہالت کو دور کر کے ان کو جہل کی بیماری سے شفا دے گا اور اس کے ذریعے اپنی مخلوق کو ہدایت دے گا اور ھدی کا مطلب

یہ ہے کہ حلال وحرام بتائے گا اللہ کی طاعت کے لیے رہنما ہوگا اور رحمت یہ ہے کہ اللہ سبحانہ اس کے ذریعے اپنی مخلوق پر رحم کرے گا ان کو گمراہی سے بچا کر ہدایت دے اور ہلاکت سے بچائے گا"

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں :

"موعظت ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ قرآن برائیوں سے ہٹانے والا ہے شفا ہونے کا مطلب یہ ہے کہ شکوک وشبہات کی بیماری سے شفا دینے والا ہے ھدی و رحمۃ کا مطلب یہ ہے کہ اس کے ذریعے اللہ کی جانب سے ہدایت اور رحمت آئے گی"

علامہ قرطبی فرماتے ہیں :

"اے لوگو! یعنی قریش تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے نصیحت آ چکی ہے یعنی قرآن اس میں مواعظ اور حکمتیں ہیں اور اس میں شک نفاق شقاق اور خلاف سے شفا ہے اور جو اس کی پیروی کرے اس کے لیے راہنما ہے اور ایمان والوں کیلئے نعمت ہے مومنین کی تخصیص اس لیے ہے کہ وہ ہی ایمان کے ذریعے قرآن سے فائدہ حاصل کریں گے۔ یہ ساری قرآن کی صفتیں ہیں اور عطف تاکید مدح کے لیے ہے"۔

امام رازی نے تفسیر کبیر میں اپنی عادت کے مطابق کتاب کے پورے دو صفحوں میں تقریر کی ہے علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اس کا خلاصہ نقل کیا ہے۔ لیجیے آپ بھی سن لیجیے۔

موعظت سے لوگوں کے ظاہری اعمال کو درست کرنے کی طرف اشارا ہے یہی شریعت ہے اور شفا سے عقائد فاسدہ اور اخلاق دینیہ سے پاک ہونے کی طرف اشارہ ہے یہی طریقت ہے اور ہدی سے صدیقین کے دلوں میں ظہور حق کی طرف اشارا ہے یہی حقیقت ہے اور رحمت سے درجہ کمال تک پہنچ جانے کی طرف اشارا ہے جس میں دوسروں میں بھی کمال پیدا کر دے یہی نبوت اور خلافت ہے"۔

آلوسی نے یہ نقل کرنے کے بعد یہ نوٹ بھی لکھ دیا ہے کہ

"یہ بالکل ظاہر آیت کے خلاف ہے۔ ظاہر کا تقاضا تو یہ ہے کہ یہ سبب

ہونے کی وجہ سے قرآن کے اوصاف ہیں"۔

علامہ ابوحیان اندلسی نے رازی کی تشریح پر یہ نوٹ لکھا ہے کہ:

"امام رازی نے اس آیت کی تفسیر میں حکمت کے نام پر جو کچھ لکھا ہے ہمیں معلوم ہے کہ اہل عرب الفاظ قرآن سے یہ بات ہرگز نہیں سمجھتے ہیں"۔

علامہ زمخشری فرماتے ہیں:

"تمہارے پاس ایک کتاب شان جامعیت لے کر آئی ہے اس میں توحید پر وعظ و تنبیہ ہے عقائد فاسدہ کی درستگی کا سامان ہے اور حق کی طرف دعوت اور بلاوا ہے اور اہل ایمان کے لیے سراپا رحمت ہے"۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں۔

"تمہارے پاس حکمت علمی اور حکمت نظری پر مبنی وہ جامع کتاب آئی ہے جو اچھے بُرے اعمال کو کھول کر پیش کرتی ہے خوبیوں کی ترغیب دیتی ہے اور برائیوں سے روکتی ہے اور حکمت نظری یہ کہ شکوک اور برے اعتقاد کے لیے نسخہ شفا ہے حق و یقین کے لیے رہنمائی کا کام دیتی ہے اور باعتبار نتائج اہل ایمان کے لیے رحمت ہے۔

علامہ خفاجی نے حاشیہ بیضاوی میں لکھا ہے کہ۔

"یہ کتاب عملیات اور نظریات کا ایک جامع ہے کمال عمل اور کمال علم دونوں اس میں موجود ہیں"

علامہ آلوسی بغدادی فرماتے ہیں:

"مطلب یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک فوائد اور منافع پر مشتمل جامع کتاب آئی ہے یہ اچھے اور برے اعمال کو کھول کر بتاتی ہے۔ اچھے اعمال کی ترغیب دیتی ہے بُرے اعمال سے روکتی ہے معارف حقہ کو بیان کرتی ہے اور راہ حق و یقین کے لیے رہنما ہے، اور نتائج کے اعتبار سے اہل ایمان کے لیے رحمت ہے کہ کفر سے بچا کر ایمان کی نعمت سے مالا مال کرتی ہے۔

یہ مشہور شارحین قرآن ہیں جن کی تشریحات ہدیہ ناظرین کی گئی ہیں دوسرے شارحین قرآن مثلاً علامہ نیشاپوری علامہ السیوطی۔ علامہ مراغی ان کی تشریحات کا خلاصہ بھی اس کے قریب

قریب ہے۔
آیئے اب اردو شارحین قرآن کی زبانی بھی اس آیت کی تشریح سے لطف اندوزی فرمایئے۔ حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز فرماتے ہیں:۔

"اے لوگو تمہارے پاس تمہارے رب کی طرف سے ایک ایسی چیز آئی ہے جو برُے کاموں سے روکنے کے لیے نصیحت ہے اور اگر اس پر عمل کرکے برُے کاموں سے بچیں تو دلوں میں جو برُے کاموں سے روگ لگ جاتے ہیں ان کیلئے شفا ہے اور نیک کاموں کے کرنے کے لیے رہنمائی کرنے والی اور اگر اس پر عمل نیک کاموں کو اختیار کریں تو رحمت اور ذریعہ ثواب ہے اور یہ سب برکات اہل ایمان کے لیے ہیں"۔

حضرت مولانا محمد شفیع مفتی رحمہ اللہ نے بھی یہی تشریح کی ہے معارف ومسائل میں وہ اس آیت کی تشریح کرتے ہوئے تعویذات وغیرہ کی وادی میں چلے گئے ہیں۔

حضرت مولانا ابوالکلام آزاد نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے فرماتے ہیں:
"اس آیت میں قرآن کے چار وصف بیان کئے۔

(ا) موعظت یعنی دل میں اتر جانے والی دلیلوں اور روح کو متاثر کرنے والے طریقوں سے ان تمام باتوں کی ترغیب دیتا ہے جو خیر وحق کی باتیں ہیں اور ان تمام باتوں سے روکتا ہے جو شر اور بطلان کی باتیں ہیں کیونکہ عربی میں وعظ کا مفہوم صرف نصیحت ہی نہیں بلکہ ایسی نصیحت جو موثر دلائل اور دل نشین اسلوبوں کے ساتھ کی جائے۔

(ب) شفاء لما فی الصدور دل کی تمام بیماریوں کے لیے نسخہ شفا ہے جو فرد اور جو گروہ بھی اس نسخہ پر عمل کرے گا ان کے قلوب ہر طرح کے مفاسد ورذائل سے پاک ہوجائیں گے۔ مطلب یہ ہے کہ انسان کی فکری اور اخلاقی حالت کے جس قدر امراض ہیں ان سب کے لیے یہ نسخہ شفا ہے۔

(ج) یقین کرنے والوں کے لیے ہدایت ہے۔

(د) یقین کرنے والوں کے لیے پیام رحمت ہے یعنی ظلم وغارت اور

بغض و تنفر سے دنیا کو نجات دلانا اور رحم و محبت اور امن و سلامتی کی روح سے معمور ہے"۔

مولانا عبد الماجد دریابادی نے اپنے تشریحی نوٹ امام رازی کا وہ اقتباس نقل کیا ہے جو علامہ الوسی نے روح المعانی میں پیش کیا ہے۔ اس کے بعد ایک عام سی تشریح کی ہے۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی معارف القرآن میں لکھتے ہیں

اے لوگو! تمہارے پاس تمہارے پروردگار کی طرف سے ایک نصیحت آچکی ہے یعنی قرآن حکیم جو تم کو برے کاموں سے روکتا ہے اور نفرت دلاتا ہے اور ان کے برے انجام سے تم کو ڈراتا ہے اور اچھے کاموں کی ترغیب دلاتا ہے اور ایک شفا اور دوا آئی ہے جو سینوں کی بیماریوں کو دور کرنے کے لیے بے حد مفید ہے یعنی قرآن دلوں کی مہلک بیماریوں جہالت ضلالت عقائد فاسدہ شکوک و شبہات اور اخلاق از ہر سے جو روح کے لیے مہلک ہیں شفا بخشتا ہے اور ایمان والوں کے لیے ہدایت و رحمت آچکی ہے یعنی یہ قرآن ایمان والوں کے لیے ہدایت ہے کہ ان کو خدا تک پہنچنے کا راستہ بتاتا ہے اور اپنے پیروؤں کو خدا کی رحمت اور عنایت کا مورد بناتا ہے"۔

حضرت مولانا پیر محمد کرم شاہ ایم اے ازہر لکھتے ہیں۔

اس آیت طیبہ میں قرآن کریم کے فیوض و برکات کا ذکر فرمایا جا رہا ہے موعظت بڑے اخلاص سے نہایت اثر انگیز پیرائے میں کسی کو نیکی اور بھلائی کی یاد دہانی کو موعظت کہتے ہیں وقال الخلیل ھو التذکیر بالخیر فیما یرق له القلب اس مفہوم کو پیش نظر رکھتے ہوئے قرآن حکیم کی اس صفت کا جائزہ لیجئے۔ خیر خواہی اور خیر اندیشی کا بے لوث جذبہ ہر آیت میں آپ کو نظر آئے گا جس کی اثر انگیزی کا عالم یہ ہے کہ اس نے صدیوں سے آغوش میں مدہوش ہونے والی قوم کو بیدار کر دیا۔ قرآن کی دوسری صفت یہ ہے کہ وہ سینوں کی لا علاج اور پرانی بیماریوں کا کامیاب علاج ہے بغض و عناد رشک اور نفاق حسد اور کینہ غرضیکہ ہر قسم کی مذموم صفات سے روح کو پاک کرتا ہے تیسری صفت یہ ہے کہ یہ سراپا ہدایت ہے حق و باطل کو

نکھار کر پیش کرتا ہے کسی قسم کا التباس نہیں رہتا اور حق کا متلاشی راہ ہدایت کو اپنے سامنے منور پاتا ہے چوتھی صفت یہ ہے کہ وہ پیکر رحمت ہے جس کتاب مقدس کا لانیوالا رحمۃ للعالمین ہو اس کتاب کے رحمت مجسم ہونے میں کیسے شبہ ہو سکتا ہے"۔

مولانا امین احسن اصلاحی تدبر قرآن میں فرماتے ہیں۔

یہاں قرآن کی چار صفتیں بیان ہوئی ہیں ایک یہ کہ یہ تمہارے رب کی جانب سے موعظت ہے یعنی جن خطرات و مہالک سے لوگوں کو بچنا چاہیے ان سے آگاہی اور جو لوگ آنکھ بند کئے ان کی طرف بڑھے چلے جا رہے ہیں ان کو زجر و تنبیہ۔ دوسری یہ شفاء لما فی الصدور ہے یعنی دلوں کو جو روگ لگے ہیں۔ اور جن کے سبب سے تمام انسانی اوصاف کھو کر مختوم القلب اور حیوانات سے بدترین بن جاتا ہے ان سب کا اس میں علاج ہے۔ تیسری اور چوتھی صفت یہ کہ یہ ہدایت و رحمت ہے۔ اس دنیا میں قرآن ہدایت ہے جو لوگ اس ہدایت کو قبول کرلیں گے ان کے لیے آخرت میں ابدی رحمت کی ضمانت ہے۔

افسوس مولانا مودودی نے تفہیم القرآن میں اس آیت کی تشریح پر ایک حرف بھی نہیں ورنہ ہم ناظرین معالم کی ضیافت طبع کے لیے ان کی تشریح کو بھی ضرور پیش کرتے۔

یہ قدیم اور جدید شارحین قرآن کی تشریحات ہیں۔ اب یہ آپ کے صوابدید پر موقوف ہے کہ سیاق و سباق اور موضوع سخن کے اعتبار سے آپ کسے پسند کرتے ہیں۔

ظاہر ہے کہ موضوع قرآن کی حقیت کو ثابت کرنا ہے اور شروع ہی سے یہ موضوع چلا آ رہا ہے اسی کی لاریبیت کا اعلان ہو رہا ہے اس میں نبوت کی جانب سے رد و بدل کو ناممکن قرار دیا جا رہا ہے۔ اسی کے لیے یہ چیلنج دیا جا رہا ہے فاتوا بسورۃ من مثلہ اور اس کے حق ہونے پر اللہ کے پیغمبر کو قسم کھانے کا حکم رہا ہے۔ اب اس آیت میں اسی کی جامعیت کا اعلان ہو رہا ہے اور پوری انسانیت کو پکار کر اعلان ہو رہا ہے کہ اس قرآن میں موعظت ہے بیماریوں کی شفا ہے اہل ایمان کے لیے زندگی میں رہنما ہے اور اس کی رہنمائی میں زندگی گذارنے والوں کے لیے سراپا رحمت ہے

جامع ہونے کے ساتھ کمال

۵۸ آپ فرما دیجئے کہ اللہ ہی کے فضل اور اس کی رحمت ہی پر بس ان کو خوشی منانی چاہیے
یہ ان ساری چیزوں سے اچھی ہے جن کو وہ ذخیرہ کرتے رہتے ہیں فرح خوش ہونا محمود بھی ہے
اور مذموم بھی کسی نعمت پر اس حیثیت سے خوش ہونا کہ اللہ کے فضل و رحمت سے ملی ہے
محمود ہے جیسے یہاں فرمایا فبذلک فلیفرحوا اور حطام دنیا پر خوش ہونا اور اکڑنا
خصوصاً یہ خیال کر کے کہ ہم کو اپنی لیاقت سے حاصل ہوتی ہے سخت مذموم ہے۔ قارون
اپنے مال و دولت کی نسبت کہتا تھا انما اوتیتہ علی علم عندی اس کو فرمایا
لا تفرح ان اللہ لا یحب الفرحین وابتغ فیما اتاک اللہ الدار الاخرۃ
ولا تنس نصیبک من الدنیا۔ یعنی اصل چیز اللہ سبحانہ کا فضل و رحمت ہے انسان کو
اسی کی تلاش کرنی چاہیے مال و دولت جاہ وحشم سب اس کے مقابلے میں ہیچ ہیں[1]
فرح کے معنے صرف خوش ہونے کے نہیں بلکہ اس پر فخر کرنا، اترانا اور گھمنڈ کرنے
کے ہیں حکم ہو رہا ہے کہ اے پیغمبر اعلان کر دو کہ لوگو تم اللہ کے فضل اور اللہ کی رحمت
سے مالا مال ہوئے ہو تمہیں اس پر پورے عالم میں فخر کرنا چاہیے، گھمنڈ کرنا چاہیے،
لوگ سونے اور چاندی کے ڈھیروں پر اتراتے ہیں، سامان زندگی پر فخر کرتے ہیں جو
دولت تمہیں اللہ سبحانہ کی جانب سے ملی ہے یہ اس دولت سے کہیں بہتر ہے جو لوگوں
کی تجوریوں میں جمع ہے۔ دو لفظ بولے ہیں ایک اللہ کا فضل دوسرے اللہ کی رحمت
فضل کہتے ہیں ان خوبیوں کو جو انسان کی ذات میں ایسا جلا پیدا کر دیں جس سے دوسرے
متاثر ہوں اور رحمت نام اس شرف کا جو آدمی کو بغیر محنت کے خود بخود حاصل ہو۔ نبوت
کا علم سرتا سر رحمت ہے کیونکہ وہبی ہے اور عمل اللہ کا فضل ہے کیونکہ محنت اور مشقت
کے ذریعے حاصل ہوا ہے قرآن نے خود قرآن کو رحمت اور قرآن پر اٹھے ہوئے عمل کو
فضل کہا ہے الا رحمۃ من ربک ان فضلہ کان علیک کبیراً گویا اگر علم
تھیوری اور نظریہ ہے تو فضل اسی علم کا پریکٹیکل اور عملی نمونہ ہے۔ اس آیت میں بتایا

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے کہ وحی کے ذریعے آیا ہو قرآن اگر اللہ سبحانہ کی رحمت ہے تو اسی کے نتیجے میں آپ کی محنتوں، مشقتوں کے نتیجے میں آپ کے دامن میں عمل کا ظہور صرف اللہ کا فضل نہیں بلکہ فضل کبیر ہے علم میں اگر شان اعجاز ہے تو عمل میں شان تعبد ہے علم اگر پڑھنے کی چیز قرآن ہے تو عمل برتنے کی چیز سنت ہے اقرآن ہی میں ہے۔

ولولا فضل اللہ علیکم ورحمتہ لاتبعتم الشیطان الا قلیلاً۔

"دیکھو اگر تم پر اللہ کا فضل اور اللہ کی رحمت نہ ہوتی تو کچھ کے سوا سارے ہی شیطان کے پیچھے لگ جاتے"۔

یعنی ان دو کے ذریعے اللہ نے تمہیں ہدایت دی ہے اب کھلے لفظوں میں رحمت اگر نبوت ہی کا علم ہے جسے ہم قرآن کہتے ہیں تو فضل نبوت ہی پیش کردہ عمل ہے جسے ہم سنت کہتے ہیں۔

ان دونوں میں باہمی رشتہ

فضل ورحمت میں باہم ربط کیا ہے آیئے قرآن ہی کی روشنی میں اس علم و عمل میں باہم رشتہ بھی معلوم کریجیے۔ قرآن ہی نے بتایا ہے کہ نبوت کا لایا ہوا علم قرآن اگر ما انزل اللہ علیک ہے تو نبوت کا قرآن پر عمل اور علم کا پرتو اور نقش ما اراک اللہ ہے۔ گویا علم اگر آئیڈیا ہے تو آپ کی زندگی آئیڈیل روایت ہے۔ اس لیے ان دونوں کو ایک دوسرے سے جدا نہیں کیا جاسکتا۔ ان میں باہم اگر کچھ فرق ہے تو لائف نامہ اور پیام کا فرق ہے۔ قرآن اگر نامہ ہے تو آپ کی زندگی اللہ کا پیام ہے۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ نبوت محمد یہ اسلام کے نام پر جو سرمایہ لے کر آئی ہے وہ سب اللہ کی جانب سے اور دونوں امت کو بطریق تواتر ملے ہیں فرق صرف یہ ہے کہ قرآن کا تواتر کتابی اور تلاوتی ہے اور عمل کا تواتر عملی ہے۔

پہلی آیت میں جامعیت کا اعلان ہوا ہے کہ قرآن ایک جامع قانون ہے کیونکہ یہ روحانی، اخلاقی عائلی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی نظاموں کا جامع ہے اس آیت میں بتایا جارہا ہے کہ صرف جامع نہیں بلکہ کامل بھی ہے کیونکہ یہ صرف آئیڈیا ہی نہیں

بلکہ اپنی ساتھ آئیڈیل لائف بھی لے کر آیا ہے۔ اگر صرف آئیڈیا ہوتا تو جامع تو ہوتا مگر کامل نہ ہوتا اب نبوت کی عملی زندگی لے کر قرآن جامع بھی ہے کامل بھی ہے چونکہ یہ جامع اور کامل نعمت تمہیں ملی ہے اس لیئے تمہیں اس پر اترانا چاہیے اور اقوام دنیا کے سامنے اترانا چاہیے۔

برہان فضل اور برہان رحمت

رحمت برہان علم کو انسانیت میں اجاگر کرنے کے لیے علم کا نزول حوادث دوقائع کے تحت بتدریج ۲۳ سال کے عرصہ میں ہوا۔ اگر یہ حقیقت ہے اور حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جب کہ سینہ قرآن سے ابلی ہوئی صدا ہی ہے۔

لولا نزل علیه القران جملة واحدة کذالك لنثبت به

کیوں نہیں اتارا گیا اس پر قرآن یکبارگی۔ اسی طرح ہوا ہے تاکہ ہم جمائے رکھیں اس کے ذریعے تیرے دل کو۔

اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے کہ قرآن اس لیے آہستہ آہستہ نازل ہوا ہے کہ اعمال و مظاہر کی تشکیل ساتھ ساتھ ہو کر حقائق پوری طرح دل میں جم جائیں۔

جب علم کے ہر گوشہ کی پشت پر ایک مقررہ نظام عمل کے مظاہر موجود ہوں تو قدرتی طور پر ہر شخص کو متمتع ہونے کا موقعہ مل سکتا ہے اور ہر آنکھ دیکھ سکتی ہے کہ علم کے ساتھ عمل بار حمت کے ساتھ فضل کی کارفرمائیاں کام کر رہی ہیں چنانچہ وہ تمام اعمال نبوت جن میں مقام نبوت کے افادہ وفیضان اور زینت و جمال کا ذکر کیا گیا ہے۔ دراصل اسی استدلال پر مبنی ہیں اس کی وجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ صرف نظریاتی طاقت سے دنیا میں اس وقت تک کوئی مؤثر تبدیلی نہیں آتی ہے جب تک نظریات کی پشت پر عمل کردار کی قوت نہ ہو۔ اگر صرف نظریات میں افادی طاقت ہوتی تو کتاب کے ساتھ نبی کی شخصیت نہ ہوتی اور اگر محض عمل ہی میں اصلاح کی ضمانت ہوتی تو نبوت کے ساتھ علم نہ ہوتا امر واقعہ یہ ہے کہ علم بغیر عمل کے اور عمل بغیر علم کے یا نظریہ بغیر واقعہ کے اور واقعہ بغیر نظریہ کے اصلاح و تفسیر کی راہ میں ادھوری اور نامکمل ہدایت ہے۔ ہدایت کے کمال کے لیے ضروری ہے کہ علم و عمل کی دونوں قوتیں موجود ہوں۔

جیسے علم کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ اس میں بھرپور صداقت ہو ایسے ہی عمل کی سب سے بڑی اور اچھائی یہ ہے کہ اس میں حسن ہی حسن ہو۔ اسی لیے قرآن میں علم نبوت کے لیے صداقت اور عمل نبوت کے لیے حسن کی تعبیر آئی ہے۔

گویا نبوت نے دنیا کو جو کچھ دیا ہے وہ سچے علمی حقائق اور حسین و خوبصورت عملی نظام کے سوا کچھ نہیں ہے۔ اور کیوں نہ ہو جب کہ یہ حقیقت ہے کہ نبوت اللہ سبحانہ کی نمائندگی کا نام ہے اللہ کی ذات اگر مجمع الکمالات ہے تو ضروری ہے کہ نبوت مجمع الکمالات ہو۔ علم کی حد تک اگر قرآن حکیم ایک جامع قانون ہے تو اس کے نقش کو بھی مجمع ہونا چاہیے تاکہ دونوں کی ہم آہنگی سے بھرپور تکمیل ہو۔

یہ اگر واقعہ ہے تو اس پر خوشی کیوں نہ منائی جائے اور اقوام دنیا کے سامنے کیوں نہ اس پر فخر کیا جائے۔ اوروں کا پتہ نہیں ہے مگر میں تو یہی سمجھتا ہوں کہ اسلام میں دو عیدیں اسی فضل و رحمت پر خوشی منانے کے مطالبے کے لیے عملی شاہکار ہیں۔ میری مراد عید الفطر اور عید الاضحیٰ ہے۔

افترائی قانون سازی

۵۹ اے اللہ کے رسول ان سے کہو لوگو کیا کبھی تم نے اس پر غور کیا ہے کہ جو روزی اللہ نے تمہیں دی ہے پھر تم نے اس میں حرام و حلال بنا لیا ہے اے پیغمبر ان سے کہو کہ کیا تم کو ایسا کرنے کا اللہ نے حکم دیا ہے یا تم اللہ پر بہتان باندھ رہے ہو۔ یعنی قرآن جو نصیحت شفا اور ہدایت و رحمت بن کر آیا ہے وہی استناد و تمسک کے لائق ہے۔ احکام الٰہیہ کی معرفت اور حلال و حرام کی معرفت اسی سے ہو سکتی ہے۔ یہ کیا واہیات ہے کہ اللہ سبحانہ نے تو تمہارے انتفاع کیلئے ہر قسم کی روزی پیدا کی پھر تم نے محض اپنی ارادے سے اس میں سے کسی چیز کو حلال کسی کو حرام ٹھہرا لیا۔ بھلا تحلیل و تحریم کا تم کو کیا حق ہے کیا تم یہ کہنے کی جرأت کر سکتے ہو کہ اللہ نے ایسا کرنے کا حکم دیا ہے یا یوں ہی اللہ پر افترا کر رہے ہو۔ اگلی آیت میں صاف اشارا کر دیا کہ بجز افترا علی اللہ کے اور کچھ نہیں جن چیزوں کو حلال و حرام کیا تھا ان کا مفصل تذکرہ سورہ مائدہ اور انعام میں گذر چکا ہے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

پہلی آیت میں قانون الٰہی کا چہرہ پیش کیا گیا تھا اور بتایا گیا تھا کہ قانونی نظام کے سارے اجزا جس مرکز سے حرکت اور زندگی حاصل کرتے ہیں وہ صرف اللہ سبحانہ کی حاکمیت ہے معاشرے کے سارے اعتقادات اور سارے اعمال و افکار اللہ سبحانہ کے بارے میں تصور آمریت پر استوار ہیں۔ انسانیت کے تمام خارجی ادارے اور تمام نظامات اسی ایک مصدر سے مشتق ہیں۔ مملکت کا قانونی نظام، معاشرے کا اخلاقی ضابطہ اعمال و فرائض کی ساری شاخیں غرض کہ انسانی زندگی کا ہر معمولی سے معمولی جزو بھی بالواسطہ اور بلاواسطہ اسی مرکز سے ہے اور یہ بالکل بدیہی عقلی بات ہے جو خالق ہے وہی آمر ہے ما انزل اللہ لکم من رزق میں رزق صرف رزق کے معنے میں نہیں بلکہ دین کے معنے میں بھی ہے بہرحال واقعہ بھی ہے اور اظہار حق بھی الا لہ الخلق والامر یعنی جس نے یہ کائنات بنائی ہے اس کے ہر گوشہ میں اسی کا امر ہے قرآن کا مخاطب ان سب باتوں کو مانتا ہے ان سے دریافت کیا جارہا ہے کہ یہ جو تم نے ہماری دی ہوئی نعمتوں میں تحریم و تحلیل کی قانون سازی کر رکھی ہے اس کے بارے میں تمہاری کیا رائے ؟ یہ تم نے خود کر رکھی ہے یا اللہ نے ایسا کرنے کی تمہیں اجازت دی ہے۔ اگر اللہ کی جانب سے ہے تو اس کا ذریعہ کیا ہے وحی و نبوت کا تم انکار کرتے ہو۔ اس کے سوا کچھ نہیں کہ تم اللہ کے نام پر جھوٹ کی دکان چلا رہے ہو تم نے اپنی رائے اور اپنے گمان سے یہ بے پر کی اڑا دی ہے کہ یہ حرام ہے اور یہ حلال ہے تمہیں کچھ پتہ بھی ہے کہ یہ کتنا سخت باغیانہ جرم ہے جو تم کر رہے ہیں جو کچھ نعمتیں ہیں وہ اللہ کی ہیں اور تم خود اللہ کے ہو یہ حق آخر تمہیں کس نے دیا ہے کہ اللہ کی املاک میں اتنے تصرف استعمال اور انتفاع کے لیے خود قانونی قدغنیں قائم کرو اگر کوئی مملوک یہ دعویٰ کرے کہ مالک کی املاک میں تصرف کی حدیں مقرر کر لینے کا اسے خود حق ہے تو اس کے متعلق تمہاری رائے کیا ہے تم خود مان رہے ہو کہ اللہ کی مخلوق ہو اور یہ بھی مانتے ہو کہ جو کچھ بھی ہے اللہ کا ہے اور پھر اس اللہ کی دی ہوئی نعم[illegible]ں میں تصرف کے حدود و قوانین بنانے ہو اور مالک سے پوچھنا ہی نہیں چاہتے ہو۔ تحلیل و تحریم کے بارے میں تمہارے خود ساختہ اس وقت صحیح ہو سکتے ہیں جب اللہ سبحانہ نے تمہیں ایسا کرنے کی اجازت دی ہو سوال یہ ہے کہ واقعی تمہارے پاس کوئی ایسی دستاویز ہے کہ اللہ نے تمہیں ایسا کرنے کی اجازت دی ہے اور ایسا یقیناً نہیں ہے کیونکہ تم وحی و نبوت کو مانتے ہی نہیں ہو اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ

تم ہماری بغاوت پر کر رہے ہو کہ خود تحلیل و تحریم کی حد بندیاں قائم کر رہے اور ہمارے نام پر کر رہے ہو یہ مزید جھوٹ اور افترا پردازی کر رہے ہو۔

آیت کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لیے قانون سازی کا حق صرف اللہ کا ہے۔ کسی بھی انسان کو یہ حق نہیں کہ وہ انسانوں کے لیے شارع بن بیٹھے۔ ان کا سنگین جرم یہ ہے کہ تحریم و تحلیل کی قانون سازی کر کے انسانوں پر خدائی قائم کر رہے ہیں اور اللہ کی مخلوق میں یہ جرم بغاوت ہے اس جرم کی سزا کس قدر سنگین ہے؟ اس کا ذکر آگے آ رہا ہے

باغیانہ فرد جرم کی سزا

سلکھ اور ان لوگوں کا کیا خیال ہے قیامت کے بارے میں جو اللہ پر جھوٹ بول کر افترا پردازی کرتے رہتے ہیں بلاشبہ اللہ سبحانہ لوگوں پر بڑا ہی مہربان ہے لیکن لوگوں کی اکثریت ناشکر گذار ہے یعنی یہ لوگ روز قیامت کے متعلق کیا خیال کر رہے ہیں کہ کیا معاملہ ان کے ساتھ ہو گا سخت پکڑے جائیں گے یا سستے چھوٹ جائیں گے۔ عذاب یقیناً بھگتنا پڑے گا یا نہیں کن خیالات میں پڑے ہیں۔ یاد رکھیں جو دردناک سزا ملنے والی ہے وہ ٹل نہیں سکتی۔ یہ دوسری بات ہے کہ اللہ سبحانہ دنیا میں بہت کچھ مہلت دیتا ہے بہت تقصیرات سے درگزر کرتا ہے لیکن بہت سے لوگ نرمی اور اغماض کو دیکھ کر بجائے شکر گذار ہونے کے اور زیادہ دلیر اور بے خوف ہو جاتے ہیں آخر سزا دینی پڑتی ہے۔

علم حق با تو مواسا با کند   چوں تو از حد گذری رسوا کند[۱]

علامہ بقاعی نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے کہ ان افترا کرنے والوں کی افترا پردازی کے لیے کوئی دستاویزی سہارا نہ تھا اس لیے فرمایا کہ قیامت جس کا آنا یقینی ہے اس کے بارے میں ان کا کیا خیال ہے یہاں تو اپنے کردار پر تمہیں شرم نہیں آتی اور دنیوی سزا کا تمہیں کوئی اندیشہ نہیں ہے لیکن قیامت کے بارے میں تمہاری کیا رائے ہے کیا تمہارا اس دن کا محاسبہ نہ ہو گا کیا تمہارا رب و مالک تمہیں سزا نہ دے گا

لہ افادات شیخ الاسلام

دنیا اس کے معاملہ سے دھوکہ میں پڑ گئے اور اس کی یہاں شان حلیمی کو دیکھ کر سمجھ رہے ہو کہ تمہارے جرائم کی تم کو کوئی سزا نہ ملے گی۔ دنیا میں تو اللہ سبحانہ کے مخلوق پر انعامات ہی انعامات ہیں۔ یہاں اپنی رضا بتانے کے لیے وہ رہنمائی کرتا ہے رسول روانہ کرتا ہے وہ کتابیں نازل کرتا ہے۔ یہاں لوگوں کو مہلت پر مہلتیں ملتی رہتی ہیں۔ لیکن اکثر لوگ اللہ سبحانہ کے اس انعام کی کوئی قدر نہیں کرتے ہیں کتابیں اور رسولوں کی پیروی نہیں کرتے ہیں وہ کردار اختیار کرتے ہیں جو اللہ کی ناراضگی کا باعث بنتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ آیت میں افترا علی اللہ کذبا کے جرم کی انتہائی شناعت کا اظہار ہے سوال کیا ہے کہ جو لوگ اللہ پر جھوٹ لگا رہے ہیں قیامت کے دن ان کا کیا گمان ہے؟ جواب دیئے بغیر بات ختم کر دی ہے جو متکلم کے انتہائی غضب کی دلیل ہے یعنی کیا یہ شامت زدہ لوگ اس جرم عظیم کو کوئی معمولی بات سمجھے بیٹھے ہیں قیامت آئے گی تو پتہ چلے گا کہ اس جسارت کی کیا سزا ملتی ہے۔ اور ان اللہ لذو فضل کا مطلب یہ ہے کہ ان کا یہ باغیانہ جرم ایسا سنگین ہے کہ لوگوں کے بڑے بڑے جرائم کے باوجود ان کو مہلت بھی دیتا ہے اور ان کو اپنے رزق و فضل سے بھی محروم نہیں کرتا کہ اگر وہ اپنے جرم کی تلافی اور توبہ و اصلاح کرنا چاہیں تو کر لیں لیکن لوگوں کی اکثریت کا حال یہی ہے کہ وہ شکر گذار نہیں ہوتے بلکہ اس ڈھیل اور درگذر سے ان کی حماقت اور شرارت میں اضافہ ہی ہوتا جاتا ہے۔

آیت قرآنی کا منطوق تو یہی ہے کہ اللہ کے بندوں کے لیے تحریم و تحلیل کی قانون سازی باغیانہ جرم ہی نہیں بلکہ ناقابل معافی مشرکانہ عمل ہے یہ خدا کے مقابلے میں خدائی کا دعویٰ ہے۔ کسی چیز کو قانونی طور پر حرام قرار دینے کا حق صرف اللہ سبحانہ کو ہے کسی انسان کو یہ حق حاصل نہیں کہ محض وہم و گمان کی بنا پر کوئی چیز حرام قرار دے۔ انسان کے عقائد و اعمال کی بنیاد علم و یقین پر ہونی چاہیے نہ کہ وہم و گمان پر قرآن مشرکین کی بنیادی گمراہی یہی قرار دیتا ہے کہ علم و یقین کی کوئی روشنی اپنے سامنے نہیں رکھتے محض اوہام و ظنون کے پرستار ہیں۔

اللہ سبحانہ کی جانب سے کسی چیز کو حرام صرف دو راہوں سے قرار دیا جا سکتا ہے یعنی قرآن کے نزدیک انسانی زندگی کے لیے قانون سازی کے دو ہی طریقے ہیں ایک استنباط دوسرے اجتہاد۔ ان دو کے علاوہ جو قانون سازی کی جائے گی اس کی بنیاد ظن و خیال اور اوہام و خرافات پر ہوگی حتیٰ کہ علما نے تصریح کی ہے کہ قانون کی اساس اولیا کا الہام بھی نہیں ہو سکتا ہے۔

وَمَا تَكُونُ فِي شَأْنٍ وَّمَا تَتْلُوا مِنْهُ مِنْ
قُرْاٰنٍ وَّلَا تَعْمَلُوْنَ مِنْ عَمَلٍ اِلَّا كُنَّا عَلَيْكُمْ شُهُوْدًا اِذْ
تُفِيْضُوْنَ فِيْهِ ؕ وَمَا يَعْزُبُ عَنْ رَّبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ
فِي الْاَرْضِ وَلَا فِي السَّمَآءِ وَلَآ اَصْغَرَ مِنْ ذٰلِكَ وَلَآ اَكْبَرَ
اِلَّا فِيْ كِتٰبٍ مُّبِيْنٍ ﴿۶۱﴾

اے اللہ کے رسول آپ کی کوئی حالت اور آپ کے قرآن کی تلاوت بھی اور لوگو تمہارے اعمال میں سے کوئی عمل بھی جب تم اس میں مصروف ہوتے ہو ایسا نہیں ہے کہ ہم سے اوجھل ہو۔ آسمان و زمین میں کوئی چیز بھی ذرہ کے برابر تیرے رب کے علم سے غائب نہیں ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی، اور بڑی سے بڑی چیز ایک واضح کتاب میں درج ہے۔[۴]

مفردات کے معانی

تفیضون افاضہ سے مضارع کا جمع مذکر حاضر ہے مادہ فیض ہے جو باب ضرب

سے خاص بفیض آتا ہے جس کے معنے بہنے اور جاری ہو سکتے ہیں اسی سے افاضہ کے معنے گھسنے اور کسی کام میں لگنے کے ہیں۔ اس کا استعمال جب باتوں کے متعلق ہوتا ہے تو باتوں میں خوض کرنے اور مشغول ہونے کے ہوتے ہیں۔

یعذب باب نصر اور ضرب دونوں سے آتا ہے اس کے معنے دور ہونے اور غائب ہونے کے ہیں۔ جو شخص ملک سے دور نکل جاتا ہے اسے عذب کہتے۔ کنوارے کو بھی عزب کہتے ہیں اس کی جمع اعزاب آتی ہے۔

کتاب مبین کھلی اور واضح کتاب قرآن کی اصطلاح میں کسی بات کے ٹھہرا دینے اور قطعی طور پر نافذ کر دینے کو کتابت کہا جاتا ہے جیسے کتب علیکم الصیام۔

قرآن قطعی اور غیر مشتبہ علم ہے

دنیا کے دوسرے قوانین سے قرآن کی سب سے بڑی اور فوق البشر خصوصیت اس کا علم قطعی اور یقینی ہے۔ قرآن کی اس خصوصیت میں کوئی انسانی کلام اور کوئی انسانی قانون قرآن کے ساتھ شریک نہیں ہے اور نہ ہو سکتا ہے اس لیے کہ قرآن کا سرچشمہ اور ماخذ علم الٰہی ہے، یہ سرچشمہ ہر قسم کے عیب و نقصان شک و اشتباہ، ظن و تخمین، تدریج و ترقی اور تعارض و اختلاف سے پاک ہے اس میں جو کچھ ہے وہ یقینی ہے۔ مشاہدہ اور مرئی ہے یکساں اور آخری ہے اللہ کا علم تدریجی اور ترقی پذیر نہیں ہے اس کا علم اس کی دوسری صفات کی طرح ابدی اور دائمی ہے اس کا علم پورے طور پر حاوی اور محیط ہے۔ اس کو غیر محسوس اور غیر مادی چیزوں کا بھی علم ہے اور اس کے علم سے کائنات کا کوئی ذرہ خارج نہیں ہے قرآن اللہ کے علم سے ماخوذ ہے اس لیے وہ اس کی خصوصیات کی حامل اور اس کا مظہر ہے۔

اس کے مقابلے میں انسانی قوانین کو دیکھئے ان کا سرچشمہ بے عیب نہیں اس کا ماخذ اور ان کی بنیاد اکثر ظن و قیاس ہے۔ اس کے ذرائع علم بھی نہایت محدود ہونے کے باوجود کمزور ہوتے ہیں۔ انسان کے پاس علم کے لیے سب سے بہتر ذریعہ اس کے حواس خمسہ ہیں جو علم ان کے ذریعہ سے حاصل ہوتا ہے وہ بدیہی ہے۔ عقلیات میں بھی انسان کے علم کی بنیاد دراصل محسوسات ہی ہیں ان ہی علوم و ادراکات کو انسان مقدمہ بنا کر ایسا نتیجہ نکالتا ہے جو اس کو حواس کے ذریعہ پہلے سے معلوم نہیں تھا۔ اور عقل کا حال یہ ہے کہ اس کے مدارج

ہیں بے انتہا تفاوت ہے پھر اس سب کے بعد بھی انسان کا علم اپنے محدود دائرے میں پورے طور پر حاوی اور کامل نہیں ہے۔ پھر اس کے علم میں تدریج اور اس کی معلومات میں ترقی ہے۔ اس طرح قانون سازی اور سیاسی، معاشرتی اور اخلاقی نظام کی تشکیل میں وہ غلطی کرے گا۔ ایک ماخذ نہ ہونے کی وجہ سے مختلف نظاموں اور قوانین کا تصادم ہوگا۔ قانون قانون سے ٹکرائے گا۔

ان تمام خرابیوں کا سرچشمہ انسان کا علم ہے جو ناقص اور ظنی ہے اس کے مقابلے میں اللہ کا علم قطعی اور یقینی ہے اس کی پہنائیوں کی آخری حد نہیں۔ انسانوں کو ہی صرف نہیں جانتا ہے بلکہ انسانوں کے سارے اطوار، سارے اقوال اور انسانی زندگی کے سارے اس کی علمی گرفت میں ہیں بلکہ عالم زیریں اور عالم بالا کی کوئی ذرہ برابر چیز بھی ایسی نہیں جس پر اس کی علمی دسترس نہ ہو اور اس سے بڑھ کر یہ کہ ہر چیز لباده وجود پہننے کے بعد چھوٹی ہو یا بڑی ضبط تحریر میں ہے۔

سوچنے کی بات ہے کہ انسانی زندگی کے لیے کونسا قانون پائدار ہو سکتا ہے وہ جس کی بنیاد ظن وتخمین پر ہے یا وہ جو علم ویقین کی اساس پر قائم ہے۔

لکھ اے اللہ کے رسول آپ کی کوئی حالت اور آپ کی تلاوت قرآن اور اے لوگو! تمہارے اعمال میں سے کوئی عمل بھی جب اس میں مصروف ہوتے ہو ایسا نہیں ہے کہ ہم سے اوجھل ہو۔ آسمان وزمین میں کوئی ایسی چیز بھی ذرے کے برابر تیرے رب کے علم سے غائب نہیں ہے۔ چھوٹی سے چھوٹی اور بڑی سے بڑی چیز ایک واضح کتاب میں ہے پہلے قرآن حکیم کے اوصاف بیان کئے تھے کہ وہ سراپا نور ہدایت، شفائے قلوب نعمت عظمیٰ اور رحمت کبریا ہے۔ پھر اشارہ کیا کہ ہدایت وبصیرت کی ایسی صاف روشنی کو چھوڑ کر لوگ اپنے خیالات واوہام کے اندھیرے میں بھٹکتے پھرتے ہیں۔ اور اللہ سبحانہ پر افترا کر کے اس کے فضل وانعام کی ناقدری کرتے ہیں۔ اس آیت میں متنبہ کیا کہ لوگ کس حال میں ہیں اور پیغمبر علیہ السلام کی کیا شان ہے آپ شب وروز مالک حقیقی کی وفاداری اور ہمدردی خلائق کی جن مشئون عظیمہ کے مظہر بنتے ہیں خصوصاً آپ کی جو امتیازی شان قرآن کریم کے پڑھنے اور پڑھانے کے وقت ظاہر ہوتی ہے یعنی قرآن کے ذریعے سے آپ جو جہاد کر رہے ہیں وہ سب اللہ سبحانہ کے حضور میں ہے۔ اور لوگ جو کچھ اچھا یا برا معاملہ کرتے ہیں وہ سب اللہ کی نظر کے سامنے ہے جس وقت مخلوق کوئی کام کرتی ہے اور اس میں

مشغول و منہمک ہوتی ہے خواہ اسے اللہ کا تصور نہ آئے لیکن اللہ سبحانہ اپنے برابر دیکھ رہا ہے فان لم تکن تراہ فانہ یراک۔ زمین و آسمان میں کہیں ایک ذرہ برابر یا اس سے چھوٹی بڑی چیز نہیں جو اللہ کے علم محیط سے غائب ہو بلکہ علم الٰہی سے نیچے اتر کر تمام ماکان و مایکون کا حال کتاب مبین لوح محفوظ میں ثبت ہے جسے عالم تدبیر میں صحیفۂ علم الٰہی کہنے ہیں جب حق تعالیٰ پر کوئی سے ادنیٰ سے ادنیٰ چیز بھی پوشیدہ نہیں تو ان مکذبین و معاندین کے معاملات و احوال کیسے مخفی رہ سکتے ہیں۔ پھر روز جزا کی کارروائی کے متعلق یہ کیا خیال کر رہے ہیں وہ خوب سمجھ لیں کہ ان کی ہر چھوٹی بڑی حرکت اللہ سبحانہ کے سامنے ہے وہاں کوئی خیانت اور چوری نہیں چل سکے گی۔ ہر عمل کی سزا مل کر رہے گی اور جس طرح دشمنوں کے معاملات اس کے سامنے ہیں۔ ان کے بالمقابل دوستوں کا ذرہ ذرہ حال بھی اس کے علم میں ہے لے

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے مخلوق کے مقابلے میں اپنے علم کی وسعتوں اور کو بتایا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

"اللہ سبحانہ بتا رہے ہیں کہ وہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اور امت کے سارے احوال کو اور ساری مخلوقات کے سارے حالات کو ہر لمحہ، ہر گھڑی اور ہر آن جانتا ہے۔ اور اس کی علمی پہنائیوں سے ذرہ برابر چھوٹی بڑی چیز پوری کائنات میں غائب نہیں ہے"۔

آگے ابن کثیر نے لکھا ہے کہ اللہ سبحانہ کے علم کی پہنائیوں کے موضوع پر یہ آیت بھی قرآن کی اس آیت کی طرح ہے۔

وعندہ مفاتح الغیب لا یعلمھا الا ھو ویعلم ما فی البر والبحر وما تسقط من ورقۃ الا یعلمھا ولا حبۃ فی ظلمات الارض ولا رطب الا فی کتاب مبین۔

دونوں آیتیں ایک ہی مطلب کی حامل ہیں اور دونوں کا منطوق و مدلول ایک ہے یعنی اللہ کا سبحانہ کا علم محیط ہے اس کو ہر ہر ذرے کی خبر ہے کوئی چیز ایسی نہیں جو اس کے

لے افادات شیخ الاسلام

دریائے علم سے باہر ہو۔ کائنات میں جو کچھ ہوا یا ہو رہا ہے اور ہوگا ازل ہی میں ان سب باتوں کا اسے علم تھا اور ہے اور وہ عالم کیوں نہ ہو جب وہی کائنات کا خالق ہے وہی اسے باقی رکھنے والا ہے اور وہی اس کی پروردگاری کر رہا ہے۔ علامہ بیاضی نے الفقہ الاکبر کے حوالہ سے بتایا ہے کہ:

"اللہ سبحانہ ازل ہی میں اشیا کے وجود میں آنے سے پہلے ان کا عالم تھا یعنی ازل ہی میں اللہ سبحانہ کو کلیات و جزئیات معدومات و محالات کا علم تھا۔"

قرآن میں ہے۔

"الا یعلم من خلق وھو اللطیف الخبیر"۔

یہاں اللہ سبحانہ کی شان علمی یہ بتانے کے لیے بیان کی گئی ہے کہ دنیا میں انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں کی بنیاد ظن و گمان اور تخمین و قیاس پر ہوتی ہے جب کہ قرآنی نظام کی اساس علم و یقین پہ ہے قرآن ہی نے دوسرے نظاموں کا یہ چہرہ پیش کیا ہے۔

و ما یتبع اکثرھم الا ظنا ان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔
ان اللہ علیھم بما یفعلون۔

یہاں قرآن یہ بتا رہا ہے کہ جس قرآن کا قانون کی حیثیت سے پہلے یہ چہرہ بیان ہوا ہے کہ وہ موعظت ہے سینوں کی بیماریوں کے لیے شفا ہے اہل ایمان کے لیے زندگی کا رہنما ہے اور اس رہنمائی کے نتیجے میں ان کے لیے رحمت ہے اس قرآن کا سرچشمہ انسانوں کی رائے قیاس اور تجربہ نہیں بلکہ اس کی اساس علم الٰہی ہے اور جو قانون اس اساس پر قائم ہو اور جس کا قانونی نظام اور اخلاقی ضابطہ اللہ سبحانہ کے علم کامل سے مشتق نہ ہو وہ اپنے نصب العین کو کبھی نہ پا سکے گی۔ یہی وجہ ہے کہ ایک اچھی مملکت صرف علم ربانی کی اساس پر قائم ہو سکتی ہے کیونکہ اللہ سبحانہ کی ذات اور صفات کا تصور انسان کی عقلی قوتوں کے بس سے باہر ہے۔

قرآن کا سارا قانونی نظام علم الٰہی کی اساس پر قائم ہے۔ خدائی علم ہی وہ مرکز ہے جس پر قرآن ہی دعویٰ کر سکتا ہے کہ وہ ایک صحیح اساس پر قائم ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے علم کا تصور نہ صرف انسان کی انفرادی زندگی کے لیے ضروری ہے بلکہ

اجتماعی زندگی کے اعلیٰ ترین مقاصد کا حصول ہی علم الٰہی کی رہنمائی سے وابستہ ہے۔

آپ جانتے ہیں کہ اجتماعیت ایک ایسا ادارہ ہے جو افراد کی تکمیل ذات اور ارتقائے شخصیت کے وسائل مہیا کرتا ہے اور یہ بھی آپ جانتے ہیں کہ شخصیت کی تکمیل عبادت ہے قابو یافتہ ارادے سے ایسا ارادہ جس میں بے قیدی اور بے آئینی معدوم ہو چکی ہو اور اعلیٰ درجہ کا ضبط پایا جاتا ہو۔ ظاہر ہے کہ ارادہ وہی ہو سکتا ہے جو خارجی مؤثرات کی مدد سے بالکل بے نیاز ہو یعنی ارادے کا یہ ضبط خارجی قیود اور حدود سے نہ پیدا ہو بلکہ کسی اعلیٰ اصول پر مبنی ہو۔ جو انسان انسانوں کے بنائے ہوئے قانونی دباؤ یا رائے عامہ کے خوف سے اعمال و کردار کی راستی اختیار کرتا اور اپنے ارادے کو ضبط میں رکھتا ہے اس کی آئین پسندی اور ضابطہ شناسی ایک عارضی اور سطحی کیفیت ہے جو خارجی مؤثرات کے ساتھ ہی ختم ہو جاتی ہے یہی وجہ ہے کہ زندگی اور عمل کے اس دائرے میں جو مملکت اور اس کے قانونی نظام کی رسائی سے خارج ہے ایسے افراد کی بے قیدی بدستور باقی رہتی ہے

یہی وہ مقام ہے جہاں انسان کی تکمیل ذات اور ارتقائے شخصیت کو ایک ایسے اعلیٰ مقام پر پہنچ جاتا ہے کہ اگر مملکت اس کے قوانین اس کی فوج اور پولیس اور معاشرے کی رائے عامہ غرض کہ ہر خارج کی ہر قوت اس کے سامنے سے ہٹائی جائے تب بھی اس کا تربیت یافتہ نفس اور قابو یافتہ ارادہ اسے راستی اور نیک عملی کی راہ پر ثابت قدم رکھتا ہے کیونکہ اللہ سبحانہ کے تصور اور اس کے قانون مکافات کے تصور سے انسان کہیں بچ نہیں سکتا ہے۔ وہ ہر حال ہر آن اور ہر مقام پر اس کے جذبہ خوف اور جذبہ الفت سے اپنا خراج وصول کرتا ہے۔

اس طرح قانون کی پشت پر اللہ سبحانہ کا اعتقاد اجتماعیت کے مقاصد کی تکمیل کے لیے اتنا ہی ضروری ہے جتنا حکومت کے وجود کے لیے فوج اور پولیس کا ہونا ضروری ہے اس لیے اجتماعی زندگی کا قانونی نظام بھی اللہ سبحانہ کے علم لامتناہی پر مبنی ہونا چاہیے کیونکہ اللہ سبحانہ کی پسند و ناپسندیدگی کا علم انسان کو صرف وحی و نبوت ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ یوں ہی اگر کسی قانون کے بارے میں یہ تصور کیا جائے کہ اسے ہمارے ہی جیسے انسانوں نے بنایا ہے تو اس کی حرمت و طاعت کا وہ طاقتور جذبہ پیدا نہیں ہو سکتا جو اس احساس سے پیدا ہوتا ہے کہ قانون ہماری اور آپ کی مرضی کا نام نہیں ہے بلکہ علم الٰہی سے

براہ راست وجود پذیر ہوا ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات وصفات کا تصور صحیح انسان کی تکمیل ذات اور ارتقائے نفس کی سب سے پہلی اور ضروری شرط ہے کیونکہ کائنات میں شخصیت کے جس قدر مظاہر ہیں وہ سب اللہ سبحانہ سے ماخوذ ہیں اور تکمیل ذات اور ارتقائے نفس نام ہے اس مبدأ اول سے قرب حاصل کرنے اور اپنے اندر اس کی صفات پیدا کرنے کا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اتباع سنت کو لازم قرار دیا ہے کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات ذات الٰہی کی صفات کا قریب ترین مظہر ہے اور تکمیل ذات کی جدوجہد اس نمونہ کامل کی اتباع کئے بغیر بے معنے ہے۔

قرآن کا سب سے بڑا شرف واعجاز ہی یہ ہے کہ اس کے تمام اجزا جس مرکز سے حرکت اور زندگی حاصل کرتے ہیں وہ علم الٰہی ہے۔ اس کے جملہ معتقدات اور سارے اعمال وافکار اسی تصور کی بنیاد پر استوار ہیں۔ قرآن نے صفات الٰہی کی تصریح وتوضیح میں جس جامعیت سے کام لیا ہے وہ دنیا کے مذاہب میں مفقود ہے۔ قرآن کے تمام خارجی ادارے اور تمام نظامات اسی مصدر سے مشتق ہیں اجتماعیت کا تصور، قانونی نظام رسول کی شخصیت اور اس کا منصب معاشرے کا اخلاقی ضابطہ اعمال فرائض کی تمام شاخیں علم الٰہی اور وحی سے وابستہ ہیں علم الٰہی کے بنیادی تصور کو نکال دیجئے تو قرآن کا کوئی جز اپنی اصلیت پر قائم نہیں رہ سکتا۔ اسی لیے قرآن نے اپنے مخاطبوں کو للکار کر کہا ہے:

"فان لم یستجیبوا لکم فاعلموا انما انزل بعلم اللہ وان لا الٰہ الا ھو۔ فھل انتم مسلمون"۔

"مسلمانو! اگر یہ لوگ تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہیں تو سمجھ لو کہ قرآن اللہ ہی کے علم سے اتارا گیا ہے اور یہ کہ اللہ کے سوا کوئی حاکم نہیں۔ کیا تم فرماں برداری کرو گے"۔

یعنی قرآن اللہ کے علم سے ماخوذ ہے اس لیے وہ اس کی خصوصیات کا حامل اور اس کا مظہر ہے۔

بہرحال آیت قرآنی کا مطلب یہ ہے کہ قرآن کسی انسان کی رائے گمان خیال ظن و تخمین کا نتیجہ نہیں ہے بلکہ اس ذات گرامی جل شانہ کے علم کا شاہکار ہے جس کی علمی پہنائیوں سے نہ پیغمبر کے حالات اور نہ پیغمبر کی تمہارے سامنے تلاوت اور نہ تمہارے اعمال کا کوئی

گوشہ باہر ہے عالم بالا اور عالم زیریں میں کوئی ذرہ بھی اس کے علم کی گرفت سے باہر نہیں ہے اب تم خود سوچو ایک طرف تمہارے رائے قیاس وہم وخیال سے بنائے ہوئے حدود د قوانین اور ایک طرف اللہ سبحانہ کے علم کی اساس پر بنا ہوا قانون ؟ کیا دونوں کا مقام ایک ہو سکتا ہے۔

عام شارحین قرآن کے اس آیت کی تشریح کا سلسلہ نبوت کی تسلی اور مخالفوں کی تہدید سے زیادہ کوئی تعلق نہیں ہے۔ موضوع قرآن حکیم ہے۔ قرآن کا سب سے بڑا معجزہ قرآن کا علم الٰہی پر مشتمل ہونا ہے اور علم الٰہی قطعی اور غیر مشتبہ علم ہے۔ قرآن کی اس خصوصیت میں کوئی انسانی کلام اور کوئی انسانی کتاب قرآن کا مقابلہ نہیں کر سکتی ہے کیونکہ قرآن کا ماخذ علم الٰہی ہے اور علم الٰہی لامحدود وسعتوں والا ہے اس کی وسعتوں سے کائنات کا کوئی ذرہ بھی خارج نہیں بلکہ کائنات میں کوئی چیز وجود کا لبادہ ہی نہیں پہن سکتی جب تک علم الٰہی میں موجود نہ ہو۔

آیئے اب کچھ شارحین قرآن کی زبانی بھی آیت کی تشریح سن لیجئے۔

اول تو شارحین قرآن موقعہ ومحل کے لحاظ سے آیت کے لیے ربط ومناسبت تلاش کرنے میں سرگرداں ہیں۔ صرف ابن کثیر نے سیاق وسباق کو پیش نظر رکھ کر آیت کی تشریح کی ہے باقی نے ربط کی تلاش بہت دور دور ہاتھ مارے ہیں۔ اور جن کی ربط ومناسبت تک رسائی نہیں ہوئی انہوں نے کہہ دیا کہ اس میں التفات ہے مقصد نبوت کے تبلیغی کردار پر اور اہل ایمان کے مسلمانہ کردار پر اجر وثواب بتانا ہے یہ علامہ محمد طاہر کی التحریر والتنویر میں کی ہے۔ ابوحیان اندلسی کی رائے میں آیت کا ماقبل سے ربط یہ ہے کہ پہلے نبوت کے منکرین کے کچھ حالات بیان کئے اور ان سے حضور اقدس کی گفتگو نقل کی اب اللہ سبحانہ بتاتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کو سب کچھ پتہ ہے منکروں کے حالات بھی اسے معلوم ہیں اور نبوت کی شان اور تلاوت قرآن بھی اس کی نگاہ میں ہے۔ علامہ مراغی نے آیت کی سیاق سے پیوندکاری اس طرح کی ہے کہ اللہ سبحانہ نے آیات سابقہ میں بتایا ہے کہ بندوں پر اللہ کے انعامات بے پایاں ہیں لیکن شکر گزار کم ہیں۔ اب بتایا جا رہا ہے کہ اللہ ان کے احوال سے خوب واقف ہے کچھ بزرگوں نے آیت قرآنی میں نبوت کی تسلی والی بات کہی۔ یہ جدت علامہ زمخشری، علامہ بقاعی نے پیدا کی اور اسی کو اردو شارحین قرآن نے آیت قرآن کا منطوق بنا لیا ہے۔

صاحب تدبر قرآن کہتے ہیں۔

"یہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھیوں کے لیے بطور التفات تسلی اور بشارت ہے کہ مخالفوں کی ان غوغا آرائیوں کی ذرا پروانہ کرو تم جہاں کہیں بھی اور جس حال میں بھی ہو عبادت و طاعت اور تذکیر و دعوت کی جس مہم میں مصروف ہو پورے انہماک اور یکسوئی سے لگے رہو۔ ہم ہر جگہ تمہارے ساتھ ہیں، تمہارے ساتھ ہیں، تمہارے ایک ایک عمل کو دیکھ رہے ہیں۔

اور مولانا مودودی تفہیم القرآن میں فرماتے ہیں :

"یہاں اس بات کے ذکر کرنے سے مقصود نبی کو تسکین اور نبی کے مخالفین کو تنبیہ کرنا ہے ایک طرف نبی سے ارشاد ہو رہا ہے کہ پیغام حق کی تبلیغ اور خلق اللہ کی اصلاح میں جس تن دہی اور جان فشانی اور جس صبر و تحمل سے تم کام کر رہے ہو وہ ہماری نظر میں ہے ایسا نہیں ہے کہ اس پر خطر کام پر مامور کر کے ہم نے تم کو تمہارے حال پر چھوڑ دیا ہو جو کچھ تم کر رہے ہو وہ بھی ہم دیکھ رہے ہیں اور جو کچھ تمہارے ساتھ ہو رہا ہے اس سے بھی ہم بے خبر نہیں ہیں"

مولانا مفتی شفیع صاحب معارف القرآن میں فرماتے ہیں۔

"بظاہر اس جگہ علم الٰہی کی وسعت اور ہر چیز کے محیط ہونے کے بیان میں یہ حکمت ہے کہ اس کے ذریعے حضور اقدس کو تسلی دی جائے۔

ان تمام تشریحات میں موضوع سے ہم آہنگ وہ تشریح ہے جو مولانا عبدالدائم جلالی نے بیان السبحان میں کی ہے، فرماتے ہیں :

"اوپر کی آیات میں کفار کی خود ساختہ تحریم تحلیل کی مذمت کی تھی اس آیت میں اس مذمت کی علت بیان ہو رہی ہے۔ انسانی عقل کا دائرہ بلوغ بہت تنگ ہے۔ مابعد الموت اور دوسری غیر محسوس چیزوں کا تو ذکر ہی کیا ہے جو اشیا نیم محسوس بلکہ محسوس ہیں ان کی حقیقت اور ذاتی احوال و خصوصیات تک کامل طور پر انسانی عقل کی رسائی نہیں ہے۔ قیامت کے تمام احوال اللہ کے صفات فرشتوں کی ہستی اور ان کے اعمال کی طرف سے

عقل انسانی بالکل تاریکی میں ہے۔ محسوس کائنات کا حسن و قبح پورے طور پر معلوم کرنا بھی طاقت بشری سے خارج ہے۔ اور ظاہر ہے کہ جب واقعات اور اشیاء کا علم ہی نہیں تو پھر کسی چیز کو حرام قرار دینا اور کسی چیز کو حلال بتانا کیسے صحیح ہو سکتا ہے۔ تحریم و تحلیل تو اس کا کام ہے جو ہر چیز کے افعال و خواص ذات ماہیت اور دنیوی و اخروی نتائج سے واقف ہو انسان کوتاہ فہم ناقص علم اور تنگ عقل ہے حلت و حرمت کا فیصلہ کرنا اس کے بس کی بات نہیں ہے بلکہ اس کا قطعی علم اللہ سبحانہ کو ہے۔ اللہ کا علم وسیع سے وسیع تر ہے اور اس کے علم کی شان یہ ہے ماتکون فی شان"۔

یہ بات سیاق قرآنی سے ہم آہنگ ہے۔ بات قرآن کی ہو رہی ہے قرآن اللہ کی کتاب ہے اور اللہ کے علم سے ماخوذ ہے۔ اس میں تعارض و اختلاف نہیں ہے کیونکہ تعارض و اختلاف جہل و ناواقفیت یا علم کی کمی بیشی یا اس کی تدریجی ترقی یا ظن و قیاس یا نسیان و غفلت یا کذب و افتراء کی وجہ سے اور علم حق سبحانہ ان تمام نقائص سے پاک ہے اس لیے اس کا کلام بھی ہر تعارض سے پاک ہے۔ اس کے مقابلے میں انسان کا علم خود اس کا خانہ زاد نہیں۔ اس میں جہل اصل ہے اور علم عارضی ہے۔ جہل اس کے اندر ہے اور علم باہر سے آتا ہے۔ اسی لیے انسانی علم کے سباق میں بھی جہل ہے اور لحاق میں بھی جہل ہے درمیان میں کچھ دھندلی سی علم کی روشنی آتی ہے جب علم انسانی عارضی ہے تو اس کا مطلب اور کیا ہو سکتا ہے کہ انسان کا جہل انسان کے علم سے زیادہ ہے اسی قلت علم کی طرف قرآن نے اشارہ کیا ہے "وما اوتیتم من العلم الا قلیلا" پھر یہ عارضی اور قلیل علم جو ایک محدود زمانے تک انسان کو ملتا ہے اس میں صرف قلت ہی کا روگ نہیں بلکہ قلت کے ساتھ اس میں علت بھی ہے جس نے اس قلیل علم کو کمزور بنا دیا ہے۔ مشہور قاعدہ ہے "لکل شئی آفۃ وللعلم آفات" انسان کے اس قلیل علم پر کچھ ایسی آفتیں مسلط ہیں کہ وہ علی الاطلاق معتبر ہی نہیں ہو سکتا جب تک مقررہ کسوٹی پہ نہ جانچا جائے۔

اسی لیے قرآن حکیم نے انسانی علم کو اس وقت تک قابل تسلیم شمار نہیں کیا جب تک اس کی پشت پر عقلی یا نقلی سند نہ ہو اسی لیے قرآن حکیم نے انسانی دعوی پر دلیل کا اصول

قائم کیا ہے تاکہ علم مستند ہو ورنہ عدم استناد کی صورت میں اس کے علم کو ظن، تخمین اور توہم کہہ کر رد کر دیا ہے ان الظن لا یغنی من الحق شیئا۔ دلیل کے مطالبہ کی بنیاد یہی ہے کہ انسان کے پاس علم ذاتی نہیں ہے عطائے غیر ہے لہذا انسانی علم اس وقت تک قابل اعتبار نہیں جب تک اس کا منبع اور سرچشمہ معلوم نہ ہو انسان کا علم نہ بلا سند معتبر ہے اور نہ علی الاطلاق قابل قبول ہے۔ دعویٰ اگر عقلی ہو تو حجت معقول اور اگر نقلی ہو تو حجت منقول ہونی چاہئے۔

کہنا یہ چاہتا ہوں کہ علم انسانی صرف قلیل ہی نہیں بلکہ علیل بھی ہے اور یہی علم کی قلت اور علت عموماً انسان کو دنیا کی زندگی میں مضار و مفاسد کا شکار بناتی ہے ورنہ اگر علم انسانی محیط ہوتا تو اسے کبھی بھی کوئی تکلیف نہ ہوتی۔ اور تو اور دنیا کے سب سے بڑے عالم اور اعلم الخلائق کی زبان مبارک سے قرآن نے یہ کہلایا لو کنت اعلم الغیب لاستکثرت من الخیر وما مسنی السوء یعنی اگر علم انسانی جامع ہوتا اور قلت و علت سے پاک ہوتا تو یقیناً وہ کسی افتاد کا شکار نہ ہوتا۔

اتنی بات معلوم ہو گئی کہ انسان کا علم ذاتی بھی نہیں اور محیط بھی نہیں اور کامل بھی نہیں، کثیر بھی نہیں، آفات کا نشانہ ہونے کی وجہ سے حتمی بھی نہیں ہے۔

اس کے برعکس اب علم الٰہی کو دیکھیں تو آپ محسوس کر لیں گے کہ اس کا علم خود اپنا اور خانہ زاد ہے عطائے غیر نہیں ذاتی ہے عارضی نہیں نہ جہل سابق پر وارد شدہ ہے اور نہ جہل لاحق سے شرمندہ۔ جہالت نہ اس کے اول میں ہے نہ آخر میں۔ اس لیے نہ وہ قلیل ہے اور نہ وہ محدود۔ پھر جیسے نفس علم ہر آفت سے پاک ہے ایسے ہی اس کی ہر کیفیت عیب اور کوتاہی سے مبرا ہے۔ نہ مناسبت اور بے مناسبتی کا سوال ہے کہ کوئی مضمون اعلیٰ ہو کوئی ادنیٰ ہو نہ اس پر حوادث مؤثر ہیں کہ کیفیت کلام میں کوئی خفیف سا تغیر ہی پیدا کر سکیں۔ نہ وہاں متضاد کیفیات اثر انداز ہو سکتی ہیں کہ کلام کے زور یا اس کی فصاحت و بلاغت میں کوئی ادنیٰ تفاوت پیدا کر سکیں۔ ذاتی علم ہونے کی وجہ سے نہ اس کے خلاف کوئی باطنی آفت ہے نہ ظاہری۔ نہ وہاں غفلت ہے اور نہ نسیان نہ علم اکتسابی ہے کہ قوت حافظہ اور تفکر درکار ہو اور نہ علم تدریجی ہے کہ فکر و نظر کے لیے ترتیب کی حاجت ہو غرض جہل اور سند علم کی کوئی آفت اس کی علمی بارگاہ تک نہیں پہنچ سکتی۔ اسی لیے قرآن نے جگہ جگہ

دعویٰ کیا ہے کہ اس کا علم محیط اور لامحدود بھی ہے اور اکمل تر اور خالص بھی ہے یعنی وہاں علم بحث اور ادراک محض ہے جس میں جہل کے کسی ادنیٰ ذرے کی بھی آمیزش نہیں ہو سکتی ہے۔ جب علم محیط اور لامحدود ہے تو اس میں قلت وکثرت کا سوال ہی نہیں ہو سکتا۔ اس لیے علم حق سبحانہ علم بشر کی طرح نہ قلیل ہے نہ علیل ہے اور نہ ناقص ہے جیسے اس کی ذات لامحدود ہے ایسے اس کا علم بھی لامحدود ہے۔

قرآن کی اس آیت میں علم الٰہی کے محیط اور لامحدود ہونے کو بتایا جا رہا ہے اور دریافت کیا جا رہا ہے کہ محمد رسول اللہ جو قرآن لے کر آئے ہیں اس کا منبع تو اللہ سبحانہ کا محیط اور لامحدود علم ہے اور تم جو تحریم وتحلیل کے قوانین بنا رہے ہو بتاؤ اس کا منبع کیا ہے اللہ کا نام لوگے تو یہ اللہ پر جھوٹا بہتان ہے۔ مطلب یہ ہے کہ انسانی زندگی کے لیے قانون بنانا صرف اللہ سبحانہ کا حق ہے تم نے اس حق پر کیسے قبضہ کیا۔ یہ مجرمانہ بغاوت ہے۔

أَلَآ إِنَّ أَوْلِيَآءَ ٱللَّهِ لَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٦٢﴾ ٱلَّذِينَ ءَامَنُوا۟ وَكَانُوا۟ يَتَّقُونَ ﴿٦٣﴾ لَهُمُ
وقف لازم ٱلْبُشْرَىٰ فِى ٱلْحَيَوٰةِ ٱلدُّنْيَا وَفِى ٱلْءَاخِرَةِ ۚ لَا تَبْدِيلَ لِكَلِمَٰتِ
ٱللَّهِ ۚ ذَٰلِكَ هُوَ ٱلْفَوْزُ ٱلْعَظِيمُ ﴿٦٤﴾ وَلَا يَحْزُنكَ قَوْلُهُمْ
إِنَّ ٱلْعِزَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۚ هُوَ ٱلسَّمِيعُ ٱلْعَلِيمُ ﴿٦٥﴾ أَلَآ إِنَّ
لِلَّهِ مَن فِى ٱلسَّمَٰوَٰتِ وَمَن فِى ٱلْأَرْضِ ۗ وَمَا يَتَّبِعُ ٱلَّذِينَ
يَدْعُونَ مِن دُونِ ٱللَّهِ شُرَكَآءَ ۚ إِن يَتَّبِعُونَ إِلَّا ٱلظَّنَّ
وَإِنْ هُمْ إِلَّا يَخْرُصُونَ ﴿٦٦﴾ هُوَ ٱلَّذِى جَعَلَ لَكُمُ ٱلَّيْلَ
لِتَسْكُنُوا۟ فِيهِ وَٱلنَّهَارَ مُبْصِرًا ۚ إِنَّ فِى ذَٰلِكَ لَءَايَٰتٍ لِّقَوْمٍ
يَسْمَعُونَ ﴿٦٧﴾

یاد رکھو کہ اللہ سے تعلق اور لگاؤ رکھنے والوں کو نہ تو ڈر ہے اور نہ ان کو غم ہو گا[۴۵] یعنی وہ لوگ جو دولت ایمان سے مالا مال ہوئے اور زندگی اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہے[۴۶] ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت کی زندگی میں بھی۔ اللہ کے قوانین کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے

اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے^{۶۶}اور اے اللہ کے
رسول تمہیں مخالفین کی باتیں غمگین نہ کریں یقین کرو کہ سارا
دبدبہ اللہ کے لیے ہے وہ سب کچھ سن رہا ہے اور سب
کچھ جانتا ہے^{۶۷} یاد رکھو کہ آسمانوں اور زمین میں سب
کے سب اللہ کے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ کے سوا شریکوں کو
پکارتے ہیں ان کی جو کچھ بھی اتباع اور پیروی ہے وہ اس
کے سوا کچھ بھی نہیں کہ سر تا سر وہم و گمان کی پیروی اور وہ
ہر بات میں اٹکل اور تخمین سے کام لے رہے ہیں^{۶۸} اللہ
ہی کی ذات گرامی نے تمہارے لیے رات بنائی ہے تاکہ
تم آرام کرو اور دن بنایا ہے روشنی والا تاکہ کام کاج کرو بلاشبہ
اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو کلام اللہ
سنتے ہیں^{۶۹}

اہلِ حق کی دنیا و آخرت میں کامیابی

اس آیت میں اولیاء اللہ کے حوالہ سے دنیا اور آخرت میں کامیابی کی بشارت ہے

جس طرح سچا ایمان اور عمل صالح آخرت میں کامیابی کے لیے شرط ہے اسی طرح دنیا میں بھی شرط ہے یعنی دنیوی برکتوں کے دروازے اہل ایمان پر اس وقت کھولے جاتے ہیں جب وہ ایمان اور عمل صالح کی شرط پوری کرتے ہیں۔ قرآن سے پہلے بھی جن سے فلاح دنیا کا وعدہ کیا گیا تھا ایمان وعمل کی شرط کے ساتھ کیا گیا تھا۔ مسلمانوں کو بھی جب کفار پر غلبہ کی بشارت دی گئی تو ان کنتم مومنین کی شرط کے ساتھ کہی گئی ہے اور جب اقتدار حکومت کا وعدہ کیا گیا تو اس صراحت کے ساتھ کیا گیا کہ یہ وعدہ صرف ان لوگوں سے ہے جو ایمان وعمل صالح کی دولت سے مالا مال ہوں گے وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم فی الارض۔ غرض جہاں اللہ سبحانہ کا یہ وعدہ ہے کہ وہ اپنے دین کے ماننے والوں کو دنیوی کامیابیوں سے نوازتا ہے وہیں اس کا یہ عمومی ضابطہ بھی ہے کہ یہ ایمان وعمل کی لازمی شرط کے ساتھ مشروط ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ایمان وعمل صالح کے بغیر صرف آخرت ہی کی نہیں دنیا کی فلاح بھی ہاتھ نہیں آسکتی ہے۔ دین کے بغیر صحیح معنوں میں دنیا بھی نہیں مل سکتی یہ ضابطہ افراد ہوں یا جماعت سب کے لیے ہے کوئی بھی اس سے مستثنیٰ نہیں ہے۔ افراد کو بھی اپنی انفرادی زندگی میں دنیوی فلاح مثلاً امن وسکون، عزت ومحبوبیت اور رضا ورباننہ زندگی وغیرہ اسی وقت ملے گی جب وہ اپنی حد تک ایسے خدا شناس اور آخرت کے دلدادہ ہوں جیسا کہ ایک مسلمان کو ہونا چاہیے۔ حضور اقدس نے اسی حقیقت کو ایک ارشاد میں بے نقاب کیا ہے۔

"جس نے اپنی ساری فکروں کو ایک ہی فکر یعنی آخرت کی فکر کو بنا لیا اللہ سبحانہ اس کی دنیا کا انتظام کر دینے کے لیے کافی ہے اور جس کے ذہن کو بے شمار افکار نے منتشر کر رکھا ہو اللہ سبحانہ کو اس کی کوئی پروا نہیں ہے کہ وہ اس دنیا کی کس گھاٹی میں ہلاک ہوتا ہے"۔

ایک اور ارشاد نبوت ہے:

"جو شخص آخرت کو اپنا مقصود بنا لیتا ہے اللہ سبحانہ اس کے معاملات کو درست کر دیتا ہے اور اس کے دل کو غنی بنا دیتا ہے اور دنیا تابع فرمان ہو کر اس کے حضور میں آجاتی ہے"۔

اس طرح امت کو بھی اپنی اجتماعی زندگی کی فلاح اسی وقت میسر آسکتی ہے جب وہ اپنی اجتماعی حیثیت میں فی الواقع امت ہو یعنی اس کی ترکیب ایسے افراد سے ہو جو ایمان کے سچے اور عمل صالح کے مالک ہوں۔

لہ یاد رکھو اللہ سے تعلق اور لگاؤ رکھنے والوں کو نہ تو ڈر ہے اور نہ ان کو غم ہو گا۔ حافظ ابن کثیر نے روایات حدیثیہ کی بنا پر اس کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اولیاء اللہ اللہ کے دوستوں کو آخرت میں احوال محشر کا کوئی خوف نہ ہوگا اور نہ دنیا کے چھوٹ جانے پر غمگین ہوں گے۔ بعض مفسرین نے آیت کو کچھ عام رکھا ہے۔ یعنی ان پر اندیشناک حوادث کا وقوع نہ دنیا میں ہوگا نہ آخرت میں ہوگا۔ اور نہ کسی مطلوب کے فوت ہونے پر وہ مغموم ہوتے ہیں گویا خوف سے خوف حق یا غم سے غم آخرت کی نفی مراد نہیں ہے بلکہ دنیا میں دنیوی خوف وغم کی نفی مراد ہے جس کا احتمال خوف اعداء وغیرہ سے ہو سکتا ہے وہ مومنین کاملین کو نہیں ہوتا۔ ہر وقت ان کا اعتماد اللہ پر ہوتا ہے اور تمام واقعات تکوینیہ کے خالی از حکمت نہ ہونے کا اعتقاد رکھتے ہیں۔ اس اعتقاد و اعتماد کے استحضار سے انہیں خوف وغم نہیں ستاتا میرے نزدیک لاخوف کا مطلب یہ لیا جائے کہ اولیاء اللہ پر کوئی خوفناک چیز ہلاکت یا معتد بہ نقصان دنیا و آخرت میں واقع ہونے والی نہیں۔ اگر فرض کیجئے دنیا میں صورۃً کوئی نقصان پیش بھی آئے تو چونکہ نتیجۃً وہ ان کے حق میں نفع عظیم کا ذریعہ بنتا ہے اس لیے اس کو معتد بہ نقصان نہیں کہا جاسکتا۔ رہا کسی سبب دنیوی یا اخروی کی وجہ سے ان کو کسی وقت خوف کا لاحق ہونا وہ آیت کی اس تقریر کے منافی نہ ہوگا کیونکہ آیت میں صرف یہ خبر دی گئی ہے کہ ان پر کوئی خوفناک چیز نہ پڑے گی یہ نہیں کہا ان کو کسی وقت خوف لاحق نہ ہوگا۔ شائد یحزنون کے مناسب لا یخافون نہ فرماتے اور لاخوف کی تعبیر اختیار کرنے میں یہ ہی نکتہ ہو۔ باقی لا یحزنون کا تعلق میرے خیال میں مستقبل سے ہے یعنی موت کے وقت اور موت کے بعد وہ غمگین نہ ہوں گے جیسا کہ فرمایا تتنزل علیھم الملائکۃ ان لا تخافوا ولا تحزنوا اور فرمایا لا یحزنھم الفزع الاکبر وتتلقاھم الملائکۃ واللہ اعلم۔ لہ

لہ افادات شیخ الاسلام

زیر نظر آیت کی تشریح میں عام مفسرین قرآن نے اجمالاً و تفصیلاً وہی کہا ہے جس کا خلاصہ حضرت شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں پیش فرمادیا ہے۔ زیادہ تفصیل امام رازی نے مفاتیح الغیب میں آلوسی نے روح المعانی میں اور قاضی ثناء اللہ نے تفسیر مظہری میں پیش کی ہے۔ دراصل اولیاء اللہ کے معنے اللہ سبحانہ سے لگاؤ رکھنے والے تعلق رکھنے والے کے ہیں ولی کی جمع ہے جس کے معنے قرب کے ہیں ولی سے صفت کا صیغہ ہے۔ یہ کون ہیں اس کی خود قرآن نے تشریح کردی ہے الذین آمنوا وکانوا یتقون۔ قرآن نے یہ لفظ ان ہی معنے استعمال کیا ہے گویا لفظ کے لغوی معنے لگاؤ رکھنے والے کے ہیں اور قرآنی معنے ایمان و تقویٰ کے زیور سے آراستہ ہونے کے ہیں ایک شخص جب ایمان لاتا ہے تو وہ اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ اس کا ارادہ اس کی عقل اور اس کے جذبات و خواہشات قانون اور احکام خداوندی کی اطاعت میں حائل نہ ہوسکیں اور اللہ سبحانہ کے مقابلے میں وہ ان سب کی قربانی دینے پر آمادہ رہے گا اس اطاعت و سپردگی کی وجہ سے اسے اللہ کا ولی کہا جاتا ہے اور اس کے معاوضہ میں اسے رضائے الٰہی اور قرب خداوندی کی بشارت دی جاتی ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جن کے چہروں کو دیکھ کر یادِ الٰہی آجاتی ہے۔ اصلی معنے تو یہی ہیں لیکن بعد کو جب تصوف و طریقت کے مختلف مدارس پیدا ہوئے تو اولیا کا لفظ ایک خاص اصطلاحی معنے میں بولا جانے لگا التفہیمات میں حکیم الامت شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں:

> اللہ سبحانہ تک پہنچانے والے راستے دو قسم کے ہیں ایک قسم تو وہ ہے جس کی وحی الٰہی اور تعلیمات انبیاء نے تلقین فرمائی ہے اور دوسری وہ ہے جسے الہام اور معارف اولیاء نے متعین کیا ہے۔"

حضرت مولانا اشرف علیؒ مبادی تصوف میں لکھتے ہیں۔

> "سلوک دو قسم پر ہے سلوک نبوت اور سلوک ولایت اور ہر ایک کے آثار و خواص جدا جدا ہیں۔"

دونوں میں فرق ہے۔ صوفیا کی زبان میں ولی دوسرے معنے میں استعمال ہوتا ہے اسی کو ولایت خاصہ کہتے ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی نے ولایت خاصہ کی یہ تعریف کی ہے۔

"ان مذکورہ باتوں کے ساتھ ظاہر کو نفلی عبادتوں میں اور باطن یعنی دل کو
اللہ کی یاد میں مشغول رکھے کسی دم غافل نہ ہو" (قصد السبیل)

مولانا قاضی ثناء اللہ پانی پتی تفسیر مظہری میں فرماتے ہیں کہ :

"کم سے کم چیز جسے صوفیہ کی زبان میں ولایت کہا جاتا ہے اور یہی قرآن
کی آیت میں اولیاء اللہ سے مراد ہے یہ ہے کہ دل یاد الہٰی میں مستغرق
ہو، اللہ کی محبت سے لبریز ہو اس میں کسی اور کی گنجائش ہی نہ ہو۔ اس کی
مخلوق سے محبت، بغض دینے اور نہ دینے کا سرچشمہ اللہ کی ذات ہو"

اور امام غزالی کیمیائے سعادت میں فرماتے ہیں :

"سب سے بڑی عبادت یہ ہے کہ انسان اپنے پورے وجود کو اللہ سبحانہ
کی یاد کے حوالہ کر دے۔ یہاں تک کہ ہر ماسوا سے بے خبر ہو جائے اور
خود اپنے آپ سے بھی بے خبر ہو جائے اور نگاہ تصور میں اللہ کے سوا کچھ
نہ رہے۔ یہ بات صرف تنہائی اور گوشہ گیری میں ہی حاصل ہو سکتی ہے
کیونکہ حق تعالیٰ کے سوا جو کچھ ہے وہ سب کا سب اس سے غافل کرنے
والا ہے"

یہ ہے صوفیائے کرام کے یہاں وہ ولایت جسے ان کے الہام اور معارف نے متعین کیا ہے۔ نبوت کے معارف نے جس ولایت کا تصور پیش کیا ہے وہ اس سے بالکل جدا ہے جس کا ذکر الذین اٰمنوا وکانوا یتقون یعنی ایمان و تقویٰ کی زندگی اختیار کرے۔ دونوں میں فرق ہے۔ راہِ نبوت کی اساس محبت الٰہی ہے اور اسی ایمان تقویٰ یعنی افکار اعمال اور اخلاق کی پوری عمارت اٹھتی ہے جب کہ راہ ولایت کی اساس محبت نہیں عشق ہے راہ نبوت کا پیش نہاد رضائے الٰہی ہے جب کہ راہ ولایت کی منزل وصال الٰہی ہے۔ دونوں راہیں الگ الگ ہیں بلکہ راہ ولایت راہ نبوت کے متوازی بندگی اور خدارسیدگی کا ایک دوسرا طریقہ بھی تسلیم کیا جا چکا ہے۔ اور یہ بھی کہ راہ ولایت کی بنیاد وحی الٰہی اور تعلیمات قرآنی پر نہیں بلکہ حضرات اولیائے کرام کے کشف والہام پر ہے۔

حضرت مولانا اشرف علی فرماتے ہیں :

"ان پر یعنی طریق ولایت پر جب عشق غالب ہوتی ہے" (شریعت اور طریقت)

مولانا اسماعیل الشہید کا ارشاد بھی یہی نوعیت رکھتا ہے فرماتے ہیں۔

"اس جگہ بڑا باریک نکتہ ملحوظ رکھنے کا ہے جس سے اکثر لوگ بے خبر ہیں اور اسے فراموش کر دیتے ہیں اور وہ یہ کہ جب نفسانی جسے عشق کہتے ہیں و حب ایمانی جسے حب عقلی کہتے ہیں دونوں میں جوہری فرق ہے پہلی محبت سلوک کے ابتدائی دور کی قلبی کیفیتوں میں سے ہے جب کہ دوسری محبت انبیائے کرام کے کمالات اور اولیائے عظام کے مقامات میں سے ہے لیکن اکثر عوام صوفیہ پہلی محبت کو دوسری کی جگہ رکھ کر یعنی دونوں کو ایک سمجھ کر اسی کو کتاب وسنۃ کے اشارات کا مقصود خیال کر کے حضرات انبیاء و اولیاء کی سیر باطن کو اہل عشق و وجد کے احوال کے مطابق قرار دینے کی لاحاصل زحمت برداشت کرتے ہیں"۔

راہ ولایت میں عبادت کا مقصود رضائے الٰہی نہیں بلکہ وصال الٰہی ہوتا ہے۔ قرآن وسنت کی تصریحات کے مطابق انسان کا مقصود عبادت اللہ سبحانہ رضا، آخرت کی فلاح اور جنت کی زندگی کا حصول ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی مطلوبیت کے ذکر سے اور ان کے بارے میں ترغیب و تحریص اور تاکید سے کتاب وسنت کے صفحات بھرے ہوئے ہیں جب کہ عشق پر مبنی تصور دین کا مطالبہ یہ ہے کہ عبادت کا مقصود یہ نہیں ہے بلکہ ذات باری کا وصال ہے۔

اور عشق پر مبنی ولایت کا ناگزیر نتیجہ ترک دنیا کی صورت میں ان بزرگوں کے سامنے آیا جب کہ قرآن وسنت سے یہ بات معلوم ہے کہ رہبانیت اور ترک دنیا کا اللہ سبحانہ کی نازل کردہ ہدایت سے کبھی کوئی تعلق نہیں رہا۔ یہ چیز عشق کی ایجاد ہے ورنہ اللہ سبحانہ کی ہدایت تو یہ ہے کہ انسان اللہ کی بندگی کا فریضہ اس دنیا سے الگ ہو کر نہیں اس میں رہ کر انجام دے۔

نظریہ ترک دنیا کے بطن سے تین تقاضے پیدا ہوئے عزلت (تنہائی) تجرد ترک نکاح اور ترک لذات اور فاقہ۔

عزلت اور گوشہ گیری کے بارے میں حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ آثار ولایت بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں۔

طریق ولایت والے خلق سے نفرت کرتے ہیں اور اسباب ظاہری کو ترک کر دیتے ہیں (شریعت وطریقت)

تجرد اور نکاح کے بارے عشق پر مبنی ولایت کا نظریہ حضرت شیخ مخدوم علی ہجویری کے کشف المحجوب میں اس بیان سے واضح ہوتا ہے۔

"اس سلک کے مشائخ کا اس پر اتفاق ہے کہ نکاح نہ کرنے والے سب سے بہتر اور افضل ہوتے ہیں"۔

گویا اصلاً صحیح بات تو یہی ہے کہ نکاح اور ازدواجی زندگی سے پرہیز کیا جائے۔

یہ ہے صوفیائے کرام کی اصطلاحی زبان میں اولیاء اللہ کا مفہوم ظاہر ہے کہ یہ نہ قرآن کا منطوق ہے نہ مدلول ہے اور نہ مفہوم۔

اس موضوع پر قاضی بیضاوی کی تشریح بہت اچھی ہے فرماتے ہیں کہ اولیاء اللہ وہ ہیں الذین یتولونہ بالطاعۃ ویتولاھم بالکرامۃ جن کا اللہ سبحانہ سے بندہ ہونے کی حیثیت میں طاعت کا لگاؤ ہوا اللہ کا آقا ہونے کی حیثیت میں بندہ سے عزت افزائی کا لگاؤ لفظ ولی فعیل کے وزن پر ہے اگر فاعلی معنے میں ہے تو پہلی بات ہے اور اگر مفعولی معنی میں ہے تو دوسری بات ہے۔ اور دونوں صحیح ہیں۔

ان اولیا کے بارے میں قرآن کا انکشاف ہے لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون۔ حافظ ابن کثیر نے یہ مطلب بتایا ہے کہ مستقبل میں اہوال روز حشر کے مناظر سے ان کو کوئی اندیشہ نہ ہوگا اور دنیا میں جو کچھ چھوڑ آئے ہیں اس پر ان کو کوئی غم نہ ہوگا۔ اور یہی معنے ابن جریر نے بتائے ہیں اردو شارحین قرآن میں اس فقرے کی تشریح جو مولانا ابوالکلام آزاد نے کی ہے وہ بہت اچھی ہے اور سیاق وسباق سے ہم آہنگ ہے فرماتے ہیں۔ قرآن نے ایمان اور اہل ایمان کی نسبت جو کچھ کہا ہے اس میں کوئی بات بھی اس قدر اہم نہیں ہے جس قدر یہ کہ لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون خوف اور غم دونوں سے محفوظ ہو جائیں گے۔ غور کرنا چاہیے کہ قرآن نے اس وصف پر کیوں اس قدر زور دیا۔ حقیقت یہ ہے کہ انسانی زندگی کی سعادت کے لیے اس سے زیادہ کچھ نہیں کیا جاسکتا۔ اس کی شقاوت کی ساری سرگذشت انہی دو لفظوں میں سمٹی ہوئی ہے خوف اور غم جونہی ان دو باتوں سے اسے رہائی مل گئی اس کی ساری سعادتیں اس کے قبضے میں آگئیں۔ زندگی

کے جتنے بھی کانٹے ہو سکتے ہیں سب کو ایک ایک کر کے چنو اور دیکھو خواہ جسم میں چبھتے ہوں خواہ دماغ میں خواہ موجودہ زندگی کی عافیت میں خلل ڈالتے ہوں۔ خواہ آخرت کی تم دیکھو گے کہ ان دو باتوں سے باہر نہیں ہیں یا خوف کا کانٹا ہے یا غم کا۔

قرآن کہتا ہے کہ ایمان کی راہ سعادت کی راہ ہے جس کے قدم اس راہ میں جم گئے اس کے لیے دونوں کانٹیں بے اثر ہو جاتے ہیں اس کے لیے نہ تو کسی طرح کا اندیشہ ہو گا نہ کسی طرح کی غمگینی۔

اولیاء کا قرآنی چہرہ

لنے یعنی وہ لوگ جو دولت ایمان سے مالا مال ہوئے اور زندگی میں اللہ کی نافرمانی سے بچتے رہے۔ یہ اولیاء اللہ کی تعریف ہوئی یعنی مومن متقی اللہ کا ولی ہوتا ہے پہلے کئی مواقع میں معلوم ہو چکا ہے کہ ایمان و تقویٰ کے بہت سے مدارج ہیں پس جس درجہ کا ایمان و تقویٰ کسی میں موجود ہو گا اسی درجہ میں ولایت کا ایک حصہ اس کے لیے ثابت ہو گا۔ پھر جس طرح مثلاً دس بیس روپیہ بھی مال ہے اور پچاس سو روپیہ ہزار دو ہزار لاکھ دو لاکھ روپیہ بھی مال ہے لیکن عرف عام میں دس بیس روپے کے مالک کو مالدار نہیں کہتے جب تک معتد بہ مال کی مقدار موجود نہ ہو اسی طرح سمجھ لیجئے کہ ایمان و تقویٰ کسی مرتبہ میں ہو وہ ولایت کا شعبہ ہے اور اس حیثیت سے سب مومنین فی الجملہ ولی کہلائے جا سکتے ہیں لیکن عرف میں ولی اسی کو کہتے ہیں جس میں ایک خاص اور ممتاز درجہ ایمان و تقویٰ کا پایا جاتا ہو۔ احادیث میں کچھ علامات و آثار اس ولایت کے ذکر کیے گئے مثلاً ان کو دیکھنے سے اللہ یاد آنے لگے یا مخلوق خدا سے ان کو بے لوث محبت ہو۔ عارفین نے اپنے اپنے مذاق کے موافق ولی کی تعریفیں کی ہیں جن کی تفصیل کا یہاں موقعہ نہیں [1]

اگر قرآن کی ساری تعلیمات کا خلاصہ صرف دو لفظوں میں بیان کرنا چاہیں تو ہم ایمان و تقویٰ کے ذریعے بیان کر سکتے ہیں۔ قرآن کی ہر تعلیم کا مقصد اپنے ہر عمل کے قالب میں اسی تقویٰ کی روح کو پیدا کرنا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تقویٰ اللہ کی ناراضگی سے بچنے کے اس گہرے احساس کا نام ہے جو آدمی کو ہر بھلے کام پر ابھارتا ہے اور ہر برے کام سے روکتا ہے یا یوں کہئے کہ تقویٰ ایک خاص قلبی کیفیت ہے جس سے ایک خاص عملی رویہ وجود میں آتا ہے یہ عملی رویہ اللہ کی طاعت اور رضاجوئی کا زدیہ ہوتا ہے۔ اس خاص کیفیت سے جو دل بہرہ ور ہوتا ہے کہ میں کوئی ایسی حرکت نہ کر جاؤں جس کو وہ پسند نہیں کرتا اور کسی ایسے کام کے کرگذرنے سے رک نہ رہوں جسے وہ پسند کرتا ہے۔

اللہ کی ناراضی سے بچنے کی اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کی یہ خواہش اور کوشش سوچئے کہ عملاً کب پوری ہو سکتی ہے۔ کوئی شک نہیں کہ یہ خواہش اور یہ کوشش اسی وقت پوری ہو سکتی ہے جب کہ انسان اپنے آپ کو قابو میں رکھے اور اپنے نفس کو من مانی کرنے سے روکے۔ گویا تقویٰ کا مقام پالینے کا راستہ صرف یہ ہے کہ انسان اپنے آپ کو لگام دے اور خواہشوں میں اسے آزاد نہ چھوڑے جیسا کہ قرآن کی اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔

واما من خاف مقام ربہ و نھی النفس عن الھویٰ

جس شخص نے اپنے دل میں اپنے رب کے حضور کھڑے ہونے کا ڈر کھا۔

اور اپنے نفس کو خواہشوں کی پیروی سے روکا۔

یہی متقی اللہ سبحانہ کی محبت اور دوستی کے سزاوار ہیں جب وہ کام ہیں اللہ سبحانہ کی مرضی اور پسندیدگی پر نظر رکھتے ہیں اور اپنے کسی کام کا بدلہ کسی انسان سے تعریف یا انعام مہر دلعزیزی کی صورت میں نہیں چاہتے تو اللہ سبحانہ ان کو اپنی طرف سے اپنے انعام اور محبت کا صلہ عطا فرماتا ہے اور اس کا اثر یہ ہوتا ہے کہ بندوں میں ان کے ساتھ عقیدت و محبت اور ہر دل عزیزی پیدا ہو جاتی ہے ان اولیاءہ الا المتقون۔ اور ان اللہ یحب المتقین۔

ایک اہم اور بنیادی بات

یہاں یہ اہم اور بنیادی بات ضرور یاد رکھنی چاہیے کہ سارے انبیاء کی دعوتوں کا خلاصہ دو لفظوں میں سمٹا ہوا ہے ایک عبادت دوسرا تقویٰ۔ سورہ انبیاء میں مختلف نبیوں کی دعوتوں کا ذکر کرنے کے بعد سب دعوتوں کا خلاصہ یہ بتایا ہے ان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاعبدون تم سب کی امت ایک ہی امت ہے اور میں ہی تم سب کا رب ہوں لہٰذا میری عبادت کرو۔ اور سورۃ مومنون میں مختلف دعوتوں کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا

وان ھذہ امتکم امۃ واحدۃ وانا ربکم فاتقون یہ تمہاری امت دراصل ایک ہی امت ہے اور میں تمہارا رب ہوں لہٰذا میری نافرمانی سے بچو۔ یہ دو آیتیں بتا رہی ہیں کہ اللہ سبحانہ کے بندوں کے تعلقات دو قسم کے ہیں ایک محبوب ہونے کے یعنی اللہ سبحانہ بندوں کے محبوب ہیں دوسرے محکوم ہونے کے یعنی اللہ سبحانہ بندوں کے حاکم ہیں محبوب ہونے کی حیثیت میں بندے عابد اور اللہ معبود ہیں اور حاکم ہونے کی حیثیت میں اللہ حاکم اور بندے محکوم ہیں جب یہ بنیادی بات معلوم ہوگئی کہ اللہ سبحانہ کی فی الواقع حیثیت کیا ہے تو یہ بات بھی خود بخود معلوم ہوگئی کہ اللہ اور بندے کے درمیان تعلق کی نوعیت کیا ہے؟ لازمی طور پر یہ نوعیت انتہائی محبوب آقا اور مکمل با دفا غلام حقیقی فرماں روا اور اطاعت گذار رعیت ہی کی ہو سکتی ہے۔

اب ہمارے سامنے بحث وتحقیق کے وہ سارے زاویے پوری وضاحت سے سامنے آجاتے ہیں جو یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ قرآن کا تصور ولایت واضح اور متعین طور پر کیا ہے۔ اس لیے ولایت کے موضوع کو قرآن کی روشنی میں سمجھنے کے لیے ان حقائق پر غور کیجئے۔

اس موضوع پر سب سے پہلا نکتہ بحث اور زاویہ تحقیق صفات باری ہیں قرآن عزیز نے اللہ سبحانہ کی جو صفات بیان کی ہیں۔ ان میں دو حقیقتیں بالکل واضح اور نمایاں ہیں۔ ایک یہ کہ ان میں معشوقیت کا کہیں کوئی نام و نشان نہیں ہے۔ دوسری یہ کہ ان صفات میں جلالی اور جمالی دونوں صفتیں ہیں یعنی ان صفات کی رو سے اللہ سبحانہ اپنی صفات کی روشنی میں صرف خالقیت رزاقیت حکمت ورحمت رافت ومحبت عطا و بخشش اور عفو و درگذر جیسے کمالات ہی کا موصوف نہیں بلکہ اس کے ساتھ وہ مدبر کائنات اور مالک الملک بھی ہے مقتدر اعلیٰ اور شہنشاہ کل بھی ہے ہادی اور قانون ساز بھی ہے۔ امر و حاکم بھی ہے عادل اور منتقم بھی ہے۔

ان دونوں حقیقتوں کو سامنے رکھ کر اللہ سبحانہ کی یہ حیثیت کہ وہ اس کائنات کا فی الواقع مالک ہے منفی اور مثبت دونوں طرح واضح اور متعین ہو جاتی ہے منفی یہ کہ یہ حیثیت معشوق کی نہیں ہے اور مثبت یہ کہ یہ حیثیت انتہائی محبوب آقا و فرماں روائے مطلق کی ہے۔ کیونکہ جب اللہ سبحانہ کی صفات میں معشوقیت موجود ہی نہیں تو اللہ سبحانہ کے معشوق ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور ولایت عشق کی اساس پر خدا رسیدگی

کا نام نہیں ہو سکتا ہے بلکہ اللہ کی صفات جلال و جمال کا مجموعی تقاضا اس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتا کہ اللہ سبحانہ محبوب کل اور فرمان روائے مطلق ہے اور جب اللہ سبحانہ کی حیثیت اور انسان سے اللہ سبحانہ کے تعلقات کی نوعیت معلوم ہو گئی تو قرآنی تصور ولایت کا مسئلہ بھی خود بخود حل ہو گیا۔ کیونکہ ان دو حقیقتوں کی موجودگی میں ولایت کا یہ تصور قرآنی تصور نہیں ہو سکتا جس کی بنیاد عشق الٰہی پر رکھی گئی ہے بلکہ واضح طور پر یہ وہی تصور ہو سکتا ہے جو اللہ سبحانہ کی مکمل اور والہانہ اطاعت کا تصور ہے۔

دوسری بات ولایت ہی کے موضوع پر یہ بھی ذہن میں رکھنے کی ہے کہ قرآن حکیم نے انسان کا مقصد تخلیق اللہ سبحانہ کی عبادت بتایا ہے اور اللہ سبحانہ کی عبادت کا مفہوم یہ ہے کہ انسان اللہ سبحانہ کے حضور ظاہر و باطن میں ہر طرح سے جھک جائے اور دل کے پورے جذبہ اخلاص و تذلل کے ساتھ اس کے احکام کی پابندی کرے اس حقیقت کی موجودگی میں یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ قرآن کا تصور ولایت عشق الٰہی والا تصور نہیں ہو سکتا بلکہ حق سبحانہ و تعالیٰ شانہ، کی والہانہ طاعت والا ہی تصور ہو سکتا ہے۔ کیونکہ یہ ایک سرتاسر غیر عقلی بات ہے کہ انسان کا مقصد تخلیق تو کچھ ہو اور ولایت کا تصور کسی اور نوعیت کا ہو۔ اللہ سبحانہ نے پیدا تو انسان کو اپنے احکام کی کامل شعوری طاعت کے لیے کیا اور اسے اپنے یہ احکام پوری تفصیل سے دیئے ہوں مگر ان احکام کے پس منظر میں جو ولایت مقصود ہو اس کا بنیادی تصور عشق کا حصول ہو۔

تیسری بات موضوع ولایت پر نوع انسانی کی مخصوص حیثیت کی ہے یہ واقعہ ہے کہ قرآن حکیم نے نوع انسانی کو ایک مخصوص اور امتیازی حیثیت کا مالک بتایا ہے اور وہ یہ کہ انسان اس زمین میں اللہ کا خلیفہ ہے اور خلافت کا مطلب یہ ہے کہ وہ اس کے عطا کیے ہوئے اختیارات سے کام لے کر اللہ کے احکام و ہدایات کو اپنی پوری زندگی میں نافذ کرے اور اس طرح اس کی مرضی پوری کرے۔ انسان کی مخصوص نوعی حیثیت اگر یہ ہے تو یہ سوال ہی خارج از بحث ہے قرآنی تصور ولایت کی بنیاد عشق الٰہی پر رکھی جائے کیونکہ انسان کا منصب خلافت پر فائز ہونا خود اس بات کا اعلان ہے کہ اس کو عطا کی جانے والی ولایت کا بنیادی تصور احکام الٰہی کی رضا کارانہ اطاعت ہے۔

چوتھی بات یہ بھی ولایت کے موضوع سے متعلق سمجھنے کی ہے کہ قرآن نے انسان کے

فطری جذبات و مطالبات کے بارے میں کیا اختیار کی ہے یہ نقطہ نظر رد و انکار اور ازالہ کا نہیں بلکہ پوری طرح اعتبار و قبول اور اپنانے کا ہے۔ قرآن نے انسان کے اندر پیدا کی جانے والی ایک ایک قوت ایک ایک خواہش اور ایک ایک جذبے کو اس کی شخصیت کی صحیح تعبیر کے لیے مطلوب و کارآمد قرار دیا ہے۔ حتیٰ کہ ان خواہشوں کی تکمیل کو مرابتہ دینی کام قرار دیا ہے۔

اس صورت واقعی کی روشنی میں سوچیئے کہ کیا انسان کی طبعی قوتوں اور اس کے فطری جذبات کے بارے میں یہ نقطہ نظر ولایت کی کوئی ایسی تصویر پیش کرسکتا ہے جس کی بنیاد عشق الٰہی ہو؟

پورے اعتماد اور یقین کے ساتھ کہا جاسکتا ہے کہ کوئی بھی صاحب نظر اس سوال کا جواب ہاں میں نہیں دے سکتا۔ آخر کون نہیں جانتا کہ عشق تو ان چیزوں کو اپنے راستہ کی رکاوٹ سمجھتا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ولایت کی بنیاد اگر عشق الٰہی پر ہو تو پھر ولایت ان فطری جذبات و مطالبات کو قبولیت کی نگاہ سے نہ دیکھے گی اور یہ ولایت کے منافی ہوں گے۔ ولایت تو نچلے درجہ کی بات ہے قرآن کہتا ہے کہ یہ نبوت کے بھی منافی نہیں ہیں۔ بلکہ نبوت نے جس حد تک ان فطری جذبات و مطالبات کو قبول کیا ہے اس کی وسعتوں کا اندازہ اس طرح کیا جاسکتا ہے کہ انسانی زندگی سے تعلق رکھنے والے بیشتر مسائل عائلی معاشی معاشرتی تمدنی اجتماعی اور سیاسی سارے کے سارے مسائل ان ہی فطری قوتوں خواہشوں ضرورتوں اور جذبات و مطالبات کے مظاہر ہیں قرآن نے ان سارے مسائل کے بارے میں ہدایات دی ہیں۔ یہ اس بات کا اعلان ہے کہ قرآن کا پیش کردہ تصور ولایت اللہ سبحانہ کی کامل اطاعت ہی ہے اللہ کے عشق کی سرمستیوں میں کھو جانے کا نام ولایت نہیں ہے۔

ولایت کے موضوع پر یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ قرآنی احکام کی نوعیت جامعیت اور ہمہ گیری کی ہے۔ قرآن نے بندگی اور پرستش سے عہدہ برا ہونے کے لیے جو احکام دیئے ہیں وہ پوری انسانی زندگی کو گھیرے ہوئے ہیں وہ انسان کی روح سے بھی تعلق رکھتے ہیں اور اس کے جسم کے مطالبات سے بھی۔ عقائد و ایمانیات سے لے کر اخلاق و اعمال تک اور نجی زندگی کے ابتدائی گوشوں سے لے کر اجتماعی زندگی کے آخری

کناروں تک کوئی ایک مسئلہ بھی ایسا نہیں جس کے بارے میں قرآن کی رہنمائی نہ ہو۔ احکام قرآنی اس نوعیت میں اس بات کی کوئی گنجائش نہیں کہ قرآن کا تصور ولایت عشق پر مبنی ہو۔
بہر حال بتانا یہ چاہتا ہوں کہ قرآن میں ولایت کا تصور عشق پر مبنی نہیں بلکہ اللہ سبحانہ کی ایسی والہانہ طاعت پر مبنی ہے جس کے پیچھے قلب کی پوری آمادگی اور باطن کا سچا احساس تذلل کار فرما ہو۔ اور بس
قرآن ہی نے جو عباد الرحمٰن کا چہرہ پیش کیا ہے اس میں یہ بات خاص طور پر بتائی ہے :

"والذین اذا ذکروا بایات ربھم لم یخروا علیھا صما وعمیانا
اور جب ان کو ان کے آقا کے احکام سمجھائے جاتے ہیں تو وہ احکام الٰہی پر بہرے اور اندھے ہو کر نہیں پڑتے ہیں"۔

مطلب یہ ہے کہ عباد الرحمٰن وہ ہیں جو نہایت فکر و تدبر سے اللہ کے احکام سنتے ہیں اور متاثر ہوتے ہیں پورے فرزانے ہیں۔ دیوانے نہیں ہیں یہ ایک منہ بولتی گواہی ہے کہ ولایت کے بنیادی تصور میں عشق کا کوئی دخل نہیں ہے۔
بتانا یہ چاہتا ہے کہ قرآن کے پیش کردہ تصور ولایت کی بنیاد اللہ سبحانہ سے محبت ہے اللہ سے عشق نہیں ہے اس لیے یہاں ایت میں وہ اولیا مراد نہیں جہاں ولایت کی اساس عشق ہے بلکہ وہ اولیا مراد ہیں جہاں ولایت کی بنیاد اللہ کی محبت ہے۔
شائد یہاں پہنچ کر آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ عشق و محبت میں کیا فرق ہے اہل لغت نے بلاشبہ عشق کے معنے فرط الحب کے لکھے ہیں یعنی حد سے زیادہ محبت۔ یہاں تفصیل کا موقعہ نہیں صرف اتنی بات ذہن میں رکھیے صوفیا میں سے حضرت ابن عطار نے محبت الٰہی کی حقیقت یہ بتائی ہے۔

اغصان تغرس فی القلب فتثمر علی قدر العقول۔
محبت ایسی ڈالیوں کا نام ہے جو دل کی زمین میں لگائی جاتی ہیں اور بقدر العقول پھل دیتی ہیں"۔

امام غزالی نے احیاء میں عبدالوہاب الشعرانی نے الیواقیت میں حافظ ابن القیم نے زاد المجبین میں اور

مدارج السالکین میں علامہ مرتضیٰ زبیدی اتحاف میں محبت کے موضوع پر تفصیلی مباحث لکھے ہیں۔ لیکن ہم نے ابن عطار کے حوالہ سے جو بات لکھی ہے سب سے زیادہ جامع ہے۔ اس میں علی قدر العقول کے الفاظ اس بات کی دلیل ہیں کہ بتانے والے کے نزدیک محبت الٰہی کا اصلی سرچشمہ انسان کی عقل ہے نہ کہ اس کی طبیعت اور طبعی جذبات مولانا سید احمد بریلوی کے تاثرات مولانا اسماعیل الشہید نے بھی صراط مستقیم میں اسی طرح بیان کیے ہیں۔ فرماتے ہیں:

"اس جگہ ایک بڑا ہی باریک نکتہ ملحوظ رکھنے کا ہے جس سے آج کل اکثر لوگ غافل ہیں اور اسے فراموش کر بیٹھے ہیں وہ یہ کہ حب نفسانی جسے عشق کہتے ہیں اور حب ایمانی جسے حب عقلی کہتے ہیں ان دونوں میں فرق ہے"۔

مولانا کے اس بیان سے صرف یہی معلوم نہیں ہوتا کہ محبت الٰہی کی دو الگ الگ قسمیں ہیں ایک حب نفسانی جسے عشق کہتے ہیں دوسری حب ایمانی بلکہ یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ مطلوب قرآن حب ایمانی ہے حب نفسانی نہیں اور یہ کہ نکتہ باریک ہونے کے باوجود ایک کھلا ہوا راز ہے یہ الگ بات ہے کہ اب یہ راز سربستہ ہوگیا اور اکثر لوگوں نے اتنے اہم نکتہ کو بھلا ڈالا۔

ایک اور ارشاد سنیئے جو اس موضوع پر صراحت کی آخری حدوں کو پہنچا ہوا ہے حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

"خدائے تعالیٰ سے جس محبت کا امر ہے وہ حب عقلی ہے نہ کہ طبعی اسی لیے نصوص میں حب طبعی عشق کا عنوان کہیں مذکور نہیں ہے بلکہ جابجا حب کا ذکر ہے۔ اس لیئے کہ حب طبعی مطلوب نہیں بلکہ حب عقلی مطلوب ہے (شریعت و طریقت)

پھر یہ بھی بات ذہن میں رہے کہ عشق ایک غیر ارادی اور غیر اختیاری کیفیت ہے قرآن میں افکار اعمال، اخلاق سب ارادی اور اختیاری ہیں۔ انسان غیر ارادی اور غیر اختیار اعمال کا ازروئے قرآن مکلف ہی نہیں ہے۔

اسی لیے اس آیت میں اولیا کی تعریف بھی ارادی و اختیاری افکار و اعمال کے ذریعے کی گئی ہے الذین آمنوا وکانوا یتقون۔ ایمان وتقویٰ دونوں اختیاری اور ارادی ہیں جیسے ایمان کی ضد کفر ونفاق اور تقویٰ کی ضد فسق و فجور ارادی و اختیاری ہیں۔

اللہ سے محبت کی دس راہیں

اللہ سے محبت کے کچھ اسباب ہیں ان سے وابستگی اللہ سے محبت اور قرب کا ذریعہ ہے حافظ ابن القیم نے اللہ سے محبت کے لیے دس اسباب بتائے ہیں۔ اور ان کو اسباب جالبہ للمحبۃ کہا ہے۔

ا۔ تلاوت قرآن پوری توجہ تدبر سے اور معانی کو سمجھ کر ایسے جیسے آپ کے نام کوئی خط آیا ہو اور آپ اسے بہ جاننے کے لیے پڑھتے ہیں کہ خط روانہ کرنے والے کا مقصد کیا ہے۔ جب آپ متکلم کی بات کی تہ تک نہ پہنچ جائیں اس وقت تک آپ کا پڑھنا پڑھنا نہیں۔

دوسرے فرائض کی ادائیگی کے بعد نوافل کے ذریعے اللہ کا قرب حاصل کیا جائے۔ نماز فرض کے علاوہ تہجد، چاشت، تحیۃ المسجد، تحیۃ الوضو، اشراق بھی پڑھیئے۔ ہو سکے تو بعد مغرب چھ رکعت بھی پڑھ لیجئے۔

رمضان کے روزوں کے علاوہ محرم کا روزہ نصف شعبان کا روزہ ایام بیض کے روزے یعنی ہر چاند کے مہینے کی ۱۳-۱۴ روز ۱۵ کا روزہ۔

زکوٰۃ فرض کے علاوہ غریبوں۔ فقیروں مسکینوں اور مسافروں کی مالی مدد کرنا۔ مدارس اور مساجد کی تعمیر میں ہاتھ بٹانا نفلی صدقہ ہے۔

حج فرض کے علاوہ نفلی عمرے کرنا۔ زیادہ سے زیادہ طواف کرنا نوافل کا یہ ذخیرہ محبت الٰہی کا بہترین ذریعہ ہے۔

تیسری چیز دوام ذکر ہے یہ ذکر زبان سے بھی ہو۔ قلب سے بھی ہو عمل سے بھی اور حال سے۔ کسی دم غافل نہ ہو۔ اللہ کے ذکر میں ہمیشہ مشغول رہے اسی کا نام نسبت ہے۔ ذکر کی مقدار ہی محبت کی مقدار کا پیمانہ ہے۔

چوتھی اللہ سبحانہ کی محبوبات کو اپنی محبوبات پر ترجیح دے بالخصوص خواہشات کے ہجوم میں اس کا زیادہ خیال رکھے۔

پانچویں قلب کو اللہ سبحانہ کے اسماء و صفات کے مشاہد ہے اور معرفت میں لگا رکھے قلب جس قدر ان کی معرفت کی کیاریوں اور مبادی میں رہے گا اسی قدر اللہ کی محبت میں اضافہ ہو گا۔

چھٹے اللہ سے انعامات اور احسانات اور اس کی ظاہری و باطنی نعمتوں کا مطالبہ کرتا رہے
ساتویں اللہ سبحانہ کے سامنے دل سراپا نیاز رہے
آٹھویں یہ کہ اللہ سے با ادب ہو کر دعا و تلاوت کرے اور آخر میں استغفار کرے اور آخر میں
نویں یہ کہ محبین صادقین کی صحبت اختیار کرے ان کی اچھی باتوں سے ایسے ہی لطف اندوز ہو
جیسے لطیف اور مزیدار پھل سے۔ صحبت میں بیٹھ کر خاموشی اپنائے۔
دسویں یہ کہ ہر اس راہ سے دور رہے جو اللہ اور اس کے قلب میں حائل بن کر نمودار ہو خواہ
یہ اشخاص ہوں یا اشیاء، قال ہو یا حال، علم ہو یا عمل اسی بنا پر حضرت مولانا اشرف علی نے کامل کا یہ
چہرہ بتایا ہے۔

کامل وہ ہے جس میں یہ باتیں ہوں۔

(۱) ضرورت کے موافق علم دین رکھتا ہو
(۲) عقیدہ عمل اور عادت شریعت کے موافق ہو
(۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو
(۴) کسی کامل کا صحبت یافتہ ہو
(۵) اس کے زمانے میں جو عالم اور درویش منصف مزاج ہوں وہ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔
(۶) عام لوگوں کی بہ نسبت خاص لوگ اس کے زیادہ معتقد ہوں
(۷) اس کے صحبت یافتہ اور تربیت میں رہے ہوئے افراد میں اکثر پابند شریعت ہوں اور دنیا کے طامع نہ ہوں۔
(۸) وہ کامل اپنے طالبوں کی تربیت سچی کرتا ہو اور چاہتا ہو کہ یہ صالح ہو جاویں
(۹) اس کے پاس چند روز بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور اللہ کی محبت میں زیادتی محسوس ہو۔
(۱۰) وہ خود بھی صاحب ذکر و فکر ہو۔

جس شخص میں یہ نشانیاں ہوں پھر یہ نہ دیکھے کہ اس سے کوئی کرامت بھی ہوتی ہے یا نہیں
وہ ولی ہے اس کے دم کو غنیمت سمجھے۔ یہی الذین امنوا وکانوا یتقون کی عملی
تفسیر ہے۔

اولیاء اللہ کے لیے بشارتیں

یعنی ان کے لیے دنیا کی زندگی میں بھی بشارت ہے اور آخرت کی زندگی میں اللہ کے قوانین کو بدلنے والا کوئی نہیں ہے اور یہی سب سے بڑی کامیابی ہے اولیاء کے لیے دنیا میں کئی طرح کی بشارتیں ہیں مثلاً حق تعالیٰ نے انبیاء کی زبانی جو لاخوف علیھم وغیرہ کی بشارت دی ہے یا فرشتے موت کے وقت انکو کہتے ہیں البشروا بالجنۃ التی کنتم توعدون یا کثرت سے سچے خواب انہیں نظر آتے ہیں یا ان کی نسبت دوسرے بندگان خدا کو دکھائی دیتے ہیں جو حدیث صحیح کے مطابق نبوت کے چھیالیس اجزا میں سے ایک جزو ہے یا ان کے معاملات میں اللہ سبحانہ کی طرف سے خاص ہی قسم کی تائید ہوتی ہے یا خواص میں اور کبھی خواص سے گذر کر عوام میں بھی ان کو مقبولیت حاصل ہوتی ہے اور لوگ ان کی مدح وثنا اور ذکر خیر کرتے ہیں یہ سب چیزیں دنیوی بشارت کے تحت میں درجہ بدرجہ آسکتی ہیں مگر اکثر روایات میں لھم البشری کی تفسیر رویائے صالحہ سے کی گئی ہے واللہ اعلم رہی بشارت اُخروی وہ خود قرآن میں منصوص ہے بشراکم الیوم جنات تجری من تحتھا الانھار اور حدیث میں بھی یہی تفسیر منقول ہے۔ اور لا تبدیل لکلمات اللہ کا مطلب یہ ہے کہ اللہ کی باتیں اور اس کے وعدے سب اٹل ہیں، جو بشارتیں دی ہیں ضرور پہنچ کر رہیں گی[1]

اس آیت کی تشریح میں شارحین قرآن کا انداز اچھا خاصا معذرت خواہی کی تصویر ہے مولانا عثمانی نے جو کچھ اپنے افادات میں لکھا ہے قرطبی بیضاوی، قنوجی، ابن کثیر ابوحیان آلوسی، ابن جریر سب نے یہی انداز اختیار کیا ہے۔ ان میں البتہ بقاعی۔ مراغی نے بات سیاق وسباق کے مطابق کہی ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ چونکہ ان بزرگوں نے آیت میں اولیاء اللہ سے آج کے اصطلاحی مشائخ مراد لیئے ہیں اس لیے لاخوف علیھم ولا ھم یحزنون کو مطالب کا وہ جامہ پہنانا پڑگیا جو ان کے حال کے مطابق ہو اسی طرح لھم البشری فی الحیاۃ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

الدنیا وفی الاخرہ کا منطوق بھی ان کے ہی حسب حال بنا یا۔ حالانکہ ایت قرآنی میں یہ اصطلاحی اولیاء مراد نہیں ہیں۔

آیت قرآن کا مطلب بالکل واضح اور صاف ہے کہ وہ لوگ جو اللہ سبحانہ سے لگاؤ رکھتے ہیں جنہوں نے خدائی اطاعت کا عہد کیا اور اپنے نفس وارادہ کو بالکلیہ احکام الٰہی کے تابع کر دیا نتیجتہً وہ ان جملہ حقوق سے دستبردار ہو گئے جو زمانہ جاہلیت میں ان کو حاصل تھے اور اللہ سبحانہ سے اللہ کے دین کو دنیا میں قائم کرنے کے لیے انہوں نے جنت کے بدلے میں اس دنیا میں اپنی جانوں اور مالوں کا سودا کر لیا ہے اللہ سبحانہ نے ان کو بتایا ہے کہ ان کی زندگی بے خوف ہو گی یعنی ان کو ہر قسم کا امن اور چین پہلے دنیا کی زندگی میں ملے گا معاشی طور پر بھی اور سیاسی طور پر بھی ان کی زندگیاں خوف سے بالا ہوں گی اور وہ اپنی زندگی میں غمگین نہیں بلکہ شاداں اور مسرور رہیں گے۔ ان کا ہی یہ چہرہ بیان ہوا ہے کہ الذین امنوا وکانوا یتقون انہوں نے اللہ کی وحدانیت اور رسالت محمدی کا اقرار کیا ہے اور اس اقرار کے ساتھ اس اقرار کے لازمی نتائج کو بھی تسلیم کیا۔ لفظ اسلام خود اس حقیقت کا شاہد ہے کہ اسلامی زندگی اپنانا اپنے نفس کے جملہ حقوق سے دست بردار ہونا ہے کیونکہ اسلام کے معنے میں اپنے تئیں کسی کے حوالہ کر دینا اور اس کی پوری پوری اطاعت بجالانا۔ ایک شخص جب مسلمان ہوتا ہے تو وہ اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ اس کا ارادہ اس کی عقل اور اس کے جذبات وخواہشات قانون الٰہی اور احکام خدا کی اطاعت میں حائل نہ ہوں گے اور اللہ سبحانہ کے حکم کے مقابلے میں وہ ان سب کی قربانی کرے گا وکانوا یتقون کا یہی مدلول ہے اس اطاعت وسپردگی کے معاوضہ میں ان کو دنیا کی زندگی میں کامیابی کی دشمن کے مقابلہ میں نصرت اور غلبہ کی اور دنیا کی زندگی میں اس دین کا بول بالا ہو گا جسے انہوں نے اپنایا ہے اور آخرت میں ان کو رضائے الٰہی اور قرب خداوندی حاصل ہو گا۔ اور فرشتے ان سے ملیں گے تو کہیں گے بشرکم الیوم جنات تجری من تحتھا الدنیا۔

اس کے بعد فرمایا لاتبدیل لکلمات اللہ یہ اللہ کا اٹل قانون ہے اس میں رد وبدل نہیں ہو سکتا ہے قوموں اور زمانوں کی تبدیلی کا قانون الٰہی پر کوئی اثر نہیں ہوتا سب کے لیے ایک ہی قانون ہے۔

اس اصولی وعدہ بشارت کا حال اگر اس کی عملی شرح اور واقعاتی شہادت کے ساتھ

دیکھنا ہو تو بنی اسرائیل کی اس تاریخ پر نظر ڈالیے جو حضرت موسیٰ کی پیدائش سے کچھ پہلے شروع ہوتی ہے اس وقت سے لے کر حضرت موسیٰ کی بعثت تک کی ان کی زندگی انتہائی ذلیل درد ناک اور ٹھکرائی ہوئی زندگی تھی۔ ان کی یہ ذلت کی زندگی عزت کی زندگی سے اس وقت بدلی جب وہ اپنے رب کی طرف پلٹے اور اس کے دین کی پیروی میں انہوں نے ثابت قدمی دکھائی۔ قرآن کا بیان ہے۔

"وتمت کلمۃ ربک الحسنی علی بنی اسرائیل بما صبروا"

"تیرا رب کا وعدہ خیر بنی اسرائیل کے حق میں پورا ہوگیا کیونکہ انہوں نے راہ حق میں ثابت قدمی دکھائی"۔

اور نہ صرف یہ کہ اپنے رب کی طرف پلٹنے اور راہ حق میں ثابت قدمی دکھلانے پر انہیں عزت و اقتدار کی زندگی مل گئی بلکہ ایک کلیہ کے طور پر ان کو یہ دائمی خوشخبری بھی سنا دی گئی کہ اللہ سبحانہ کی شکر گذاری اور احکام کی پیروی میں تم جتنا بھی آگے بڑھو گے اتنی ہی مزید نعمتوں سے نوازے جاؤ گے۔

واذ تاذن ربکم لئن شکرتم لازیدنکم

"تیرے رب نے اعلان کر دیا کہ اگر تم نے راہ شکر اختیار کی تو مزید انعامات سے نوازے جاؤ گے"۔

جب تک وہ شکر گذاری کی روش اختیار کیے رہے دنیا نے دیکھا کہ اللہ سبحانہ کا وعدہ بشارت پورا ہوتا رہا بلکہ اس شان سے پورا ہوا کہ وہ قومی عزت و اقبال کی آخری بلندیوں پر پہنچا دیئے گئے۔ اور پھر جب انہوں نے شکر گذاری یعنی اللہ کی پرستش و بندگی کی یہ روش چھوڑ دی تو عزت و اقبال کو ان سے چھین لیا گیا۔ سب قوموں کے لیے اللہ کا یہی قانون ہے۔

ولو ان اهل القری امنوا واتقوا لفتحنا علیهم برکات من السماء والارض"۔

"اگر بستیوں والے ایمان لاتے اور راہ تقویٰ اختیار کرتے تو ہم ان پر زمین و آسمان کی برکتوں کے دروازے کھول دیتے"۔

یہی قانون یہاں الذین امنوا وکانوا یتقون میں بیان ہو رہا ہے اس کے نتیجے

میں بھی مسلمانوں اور دوسری امتوں میں بالکل برابری ہے۔ امتوں میں سے جنہوں نے ایمان و تقویٰ کی راہ اختیار کی ان کے بارے میں قرآن کا بیان ہے۔

فاتاھم اللہ ثواب الدنیا وحسن ثواب الاخرۃ

تو اللہ نے ان کو دنیا کا بھی اجر دیا اور آخرت کا بھی بہترین اجر

انبیائی امتوں کی یہ متفقہ شہادتیں ہمارے سامنے موجود ہیں ان سے اللہ سبحانہ کے جس نہ بدلنے والے ضابطہ اور قانون کا پتہ چلتا ہے وہ قطعی طور پر یہی ہے کہ اپنی طاعت اور بندگی کے عوض وہ آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی بھی آسائش اور عزت واقتدار بخشے گا۔ پھر یہی متفقہ شہادتیں یہ بھی بتاتی ہیں کہ جب بھی کسی قوم نے اطاعت وبندگی کی یہ راہ اپنائی ہے اس کے حق میں یہ ضابطہ اور وعدہ لازماً پورا ہوا۔ اور وہ جن کی آخرت سنورتی تھی۔ ان کی دنیا بھی باغ و بہار ہی بنی رہی۔

کوئی وجہ نہیں کہ امت مسلمہ کے بارے میں اللہ سبحانہ کا یہ ضابطہ اور قانون بدل جائے۔ چنانچہ اس آیت میں امت مسلمہ کے بارے میں اسی قانون کو بتایا جارہا ہے کہ ایمان وتقویٰ کی شرطیں پورا کرنے کے نتیجے میں اہل ایمان کو دنیا کی زندگی ملے گی اور ان کو دشمنوں کے مقابلہ میں غلبہ اور برتری دی جائے گی ذلت کی جگہ عزت محکومی کی جگہ حاکمیت پستی کی جگہ بلندی اور زمین میں اقتدار ملے گا۔ یہ وعدے یہ بشارتیں یہ دعدے کیسے پورے ہوئے اس سے دنیا ناواقف نہیں ہے وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ قرآن نے مسلمانوں کو وہ سب کچھ دیا جو دنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہوسکتا ہے۔ قرآن ہی میں ہے۔

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنھم
فی الارض کما استخلف الذین من قبلھم ولیمکنن لھم
دینھم الذی ارتضی لھم ولیبدلنھم من بعد
خوفھم امنا۔

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے ہیں اور عمل صالح کی نعمت سے بہرہ ور ہیں ان سے اللہ سبحانہ کا وعدہ ہے کہ وہ ضرور ان کو اقتدار عطا فرمائے گا جس طرح اس نے پہلے لوگوں کو اقتدار عطا فرمایا تھا اور ان کے لیے ان کے اس قانون کی جڑیں مضبوط سے جمادے گا جسے اللہ سبحانہ نے ان کے لیے پسند فرمایا ہے

اور ان کی موجودہ حالت خوف کو امن سے بدل دے گا۔"

ان تمام صراحتوں اور شہادتوں کے بعد یہ بات بالکل واضح ہو کر سامنے آجاتی ہے کہ جو بات آیت استخلاف میں کہی گئی ہے وہی بات یہاں آیت ولایت کی ہے جو بات آیت استخلاف میں صراحت کہی گئی ہے وہی بات اس آیت میں کنائی زبان میں کہی گئی ہے ایک ہی بات ہے مگر تعبیرات جدا جدا ہیں۔

یہاں پہنچ کر شائد آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ صورت حال اگر یہ ہے تو شارحین نے اس آیت کے منطوق میں خواب کی بات کیوں رکھ دی ہے۔

اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ شارحین قرآن نے اولیاء اللہ سے اپنے زمانہ کے تارک الدنیا عزلت گزین خانقاہوں اور زاویوں میں مجاہدات کرنے والے بزرگوں کو قرآن کا اولیاءاللہ سمجھ لیا ہے۔ یہ سمجھ لینے کے بعد جب ان کو اقتدار و دبدبہ سے محروم دیکھا تو آیت قرآنی کی تشریح کیلئے خواب کا سہارا لے لیا۔ اور سوء اتفاق سے اس موضوع پر ایک منقطع حدیث بھی ان کو دفتر حدیث میں مل گئی۔ لیجئے حدیث آپ بھی سن لیجئے۔

حضرت ابوالدرداء فرماتے ہیں کہ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لھم البشری فی الحیاۃ الدنیا کے متعلق دریافت کیا حضور نے فرمایا کہ جس وقت سے مجھ پر یہ آیت قرآنی نازل ہوئی ہے کسی نے میرے میں بشری سے مراد مسلمان کا وہ اچھا خواب ہے جو وہ دیکھے یا اسے دکھایا جائے۔"

یہ ترمذی نے اپنی سنن میں روایت کی ہے۔ لیکن امام ترمذی فرماتے ہیں کہ یہ حدیث ابوصالح روایت کرتا ہے لیکن ابوصالح اور ابوالدرداء کے درمیان اس میں عطاء بن یسار نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ حدیث کی سند میں اتصال نہیں بلکہ انقطاع ہے۔ امام ترمذی نے یہی حدیث دوسری دو سندوں سے بھی روایت کی ہے جن میں عطاء بن یسار موجود ہے لیکن ان میں عطاء بن یسار مصر کے ایک مجہول شخص سے روایت کرتے ہیں اس لیے یہ روایت بھی منقطع ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت عطاء نے خود ابوالدرداء سے نہیں سنا ہے۔ موطا میں اس موضوع پر حضرت عروہ ابن الزبیر کی یہ تشریح کہ اس آیت میں بشری سے مراد رؤیائے صالحہ ہے یہ روایت موقوف ہے کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حدیث کی روشنی میں بشری کی خواب سے تشریح صحیح طریقہ سے ثابت نہیں ہے دو باتیں ہیں اور دونوں

الگ الگ ہیں۔

ایک یہ کہ اس آیت میں بشریٰ سے مراد رویائے صالحہ ہے۔ دوسری یہ کہ رویائے صالحہ بشریٰ اور مبشرات میں سے ہے۔ میں پہلی بات کو بتا رہا ہوں کہ وہ صحیح طریق سے ثابت نہیں ہے باقی دوسری بات کہ رویائے صالحہ مبشرات میں سے ہے یہ اپنی جگہ صحیح ہے اور احادیث سے ثابت ہے۔

اچھا خواب بھی مبشرات سے ہے

یہ حقیقت بالکل بے غبار ہے کہ احادیث میں اچھے خواب کو مبشرات میں سے ہی نہیں بلکہ نبوت کا چھیالیسواں حصہ بتایا ہے اور نبوت کے اجزا میں سے بھی ایک حصہ یعنی بشریٰ امت کو نبوت سے وراثت میں ملا ہے چنانچہ ایک سے زیادہ احادیث میں یہ بات کھول کر بتائی ہے۔ موطا امام مالک میں بحوالہ حضرت انس بن مالک ہے کہ

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ نیک آدمی کا اچھا خواب نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک ہے۔

اور امام بخاری نے حضرت ابو ہریرہ کے حوالہ سے بتایا کہ

> حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ نبوت سے مبشرات کے سوا کچھ باقی نہیں رہا۔ صحابہ نے دریافت کیا یا رسول اللہ مبشرات کیا ہیں؟ فرمایا اچھا خواب

اچھے آدمی کے اچھے خواب کا نبوت کے اجزا میں سے ہونے کا کیا مطلب ہے حکیم الامت شاہ ولی اللہ المسوی میں لکھتے ہیں کہ

> اس کا مقصد خواب کے معاملہ کو بتانا ہے کہ خواب انبیاء کے حق میں نبوت کا ایک حصہ ہے خوب سمجھ لو کہ یہ حقیقت ہے اگر تم میں کوئی خواب دیکھے تو اس کو ناقابل التفات نہ سمجھو کیونکہ نبوت کے متعدد اجزا میں یہ جزامت میں باقی ہے۔

اگر خواب مبشرات میں سے ہے اور اس کی حیثیت نبوت کے چھیالیسویں حصہ کی ہے تو پھر ایسے خوابوں کی قانونی حیثیت کیا ہے یہ تو سب جانتے ہیں کہ نبوت کے سوا کسی کا نہ خواب

قانونی طور پر حجت اور نہ الہام۔ نبی کا خواب قطعی ہے جب کہ دوسروں کا خواب قطعی نہیں ظنی ہے لیکن ظنی ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پایۂ اعتبار سے ساقط ہے ورنہ یوں تو قرآن کے سوا اخبارِ آحاد بھی ظنی ہیں۔ قیاس مجتہد بھی ظنی ہے خواب بھی ظنی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ثبوت میں قطعیات سے کمتر ہے نہ یہ کہ اس میں حجیت کی شان ہی نہیں ہے۔ البتہ حجیت ہونے کی حیثیت الگ الگ ہے۔ خبرِ واحد ظنی ہے صرف وسائط کے درمیان میں آجانے کی وجہ سے چونکہ شبہ کی گنجائش آگئی ہے اس لیے ارشادِ نبوت ہونے کے باوجود وہ ثبوتاً ظنی ہوگئی اور ثمرہ کے اعتبار سے بھی ظنی شمار ہوگی لیکن اس کے باوجود حجت شرعیہ ہے اور موجب للعمل ہے۔ ایسے ہی اجتہادِ مجتہد بھی ظنی ہے مگر خبرِ واحد سے درجہ میں کمتر ہے کیونکہ وحی سے ماخوذ ہے اور چونکہ اس میں بندے کے فہم و عقل کو دخل ہے اس لیے بلحاظ ثبوت خبرِ واحد سے کمتر ہوگا مگر پھر بھی نص سے ماخوذ ہونے کی وجہ سے مورث ظن ہی ہے اور اس میں حجت شرعیہ ہونے کی شان بھی باقی ہے الخ اجتہاد کو مثبت احکام نہیں بلکہ مظہرِ احکام کہا جائے گا۔

رویائے صالحہ مؤید ہے

رویائے صالحہ یقیناً خبرِ واحد اور اجتہادِ مجتہد سے درجہ میں کمتر ہے کیونکہ وہ خود نہ وحی ہے اور نہ وحی سے ماخوذ ہے بلکہ غیر نبی پر گذرے ہوئے واقعات ہیں جس کی سند صرف یہ خواب دیکھنے والا ہے جس کا کوئی شاہد اور متابع نہیں اس لیے وہ اور الہام ولی نہ احکام کے لیے مثبت ہوگا اور نہ مظہر۔ البتہ ثابت شدہ احکام یا واقعات کے لیے مؤید ضرور ہوسکتا ہے اسی لیے سلف سے لے کر خلف تک اہل علم خوابوں سے اس قسم کی تائیدات کا اثبات کرتے آئے ہیں۔ آخر خواب کو نبوت کا $\frac{1}{46}$ حصہ فرمایا گیا ہے جس سے ظاہر ہے کہ اس کا تعلق فرضیات سے نہیں واقعات سے ہے۔ نبوت کی ابتدا ہی سچے خوابوں سے ہوئی کہ آپ جو کچھ خواب میں دیکھتے وہی چیز واقعہ بن کر سامنے آجاتی۔ بتانے والوں نے سچے خوابوں کا عرصہ ۶ ماہ بتایا ہے اور وحی کا عرصہ نبی ہونے کے بعد ۲۳ سال ہے۔ ان ۲۳ سالوں کو ۱۲ سے ضرب دیجئے تو حاصل ضرب ۲۷۶ آتا ہے اس کو ۶ ماہ پر تقسیم کیجئے تو چھیالیسواں حصہ ۴۶ آتا ہے۔ نبوت کے بعد نبوت کے اس چھیالیسویں حصہ کے باقی رہنے کی خبر دی گئی۔

لم یبق من النبوۃ الا المبشرات، اس کا حاصل یہی ہے کہ سچے اور اچھے خواب نبوت کا ایک جزو ہونے کی وجہ سے تبشیر کا کام ضرور دے سکتے ہیں۔ اور اگر ان سے احکام اور علل احکام ثابت نہیں ہو سکتے تو ان احکام و علل کی تائید اور توضیح تو ہو سکتی ہے۔

رویائے صالحہ کی تاثیر

رویائے صالحہ کی تاثیر بھی نمایاں ہے۔ اچھا خواب اگر وہ از قسم مبشرات ہے تو قلوب کو تسلی ہوتی ہے اور اگر از قسم انذار ہو تو دل لرز کر محتاط ہو جاتے ہیں سوچنے کی بات ہے کہ اگر ایک واقعہ بیداری میں اثر ڈالے بغیر نہیں رہتا تو آخر خواب میں دیکھنے والے کے لیے بے اثر ہو کر کیسے رہ جائے گا صرف ظرف ہی تو بدلتا ہے واقعہ تو نہیں بدلتا۔ مورد نگاہ ہی تو بدلتا ہے نگاہ تو نہیں بدلتی ہے۔

نیز یہ بھی ایک ثابت شدہ حقیقت ہے کہ دنیا میں حقیقی نگاہ بھی قوت خیال ہے جو نفس انسانی کا ایک طبعی جوہر ہے اور خواب کی نگاہ بھی اسی نفس کی وہی قوت خیالیہ ہے صرف اس کے پیکر کی شکل بدل جاتی ہے۔ قوت نہیں بدلتی ہے۔ اس لیے جب نفس بھی ایک ہی ہے اور آلۃ الابصار بھی ایک ہے اور واقعہ کی نوعیت بھی ایک ہی ہے اگر بدلا ہے تو صرف ظرف بدلا ہے تو ظرف کے بدلنے سے مظروف یا اس کی تاثیر کیسے بدل جا سکتی ہے زیادہ سے زیادہ کیفیت کی نوعیت میں فرق ہو سکتا ہے کیفیت کی تبدیلی سے عین نہیں بدل سکتا اس لیے بیداری کی آنکھ سے کسی واقعہ کو دیکھا جائے یا خواب میں دیکھا جائے دیکھنے والا نفس اور اس کی قوت خیال سمع و بصر اور ذوق و شم کی نوعیتوں میں بٹی ہوئی ہے ایک ہی رہے گی اور اثر بھی ایک ہی ظاہر ہوگا اس لیے سچا خواب یقیناً اپنا اثر دکھلائے بغیر نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ ظنی ہے تو ہمارے ادراک کی وجہ سے ظنی ہے نہ کہ واقعات کے اعتبار سے اس لیے سچے خواب میں قبولیت کے علاوہ ایک گونہ حجیت کی شان بھی کچھ نہ کچھ ہو گی جب ایک سچے مومن کا خواب ایک سچا واقعہ ہے تو بوجہ واقعیت اپنے متعلقہ معاملہ کیلئے حجت ہوگا گو دیا نتہ ہی حجت ہو قانون کی نظر میں نہ ہو۔

تواتر کی صورت میں سچا خواب

اگر ایک شخصیت یا ایک واقعہ کے بارے میں کئی سچے خواب جمع ہو جاویں تو ان میں حجیت کی شان کچھ زیادہ ہو جاتی ہے دورِ نبوت میں ایسے خوابوں کو حجت شرعیہ سمجھا گیا ہے

لیلۃ القدر کو جب متعدد صحابہ نے رمضان کے آخری عشرے ہی میں خواب میں دیکھا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اس کے عشرہ آخر میں ہونے کا حکم دے دیا اور اس کی علت یہ ارشاد فرمائی۔

"میں دیکھتا ہوں کہ تمہارے بہت سے خواب اس پر متفق ہو گئے کہ لیلۃ القدر عشرہ آخرہ رمضان میں ہوتی ہے۔"

اس سے پتہ چلتا ہے کہ خوابوں کی یکسانیت اور تواتر و تعدد جھوٹ پر محمول نہیں ہوتا۔ لہذا جیسے اہل ایمان کے خوابوں کی ہم آہنگی روایت کو واجب القبول اور مورث ظن غالب بنا دیتی ہے اور جس طرح رائے میں علما کی ہم آہنگی یعنی اجماع و استحسان کسی چیز کو واجب العمل قرار دیتی ہے ٹھیک اسی طرح سچے اہل ایمان کا سچے خواب پر اتفاق خواب کو واجب القبول بنا دے تو اس میں حیرت کی کونسی بات ہے اور اگر ایک حد تک زندگی میں قانونی طور پر حجت مان لیا گیا ہے تو اس میں کیا قباحت ہے بلکہ بعض اوقات زمانہ نبوت میں ایک ہی شخص کے خواب کو شرعی حکم کی بنا قرار دیا گیا ہے جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اذان کی مشروعیت کے لیے عبداللہ بن یزید بن عبد ربہ کے خواب کو شرف پذیرائی دیا اور فرمایا انھا لرؤیا حق قم یا بلال فاذن یہ سچا اور واقعی خواب ہے بلال کھڑے ہو اذان دو یہ الگ بات ہے کہ وہ دور نبوت تھا اور آپ کی توثیق ہے خواب حجت شرعی بن گیا لیکن توثیق تو بہر حال خواب ہی کی ہوئی جس سے اتنا واضح ہو گیا کہ مومن صالح کا سچا خواب کسی نہ کسی درجے میں حجیت کی شان ضرور لیے ہوئے ہے۔

یہاں پہنچ کر آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ بشریٰ اگر خواب ہے۔

کونسا خواب البشری ہے؟

تو کیا ہر خواب لبشری ہے یا اس کا کوئی خاص پیمانہ ہے۔
اس موضوع پر بزرگوں نے کافی تحقیق اور دقیق سے کام لیا ہے سب سے پہلے اس موضوع پر حکیم الامت شاہ ولی اللہ کے علوم سے استفادہ کیجئے شاہ صاحب علوم شرعیہ اور علوم باطنیہ دونوں کے شتادر ہیں شاہ صاحب نے مؤطا امام مالک کی دو شرحین لکھی ہیں ایک عربی میں اس کا نام المسوی ہے دوسری فارسی میں اس کا نام مصفی ہے۔ شاہ صاحب نے المسوی میں مؤطا کی اس حدیث

ابو قتادہ بن ربعی کہتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ ارشاد سنا ہے کہ اچھی خواب اللہ کی جانب سے اور حلم شیطان کی جانب سے ہے جب تم میں سے کوئی شخص خواب میں ناگوار چیز دیکھے تو اسے بائیں طرف تین بار ہو کر تھوک دینا چاہیے اور یوں کہنا چاہیے اعوذ باللہ من شرھا میں اللہ کی پناہ میں آتا ہوں اس کی برائی سے انشاء اللہ ہر قسم کے نقصان سے محفوظ رہے گا۔
حدیث کے راوی ابوسلمہ کہتے ہیں میں بری خوابیں دیکھتا جو مجھ پر پہاڑ سے زیادہ گران ہوتیں۔ جب سے میں نے حضور اقدس کا یہ ارشاد سنا ہے تب سے میں ایسے خوابوں کی پرواہ نہیں کرتا۔

پر یہ نوٹ لکھا ہے:

اس ارشاد کے ذریعے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم یہ بتا رہے ہیں کہ انسان کے سارے خواب صحیح نہیں ہوتے ہیں صحیح تو صرف وہ خواب ہوتا ہے جو اللہ کی جانب سے خواب کا فرشتہ لے کر آئے اس کے علاوہ سب خیالات فاسدہ میں ان کی کوئی تعبیر نہیں ہوتی۔ یہ خیالات فاسدہ میں خواب کئی قسم کے ہوتے ہیں کبھی خواب دیکھنے والے سے شیطان کھیلتا ہے یا اس کو غمناک مناظر دکھاتا ہے اسی کے بارے میں حضور کا حکم ہے کہ بیدار ہو کر بائیں جانب تھوک دے اور اعوذ باللہ من شرھا کہے۔ اور کبھی خواب کا پس منظر جی کی باتیں ہوتی ہیں مثلاً کسی کام میں اپنے کو لگا ہوا دیکھتا

ہے اور کبھی خواب کا پس منظر خود انسانی طبیعت کا مزاج ہوتا ہے دموی مزاج کو خواب میں نکسیر سفید یا سرخ رنگ کی چیزیں نظر آتی ہیں صفرائی طبیعت والے آگ اور زرد رنگ کی چیزیں خواب میں دیکھتے ہیں سودائی طبیعت والے سیاہی تاریکی کالی چیزیں ہولناکیاں اور موت دیکھتے ہیں، بلغمی مزاج والوں کو خواب میں پانی۔ برف اور سپید چیزیں نظر آتی ہیں ان کی کوئی تعبیر نہیں ہے۔

تاویل الرؤیا یا تعبیر کے مقام پر انشاء اللہ تفصیلی بحث سورہ یوسف میں آرہی ہے۔ یہاں تو صرف یہ بتانا ہے کہ احادیث کی روشنی میں اچھے آدمی کے اچھے خواب بھی بشری ہیں۔ لیکن آیت قرآنی لھم البشری فی الحیاۃ الدنیا میں بشری سے مقصود اچھا خواب نہیں ہے بلکہ دنیا کی زندگی میں خوشحال۔ امن وچین، خوشی وشادمانی ہے۔ لوگ اپنے کو پستیوں میں دیکھ کر چاہتے ہیں کہ قرآن کو اس کی بلندیوں سے ہٹا کر اپنی پستیوں کا ہمنوا بنالیں ہونا یہ چاہیے کہ ہم قرآن کی بلندیوں تک پہنچے تھے۔ اور آن واحد میں دنیا کی روحانی، اخلاقی، عائلی، معاشرتی معاشی، سیاسی اور قانونی نظام کی امامت پر قابض ہو گئے تھے واجعلنا للمتقین اماما۔

عزت ودبدبہ پر اللہ کا قبضہ ہے

۶۵ اور اے اللہ کے رسول تمہیں مخالفین کی باتیں غمگین نہ کریں یقین کرو کہ سارا دبدبہ اللہ کے لیے ہے وہ سب کچھ سن رہا ہے اور سب کچھ جانتا ہے اوپر سے اعداء مکذبین کا ذکر چلا آرہا تھا ان کے بالمقابل دوستوں کا ذکر آیا اور ان کو دارین میں محفوظ رہنے کی بشارت دی۔ اسی سلسلہ میں حضور کو تسلی دی کہ آپ احمقوں اور شریروں کی باتوں سے رنجیدہ نہ ہوں غلبہ اور زور سب اللہ کے لیے ہے وہ اپنے زور وتائید سے حق کو غالب ومنصور اور مخالفین کو ذلیل ورسوا کر کے چھوڑے گا وہ ان کی سب باتیں سنتا اور سب حالات جانتا ہے لے ان آیات کے نزول کے زمانے میں نبوت اور اہل ایمان پر آشوب حالات سے دوچار تھے ان حالات میں تمکن اور غلبہ کی بشارت مخالفین کے لیے استہزا واعراض کا باعث ہو سکتی تھی۔ ان کا دعویٰ ضرور اپنے غلبہ کا ہوگا وہ کہہ سکتے تھے اور انہوں نے کہا بھی ہوگا کہ اس بے کسی اور بے بسی کی حالت میں لھم البشری فی الحیاۃ الدنیا کا

لے افادات شیخ الاسلام

نعرہ کیسا عجیب ہے ان کو دو وقت کی روٹی کھانے کو اور بدن ڈھانکنے کو کپڑا نہیں ملتا اور اقتدار و غلبہ کا خواب دیکھ رہے ہیں فرمایا ان کی یہ بات آپ کو غمگین نہ بنائے آپ کے لیے جو بشارت ہے وہ یقینی ہے آگے اس کی علت بیان ہو رہی ہے ان العزۃ للہ جمیعًا اس لیے کہ غلبہ و اقتدار اور عزت کا مالک اللہ ہے وہ بلا ریب ان کو ذلیل کرے گا اور آپ کو عزیز بنائے گا یہ نعمت جس کو ملتی ہے اللہ ہی کی دین سے ملتی ہے اب اگر اللہ نے یہ عزت تمہیں اور تمہارے ساتھیوں کو دینے کا ارادہ کر لیا تو اسے کون روک سکتا ہے یہ اللہ سبحانہ کا فیصلہ ہے دنیا کی کوئی طاقت اس میں رکاوٹ نہیں ہو سکتی علامہ بقاعی اور قاضی بیضاوی نے ان العزۃ للہ جمیعًا کو پہلے جملہ کی تعلیل قرار دیا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ ان کی بات پر غمگین نہ ہوجیئے اور ان کی پروا نہ کیجئے کیونکہ غلبہ و اقتدار اللہ کی ملکیت ہے۔ کوئی اس میں اللہ کا شریک نہیں ہے اللہ سبحانہ ضرور ان کو مغلوب کرے گا۔ اور آپ کو غلبہ عطا فرمائے گا۔

ایمان و تقویٰ اور فلاح دنیا

ان تمام صراحتوں اور شہادتوں کے بعد قرآن کے قاری کا ذہن اس پر تو بالکل مطمئن ہو جاتا ہے کہ قرآن ایمان و اتقا سے مالا مال ہونے والوں کو دنیا کی فلاح سے خوب نوازتا ہے۔ لیکن ذہن میں یہ خلش ضرور چٹکیاں لے گی کہ قرآن تو صرف آخرت کی طرف انسان کو متوجہ کرتا ہے اور اسے دنیا سے بے پروا بناتا ہے پھر اسے ایمان و اتقا کا دامن پکڑنے کے نتیجے میں دنیا کس طرح ملے گی۔

اس مسئلہ کو سمجھنے کے لیے ہمیں پہلے کچھ اصولی حقائق سمجھ لینی چاہئیں ایک تو یہ کہ دولت و عزت و اقتدار جنہیں دنیا کی فلاح کہا جاتا ہے قرآن کی نظر میں بجائے خود محبوب نہیں بلکہ اللہ کی نعمتیں ہیں۔ خود قرآن نے اپنے مخاطبوں کے سامنے ان کو یہی حیثیت دی ہے۔

اذکروا نعمۃ اللہ علیکم اذ جعل فیکم انبیاء وجعلکم ملوکاً

دوسری یہ کہ انسان اس دنیا میں اللہ سبحانہ کا خلیفہ اور نائب ہے اس کا منصب یہ ہے کہ وہ اس زمین کا انتظام اپنے ہاتھ میں رکھے اور اسے اپنے مالک کے احکام

رہنمایات کے مطابق چلائے۔

یہ دونوں بنیادی حقیقتیں اگر سامنے ہوں تو زیر بحث سوال اس حد تک بالکل حل ہو جاتا ہے کہ دنیا کی عزت دولت اور اقتدار ہرگز ایسی چیزیں نہیں ہیں جن سے تعلق رکھنا اور فائدہ اٹھانا قرآن کی دعوت کے منافی ہے کیونکہ جو چیزیں اللہ کا فضل اللہ کی نعمت ہوں وہ اہل ایمان کے لیے ممنوع نہیں ہو سکتی ہیں۔ قرآن بتاتا ہے۔

قل ھی للذین امنوا فی الحیاۃ الدنیا خالصۃ یوم القیامۃ

یہ ساری چیزیں دنیا کی زندگی میں ایمان والوں کے لیے ہیں اور قیامت کے دن تو خالصتہ ان کے لیے ہی ہوں گی۔

اس کا مطلب یہ ہے کہ ان چیزوں کے اصلی حقدار اہل ایمان ہیں اگر فی الواقع وہ حقدار ہیں تو وہ ان کے لیے ناپسندیدہ کسی طرح نہیں ہو سکتی ہیں اہل ایمان اللہ کی نعمتوں سے نہیں اس کی نعمتوں سے گریز کرتے ہیں۔

یہ بھی سوچئے کہ اگر اللہ سبحانہ نے انسان کو اپنا خلیفہ بنایا ہے اور چاہتا ہے کہ اس زمین پر وہ اس کے احکام کے مطابق اپنے اختیارات استعمال کرے تاکہ یہاں بھی اس کی مرضی پوری ہو جس طرح باقی کائنات میں ہو رہی ہے تو جب تک یہاں ایسے لوگ موجود ہوں جو اپنے فرض منصبی کا پورا احساس رکھتے ہوں اس وقت تک یہ بات اللہ سبحانہ کی حکمت کے منافی ہے کہ ان کو زمین کے اقتدار سے محروم رکھے اور ان کے ہوتے ہوئے اقتدار ان لوگوں کے سپرد کر دے جو اس فرض منصبی کے منکر ہوں۔ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا ہے قرآن کے اوراق کھلے ہوئے ہر شخص پڑھ سکتا ہے۔

ولقد کتبنا فی الزبور من بعد الذکر ان الارض یرثھا عبادی الصالحون

ہم نے زبور میں یاد دہانی کے بعد لکھ دیا تھا کہ زمین کے وارث حاکم میرے صالح نیک بندے ہوں گے۔

صالحین سے مراد الذین امنوا وکانوا یتقون ہیں۔ قرآن میں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ فرما کر کہ

وکذالک مکنا لیوسف فی الارض

اور اسی طرح ہم نے حضرت یوسف کو زمین میں حکومت دے دی ارشاد ہوا ہے۔
ولاجر الاخرۃ خیر للذین امنوا وکانوا یتقون۔
اور آخرت کا اجر اس سے بہتر ہے ان لوگوں کے لیے جو ایمان و اتقاء کی نعمت سے مالا مال ہیں۔

اب اہل ایمان و اتقاء کے لیے یہ بات کسی طرح صحیح نہ ہوگی کہ وہ اس اقتدار کے حاصل کرنے سے بے نیازی برتیں جس کے بغیر وہ اپنے فرض خلافت سے کسی طرح عہدہ برآ نہیں ہوسکتے۔ جس چیز سے ان کی زندگی کا اصل فریضہ وابستہ ہو وہ ان کے لیے صرف پسندیدہ نہیں بلکہ ضروری بھی ہے۔ ان ساری باتوں کو پیش نظر رکھ کر یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ مسلمان صرف اخروی فلاح ہی کا نہیں بلکہ دنیوی فلاح کا بھی حقدار اور طلب گار ہے اور ایسا ہونا یہ مسلمان کی سچی دینداری کا تقاضا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ایک سچے اور صحیح الفکر مسلمان کی دعا یہ ہوتی ہے۔

ربنا اتنا فی الدنیا حسنۃ وفی الاخرۃ حسنۃ وقنا عذاب النار

یہ دعا یقیناً قبول ہوکر رہتی ہے اگر وہ الذین امنوا وکانو یتقون کا مصداق بنا دے۔

دنیا کے سارے قوانین وہم وگمان کی تخلیق ہیں

لہ یاد رکھو کہ آسمانوں اور زمین میں سب کے سب اللہ کے ہیں اور وہ لوگ جو اللہ کے سوا شریکوں کو پکارتے ہیں ان کی جو کچھ بھی اتباع اور پیروی ہے وہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ وہ سرتاسر گمانوں کی پیروی کر رہے ہیں اور وہ ہر بات میں اٹکل اور تخمین سے کام لے رہے ہیں یعنی کل زمین و آسمان میں خدائے واحد کی سلطنت ہے۔ سب جن وانس اور فرشتے اسی کے مملوک مخلوق ہیں مشرکین کا غیر اللہ کو پکارنا اور انہیں خدائی کا حصہ دار بنانا محض اٹکل کے تیر اور واہی تباہی خیالات ہیں ان کے ہاتھ میں نہ کوئی حقیقت ہے نہ حجت و برہان خالی اوہام و ظنون کی اندھیریوں میں پڑے ٹھوکریں کھا رہے ہیں

لہ افادات شیخ الاسلام

روحانی نظام ہو یا اخلاقی عائلی نظام ہو یا معاشرتی، معاشی نظام ہو یا سیاسی اور قانونی الغرض انسانوں کا بنایا ہوا کوئی نظام وہ خود انسان ہی کے وہم گمان اور تخمین و اندازے کی تخلیق ہوتا ہے۔

غور سے دیکھا جائے تو نظام کوئی ہو روحانی ہو یا کوئی اور اس میں بنیادی نظریات اور اساسی اصولوں کا ماخذ انسان کے وہ تصورات ہوتے ہیں جو وہ خود اپنی ذات اپنے آغاز و انجام اور لوگوں سے اپنے تعلق کی نسبت قائم کرتا ہے۔ یہی وہ بنیاد ہے جس پر بالآخر دیگر نظریات و تصورات قائم ہوتے ہیں کیونکہ انسان اپنی نسبت اپنے مرتبہ اور کائنات سے اپنے تعلق کی بات جو تصور تعبیر کرے گا وہی اس کے جملہ افکار و اعمال کی تشکیل پر موثر ہوگا۔

قرآن نے اس آیت میں الا حرف تنبیہ کے ذریعے انسان اس کی ذات اور کائنات سے اس کے تعلق کا نظریہ بتایا ہے۔ قرآنی نقطہ نظر سے من فی السماوات و من فی الارض اللہ کی مملوک کی ہے اس لیے انسان کی حیثیت اس زمین میں مملوک کی ہے اور اللہ سبحانہ اس کے مالک ہیں مملوک ہونے کی حیثیت میں اسے مالک نے ایک مکمل قانون دے کر دنیا میں اس لیے روانہ کیا ہے کہ وہ اس قانون کو خود اپنی زندگی اور اس کے معاملات کے لیے چراغ راہ بنائے اور دوسروں کو بھی اسی قانون کے مطابق چلائے۔ اس کام کے لیے اسے کچھ تھوڑے بہت اختیار بھی دیے گئے۔ اور اسی مقصد کی خاطر کائنات خارجی اور اس کی لاتعداد قوتوں کو انسان کا خادم بنا دیا گیا ہے کہ وہ انہیں جس طرح چاہے کام میں لائے۔ انسان اس لیے نہیں ہے کہ وہ خارج کا بے بس غلام بن کر رہے۔ اس کا شرف و امتیاز یہ ہے کہ وہ خارج اور اس کی قوتوں پر اپنے ارادے کو موثر کرے اور جس مالک کا ملک ہے اس کی ذات و صفات سے قرب حاصل کرے۔

اللہ سے قرب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اللہ سبحانہ کی ذات انسانوں کی طرح جسمانیت اور اس کے لوازم سے آلودہ ہے۔ قرب سے مراد اللہ کی رضا حاصل کرنا اس احکام کی پیروی کرنا۔ قرب عبارت ہے ایسے ارادہ سے جو خارج و باطن دونوں پر موثر ہو اللہ کی ذات سب سے زیادہ مکمل ہے کہ اس کا ارادہ کائنات پر غالب ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی اس معنی کر کے سب سے زیادہ مکمل ہے کہ وہ اپنے ارادے پر پورا اختیار رکھتا ہے اور کائنات

پر غالب ہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ان معنی کرکے سب سے زیادہ مکمل ہے کہ وہ اپنے ارادے پر پورا اختیار رکھتا ہے اور کائنات خارجی اس کے ارادے کی محکوم ہے۔

چونکہ زمین پر خدا کی مملوک ہونے کی حیثیت سے انسان کا کمال مطلوب یہ ہے کہ وہ اللہ سبحانہ سے زیادہ سے زیادہ قرب حاصل کرے اس لیے اسلامی زندگی کا اصل اصول اللہ کا قرب ہے اور یہی اسلام اور کفر کے درمیان حد فاصل ہے۔ کفر غیر اللہ سے قرب ہے بے قیدی اور بے راہ روی ہے وہ ایسی زندگی ہے جس میں وہ عجز و درماندگی کی آخری حد تک پہنچ جاتے ہیں اور بے جان اشیاء تک کو عبادت میں اللہ کا شریک بنا لیتے ہیں اسی کا نام اوثان ہے اور کبھی اپنے ہی جیسے انسانوں کی چاکری کرنے لگتے ہیں ان کو ہی قرآن کی زبان انداد کہتے ہیں اور ان سب کا مجموعی نام شرکاء ہے۔ اس آیت میں وما یتبع الذین یدعون من دون اللہ شرکاء۔ عام غلط فہمی یہ ہو گئی ہے کہ شرک کو صرف عبادت تک محدود کر دیا گیا ہے حالانکہ شرک عبادت ہی میں نہیں طاعت میں بھی ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہ کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے حضرت شاہ عبدالقادر کیسی عمدہ بات فرما گئے۔ موضح القرآن میں آیت لا تنکحوا المشرکات کے تحت فرماتے ہیں۔

> شرک یہ کہ اللہ سبحانہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے یا وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ یا ہمارا بھلا یا برا کرنا اس کے اختیار میں ہے اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خرچ کرے مثلاً کسی کو سجدہ کرے اس سے حاجت مانگے مختار جان کر۔

اور سورہ نساء میں ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ پر نوٹ لکھتے ہیں۔

> اوپر سے ذکر تھا منافقوں کا جو پیغمبر کے حکم پر راضی نہ ہوا اور جُدی راہ چلے یہ آیت فرمائی کہ اللہ شرک نہیں بخشتا تو شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے بس جو دین ہے سوائے اسلام کے سب شرک ہے اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔

اس کا مطلب یہی ہے کہ عبادت میں شرک سے بچتے ہوئے اگر اسلامی قانون کے سوا کسی اور قانون کی اطاعت کر رہے ہوں یہ شرک طاعت میں ہے۔ اور سورہ انعام میں

روایت وان اطعتموھم انکم لمشرکون فرماتے ہیں:
"شرک فقط یہی نہیں کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجئے بلکہ شرک کے حکم میں ہے
کہ اور کا مطیع ہو جائے۔"

حضرت شاہ عبدالقادر نے شرک کے موضوع پر جو کچھ فرمایا ہے اسی کی روشنی میں اس آیت میں عبادت والا شرک مراد ہے اور مطلب یہ ہے کہ جن شرکا کی وہ شرکا سمجھ کر اتباع کر رہے وہ ان کی اتباع نہیں ہے۔ معاً سوال پیدا ہوا کہ پھر وہ کیا ہے جواب میں فرمایا کہ یہ سب کچھ ان کے اپنے ہی وہموں اور گمانوں کی پیروی ہے اور شرکا کے شرکا ہونے کے بارے میں ان کا اندازہ اور تخمین کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یا یہ مطلب ہے کہ جن کی تم اللہ کی شریک بنا کر اتباع کر رہے ہو یہ تو تمہاری اپنے اوہام کی پیروی ہے۔ ان کی پیروی کرتے تو اللہ کی عبادت کرتے وہ اللہ کی عبادت کرتے تھے۔ یہ ساری کارگذاری تخمین و انداز سے دب کر ہو رہی ہے۔ اور اگر ما موصولہ ہو تو مطلب یہ ہے کہ یہ اللہ کے سوا دوسروں سے مانگنے والے جو کچھ جتنی کچھ اپنی زندگی میں جن کی اتباع کر رہے ہیں اس کی اساس ان کے وہم و گمان کے سوا کچھ نہیں اس صورت میں یہ شرک فی الطاعۃ ہے۔ یہ وہی اتباع ہے جو قرآن کی اس آیت میں بتائی ہے۔

اذ تبرا الذین اتبعوا من الذین اتبعوا ورا العذاب وتقطعت
بھم الاسباب۔

جب متبوعین اپنے اتباع سے بیزاری کا اعلان کریں گے اور عذاب الٰہی
کا آنکھوں سے مشاہدہ کر لیں گے اور سارے وسائل ختم ہو جائیں۔

عبادت میں شرک کرنے والوں کے شرک کی بنیاد گمان پر ہے اور طاعت میں شرک کرنے والوں کے شرک کی بنیاد بھی وہم و گمان اور تخمین و انداز پر ہے۔ دنیا میں وہ سب لوگ جو روحانی نظام اخلاقی نظام اور سیاسی نظام میں وحی الٰہی سے براہ راست تعلق نہیں رکھتے ہیں ان سب کا حال یہی ہے کہ جو کچھ کر رہے ہیں اور جس چیز کی دعوت دے رہے ہیں وہ سب ان کے خیالوں وہموں اور خیالوں کے پیشاؤں سے دو دو پی کر بیٹھے ہیں۔ عبادت میں اصنام، اوثان کی پرستش کرتے ہیں اور طاعت میں وہ اپنے ہی جیسے انسانوں کی بندگی کرتے ہیں قانون الٰہی کی طاعت اور اللہ کی بندگی اور پرستش سے انہیں بیر ہے۔

قرآن ضبط و طاعت کی زندگی چاہتا ہے ایسا ضبط اور ایسی طاعت جو کسی انسان اور انسانوں کسی جماعت کے ارادوں اور خواہشات پر نہیں بلکہ قانون خداوندی اور رضائے الٰہی پر مبنی ہو۔ ایسے ہی ضبط اور آئین شناسی سے انسان اپنے ارادے پر قابو حاصل کر سکتا ہے اور نفس و خواہشات کی غلامی سے نجات پا سکتا ہے۔ یہی تسخیر نفس ہے دوسری طرف وہ تسخیر فطرت کا بھی مطالبہ کرتا ہے اور اس غرض سے ہمیں وہ غیر اللہ کے سامنے جھکنے سے سر جھکانے سے یا انہیں اپنا حاجت روا تصور کرنے سے روکتا ہے خواہ وہ انسان ہو یا کائنات کی بے جان اشیاء، اس طرح تسخیر نفس اور تسخیر کائنات سے قرآن مسلمان کی شخصیت کی تکمیل کرتا ہے لیکن یہ دونوں کام نہ تنہا کسی ایک انسان کا کام نہیں ہے ایک شخص خواہ کتنی ہی اعلیٰ صلاحیتوں کا مالک ہو ان مشکلات پر قابو نہیں پا سکتا جو کائنات اور اس کی لاتعداد قوتوں کو رام کرنے میں پیش آتی ہیں اس مقصد کے لیے اجتماعی زندگی کا قیام اور انسانوں کا ایک مربوط جماعت کی شکل میں زندگی بسر کرنا ضروری ہے یہ تفصیل کا محل نہیں ہے۔ آیت قرآن میں شرک فی الطاعت اور شرک فی الطاع دونوں داخل ہیں۔ عبادت اور طاعت دونوں کے اجتماع سے انسان کی تکمیل ذات ہوتی ہے۔

تحقیق کا صحیح علمی طریقہ

ف۔ اللہ ہی کی ذات گرامی نے تمہارے لیے رات بنائی ہے تاکہ تم آرام کرو اور دن بنایا ہے روشنی والا تاکہ تم کام کاج کرو بلاشبہ اس میں ان لوگوں کے لیے بڑی نشانیاں ہیں جو کلام اللہ سنتے ہیں دن رات اور اندھیرے اجالے کا پیدا کرنے والا ایک ہی خدا ہے اسی سے خیر و شر اور تمام متقابل اشیاء کی پیدائش کو سمجھ لو اس میں مجوس کے شرک رد ہو گیا اور ادھر یہی لطیف ارشاد ہو گیا کہ جس طرح رات کی تاریکی کے بعد خدا روز روشن کر لاتا ہے اور دن کے اجالے میں وہ چیزیں نظر آتی ہیں۔ جو شب کی ظلمت میں دکھائی نہ دیتی تھیں ایسے ہی مشرکین کے اوہام ظنوں کی اندھیروں کا پردہ چاک کرنے کے لیے اس نے قرآن کریم کا آفتاب چمکایا ہے جو لوگوں کو وصول الی اللہ کا ٹھیک راستہ دکھانے والا ہے [1]

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں قرآن نے وہم وگمان اور ظن وتخمین کی بنیاد پر روحانی وسیاسی نظام بنانے والوں کو تحقیق کا صحیح علمی طریقہ یہ بتایا ہے کہ پہلے قرآن اور نبوت کی بات کھلے کانوں سے سنو جس کا دعویٰ ہے کہ میں جو نظام لے کر آیا ہوں اس کی بنیاد قیاس وگمان اور وہم وخیال پر نہیں بلکہ علم ویقین اور اذعان وبصیرت پر ہے۔ کائنات فطرت تمہارے سامنے ہے اس پر غور کرو اس کی شہادتوں کو مرتب کرو اور پھر سوچو تمہیں اس ظاہر کے پیچھے حقیقت کی نشانیاں ملیں گی۔ اس سے تم پر نبوت کے بیان کی حقیقت اور حقانیت کھل جائے گی

اس آیت میں مثال کے طور پر صرف دو نشانیوں کی طرف توجہ دلائی گئی ہے یعنی رات اور دن۔ یہ انقلاب لیل ونہار دراصل سورج اور زمین کی نسبتوں میں انتہائی باضابطہ تغیر کی وجہ سے رونما ہوتا ہے۔ یہ ایک عالمگیر ناظم اور ساری کائنات پر غالب اقتدار رکھنے والے حاکم کے وجود کی صریح علامت ہے اس میں صریح حکمت اور مقصدیت بھی نظر آتی ہے کیونکہ تمام موجودات زمین کی بے شمار مصلحتیں اسی گردش لیل ونہار سے وابستہ ہیں۔ اس میں صریح ربوبیت اور رحمت اور پروردگاری کی علامتیں بھی پائی جاتی ہیں کیونکہ اس سے یہ ثبوت ملتا ہے کہ جس نے زمین پر یہ موجودات پیدا کی ہیں وہ خود ہی ان کے وجود کی ضروریات فراہم کرتا ہے اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ انصرام وانتظام ایک ذات میں مرکوز ہے اور یہ بھی کہ وہ ذات گرامی حکیم ہے اور بامقصد کام کرتا ہے اور یہ بھی کہ وہ ہی محسن ومربی ہونے کی حیثیت سے انسانوں کی عبادتوں اور طاعتوں کا مستحق ہے اور یہاں جو کچھ ہے وہ اس کا مربوب ہے، مملوک ہے غلام ہے۔ بندہ ہونے کی حیثیت میں بندہ کا کام مالک کی پرستش اور بندگی ہے۔ آقائی صرف اللہ کی ذات گرامی کو سجتی ہے۔

قَالُوا اتَّخَذَ اللّٰهُ وَلَدًا سُبْحٰنَهٗ ؕ هُوَ الْغَنِیُّ ؕ لَهٗ
مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ ؕ اِنْ عِنْدَكُمْ مِّنْ سُلْطٰنٍۭ
بِهٰذَا ؕ اَتَقُوْلُوْنَ عَلَی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿۶۸﴾ قُلْ اِنَّ الَّذِیْنَ
یَفْتَرُوْنَ عَلَی اللّٰهِ الْكَذِبَ لَا یُفْلِحُوْنَ ﴿۶۹﴾ مَتَاعٌ فِی الدُّنْیَا
ثُمَّ اِلَیْنَا مَرْجِعُهُمْ ثُمَّ نُذِیْقُهُمُ الْعَذَابَ الشَّدِیْدَ بِمَا كَانُوْا
یَكْفُرُوْنَ ﴿۷۰﴾ ع

کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنالیا ہے۔ اللہ کی ذات پاک ہے وہ بے نیاز اور بے پروا ہے اسی کا تو ہے جو کچھ آسمانوں اور جو کچھ زمین میں ہے۔ تمہارے پاس اس دعویٰ کی کوئی سند نہیں ہے کیا اللہ کے بارے میں ایسی بے پر کی باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں کچھ بھی پتہ نہیں ہے ۶۸ اے اللہ کے رسول ان سے کہہ دو کہ یقیناً وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ کا افترا کرتے ہیں فلاح نہیں پاتے ہیں۔ دنیا کی زندگی وقتی فائدہ ہے پھر ہمارے حضور میں ان کو پیش ہونا ہے۔ پھر ہم ان کو کافرانہ کرتوتوں کی پاداش میں سنگین عذاب

کا مزہ چکھائیں گے ۸۲

معانی مفردات

سبحانہ: السیوطی نے الاتقان میں لکھا ہے۔ سبحان مصدر ہے یہ منصوب ہوتا ہے اور مضاف بھی۔ مضاف الیہ مفرد اسم ظاہر ہوتا ہے یا اسم ضمیر جیسے سبحان اللہ اور سبحانہ، سبحانك اور یہ ان مصادر میں سے ہے جن کا فعل استعمال نہیں ہوتا ہے۔ علامہ کرمانی نے زمخشری کی اتباع کو کہ اس کا فعل سَبَّحَ ہے۔ عجیب اور غریب ہے علامہ زمخشری نے استشہاد میں یہ شعر پیش کیا ہے۔

قسبح اللہ وجوہ تغلب کلما
سبح الحجیج وکبر وا اھلالا

اللہ سبحانہ قبیلہ تغلب کے چہروں کو برا کرے جب بھی حج کرنے والے بلند آواز سے دعا کریں اور حالت احرام میں تکبیریں کہیں۔

علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے قاموس اور بصائر ذوی التمیز میں سبحان کو معرفہ لکھا ہے وہ اس کو تسبیح کا علم جنس قرار دیتے ہیں یہی جمہور کا مذہب ہے قاضی بیضاوی زمخشری دنا میتی اور بہت سے علماء نے یہ بات کھول کر بتائی ہے علامہ زجاج نے بھی سبحان الذی اسری کی تفسیر میں اسے مصدر ہونے کی بنا پر منصوب بتایا ہے یعنی یہ فعل محذوف کا مفعول مطلق ہے۔ شیخ محمد ناسی لکھتے ہیں کہ سبحان فعل کے قائمقام ہوکر تنزیہ بلیغ کے معنے میں استعمال ہوتا ہے مجد الدین بصائر ذوی التمیز میں سبحان کے معنی اللہ کی طرف لپکنے اور اس کی طاعت میں ہلکا پھلکا ہونے کے بتائے ہیں۔
بہر حال سبحان مصدر ہے اس کا فعل سبح ہے۔ جیسے شکران شکر کا اور رجحان رجح کا اور غفران غفر کا۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی نے تاج العروس میں اس پر تفصیلی بحث کی ہے۔

شرک کے مظاہر میں سے ایک اور

یہ تو سُن آئے ہو کہ شرک پرستش میں ہو یا بندگی اس کی اساس کوئی عقلی اور منطقی دلیل کی قوت نہیں بلکہ محض وہم گمان خیال اور قیاس پر ہے عرب مشرکین بھی ملائکہ کو اللہ کی بیٹیاں کہتے یہودی بھی ابنیت کے قائل تھے ان سب سے بڑھ کر عیسائی تھے جن کا عقیدہ صرف حضرت عیسیٰ کی ابنیت ہی کا نہیں بلکہ الوہیت کا بھی عقیدہ رکھتے تھے۔ اس عقیدے کے نتیجے میں ان کے سارے افکار اللہ سبحانہ کی تسبیح اور تحمید سے بیگانہ ہو گئے وہ کمزوریوں سے منزہ اور نہ خوبیوں اور کمالات کا مرکز رہا۔ شرک یہی نہیں کہ کسی کو اللہ کے برابر اللہ جانے بلکہ شرک کے معنے یہ ہیں کہ اللہ سبحانہ کی تنزیہ میں جن افکار و اعمال سے بگاڑ آتا ہو وہ کرے اور اللہ کے خاص کمالات میں جہاں شرکت کا شائبہ بھی ہو وہ بھی شرک ہے مثلاً ہر جگہ حاضر ناظر ہونا اور ہر چیز کی ہر وقت خبر رکھنا دور ہو یا نزدیک چھپی ہو یا کسی اندھیرے میں ہو یا اُجالے میں آسمانوں میں ہو یا زمینوں میں پہاڑوں کی چوٹی پر، سمندر کی تہ میں یہ اللہ ہی کی شان اور اس کا کمال ہے اور کسی میں یہ کمال نہیں ہو سکتا۔ یہی اس کی معبودیت ہے اور الحمد للہ کا بھی تقاضا ہے اس میں کسی شریک کرے تو یہ شرک ہے اور اس کو شرک فی العلم کہتے ہیں۔

ایسے ہی عالم میں ارادہ سے تصرف کرنا اور اپنا حکم جاری کرنا اور مارنا جلانا روزی دینا اس میں فراخی کرنا اور تنگی کرنا تندرست اور بیمار کرنا، فتح و شکست دینا اقبال و ادبار دینا مرادیں پوری کرنا بلائیں ٹالنا مشکلات میں دست گیری کرنا یہ بھی اللہ کی شان ہے اور اللہ کے سوا کسی کی یہ شان نہیں ہے نہ حضرت عیسیٰ میں نہ حضرت عزیز میں یہ بھی اللہ کی شانِ معبودیت کا تقاضا ہے اس میں کسی کو شریک کرنا شرک ہے اور اسے شرک فی التصرف کہتے ہیں۔ بہرحال شرک کے بہت سے مظاہر ہیں ایک مشرکانہ شاہکار کا یہاں ذکر ہو رہا ہے۔

لوگ کہتے ہیں کہ اللہ نے بیٹا بنا لیا ہے۔ اللہ کی ذات پاک ہے وہ بے نیاز اور بے پروا ہے اسی کا ہے جو کچھ آسمانوں میں اور زمین میں ہے۔ تمہارے پاس اس دعوے کی کوئی سند نہیں ہے کیا اللہ کے بارے میں ایسی بے پر کی باتیں کہتے ہو جن کا تمہیں کچھ بھی پتہ نہیں ہے اس میں عیسائیوں کے شرک کا رد ہے جو حضرت مسیح کو خدا کا بیٹا کہتے تھے۔

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ اگر واقعی طور پر مسیح کو معاذ اللہ خدا کا صلبی بیٹا سمجھتے ہیں تو اس سے بڑھ کر کیا گستاخی ہوگی۔ خداوند قدوس بالبداہتہ بیوی بچوں سے پاک ہے اور اگر بیٹے سے مراد متبنیٰ ہے تو خدا کو اس کی ضرورت کیا پیش آئی کہ ایک مخلوق کو متبنیٰ بنائے کیا معاذ اللہ اسے اولاد کی حسرت اور بیٹا نہ ہونے کا غم تھا یا یہ فکر تھی کہ اس کے بعد مال و دولت کا وارث اور اس کا نام روشن کرنے والا کون ہوگا یا یہ کہ بڑھاپے اور ہرج مرج میں کس سے سہارا ملے گا العیاذ باللہ وہ تو سب سے بے نیاز ہے اور سب ہر وقت اس کے محتاج ہیں اسے بیٹے پوتے یا متبنیٰ وغیرہ کی احتیاج کہاں ہوسکتی ہے سب چیزیں اس کی مملوک و مخلوق ہیں پھر مالک و مملوک اور خالق و مخلوق کے درمیان ان نسبی رشتوں کی کہاں گنجائش ہے۔ یہ بڑی سخت بات ہے کہ خدا کی نسبت محض جہالت سے ایسی جھوٹی اور بے سند باتیں کہی جائیں۔[1]

اس جگہ سب سے اہم بات قالوا اتخذ اللہ ولداً سے متعلق بتائی ہے۔ عام شارحین قرآن کا میلان یہ ہے کہ اس میں عیسائیوں کا رد ہے حالانکہ انداز بیان اس کی اجازت نہیں دیتا قالوا کی ضمیر کا مرجع الذین یدعون من دون اللہ ہے ولد سے واحد اور جمع دونوں مراد ہوتے ہیں اور ایسے ہی بیٹے اور بیٹی دونوں پر اس کا اطلاق ہوتا ہے علامہ مجدالدین نے بصائر ذوی التمیز میں تصریح کی ہے الولد یکون جمعاً وواحداً۔ ویطلق الولد علی الابن والابنۃ یعنی لفظ واحد جمع بیٹا اور بیٹی کے لیے عربی زبان میں استعمال ہوتا ہے۔ اور پھر سورت مکی ہے اور مکی سورتوں میں روئے سخن مشرکین کی طرف ہے۔ وہ فرشتوں کو اللہ سبحانہ کی اولاد سمجھ کر ان کی الوہیت کے قائل تھے یعنی مشرکین بھی عیسائیوں کی طرح عقیدہ تولید کے قائل تھے۔ لفظ ولداً لاکر ان کے عقیدہ تولید ہی پر ضرب لگانی مقصود ہے۔ مشرکین ہوں یا عیسائی وہ عقیدہ تولید رکھتے ہیں اسی کو بتانے کے لیے اتخذ اللہ ولداً کی تعبیر اختیار کی ہے۔

عقیدۂ توحید کی تعبیر

اتخذ اللہ ولداً میں زیادہ قابل توجہ لفظ ولد ہے۔ اردو میں عموماً لڑکا بیٹا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور بچہ ہے اس لفظ کا ترجمہ کیا جاتا ہے۔ غالباً یہ خیال ہے کہ عربی میں ابن کے لفظ اور ولد میں کسی قسم کا کوئی فرق نہیں ہے یعنی دونوں ہم معنے اور مرادف ہیں۔ لیکن ذرا سے غور سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے کہ د ل د ولادت سے بنا ہے ولادت کے معنے جننے کے ہیں گویا جب ہم کسی کو کسی کا ولد بتاتے ہیں تو ہمارا یہ دعویٰ ہوتا ہے کہ ولد اس شخص سے جس کا وہ ولد ہے ولادت کا تعلق رکھتا ہے۔

اب سوچئے کہ ولادت کے اس لفظ کا اطلاق اللہ سبحانہ کی نسبت سے کیا جائے گا تو اس کا مطلب کیا ہوگا یہی ناکہ جب ہم کہیں گے کہ رشید ولد ہے اور حمید رشید کا والد ہے۔ رشید بیٹے اور حمید والد کے باہمی تعلقات کی نوعیت کیا ہوتی ہے؟ کیا حمید والد اپنے بیٹے رشید کا خالق ہوتا ہے۔ بلاشبہ واقعہ کی یہ غلط تعبیر ہے۔ رشید نطفہ کی صورت میں والد کے اندر نمودار ہوتا ہے اور حمید والد اسی نطفہ کو رشید کی ماں کے رحم میں گراتا ہے۔ ولد یعنی رشید کی ذات اس کا وجود، وجود کے سارے لوازم و صفات صفات کے ثمرات و نتائج میں سے کسی چیز کو رشید اپنے والد حمید سے نہیں لیتا خلق کے معنے اگر نیست کو ہست کرنا ہیں تو اس معنی کے اعتبار سے قطعاً کوئی والد اپنے ولد کا خالق نہیں ہوتا اور اگر خلق کے معنے گھڑنا کیے جائیں جیسے سونا چاندی سے زیور گھڑتا اور بناتا ہے یا بت تراش پتھر کو تراش کر بت بناتا ہے تو اس معنے کے اعتبار سے بھی بیٹا اپنے باپ کی مخلوق نہیں ہوتا۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اتخذ اللہ ولدا کا مطلب یہ ہے کہ جیسے اللہ نے ولد ٹھہرا لیا ہے وہ عقیدہ تولید کی رو سے اللہ سبحانہ کی مخلوق نہیں ہے کسی معنی اور کسی حیثیت سے بھی مخلوق نہیں ہے۔

آیئے اسی لفظ ولد سے جو دوسری بات سمجھ میں آرہی ہے وہ گوش گذار فرمایئے سب جانتے اور مانتے ہیں کہ قانون ولادت کے تحت آدمی سے جو چیز پیدا ہوگی وہ آدمی ہوگی اور جیسے آدمی سے گھوڑا نہیں آدمی ہی پیدا ہوتا ہے۔ یہ ایک عام قانون ہر اس چیز میں جس میں والد اور ولد ہونے کا تعلق ہو۔ جب یہ قانون عام ہے کہ لومڑی سے جوہا اور چوہے سے شیر نہیں پیدا ہوتا بلکہ لومڑی سے لومڑی اور چوہے سے چوہا ہی پیدا ہوتا ہے تو آپ ذرا ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سوچئے جنہوں نے اتخذ اللہ ولدا کو اپنا عقیدہ

بنایا ہے انہوں نے فی الواقع کیا دعویٰ کیا ہے اور اپنے ایمان کی بنیاد کس چیز پر رکھی ہے یہی تاکہ اللہ سبحانہ کے سوا کوئی دوسری ہستی بھی ایسی ہے جو اللہ سبحانہ کی مخلوق نہیں یعنی ولد ولد کی ذات اس کے صفات و کمالات اللہ سبحانہ کے عمل تخلیق کے رہین منت نہیں ہیں اور قانون ولادت کی رُو سے ولادت کا تعلق رکھنے والا معاذ اللہ، بجز اللہ ہونے کے اور کیا ہو گا اللہ سے پیدا ہونے والا اللہ کے سوا اور کیا ہو گا۔ گھوڑے سے گھوڑا پیدا ہوتا ہے اس عقیدہ تولید کا یہی مطلب ہے کہ خدائی کے سارے کمالات کے بارے میں آپ جانتے ہیں کہ اللہ کے اس ولد میں بھی پائے جاتے ہیں۔

یہ ہے ان کے دعویٰ اتخذ اللہ ولدا کی وہ ہیبت اور خوفناک شکل جس پر مشرکین اور عیسائیوں کے مذہب کی بنیاد قائم ہے۔

کچھ بھی ہو آیت میں ولد کا لفظ بتا رہا ہے کہ درحقیقت عقیدہ تولید رکھنے والوں کا موقف یہ ہے کہ خالق عالم کے سوا ایک اور ہستی بھی ہے جو اللہ سبحانہ کی مخلوق بھی نہیں ہے اور سارے خدائی کمالات و صفات کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ اگرچہ کہنے والے اس کو اللہ نہیں کہتے بلکہ ولد اللہ کہتے ہیں مگر ولد اللہ ہونے کا مطلب ہی یہ ہے کہ وہ بھی اللہ ہے لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔

نظریہ ولدیت کی توضیح

شرک کے وہ سارے مظاہر جن میں خالق کے سوا ہر معبود کو مخلوق مان کر عبادت کی جاتی ہے۔ ان کا مسئلہ کچھ پیچیدہ نہیں ہے۔ اصل پیچیدگی تو اس عجیب و غریب شرک میں ہے جس کی بنیاد ولدیت کے عقیدے پر استوار کی گئی ہے کہ اس میں خالق کے سوا ایک ایسی ہستی کو معبود بنا لینے کی کوشش کی گئی ہے جو مخلوق نہیں بلکہ العیاذ باللہ اللہ کا مولود ہے اور ولدیت کا لازمی تقاضا یہی ہے کہ اللہ کا ولد بھی اللہ ہو بلکہ اس نظریہ ولدیت کو مان کر خود والد کی طرف بھی ناگفتہ امور کو منسوب کرنے پر اس نظریہ کا معتقد بے بس اور مجبور ہے۔

کھلی بات ہے ولد کا لفظ والد کے سامنے قدرتاً والدہ کا تصور سامنے لاتا ہے جس کے برے اطوار کے ذکر سے زبان تو کیا خیال بھی کانپ اٹھتا ہے۔

یہاں تک تو قرآنی آیت قالوا اتخذ اللہ ولداً کا مطلب ہوا اب آگے چلیے ارشاد ہوتا ہے سبحانہ ھو الغنی الصمد کی ذات پاک ہے یعنی اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ولدیت سے پاک ہے اس کی جناب میں یہ بات محال ناممکن اور ناقابل تصور ہے اس سے قبل لم یمکن ولا یتصور یہاں تو صرف اتنی بات فرمائی ہے دوسری جگہ ارشاد ہوا ہے مالھم بہ من علم ولا لآبائھم ان کو اس بارے میں کچھ بھی پتہ نہیں اور نہ ان کے باپ دادوں کو کسی چیز کے علم کی دو ہی صورتیں ممکن ہیں خود بخود ہو یا کسی ذریعے سے ہو۔ نظریہ ولدیت کی حد تک دونوں منتفی ہیں اسی لیے یہاں فرمایا ہے ان عندکم من سلطان ھذا تمہارے پاس اپنے موقف کے لیے کوئی سند نہیں ہے۔ اب اس کے سوا اور کیا ہے کہ ان ہی سے جو نظریہ ولدیت کے تحت بجائے قرار دینے کے کسی شخص کو خالق عالم جل مجدہ کا مولود بنا رہے ہیں دریافت کیا جائے اتقولون علی اللہ مالا تعلمون کیا تم اللہ پر ایسی بے پر کی باتیں اڑا رہے ہو جن کا تمہیں کوئی پتہ نہیں ہے۔

ولدیت کا عقیدہ انسانیت کے اس متفقہ فیصلہ کے خلاف بغاوت ہے کہ اللہ کے سوا جو کچھ بھی ہے سب مخلوق ہے، اس کی جگہ یہ دعویٰ کہ ایک خاص ذات اللہ سبحانہ کی مخلوقیت سے خارج ہے وہ مخلوق نہیں مولود ہے یہ درحقیقت اللہ کے ساتھ ایک اور اللہ کو ماننا ہے اور صرف یہی نہیں بلکہ اللہ کو والد بنانے کے ساتھ والدہ بنانے کے لیے انسانی گھرانے کی ایک عورت کے متعلق یہ تسلیم کر لینا پڑتا ہے کہ والدہ ہونے کے فرائض اسی نے انجام دیئے اور اس راہ میں جن ناقابل بیان تصورات سے دل و دماغ کو گذرنا پڑتا ہے۔ خدا کی پناہ۔

قرآن کا سوال یہی ہے کہ ان سارے اعتقادی طوفانوں کے نیچے کسی حیثیت سے کسی جگہ کسی منزل میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ براہ راست اس کا علم اسے حاصل ہوا ان عندکم من سلطان بھذا کتنے گمان نے کتنے دہشت ناک کتنے خوفناک نتائج پر یہ عقیدہ مشتمل ہے خدا کی مخلوقیت سے ایک شخص کو نکالنے کا دعویٰ اور اللہ کے ساتھ ایک اور اللہ کا دعویٰ کس قدر بے باکی ہے اتقولون علی اللہ مالا تعلمون کیا تم اس قدر بے باک ہو گئے کہ اللہ کے نام ایسا جھوٹ کا طوفان اٹھاتے ہو تم یہ بات کہنے کی جرأت کیسے کرتے ہو جس کا تمہیں خود پتہ نہیں ہے۔ قرآن نے ان لفظوں میں جو اس عقیدے پر تنقید کی ہے

کیا واقعہ کی صحیح تعبیر نہیں ہے اس سے بڑا دعویٰ اور کیا ہو سکتا ہے کہ ایک ایسی بادر ہوا بات جس کی قطعاً کسی قسم کی کوئی علمی بنیاد نہیں اور انسانیت کی تاریخ میں جو کبھی سوچی بھی نہیں گئی اسی کو پیش کر کے الٰہیات کے سارے نظام ہی کو درہم برہم کر دیا۔ اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ سورہ مریم میں آرہی ہے۔

قرآن کی افترا کرنے والوں کو دھمکی

۷۲ اے اللہ کے رسول ان سے کہدو کہ یقیناً وہ لوگ جو اللہ پر جھوٹ کا افترا کرتے ہیں فلاح نہیں پاتے ہیں۔ دنیا کی زندگی وقتی فائدہ ہے پھر ہمارے ہی حضور میں پیش ہوتا ہے پھر ہم ان کو ان کے کافرانہ کرتوتوں کی وجہ سے سنگین عذاب کا مزہ چکھائیں گے یعنی اللہ پر جھوٹ باندھنے والے خواہ دنیا میں کیسی طاقت رکھتے ہوں اور اپنے سازو سامان پر مغرور ہوں لیکن انہیں حقیقی بھلائی اور کامیابی ہرگز نصیب نہ ہوگی۔ تھوڑے دن دنیا کی زندگی میں مزے اڑالیں انجام کار ان کا معاملہ اللہ کے حضور پیش ہوگا۔ جہاں سے اپنے جرائم کی یادداشت میں نہایت سخت عذاب کا مزہ چکھیں گے ۱؎

پہلے بتایا تھا کہ ان نظریہ ولدیت رکھنے والوں کے پاس دلیل کی کوئی قوت نہیں ہے ان عندکم من سلطان بھذا لفظ سلطان آیا ہے۔ اس دنیا کے کچھ قوانین تو ایسے ہیں جن میں اللہ سبحانہ نے سلطانیت کی صفت پیدا کی ہے یعنی اپنے آثار و نتائج کے اعتبار سے انسانی فطرت پر ان کا تسلط اور ان کی گرفت اتنی سخت اور مضبوط ہے کہ انکی واقفیت کا انکار انسان کے بس کی بات نہیں ہے۔ جیسے آگ جلاتی ہے آفتاب روشن ہے دو دونی چار ہوتے ہیں اللہ سبحانہ کے ان ہی قوانین کو سلطانی قوانین کہا جاتا ہے اور ان کے بالمقابل ایسی چیزیں جن کے ساتھ انسان کی فطرت کا یہ تعلق نہیں ہے وہ غیر سلطانی باتیں ہیں اب آپ باسانی سمجھ سکتے ہیں کہ پیدائش و تخلیق کی وہ واضح اور کھلی ہوئی راہیں جن کے آثار و نتائج کا کسی حال میں انکار ممکن نہیں سلطانی قوانین کہلائیں گے۔ قرآن میں شرک کے موضوع پر اس قسم کی آیتوں کا تکرار

۱؎ افادات شیخ الاسلام

ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم و آباءکم ما انزل اللہ
بھا من سلطان ۔ ان یتبعون الا الظن و ما تھوی الانفس۔
نہیں ہے یعنی جن چیزوں کو لوگ پیدائش کا ذریعہ سمجھتے تھے لیکن صرف نام
ہی ناالفاظ جن کو تم نے اور تمہارے باپ دادا نے خود ہی رکھ لیا ہے
اللہ نے ان کے لیے کوئی سلطان نہیں اتارا وہ صرف اٹکل کے پیچھے لگے
ہوئے ہیں اور ان باتوں کے جن سے ان کا جی چاہتا ہے۔

با اسی موضوع کی وہ آیت جو ابھی گذری ہے ان یتبعون الا الظن بھی بتا رہا ہے کہ سلطانیت کے قدرتی معیار سے ہٹ کر تحقیق و تلاش کے باب میں جہاں بھی یہ غیر منطقی راہ اپنائی گئی ہے لوگوں میں گمراہی کے سوا کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا۔ انہی غیر سلطانی دلائل کے دباؤ نے انسانوں کو افترائی قوانین پر مجبور کر دیا ہے۔ یہاں قرآن یہی بتا رہا ہے کہ جو لوگ غیر سلطانی دلائل سے ہٹ کر افترائی قوانین اپنا لیتے ہیں وہ کبھی فلاح و کامیابی سے ہمدوش نہیں ہوتے ہیں۔ افسوس کتنے ہیں جو ان ہی افترائی قوانین کی جکڑ بندیوں میں جکڑے ہوئے کہہ رہے ہیں کہ حضرت مسیح ولد اللہ ہیں۔ دانائے غیب ہیں۔ مختار کل حاضر ناظر ہیں۔ آخر ان ہی انسانوں میں کتنے ہیں جنہیں کئی خانقاہوں میں مصائب کا طوفان نظر آیا بلکہ بعض بزرگوں کے مزاروں میں اتنی قوت لوگوں کو محسوس ہوئی کہ کسی سخت سے سخت حادثہ کو رفع کر دینے کے لیے وہ کافی ہے۔

یہ آیت اوپر کے مضامین کا خلاصہ ہے کہ افترائی قوانین والے کبھی کامیاب نہیں اور زندگی کے کسی شعبے میں کبھی کامیاب نہیں ہوتے۔

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

قرآن کے اس اعلان کو سن کر انسانی ذہن میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ ہمارا مشاہدہ تو یہ ہے کہ یہ افترا کرنے والے کامیاب ہیں۔ اس کے جواب میں ارشاد ہوا ہے متاع فی الدنیا۔ قاضی بیضاوی لکھتے ہیں کہ یہ مبتدا محذوف کی خبر ہے یا مبتدا ہے اور خبر محذوف ہے پہلی صورت میں مطلب یہ ہے کہ ان کے یہ افترائی قوانین جن کے بل بوتے پر کافرانہ نظام حکومت قائم کر رہے ہیں وقتی سامان ہے جیسے قرآن ہی میں ہے کلوا وتمتعوا

قلیلا انکم مجرمون کھالو مزے اڑالو تھوڑے دن تم لوگ مجرم ہو یا جیسے قرآن ہی میں خبر دی گئی ہے۔

الذین کفروا یتمتعون ویاکلون کما تاکل الانعام والنار مثوی لھم۔

جنہوں نے راہ کفر اختیار کی اور مزے اڑا رہے اور کھا رہے ہیں جیسے چوپائے کھاتے ہیں۔ اور ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

اور دوسری صورت میں مطلب یہ ہے کہ ان کے لیے دنیا کی زندگی میں وقتی سامان ہے۔ متاع میں تنکیر قلت کے لیے ہے۔ قلت آخرت کے مقابلے میں ہے۔ یہ فقرہ یہاں بطور استیناف بیانی مقام دلیل میں ہے کہ اس سے مراد اس وقت اہل کفر کا ملک کے حالات ومعاملات میں وہ آزادانہ وخود مختارانہ تصرف ہے جو مسلمانوں کے مقابلے میں ان کو حاصل تھا۔ اس وقت تک مسلمان کمزور تھے اور کفار اپنی سطوت کے گھمنڈ میں ہر جگہ دندناتے پھر رہے تھے اور کمزور مسلمانوں پر ظلم ڈھا رہے تھے ان ہی کمزور مسلمانوں کی تنگ زندگی میں اس آیت میں حوصلہ افزائی کی گئی ہے اور اطمینان دلایا ہے کہ اس وقت کفار کو جو ملک میں غلبہ اور زور حاصل ہے اس سے کوئی غلط فہمی نہ ہونی چاہیئے یہ چمک دمک محض چند روزہ ہے اس کے بعد ان کا ٹھکانا دوزخ ہے۔

آیت میں کفار کی دنیوی ترقیوں کو متاع قلیل کہا ہے۔ یہ بات اسی وقت کے کافروں کے لیے نہیں بلکہ ہر دور اور ہر عہد کے اور ہر زمانہ کے کافروں کے لیے ہے۔ کفر نام ہے پیروی نفس، انسان کی بے راہ روی فکری آوارگی اور غیر ذمہ داری کی دعوت کا اس دعوت کی قیادت دنیا کی مختلف قومیں کرتی رہی ہیں۔ اور اب تقریباً دو صدیوں سے تقدیر الہی نے اس کی اس دعوت کی قیادت اور امامت کا فیصلہ یورپ کی قوموں کے حق میں کیا ہے اس وقت یورپ کفر کی عالمگیر نمائندگی کر رہا ہے۔ آج بھی قرآن کی یہی پکار ہے کہ اہل ایمان اس طاقت کو اسی نظر سے دیکھیں کہ یہ متاع قلیل ہے اور آخرت کے مقابلہ میں اس کی کوئی حیثیت نہیں ہے۔

یہاں متاع دنیا کی قلت آخرت کے مقابلے میں ہے قرآن کی دوسری آیات سے اس کی تائید ہوتی ہے یہاں بھی ثم الینا مرجعھم قرینہ ہے۔

آخرت کے مقابلے میں دنیا کے قلیل ہونے کی وجہ یہ ہے کہ انسان ماں کے پیٹ سے لامحدود خواہشیں لے کر آیا ہے۔ اتنی لامحدود خواہشیں ہیں کہ ان کی پا بجائی دنیا کا موجودہ سرمایہ نعمت ہائے گوناں گوں کر ہی نہیں سکتا۔ کیونکہ گوناں گوں ہونے کے باوجود محدود ہے انسانی فطرت کے لامحدود تقاضوں کو پورا کرنے کیلئے لامحدود وسائل کی ضرورت ہے۔ آخرت میں نعمتیں انسان کے لامحدود تقاضوں کے مطابق لامحدود ہوں گی قرآن میں ہے ولکم فیھا ماتشتھیہ الانفس و تلذ الاعین۔ موجودہ زندگی میں انسان میں لامحدود تمنائیں رکھی گئی ہیں۔ اور محدود شکل میں یہاں انسان کی کچھ آرزوئیں پوری کر دی گئی ہیں یہی متاع الدنیا قلیل ہے۔ اور ساتھ ہی بتا دیا کہ آدمی کو لامحدود پورا کرنے کے لیے اس قوت و قدرت کے لازوال چشمہ کی تلاش میں نکلنا چاہیے جس کی لامحدودیت کی شہادت کائنات کا ذرہ ذرہ دے رہا ہے۔ جہاں لامحدود کمالات رکھنے والی ذات اپنے لامحدود کمالات کا مظاہرہ کرے گی اس طرح لامحدود مطالبات والی فطرت کو لامحدود مطلوبات سے متمتع ہونے اور لذت یاب ہونے کا موقعہ ہمیشہ ہمیشہ ملتا رہے گا۔

بہر حال متاع قلیل کہہ کر قرآن نے منکر و تکذیب قوموں کی بالکل صحیح نقشہ کشی کر دی ہے۔ اس کی تفصیل دیکھنا چاہتے ہو تو روس امریکہ اور برطانیہ بڑی بڑی ترقی یافتہ قوموں کا حال دیکھئے ان کے باہم رشک و حسد ان کی حرامکاریوں ان کی شراب نوشیوں ان کی سود خواریوں، ان کے جرائم۔ ان کے یہاں کے امراض خبیثہ۔ ان کے ہاں اسٹرائیکوں ہڑتالوں کثرت طلاق، کثرت فواحش معاشی ابتری کا حال دیکھئے اور پھر فیصلہ فرمایئے کہ متاع دنیا کا زیادہ سے زیادہ ذخیرہ رکھنے کے بعد بھی ان منکرین حق کو باوجود اپنی انتہائی ترقیوں کے فلاح کسی معنی میں بھی حاصل نہیں ہے۔

اس کے بعد ارشاد ہے ثم الینا مرجعھم کہیں ضمیر غائب اور کہیں ضمیر خطاب کے ذریعے یہ انداز بیان آیا ہے۔ موت کے لیے قرآن میں اکثر خدا کی طرف لوٹ جانے کی اصطلاح اختیار کی گئی ہے یہ طرز ادا بیسیوں جگہ آیا ہے یہ بالکل بدیہی ہے کہ ہر رجوع کے مفہوم میں ورود درآمد داخل ہے اس سے یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ تمام ارواح انسانی اللہ سبحانہ کے یہاں سے اس جسم و قالب میں آتی ہیں۔ اور موت کے وقت اس عناصر کی چہار دیواری سے نکل کر پھر ان کو وہیں واپس جانا ہے جہاں سے آئی تھیں۔ اس واپسی کے سفر میں ان

کا زادِ راہ صرف وہی ہوگا جو اس دنیا میں انہوں نے کمایا ہے یعنی ان کے اندرونی وبیرونی افکار اعمال اخلاق اور احوال اور اس کے بعد ان کی جو زندگی ہوگی وہ عناصر کی ترکیب سے نہیں بلکہ افکار و اعمال اخلاق و احوال کی ترکیب سے ہوگی۔ اسی لیے فرمایا ہے ثم نذیقهم العذاب الشدید بما یکفرون یہاں باء سببیہ لا کر بتا دیا کہ عذاب شدید کا سبب ان کی کافرانہ زندگی ہے یعنی دوزخ کا عذاب جو کچھ ہے وہ انسان کے اپنے ہی اعمال کا لازمی نتیجہ ہے۔ جس طرح دنیا کے ہر عمل کا کوئی نہ کوئی لازمی نتیجہ ہوتا ہے مثلاً کھانے کا نتیجہ شکم سیری پینے کا سیرابی بیماری کا بے آرامی گرنے کا چوٹ زہر کا موت غرض ہر کام کا ایک لازمی نتیجہ ہوتا ہے اسی طرح کافرانہ زندگی کا بھی ایک لازمی نتیجہ کافروں کو ملنے والا ہے جو آخرت کی زندگی میں ملنے والا ہے۔ جس طرح زہر کھا کر مرنے کی ذمہ داری خود ہم پر عائد ہوتی ہے اور ہم یہ نہیں کہتے کہ ہم زہر کھا کر کیوں مر گئے اسی طرح ہم یہ سوال بھی نہیں کر سکتے کہ ہم کو اعمال کے بعد دوزخ کی سزا کیوں ملی کہ دونوں ہمارے اعمال کے لازمی نتائج ہیں۔

وَاتْلُ عَلَيْهِمْ نَبَاَ نُوْحٍ ۘ اِذْ قَالَ لِقَوْمِهٖ يٰقَوْمِ
اِنْ كَانَ كَبُرَ عَلَيْكُمْ مَّقَامِيْ وَتَذْكِيْرِيْ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ فَعَلَى
اللّٰهِ تَوَكَّلْتُ فَاَجْمِعُوْٓا اَمْرَكُمْ وَشُرَكَآءَكُمْ ثُمَّ لَا يَكُنْ
اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً ثُمَّ اقْضُوْٓا اِلَيَّ وَلَا تُنْظِرُوْنِ ﴿۷۱﴾
فَاِنْ تَوَلَّيْتُمْ فَمَا سَاَلْتُكُمْ مِّنْ اَجْرٍ ؕ اِنْ اَجْرِيَ اِلَّا
عَلَى اللّٰهِ ۙ وَاُمِرْتُ اَنْ اَكُوْنَ مِنَ الْمُسْلِمِيْنَ ﴿۷۲﴾ فَكَذَّبُوْهُ
فَنَجَّيْنٰهُ وَمَنْ مَّعَهٗ فِي الْفُلْكِ وَجَعَلْنٰهُمْ خَلٰٓئِفَ وَاَغْرَقْنَا
الَّذِيْنَ كَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا ۚ فَانْظُرْ كَيْفَ كَانَ عَاقِبَةُ الْمُنْذَرِيْنَ ﴿۷۳﴾

اور پیش کرو ان کے سامنے حضرت نوح کا وہ واقعہ کہ جب انہوں نے اپنی قوم سے یہ خطاب کیا[۸۳] لوگو! اگر تم کو میرا دعوت پیش کرنا اور آیات الٰہی کے ذریعے نصیحت کرنا گراں محسوس ہو رہا ہے تو میں نے سب سے ہٹ کر بس اللہ پر بھروسہ کر لیا ہے۔ تم سب اپنے شرکا ساتھ لے کر اپنا کام مل جل کر کر ڈالو ایسا کہ پھر تمہارے لیے گنجلک نہ باقی رہے

پھر جو کچھ کرنا ہے میرے ساتھ کر لو اور مجھے کوئی مہلت نہ دو ۸۴ اگر تم نے میری دعوت سے منہ پھیر لیا ہے تو مجھے کوئی نقصان نہیں کیونکہ میں نے اس پر کوئی مزدوری تم سے نہیں مانگی ہے۔ مجھے تو اس کام کا صرف اللہ سے اجر لینا ہے اور مجھے تو صرف یہی حکم ہے کہ اس کا فرمانبردار رہوں ۸۵ حضرت نوح کے مخاطبوں نے حضرت نوح کی تکذیب کی۔ اس کے نتیجہ میں جب طوفان کی صورت میں اللہ کا عذاب آیا تو ہم نے حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان کو جانشین بنا کر طوفان کی نذر کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی دیکھو ان لوگوں کا انجام کیسا رہا جن کو اللہ کے پیغمبر نے ڈرایا تھا ۸۶

معانی مفردات

اجمعوا امرکم اجماع سے امر ہے اس کے معنے ہیں ایک رائے ہونے کے لوگوں کو اکٹھا کرنا یا اکٹھا ہونا۔ امر سے مراد فیصلہ ہے۔ ابوالبقا کہتے ہیں کہ اجمعت علی الامر سے محاورہ ہے علی محذوف ہے معنی ہیں کام کا پختہ فیصلہ کرنا۔ پھر کی رائے میں

اجماع بغیر حرف جر کے متعدی بنفسہ ہوتا ہے السدوسی کی رائے میں متعدی بنفسہ زیادہ فصیح ہے یعنی اجمعت الامر زیادہ فصیح ہے اجمعت علی الامر سے۔ اصلی معنے تو بکھرے ہوئے کو یک جا کر لیے کے ہیں اور اجماع وجمع دونوں برابر ہیں کچھ کے خیال میں دونوں میں فرق ہے۔ مقصد یہ ہے کہ جو مکر وکید میرے خلاف کرنا چاہتے ہو کر لو۔

غمۃ غم یغم سے ہے اس کے معنے چھپا دینے کے ہیں۔ حدیث میں ہے لا غمۃ فی فرائض اللہ اللہ کے فرائض میں چھپانا نہیں ہے ان کو تو علانیہ ہونا چاہیئے رنج وحزن کو غم اسی لیے کہتے ہیں کہ وہ شادمانی اور خوشی کو چھپا دیتا ہے مطلب یہ ہے کہ اپنے معاملہ میں رنج وغم کو ہٹا کر خوب دل خوش کر لو۔ حدیث میں دعا ہے یا فارج الھم ویا کاشف الغمۃ

تاریخی واقعات سے استشہاد

تاریخی دلائل وشواہد سے واضح کیا گیا ہے کہ کس طرح اللہ سبحانہ نے ان کو اس سرزمین میں اقتدار بخشا لیکن انہوں نے اقتدار پا کر ناشکری کی راہ اختیار کی۔ زمین میں اصلاح کی جگہ فساد برپا کیا، عدل وانصاف کو درہم برہم کیا بالآخر اللہ سبحانہ نے اصلاح حال کے لیے رسول روانہ کیا جس نے ان کو پرستش اور بندگی میں توحید کی دعوت دی۔ اللہ سبحانہ نے ان کو ایک خاص مدت تک مہلت دینے کے بعد اس قوم کو تباہ کر دیا لیکن اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ یہ سارا قصہ ایک دو صحبتوں میں ختم ہو گیا تھا بلکہ جن تاریخی حقائق کا یہاں مطالعہ پیش کیا جا رہا ہے وہ ایک نہایت طویل مدت میں پیش آئے تھے قرآن کا یہ خاص انداز ہے کہ وہ واقعات کو محض تاریخی داستان بنا کر پیش نہیں کرتا بلکہ واقعات کے ان اجزا کو پیش کرتا ہے جن کا مقام عبرت سے گہرا لگاؤ ہوتا ہے۔ ان واقعات سے ایک طرف قریش کو یہ بتانا ہے کہ اب تمہارا معاملہ بھی اسی کی عدالت میں ہے جس میں ان تمام قوموں کے مقدمات پیش ہو کر فیصلہ ہوئے کوئی وجہ نہیں کہ اگر تم نے بھی وہی روش اختیار کی جو ان قوموں نے اختیار کی تھی تو اس بے لاگ عدالت کا فیصلہ تمہارے لیے کچھ مختلف ہو اللہ سبحانہ کا قانون سب کے لئے یکساں ہے فرمایا کہ آپ انکو حضرت نوح کی سرگذشت سناؤ یعنی حضرت نوح اور ان کی قوم کا معاملہ اس حقیقت کے لیے ایک شاہد وحجت ہے ان کا اعلان بھی تھا کہ تم میری مخالفت

ہیں جو کچھ بھی کر سکتے ہو کر گذرو اگر میں صادق ہوں تو تمہاری کوئی کوشش میرے خلاف کامیاب نہ ہوگی نتیجہ نے فیصلہ کر دیا کہ کون سچا تھا اور کون اللہ کی سچائی کو جھٹلانے والا ہے۔

۳۱ اور پیش کرو ان کے سامنے حضرت نوح علیہ السلام کا وہ واقعہ جب انہوں نے اپنی قوم سے یہ خطاب کیا۔ یعنی اہل مکہ کو حضرت نوح اور ان کی قوم کا حال سنا تاکہ معلوم ہو کہ مکذبین و مفترین کو حقیقی کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ ان کی اچھل کود چمک دمک محض چند روزہ ہے جو انجام کار ہلاکت ابدی پر منتہی ہوتی ہے۔ اہل مکہ کو قوم نوح کا قصہ سن کر عبرت حاصل کرنا چاہیے کہ اگر وہ خاتم الانبیاء کی تکذیب و عداوت اور اپنے مشرکانہ اعمال سے باز نہ آئے تو ان کا انجام بھی ویسا ہی ہو سکتا ہے جو حضرت نوح کی تکذیب کرنے والوں کا ہوا۔ نیز اس واقعہ کے بیان کرنے میں حضور اقدس کو تسلی دینا ہے کہ آپ ان لوگوں کی دشمنی اور شرارت سے دلگیر نہ ہوں ہر نبی کو اس قسم کے حالات کا مقابلہ کرنا پڑتا ہے۔ پھر آخر میں حق ہی غالب ہو کر رہا اور حق و صداقت کے دشمن تباہ و برباد کر دیئے گئے۔ عام سامعین کو ان واقعات کے ایسے مفصل بیان سے یہ سبق ملتا ہے کہ نبی عربی صلی اللہ علیہ وسلم باوجود امی ہونے اور کسی مخلوق کے سامنے ایک منٹ کے لیے بھی زانوئے تلمذ تہ نہ کرنے کے پچھلی قوموں کے اس قدر صحیح اور پختہ احوال بیان فرماتے ہیں جو بظاہر بدون تعلیم اور طویل استفادہ کے ممکن نہیں ناچار ماننا پڑے گا کہ آپ کا معلم کوئی انسان نہیں بلکہ سب انسانوں کا پیدا کرنے والا ہے۔ یہ تو آپ کی سچائی کی ایک دلیل ہوگی ۔[1]

قرآن کا عام انداز بیان یہ ہے کہ پہلے وجدانی دلائل بیان کرتا ہے پھر واقعات کے شواہد سے استدلال کرتا ہے۔ یہاں سے ان ہی تاریخی واقعات کو پیش کر کے مخاطبوں کے دل و دماغ میں بات اتاری ہے اور بتایا ہے کہ مفتری علی اللہ کبھی فلاح نہیں پا سکتا۔ اس کے لیے حضرت نوح اور ان کی قوم کا معاملہ ایک شاہد و حجت ہے۔ یہ تاریخی شہادت اس وقت پیش کی گئی ہے جب ان لوگوں کو معقول دلائل کے ساتھ پہلے سمجھایا جا چکا کہ ان کے انکار اور اعمال میں کیا غلطی ہے اور کیوں صحیح نہیں ہے اور اس کے مقابلہ میں حقیقی اور صحیح راہ کیا ہے اور کیوں صحیح ہے۔ اب ان کے اس طرز عمل کی طرف توجہ منعطف ہوتی ہے جو وہ اس

[1] افادات شیخ الاسلام

ہٹ دھرمی اور صاف دعوت کے جواب میں اختیار کر رہے ہیں، دس گیارہ سال سے ان کی روش یہ تھی کہ وہ بجائے اس کے کہ اس معقول تنقید اور صحیح رہنمائی پر غور کر کے اپنی ناہمواریوں پر سوچتے اُلٹے صاحب دعوت کے دشمن ہو گئے اور دلائل کا جواب پتھروں سے اور نصائح کا جواب گالیوں سے دیتے۔ ان کا مطالبہ یہ تھا کہ ہم اندھوں کے درمیان جو بینا موجود ہے وہ ہماری بینائی کا انتظام کرنے کے بجائے خود بھی نابینا ہو جائے ورنہ ہم زبردستی اس کی بینائی ختم کر دیں گے۔ یہ طرز عمل جو انہوں نے اختیار کر رکھا تھا یہ معاملہ کی انتہا ہو چکی تھی اس لیے آپ ان کو اللہ کے رسولوں اور ان کی قوموں کے درمیان ایسے حالات ہیں جو سنت الٰہی ہے ایسی کو ان کو بتانے کا حکم ہو رہا ہے اور بتایا جا رہا ہے کہ اب تک تمہیں نبوت آیات ہدایت سنا رہی تھی اور حق کی طرف دعوت دی جا رہی تھی۔ مخالفین میں جس قدر صالح اجزا موجود تھے انہوں نے اس دعوت کو قبول کر لیا اب دعوت اس مرحلہ میں آ چکی تھی جب نبوت کے مخاطبوں میں مادہ فاسدہ کے سوا کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہا اس وقت ہلاکت آسمان کی بجلی فضا کی آندھی زمین کا سیلاب لوہے کی تلوار بن کر رونما ہوتی ہے۔ سورہ یونس زمانہ قیام مکہ کے آخری دور میں نازل ہوئی ہے اب ہدایت کی دعوت اپنے آخری انجام کو پہنچ گئی ہے اسی سلسلے میں پہلے حضرت نوح کا واقعہ سنانے کا حکم ہوا کہ ان کی ہلاکت کا فیصلہ اس وقت تک نہیں ہوا تھا جب تک آیات ہدایت سے قوم کے تمام صالح اجزا اس کے فاسد عنصر سے ممتاز نہ ہوئے۔ اور مومنین و کافرین ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو گئے۔ گویا یہ واقعات اس لیے سنائے جا رہے ہیں کہ انبیاء ربانی اللہ کی سنت کے مطابق قریش کی ہلاکت کے دن قریب آ گئے اسی لیے سارے تاریخی واقعات بیان کرنے کے بعد فرمایا ہے قل فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔

حضرت نوح کا قوم کو چیلنج

۵۵ لوگو! اگر تم کو میرا دعوت پیش کرنا اور آیات الٰہی کے ذریعے نصیحت کرنا گراں محسوس ہو رہا ہے تو میں نے سب سے ہٹ کر بس اللہ پر بھروسہ کر لیا ہے تم سب اپنے شرکا کو ساتھ لے کر اپنا کام مل جل کر کرو۔ ایسا کہ تمہارے کام میں کوئی گنجلک نہ رہے پھر جو کچھ کرنا ہے میری ساتھ کر لو اور مجھے کوئی مہلت نہ دو۔ یعنی تمہاری خوشی و ناخوشی یا موافقت و

مخالفت کی مجھے ذرہ برابر پروا نہیں ہے تمام پیغمبروں کی طرح برابر میرا بھروسہ اللہ پر ہے۔ اگر تم میری فہمائش سے برا مانو تو مانا کرو میں اپنے فرائض منصبی کے ادا کرنے میں قصور نہیں کر سکتا تم برا مان کر مجھ سے دشمنی کرنا چاہو اور نقصان پہنچانا چاہو تو یہ چیز میرے ارادوں پر قطعاً اثر ڈالنے والی نہیں ہے جو کچھ تمہارے امکان میں ہے شوق سے کر گزرو میرے خلاف مشورہ کر کے کوئی تجویز پختہ کر لو اپنے رفقائے کار بلکہ فرضی معبودوں کو بھی جمع کر کے ایک غیر مشکوک اور غیر مشتبہ رائے پر قائم ہو جاؤ پھر متفقہ طاقت سے اسے جاری کر ڈالو۔ ایک منٹ بھی مہلت مجھے نہ دو پھر دیکھ لو کہ پیغمبرانہ استقامت و توکل کا پہاڑ تمام دنیا کی طاقتوں اور تدبیروں کو کچل کر کس طرح پاش پاش کر ڈالتا ہے ؎

اس آیت میں سب سے زیادہ اہمیت وشرکاءکم کو ہے اعراب کے اعتبار سے بھی اور معنویت کی راہ سے ہے۔ اعراب کی حد تک رہے امرکم پر معطوف کر کے منصوب کے تابع ہونے کی وجہ سے منصوب پڑھا ہے اور فعل محذوف مانا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے اجمعوا امرکم واجمعوا شرکاءکم میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو اسے کر لو اور اپنے شریکوں کو بھی جمع کر لو دوسری صورت یہ ہے کہ وشرکاءکم کو مفعول معہ بناؤ واو کو بمعنے مع لو اور معنی یہ کرو کہ میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو اپنے شرکا کو ساتھ لے کر کرو۔ کچھ کی رائے میں فعل محذوف کا مفعول یہ ہے وادعو شرکاءکم یعنی جو کچھ میرے خلاف کرنا چاہتے کر لو اور اپنے شرکا کو بھی بلا لو۔ دوسری بات یہ کہ شرکا سے کیا مراد ہے۔ کچھ شارحین قرآن لکھتے ہیں کہ ان کے بت مراد ہیں لیکن علامہ قرطبی کو یہ بات کھٹکی ہے وہ فرماتے ہیں والاصنام لا تصنع شیئا ولا فعل لھا اصنام تو کچھ کرتے ہی نہیں ان کا تو کوئی کردار ہی نہیں ہوتا۔ اگرچہ علامہ خفاجی نے یہ توجیہ کی ہے کہ منہ بند کرنے کی خاطر بات کہی گئی ہے۔ لیکن پتے کی بات قاضی بیضاوی نے کہی ہے کہ معطوف علی امرکم بحذف المضاف اور علامہ خفاجی نے مضاف کو یہ کہہ کر کھول دی المعنی ذوی امرکم اور لکھا ہے کلام المصنف یمیل الیہ کہ قاضی بیضاوی کا تقاضا بھی یہی ہے۔ مطلب صاف ہے کہ حضرت نوح کا قوم سے خطاب ہے کہ تمہیں

؎ افادات شیخ الاسلام

جو کچھ میرے خلاف کرنا ہے کرلو اور اس مہم میں ارباب اقتدار کو بھی ساتھ ملا لو۔ یعنی شرکار سے مراد بت نہیں بلکہ ارباب اقتدار ہیں۔ آپ قرآن میں یہ بات پڑھ چکے ہیں کہ جب حضرت نوح نے قوم کو اللہ کی بندگی کی دعوت دی یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ تو ارباب اقتدار نے کہا تھا قال الملا من قومہ انا لنراک فی ضلال مبین حضرت نوح کی قوم میں سے ارباب اقتدار نے کہا کہ ہم تو تجھے بالکل بھٹکا ہوا سمجھتے ہیں۔ خفاجی لکھتے الملا القدم الاشراف ملا بر سر اقتدار لوگوں کو کہتے ہیں۔ شائد آپ کے ذہن میں یہ خلش ہو کہ ان کو شرکار کیوں کہا یہی بات سمجھنے کی ہے شرک صرف پرستش اور عبادت ہی میں نہیں ہوتا ہے بلکہ بندگی اور طاعت میں بھی ہوتا ہے حضرت نوح کی قوم پرستش میں بھی شرک کر رہی تھی یعنی ود۔ سواع، یعوق۔ یغوث اور نسر سے ان کے عابدانہ تعلقات تھے اور بندگی میں شرک کر رہی تھی۔ حضرت نوح کی دعوت کی ضرب صرف پرستش والے شرک پر نہ تھی بلکہ اس کے ساتھ ان کی ضرب کاری بندگی والے شرک پر بھی تھی اسی لیے سربرا ہان مملکت ان کی دعوت کے ویسے ہی مخالف تھے جیسے عام لوگ تھے۔ عام شارحین قرآن کی نظروں سے یہ بات اوجھل رہی ہے۔

آیئے اب حضرت نوح کی تقریر پر غور فرمایئے یاقوم ان کان کبر علیکم مقامی اے لوگو اگر تم پر میرا مقام بھاری اور بڑا ہو رہا ہے مقام مصدر بھی ہے اور قیام کے معنے ہیں مطلب یہ ہے کہ میرا تمہارے درمیان رہنا اور ٹھہرنا تمہیں شاق ہے دوسرے مقام کے معنے یہ ہیں کہ اگر تمہیں میرا یہ دعوت کا کام کرنا شاق ہو رہا ہے نبی بیک وقت دو چیزیں لے کر آتا ہے ایک منصب نبوت دوسرا مقام نبوت، منصب نبوت نام ہے اور مقام نبوت نام ہے دعوت کے کام کا۔ شیخ اکبر نے الحکم المربوط میں لکھا ہے اعلم ان مقام النبوۃ ھو الدعوۃ الی اللہ مقام نبوت نام ہے اللہ کے بندوں کو اللہ کی طرف بلانے کا آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگو اگر تمہیں میرا دعوت کام کرنا اور اس میں شب و روز محنت کرنا تمہاری گرانی کا باعث ہے۔ یہ کام حضرت نوح نے ۹۵۰ سال کیا ہے اور کتنا کیا ہے اس کا اندازہ کرنے کے لیے قرآن کا یہ بیان پڑھئے۔

رب انی دعوت قومی لیلا و نھارا فلم یزدھم دعائی الا فرارا۔

"خداوندا میں نے اپنی قوم کو ایک ایک رات اور ایک ایک دن دعوت دی
ہے مگر ان میں صرف گریز پائی ہی کا اضافہ ہوا ہے۔"

اس لیے یہاں مقام سے مراد حضرت نوح کا دعوت الی اللہ کا کام ہے اور تذکیر ی بایات اللہ سے مراد یہ ہے کہ اگر تم پر میرا دعوت الی اللہ کا کام اور توحید پر بے لاگ اور کھلا خطاب گراں ہو رہا ہے تو مجھے تمہاری گرانی کی کوئی پروا نہیں ہے۔ تم جو چاہو میرے خلاف کرو میرا اسرا صرف اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے۔ تم مجھے نقصان پہنچانے کے لیے جو تدبیر کر سکتے ہو کر لو خود ہی نہ کرو بلکہ اس میں ارباب اقتدار کو بھی شریک کر لو اور یہ کار گذاری اس انداز سے کرو کہ بعد میں تمہاری ہر کارکردگی میں کوئی گنجلک نہ رہے اور تمہاری گھٹن کا باعث نہ ہو۔ یعنی تدبیر کو خفیہ رکھنے کی ضرورت نہیں جو کچھ میرے خلاف جو کچھ کرنا چاہتے ہو کھلم کھلا کرو ثم اقضوا الی پھر میرے جو کچھ بھی تمہیں کرنا ہے کر گذرو ولا تنظرونی اور مجھے کسی قسم کی کوئی مہلت نہ دو۔ ظاہر ہے کہ یہ بات آغاز نبوت میں نہیں کہی جا رہی ہے بلکہ کلام کا انداز بتا رہا ہے کہ اس وقت کہی جا رہی ہے جب دعوت کی محنت سے قوم کے صالح اجزا اس کے فاسد عنصر سے الگ ہو چکے ہیں اور اہل ایمان و اہل کفر میں ایک حد فاصل قائم ہو چکی ہے اور حضرت نوح کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی ہو چکی ہے۔ یہ ایک طویل زمانہ تک اپنی قوم کو دعوت کے بعد قوم سے خطاب فرما رہے ہیں۔ یہی وہ منزل ہے جو قریش مکہ کے سامنے حضور اقدس پورے ۱۲ سال دعوت کے گذر جانے کے بعد رونما ہوئی۔ اسی لیے یہاں قریش کو تنبیہ کے لیے حضور اقدس کو حکم ہوا ہے کہ ان کو حضرت نوح کا واقعہ سنایئے اور بتایئے کہ ان پر بھی وہ وقت آنے والا ہے جو اپنے اپنے پیغمبر کے سامنے قوم نوح پر آچکا تھا یعنی قبیلہ قریش میں سے وہ افراد صالحہ جو بے خوف و خطر حق کو قبول کر سکتے انہوں نے حق قبول کر لیا اب صرف وہ روسائے قریش رہ گئے جن میں حق قبول کرنے کی کوئی صلاحیت نہ تھی یا وہ ضعفا تھے جو ان روسا کی موجودگی میں حق کا ساتھ دینے کی قوت نہ رکھتے تھے۔ اب ضرورت ہوئی کہ ان روسا کے وجود سے ارض حرم کو پاک کیا جائے یہ واقعات اسی کی تمہید میں سنائے جا رہے ہیں۔ اور نبیوں اور امتوں کے بارے میں اللہ کے قانون اس کی سنت کو واضح کیا جا رہا ہے۔

میں اجیر نہیں رضا کار ہوں

؎ اگر تم نے میری دعوت سے منہ پھیر لیا ہے تو مجھے کوئی نقصان نہیں ہے کیونکہ میں نے اس پر تم سے کوئی مزدوری نہیں مانگی ہے۔ مجھے تو اس کام کا صرف اللہ سے اجر لینا ہے اور مجھے تو صرف یہی حکم ہے کہ اس کا فرمان بردار رہوں۔ یعنی تمہارے مقابلہ میں نہ جانی تکلیف سے گھبراتا ہوں اور نہ مالی نقصان کی کوئی فکر ہے کیونکہ میں نے خدمت تبلیغ و دعوت کا تم سے کچھ معاوضہ کبھی طلب نہیں کیا ہے جو یہ اندیشہ ہو کہ تمہاری ناخوشی سے میری تنخواہ بند ہو جائے گی یا کم از کم تم کو یہ کہنے کا موقعہ ملے گا کہ میری ساری جدوجہد مال کی حرص اور روپے کے لالچ سے تھی۔ میں جس کا کام کر رہا ہوں اور حکم بجا لا رہا ہوں اسی کے ذمہ میری اجرت ہے جب میں اس کا فرمان بردار ہوں اور خدمت مفوضہ بے خوف و خطر انجام دیتا ہوں تو کیسے ممکن ہے کہ وہ اپنے فضل و رحمت کے دروازے مجھ پر نہ کھولے سکے لے

یہ آیت قرآنی حضرت نوح کی تقریر میں نہایت بلیغ ہے جس میں مخاطبوں کے سامنے رسالت کی پوری زندگی کی غرض و غایت کو سمیٹ دیا گیا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ میری بات کو جس طرح سرسری انداز میں تم نظر انداز کر رہے ہو اور اس پر سنجیدگی سے غور نہیں کرتے ہو یہ اس بات کی دلیل ہے کہ تم مجھے غرض مند سمجھتے ہو۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو تم ضرور سوچتے کہ جو شخص اپنی کسی ذاتی غرض کے بغیر دعوت و تبلیغ اور تذکیر و نصیحت کی یہ سب مشقتیں لگاتار برداشت کر رہا ہے جس کی اس تگ و دو میں تم کسی شخصی یا خاندانی مفاد کا شائبہ تک نہیں پا سکتے وہ ضرور اپنے پاس یقین و اذعان کی کوئی ایسی بنیاد اور ضمیر کے اطمینان کی کوئی ایسی وجہ رکھتا ہے جس کی بنا پر اس نے اپنا عیش و آرام چھوڑ کر اپنی دنیا بنانے کی فکر سے بے پرواہ ہو کر اپنے آپ کو اس مشقت میں ڈالا ہے کہ صدیوں کے جمے اور رچے ہوئے عقائد، رسوم اور طرز زندگی کے خلاف آواز اٹھائے اور اس کی بدولت دنیا بھر کی دشمنی مول لے لے ایسی شخص کی بات کم از کم اتنی بے وزن نہیں ہو سکتی کہ اسے در خور اعتناء نہ سمجھا جائے اور اس پر

لے افادات شیخ الاسلام

سنجیدہ غور و فکر کی ذرا سی تکلیف نہ برداشت کی جائے۔ دراصل یہ ارباب اقتدار کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ اگر تم میری بات سننے کے لیے تیار نہیں ہو تو اچھی طرح سمجھ لو کہ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے سر تا سر تمہارا ہی نقصان ہے میں جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں اگر میں اس کے عوض میں تم سے کسی اجرت کا طالب ہوتا تب تو تمہاری اس بیزاری کی مجھے کوئی پروا ہوتی کہ تم نے میرے مقام کی کوئی قدر نہیں کی لیکن جب میں تم سے کوئی تجارت نہیں کر رہا ہوں جس طرح مجھے مفت ملا ہے ویسے ہی میں تمہیں مفت دے رہا ہوں تو تم اگر اسے قبول نہ کرو گے تو خود ہی خسارے میں رہو گے۔ مجھے تو اجر جو ملنا ہے وہ اللہ کے ذمہ ہے کام اس کا ہے اور وہ مجھے مل کر رہے گا تمہارے رد و قبول سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ مجھ پر یہ ذمہ داری ہی نہیں ڈالی گئی کہ لازماً تمہیں مسلم بناؤں مجھ پر تو یہ ذمہ داری ہے کہ خود اللہ کا فرمان بردار بن کر رہوں۔

حافظ ابن جریر فرماتے ہیں:

لوگو! اگر میری دعوت و تبلیغ کے باوجود تم میری بات کو پذیرائی نہ دو گے اور حق سے منہ موڑ کر باطل ہی پر جمے رہو گے اقرار توحید اور اخلاص عبادت کو نہیں اپناؤ گے تو اس میں میرا کوئی نقصان نہیں بلکہ سر تا سر تمہارا اپنا ہی نقصان ہے۔ تمہارا اس لیے کہ تم نے اللہ کے معاملے میں اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی اور میرا اس لیے نہیں کہ میں اپنی دعوت پر تم سے کسی مزدوری کا طالب نہیں ہوں نہ اپنے کام پر تم سے کسی بدلہ اور جزا کا خواہاں ہوں۔ میرا اجر تو اسی کے ذمے ہے جس کا میں کام کر رہا ہوں مجھے تو صرف اپنے رب کا کہا ماننا ہے اور اس کے حکم پر چلنا ہے اور اسی کی میں تمہیں دعوت دے رہا ہوں۔

علامہ آلوسی نے وامرت ان اکون من المسلمین پر یہ لطیف بات لکھی ہے کہ مجھے تو ان مسلمین کے زمرے میں شامل ہونے کا حکم دیا گیا ہے جو دین کی تعلیم کا کام اجیر بن کر نہیں بلکہ رضا کارانہ کرتے ہیں اور دین کو دنیا طلبی کے لیے ذریعہ نہیں بناتے ہیں۔

دنیا کی حرص و طمع وہ برائی ہے جس میں نفس کی دناءت پوری طرح ظاہر ہوتی ہے خصوصاً دنیا کی وہ حرص و طمع جو دین کو ذریعہ بنا کر دنیا کے حصول کے لیے ہو۔ اس کی برائی قرآن میں تقریباً سب نبیوں کی زبان پر آئی ہے لا اسالکم علیہ اجرًا

آیت میں اسلام اپنے لغوی معنی میں ہے یعنی انقیاد و فرمان برداری اس سے معلوم ہوا کہ

نبوت کے کام کی غرض و غایت صرف ایک ہی ہوتی ہے اور وہ اللہ سبحانہ کی خوشنودی اور رضا مندی ہے۔ سارے حوادث اور مصائب کے سارے طوفانوں میں نبوت کی زبان پر لک العتبیٰ حتیٰ ترضیٰ ہوتا ہے۔

تکذیب کرنے والوں کا انجام

آیت حضرت نوح کے مخاطبوں نے حضرت نوح کی تکذیب کی۔ اس کے نتیجہ میں جب طوفان کی صورت میں اللہ کا عذاب آیا تو ہم نے حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کو بچا لیا اور ان کو جانشین بنا دیا۔ اور ان لوگوں کو طوفان کی نذر کر دیا جنہوں نے ہماری آیات کی تکذیب کی تھی۔ دیکھو ان لوگوں کا انجام کیسا رہا جن کو اللہ کے پیغمبر نے ڈرایا تھا۔ یعنی جس کے پاس چشم عبرت ہو وہ دیکھ لے کہ جھٹلانے والوں کا انجام کیا ہوا ان لوگوں کو سینکڑوں برس نوح علیہ السلام نے نصیحت کی نفع و ضرر سے آگاہ کیا جب کوئی بات مؤثر نہ ہوئی۔ بلکہ الٹا عناد فرار بڑھتا گیا اس وقت اللہ سبحانہ نے سخت طوفان پانی کا روانہ کیا۔ سب مکذبین غرقاب کر دیئے گئے صرف نوح علیہ السلام اور چند نفوس جو ان کے ساتھ تھے محفوظ رہے ان ہی سے آگے نسل انسانی چلی۔ اور ڈوبنے والوں کی جگہ یہی آباد ہوئے۔ نوح علیہ السلام کا کچھ قصہ سورۂ اعراف میں گذر چکا ہے[1]

حضرت نوح کا ظہور اس سرزمین میں ہوا تھا جو دجلہ اور فرات کی وادیوں میں ہے۔ دجلہ اور فرات آرمینا کے پہاڑوں سے نکلے ہیں اور بہت دور الگ الگ ہو کر عراق زیریں میں باہم مل گئے ہیں۔ پھر خلیج فارس میں سمندر سے ہمکنار ہوتے ہیں۔ ارمینیا کے یہ پہاڑ ارادات کے علاقہ میں واقع ہیں اسی لیے انہیں تورات میں ارادات کا پہاڑ کہا ہے۔ ایک ایسے طوفان و سیلاب کے بعد ملک کی جو حالت ہو گئی ہو گی اس کی ہولناکی محتاج بیان نہیں ہے۔

آیت میں پہلے عذاب کو نہیں عذاب کی وجہ کو بیان کیا ہے فکذبوہ کے معنی حضرت نوح نے نبوت کا کام کیا اور ایک عرصہ تک کام کیا فا اس جگہ تفریع ذکری کے لیے نہیں قوم تو تکذیب حضرت نوح کے اس کہنے سے پہلے بھی کر رہی تھی کہ اگر تم میری دعوت و تذکیر کو پوری طرح رد کر چکے۔ فکذبوا ہ کے معنی ہیں موقعہ کے لحاظ تکرار اور دوام بھی ہے یعنی جب وہ

[1] افادات شیخ الاسلام

لگاتار حضرت نوح کی تکذیب کرتے ہی رہے۔ یہاں اطناب کو چھوڑ کر ایجاز سے کام لیا ہے۔ طوفان کا ذکر کے بجائے پہلے حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں کو طوفان سے بچانے کا ذکر کیا اول اس لیے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں مخالفوں کی تباہی سے مقدم نبوت کے ہمنواؤں کو بچانا ہے ثانیا اس لیے واقعہ کے سننے والوں کو حوصلہ ہو کہ اگر قریش کی ساتھ یہی تاریخ دہرائی گئی تو اہل ایمان محفوظ رہیں گے۔ اور بتا دیا کہ نبوت کے مخالفین سارے ختم ہو گئے اور ان مخالفین کی جگہ حضرت نوح اور ان کے ساتھیوں نے لے لی اب پورے ملک میں حضرت نوح کی کوئی اپوزیشن نہ تھی۔ مخالفوں کی تباہی کا ذکر کرتے ہوئے اغرقنا الذین کذبوا بآیاتنا کی تعبیر اس لیے اختیار کی کہ پتہ لگ جائے کہ مخالفین کی تباہی کا باعث آیات کی تکذیب ہے اور قریش کو معلوم ہو جائے کہ جو کچھ کل ہوا تھا۔ وہی آج بھی ہوگا۔ اگر قریش آج بھی تکذیب چھوڑ دیں تو تاریخ بدل سکتی ہے۔

آخر میں فرمایا کہ فانظر کیف کان عاقبۃ المنذرین۔ منذرین سے مراد تکذبین ہیں۔ یہ انداز بیان تکذیب میں تکرار اور اصرار بتانے کی غمازی کر رہا ہے۔ یہاں علامہ خفاجی نے یہ لطیف نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ عموم رسالت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خصوصیت ہے حضرت نوح کی نبوت عمومی تھی یا علاقائی تھی۔ اہل علم کا اس میں اختلاف ہے اور اسی پر یہ مسئلہ بھی مبنی ہے کہ طوفان نوح عام تھا یا خاص علاقائی تھا جیسا کہ آیات و احادیث میں صراحت ہے ابن عطیہ مفسر نے نبوت کو بھی علاقائی اور طوفان کو بھی علاقائی قرار دیا ہے اور لکھا ہے وھو الراجح عند المحققین۔

ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ بَعْدِهٖ رُسُلًا اِلٰى قَوْمِهِمْ فَجَآءُوْهُمْ
بِالْبَيِّنٰتِ فَمَا كَانُوْا لِيُؤْمِنُوْا بِمَا كَذَّبُوْا بِهٖ مِنْ قَبْلُ ؕ
كَذٰلِكَ نَطْبَعُ عَلٰى قُلُوْبِ الْمُعْتَدِيْنَ ۝ ثُمَّ بَعَثْنَا مِنْ
بَعْدِهِمْ مُّوْسٰى وَهٰرُوْنَ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۠ئِهٖ بِاٰيٰتِنَا
فَاسْتَكْبَرُوْا وَكَانُوْا قَوْمًا مُّجْرِمِيْنَ ۝ فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ
مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْۤا اِنَّ هٰذَا لَسِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ قَالَ مُوْسٰۤى
اَتَقُوْلُوْنَ لِلْحَقِّ لَمَّا جَآءَكُمْ ؕ اَسِحْرٌ هٰذَا ؕ وَلَا يُفْلِحُ
السّٰحِرُوْنَ ۝ قَالُوْۤا اَجِئْتَنَا لِتَلْفِتَنَا عَمَّا وَجَدْنَا عَلَيْهِ
اٰبَآءَنَا وَتَكُوْنَ لَكُمَا الْكِبْرِيَآءُ فِى الْاَرْضِ ؕ وَمَا نَحْنُ
لَكُمَا بِمُؤْمِنِيْنَ ۝

ہم نے پھر روانہ کیئے حضرت نوح کے بعد بہت سے رسول
ان کی قوموں میں۔ انہوں نے ان کے سامنے اللہ سبحانہ کے
کھلے احکام پیش کیے۔ وہ لوگ چونکہ پہلے جھٹلا چکے تھے اس
لیے وہ ان کھلے احکام کو ماننے کو تیار نہ تھے۷۴ ہم اسی طرح

سرکشی میں حد سے گذر جانے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے
ہیں ۸۶؎ پھر ان رسولوں کے بعد فرعون اور اس کے انتظامی
سربراہوں کی طرف ہم نے موسیٰ اور ہارون کو اپنی آیات
دے کر روانہ کیا مگر انہوں نے بڑائی کا مظاہرہ کیا اور وہ لوگ
جرائم پیشہ تھے ۸۹؎ لہٰذا جب ان کے پاس حق ہماری جانب
سے آیا تو وہ بول پڑے کہ یہ تو کھلا جادو ہے ۹۰؎ حضرت موسیٰ
نے فرمایا کہ تم سچائی کی رونمائی کے بعد سچائی کو جادو کہتے ہو
کیا جادو یہ ہے حالانکہ جادوگر فلاح سے ہمدوش نہیں ہوتے
ہیں ۹۱؎ انہوں نے کہا اے موسیٰ کیا تیرا مقصد یہ ہے کہ
ہمیں ہمارے آبائی طریقہ سے ہٹا کر ملک میں اپنی دونوں کی
حکومت قائم کرے ہم تو تمہارے اقتدار کو تسلیم نہ کریں گے ۹۲؎

مفردات کے معانی

نطبع ہم مہر لگا دیتے ہیں بند لگا دیتے ہیں چھاپ لگا دیتے ہیں۔ کندہ کر دیتے ہیں۔ فتح یفتح سے مضارع کا جمع متکلم کا صیغہ ہے۔ کسی چیز کے کسی چیز میں اتارنے کو طبع کہتے ہیں یہ ختم سے عام ہے اور نقش سے خاص۔ اور طبع السیف کے معنے ہیں تلوار کا زنگ آلود

ہو جانا اور اس پر میل کچیل چڑھ جانا محاورہ ہے رجل طبع یعنی وہ شخص جس کے اخلاق دنی ہوں اور گندہ کہ کسی بے حیائی سے نہ شرماتا ہو چنانچہ بعض علما نے نطبع علی قلوب المعتدین میں طبع کو اسی پر محمول کیا ہے اور معنے بتائے کہ ہم ان کے دلوں کو زنگ آلود اور میلا کر دیتے ہیں۔ علامہ محمد طاہر پٹنی مجمع بحار الانوار فی غرائب التنزیل والاخبار میں لکھتے ہیں۔ طبع سکون کے ساتھ بمعنے ختم مہر لگا لے کے معنی میں آتا ہے اور حرکت با کے ساتھ طبع زنگ لگنے کے معنے میں آتا ہے طبع السیف سے بنا ہے پھر گناہ وغیرہ کے لیے استعمال ہونے لگا۔

دراصل جب انسان سے کفر و عدوان کا صدور ہوتا ہے تب اللہ سبحانہ کی جانب سے اس کا اثر ظاہر ہوتا ہے اس کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ ہم ان کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں بل طبع اللہ علیہا بکفرھم یہاں بھی علی قلوب المعتدین آیا ہے یعنی ان سے کفر اور عدوان پہلے ظاہر ہوا اور اس کا اثر طبع کی صورت رونما ہوا مطلب یہ ہے کہ عدوان کا صدور ان سے ہوتا رہا تو اس کا اثر یہ ہوا کہ دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو گیا یہی اللہ کی جانب سے طبع ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں طبع کا ذکر ہے وہاں کفر عدوان فسق کو علت کے طور پر ضرور ذکر کیا گیا ہے۔ امام راغب نے بھی بات اس طرح سمجھائی ہے کہ ختم اور طبع دو طرح استعمال ہوتے ہیں بمعنے تاثیر لشئے کے یعنی کسی چیز کا کسی چیز میں اثر اور نشان چھوڑنا دوسرے خود وہ اثر جو نقش سے حاصل ہو یہاں پہلے معنے میں ہے سحر جادو۔ جادو کرنا سحر یسحر کا مصدر ہے لیکن فعل بفعل سے۔ فعل کے وزن پر یہ مصدر شاذ ہے۔ علامہ ابن خالویہ نحوی نے تصریح کی ہے کہ عربی زبان میں فعل یفعل فعلا کے وزن پر سوائے سحر یسحر سحرا کے کوئی مصدر نہیں ہے لیکن ابو حیان اندلسی نے یہ اضافہ کیا ہے کہ سوائے فعل اور سحر کے اور کوئی مصدر اس وزن پر اس باب سے نہیں آتا ہے۔ ابو حیان اندلسی نے لکھا ہے کہ سحر کی حقیقت کیا ہے، اس موضوع پر مختلف رائیں ہیں۔

اوّل یہ کہ وہ اعیان وحقائق کی تبدیلی اور لوگوں کی صورتوں کا بدلنا ہے۔

دوم یہ کہ دھوکہ بازی گری، ملمع سازی اور شعبدہ بازی کا نام سحر ہے جن میں واقفیت نہیں ہوتی یخیل الیہ من سحرھم انہا تسعیٰ بھی بتا رہی ہے یہ معتزلہ کی رائے ہے۔ شوافع میں سے ابو اسحاق استرابادی کی یہی رائے ہے۔

سوم وہ حیلہ کے طور پر ایسا معاملہ ہے جو نظر بندی کر دیتا ہے اسی سے سحروا

ابن الناس ہے۔
چہارم یہ کہ وہ خدمت جنات کی ایک قسم ہے اور انہوں نے ہی اسے اپنے اجسام کی جنس لطیف اور اس کی کیفیات سے نکالا ہے۔
پنجم یہ کہ وہ ان اجسام سے مرکب ہے جن کو جمع کر کے جلایا جاتا ہے اور ان کی راکھ اور سیاہیاں بنا کر ان پر اسمار اور عزیمتیں پڑھی جاتی ہیں۔ پھر جہاں سحر کی ضرورت پڑتی ہے وہاں انہیں استعمال کیا جاتا ہے۔
ششم یہ کہ اس کی اصل طلسمات اور نیرنجات ہیں جو ستاروں کی خاصیت کی تاثیر پر بنائے جاتے ہیں۔
ہفتم یہ کہ وہ ان کلمات سے مرکب نہیں جو کفر پر مشتمل ہیں۔ کچھ لوگوں کی رائے میں یہ سب اقوال سحر کی قسمیں ہیں اور ان کے علاوہ اور بھی قسمیں ہیں۔ اس میں کوئی شبہ نہیں ہے کہ سحر کا وجود ہے۔ قرآن وحدیث دونوں میں اس کی تائید ہے۔
اگر اس کا کوئی وجود نہ ہوتا تو قرآن وسنت میں اس پر احکام نہ ہوتے اس پر پوری بحث انشاء اللہ سولہویں جلد میں آئے گی۔ سحر کی حقیقت پر امام ابوبکر الجصاص رازی نے احکام القرآن میں امام فخر الدین رازی نے مفاتیح الغیب میں اور علامہ ابن خلدون نے مقدمہ میں اور شاہ عبدالعزیز نے تفسیر عزیزی میں اور شیخ طنطاوی نے تفسیر الجواہر میں بڑی سیر حاصل بحثیں کی ہیں ہم انشاء اللہ ان سب سے استفادہ کریں گے۔

قصص وواقعات تذکیر کے دلائل ہیں

قرآن نے جہاں بھی گذشتہ قوموں کے حالات بیان کئے ہیں وہاں یہ بات واضح کر دی ہے کہ اس واقعہ کے بیان سے اس کا مقصود کیا ہے جب اس پر غور کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ تورات کی طرح دنیا کی تاریخ بیان کرنی مقصود نہیں ہے بلکہ مقصود کچھ باتوں کا دلوں میں یقین واذعان پیدا کرنا ہے اور واقعات کو ان کے لیے بطور دلائل پیش کرتا ہے اور اس کے لیے دو باتیں ضرور ذہن میں رکھنی چاہئیں۔
اول یہ کہ یہاں ہر جگہ ایک ہی قانون ایک ہی انداز سے کام کر رہا ہے کوئی مقام نہیں جو قانون تخلیق میں دوسروں سے ممتاز ہو، لباس تو ضرور مختلف ہیں اور نام بھی جدا جدا ہیں مگر

حقیقت سب جگہ ایک ہے مثلاً حیوان کے لیے موت وحیات ہے۔ پھولوں کے لیے کھلنا اور مرجھانا ہے پتھروں کے لیے بننا اور بگڑنا ہے اجزا کے لیے ملنا اور بکھرنا ہے جو قانون حیوانات میں موت وحیات کا وہی نباتات میں کھلنا اور مرجھانا ہے اور جمادات میں بننا اور پامال ہونا ہے الفاظ بدل جاتے ہیں معنے نہیں بدلتے۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ جب عالم مادی میں وحدت قانون کی بنیادی صل کام کر رہی ہے تو یہ کیونکر ہوسکتا ہے کہ عالم انسانی کا گوشہ اس سے باہر ہو۔ یہاں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں کارفرما ہے۔ لہذا اگر عالم مادی میں آگ کا خاصہ جلانا ہے ٹھیک اسی طرح عالم انسانی میں بھی کفر کی ایک خاصیت ہے جیسے یہ ہو نہیں سکتا کہ آگ روشن ہو اور اس کے شعلوں سے ٹھنڈک نکلے ایسے ہی یہ نہیں ہوسکتا کہ کفر موجود ہو اور اس کی راہ سے قرب خداوندی حاصل ہو جائے

پھر جیسے عالم انسانی میں افراد کے اعمال کے انفرادی قوانین ہیں ایسے ہی قوموں جماعتوں کی سعادت وشقاوت اور حیات موت کا بھی ایک قانون ہے جس طرح اللہ سبحانہ کے سارے قوانین میں ہم آہنگی ہے اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہوسکتی۔ کیونکہ اللہ سبحانہ کے قوانین میں ہم آہنگی اور یکسانی ہے ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہوتی، اسی کو قرآن میں سنت اللہ سے تعبیر کیا ہے۔

۸۷ ہم نے پھر روانہ کیے حضرت نوح کے بعد بہت سے رسول ان کی قوموں میں انہوں نے ان کے سامنے اللہ سبحانہ کے کھلے احکام پیش کئے وہ لوگ چونکہ پہلے جھٹلا چکے تھے اس لیے وہ ان کھلے احکام کو ماننے کے لیے تیار نہ تھے یعنی حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہود، صالح ابراہیم لوط شعیب وغیرہ انبیا کو اپنی اپنی قوم کی طرف کھلے ہوئے نشانات دے کر بھیجا لیکن جس جہالت اور کفر کی حالت میں وہ لوگ اپنے اپنے پیغمبر کی بعثت سے پہلے تھے اور جن چیزوں کو پیشتر سے جھٹلاتے آرہے تھے یہ توفیق نہ ہوئی کہ انبیاء کے تشریف لانے اور سمجھانے کے بعد ان کو مان لیتے بلکہ جن اصول صحیحہ کی تکذیب پہلے قوم نوح کر چکی تھی ان سبھوں نے ان کے ماننے سے انکار کر دیا اور جب پہلی مرتبہ منہ سے نہ نکل گئی ممکن نہ تھا کہ پھر کبھی ہاں نکل سکے اسی بے ایمانی اور تکذیب حق پر آخر تک اڑے رہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس آیت میں رسولوں اور ان کی قوموں کا اجمالاً تقابلی مطالعہ پیش کیا ہے پہلے رسولوں کا حال بیان کیا ہے کہ حضرت نوح کے بعد جتنے رسول آئے ان کی پکار کیا تھی ان کی پکار کی نوعیت کیا تھی۔ ان کی دلیلیں کیا تھیں جو انہوں نے پیش کیں ان کا طریق کار کیا تھا جس پر وہ برابر کاربند رہے انہوں نے اپنے قدم جہاں ٹکائے تھے وہ جگہ کونسی تھی اور سہارے کے لیے جس کی طرف ہاتھ بڑھا تھا وہ کون تھا پھر ان میں اور ان کی قوموں میں جو معاملات پیش آئے وہ کس قسم کے تھے اور ان معاملات میں ان کا جو قول و فعل رہا وہ کس قسم کا تھا ان ساری باتوں میں ہر رسول دوسرے رسول کی تصویر تھا اور ہر دعوت دوسری دعوت کا عکس تھی۔ کسی بات میں بھی ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں سب اسی حال پیدا ہوئے کہ دنیوی طاقتوں اور حکمرانیوں میں سے کچھ نہ رکھتے تھے سب کا ظہور ایسے وقتوں میں جب خدا پرستی اور اللہ کی بندگی کی روشنی بجھ چکی تھی سب کی ایک ہی دعوت تھی سب نے ایک ہی طرح لوگوں کو بلایا سب نے کہا کہ اللہ سے عابدانہ تعلقات استوار کرو اس کے سوا تمہاری پرستاریوں کا کوئی مستحق نہیں سب نے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اللہ کے سوا تمہاری فرمانبرداریوں اور طاعتوں کے لائق کوئی نہیں ہے سب نے کہا کہ ہم علم و یقین لے کر آئے ہیں سب نے کہا کہ اللہ کی جانب سے صاف اور کھلے احکام لے کر آئے ہیں یہ ہے ثم بعثنا من بعدہ رسلا الی قومھم فجاءوھم بالبینات کا مطلب۔ حضرت نوح کے ایک عرصہ دراز بعد ہم نے مختلف قوموں میں مختلف زمانوں میں مختلف رسول روانہ کیے۔ ان رسولوں نے ان قوموں کے سامنے اللہ سبحانہ کے کھلے کھلے احکام پیش کیے اور بتایا کہ ہمارا دعویٰ اسکے سوا کچھ نہیں کہ ہم عالم انسانی کی حد تک ایمان اور نیک عمل کے نتائج کی خوشخبری دینے والے اور کفر و اعمال بد کے نتائج سے ڈرانے والے ہیں ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔

اور اب ان قوموں کو دیکھو جن میں ان دعوتوں کا ظہور ہوا تھا یہاں ہر قوم اپنے طرز عمل میں ٹھیک ٹھیک دوسری قوم کی شبیہ ہے اور کس طرح گمراہی کا چہرہ ہمیشہ ایک ہی طرح کا رہا غور کرو کہ کوئی بات بھی ایسی ہے جس میں ظلم و فساد کی ایک نمود ظلم و فساد کی دوسری نمود سے ہم رنگ نہ رہی ہو سب نے اپنی اپنی باری وہی سب کچھ کیا جو ان میں سے کسی ایک نے کہا تھا۔ سب نے دعوت کا انکار کیا سب نے تکذیب کی سب نے ہنسی اڑائی سب نے دلائل سے بے رخی اختیار کی سب نے روشنیوں سے منہ موڑا سب نے سرکشی اور گھمنڈ سے مقابلہ کیا سب نے موعظت و دلائل کا جواب سب نے جبر و تشدد سے راستہ روکا۔

ظلم وتعدی سے دیا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی طرح کی صدائیں نکلیں۔ سب کے انکار و اعراض کا مزاج ایک ہی طرح کا رہا اور پھر سب کو غرور و طغیان نے آخر تک اس کی مہلت نہ دی کہ روشنی و تاریکی میں امتیاز کرتے فما کانوا لیومنوا بما کذبوا بہ من قبل میں اسی کی طرف اشارہ ہے۔ گویا نبیوں کی دعوت اور ان کی قوموں کے جواب کی پوری تاریخ کے سمندر کو ایک کوزہ میں بند کر دیا گیا ہے۔

شارحین قرآن فما کانوا لیومنوا بما کذبوا بہ من قبل کی تفسیر میں حیرانیوں کا شکار ہیں۔ قاضی بیضاوی نے فرمایا کہ

"حضرت نوح کے بعد انبیاء کی قوموں کو ایمان لانے کی کفر میں رچ بس جانے سے توفیق ہی نہ ہوئی۔ کیونکہ وہ پہلے ہی سے نبوت کی تکذیب کے خوگر تھے۔"

ابوحیان اندلسی نے البحر المحیط میں بتایا کہ لام جحود یہ بتانے کے لیے آیا ہے کہ ان کا ایمان لانا ممتنع اور محال ہے۔ علامہ بقاعی نے فرمایا کہ تکذیب کے مجرم عادی ہونے کی وجہ سے کسی طرح بھی ان کو ماننے کی سعادت ہی نصیب نہ ہوئی نواب صدیق حسن خاں رحمہ اللہ نے فتح البیان میں انکشاف فرمایا۔

"مطلب یہ ہے کہ قوموں میں سے کوئی بھی انبیاء کی دعوت کو ماننے کو تیار نہ ہوا کیونکہ وہ انبیاء کے آنے سے پہلے ہی دین کی تکذیب کرتے تھے۔"

حالانکہ معاملہ بالکل صاف اور واضح ہے کہ نہ ماننے میں سب کی ہم آہنگی تھی اور انکار و سرکشی میں سب کا طرز عمل ایک تھا۔ سب قوموں کا اعراض و انکار میں معاملہ بالکل ہم آہنگ رہا ہے ہمیشہ ایسا ہی ہوا کہ غرور و طغیان نے ان کو اس کی مہلت نہ دی کہ حق کو قبول کرنے۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ جو لوگ عقل و فطرت کے بدیہیات و یقینیات کو جھٹلا دیتے ہیں ان کو رسول کے انذار سے کوئی نفع نہیں ہوتا ہے بلکہ صاف اور واضح مطلب یہ ہے کہ اعراض و انکار جن کا مزاج بن جاتا ہے اور غرور و سرکشی جن کی طبیعت ہوتی ہے ان کو رسولوں کی دعوت کو اپنانا راست ہی نہیں آتا ہے۔

حق قبول کرنے کی استعداد کا خاتمہ

۷۴ہم اسی طرح سرکشی میں حد سے گذرنے والوں کے دلوں پر مہر لگا دیتے ہیں جو لوگ تکذیب و عداوت حق میں حد سے نکل جاتے ہیں ان کے دلوں پر مہر لگنے کی یہی صورت ہوتی ہے کہ اول تکذیب کرتے ہیں پھر اس پر ضد اور اصرار کرتے کرتے محض دشمنی اور عناد کی روش اختیار کر لیتے ہیں یہاں تک کہ دل کی ساری کلیں بگڑ جاتی ہیں اور قبول حق کی استعداد باقی نہیں رہتی ہے [1] طبع کے معنے کی وضاحت ہو چکی ہے۔ طبع کی حقیقت جاننے کے لیے ضروری ہے کہ یہ سمجھ لیا جائے کہ قرآن میں ختم اور طبع جہاں بھی آیا ہے وہ کفر کے نتیجے میں آیا ہے یعنی انسان سے جب کفر کا صدور ہوتا ہے تو اس کے نتیجے کو تشبیہاً یوں ادا کیا کہ ان کے دلوں پر مہر لگ گئی کہ سمجھتے نہیں طبع اللہ بکفرھم۔ یعنی ان کفر کی وجہ سے اللہ نے مہر لگا دی ہے مقصد یہ ہے کہ جب کفر کا صدور ہوتا رہا تو دلوں سے صداقت شناسی اور اثر پذیری کا جوہر سلب ہو گیا۔ پیش نظر آیت میں بھی مخاطبوں کا عدوان دلوں پر مہر لگنے کا سبب ہے یعنی وہ لگاتار عدوان کرتے رہے اس کے نتیجے میں ان کے دلوں پر مہر لگ گئی یعنی ان کے دلوں سے حق آشنائی کی استعداد اور حق پذیرائی کی صلاحیت ناپید ہو کر رہ گئی۔ اللہ کا قانون یہ ہے کہ جو شخص اندھا اور بہرا بنتا ہے اور حق کا پیغام نہ سنتا ہے اور نہ اس پر عمل کرتا ہے اللہ سبحانہ پھر اس کو دیکھنے اور سننے کی توفیق نہیں دیتا ہے اگر وہ ایسا کرے تو یہ ظلم ہو اور ظلم کے ہر شائبہ سے اس کا ہر حکم اور ہر کام پری ہے۔ قرآن میں جہاں جہاں بھی اللہ سبحانہ کی مہر کا ذکر ہے وہاں اس کے کفر و فسق کی علت ہمیشہ پہلے ذکر کر دی گئی ہے اس لیے ان آیتوں سے جبر پر استدلال درست نہیں یہ ہے نبیوں اور ان کی قوموں کی داستان تاریخ کا وہ اجمالی نقشہ جو قرآن نے یہاں پیش کیا ہے۔ نبیوں کی جانب سے دعوت اور قوموں کی جانب سے تکذیب کی داستان کن ل۔ آیئے اسی آیت کی مدد سے یہ بھی معلوم کر لیجئے کہ نتیجہ دونوں کے حق میں کیا رہا۔ نتیجہ بھی ہمیشہ ایک رہا اور کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس ایک کے خلاف ہوا ہو۔ ہمیشہ اللہ سبحانہ کے فیصلہ کا انتظار کیا گیا اور ہمیشہ فیصلہ یہی ہوا کہ مومنوں نے نجات پائی سرکشوں کے لیے ہلاکت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہوئی۔ یہ گویا اس معاملہ کا ایک قدرتی خاصہ تھا اور خاصہ کبھی بدل نہیں سکتا یہ آگ کے لیے گرمی تھی۔ برف کے لیے ٹھنڈک تھی سنة الله فی الذین خلوا من قبل ۔

موسیٰ و ہارون کی پکار

۸۹ پھر ان رسولوں کے بعد فرعون اور اس کے انتظامی سربراہوں کی طرف ہم نے حضرت موسیٰ اور ہارون کو روانہ کیا اپنی آیات دے کر مگر انہوں نے بڑائی کا مظاہرہ کیا اور وہ لوگ جرائم پیشہ تھے یعنی جرائم پیشہ لوگ تھے نافرمانی کی خو قبول حق کی اجازت کہاں دیتی تکبر مانع ہوا کہ اللہ سبحانہ کی نشانیوں کو دیکھ کر اس کے سفرا کے سامنے گردن جھکائیں وجحدوا بها واستيقنتها انفسهم ظلما وعلوا یہ بھی تکبر تھا جس نے فرعون سے یہ الفاظ کہلائے الم نربك فينا وليدا ولبثت فينا سله

حضرت نوح کے ذکر کے بعد فرمایا کہ ان کے بعد بہت سے رسول آئے پھر حضرت موسیٰ کا ذکر کیا ان سب میں قدر مشترک یہ ہے کہ یہ سب اللہ کی ذات کی پرستش اور اس کی طاعت کے داعی تھے اور ان کے مخاطب عوام اور ارباب اقتدار تھے۔ حضرت موسیٰ بھی اسی خدمت پر مامور تھے جس پر حضرت نوح، حضرت ہود حضرت صالح حضرت ابراہیم ان سے پہلے مامور تھے اور اسی خدمت پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم تک سارے انبیا مامور ہوتے رہے اور وہ یہ کہ پرستش اور بندگی اللہ سبحانہ کے سوا کسی کی نہ کرو عابدانہ اور نیازمندانہ تعلقات بھی اسی قائم کرو اور طاعت بندگی بھی زندگی میں اسی کی کرو اسی کے وفادار شہری بن کر رہو اور یہ یقین کرو کہ اس زندگی کے بعد نہیں دوسری زندگی میں اللہ کے حضور پیش ہو کر اپنے اعمال کا حساب دینا ہے۔ اللہ کی توحید اور آخرت کا عقیدہ سب نبیوں کی دعوت ہے، توحید عبادت میں بھی اور توحید طاعت میں بھی۔ اسی پر سارے نبیوں نے روحانی سیاسی معاشی اور قانونی نظام کی دعوت دی ہے۔ فلاح صرف ان کو ہی ہے جنہوں نے عبادت اور طاعت میں اللہ سبحانہ سے تعلقات استوار کئے ہیں یہی سورۃ یونس کا مرکزی موضوع ہے۔ یہی دعوت حضرت موسیٰ اور ہارون بھی فرعون اور اشراف حکومت کی طرف لے کر آئے حضرت موسیٰ و ہارون

سلہ افادات شیخ الاسلام

کا پیش نہاد صرف شخصی استبداد کا خاتمہ نہیں تھا بلکہ عبادت وطاعت میں اللہ سے رابطہ کی دعوت تھی۔ فرعون کی جگہ اگر خود بنی اسرائیل بھی ہوتے پھر بھی دعوت ہی ہوتی۔ یہاں علامہ بقاعی نے یہ خوب نکتہ آفرینی کی ہے کہ اب تک جن نبیوں کا تذکرہ ہوا ہے ان کی بعثت ان کی قوموں کی طرف ہوتی ہے اسی لیے قرآن نے سب کے لیے بھائی کی تعبیر اختیار کی ہے۔ اس کے برعکس حضرت موسیٰ کی بعثت فرعون اور فرعون کے اعیان حکومت کی طرف ہوتی ہے مدعا یہ ہے کہ انبیاء کی دعوت ایک ہی ہوتی ہے چاہے اپنے ہوں یا بیگانے ہم وطن ہوں یا غیر ملکی اور اجنبی۔ انبیاء کی دعوت کے سامنے رنگ، نسل زبان قوم اور وطن کی تفریقات نہیں ہوتی ہیں ان کی پکار ایک ہوتی ہے کہ اللہ سے عابدانہ اور مطیعانہ تعلقات قائم کرو اصنام و اوثان کی پرستش نہ کرو اور تخت و تاج کی طاعت نہ کرو۔ عبادت کا مستحق بھی اللہ ہے اور اطاعت کا حقدار بھی اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ کو مختلف معجزات عطا ہوئے تھے وہ اس لیے تھے کہ فرعون کو دکھا کر اسے حق کی طرف دعوت دی جائے قرآن کا انکشاف ہے کہ فرعون نے ان معجزات کو دیکھ کر بجائے حق کو قبول کرنے کے اپنی بڑائی کا مظاہرہ کیا اور حضرت موسیٰ کی دعوت کو پائے استکبار سے ٹھکرا دیا قرآن نے بتایا ہے کہ فرعون اور اس کے اعیان حکومت جرائم پیشہ لوگ تھے یعنی چھوٹے گناہ نہ کرتے تھے بلکہ بہت بڑے بڑے معاشرتی، عائلی فوجداری معاشی اور سیاسی جرائم کرتے تھے۔ اور صرف کرتے تھے بلکہ جیسا کہ الخفاجی نے بتایا ہے کہ جرائم کے عادی اور فن کار تھے۔

حضرت موسیٰ کے بارے بس یہ سمجھنا کہ وہ ایک قومی لیڈر کی حیثیت سے صرف بنی اسرائیل کی آزادی چاہتے تھے بالکل بے ربط اور دعوت انبیا سے بے خبر ہونے کی علامت ہے بلاشبہ حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو مصر سے نکالنے کا بھی فرعون سے مطالبہ کیا لیکن یہ تو اس وقت کیا جب ایک مدت تک کام کرنے کے بعد قانون الٰہی نے حضرت موسیٰ کے دشمن کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کر لیا تو اللہ کی جانب سے بنی اسرائیل کو ساتھ لیکر مصر سے ہجرت کا حکم ہوا فرعون کی ہلاکت حضرت موسیٰ کا معجزہ عذاب تھا۔ اور معجزہ عذاب اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک قوم کے سارے صالح اجزا اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہوتے اور مومنین اور کافرین ایک دوسرے سے پھوٹ کر جدا نہیں ہو جاتے اور رسول کو معاندین

کے ایمان سے قطعی مایوس نہیں ہوجاتی ہے بنی اسرائیل کی آزادی خود مقصد نہیں بلکہ حصول مقصد کا ایک ذریعہ ہے اصل مقصد تو فرعون کی ہدایت اور حق کی طرف دعوت تھی آگے تفصیل آرہی ہے۔

حضرت موسیٰ کا اعلان حق

نشہ لہذا جب حق ان کے پاس ہماری جانب سے آیا تو وہ بول پڑے کہ یہ تو کھلا جادو ہے یعنی عصا اور ید بیضا وغیرہ معجزات دیکھ کر اور موسیٰ علیہ السلام کی نہایت پر تاثیر تقریریں سن کر کہنے لگے کہ یہ سب کھلا جادو ہے کیونکہ ان کے خیال میں تمام مافوق العادت چیزوں کا آخری درجہ جادو ہی ہوسکتا تھا لے

سورت کے آغاز میں گذر چکا ہے قال الکافرون ان هذا الساحر مبین۔ دونوں طرح پڑھا گیا ہے سحر مبین یہاں بھی دو قرائتیں ہیں سحر مبین اور ساحر مبین انبیاء کے مخاطب وحی و نبوت کا انکار کرتے ہیں۔ دوسری طرف یہ بھی دیکھتے ہیں کہ یہ شخص دوسرے آدمیوں کی طرح نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے پھر جب اس کی کوئی توجیہ سمجھ میں نہ آئی تو کہتے ہو نہ ہو یہ جادوگری ہے۔ ان کا یہ کہنا حضرت موسیٰ کی حیرت انگیز تاثیر کی سب سے بڑی شہادت ہے یعنی اس کا اثر اس درجہ نمایاں اور قطعی تھا کہ باوجود عناد و جحود کے اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے اسے جادوگری سے تعبیر کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے حضرت موسیٰ کی صداقت کی اس سے بڑھ کر اور کیا دلیل ہوسکتی ہے کہ ان کا سخت سے سخت معاند بھی اس عجیب و غریب کشش و تاثیر سے انکار نہیں کر سکتے تھے جو آپ کی شخصیت اور آپ کی تعلیم میں پائی جاتی تھی اور چونکہ اعتراف حقیقت کے لیے تیار نہ تھے اس لیے مجبور ہو جاتے تھے کہ اسے جادو سے تعبیر کریں۔

عام شارحین قرآن نے آیت میں الحق سے مراد خود حضرت موسیٰ کی بات اور دعوت سے ہٹ کر دعوی نبوت کے دلائل یعنی معجزات لیے ہیں۔ حالانکہ قرآن کا انداز بیان اس احتمال کا ساتھ نہیں دیتا ہے قرآن نے ایک وقت میں دو باتیں کہی ہیں ایک یہ کہ جو کچھ حضرت

لے افادات شیخ الاسلام

نے بات کہی ہے وہ حضرت موسیٰ کی نہیں ہماری ہے اور دوسری یہ کہ وہ الحق ہے۔ الحق حق سے ہے اور عربی حق کا لغوی خاصہ ثبوت اور قیام ہے یعنی جو بات ثابت ہو اٹل ہو اسے حق کہتے ہیں اور باطل ٹھیک ٹھیک اس کی ضد ہے یعنی ایسی بات جو مٹ جانے والی اور باقی نہ رہنے والی ہو۔ اسی لیے قرآن نے سچائی کو حق سے اور انکار کو باطل سے تعبیر کرکے یہ بات واضح کردی ہے کہ سچائی کا خاصہ ثبوت وقیام ہے اور انکار وسرکشی کے لیے مٹ جانا ہے علامہ البقاعی نے آیت کی تشریح اس طرح کی ہے۔

"جب ان کے پاس یعنی فرعون اور اس کے اعیان حکومت کے پاس حقانیت سے بھرپور حق ہماری جانب سے آیا یعنی یہ خود رسولوں کا پیغام نہیں تھا بلکہ اللہ کی جانب سے تھا وہ بغیر سوچے اور صورت حال پر غور کیے بغیر محض دشمنی اور اپنی بڑائی کی وجہ سے بول پڑے کہ یہ تو کھلا جادو ہے جیساکہ حضور انور کے مخاطبوں نے قرآن کے بارے میں کہا تھا کہ یہ تو کھلا جادو ہے۔"

حافظ ابن کثیر نے ان ھذا لسحر مبین تاکیدی انداز سے یہ لطیف نکتہ افرینی فرمائی ہے کہ حضرت موسیٰ کے مخاطبوں نے اس بات پر قسم اس لیے کھائی ہے کہ وہ جانتے تھے کہ جو بات حضرت موسیٰ کے بارے میں کہہ رہے ہیں یہ جھوٹ ہے اور سراسر بہتان ہے قرآن کی زبان میں اسی کا نام کفر جحود ہے۔ قرآن نے فرعون اور فرعونوں کے بارے میں بتایا ہے۔

وجحدوا بہا واستیقنتہا انفسہم ظلما وعلوا

"انہوں نے ازراہ ظلم وتکبر اس کا انکار کیا حالانکہ ان کا دل ان کی صداقت کا یقین کرچکا تھا۔"

مطلب یہ ہے کہ جو لوگ آخرت پر یقین نہیں رکھتے اور مادہ پرستیوں میں اندھے ہوجاتے ہیں وہ نبوت کی ہدایت پر ایمان نہیں لاتے اور اس انکار کا اصلی سبب ان کا ظالمانہ طرز عمل اور اقتدار کا نشہ ہوتا ہے ورنہ ان کے دلوں کو پیغمبر کی صداقت کا یقین ہوتا ہے۔

جادو اور اعجاز میں فرق

لا۹ے حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ تم سچائی کی رونمائی کے بعد سچائی کو جادو کہتے ہو۔ کیا جادو یہ ہے حالانکہ جادوگر فلاح سے ہمدوش نہیں ہوتے ہیں یعنی حق کو جادو کہتے ہو۔ کیا جادو ایسا ہوتا ہے اور کیا جادو کرنے والے نبوت کا دعوت کرکے حق و باطل کی کش مکش سے کامیاب نکل سکتے ہیں۔ سحر و معجزے میں تمیز نہ کرسکنا ان کوتاہ بینوں کا کام ہے جو سونے اور پیتل میں تمیز نہ کرسکیں۔ نبی کے روشن چہرے، پاکیزہ اخلاق نور تقوی، پھر شوکت و عظمت احوال میں بدیہی شہادت اس کی موجود ہوتی ہے کہ جادوگری اور شعبدہ بازی سے انہیں دور کی بھی نسبت نہیں پھر اللہ کے رسول کو ساحر کہنا کس درجہ بے حیائی یا دیوانگی ہے لے

سحر اور اعجاز کے فرق پر متکلمین نے علم کلام کی کتابوں میں بہت کچھ لکھا ہے ہم یہاں تفصیل تو نہیں مگر کچھ اجمالاً اس کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

یہ سوال بلاشبہ بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ معجزہ سے جس طرح عجیب و غریب امور صادر ہوتے ہیں، سحر و طلسم نیرنگ شعبدہ سے بھی اس قسم کی باتیں دکھائی جاسکتی ہیں۔ سحر و طلسم کے الفاظ اگر اس بیسویں صدی میں مکروہ معلوم ہوں تو ان کے معنے مسمریزم اور ہپناٹزم کے سمجھ لیے جائیں۔ ایسی صورت میں ایک اللہ کے رسول اور ساحر و شعبدہ باز میں کیا فرق ہوگا۔ یہ سوال ہے جس پر علم کلام میں طول طویل بحثیں ہیں۔ معتزلہ اور ارباب ظواہر میں حافظ ابن حزم ظاہری کا یہ دعویٰ ہے کہ معجزے کے علاوہ سحر و طلسم و شعبدہ وغیرہ جو چیزیں ہیں وہ صرف فریب نظر ہیں۔ لیکن معجزے سے قلب ماہیت اور تبدیل حقیقت ہوجاتی ہے۔ اشاعرہ سحر و طلسم کی حقیقت کو مانتے ہیں لیکن یہ کہتے ہیں کہ معجزے سے جو عظیم الشان عجائبات سرزد ہوتے ہیں مثلاً سمندر کا خشک ہونا، چاند کا شق ہونا وغیرہ یہ چیزیں سحر و طلسم کے زور سے نہیں ہوسکتیں۔ حکمائے اسلام کا مسلک یہ ہے کہ معجزہ اور سحر میں فرق یہ ہے کہ صاحب معجزہ اپنی قوت کو خیر میں صرف کرتا ہے اور ساحر شر میں۔

لیکن حقیقت یہ ہے کہ ان جوابات سے اشکال کی اصل گرہ نہیں کھلتی ایک شخص اپنے

لے افادات شیخ الاسلام

دعویٰ کی ثبوت میں بظاہر ایک خارق عادت کرشمہ پیش کرتا ہے اب اس پر یہ بحث کہ یہ دھوکہ یا نظر بندی ہے یا امر الٰہی ہے یا معمولی کام ہے یا عظیم الشان کارنامہ ہے نہایت مشکل کام ہے کیونکہ ان اشیاء کے وقوع میں کوئی ظاہری امتیاز رونما ہو نہیں سکتا۔ نیز اس کا فیصلہ کہ یہ قوت خیر میں صرف ہو یا محل شر میں اس کے علاوہ کوئی تیسری شکل نہیں ہو سکتی بہت کچھ قابل بحث ہے۔ ایک مسمریزرا اپنی قوت سے بعض بیماریوں کو دور کر دیتا ہے اور اس سے غریبوں کا علاج کرتا ہے یہ تو خیر اور نیکی کی چیز ہے کیا آپ اسے معجزہ کہہ دیں گے۔

اصل یہ ہے کہ معجزہ اور دیگر عجائبات میں دو عظیم الشان فرق ہیں ایک یہ کہ معجزہ براہ راست اللہ سبحانہ کا فعل ہوتا ہے اور دوسرے عجائبات امور اسباب طبعی و نفسی کے نتائج ہوتے ہیں۔

دوسرے یہ کہ معجزے سے مقصود اعدائے دعوت الٰہی کی ہلاکت یا رسول خدا کی تائید اور مومنین کی حمایت اور برکت ہوتی ہے محض کھیل تماشہ شعبدہ بازی، بازیگری اس کا مقصد نہیں ہوتا اور سب سے آخری شے جو ان دونوں کے درمیان حد فاصل بن جاتی ہے یہ ہے کہ ساحر صرف تماشہ اور کرتب دکھاتا ہے اس کے ساتھ وہ اپنی زندگی کی پاکیزگی ارادے کی بے گناہی دل کی طہارت شریعت کی تبلیغ تزکیہ قلوب کا نہ وہ مدعی ہوتا ہے اور نہ یہ خواص اور کارنامے اس سے ظاہر ہوتے ہیں لیکن انبیاء علیہم السلام کی معصوم زندگی پاک اخلاق، مقدس اعمال اور دیگر پیغمبرانہ خصائص و کیفیات خود ان کی نبوت کی منادی کرتے رہتے ہیں۔ قدم قدم پر خدا ان کی دعوت کی تائید کرتا ہے۔ ان کی صدائے حق جماعتوں اور قوموں اور ملکوں میں روحانی انقلاب پیدا کر دیتی ہے ان کی سچائی دوستی اور صداقت پر ان کی سوانح حیات کا حرف حرف گواہ ہوتا ہے وہ سونے چاندی پر نہیں بلکہ دلوں پر اخلاص و ایثار اور صدق و صفا کی مہر لگاتے ہیں۔ ایک ساحر اور مسمریزر خواص اشیاء میں انقلاب پیدا کر سکتا ہے مگر کافر کو مومن بدکار کو عفیف بے باک کو متقی بخیل کو فیاض سخت کو نرم اور جاہل کو عالم نہیں بنا سکتا وہ لوہے کو زر خالص کی صورت میں بدل سکتا ہے لیکن کسی زنگ آلود دل کو جلا نہیں دے سکتا۔

یہ ظاہری اشتباہ صرف نبی و ساحری میں نہیں ہے بلکہ دنیا کی ہر حقیقت اسی طرح اپنے مقابل سے مشتبہ ہے۔ صبر اور بے صبری توکل اور عجز بخل و کفایت شعاری، سخاوت اور اسراف تنقید اور تنقیص حق گوئی اور گستاخی شجاعت اور تہور۔ ان میں باہم اس قدر التباس ہے

کہ انسان کی قوت تمیز کبھی کبھی دھوکا کھا جاتی ہے لیکن اہل نظر ان دونوں کے باہم تشابہ سے فریب میں نہیں آتے۔ ان دونوں کی ظاہری شکل و صورت بے شک ایک ہو مگر ان دونوں کے خصائص و آثار اس درجہ متفاوت ہیں کہ وہ ایک دوسرے کے فرق و امتیاز کو فوراً پہچان لیتے ہیں جب پیغمبر اپنا معجزہ اور جادوگر اپنا کرتب دکھاتے ہیں تو ظاہری سیرت زائی کے لحاظ سے عوام کے نزدیک ایک لمحہ کے لیے گو دونوں ایک ہوں مگر جب حقیقت کا پردہ چاک ہو جاتا ہے تو ایک اخلاق کا مجسمہ پاکیزگی کا فرشتہ، شریعت کا حامل گنہ گاروں کا معالج اور دلوں کا طبیب ہوتا ہے اور دوسرا محض تماشا گر ہوتا ہے۔

ایک عطائی اور طبیب حاذق ایک معمولی سپاہی اور ایک بہادر جرنیل ایک حرف شناس اور ماہر علوم ایک مکار اور زاہد ایک بناوٹی اور حقیقی موتی کے درمیان شاید عوام فرق نہ کر سکیں مگر جب ان دونوں کے آثار و خصائص اور علامات و قرائن باہم رائے جائیں تو ظلمت و نور کی طرح ان دونوں میں علانیہ فرق محسوس ہو جاتا ہے۔ اور حضرت مولانا روم رحمۃ اللہ علیہ نے مثنوی میں سحر و اعجاز کو اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔

آیئے آپ بھی لطف اندوز ہو جائیے فرماتے ہیں۔

سحر را با معجزہ کردہ قیاس	ہر دو را بر مکر پندارد اساس
جادو کو معجزہ پر قیاس کر لیا	اور یہ سمجھا کہ دونوں کی بنیاد فریب پر ہے
زر قلب و زر نیکو در عیار	بے محک ہرگز نہ دانی ز اعتبار
تم کھوٹے اور کھرے سونے کو	کسوٹی کے بغیر ہرگز نہیں جان سکتے
ہر کرا در جان خدا بنہد محک	ہر یقین را باز داند او ز شک
اللہ نے جس کی روح میں کسوٹی رکھی ہے	وہی یقین و شک میں امتیاز کر سکتا ہے
چوں شود از رنج و علت دل سلیم	طعم صدق و کذب را باشد علیم
جب دل میں بیماری نہیں ہوتی	تو وہ سچ اور جھوٹ کے مزے کا پتہ لے لیتا ہے

اور فرق مراتب کو متعدد تشبیہات کے ذریعے سمجھایا ہے خلاصہ یہ ہے سینکڑوں اور ہزاروں چیزیں باہم مشابہ ہوتی ہیں میٹھے اور شور پانی رنگ میں یکساں ہوتا ہے بھڑ اور شہد کی مکھی ایک ہی پھول چوستی ہیں ایک سے زہر اور دوسری سے شہد پیدا ہوتا ہے ہرن ایک ہی گھاس اور ایک ہی پانی پیتے ہیں مگر ایک سے مینگنیاں اور دوسرے سے مشک ہوتا ہے

بانس اور گنا ایک زمین میں اور ایک پانی سے پلتے ہیں مگر ایک بے مزہ اور دوسرا شیریں ہوتا ہے۔ ایک شخص غذا کھا کر بخل کی تصویر اور دوسرا اسی غذا سے نور خدا کا حامل ہوتا ہے۔ اس قسم کی مختلف تشبیہات سے متشابہات میں فرق مراتب کی توضیح کی ہے۔ بہرحال ساحر ایک تماشا گر ہوتا ہے اس میں یہ قدرت ہی نہیں ہوتی کہ وہ اس کے ذریعے تزکیہ نفوس تطہیر اخلاق اور اصلاح عالم کا کام لے سکے یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی ساحر اور شعبدہ باز نے اصلاح کا فرض انجام نہیں دیا لیکن اللہ کا رسول اپنے معجزانہ کارناموں سے دنیا کو الٹ دیتا ہے بدی کے کانٹوں کو ہٹا کر نیکی کے گل وریحان سے اس خاکدان عالم کو سجا دیتا ہے مطلب یہ ہے کہ ظاہر نظر میں جادو اور معجزے کے درمیان جو مشابہت ہوتی ہے اس کی بنا پر فرعون اور اس کے اعیان حکومت نے اسے جادو قرار دے دیا مگر یہ نہ دیکھا کہ جادوگر کس سیرت واخلاق کے لوگ ہوتے ہیں اور کن مقاصد کے لیے جادوگری کرتے ہیں۔ کیا کوئی جادوگر بے دھڑک اور بے غرض کسی فرمان روا کے دربار میں آتا ہے۔ کیا جادوگر کا جادو اس کے کسی دعویٰ کی دلیل ہوتا ہے۔ اللہ کا رسول اپنے تئیں اللہ کا رسول ہونے کا دعویٰ کرتا ہے اور اس دعویٰ پر اعجاز کو بطور دلیل پیش کرتا ہے۔ کیونکہ نبوت ایک دعویٰ ہے کہ میں اللہ سبحانہ کا نمائندہ ہوں۔ اتنا عظیم دعویٰ کہ میں خدا کا نمائندہ ہوں اس دعویٰ کے لیئے بطور دلیل نبوت کو وہ عجیب چیز عطا کی جاتی ہے کہ ساری مخلوق اس کے کرنے سے عاجز ہوتی ہے وہ چیز نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتی ہے۔ اسی کو معجزہ کہتے ہیں۔

اس پورے مضمون کو حضرت موسیٰ نے اسحر ھذا کہہ کر پہلے یہ جتایا کہ کیا یہ جادو ہے اور پھر اس ساری داستان کو اس ایک فقرے میں سمیٹ دیا کہ ولا یفلح الساحرون کہ جادوگر فلاح نہیں پاتے ہیں یعنی جادوگر کسی پائدار کامیابی سے ہمدوش نہیں ہوتے ان کے کرشموں اور شعبدوں کی چمک دمک وقتی اور عارضی ہوتی ہے۔ یہ جملہ حضرت موسیٰ کی جانب سے فرعون اور اس کے اعیان حکومت کو ایک چیلنج بھی ہے کہ اگر اس کو سحر کہتے تو اس کے مقابلے میں جب تم ساحروں کو لاؤ گے تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا اور تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ رسول کے معجزے اور ساحر کے سحر میں کیا فرق ہوتا ہے۔

حضرت موسیٰ پر سیاسی الزام

۹۲ انہوں نے کہا کہ اے موسیٰ کیا تیرا مقصد یہ ہے کہ ہمیں ہمارے آبائی طریقہ سے ہٹا کر ملک میں اپنی دونوں کی حکومت قائم کرے ہم تو تم دونوں کے اقتدار کو تسلیم نہ کریں گے یعنی تم معاذ اللہ دنیا کے حریص اور بدنیت ہو ایک سیاسی تحریک کو مذہبی رنگ میں پیش کرتے ہو۔ تمہاری غرض یہ معلوم ہوتی ہے کہ مذہب کے نام پر ایک انقلاب عظیم برپا کر کے اس ملک میں اپنی حکومت قائم کرو اور یہاں کے پرانے حکمرانوں قبطیوں کو برطرف کر دو۔ یاد رکھو کہ تمہاری یہ خواہش پوری ہونے والی نہیں ہے ہم لوگ ہرگز تمہاری بات نہ مانیں گے نہ تمہاری بزرگی کبھی تسلیم کریں گے [1]

موسیٰ علیہ السلام نے ایسی دندان شکن واقعاتی اور نمایاں ٹھوس حقیقت فرعون کے سامنے پیش کی کہ فرعون لاجواب ہو کر رہ گیا۔ لاجواب ہونے کی صورت میں انسانی طبیعت کی عام کمزوری یہ ہے کہ وہ ایسے مواقع پر قوت و طاقت کا سہارا لیتا ہے یا پھر دین آبائی کی آغوش میں پناہ لیتا ہے چنانچہ فرعون اور اس کے اعیان حکومت نے حضرت موسیٰ کے خلاف عوام کو بھڑکانے کے لیے ان پر آبائی دین اور ملک کی حکومت دونوں کے خلاف بغاوت برپا کرنے کا الزام لگایا کہ تم ہمارے آبائی دین سے ہمیں برگشتہ کرنا چاہتے ہو اور تمہاری خواہش یہ ہے کہ اس ملک کے اقتدار پر قبضہ کر دو۔

آیت میں یہ بھی اشارہ ہے کہ حضرت موسیٰ کا مطمح نظر صرف بنی اسرائیل کی رہائی نہ تھی۔ اگر ایسا ہوتا تو فرعون اور اس کے درباریوں کو یہ اندیشہ کرنے کی ضرورت نہ تھی کہ حضرت موسیٰ کی دعوت پھیلنے سے سرزمین مصر کا دین بدل جائے گا اور ملک میں ہمارے بجائے ان کا اقتدار قائم ہو جائے گا ان کے اس اندیشے کی وجہ یہی تھی کہ حضرت موسیٰ اہل مصر کو بندگی حق کی دعوت دے رہے تھے اور اس سے وہ مشرکانہ نظام خطرے میں تھا جس پر فرعون کی حکومت اور مذہبی رہنماؤں کی پیشہ ورانہ زندگی قائم تھی۔ دراصل حضرت موسیٰ کی حیثیتیں دو تھیں ایک حیثیت آپ کی نبی ماننے والی بگڑی ہوئی امت کی اصلاح کی تھی اس حیثیت میں آپ جعز البیانی

[1] افادات شیخ الاسلام

مسلم قوم یعنی بنی اسرائیل کے بھی تھے اور دوسری حیثیت میں آپ قبطی قوم کیطرف دعوت حق لے کر آئے تھے ایک وقت میں آپ دو کام کر رہے تھے بگڑی ہوئی امت کی اصلاح اور منکرین حق کے سامنے حق کا اعلان۔

یہاں حافظ ابن کثیر کا یہ اضافی نوٹ پڑھنے کے لائق ہے کہ

> اللہ سبحانہ نے حضرت موسیٰ کو فرعون کی آغوش میں شہزادہ کی حیثیت سے پرورش کرایا، پھر ان کو نبوت و رسالت سے سرفراز فرما کر فرعون کی طرف روانہ کیا صرف اس لئے کہ فرعون کو اللہ سبحانہ کی طرف یہ دعوت دی جائے کہ اپنے عابدانہ تعلقات اللہ سبحانہ سے استوار کر، لیکن فرعون نے آمرانہ اقتدار کے نشہ میں حضرت موسیٰ کی دعوت کو قبول نہیں کیا۔ اور صرف قبول نہیں کیا بلکہ تمرد استکبار کا مظاہرہ کیا۔ حضرت موسیٰ کی دعوت کے خلاف اعلان بغاوت کر کے اہل ایمان کو مٹانے کے درپے ہو گیا۔ حضرت موسیٰ سے مجادلہ اور مناظرہ کیا۔ پے درپے اور لگاتار معجزات کا مشاہدہ کرنے کے باوجود فرعون اور اس کے اعیان حکومت نے جحود و عناد اور مکابرہ کی راہ اختیار کی۔

اس سے پہلے انبیا کے جو تاریخی واقعات بیان ہوئے ہیں۔ ان میں اور حضرت موسیٰ کی تاریخی داستان میں بہت بڑا فرق ہے۔ انبیا کی تاریخی شہادتوں سے یہ ذہن نشین کرانا مقصود ہے کہ جو قوم نبوت کی دعوت اور اللہ کے پیغام کو ٹھکرا دیتی ہے اسے ضرور اپنے اعمال کی سزا ملتی ہے۔ اب حضرت موسیٰ کی زندگی کے دو پہلو پیش کئے جا رہے ہیں ایک پہلو یہ کہ حضرت موسیٰ امت دعوت سے مخاطب میں یہ فرعون اور فرعون کے اعیان حکومت اور مصر کے قبطی ہیں۔ امت دعوت کے وقائع میں کفار مکہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ دعوت حق کے مرحلے میں حق و باطل کی قوموں کا جو تضاد سب نظر آتا ہے اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیے۔ حق کی پوری تاریخ اس پر گواہ ہے کہ نبوت کا آغاز ایک ننھی قوم کی اقلیت سے ہوتا ہے اور بغیر کسی ساز و سامان کے اللہ کا رسول اس باطل کے خلاف لڑائی چھیڑ دیتا ہے جس کی پشت پر بڑی بڑی قوموں اور حکومتوں کی طاقت ہوتی ہے۔ لیکن نتائج کے لحاظ سے نبوت ہی غالب آکر رہتی ہے۔ نیز اس واقعہ میں یہ بھی بتایا جا رہا ہے کہ داعی حق کے خلاف جو چالیں چلی جاتی ہیں اور جن تدبیروں سے ان کی دعوت کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے وہ کس طرح الٹ جاتی ہیں اور یہ

کہ اللہ سبحانہ منکرین حق کی ہلاکت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ان کو کتنی کتنی طویل مدت تک سنبھلنے اور درست ہونے کے مواقع دیتا رہتا ہے اور جب کسی تنبیہ اور کسی روشن نشانی سے وہ متاثر نہیں ہوتے تو پھر وہ انہیں عبرتناک سزا دیتا ہے۔

وَقَالَ فِرْعَوْنُ ائْتُونِي بِكُلِّ سٰحِرٍ
عَلِيمٍ ﴿٧٩﴾ فَلَمَّا جَاءَ السَّحَرَةُ قَالَ لَهُم مُّوسَىٰ أَلْقُوا مَا أَنتُم
مُّلْقُونَ ﴿٨٠﴾ فَلَمَّا أَلْقَوْا قَالَ مُوسَىٰ مَا جِئْتُم بِهِ السِّحْرُ ۖ
إِنَّ اللَّهَ سَيُبْطِلُهُ ۖ إِنَّ اللَّهَ لَا يُصْلِحُ عَمَلَ الْمُفْسِدِينَ ﴿٨١﴾
وَيُحِقُّ اللَّهُ الْحَقَّ بِكَلِمَاتِهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُجْرِمُونَ ﴿٨٢﴾

اور فرعون اپنے اعیانِ حکومت سے کہا کہ ہر فنکار جادوگر میرے حضور میں پیش کرو [93] جب جادوگر فرعون کی بارگاہ میں پیش ہو گئے تو حضرت موسیٰ نے جادوگروں سے مخاطب ہو کر کہا تمہیں جو کچھ کرنا ہے کرو [94] پھر جب جادوگروں نے جو کچھ کرنا تھا کر لیا تو حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ تم نے کیا ہے یہ جادو ہی ہے [95] بلاشبہ اللہ سبحانہ اسے ضرور ملیامیٹ کر دے گا۔ اللہ سبحانہ بگاڑ کرنے والوں کے کام کو نہیں سنوارتا ہے [96] اور اللہ اپنے قوانین کے مطابق حق کو ضرور جماد عطا فرمائے گا۔ اگرچہ جرائم پیشہ لوگوں

کو کیسا ہی ناگوار ہو ۹۲ھ

فرعون کا تاریخی چہرہ

فرعون شاہان مصر کا لقب ہے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے تین ہزار قبل مسیح زمانہ اسکندر تک فراعنہ کے اکتیس خاندان مصر پر حکمران رہے ہیں۔ سب سے آخری خاندان فارس کی شہنشاہی کا تھا جو ۳۳۲ء قبل مسیح سکندر کے ہاتھوں مفتوح ہوا۔ ان میں سے حضرت یوسف کا فرعون ہکسیس عمالقہ کے خاندان سے تھا جو دراصل عرب خاندانوں ہی کی ایک شاخ تھی۔

یہ بات کہ حضرت موسیٰ نے کس فرعون کا زمانہ پایا ہے؟ عام مورخین عرب اور شارحین قرآن اس کو بھی عمالقہ ہی کے خاندان ہی کا فرمانروا بتاتے ہیں مشہور مورخ ابن قیتبہ لکھتا ہے۔ سام بن نوح کی اولاد میں سے عمالیق ہیں یہ متعدد قوموں کا مجموعہ تھے جو متفرق ہو کر ممالک میں پھیل گئے ان میں سے ہی مصر اور بابل کے حکمران ہیں ان ادوار پر ہم نویں جلد میں تبصرہ کر چکے ہیں۔ جدید مصری اثری تحقیق یہ ہے کہ حضرت موسیٰ کے زمانہ کا فرعون رعمیس ثانی کا بیٹا منفتاح ہے۔

حضرت مولانا حفظ الرحمن سیوہاری نے قصص القرآن میں علامہ نجار کی قصص الدنیا کے حوالہ سے اس موضوع پر تفصیلی بحث کی ہے اور ہم اس کا خلاصہ معالم القرآن کی جلد ۹ میں پیش کر چکے ہیں دیکھو ص ۸۴ جلد نہم

۹۳ھ اور فرعون نے اپنے اعیان حکومت سے کہا کہ ہر فن کار جادوگروں کو میرے حضور میں پیش کرو یہ گویا موسیٰ علیہ السلام کی تقریر کا جواب تھا یعنی رہا سحر اور معجزہ کا جھگڑا۔ اس کا ہم عملاً تصفیہ کئے دیتے ہیں کہ اس ملک کے بڑے بڑے ماہر جادوگر اکٹھے کیے جائیں۔ پھر ان کے خوارق کے سامنے معجزات دکھلائیں۔ دنیا مشاہدہ کرے گی کہ تم پیغمبر ہو یا معاذ اللہ جادوگر ہو۔ اس کے لیے فرعون نے تمام ملک میں گشتی جاری کر دی اور آدمی بھیج دیئے کہ مشاق اور ماہر جادوگر جہاں کہیں ہوں فوراً حاضر کیے جائیں ۱؎

۱؎ افادات شیخ الاسلام

فرعون اور اس کے اعیان حکومت سے یہ حقیقت تو مخفی نہیں رہ سکتی تھی کہ نہ حضرت ساحر ہیں اور نہ جو کچھ وہ پیش کر رہے ہیں سحر ہے لیکن چونکہ ان کی بات مان لینے کی صورت اس کو اپنی اور اپنی مزعومہ خداوندی و حکمرانی کی موت نظر آتی تھی اس وجہ سے اس کو جائے فرار کی صورت یہی نظر آئی کہ ملک کے تمام ماہر جادوگروں کو بلا کر مقابلہ کرایا جائے کہ شاید اس طرح بات بن جائے۔ اگرچہ یہ ایک کھلی حماقت تھی لیکن کسی حقیقت کو نہ ماننے کی خواہش ایک ایسی خواہش ہے جس کی خاطر انسان بہت سی حماقتیں کرتا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بعثت کا زمانہ مصری تمدن کی جو تاریخ پیش کرتا ہے اس میں یہ بات بہت نمایاں نظر آتی ہے کہ مصری علوم و فنون میں جادو کو ایک نمایاں مقام حاصل ہے۔ اسی لیے ساحرین کا مرتبہ مصری معاشرے میں ایک ممتاز مرتبہ تھا حتیٰ کہ ان کو شاہی دربار میں بہت بڑا رسوخ حاصل تھا۔ جنگ و صلح پیدائش و موت کی زائچہ کشی کے لیے اور اہم سرکاری معاملات میں حالات کی دریافت کا وہ ہی مرکز سمجھے جاتے تھے اور ان کے علوم کو بڑی وقعت سے دیکھا جاتا تھا۔ مذہبی مقامات میں ان کو اہم جگہ دی جاتی تھی قدیم شاہی خاندانوں میں جو ممی شدہ نعشوں کے ساتھ جو کاغذات اور دستاویزیں برآمد ہوئی ہیں اور ان حجروں میں جو نقوش و تصاویر پائے جاتے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے۔

قدیم قوموں کی عام گمراہیوں میں سے ایک گمراہی یہ بھی رہی ہے کہ وہ جادو پر خالص دینی حیثیت سے اعتقاد رکھتے تھے اور اس کے ہی ذریعے اپنی دینی زندگی کے احوال و ظروف تیار کرتے تھے۔ دینی عقیدت سے اس کو سیکھتے اور سکھاتے اور اس میں وہ اپنی اجتہادی قوتیں صرف کر کے نت نئی اختراعات کرتے۔ مصر، بابل، چین عراق اور ہندوستان کی تاریخ اس کی گواہ ہے۔

یہی وجہ تھی کہ مصری قوم پر فرعون اور اس کے اعیان حکومت کا یہ داؤ چل گیا کہ حضرت موسیٰ جادوگر ہیں اور یہ اپنے جادو کے اثر و رسوخ کو کام میں لا کر مصری حکومت پر قبضہ کرنا چاہتا ہے۔ اب اس کا علاج یہی ہے کہ اپنے ملک کے ماہر جادوگروں کو جمع کر کے سر عام حضرت موسیٰ کو شکست دی جائے۔ موسیٰ علیہ السلام نے بھی سرکار کے فیصلہ کو اس لیے غنیمت سمجھا کہ اعجاز نبوت اور ساحروں کے سحر کا مقابلہ ہو گا تو دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا اور ان کو ناچار حق و صداقت کے سامنے جھکنا پڑے گا نیز حضرت موسیٰ کے پیش نظر یہ بھی تھا کہ اگرچہ

وحی الٰہی کا تعین روشن حجت و برہان کے ذریعے ہو چکا ہے تاہم فرعون اور اعیانِ حکومت چونکہ دلائلِ نبوت کو سحر کہہ کر عوام کو اصل حقیقت سے بے خبر رکھنے کی کوشش کرتے رہے ہیں اس لیے ضرورت ہے کہ عوام و خواص کے مجمع میں سحر و اعجاز کے امتیاز کی کھلم کھلا نمائش ہو جائے تاکہ اللہ کی بندوں کی ہدایت کے لیے اللہ کی آخری حجت بھی پوری ہو جائے۔

اعجاز و سحر کی نمائش

جب جادوگر فرعون کے دربار میں پیش ہو گئے تو حضرت موسیٰ نے جادوگروں سے کہا کہ جو کچھ تمہیں کرنا ہے کر لو۔ دوسری جگہ مذکور ہے کہ ساحرین نے موسیٰ علیہ السلام سے دریافت کیا تھا کہ اپنا کرتب دکھلانے میں تم پہل کرتے ہو یا ہم کریں اس کے جواب میں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ تم کو جو دکھلانا ہے دکھا دو۔ کیونکہ باطل کی پوری زور آزمائی اور نمائش کے بعد حق کا آنا اور باطل کو نیچا دکھا کر ملیامیٹ کر دینا زیادہ مؤثر اور غلبہ حق کو زیادہ واضح کرنے والا ہے [۱]

حضرت موسیٰ کا یہ کہنا کہ جو کچھ تم پیش کرنا چاہتے ہو وہ پیش کر دو اپنے مقام پر بہت بڑے اعتماد کی نشانی ہے۔ نبوت کو اللہ سبحانہ کے وعدہ نصرت پر پورا بھروسہ ہے کہ جادوگر جتنا بڑا جادو دکھائیں اللہ ان کی رہنمائی فرمائے گا۔ سورہ اعراف میں ہے کہ جادوگروں نے میدان مبارزت میں اترتے ہی کہا یا موسیٰ اما ان تلقی و اما ان نکون نحن الملقین اس سوال کے جواب میں حضرت موسیٰ نے یہ بات ارشاد فرمائی القوا ما انتم ملقون جو کچھ تمہیں کرنا ہے کر لو۔ نظم قرآن بتا رہا ہے کہ حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں جادوگروں کی خواہش بھی تھی کہ پہل ہم کریں۔ جادوگر اس وقت تک حضرت موسیٰ کو اپنے ہی طرح کا جادوگر سمجھ رہے تھے اور گویا کہہ رہے تھے کہ مقابلہ ہمارے تمہارے ہی فن کا ہے اب بتلاؤ کہ پہل کون کرے ہم یا تم اور صیغہ متکلم پر زور دے کر پہل میں اپنی رغبت ظاہر کر دی۔ حضرت موسیٰ نے ان کی خواہش تاڑ کر ان کو پہلے ہی موقع دیا کہ وہ اپنے فن کا مظاہرہ کریں اور فرمایا القوا ما انتم ملقون یہ اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت موسیٰ کو پورا اعتماد تھا کہ ان کو اللہ سبحانہ کی تائید حاصل ہے۔
جادوگروں نے پیشہ ورانہ طور پہ پہلے یہ اطمینان کر لیا کہ غلبہ کی صورت میں ان کو انعام ملیگا

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

جیسا کہ سورہ اعراف میں پڑھ چکے ہو اور سورہ الشعراء میں پڑھو گے فالوان لنا اجرا ان کنا نحن الغالبین فرعون نے اس کے جواب میں کہا نعم انکم اذا لمن المقربین یعنی انعام تو جو کچھ ملتا ہے وہ تو ملے ہی گا تم پر مزید نوازش یہ ہو گی کہ تم خاص مقربین میں شمار ہو گے مطلب یہ ہے کہ روپیہ پیسہ ہی نہیں ملے گا۔ بلکہ تم سرکار کے درباری اور کرسی نشین ہو گے۔ اس طرح فرعون اور جادوگروں نے خود ہی نبی اور جادوگروں کا عظیم اخلاقی فرق ظاہر کر دیا۔ دونوں کا تقابلی مطالعہ فرمایئے ایک طرف بنی اسرائیل جیسی پسی ہوئی قوم کا ایک بیکس اور بے بس فرد دس سال تک قتل کے الزام میں روپوش ہونے کے بعد فرعون کے دربار میں آتا ہے اور بڑے طنطنے کے ساتھ ڈنکے کی چوٹ کہہ رہا ہے۔ انی رسول من رب العالمین فرعون سے بات کرنے میں وہ ادنیٰ سی بھی جھجک محسوس نہیں کرتا اس کی دھمکیوں کی وہ ذرا برابر پروا نہیں کرتا۔ یہ نبوت کی شان ہے اس کے مقابلے میں جادوگروں کی صورت میں خالص مادیت ہے جن کو فرعون کے سرکاری دین اور اس کے خود ساختہ نظام حیات کو بچانے کے لیے بلایا گیا ہے مادیت ہاتھ جوڑ کر کہہ رہی ہے کہ سرکاری انعام ملنا چاہیے اور جواب سن کر کہ پیسہ بھی ملے گا اور قرب شاہی سے بھی نوازے جاؤ گے پھولے نہیں سمائے۔ یہ دو متقابل کردار خود زبان حال سے بول رہے ہیں کہ نبی کی شان کیا ہوتی ہے اور اس کے متقابل کا کیا مقام ہوتا ہے؟ رسول اللہ کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کا نعرہ لا اسالکم علیہ اجرا ہوتا ہے اور رسول کا مد مقابل ناخدا شناسی کی نمائندگی کرتا ہے اور اس کا نعرہ ان لنا اجرا ان کنا نحن الغالبین ہوتا ہے نبی کی ذات نبوت سے سرفراز ہونے کے بعد سراپا ہدایت و رحمت اور مجسم امامت و پیشوائی کی تصویر ہوتی ہے۔

جادوگروں کی افسوں کاری

[۹۵] پھر جب جادوگروں نے جو کچھ کرنا تھا کر لیا تو حضرت موسیٰ نے فرمایا کہ جو کچھ تم نے کیا ہے یہ بس جادو ہے جادوگروں نے اپنی لاٹھیاں رسیاں زمین پر پھینک دیں اور تخیل و نظر بندی سے دیکھنے والوں کو ایسا معلوم ہونے لگا گویا تمام میدان زندہ سانپوں سے بھرا ہوا ہے۔ موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ یہ صرف جادو ہے وہ جادو نہیں جسے فرعون اور اس کے ساتھیوں نے جادو کہا تھا بلکہ حضرت موسیٰ نے فرمایا ما جئتم به السحر۔ ما موصولہ ہے اور جملہ مبتدا ہے

[۱] افادات شیخ الاسلام

السحر مبتدا کی خبر ہے یعنی جو کچھ تم نے کیا ہے یہ جادو کے سوا کچھ نہیں ہے جادو ایک فن اور آرٹ ہے اس کی کوئی حقیقت ہے یا نہیں اس پر پہلے بحث ہو چکی ہے۔ جادو میں واقفیت ہے یا نہیں یہ مسئلہ تو اختلافی ہے لیکن جو جادو حضرت موسیٰ کے مقابلہ میں جادوگروں نے پیش کیا تھا وہ تخیل و فریب نظر کے سوا کچھ نہیں تھا۔ قرآن میں اللہ سبحانہ نے اسے یخیل الیہ من سحرھم انھا تسعیٰ سے تعبیر کیا ہے یعنی جادوگروں کی رسیاں اور لاٹھیاں سانپ بن گئیں تھیں بلکہ ان کی شعبدہ گری سے دیکھنے والا خیال کرنے لگتا سانپ کی طرح حرکت کر رہی ہیں۔ کہیں فرمایا انما صنعوا کید ساحر ولا یفلح الساحر حیث اتی یہ جادوگروں کا فریب ہے اور جادوگر کیسا ہی تماشہ دکھائے حقیقت کی طرح کامیاب نہیں ہو سکتا سورہ اعراف میں جادوگروں کے متعلق فرمایا سحروا اعین الناس لوگوں کی آنکھیں جادو زدہ ہو گئی تھیں یعنی جادو ں کے شعبدوں کی کوئی حقیقت نہیں محض نگاہ کا دھوکا تھا سورہ اعراف میں جادوگروں کی شعبدہ بازی کو ما یافکون فرمایا یعنی ان کی جھوٹی نمائش تھی۔

بتانا یہ ہے کہ شعبدہ گری کے فنون میں سے ایک فن ہے یا آرٹ ہے حکمت اور علوم عقلیہ سے اس کا تعلق ہے۔ طلسمات و نیرنجات کا بھی ان علوم عقلیہ و مادیہ سے تعلق ہے بلکہ طلسمات و نیرنجات تو محققین کی رائے کے مطابق اشراقی فلسفہ کی شاخ تھی۔ فلسفہ میں کمال حاصل کرنے والے ان فنون میں مہارت حاصل کرتے تھے۔ شیخ مقتول شہاب الدین سہروردی کے متعلق کتابوں میں لکھا ہے کہ کبھی کبھار وہ اس قسم کے تماشے دکھاتے تھے مثلاً لکھتے ہیں کہ دمشق سے نکلتے ہوئے راستہ میں شیخ الاشراق کا جھگڑا ایک چرواہے سے ہو گیا۔ گڈریے نے شیخ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا۔ ایسا معلوم ہوا کہ مونڈھے سے شیخ کا ہاتھ اتر کر چرواہے کے ہاتھ میں چلا گیا۔ اس حال کو دیکھتے ہی بے چارہ چرواہا پریشان ہو گیا اور ہاتھ پھینک کر بھاگ گیا۔ شیخ نے بڑھ کر اسے اٹھا لیا اور اپنے ساتھیوں سے آکر مل گئے بجائے ہاتھ کے اصل میں رومال تھا مگر شیخ کی فنی مہارت سے چرواہے کو ہاتھ معلوم ہوا۔ امام اوزاعی سے ایک یہودی اشراقی کا قصہ بھی اسی قسم کا منقول ہے۔ یہودی نے ایک مینڈک پکڑا۔ امام اوزاعی بھی سفر میں تھے عیسائیوں کے ایک گاؤں میں جب یہودی اس مینڈک کو فروخت کرنے لگا تو دیکھنے والوں کو معلوم ہوتا تھا کہ سور کا بچہ ہے۔ کسی غریب عیسائی نے سور سمجھ کر خرید لیا جب یہودی قیمت لے کر گاؤں سے باہر آیا تو مینڈک اصلی صورت میں واپس آ گیا گاؤں والوں نے یہودی کا پیچھا کیا امام

اوزاعی کہتے ہیں کہ جونہی وہ لوگ قریب ہوئے یہودی کی گردن سے اس کا سر الگ ہو گیا اور زمین پر لڑھکنے لگا گاؤں والے یہ تماشا دیکھ کر واپس بھاگ گئے وہی سر جو بدن سے الگ پڑا معلوم ہوتا تھا امام اوزاعی سے پوچھ رہا تھا۔ اے ابو عمر کیا وہ لوگ چلے گئے انہوں نے کہا کہ ہاں تو اچھل کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ اتحاف میں ان اشراقی تماشوں کا ذکر طاش کبری زادہ نے کیا ہے مشہور مصنف علامہ سکاکی کے متعلق لکھا ہے کہ ایک طرف تو وہ مفتاح العلوم جیسی کتاب لکھتے تھے اور دوسری طرف اسی قسم کے علوم و فنون کے ذریعے عجب تماشے دکھاتے تھے روضۃ الصفا میں لکھا ہے کہ بغداد میں وزیر سے ان کا ایک بار جھگڑا ہو گیا۔ سکاکی نے عمل کے زور سے سارے بغداد کی رگ باندھ دی۔ کسی کے گھر چولہا روشن نہیں ہوتا تھا تین دن کے بعد خلیفہ کو معلوم ہوا کہ سکاکی کی یہ شرارت ہے لجاجت سے کہلا بھیجا کہ لوگ پریشان ہیں اب اپنے عمل کو اٹھالیں۔ سکاکی نے بھی پیغام بر سے کہا۔ یہ قصے میں نے اس لیے نقل کیے ہیں کہ سحر ایک فن ہے۔ مسلمان بھی اپنے دور پستی میں اس میں لگے رہے۔ حکما میں یہ چیزیں اشراقی فلسفہ کی راہ سے آئی تھیں، لیکن اشراقی خواص ہوں یا عوام سب جانتے ہیں، کہ دین سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔

قرآن نے حضرت موسیٰ کی زبانی یہی انکشاف کیا ہے کہ جادوگروں نے جس چیز کی نمائش کی ہے وہ صرف سحر ہے اور نبوت جو کچھ پیش کرتی ہے وہ سحر نہیں اعجاز ہے سحر فن ہے محنت و ریاضت سے حاصل کیا جا سکتا ہے اعجاز فن نہیں ہے خود صاحب اعجاز کی محنت کا بھی اعجاز میں دخل نہیں ہوتا ہے۔ یہ بھی نبوت کی طرح وہبی ہے۔ اور اللہ کی جانب سے ہوتا ہے۔

جادو کا عمل صرف فساد ہے

۹۶ یعنی بلاشبہ اللہ سبحانہ اسے ضرور ملیا میٹ کر دے گا۔ اللہ سبحانہ بگاڑ پیدا کرنے والوں کے کام کو نہیں سنوارتا ہے یعنی بس تم اپنی قوت صرف کر چکے اب سنبھل جانا کہ اللہ اپنی قدرت و رحمت سے یہ سب بنا بنایا کھیل بگاڑ دیتا ہے جو میرے مقابلے میں پھر کبھی نہیں سنور سکے گا۔ کیونکہ اللہ سبحانہ کی عادت کے خلاف ہے کہ مصلح و مفسد کے مقابلہ کے وقت جبکہ اس سے مقصود خالص اتمام حجت ہو۔ مفسدوں اور شریروں کی بات سنوار دے

اور کلمہ حق کو پست و مغلوب کر دے ۔ قرآن نے نبوت کے جو خصائص و علامات بتائے ہیں ان سے خود معجزے اور سحر کا فرق اور ساحر و نبی کا امتیاز ظاہر ہوتا ہے۔ سحر و شعبدہ میں صرف دل لگی کے وقتی تماشے ہوتے ہیں لیکن معجزات قوموں اور جماعتوں کے صلاح و فساد تعمیر و تخریب ترقی و تنزل کا سامان ہوتے ہیں۔ ساحر کا مقصد کسی غیر معمولی واقعہ کا صرف حیرت انگیز طریقہ سے اظہار ہوتا ہے تاکہ وہ دیکھنے والوں کو تھوڑی دیر کے لیے متحیر کر دے لیکن نبی کا مقصد اپنے معجزات سے دنیا کی اصلاح قوموں کی دعوت، جماعتوں کی تہذیب اور دین الٰہی کی تقویت کے سوا کچھ اور نہیں ہوتا۔ اللہ کا رسول بشیر نذیر نذیر کی ہادی سراج منیر اور شاہد عالم ہوتا ہے، جادوگر ان تمام اوصاف سے خالی ہوتا ہے اور حیرت انگیز تماشہ گری کے سوا کوئی اور ممتا نیات اس کے اندر نہیں ہوتی۔ قرآن میں حضرت موسیٰ کے مدمقابل جادوگروں کے سحر کے متعلق جس قدر بیانات ہیں ان سے واضح ہوتا ہے کہ وہ سحر کی حقیقت کو نبوت کے مقابلے سے زیادہ تسلیم نہیں کرتا اور تخیل و نظر بندی سے اس کو وقعت نہیں دیتا۔

ساحر اور نبی میں اللہ تعالیٰ نے جو فرق بتایا وہ بھی ہے کہ نبی فلاح پاتا ہے اور جادوگر فلاح نہیں پاتا۔ نبی کے تمام اعمال، مساعی، جدوجہد اور معجزات کا مرکز و محور صلاح و فلاح اور خیر ہوتا ہے۔ اور جادوگر کا مقصد صرف دھوکا اور فتنہ ہوتا ہے۔ اس آیت میں اسی بات کو بتایا گیا ہے ان اللہ سیبطلہ یعنی سحر و جادو ایک وقتی تماشا ہوتا ہے اور اعجاز کا اثر دائمی ہوتا ہے اور اس کے نتائج دنیا میں نہایت عظیم الشان ہوتے ہیں۔

احقاق حق کا قانون

ے اور اللہ اپنے قوانین کے مطابق حق کو ضرور جاد عطا فرمائے گا اگرچہ جرائم پیشہ لوگوں کو کیسا ہی ناگوار ہو یعنی جو کچھ بھی ہے حق اور باطل کی کش کش ہے حق اور باطل کیا ہے۔ کونسا قانون الٰہی ہے جو اس میں کام کر رہا ہے یہ واضح کیا ہے کہ صلاح اور اصلاح حق ہے اس کے مقابلہ پر فساد اور افساد باطل ہے۔ حق کے معنے عربی میں ثبوت اور قیام کے ہیں یعنی جو بات ثابت ہو، قائم رہنے والی اور اٹل ہو۔ قرآن نبوت کی دعوت کو حق اور اس کے انکار کو

ے افادات شیخ الاسلام

باطل کہتا ہے کیونکہ نبوت جو کچھ پیش کر رہی ہے وہ صلاح ہے اور نبوت کے مدمقابل جس چیز کے علمبردار ہیں وہ سرتاسر فساد ہے حق کا خاصہ نبوت و قیام ہے اور باطل کے لیے مٹ جاتا ہے نبوت جو حق کی علمبردار ہو کر باطل سے مقابلہ کرتی ہے یہ حق کی باطل پر چوٹ ہے اس مقابلہ میں باطل ختم ہو کر رہ جاتا ہے اس تقاعی سطالعہ میں احقاق حق اور ابطال باطل اللہ کا قانون ہے ویحق اللہ الحق بکلماتہ ویبطل الباطل یہ بقائے حق کا قانون ہے یعنی اللہ سبحانہ نے یہ قانون ٹھہرا دیا ہے کہ یہاں وہی چیز باقی رہ سکتی ہے جس میں صلاح ہو نفع ہو اور جس میں صلاح ونفع نہ ہو وہ ٹھہر نہیں سکتی۔ اسی کو قرآن کی زبان میں قضا بالحق سے تعبیر کیا گیا ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ مجرمین ومفسدین خواہ حق کو دبانے کی نبوت کے مقابلہ میں اپنے علوم فنون سے کتنی ہی کوششیں کریں لیکن اللہ سبحانہ حق کا بول بالا کرنا ہے۔

فَمَآ اٰمَنَ

لِمُوْسٰٓى اِلَّا ذُرِّيَّةٌ مِّنْ قَوْمِهٖ عَلٰى خَوْفٍ مِّنْ فِرْعَوْنَ وَ
مَلَا۟ئِهِمْ اَنْ يَّفْتِنَهُمْ ؕ وَاِنَّ فِرْعَوْنَ لَعَالٍ فِى الْاَرْضِ ۚ
وَاِنَّهٗ لَمِنَ الْمُسْرِفِيْنَ ۝ وَقَالَ مُوْسٰى يٰقَوْمِ اِنْ كُنْتُمْ

اٰمَنْتُمْ بِاللّٰهِ فَعَلَيْهِ تَوَكَّلُوْٓا اِنْ كُنْتُمْ مُّسْلِمِيْنَ ۝ فَقَالُوْا
عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا ۚ رَبَّنَا لَا تَجْعَلْنَا فِتْنَةً لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝
وَنَجِّنَا بِرَحْمَتِكَ مِنَ الْقَوْمِ الْكٰفِرِيْنَ ۝ وَاَوْحَيْنَآ اِلٰى
مُوْسٰى وَاَخِيْهِ اَنْ تَبَوَّاٰ لِقَوْمِكُمَا بِمِصْرَ بُيُوْتًا وَّاجْعَلُوْا
بُيُوْتَكُمْ قِبْلَةً وَّاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ ۗ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝

حضرت موسیٰ کی قوم میں سے حضرت موسیٰ کی بات چند نوجوانوں نے مانی۔ فرعون اور اس کے اعیان حکومت کے اس خوف سے کہ کہیں ان کو کسی فتنہ میں نہ ڈال دے۔ اور بلاشبہ فرعون ملک میں بڑا ہی سرکش تھا۔ اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ظلم و استبداد میں چھوٹ تھا۔ ۹۷ اور حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور فی الواقع اسی کے فرماں بردار ہو تو صرف اسی پر بھروسہ کرو۔ ۹۸ انہوں نے کہا کہ ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب اس ظالم گروہ کے لیے ہمیں فتنوں کی آماجگاہ نہ بنا۔ اور ہمیں اپنی رحمت کے صدقے کفر پیشہ لوگوں سے بچا لے۔ ۹۹

اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو حکم دیا کہ مصر میں اپنی قوم کے لیئے گھر بناؤ۔ اور گھروں کو قبلہ رُو بناؤ۔ اور نماز قائم کرو۔ اور اہل ایمان کو کامیابی کی خوشخبری دو ۝

مفردات کے معانی

ذریتہ۔ اصل میں چھوٹے بچوں کو کہتے ہیں۔ اگرچہ عرف میں چھوٹوں اور بڑوں دونوں کے لیئے استعمال ہوتا ہے۔ اصل میں اسم جمع ہے۔ لیکن مفرد اور جمع دونوں کے لیئے بولاجاتا ہے۔ ذریتہ کا مادہ کیا ہے۔ اس میں تین خیال ہیں۔ ایک یہ کہ ذرأ سے بنا ہے اس کے معنے پھیلانے اور پیدا کرنے کے ہیں۔ ہمزہ متروک ہے جیسے برأ سے بریتہ دوسرے یہ کہ اس کی اصل ذرویتہ ہے۔ تیسرے یہ کہ ذرؓ سے فعلیتہ کے وزن پر ہے۔ جس کے معنے بکھرنے کے ہیں۔ جیسے قمریتہ۔

توکلوا تم بھروسہ کرو توکل سے ہے۔ جس کے معنے بھروسہ کرنے کے ہیں۔ شاہ ولی اللہ نے حجۃ اللہ البالغہ میں توکل کی یہ تعریف کی ہے کہ توکل یہ ہے کہ بندہ پر یقین اس قدر غالب ہو کہ جلب منافع اور دفع مضار کے اسباب۔ اس کی محنت و کوشش میں سرد پڑ جائیں لیکن اللہ سبحانہٗ نے اپنے بندوں کے لیئے جو حدیں مقرر کی ہیں ان پر اعتماد کے بغیر ان میں کوتاہی نہ کرے اور ان پر عمل پیرا ہو۔ علامہ مجدالدین فیروز آبادی بصائر ذوی التمیز میں لکھتے ہیں کہ تمام اولیائے کرام کا اس پر اتفاق ہے کہ اسباب کی پابجائی کے توکل منافی نہیں ہے بلکہ اسباب پر عمل پیرا ہوئے بغیر توکل صحیح ہی نہیں ہے۔ اگر تارک اسباب ہو کر دعویٰ توکل کرتا ہے تو یہ سر تا سر بطالت ہے اور توکل فاسد ہے صوفیا میں حضرت سہل نے کیسی پیاری بات فرمائی ہے۔ اسباب میں رخنہ اندازی سنتہ میں رخنہ اندازی ہے۔ اور توکل میں رخنہ ایمان میں رخنہ ہے۔ توکل حضور اقدس کا حال ہے اور اسباب کی پابجائی آپ کی سنت ہے۔ حال پر عمل کرنے والے کو تارک سنتہ نہ ہونا چاہیئے

اسی لیئے امام احمد فرماتے ہیں کہ توکل دل کے اعمال میں سے ایک عمل ہے اس کا جوارح سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ تفصیل حافظ ابن القیم کی مدارج السالکین علامہ مرتضیٰ زبیدی کی اتحاف السادۃ المتقین میں ہے۔

حضرت موسیٰ اور اُمت اجابت

حضرت موسیٰ کی مخاطب دو اُمتیں ہیں۔ ایک امت دعوت دوسرے اُمت اجابت۔ امت دعوت۔ فرعون۔ مصر کی قبطی قوم اور فرعون کے اعیان حکومت ہیں اور امت اجابت سے مُراد خود بنی اسرائیل ہیں۔ ان کا تعلق خانوادۂ نبوت سے ہے۔ یہ رسولوں کی گود میں پلی ہوئی اُمت ہے حضرت ابراہیم کے حضرت اسحاق کے حضرت یعقوب ان کا ہی نام اسرائیل ہے ان کی اولاد کو بنی اسرائیل کہتے ہیں۔ بنی اسرائیل کا عروج صدیوں تک رہا ہے۔ یہ سلسلہ وحی و نبوت کے قائل تھے اور عقیدۂ جزاء وسزا رکھتے تھے۔ علوم انبیاء اور معارف اولیاء کے حامل تھے جن شارحین قرآن نے الا ذریۃ من قومہ کی ضمیر کا مرجع فرعون کو قرار دیا ہے وہ اس سے اُمت دعوت مراد لیتے ہیں۔ یہ ہیں حافظ ابن کثیر اور جن لوگوں نے ضمیر کا مرجع آیت میں مذکور حضرت موسیٰ کو قرار دیا ہے وہ اُمت سے امت اجابت مراد لیتے ہیں یہ حافظ ابن جریر وغیرہ ہیں۔ میرا خیال ہے کہ اُمت سے امت اجابت مراد ہے یعنی بنی اسرائیل اس سے پہلے حضرت موسیٰ کے مخاطبات امت دعوت سے تھے اب امت اجابت سے شروع ہوئے ہیں۔ امت دعوت کے وقائع میں کفار مکہ کو یہ سمجھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ دعوت حق کے ابتدائی مراحل میں حق و باطل کی قوتوں میں بظاہر جو تناسب نظر آتا ہے اس سے دھوکہ نہ کھانا چاہیئے۔ حق و باطل کی آویزش کی پوری تاریخ گواہ ہے کہ نبوت کا آغاز ایک ہی توم سے ہوتا ہے۔ اور بغیر کسی سامان کے اس باطل کے خلاف لڑائی شروع کرتی ہے جس کی پشت پر بڑی بڑی قوموں اور حکومتوں کی طاقت ہوتی ہے پھر بھی بالاخر حق کا بول بالا ہوتا ہے۔ نیز اس میں یہ بھی بتایا ہے کہ داعی حق کے مقابلے میں جو چالیں چلی جاتی ہیں اور جن تدبیروں سے دعوت کو دبانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ وہ کس طرح الٹ جاتی ہیں۔ اور یہ کہ اللہ سبحانہ منکرین حق کی ہلاکت کا آخری فیصلہ کرنے سے پہلے ان کو کتنی کتنی طویل مدت تک سنبھلنے اور درست ہونے کے مواقع دیتا چلا جاتا ہے۔ اور جب کسی تنبیہ کسی سبق واقع اور کسی روشن نشانی سے وہ

اثر نہیں لیتے تو پھر انہیں کیسی عبرتناک سزا دیتا ہے۔

۸۳ حضرت موسیٰ کی قوم میں سے حضرت موسیٰ کی بات چند نوجوانوں نے مانی۔ فرعون اور اس کے اعیان کے اس خوف سے کہ کہیں ان کو کسی فتنہ میں نہ ڈال دے اور بلاشبہ فرعون ملک میں بڑا ہی سرکش تھا اور اس میں شک نہیں کہ فرعون ظلم و استبداد میں حد سے بڑھ چکا تھا۔ بنی اسرائیل فرعونیوں کے ہاتھوں سخت ذلت اور مصیبت اٹھا رہے تھے۔ اور پرانی پیشن گوئیوں کے مطابق منتظر تھے کہ فرعون کا خاتمہ کرنے اور اس کی سلطنت کا تختہ الٹنے والا اسرائیلی پیغمبر مبعوث ہو۔ موسیٰ علیہ السلام ٹھیک اسی شان سے تشریف لائے جس کا انہیں انتظار تھا۔ اس لئے تمام بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی بعثت کو نعمت عظمیٰ سمجھتے تھے۔ وہ دل سے حضرت موسیٰ کو سچا مانتے اور ان کی عزت کرتے تھے۔ مگر بڑے آدمی فرعون اور فرعونی سرداروں سے خوف زدہ تھے اس لئے ابتدا میں شرعی طور پر ایمان نہیں لائے وقت کے منتظر رہے کہ جس وقت حق کا غلبہ ہوگا مسلمان ہو جائیں گے۔ بنی اسرائیل کے تھوڑے سے نوجوانوں نے ہمت کر کے باوجود فرعونیوں سے خائف ہونے کے اپنے اسلام کا اظہار کیا۔ چند گنے چنے قبطی بھی جو فرعون کی قوم سے تھے مشرف با ایمان ہوئے۔ آخر میں جب موسیٰ علیہ السلام کا اثر اور حق کا غلغلہ بڑھتا گیا تب پوری قوم بنی اسرائیل کی جو تقریباً چھ لاکھ بالغ مردوں پر مشتمل تھی مسلمان ہو گئی یہاں ابتدا کا قصہ بیان ہوا ہے۔ سرداروں سے مراد یا تو فرعون کے حکام و عمال ہیں۔ یا بنی اسرائیل کے وہ سردار ہیں جو خوف و طمع کی وجہ سے اپنی ہم قوموں کو فرعون کی مخالفت سے ڈراتے تھے۔ اور بچلا دینے کا مطلب ہے کہ فرعون ایمان لانے کی خبر سنکر سخت ایذائیں پہنچائے۔ جن سے گھبرا کر ممکن ہے کہ بعض ضعیف القلب راہ حق سے پھسل جائیں لہ یہاں سے حضرت موسیٰ کا روئے سخن امت اجابت بنی اسرائیل کی طرف ہو گیا ہے اس صورت میں قومہ کی ضمیر کا مرجع بنی اسرائیل ہوں گے۔ اور معنے یہ ہوں گے کہ بنی اسرائیل میں سے کچھ نوجوانوں نے حضرت موسیٰ کی بات مانی۔ اس پہ بزرگوں کو یہ شبہ ہوا ہے کہ بنو اسرائیل کا پہلے ہی حضرت موسیٰ پر ایمان تھا۔ اس لیئے ان کے ایمان لانے کا تذکرہ بے معنی ہے۔ اس لیئے انہوں نے قومہ کی ضمیر کا مرجع فرعون کو قرار دیا اور مطلب یہ بتایا کہ فرعونیوں میں سے کچھ نوجوان حضرت موسیٰ پر ایمان لائے لیکن قرآنی سیاق اس کی تائید میں نہیں ہے آگے یا قوم ان کنتم آمنتم باللہ آ رہا ہے۔ جو پوری قوم کے ایمان کی خبر دے رہا ہے۔ ظاہر ہے یہ فرعونی

نہیں بنی اسرائیل ہیں۔ اصل بات یہاں آیت میں آئے ہوئے لفظ ایمان سے بگڑی ہے ایمان امانت سے بنا ہے۔ اور عربی میں اس کے استعمال دو ہیں ایک ایمان با کے ساتھ آتا ہے۔ جیسے امنا باللہ اس کے معنے تصدیق کرنا۔ باور کرنا کسی کی سچائی کا یقین کرنا۔ اور ایک لام کے ساتھ ایمان کا استعمال ہوتا ہے اس کے معنے بات ماننا ۔ قرآن یہاں دوسری بات بتا رہا ہے کہ حضرت موسیٰ کو نبی نہیں بلکہ فرعون کے ظلم و فساد اور جبر و استبداد کا تختہ الٹنے کے لیے بنی اسرائیل میں سے حضرت موسیٰ کی بات کچھ نوجوانوں نے مانی۔ اس سے اصل مطلب یہ ہوا کہ بنی اسرائیل کی پوری قوم میں سے چند نوجوانوں کو چھوڑ کر کوئی بھی اس بات پر آمادہ نہ تھا کہ فرعونی استبداد کے خلاف ان کی دعوتی جدوجہد میں ہاتھ بٹائے۔

اس کی وجہ یہ نہ تھی کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کی نبوت نہیں مانتے تھے بلکہ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ وہ حضرت موسیٰ کا اس جدوجہد میں ساتھ دے کر اپنے آپ کو فرعونی مظالم کا تختہ مشق نہ بنانا چاہتے تھے۔ اگرچہ بنی اسرائیل نسبی لحاظ سے نبیوں کی امت اور مسلمان تھے لیکن ایک مدت دراز کی غلامی نے ان میں اتنی سکت نہ چھوڑی تھی کہ کفر و ضلالت کی فرماں روائی کے مقابلے میں ایمان و ہدایت کا علم لے کر خود اٹھیں یا جو اٹھائے اس کا ساتھ دیں

اس سے امت اجابت کو یہ سبق سکھایا جا رہا ہے کہ جب کبھی عزائم و مقاصد کی خاطر شدائد کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وطن کے بڑے بوڑھے بہت کم کام آتے ہیں۔ زیادہ تر نئی نسل کے نوجوان ہی آگے بڑھتے ہیں کیونکہ بڑے بوڑھوں کی ساری زندگیاں ظلم و فساد کی آب و ہوا میں بسر ہو چکی ہوتی ہیں اور محکومی کی حالت میں رہتے رہتے عافیت کوشی کے عادی ہو جاتے ہیں۔ البتہ نوجوانوں میں نیا دماغ ہوتا ہے۔ نیا خون ہوتا ہے۔ نئی امنگیں ہوتی ہیں۔ ان کو مصائب اور تکلیفوں کا اندیشہ مرعوب نہیں کرتا ہے وہی پہلا قدم اٹھاتے ہیں۔ پھر سارے ان کے پیچھے چلنے لگتے ہیں۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہوئے فرعون کے قہر و استبداد نے بنی اسرائیل کے بڑے بوڑھوں کی ہمتیں سلب کر دی تھیں وہ شکر گذار ہونے

ا۔ افادات شیخ الاسلام

کی جگہ ایسی شکائتیں کرتے لیکن نوجوانوں کا حال یہ نہ تھا۔ ان میں ایک گروہ نکل آیا جنہوں نے حضرت موسیٰ کے احکام کی تعمیل کی۔

در اصل محکومانہ زندگی کا پہلا اثر یہ ہوتا ہے کہ عزم وہمت کی روح پژمردہ ہو جاتی ہے لوگ غلامی کی ذلت آمیز زندگی پہ قانع ہو جاتے ہیں اور طلب وسعی کی راہوں سے جی چرانے لگتے ہیں۔ یہی حال بنی اسرائیل کا ہو گیا تھا۔ عرصہ تک مصریوں کی غلامی میں رہنے سے اس درجہ مسخ ہو گئے تھے۔ کہ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ آزادی و کامرانی کی طلب میں ان حقیر راحتوں سے کیوں ہاتھ دھو بیٹھیں جو غلامی کی حالت میں میسر آ رہی ہیں۔ اس سے حضرت موسیٰ نے ان کو توکل اور اللہ پر اعتماد کی تلقین کی ہے۔

قرآن نے یہاں یہ بھی انکشاف کر دیا ہے کہ بنی اسرائیل حضرت موسیٰ کے احکام کی تعمیل کیوں نہیں کر رہے تھے کیا اس لیئے کہ ان کے دل حضرت موسیٰ کی نبوت پر ایمان سے خالی ہو گئے۔ قرآن بتا رہا ہے کہ اصلی وجہ یہ تھی علی خوف من فرعون و ملائھم ان یفتنھم کہ ان کو فرعون اور اعیان حکومت کی طرف سے یہ خطرہ تھا کہ حضرت موسیٰ کی حمایت کے جرم میں ان کو کسی مصیبت میں نہ ڈال دے کیوں کہ ان فرعون لعال فی الارض و انہ لمن المسرفین یعنی ان کا خوف کھانا ہی کچھ بیجا نہ تھا کیونکہ اس وقت ملک میں فرعون کی مادی طاقت بہت زیادہ تھی اور اس کا ظلم وعدوان اور کفر و طغیان حد سے تجاوز کر چکا تھا کمزوروں کو ستانے کے لیئے بالکل چھوٹ اور بے لگام تھا [1]

اس سے فما آمن کی تعبیر سے یہ نتیجہ نکالنا ہرگز درست نہیں ہے کہ بنی اسرائیل مسلمان نہیں تھے۔ علامہ آلوسی کا یہ کہنا بالکل برمحل ہے کہ یہ داستان آغاز نبوت کی ہے۔

توکل علی اللہ کی تلقین

۸۴ اور حضرت موسیٰ نے اپنی قوم سے کہا، لوگو! اگر تم اللہ پر ایمان لائے ہو اور فی الواقع اسی کے فرماں بردار ہو تو بس اسی پر بھروسہ کرو یعنی گھبرانے اور خوف کھانے کی ضرورت نہیں ہے۔ ایک فرماں بردار مومن کا کام اپنے مالک کی طاقت پر بھروسہ کرنا ہے جیسے اللہ سبحانہ کی لامحدود قدرت و رحمت پر یقین ہوگا۔ وہ یقیناً ہر معاملہ میں اللہ سبحانہ پر اعتماد

[1] افادات شیخ الاسلام

کرے گا۔ اور اس اعتقاد کا اظہار جب ہی ہو سکتا ہے کہ بندہ اپنے کو بالکلیہ اللہ سبحانہ کے سپرد کردے اسی کے حکم پر چلے اور تمامی جد و جہد میں صرف اسی پر نظر رکھے [۱]

حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ قال یعنی اسرائیل حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل سے کہا۔ اور علامہ آلوسی کہتے ہیں قال موسیٰ لما رای تخوف المومنین جب حضرت موسیٰ نے اہل ایمان میں فرعون کا خوف دیکھا تو کہا اے میری قوم۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی بھی علامہ آلوسی کے ہمزبان ہیں ظاہر ہے کہ حضرت موسیٰ کا یہ خطاب فرعونیوں اور قبطیوں میں سے مشرف باسلام ہونے والوں سے نہیں ہو سکتا جب کہ ان کی تعداد بقول علامہ قرطبی فرعون کی بیوی بیٹی خازن اور خازن کی بیٹی سے زیادہ نہ تھی۔ حضرت موسیٰ کے مخاطب بنی اسرائیل ہیں یہ خطاب صاف بتا رہا ہے کہ بنی اسرائیل پورے کے پورے مسلمان تھے ان مسلمانوں ہی کو جن کو فرعون کی طاقت کا اندیشہ حضرت موسیٰ کی آواز پر لبیک کہنے میں رکاوٹ بنا حضرت موسیٰ سمجھا رہے ہیں۔ سورۂ اعراف میں بھی ایسے ہی تلقین دوسرے پیرا یے میں گذر چکی ہے بات ایک ہے صرف تعبیر میں بلاغت ہے یہاں جس بات کو ما آمن لموسیٰ الا ذریۃ من قومہ کے انداز میں ہی پیش کیا ہے اوذینا اعراف میں اسی بات کو اس طرح پیش کیا گیا۔ اوذینا من قبل ان تاتینا و من بعد ما جئتنا۔ اے موسیٰ تیرے آنے سے پہلے اور تیرے آنے کے بعد ہمیں بڑی تکلیفیں دی گئی ہیں۔

اس جگہ تلقین کا پیرایہ جو اختیار کیا ہے وہ یہ ہے۔

استعینوا باللہ واصبروا

اللہ سے مدد مانگو اور ڈٹ جاؤ

استعینوا کو یہاں یا قوم ان کنتم آمنتم باللہ فعلیہ توکلوا ان کنتم مسلمین یعنی اگر تم واقعی مسلمان ہو۔ جیسا کہ تمہارا دعویٰ ہے تو فرعون کی طاقت سے خوف نہ کھاؤ۔ بلکہ اللہ کی طاقت پر بھروسہ کرو۔

اس میں تین باتوں کی تلقین کی گئی ہے۔ ایک ایمان دوسرے اسلام اور تیسرے توکل ایمان سے مراد تصدیق ہے اور اسلام سے طاعت میں اخلاص اور توکل سے کاموں کی کامیابی میں اللہ پر اعتماد ہے۔ اس میں دو شرطیں اور ایک جزا ہے ایمان و اسلام شرطیں

[۱] افادات شیخ الاسلام

اور توکل جزا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ پر پیش پا افتادہ حالات کے بارے میں اعتماد کرنا تمہارے ایمان کا ناگزیر تقاضا ہے۔ اس کے بغیر ایمان صرف ایک دعویٰ ہے جس کی دلیل کوئی نہیں اور توکل کا موجود ہونا اللہ سے تمہارے تعلقات کے مخلصانہ ہونے کی علامت ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے آپ سے کوئی کہے کہ اگر رشید آپ کو بلائے تو آپ بشرط قدرت ضرور جائیں۔ اس کی دعوت کا قبول کرنا رشید کے دعوت دینے پر موقوف ہے اور خود دعوت کا مدار قدرت ہے۔ علامہ طیبی فرماتے ہیں کہ یہ انداز بیان جزا کے شرط پر مرتب کرنے میں مبالغہ کا فائدہ دیتا ہے۔

یوں تو دنیا کا کوئی کام اور مقصد نہیں جو بغیر کسی جدوجہد کے محض زبانی دعووں سے پورا ہو جائے۔ مگر وہ مقصد جو اپنی عظمت میں اپنی آپ نظیر ہو۔ اس کے لیئے سعی وجہد کی کوئی معمولی مقدار کافی نہیں ہے۔ اللہ پر ایمان اس کی بندگی اس کے دین کی پیروی اور پھر اسے قانون و سیاست میں برسر اقتدار لانے کا مقصد وہ مقصد ہے۔ جس کے لئے بڑی ہی پختہ عزیمت کی ضرورت ہے۔ حضرت موسیٰ فرعون کے مقابلے میں یہی مقصد لے کر آئے ہیں۔ اس کی راہ میں مشکلات مصائب اور رکاوٹوں کا ہونا یقینی ہے حضرت موسیٰ نے اسی کی طرف یہاں ان کنتم امنتم باللہ فعلیہ توکلوا ان کنتم مسلمین فرما کر اشارا کیا ہے۔ اس راہ میں عوام کے قریب نعروں طنز وافترا جان و مال کا نقصان اور محبوب رجحانات کی قربانیوں سے سب کو ہی دوچار ہونا پڑتا ہے ہمیں بھی اس میدان سے گذرنا ہوگا۔ اس میدان میں کامیابی کا راز صرف اور صرف اللہ سبحانہ پر ایمان ویقین۔ اس کی فرمانبرداری اور اس پر بھرپور اعتماد و توکل میں ہے۔ مطلب یہ ہے کہ فرعون کی طاغوتی طاقت سے پریشان نہ ہو۔ اللہ سبحانہ سے صحیح عابدانہ تعلقات استوار کرو۔ اور توکل کا دامن ہاتھ سے نہ دو۔ فتنوں اور آزمائشوں کی منزل توکل ہی سے سر ہوتی ہے۔ جس قدر اللہ پر اعتماد ویقین زیادہ ہوگا۔ اسی قدر اللہ کی مدد زیادہ ہوگی۔

نوجوانوں کا بھرپور اخلاص

۸۵ انہوں نے کہا کہ ہم نے اللہ ہی پر بھروسہ کیا۔ اے ہمارے رب اس ظالم گروہ کے

لیئے ہمیں فتنوں کی آماجگاہ نہ بنا اور ہمیں اپنی رحمت کے صدقے کفر پیشہ لوگوں سے بچالے.
موسیٰ علیہ السلام کی نصیحت پر انہوں نے اخلاص کا اظہار کیا کہ بے شک ہمارا بھروسہ خالص
خدا پر ہے اسی سے دعا کرتے ہیں کہ ہم کو ان ظالموں کیلئے تختہ مشق نہ بنا ۔اس طرح کہ یہ
یہ اپنے زورِ طاقت سے ظلم ڈھاتے رہیں۔ اور ہم ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں ایسی صورت میں ہمارا
دین ہی خطرے میں ہے. اور ان ظالموں یا دوسرے دیکھنے والوں کو یہ موقعہ ملے گا کہ اگر ہم
حق پر نہ ہوتے تو تم پر ایسا تسلط و تفوق کیوں حاصل ہوتا اور تم اس قدر پست اور ذلیل
کیوں ہوتے یہ خیال ان گمراہوں کو اور زیادہ گمراہ کر دے گا گویا ایک حیثیت سے ہمارا
وجود ان کے لیئے فتنہ بن جائے گا۔ اور نجات کا مطلب یہ ہے کہ ہمیں کافروں کی غلامی
اور محکومی سے نجات دے اور دولت آزادی سے مالا مال فرمائے

دعا سے پہلے حضرت موسیٰ کی دعوتِ توکل کا جواب علی اللہ توکلنا سے دیا ہے اور
صیغہ ماضی میں دیا ہے صیغہ مستقبل میں نہیں دیا۔ یعنی کہا کہ ہم نے اللہ پر بھروسہ کر لیا یہ نہیں
فرمایا کہ ہم اللہ پر بھروسہ کریں گے. آلوسی نے اس فرق تعبیر سے یہ بات خوب سمجھی ہے کہ یہ
لوگ اپنے ایمان و اخلاص میں واقعاتی حقیقت رکھتے تھے ۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ تعبیر بھی حصر وقصر
والی ہے یعنی ہمارا اعتماد صرف اللہ ہی پر ہے اور اللہ کے سوا کسی پر نہیں ہے۔

قرآن میں عبادت و توکل اور ایمان و توکل میں ہم آہنگی بتائی ہے مثلاً فاعبدہ وتوکل
علیہ اور قل ھو الرحمٰن امنا بہ وعلیہ توکلنا۔ بنی اسرائیل نے اسی کی تعمیل
میں اعلان کیا۔ عَلَى اللّٰهِ تَوَكَّلْنَا

توکل وکل سے باب تفعل ہے وکیل اسی سے ہے اس کے لفظی معنے بھروسہ کرنے کے
ہیں اور اصطلاح میں اللہ سبحانہ پر بھروسہ کرنے کو کہتے ہیں لیکن کس بات میں بھروسہ کرنا کسی
کام کے کرنے میں یا نہ کرنے میں عشق مزاج صوفیوں نے ترک عمل اور اسباب و تدابیر سے بے
پرواہی اور خود کام نہ کرکے دوسروں کے سہارے جینے کا نام توکل کیا ہے . حالانکہ توکل نام
ہے کسی کام کو پورا ارادہ وعزم اور تدبیر وکوشش کے ساتھ انجام دینے اور یہ یقین رکھنے

۵۱ افادات شیخ الاسلام

کہ اگر اس کام میں بھلائی ہے تو اللہ سبحانہ اس میں ضرور ہی ہمیں کامیاب فرمائے گا اگر اگر تدبیر اور جدوجہد چھوڑ دینے کا نام توکل ہوتا تو دنیا میں لوگوں کو سمجھانے کے لیئے اللہ سبحانہ پیغمبر روانہ نہ کرتا اور نہ انبیا کو دعوت و تبلیغ کی خاطر جدوجہد، محنت و کوشش کا حکم دیتا اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کو کہتا اور نہ رسول کو ایک ایک قبیلہ میں جاکر دعوت کے پیغام سنانے کی ضرورت ہوتی. بہر حال توکل نام ہے وہ سب کچھ کرگذرنے کا جو اپنے بس میں ہو اور جو اپنے بس میں نہ ہو اس کو اللہ ہی سے مانگنے کا. یا توکل نام ہے. اسباب کی حد تک سب کچھ کرنے کا اور نتائج کے لیئے اسباب پر نہیں مگر اللہ پر بھروسہ اور اعتماد کرنے کا - یہی مطلب ہے علیہ توکلوا کے قہر کا

اس کے بعد فرمایا. ربنا لا تجعلنا فتنۃ للقوم الظالمین آیت کی تشریح تو اجمالی شیخ الاسلام کی زبان سے آپ سن چکے. اس کی تفصیل یہ ہے کہ دعا کا یہ پیمانہ بڑے وسیع مطالب اپنی گود میں لیئے ہوئے ہے. گمراہی اور بغاوت کا جب اقتدار عام ہوجاتا ہے تو اس وقت کچھ ارباب عزیمت حق کا بول بالا کرنے کے لیئے اٹھتے ہیں. ان کو کئی قسم کے ظلم پیشہ لوگوں سے مقابلہ کرنا ہوتا ہے ایک طرف وہ مشینری ہوتی ہے جس کے ذریعے باطل کی گاڑی چل رہی ہے جو پوری طاقت سے ان داعیان حق کو صفحہ ہستی سے مٹانے کے درپے ہوتی ہے. دوسری ان مردم شماری کے رجسٹروں میں درج ہونیوالے حق پرستوں کا ایک گروہ ہوتا ہے جو ایمان کا تو مدعی ہوتا ہے مگر ایمان کے تقاضے پورے نہیں کرتا. یعنی اسلام کو اجتماعی زندگی میں قائم کرنے کو غیر ضروری لاحاصل یا حماقت سمجھتا ہے اور ان کی کوشش یہ ہوتی ہے کہ وہ اپنی اس خیانت پر مبنی زندگی کو کسی نہ کسی طرح لوگوں میں خوبصورت بنا کر پیش کرے تیسری طرف وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی حیثیت صرف تماشائی کی ہوتی ہے - اس صورت حال میں ان داعیان حق کی ناکامی اور مصیبت ان سب کے لیئے کئی طرح سے فتنہ بن جاتی ہے داعیان حق کو اقتدار پر قابض باطل کچل دے تو برسر اقتدار باطل پرست طبقہ کہتا ہے کہ حق ہمارے ساتھ تھا. نہ کہ ان لوگوں کے جو ناکام ہو گئے. دوسرے مردم شماری کے رجسٹر میں ایمان کو کھوکھلا دعوی کرنے والے کہتے ہیں کہ پہلے ہی کہتے تھے کہ طاقت سے ٹکر لگانی چاہیئے اس کا حاصل اس کے سوا کچھ نہ ہوتا. تیسرا تماشائی طبقہ یہ فیصلہ کر دیتا ہے

کہ حق پر وہی ہے جو غالب آگیا۔ اس طرح اگر داعیان حق اپنی دعوت میں کوئی غلطی کر جائیں یا مصائب کو برداشت نہ کرنے کی وجہ سے ان میں کسی قسم کی کوئی کمزوری نظر آجائے تو بہت سے لوگوں کو باطل سے چمٹنے کیلئے ایک بہانہ مل جائے اور عرصہ دراز تک حق کی آواز کو بلند ہونے کے امکانات ختم ہو کر رہ جائیں۔ اس دعا میں بڑی معنویت ہے کہ اے مولیٰ ہمیں غلطیوں اور خامیوں سے بچا اور ہماری محنت کو ٹھکانے لگا۔ تاکہ ہمارا وجود تیری مخلوق کے لیئے سبب خیر بنے نہ کہ ظالموں کے لیئے سرکشی کا ذریعہ۔ اس کے بعد دعا میں فرمایا اور اپنی رحمت کے صدقے ہمیں کفر پیشہ لوگوں سے بچالے۔ یعنی ان کی غلامی اور محکومی سے ہم کو نجات دے اور دولت آزادی سے مالا مال کر۔ اس سے معلوم ہوا کہ کفر کی حاکمیت مسلمانوں کے لیئے فتنہ ہے اس سے بچنے کے لیئے محنت کرنا اور محنت کرتے ہوئے اللہ سے اچھے نتائج کے لیئے دعا کرنا ایمان و اسلام کا ناگزیر تقاضا ہے۔

آیت میں بلیغانہ لطافت یہ ہے کہ شرطیں دو ہیں پہلے ان کنتم امنتم باللہ اور دوسری ان کنتم مسلمین اور دونوں کے درمیان جزا ہے۔ شارحین قرآن یہاں حیران ہیں، اور طرح طرح کے الجھاؤ میں پڑ گئے ہیں۔ اور آیت میں بیان کردہ بات کو ایک حکم کو دو شرطوں کے معلق کرنے کے مترادف قرار دیا ہے۔ اردو شارحین قرآن میں صرف مولانا محمد ادریس کاندھلوی نے اس طرف توجہ فرمائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ

اس آیت میں ایک حکم توکل کو دو شرطوں پر معلق فرمایا۔ دو شرطوں کے درمیان اس لئے ذکر فرمایا کہ نفس توکل کا وجوب تو نفس ایمان پر موقوف و معلق ہے اور صدق توکل ظہور اسلام یعنی تفویض و تسلیم پر موقوف و معلق ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے یہی بات اس انداز میں بیان فرمائی ہے۔

یہ حکم کو دو شرطوں میں معلق کرنے والی بات نہیں بلکہ اصل ایمان پر توکل کو معلق کیا ہے۔ اور حصول توکل کے لیئے اسلام کی شرط ہے۔

مطلب یہ ہے کہ توکل ایک قلبی کیفیت ہے اور ایک اس کی عملی زندگی میں مظاہرہ ہے عملی زندگی میں ظہور کیلئے اسلام شرط ہے اور قلب میں کیفیت کے لئے ایمان شرط ہے۔ دونوں چیزوں میں بہت بڑا فرق ہے گویا ایمان کا لازمی تقاضا اللہ سبحانہ پر توکل ہے اور

اس توکل کالازمی تقاضا ہے کہ مسلمان اپنے آپ کو اپنے رب کے سپرد کردے۔

لیکن علامہ شیخ محمد طاہر ابن عاشور کو شارحین قرآن کے بیان کردہ مطلب سے اختلاف ہے۔ وہ التحریر والتنویر میں فرماتے ہیں

یہ شرط پر شرط کو معلق کرنے والی بات ہے۔ ایمان تو نبوت کو مان لینے کا نام ہے۔ اور یہ خالصتہ دل کا عمل ہے اور یہ قلبی عمل شرعًا اسلام کے بغیر قابل اعتبار نہیں ہے اور اسلام نام ہے اس اقرار و اعتراف کا جو ایمان قلبی کو ظاہر کرے۔ اور یہ اقرار نا قابل اعتبار ہے جب تک تصدیق قلبی نہ ہو۔ لہذا ایمان اگر قلبی انفعال ہے تو اسلام جسمانی فعل ہے اور یہ دونوں لازم و ملزوم ہیں۔ کیونکہ کسی کی تصدیق قلبی کا علم بغیر اقرار اور طاعت کے ہو نہیں سکتا۔ کیونکہ کسی بات میں واقعیت ممکن ہی نہیں جب تک اندر کے مطابق نہ ہو قرآن ہی اس کا موید ہے۔ فان قالت الاعراب آمنا ولکن قولوا اسلمنا ولما یدخل الایمان فی قلوبکم اور صحیحین میں حدیث جبریل ہی اس کی موید ہے۔ آیت کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر وہ توکل نہ کریں گے تو مومن تو ہوں گے۔ مگر مسلم نہ ہوں گے اور نہ یہ مطلب ہے کہ اگر توکل کریں گے تو مسلم ہوں گے مومن نہ ہوں گے۔ آیت میں فعلیہ توکلوا دونوں شرطوں کی جزا ہے۔ آیت کا محمل یہی ہے اور بس۔

نظم الدرر میں علامہ بقاعی نے بھی اسی کی ہمنوائی کی ہے۔

اجتماعی زندگی کی بنیاد

۸۷ اور ہم نے موسیٰ اور اس کے بھائی کو حکم دیا کہ مصر میں اپنی قوم کے گھر بناؤ۔ اور ان گھروں کو قبلہ بناؤ۔ اور نماز قائم کرو۔ اور اہل ایمان کو کامیابی کی خوشخبری دے دو۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ فرعون کی ہلاکت کا وقت آیا تو حکم ہوا کہ اپنی قوم بنی اسرائیل کو ان میں شامل نہ رکھو۔ اپنا محلہ جدا بسا دو کہ آگے ان پر آفتیں آنے والی ہیں۔ اس وقت تمہاری قوم ظاہری طور پر بھی آفتوں سے الگ تھلگ رہے۔ مفسرین قرآن نے بیتوا لقومکما بمصر بیوتا سے مراد یہ لی ہے کہ اپنے مکانوں میں کھڑے رہو۔ اور ان میں سے بعض کو عبادت کے لیے مخصوص کر لو۔ کیوں کہ فرعون نے مسجدیں اور عبادت گاہیں خراب کر دی تھیں

کوئی باہر نکل کر اللہ سبحانہ کی عبادت نہ کرسکتا تھا۔ بحالت مجبوری حکم ہوا کہ مکان میں کوئی جگہ نماز کے لیئے مخصوص کر لی جائے جو قبلہ رو ہو۔ نماز ترک مت کرو کہ اسی کی برکت سے اللہ سبحانہ کی مدد آتی ہے۔ واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ ہجرت سے پہلے مکہ میں مسلمانوں کا ایسا ہی حال تھا۔ اسی سے دنیا میں فتح و نصرت کی اور آخرت میں نجات و رضائے الٰہی کی خوشخبری ملے گی لے

پس آیت کی ایک تشریح تو یہی ہے جو آپ نے شیخ الاسلام کی زبان قلم سے سُنی ہے اس کے علاوہ بھی شارحین قرآن نے اس آیت کے مطالب پر داد تحسین دی ہے۔

اور مخدوم مہائمیؒ نے ان تبوءا لقومکما بمصر بیوتا کا مطلب یہ بتایا ہے کہ اندرون شہر گھر بناؤ۔ شہر سے باہر گھر نہ بناؤ یا یہ مطلب ہے کہ تم بدستور اپنے گھروں میں ٹھہرے رہو۔ اور فرعونیوں کے خوف سے اپنے گھروں کو نہ چھوڑو اور آیت میں بیوتا چونکہ نکرہ آیا ہے اس لیے قریب قیاس یہی ہے کہ نئے گھر بنانے کا حکم ہے اگر ٹھہرنے کا حکم پہلے ہی گھروں کا ہوتا تو تعبیر یہ ہوتی ان تبوءا القومکما بمصر بیوتکم مگر یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ بنی اسرائیل تو پہلے ہی مکانوں میں رہتے تھے اور شہر ہی میں رہتے۔ شہر میں رہنے والوں کو شہر ہی میں گھر بنانے کے حکم کے کیا معنی۔

علامہ محمد طاہر ابن عاشور نے اپنی مایہ ناز تفسیر التحریر التنویر میں اس کو اس طرح سمجھایا ہے۔ کہ جن گھروں کے بنانے کا ان کو حکم ہوا تھا وہ خیمے یا جھونپڑیاں تھیں اور یہ ان گھروں کے علاوہ میں جن میں بنی اسرائیل پہلے رہتے تھے یہ گویا مستقبل میں مصر چھوڑنے کی تیاری کرائی جا رہی تھی۔

یہ بات دھیان میں رہے کہ مصر شہر کا نام نہیں ملک کا نام ہے۔

اور کچھ لوگوں نے مکان بنانے کا مطلب یہ بتایا کہ مصر میں کچھ مکان اس غرض کے لیئے بنائے جائیں کہ جہاں اجتماعی طور پر اکٹھے ہو کر نماز ادا کی جائے۔ کیونکہ ایک بگڑی ہوئی امت کے لیئے دینی رُوح کو پھر سے زندہ کرنے اور اس کی منتشر طاقت کو از سر نو مجتمع کرنے کے لیئے اسلامی طرز پر جو کوشش بھی کی جائے گی اس کا پہلا قدم یہی ہوگا۔ کہ اس میں نماز باجماعت کا نظام قائم کیا جائے۔ اس صورت میں آیت کا منشا یہ ہوگا کہ مصر کے مختلف حصوں میں کچھ مکانات مسجد کی

حیثیت سے بنائے جائیں جن میں بنی اسرائیل اوقات نماز میں مجتمع ہو کر نماز ادا کریں۔
اور کچھ بزرگوں نے آیت کے معنے حضرت ابراہیم نخعی اور عکرمہ کے حوالہ سے حضرت عبداللہ بن عباس نے یہ بتائے ہیں کہ اپنے گھروں میں مسجدیں بنائیں اور ان میں نماز ادا کریں۔ امام بغوی نے اس کو اکثر مفسرین کا مختار بتایا ہے اور اس کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ بنی اسرائیل عبادت صرف عبادت گاہوں میں کرتے تھے اور یہ عبادت گاہیں شہری زندگی میں سرعام اور سب کی نگاہوں میں ہوتی ہیں۔ حضرت موسیٰ کی تشریف آوری کے بعد بنی اسرائیل کی عبادت گاہوں کو فرعون نے سرکاری طور پر خلاف قانون قرار دیا اور ان کو گرا دیا۔ اللہ سبحانہ نے حضرت موسیٰ کے حوالہ سے ان کو حکم دیا کہ گھروں میں عبادت گاہیں بنائیں اور نماز پڑھیں۔ یعنی کام بھی ہو جائے اور خلاف قانون کا اندیشہ بھی نہ رہے۔
اس تفصیل کا مقصد یہ ہے کہ مطلب دو ہیں ایک یہ کہ مکان رہائش کے لئے بناؤ دوسرے یہ کہ مکان عبادت کے لئے بناؤ۔ ان دونوں کو ذہن میں رکھ کر آگے آنے والے فقرے کو سمجھنے کی کوشش کیجئے۔

واجعلوا بیوتکم قبلۃ جو لوگ مکان کو عبادت کے لئے کہتے ہیں وہ اس فقرے کے معنے یہ بتاتے ہیں کہ مکانوں کو قبلہ رو بناؤ اور ان میں نماز پڑھ لیا کرو۔ تاکہ تمہاری نمازوں کا فرعون کی سرکار کو پتہ نہ ہو اور مشہور مفسر ابن عطیہ نے عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے یہی بتایا ہے۔ قبلہ دراصل جہت کعبہ کو کہتے ہیں۔ مصر میں کعبہ کی جہت وہی ہے جو مدینہ میں ہے یعنی مشرق و مغرب کے درمیان ہے اور قبلہ رو بنانے میں وہاں یہ حکمت بتائی ہے کہ آفتاب دن کے بیشتر حصے میں ان کے گھروں میں رہے گا۔ اور یہ صحت و تندرستی کے لئے مفید ہے یہاں کچھ لوگوں کو یہ بھی لکھ دیا ہے کہ حضرت موسیٰ کعبہ کیطرف نماز پڑھتے تھے۔ لیکن علامہ خفاجی نے شہاب میں اسے خلاف مشہور قرار دیا ہے۔
جن لوگوں نے مکان کو رہائش کے لئے بنایا ہے وہ اجعلوا بیوتکم قبلۃ کے معنے یہ بتاتے ہیں کہ گھروں کو آمنے سامنے بناؤ۔ اور کچھ یہ کہتے ہیں کہ مکانوں کو ساری قوم کے لئے مرکز بناؤ۔ اور کچھ لوگوں نے آیت کے رُخ کو عموم سے ہٹا کر مخصوص کر دیا ہے اور گھروں سے مراد حضرت موسیٰ و ہارون کے گھر ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ چونکہ دعوت و ہدایت کی

مرکز کی حیثیت انہی گھروں کو حاصل تھی۔ اس وجہ سے اس عبوری دور میں ان ہی کو عارضی طور پر قبلہ کی حیثیت دے دی گئی۔ لیکن اس خیال کی بازارِ تحقیق میں کوئی قیمت نہیں ہے اصل بات وہی ہے کہ مکانوں کو عبادت گاہوں کے طور پر بنایا گیا اور قبلہ رو بنایا گیا تھا۔ اور یہ مکان بھی خیموں کی صورت میں تھے تاکہ کوچ کے وقت میں کسی تکلف اور تکلیف سے دو چار نہ ہوں۔

اس کے بعد ارشاد ہوا ہے کہ واقیموا الصلوٰۃ اور نماز قائم کرو یعنی اب مسجدیں بنانا چونکہ فرعون کے استبدادی قانون کی وجہ سے تمہارے بس کی بات نہیں ہے۔ اس لیئے نماز گھروں ہی میں ادا کر لیا کرو۔ اب مسجدوں کی حاضری ضرور نہیں ہے۔ اس سے معلوم ہوا اگر مقاصد تک پہنچنے کے وسائل خطرے میں پڑ جائیں تو مقاصد کو نہ چھوڑا جائے گا لیکن چھوڑ دیئے جائیں گے۔ اسلام کی ابتدائی زندگی میں بھی یہی حکم تھا۔ فرعون کی حکومت۔ بنی اسرائیل کو مساجد میں نماز پڑھنے سے روکتی تھی۔ اس لیئے اس حالت میں حکم ہوا کہ اپنے گھروں کو قبلہ رو بنا کر ان ہی میں نماز پڑھو۔ معلوم ہوا کہ نماز صرف درجاتی ترقیوں ہی کا ذریعہ نہیں بلکہ اہل ایمان کی اجتماعی زندگی کی بھی یہی اساس ہے کیونکہ جس بات کے بعد ایک جماعت اسلامی جماعت تسلیم کی جا سکتی ہے وہ یہ ہے کہ زبان سے نبوت کی پیش کردہ دعوت کا اقرار کرے اور عمل میں نماز کا محسوس پیمانہ ضرور پیدا کرے۔ یاد رہے کہ نماز مسلمانوں کی جماعتی زندگی کی بنیادی شرط ہے۔ ایک فرد اگر نماز میں کوتاہی کرتا ہے تو بلا ریب گناہگار ہے لیکن اگر ایک جماعت بحیثیت جماعت نماز ترک کرتی ہے تو وہ اسلامی زندگی کی بنیادی شناخت سے محروم ہو جاتی ہے۔

آخر میں فرمایا وبشر المومنین اہل ایمان کو کامیابی کی بشارت دیدو جو نماز کا سجدوں سے تعلق ہے وہی کامیابی اور کامرانی کا اہل ایمان کے لیئے نماز سے تعلق ہے یہاں المومنین سے مراد وہی ہیں جنہوں نے علی اللّٰہ توکلنا حضرت موسیٰ کی دعوت توکل کے جواب میں فرمایا تھا۔ ارشاد ہوا کہ ان صادق الایمان نوجوانوں کو کامیابی اور بامرادی کی مستقبل میں اور آخرت میں بشارت اور خوشخبری دے دو۔ ان کے توکل کا مطلب کہ اللہ سبحانہ نے عقائد، عبادات، اخلاق اور معاشرت تمدن اور معیشت، سیاست عدالت کے معاملات میں جو حدیں مقرر کی ہیں وہ اُن کو پوری پابندی کے ساتھ محفوظ

رکھتے ہیں اپنے انفرادی واجتماعی عمل کو اپنی حدود کے اندر محدود رکھتے ہیں اور نہ انہی قوانین کے بجائے خود ساختہ قوانین یا انسانی ساخت کے دوسرے قوانین کو اپنی زندگی کا ضابطہ بناتے ہیں. ان کو بہترین انجام کی حالات کی ناخوشگواریوں میں خوشخبری دیدو کہ دشمن کے مقابلہ میں ان کی مدد کی جائے گی۔ اور یہ کامیاب ہوں گے۔

بیان تعبیر میں تفنن کرکے بلیغ لطافت آگئی ہے۔ جب گھروں کے بنانے کا ذکر ہوا تو مخاطب حضرت ہارون اور موسیٰ کو کیا اور جب مکانوں کو قبلہ رو بنانے اور نماز قائم کرنے کا حکم ہو تو مخاطب حضرت موسیٰ اور ہارون کے ساتھ بنی اسرائیل کے صادق الایمان مومنین کو کیا اور جب بشارت کا ذکر ہوا تو صرف حضرت موسیٰ کو مخاطب کیا۔

قاضی بیضاوی رحمۃ اللہ نے آیت کی اس لطیف بلاغت کو اس طرح پیش کیا ہے کہ سب سے پہلے صرف حضرت موسیٰ اور ہارون کو مخاطب کیا کہ اپنی قوم کے لیئے مصر میں گھر بناؤ۔ کیوں کہ ان دونوں ہی کو قوم کے سربراہوں سے مل کر اس معاملہ میں پایۂ تکمیل پہنچانا تھا۔ پھر گھروں کو مسجد بنانے اور نماز قائم کرنے کے لیئے پوری قوم کو مخاطب کیا کیونکہ یہ کام ہر ایک سے مطلوب تھا۔ اور آخر میں بشارت کے موقعہ پر صرف حضرت موسیٰ کو مخاطب کیا۔ کیونکہ بشارت دینا صرف صاحب شریعت ہی کا کام ہے. علامہ بقاعی نے نظم الدرر میں یہ کہہ کر اس میں اور لطافت پیدا کر دی کہ بنائے مساجد اور اقامت صلوٰۃ کا تعلق چونکہ پورے اجتماعی نظم سے ہے اس لئے جمع کے صیغہ سے تعبیر کیا ہے اور کامیابی کی بشارت کا تعلق چونکہ امیر اور سربراہ سے امر ہونے کی وجہ سے ہے اس لیئے تعبیر میں وحدت پیدا کر دی اس میں سربراہ کی عظمت اور اس کی اہل ایمان میں عقیدت کا اظہار بھی مقصود ہے۔

امام بغوی یہاں یہ عجیب بات کہ بشر المومنین کے مخاطب حضرت موسیٰ نہیں بلکہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم ہیں. لیکن انداز تعبیر اس کی اجازت نہیں دیتا۔ آپنے پوری آیت پر ایک جامع نظر بھی ڈال لیجئے۔

نماز میں ان لوگوں کو جو ایمان لائے ذریۃ من قومہ سے تعبیر کیا ہے ذریۃ کے لغوی معنے کم سن اولاد کے ہیں. یہاں چونکہ قوم کے ساتھ ذریۃ کا لفظ آیا ہے اس

لئے یہ لفظ لغوی ہی میں آیا ہے۔ یعنی قوم بنی اسرائیل بوڑھے نہیں بلکہ نوجوان اس سے معلوم ہُوا کہ جب کسی مقاصد و عزائم کی راہ میں شدائد و محن کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو قوم کے بڑے بوڑھوں سے بہت کم امید کی جا سکتی ہے زیادہ تر نئی نسل کے نوجوان ہی آگے بڑھتے ہیں۔ کیوں کہ بوڑھوں کی زندگیاں ظلم و فساد کی آب و ہوا میں بسر ہو چکتی ہیں اور غلامی کی حالت میں رہتے رہتے عافیت کوشی کے عادی ہو جاتے ہیں البتہ نوجوانوں میں نیا دماغ ہوتا ہے نیا خون ہوتا ہے نئی امنگیں ہوتی ہیں۔ انہیں شدائد و محن کا خوف مرعوب نہیں کرتا وہی پہلے قدم اٹھاتے پھر ساری قوم ان کے پیچھے چلنے لگتی ہے۔ مصر میں حضرت موسیٰ کو ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔ فرعون کے جبر و استبداد نے بنی اسرائیل کے بڑے، بوڑھوں کی ہمتیں سلب کر دی تھیں۔ وہ شکر گزار ہونے کی جگہ اُلٹی شکائتیں کرتے تھے لیکن نوجوانوں کا یہ حال نہ تھا۔ ان میں ایک گروہ نکل آیا جس نے حضرت موسیٰ کے احکام کی تعمیل کی لے

لے ترجمان القرآن

ع

وَقَالَ مُوسٰى رَبَّنَآ اِنَّكَ اٰتَيْتَ فِرْعَوْنَ وَمَلَاَهٗ زِيْنَةً وَّ
اَمْوَالًا فِى الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ۙ رَبَّنَا لِيُضِلُّوْا عَنْ سَبِيْلِكَ ۚ رَبَّنَا
اطْمِسْ عَلٰٓى اَمْوَالِهِمْ وَاشْدُدْ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ فَلَا يُؤْمِنُوْا
حَتّٰى يَرَوُا الْعَذَابَ الْاَلِيْمَ ﴿۸۸﴾ قَالَ قَدْ اُجِيْبَتْ دَّعْوَتُكُمَا
فَاسْتَقِيْمَا وَلَا تَتَّبِعٰٓنِّ سَبِيْلَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۸۹﴾

اور حضرت موسیٰ نے جناب الٰہی میں دُعا کی، خداوندا۔ تُو نے فرعون اور اس کے امراء کو دنیا کی زندگی میں شان و شوکت اور مال و دولت دے رکھا ہے اے ہمارے آقا اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ لوگوں کو راہِ حق سے بھٹکا رہے ہیں اسے خداوندا ان کی دولت کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ اللہ نے فرمایا کہ تم دونوں کی دُعا قبول ہوگئی۔ دونوں ڈٹے رہو۔ اور ان لوگوں کے پیروکار نہ بنو جو ناآشنائے راہِ حق ہیں ۸۹

مقابلے کے وقت حق پر استقامت

اور دن کا پتہ نہیں مگر میرا ذوق تفسیر یہ کہتا ہے کہ اللہ سبحانہ کی جانب سے حضرت موسےٰ و ہارون کو جب وحی آئی ان تبوا لقومکما بمصر بیوتا تو اس سے حضرت موسیٰ نے یہ سمجھا ہے کہ فرعون کی ہلاکت کا وقت قریب آگیا ہے۔ شاہ صاحب نے موضح القرآن میں لکھا ہے کہ جب فرعون کی ہلاکت کا وقت آیا تو حکم ہوا کہ اپنی قوم کو ان میں شامل نہ رکھو۔ اپنا محلہ الگ بساؤ۔ کہ ان پر آفتیں آنے والی ہیں۔ اس وقت تمہاری قوم ظاہری طور پر آفتوں سے الگ رہے اور آپ کی قوم ان کی آفت میں شامل نہ ہو۔ (موضح القرآن)

بہرحال حضرت موسیٰ نے اس حکم سے یہی سمجھا کہ فرعون کی ہلاکت قریب آگئی۔ کیونکہ عذاب اس وقت تک نہیں آتا جب تک آیات ہدایت سے قوم کے تمام اجزاء صالحہ اس کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے اور مومنین کا فرق ایک دوسرے سے پھٹ کر جدا نہیں ہو جاتے اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعی مایوسی نہیں ہو جاتی۔ حضرت نوحؑ نے ایک طویل زمانے تک اپنی قوم کو دعوت دی۔ اور اس کے بعد مایوس ہوکر انہوں نے آخری معجزے کی دعا کی ربّ لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا۔ اس کے بعد طوفان آیا اور قوم نوح کو بہا کر لے گیا۔ اسی طرح حضرت موسیٰ نے جب وحی کے حکم سے سمجھ لیا کہ ان پر عذاب آنے والا ہے۔ اور ان کے ایمان کی کوئی آس باقی نہ رہی تو اس قسم کی دعا کی اس موقع پر اس قسم کی دوسرے انبیاء نے بھی کی ہیں۔ شاہ صاحب نے دعا کا پس منظر بڑا ہی لطیف فرمایا ہے لکھا ہے کہ اس سے پہلے یہ ہوتا کہ عذاب کی کوئی کرن نظر آتی تو کہتے کہ ہم مانیں گے۔ عذاب ختم ہو جاتا دعا اس لئے مانگی کہ یہ جھوٹا ایمان نہ لائیں۔ ان کی شان وشوکت کو بالکل ملیامیٹ کر دے۔ اس پر حکم آیا کہ دعا قبول ہوگئی۔ تم اپنا کام جم کر کرو۔ کسی نوع سے ان کی ہم نوائی نہ کرو۔ یہ بے علم لوگوں کا ٹولہ ہے۔

اللہ اور حضرت موسیٰ جناب الٰہی میں دعا کی خداوندا تو نے فرعون اور اس کے امراکو دنیا کی زندگی میں شان وشوکت اور بھرپور مال و دولت دے رکھا ہے۔ اے ہمارے آقا اسی کا نتیجہ ہے کہ وہ لوگوں کو راہ حق سے بہکا رہے ہیں۔ یعنی ہر قسم کا سامان رونق و آرائش کا دیا۔ مثلاً حسن

صورت سواری عمدہ پوشاک اثاث البیت وغیرہ اور مال و دولت کے خزانے سونے اور چاندی کی کانیں عطا فرمائیں۔ اگر لیضلوا میں لام تعلیل ہے تو مطلب یہ ہے کہ تکوینی طور پر یہ سامان ان نابکاروں کو اس لیئے دیا گیا ہے کہ مغرور ہو کر خود گمراہ ہوں اور دوسروں کو گمراہ کرنے میں خرچ کریں۔ بڑی آزادی سے دل کھولکر زور لگائیں۔ آخر میں دیکھ لیں گے کہ وہ کچھ بھی کام نہ آیا۔ جب خالق خیر وشر اللہ ہے اور ظاہر ہے کہ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں ہے بلاشبہ خلق شر میں بھی مجموعہ کائنات کے اعتبار سے کوئی حکمت ضرور ہوگی وہی حکمت شریروں کو اس قدر سامان عطا کرنے میں ہے۔

کلا نمد هٰؤلاء وهٰؤلاء من عطاء ربك

اور

انما نملي لهم ليزدادوا اثما۔

بعض مفسرین نے لیضلوا میں لام عاقبت لیا ہے جیسے فالتقطهٗ ال فرعون لیکون لهم عدوا و حزنا

میں لام عاقبت ہے اس صورت میں مطلب یہ ہوگا کہ یہ سامان دیا تو اس لیئے تھا کہ بھلائی کے کاموں میں خرچ کریں اور نعمتوں کو لے کر منعم حقیقی کو پہچانیں۔ اس کے شکر گذار بندے بنیں۔ مگر اس کے برخلاف انہوں نے اپنی بدبختی سے خدا کی نعمتوں کو لوگوں کے بہکانے اور گمراہ کرنے میں ایسا بے دریغ خرچ کیا گویا وہ اسی کام کے لیئے ان کو دی گئیں تھیں۔ اس تفسیر پر کوئی اشکال وارد نہیں ہوتا۔ ۱؎

حضرت موسیٰ نے یہ دعا وحی کے اشارے سے معلوم کر کے کی۔ ایسے ہی حضرت نوح نے بھی لمن یومن من قومك زبان وحی سے سنکر جناب الٰہی میں طوفان سے پہلے کی حضرت موسیٰ نے یہاں ان بنوا لقومکما کا اشارا پاکر یہ دعا کی۔ حضرت نوح نے فرمایا خداوندا اب زمین پر بسنے والا کوئی کافر نہ چھوڑ۔ جب تک وہ زندہ رہیں گے تیرے نام کی تقدیس نہ ہوگی اور نہ ان کی نسل سے کوئی تیرا نام لینے والا پیدا ہوگا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کہا۔

۱؎ افادات شیخ الاسلام

خداوندا تو نے ان کو شان و شوکت اقتدار و جاہ دیا ہے۔ اس کے نشے میں چور ہو کر یہ تیرے بندوں کو کفر کی راہ پر لگا رہے ہیں۔ یہ دُعا زمانہ قیام مصر کے بالکل آخری زمانے میں کی ہے جیسے حضرت نوح نے ۹۰۰ سال محنت و مشقت کے بعد دعا مانگی۔ ایسے ہی حضرت موسیٰ نے یہاں سارے معجزات دکھائے ہر طرح سے ان کے سامنے دعوت پیش کرنے کے بعد دُعا مانگی۔ اس سے یہ نکتہ بھی واضح ہو کر سامنے آگیا کہ انبیاء تھک کر بددُعا نہیں کرتے ہیں بلکہ اللہ کی مرضی پا کر دعا کرتے ہیں۔ طائف میں ساری تکلیفوں کے باوجود یہ دعا آتی ہے لک العتبیٰ حتیٰ ترضیٰ یہ بالکل نبوت کی ابتدائی زندگی ہے حضرت موسیٰ نے دُعا اس وقت فرمائی جب قبول حق کے لیئے ساری تدبیریں کر چکے۔ اتمام حجت کے بعد اگر کوئی قوم ایمان نہیں لاتی تو اس کے معنے یہ ہیں کہ اس میں قبول حق کی تھوڑی سی رمق بھی باقی نہیں ہے اب اگر وہ دنیا میں رہے تو اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ لوگوں کی گمراہی کا ذریعہ بنیں گے۔

ان سے خیر کی اب کوئی توقع نہیں ہے اس لیئے قانون یہی ہے کہ جن قوموں پر کسی رسول کے ذریعے اتمام حجت ہو جاتی ہے، منکرین کو ایک خاص وقت تک مہلت ملنے کے بعد لازماً ان کو تباہ کر دیا جاتا ہے۔ حضرت موسیٰ نے بھی اسی قانون کے مطابق دعا اس وقت کی جب ان پہ یہ بات واضح ہو گئی کہ ان سرکشوں کی بیہوشی عذاب کے بغیر ختم نہ ہو گی۔

یہ بات بھی یہاں سمجھنے کی ہے لیضلوا میں لام کے بارے میں شارحین قرآن نے تین راہیں اختیار کی ہیں لام تعلیل، لام عاقبت اور لام امر لام تعلیل اور لام عاقبت کی بنیاد پر مطالب آپ شیخ الاسلام کی زبانی سن چکے ہیں۔ پہلی دو صورتوں میں لیضلوا مضارع منصوب ہے جب کہ لام امر غائب کی صورت میں مضارع مجزوم ہے۔ زمخشری قاضی بیضاوی اور علامہ طیبی کا میلان لام امر کی طرف ہے۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ اے مولائے کریم یہ نعمتیں تو نے ان کو اس لیئے ارزانی فرمائی ہیں کہ وہ تیری بندگی کریں اور تیری رضا کے جویا ہوں لیکن تیرے انعامات کی فراوانی نے ان میں عبادت کی جگہ بغاوت طاعت کی جگہ معصیت و طغیانی پیدا کی ہے جب صورت حال یہ ہے تو ان کو جادہ حق سے لوگوں کو بھٹکانا ہی چاہیئے۔ طاغی، باغی اور عاصی سے ہدایت کی نہیں اضلال ہی کی توقع ہونی چاہیئے۔ باغی تو دوسروں کو بغاوت ہی پر اکسائے گا۔ جو خود طغیانی کا شکار ہو وہ دوسروں کی ہدایت کا ذریعہ کیسے بنے گا۔ شان و شوکت مال و دولت

اور عزت و اقتدار کے زور پر ان کو ضلالت ہی کو پروان چڑھانا چاہیئے اس طرح یہ نقرہ بھی ان کے حق میں بد دعا بن گیا

محققین کی رائے یہی ہے کہ یہ لام عاقبت ہے لام امر اور لام تعلیل نہیں ہے کچھ لوگوں نے یہاں حرف استفہام محذوف مانکر اس میں تعجب اور حیرت کے معنے لئے ہیں۔ امام رازی کا میلان اسی طرف ہے اور مطلب یہ کیا یہ مال و دولت اور شان و شوکت آپ نے ان کو اس لیئے دی ہے کہ وہ لوگوں کو گمراہ کریں۔ لیکن اس تشریح میں کوئی جان نہیں ہے۔ اگرچہ مولانا آزاد۔ مولانا مودودی کے انداز ترجمہ سے امام رازی کی ہمنوائی محسوس ہوتی ہے۔ لیکن بات زیادہ وزنی وہی جس میں لام عاقبت ہے یعنی تو نے ان کو جو شان و شوکت اور مال و اسباب دیا ہے وہ ان کے لیئے شکر گذاری کے بجائے طغیان و فساد کا سبب بنے اس لیئے اے ہمارے رب اب تو ان کو مزید مہلت نہ دے کہ یہ تیرے بندوں کو گمراہ کریں۔

کفر کے غلبہ کیلئے بد دُعا

۱۱۔ خداوندا تو ان کی دولت کو مٹا دے اور ان کے دلوں کو سخت کر دے کہ اس وقت تک ایمان نہ لائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں۔ جب موسیٰ علیہ السلام مدت دراز تک ہر طرح ہدایت کر چکے۔ اور عظیم الشان معجزات دکھلا چکے مگر معاندین کا جحود و عناد بڑھتا ہی رہا۔ حتی کہ تجربہ اور طول صحبت یا وحی الٰہی سے پوری طرح ثابت ہو گیا کہ یہ لوگ کبھی ایمان لانے والے نہیں تب ان کی ہلاکت کی دعا فرمائی۔ تاکہ ان کی گندگی سے دنیا جلد پاک ہو۔ اور دوسروں کے لیئے ان کی بدانجامی درس عبرت ہو جائے آپ نے بد دعا کی کہ خداوندا تو ان کے اموال کو تباہ اور ملیا میٹ کر دے۔ اور ان کے دلوں پر سخت گرہ لگا دے۔ جن میں ایمان و یقین نفوذ نہ کرے۔ بس اسی وقت یقین حاصل ہو۔ جب اپنی آنکھوں سے عذاب الیم کا مشاہدہ کریں۔ یہ دُعا ان کے حق میں ایسی سمجھو جیسے ابلیس کو لعنۃ اللہ اور کفار کو خذلھم اللہ کہا جاتا ہے حالانکہ ان کی ملعونیت اور خذلان کا فیصلہ پیشتر سے کیا جا چکا ہے۔ حضرت شاہ صاحب نے آیت کو دوسرے انداز میں سمجھایا ہے۔ فرماتے ہیں۔ سچے ایمان کی ان سے

اُمید نہ تھی مگر جب کوئی آفت پڑتی تو جھوٹی زبان سے کہتے کہ اب ہم مانیں گے۔ اس پر عذاب تھم جاتا فیصلہ نہ ہوتا۔ دُعا اس لیئے مانگی کہ جو جھوٹا ایمان نہ لائیں۔ دل ان کے سخت رہیں۔ تاکہ عذاب پڑ جائے اور کام فیصلہ ہو جائے لہ

قاضی ثناء اللہ پانی پتی فرماتے ہیں کہ حضرت موسیٰ نے یہ دعا اس وقت کی جب بالکل آخری زمانہ، قیام مصر میں فرعون اور اس کے امراء سے مایوس ہو گئے جب لگاتار معجزے دیکھ لینے اور دعوت و تبلیغ کی حجت پوری ہو جانے کے بعد بھی فرعون اور اس کے رؤسائے مملکت دعوت حق کی دشمنی پر ڈھٹائی دکھاتے رہے۔ اللہ سبحانہ نے حضرت موسیٰ کو بذریعہ وحی بتا دیا کہ یہ لوگ ایمان نہیں لائیں گے یہ گویا ٹھیک دعا ہوئی جو خود ان کے بارے اللہ سبحانہٗ کا فیصلہ تھا یعنی یہ کہ ان کو ایمان کی توفیق ارزانی نہ ہوگی۔ یہاں قاضی صاحب نے یہ لطیف نکتہ آفرینی کی ہے کہ اگر ان کا کفر پہ مرنا معلوم نہ ہو تو پھر یہ دُعا جائز نہیں ہے کیونکہ نبوت آتی ہے ان کو ایمان کی دعوت دینے کے لیئے اور یہ شبہ کفر پہ موت کے معلوم ہو جانے کے بعد دعا کا کیا فائدہ ہے۔ ایمان کیلئے کیونکہ اس سے مقصود اللہ کے دشمنوں سے اظہار بغض اور اعلان بیزاری ہے اور یہ ایمان کا تقاضا ہے۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنی چاہیئے کہ نبوت کو جھٹلانے والوں نے نبوت کے سارے دلائل اور ساری نشانیوں سے آنکھیں بند کر کے ہمیشہ اس بات پر اصرار کیا ہے کہ جب تک ان کو وہ عذاب نہ دکھایا جائے جس سے ان کو ڈرایا جا رہا ہے اس وقت تک وہ ایمان نہیں لائیں گے۔ یہی مطالبہ فرعون اور اس کے امرا کا بھی تھا۔ ان کی اسی ذہنیت کو سامنے رکھ کر ان کے ایمان سے کلیتہً مایوس ہو جانے کے بعد اور مرضی الٰہی بپا اشارا معلوم کرنے کے بعد ان کے لیئے اللہ سبحانہ سے درخواست کی۔ یہاں علامہ آلوسی نے رُوح المعانی میں اور علامہ خفاجی نے عنایۃ القاضی میں یہ عجیب بحث چھیڑ دی ہے کہ کسی کے کفر پہ راضی ہونا اگر کفر ہے تو حضرت موسیٰ نے فرعون کے لیئے یہ دعا کیوں کی فلا یومنوا حتی یروا العذاب ان بزرگوں نے جو کچھ اس موضوع

لہ افادات شیخ الاسلام

پہ لکھا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے کہ غیر کے کفر پر راضی ہونا اس وقت کفر ہے جب کفر کو بنظر استحسان دیکھے اور اگر کسی ظالم اور معاند کے لیئے یہ بد دعا کرے کہ اسے اللہ اس ظالم سے انتقام لے اور کفر پر اسے مار تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ہے۔ لیکن اسی بات کو جس خوبصورت انداز میں علامہ بقاعی نے نظم الدرر میں پیش کیا وہ پڑھنے کے لائق ہے۔

یہ آیت اپنے مخاطبوں کو بتا رہی ہے کہ کسی کے لیئے کفر پر راضی ہونا کفر کو اچھا سمجھنے کو مستلزم نہیں ہے امام حلیمی نے اپنی کتاب المنہاج میں لکھا ہے کہ اگر کوئی مسلمان کسی مسلمان کے لیئے کفر کی تمنا کرے تو اس کی دو صورتیں ہیں ایک یہ کہ تمنا ایسی ہو جیسے ایک دوست کسی دوست کے لیئے کسی اچھی چیز کی تمنا کرتا ہے چاہتا ہے کہ یہ اچھی چیز دوست کو مل جائے۔ یہ تو بلاشبہ کفر ہے اور ناجائز ہے۔ کیونکہ کفر کو اچھا سمجھنا اور اس پر رضا یقیناً کفر ہے۔ دوسرے یہ کہ تمنا ایسی ہو جیسے دشمن کسی دشمن کے لیئے کوئی بری چیز کی تمنا کرتا ہے یہ کفر نہیں ہے کیونکہ اس میں کفر کا استحسان نہیں ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے لیئے تمنا کی کہ کفر پر اس کی موت پر ہو تاکہ عذاب کی سنگینی سے دوچار ہو۔ اور صرف تمنا نہیں کی بلکہ جناب الٰہی میں دعا کی اور حق سبحانہ نے بجائے حضرت موسیٰ کو کچھ کہنے کے دعا کو شرف قبولیت بخشا۔ اور عزالدین عبدالسلام کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص کا دشمن قتل کر دیا گیا اور اسے خوشی ہوئی تو کیا وہ گنہ گار ہوگا۔ اگر وہ اس لیئے خوش ہوا کہ اللہ کی نافرمانی کا ارتکاب ہوا تو بلاشبہ گنہ گار ہے اور اس لیئے خوش ہوا کہ مقتول کے شر سے نجات ملی تو کوئی مضائقہ نہیں۔

یہ مسئلہ شوافع اور احناف کے فتاویٰ میں زیر بحث ہے۔ اور شوافع میں نووی نے شرح المہذب اور روضۃ الطالبین اور احناف میں سے ایک سے زیادہ علما نے اسے موضوع بحث بنایا ہے

دُعا کی قبولیّت کی بشارت

یعنی اللہ نے فرمایا کہ تم دونوں کی دعا قبول ہوگئی۔ دونوں ڈٹے رہو۔ اور ان لوگوں کے پیروکار نہ بنو۔ جو نا آشنائے راہ حق ہیں۔ روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت موسیٰ دعا کرتے تھے اور حضرت ہارون علیہ السلام آمین کہتے جاتے تھے۔ اس سے دعوتکما فرمایا۔ چونکہ تمہاری

دعا قبول ہو چکی ہے اس لیئے دونوں اپنا کام استقلال اور ثابت قدمی سے انجام دیتے رہو۔ اگر قبولیت دعا کے اثرات دیر سے ظاہر ہوں تو نادان لوگوں کی طرح شتابی مت کرو۔ وقت مقررہ پر ہی ہو کر رہے گا۔ گھبرانے سے کچھ حاصل نہیں[1]

حضرت موسیٰ اور ہارون کو دعوت و اصلاح کی جو ذمہ داری سپرد کی گئی تھی اس ذمہ داری کے احساس کی یاددہانی کرائی گئی ہے کہ دُعا کی قبولیت کی بشارت سنکر اور ان پر عذاب کی خبر سن کر اس میں کمی نہ ہو۔ بلکہ اس میں بھرپور استقامت اور استقلال سے محنت کرو۔ اور لگاتار کام کرتے جاؤ۔ عذاب کا لانا ہمارا کام ہے تمہارا کام نہیں۔ ایسا نہ ہو کہ تم اپنی ذمہ داری میں کمی کر دو۔ تمہیں تو حکم کے مطابق اپنے کام میں لگے رہنا چاہیئے عذاب کے لیئے وقت علم الٰہی میں متعین ہے اس موضوع پر سوچنا تمہارا کام نہیں ہے تم پر جو ذمہ داری ڈالی گئی ہے۔ اس پر مضبوطی سے قائم رہو اور اپنا کام کیئے جاؤ۔ ادھر ادھر مت دیکھو۔ زندگی کے کسی گوشے میں ان بے علم اور بے خبر لوگوں کی راہ اختیار نہ کرنا۔ اپنے دائرے کے اندر رہو مگر اپنے طریقہ پر قائم رہو۔ ان پر عذاب لانا تمہاری طاقت نہیں تمہاری طاقت کا سرچشمہ دعوت و اصلاح کا کام ہے اسی کی تمہیں فکر ہونی چاہیئے۔ اسی میں لگے رہنا چاہیئے کہ اصلی اور بنیادی کام ہے۔ اس کو آپ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ

جو لوگ ناآشنائے حقیقت ہیں اور مصالح حکمتہا ئے خداوندی سے بیگانے ہیں وہ طغیان کے سامنے دعوت حق کی بے بسی اور حق کی راہ میں کام کرنے والوں کی پے در پے اور لگاتار نامرادیاں اور طاغوت کی دنیوی سربلندیاں اور شان و شوکت دیکھ کر یہ خیال کرنے لگتے ہیں کہ یہ باطل پرست ہی اللہ کے پسندیدہ ہیں اس لیئے انکو دنیا میں جاہ و جلال ملا ہے اور اللہ سبحانہ کو ان ہی کا برسر اقتدار رہنا منظور ہے۔ اس خام خیالی کی بنا پر یہ نادان یہ سمجھ لیتے ہیں کہ دعوت و اصلاح پر وقت لگانا اور محنت کرنا بیکار اور بے وقت کی راگنی ہی ہے مناسب یہی ہے کہ جیسے کچھے دین پر گذارہ کر لو۔ لیے چوڑے ہاتھ مارنے کی ضرورت نہیں ہے اس آیت میں حضرت ہارون اور حضرت موسیٰ کو مخاطب کر کے اس دور کے مسلمانوں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سمجھایا ہے کہ اس قسم کی غلطی عذاب کی خبر سنکر تم نہ کرنا منشا یہ ہے کہ پوری استقامت سے ساتھ ساری ناخوشگواریوں کے باوجود کام میں لگے رہو کہیں ایسا نہ ہو کہ تمہیں بھی وہی غلط فہمی ہو جائے جو ایسے حالات میں بے خبر اور نادان لوگوں کو عام طور سے لگ جایا کرتی ہے آپ یوں ہی کہہ سکتے ہیں کہ تم دونوں کی دعا قبول ہوچکی ہے لہذا تم دونوں بے فکر ہو کر اپنے منصبی کام دعوت و تبلیغ میں لگے رہو۔ اور تاخیر عذاب سے غمگین ہو تمہاری دعا قبول ہوچکی ہے۔ عذاب کا ظہور اپنے وقت پر ہوگا اور تم نادانوں کی راہ پر نہ چلنا جو جلدی چاہتے ہیں یا جن کو وعدہ الٰہی پر اطمینان نہیں ہوتا۔ سو تم یقین جانو کہ تمہاری دعا قبول ہوچکی ہے ان پر عذاب ضرور نازل ہوگا۔ مگر بمقتضائے حکمت و مشیت اس میں کچھ توقف ہوگا۔ اور اپنے وقت پر اس کا ظہور ہوگا۔ جلدبازی اور بے اطمینانی یہ کام نادانوں کا ہے۔

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ

دُعا کی قبولیت کی بشارت میں حضرت موسیٰ اور ہارون کو فرعون کی ہلاکت کی خبر دے دی گئی ہے کہ واقعی ان کے مالوں کو غارت کیا جائے گا۔ اور یہ ایمان نہیں لائیں گے اور عذاب الیم کا نشانہ بنیں گے۔ ان کی شان و شوکت اور تہذیب و تمدن کی وہ خوش نمائی جس کی وجہ سے دنیا ان پر اور ان کے طور و طریقہ پر فریفتہ ہے سب دریا برد کر دیئے جائیں

دوسری طرف تعالیٰ نے تعقیب یہ بھی اشارہ دیا کہ دعا کے بعد اس کام کے ہونے میں کچھ عرصہ لگے گا بشائد ابن جریح۔ محمد بن کعب اور علی ابن الحسین نے اسی انداز تعبیر سے چالیس سال کا عرصہ سمجھا ہے۔ اگر دعا کے فوراً بعد ظہور عذاب ہوتا تو یہ ارشاد نہ ہوتا کہ اپنے کام پر جمے رہو اور دعوت و تبلیغ کرتے رہو اور ان بے خبر لوگوں کی راہ نہ چلنا۔

اجیبت دعوتکما سے یہ اشارہ بھی ہو رہا ہے کہ حضرت موسیٰ اگر دعا مانگ رہے تھے تو حضرت ہارون آمین کہہ رہے تھے دونوں کی دعا کہکر بتا دیا کہ دعا تو اپنی جگہ دعا ہے مگر آمین بھی دعا ہے کیوں کہ اس کے معنی ہی دے اور قبول کر۔ اس سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ مقتدی کا امام کی قرأت پر آمین کہنا ہی مقتدی کی قرأت

ہے حافظ ابن کثیر لکھتے ہیں۔
وہ لوگ جو مقتدی کی آمین کہنے کو سورۃ فاتحہ کی قرأت کے قائمقام کہتے ہیں ان کا استدلال یہی آیت ہے۔
آیئے اب آیت پر ایک دوسرے پہلو سے نظر ڈالیئے .... اگر آپ انداز بیاں سے اس نتیجہ پر پہنچے کہ دعا کی اجابت کے اعلان کے بعد اس کا عملی ظہور چالیس سال کے بعد ہوا تو اس کا مطلب صاف یہ ہے کہ اسی عرصہ میں کام کرنے کے لیئے حضرت موسیٰ و ہارون کو کام کرنے کی ہدایت اور کام کا طریق کار بتایا جا رہا ہے۔
سورہ شوریٰ میں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی قریش کی اندھی بہری مخالفت کا ذکر کیا ہے ارشاد ہوا ہے کہ
اگر تیرا رب پہلے ہی یہ فرما چکا نہ ہوتا کہ ایک وقت مقرر تک فیصلہ کو مؤخر کیا جائے تو آپ کے مخالفین کا کام تمام ہو چکا ہوتا اور بلاشبہ آپ کے مخالفین میں اہل کتاب بھی آپ کے بارے میں بڑی اضطراب انگیز حالت میں ہیں۔
اس کے بعد خدا و لاکر ارشاد ہوا۔

فلذالک فادع فاستقم کما امرت ولا تتبع اھواءھم

چونکہ یہ حالت ہو چکی ہے اس لیئے آپ ان کو دعوت دیجئے اور آپ کو جیسے حکم دیا گیا ہے اس پر ڈٹ جایئے اور ان لوگوں کی چاہتوں کی اتباع نہ کیجئے۔
یعنی ان کو راضی کرنے کے لیئے اللہ کے دین میں کوئی ردو بدل نہ کرنا۔ کچھ دو اور کچھ لو۔ کے اصول پر ان بےخبر لوگوں سے کوئی مصالحت نہ کرو۔ ان کے اوہام اور تعصبات اور جاہلانہ طریقوں کے لیئے دین اسلام میں کوئی گنجائش محض اس لالچ میں آکر نہ نکالو کہ کسی نہ کسی طرح ہماری دعوت کو قبول کر لیں جس کو ماننا ہے اللہ کے اصلی اور خالص دین کو مانے
• اللہ کا دین لوگوں کی چاہتوں سے بدلا نہیں جا سکتا
آیئے اب یہی بات سورہ جاثیہ میں پڑھیئے۔ یہاں بھی دعوت کا مقابلہ کرنے اس کا مذاق اڑانے میں پیش پیش تھے۔ قرآن نے حضور انور کو مخاطب کر کے فرمایا۔
ثم جعلناک علی شریعۃ من الامر فاتبعھا ولا تتبع اھواء الذین

لا یعلمون۔

پھر اسے نبی ہم نے تم کو الامر کے معاملہ میں ایک عظیم شریعت پر قائم کیا ہے۔ لہذا بس تم اسی کی پیروی کرو اور ان لوگوں کی خواہشات کی پیروی نہ کرو جو علم سے بیگانے ہیں۔ دونوں میں بھرپور ہم آہنگی ہے فرق ہے تو صرف یہ کہ یہاں حضرت موسیٰ اور ان کا مخاطب فرعون ہے اور وہاں حضور انور صلے اللہ علیہ السلام ہیں اور ان کے مخاطب قریش مکہ اور اہل کتاب یہود و نصاریٰ وہاں بھی بغاوت کی نسبتہ فرعون کی طرف ہے۔ اور یہاں بھی بغیا کہہ کر بغاوت کا ان کو مجرم گردانا گیا ہے۔ حضرت موسیٰ اور ہارون سے کہا جا رہا ہے۔ فاستقیما ولا تتبعان سبیل الذین لا یعلمون اور وہاں حضور انور سے یہی بات کہی جا رہی ہے کہ فاتبعھا ولا تتبع اھوا الذین لا یعلمون۔ تعبیر مختلف ہے لیکن روح دونوں جگہ ایک ہے۔ قرآن عزیز کو جو شخص بھی آنکھیں کھول کر پڑھے گا اسے یہ بات صاف نظر آئے گی کہ قرآن اپنے ماننے والوں کو کفر اور کفار کی رعیت فرض کر کے مغلوبانہ حیثیت میں مذہبی زندگی بسر کرنے کی تلقین نہیں کرتا ہے بلکہ یہ علانیہ اپنی حکومت قائم کرنا چاہتا ہے۔ وہ اپنے ماننے والوں سے مطالبہ کرتا ہے کہ وہ دین حق کی فکری، اخلاقی، مذہبی اور قانونی وسیاسی حیثیت سے غالب کرنے کے لیئے جان لڑا دیں۔ کسی جگہ بھی برسر اقتدار کفر سے کچھ لو اور کچھ دو کی بنیاد پر مصالحت نہ کریں اس معاملہ میں پوری استقامت اور استقلال کا مظاہرہ کریں۔ اور کفر کی زندگی کے کسی گوشہ میں پیروی نہ کریں۔ یہ چیز دونوں میں مشترک ہے۔

انا ارسلنا الیکم شاھدا علیکم کما ارسلنا الی فرعون رسولا

ہم نے تمہاری طرف اعلان حق کرنے والا ایسا ہی رسول روانہ کیا جیسے فرعون کی طرف رسول روانہ کیا تھا۔

وَجٰوَزْنَا بِبَنِیْٓ اِسْرَآءِیْلَ الْبَحْرَ فَاَتْبَعَهُمْ فِرْعَوْنُ وَجُنُوْدُهٗ
بَغْیًا وَّعَدْوًا ۭ حَتّٰٓی اِذَآ اَدْرَكَهُ الْغَرَقُ ۙ قَالَ اٰمَنْتُ اَنَّهٗ لَآ اِلٰهَ
اِلَّا الَّذِیْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِیْلَ وَاَنَا مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ ۝۹۰
آٰلْــٰٔنَ وَقَدْ عَصَیْتَ قَبْلُ وَكُنْتَ مِنَ الْمُفْسِدِیْنَ ۝۹۱
فَالْیَوْمَ نُنَجِّیْكَ بِبَدَنِكَ لِتَكُوْنَ لِمَنْ خَلْفَكَ اٰیَةً ۭ وَ
اِنَّ كَثِیْرًا مِّنَ النَّاسِ عَنْ اٰیٰتِنَا لَغٰفِلُوْنَ ۝۹۲

اور سمندر پار کر دیا ہم نے بنی اسرائیل کو۔ ظلم و شرارت سے فرعون اور اس کے فوجیوں نے اُن کا پیچھا کیا۔ اور حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب فرعون غرق ہونے لگا۔ تو وہ بول پڑا کہ میں اس بات پر ایمان لے آیا کہ اس ہستی کے سوا کوئی معبود نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لے آئے ہیں۔ اور میں بھی اسی کا فرماں بردار ہوں۔ اب ایمان۔ حالانکہ اس سے پہلے تو برابر نافرمانی کرتا رہا ہے۔ اور دُنیا کے فسادیوں سے ایک بڑا فسادی

نکھا ۹۲ لہٰذا ہم آج ہم تیرے جسم کو بچالیں گے تاکہ تیرے بعد
آنے والوں کے لیئے ہماری قدرت کی نشانی کا کام دے۔ اور
اکثر انسان ہماری نشانیوں سے بالکل غافل ہیں ۹۲

حضرت موسیٰ کی ہجرت اور فرعون کی ہلاکت

اب وہ منزل سامنے آگئی جب اللہ کے رسول کو اپنی جماعت کو ساتھ لے کر ہجرت کا
حکم ہوتا ہے۔ حضرت نوح کو مع رفقاء کے کشتی پر چڑھا کر کفار سے الگ کر دیا جاتا ہے۔
حضرت ابراہیم نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں انی مہاجر الی
ربی حضرت موسیٰ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاتے ہیں۔ کیونکہ جب تک یہ
ہجرت نہیں ہو لیتی اور مومن وکافر جُدا نہیں ہو جاتے۔ معجزۂ عذاب ظاہر نہیں ہوتا
مصر میں رہتے ہوئے مسجد مکان بنانے کا حکم اس کی تمہید تھی۔ حضرت نوح جب تک
کشتی پر سوار نہ ہوئے۔ طوفان نہ آیا۔ حضرت ابراہیم کلدانیوں کے ملک عراق سے نکل
کر شام اور مصر نہ چلے گئے۔ اسی طرح حضرت موسیٰ جب تک بنی اسرائیل کو لیکر دریا
پار نہیں ہوئے عذاب نہیں آیا۔ اور جب پار ہو گئے تو اللہ کا عذاب فرعونیوں پر غرق
کی صورت میں آیا۔ مومنین کو نجات اور کافروں کو ہلاکت ملی۔ اللہ کا دستور اور اللہ کی صفت
یہی ہے اس میں کوئی تغیر و تبدل نا ممکن ہے کہ جب مادہ فاسد کے سوا کفار کی جماعت کرنی
صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں یعنی اس کثیف مادے سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیفہ
الگ ہو جاتے ہیں۔ اور ڈھیر میں پھونس کے سوا کچھ نہیں رہ جاتا تو اس وقت معجزہ
ہلاکت امتحان کی بجلی فضا کی آندھی زمین کا سیلاب لوہے کی تلوار بن کر رونما ہوتا ہے۔
اور روئے زمین کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ کو
متعدد معجزے عنایت ہوئے مگر وہ اس لئے کہ ان کو دکھا کر فرعون کو حق کی طرف دعوت

دی جائے جب ایک مدت کے بعد اہل مصر میں سے جس قدر ایمان لا سکتے تھے لے آئے تو حضرت موسیٰ کو شق بحر کی آیت ہلاکت ملی اور رود احمر کی لہریں فرعون کو اس کے سارے ساز و سامان اور امرائے دربار کے ساتھ ہمیشہ کے لیئے نگل گئیں ان آیات میں اسی آیت ہلاکت کو پیش کیا گیا ہے ۔

۱۰:۹۰ اور سمندر پار کر دیا ہم نے بنی اسرائیل کو۔ ظلم و شرارت سے فرعون اور اس کے فوجیوں نے ان کا پیچھا کیا ۔ اور حالت یہاں تک پہنچ گئی کہ جب فرعون غرق ہونے لگا تو وہ بول پڑا کہ میں اس بات پر ایمان لایا کہ اس ہستی کے سوا کوئی نہیں ہے جس پر بنی اسرائیل ایمان لے آئے ہیں اور میں اسی کا فرماں بردار ہوں ۔ حکم ہوا کہ اب ایماں ۔ حالانکہ اس سے پہلے تو برابر نا فرمانی کرتا رہا اور تو دنیا کے فسادیوں میں سے ایک بڑا فسادی تھا ۔ موسیٰ علیہ السلام کئی لاکھ بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکلے فرعون کو خبر ہوئی تو ایک لشکر جرار لے کر تعاقب کیا ۔ تاکہ اس کے پنجہ ظلم سے چھوٹنے نہ پائیں ۔ بنی اسرائیل جب بحر قلزم کے کنارے پہنچے تو سخت پریشان ہوئے آگے سمندر پیچھے فرعون کا لشکر دندناتا چلا آ رہا تھا ۔ موسیٰ علیہ السلام نے تسلی دی اور حق تعالیٰ شانہ کے حکم سے لاٹھی سمندر پر ماری سمندر کا پانی ادھر اُدھر کھڑا ہو گیا ۔ اور درمیان میں اللہ سبحانہ نے بارہ راستے خشک بنا دیئے یہ پار ہوئے ادھر فرعون لشکر سمیت سمندر کے کنارے سے خشک راستے دیکھ کر سب نے گھوڑے ڈال دیئے ۔ جب ایک ایک کر کے تمام فوج دریا کے درمیان پہنچی پانی کو حکم ہوا کہ مل جائے فوراً پانی کے طبقات مل گئے ۔ سب لشکر اور سامان سمندر کی موجوں کی نذر ہو گیا ۔ فرعون نے دیکھا کہ اب ڈوبتا ہوں اس وقت گھبرا کر ایمان و اسلام کا لفظ زبان پر لایا شاید بنی اسرائیل کا معبود ایمان کا لفظ سنکر دریا کی موجوں سے باہر نکالدے اس پر اللہ سبحانہ کی جانب سے ارشاد ہوا کہ الآن وقد عصیت قبل یعنی ساری عمر مخالفت ہو کر گمراہی پھیلاتا اور شرارتیں کرتا رہا اب عذاب دیکھ کر یقین لایا اس وقت کا یقین کیا معتبر ہے ۔ فلم یک ینفعھم ایمانھم لما رأوا باسنا سنة الله التی قد خلت فی عبادہ وخسر ھنالک الکافرون ۔

(تنبیہ) قبض روح اور معائنہ عذاب کے وقت ایمان لانا ایمان غرغرہ ۔ ایمان باس

ایمان یاس کہلاتا ہے جو اہل السنۃ والجماعت کے نزدیک نافع نہیں۔ شیخ عبدالوہاب شعرانی نے کتاب الیواقیت والجواہر میں فتوحات مکیہ سے عبارت نقل کی ہے۔ جس میں ایمان فرعون کی نسبت یہی تصریح ہے۔ اور دیباچہ میں لکھا ہے کہ فتوحات کے نسخوں میں ملحدین زنادقہ نے بہت سی عبارتیں مدسوس کر رکھی ہیں۔ میرے پاس جو نہایت مستند اور معتبر نسخہ ہے اس میں ان عبارتوں کا پتہ نہیں ہے واللہ اعلم۔ اخیر وقت میں فرعون سے لفظ امنت کہلا کر حضرت موسیٰ کی دعا فلا یومنوا حتٰی یروا العذاب الالیم کی مقبولیت کا اللہ سبحانہ نے مشاہدہ کروایا [1]

یہ اللہ سبحانہ کے عجائب قدرت میں سے ہے کہ جس مقام سے سمندر نے بنی اسرائیل کو خشک راستہ دیا اس مقام سے گذرتے ہوئے فرعون اپنی فوجوں کے ساتھ غرق ہو گیا۔ فرعون کے تعاقب کو قرآن نے بغیا وعدوان سے تعبیر کیا ہے فرعون کا یہ فعل یوں تو ہر پہلو سے سرکشی اور تعدی تھا۔ لیکن اس کا یہ پہلو خاص طور پہ قابل لحاظ ہے کہ مدت کی کش مکش کے بعد فرعون نے خود بنی اسرائیل کو جانے کی اجازت دی تھی۔ اس اجازت کے بعد پیچھے سے اپنی فوجیں لے کر جانا ایک ایسی زیادتی تھی۔ جو اس کی ساری زیادتیوں پر بازی لے گئی۔

مصر سے فلسطین جانے کے دو راستے تھے۔ ایک خشکی کا راستہ ہے اور وہ قریب ہے۔ اور دوسرا البحر احمر کا راستہ یعنی اس کو عبور کر کے بیابان سینا کی راہ ہے اور یہ دور کا راستہ ہے۔ لیکن اللہ سبحانہ کی حکمت کا تقاضا یہی ہوا کہ وہ خشکی کی راہ چھوڑ کر دور کی راہ اختیار کریں اور قلزم کو پار کر کے جائیں۔

کہا جا سکتا ہے کہ اس راہ کو اللہ سبحانہ نے اس لئے ترجیح دی کہ خشکی کے راستہ سے گزرنے میں فرعون اور اس کی فوج سے ضرور جنگ ہوتی۔ کیوں کہ انہوں نے بنی اسرائیل کو قریب ہی آلیا تھا۔ اگر دریا کا معجزہ پیش نہ آتا تو فرعون بنی اسرائیل کو واپس لے جانے میں کامیاب ہو جاتا اور چونکہ بنی اسرائیل کو صدیوں کی غلامی نے بزدل اور پست ہمت بنا دیا تھا۔ اس لیئے وہ خوف اور رعب کی وجہ سے کسی طرح فرعون کے ساتھ جنگ کرنے پر تیار نہ ہوتے تورات سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہی اس توجیہہ کی تائید نکلتی ہے اس میں مذکور ہے اور جب فرعون نے ان لوگوں کو جانے کی اجازت دی تو خدا ان کو فلسطینیوں کے راستہ سے نہیں لے گیا اگرچہ ادھر سے نزدیک پڑتا کیونکہ خدا نے کہا ایسا نہ ہو کہ لوگ لڑائی بھڑائی دیکھ کر پچھتانے لگیں اور مصر کو لوٹ جائیں۔ بلکہ خدا وند ان کو چکر دلا کر بحر قلزم کے بیابان کے راستے لے گیا (خروج)

نیز فرعون اور قوم فرعون کو ان کی نافرمانی اور سرکشی کی پاداش اور عظیم الشان اعجاز کے ذریعے ظالم و نیا پرا قتدار سے مظلوم و مقہور قوم کی نجات کا عظیم الشان مظاہرہ کرنا تھا اس لئے یہ راستہ اختیار کیا۔

بہر حال حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ہارون علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر راتوں رات بحر احمر کی راہ پر ہو لیئے اور روانہ ہونے سے پہلے مصری عورتوں کے زیورات جو ایک تہوار کے لیئے مانگے تھے واپس نہ کر سکے۔

ادھر پرچہ نویسوں نے فرعون کو اطلاع کی کہ بنی اسرائیل مصر چھوڑ کر راہ فرار اختیار کر رہے ہیں اور شہروں سے نکل گئے۔ فرعون نے اسی وقت ایک زبردست فوج کو ساتھ لیا۔ اور ان کا تعاقب کیا اور صبح ہونے سے پہلے پہلے ان کے سر پر جا دھمکا بنی اسرائیل نے پو پھٹنے کے وقت پیچھے مڑ کر دیکھا تو دیکھ کر گھبرا گئے اور کہنے لگے۔

کیا مصر میں قبریں نہ تھیں جو تو ہم کو مرنے کے لیئے بیابان میں لے آیا ہے۔ تو نے ہم سے یہ کیا کیا کہ ہم کو مصر سے نکال لایا کیا ہم تجھ سے مصر میں یہ بات نہ کہتے تھے کہ ہم کو رہنے دے کہ ہم مصریوں کی خدمت کریں۔ (خروج)

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے ان کو تسلی دی اور فرمایا خوف نہ کرو۔ اللہ سبحانہ کا وعدہ سچا ہے وہ تم کو بچائے گا۔ اور تم ہی کامیاب ہوگے اور پھر درگاہ الٰہی میں دعا کی اللہ نے حضرت موسیٰ کو حکم دیا کہ لاٹھی پانی پر مارو راستہ بن جائے گا۔ انہوں نے لاٹھی ماری اور راستہ بن گیا۔ بنی اسرائیل پار ہو گئے۔ فرعون اور اس کا لشکر بھی بنی اسرائیل کے پیچھے اسی راستہ پر چل پڑا۔ جب اسرائیل کا ہر فرد سلامتی کے ساتھ کنارہ سے پر پہنچ گیا تو پانی بحکم الٰہی اپنی حالت پر آگیا۔ جب فرعون غرق ہونے لگا تو بول پڑا امنت انہ لا الٰہ الا الذی امنت بہ بنوا سرائیل و انا من المسلمین مگر یہ ایمان چونکہ واقعی

ایمان نہ تھا بلکہ بے قراری میں ایک اضطرابی نعرہ تھا۔ اس لیئے جواب ملا

آلآن وقد عصیت قبل وکنت من المفسدین

یعنی اللہ سبحانہ خوب جانتا ہے کہ تو مسلمین میں سے نہیں بلکہ مفسدین میں سے ہے۔

فی الواقع فرعون کا یہ نعرہ عذاب کو آنکھوں سے دیکھنے کے بعد اضطراری اور بے اختیاری نعرہ تھا اور مشاہدہ عذاب کے وقت اس کی یہ صدا دراصل حضرت موسیٰ کی دُعا کا واقعاتی مظہر تھا یہاں شارحین قرآن نے ایمان فرعون کی بحث چھیڑ دی ہے۔ علامہ دوانی اور شیخ اکبر محی الدین عربی کے بارے میں یہ بات بتائی ہے کہ وہ اس نعرے کی وجہ سے ایمان فرعون کے قائل ہیں۔ ایک جواب تو وہی ہے جو شیخ الاسلام نے دیا ہے۔ اور دوانی کے بارے میں علامہ خفاجی نے یہ انکشاف کیا ہے کہ دوانی کے بارے میں اس موضوع پر لوگوں نے جو کچھ بھی لکھا ہے وہ دوانی پر الزام ہے۔ یعنی خود فاضل حلبی کی تاریخ حلب میں پڑھا ہے کہ وہ رسالہ دوانی کی تصنیف نہیں بلکہ محمد بن بلال نحوی کے رشحات قلم ہیں۔ قزوینی نے اس کا رد لکھا ہے کہ یہ بے نام مصنف شہرت کا بھوکا ہے اس کی حیثیت بالکل بدنام ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا کی ہے اور اس روایتی بے نام جیسا ہے جس نے شہرت کی خاطر زمزم میں پیشاب کر دیا تھا۔

محی الدین عربی کی صفائی میں شیخ الاسلام کے علاوہ آلوسی، خفاجی اور دوسرے شارحین قرآن نے بہت کچھ لکھا ہے لیکن اس موضوع پر علامہ جمال الدین قاسمی نے اپنی تفسیر محاسن التاویل میں جو داد تحقیق دی ہے وہ اس قابل ہے کہ اس کو پڑھا جائے۔ علامہ قاسمی نے شیخ عطار کی کتاب الفتح المبین فی سر اعتراض المعترض علی محی الدین کے حوالہ سے لکھا ہے خلاصہ یہ ہے۔

فتوحات مکیہ میں شیخ محی الدین ابن العربیؒ جہنمیوں کا ذکر کرتے ہوئے لکھا ہے کہ فرعون جہنمی ہے اور جہنم کے اس خاص طبقہ میں ہے جس کے باسی اس میں ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے۔ ایک دوسرے موقعہ پر حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کی اس دعا کا تذکرہ کرتے ہوئے اعوذ بلک منک لکھا ہے۔ یہ مقام اتحاد ہے حضور نے پناہ لی ہے جس کا اناربکم الاعلیٰ میں فرعون علم بردار تھا۔ اس سے معلوم ہوا کہ شیخ محی الدین ابن عربی کے نزدیک بھی فرعون ایسا ہی کافر ہے جیسا کہ ساری اُمت کا اس میں موقف ہے۔

اب یہ حقیقت بالکل بے غبار ہو گئی ہے کہ فرعون کے ایمان والی بات ان بزرگوں کے متعلق بناوٹی ہے کچھ لوگوں نے اور بھی جوابات دیئے ہیں لیکن وہ جوابات

تحقیقی نہیں ہیں۔

بہر حال حضرت موسیٰ کے معجزات دو قسم کے تھے۔ معجزہ ہدایت اور معجزہ ہلاکت یہاں ذکر معجزہ ہدایت کا نہیں بلکہ معجزہ ہلاکت کا ہے۔ سارے شارحین قرآن اس پر متفق ہیں کہ یہ معجزہ ہلاکت ہے اس کے ظہور کے بعد ایمان معتبر نہیں ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ ن من حیث لم ینفعہ الایمان امام نسفی مدارک میں لکھتے ہیں کہ اب جب کہ انکشاف آخرت شروع ہو چکا اور قبول ایمان کا وقت نہیں رہا تو سی بالساعۃ فی وقت الاضطرار۔ امام رازی فرماتے ہیں۔ اب جبکہ ہمارے عذاب کا مشاہدہ ہونے لگا ایمان لایا انما نومن عند نزول العذاب والایمان فی ھذالوقت غیر مقبول امام قرطبی فرماتے ہیں کہ وقت ایمان کا نہیں اس وقت کا ایمان لایا سود مند نہیں والایمان لا ینفع حینئذ

قدرت خداوندی کی ایک نشانی

۱۰۵ لہذا آج ہم تیرے جسم کو بچا لیں گے تاکہ تیرے بعد آنے والوں کے لیئے ہماری قدرت کی نشانی کا کام دے اور اکثر انسان ہماری نشانیوں سے غافل ہیں۔ موضح القرآن میں ہے کہ جب بے وقت ایمان لایا بے فائدہ ایسے ہی اللہ سبحانہ نے مرے پیچھے اس کا بدن دریا میں سے نکال کر ٹیلے پر ڈال دیا کہ بنی اسرائیل دیکھ کر شکر کریں اور پیچھے آنے والے اس کے حال سے عبرت پکڑیں۔ ورنہ اس کو بدن کے بچنے سے کیا فائدہ جیسا بے فائدہ ایمان تھا ایسا ہی بے فائدہ نجات مل گئی۔

جدید تحقیقات سے ثابت ہوا ہے کہ فرعون کی لاش آج تک محفوظ چلی آرہی ہے۔ لیکن الفاظ قرآنی کی صحت اس کے ثبوت پر موقوف نہیں ہے۔ اتفاقاً بنی اسرائیل کے نجات پانے اور فرعون کے غرق ہونے کا واقعہ عاشورا کے دن ہوا اور اتفاق سے آج بھی بندہ یہ سطور لکھ رہا ہے یوم عاشورا ۱۴۲۸ھ اللہ سبحانہ ہو ہم کو دنیا و آخرت میں

اپنے عذاب سے محفوظ رکھے اور دشمنانِ دین کا بیڑا غرق کرے آمین [1]

آیت کا مضمون بظاہر عجیب معلوم ہوتا ہے یعنی اللہ سبحانہ کا یہ فیصلہ ہے کہ فرعون کے جسم کو غرق ہونے سے نجات دی جائے گی۔ تاکہ آنے والی قوموں کے لیئے قدرت حق کی نشانی ہو اسی لیئے قدیم مفسرین کو حل مطلب میں مشکلات پیش آتی ہیں لیکن اگر وقت نظر سے کام لیا جائے تو مطلب بالکل واضح ہے۔

قدیم مصریوں میں حنوط کا طریقہ رائج تھا یعنی بادشاہوں اور امیروں کی نعشیں ایک خاص طرح کا مصالحہ لگا کر ایک عرصہ تک محفوظ کر لی جاتیں چنانچہ اٹھارہویں صدی کے اوائل سے لے کر اس وقت تک بے شمار نعشیں مصری نکل چکی ہیں۔ اور دنیا کا کوئی عجائب خانہ نہیں ہے جس کے حصے میں دو چار نعشیں نہ آئی ہوں۔ اس طرح کی نعشوں کے لیئے "ممی" کا لفظ یونانیوں نے استعمال کیا تھا۔ جو غالباً خود مصریوں کی اصطلاح تھی۔

آیت کا مطلب یہ معلوم ہوتا ہے کہ فرمایا تو اب موت سے تو نہیں بچ سکتا مگر تیرا جسم سمندر کی موجوں سے بچا لیا جائے تاکہ وہ حسب معمول ممی کر کے رکھا جائے اور آنے والی نسلوں کے لیئے عبرت و تدبر کا موجب ہو۔ اگر مصریات کے بعض علما کی یہ تحقیق درست ہے کہ یہ فرعون ریمسس ثانی تھا تو اس کا بدن آج تک زائل نہیں ہوا۔ کیونکہ اس کی ممی نکل آئی ہے اور قاہرہ کے دارالآثار میں صحیح و سالم موجود ہے [2]۔

آج تک وہ مقام جزیرہ نمائے سینا کے مغربی ساحل پر موجود ہے۔ جہاں فرعون کی لاش تیرتی ہوئی پائی گئی تھی۔ اس کو موجودہ زمانے میں جبل فرعون کہتے ہیں۔ اور اسی کے قریب ایک گرم چشمہ ہے جس کو مقامی آبادی نے حمام فرعون کے نام سے موسوم کیا ہے۔ اس کی جائے وقوع ابو زنیمہ سے پندرہ میل شمال کی جانب ہے۔ اور علاقے کے باشندے اسی جگہ کی نشاندہی کرتے ہیں کہ فرعون کی لاش یہاں پڑی ہوئی تھی۔ اگر یہ ڈوبنے والا فرعون وہی منفتہ ہے جس کو زمانہ حال کی تحقیق نے فرعون موسیٰ قرار دیا ہے تو اس کی لاش آج تک قاہرہ کے عجائب خانے میں موجود ہے ۱۹۰۷ء میں سر گرافٹن

[1] ترجمان القرآن [2] تفہیم القرآن

نے اس کی ممی پر سے پٹیاں کھولی تھیں تو اس کی لاش پر نمک کی تہ جمی ہوئی تھی. جو کھاری پانی میں اس کی غرقابی کی کھلی نشانی ہے ؎۲

اگر مصری مقالہ نگار کا مضمون صحیح ہے کہ متفقہ اعمیس ثانی ہی فرعون موسیٰ تھا تو بلاشبہ اس کی نعش آج تک محفوظ ہے اور سمندر میں تھوڑی دیر غرق رہنے کی وجہ سے اس کی ناک کو مچھلی نے کھا لیا ہے۔ اور آج وہ مصریات کے عجائب گھر میں تماشا گاہ خاص و عام ہے

یہاں یہ بات اور جان لینی چاہیئے کہ قرآن حکیم میں حضرت موسیٰ کے قصے کے سلسلہ میں دو فرعونوں کا ذکر آتا ہے۔ ایک وہ جس کے زمانے میں آپ پیدا ہوئے اور جس کے گھر میں آپ نے پرورش پائی۔ دوسرا وہ جس کے پاس آپ اسلام کی دعوت اور بنی اسرائیل کی رہائی کا مطالبہ لے کر پہنچے اور جو بالآخر غرق ہوا۔ موجودہ زمانے کے عام محققین کا میلان اس طرف ہے کہ پہلا فرعون کا زمانہ حکومت ۱۲۹۲ء سے ۱۲۲۵ء قبل مسیح تک رہا اور دوسرا فرعون جس کا ذکر بیان ہو رہا ہے منفتاح تھا جو اپنے باپ اعمیس دوم کی زندگی میں ہی شریک حکومت ہو چکا تھا۔ اور اس کے مرنے بعد سلطنت کا مالک ہوا۔

وَلَقَدْ بَوَّأْنَا
بَنِيٓ إِسْرَآءِيلَ مُبَوَّأَ صِدْقٍ وَّرَزَقْنٰهُم مِّنَ الطَّيِّبٰتِ ۚ
فَمَا اخْتَلَفُوا حَتّٰى جَآءَهُمُ الْعِلْمُ ۚ إِنَّ رَبَّكَ يَقْضِي بَيْنَهُمْ
يَوْمَ الْقِيٰمَةِ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُونَ ﴿۹۳﴾

اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو بہترین ٹھکانا دیا اور ان کو اچھی اچھی نعمتیں ارزانی کیں[۱۰۶] پھر انہوں نے نبوت کی راہ عمل سے علم آنے کے باوجود علیحدگی اختیار کر لی. اللہ سبحانہ روز قیامت ان کے اس اختلاف کا فیصلہ فرمائیگا[۱۰۷]

بنی اسرائیل پر اللہ کا انعام

یہاں ذکر مذہب یہود کا نہیں ایک مخصوص قوم ونسل کا ہے. بنی اسرائیل نام کسی مذہب فرقہ یا عقیدہ کا نہیں ایک خاص نسل کا ہے قرآن میں فضیلت مذہب یہود کی نہیں بلکہ نسل یہود کی بیان کی گئی. یہ سوال کہ اس نسل کی فضیلت کس وجہ سے ہے۔ اور وہ کون سی ایسی نعمت ہے جو بحیثیت نسل بنی اسرائیل کے لیے بلا شرکت غیرے مدتوں مخصوص رہی. اگر کہیئے کہ دولت یا حکومت یا تجارت یا کثرت آبادی تو اول تو یہ

انعامات اللہ کے خود اس درجہ کے نہیں کہ ان کا ذکر اس شان و اہتمام کے ساتھ کیا جائے اور انہیں کو معیارِ فضیلت بنایا جائے اور اس سوال کا جواب تاریخ کی زبان سے ایک ہی ملتا ہے کہ وہ دولت یا اللہ کی نعمت مسلک توحید تھا۔ دنیا کی تاریخ کے جس دور میں ساری قومیں اور ساری نسلیں کم و بیش شرک میں مبتلا تھیں تو نسل اسرائیل ہی ایک ایسی قوم تھی جو من حیث القوم توحید کی علمبردار تھی۔ عقیدۂ توحید اور عقیدہ رسالت میں چولی دامن کا ساتھ ہے۔ رسالت کی قائل صرف وہی قوم ہوگی جس کا عقیدہ توحید واضح و پختہ ہوگا۔ اور انبیاء و رسل جہاں تک کسی نسل کا تعلق ہے۔ نسل اسرائیل ہی میں مسلسل پیدا ہوتے رہے ہاں متفرق طور پر کسی دوسری نسل میں بھی کبھی پیدا ہو گئے ہوں تو وہ اس کے منافی نہیں ہے۔ دنیا کی، ساری دوسری قوموں میں جس وقت ظہور اوتاروں کا ہو رہا تھا اور وہ قومیں عناصر پرستی مظاہر پرستی، دیوتا پرستی، بُت پرستی، غرض شرک ہی کی کسی نہ کسی صورت میں گرفتار تھیں انبیاء و رسل اور اُن کی تعلیمات کے پرچار صرف بنی اسرائیل میں تھے اور توحید و رسالت کی دعوت صرف ساری نسل کی شاخ اسرائیل کے حصہ میں آئی تھی۔ موجودہ یہود بھی اپنے اسلاف کی یہ امتیازی حیثیت یاد ہے۔ بہر حال نسل اسرائیل کے لیئے مبوء صدق سلسلہ نبوت کی وجہ سے تھی۔ مبوا صدق کے معنی منزل حسن اور مکان خوب دل پسند کے۔ عربی محاورہ میں صدق کا مفہوم بہت وسیع ہے۔

۲؎ اللہ اور بے شک ہم نے بنی اسرائیل کو بہترین ٹھکانا دیا اور ان کو اچھی اچھی نعمتیں ارزانی کیں یعنی فرعونیوں کو ہلاک کر کے اول ملک مصر دیا۔ پھر کچھ عرصہ کے بعد عمالقہ کو نکال کر ملک شام دیا گیا۔ دونوں ملک سرسبز و شاداب ہیں۔ جہاں سبزی اور لذیذ چیزوں کی افراط ہے۔ غرضیکہ بنی اسرائیل کو حلال و طیب نعمتوں سے مالامال کر دیا لہ شیخ الاسلام نے مصر بتایا ہے۔ اس پر تفصیلی بحث سورہ الشعراء میں آ رہی ہے۔ یہاں فلسطین و شام کے علاقے مراد قدیم شارحین قرآن نے بھی یہی مراد لی ہے عبد اللہ بن عباس فرماتے ہیں ھو الاردن والشام قتادہ ابن زید ضحاک کہتے ہیں المراد بہ الشام و بیت المقدس۔ لیکن یکبارگی نہیں بتدریج عمل میں آیا ہے۔ پہلے وہ واقعات وادی سینا میں پیش آئے ہیں۔ جن کا ذکر قرآن میں ہے۔ مثلاً بنی اسرائیل کا حضرت موسیٰ سے مطالبہ کرنا۔ اجعل لنا الٰھا کما لھم آلھۃ حضرت موسیٰ

پانی کا مطالبہ کرنا۔ بنی اسرائیل نے بحر احمر کو پار کر کے جس سرزمین میں قدم رکھا یہ لق ودق بے آب وگیاہ میدان سے شروع ہوتی ہے۔ تورات کی زبان میں اسے بیابان شور، سین وادی سینا کہتے ہیں اور کوہ طور تک اس کا دامن وسیع ہے۔ یہاں شدید گرمی پڑتی ہے دور دور تک پانی اور سبزہ کا نام ونشان نہیں ہے۔ بنی اسرائیل کو صرف پینے کے لیئے پانی کی ضرورت نہ تھی کھانے کے لیئے خوراک بھی ان کی مانگ تھی۔ من وسلویٰ کا واقعہ بھی وادی سینا میں پیش آیا۔ کھانے اور پینے کے انتظام کے بعد سر چھپانے اور تپتی دھوپ سے حفاظت کا واقعہ بھی اسی جگہ پیش آیا۔ جسے قرآن تظلیل غمام کہہ کر پکارا۔ اور جب ایک عرصہ وادی سینا میں رہتے گزر گیا تو ایک خوراک سے گھبرا کر غذائی نیرنگیوں کا بھی اسی وادی تیہ میں مطالبہ کیا۔ اور اسی وادی کے زمانہ قیام میں حضرت موسیٰ کو تورات بھی ملی۔ حضرت موسیٰ کوہ طور گئے اس زمانہ میں حضرت ہارون کو اپنا نائب بنا گئے۔ غیبت کے زمانے میں گوسالہ پرستی کا ڈرامہ پیش آیا۔ ان سب واقعات کے بیتنے میں کتنا عرصہ گذرا۔ اس کا کسی تاریخ میں مثبت انداز میں ذکر نہیں۔ ان واقعات کے بعد حضرت موسیٰ نے بنی اسرائیل کو میدان کارزار میں اترنے کی دعوت دی اور کہا۔ یا قوم ادخلوا الارض المقدسۃ التی کتب اللہ لکم۔ بنی اسرائیل میں ابھی تک غلامانہ زندگی کے آثار موجود تھے یہ سنکر جوابات قران نے بتائی کہ انھوں نے کہا ان فیہا قوما جبارین اور صاف انکار کر دیا۔

انا لن ندخلھا ابدا ما داموا فیہا فاذھب انت وربک فقاتلا انا ھاھنا قاعدون۔ اس کے بعد کیا ہوا قرآن ہی کا بیان ہے کہ پورے چالیس سال تک وادی سینا میں رہے اور انھا محرمۃ علیھم اربعین سنۃ۔ حضرت ہارون کی وفات بھی وادی تیہ میں جبل ہود پر ہوئی اور حضرت موسیٰ نے تجہیز وتکفین کی اس کے بعد حضرت موسیٰ کی وفات بھی اسی وادی میں ہوئی۔ حضرت موسیٰ نے آخری وقت میں یہ دعا کہ مجھے ارض مقدس سے قریب کردے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ اگر میں اس جگہ ہوتا تو تم کو حضرت موسیٰ کی قبر کا نشان دکھا دیتا کہ وہ سرخ ٹیلہ

لہ افادات شیخ الاسلام

کے قریب اس جگہ دفن ہیں۔

ضیاء المقدسی کہتے ہیں کہ اریحا میں سرخ ٹیلہ کے قریب ایک قبر ہے جس کو حضرت موسیٰ کی قبر بتایا جاتا ہے۔ یہ میدان تیہ کے بالکل قریب ہے اور اسی جگہ وہ کثیب احمر سرخ ٹیلہ ہے جس کا حدیث میں ذکر ہے۔

تورات اور کتب تاریخ میں ہے کہ حضرت موسیٰ کی عمر ایک سو بیس سال ہے۔ تورات میں حضرت موسیٰ کی وفات کا ذکر متعدد مقامات پر کیا گیا ہے ان میں سے ایک جگہ اس طرح ہے۔

اور موسیٰ موآب کے میدانوں میں سے نبو کے پہاڑوں پر پسگہ کی چوٹی پر جو یریحو کے مقابل ہے چڑھ گیا اور خداوند نے ساری زمین جلعاد سے لے کر دان تک اس کو دکھلائی اور شمال کا سارا ملک پچھلے سمندر تک اور جنوب کا سارا ملک اور وادی اریحو جو خزانوں کا کا شہر ہے۔ اس کی وادی کا میدان صفر تک اس کو دکھایا اور خداوند نے اس سے کہا یہی وہ ملک ہے جس کی بابت میں نے ابراہام، اسحاق اور یعقوب سے کہا کہ اسے میں تمہاری نسل کو دوں گا۔ سو میں نے ایسا کیا تو اسے اپنی آنکھوں سے دیکھ لے۔ پھر تو اس پار وہاں نہ جائے گا۔ پس خداوند کے بندے موسیٰ نے خداوند کے کہنے کے مطابق رہن مراتب کے ملک میں پائی اور اسے موآب کی ایک وادی میں بیت کے سامنے دفن کیا۔ پھر آج تک کسی کو اس کی قبر معلوم نہیں اور موسیٰ وفات کے وقت ۱۲۰ برس کا تھا[1]۔

اس تفصیل سے بتانا یہ چاہتا ہوں کہ بنی اسرائیل نے ایک عرصہ تک وقت تیہ میں گذارا تو وہ مصر واپس آئے اور نہ فلسطین دار فاسقین تھا۔ یہاں اسرائیل سے مقصود وہ لوگ نہیں ہیں جو سمندر پار کر کے وادی تیہ میں پہنچے بلکہ ان کی اولاد مراد ہے جو ایک عرصہ کے بعد فلسطین پر قابض ہوئے۔ یہ سرزمین اپنی سرسبزی شادابی خوش پیداواری کے لئے شروع سے آج تک مشہور چلی آرہی ہے۔ آج بھی جغرافیہ کی کتابوں میں اس کے بارے میں بھی تفصیلات ملیں گی۔ مبوأ صدق سے مراد فلسطین اور شام اور جزیرہ نما سینا ہے۔ یہ

[illegible]

یہ مقام علاقہ مصری شہنشاہی کا حصہ تھا کیونکہ اس وقت فرعون کی حکومت شام سے لیبیا اور بحیرہ روم کے سواحل سے حبش تک تھی۔

بنی اسرائیل کی ناشکر گذاری

ان پھر انہوں نے علم آنے کے باوجود نبوت کی راہ عمل سے علیحدگی اختیار کر لی۔ اللہ سبحانہ روز قیامت ان کے اس اختلاف کا فیصلہ کرے گا یعنی مادی انعام و اکرام کے ساتھ دینی وروحانی نعمت سے سرفراز فرمایا کہ تورات مقدس کا علم دیا۔ جس میں دین کے اصول و فروع بیان ہوئے تھے اور اگلوں پچھلوں کے بارے میں خبریں تھیں ان واضح حقائق سے خبردار ہونے کے باوجود لائق نہ تھا کہ ایسی صاف چیزوں میں اختلاف کر کے آپس میں پھوٹ ڈالیں۔ اور فرقہ بندی کی نحوست میں گرفتار ہوں۔ مگر باوجود علم صحیح اور خبر صادق پہنچ جانے کے طرح طرح کے اختلافات پیدا کئے اور پھوٹ ڈال کر رہے۔ بعض احکام میں اپنے پیغمبر موسیٰ علیہ السلام سے کٹ حجتی جیسے ذبح بقرہ کے واقعہ میں گذرا۔ بعد میں آنے والے خصوصًا خاتم النبیین کی اکثر نے تکذیب کی حالانکہ ان کے متعلق بہت سی پیشین گوئیوں پر مطلع ہو چکے تھے بلکہ بعثت محمدی سے پہلے نبی آخر الزماں کی آمد کے منتظر تھے اور مشرکین سے کہتے تھے کہ ہم پیغمبر آخر الزماں کے ساتھ ہو کر تمہاری خبر لیں گے نہ صرف اس مسئلہ میں اختلاف ہوا بلکہ اپنے مذہب میں تحریف کر کے اصول و فروع بدل ڈالے اور رفتہ رفتہ بیسیوں فرقے پیدا ہو گئے۔ مسیح علیہ السلام کے تین سو برس کے بعد قسطنطین اعظم ایک فلسفی مزاج بادشاہ تھا۔ از راہ نفاق دین نصرانیت میں داخل ہوا۔ تو پادریوں نے اس کی خاطر جدید قوانین وضع کئے اور نئی شریعت بنائی۔ اس نے ان کے لئے بڑے بڑے گرجے اور معابد و مشاہد تعمیر کرائے اور اس نئے دین مسیحی کی جو اصلی مسیحیت کو بگاڑ کر کیا گیا تھا۔ خوب اشاعت ہوئی۔ بجز چند تارک الدنیا راہبوں کے جو بستیوں سے الگ جنگلوں اور پہاڑوں میں جا رہے تھے کوئی شخص اصلی دین مسیحی پر قائم نہ رہا۔ صلیب کی پرستش مشرق کی طرف نماز پڑھنا۔ کلیساؤں میں مسیح و مریم وغیرہ کی تصاویر پوجنا۔ خنزیر وغیرہ کو حلال کرنا اور اس طرح کی تحریفات نے حقیقی مسیحیت کو بالکل مسخ کر ڈالا۔ اور یہ ہی مسخ شدہ مسیحیت ساری دنیا میں پھیل گئی۔ یہ زمانہ تھا جب ملک شام بیت المقدس جزیرہ اور بلاد

روم پر نصاریٰ کا تسلط تھا تا آنکہ فاروق اعظم کے عہد میں صحابہ رضی اللہ عنہم نے ان ممالک کو نصاریٰ کے قبضہ سے نکالا۔ او ر للہ الحمد والمنۃ [1]

یہ آیت کی ایک تشریح ہے جو آپ نے مولانا عثمانی کی زبان سے سنی آیئے دوسرے شارحین کی زبانی بھی آیت کی تفسیر سُن لیجئے۔

یہ ناشکری اور ناسپاسی کی طرف اشارہ ہے جو اللہ تعالیٰ کے اتنے احسانات کے مورد ہونے کے بعد اللہ کے دین اور اس کی کتاب و شریعت کے معاملے میں برتی کی۔ انہوں نے اس کے اندر طرح طرح کے اختلافات پیدا کر کے پائی ہوئی حقیقۃ گم کر دی اور اسی سرگشتگی اور حیرانی میں پھر مبتلا ہو گئے جس سے اللہ تعالیٰ نے اس اہتمام سے نکالا تھا حتی جاءھم العلم سے اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ یہ وہ بدقسمت قوم ہے۔ جس نے رات کی تاریکی میں نہیں بلکہ پورے دن کی روشنی میں ٹھوکر کھائی۔ اس وجہ سے سارا بارِ الزام اس کے اپنے ہی کاندھوں پر ہے۔

ان ربك يقضي بينهم یہ دھمکی ہے یہود کو آج انہوں نے اللہ کے دین کے معاملے میں جو دھاندلی مچائی ہے اور کتاب الٰہی کی جن حقیقتوں پر پردہ ڈالا ہے سب کے فیصلے کے لئے اللہ نے ایک دن مقرر کیا ہوا ہے۔ اس دن سب کچھ معلوم ہو جائے گا۔ اور ہر شخص اپنے جرم کی نوعیت کے لحاظ سے سزا پائے گا۔

یہ بھی لکھنے والوں نے اسی آیت پر لکھا ہے کہ

ان نعمتوں کا مقتضا تو یہ تھا کہ بنی اسرائیل ہمیشہ سپاس گذار رہ کر توحید و رسالت کے عقائد کے علمبردار رہتے۔ لیکن اس کے برعکس انہوں نے دین حق سے انحراف و اختلاف کی راہ اختیار کی اور وہ بھی بیانات نبوت سننے کے بعد

اور یہ بھی اسی آیت کی تشریح کی گئی ہے۔

مطلب یہ ہے کہ بعد میں انہوں نے اپنے دین میں جو تفرقے برپا کئے نئے نئے مذاہب نکالے اس کی وجہ یہ نہیں کہ ان کو حقیقت کا علم نہیں تھا۔ اور ناواقفیت کی بنا پر انہوں نے مجبوراً ایسا کیا بلکہ فی الحقیقت یہ سب کچھ ان کے اپنے نفس کی شرارتوں کا نتیجہ تھا۔ اللہ سبحانہ کی

[1] افادات شیخ الاسلام

کی بات ہے انہیں بجا طور پر بتا دیا گیا تھا کہ دین حق یہ ہے۔ یہ اس کے اصول ہیں یہ اس کے تقاضے اور مطالبے ہیں۔ یہ کفر و اسلام کے امتیازی حدود ہیں۔ طاعت اس کو کہتے ہیں۔ معصیت اس کا نام ہے۔ ان چیزوں کی باز پرس اللہ سبحانہ کے یہاں ہوگی۔ اور یہ قواعد ہیں جن پر دنیا میں تمہاری زندگی قائم ہونی ہے۔ مگر ان صاف صاف ہدایتوں کے باوجود انہوں نے ایک دین کے بیسیوں دین بنا ڈالے اور اللہ کی دی ہوئی بنیادوں کو چھوڑ کر کچھ دوسری ہی بنیادوں پر اپنے مذہبی فرقوں کی عمارتیں کھڑی کر لی ہیں۔

یہ بات بھی اس آیت کے مطالب میں کہی گئی ہے۔

انہوں نے دین حق میں اختلاف ڈالا۔ یعنی اپنے دین کے بارے میں یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کے بارے میں یہاں تک کہ ان کے پاس احکام توریت کا علم آگیا اور ان کو یقین آگیا کہ اصل عزت ہدایت اور اتباع شریعت میں ہے۔ مال و دولت کی عزت چند روزہ ہے چاہیئے تھا کہ سب اتباع شریعت پر متفق ہو جاتے جس کے ذریعے یہ عزت ملی ہے۔ لیکن افسوس کہ مختلف ہوگئے۔ یا یہ معنی ہیں کہ بنی اسرائیل کو علم تھا۔ کہ محمد رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم وہی نبی آخر الزماں ہیں جن کے مبعوث ہونے سے پہلے آپ کی نبوت پر ایمان رکھتے تھے اور جن کی صفتیں تورات میں مذکور ہیں لیکن جب اللہ سبحانہ نے آپ کو مبعوث بنا کر روانہ کیا تو از راہ عداوت آپ کے بارے میں اختلاف کیا۔

اور اسی آیت کا یہ مطلب بھی بتایا گیا ہے کہ

چاہیئے تھا کہ ہماری اطاعت کرتے لیکن انہوں نے الٹا اس میں اختلاف کرنا شروع کر دیا۔ اور غضب یہ کہ انہوں نے جہل کی وجہ سے اختلاف نہیں کیا۔ یہاں تک کہ ان کے پاس احکام کا علم پہنچ گیا تھا۔ اور پھر اختلاف کیا۔ آگے اس اختلاف پر وعید ہے کہ یقینی بات ہے کہ آپ کا رب اختلاف کرنے والوں کے درمیان قیامت کے دن ان امور میں فیصلہ کرے گا۔ جن میں وہ اختلاف کیا کرتے تھے۔

اور کچھ لوگوں نے اس طرح بھی سمجھایا۔

آخر آیت میں پھر ان کی کجروی اور غلط کاری کا ذکر ہے۔ کہ ان میں بھی بہت سے لوگوں نے اقتدار پانے کے بعد اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی قدر نہ کی اور اس کی اطاعت سے پھر گئے تورات میں جو نشانیاں رسول کریم صلے اللہ علیہ وسلم کی یہ لوگ پڑھتے تھے اس کا تقاضا یہ تھا کہ آپ کے تشریف لانے

کے بعد سب سے پہلے ہی لوگ ایمان لائے. مگر یہ عجیب اتفاق ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پہلے تو یہ سب لوگ نبی آخرالزماں پر ایمان رکھتے تھے اور ان کی نشانیوں اور ان کے ظہور کی خبریں لوگوں کو بتاتے تھے اور اپنی دعاؤں میں نبی آخرالزماں کا وسیلہ دے کر دعا کرتے تھے مگر جب نبی آخرالزماں تشریف لائے تو وہ اختلاف میں پڑ گئے. کچھ لوگ ایمان لائے اور باقیوں نے انکار کر دیا۔ آیت میں حضور اقدس کی تشریف آوری کو العلم سے تعبیر کیا ہے.

یہ تو ہوئے متاخرین اور ان کی تشریحات. آئیے متقدمین کی زبانی بھی آیت کی تشریح سن لیجئے.

متقدمین میں حافظ ابن جریر کا نام سب سے پہلے ہے وہ فرماتے ہیں کہ اللہ سبحانہ کا ارشاد فما اختلفوا حتی جاءهم العلم اس کا مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں پر بنی اسرائیل میں سے مذکورہ بالا انعامات کئے تھے انہوں نے اختلاف کیا تا آنکہ وہ چیز ان کے پاس آگئی جسے وہ جانتے تھے یعنی حضور اقدس کی تشریف آوری سے پہلے ان کو پتہ تھا کہ آپ کی بعثت ہونے والی ہے اس پر سب کا اتفاق تھا. اور سب مانتے تھے لیکن جب ان کی جانی پہچانی چیز آ گئی تو اختلاف کر بیٹھے کچھ نے مانا اور اکثر نے نہ مانا اس صورت میں العلم سے مراد حضور انور کی ذات گرامی ہے یعنی علم بمعنی معلوم ہے.

اور کچھ کی رائے میں یہاں العلم سے مراد کتاب اور وحی ہے.

حافظ ابن کثیر اپنی مشہور تفسیر میں فرماتے ہیں.

انہوں نے مسائل علم کے باوجود اختلاف کیا اور اختلاف ان کو مناسب نہ تھا. کیونکہ اللہ سبحانہ نے ان کے سامنے سب کچھ کھول کر بیان کر دیا تھا: حدیث میں ہے کہ یہودی اختلاف ۷۱ فرقوں میں ظاہر ہوا. عیسائی اختلاف نے ۷۲ فرقوں کی شکل اختیار کر لی اور میری امت کا اختلاف ۷۳ فرقوں کی صورت میں نمایاں ہوگا. ایک جنتی ہوگا. باقی سب دوزخی ہوں گے. صحابہ نے دریافت کیا کہ جنتی کون ہوگا. فرمایا جس پر میں اور میرے صحابہ ہیں.

قاضی بیضاوی اپنی مشہور تفسیر میں فرماتے ہیں.

انہوں نے اپنے دین میں اختلاف کی راہ تورات پڑھنے اور اس کے احکام جاننے کے بعد اختیار کی۔ یا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے حضور اقدس کے بارے میں اختلاف آپ کی صداقت کو جان لینے کے بعد کیا ہے۔

مشہور مفسر قرآن علامہ قرطبی اپنی تفسیر الجامع لاحکام میں کہتے ہیں۔

انہوں نے حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم کے بارے میں حضور کی تشریف آوری کے بعد اختلاف کیا ہے یہاں علم بمعنی معلوم

علامہ محمود آلوسی بغدادی رُوح المعانی میں لکھتے ہیں۔

بنی اسرائیل اپنے دینی مسائل میں اختلاف کا شکار نہیں ہوئے بلکہ اپنے رسول کے احکام کے پیروکار رہے مگر بعد اس کے کہ انہوں نے تورات پڑھی اور اس کے احکام سے واقف ہوگئے۔ اور کچھ کہتے ہیں کہ مطلب یہ ہے کہ بنی اسرائیل حضور اقدس کے بارے اختلاف کا شکار اپنی کتاب میں حضور کے اوصاف پڑھنے کے بعد ہوئے۔ پہلی تشریح کی بنیاد پر۔ بنی اسرائیل سے اگر وہی ہیں جن کے بارے میں بوانا بنی اسرائیل فرمایا ہے تو حضرت موسیٰ کے زمانے میں نہ انہیں تورات میں اختلاف اور نہ حضور کی نبوت ہی میں اختلاف ہوا۔

امام رازی نے تفسیر کبیر ابو حیان نیشاپوری اندلسی نے البحر المحیط اور علامہ نیشاپوری نے نظام القرآن قاضی ثناء اللہ پانی پتی نے تفسیر مظہری اور جناب نواب صدیق حسن خان نے فتح البیان اور علامہ شوکانی نے فتح القدیر میں تھوڑے سے اختلاف تعبیر کے ساتھ آیت کی یہی تشریح پیش کی ہے۔ یعنی ان بزرگوں کی پیش کردہ تشریح کو میں نے بتکرار سمجھنے کے لیئے پڑھا ہے مگر سچی بات یہ ہے کہ میں اس پر مطمئن نہیں ہوں۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ کیوں؛

وجہ اس کی یہ اور صرف یہ ہے کہ سیاق قرآنی کہہ رہا ہے کہ بنی اسرائیل کی مدح کی جارہی ہے۔ مگر ان بزرگوں کی تشریحات ببانگِ دہل کہہ رہی ہیں کہ اس آیت میں بنی اسرائیل کی مذمت ہو رہی ہے۔

فما اختلفوا فاتفریع کے لیئے ہے۔ یعنی اللہ کی جانب سے ان کو بہترین مقام ملنے اور ان کو اللہ سبحانہ کی جانب سے نعمتوں کی ارزانی کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی زندگی میں ان نعمتوں کا

کفر نہیں پیدا ہوا بلکہ انہوں نے شکر کیا ایسا نہیں ہوا جیسے ان مشرکین مکہ نے جن کو اللہ سبحانہ نے حرم میں ٹھکانا دیا امن وچین کی زندگی. رزق کی فراوانی عطا کی. لیکن ان انعامات کا شکریہ ادا کرنے کی جگہ کفر کو انہوں نے اپنایا. بنی اسرائیل کسی بھی نبوت کو ماننے میں پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے ہمیشہ نبوت کا استقبال کیا ہے۔ اختلاف خلف سے ہے. جس کے معنی پیچھے کے ہیں. یہ تو اب جب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کی جانب سے قرآن کی صورت میں علم لے کر آئے پیچھے رہے ہیں. یہ بعد میں آنے والے بنی اسرائیل جو نبوت کے شدید مخالف بن کر سامنے آئے ہیں ورنہ ان کے اسلاف کی تاریخ تو انبیا کو ماننا ہے. اس طرح حضور کے زمانے میں موجودہ یہودیوں کو ان کے اکابر کا نمونہ پیش کر کے ملامت کی ہے، یہی مطلب ہے کہ حضرت عبداللہ بن عباس کی اس بات کا کہ وہ یہودی مراد ہیں جو حضور کے زمانے میں تھے. یہ لوگ قرآن کے آنے سے پہلے آنے والے پیغمبر کو مانتے تھے. قرآن آنے کے بعد حضور کی تصدیق میں پیچھے رہے۔ یہ حقیقت ہے کہ یہودی نسل نے نبوت کی اس انداز میں تصدیق نہیں کی جس انداز میں ان کو کرنی چاہیئے تھی. چند گنتی کے یہودیوں کو چھوڑ کر کسی نے آپ کو نہیں مانا۔ اسی لیئے آگے فرمایا ہے ان ربك یقضی بینھم یوم القیامۃ فیما کانوا یختلفون ان اخلاف بنی اسرائیل کا آپ کی نبوت سے پیچھے ہٹ جانے کا فیصلہ اللہ سبحانہ روز قیامت فرمائے گا. اسلاف کے کارنامے ان کو کام نہ آئیں گے اس لیئے کہ جو دین کو گمراہی سے بچنے کی تدبیر کر لینی چاہیئے. تاکہ روز قیامت مواخذہ نہ ہو.

آیت کی یہ تشریح علامہ محمد طاہر ابن عاشور نے اپنی تفسیر التحریر والتنویر میں پیش کی ہے. اس میں ایک درجہ معنویت ہے. اور سیاق وسباق سے ہم آہنگ ہے.

فَإِنْ كُنْتَ فِي
شَكٍّ مِّمَّآ أَنْزَلْنَآ إِلَيْكَ فَسْـَٔلِ الَّذِينَ يَقْرَءُونَ الْكِتٰبَ مِنْ
قَبْلِكَ ۚ لَقَدْ جَآءَكَ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ
الْمُمْتَرِينَ ﴿۹۴﴾ وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الَّذِينَ كَذَّبُوا بِاٰيٰتِ اللّٰهِ
فَتَكُونَ مِنَ الْخٰسِرِينَ ﴿۹۵﴾

لہذا اگر آپ کو ماضی کے ان واقعات میں جو ہم نے آپ پر پیش کئے ہیں بفرض محال کوئی شک ہے تو ان کی تصدیق ان سے کر لیجئے جو آپ سے پہلے کتاب پڑھ رہے ہیں۔ بلاشبہ جو کچھ آپ کے رب کی جانب سے آپ کی طرف آئے ہیں یہ امر واقعہ اور حقیقت ہے اس میں شبہ و شک کی کوئی گنجائش نہیں ہے ۱۰۸ اس میں شک کر کے ان لوگوں میں سے نہ ہو جائیے جو آیات الٰہی کی تکذیب کر کے نقصان اٹھانے والوں میں سے ہو جاتے ہیں ۱۰۹

بلاغت کا ایک لطیف نکتہ

یہاں شارحین قرآن نے ایک عجیب و غریب بحث چھیڑ دی ہے لیجئے آپ بھی سن لیجئے بحث

یہ کہ یہاں قرآن میں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخاطب بناکر کہا ہے فان کنت فی شک سوال یہ ہے کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم جو مہبط وحی ہیں آپ کو شک کیسے ہوسکتا ہے! اگر آپ کو بھی وحی میں شک ہوسکتا ہے تو پھر دوسروں کو بدرجہ اوّل ہونا چاہیئے۔ اس شبہ کو دور کرتے ایک کی خود ان لوگوں نے جن کے ذہنوں میں یہ شبہ پیدا ہوا ہے۔ طرح سے نہیں مختلف انداز میں کوشش کی ہے۔ پہلے شبہ کی بنیاد و اساس معلوم کر لیجئے بنیاد یہ ہے کہ عربی زبان میں اذا یقینیات کے لیئے تو ممتنعات کے لیئے اور ان مشکوکات کے لیئے استعمال ہوتا ہے اور یہاں ان استعمال ہوا ہے۔ بزرگوں نے اس شبہ کا جو جواب دیا ہے اس میں بڑا تنوع اور نیرنگی ہے یہاں سب کا نقل کرنا ایک طویل عمل ہے اس لئے اردو شارحین قرآن سے نہیں مشہور تفاسیر سے کچھ ہدیہ ناظرین کرتا ہوں۔ شیخ الاسلام مولانا عثمانی فرماتے ہیں۔

بظاہر یہ خطاب پیغمبر علیہ السلام کو ہے لیکن حقیقت میں آپ کو مخاطب بناکر دوسروں کو سنانا مقصود ہے۔ جو ایک امی کی زبان سے ایسے عظیم الشان حقائق و واقعات سنکر حیرت زدہ رہ جاتے تھے اور جہل تعصب کی وجہ سے ان کی واقعیت میں شک و تردد کرتے تھے ورنہ ظاہر ہے کہ آپ خود ہی اپنی لائی ہوئی چیز کے بارے میں کیسے شک کر سکتے تھے اور جس کی طرف تمام دنیا کی دعوت دینے اور پہاڑ سے زیادہ مضبوط یقین سننے والوں کے قلوب میں پیدا کر دیتے تھے اس کو خود اپنی زبان سے کیسے جھٹلاتے۔ چند آیات کے بعد صاف فرما دیا۔ ان کنتم فی شك من دینی آیت صاف بتلا رہی ہے کہ شک کرنے والے دوسرے لوگ تھے جن کے مقابلہ میں آپ اپنے غیر متزلزل اور اصل عقیدہ کا اعلان کر رہے ہیں۔

حضرت مولانا اشرف علی رحمۃ اللہ بیان القرآن میں فرماتے ہیں۔

ظاہر میں خطاب آپ کو ہے مگر مقصود دوسروں کو ہے آپ کو خطاب کرنے میں ایک تو مبالغہ ہے اس دلیل کی کفایت میں کیونکہ صاحب وحی جو بلا واسطہ تلقی من اللہ ومن الملئکہ کرتا ہے۔ جب تلقی من اہل العلم جو تلقی من اللہ کا واسطہ ہے اس کے لیئے کافی ہوگی جو تلقی بلا واسطہ کر ہی نہیں سکتا اس کے لیئے تو وہ تلقی بدرجہ اولی کافی ہوگی۔

ا۔ افادات شیخ الاسلام ۱۱ - ۱ - ۱۱

حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب معارف القرآن میں لکھتے ہیں۔

آیت میں بظاہر خطاب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہے مگر یہ ظاہر ہے کہ آپ کو وحی میں شک ہونے کا احتمال نہیں اس لیے اس خطاب کے ذریعے اُمت کو سنانا مقصود ہے خود آپ مقصود نہیں ہیں۔

مولانا محمد ادریس کاندھلوی معارف القرآن میں فرماتے ہیں۔

بظاہر خطاب آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کو ہے لیکن درحقیقت مخاطب دوسرے لوگ ہیں۔ اس لئے کہ جس پر اللہ کی وحی نازل ہو رہی ہے اس کو شک وشبہ ہو ہی نہیں سکتا۔ اس خطاب کے اصلی مخاطب وہ لوگ ہیں جو شک وشبہ میں پڑے ہوئے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزاد فرماتے ہیں۔

قرآن کا اسلوب بیان یہ ہے۔ کہ مومنوں سے خطاب مقصود ہوتا ہے لیکن پیغمبر اسلام کو کرتا ہے۔ مثلاً یا ایھا النبی اذا طلقتم الخ پس یہاں بھی اگرچہ خطاب پیغمبر اسلام سے ہے۔ مگر مقصود مومنوں کی وہ ابتدائی جماعت ہے جو آغاز دعوت کی بے چارگی و مظلومی میں ایمان لائی تھی۔

مولانا ابوالاعلیٰ مودودی تفہیم القرآن میں فرماتے ہیں۔

یہ خطاب بظاہر نبی صلے اللہ علیہ وسلم سے ہے مگر دراصل بات ان لوگوں کو سنانی مقصود ہے جو آپ کی دعوت میں شک کر رہے تھے۔ اور اہل کتاب کا حوالہ اس لیئے دیا گیا ہے کہ عرب کے عوام تو آسمانی کتابوں کے علم سے بے بہرہ تھے اور ان کے لیئے یہ آواز ایک نئی آواز تھی مگر اہل کتاب کے علماء میں سے جو لوگ متدین اور منصف مزاج تھے وہ اس امر کی تصدیق کر سکتے تھے کہ جس چیز کی دعوت قرآن دے رہا ہے یہ وہی چیز ہے جس کی تمام انبیاء دعوت دیتے رہے ہیں۔

مولانا امین احسن اصلاحی تدبر قرآن میں فرماتے ہیں۔

بعض مرتبہ خطاب بظاہر پیغمبر صلے اللہ علیہ وسلم سے ہوتا ہے لیکن اس میں جو عتاب مضمر ہوتا ہے اس کا رُخ منکرین و مکذبین کی طرف ہوتا ہے وہ اپنی ضد کی وجہ سے چونکہ لائق خطاب نہیں رہ جاتے اس لئے بات پیغمبر کو خطاب کر کے کہی جاتی ہے۔

ان سب کی حیثیت تاویل کی ہے۔ شیخ الاسلام اور حضرت تھانوی کو چھوڑ کر اوروں کی تاویل میں بھی تضاد ہے۔ مولانا ابو الکلام فرماتے ہیں کہ حضور اقدس مخاطب ہیں مگر خطاب میں مقصود حضور نہیں بلکہ مومنوں کی وہ جماعت ہے جو آغاز دعوت کی بیچارگی اور مظلومی میں ایمان لائی تھی۔ مولانا مودودی فرماتے ہیں کہ روئے سخن ان لوگوں کی طرف ہے جو آپ کی دعوت میں شک کر رہے تھے۔ اور مولانا اصلاحی فرماتے ہیں کہ اس میں عتاب مضمر ہے اس کا رُخ منکرین و مکذبین کی طرف ہے وہ اپنی ضد کی وجہ سے چونکہ قابل خطاب نہیں ہیں اس لئے بات پیغمبر کو خطاب کرکے کہی جارہی ہے۔

یہ سب تاویلات اس لیے کی جارہی ہے کہ یہ بات طے کرلی گئی ہے کہ عربی میں اِنْ ان باتوں کے لیئے آتا ہے جن کا ہونا مشکوک ہو حالانکہ یہ کلی قانون نہیں ہے۔ اذا جب یقین کے لیئے آتا ہے۔ اور لو جیسے ممتنع اور محال کے لیئے آتا ہے ان ممکن اور مستحیل دونوں کے لیئے آتا ہے بلکہ محال عقلی کے لیئے بھی آتا ہے قرآن میں ان معنی میں آیا ہے۔

قل ان کان للرحمان ولد فانا اول العابدین

حالانکہ اللہ سبحانہ کے ولدیت کا تصور ہی ممکن نہیں ہے۔ ایسے ہی قرآن میں ان محال عادی کے لیئے بھی آیا ہے۔ جیسے

ان استطعت ان تبتغی نفقا فی الارض او سلما فی السماء فتاتیھم بآیۃ۔

اتنی بات ضرور ہے کہ محالات میں ان کا استعمال کم ہے۔ ابو حیان لکھتے ہیں ان کا مستقبل میں مستحیلات کے لیئے استعمال تھوڑا ہے۔ آگے لکھتے ہیں کہ یہ جگہ بھی ان ہی مواقع میں سے ہے۔ چونکہ عام شارحین قرآن کی نگاہ سے یہ نکتہ ذرا اوجھل رہا ہے۔ اس لیئے ان کو تاویلات کا سہارا لینا پڑا ہے اور آیت کی تشریح کے لیئے مختلف انداز اختیار کئے اب معنے یوں ہوں کہ اگر بفرض محال آپ کو اس میں کسی طرح کا شک ہے تو ان لوگوں سے پوچھ لیجئے جو پہلے کتابیں پڑھتے رہے ہیں اب معنی صحیح ہیں کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے آیئے اب آیت کا مطلب سنیئے۔

۱۰۸ لہذا اگر آپ کو ماضی کے ان واقعات میں جو ہم نے آپ پر پیش کیئے ہیں بفرض محال کوئی

شک ہے تو ان کی تصدیق ان سے کر لیجیئے۔ جو آپ سے پہلے کتابیں پڑھتے ہیں۔ یہ امر واقعہ اور حقیقت ہے اس میں شک و شبہ کی گنجائش ہی نہیں ہے جیسے فما اختلفوا کا فقرہ بطور تفریع کے بوا نا اور رزقنا کے بعد آیا تھا ٹھیک اسی طرح ان تمام واقعات کے بعد جن کو قرآن مکہ والوں کے لیئے بطور نصیحت اور عبرت بیان کیئے ہیں یہ تفریع آئی ہے۔ اس تفریع کے ذریعے اسلوب بیان مختلف ہوا ہے پہلے انداز بیان میں اور اس میں مکذبین نبوت پر تعریض ہے۔ پہلے اسلوب میں اہل مکہ کو خبردار کیا گیا تھا کہ تم پر بھی وہی کچھ بیتے گی جو حضرت موسیٰ کے مکذبین پہ گذر چکی اور اس اسلوب و انداز میں ان پر اہل کتاب کی شہادت کے ذریعے تعریض کی گئی ہے اگر ان حقائق سے تم بے خبر ہو تو حیان کاروا کی شہادت ان واقعات پر دیکھ لو اس سے ا نزلنا سے یہاں مراد وہ واقعات تاریخی ہیں جو اس صورت میں بیان ہوئے ہیں۔

آیت کے دو ہی مطالب ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ فی شک کی ظرفیت حقیقی ہے اور شک بولا گیا ہے اور مراد ارباب شک ہیں یعنی اگر آپ بالفرض ان میں سے ہیں جو ان واقعات کے ہونے میں شک کرتے ہیں۔ جیسے فتنہ بولکر اہل فتنہ اور قریہ بولکر اہل قریہ مراد لیتے ہیں تو ان واقعات کی تصدیق کے لیئے ان کے سامنے اہل کتاب کی تاریخی شہادت پیش کیجیئے وہ وہی کچھ بتائیں گے جو آپ سنا رہے ہیں۔ اس طرح شک کرنے والوں کا شک سر عام مٹ کر رہ جائے گا۔ اس طرح یہ آیت گرامی مشرکین مکہ کے خلاف ان کی معذرت کو ختم کرنے کے لیئے اہل کتاب کی شہادت کے ذریعے ایک بڑی حجت ہو گی۔

اگر فان کنت فی شک میں فی کی ظرفیت مجازی ہو اور روئے سخن حضور اقدس کی طرف ہے اور بات فی الواقع حضور کو مخاطب کر کے مشرکین کو سنائی جا رہی ہے یہ انداز سخن حکما اور اخلاقیین اپناتے ہیں۔ جیسے قرآن ہی میں ہے لئن اشرکت لیحبطن عملک۔

دونوں مطالب فاسأل الذین یقرءون الخ سے بھر پور انداز میں ہم آہنگ ہیں۔ اس سے یہ اشارہ ہے کہ اہل کتاب کے بیان کتابوں میں یہ واقعات صحیح ہیں اور ان کی تاریخی حیثیت مضبوط اور پائیدار ہے۔ اگر یہ واقعات تورات میں صحیح نہ ہوتے تو قرآن ان کو شہادت میں پیش نہ کرتا۔

آیت میں لقد جاءك الحق استینافیہ بیانی ہے یعنی ایک اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ مخاطبوں کے ذہن میں یہ سوال ابھرا کہ ان سے پوچھ کر کیا ہوگا۔ جواب میں فرمایا کہ حق وہی ہوگا۔ جو تیرے رب کی جانب سے تیرے پاس آچکا ہے۔ اس انداز بیان اختیار کرنے کا مقصد چونکہ بطور تعریض سامعین کے علم کی تربیت ہے نہ کہ نبوت کے علم کی۔ اس لیئے جملہ پر تاکیدی حرف لائے۔ ایک لام قسم، دوسرے قد تاکہ منکر کو یارائے انکار نہ ہو۔

فلا تکونن من الممترین میں مشرکین پر چوٹ ہے کہ آپ ان سے چوکنے رہیں۔ جو ضد اور فساد میں حق کو شک کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں اور شک کے کانوں سے سنتے ہیں۔ پوری آیت کا مطلب یہ ہے کہ لوگو! اگر تمہیں ان واقعات کی صداقت میں کوئی شک ہے تو اہل کتاب سے دریافت کرو وہ تمہیں بتائیں گے کہ یہ واقعہ اور حقیقت ہے۔ اب حق تمہارے پاس رب محمد کی جانب سے آچکا ہے اس لیئے اب تم اس میں شک نہ کرو اور نہ ہی اس کی تکذیب کرو۔ اگر ایسا کروگے تو اس میں سرتاسر تمہارا ہی گھاٹا ہے۔ مشرکین کو بتا دیا گیا کہ جو واقعات بھی ماضی میں ہو چکے ہیں ان کی کاپی آج بھی ہوگی۔ اگر اعمال وہی ہوں گے جن کی بنا پر وہ گرفت میں آ بیٹھے تھے۔ یہ واقعات حضرت موسیٰ کے فرعون ہی کے ساتھ مخصوص نہیں بلکہ ہر عہد کے فرعون اور ہر پیغمبر کے معاندین کے ساتھ یہی برتاؤ ہوتا ہے زمانہ نبوت محمدی کے فرعونوں کی نفسی کیفیت یہی تھی کہ ان کو نشانیاں دکھائی جاتی تھیں، مگر انہیں فساد کی کور باطنی کے باعث تسکین نہ ہوتی تھی کیونکہ ان کے شک وشبہ کا منشا محض عناد ہے حق طلبی نہیں ہے اگر حق طلبی مقصود ہوتی تو ایمان لے آتے

انسانی نفسیات کا خاصہ ہے کہ جب کسی کی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ اس کی کسی بات کو حسن ظن پر محمول نہیں کرتا اور اس کو اس کی ہر بات میں شر وخبث اور بدی ہی نظر آتی ہے۔ جلی سے جلی واضح سے واضح برہان بھی اس کے اترا اور اس کے قلب کے شک کو دور نہیں کر سکتے۔ معاندین جو انبیائے کرام کے مکارم اخلاق حسن تعلیم اور دیگر علمی وعملی کمالات کو باور نہیں کرتے اور ان کے لیئے اور بدیہی دعوؤں کو بھی تسلیم کرنے کے لیئے آمادہ نہیں ہوتے اور ہر قسم کی دلیلوں کو سن لینے کے بعد بھی وہ اپنے لا علاج مرض شک سے نجات نہیں پاتے تو وہ انبیاء سے معجزوں کا مطالبہ کرتے ہیں اور شک اور

بدگمانی سے انہیں یقین ہوتا ہے کہ ہماری طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسی عجیب و غریب کام پر
قدرت نہیں رکھتا اس لیئے وہ کبھی کوئی معجزہ نہ دکھائے گا۔ اور اس طرح اس کی رسوائی عالم
آشکارا ہو جائے گی۔ معجزات کو دیکھ کر معاندانہ رُوح ان کے دلوں کے شکوک کو دُور نہیں ہونے
دیتی اور بدگمانی انہیں بتاتی ہے کہ اگرچہ یہ خرق عادت ہے۔ مگر یہ خدائی
کرشمہ نہیں بلکہ یہ شیطانی عمل ہے اور سحر و جادو کی قوت ہے۔ حضرت موسیٰ نے فرعون کو متعدد
معجزات دکھائے مگر ہر ایک کے جواب میں انہیں یہی سُننا پڑا کہ یہ جادو ہے کفار قریش کا بھی
یہی حال تھا۔ کہ جب کوئی معجزہ دیکھتے تو کاہن اور جادوگر کی پھبتی کس دیتے۔ اس موقعہ
پر پہنچکر جو کچھ فرعون کے ساتھ ہوا وہی کچھ قریش مکہ کے ساتھ بھی ہوتا ہے۔ قرآن کی کچھ مختلف
سورتوں میں ان واقعات کو بکثرت بیان کیا گیا ہے۔ نیز اس کو اللہ تعالیٰ نے اپنا دستور اور قانون
فرمایا ہے جس میں تغیر اور تبدل ناممکن ہے۔ یہی بات یہاں آگے آرہی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ حَقَّتْ عَلَیْهِمْ كَلِمَتُ
رَبِّكَ لَا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۹۶﴾ وَلَوْ جَآءَتْهُمْ كُلُّ اٰیَةٍ حَتّٰى یَرَوُا
الْعَذَابَ الْاَلِیْمَ ﴿۹۷﴾ فَلَوْ لَا كَانَتْ قَرْیَةٌ اٰمَنَتْ فَنَفَعَهَاۤ
اِیْمَانُهَاۤ اِلَّا قَوْمَ یُوْنُسَ ؕ لَمَّاۤ اٰمَنُوْا كَشَفْنَا عَنْهُمْ عَذَابَ
الْخِزْیِ فِی الْحَیٰوةِ الدُّنْیَا وَمَتَّعْنٰهُمْ اِلٰى حِیْنٍ ﴿۹۸﴾

بلاشبہ وہ لوگ جو قانونِ الٰہی کا نشانہ بن چکے ہیں وہ ایمان نہ لائیں گے خواہ ان کے پاس ساری ہی نشانیاں آجائیں جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں گے ؀۹ پس کیا کوئی بستی ایسی ہے یونس کی بستی کے علاوہ کہ ایمان لائی ہو اور اس کا ایمان اس کے لئے نفع بخش ہوا ہو۔ یونس کی قوم جب ایمان لے آئی تو ہم نے دُنیا کی زندگی میں رسوائی کے عذاب کو ان سے ہٹا دیا۔ ایک خاص مُدت تک ان کو سروسامان حیات سے فائدہ اٹھانے کی مہلت دی ؀۱۰

فرعون کی ہلاکت کا خدائی قانون

گمراہی کا چہرہ ہمیشہ ایک ہی طرح رہا ہے۔ کوئی واقعہ ایسا نہیں ہے جس میں ظلم وفساد کی ایک نمود سے ظلم فساد کی دوسری نمود ہم رنگ نہ ہو۔ سب قوموں نے وہی کچھ کیا جو ان میں سے کسی ایک نے کیا تھا۔ سب نے دعوت سے انکار کیا۔ سب نے داعیوں کا مذاق اڑایا۔ سب نے دلائل سے بے رُخی کی سب نے روشنیوں سے آنکھیں بند کرلیں سب نے سرکشی اور گھمنڈ دکھائی۔ سب نے جبر وتشدد سے حق کی راہ روکنی چاہی سب نے موعظت ودلائل کا جواب ظلم وتعدی سے دیا۔ سب کی زبانوں سے ایک ہی طرح کی صدائیں نکلیں۔ سب کے اعراض وانکار میں ہم آہنگی رہی۔ پھر سب کو غرور وطغیان نے آخر وقت تک اس کی مہلت نہ دی کہ ہدایت و ضلالت کا فرق سمجھتے۔ نتیجہ بھی ہمیشہ ایک رہا۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ اس کے خلاف ہوا ہو۔ ہمیشہ اللہ سبحانہ کے فیصلہ کا انتظار کیا گیا اور ہمیشہ فیصلہ یہی ہوا کہ اہل ایمان نے نجات پائی۔ سرکشوں کے لیئے ہلاکت یہ گویا اللہ کا قانون ہے حکم رب ہے یہ کبھی بدل نہیں سکتا یہ گویا آگ کے لیئے گرمی برف کے لیئے ٹھنڈک ہے۔

سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا

یہ اعمال کے خواص کا قانون ہے بے شمار قومیں اسی زمین پر گذر چکی ہیں۔ ان کی بھی آبادیاں تھیں بسر لفلک عمارتیں تھیں فکر وعمل کی سرگرمیاں تھیں یہاں فرعون ہی کی سرگذشت نہیں بلکہ سرگزشتیں ہی سرگزشتیں ہیں۔ سعادت وشقاوت سب کے لیئے ہے۔ اگر ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے تو کیا تمہارے رؤسائے مکہ تم سمجھتے ہو کہ اللہ سبحانہ اپنا قانون اپنا کلمہ معطل کر دے گا۔ اور تمہارے لیئے اس قانون میں کوئی اثر نہ رہے گا۔

۹۶تا۱۰۰ بلاشبہ وہ لوگ جو قانون الٰہی کا نشانہ بن چکے ہیں وہ ایمان نہیں لائیں گے خواہ ان کے پاس ساری نشانیاں آجائیں۔ جب تک دردناک عذاب نہ دیکھ لیں گے۔ ان آیات میں پیغمبر کی زبان سے قرآن کے ہر مخاطب کو متنبہ کیا کہ کفر وتکذیب کی بیماری شک سے شروع ہوتی ہے۔ اگر تم کو قرآن کے بیان کردہ واقعات میں شک وشبہ ہو تو اس کا فوراً علاج کرو۔ یعنی جو لوگ کتب سابقہ کا علم رکھتے ہیں۔ ان سے تحقیق کر لو۔ آخر ان میں کچھ آدمی سچے اور انصاف

پسند بھی ہیں وہ بتائیں گے کہ نبی امی نے جو کچھ فرمایا ہے کہاں تک درست ہے بلا شبہ جو کچھ آپ لائے وہ سچ کے سوا کچھ نہیں ہے وہ پروردگار کا اتارا ہوا ہے جس میں شک و تردد کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اگر بیہودہ شکوک کا علاج نہ کیا جائے تو چند روز میں شک ترقی کر کے اترا د جدل اور اترا ترقی کرکے تکذیب کی حد تک پہنچ جائے گا۔ جس کا نتیجہ خسران وخرابی کے سوا کچھ نہیں۔ تکذیب کے بعد ایک اور درجہ ہے جہاں پہنچکر دل پر مہر لگ جاتی ہے تکذیب کرتے کرتے قبول حق کی استعداد ہی برباد ہو جاتی ہے۔ ایسا شخص اگر دنیا جہاں کے سارے نشان دیکھ لے تب بھی ایمان نہ لائیگا اسے عذاب الیم دیکھ کر ہی یقین آئے گا۔ جب کہ اس یقین سے کوئی فائدہ نہیں پہنچ سکتا۔ کلمۃ ربک۔ رب کی بات سے غالباً وہ ہے جو دوسری جگہ فرمایا لاملئن جھنم من الجنۃ و الناس اجمعین۔ جن لوگوں پر بدبختی سوء استعداد اور شامت اعمال سے یہ بات علم الٰہی میں ثابت ہو چکی ہے۔ یہاں ان کا ذکر ہے لہ

یہ جملہ ان الذین یا تو استیناف ہے اور ان پیشانی پر بات کو مضبوط بنانے کے لیئے لگایا ہے اور الذین سے مقصود مقرر و معین اشخاص ہیں اور مطلب یہ کہ بات ثابت شدہ اور ایک بے غبار حقیقت ہے کہ حضور اقدس کے مخاطبوں اور حضرت موسیٰ کے مخاطبوں میں کوئی فرق نہیں ہے دونوں کا معاملہ اعمال اور اعمال کے نتائج میں واضح اور صاف ہے وہ بھی ایمان کیلئے عذاب الیم کے مشاہدے کی انتظار میں ہے اور یہ بھی عذاب الیم کے انتظار میں تھے۔

جب اعمال میں یکسانی ہے تو اعمال کے نتائج میں بھی یکسانی ہوگی فرعونیوں کی ایسی حالت کی طرف حضرت موسیٰ نے اپنی فلا یومنوا حتی یروا العذاب الالیم میں اشارہ کیا تھا۔

حضور صلے اللہ وسلم کے مخاطبوں کی اسی حالت کی طرف یہاں قرآن نے حتی یروا العذاب الالیم کہہ کر اشارہ کیا ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ ایسا کیوں ہے۔

اس لیئے کہ قوموں اور جماعتوں کی سعادت و شقاوت کا قانون ایک ہے اور جس طرح اللہ سبحانہ کے سارے قوانین یکساں ہیں عالمگیر ہیں غیر مبدل ہیں اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک

لہ افادات شیخ الاسلام

ہی طرح رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام و نتائج بھی ظاہر ہوئے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہوتی۔ جس طرح سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہے خواہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں کھایا جائے اسی طرح قانون ہلاکت کے احکام و نتائج ہی ایک رہے ہیں خواہ کسی ملک اور کسی زمانہ میں پیش ہوں یہ نہیں ہو سکتا کہ حضرت موسیٰ کے زمانے میں تو فرعونیوں کے حق میں سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہو۔ اور اب حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں قریش کے لیئے زندگی ہو جائے۔ لہذا جو کچھ ماضی میں فرعونیوں کے لیئے پیش آچکا ہے ضروری ہے کہ اب قریشیوں کے لیئے ہی پیش آئے۔ اس میں کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی کیونکہ کلمہ رب میں تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے پیچھے پڑھ آئے ہو۔ لا تبدیل لکلمات اللہ

اگر ان الذین حقت کو تعلیل قرار دیا جائے کہ گذشتہ قوموں کے ساتھ جو کچھ ہوا ہوا ہے اس کی علت یہ ہے کہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ طبعیتیں جب حق سے عناد کرتے کرتے اس درجہ پر پہنچ جائیں تو ان کو ایمان کی توفیق نہیں ہوتی وہ عذاب الیم کو دیکھ کر ہی مانتے ہیں۔ مگر اس وقت کا ماننا سودمند اور نافع نہیں ہوتا ہے اس میں بھی قریش کو تعریضاً بتا دیا گیا ہے کہ تم بھی ماننے کے لیئے فرعونیوں کی طرح عذاب الیم کا انتظار کر رہے ہو۔ تم طالب حق نہیں ہو۔ تمہارے دلوں پر ضد تعصب اور ہٹ دھرمی کے تالے لگے ہوئے ہیں اور دنیا کے عشق میں مدہوش اور آخرت سے بے فکر ہو۔

تاریخ کی روشنی میں قریش کو تنبیہ

فلولا ایسا کیوں نہ ہوا کہ یونس کی بستی کے علاوہ اور کوئی بستی ایمان لے آتی کہ اسے اس کا ایمان فائدہ دیتا۔ یونس کی قوم جب ایمان لے آئی تو ہم نے دنیا کی زندگی میں ان کی رسوائی کا عذاب ان سے ہٹا دیا اور ایک خاص مدت تک ان کو سروسامان حیات سے فائدہ اٹھانے کی مہلت دی یعنی جتنی بستیاں اور شرارتوں کی وجہ سے مستوجب عذاب ٹھہریں ان میں سے کسی کو اسی طرح ایمان لانے کی نوبت نہ آئی جو عذاب الٰہی سے نجات دیتا صرف یونس علیہ السلام کی قوم کی ایک مثال ہے۔ جس نے ایمان لاکر اپنے کو عذاب الٰہی سے بال بال بچا لیا جو بالکل ان کے سروں پر منڈلا رہا تھا۔ اللہ سبحانہ نے ایمان کی بدولت دنیوی زندگی میں ان کے سر پر آنے والی بلا ٹال دی۔ اور

جس وقت تک انہیں دنیا میں رہنا تھا۔ یہاں کے فوائد و برکات سے منتفع کیا۔ مفسرین نے نقل کیا ہے کہ حضرت یونس علیہ السلام سرزمین موصل میں اہل نینوی کی طرف مبعوث ہوئے وہاں کے لوگ بت پرست تھے۔ یونس علیہ السلام لگاتار سات سال تک پند و نصیحت کرتے رہے انہوں نے ایک نہ سنی یوماً فیوماً انکار و تکذیب بڑھتا رہا۔ آخر حضرت یونس علیہ السلام نے تنگ آ کر ان کو آگاہ کیا کہ باز نہ آئے تو تین دن کے اندر عذاب آنے والا ہے جب تیسری شب آئی یونس علیہ السلام آدھی رات گذر جانے پر بستی سے نکل کھڑے ہوئے صبح ہوتے ہی آثار عذاب کے نظر آنے لگے۔ آسمان پر نہایت ہولناک اور سیاہ بادل چھا گئے جس سے سخت دھواں نکلتا تھا وہ ان کے مکانوں سے قریب ہوتا جاتا تھا۔ حتیٰ کہ ان کی چھتیں بالکل تاریک ہو گئیں یہ آثار دیکھ کر جب انہیں ہلاکت کا یقین ہو گیا تو یونس کی تلاش ہوئی وہ نہ ملے تو سب لوگ عورتوں اور بچوں سمیت بلکہ مواشی اور جانوروں کو بھی ساتھ لے کر جنگل میں نکل آئے اور سچے دل سے اللہ کی طرف رجوع ہوئے خوف سے چیخیں مارتے تھے اور بڑے اخلاص و تضرع سے اللہ سبحانہ کو پکار رہے تھے چاروں طرف سے آہ و بکا کی آوازیں بلند ہو رہی تھیں اور کہتے جاتے تھے امنا ما جاء بہ یونس۔ حق تعالیٰ نے ان کے تضرع و بکا پر رحم فرمایا اور آثار عذاب جو پیدا ہو چکے تھے اٹھا لیے گئے۔

یہاں علمائے سلف کے دو قول ہیں۔ اکثر علما کہتے ہیں کہ ابھی اصل عذاب کا ان کو معائنہ نہ ہوا تھا۔ صرف علامات و آثار نظر آئے تھے ایسے وقت کا ایمان شرعاً نافع اور معتبر ہے۔ ایمان یاس جو معتبر اور نافع نہیں ہے اس سے مراد یہ ہے کہ عین عذاب کو دیکھ کر ایمان لائے جیسے فرعون نے سمندر کی موجوں میں پھنس کر اقرار کیا تھا۔ بعض علماء کے نزدیک قوم یونس کا ایمان بھی ایمان یاس تھا۔ جو عام ضابطہ کے مطابق نافع نہ ہونا چاہیے۔ لیکن حق تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے خلاف قاعدہ بطور استثنا اس قوم کا ایمان معتبر گردانا۔ فرعون کے ایمان کی طرح رد نہیں فرمایا۔ اس کے بعد پھر اختلاف ہے کہ ان کا ایمان صرف دنیوی زندگی تک معتبر ہے کہ دنیا میں آنے والا عذاب ٹل گیا یا آخرت میں بھی موجب نجات ہوگا۔ حافظ ابن کثیر نے دوسرے احتمال کو ترجیح دی ہے یعنی دنیا و آخرت دونوں جگہ معتبر ہوگا واللہ اعلم حضرت شاہ صاحب نے نہایت لطیف و دقیق طرز پر آیت کی تفسیر کی ہے یعنی دنیا میں عذاب دیکھ کر یقین لانا کسی کو کام نہیں مگر قوم یونس کو اس واسطے کہ ان پر حکم عذاب نہ پہنچا

تھا حضرت یونس کی شتابی سے محض صورت عذاب نمودار ہوئی تھی تاکہ ان کی نگاہوں میں حضرت یونس کی بات جھوٹی نہ ہو۔ وہ ایمان لائے پھر بچ گئے اور صورت عذاب ہٹالی گئی اسی طرح مشرکین مکہ کہ فتح مکہ میں اسلامی فوج ان پر پہنچی قتل وغارت کے لیے لیکن ان کا ایمان قبول ہوگیا۔ اور امان ملی [1]

آیت کی تشریح سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے۔

حضرت یونس علیہ السلام کا عبرانی نام یوناہ تھا جو عربی میں یونس ہوگیا۔ ان کا زمانہ آٹھویں صدی قبل مسیح کے وسط کا ہے ان کا معاصر اسرائیلی بادشاہ پربعام تھا جس کا زمانہ ۷۸۰ء ق م تا ۷۴۱ء قبل مسیح ہے رہنے والے شہر نینوا کے تھے۔ جو اپنے زمانے میں اسیریا کی بر قوت حکومت کا پایۂ تخت تھا۔ اور آج تک عراق میں جہاں موصل ہے۔ اس کے مقابل دریائے دجلہ کے بائیں کنارے پر واقع ہے۔ اس وقت شہر کا رقبہ ۱۸۰۰ ایکڑ تھا۔ اس کی قدامت اس سے ظاہر ہے کہ اس کا ذکر حورابی کے نوشتوں میں ملتا ہے۔ ۲۲۸۵ء قبل مسیح میں۔ حضرت یونس بنی اسرائیل کے نبیوں میں سے ہیں اور عہد عتیق کے نوشتوں میں ایک نوشتہ ان کے نام سے بھیجا ہے۔ اس میں کچھ تفصیل تو ملتی ہے مگر وہ چنداں قابل اعتماد نہیں ہے کیونکہ اولاً تو وہ صحیفہ آسمانی نہیں ہے اور نہ ہی خود حضرت یونس کا نوشتہ ہے بلکہ ان کے چار پانچ سو برس بعد کسی نامعلوم شخص نے تاریخ یونس کے نام سے لکھ کر کتب مقدس میں شامل کر دیا ہے۔ ثانیاً اس میں دور از کار باتیں بھی پائی جاتی ہیں۔ جن کا سر پاؤں کوئی نہیں۔

جمہور علما کی تفسیر کے مطابق صحیح بات یہی ہے کہ حضرت یونس کی قوم پہ عذاب نہیں آیا بلکہ کچھ ابتدائی آثار نمودار ہوئے تھے جن میں سب سے بڑا اثر حضرت یونس کا عذاب کی دعا کر کے بستی کو چھوڑ دینا تھا جسے لوگوں نے فوراً محسوس کیا اور دوسرے آثار وقرائن کو دیکھ کر یقین کر لیا کہ یونس علیہ السلام بے شک اللہ کے سچے پیغمبر ہیں اور ایمان لے آئے۔

حافظ ابن حجر عسقلانی اور حافظ ابن کثیر نے حضرت عبداللہ بن مسعود حضرت عبداللہ

[1] افادات شیخ الاسلام

بن جبیر اور امام مجاہد سعید بن جبیر سے یہی نقل کیا ہے اور کہا ہے سلف الصالحین یہی تفسیر کرتے تھے حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔
غرض گذشتہ بستیوں میں سے کوئی بستی ایسی نہ تھی کہ اس کے باشندے اپنے نبیوں پر کامل ایمان لے آئے جس طرح یونس کی قوم یونس پر ایمان لے آئی۔ اور یہ باشندگان نینوی تھے اور ان کے ایمان لانے کا واقعہ ہے۔ کہ ان کے عذاب کے زمانے کا ڈر پیدا ہو گیا تھا جس سے ان کے پیغمبر نے ان کو ڈرایا تھا۔ جب انہوں نے عذاب کے آثار محسوس کئے اور دیکھا کہ حضرت یونس ان میں موجود نہیں ہیں اس وقت اللہ کی جناب میں پناہ گیر ہو گئے اور اللہ سے مدد مانگی۔

حضور اقدس کو تسلی

اسی آیت کی تشریح میں اس پہلو پر بھی غور فرمایئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی اس تمنا کا سارے نعمت ایمان سے مالا مال ہو جائیں۔ مختلف سورتوں اور مختلف شکلوں میں مظاہرہ ہوتا تھا۔ آیت میں یہ کہہ کر آپ کو تسلی دی جا رہی ہے کہ تاریخ نبوت میں کوئی بھی ایسا نہیں ہے کہ پوری کی پوری بستی نعمت ایمان سے مالا مال ہو گئی ہو۔ ہر پیغمبر کے ساتھ ایمان کے معاملہ میں صورت حال یہی رہی ہے کہ کچھ نے مانا اور کچھ نے نہیں مانا۔ صرف حضرت یونس کی قوم ساری تاریخ میں ایک منفرد مثال ایسی ہے کہ ایک حادثہ کی وجہ سے پوری کی پوری قوم نے آپ کی دعوت ایمان کو قبول کر لیا اور ان کا ایمان ان کے لیئے نافع اور سود مند ہوا۔ ذہن میں سوال اٹھا ہوا کہ ان کو کیا نفع ہوا۔ فرمایا جب ایمان کی نعمت سے ہمدوش ہو گئے تو اس کے نتیجے میں دنیوی ذلت و رسوائی کی جگہ ان کو عزت و رفعت ملی اور وقت مقرر تک ان کو دنیا کی زندگی میں بہت فائدہ اٹھانے کا موقعہ ملا۔ اسی طرح یہ آیت سیاق و سباق سے مربوط ہو گئی۔ سباق میں قانون بتایا تھا کہ جن میں طلب نہیں ہوتی ہے ان کو خود بخود ایمان نہیں ملتا ہے۔ بے طلب افراد آیات معجزات سے بھی ایمان نہیں لاتے ایمان کے لیئے طلب اہم اور بنیادی شرط ہے ایمان نام ہے دل کی پہنائیوں سے صداقت کو مان کر قبول کر لینے کا۔ لہذا جو لوگ طلب نہیں رکھتے وہ کبھی ایمان نہیں لاتے یہ معاملہ صرف آپ کے ساتھ نہیں سارے

سارے نبیوں کے ساتھ رہا ہے۔ سب کو کچھ نے مانا اور کچھ نے نہ مانا ہے۔ صرف حضرت یونس کی خوش قسمت تاریخ میں ایسی قوم ہے کہ اس نے بلا استثنا حضرت یونس کی آواز پر لبیک کہی۔

سباق میں بتایا جا رہا ہے کہ ایمان ارادی اور اختیاری چیز ہے بلا جبر و اکراہ ہے آپ کسی کے مفہوم میں ایمان داخل نہیں کر سکتے ہیں۔ ارادی و اختیاری ہونے کی وجہ سے ایمان وکفر قابل جزا وسزا ہیں۔

یہ گویا تاریخ کی روشنی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی گئی کہ آپ سے پہلے جس قدر بھی انبیاء آئے ہیں ان میں سے کسی بھی رسول کے مخاطب سارے کے سارے ایمان نہیں لائے۔ ساری تاریخ انبیاء میں صرف ایک مثال قوم یونس کی اس سے مستثنیٰ ہے کہ وہ پوری کی پوری قوم ایمان لے آئی تھی۔

اس طرح آیت قرآن اپنے مطالب کے لحاظ سے دو کام دے رہی ہے۔ قریش مکہ کو دھمکی بھی ہے اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی بھی ہے فلو لا کانت قریۃ ا؟ میں فا، تفریع کیلئے ہے اور لولا کے اصل معنے تو کسی کام پر انگیختہ کرنے کے آتے ہیں۔ اگر گذرے ہوئے حالات پر آئے تو ؟یخ تندیم اور تغلیط کا کام دیتا ہے۔ اور ایسے موقع پر اس کا مدخول ماضی ہوتی ہے مقصود اہل مکہ کو شرم دلانا ہے اور ایمان کے لیئے برانگیختہ کرنا ہے۔

لما امنوا جملہ مستانفہ ہے استثنائی معنے کو کھولا گیا ہے اور اس میں اشارہ ہے کہ اللہ سبحانہ کا معاملہ اہل مکہ کے ساتھ وہی ہوگا جو قوم یونس کے ساتھ ہوا تھا۔ وہ بھی عذاب کی علامات دیکھکر مسلمان ہوئے تھے اور اہل مکہ بھی جب فتح مکہ کے موقع پر فوجوں اور اسلامی لشکر کی آمد کی خبر سنیں گے تو سب نعمت ایمانی سے ہمدوش ہو جائیں گے اور واقع بھی یہی ہے کہ اگر وہ ایمان نہ لاتے تو وہ روز یوم الملحمہ ہوتا۔ ایمان لانے کی وجہ سے یوم المرحمہ بن گیا۔ شاہ عبدالقادر فرماتے ہیں۔

اسی طرح مکہ کے لوگ فتح مکہ میں ان پر فوج اسلام پہنچی قتل و غارت کو لیکن ان کا ایمان قبول ہوگیا اور امان مل گئی۔

جس طرح قوم یونس علامات عذاب دیکھ کر ایمان سے ہمدوش ہوتی تھی۔ اسی طرح اہل مکہ صرف اسلامی لشکر کی آمد مکہ میں سنکر ایمان لے آئے نہ مقابلہ کیا اور نہ قیدی بنے اس طرح آپکی

قوم کے سارے لوگ آہستہ آہستہ داخل ایمان ہو گئے صرف شریر قسم کے لوگ اس سے محروم رہے اور وہ مختلف غزوات میں کام آ گئے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اپنی اپنی قوم کی تباہی کی دعا مانگی۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بدر میں جو دعا مانگی تو صرف اہل ایمان کی نصرت و فتح کی دعا مانگی۔ اہل مکہ کی تباہی اور بربادی کی دعا نہیں مانگی۔ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم مکہ سے مایوس ہو کر طائف تشریف لے گئے وہاں بھی کوئی حق سننے والا نہ تھا۔ بازار اور راستہ میں شریروں نے پتھر مارے یہاں تک کہ قدم مبارک خون آلود ہو گئے۔ آپ مکہ واپس آ رہے تھے کہ فرشتہ جبال نے آپ کو ندا دی کہ اگر اجازت ہو تو پہاڑوں سے ان کو چکنا چور کر دیا جائے۔ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اب بھی یہ دعا نہیں کی اور بارگاہِ الٰہی میں عرض کی کہ یا اللہ ان کو ہلاک نہ کر شاید کہ ان کی نسل سے کوئی توحید کا پرستار پیدا ہو۔ صحیح بخاری اور مسلم میں ہے کہ حضرت عائشہ نے آپ سے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ اُحد کے علاوہ آپ پر سخت دن کون سا تھا۔ فرمایا وہ دن جب میں نے طائف کے سردار عبد یالیل کے سامنے اپنے کو پیش کیا اور اس نے انکار کیا میں مغموم واپس آ رہا تھا کہ فرشتہ جبال نظر آیا اس کے بعد کفار کی ہلاکت کا فرشتہ کی اجازت طلبی اور اپنا جواب بیان کیا۔ حضور اقدس نے اس دن کو ایام مصائب کی تاریخ میں سب سے زیادہ سخت دن اس لیئے فرمایا کہ یہ قریش کی فرصت اور مہلت کی آخری گھڑی تھی اب ہلاکت ان کے سروں پر منڈلا رہی تھی۔ اور حضور اقدس کو اس کا صدمہ تھا۔ اسی صدمہ کا اظہار آپ نے حضرت عائشہ کے جواب میں اس انداز سے کیا۔

وَلَوْ شَآءَ
رَبُّكَ لَاٰمَنَ مَنْ فِی الْاَرْضِ كُلُّهُمْ جَمِیْعًا ؕ اَفَاَنْتَ تُكْرِهُ
النَّاسَ حَتّٰی یَكُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ ﴿۹۹﴾ وَمَا كَانَ لِنَفْسٍ اَنْ
تُؤْمِنَ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰهِ ؕ وَیَجْعَلُ الرِّجْسَ عَلَی الَّذِیْنَ لَا
یَعْقِلُوْنَ ﴿۱۰۰﴾ قُلِ انْظُرُوْا مَاذَا فِی السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ
وَمَا تُغْنِی الْاٰیٰتُ وَالنُّذُرُ عَنْ قَوْمٍ لَّا یُؤْمِنُوْنَ ﴿۱۰۱﴾ فَهَلْ
یَنْتَظِرُوْنَ اِلَّا مِثْلَ اَیَّامِ الَّذِیْنَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِهِمْ ؕ قُلْ
فَانْتَظِرُوْۤا اِنِّیْ مَعَكُمْ مِّنَ الْمُنْتَظِرِیْنَ ﴿۱۰۲﴾ ثُمَّ نُنَجِّیْ رُسُلَنَا
وَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا كَذٰلِكَ ۚ حَقًّا عَلَیْنَا نُنْجِ الْمُؤْمِنِیْنَ ﴿۱۰۳﴾ ع

اے پیغمبر اگر تیرا پروردگار چاہتا تو سارے زمین والے مومن ہو جاتے
تو کیا آپ ان کو مجبور کر کے ایمان والے بنائیں گے [۹۹] اور یاد رکھو
کوئی جان اللہ کے حکم کے بغیر ایمان نہیں لا سکتی اور اللہ سبحانہ ان
لوگوں کو گندگی میں رکھتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے [۱۰۰] اب ان

سے کہہ دیجئے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ان کو غور سے دیکھو
اور جو مانتے نہیں ہیں ان کو نشانیاں اور ڈراونی باتیں کچھ فائدہ نہیں
دیتی ہیں ۱۰۱ لہذا کیا یہ لوگ ماننے کے لیے گذشتہ تاریخ کے
دہرائے جانے کا انتظار کر رہے ہیں اگر ایسا ہے آپ فرمائیے انتظار کرو،
میں بھی انتظار کرنے والوں میں تمہارے ساتھ ہوں ۱۰۲ پھر اس وقت
ہم اپنے رسولوں کو اور اہل ایمان کو بچالیں گے۔ ایسا ہی ہو کر رہے گا
اہل ایمان کو بچا لینا ہماری ذمہ داری ہے ۱۰۳

ایمان میں جبر واکراہ نہیں ہے

قرآن نے جا بجا یہ حقیقت واضح کی ہے کہ انسانی طبیعت واستعداد کا اختلاف فطری ہے اور اللہ سبحانہ کی مشیت یہی ہوئی کہ یہ اختلاف ظہور میں آئے اگر وہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طرح کی طبیعت ایک طرح فکری وعلمی حالت پر مجبور کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں چاہا اس کی حکمت کا یہی فیصلہ ہوا کہ انسان میں ہر طرح کی حالت پیدا کرنے کی استعداد ہو۔ اور ہر طرح کی راہ اس کے آگے کھول دی جائے۔ وہ اگر ہونا چاہے تو زیادہ سے زیادہ اونچا ہونا چاہیے اور اگر پست ہو۔ جائے تو زیادہ سے زیادہ پستی میں گر سکے تنوع واستعداد کا نتیجہ ہے کہ فکر وعمل کے ہر گوشہ میں مختلف حالتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک فرد وجماعت کا ذوق ایک طرح کا ہوا دوسرے کا دوسری طرح کا۔ ایک کی سمجھ ایک طرف گئی دوسرے کی دوسری طرف ایک نے ایک راہ پسند کی کہ حق ہے دوسرے نے اسی سے انکار کیا کہ حق نہیں ہے اور پھر اسی اختلاف فکر وعمل نے ہدایت وسعادت اور شقاوت وضلالت کی وہ کش مکش پیدا کر دی جسے قرآن آزمائش حیات سے تعبیر کرتا ہے۔ لیبلوکم ایکم احسن عملاً وہ تمہیں کش مکش

حیات کی آزمائش میں ڈالتا ہے تاکہ کھل جائے کہ تم میں سے کون ہے جس کے عمل سب سے زیادہ اچھے ہوتے ہیں کیونکہ اس کش مکش میں کامیاب وہی ہوگا جو اپنے عمل میں احسن واقع ہوگا۔

اس آیت میں بھی اسی حقیقت کی طرف اشارا کیا ہے! مختصر لفظوں میں کتنی عظیم الشان بات کہدی فرمایا فکر و استعداد کا اختلاف یہاں ناگزیر ہے اور ایمان کوئی ایسی چیز نہیں ہے کہ زور زبردستی سے کسی کے اندر ٹھونس دی جائے یہ تو اسی کے اندر پیدا ہوگا جس میں فہم و قبول کی استعداد ہے پھر اگر تم پر یہ بات شاق گذرتی ہے کہ کیوں لوگ ایمان نہیں لاتے تو کیا آپ لوگوں کو مجبور کریں گے کہ نہیں۔ تمہیں ضرور مان ہی لینا چاہیئے۔

اس آیت نے یہ حقیقت بھی کھول دی ہے کہ قرآن کے نزدیک دین و ایمان کا معاملہ ایک ایسا معاملہ ہے۔ جس میں جبر و اکراہ کا تصور ہی نہیں کیا جا سکتا۔ سورہ بقرہ کی آیت اس بارے میں قرآن کا مقررہ قانون ہے۔ لا اکراہ فی الدین [1]

[2] اے پیغمبر اگر آپ کا پروردگار چاہتا تو سارے زمین والے مومن ہو جاتے تو کیا آپ ان کو مجبور کر کے ایمان والے بنائیں گے یعنی آپ کو یہ قدرت نہیں کہ زبردستی کسی کے دل میں ایمان اتار دیں اللہ سبحانہ چاہتا تو بے شک سب آدمیوں کے دلوں میں ایمان ڈال سکتا تھا۔ مگر جب کہ پہلے متعدد مواضع پر تقریر کی جا چکی ہے ایسا کرنا اس کی تکوینی مصلحت و حکمت کے خلاف تھا۔ اس لیے نہیں کیا ہے [2] مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کی یہی مشیت میں ہوتی کہ اس کی زمین میں صرف اہل ایمان ہوں اور کفر کا نام و نشان نہ ہو تو اللہ سبحانہ کے لیے یہ کام کوئی مشکل نہ تھا کہ تمام روئے زمین کے انسانوں کو مومن ہی پیدا کرتا۔ اور نہ ہی مشکل تھا کہ سب کے دل اپنے ایک تکوینی اشارے کے ذریعے ایمان کی طرف پھیر دیتا۔ لیکن انسان کی تخلیق میں جو حکیمانہ مقصد اللہ سبحانہ کے پیش نظر ہے وہ شرمندہ ظہور نہ ہوتا۔ بلاشبہ اللہ سبحانہ کو کفر پسند نہیں ایمان پسند ہے۔ لبشرطیکہ لوگ اپنی عقل اور اپنے مجز کی راہنمائی میں ایمان لائیں۔

یہاں یہ بات ذہن نشین کر لیجیے کہ یہاں دو صداقتیں ہیں ایک یہ کہ اللہ سبحانہ کی اجازت کے بغیر درخت کا ایک پتہ بھی گر نہیں سکتا دوسری یہ کہ ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرد ہے یعنی اللہ کی ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور ناقابل رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادے کے

---

[1] ترجمان القرآن، [2] افادات شیخ الاسلام۔

مطابق اپنے کام کرنے والے اعضا کو ہلانے کی مشروط طاقت دی ہے۔ یہی ارادہ اور اعضا کو حرکت دینے کی محدود طاقت اور قدرت انسان کی ذمہ داری، تکلیف باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے اور اسی پر اس کے اعمال اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے اس تطبیق سے نہ تو اللہ سبحانہ کی قدرت واختیار کی وسعت میں فرق آتا ہے اور نہ انسان کا تمام تر مجبور ہونا لازم آتا ہے اللہ جب چاہے انسان سے اپنے دیئے ہوئے اختیار کو چھین لے۔ مگر ایک وقت مقرر تک اپنے بنائے ہوئے قانون کے مطابق انسان کو ارادہ واختیار سے محروم نہیں کرے گا۔ فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر

ایمان کے باب میں سنت الٰہی

۱۰۰ اور یاد رکھو کوئی جان اللہ کے حکم کے بغیر ایمان نہیں لا سکتی اور اللہ سبحانہ ان لوگوں کو گندگی میں رکھتا ہے جو عقل سے کام نہیں لیتے خدا کی مشیت وتوفیق اور حکم تکوینی کے بغیر کوئی ایمان نہیں لا سکتا اور یہ حکم وتوفیق ان ہی کے حق میں ہوتی ہے۔ جو اللہ کے نشانات میں غور کریں اور عقل وفہم سے کام لیں۔ جو لوگ سوچنے اور سمجھنے کی تکلیف گوارا نہیں کرتے انہیں اللہ تعالیٰ کفر وشرک کی گندگی میں پڑے رہنا دیتا ہے سلہ

یہاں اذن الٰہی کا کلامی موشگافیوں سے الگ ہو کر مطلب سمجھ لیجئے۔ یہاں اذن تکوینی اور تقدیری ہے یعنی نفس انسانی میں اللہ سبحانہ نے ایسی صلاحیت اور استعداد تکوینی طور پر رکھی ہے جس کے ذریعے وہ حق وباطل میں تمیز کر سکتا ہے۔ صلاح وفساد کے فرق کو سمجھ سکتا ہے۔ نظر صحیح کے ذریعے صحیح چیز کی اسے معرفت حاصل ہو سکتی ہے۔ اللہ کی عطا کردہ اس قوت کو استعمال کرتا ہے اور اپنے اندر ارادہ کرتا ہے تو اللہ کی جانب سے اسے خیر کی صلاح کی اور حق پر چلنے کی توفیق ارزانی ہو جاتی ہے اس لئے طاعت اور معصیت دونوں ارادی اور اختیاری ہیں۔ اس میں اللہ سبحانہ کا حکیمانہ دستور یہ ہے کہ جو شخص طاعت ومعصیت میں اپنی عقل کو ٹھیک کرتا ہے اس کے لئے اللہ سبحانہ کی جانب سے حقائق تک پہنچنے کے اسباب وذرائع اس کی محنت اور جد وجہد کے مطابق مہیا کر دیئے جاتے ہیں۔ اور اسی کو صحیح علم پانے اور ایمان لانے کی توفیق ارزانی ہوتی ہے اور وہ لوگ جن میں حق کی طلب ہی نہیں ہوتی اور جو تلاش حق کے لئے اپنی عقل کو استعمال ہی نہیں کرتے تو ان

سلہ افادات شیخ الاسلام

کو اللہ سبحانہ کی توفیق نہیں ہوتی بلکہ اس کے لیئے اللہ سبحانہ کے خزانہ میں جہالت، گمراہی، غلط اور غلط بینی کی نجاست کے سوا کچھ نہیں ہے۔ یہاں دو تاریں ہیں ایک بندے کے پاس ہے۔ یہ ارادہ کا تار ہے دوسرا اللہ سبحانہ کے پاس ہے اور یہ توفیق کا تار ہے دونوں تار حرکت کرتے ہیں تو ایمان کی روشنی ظاہر ہوتی ہے۔ یا یوں کہہ لیجئے یہاں دو روشنیاں ہیں ایک اندر کی روشنی اور دوسری باہر کی روشنی۔ ایک بندے کے ارادے کی روشنی دوسری اللہ کی توفیق کی روشنی جب تک دونوں وجود ہی تندرست اور صحیح نہ ہوں حقیقت نظر نہیں آتی۔ سو کیا کیسی ہی جو دیں آئیں اور خود دیکھیں استعمال کرے جب تک باہر روشنی نہ ہو آنکھ کچھ نہیں دیکھ سکتی۔ اور دوپہر میں آفتاب کتنا ہی تاباں ہو لیکن اندھا دیکھ نہیں سکتا۔ یہ اللہ کا قانون اور سنتہ ہے۔ جو بھی ایمان لاتا ہے۔ وہ اللہ کے حکم اور توفیق سے ایمان لاتا ہے اور یہ توفیق ان کو ملتی ہے۔ جو اللہ سبحانہ کی بخشی ہوئی تکوینی استعداد عقل اور سمجھ سے کام لیتے ہیں۔ جو لوگ عقل اور سمجھ سے کام نہیں لیتے اور اس کے لیئے ارادہ نہیں کرتے ان کی بصیرت پر اللہ سبحانہ ان کے اعمال کی نجاست مسلط کر دیتا ہے۔ اس کے نتیجے میں وہ اتباع ہوا کا شکار ہو کر اتباع ہدیٰ سے محروم ہو جاتے ہیں۔

اذن اللہ کا مقابلہ یجعل الرجس علی الذین لا یعقلون سے رکھ کر بتا دیا گیا ہے کہ ایمان کی حالت عقل و تبصیر کی لافانی اور فرزانگی کی حالت ہے۔ اور کفر و نفاق جہل و کودی اور گندگی و نجاست کی حالت ہے۔

علامہ بقاعی نے یہ بات بہت خوب لکھی ہے کہ علی الذین لا یعقلون سے ان لوگوں پر تعریض ہے جو اپنے آپ کو سب سے بڑے فرزانے صاحب بصیرت اور تمام علوم و فنون کا مالک سمجھتے ہیں لیکن دین کے معاملے میں عقل کو استعمال نہیں کرتے ہیں اور اس کے نتیجے میں ساری برائیوں کا گہوارہ بنے رہتے ہیں۔

۱۰۱ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ جو کچھ آسمانوں اور زمین میں ہے ان کو غور سے دیکھو اور جو مانتے نہیں ہیں ان کو نشانیاں اور ڈراونی باتیں کچھ فائدہ نہیں دیتی ہیں۔ یعنی سوچنے اور غور کرنے والوں کے لیئے آسمان و زمین اللہ سبحانہ کی قدرت و حکمت اور توحید و تفرید کے کیا کچھ نشان موجود ہیں بلکہ ذرہ ذرہ اور پتہ پتہ اس کی توحید پر دلالت کر رہا ہے۔ لیکن جو کسی بات کو ماننا اور تسلیم کرنا نہیں چاہتا اس کے لیئے یہ سب نشانات و دلائل بیکار ہیں۔ اور ڈرانے والے پیغمبر کی تنبیہ و تخویف بھی غیر

مؤثر ہے لہ دراصل اللہ سبحانہ نے اپنی روحانی کائنات کو بھی ایک نظام اور اصول کے تحت رکھا ہے۔ اس لیے ہمیں چاہیئے کہ ان مصالح اور اسباب کا پتہ لیں جن کی وجہ سے باوجود قدرت کے اور باوجود شدت ضرورت کے معجزات سے کلیۃً انکار کیا گیا یا ان کے ظہور میں تاخیر ہوئی۔ اصل بات یہ ہے کہ معجزات کے ذریعے جو لوگ ایمان لاتے ہیں ان کا ایمان محض جبری تقلیدی۔ اور بالواسطہ ہوتا ہے۔ وہ لوگ اپنے دلوں میں انبیا کے محاسن تعلیم کا کوئی خاص ذوق نہیں رکھتے ہیں۔ صرف معجزہ کی قوت اور اعجوبگی ان کو متحیر اور مبہوت کر دیتی ہے حالانکہ نبوت کی تعلیم کا سب سے بڑا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ان کی جماعت میں ایسے افراد شامل ہوں جو شریعت کے رمز شناس اور اس کے اسرار حکم سے ذوق آشنا ہوں۔ قرآن کی زبان میں اسی کو شرح صدر اور انشراح قلب کہا جاتا ہے۔ اس قسم کے لوگوں کے لیئے معجزات کی ضرورت نہیں ہوتی ان کے لئے آفتاب و ماہتاب آسمان و زمین دن اور رات غرض دنیا کا ایک ایک ذرہ معجزہ ہوتا ہے اور اللہ سبحانہ کی وحدانیت اور پیغمبر کی نبوت پر بلاواسطہ دلالت کرتا ہے۔ ان کے لیئے صرف تفکر اور بصیرت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہی گروہ ہے جس پر سب سے زیادہ انبیا کی نگاہ انتخاب پڑتی ہے اور وہ ان کو صرف تفکر و اعتبار کی ترغیب دیتے ہیں۔ اس گروہ کے بالمقابل ایک کور باطن فرقہ اور بھی ہوتا ہے جس پر نظام فطرت کے دوسرے شواہد و آیات کی طرح معجزات کا بھی کوئی اثر نہیں ہوتا۔ انبیاء کو ابتدائے بعثت سے انہی دو گروہوں سے سابقہ پڑتا ہے اور چونکہ فطرتاً ایک معجزات سے بے نیاز ہوتا ہے اور دوسرے پر معجزات کا کوئی اثر نہیں پڑتا اس لیے ان دونوں گروہوں کے لیئے معجزات بیکار ہو جاتے ہیں۔ اور اس بنا پر نبوت معجزہ پیش کرنے سے انکار کرتی ہے۔ اس آیت میں بیان کیا ہے

قل انظروا جملہ اسی بات کو ہے یعنی اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ جب یہ بات بتائی گئی ولو شاء ربك الخ اللہ مشیت ہی نے طبائع میں اختلاف رکھا ہے آپ جبراً ایمان کسی کے اندر نہیں تار سکتے تو منشا سوال پیدا ہوا کہ پھر میں کیا کروں؟ جواب میں فرمایا قل آپ ان کو کائنات میں نظر کی دعوت دیں اس سے معلوم ہوا کہ معرفت حقیقت کی راہیں صرف دو ہیں نظر اور فکر۔ یہاں نظر سے نظر قلبی اور بصری دونوں مراد ہیں۔ فکر یہ کہ اللہ سبحانہ کی دی ہوئی عقل سے کام لیں اور سوچیں اور سمجھیں یہی نظر قلبی ہے اور نظر بصری یہ کہ کارخانہ ہستی کے عجائب و دقائق کا مشاہدہ کریں اور اس سے بصیرت حاصل کریں۔ جو شخص ان دو باتوں سے محروم ہے وہ اندھا بہرا ہے اور گمراہی سے

لوٹنے والا نہیں ہے اسے دنیا بھر کی نشانیاں کام نہیں دے سکتی ہیں. یہاں لفظ عن قوم کو نکرہ لاکر اس کی صفت لا یومنون لاکر یہ بتانا ہے کہ بے ایمانی ان کا قومی شعار بن چکی ہے اگر جملہ عن قوم لا یومنون کی جگہ عن لا یومنون ہوتا تو یہ معنویت نہ پیدا ہوتی. عنبری کے شعر میں بھی یہی بات کہی گئی .

قوم اذا الشر ابدی ناجذیہ لھم — طاروا الیہ زرافات ووحدانا

یعنی میدان جنگ میں شجاعت کے جوہر دکھانا ان کا قومی نشان ہے .

مطالبہ عذاب کا جواب

۱۰۲ لہذا اب بھی کیا یہ لوگ ماننے کے لیئے گذشتہ تاریخ کے دہرانے جانے کا انتظار کر رہے ہیں اگر ایسا ہے تو آپ فرما دیجیئے کہ انتظار کرو میں بھی انتظار کرنے والوں میں تمہارے ساتھ ہوں ایسی ضدی اور معاند قوم کے لیئے جو کسی دلیل اور نشان کو نہ ماننے اور کچھ باقی نہیں بجز اس کے کہ گذشتہ مکذبین پر جو آفات وحوادث نازل ہوئے ہیں ان کا یہ بھی انتظار کریں سو بہتر ہے کہ ہم اور تم دونوں مل کر اس وقت کا انتظار کرتے ہیں. تاکہ صادق وکاذب کا آخری فیصلہ سامنے آجائے لہ

کفار کے لیئے نتائج سے معجزات کی دو قسمیں ہوتی ہیں. معجزہ ہدایت اور معجزہ ہلاکت. نبوت پہلے کفار کو ہدایت کی نشانیاں دکھاتی ہے اور ان کو حق کی دعوت دیتی ہے. کفار کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزا ہوتے ہیں وہ اس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں یہاں تک کہ بالآخر وہ وقت آجاتا ہے جب مادہ فاسد کے سوا کفار میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہتا یعنی اس کثیف مادے سے چھٹ کر تمام اجزا اسے لطیفہ الگ ہو جاتے ہیں اور ڈھیر کھونس کے سوا باقی کچھ نہیں رہتا تو اس وقت آیت ہلاکت آسمان کی بجلی فضا کی آندھی۔ زمین کا سیلاب لوہے کی تلوار بن کر رونما ہوتی ہے . اور سطح خاکی کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتی ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک سے زیادہ معجزے عطا ہوئے کہ ان کو دکھا کر فرعون کو حق کی طرف دعوت دی جائے جب ایک مدت کے بعد اہل مصر میں سے جس قدر لوگ ایمان لاسکتے تھے لے آئے تو حضرت موسیٰ کو شق بحر کا معجزہ ہلاکت عنایت ہوا. حضرت نوح معجزہ طوفان حضرت

لہ افادات شیخ الاسلام ا، ہ نمبر ۱۹

صالح کو ناقہ اور حضرت لوط کو ہلاکت سدوم کی نشانی اور حضرت شعیب کو آیت رجفہ عطا ہوئی ان میں سے ہر معجزہ اور نشانی کے بعد معاندین کی ہلاکت استیصال اور بربادی ہوئی۔ قرآن نے اسی کو مثل الذین من قبلھم کہا ہے کہ ہر پیغمبر کی قوم میں اسی طرح ہوتا چلا آیا ہے۔ یہاں ھل استفہامیہ کے ذریعے قریش مکہ سے یہی سوال کر رہا ہے کہ معجزات ہدایت تو یکے بعد دیگرے آچکے ہیں۔ اب تمہیں صرف معجزہ ہلاکت کا انتظار ہے۔ اس آیت میں قریش کو اسی کی اطلاع دی جارہی ہے کہ اب تمہاری فرصت اور مہلت کی آخری گھڑی ہے۔ اور معجزہ ہلاکت تمہارے سر پر ہے

فھل ینتظرون میں فاتفریع کے لیئے ہے یعنی جب معجزات ہدایت اور ڈراونی باتیں ان کو کام نہیں دیتی ہیں۔ تو پھر کیا کر رہے ہیں اب معجزہ ہلاکت کا انتظار اے پیغمبر ان سے کہو اگر تم بھی چاہتے ہو تو بس انتظار کرو کہ گذشتہ قوموں جیسا تمہاری ساتھ معاملہ ہو۔ یہاں انی معکم من المنتظرین اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے ہم تو انتظار کریں گے آپ کیا کریں گے۔ فرمایا تم ہلاکت کا انتظار کرو۔ میں اللہ سبحانہ کی مدد کا انتظار کروں گا۔ آیت میں معیت نفس انتظار میں ہے۔ نتیجہ انتظار میں نہیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ کو قریش کے لیئے معجزہ ہلاکت کا بے حد صدمہ تھا۔ تاہم قریش کو آخری کی اس آیت میں اطلاع دی اور وہ نادان استہزا کرتے تھے کہ آنحضرت صلے اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں اکثر کہتے کہ جس ہلاکت کی آنے کی بات رہے وہ کب آئے گی۔

ویقولون لولا انزل علیہ آیۃ من ربہ فقل انما الغیب للہ فانتظروا انی معکم من المنتظرین۔

وہ کہتے ہیں کہ کیوں نہیں اتاری گئی نشانی اس کے رب کی طرف آپ فرما دیجئے کہ غیب تو اللہ ہی جانتا ہے تم انتظار کرو میں تمہارے ساتھ انتظار کرنے والوں میں سے ہوں۔

اہل ایمان کے لیئے بشارت

۱۰۳ پھر اس وقت ہم اپنے رسولوں کو اور اہل ایمان کو بچالیں گے ایسا ہی ہو کر رہے گا۔ اہل ایمان کو بچا لینا ہماری ذمہ داری ہے یعنی جیسی پہلی قوموں کے ساتھ ہماری عادت رہی ہے کہ منکرین کو ہلاک کرکے پیغمبروں اور مومنین کو بچایا۔ اسی طرح موجودہ اور آئندہ مومنین کی نسبت ہمارا وعدہ ہے

کر ان کو نجات دیں گے ۔ آخرت میں عذاب الیم سے اور دنیا میں کفار کے مظالم اور سختیوں سے ہاں شرط یہ ہے کہ مومنین مومنین ہوں یعنی وہ صفات و خصال رکھتے ہوں جو قرآن و حدیث میں مومنین کی بیان ہوئی ہیں لے

پہلی آیت میں مخالفین کو معجزہ ہلاکت کی اطلاع دی گئی تھی ۔ اور عذاب والی جگہ میں اللہ کا رسول اور اہل ایمان بھی رہتے ہیں۔ اس لیے فرمایا۔ ثم ننجی رسلنا والذین آمنوا علامہ بقاعی فرماتے ہیں کہ ثم تراخی کے لئے آتا ہے ۔ اس سے معلوم ہو کہ قریش مکہ کا ابتلا طویل ہوگا۔ اور ساتھ ہی یہ بھی بتا دیا کہ اس وقت رسول اور اہل ایمان کی نجات کا عمل بڑا عظیم اور کذ الک سے یہ بات جتائی کہ جیسا کافروں کو معجزہ ہلاکت کے ذریعہ ہلاک کرنا ہمارا کام ہے اور اہل ایمان کو بچا لینا ہماری ذمہ داری ہے ۔

نبوت جو مقصد لے کر آتی ہے خواہ کسی قدر مشکلات پیش آئیں کتنی ہی رکاوٹیں ہوں کتنی ہی تکلیفوں اور زحمتوں کا سامنا ہو۔ بالآخر وہ مقصد کامیاب ہی ہوتا ہے۔ نبوت کی سیرت اور اس کی دعوت کی تاریخ خود اس پر گواہ ہے ۔

انھم لھم المنصورون وان جندنا لھم الغالبون۔

نہ صرف دنیا میں بلکہ آخرت میں بھی ان ہی کو اور ان کے ذریعے اہل ایمان کو کامیابی ہوگی ۔ نبوت کی تاریخ میں ایسے سخت وقت آتے ہیں جب ان کو اپنی قوم کی ہدایت سے پوری مایوسی ہو جاتی ہے ۔ اور امید کی روشنی کسی طرف سے دکھائی نہیں دیتی اور عذاب میں تاخیر کی وجہ سے ان کے منکر یہ سمجھنے لگتے ہیں کہ ان کو عذاب کی دھمکی جھوٹ دی گئی تو دفعتہ امید کا دروازہ کھلتا ہے۔ اور اللہ سبحانہ کی تائید و نصرت کے پھریرے اس طرح آتے دکھائی دیتے ہیں کہ صالح لوگوں کے لئے دل قبول کے لیے کھول دیئے جاتے ہیں اور معاندوں پر کسی نہ کسی طرح عذاب آکر ان کا استیصال کر دیتا ہے ۔ اللہ سبحانہ کی اسی نصرت کا ان کو یقین ہوتا ہے کہ وہ ہر مشکل کو اس ارادہ میں جھیل لیتے ہیں اور اپنے سروں کو ہتھیلیوں پر لیئے پھرتے ہیں ۔ مخالفتوں کی فوج و لشکر، تیغ و خنجر اور خوف و خطر کے باوجود اپنی دعوت میں کوئی کمی نہیں ہونے دیتے اور کسی قیمت پر بھی مخالفوں سے صلح پر آمادہ نہیں ہوتے ۔ منکروں کو شروع شروع میں ان کی ظاہری بیچارگی اور تنہائی دیکھ کر ان کی ناکامی کا گمان ہوتا ہے لیکن اللہ سبحانہ ان کے سوء ظن کی تردید کر کے فرماتا ہے ۔ مثلاً تحسبن اللہ مخلف وعدہٖ

ورسلہ۔ ازل کے دن ہی یہ قانون بن چکا ہے کہ سچائی کے ان پکارنے والوں ہی کی آخر جیت ہو گی
کتب اللہ لاغلبن انا ورسلی۔

علامہ آلوسی یہاں یہ بات بے حد درزنی لکھی ہے کہ آیت بتا رہی ہے کہ مدار نجات ایمان ہے۔
قاضی بیضاوی کا یہ استنباط بھی لطیف ہے کہ حقا علینا ننجی میں المؤمنین ہی ذمہ داری کا وجوب وعدے
کی وجہ سے ہے۔ کسی استحقاق کی بنیاد پر نہیں کیونکہ مخلوق کا خالق پر کوئی حق نہیں ہے بہرحال قرآن عزیز
نے اس حقیقت کو بار بار مختلف پیرایوں میں واضح کیا ہے کہ عذاب الٰہی جب آتا ہے صرف
کافروں اور منکروں پر آتا ہے اور اہل ایمان کو اس سے بچا لیا جاتا ہے اور یہیں سے یہ بات بھی
واضح ہو جاتی ہے کہ تکوینی حادثہ جس میں مومن و کافر سب بلا امتیاز و تفریق مبتلا ہو جاتے ہیں۔
ہرگز صحیح معنے میں عذاب الٰہی نہیں زیادہ سے زیادہ اسے ایک تنبیہ کہا جا سکتا ہے۔

آیت میں اہل ایمان کی نجات اور اہل کفر کی ہلاکت کا جو مسئلہ بیان ہوا ہے وہ ایک عظیم
حقیقت کا انکشاف کرتا ہے کہ نبوت کے مدمقابل ارباب اقتدار کو ہلاک کر دیا جاتا ہے۔
اور اہل ایمان کو بچا لیا جاتا ہے۔ تو لازماً اقتدار اہل ایمان کو منتقل ہو جاتا ہے۔ بتانا یہ چاہتا
ہوں کہ نبوت جو مشن لے کر آتی ہے وہ آخری عملی شکل کے لحاظ سے ایک دینی اور اسلامی
حکومت کا قیام ہی ہوتا ہے ورنہ دشمنوں کی ہلاکت اور اہل ایمان کے بچانے میں کوئی معنویت ہی
نہیں ہے۔ اس طرح ان واقعات و قصص کا بنیادی مطالبہ یہ ہے کہ نبوت کا مشن لے کر چلنے والوں
کا منتہائے نظر لازماً یہ ہونا چاہیئے کہ اقتدار نبوت کے کام کرنے والوں کے ہاتھ میں ہو۔ یہی دعوت نبوت
کا حد کمال ہے۔ اس پر تفصیل بحث انشاء اللہ اٹھارہویں پارے میں آ رہی ہے۔

قُلْ
يَٰٓأَيُّهَا النَّاسُ إِن كُنتُمْ فِى شَكٍّ مِّن دِينِى فَلَآ أَعْبُدُ الَّذِينَ
تَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ وَلَٰكِنْ أَعْبُدُ اللَّهَ الَّذِى يَتَوَفَّىٰكُمْ ۖ
وَأُمِرْتُ أَنْ أَكُونَ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ ﴿١٠٤﴾ وَأَنْ أَقِمْ وَجْهَكَ
لِلدِّينِ حَنِيفًا وَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُشْرِكِينَ ﴿١٠٥﴾ وَلَا تَدْعُ
مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَنفَعُكَ وَلَا يَضُرُّكَ ۖ فَإِن فَعَلْتَ
فَإِنَّكَ إِذًا مِّنَ الظَّٰلِمِينَ ﴿١٠٦﴾ وَإِن يَمْسَسْكَ اللَّهُ بِضُرٍّ فَلَا
كَاشِفَ لَهُۥٓ إِلَّا هُوَ ۖ وَإِن يُرِدْكَ بِخَيْرٍ فَلَا رَآدَّ لِفَضْلِهِۦ ۚ
يُصِيبُ بِهِۦ مَن يَشَآءُ مِنْ عِبَادِهِۦ ۚ وَهُوَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ ﴿١٠٧﴾

اے اللہ کے رسول لوگوں سے کہہ دو کہ اے لوگو! اگر تم میرے دین کے معاملے میں کہیں شک میں ہو تو سُن لو کہ میں ان کی عبادت نہیں کرتا ہوں جن کی تم اللہ سے درے عبادت کرتے ہو۔ بلکہ میں تو صرف اس اللہ

کی عبادت کرتا ہوں جس کے قابو میں پوری طرح تمہاری جانیں ہیں اور
مجھے حکم دیا گیا ہے کہ ایمان والوں سے ہوں اور اے پیغمبر اپنے آپ
کو سب سے ہٹا کر دین کا ہو کر رہ جا اور مشرکین میں سے ہرگز نہ ہو ۱۰۶
اور اللہ سے ورے ان کو نہ پکار جو تجھے نہ نفع دیتے ہیں نہ نقصان پس
اگر تو نے ایسا کیا تو تو بھی ان ظالموں میں سے ہو جائے گا ۱۰۷ دیکھو
اگر اللہ کی جانب سے کوئی تکلیف آئے گی تو اسے اللہ کے سوا ہٹانے
والا کوئی نہیں ہے اور اگر تمہارے ساتھ کسی خیر کا ارادہ کرے گا تو اس
مہربانی کو لوٹا دینا کسی کے بس کی بات نہیں ہے اللہ کی شان یہ
ہے جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں سے اپنے فضل سے نوازتا ہے
وہ بہت ہی بخشش والا اور بڑا ہی مہربان ہے ۱۰۸

اسلام واضح اور صاف ہے

دین اسلام صاف اور واضح راستہ ہے اس میں اہم اور بنیادی چیز ایمان باللہ ہے
ایمان باللہ کے ناگزیر تقاضے یہ ہیں۔ اللہ کے سوا کوئی دوسری ہستی نہیں جو خود بخود وجود رکھتی ہو۔
یہاں ہر چیز مخلوق ہے اللہ کی پیدا کی ہوئی ہے اسی کی ملک ہے اسی کی محتاج ہے
اسی کی محکوم ہے کوئی چیز کوئی مخلوق اپنے اندر ذاتی صفت نہیں رکھتی ہے۔ جو
وصف بھی کسی میں ہے وہ اللہ کا عنایت کردہ ہے اور صرف اسی وقت تک اس کے پاس
رہ سکتا ہے جب تک وہ چاہے۔ اللہ سبحانہ کی ذات اقدس ساری کائنات سے مختلف ہے

اور کسی طرح سے بھی کوئی اس کا ہمسر نہیں ہے۔ کسی بڑی سے بڑی ہستی پر اس کو قیاس نہیں کیا جاسکتا ہے نہ وہ کسی کا باپ ہے نہ بیٹا اور نہ وہ اور ہستی کے ساتھ متحد ہے نہ اس کے اندر حلول کرتا ہے وہ جسم نہیں رکھتا ہے اور نہ جسمانیت رکھتا ہے۔ صرف وہی ہے جس کی رضا جوئی کی انسان کو فکر کرنی چاہیئے۔ وہی انسان کے سارے کاموں کا محرک ہونا چاہیئے اور اصل مقصد بھی سارے اعمال صرف اللہ کے لیئے مخصوص رکھنے چاہئیں خواہ وہ پرستش کی قسم ہوں اور خواہ بندگی کی قسم کے ہوں۔ سجدہ صرف اللہ کو کیا جاسکتا ہے نذر صرف اسی کے نام کی مانی جاسکتی ہے۔ دعا صرف اسی سے کی جاسکتی ہے نادیدہ پناہ صرف اسی کی ڈھونڈی جا سکتی ہے۔ غیبی امداد کے لیئے صرف اسی کو پکارا جا سکتا ہے۔ جذبات واحساسات بھی اللہ کے ساتھ خاص کر دینے چاہئیں جن کے اندر پرستش کی روح پائی جاتی ہو توکل صرف اسی پر کیا جائے۔ امیدیں صرف اسی سے وابستہ کی جائیں۔ تقویٰ صرف اس کا اختیار کیا جائے۔ خوف اسی کا رکھا جائے حقیقی محبت صرف اسی سے کی جائے۔ اس پوری کائنات میں اقتدار اعلیٰ اسی کا مانا جائے۔ حکم دینے منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا اصلی مستحق وہی ہے حقیقی شارع اور حقیقی قانون ساز بھی وہ ہی ہے۔ اللہ سبحانہ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر معبودیت کی شان رکھتا ہو۔ جو پوجے جانے کا مستحق ہو۔ جس کی رضا چاہی جائے۔ کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں نذریں پیش کی جائیں۔ کوئی اور نہیں جسے ولی کارساز حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے۔ جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیئے پکارا جائے۔ کوئی اور نہیں جس پر توکل کیا جائے۔ دل میں جس کا خوف اور خشیت رکھا جائے جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں اور جس سے حقیقی محبت رکھی جائے۔ کوئی اور نہیں جس کے پاس حقیقی اقتدار ہو اور جو بال برابر بھی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکے۔ جو کسی کے لیئے قانون بنانے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔ یہ ہے نبوت کا دین۔ یہی اسلام کی بنیاد ہے ۱۱۶ اے اللہ کے رسول لوگوں سے کہدو کہ اے لوگو اگر تم میرے دین کے معاملے میں کسی شک میں ہو تو سن لو کہ میں ان ہستیوں کی عبادت نہیں کرتا ہوں جن کی تم اللہ سے ورے عبادت کرتے ہو۔ بلکہ میں تو صرف اس اللہ کی عبادت کرتا ہوں جس کے قابو میں پوری طرح تمہاری جانیں ہیں اور مجھے تو حکم دیا گیا ہے کہ ایمان والوں کے

معاشرے کا فرد ہوں. اور اسے پیغمبر اپنے آپ کو سب سے ہٹا کر دین کا ہو کر رہ جا اور مشرکین سے کسی طرح کا لگاؤ نہ رکھ۔ یعنی اگر میرا طریقہ اور مسلک دینی تمہاری سمجھ میں نہیں آتا ہے اس لیئے اسکی نسبت شکوک و شبہات میں پھنسے ہوئے ہو تو میں اپنے دین کا اصل اصول جو توحید خالص ہے سمجھائے دیتا ہوں خلاصہ یہ ہے کہ میں تمہارے ان فرضی معبودوں کی عبادت سے سخت متنفر اور بیزار ہوں جس کے اختیار کرنے کا امکان ہی کبھی میری طرف سے دل میں نہ لانا۔ میری عبادت خالص اس اللہ کے لیئے ہے۔ جس کے قبضے میں تمہاری سب کی جانیں ہیں کہ وہ جب تک چاہے انہیں جسموں میں چھوڑے رکھے اور جب چاہے ایک دم کھینچ لے گویا موت وحیات کا رشتہ جس کے ہاتھ میں ہے بندگی اسی کی ہوسکتی ہے نہ صرف یہ کہ جوارح سے اس کی بندگی کی جائے۔ ضروری ہے۔ کہ دل میں اس کی توحید پر پورا یقین و ایمان ہو۔ اسی دین حنیف پر جو ابراہیم خلیل اللہ کا دین ہے پوری ہمت اور توجہ سے مستقیم رہ کر شرک جلی وخفی کا تسمہ نہ لگا رہنے دیا جائے۔ جس طرح عبادت اسی کی کریں استعانت کے لیئے بھی اسی کو پکاریں۔ کیوں کہ ہر قسم کا نفع و نقصان اور بھلائی برائی تنہا اسی کے قبضے میں ہے [1]

اگرچہ شارحین قرآن نے اس کو قل انظروا آیت کے ساتھ مربوط کیا ہے مگر دراصل فھل ینتظرون الا مثل ایام الذین الخ کے بعد جب یہ کہا گیا کہ ان سے کہو کہ تم اپنی ہلاکت کا انتظار کرو میں تمہاری ساتھ اپنی نصرت کا انتظار کر رہا ہوں اور اس کے بعد ارشاد کہ لپنے رسولوں اور اہل ایمان کا بچا لینا ہمارے ذمے ہے یہاں پہنچ کر معاً سوال پیدا ہوا کہ اس مرحلہ پر نبوت کا فرض کیا ہے فرمایا اپ کا کام یہ ہے کہ آپ لوگوں کو دین کی حقیقت بتائیں۔ یہاں الناس سے مشرکین مکہ مراد ہیں یا پوری امت دعوت مراد ہے آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر اس دین کی معرفت کے بارے میں تمہیں کوئی شک ہے مجھے تو تمہارے دین کے غلط ہونے کا یقین کامل ہے لیکن اگر تم میرے دین کی معرفت میں کسی شک کا شکار ہو تو تمہیں میرے دین کا یہ خلاصہ سمجھ لینا چاہیئے کہ میں ان ہستیوں کی عبادت نہیں کروں گا۔ جن کی تم اللہ کے سوا عبادت کرتے ہو۔ میرے عابدانہ تعلقات تو ہر حال میں اللہ سبحانہ سے وابستہ رہیں گے جس کے قبضہ میں تم سب کی جانیں ہیں۔ یہاں لفظ

[1] افادات شیخ الاسلام

توفی کے لانے میں بڑی گہری معنویت ہے یہ ان کے مسلمات سے استدلال ہے ۔ کیونکہ ان کا مشرکانہ ذہن اس حد تک نہیں بگڑا تھا کہ موت وحیات پر بھی اپنے معبودوں کے لیئے کوئی دعویٰ رکھتے ہوں اور اس میں ان پر ایک میٹھی سی تعریض بھی ہے کہ تم اس کردار کے ذریعے اپنی موت کو دعوت دے رہے ہو پورے دین کا چہرہ ایسے بلیغ اور لطیف انداز میں پیش کیا گیا ہے کہ پہلے جملہ منفیہ لاکر شرک کا ابطال کیا گیا ہے ۔ اور بعد میں جملہ مثبتہ کے ذریعے توحید عبادت کا اعلان کیا ہے گویا لا اعبد الذین تعبدون من دون اللہ نیابت کررہا ہے لا الہ اور اعبد اللہ الذی یتوفاکم آیا ہے الا اللہ کی جگہ اور یہی دین نبوت کا خلاصہ ہے ذہنوں میں کوئی تصور واضح اسی وقت ہوتا ہے جب کہ اس کے مخالف تصور کو ساتھ کے ساتھ اور پہلے بیان کردیا جائے ۔ اس لئے اہم اصول ونظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا اہتمام ضرور کیا جاتا ہے ۔ کہ ان کے مخالف اصولوں کو ان کے بالمقابل رکھا جائے ۔ توحید عبادت سے زیادہ کس نظریے اور عقیدے کی اہمیت ہوسکتی ہے ۔ یہاں توحید عبادت کا چہرہ پیش کرتے ہوئے جو جملہ مثبتہ لائے ہیں اس میں اللہ سبحانہ کی ساری صفات کو چھوڑ کر اللہ الذی یتوفاکم یعنی وہ جس کا تمہاری موت وحیات پر پورا پورا اور ہر وقت قبضہ وقابو ہے جو تم پر ایسا حاکمانہ اقتدار رکھتا ہے کہ تمہاری زندگی کے انفاس کا بقا اس کی مرضی پر موقوف ہے ۔ میں تو صرف اسی کی پرستش اور بندگی کرتا ہوں ۔ اسی کی بندگی اور اطاعت کرتا ہوں ۔ اور سب کو چھوڑ کر صرف اسی کی عبادت اس لئے کرتا ہوں کہ زندگی اور موت پر صرف اس کا اقتدار ہے کمال بلاغت یہ ہے کہ وہ الذی یتوفانی کی جگہ الذی یتوفاکم فرمایا ۔ اس طرح ایک ہی تعبیر میں ۔ دعویٰ ۔ دلیل دعویٰ اور دعوت تینوں جمع ہوگئے اور اس میں یہ تعریض بھی آگئی ہے کہ مجھے ہی نہیں تمہیں بھی اس کی عبادت کرنی چاہیئے ۔ یہ تمہاری ضلالت ہے کہ اس کے سوا اوروں کی عبادت کرتے ہو ۔

آخری فیصلہ کن اعلان

۱۰۶ اور اللہ سے ورے ان کو نہ پکارو جو تجھے نہ نفع دیتے اور نہ نقصان اگر تو نے ایسا کیا تو تو ان ظالموں میں سے ہو جائے گا ۔ ہر قسم کا نفع ونقصان اور بھلائی برائی تنہا اسی کے قبضے میں ہے ۔ مشرکین کی طرح ایسی چیزوں کو مدد کے لیئے پکارنا جو کسی نفع ونقصان کی مالک نہ ہوں سخت

بے موقع بات بلکہ ظلم عظیم یعنی شرک کا ایک شعبہ ہے۔ اگر بفرض محال نبی سے ایسی حرکت صادر ہو تو ان کی عظیم الشان شخصیت کے پیش نظر ظلم اعظم ہو گا۔[1]

اگرچہ شارحین قرآن نے فان فعلت کو لا تدع من دون اللہ الخ کے ساتھ جوڑا ہے اور فعل کو دعا کیلئے کنایہ قرار دیا ہے۔ لیکن میرے خیال میں فان فعلت دونوں ممانعتوں پر تفریع ہے۔ یعنی لا تکونن من المشرکین اور لاتدع من دون اللہ۔ مطلب ان دونوں میں جو بھی کردار اختیار کیا جائے اس کی معذرت قبول نہ ہوگی۔ پہلے کا تعلق بندگی سے ہے اور دوسرے کا تعلق پرستش سے ہے۔ علت دونوں کی ظلم ہے۔ بندگی کے بارے میں لا تکونن من المشرکین یعنی ان لوگوں سے ہرگز تعلق نہ رکھو جو اللہ کی حاکمیت میں کسی طور سے غیر اللہ کو شریک کرتے ہیں۔ اہل ایمان کو ایک جگہ مخاطب کرکے فرمایا ہے۔ وان اطعتموھم انکم لمشرکون اگر ان کی اطاعت کرو گے تو بلاشبہ تم بھی شرک کرنے والے ہو۔ اس حاکمیت میں شرک کے لیے سہارا خواہ ان کی اپنی ہوائے نفس ہو یا کوئی دوسرا انسان ہو یا انسانوں کی کوئی جماعت ہو۔ بس مطالبہ صرف مثبت انداز میں نہیں بلکہ منفی انداز میں بھی ہے۔ کہ ان لوگوں سے علیحدگی اختیار کرو جو کسی صورت میں شرک کی آلودگی رکھتے ہیں۔ صرف انفرادی زندگی میں نہیں بلکہ اجتماعی نظام مسجدوں اور عبادت گاہوں میں ہی نہیں۔ بلکہ درس گاہوں عدالت خانوں میں بھی۔ قانون سازی کی مجالس میں بھی سیاست کے ایوانوں میں بھی۔ معیشت کے مختلف گوشوں میں بھی۔ غرض ان لوگوں سے اپنا طریقہ الگ کرو۔ جنہوں نے اپنے افکار و اعمال اخلاق، معیشت۔ معاش اور قانون کا نظام ناخدا شناسی اور خدا کی کھلم کھلا بغاوت پھر یا نام نہاد خدا پرستی اور نفس پرستی پر قائم کر رکھا ہے۔ پھر مطالبہ صرف یہی نہیں یہ تو بندگی میں اور اطاعت میں شرک سے متعلق ہے بلکہ پرستش میں بھی شرک سے کھول کر منع کیا ہے کہ اللہ سے دوسرے کسی کے سامنے دعا کے لیے ہاتھ نہ اٹھا خواہ کوئی روح ہو جن ہو یا فرشتہ ہو ولی ہو نبی ہو یا کوئی مادی یا خیالی یا وہمی موجود ہو کیا بلیغ اور لطیف انداز ہے کہ عبادت کے موقع پر الذین تعبدون من دون اللہ کی تعبیر اختیار فرمائی اور دعا کے موقع پر مالا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ینفعہ کا انداز اپنایا پہلی تعبیر ذوی العقول کی ہے جب کہ دوسری تعبیر بے جان اور غیر ذوی العقول کی ہے مشرکین جن بتوں اور مورتیوں کی پرستش کرتے تھے ۔ ان کی دو حیثیتیں تھیں ۔ ایک وہ اشخاص ہیں جو مٹی ، لوہے لکڑی اور پتھر سے بتوں کی صورت میں بنائے جاتے ہیں اور ایک وہ شخصیتیں ہیں جن کے یہ بت اور مورتیاں ہیں قرآن شخصیتوں کے اعتبار سے تعبیر ذوی العقول کی اور ٹھاکروں اور اشخاص کے اعتبار سے تعبیر غیر ذوی العقول کی اختیار کرتا ہے ۔ اختلاف تعبیر سے دونوں کی ممانعت مقصود ہے یعنی پرستش کی حدود میں اشخاص سے دعا کی اور شخصیتوں سے بھی دعا کی ممانعت ہے نہ بت سے دعا کرو اور نہ اس سے دعا کرو جس کا بت بنایا گیا ہے ۔ ان میں سے کسی سے بھی عابدانہ لگاؤ ایمان کی بربادی ہے یہی حکم قبر اور صاحب قبر کا ہے ۔ ان سے عابدانہ تعلقات بھی شرک جلی ہے ۔ جب تک شرک کی آلودگی سے دامان ایمان محفوظ نہ ہوگا توحید ایک بے معنے اور بے حقیقت دعویٰ ہے ۔

اللہ سبحانہ کی حقیقی عظمت

۱۰۸ دیکھو اگر اللہ کی جانب سے کوئی تکلیف آئے گی تو اسے اللہ کے سوا ہٹانے والا کوئی نہیں ہے اور اگر تمہارے ساتھ اللہ خیر کا ارادہ کرے گا تو اس مہربانی کو لوٹا دینا کسی کے بس کی بات نہیں ہے اللہ کی شان یہ ہے جسے چاہتا ہے اپنے بندوں میں اپنے فضل سے نوازتا ہے ۔ وہ وہ بہت ہی بخشش والا اور بڑا ہی مہربان ہے ۔ جب ان چیزوں کے پکارنے سے منع کر دیا جن کے قبضے میں تمہارا بھلا یا بُرا نہیں ہے تو مناسب ہوا کہ اس کے بالمقابل مالک علی الاطلاق کا ذکر کیا جائے جو تکلیف و راحت اور بھلائی برائی کے پورے سلسلہ پر کامل اختیار اور قبضہ رکھتا ہے جس کی بھیجی ہوئی تکلیف کو دنیا میں کوئی ہٹا نہیں سکتا اور جس پر فضل و رحمت فرمانا چاہیئے کسی کی طاقت نہیں کہ اسے محروم کر سکے لہٰذا یہ آیت پہلی آیت سے مربوط ہے ۔ پہلے بتایا گیا تھا لا تدع من دون اللہ ما لا ینفعہ ولا یضرک ۔ مشرکین عرب کا عقیدہ تھا کہ دیوتا اور ان کے بت اللہ کی طرف سے دونوں عالم میں مختار کل ہیں ویسا دینے نہ دینے کا اور اس عالم میں بخشنے کا اختیار رکھتے ہیں ۔ اس عقیدے کا نام ان کے یہاں شفاعت تھا ۔ اور یہ دیوتا اسی معنے میں ان کے شفیع تھے قرآن نے پہلے اعلان کیا ہے کہ یہ تصور غلط ہے وہ

کسی طرح کے کسی نفع و نقصان کے مالک نہیں ہیں اس کے مقابلے میں اس آیت میں اللہ سبحانہ کی عظمت کا جلوہ نمایاں کیا۔ جو آسمان کے اوپر سے لے کر زمین کے نیچے تک تنہا مالک ہے اس کے کاروبار میں دوسرا شریک نہیں۔ اس کی شاہنشاہی میں کسی دوسرے کا حصہ نہیں۔ اس کے کارخانہ قدرت میں کوئی دوسرا ساجھی نہیں کائنات کا کوئی ذرہ اس کے حکم سے باہر نہیں۔ دنیا کی کوئی چیز اس کی نگاہوں سے چھپی نہیں۔ شجر و حجر، جنگل پہاڑ، صحرا دریا، سورج چاند، دریا، زمین و آسمان۔ انسان و حیوان۔ زبان والے اور بے زبان سب اس کے آگے سربسجود اور اس کی تسبیح و تہلیل میں مصروف ہیں۔ وہی ایک قوت والا ہے سب کمزور ہیں۔ وہی ایک علم والا ہے سب نادان ہیں۔ اسی کو بقا ہے سب فانی ہیں۔ وہ ہی ایک بے نیاز ہے سب محتاج ہیں۔ سب اس کے بندے ہیں وہی ایک شہنشاہ ہے۔ عرش سے فرش تک جو کچھ ہے وہ اس کا ہے۔ اور اس پر اس کی حکمرانی ہے وہ اگر کسی کو سزا دے تو اسے اس کے سوا ہٹانے والا کوئی نہیں۔ اگر وہ کسی کے ساتھ بھلائی کرے تو اس کے فضل و کرم کا رد کرنے والا کوئی نہیں ہے گویا یہ آیت بتا رہی ہے کہ کائنات کی کوئی طاقت ارادہ الٰہی میں روک نہیں بن سکتی۔ ارادہ نفع کا ہو نقصان کا۔

آیت میں نقصان کے ذکر میں مس کا ذکر ہے جب کہ خیر میں ارادہ آیا ہے۔ قاضی بیضاوی نے اس کی معنویت پر یہ بات خوب فرمائی ہے کہ خیر کے ارادہ یہ بتانے کے لیئے لائے ہیں کہ خیر کا ارادہ بالذات ہے اور یہ اصل ہے اور ضرر ایک اضافی چیز ہے، اس کا ظہور جزا ہی کے موقعہ پہ ہوتا ہے۔ اور اس سے بڑھ کر لطافت یہ ہے کہ ضرر کے موقعہ پہ ضمیر لائے لیکن خیر کیلئے ضمیر نہیں لائے بلکہ فرمایا و ندراد مقصد بتانا یہ ہے کہ دنیا میں خیر جو کچھ جتنی کچھ بھی ہے وہ کسی استحقاق کی بنا پر نہیں بلکہ محض اللہ کا فضل ہے۔ فلا راد لفضلہ

آخر میں فرمایا۔ یصیب بہ من یشاء من عبادہ، اللہ سبحانہ اپنے فضل سے جسے چاہتا ہے نواز دیتا ہے یہاں اصابت، کو مجمل رکھا ہے اس کے اسباب کی تفصیل نہیں کی مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ خیر کا فیضان اسباب کے تحت ہی کرتا ہے اور بغیر اسباب کے بھی۔ کیونکہ فضل الٰہی عموم رحمت کی وجہ سے بندوں پہ عام ہے برخلاف ضرر کے کہ اس کا وقوع ہمیشہ اسباب ہی کی وجہ سے ہوتا ہے۔ خواہ اسباب خاص ہوں یا عام۔ بالکل آخر میں ارشاد ہوا ہے وھو الغفور الرحیم یعنی اللہ سبحانہ کی جانب سے بندوں پہ خیر کا فیضان خیر محض اس کی رحمت اور اس فیضان خیر کے لیئے

اللہ سبحانہ بندوں کی ان کوتاہیوں گناہوں کو معاف کرتا ہے جو خیر کے راستہ میں رکاوٹ بنتے ہیں۔ اگر پہلے اللہ کی بات سے مغفرت کا فیضان نہ ہو تو بندوں میں اصابت خیر کی اہلیت اور صلاحیت ہی نہ ہو۔ اسی لئے اسلام میں استغفار کی بے حد اہمیت ہے۔ استغفار گناہوں کا کفارہ ہے۔ کیونکہ انسان کے تمام کاروبار اصل چیز اس کا دل ہے اسی سے وہ پاک ہوتا ہے اور اسی سے وہ ناپاک بنتا ہے۔ انسان کا دل اگر خلوص کے ساتھ کسی وقت اللہ سبحانہ کی طرف رجوع کرے اور اپنی تقصیروں اور فروگذاشتوں پر اس کی بارگاہ میں نادم و شرمسار ہو کر اللہ سے معافی مانگے اسی کا نام استغفار ہے اللہ کی ذات الغفور ہے گناہوں کے اثار کو مٹا کر انسان کو اپنی رحمت کے فیضان کے قابل بناتی ہے آیت میں اسی نکتہ کی وجہ سے اس قدر مقدم ہے۔

قُلْ يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ قَدْ جَآءَكُمُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكُمْ ۚ فَمَنِ
اهْتَدٰى فَاِنَّمَا يَهْتَدِىْ لِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ ضَلَّ فَاِنَّمَا
يَضِلُّ عَلَيْهَا ۚ وَمَاۤ اَنَا عَلَيْكُمْ بِوَكِيْلٍ ۝۱۰۸ وَاتَّبِعْ مَا يُوْحٰۤى
اِلَيْكَ وَاصْبِرْ حَتّٰى يَحْكُمَ اللّٰهُ ۚ وَهُوَ خَيْرُ الْحٰكِمِيْنَ ۝۱۰۹

اے اللہ کے رسول کہدو لوگو! تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس حق آچکا ہے۔ لہٰذا جو شخص اس کی رہنمائی میں زندگی گذارے گا۔ اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ اور جو شخص اس کی راہ سے بھٹک جائے گا۔ تو اس کا نقصان خود اٹھائے گا۔ اور میں اللہ کی جناب میں تمہارے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہوں ۱۰۹ اے پیغمبر اب تو صرف اسی چیز کا اتباع کیجئے جو وحی الٰہی آپ کو بتا رہی ہے۔ اور اللہ کا فیصلہ ہونے تک آپ اسی پر ڈٹے رہیئے۔ اللہ ہی بہترین فیصلہ کرنیوالا ہے۔ ۱۲۰

محمد رسول اللہ کی دعوت میں اصل الاصول دو باتیں ہیں۔ ایک توحید کامل دوسرے رسالت عمومی۔ اس سے پہلی آیت میں توحید کامل کو پیش کیا ہے اور اس آیت میں یا ایھا الناس کہہ کر عموم رسالت کو پیش فرمایا ہے۔ یعنی جو حق آپ لے کر آئے صرف اسی شہر اسی ملک اور اسی زمانے کے لوگوں کے لئے نہیں بلکہ تمام انسانوں کے لیئے ہے یہ بات قرآن کی مکی سورتوں میں ایک سے زیادہ تعبیرات میں دہرائی گئی ہے کہیں فرمایا ہے۔

واوحی الیّ ھذا القرآن لانذرکم بہ ومن بلغ

یہ قرآن میری طرف وحی کے ذریعے آیا ہے تاکہ میں تمہیں تنبیہ کروں اور ان سب کو جن جن کو یہ پیغام پہنچے۔

سورہ اعراف میں ہے:۔

قل یا ایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا الذی لہ ملک السماوات والارض

کہہ دو اے انسانو، میں تم سب کی طرف اس اللہ کا رسول بن کر آیا ہوں جو زمین اور آسمانوں کی بادشاہت کا مالک ہے۔

سورہ فرقان میں ہے:۔

تبارک الذی نزل الفرقان علی عبدہ لیکون للعالمین نذیرا

بڑی بابرکت ہے وہ ذات گرامی جس نے اپنے بندے پر قرآن اتارا تاکہ جہانوں کو ڈر سنانے والا ہو۔

یہ سب مکی سورتوں میں اعلان ہوا ہے۔ اس سورت میں آخر میں توحید کے ساتھ عموم رسالت کو پیش کیا ہے اور بتایا ہے کہ یہی حق ہے اور یہی ہدایت کاملہ ہے اور سب کو مخاطب کر کے فرمایا کہ یہی وہ حق ہے۔ جس کو حضرت ابراہیم و حضرت اسماعیل اور حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہم السلام کے ماننے والوں نے کھو دیا تھا۔ اب جس کو میں تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں۔

قل للذین اوتوا الکتاب والامیین ءاسلمتم فان

اسلموا فقد اھتدوا وان تولوا فانما علیك البلاغ

اسے رسول اہل کتاب اور اہل مکہ سے کہدو کہ کیا تم نے اسلام قبول کرلیا۔ اگر انہوں نے قبول کرلیا تو وہ ہدایت پہ آگئے۔ اور اگر نہیں کیا تو تمہاری ذمہ داری صرف حق کا پیغام پہنچا دینا ہے۔

بہر حال یہ اس سورت کا آخری پیغام اور پوری تذکیر کا نچوڑ ہے اس لیے اس رکوع میں پہلے توحید کامل کا پورا نقشہ پیش کرکے آخر میں عموم رسالت کی تصویر پیش کی ہے یہی ہدایت نامہ ہے اور یہی ساری سورت کا خلاصہ ہے۔

١٠٩ اسے اللہ کے رسول کہدو لوگو! تمہارے رب کی جانب سے تمہارے پاس حق آچکا ہے لہذا جو شخص اس کی رہنمائی میں زندگی گذارے گا۔ اس کا فائدہ اسی کو ہوگا۔ اور جو بھٹک جائے گا تو اس کا نقصان خود اٹھائے گا۔ میں اللہ کی جانب سے تمہارے اعمال کا ذمہ دار نہیں ہوں یعنی حق واضح طور پر دلائل و براہین کے ساتھ پہنچ چکا ہے جس کے قبول نہ کرنے کا کوئی معقول عذر کسی کے پاس نہیں ہے۔ اللہ سبحانہ کی آخری حجت بندوں پر قائم ہوگئی ہے اب ہر ایک اپنا نفع اور نقصان سوچ لے۔ جو اللہ سبحانہ کی بتلائی راہ پر چلے گا دنیا و آخرت میں کامیاب ہوگا اور جو اسے چھوڑ کر ادھر اُدھر بھٹکتا پھرے گا۔ خود پریشان اور ذلیل و خوار ہوگا۔ اپنے بھلے بُرے کو خوب سمجھ کر ہر شخص اپنے مستقبل کا انتظام کرے۔ راستہ پسند ہو اختیار کرے پیغمبر کوئی مختار بنا کر نہیں بھیجے گئے جو تمہارے افعال کے ذمہ دار جوابدہ ہوں۔ ان کا کام صرف آگاہ کردینے اور راستہ بتا دینے کا ہے اس پر چلنا چلنے والے کے اختیار میں ہے۔ ١ھ

اس آیت میں غور طلب دو باتیں ہیں۔

ایک من اھتدی الخ یعنی حق کی صداقت کی دعوت کا معاملہ سر تا سر سمجھنے بوجھنے اور سمجھ بوجھ کر اختیار کرلینے کا ہے اس میں نہ تو کسی طرح کی زبردستی ہے اور نہ کسی طرح کی لڑائی جھگڑا۔ تمہاری بھلائی کے لیے ایک بات کہی گئی ہے اگر سمجھ میں آجائے تو مان لو نہ آئے تو نہ مانو۔ اگر مان لوگے تمہارا ہی بھلا ہوگا۔ نہ مانوگے تو تمہارا ہی نقصان ہوگا۔ ہر شخص کو اپنا اختیار ہے چاہے بھلائی کی راہ چلے اور بھلائی کمالے اور چاہے برائی کی

راہ چلے اور برائی کمائے اگر کوئی بھلائی کی راہ چلے گا تو کسی کو کچھ نہ دے گا اور اگر برائی کی راہ چلے گا تو کسی کا نقصان نہ کرے گا۔ اپنی اپنی راہ اور اپنی اپنی چال من عمل صالحا فلنفسہ ومن اساء فعلیھا۔

دوسرے وما انا علیکم بوکیل اس میں پوری صراحت کے ساتھ واضح کر دیا کہ داعی کی حیثیت کیا ہے۔ فرمایا میں داعی اور مذکر ہوں مجھے تم پر وکیل نہیں بنایا گیا ہوں یعنی میرا کام یہ ہے کہ نصیحت کی بات سمجھا دوں یہ نہیں ہے کہ نگہبان بنکر تم پر مسلط ہو جاؤں اور سمجھ لوں کہ مجھے تمہاری ہدایت کی ٹھیکیداری مل گئی ہے۔ دوسری جگہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے یہی بات اس طرح کہی گئی ہے۔ ما انت علیھم بجبار آپ ان لوگوں پر حاکم جابر کی طرح مسلط نہیں ہیں کہ جبراً و قہراً بات منوالیں نیز فرمایا لست علیھم بمصیطر آپ کو ان لوگوں پر داروغہ نہیں بنایا گیا ہے کہ مانیں نہ مانیں اب ان کو ضرور حق پر چلانے کے ذمہ دار ہیں نیز متعدد مقامات پر یہ حقیقت واضح کی گئی ہے۔ نبوت کا کام اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ سچائی کی پکار ہے۔ حق پہنچا نا نصیحت کی بات کرنا ایمان و عمل کے نتائج کی خوش خبری دینا اس سے زیادہ نبوت کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے یہ کس قدر واضح اور صاف راہ ہے اگر دنیا دعوت حق کی یہ روح سمجھ لیتی تو کوئی انسان دوسرے انسان سے محض فکر و عمل کے اختلاف کی وجہ سے بر سر پیکار نہ ہوتا۔ افسوس کہ انسان کی سرکشی نے کبھی اس حقیقت کو نہ مانا۔ اور یہی بات سارے جھگڑوں کی بنیاد ہی ملے گی۔ انبیاء کی سیرت اور قرآن میں ان کے واقعات پڑھو ہر جگہ نزاع کی بنیاد ہی ملے گی۔ انبیاء ہمیشہ یہی صدا بلند کرتے رہے ہمارا کام تمہیں نصیحت کرنا ہے ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ اگر نہیں مانتے تو تم اپنی راہ چلو۔ ہمیں اپنی راہ چلنے دو۔ اور نتائج کا انتظار کرو لیکن نبوت کے مخالف کہتے تھے کہ نہ تو تمہاری بات مانیں گے اور نہ تمہیں تمہاری راہ چلنے دینگے نویں پارے میں حضرت شعیب کی سرگذشت میں پڑھ چکے ہو کہ جب ان کی قوم کے سرکشوں نے کہا لنخرجنک یا شعیب والذین امنوا معک اولتعودن فی ملتنا تو انہوں نے جواب میں کہا اولو کنا کارھین۔

حضور انور صلے اللہ علیہ وسلم اور انکے مخالفین میں بنا دنزاع یہی تھی حضور فرماتے تھے کہ میری راہ تبلیغ و تذکیر کی ہے۔ مخالفین کہتے تھے۔ ہماری راہ جبر و تشدد کی ہے۔ مخالفین کہتے تھے۔ ہماری

راہ جبر و تشدد کی ہے۔ آپ فرماتے اگر میری بات سمجھ میں آجائے تو مان لو نہ سمجھ میں آئے تو ماننے والوں کو ان کی راہ چلنے دو۔ وہ کہتے ہیں کہ ہماری بات تمہاری سمجھ میں آسکے یا نہ آسکے تمہیں ماننی ہی چاہیئے نہیں مانو گے تو جبراً منوائیں گے۔

یہاں قرآن نے ما انا علیکم بوکیل کہہ کر اپنے مخاطبوں کو تذکیر اور توکیل کا فرق سمجھایا ہے اور ہر داعی حق کو بتایا ہے کہ تمہارا کام تذکیر ہے توکیل نہیں ہے۔ تذکیر یہ کہ جس بات کو تم حق سمجھتے ہو اس کی دوسروں کو بھی ترغیب دو اور یہ یاد رکھو کہ ماننے اور نہ ماننے کا اور پسند کرنے اور نہ کرنے کا حق مخاطب کو ہے تم منوانے کے ذمہ دار نہیں ہو اور توکیل یہ کہ ڈنڈا لیکر کھڑے ہو جاؤ اور جو تمہاری بات نہ مانے اس کے پیچھے پڑ جاؤ۔ تم داعی ہو اللہ کی جانب سے ہدایت وضلالت کے ٹھیکدار نہیں ہو۔ جب نبوت کا منصب ہی تذکیر و دعوت ہے تو پھر کسی دوسرے شخص کے لیئے یہ کب روا ہے کہ دعوت کے میدان میں وکیل وجبار بن جائے۔

گویا قرآن نے اپنے مخاطبوں کو اس طرح دعوت کے حدود بتادیئے ہیں دعوت کے کام میں دو حق ہیں اور ان دونوں کو اپنی اپنی حد کے اندر رہنا چاہیئے داعی کا حق تذکیر و تبلیغ کا ہے جب کہ مدعو کا حق ماننے یا نہ ماننے کا ہے بلاشبہ ہر شخص کو یہ حق ہے کہ جس بات کو وہ حق سمجھتا ہے اسے دوسروں کو بھی سمجھائے۔ لیکن حق کو منوانا اس کا کام نہیں ہے۔ بتانا اس کا حق ہے۔ ماننا یا نہ ماننا مخاطب کا حق ہے۔ آپ جس بات کو حق سمجھتے ہیں یہ آپ کا فرض ہے کہ آپ اسے دوسروں تک پہنچائیں۔ اگر آپ اس میں کوتاہی کریں گے تو اللہ کے حضور جوابدہ ہوں گے۔ یہی تبلیغ و تذکیر ہے اور جوابدہی اس میں ہے کہ تم نے تبلیغ کی باتیں کیں اس میں نہیں کہ مخاطبوں نے مانا یا نہیں مانا۔

قرآن نے ایک ہی نظر سے میں معاملہ کے دونوں پہلوؤں کی حفاظت کر کے ان کی حد بندیوں کی ایک لائن کھینچدی ہے۔ اس نے ایک طرف تذکیر و دعوت پر زور دیا ہے تاکہ حق کی طلب و قیام کی روح پامال نہ ہو۔ دوسری طرف انسان کی شخصی آزادی بھی محفوظ کر دی کہ جبر و تشدد کو راہ نہ مل سکے۔ حد بندی کا یہی پیمانہ ہے اسے اپنی جگہ سے اگر ہٹاؤ گے دونوں میں سے ایک بات ضرور غلط ہو جائے گی۔ اگر دعوت و تذکیر کا قدم آگے بڑھے گا۔ فکری آزادی نہ رہے گی۔ اگر آزادی کے مطالبہ پر زور دو گے تو حق و عدل۔ طلب و قیام کا نظام درہم برہم ہو جائیگا یہ

چودہ سو سال پہلے قرآن نے عرب کے ایک امی کے ذریعے انسان کے بنیادی حقوق کا اعلان کیا ہے[1]
مطلب یہ ہو کہ میرے ذمے تمہیں راہ راست پر لانا نہیں ہے میرا کام صرف یہ ہے کہ تمہارے
سامنے راہ حق پیش کر دوں۔ اس کے بعد تم اگر گمراہی کو اپنے اختیار اور صواب دید سے اپناؤ
تو مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔ علامہ آلوسی نے یہ بات اس سے معلوم کی ہے۔
یہ آیت اشارہ کر رہی ہے کہ حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کسی کو ایمان پر مجبور نہ کرتے
تھے۔ آپ کا فرض تو صرف تذکیر و تبلیغ تھا۔

نبوّت کا کام وحی کی پیروی ہے

۱۰۹ اور اے پیغمبر آپ تو صرف اس چیز کا اتباع کیجئے جو اللہ کی وحی آپ کو بتا رہی ہے اور اللہ
کا فیصلہ ہونے تک اس پر ڈٹے رہیئے اللہ بہترین فیصلہ کرنے والا ہے۔ اس میں ان حضرت
صلے اللہ علیہ وسلم کو یہ تسلی دی گئی ہے کہ اگر یہ لوگ حق قبول نہ کریں تو آپ ان کے غم میں نہ گھلائیں
آپ حق تعالیٰ شانہ کے احکام کی پیروی کرتے رہیئے۔ اور تبلیغ وغیرہ کے کام میں لگے رہیئے اور
جو شدائد اس کی راہ میں آئیں ان کو برداشت کیجئے۔ مخالفین کی ایذا رسانیوں کا تحمل کرتے
رہنا چاہیئے۔ یہاں تک اللہ سبحانہٗ آپ کے اور ان کے درمیان بہترین فیصلہ کر دے یعنی
حسب وعدہ آپ کو منصور و غالب کرے یا جہاد کا حکم بھیجدے تم سورہ یونس علیہ السلام
تعالیٰ وفضلہ الحمد علےٰ ذالک[1]

ہمیں اس قسم کی آیت کی تشریح میں یعنی ایک غلط فہمی کو دُور کرنا ہے جو بعضوں کو اس تعلم کی آیات
کے سمجھنے میں پیش آتی ہے۔ قرآن میں ایک سے زیادہ جگہ یہ بات دہرائی گئی ہے کہ رسُول کا
کام وحی کا اتباع کرنا ہے۔ اس سے بعض کوتاہ بینوں کو یہ دھوکا ہو گیا ہے کہ رسول کا کام صرف
وحی الہٰی کی تبلیغ ہے یعنی قرآن پاک کے الفاظ کو بعینہ انسانوں تک پہنچا دینا اس کا کام ہے۔ اور اس
کے معانی کی تشریح اور اس کے مطالب کی توضیح نہ رسول کا منصب ہے نہ اس کا اس کو کوئی حق
ہے۔ ان کے خیال میں رسول کی حیثیت صرف ایک قاصد اور نامہ بر کی شان ان کو یہ دھوکا اتباع وحی
کے حکم کے علاوہ لفظ رسول سے ہی ہُوا ہے جس کے لفظی معنے پیامبر اور قاصد کے ہیں۔ لیکن وہ لوگ یہ
نہیں سوچتے کہ قرآن نے جہاں رسول کہا ہے وہاں نبی، مبشر، نذیر، سراج منیر، صاحب

[1] افادات شیخ الاسلام

حکمت۔ صاحب خلق عظیم۔ صاحب مقام محمود۔ مجتبیٰ مصطفےٰ۔ مبین معلم۔ ذکی۔ داعی۔ حاکم۔ مطاع۔ امر۔ ناہی بھی تو کہا گیا ہے۔ کیا یہ اوصاف و القاب صرف ایک نامہ بر اور قاصد کے ہیں۔ اس کے پیغام کے مفہوم اور مطالب کی تشریح و تفسیر کا آج تو ہر عربی دان کو حق حاصل ہے اور اس کی اصل حقیقت تک پہونچ جانے کا ہر مدعی کو دعویٰ ہے مگر خود صاحب وحی کو وحی کے وقت نہ مفہوم و معنی کا علم تھا اور نہ اس کی تشریح کا اسے حق تھا۔ ان ھذا الا من اعاجیب الزمن

وہ اپنے اس اشتباہ کو اس انداز میں ہی پیش کرتے ہیں کہ اسلام میں شرع اور وضع قانون کا حق صرف اللہ تعالیٰ کے لیئے تسلیم کیا گیا ہے۔ اگر رسول کے لیئے بھی وحی کتابی سے الگ شرع سازی کا حق تسلیم کر لیا جائے تو یہ اتباع وحی کے منافی ہونے کے ساتھ ایک اور شارع کو تسلیم کر لینا ہے۔

اس کا پہلا جواب یہ ہے کہ ہم رسول کو شارع نہیں بلکہ شارح مانتے ہیں اور اجتہاد کو مثبت نہیں مظہر مانتے ہیں کیا عدالت کی کرسی پر بیٹھ کر جج صاحب حکومت کے قانون کی تشریح کرتا ہے تو وہ اپنے اس عمل سے سلطان وقت بن کر قانون سازی کا منصب حاصل کرتا ہے یا صرف قانون کے مفہوم کا شارح ہوتا ہے۔ یہی حیثیت آسمانی عدالت کے اس قاضی کی ہے جس کو ہم نبی رسول معلم۔ مبین کہتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ اپنے ہر پیام اور مقصد اور مفہوم اور فیصلہ سے صرف وحی کے اسی طریقہ خاص کے ذریعے اپنے رسول کو مطلع نہیں کرتا جو طریقہ قرآن کی وحی کے لیئے ہے بلکہ وحی کی تینوں قسموں میں سے کسی بھی طریق سے اپنی بات کو رسول تک پہنچا دیتا ہے۔ اور ان میں ہر طریق کی وحی کی طاعت تمام امت پر لازم ہے خواہ وہ وحی ہو جو الفاظ الٰہی کی قید کے ساتھ آئی ہو جس کو قرآن کہتے ہیں یا ربانی مفہوم ومعنی رسول کے الفاظ میں ادا ہوں جس کو حدیث و سنت کہتے ہیں۔ الغرض خواہ وہ کتاب الٰہی کے ذریعے ہو یا حکمت ربانی کے فیض سے ہو۔

لیکن دونوں کی وحی میں فرق ہے۔ وحی تو دونوں ہیں مگر چونکہ قرآن حکیم وحی ہونے کے ساتھ اپنے اندر شان اعجاز اور اس کے الفاظ میں شان تعبد ہے اس لیئے اس کی روایت باللفظ ہے برخلاف کے سنت کے چونکہ معجزہ نہ تھی اور نہ اس کے لفظوں میں شان تعبد تھی۔ اس لیئے اس کے الفاظ نہیں بلکہ معانی و مطالب آپ پر نازل ہوتے تھے اور اس کو آپ اپنے لفظوں میں مخاطبوں کے

احوال اور تقاضوں کے مطابق پیش فرماتے تھے۔ بالفاظ دیگر قرآن و سنت میں وہی فرق ہے۔ جو اردو زبان میں نامہ اور پیام میں ہوتا ہے۔ یہ فرق حافظ جلال الدین السیوطی نے الاتقان فی علوم القرآن میں امام الحرمین کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہ کی جانب سے نازل شدہ کلام دو قسم کا ہے ایک قسم یہ کہ اللہ سبحانہ حضرت جبریل سے فرمائیں کہ ہمارے رسول کو ہمارا یہ پیغام پہنچا دو کہ اللہ سبحانہ فرماتا ہے کہ فلاں کام کرو ایسے کرو۔ حضرت جبریل حضرت حق سبحانہ کا پیغام سنتے ہیں۔ بعد ازیں حضور اقدس صلے اللہ علیہ وسلم کے پاس تشریف لاتے ہیں اور اللہ سبحانہ کا پیغام پہنچاتے ہیں۔ بات اللہ سبحانہ کی ہوتی ہے۔ اور تعبیر حضرت جبریل کی۔ قال ما قال ربہ ولم تکن العبارۃ تلک العبارۃ۔ اس کی اس کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی بادشاہ اپنے معتمد سے کہے کہ فلاں شخص سے کہو بادشاہ کہتا ہے کہ کام ٹھیک کیا کرو۔ اس پیغام کو اگر قاصد یوں پہنچا دے سست مت ہو محنت کرو۔ تو تعبیر کے اس اختلاف سے ادائے پیغام میں کوئی فرق نہ آئے گا اور اس سے فرض رسالت میں کوتاہی نہ کہیں گے۔ دوسری قسم یہ ہے کہ اللہ سبحانہ حضرت جبریل سے کہیں کہ یہ خط ہمارے رسول کو جا کر دو اس کے سامنے پڑھو۔ حضرت جبریل تشریف لاتے ہیں اور بلا کم و کاست اور بغیر رد و بدل خط آ کر سناتے ہیں۔ اور ان کے سامنے پڑھ دیتے ہیں۔

حافظ جلال الدین السیوطی فرماتے ہیں کہ پہلی قسم سنت اور دوسری قسم قرآن ہے اور امام الحرمین کے نظریہ کی تائید میں لکھتے ہیں " میں نے سلف سے اس کی تائید دیکھی ہے۔ غالباً اسی جوہری فرق کی وجہ سے قرآن نے اتباع وحی اور تلاوت وحی میں فرق کیا ہے۔ قرآن میں دو قسم کے حکم ہیں کہیں وحی الٰہی کی اتباع پر زور دیا گیا ہے جیسے زیر تشریح آیت میں اور کہیں وحی کی تلاوت کا حکم ہے۔ جیسے اتل ما اوحی الیک من الکتاب مگر قرآن نے ان دونوں میں فرق کیا ہے۔ قرآن میں جہاں وحی کی تلاوت کا حکم دیا گیا ہے۔ ما اوحی کے ساتھ الکتاب کی قید ضرور لگا دی ہے۔ مثلاً اتل ما اوحی الیک من کتاب ربک اور اسی قسم کے دوسرے مقامات۔ لیکن جہاں وحی کی اتباع کا حکم دیا گیا ہے وہاں لفظ کتاب کی قید ہٹا دی گئی ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں میں اس

اس سے یہی سمجھتا ہوں کہ قرآن اپنے مخاطبوں کے قلب و دماغ میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے کہ وحی جو ذات نبوت پر آتی ہے وہ قرآن ہی تک محدود نہیں ہے بلکہ قرآن کے باہر بھی وحی ہے۔ کتابی وحی کی تلاوت کی جاتی ہے اس کے لفظوں میں شان اعجاز کے ساتھ شان تعبد بھی ہے غیر کتابی وحی کی اتباع کی جاتی ہے گویا تلاوت الفاظ میں تعبد کی وجہ سے کتابی وحی کی خصوصیت ہے۔ اور اتباع کا دائرہ کتابی وحی اور غیر کتابی وحی کے لیئے عام ہے۔

آخر میں ارشاد ہوا واصبر حتی یحکم اللہ وھو خیر الحاکمین۔ حافظ ابن کثیر نے معنے بتائیے ہیں کہ جو لوگ آپکی مخالفت کر رہے ہیں ان کی مخالفتوں کو سہتے جائیے۔ یہی معنے علامہ آلوسی نے کئے ہیں لیکن کچھ علماء نے معنے یہ بتائے ہیں کہ اللہ سبحانہ کی طاعت پر جمے رہیئے ابوحیان اندلسی نے آیت کے معنے یہ بتائے ہیں کہ اللہ کی طاعت پر ڈٹے رہیئے نبوت کی ذمہ داری کا بوجھ برداشت کیجئے اور فرائض رسالت کی ادائیگی میں حالات کا مقابلہ تن کر کیجئے۔ آگے صبر کی غایت جو بتائی ہے اس سے حافظ ابن کثیر کے معنے کی تائید ہوتی ہے۔ ظاہر ہے طاعت کے لیئے حتی یحکم اللہ غایت نہیں تکالیف برداشت کرنے کے لیے یہ غایت ہو سکتی ہے۔ یعنی یہاں تک اللہ تعالیٰ کے وعدے کے مطابق آپ کی مدد ہے اور آپ کو مخالفین پر غلبہ حاصل ہو۔ یہ مکی زندگی میں دعوتی اور فکری جہاد اور اس پر محنت کے نتائج کا ذکر ہے یعنی اس دور میں لوگوں کے سامنے اسلام کو دلائل کی قوت کے ساتھ مسلح کر کے پیش کیا جا رہا تھا۔ لوگوں کے سامنے اس کی ٹھیک ٹھیک ترجمانی کی جا رہی تھی اور ان کے ذہن کی گرہیں کھولی جا رہی تھیں اسی کو قرآن نے اللہ کی مدد کہا ہے۔ اللہ کے مددگار بننے کا فیصلہ اس وقت ہوتا ہے جب دین کی دعوت اپنی عام تبلیغ و تفہیم سے گزر کر شدید مخالفتوں کی زد میں آجاتی ہے اس وقت کہا جاتا ہے واصبر حتی یحکم اللہ اسی کا نام جہاد کبیر ہے۔

اس پارے کی تفسیر یہیں ختم کرتا ہوں آیندہ بارہواں پارہ سورہ ہود سے شروع ہوگا۔ اس پارے کی تفسیر میں یہ آخری سطریں ہیں جو اس کوتاہ علم اور کمترین عمل کے قلم سے سات سو تہتر ۷۷۳ صفحات کے سپرد ہوئی ہیں۔ جو باتیں صحیح ہیں وہ اللہ سبحانہ کا فضل و انعام ہیں۔ اور جو غلط یا کمزور ہیں وہ میری کم علمی کم فہمی اور نادانی کا نتیجہ ہیں۔ اللہ سبحانہ دعا قبول فرمائے

پارہ نمبر ۱۱

کہ میری کوتاہیوں کو معاف فرمائے اور اپنی باتوں کے لئے قبولیت کے دروازے کھولدے
رب تقبل منی معالم القرآن انک انت السمیع العلیم وصلی اللہ
علی خیر خلقہ محمد والہ اجمعین برحمتک یا ارحم الراحمین

معالم القرآن

جلد دوازدہم

محمد علی الصدیقی کاندھلوی

علم وکتاب واٹس ایپ گروپ

شیخ القرآن حضرۃ العلام **مولانا محمد علی** الصدیقی کاندھلوی

کی تصانیف

تفسیر معالم القرآن

جلد اوّل	۱۰۰/=	جلد ہفتم	۱۰۰/=
جلد دوم	۱۲۰/=	جلد ہشتم	۱۰۰/=
جلد سوم	۱۲۰/=	جلد نہم	۱۰۰/=
جلد چہارم	۱۲۰/=	جلد دہم	۱۰۰/=
جلد پنجم	۱۲۰/=	جلد یازدہم	۱۲۰/=
جلد ششم	۱۰۰/=		

امام اعظم اور علم حدیث ۱۰۰/=

اسلام کا نظامِ اذکار ۶۰/=

ملنے کے پتے

ادارہ تعلیماتِ قرآن
دار العلوم شہابیہ سیالکوٹ

اسلامی اکادمی
۱۷۔ اردو بازار۔ لاہور

ملکیت ــــــــــ ادارہ تعلیمات قرآن دارالعلوم الشہابیہ

طابع ــــــــــ حافظ محمد یوسف بٹ

تزئین دآرائش ــــــــــ السید انور حسین نفیس رقم

کتابت ــــــــــ سجاد احمد سہالوی تلمیذ محمد جمیل سرزا نگپور سیالکوٹ

ناشر ــــــــــ قاری عبدالرحمٰن ایم اے

صفحات ــــــــــ

تاریخ اشاعت ــــــــــ جنوری ۱۹۹۲ء

مطبع ــــــــــ عرفان افضل پریس ۔ لاہور

قیمت ــــــــــ ۱۷۵/- روپے

ملنے کے پتے

ادارہ تعلیمات قرآن ۔ دارالعلوم الشہابیہ سیالکوٹ

اسلامی اکادمی ۔ ۱۷ اردو بازار ۔ لاہور

انتساب

میں معالم القرآن کی بارھویں جلد کو جس میں اسلام کی اجتماعی زندگی کا بھرپور چہرہ پیش کرنے کے بعد دنیا میں اسے قائم کرنے ؛ اس کے لیے محنت کرنے کی دعوت دی گئی ہے اور بتایا ہے کہ بلکتی انسانیت کے فکری ، اخلاقی ، مالیاتی ، معاشی ، سیاسی اور روحانی بیماریوں کا یہی واحد علاج ہے ۔ اور اسلام کے ماننے والوں کے ایمان باللہ کا یہی حقیقی ایمان ہے ۔ قابل صد احترام فضیلت مآب الحاج حافظ عبدالرشید خاقان صاحب کے نام سے منسوب کرتا ہوں جن کی اسلام سے مخلصانہ ہمدردی اور اس کے لیے قربانی ددیا دلی سے یہ بارھویں جلد زیورِ طباعت سے آراستہ ہو کر ہدیہ ناظرین ہو رہی ہے ۔

دعا ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس جذبہ خیر کو تا دیر سلامت رکھے اور ان کے اس مخلصانہ جذبہ سخاوت دنیا و آخرت میں ان کی کامیابی کا بہانہ کر دے ۔

(آمین)

قاری عبد الرحمٰن ایم اے
ناظم ادارہ تعلیماتِ قرآن
دار العلوم شہابیہ ۔ سیالکوٹ

دریا بحباب اندر

حرفِ آغاز

یہ معالم القرآن کی بارہویں جلد ہے۔

گیارہویں جلد جنوری ۱۹۹۱ء میں زیورِ طباعت سے آراستہ ہوکر اربابِ سواق کے سامنے آئی تھی۔ اب پورے ایک سال سات ماہ کے بعد بارہویں جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ تاخیر کی وجہ مؤلف کی بیماری ہے دو اپریشن ہوئے اور الحمدللہ دونوں کامیاب رہے۔ علاج کے لیے میں ڈاکٹر تسلیم کے لیے دِل کی پنہائیوں سے دعا گو ہوں۔ آپ نے جس فدیہ خیر سگالی کا مظاہرہ کیا ہے۔ مَیں اور میرے رفقائے کار آپ کے بے حد ممنون ہیں۔ بیماری کا عرصہ اچھا خاصا دراز بھی تھا اور تشویشناک بھی۔ لیکن الحمدللہ ثم الحمدللہ صحت یابی کی نعمت سے مالا مال ہوا۔ اللہ سبحانہٗ کا لاکھ لاکھ شکر و احسان ہے کہ اس نے معالم القرآن کی جلد دوازدہم کی تکمیل کا سامان بہم پہنچایا اور مجھ گنہگار کو یہ توفیق ارزانی فرمائی کہ بارہویں پارے کے مطالب پیش کرکے اپنے نامہ اعمال کو دھونے کے لیے رحمت کے چند قطرے مہیا کردں۔ اب یہ جلد دوازدہم مشتاق نگاہوں کے سامنے ہے۔ اس جلد میں جو عرق ریزی کی گئی ہے اس کا بڑا صلہ یہی ہے کہ قلم جادۂ حق سے نہ ہٹا ہو اور حقیقت کی منزل سے دُوری ہوئی نہ ہو۔

الحمدللہ اس جلد میں سارا کام دارالعلوم ہی میں ہوا ہے اور جنوری ۱۹۹۱ء سے شروع ہوکر یہ جلد جولائی ۱۹۹۲ء کو مکمل ہوئی۔

اس جلد میں جن گرامی قدر علمی گہواروں سے استفادہ کیا گیا ہے ان کی تفصیل یہ ہے۔

البدایہ والنہایہ	حافظ ابن کثیر
الرصف	محمد بن عبداللہ العاقولی
منہاج السنہ	حافظ ابن تیمیہ
المنتقی	حافظ شمس الدین الذہبی

عقیدۃ الاسلام	السید انور شاہ کشمیری
فتح الباری	حافظ ابن حجر عسقلانی
التحریر والتنویر	علامہ محمد طاہر بن عاشور
الجامع الاحکام القرآن	علامہ قرطبی
مدارک التنزیل	لنسفی
تفسیر سورہ کہف	مولانا مناظر احسن گیلانیؒ
ترجمان القرآن	مولانا آزاد ابوالکلامؒ
قصص القرآن	مولانا حفظ الرحمٰن

اس سورت میں قرآن نے اپنے مخاطبوں کو نہایت لطیف انداز میں یہ بات سمجھائی ہے کہ عذاب کے آنے میں جو تاخیر ہو رہی ہے۔ یہ دراصل ایک مہلت ہے جو اللہ سبحانہٗ اپنے فضل سے تمہیں عطا کر رہا ہے اس مہلت سے اگر تم نے فائدہ نہ اٹھایا تو وہ عذاب آئے گا. جو کسی کے ٹالے نہ ٹل سکے گا۔ اور اہلِ ایمان کی مٹھی بھر جماعت کو چھوڑ کر تمہاری قوم کو صفحۂ ہستی سے مٹا دے گا۔ یہ بات قریش مکہ سے براہ راست نہیں کہی بلکہ سمجھانے کے لیے قوم نوح ، قوم ہود ، قوم صالح ، قوم لوط ، قوم مدین اور قوم فرعون کے واقعات سے کام لیا گیا ہے۔

ان واقعات سے قرآن اپنے مخاطبوں کو یہ سمجھانا چاہتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے قوانین میں ہم آہنگی اور یکسانیت ہے یعنی یہاں ہر جگہ ایک ہی قانون کام کر رہا ہے۔ کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو دوسرے سے ذرا بھی الگ ہو۔ بلاشبہ قومیں الگ الگ ہیں زمانے متفرق جگہیں الگ الگ ہیں۔ یہیں بہت ہیں نام بھی یکساں نہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے جونہی پردے ہٹتے ہیں. اصلیت کی بے لاگ وحدت سامنے آجاتی ہے۔
جب پوری کائنات میں وحدت قانون کام کر رہی ہے۔ تو یہ کیونکر ممکن ہے کہ قوموں کے اعمال اس سے باہر ہوں اور وہاں کوئی قانون کام نہ کر رہا ہو. قرآن کا دعویٰ ہے کہ یہ گوشہ ہی دوسرے گوشوں کے ساتھ جڑا ہوا ہے۔ یہاں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے. جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں ہے اور یہاں کے بھی وہی احکام و نتائج ہیں جو دوسرے گوشوں میں کارفرما ہیں۔ اگر عالم مادی میں آگ کا خاصہ جلانا ہے ایسا ہی عالم معنے میں بھی

ہے یعنی مادیات کے خواص کی طرح معنویات کے بھی خواص ہیں اور خواص ونتائج کا ایک ہی عالمگیر قانون یکساں طور پر دونوں جگہ کام کر رہا ہے۔ اسی کی طرف سورت کے آخر میں رہنمائی ہے۔

وکلا نقص علیک من انباء الرسل ما نثبت بہ فوادک

واضح کر دیا کہ گزشتہ رسولوں اور ان کی قوموں کی جو سرگزشتیں بیان کی گئی ہیں ان سے قرآن کا مقصد کیا ہے۔

۱۔ تاکہ تیرے دل کو تسکین ہو۔

۲۔ یہ سرگزشتیں حق کو واضح کر دیتی ہیں۔ ان میں حقیقت کی دلیلیں اور روشنیاں ہیں یہ بتلاتی ہیں کہ اس بارے میں اللہ کا ایک مقررہ قانون ہے۔ اور اس میں کبھی تبدیلی ہونے والی ہیں۔

مقدمہ

اللہ سبحانہٗ کے اپنے بندوں سے تعلقات دو طرح کے ہیں ایک حاکمیت کے دوسرے محبوبیت کے حاکمیت میں اللہ کا رسُول اللہ کی ہدایات کرتا ہے اور اللہ کی سیاست مثبت معاشرت سے تعلق رکھنے والی ہدایات کو بندوں میں نافذ کرتا ہے۔ اسی کے لیے لوگوں پر اللہ کے رسُول کی اطاعت فرض کی گئی ہے اور اسی کی خاطر ان سب لوگوں پر اطاعت فرض کی گئی ہے جو رسُول کی رہنمائی میں اللہ کی ہدایات کو لوگوں پر نافذ کرتے ہیں اطیعوا اللہ واطیعوا الرسول واولی الامر منکم اسی کو خلافت کہتے ہیں۔

اللہ سے بندوں کے تعلقات کی دوسری قسم محبوبیت ہے اور محبت کے لیے اللہ نے رسُول کی اتباع کی شرط لگائی ہے یعنی اللہ کی محبت کا ہر دعویٰ بے جان ہے اگر رسُول کی اتباع نہ ہو ان کنتم تحبون اللہ فاتبعونی ۔ اسی لیے اس کو آیت محبت کہتے ہیں۔

پہلی قسم میں لوگوں کا امتحان نعمتوں کے ذریعے ہوتا ہے۔ نعمتیں دے کر دیکھا جاتا ہے کہ ان کو رب کی مرضی میں استعمال کرتے ہیں یا اپنی چاہتوں میں۔ حضرت سلیمان فرماتے ہیں ھذا من فضل ربی لیبلونی ءاشکر ام اکفر ۔ حکومت کی نعمت، جاہ کی نعمت کاروبار میں وسعت اولاد اور اس قسم کی دوسری نعمتوں سے ان لوگوں کا امتحان لیا جاتا ہے۔

حاکمیت ہی میں مقابلہ کو کفر جحود مشاقہ اور جحادہ کہتے ہیں وجحدوا بہا واستیقنتھا انفسھم ظلما وعلوا الخ ومن یشاقق الرسول من بعد ما تبین لہ الھدی الخ اور ان الذین یحادون اللہ ورسولہ الخ اور اسی میں نافرمانی اور بغاوت کو طغیان، عدوان کہتے ہیں اور اسی کی پاداش میں انبیاء کی قوموں پر عذاب آیا ہے۔

اس سورت میں پوری تاریخی تربیت کے سیاستدان قوموں کا ذکر کیا ہے جو برسر اقتدار نہیں، اور جنہوں نے اقتدار کے نشہ میں نبوت کی دعوت کا مقابلہ کیا قوم نوح ہو یا قوم ہود یا قوم صالح یا قوم شعیب

اور آخر میں حضرت موسیٰ مخاطب فرعون ہو یا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب اہل مکہ ہوں۔ سب پر غور کرو ایک ہی حقیقت ابھرتی نظر آئے گی وہ کیا ہے کہ زندگی کے مختلف گوشوں میں اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو۔ پوری سورت کا مطالعہ کرو آپ کو معلوم ہوگا کہ ہر جگہ ہی استدلال کام کر رہا ہے۔ البتہ ہر مقام پر ایک طرح کا بیان نہیں ہے اور نہ ایک ہی پہلو پر زور دیا گیا ہے۔ کسی مقام پر شخصیتوں کا ذکر کیا گیا ہے کہیں قوموں کا ذکر کیا گیا۔ کہیں وقائع کی طرف اشارا کیا گیا ہے۔ یہ سورت ان سورتوں میں سے ہے جس میں وقائع کو پوری تاریخی ترتیب سے پیش کیا گیا ہے۔ ان تمام سرگذشتوں پر نظر ڈالو جو اس سورت میں بیان کی گئی ہیں۔ یہ حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت سے شروع ہوتی ہوئی ہیں اور حضرت موسیٰؑ کے ذکر پر ختم کردی جاتیں ہیں۔ غور کرنے کی بات ہے کہ دعوت میں، اعلانات میں تذکیر وموعظت میں احوال وظروف میں اور قبول میں نوعیت وحیثیت میں اور ہر تقرری نتیجہ میں کامل یکسانیت پائی جاتی ہے اور کس طرح حضرت آدم سے لے کر حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تک ہی ایک حقیقت کام کر رہی ہے۔ مخاطب ایک سے زیادہ ہیں مگر دعوت سب جگہ ایک ہے ان کی پکار کیا تھی اور پکار کی نوعیت کیا تھی ان کی دلیلیں کیا تھیں جن پر انہوں نے زور دیا۔ ان کا طریق کار کیا تھا جس پر وہ برابر کاربند رہے اور پھر ان کے اور ان کی قوموں میں جو معاملات پیش آئے وہ کس قسم کے تھے اور ان معاملات میں ان کا جو قول وفعل رہا وہ کس قسم کا تھا۔ ان ساری باتوں میں ہر رسول دوسرے رسول کی تصویر تھا ہر دعوت دوسری دعوت کا عکس تھی سب نے کہا یاقوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ لوگو اللہ کی بندگی کرو۔ اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں۔ سب نے کہا ظلم و بدعملی سے باز آجاؤ۔ اس کا نتیجہ ہلاکت ہے بہرحال شان حاکمیت میں اللہ سے عابدانہ تعلقات کا نام بندگی ہے۔

اللہ سبحانہٗ کی دوسری شان محبوبیت ہے۔ سب نبیوں نے اس کی دعوت دی ہے۔ سب نے یاد الٰہی پر زور دیا ہے اس کی انابت اسپر توکل کی راہ بتاتی ہے۔ اسی کا نام ولایت ہے۔ شان محبوبیت میں اللہ سے عابدانہ تعلقات کا نام پرستش ہے۔ محبت کا امتحان رحمتوں سے ہوتا ہے۔ اس کی تفصیل انشاءاللہ سورہ یوسف میں ملے گی ترجمین قرآن نے شان محبوبیت کو بتانے کے لیے ما لکم من الٰہ غیرہ کا ترجمہ یہ کیا ہے کہ اللہ کے سوا تمہارا معبود کوئی نہیں ہے۔ شانِ محبوبیت کو اجاگر کرنے کے لیے حضور اقدس کی اتباع کو لازم قرار دیا ہے اور اسی کے نتیجہ میں آپ کو اسوہ حسنہ دیا گیا ہے۔ اسی کو سنت کہتے ہیں

بہرحال بتانا یہ ہے کہ سورہ ہود میں اللہ سبحانہٗ کی شان حاکمیت سے بغاوت کرنے والوں کی داستانیں بیان ہو رہی ہیں۔ تاریخی استقرار کی روشنی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بتایا گیا ہے کہ

حضرت نوح علیہ السلام بشارت و انذار کے ساتھ اپنی قوم کے پاس رہے بعینہٖ اسی انذار و بشارت کے ساتھ آپ بھی قریش مکّہ کے سامنے اللہ سبحانہٗ کی شانِ حاکمیت کا بول بالا کرنے آئے ہو ۔ حضرت نوح کی قوم کے برسرِ اقتدار طبقہ نے بھی اسی طرح کی باتیں بنائی تھیں جس قسم کی باتیں قریش کا برسرِ اقتدار طبقہ بنا رہا ہے بالآخر ان پر اللہ کا عذاب آیا ۔ آخر میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کو مخاطب کرکے بشارت دی گئی ہے فاصبر ان العاقبۃ للمتقین اس کے بعد قوم ہود کی سرگزشت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو سنائی گئی اور بتایا کہ انہوں نے حضرت ہود کا اللہ کی شانِ حاکمیت میں مقابلہ کیا اور وہی روش اختیار کی جو قریش مکّہ حضور کے ساتھ کر رہے ہیں ۔ اس داستان کے سنانے سے مقصود قریش کو تاریخ کے آئینے میں ان کا چہرہ دکھانا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دینا ہے ۔ حضرت لوط اور حضرت شعیب اور حضرت موسیٰ کی داستان بھی اسی پس منظر میں پیش کی گئی ہے ۔

سورہ ہود میں شخصیتوں اور قوموں کا ذکر کرکے تمام سرگزشتیں ایک ہی مقام پر جمع کر دی ہیں اور ان سب سے بحیثیت مجموعی استدلال کیا ہے تاکہ استدلال کے سارے پہلو اشکارا ہو جائیں ۔

یہ پہلی قومیں جو یکسر ہلاک ہو گئیں تو صرف اس لیے ہوئیں کہ ان میں اہلِ خیر و صلاح معدوم ہو گئے تھے کوئی شر و فساد سے روکنے والا نہیں رہا تھا ۔ اگر ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے موجود ہوتے تو کبھی اس نتیجہ سے دوچار نہ ہوتے کیونکہ ایسا نہیں ہو سکتا کہ کسی قوم کو عذاب کی گرفت میں ایسی حالت میں پکڑ لیا جائے کہ قوم میں اصلاح کرنے والے کام کر رہے ہوں ۔ یہ اشارہ ہے اس طرف کہ اگر آپ اپنی راہ پر جمے رہے اور ایک گروہ داعیان حق کا پیدا ہو گیا تو یہ سزائیں عذاب استیصال سے محفوظ رہے گی ۔

اصطلاحاتِ قرآنی

اُحکمت احکام سے ماضی مجہول کے صیغہ واحد
مؤنث غائب ہے مضبوط کی گئی تاب کی گئی
احکام علامہ مجدالدین فیروز آبادی بعصا
ترمذی التمیری لکھتے ہیں کہ اس مادے کی
اصلی معنے اصلاح خیز روک کے ہیں اسی سے
عربی میں حکمہ لگام کے اس رنبی حصہ کو
کہتے ہیں جو گھوڑے کے منہ میں سوتا ہے
احکمت الدابۃ کے معنے ہیں گھوڑے
کے منہ میں لگام لگا دیا اور حکمت الدابۃ
کے معنے ہیں لگام کے ذریعے اسے
روک لیا اسی سے حکمت ہے جس کے ایک
سے معانی ہیں عدل علم، حلم نبحت قرآن
انجیل دین میں سمجھ، دین پر عمل ختیبہ پرہیز
عقلی، بات کی درستگی اور کردار میں تفکر۔
اسی معنے کی رعایت حکیم ہیں۔ روک ہی
حمایت سے مضبوط بنانے کے احکمت لیانہ
کے دو معنے ہیں ایک یہ کہ قرآن کی آیات
کو مضبوط بنا دیا ہے دوسرے یہ کہ آیاتِ
قرآنی حکمت والی ہیں

یثنون مضارع کا جمع مذکر غائب ہے ثنی
یثنی ثنیا موڑنا اور ثنی کے معنے دوسرا
ہونا ہیں اس کے اصل معنے موڑنے کے ہیں
اسی سے ثانی عطفہ سے پہلو موڑنا۔ اسی سے
مثانی جسے بار بار کہا جائے موڑ فاتحہ مثانی
اسی لیے کہتے ہیں کہ اس کا نمازوں میں تکرار
ہوتا ہے۔

عرش عرش، تخت شاہی امام ابوبکر سجستانی نزہتہ
القلوب میں فرماتے ہیں۔ عرش کے معنے تختِ
شاہی کے ہیں آیات ذیل میں عرش سے
مراد یہی ہے ورفع ابویہ علی العرش
اور اونچا بٹھایا اپنے ماں باپ کو تخت پر
المسکن العرشد کیا تیرا تخت
بھی ایسا ہی ہے۔ اور امام راغب اصفہانی
مفرداتِ القرآن میں رقم طراز ہیں۔ عرش
اصل میں مسقف چیز کو کہتے ہیں اس کی جمع
عروش ہے وھی خاویۃ علی عروشھا
اور اسی اعتبار سے عرشت الکرم کے انگور
کی بیلوں کے لیے ٹٹیاں بنانے کے ارشاد
ہے معروشات وغیر معروشات اور بادشاہ
کے بیٹھنے کی جگہ کو بھی اسی اعتبار سے عرش

کہتے ہیں کہ وہ بلند ہوتی ہے۔ چنانچہ
ارشاد ہے ورفع ابویہ علی العرش
اور کبھی عرش عزت غلبہ اور سلطنت کیلئے
بطور کنایہ استعمال ہوتا ہے اور خداوند
قدوس کے بارے میں انسان کو نام کے
سوا کچھ معلوم نہیں ہے۔ حقیقت تک انسان
کی رسائی نہیں ہے۔ عوامی ذہن اس موضوع
جو کچھ سمجھتے ہیں وہ صحیح نہیں ہے کیونکہ اس
صورت میں عرش ذات باری کا حامل ہوگا
نہ کہ محمول حالانکہ ذات باری اس سے
بالاتر ہے کہ کوئی چیز اسے اپنائے۔ اللہ
سبحانہٗ کا ارشاد ہے ان یمسک السماوات
والارض ان تزولا ولئن زالتا
ان امسکہما من احد من بعدہ
اور یہ ارشاد وکان عرشہ علی الماٗ
اس میں تنبیہ ہے کہ عرش جب سے وجود
میں آیا ہے پانی کے اوپر ہی رہا۔ اور ذو
العرش المجید اور رفیع الدرجات
ذوالعرش نیز اس طرح کی جو آیات ہیں
ان کے متعلق کہا گیا ہے کہ یہ حق تعالیٰ شانہٗ
کی سلطنت و مملکت کی طرف اشارا ہے اور
اس کے مستقر کا بیان نہیں ہے کیونکہ اس
کی ذات عالی اس سے بالا ہے۔ اور امام
ابوبکر احمد بن الحسین البیقہی اپنی کتاب
الاسمائو الصفات میں لکھتے ہیں کہ مفسرین
کے اقوال بھی ہیں کہ عرش سے مراد تخت ہی
ہے اور یہ ایک جسم ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے
پیدا فرمایا ہے اور فرشتوں کو حکم دیا ہے کہ
اسے اٹھائے رکھیں اور اس کی تعظیم اور طواف
کے ذریعہ اللہ کی عبادت بجالائیں۔ اور جس
طرح سے زمین میں ایک گھر پیدا فرمایا اور
نبی آدم کو حکم دیا کہ اس کا طواف کریں اور
نماز میں اس کی طرف منہ کریں ــــ اور امام
عبدالوہاب شعرانی الیواقیت والجواہر فی عقائد
الاکابر میں ارقام فرماتے ہیں اگر تم یہ سوال
کرو کہ عرش کو عظیم کریم اور مجید تین ناموں
سے موسوم کرنے کی کیا حکمت ہے کیا ان میں
ترادف ہے؟ جواب یہ ہے کہ یہ ترادف
نہیں ہیں بلکہ عرش کو اس کے احاطہ کی حیثیت
سے عظیم کہا ہے کیونکہ سب اجسام سے بڑا ہے
اور اس حیثیت سے کہ اس کو سب پر فوقیت
ہے وہ کریم ہے اور اس حیثیت سے کہ کوئی
اور جسم اس کا احاطہ کرسکے۔ اس سے وہ بالا
ہے وہ مجید ہے۔

اُمَّۃ جماعت، مدت، طریقہ، دین، ہر وہ جماعت
جس میں کوئی رابطہ اشتراک موجود ہو اسے امت
کہا جاتا ہے۔ خواہ یہ اتحاد مذہبی وحدت کی بنا
پر ہو، یا جغرافیائی اور عصری وحدت کی وجہ سے
ہو اور خواہ اس رابطہ میں امت کے اپنے
اختیار کو دخل ہو یا نہ ہو۔ اخفش نے تصریح کی

ہے کہ اُمت باعتبار لفظ کے واحد ہے اور باعتبار معنے کے جمع نیز حیوان کی ہر جنس ایک اُمت ہے قال النبی فی العمدہ ابن درستویہ کا بیان ہے کہ جہاں بھی اُمت کے معنے مدت کے ہوں گے وہاں اس کا مضاف محذوف ہوگا اور مضاف الیہ مضاف کے قائم مقام ہوگا واد کو بعد امۃ میں لفظ زمن یا حین محذوف ہے گو اصل میں یوں ہوگا۔ الی زمن امۃ معدودۃ اور بعد حین امۃ زمن اور حین کو حذف کرکے مضاف الیہ کو یعنی لفظ اُمۃ کو اس کے قائم مقام کر دیا ہے۔ اُمت کے مجازی معنے طریقہ اور دین کے بھی آتے ہیں عرب والے بولتے ہیں فلان لا اُمۃ۔ یعنی فلاح کا کوئی دین اور طریقہ نہیں ہے کذا فی عمدۃ القاری

ضائق ضاق یضیق سے اسم فاعل ہے۔ ضیق سعہ وسعت اور کشادگی کی ضد ہے اور ضیق بھی بولا جاتا ہے۔ ضیقۃ کا استعمال فقر، بخل، غم اور اسی قسم کے معنوں میں ہوتا ہے ارشاد ہے ضائق بہ صدرک اور تنگ ہوگا تیرا سینہ یضیق صدری رُک جاتا ہے میرا سینہ ضاق بہم ذرعاً یعنی ان سے عاجز ہوگیا۔ ضیقا حرجا تنگ بے نہایت تنگ لاتک فی ضیق اور تنگ مت ہو یہ سب غم و حزن کی تعبیریں ہیں۔

امام پیشوا، مقتدا، رہنما، وزن فعال اسم ہے اُمّ یوم سے جس کے معنے ہیں جس کا قصد کیا جائے چونکہ مقتدا اور رہنما کی طاعت کا قصد کیا جاتا ہے اس لیے اس کو امام کہتے ہیں بغرض جس کی پیروی کی جائے وہ امام ہے۔ حق میں پیروی ہو یا ناحق میں اور خواہ جس کی پیروی کی جائے وہ انسان ہو کہ اس کے قول وفعل کی پیروی کریں یا کتاب ہو کہ اس کے اوامر و نواہی پر عمل کیا جائے جمع ائمہ آتی ہے اور جمع کے موقعہ پر لفظ واحد ہی استعمال ہوتا ہے۔

عوج کجی، ٹیڑھا پن، یہ عوج یعوج سے بنا ہے جس کا استعمال ٹیڑھا اور کج کے لیے ہوتا ہے اسم ہے ابوزید نے جو لغت کے مشہور امام ہیں تصریح کی ہے کہ جو کجی آنکھوں سے نظر آئے اس کے لیے عین کے زیر کے ساتھ عِوج ہے اور جو آنکھ سے نہیں بلکہ عقل وشعور سے سمجھ میں آئے اس کے لیے عوج

عُمّیت وہ چھپا دی گئی۔ وہ نگاہوں سے اوجھل کر دی گئی۔ معتبر ہے جس کے معنے اندھا کر دے اور چھپا دینے کے ہیں۔ عمی مادہ ہے علامہ فیومی نے مصباح المنیر میں لکھا ہے عمی الخبر کے معنے ہیں خبر کا پوشیدہ ہونا اور امام راغب فرماتے ہیں ـــــ عمی غلبہ کے معنے میں کسی چیز کا ایسا مشتبہ ہو جانا کہ وہی اس کے لحاظ سے اندھا ہو جائے اور وہ چیز اس سے بالکل سجھائی نہ دے ارشاد ہے فعمیت علیہم الانباء یومئذٍ نیز و آتانی رحمۃ من

عندہ فعمیت علیکم اس نے بھیجی مجھ پر رحمت اپنے پاس سے پس وہ تمہاری نظروں سے اُوجھل کر دی گئی۔

عصبۃ جماعت، گروہ، یہ عصبت سے بنا ہے جس کے معنے جمع ہونے اور گھیرنے کے ہیں۔ علامہ زمخشری فرماتے ہیں" عصبۃ اور عصابۃ دس اور دس سے زیادہ اشخاص کو کہتے ہیں اور بعض چالیس تک بتاتے ہیں وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اتنے اشخاص سے سب کاموں میں قوت ہوتی ہے اور وقت پڑنے پر لوگ کافی ہوتے ہیں اور امام ابن جریر نے تصریح کی ہے کہ نفر اور رھط کی طرح اس کا بھی واحد نہیں آتا۔ اور مصباح میں ہے کہ عصبۃ مردوں کی جماعت ہے اور اس کی جمع عُصَب ہے جیسے غرفہ کی جمع غرف۔ راغب اصفہانی کہتے ہیں عصبۃ وہ جماعت ہے جو ایک دوسرے کی پشتیباں ہو۔ ارشاد ہے لتنوء بالعصبۃ اور نحن عصبۃ یعنی ہماری بات ایک ہے اور ہم ایک دوسرے کے یار و مددگار ہیں۔ عصبہ کتنے افراد کی جماعت اس کے بارے میں علامہ ابوحیان اندلسی نے تفسیر البحر المحیط میں ایک سے زیادہ قول لکھے ہیں۔ علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں الخبر شیخ سے غافل ہیں۔ اصل میں تو دس کے معنے مطلق جماعت کے ہیں پھر عرف میں ایک خاص تعداد کے ساتھ مخصوص ہو گیا۔ بعد کو عرف بھی مختلف ہو گئے۔

عصیب سخت بھاری عصب سے جس کے معنے سخت کسنے کے ہیں۔ بروزن فعیل صفت مُشبہ کا صیغہ ہے۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں فرماتے ہیں۔ قرآن میں ہے ھذا یوم عصیب یہ دن بڑا سخت ہے۔ فراء کہتے ہیں یوم عصبصب اور یوم عصیب کے معنے سخت گرم دن یا سخت دن کے۔ یہی معنے لیلۃ عصیب کے ہیں اور لیلۃ عصیبۃ نہیں بولتے ہیں فراء نے کہا ہے کہ عصبت الشئ سے ماخوذ ہے جس کے معنے باندھنے کے ہیں لیکن یہ مشہور نہیں ہے ازہری کہتے ہیں کہ یہ عصب القوم امر یعصبھو عصبًا سے ماخوذ ہے جس کے معنے ہیں کسی سخت بات کا پیش آ کر لوگوں کو جمع کر دینا۔

امام راغب مفردات القرآن میں لکھتے ہیں یوم عصیب میں عصیب بمعنے شدید ہے اور یہ فاعل کے معنے میں بھی ہو سکتا ہے اور مفعول کے معنے میں بھی۔

اوّاہ نرم دل۔ بہت آہ کرنے والا اوّاہ ہے جس کے معنے آہیں بھرنے کے ہیں۔ مبالغہ کا صیغہ فعّال۔ قرآن عزیز میں اوّاہ سے کیا مراد ہے اس بارے میں مصنف سے یہ اقوال منقول ہیں

۱۔ بہت زیادہ دعا کرنے والا۔
۲۔ مومن
۳۔ فقیہ
۴۔ رحمدل

۵۔ مومن تواب
۶۔ تسبیح من سبحانہٗ میں مشغول رہنے والا
۷۔ کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا
۸۔ کتاب اللہ کی بہت زیادہ تلاوت کرنیوالا
۹۔ خشیت الٰہی کی بنا پر بہت زیادہ آہ آہ کرنیوالا
۱۰۔ دربار الٰہی میں خشوع وخضوع کرنے والا
۱۱۔ حبشی زبان میں مومن کو کہتے ہیں
۱۲۔ معلم خیر
۱۳۔ وعدہ کو پورا کرنے والا
۱۴۔ گناہوں کو یاد کرتے وقت استغفار کرنیوالا
۱۵۔ شفیق
۱۶۔ ہر بات سے ہٹنے والا ۔(البحر المحیط)

علامہ شوکانی لکھتے ہیں ۔

لغت کے اعتبار سے اواہ کے یہ معنے زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں کہ اواہ وہ ہے جو اپنے گناہوں پر بہت زیادہ آہ کرے مثلاً یہ کہے کہ آہ میرے گناہ آہ مجھے اس پر کیا سزا دی جائے گی ۔فراء کی بھی یہی رائے ہے اور حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ سے بھی یہی منقول ہے امام ابوجعفر ابن جریر طبری فرماتے ہیں ۔

ان سب اقوال میں اوّل اس شخص کا قول ہے جو اس کے معنے بہت زیادہ دعا کرنے والے کے بیان کرتا ہے سیاق قرآنی کے بھی یہی معنے مناسب ہیں کیونکہ جب اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم کے متعلق فرمایا کہ اپنے باپ کے لیے ان کی طلب مغفرت ایک وعدے کی بنا پر کی تھی ۔اس سلسلے میں اپنے باپ سے انہوں نے کہا تھا اب چونکہ حضرت ابراہیم بہت زیادہ دعا کرتے ہیں نیز جو آپ کو ستاتا اور تکلیف دیتا اب اس کے ساتھ بردباری سے پیش آتے تھے ۔بدیں وجہ باپ کی طرف سے آپکو شدید اذیت پہنچنے پر آپ نے اس لیے استغفار کیا ۔

رَبّ: پروردگار، مالک، صاحب، یہ اصل میں رَبَّ یَرُبُّ کا مصدر ہے جس کے معنیٰ تربیت کے ہیں اور پھر مبالغہ کے لیے عدلٌ کی طرح بطور وصف استعمال کیا جانے لگا اور بعض کا قول ہے کہ بَرٌّ کی طرح صفت مشبہ کا صیغہ ہے ۔امام راغب کا بیان ہے کہ رب مصدر ہے جو فاعل کے لیے مستعار ہے ۔تربیت کی تعریف امام موصوف نے ان الفاظ میں کی ہے ۔ھو انشاء الشئ حالاً فحالاً الی حد التمام یعنی کسی چیز کو یکے بعد دیگرے ایک حالت سے دوسری حالت میں اس طرح نشوونما دیتے رہنا کہ حد کمال تک پہنچ جائے ،اس معنیٰ کے اعتبار سے امام حلیمی نے جو رب کی تعریف کی ہے وہ ان ہی کے الفاظ میں درج ذیل ،امام بیہقی کتاب الاسماء والصفات میں رقمطراز ہیں ۔

حلیمی رحمۃ اللہ نے رب کے معنیٰ میں فرمایا ہے کہ رب وہ ہے جو ہر اس چیز کو جسے اس نے ایجاد کیا ہے کمال کی اس حد تک پہنچا دیتا ہے

کہ جو حد اس چیز کے لیے اس نے مقرر فرمادی
ہے، پس وہ نطفہ کو پشت سے نکالتا. پھر اس
کو پھٹکی بناتا پھر پھٹکی کو بوٹی پھر بوٹی سے ہڈیاں
پیدا کرتا پھر ہڈیوں پر گوشت چڑھاتا پھر ان میں
جان ڈالتا اور اس کو ایک نئی صورت میں جبکہ
وہ ناتواں بچہ ہوتا ہے نکال کھڑا کرتا اور برابر
اس کو نشوونما کرتا رہتا ہے یہاں تک کہ اس
کو پورا مرد کردیتا ہے اور ابتدا ر حال میں وہ
جوان ہوتا ہے پھر اس کو ادھیڑ پھر بوڑھا بنا
دیتا ہے اور جو چیز بھی اس نے پیدا کی
اس کا یہی طور ہے پس ربّ وہ ہے جو اس
کا نگراں اور اس حد پر اس کو پہنچانے والا
ہو جو حد کہ اس کے لیے اس نے مقرر کی اور
اس کی نہایت و مقدار قرار دی ہے۔

ابن خالویہ لغوی نے تصریح کی ہے کہ ربّ
کے معنیٰ لغت میں سید اور مالک کے ہیں۔

امام بیہقیؒ کتاب الاسماء والصفات میں امام
خطابیؒ سے ناقل ہیں کہ

بہت سے مفسرین سے یہ آیۂ کریمہ اَلْحَمْدُ
لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ کی تفسیر میں مروی ہے
کہ ربّ کے معنی سید (سردار) کے ہیں
اور یہ معنیٰ اس وقت بن سکتے ہیں جب کہ ہم
عالمین کے معنیٰ جماد کو چھوڑ کر ممیزین یعنی
ذوی العقول کے قرار دیں کیونکہ جس طرح سید
الناس کہا جاتا ہے اس طرح سیّد الشجر والجبال
وغیرہ کہنا درست نہیں ہے اور اسی معنیٰ میں
ارشاد الٰہی ہے. ارجع الی ربک فسئلہ
ما بال النسوۃ الّٰتی قطعن ایدیھن
(پھر جا اپنے آقا کے پاس اور اس سے پوچھ
کیا حقیقت ہے ان عورتوں کی جنہوں نے
اپنے ہاتھ کاٹ لیے) کہ یہاں رب بمعنیٰ سید
(آقا، خاوند) ہے اور بعض کا قول ہے کہ ربّ
بمعنیٰ مالک ہے اور اس اعتبار سے اضافت بر
بنا دے عموم درست ہے اور بہت سے علماء
اس طرف گئے ہیں کہ اسم عالم تمام کائنات
کے لیے بولا جاتا ہے، اور ان کا استدلال اس
آیت کریمہ سے ہے. قال فرعون و
ما رب العلمین ۰ قال رب السموٰت
والارض وما بینھما ان کنتم موقنین
(بولا فرعون کیا معنیٰ جہان کا صاحب. موسیٰؑ نے
کہا صاحب آسمان اور زمین کا اور جو ان کے
بیچ میں ہے اگر تم یقین کرو)

امام راغب نے لکھا ہے کہ

ربّ مطلقاً (یعنی جب بغیر کسی شرط کے
استعمال ہو) سوائے اللہ تعالیٰ کے جو مصالح موجودات
کا کفیل ہے اور کسی کے لیے نہیں بولا جاتا چنانچہ
ارشاد ہے بلدۃ طیبۃ و رب غفور
(دیس ہی پاکیزہ اور رب ہی گناہ بخشتا) اور ایسی
طرح اللہ کا قول ہے. ولا یامرکم ان
تتخذوا الملٰئکۃ والنبیین اربابا

(اور نہیں لائق کہ تم کو حکم کرے کہ ٹھہراؤ
فرشتوں کو اور نبیوں کو رب) یعنی انہیں معبود
قرار دو اور خالق اور مسبب الاسباب اور
بندوں کی مصلحتوں کا کفیل سمجھو۔
اور اضافت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے لیے بھی
بولا جاتا ہے اور غیر اللہ کے لیے بھی آتا ہے
جیسے ارشاد ہے۔ رب العلمین (سارے
جہان کا صاحب) اور ربکم و ربُّ
اٰبائکم الاوّلین (صاحب تمہارے اگلے
باپ دادوں کا) اور ربّ الدار (گھر والا) اور
رب الفرس (گھوڑے والا) ان دونوں کے
مالک کے لیے بولا جاتا ہے اور اسی معنیٰ میں
ارشاد الٰہی ہے۔ اُذْكُرْنِي عِنْدَ رَبِّكَ
فَأَنْسٰهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ (میرا ذکر
کیجیو اپنے بادشاہ کے پاس سو بھلا دیا شیطان
نے ذکر کرنا اپنے بادشاہ سے)
اور ارشاد ہے اِرْجِعْ اِلٰى رَبِّكَ
(پھر جا اپنے بادشاہ کے پاس)
آیت کریمہ (قال معاذ اللہ انہٗ ربّیٓ
اَحْسَنَ مَثْوَایَ (اس نے کہا۔ خدا کی پناہ
وہ مالک ہے میرا اچھی طرح رکھا ہے مجھ کو)
میں بعض کا قول ہے کہ رب سے اللہ تعالیٰ
مراد ہے اور بعض کہتے ہیں کہ وہ بادشاہ مراد
ہے جس نے ان کی تربیت کی تھی۔ اور حضرت
یوسف علیہ السلام کے قول کے زیادہ مناسب
پہلے معنی ہیں۔

سوٓء: برائی، آفت، گناہ، بُرا کام، عیب، سوء
سے اسم ہے علامہ سید مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے
کہ یہ آفات و امراض کا ایک جامع نام ہے امام
راغب فرماتے ہیں۔
سوٓءٌ ہر وہ چیز ہے جو انسان کو غم میں ڈال دے
خواہ دنیوی امور میں سے ہو یا اخروی امور سے
احوال نفسیہ میں سے ہو یا احوال بدنیہ میں سے
یا ان حالات میں سے ہو کہ جو جاہ و مال کے
چھوٹ جانے اور دوست کے بچھڑ جانے
سے پیدا ہوتے ہیں۔
قرآن مجید میں اس کا استعمال جن معانی
ہوا ہے امام سیوطیؒ نے ان کو تفصیل کے
ساتھ قلم بند کیا ہے۔ فرماتے ہیں
سوٓء کئی طرح پر استعمال ہوتا ہے
(۱) شدت کے لیے۔ یسومونکم سوٓء
العذاب (وہ کرتے تھے تم پر سخت
عذاب)
(۲) کونچیں کاٹنے کے لیے ولا تمسوھا
بسوٓء (اور اس کو ہاتھ نہ لگا بُری طرح یعنی
ناقہ کی کونچیں نہ کاٹ ڈالنا)
(۳) زنا کے لیے ما جزاء من اراد
باھلک سوٓءً (اور کچھ سزا نہیں ہے
ایسے شخص کی جو چاہے تیرے گھر میں برائی
یعنی زنا)

(۴) برص کے لیے بیضاء من غیر سوء
(سفید بغیر عیب یعنی برص کے)
(۵) عذاب کے لیے إن الخزی الیوم
والسوء علی الکفرین۔
(بے شک رسوائی آج کے دن اور برائی منکروں
پر ہے)
(۶) شرک کے لیے ما کنا نعمل من
سوء (ہم تو کرتے نہ تھے کچھ برائی یعنی
شرک)
(۷) گالی گلوچ کے لیے لا یحب الله
الجهر بالسوء (اللہ پسند نہیں کرتا
کسی بری بات کو یعنی کسی کی دشنام طرازی کو)
والسنتهم بالسوء (اور رکھولیں) اپنی
زبانیں بُرائی کے ساتھ)
(۸) گناہ کے لیے یعملون السوء
بجهالة (کرتے ہیں بُرا کام جہالت سے)
(۹) بئس (بُرا ہے) کے معنیٰ میں ولهم
سوء الدار (اور ان کے لیے ہے بُرا گھر
(۱۰) ضرر کے لیے ویکشف السوء
(اور دُور کر دیتا ہے سختی) وما مسنی
السوء (اور مجھ کو بُرائی کبھی نہ پہنچتی)
(۱۱) قتل و ہزیمت کے لیے لم یمسسهم
سوء (نہ پہنچی ان کو کچھ آنچ)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ ہود

موضوع ۔ اس سورت کا موضوع انسانی زندگی میں رذائل کا خاتمہ اور پھر بھرپور اور سیر حاصل تنقید ہے ۔ رذائل وہ برائیاں جن کو اللہ سبحانہ ناپسند کرتا ہے ۔ جن سے بچنے کا حکم اس نے اپنے بندوں کو دیا ہے جن کے کرنے والے اس کے حضور میں گنہگار ٹھہرتے ہیں ۔ جن کی برائی کو ہر عقلمند جانتا ہے اور جن کی بدولت شہریوں کی خانگی ۔ معاشرتی ، سیاسی اور روحانی زندگی تباہی کا نشانہ بن جاتی ہے ۔ رذائل اگرچہ بہت ہیں مگر بنیادی یہ ہیں ۔ شرک ، فاحشہ ، بغی ، عدوان ، اثم

جیسے فضائل میں توحید راس الطاعات ہے ایسے ہی رذائل میں شرک ام الرذائل ہے ۔ قرآن انسانی زندگی میں دوگونہ مقاصد لے کر آتا ہے ۔

ایک فضائل کی ترغیب جن سے انسانی زندگی میں صلاح ، آراستگی اور حسن وجمال آتا ہے ۔ دوسرے رذائل سے ترہیب ہے جن سے انسانی زندگی فساد ، بگاڑ اور خرابی کا گہوارہ بنتی ہے ۔

فضائل سمیٹنے کا نام عبادت وطاعت اور رذائل سے بچنے کا نام تقویٰ ہے مکی زندگی میں زیادہ زور رذائل سے بچنے پر ہے اور یہی سورت کا موضوع ہے حضرت نوح ، حضرت ہود اور حضرت صالح کی تقریریں شرک کی تردید میں ہیں جب کہ حضرت لوط کی تقریر کا خلاصہ فواحش کے خلاف اعلان ہے ۔ حضرت شعیب مالیاتی مسائل میں بغی پر ملامت کر رہے ہیں اور حضرت موسیٰ فرعون کے عدوان وفساد کے خلاف اعلان بغاوت کر رہے ہیں ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے مکی زندگی میں شرک ، فاحشہ ، بغی اور عدوان کے سارے نمونے موجود ہیں ان سب کو مٹانا نبوت محمدیہ کا نصب العین ہے ۔

نبوت کے کام کا آغاز رذائل کے خلاف پر مبنی دعوت سے ہوتا ہے ۔ ہے بھی یہ عقلی بات پہلے برتن کی منجھائی اور صفائی ہو ۔ قلعی کے ذریعے اس میں چمک اور دمک ہو ۔ منجھائی کا نام تخلیہ ہے جبکہ چمک اور دمک کا نام تحلیہ ہے اسی کی فقہاء نے معاملات میں رعایت رکھی ہے اور یہ قانون بنایا ہے کہ

درأ المفاسد اولیٰ جلب المصالح

مفاسد کا دور کرنا مصالح کے حصول سے زیادہ اچھا ہے

اور اسی لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بیعت برائیوں کے چھوڑنے پر لیتے تھے اور آج بھی مشائخ کا یہی معمول ہے ۔

بہر حال سورت کا موضوع انسانی زندگی سے رذائل کو مٹانا ہے ۔قرآن نے رذائل اور ان کے نتائج کے بارے میں اس سورت میں ایک مکمل تاریخی دستاویز تاریخی ترتیب کے ساتھ پیش کی ہے ۔

قرآن نے یہ تاریخی واقعات موضوع کے لیے بطور دلائل پیش کیے ہیں کیونکہ قرآن نے خود واقعات کے پیش کرنے کا پس منظر یہ بتایا ہے کہ یہ وہ حقائق ہیں جن کا دلوں میں یقین واذعان ہونا چاہیئے اور یہ سرگزشتیں ان حقائق کے لیے دلیلیں ہیں حجتیں ہیں براہین ہیں ۔سورہ ہود میں یہ بات بالکل واضح اور صاف ہے ۔

قرآن کا دعویٰ ہے کہ اس دنیا میں ایک حقیقت بالکل صاف اور واضح ہے یہ کہ اعمال اور نتائج عمل کا قانون ایک ہے یعنی ہر جگہ ایک ہی قانون کی کارفرمائی ہے بلاشبہ اعمال کے مظاہر اور قوالب مختلف ہیں اور نام بھی الگ الگ ہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے مثلاً ہم کہتے ہیں جاندار کے لیے موت و حیات ہے ۔پھولوں کے لیے کھلنا اور مرجھانا ہے ۔بہتر دن کے لیے بننا اور بگڑنا ہے ۔اجزا کے لیے ملنا اور بکھرنا ہے قوالب بہت ہیں ۔نام متعدد ہیں مگر حقیقت ایک اور صرف ایک ہے ۔ وہی قانون جو حیوانات میں موت و حیات ہے ۔نباتات میں کھلنا اور مرجھانا ہے ۔اسی طرح پوری کائنات کے ہر گوشہ میں قانون کی بنیاد وہی اصل کام کر رہی ہے ۔جب صورت حال یہ ہے ۔تو اعمال انسانی اس سے الگ کیونکر ہو سکتے ہیں ۔یہاں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے ۔جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں کام کر رہا ہے ۔اور یہاں بھی وہی احکام و نتائج ہیں جو دوسرے مواقع پر ہیں ۔مثلاً عالم مادی میں اگر آگ کا خاصہ جلانا ہے ۔تو عالم انسانی میں بھی اعمال کے یہی خواص ہیں ۔جیسے آگ اگر روشن ہو تو اس کا خاصہ جلانا ہے ۔اعمال میں بھی کوئی بات آگ کی طرح ہے ۔بتانا یہ چاہتا ہوں ۔کہ مادیات کے خواص کی طرح عالم انسانی میں معنویات کے بھی خواص ہیں ۔اور خواص و نتائج کا ایک ہی قانون کام کر رہا ہے ۔

یہ بات ذہن میں رکھنے کے بعد اتنی بات اور سمجھ لیجیے کہ جس طرح ہر بات کے لیے اللہ سبحانہ کے قوانین میں وحدت ہے ۔ ایسے ہی جماعتوں اور قوموں کی سعادت شقاوت اور حیات و موت کا بھی ایک قانون ہے ۔اور جیسے اللہ سبحانہ کے سارے قوانین میں یکسانی اور ہم آہنگی ہے عالمگیری اور ہمہ گیری ہے ۔اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ سے ایک ہے اور ہمیشہ سے ایک طرح کے

یہی نتائج ظاہر ہو رہے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی۔ قرآن کی اصطلاح میں اسی کا نام سنۃ اللہ ہے۔

زمانۂ نزول

سورہ یونس اور سورہ ہود اگاڑی پچھاڑی نازل ہوئی ہیں دونوں کے مباحث میں ہم آہنگی ہے۔ اس قدر ہم آہنگی ہے کہ اگر کہا جائے کہ سورہ ہود اس اجمال کی تفصیل ہے۔ جو سورہ یونس میں ہے۔ تو کوئی مبالغہ نہیں۔ موضوع دونوں کا ایک ہے۔ یہ سورۃ بہت ہی پُر آشوب حالات میں نازل ہوئی ہے۔ دونوں سورتوں کے مضامین پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس دور میں نبوت کی دعوت کی مخالفت کا بہت بڑا طوفان تھا۔ اور حالات میں اس قدر سنگینی تھی کہ ان کا مقابلہ کرنا بہت بڑے جگر کا کام تھا۔ حالات کی سنگینی کا اس حدیث سے ہی اندازہ ہوتا ہے۔ جو ترمذی میں بحوالہ حضرت عبداللہ بن عباسؓ بسند حسن کتاب التفسیر میں آئی ہے۔ جس میں تصریح ہے۔ کہ حضرت ابوبکرؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے عرض کیا کہ میں دیکھتا ہوں کہ آپ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ اس کی کیا وجہ ہے؟ فرمایا۔ شیبتنی سورۃ ہود واخوا تھا۔ مجھے سورۃ ہود اور اس جیسی سورتوں نے بوڑھا بنا دیا ہے۔ یہ حدیث مختلف الفاظ میں حدیث کی کتابوں میں آتی ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس سورۃ کے نازل ہونے کا زمانہ کیسا سخت ہو گا۔ جبکہ قریش کی چیرہ دستی اور مظالم انتہا کو پہنچے ہوئے تھے۔

سورۃ کا نام

حدیث کی ساری کتابوں اور تفسیروں میں سورہ ہود کا نام سورہ ہود ہی ہے۔ اور اس کے علاوہ کوئی دوسرا نام نہیں ہے۔ حضرت ہود کا نام اس سورۃ میں پانچ بار آیا ہے۔ یہ سورۃ مکی ہے۔ جمہور کی رائے میں ساری سورۃ مکی ہے۔ بعض روایات میں کچھ آیات کے استثنار کی طرف اشارا ہے۔ لیکن ان کی روایتی حیثیت کچھ زیادہ شاندار نہیں ہے۔ نزول سور کی ترتیب میں سورۃ ہود کا نمبر ۵۲ ہے۔

یہ سورۃ منجملہ ان سورتوں کے ہے جس میں حضرت نوحؑ سے بات شروع ہوئی اور حضرت موسیٰؑ پر ختم ہوئی۔ یہ تاریخی داستان تاریخی ترتیب کے مطابق ہے۔ اس اعتبار سے اس سورۃ کو

خاص اہمیت حاصل ہے۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ ان واقعات میں، داعیوں کی آوازوں میں تذکیر و موعظت میں، احوال و ظروف میں، مخاطبوں کی جانب سے رد و قبول میں، نوعیت و حیثیت میں اور پھر آخری نتیجہ میں، یکسانیت پائی جاتی ہے۔ اور کس طرح ان کی ہم آہنگی کھل کر سامنے آئی ہے اسی یکسانی اور ہم آہنگی کی طرف قرآن نے ان لفظوں میں اشارا کیا ہے۔

کلا نقص علیک من انباء الرسل

آیاتها ۱۲۳ (۱۱) سُورَةُ هُودٍ مَكِّيَّةٌ (۵۲) رکوعاتها ۱۰

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ ۚ كِتٰبٌ اُحْكِمَتْ اٰيٰتُهٗ ثُمَّ فُصِّلَتْ مِنْ لَّدُنْ حَكِيْمٍ خَبِيْرٍ ﴿۱﴾ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنَّنِيْ لَكُمْ مِّنْهُ نَذِيْرٌ وَّبَشِيْرٌ ﴿۲﴾ وَّاَنِ اسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ يُمَتِّعْكُمْ مَّتَاعًا حَسَنًا اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى وَّيُؤْتِ كُلَّ ذِيْ فَضْلٍ فَضْلَهٗ ؕ وَاِنْ تَوَلَّوْا فَاِنِّيْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ كَبِيْرٍ ﴿۳﴾ اِلَى اللّٰهِ مَرْجِعُكُمْ ۚ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۴﴾

الف۔ لام۔ را۔ یہ ایک عظیم الشان کتاب ہے۔ جس کی آیات باعتبار دلائل مضبوط اور باعتبار مطالب مفصل ہیں۔ اُس کی جانب سے ہیں۔ جو حکمت و دانائی والا اور باخبر ہے۔ اس کتاب

کا اعلان ہے۔ کہ اللہ کے سوا عابدانہ تعلقات کسی سے نہ رکھو۔[۲]

بلاشبہ میں اللہ سبحانہ کی جانب سے تمہیں خبردار کرنیوالا اور خوشخبری دینے والا ہوں[۳]۔ اور یہ کہ تم اپنے گناہوں کی اپنے رب سے معافی مانگو۔ اور آئندہ کے لیے اس کی طرف پلٹ آؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو وہ تمہیں ایک وقت مقررہ تک اچھا سامان زندگی دے گا۔ اور عمل میں زیادہ کرنے والے کو اس کی مزید کوشش و محنت کا اجر دے گا[۴]۔ اور دیکھو اگر تم نبوت کی دعوت سے روگردانی کرو گے تو مجھے اندیشہ ہے تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب کا یاد رکھو تم سب کو اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے اور وہ قادر مطلق ہے[۵]۔

آیات قرآنی کی ایک اور تقسیم

ان آیات میں قرآن کی دعوت کا خلاصہ بیان کیا گیا ہے۔ ان لاتعبدوا الا اللہ۔ یہ اوّل دن سے تمام دعوتوں کا اعلان رہا ہے۔ اور یہی قرآن کی دعوت ہے۔ قرآن میں لفظ عبادت چار طرح استعمال ہوا ہے۔ اوّل یہ کہ کسی کے ساتھ پرستش کا رویہ اختیار کرنا اس کی عبادت ہے کیونکہ مشرکین اپنے بتوں کے ساتھ جو کچھ کیا کرتے ہیں۔ اسے قرآن میں عبادت کہا گیا ہے۔

قالوا نعبد اصناما

دوسرے یہ کہ کسی کو مطاع مطلق مان کر اپنے ارادے اور اپنی مرضی سے اس کے احکام پر چلنا اس کی عبادت کرنا ہے۔ قرآن کی اس آیت والذین اجتنبوا الطاغوت ان یعبدوھا میں اسی طرز عمل کو عبادت کہا گیا ہے۔ جو طاغوت کے ساتھ اس کی پیروی

یں اختیار کرتے ہیں۔ طاغوت کے لفظی معنے حد سے نکل جانے والے اور بڑے سرکش کے ہیں۔ اور قرآن کی زبان میں طاغوت سے مراد ہر وہ شخص ہے۔ جو اللہ کی بندگی سے نکل جائے۔ یا نکل جانے کا ذریعہ ہو۔ اسی طرح اگر شیطان اور بت طاغوت ہیں۔ تو وہ حکمران، قومی لیڈر اور مذہبی پیشوا بھی طاغوت ہی ہیں۔ جو خوف خدا سے بے بہرہ اور ہدایت الٰہی سے بے نیاز ہوتے ہیں۔

سوم: وہ اطاعت بھی عبادت ہے۔ جو اگرچہ اپنی مرضی کے خلاف کرنی پڑی ہو۔ مگر شعور اور ارادے کے ساتھ اور بلا چوں وچرا کی جارہی ہو۔ جیسے بنی اسرائیل فرعون کی عبادت کر رہے تھے۔ انؤمن لبشرین مثلنا وقومھما لنا عابدون اور ایسے ہی تلک نعمۃ تمنھا علیَّ عبدت بنی اسرائیل۔ ان آیتوں میں بنی اسرائیل کی غلامی کو فرعون کی عبادت کہا گیا ہے۔

چہارم: یہ کہ کسی کی غیر شعوری اطاعت کاملہ بھی عبادت ہے۔ کیونکہ شیطان کی عبادت سے قرآن میں منع کیا گیا ہے۔ یا ابت لا تعبد الشیطان اور یا بنی ادم ان لا تعبدوا الشیطان وہ لوگ جن کے بارے میں یہ بات فرمائی گئی ہے۔ ان کا معاملہ اس کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ کہ ان کے عقائد و اعمال ٹھیک ویسے ہی تھے۔ جیسے کہ شیطان چاہتا ہے۔ ورنہ جہاں تک ظاہر کا تعلق ہے۔ ان میں سے کوئی بھی شیطان کو سجدہ نہ کرتا تھا۔ کوئی اس سے دعائیں نہ مانگتا تھا۔

قرآن عزیز کے ان چاروں انداز استعمال میں سے کسی ایک کے بارے میں بھی یہ کہنا درست نہیں کہ اس میں مجاز کا انداز بیاں اختیار کیا گیا ہے۔ عبادت کی یہ چاروں صورتیں قرآن کے مطالبے ان لا تعبدوا الا اللہ میں داخل ہیں۔ اس کی تفصیل بھی آپ سورہ ہود میں پڑھیں گے[1]۔ یہ ایک عظیم الشان کتاب ہے۔ جس کی آیات با عتبار دلائل کے مضبوط اور با عتبار مطالب کے مفصل ہیں۔ اُس کی جانب سے جو حکمت و دانائی والا اور باخبر ہے۔ یعنی قرآن حکیم وہ عظیم الشان اور جلیل القدر کتاب ہے۔ جس کی آیتیں لفظی اور معنوی حیثیت سے نہایت جچی تلی، یا دن تولہ پاؤرتی ہیں۔ نہ ان میں تناقض ہے نہ کوئی مضمون حکمت و واقع کے خلاف ہے۔ نہ با عتبار معجزات فصاحت و بلاغت کے ایک حرف پر نکتہ چینی ہو سکتی ہے۔ جس مضمون کو جس عبارت میں ادا کیا گیا ہے محال ہے۔ کہ اس سے بہتر تعبیر ہو سکے۔ الفاظ کی قبا معانی کی قامت پر ذرا بھی نہ ڈھیلی ہے اور نہ تنگ۔ جن اصول و فروع میں اخلاق و اعمال اور قیمتی پند و نصیحت پر یہ آیات مشتمل ہیں۔ اور جو دلائل و براہین اثبات دعاوی کے لیے استعمال کی گئی ہیں۔ وہ سب علم و حکمت کے کانٹے میں

تلی ہوئی ہیں۔ قرآنی حقائق و دلائل ایسی مضبوط اور محکم ہیں۔ کہ زمانہ کتنی ہی پلٹنیاں کھائے ان کے بدلنے اور غلط ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ عالم کے مزاج کی پوری تشخیص کر کے اور قیامت تک پیش آنے والے تغیرات و حوادث کو من کل الوجوہ جانچ تول کر ایسی معتدل اور ابدی غذائے روح مائدہ قرآنی کے ذریعے پیش کی گئی ہے۔ جو تناول کرنے والوں کے لیے ہر وقت اور ہر حالت میں مناسب ہے۔ ان تمام حکیمانہ خوبیوں کے باوجود یہ نہیں کہ اجمال و ابہام کی وجہ سے کتاب معمہ اور چیستاں بن کر رہ جاتی بلکہ معاش و معاد کی تمام شبہات کو خوب کھول کر سمجھایا ہے اور موقع بموقع دلائل توحید احکام، مواعظ، قصص ہر چیز بڑی خوبصورتی اور قرینے سے الگ الگ رکھی ہے۔ اور تمام ضروریات کا کافی تفصیل سے بیان ہوا ہے۔ نزولی حیثیت میں بھی یہ حکمت مرعی رہی ہے۔ کہ پورا قرآن ایک دم نہیں اُتارا بلکہ وقتاً فوقتاً موقع و مصلحت کے لحاظ سے علیحدہ آیات کا نزول ہوتا رہا۔ قرآن میں ان تمام باریکیوں کو مجتمع دیکھ کر آدمی حیران ہو جاتا ہے۔ مگر حیرت کی کوئی وجہ نہیں۔ اگر حکیم مطلق اور خبیر برحق کے کلام میں سب حکمتیں اور خوبیاں جمع نہ ہوں گی۔ تو اور کس کے کلام میں توقع کی جا سکتی ہے[۱]

اس میں قرآن کا چہرہ پیش کیا گیا ہے۔ اور اس کے بارے میں دو باتیں کہی گئی ہیں

ایک یہ کہ قرآن کی آیات میں احکام ہے۔

دوسرے یہ کہ آیات میں تفصیل ہے۔

نبوت کے ذریعے انسان کی زندگی کی ساری ضروریات کی پا بجائی اللہ سبحانہٗ کی ربوبیت کا اہم تقاضا ہے۔ انسانی ضرورتیں دو طرح کی ہیں جسمانی اور روحانی۔ یہ کتاب وحی کے ذریعے نازل شدہ ایسی کتاب ہے۔ جو زندگی میں انسان کے لیے ہدایت و سعادت کی راہ کھولتی ہے۔ اس کتاب کے احکام میں احکام بھی ہے اور تفصیل بھی۔ اُحکمت احکام سے بنا ہے۔ احکام کا مادہ حکم ہے۔ حکم کے اصلی معنے روکنے کے ہیں۔ اسی سے حکمۃ الفرس گھوڑے کی لگام کو کہتے ہیں۔ اور اسی سے فرمانروا کو حاکم بولتے ہیں۔ کیونکہ وہ لوگوں کو ظلم سے روکتا ہے۔ اور اسی سے احکام کے معنے پختہ کرنے کے ہیں۔ کیونکہ وہ اپنی پائیداری کی وجہ سے اپنے کو تباہی سے روکتا ہے۔ اسی سے احکام کے معنے عمدہ کرنے اور شاندار بنانے کے ہیں۔ کیونکہ اس کی شان و شوکت نگاہوں کو روکتی ہے۔ اسی سے دانائی کی بات اور کام کو حکمت کہتے ہیں۔ کیوں کہ وہ حماقت اور بیوقوفی کے لیے رکاوٹ ہوتی ہے۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ احکام کے تین معنے ہیں

مضبوط بنانا۔ شاندار بنانا اور حکمت والا ہونا۔

قرآن میں احکام دوسرے مواقع پر متشابہ کے مقابلے پر آیا ہے۔ آیات محکمات هن ام الکتاب واخر متشابہات۔ اور کہیں منسوخ کے مقابلہ پر آیا ہے۔ فینسخ اللہ مایلقی الشیطان ثم یحکم اللہ آیاتہ۔ اور یہاں احکام کی تفصیل کے مقابلہ پر آیا ہے۔ احکمت آیاتہ ثم فصلت۔ حافظ ابن تیمیہ الاکلیل فی المتشابہ والتاویل میں فرماتے ہیں۔

محکم ہونے کی تین صورتیں ہیں۔ اول یہ کہ قرآن کے القاء میں محکم ہوں۔ اس کے مقابلے میں القاء شیطان سے یعنی محکم وہ القاء رحمانی ہے۔ جو القاء شیطانی سے بالکل محفوظ ہے۔ دوم یہ کہ قرآن کے ابقاء میں محکم ہو یعنی منسوخ نہ ہو۔ سوم یہ کہ معانی میں محکم ہو۔ یعنی اپنے معانی کے لحاظ سے حقائق کو بتاتا ہو۔

علامہ شاطبیؒ الموافقات میں لکھتے ہیں۔

قانون سازی کے لیے مجتہدین کے غور وفکر کی قانونی دلائل ہوتے ہیں ان میں باہم ربط ونظم کا ہونا ضروری ہے۔ احکمت آیاتہ میں اس کی طرف اشارہ ہے۔

اس لیے احکام کی آیات کا مطلب یہ ہے۔ کہ قرآن کے بیان کردہ وہ اصولی کلیات جن کی پشت پر دلائل کی قوت ہو۔ اور جو بالکل بدیہی ہوں۔ اور ان کے معانی کو دلائل ہر قسم کی تاویل سے روک رہے ہوں۔ وہ اپنی جگہ اس قدر مضبوط ہوں۔ کہ زمانوں، مکانوں اور قوموں کی کوئی تبدیلی ان پر اثر انداز نہ ہو۔ اسی لیے ہم نے احکمت آیاتہ کا ترجمہ کیا ہے۔ کہ جن کی آیات باعتبار دلائل مضبوط ہوں۔ قاضی بیضاوی نے بھی اس تفسیر کو شرف پذیرائی یہ کہہ کر فرمایا۔

احکمت بالحجج والدلائل

قرآن میں احکام آیات تین مواقع پر ذکر کیا گیا ہے۔ ایک موقعہ تو وہ ہے جس میں آیات محکمات کا متشابہات سے مقابلہ کیا گیا ہے۔ دوسرا موقعہ وہ ہے۔ جہاں القاء شیطان کے مقابلے میں احکام آیات کا ذکر ہے۔ فینسخ اللہ مایلقی الشیطان ثم یحکم اللہ آیاتہ۔ اور ایک تیسری جگہ یہ ہے کہ تفصیل آیات کے مقابلے میں احکام آیات کا ذکر ہوا ہے۔ بلیغانہ انداز میں تعبیرات مختلف ہیں۔ بات ایک ہے۔ کہ وہ قرآن کے احکام جن کی پشت پر دلائل کی بھرپور طاقت ہو۔ اور ہمارے احساسات اور ادراک سے ماورار

نہ ہوں۔ محکمات ہیں۔ علماء نے محکم کی حقیقت بتاتے ہوئے۔ جو داد تحسین دی ہے۔ اس کا خلاصہ بھی تعبیری اختلاف کے باوجود یہی ہے کہ احکام اس حقیقت کا نام ہے۔ جہاں بالکل پختگی ہو۔ صحیح وصواب اور حسن اس میں واضح اور صاف ہوں مطالب مقرر ہوں۔ معانی واضح اور صاف ہوں۔ کسی دوسرے معنے کا ان میں احتمال نہ ہو۔ اسی قسم کی آیات ام الکتاب ہیں۔ یہی آیات مجتہدین کے اجتہاد میں فکری جولانگاہ ہیں۔ مجتہدین محکمات کی پشت دلائل کی قوت کے ذریعے ہی استنباط و اجتہاد کرتے ہیں۔ محکمات ہی کا زبان نبوت میں نام بیّنات ہے۔ آیات قرآنی کے احکام اصول و کلیات کے لحاظ سے۔ علامہ شاطبیؒ فرماتے ہیں۔

> قرآن نے اکثر قوانین کلی طور پر بیان کیئے ہیں۔ جزئیات کو اصلاً بیان نہیں کیا۔

اور یہ بھی علامہ شاطبیؒ نے لکھا ہے کہ

> قرآن میں آیات محکمات کی کثرت ہے۔

یہی قرآن کی جامعیت ہے۔ دین دراصل ان ہی قوانین کلیہ کا نام ہے۔ ان قوانین کلیہ سے نبوت کی تبیین اور اہل ایمان کی تفکر کا تعلق ہے۔ چونکہ قرآن اللہ سبحانہٗ کا آخری اور ابدی قانون ہے۔ اور ایسی کتاب کے لیے ضروری ہے۔ کہ وہ زیادہ تر زور قانون کے کلی اور ابدی اصول ومبادی پر دے۔ علامہ شاطبیؒ نے یہ بات خوب لکھی ہے۔

> قرآن حکیم مختصر ہونے کے باوجود جامع کتاب ہے اور اس کی جامعیت یہی ہے کہ اس میں اصول وکلیات بتائے گئے ہیں۔

بتانا یہ چاہتا ہوں۔ کہ احکام سے مقصود یہ ہے۔ کہ قرآن میں بیان شدہ ضوابط و قواعد اور کلیات دلائل کی ایسی مضبوط اور پائیدار چٹان ہے۔ کہ زمانے کی کوئی تبدیلی ان پر اثر انداز نہیں ہو سکتی۔ شیخ الاسلام نے یہ بات کہہ کر اسی طرف اشارا کیا ہے۔

> قرآن کے حقائق اور دلائل ایسے مضبوط ومحکم ہیں۔ کہ زمانہ کتنی ہی پلٹنیاں کھائے اُنکے بدلنے اور غلط ہونے کا کوئی امکان نہیں ہے۔

قرآنی آیات میں تفصیل

آیئے اب دوسری بات کی طرف ارشاد ہوا ہے۔ ثم فصلت۔ پھر ان آیات کی

تفصیل کی گئی ہے۔ یہ بھی احکام کی طرح آیات قرآنی کی صفت ہے۔ آیات قرآنی کی یہ صفت قرآن میں بار بار دہرائی گئی ہے۔ مثلاً قد فصلنا الایات لقوم یعلمون ۹۷۔ انعام کذالک نفصل الآیات ۵۵۔ انعام۔ وکذالک نفصل الایات لقوم یعلمون ۲۲۔ الاعراف۔ کذالک نفصل الآیات لقوم یتفکرون ۲۴ سورہ یونس کذالک نفصل الآیات لقوم یعقلون۔ ۲۸ سورہ روم۔ ان آیات میں علم، تفکر، عقل کو تفصیل کا متعلق بنایا ہے۔ یعنی قرآن کی آیات میں تفصیل اہل علم، اہل فکر، اور اہل عقل کی خاطر کی گئی ہے۔ اس میں اشارا ہے۔ کہ قرآن کی آیات صرف دلائل و براہین کی ہی قوت سے مالا مال نہیں ہیں۔ بلکہ ان میں جامعیت بھی ہے۔ کہ زندگی کا کوئی گوشہ اس کی گرفت سے باہر نہیں ہے۔ علامہ بقائیؒ نے اسی ہمہ گیری کے پیش نظر تفصیل کی یہ تشریح کی ہے۔

والتفصیل لجمیع العلوم الشریفة وعقلیها ونقلیها

یعنی اس میں تمام اچھے علوم کی تفصیل ہے۔

اصل میں یہ لفظ الشریفہ نہیں ہے۔ الشریعہ ہے۔ سہو کاتب سے الشریفہ ہو گیا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ جس قدر قانونی علوم ہیں۔ خواہ وہ عملی ہوں۔ یا نقلی ان کی قرآنی آیات میں تفصیل ہے۔ علامہ محمد طاہر ابن عاشور نے بھی تفصیل کی تشریح التبیین بانواعہٖ سے کی ہے۔ یعنی قانون کی ساری انواع کی تفصیل ہے۔ علامہ شاطبیؒ نے الموافقات میں حافظ ابن حزم ظاہری کی حوالے سے یہ کہہ کر آیات قرآنی کی اسی تفصیل کی طرف اشارا کیا ہے۔ کہ قانون کے تمام موضوعات میں کوئی بھی موضوع ایسا نہیں جس کی اصل قرآن کی آیات میں نہ ہو۔ اللہ کا شکر ہے۔ کہ ہم جانتے ہیں۔ کہ سوائے موضوع قراض کے کہ اس کی اصل ہمیں قرآن میں معلوم نہیں ہوتی ہے یہ حافظ ابن حزم کی رائے ہے ورنہ حافظ ابن القیم اور علامہ شاطبیؒ کا نقطہ نظر حافظ ابن حزم سے مختلف ہے ان کا دعویٰ ہے کہ قراض کی اصل بھی قرآن میں موجود ہے۔

قرآن میں تفصیل کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ کہ وہ توضیح و تشریح کا محتاج نہیں اگر ایسا ہوتا تو قرآن میں تفصیل کے مواقع پر لقوم یعلمون۔ لقوم یعقلون۔ لقوم یتفکرون کی قید نہ ہوتی، بلکہ قرآن کے مفصل ہونے کا یہ اور صرف یہ مطلب ہے کہ اس کی آیات میں بنیادی عقائد۔ اور ایمانی صفات سے لے کر اجتماعی زندگی کے دور دراز کے گوشوں سے تعلق رکھنے والی ایسی ہدایات موجود ہیں۔ جن میں اہل علم، اہل فکر اور اہل عقل کے اشارات موجود

ہیں ۔احکامات کی ہمہ گیری جزئیات کی بلکہ اصول وکلیات کی ہے ۔کہ اس میں منتشر اور مختلف حوادث کا جواب کلیات کی صورت میں موجود ہے۔ امام شافعیؒ فرماتے ہیں ۔

کہ قرآن حکیم محکم ہونے کے باوجود جامع ہے۔ اور اس کی جامعیت یہی ہے کہ اس میں اصول وکلیات بتائے گئے ہیں ۔اسی لیے اس کی تفصیلات کی آغوش میں زندگی کے سارے بکھرے ہوئے سوالات کا بھرپور جواب ہے ۔

قرآنی آیات زمین کی طرح پھلوں اور پھولوں کا گہوارہ ہیں ۔جس سے زمین میں پھلوں اور پھولوں کے عجائبات نت نئے رنگوں میں کھلتے رہتے ہیں ۔مگر زمین ایک ہی رہتی ہے ۔اور جس طرح سمندر سے انواع واقسام کے موتی اور جواہرات نکلتے رہتے ہیں مگر سمندر ایک ہی رہتا ہے ۔ اسی طرح قرآن کے اصول وکلیات سے جزئیات اور مسائل قیامت تک نکلتے رہیں گے۔ مگر اصول وکلیات ایک ہی رہیں گے ۔

اس بنیاد پر آپ کہہ سکتے ہیں ۔کہ انسانیت کا کوئی ایسا مسئلہ نہیں جو قرآنی آیات کے دائرے سے باہر ہو ۔وہ ایک ایسی دستاویز ہے ۔جو ہر جگہ انسان کے ساتھ ہوتی ہے اور وہ جو قدم بھی اٹھاتا ہے ۔اس کی ہدایت کو سامنے موجود پاتا ہے ۔مختصر یہ کہ قرآن ایسی جامعیت کی شان رکھتا ہے ۔کہ انسانی زندگی کے فکری ، اعتقادی ، اخلاقی ، روحانی ، معاشی ،سیاسی، عائلی، معاشرتی، اجتماعی اور قانونی گوشوں کو پوری طرح گھیرے ہوئے ہے ۔پھر اس طرح جیسے کہ ہوا کا کرّہ اس زمین کو چاروں طرف سے اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہے ۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے ۔من لدن حکیم خبیر شارحین قرآن نے اس کی بلیغانہ لطافت پر دل کھول کر داد تحسین دی ہے ۔ آیئے آپ بھی اس گلزار سے استفادہ کیجیے

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں ۔ یہ تعبیر موقع پر اور دلیل میں آئی ہے ھو تقدیر لاحکامہا وتفصیلہا ، یعنی من لدن حکیم خبیر میں بتایا گیا ہے۔کہ آیات قرآن کے احکام کی وجہ یہ ہے ۔کہ یہ آیات ایسی ذات کی جانب سے ہیں ۔جو حکیم ہے ۔اور آیات کے مفصل ہونے کی وجہ یہ ہے ۔کہ اللہ کی ذات علم والی اور باخبر ہے ۔اور علامہ زمخشری نے انداز کلام میں لف ونشر بتایا ہے ۔اور پورے فقرے کی اس طرح نشاندہی کی ہے ۔ کہ احکمت آیاتہ وفصلہا خبیر فرق دونوں میں یہ ہے ۔کہ قاضی صاحب کی نظر فقرے

کی معنویت پر ہے جبکہ زمخشری کی رسائی تعبیر کی ظاہری سطح پر ہے۔ علامہ طیبی نے زمخشری کی بات کو یہ کہہ کر جاندار بنا دیا۔ کہ یہ تعبیر اور انداز یسبح لہ بالغدو والاصال رجال کے قبیل سے ہے۔ جبکہ یسبح فعل مجہول ہو۔ یعنی یہ گویا اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ اور علامہ بقاعی نے اس موقع پر تشریح کا انداز اختیار کیا ہے وہ بالکل انوکھا اور منفرد ہے۔ فرماتے ہیں۔

احکام اور تفصیل کا ذکر کرنے کے بعد آیت کا خاتمہ کس قدر شاندار ہے۔ من لدن حکیم خبیر یعنی یہ آیات محکمہ اور مفصلہ نازل ہوئی ہیں۔ اور ان کے نزول کا مبدأ اللہ کی ذات ہے۔ جس کی بارگاہ تمام بارگاہوں سے اعلیٰ ہے۔ اور جو حکیم وخبیر ہے۔ اور نزول کا منتہیٰ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔

علامہ قاشانی کے حوالے سے شام کے مشہور علامہ قاسمی نے جو بات لکھی ہے وہ بھی اس لائق ہے کہ پڑھی جائے۔ فرماتے ہیں۔ کہ

اللہ سبحانہ نے اپنے علم وحکمت پر مبنی یہ کتاب نازل کی ہے کہ اس سے زیادہ اچھی کتاب احکام کے اعتبار سے ممکن ہی نہیں۔ وہ اس کتاب کی تفاصیل سے خوب واقف ہے۔ اور جانتا ہے کہ قانونی نظام میں تقدیر، فوقیت، ترتیب کیسے ہونی چاہیئے۔

آیت قرآنی پر ایک جامع نظر

یہ آیت قرآنی مہمات معارف میں سے ہے۔ آیئے اس پر ایک جامع نظر ڈال لیجئے۔

احکام کے معنے لغت کی زبان میں روکنے اور مضبوط بنانے کے ہیں۔ احکام اپنے دونوں معنے کے لحاظ سے اپنا متعلق چاہتا ہے۔ جب آپ کہیں گے کہ اس کی آیات کو روک دیا گیا ہے تو ذہن میں یہ سوال خود بخود اُبھر آئے گا۔ کہ کہاں سے روکا گیا ہے۔ ایک جواب تو وہی ہے۔ جو شارحین قرآن کی زبان سے سُن چکے ہیں۔ لیکن آیت کے لفظوں میں اس کی بھی گنجائش ہے۔ کہ آپ سوال کرنے والے سے کہیں کہ زمانے کی ساری کروٹوں اور قوموں کی ساری ترقیوں کے باوجود یہ کتاب الٰہی ہر طرح کی لفظی تحریف اور تصرف سے محفوظ رہے گی۔ یہ گویا اس آیت میں قرآن

کی قیامت تک حفاظت کا اعلان ہے۔ اور اس اعلان کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ قرآن سے پہلے کوئی کتاب الہی دانستہ اور نادانستہ لفظی تحریفات اور تصرفات سے پورے طور پر محفوظ نہیں رہی۔ لاکھوں انبیاء میں سے چند کے سوا کسی کا صحیفہ دنیا میں باقی نہیں رہا۔ اور جو باقی ہے وہ فنا ہو کر نئے نئے قالب بدلتا رہا۔ اس لیے قرآن کے بارے میں یہ وعدہ کیا گیا کہ وہ ہمیشہ کے لیے باقی اور محفوظ رہے گا۔ ہر قسم کی تحریف و تصرف کو اس سے روک دیا گیا ہے۔ یہی بات قرآن میں دوسری جگہ صراحتاً بتائی گئی ہے۔

انا نحن نزلنا الذکر وانا لہ لحافظون

احکام کے دوسرے معنے مضبوط بنانے کے ہیں۔ احکمت آیاتہ کے معنے یں ہے کہ آیات قرآنی کو مضبوط بنا دیا گیا ہے۔ تو آپ کے ذہن میں یہاں بھی یہ سوال ابھر آئے گا۔ کہ کس طرح مضبوط بنایا گیا۔ ایک جواب تو آپ قاضی بیضاوی کے حوالے سے سن رہے ہیں۔ کہ دلائل و براہین کے ذریعے مضبوط بنایا گیا ہے۔ لیکن اگر آپ یوں کہیں کہ حکمت کے ذریعے مضبوط بنایا گیا۔ تو اس میں زیادہ لطافت ہے۔ کیونکہ قرآن نے کتاب کے ساتھ بار بار حکمت کا ذکر کیا ہے۔ اور وہ بھی تعلیم کے موضوع پر۔ من یعلمھم الکتاب والحکمۃ۔ یہ اور اس قسم کی آیات میں بتایا گیا ہے۔ کہ پیغمبر کا کام کتاب اور حکمت کی تعلیم دینا ہے کتاب کی تعلیم کے معنے تلاوت کی طرح کتاب کے الفاظ سنا دینا اور پڑھا دینا نہیں بلکہ الفاظ قرآنی کی تلاوت کے بعد آپ کا پہلا اور اہم کام یہ تھا۔ کہ کتاب کے مشکل مطالب کو حل کریں۔ مجمل معانی کو سمجھائیں۔ اور اپنی گفتار اور اپنے کردار سے اس کی شرح و تفصیل کریں۔ اسی کا نام کتاب و حکمت کی تعلیم ہے۔ یہی وہ تعلیم ہے۔ جس کا قرآن میں بار بار ذکر ہوا ہے۔ اسی کی خاطر قرآن کا نزول تدریج ہوا ہے۔ اگر یہ حقیقت نہیں ہے۔ تو حقیقت نہ ہونے کی وجہ کیا ہے۔ جبکہ سینۂ قرآن کی ابلی ہوئی صدا یہی ہے۔

وقرآنا فرقناہ لتقراٴہ علی الناس علی مکث

اور قرآن کو ہم نے جو جدا جدا کر کے پیش کیا تاکہ تو لوگوں کے سامنے ٹھہر ٹھہر کر پیش کرے۔

گویا آہستہ آہستہ نزول کی وجہ یہ ہے۔ کہ احوال و واقعات کے موافق ہدایات آئیں۔ اس طرح ان تیئس ۲۳ سالہ پیش یا افتادہ حالات و وقائع کا نام یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی

تیئس ۲۳ سالہ شب و روز میں قرآن ہی کی ہدایات پر اُٹھی ہوئی۔ عادتوں، باتوں، کاموں اور حالتوں کا نام حکمت ہے۔ اسی کو اصلاحی زبان میں سُنت کہا جاتا ہے۔ دراصل یہاں دو چیزیں ہیں۔ ایک کتاب دوسری کتاب کی ہدایات پر اُٹھی ہوئی نبوت کی محسوس و مرئی زندگی ان دونوں میں وہی تعلق ہے۔ جو نقش و نقاش میں نظریہ اور عمل میں پروردگار اور پروردگاری میں معمار اور عمارت میں نظم اور ناظم میں ہوتا ہے۔ اگر آپ چراغ کی روشنی کو چراغ سے یا چراغ کو اس کی روشنی سے الگ نہیں کر سکتے۔ تو پھر حکمت کو کتاب سے یا سُنت کو قرآن سے کیسے جدا کر سکتے ہیں۔ کتاب کو چراغ اور حکمت کو اس کی روشنی کہہ دیجئے۔

قد جاءکم من اللہ نور و کتاب مبین

فرق صرف یہ ہے کہ وحی کے ذریعے آئی ہوئی ہدایات کا نام کتاب ہے۔ اور اس وحی کی راہنمائی میں بنے ہوئے نقشہ عمل کا نام حکمت ہے۔ امام شافعیؒ نے حکمت کا نام سُنت بتایا ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ

> آپ کی سُنت وہ حکمت ہے۔ جو آپ کے قلب میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ڈالی گئی ہے۔ (الرسالہ[۱] صہ ۴۸)

ایک اور مقام پر امام موصوف لکھتے ہیں۔

> میں نے قرآن کے ان اہل علم سے جن کو میں پسند کرتا ہوں۔ یہ سُنا ہے کہ حکمت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت کا نام ہے۔ الرسالہ (۱)

(۱) **الرسالہ**: یہ امام شافعیؒ کی اصول فقہ میں کتاب ہے۔ شاہ ولی اللہ انصاف میں رقمطراز ہیں "مختلف نصوص میں مطابقت کے لیے قواعد نہ تھے۔ اس لیے اجتہادی مسئلوں میں بڑا رخنہ پڑتا تھا۔ حضرت امام شافعیؒ نے اس کے قواعد بنائے اور ان کو کتابی صورت میں مرتب کیا۔ و ھذا اول تدوین فی اصول الفقہ۔ دراصل یہ کتاب امام شافعیؒ نے امام عبدالرحمٰن بن مہدی کی فرمائش پر لکھی ہے۔ چنانچہ خطیب بغدادی نے امام شافعیؒ کے مشہور شاگرد ابو ثور کے حوالے سے نقل کیا ہے۔ کہ امام عبدالرحمٰن بن مہدی نے امام شافعیؒ کو ایک خط لکھا اور درخواست کی۔ کہ ایسی کتاب لکھیں جس میں قرآن کے معانی و مطالب ہوں۔ اور جس میں اخبار و احادیث کی قسمیں اجماع اور کتاب و سُنت کے ناسخ و منسوخ کا تذکرہ ہو۔ امام ابو ثور فرماتے ہیں۔ فوضع لہ الرسالہ

اس درخواست کے مطابق امام شافعیؒ نے الرسالہ لکھا۔ دیکھو تاریخ بغداد ۲ صہ ۶۵ — حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے توالی التاسیس میں اس خط کا خلاصہ ان الفاظ میں لکھا ہے۔

کتب عبدالرحمٰن بن مہدی الی الشافعیؒ وھو شاب ان یصنع لہٗ کتابا فوضع لہ کتاب الرسالہ۔ صہ ۵۵

یہ صرف حضرت امام شافعیؒ کی رائے نہیں کہ قرآن میں حکمت مصداق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سُنت ہے۔ خود امام شافعیؒ نے ایک مناظرے میں اسے دلائل سے ثابت کیا ہے۔ اور جب ان سے دریافت کیا گیا۔ کہ قرآن کی جن آیات میں حکمت کا ذکر آیا ہے۔ وہاں حکمت سے کیا مراد ہے۔ آپ نے جواباً فرمایا۔ کہ

حکمت سے مراد سنت ہے۔ سائل نے کہا کہ اس کا بھی امکان ہے۔ کہ یعلمھوا الکتاب والحکمۃ کا یہ مطلب ہو کہ رسول کتاب کی تعلیم دیتا ہے۔ اور خاص طور پر حکمت کی اور حکمت سے مراد اللہ کے احکام ہوں۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اس کا حاصل یہ ہے کہ اللہ کا رسول اللہ کی جانب سے لوگوں کے سامنے ایسے ہی بیان کرتا ہے۔ جیسے اس نے ان کے سامنے فرائض، نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو بیان کیا ہے۔ مخاطب نے کہا کہ ٹھیک ہے۔ امام شافعیؒ نے فرمایا کہ اگر یہی مطلب ہے۔ تو پھر اس کا علم بغیر جزئی کے کیسے ہو سکتا ہے۔ اس صورت میں بھی ارشادات کی ضرورت ہوگی۔ سائل بولا اگر کتاب و حکمت دونوں سے ایک چیز مراد ہو۔ اور کلام میں صرف تکرار ہو۔ امام شافعیؒ نے فرمایا یہ آپ ہی بتایئے کہ کون سی چیز پسندیدہ ہے۔ کتاب و حکمت دونوں ایک ہوں یا دونوں الگ الگ ہوں۔ سائل نے جواب دیا۔ کہ دونوں کا احتمال ہے۔ چاہے تو کتاب سے مراد قرآن اور حکمت سے مراد سنت ہو۔ جیسا کہ آپ کا خیال ہے۔ اور چاہے دونوں سے ایک ہی مراد ہو۔ امام شافعیؒ نے فرمایا زیادہ قرین عقل یہی صورت ہے۔ کہ کتاب سے قرآن اور حکمت سے سنت مراد ہو۔ اور اس پر قرآن میں شہادت ہے۔ سائل نے پوچھا کہ قرآن میں کون سی شہادت ہے۔ امام شافعیؒ نے جواب میں یہ آیت تلاوت کی۔

واذکرن مایتلی فی بیوتکن من آیات اللہ والحکمۃ [1]

بتانا یہ چاہتا ہوں۔ کہ کتاب کو حکمت کے ساتھ اور قرآن کو سُنت کے ذریعے مضبوط اور مستحکم بنا دیا۔ کتاب اگر نظریہ ہے۔ تو حکمت اسی نظریے کی اساس پر اُٹھی ہوئی ایک شاندار عمارت ہے۔ کتاب کو حکمت کے ذریعے مضبوط بنا کر کتاب کو لوگوں کی فکری آوارگی سے ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ اسی لیے کتاب کو حکمت والی کتاب کہا گیا ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں۔ کہ اگر کتاب الٰہی اپنی آغوش میں حکمت لے کر آئی ہے۔ تو حکمت کا ظہور دوجود کیسے ہوا۔ اس کا جواب خود قرآن نے دیا ہے۔ کہ اس کا ظہور دو طریقے سے ہوا ہے ایک نبوت کی تبیین پر مبنی فتویٰ۔ دوسرے اللہ سبحانہٗ کی ارارت کے مطابق نبوت کے فیصلے۔

یہ بات کہ کتاب اللہ کے بیان و شرح کی طاقت اور اس کا اختیار اللہ سبحانہٗ کی جانب سے نبوت کو عطا ہوا تھا۔ قرآن نے کھول کر بتائی ہے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبیّن للناس مانزل الیھم
ولعلھم یتفکرون

بیان و تبیین کے لفظی معنے کھولنے اور واضح کرنے کے ہیں۔ اور اس کا استعمال دو طرح سے ہوتا ہے۔ ایک اعلان و اظہار کے ذریعے دوسرے توضیح و تفسیر کے ذریعے۔ سوال یہ ہے۔ کہ اس آیت گرامی میں بیان کس طرح ہوا۔ اظہار و اعلان کے ذریعے یا توضیح و تشریح کے ذریعے۔ حقیقت یہ ہے۔ کہ یہاں اعلان و اظہار کی بجائے۔ توضیح و تشریح کے ذریعے اعلان ہوا ہے غور و فکر کے لیے توضیح و تشریح مناسب ہے۔ نہ کہ اعلان و اظہار۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ اس آیت کی رُو سے کتاب کا جو بیان جو توضیح و تشریح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب بتایا گیا ہے۔ وہ بھی حکمت ہے۔ اور اسی کا نام محدثین کی زبان میں سُنت ہے۔ اور اس بیان و تشریح کا فیضان بھی اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہے۔ جیسے فرمایا ہے۔

"وانزلنا علیک الکتاب والحکمۃ"

اور اس کا اتباع بھی اللہ کے حکم کی پیروی ہے۔ کیونکہ اسی بیان و تشریح کو قرآن کی سورۃ

---

[1] کتاب الام جلد ۷ صہ ۲۵۱

قیامہ میں اللہ سبحانہٗ نے اپنا بیان قرار دیا ہے۔ لیجئے سورہ قیامہ کی آیت پڑھ لیجئے

ان علینا جمعہٗ وقرآنہ فاذا قرأناہ فاتبع قرآنہ ثم ان علینا بیانہ

بلا شبہ اس قرآن کو جمع کر دینا ہماری ذمہ داری ہے۔ اور اس کو پڑھانا بھی ہمارا کام ہے۔ لہذا جب ہم پڑھیں۔ تو آپ اس پڑھنے کی پیروی کریں۔ پھر اس کا بیان کرنا بھی ہمارا کام ہے۔

حکیم الامت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے ثم ان علینا بیانہ کی تشریح یہ کی ہے۔ کہ

ہمارے ذمہ ہے قرآن کی توضیح یعنی ہر زمانہ میں ہم ایک جماعت کو لغوی تشریح اور اس کے شان نزول بیان کرنے کی توفیق دیں گے۔ تاکہ وہ لوگ احکام قرآنی کا مصداق بیان کریں۔ اور یہ بات یاد کرنے اور تمہاری تبیین کے بعد ہوگی۔ کیونکہ قرآن کی آیات میں تشابہ ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قرآن کے مبین ہیں[1]

چونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم خود اس کے مبین ہیں۔ اس لیے اس کا بیان بھی حکمت ہے۔ اور اس بیان میں نزول کتاب کے بعد بھی حالات وواقعات میں تراخی ہوتی ہے۔ اس لیے ثم ان علینا بیانہ میں ثم لے کر آئے ہیں۔ اب آیت کا مطلب یہ ہوا۔ کتاب احکمت آیاتہ ثم فصلت۔ اس کتاب کی آیات کو حکمت والا بنایا گیا۔ پھر اس حکمت کو نبوت کی توضیح وتشریح کے ذریعے کھول دیا گیا۔ یہ تفصیل چونکہ نزول آیات کے بعد نبوت کے ذریعے ہوئی۔ اس لیے ثم فصلت میں ثم تراخی کے لیے لائے۔ پھر جیسے جمع قرآن ہوا۔ ایسے ہی یہاں نبوت کے بعد جمع وترتیب، تدوین وتہذیب کے ذریعے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ فتاویٰ ظہور میں آئے۔ جو خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے آیات قرآنی کی روشنی میں لوگوں کے سامنے پیش کیے۔

حکمت کے ظہور کا دوسرا ذریعہ ارادت ہے۔ انسانی الفاظ میں یہ قدرت نہیں ہے۔

---

[1] ازالۃ الخفاء جلد ۲

کہ ان کے ذریعے سے کوئی ایسا قانون وضع کیا جا سکے۔ جو ایک طرف تو اختلاف فہم سے محفوظ رہے۔ اور دوسری طرف اس میں یہ وسعت ہو۔ کہ تمام آئندہ پیش آنے والے واقعات پر جن کی جزئیات کی کوئی حد نہیں پوری طرح حاوی ہو سکے لیکن فہم انسانی کے اختلاف سے جو نقائص قانون میں ہوتے ہیں۔ گو ان کو تمام تر دور نہیں کیا جا سکتا۔ تاہم ان کو کم کیا جا سکتا ہے۔ اس اختلاف فہم کے نقصان کو کم کرنے کے لیے اللہ سبحانہ نے یہ کیا کہ فتاویٰ میں اپنے رسول کی معرفت زبانی اور عملی طور پر اس کی تشریح کرا دی اور قضایا میں قرآن نے خود یہ ضابطہ بتایا ہے۔

انا انزل الیک الکتاب بالحق لتحکم بین الناس بما اراک اللہ

اے پیغمبر ہم نے سچائی کے ساتھ تجھ پر کتاب اتاری تاکہ لوگوں کے درمیان جو تجھ کو اللہ نے سمجھایا ہے اس کے ذریعے فیصلہ کرے۔

اس آیت میں روزمرہ کے پیش یا افتادہ حالات و معاملات کے لیے یہ سورت رکھی گئی ہے۔ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عدالت میں روزانہ واقعات و مقدمات پیش ہوتے اور آپ کتاب اللہ کے اصول و کلیات کے تحت اپنی خداداد نور بصیرت سے ان کے فیصلے فرماتے۔ یہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قضایا کہلاتے ہیں۔ آیت میں کتاب الٰہی کے نزول کی غرض ہی یہ بتائی گئی ہے۔ کہ نبوت کتاب کے احکام و قوانین لے کر اس فہم کے ذریعے جو اللہ نے نبوت کو عطا فرمائی ہے۔ لوگوں کے درمیان فیصلہ کرے۔ گویا حکمت نام ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تبیین و توضیح اور بیان و تشریح کا اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے اللہ کی ارائے کے مطابق فیصلوں کا۔ اسی کا نام محدثین کی زبان میں سُنت ہے۔

خلاصہ یہ ہے۔ کہ آیات قرآن کی عمارت کو حکمت کے بند کے ذریعے مضبوط بنایا گیا ہے۔ اگر آیات قرآن کو سنت و حکمت کے بند کے ذریعے مضبوط نہ بنایا جاتا۔ تو نتیجہ یہ ہوتا کہ جو جس کے جی میں آتا قرآن سے سمجھ لیتا اور جس قسم کا فیصلہ چاہے کر لیتا۔ اللہ اللہ اگر اس کی اجازت دے دی جاتی اور آیات قرآنی کے لیے سُنت کا پشتارہ نہ ہوتا۔ تو جس طرح ہر شخص کی صورت بلکہ ہر شخص کی آواز دوسرے سے مختلف ہے۔ ہر مسلمان کا مذہب دوسرے مسلمان سے مختلف ہوتا۔ گویا ۷ کروڑ مسلمانوں کی نمازیں ستر کروڑ شکلوں میں ہوتیں۔ اتنے سخت نظم کے بعد بھی جب اختلافات کا یہ حال ہے۔ تو قرآنی آیات کی پشت پر اگر حکمت و سُنت کا طاقتور بند نہ ہوتا تو پورا

دین فکری آوارگی اور بے راہ روی کا شکار ہو جاتا ۔ العیاذ باللہ ثم العیاذ للہ ۔
بہر حال آیات قرآنی کی پشت پناہی کے لیے حکمت کی پائیدار طاقت کا جو سرمایہ نبوت نے بیان و تبیین کے ذریعے فتاویٰ کی صورت میں اور ارارت خداوندی کے ذریعے قضایا کی شکل میں چھوڑا تھا۔ اس کو خلفائے راشدین نے خلافت راشدہ میں قضایا اور فتاویٰ میں ماخذ قرار دیا ۔ اور اسی کو بعد کے فقہاء و مجتہدین نے اختیار کیا ۔ اسی مجموعے کا نام آج فقہ یا قانون اسلامی ہے ۔

(۲) "توحید عبادت وحی کا اولین مقصد ہے"

اس کتاب کا اعلان ہے ۔ کہ اللہ سبحانہ کے علاوہ کسی سے عابدانہ تعلقات نہ رکھو ۔ یعنی اس محکم و مفصل کتاب کے نازل کرنے کا بڑا مقصد یہ ہے ۔ کہ دنیا کو صرف خدا ر واحد کی عبادت کی طرف دعوت دی جائے ۔ اور اس کے طریقے سیکھائے جائیں ۔ اسی عظیم و جلیل مقصد کے لیے پہلے انبیاء تشریف لائے ۔ یہ آیات پڑھیئے ۔

وما ارسلنا قبلك من رسول الا نوحی الیه انه لا اله الا انا فاعبدون ۔ الانبیاء ۔ ۲۵

اور نہیں بھیجا ہم نے تیرے سے پہلے کوئی رسول مگر اس کو بھی حکم بھیجا کہ بات یہی ہے کہ کسی کی بندگی نہیں سوائے میرے لہذا میری ہی بندگی کرو ۔

اور

ولقد بعثنا فی کل امة رسولا ان اعبدوا اللہ واجتنبوا الطاغوت النحل ۔ ۳۶

اور ہم نے روزانہ کیے ہیں ۔ ہر امت میں رسول کہ لوگو بندگی کرو اللہ کی اور بچو ہڑدنگے سے ۔ [1]

آیئے سب سے پہلے اس فقرے کی تشریح شارحین قرآن کی زبانی سُن لیجیے ۔
شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں جو کچھ لکھا ہے ۔ اس کی لطافت قابل داد ہے ۔ لیکن

---

[1] ۔ افادات شیخ الاسلام : ہڑدنگا وہ ہے ۔ جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے ۔ کچھ سند نہ رکھے ایسے کو طاغوت کہتے ہیں ۔ افادہ شیخ عبد القادر فی الموضح

اردو زبان کے تمام شارحین قرآن نے اس فقرے کو اپنی تشریحات میں اس طرح نظر انداز کر دیا ہے گویا اس میں کوئی بات ہی نہیں ہے۔ حالانکہ یہی فقرہ اپنی گہری معنویت کی وجہ سے پوری سورۃ کے مضامین کو اپنی آغوش میں لیے ہوئے ہیں۔

آیئے عربی تفاسیر سے استفادہ کریں۔ علامہ محمود آلوسی نے روح المعانی میں اس آیت کی پیوندکاری پر تفصیلی تبصرہ کیا ہے۔ ان کا موقف ہے کہ یہ فقرہ پہلے فقرے احکمت آیاتہ ثم فصلت کی علت بن کر آیا ہے۔ اصل فقرہ الا تعبدوا الا اللہ ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اس کتاب الٰہی کی آیات میں احکام اور پھر تفصیل اس لیے ہوتی ہے تاکہ تمہارے اللہ کے سوا اور کسی سے عابدانہ تعلقات نہ ہوں۔ صرف اللہ سبحانہٗ سے تمہارا عابدانہ تعلق ہو۔ قرآن میں احکام و تفصیل کی پکار بھی یہ ہے۔ کہ اللہ پر ایمان لاؤ۔ اور صرف اس سے عابدانہ تعلقات قائم کرو۔ اور پوری زندگی میں پھیلی ہوئی ساری کی ساری اطاعتیں اس کی اور صرف اس کی ہوں۔ زمخشری کے کشاف میں بیضاوی نے تفسیر میں اور دوسرے مفسرین نے بھی اسی پیوندکاری کو اولیت کا مقام دیا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے بھی اسی کو شرف پذیرائی دیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ان لا تعبدوا الا اللہ جملہ مستانفہ ہے۔ اور اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ استیناف کی حد تک سارے شارحینِ قرآن کی علامہ آلوسی کو ہمنوائی حاصل ہے۔ لیکن علامہ بقاعی کو نظم الدرر میں استیناف کی نوعیت میں اختلاف ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ کہ

> یہ جملہ مستانفہ احکمت آیاتہ، ثم فصلت کی علت نہیں بلکہ اس کا جوڑ فعل محذوف کے ساتھ ہے۔ پوری بات اس طرح ہے۔
>
> (ہم نے آپ کو یہ اس لیے روانہ کیا ہے۔ کہ تم لوگوں سے کہہ دو کہ لوگو اللہ کے سوا کسی سے کسی قسم کا عابدانہ تعلق نہ رکھو۔[1])

اس فقرے کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے۔ کہ یہ سب نبیوں کی دعوت اور پکار ہے جیسا کہ شیخ الاسلام نے فرمایا کہ اسی عظیم وجلیل مقصد کے لیے پہلے انبیاء تشریف لائے ہیں۔ اسی دعوے کو دلائل سے ثابت کرنے کے لیے سورت میں تاریخی واقعات کو استشہاد میں پیش کیا گیا ہے۔

---

[1] نظم الدرر

یہاں ان لا تعبدوا الا اللہ لاکر بتایا ہے۔ کہ قرآن کے نزول کا مقصد اس کے سوا کچھ نہیں کہ وہ لوگوں کو

۱۔ توحید عبادت کے منافع بتائے۔

۲۔ عبادت میں شرک کے مفاسد سے آگاہ کرے۔

کیونکہ عبادت وہ چیز ہے۔ جو انسانی روح کو پاکیزگی اور بلندی عطا کرتی ہے۔ اور اس طرح اسے اللہ سبحانہٗ کی خوشنودیوں اور کرم بخشیوں کا سزاوار بناتی ہے۔ یہ ہے وہ تصور جو عبادت کے بارے میں سب رکھتے ہیں۔ اور کوئی شک نہیں کہ یہ ایک ایسا تصور ہے۔ جسے قرآن ایک واضح ترین حقیقت قرار دیتا ہے اور پوری صراحت کے ساتھ کہتا ہے۔ کہ کسی نبی کی دعوت اس کے سوا کچھ تھی بھی نہیں۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس سے زیادہ وضاحت کرتا ہے۔ اور کہتا ہے کہ اسے انسان تو پیدا ہی صرف اس کام کے لیے کیا گیا ہے۔

وما خلقت الجن والانس الا لیعبدون

میں نے جنوں اور انسانوں کو صرف اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں۔ ذاریات ۵۶

یعنی عبادت ہی وہ چیز ہے۔ جس کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کو مبعوث بھی کیا گیا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں لازم و ملزوم ہیں۔ جس کام کے لیے انسان کو پیدا کیا ہے۔ نبوت کے آنے کا مقصد بھی اس کے سوا کیا ہو سکتا ہے۔

"عبادت کا مفہوم"

عبادت کا لفظ جب قرآن و حدیث میں آتا ہے۔ تو اس کا مفہوم کیا ہوتا ہے۔ اور اس کی حدیں کہاں تک پہنچتی ہیں۔ یہ جاننے کے لیے ہمیں ہر اس چیز پر نظر ڈالنی چاہیئے۔ جو اس بارے میں کچھ بھی اہمیت رکھتی ہے۔ اور عبادت کا مفہوم مقرر کرنے میں سند کا مقام رکھتی ہو۔ آئیے پہلے زبان و ادب کے شاہکاروں سے اس کے معنے کی تحقیق کریں۔ آئیے سب سے پہلے لغت قرآن کے محقق امام راغب سے معلوم کریں۔ کہ عبادت کے کیا معنے ہیں۔ وہ فرماتے ہیں۔

عبادت کے معنے انتہائی حد تک پست ہونے اور بچھ جانے کے ہیں۔ اور اس کا استحقاق سوائے اس ذات عالی کے جس کے افضال و انعامات بے پایاں

ہیں۔ اور کسی کو نہیں ہے۔

علامہ مجد الدین فیروز آبادی نے قاموس میں عبادت کے معنے اطاعت کے بتائے ہیں۔ اور بصائر ذوی التمییز میں علامہ موصوف ہی نے عبادت کے معنے یہ لکھے ہیں۔

عبادت کے معنے اطاعت کے ہیں۔ لیکن یہ عبودیت سے بلیغ تر ہے۔ کیونکہ اس کے معنے انتہائی فروتنی کے ہیں۔ اس کا مستحق افضال و انعام والے کے سوا کوئی نہیں اور وہ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی ہے۔

علامہ ابن الاثیر کے نہایہ میں یہ الفاظ ہیں۔ لغت میں عبادت نام ہے۔ اس اطاعت کا جو عاجزی کے ساتھ ہو۔ علامہ ابن الاثیر کی یہ تعریف بہت جامع ہے۔ راغب اصفہانی اور مجد الدین فیروز آبادی نے اس کے صرف ایک جز کو بیان کیا ہے۔ علامہ شوکانی نے اپنی تفسیر فتح القدیر میں حافظ ابن کثیر کے حوالہ سے عبادت کی شرعی تعریف ان لفظوں میں کی ہے۔

شریعت میں عبادت وہ ہے جو انتہائی محنت، فروتنی اور خوف پر مشتمل ہو۔

علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس شرح قاموس میں لکھتے ہیں۔

کچھ آئمہ اشتقاق کا بیان ہے۔ کہ عبودیت کی اصل عاجزی اور فروتنی ہے۔ اور دوسرے حضرات یہ کہتے ہیں۔ کہ عبودیت کے معنے ہیں۔ رب جو کرے اس پر راضی رہنا اور عبادت کے معنے ہیں وہ کام کرنا جس سے رب راضی رہے اور زیادہ محنت، مشقت کا کام ہے۔ اسی لیے کہا گیا ہے۔ کہ عبادت عالم آخرت میں ساقط ہو جائے گی۔ مگر عبودیت بدستور باقی رہے گی۔ کیونکہ عبودیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ دونوں جہان میں اللہ کے سوا کسی کو متصرف نہ سمجھے۔

اس عبادت کو نقل کر کے علامہ زبیدی فرماتے ہیں۔

ہمارے شیخ نے کہا کہ یہ عبادت کے معنے ہیں صوفیانہ نقطۂ نگاہ ہے۔ لفظ عبادت کی لغوی ساخت کو اس تشریح میں کوئی دخل نہیں ہے۔

یہ لغت اور ادب کی زبان میں عبادت ہے۔ بظاہر یہ معانی ایک دوسرے سے الگ اور مختلف ہیں۔ مگر فی الواقع مختلف نہیں۔ بلکہ ان میں بڑی ہم آہنگی ہے۔ ان لغوی وضاحتوں کو اگر سامنے رکھا جائے۔ تو عبادت کا دینی اور اسلامی تصور بہت کچھ سمجھ میں آجائے گا۔ ان سے بڑی آسانی سے

یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ کہ عبادت الٰہی کا اصلی جوہر کیا ہے۔ اور اللہ کی عبادت کرنے والا کون ہوتا ہے۔ اور کیا ہوتا ہے؟

عبادت کا اصل اور بنیادی مفہوم اگر آخری درجہ کی فروتنی ہے تو یہ اس بات کا ثبوت ہے۔ کہ یہی فروتنی اللہ سبحانہٗ کا اصلی جوہر ہے۔ پھر چونکہ اللہ سبحانہٗ انسان کے حقیقی فرماں روا بھی ہیں اور اس کے حقیقی محسن بھی۔ اس لیے انسانی عقل یہ باور نہیں کر سکتی کہ اس آخری درجہ کی فروتنی کا نتیجہ اطاعت اور پرستش نہ ہو۔ یہ بات کچھ ایسی ہی ناممکن ہے۔ کہ آگ تو بھڑک رہی ہے۔ مگر اس میں گرمی نہ ہو۔ غرض اللہ سبحانہٗ کے سامنے انسان کی فروتنی کی جو فطری نوعیت ہو سکتی ہے اس کا قطعی تقاضا یہی ہے۔ کہ عبادت الٰہی میں تینوں چیزیں موجود ہوں۔ انتہائی تذلل بھی، اطاعت بھی اور پرستش بھی۔

عبادت کے ان معانی کو پیش نظر رکھ کر آپ ذرا اس پر غور فرمایئے کہ انبیاء علیہم اسلام نوع انسانی کی ہدایت کے لیے تشریف لائے۔ ان بزرگوں نے لوگوں کو جس بات کی ہدایت کی وہ واضح اور قطعی لفظوں میں یہ کہ اعبدوا اللہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت کرو اور ظاہر ہے یہی دعوت ہونی چاہیئے۔ اگر انسان اللہ سبحانہٗ کی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ تو یہ کیسے ممکن تھا۔ کہ انبیاء علیہم اسلام کو جو ہدایت دے کر روانہ کیا جاتا۔ وہ اس سے مختلف ہوتی۔

قرآن میں لفظ عبادت مختلف صیغوں کی شکل میں بے شمار مواقع پر استعمال ہوا ہے۔ ان میں سے کچھ منتخب آیتوں کا ترتیب وار مطالعہ کیجیئے۔

اولاً۔ کسی کے ساتھ پرستش کا رویہ اختیار کرنے کو عبادت کہا گیا ہے۔ مثلاً

ما تعبدون من دونه الا اسماء سميتموها انتم

اور

قالوا نعبد اصناما فنظل لها عاكفين

یہ آیات ببانگ دہل علی روس الاشہاد کہہ رہی ہیں۔ کہ مشرکین اپنے بتوں کی جو پرستش کرتے تھے۔ وہ عبادت ہے۔

ثانیاً۔ کسی کو مطاع مطلق سمجھ کر اپنے ارادے اور مرضی سے اس کے احکام پر چلنا اس کی عبادت ہے۔ مثلاً

والذين اجتنبوا الطاغوت ان يعبدوها وانابوا

الی اللہ لھم البشری

اس آیت میں واضح طور پر اس طرزِ عمل کو عبادت کہا گیا ہے۔ جو طاغوت کے ساتھ اس کی پیروی اختیار کی جاتی ہے۔ طاغوت کے معنے جیسا کہ شاہ عبد القادر کی زبانی سُن چکے ہو۔ ہر زبردست جو ناحق سرداری کا دعویٰ کرے۔ اور اس کے لیے اس کے پاس کوئی سند نہ ہو۔ یعنی ہر وہ مخلوق جو اللہ کی بندگی سے نکل گئی ہو یا نکل جانے کا ذریعہ ہو۔ اس طرح اگر شیطان اور بت طاغوت ہیں تو وہ حکمران، سردار اور وہ قومی لیڈر بھی طاغوت ہی ہیں۔ جو خوفِ خدا سے بے بہرہ اور ہدایت الٰہی سے بے نیاز ہو کر اپنی رائے اور مرضی کو وقت کا قانون سمجھتے ہیں۔

ثالثاً۔ صرف وہی اطاعت عبادت نہیں جس کے پیچھے ارادۂ دل کی آمادگی اور جس کی اطاعت کی جا رہی ہو اسکے بارے میں بے قید اطاعت کے مستحق ہونے کا خیال موجود ہو۔ بلکہ وہ اطاعت بھی عبادت ہے۔ جو اگرچہ اپنی مرضی کے خلاف کرنی پڑ رہی ہے۔ مگر شعور اور ارادے کے ساتھ اور بلاچون وچرا کی جا رہی ہو۔ اور جس کی اطاعت کی جا رہی ہو۔ وہ خود کو کسی بالاتر قانون کا پابند نہ سمجھتا ہو۔ مثلاً

فقالوا انؤمن لبشرین مثلنا وقومهما لنا عابدون

اور جیسے

وتلك نعمة تمنها علی ان عبدت بنی اسرائیل

ان آیتوں میں بنی اسرائیل کی غلامی کو قبطیوں کی عبادت کرنا کہا گیا ہے۔

رابعاً۔ کسی کی غیر شعوری اطاعت کاملہ بھی عبادت ہے۔ مثلاً یا ابت لا تعبد الشیطان

اس آیت میں شیطان کی عبادت کرنے سے روکا گیا ہے۔ حالانکہ شیطان کی عبادت اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔ کہ ان کے عقائد و اعمال بالکل ویسے تھے جیسا کہ شیطان چاہتا تھا۔

قرآن کا اہل ایمان سے مطالبہ

اللہ سبحانہٗ نے اپنی جس عبادت کو انسان کا مقصد وجود قرار دیا ہے۔ اور جس کی تلقین وہدایت کے لیے اس کے رسول آتے رہے ہیں۔ وہ کوئی ادھوری، آدھی، تہائی قسم کی عبادت نہیں ہے۔ نہ صرف وہ پرستش تک محدود ہے۔ نہ صرف اطاعت تک، قرآن کا اہل ایمان سے مطالبہ یہ

ہے۔ کہ اللہ سبحانہ کی پرستش اور اس کی اطاعت دونوں ہی چیزیں یکساں طور پر کرو۔ وہ جہاں یہ کہتا ہے۔ کہ اللہ ہی کو سجدہ کرو۔ اسی کے نام کی پاکی بیان کرو۔ اسی کی نذر مانو، اسی سے دعا مانگو، اسی کی بڑائی کا اعلان کرو، اسی کو دہائی دو، اسی کو مدد کے لیے پکارو اور اسی کے حضور اعتراف نعمت کرو۔ وہیں یہ بھی کہتا ہے۔ کہ اللہ ہی کی بے قید اطاعت کرو اور اسی کو بلا شرط حقیقی فرمانروا مانو۔ اسی کو مستقل اور بالذات قانون ساز تسلیم کرو۔ اسی کے احکام کی اطاعت کرو۔ اسی کے قوانین کے مطابق فیصلے کرو۔ اور اسی کے ضابطوں کو زندگی کے ضابطے بناؤ۔ اسی کے حلال کو حلال اور اسی کے حرام کو حرام سمجھو۔ اس لیے اس عبادت کا مفہوم جسے انسان کی پیدائش کا مقصد و مدعا فرمایا گیا ہے۔ جو ہر نبی کی دعوت سر عنوان تھی اور جس کا قرآن نے ہمیں حکم دیا ہے۔ لازماً وہ ہی جامع اور کامل مفہوم ہوگا۔ جس میں پرستش اور اطاعت دونوں شامل ہیں۔

اسی لیے قرآن میں عبادت کا مقابل اور ضد استکبار آیا ہے۔ ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جھنم داخرین۔

اس قسم کی اور آیات بھی قرآن میں ہیں۔ جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ عبادت اور استکبار ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ اس لیے اگر استکبار کے معنے اللہ کے مقابلے میں اپنے آپ کو بڑا سمجھتے اپنی ہستی کو بھی کوئی جاننا اور اللہ سبحانہ کے سامنے اپنی گردن جھکانے سے عار کرنے کے ہیں تو عبادت کے معنے اللہ سبحانہ کے سامنے اپنی عاجزی فروتنی کا اظہار اور بندگی میں اس کے احکام و قوانین کے سامنے اپنی گردن اطاعت کو خم کرنا ہے۔ اس بنا پر عبادت بندہ کا ہر وہ کام ہے۔ جس سے مقصود اللہ سبحانہ کے سامنے اپنی بندگی کا اظہار اور اس کے قوانین و احکام کی اطاعت ہو۔ اگر کوئی شخص بظاہر کیسے ہی اچھے کام کرے۔ لیکن اس سے مقصود اپنی فروتنی کا اظہار اور اللہ سبحانہ کے حکم کی اطاعت نہ ہو۔ تو وہ عبادت نہیں ہے۔

اس بحث سے قرآن کی مطلوبہ عبادت ان لا تعبدوا الا اللہ کا مفہوم و مدعا بالکل نکھر کر سامنے آجاتا ہے۔ اور وہ یہ کہ انسان کا دل بھی اللہ کے حضور بچھا ہوا ہو۔ اور اس کے اعضا و جوارح بھی جھکے ہوئے ہوں۔ وہ اس کی والہانہ اطاعت میں سرگرم رہے اور اسی اطاعت کے اولین تقاضے کی حیثیت سے اس کی مخلصانہ پرستش بھی کرے۔ یہاں تک کہ اس کے باطن کے کسی جذبے، رجحان اور ظاہر کے کسی قول و عمل سے یہ محسوس نہ ہو سکے کہ اس کے اندر اپنے اللہ کے سوا کسی اور کی عظمت و کبریائی موجود ہے۔ یا کسی دوسرے کے لیے

یہی ظاہر یا باطن کا جھکاؤ خضوع پایا جاتا ہے۔

(۳) نبوت انسانیت کیلئے بشیر و نذیر ہے

بلاشبہ میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے تمہیں خبردار کرنے والا اور خوش خبری دینے والا ہوں۔ یعنی جو کتاب کو ملنے اور شرک چھوڑ کر خدائے واحد کی عبادت کرے اسے فلاح دارین کی خوشخبری سناتے ہیں۔ جو نہ ملنے اور کفر و شرک اختیار کرے اس کو عذاب الٰہی سے ڈراتے ہیں۔ قاضی بیضاوی نے یہی مطلب بتایا ہے۔ جو شیخ الاسلام لے لکھا ہے۔ لیکن دوسرے شارحین قرآن نے اس موضوع پر جو داد تحسین دی اس سے بھی استفادہ فرمائیے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔

بلاشبہ میں تمہیں عذاب سے آگاہ کرنے والا ہوں۔ اگر تم میری پیش کردہ دعوت کی مخالفت کروگے اور تم اس دعوت کو مان کر اطاعت کا رویہ اختیار کروگے۔ تو میں اس پر ثواب کی تمہیں بشارت دینے والا ہوں۔ جیسا کہ حدیث صحیح میں آیا ہے۔ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کوہ صفا پر گئے اور خاندان کے ایک ایک قبیلے کا نام لے کر پکارا۔ لوگ آواز پر جمع ہو گئے۔ فرمایا کہ اے قریش تمہاری کیا رائے ہے اس میں کہ اگر تمہیں یہ بتاؤں کہ ایک گھوڑے سواروں کا دستہ تم پر شب خون مارنے والا ہے۔ کیا تم میری بات کا یقین کرلوگے۔ قریش نے یک زبان ہوکر جواب دیا۔ کیوں نہیں ضرور مانیں گے۔ آپ کے متعلق ہمارا جھوٹ کا کوئی تجربہ نہیں اچھا لو سنو! خاص کر تمہیں ایک سخت ترین عذاب سے آگاہ کر رہا ہوں۔

بنیادی طور پر نبوت لوگوں کی ہدایت کے لیے آتی ہے۔ اور ہدایت کی گاڑی انسانی زندگی میں دو طرح سے چلاتی ہے۔ ایک انذار دوسرے تبشیر۔ انذار یہ کہ وہ اعمال بد سے روکتی ہے۔ اور اس کے نتائج سے آگاہ اور خبردار کرتی ہے۔ اسی معنے کے اعتبار سے نبی کو نذیر کہا جاتا ہے اور اسی کا نام قرآنی زبان میں تقویٰ اور نہی عن المنکر ہے۔ یعنی رذائل اور برائیوں سے بچنا اسی کو محدثین کے یہاں ترہیب کہتے ہیں۔ اسی کو قانون کی زبان میں دفع مفاسد کو دور کرنا اور صوفیا

لے افادات شیخ الاسلام

کی اصلاح میں تخلیہ کہتے ہیں۔ تبشیر یہ کہ نبوت اعمال صالحہ اور امر بالمعروف کی دعوت دیتی ہے ان کے فضائل بیان کرتی ہے۔ ان کے اچھے نتائج کی خوشخبری دیتی ہے۔ اسی کو قرآن کی زبان میں عبادت واطاعت اور امر بالمعروف کہتے ہیں۔ محدثین کی اصلاح میں ترغیب اور قانون کی زبان میں جلب مصالح اور صوفیار کی اصلاح میں تخلیہ ہے۔

یہاں نذیر پہلے آیا ہے۔ اور بشیر بعد میں یہ سورۃ مکی ہے۔ اور زمانہ دعوت کا آغاز ہے۔ عام شہری زندگی میں منکرات اور رذائل شاہراہ عام پر ہیں۔ اس لیے نذیر لاکر اشارا کر دیا کہ رذائل کے خلاف آواز بلند کرنا مقدم ہے۔ عقل کا تقاضا بھی یہی ہے۔ کہ برتن کو چمکدار بنانے کے لیے پہلے میل اور زنگ اتارا جائے پھر قلعی کی جائے۔ قانون دان محققین نے بھی یہی فیصلہ کیا ہے کہ مفاسد کو پہلے دور کیا جائے مصالح بعد کی بات ہے۔

ہاں جب شہری زندگی میں برائیاں دبی ہوئی ہوں۔ رذائل شاہراہ عام پر نہ ہوں۔ وہاں دعوت کا رُخ فضائل کی طرف ہوگا۔ قانون مصالح سے بحث کرے گا۔ مکی اور مدنی سورتوں میں آپ کو یہ صرف نمایاں نظر آئے گا۔ مکی سورتوں میں لفظ نذیر پہلے آئے گا۔ جبکہ مدنی سورتوں میں بشیر سے آغاز کیا جائے گا۔ مدنی سورتوں میں بھی وہ سورتیں جو مدنی زندگی کے دور آغاز میں ہیں۔ ان میں نذیر پہلے آیا ہے۔ یہ احوال وظروف کی رعایت پر مبنی فرق ہے۔ اور انبیاء علیہم السلام کی بعثت کے تذکار میں قرآن نے جو تبشیر کو مقدم کیا ہے۔ اس میں یہ بتایا ہے۔ کہ اصل فطرت انسانی میں نیکی سے ہی اور رذیلہ ایک اضافی چیز ہے۔ جیسے اصل اللہ سبحانہ میں رحمت ہے۔ اور تبشیر رحمت ہی کا تقاضا ہے۔ اور غضب ایک اضافی چیز ہے۔ اور غضب ہی کا نتیجہ ہے۔

آیات قرآنی کا اس فکر کے ساتھ مطالعہ کیجئے۔ تو آپ پر قرآنی مخاطبات کی بلاغت کے دروازے کھل جائینگے۔

اس سے یہ نکتہ بھی سمجھ میں آتا ہے۔ کہ داعی کو دعوت میں احوال وظروف کی رعایت ضروری ہے۔ اگر داعی اس کی رعایت نہ کرے گا تو داعی کی دعوت حکمت پر مبنی نہ ہوگی۔

(۴) نبوت کی دعوت میں فلاح دنیا کی ضمانت

اور یہ کہ تم اپنے گناہوں کی اپنے رب سے معافی مانگو اور آئندہ کے لیے اسی کی طرف پلٹ آؤ۔ اگر ایسا کرو گے تو وہ تمہیں ایک وقت مقررہ تک اچھا سامان زندگی دے گا۔ اور عمل میں زیادتی کرنے

والے کو اس کی مزید محنت و کوششیں کا اجر دے گا۔ یعنی جو پچھلی تقصیرات معاف کرائے گا۔ اور آئندہ کے لیے اللہ سبحانہٗ کی طرف رجوع ہو۔ تو دنیا کی زندگی اچھی طرح گزرے گی۔ کیونکہ مومن قانت خواہ کسی حال میں بھی ہو مگر اللہ سبحانہٗ کے فضل و کرم کی بڑی بڑی امیدیں رکھتا ہے۔ اور وہ حق تعالیٰ کی رضا جوئی اور مستقبل کی عظیم الشان خوشحالی کے تصور میں اس قدر مگن رہتا ہے کہ یہاں کی بڑی بڑی سختیوں کو خاطر میں نہیں لاتا۔ وہ جب خیال کرتا ہے۔ کہ اپنی زندگی کے فرائض صحیح طور پر انجام دے رہا ہوں۔ جس کا صلہ مجھ کو ضرور ایک دن عرش والی سرکار سے ملنے والا ہے۔ تو اپنی کامیابی اور حق تعالیٰ کے وعدوں پر اعتماد کر کے اس کا دل جوش مسرت سے اچھلنے لگتا ہے۔ اسے دنیا کی تھوڑی سی پونجی میں وہ سکون قلب اور راحت باطنی نصیب ہوتی ہے۔ جو بادشاہوں کو بے شمار سامانوں اور اموال و خزائن سے حاصل نہیں ہو سکتی بلکہ بعض اوقات یہاں کی چند روزہ تکلیفوں اور سختیوں میں وہ لذت پاتے ہیں۔ جو اغنیاء و ملوک اپنے عیش و تنعم میں محسوس نہیں کرتے۔ ایک محب وطن سپاہی قیدی کو اگر فرض کیجیے یقین ہو جائے کہ میری اسیری سے ملک اجنبیوں کی غلامی سے آزاد ہو جائے گا۔ اور جسے قید سے نکلتے ہی ملک کی جمہوریہ کا صدر بنایا جائے گا تو کیا اس کو جیل خانہ کی بند کوٹھڑی میں سرور اطمینان کی کیفیت اس بادشاہ سے زیادہ حاصل نہ ہوگی۔ جس کے لیے ہر قسم کے عیش و طرب فراہم ہیں مگر اندیشہ لگا ہوا ہے۔ کہ وہ ایک ہفتہ کے اندر نہایت ذلت کے ساتھ تخت شاہی سے اتارا جانے والا ہے اسی پر دنیا کے جیل خانہ کو قیاس کر لو۔ پھر جو جس قدر زیادہ بڑھ کر عمل کرے گا۔ اسی قدر اللہ سبحانہٗ کے فضل سے زیادہ حصہ پائے گا۔ آخرت میں اجر و ثواب اور دنیا میں مزید طمانیت حاصل ہوگی۔[1] یہاں اہم اور ضروری باتیں غور طلب ہیں۔

اوّل یہ کہ غور کرو قرآن کے ایک ایک لفظ میں کیسی دقیق مناسبتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ آیت انّنی لکم منہ نذیر و بشیر میں پہلے نذیر آیا ہے۔ اس کی مناسبت سے ان استغفروا آیا ہے۔ انذار چونکہ رذائل اور منکرات کے نتائج سے آگاہ کرنے کو کہتے ہیں۔ اس لیے فرمایا کہ ان رذائل سے جو کر چکے ہو معافی طلب کرو۔ یہ رذائل پوری زندگی میں ہیں۔ ان کی معافی کی پہلے جناب الٰہی میں درخواست کرو۔ ان رذائل میں ام الرذائل شرک ہے۔ اس میں ساری شہری زندگی مبتلا تھی۔ حافظ ابن جریرؒ نے یہ بات بالکل برمحل لکھی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

الاستغفار استغفار من الشرک

شرک سے معافی مانگنا مراد ہے۔ وجہ اس کی ظاہر ہے۔ کہ شرک کی موجودگی میں کوئی عمل اللہ کے لیے نہیں ہو سکتا ہے۔ اور بشیر کی رعایت سے ثم توبوا الیہ لائے ہیں۔ بشیر اعمال صالحہ کے نتائج کی خوشخبری دینے والی کہتے ہیں۔ اس لیے اس کی مناسبت سے فرمایا۔ ثم توبوا الیہ۔ پھر اپنے اللہ کے لیے انابت پیدا کرو یعنی اعمال صالحہ کرو۔ حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں۔ کہ

توبہ نام ہے۔ الرجوع الی العمل بطاعۃ اللہ۔ اللہ کی فرمان برداری پر مبنی عملی زندگی کا۔

اس طرح نذیر کے ساتھ استغفار اور بشیر کے ساتھ توبہ کی پیوندکاری سے از روئے بلاغت اس میں لف ونشر ہے۔

دوسرے یہ کہ علامہ آلوسی استغفار، تمتیع اور توبہ وابتا رفضل میں بھی لف ونشر بتایا ہے یہ اگرچہ ان کی اپنی رائے نہیں۔ بلکہ صیغہ تمریض سے پیش کی ہے۔ جو خود ان کے یہاں بھی اس کے کمزور ہونے کی نشانی ہے۔ اور ہے بھی یہ بات بے پر کی اور ہوائی ان میں باہم کوئی پیوند نہیں ہے

تیسرے یہ کہ شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں اس آیت کے معانی ومطالب کا جماعت سے ہٹا کر افراد کو محمل بنادیا۔ اور مطالب کا رُخ دنیا سے ہٹا کر آخرت کی طرف کردیا۔ حالانکہ آیت قرآنی اپنے مطالب میں بالکل واضح اور صاف ہے آیئے پہلے شارحین قرآن کی زبانی تشریحات سُنیئے۔ حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہٗ مشرکین کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں کہ گزشتہ گناہوں اور رذائل کی جناب الٰہی میں معافی مانگو اور آئندہ کے لیے گناہوں سے باز رہنے اور اللہ کی مخلصانہ اطاعت کا عہد کرو۔ جب تم یہ کام کرلوگے۔ تو اللہ سبحانہٗ تم پر دنیا فراخ کردے گا۔ اور تمہیں دنیا میں شان وشوکت سے نوازے گا۔ اور تمہاری عمروں میں برکت دے گا۔

حافظ ابن کثیر رحمۃ اللہ فرماتے ہیں۔

میں تمہیں گزشتہ گناہوں سے معافی مانگنے کا حکم دیتا ہوں۔ اور مستقبل میں تمہیں اطاعت گزاری کی اور اس پر دوام کی ہدایت کرتا ہوں۔ اگر تم ایسا کروگے تو اللہ تعالیٰ

تم کو اس دنیا کی زندگی میں متاع حسن دے گا۔ ایک مقررہ مدت تک۔

علامہ قرطبیؒ یمتعکم متاعاً حسناً کی تشریح کرتے ہوئے رقمطراز ہیں۔

اللہ سبحانہٗ تمہیں وسعت رزق اور مزیدار زندگی کے منافع سے مالا مال کرے گا۔ اور تمہاری بیخ کنی نہیں کرے گا۔ عذاب کے ذریعے جیسا کہ تم سے پہلوں کے ساتھ ہو چکا ہے۔

قاضی بیضاوی فرماتے ہیں۔

تمہیں امن و راحت کی زندگی سے نوازے گا۔ مقررہ مدت تک یا تمہیں عذاب استیصال کا نشانہ بننے سے محفوظ رکھے گا۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں۔

گزشتہ گناہوں سے معافی مانگو اور آئندہ زندگی اللہ کی اطاعت میں گزارنے کا عہد کرو۔ اللہ سبحانہٗ تمہیں اس دنیا میں امن و راحت والی شاندار زندگی عطا کرے گا کیونکہ اللہ سبحانہٗ کی نافرمانیاں مصائب اور بلیات کو جنم دیتی ہیں۔

علامہ بقاعی نظم الدرر میں فرماتے ہیں۔

اللہ سبحانہٗ تمہاری لذت والی زندگی کو دراز کرے گا اور یہی مزیدار زندگی زمانہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ میں صحابہ کرام کو عطا کی گئی اس میں دنیا کی وسعت اور راحت و آرام کی فراوانی تھی۔

مولانا صدیق الحسن قنوجی فتح البیان میں لکھتے ہیں۔

امتاع کے معنے لمبا کرنے کے ہیں۔ اسی سے امتع اللہ بک بولا جاتا ہے۔ آیت قرآنی کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ دنیا کی زندگی میں تمہاری نفع اندوزیوں کو اچھے اور شاندار منافع کے ذریعے طویل کرے گا۔ زندگی اچھی پسندیدہ ہوگی۔ رزق میں فراخی اور راحت و آرام میں بہتات ہوگی۔

علامہ محی السنۃ ابو محمد حسن بن مسعود بغوی معالم التنزیل میں رقمطراز ہیں۔

استغفار کرو اور آئندہ کے لیے اطاعت گزاری کا عہد کرو۔ تو اللہ سبحانہٗ تمہیں اس دنیا میں اچھی آرام و راحت والی زندگی کا انعام دے گا۔ جس میں امن و چین بھی اور رزق کی فراوانی بھی ہوگی۔

مشہور صوفی علامہ علاؤ الدین علی بن محمد لباب التاویل میں لکھتے ہیں۔

جب تم استغفار و توبہ کی پا بجائی کرلو گے۔ اور تمہاری عابدانہ زندگی میں اللہ کے
لیے اخلاص ہو جائے گا۔ تو اللہ دنیا کی زندگی میں دنیا کے دھانے کھول دے
گا۔ اور رزق کی راہوں میں وسعت دے گا۔

یہ ہیں عربی میں ارباب تفسیر میں منقول اور معقول تفسیری سرمائے کے اہل علم۔ آیئے ذرا ان لوگوں سے خوشہ چینی کریں جنہوں نے اردو زبان میں تفسیر پر داد تحقیق دی ہے۔ چند شارحین قرآن کی تشریحات ہدیہ ناظرین ہیں۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ بیان القرآن میں فرماتے ہیں۔

تم لوگ اپنے گناہ شرک و کفر وغیرہ اپنے رب سے معاف کراؤ یعنی ایمان لاؤ اور
پھر ایمان لا کر اس کی طرف عبادت سے متوجہ رہو۔ یعنی عمل صالح کرو پس ایمان و
عمل صالح کی برکت سے وہ تم کو وقت مقررہ تک دنیا میں خوش عیشی دے گا۔ اور
آخرت میں ہر زیادہ عمل کرنے والے کو زیادہ ثواب ملے گا۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے معارف القرآن میں تفصیلی تبصرہ فرمایا ہے۔ اور خلاصہ یہ لکھا ہے۔ کہ

اسی لیے آیت مذکورہ میں متاع حسن کی تفسیر بھی اکثر مفسرین نے یہ کی ہے کہ استغفار و
توبہ کے نتیجہ میں اللہ تعالیٰ تم کو رزق کی وسعت اور عیش کی سہولتیں عطا فرمائے
گا۔ اور آفتوں اور عذابوں سے تمہاری حفاظت کرے گا۔ اور حیات دنیا کا ایک
روز ختم ہو جانا لازمی ہے۔ اور اس کی عیش و راحت قانون قدرت میں دائمی نہیں
ہو سکتی۔ اس لیے الی اجل مسمیٰ فرما کر ہدایت کردی کہ دنیا میں پاکیزہ زندگی اور
عیش کی سہولتیں ایک خاص میعاد یعنی موت تک حاصل رہیں گی۔ آخر کار موت ان
سب چیزوں کا خاتمہ کر دے گی۔

مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی معارف القرآن میں فرماتے ہیں۔

تم اپنے پروردگار سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو یعنی ایمان لے آؤ۔ پھر آئندہ
کے لیے اس کی طرف رجوع ہو جاؤ یعنی ہمہ تن اس کی اطاعت اور اعمال صالحہ
کی طرف متوجہ ہو جاؤ۔ اللہ تعالیٰ تم کو ایمان و عمل صالح کی برکت سے دنیا
میں ایک وقت مقررہ تک اچھا بہرہ مند بنائے گا۔ یعنی تمہارے رزق میں برکت
ہو گی۔ اور سکون و اطمینان کی زندگی بسر کرو گے۔

آپ دیکھ رہے ہیں کہ ان سارے شارحین قرآن میں سے کسی ایک نے بھی شیخ الاسلام کی ہمنوائی

نہیں کی ہے۔ اور تو اور شاہ عبدالقادر کی بھی موضح القرآن میں شیخ الاسلام کو ہمنوائی حاصل نہیں ہے شاہ صاحب فرماتے ہیں ۔

یعنی ایمان لاؤ تو دنیا کی زندگی اچھی طرح گزرے اور کوئی اس سے زیادہ قدم رکھے وہ زیادہ درجہ پائے ۔

غالباً شیخ الاسلام کے پیش نظر کچھ صوفیار کرام کے عارفانہ واردات ہیں ۔ ان ہی سے متاثر ہو کر آیت قرآن کی یہ تشریح فرما رہے ہیں ۔ مثلاً سہل بن عبداللہ اس کی تشریح کرتے ہوئے ۔ یوں گوہر فشاں ہیں کہ

متاع حسن سے مراد یہ ہے ۔ کہ انسان کی توجہ مخلوق سے ہٹ کر خالق پر جم جائے ۔

یا جیسا کہ قرطبی نے بعض بزرگوں کے حوالہ سے لکھا ہے کہ

متاع حسن یہ ہے ۔ کہ انسان موجود پر قناعت کرے ۔ مفقود کے غم میں نہ پڑے ۔

مطلب یہ ہے کہ دنیا جس قدر میسر ہو اس پر مطمئن ہو جائے جو حاصل نہیں اس کے غم میں نہ پڑے یہ تشریح اس وقت ٹھیک ہے ۔ جب فرد کی انقلابی آیت قرآنی کا محل ہو ۔ لیکن آیت قرآنی میں قرآن کا مخاطب فرد نہیں بلکہ اجتماع ہے جیسا کہ علامہ آلوسی نے زجاج سے نقل کیا ہے ۔

والخطاب لجميع الامة بقطع النظر عن كل فرد فرد ى

دراصل صوفیار کی کوشش یہ ہوتی ہے ۔ کہ قرآن کی اپنے احوال و ظروف کے مطابق تشریح کی جائے چونکہ تصوف کی ساری تگ و دو فرد کی انفرادی زندگی ہوتی ہے ۔ اس لیے وہ قرآن کی آیات کی تشریح بھی اپنے تصورات کے تحت کرتے ہیں ۔ ان کا مقصود و منتہائے نظر فرد کی جمعیت ہے ۔ امت کی اجتماعیت نہیں ہے ۔ صوفیار پر اسی جمعیت کی وجہ سے تفرد غالب ہوتا ہے ۔ اور جس دین کی اساس عشق الہی ہو ۔ اس کے لازمی تقاضے یہی ہیں ۔ مولانا اسماعیل شہید عشق الہی کے آثار بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں ۔

اس عشق الہی کے آثار میں سے ایک تفرد ہے ۔ یعنی یہ کہ انسان محبوب کے سوا باقی سارے علائق سے علیحدہ ہو جاتا ہے ۔ زندگی کے رنگا رنگ مشاغل اور بے شمار تعلقات کا سامنا کرتے ہوئے اس کا دل بڑی تنگی محسوس کرتا ہے ۔ اور طرح طرح کے نظم و انصرام سے مثلاً خانگی مسائل کے انتظام معاشرتی اور اجتماعی امور کی انجام دہی

جماعت کا اجتماعی انتظام، عیدین اور جمعہ کی اقامت، حق دار امزہ کے حقوق کی بجاآوری
وغیرہ امور سے سخت انقباض ہوتا ہے۔ چنانچہ یہی وجہ ہے۔ کہ نکاح سے جو تمام
علائق کی بنیاد ہے۔ اسے حد درجہ نفرت ہوتی ہے۔ ؎

بہر حال صوفیاء کرام کی کیفیات قلبی اور واردات پر قرآن کی تفسیر نہیں ہو سکتی ہے قرآن کی تشریح و تفسیر کے لیے راہ نبوت راہنما ہے۔ نہ کہ راہ ولایت۔

یہ امر واقعہ ہے۔ کہ جہاں تک انفرادی فلاح کا تعلق ہے۔ اس کی اہمیت اور ضرورت ناقابل تردید حقیقت ہے۔ اور انفرادی فلاح کی حد تک بقول حضرت شاہ ولی اللہؒ "نسبت صوفیاء غنیمتے است کبریٰ" ہر مومن اس کا ضرورت مند ہے۔ لیکن صرف اگر انفرادی فلاح ہی اگر راہ ولایت ہے۔ تو انفرادی اور اجتماعی فلاح راہ نبوت ہے۔ اسلام دونوں کے مجموعے کا نام ہے۔

سورہ ہود مکی سورۃ ہے۔ مکی زندگی کا دور ایک تاریک دور ہے۔ قرآن نے اس تاریک دور میں ان لوگوں سے جو ابھی اسلام نہیں لائے تھے۔ خطاب کر کے کہا۔ استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ یمتعکم متاعا حسنا الی اجل مسمیٰ۔ اس آیت میں ایمان کی دعوت قبول کرنے اور مخلصانہ اطاعت والی زندگی اپنانے پر اللہ سبحانہ نے نبوت کی وساطت سے بتایا ہے۔ کہ تمہیں دنیوی فلاح ملے گی۔ اور یہ صرف حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت ہی کے بارے میں نہیں ہے۔ بلکہ اس غرض کے لیے جب ہم انبیاء علیہم السلام کی دعوتوں کا جائزہ لیتے ہیں۔ تو قرآن ہمیں بتاتا ہے۔ کہ جس نبی نے بھی یہ دعوت دی۔ اپنی قوم کو یہ یقین دلاتے ہوئے دی۔ کہ میری دعوت کو قبول کرنا تمہیں آخرت کی ہی نہیں دنیا کی بھی فلاح بخشے گی۔ حضرت نوحؑ اپنی قوم کو مخاطب کر کے فرماتے ہیں۔

استغفروا ربکم انہ کان غفارا یرسل السماء علیکم
مدرارا ویمددکم باموال وبنین ویجعل لکم جنات
ویجعل لکم انہارا سورۃ نوح ۱۰ - ۱۲

اپنے رب سے معافی مانگو بلاشبہ وہ بڑا ہی بخشنے والا ہے اگر ایسا کرو گے
تو وہ تم پر موسلا دھار بارشیں برسائے گا۔ تمہیں دولت اور اولاد عطا فرمائے

؎ صراط مستقیم ص۱۰۱

گا۔ شاداب باغ مہیا کرے گا۔ اور نہریں جاری کرے گا۔

اسی طرح حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت کے الفاظ یہ تھے۔

یاقوم استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ یرسل السماء علیکم مدرارا ویزدکم قوۃ الی قوتکم۔ سورہ ہود۔ ۵۲

اے میری قوم اپنے رب سے معافی مانگو اور پھر اس کی طرف پلٹو۔ وہ تم پر موسلا دھار بارشیں برسائے گا۔ اور تمہاری طاقت میں برابر افزونی عطا کرتا رہے گا۔

انبیاء کی دعوتوں کی یہ متفقہ شہادتیں قرآن میں موجود ہیں۔ ان سے اللہ سبحانہ کے جس نہ بدلنے والے ضابطہ اور فیصلے کا پتہ چلتا ہے بہ قطعی طور پر یہی ہے۔ کہ اپنی اطاعت اور بندگی کے عوض وہ آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی بھی آسائش اور عزت واقتدار بخشے گا۔ پھر یہی شہادتیں یہ بھی بتاتی ہیں۔ کہ جب بھی کسی قوم نے اطاعت وبندگی کی یہ راہ اپنائی۔ اس کے حق میں یہ ضابطہ اور وعدہ لازماً پورا ہوا۔ اور وہ جن کی آخرت سنور رہی تھی۔ ان کی دنیا بھی باغ وبہار ہی بنی رہی ہے۔

قرآن دنیاوی فلاح کی ضمانت دیتا ہے

کوئی وجہ نہیں کہ اسلام اور امت مسلمہ کے بارے میں اللہ سبحانہ کا یہ ضابطہ اور فیصلہ بدل جاتا۔ چنانچہ وہ نہیں بدلا۔ اور دنیاوی فلاح کے بارے میں ٹھیک اسی طرح کا وعدہ اس امت سے بھی کیا گیا۔ جیسے پہلوں سے کیا جاتا رہا ہے۔ اور ہر مرحلے میں کیا گیا۔ مکہ کے تاریک ماحول میں بھی کیا گیا۔ اور مدینہ کے پُرخطر دور میں بھی۔ پیش نظر آیت قرآنی جس کی تشریح ہو رہی ہے۔ اس میں مشرکین مکہ سے ایمان وعمل کی دعوت پر یہ یقین دلایا گیا۔ یمتعکم متاعا حسنا آگے چل کر ایمان لانے والوں سے خطاب کرکے فرمایا۔

وعد اللہ الذین امنوا منکم وعملوا الصالحات یستخلفنھم فی الارض سورہ نور۔ ۵۵

تم میں سے جو لوگ ایمان لائے اور عمل صالح کرتے ہیں اللہ تعالیٰ کا ان سے یہ وعدہ ہے۔ کہ وہ ان کو زمین میں اقتدار ضرور عطا فرمائے گا۔

ایمان اور عمل صالح کی شرطیں پوری کرنے کے نتیجے میں یہ وعدے کیسے پورے ہوئے اس سے دنیا ناواقف نہیں ہے۔ وہ اچھی طرح جانتی ہے کہ اسلام نے مسلمان کو وہ سب کچھ دیا جو دنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہو سکتا ہے۔

⑤ دو جزاؤں کا مقابلہ دو سزاؤں سے

اور دیکھو اگر تم نبوت کی دعوت سے روگردانی کرو گے تو مجھے اندیشہ ہے۔ تمہارے بارے میں ایک بڑے دن کے عذاب کا۔ یاد رکھو تم سب کو اللہ کے حضور میں پیش ہونا ہے۔ اور وہ قادر مطلق ہے۔ یعنی میری بات نہ مانو گے تو قیامت کا عذاب یقینی ہے۔ باقی یہ فرمانا کہ میں ڈرتا ہوں اس سے مقصود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عام شفقت اور ہمدردی و خلائق کا اظہار ہے۔[1]

عام شارحین قرآن کا رجحان بھی یہی ہے کہ یوم کبیر میں عذاب سے مراد قیامت میں سزا ہے۔ جیسا کہ شیخ اسلام کے افادے سے معلوم ہوتا ہے۔ لیکن ذرا سوچنے کی بات ہے۔ کہ دو حکم دیئے گئے۔ استغفروا اور توبوا ان دونوں کی جزائیں بتائی گئیں۔ ایک دنیا میں یمتعکم متاعا حسنًا اور دوسری آخرت میں ویؤت کل ذی فضل فضلہ انداز بلاغت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ سزائیں دو ہوں۔ ایک دنیا میں دوسری آخرت میں پہلی دنیا میں سزا۔ انی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر کے ذریعے بتائی گئی ہے۔ دوسری آخرت میں سزا الی اللہ مرجعکم جمیعا وھو علی کل شئ قدیر۔ کے ذریعے سنائی گئی ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں کہ دنیوی سزا کیا ہے۔ اوروں کا پتہ نہیں ہے مگر میری سوچ یہ ہے کہ دنیا میں ان پر سزا بدر کی صورت میں آئی۔ مجھے اس میں کچھ شارحین کی ہمنوائی بھی حاصل ہے۔ اگرچہ بدر والی بات کو شارحین نے بصیغہ تمریض سے ذکر کیا ہے۔

جس طرح دوسری قوموں کے لیے مختلف قسم کے عذاب آئے اسی طرح جس قوم میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہوئی۔ اس کے لیے غزوہ بدر عذاب ہلاکت تھا۔ ہجرت سے پہلے قریش مکہ پر قحط کا عذاب آیا۔ جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ آسمان کی طرف دیکھتے تھے تو دھواں سا نظر آتا تھا۔ قریش کی درخواست پر حضور صلی اللہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علیہ وسلم کی دعا سے یہ بلا دور ہوئی۔ مگر اس کے بعد پھر قریش کی سرگردانی کا وہی حال ہو گیا۔ تو ان کے لیے عذاب ہلاکت کے سوا کوئی اور طریقہ علاج باقی نہ رہا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بطشۂ کبری ان کے لیے ہلاکت کی نشانی قرار پائی۔ قرآن مجید نے ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں یہ اعلان سنا دیا تھا۔

یوم نبطش البطشۃ الکبری انا منتقمون۔ ولقد فتنا قبلھم قوم فرعون۔

ان آیات میں بتا دیا ہے کہ بطش اکبران روسائے قریش کے لیے وہی حیثیت رکھتا ہے۔ جو فرعون کے لیے غرق بحر کی حیثیت تھی۔

سورۃ انفال جس میں بدر کے تمام واقعات کا ذکر ہے۔ اس میں اللہ سبحانہٗ نے یہ ظاہر کر دیا ہے۔ کہ یہی وہ فیصلے کا دن تھا۔ جس کا موت سے انتظار تھا۔

کدأب آل فرعون والذین من قبلھم کذبوا بآیاتنا فاخذھم اللہ بذنوبھم۔

یہ ویسا ہی ہوا جیسا کہ آل فرعون اور ان سے پہلوں کے ساتھ ہوا۔ انہوں نے اللہ کی آیات کی تکذیب کی تھی۔ تو اللہ نے ان کے گناہوں کی پاداش میں ان کو پکڑ لیا۔

بہر حال بدر قریش کے عذاب کا دن تھا۔ یہاں اس آیت میں اسی بڑے دن کے عذاب کا اندیشہ نبوت کی زبان سے ظاہر کیا ہے۔ بدر میں ہونے والی پکڑ قرآن کی زبان میں اگر بطشۂ کبری ہے تو بطشۂ کبری بپا ہونے والا دن بلا ریب یوم کبیر ہے۔ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اگر نبوت کی دعوت سے روگردانی کرو گے۔ تو بطشہ کبری کے بڑے دن سے دوچار ہونے کے لیے تیار ہو جاؤ بڑا دن اس کو ہولناکی کی وجہ سے کہا ہے یعنی عذاب کی سنگینی کی وجہ سے۔

مطلب یہ ہے کہ اگر تم میری دعوت سے روگردانی کرو گے تو تمہیں دو عذابوں سے دوچار ہونا پڑے گا۔ ایک دنیوی جو بڑے دن میں بڑی پکڑ کی صورت میں رونما ہو۔ دوسرا قیامت میں اخروی جو اللہ کی عدالت میں پیش ہونے کے وقت اعمال کے محاسبہ کے بعد ہو گا۔

أَلَآ إِنَّهُمْ يَثْنُونَ صُدُورَهُمْ لِيَسْتَخْفُوا مِنْهُ ۚ أَلَا حِينَ يَسْتَغْشُونَ ثِيَابَهُمْ يَعْلَمُ مَا يُسِرُّونَ وَمَا يُعْلِنُونَ ۚ إِنَّهُ عَلِيمٌ بِذَاتِ الصُّدُورِ ۝

وَمَا مِن دَآبَّةٍ فِى الْأَرْضِ إِلَّا عَلَى اللَّهِ رِزْقُهَا وَيَعْلَمُ مُسْتَقَرَّهَا وَمُسْتَوْدَعَهَا ۚ كُلٌّ فِى كِتَٰبٍ مُّبِينٍ ۝

یادرکھو یقیناً یہی وہ لوگ ہیں۔ جو اپنے سینے موڑ کر چلتے ہیں، تاکہ اس سے اوجھل ہو جائیں۔ سن لو اور آگاہ رہو۔ کہ یہ لوگ جس وقت کپڑوں کو لپیٹ کر لیٹتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ ان کو پوشیدگی اور ظاہری حالت میں خوب جانتا ہے۔ وہ تو اُن کے سینوں کی باتوں اور وسوسوں سے واقف ہے۔[۶]

اور صرف یہی نہیں بلکہ اسی علم کے سہارے وہ
ہر جاندار کو زمین میں رزق پہنچا رہا ہے[۸] اور ہر جاندار کے
مستقر اور سپردگی کے مقام کو جانتا ہے ۔ یہ سب
کچھ کتاب الٰہی میں محفوظ ہے[۸] ۔

مفردات کے معانی

یثنون ثنی سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے ۔ ثنی یثنی باب ضرب ہے اس کے معنے پھیرنے موڑنے ، لپیٹنے کے آتے ہیں ۔ آدمی جب کسی بات کو سننا نہیں چاہتا تو رُخ موڑ کر چل دیتا ہے ۔ اسی سے تثنیہ آتا ہے ۔ جس کے معنے ایک کو ایک پر موڑ دینا ۔ یعنی دو ہو جانا ۔ ایک ہی چیز کے دو بار بننے کو ثنی کہتے ہیں ۔ اور وہ عورت جس کے دو بچے پیدا ہوں ۔ وہ بھی ثنی کہلاتی ہے ۔ اسی سے ثانی بے رُخی کرنے والے اور پہلو موڑنے والے کو کہتے ہیں ۔ اسی سے مثانی ہے جس کے معنی دوبارہ ہونے اور دہرائے جانے کے ہیں ۔ اسی سے ثمنیہ پہاڑ کی گھاٹی یا راستہ کو کہتے ہیں ۔ اسی سے اوپر اور نیچے دو دانت والے جانور کو ثنی کہتے ہیں ۔

یستخفون ۔ یہ استخفار سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے ۔ اس کا مادہ خفی ہے ۔ باب سمع سے چھپنے کے معنے میں آتا ہے ۔ اسی سے باب استفعال استخفار ہے ۔ اس کے معنے چھپنے کو چاہتا ہیں ۔ یا سین تاکید کے لیے ۔ اور معنے میں خوب چھپ جاتے ہیں ۔ اسی سے اخفار ، اعلار کے مقابلے میں آتا ہے ۔

یستغشون ۔ باب استفعال سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے ۔ مادہ غشی ہے ۔ معنے ڈھانپ دینا اسی سے باب افعال اغشار اور باب تفعیل تغشیہ آتا ہے ۔ غشار اور غشاوہ اسی سے پردے کو

کہتے ہیں۔ استغشار، بار کے ملنے کے اور بغیر ملنے کے استعمال ہوتا ہے۔

علم الٰہی کی پنہائیاں

اللہ کے علم کا مسئلہ قرآن کے ان اہم مسائل میں سے ہے۔ جن سے نہ صرف عرب کے جاہل ناآشنا تھے۔ بلکہ دنیا کے بڑے بڑے مذاہب کے پیرو بھی ان کے بارے میں غلط فہمیوں کے شکار تھے۔ قرآن نے علم کے بارے میں ان کے ان تمام فاسد خیالات کو باطل ٹھہرایا۔ ان کے غلط عقیدوں کی تردید کی۔ اور ربانی ہدایت کے نور سے جس طرح حقیقت کو روشن کیا۔ وہ قرآن کا عظیم الشان کارنامہ ہے

قرآن نے بتایا کہ اللہ سبحانہٗ کا علم کامل گنتی اور شمار کی حد سے باہر اور بے نہایت ہے۔ اور اس کی پنہائیوں کی کوئی انتہا نہیں ہے۔ قرآن نے بتایا ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ کے علمی کمالات لامحدود ہیں۔ جتنا علم انسانی ضرورت اور ظرف واستعداد کے مطابق بتلایا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی معلومات سے اس کو اتنی بھی نسبت نہیں ہے۔ جتنی سمندر کے قطرے کو سمندر سے یا ذرے کو آفتاب سے ہوتی ہے۔ فرض کرو اگر پورے سمندر کا پانی روشنائی بن جائے جس سے اللہ سبحانہٗ کی معلومات لکھنی شروع کی جائیں اس کے بعد دوسرا اور تیسرا سمندر بھی اس میں روشنائی کا شامل کرلو۔ تو سمندروں کا ختم ہونا ممکن ہے لیکن معلومات الٰہیہ کا ختم ہونا محال اور ناممکن ہے۔

ارشاد ہے۔

لوکان البحر مداد الکلمات ربی لنفد البحر قبل ان تنفد کلمات ربی ولو جئنا بمثلہٖ مددا

اگر اللہ سبحانہٗ کی باتیں لکھنے کے لیے دنیا کے تمام سمندر سیاہی بن جائیں۔ تو سمندر کا پانی ختم ہو جائے گا۔ مگر اللہ سبحانہٗ کی باتیں ختم نہ ہوں گی اگر ان سمندروں کا ساتھ دینے کے لیے ویسے ہی سمندر اور بھی پیدا کردیں۔ جب وہ کافی نہ ہوں۔

سورۃ لقمان میں اسی بات کو سمجھانے کے لیے اور بلیغ انداز اختیار کیا ہے۔

لوان مافی الارض من شجرۃ اقلام۔ والبحر یمدہ من بعدہ سبعۃ ابحر مانفدت کلمات اللہ۔ ان اللہ عزیز حکیم

اگر زمین میں جس قدر درخت ہیں وہ قلم بن جائیں اور سمندر اور اس کے بعد سات سمندروں کا پانی سیاہی ہو جائے تب بھی اللہ کی باتیں ختم نہ ہوں گی۔

دراصل علم الٰہی ایک صفت قدیم ہے۔ جو ازل سے ذات الٰہی کے ساتھ قائم ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی کے حق میں جہل ہونا امر محال ہے۔ جو کچھ ہو چکا ہے اور جو کچھ آئندہ ہوگا۔ اسے سب معلوم ہے۔ اس کے علم ہونے کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر بات اور ہر حرکت کو جانتا ہے۔ کیا ہوا، کیا ہو رہا ہے۔ اور کیا ہوگا۔ سب اس کے علم میں ہے کوئی چیز اس کے علم سے باہر نہیں ہے۔

(۹۱) اللہ کی دسترس سے باہر کوئی نہیں

یاد رکھو یقیناً یہی لوگ ہیں۔ جو اپنے سینے موڑ کر چلتے ہیں۔ تاکہ اس سے اوجھل ہو جائیں۔ سُن لو اور آگاہ رہو کہ یہ لوگ جس وقت کپڑوں میں لپٹ کر لیٹتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ ان کو پوشیدہ اور ظاہری حالت میں خوب جانتا ہے۔ وہ تو ان کے سینوں کی باتوں اور وسوسوں سے واقف ہے۔ سزا دینے کے لیے ضروری ہے کہ مجرم حاضر ہو۔ حاکم سزا دینے کی پوری قدرت اور کامل اختیار رکھتا ہو۔ مجرمین کی ساری کاروائیاں اس کے علم میں ہوں۔ الیہ مرجعکم میں بتلا دیا کہ مجرم اور غیر مجرم سب کو اللہ سبحانہٗ کے حضور میں پیش ہوتا ہے۔ وھو علی کل شئ قدیر۔ میں قدرت و اختیار کا عموم بیان فرمایا۔ اور الا انھم یثنون صدورھم سے بذات الصدور تک اس کے علم محیط کی وسعت کو ظاہر کیا کہ اللہ سبحانہٗ ہر کھلی اور چھپی چیز کو یکساں جانتا ہے۔ حتی کہ دلوں کی تہہ میں جو خیالات ارادے اور نیتیں پوشیدہ ہوتی ہیں۔ ان پر بھی مطلع ہے۔ پھر کوئی مجرم اپنے جرم کو کس طرح اس سے مخفی رکھ سکتا ہے[1]

اس آیت گرامی کے اپنے سیاق و سباق کے پیش نظر مطالب و معانی بالکل واضح اور صاف ہیں۔ یعنی مکی زندگی کے پُر آشوب دور میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے بارے میں نبوت کے مخاطبوں کا معاندانہ رویہ اس قدر ترقی کر گیا تھا کہ دعوت کی مخالفت میں اپنی بیزاری کا اظہار اس حد تک کرتے تھے۔ کہ آپ کی بات بھی سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ بے رُخی اور اعراض کی تمام صورتیں اختیار کرتے۔ اس آیت میں ان کی اسی بے رُخی کی ایک نہیں دو صورتیں بیان کی ہیں۔

ایک یہ کہ نبوت کو کسی مقام پر دعوت پیش کرتے دیکھتے تو بڑے طنطنے سے سینہ موڑ کر وہاں سے چل دیتے اور اپنے اس طرز عمل سے سمجھتے کہ ہم بچ گئے۔ گویا حقیقت کو حقیقت سمجھتے ہوئے اس کا سامنا کرنے سے گریز پائی اختیار کرتے۔ اور سمجھ لیتے کہ اگر یہ خدا ہی کا پیغام ہے تو اس سے چھپ کر بچنے کی تدبیر بھی ہمارے پاس ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

دوسرے یہ کہ ایسے مواقع پر آدمی بے رُخی کو ظاہر کرنے کے لیے کپڑے سے منہ ڈھانپ لیتا ہے۔ اور منہ پر پلّا لے لیتا ہے۔ تاکہ نبوت کی دعوت سننی نہ پڑ جائے۔

ان ہی دو قسم کے لوگوں کی طرف اس آیت میں اشارا ہے۔ کہ یہ لوگ حق کا سامنا کرنے سے گھبراتے ہیں۔ اور خیال کرتے ہیں کہ ان کے ایسا کرنے سے اب حقیقت ہی ناپید ہو چکی ہے۔ حالانکہ نبوت کی پکار ایک واقعہ اور حقیقت ہے۔ اور اپنی جگہ موجود ہے۔

دراصل یہ رویہ بے وقوف لوگ اس لیے کرتے ہیں کہ اس کردار کے ذریعے حق کا سامنا کرنے سے بچ جائیں گے۔

اللہ سبحانہٗ نے ان کے دونوں کردار پیش کر کے بتایا ہے۔ کہ خوب کان کھول کر سُن لو۔ کہ جیسے اللہ سبحانہٗ کی قدرت کاملہ کی دسترس میں سے کوئی چیز باہر نہیں ایسے ہی اللہ سبحانہٗ کی علمی پنہائیوں سے کوئی چیز خارج نہیں ہے۔ وہ ان کے ان تمام اعمال کو خوب جانتا ہے۔ جو وہ تنہائیوں میں رازداری کے ساتھ کرتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ اپنی جلوتوں اور مجلسی زندگی میں کرتے ہیں۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ جو باتیں وہ سینوں میں ارادوں، خیالوں اور وسوسوں کے درجے میں چھپائے رکھتے ہیں۔ وہ بھی اللہ سبحانہٗ کے علم کی گرفت میں ہیں۔ یہ تو ہے آیت کا وہ مطلب جو قرآن کے سیاق وسباق کا تقاضا ہے

یہ صرف دعوت محمدیہ کے مخاطبوں کا ہی کردار نہیں بلکہ دوسرے انبیاء کے مخاطبوں کا بھی ان کی دعوت کے مقابلے میں یہی کردار رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کا یہی رویہ قرآن نے ان لفظوں میں پیش کیا ہے۔

وانی کلما دعوتھم لتغفر لھم جعلوا اصابعھم فی اذانھم واستغشوا ثیابھم

میں نے جب بھی ان کو دعوت دی اس لیے دی کہ ان کے لیے تیری بخشش کے دروازے کھل جائیں۔ ان کا رویہ یہ رہا ہے۔ کہ اپنے کانوں میں انگلیاں ٹھونس لیں۔ اور اپنے کپڑوں کو اپنے پر لپیٹ لیا۔

یہ کانوں میں انگلیاں دے لینا استعارہ بات نہ سننے سے ہے یعنی وہ میری بات سُننا ہی نہیں چاہتے ہیں۔ اور کپڑوں کو ڈھانپ لینا بھی بے رُخی اور اعراض کے لیے بلیغ تعبیر ہے۔ یہی بات اس آیت میں حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں کے بارے میں پیش کی جا رہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت سے اعراض اور بے رُخی کی نمائش کبھی سینہ موڑ کر اور رُخ بدل کر کرتے ہیں۔

اور کبھی کپڑے لپیٹ کر کرتے ہیں۔ بات ایک ہے مگر انداز تعبیر مختلف ہے۔

آیت میں قابل غور دو فقرے ہیں۔ یثنون صدورھم اور یستغشون ثیابھم۔ ان میں دو ہی احتمال ہیں ایک یہ کہ الفاظ کے حقیقی معنے ہوں۔ اور عربی زبان میں ان کے جو معنے ہیں وہ مراد ہوں دوسرے یہ کہ مجازی معنے ہوں اور ان کی نفسیاتی حالت کو محسوس حالت سے تشبیہ دے کر بات پیش کی جا رہی ہو۔

اگر پہلی بات ہے یعنی الفاظ کے حقیقی معنے مراد ہیں تو اس صورت میں آیت میں مشرکین کی جہالت اور نادانی پر حیرت اور تعجب کیا جا رہا ہے۔ کہ عجیب حماقت ہے کہ اللہ کی صفات کو انسانوں کی صفات کے پیمانے سے ناپ رہے ہیں۔ اور یہ سمجھ رہے ہیں کہ ایسا کر لینے سے اللہ کو علم نہ ہوگا۔ روایات میں ان کے اس ذہن کی عکاسی بھی ہوتی ہے۔

ایک شخص گھر میں جاتا۔ کمرے میں داخل ہو کر پردے چھوڑ لیتا اور کپڑوں میں لپٹ کر کہتا کہ کیا اللہ میرے دل کے اندر کی بات جانتا ہے۔

صحیح بخاری میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کے حوالہ سے ہے کہ

خانہ کعبہ کے پاس دو قریشی اور ایک ثقفی جمع تھے۔ پیٹ دونوں کے بڑے تھے لیکن بے سمجھ تھے۔ ایک بولا کہ بتاؤ جو باتیں ہم کر رہے ہیں کیا اللہ سنتا ہے دوسرا بولا کہ اگر ہم باآواز بلند باتیں کریں تو اللہ سنتا ہے لیکن آہستہ والی بات نہیں سنتا۔

زمانہ جاہلیت میں ساری گمراہیوں کی اساس اسی قسم کا فکر فاسد ہے، نظری اعتبار سے ان کے موقف میں بگاڑ ہی بگاڑ ہے۔ وہ عالم غیب کے حقائق کو اپنے عرف و عادت کے پیمانوں سے ناپتے ہیں۔

دوسرے احتمال کی صورت میں مخاطبوں کی طبعی نفسیات کو دعوت نبوت کے سامنے استعارے کی زبان میں پیش کیا گیا ہے۔ دعوت سے ان کی دشمنی اور عناد کی اس انداز میں عکاسی کی گئی ہے اور بتایا گیا ہے کہ توحید عبادت سے نفرت میں اس قدر گر گئے تھے۔ کہ اس کے بارے میں کچھ سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ ان کی اسی نفسیاتی افتاد کے لیے قرآن نے ولوا علی ادبارھم نفورا اور اشمازت قلوب الذین لا یؤمنون بالآخرہ کی بلیغ تعبیر بھی اختیار کی ہے۔ کیونکہ وہ جس گمراہی میں مبتلا تھے وہ یہ تھی کہ وہ الوہیت کو اللہ کے لیے مخصوص نہیں سمجھتے تھے بلکہ اللہ کی عبادت کے ساتھ اوروں کی بھی عبادت کرتے تھے۔ ان کو یہ بات سخت ناگوار تھی کہ عبادت کے موضوع پر صرف اللہ کا نام لیا جائے۔ اسی توحید سے بیزاری اور شرک میں ان کے استغراق کا یہ آیت ان کی نفسیاتی

حالتوں کی پوری تصویر پیش کر رہی ہے ۔

آئیے اب ذرا شارحین قرآن کی زبانی بھی آیت کی تشریح سن لیجئے ۔ اور غور فرمائیے کہ انہوں نے آیت قرآن کو کس انداز سے پیش کیا ہے ۔ علامہ آلوسی فرماتے ہیں ۔

یہ ایک اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے ۔ سابقہ ترغیب و ترہیب سننے کے بعد قاری کے ذہن میں سوال پیدا ہوا کہ پھر قرآن کے مخاطبوں کا اس دعوت کے بارے میں کیا رویہ تھا ۔ کیا ان میں کچھ پذیرائی کے جذبات پیدا ہوئے یا اعراض و روگردانی کی صورت حال ویسی باقی رہی ۔ حرف تنبیہ لا کر جواب دیا کہ اس کے بعد مخاطبوں کا رویہ بڑا ہی حیرت انگیز اور تعجب خیز رہا ہے ۔۔

امام قرطبی الجامع لاحکام القرآن میں رقم طراز ہیں ۔

اس آیت میں اللہ سبحانہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے حوالہ سے ان مشرکین کے عناد اور عداوت پر مبنی رویہ کو بتایا ہے ۔ جن کا خیال تھا کہ ہمارے طرز عمل کا اللہ سبحانہ کو علم نہیں ہے ۔

شان نزول کے سہارے تفسیر

کچھ شارحین قرآن نے شان نزول پر مبنی روایات کے حوالہ سے اس آیت کی تشریح کی ہے حافظ ابن جریرؒ ، حافظ ابن کثیر ، امام بغوی ، علامہ شوکانی ، امام رازی اور دوسرے اکابر نے آیت کی تشریح میں ان روایات کا سہارا لیا ہے ۔ جن میں اس آیت کا پس منظر بتایا ۔ ان روایات میں تاریخی حیثیت سے سب سے زیادہ صحیح روایت وہ ہے جسے امام بخاریؒ نے اپنی صحیح میں جگہ دی ہے ۔ اور جسے حافظ ابن کثیرؒ نے تفسیر میں درج کیا ہے ۔ آیئے پہلے یہ روایت شیخ الاسلام کے افادے میں پڑھیئے ۔

صحیح ترین روایت ابن عباسؓ کی بخاری میں ہے کہ بعض مسلمانوں پر حیا کا اس قدر حد سے زیادہ غلبہ ہوا ۔ کہ استنجا یا جماع وغیرہ ضروریات بشری کے وقت کسی بھی حصہ بدن کو برہنہ کرنے سے شرماتے تھے ۔ کہ آسمان والا ہم کو دیکھتا ہے برہنہ ہونا پڑتا تو غلبہ حیا سے جھک جاتے اور ستر گاہ کو چھپانے کے لیے سینہ دوہرا کر لیتے ۔

یہ روایات صحیح بخاری کی کتاب التفسیر میں ہے۔ شیخ الاسلام نے اس روایت اور آیت قرآنی میں اپنے ذوق کے مطابق مفاہمت کے لیے فرماتے ہیں کہ

اس طرح کے آثار کبھی کبھی غایت تأدب مع اللہ اور غلبہ حیا سے ناشی ہو سکتے ہیں۔ اور ایسے لوگ صوفیاء کی اصطلاح میں مغلوب الحال کہلاتے ہیں۔ چونکہ صحابہ رضی اللہ عنہم کا کسی مسئلہ میں غلو اور ایسا تعمق آئندہ امت کو ضیق میں مبتلا کر سکتا تھا۔ اس لیے قرآن نے الا انہم یثنون صدورھم سے ان کی اصلاح فرمادی یعنی اگر بوقت ضرورت بدن کھولنے کے لیے اللہ سے حیا آتی ہے اس لیے جھکے جاتے ہو۔ تو غور کرو کپڑے پہننے کی حالت میں تمہارا ظاہر و باطن کیا اللہ سبحانہ کے سامنے نہیں ہے۔ جب انسان اس سے کسی وقت نہیں چھپ سکتا پھر ضروریات بشریہ کے متعلق اس قدر غلو سے کام لینا ٹھیک نہیں ہے۔

یہ مفاہمت قرآن کی آیت اور روایت ابن عباسؓ میں ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ایک اور روایت بھی عبداللہ بن عباسؓ کی محمد بن عجلانؒ کے حوالہ سے صحیح بخاری میں موجود ہے۔ پہلی روایت اگر حجاج اور ابن جریج کی وساطت سے محمد بن عباد بن جعفر تک پہنچی ہے تو دوسری روایت ابراہیم بن موسیٰ ہشام اور ابن جریج کی وساطت سے محمد بن عباد بن جعفر تک پہنچی ہے۔ مرکزی راوی محمد بن عباد بن جعفر ہیں۔ اور دونوں روایتیں ابن عباس کے حوالہ سے ہیں۔ مضمون کی روح دونوں کی ایک ہے مگر تھوڑا سا اختلاف ہے روایت یہ ہے کہ

عبداللہ بن عباسؓ نے اس آیت کو اس طرح پڑھا ہے۔ یثنونی صدورھم میں نے دریافت کیا کہ سینوں کا مڑنا کیسے ہے عبداللہ بن عباسؓ نے بتایا کہ ایک حالت جماع میں شرمانا خلوت میں ہوتا تو برہنگی سے شرماتا۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔

اس صورت میں یثنونی باب افعیعال سے مضارع ہے۔ اثنونی یثنونی بروزن اعشوشب یعشوشب یہ وزن فعل لازم میں مبالغہ کے لیے آتا ہے۔ اس صورت میں صدورھم مرفوع ہے۔ اور فاعل ہے اور معنے یوں ہوں گے۔

خبردار ہو جاؤ یہی وہ لوگ ہیں۔ جن کے سینے خوب مڑ جاتے ہیں۔

ان دونوں روایتوں کے آخر میں ہے۔ کہ صحابہ کا یہ کردار آیت قرآنی کے نزول کا سبب ہے۔ اس واقعہ

کو اگر نزول آیت کا سبب قرار دیا جائے تو قرآنی آیت کے مطالب کہاں سے کہاں پہنچ جائیں گے سب سے اہم اور بنیادی تبدیلی یہ ہوگی کہ آیت قرآن کا خطاب معاندین اور دشمنوں سے ہٹ کر صحابہ اور محبوبوں کی طرف ہو جائے گا۔ اور اس کا نتیجہ یہ ہوگا۔ کہ

اولاً۔ اس آیت میں مشرکین کو نہیں بلکہ صحابہ کو مخاطب بنا کر کہا جارہا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے علم کی پہنائیاں کس قدر ہیں ۔

ثانیاً۔ آیت اپنے منطوق میں بتا رہی ہے اور استعارے کی زبان میں مشرکین کو دعوت حق سے اعراض اور روگردانی کی داستان سنا رہی ہے اور ابن عباسؓ کی روایت کہتی ہے کہ یہ استعارے کی زبان نہیں بلکہ حقیقت میں صحابہ شرم سے سینے دوہرے کرتے تھے ۔

ثالثاً۔ آیت قرآنی مشرکین کے ایک سنگین جرم دعوت حق سے اعراض پر ان کو سخت دھمکی دے رہی ہے ۔ اور ابن عباسؓ کی روایت کہتی ہے ۔ کہ محض ادب کی بنا پر کسی مغلوب کی حرکت پر یہ دھمکی آئی ہے ۔

رابعاً۔ آیت قرآنی علم باری کے بارے میں مشرکین کی جہالت اور حماقت کا ماتم کر رہی ہے ۔ اور ابن عباسؓ کی روایت کہتی ہے ۔ کہ آیت قرآنی صحابہ کی مغلوبانہ تاریب پر نوحہ کر رہی ہے

خامساً۔ صحابہ کا خلوت میں اس خیال سے سینہ کو دوہرا کرنا کہ اللہ دیکھ رہا ہے۔ اس بات کی نشاندہی کر رہا ہے ۔ کہ معاذ اللہ صحابہ کا ذہن صفات باری کے بارے میں صاف نہیں تھا۔ اور وہ سمجھ رہے تھے ۔ کہ ایسا کرنے سے وہ اللہ سے چھپ جائیں گے۔ ابن عباسؓ کی روایت کے بارے میں علامہ آلوسی نے یہ بتانے کے لیے کہ

> یہ روایت اس موضوع پر سب سے زیادہ صحیح روایت ہے صحت میں دوسری روایات اس کی گرد پا کو بھی نہیں پہنچتی ہیں ۔

لکھا ہے ۔ کہ اس روایت کی روشنی میں آیت کے مطالب میں بے حد دشواری پیش آگئی اور آیت کی تشریح کا مسئلہ بڑا مشکل ہو گیا۔ وجہ یہ بتائی ہے ۔

> کیونکہ اگر مسلمان خلوت میں شرم کی وجہ سے ستر نہ کھولے ۔ تو اس کا منشا صرف اظہار ادب مع اللہ ہو سکتا ہے ۔ اور اس کے سوا کچھ نہیں ۔ اس کے عقیدے میں یہ بات ہوتی ہے کہ اللہ سبحانہٗ سے کوئی چیز پوشیدہ نہیں ہے حیا میں یہ کردار نہ قابل مذمت ہے اور نہ قابل گرفت ۔ اور یہ کہنا کہ مسلمانوں کا حیا کے

موضوع پر یہ عمل صفات الہی سے بے خبری کی وجہ سے تھا۔ اور وہ کسی درجے
میں یہ سمجھتے تھے۔ کہ کوئی چیز اللہ سے پوشیدہ ہو سکتی ہے۔ اس لیے اللہ نے
اس آیت کے ذریعے اصلاح فرمادی۔ یہ ایسی بات ہے۔ جس کو کوئی
مان ہی نہیں سکتا۔

اور آخر میں فرماتے ہیں۔

اس روایت پر آیت کے مطالب کی تعمیر اشکال سے خالی نہیں ہے اور سب
کچھ کہنے کے بعد یہ فیصلہ دیا ہے کہ
سیاق قرآنی کا تقاضا یہی ہے۔ کہ آیت قرآنی کا روئے سخن مکہ میں مشرکین
کی طرف ہے۔

بہر حال آیت قرآنی اپنے معانی ومطالب میں بالکل واضح اور صاف ہے اسے کسی روایت کے
سہارے کی ضرورت نہیں ہے۔

آیئے ذرا اردو میں شارحین قرآن سے بھی استفادہ کر لیجئے۔ حضرت مولانا اشرف علیؒ
فرماتے ہیں۔

یاد رکھو وہ لوگ دوہرا کیئے دیتے ہیں اپنے سینوں کو اور اُوپر سے کپڑا لپیٹ
لیتے ہیں تاکہ خدا سے اپنی باتیں چھپا سکیں یعنی اسلام اور مسلمانوں کے خلاف
جو باتیں کرتے ہیں تو اس ہیئت سے کرتے ہیں تاکہ کسی کو خبر نہ ہو جائے۔ اور
جس کو اعتقاد ہوگا کہ خدا کو ضرور خبر ہوتی ہے۔ اور آپ کا صاحب وحی ہونا دلائل
سے ثابت ہے بس وہ اخفار کی یہ تدبیریں کبھی نہ کرے گا۔ پس یہ تدبیر کرنا گویا
بدلالت حال اللہ سے پوشیدہ رہنے کی کوشش کرنا ہے۔ سو یاد رکھو کہ وہ لوگ
دوہرے ہو کر اپنے کپڑے اپنے اوپر لپیٹ لیتے ہیں وہ اس وقت بھی سب کچھ
جانتا ہے جو کچھ چپکے چپکے باتیں کرتے ہیں۔ اور جو کچھ وہ ظاہر باتیں کرتے
ہیں۔ کیونکہ بالیقین وہ تو دلوں کی باتیں جانتا ہے۔

مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے بھی حضرت مولانا اشرف علیؒ کی معارف القرآن میں ہمنوائی کی ہے۔ اور مولانا
محمد ادریس کاندھلوی نے بھی یہی مطلب بتایا ہے۔ جدید شارحین قرآن نے بھی آیت کی تشریح میں کوئی
جدت پیدا نہیں کی بلکہ بزرگوں ہی کے قدم بقدم چلے فرق صرف تعبیر کا ہے۔ یہاں جدت ہے وہاں

قدامت ہے۔ مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تفہیم القرآن لکھتے ہیں۔

مکہ میں جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کا چرچا ہوا۔ تو بہت سے لوگ وہاں ایسے تھے، جو مخالفت میں تو زیادہ سرگرم نہ تھے۔ مگر آپ کی دعوت سے سخت بیزار تھے۔ ان لوگوں کا رویہ یہ تھا۔ کہ آپ سے کتراتے تھے۔ آپ کی کسی بات کو سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ کہیں آپ کو بیٹھا دیکھتے تو اُلٹے پاؤں پھر جاتے۔ دور سے آپ کو آتا دیکھ لیتے رُخ بدل لیتے یا کپڑے کی اوٹ میں منہ چھپا لیتے۔ تاکہ آمنا سامنا نہ ہو جائے۔ اور آپ انہیں مخاطب کر کے کچھ اپنی باتیں نہ کہنے لگیں۔

اور مولانا امین احسن اصلاحی تدبر قرآن میں فرماتے ہیں۔

اِس آیت میں تصویر ہے اس رویہ کی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت کے جواب میں متکبرینِ قریش اختیار کرتے تھے۔ کہ عزور سے سینہ موڑ کر وہاں سے چل دیتے اور اس طرح اپنے زُعم میں گویا خدا اور اس کے انذار سے اپنے آپ کو محفوظ کر لیتے۔ انسان کی حماقتوں میں سے ایک حماقت یہ بھی ہے۔ کہ وہ ایک حقیقت کا مواجہہ کرنے سے گریز کرتا ہے۔ اور سمجھ بیٹھتا ہے کہ اب وہ حقیقت حقیقت نہیں رہی۔ حالانکہ کسی کے گریز کرنے سے حقیقت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔

(۷) علم الٰہی کی وسعت اور رزق کی ضمانت

اور صرف یہی نہیں بلکہ اسی علم کے سہارے وہ ہر جاندار کو زمین میں رزق پہنچا رہا ہے۔ پہلے علم الٰہی کی وسعت بیان ہوئی تھی۔ یہ اسی مضمون کا تکملہ ہے۔ یعنی زمین پر چلنے والا ہر جاندار جسے رزق کی احتیاج ہو۔ اس کو روزی پہنچانا اللہ سبحانہٗ نے اپنے فضل سے اپنے ذمہ لیا ہوا ہے۔ جس قدر روزی کی جس قدر مقدار جس کے لیے مقدر ہے یقیناً پہنچ کر رہے گی۔ جو وسائل واسباب بندہ اختیار کرتا ہے وہ روزی پہنچنے کے دروازے ہیں۔ اگر آدمی کی نظر اسباب و تدابیر اختیار کرتے وقت سبب الاسباب پر ہو۔ تو یہ توکل کے منافی نہیں ہے البتہ اللہ سبحانہٗ کی قدرت کو ان اسباب عادیہ میں محصور و مقید نہ سمجھا جائے۔ وہ گاہ بگاہ سلسلہ اسباب کو چھوڑ کر بھی روزی پہنچاتا یا کوئی اور کام کر دیتا ہے۔ بہرحال جب جانداروں کی حسب استعداد غذا و معاش مہیا کرنا حق تعالیٰ کا کام ہے تو ضروری ہے کہ اس کا علم ان سب پر محیط ہو ورنہ ان کی روزی کی خبر گیری کیسے

کرے گا[1] بتانا یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے علم کی پنہائیوں ہی کی یہ کارفرمائی ہے۔ کہ ایک ایک پرندے کے آشیانے اور سارے حشرات الارض کے بلوں کا حال اسے معلوم ہے۔ اور وہ اس کو اس کے مقام پر زندگی کا سامان پہنچا رہا ہے۔ اور جسے ہر لحہ یہ علم ہے کہ کون سا جانور کہاں رہتا ہے اور اس کو بقائے حیات کے لیے کس قدر سامان کی ضرورت ہے علم الٰہی کی پنہائی تو اس آیت کا مدلول ہے لیکن آیت کا منطوق ہر جاندار کے لیے رزق کی ضمانت ہے۔ قرآن نے اسی منطوق کو دوسرے انداز میں اس طرح پیش کیا ہے۔

وکاین من دابۃ لاتحمل رزقھا اللہ یرزقھا وایاکم

کتنے ہی جاندار ہیں۔ جو اپنا رزق اٹھائے نہیں پھر رہے ہیں۔ روزی دینا اللہ کی ذمہ داری ہے ان کو بھی دیتا ہے اور تمہیں بھی دیتا ہے۔

یعنی اس زمین میں کتنے جاندار ہیں۔ جو اپنی روزی باندھے نہیں پھرتے ہیں۔ ان کا رب ان کو رزق بہم پہنچاتا ہے۔ یہ سب کے لیے رزق کی ضمانت کا اعلان ہے۔ اور یہ ضمانت محض اللہ کے فضل وکرم کی وجہ سے ہے۔

حافظ ابن کثیرؒ نے یہ بات خوب فرمائی ہے۔

اللہ سبحانہٗ نے ساری مخلوقات کے رزق کی کفالت اپنے ذمہ لے لی ہے۔

یعنی ادنیٰ سے ادنیٰ اور حقیر سے حقیر کیڑے کے لیے سامان رزق کی فراہمی کے اسباب پیدا کیے ہیں۔ اب یہ بندے کا کام ہے کہ جن راہوں سے رزق آرہا ہے ان سے رزق تلاش کرے رزق کی ضمانت اور کفالت کا یہ مطلب نہیں کہ انسان تلاش معاش سے غافل اور بے خبر ہو جائے۔ بلکہ مراد یہ ہے کہ اسباب پر تکیہ نہ کرے۔ ان اسباب کا مبدأ و مرجع اللہ سبحانہ کو سمجھے۔ یہاں قاضی بیضاویؒ نے یہ نکتہ آفرینی خوب فرمائی کہ

الا علی اللہ، میں لفظ علی آیا ہے۔ اور یہ عربی زبان میں وجوب کے لیے بولا جاتا ہے۔ یہاں یہ بتلانے کے لیے کہ یہ رزق کی ضمانت اور کفالت جو اللہ نے لی ہے وہ ضرور پوری ہوگی۔ اور یہ سمجھانے کے لیے ہے کہ بھروسہ اسباب پر نہیں بلکہ خالق اسباب پر ہونا چاہیئے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علامہ محمود آلوسیؒ نے یہ بات یہاں خوب بھی ہے۔ کہ

اسباب کی پابجائی اور رزق کی تلاش وجستجو توکل کے منافی نہیں ہے۔ بشرطیکہ اسباب کو اسباب سمجھے۔ اور اعتماد و توکل کا مرکز اللہ سبحانہٗ کو سمجھے۔

آیت گرامی کا منشا یہ بتانا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کا علم ہر چیز کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔ کوئی اس سے بھاگ یا چھپ نہیں سکتا ہے۔ کیونکہ جو ذات گرامی ہر جاندار کو وہ جہاں بھی ہو پہاڑوں کی چوٹیوں پر ہو یا سمندروں کی تہوں میں، گھنے جنگلوں میں، یا آباد شہروں میں ہو۔ رزق پہنچا رہی ہے۔ اس کا علم سب کا احاطہ کیئے ہوئے ہے۔ کیا اس سے کوئی چیز مخفی رہ سکتی ہے۔

یہاں علامہ بقاعیؒ نے یہ لطیف نکتہ لکھا ہے اور خوب لکھا ہے۔ کہ یہ آیت قرآنی ان استغفروا کے نتیجہ میں یہ بتا رہی ہے۔ کہ اللہ سے مخلصانہ عبادت میں تعلقات استوار کرو۔ اور رزق کی تلاش میں لگ کر عبادت سے بیگانگی اختیار نہ کرو۔ فی الارض کی قید لگا کر اشارہ کر دیا کہ اموال سے استفادہ زمین کے مکینوں کا کام ہے۔ اور یہ بھی جتا دیا کہ زمین کی ساری مخلوق کی کفالت اللہ نے لی ہے۔ اور ان سب کا علم اللہ کو ہے۔ علامہ بقاعی لکھتے ہیں۔

میں نے سمندر کے کنارے ایک سفید پتھری کو توڑ کر اس کے اندر دیکھا کہ ایک کیڑا ہے اور اس کے پاس کھانے کی چیز ہے۔

اور یہ بھی لکھا ہے۔ کہ مجھ سے جناب عزالدین محمد بن احمد تاجر کتب نے بتایا ہے۔ کہ میں نے متعدد باران پتھروں کے اندر جو پہاڑوں سے کاٹے جاتے ہیں کہ کیڑے کے لیے پتھر میں سبز گھاس اور پینے کے لیے پانی موجود ہے۔

(۸) اللہ کا علم سارے جہانوں کو محیط ہے

اور ہر جاندار کے مستقر اور سپردگی کے مقام کو جانتا ہے۔ یہ سب کچھ کتاب الہٰی میں موجود ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں۔ کہ مستقر جہاں ٹھہرتا ہے۔ بہشت و دوزخ اور مستودع جہاں سونپا جاتا ہے۔ اس کا قبر ہے۔ وما من دابۃ دنیوی زندگی کا ذکر تھا۔ یہاں برزخ اور آخرت کا ذکر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ ابتدا سے انتہا تک تمہاری ہستی کے تمام درجات کا علم رکھتا ہے۔ مستقر و مستودع میں مفسرین قرآن کے بہت اقوال ہیں۔ اس سے پہلے سورہ انعام میں بھی ہم کچھ لکھ چکے ہیں۔

عبداللہ بن عباسؓ ـــــ اس زندگی میں جہاں رہے مستقر اور موت کے بعد جہاں دفن کیا جائے مستودع ہے۔

امام مجاہدؒ ـــــ مستقر سے رحم مادر اور مستودع صلب پدر مراد ہے۔

عطاء بن رباحؒ ـــــ مستقر سے صلب پدر اور مستودع سے رحم مادر مراد ہے۔

ابن کثیرؒ ـــــ زمین میں جہاں تک چلے پھرے اس کے منتہائے سیر کو مستقر اور چل پھر کر جس جگہ آئے اسے مستودع کہتے ہیں ــــ زمین میں حیوانات کا جو مسکن بالفعل ہے اسے مستقر کہتے ہیں۔ اور وجود نسلی سے پہلے جن مواد و مقار میں رہ کر آئے اسے مستقر کہتے ہیں۔

یعنی اللہ سبحانہٗ ان تمام مختلف مواد، اطوار، ادوار کا عالم ہے جن میں سے کوئی حیوان گزر کر اپنی موجودہ ہیئت کذائی تک پہنچا ہے۔ وہ بھی اپنے علم محیط سے ہر مرتبہ وجود اس کی استعداد کے مناسب وجود و کمالات وجود عطا کرتا ہے[1]

مستقر و مستودع لغت کے اعتبار سے جائے قیام اور عارضی ٹھہرنے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ اور شارحین قرآن کے اس موضوع پر متعدد اور متنوع خیالات ہیں۔ لیکن ہمیں شاہ عبدالقادر کی بات زیادہ پسند آئی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔ اوّل سپرد ہوتا ہے۔ ماں کی پیٹ میں کہ آہستہ آہستہ دنیا کے اثر پیدا کرے پھر آکر ٹھہرتا ہے دنیا میں اور پھر سپرد ہوگا قبر میں کہ آہستہ آہستہ اثر آخرت کے پیدا کرے پھر ٹھہرے گا جنت میں یا دوزخ میں طلب یہ ہے کہ مستقر دو ہیں اور مستودع بھی دو۔ مستقر اول دنیا ہے اور پھر آخرت جنت یا دوزخ ہے۔ اور مستودع اول ماں کا پیٹ ہے اور پھر قبر کا پیٹ ہے۔ ماں کے پیٹ میں رہ کر عالم دنیا میں یعنی مستقر میں آنے کی تیاری کرتا ہے۔ اور قبر کے پیٹ میں رہ کر آخرت میں جانے کی تیاری کرتا ہے۔ قرینہ دلیل ہے کہ یہاں مستقر سے مراد وہ جگہ ہے۔ جہاں پیدا ہونے کے بعد انسان رہتا ہے اور مستودع سے مراد وہ جگہ جہاں مرنے کے بعد دفن کیا جاتا ہے دنیا میں آنے کے بعد انسان یہ دونوں ہی چیزیں پاتا ہے جتنی زندگی اس کے لیے مقدر ہوتی ہے۔ اتنے دن وہ گزارتا ہے۔ اور جو رزق اس کے لیے مقرر ہوتا ہے۔ اس سے استفادہ کرتا ہے۔ اس کا جینا اور اللہ کے دیئے ہوئے رزق سے استفادہ اس بات کی دلیل ہے۔ کہ وہ اللہ کی نگرانی اور اس کے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علم میں ہے۔ بس بتانا یہی ہے۔ کہ اللہ سبحانہ' ہر انسان کے مستقر کو بھی جانتا ہے۔ اور اس کے مستودع کو بھی جانتا ہے جہاں وہ مرنے کے بعد زمین کی امانت میں دیا جاتا ہے۔ مرنے کے بعد مستودع کی تعبیر میں یہ بھی اشارا ہے۔ کہ کوئی یہ نہ سمجھے کہ جب وہ مرگیا تو بس وہ فنا ہو گیا۔ وہ فنا نہیں ہو جاتا بلکہ زمین کی گود میں بطور امانت دیا جاتا ہے۔ اور ایک دن آئے گا کہ جب یہ زمین اللہ سبحانہ' کی امانت اللہ کے سپرد کر دے گی۔

ہر جاندار کا رزق ہو مستقر ہو مستودع ان کا تعلق علم محیط کے لازوال سرچشمہ سے ہے۔ علم کا وہی ابدی سرچشمہ جس سے نہ غائب پوشیدہ ہے اور نہ حاضر مستقبل میں بھی جو کچھ پیش آنے والا ہے پیش آنے سے پہلے وہ جانا ہوا ہے۔ ظاہر میں جو کچھ ہے اس پر بھی اور باطن کی گہرائیوں میں جو کچھ پوشیدہ ہے اس پر بھی علم کی یہ لازوال طاقت حاوی ہے۔ اور اس طرح حاوی ہے جس سے کسی چیز اور کسی بات کا کوئی پہلو پوشیدہ نہیں ہے۔ اور جس کے جھٹلانے کی قوت انسان کے دل سے سلب ہو چکی ہے۔

اس آیت کے ذریعے قرآن نے یہی یقین دلایا ہے۔

وَهُوَ الَّذِي خَلَقَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ فِي سِتَّةِ اَيَّامٍ وَّكَانَ عَرْشُهٗ عَلَى الْمَآءِ لِيَبْلُوَكُمْ اَيُّكُمْ اَحْسَنُ عَمَلًا ؕ وَلَئِنْ قُلْتَ اِنَّكُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ مِنْۢ بَعْدِ الْمَوْتِ لَيَقُوْلَنَّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝ وَلَئِنْ اَخَّرْنَا عَنْهُمُ الْعَذَابَ اِلٰٓى اُمَّةٍ مَّعْدُوْدَةٍ لَّيَقُوْلُنَّ مَا يَحْبِسُهٗ ؕ اَلَا يَوْمَ يَاْتِيْهِمْ لَيْسَ مَصْرُوْفًا عَنْهُمْ وَحَاقَ بِهِمْ مَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ۝

اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا[۹] جبکہ اس کا تخت اقتدار پانی پر تھا[۱۰] تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کس کے کردار میں خوبصورتی ہے[۱۱] اور اے پیغمبر اگر آپ ان سے کہیں کہ تمہیں مرنے کے بعد ضرور اٹھایا جائے گا۔ تو منکرین کہیں گے۔ اس پیغمبر کی دعوت تو نرا جادو ہے[۱۲]۔ اور البتہ اگر ہم ان کو یعنی آپ کے مخاطبوں کو مہلت کی خاطر ان پر آنے والی پاداش کو کچھ عرصہ کے لیے مؤخر کر دیں۔ تو یہ آوازہ کسیں گے۔ عذاب کے لیے

رکاوٹ کیا ہے۔ سُن لو جس روز ان پر ان کے اعمال کی پاداش
رونما ہوگی۔ تو یہ ان سے ہٹائی نہ جائے گی۔ اور جس چیز کا وہ مذاق
کرتے رہے ہیں۔ وہ ان کو گھیرے میں لے لے گی[۳]

مفردات کے معانی

عرش: امام راغب اصفہانی فرماتے ہیں۔ عرش دراصل سقف کو کہتے ہیں۔ اور اس کی جمع عروش آتی ہے۔ ارشاد ہے۔ وھی خاویۃ علی عروشھا۔ (وہ اپنی چھتریوں کے بل گرا ہوا تھا) اور اسی سے عرشت الکرم اور عرّشت الکرم کے معنے انگور کی بیلوں کے لیے ٹہنیاں اور چھتریاں لگانے کے ہیں۔ ارشاد ہے۔ معروشات وغیرہ معروشات ٹہنیوں پر چڑھائے ہوئے اور بغیر چڑھائے ہوئے ——— اور بادشاہ کے تحت کو بھی اسی لیے عرش کہتے ہیں۔ کہ وہ بلند ہوتا ہے چنانچہ قرآن میں اسی معنے میں ہے۔ ورفع ابویہ علی العرش اور ایکم یاتینی بعرشھا۔ نکروا لھا عرشھا اھکذا عرشک اور علامہ مجدالدین فیروز آبادی بصائر ذوی التمیز میں لکھتے ہیں کہ کبھی عرش عزت، غلبہ اور سلطنت کے معنے میں آتا ہے۔ محاورہ ہے فلان ثل عرشہ اس کی عزت خاک میں مل گئی۔ حضرت عمرؓ کو کسی شخص نے خواب میں دیکھا تو ان سے پوچھا کہ اللہ سبحانہٗ کا آپ کے ساتھ کیا معاملہ رہا جواب میں فرمایا لولا ان تدارکنی اللہ برحمتہ لثل عرشی اگر اللہ کا میرے ساتھ رحمت کا معاملہ نہ ہوتا تو بس میری عزت ختم تھی۔ اور اللہ سبحانہٗ کے عرش کے متعلق انسان کو نام کے سوا کچھ معلوم نہیں ہے۔ عوامی ذہن اس بارے میں جو کچھ سوچتا ہے۔ وہ صحیح نہیں ہے۔ کیونکہ اس صورت میں عرش ذات باری کا حامل ہوگا۔ نہ کہ محمول۔ حالانکہ ذات باری اس سے برتر ہے۔

انسانی زندگی ابتدائی ہے۔

انسانی زندگی خیر و شر، راحت و رنج، مفلس اور امیری غلبہ اور مغلوبی، قوت اور ضعف،

صحت اور بیماری جیسی اضداد کا گہوارہ ہے ۔ اس میں بھی انسان کی آزمائش کی جارہی ہے تاکہ معلوم کیا جائے کہ اچھے حالات میں متکبر ظالم اور خدا فراموش بندہ نفس کون ہے ۔ اور بُرے حالات میں پست اور ذلیل طریقے اور ناجائز راستے کون اختیار کرتا ہے ۔ خیر وشر، حسنات و سیئات، قبض و بسط، جبر و اختیار زندگی میں امتحانی پرچے ہیں مطلب یہ ہے ۔ کہ زندگی کا کوئی رُخ ہی نہیں بلکہ پوری زندگی ہی آدمی کی امتحان و ابتلا کی زندگی ہے ۔ یہ امتحان کیا ہے ۔ تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں انسان میں دوراہوں خیر و شر، ہدایت و ضلالت، ایمان و کفر، سعادت و شقاوت سے کسی ایک کو انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی ہے ۔ درحقیقت فطرت کے اسی اقتضا کے صحیح استعمال کے مطالبے کی دوسری تعبیر یہ ہے ۔ کہ آدمی کی پوری زندگی ہی ابتلا و امتحان کی زندگی ہے کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اللہ سبحانہٗ کی طرف جو ابتلا کی نسبت کی گئی ہے ۔ تو اس کا مطلب یہ نہیں ہے ۔ کہ اللہ سبحانہٗ جن باتوں کو نہیں جانتا ان کو امتحان لے کر جاننا چاہتا ہے بلکہ انسانی فطرت میں اقتدار و اختیار انتخاب و ترجیح کی جو قوت رکھی گئی ہے ۔ اسی وقت کے صحیح استعمال کے مطالبہ کا نام ابتلا و امتحان ہے ۔

⑨ اللہ کی بے پایاں قدرت

اور وہی تو ہے جس نے آسمانوں اور زمین کو چھ دن میں پیدا کیا ۔ یہ علم کے بعد قدرت کا ذکر ہے ۔ اس کی تفسیر سورہ اعراف پارہ ۸ کے ساتویں رکوع میں آچکی ہے [1] یہ بات پہلے بتائی جا چکی ہے کہ عالم کی پیدائش کے پہلے دن سے وہ دن مراد نہیں ہو سکتا جو عالم کی پیدائش کے بعد ۲۴ گھنٹے کا ہوتا ہے ۔ بلکہ اس سے مراد چھ حالتیں یا چھ مختلف دور ہیں ۔ یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیے کہ آسمانوں اور زمین کی پیدائش ایک ایسے مادے سے ہوئی جسے قرآن دخان کے لفظ سے تعبیر کرتا ہے ۔ دخان کے معنے دھوئیں کے ہیں ۔ یا ایسی بھاپ جو اوپر چڑھتی ہو ۔ ثم استوی الی السماء وھی دخان ۔ یہ مادہ دخانیہ ابتدا میں ملا ہوا تھا ۔ الگ الگ نہ تھا ۔ مراد مادے کی وہ ابتدائی حالت ہے ۔ جس میں وہ کائنات کی صورت گری سے پہلے ایک بے شکل منتشر الاجزا غبار کی طرح فضا میں پھیلا ہوا تھا ۔ موجودہ زمانے کے سائنس دان اسی کو سحابیئے سے تعبیر کرتے ہیں ۔ اور آغاز کائنات کے متعلق ان کا تصور بھی یہی ہے کہ تخلیق سے پہلے وہ مادہ جس سے کائنات بنی ہے اسی دخانی شکل میں منتشر تھا ۔

یہ مادہ دخانیہ ابتدا میں الگ نہ تھا ۔ پھر اس کے حصے ایک دوسرے سے جدا کیے

[1] افادات شیخ الاسلام

گئے۔ ان السماوات والارض کانتا رتقا ففتقنا ھما۔ رتق کے معنے ہیں یک جا ہونا۔ اکٹھا ہونا، ایک دوسرے سے جڑا ہوا ہونا، متصل اور متلاصق ہونا۔ اور فتق کے معنے پھاڑنے اور جدا کرنے کے ہیں۔ اس سے بات سمجھ میں آتی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ابتدائی شکل ایک ملی جلی چیز کی تھی۔ بعد میں اس کو الگ الگ کیا گیا۔ اور اس سے اجرام سماویہ زمین اور دوسرے اجرام فلکی جدا جدا دنیاؤں کی شکل میں بنائے گئے۔ یہ تمام کائنات یکبارگی ظہور میں نہیں آئی۔ بلکہ اس پر تخلیق کے مختلف دور یکے بعد دیگرے طاری ہوئے۔ یہ دور چھ تھے۔ ان ربکم اللہ الذی خلق السماوات والارض فی ستۃ ایام میں ان ہی چھ دوروں کو چھ دن سے تعبیر کیا ہے۔ ظاہر ہے کہ چھ دنوں سے ہمارے یہ دن مراد نہیں۔ بلکہ خدائی دن مراد ہیں۔ جن میں ہر دن ہمارے ہزار سال کے برابر ہوتا ہے۔ ان یوما عند ربک کالف سنۃ۔ ہم اُن کو ادوار کہہ سکتے ہیں۔ یہ کائنات کا چھ دوروں میں درجہ بدرجہ ظہور میں آنا اور اپنے نقطۂ کمال کو پہنچنا اس حقیقت کو ظاہر کرتا ہے۔ کہ اس کا ظہور کوئی اتفاقی حادثہ نہیں ہے بلکہ ان کے خالق نے ارادہ، اسکیم، ترتیب اور حکمت کے ساتھ اس کو وجود بخشا ہے۔

⑩ اللہ سبحانہٗ کی حکومت پانی پر تھی

جب اس کا تخت اقتدار پانی پر تھا۔ یعنی آسمانوں اور زمین سے پہلے یعنی آسمانوں اور زمین کی پیدائش سے بھی پہلے پانی مخلوق ہوا جو آئندہ اشیار کا مادہ حیات بننے والا تھا۔ وجعلنا من الماء کل شیٔ حیی۔ اس وقت عرش خداوندی بھی اسی کے اوپر تھا۔ جیسے اب سماوات کے اوپر ہے۔ گویا یہ ایک صورت تھی جو اس حقیقت کو ظاہر کر رہی تھی۔ کہ کائنات کا مادہ اور ذریعہ حیات بالکلیہ رب العرش کے تصرف و تسلط اور قبولیت مطلقہ کے ماتحت ہے[1] مطلب یہ ہے کہ اس کرہ زمین کی خشکی سے پہلے یہ سارا کرہ پانی تھا۔ اور اللہ سبحانہٗ کی حکومت اس پر تھی۔ پھر پانی سے خشکی نمودار ہوئی۔ اور زندگی کے مختلف النوع الواع ظہور میں آئیں۔ اور درجہ بدرجہ یہ پورا عالم ہستی آباد ہوا۔ دوسری جگہ فرمایا۔ کہ ہم نے تمام زندہ اجسام پانی سے پیدا کیے۔ وجعلنا من الماء کل شیٔ حیی۔ اس سے معلوم ہوا کہ زمین پر ایک ابتدائی دور گزر چکا ہے۔ جبکہ پانی

[1] افادات شیخ الاسلام

تھا یا ایسی چیز تھی جسے پانی سے تعبیر کیا ہے۔ اور قوانین الٰہی اس میں کام کر رہے تھے۔ وکان عرشہ علی الماء کی تعبیر جیسے عرش کی تخلیق کو کائنات اور زمین سے پہلے ہونے کو بتا رہی ہے۔ ایسے ہی یہ بتا رہی ہے۔ کہ پانی کی تخلیق بھی پہلے ہوئی تھی۔ اور اس کی یہی نشان دہی ہو رہی ہے کہ عرش پانی کو احاطہ میں لیے ہوئے تھا۔ یا پانی پر عرش کا دباؤ تھا۔ یہاں علامہ بقاعی کی تشریح نظم الدرر قابل دید ہے۔

> کائنات کی تخلیق سے پہلے عرش پانی پر تھا۔ پانی پر ہونے کا یہ مطلب نہیں کہ پانی سے ملاصق تھا۔ عرش پانی پر ایسا ہی تھا۔ جیسا کہ اب آسمان زمین پر ہے اس انداز تعبیر سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے۔ کہ زمین کی تخلیق سے پہلے کوئی تخلیقی کارنامہ تھا۔ اور یہ بھی معلوم ہو رہا ہے۔ کہ قدرت الٰہی کے اس کی عظمت کے اعتبار سے درجات لامتناہی ہیں۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے۔ کہ یہاں توحید خالقیت سے توحید عبادت پر استدلال ہے۔ اس سے پہلے احاطۂ علم اور قدرت کاملہ سے استدلال تھا۔ پھر رزق رسانی سے توحید عبادت پر استدلال کیا۔ اب توحید خالقیت اور توحید اقتدار اعلیٰ سے توحید عبادت پر استدلال کیا ہے۔

قرآن حکیم کے دلائل و براہین پر غور کرتے ہوئے یہ اصل ہمیشہ پیش نظر رکھنی چاہیئے کہ اس کے استدلال کا طریقہ منطقی بحث و تقریر کا نہیں ہے۔ جس کے لیے چند مقدمات کی ضرورت ہوتی ہے۔ پھر اثبات مدعا کے لیے شکلیں ترتیب دینی پڑتی ہیں۔ بلکہ ہمیشہ تلقین کا قدرتی اور سیدھا طریقہ اختیار کرتا ہے۔ عموماً اس کے دلائل اس کے اسلوب و بیان و خطاب مضمر ہوتے ہیں۔ وہ یا تو کسی مطلب کے لیے اسلوب خطاب ایسا اختیار کرتا ہے۔ کہ اسی سے استدلال کی روشنی نمودار ہو جاتی ہے۔ یا پھر کسی مطلب پر زور دیتے ہوئے۔ کوئی ایک لفظ ایسا بول دیتا ہے۔ کہ اس کی تعبیر میں اس کی دلیل یہی ہوتی ہے۔ اور خود بخود مخاطب کا ذہن دلیل کی طرف پھر جاتا۔ اس کی واضح مثال اسی آیت میں خلق اور عرش کا استعمال ہے۔ خالقیت کو بتانے کے لیے خلق لائے تو اس کائنات کے ظہور میں آنے سے پہلے حکومت و اقتدار بتانے کے لیے لفظ عرش آیا ہے۔ اور وہ لفظ لا کر بتا دیا کہ اگر خلق اس کا کام ہے تو حاکمیت بھی اسی کا کام ہے۔ اور اشارا کر دیا۔ جیسے پرستش کی اس کی ذات مستحق ہے۔ بندگی کی بھی وہی مستحق ہے۔

یہاں یہ بات قابل توجہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ اور مخلوق کے تعلقات کو واضح کرنے کے لیے انسانی زبان میں سے زیادہ تر وہ الفاظ، اصطلاحات اور استعارات انتخاب کیے گئے ہیں جو سلطنت اور بادشاہی سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہ طرز بیان قرآن میں اس قدر واضح ہے کہ کوئی شخص جو قرآن کو سمجھ کر پڑھتا ہو۔ اسے محسوس کیے بغیر نہیں رہتا ہے۔ کچھ عقل سے محروم ناقدین نے اس سے یہ بات سمجھی ہے۔ کہ قرآن مجید جس عہد کی تصنیف ہے اس زمانے میں انسان کے ذہن پر شاہی نظام مسلط تھا۔ حالانکہ قرآن جس دائمی اور ابدی حقیقت کو پیش کر رہا ہے وہ اس کے برعکس ہے۔ وہ حقیقت یہ ہے۔ کہ زمین اور آسمانوں میں بادشاہی صرف ایک ذات بے ہمتا کی ہے۔ اور حاکمیت جس چیز کا نام ہے۔ وہ اللہ سبحانہٗ کے لیے خاص ہے۔ اور یہ نظام کائنات ایک کامل مرکزی نظام ہے۔ جس میں تمام اختیارات کو وہی ذات استعمال کر رہی ہے۔

(۱۱) تخلیق کائنات کی قرآنی توجیہہ

(۱۱) تاکہ تمہیں آزمائے کہ تم میں سے کس کے کردار میں خوبصورتی ہے یعنی اس سارے نظام کی تخلیق و تربیت سے مقصود تمہارا یہاں بسانا اور امتحان کرنا ہے کہ کہاں تک اس عجیب و غریب نظام اور سلسلہ مصنوعات میں غور کر کے خالق اور مالک کی صحیح معرفت حاصل کرتے اور مخلوقات ارضی و سماوی سے منتفع ہو کر محسن شناسی اور سپاس گزاری کا فطری فرض بجا لاتے ہو۔ یہ مقام تمہاری سخت آزمائش کا ہے۔ مالک حقیقی کو دیکھنا ہے۔ کہ تم میں سے کون سا غلام صدق و اخلاص اور سلیقہ مندی سے اچھا کام کرتا ہے۔ اور فرائض بندگی انجام دیتا ہے [۱]

یہ آیت مہمات معارف میں سے ہے۔ افسوس کہ ہمارے شارحین قرآن نے اس کی اہمیت کو زیادہ محسوس نہیں کیا۔ اس کی اہمیت کا اندازہ اس سے ہوتا ہے۔ کہ قرآن عزیز نے اس کا تذکرہ ایک سے زیادہ تعبیروں میں کیا ہے۔ مثلاً سورہ مائدہ میں ہے۔

ولو شاء اللہ لجعلکم امۃ واحدۃ ولکن لیبلوکم فیما اتاکم

اور اگر خدا چاہتا تو تم سب کو ایک امت بنا دیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا

[۱] افادات شیخ الاسلام

اور اس لیے نہیں کیا تاکہ جو کچھ اس نے تمہیں دیا ہے۔ اس میں تمہیں آزمالے۔

مطلب یہ ہے۔ کہ اے انسانو! کہ اگر اللہ سبحانہ تمہیں ایک شریعت والی امت بنانا چاہتا تو بنا دیتا اس طرح کہ تمام انسانوں کو روز اوّل ہی سے ایک ہی طرح کی طبیعت، ایک ہی طرح کی استعداد اور ایک ہی طرح کی فکری اور عملی حالت پر بنا دیتا، اخلاق ایک ہوتے، اطوار معیشت ایک ہوتے، ہر زمانہ کے انسانوں کے احوال وظروف میں یکسانی اور ہم آہنگی ہوتی۔ اور اس طرح ہر زمانہ میں شریعت وقانون بھی ایک ہی ہوتا لیکن اللہ سبحانہ نے ایسا نہیں کیا اس کی حکمت کا یہی تقاضا ہوا کہ انسان تمام مخلوقات میں ممتاز نوع ہو جو اطوار حیات میں بتدریج ترقی کرے اسی تنوع واستعداد کے نتیجے میں ارتقار کا تنوع رونما ہو۔ اسی ارتقار کا نتیجہ ہے۔ کہ انسانی زندگی کے مختلف اطوار ہیں۔ مختلف شریعتیں آتی رہی ہیں۔ انسانیت کے بچپنے میں جو شریعت تھی وہ یقیناً انسانیت کے لڑکپن میں نہ تھی اور جو لڑکپن کے زمانہ میں تھی وہ انسانیت کی جوانی میں نہیں ہے۔ ارشاد میں لیبلوکم کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ سبحانہ تمہارا امتحان لے رہا ہے۔ یعنی پوری دنیا کو چھوڑ کر تمہیں بین الاقوامی ذمہ داری اس لیے دی ہے۔ کہ اس میں تمہارا امتحان مقصود ہے۔ کہ تم کہاں تک اس میں پورے اترتے ہو۔

ایک دوسرے موقع پر قرآن میں ہے۔

وھوالذی جعلکم خلائف الارض ورفع بعضکم فوق بعض
درجات لیبلوکم فیما اتاکم

اور وہی ذات ہے جس نے تمہیں ایک دوسرے کا زمین میں جانشین بنایا ہے
اور تم میں سے کچھ کو کچھ پر برتری دی تاکہ جو کچھ تمہیں دیا ہے۔ اس میں تمہیں آزمائے

مطلب یہ ہے کہ یہ پوری زندگی اپنی بوقلموں نعمتوں کے ساتھ ایک امتحان گاہ ہے اور جس کو جو کچھ بھی اللہ سبحانہ نے دیا ہے۔ اسی میں اس کا امتحان ہے۔ کہ اس نے اللہ سبحانہ کی امانت میں تصرف کیا۔ کہاں تک امانت کی ذمہ داری کو سمجھا اور اس کا حق ادا کیا اور کس حد تک اپنی قابلیت اور ناقابلیت کا ثبوت دیا ہے۔ بتایا یہ جا رہا ہے۔ کہ زندگی کا خاص پہلو نہیں بلکہ پوری زندگی ابتلائی ہے۔ آیت کا منشار یہ ہے کہ زمین اور زمین کی پیداواروں پر غلبہ دے کر مدارج اور مراتب کا جو اختلاف نسل انسانی کے افراد میں پیدا کر دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے۔ کہ جو کچھ دیا ہے۔ اسی لیے دیا ہے۔ کہ وہ جانچنے اور آزمائے۔

ایک اور جگہ قرآن میں ہے۔

خلق الموت والحیٰوۃ لیبلوکم ایکم احسن عملا

اللہ نے موت وحیات پیدا کیں تاکہ جانچے تمہیں کہ تم میں سے عمل میں کون اچھا ہے ۔

اور اسی قسم کی تعبیر سورہ کہف میں آئی ہے ۔

انا جعلنا ما علی الارض زینۃ لہا لنبلوھم ایھم احسن عملا ۔

ہم نے بنایا ان ساری چیزوں کو جو زمین پر ہیں زمین کے لیے زیب و زینت تاکہ ہم جانچ لیں کہ ان میں عملاً سب سے اچھا کون ہے ؛

ان آیات کی روشنی میں جو بات سمجھ میں آرہی ہے ۔ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے انسان کو جن اوصاف و کمالات کا مجموعہ بنایا ہے ۔ اور ان میں جو اضداد کی ہمہ گیری رکھی ہے ۔ اگر صفات کے تفاوت کا یہ تماشا نہ ہوتا تو ان گنت ، طرح طرح کی بوقلموں ہستیوں سے یہ دنیا خالی ہوتی ۔ کثرتوں کا یہ مجموعہ ایک واحد شخصیت کی شکل اختیار کر لیتا ۔ انسان پر صفات کے تفاوت کے تناظر میں غور کیجئے تو آپ محسوس کریں گے ۔ کہ ایک ہی باپ کے دو بچے ہوتے ہیں ۔ لیکن دونوں میں پیدائشی صفات و کمالات کے لحاظ سے تفاوت اور اتنا تفاوت ہوتا ہے ۔ کہ ان میں سے ایک کو انسان کہا جا سکتا ہے ۔ تو دوسرے پر شاید حیوان کا اطلاق ہی مشکل سے صحیح ہو ویسے بظاہر دونوں انسان ہیں ۔ اور دونوں انسانی چہرے رکھتے ہیں لیکن ذہنی ، دماغی ، جسمانی ، اندرونی و بیرونی ، ظاہری و باطنی کمالات و صفات کے حوالہ سے دیکھا جائے تو آپ کو پتہ لگے گا ۔ کہ ایک اگر آسمان پر ہے تو دوسرا پاتال میں ہے ۔ ایک خوبصورت ہے تو دوسرا بدصورت ہے ۔ ایک غبی ہے تو دوسرا ذہین ہے ۔ ایک چست و چالاک ہے تو دوسرا کاہل و سست ، ایک فرشتہ خصلت ہے ، دوسرا شیطان سیرت ، ایک کو شاعری سے لگاؤ دوسرے کو ریاضی سے ، کسی کا جی کاروبار کرنے کو چاہتا ہے ۔ اور کوئی کتابوں کا دلدادہ ہے ۔ افراد انسانی میں اندرونی و بیرونی ، ظاہری و باطنی ، اعتبار سے کمالات وصفات اور ان کی قدر و قیمت میں جو تفاوت پایا جاتا ہے ۔ اسی سے زندگی کے ہر شعبہ میں ان میں مدارج کا اختلاف رونما ہو گیا مدارج و مراتب کا یہ اختلاف افراد انسانی میں ان کمالات و صفات کے تفاوت ہی کا نتیجہ ہے ۔ اسی فرق مراتب کو جو فرق صفات و کمالات کا ناگزیر نتیجہ ہے ۔ قرآن نے رفع درجات اور تفضیل سے تعبیر کیا ہے ۔ ورفعنا بعضھم فوق درجات اور فضلنا بعضھم علی بعض ۔

آئیے اس صفاتی اور کمالاتی تفاوت کو پیش نظر رکھ کر ادھر دیکھئے کہ الارض کو خیر و شر حسنات و سیئات، اتحاد و انتشار، تبیض و بسیط، جبر و اختیار کا گہوارہ بنا دیا۔ اور ان کو انسان کی صفات و کمالات کے لیے پرچہ امتحان بنا دیا۔ اور اعلان کر دیا۔ نبلوکم بالشر والخیر. لیبلوکم فیما اٰتٰکم۔ اس کارگاہ زندگی میں امتحان یہ ہے۔ کہ ایکم احسن عملا۔ یعنی زندگی کا کوئی خاص پہلو اور خاص رُخ ہی نہیں بلکہ پوری زندگی ہی آدمی کی امتحان و ابتلا کی زندگی ہے۔ تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں انسانی فطرت میں دو راہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی ہے۔ فی الواقع قدرت کے اسی تقاضے کے صحیح استعمال کے مطالبہ کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی طرف ابتلا و امتحان کے جو الفاظ منسوب کیئے گئے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے۔ کہ جن باتوں کو اللہ سبحانہٗ نہیں جانتا امتحان لے کر انہی کو جاننا چاہتا ہے۔ بلکہ انسانی فطرت میں اختیار و اقتدار کی جو قوت رکھی گئی اسی قوت کے صحیح استعمال کے مطالبہ کا نام ابتلاء و امتحان ہے۔

اہل علم نے لیبلوکم کے لام کو تعلیل کے لیے بنا کر لکھا ہے۔ کہ یہ خلق کے متعلق ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آسمانوں و زمین کی تخلیق کی علت انسان کی زندگی کا ابتلا ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ

> اللہ سبحانہٗ نے آسمانوں و زمین اور اس میں جو کچھ اور جتنی مخلوقات ہیں۔ ان کو پیدا کیا۔ اور ان میں تمہارے بقا کی خاطر ساری ضروریات ترتیب دی ہیں۔ تاکہ تمہارا امتحان لے۔

اس کا مطلب اس کا سوا کیا ہے۔ کہ محاسن و کمالات کے لامحدود ذخیرے زمین میں نہیں بلکہ خود انسان میں ہیں۔ ان کو بروئے کار لانے کی تدبیر یہ اور صرف یہ ہے۔ کہ انسان لامحدود کمالات والے خالق کائنات کے ساتھ ربط پیدا کرے اور اعمال کے حسن و قبح بھلائی برائی کا واحد معیار اس کی رضا کو بنائے یہی مطلب ہے۔ لیبلوکم ایکم احسن عملاً۔ کا کہ

(۱۲) امتحانی نتائج کا ظہور ناگزیر ہے۔

(۱۲) اور اگر آپ ان سے کہیں کہ تمہیں مرنے کے بعد ضرور اٹھایا جائے گا تو منکرین کہیں گے۔ کہ اس پیغمبر کی دعوت تو نرا جادو ہے۔ جب یہ امتحان و آزمائش کی جگہ ہے تو ضروری ہے کہ اس کے

بعد مجازات انعام وانتقام کا سلسلہ ہو تاکہ شاکرین وکافرین کو اپنے اپنے کیئے کا پھل ملے اسی لیے یہاں بعث بعد الموت کا ذکر کیا یعنی کفار مکہ کو یقین نہیں آتا کہ موت کے بعد دوبارہ اٹھائے جائیں گے۔ اور اپنے جرائم کی سزا بھگتیں گے۔ جب وہ قرآن یا حضور صلے اللہ علیہ وسلم کی زبان سے بعث بعد الموت کا نہایت مؤثر بیان سنتے ہیں تو کہتے ہیں کہ آپ کا یہ بیان کھلا جادو ہے۔ جس نے بہت سے لوگوں کو مسحور اور مرعوب کر لیا مگر یاد رکھیئے کہ ہم پر یہ جادو چلنے والا نہیں۔ (ابن کثیر)[۱]

اس آیت میں چند ضروری باتیں تشریح طلب ہیں۔

اول: آیت کی پیشانی پر لگا ہوا واؤ حالیہ ہے۔ اور اس کا ذوالحال خلق کی ضمیر فاعل ہے۔ یعنی سن چکے ہو کہ کائنات کی تخلیق چھ روز میں ہوئی اور یہ بھی معلوم کر چکے ہو کہ انسانی زندگی ابتلائی ہے۔ اس کے باوجود حال یہ ہے۔ کہ تم قیامت کا انکار کرتے ہو۔

دوم: آیت میں دو باتیں، بتائی گئی ہیں۔ ایک یہ کہ تم مانتے ہو کہ تخلیق کا آغاز ہوا ہے۔ اور بالفعل تخلیقات موجود ہیں۔ یہاں بقائے حقیقت کا قانون ہر گوشہ میں کام کر رہا ہے۔ تو پھر تم نے یہ کیسے سمجھ لیا ہے کہ انسان وجود میں آکر مطلقاً نابود ہو جاتا ہے۔ اور اس کی کوئی حقیقت جوہری باقی نہیں رہتی۔ اللہ سبحانہٗ کا جو قانون وجود دنیا کے ہر گوشہ میں موجود ہے۔ وہ انسانی زندگی اور روح کے لیے کیوں معطل ہو جائے۔ جو کرہ ارضی کی تمام مخلوقات کا ماحصل اور سلسلہ تخلیق کا مقصود ہے۔ یہاں کوئی ہستی بھی جو وجود میں آجاتی ہے۔ ناپید محض نہیں ہو سکتی تم درخت کو چیر کر تختہ بنا لیتے ہو۔ اب درخت معدوم ہو گیا۔ تختہ پیدا ہو گیا۔ اب تختہ جلا دو تختہ نابود ہو گیا راکھ پیدا ہو گئی۔ راکھ ہی اڑا دو منتشر ذرات پیدا ہو گئے اگر تم منتشر ذرّوں کا تعاقب کر سکتے ہو تو کر لو۔ صورت بدلتی جائے گی حقیقت کبھی ناپید نہ ہو گی۔ مطلب یہ ہے۔ کہ جو ہستی بھی وجود کا لبادہ پہن لیتی ہے۔ نابود محض نہیں ہوتی۔ بلاشبہ صورت مٹ جاتی ہے مگر حقیقت نہیں مٹتی۔ اس کی صورت پر ہزار تبدیلیاں آجائیں مگر بالآخر کوئی نہ کوئی حقیقت جوہری باقی رہے گی۔ ایک دانہ تخم ہو یا ایک نطفہ پیدائش وہ کسی نہ کسی حالت میں ضرور موجود رہتا ہے۔ پھر جب اعادے کا وقت آئے گا۔ اور زندگی کا صور پھونکا جائے گا۔ ہر انسانی زندگی اس سے نمودار ہو کر کھڑی ہو جائے گی۔ ٹھیک اسی طرح جس طرح نطفہ پیدائش سے شکم مادر میں زندگی نمودار ہو جاتی ہے۔

سوم: یہ زندگی ابتلائی ہے۔ ابتلا کا مقتضا ہے۔ کہ اعادہ حیات ہو۔ محسن کو احسان کی جزا اور مجرم

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کو اجرام کی سزا ملے۔ تخلیق کی علت ہی یہ ہے۔ اگر جزا و سزا نہ ہو۔ تو حکمت تخلیق ناتمام رہ جائے گی۔ اسی کو قرآن نے یوں تعبیر کیا ہے۔ افنجعل المسلمین کالمجرمین یا دوسرے موقعہ پر ہے۔

وما خلقنا السماء والارض وما بینھما باطلا ذالک ظن الذین کفروا فویل للذین کفروا من النار۔ ام نجعل الذین آمنوا وعملوا الصالحات کالمفسدین فی الارض ام نجعل المتقین کالفجار

اور ہم نے آسمانوں و زمین اور ان کے درمیان کی چیزیں عبث نہیں پیدا کی ہیں۔ یہ ان لوگوں کا گمان ہے جنہوں نے کفر کیا۔ ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا دوزخ کی ہلاکت ہے۔ کیا ہم ان لوگوں کو جو ایمان لائے اور انہوں نے اعمال صالحہ کیے زمین میں فساد مچانے والوں کی طرح کر دیں گے۔ یا ہم متقیوں کو فاجروں کی طرح بنا دیں گے۔

یہ ابتلائی زندگی کا لازمی تقاضا ہے۔ کہ نتائج کے حوالہ سے کچھ کامیاب اور کچھ ناکام ہوں۔ کامیاب ہونے والوں کا اعزاز ہو اور ناکامیاب رسوائیوں کا نشانہ ہوں۔ اگر جزا و سزا کے تناظر میں ابتلا نہ ہو۔ تو اس کا مطلب اس کے سوا اور کیا ہو سکتا ہے۔ کہ ایمان و کفر، ارتقاء و فجور کا تفاوت ختم ہو کر رہ جائے۔ اور کامیاب ناکامیاب ایک ہی نتیجہ سے دوچار ہوں۔ یہ ایک ایسی بات ہے جس کا ایک حکیم و رحیم اور قادر و عزیز ذات کے بارے میں تصور ہی نہیں ہو سکتا ہے۔

چہارم، یہ کہ ان ہذا الا سحر مبین یہ تو کھلا جادو ہے یہ کا اشارا اگر کہنے کی طرف ہے۔ تو مطلب یہ ہے کہ یہ بات تو بالکل غلط ہے۔ اس کی کوئی اصل نہیں ہے۔ بے حقیقت ہے اس صورت میں یہ تشبیہ بلیغ ہے۔ اور یہ بھی آپ کہہ سکتے ہیں۔ کہ یہ کا اشارا قرآن کی طرف ہے۔ اور مطلب یہ ہے۔ کہ نظریہ قیامت پر مبنی جب آپ ان کے سامنے قرآن پیش کرتے ہیں۔ تو منکرین اور ناقدرے کہتے ہیں کہ یہ قرآن کھلا جادو ہے۔ یعنی یہ منکرین ایک طرف تو قرآن کے وحی الہٰی ہونے کا انکار کرتے ہیں، دوسری طرف یہ بھی دیکھتے تھے۔ کہ یہ شخص اوروں کی طرح نہیں ہے۔ کوئی نہ کوئی بات ضرور ہے۔ پھر جب کوئی توجیہہ ان کی سمجھ میں نہ آتی تو کہتے کہ ہو نہ ہو یہ جادوگری ہے۔ ان کا یہ کہنا قرآن کی حیرت انگیز تاثیر کی سب سے بڑی شہادت ہے۔ یعنی اس کا اثر اس قدر نمایاں اور کھلا تھا۔ کہ باوجود دشمنی اور عناد کے ان کے لیے ماورائے انکار نہ تھا۔ اس لیے وہ اسے جادو کہنے پر مجبور تھے۔

⑭ معاندین کا تاخیرِ عذاب پر سوال

اور البتہ اگر ہم آپ کے مخاطبوں کو مہلت کی خاطر کچھ عرصہ کے لیے مؤخر کردیں۔ تو یہ آوازہ کسیں گے۔ کہ عذاب میں رکاوٹ کیا ہے۔ سُن لو! جس روز ان پر ان کے اعمال کی پاداش رونما ہوگی۔ یہ ان سے ہٹائی نہ جائے گی اور جس چیز کا وہ مذاق کر رہے ہیں۔ وہ ان کو گھیرے میں لے لے گی۔ یعنی جب ان کی شرارتوں پر عذاب الٰہی سے ڈرایا جاتا ہے مگر اللہ سبحانہٗ کی حکمت ایک مقررہ مدت تک عذاب کو روکے رکھتی ہے۔ تو تکذیب و استہزار کے طور پر کہتے ہیں۔ کہ وہ عذاب کہاں ہے۔ آخر آتا کیوں نہیں؟ کس چیز نے اسے پکڑ لیا ہے۔ فرماتے ہیں کیا مذاق کرتے ہیں۔ وقت مقررہ پر جب آئے گا تو کسی کے ٹلانے نہ ٹلے گا۔ اور ہر طرف سے گھیر کر تباہ و برباد کر کے چھوڑے گا ؎

معاندین نے کس عذاب کی تاخیر کے بارے میں ما یحبسہ؟ اسے کس چیز نے روک رکھا ہے قیامت میں ہونے والے عذاب کے بارے میں یا دنیا میں ہونے والے عذاب کے بارے میں شارحین قرآن کا میلان دونوں طرف ہے۔ لیکن قرینہ ہے کہ عذاب سے وہ عذاب مراد ہے۔ جس کا نبوت کی زبان سے قرآن نے یہ کہہ کر انی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ ہم بتاتے ہیں کہ مشرکین مکہ کے لیے یوم کبیر بدر کا دن ہے۔ اسی کو قرآن نے البطشۃ الکبریٰ اور اسی کو یوم الفرقان کہا ہے۔ جس طرح دوسری قوموں پر مختلف قسم کے عذاب آئے اسی طرح جس قوم میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہو کر آئے اس کے لیے غزوہ بدر معجزہ عذاب تھا۔ ہجرت سے پہلے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بددعا سے قحط کا عذاب آیا۔ جو اس قدر سخت تھا کہ بھوک سے آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا جاتا تھا۔ قرآن نے اس کی تصویر اس طرح پیش کی ہے۔ یوم تاتی السماء بدخان مبین یغشی الناس ھذا عذاب الیم۔ بعض روسائے قریش نے خدمت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم میں دعا کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے دعا کی اور یہ بلا دور ہوئی۔ مگر پھر قریش کی سرگردانی کا وہی عالم ہوگیا۔ تو ان کے لیے معجزہ عذاب کے سوا اور کوئی طریقہ علاج باقی نہ رہا۔ چنانچہ ہجرت کے بعد بدر کا بطشہ کبریٰ پیش آیا۔ قرآن نے مکی سورتوں میں ہجرت سے پہلے ہی مکہ میں اپنا یہ اعلان سنا دیا تھا کہ قحط کا عذاب، ہٹایا جا رہا ہے۔ لیکن تم پھر وہی کچھ کرنے والے ہو۔ اب بطشہ کبریٰ کا انتظار کرو۔

؎ افادات شیخ الاسلام

انا کاشفوا العذاب قلیلا انکم عائدون یوم نبطش البطشۃ الکبری انا منتقمون۔

ہم تھوڑے عرصہ کے لیے عذاب ہٹا رہے ہیں۔ لیکن تم پھر وہی کچھ کرو گے۔ اس دن کا انتظار کرو جب بڑی پکڑ پکڑیں گے ۔

مکی زندگی میں اسی کا وہ مذاق اڑاتے تھے ۔ اور اسی کے بارے میں انی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر۔ سُن کر کہتے تھے ۔ ما یحبسہ ؟ اس کے آنے میں رکاوٹ کیا ہے ۔

عذاب میں تاخیر کی حکمت

عذاب اس وقت تک نہیں آتا ۔ جب تک ہدایت کے ذریعہ قوم کے تمام صالح اجزا ان کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے ۔ اور مومنین و کافرین ایک دوسرے سے پھٹ کر الگ نہیں ہو جاتے۔ اور رسول کو بقیہ عناصر کے ایمان سے قطعاً مایوسی نہیں ہو جاتی حضرت نوحؑ نے ایک لمبا عرصہ دعوت دی۔ اور اس کے بعد نا امید ہو کر دعا کی رب لا تذر علی الارض من الکافرین دیارا۔ اسی طرح حضرت موسیٰؑ کو جب فرعون کے ایمان سے مایوسی ہو گئی تو انہوں نے دعا کی ربنا اطمس علی اموالھم واشدد علی قلوبھم ۔ اس موقع پر اسی قسم کی دعائیں اور انبیاء نے بھی کی ہیں ۔

اس وقت پھر رسول کو اپنی امت کو لے کر کافروں سے علیحدگی کا حکم ہوتا ہے ۔ سورہ یونس میں یہ قانون بالتفصیل پڑھ چکے ہو ۔

ہدایت کی خاطر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جو غیبی نشانات صادر ہوتے تھے ۔ ان کا بڑا حصہ غیر معمولی قوت تاثیر، استجابت دعا، تائید و نصرت اور پیشین گوئی کا تھا ۔ اسی غیر معمولی تاثیر کا نتیجہ تھا کہ قریش لوگوں کو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس جانے سے روکتے تھے ۔ سیرت کی کتابوں میں اس قسم کے متعدد واقعات موجود ہیں قرآن عزیز کی یہ آیت کافروں کے اس باطنی انحراف کا آئینہ ہے ۔ لا تسمعوا لھذا القرآن ۔ قرآن کے اثر ہی کا نتیجہ تھا ۔ کہ وہ اسے سحر مبین کہتے ہیں ۔ الغرض ہدایت کے بہت سے نشانات تھے جو مکہ میں کفار کو اس لیے دکھلائے گئے ۔ کہ انکو دیکھ کر قبول حق کی صلاحیت رونما ہو ۔ تیرہ سال تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مکہ والوں کو دعوت دیتے رہے ۔ اور کہتے رہے ۔ انی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر ۔ مگر وہ اس اندیشہ سے متاثر ہونے کی بجائے اس کا مقابلہ کرتے ۔ اس کا مذاق اڑاتے ، آوازے کستے متی ھذا الوعد ؟ کفار کو معجزہ عذاب

دیکھنے کی جلدی تھی۔ کیونکہ وہ سمجھتے تھے۔ کہ یہ اندیشہ افسانہ ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے بتایا کہ جب تک پیغمبر کی آمد کی برکات ختم نہ ہو جائیں عذاب میں تاخیر ہوتی رہے گی۔

بالآخر قانون الٰہی کے مطابق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دعا کی۔

رب ادخلنی مدخل صدق واخرجنی مخرج صدق واجعل لی من لدنک سلطانا نصیرا۔

اے میرے رب مجھے خوبی سے کہیں پہنچا اور خوبی سے نکال اور اپنے پاس سے مجھے ایک مددگار طاقت دے۔

یہ دعا مقبول ہوئی اور بشارت آئی جاء الحق وزھق الباطل بس یہی وجہ عذاب کی تاخیر میں حکمت ربانی کررہی تھی اسی کو وہ کہہ رہے ہیں مایحبسہ ؟ عذاب کو روکنے والی چیز کیا ہے جواب میں فرمایا ہے۔

الایوم یاتیھم لیس مصروفا عنھم وحاق بھم ماکانوا بہ یستھزءون۔

مطلب یہ ہے کہ بے چین ہونے کی ضرورت نہیں عذاب آکر رہے گا۔ عذاب آنے کے سارے عوامل فراہم ہو چکے ہیں۔ سوال کو بنانے کے لیے قرآن نے اس کی تمہید بڑی لطیف قائم کی ہے یعنی اگر ہم عذاب کو ایک عرصہ مقررہ کے مؤخر کررہے ہیں تو کہنے والے ضرور کہیں گے۔ اصل ارشاد میں امۃ معدودۃ ہے حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔

قرآن وسنت میں لفظ امۃ ایک سے زیادہ معانی میں استعمال ہوا ہے۔ مدت اور عرصہ کے معنے میں جیسے وادکر بعد امۃ اور اس جگہ الی امۃ معدودۃ امام ومقتدا کے معنے میں جیسے ان ابراہیم کان امۃ ملت اور دین کے معنے میں جیسے انا وجدنا آباءنا علی امۃ جماعت کے معنے میں جیسے وجد علیہ امۃ من الناس۔

سوال یہ تھا کہ عذاب کے آنے میں کیا رکاوٹ ہے جواب میں صرف یہ فرمایا کہ عذاب جب آئے گا وہ اس کا دفاع نہ کرسکیں گے۔ کسی طرح بھی۔ عذاب کے لیے ان کی جلد بازی چونکہ استہزائی رنگ میں تھی۔ اس لیے فرمایا کہ وحاق بھم ماکانوا بہ یستھزءون۔ وہ عذاب ان کو اپنے گرداب میں لے لے گا۔ جس کو یہ دل لگی سمجھ رہے ہیں۔ اور جس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

وَلَئِنْ اَذَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنَّا رَحْمَةً ثُمَّ نَزَعْنٰهَا مِنْهُ اِنَّهٗ لَيَئُوْسٌ كَفُوْرٌ ﴿۹﴾ وَلَئِنْ اَذَقْنٰهُ نَعْمَآءَ بَعْدَ ضَرَّآءَ مَسَّتْهُ لَيَقُوْلَنَّ ذَهَبَ السَّيِّاٰتُ عَنِّيْ اِنَّهٗ لَفَرِحٌ فَخُوْرٌ ﴿۱۰﴾ اِلَّا الَّذِيْنَ صَبَرُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اُولٰٓئِكَ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ اَجْرٌ كَبِيْرٌ ﴿۱۱﴾

اور البتہ اگر ہم انسان پر اپنی جانب سے رحمت نچھاور کرتے ہیں۔ پھر اس رحمت کو اس سے ہٹا دیتے ہیں۔ تو انسان مایوسیوں اور ناشکریوں کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے[۱۴]۔ اور البتہ اگر ہم انسان کو اس تنگ حالی کے بعد جس کا وہ شکار ہو گیا تھا۔ خوشحالی سے دوچار کرتے ہیں تو وہ ضرور بالضرور چہکنے لگتا ہے۔ کہ میری بدحالیاں ختم ہو گئی ہیں۔ یقیناً اب وہ اتراہٹ اور گھمنڈ کا پیکر بن جاتا ہے[۱۵]۔ ہاں وہ لوگ ایسا نہیں کرتے جو صبر کا دامن تھامے ہوئے اور اعمال صالحہ کے خوگر ہیں۔ ان ہی لوگوں کے لیے بہت بڑا اجر ہے اور اللہ سبحانہٗ کی مغفرت اس کا

استقبال کرتی ہے [۱]

مفردات کے معانی

یئوس: یہ فعول کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ یئس ییئس باب سمع سے آتا ہے۔ اس کے معنے آس چھوڑ بیٹھنا اردو میں اسی سے مایوس استعمال ہوتا ہے۔

کفور: کاف کے زبر کے ساتھ فعول کے وزن پر مبالغہ ہے۔ اور کاف کے پیش کے ساتھ کفور مصدر ہے۔ اس کے تین مصدر کفر، کفور، کفوران، کفران زیادہ ناشکری کے لیے بولا جاتا ہے۔ کفر انکار کے معنے میں آتا ہے۔ اور کفور دونوں میں استعمال ہوتا ہے۔ کفر سے کفار مبالغہ آتا ہے۔ اس میں زیادہ زور ہے۔ کل کفار عنید اسی سے ہے۔

نعماء: نعم ینعم سے اسم ہے۔ خوش حالی کے معنے میں اچھے کھانے کو طعام ناعم کہتے ہیں۔ نعمۃ، نعمی اور نعماء تینوں ایک ہیں۔

ضراء: ضر یضر سے اسم مؤنث ہے۔ سختی اور تنگی کے معنے میں اس کا مذکر نہیں آتا۔ تنگ حالی کے معنے میں ہے۔

فرح: یہ فعل کے وزن پر مبالغہ کا صیغہ ہے۔ کثیر الفرح بہت زیادہ اترانے والے کو کہتے ہیں۔ باب سمع سے آتا ہے۔ ان اللہ لایحب الفرحین۔

فخور: یہ فخر یفخر سے مبالغہ ہے۔ اس کے معنے مال و جاہ پر گھمنڈ کرنے والے کے ہیں۔ فاخر، فخور اور فخر اسی معنے میں استعمال ہوتے ہیں۔ نفیس اور عمدہ کو بھی فاخر کہتے ہیں۔

انکار حق کا سرچشمہ نفسیاتی رذائل ہیں

جب انسان نفسیاتی رذائل کا شکار ہو جاتا ہے۔ رذائل تو بہت ہیں۔ یہاں صرف ان رذائل کا چہرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ جو انکار حق کا باعث ہوتے ہیں۔ مایوسی، ناشکری، فرح، فخور، یاس رجا کی ضد اور کفران شکر کی ضد ہے۔ یہ انسان کی کمزوری ہے۔ کہ صحت کے ملنے کے بعد، عزت سے دوچار ہونے کے بعد جب بیماری اور ذلت کا شکار ہوتا ہے۔ تو مستقبل کو شک کی نگاہوں سے دیکھنے لگتا ہے اور اللہ کے انعامات و احسانات کو طاق نسیان بنا کر ناشکری اور کفران نعمت کا علمبردار ہو جاتا ہے پوری

زندگی اس طرح گزارتا ہے۔ کہ صحت نہیں ملتی تو مایوسیوں کو اپنا لیتا ہے مل جاتی ہے کہ تو ناشکر گزاری کا مجسمہ بن جاتا ہے۔ زندگی کی گاڑی مایوسی سے نہیں۔ صبر سے اور ناشکری اور کفران سے نہیں شکر گزاری سے چلتی ہے۔ یہی دو پہیے ہیں جن کے ذریعہ زندگی کی گاڑی تیز رفتاری سے چلتی ہے۔ اور جہاں صبر کی جگہ مایوسیاں آجاتی ہیں۔ اور شکر کی جگہ کفران آجاتا ہے۔ وہ زندگی کبھی حالات کی ناسازگاریوں کا سامنا نہیں کر سکتی ہے۔ حالات میں خواہ کیسی سنگینی ہو۔ مایوس نہ ہونا چاہیئے۔ انہ لایئیس من روح اللہ الا القوم الکافرون دامن صبر کو تھام کر رکھنا چاہیئے۔ اور اس کے برعکس حالات خواہ کیسے ہی خوشگوار ہوں خوشگواری میں منعم کو نہ بھولنا چاہیئے۔ شکر کرنا چاہیئے۔ حوادث میں صبر اور انعامات بر عکس سے انسان زندگی میں اور اس دنیا میں بے غم اور بے خوف ہو جاتا ہے۔

آیئے تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھئے۔ بدحالیوں کے بعد انسان خوشحالیوں سے ہمدوش ہوتا ہے صرف بدحالیوں کے اختتام کے نعرے ہی پر بس نہیں کرتا بلکہ اس موقعہ پر اس میں اترانا اور ہم حیثیوں اور کم تر لوگوں کے مقابلے میں فخر و مباہات کی تصویر بن جاتا ہے۔

سوچنے کی بات ہے۔ کہ انسان کے ان رزائل کا یہاں ذکر کیوں کیا ہے ؟ ایک نہایت اچھوتے انداز میں اس بات پر متنبہ کرنا ہے کہ آج نبوت کی زبان سے انی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر کا اعلان سُن کر مذاق کر رہے ہو۔ اور سمجھتے ہو کہ ہم پر نعمتوں کی بارش ہو رہی ہے۔ ہمارا کیا بگڑے گا۔ نبوت کے جواب میں تمہارا یہ استہزار اس ذلیل صفت کا ذلیل مظاہرہ ہے۔

(۱۴) اور البتہ اگر ہم انسان پر اپنی جانب سے رحمت نچھاور کرتے ہیں۔ پھر بعد ازیں اس رحمت کو اس سے ہٹائے دیتے ہیں۔ تو انسان مایوسیوں اور ناشکریوں کی تصویر بن کر رہ جاتا ہے۔ یعنی اب تو کہتے ہیں کہ عذاب کہاں ہے ؟ کیوں نہیں آتا۔ لیکن آدمی بودا اور تھڑدلا اتنا ہے۔ کہ اگر اللہ سبحانہٗ چند روز اپنی مہربانی سے عیش و آرام میں رکھنے کے بعد تکلیف میں مبتلا کر دے تو پچھلی مہربانیاں بھی بھلا دیتا ہے۔ اور ناامید ہو کر آئندہ کے لیے آس توڑ بیٹھتا ہے۔ گزشتہ پر ناشکری اور آئندہ سے مایوسی یہ ہی اس کی زندگی کا حاصل ہے۔ عام انسانی طبیعت اور فطرت یہی ہے۔ کہ تکلیف و مصیبت سے دوچار ہوتا ہے۔ تو ماضی کو بھول کر مستقبل میں مایوسیوں کا شکار ہو جاتا ہے۔ ماضی میں جو انعامات کیئے ان کے لیے اس میں شکر کا کوئی احساس نہیں ہوتا۔ اور حال میں حالات کی سنگینی کی وجہ سے دامن صبر ہاتھ سے چھوڑ کر مایوسیوں کی آماجگاہ بن کر رہ جاتا ہے۔

شارحین قرآن نے اس آیت کی جو تشریح کی ہے اس سے بھی استفادہ فرمالیجئے۔ حافظ ابن

فرماتے ہیں ۔

اللہ سبحانہٗ نے انسان اور اس کی بُری نفسیات کے بارے میں یہ انکشاف فرمایا ہے ۔ کہ جب انسان پر خوش حالی کے بعد تنگ حالی آتی ہے تو جیسے وہ مستقبل کے بارے میں یاس و قنوط کا شکار ہو جاتا ہے ۔ ایسے ہی نعمتوں سے بھرپور ماضی کے لیے اس میں جحود انکار کو اپنا لیتا ہے ۔ ایسا ہوتا ہے جیسے پہلے سے گویا اس پر کبھی کوئی انعام ہی نہیں ہوا ہے ۔

حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ

اگر ہم انسان کو زندگی میں فراخی اور معاش میں بسط کی حالت دیتے ہیں ۔ تو دنیا کی ساری فراخیوں کو مصائب کا چکر آنے کے بعد انسان مستقبل کے بارے میں یاس و قنوط کی آماجگاہ بن جاتا ہے ۔ اللہ کی رحمت سے مایوس ہو کر اس کی دی ہوئی نعمتوں سے بالکل بیگانہ ہو جاتا ہے ۔

امام محی السنۃ ابو محمد بغوی معالم التنزیل میں لکھتے ہیں ۔

اللہ سبحانہٗ بتا رہے ہیں کہ انسان کی کمزوری یہ ہے کہ وہ مصائب میں مایوس اور انعامات میں کفور ہو جاتا ہے ۔ معاش کی خوشحالی میں ناشکرا اور تنگ حالی میں یاس و قنوط کا پتلا بن جاتا ہے ۔

امام فخر الدین رازی مفاتیح الغیب میں فرماتے ہیں ۔

انسان پر دو حالتیں آتی ہیں ۔ ایک حالت میں وہ نعمتوں کا گہوارہ ہوتا ہے ۔ اور ایک حالت میں وہ مصیبتوں کے چکر میں ہوتا ہے ۔ نعمتوں سے جب ہمدوش ہوتا ہے تو منعم کو فراموش کر دیتا ہے ۔ اور انعام کا شکر کرنے کی جگہ کفران کرتا ہے اور مصیبتوں میں پھنستا ہے ۔ تو سراپا شکوہ و شکایت بن جاتا ہے ۔

علامہ آلوسیؒ روح المعانی میں فرماتے ہیں ۔

جب ہم انسان کو صحت ، امن ، اور مال کی نعمت دیتے ہیں ۔ تو وہ ناشکر گزار ہوتا ہے جب دی ہوئی نعمت کو چھین لیتے ہیں ، وہ مایوسیوں سے دوچار ہو جاتا ہے ۔

قاضی بیضاویؒ اپنی تفسیر میں اس طرح تشریح فرماتے ہیں ۔

اگر ہم انسان پر نعمتوں کی نوازش کرتے ہیں ۔ پھر حالات کے تحت نعمت اس سے

چھین لیتے ہیں۔ تو انسان کی کمزوری یہ ہے۔ کہ وہ ماضی میں کیئے گئے انعامات سے آنکھیں بند کر کے ناشکرا اور شکوہ و شکایت کرنے لگتا ہے۔ اور مستقبل کے بارے میں یاس و قنوط کا رویہ اپنا لیتا ہے۔

اور علامہ شوکانی تفسیر فتح القدیر میں فرماتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ اگر اللہ سبحانہٗ بندہ کو صحت اور مال کی نعمت دیتے ہیں اور پھر یہ نعمت زحمت سے بدل جاتی ہے۔ تو اس وقت انسان کا ماضی اور مستقبل کے بارے میں رویہ عجیب ہو جاتا ہے۔ ماضی میں نعمتوں کے لیے اس میں شکر کی جگہ کفران اور مستقبل میں رجار کی جگہ مایوسی آجاتی ہے۔

اور قاضی ثنار اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں۔

جب انسان کو صحت، امن و عافیت اور مال و دولت کی نعمت عطا کرتے ہیں بعد ازیں اس سے نعمتیں چھن جاتی ہیں۔ تو چھن جانے کے بعد ایک طرف اگر وہ مستقبل میں خوشحالی سے مایوس ہو جاتا ہے تو دوسری طرف ماضی میں کی گئی نعمتوں کے لیے بہت زیادہ ناشکر گزار ہو جاتا ہے۔

اصل مقصد اس ارشاد کے ذریعے یہ سمجھانا ہے کہ عذاب کے بارے میں تاخیر پر مشرکین و منکرین یہ سوال کیوں کر رہے ہیں۔ کہ عذاب میں تاخیر کیوں ہو رہی ہے۔ اس کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ انسانی طبیعت کی یہ فطری کمزوری ہے کہ راحت اور خوشحالی میں وہ کفور ہوتا ہے۔ اور مصائب کے ہجوم میں وہ مایوس بن کر رہ جاتا ہے۔ یعنی اس میں صبر و شکر کی صفتیں نہیں بلکہ یاس و کفر کے رذائل ہیں۔ اور یہ دو بُری عادتیں انسان کو عذاب نہ ہونے کی حالت میں اب بجائے شکر کے کفران پر اُبھار رہی ہیں۔ وہ عذاب نہ آنے پر اور امن و عافیت پر اللہ کا شکر نہیں کرتا ہے۔ بلکہ اس کی اس نعمت کی ناقدری کرتا ہے۔ اور ان کے اعمال کے نتیجے میں اور نبوت کے اندیشہ کے مطابق عذاب آجائے گا۔ تو یہ مایوسیوں کے شکار ہو جائیں گے منشا یہ ہے کہ انسان میں کمال صبر و شکر کے ذریعہ ہوتا ہے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں کا یہ طبقہ صبر و شکر کے فضائل سے عاری ہے۔ یاس و کفران جیسے رذائل کی آماجگاہ ہے۔ ان رذائل کی موجودگی میں ان کا یہ سوال کہ عذاب میں دیری کیوں ہے۔ تعجب خیز نہیں۔

(۱۵) فرح و فخر بدترین صفات ہیں۔

اور البتہ اگر ہم انسان کو اس تنگ حالی کے بعد جس کا وہ شکار ہو گیا تھا۔ خوشحالی سے دوچار کرتے

ہیں۔ تو وہ مغرور بالضرور چہکنے لگتا ہے کہ میری بدحالیاں ختم ہوگئی ہیں۔ یقیناً اب وہ اتراہٹ اور گھمنڈ کا پیکر بن جاتا ہے۔ یعنی مصیبت کے بعد اگر اللہ سبحانہٗ آرام و آسائش نصیب کرے تو سمجھتا ہے کہ گویا اب ہمیشہ کے لیے مصائب و تکالیف کا خاتمہ ہو چکا۔ پچھلی کیفیت لوٹ کر کبھی آنے والی نہیں اس وقت غافل و مغرور ہو کر شیخیاں مارتا اور اتراتا پھرتا ہے۔ حالانکہ چاہیئے یہ تھا کہ پچھلی حالت یاد کر کے خدا کا شکر ادا کرتا۔ اور اس کے احسان کے سامنے جھک جاتا[1]

یہ ان اخلاقی رذائل کی تصویر کا دوسرا رُخ ہے۔ جن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب خاص طور پر مبتلا تھے۔ تصویر کا پہلا رُخ صبر و شکر سے بیگانہ ہو کر یاس و کفران جیسے رذائل میں مبتلا ہونا تھا۔ دوسرا تصویر کا رُخ فرح اور فخر کی بیماری ہے۔ اور یہ تینوں رذائل قبول حق میں سنگ راہ ہیں۔ یہ وہ رذائل ہیں جن سے اعراض عن الحق کا استہزاء حق کے علمبرداروں کی تحقیر جیسے روگ جنم پاتے ہیں۔ ان ہی سے آدمی خود بینی، خود نمائی، حسد، فحش گوئی، نمائش، ظلم، غیظ و غضب، بے ایمانی، جھوٹ، بدگمانی، حرص و طمع، بہتان، خیانت اور بدگوئی جیسے جرائم پروان چڑھتے ہیں۔

آیت قرآنی خوشحالی کے لیے اذاقت اور بدحالی کے لیے مساس کی تعبیر بلیغ ہونے کے ساتھ لطیف بھی ہے۔ بلاغت تو یہی ہے کہ نعمار خوش حالی کا مد مقابل ضرار بدحالی کا ذکر کیا ہے مگر لطافت یہ ہے کہ خوشحالی کی مقصدیت اور اس کی پشت پر ارادہ اور محنت ہونے کی وجہ سے اذاقت سے تعبیر کیا۔ جبکہ ضرار اور بدحالی چونکہ وقتی اور غیر ارادی ہوتی ہے۔ اس لیے اس کو مساس سے ظاہر کیا۔ اس میں یہ بھی اشارا ہے۔ کہ رحمت غضب سے پہلے ہے کیونکہ رحمت اصل ہے۔ اور کچھ اہل علم نے لفظ اذاقت کی تعبیر سے یہ بھی سمجھا ہے کہ آخرت کی دائمی اور لا محدود نعمتوں کے مقابلے میں دنیا کی زندگی میں جو کچھ بھی مل رہا ہے۔ اس کی حیثیت کھانے اور استعمال کرنے کی نہیں صرف چکھنے کی ہے۔ اور یہ گویا آخرت کی نعمتوں کا ایک اُرنگا ہے۔ حیرت ہے کہ صرف نمونہ ہاتھ میں آنے پر انسان اترا رہا ہے اور گھمنڈ کھا رہا ہے

اصل بات پہلے بتائی گئی تھی۔ کہ خوشحالی کے بعد تنگ حالی آتی ہے۔ صحت کے بعد بیماری آتی ہے۔ غنا کے بعد فقیری آتی ہے۔ عزت کے بعد ذلت آتی ہے۔ تو انسانی عادت رذیلہ یہ ہے کہ ماضی کی خوشحالیوں کی طاق نسیاں بنا کر مستقبل میں یاس و قنوط کا رویہ اپنا لیتا ہے۔ اب بتایا جا رہا ہے۔ کہ بدحالیوں کے بعد اگر خوش حالی بیماری کے بعد صحت، فقیری کے بعد امیری اور ذلت کے بعد عزت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

آتی ہے۔ تو یہی جو پہلے مایوسیوں کی تصویر بنا ہوا تھا۔ فرح و فخر کا پیکر بن جاتا ہے۔ خوشحالی پر اتراتا ہے۔ اور لوگوں کے سامنے قسم قسم کی ڈینگیں مارتا ہے۔

حافظ ابن الکثیرؒ فرماتے ہیں۔

نقمت کی جگہ جب نعمت آتی ہے تو کہتا ہے کہ اب میری ساری مصیبتیں کافور ہو چکیں ہیں اب اس کے بعد میں کسی افتاد کا شکار نہ ہوں گا۔ موجود نعمت پر اتراتا ہے۔ اور دوسروں کے سامنے فخر کرتا ہے۔

آیت میں فرد کی موجودگی کا قانون بتایا جا رہا ہے۔ قرآن کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اقوام کا بھی یہی قانون ہے۔ فرد کی مثال قرآن میں قارون کی ہے۔ اور سورہ کہف میں ان دو شخصوں کی ہے جن کے دو باغ تھے۔ اس کی تفصیل انشاء اللہ سورہ کہف ہی میں آپ پڑھیں گے۔

اب سوچیں اس موقعہ پر ان رذائل کے ذکر کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ یہاں یہ بات دو وجہ سے بیان کی گئی ہے۔

اولا : اس لیے کہ منکرین حق اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطب عذاب کی خبر سن کر ہنسی اڑاتے تھے۔ اور اہل ایمان پر مصیبت کی گھڑیاں شاق گزرتی تھیں۔ بتایا کہ منکرون کی یہ حالت کوئی غیر معمولی حالت نہیں ہے۔ انسان خوشحالیوں میں پڑکر اسی طرح غافل ہو جاتا ہے اور ڈینگیں مارنے لگتا ہے۔

ثانیا : اس لیے کہ ایک نہایت لطیف انداز میں منکرین حق کو آگاہ کرتا ہے۔ کہ آج مطمئن زندگی میں نبوت تمہیں خبردار کر رہی ہے۔ کہ اللہ سبحانہ کی نافرمانیوں کا نتیجہ عذاب ہے۔ اور تم نبوت کی بات کا استہزاء کر رہے ہو۔ اور اس میں ممکن ہو کہ ہماری خوشحالیوں میں عذاب کی بات بے وقت کی راگنی ہے تو نبوت کی بات پر تمہارا یہ استہزاء اسی رذیل صفت کا ایک ذلیل کردار ہے۔

(۱۶) پسندیدہ لوگوں کی روش

ہاں وہ لوگ ایسا نہیں کرتے جو صبر کا دامن تھامے ہوئے ہیں اور اعمال صالحہ کے خوگر ہیں۔ ان ہی لوگوں کے لیے بہت بڑا اجر ہے۔ اور اللہ سبحانہ کی مغفرت ان کا استقبال کرتی ہے۔ یعنی جو حال اوپر عام انسانوں کا بیان ہوا۔ اس سے اللہ کے وہ بندے مستثنیٰ ہیں جو تکلیف و مصیبت کا مقابلہ صبر و استقامت سے کرتے تھے۔ اور امن و راحت کے وقت شکر گزاری کے ساتھ عمل صالح میں مستعدی دکھاتے ہیں۔ ایسے اولوالعزم وفاداروں کی جماعت ہی عظیم الشان بخشش و انعام

کی مستحق ہے لے افراد کی زندگی میں سب سے نازک موقعہ وہ آتا ہے جب وہ بدحالی کے بعد کسی کامیابی اور خوشحالی سے ہمدوش ہوتے ہیں۔ اس وقت پر نفس کو قابو میں رکھنا اور ضبط سے کام لینا دشوار ہوتا ہے۔ مگر یہی ضبط نفس کا اصل موقعہ ہوتا ہے۔ اور اسی سے اشخاص میں سنجیدگی، متانت، وقار اور سیرت کی مضبوطی پیدا ہوتی ہے۔

دنیا میں غم و مسرت اور رنج و راحت میں ہم آہنگی ہے ان دونوں حالتوں میں آدمی کو ضبط نفس اور اپنے آپ پر قابو کی ضرورت ہے یعنی نفس پر اتنا قابو ہو کہ مسرت و خوشی کے نشے میں اس میں فخر و غرور پیدا نہ ہو۔ اور غم و تکلیف میں وہ اداس نہ ہو۔ دل کے ان دونوں عیبوں یا سیرت کے ان رذائل کا علاج صبر و ثبات اور ضبط نفس ہے۔ اس آیت میں اسی راز کو منکشف کیا گیا ہے۔ کہ پُر وقار، متین اور صابر وہ شخص ہے جو زمانہ کے بدلتے ہوئے حالات میں اپنے آپ کو قابو میں رکھے وقت کی ہر گردش سے متاثر ہو کر بدلتا نہ جائے بلکہ ایک معقول اور صحیح رویے پر قائم رہے۔ اگر حالات میں سازگاری ہو اور اقتدار مل جائے تو بڑائی کے نشے میں مخمور ہو کر بہک نہ جائے اور اگر نکبتوں اور نوازل میں پھنس جائے تو اپنے جوہر انسانیت کو اس میں پامال نہ ہونے دے۔ ابتلا اللہ سبحانہٗ کی جانب سے نعمتوں کی صورت میں ہو یا زحمتوں کی شکل میں دونوں صورتوں میں ضابط، متین اور باوقار عمل ہے۔ اور اپنے آپ کو کسی حال میں بھی قابو سے باہر نہ ہونے دے۔

علامہ آلوسیؒ نے کشف کے حوالہ سے یہاں یہ بات خوب لکھی ہے کہ

> یاس میں صبر نہ ہونے اور کفران میں شکر نہ ہونے کے معنے تھے۔ اس لیے استثنا کے موقعہ پر ان لوگوں کا ذکر کیا ہے۔ جو ان رذائل کی جگہ صبر و شکر کے فضائل سے آراستہ ہیں۔

گویا یہاں محبوبوں کے ذکر میں کنائی زبان میں فضائل کا ذکر کیا۔ جبکہ معاندین کے ذکر میں رذائل کی تصریح کی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ وہ لوگ ہیں، جو کسی آزمائش و مصیبت میں گرفتار ہوتے ہیں تو اللہ کی رحمت سے مایوس اور دل شکستہ ہونے کی بجائے اس کی رحمت کی امید پر دامن صبر ہاتھ سے نہیں چھوڑتے اور جب اس کے فضل و نعمت سے نوازے جاتے ہیں تو اکڑنے اور مغرور ہونے کی جگہ اس کے شکر گزار ہوتے ہیں۔ اور عمل صالح کرتے ہیں۔ مصائب ان میں ضبط، وقار اور متانت پیدا

لے افادات شیخ الاسلام

کرتے ہیں ۔ اور نعمتیں ان میں شکر اور تواضع کی راہیں کھولتی ہیں ۔
جناب قاضی ثناء اللہ نے تفسیر مظہری میں یہ بات خوب لکھی ہے کہ

وہ اہل ایمان جو نعمتوں کے چھن جانے پر یاس اور کفران کی تصویر نہیں ہوتے بلکہ اللہ سے امیدوار رحمت ہوتے ہیں اور اس کی موجود اور سابق نعمتوں کے سراپا شکر ہوتے ہیں نہ اتراتے ہیں نہ گھمنڈ کرتے ہیں اور نہ لوگوں کے سامنے فخر کرتے ہیں ۔ بلکہ اللہ سبحانہٗ کے شکر گزار ہوتے ہیں ۔

آخر میں ارشاد ہوا ہے ۔ اولٰئک لھم مغفرۃ واجر کبیر اس میں صبر کی تلخیوں کو مٹانے کی ایک تدبیر بتائی ہے ۔ اور صبر کو ایک مستقل عمل قرار دے کر اس پر مرتب ہونے والے نتائج کی خوشخبری دی ہے کہ ان کے لیے عظیم مغفرت اور بہت بڑا اجر ہے بلکہ فرمایا ہے ۔ ان اللہ مع الصابرین جن کو اللہ کی رفاقت و معیت کی دولت مل جاتی ہے ۔ اگر اللہ کی طرف سے ان پر مغفرت اور اجر کبیر کا نزول ہو ۔ تو اس میں حیرت کی کون سی بات ہے ۔ آخر اللہ سبحانہٗ ہی جس کے ساتھ ہو گیا ہو تو سوچیئے کہ اور اجر کبیر کے سوا اور کسی دوسری بات کا امکان ہی کیا ہے ۔

یہاں الذین صبروا جملہ خبریہ ہے ۔ اور مقام مدح میں ہے ۔ اس کا انداز بتا رہا ہے ۔ کہ جن کے بارے میں یہ بات بتائی جا رہی ہے ۔ انہوں نے موجودہ زندگی کے مصائب کا صبر سے مقابلہ کیا اور صبر کو خوشگوار بنانے کے لیے مذکورہ بالا قرآنی تدبیر سے فائدہ اٹھایا ۔ جن نتائج کا وعدہ صبر پر کیا گیا ہے اس سے قلب کو قوی رکھتا اس عہد کے مسلمانوں کے دماغ کی منطق ٹھیک قرآنی منطق بن گئی تھی ۔ یقین نہیں آتا تو حضرت عمرؓ کے اس ارشاد گرامی کو پڑھیئے جو ازالۃ الخفاء میں شاہ ولی اللہؒ نے پیش کیا ہے ۔

میں جب بھی کسی مصیبت میں مبتلا ہوتا ہوں تو اپنے اندر چار نعمتوں کو محسوس کرتا ہوں ۔ اول یہ کہ مصیبت میرے دین میں نہیں ہے دوم یہ کہ اس سے بڑی مصیبت میں مبتلا نہیں سوم یہ کہ اس کی وجہ سے رضائے الٰہی سے محروم نہیں ہوں چہارم یہ کہ اس مصیبت پر ثواب کا امیدوار ہوں ۔

ہر مصیبت میں چار نعمتوں کا آپ کے دل میں بیدار ہونا ہے اور وہ نعمتیں کیا ہیں ۔ یہ کہ اسلام محفوظ رہ گیا ۔ یہ کہ اس سے بڑی مصیبت سے محفوظ ہوں ۔ یہ کہ قانون الٰہی کی مخالفت کے جرم سے محفوظ ہوں ۔ یہ کہ الحمدللہ احتساب کی نعمت مالا مال ہوں ۔

یہ احساس قرآن کے اس حیرت انگیز اثر کی دلیل ہے۔ جو قرآن نے اپنے ماننے والوں میں پیدا کیا تھا۔

البقاعیؒ لکھتے ہیں۔ سیاق قرآنی صحابہ کرامؓ کی مدح میں ہے اس لیے یہاں اُٹھے ہوئے سوال کا جواب دیا ہے۔ کہ جن کے چہرے مذکورہ اوصاف وفضائل کی روشنی میں پیش کیے گئے ہیں۔ ان کا مقام کیا ہے۔ جواب میں ارشاد ہوا ہے۔ اولائك یعنی ان کو ان کی کوتاہیوں کے نتائج سے محفوظ رکھا جائے گا۔ اور ان کے صبر و شکر کی ان کو بہت بڑی جزا ملے گی۔ مطلب یہ ہے۔ کہ ان اوصاف وفضائل کی وجہ سے یہی اس مغفرت اور اجر کبیر کے مستحق ہیں۔

فَلَعَلَّكَ تَارِكٌۢ بَعْضَ مَا يُوْحٰٓى اِلَيْكَ وَضَآئِقٌۢ

بِهٖ صَدْرُكَ اَنْ يَّقُوْلُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ كَنْزٌ اَوْ جَآءَ مَعَهٗ

مَلَكٌ ؕ اِنَّمَآ اَنْتَ نَذِيْرٌ ؕ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ وَّكِيْلٌ ۞ اَمْ

يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِعَشْرِ سُوَرٍ مِّثْلِهٖ مُفْتَرَيٰتٍ وَّ

ادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۞

فَاِلَّمْ يَسْتَجِيْبُوْا لَكُمْ فَاعْلَمُوْٓا اَنَّمَآ اُنْزِلَ بِعِلْمِ اللّٰهِ وَاَنْ لَّآ

اِلٰهَ اِلَّا هُوَ ۚ فَهَلْ اَنْتُمْ مُّسْلِمُوْنَ ۞

توکیا آپ غالباً کچھ وہ باتیں جن کی وحی آپ کی طرف اللہ سبحانہ کی جانب سے کی جا رہی ہے چھوڑ دیں گے۔ اور کیا آپ جی میں تنگ ہوں گے۔ صرف اس لیے کہ کہنے والے کہہ رہے ہیں کہ اس پیغمبر پر خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ یا اس کی ہمرکابی میں فرشتہ کیوں نہیں آیا، یاد رکھیئے کہ آپ صرف لوگوں کو اعمال کے نتائج سے خبردار کرنے والے ہیں۔ ذمہ داری آپ کی نہیں، وہ تو اللہ کی ہے (یہاں بلکہ) کیا وہ یہ کہتے ہیں۔ کہ یہ اللہ کی وحی نہیں بلکہ اس

مدعی نبوت کی ساختہ و پرداختہ ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ اگر صورت
حال یہی ہے۔ تو پھر تم بھی اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ
اور اللہ کے سوا جس کو بلا سکتے ہو بلا لو۔ اگر تم سچے ہو۔ مسلمانو!
اگر وہ تمہارا کہا پورا نہ کریں۔ تو جان لو کہ قرآن اللہ کی وحی اور اس کے
علم سے اتارا گیا ہے۔ اور یہ بات بھی جان لو کہ اللہ کے سوا عبادت کے
لائق کوئی نہیں بولو کیا تم سب کہا مانو گے[۱۸]

مفردات کے معانی

ضائق ضاق یضیق سے اسم فاعل ہے۔ مجدالدین فیروزآبادی بصائر ذوی التمیز میں لکھتے ہیں ضیق وسعت وکشادگی کی ضد ہے۔ مکان کی تنگی کے لیے ضاق المکان بولا جاتا ہے۔ اسی سے تضایق اور تضیق آتے ہیں۔ ضیق بالکسر اور بالفتح اور ضیقۃ فقیر، رنج وغم، اور بخل کے معنے میں استعمال ہوتے ہیں اور امام راغب اصفہانی مفردات القرآن میں لکھتے ہیں، ضیق، ضَیق اور ضیقۃ کا استعمال فقر، بخل اور غم اور اسی قسم کے معنوں میں ہوتا ہے۔ ضاق بھم ذرعًا ان سے تنگ ہو گیا۔ ضائق بہ صدرک، تیرا جی اس سے تنگ ہو رہا ہے۔ یعنی تو غمگین ہو رہا ہے۔ یضیق صدری، میرا جی تنگ ہو رہا ہے مجھے غم ہو رہا ہے۔ ضیقا حرجًا، تنگ اور بے حد تنگ۔ ضاقت علیھم الارض بما رحبت زمین ان پر ساری کشادگیوں کے باوجود تنگ ہو گئی۔ ضاقت علیھم انفسھم وہ بے حد غمگین ہو گئے۔ لاتک فی ضیق، تنگی میں نہ ہو۔ یہ سب رنج وغم کی تعبیریں ہیں۔

لم یستجیبوا —— یہ مضارع مجزوم کا جمع مذکر غائب ہے۔ اس کا مادہ جوب ہے۔ اس کے معنے قطع کرنے کے آتے ہیں۔ اسی سے جواب ہے چونکہ فضا کو قطع کر کے کہنے والے کے منہ سے سننے والے کے کانوں تک پہنچتا ہے۔ اس لیے جواب کہتے ہیں۔ اسی سے اجابت اور استجابت آتے ہیں۔ دونوں کے معنے ماننے اور قبول کرنے کے ہیں۔ اجیبوا داعی اللہ اللہ کی طرف

دعوت دینے والے کی بات مان لو۔ اور قبول کرلو۔ اوراجیبت دعوتکما تمہاری مانگ مان لی گئی اور قبول ہوگئی ادعونی استجب لکم مجھ سے مانگو میں ضرور قبول کروں گا۔ اوراجیبت الدعوۃ الداع اذا دعان، میں قبول کرتا ہوں دعا کرنے والے کی دعا۔ اصل معنے دونوں کے جواب دینے کے ہیں۔ اسی سے ان کے معنے ماننے اور قبول کرنے کے ہوگئے، مگر استجابت میں بہ نسبت اجابت کے ذرا زور اور تاکید ہے استفعال کا سین طلب کے لیے نہیں تاکید کے لیے ہے۔

ناسازگار حالات میں داعی کو تسلی

فا، تفریع کے لیے ہے۔ یہ تفریع ان حالات کی نشاندہی کررہی ہے جن حالات میں یہ بات فرمائی گئی ہے۔ سرزمین مکہ ایک ایسے قبیلہ کے صدر مقام ہے۔ جو تمام عرب پر اپنے مذہبی اقتدار اپنی دولت و تجارت اور اپنے سیاسی دبدبے کی وجہ سے چھایا ہوا ہے۔ عین اس حالت میں جبکہ یہ لوگ اپنے انتہائی عروج پر ہیں۔ اس بستی میں ایک شخص اُٹھ کر علی الاعلان کہتا ہے کہ جس نظام عبادت کی تم امامت کررہے ہو۔ وہ سراسر گمراہی ہے۔ جس نظام تمدن کے تم سردار ہو وہ بالکل بودا ہے۔ اللہ کا عذاب تمہارے کردار کے نتیجے میں تم پر آنے والا ہے۔ اور تم اس کی گرفت سے کسی بھی تدبیر سے بچ نہیں سکتے، بچنے کی صورت ایک ہی صورت ہے کہ اس نظام صالح کو قبول کرلو۔ جو میں اللہ سبحانہ کی طرف سے لے کر آیا ہوں۔ اس شخص کے پاس اس کی پاک سیرت اور اس کی معقول باتوں کے علاوہ کوئی ایسی غیر معمولی چیز نہیں ہے جس سے عام لوگ اسے اللہ کا فرستادہ سمجھیں۔ اور گردوپیش کے حالات میں بھی مذہب واخلاق اور تمدن کی گہری بنیادی خرابیوں کے سوا کوئی ایسی ظاہری علامت نہیں ہے۔ جو نزول عذاب کی نشاندہی کررہی ہو۔ بلکہ اس کے برعکس تمام نمایاں علامتیں بھی ظاہر کرتی ہیں کہ ان لوگوں پر اللہ سبحانہ کا اور ان کے عقیدے کے مطابق ان کے دیوتاؤں کا بڑا فضل ہے۔ اور جو کچھ وہ کررہے ہیں ٹھیک کررہے ہیں۔ ایسے حالات میں یہ بات کہنے کا نتیجہ یہ ہوتا ہے۔ اور اس کا سوا کچھ ہو ہی نہیں سکتا کہ چند نہایت صحیح الدماغ اور حقیقت رس لوگوں کے سوا پوری کی پوری آبادی اس کے پیچھے پڑجاتی ہے۔ کوئی متعصبانہ ظلم وستم سے دبانا چاہتا ہے کوئی جھوٹے الزامات اور اوچھے اعتراضات لے کر اس کے منہ آتا ہے۔ کوئی شخصیات بے رُخی سے اس کی ہمت شکنی کرتا ہے کوئی مذاق اڑا کر آوازے کس کر اور ٹھٹھے لگا کر اس کی باتوں کو ہوا میں اُڑا دینا چاہتا ہے۔ یہ استقبال جو ایک دن یا ایک ہفتہ اور ایک ماہ نہیں کئی سالوں تک اس شخص کی دعوت کا ہوتا ہے۔ جب کچھ دل شکن اور مایوس کن ہوسکتا ہے ظاہر ہے۔ تو بس یہی صورت حال ہے۔ جس میں اللہ سبحانہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی

ہمت بندھانے کے لیے تلقین فرماتا ہے۔ کہ ان کی وجہ سے تمہارے پائے ثبات میں ذرا لغزش نہ آنے پائے۔ جو صداقت تم پر بذریعہ وحی منکشف کی گئی ہے۔ اس کے اظہار و اعلان میں قطعاً کوئی باک نہ ہونا چاہیئے۔ تمہارے خیال میں یہ بات ہرگز نہ آئے۔ کہ فلاں بات کیسے کہوں جبکہ لوگ سنتے ہی اس کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

(۱۷) تو کیا آپ غالباً کچھ وہ باتیں جن کی وحی آپ کی طرف اللہ سبحانہٗ کی جانب سے کی جا رہی ہے۔ چھوڑ دیں گے۔ اور کیا آپ جی میں صرف اس لیے تنگ ہوں گے۔ کہ کہنے والے کہہ رہے ہیں۔ کہ اس پیغمبر پر خزانہ کیوں نہیں اتارا گیا۔ یا اس کی ہمرکابی میں فرشتہ کیوں نہیں آتا۔ یاد رکھیئے کہ آپ صرف لوگوں کو ان کے اعمال کے نتائج سے خبردار کرنے والے ہیں۔ ذمہ داری آپ کی نہیں وہ تو اللہ کی ہے۔ مشرکین شرک و بت پرستی کی تردید سے بہت غیظ کھاتے تھے۔ مشرکانہ خرافات پر جس قدر ان کی تحقیق اور تجہیل کی جاتی۔ اس قدر ان کے غصے کی آگ بھڑکتی تھی۔ کبھی کوشش کرتے تھے کہ آپ کو اس معاملے میں ذرا ڈھیلا کر دیں۔ اور اس سب سے بڑے اور بنیادی مسئلہ کی تبلیغ میں نرمی اور تساہل برتنے پر آمادہ کریں۔ جب ادھر سے مایوس ہوتے۔ تو محض دق کرنے کو عجیب بیہودہ فرمائشیں کرنے لگتے۔ مثلاً یہ ہے کہ آپ سچے ہیں اور منصب رسالت پر مامور ہو کر آئے ہیں۔ تو آپ کے ساتھ اللہ سبحانہٗ کے یہاں سے مال و دولت کا بڑا خزانہ آنا چاہیئے تھا یا آسمان سے ایک فرشتہ آتا جو آپ کے ہمراہ تصدیق کے لیے ہر طرف جاتا گویا جب آپکے منوانے کے لیے نہ مادی طاقت ساتھ ہے نہ روحانی پھر ہم کس طرح تسلیم کر سکتے ہیں۔ آپ ان بیہودہ فرمائشوں سے سخت مغموم اور دل گیر ہوتے تھے۔ ممکن ہے کبھی ایسا خیال بھی آتا ہو کہ ان کے معبودوں کے معاملہ میں اگر خدا کی جانب سے اس قدر سختی اختیار کرنے کا حکم نہ رہے۔ تردید کی جائے مگر فی الحال نرمی اور رواداری کے ساتھ تو شاید زیادہ مفید اور مؤثر ہو۔ یا جو فرمائشیں یہ لوگ کرتے ہیں ان کی ضد بھی کسی حد تک پوری کر دی جائے۔ تو کیا عجب ہے کہ مسلمان ہو جائیں بہر حال وہ ایسا نازک اور پُرخطر وقت تھا۔ کہ پوری دنیا باطل پرستی کے شور سے گونج رہی تھی۔ صرف ایک مقدس ہستی تھی جس کے حلقوم سے حق کی آواز نکل کر باطل کے قلعوں میں زلزلہ ڈال رہی تھی۔ آپ چاروں طرف سے موذی دشمنوں کے نرغے میں گھر رہے تھے کوئی جھٹلاتا کوئی طعن کرتا کوئی مذاق اڑاتا۔ اس ماحول کا تصور اور اس مبلغ اعظم کی قوت قلب اور ہمت مردانہ کا اندازہ لگاؤ جس کا تمام تر اعتماد و اتکال ظاہری اسباب سے ہٹ کر اللہ سبحانہٗ کے وعدوں پر تھا۔ آپ جب محزون و دلگیر ہوتے تو صرف اپنے پروردگار کی آواز سے ہی تسلی پاتے۔ اور دنیا کے مقابلے میں تازہ دم ہو کر کھڑے ہو جاتے تھے۔ اسی سلسلے میں یہ آیات نازل ہوئیں جن کا حاصل یہ ہے۔ کہ

ان لوگوں کی بیہودہ خرافات اور فرمائشوں کی وجہ سے اس قدر فکرمند اور غمگین نہ ہوں نہ اپنے دل میں ان لوگوں کی مراعات کا خیال لائیں۔ کہیں ایسا ہوسکتا ہے۔ کہ وحی الٰہی نے جو چیزیں آپ کو سکھلائی ہیں اور جس بے خوف وخطر تبلیغ کا آپ کو حکم دیا ہے۔ اس کے کچھ حصے کو ان لوگوں کی خرافات سے تنگ دل ہو کر چھوڑ بیٹھیں۔ جب یہ نہیں ہوسکتا کیونکہ پیغمبرانہ عصمت اور اولوالعزمی مانع ہے۔ تو تنگ دل ہونے سے کیا فائدہ؟ آپ کا کام صرف بھلے برے سے آگاہ کردینا۔ ان کی ہدایت کی ذمہ داری آپ پر نہیں اللہ سبحانہ جس کے سپرد ہر چیز ہے۔ ان کا معاملہ بھی اسی کے سپرد کیجئے۔ اور صبر واستقامت کے ساتھ فرائض تبلیغ کی انجام دہی میں ثابت قدم رہیئے۔[1]

یہ ہیں حضرت شیخ الاسلام کے افادات۔ آیئے دوسرے شارحین قرآن نے جو یہاں دا تشریح دی ہے۔ اس سے بھی استفادہ کرلیجئے۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔

> اللہ سبحانہ اپنے رسول کو پرشورش حالات کی سنگینی میں جن سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم دعوت کے میدان میں دوچار تھے۔ تسلی دیتے ہوئے فرماتے ہیں۔ کہ ان مخالفین کی باتوں سے آپ کو غمگین نہ ہونا چاہیئے۔ اور نہ ان کی یہ باتیں دعوت میں رکاوٹ ہونی چاہئیں شب و روز آپ کا دعوت کا کام جاری رہنا چاہیئے۔ آپ تو اللہ کی جانب سے انذار کا فرض انجام دینے کے لیے آئے ہیں۔ آپ سے پہلے آپ کی برادری کے ساتھ بھی یہی سلوک ہوا ہے۔ ان کی تکذیب کی گئی۔ ان کو تکلیفوں سے دوچار رہنا پڑا۔ بالآخر اللہ کی مدد آگئی۔

حافظ ابن جریرؒ فرماتے ہیں۔

> اللہ سبحانہ اپنے رسول سے فرما رہے ہیں۔ کہ کیا آپ کچھ وہ باتیں جن کی تبلیغ کا حکم آپ کو ہوا ہے چھوڑ دیں گے۔ اور کیا آپ اس لیے سنجیدہ ہو رہے ہیں۔ کہ لوگ کہہ رہے ہیں۔ کہ اس کے پاس خزانہ کیوں نہیں۔ یا اس کے ساتھ فرشتے کیوں نہیں آپ کا کام پیغام الٰہی لوگوں تک پہنچانا ہے کیونکہ آپ اللہ کی جانب سے نذیر ہیں۔ آپ کا کام ڈرانا ہے۔ ان کا آیات کا مطالبہ پورا کرنا آپ کا کام نہیں۔ یہ اللہ کا

---

[1] افادات از شیخ الاسلام

کام ہے جب چاہے گا نزول آیات فرمائے گا۔

یہ تو ہیں ارباب تفسیر، آیئے ارباب تاویل کی زبانی بھی آیت کی کہانی سن لیجئے۔ کہ ان کے انداز تشریح کیا کہتے ہیں۔ علامہ زمخشریؒ لکھتے ہیں۔

منکرین حق عناد کی وجہ سے آیات کا مطالبہ کرتے تھے۔ ان کا پیش نہاد راہ حق کی تلاش نہیں تھا۔ اگر راہ حق کی تلاش ان کے پیش نظر ہوتی۔ تو اس کے لیے ایک ہی معجزہ کافی ہوتا قرآنی اعجاز ان کے سامنے تھا۔ اور اس کے علاوہ اور بھی آیات کو وہ کھلی آنکھوں سے دیکھ چکے تھے۔ مگر اس کے باوجود ان کا مطالبہ تھا۔ لولا انزل علیہ کنز او جاء معہ ملک، قلب مبارک ان کے اس رویہ سے غمگین تھا کہ دعوت کو صرف قبول ہی نہیں کرتے بلکہ کھلم کھلا مذاق اڑا رہے ہیں۔ اس موقع پر اللہ سبحانہ نے فرض رسالت ادا کرنے کی تلقین کی اور بتایا کہ ان کے مذاق استہزاء، اور آیات کے مطالبہ کو نظر انداز کر دیجئے۔ اور اپنا وہ فرض ادا کیجئے جس کے لیے آپ کو روانہ کیا گیا ہے۔ اس کے باوجود اگر نہیں مانتے تو آپ پر ان کی ذمہ داری نہیں۔ معاملہ کو اللہ کے سپرد کیجئے۔

اسی کی تائید میں علامہ طیبیؒ نے الکشف میں یہ انکشاف کیا ہے جیسے علامہ آلوسیؒ نے روح میں نقل کیا ہے

اگر آیت پر پورا غور کرو گے۔ تو یہ حقیقت تمہارے سامنے کھل کر آجائے گی کہ سورت کا موضوع حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو طریق دعوت بتانا ہے۔ آغاز سورت سے انجام تک یہی انداز ہے۔ اس راہ میں آپ کو جو دشواریاں پیش آرہی ہیں ان کو ظاہر کیا جا رہا ہے۔ تسلی کا اس سے دور کا بھی تعلق نہیں۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دعوت کے سلسلے میں جو حالات پیش آرہے تھے بتایا ہے کہ لوگوں کی باتوں سے دل تنگ نہ ہو جایئے اور اعلان حق میں ذرا بھی تامل نہ کیجئے کیونکہ تم صرف نذیر ہو۔ ان پر نگہبان بنا کر نہیں روانہ کیے گئے ہو کہ ان کے مان لینے کی ذمہ داری بھی تم پر ہو۔ تدبیر کی حیثیت پر زور دے کر یہ بات بھی واضح کر دی کہ نبی و رسول اس لیے نہیں آتے۔ کہ خزانے بانٹتے پھریں یا طرح طرح کے عجائبات دکھائیں۔ ان کا کام صرف یہ ہونا چاہیئے کہ انکار و بدعملی کے نتائج سے خبردار کر دیں۔ اور سچائی کی راہ دکھائیں۔

دراصل آیت کا روئے سخن نبوت کے مخاطبوں کی طرف ہے۔ اور ان کی نبوت کے بارے میں غلطیوں کی اصلاح ہے۔ قرآن ان کو سمجھا رہا ہے۔ کہ نبوت اور معجزات میں کوئی تلازم نہیں۔ اور یہ آثار و

دلائل اصل نبوت سے خارج ہیں۔ نبوت کے اصل لوازم وحی، مخاطبہ الٰہی، تزکیہ، انذار اور تعلیم ہے۔ اسی لیے جب بھی معاندین نے معجزہ کا مطالبہ کیا ہے۔ تو اللہ سبحانہ نے اکثر اس کے جواب میں نبوت کی اصل حقیقت کی طرف متوجہ کیا ہے۔ اسی لیے محققین نے لعل کو ترجی کے لیے مان کر توقع کا مرکز مخاطبوں کو بتایا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے۔ کہ

ان کے سامنے دعوت پیش کرنے میں آپ اس قدر جان تیج کر چکے ہیں کہ اب آپ کے مخاطب آپ سے کچھ باتوں میں ترکِ تبلیغ کی توقع رکھتے ہیں۔ (عنایۃ القاضی)

اس لیے بنیادی بات نبوت کے بارے میں لوگوں کے ذہن کی اصلاح ہے چونکہ عام ذہن انبیاء کے بارے میں یہ تھا۔ کہ وہ براہ راست عالم کائنات میں تصرف پر قادر ہیں۔ اسی ذہنی تحفظ کی وجہ سے وہ مطالبہ کرتے تھے کہ لولا انزل علیہ کنز او جاء معہ ملک۔ قرآن نے یہاں اجمالاً اور دوسری آیات میں تفصیل سے بتایا ہے۔ کہ معجزات اور نشانات پیغمبر کی قوت اور ارادے سے نہیں۔ بلکہ اللہ سبحانہ کی قدرت اور مشیت سے ہوتے ہیں۔ اگر ان کے مطالبے پر آسمان سے خزانہ آجاتا یا فرشتہ آپ کی ہمرکابی اختیار کر لیتا تو دو صورتوں میں سے ایک صورت ضرور پیش آجاتی۔ بدعقیدگی سے دب جاتے تو کہہ دیتے کہ جادوگر ہے۔ اور اگر عقیدت کا اظہار کرتے تو آپ کو مافوق البشر مان لیتے۔ دونوں باتیں منشاءِ الٰہی کے خلاف ہوتیں۔ اس لیے سرے سے ان کے اس جاہلانہ مطالبے کو رد کر دیا۔ اور مطالبہ کی شناعت اور رکاکت کی وجہ سے ان کو قابل خطاب نہیں سمجھا۔ بلکہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے ان کو سمجھایا کہ چند لوگوں کے ایمان و عدم ایمان کی وجہ سے نفس پیغام و دعوت کے اصول کی بیخ کنی نہیں کی جا سکتی ہے۔ بہر حال آیت قرآنی کا مدعا یہ ہے کہ آپ ان لوگوں کے رویہ سے دل برداشتہ اپنے فرض کی ادائیگی پوری ہمت سے کیجئے۔ اگر آپ کے مخاطب آپ کو رسول ماننے کے لیے یہ شرط لگاتے ہیں کہ آپ کسی خزانے کے مالک ہوں۔ یا کوئی فرشتہ آپ کی رسالت کی گواہی دینے کے لیے آپ کے ساتھ ہو تو ان کے ان احمقانہ مطالبوں کی وجہ سے غمگین نہ ہوں۔ آپ کا کام صرف پیغام پہنچانا ہے۔ منوانا نہیں ہے۔ اگر وہ اس قسم کے احمقانہ مطالبات پیش کر کے حقیقت سے روگردانی کرنا چاہتے ہیں تو معاملہ کو اللہ کے حوالہ فرمائیے۔ یہاں علامہ جمال الدین قاسمی نے محاسن التاویل میں علامہ قاشانی سے یہ بات بہت خوب لکھی ہے کہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخاطبوں نے دعوت قبول کرنے کی جگہ دعوت کا استہزاء اور عناد سے مقابلہ کیا۔ اور آپ کے سامنے غلط مطالبات رکھ دیئے۔ اس سے آپ کو انقباض ہوا اور دعوت پیش کرنے میں انبساطی حالت نہ رہی کیونکہ سامعین

کی بات کو سننا متکلم میں نشاط اور امنگ پیدا کرتا ہے۔ اور جب متکلم کو محسوس ہوتا ہے کہ ذہن میں صلاحیت نہیں ہے تو اس کا بات کرنے کو جی نہیں چاہتا اس پر ایک بے چینی کی کیفیت طاری ہو جاتی ہے۔ اس موقعہ پر اللہ سبحانہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ کہہ کر دلیری دی کہ آپ تو نذیر ہیں۔ انذار کیجئے اس کے دو گونہ فائدے ہیں۔ مان لیں گے اور نہیں مانیں گے تو ان پر حجت تمام ہو جائے گی۔ اتمام حجت کے بعد یہ لوگ ملزم ہوں گے ملزم کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔

(۱۸) اعجاز قرآن کا انکار

ہاں کیا وہ یہ کہتے کہ یہ اللہ کی وحی نہیں ہے۔ بلکہ اس مدعی نبوت کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ آپ فرما دیجئے کہ اگر صورت حال یہی ہے تو پھر تم بھی اس جیسی دس سورتیں گھڑی ہوئی لے آؤ۔ اور اللہ کے سوا جن کو بلا سکتے ہو۔ بلا لو۔ اگر تم سچے ہو۔ مسلمانو! اگر وہ تمہارا کہا پورا نہ کریں تو جان لو کہ قرآن اللہ کی وحی اور اس کے علم سے اتارا گیا ہے۔ اور یہ بات بھی جان لو کہ اللہ کے سوا عبادت کے کوئی لائق نہیں ہے۔ بولو کیا تم سب فرماں بردار بنو گے۔ یعنی فرمائشی معجزات طلب کرتے ہیں جن کا دیا جانا مصلحت نہیں ہے۔ اور یہ جو سب سے بڑا معجزہ قرآن ان کے سامنے ہے۔ اسے مانتے نہیں۔ کہتے ہیں کہ یہ تو معاذ اللہ تمہاری بنائی ہوئی گھڑنت ہے۔ اس کا جواب دیا کہ تم بھی آخر عرب ہو فصاحت و بلاغت کا دعویٰ رکھتے ہو سب مل کر ایسی ہی دس سورتیں گھڑ کر پیش کر دو اور اس کام میں مدد دینے کے لیے ساری مخلوق کو بلکہ ان معبودوں کو بھی بلا لو جنہیں خدائی میں شریک سمجھتے ہو اگر نہ کر سکو اور کبھی نہ کر سکو گے تو سمجھ لو کہ ایسا کلام خالق ہی کا ہو سکتا ہے۔ جن کا مثل لانے سے تمام مخلوق عاجز رہ جائے۔ تو یقیناً یہ وہ کلام ہے جو اللہ سبحانہ نے اپنے علم کامل سے پیغمبر پر اتارا ہے۔ بے شک جس کے کلام کا مثل نہیں ہو سکتا اس کی ذات و صفات میں کیسے شریک ہو سکتا ہے۔ ایسا بے مثال کلام اُسی بے مثال خدا کا ہے۔ جس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ کیا ایسے واضح دلائل کے باوجود مسلمان ہونے اور اللہ سبحانہ کا حکم بردار بننے میں کسی چیز کا انتظار ہے۔[۱]

قرآن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا سب سے بڑا معجزہ ہے۔ خود قرآن ہی نے بتایا ہے کہ

---

[۱] افادات از شیخ الاسلام

قرآن حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کو بارگاہ الٰہی سے معجزہ عطا ہوا ہے۔ اہل مکہ نے جب معجزے کا مطالبہ کیا۔ تو اللہ سبحانہٗ نے ان کے اس مطالبہ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا۔

اولم یکفھم انا انزلنا علیک الکتاب یتلی علیھم

کیا ان کو یہ معجزہ کافی نہیں ہے۔ کہ ہم نے آپ پر وہ کتاب اتاری جو ان کو پڑھ کر سنائی جاتی ہے۔

خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی دوسرے نبیوں کے معجزات کے مقابلے میں اپنی اسی آسمانی وحی کو سب سے بڑا معجزہ قرار دیا ہے۔ انبیاء میں سے ہر نبی کو اللہ سبحانہٗ نے اس قدر معجزات دیئے ہیں۔ جن کو دیکھ کر لوگ ایمان لائے ہیں۔ لیکن جو معجزہ مجھے مرحمت ہوا ہے وہ قرآن ہے۔ جو مجھے بذریعہ وحی عطا کیا گیا ہے۔ اس لیے مجھے اُمید ہے کہ روزِ قیامت میرے پیروؤں کی تعداد سب سے زیادہ ہو گی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ہر نبی کو معجزہ عطا ہوا ہے۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو معجزہ قرآن ملا ہے۔ دونوں میں فرق ہے۔ اول سب نبیوں کے معجزات عملی تھے۔ جبکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ علمی تھا۔ دوسرے سب نبیوں کے معجزات وقتی اور عارضی تھے۔ لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ علم یعنی قرآن عزیز قیامت تک دنیا قائم اور باقی رہے گا۔ تیسرے چونکہ دوسرے انبیاء کے معجزے وقتی اور عارضی تھے۔ اس لیے ان سے جو اثر پیدا ہوا وہ بھی وقتی اور عارضی تھا۔ برخلاف اس کے قرآن مجید چونکہ ہمیشہ دنیا میں قائم رہنے والا ہے۔ اس لیے اس کا اثر بھی دائمی اور ہمیشہ باقی رہنے والا ہے۔

چوتھے یہ کہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے معجزات میں سے صرف قرآن کا معجزہ ایک ایسا معجزہ ہے جس کی اللہ سبحانہٗ نے کائنات کو تحدی کی ہے۔ اور اعلان عام کیا ہے۔ کہ کوئی اس کی مثال پیش کرے۔ اور پھر خود ہی یہ پیشن گوئی بھی کر دی ہے۔ کہ پوری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے ہمیشہ عاجز رہے گی۔

اس موقعہ پر سید سلیمان ندوی رحمۃ اللہ نے جو فکر انگیز بات لکھی ہے۔ وہ اس لائق ہے کہ اسے جی لگا کر پڑھا جائے۔

غور کیجئے کہ ایک اُمی شخص جو اُمیوں ہی کی گودوں میں پلا اور پل کر جوان ہوا۔ اس نے ہوش

سنبھالا تو گردوپیش میں تاریکیوں اور ظلمتوں کے سوا اس کو کچھ نظر نہ آیا۔ علوم وفنون اور تہذیب وتمدن سے ایک عاری ملک، عاری شہر اور عاری خاندان کے اندر نشوونما پائی۔ جہاں اہل فکر اور ارباب علم کا وجود نہ تھا۔ وہ خود اس کا خاندان اور اس کا وطن نوشت وخواند کے نقوش وحروف سے ناآشنا تھا۔ گزشتہ صحف انبیار اور افکار عالیہ کا ایک حرف بھی اس کے کان میں کبھی نہیں پڑا۔ علمار اور دانشوروں کی صحبت اس نے نہیں اپنائی۔ اصول، قانون، مبادئ، اخلاق، محاسن اعمال کی کوئی ظاہری تعلیم اس کو نہیں ملی بلکہ مدرسہ علم وحکمت کے سایہ دیوار تک کبھی اس کا گزر نہیں ہوا۔ اور اسی طرح وہ اپنی زندگی کے چالیس دور پورے کرتا ہے۔ کہ دفعتہً غارِ حرا سے نکل کر علوم وفنون اور تہذیب وتمدن کا سرچشمہ بن جاتا ہے ظاہری نوشت وخواند کے نقوش وحروف کا طلسم ٹوٹ جاتا ہے۔ صحف انبیار اور افکار عالیہ کے اوراق اس کی زبان پر جاری ہوجاتے ہیں۔ اصول قانون، مبادی اخلاق اور محاسن علم وعمل کی تعلیم کا غلغلہ اس کی بزم کے گوشہ گوشہ سے بلند ہوتا ہے۔ کلام ربانی کے پردہ میں علم وحکمت کے پوشیدہ اسرار فاش ہونے لگتے ہیں۔ اس سے زیادہ اعجاز قرآن کی اور کیا دلیل ہوسکتی ہے؟

دنیا میں صرف قرآن ہے۔ جو قانون وشریعت بھی ہے۔ اور اخلاق وموعظت بھی، مخاطبات قلبی اور دعاؤں کا گنجینہ بھی ہے۔ اور دیگر کتب اربعہ کی صفات کا حامل بھی ہے۔ خطابت بھی ہے۔ اور استدلال وفکر بھی، اظہار غیب اور پیشین گوئیوں سے لبریز بھی ہے۔ اور حکمت وسزا ایمان وعمل سے معمور بھی اور ان سب کے ساتھ عین اس وقت جب اور کتب الٰہی تحریف وتفسیر اور تراجم وتعبیر سے اپنی اصلی زبان اور اصلی الفاظ کھو چکے ہیں۔ اس کی بقا وحفاظت کی یہ ذمہ داری کہ تیرہ سو برس بعد بھی اس کے ایک ایک لفظ، ایک ایک حرف، ایک ایک نقطہ میں تغیر وتبدل نے راہ نہیں پائی وہ اپنی زندگی جاوید کے لیے کاغذ کے نقوش وحروف کا محتاج نہیں۔ کہ لاکھوں انسانوں کے سینے اس خزانے کے صندوق ہیں وہ اسی زبان، انہی الفاظ اور انہی حروف کے قالب میں اب تک جلوہ گر ہے۔ جس میں دست قدرت نے اسے ڈھالا تھا۔ اور جبرئیل امین عؑ نے اسے اتارا تھا۔ اور محمد عربی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو امت کے ہاتھوں میں سونپا تھا۔ کیا یہ اعجاز نہیں ہے؟

یہ بات بھی سوچنے کی ہے۔ کہ قرآن عزیز اپنی تعلیمات اور معانی کے ساتھ اپنے الفاظ، کلمات اور عبارت میں بھی معجزہ ہے۔ اور اس کی فصاحت وبلاغت کے معجزانہ کمال کی کوئی دوسری آسمانی کتاب حریف نہیں بن سکتی ہے۔ کیونکہ دوسری آسمانی کتابیں اپنے الفاظ کے لحاظ سے نہیں بلکہ اپنے معانی کے لحاظ سے وحی ہیں چنانچہ نہ خود ان کتابوں کو اور نہ ان کتابوں کے ماننے والوں کو اس

کا دعویٰ ہے۔ اور نہ کبھی انہوں نے اپنی کتابوں کو کلام وعبادت کے لحاظ سے معجز کہا ہے۔ اسی لیے یہ نہ وہ اصل الفاظ اور جس کے قالب میں وحی موسوی تورات اور عیسوی انجیل نے ظہور کیا تھا۔ مدت ہوئی کہ دنیا ان سے محروم ہوگئی۔ تورات کی اصل زبان عبرانی زبان تھی۔ وہ بخت نصر کی آگ کی نذر ہوگئی۔ اور اس نے آرامی اور سُریانی زبانوں کا قالب اختیار کر لیا۔ اور آخر صدہا سال کے بعد حضرت عزیرؑ نے پھر اس کو عبرانی زبان میں منتقل کیا۔ انجیل کے متعلق ابھی تک یہ فیصلہ نہیں ہوا کہ اس کی اصل زبان کیا تھی۔ اور انجیل پہلے پہل کس زبان میں لکھی گئی تھی۔ انجیل کی سب سے قدیم زبان یونانی زبان ہے مگر ظاہر ہے یہ وہ یونانی نہیں جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام فلسطین میں بولتے تھے۔ ایسی حالت میں ان کتابوں کی فصاحت و بلاغت کے اعجاز اور اس کے منجانب اللہ ہونے کا کیسے دعویٰ ہو سکتا ہے۔ برخلاف اس کے کہ دنیا میں وحی محمدی صلی اللہ علیہ وسلم سب سے پہلی اور سب سے آخری کتاب ہے جس نے اس حیثیت سے اپنے اعجاز کا دعویٰ کیا ہے۔ چنانچہ قرآن عزیز کا حرف حرف اور لفظ لفظ وحی ہے اور وہ بھی جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے ادا ہوا۔ وہ ہر قسم کی تحریف و تغیر سے پاک ہے۔ اس لیے اس کے الفاظ، کلمات اور عبارات تک معجزہ ہیں۔ اور اس وصف میں دنیا کی کوئی آسمانی کتاب اس کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔[1]

بہرحال قرآن عزیز نبوت محمدیہ کا معجزہ ہے۔ اور معجزہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ یہ دعویٰ نبوت کی دلیل ہے۔ مخالفوں کے سامنے یہ دلیل اس طرح پیش کی گئی ہے کہ میں اللہ کا نبی ہوں۔ اور یہ میرے پاس اللہ کی کتاب ہے۔ یہ میری ساختہ و پرداختہ نہیں بلکہ وحی کے ذریعے اللہ کی روانہ کردہ ہے یہ میرا علم نہیں بلکہ تمہارا اپنا علم ہے۔ اور تم اللہ پر جھوٹا الزام لگا رہے ہو۔ ام یقولون افترٰہ یعنی وہ صرف خزانہ ہونے اور فرشتہ کی ہمرکابی ہی کا معجزہ طلب نہیں کر رہے۔ بلکہ وہ تو اعجاز قرآن کا بھی یہ کہہ کر انکار کر رہے ہیں کہ یہ اللہ سبحانہٗ کا کلام نہیں اس شخص نے قرآن کو اللہ کا کلام کہہ کر اللہ پر بہتان باندھا ہے۔ یہ تو خود اسی کا ساختہ و پرداختہ ہے۔ یہ انداز تعبیر اظہار تعجب کے لیے ہے کیونکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ساختہ و پرداختہ بتانا ایک نہایت عجیب بات ہے۔ بالخصوص ان لوگوں کی جانب سے جو عربی ہونے میں، عربی زبان میں، وطن اور زمانہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ کے ہم وطن ہم زبان اور ہم زمانہ ہوں بلکہ کتابت، قرأت، شعر گوئی، خطابت اور انداز سخن میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم

---

[1] سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم

سے زیادہ ہوں۔ ان کی زبان پر اس بات کا آنا بڑا ہی عجیب ہے۔ اس لیے فرمایا کہ اگر صورت حال یہی ہے کہ قرآن اللہ سبحانہ کی وحی نہیں ہے۔ بلکہ میری گھڑنت ہے۔ تو ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ اس کا فیصلہ خود تمہارے ہاتھ میں ہے۔ آؤ تم بھی فاتوا بعشر سور مثلہ مفتریات دس سورتیں گھڑ کے لے آؤ۔ دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔

یہ تحدی قرآن میں ایک طرح نہیں کئی طرح ہوئی ہے۔

سب سے پہلے مکہ میں سورۃ الاسرا میں یہ تحدی پورے قرآن کے بارے میں ہے۔

قل لئن اجتمعت الانس والجن علی ان یأتوا بمثل ھذا القرآن لا یاتون بمثلہ ولوکان بعضھم لبعض ظھیرا

آپ اعلان کر دیجئے کہ اگر انسان اور جن سب چاہیں کہ اس قرآن کی مانند کوئی کلام پیش کریں تو کبھی پیش نہ کر سکیں گے۔ اگرچہ باہم ایک دوسرے کی مدد کریں۔

یہ سورت مکی ہے۔ اس کے آغاز میں اسرار کا واقعہ ہے۔ اس پر تو سب کا اتفاق ہے کہ واقعہ معراج ہجرت سے پہلے پیش آیا۔ لیکن آغاز وحی کے بعد کس حال میں پیش آیا۔ اس کے بارے میں حتماً کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ عرب میں اسلام سے قبل تاریخ اور تدوین کا کوئی وجود نہ تھا۔ ہجرت سے ایک، دو، تین، چار یا پانچ سال پہلے پیش آیا۔ امام بخاری نے الجامع الصحیح میں اگرچہ کوئی تاریخ نہیں بتائی لیکن ترتیب میں بیعت عقبہ سے متصلاً پہلے واقعہ معراج کو بیان کیا ہے۔ اور سب جانتے ہیں۔ کہ بیعت عقبہ پہلے اعلان نبوت سے گیارہویں سال اور دوسری بارہویں سال ہوئی۔ ظاہر ہے کہ معراج اس سے پہلے ہوا۔ اور سورۃ الاسرار نزول معراج کے بعد ہوا۔ اس میں منکرین حق کے سامنے قرآن کے بارے میں یہ تحدی پیش کی گئی۔ کہ قرآن وہ عظیم کتاب ہے۔ کہ اس کی مثال پر جن وانس کی مجموعی قوت بھی قادر نہیں ہے۔

پھر مکی زندگی میں سورہ ہود نازل ہوئی۔ اس میں پورے قرآن سے ہٹ کر دس سورتوں کی تحدی پیش کی گئی۔ فأتوا بعشر سور مثلہ۔

اس کے بعد مکی زندگی ہی میں سورہ یونس نازل ہوئی زمانہ نزول کے بارے میں روایت تو کوئی نہیں ملی ہے۔ مگر سورۃ کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ مکی زندگی کے آخری دور میں نازل ہوئی ہے۔ اس میں دس سورتوں سے ہٹ کر ایک سورۃ کی تحدی پیش کی گئی ہے۔

اس کے بعد سورہ طور میں اس سے کم تر درجہ کی آخری تحدی ہے جو اہل مکہ کے سامنے آئی وہ یہ ہے فلیأتوا بحدیث مثلہ

پھر اس کے بعد بقرہ میں اس تحدی کو مدنی زندگی میں پوری قوت سے مشرکین، یہود اور عیسائیوں کے سامنے دہرایا گیا۔ اور پیشین گوئی کی گئی ہے۔ کہ اس کا جواب ممکن ہی نہیں ہے۔ فان لم تفعلوا ولن تفعلوا۔ اور یہ ہے بھی یہ عقلی بات۔ کیونکہ اگر خالق ایک ہے اور رب ایک ہے تو جیسے تکوین و تخلیق میں پوری انسانیت مل کر ایک مکھی نہیں بنا سکتی تو تشریع میں اس کتاب جیسی کتاب بھی نہیں ہو سکتی ہے۔

فرمایا کہ اگر تمہارا خیال ہے کہ یہ قرآن اللہ سبحانہ کی وحی نہیں ہے۔ بلکہ میری بنائی ہوئی ہے۔ تو اس جیسی تم بھی صرف دس بنا کر لے آؤ۔ اور وادعوا من استطعتم من دون اللہ۔ اللہ سے ورے جن کو اس معاملہ میں اپنی امداد کے لیے بلا سکتے ہو بلا لو ان کنتم صادقین اگر تم اپنے اس دعوے میں صداقت رکھتے ہو۔ کہ یہ میری ساختہ و پرداختہ ہے اس کے بعد ارشاد ہے۔ فان لم یستجیبوا لکم۔ یہاں ضمیر مخاطب جمع لے کر آئے ہیں۔ یا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام کی خاطر لائے اور یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ کو اور صحابہ کرام کو مخاطب کیا ہے۔ کہ اگر یہ منکرین حق آپ کی بات نہ مانیں۔ اس میں اشارہ ہے۔ کہ مسلمانوں کو اس معاملہ میں نبوت کا ساتھ ایسے ہی دینا چاہیئے جیسے دین کی خاطر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ رہتے ہیں۔ اور یہ بھی بتایا کہ مسلمانوں کا یہ طرز عمل ان کے ایمان میں رسوخ کا فائدہ دے گا۔ اور کچھ نے اس کا مطلب یہ بتایا ہے۔ کہ لم یستجیبوا لکم میں ضمیر غائب کا مرجع وہ ہیں جن کو اس معاملہ میں مدد کے لیے اور ہاتھ بٹانے کے لیے کہا ہے۔ یعنی من استطعتم۔ اس صورت میں منکرین حق مخاطب ہیں اور مقصد یہ ہے کہ اگر وہ لوگ جن کو تم اس کام میں مدد کے لیے بلاؤ گے۔ تمہاری بات کو پذیرائی نہ دیں تو پھر جان لو کہ اللہ سبحانہ کے سوا تمہاری عبادتوں کا مستحق کوئی نہیں اب بتاؤ کیا تم اسلام کو اپناؤ گے۔

آیت قرآنی کی تشریح کا ایک انداز یہ بھی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر تمہارے نزدیک یہ انسانی کلام ہے۔ تو انسان کو ایسے کلام پر قادر ہونا چاہیئے۔ لہذا تمہارا یہ دعویٰ کہ میں نے خود اسے تصنیف کیا ہے صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ تم ایک ایسی کتاب کی دس سورتیں تصنیف کر کے دکھاؤ لیکن اگر چیلنج کے باوجود بھی تم سب مل کر اس کی نظیر نہیں پیش کر سکتے تو میرا یہ دعویٰ یقیناً بالکل صحیح ہے۔ کہ میں اس کتاب کا مصنف نہیں ہوں، بلکہ انما انزل بعلم اللہ۔ اللہ کے علم کی آغوش میں نازل ہوئی ہے۔ اور میری یہ دعوت بھی بالکل درست ہے کہ لا الہ الا ھو۔ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے۔ ان باتوں کے واضح ہو جانے کے بعد اب فیصلہ تمہارے ہاتھ میں ہے۔ بتاؤ کیا اس امر واقعی

کے سامنے سر تسلیم خم کرتے ہو۔

پوری آیت پر ایک جامع نظر

آیئے اب پوری آیت پر ایک جامع نظر ڈال لیجئے۔ کیا آپ حالات کی پُر آشوبی و سنگینی کی وجہ سے منکرین کی طرح اس توقع کو پورا کریں گے کہ قرآن کے کچھ حصے کو چھوڑ دیں گے۔ پھر کیا آپ اس لیے غمگین اور فکرمند ہیں کہ آپ کے مخاطب آپ سے مطالبہ کر رہے ہیں کہ آپ کے پاس خزانہ ہو یا آپ کے ساتھ فرشتہ ہو تو یاد رکھیئے کہ آپ اللہ کی جانب سے صرف نذیر بن کر آئے ہیں۔ یعنی آپ کا کام ان کو ان کے اعمال کے نتائج سے خبردار کرنا ہے۔ یا آپ اس لیے غمگین ہیں کہ وہ قرآن کو اللہ کی وحی نہیں مانتے ہیں۔ اور کہہ رہے ہیں کہ یہ تو آپ کی ساختہ و پرداختہ ہے۔ اگر غم یہ ہے تو اس کا علاج یہ ہے۔ کہ آپ ان کے دفاع کی فکر نہ کیجئے۔ بلکہ ایک حملہ آور کی حیثیت سے ان سے مطالبہ کیجئے۔ فأتوا بعشر سور مثلہ مفتریات کہ اس جیسی دس سورتیں بنا کر لے آؤ یعنی اگر میں نے بنائی ہے تو تم بھی بنا کر لے آؤ اور اس معاملہ میں جن کو مدد کے لیے بلا سکتے ہو۔ بلا لو۔ اگر وہ آپ کے مطالبہ کو پورا نہ کریں گے تو نتیجہ میں دو یا تین کہہ کر سامنے آجائیں گے۔ اول یہ کہ کتاب علم الٰہی ہے۔ اور جب علم الٰہی ہے تو آپ کی رسالت ہی برحق نہیں، بلکہ رسالت کی دعوت ان لا تعبدوا الا اللہ۔ یہی ایک واقعہ اور حقیقت ہے۔

مَنْ كَانَ يُرِيْدُ

الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا نُوَفِّ اِلَيْهِمْ اَعْمَالَهُمْ فِيْهَا وَهُمْ فِيْهَا لَا يُبْخَسُوْنَ ﴿۱۵﴾ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ لَيْسَ لَهُمْ فِي الْاٰخِرَةِ اِلَّا النَّارُ ۖ وَحَبِطَ مَا صَنَعُوْا فِيْهَا وَبٰطِلٌ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۶﴾

جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت چاہتے ہیں۔ تو ہم ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پورا پورا دیتے ہیں۔ اس میں ان کو گھاٹے میں نہیں رکھا جاتا ہے[19] یہی وہ لوگ ہیں۔ جن کے لیے آخرت والی زندگی میں دوزخ کی آگ کے سوا کچھ نہ ہوگا۔ جو کچھ انہوں نے یہاں کاریگری کی ہے سب اکارت ہو جائے گی اور جو اعمال وہ کرتے رہے ملیامیٹ ہو جائیں گے[20]

مفردات کے معانی

نوف یہ توفیہ سے مضارع مجزوم ہے۔ اس کا مادہ وفی ہے اس کا معنے پورا ہونے کے ہیں۔ اور توفیہ کے معنے آہستہ آہستہ پورا کر دینے کے ہیں۔ اس سے ثلاثی مزید کے چند باب آتے ہیں۔ باب تفعیل توفی، توفیا باب افعال اوفی، یوفی، ایفار باب مفاعلہ وافی، یوافی، موافاۃ باب تفاعل توافی، یتوافی،

توانی آتے ہیں۔ توفیہ کے معنے پورا پورا دینا جیسے کہ یہاں ہے نوف الیھم اعمالھم یا دوسری جگہ توفون ہے استیفار کے معنے پورا پورا چاہنا جیسے اذاکتالوا علی الناس یستوفون اور توفی کے معنے پورا پورا لینے کے ہیں۔ موت اس کے معنے نہیں بلکہ اس کی ایک قسم ہے۔ کیونکہ تین طرح ہوتا۔ ہوش چھین لینا، روح کھینچ لینا، روح اور جسم دونوں لے لینا۔ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں۔ توفی کے معنے ہیں۔ کسی چیز کو پورا پورا لے لینا اور موت اس کی ایک قسم ہے۔ علامہ ابوالبقا کلیات میں رقم طراز ہیں۔ توفی یعنی موت کے معنے ہیں، یہ عام لوگوں کا محاورہ ہے۔ اور امام راغبؒ فرماتے ہیں موت اور نیند کو بھی توفی سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ انہوں نے انداز تعبیر ہیں وقد عبر بولا ہے اور اس لیے بولا ہے کہ موت اور نیند کو کوئی توفی کے معنے نہ سمجھے۔ بہرحال یہاں باب تفعیل سے نوف آیا ہے۔ اس کے معنے پورا دینا ہیں۔ قرآن میں ہے ووفیت کل نفس۔ ہر جان کو پورا پورا دیا جائے گا۔

ایک اہم سوال کا جواب

پیچھے پڑھ آئے کہ دنیا کی زندگی پوری کی پوری ابتلائی ہے۔ یہاں رزق میں بسط اور قبض دونوں کے ذریعے ابتلا رہو رہا ہے منکرین حق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بے سروسامانی کو آپ کی رسالت کے خلاف بطور دلیل پیش کرتے تھے۔ جیسا کہ لولا انزل علیہ کنز سے معلوم ہو رہا ہے۔ ان کا خیال یہ تھا کہ چونکہ دنیوی وسائل کے اعتبار سے ہم ان سے برتر ہیں۔ تو اس کا مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں بھی ہمارا مرتبہ ان سے اونچا ہے۔ پھر ہمیں اللہ کے عذاب سے کیوں ڈرایا جاتا ہے۔ دولت و ثروت کا یہ انعام اللہ کے یہاں ہماری مقبولیت کی نشانی ہے۔ اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے مقبول ہوتے تو اس کے نتیجے میں ان کو خوشحال ہونا چاہیئے اور ہمیں بدحال۔ ان آیتوں میں اسی سوال کا جواب ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ اگر انکار و سرکشی میں انہیں دنیوی فوائد مل رہے ہیں۔ تو صرف اتنی بات دیکھ کر مغرور نہ ہو جائیں۔ اور نہ اہل ایمان اس پر متعجب ہوں۔ اللہ سبحانہ نے دنیا کے لیے قانون ایسا ہی بتایا ہے کہ انسان کا ہر عمل ایک نتیجہ رکھتا ہے۔ اور جیسا کچھ عمل ہوتا ہے۔ اسی کے مطابق نتیجہ بھی نکلتا ہے۔ اگر ایک شخص چاہتا ہے کہ ایک شاندار مکان اسے رہنے کے لیے ملے۔ اور وہ اس کے لیے ان تدابیر کو عمل میں لاتا ہے۔ جن سے یہاں مکان بنا کرتے ہیں۔ تو ضرور ایک عالیشان مکان بن کر تیار ہو کر رہے گا۔ اور اس کی کوئی اینٹ بھی صرف اس لیے جننے سے انکار

نہیں کرے گی ۔ کہ ایک کافر کے ہاتھ سے لگ رہی ہے ۔یعنی دنیا اور اس کی ٹیپ ٹاپ نیک اعمال کے صلہ کے طور پر نہیں ملتی ہے ۔ دنیا تو نیک و بد دونوں کو ملتی ہے ۔ رزق کے بارے میں انسان کی ہمیشہ سے گمراہی یہ رہی ہے ۔کہ رزق کی بساطت کو انسان نے اکرام اور رزق کے قدرے بچانے کو اہانت قرار دیا ہے ۔قرآن نے دونوں کے بارے میں کلا فرمایا ہے ۔یعنی ایسا ہرگز نہیں ہے ۔رزق کی بساطت اور قدر کا دارومدار تو انسان کی تگ و دو دوڑ دھوپ اور محنت و جانفشانی پر ہے ۔سب کو ملتا ہے اور اپنے اپنے عمل کے مطابق ملتا ہے ۔اور یہ اللہ کا قانون ہے ۔

(۱۹) جو لوگ دنیا کی زندگی اور اس کی زیب و زینت کو چاہتے ہیں ۔تو ہم ان کے اعمال کا بدلہ دنیا ہی میں پورا پورا دیتے ہیں ۔اور اس میں ان کو گھاٹے میں نہیں رکھا جاتا ہے ۔یعنی ایسے واضح ثبوت کے بعد جو قرآن پر ایمان نہیں لاتا ۔یا اس کے بتلائے ہوئے راستہ پر نہیں چلتا بلکہ دنیا کی چند روزہ زندگی اور فانی ٹیپ ٹاپ ہی کو قبلہ مقصود بنا کر عملی جدوجہد کرتا ہے ۔ اگر بظاہر کوئی نیک کام مثلاً خیرات وغیرہ کرتا ہے ۔ تو اس سے بھی آخرت کی بہتری اور اللہ سبحانہ کی خوشنودی نہیں مقصود ہوتی ہے ۔محض دنیوی فوائد حاصل کرنا پیش نظر ہوتا ہے ۔ ایسے لوگوں کی بات خواہ یہود ہوں یا نصاریٰ اور یا مشرکین یا منافقین اور یا دنیا پرست ریاکار مسلمان ۔بتلا دیا کہ دنیا ہی میں ان کے اعمال کا بھگتان کر دیا جائے گا ۔اور جو اعمال اور کوششیں وہ حصول دنیا کے لیے کریں گے ان کی کمیت اور کیفیت کے پیش نظر اللہ تعالیٰ اور حکمت و علم سے جس قدر مناسب جانے گا اور دینا چاہے گا عطا فرمائے گا ۔احادیث سے معلوم ہوتا ہے کہ کافر جو خیرات وغیرہ کے کام کرے اس کی یہ فانی اور صوری حسنات جو روح ایمان سے یکسر خالی ہیں ۔دنیا میں رائیگاں نہیں جاتی ہیں ۔ان کے بدلہ میں اللہ سبحانہ تندرستی مال اولاد عزت و حکومت وغیرہ دے کر سب کھاتہ بے باق کر دیتا ہے ۔مرنے کے بعد دوسری زندگی میں کوئی چیز اس کے کام آنے والی نہیں ہے ۔جس کافر کے لیے جس درجہ کی سزا ہو چکی ہے ۔وہ کبھی اس سے ٹلنے والی نہیں ہے ۔

من كان يريد العاجلة عجلنا له فيها ما نشاء لمن نريد
ثم جعلنا له جهنم يصلاها مذموما مدحورا ۔

جو کوئی چاہتا ہو پہلا گھر جلدی دے دیں ہم اس کو اسی میں جتنا چاہیں جس کو چاہیں ۔پھر ٹھہرا دیا ہم نے اس کے لیے دوزخ کو داخل ہوگا اس میں اپنی برائی سن کر دھکیلا جائے گا ۔ (بنی اسرائیل)

دنیا پرست عالم متصدق اور مجاہد کے حق میں جو وعید آئی ہے ۔اس کا حاصل بھی یہی ہے ۔کہ ان سے

حشر میں کہا جائے گا۔ کہ جس غرض کے لیے تم نے علم سکھلایا یا صدقہ وجہاد کیا ۔ وہ دنیا میں حاصل ہو چکا ہے ۔ اب ہمارے پاس تیرے لیے کچھ نہیں ہے ۔ فرشتوں کو حکم ہو گا ۔ کہ اسے جہنم میں لے جاؤ ۔ (اعاذ اللہ) لہ

اصل میں باتیں دو ہیں ۔

ایک یہ کہ کافروں کی دنیا میں دنیا کی خاطر جو محنتیں ہو رہی ہیں ان محنتوں کے ثمرات اور نتائج کا دنیا میں ان کو ملنا ۔

دوسرے یہ کہ کافروں کی دنیا کی زندگی میں کی ہوئی نیکیوں کا حالت کفر میں اجر ملنا

آیت قرآنی کا موضوع دوسری بات نہیں پہلی بات ہے ۔ یعنی کافروں کو دنیا میں اموال، دولت عزت اور اقتدار مل رہا ہے ۔ یہ ان کے مقبول ہونے کی وجہ سے نہیں ہے ۔ یہ تو اللہ سبحانہ' کے اس قانون کی وجہ سے ہے ۔ کہ دنیا میں جو بھی محنت کرتا ہے ۔ اس کے ہر عمل کا ایک نتیجہ ضرور ہے ۔

آیت قرآنی یہ بتا رہی ہے ۔ کہ حیات دنیا اور اس کی زینت کو حاصل کرنے کو جو لوگ اپنی زندگی کا واحد نصب العین بنا لیتے ہیں اور اسی راہ میں سعی وعمل کی ساری توانائیوں کو خرچ کرتے رہتے ہیں ان کو اپنے عمل کے نتیجے سے محروم نہیں کیا جاتا ۔ بلکہ جدوجہد سعی وعمل کے مطابق نتائج سے اللہ سبحانہ' ان کو سرفراز کرتا ہے ۔

قرآن میں جو کچھ کہا گیا ہے ۔ آج اس کی تفسیر ان ملکوں کے باشندوں کے طرزِ عمل سے ہو رہی ہے ۔ جنہوں نے اسی حیات دنیا کی زینت بناؤ سنگھار کو اپنا مقصود بنا رکھا ہے ۔ اور اپنے اپنے عمل کے مطابق اس کے نتائج ان کے سامنے آ رہے ہیں ۔ اور ان کی یہی کامیابیاں بالآخر ان کو اس مقام تک پہنچا دیتی ہیں ۔ کہ ان کے دلوں پر غفلت کے پردے پڑ جاتے ہیں ۔ اس لیے اللہ سبحانہ' کو وہ بھول جاتے ہیں ۔ اپنے جینے کا مطلب ان کے نزدیک صرف یہ ہو کر رہ جاتا ہے کہ جو خواہش دل میں پیدا ہو اس کے پیچھے روانہ ہو جائیں اور جس طرح بن پڑے اس خواہش کو پورا کریں ۔ اس کی تصدیق بھی ان ممالک کے باشندوں کی زندگیوں سے ہو رہی ہے ۔ جو الدنیا وزینتہا کو اپنی زندگی کا نصب العین بنا کر اپنی سعی وعمل کے نتائج سے بہرہ ور ہو رہے ہیں ۔

لہ افادات از شیخ الاسلام

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

جو اپنے وجود کا مقصد حیات الحیاۃ الدنیا کو بنائے ہوئے ہیں ان کے متعلق قرآن میں سورۃ بنی اسرائیل ہے۔ جیسا کہ آپ شیخ الاسلام کے افادات میں پڑھ چکے ہیں۔

من کان یرید العاجلۃ عجلنا لہ فیھا مانشاء لمن نرید
جو مقصود بناتا ہے الدنیا کو تو ہم جلد عطا کرتے ہیں دنیا میں جس کو چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں۔

سوال یہ ہے کہ زیر تشریح آیت میں تو فرمایا ہے نوف الیھم اعمالھم وھم فیھا لا یبخسون یعنی ان کے اعمال کے نتائج اسی زندگی میں پورے پورے دیتے ہیں اور اس میں کمی نہیں کی جاتی۔ اس سے تو معلوم ہو رہا ہے۔ سب کو دیا جاتا ہے اور سب کچھ دیا جاتا ہے۔ لیکن بنی اسرائیل میں یہ قید لگاوی ہے کہ ہم جسے چاہتے ہیں اور جتنا چاہتے ہیں دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوا کہ دنیا خواہوں میں سے ہر ایک کی ہر آرزو کا پورا ہونا ضروری نہیں ہے۔ سورہ ہود کی آیت بتا رہی ہے کہ ان کو پورا پورا دیا جاتا ہے۔ کہنا یہ چاہتا ہوں کہ بظاہر دونوں میں تضاد معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اگر اس پر غور کیا جائے کہ سورہ ہود والی آیت میں سعی و عمل کے نتائج کے بارے میں قانون بتایا گیا ہے۔ یعنی محنت و کوشش کسی کی رائیگاں نہیں جاتی نوف الیھم اعمالھم سے صراحتاً اس پر تنبیہ کی گئی ہے کہ عمل پر نتائج مرتب ہوتے ہیں برخلاف بنی اسرائیل والی آیت کے۔ اس میں صرف ان لوگوں کا حال ہے۔ جو صرف آرزو کرتے ہیں۔ اور دنیا خواہوں میں بلا شبہ ایک بڑی تعداد ایسوں کی بھی ہے جس نے دنیا ہی کو اپنا نصب العین بنایا ہے لیکن محنت و جفاکشی ان سے نہیں ہو سکتی ان کے متعلق فرمایا جتنا چاہتے ہیں اور جس کو چاہتے ہیں۔ دے دیتے ہیں۔

آیئے شارحین قرآن کی زبانی بھی آیت کی کچھ تشریح سُن لیجئے۔ مشہور مفسرِ قرآن ابن جریرؒ فرماتے ہیں کہ

جو لوگ اپنے عمل کے ذریعے دینوی زندگی، اس کا سامان آرائش و زینت کے طالب ہوتے ہیں ہم ان کے اعمال کی اجرتیں دنیا میں پوری پوری دے دیتے ہیں اور اس میں کوئی کمی نہیں کی جاتی ہے۔

اسی آیت کی دوسرے شارحین قرآن نے دوسرے انداز پر بھی تشریح کی ہے۔ یعنی کافروں کی دنیا کی زندگی میں کی ہوئی

نیکیاں بحالت کفر اکارت نہیں جاتی ہیں۔ ان کو دنیا میں اجر ملتا ہے اور یہ اجر دنیا میں مال، اولاد، عزت اور اقتدار کی صورت میں ملتا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ اور بیشتر شارحین قرآن کا میلان یہی ہے۔ علامہ بقاعیؒ نے یہاں یہ لطیف بات لکھی ہے۔

بداعمالیوں کے باوجود ان کی خوشحالیاں اور خوشحالیوں میں مہلت بخشیاں عذاب کی تاخیر کا سبب بتارہی ہیں۔

(۲۰) آخرت میں ان کے لیے دوزخ کی آگ ہے

یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے آخرت کی زندگی میں دوزخ کی آگ کے سوا کچھ نہیں ہے۔ جو کچھ انہوں نے یہاں کاریگری کی ہے سب اکارت ہو جائے گی۔ اور جو اعمال وہ کرتے رہے ہیں۔ ملیا میٹ ہو جائیں گے۔ یعنی ان اعمال پر دوزخ کے سوا اور کسی چیز کے مستحق نہیں۔ کفار ابدی طور پر اور ریاکار مسلمان محدود مدت کے لیے۔ ہاں اللہ سبحانہٗ بعض مومنین کو محض اپنے فضل وکرم سے معاف فرما دے وہ الگ بات ہے دنیا میں جو کام دنیوی اغراض کے لیے کیئے تھے آخرت میں پہنچ کر ظاہر ہو گا۔ کہ وہ سب برباد ہو جائیں گے۔ اور ریاکاری وہ دنیا پرستی کے سلسلے میں بظاہر جو نیکیاں کمائی تھیں۔ اب یوں ہی خراب ہو گئیں یہاں کوئی کام نہ آئی۔ ۱؎

یہ تشریح عام شارحین کے مطابق اس بنیاد پر ہے کہ آیت قرآنی من کان یرید الحیاۃ الدنیا کا موضوع دنیا میں کیئے ہوئے اچھے اعمال کافروں اور دنیا پرستوں کے آخرت میں رائیگاں ہوں۔ ہم پہلے بتا آئے ہیں۔ کہ آیت قرآنی کا موضوع یہ اور صرف یہ ہے کہ کافروں کی دنیا میں دنیا کی خاطر محنتیں دنیا میں بے نتیجہ نہیں ہیں۔ ظاہر ہے کہ ثبوت کی پوزیشن وہ کافرانہ زندگی ہے جو دن رات دنیا میں محنتیں کر رہی ہے۔ ان کو بھی بتایا جارہا ہے کہ دنیا کی خاطر ان کی کی ہوئی محنتوں کے دنیا میں تو قانون الٰہی کے مطابق نتائج ہیں مگر آخرت کی زندگی میں یہ سب اعمال بے نتیجہ اور صفر ہیں۔ وہاں ان اعمال کے ذریعے دوزخ کا الاؤ تیار ہوتا ہے یعنی دنیا میں تو ان کے اعمال کے نتائج بغیر کسی کمی کے ان کے سامنے آجاتے ہیں۔ لیکن آخرت کی ابدی زندگی میں ان متعلق اعلان ہے کہ آخرت میں ان کے لیے صرف آگ ہے۔ اور ان کا سارا کیا دھرا تہس نہس ہو کر رہ جائے گا۔ اور ان کے سارے اعمال بے نتیجہ ہو کر رہ جائیں گے۔ مسلمان

۱؎ افادات شیخ الاسلام

کو ان کی اطاعت اور پیروی سے منع کیا گیا ہے کہ ان کی راہوں کو اگر تم بھی اختیار کرو گے تو زندگی کا اسلامی نصب العین تمہاری نگاہوں کے سامنے سے ہٹ جائے گا۔ ان دنیا پرستوں کی دولت، ان کی عزت، ان کی شہروں میں سربلندی، تجارت پر ان کا قبضہ اور اقتدار پر ان کا غلبہ بھی الحیاۃ الدنیا وزینتھا ہے۔ ان کے مقابلے میں اہل ایمان کا چہرہ الا الذین صبروا کے ذریعہ پیش کیا ہے اور زینۃ الحیاۃ الدنیا کے نصب العین بنانے والوں کے سامنے ان کی سعی وعمل کے نتائج جیسے سامنے آتے ہیں۔ اسی طرح قرآن نے یہاں صبر کو بھی ایک مستقل عمل قرار دے کر اس پر مرتب ہونے والے نتائج کی بھی تفصیل دی ہے۔ لھم مغفرۃ واجر کبیر پہلا نتیجہ تو اس کا یہی ہے۔ اور دوسرا نتیجہ قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر یہ بتایا ہے کہ ان اللہ مع الصابرین۔ مسلمانوں کی زندگی معاشی اعتبار سے کافروں کے مقابلے میں کم سے کم تر تھی۔ اسی معیشت کے سلسلے میں مسلمانوں کو جس صبر کی تلقین کی ہے۔ آپ چاہیں تو اسے یوں سمجھ سکتے ہیں کہ مسلمانو! جن نایافتہ نعمتوں کی محرومی تمہیں غمگین رکھتی ہے۔ اگر بجائے اس حزن کے صبر کے عمل سے اس موقعہ پر امداد لو گے تو تمہیں ان نایافتہ نعمتوں کی جگہ خود اللہ سبحانہٗ کی محبت و رفاقت مل جائے گی۔ جو بجائے خود ایک ایسی دولت ہے۔ جس کا مقابلہ دنیا کی کسی چیز سے بھی نہیں ہوسکتا ہے۔ سوچیے اللہ سبحانہٗ ہی جس کے ساتھ ہو جائے اس نے کیا کچھ نہیں پالیا صبر کرنے والوں ہی کو قرآن میں یہ بشارت سنائی گئی ہے۔

اولائک علیھم صلوات من ربھم ورحمۃ واولائک ھم المھتدون

یہی وہ لوگ ہیں جن پر ان کے رب کی جانب سے صلوات آتی ہے اور رحمت۔ اور یہی ہیں وہ لوگ جنہوں نے راہ پالی ہے۔

یہ سب اللہ سبحانہٗ کی معیت کے نتائج ہیں اللہ کی معیت ان کو صبر کی بدولت ملی ہے۔ آخر جس کے ساتھ اللہ سبحانہٗ ہو جائے تو اس پر اگر اللہ کی طرف سے صلوات کا نزول ہو، خدائی نعمتوں سے وہ مالا مال ہو اور ہدایت کی راہ زندگی میں اسے مل جائے تو سوچیئے کہ اس کے سوا اور دوسری بات کیا ہے جس کا امکان ہو؟

دونوں کا تقابلی مطالعہ کیجئے۔ ایک طرف وہ دنیا پرست ہیں جن کا نصب العین زینۃ الحیاۃ الدنیا ہے جن کے بارے میں اعلان ہے نوف الیھم اعمالھم کہ ان کو ان کے اعمال کے نتائج پورے پورے ملیں گے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو ایمان وعمل صالح کا سرمایہ رکھتے ہیں۔ یے بس۔ یہ ہیں سب

کچھ دیکھ رہے ہیں . مگر صابرین ہیں . ان صابرین سے بھی قرآن میں کہا گیا ہے . کہ دنیا پرستوں کو ان کی محنتوں کے نتائج پورے پورے ملیں گے . اسی طرح صبر کرنے والوں کو بھی اللہ سبحانہٗ صبر کے پورے پورے نتائج سے مالا مال کرے گا . انما یوفی الصابرین اجرھم بغیر حساب .
خبر نہیں لوگوں کو اس پر حیرت کیوں ہوتی ہے . جس عمل کی وجہ سے لامحدود طاقتوں والے اللہ سبحانہٗ کی معیت میسر آتی ہے . صلات اور اللہ کی رحمتوں سے جو عمل آدمی کو ڈھانپ دیتا ہو . جس کی روشنی میں سیدھی راہ پر عمل کرنے والے بڑھ جاتے ہوں یقیناً ان کا غیر محدود اجر اور اجر کبیر ہی تو ہے . جو ان شکلوں میں ان کے سامنے آتا چلا جاتا ہے .

خبر نہیں لوگ قرآن کو قرآن سے کیوں نہیں سمجھتے . قرآن ہی میں ایک دوسرے موقعہ پر دنیا پرست اور خدا پرست کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے .

فخرج علی قومہ فی زینتہ قال الذین یریدون الحیاۃ الدنیا
یالیت لنا مثل ما اوتی قارون انہ لذو حظ عظیم

ایک روزہ اپنی قوم کے سامنے پورے ٹھاٹھ سے نکلا جو لوگ دنیا پرست دنیا کے طالب تھے وہ اسے دیکھ کر کہنے لگے کاش ہمیں بھی وہی کچھ ملتا جو قارون کو ملا ہے وہ تو بڑا ہی با نصیب ہے .

یہ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے وہ مخاطب ہیں جن کا یہاں جیرہ من کان یرید الحیاۃ الدنیا وزینتھا کے ذریعے پیش کیا گیا ہے . یہاں یریدون الحیاۃ الدنیا اور حضور کے مخاطبوں کے لیے یرید الحیاۃ الدنیا وزینتھا کی تعبیر آئی ہے . دیکھ لیجئے دونوں میں کیسی ہم آہنگی ہے .

قال الذین اوتوا العلم ویلکم ثواب اللہ خیر لمن امن
وعمل صالحا ولا یلقھا الا الصابرون

علم والوں نے ان سے کہا افسوس تمہارے حال پر اللہ کا ثواب بہتر ہے اس شخص کے لیے جو ایمان وعمل صالح کی مایہ رکھتا ہو اور یہ دولت تو صرف صابرین کو ملتی ہے

یہ گویا حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کے ان مخاطبوں کا حال ہے جنہوں نے آپ کی دعوت کو قبول کرلیا اور دنیا کی زندگی میں معاشی بدحالی اور غریبی کی تصویر میں مطلب یہ ہے کہ دنیا کی نعمتیں سر تا سر

رحمت اور نعمت ہیں۔ اگر ایمان و عمل صالح کی آغوش میں نہ ہوں۔ اصل چیز تو ایمان اور عمل صالح ہے۔ دولت اور سرمایہ کو دیکھ کر اس کی تمنا نہ کرو بلکہ صبر کرو بلکہ صبر کرو۔ صبر کے نتائج اس سے زیادہ خوبصورت ہیں۔ یہی بات یہاں صحابہ کا چہرہ پیش کرتے ہوئے فرمائی الا الذین صبروا وامنوا وعملوا الصالحات اولائک لھم مغفرۃ واجر کبیر۔

أَفَمَن كَانَ عَلَىٰ بَيِّنَةٍ مِّن رَّبِّهِ وَيَتْلُوهُ شَاهِدٌ مِّنْهُ وَمِن
قَبْلِهِ كِتَابُ مُوسَىٰ إِمَامًا وَرَحْمَةً ۚ أُولَٰئِكَ يُؤْمِنُونَ بِهِ ۚ وَ
مَن يَكْفُرْ بِهِ مِنَ الْأَحْزَابِ فَالنَّارُ مَوْعِدُهُ ۚ فَلَا تَكُ فِي
مِرْيَةٍ مِّنْهُ ۚ إِنَّهُ الْحَقُّ مِن رَّبِّكَ وَلَٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ
لَا يُؤْمِنُونَ ﴿١٧﴾

کیا بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل رکھتا ہو اور اس کے ساتھ ہی ایک گواہ بھی اس کی طرف سے آگیا ہو۔ اور اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب پیشوائی کرتی ہوئی اور سرتاپا رحمت آچکی ہو۔ یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں[۲۱] اور مختلف لوگوں میں سے جو بھی اس کا انکار کرے گا۔ تو دوزخ کی آگ اس کے وعدہ کی جگہ ہے[۲۲] لہٰذا تم اس دعوت کی کامیابی کے بارے میں کسی طرح کا شک نہ کرو بلاشبہ یہ تمہارے رب کی جانب سے ایک امر واقعہ اور حقیقت ہے لیکن لوگوں کی اکثریت نہیں مانتی ہے[۲۳]

مفردات کے معانی

بینہ ۔ یہ بان یبین سے صفت کا صیغہ ہے اس کے معنے ہیں۔ واضح صاف اور کھلی ۔ دلیل کو بھی

وضاحت کی وجہ سے بینہ کہا جاتا ہے ۔ چاہے عقلی ہو یا نقلی ۔

احزاب ۔ گروہ اور ٹولیاں حزب کی جمع ہے ۔

ہدایت وضلالت کا تقابلی مطالعہ

کائنات مجموعہ اضداد ہے ہر جگہ قانون تزویج رائج ہے اور یہ صرف مادیات ہی میں نہیں معانی میں بھی قانون رائج ہے ۔ ایمان وکفر، ہدایت وضلالت وشقاوت، صلاح وفساد ساتھ ساتھ ہیں۔ اس کے ساتھ انسان بھی متضاد اوصاف وخصائص کا مجموعہ ہے ۔ اس میں کرنے اور نہ کرنے کی صلاحیت ہے ۔ انسانی فطرت یوں تو اللہ سبحانہٗ کی قدرت کے رازہائے گرانمایہ کا ایک لامحدود خزانہ ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ یوں تو تماشا گاہ عالم کی بنیا دصفات وکمالات کے تفاوت پر ہے ۔ جمادات میں وہ صفات نہیں پائی جاتی ہیں ۔ جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے نباتات ان صفات سے مفلس ہیں ۔ جن سے حیوانات سرفراز ہیں ۔ حیوانوں کو ان صفات سے حصہ نہیں ملا ہے جن پر انسان کی انسانیت کی بنیاد قائم ہے ۔ اور صفات کے تفاوت کا یہ قصہ اتنا دراز ہے کہ کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ دو آدمیوں کی جسمانی، اخلاقی حالت بھی ہر لحاظ سے یکساں نہیں ہیں ۔ تجلیات میں تکرار نہیں ہے ۔ تفاوت صفات ہی کے مسئلہ کی صوفیانہ تعبیر ہے ۔ حقیقت یہ ہے ۔ کہ اگر صفات کے تفاوت کا یہ تماشا نہ ہوتا تو ان گنت بے شمار طرح طرح کی بوقلموں ہستیوں سے آج عالم جو بھرا ہوا ہے ایک واحد شخصیت کی شکل اختیار کر لیتا ۔ مختلف استعدادیں، مختلف صلاحیتیں اور مختلف قابلیتوں کی انفعالی قوتیں کارفرما ہیں ۔ بلاشبہ قوت فاعلی ایک ہے مگر انفعالی قوتوں کے اختلاف سے ہدایت وضلالت، ایمان وکفر، سعادت وشقاوت کے لبادے مختلف ہو گئے ہیں ۔

قرآن کی ان آیات میں اسی قانون کی طرف رہنمائی ہے ۔

(۲۱) کیا بھلا وہ شخص جو اپنے رب کی جانب سے ایک روشن دلیل رکھتا ہو ۔ اور اس کے ساتھ ایک گواہ بھی اس کی طرف سے آ گیا ہو اور اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب پیشوائی کرتی ہوئی اور سراپا رحمت آچکی ہو یہی لوگ اس پر ایمان رکھتے ہیں ۔ یعنی یہ شخص اور وہ ریاکار دنیا پرست مسلمان جن کا ذکر کیا ۔ برابر ہو سکتے ہیں ہرگز نہیں ۔ بینہ صاف راستہ سے مراد وہ راستہ ہے ۔ جس پر انسان اپنی اصلی اور صحیح فطرت کے مطابق چلنا چاہتا ہے ۔ بشرطیکہ گرد وپیش کے حالات وخیالات سے متاثر نہ ہو اور وہ توحید اسلام اور قرآن کا راستہ ہے ۔

فاقم وجهك للدين حنيفا فطرة الله التى فطر الناس

علیہا لا تبدیل لخلق اللہ ذالک الدین القیم

لہذا تو سیدھا رکھ اپنا چہرہ دین پر سب سے ہٹ کر وہی اللہ کی بناوٹ جس پر اللہ نے لوگوں کو بنایا ہے۔ اللہ کی تخلیق کو بدل دینا نہیں ہے یہی سیدھا اور پائیدار دین ہے۔

اور حدیث میں ہے۔

کل مولود یولد علی الفطرۃ فابواہ یہودانہ او ینصرانہ او یمجسانہ

ہر بچہ فطرۃ پر پیدا ہوتا ہے۔ اس کے والدین اسے یہودی یا عیسائی اور یا مجوسی بنا لیتے ہیں۔

اور شاھد منہ گواہ اللہ کی طرف سے۔ قرآن عظیم ہے جو گواہی دیتا ہے کہ دین فطرت (توحید و اسلام) پر چلنے والا بے شک ٹھیک راستہ پر چل رہا ہے اور وہ قرآن اپنی حقانیت کا بھی خود گواہ ہے۔ آفتاب آمد دلیل آفتاب۔ چونکہ قرآن لانے والے جبرئیل امین اور لینے والے محمد صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ اس اعتبار سے ان کو بھی شاہد کہہ سکتے ہیں بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی شان تو یہ ہے۔ کہ آپ کے اخلاق و عادات، معجزات زبان مبارک چہرہ نورانی سے ہر چیز سے شہادت ملتی ہے۔ کہ جس دین کے آپ حامل ہیں وہ بالکل سچا دین ہے آگے ومن قبلہ کتاب موسیٰ اماما ورحمۃ کا مطلب یہ ہے کہ قرآن سے پہلے جو وحی کسی نبی پر نازل کی گئی وہ بھی دین فطرۃ کی صداقت پر گواہ تھی۔ خصوصاً حضرت موسیٰ علیہ السلام پر جو عظیم الشان کتاب تورات اتاری گئی۔ قرآن سے پیشتر اسے ایک بڑا بھاری شاھد ان لوگوں کی حقانیت کا کہنا چاہیئے جو دین فطرت کے صاف راستہ پر چلتے ہیں۔ ؎

یہ آیت گرامی شارحین قرآن کی تحقیقی جولانیوں کے لیے بہت بڑی جولانگاہ ہے۔ اس آیت میں احتمالات کے ہجوم نے آیت کے معانی کو پیچیدہ کر دیا ہے۔ آیت میں ضمیروں کے مراجع، اسم اشارے کا مشارالیہ اسم موصول کا مصداق، استفہام کی حیثیت اور فاء تفریعیہ کا موقعہ میں ایک سے زیادہ احتمالات ہیں۔ مثلاً

۱۔ من کان علی بینۃ من ربہ کا مصداق کون ہے۔

؎ افادات شیخ الاسلام

۲ ۔ بینۃ من ربہ سے کیا مراد ہے ۔
۳ ۔ یتلوہ کا مطلب کیا ہے ۔
۴ ۔ شاھد سے کیا مراد ہے ۔
۵ ۔ یتلوہ کی ضمیر منصوب کا مرجع کیا ہے ۔
۶ ۔ منہ میں من کے معنے
۷ ۔ منہ کی ضمیر مجرور کا مرجع
۸ ۔ ومن قبلہ کتاب موسیٰ کا اعرابی مقام
۹ ۔ اولائک میں اسم اشارہ کا مشار الیہ
۱۰ ۔ یؤمنون بہ کی ضمیر مجرور کا مرجع ۔

آیئے اب اس تفصیل کو پیش نظر رکھ کر آیت قرآنی کی تشریح سنیئے ۔ فار تفریع کے لیے اور تفریع بھی ام لیقولون افتراہ سے فھل انتم مسلمون پر ہے ۔ درمیان میں جملہ معترضہ ہے ۔ تفریع بھی ضد کی ضد پر ہے مطلب یہ ہے کہ اگر ان مکابرین اور مکذبین کا حال یہ ہے تو ان کے برعکس ایسے لوگ بھی ہیں ۔ جو بینات اور شواہد سے حقیقت تک پہنچنے کی کوشش کرتے ہیں ۔ ان کا بھی قرآن پر ایمان ہے ۔ اور یہ مُسلم ہیں ۔ فھل انتم مسلمون کی روح یہی ہے ۔ یعنی کیا تم بھی اسلام قبول کرو گے جیسے وہ لوگ ایمان کی نعمت سے مالا مال ہو گئے جو تم میں سے اور اہل کتاب میں سے اپنے رب کی جانب سے بینہ پر ہونے کی وجہ سے اسلام لا چکے ہیں ۔ استفہام تقریری ہے ۔ یعنی اگر یہ لوگ ایمان سے گریز پائی اختیار کر رہے ہیں تو وہ لوگ ضرور نعمت ایمان سے ہمدوش ہوں گے ۔ جو اللہ پاک کی جانب سے بینہ پر ہیں ۔ اسی کی تائید قرآن شان اعجاز سے کرے گا اور اسی کی ہمنوائی اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب کر چکی ہے ۔ لہٰذا اے مشرکین قرآن پر ایمان لانے والے تم جیسے نہیں ہیں ۔ بلکہ پوری بصیرت کے ساتھ کتاب الٰہی پر ایمان لائے اور حلقہ اسلام میں داخل ہوئے ۔ اس طرح اولائک یؤمنون خبر ہے ۔ اور افمن کان الخ مبتدا ہے ۔ آیت قرآنی یہ بتا رہی ہے کہ ایک طرف وہ دنیا پرست ناخدا شناس اور اللہ سبحانہٗ کی کھلم کھلا بغاوت کرنے والے ہیں ۔ اور دوسری طرف وہ خدا پرست اللہ پر ایمان رکھنے والے اور اپنے ایمان کی پشت پر عقلی اور نقلی دلائل کی قوت رکھنے والے ہیں ۔ کیا یہ دونوں کبھی برابر ہو سکتے ہیں ۔ شوکانی" لکھتے ہیں ۔

ایک صرف دنیا کی طلب رکھتا ہے دوسرا دنیا و آخرت دونوں کا طالب ہے ۔ ان دونوں میں بہت بڑا فرق ہے ۔

آیت میں مومن و کافر کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ ایک وہ شخص ہے۔ جو دین کی زندگی میں پوری بصیرت رکھتا ہے۔ اور اس کی بصیرت کی صحت کی اللہ سبحانہٗ کی وحی تائید کر رہی ہے اور اس کی شہادت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب دے رہی ہے اس کے مقابلے میں دوسرا وہ ہے جو دنیا اور اس کی ٹیپ ٹاپ کے پیچھے پڑا ہوا ہے۔ کیا ان دونوں کا مقام ایک ہو سکتا ہے۔ بلاشبہ وہ لوگ جو عقلی اور نقلی دلائل کی قوت سے مالامال ہیں۔ وہ ہی اس قرآن پر ایمان کی نعمت سے مالامال ہیں۔ یعنی جو لوگ اللہ کی طرف سے دلیل و حجت پر ہیں۔ اور وہ نعمت ایمان سے مالامال ہو چکے ہیں۔ وہ ان مغرورین دنیا کی طرح نہیں ہو سکتے۔ جو دنیا پر ریجھ رہے ہیں۔ ان کا راستہ ہدایت الٰہی کا راستہ ہے۔

آپ اسے یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ ایک وہ شخص ہے جو اپنے موقف پر دلائل عقلیہ رکھتا ہے۔ اور دلائل عقلیہ کی تائید دلائل نقلیہ سے ہو رہی ہے۔ اور یہ دلائل نقلیہ دو قسم کے ہیں۔ ایک قرآن اپنی اعجازی شان سے اس کا موئید ہے۔ دوسرے قرآن سے پہلے کتاب موسیٰ علیہ السلام ان کی ہمنوائی کر رہی ہے۔ یہی لوگ جن کے اوصاف یہ بیان ہوئے ہیں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کو ماننے والے ہیں۔ علامہ آلوسیؒ نے یہ بات بالکل برمحل فرمائی ہے۔

> انداز بیان بہانگ دہل کہہ رہا ہے کہ ماننے والوں اور نہ ماننے والوں کا اس آیت میں چہرہ پیش کیا جا رہا ہے۔ نہ ماننے والوں اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا تقابل نہیں ہے۔

آیت میں یتلو تلو سے ہے تلاوۃ سے نہیں ہے یعنی دلیل عقلی کی تائید دلیل نقلی کر رہی ہے آیت میں اس طرح جیسا کہ علامہ آلوسیؒ نے سمجھا ہے۔ اشارہ ہے کہ دلائل دو قسم کے ہیں عقلی اور نقلی۔ اور نقلی دلائل کے عقلی دلائل کے تابع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ نقلی دلائل عقلی دلائل کے موافق ہوتے ہیں۔ یہیں سے علماء نے یہ نکتہ نکالا ہے کہ۔

> نقل صحیح کبھی عقل صریح کے مخالف نہیں ہوتی ہے۔

یہاں سمجھنے کی بات سادہ انداز میں یہ ہے۔ کہ اسلام میں داخل ہونے والے وہی ہوں گے۔ جن کے فطری قوانین مسخ ہونے سے محفوظ ہوں۔ وہی پہلے سے بنیادی حقائق کے بارے میں اپنے اندر ایک دلیل و برہان رکھتے ہیں۔ پھر اس کے بعد اللہ کی جانب سے قرآن کی شہادت آجاتی ہے۔ تو وہ ان کو بعینہٖ اپنے دل کی آواز معلوم ہوتی ہے۔ وہ محسوس کرتے ہیں کہ جو کچھ اپنے اندر پا رہے ہیں۔ اسی کی تائید و تصدیق اس آسمانی شاہد کی زبان سے ہو رہی ہے۔ قرآن کے ساتھ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب

کا حوالہ بڑا ہی معنی خیز ہے کتاب موسیٰ علیہ السلام میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری کی پیشین گوئی ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے یہاں جو تشریح کی ہے۔ وہ بہت معنویت رکھتی ہے۔

کیا منکر قرآن ایسے شخص کی برابری کر سکتا ہے۔ جو قرآن پر قائم ہو جو کہ اس کے رب کی طرف سے آیا ہے۔ اور اس قرآن کا ایک گواہ تو اسی میں موجود ہے یعنی اس کا معجزہ ہونا اور ایک اس سے پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی کتاب ہے۔ جو کہ آیا ہے اور رحمت ہے۔ اور یہ دلیل نقلی ہے۔ غرض قرآن کے صدق وصحت کے لیے دونوں دلیلیں موجود ہیں۔ ان ہی دلائل کی وجہ سے لوگ اس قرآن پر ایمان رکھتے ہیں۔

بہرحال آیت قرآنی نے اہل ایمان اور اہل کفر کا موازنہ کرکے اہل ایمان کو نجات کا حامل قرار دیا ہے۔ کیونکہ نبوت پر ان کے ایمان کے لیے تین براہین موجود ہیں۔ بینہ، شاہد اور تورات بینہ سے عقل اور نور فطرت مراد ہے۔ یعنی دل کی وہ آنکھ جو حق وباطل میں تمیز کرتی ہے۔ کلام الٰہی کا کوئی حکم اور کوئی نظریہ اس کو خلاف عقل اور خلاف واقعہ نظر نہیں آتا ہے۔ یہی نور فطرت اقرار توحید ورسالت اور صداقت کی واضح دلیل ہے۔ قرآن اسی بینہ کو فطرۃ اللہ کہتا ہے۔ حدیث میں اسی فطرۃ کی طرف رہنمائی ہے۔ گویا یہ بات کھول کر بتادی گئی کہ جو لوگ دنیوی زندگی کی رعنائیوں اور خوشنمائیوں کے دلدادہ ہیں۔ ان کے لیے نبوت کی دعوت کا رد کر دینا آسان ہے۔ مگر وہ لوگ جو اپنی ہستی اور کائنات کے نظام میں پہلے سے توحید وآخرت کی کھلی شہادت پا رہے ہیں۔ اور نبوت ان کو وہی کچھ بتا رہی ہے۔ جس کی شہادت پہلے سے ان کے اندر موجود ہے۔ اور پھر اس کی مزید تائید قرآن سے پہلے نازل شدہ کتاب سے بھی ہوتی ہے تو یہ صادق اور راست لوگ اتنی زبردست شہادتوں کی آنکھیں بند کرکے ان منکرین نبوت کے ہمنوا کیوں کر ہو سکتے ہیں۔

یہاں حضرت مولانا محمد ادریسؒ کاندھلوی نے آیت قرآن کے منشا کو جس کو جس اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے۔ وہ اس لائق ہے کہ ناظرین معالم القرآن اس سے استفادہ کریں۔

خلاصہ کلام یہ ہے کہ بینہ سے روشن دلیل اور صاف راستہ مراد ہے یا با الفاظ دیگر اس سے صحیح یعنی دین اسلام مراد ہے۔ جس کی صحت دلائل عقلیہ اور فطریہ سے ثابت ہے۔ اور اس کی صحت وصداقت پر دو شاہد عدل موجود ہیں۔ ایک قرآن کریم دوسری تورات پس ایسے دین کے حسن وجمال میں کیا شبہ ہو سکتا ہے اور من کان علی بینہ سے وہ مؤمنین ومخلصین مراد ہیں۔ جو اس دین حق پر

قائم ہیں۔ اور مطلب یہ ہے کہ یہ دین اسلام ایک نور عقل، نور فطرت اور نور بصیرت سے عجیب قسم کا ایک نور ہے۔ اور دو نور غیبی اس کے شاہد اور مؤید ہیں۔ ایک نور قرآن اور ایک نور تورات ہر طرح یہ دین نور علی نور ہے۔ دین اسلام کیا ہے۔ ایک مجموعہ انوار ہے۔ تو کیا جو شخص ایسے روشن اور منور دین پر قائم ہو وہ اس شخص کے برابر ہو سکتا ہے۔ جو ظلمات بعضھا فوق بعض میں گھرا ہوا ہو۔ اور سعادت۔ اخرویہ سے محروم ہو۔ وہ اہل نور اور اہل بصیرت کے مماثل اور مشابہ کہاں ہو سکتا ہے۔

(۲۲) اسلام کا تمام کو یکساں خطاب

اور مختلف لوگوں میں سے جو بھی اس کا انکار کرے گا۔ تو دوزخ کی آگ اس کے وعدہ کی جگہ ہے یعنی یہود و نصاریٰ، بت پرست مجوس عرب عجم یورپ ایشیا کسی فرقہ جماعت ملک وملت سے تعلق رکھتا ہو۔ جب تک قرآن کو نہ مانے گا۔ نجات نہیں ہو سکتی۔ جیسا کہ صحیح مسلم وغیرہ بعض احادیث میں بہت تصریح و تعمیم کے ساتھ بیان فرمایا ہے[۱] اصل ارشاد میں احزاب کا لفظ آیا ہے۔ یہ حزب کی جمع ہے جس کے معنے گروہ اور جماعت کے ہیں مشرکین بھی حزب ہیں، یہود بھی حزب اور عیسائی بھی حزب ہیں۔ قرآن نے قوم نوحؑ، قوم عاد، قوم ثمود، قوم فرعون اور قوم لوطؑ کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا ہے۔ اولائك الاحزاب نظریاتی جماعتیں ہوں یا نسلی زبان سے تعلق رکھنے والی یا وطن سے سب کو احزاب کہا جاتا ہے ان سب کے بارے میں قرآن کا انکشاف ہے۔ من یکفر من الاحزاب کوئی اور کسی گروہ سے تعلق رکھتا ہو۔ ان کے عمل کے مقبول ہونے کے لیے ایمان شرط ہے۔ اور ایمان کی صحت کے لیے نبی کی تصدیق ضروری ہے۔ یہود ہوں یا عیسائی یہ وہ ہیں جو کسی نہ کسی پیغمبر کو مانتے ہیں۔ مراد نجات یہ ہے کہ تمام رسولوں کو صادق مانا جائے۔ یہ آیت بتا رہی ہے کہ اللہ پر اور اس کے تمام رسولوں پر ایمان لانا اسلام ہے۔ جس نے اس اصول کو قبول نہیں کیا۔ اس کی نجات نہیں ہے۔ یہود و نصاریٰ کو اسلام قبول کرنے پر ہدایت کی بشارت دی گئی ہے۔ یہی وہ دین ہے۔ جس کو یہود و نصاریٰ نے اور تمام اہل مذاہب نے جو کسی گزشتہ پیغمبر کی اُمت ہوں کھو دیا تھا۔ اور اب جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دنیا میں پیش کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ جو ہدایت ان قوموں کے پاس تھی وہ ناقص تھی۔ اور

[۱] افادات شیخ الاسلام

محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جس کو لے کر آئے ہیں وہ کامل ہے۔ من یکفر بہ من الاحزاب
سے یہ بھی معلوم ہوا۔ کہ قرآن کی جن آیتوں میں یہ کہا گیا ہے۔ کہ اب جو ایمان لایا اور جو یہودی ہوا۔
اور نصرانی اور صابیؔ جو بھی خدا اور یوم آخرت پر ایمان لائے گا اور نیک کام کرے گا۔ اس کو خوف دغم نہ
ہوگا۔ اس میں اللہ پر ایمان لانے سے مقصود توحید کامل ہے۔ اور اس کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے۔ کہ
یہود ونصاریٰ اپنے موجودہ گمراہ عقیدوں کے ساتھ نجات کے مستحق ہیں۔ یہود ونصاریٰ کیا خود مسلمان
بھی اس توحید کامل کے بغیر نجات کے مستحق نہیں جب تک مسلمانوں کا ایمان اور عمل ٹھیک اس تعلیم کے
مطابق نہ ہو جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے دنیا میں آئی ہے۔ یہ اصول ہر ایک
کے لیے ایک ہے۔

ومن یکفر بہ من الاحزاب فالنار موعدہ

ضمناً آیت سے یہ بھی معلوم ہوا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت عمومی بھی ہے اور دائمی بھی یعنی
آپ سب کے لیے رسول بن کر آئے ہیں۔ اور آپ اللہ کے آخری نبی بھی ہیں۔ آپ کے بعد کوئی
نبی بن کر نہیں آئے گا۔

(۲۴) دعوت کا مستقبل کامیاب ہے

لہٰذا تم اس دعوت کی کامیابی کے بارے میں کوئی شک نہ کرو بلاشبہ یہ تمہارے رب کی
جانب سے ایک امر واقعہ اور حقیقت ہے۔ لیکن لوگوں کی اکثریت مانتی نہیں ہے۔ یہ خطاب ہر شخص کو
ہے۔ جو قرآن کنے یا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر دوسروں کو سنانا مقصود ہے۔ کہ قرآن کی
صداقت اور من جانب اللہ ہونے میں قطعاً کوئی شبہ کی گنجائش نہیں ہے۔ جو لوگ نہیں مانتے وہ احمق ہیں۔[1]
اصل تعبیر یہ ہے۔ فلا تك فی مریۃ منہ انہ الحق من ربك۔ مطلب یہ ہے۔ کہ
دعوت قرآنی کا کامیاب ہونا آپ کے پروردگار کی جانب سے اٹل انمٹ اور قیامت تک باقی رہنے
والی حقیقت ہے۔ حق باطل کی نقیض۔ باطل ایسی چیز جس میں ثبات وقیام نہ ہو ٹل جانے والی اور
مٹ جانے والی۔ اور حق کا خاصہ ثبوت اور قیام ہے۔ یعنی جو چیز ثابت ہو۔ قرآن جب کسی بات کو
علامت تعریف کے لیے کہتا ہے۔ تو الحق کہتا ہے۔ تو اس سے مقصود مخاطبوں کو یہ سمجھانا ہوتا ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ یہ دنیا کی ایک قائم وثابت حقیقت ہے ۔جن قوموں نے اسے مٹانا چاہا ہے ۔ وہ خود مٹ گئیں حتی کہ ان کا نام و نشان تک باقی نہ رہا ۔لیکن قرآن کی دعوت ہمیشہ قائم رہنے والی ہے اسی حقیقت کی طرف اشارا کرنے کے لیے یہاں وہ صرف الحق کہہ کر خاموش ہو گیا ۔ اس سے زیادہ کچھ کہنا ضروری نہیں سمجھا کیونکہ اللہ کا قانون یہ ہے کہ حق و باطل کی جنگ میں حق ہی کو باقی رکھتا ہے ۔تو کسی بات کے امر حق ہونے کے لیے صرف یہی کہہ دینا کافی ہے ۔کہ وہ حق ہے ۔یعنی باقی اور قائم رہنے والی حقیقت ہے ۔
حدیث وسیر کی کتابوں میں جو آتا ہے ۔حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فتح مکہ کے بعد جب خانہ کعبہ میں داخل ہوئے تو کعبہ کے اندر کے بتوں کو توڑتے جاتے تھے ۔ اور زبان مبارک سے فرماتے جاتے تھے ۔ جاء الحق وزھق الباطل تو اس میں اسی طرف اشارا ہے ۔

یہاں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب اس لیے نہیں بنایا گیا ۔کہ آپ کو شک نہ کرنے کی ہدایت مقصود ہے ۔ بلکہ اس لیے بنایا گیا ہے ۔کہ آپ کے مقابل قوتوں کا شک ثابت کرنا مقصود ہے گویا اس میں مشرکین مکہ ، یہودیوں اور عیسائیوں کو عتاب ہو رہا ہے ۔لیکن چونکہ وہ لائق خطاب نہیں ہیں ۔اس لیے روئے سخن ان کی طرف نہیں بلکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف کر دیا اور ضمناً اس اس حقیقت کی طرف اشارا کر دیا کہ حالات کی ساری ناسازگاریوں اور بے سروسامانی کے سارے درجوں کے باوجود دعوت حق کے کامیاب ہونے کا معاملہ ہو کر رہنا ہے ۔ اور ایسی حالت میں ہو کر رہے گا ۔جبکہ لوگوں کی اکثریت اسے مانتی نہیں ہے ۔یعنی الاحزاب دنیا کی بڑی طاقتیں یہودی ، عیسائی ، مجوسی اور مشرکین اس کا مقابلہ کر رہی ہیں ۔فرمایا ایسا ہی ہو کر رہے گا ۔مستقبل کو مشکوک نگاہوں سے نہ دیکھیے انہیں مظلومیتوں سے فتح و کامرانی کا سورج طلوع ہو گا ۔کیونکہ یہ حق ہے ۔اور کامیابی حق کی ہوتی ہے ۔

وَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا ؕ
اُولٰٓئِكَ يُعْرَضُوْنَ عَلٰى رَبِّهِمْ وَيَقُوْلُ الْاَشْهَادُ هٰٓؤُلَآءِ الَّذِيْنَ
كَذَبُوْا عَلٰى رَبِّهِمْ ۚ اَلَا لَعْنَةُ اللّٰهِ عَلَى الظّٰلِمِيْنَ ﴿۱۸﴾ الَّذِيْنَ
يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَيَبْغُوْنَهَا عِوَجًا ؕ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ
هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۱۹﴾ اُولٰٓئِكَ لَمْ يَكُوْنُوْا مُعْجِزِيْنَ فِى الْاَرْضِ وَ
مَا كَانَ لَهُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ اَوْلِيَآءَ ۘ يُضٰعَفُ لَهُمُ الْعَذَابُ ؕ وقف لازم
مَا كَانُوْا يَسْتَطِيْعُوْنَ السَّمْعَ وَمَا كَانُوْا يُبْصِرُوْنَ ﴿۲۰﴾ اُولٰٓئِكَ
الَّذِيْنَ خَسِرُوْٓا اَنْفُسَهُمْ وَضَلَّ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَفْتَرُوْنَ ﴿۲۱﴾
لَا جَرَمَ اَنَّهُمْ فِى الْاٰخِرَةِ هُمُ الْاَخْسَرُوْنَ ﴿۲۲﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ وَاَخْبَتُوْٓا اِلٰى رَبِّهِمْ ۙ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ
الْجَنَّةِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۳﴾ مَثَلُ الْفَرِيْقَيْنِ كَالْاَعْمٰى وَالْاَصَمِّ
وَالْبَصِيْرِ وَالسَّمِيْعِ ؕ هَلْ يَسْتَوِيٰنِ مَثَلًا ؕ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ﴿۲۴﴾ ع ۱۶ ۲

اور ان سے زیادہ ظلم کار کون ہے۔ جو اللہ پر جھوٹ باندھے ان ہی لوگوں
کو اللہ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے گا۔ اور گواہی دینے والے بتائیں گے۔ کہ
یہ ہیں وہ لوگ جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا یاد رکھو ان ظلم کار لوگوں پر اللہ

کی لعنت ہے۔ جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔ اور راہِ خدا میں بجی کے متلاشی ہیں۔ اور بعد میں آنے والی زندگی کا انکار کرتے ہیں[۲۶] یہ لوگ زمین میں بھاگ کر اللہ کو ہرانے والے نہیں ہیں۔ اور اللہ سے ورے ان کا کوئی کارساز نہیں ہے ان کو ڈبل عذاب دیا جائے گا۔ کیونکہ نہ تو وہ حق سننا چاہتے تھے اور نہ حق دیکھنا چاہتے تھے[۲۷] ان ہی لوگوں نے اپنے آپ کو تباہی میں ڈال دیا ہے۔ اور زندگی میں حق کے خلاف جو افترا پردازیاں کرتے تھے۔ وہ سب اکارت ہو جائیں گے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی وہ لوگ ہیں جو آخرت میں سب سے زیادہ گھاٹے میں رہیں گے۔[۲۸] بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان کی نعمت سے ہمدوش ہوئے اور ایمان کی زندگی میں اعمال صالحہ کیے۔ اور اپنے مولیٰ کے حضور میں عاجزی اختیار کی یہی جنت والے ہیں اور اس میں سدا رہنے والے ہیں[۲۹] ان دونوں فرقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا بہرہ ہو اور دوسرا بینا اور شنوا ہو۔ بتاؤ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں کیا تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہو۔[۳۰]

مفردات کے معانی

یصدون ۔ صد سے مضارع کا جمع مذکر غائب ہے ۔ یہ لازم اور متعدی دونوں طرح آتا ہے ۔ مصدر اگر صدود ہو تو لازم آتا ہے ۔ اور مصدر اگر صد ہو تو متعدی ۔ لازم کی مثال جیسے یصدون عنك صدودا اور متعدی کی مثال جیسے فصدهم عن السبيل ۔

عوجاً ۔ کجی، ٹیڑھا پن یہ عوج یعوج سے ہے جس کا استعمال ٹیڑھا اور کج ہونے کے معنے میں ہے ۔ ابو زید نے جو لغت کے مشہور امام ہیں تصریح کی ہے کہ جو کجی آنکھوں سے نظر آئے عَوَج بالفتح اس کے لیے آتا ہے ۔ اور جو آنکھ سے نہیں بلکہ عقل و شعور سے سمجھ میں آئے تو اس کے لیے عِوج بکسر العین آتا ہے ۔

ضل ۔ ضلالۃ سے ماضی کا پہلا صیغہ ہے ۔ گمراہی، بھٹکنا، راہ سے دور جا پڑنا، کھو جانا، ضائع ہو جانا، گم ہو جانا، ہلاک ہونا، صراح میں علامہ جمال الدین قرشی لکھتے ہیں ضَلال بالفتح ضائع ہونا، گم ہونا اور مغلوب کیا جاتا ہے۔ ضل الماء فی اللبن یعنی پانی اتنا مغلوب ہوا کہ دودھ میں اس کا اثر ظاہر نہیں ہوا ۔ اور اسی سے اللہ سبحانہ کا ارشاد ہے ۔ یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی زبانی ان ابانا لفی ضلال مبین ہمارے ابا تو ان دونوں کی محبت میں مغلوب ہیں ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زبانی مذکور ہے ۔ فعلتہا اذا وانا من الضالین ۔ نیز ہلاک ہونے کے معنے یہی ہیں ۔ نیز ضلال رشاد کی ضد ہے ۔ باب ضرب یضرب سے آتا ہے ۔ ان ضللت فانما اضل علیٰ نفسی ۔

اخبتوا ۔ وہ جھکے انہوں نے عاجزی اختیار کی جس کے معنے تواضع اور خشوع وخضوع کے ہیں ۔ اخبات کے اصل معنے سیدھے ہونے کے ہیں ۔ نرم ہموار زمین کو خبت کہتے ہیں ۔ اللہ کی بارگاہ میں ایسی انابت جس میں تسلسل ہو ۔ اس لیے تواضع اور انکساری کے معنے بھی آتے ہیں ۔

اسلام ہی کی پیروی ضروری ہے

نبوت کی دعوت کے بارے میں قرآن نے یہ بات کھول کر بتا دی ہے کہ انہ الحق من ربك اس کا لازمی تقاضا یہ ہے ۔ کہ دوسرے تمام مذاہب منسوخ ہو چکے ہیں ۔ اور اب اللہ سبحانہ کے نزدیک ثابت اور باقی رہنے والی چیز صرف اسلام ہے ۔ ضروری ہے کہ اس پر ایمان لایا جائے اور ہر قوم، ہر ملک اور ہر زمانہ کا انسان اس کی پیروی کرے ۔ کیونکہ جب یہ دین دلائل عقلیہ اور نقلیہ کی روشنی لے کر آیا ہے ۔ اور اسی کا لانے والا بلا قید زمان و مکان سب انسانوں کے لیے نذیر بن کر آیا ہے ۔ تو اب کسی اور دین اور کسی اور پیغمبر کا زمانہ باقی نہیں رہ سکتا ۔ رسول تو آتا ہی اس لیے ہے کہ اللہ کا رسول مانا جائے ۔ اور اسی کی غیر مشروط اطاعت کی جائے اس کے علاوہ جب قرآن کے سوا اب دوسری کوئی کتاب نہیں جیساکہ انہ الحق من ربك کے قصر کا تقاضا ہے ۔ تو اس کا مطلب یہ اور صرف یہ ہے کہ آخرت کی نجات صرف اسلام پر موقوف ہے ۔ خود قرآن کا اعلان ہے ۔

من یبتغ غیر الاسلام دینا فلن یقبل منہ وھو فی الآخرۃ من الخاسرین

جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو اپنائے گا وہ آخرت میں گھاٹے میں رہے گا۔

اور خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اسی فیصلہ خداوندی کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

والذی نفس محمد صلی اللہ علیہ وسلم بیدہ لا یسمع بی احد من ھذہ الامۃ یھودی ولا نصرانی ثم یموت ولم یومن بالذی ارسلت بہ الا کان من اصحٰب النار۔

قسم ہے اس ذات کی جس کے قبضے میں محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی جان ہے۔ اس امت میں سے جس کسی شخص تک یہودی ہو یا نصرانی میری نبوت کا پیغام پہنچا اس کے باوجود وہ میرے لائے ہوئے دین پر ایمان لائے بغیر مر گیا۔ وہ دوزخی ہو گا۔

اس حدیث میں نام اگرچہ یہود و نصاریٰ کا لیا گیا ہے مگر اس میں کوئی شک نہیں کہ یہ نام صرف مثال کے طور پر لیے گئے ہیں۔ ورنہ اس میں جو بات کہی گئی ہے وہ اپنی جگہ بالکل عام ہے کلیہ اور اصول کی حیثیت رکھتی ہے۔ دنیا کا کوئی گروہ کوئی قوم اور کوئی ملت ایسی نہیں ہے جس پر اسکا اطلاق نہ ہوتا ہو۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو من یکفر من الاحزاب کھینچ تان نکالی جا رہی ہو۔ بلکہ ایک ایسی حقیقت ہے۔ جو اس آیت قرآنی کا صریح مفہوم ہے ظاہر ہے کہ قرآن میں الاحزاب سے مراد امت دعوت ہے۔ یعنی وہ پورا گروہ انسانی جس کی طرف آپ نبی بنا کر مبعوث ہوئے ہیں۔ اب اگر کوئی گروہ، کوئی قوم، کوئی جماعت یہ کہتی ہے۔ کہ یہ اللہ کا پیغمبر نہیں ہے اور یہ قرآن اللہ کی وحی نہیں ہے۔ اور فی الواقع وہ اللہ کا پیغمبر ہے تو اس سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے۔ ٹھیک ایسے ہی جیسے کوئی پیغمبر نہ ہو۔ اور وہ یہ کہے کہ میں اللہ کا رسول ہوں اس شخص سے زیادہ ظالم کون ہو سکتا ہے۔ باتیں دونوں ایک ہیں۔ ایک سچے پیغمبر کو رسول نہ ماننے والا ایسا ہی ظالم ہے جیسے جھوٹا پیغمبر ہونے کا دعویٰ کرنے والا یہاں قرآن یہی بتا رہا ہے کہ اللہ کا نام لے کر جھوٹ کی گاڑی چلانے والوں کا انجام کیا ہو گا۔ پیغمبر کی حد تک پہلے پوری وضاحت ہو چکی ہے کہ اس کے پاس آنے والی وحی بلا ریب اللہ کی وحی ہے اور دلیل یہ ہے کہ پوری کائنات مل کر اس کی مثال نہیں بنا سکتی۔ نبوت کے ساتھیوں کے بارے میں بتایا جا چکا ہے کہ انہوں نے نبوت کو دلائل عقلیہ اور نقلیہ کی پشت پناہی میں مانا ہے اب صرف سوال یہ ہے کہ اگر یہ واقعہ ہے تو

جو نہیں مانتے ان کا کیا بنے گا ۔ ان آیات میں اسی کی وضاحت ہے ۔

(۲۴) اور ان سے زیادہ ظلم کار کون ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے یعنی قرآن جھوٹ اور افترا نہیں ۔ اللہ کا سچا پیغام ہے جس کو قبول کرنا ضروری ہے ۔ خوب سمجھ لو اس شخص سے زیادہ ظالم کوئی نہیں ہو سکتا ہے جو اللہ پر جھوٹ باندھے مثلاً اس کا کلام نہ ہوا اور کہہ دے کہ اس کا کلام ہے ۔ یا واقعی اس کا کلام ہو اور اللہ سبحانہٗ بار بار فرمائے کہ یہ میرا کلام ہے مگر باوجود روشن دلائل کے وہ جھٹلاتا رہے اور کہتا رہے کہ اس کا نہیں ہے^ل ۔ یہی بات سورہ یونس میں اس سے پہلے آچکی ہے ۔ وہاں کھول کر بتایا تھا کہ تم دو باتوں کا انکار نہیں کر سکتے ۔ جو شخص اللہ پر جھوٹ باندھے اس سے بڑھ کر ظالم کوئی نہیں ۔ اور جو سچ کو جھٹلائے وہ بھی سب سے بڑا ظالم ہے ۔ اب اگر میں مفتری علی اللہ ہوں تو مجھے ناکام ہونا پڑے گا ۔ اور اگر تم سچائی کی تکذیب کر رہے ہو تو تمہیں اس کا خمیازہ ضرور بھگتنا ہے فیصلہ اللہ سبحانہٗ کے ہاتھ میں ہے ۔ یہاں قرآن نے مقابلہ مومنین اور منکرین کا پیش کیا ہے ۔ اور بتایا ہے کہ اس سے بڑھ کر ظالم کون ہے جو اللہ پر افترا کرے یعنی مومن تو اللہ کی دلیل وحجت پر چلتے ہیں ۔ اور منکرین اللہ پر افترا کر رہے ہیں ۔ لہٰذا دونوں کی راہیں الگ الگ ہیں ۔ نتائج بھی الگ الگ ہوں گے ۔ اہل ایمان نے اللہ کی بخشی ہوئی عقل سے کام لیا ۔ اور اس کی وحی پر ایمان لایا دوسرے نے عقل وبصیرت سے انکار کیا اور اللہ کی وحی کو جھٹلایا ۔ اس فقرے میں ان کے سارے افترأت کی طرف اشارا کر دیا ۔ اور بتا دیا کہ ایک طرف تو وہ جماعت ہے جس نے فکر وعمل اور اپنا نظام حیات عقل صریح اور نقل صحیح کی روشنی میں بنایا ہے ۔ اور اس کے مقابلے میں وہ گروہ ہے جس کے فکر وعمل کے لیے نہ عقل کی دلیل ہے ۔ اور نہ نقل کی طاقت ہے ۔ اس کا سارا علمی اور عملی سرمایہ افترأت کے سوا کچھ بھی نہیں ہے فکری گمراہی کا حال یہ ہے کہ فرشتوں کو اللہ کی بیٹیاں بنا رہے ہیں ۔ اپنے پسندیدہ اشخاص کو اپنا شفیع قرار دے رہے ہیں ۔ اور عملی زندگی یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت میں نت نئی سرمسازیاں کر رہے ہیں ۔ ان کی علمی اور عملی زندگی ساری کی ساری افترأت کا انبار ہے بتاؤ اس سے بڑا ظالم کون ہو سکتا ہے ۔

(۲۵) اعمال کے نتائج ولوازم

ان ہی لوگوں کو اللہ کے حضور پیش کیا جائے گا ۔ اور گواہی دینے والے بتائیں گے ۔ کہ یہ وہ لوگ

ل افادات شیخ الاسلام

ہیں جنہوں نے اللہ پر جھوٹ باندھا یعنی محشر میں جب اللہ سبحانہ کے سامنے علی رؤس الاشہاد پیش ہوں گے۔ اوران کی شرارتوں کے دفتر کھولے جائیں گے۔ اس وقت گواہی دینے والے فرشتے انبیاء صالحین بلکہ ان کے خود ہاتھ پاؤں کہیں گے یہ ہی وہ بدبخت ظالم ہیں۔ جنہوں نے اپنے پروردگار کی نسبت جھوٹ بولا تھا۔[1] ان کا سب سے بڑا جرم اللہ پر افترا اور جھوٹ باندھنا ہے۔ اس جرم کی سنگینی کا اندازہ اس سے ہوسکتا ہے کہ اس کو قرآن صرف افتری علی اللہ کذبا ہی نہیں بلکہ قول علی اللہ کذبا اور قول علی اللہ ما لا تعلمون بھی کہتا ہے۔ ان کی ساری زندگی افترائی ہے انکار اعمال، اخلاق کی پوری عمارت افترائی بنیادوں پر کھڑی ہے۔ نذریں نیازیں، چڑھاوے سب کے سب افترار علی اللہ ہیں۔ مشرکین کا شفعاء والا دھندا، عیسائیوں کا نظریۂ ولدیت، یہودیوں کا نظریۂ محبوبیت سب کا سب افترائی گھروندا ہے۔ جس کی پشت پر کوئی دلیل عقلی اور نقلی نہیں ہے۔ روز قیامت ان کے بھی اعمال بارگاہ الہی میں پیش ہوں گے قرآن میں تعبیر یہ ہے کہ افترار کے مجرمین اللہ کی بارگاہ میں پیش کیے جائیں گے یعنی اپنے اپنے اعمال کا پشتارہ لیے حاضر ہوں گے۔ اور ساتھ ہی ان کے اعمال پر شہادت دینے والے بول پڑیں گے کہ یہ وہ لوگ ہیں جو اللہ پر جھوٹ باندھنے کے مجرم ہیں۔ اسم اشارے کے ذریعے ان کی تشہیر کی طرف اشارہ ہے کہ یہ رسوائی سرعام ہوگی۔ صحیح مسلم میں اس تشہیر کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس انداز میں پیش فرمایا ہے۔

> کفار اور منافقین کو علی رؤس الخلائق پکارا جائے گا۔ اور کہا جائے گا کہ یہ لوگ ہیں اللہ پر جھوٹ باندھنے والے۔

سب سے بڑا جرم سب سے پہلے بیان کرنے کے بعد آگے دوسرے جرائم کی تفصیل ہے۔

(۲۶) ظالموں کے جرائم

یاد رکھو ان ظلم کار لوگوں پر اللہ کی لعنت ہے جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔ اور راہ خدا میں کجی کے متلاشی ہیں اور بعد میں آنے والی زندگی کا انکار کرتے ہیں۔ یہ حق تعالیٰ کا ارشاد ہے یعنی جو لوگ ظلم و ناانصافی سے اللہ سبحانہ کے کلام کو جھوٹا بتلاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر آخرت کے منکر ہیں دوسروں کو اللہ سبحانہ کے راستہ پر چلنے پر روکتے ہیں اور اس تلاش میں رہتے ہیں کہ سیدھے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

راستے کو ٹیڑھا ثابت کریں ایسے ظالموں پر اللہ سبحانہٗ کی خصوصی لعنت ہے[1]۔ اگرچہ شیخ الاسلام نے الا لعنۃ اللہ علی الظالمین کی نسبت اللہ سبحانہٗ کی طرف بتائی ہے۔ لیکن قرینہ مقام کا تقاضا یہی ہے کہ یہ شہادت دینے والوں کی جانب ہے۔ سورہ اعراف میں یہ بات پڑھ چکے ہو۔

فاذن مؤذن بینھم ان لعنۃ اللہ علی الظالمین

صحیح مسلم میں ارشاد نبوت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے جیسا کہ پہلے سن چکے ہو۔

واما الکفار والمنافقین فیقول الاشھاد ھؤلاء الذین کذبو علی ربھم الا لعنۃ اللہ علی الظالمین۔

ظالمین کی تصریح لعنت کی علت بتانے کے لیے ہے اور ان ظالموں کے جو جرائم آگے بتائے ہیں وہ یہ ہیں

۱۔ یہ لوگ انسانوں کو راہ خدا سے روکتے ہیں۔

۲۔ یہ لوگ اللہ کے بتائے ہوئے سیدھے راستہ میں کجی تلاش کرتے ہیں۔

۳۔ یہ لوگ دنیا کی زندگی کے بعد آنے والی زندگی کا انکار کرتے ہیں۔

[2] یہی سنگین جرائم ہیں جن کی وجہ سے یہ لوگ رحمت الٰہی سے دور ہو گئے ہیں۔ ان کا پہلا جرم یہ بتایا گیا ہے یصدون عن سبیل اللہ۔ یہاں یہ بات مشرکین مکہ کے بارے میں بتائی گئی ہے کہ وہ لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روکتے ہیں۔ یہ روکنا احوال وظروف کے اختلاف اور زمان ومکان کے اختلاف سے ایک سے زیادہ رویوں میں ہوتا تھا۔ کبھی سرمایہ ودولت کے زور سے کبھی جگہ تشدد اور طاقت سے لوگوں کو روکا جاتا تھا۔ ایک روکنا فرعون کا ہے۔ ایک روکنا قوم شعیبؑ کا ہے آج یہی روکنا علم وتحقیق کے روپ میں ہے۔ قرآن میں یہی بات یہود ونصاریٰ کے بارے میں چوتھی جلد کے آغاز میں پڑھ چکے ہو۔

یا اھل الکتاب لم تصدون عن سبیل اللہ من آمن تبغونھا عوجا وانتم شھداء

اے اہل کتاب اہل ایمان کو اللہ کے راستہ سے کیوں روکتے ہو۔ چاہتے ہو کہ وہ سیدھے راستہ سے ہٹ کر ٹیڑھے راستے پر پڑ جائیں حالانکہ تمہیں اہل ایمان کا

[1] افادات شیخ الاسلام

[2] افادات شیخ الاسلام

سیدھے راستہ پر ہونا خوب معلوم ہے ۔

اللہ کے راستہ سے روکنے کی نوعیت اس دور میں جو تھی وہ آج نہیں ہے آج اہل ایمان کو علم و تحقیق کے زور سے روکا جارہا ہے ۔ مسلمان نوجوانوں ، مسلمان حکمرانوں ، مسلمان سیاست کاروں اور مسلمان طالب علموں کے دماغ ، میں علم و تحقیق کے نام پر وہ جراثیم ڈالے جاتے ہیں جس سے وہ اسلام کے ماضی کی طرف سے بدگمان ، اس کے حال سے بیزار اور اس کے مستقبل کی طرف سے مایوس ہو جاتے ہیں ۔ وہ اپنی تمام صلاحیتوں کو معقول اور غیر معقول طریقہ پر ان کمزوریوں کی نشاندہی اور ان کو نہایت بھیب شکل میں پیش کرنے میں صرف کرتے ہیں وہ خوردبین سے اسلام کا مطالعہ کرتے ہیں اور اپنے مخاطبوں کو دوربین سے دکھاتے ہیں وہ اسلام کی تاریک تصویر پیش کرنے میں اس سبک دستی ، ہنرمندی سے کام لیتے ہیں جس کی مثال مل نہیں سکتی ہے مولانا ابوالحسن میاں ندوی نے یہ بات بالکل برمحل لکھی ہے کہ

> قرآن سیرۃ نبوی ، فقہ و کلام ، صحابہ کرامؓ ، تابعینؒ ، آئمہ کرامؒ ، محدثین ، فقہاء ، مشائخ و صوفیاء ، رواۃ حدیث ، فن جرح و تعدیل ، اسماء الرجال ، حدیث کی حجیت ، تدوین حدیث فقہ اسلامی کے مآخذ ، فقہ اسلامی کا ارتقاء ان میں سے ہر موضوع کے متعلق ان مستشرقین کی کتابوں اور تحقیقات میں اتنا تشکیکی مواد پایا جاتا ہے ۔ جو ایک ایسے ذہین حساس آدمی کو جو اس موضوع پر وسیع اور گہری نظر نہ رکھتا ہو ۔ پورے اسلام سے روک دینے کے لیے کافی ہے ۔

مولانا ابوالحسن علی میاں ہی نے ڈاکٹر محمد البہی کی فاضلانہ کتاب الفکر الحدیث کے حوالہ سے ان ارباب تحقیق کا جو پیش نہاد بتایا ہے وہ پڑھنے کے لائق ہے ۔ اس کے لیے مولانا کی فاضلانہ کتاب الصراع اور اسلام و مغربیت کے درمیان کشمکش کا مطالعہ ضروری ہے ۔ یہاں تو میں صرف ویصدون عن سبیل اللہ کے نئے ادب سے قارئین معالم کو آگاہ کرنا چاہتا ہوں ۔

قرآن نے ان کا دوسرا جرم یہ بتایا کہ ویبغونھا عوجا یعنی یہ لوگوں کے بتائے ہوئے سیدھے راستے میں کجی تلاش کرتے ہیں ۔ سورہ کہف میں آغاز قرآن کا چہرہ یہ پیش کیا ہے ۔

> الحمد للہ الذی انزل علی عبدہ الکتاب ولم یجعل لہ عوجا قیما
>
> ساری ستائش ہی اس اللہ کے لیے ہیں جس نے اپنے بندے پر کتاب اتاری اور اس میں کوئی کجی نہیں رکھی بالکل سیدھی بات ۔

یعنی عوج، پیچ وخم، کجی اور ٹیڑھ سے اس کتاب کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ خود سیدھی ہے سیدھی بات بتاتی ہے۔ فکر ونظر مصنوعی اور من گھڑت ورزشوں سے جن کے دل و دماغ الٹ پلٹ نہیں کردیئے گئے ان کو سیدھی راہ بتاتی ہے۔ اور صرف سیدھی ہی نہیں بلکہ سب سے زیادہ سیدھی راہ بتاتی ہے یہاں دی ملتی جی اقوام جو اسے پڑھے گا اس کے اندر اترجائے گی۔ اترتی چلی جائے گی۔ ان کو ایسا معلوم ہوگا۔ کہ وہ اس کتاب کے لیے مخلوق ہوئے ہیں۔ مگر فلسفی مشینوں کی آنچ سے پگھلائی ہوئی ٹیڑھی ترچھی ذہنیتوں اور عصری تقاضوں کے مطابق ڈھالے ہوئے کج دماغوں سے یہ کتاب اچٹ جاتی ہے۔ نہ وہ اس کے وزن کو محسوس کرسکتے ہیں اور نہ یہ کتاب اپنے واقعی وزن کو محسوس کراسکتی ہے۔ خود جس مسئلہ میں الجھنوں کے کانٹے کے سوا کچھ نہیں ہے۔ وانہیں کانٹوں کی سیج پر انہیں نیند آگئی ہے۔ اور یقین کیئے بیٹھے ہیں کہ زندگی کی ساری بنیادی کانٹوں کی الجھنیں ان ہی کانٹوں کی نوک سے کھل چکی ہیں اور آئندہ کھلتی جائیں گی۔ یہ اس لیے ہورہا ہے کہ پاؤں کو ٹیڑھا بنا لینے کے بعد ان کو ٹیڑھا جوتا بھی سیدھا نظر آرہا ہے۔ ان کی ذہنیت اور فکر یہ مصنوعی کجی جو ہر ٹیڑھی بات کو آج سیدھی مان رہی ہے۔ اور سیدھی باتیں ان کو ٹیڑھی نظر آرہی ہیں۔ بہرحال ویبغونہا عوجا اور تلاش کرتے ہیں اللہ کے راستہ میں کجی کا مطلب یہ ہے کہ وہ ایک طرف اسلام کے دینی افکار واقرار کی تحقیر کا کام کرتے ہیں اور کافرانہ افکار واقرار کی عظمت ثابت کرتے ہیں۔ اور اسلامی تعلیمات واصول کی ایسی تشریح کرتے ہیں کہ اس سے اسلامی افکار کی کمزوری ثابت ہو۔ اور ایک مسلمان کا اسلام سے رابطہ کمزور پڑجائے۔ اور وہ قرآن واسلام کے بارے میں متشکک ہوجائے۔ یا کم از کم یہ سمجھنے پر مجبور ہوجائے کہ اسلام موجودہ زندگی کے مزاج کے ساتھ نہیں چل سکتا۔ اور اس زمانہ کی ضروریات اور تقاضوں کو پورا کرنے سے عاجز ہے۔ ان کی اعوجاجی ذہنیتوں اور پراگندہ توجیہوں کی گتھیاں اتنی دلچسپ ہوتی ہیں کہ سننے والا مشکل ہی سے اپنی ہنسی روک سکتا ہے۔ اس رجالی زندگی کے ہر پہلو میں پیچا پیچ اور گرہ درگرہ کے سوا اور کچھ نہیں ہوتا عدالت ہو یا انصاف، علاج ہو یا معالجہ، تعلیم ہو یا تعلم، یا اسی قبیل کی کوئی اور چیز اس کی سب سے بڑی خصوصیت عوج اور صرف عوج سامنے آتی ہے۔

غور فرمایئے انسانیت کے سامنے ساحل مراد تک پہنچانے کے لیے جو کشتی بھی پیش کی جاتی ہے۔ اس کی پیشانی پر لکھا ہوتا ہے کہ ساحل پر پہنچانے کا سواریوں کو یقین نہیں دلایا جاسکتا بلکہ ممکن ہے کہ منجدھار میں پہنچ کر وہی چیز جس کا نام کشتی نجات رکھا ہے طوفان کی نذر ہوجائے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا جہاز بھی ہے جس میں ضمانت دی جاسکتی ہے کہ اس میں سوار ہونے والے کہ سیدھی راہ سے لیجانے والوں کو لے جائے گا۔ اور قطعی طور پر ہر ایک کو ساحل مراد تک پہنچائے گا۔

ان ھذا القران یھدی للتی ھی اقوم

یہ ضمانت نامہ واضح اور صاف ہے اس کے مالک حقیقی کی جانب سے ہونے پر تاریخ انسانی کے ہر دور کی برگزیدہ ہستیوں کی تصدیقی مہریں ثبت ہیں۔ ویتلوہ شاھد سارے نبیوں کے اس پر دستخط ہیں ومن قبلہ کتاب موسیٰ آیت آپ کے اختیار اور صوابدید پر موقوف ہے کہ اپنی نجات کے لیے ان دونوں کشتیوں میں سے جس پر چاہیں سوار ہو جائیں فمن شاء فلیومن ومن شاء فلیکفر آیت کے آغاز پر غور فرمایئے۔ افمن کان علی بینۃ من ربہ تیسری بات ان کے بارے میں یہ بتائی گئی ہے کہ یہ آخرت والی زندگی کا انکار کرتے ہیں۔ ھم بالاخرۃ ھم کافرون قرآن نے آخرت کی زندگی پر طرح طرح سے استدلال کیا ہے واقعہ یہ ہے کہ یہ دنیا خود اپنے سارے وجود کے ساتھ اس بات کا اعلان ہے کہ وہ نا مکمل ہے اور اس کا نامکمل ہونا اس بات کا ثبوت ہے کہ ایک وقت آنا چاہیئے جب وہ مکمل کی جائے۔

آخرت کی زندگی کو قرآن کی روشنی میں ماننے کا مطلب یہ ہے۔ کہ ان حقیقتوں کو دل سے تسلیم کیا جائے کہ۔

انسان کی تخلیق ایک منفرد مقصد کے لیے ہوئی ہے وہ ایک ذمہ دار ہستی ہے۔ اس کے پیدا کرنے والے نے اسے زندگی بسر کرنے کا ایک مکمل ہدایت نامہ دے کر پیدا کیا ہے اس کے مطابق عمل کرنا ہی حق اور نیکی ہے اسے چھوڑ کر من مانا طریقہ اختیار کرنا گمراہی اور برائی ہے۔

انسان کی زندگی موت کے ساتھ نہیں ختم ہو جاتی بلکہ اس کے بعد بھی مسلسل باقی رہنے والی ہے۔ اور اس دنیا کی زندگی میں وہ جو کچھ کرتا ہے اپنے مادی نتائج کے اعتبار سے اگرچہ اسی جگہ ختم ہو جاتا ہے مگر اپنے معنوی نتائج کے اعتبار سے سب کا سب باقی رہتا ہے۔

سوچیئے کہ اگر آخرت ایک فرضی زندگی ہے تو ہمارے لیے اس قدر ضروری کیوں ہے۔ کیوں ایسا ہے کہ اس کے بغیر ہم کوئی سماجی نظام قائم ہی نہیں کر سکتے۔ انسانی ذہن سے اس تصور کو نکال لینے کے بعد کیوں ہماری ساری زندگی ابتر ہو جاتی ہے۔ کیا کوئی فرضی چیز زندگی کے لیے اس قدر ناگزیر ہو سکتی ہے۔ زندگی کی صحیح اور منصفانہ تنظیم کے لیے آخرت کے تصور کا اس قدر ضروری ہونا خود یہ ظاہر کرتا ہے کہ آخرت اس زندگی کی سب سے بڑی حقیقت ہے۔

بہرحال قرآن جن حقیقتوں کی طرف ہمیں دعوت دیتا ہے ان میں سے اہم ترین حقیقت آخرت کا تصور ہے اور مکہ کے مشرک اس کے منکر ہیں۔

(۲۷) جرائم پیشہ لوگوں کو ڈبل سزا

یہ لوگ زمین میں بھاگ کر اللہ سبحانہٗ کو ہرانے والے نہیں ہیں اور اللہ سے ورے ان کا کوئی کارساز نہیں ہے اللہ ان کو ڈبل عذاب دے گا۔ کیونکہ نہ تو وہ حق سننا چاہتے تھے۔ اور نہ حق دیکھنا چاہتے تھے۔ یعنی وسیع زمین میں نہ کہیں بھاگ کر اللہ سبحانہٗ سے چھپ سکتے ہیں۔ اور نہ کوئی مددگار حمایتی مل سکتا ہے جو اللہ سبحانہ کے عذاب سے بچا سکے۔ وہ دنیا میں ایسے اندھے بہرے تھے کہ نہ حق بات سننے کی تاب تھی نہ اللہ سبحانہ کے نشانوں کو دیکھتے تھے جنہیں دیکھ کر ممکن تھا راہ ہدایت پا لیتے۔ حضرت شاہ صاحبؒ نے اس کا یہ مطلب بتایا ہے کہ اللہ پر جھوٹ بولا، بے اصل اور غلط باتیں اس کی طرف منسوب کیں۔ کہاں سے لائے غیب سے سُن نہ آئے تھے۔ غیب دیکھتے تھے پھر ان کا ماٰخذ کیا ہے [1]

اس میں بتایا ہے کہ نبوت جو دعوت لے کر آئی ہے اسے حتماً کامیابی سے ہمدوش ہونا ہے۔ اور وہ دنیا میں نبوت کی راہ نہ روک سکیں گے۔ یہ اسلام کے نظام حیات کی کامیابی کی پیشین گوئی کی طرح ہے۔ پیشین گوئی کی گئی ہے کہ مستقبل میں دعوت نبوت کامیاب ہوگی اور مخالفین اس کی کامیابی کو روک نہ سکیں گے غور فرمائیے کہ یہ پیشین گوئی کن حالات میں کی گئی ہے۔ قرآن نے اسی زمانہ کا نقشہ ان الفاظ میں پیش کیا ہے۔

ان الذین اجرموا کانوا من الذین اٰمنوا یضحکون واذا مروا بہم یتغامزون واذا انقلبوا الی اھلہم انقلبوا فکہین واذا راوھم قالوا ان ھٰؤلاء لضالون

یہ جرائم پیشہ اہل ایمان پر ہنستے ہیں اور ان کا جب اہل ایمان کے پاس سے گزر ہوتا ہے تو ان کے متعلق باہم ایک دوسرے سے چشمک زنی کرتے ہیں۔ اور جب واپس لوٹتے ہیں اپنے گھروں کی طرف تو باتیں بناتے ہیں۔ اور جب اہل ایمان کو دیکھتے ہیں تو کہتے ہیں کہ یہی لوگ گمراہ ہیں۔

صحابہ کرامؓ کے سامنے ایسے واقعات گزر رہے تھے۔ کہ ان کی کوئی عبادت گاہ نہ تھی۔ بلکہ اسلام کے

[1] افادات شیخ الاسلام

سارے احترامی عناصر کا تقدس جس ذات گرامی کے احترام و تقدس کے ساتھ وابستہ ہے یعنی خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں سجدے میں ہیں۔ پشت مبارک پر اونٹنی کی بچہ دانی ڈال دی گئی ہے اور صحابہ کرامؓ جیسے تر و تازہ ایمان رکھنے والے حضرات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھتے ہیں مگر صحابہ کی بے بسی کا حال یہ ہے کہ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جیسے جلیل القدر صحابی کا بیان امام بخاریؒ نے نقل کیا ہے۔

> میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس حالت میں دیکھتا اور کچھ کام نہ آسکتا۔ کاش میرے پاس مدافعت کی قوت ہوتی۔

ان حالات میں پیشین گوئی کی ہے اولائك لم يكونوا معجزين في الارض یہ مخالفین حق کی راہ نہیں روک سکیں گے۔ یہ پیشین گوئی کیسے پوری ہوئی۔ اس کا اندازہ کرنے کے لیے تاریخ کے اس بیان پر غور فرمائیے کہ آپ کی حیات ہی میں عرب میں جو ایک آزاد حکومت قائم ہوئی وہ یہ تھی۔ جرجی زیدان نے لکھا ہے۔

> شمالاً تبوک سے ایلہ تک اور جنوباً یمن کے ساحل تک مشرق میں خلیج فارس اور بحر قلزم تک غرباً ان کی حکومت پھیلی ہوئی تھی۔ (تاریخ التمدان الاسلامی)

مطلب یہ ہے کہ دوست دشمن سب کا اس پر اتفاق ہے کہ

> ۱۱ھ میں جب حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک ہوا۔ تو اسلام کی حکومت سارے جزیرۃ العرب پر چھائی ہوئی تھی۔

اب دس لاکھ مربع میل زمین کی اس آبادی کو دیکھئے جو زمانہ نبوت ہی میں حلقہ بگوش اسلام ہو چکی تھی۔ اور عہد رسالت کے بعد دس بارہ سال کی قلیل مدت میں ایران، مصر، شام، الجزیرۃ، ترکستان تک اسلام کی حکومت پھیل گئی۔ اس میں انسانوں کی کتنی تعداد اسلام کے احاطہ میں داخل ہوئی اس کے اندازے کے لیے بھی مسلمانوں کی نہیں بلکہ ایک عیسائی مؤرخ کی یہ شہادت پڑھیئے۔ وہ لکھتا ہے کہ

> اسلامی حکومت کی حدود میں اس زمانہ کی متمدن دنیا کا بڑا حصہ داخل ہو گیا تھا۔ جس میں عرب بھی تھے، ایران کے باشندے بھی، ان میں کلدانی بھی تھے اور روم والے بھی، اور گاتھ قوم کے لوگ بھی، قبطی بھی، سوڈانی بھی، بربر بھی، جو زبانیں یہ بولتے تھے ان میں عربی، فارسی، ہندی، روسی، ترکی، کردی اور ارمنی نیز قبطی اور بربری کے سوا بھی زبانیں تھیں۔

جرجی زیدان نے قدیم معتبر وثائق کی مدد سے ثابت کیا ہے کہ اس زمانہ میں صرف مصر کی آبادی تیس کروڑ تھی مجموعی طور پر پہلی صدی ہجری میں ممالک محروسہ اسلامیہ کے متعلق تخمینہ آبادی اسی مصنف نے یہ بتایا ہے کہ

اسلامی قلمرو کی آبادی اپنے عنفوان شباب میں بیس کروڑ سے پچیس کروڑ تھی ۔

اسی عیسائی مصنف نے اپنے اس بیان کو اس فقرے پر ختم کیا ہے ۔

مردم شماری کی یہ تعداد وہی ہے جو اس وقت یورپ کی ہے ۔

آپ نے دیکھا کہ یہ اولائك لـم يكونوا معجزين في الارض کی کیسی جیتی جاگتی اور زندہ تاریخی تفسیر ہے ۔

بہرحال آیت قرآنی میں یہ بتایا گیا ہے کہ منکرین دعوت کو اگرچہ اپنی قوت، شوکت، عزت، حکومت، افرادی طاقت، کثرت مال واولاد پر غرور تھا۔ مگر اللہ سبحانہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے تھے۔ اور نہ ان کے ان کو فرضی معبود کام آئے ۔ کسی میں بھی ان کی حمایت کرنے کی تاب نہ تھی ۔ ان کو دوگنا عذاب ہوگا ۔ ایک بدکاری کا دوسرا بدکاری کی راہنمائی اور یہ سب کچھ اس لیے ہوگا ۔ کہ نفرت وبیزازی کی وجہ سے وہ دعوت حق سننے کے لیے تیار نہ تھے۔ اور نہ محبت دنیا کی وجہ سے اللہ کی نشانیاں دیکھتے تھے ۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے وہ نظریات پادر ہوا ہو گئے جو انہوں نے اللہ سبحانہ اور کائنات اور اپنی ہستی کے متعلق گھڑ رکھے تھے اور وہ سب بھروسے بھی جھوٹے ثابت ہوئے جو انہوں نے اپنے معبودوں پر کر رکھے تھے۔

حافظ ابن جریرؒ نے اس آیت کی تشریح اس طرح کی ہے ۔

یہ لوگ جن کا چہرہ اللہ سبحانہ نے پیش فرمایا ہے کہ یہ لوگوں کو اللہ سبحانہ کے راستہ سے روکتے ہیں ۔ یہ ملک میں بھاگ کر اللہ سبحانہ کی گرفت سے بچ نہیں سکتے جب اللہ سبحانہ ان کو سزا دینا چاہے گا ۔ تو اور کوئی مدد گار ان کے کام نہیں آئے گا ۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں ۔

یہ لوگ اللہ سبحانہ کو زمین میں ہرا نہیں سکتے اور نہ ہی ان کے مددگار یہ سب اللہ کے دباؤ میں ہیں ۔ ان پر اللہ کا پورا پورا قبضہ اور غلبہ ہے اور اللہ ان سے دنیا ہی میں انتقام پر قدرت رکھتا ہے ۔ لیکن یہاں عذاب میں تاخیر ہے اور تاخیر کا منشا توبہ کے لیے مہلت دینا ہے ۔ روز قیامت ان کو ڈبل عذاب ہوگا ۔ اور اس لیے ہوگا ۔ کہ اللہ سبحانہ نے ان کو سننے کے لیے کان ، دیکھنے کے لیے آنکھیں ، اور سمجھنے کے لیے دل دیئے تھے ۔ انہوں نے ان سے کام نہیں لیا بلکہ حق کے سننے میں بہرے اور

حق کی پیروی میں اندھے بن گئے۔

علامہ آلوسیؒ روح المعانی میں لکھتے ہیں۔

ان لوگوں کی تباہی ناگزیر ہے یہ خود کو اللہ کی گرفت سے زمین میں بچا نہیں سکتے اور نہ اللہ کے سوا ان کے خیال کے مطابق مددگار ان کو بچا سکتے ہیں۔ لیکن حکمت الٰہی کا تقاضا ہے عذاب میں تاخیر ہو۔ آخرت میں ان کو ڈبل عذاب ہوگا۔ یہ لوگ نبوت کی راہ سے آئے ہوئے حق کو سننا نہیں چاہتے تھے اور راہ حق کو دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے تھے۔

۲۸ آخرت میں سب سے گھاٹے والے

ان ہی لوگوں نے اپنے آپ کو تباہی میں ڈال دیا ہے اور زندگی میں حق کے خلاف جو افترا پردازیاں کرتے تھے۔ وہ سب اکارت ہوجائیں گے۔ تباہی میں ڈالنا یہی کہ ابدی عذاب میں گرفتار اور سب چھوٹے دعوے وہاں پہنچ کر گم ہوگئے اس میں کوئی شک نہیں کہ یہی لوگ ہیں جو آخرت میں سب سے گھاٹے میں رہیں گے۔ ظاہر ہے کہ جن لوگوں نے اپنی صلاحیتیں اس طرح برباد کی ہیں۔ انہوں نے خود کو اپنے ہاتھوں برباد کیا ہے اور جن کی مدد اور شفاعت کے اعتماد پر یہ خطرناک کھیل کھیلے ان میں سے کوئی ان کے کام نہ آئے گا۔ کیونکہ اللہ سبحانہٗ پر افترا کرکے محض اپنے ذہن سے جو خیالی پلاؤ پکاتے تھے وہ سب بے حقیقت ثابت ہوں گے۔

یہ استیناف بیانی ہے ان ہی لوگوں کا ایک اور چہرہ ہے جو روز قیامت بارگاہ الٰہی میں پیش ہوں گے اور اعمال کے نتائج نمایاں ہوں گے اس روز ان کو نتائج کے لحاظ سے اپنی تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ اور اللہ پر جو جھوٹ کی افترا پردازیاں کرتے رہے سب سوا ہوکر رہ جائیں گی یعنی افترا پر مبنی سارے اعمال بے نتیجہ ہوکر رہ جائیں گے۔ جن جن کے بارے میں جو جو افترآت کر رکھے ہیں۔ سب ملیامیٹ اور ناپید ہوجائیں گے۔ ان کی بنائی ہوئی شفاعتوں کے گھروندے مسمار ہوجائیں گے۔ جن جن شخصیتوں کے اشخاص اور مجسموں کے سہارے ان کی مذہبی زندگی قائم تھی سب کافور ہوجائیں گے اور ان افترائی افکار، افترائی اعمال، افترائی اخلاق، افترائی معاشرت، افترائی معیشت رکھنے والے اس روز بلاریب سب سے زیادہ گھاٹے اور نقصان میں ہوں گے۔ انکی حالت اس تاجر کی سی ہوگی جو نفع اور فائدے کے ولولوں کے ساتھ بازار میں آئے اور نفع کی جگہ نقصان سے دوچار ہوجائے۔ یہ لوگ نقصان اور خسارے میں اس روز منفرد

ہوں گے ۔ لاجرم انهم فی الاخرۃ هم الاخسرون کی تعبیر بے حد بلیغ ہے یہ بتانے کے لیے ہے کہ ایسا ہی ہوگا ۔

(۲۹) لطف و مسرت کا بلند تر مقام

بلاشبہ وہ لوگ جو ایمان کی نعمت سے ہمدوش ہوئے اور ایمان کی زندگی میں اعمال صالحہ کیے اور انہوں نے اپنے مولیٰ کے حضور میں عاجزی اختیار کی یہی جنت والے ہیں اور اس میں سدا رہنے والے ہیں ۔ منکرین کی بدانجامی کے بالمقابل مؤمنین کا نیک انجام بیان فرمایا ۔ ان کی عاجزی اللہ سبحانہ کو پسند آئی اس لیے اپنی دائمی خوشنودی کا ان کو مقام عطا فرمایا[1]

ان کے مقابلے میں جو لوگ اپنے پرورش کرنے والے سے لاپروائی اور بے اعتنائی کا طریقہ اختیار کیے ہوئے زندگی گزار رہے تھے ۔ جو لوگوں کو اللہ کے راستہ سے روک رہے تھے ۔ جن کی ساری زندگی افترائی بنی ہوئی تھی وہاں کچھ لوگ ایسے بھی تھے جنہوں نے اپنی راہ اپنے رب پر ایمان کی راہ اپنائی اور اس طرح اپنا رشتہ اللہ سے قائم کرکے مؤمن ہو گئے اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنی زندگی میں اس ایمان کے تقاضے پورے کیے اور اچھے اچھے کام کیے ۔ اللہ کی رضا جوئی کی ان کو فکر ہو گئی اور سارے اعمال و حرکات کو اللہ کے لیے مخصوص کر لیا ۔ اور صرف یہی نہیں بلکہ اپنے جذبات و احساسات بھی اللہ سبحانہ کے لیے خاص کر لیے ۔ ایمان سے پہلے جن باتوں کا تصور بھی ان کے لیے دشوار تھا انہوں نے ایمان اور عمل صالح کی قوت سے اپنے اندر پیدا کر لیں ۔ تا اینکہ باطنی سلوک کی اس روشنی میں چلتے ہوئے ایک ایسے مقام پر پہنچ گئے ۔ جس کی خبر قرآن نے ان الفاظ میں دی ہے واخبتوا الی ربهم یعنی ایمان کی راہ سے اپنے پرورش کرنے والے کو جو پا لیتے ہیں اور اس ایمان کے صدقے میں جو معنوی روشنی ان کو عطا ہوئی ۔ اس روشنی کی شدت جس قدر زیادہ ہوتی گئی اسی حد تک ان کے آگے اصل حقیقت اور ربوبیت کا صادق نظارہ بے نقاب ہونے لگا ۔ تا آنکہ ہر طرف سے ہٹ کر اللہ کے ہو کر رہ گئے ۔ اطمینان و سکون کی اس نعمت کو لوگ روپے کے ڈھیروں بنک کی پاس بکوں اور سرمایہ کی دوسری منقولہ وغیر منقولہ جائیدادوں میں تلاش کرتے ہیں لیکن اخبات الی ربهم کی باطنی نعمت جسے مل جاتی ہے اس کے پاس ظاہر میں خواہ کچھ ہو یا نہ ہو لیکن اس کے قلب میں سکون و اطمینان ہوتا ہے ۔ دل کے ڈانوا ڈول ہونے سے ان کو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نجات مل جاتی ہے اور اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ایسے اقدامات کی ان کے اندر جرأت پیدا ہو جاتی ہے۔ جن کو اللہ سے بیگانہ لوگ سوچ ہی نہیں سکتے۔ اخبات کی باطنی روشنی جو ایمان و عمل صالح کے نتیجے میں ان کو ملی تھی اسی روشنی میں انہوں نے معلوم کر لیا کہ اللہ سبحانہ کی ربوبیت سب کی پروردگاری کر رہی ہے وحدانی ربوبیت کے اس جلوے نے ان کے لیے اسیری غریبی، گھر میں ہونا اور بے گھر ہونا دونوں کو ایک کر دیا تھا ان کی قوم جو ایمان سے پیدا ہونے والی اس بصیرت سے محروم تھی۔ ان کی سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ کہ لا محدود کثرتوں کے اس نظام کی ربوبیت و پروردگاری کے لیے صرف ایک ہی رب کیسے کافی ہو سکتا ہے۔ اسی لیے ایک خالق کے وجود کو ربوبیت و پروردگاری کے لیے ناکافی سمجھتے ہوئے انہوں نے دوسری ہستیوں کے ساتھ وہی رشتہ قائم کر لیا تھا جو رشتہ بندوں اور ان کے معبود میں ہوتا ہے۔ یعنی ان سے مدد حاصل کرنے کے لیے ان کی عبادت کرتے تھے۔ ان سے دعائیں مانگتے تھے، ان کی پوجا پاٹ کرتے تھے، مگر ان مؤمنین اور مخلصین کے استکبار اور غرور نفس چھوڑ کر اللہ کے سامنے عاجزی اختیار کی۔ اس کی بندگی اور غلامی پر مطمئن ہو گئے اور اس کے فیصلوں پر راضی ہو گئے۔

(۳۰) دو مثالی جماعتوں کی تمثیل

ان دونوں فرقوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک اندھا بہرا ہو۔ اور دوسرا بینا اور شنوا ہو بتاؤ کیا یہ دونوں برابر ہو سکتے ہیں۔ کیا تم غور و فکر سے کام نہیں لیتے ہو یعنی منکرین حق اندھے اور بہرے ہیں۔ جیسا کہ پہلے ارشاد ہوا ما کانوا یستطیعون السمع وما کانوا یبصرون۔ پھر جسے نہ خود نظر آئے اور نہ دوسرے کی سن سکے اس کا آغاز و انجام کیسے ان روشن ضمیر ایمان داروں کے برابر ہو سکتا ہے جو بصیرت کی آنکھوں سے حق و باطل اور بھلے برے میں تمیز کرتے ہیں اور اپنے ہادیوں کی باتیں گوش ہوش سنتے ہیں۔ غور کرو ان دونوں کا انجام کیسے برابر ہو سکتا ہے ؟ آگے حضرت نوح علیہ السلام کا واقعہ اس کی تائید میں پیش کرتے ہیں۔[1]

دونوں جماعتوں کا بھرپور چہرہ پیش کرنے کے بعد ان دونوں کی ایک تمثیل پیش کی ہے ایک اہل ایمان کی جماعت اور دوسری منکرین حق کی۔

منکرین حق کی حالت ایسی ہے جیسے کوئی شخص اندھا اور بہرا ہو۔ اندھا ہونے کی وجہ سے راہ دیکھ

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں سکتا اور بہرا ہونے کی وجہ سے راہ آشنائی بات سُن نہیں سکتا۔ یہ منکرین حق ہیں جو اندھے ہونے کی وجہ سے راہ حق نہیں دیکھتے ہیں اور بہرے ہونے کی وجہ سے راہ حق پر جانے والے کی پکار نہیں سنتے ہیں۔ اس کے مقابلے میں اہل ایمان کی جماعت ہے جو آنکھوں سے بینا اور کانوں سے شنوا ہے۔ حق کو آنکھوں سے دیکھ رہی ہے۔ اور داعی حق کی بات کانوں سے سُن رہی ہے۔ سوچو کہ یہ دونوں برابر کیسے ہو سکتے ہیں۔ کیا روشنی اور اندھیرے میں کوئی فرق نہیں ہے، کیا بصارت اور کوری کا ایک حکم ہے اگر نہیں ہے تو ضروری ہے کہ دونوں کے احوال و نتائج ایک دوسرے سے متضاد ہوں اور دنیا میں ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے جیسا کہ اب ہو رہا ہے۔ سوچنے کی بات ہے کیا ان دونوں کو طرز عمل اور بالآخر انجام برابر ہو سکتا ہے۔ ظاہر ہے جو شخص نہ خود راستہ دیکھتا ہو اور نہ کسی ایسے شخص کی بات ہی سنتا ہے جو اسے راستہ بتا رہا ہے وہ ضرور کہیں ٹھوکر کھائے گا۔ اور کہیں کسی سخت حادثہ سے دوچار ہوگا۔ بخلاف اس کے جو خود ہی راستہ دیکھ رہا ہے اور کسی واقف کار کی راہنمائی سے فائدہ اٹھاتا ہے۔ وہ ضرور منزل مقصود پر بسلامت پہنچ جائے گا۔ یہی فرق ان لوگوں کے درمیان ہے جن میں سے ایک اپنی آنکھوں سے بھی کائنات میں حقیقت کی نشانیوں کا مشاہدہ کر رہا ہے۔ اور اللہ سبحانہ کے روانہ کردہ رسول کی بھی بات سنتا ہے۔ اور دوسرا نہ خود ہی دیکھتا ہے اور نہ پیغمبر کی بات سنتا ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دونوں برابر ہوں۔ اعمال کا یہ اختلاف بزبان حال بول رہا ہے۔ کہ دونوں کا انجام بھی مختلف ہے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا نُوْحًا اِلٰى قَوْمِهٖٓ اِنِّىْ لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝

اَنْ لَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّا اللّٰهَ ؕ اِنِّىْٓ اَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ اَلِيْمٍ ۝

فَقَالَ الْمَلَاُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ قَوْمِهٖ مَا نَرٰىكَ اِلَّا بَشَرًا

مِّثْلَنَا وَمَا نَرٰىكَ اتَّبَعَكَ اِلَّا الَّذِيْنَ هُمْ اَرَاذِلُنَا بَادِىَ

الرَّاْىِ ۚ وَمَا نَرٰى لَكُمْ عَلَيْنَا مِنْ فَضْلٍۭ بَلْ نَظُنُّكُمْ

كٰذِبِيْنَ ۝

اور بلاشبہ ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف روانہ کیا۔ انہوں نے قوم سے کہا۔ لوگو! میں تمہارے لیے کھلے طور پر نذیر بن کر آیا ہوں یعنی یہ بتانے آیا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی سے بھی عابدانہ تعلقات نہ رکھو۔ مجھے اندیشہ ہے تمہارے لیے دردناک عذاب کے دن کا[۲۵] ان کی قوم میں سے بڑے منکرین نے کہا تم تو ہمیں ہمارے ہی جیسے انسان نظر آتے ہو اور تمہارے پیچھے لگنے والے بھی بظاہر نیچ قوم کے لوگ نظر آتے ہیں اور تمہیں ہم پر کوئی بھی برتری نہیں ہے ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں[۲۶]

توحید عبادت پر تاریخی استدلال

توحید عبادت یہ ہے کہ جب خالق ایک ہے۔ ساری کائنات کا چلانے والا ایک ہے۔ تو ہمارے نیازمندانہ اعمال اور ہماری عبادتوں کا مستحق بھی ایک ہی ہے۔ ایک کے ساتھ کوئی دوسرا نہیں ہے۔ سرزمین عرب میں ملحد کم تھے زیادہ تر بلکہ قریباً تمام تر مشرکین تھے۔ جو اللہ سبحانہ کو اگرچہ مانتے تھے لیکن یہ بھی مانتے تھے کہ اس کے سوا ہمارے نیازمندانہ اعمال کے اور بھی مستحق ہیں۔ وہ دو خدا نہیں مانتے تھے۔ لیکن خدائی میں ضرور شریک مانتے تھے اور نظام عالم کے چلانے میں ان کو اللہ کا ساجھی اور ساتھی کہتے تھے۔ انسان کی فطرت ہے کہ جس سے اس کو براہ راست کام پڑتا ہے اس کو زیادہ مانتا ہے۔ اسی سے زیادہ محبت کرتا ہے اسی کی زیادہ پرستش کرتا ہے۔ چونکہ مشرکین کا اعتقاد تھا کہ بادلوں کی بارش غلہ کی پیداوار اور نباتات کی روئیدگی سب اجرام فلکی یا اصنام کا کام ہے۔ اس لیے ان کو عبودیت کا جو تعلق تھا ان ہی معبودوں سے وہ ان ہی کی عبادت کرتے تھے ان ہی سے محبت کرتے تھے۔ ان ہی پر نذرانے چڑھاتے ان ہی کے سامنے قربانیاں کرتے معرکوں میں ان ہی کے نام کی جے پکارتے اس بنا پر قرآن اور نبوت کا اصلی کام اسی شرک اور اصنام پرستی کو مٹانا تھا۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم میں وجود باری کے متعلق بہت کم استدلال ہے۔ زیادہ تر شرک کا ابطال اور اس کی تحقیر و توہین ہے۔ قرآن نے ان کو بتایا کہ اللہ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر شان معبودیت رکھتا ہو۔ جو پوجے جانے کا مستحق ہو، جس کی رضا چاہی جائے، کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے سامنے پیشانیاں جھکیں، نذریں پیش کی جائیں۔ اعتراف نعمت کیا جائے۔ کوئی اور نہیں جسے ولی کارساز حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے۔ جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے، کوئی اور نہیں جس پر توکل کیا جائے۔ دل میں جس کا خوف رکھا جائے، جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں اور جن سے حقیقی محبت رکھی جائے، کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا کوئی ذرہ ہو جو بال برابر بھی کسی کو نفع یا نقصان پہنچا سکے جو کسی کیلئے قانون بنانے اور اپنا حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔ پرستش بھی اسی کی ہونی چاہیئے اور بندگی کے تعلقات بھی اُسی سے استوار ہونے چاہئیں۔ یہ ہے۔ توحید عبادت اور وہ دعوت جو قرآن پیش کرتا ہے اور جو نبوت محمدیہ لے کر آئی اور جو اسلام کا طرہ امتیاز ہے ان میں سے ایک کا بھی انکار اللہ پر ایمان رکھنے کے دعوے کو بے معنے کر دیتا ہے۔

(۲۵) اور بلاشبہ ہم نے حضرت نوح علیہ السلام کو ان کی قوم کی طرف روانہ کیا۔ انہوں نے قوم سے کہا

لوگو! میں تمہارے لیے کھلے طور پر نذیر بن کر یہ بتانے آیا ہوں کہ اللہ کے سوا کسی سے بھی عابدانہ تعلقات نہ رکھو۔ مجھے اندیشہ ہے تمہارے لیے دردناک عذاب کے دن کا یعنی نہایت وضاحت کے ساتھ دو چیزیں بتلاتا ہوں۔ جن کے ارتکاب پر مہلک عذاب نازل ہونے کا اندیشہ ہے یا جو اس عذاب سے محفوظ رہنے کے ذرائع ہیں۔ غیر اللہ کی پرستش سے باز نہ آنے کی صورت میں سخت عذاب آنے کا اندیشہ ہے۔ ہے۔ دردناک دن سے وہ دن مراد ہے۔ جس میں المناک اور دردانگیز حوادث کا وقوع ہوگا مثلاً قیامت کا دن یا وہ دن جس میں قوم نوحؑ غرق آب کی گئی[1]

سورت کے آغاز میں جو دعوی کیا گیا تھا۔ ان لاتعبدوا الا اللہ یہاں سے اسی دعوے کے تاریخی دلائل شروع ہوئے ہیں ان تاریخی دلائل میں پہلی کڑی حضرت نوح علیہ السلام کی ہے۔ قرآن کے ارشادات اور بائبل کی تصریحات سے یہ بات متحقق ہوجاتی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم اس سرزمین میں رہتی تھی جسے ہم آج عراق کہتے ہیں۔ بابل کے آثار قدیمہ بائبل سے قدیم تر جو کتبات ملے ہیں ان سے بھی اس کی تصدیق ہوتی ہے ان میں تقریباً اسی قسم کا ایک قصہ مذکور ہے جس کا ذکر قرآن اور توراۃ میں ہے اور اس کی جائے وقوع موصل کے نواح میں بتائی گئی ہے۔ جو روایات کردستان اور اور آرمینیا قدیم ترین زمانہ سے نسلاً بعد نسل آرہی ہیں۔ ان سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ طوفان کے بعد حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی اسی علاقہ میں کسی مقام پر ٹھہری تھی۔ موصل کے شمال میں جزیرہ ابن عمر کے آس پاس آرمینیا کی سرحد پر کوہ ارارط کے نواح میں نوح علیہ السلام کے مختلف آثار کی نشاندہی اب بھی کی جاتی ہے۔ اور شہر نخچیوان کے باشندوں میں آج تک مشہور ہے کہ اس شہر کی بنیاد حضرت نوح علیہ السلام نے رکھی تھی۔ حضرت نوحؑ کے واقعہ سے ملتی جلتی روایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں۔ اس کے علاوہ برما، ملایا، جزائر شرق الہند، آسٹریلیا، نیوگنی اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں ایسی ہی قدیم زمانہ سے روایات چلی آرہی ہیں۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ قصہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے جبکہ پوری نسل آدم کسی ایک ہی خطہ زمین میں رہتی تھی۔ اور پھر وہاں سے مختلف حصوں میں پھیلی۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی دعوت کا آغاز ان جملوں سے کیا ہے۔ جو اس سورۃ کے شروع میں آئے ہیں انی لکم نذیر مبین اور ان لاتعبدوا الا اللہ اور انی اخاف

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علیکم عذاب یوم الیم ۔ سورۃ کے شروع میں پڑھ آئے ہو ۔ ان لا تعبدوا الا اللہ اننی لکم منہ بشیر و نذیر ۔ اسی دعوے پر یہ تاریخی شہادت ہے جو بات آج کہی جا رہی ہے۔ وہی بات تاریخ کے ہر دور میں کہی گئی ہے ۔ جو بات محمد رسول صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں وہی بات حضرت نوح علیہ السلام نے فرمائی تھی کہ ان لا تعبدوا الا اللہ اس کے سوا اس کا مطلب کچھ نہیں ہے کہ اللہ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلقات نہ رکھو۔

اللہ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلقات کیوں نہ رکھو؟ اس لیے کہ لا الہ الا اللہ پوری کائنات ہستی میں اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے ۔ الٰہ مفال کے وزن پر ہے ۔ اس کے معنے اس ذات کے ہیں جس کی عبادت کی جائے ۔ جیسے امام اس کو کہتے ہیں جس کی اقتدا کی جائے ۔ ہر قوم کے نزدیک جس کی عبادت کی جائے وہ الٰہ ہے ۔ خواہ معبود برحق ہو یا معبود باطل ۔ لفظ اللہ اسم ذات ہے جبکہ الٰہ اسم ذات نہیں اسم صفت ہے ۔ یعنی خدا کی ساری صفتوں کا موصوف لفظ اللہ ہوتا ہے ۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ یہ دونوں مترادف نہیں ہیں ۔ لا الہ الا اللہ کے یہ معنے نہیں کے خدا کے سوا خدا کوئی نہیں بلکہ صحیح معنے یہ ہیں کہ اللہ کے سوا معبود کوئی نہیں قرآن عزیز کے تمام مترجمین نے اس کا ترجمہ غلط اور مراد متکلم کے خلاف کیا ہے۔ صرف حضرت شاہ عبد القادرؒ، شیخ الہندؒ نے ترجمہ صحیح کیا ہے ۔ یہاں جو بات منفی انداز میں کہی گئی ہے ۔ دوسرے موقعہ پر مثبت انداز میں اس طرح پیش کیا ہے ۔ یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہٗ ۔ لوگو! اللہ سے عابدانہ تعلقات رکھو اللہ کے سوا تمہارا معبود کوئی نہیں ہے ۔ اس کا مطلب یہی ہو سکتا ہے کہ جس فطری جذبے کی راہنمائی میں دعا، نذر قربانی وغیرہ مختلف اشغال و اعمال کی صورت میں استفادہ کیا جاتا ہے اس جذبے کے تعلق کا مستحق اللہ سبحانہ کی ذات مبارک کے سوا کوئی دوسری طاقت نہیں اسی کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ لا الہ الا اللہ ۔ اللہ کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں ۔ موجودہ زندگی ہو یا مرنے کے بعد آنے والی زندگی ۔ ہر زندگی کی ضروریات کے بارے میں بتایا جا رہا ہے کہ اللہ سبحانہٗ ہمارا الٰہ سب ضروریات میں ہے ۔ دوسرے لفظوں میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ ہمارا الٰہ الدنیا والٰہ بالآخرۃ ہے ۔ بلا شبہ انبیاء کی دعوت میں حق تعالیٰ شانہٗ کی الوہیت کو الدنیا بالآخرۃ کے ساتھ محدود نہیں کیا ہے ۔ بلکہ عموماً ان لا تعبدوا الا اللہ کا خطاب جن لوگوں سے تھا ۔ اور جن کی غلطی کی تصحیح نبوت کے پیش نظر تھی وہ اولا الدنیا کی ضرورتوں کی بجا آوری کے لیے اللہ کے سوا دوسروں سے عابدانہ تعلقات رکھتے ہیں ۔ یعنی اللہ کے سوا جن کو الٰہ بنا کر جو کچھ مانگا جاتا تھا وہ عام طور پر اسی زندگی کی چیزیں ہوتی ہیں ۔ مثلاً بارش برسائی جائے، مویشیوں کا دودھ اور ان کی نسل بڑھائی جائے ۔ کھیتیوں کی پیداوار

میں برکت دی جائے ۔ باغوں کو آفتوں سے محفوظ رکھا جائے، قحط دور کیا جائے، بیماریوں اور وباؤں سے تحفظ ہو، ہنرمند اولاد ہو، دشمنوں پر فتح نصیب ہو ۔ غیر اللہ کو الہ بنا کر جو پوجا پاٹ کرتے ہیں ان کی غرض یہی ہوتی تھی اور اب بھی یہی ہے آج بھی دنیا میں الوہیت میں شرک پس منظر معاشی ضرورتوں کے سوا کچھ نہیں ہے ۔ آپ نے کسی مندر کے پجاری، کسی گرجا میں حضرت مسیح کی مورتی کے سامنے پوجا پاٹ کرنے والے اور کسی مزار پر چڑھاوا چڑھانے والے کو یہ مانگتا ہوا کبھی نہ دیکھا ہوگا ۔ کہ عذاب قبر سے بچایا جائے، حشر کی پریشانیاں دور ہوں ۔ جہنم سے حفاظت ہو ۔ جنت کی ابدی زندگی ملے ۔ بلکہ جو کچھ ان معبودوں اور الہوں سے ان کا تعلق سارا کا سارا دنیا کی ضرورتوں سے ہے ۔ ایسی حالت میں نبوت کا ان سے یہ مطالبہ کہ اللہ سے عابدانہ تعلقات قائم کرو ۔ اللہ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلقات نہ رکھو ۔ اس کا مطلب مخاطب کے طرز عمل کی بنیاد پر یہی ہو سکتا ہے کہ جن حاجتوں اور ضرورتوں کے لیے غیر اللہ کو الہ بنائے ہوئے ہو ۔ ان ہی حاجتوں اور ضرورتوں کے لیے بجائے ان کے اللہ سبحانہٗ کو اپنا الہ بناؤ ۔ اس لیے کہ یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ ان لا تعبدوا الا اللہ کا اولین رُخ دنیوی زندگی کی پیچیدگیاں ہیں ۔ مطلب یہ ہے کہ جب سب چیزوں کا پیدا کرنے والا اللہ ہے تو مانگنا بھی اللہ سے چاہیئے اور سب کچھ مانگنا چاہیئے ۔ حتی کہ خمیر میں ڈالنے کے لیے نمک بھی ۔

کاش ان لا تعبدوا الا اللہ کا مقصد سمجھ لیا جاتا تو معاشی ضرورتوں کے لیے اللہ سے عابدانہ تعلقات کا طریقہ رفتہ رفتہ جو مسلمانوں میں مفقود ہوتا جا رہا ہے وہ مفقود نہ ہوتا ۔ اور آج امت اسلامیہ کے ایک بڑے طبقہ نے ان ہی معاشی ضرورتوں کے لیے مختلف ناموں سے ہر جگہ الہ بنا رکھے ہیں ۔ اور جنہیں دیکھ کر اہل ایمان کا کلیجہ منہ آتا ہے ۔ وجود میں نہ آتا ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون ۔

غربت و افلاس کے اس دور میں آج بھی مسلمانوں کی دولت، ان کا وقت، ان کی توانائیوں کی بہت بڑی مقدار ان بے سود مشرکانہ اعمال پر صرف ہو رہی ہے یہ تو دنیا میں ہے ۔ اور خدا ہی جانتا ہے ۔ کہ اس سلسلے میں کتنوں کے اعمال و افعال شرک جلی کی ان حدود کو پھاندرہے ہیں جن کے بعد اخروی زندگی کی ان تباہیوں سے دوچار ہونا پڑے گا جن کی خبر قرآن نے دی ہے ۔

"ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ"

خلاصہ یہ ہے کہ ان لا تعبدوا الا اللہ کا مطالبہ اس وقت تک پورا نہیں ہوتا جب تک خودساختہ الہوں سے انسانی زندگی کا عابدانہ تعلق نہیں ٹوٹتا ۔ اور یہ تعلق اس وقت تک نہیں ٹوٹ سکتا جب تک اللہ سبحانہٗ سے معاشی ضرورتوں میں الٰہ ہونے کا تصور پختہ نہ ہو جائے ۔ ایسا تعلق جو ہر وقت، ہر حال میں ۔ ہر جگہ اس کے پاس ہو، اس کو محیط ہو ۔ ظاہر و باطن، اول و آخر سب پر وہی حاوی ہو جائے ۔ کس قدر

دردانگیز ہے یہ سماں کہ انسان زندگی کے تمام شعبوں میں مدد تو اللہ سبحانہٗ سے حاصل کر رہا ہے قدموں سے لے کر انفاس تک تو اس کے سہارے گزارتا ہے لیکن بھجن دوسروں کے گاتا ہے۔ دہائی دوسروں کی دیتا ہے۔ قرآن نے ان لاتعبدوا الا اللہ کہہ کر انسان کو بتایا ہے کہ اسی کی عبادت کی جائے اور اسی سے زندگی کی ساری شاخوں میں مدد مانگی جائے۔ جو معبود ہو وہی مستعان ہو۔ جس کا کھائیے اسی کا گائیے اس مقصد میں کامیابی کی بنیادی شرط یہ ہے کہ لہٗ الآخرۃ کے ساتھ لہ الاولیٰ کے قرآنی یقین کو دلوں میں پوری طاقت کے ساتھ پیدا کرے۔ آخر سوچیے کہ اللہ سبحانہٗ کو معبود بنانے کا مطلب اس کے سوا کیا ہے کہ کسی دوسرے سے نہیں بلکہ پیدا کرنے والے ہی سے اس کی پیداواروں کو مانگا جائے۔ بلاشبہ علم ویقین کا جس احساس پر دعا کا یہ شعبہ قائم ہے یعنی یہ بات کہ ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے یہ ایسا دعویٰ ہے جو وجدانی طور پر ہر ایک کی فطرت کے خمیر میں گندھا ہوا ہے۔ قرآن نے اس کی خبر دی ہے۔ تجربہ اس کی شہادت دیتا ہے۔ بات صاف ہے کہ جب ہر چیز کا پیدا کرنے والا اللہ ہی ہے تو پیدا کرنے والے ہی سے اس کی پیدا کی ہوئی چیزوں کو مانگنے کے لیے ان لاتعبدوا الا اللہ کی تعمیل کے سوا چارہ کار ہی کیا ہے اور اللہ کو معبود مان لینے کے بعد الٰہ باطلہ کا نظام درہم برہم ہو کر رہ جاتا ہے۔ اور معاشی خساروں کی وہ ساری راہیں خود بخود بند ہو جاتی ہیں۔ جن کی بے حاصلی کو دیکھ کر بصیرت والوں نے ہمیشہ خون کے آنسو بہائے ہیں۔

بہرحال حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا ان لاتعبدوا الا اللّٰہ اللہ سبحانہٗ کے سوا کسی کی پرستش اور بندگی نہ کرو دعاؤں، طلبگاریوں، درودوں، وظیفوں میں اللہ کے سوا کسی کے سامنے طلبگاری کے لیے ہاتھ نہ پھیلاؤ احبیب الدعوۃ الداع اذا دعان اسی کی شان ہے ادعونی استجب لکم اسی کا مقام ہے۔ ان اعبدونی ھٰذا صراط مستقیم اسی کا اعلان ہے اگر تم سرکشی سے باز نہ آئے تو عذاب کا ایک بڑا ہی دردناک دن آنے والا ہے یہ وہی بات ہے جو نبوت محمدیہ نے آغاز سورۃ میں پیش کی تھی۔ ان تولوا فانی اخاف علیکم عذاب یوم کبیر۔ دونوں باتوں میں کیسی ہم آہنگی ہے۔ جو بات مکہ میں کہی جا رہی ہے وہی بات عراق میں حضرت نوح علیہ السلام ہزاروں سال پہلے فرما رہے ہیں۔ یہی قرآن کا مقام استشہاد ہے کہ تاریخ کا مطالعہ کرو۔ تاریخ کا مطالعہ تمہیں بتائے گا کہ دنیا کی کوئی آبادی ایسی نہیں ہے جہاں اس طرح کا معاملہ پیش نہ آیا ہو جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو پیش آرہا ہے۔ ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے کہ قوموں میں ایک خاص قسم کی شخصیتیں پیدا ہوتی ہیں۔ اور انہوں نے ایک خاص طرح کی صدا بلند کی اور ان کے اور ان کی قوم کے درمیان خاص طرح کے معاملات پیش آئے اور بالآخر نتیجہ رونما ہوا اور اس نتیجے نے تمام قضیے کا فیصلہ کر دیا۔ یہ سارا معاملہ اپنی

ساری باتوں میں کچھ اس طرح یکساں اور ہم آہنگ ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے کہ ایک ہی حقیقت ہے جو بار بار ابھرتی اور اپنے آپ کو دکھاتی رہتی ہے یا ایک ہی زنجیر ہے جس کی مختلف کڑیاں یکے بعد دیگرے رونما ہوئی ہیں یہ اس بات کی نشاندہی ہے کہ ملکوں اور قوموں کا اللہ سبحانہٗ کی جانب سے قانون سعادت و شقاوت ایک ہے۔ چونکہ ہمیشہ کام کرتا رہا ہے اس لیے اب بھی ضرور کام کرے گا۔

(۳۴) زعماء، قوم اور حکمران کی سرکشی

ان کی قوم میں سے بڑے متکبرین نے کہا کہ تم ہمیں ہمارے ہی جیسے انسان نظر آتے ہو اور تمہارے پیچھے لگنے والے بظاہر نیچ قوم کے لوگ نظر آتے ہیں اور تمہیں ہم پر کوئی بھی برتری نہیں ہے ہم تو تمہیں جھوٹا سمجھتے ہیں۔ یعنی رسول کو تمام قوم کے مقابلے میں نمایاں امتیاز ہونا چاہیئے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ تم ہماری طرح جنس بشر ہو کوئی آسمان کے فرشتے نہیں ہو جس کے سامنے خواہ مخواہ انسانوں کی گردنیں جھک جائیں پھر بشر بھی ایسے نہیں جسے کوئی خاص تفوق اور بڑائی ہم پر حاصل ہوتی۔ مثلاً بڑے دولت مند اور جاہ و حکومت کے مالک ہوتے۔ جو لوگ تمہارے پیرو ہوتے وہ بھی ماشاء اللہ سب کے سب مفلس، رزیل، پست اور ادنیٰ طبقہ کے لوگ ہیں۔ جن کے ساتھ بیٹھنا بھی ہم جیسے شریفوں کے لیے ننگ و عار کا موجب ہے تو کیا ساری خدائی میں سے تم ہی ملے تھے۔ جنہیں خدا نے اپنے منصب سفارت پر مامور فرمایا۔ آخر ہم تم میں سے حسب نسب، مال و دولت، خلق و خلق کس بات میں کم تھے۔ جو ہمارا انتخاب اس عہدہ کے لیے نہ کیا گیا۔ کم از کم آپ کا اتباع کرنے والے ہی کوئی معزز اور بڑے آدمی ہوتے بھلا ان موچیوں اور حجاموں کا تابع ہو جانا آپ کے لیے کیا موجب فضل و شرف ہو سکتا ہے اور کس طرح صداقت کی دلیل بن سکتی ہے ایسے سطحی لوگوں کا جن کی پستی اور رزالت بالکل عیاں ہے بے سوچے سمجھے بدوں غور و تامل کے ظاہری اور سرسری طور ایمان لے آنا آپ کا کون سا کمال ہے بلکہ ہمارا خیال تو یہ ہے کہ تم اور تمہارے ساتھی سب جھوٹے ہو۔ تم نے ایک بات بنائی اور چند بے وقوفوں نے ہاں میں ہاں ملا دی تاکہ اس طرح ایک نئی تحریک اٹھا کر کوئی امتیاز اور بزرگی حاصل کر لیں یہ ان ملعونوں کی تقریر کا ماحصل تھا۔ نوح علیہ السلام کا جواب آگے آ رہا ہے[1] لفظ مـلأ ملأ یملأ سے بنا ہے لغوی مفہوم بھرنا ہے اپنے اسی مفہوم سے ترقی کر کے ان لوگوں کے لیے بولا جاتا ہے جن میں طاقت بھری ہوئی ہو۔ جیسے

[1] افادات از شیخ الاسلام

کسی قوم کے اشراف واعیان اور اکابر وسادات مطلق جماعت کے معنے میں نہیں بلکہ اہل حل وعقد یا اہل الرائے کو کہتے ہیں۔ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں۔ اشرافہم ووجوہہم۔ قوم کے اشراف اپنی رائے کی خوبی اور طاقت کی نمائش سے لوگوں کی آنکھوں کو بھر دیتے ہیں۔ یا اپنی قوت انتظامی سے دلوں میں ہیبت بھر دیتے ہیں۔ اس لیے ان کو ملأ کہتے ہیں علامہ ابوالسعودؒ کہتے ہیں۔ جو لوگ زینت محفل ہوں دلوں میں ان کی عظمت وہیبت بھری ہوئی ہو۔ اور آنکھوں میں ظاہری حسن وجمال ہو تو ان کو ملأ کہتے ہیں۔ امام راغب نے بھی ابوالسعودؒ کی تائید کی ہے۔ بہرحال قوم کے ان زعمار اشراف واعیان نے حضرت نوح علیہ السلام کی اس دعوت کے جواب میں انی لکم نذیر مبین ان لا تعبدوا الا اللہ بیک وقت تین باتیں کہی ہیں۔ ایک یہ کہ ما نراک الا بشرا مثلنا
دوسری یہ کہ ما نراک اتبعک الا الذین ہم اراذلنا
تیسری یہ کہ ما نری لکم علینا من فضل

ان تینوں مقدمات یا ان کی بنیاد انکے خیال میں یہ ہے کہ نبوت ایک درجہ کمال ہے اور درجہ کمال حاصل ہونے کے لیے تین باتوں میں سے ایک بات کا ہونا ضروری ہے۔

اوّل یہ کہ تم ہمارے ہی جیسے انسان ہو اگر اللہ سبحانہ روانہ فرماتے تو اس کے لیے کسی برتر مخلوق جیسے فرشتے کو رسول بنا کر روانہ کرتے۔ یہی وہ بنیادی گمراہی ہے جس میں پھنس کر عیسائی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انسانیت کے منکر ہو گئے ان کا خیال ہے کہ انسان کو انسان کا بیٹا کیونکہ نجات دے سکتا ہے اور یہ نہ سمجھے کہ انسان ماں کے پیٹ سے گنہگار نہیں ہے بے گناہی اور معصومیت کے لیے انسانیت سے پاک ہونا ضروری نہیں ہے یہی بات دوسرے منکرین نبوت کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ وہ انبیا علیہم السلام کو ظاہری اور جسمانی طور پر اپنی ہی طرح کا انسان سمجھ کر ان کو نبوت کا مستحق نہ سمجھتے۔ ان انتم الا بشرا مثلنا دوسروں کو نبی کے انکار پر بھی اسی دلیل سے آمادہ کرتے ہل ھذا الا بشر مثلکم حضرت نوح علیہ السلام کی قوم بھی اسی بیماری کا شکار تھی۔ انہوں نے اپنے دعوے کی صداقت کو ہدایت اور مشاہدے کا سہارا لے کر پیش کیا۔ ما نراک الا بشرا مثلنا

حقیقت یہ ہے کہ انبیا کے دو رُخ ہوتے ہیں۔ ایک طرف تو وہ بشریت کے جامہ میں ہوتے ہیں۔ اور انسانوں ہی کی طرح کھاتے پیتے ہیں، چلتے پھرتے ہیں، سوتے جاگتے ہیں، شادی بیاہ کرتے اور پیدا ہوتے ہیں رحلت فرماتے وارتقا ہوتے ہیں۔ دوسری طرف وہ اپنی روحانیت بے گناہی باکرامتی اور اختصاص نبوت میں انسانوں سے بلند تر ہوتے ہیں۔ وہ اپنے بشری اوصاف کے لحاظ

سے بلاشبہ انسان ہوتے ہیں لیکن اسی کے ساتھ وہ اپنے مافوق الفطرت بشری خصوصیات کی بنا پر فوق البشر ہوتے ہیں۔ قرآن ایک طرف انبیاء کو مخلوق محض صرف انسان اور پورا بندہ اللہ سبحانہٗ کے حکم کے سامنے عاجز تسلیم کرتا ہے۔ لیکن دوسری طرف وہ ان کو اللہ سبحانہٗ کا برگزیدہ معصوم اور نیک اور اللہ سبحانہٗ کی قدرت سے فیض پاکر برکتوں، سعادتوں اور ہدایتوں کا مرکز اور اس کی اجازت سے عجیب وغریب امور صادر کرنے والا بتاتا ہے۔

اہل عرب بھی ہندوؤں، یونانیوں کی طرح یہ سمجھتے تھے کہ انسان کی راہنمائی کے لیے خود انسان نہیں بلکہ انسان سے مافوق ہستی ہونی چاہیئے۔ قرآن نے ان کے خیال کی بار بار تکذیب کی ہے۔

قوم نوحؑ کے زعماء اشراف اور اکابر کا موقف بھی یہی تھا کہ تم چونکہ انسان ہو اس لیے انسان ہوتے ہوئے تم اس کمال کے لائق نہیں ہو۔ یہاں علامہ بقاعیؒ نے یہ بات خوب فرمائی ہے کہ

فرشتہ نہیں ہو جس میں رسالت کی صلاحیت ہوتی ہے۔ تم تو آدمی ہو اور آدمی میں رسول ہونے کی صلاحیت نہیں ہوتی ہے۔

براہمہ کی بھی یہی رائے ہے۔

یعنی ان کے خیال میں انسان میں روحانی کمال حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے۔ یہی نبوت کے موضوع پر ان کی فکری گمراہی تھی۔

حضرت نوح علیہ السلام کی تکذیب کا وہ فیصلہ پہلے کر چکے تھے اس فیصلہ کے لیے بطور دلیل پہلے یہ بات پیش کی ہے کہ چونکہ آپ انسان ہیں اس لیے تم نبی نہیں ہو۔ دراصل چونکہ ان کے پیش نظر اسباب کمال نہ تھے اس لیے کمال کے اسباب کو مقرر کرنے کے لیے ادھر ادھر ہاتھ مارے۔ استدلال کی اسی غلطی نے ان کے منہ سے یہ بات نکلوائی ۔ ما نراک الا بشرا مثلنا۔ استدلال کا رخ بجائے کسی معقول اساس کے اپنے دیکھنے کی طرف پھیر دیا۔ اور جب دیکھا کہ یہ استدلال نا تمام ہے تو بات کو دوسری طرف لے گئے اور بولے ما نراک اتبعک الا الذین ھم۔ اراذل جمع ارذل کی ہے بافلاف قیاس رذیل کی جمع ہے یعنی تمہارے پیچھے لگنے والا ہمارے معاشرے کا اور شہری زندگی کا وہ طبقہ ہے جو کہ شہری زندگی میں نیچ اور ادنیٰ درجے کے لوگ ہیں۔ انداز تعبیر ما نراک اتبعک الا اراذلنا چھوڑ کر الا الذین ھم اراذلنا۔ صرف یہ بتلانے کے لیے اختیار کیا ہے کہ نوح علیہ السلام اور ان کی پیروی کرنے والوں کی شہری زندگی میں بہت زیادہ شہرت تھی۔ یہ بھی ان کی فکری بحث کی ایک جیتی جاگتی مثال ہے کہ حصول کمال کے لیے معیار معاشی اور معاشرتی برتری کو بنا رہے ہیں۔

سوچیئے ان دو باتوں میں کون سا منطقی ربط ہے کہ چونکہ تمہارے پیروکار نادار، غریب، اور ضعفا ہیں۔ اس لیے آپ پیغمبر نہیں ہیں۔ یہ ان کی مادہ پرستانہ نگاہ کا قصور ہے ورنہ حصول کمال کے لیے امیری، دولت مندی شرط نہیں ہے۔ دیکھنے کی چیز دولت و سرمایہ نہیں بلکہ دیکھنے کی چیز فکر صحیح، عمل صالح اور اخلاق حسنہ ہیں۔ خود انکے نزدیک بھی انکار نبوت کیلئے اس دلیل میں کوئی قوت نہیں ہے اسی لیے اس سے ہٹ کر تیسری بات یہ کہتے ہیں مانری لکم علینا من فضل ہم پر تمہیں کوئی برتری نہیں ہے لہٰذا ہم تمہیں نبی کیسے مان لیں۔ یہ ان کے اندر کی بات ہے۔ قلب کی طہارت، ایمان کی قوت، اعمال کی کیفیت، اور اخلاق کی بلندی پر ان کی نظر نہ تھی۔ ان کو جو کچھ آنکھوں سے نظر آرہا تھا یہی کہ ان کے مقابلے میں حضرت نوحؑ کو سرمایہ اور دولت کی برتری حاصل نہ تھی۔ زعامت، سیادت کی طرح نبوت ہے جیسے نادار کو ہم چودھری نہیں بناتے اسی طرح نادار کو ہم نبی بھی نہیں مانتے یہ باتیں اپنے خیال میں بطور دلیل پیش کرکے اپنا یہ فیصلہ سنا دیا۔ بل نظنکم کاذبین۔ ہمارے خیال میں نبوت والی بات تم نے جھوٹ اڑائی ہے۔ غور کیجیئے یہی باتیں جن کے سہارے قوم نوح علیہ السلام حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کا انکار کر رہی تھی۔ بعینہ یہی باتیں قریش مکہ کی زبان پر حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے مقابلے پر آئی ہیں۔ قرآن میں ہے۔

مال ہذا الرسول یاکل الطعام ویمشی فی الاسواق

اس رسول کو کیا ہوا کہ کھانا بھی کھاتا ہے۔ بازاروں میں چلتا پھرتا بھی ہے۔

یہ اور اس قسم کی ساری باتیں مشرکین مکہ ہی کہتے تھے۔ یہاں قرآن کا موقف یہی ہے کہ جتنے رسول بھی آئے وہ ایسے ہی وقتوں میں پیدا ہوئے اور جن لوگوں میں پیدا ہوئے ان کی پکارہ بھی یہی تھی اور پکار کی نوعیت بھی یہی تھی۔ ان کی دلیلیں بھی یہی تھیں جن باتوں پر انہوں نے زور دیا وہ بھی یکسانی تھیں۔ ان ساری باتوں میں جیسے ایک رسول دوسرے رسول کی تصویر تھا۔ اور ہر دعوت دوسری دعوت کا عکس تھی۔ سارے انبیا علیہم السلام اس حال میں پیدا ہوئے کہ دنیوی طاقتوں اور حکمرانوں میں سے کچھ نہ رکھتے تھے۔ سب کا ظہور ایسے وقت میں ہوا جب خدا پرستی اور نیک عملی کی روشنی بجھ چکی تھی۔ سب نے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو اس کے سوا کوئی معبود نہیں ہے۔

قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ
رَّبِّيْ وَاٰتٰىنِيْ رَحْمَةً مِّنْ عِنْدِهٖ فَعُمِّيَتْ عَلَيْكُمْ ۭ اَنُلْزِمُكُمُوْهَا
وَاَنْتُمْ لَهَا كٰرِهُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ لَآ اَسْـَٔلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا ۭ اِنْ
اَجْرِيَ اِلَّا عَلَى اللّٰهِ وَمَآ اَنَا بِطَارِدِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ۭ اِنَّهُمْ مُّلٰقُوْا
رَبِّهِمْ وَلٰكِنِّيْٓ اَرٰىكُمْ قَوْمًا تَجْهَلُوْنَ ۝ وَيٰقَوْمِ مَنْ
يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ طَرَدْتُّهُمْ ۭ اَفَلَا تَذَكَّرُوْنَ ۝ وَ
لَآ اَقُوْلُ لَكُمْ عِنْدِيْ خَزَاۗىِٕنُ اللّٰهِ وَلَآ اَعْلَمُ الْغَيْبَ وَ
لَآ اَقُوْلُ اِنِّيْ مَلَكٌ وَّلَآ اَقُوْلُ لِلَّذِيْنَ تَزْدَرِيْٓ اَعْيُنُكُمْ
لَنْ يُّؤْتِيَهُمُ اللّٰهُ خَيْرًا ۭ اَللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا فِيْٓ اَنْفُسِهِمْ ښ اِنِّيْٓ
اِذًا لَّمِنَ الظّٰلِمِيْنَ ۝

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا لوگو! تمہاری اس معاملے میں کیا رائے ہے کہ اگر میں فی الواقع اپنے رب کی جانب سے ایک روشن اور صاف راستہ پر ہوں اور اس نے مجھے اپنی جانب سے خاص رحمت سے نوازا ہو یعنی نبوت دی ہو۔ مگر وہ تمہیں نظر نہ آتی ہو تو کیا ایسی صورت میں میں

اور میرے ساتھی تمہیں اس کے بارے میں مجبور کر سکتے ہیں جبکہ تم اس سے بیزار ہو[۲۳] لوگو! میں اس کام پر تم سے کوئی سرمایہ کا سوالی نہیں ہوں۔ مزدوری تو مجھے اس کام کی وہی دے گا۔ جس کا میں کام کر رہا ہوں یعنی اللہ[۲۴]۔ اور دیکھو میں ان لوگوں کو دھکے نہیں دے سکتا جو نعمت ایمان سے مالا مال ہو گئے ہوں خواہ وہ تمہاری نظر میں کتنے ہی حقیر ہوں۔ وہ بلاشبہ اپنے پروردگار کے حضور پیش ہوں گے[۲۵] لیکن میری بصیرت یہ کہتی ہے کہ اس راہ میں تم عقل سے بے بہرہ ہو حقیقت تک تمہاری کوئی رسائی نہیں ہے[۲۶]۔ لوگو! بتاؤ کہ اگر میں ان کو دھکے دیدوں تو مجھے اللہ کی گرفت سے کون بچائے گا۔ کیا تم اس پر غور نہیں کرتے ہو[۲۷]۔ اور دیکھو میں تم سے یہ نہیں کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں۔ اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں۔ اور نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں۔ اور میں یہ بھی نہیں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تم حقارت کی نظر سے دیکھتے ہو اللہ انہیں کوئی بھلائی نہیں دے گا اللہ ہی بہتر جانتا ہے جو کچھ ان کے دلوں میں ہے۔ اگر میں ایسا کہوں تو میں ظالموں میں سے ہوں گا[۲۸]۔

مفردات کے معانی

عُمِّیَت : وہ چھپادی گئی نظروں سے اوجھل کر دی گئی تعمیہ سے بنا ہے۔ باب تفعیل ہے۔ مادہ عمی ہے

عمی یعمی باب سمع سے ہے۔ مشتبہ ہوجانا۔ نظروں سے اوجھل ہونا علامہ احمد فیومی نے مصباح میں عمی الخبر کے معنے خبر پوشیدہ ہونے کے لکھے ہیں۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں عمی علیہ کے معنے کسی چیز کا ایسا مشتبہ ہونا کہ آدمی اس کے لحاظ سے اندھا ہوجائے اور وہ چیز اسے بالکل سجھائی نہ دے ارشاد ہے فعمیت علیھم الانباء پھر سجھائی نہ دیں گی اس دور کی ان کو باتیں نیز اتانی رحمۃ من عندہ فعمیت علیکم اور اس نے بھیجی مجھ پر اپنی رحمت اپنے پاس سے پھر وہ تمہاری نظروں سے اوجھل کر دی گئی۔

علامہ خفاجیؒ عنایت القاضی میں لکھتے ہیں دلیل سے اندھا ہونے کا مطلب مجازاً دلیل کا چھپ جانا ہے محاورے حجۃ عمیاء بولا جاتا ہے جیسے واضح اور روشن دلیل کے لیے حجۃ بصرہ بولا جاتا ہے۔ دلیل کی پوشیدگی کو عمی سے تشبیہ دی گئی ہے اس لیے استعارہ تبعیہ ہے۔

تزدری: زری سے باب افتعال ہے مصدر ازدراء ہے اس کے معنے حقیر سمجھنے کے ہیں۔ مضارع کا صیغہ واحد مؤنث ہے۔ زری یزری باب سمع آتا ہے محاورہ ہے زری علیہ عملہ اس کے کام میں عیب نکالا ازری بالامر عیب نکالا۔ اسی سے باب افتعال ازدراء اور باب استفعال استزراء آتا ہے۔ حقیر سمجھنے کے معنے ہیں۔

(۳۳) زعماء قوم کو حضرت نوح علیہ السلام کا جواب

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا لوگو! تمہاری اس معاملے میں کیا رائے ہے کہ اگر میں فی الواقع اپنے رب کی جانب سے ایک روشن اور صاف راستہ پر ہوں۔ اور اس نے مجھے اپنی جانب سے خاص رحمت سے نوازا ہو یعنی نبوت دی ہو۔ مگر وہ تمہیں نظر نہ آتی ہو تو کیا ایسی صورت میں میں اور میرے ساتھی تمہیں مجبور کر سکتے ہیں جبکہ تم اس سے بیزار ہو یعنی یہ صحیح ہے کہ پیغمبر کو عام انسانوں سے بالکل ممتاز ہونا چاہیئے لیکن وہ امتیاز مال و دولت، ملک و حکومت اور دنیا کی ٹیپ ٹاپ میں نہیں بلکہ اعلیٰ اخلاق، بہترین اخلاق، بہترین ملکات، تقویٰ خداترسی، حق پرستی، دردمندی، خلائق اور ان صریح آیات و نشانات پیش کرنے سے ان کو امتیاز حاصل ہوتا ہے جو حق تعالیٰ بطور اتمام حجت اور اکمال نعمت ان کے اندر قائم کرتا یا ان کے ذریعہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ وہ وحی الٰہی اور ربانی دلائل و براہین کی روشنی میں صاف راستے پر چلتے ہیں۔ اور دن رات خدا کی خصوصی رحمتیں ان پر بارش کی طرح برستی ہیں۔ نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر یہ سب چیزیں مجھ میں کھلے طور پر موجود ہوں اور یقیناً موجود ہیں جس طرح اندھے کو

سورج کی روشنی نظر نہیں آتی ۔ تو تمہاری آنکھیں بھی اس نور الہی کے دیکھنے سے قاصر ہیں تو کیا ہم زبردستی مجبور کر کے تم سے اس نور اور رحمت کا اقرار کرا سکتے ہیں ۔جس سے تم اس قدر نفور و بیزار ہو کہ آنکھ کھول کر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے ہو ۔ خلاصہ یہ ہوا کہ میری بزرگی اور برتری جو تم کو نظر نہیں آتی ۔ یہ اس لیے ہے کہ تمہارے دل کی آنکھیں اندھی ہیں یا بند ہیں[1]

منکرین حق نے حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت کی تکذیب کے لیے پہلی بات یہ کہی تھی ۔ ما نراک الا بشرا مثلنا ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے سب سے پہلے اسی کا جواب دیا ہے کہ جس انسان کو نفس ناطقہ پر فضیلت ہے کہ یہ عقلی خصوصیت حیوان میں نہیں ہے جس کی وجہ سے انسان حیوان پر حکمرانی کرتا ہے اسی طرح انبیاء کو اپنے نفوس قدسیہ کی وجہ سے تمام انسانوں پر برتری حاصل ہے وہ اپنے نفس قدسی اور اپنے پیغمبرانہ قوت کی وجہ سے دوسروں کو راہ راست سمجھاتے ہیں ۔ اور خود راہ راست پر قائم ہوتے ہیں ۔ ان کی پیغمبرانہ عقل و فہم تمام انسانی عقلوں سے برتر ہوتی ہے اور ان کو وہ ربانی خصوصیت حاصل ہوتی ہے جس کی بنا پر وہ تمام انسانوں کی ہدایت کا فرض انجام دیتے ہیں ۔ اور جس طرح انسانوں کے عجیب و غریب کام حیوانوں کو حیرت انگیز معلوم ہوتے ہیں اسی طرح انبیاء کے عجیب و غریب کام انسانوں کو معجزہ معلوم ہوتے ہیں ۔ اگرچہ تمام انسانوں کے ساتھ بشریت میں شریک ہوتے ہیں ۔ مگر فضیلت و معنویت میں وہ ان سے بالکل الگ ہوتے ہیں ۔ کیونکہ ان میں وحی قبول کرنے کی جو صلاحیت ہوتی ہے وہ دوسرے انسانوں میں نہیں ہوتی ہے اسی بات کو حضرت نوح علیہ السلام نے ان الفاظ میں ادا کیا ہے ۔

ان کنت علی بینۃ من ربی و آتانی رحمۃ من عندہ

یعنی ہوں تو میں انسان اور ہوں بھی تمہارے ہی جیسا لیکن اس کے ساتھ میں اپنے مولی کی جانب سے بینہ پر ہوں ۔ اور اللہ نے مجھے اپنے پاس سے عظیم الشان رحمت سے نوازا ہے تمہیں میرا انسان ہونا تو نظر آتا ہے لیکن اللہ سبحانہ کی وہ نوازش تمہیں نظر نہیں آتی ہے جو مجھ پر ہوئی ہے اسی بات کو حضرت نوح علیہ السلام نے فعمیت علیکم سے تعبیر کیا ہے یعنی نبوت والے اوصاف تمہاری آنکھوں سے اوجھل ہو گئے ہیں ۔ میں جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں ۔ اس کی بنیاد دو چیزوں پر ہے ۔ ایک تو اس نور فطرت پر جو اللہ نے مجھ میں پہلے ودیعت کیا ہے یعنی نبی بننے کی صلاحیت ۔ دوسرے اس وحی

[1] افادات شیخ الاسلامؒ

الٰہی پر جس سے اللہ سبحانہ نے مجھے نوازا ہے۔ اب تم خود سوچ کر بتاؤ کہ اگر جو کچھ میں کہہ رہا ہوں یہ واقعہ اور حقیقت ہے نہ ہونے کی وجہ کیا ہے جبکہ یہ امر واقعہ ہے تو کیا اب میں تمہیں اس کے ماننے کے لیے مجبور کروں اور جبر سے تمہیں منواؤں اور ایسی حالت میں منواؤں جبکہ تم اس سے بیزار ہو۔

اس ارشاد کے ذریعے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے مخاطبوں کو یہ بھی بتا دیا ہے کہ اگر تم اس دعوت سے بیزار ہو اور اس لیے نہیں مانتے ہو اور اس بیزاری کی علت عناد و عداوت کے سوا کچھ نہیں ہے تو ایسی صورت میں تمہیں ماننے پر مجبور نہیں کر سکتا ہوں۔ کیونکہ نبوت کی دعوت اپنی اشاعت کے لیے صرف تبلیغ کا راستہ اختیار کرتی ہے وہ عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کا ہر معاملہ میں اپنے مخاطبوں سے مطالبہ کرتی ہے۔ ہر قدم پر عقلی استدلال اور مصلحت و حکمت پیش کرتی ہے وہ کیونکہ الزام و اکراہ کے طریقہ کو اختیار کرے گی۔ نبوت کا اولین مطالبہ ایمان ہے ایمان یقین کا نام ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرہ بھی بزور پیدا نہیں کر سکتی ہے۔ یہ اسلام کی وہ اساس ہے جس کا اعلان سب انبیاء نے کیا ہے۔ ایمان و کفر دونوں میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور نافہم اس سے محروم رہیں گے۔ فعمیت علیکم میں اسی طرف اشارہ ہے اس لیے قرآن میں بار بار یہ اعلان کیا گیا ہے کہ رسول کا کام لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچانا ہے۔ زبردستی منوانا نہیں ہے۔

اس آیت سے یہ بھی اشارہ مل رہا ہے۔ میری مراد ان کنت علی بینۃ من ربی سے ہے یعنی یہ آیت بتا رہی ہے کہ انبیاء کرام جب سے عرصہ وجود میں قدم رکھتے ہیں۔ اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگتے ہیں۔ وہ حسب و نسب، سیرت و صورت میں ممتاز ہوتے ہیں۔ شرک و کفر کے ماحول میں ہونے کے باوجود اس کی گندگی سے بچائے جاتے ہیں۔ اخلاق حسنہ سے آراستہ ہوتے ہیں۔ ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہوتی ہے یہ تمہیدیں اس لیے ہوتی ہیں۔ تاکہ منصب نبوت ملنے کے بعد ان کے دعوئ نبوت کی تصدیق اور لوگوں کے میلان خاطر کا سامان پہلے ہی موجود ہو۔ شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح میں اس بات کا اشارا کیا ہے۔ علامہ بقاعیؒ نے علی بینۃ کی تفسیر میں لکھا ہے،

روشن دلیل مجھے میرے رب نے دی ہے جس نے مجھے پیدا کیا ہے یہ روشن دلیل میرے دعوی نبوت کی شہادت ہے اس میں کسی با انصاف آدمی کو شبہ نہیں ہوسکتا ہے

علامہ محمود آلوسیؒ لکھتے ہیں ۔

کھلی دلیل میرے رب کی جانب سے یہ میرے دعوئی کی صداقت کی گواہ ہے ۔

یہ بات بالکل ظاہر ہے کہ اس سے مراد معجزہ نہیں ہے کیونکہ اگر معجزہ مراد ہوتا تو تعبیر یہ نہ ہوتی کنت علی بینۃ من ربی ۔ میں اپنے رب کی جانب سے بینہ پر تھا ۔ بلکہ یوں کہا جاتا انا علی بینۃ من ربی میں اپنے رب کی جانب سے بینہ پر ہوں ۔ خلاصہ یہ کہ بینہ وہ نور فطرت ہے جو انبیاء کو خاص طور پر اللہ سبحانہ کی جانب سے ارزانی ہوتا ہے ۔

(۳۴) حضرت نوح علیہ السلام کی نبوت کی ایک اور دلیل

لوگو! میں اس کام پر تم سے کوئی سرمایہ کا سوالی نہیں ہوں ۔ مزدوری تو اس کام کی مجھے وہی دے گا جس کا میں کام کر رہا ہوں ۔ یعنی اللہ یعنی میں تبلیغ کے کام پر کوئی تنخواہ تم سے نہیں مانگتا ہوں ۔ جو مالی خودغرضی کا شبہ ہو ۔ میں تو اپنے پروردگار کا نوکر ہوں ۔ اسی کے یہاں سے مجھے مزدوری ملے گی ۔ بحمد اللہ نہ مجھے تمہارے مال کی ضرورت ہے نہ طلب ۔ پھر میں غریبوں کو چھوڑ کر مالداروں کی طرف کیوں جھکوں [۱]

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی نبوت کے حق میں ایک اور دلیل پیش فرمائی ہے یعنی یہ کہ آپ اپنے اس کام میں بالکل بے غرض ہیں ۔ کوئی شخص ایمانداری کے ساتھ یہ الزام نہیں لگا سکتا کہ آپ دعوت کی راہ میں یہ ساری محنت اور تگ و دو صرف اس لیے کر رہے ہیں کہ کوئی مادی غرض آپ کے پیش نظر ہے ۔ یہ آپ اپنی قوم کے سرمایہ داروں اور سرداروں سے کہہ رہے ہیں ۔ کہ اگر تم میری بات سننے اور سمجھنے کے لیے تیار نہیں ہو تو کان کھول کر سن لو کہ اس میں میرا کوئی نقصان نہیں ہے ۔ سرتاسر تمہارا ہی نقصان ہے میں جو کچھ تمہارے سامنے پیش کر رہا ہوں ۔ اگر میں اس کے عوض میں تم سے کسی اجرت کا طالب ہوتا تب تو مجھے تمہاری اس بیزاری کی پرواہ ہوئی لیکن جب میں تم سے کسی سرمایہ کا سوالی نہیں ہوں تو تم اس کو اگر قبول نہ کرو گے تو خود ہی گھاٹے میں رہو گے مجھے تو اس کا جو اجر ملنا ہے وہ اللہ کے پاس ہے اور وہ مجھے مل کر رہے گا ۔ تمہارے ماننے اور نہ ماننے سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ میں ایک بے غرض ناصح ہوں اپنے کسی

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

فائدے کے لیے نہیں بلکہ تمہارے ہی بھلے کے لیے یہ ساری مشقتیں اور محنتیں برداشت کر رہا ہوں۔ تم کسی ایسے ذاتی مفاد کی نشاندہی نہیں کر سکتے جو اس امر حق کی دعوت دینے میں اور اس کے لیے جان توڑ محنتیں اور مشقتیں جھیلنے میں میرے پیش نظر ہو۔ آپ سورۂ شعراء میں پڑھیں گے کہ یہ بات نبیوں کی زبان پر آئی ہے۔

(۳۵) ایمان میں امیر و غریب برابر ہیں

اور دیکھو میں ان لوگوں کو دھکے نہیں دے سکتا جو نعمت ایمان سے مالا مال ہو گئے خواہ تمہاری نظر میں کتنے حقیر و معیوب ہوں وہ بلاشبہ اپنے پروردگار کے حضور میں پیش ہوں گے یعنی اگر تم میرے اتباع کو محض ان کے افلاس یا پیشہ کی وجہ سے حقیر و ذلیل سمجھتے ہو تو خوب سمجھ لو کہ میں انہیں جو دولت ایمان کے سرمایہ داروں کو ظاہری خستہ حالی کی بنا پر جانوروں کی طرح دھکے دے کر نکال دوں۔ انہیں ایک روز پروردگار سے ملنا ہے وہ میری شکایت اس کے دربار میں کریں گے۔ کہ آپ کے پیغمبر نے متکبر دنیا داروں کی خاطر ہم غریب وفاداروں کو نکال دیا تھا۔ میں ظاہر حال کے خلاف یہ کیونکر کہوں کہ ان کا ایمان محض ظاہری اور سرسری ہے۔ دلوں کو چیر کر دیکھنا میرا کام نہیں ہے۔ یہ پروردگار کے یہاں پتہ لگے گا۔ کہ ان کے دلوں کا کیا حال تھا[1]

یہاں تو انہوں نے یہ اعتراض کیا ہے وما نراک اتبعک الا الذین ھم اراذلنا تمہارے پیروکار تو صرف نیچ قسم کے لوگ ہیں۔ اور دوسرے موقعہ پر اسی بات کو اس انداز میں پیش کیا ہے۔ انؤمن لک واتبعک الارذلون۔ کیا ہم تجھے ایسی حالت میں نبی مان لیں جبکہ تیری پیروی نیچ قسم کے لوگ کر رہے ہوں۔ یہ ان کے اسی اعتراض کا جواب ہے۔ ان کے اعتراض میں یہ بات بھی پوشیدہ تھی۔ کہ ایمان لانے والوں کا جو گروہ حضرت نوح علیہ السلام کے گرد جمع ہو رہا ہے یہ چونکہ ہمارے معاشرے کے ادنیٰ طبقات پر مشتمل ہے۔ اس لیے بڑے لوگوں میں سے کوئی شخص ان میں شامل ہونا گوارا نہیں کرتا ہے دوسرے الفاظ میں وہ گویا یوں کہہ رہے ہیں۔ کہ اے نوح کیا آپ پر ایمان لا کر ہم اپنے آپ کو ان اراذل کی صف میں لا کھڑا کریں۔ کیا ہم غلاموں، نوکروں اور پیشہ ور لوگوں میں آ بیٹھیں حضرت نوح علیہ السلام نے اس کا جواب یہ دیا ہے۔ کہ میں یہ غیر معقول طرز عمل اپنے کام میں کیسے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اختیار کرسکتا ہوں کہ جو نہیں مانتے ان کے پیچھے جاؤں اور جو مانتے ہیں ان کو دھکے دے کر نکال دوں ما انا بطارد الذین اٰمنوا۔ میری حیثیت تو داعی کی ہے میں تو دعوت دے رہا ہوں کہ جس راستہ پر تم چل رہے ہو یہ ہلاکت کا راستہ ہے اور اس پر چلنے کا انجام تباہی کے سوا کچھ بھی نہیں ہے اور میں جس راستہ کی طرف تمہیں بلا رہا ہوں۔ اسی میں تم سب کی نجات ہے۔ جس کا جی چاہے میری بات کو پذیرائی دے کر میرے بتائے ہوئے راستہ پر چلے میں یہ نہیں کرسکتا کہ آنے والوں سے دریافت کروں کہ ان کی ذات برادری اور نسب نامہ کیا ہے۔ اگر وہ تمہاری نگاہوں میں نیچ ہوں تو ان کو واپس کرکے اس انتظار میں بیٹھ جاؤں کہ سرمایہ دار لوگ کب تباہی کا راستہ چھوڑ کر نجات کی راہ پر قدم رنجہ فرماتے ہیں۔

یہی صورت حال حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی مکہ میں پیش آئی اسی لیے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا یہ مکالمہ یہاں پیش کیا جا رہا ہے یہی مقام استشہاد ہے۔ کفار مکہ کے بڑے بڑے سردار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے۔ کہ ہم آخر بلالؓ، صہیبؓ اور عمارؓ جیسے غلاموں کے ساتھ کیسے بیٹھ سکتے ہیں۔ ان کا مطلب بھی یہی تھا۔ کہ ایمان لانے والوں کی صف سے یہ غریب و فقیر لوگ نکالے جائیں۔ آپ سورۃ الانعام میں پڑھ چکے ہیں۔

ولا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ ما علیک من حسابھم من شیء وما من حسابک علیھم من شیء فتطردھم فتکون من الظالمین

دور نہ کرو ان لوگوں کو جو صبح و شام اپنے رب کو پکارتے ہیں۔ جن کا مقصد محض اللہ سبحانہٗ کی خوشنودی ہے۔ ان کا کوئی حساب آپ کے ذمہ نہیں اور نہ تمہارا کو حساب ان کے ذمہ ہے۔ تم ان کو دور کرو گے۔ تو تمہارا کوئی شمار بھی ان ظالموں میں ہو گا۔

یہ ہدایت اس لیے کی گئی کہ سرداران قریش کے تمرد و غرور پر ضرب کاری لگائی جائے مطلب یہ ہے۔ کہ جو بکواس یہ لوگ کرتے ہیں کرنے دو آپ ان کے پیچھے پڑ کر اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ آگے جو بات فرمائی ہے وہ بھی سنانا چاہتا ہوں۔

وکذالک فتنا بعضھم ببعض لیقولوا اھٰؤلاء من اللہ علیھم

من بیننا الیس اللہ یاعلم بالشاکرین ۔

اسی طرح ہم نے کچھ کا کچھ کے ذریعے امتحان لیا ہے۔ تاکہ کہنے والے کہیں ۔ کیا ہمارے معاشرے میں یہی لوگ رہ گئے تھے جن پر اللہ کا فضل ہو ۔ کیا اللہ اپنے شکرگزار بندوں کو ان سے زیادہ نہیں جانتا ۔

مطلب یہ ہے کہ امارت اور غربت دونوں پرچہ امتحان ہیں غریب یہ نہیں کہہ سکتا کہ غریبی میرے اعمال کی سزا ہے اور امیر یہ نہیں کہہ سکتا کہ دولت ریل پیل میرے اعمال کی جزا ہے ۔ یہ اللہ کا قانون ہے کہ دنیا میں اگر کسی کو دولت مند بنایا ہے کو اس بنا پر نہیں بنایا کہ وہ اس کا حقدار تھا اسی طرح اگر کسی کو غربت دی ہے تو اس وجہ سے نہیں کہ وہ اس کا سزاوار تھا۔ بلکہ ایک کو دولت اور دوسرے کو غربت دے کر دونوں کا امتحان مقصود ہے وہ جن کو دولت دیتا ہے ۔ تو اس لیے دیتا ہے کہ وہ دیکھے کہ اللہ کی دی ہوئی نعمت پا کر اس کے شکر گزار متواضع اور فرماں بردار بنتے ہیں یا مغرور و متکبر ہو کر اکڑنے والے، اترانے والے، غریبوں کو بنظر حقارت دیکھنے والے اور خدائی نعمتوں کے اجارہ دار بن بیٹھے ہیں ۔ اسی طرح جن کو غربت دیتا ہے تو یہ دیکھنے کے لیے دیتا ہے کہ وہ اپنی غربت پر صابر اور اپنے نان جویں پر قانع اپنی تقدیر پر راضی اور اپنے فقر پر خود دار رہتے ہیں ۔ یا مایوس و دل شکستہ ہو کر پست ہمت، بے حوصلہ، تقدیر سے شاکی ، خدا سے برہم اور ذلیل و خوار ہو کر رہ جاتے ہیں ۔ بس یہی امتحان فقیری اور امیری کا پس منظر ہے ۔

حضرت نوح علیہ السلام اپنے مخاطبوں کو سمجھا رہے ہیں ۔ کہ اونچ نیچ کا مسئلہ تمہارا بنایا ہوا ہے۔ اس کا ایمان پر کوئی اثر نہیں ۔ امیر ہو یا غریب دعوت سب کے لیے ہے ۔ اگر میں غریب اہل ایمان کو ہٹا دوں ۔ تو اس وقت میرا کیا حال ہوگا جب یہ لوگ بارگاہ الٰہی میں میرے خلاف استغاثہ دائر کریں گے ۔

(۳۶) حقیقت سے بے خبری

میری بصیرت یہ کہتی ہے کہ اس راہ میں تم عقل سے بے بہرہ ہو ۔ حقیقت تک تمہاری رسائی نہیں ہے یعنی جہل و حماقت سے انجام پر نظر نہیں کرتے ہو ۔ صرف ان کی ظاہری شکستگی دیکھ کر حقیر سمجھتے ہو ۔ اور ایسی مہمل درخواست کرتے ہو کہ ان کو ہٹا دیا جائے تو ہم تمہارے پاس آئیں ۔ کیا غربت اور کسب حلال کوئی عیب ہے یہ ہی چیز تو ہے جو حق کے قبول کرنے میں مزاحم نہیں ہے ۔ عموماً دولت وجاہ

کا نشہ انسان کو قبول حق سے روکتا ہے ۔ اسی لیے حدیث ہرقل میں آیا ۔ کہ انبیاء علیہم السلام کے پیروکار ضعفاء ہوتے ہیں ۔ بہرحال تم نہیں جانتے کہ سب کو اللہ سبحانہٗ کے پاس جانا ہے ۔ وہاں پہنچ کر ظاہر ہوگا کہ اپنے کو ان سے بہتر سمجھنا تمہارا جاہلانہ غرور تھا[1]

جہل کے دو معنے ہیں ۔ایک یہ کہ تم علم سے بیگانے ہو ۔ اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ تمہیں پتہ نہیں ہے کہ ان غریب اور نادار اہل ایمان کا اللہ سبحانہٗ کے یہاں کیا مقام ہے۔ مال کی محبت نے تمہارا ذہنی توازن خراب کردیا ہے ۔اور مال کے عشق مفرط میں سرمایہ میں پیچھے رہنے والوں پر حماقت، سفاہت، ناقبت اندیشی اور اسی قسم کے بیسیوں عیوب کے ساتھ حملہ کررہے ہو ۔ قرآن کی نگاہ میں یہ لوگ قوانین قدرت سے بے خبر ہیں ۔ ان کو رزق کے بارے میں قبض و بسط کے قوانین کا پتہ ہی نہیں ہے ۔

جہل کے دوسرے معنے احمق ہونے کے ہیں ۔اس صورت میں مطلب یہ ہے کہ غریب اہل ایمان کو رذیل کہہ کر تم بیوقوفی کا مظاہرہ کررہے ہو ۔

دراصل انی اراکم قوماً تجہلون کے ذریعے ان کے علم کی تصحیح فرمارہے ہیں ٹھیک ایسے ہی جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام یہ کہہ کر انکم قوم تجہلون بنی اسرائیل کی تصحیح علم فرمارہے ہیں ۔اور نبوت تو آتی ہے تصحیح علم کی خاطر ۔ علامہ بقاعیؒ نے یہاں یہ بات بالکل برموقع لکھی ہے کہ

> تم جاہلوں اور بے خبر لوگوں کا کردار پیش کررہے ہو ۔ سچ کی تکذیب کررہے ہو اور اہل ایمان میں بلاوجہ کیڑے نکال رہے ہو ۔ اللہ کی عدالت سے نڈر ہو کر بے محل اور بے موقعہ تنگ بندیاں کررہے ہو ۔

قوماً جاھلین کی تعبیر چھوڑ کر قوماً تجہلون اس لیے کہا ہے کہ تمہارا یہ کردار وقتی ہے ورنہ یہ تمہاری عادت نہیں ہے ۔

(۳۷) خدائی مواخذہ کا اندیشہ

لوگو! بتاؤ کہ اگر میں ان کو دھکے دیدوں تو مجھے اللہ کی گرفت سے کون بچائے گا کیا تم اس

[1] افادات شیخ الاسلام

پر غور نہیں کرتے ہو یعنی میں تمہارے کبر و غرور اور جہالت سے متاثر ہو کر اپنا نقصان کیسے کروں۔ اگر تمہاری رعایت سے میں نے اللہ کے مخلص بندوں کو دھکے دے دیئے تو اس کی سزا اور گرفت سے مجھے کون بچائے گا۔ جن کو تم رذیل کہتے ہو میں کبھی ان کو رذیل نہ کہوں گا۔ اور یہ نہیں کہوں گا کہ وہ خوبی و سعادت سے ہمدوش نہیں ہو سکتے اگر میں ایسا کہوں تو مجھ سے اللہ سبحانہ مواخذہ فرمائیں۔ میں اللہ کا پیغمبر ہوں۔ اللہ کا پیغام پہنچانا میرا کام ہے اور بس۔ آیت میں اشارا ہے کہ جیسے ناداری وفقیری کی وجہ سے کسی شخص کو سعادت سے محروم نہیں رکھا جا سکتا ٹھیک سو نیچ اور رذالت کے جعلی پیمانوں کی بنا پر بھی کسی کو سعادت سے محروم کرنا جائز نہیں ہے اس میں درسگاہوں میں دین کا طالب علم ہو یا خانقاہوں میں شیخ طریقت سے طالب اصلاح ہو۔ دونوں کا حکم ایک ہے۔

نبوت کے ابتدائی مراحل میں نبوت کی دعوت پر لبیک کہنے والے نادار، کمزور اور ضعیف ہوتے ہیں۔ سرمایہ داران کمزوروں کو اپنے ایمان میں رکاوٹ بنا لیتا ہے۔ قریش کے بڑے بڑے سرداروں اور کھاتے پیتے لوگوں کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر منجملہ اور اعتراضات کے ایک اعتراض یہ بھی تھا۔ کہ آپ کے گرد و پیش ہماری قوم کے غلام، موالی اور ادنیٰ طبقے کے لوگ جمع ہو گئے ہیں۔ وہ طعنہ دیا کرتے تھے کہ ان کو ساتھی کیسے ملے ہیں۔ بلالؓ، عمارؓ، صہیبؓ، رومیؓ اور خبابؓ یہی لوگ اللہ کو ہمارے درمیان لیسے ملے جن کو اس کام کے لیے منتخب کیا۔ پھر ان نادار اہل ایمان کی خستہ حالی کا مذاق اڑایا کرتے تھے۔ قرآن نے اس موضوع پر نبوت کو دو ہدایتیں دی ہیں۔

ایک یہ کہ آپ ان کو اپنی مجلس سے نہ ہٹایئے یہ لوگ اپنے رب کو دن رات پکارتے رہتے ہیں اور ان کی تگ و دو یہی ہے کہ اللہ سبحانہ کی خوشنودی حاصل ہو۔

لا تطرد الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی

دوسری یہ کہ

واصبر نفسک مع الذین یدعون ربھم بالغداۃ و یریدون وجھہ ولا تعد عیناک عنھم ترید زینۃ الحیاۃ الدنیا۔

اور روکے رکھیے اپنے آپ کو ان لوگوں کے ساتھ جو پکارتے ہیں اپنے مالک کو

لے افادات شیخ الاسلام

صبح وشام ۔ مقصود بنایا ہے اللہ سبحانہ کی ذات کو اور نہ ہٹانا اپنی دونوں آنکھیں ان
سے کیا تم دنیا کی شان وشوکت چاہتے ہو ۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا بیان ہے کہ قریش کے سردار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہتے تھے ۔ کہ یہ فقرار قسم کے لوگ بلالؓ، عمارؓ، خبابؓ اور صہیبؓ جیسے لوگ آپ کی مجلس میں ہوتے ہیں ۔ ان کے ساتھ ہم نہیں بیٹھ سکتے ۔ ان کو ہٹا دو تو ہم آپ کی مجلس میں بیٹھیں گے ۔ اس پر اللہ سبحانہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ ہدایت فرمائی کہ جو لوگ رضائے الٰہی کی خاطر آپ کے گرد جمع ہوئے اور صبح وشام اپنے مالک کو یاد کرتے رہتے ہیں ۔ آپ ان سے وابستہ اپنی نگاہ نہ پھیریئے ۔ مطلب یہ ہے کہ جن لوگوں نے اللہ سبحانہ کو اپنے وجود کا نصب العین بنا کر جینا یعنی اس کی مرضیات کے مطابق زندگی بسر کرنا اختیار کر لیا ہے ۔ یہی تو اسلام کا آخری خلاصہ ہے ان کے ساتھ آپ اپنے کو جوڑے رکھیں ان سے اپنی نگاہیں نہ ہٹائیں ۔

ظاہر ہے یہی دونوں ہدایتیں نبی ہونے کی حیثیت سے حضرت نوح علیہ السلام کو بھی ملی تھیں ۔ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کا بھی یہی مطالبہ تھا ۔ کہ ان فقرار مومنین کو اپنے پاس سے ہٹا دیجئے ۔ حضرت نوح علیہ السلام جواب میں فرما رہے ہیں ۔ کہ اگر میں ایسا کروں تو یہ ربانی ہدایات کی نافرمانی ہوگی ۔ اور اس نافرمانی کی پاداش میں جب اللہ سبحانہ میرا محاسبہ کریں گے ۔ تو وہاں میری مدد کون کرے گا من ینصرنی من اللہ ان طردتھم ۔ میں ان کو چھوڑ کر ان لوگوں کے پیچھے نہیں جا سکتا ہوں جنہوں نے اپنے وجود کا نصب العین یہ بنا رکھا ہے کہ اس پست زندگی کی زیب و زینت اور آرائشوں، آسائشوں کے حاصل کرنے میں اپنی زندگی کی آخری سانس پوری کریں گے ۔
افلا تذکرون ۔ بڑائی کے نشہ میں مخمور ہو کر تم اس بات پر دھیان نہیں دیتے ہو ۔

(۳۸) مقامِ نبوت کی حد بندی

اور دیکھو میں تم سے یہ نہیں کہتا ہوں کہ میرے پاس اللہ کے خزانے ہیں ۔ اور نہ میں غیب کی باتیں جانتا ہوں اور نہ میرا یہ دعویٰ ہے کہ میں فرشتہ ہوں اور میں یہ بھی نہیں کہتا ہوں کہ جن لوگوں کو تم بنظر حقارت دیکھتے ہو ۔ اللہ انہیں کوئی بھلائی نہیں دے گا ۔ اللہ ہی بہتر جانتا ہے ۔ جو کچھ ان کے دلوں میں ہے اگر میں ایسا کہوں تو میں ظالموں میں سے ہو جاؤں گا ۔ کفار نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا تھا کہ تم ہمارے جیسے بشر ہو ۔ جتھے اور دولت کے اعتبار سے بھی کوئی امتیاز

نہیں رکھتے ہو۔ اس کا جواب نہایت متانت اور انصاف کے ساتھ دیتے ہیں۔ کہ بے شک جیسا تم امتیاز چاہتے ہو اس کا ہم دعویٰ نہیں رکھتے۔ بلا شبہ میں ایک بشر ہوں۔ نہ خدا نے اپنے سارے خزانے میرے تصرف و اختیار میں دے دیئے ہیں۔ نہ تمام غیب کی باتوں پر مطلع کیا گیا ہوں۔ لیکن ان تمام باتوں کے اعتراف کے ساتھ تمہاری طرح یہ کبھی نہ کہوں گا کہ جو لوگ تمہاری نگاہ میں معیوب و حقیر ہیں یعنی میں اور میرے رفقاء ان کو ہرگز کوئی خیر بھلائی نہیں دے سکتا۔ مثلاً ان میں سے کسی کو نبوت و حکمت عطا فرما دے اور باقیوں کو ایمان و عرفان کی دولت سے بہرہ ور کرے۔ خوب سمجھ لو حق تعالیٰ ان کے مناسب فیض پہنچانا اور باطنی احوال و کیفیات کے موافق برتاؤ کرتا ہے۔ اس نے جو خاص مہربانی میرے ساتھیوں پر کی ہے وہ تمہاری آنکھ سے پوشیدہ ہے۔ اگر میں یہ کہنے لگوں کہ جو تمہیں بظاہر شکستہ حال اور حقیر دکھائی دیتے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے بھی جو بواطن کا جاننے والا ہے انہیں کوئی عزت و شرف نہیں بخشا تو نہایت بے اصول اور نا انصافی کی بات ہوگی [1]

دراصل اس آیت میں حضرت نوح علیہ السلام نے مقام نبوت کے بارے میں اپنے حق طلبوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ کیا ہے اور بتایا ہے کہ روحانی ہدایت کے لیے ضروری نہیں ہے کہ اس کو پیش کرنے والا انسانیت سے بالاتر ہو۔ تمہارا یہ کہنا کہ ما نراك الا بشرا مثلنا۔ بتا رہا ہے کہ تم نبوت اور بشریت میں منافات سمجھتے ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کا یہ کہنا دلیل و حجت کی تلاش کی خاطر نہیں تھا۔ بلکہ محض سرکشی، ہٹ دھرمی کی باتیں تھیں جو اس سے کہی جاتی تھیں کہ کوئی نہ کوئی بات کہہ کر انکار کے لیے سہارا پیدا کیا جائے اور ہمیشہ راستبازوں کے مقابلے میں نہ ماننے والوں کا ایسا ہی طرز عمل رہا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے یہاں کھول کر بتایا ہے کہ

۱۔ مختار کل ہونا اور اختیار ناطق رکھنا اور دولت کے انبار ہونا۔
۲۔ غیب دان ہونا اور غیب کی باتیں جاننا۔
۳۔ فرشتہ ہونا۔
۴۔ فقیری اور غریبی کو حقیر نگاہوں سے دیکھنا۔

لوازم و شرائط نبوت میں سے نہیں ہیں۔ مختار کل ہونا، غیب دان ہونا، اللہ سبحانہٗ کی صفات خاصہ میں سے ہے اس میں اس کا کوئی شریک نہیں نہ نبی اور نہ فرشتہ۔ ان دونوں کی تعبیر علم اور قدرت

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے۔ یہ دونوں خاصہ خداوندی ہیں۔ انسان کے علم کے ذریعے وجدان، حواس اور عقل و استدلال ہیں ان طبعی ذریعوں سے جو علم حاصل نہ ہو۔ اس کو علم غیب سمجھتے ہیں۔ یا یوں کہہ دیجئے جو علم قرائن، وسائل ذرائع اور دلائل سے حاصل نہ ہو بلکہ خود بخود ہو وہ علم ہے یہ علم صرف اللہ سبحانہٗ کا ہی ہو سکتا ہے۔ جس کی ذات خود بخود ہے۔ اور جس کی ذات خود بخود نہیں اس کا علم بھی خود بخود نہیں۔ اللہ کی ذات قدیم اس کی صفات وجود علم و قدرت بھی قدیم ہیں۔

یہ بات بداہت عقل کے خلاف ہے کہ موصوف خود بخود نہ ہو۔ اور اس کی صفت خود بخود ہو۔ عام انسانوں سے علمی ذرائع سے ممتاز نبوت کا علمی ذریعہ اللہ سبحانہٗ کی وحی ہوتی ہے۔ اس لیے نبی وہ ذات گرامی کہلاتی ہے جس کا علمی ذریعہ اللہ کی وحی ہو۔ نبی کے بارے میں غیب دانی کا تصور اس ذریعہ کی نفی کرتا ہے۔ بہرحال حضرت نوح علیہ السلام اپنے مخاطبوں کو سمجھا رہے ہیں کہ نبوت کے اصل لوازم وحی مخاطبہ الٰہی، تزکیہ، انذار تبشیر تعلیم اور ہدایت ہیں۔ اس بنا پر حضرت نوح علیہ السلام ان کو بتا رہے ہیں۔ کہ تمہاری نگاہوں میں تمام فضائل و محاسن کا مرکز صرف دولت جائداد مال و اسباب ہوتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ عام لوگ اخلاق و عادات تمدن و معاشرت، رسم و رواج غرض کہ تمام چیزوں میں امراء کی تقلید کرتے ہیں لیکن نبوت ہمیشہ اپنی معاشرت، اپنی وضع، اپنے لباس غرض اپنی ہر ایک چیز سے یہ ثابت کرتی ہے کہ فضائل کا منبع صرف روح ہے۔ اور زخارف دنیوی سے ان کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ لا اقول لکم عندی خزائن اللہ کا یہی منطوق ہے اور اس کا مدلول یہ بھی ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی طرف سے آنے والا بے انتہا خدائی قدرتوں کا مالک نہیں ہوتا اور اسے کائنات میں اختیار مطلق حاصل نہیں ہوتا ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کا یہ ذہن تھا کہ نبی ہونے کے لیے ضروری ہے کہ وہ مقام انسانیت سے بالا ہو۔ اور براہ راست عالم کائنات کا علم رکھتا ہو۔ اور کائنات میں تصرف پر قادر ہو۔ یہی وہ بنیادی پتھر ہے جس پر دین باطل اور ضلالت کی دیوار کج کھڑی ہوتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے نہایت شدت اور نہایت اصرار سے یہ حقیقت واضح کی ہے کہ کائنات میں تصرف اور کائنات کے علم سے نبوت کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ ولا اعلم الغیب۔ کا یہی مقصود ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کی ایک گمراہی یہ بھی تھی کہ نبوت کو دنیوی علائق سے بالا سمجھتے تھے۔ کھانا تناول کرنا، پانی پینا، نہانا، ضروریات زندگی کی پا بجائی کرنا، معاشرتی تقاضوں سے ہم آہنگ ہونا۔ اسی غلط خیال کی حضرت نوح علیہ السلام نے یہ کہہ کر اصلاح فرمائی ہے۔ لا اقول

انی ملک یہ فرشتوں کی خصوصیات ہیں اور میں فرشتہ نہیں ہوں۔ میں انسان ہوں اور خالص انسان ہوں۔ مجھے بھوک بھی لگتی ہے، پیاس بھی لگتی ہے۔ میں ساری انسانی ضروریات کے تقاضے رکھتا ہوں۔ ان کا خیال حضرت نوح علیہ السلام کے بارے میں یہ تھا۔ کہ یہ کیسا رسول ہے جو بال بچے بھی رکھتا ہے۔ کھاتا پیتا ہے۔ بازاروں میں پھرتا ہے اور ہم جیسے انسانوں کی طرح زندگی بسر کرتا ہے اس پر حضرت نوح علیہ السلام فرما رہے ہیں۔ کہ میں نے فرشتہ ہونے کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ فرشتوں کی خصوصیات ہیں۔ میں تو انسان ہوں اور مجھ میں انسانوں کی خصوصیات ہیں۔

آخر میں حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے مخاطبوں کی اس دلیل کا ذکر کیا کہ اگر تم رسول ہوتے تو قوم کا کمترین طبقہ تمہاری دعوت پر لبیک نہ کہتا بلکہ ہم جیسے بڑے لوگ اس کا استقبال کرتے۔ یہ کمتر لوگوں کا تمہارے پیچھے لگنا ہی تمہارے رسول نہ ہونے کی دلیل ہے۔ اگر تم کسی صحیح بات کی دعوت لے کر آتے تو قوم کے سربرآوردہ لوگ آگے بڑھ کر اسے قبول کرتے آپ کی ہمرکابی میں اراذل اور کمترین لوگ نہ ہوتے۔ اس پر فریب استدلال سے وہ عوام کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ کہ اس دعوت میں ضرور کوئی خرابی ہے اسی لیے تو بڑے لوگ اس کو نہیں مان رہے ہیں۔

حضرت نوح علیہ السلام نے ان کو جواب دیا کہ میری دعوت جن لوگوں نے قبول کی ہے وہ تمہاری نگاہوں میں کمین و رذیل ہیں۔ اس کی بنیاد پر تم میری دعوت کو رد کر رہے ہو تو یاد رکھو میں تمہاری دلداری کی خاطر ان کو اپنے پاس سے دور کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ اپنے رب پر ایمان لائے ہیں۔ اور کل کو ایمان کی حالت میں اپنے رب کے حضور حاضر ہوں گے۔ یہ تو میری دوکان دعوت کا نقد سرمایہ اور حقیقی سرمایہ ہے۔ میں موہوم کے پیچھے متقین کو دریا برد نہیں کر سکتا۔ اگر آج میں ان کو تمہاری خاطر اپنے پاس سے دھتکار دوں تو اس میں دو قباحتیں ہیں۔

اول۔ یہ کہ اس کی ضمانت کوئی نہیں کہ تم میرے اقدام کے بعد دعوت کو شرف پذیرائی دو گے تمہاری یہ فرمائش حجت و برہان کی طلب میں نہیں بلکہ محض سرکشی اور ہٹ دھرمی کی فرمائش ہے۔ جو اس لیے کی جا رہی ہے کہ کوئی نہ کوئی بات کہہ کر اپنے انکار کے لیے کوئی سہارا تلاش کیا جائے۔ تمہارا یہ کہنا کہ لن یؤتیھم اللہ خیرا۔ اللہ سبحانہ، ان پر اپنی رحمت و خیر کی ارزانی کا دروازہ کبھی اور ہرگز نہ کھولے گا۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ ہمیشہ نبوت کے مقابلے میں نہ ماننے والوں کا ایسا ہی طرز عمل رہا ہے تم نے یہ بات رجما بالغیب کیسے کہہ دی۔ یہ تو اللہ ہی جانتا ہے کہ قبول حق کی استعداد کس میں ہے کون ارادہ کرتا ہے۔ اللہ اعلم بما فی انفسھم۔

دوسرے۔ یہ کہ اگر میں ان نادار اہل ایمان کو تمہاری خاطر دھکے دے دوں تو کل کو میں اللہ سبحانہٗ کو کیا جواب دوں گا۔ شرافت اور رذالت کا فیصلہ تو اللہ سبحانہٗ کے دربار میں ہوگا۔ وہ بتائے گا کہ کون شریف ہے اور کون رذیل ہے۔ امیری، فقیری، نسب، نسل، رنگ اور زبان، ملک اور وطن ان میں سے کوئی بات بھی شرافت و رذالت کا پیمانہ نہیں ہے۔

ساری آیات کا خلاصہ یہ ہے کہ اگر تم مجھ میں کوئی بات مافوق البشریت نہیں پاتے ہو۔ تو میں نے بشریت سے بالاتر ہونے کا دعویٰ ہی کب کیا ہے کہ میں خدائی خزانوں کا مالک ہوں یا میں غیب دان ہوں یا میں فرشتہ ہوں میں ان باتوں میں سے کسی بات کا بھی مدعی نہیں ہوں۔ میں صرف اللہ کا رسول ہوں۔ اور جس پیغام کے ساتھ اس نے مجھے تمہاری طرف روانہ کیا ہے وہ میں تمہیں سنا رہا ہوں۔ میرے ساتھی غریب اور نادار لوگ ہیں۔ اس وجہ سے تم ان کو حقیر سمجھتے ہو اور چونکہ تمہاری نگاہوں میں ساری قدر و قیمت دنیا اور سامان دنیا کی ہے۔ اس لیے تم سمجھتے ہو کہ اس دعوت میں اگر کوئی خیر ہوتی تو یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ یہ نادار طبقہ اس سے ہمنوائی کرتا اور تم سربرآوردہ ہو کر اس سے محروم رہتے اگر تم اس کج فہمی کا شکار رہو کہ چونکہ ان کے پاس دنیا اور سامان دنیا نہیں ہے۔ تو اللہ سبحانہٗ ان کو ایمان کی دولت سے کیسے مالا مال کر سکتا ہے تو میں تمہاری اس کج فہمی کی تائید کرنے کے لیے تیار نہیں ہوں۔ اگر میں ایسا کر دوں تو میرا شمار بھی بے انصاف لوگوں میں ہو جائے گا۔

قَالُوْا يٰنُوْحُ قَدْ جٰدَلْتَنَا فَاَكْثَرْتَ
جِدَالَنَا فَاْتِنَا بِمَا تَعِدُنَاۤ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝ قَالَ
اِنَّمَا يَاْتِيْكُمْ بِهِ اللّٰهُ اِنْ شَآءَ وَمَاۤ اَنْتُمْ بِمُعْجِزِيْنَ ۝ وَلَا
يَنْفَعُكُمْ نُصْحِيْۤ اِنْ اَرَدْتُّ اَنْ اَنْصَحَ لَكُمْ اِنْ كَانَ اللّٰهُ
يُرِيْدُ اَنْ يُّغْوِيَكُمْ ؕ هُوَ رَبُّكُمْ ۫ وَاِلَيْهِ تُرْجَعُوْنَ ۝ اَمْ
يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ اِنِ افْتَرَيْتُهٗ فَعَلَيَّ اِجْرَامِيْ وَاَنَا
بَرِيْٓءٌ مِّمَّا تُجْرِمُوْنَ ۝

ع ۱۱

حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں نے کہا اے نوحؑ تم نے ہم
سے جھگڑا کیا پس جھگڑا بہت کر چکے ہو۔ اب اگر تم سچے ہو تو وہ
چیز لاؤ جس کی تم دھمکی دے رہے ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام
نے فرمایا۔ بتانا میرا کام ہے۔ لانا میرا کام نہیں صرف اللہ کا کام ہے
اور وہ بھی اس کی مشیت پر موقوف ہے نہ کہ میری اور تمہاری
بات جب اللہ سبحانہٗ اپنی مشیت کے مطابق لائے گا تو تم اللہ کے
مقابلے میں بیچارگی کے سوا کچھ نہ کر سکو گے۔ اور دیکھو اگر اللہ کے
قانون میں تمہارا اغوا ہی ہے تو میں تمہاری کتنی خیر خواہی بھی چاہوں۔

میری خیر خواہی تمہارے لیے بالکل بے سود ہوگی۔ یاد رکھو اللہ ہی تمہارا مالک ہے اور اسی کی بارگاہ میں تمہیں پیش ہونا ہے[۱۲] کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے دعویٰ نبوت جھوٹ موٹ کر دیا ہے آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر واقعی دعویٰ نبوت میں نے جھوٹ موٹ کیا ہے تو میرے جرم کرنے کا وبال مجھ پر ہوگا۔ اور اگر میں واقعی نبی ہوں تو انکار کا سنگین جرم اس کی سزا تمہیں ملے گی۔ میں اس سے قطعاً بری الذمہ ہوں۔[۱۳]

مفردات کے معانی

نصحی۔ نصح ینصح باب فتح سے ہے۔ لغت میں نصحت العسل اس وقت بولا جاتا ہے جب شہد کو موم سے صاف کر دیا جائے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔ کہ نصح کے معنے کسی چیز کا کھوٹ نکال دینا۔ یہ معنی نصحت العسل کے محاورے سے لیے گئے ہیں۔ محکم میں ہے کہ نصح کھوٹ غش کی ضد ہے۔ ابن طریف لکھتا ہے کہ نصح قلب الانسان اس وقت بولتے ہیں جب دل میں کوئی کھوٹ باقی نہ رہے۔ اس لیے نصیحت کے معنے یہ ہیں کہ ناصح اپنے آپ اور جس کو نصیحت کر رہا ہے کے درمیان کوئی کھوٹ کا معاملہ نہ رکھے۔

أن یغویکم۔ یہ اغوا سے باب افعال ہے مضارع منصوب کا واحد مذکر غائب ہے۔ اس کے معنے بے راہ کرنے کے ہیں۔ جب اغوا اللہ کی طرف سے ہو۔ تو اس کے معنے دو ہو سکتے ہیں۔ ایک یہ کہ غوایت اغوا کا سبب بن گیا۔ بایں طور کہ کسی شخص نے بے راہ روی اختیار کی بدیں وجہ اللہ سبحانہ نے اس پر اغواء کا حکم صادر فرما دیا۔ دوسری صورت اغوار الٰہی کی یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے جبلت انسانی کو ایک خاص وضع پر بنایا ہے۔ جب انسان کسی اچھے یا برے راستہ کو اختیار کر لیتا ہے۔ تو پھر وہی راستہ

اس کو مرعوب و مجبور ہو جاتا ہے۔ اس کو وہ کسی حال میں بھی نہیں چھوڑتا۔ اس وقت اغوا کی نسبت اللہ سبحانہٗ کی طرف اس لیے ہوتی ہے کہ وہ عالم انسانی اس کے قوانین کے تحت ہوا ہے۔

نبوت کا جذبہ خیر خواہی

نبوت اللہ سبحانہٗ کی جانب سے بندوں کے نام جو پیغام لے کر آتی ہے۔ اس کی تمام تر اساس خیر خواہی پر ہوتی ہے۔ اسی لیے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پورے دین کا جوہر الدین النصیحۃ کہہ کر پیش فرمایا ہے۔ قرآن نے نصیحۃ اور خیر خواہی کو انبیاء کی دعوت کی اساس بتایا ہے حضرت نوح علیہ السلام انصح لکم کا اعلان کر رہے ہیں۔ یعنی لوگو! میں تمہاری خیر خواہی کر رہا ہوں۔ حضرت ہود علیہ السلام فرماتے ہیں۔ انا لکم ناصح امین۔ میں بھروسہ کے قابل تمہارا خیر خواہ ہوں۔ حضرت صالح علیہ السلام فرماتے ہیں۔ ونصحت لکم ولکن لا تحبون الناصحین۔ میں نے تمہاری خیر خواہی کی ہے لیکن تم خیر خواہوں کو پسند نہیں کرتے ہو لوگوں کی خیر خواہی کا مطلب یہ ہوتا ہے۔ کہ لوگوں کے بُرے اعمال بُرے اخلاق، اور بُرے افکار پر نبوت غمگین ہوتی ہے۔ اور دل سے چاہتی ہے کہ لوگ اچھے اعمال اچھے اخلاق اور اچھے افکار کو اپنائیں لوگوں کی محاسن سے گریز پائی اور منکرات کا ارتکاب نبوت کے لیے پریشان کن اور تکلیف دہ ہوتا ہے۔ اسی بے چینی اور اضطراب میں نبی راتوں کو جاگتا ہے اور اللہ کی جناب میں روتا ہے۔

نبوت کی دعوت کی اصلی اساس عوام کے لیے جذبہ خیر خواہی ہوتا ہے شہری زندگی کا کوئی خاص طبقہ مثلاً تاجروں کا گروہ، کاشتکار، زمیندار، پیشہ ورانہ زندگی گزارنے والوں کی کوئی جماعت نبوت کی مخاطب نہیں ہوتی۔ اس کا خطاب سب سے یکساں ہوتا ہے اور اس خطاب کے پس منظر میں سب کے لیے جذبہ خیر خواہی کارفرما ہوتا ہے۔ اسی جذبہ خیر خواہی کی وجہ سے نبوت کی دعوت میں عوام سے خطاب کے لیے حکمت اور موعظت حسنہ ہوتی ہے۔ حکیمانہ استدلال ہو یا واعظانہ انداز بیان ہو نرمی اور خیر خواہی داعی کی ضرورت ہے۔ سختی اور شدت کا طریق کار دوسرے کے دل میں عداوت اور نفرت کے جذبات پیدا کر دیتا ہے۔ اور یہ خیر خواہی کے منافی ہے اس لیے ہر پیغمبر اپنا کام عوام کی خیر خواہی پر مبنی جذبات کے تحت کرتا ہے۔

۳۹ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں نے کہا۔ اے نوحؑ تو نے ہم سے جھگڑا کیا پس جھگڑا بہت کر چکے ہو اب اگر تم سچے ہو تو وہ چیز لاؤ جسکی تم دھمکی دے رہے ہو۔ حضرت نوح علیہ السلام قبل از طوفان

ساڑھے نو سو سال ان میں رہے۔ شب و روز سرا و علانیہ انہیں نصیحت کرتے رہے۔ ہر شبہ کا جواب دیتے تبلیغ و تفہیم اور بحث و مناظرے کا سلسلہ جاری رہا اس جھگڑے میں صدیاں گزر گئیں۔ کفار نے ان حقائی بحثوں اور شب و روز کی نوک جھوک سے عاجز ہو کر کہا۔ کہ اب یہ سلسلہ بند کیجئے اگر آپ سچے ہیں تو جس عذاب کی دھمکیاں دیتے رہتے ہو وہ فوراً لے آؤ تاکہ یہ روز روز کا جھگڑا ختم ہو۔[1]

جب حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطب بحث و مناظرہ کے میدان میں شکست کھا کر پسپا ہو گئے اور نوح علیہ السلام نے ہر پہلو سے ان پر حجت تمام کر دی اور ان کے لیے کوئی جائے گریز باقی نہ چھوڑی تو آخر میں انہوں نے جائے پناہ اسی خیال میں محسوس کی کہ حضرت نوح علیہ السلام سے اس عذاب کے لانے کا مطالبہ کریں۔ جس کی وہ خبر دے رہے تھے۔ چنانچہ صاف صاف کہہ دیا کہ جناب بحث و مناظرہ کی کافی منزلیں طے ہو چکی ہیں۔ بس اب تو اگر آپ سچے ہیں تو وہ عذاب لائیے جس کی آپ مدت سے دھمکی دیتے آ رہے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے جواب دیا کہ عذاب کا لانا اللہ کے اختیار میں ہے وہی جب چاہے گا لائے گا۔ لیکن یہ یاد رکھو کہ جو عذاب کا مطالبہ کر رہے ہو تو جب آ دھمکے گا اس وقت کوئی بھی خدا کے قابو سے باہر نہیں ہو گا۔

معاندین عموماً انبیاء علیہم السلام کو جھوٹا جان کر یہ مطالبہ کرتے ہیں کہ جس آخری معجزہ عذاب کی تم دھمکی دیتے ہو۔ وہ آخر کب آئے گا۔ چونکہ اپنی نافہمی سے ان کو یقین ہوتا ہے۔ کہ یہ معجزہ عذاب اب ظاہر نہ ہو گا اس لیے وہ اس کا مطالبہ بڑی دلیری سے کرتے ہیں۔ تاکہ وہ رائے عامہ کو گمراہ کر سکیں اور اس طرح لوگوں میں پیغمبر کی سبکی ہو۔ اور ہماری طرح اور لوگ بھی اس کو کاذب تسلیم کریں۔ قرآن میں بار بار ہر دور کے کافروں کے اس مطالبہ کو دہرایا گیا ہے۔ اور اس کا جواب دیا گیا۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی امت نے کہا۔

وان نظنک لمن الکاذبین فاسقط علینا کسفا من السماء ان کنت من الصادقین ۔

اور ہمارے خیال میں تو تم جھوٹے ہو اگر سچے ہو تو ہم پر آسمان کا ایک ٹکڑا گرا دو۔

تاخیر عذاب کا بڑا سبب یہ ہوتا ہے۔ کہ معجزہ ہلاکت سے پہلے پیغمبر کو ہجرت کا حکم ہو جاتا ہے اور

[1] افادات شیخ الاسلام

منکرین کا گروہ ہلاک ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی قوم کے لیے عذاب کی تاخیر کا یہی راز ہے۔

دراصل منکرین نبوت پر نتائج کی حیثیت سے معجزات دو قسم کے ہوتے ہیں۔ معجزہ ہدایت، معجزہ ہلاک۔ نبوت پہلے کفار کو ہدایت کی نشانیاں دکھاتی ہے۔ اور ان کو حق کی دعوت دیتی ہے۔ نبوت کے مخاطبوں کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزا ہوتے ہیں۔ وہ اس دعوت کو قبول کر لیتے ہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ وقت آتا ہے جب مادہ فاسد کے سوا کفار کی جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہتا یعنی کثیف مادے سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیفہ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور ڈھیر میں پھونس کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ یہاں قوم نوحؑ جس معجزہ ہلاکت کا مطالبہ کر رہی ہے۔ اس کی تاخیر کا سبب یہی ہے۔

آیت قرآنی کا مدلول بتا رہا ہے۔ کہ باطل کے مقابلہ میں حق کو دلائل کی قوت سے پیش کرتا اور منکرین کے شبہات کا ازالہ۔ انبیاء علیہم السلام کا کردار ہے۔ باطل پر اصرار اور باپ دادا کی ڈگر پر چلتے رہنا۔ حق کا انکار کفار معاندین کا شیوہ ہے اور آیت میں اس بات کی طرف اشارہ ہو رہا ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام توحید و معاد اور نبوت کی تائید میں دلائل و شواہد ایک عرصہ دراز تک پیش فرماتے رہے ہیں۔ اور یہ آیت سے اشارہ معلوم ہو رہا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں نے یہ بات اس مکالمہ کے بعد کہی ہے جو یہاں اس رکوع میں بیان ہوا ہے اس سے معلوم ہوا ہے۔ کہ یہ ان کا اپنی قوم سے آخری مجادلہ تھا اور یہ بات لوگوں نے حضرت نوحؑ کی تقاریر ان کے مواعظ اور نصائح کی بہتات سے تنگ آکر اور دل برداشتہ ہو کر کہی تھی۔

یاد رہے کہ قرآن نے بتایا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم میں دعوت کا کام ۹۵۰ سال کیا ہے۔ اور اتنی طویل مدت تک ان کی زیادتیاں برداشت کرتے رہے اور انہوں نے ہمت نہیں ہاری ۹۵۰ سال کام کرنے کا مطلب یہ نہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام سالانہ اجتماع کر کے دعوت دیتے تھے یہ بھی نہیں کہ اس مقصد کے لیے کوئی ماہانہ کانفرنس کرتے تھے یہ بھی نہیں کہ کوئی ہفتہ وار اجتماع کرتے تھے۔ بلکہ قرآن نے انکشاف کیا ہے۔

رب انی دعوت قومی لیلا ونھارا فلم یزدھم دعائی الا فرارا۔

اس کا مطلب اس کا سوا اور کیا ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے قوم میں ۹۵۰ سال کے ایک ایک دن اور ایک ایک رات دعوت کا کام کیا ہے۔ اس طویل عرصہ میں اس طویل کام کے بعد یہ آخری

دعوت ہے جس میں قرآن نے لوگوں کی دعوت سے بیزاری کو اکثرت جدالنا فاتنا بما تعدنا ان کنت من الصادقین سے تعبیر کیا ہے۔ یعنی صرف یہ نہیں کہ وہ دعوت قبول نہیں کرتے تھے۔ بلکہ وہ خود حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت ہی سے بیزار ہو چکے تھے۔

(۴۰) عقیدہ معجزات کی اصلاح

حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا۔ بتانا میرا کام ہے لانا میرا کام نہیں ہے۔ یہ صرف اللہ کا کام ہے۔ اور اس کی مشیت پر موقوف ہے۔ نہ کہ میری اور تمہاری۔ جب اللہ سبحانہ اپنی مشیت کے مطابق لائے گا تو تم اللہ کے مقابلے میں بیچارگی کے سوا کچھ نہ کر سکو گے یعنی یہ چیز میرے قبضہ میں نہیں۔ اللہ سبحانہ جس وقت اپنی حکمت کے موافق چاہے گا عذاب نازل کر دے گا۔ ہمارا فرض صرف آگاہ کر دینا تھا۔ باقی عذاب تو ایسی ہولناک اور عظیم الشان چیز ہے۔ جس کا لے آنا اور دفع کر دینا دونوں پہلو قوائے بشریہ سے خارج ہیں۔ جب مشیت الٰہی ہو گی تو کہیں بھی بھاگ کر پناہ نہ لے سکو گے ایسا کون ہے جو اللہ سبحانہٗ کو معاذ اللہ بھٹکا کر عاجز کر سکے [۱]

اصل یہ ہے کہ نبوت کی نظر میں ظاہری اعجاز کی چنداں وقعت نہیں ہوتی وہ لوگوں کو ہمیشہ اصلی روح نبوت کی طرف متوجہ کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ ظاہری معجزات لوگوں میں بہت غلط عقیدے پیدا کرتے ہیں۔ اس لیے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے اس بیان کے ذریعے نہایت تصریح اور نہایت وضاحت کے ساتھ اپنے مخاطبوں کو بتایا ہے۔ کہ عذاب کا آنا نبی کی قوت اور ارادے سے نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ کی قدرت اور مشیت سے ظاہر ہوتا ہے۔ فرمایا انما یاتیکم بہ اللہ۔ انما حرف قصر ہے اس کا کام یہ بتانا ہے۔ کہ عذاب کا لانا اللہ سبحانہ کے سوا کسی کی قدرت میں نہیں ہے۔ اس کے منہ میں بیک وقت دو مثبت اور منفی باتیں ہوتی ہیں۔ مثبت یہ کہ عذاب کا لانا اللہ سبحانہٗ کا کام ہے۔ اور منفی یہ کہ اللہ کے سوا اور کسی کا یہ کام نہیں ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے اسی قصر کو سمجھانے کے لیے یہ لکھا ہے۔ کہ

> یہ میرا کام نہیں اور نہ یہ میرے بس میں ہے یہ تو صرف اللہ سبحانہٗ کا ہی کام ہے۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

حافظ ابن جریر رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ۔

حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم سے اس وقت جب انہوں نے جلدی عذاب کا مطالبہ کیا فرمایا لوگو! جس چیز کے بارے میں تم جلدی کا مطالبہ کر رہے ہو یہ میری قدرت میں اور بس میں نہیں یہ تو صرف اللہ ہی کا کام ہے کہ وہ اگر چاہے تو تم پر عذاب لے آئے ۔

ان بزرگوں نے اسی انداز تعبیر کو سمجھانے کے لیے یہ انداز تشریح اختیار کیا ہے ۔

(۴۱) شر پسندی اور خیر سے بے رغبتی کا نتیجہ

اور دیکھو اگر اللہ کے قانون میں تمہارا اغوا ہی ہے تو میں تمہاری کتنی خیر خواہی چاہوں ۔ میری خیر خواہی تمہارے لیے بالکل بے سُود ہو گی ۔ یاد رکھو اللہ ہی تمہارا مالک ہے ۔ اور اسی کے دربار میں تمہیں پیش ہونا ہے ۔ یعنی کفر پر اس قدر اصرار و ضد اور انتہائی شوخ چشمی سے نزول عذاب کی استدعا پتہ دیتی ہے ۔ کہ اللہ سبحانہٗ کا ارادہ یہی ہے ۔ کہ تم کو گمراہی میں پڑا رہنے دے اور آخر کار ہلاک کر دے ۔ پس اگر تمہاری بدکرداری کے سبب سے اللہ نے یہی چاہا تو میں کتنا ہی نصیحت و خیر خواہی کر کے تم کو نفع پہنچانا چاہوں تو کچھ نافع اور مؤثر نہ ہو گا ۔ تمہارا رب وہی ہے جس کے ملک اور تصور میں ہر چیز ہے ۔ جیسا جس کے ساتھ معاملہ کرنا چاہے کوئی روک نہیں سکتا ۔ سب کو اسی کی طرف لوٹ کر جانا ہے ۔ وہی سب کے اعمال کی جزا و سزا دینے والا ہے[۱] یہ دعوت و نصیحت اور تذکیر و موعظت کا آخری مرحلہ ہوتا ہے کہ اللہ کا رسول اپنا فرض ادا کر کے اپنی سبکدوشی کا اعلان کرتا ہے اور اپنے جھٹلانے والوں کو ان کے اس انجام کے حوالے کر دیتا ہے جو ان کے لیے ان کے کردار کے نتیجے میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے مقرر ہو چکا ہے ۔ یہ بات حضرت نوح علیہ السلام نے اسی موقعہ پر فرمائی ہے کہ اب تم اللہ سبحانہٗ کے قانون کی زد میں آچکے ہو اور اپنے اعمال کی وجہ سے اس لائق ہو کہ اللہ سبحانہٗ تمہیں گمراہی کی راہ پر چھوڑ دے اور خیر کی ساری توفیق تم سے صلب کر لے ایسی حالت میں میں لاکھ نصیحت اور وعظ کروں میری کوئی نصیحت کارگر نہ ہو گی ۔ اب تمہارا معاملہ اللہ سبحانہٗ کے سپرد ہے وہی تمہارا مالک ہے ۔ اور اسی کی بارگاہ میں تمہیں اپنے اعمال کی جواب دہی کے لیے پیش ہونا ہے ۔ بتانا یہ چاہتے ہیں ۔ کہ اگر اللہ سبحانہٗ نے تمہاری ہٹ دھرمی اور خیر

[۱] افادات شیخ الاسلام

سے گریز پائی دیکھ کر یہ فیصلہ کر لیا ہے۔ کہ تمہیں راہ راست پر چلنے کی توفیق نہ دے۔ اور جن راہوں میں تم خود بھٹکنا چاہتے ہو ان ہی میں تمہیں بھٹکا دے تو اب تمہیں راہ راست پر لانے کے لیے میری کوئی کوشش کامیاب نہیں ہو سکتی ہے۔

شارحین قرآن نے یہاں دو بحثیں چھیڑ دی ہیں۔ ایک نحوی اور دوسری کلامی۔ آیت قرآنی اپنے معنے اور مطالب میں بالکل واضح اور صاف ہے۔ ہم معالم القرآن کے پڑھنے والوں کو اس میں الجھانا نہیں چاہتے ہیں۔ اصل یہ ہے یہاں دو صداقتیں ہیں۔ اور دونوں عالم انسانیت میں کارفرما ہیں۔

ایک یہ کہ ایمان وہدایت کے لیے بندے کا ارادہ اور کوشش ہو۔ اسی کو قرآن میں بندے کی مشیت کہا گیا ہے۔ فرمایا کہ

فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر

جو چاہے ایمان لائے اور جو چاہے کفر کرے۔

دوسری جگہ ہے۔

فمن شاء اتخذ الی ربہ سبیلا۔

جو چاہے اپنے پروردگار کے راستہ کو اختیار کرے۔

ایک اور آیت ہے۔

فمن شاء اتخذ الی ربہ مآبا

جس کا جی چاہے اپنے رب کی طرف بازگشت کرے۔

سورہ فرقان میں ہے۔

الا من شاء ان یتخذ الی ربہ سبیلا

ہاں مگر جو اپنے پروردگار کی طرف راستہ اختیار کرنا چاہے

ان سب میں بندے کی مشیت اور اس کے ارادے کا ذکر ہے۔ ایمان وعمل صالح، کفر وفسق، ہدایت وسعادت، ضلالت وشقاوت سب بندے کے لیے اللہ سبحانہ کی جانب سے ارادی اور اختیاری چیزیں ہیں۔ اگر بندے کے ارادے اور اختیار میں نہ ہو تو ان پر جزا وسزا نہ ہو۔ فرشتوں اور انسانوں میں یہی بنیادی فرق ہے۔

دوسری صداقت یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت وارادہ ہر جزء وکل پر حاوی ہے ان آیتوں میں اسی صداقت کا ذکر کیا ہے۔ وما تشاؤن

الا ان یشاء اللّٰہ رب العالمین تم نہیں چاہو گے مگر یہ اللہ سبحانہٗ چاہے گا۔ وما کانوا لیؤمنوا الا ان یشاء اللّٰہ۔ وہ نہیں ہیں کہ ایمان لائیں مگر یہ کہ اللہ چاہے۔ ولو شاء اللّٰہ لجمعھم علی الھدی اور فلو شاء لھداکم اجمعین اور ولو شئنا لاٰتینا کل نفس ھداھا۔ ان آیات میں اللہ کی مشیت اور ارادے کا ذکر کیا ہے۔ ہدایت وضلالت، سعادت وشقاوت اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہے۔ اور اس کی مشیت اور ارادے سے ہے۔

نبوت یہ دونوں صداقتیں لے کر آتی ہے اور ان کی تبلیغ کرتی ہے۔ ایک اس کا اعلان ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی اجازت کے بغیر درخت کا پتا بھی نہیں ہلتا اور دوسری وہ یہ کہتی ہے کہ ہر جان ارادہ واختیار کے مطابق کام کرنے کی طاقت رکھتی ہے یہی ارادہ و اختیار اور مشیت اس کی ذمہ داری، تکلیف، باز پرس اور مواخذہ کی بنیاد ہے۔ اور اسی پر اس کے اعمال، اخلاق اور معاملات کی پوری عمارت کھڑی ہے۔ اس لیے انسان پر اس کے کسی عمل کی ذمہ قانوناً نہیں جو اس کے ارادے اور نیت سے صادر نہ ہوتی ہو بلکہ اس کے کرنے یا کرنے میں مجبور و بے اختیار ہو۔ اسی لیے ارشاد ہے۔ فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔ اس لیے ہر انسان اپنی جنت اور دوزخ خود بناتا ہے۔

من عمل صالحا فلنفسه ومن اساء فعلیها

جس نے نیک کام کیا تو اپنے لیے کیا اور جس نے بُرا کیا تو اپنے لیے کیا۔

انسان کو اسی ارادے اور اختیار کی تکمیل کی خاطر اللہ سبحانہٗ نے حواس خمسہ اور مشاعر خمسہ ارزانی فرمائے ہیں۔ ایک شخص اگر آنکھیں رکھتے ہوئے بھی دیکھتا نہیں ہے۔ اور کان ہوتے ہوئے سنتا نہیں ہے۔ تو اللہ سبحانہٗ اس کو جبراً دیکھنے اور سننے پر مجبور نہیں کرتا۔

ہدایت واضلال، رشاد واغوار کا مسئلہ بھی یہیں سے سمجھ لو ضلالت ہو یا ہدایت دونوں اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں۔ اور انسان کے اچھے یا بُرے کام جواب ہیں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہوتے ہیں۔

اللہ سبحانہٗ کی جانب سے اضلال واغوا کن لوگوں کے لیے آتی ہے قرآن نے صراحتاً بتایا ہے۔ اللہ سبحانہٗ بدکاروں کو گمراہ کرتا ہے۔ وما یضل بہ الا الفاسقین یعنی لوگوں کی بدکاری کے نتیجے میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے اضلال ہوتا ہے۔ یا فلما زاغوا ازاغ اللّٰہ قلوبھم یعنی ان کے اعمال وافکار اور اخلاق میں کجی آنے کے سبب اللہ نے ان کے دلوں کو کج کر دیا۔ یہ اور اس قسم کی

آیات ہیں۔ ہر ایک سے صاف اور صریح معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کی بداعمالی مقدم ہے۔ اور اللہ سبحانہٗ کا اس کے جوابی اثر کو اپنی طرف سے اضلال، اغوار فرمانا مؤخر ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہٗ کی جانب اضلال اور اغوار معلول ہے اور لوگوں کی بدکاری، فسق وفجور، کفر، انکار وجحود علت ہے۔ یہی طبعی اصول ہے۔ انسان جب گرتا ہے تو چوٹ لگتی ہے۔ غمگین ہوتا ہے تو آنسو کے قطرے ٹپکتے ہیں۔ اگر کوئی اسے الٹ کر بیان کرے کہ چوٹ کی وجہ سے گرا ہے۔ یا آنسو کی وجہ سے غمگین ہوا ہے یا اللہ کے گمراہ کرنے کی وجہ سے بدکار ہوا ہے۔ اور اللہ سبحانہٗ کے دل کو ٹیڑھا کرنے کی وجہ سے وہ ٹیڑھا ہوا ہے۔ تو یہ کیسی بے دانشی اور سخت نادانی ہوگی۔

آیئے اب زیر بحث آیت ان کان اللہ یرید ان یغویکم پر غور کیجئے۔ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کا اغوار معلول ہے اس ارادہ واغوار کی علت ان کی جانب سے دعوت حق سے اعراض وانکار میں شدت اور تسلسل اور پھر حضرت نوح علیہ السلام سے گستاخانہ انداز میں یہ کہنا کہ اگر تمہارے پاس اپنے دعویٰ نبوت کی صداقت ہے تو ہمارے انکار واعراض پر جو عذاب لانا ہے وہ لاؤ۔ اس اغوار کی علت ہے۔ لوگ علت پر دھیان نہیں دیتے معلول پر زور دیتے ہیں۔ حالانکہ بات واضح اور صاف ہے۔ کفر میں ان کے شدت آتی ہے تو نبوت کے منہ آئے۔ بات کہی گئی نہیں۔ نبی کی ذات نے باطنی نشانیوں سے آنکھیں بند کرلی ہیں اب اس کے نتیجے میں اللہ کا ارادہٗ واغوار رونما ہوا تو اس پر شور مچا رہے ہو۔ علم کی تصحیح خود نہیں کرتے اور عدم صحت علم کی پاداش میں عمل غلط ہو رہا ہے تو الزام دوسروں کو دے رہے ہو۔ دیکھ کر خود نہیں چلتے اب چوٹ لگنے پر الزام حق سبحانہٗ پر تھوپ رہے ہو۔

بلاشبہ اللہ سبحانہٗ کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے اور اس کی مشیت وارادہ ہر جزو کل پر حاوی ہے۔ اور یہ بات بھی بے غبار ہے کہ انسان کو بھی اللہ سبحانہٗ کی جانب ارادہٗ واختیار کا فیضان ہوا ہے۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے اس عمل کا ذمہ دار بنتا ہے۔ نیکی کے کاموں کو کرنے پر وہ تعریف کا اور بدی کے کاموں پر ملامت کا سزاوار ٹھہرتا ہے اور اسی بنا پر وہ اپنی دوسری زندگی میں اپنے فعل کی جزاو سزا پانے کا مستحق ٹھہرے گا۔ اسی پر وہ فطرت کے سامنے دنیا کی عدالت میں اور آخرت میں بھی مواخذہ اور بازپرس کی ذمہ داری میں گرفتار ہے اور اسی کے لیے اللہ سبحانہٗ کی طرف سے اس کے پاس ہدایت کی کتاب اور راستہ دکھانے والے رسول آئے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام اپنے مخاطبوں کو ان دونوں صداقتوں کو پوری قوت کے ساتھ سمجھا رہے ہیں۔ اور تبلیغ کر رہے ہیں کہ ہر انسان اپنے کردار کا ذمہ دار ہے یعنی اللہ سبحانہٗ کی

ہمہ گیر قدرت وسیع اختیار اور ناقابل رد مشیت کے باوجود اس نے خود اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادے اور مشیت کے مطابق کام کرنے کی استعداد و صلاحیت کو بروئے کار لانے کی کوشش نہیں کی ہے۔ بلکہ اس کے برعکس تم نے دعوت حق کے مقابلہ میں مبارزت کا ارادہ کر لیا، مخاصمت اور عناد کو اپنا لیا اس کا نتیجہ یہی ہوا اور یہی ہونا چاہیئے کہ حق قبول کرنے کی صلاحیت تم سے سلب ہو گئی ہے اور اللہ نے اسی راہ کا دروازہ تمہارے لیے کھول دیا ہے جس راہ پر چلنے کا تم نے خود ارادہ کیا ہے یہ مطلب ہے۔ ان کان اللہ یرید ان یغویکم کا یعنی تمہارا ارادہ غوایت کا ہے تو اللہ کا ارادہ بھی تمہارے اغوار کا ہو گیا۔ اس صورت حال میں قانون الہی کے مقابلے میں میری نصیحت تمہارے لیے کیسی نافع اور سودمند ہو سکتی ہے وہی ہو گا جو اللہ کا ارادہ ہو گا۔ اللہ کی مشیت ہو گی۔ اللہ کا ارادہ اور اس کا قانون بغیر ارادے کے کسی کو ہدایت کی نعمت نہیں دیتا اور جبرا کسی کو حق قبول کرنے کے لیے آمادہ نہیں کرتا۔

(۴۲) افترا اور جُرم انکار کا تقابل

کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے دعوئ نبوت جھوٹ موٹ کیا ہے۔ آپ ان سے کہہ دیجئے کہ اگر واقعی میں نے دعوئ نبوت جھوٹ موٹ کیا میرے جُرم کا وبال مجھ پر ہو گا۔ اور اگر میں واقعی نبی ہوں تو انکار نبوت کا سنگین جرم تم کر رہے ہو۔ اس کی سزا تمہیں ملے گی پس اس سے قطعی بری الذمہ ہوں حضرت شاہ عبدالقادر موضح میں لکھتے ہیں۔ یہاں تک جتنے سوالات و اعتراضات اس قوم کے تھے۔ وہی تھے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی قوم کے گویا یہ سب جواب ان کو ملے ایک ان کا نیا دعویٰ تھا اسے آگے قصہ کے درمیان بیان فرماتے ہیں۔ یہ ہے شاہ عبدالقادرؒ کی بات۔ شیخ الاسلامؒ فرماتے ہیں۔ یہ گفتگو کفار کی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ۔ کہ قرآن آپ خود بنا لائے ہیں۔ اللہ سبحانہ کا کلام نہیں ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کتاب نہ لائے تھے جو ان کی قوم یہ بات کہتی لیکن بعض مفسرین نے اس آیت کو بھی نوح علیہ السلام کے قصے کا جزء بتایا ہے۔ یعنی ان کی قوم نے کہا کہ جن باتوں کو نوح علیہ السلام اللہ سبحانہ کی طرف منسوب کرتے ہیں۔ وہ خود ان کی من گھڑت ہے بعض نے کہا کہ گفتگو تو اہل مکہ کی حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ہے۔ مگر اس کا تعلق خاص نوح علیہ السلام کے قصے سے تھا گویا وہ کہتے تھے۔ کہ یہ داستان آپ نے جھوٹ بنا لی ہے واقعہ میں ان قصوں کی کوئی اصل نہیں ہے [1]

[1] افادات شیخ الاسلامؒ

اس آیت کی تشریح دو طرح سے کی گئی ہے خلاصہ یہ ہے ۔

۱۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کا تعلق حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ سے ہے جو کلام مربوط مسلسل ہے جملہ معترضہ نہیں ہے ۔

۲۔ حضرت مقاتل کہتے ہیں کہ آیت کا تعلق حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور ان کے مخاطبوں اہل مکہ سے ہے۔ کلام مربوط نہیں یہ درمیان میں جملہ معترضہ ہے ۔

دوسری تشریح جو مقاتل کے حوالہ سے آئی ہے اور جسے حافظ ابن کثیرؒ اور حافظ ابن جریرؒ نے شارحین قرآن سے شریف پذیرائی دی ہے۔ اردو شارحین میں سے مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز مولانا مفتی محمد شفیعؒ مولانا مودودیؒ نے مقاتل ہی کی تشریح کو اپنایا ہے چنانچہ مولانا حضرت اشرف علیؒ فرماتے ہیں ۔

> کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے نعوذ باللہ قرآن تراش لیا ہے ۔ آپ جواب میں فرما دیجئے میں نے تراشا ہوگا تو میرا یہ جرم مجھ پر عائد ہوگا ۔ اور تم میرے جرم سے بری ہو گئے ۔ اور اگر یہ دعویٰ تراشا ہوگا تو تمہارا یہ جرم تم پر عائد ہوگا اور میں تمہارے اس جرم سے بری الذمہ ہوں ۔

حضرت مولانا مفتی محمد شفیعؒ نے بھی مولانا موصوف کی ہمنوائی کی ہے۔ مولانا مودودیؒ نے اس تشریح کو اپنانے کے لیے سب سے الگ ایک نئی راہ اختیار کی ہے ۔ فرماتے ہیں ۔

> انداز کلام سے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان سے حضرت نوح علیہ السلام کا قصہ سنتے ہوئے اعتراض کیا ہوگا ۔ کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم یہ قصے بنا بنا کر اس لیے پیش کرتا ہے کہ انہیں ہم پر چسپاں کرے ۔ جو چوٹیں وہ ہم پر براہ راست نہیں لگا سکتا ۔ ان کے لیے ایک قصہ گھڑ لیتا ہے ۔ اور اس طرح در حدیث دیگراں کے انداز میں ہم پر چوٹ کرتا ہے ۔ لہذا سلسلہ کلام توڑ کر ان کے اعتراض کا جواب اس فقرے میں دیا گیا ۔

لیکن امام رازیؒ ، علامہ آلوسیؒ ، قاضی بیضاویؒ نے سیاق وسباق قرآنی کے پیش نظر عبداللہ بن عباسؓ کی تشریح کو اپنایا ہے اور اس کو علامہ آلوسیؒ اور علامہ خفاجیؒ جمہور کا مذہب قرار دیا۔ آلوسیؒ لکھتے ہیں۔

> یہ حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ کا نتیجہ ہے اور آیت حضرت نوح علیہ السلام ہی سے تعلق رکھتی ہے یہی ظاہر ہے اور یہی جمہور کا مختار ہے

خفاجیؒ نے یہی بات لکھی ہے ان کا کہنا ہے۔

والظاهر انه من نتيجة قصة نوحؑ وفی شانه وعليه الجمهور

ان بزرگوں نے آیت کی جو تشریح فرمائی ہے یہ ہے۔ امام رازیؒ فرماتے ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ، اگر میں نے اپنی جانب سے اللہ کی وحی کی بات خود ہی گھڑلی ہے تو اس کی سزا مجھے ملے گی اور اگر میں دعویٰ وحی میں سچا ہوں اور اس کے باوجود تم نے میری تکذیب کی ہے تو اس کی سزا تمہیں ملے گی اور تمہارے جرم اور جرم کی سزا کی مجھ پر ذمہ داری نہیں ہے۔

علامہ محمود آلوسیؒ نے بھی یہی مطلب بتایا ہے اور لکھا ہے کہ

کیا نوح علیہ السلام کی قوم کہتی ہے کہ نوح علیہ السلام نے اللہ کی وحی والی بات اللہ کے ذمہ جھوٹ موٹ اڑا دی ہے اے نوح علیہ السلام ان سے کہہ دو کہ بالفرض اگر میں نے یہ بات اللہ کی جانب سے خود کہی ہے تو اس کا وبال میرے سر ہے اور میں تمہارے اس جرم کا ذمہ دار نہیں ہوں کہ تم مجھے مفتری بتا رہے ہو اور مما تجرمون میں ما مصدریہ ہی ہو سکتا ہے یعنی تمہارے جرم کرنے کی مجھ پر کوئی ذمہ داری نہیں ہے۔

لباب التاویل فی معانی التنزیل میں علامہ علاء الدین نے بھی یہی مطلب بتایا ہے اور آخر میں لکھا ہے کہ

اکثر شارحین قرآن کا موقف یہی ہے کہ یہ گفتگو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کے درمیان ہو رہی ہے اور اس کا تعلق حضرت نوح علیہ السلام کے واقعہ سے ہے۔

مشہور مفسر قرآن امام محمد بغوی کا میلان بھی یہی ہے۔ علامہ شوکانیؒ نے فتح القدیر میں اسی تشریح کو ترجیح دی ہے اور لکھا ہے کہ

حضرت نوح علیہ السلام سے متعلق تشریح زیادہ بہتر ہے کیونکہ یہ آیت موقعہ ومحل اور سیاق وسباق کے اعتبار سے یہی چاہتی ہے۔

قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں اسی تشریح کو پذیرائی دی ہے اور فتح البیان میں نواب

صدیق حسن رحمتہ اللہ نے اسی کو اپنایا ہے۔

کیا حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطب کہتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے پر اللہ کی وحی آنے کا قصہ خود گھڑ لیا ہے۔ اے نوح علیہ السلام آپ کہہ دیجئے کہ اگر اللہ کی وحی کا واقعہ میرا من گھڑت ہے تو اس گناہ کی سزا کا وبال مجھ پر ہے لیکن اگر میں سچا ہوں اور تم میری تکذیب کر رہے ہو۔ تو اس کی پاداش کے لیے تمہیں تیار رہنا چاہیئے اور تمہارے اس جرم سے کہ تم مجھ پر اللہ کی وحی کو من گھڑت بتا رہے ہو۔ میں بالکل بری ہوں۔ اس کی ذمہ داری کوئی بھی مجھ پر نہیں ہے۔

علامہ آلوسیؒ نے مقاتل کی تشریح کے بارے میں یہ فیصلہ دیا ہے کہ۔

آیت کی یہ تشریح مطالب قرآن سے دور کا بھی واسطہ نہیں رکھتی ہے۔ خواہ اس میں کچھ اور بھی کوئی تاویل کی جائے۔

ہماری رائے میں قرآن کے سیاق وسباق کے لحاظ سے عبد اللہ بن عباسؓ کی تشریح قابل قبول و ترجیح ہے۔ دراصل یہ دعوت وموعظت کے آخری مرحلہ میں حضرت نوح علیہ السلام کی جانب سے اعلان برارت ہے۔ اس آیت میں حضرت نوح علیہ السلام کو ہدایت ہوئی ہے کہ اگر تمہاری قوم کے لوگ یہ سمجھتے ہیں۔ کہ یہ جو کچھ تم انہیں بتا رہے ہو یہ سب تمہاری اپنی گھڑی ہوئی باتیں ہیں جن کو تم جھوٹ موٹ اللہ سبحانہٗ کی طرف منسوب کر رہے ہو۔ تو اب یہ بحث بالکل ختم کر دو اور ان سے صاف صاف کہہ دو کہ اگر یہ سب کچھ میرا افترا ہے تو اس جرم کی ذمہ داری مجھ پر ہے اور اگر یہ حق ہے اور تم عناد سے جان کر انکار کر رہے ہو تو اس جرم سے میں اپنی برأت کا اعلان کرتا ہوں۔

اصل یہ ہے کہ ذہنی مریضوں کا ذہن ہمیشہ بال کی کھال نکالنے کی فکر میں رہتا ہے۔ ان کو حقائق و واقعات سے کوئی دلچپی نہیں ہوتی ہے۔ کہ بات کو دیکھیں اور تولیں۔ ایک شخص اگر کوئی حکمت کی بات کہہ رہا ہے یا آپ کو وہ کوئی مفید سبق دے رہا ہے۔ یا آپ کی کسی غلطی پر متنبہ کر رہا ہے۔ تو اس سے فائدہ اپنانا اور اپنی اصلاح کرنا آپ کا کام ہے۔ مگر اخلاق باختہ لوگ بات سے ہٹ کر بات کہنے والے سے عناد اور دشمنی کا اظہار کرے۔ بات کا مخاطب کے پاس کوئی جواب نہیں تو کہنے لگتا ہے کہ یہ کیوں کہہ رہا ہے۔ اور کہنے والے میں ایسا کوئی پہلو تلاش کرے گا۔ جس سے حکمت ونصیحت پر پانی پھیر دے۔ اور نہ صرف یہ کہ اپنی برائی پہ ڈٹا رہے۔ بلکہ بات کہنے والے کے ذمہ بھی الٹی باتیں

لگا دیتے ہیں۔ مثلاً یہی کہ ہمارے ماننے والے لوگ کمین ہیں۔ بہتر سے بہتر بات بے قیمت اور بے وزن ہو کر رہ جاتی ہے۔ اگر سننے والا سننے پر تیار نہ ہو اور اس کا ذہن اپنی غلطی کے احساس کی جگہ برائیاں تلاش کرنے میں لگ جائے۔ یہی صورت حال یہاں ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطب حضرت نوح علیہ السلام پر الزام لگا رہے ہیں کہ تم نے وحی والی بات خود گھڑلی ہے اور یہ سارا گھروندا تمہارا اپنا ساختہ و پرداختہ ہے۔ اسی لیے حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا کہ تم بات کو دیکھو اگر میں یہ بات خود تراش کر کہہ رہا ہوں اور اللہ پر افترا کر رہا ہوں تو اپنے جرم کا میں خود ذمہ دار ہوں۔ لیکن تم جس جرم کا ارتکاب کر رہے ہو وہ تو اپنی جگہ قائم رہے اور اس کی باز پرس تم سے ہوگی نہ کہ مجھ سے۔

وَأُوحِيَ إِلَىٰ نُوحٍ أَنَّهُ لَن يُؤْمِنَ
مِن قَوْمِكَ إِلَّا مَن قَدْ آمَنَ فَلَا تَبْتَئِسْ بِمَا كَانُوا
يَفْعَلُونَ ﴿٣٦﴾ وَاصْنَعِ الْفُلْكَ بِأَعْيُنِنَا وَوَحْيِنَا وَلَا تُخَاطِبْنِي
فِي الَّذِينَ ظَلَمُوا ۚ إِنَّهُم مُّغْرَقُونَ ﴿٣٧﴾ وَيَصْنَعُ الْفُلْكَ
وَكُلَّمَا مَرَّ عَلَيْهِ مَلَأٌ مِّن قَوْمِهِ سَخِرُوا مِنْهُ ۚ قَالَ إِن تَسْخَرُوا
مِنَّا فَإِنَّا نَسْخَرُ مِنكُمْ كَمَا تَسْخَرُونَ ﴿٣٨﴾ فَسَوْفَ تَعْلَمُونَ
مَن يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَيَحِلُّ عَلَيْهِ عَذَابٌ مُّقِيمٌ ﴿٣٩﴾

اور حضرت نوح علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتایا گیا کہ ان کے سوا جو اب تک ایمان لا چکے ہیں۔ کوئی ہرگز ایمان نہ لائے گا۔ لہٰذا ایمان نہ لانے والوں کے کردار پر تم غمگین نہ ہو[۴۳] اور اب تم ہماری ہدایت میں ہمارے رُوبرو جہاز بناؤ اور دیکھو ان لوگوں کے بارے میں مجھ سے بات نہ کرنا جو ظلم کار ہیں وہ بلا ریب ڈوب کر رہیں گے۔[۴۴] اور حضرت نوح علیہ السلام جہاز سازی کا کام کر رہے تھے۔ اس حالت میں جب بھی بڑے لوگوں کی جماعت کا گزر ہوتا تو وہ حضرت نوح علیہ السلام

کا مذاق اُڑاتے[۱۴۴] حضرت نوح علیہ السلام ان کے تمسخر کے جواب میں فرماتے اگر تم ہمارا مذاق اُڑا رہے ہو تو وقت آرہا ہے ہم بھی تمہارے ساتھ ایسے ہی مذاق کریں گے جیسے تم ہمارا مذاق کر رہے ہو[۱۴۶] تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا کہ رسوا کن عذاب کا نشانہ کون بنتا ہے اور کس پر دائمی عذاب ڈیرہ لگاتا ہے۔[۱۴۷]

مفردات کے معانی

اوحی ۔ ایحا، باب افعال سے ماضی مجہول کا واحد مذکر غائب ہے ۔ وحی کی گئی ۔ حکم دیا گیا ۔ وحی کے لغوی معنے کسی کا اپنے دلی منشا کو لبوں کی جُنبش کے بغیر اخفار اور آہستگی کے ساتھ دوسرے پر ظاہر کر دینا ہیں اور اصطلاحاً اس کے معنے ہیں ۔ اللہ سبحانہٗ کا اپنے دلی منشار سے اپنے خاص بندوں کو کسی غیبی ذریعہ سے مطلع کرنا ہیں ۔ یہ علم و اطلاع کے روحانی ذریعوں کی آخری سرحد ہے ۔ جس طرح علم کے تینوں ذریعے وجدانیات، حسیات، اور بدیہیات عام انسانوں کے لیے یقینی ہیں ۔ اس طرح روحانی ذریعہ علم انبیار علیہم السلام کے لیے یقینی ہیں ۔

لاتبتئس ۔ تو غم نہ کھا، تو غمگین نہ ہو ۔ ابتأس سے فعل نہی ہے ۔ اس کے معنے غمگین ہونا اور رنجیدہ ہونے کے ہیں ۔

سخروا ۔ انہوں نے ٹھٹھا کیا ۔ سخر یسخر باب سمع سے آتا ہے جس کے معنے ٹھٹھا کرنے کے ہیں ۔ سخر سے ماضی کا جمع مذکر غائب اسی سے سخریٌ اسم ہے ۔ علامہ زمخشری رقمطراز ہیں ۔ سُخری پیش اور زیر کے ساتھ بھی تسخیر کا مصدر ہے ۔ سخر کی طرح مگر یاءِ نسبت کی وجہ سے فعل کی قوت میں زیادتی ہو جاتی ہے ۔ جیسے خصوص سے خصوصیت ۔ اور کسائی اور فرار سے منقول ہے کہ مکسور تو ٹھٹھے کے معنے میں ہے اور مضموم مسخر کرنے کے معنے میں ہے پہلا مذہب خلیل اور سیبویہ کا ہے ۔

ظہور نتائج کی تمہید

سوچنے کی بات یہ ہے کہ قرآن حکیم کی دعوت کا ایک خاص انداز ہے وہ جو کچھ کہتا ہے اس کے اندر رہ کر کہتا ہے۔ قرآن کا انداز دعوت بتاتا ہے کہ تاریخ کا صحیح استعمال کیا ہونا چاہیئے۔ قرآن کے انداز سے معلوم ہوتا ہے کہ گزشتہ کا مطالعہ اس لیے کرنا چاہیئے کہ آئندہ کے لیے عبرت حاصل کی جائے یعنی جو کچھ گزر چکا ہے وہ آئندہ کے لیے ذخیرہ بصیرت ہے۔ اور ماضی کے آئینے میں مستقبل کی صورت دیکھی جا سکتی ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی قوم کا جو حال بیان کیا گیا ہے اس سے یہ بات صاف ظاہر ہوتی ہے کہ یہ قوم نہ تو اللہ سبحانہٗ کے وجود گرامی کی منکر تھی نہ اس سے ناواقف تھی نہ اسے اللہ کی عبادت سے انکار تھا۔ بلکہ اصل گمراہی جس میں وہ مبتلا تھی۔ شرک کی گمراہی تھی یعنی اس نے اللہ کے ساتھ دوسری ہستیوں کو کائنات کی کارفرمائی میں شریک اور عبادت کے استحقاق میں حصہ دار قرار دے لیا تھا۔ اسی بنیادی گمراہی سے بے شمار خرابیاں اس قوم میں پیدا ہو گئیں تھیں جو خود ساختہ عبادت میں ٹھہرائے گئے تھے۔ ان کی نمائندگی کرنے کے لیے قوم میں ایک خاص طبقہ پیدا ہو گیا تھا جو تمام مذہبی، سیاسی اور معاشی اقتدار کا مالک بن بیٹھا تھا اور اس نے انسانوں میں اونچ نیچ کی تقسیم پیدا کر دی تھی۔ اجتماعی زندگی کو ظلم و فساد سے بھر دیا اور اخلاقی فسق و فجور سے انسانیت کی جڑیں کھوکھلی کر دیں۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اس حالت کو بدلنے کے لیے ایک زمانہ دراز تک انتہائی صبر و حکمت کے ساتھ کوشش کی۔ مگر عامۃ الناس کو ان لوگوں نے اپنے مکر کے جال میں ایسا پھنسایا تھا کہ اصلاح کی کوئی تدبیر کارگر نہیں ہوئی۔ آخر کار حضرت نوح علیہ السلام نے ان سے انی بریئی مما تجرمون کہہ کر اعلان برارت کیا اور اللہ سبحانہٗ سے دعا کی۔ رب لا تذرعلی الارض من الکافرین دیارا۔ اس موقعہ پر اللہ سبحانہٗ نے حضرت نوح علیہ السلام کو بتایا کہ من یؤمن قومك الا من قد آمن

(۳۶) اور حضرت نوح علیہ السلام کو بذریعہ وحی بتایا کہ ان کے سوا جواب تک ایمان لا چکے ہیں۔ کوئی ہرگز ایمان نہ لائے گا۔ لہذا ایمان نہ لانے والوں کے کردار پر غمگین نہ ہو جب قوم کی ایذائیں حد سے گزر گئیں تو نوح علیہ السلام نے سینکڑوں برس ظالموں کی زہرگداز جفائیں جھیلنے کے بعد اللہ سبحانہٗ کی جناب میں شکوہ کیا۔ رب انی مغلوب فانتصر۔ میں مغلوب ہوں آپ ان سے بدلہ لے لیجیئے۔ ارشاد ہوا کہ جن گنے چنے افراد کی قسمت میں ایمان لانا تھا لا چکے۔ آئندہ ان میں کوئی ایمان لانے والا نہیں۔ لہذا اب آپ ان کی عداوت و تکذیب اور ایذا رسانی سے زیادہ غمگین نہ رہیں بلکہ قریب

اللہ سبحانہ کی شمشیر انتقام بے نیام ہونے والی ہے جو سب شرارتوں اور شریروں کا خاتمہ کر دے گی۔[1]
اس آیت میں سب سے اہم بات انہ لن یومن من قومک الا من قد امن ہے۔
یہ بات اس لیے کہی ہے۔ کہ نبوت اوّل اپنے مخاطبوں کو حق کی دعوت دیتی ہے۔ مخاطبوں کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح اجزا ہوتے ہیں وہ اس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ آخر وہ وقت آجاتا ہے۔ جب مادہ فاسد کے سوا مخاطبوں کی پوری جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں رہتا یعنی اس کثیف مادے سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیفہ الگ ہو جاتے ہیں اور ڈھیر میں پھونس کے سوا کچھ باقی نہیں رہ جاتا تو اس وقت آیت ہلاکت، آسمان کی بجلی، زمین کا سیلاب رونما ہوتا ہے اور زمین کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو دعوت دی جب ایک مدت کے بعد اہل مصر میں سے جس قدر لوگ ایمان لا سکتے تھے۔ لے آئے تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو شق بحر کی صورت میں آیت ہلاکت عنایت ہوئی۔ اور بحر احمر کی لہریں فرعون کو اس کے سازوسامان کے ساتھ کھا گئیں۔ یہ معجزہ ہلاکت اس وقت تک ظاہر نہیں ہوتا جب تک آیات سے قوم کے تمام صالح اجزاء ان کے فاسد عنصر سے الگ نہیں ہو جاتے۔ اور رسول کو بقیہ عناصر سے قطعی مایوسی نہیں ہو جاتی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے ایک طویل زمانے تک اپنی قوم کو دعوت دی۔ اس کے بعد نا اُمید ہو کر معجزہ ہلاکت کی دعا مانگی۔ یہاں یہ بتانے کے بعد فرمایا فلا تبتئس بما کانوا یفعلون۔ ابتئاس۔ غم کی گھٹن محسوس کرنا۔ اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کا تعلق امت کی دعوت سے غرض پر مبنی نہیں ہوتا۔ بلکہ سرتاسر خیر خواہی پر ہوتا ہے۔ اسی جذبہ خیر خواہی کی وجہ سے ایمان نہ لانے والوں پر حزن وملال اور رنج وغم ہوتا ہے۔ رنج وغم کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے یہ آپ کے جذبات ہیں جو آنسوؤں کی لڑی بن کر رونما ہوتے ہیں۔ راحت وشفقت بھی خیر خواہی کی اساس ہوتی ہے۔

(۴۴) جہاز سازی کی صنعت حضرت نوحؑ کی ایجاد ہے

اب تم ہماری ہدایت میں ہمارے رُوبرو جہاز بناؤ اور دیکھو ان لوگوں کے بارے میں مجھ سے کوئی بات نہ کرنا جو ظلم کار ہیں وہ بلا ریب ڈوب کر رہیں گے۔ حق تعالیٰ نے نوح علیہ السلام سے فرمایا کہ ایک جہاز ہمارے رُوبرو یعنی ہماری حفاظت میں اور نگرانی میں ہمارے حکم تعلیم اور الہام کے موافق

---

[1] افادات شیخ الاسلامؒ

تیار کرو کیونکہ عنقریب پانی کا سخت طوفان آنے والا ہے جس میں یہ سب ظالمین و مکذبین یقیناً غرق کیے جائیں گے۔ ان کے حق میں اب یہ فیصلہ نافذ ہو کر رہے گا۔ آپ کسی ظالم کی سفارش وغیرہ کے لیے کوئی بات نہ کریں۔ آنے والا عذاب بالکل اٹل ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جب قوم لوط کے حق میں جھگڑنا شروع کیا تھا۔ ان کو بھی اسی طرح کا ارشاد ہوا تھا۔

یا ابراھیم اعرض عن ھذا۔ انہ قد جاء امر ربك وانھم اتیھم عذاب غیر مردود[1]

اے ابراہیم علیہ السلام اب اس بات کا خیال چھوڑ دے تیرے پروردگار کی ٹھہرائی ہوئی بات جو تھی وہ آپہنچی اور ان لوگوں پر عذاب آرہا ہے جو کسی طرح ٹل نہیں سکتا۔

مطلب یہ ہے کہ اب قانون الٰہی کے مطابق ان کے لیے اللہ کی عدالت کے ظہور کا وقت آگیا ہے اور اللہ سبحانہ کا فیصلہ یہ ہے کہ یہ سب غرق کر دیئے جائیں گے۔ تو تم اپنے اور اہل ایمان کے بچاؤ کے لیے ہماری نگرانی میں اور ہماری ہدایت کے تحت ایک جہاز بناؤ اور ان ظالموں کے بارے میں ہم سے کچھ نہ کہنا ان کو بلاشبہ غرق ہونا ہے۔

قرآن کا انداز بیان بتا رہا ہے کہ کشتی سازی نہیں بلکہ جہاز سازی کی ایجاد کا سہرا حضرت نوح علیہ السلام کے سر ہے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام نے جہاز اللہ سبحانہ کی تعلیم اور وحی کی راہنمائی میں تیار کیا ہے قرآن نے الفلك کہا ہے۔ عام تراجم میں اس کا ترجمہ کشتی کیا گیا ہے کشتی کے لفظ سے اردو میں جو بات سمجھی جاتی ہے۔ یقیناً حضرت نوح علیہ السلام کی اس کشتی کی حیثیت اس سے بالکل مختلف تھی اتنا تو قرآن بھی بتا رہا ہے کہ کوہ آسا موجوں کو چیرتی پھاڑتی یہ کشتی آگے بڑھتی جاتی تھی۔ کشتی والوں کو لیے ہوئے پہاڑ جیسے تھپیڑوں میں جانے سے ہی اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ کیا کشتی جسے اردو میں ناؤ کہتے ہیں۔ ایسے تھپیڑوں کو برداشت کر سکتی ہے۔ پھر قرآن سے جیسا کہ آگے آرہا ہے جب یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اس میں حضرت نوح علیہ السلام کو ہر قسم کے چرند پرند اور درندے کے جوڑے رکھنے کا حکم ہوا ہے۔ اس سے کشتی کی وسعت اور گنجائش کا اندازہ ہوتا ہے۔ اور بائیبل میں جو تفصیلات اس کے بارے میں پائی جاتی ہیں اس کے بعد اسے کشتی کہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ تورات کتاب

[1] ۔ نادارت شیخ الاسلامؒ

پیدائش میں ہے۔

تو اپنے لیے ساگوان کی لکڑی کی ایک کشتی بنا۔ اس کشتی میں کوٹھڑیاں بناکر اور اس کے باہر اندر پرال لگا اور اس کو ایسی بنا کہ لمبائی ۳۰۰ ہاتھ اور چوڑائی ۵۰ ہاتھ ہو اور اس کی اونچائی ۳۰ ہاتھ ہو۔ اور اس کشتی میں ایک روشن دان بنا اس سے اوپر ہاتھ بھر چھوڑ تمام کر اور کشتی کے ایک طرف دروازہ بنا اور نیچے کا طبقہ اور دوسرا تیسرا طبقہ بھی بنا۔ (پیدائش باب ۷۔۱۰)

کیا اس کے بعد بھی کوئی شک کر سکتا ہے کہ جہاز سازی کی صنعت حضرت نوح علیہ السلام کے بعد ہزاروں سال میں ایک بال بھی ترقی نہ کر سکی البتہ سٹیم اور برق کے عہد میں بلا شبہ ترقی کی دوسری منزلیں اس صنعت نے طے کی ہیں۔ بہر حال حضرت نوحؑ کی یہ صنعتی ایجاد ایک ایسی ایجاد تھی۔ جس کے بعد نسل انسانی انقلاب کے ایک جدید دور میں داخل ہوئی۔ کہنا یہ چاہتا ہوں۔ کہ آج دنیا کی مختلف اقالیم اور خطوں میں انسان آباد ہیں اور ہر جگہ تمدن وعمران برپا ہوا ہے تو یقیناً اس کا امکان اسی ایجاد کے بعد پیدا ہوا۔ اور خونخوار سمندروں اور ذخار دریاؤں کو پھاند کر بنی آدم کے گھرانوں کا ایک براعظم سے دوسرے براعظم کی طرف انتقال کی صورت اس سے پہلے کیا تھی؟ اس انتقال کی ساری داستان اس نوحی ایجاد کے ذریعے وجود میں آئی ہے دنیا کے جس خطے میں بھی انسانوں کی آبادی ہے وہاں کسی نہ کسی شکل میں حضرت نوح علیہ السلام کی اس ایجاد کا تذکرہ پایا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ ہندوستان والوں میں کشتی کا ہم معنے لفظ بھی نوح کی بگڑی ہوئی شکل ناؤ ہے اگرچہ زمانہ کی طول دانی سے واقعات کے بعض اجزاء میں ردوبدل ہو گیا ہے۔ مگر کشتی کی تاریخ کا مرکزی نقطہ ہر جگہ حضرت نوح علیہ السلام کی ذات گرامی ہے۔ ہندوستان والے ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی کو ناؤ بندھن کہتے ہیں اور بجائے نوحؑ کے کشتی والے کا نام منوجی بتاتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ یہ بھا نوح کی بگڑی ہوئی شکل ہو۔ بہر حال دنیا کی تاریخ میں جہاز سازی کی صنعت کے موجد حضرت نوح علیہ السلام ہیں۔ اور حضرت نوح علیہ السلام نے یہ کام اللہ سبحانہٗ کی نگرانی میں اللہ کی ہدایت کے مطابق کیا ہے۔

(۴۵) جہاز سازی پر قوم کے آوازے

اور حضرت نوح علیہ السلام جہاز سازی کا کام کر رہے تھے۔ اس حالت میں ان کے پاس سے جب بھی بڑے لوگوں کی جماعت گزرتی تو وہ حضرت نوح علیہ السلام کا مذاق اڑاتی۔ کہتے ہیں کہ کشتی سالہا سال میں تیار کی گئی۔ کشتی کیا تھی ایک بڑا جہاز تھا جس میں الگ الگ درجے تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام

کو بناتے دیکھتے تو کہتے کہ دیکھو پیغمبر سے بڑھئی بن گئے ہیں۔ کبھی ایک عجیب سی چیز دیکھ کر نوح علیہ السلام سے پوچھتے کہ یہ کیا بناتے ہو؟ آپؑ فرما دیتے کہ ایک گھر بناتا ہوں جو پانی پر چلے گا۔ اور ڈوبنے سے بچائے گا۔ وہ سُن کر ہنسی اُڑاتے کہ خشک زمین پر ڈوبنے کا بچاؤ کر رہے ہو۔ جہاں یہ قوم آباد تھی وہ کوئی نشیبی علاقہ نہیں تھا۔ ایک بلند میدان تھا اور قریب ترین سمندر یعنی خلیج فارس سے صدہا میل کے فاصلے پر۔ اس لیے ان لوگوں کا اپنے نقطہ نظر سے حیرت کا اظہار کرنا کچھ بیجا نہ تھا۔ یہ ایک عجیب معاملہ ہے جس پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان کے وجدان حواس خمسہ اور مشاعر کو ظاہر سے کس قدر دھوکا ہوتا ہے جب حضرت نوح علیہ السلام دریا سے بہت دور خشکی پر اپنا جہاز بنا رہے تھے تو فی الواقع لوگ یہ ایک نہایت مضحکہ خیز کام محسوس کرتے ہوں گے اور مذاق کے انداز پر کہتے ہوں گے کہ بڑے میاں کی دیوانگی ترقی کر کے یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ خشکی پر جہاز چلانے کی فکر میں ہیں۔ اس وقت بیچاری عقل نے ہتھیار ڈال دیئے ہوں گے اور یہ بات کسی کے ذہن میں بھی نہ آئی ہو گی کہ چند روز کے بعد واقعی یہاں جہاز چلے گا وہ اس کام کو حضرت نوح علیہ السلام کی خرابیٔ دماغ کا نتیجہ قرار دیتے ہوں گے اور باہم کہتے ہوں گے کہ اس کردار کی موجودگی میں تو ان کے دیوانہ ہونے میں کوئی شبہ ہی نہیں ہے۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام کو حقیقت کا علم تھا اور ان کو معلوم تھا کہ کل یہاں جہاز کی کیا ضرورت پیش آنے والی ہے اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مادی علمی وسائل کی حقیقی علمی ذریعہ کے یعنی وحی کے مقابلے میں کیا حیثیت ہوتی ہے۔

بہرحال حضرت نوح علیہ السلام نے اللہ سبحانہٗ کی نگرانی میں اور اللہ کی راہنمائی میں جہاز بنانا شروع کیا۔ ان کی قوم کے متکبرین جو عذاب کی دھمکی کو خیالی پلاؤ سمجھ رہے تھے۔ انہوں نے جب دیکھا کہ عذاب کے بچاؤ کے لیے کشتی بنانا شروع ہو گئی ہے تو بجائے متنبہ ہونے کے انہوں نے اس کو بھی خلل دماغ ہی پر محمول کیا اور جب پاس سے گزرتے تو خوب آوازے کستے طنز آمیز فقرے بولتے اور کون اندازہ کر سکتا ہے کہ اس صورت حال سے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں پر کیا گزرتی ہو گی۔ لیکن نبوت اور اس کے ساتھیوں کو اس قسم کے امتحانات سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ جس غیب سے نبوت لوگوں کو مطلع کرتی ہے اس پر اس کو کس درجہ یقین ہوتا ہے گویا وہ اسے اپنی سر کی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔

علامہ آلوسیؒ نے لوگوں کے مذاق کی دو وجہیں لکھی ہیں۔

لہ افادات شیخ الاسلامؒ

۱. اس لیے کہ وہ کشتی سے آشنا ہی نہ تھے اور کشتی کا وجود مجہول مطلق تھا۔ انکو دیکھ کر حیرت ہوتی اور حیرت کا اظہار مذاق کے ذریعے کرتے تھے۔ اس کی تائید حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے کہ

اللہ سبحانہٗ نے جب حضرت نوح علیہ السلام سے کہا کہ اصنع الفلک تو حضرت نوح علیہ السلام نے حیرت سے پوچھا اے مولیٰ فلک کیا ہوتا ہے۔ فرمایا لکڑی کا گھر جو پانی پر چلے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا اے مولیٰ پانی کہاں ہے؟ فرمایا میں سب کچھ قدرت رکھتا ہوں۔

۲. اور یاان کا مذاق اس لیے تھا کہ حضرت نوح علیہ السلام پانی سے دور کشتی بنارہے تھے۔ اور یہ ہنس رہے تھے اور کہتے جاتے تھے کہ نوحؑ! نبی ہوکر بڑھئی بن گئے۔ اس پس منظر کا مطلب یہ ہے کہ کشتی حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطبوں کے لیے جانی بوجھی چیز تھی۔ حاکم اور ابن جریرؒ کی روایت سے اس کی تائید بھی ہوتی ہے۔ لیکن حافظ ذہبیؒ نے اس کی تضحیک کی ہے۔

جمہور شارحین قرآن کا موقف یہی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطب کشتی اور جہاز سے قطعاً ناآشنا تھے۔ کشتی اور جہاز کی ایجاد کا سہرا حضرت نوح علیہ السلام کے سر ہے۔

(۴۶) ایک خاص اور بلیغ انداز جواب

حضرت نوح علیہ السلام ان کے تمسخر کے جواب میں فرماتے کہ اگر تم ہمارا مذاق اُڑاتے ہو تو وہ وقت آرہا ہے کہ ہم بھی تمہارے ساتھ ایسا ہی مذاق کریں گے۔ حضرت شاہؒ صاحب لکھتے ہیں وہ ہنستے تھے کہ خشک زمین پر غرق کا بچاؤ کرتا ہے۔ یہ ہنستے تھے اس پر کہ موت سر پر کھڑی ہے اور یہ ہنستے ہیں اسی تفسیر کے مطابق حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ کیا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے لنسخر میں استقبال کے معنے مراد لیے ہیں۔ کہ آج تم ہمیں احمق بناتے ہو اور ہنستے ہو لیکن وہ زمانہ قریب ہے کہ اس کے جواب میں تمہاری حماقت اور سفاہت پر ہمیں ہنسنے کا موقعہ ملے گا۔ جب تم اپنے جرائم کی پاداش میں سزایاب ہو گے[1] بلاشبہ اس بلیغ انداز جواب کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہم بھی تمہارے ساتھ مذاق کا وہی انداز اختیار کر رہے ہیں جیسے تم نے اختیار کیا ہے بلکہ منشا یہ ہے کہ آج جس طرح بے کسی و بیچارگی کی حالت

[1] افادات شیخ الاسلامؒ

میں ہمارا یہ فعل تمہاری نگاہوں میں سامان استہزاء و تمسخر ہے۔ اسی طرح کل تمہارا انجام ہمارے ازدیاد ایمان کا باعث اور سامان اطمینان ہوگا۔ آج تم ہنس رہے ہو کل کو تم رُوؤ گے۔ اور ہم نصرت الٰہی کے ظہور پر شاداں ہوں گے۔ اور اپنے رب کا شکر ادا کریں گے۔

دراصل یہاں شارحین قرآن کو شبہ یہ پیش آگیا ہے۔ کہ تمسخر نبی کی شان سے فروتر ہے۔ ایک جواب تو شیخ الاسلام نے شاہ عبدالقادرؒ کے حوالہ سے دیا ہے کہ تسخر فعل حال کے معنے میں ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ وہ ہنستے تھے کہ خشک زمین پر پانی سے بچاؤ کر رہے ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھی ہنس رہے ہیں کہ موت سر پر کھڑی ہے اور یہ ہنس رہے ہیں اور حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانویؒ نے لکھا ہے کہ انتقام کے موقعہ پر جواب بالمثل سے کام لینا مکارم اخلاق کے منافی نہیں ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے ابن جریجؒ کے حوالہ سے دونوں فعلوں کا متعلق محذوف مانا ہے اور مطلب یہ بتایا ہے کہ اگر تم دنیا میں ہمارا مذاق اڑا رہے ہو ہم تمہارا آخرت میں مذاق اڑائیں گے۔ اور مشہور علامہ طبریؒ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ تسخر کا مطلب یہ ہے کہ ہم تمہیں تمہارے مذاق کا بدلہ دیں گے۔

دراصل یہ استیناف بیانی ہے یعنی اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ سوال یہ پیدا ہوا۔ کہ مخاطبوں کی جانب سے جب یہ ناخوشگوار حالات پیدا ہوگئے تو حضرت نوح علیہ السلام نے کیا کہا۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا ان تسخروا منا فانا نسخر منکم۔ عربی کا یہ انداز تعبیر جو ہے اس کو مشاکلت کہتے ہیں۔ مجاوزات سزا معاوضہ کے موقعہ پر لغت عرب میں یہ محاورہ عام ہے کبھی کبھی جملہ میں صوتی ہم آہنگی کے اقتضاء سے ایک ہی لفظ استعمال ہوتا ہے لیکن اس کا مفہوم الگ الگ ہوتا ہے۔ جیسے اجزاء سیئۃ سیئۃ مثلھا اور دنا ملھم کما دانوا میں ہے۔ بلاشبہ کسی کا مصیبت پر خوش ہونا عام حالات میں اچھا نہیں ہے۔ لیکن جن لوگوں پر اس طرح کی حجت تمام ہو چکی ہو۔ جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے اپنی قوم پر کی۔ ان پر عذاب الٰہی کا نزول حق کی فتح مندی اور باطل کے سرنگوں کا ایک یادگار واقعہ ہے۔ جس پر اہل ایمان کا خوش ہونا عین مقتضائے ایمان ہوتا ہے۔

یہاں صاحب تفسیر التحریر والتنویر بڑی لطیف بات لکھ گئے۔

کما تسخرون میں اگر کما تشبیہ کے لیے ہے اور مطلب یہ ہے کہ سخریۃ کے سبب میں تشبیہ ہے۔ اگرچہ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ ان کے مذاق کا باعث یہ ہے کہ نوح علیہ السلام جو کر رہے ہیں۔ یہ نتیجہ کے لحاظ سے صفر

ہے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کے مذاق کا سبب یہ ہے کہ یہ لوگ کتنے ناخدا شناس ہیں اور صفات باری سے بے خبر ہیں۔ گویا ان کی ہنسی مخاطبوں کی نادانی پر ہے اور مخاطبوں کا مذاق ان کے خیال میں کشتی بنانے کے عمل کا بیکار ہونا ہے۔ اور اگر کما تعلیل کے لیے ہے جیسے واذکروہ کما ھداکم میں تو پھر دونوں مذاقوں میں جوہری فرق ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطب تو ایسے عمل پر مذاق کر رہے ہیں جس کے نتیجے سے وہ بے خبر ہیں اور حضرت نوح علیہ السلام اپنے مخاطبوں کی غرور پر مبنی جہالت پر مذاق کر رہے ہیں۔ آگے فا کے ذریعے تفریع ہے فسوف تعلمون میں اس کی دلیل ہے۔

یعنی حضرت نوح علیہ السلام کہتے ہوں گے کہ کس قدر نادان ہیں کہ عذاب الٰہی سروں پر منڈلا رہا ہے۔ میں ان کو اس کی آمد کی خبر بھی دے چکا ہوں۔ اور ان کے سامنے اس سے بچنے کی تیاری کر رہا ہوں مگر یہ مطمئن ہیں۔ اور الٹا مجھے دیوانہ سمجھ رہے ہیں۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ دنیا کے ظاہر و محسوس کے اعتبار سے انسان جسے بے وقوفی اور عقلمندی قرار دیتا ہے۔ وہ حقائق سے کس قدر مختلف ہوتا ہے۔ ظاہر بینوں کا پیمانہ اور ہے اور حقیقت شناس اور ارباب نظر کا پیمانہ کچھ اور ہوتا ہے۔ ظاہر میں آدمی جس چیز کو انتہائی دانشمندی سمجھتا ہے وہ حقیقت شناس کی نظر میں انتہائی بیوقوفی ہوتی ہے۔ جو بات ظاہر کی رائے میں بالکل لغو، سراسر دیوانگی ہوتی ہے۔ حقیقت شناس کے لیے وہی کمال دانش انتہائی سنجیدگی اور مقتضائے عقل ہوتی ہے۔

اصل یہ ہے کہ تسخرون کے آئینے میں حضرت نوح علیہ السلام اپنے مخاطبوں کو ان کا جو چہرہ دکھا رہے ہیں وہ یہی کہ زندگی کے بنیادی حقائق کی تلاش وجستجو کا جو احساس انسانی فطرت میں ودیعت کیا گیا ہے وہی احساس بتدریج معطل ہوتے ہوتے تباہی کی ان حدود تک پہنچ گیا ہے۔ جس کو حضرت نوح علیہ السلام نے تسخرون سے تعبیر کیا ہے۔ اس کا مطلب بقول علامہ آلوسیؒ یہی ہے کہ ایمان وطاعت سے گریز کا فرانہ زندگی پر جاد غضب الٰہی کے اسباب حاصل کرنے کی لگاتار کوشش اور نبوت کی جناب میں گستاخانہ انداز یہ سب عوامل ہیں عذاب الٰہی کی آمد کے۔ اعاذنا اللہ من غضبہ۔

(۱۴) قوم نوحؑ کے لیے عذاب مقیم

لہٰذا تمہیں عنقریب معلوم ہو جائے گا۔ کہ رسواکن عذاب کا نشانہ کون بنتا ہے۔ اور کس پر نازل

عذاب ڈیرہ لگاتا ہے یعنی اب زیادہ تاخیر نہیں ہے۔ جلد آشکارا ہو جائے گا۔ کہ دنیا کا رسوا کن اور آخرت کا دائمی عذاب کس پر نازل ہوتا ہے [1] یہاں فسوف تعلمون پر فاء دو حال سے خالی نہیں ہے یا تو تفریع کے لیے ہے تو مطلب یہ کہ تمہارے مذاق کا نتیجہ عنقریب تمہاری آنکھوں کے سامنے آجائے گا اور تمہیں پتہ لگ جائے گا کہ مذاق کس کا اڑایا جاتا ہے۔ یہ فرمایا کہ تمہیں معلوم ہو جائے گا یہ نہیں فرمایا کہ ہمیں پتہ لگ جائے گا۔ یہ بتانے کے لیے کہ تمہیں پتہ لگنا چاہیئے اور جہاں تک ہمارا معاملہ ہے تو ہمیں تو پورا یقین ہے کہ تمہارے اعمال کے نتائج ضرور علی رؤس الاشہاد ظاہر ہو کر رہیں گے۔ جب پوری کائنات میں ایک ہی قانون ہے تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اعمال انسانی کا گوشہ اس سے باہر ہو اور وہاں کوئی قانون کام نہ کر رہا ہو۔ اعمال کے نتائج کا بھی اللہ نے قانون بنا رکھا ہے اور اس قانون کے مطابق تمہارے اعمال کے نتائج ظاہر ہو کر رہیں گے۔ فا جزائیہ ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ اگر تمہیں آج میرے کام کا فائدہ معلوم نہیں ہے تو کام پورا ہونے پر عنقریب تمہیں پتہ لگ جائے گا۔ کہ رسوائی، ہلاکت اور ذلت کی آماجگاہ کون بنتا ہے اور آخرت میں عذاب کا نشانہ کون ہوتا ہے۔

یہاں یہ بات یاد رکھنی چاہیئے کہ عذاب دو قسم کا ہوتا ہے۔ ایک تو وہ عذاب ہوتا ہے۔ جس کا مطلب غافلین کو جگانا ہوتا ہے۔ تاکہ وہ داعی کی بات پر توجہ کریں اور جس خطرے سے وہ ان کو آگاہ کر رہا ہے۔ اس کے آثار دیکھ کر متنبہ ہو جائیں۔

دوسرا۔ عذاب وہ ہوتا ہے جو کامل اتمام حجت کے بعد رسول کی تکذیب کرنے والوں کی جڑ کاٹ دینے کے لیے نازل ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ کن عذاب ہوتا ہے۔ جو ان لوگوں کو ہمیشہ کے لیے رسوا کر کے رکھ دیتا ہے جو اللہ کے رسول کی دعوت کا تمسخر کرتے ہیں اور اس کے مواعظ کو دماغی خلل کا نتیجہ قرار دیتے ہیں۔ یہ جھونکا نہیں ہوتا کہ وقتی طور پر آیا اور گیا بلکہ جس بستی پر اور جس قوم پر آتا ہے وہیں ڈیرے ڈال دیتا ہے۔ تاکہ آنے والی نسلیں بھی ان کے انجام سے سبق حاصل کریں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلامؒ

حَتّٰۤى اِذَا جَآءَ اَمْرُنَا وَفَارَ التَّنُّوْرُ قُلْنَا احْمِلْ فِيْهَا مِنْ كُلٍّ زَوْجَيْنِ اثْنَيْنِ وَاَهْلَكَ اِلَّا مَنْ سَبَقَ عَلَيْهِ الْقَوْلُ وَمَنْ اٰمَنَ ؕ وَمَاۤ اٰمَنَ مَعَهٗۤ اِلَّا قَلِيْلٌ ۝۴۰ وَقَالَ ارْكَبُوْا فِيْهَا بِسْمِ اللّٰهِ مَجْرٖىهَا وَمُرْسٰىهَا ؕ اِنَّ رَبِّيْ لَغَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ۝۴۱ وَهِيَ تَجْرِيْ بِهِمْ فِيْ مَوْجٍ كَالْجِبَالِ ۫ وَنَادٰى نُوْحُ ِۨابْنَهٗ وَكَانَ فِيْ مَعْزِلٍ يّٰبُنَيَّ ارْكَبْ مَّعَنَا وَلَا تَكُنْ مَّعَ الْكٰفِرِيْنَ ۝۴۲ قَالَ سَاٰوِيْۤ اِلٰى جَبَلٍ يَّعْصِمُنِيْ مِنَ الْمَآءِ ؕ قَالَ لَا عَاصِمَ الْيَوْمَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ ۚ وَحَالَ بَيْنَهُمَا الْمَوْجُ فَكَانَ مِنَ الْمُغْرَقِيْنَ ۝۴۳ وَقِيْلَ يٰۤاَرْضُ ابْلَعِيْ مَآءَكِ وَيٰسَمَآءُ اَقْلِعِيْ وَغِيْضَ الْمَآءُ وَقُضِيَ الْاَمْرُ وَاسْتَوَتْ عَلَى الْجُوْدِيِّ وَقِيْلَ بُعْدًا لِّلْقَوْمِ الظّٰلِمِيْنَ ۝۴۴

حضرت نوح علیہ السلام جہاز بنا رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب ہمارے فیصلے کی گھڑی آگئی۔ اور تنور نے جوش مارا[۴۸] تو ہم نے حضرت نوح[۴۹] علیہ السلام سے کہا کہ جہاز میں ہر قسم کے جانوروں میں سے نر اور مادہ لو۔ اور اپنے اہل وعیال کو ساتھ لے لو۔ مگر اہل وعیال میں وہ لوگ نہ

ہوں جن کے لیے بات پہلے ہو چکی ہے۔ نیز ان لوگوں کو بھی لے لو جو ایمان لے آئے ہیں ۔ نوح علیہ السلام کے ساتھ ایمان لانے والے تھوڑے ہی تھے [۴۰]۔ اور حضرت نوح علیہ السلام نے ساتھیوں سے کہا۔ اس میں سوار ہو جاؤ ۔ اس جہاز کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کے نام سے ہے ۔ بلاشبہ میرا آقا بخشنے والا رحمت والا ہے [۴۱]۔ جہاز ان کو لیے پہاڑوں جیسی موجوں کے تھپیڑوں میں جا رہا تھا اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو آواز دی اور وہ حضرت نوح علیہ السلام سے کسی دُور جگہ تھا ۔ میرے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا ۔ کافروں کے ساتھ نہ ہو [۴۲]۔ بیٹے نے کہا میں تو کسی پہاڑ پر چڑھ ہی جاؤں گا ۔ جو مجھے پانی سے محفوظ رکھے گا ۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا بیٹے آج اللہ کے حکم سے بچانے والا کوئی نہیں ہے ۔ ہاں وہی بچ سکتا ہے جس پر اللہ رحم فرمادے اسی حالت میں باپ اور بیٹے کے درمیان سیلاب کی موج روک بن گئی ۔ بس پھر بیٹا سیلاب کی نذر ہو گیا [۴۳]۔ پھر اللہ کا حکم ہوا کہ اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تو تھم جا ۔ اور پانی کا چڑھاوا اتر گیا۔ اور سیلاب کا حادثہ ہو چکا ۔ اور جہاز جودی پر ٹھہر گیا۔ اور کہا گیا۔ ان لوگوں کے لیے رحمت حق سے دُوری ہے جو ظلم کار ہیں [۴۴]۔

مفردات کے معانی

التنور ۔ فارسی زبان کا لفظ ہے ۔ معرب ہے ۔ چونکہ اہل عرب اس کے دوسرے نام سے واقف نہیں اس لیے قرآن میں یہی لفظ استعمال ہوا ہے اور جس لفظ کو وہ جانتے تھے وہی بتایا ۔ بعض کا خیال ہے کہ تنور فارسی اور عربی دونوں میں اسی طرح ہے ۔ اس لیے یہ عربی بھی ہے اور فارسی بھی ۔ اور یہ بھی بتایا ہے کہ اصل میں تنور بھی ہے ۔ پھر اہل عرب نے اسے بولنا شروع کر دیا تو عربی ہو گیا ۔ علماء نے لفظ تنور کو ان الفاظ میں شمار کیا ہے ۔ جو غیر عربی الفاظ قرآن میں استعمال ہوئے ہیں ۔ ابو علی الفارسی کہتے ہیں کہ اس کا وزن تفعول ہے اور ثعلب کا خیال ہے کہ یہ عربی ہے ۔ اس کا وزن تفعول ہے ۔ نور مادہ ہے ۔ اصل میں تنوور تھا ۔ پہلے واؤ کو ماقبل مضموم ہونے کی وجہ سے ہمزہ سے بدلا ۔ پھر ہمزہ کو تخفیف کی خاطر حذف کر دیا ۔ پھر ہمزہ کے عوض میں نون کو ڈبل کر کے ادغام کر دیا ۔ تنور ہو گیا ۔

عذاب قانون اعمال کے مطابق ہوتا ہے

جس طرح ہر بات کے لیے اللہ سبحانہ کے مقررہ ضوابط ہیں ۔ اسی طرح قوموں اور جماعتوں کی ہدایت وضلالت، نجات و ہلاکت کا بھی ایک قانون ہے ۔ اور جیسے اللہ سبحانہ کے سارے قوانین یکساں ہیں، عالمگیر ہیں، غیر مبدل ہیں ۔ اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی طرح رہا ہے ۔ اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوئے ہیں ۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی جیسے سنکھیا کی خاصیت ہلاکت ہے ۔ خواہ کسی ملک اور کسی دور میں کھائی جائے ۔ اسی طرح اس قانون کے احکام و نتائج بھی یکساں ہیں خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں پیش آئیں ۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اب سے ہزاروں سال پہلے تو سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہو ۔ اور اب زندگی ہو جائے ۔ جو کچھ ماضی میں ہوتا رہا ہے ۔ ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے ۔ قوموں کا ماضی قوموں کے مستقبل کے لیے آئینہ ہے ۔ قرآن اسی قانون کو سنت اللہ سے تعبیر کرتا ہے ۔ حضرت نوح علیہ السلام کا ظہور اس سرزمین میں ہوا ۔ جو دجلہ و فرات کی وادیوں میں ہے دجلہ و فرات دونوں دریا آرمینیا کے پہاڑوں سے نکلے ہیں ۔ اور بہت دور الگ الگ بہہ کر عراق زیریں میں باہم مل گئے ہیں ۔ پھر خلیج فارس میں سمندر سے ہمکنار ہوئے ہیں ۔ اسی سرزمین میں حضرت نوح علیہ السلام تشریف لائے ۔ پوری قوم ظلم و فساد کا گہوارہ بنی ہوئی ہے ۔ سب نے دعوت سے انکار کیا ۔ سب نے دعوت کی ہنسی اڑائی ۔ سب نے دلیلوں سے منہ موڑا ۔ سب سرکشی اور گھمنڈ کی چال چلے ۔ سب نے جبر و تشدد

سے حق کی راہ روکنی چاہی۔ سب نے موعظت و دلائل کا جواب ظلم و تعدی سے دیا۔ سب کو غرور و طغیان نے آخر وقت تک اس کی مہلت نہ دی کہ حق و باطل میں امتیاز کرے۔ نتیجہ ہمیشہ کی طرح ایک رہا۔ اللہ کے فیصلے کا انتظار ہوا۔ فیصلہ یہی ہوا کہ مؤمنوں نے نجات پائی اور سرکشوں کے لیے ہلاکت ہوئی۔

(۷۸) حضرت نوح علیہ السلام جہاز بنا رہے تھے۔ یہاں تک کہ جب ہمارے فیصلے کی گھڑی آگئی اور تنور نے جوش مارا یعنی نوح علیہ السلام کشتی تیار کرتے رہے۔ یہاں تک کہ وعدے کے مطابق اللہ سبحانہ کا حکم پہنچ گیا۔ بادلوں کو کہا کہ برس پڑیں اور زمین کو کہا کہ اُبل پڑے۔ اور فرشتوں کو کہا تعذیب وغیرہ کے متعلق اپنے فرائض منصبی کو سر انجام دیں۔ آخر اُوپر سے بارش ہوئی اور نیچے زمین کی سطح سے چشموں کا جوش مار کر پانی اُبلنے لگا حتیٰ کہ روٹی پکانے کے تنوروں میں بھی جہاں آگ بھری ہوئی تھی پانی اُبل پڑا[1] یہ اس عذاب کی جو سیلاب و طوفان کی شکل میں آیا ایک دلکش منظر کشی ہے۔ امر سے مراد یہاں وہ عذاب ہے جو حکم الٰہی سے ظہور میں آیا۔

یہاں تنور سے کیا مراد ہے۔ اس موضوع پر شارحین قرآن میں اختلاف ہے۔ عکرمہ اور زہری کا بیان ہے کہ تنور سے سطح زمین مراد ہے کیونکہ نوح علیہ السلام سے کہا گیا تھا کہ جب پانی کو سطح زمین سے اُبلتا ہوا دیکھو۔ تو کشتی پر سوا ہو جانا۔ لہذا اس سے ثابت ہوتا ہے کہ تنور کے جوش مارنے یعنی سطح زمین سے اُبلنے کو نوح علیہ السلام کے لیے اس حادثہ کی علامت بتایا گیا تھا۔ حضرت علی فرماتے ہیں۔ کہ فار التنور کے معنے ہیں۔ طلع الفجر تنور الصبح۔ یعنی پو پھٹ گئی اور صبح ہوگئی۔ صبح کی روشنی کو تنور میں سے آگ نکلنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے۔ حسن بصریؒ اور شعبیؒ فرماتے ہیں کہ تنور وہی ہے جس میں روٹی پکاتے ہیں۔ یہی اکثر مفسرینؒ کا خیال ہے۔ اور یہی حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے ایک بیان میں آیا ہے۔ اور یہی قول زیادہ صحیح ہے۔ کیونکہ لفظ میں جب حقیقی اور مجازی معنے کا احتمال ہو تو جب تک مجازی معنے کے لیے قرینہ نہ ہو حقیقی معنے ہی مراد لینا زیادہ بہتر ہے اور لفظ تنور اس جگہ کے نام کے لیے جہاں روٹی پکائی جاتی ہے حقیقت ہے۔ اور اگر یہ وسوسہ ہو کہ الف لام التنور تعین چاہتا ہے اور یہاں سامع کے ذہن میں کوئی چیز متعین نہیں لہذا تنور کو کسی اور معنے پر محمول کرنا ناگزیر ہے۔ اس لیے فار التنور کے معنے یہ ہیں کہ بس صورت حال سنگین سے سنگین تر ہوگئی۔

اصل یہ ہے کہ فار التنور میں لفظ فوران سے فار آیا ہے۔ اور فوران کے معنے دیگچی میں اُبال آنے

---

[1] افادات شیخ الاسلامؒ

لے ہیں۔ پانی قوت اور زور سے اُچھل کر نکلے تو اس کے لیے فار الماء بولتے ہیں۔ لیکن یہاں فوران کی نسبت تنور کی طرف ہے۔ اس نسبت ہی نے عام نگاہوں میں اس کے معنے میں پیچیدگی پیدا کردی ہے کیونکہ تنور روٹی پکانے کی جگہ کو کہتے ہیں۔ ان دو باتوں نے مل کر تشریح و تفسیر میں متعدد آراء کو جنم دے دیا۔

کچھ شارحین قرآن نے لفظ تنور کو حقیقی معنے میں لیا اور معنے یہ بتائے کہ تنور سے پانی اُبلنا شروع ہوگیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کو آغاز طوفان کے لیے اسی کو علامت مقرر کیا گیا تھا۔

کچھ نے تنور کو مجازی معنے میں لے کر سطح زمین کے معنے بتائے۔ یعنی ساری زمین سے تنور کی طرح پانی اُبلنے لگا۔

اور کچھ نے فار اور تنور کو دونوں کو حقیقی معنے میں لیا ہے۔ لیکن پورے جملے کو صورت حال کی سنگینی کے لیے تمثیل قرار دیا۔ جیسے جنگ کی سنگینی کے پیش نظر حمی الوطیس بولا جاتا ہے۔ اب تنور گرم ہوگیا۔ یہ تشریح مشہور مفسر ابن عطیہؒ نے کی ہے۔ نابغہ جعفری کہتا ہے۔

تفور علینا قدرهم فنديها
ونفثاء عنا اذا قدرها نملى

ہمارے خلاف ان کی جنگ کی دیگچی میں اُبال آتا ہے۔ ہم اسے برقرار رکھتے ہیں۔ لیکن جب دیگچی کو زیادہ اُبال آتا ہے تو ہم پانی کے چھینٹے سے اُبال کو دبا دیتے ہیں۔

تنور کے معنے وادی کے کنارے کے بھی آتے ہیں۔ اس لحاظ سے ایسا بھی محاورہ ہے جیسے بلغ السیل الزبی۔ سیلاب ٹیلوں تک پہنچا۔ مطلب یہ ہے کہ ہمارا فیصلہ اس وقت ظہور پذیر ہوا جب ان کی سرکشی اور کفر و ظلم کی عمر درازی ناقابل معافی کی حد تک پہنچ گئی۔

آیئے اس ساری تفصیل کا خلاصہ افادات میں شیخ الاسلامؒ کی زبانی بھی سُن لیجئے۔

تنور کے معنے میں اختلاف ہے۔ بعض مطلق روٹی پکانے کا تصور مراد لیتے ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ایک تنور حضرت حوّا سے منتقل ہوتے ہوتے حضرت نوح علیہ السلام کے پاس پہنچا تھا۔ وہ ان کے گھر میں طوفان کا نشان ٹھہرا دیا گیا تھا۔ کہ جب اس سے پانی اُبلے۔ کشتی میں سوار ہوجانا۔ بعض کے نزدیک تنور کوئی خاص چشمہ کوفہ یا جزیرہ میں تھا۔ بعض نے دعویٰ کیا ہے کہ تنور صبح کے اُجالے اور روشنی کو کہتے ہیں یعنی صبح کی روشنی خوب ہوجائے۔ ابوحیان کہتے ہیں۔ کہ فار التنور ممکن ہے ظہور عذاب اور شدت ہول سے کنایہ ہو۔ جیسے حمی الوطیس شدت حرب سے کنایہ ہے۔ ابن عباسؓ سے منقول ہے

کہ تنور کے معنے وجہ ارض سطح زمین کے آتے ہیں۔ ہم نے اوپر جو تفسیر کی ہے۔ بمقدم اسی کو رکھا ہے۔ اشارہ بعض دوسرے معانی کی طرف بھی کر دیا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ بھی تفسیر لکھنے کے بعد فرماتے ہیں۔ ھذا قول جمھور السلف وعلماء الخلف[1] علامہ بقاعی نے بھی اسی کو ترجیح دی ہے۔

عبداللہ بن عباسؓ، حسن بصریؒ اور مجاہدؒ بھی لکھتے ہیں کہ تنور اپنے حقیقی معنے میں ہے۔ ظاہر کا تقاضا بھی یہی ہے۔ لہٰذا ظاہر سے بلا دلیل ہٹنا عبث ہے۔

ظاہر کا بھی یہی تقاضا ہے۔ اس لیے فرمایا ہے کہ فار التنور جملہ کی بذریعہ عطف جاء امر اللہ سے پیوند کاری کی ہے۔ اس طرح حتیٰ کا مدخول دونوں جملے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی۔ کہ اللہ کا فیصلہ ظاہر ہوگیا۔ اور روٹی پکانے کے تنور سے پانی اُبلنے لگا۔ اور تنور ہی سے طوفان کا آغاز ہوگیا۔ جس کے اندر سے پانی کا چشمہ پھوٹ پڑا۔ پھر ایک طرف سے موسلا دھار بارش شروع ہوئی۔ اور دوسری طرف وفجرنا الارض عیونا۔ زمین میں جگہ جگہ چشمے پھوٹ پڑے۔ اس طرح سیلاب نے اتنا گہرا پانی جمع کر لیا تھا۔ اور طوفانی ہواؤں کا یہ عالم تھا کہ اُونچی اُونچی موجیں ٹھاٹھیں مارنے لگیں۔ اور یہ طوفانی ہوائیں تند اور چکر والی تھیں۔ جن سے سخت بارش ہوتی تھی۔ بارش کے سمندر کا پانی بھی اُبل پڑا۔

(۴۹) جہاز میں نر و مادہ رکھنے کا حکم

تو ہم نے حضرت نوح علیہ السلام سے کہا جہاز میں ہر قسم کے جانوروں میں سے دو نر و مادہ رکھ لو یعنی جن جانوروں کی ضرورت ہے۔ اور نسل باقی رکھنی مقصود ہے ان میں سے ایک ایک جوڑا نر و مادہ دونوں لے کر کشتی میں سوار ہو جاؤ[2] احمل من کل زوجین اثنین۔ لفظ کُلٌ دو طرح سے پڑھا گیا ہے ایک یہ کہ کُلٌ کو مضاف بنایا جائے۔ اور زوجین کو مضاف الیہ اور اثنین کو احمل کا مفعول بہ بنایا جائے۔ مطلب یہ ہے کہ ہر جوڑے میں سے دو عدد لے لو۔ یعنی نر اور مادہ زیادہ نہ ہوں۔ اور دو جوڑے نہ ہوں۔ کچھ شارحین قرآن نے دو ترجمہ کیا ہے۔ یہ مراد کے خلاف ہے۔ زوجین نر و مادہ کو ملا کر کہتے ہیں۔ یہ زوج کا تثنیہ ہے۔ قرآن میں ہے۔ ومن کل شیئ خلقنا زوجین۔ ہم نے ہر چیز کا جوڑا پیدا کیا

[1] افادات شیخ الاسلام

[2] افادات شیخ الاسلام

ہے۔ قرآن نے نر و مادہ کو زوجین ہی کہا ہے۔ انہ خلق الزوجین الذکر و الانثیٰ
آیت کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ نر و مادہ کے دو دو جوڑے رکھو۔ جیسا کہ اُردو کے بعض تراجم سے ابہام
ہوتا ہے۔ بلکہ مطلب یہ ہے۔ نر و مادہ رکھو جو دو پر مشتمل ہوں۔ اگر زوجین سے مراد دو جوڑے ہوں۔ تو
پھر دو نہیں چار ہو جائیں گے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں۔

> مراد اس سے وہ ایک ہے۔ جو دوسرے سے ملا ہوا ہو۔ لہذا نر زوج ہے مادہ کا اور مادہ زوج ہے نر کا۔ کبھی دونوں کے مجموعہ پر بھی زوج بولا جاتا ہے۔ لیکن یہاں وہ مراد نہیں ہے ورنہ لازم آئے گا کہ ہر صنف میں سے چار لیے جائیں اور اس لیے بھی کہ اس صورت میں اثنین زوجین کی صفت نہ رہے گی۔

دوسری قرأت یہ ہے۔ کہ کل کو کسرے کی تنوین کے ساتھ پڑھا جائے۔ اس صورت میں مضاف الیہ یعنی
من کل شئ یعنی دو لے لو۔ حال دونوں کا ایک ہے مگر اس میں عموم زیادہ ہے۔ یہاں پوری کائنات میں
قانون تزویج کام کر رہا ہے۔

> سبحان الذی خلق الازواج کلھا مما تنبت الارض ومن انفسھم ومما لا یعلمون۔
>
> پاک ہے وہ ذات جس نے جملہ اقسام کے جوڑے پیدا کیے خواہ وہ زمین کے نباتات میں سے ہوں یا خود نوع انسانی میں سے یا ان اشیاء میں سے جن کو لوگ جانتے نہیں ہیں۔

مطلب یہ ہے کہ دن رات جو کچھ دیکھ رہے ہو ان کے اندر حقیقت کا سراغ دینے والے نشانات موجود
ہیں۔ عورت اور مرد کا جوڑا خود انسان کا سبب پیدائش ہے۔ حیوانات کی نسلیں بھی نر و مادہ کے ازدواج
سے چل رہی ہیں۔ نباتات کے متعلق بھی انسان جانتا ہے کہ ان میں تزویج کا اصول کام کر رہا ہے۔ بہرحال
اس صورت میں مطلب بالکل واضح اور صاف ہے۔

یہاں شارحین قرآن نے بڑی و دور راز کار بحثیں اس موضوع پر چھیڑ دی ہیں۔ کہ جن جانوروں کے
نر و مادہ لینے کا یا جن چیزوں کے جفت لینے کا حکم ہے۔ وہ کون کون سی اور کیا کیا ہیں۔
من کل کے عموم سے یہ لازم نہیں آتا کہ دنیا بھر کے سارے جانور کیڑے مکوڑے تک سب اسی
میں شامل ہوں۔ بلکہ یہ بات معیشت انسانی کو پیش نظر رکھ کر فرمائی گئی ہے۔ اس سے مراد صرف وہی جانور
ہو سکتے ہیں۔ جن کا تعلق انسان کی معیشت سے ہے۔ اور جو ان کی مختلف معاشی ضرورتوں کے لیے ناگزیر

تھے ۔یہاں مولانا اشرف علیؒ کی یہ بات بہت وزنی ہے ۔کہ

تمام انواع حیوان میں سے وہ یقیناً خارج ہیں جو پانی میں رہ سکتے ہیں ۔اور جو محتاج تناسل نہیں وہ بھی خارج ہیں اور اقسام تو ان میں سے ممکن ہے کہ وہی سوار کیے گئے ہوں جن سے انسانی جسامت متعلق ہوتی ہے ۔ جیسے ماکولات ،مرکوبات ،حوامل اور حواسل تاکہ بعد ختم طوفان کے بقیہ افراد انسانی کو تکلیف نہ ہو۔

(۵۰) اور اپنے اہل وعیال کو بھی لے لو ۔مگر اہل وعیال میں وہ نہ ہوں ۔جن کے بارے میں بات پہلے ہو چکی ہے۔نیز ان لوگوں کو بھی لے لو ۔جو ایمان لے آئے ۔نوح علیہ السلام کے ساتھ ایمان لانے والے تھوڑے تھے ۔یعنی مقرر ہو چکا ہے کہ وہ ظالموں کے زمرے میں داخل ہونے کی وجہ سے غرق کیے جائیں گے ۔ ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا انھم مغرقون ۔اس سے مراد ہے حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا (یام) جس کا لقب کنعان تھا ۔اور کنعان کی والدہ "واعلہ"گھر والوں میں سے یہ دونوں علیحدہ رہے ۔اور غرق ہوئے ؎

من سبق علیہ القول ۔جس پر بات پہلے ہو چکی سے مراد کیا ہے ۔ظاہر یہی ہے کہ جن کے بارے میں ظلم کاری کی پاداش میں غرق کیے جانے کا فیصلہ اللہ سبحانہ پہلے لا تخاطبنی الخ میں وحی کے ذریعہ سنا چکے ہیں ۔ان کو کشتی میں سوار نہ کرنا ۔ واھلک میں دو احتمال ہیں ۔ایک یہ کہ اہل ایمان مراد ہوں ۔دوسرے یہ کہ اہل قرابت ہوں ۔اہل ایمان اگر مراد ہیں ۔تو الا من سبق میں استثناء متصل ہے ۔اور اگر اہل قرابت ہیں استثناء منقطع ہے ۔اور قرینہ دلیل ہے کہ اہل سے اہل قرابت مراد ہیں ۔حضرت نوح علیہ السلام نے اہل سے اہل قرابت ہی سمجھ کر دعا کی تھی ۔کہ ان ابنی من اھلی ۔اگر اہل سے اہل ایمان مراد ہوتے تو حضرت نوح علیہ السلام یہ دعا ہرگز نہ فرماتے۔ یہ کہنا بالکل بے معنی اور بے جان ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے بیٹے کے کفر کی خبر نہ تھی ۔اس لیے کہا کہ وہ میرے اہل سے ہے اور میرے اہل وعیال کی حفاظت کا آپ نے وعدہ کیا ہے ۔کیونکہ اہل ایمان کا صراحتاً آگے ذکر آرہا ہے ۔ ومن اٰمن وما اٰمن معہ الا قلیل اس لیے بلا ریب اہل سے مراد اہل قرابت ہیں ۔نہ کہ اہل ایمان مطلب صاف ہے ۔کہ الذین ظلموا میں داخل ہیں اہل قرابت اور اہل ایمان کو یہاں اہلک کہہ کر یہی کہا گیا ہے کہ اپنے اہل قرابت کو جہاز

لے افادات شیخ الاسلام

میں سوار کر لینا مگر ان اہل قرابت کو کشتی میں سوار نہ کرنا جن کے دامن پر ظلم کے دھبے ہیں ۔ یہ سوال کہ اگر ایسا ہے تو حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کیوں کی ۔؟ دعا اس لیے کی کہ اہلک مطلق ہے۔اس میں ایمان کی قید نہ تھی ۔حضرت نوح علیہ السلام نے شفقت پدری کی وجہ سے اس اطلاق سے یہ فائدہ اٹھایا ہے۔اور اس کہنے میں بھی کہ

اس فیصلہ سے مراد وہ فیصلہ ہے جو اللہ تعالیٰ نے شیطان کو روز اول اس کے الٹی میٹم کے کے جواب میں سنا دیا تھا کہ جنوں اور انسانوں میں سے جو تیری پیروی کریں گے ۔میں ان سب کو جہنم میں بھر دوں گا ۔مطلب یہ ہے کہ جو حکم ازل کی زد میں آچکے ہیں ۔ وہ تو اس میں سوار ہونے سے محروم رہیں گے ۔باقی کو ان میں سوار کر ۔

کوئی معنویت نہیں ہے ۔خود حضرت نوح علیہ السلام جو اس کلام کے مخاطب ہیں ان کے ذہن میں بھی یہ بات نہیں جو ان شارح قرآن کے جملۂ دماغ میں آئی ہے ۔

آخر میں ہے کہ ما آمن معہ الا قلیل ۹۵۰ سال کے طویل عرصہ میں جانکاہ اور روح فرسا محنت اور عرق ریزی کے بعد ایمان میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت پر لبیک کہنے والوں کی تعداد قلیل تھی ظاہر ہے کہ قلت سے قلت عددی مراد ہے ۔حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت عمومی نہیں بلکہ علاقائی ہے اس علاقہ میں اس دور میں افرادی طاقت عام شہری زندگی میں کیا تھی ۔اس کا کوئی حتمی فیصلہ محض قیاس سے نہیں کیا جا سکتا ہے ۔یہاں قلت کا پیمانہ بتا رہا ہے کہ کفر پسندوں کی بھرپور اکثریت تھی ۔اور قرآن بتا رہا ہے ۔کہ آدمیوں کے سمندر میں سے صرف ایمان لانے والے گنتی کے چند آدمی تھے ۔ان گنتی کے اہل ایمان میں سے متمول سرمایہ دار شہری زندگی میں اونچے مرتبہ والا کوئی نہ تھا ۔بلکہ یہ سارے لوگ شہری زندگی کے ایسے افراد پر مشتمل تھے ۔جن پر مادیت کے پرستار اراذل کی پھبتی کستے تھے ۔اور ان سے بات کرنا ، ان کے پاس بیٹھنا اپنے لیے باعث توہین سمجھتے تھے ۔

اس تعبیر سے یہ بات بھی دلالۃ سمجھ میں آ رہی ہے ۔کہ یہ خوفناک اور بلا خیز طوفان انسانوں کی اس عظیم اکثریت کو بہا کر لے گیا ۔صرف چند گنے چنے لوگ جن کو ایمان لانے کا شرف حاصل ہوا ۔وہ اس بلائے بے درماں سے محفوظ رہے ۔

اس سے اشارۃً یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اکثریت اگر ظلم و فساد کا گہوارہ اور کفر و شرک کا الاؤ ہو تو نگاہ رب العزت میں وہ گندگی کا ڈھیر ہے ۔وہ اس گندگی سے زمین کو پاک ہی دیکھنا چاہتا ہے ۔اور صرف اس لیے کہ کفر و شرک کو عددی اکثریت اور افرادی قوت حاصل ہے ۔اپنی زمین کی پشت پر لادے رکھنا

وہ پسند نہیں کرتا۔

یہ آیت یہ بھی بتا رہی ہے۔ کہ اچھے لوگ خواہ تعداد میں کتنے تھوڑے ہوں۔ اللہ کی رحمت ان کو اپنے دامن کرم میں رکھ کر ان کی حفاظت کرتی ہے۔ یہاں تک کہ طوفان نوح بھی اسے گزند نہیں پہنچاتا۔

(۵۱) ایمان کا مرکزی نقطہ نظر

اور حضرت نوح علیہ السلام نے ساتھیوں سے کہا۔ اس جہاز میں سوار ہو جاؤ۔ اس جہاز کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ کے نام سے ہے۔ بلاشبہ میرا اللہ بخشنے والا رحم والا ہے۔ نوح علیہ السلام نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ بنام خدا کشتی میں سوار ہو جاؤ۔ کچھ فکر مت کرو۔ اس کا چلنا اور ٹھہرنا اللہ سبحانہ کے اذن وحکم اور اس کے نام کی برکت سے ہے۔ غرقابی کا کوئی اندیشہ نہیں۔ میرا پروردگار مومنین کی کوتاہیوں کو معاف کرنے والا اور ان پر بے حد مہربان ہے۔ وہ اپنے فضل سے ہم کو صحیح وسلامت اتارے گا۔ اس آیت سے نکلتا ہے کہ کشتی وغیرہ پر سوار ہوتے وقت بسم اللہ کہنا چاہیئے[۱] اللہ سبحانہ کے حکم کے موافق حضرت نوح علیہ السلام نے ان لوگوں کو جنہوں نے دعوت ایمان پر لبیک کہی تھی۔ جہاز پر سوار ہونے کا حکم دیا۔ اور پہلی بات اس موقعہ پر جو زبان مبارک پر آئی یہ تھی۔ بسم اللہ مجرھا ومرسا ھا۔ یہ کہنا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ اسباب ووسائل خود کتنی ہی اہمیت رکھتے ہوں۔ لیکن مرد مومن کا اصلی سہارا اسباب نہیں بلکہ اللہ سبحانہ کی قدرت ورحمت پر ہوتا ہے۔ اُس کی آغوش رحمت اگر متوجہ ہو تو بحر زخار کی متلاطم موجوں میں لکڑی کا ایک ٹوٹا ہوا تختہ بھی آدمی کے لیے بچاؤ کا بہانہ بن جاتا ہے۔ اور یہ بھی آیت بتا رہی ہے کہ اسباب میں محو ہو کر خالق اسباب سے بیگانہ ہونا یا یاد الٰہی میں لگ کر ترک اسباب کرنا ایمان کا مطالبہ نہیں ہے۔ ایمانی تقاضا یہ ہے کہ دونوں میں ہم آہنگی پیدا کرے۔ اسباب کی پاسبانی اسباب کی حد تک کرے مگر اصلی اعتماد اسباب پر نہیں بلکہ خالق اسباب کی رحمت پر ہو۔ اسباب کا ہو کر رہ جانا اگر مادیت ہے۔ اور اسباب سے بیگانہ ہو کر نرا خالق اسباب پر سہارا کر لینا۔ رہبانیت ہے۔ اسلام اور صراط مستقیم دونوں کے درمیان ہے۔ گویا مومن کی اصلی شان یہ ہے۔ کہ وہ عالم اسباب میں ساری تدابیر اللہ سبحانہ کے قانون کے مطابق اسی طرح اختیار کرتا ہے۔ جس طرح دنیا دار کرتے ہیں۔ مگر اس کا بھروسہ

[۱] افادات شیخ الاسلامؒ

ان تدابیروں پر نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ پر ہوتا ہے اور اسے بھرپور یقین ہوتا ہے۔ کہ کوئی تدبیر نہ تو ٹھیک شروع ہو سکتی ہے۔ اور نہ ٹھیک چل سکتی ہے۔ اور نہ آخری مطلوب تک پہنچ سکتی ہے۔ جب تک اللہ سبحانہٗ کا فضل اور اس کا رحم وکرم شامل حال نہ ہو۔

سورہ مومنون میں یہ ہدایت بھی ہے۔ کہ جہاز پر سوار ہونے کے بعد یہ بھی کہو۔

الحمد للہ الذی نجانا من القوم الظالمین

اور ساتھ ہی یہ دعا بھی کرو۔

رب انزلنی منزلا مبارکا وانت خیر المنزلین

خدایا مجھے زمین پر اس طرح اتار کہ برکت کا اترنا اور تو بہترین جگہ دینے والا ہے۔

یہ دعائیں بتا رہی ہیں۔ کہ نبوت زندگی کا جو نظام لے کر آتی ہے اس کے تمام اجزا جس مرکز سے جرأت اور زندگی حاصل کرتے ہیں۔ وہ اللہ سبحانہٗ کی ذات ہے۔ نبوی معاشرے کے جملہ اعتقادات اور سارے اعمال و افکار اسی تصور کی بنیادوں پر استوار ہیں۔ اس کے تمام انفرادی اور اجتماعی زندگی کے شعبے اور تمام احوال اسی ایک مصدر سے مشتق ہیں۔ رنج وغم کی حالت ہو یا شادمانی ومسرت ہو، معاشرتی زندگی ہو، یا اخلاق واعمال وفرائض ہوں، یا آداب کی تمام شاخیں غرض زندگی کی ہر معمولی سے معمولی چیز بھی بالواسطہ یا بلاواسطہ اس مرکزی تخیل سے وابستہ ہے۔ اس بنیاد سے ذرا ہٹ جایئے تو نبوت کا کوئی حصہ اپنی اصلیت پر باقی نہیں رہ سکتا ہے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے غالباً اسی آیت کے اشارے سے معلوم کر کے سفر کے آداب واذکار کا نقشہ مسلمانوں کی رہنمائی کے لیے پیش فرمایا ہے۔ تفصیل دیکھنی ہو تو امام نوویؒ کی کتاب الاذکار الجزری کی الحسن الحصین حافظ ابن القیم کی الوابل الصیب حافظ ابن تیمیہ کی الکلم الطیب پڑھیئے۔

(۵۲) طوفان کی بلاخیزی کا دہشتناک منظر

جہاز ان کو پہاڑوں جیسی موجوں کے تھپیڑوں میں لیے جا رہا تھا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ اور وہ حضرت نوح علیہ السلام سے کسی دور جگہ پر تھا۔ میرے بیٹے ہمارے ساتھ سوار ہو جا۔ کافروں کے ساتھ نہ ہو۔ یعنی کشتی پہاڑوں جیسی موجوں کو چیرتی ہوئی۔ بے خوف وخطر چلی جا رہی تھی۔ سوار ہونے کے بعد حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے یام کنعان کو جو اپنے باپ بھائی وغیرہ سارے کنبے سے کنارے ہو کر کافروں کی صحبت میں تھا۔ آواز دی کہ ان بدبخت کافروں کی معیت چھوڑ کر ہمارے ساتھ ہو جاؤ تاکہ اس مصیبت عظمیٰ سے نجات مل سکے۔ یہ پکار یا تو اس لیے تھی کہ حضرت

نوح علیہ السلام اسے مسلمان خیال کرتے تھے۔ خواہ وہ واقع میں مؤمن نہ ہو یا کافر ہونا معلوم تھا مگر یہ توقع ہو گی۔ کہ ان ہولناک نشانات کو دیکھ کر مسلمان ہو جائے گا۔ واھلک کے عموم میں داخل سمجھ کر شفقت پدری کے جوش میں ایسا کیا ہو۔ اور الا من سبق علیہ القول۔ کو مجمل ہونے کی وجہ سے اس پر منطبق نہ سمجھتے ہوں [1] جہاز بلاخیز موجوں میں چل رہا تھا۔ موجیں اس طرح ٹھاٹھیں مار رہی تھیں۔ گویا پہاڑ اُٹھ رہے ہوں۔ یہ اس منظر کی صحیح تصویر ہے۔ جو طوفانی سمندروں میں موجوں کے اُٹھنے سے ہو جاتی ہے۔ یہ ساری صورتِ حال یکبارگی نہیں ہوئی بلکہ بتدریج دھیرے دھیرے فعل مضارع تجری اسی تدریج کو ظاہر کر رہا ہے۔ موجوں کا یہ نظارہ سیلاب کی جوانی ہے۔ اسی سیلاب کے آغاز میں جب طوفان میں یہ بلاخیزی نہ آئی تھی۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ نادیٰ ماضی کا صیغہ اسی بات کو ظاہر کر رہا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ موجوں کے تلاطم سے پہلے حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو پکارا۔ بیٹا حضرت نوح علیہ السلام سے کافی فاصلے پر ہے۔ اس کو دیکھ کر پدری شفقت جوش میں آگئی۔ اُس کو آواز دے کر پکارا۔ یا بنی ارکب معنا ولا تکن مع الکافرین۔ علامہ آلوسیؒ نے محققین کی طرف منسوب کر کے اس طرف اشارہ کیا ہے۔ انما کان قبل الرکوب فی السفینۃ والواو لاتدل علی الترتیب۔ لیکن یہ بات درست نہیں ہے۔ بات وہی ہے کہ ابھی جہاز اور زمین کے درمیان علاقہ تھا۔ پانی کی ابھی بہتات نہ تھی۔ سیلاب بتدریج بڑھ رہا تھا۔ کہ یہ گفتگو حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے بیٹے کے درمیان ہو رہی تھی۔ اس پکار میں بیک وقت شفقت اور دعوت دونوں کی روح کام کر رہی ہے۔ یا بنی پیار و شفقت میں ڈوبی ہوئی پکار ہے۔ اور لا تکن مع الکافرین میں گویا آخری دعوت ہے۔ کہ پیارے اب بھی موقع ہے۔ کہ ان کافروں کا ساتھ چھوڑ کر ہم میں شامل ہو جا۔ بلاشبہ تجری حال کا صیغہ تصویرِ حال کے لیے ہے۔ لیکن نادیٰ نوح ابنہٗ وکان فی معزل۔ کے الفاظ قاری کے سامنے حال کی نہیں ماضی کے منظر کی عکاسی کر رہے ہیں۔ ایک قرآنی تفسیر کے شارح کی سمجھ میں ماضی اور حال میں منظر کشی کے لیے ہم آہنگی سمجھ میں نہیں آتی تو یہ دور از کار تاویل کی اور الفاظ کی شوکت سے اپنے مخاطبوں کو مطمئن کرنے کی ناکام کوشش ہے۔ وہ فرماتے ہیں

> طوفانی ہوائیں چل رہی ہیں۔ موسلا دھار بارش ہو رہی ہے۔ پہاڑوں کی طرح موجیں اُٹھ رہی ہیں۔ ان موجوں کے تھپیڑوں سے حضرت نوح علیہ السلام کی کشتی نبرد آزما ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ اتنے میں نگاہ اٹھتی ہے۔ تو دیکھتے ہیں کہ کچھ فاصلے پر جواں سال بیٹا حالات سے سراسیمہ ششدر کھڑا ہے۔

کوئی ان سے پوچھے کہ جب موجیں پہاڑوں سے باتیں کر رہی تھیں۔ تو یہ صاحبزادے کہاں کھڑے تھے؟ خشکی کہاں تھی؟ اور جب ان موجوں میں سب ڈوب رہے تھے تو یہ اکیلے کہاں تھے؟

اصل یہ ہے۔ کہ انہوں نے آیت میں واؤ کو ترتیب کے لیے سمجھ لیا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ان دو باتوں میں زمانی اور مکانی ترتیب کوئی نہیں ہے۔ اس لیے بات بتائی جا رہی ہے۔ کہ

اللہ نے چاہا کہ حضرت نوح علیہ السلام بیٹے کے ڈوبنے کا تماشا اپنی آنکھوں سے دیکھیں۔

یہ حضرت نوح علیہ السلام کی وفاداری کا آخری امتحان تھا۔

غور فرمایئے اس میں نبوّت کے امتحان کی کون سی بات ہے۔ جب کہ حضرت نوح علیہ السلام کفر سے بیزاری کا کھلے بندوں اظہار فرما رہے ہیں۔ اور بیٹے کو کافروں کی معیت چھوڑنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ بلا ریب حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹے سے یہ مکالمہ پہاڑوں جیسی موجوں میں نہیں بلکہ اس سے پہلے ہے۔ جب کہ ان کا بیٹا کسی دُور مقام پر خشکی پر کھڑا ہے۔ قرآن میں نادیٰ اور کان فی معزل۔ اسی کی تائید کر رہے ہیں۔ علامہ طاہر نے التحریر والتنویر میں یہی بات مخاطبوں کو سمجھانے کے لیے لکھی ہے۔

کان نداءہ ابنہ قبل جریان السفینۃ فی موج کالجبال

یعنی حضرت نوح علیہ السلام کا اپنے بیٹے کو پکارنا پہاڑ جیسی موجوں میں جہاز کی روانگی سے پہلے تھا۔ جہاز کی روانگی کے بعد پہاڑوں جیسی موجوں میں جہاز کا ٹھہرنا ہی ممکن نہیں ہے کان فی معزل۔ کا مطلب یہ نہیں کہ وہ دُور کھڑا تھا۔ بلکہ مطلب یہ ہے کہ وہ اہل ایمان سے علیحدہ تھا۔ یا تو اس لیے کہ وہ ایمان کی نعمت سے ہمدوش نہ ہونے کی وجہ سے طوفان کے آنے کی تصدیق نہ کرتا تھا۔ اور یا اس نے راہ ارتداد اپنالی تھی۔ لاتکن مع الکافرین قرینہ ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام اس کو مومن سمجھتے تھے۔ ورنہ یہ نہ کہتے کہ کافروں کے ساتھ نہ ہو۔ اور ارکب معنا دلیل ہے۔ کہ جہاز میں سوار ہونے کے وقت یہ گفتگو ہو رہی ہے۔ اگر وہ پہلے مسلمان نہ ہوتا۔ تو حضرت نوحؑ یہ نہ فرماتے کہ کافروں کے ساتھ نہ ہو۔ بلکہ فرماتے بیٹے اب تو مان لے۔ اس سے معلوم ہوا۔ کہ مسلمان کے لیے کفار کی معیت بھی سنگین جرم ہے۔ یہ ایمانی زندگی کا اصل اُصول ہے۔ اور یہی اسلام اور کفر کے درمیان حدِ فاصل ہے۔ کفر بے قیدی اور بے راہ روی ہے۔ وہ ایک ایسی زندگی ہے۔ جس میں افراد کے ارادوں پر کوئی بالاتر ضابطۂ حیات

اور اعلیٰ ترین آئین زندگی حکمران نہیں ہوتا ہے۔ کفار کا ارادہ بے قید اور ان کا نفس بے لگام ہوتا ہے۔

(۵۳) یہ سیلاب نہیں عذاب الٰہی ہے

بیٹے نے کہا ابا میں تو کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔ جو مجھے پانی سے محفوظ رکھے گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے فرمایا بیٹے آج اللہ کے حکم سے بچانے والا کوئی نہیں ہے۔ ہاں وہ بچ سکتا ہے۔ جس پر اللہ رحم فرمائے۔ اسی حال میں باپ اور بیٹے کے درمیان سیلاب کی موج روک بن گئی۔ بس پھر بیٹا سیلاب کی نذر ہوگیا۔ یعنی کس خبط میں پڑا ہے یہ معمولی سیلاب نہیں۔ وہ اپنی عبادت سے ابھی یہی خیال کر رہا تھا۔ کہ جس طرح معمولی سیلابوں میں بعض کسی بلندی پر چڑھ کر آدمی جان بچا لیتا ہے۔ میں بھی کسی اونچے پہاڑ پر چڑھ کر جان بچا لوں گا۔ حضرت نوح علیہ السلام نے بتایا۔ یہ طوفان عذاب الٰہی ہے۔ پہاڑ کی کیا حقیقت۔ کوئی چیز آج عذاب سے نہیں بچا سکتی ہے۔ ہاں اللہ سبحانہ ہی کسی پر رحم کرے تو بچ سکتا ہے۔ مگر اس ہنگامہ دار و گیر اور مقام انتقام میں کھڑے مجرموں پر رحم کیا؟ باپ بیٹے کی یہ گفتگو پوری نہ ہوئی تھی۔ کہ پانی کی ایک موج نے درمیان میں حائل ہو کر ہمیشہ کے لیے دونوں کو جدا کر دیا[1] حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کو سیلاب کی ہولناکی کا کوئی اندازہ نہ تھا۔ اور حضرت نوح علیہ السلام سے یہ مکالمہ جہاز میں سوار ہونے کے وقت ہو رہا تھا۔ اور جہاز ابھی روانہ نہ ہوا تھا۔ کہ باپ کی اس شفقت بھری دعوت کا جواب بڑے دانشمندانہ انداز میں اس طرح دیا۔ کہ میں کسی پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔ پہاڑ کی بلندی مجھے پانی سے بچا لے گی۔ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔ کہ نادان سمجھ رہا تھا۔ پانی کے طوفان کی پہاڑوں کی بلندی تک رسائی نہ ہوگی۔ اور یہ بھی حافظ ابن کثیرؒ نے بتایا ہے۔ کہ اپنے بیٹے کو جہاز پر سوار ہونے کی دعوت جہاز پر خود سوار ہونے کے وقت دی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ دونوں باتیں جہاز پر سوار ہونے کی دعوت سوار ہونے کے وقت اور بیٹے کا یہ کہنا کہ میں پہاڑ پر چڑھ جاؤں گا۔ بتا رہی ہیں۔ کہ یہ گفتگو طوفان کے آغاز میں ہو رہی ہے۔ ورنہ پہاڑوں جیسی موجیں آنے کے بعد پہاڑ پر چڑھنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اور جہاز کے پانی سے اٹھ جانے کے بعد دعوت کا کوئی سوال نہیں ہے۔

نوح علیہ السلام نے بیٹے کو سمجھایا۔ بیٹے یہ سیلاب نہیں قہر الٰہی ہے۔ اس سے بچانا پہاڑ کا نہیں اللہ کا کام ہے۔ جس پر اللہ رحم کرے گا وہ ہی عذاب کی گرفت سے محفوظ رہے گا۔ یہ طبعی سیلاب

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں ہے۔ یہ دعا کی قبولیت پر عذاب الہی آیا ہے۔ یہ قہر الہی ہے۔ اس سے پناہ دینے کی مجال کسی کو نہیں ہے۔ نہ پہاڑ کو اور نہ پہاڑ کی چوٹی کو ہاں جسے اللہ سبحانہ خود ہی بچا لینا چاہے بچائے بائیبل میں ہے۔

اور پانی بڑھ گیا اور کشتی کو اُوپر اٹھایا۔ کشتی زمین پر سے اُٹھ گئی۔ اور پانی زمین پر بڑھا۔ اور بہت زیادہ ہوا۔ اور کشتی پانی کے اُوپر بہتی رہی۔ اور پانی زمین پر بے نہایت بڑھ گیا۔ اور سب اُونچے پہاڑ جو زمین کے نیچے تھے۔ چھپ گئے۔ پندرہ ہاتھ ان کے اُوپر بڑھا اور پہاڑ ڈوب گئے۔ پیدائش ۷: ۱۷۔ ۲۱

ارشاد ہوا ہے۔ وحال بينهما الموج اور دونوں کے درمیان موج حائل ہو گئی۔ واؤ صرف جمع کے لیے ہے ترتیب کے لیے نہیں ہے۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام کی یہ گفتگو جہاز پر سوار ہوتے وقت ہوئی۔ پانی نے بڑھنا شروع کیا۔ حضرت نوح علیہ السلام کی نگاہیں بچے کو اس بلاخیز طوفان میں اپنے بچے کو دیکھ رہی تھیں۔ دیکھتے ہی دیکھتے حضرت نوح علیہ السلام اور بیٹے کے درمیان پانی کا ایک بڑا ریلا حائل ہو گیا۔ قرآن نے یہی نہیں بتایا کہ حضرت نوح علیہ السلام ہی کا بیٹا غرق ہوا ہے بلکہ بتایا کہ سب غرق ہو گئے اور وہ بھی غرق ہونے والوں میں تھا۔ یعنی نہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بچا نہ اور کوئی اس طوفانی عذاب سے محفوظ رہا۔

(۵۴) بلاخیز طوفان کا خاتمہ

پھر اللہ کا حکم ہوا کہ اے زمین اپنا پانی نگل جا اور اے آسمان تو تھم جا اور پانی کا چڑھاوا اتر گیا۔ اور سیلاب کا حادثہ ہو چکا اور جہاز جودی پر ٹھہر گیا اور کہا گیا کہ ان لوگوں کے لیے رحمت حق سے دُوری ہے۔ جو ظلم کار ہیں۔ یعنی ایک مدت تک اتنا پانی برسا گویا آسمان کے دہانے کھل گئے۔ اور زمین کے دہانے پھٹ گئے۔ درخت اور پہاڑ تک پانی میں چھپ گئے۔ جہاز والوں کے سوا تمام لوگ جن کے حق میں حضرت نوح علیہ السلام نے دعا کی تھی۔

رب لا تذر على الارض من الكافرين ديارا

غرق ہو گئے۔ اس وقت خداوند قدوس نے زمین کو حکم دیا کہ اپنا پانی نگل جا اور بادل کو فرمایا کہ تھم جا۔ پھر کیا مجال تھی کہ دونوں اس کے تعمیل حکم میں ایک لمحہ کی تاخیر کرتے۔ چنانچہ پانی خشک ہونا شروع ہو گیا۔ کشتی جودی پہاڑ پر جا لگی۔ جو بعض کے نزدیک موصل میں تھا۔ اور جو کام اللہ سبحانہ نے کرنا تھا یعنی مجرمین کو سزا دینا وہ پورا ہو

چکا۔ ظالموں کے حق میں کہہ دیا گیا کہ اللہ سبحانہٗ کی رحمت سے دُور ہو کر ہمیشہ کیلیے معیبت و ہلاکت میں پڑے رہو۔

اس میں اختلاف ہے کہ طوفانِ نوحؑ تمام دنیا میں یا خاص مُلکوں میں آیا۔ اس کے فیصلے کا یہاں موقعہ نہیں ہے مگر یاد رہے کہ دائرۃ المعارف میں بعض محققین یورپ کے ایسے اقوال و دلائل نقل کیئے ہیں جو عموم طوفان کی تائید کرتے ہیں۔ جو لوگ عام طوفان کے قائل ہیں۔ ان میں سے اکثر کے نزدیک موجودہ دنیا کے کل انسان حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں سام، حام اور یافث کی اولاد ہیں۔ وجعلنا ذریتہ ھم الباقین طوفان سے جو بچے اور حیوانات ہلاک ہوئے۔ ان کا اہلاک بطور تعذب نہ تھا۔ بلکہ جیسے اللہ سبحانہٗ دوسرے اسباب طبعیہ کے ذریعے سے ان پر موت طاری کرتا ہے۔ اور وہ ظلم نہیں ہوتا ہے۔ اسی طرح یہاں ان کی موت اس ذریعہ سے واقع ہوئی۔ آخر اب بھی جو سیلاب اور طوفان آتے ہیں۔ ان میں کتنے جانور اور بچے ہلاک ہوجاتے ہیں[1]

طُوفان کے موضوع پر کچھ کہنے سے پہلے یہ سوچ لینا چاہیئے۔ کہ

۱۔ کیا دنیا کی آبادی صرف عراق تک محدود تھی۔ یا آج کی طرح دنیا آباد تھی۔

۲۔ اگر دنیا عراق سے باہر بھی تھی۔ تو کیا حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت عمومی تھی۔ یعنی کیا آپ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرح عموم بعثت لے کر آئے تھے۔

قرآن میں صراحتہ دلالتہ اور اشارۃ بھی ایسی کوئی بات نہیں ہے۔ جس سے معلوم ہو کہ دنیا کی آبادی اس علاقہ تک محدود تھی۔ آیت قرآنی وجعلنا ذریتہ ھم الباقین۔ سے اس پر استدلال صحیح نہیں ہے۔ اس کے معنے تو یہ ہیں۔ کہ جو لوگ حضرت نوح علیہ السلام کے مخالف تھے۔ ان کی نسل اس علاقہ سے جہاں حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت ہوئی تھی ناپید کردی گئی۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کی نسل باقی رکھی گئی۔ اور بس۔ کیونکہ حضرت نوح علیہ السلام کی بعثت علاقائی تھی۔ عالمی نہ تھی۔ جیسا کہ ہر جگہ الی قومہ کی تعبیر بتا رہی ہے۔ ان دو باتوں میں کوئی منطقی ربط نہیں ہے۔ کہ بعثت حضرت نوح علیہ السلام کی اپنی قوم کی طرف ہو۔ اور اپنے علاقہ میں ہو۔ اور طوفان کے ذریعے ان لوگوں کو تباہ کردیا جائے۔ جو حضرت نوح علیہ السلام کے مخاطب نہیں ہیں۔ یہ بات صراحتہً قرآن کے خلاف ہے۔ وما کنا معذبین حتی نبعث رسولا۔ یہ ایک اصولی حقیقت ہے۔ جسے قرآن بار بار اور مختلف طریقوں سے اپنے مخاطبوں کے ذہن

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں بٹھانا چاہتا ہے۔ کہ اللہ سبحانہ کا نظام عدالت بھی ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے۔ رسول اور اس کا لایا ہوا پیغام بھی بندوں پر اللہ سبحانہٗ کی حجت ہے۔ یہ حجت قائم نہ ہو۔ تو بندوں کو عذاب دینا خلاف انصاف ہوگا۔ یہ کہنا کہ حضرت نوح علیہ السلام کے زمانہ میں پوری دنیا عراق میں سمٹی ہوئی تھی اور اس کی توجیہ اس طرح کرنا کہ

> حضرت نوح علیہ السلام کے اس قصے سے ملتی جلتی روایات یونان، مصر، ہندوستان اور چین کے قدیم لٹریچر میں بھی ملتی ہیں۔ اور اس کے علاوہ برما، ملایا، شرق الہند، آسٹریلیا، نیوگنی اور امریکہ و یورپ کے مختلف حصوں میں بھی ایسی ہی قدیم روایات قدیم زمانہ سے چلی آرہی ہیں۔

اور اس سے یہ استدلال کرنا کہ

> اس سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ یہ قصہ اس عہد سے تعلق رکھتا ہے۔ جبکہ پوری نسل آدم ایک ہی خطۂ زمین میں رہتی تھی۔

بالکل بے معنے سا ہے۔ کسی بات کا سب کی زبانوں پر ہونا واقعہ کے ہونے کی دلیل تو ہو سکتا ہے۔ کہ یہ تواتر ہے۔ مگر واقعہ کے عام ہونے کی دلیل نہیں ہوسکتا۔ اور پھر یہ توجیہ کرنا بھی اپنے اندر کوئی جان نہیں رکھتا۔ کہ

> پھر وہاں سے نکل کر دنیا کے مختلف حصوں میں آباد ہوئی ہیں۔ اس سے تمام قومیں اپنی ابتدائی تاریخ میں ایک ہمہ گیر طوفان کی نشاندہی کرتی ہیں۔

قرآن نے جس طرح دوسری قوموں کے عذاب کا ذکر کیا ہے۔ اسی طرح قوم نوحؑ کے عذاب کا بھی ذکر کیا ہے۔ اگر دوسری قوموں کا عذاب صرف ان ہی قوموں کے لیے تھا تو کوئی وجہ نہیں کہ قومِ نوحؑ کا عذاب یعنی طوفان عالمگیر تصور کیا جائے۔ لیکن چونکہ تورات کی کتاب پیدائش میں اس طرح کی تصریحات ہیں۔ کہ طوفان عام تھا۔ اور یہودیوں اور عیسائیوں کا ایسا ہی عقیدہ رہا ہے۔ اس لیے مسلمانوں میں بھی خیال پھیل گیا۔ ورنہ قرآن میں ایسی کوئی بات نہیں جس سے طوفان نوحؑ عام ثابت ہوتا۔ غالباً اسی لیے علامہ آلوسیؒ نے صاف کہدیا۔ والذی یمیل الیہ القلب ان الطوفان لم یکن عاما۔ دل کا میلان تو یہی ہے۔ کہ طوفان عام نہ تھا۔ تورات میں یہ واقعہ چار فصلوں میں بیان کیا گیا ہے۔ اور بڑی تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ لیکن حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے صاحبزادے کے مکالمے کا کوئی ذکر نہیں کیا۔ تورات کے بقیہ اجزاء کے بارے میں کچھ کہا جائے۔ لیکن موجودہ زمانے

کے محققین کا یہ فیصلہ قطعی ہے۔ کہ کتاب پیدائش لائق اعتماد نہیں ہے۔ بہرحال یہ بات کہ طوفان ساری روئے زمین پر عام تھا۔ قرآن میں نہیں کہی گئی ہے۔ اسرائیلی روایات کی بنا پر عام خیال یہی ہے۔

جہاز کا جودی پر ٹھہراؤ

جہاز پانی کے بہاؤ پر چلتے چلتے جودی نامی پہاڑ پر لگ گیا۔ جودی ایک پہاڑ کا نام ہے۔ امام بخاریؒ نے صحیح میں امام مجاہدؒ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ جودی جزیرہ میں ایک پہاڑ ہے۔ یعنی کردستان کے علاقہ میں جزیرہ ابن عمر کے شمال مشرق کی جانب واقع ہے۔ بائیبل میں اس کشتی کے ٹھہرنے کی جگہ اراراط بتائی گئی ہے۔ جو آرمینیا کے ایک پہاڑ کا نام بھی ہے۔ اور ایک سلسلہ کوہ کا نام بھی ہے۔ سلسلہ کوہ کے معنے میں جس کو اراراط کہتے ہیں۔ وہ آرمینیا کی سطح مرتفع سے شروع ہو کر جنوب میں کردستان تک چلا جاتا ہے۔ اور جبل الجودی اسی سلسلہ کا ایک پہاڑ ہے۔ جو آج بھی جودی کے نام سے مشہور ہے۔ تورات میں اراراط کا ذکر ہے۔ اور قرآن نے خاص اُس چوٹی کا ذکر کیا ہے۔ جہاں جہاز جا کر ٹھہرا۔ اس سے اگر ایک طرف طوفان کی ہولناکی کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ اور دوسری طرف یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ طوفان عالمگیر نہیں علاقائی تھا۔ کہتے ہیں کہ محرّم کی دس تاریخ تھی۔ اور جمعہ کا دن تھا۔ جب حضرت نوح علیہ السلام کا جہاز کوہ جودی پر آکر رکا۔

آخر میں ارشاد ہے فبعداً للقوم الظالمین یہ بعد یبعد سے مصدر ہے۔ پوری عبارت یوں ہے۔ یبعدوا البعد یعنی ان ظالموں کو ہلاک اور تباہ و برباد ہونا چاہیئے۔ یہ ان کی ظالمانہ زندگی کا ناگزیر تقاضا ہے۔

یہاں لفظ ظالم لا کر اشارہ کر دیا۔ کہ ہلاک ہونے والے اور طوفان کی نذر ہونے والے صرف ظالم ہیں۔ اور ان کی ہلاکت کی علت ظلم ہے۔ اس میں بھی خیال کی تردید ہوتی ہے۔ کہ تمام دنیا کی انسانی آبادی کا نسلی سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں تک پہنچتا ہے۔ دراصل اسرائیلی روایات نے یہ غلط فہمی پھیلا دی ہے کہ اس طوفان سے حضرت نوح علیہ السلام کے ان تینوں بیٹوں اور ان کی بیویوں کے سوا کوئی نہ بچا تھا۔ لیکن قرآن متعدد مقامات پر اس کی تصریح کرتا ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے خاندان کے سوا ان کی قوم کی ایک معتدبہ تعداد اگرچہ وہ تھوڑی تھی اللہ تعالیٰ نے ان کو طوفان سے بچا لیا تھا۔ نیز قرآن بعد کی انسانی نسلوں کو صرف حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد نہیں بلکہ ان سب لوگوں

کی اولاد قرار دیتا ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے ان کے ساتھ بٹھایا تھا۔ ذریۃ من حملنا مع نوح
اور من ذریۃ آدم ومن ذریۃ من حملنا مع نوح

فصاحت وبلاغت کا شاہکار

زیر نظر آیت گرامی قیل یا ارض ابلعی الخ کو موضوع بنا کر عربی ادب کے شناوروں نے اس کی فصاحت و بلاغت پر مختلف زاویوں سے داد تحقیق دی ہے۔ علامہ سکاکی نے مفتاح العلوم میں۔ آمانی نے اعجاز القرآن میں، زمخشری نے کشاف میں، طیبی نے کشف میں، علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں، علامہ طاہر نے التحریر والتنویر میں اس کو بھرپور انداز میں پیش کیا ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے موضوع کے آغاز میں لکھا ہے۔ کہ

یہ آیت گرامی بلاغت میں حد اعجاز کی بلندیوں تک پہنچی ہوئی ہے۔ اس کی بلاغت کے سامنے بڑے عربی ادب کے شہسوار بھی مات کھا گئے ہیں۔

افسوس اس کی تفصیلات ناظرین معالم القرآن کے لیے چنداں مفید نہیں ہیں۔ اس لیے ہم اس موضوع پر کچھ کہنے سے اپنے ناظرین سے معذرت خواہ ہیں۔ کیونکہ یہ ذوقی چیز ہے۔ اور ذوقیات سے استفادے کے لیے صاحب ذوق ہونا ضروری ہے۔ معالم القرآن میں معانی بیان اور بدیع کی لطافتوں کو پیش کرنے کے لیے مخاطبوں کی رعایت ناگزیر ہے۔ اسی لیے بہت مباحث میں بالارادہ قلم کو روکنا پڑا ہے۔ معالم القرآن میں صرف یہ کوشش کی گئی ہے۔ کہ پیش پا افتادہ حالات میں مخاطبوں کی صلاحیت کے مطابق قرآن عزیز کے مقاصد اور مطالب سادہ انداز میں کھل کر سامنے آجائیں۔ اس میں نہ روایات کا انبار ہے۔ نہ کلامی موشگافیاں نہ عربی ادب کی نزاکتیں ہیں۔ قرآن اور صرف قرآن سے قرآن دانی کی راہ کو مشکلات سے صاف کیا گیا ہے۔ اور مخاطبوں کے لیے قرآن کے علوم و معارف کو مؤلف نے کسی کی نہیں اپنی زبان میں اپنی استعداد کے مطابق پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ اور بس۔ اللہ اسے قبول فرما کر میرے لیے آخرت میں میری نجات کا ذریعہ بنائے۔

وَنَادٰی نُوۡحٌ رَّبَّهٗ
فَقَالَ رَبِّ اِنَّ ابۡنِیۡ مِنۡ اَهۡلِیۡ وَاِنَّ وَعۡدَكَ الۡحَـقُّ وَاَنۡتَ
اَحۡكَمُ الۡحٰكِمِيۡنَ ۞ قَالَ يٰـنُوۡحُ اِنَّهٗ لَـيۡسَ مِنۡ اَهۡلِكَ‌ ۚ اِنَّهٗ
عَمَلٌ غَيۡرُ صَالِحٍ ‌ۖ فَلَا تَسۡـئَلۡنِ مَا لَـيۡسَ لَـكَ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ اِنِّىۡۤ اَعِظُكَ
اَنۡ تَكُوۡنَ مِنَ الۡجٰهِلِيۡنَ ۞ قَالَ رَبِّ اِنِّىۡۤ اَعُوۡذُ بِكَ اَنۡ
اَسۡـئَلَكَ مَا لَـيۡسَ لِىۡ بِهٖ عِلۡمٌ‌ ؕ وَاِلَّا تَغۡفِرۡ لِىۡ وَتَرۡحَمۡنِىۡۤ اَكُنۡ
مِّنَ الۡخٰسِرِيۡنَ ۞ قِيۡلَ يٰنُوۡحُ اهۡبِطۡ بِسَلٰمٍ مِّنَّا وَبَرَكٰتٍ
عَلَيۡكَ وَعَلٰٓى اُمَمٍ مِّمَّنۡ مَّعَكَ‌ ؕ وَاُمَمٌ سَنُمَتِّعُهُمۡ ثُمَّ يَمَسُّهُمۡ
مِّنَّا عَذَابٌ اَلِيۡمٌ ۞ تِلۡكَ مِنۡ اَنۡۢـبَآءِ الۡغَيۡبِ نُوۡحِيۡهَاۤ اِلَيۡكَ‌ ۚ مَا
كُنۡتَ تَعۡلَمُهَاۤ اَنۡتَ وَلَا قَوۡمُكَ مِنۡ قَبۡلِ هٰذَا ‌ ۛؕ فَاصۡبِرۡ ‌ ۛؕ اِنَّ
الۡعَاقِبَةَ لِلۡمُتَّقِيۡنَ ۞

اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب کے حضور میں دعا کی اور کہا کہ میرے مولا میرا بیٹا تو میرے اہل سے ہے۔ اور آپ کا وعدہ یقیناً سچا ہے۔ اور آپ سب سے پائیدار اور حکیمانہ فیصلہ کرنے والے

ہیں[۵۵] اللہ سبحانہ نے فرمایا : اے نوحؑ یہ تیرے اہل سے نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ تو سرتاسر عمل بد ہے۔ لہٰذا جس چیز کی حقیقت کا تجھے پتہ نہیں ہے اس کے بارے میں سوال نہ کرو۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں کہ ناواقفوں میں سے نہ ہو جانا[۵۶] حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا۔ اے میرے آقا: میں اس بات میں تیری جناب میں پناہ لیتا ہوں۔ کہ ایسی بات کا سوال کروں جس کی حقیقت کا مجھے پتہ نہیں ہے۔ اگر آپ نے مجھے نہ معاف کیا اور میرے ساتھ رحمت کا معاملہ نہ کیا تو میں تباہ حال ہونے والوں میں سے ہو جاؤں گا[۵۷] حکم ہوا : اے نوحؑ جہاز سے اُترو۔ ہماری جانب سے تم پر سلامتی اور برکتیں ہوں گی۔ نیز اُن جماعتوں پر جو تمہارے ساتھ ہیں۔ اور کچھ اور جماعتیں ہیں۔ جن کو ہم زندگی کے فوائد سے بہرہ یاب کریں گے۔ پھر دیر بعد وہ ہماری دردناک گرفت کا نشانہ بنیں گے[۵۸] اے اللہ کے رسول یہ غیب کی خبریں ہم تمہیں بذریعہ وحی بتا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو یہ باتیں تم جانتے تھے۔ اور نہ تمہاری قوم۔ بس صبر کرو۔ بلاشبہ انجام متقیوں کے حق میں ہے[۵۹]

واقعہ نوحؑ کی واقعاتی تعبیر

یہ حضرت نوح علیہ السلام کے حالات و واقعات کا آخری حصہ ہے۔ واقعہ کو پڑھتے وقت یہ

بات ذہن میں رکھنی چاہیئے۔ کہ یہ سارا معاملہ جو یہاں دو رکوع میں بیان ہوا ہے۔ اور جس کے چیدہ اجزاء دوسرے مواقع پر قرآن میں آئے ہیں۔ صرف ایک دو صحیفوں میں ختم نہیں ہوئے۔ فی الواقع جن واقعات کے چہرے سے یہاں نقاب ہٹائی ہے۔ وہ ایک نہایت طویل مدت میں پیش آئے ہیں۔ قرآن کا یہ مخصوص طرز بیان ہے۔ کہ وہ قصّہ گوئی محض قصّہ گوئی کی خاطر نہیں کرتا ہے بلکہ سبق آموزی کے لیے کرتا ہے۔ اس لیے ہر جگہ تاریخی واقعات کے بیان میں وہ قصّے کے صرف ان اجزاء کو پیش کرتا ہے۔ جو اس کے مقصد سے تعلق رکھتے ہوں۔ باقی تمام تفصیلات کو نظر انداز کر دیتا ہے۔ پھر اگر کسی واقعہ کو مختلف مواقع پر مختلف اغراض کے لیے بیان کرتا ہے۔ تو ہر جگہ مقصد کی مناسبت سے تفصیلات بھی مختلف انداز میں پیش کرتا ہے مثلاً اسی واقعہ حضرت نوح علیہ السلام کو دیکھئے۔ یہاں اس واقعہ کو پیش کرنے کا مقصد یہ بتانا ہے کہ نبوت کی تکذیب کا انجام کیا ہوتا ہے۔ لہٰذا اس موقعہ پر یہ بتانے کی ضرورت نہ تھی۔ کہ اللہ کا رسول کتنی طویل مدت تک اپنی قوم کو دعوت دیتا رہا۔ لیکن جہاں یہ واقعہ اس لیے بیان ہوا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب کو دعوت کے میدان میں صبر کی تلقین کی جائے۔ وہاں خاص طور پر حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت کی طویل مدّت کا ذکر کیا ہے۔ تاکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے ساتھی اپنی چند سال کی تبلیغی جدوجہد کو نتیجہ خیز نہ ہوتے دیکھ کر دل برداشتہ نہ ہوں۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کی صبر آزما منزل کو دیکھیں۔ جنہوں نے مدت ہائے دراز تک نہایت دل شکن حالات میں دعوت حق کی خدمت انجام دی اور ذرا ہمت نہ ہاری۔

(٥٥) اور حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے رب کے حضور میں دعا کی۔ اور کہا اے میرے مولا۔ میرا بیٹا تو میرے اہل سے ہے۔ اور آپ کا وعدہ یقیناً سچا اور پکا ہے۔ اور آپ سب سے پائیدار اور حکیمانہ فیصلہ کرنے والے ہیں۔ نوح علیہ السلام نے یہ کس وقت عرض کیا۔ کنعان کے غرق ہونے سے پہلے یا غرق ہونے کے بعد۔ دونوں احتمال ہیں۔ نیز کنعان کو اس کی منافقانہ اوضاع و اطوار دیکھ کر غلط فہمی سے مؤمن سمجھ رہے تھے۔ یا کافر سمجھتے ہوئے بارگاہ رب العزت میں یہ گزارش کی۔ دونوں باتوں کا امکان ہے اگر مؤمن سمجھ کر غرق آبی سے پہلے عرض کیا تھا۔ تو مقصود اپنی اضطرابی کیفیت کا اظہار اور اللہ سبحانہٗ سے کہہ کر اس کے بچاؤ کا انتظام کرنا تھا۔ اور اگر غرق آبی کے بعد یہ گفتگو ہوئی۔ تو محض معاملہ کی اصل حقیقت معلوم کرنے کی غرض سے اپنا خلجان یا اشکال پیش کیا۔ یعنی خداوند تو نے میرے گھر والوں کو بچانے کا وعدہ کیا تھا۔ اور کنعان مؤمن ہونے کی وجہ سے **الامن سبق علیہ القول** کے استثناء میں بظاہر داخل نہیں ہے۔ پھر اس کی غرقابی کا راز کیا ہے؟ بلا شبہ آپ کا وعدہ سچا ہے۔ کسی کو یہ خیال نہیں

گزر سکتا کہ معاذ اللہ وعدہ خلافی کی ہو۔ آپ تو احکم الحاکمین اور شہنشاہ مطلق ہیں۔ سمجھ میں آئے یا نہ آئے۔ کسی کو حق نہیں کہ آپ کے فیصلے کے سامنے دم مار سکے۔ یا آپ کو وعدہ خلافی پر مجبور کر دے۔ نہ کسی کا یہ منصب ہے۔ کہ آپ کے حکم ناطق کے متعلق کسی قسم کی نکتہ چینی کر سکے۔ فقط اطمینان قلبی کے لیے بطور استعلام و استفسار اس واقعہ کا راز معلوم کرنا چاہتا ہوں [1]

ارشاد کا موقعہ و محل کے لحاظ سے تقاضا یہ ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے یہ دعا اس وقت کی ہے جب جہاز جودی پر ٹھہر گیا۔ شفقت پدری کے طبعی تقاضا سے مغلوب ہو کر محض اہل کے اس لفظ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے یہ دعا کی جو اوپر آیت واھلك الا من سبق علیہ القول میں گزرا ہے۔ جس میں حضرت نوح علیہ السلام کو حکم ہوا تھا۔ کہ اس جہاز میں ہر چیز کے نر و مادّہ اور اپنے اہل و عیال کو بجز ان کے جن کے بارے میں پہلے فیصلہ ہو چکا ہے۔ سوار کر لو۔ دنیا کی نجات سے مایوس ہونے کے بعد آخرت میں نجات کے لیے دعا کی ہے۔ کیونکہ یہ بات اللہ سبحانہ نے دنیا کی حد تک حضرت نوح علیہ السلام کو دی تھی نہ کہ جہاز میں سوار ہونے والوں کے سوا غرق آبی سے کوئی نہ بچے گا۔ اور اس لیے بھی کہ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنے بیٹے کو جہاز پر سوار ہونے کی دعوت دی۔ اور وہ یہ کہہ کر کہ ساوی الی جبل انکار کر چکا ہے۔ اور جہاز روانہ ہو چکا ہے۔ اور بیٹا آنکھوں کے سامنے غرق ہو چکا ہے۔ تو اب دنیا کی نجات کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا ہے۔ اس لیے اب دعا دنیا کے عذاب سے بچاؤ کی نہیں بلکہ آخرت میں مغفرت کی ہو سکتی ہے۔ قرآن میں آگے فلا تسألن ما لیس لك بہ علم اسی کی تائید کر رہا ہے۔ ظاہر کلام کا تقاضا یہی ہے۔ اب اس تاویل کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کہ ترتیب کے لحاظ سے اس دعا کا ذکر پہلے ہونا چاہیئے تھا۔ غرق ہونے کے بعد یہ دعا صرف اس لیے کی گئی کہ۔

> خدا کی نگاہوں میں یہ شخص حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا ہونے کے باوجود ایسا نابکار تھا کہ جب تک خدا نے اس کو غرق نہیں کر لیا۔ اس کے باب میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعا کو زیر بحث لانا ہی پسند نہیں فرمایا۔

اس توجیہہ میں کوئی معقولیت نہیں ہے۔ بات صاف ہے کہ غرق ہونے کے بعد آخرت میں مغفرت کے لیے دعا مانگی ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ونادی نوح الربہ فقال رب میں نکتہ بلاغت یہ ہے۔ کہ نادٰی دعا کے معنے میں نہیں، بلکہ ارادہ دعا کے معنے میں ہے۔ جیسے اذا قمتم الی الصلوٰۃ میں ارادہ قیام مراد ہے۔ یہاں جملہ کا انداز خلاف مقتضا رظاہر محض اس لیے اختیار کیا گیا ہے۔ کہ نادٰی کے بعد فار آرہی ہے۔ ورنہ ظاہر کا اقتضا یہی تھا۔ کہ قال رب ہو۔ جیسے اذ نادٰی ربہ نداءً خفیا فقال رب۔ اس سے معلوم ہوا ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے دعاء کا ارادہ فرمایا۔ بعدازیں دعار میں تردد ہوا۔ اور الا من سبق علیہ القول میں غور فرمانے لگے۔ مگر غلبۂ شفقت نے تردد کی مہلت زیادہ نہ دی۔ اور دعا مانگ لی۔ اِنَّ ابنی من اہلی۔ اور اس دعا مانگنے کی وجہ یہ ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے خیال میں بیٹا مؤمن تھا۔ قرطبیؒ نے بتایا ہے۔ کہ لا تکن مع الکافرین کا مطلب یہ ہے۔ کہ بیٹے تو ان لوگوں کی معیت اختیار نہ کر جن میں سے تو نہیں ہے۔

ان وعدك الحق فائدۃ الخبر کے لیے نہیں بلکہ لازم فائدۃ الخبر کے لیے ہے۔ یعنی حضرت نوح علیہ السلام اللہ سبحانہٗ کے وعدہ کے سچا اور پکا ہونے کے لیے اپنا علم بتا رہے ہیں۔ یعنی مجھے اس بات کا علم ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ کا وعدہ بالکل پکا ہے۔ اور تاکید کا مقصود صرف بات کی اہمیت جتانا ہے اور وعدہ سے الا من سبق علیہ القول منہم میں کیا ہوا وعدہ مراد ہے۔ اسی وعدہ کا اگلا حصہ ولا تخاطبنی فی الذین ظلموا۔ بتا رہا ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کے اہل میں کچھ ضرور ہوں گے۔ جو جہاز میں سوار نہ ہوں گے۔ اس کا مصداق واقعہ کی روشنی میں صرف حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی نہیں۔ جس کو حضرت نوح علیہ السلام نے سوار ہونے کی دعوت دی ہو۔ اور اس نے سوار ہونے سے انکار کیا ہو۔ جہاز میں سوار نہ ہونے والا علم الٰہی کی رو سے ظالم ہے۔ اور اسے غرق ہونا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو معلوم ہے۔ کہ سوار نہ ہونا اور غرق ہونا کفر کی علامت ہے۔ مگر شفقت پدری کے جوش میں اس آس پر دعا کے لیے ہاتھ اُٹھا دیئے۔ کہ شاید اللہ سبحانہٗ قرابت کی بنیاد پر بیٹے کو معاف فرما دیں۔ آیت میں اس کا قرینہ انت احکم الحاکمین ہے۔ شریعت نوحؑ میں کافر کی عدم مغفرت کا کوئی قانون نہ تھا۔ یہ ایسا ہی ہے جیسے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ابوطالب کے بارے میں فرمایا تھا۔ لاستغفرن لك مالم انه۔ میں ضرور آپ کیلئے دعار مغفرت کروں گا جب تک مجھے روکا نہ جائے۔ اور یہ صورت حال آیت قرآنی میں۔

ماکان للنبی والذین امنوا معہ ان یستغفروا للمشرکین ولو کانوا

ادبی قرب بی۔

نازل نہیں ہوئی تھی۔ آیت قرآنی میں تین جملے بولے ہیں۔ پہلا جملہ ان ابنی من اہلی دوسرا جملہ ان وعدک الحق اور تیسرا جملہ وانت احکم الحاکمین۔ تینوں جملے اہل مقصود کو بطور تعریض پیش کرنے کے لیے آئے ہیں۔ مقصود کا صراحتاً ذکر نہیں کیا یہ بہت ہی عظیم دعار کا ادب ہے۔ گویا بزبان حال اس انداز تکلم سے کہہ رہے ہیں۔ کہ درخواست کروں یا نہ کروں۔

دوسرے بزرگوں نے اس آیت کے بارے میں لکھا ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام نے یہ دعا بیٹے کے ڈوبنے سے پہلے کی تھی۔ مگر قرآن کا سیاق و سباق اس کی ہمنوائی نہیں کرتا۔

(۵۶) حضرت نوحؑ کی درخواست کا جواب

اللہ سبحانہٗ نے فرمایا۔ کہ اے نوحؑ یہ تیرے اہل سے نہیں ہے۔ بلاشبہ وہ تو سرتاسر عمل بد ہے۔ لہٰذا جس چیز کی حقیقت کا تجھے علم نہیں ہے۔ اس کے بارے میں سوال نہ کرو۔ میں تمہیں نصیحت کرتا ہوں۔ کہ نادانوں میں سے نہ ہو جانا۔ جواب ملا: یہ ان گھر والوں میں سے نہیں جن کے بچانے کا وعدہ کیا تھا۔ بلکہ الا من سبق علیہ القول میں شامل ہے۔ کیونکہ اس کے عمل خراب ہیں تم کو اس کے کفر و شرک کی خبر نہیں ہے۔ مقام تعجب ہے کہ پیغمبرانہ فراست کی روشنی میں صریح آثارِ کفر کے باوجود ایک کافر کا حال مشتبہ رہا۔ جس شخص کا واقعی حال تمہیں معلوم نہیں۔ اس کے بارے میں ہم سے ایسی نامناسب رعایت یا اس طرح کی کیفیت مت طلب کرو۔ سفر میں کوئی لائق نہیں کہ وہ بے سوچے سمجھے ادب ناشناس جاہلوں جیسی باتیں کرنے لگے۔ آیت کی یہ تقریر اس صورت میں ہے کہ نوح علیہ السلام کنعان کو مومن سمجھتے ہوں۔ اور اگر وہ کافر سمجھتے تھے۔ تو شاید اس درخواست یا سوال کا منشا یہ ہو کہ انجام کے ذکر میں اہل کو چونکہ عام مومنین سے الگ کر کے ذکر کیا تھا۔ اس سے نوح علیہ السلام نے یہ خیال کیا کہ میرے اہل کو اس دنیا کے عذاب سے محفوظ رکھنے کے لیے ایمان شرط نہیں ہے۔ اور الا من سبق علیہ القول مجمل تھا۔ اس لیے اس کے مصداق کی تعیین نہیں کر سکے۔ بنا بر علیہ شفقتِ پدری کے جوش میں عرض کیا کہ الہ العالمین میرا بیٹا یقیناً میرے اہل میں داخل ہے۔ جس کے بچانے کا آپ وعدہ فرما چکے ہیں۔ پھر یہ کیوں غرق کیا جا رہا ہے۔ یا غرق کر دیا گیا۔ جواب ملا: کہ تمہارا پہلا مقدمہ ان ابنی من اہلی غلط ہے۔ جس اہل کے بچانے کا وعدہ

تھا۔ یہ اس میں داخل نہیں ہے۔ کیونکہ اس کے کرتوت بہت خراب ہیں۔ نیز الا من سبق علیہ القول کے مصداق کا تمہیں کچھ علم نہیں ہے۔ کہ وہ کون لوگ ہیں۔ پھر جس چیز کا تم علم نہیں رکھتے۔ اس کی نسبت ایسے محاجہ کے رنگ میں سوال یا درخواست کرنا تمہارے لیے اچھا نہیں ہے[۱]

یہ تشریح اس مفروضہ پر کی گئی ہے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی یہ درخواست بیٹے کے غرق ہونے سے پہلے ہوئی ہے۔ اور اس وجہ سے ایک نہیں متعدد تاویلات کا سہارا لینا پڑا ہے۔ دوسرے شارحین قرآن نے اسی مفروضہ کے تحت آیت کی تشریح کی ہے۔ لیکن ہم نے آیت کی جو تشریح کی ہے وہ ان تمام خدشات سے پاک ہے۔ اصل بات یہی ہے کہ حضرت نوح علیہ السلام نے بیٹے کو غرق ہوتا دیکھ کر آخرت میں اس کی مغفرت کی دعا کی۔ جواب میں اللہ سبحانہ نے انہ لیس من اھلک کہہ کر بتایا کہ آخرت میں مغفرت کا مدار نسبی کی قرابت نہیں بلکہ ایمانی قرابت ہے۔ اور وہ عمل غیر صالح ہونے کی وجہ سے ناپید ہے۔ آپ کا اہل ہونا ایمان پر موقوف ہے۔ چونکہ ایمان کے مفقود ہونے کی وجہ سے آپ کے اہل سے نہیں اس لیے آپ کو اس قسم کا سوال زیب نہیں دیتا۔ اور یہ آپ کے مقام کے خلاف ہے۔ یعنی یہ سوال آپ کو کرنا ہی نہ چاہیئے تھا۔ اور سوال کرنے سے پہلے غور کر لینا چاہیئے تھا۔ یہ آپ کے مقام سے بہت فروتر ہے۔ کہ آپ ایسے شخص کی مغفرت کی دعا کریں۔ جس کی موت کفر پر ہوئی۔ اور صرف اس لیے کریں کہ اس سے آپ کی نسلی قرابت ہے۔

اندر راہ فلاں بن فلاں چیزے نیست

کسی کام کے لیے قدم اٹھانے سے پہلے غور کر لینا دانشمندی کا تقاضا ہے۔ آپ کا یہ اقدام اس ایمانی دانش کے خلاف ہے۔ بے شک بیٹے سے آپ کا جذباتی تعلق ہے۔ لیکن جذبات میں مغلوب ہو کر تقاضائے عقل سے بیگانہ ہونا آپ کے مقام و منصب کے خلاف ہے۔ یہی مطلب ہے انی اعظک ان تکون من الجاھلین کا۔ مطلب یہی ہے کہ وفور جذبات میں قانونی، اصولی اور عقلی تقاضوں کو پیش نظر نہ رکھنا۔

یہ کہنا کہ انہ لیس من اھلک۔ یہ بیٹا تمہارے خاندان سے نہیں ہے۔ کیونکہ یہ ایمان و عمل صالح کی نعمت سے محروم ہے۔ اس کے یہ معنے نہیں کہ اس کے بیٹا ہونے کی نفی کی جارہی ہے۔ بلکہ اس کا صرف یہ مطلب ہے۔ کہ یہ بیٹا تمہارے ایمانی خانوادے سے تعلق نہیں رکھتا ہے۔ وہ آپ

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کے نبی خاندان کا فرزند ہو تو ہو مگر آپ کے ایمانی خاندان سے اس کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ اور آخرت میں نجات کا فیصلہ قومی یا نسلی قرابت کی بنیاد پر نہیں۔ بلکہ یہ کفر و ایمان کے نزاع کا فیصلہ ہے۔ جس میں صرف اہل ایمان کی مغفرت ہوگی۔ اس نزاع میں سب کا حکم ایک ہے۔ خواہ محمّد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب ہوں یا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے والد ہوں اور یا حضرت نوح علیہ السلام کے صاحبزادے ہوں۔

انہ عمل غیر صالح فرما کر اس اہم حقیقت کی طرف بھی اشارہ کر دیا کہ ایمان کا رشتہ نسلی، لسانی، وطنی رشتوں پر مقدم ہے۔ اس پر سب کو قربان کیا جا سکتا ہے۔ لیکن ایمان کے رشتے کو کبھی قربان نہیں کیا جا سکتا ہے۔ صاحب ایمان کی نظر اس حقیقت پر ہونی چاہیئے۔ کہ رب کی وفاداری کہاں ہے۔ ایمان ایک فکری و اخلاقی صفت ہے۔ مومن اسی صفت کے لحاظ سے مومن کہلاتا ہے۔ اگر ایمان و کفر کے نزاع میں اہل قرابت اہل ایمان کے مقابل ہوں۔ تو اس کے لیے وہ اور اجنبی کافر دونوں برابر ہیں۔

بتانا یہ ہے۔ کہ نبوت کا گھرانہ صرف نسب سے نہیں بنتا بلکہ ایمان و عمل کی موجودگی میں نبوت سے نسبی رشتہ ضرور نافع ہوتا ہے۔ لیکن ایمان نہ ہونے کی صورت میں نبی زادہ ہونا کسی درجہ میں بھی مدارِ نجات نہیں ہے۔

(۵۷) حضرت نوحؑ کی اخلاقی رفعت

حضرت نوح علیہ السلام نے عرض کیا! اے میرے آقا میں اس بات سے تیری جناب میں پناہ لیتا ہوں۔ کہ ایسی بات کا سوال کروں۔ جس کی حقیقت کا مجھے پتہ نہیں۔ اگر آپ نے مجھے معاف نہ کیا اور میرے ساتھ رحمت کا معاملہ نہ فرمایا تو میں تباہ حال ہونے والوں میں سے ہو جاؤں گا۔ حضرت شاہ صاحب فرماتے ہیں۔ کہ آدمی وہی پوچھتا ہے جو معلوم نہ ہو۔ لیکن مرضی معلوم ہونی چاہیئے۔ یہ کام جاہل کا ہے کہ بڑے کی مرضی پوچھنے کی نہ دیکھے پھر پوچھے مرضی کیوں نہ تھی۔ اسے ہم قاعدہ گزشتہ میں بیان کر چکے ہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کانپ اُٹھے اور توبہ کی۔ لیکن یہ نہ کہا کہ پھر ایسا نہ کروں گا کہ اس میں دعویٰ نکلتا ہے۔ بندے کو کیا مقدور ہے۔ چاہیئے کہ اسی کی پناہ مانگے کہ مجھ سے پھر نہ ہو۔ اور دل میں نہ کرنے کا عزم رکھے۔ حضرت آدمؑ اور حضرت یونسؑ کی توبہ کے جو الفاظ قرآن میں نقل ہوئے۔ ان میں بھی ادب ملحوظ رہا۔[1] حضرت نوح علیہ السلام کے مقامِ رفیع اور اخلاقی برتری کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ ابھی جوان جان بیٹا موت کے منہ میں جا چکا ہے۔ اور اس نظارہ سے دل پارہ پارہ ہو رہا ہے۔ اس کی مغفرت کی دعا نہیں بلکہ صرف دعا کا ارادہ ہی فرما رہے ہیں۔ اور صرف اتنا کہہ سکے ہیں۔ کہ یہ میرا بیٹا ہے۔ آپ کا وعدہ برحق اور سر آنکھوں پر آپ احکم الحاکمین ہیں۔ ابھی زبان پر بات نہیں آئی۔ اللہ سبحانہٗ نے بتا دیا کہ یہ انداز سخن مقام نبوت کے شایان شان نہیں ہے۔ جس بیٹے نے حق کو چھوڑ کر باطل کا ساتھ دیا ہے۔ اس کو محض اس لیے اپنا بیٹا کہنا کہ وہ تمہاری نسل ہے محض ایک جذباتی بات ہے۔ نظریاتی دعوت کا یہ تقاضا نہیں ہے۔ تو حضرت نوح علیہ السلام فوراً جذبات سے بے پروا ہو کر اس اندازِ فکر کو اپنا لیتے ہیں۔ جو نظریہ دعوت کی جان ہے۔ اور فرماتے ہیں۔ رب انی اعوذ بک۔ حضرت نوح علیہ السلام بیٹے کے لیے مغفرت کی دعا کے بارے میں یہ سوچ کر چونک گئے۔ کہ قرابت ایمانی کے مقابلے میں قرابت نسبی کی بات جذباتی ہے۔ اور اس کا حقیقت سے دور کا بھی واسطہ نہیں۔ یہ نہیں فرمایا کہ معاف کر دیجئے۔ آئندہ نہ کروں گا بلکہ فرمایا کہ میں تو آپ کی پناہ کا طلب گار ہوں۔ مجھے تو آپ کا آسرا چاہیئے۔ آپ ہی میرے معاذ ہیں۔ آپ کی پناہ میں آکر میں ایسے سوال سے بچ سکتا ہوں۔ جس کا مجھے علم نہیں ہے۔ اگر آپ مجھے معاف کر کے اپنے دامنِ رحمت میں نہ لیں گے۔ تو میں تو ان لوگوں کی صف میں ہو جاؤں گا۔ جو تباہی کے گرداب میں پھنس جاتے ہیں۔

اس دعائی پیمانے انی اعوذ بک میں بڑی بلاغت ہے۔ عوذ کے دو معنے ہیں۔ ایک تھامنے کے اور دوسرے چمٹ جانے کے ہیں۔ اور استعاذ سے دونوں معنے پائے جاتے ہیں۔ یہ استعاذہ اصل میں قلبی کیفیت ہے۔ قلب میں پناہ گیری، چمٹ جانے، بچھ جانے، محتاج ہونے، عاجز و نیاز مند ہونے اور بیقرار ہونے کی حالتیں رونما ہوتی ہیں۔ تو کہنے والے کی زبان پر اعوذ باللہ آتا ہے۔ استعاذے تین ہوتے ہیں۔ مستعیذ، مستعاذ منہ، مستعاذ بہ۔ یہاں مستعیذ حضرت نوح علیہ السلام مستعاذ بہ اللہ سبحانہٗ اور مستعاذ منہ ان اسئلک ما لیس لی بہ علم ہے مستعاذ منہ یہاں نہ گناہ ہے۔ اور نہ شرور میں سے کوئی شر ہے۔ مقام نبوت چونکہ بلند ترین مقام اور اللہ سبحانہٗ سے قرب کا اشرف ترین درجہ ہے۔ اس لیے اپنے مقام رفیع کے لحاظ سے اس کو مستعاذ منہ بنا کر پیش کیا ہے۔ اس لیے یہ مقام عصمت کے بھی منافی نہیں ہے۔ اس لیے یہ گمان بھی نہ ہونا چاہیئے کہ حضرت نوح علیہ السلام کے اندر روحِ اطاعت کی کوئی کمی تھی۔

اصل بات یہ ہے کہ یہ بات انبیاء کے مقام سے متعلق ہے۔ اُن کی استغفار کا پیمانہ ان کے

مقام کی رفعتوں سے مقرر کیا جاتا ہے۔یہی حضرت نوح علیہ السلام کے مقام کی بلندی ہے۔

(۵۸) حضرت نوحؑ اور ساتھیوں پر برکتوں کا نزول

حکم ہوا کہ اے نوح جہاز سے اترو ہماری جانب سے تم پر سلامتی اور برکتیں ہونگی۔نیز ان جماعتوں پر جو تمہارے ساتھ ہیں۔اور کچھ اور جماعتیں جن کو ہم زندگی کے فوائد سے بہرہ یاب کریں گے۔اور دیر بعد ہماری دردناک سزا کا نشانہ بنیں گے۔یعنی کشتی سے جودی پر اور جودی سے زمین پر اتریئے برکتیں اور سلامتی تم پر اور ان قوموں پر رہے گی جو تمہارے ساتھیوں سے پیدا ہونے والی ہیں۔فی الحال جو زمین طوفان سے بالکل اُجڑ گئی ہے۔اللہ سبحانہ دوبارہ آباد کردے گا۔اور اسکی رونق و برکت پھر عود کر آئے گی۔سلامت کے لفظ سے گویا حق سبحانہ نے تسلی فرمادی کہ پھر ساری نوع انسانی پر قیامت سے پہلے ایسی عام ہلاکت نہ آئے گی بلکہ بعضے فرقے ہلاک ہوں گے۔[1]

یہ آیت قرآنی ان مؤرخین اور علماء انساب کی تردید کررہی ہے۔جو تمام انسانوں کا شجرہ نسب حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں کے ساتھ ملاتے ہیں۔اسرائیلی روایات نے یہ غلط فہمی پھیلائی ہے۔کہ اس طوفان سے حضرت نوح علیہ السلام اور ان کے تین بیٹوں اور ان کی بیویوں کے سوا کوئی نہ بچا تھا۔لیکن قرآن متعدد مقامات پر تصریح کرتا ہے۔کہ حضرت نوح علیہ السلام کے خاندان کے سوا ان کی قوم کی ایک معتد بہ تعداد کو بھی اگرچہ وہ تھوڑی تھی۔اللہ نے طوفان سے بچا لیا تھا۔نیز قرآن بعد کی انسانی نسلوں کو صرف حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد نہیں۔بلکہ ان سب لوگوں کی اولاد قرار دیتا ہے۔جنہیں اللہ سبحانہ نے کشتی میں ان کے ساتھ بٹھایا تھا۔ذریۃ من حملنا مع نوح۔اور من ذریۃ آدم، وممن حملنا مع نوح (سورہ مریم) اب من حملنا مع نوح کو امم ممن معک کے ساتھ ملا کر دیکھئے۔آپ ضرور اس نتیجہ پر پہنچیں گے۔کہ حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ جہاز پر سوار ہونے والے اگرچہ اہل کفر کی بہت بڑی تعداد کے مقابلے میں تھوڑے سے تھے۔مگر امتوں کی صورت میں تھے۔اور آپ کو معلوم ہے کہ اُمت کا اطلاق جماعتوں پر ہوتا ہے۔ہر وہ جماعت جس میں کسی قسم کا رابطہ ہو اُسے اُمت کہا جاتا ہے۔ایمان کے لحاظ تو یہ ایک اُمت تھے۔مگر نسل و نسب کے اعتبار سے یہ مختلف جماعتوں پر مشتمل تھے۔تعداد ان کی تھوڑی

[1] افادات شیخ الاسلام

تھی مگر اہل کفر کے مقابلے میں یعنی ان کی اکثریت کے مقابلے میں کتنے تھوڑے نہ تھے۔ جتنے اسرائیلی روایات کی بنا پر شارحین بتا رہے ہیں۔ صرف تفسیر قرطبی میں ما امن معہ الا قلیل کی تفسیر میں جو تعداد بتائی ہے۔ اسے دیکھ کر غور کیجئے۔ کہ اسرائیلی روایات کی بنا پر قلیل بتانے کا شوق کی آخری منزل کیا ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ کی جانب ۸۰ کی تعداد منسوب ہے۔ ایک روایت میں صرف آٹھ ہیں۔ امام اعمش صرف ، بتاتے ہیں حافظ ابن جریرؒ نے یہ کہہ کر قلت کی اس ساری کہانی کو بے جان کر دیا ہے۔

درست بات یہ ہے کہ تعداد کے موضوع پر صرف یہ بات درست ہے کہ وہ تھوڑے تھے۔ لیکن کتنے تھے ؟ یہ اللہ سبحانہ نے مقرر نہیں کیا۔ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اس موضوع پر کوئی صحیح بیان نہیں آیا ہے۔ لہذا جب تک قرآن و سنۃ کا پیمانہ نہ ہو تو قرآن کی بتائی ہوئی بات سے تجاوز نہ کرنا چاہیئے۔

اور کچھ بزرگوں نے پوری انسانیت کو ذریۃ حضرت نوح علیہ السلام بنانے کے شوق میں جہاز میں حضرت نوح علیہ السلام کے ساتھ ہونے والوں کو جہاز سے اترنے کے بعد موت کے منہ میں پہنچا دیا۔ قرآن کے اشارات صاف کہہ رہے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام پر ایمان لانے والے بلا ریب اس تعداد کثیر کے مقابلے میں تھوڑے تھے۔ جنہوں نے حضرت نوح علیہ السلام کو نہیں مانا تھا۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ان کی تعداد ۸ یا ۸۰ تھی۔ بلکہ ان کی تعداد کافی تھی۔ اسی تعداد کے موافق جہاز تیار ہوا تھا۔ خود ہی بتانے والوں نے کہا کہ جہاز کی لمبائی تین سو ہاتھ اور چوڑائی پچاس ہاتھ تھی۔ اور حسن بصریؒ نے بارہ سو ہاتھ بتائی ہے۔ اور ہاتھ کو شانے تک مقرر کیا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاز سو فٹ چوڑا اور چھ فٹ لمبا تھا۔ اور اس میں تین منزلیں تھیں تحتانی منزل حیوانات کے لیے ، درمیانی منزل کھانے پینے کے سامان کے لیے۔ اور فوقانی منزل آدمیوں کے لیے۔ سوچیے کیا یہ عظیم الشان جہاز صرف اسی یا آٹھ آدمیوں کے لیے بنایا تھا۔ اس میں تو ہزاروں کی تعداد رہ سکتی ہے۔ جہاز کی بناوٹ اور سواریوں کی تعداد میں کوئی ربط نہیں ہے۔ ہاں قرآن کی امم ممن معک کی تصریح پیش نظر ہو تو پھر کوئی کھٹک نہیں رہتی ہے اور بات صاف ہو جاتی ہے۔

اس ارشاد کے ذریعے اگر ایک طرف اللہ سبحانہ نے حضرت نوح علیہ السلام کو توبہ کے قبول ہونے کی بشارت دی ہے۔ تو دوسری طرف حضرت نوح علیہ السلام اور ان کی ہمرکاب جماعتوں کو زندگی میں عظیم سلامتی کے ساتھ برکتوں کی خوشخبری سنائی ہے۔ سلامتی تو ظاہر ہے کہ جان و مال، آبرو اور ایمان کو تحفظ

ہوگا۔ اور برکات یہ کہ افرادی قوت میں اضافہ اقتصادی اور معاشی خوشحالی کا فیضان ہوگا۔ اور جملہ اسمیہ سے تعبیر میں ان انعامات کے دیرپا ہونے کی طرف اشارہ ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام نے اپنی قوم کو خطاب کے موقع پر فرمایا تھا۔

استغفروا ربکم انہ کان غفارا یرسل السماء علیکم مدرارا ویمدد کم باموال وبنین ویجعل لکم جنات ویجعل لکم انہارا۔

یعنی تم اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور توبہ کرو۔ اس کے نتیجے میں اللہ سبحانہ

۱۔ باران رحمت نازل فرمائے گا۔

۲۔ تمہارے مالیاتی حالات خوشگوار ہوں گے۔

۳۔ افرادی قوت میں اضافہ ہوگا۔

۴۔ تمہاری معاشی حالت بہترین اور شاندار ہوگی۔

ان ہی چاروں کے لیے یہاں اللہ سبحانہ نے سلام اور برکات کی تعبیر اختیار کی ہے۔ گویا بتا دیا کہ ایمان و عمل کے عوض وہ آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ اس دنیا میں آسائش اور عزت و اقتدار بخشے گا۔ اب قانونی، سیاسی، معاشی، معاشرتی، عائلی، اخلاقی اور زندگی میں بھرپور سلامتی اور برکتیں ہوں۔

اس دعائی پیمانے نے یہ بات بھی کھول دی ہے۔ کہ انبیائی دعوت میں نجات کے لیے کام آنے والی چیز صرف ایمان و عمل ہے۔ وراثت اور نسب سے اس کا کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم خواہ کیسے ہی کام کریں مگر ہم پر خدا کا غضب نہیں نازل ہوسکتا۔ کیونکہ ہمارا نسبی تعلق سادات سے ہے۔ یا ہم فلاں حضرت سے تعلق رکھتے ہیں۔ یہاں بتایا گیا ہے۔ کہ ایک عظیم المرتبت پیغمبر اپنی آنکھوں کے سامنے اپنے لخت جگر کو ڈوبتا دیکھ رہا ہے۔ کڑھ رہا ہے مگر بے بس ہے۔ اور پھر مغفرت کی دعا کرتا ہے۔ تو دربار الٰہی سے کہا جاتا ہے۔ کہ تمہاری اپنے بیٹے سے ایمانی قرابت نہیں ہے۔ نسبی قرابت ہے۔ نجات کے لیے ایمانی قرابت شرط ہے۔ پیغمبر کا باپ ہو یا بیٹا، پیغمبر کا چچا ہو یا پیغمبر کی بیوی کوئی رشتہ، کوئی قرابت ایمانی قرابت کے بغیر کام نہ آئے گی۔

(۵۹) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف روئے سخن

اے اللہ کے رسول یہ غیب کی خبریں ہم آپ کو بذریعہ وحی بتا رہے ہیں۔ اس سے پہلے نہ تو آپ یہ باتیں جانتے تھے اور نہ آپ کی قوم۔ بس صبر کرو انجام متقیوں کے حق میں ہے۔ یعنی یہ

دلائل نبوت میں سے ہے۔ کہ ایک اُمّی کی زبان سے امم سابقہ کے ایسے مستند اور مفصل حالات سنوائے جائیں۔ جیسے نوح علیہ السلام اور ان کے رفقاء کا انجام جلد ہوا۔ آپ کے ساتھیوں کا مستقبل بھی نہایت تابناک اور کامیاب ہے۔ آپ کفار کی ایذاؤں پر صبر کریں۔ گھبرا کر تنگدل نہ ہوں۔ جیسے نوح علیہ السلام نے ساڑھے نو سو سال صبر کیا ہے۔[1]

واقعہ بیان کرنے کے بعد روئے سخن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف ہو گیا۔ اس آیت میں دو باتیں بتائی ہیں۔ ایک کا تعلق تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مخالفین سے ہے۔ اور دوسری کا تعلق خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مقام نبوت سے یعنی اس کام سے جس کو انجام دینے کے لیے آپ تشریف لائے ہیں۔

پہلی بات حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر رکھ کر مخاطبوں کو سنائی ہے کہ زمانہ ماضی کے واقعات کا علم نہ تو حواس کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ کہ حواس سے صرف موجود کا علم ہوتا ہے۔ اور نہ عقل و فکر کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اگر ہو سکتا ہے تو نقل و روایت کے ذریعے۔ لیکن جس کے لیے تحریر و روایات کا ذریعہ یقینی طور پر مسدود ہو اس کے لیے ان کا علم اگر ہو سکتا ہے۔ تو نبی ہی کے ذریعے ہو سکتا ہے۔ اس آیت میں واقعات کے علم کے طبعی طریقے کی نفی کی گئی کہ آپ کو اس کا علم نہ تھا۔ اب رہ گیا کسی انسانی ذریعہ سے استفسار اس کی نفی پہلے ہی سے ہے۔ کہ تیری قوم میں کسی کو معلوم نہ تھا۔ اب اس کا علم آپ کو جس غیر طبعی طریقہ سے دیا گیا ہے۔ وہ اللہ سبحانہٗ کی وحی ہے۔ اور نبی اسی کو کہتے ہیں۔ جس کے علم کا ذریعہ اللہ سبحانہٗ کی وحی ہو۔ نبی کی یہی حقیقت بتانے کے لیے حضرت امام بخاریؒ نے اپنی کتاب کا آغاز قرآن کی اس آیت سے انا اوحینا الیک کما اوحینا الی نوحؑ الخ کیا ہے۔

ہم اس علمی ذریعہ یعنی وحی پر کوئی تبصرہ نہیں کرتے ہیں۔ یہ علمی ذریعہ کسبی نہیں خالصۃ وہبی ہے۔ حکیم الامت نے شاہ ولی اللہ اس ذریعہ علمی پر حجۃ اللہ البالغہ میں بہترین کلام کیا ہے۔ یہاں آیت کا منطوق چونکہ اس کے پاس علمی ذریعہ ہے۔ تو تم کیوں عناد سے انکار کر رہے ہو۔ اس انکار و سرکشی کا نتیجہ وہی ہوگا۔ جو تم واقعہ نوحؑ میں سُن چکے ہو۔ اعمال اور ان کے نتائج میں چولی دامن کا ساتھ ہوتا ہے۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ تم نبوت کے مدِمقابل ہو۔ عناد و بغض اختیار کرو، حق کے راستے میں روڑے اٹکاؤ۔ اور تمہارے اوپر کوئی گرفت نہ ہو۔ یہ واقعہ نوح علیہ السلام بتا رہا ہے۔ کہ ایک مرتبہ کا حادثہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ایک مرتبہ کا حادثہ نہیں۔ جو اس ونتائج دائمی ہیں۔ تاریخ کا صحیح استعمال یہی ہے۔ کہ گزشتہ کا مطالعہ سے آئندہ کے لیے عبرت حاصل کی جائے۔ یعنی جو کچھ گزر چکا ہے۔ وہ آئندہ کے لیے ذخیرہ بصیرت ہے۔ اور ماضی کے آئینے میں مستقبل کی صورت دیکھی جا سکتی ہے۔ ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ اگر مانتے نہیں تو کم از کم حق کے مقابلہ میں سرکشی کرنا چھوڑ دو۔ کیونکہ سرکشی کا نتیجہ عذاب ہے اگر اس نشہ میں ہو۔ کہ ہم حضرت ابراہیمؑ و اسماعیلؑ کی اولاد ہیں۔ تو حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کے انجام سے عبرت پکڑو۔ اللہ کا عذاب نسب نامے نہیں دیکھتا ہے۔ عذاب نسبوں اور نسبتوں سے نہیں ٹلتا ہے۔

دوسری بات خاص حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے فرمائی گئی۔ فاصبر ان العاقبة للمتقین۔ یعنی صبر کیجیے۔ صبر کے معنے ڈٹنے اور سہنے اور روکنے کے آتے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ جو کام آپ کو بتایا ہے۔ اس کو خوب جم کر اور ڈٹ کر حضرت نوح علیہ السلام کی طرح کیجیے۔ دیکھ لیجئے ۹۵۰ سال کی جانفشانی اور محنت کے نتیجے میں برکتوں کا نزول ہوا۔ اور دشمنوں کی تباہی رونما ہوئی۔ اور اس راہ میں جو بھی تکلیف آئے۔ سہتے جائیے۔ اور حضرت نوح علیہ السلام کی طرح مصائب کا خندہ پیشانی سے استقبال کیجیے۔ اور اپنے آپ کو جزع و فزع اور شکوہ و شکایت سے حضرت نوح علیہ السلام کی طرح روکے رکھیئے۔ ظاہر ہے کہ صبر کا مطالبہ عموماً نامناسب اور ناموافق حالات میں کیا جاتا ہے۔ سورۂ ہود جس [illegible] میں نازل ہوئی ہے۔ اس کے پُرآشوبی کا اندازہ اس سے لگایئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم صحنِ حرم میں نماز پڑھ رہے تھے۔ رؤسائے قریش ادھر اُدھر بیٹھے ہنسی اور دل لگی کی باتیں کر رہے تھے۔ ابوجہل نے کہا کہ کون مذبح میں جا کر وہاں سے اُونٹ کی اُوجھڑی اٹھا لائے گا۔ چنانچہ ایک شریر نے یہ خدمت انجام دی اور جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سجدہ میں گئے تو وہ نجاست کا لادہ آپ کی پشت مبارک پر ڈال دیا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اس بوجھ کی وجہ سے سر نہیں اُٹھا سکتے تھے۔ اور کفار اس منظر کو دیکھ کر ہنسی سے بے قابو ہو رہے تھے۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ جو اس موقعہ پر موجود تھے کہتے ہیں۔ کہ میں یہ دیکھ رہا تھا۔ لیکن مجھ میں اتنی طاقت نہ تھی کہ میں ان کے سامنے کچھ کر سکتا۔ اسی اثنا میں کسی شخص نے جا کر حضرت فاطمہؓ کو اطلاع دی جو اس زمانہ میں بچی تھیں۔ وہ آئیں اور اس نجاست کو ہٹایا۔ یہ پہلا موقعہ ہے۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم رؤسائے قریش کے ایمان سے قطعاً مایوس ہوئے ہیں۔ اور یہ اس لیے نہیں کہ آپ کے جسم مبارک کو تکلیف پہنچی۔ بلکہ اس لیے کہ وہ لوگ نماز میں خلل انداز ہوئے۔ یہ روسائے قریش کی مہلت کا آخری موقعہ تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بلند آواز میں بددعا کی مگر پھر بھی رحمت عالم کی شفقت دیکھئے۔ کہ حضرت نوح علیہ السلام کی طرح یہ نہیں فرمایا۔

رب لاتذر علی الارض من الکافرین دیارا ۔ بلکہ صرف قریش کے رؤساء کے حق میں بد دعا کی ۔ اور ان میں سے بھی صرف سات رئیسوں کے نام لیے ۔ اور فرمایا کہ خداوندا قریش کے سرداروں کو لے ۔ خداوندا ابوجہل، عتبہ، شیبہ، عقبہ ابن معیط، امیہ ابن خلف، ولید بن عقبہ اور ابی بن خلف کو پکڑ ۔ یہ دعا سُن کر سب کے ہوش اڑ گئے[لہ] ان ہی حالات میں فرمایا فاصبر ۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ

تکذیب کرنے والوں کی تکذیب پر اور ان کی جانب سے ہونے والی تکلیفوں پر صبر کیجیے ۔ ہم ضرور مدد کریں گے اور اپنی عنایت کریں گے ۔

اور علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں ۔

جب آپ وحی کے ذریعے حضرت نوح علیہ السلام کی دعوتی داستان سُن چکے ہیں تو راہِ دعوت میں آنے والی تکلیفوں پر صبر کیجیے ۔

علامہ قرطبی فرماتے ہیں ۔

آپ حکم الٰہی کی بجاآوری پر ڈٹے رہیئے اور اس راہ میں جو تکلیفیں آئیں ان کو حضرت نوح علیہ السلام کی طرح سہتے جایئے ۔

آخر میں فرمایا والعاقبۃ للمتقین یعنی انجام کار متقیوں کے حق میں ہوتا ہے ۔ دو چیزیں ہیں اور دونوں کے تقاضے الگ الگ ہیں ۔ ایک انفرادی صلاح و فلاح دوسری اجتماعی فلاح و صلاح یہاں دوسری بات بیان ہو رہی ہے ۔ اور بتایا جا رہا ہے ۔ کہ اجتماعی فلاح کے لیے ضروری ہے ۔ کہ آپ کی رفاقت میں متقیوں کی جماعت ہو ۔ ایک دوسرے موقع پر انفرادی کامیابی کا ذکر کیا ہے ۔

نحن نرزقك والعاقبة للتقوى

ہم ہی آپ کو روزی دیتے ہیں ۔ اور انجام کار متقیوں کے لیے ہے ۔

یہاں انفرادی نہیں اجتماعی فلاح کا ذکر ہے ۔ اس لیے متقین کی تعبیر اختیار کی ہے ۔ اور مطلب یہ ہے کہ صبر کی آخری منزل یہ ہے ۔ کہ اجتماعی تقویٰ پر مشتمل ایک جماعت آپ کی رفاقت میں آجائے اگر ایسی جماعت جو تقویٰ کے زیور سے آراستہ ہو ۔ آپ کے صبر سے وجود میں آگئی تو جس طرح نوح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کا آخر میں بول بالا ہوا ۔ اسی طرح آپ کا اور آپ کے ساتھیوں کا بول بالا ہوگا ۔ اللہ کا

لہ افادات شیخ الاسلام

قانون یہی ہے کہ آغاز کار میں دشمنان حق خواہ کتنے ہی کامیاب ہوں۔ مگر آخری کامیابی صرف ان لوگوں کا حصہ ہوتی ہے۔ جو اللہ سے ڈر کر فکر وعمل کی غلط راہوں سے بچتے ہوئے حق کے لیے کام کرتے ہیں۔ گویا رفاقت کی زندگی اختیار کرنے والوں کو خبردار کر دیا گیا ہے۔ اس راہ میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ صبر کے جذبے کو ہر رفیق دوسرے رفیق کے متعلق زندہ کر کے رفاقت کے رشتہ کو قائم کرے۔ اس لیے قرآن نے اصبر کے بعد والعاقبۃ للمتقین کہہ کر انتخاب رفقار کا قانون بتایا ہے رفقار کا معیار، مال و دولت جاہ و اقتدار، رنگ و نسل نہیں ہے۔ بلکہ تقویٰ اور صرف تقویٰ ہے۔ اور اسی کی بنیاد پر رفاقت کی عمارت استوار ہوتی ہے۔ قرآن نے متقی جماعت کی خود علامتیں بتائی ہیں۔ اور حضور کو ارشاد فرمایا واصبر نفسك اپنے آپ کو تھامے رکھیئے، کن کے ساتھ! ان کے ساتھ۔ الذین یدعون ربھم بالغداۃ والعشی یریدون وجھہ۔ وہ جو صبح و شام اللہ سبحانہ کو اپنی مراد بنا کر پکارتے رہتے ہیں۔ یہ ان متقین کی شناخت کی پہلی قرآنی علامت اور نشانی ہے۔ علامہ شوکانی ان الفاظ کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں۔

سارے اوقات میں دعائیں کرتے رہنا اسی کی طرف اشارہ ہے۔

اس کا مطلب یہی ہے۔ کہ اللہ سبحانہ کے ساتھ اپنے احتیاجی تعلق کے احساس کو ہمہ دم مسلسل بغیر کسی انقطاع کے زندگی کے ہر موڑ پر اپنے اندر بیدار رکھنا اور اسی احساس کے زیر اثر چھوٹی بڑی ضرورت میں اسی کی طرف پلٹنا اور اسی کو پکارتے رہنا ہی ان کی زندگی کا مشغلہ اور یہی ان کا اوڑھنا بچھونا بنا ہوتا ہے۔ اور فقر نام احتیاج مطلق فقط سوال صرف بھیک کی اسی پستی میں جو بلندی ان کو حاصل ہوتی ہے۔ یریدون وجھہ کے فقرے میں اس کی تصویر پیش کی گئی ہے۔ اس کا صاف مطلب یہ ہے۔ کہ ان کو اپنی دعاؤں اور پکاروں کے جواب میں جو کچھ بھی ملتا ہے۔ اس میں اپنی اپنی زندگی کے منطقی نتیجہ سے زیادہ ان کو اپنا رب اور اس کا فضل و احسان نظر آتا ہے۔ ان کی نگاہ کسی حال میں بھی وجہ اللہ سے نہیں ہٹتی۔ حتیٰ کہ جنت بھی ان کے سامنے ہوگی۔ تو وہ بھی ان کو رسوائے من اللہ کا پیمانہ محسوس ہوگا۔ وہ محسوس کریں گے۔ کہ رب ہی اپنی رضامندیوں کے ساتھ ان کے سامنے بے نقاب ہو کر آگیا ہے۔ الغرض اللہ سبحانہ کے ساتھ فقر و احتیاج کا دوامی تعلق اور ہر حال میں اللہ ہی کو مراد بنائے رکھنا ان ہی دو علامتوں سے قرآن نے ان متقین کی شناخت کرائی ہے۔ ان ہی کے لیے فلاح کی راہیں کھلتی ہیں۔ والعاقبۃ للمتقین۔

وَإِلَىٰ عَادٍ أَخَاهُمْ هُودًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ
اعْبُدُوا اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ إِنْ أَنتُمْ إِلَّا مُفْتَرُونَ ﴿٥٠﴾
يَا قَوْمِ لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ أَجْرًا ۖ إِنْ أَجْرِيَ إِلَّا عَلَى الَّذِي
فَطَرَنِي ۚ أَفَلَا تَعْقِلُونَ ﴿٥١﴾ وَيَا قَوْمِ اسْتَغْفِرُوا رَبَّكُمْ ثُمَّ
تُوبُوا إِلَيْهِ يُرْسِلِ السَّمَاءَ عَلَيْكُم مِّدْرَارًا وَيَزِدْكُمْ قُوَّةً
إِلَىٰ قُوَّتِكُمْ وَلَا تَتَوَلَّوْا مُجْرِمِينَ ﴿٥٢﴾

اور ہم نے قوم عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام ان کے بھائی کو روانہ کیا۔
حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا: اے میری قوم اللہ سے عابدانہ تعلقات
پیدا کرو۔ اللہ کے سوا تمہاری عابدانہ نیازمندیوں کا کوئی مستحق نہیں ہے
عبادت کے موضوع پر تمہاری زندگی افترا کے سوا کچھ نہیں ہے[۱۶۰]
اے میری قوم میں اپنے کام پر تم سے کسی اُجرت کا خواہاں نہیں ہوں۔
میری اُجرت تو وہی دے گا جس نے مجھے پیدا کیا ہے۔ کیا اتنی
سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ہے[۱۶۱] اور اے میری قوم تم اپنے
گناہوں کی اللہ سے معافی مانگو۔ پھر آئندہ کیلئے گناہ نہ کرنے کا عہد کرو۔
وہ تم پر برستے ہوئے بادل روانہ کرے گا۔ اور تمہاری طاقت میں اور

طاقت بڑھائے گا۔ اور مجرمانہ انداز میں اس سے منہ نہ موڑو۔[۶۲]

عاد اور قوم عاد کا تاریخی چہرہ

السنۂ سامیہ میں لٹریچر کے لحاظ سے عبرانی زبان سب سے قدیم زبان ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ قدیم الفاظ کی اصلیت عربی سے زیادہ اس میں محفوظ ہے۔ لغوی حیثیت سے عربی میں عاد کے کوئی معنے نہیں ملتے۔ عبری میں عاد کے معنے بلند و مشہور کے ہیں۔ تورات میں عاد مذکر ہے۔ اور اس کا مؤنث عادہ ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ عہد قدیم میں یہ نام عموماً مستعمل تھا۔

نام کے بعد دوسری بحث زمانہ کی ہے۔ عرب قبل از اسلام میں کوئی باقاعدہ تاریخ رائج نہ تھی۔ اس لیے عرب بائدہ کا کوئی زمانہ مذکور نہیں لیکن اس بنا پر کہ مؤرخین عرب نے عاد کو عوض بن ارم بن سام کا حقیقی فرزند لکھا ہے۔ اس لیے اس کا زمانہ ...۳ قبل مسیح سے پہلے قرار دینا چاہیئے۔ قرآن حکیم نے عاد کا ذکر خلفاء قوم نوحؑ بنا کر کیا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ بنو سام کی پہلی ترقی شام کی دوبارہ آبادی کے بعد عاد سے شروع ہوتی ہے۔ اس لیے آیت قرآنی اذ جعلکم خلفاء من بعد قوم نوحؑ میں نہ صرف زمانہ کی تعین ہوتی ہے۔ بلکہ ہمارے اس خیال کی بھی تائید ہوتی ہے۔ کہ ام سامیہ اولی اور علی الاغلب عاد ایک ہی چیز ہے۔ اسی قرآن نے ان کو عاد الاولی وانہ اہلک عاد الاولی۔ لیکن بنو سام کی حقیقی ترقی کا زمانہ ...۲۲ قبل مسیح یا ...۲ قبل مسیح ہے۔ سامی اقوام کے مصر و بابل پر حملہ کی بھی یہی تاریخ ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ عاد کا زمانہ ...۲۲ قبل مسیح سے شروع ہوتا ہے۔ انتہائے مدت کی تعین کی صورت ہے۔ کہ ...۱۵ قبل مسیح میں یمن میں ایک دوسری قوت کا ظہور معلوم ہوتا ہے۔ اور اس سے کچھ ہی پہلے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا زمانہ ہے۔ حضرت موسیٰؑ سے پہلے عاد کی عام تباہی ہو چکی تھی۔ قرآن عزیز نے نقل قصص میں ہمیشہ عاد کا ذکر حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے کیا ہے۔ اس لیے عاد کی عظمت کا زمانہ ...۲۲ قبل مسیح سے ...۱۷ قبل مسیح تک ہے۔

عاد کا مقام کیا ہے؟ ان کی مرکزی آبادی عرب کے بہترین حصے یعنی یمن و حضرموت سواحل خلیج فارس سے حدود عراق تک تھی۔ دراصل حکومت کا مرکز یمن تھا۔ لیکن خلیج فارس کے کنارے کنارے وہ عراق تک وسیع تھی۔ جس سے آسانی سے وہ راہ معلوم ہو سکتی ہے۔ جدھر سے یہ قوم عرب سے عراق

اور عراق سے دیگر ممالک میں پھیلی ۔ (ارض القرآن)

(۶۰) اور ہم نے قوم عاد کی طرف حضرت ہود علیہ السلام ان کے بھائی کو روانہ کیا ۔حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا: اے میری قوم تم اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو ۔ اللہ کے سوا تمہاری عابدانہ نیازمندیوں کا کوئی مستحق نہیں ہے ۔عبادت کے موضوع پر تمہاری زندگی افترار کے سوا کچھ نہیں ہے ۔کہ پتھر کے بت بھی بااختیار، حاکم بلکہ معبود ہیں ۔[1]

قوم عاد عرب کی قدیم ترین قوم ہے ۔ اُن کی شوکت وحشمت ضرب المثل تھی ۔ اسی شہرت کی وجہ سے ہر قدیم چیز کے لیے عادی کا لفظ بولا جاتا ہے ۔ آثارِ قدیمہ کو عادیات کہتے ہیں ۔جس زمین کے ممالک باقی نہ رہے ہوں ۔ اور جو آباد کار نہ ہونے کی وجہ سے افتادہ پڑی ہوئی ہو ۔ اسے عادی الارض کہتے ہیں قدیم عربی شاعری میں اس قوم کا بڑی کثرت سے ذکر آتا ہے ۔ ان کی حکومت وسیع ہونے کے ساتھ بڑی طاقتور تھی ۔ ان کا نعرہ تھا ۔من اشد مناقوۃ ۔ ہم سے زیادہ طاقتور کون ہے ؟

پرستش میں ان کے تعلقات اللہ سبحانہٗ کو چھوڑ کر اُن کے وہی معبودوں سے تھے ۔قرآن سے معلوم ہوتا ہے ۔کہ معبودان باطل کی پرستش ان میں عام تھی ۔ظلم وجور ان کی حاکمانہ زندگی کا سب سے بڑا نشان تھا ۔ اپنے ممالک میں اکڑتے پھرتے ۔بغیر کسی تحقیق کے قوموں کو چھیڑتے تھے ۔عاد کی اس جباری اور ستمگری کا ثبوت مصری مفتوح اقوام کی زبان سے بھی ملتا ہے ۔

قرآن نے قوم عاد کے دو جرم بتلائے ہیں ۔ایک اللہ کے سوا مظاہر آثار اور خود تراشیدہ شخصیتوں کے اسمار کی پرستش ان کا مذہب تھا ۔حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم عاد کو سمجھاتے ہوئے فرماتے ہیں

اتجادلونني في اسماء سميتموها انتم وآباءكم ۔

یہ ان کے عابدانہ کردار پر ایک ضرب کاری ہے ۔جن کی تم عبادت کرتے ہو ۔ اور جن ناموں کی تم دہائی دیتے ہو ۔یہ سارا صرف ناموں کا گورکھ دھندہ ہے ۔ اور سب کا سب افسانہ تمہارا افترائی ہے ۔تم کسی کو بارش کا کسی کو ہوا کا ، کسی کو دولت کا اور کسی کو بیماری کا رب کہتے ہو ۔ حالانکہ کوئی بھی فی الحقیقت رب نہیں ہے ۔یہ سب افترارات ہیں ۔ اگر آپ کسی کو اللہ کے سوا مشکل کشا کہتے ہیں ۔ یا داتا کہتے ہیں یا گنج بخش کہتے ہیں ۔ ایسے سب نام محض نام ہیں ۔جن کے پیچھے کوئی مسمّیٰ نہیں ہے ۔ اور ناموں کی یہ ترش توہمات کی تخلیقات ہیں ۔اس لیے ان کا سرمایہ افترائی ہے ۔ اس جرم میں تو پوری قوم شریک تھی ۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چھوٹے بڑے، ادنیٰ، اعلیٰ، امیر، غریب، حاکم اور محکوم سب ہی اس حمام میں برابر کے ننگے تھے۔ اجسام پرستی، ستارہ پرستی، بُت پرستی، ارواح پرستی موجود تھی۔ لیکن استقصاء سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عام قومی مذہب ستاروں اور روحوں کے خیالی مجسموں کی پرستش کرنا تھا۔ حضرت ہود علیہ السلام نے اسی بات کو فی اسماء سمیتوھا میں ظاہر کیا ہے۔

دوسرا جرم ان کا قرآن نے جو بتایا ہے۔ فاستکبروا فی الارض قوم عاد نے ملک میں بڑائی لی۔ ان کی بڑائی ملک میں یہی تھی۔ کہ سرکش و جبّار بنے ہوئے تھے۔ اور ملک میں صرف خدا کے نافرمان نہ تھے۔ بلکہ ملک میں اللہ کی نافرمانی پر مبنی قوانین بناتے تھے۔ اور لوگوں کو اسی پر چلنے کے لیے مجبور کرتے تھے۔ قرآن کی زبان میں اسی استکبار کا نام طغیان ہے۔ اور اس کردار کے مالک کو الطاغوت کہتے ہیں۔ اور لوگوں کے ان مستکبرین کے تحت تابعدارانہ زندگی گزارنے کا نام بندگی ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام پرستش اور بندگی دونوں کے بارے میں بتا رہے ہیں کہ تمہارے عابدانہ تعلقات صرف اللہ سے ہونے چاہییں۔ نیازمندانہ اعمال اور نذر و نیاز طلبگاری، رکوعوں، سجدوں میں دور سے پکارنے، روح کی تربیت کے سارے اطوار میں، اخلاق، عائلی زندگی، معاشرتی اطوار، معاشی اقدار، سیاسی نظام اور قانون کی اطاعت کی حد میں صرف اللہ کی عبادت ہونی چاہیئے۔ اسی لیے جن بزرگوں کی نظر قوم کی قانون و سیاست پر گئی انہوں نے مالکم من الٰہٍ غیرہٗ کے معنے یہ کیئے ہیں۔ کہ اللہ کے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں۔ اور جن کی نگاہ قوم کی پرستاری پر گئی۔ انہوں نے ترجمہ یوں کیا ہے۔ کہ اللہ کے سوا پوجا کے لائق کوئی نہیں۔ اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کہ مالکم من الٰہ غیرہٗ کے مفہوم میں پرستش اور بندگی دونوں داخل ہیں۔ اللہ کو صرف حاکم سمجھنا ضرور غلط ہے۔ مگر اس سے زیادہ غلط یہ بات ہے۔ کہ الٰہ کے مفہوم میں حاکمیت کا تصور ہی نہ مانا جائے۔ اسی طرح یہ بھی بالکل صحیح ہے۔ کہ کسی نبی نے اپنی دعوت ان لفظوں میں نہیں دی تھی۔ کہ لوگو! اللہ کی حکومت قائم کرو۔ کیونکہ اس کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے۔ بلکہ ہر نبی کی دعوت کے الفاظ یہی تھے۔ اعبدوا اللہ مالکم من الٰہٍ غیرہٗ۔ اللہ کی عبادت کرو اسکے سوا تمہارا الٰہ کوئی نہیں۔ مگر کون کہہ سکتا ہے۔ کہ ان الفاظ کے مفہوم میں ان لفظوں کا مفہوم بھی پوری طرح شامل نہیں ہے۔ کیونکہ یہ بات اسی وقت کہی جا سکتی ہے۔ جبکہ عبادت کا مفہوم صرف پرستش ہوتا بندگی نہ ہوتا۔ لیکن جب یہ حقیقت ہے۔ کہ عبادت کے مفہوم میں پرستش اور بندگی دونوں داخل ہیں۔ کیونکہ جیسے پرستش اللہ سبحانہٗ کی محبوبیت کا تقاضا ہے۔ ایسے ہی بندگی اللہ سبحانہٗ کی حاکمیت کا ناگزیر مطالبہ ہے۔ مالکم من الٰہٍ غیرہٗ کے معنے موقع و محل کی مناسبت سے کیئے جن کی

نگاہ اللہ سبحانہ کی شان محبوبیت پر ہوتی ہے ۔ وہ معنے یوں کرتے ہیں ۔ کہ اللہ کے سوا تمہارا معبود کوئی نہیں ہے ۔ اور جن کی نگاہ اللہ کی شانِ حاکمیت پر ہوتی ہے ۔ اور نبوت کا خطاب اربابِ اقتدار سے ہوتا ہے ۔ وہ ترجمہ یوں کرتے ہیں ۔ کہ اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے ۔ بزرگوں میں شاہ عبدالقادرؒ نے حضرت نوحؑ، حضرت ہودؑ، حضرت صالحؑ، حضرت شعیبؑ اور حضرت موسیٰؑ کے مخاطبات میں ترجمہ یہی کیا ہے ۔ دیکھ لیجئے آٹھویں پارے بارہویں پارے کے خطابوں میں الٰہ کا ترجمہ حاکم اور عبادت کا ترجمہ بندگی ہے ۔ تراجم میں بے جان بے روح اور بے مقصد ترجمہ ان لوگوں کا ہے ۔ جو یہ کہتے ہیں : لوگو ! خدا کے سوا تمہارا خدا کوئی نہیں ہے ۔ حالانکہ نبوت کے مخاطبوں میں منکرین خدا نہیں بلکہ مشرکین ہیں ۔

بہر حال حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم کو مخاطب کرکے کہا ہے ۔ لوگو ! عبادت واطاعت، پرستش اور بندگی، اطوار پرستش اور اقدار بندگی میں تمہاری روحانی، معاشرتی، اخلاقی، معاشی اور سیاسی زندگی پوری کی پوری بلا استثناء افترائی ہے ۔ یہ سب کچھ تمہارے توہمات اور تمہاری خواہشوں کے خود ساختہ پیمانے ہیں ۔ ان کی پشت پر کوئی سلطانی دلیل نہیں ہے ۔ اللہ سبحانہ سے تعلقات بندگی کے ہوں یا پرستش کے ۔ ان دونوں میں فساد جن راہوں سے آتا ہے ۔ ان میں قرآن کی نظر میں سب سے زیادہ اہمیت افترا کی ہے ۔ دونوں تعلقات افترارات کا مجموعہ بن جاتے ہیں ۔ اور افترائی زندگی کی بنیاد علم کا صحیح نہ ہونا ہے ۔ نبوت علم ہی کی تصحیح کے لیے آتی ہے ۔ اس لیے ہر افترا پر ٹوکتے ہوئے باآواز کہتی ہے ۔ ما انزل اللہ بها من سلطان ۔ اسی لیے حضرت ہود علیہ السلام نے اپنی قوم سے صاف کہا ہے ۔ اور پوری قوت سے تفسر کے ساتھ کہا ہے ۔ ان انتم الا مفترون ۔ تم اللہ سبحانہ کے نام پر جو کچھ کہہ رہے ہو ۔ کر رہے ہو ۔ سب کا سب جھوٹ اور صرف جھوٹ ہے جھوٹ کے سوا اس میں کچھ نہیں ہے ۔

(۶۱) حضرت ہودؑ کی بیقراری

اے میری قوم میں اپنے کام پر تم سے کسی اُجرت کا خواہاں نہیں ہوں ۔ میری اُجرت تو وہی دے گا جس نے مجھے پیدا کیا ہے ۔ کیا اتنی سی بات تمہاری سمجھ میں نہیں آتی ہے ۔ یعنی تمہارے مال کی مجھے ضرورت نہیں ہے ۔ میرا پیدا کرنے والا ہی تمام ضروریات اور اُخروی اجر و ثواب کا کفیل ہے ۔ یہ بات ہر ایک پیغمبر نے اپنی قوم سے کہی ہے ۔ تاکہ نصیحت بے لوث اور مؤثر ہو ۔ لوگ ان

کی محنت کو دنیوی طمع پر محمول نہ کریں ۔ آگے فرمایا افلا تعقلون یعنی اس قدر غبی ہو ، اتنی موٹی بات بھی نہیں سمجھتے ۔ کہ ایک شخص بے طمع ، بے غرض محض دردمندی اور خیر خواہی سے تمہاری فلاح دارین کی بات کہتا ہے ۔ تم اسے دشمن اور بدخواہ سمجھ کر دست و گریباں ہوتے ہو[1]

انبیار کی دعوت میں تبشیر و انذار دونوں ہوتے ہیں ۔ تبشیر یعنی بشارت دینا اور خوشخبری سنانا ۔ اور انذار اللہ سبحانہٗ کے جلال سے ڈرانا ، عذاب الٰہی کا خوف دلانا ، اور لوگوں کو ان کے عذاب بد سے آگاہ کرنا ۔ اور انبیار کی یہ شان اس لیئے ہوتی ہے ۔ کہ اللہ سبحانہٗ کی حجت بندوں پر پوری ہو جائے ۔ وہ اس انذار میں لوگوں کے سامنے اپنی خیر خواہی ، دلسوزی اور اخلاص مندی کا اعلان کرتے ہیں ۔ انا لکم ناصح امین ۔ وہ اپنی بے لوثی ، بے غرضی کو ظاہر کرتے ہیں ۔ لا اسالکم علیہ اجرا ۔ یعنی وہ اس خیر خواہی پر مخاطبوں سے کسی اُجرت کے خواہاں نہیں ہوتے ہیں ۔ علامہ آلوسیؒ نے یہ بات یہاں بالکل برموقع لکھی ہے ۔ کہ حضرت ہود علیہ السلام اس کے ذریعے لوگوں کے ذہنوں میں اُبھرے ہوئے اس وہم کو دُور کر رہے ہیں ۔ کہ شاید مادیت کے متوالے سوچنے لگیں کہ اس کارنبوت کی پشت دنیا حاصل کرنے کی فکر میں کام کر رہی ہے ۔ اور اسے جاہ و وقار کی طمع ہے ۔ فرمایا کہ میری خیر خواہی قطعاً بے لوث ہے ۔ اس میں طمع کی کوئی ملاوٹ نہیں ہے ۔ یہ بات تھوڑی سی عقل والا بھی سمجھ سکتا ہے کہ جو بغیر لالچ اور طمع کے محنت کر رہا ہے ۔ وہ بلا شبہ پیکر اخلاص ہے ۔ افلا تعقلون میں ایک بڑا استدلال چھپا ہوا ہے ۔ یعنی یہ کہ میری دعوت کو جس انداز پر تم نظر انداز کر رہے ہو ۔ اور اس پر غور نہیں کرتے ہو ۔ یہ صاف اس بات کی نشانی ہے کہ تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے ہو ۔ ورنہ اگر عقل سے ذرا بھی کام لیتے تو ضرور سوچتے کہ جو شخص کسی ذاتی غرض کے بغیر دعوت و تبلیغ ، تبشیر و انذار اور تذکیر و نصیحت پر یہ گوناگوں تکلیفیں برداشت کر رہا ہے ۔ جس کی تگ و دو میں شخصی یا خاندانی مفاد کا شائبہ تک نہیں ہے ۔ وہ ضرور اپنے پاس یقین و اذعان کی کوئی ایسی بنیاد اور ضمیر کے اطمینان کی کوئی ایسی وجہ رکھتا ہے ۔ جس کی وجہ سے اس نے اپنا عیش و آرام تج کر دیا ہے ۔ اور اپنی دنیا بنانے کی فکر سے بے پروا ہو کر اپنے آپ کو اس کام میں ڈالا ہوا ہے ۔ کہ صدیوں کے رچے اور بسے ہوئے عقائد کے خلاف آواز اٹھا رہا ہے ۔ ایسے شخص کی بات کم از کم اتنی بے وزن نہیں ہو سکتی ہے کہ بغیر سوچے سمجھے اس سے بے رُخی اختیار کر لی جائے ۔ گویا حضرت ہود علیہ السلام لوگوں سے فرما

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رہے ہیں۔ لوگو! میں یہ نصیحت اور انذار کا کام اس لیے نہیں کر رہا ہوں کہ اس کے بدلے میں تم سے میں اپنا مفاد وابستہ رکھتا ہوں۔ یہ کوئی مالِ تجارت نہیں ہے کہ میں گاہک تلاش کر رہا ہوں۔ کہ اگر تم نے نہ خریدا تو میرے کاروبار میں نقصان ہو جائے گا۔ یہ تو صرف اور صرف تمہاری صلاح اور فلاح کی خواہش میرے اندر جوش مار رہی ہے۔ خدارا میری بات توجہ سے سنو۔ آخر میں اس کا تم سے معاوضہ تو نہیں طلب کر رہا ہوں کہ تم مجھے خود غرض سمجھ کر میری بات سننے کے لیے بھی تیار نہیں ہو۔

(۶۲) استغفار و توبہ کی تلقین

اور اے میری قوم تم اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگو۔ پھر آئندہ گناہ نہ کرنے کا عہد کرو۔ وہ تم پر برستے ہوئے بادل روانہ کرے گا۔ اور تمہاری طاقت میں اور طاقت بڑھائے گا۔ اور مجرمانہ انداز میں منہ نہ موڑو۔ اسی سورت کے شروع میں اس جملہ کی تفسیر گزر گئی۔ یرسل السماء الخ کا مطلب یہ ہے۔ کہ موقع بموقع خوب بارش دے گا۔ وہ قوم چونکہ کھیتی باڑی اور باغ لگانے میں بڑی دلچسپی رکھتی تھی۔ اس لیے ایمان لانے کے ظاہری فوائد و برکات بیان کیے۔ جو ان کے حق میں خصوصی طور پر موجبِ ترغیب ہوں۔ لکھتے ہیں کہ وہ لوگ تین سال سے خشک سالی اور امساک باراں کی مصیبت میں گرفتار تھے۔ ہود نے وعدہ کیا کہ ایمان لا کر اللہ سبحانہٗ کی طرف رجوع کرو گے تو یہ مصیبت دور ہو جائے گی۔ اور یزدکم قوۃ الی قوتکم کا مطلب یہ ہے۔ کہ مالی اور بدنی قوت بڑھائے گا۔ اولاد میں برکت دے گا۔ خوشحالی میں ترقی ہو گی۔ مادی قوت کے ساتھ روحانی و ایمانی قوت میں اضافہ کر دیا جائے گا۔ بشرطیکہ اللہ سبحانہٗ کی طرف رجوع ہو کر اس کی اطاعت سے مجرموں کی طرح روگردانی نہ کرو۔[1]

سورت کے آغاز میں بھی یہی بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے قرآن کے حوالہ سے کہلوائی گئی۔ اپنے رب سے معافی مانگو۔ اور اس کی طرف پلٹ آؤ۔ تو اللہ سبحانہٗ تم کو بہترین سامان حیات عطا فرمائے گا۔ یہاں یہی بات حضرت ہود علیہ السلام اپنی قوم سے فرما رہے ہیں۔ کہ اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور اس کی طرف لوٹ آؤ۔ لوٹ آنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ آئندہ اللہ کی نافرمانیوں سے بچو۔ ناخداشناسی اور اللہ سبحانہٗ کی کھلم کھلا بغاوت چھوڑ دو۔ جو کچھ ہو چکا اس کی معافی مانگو اور آئندہ خداشناس بنو۔ اور اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو۔ اس کے نتیجے میں اللہ سبحانہٗ تمہیں اس مادی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

زندگی میں پہلے فلاح سے ہمدوش کرے گا۔ وقت پر بارشیں ہوں گی۔ پیداوار خوب ہوگی۔ تمہاری معاشی زندگی خوب سے خوب تر ہوجائے گی۔ ویزدکم قوۃ الی قوتکم ۔اور سیاسی اعتبار سے تمہاری طاقت میں اضافہ ہوجائے گا۔اس سے معلوم ہوا کہ نبوت کی دعوت میں صرف آخرت ہی فلاح کی ضمانت نہیں بلکہ آخرت کے ساتھ نبوت دنیا کی کامیابی اور فلاح کی بھی ضمانت دیتی ہے۔اس سے اللہ سبحانہٗ کے جس نہ بدلنے والے ضابطہ کا پتہ چلتا ہے ۔وہ قطعی طور پر یہی ہے ۔کہ اللہ سبحانہٗ ایمان وعمل صالح کے عوض آخرت کی فلاح کے ساتھ ساتھ اس دنیا کی بھی آسائش اور عزت واقتدار بخشے گا۔اور اس سے یہ بھی معلوم ہورہا ہے ۔اس کے حق میں یہ ضابطہ اور وعدہ لازماً پورا ہوا۔اور وہ جن کی آخرت سنور رہی تھی ۔ان کی دنیا بھی باغ وبہار بنی رہی ۔یہ واقعات قرآن میں اس لیے آئے ہیں ۔تاکہ قرآن کے مخاطب جانیں کہ اللہ تعالیٰ کا یہ ضابطہ جیسے قوم ہود کے لیے تھا۔ویسے ہی اُمّت مسلمہ کے لیے ہے ۔شروع سورت کی پکار اور حضرت ہودؑ کی پکار کو ملا کر دیکھئے ۔دونوں میں کیسی ہم آہنگی ہے ۔حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم قریش مکہ سے کہہ رہے ہیں ۔

ان استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ یمتعکم متاعا
حسنا الی اجل مسمی ویوت کل ذی فضل فضلہٗ ۔

اور یہاں حضرت ہود علیہ السلام فرما رہے ہیں ۔

یا قوم استغفروا ربکم ثم الیہ یرسل السماء علیکم مدرارا
ویزدکم قوۃ الی قوتکم

اس اُمت سے بھی فلاح دنیا کے بارے میں ٹھیک اسی طرح کا وعدہ ہے ۔جیسا کہ پہلوں سے کیا جاتا رہا ہے اور ہر مرحلے میں کیا گیا ۔ایمان وعمل کی شرطیں پوری کرنے کے نتیجے میں یہ وعدے کس طرح پورے ہوئے ۔اس سے دنیا ناواقف نہیں ہے ۔وہ اچھی طرح جانتی ہے ۔کہ اسلام نے مسلمانوں کو وہ سب کچھ دیا جو دنیا میں کسی قوم کو مطلوب ہوسکتا ہے ۔یہ آیات بتا رہی ہیں ۔کہ آخرت میں ہی نہیں، بلکہ اس دنیا میں بھی قوموں کی قسمتوں کا اتار چڑھاؤ ایمان وعمل ہی پر ہوتا ہے ۔یہ بات قرآن میں متعدد مقامات پر بتائی گئی ہے ۔کہ جب نبوّت اللہ سبحانہٗ کا پیغام لے کر آتی ہے ۔تو قوم کی قسمت کا فیصلہ اس پیغام سے وابستہ ہوجاتا ہے ۔اگر وہ اسے قبول کرلیتی ہے ۔تو اللہ تعالیٰ اس پر اپنی نعمتوں اور برکتوں کے دروازے کھول دیتا ہے ۔اور اگر رد کردیتی ہے ۔تو اسے تباہ کر ڈالا جاتا ہے ۔

یہ حضرت ہود علیہ السلام کی جانب سے قوم کو اجتماعی توبہ کی دعوت ہے ۔کہ شرک اور نافرمانی سے

توبہ کرو اور خالص اپنے رب سے عابدانہ تعلقات استوار کرو۔ یہاں دو لفظ آئے ہیں۔ استغفار اور توبہ استغفار کا مطلب یہ ہے۔ کہ بندہ اللہ سبحانہٗ سے التجا کرے۔ کہ وہ اس کے ماضی میں کیئے ہوئے گناہوں کے نتائج سے اس کی حفاظت فرمائے۔ یہ غفر سے ہے۔ غفر کے معنے ڈھانپنے کے ہیں۔ بلکہ محفوظ کرنے کے ہیں۔ مغفر ڈھال کو اس لیے کہتے ہیں۔ کہ وہ سر کو تلوار کی ضرب سے محفوظ رکھتی ہے غفار پٹے کو اس لیے کہتے ہیں۔ کہ وہ ازار کو گرنے سے محفوظ رکھتا ہے۔ استغفار کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ ماضی کے گناہوں پر پردہ ڈالا جائے۔ بلکہ مطلب یہ ہے۔ کہ گناہوں کے نتائج سے حفاظت فرمائے۔ اور توبہ کے معنے لوٹنے کے ہیں۔ مطلب یہ ہے۔ کہ اس صراط مستقیم کی طرف لوٹ آؤ۔ جو نبوت لے کر آئی ہے۔ یرسل السماء اور یزدکم قوۃ الی قوتکم۔ اجتماعی توبہ کی برکتیں ہیں۔ لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے۔ کہ انفرادی توبہ ان برکتوں سے خالی ہوتی ہے۔ جو بندہ گناہ کی زندگی سے منہ موڑ کر اللہ کی جناب میں استغفار و توبہ کرتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ رزق طیب سے اس کی حفاظت کرتا ہے۔ اور اس کو سکینت و اطمینان کی نعمت مرحمت فرماتا ہے۔ حدیث میں ہے۔

من لزم الاستغفار جعل اللہ لہٗ من ھم مرجا ومن کل ضیق مخرجا ورزقہٗ من حیث لا یحتسب۔

جو استغفار کو اپنا لیتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ اس کے ہر غم میں فراخی اور ہر تنگی سے نکلنے کی راہ پیدا کر دے گا۔ اور داد و دہش ایسے مقام سے ہوگی جہاں کا خیال ہی نہ ہوگا۔

یہ آیت یہ بھی بتا رہی ہے۔ کہ جو قوم دنیا کی خوشحالی سے دھوکہ کھا کر ظلم و بدکاری کی راہوں کو اپنا لیتی ہے۔ اس کا انجام بربادی ہے۔ لیکن اگر اسے اپنی غلطی کا احساس ہو جائے اور نافرمانی چھوڑ دے تو اس کی قسمت برآتی ہے۔ ولا تتولوا مجرمین کے فقرے سے ویسے ہی نہ گزر جاؤ۔ قرآن کا ترجمہ کرنے والوں نے اسے اس طرح سمجھایا ہے۔ شاہ عبد القادرؒ فرماتے ہیں کہ اور نہ پھرے جاؤ گنہگار ہو کر۔ حضرت شیخ الہندؒ فرماتے ہیں۔ رو گردانی نہ کرو گنہگار ہو کر۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ اور مجرم رہ کر اعراض نہ کرو۔ اور مولانا دریا آبادی فرماتے ہیں۔ اور مجرم رہ کر رد گردانی نہ کرو۔ اور مولانا غلام اللہ خانؒ فرماتے ہیں۔ نہ رو گردانی کرو گنہگار ہو کر۔ مولانا پیر کرم شاہؒ فرماتے ہیں۔ نہ منہ موڑو اللہ تعالیٰ سے جرم کرتے ہوئے۔ مولانا آزادؒ فرماتے ہیں۔ اور جرم کرتے ہوئے اس سے منہ نہ موڑو۔ مولانا

مودودیؒ فرماتے ہیں۔ کہ مجرموں کی طرح منہ نہ موڑو۔ مولانا اصلاحیؒ فرماتے ہیں۔ اور مجرمانہ روگردانی کی روش اختیار نہ کرو۔

لفظ مجرمین کو سارے شارحین قرآن نے تتولوا کی ضمیر سے حال قرار دیا ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے مراد یہ بتائی ہے۔ کہ جرائم پیشہ زندگی پر اصرار کرکے میری دعوت سے روگردانی نہ کرو۔ قاضی بیضاویؒ نے بھی آلوسیؒ سے پہلے یہی بات کہی ہے۔ علامہ شوکانی نے فتح القدیر میں بات کو اور کھول دیا ہے۔ کہ کفر پر جم کر اور جرائم پر کافرانہ زندگی میں اڑ کر میری دعوت سے اعراض نہ کرو۔ حافظ ابن جریرؒ نے ان سے پہلے یہ تشریح کی ہے۔

میری دعوت توحید اور برارت عن الشرک سے اللہ سبحانہ کا کفر کرکے روگردانی نہ کرو۔

حال سب کا ایک ہے۔ کہ تمہاری موجودہ زندگی جرائم کی زندگی ہے۔ اسی پر جم کر تم میری دعوت کو رد نہ کرو۔ بلکہ اسے چھوڑ کر میری دعوت کو اپناؤ۔

قَالُوۡا یٰـہُوۡدُ مَا جِئۡتَنَا
بِبَیِّنَۃٍ وَّمَا نَحۡنُ بِتَارِکِیۡۤ اٰلِہَتِنَا عَنۡ قَوۡلِکَ وَمَا نَحۡنُ لَکَ
بِمُؤۡمِنِیۡنَ ﴿۵۳﴾ اِنۡ نَّقُوۡلُ اِلَّا اعۡتَرٰىکَ بَعۡضُ اٰلِہَتِنَا بِسُوۡٓءٍ ؕ
قَالَ اِنِّیۡۤ اُشۡہِدُ اللّٰہَ وَاشۡہَدُوۡۤا اَنِّیۡ بَرِیۡٓءٌ مِّمَّا تُشۡرِکُوۡنَ ﴿۵۴﴾
مِنۡ دُوۡنِہٖ فَکِیۡدُوۡنِیۡ جَمِیۡعًا ثُمَّ لَا تُنۡظِرُوۡنِ ﴿۵۵﴾ اِنِّیۡ
تَوَکَّلۡتُ عَلَی اللّٰہِ رَبِّیۡ وَرَبِّکُمۡ ؕ مَا مِنۡ دَآبَّۃٍ اِلَّا ہُوَ اٰخِذٌۢ
بِنَاصِیَتِہَا ؕ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی صِرَاطٍ مُّسۡتَقِیۡمٍ ﴿۵۶﴾ فَاِنۡ تَوَلَّوۡا
فَقَدۡ اَبۡلَغۡتُکُمۡ مَّاۤ اُرۡسِلۡتُ بِہٖۤ اِلَیۡکُمۡ ؕ وَیَسۡتَخۡلِفُ رَبِّیۡ قَوۡمًا
غَیۡرَکُمۡ ۚ وَلَا تَضُرُّوۡنَہٗ شَیۡئًا ؕ اِنَّ رَبِّیۡ عَلٰی کُلِّ شَیۡءٍ
حَفِیۡظٌ

قوم عاد نے کہا۔ کہ اے ہود علیہ السلام تو نے ہمارے سامنے کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی ہے۔ تیرے کہنے سے ہم اپنے معبود نہ چھوڑیں گے۔ اور ہم تیری بات ماننے والے نہیں ہیں[۶۳]۔ ہمارا کہنا تو صرف یہ ہے۔ کہ تجھے ہمارے کسی معبود نے جھپٹ لیا ہے۔ برائی سے[۶۴]
حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا۔ لوگو! میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں۔ تم بھی

گواہ رہو۔ کہ اللہ سے ورے جن کو تم اللہ کی عبادت میں شریک کرتے
ہو۔ میں ان سے بیزار ہوں۔ تم سب مل کر میرے خلاف جو تدبیر کر سکتے
ہو۔ ضرور کر لو۔ پھر مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ اللہ پر ہے
جو میرا بھی پروردگار ہے۔ اور تمہارا بھی۔ پاؤں سے چلنے والا کوئی جاندار
بھی ایسا نہیں ہے۔ جس کی چٹیا اللہ کے قبضے میں نہ ہو۔ بلاشبہ میرا
رب سیدھی راہ پر ہے[۶۵] اگر تم روگردانی کرو گے تو جو پیغام مجھے تمہاری
طرف دے کر روانہ کیا گیا ہے۔ وہ میں نے تم کو پہنچا دیا ہے۔ اور میرا
رب تمہاری جگہ کسی اور قوم کو دے دے گا۔ اور تم اللہ کا کچھ بھی
نہ بگاڑ سکو گے۔ میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے۔[۶۶]

مفردات کے معانی

مؤمنین۔ مؤمن کی جمع مذکر سالم ہے۔ یہ ایمان سے بنا ہے۔ عربی میں ایمان دو طرح استعمال ہوتا ہے۔ با کے ساتھ جیسے امنا باللہ اور یؤمنون بالیوم الآخر اس کے معنے میں تصدیق، اعتراف اور تسلیم وانقیاد ہوتا ہے۔ یعنی خبر دینے والے کو سچا یقین کرنا اور اس کی بات کو سچا تعین کرنا اس طرح کہ اس بات کو قبول کرنا اور اس کا اعتراف کر کے تسلیم و طاعت کے لیے تیار ہو جانا۔ جس سے اس طرف اشارہ ہوتا ہے۔ کہ بغیر اعتراف کے تصدیق کا اعتبار نہیں ہے۔ اور کبھی یہ ایمان لام کے ساتھ استعمال ہوتا ہے اس کے معنے ماننا آتے ہیں۔ جیسے حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی یہ کہہ کر کہ یوسفؑ کو بھیڑیئے نے کھا لیا۔ سمجھتے ہیں۔ ما انت بمؤمن لنا۔ آپ ہماری بات کو نہ مانیں گے۔ یا آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں آئے گا۔ فآمن لہ لوط۔ حضرت لوط علیہ السلام نے حضرت ابراہیمؑ

کی بات مان لی۔ ما آمن لموسیٰ الا ذریۃ من قومہ۔ موسیٰ کی قوم میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی بات کچھ لوگوں نے مان لی۔ اسی لیے محققین نے یہاں ترجمہ اس طرح کیا ہے۔ ہم تجھے ماننے والے نہیں۔ اور غیر محققین کہتے ہیں۔ کہ ہم تجھ پر ایمان لانے والے نہیں ہیں۔ ایمان یہ ہے کہ نبوت کی ان تمام تعلیمات کی تصدیق کی جائے جن کے متعلق نبی کی تعلیم ہونا ثابت ہو جائے۔ جس چیز کا علم تفصیلی ہو۔ اس کی تفصیلی اور جس کا اجمالی علم ہو۔ اس کی اجمالی طور پر تصدیق کرنا جمہور کا ہی مذہب ہے۔

قوم عاد اور اشراک باللہ

ذہنوں میں کوئی تصور اسی وقت واضح ہوتا ہے۔ جبکہ اس کے مخالف تصور کو بھی ساتھ ہی ساتھ بیان کر دیا جائے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے پہلے فرمایا تھا۔ اعبدوا اللہ مالکم من الہ غیرہ۔ اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو۔ اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے۔ اب فرمایا۔ انی بریئ مما تشرکون من دونہ۔ تم اللہ کے سوا جن جن کو اللہ کی عبادت میں شریک کرتے ہو۔ میں اس سے بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔

عرب کی سرزمین عجیب سرزمین تھی۔ یہاں انسان کے مذہبی ارتقار کے ہر درجہ کی مجسم تاریخ موجود تھی۔ اجسام پرست، ستارہ پرست، بت پرست، ارواح پرست، ہر طبقہ کے لوگ موجود تھے۔ لیکن استقصا سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ان کا عام قومی مذہب ستاروں اور روحوں کی پرستش تھا۔

قوم عاد عرب سے لے کر عراق و شام اور مصر تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس بنا پر ان کا مذہب وہی ہو سکتا ہے۔ جو ان ممالک کے اندر اس عہد میں رائج تھا۔ عربی تاریخوں سے صرف اس قدر پتہ چلتا ہے۔ کہ یہ قومیں بت پرست تھیں۔ لیکن کن بتوں کی پرستش کرتے تھے۔ ان کی بت پرستی کے اصول مراسم کیا تھے۔ اس کی تفصیل نہیں ملتی ہے۔ قرآن عزیز نے عاد کے ذکر میں حضرت ہود علیہ السلام کی زبانی صرف اس قدر معلوم ہوا۔ کہ الٰہ برحق کو چھوڑ کر اور بہت سے الٰہوں کو پوجتے تھے۔ اور ان کے الگ الگ نام رکھے ہوئے تھے۔ حضرت ہود علیہ السلام کی تقریر معالم القرآن کی آٹھویں جلد میں پڑھ چکے ہو۔ کہ حضرت ہود علیہ السلام فرما رہے ہیں۔ اتجادلوننی فی اسماء سمیتموھا۔ ان کی قوم جواب دیتی ہے۔ اجئتنا لنعبد اللہ وحدہ ونذر ما کان یعبد آباءنا۔ اس سوال و جواب سے کہ قوم عاد اللہ کے ساتھ اور الٰہوں کو بھی پوجتی تھی۔ عرب سے مصر و شام اور

مصر میں بھی عاد تھے۔ ان ملکوں میں جو مذہبی مراسم ان قوموں کے جاری تھے۔ ان ہی پر ان کی عرب آبادی کو بھی قیاس کر لینا چاہیئے۔ ان ممالک کے بارے میں قدیم کتبات اور تحریروں کی چھان بین سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اس زمانہ میں قاعدہ یہ تھا۔ کہ قومیں مختلف آبادیوں میں منقسم ہوتی تھیں۔ ہر آبادی میں دو بڑی بڑی عمارتیں ہوتی تھیں۔ ایک بیت الحکومت اور ایک ہیکل۔ آبادی کا حاکم بیت الحکومت میں رہتا تھا۔ اور ہیکل آبادی کے کاہن کا مسکن ہوتا تھا۔ اور ان ہی دونوں کی شرکت سے آبادی پر دنیاوی اور مذہبی حکمرانی کی جاتی تھی۔ اور جس طرح ہر آبادی کا الگ حاکم ہوتا تھا۔ اسی طرح ہر ہیکل میں ایک دیوتا تھا جو اس آبادی کا محافظ خیال کیا جاتا تھا ہوتا تھا۔ جب دو آبادیوں کے رہنے والوں میں جنگ ہوتی۔ تو گویا ان دونوں آبادیوں کے دیوتاؤں میں جنگ ہوتی۔ فاتح مفتوح کا دیوتا اٹھا کر لے جاتا۔ مفتوح اس وقت تک دم نہ لیتے جب تک لڑ کر یا منت سماجت کر کے اپنا دیوتا واپس نہ لیتے۔

۶۳ قوم عاد نے کہا۔ اے ہود علیہ السلام تو نے ہمارے سامنے کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی۔ تیرے کہنے سے ہم اپنے معبود نہ چھوڑیں گے۔ اور ہم تیری بات ماننے والے نہیں ہیں۔ یہ ان کی کھلی ہٹ دھرمی تھی۔ جو کہتے تھے کہ آپ کوئی واضح سند اور دلیل اپنی صداقت کی نہیں لائے۔ اللہ سبحانہٗ جسے پیغمبری عہدہ پر فائز کرے۔ ضروری ہے کہ اس کو تقرر کی سند اور پروانہ عطا فرمائے۔ چنانچہ حدیث میں ہے۔ کہ جو نبی مبعوث ہوا۔ اس کے ساتھ ایسے واضح نشانات بھیجے گئے۔ جس پر آدمی ایمان لانا چاہیں۔ تو لا سکتے ہیں۔ اس لیے بالیقین کہا جا سکتا ہے۔ کہ ہود علیہ السلام نے نشان پیش کیئے ہوں گے۔ مگر وہ لوگ ہٹ دھرمی سے کہہ رہے ہیں۔ کہ آپ کوئی کھلا نشان نہیں لائے۔ شاید یہ مراد ہو کہ ایسا نشان نہیں لائے جو سب کی گردنیں پکڑ کر ایمان لانے پر مجبور کر دے۔ بہر حال ہم تیرے کہنے سے اپنے معبودوں کو نہیں چھوڑ سکتے۔ نہ کبھی تیری رسالت پر ایمان لا سکتے ہیں[1]

ان کا یہ کہنا کہ اے ہودؑ تو نے کوئی واضح دلیل پیش نہیں کی۔ اس بات کی طرف اشارہ کر رہا ہے۔ کہ حضرت ہود علیہ السلام کی جانب سے ان کے سامنے ان گنت دلائل پیش کیئے جا چکے ہیں۔ اور وہ ان دلائل کا انکار کر چکے ہیں۔ آگے قرآن میں آرہا ہے۔ تلک عاد جحدوا بایات ربھم۔ آیات آیت کی جمع ہے۔ شاید بینہ کہہ کر یہ جتانا چاہتے ہیں کہ آیتیں تو آتی ہیں مگر چونکہ ہمارے مطالبے کے مطابق نہیں ہیں۔ اس لیے وہ واضح نہیں ہیں۔ دراصل ہمارا فن استدلال آیات

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہی پر موقوف ہے ۔ ہم علت سے معلول پر اور معلول سے علت پر استدلال کرتے ہیں ۔ قرآن میں ان معنے میں آیات کا لفظ اس کثرت سے آیا ہے ۔ کہ ہم یہاں ان کا استقصا بھی نہیں کر سکتے ہیں ۔ جس طرح یہ آیات الہٰی عام بندہ اور خدا، خالق اور مخلوق کے تعلق کو اور رابطہ کو نمایاں کرتی ہیں ۔ اسی طرح اللہ سبحانہٗ کسی خاص بندے سے اپنے تعلق اور رابطہ کو اپنے مخصوص علامات و آیات کے ذریعے نمایاں کرتا رہتا ہے ۔

نبوت قوموں کے تاریک ترین زمانوں میں نور الہٰی کی مشعل لے کر تنہا مجعوث میں آتی ہے ۔ مادیت پوری طاقت سے اس نور کو بجھانا چاہتی ہے ۔ اور تیغ و خنجر سے مشعل تھامنے والے ہاتھ اور بازو کو زخمی کرنا چاہتے ہیں ۔ مگر وہ شمع الہٰی بجھنے کی بجائے رفتہ رفتہ اپنے دائرہ نورانی کو وسیع کرتی جاتی ہے باوجود تمام معاندانہ کوششوں اور مخالفانہ جدوجہد کے الذین امنوا معہٗ کا وجود میں آنا اس بات کی بات کی دلیل ہے ۔ کہ وہ اللہ سبحانہٗ کی طرف سے ہے ۔

نبوت کے صحیفۂ زندگی کا صفحہ صفحہ ہر قسم کے اخلاقی داغ سے پاک ہوتا ہے ۔ اس کی سچائی اور راستبازی عالم آشکارا اور دوست و دشمن سب کے نزدیک بے عیب ہوتی ہے

غرض یہ وہ امور ہیں ۔ جو خالق فطرت اور داعی حق کے درمیان رابطہ خاص کا کام کرتے ہیں ۔ اور جن سے معلوم ہوتا ہے ۔ کہ وہ اللہ کا رسول ہے ۔

اس سے معلوم ہوا کہ آیات و دلائل کی دو قسمیں ہیں ۔ ظاہری اور باطنی ۔

ظاہری اور مادی آیات وہ خوارق ہیں ۔ جن کو لوگ عام طور پر معجزہ کہتے ہیں ۔ بلاشبہ قرآن نے ان آیات کا ذکر نہیں کیا ۔ مگر کون کہہ سکتا ہے ۔ کہ واقع میں وہاں آیات و معجزات نہ تھیں ۔ تو قرآن ان کے انکار کا دجحدوا بایات ربھم کہہ کر کیوں ذکر کر رہا ہے ۔ انداز تعبیر بتا رہا ہے ۔ کہ آیت نہیں بلکہ حضرت ہودؑ کی جانب سے آیات پیش کی گئیں ۔ یہ دوسری بات ہے ۔ کہ ان کی افتراحی آیات کو نظر انداز کر دیا گیا ۔ پیغمبر کو معجزہ مخاطبوں کی خواہش کے مطابق نہیں دیا جاتا بلکہ اعجاز کا سارا دار و مدار اللہ سبحانہٗ کے ارادے اور مشیت پر ہوتا ہے ۔ ان سب آیات کو دیکھ کر وہ کہہ رہے ہیں ۔ کہ تمہاری کسی نشانی کو نہیں مانیں گے ۔ اور تمہارے کہنے سے ہم اپنے معبودوں سے عابدانہ تعلقات نہ توڑیں گے ۔

(۶۴) جاہلی ذہنیت کی صحیح ترجمانی

ہمارا کہنا تو صرف یہ ہے کہ تجھے ہمارے کسی معبود نے برائی سے جھپٹ لیا ہے ۔ یعنی یہ جو تم

بہکی بہکی باتیں کرتے ہو۔ اور سارے جہاں کو بیوقوف بنا کر اپنا دشمن بنا رہے ہو۔ ہمارا خیال یہ ہے
کہ ہمارے دیوتاؤں میں سے کسی نے آسیب پہنچا کر تمہیں مجنوں اور پاگل کر دیا ہے۔ العیاذ باللہ۔
تم جو ان کی عبادت سے روکتے اور برا بھلا کہتے تھے۔ انہوں نے اس گستاخی کی سزا دی کہ اب تم
بالکل دیوانوں کی طرح باتیں کرنے لگے ہو۔ [1]

آیت کا مطلب یہ ہے۔ کہ قوم عاد نے حضرت ہود علیہ السلام سے کہا کہ تمہاری بات ماننا الگ رہا ہمارا کہنا تو یہ ہے۔ کہ تم پر ہمارے معبودوں میں سے کسی معبود کی مار پڑی ہے۔ جس کی وجہ سے تم پاگل ہوگئے ہو۔ اور اس قسم کی باتیں کرتے ہو۔ کہنا یہ چاہتے ہیں۔ اے ہود علیہ السلام تم نے ہماری کسی دیوی یا دیوتا یا کسی حضرت کے آستانے پر کچھ گستاخی کی ہوگی۔ تم اسی کا خمیازہ بھگت رہے ہو۔ کہ بہکی بہکی باتیں کرنے لگے ہو۔ اور پورے معاشرے سے کٹ کر الگ ہوگئے۔ اور اس وجہ سے تم یہ یاوہ گوئی کر رہے ہو۔

دراصل یہ جملہ استیناف بیانی ہے۔ یعنی ایک ذہنوں میں اٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے۔ وما نحن لك بمؤمنين۔ ان کی زبان پر آتے ہی ذہنوں میں یہ سوال ابھر آیا ہے۔ کہ اگر نہیں مانتے ہو۔ تو پھر حضرت ہود علیہ السلام کے بارے میں کیا خیال کرتے ہو۔ جواب دیا کہ ہم تو اس پر اپنے معبودوں کی پڑی ہوئی مار خیال کرتے ہیں۔ اسی وجہ سے یہ بہکی بہکی باتیں کر رہا ہے۔ اور یہ سب دیوتاؤں کی مار کا نتیجہ نہیں کچھ کی مار کا نتیجہ ہے۔ تاکہ مخاطب سمجھ لیں۔ کہ کچھ کی مار کا یہ نتیجہ ہے۔ اگر سب کی مار ہوتی تو ہود علیہ السلام کا نام و نشان ہی مٹ جاتا۔ یہاں علامہ آلوسیؒ نے یہ بات بہت لطیف لکھی ہے۔

> حضرت ہود علیہ السلام کے مخاطبوں نے مخالفت وعناد کی راہ میں ترقی کا راستہ اختیار کیا۔ برا اور برے سے زیادہ پہلے کیا کہ تم واضح دلیل نہیں لائے حالانکہ ان کا وجود ہی مستقل دلیل ہے۔ اور ترقی کی اور بولے کہ ہم تمہارے کہنے سے بتوں کی عبادت نہ چھوڑیں گے۔ اس میں ابہام تھا۔ کہ تمہیں مانتے تو ہیں۔ مگر تمہارے کہنے پر نہ چلیں گے۔ پھر ایک قدم اور بڑھایا اور بولے کہ ما نحن لك بمؤمنين کہ ہم تمہیں مانتے ہی نہیں ہیں۔ اس میں گنجائش تھی۔ کہ ہے تو تمہاری بات ٹھیک

[1] افادات شیخ الاسلام

مگر ہم نہیں مانتے پھر ایک قدم اور بڑھایا کہ تمہاری باتیں جنون کا نتیجہ ہیں۔ اور تمہیں ہمارے معبودوں کی گستاخی کے نتیجے میں جنون اور دیوانگی ہو گئی ہے۔

العیاذ باللہ۔

جاہلوں کا جیسے یہ اعتقاد ہوتا ہے۔ کہ فلاں دیوتا فلاں پیر کے خلاف اگر کچھ زبان سے نکالے تو فوراً بلائیں ہمیں آلپٹیں گی۔ قوم عاد میں بستی بستی بت تھے۔ اور بیسیوں صنم خانے تھے۔ ان کو ہیکل کہتے تھے۔ دنیا کے تمام کام انہیں اصنام کے متعلق سمجھے جاتے تھے۔ مدتوں سے یہ خیال راسخ چلا آرہا تھا۔ اسی وجہ سے حضرت ہود علیہ السلام کی دعوت سے ان کو لرزہ آتا تھا۔ اسی لیے پوری قوم نے اسی توہم کی بنا پر حضرت ہودؑ سے کہا۔

ان نقول الا اعتراك بعض الهتنا بسوء۔

خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنے مخاطبوں کی ان ذہنی تخلیقات سے دوچار ہونا پڑا۔ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بتوں کے خلاف آواز اٹھائی تو اکثر لوگوں نے آپ کو نعوذ باللہ مجنوں سمجھ لیا۔ زمانہ جاہلیت کے بعض احباب ہمدردی کی راہ سے جھاڑ پھونک کرنے آئے۔ ضمام بن ثعلبہ ایک صحابی تھے وہ مسلمان ہو کر اپنے قبیلہ میں واپس آئے اور لات وعزیٰ کی مذمت شروع کی تو تمام قبیلہ خوف سے کانپ گیا۔ کہ ضمام ان کو برا نہ کہو۔ دیکھو کہیں تم کو برص، جنون یا جذام نہ ہو جائے۔ حضرت زنیرہؓ مسلمان ہونے کے بعد بصارت سے محروم ہو گئیں تھیں۔ کفار نے کہنا شروع کر دیا۔ کہ لات وعزیٰ نے ان کو اندھا کر دیا ہے۔ حضرت طفیل بن عمرو دوسی مسلمان ہو کر جب اپنے وطن واپس آئے۔ اور اپنی بیوی کو اسلام کی دعوت دی تو انہوں نے کہا دیکھو "ذوالشریٰ" بت کہیں برباد نہ کر دے۔

توہم پرستی میں کسی دعوت کی صحت اور بطلان کی دلیل شواہد عقلی نہیں بلکہ توہمات ہوتے ہیں اور بس۔

(۶۵) حضرت ہودؑ کا شرک کے خلاف اعلان

حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا لوگو! میں اللہ کو گواہ بناتا ہوں تم بھی گواہ رہو کہ اللہ سے ورے جن کو تم اللہ کی عبادت میں شریک کرتے ہو۔ میں ان سے بیزار ہوں۔ تم سب میرے خلاف جو تدبیر کر سکتے ہو ضرور کر لو۔ پھر مجھے ذرا بھی مہلت نہ دو۔ میرا بھروسہ اس اللہ پر ہے۔ جو میرا بھی پروردگار

ہے۔ اور تمہارا بھی۔ پاؤں سے چلنے والا کوئی بھی جاندار ایسا نہیں ہے جس کی چُٹیا اللہ کے قبضے میں نہ ہو۔ بلاشبہ میرا رب سیدھی راہ پر ہے۔ یعنی وہ بیچاری پتھر کی مورتیاں تو مجھے کیا گزند پہنچا سکتی ہیں۔ تم سب جو بڑے شہزور، تنومند، طاقتور نظر آتے ہو۔ اپنے دیوتاؤں کی فوج میں بھرتی ہو کر اور مجھ جیسے یکہ و تنہا پر پوری قوت سے بیک وقت ناگہاں حملہ کر کے بھی میرا بال بیکا نہیں کر سکتے۔ سنو! میں اللہ سبحانہٗ کو گواہ بنا کر اعلان کرتا ہوں۔ اور تم سب بھی اس پر گواہ رہو۔ کہ میں تمہارے جھوٹے دیوتاؤں سے قطعاً بیزار ہوں۔ تم سب جمع ہو کر جو برائی مجھے پہنچا سکتے ہو۔ پہنچاؤ۔ ذرا کوتاہی نہ کرو۔ ایک منٹ بھی مہلت نہ دو۔ اور خوب سمجھ لو۔ کہ میرا بھروسہ اللہ وحدہٗ لاشریک پر ہے۔ جو میرا رب ہے۔ اور تمہارا بھی مالک و حاکم ہے۔ گو بدقسمتی سے تم نہیں سمجھتے ہو۔ نہ صرف میں اور تم بلکہ ہر چھوٹی اور بڑی چیز جو زمین پر چلتی ہے۔ خالص اس کے قبضہ و تصرف میں ہے۔ گویا ان کے سر کے بال اس کے ہاتھ میں ہیں۔ جدھر چاہے پکڑ کر کھینچے اور پھیر دے۔ کسی کی مجال نہیں کہ اس کے قبضہ و اختیار سے نکل کر بھاگ جائے۔ نہ ظالم اس کی گرفت سے چھوٹ سکتے ہیں۔ نہ سچے اس کی پناہ میں رہ کر رسوا ہو سکتے ہیں۔ بلاشبہ میرا پروردگار عدل و انصاف کی سیدھی راہ پر ہے۔ اس کے یہاں نہ ظلم ہے۔ نہ بے موقع انعام۔ اپنے بندوں کو نیکی اور خیر کی جو راہ یعنی سیدھی راہ جو اس نے بتلائی ہے بے شک اسی پر چلنے سے وہ ملتا ہے۔ اور اس پر چلنے والوں کی حفاظت کے لیے خود ہر وقت وہاں موجود رہے۔[1]

قوم عاد کی یہ بات سُن کر کہ تم پر ہمارے دیوتاؤں کی مار پڑی ہوئی ہے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے توحید الوہیت کا اعلان کیا۔ کہ اگر تمہارا خیال یہ ہے۔ کہ تمہارے یہ معبود میرا بگاڑ سکتے ہیں۔ تو لو میں اللہ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں۔ اور تم بھی گواہ رہو۔ کہ میں ان تمام معبودوں سے جن کو تم نے اللہ کی عبادت میں شریک کر رکھا ہے۔ بیزاری کا اعلان کرتا ہوں۔ تم اور تمہارے معبود سب کے سب یا تم سب یعنی ہیکل والے اور بیت الحکومت والے سب مل کر جو کچھ میرے خلاف کر سکتے کر لو۔ اور مجھے کسی قسم کی مہلت نہ دو۔

ٹھہر جائیے: مما تشرکون میں حضرت ہود علیہ السلام نے جس شرک کی ان کی طرف نسبت کی ہے۔ قرآن ہی کی روشنی میں اس کی حقیقت معلوم کر لیجیے۔ شارحین قرآن میں سے حضرت شاہ عبدالقادرؒ نے موضح القرآن میں بڑی دقت نظر سے کام لے کر چھوٹے چھوٹے جملوں میں اپنی تفسیر میں شرک کی جو

[1] افادات شیخ الاسلام

حقیقت سمجھائی ہے۔ وہ اس لائق ہے۔ کہ اس کا گہری نظر سے مطالعہ کیا جائے۔

سورۂ بقرہ میں زیر نظر آیت ولا تنکحوا المشرکات میں رقمطراز ہیں۔ شرک یہ کہ اللہ کی صفت کسی اور میں جانے مثلاً کسی کو سمجھے کہ اس کو ہر بات معلوم ہے۔ یا وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ یا ہمارا بھلا یا بُرا کرنا اس کے اختیار میں ہے۔ اور یہ کہ اللہ کی تعظیم کسی اور پر خروج کرے مثلاً کسی کو سجدہ کرے اور اس سے حاجت مانگے اس کو مختار جان کر۔

اس سے معلوم ہوا کہ کسی کو دانائے غیب جاننا، حاضر و ناظر یقین اور مختار کُل سمجھنا اور تصرف و اختیار کا مالک خیال کرنا اور اس سے حاجتیں مانگنا شرک ہے۔ بلا استثناء اس میں اللہ کا کوئی شریک نہیں ہے۔ نہ جن نہ فرشتہ نہ ارواح نہ ستارے نہ انبیاء نہ اولیاء۔ مزارات پر حاجتوں کی بھیک کے لیے جانا قبروں پر چادریں چڑھانا، ان کے نام کے بکرے دینا، قبروں کو سجدے کرنا۔ اور ان کے گرد گھومنا سب مشرکانہ اعمال ہیں۔ یہ اللہ کی بارگاہ میں قطعاً پسند نہیں ہیں۔

سورۂ نساء میں زیر نظر آیت ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہٖ میں تحریر فرماتے ہیں۔

شرک فرمایا حکم میں شریک کرنے کو یعنی سوائے دین اسلام کے اور دین پسند رکھے اور اس پر چلے۔ بس جو دین ہے۔ سوائے۔ اسلام کے سب شرک ہے۔ اگرچہ پوجنے میں شرک نہ کرتے ہوں۔

اور سورۂ انعام میں زیر نظر آیت وان اطعتموھم انکم لمشرکون۔ میں فرماتے ہیں۔

شرک یہی نہیں ہے۔ کہ کسی کو سوائے خدا کے پوجے بلکہ شرک کے حکم میں ہے کہ اور کا مطیع ہو جائے۔

بتانا یہ چاہتے ہیں۔ کہ شرک صرف عبادت میں نہیں ہوتا بلکہ اطاعت میں بھی ہوتا ہے۔ اگر آپ چور کو زانی کو قاتل کو اللہ کے قانون کے مقابلے میں سزا دینے کے لیے کسی اور کے قانون کی اطاعت کرتے ہیں تو یہ بھی شرک ہے۔ یہ اطاعت میں شرک ہے۔ بتانا یہ چاہتے ہیں۔ کہ عبادت میں شرک ہو یا اطاعت میں شرک دونوں ہیں۔

حضرت ہود علیہ السلام دونوں طرح کے شرک یعنی عبادت میں شرک اور اطاعت میں شرک دونوں کا رد کر رہے ہیں۔ اور دونوں سے اپنی بیزاری کا اعلان کر رہے ہیں۔ قوم عاد نے دونوں گھڑنے

بنا رکھے تھے۔ شرک فی العبادت کی قیادت ان کے ہیکل کر رہے تھے۔ تو شرک فی الطاعت کی امامت ان کا بیت الحکومت کر رہا تھا۔ جو بات یہاں حضرت ہود علیہ السلام نے فرمائی ہے۔ ٹھیک یہی بات حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں نے فرمائی ہے۔

انا برآؤ منکم ومما تعبدون من دون اللہ

دوسری بات حضرت ہود علیہ السلام نے فرمائی یعنی انی توکلت علی اللہ ربی وربکم۔ یہ توحید خالص کی دعوت ہے۔ اور توحید ربوبیت سے توحید الوہیت پر استدلال ہے۔ ربی وربکم کا زور سمجھنے کے لائق ہے۔ قوم عاد کو ہی نہیں بلکہ تمام مشرک قوموں کو اس بات سے انکار نہ تھا کہ ایک خالق و پروردگار کی ہستی موجود ہے۔ اور اصلی طاقت اس کی طاقت ہے۔ یعنی وہ توحید ربوبیت میں نہیں توحید الوہیت میں کھوئے گئے یعنی سمجھتے تھے۔ کہ اس پروردگار ہستی کے ماتحت دوسری ہستیاں ہیں جنہیں اللہ کی جانب سے تصرف و اختیار مل گیا ہے۔ اس لیے ہمیں ان کی پوجا کرنی چاہیئے۔ حضرت ہود علیہ السلام نے ربی وربکم فرما کر ان کو سمجھایا کہ جب تم مانتے ہو کہ کائنات ہستی کا پیدا کرنے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ خالق بھی وہی ہے رب بھی وہی ہے۔ تو پھر یہ حاجت روائیوں اور طلبگاریوں کے لیے بہت سے تخت اقتدار تم نے کیوں بنا رکھے ہیں۔ اور کیوں انہیں نذر و نیاز کا مستحق سمجھتے ہو۔ شاہ عبدالقادرؒ نے لا تضربوا للہ الامثال کی تشریح میں کیسی اچھی بات لکھی ہے۔ کہ

مشرک کہتے ہیں کہ مالک اللہ ہی ہے۔ یہ لوگ اس کی سرکار میں مختار ہیں۔ "موضح القرآن"

حکیم الامت حضرت شاہ ولی اللہؒ محدث دھلوی نے حجۃ اللہ البالغہ میں یہ بات واشگاف انداز میں اپنے مخاطبوں کو سمجھائی ہے۔ کہ توحید کے چار درجے ہیں۔ توحید وجود، توحید خالقیت، توحید ربوبیت اور توحید عبادت۔ اسی کا دوسرا نام توحید الوہیت ہے۔ فرمایا ہے کہ انبیاء کا اپنی مخاطب قوموں سے توحید وجود، توحید خالقیت، توحید ربوبیت میں کوئی اختلاف نہیں تھا۔ یہ تینوں توحید کے درجے انبیاء کے مخاطبوں کے مسلمات میں سے تھے۔ ان کا اختلاف، توحید الوہیت میں تھا۔ یعنی اللہ سبحانہٗ کے سوا کوئی ہستی اس کی مستحق نہیں کہ اس کی عبادت کی جائے۔ نیاز مندیوں اور طلبگاریوں میں اس کو ہی سمجھا جائے، نہ سجدوں میں، نہ دعاؤں اور پکاروں میں نہ نذروں اور نیازوں میں، نہ مصیبتوں کے ٹالنے میں، نہ اعتماد و توکل میں اور نہ امید و رجاء میں نہ بیماریوں کے دور کرنے میں ہر حال میں اللہ کی ذات مومن کا مقصود ہو۔

حضرت ہود علیہ السلام نے ان کے دیوتاؤں کی مار کا مقابلہ انی توکلت علی اللہ کہہ کر کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ عالم غیب میں اللہ کے سوا کسی پر بھروسہ کرنا توحید کے منافی ہے۔ اللہ پر توکل کا اعلان کر کے حضرت ہود علیہ السلام نے اپنے مخاطبوں کو سمجھایا ہے کہ

(۱) صرف اللہ ہی ہے۔ جس کی رضاجوئی کی انسان کو فکر کرنی چاہیئے۔ وہی اس کے سامنے کاموں کا محرک ہونا چاہیئے۔ اور اصل مقصد یہی ہو۔

(۲) وہ جذبات احساسات بھی اللہ کے لیے خاص کر دینے چاہئیں۔ جن کے اندر پرستش کی روح پائی جاتی ہو۔ توکل صرف اسی پر کیا جائے۔ امیدیں صرف اس سے وابستہ کی جائیں۔ تقویٰ صرف اس کا اختیار کیا جائے۔ خوف صرف اسی کا رکھا جائے۔ حقیقی محبت صرف اسی سے کی جائے۔

(۳) اللہ سبحانہٗ کے سوا کوئی اور نہیں ہے۔ جو اپنے اندر شان معبودیت رکھتا ہو۔ جو پوجے جانے کا مستحق ہو۔ جس کی رضا چاہی جائے۔ کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے آگے پیشانیاں جھکیں، نذریں پیش کی جائیں، اعتراف نعمت کیا جائے، کوئی اور نہیں جسے ولی، کارساز، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے۔ جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے۔

اس کے بعد توکلت علی اللہ کی علت بیان فرمائی۔ یعنی میرا اللہ پر توکل اس لیے ہے۔ کہ اس کائنات میں کوئی حرکت کرنے والی ہستی نہیں جو اس کے قبضہ سے باہر ہو۔ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں۔ کہ یہ فقرہ اس دعویٰ کی دلیل ہے۔ کہ میرا بھروسہ اللہ پر ہے۔ اور تمہارے معبودوں پر نہیں ہے۔ ساری مخلوقات اللہ سبحانہٗ کے سامنے مغلوب اور مقہور ہے۔ کسی کو یارائے دم زدن نہیں ہے سب کی پیشانیاں اسکے قبضے میں ہیں۔ وہ جس کو جدھر چاہے اس کی چٹیا پکڑ کر موڑ دے اور جہاں چاہے روک دے۔

آخر میں فرمایا ان ربی علی صراط مستقیم یہ نہ سمجھو کہ مجھے اپنے رب تک پہنچنے کے لیے متعدد راہوں سے گزرنے اور تمہارے خیال کے مطابق بہت سے واسطوں اور وسیلوں کی ضرورت ہے۔ اس تک پہنچنے کے لیے یہی کافی ہے کہ میں سچے دل سے اس کی طرف متوجہ ہو جاؤں۔ اگر میں متوجہ ہو جاؤں تو بس وہ سیدھی راہ پر میرے سامنے ہے۔

یہاں مدارج السالکین میں حافظ ابن القیمؒ نے اللہ سبحانہٗ کے صراط مستقیمؒ پر ہونے کا جو مطلب بتایا ہے۔ اس میں گہری معنویت ہے۔ فرماتے ہیں۔

یہ آیت صریح ہے۔ اور اس کے ایک ہی معنے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ کے صراط مستقیم پر ہونے کا مطلب یہ ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ کے ارشادات میں صداقت، رشد و ہدایت، عدالت اور

حکمت کے خزانے ہیں۔ و تمت کلمۃ ربک صدقا وعدلا اور اللہ سبحانہٗ
کے کاموں میں مصالح ہیں، حکمتیں ہیں، رحمت ہے، عدل ہے، اور سرتاسر خیر
ہے۔ شرک کا اس کے اقوال و افعال سے دور کا بھی واسطہ نہیں ہے۔ ان معنے کو
پیش نظر رکھ کر فقرے کی پشت پر توکلت علی اللہ کے بعد غور کیجئے۔ آپ کو محسوس
ہوگا۔ کہ یوں کہا جا رہا ہے۔ کہ میں نے اس پر توکل اس لیے کیا ہے۔ کہ وہ مجھے
چھوڑے گا نہیں۔ ضائع نہیں ہونے دے گا۔ اور تمہارا بھی رب ہے۔ اس لیے تم
کو مجھ پر غلبہ نہ دے گا۔ کیونکہ تمہاری چوٹیاں اس کے قبضے میں ہیں۔ تم اسکی مشیت
کے بغیر حرکت بھی نہیں کر سکتے ہو۔ وہ جو کچھ بھی کرتا ہے۔ صراط مستقیم پر ہونے کی وجہ
سے حکمت پر مبنی کرتا ہے۔ اگر بالفرض تمہیں مجھ پر قابو بھی دے دے۔ تو یہ بھی
اس کی شان حکیمانہ ہے۔ اس کی بارگاہ میں ظلم اور عبث کی باریابی نہیں ہے۔

(۶۶) حضرت ہودؑ کا آخری پیغام

اگر تم روگردانی کرو گے۔ تو جو پیغام مجھے دے کر تمہاری طرف روانہ کیا گیا ہے۔ وہ میں نے
تمہیں پہنچا دیا ہے۔ اور میرا رب تمہاری جگہ کسی اور قوم کو دے دے گا۔ اور تم اللہ کا کچھ بھی نہ بگاڑ
سکو گے۔ میرا رب ہر چیز کا نگہبان ہے۔ یعنی ایسی صاف اور کھری باتیں سن کر بھی نہ مانو گے تو اب میرا
کچھ نقصان نہیں ہے۔ میں فرض تبلیغ پوری طرح ادا کر چکا ہوں۔ تم اپنی فکر کر لو۔ ضروری ہے کہ اس
قسم کی ہٹ دھرمی اور تعصب و عناد پر آسمان سے عذاب آئے جو تم کو ہلاک کر ڈالے۔ اللہ سبحانہٗ کی
زمین تمہاری بربادی سے ویران نہ ہوگی۔ وہ دوسرے لوگوں کو تمہارے اموال وغیرہ کا وارث بنادے
گا۔ تمہارا قصہ ختم کر دینے سے یاد رکھو۔ اللہ کا یا اس کے پیغمبر کا کچھ نہیں بگڑتا نہ اس کا ملک خراب
ہوتا ہے۔ جب وہ ہر چیز کا محافظ و نگہبان ہے۔ تو ہر قابل حفاظت چیز کی حفاظت کے سامان اپنی
قدرت کاملہ سے کر دے گا۔ [1]

یہ حضرت ہود علیہ السلام نے خدا کا آخری پیغام پہنچایا۔ اب وہ وقت آگیا کہ اس عظیم الشان
قوم کو جس نے اپنے زور قوت سے دنیا کو ہلا دیا آخری دعوت دی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن میں اس رکوع میں ان کی تباہی کا اہم اور بنیادی سبب ناخدا شناسی اور اللہ سبحانہٗ کی کھلم کھلا بغاوت اور معبودان باطل کی پرستش ہے۔ یہاں حضرت ہود علیہ السلام بتا رہے ہیں کہ اگر تم اسی اعراض کی روش پر اڑے رہے تو اب نتائج کی ذمہ داری تم پر ہوگی۔ کیونکہ مجھے اللہ سبحانہٗ کی جانب سے جو پیغام دے کر بھیجا گیا ہے۔ وہ تمہیں واضح طور پر پہنچا چکا ہوں۔ اب آگے مرحلہ یہ ہے کہ میرا رب تمہاری جڑ کاٹ دے گا۔ اور تمہاری جگہ کسی اور قوم کو اقتدار دے گا۔ اور تمہاری بربادی سے اس کا کوئی نقصان نہ ہوگا۔ وہ ہر چیز کا نگران ہے۔ جس کو بچانا ہوگا بچالے گا۔ ان آیات میں ان کی تباہی کے اسباب میں سے صرف اللہ سے عابدانہ تعلق کو توڑ کر غیر اللہ سے عابدانہ تعلقات وابستہ کرنے کا ذکر کیا ہے۔ لیکن قرآن ہی میں دو سبب اور بھی بتائے ہیں۔

(۱) غرور و قوت: عاد کو اپنی قوت پر بڑا ناز تھا۔ اور اسی طرح ہر قوم جو مجد و تفوق پر قابض ہوتی ہے اپنی زندگی کے آخری مرحلے میں اپنی قوت پر مغرور رہتی ہے۔ متکبرین عاد نے کہا: کہ اے ہود علیہ السلام ہمیں کس سے ڈراتے ہو۔ من اشد منا قوۃ حضرت ہود علیہ السلام نے فرمایا تمہاری قوت مسلم لیکن اگر اصلاح و تقویٰ کی دعوت قبول کرو گے تو یزدکم قوۃ الی قوتکم لیکن وہ نہ سمجھے۔ ان کو نہ صرف اپنی فوجی اور سیاسی قوت پر ناز تھا بلکہ اپنی افرادی طاقت اور مویشیوں کی بہتات پر اور اپنے باغوں کی کثرت پر بھی ناز تھا۔ جو اس زمانہ کی سب سے بڑی دولت تھی۔

(۲) ظلم و جور: قوم کی حاکمانہ زندگی کا سب سے زیادہ زہر قاتل ظلم اور جور و ستم ہے۔ اقوام عالم کی تاریخ اس دعویٰ پر بہترین شاہد ہے۔ عاد اپنے مملوکہ ممالک میں اکڑتے پھرتے تھے۔ بغیر کسی استحقاق کے قوموں کو چھیڑ چھیڑ فنا کرتے رہے ہیں۔

عاد اور قوم عاد کی تاریخی حیثیت

یہ ایک عجیب بات ہے۔ کہ تاریخ قدیم کے بعض یورپین مصنفین عاد کو محض ایک فرضی نام اور مذہبی افسانہ خیال کرتے ہیں۔ چنانچہ مشہور مستشرق قرلاکی نے جو یورپ کی سرزمین میں مشرقیات اور تاریخ کا سب سے بڑا فاضل مانا جاتا ہے۔ عاد اور عمالقہ کی تحقیق میں ایک رسالہ لکھا ہے۔ جس میں ثابت کیا ہے۔ کہ یہ غیر تاریخی قوم ہے۔ لیکن یہ کوئی نئی ریسرچ نہیں قدیم زمانہ میں بھی بعض ایرانیوں کو ان کے وجود سے انکار تھا۔ چنانچہ حافظ ابن جریر طبریؒ نے جو مشہور مورخ ہیں۔ عاد کے حالات میں لکھا ہے بعض ایرانیوں نے عاد کا انکار کیا ہے۔ حالانکہ اشعار جاہلیت میں ان کا نہایت

کثرت سے تذکرہ ہے۔ اگر خوف تطویل نہ ہوتا تو میں ان کو ضرور نقل کرتا۔

لیکن یہ ایک نہایت فاش غلطی ہے۔ عاد و ثمود کے واقعات عرب کے مشہور ترین واقعات ہیں۔ جن کا علم خود ان کو ذاتی طور پر حاصل تھا۔ کیونکہ عاد و ثمود کی آبادیاں خود ان کے ملک کی آبادیاں تھیں۔ اور ان کے حالات واقعات خاندانی طور پر ان میں نقل ہوتے چلے آتے تھے۔ مشہور مؤرخ ابن ہشام کلبی نے جس کا مخصوص موضوع عرب جاہلیت کی تاریخ درروایت ہے۔ ان کے حالات میں تین مستقل کتابیں لکھی ہیں۔ پہلی کتاب کا نام "تفرق عاد" یعنی عاد کی قوم عرب سے نکل کر کہاں کہاں گئی۔ اور دوسری کتاب کا نام کتاب من نقل من عاد و ثمود والعمالیق وجرہم و بنی اسرائیل ہے۔ تیسری کتاب کا نام ہے کتاب عاد الاولیٰ والثانیہ یعنی عاد اولیٰ اور عاد ثانیہ کے حالات۔

بطلیموس نے اپنے جغرافیہ میں جنوبی عرب کے قبائل میں عادریٹیا اور عاد ائٹ کا ذکر کیا ہے ظاہر ہے کہ پہلا نام عادارم اور دوسرا عاد ہے جس کو یونانی تلفظ نے یہ صورت دے دی ہے۔ بطلیموس دوسری صدی عیسوی میں تھا۔ اس لیے عاد کا وجود اس زمانہ تک مسلم ہے۔

حضرت معاویہؓ کے زمانہ میں عبدالرحمٰن مصر کے گورنر تھے۔ انہوں نے حضرموت کے منہدم شدہ قلعہ حصن عزاب پر ایک کتبہ پایا تھا۔ یہ کتبہ علامہ نوری نے اپنی کتاب مسالک الابصار میں نقل کیا ہے۔ ۱۸۳۴ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ایک مشن پرین بھیجا تھا۔ اس کو یہی کتبہ اصل قدیم حمیری خط میں ملا۔ یہ کتبہ فارسٹر صاحب کی تحقیق کے مطابق قوم عاد کا ہے۔ اور عرب کے قدیم ترین کتبات میں سے ہے۔ جس کا زمانہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے اٹھارہ سو برس پہلے ہے۔ یہ کتبہ ایک منہدم عمارت میں پتھر پر کندہ تھا۔ ایک انگریز افسر جس کا نام ولٹڈ تھا۔ اس کا مکتشف تھا۔ اور یہ سب سے پہلا عربی کتبہ ہے جو یورپ نے عرب کی سرزمین میں دریافت کیا۔ اصل کتبہ اور اس کا حل اولا ایشیاٹک سوسائٹی کے جرنل میں شائع ہوا تھا۔ مولانا سید سلیمان ندوی نے اس کا پورا ترجمہ عاد ثانیہ کی تحقیق میں اپنی مشہور کتاب ارض القرآن میں درج کر دیا ہے۔ جو پیش خدمت ہے۔

> ہم مدت تک اس وسیع قصر میں رہے۔ اور ہماری حالت بدنصیبی اور ادبار سے دور تھی۔ ہماری نہروں میں دریا کا پانی زور سے آتا تھا۔ سمندر موجیں مارتا ہوا ہمارے قلعہ کی دیواروں سے غضبناک ہو کر ٹکریں مارتا تھا۔ ہمارے چشمے خوش آئند آواز سے بہتے تھے۔ بلند کھجوروں کے اوپر جن کے باغباں خشک چھوہارے ہماری وادیوں

کے چھوہاروں کی زمینوں میں لگاتے تھے۔ اور خشک چاول بوتے تھے۔ ہم پہاڑی بکروں کا اور جوان خرگوشوں کا شکار زنجیروں اور جالوں سے کرتے تھے۔ اور مچھلیوں کو بہلا کر باہر نکال لیا کرتے تھے۔ اور ہم آہستہ آہستہ خراماں خراماں رنگ برنگ کے ریشم کے کپڑے اور کاہی سبز مختلف الالوان جامہ پہن کر چلتے تھے۔ اور ہم پر وہ بادشاہ حکومت کرتے تھے جو کمینہ خیالات سے بہت دور اور شریروں کو سزا دینے والے تھے۔ ہود علیہ السلام کی شریعت کے مطابق اچھے فیصلے ایک کتاب میں لکھے جاتے تھے۔ ہم معجزات کا یقین رکھتے تھے۔ قیامت کے راز اور فتنوں کے راز پر ایمان رکھتے ہیں۔ رہزن دشمن گھس آتے اور وہ ہمارے ساتھ کچھ جھگڑا کرتے مگر ہم نے گھوڑوں کو پویہ ڈال دیا اور ہمارے کریم نوجوان سخت اور توکدار نیزوں کو لے کر آگے بڑھے۔ ہمارے خاندان کے مغرور بہادر مرد اور عورتیں گھوڑوں پر لڑ رہی تھیں جن کی گردنیں لمبی تھیں۔ اور جو چمکدار کمیت رنگ کے تھے۔ ہماری تلواریں بدستور دشمنوں کو زخمی کر رہی تھیں۔ اور چھید رہی تھیں۔ یہاں تک کہ ان کے قلب پر حملہ کر کے ان کو مفتوح اور بالکل پست کر دیا جو بدترین نوع انسان میں سے تھے۔

یہ کتبہ متعدد حیثیتوں سے قرآن عظیم کی تائید کرتا ہے۔ اول یہ کہ حضرت ہود علیہ السلام کی تاریخی شخصیت ثابت ہے۔ دوسرے یہ کہ بقایائے عاد صرف متبعین ہود تھے۔ تیسرے یہ کہ عاد ذات العماد اور عمارتوں کے بانی تھے۔ چوتھے یہ کہ وہ حقیقتاً جیسا کہ قرآن نے بتایا ہے۔ بڑے بڑے باغ اور چشمے آل اولاد اور چوپایوں والے تھے۔

بہرحال عاد کا انکار تاریخ کی ایک مسلّمہ حقیقت کا انکار ہے۔ تاریخ اور اکتشافات عصریہ دونوں کا متفقہ فیصلہ ہے۔ کہ عرب کے باشندے ایک کثیر التعداد اور باعظمت وجبروت قوم تھی۔ جن کا زمانہ حضرت اسمٰعیل علیہ السلام سے پہلے ہے۔ عرب مؤرخین ان کو عرب عاربہ یعنی خالص عرب کہتے ہیں۔ یہ بہت سے قبائل تھے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے البدایہ میں ان میں سے حسب ذیل بارہ قبائل نام بنام گنائے ہیں۔

(۱) عاد (۲) ثمود (۳) جرہم (۴) طسم (۵) جدیس (۶) امیم (۷) مدین (۸) عملاق (۹) وعبیل (۱۰) جاسم (۱۱) قحطان (۱۲) بنو یقطن

ان قبائل کو امم بائدہ بھی کہا جاتا ہے۔ یعنی برباد شدہ قومیں۔ ان میں سے عاد، ثمود، جرہم،

لمیان، طسم، جدیس وغیرہ مشہور قبائل ہیں۔ اور اشعار جاہلیت میں ان کا ذکر کثرت سے آیا ہے۔ قبیلہ عاد کی ان قبائل میں سب سے زیادہ کثیر الافراد باعظمت جماعت تھی۔ جو تمام عرب بائدہ میں شوکت و جبروت کے اعتبار سے ممتاز تھی۔ یہی قوم دنیا کی قدیم ترین تہذیب کی بانی تھی۔ بڑی بڑی عظیم الشان عمارتیں اسی کی دستکاری کا نتیجہ ہیں۔ ذرا اس پر غور فرمایئے۔ کہ

(۱) جیمز منٹگمری نے اپنی کتاب عرب اور بائیبل میں بتایا ہے۔ کہ عہد قدیم میں عرب میں نسبتاً" وافر پانی موجود تھا۔ وادیاں اور سرسبز قطعات تھے۔ احقاف میں جہاں آجکل زندگی بسر کرنا محال ہے آبادیوں کے کھنڈر ملتے ہیں۔ جو کسی قوم کے نقش پا کی غمازی کرتے ہیں۔ عاد اسی زمانہ کی قوم ہے۔

(۲) آر.بی. دوگرٹی اپنی کتاب عرب کی سمندری زمین میں لکھتا ہے کہ عرب عہد شادابی سے گزر چکا ہے۔ یہاں کئی تہذیبیں دفن ہیں آشوری کتبات میں ریگ زار عرب کی ایک قوم عادرماتو اُمت عاد کا ذکر ہے

(۳) عصر حاضر میں مشرقی عرب اور خلیج فارس کی ریاستوں میں علمائے اثریات نے کام کیا ہے۔ اس کے نتائج جیفری بی بی نے اپنی کتاب میں پیش کیئے ہیں۔ کہ دنیا میں قدیم ترین سمیری تہذیب کا مرکز عراق نہیں بلکہ عرب تھا۔ عہد قدیم میں عرب میں پانی وافر مقدار میں موجود تھا۔ جھیلیں جو کہ اب خشک ہو چکی ہیں۔ موجود تھیں۔ ان کے قرب وجوار میں برابر آبادیوں کے نشانات ملتے ہیں۔

(۴) علماء کو جنوبی عرب کے آثار تک پوری دسترس حاصل نہیں ہوئی۔ جو محدود کام ہوا ہے۔ اس سے پتہ چلتا ہے۔ کہ عرب کا جنوبی حصہ اقوام وملل کا گہوارہ رہا ہے۔ برائیڈی کی کتاب جنوبی عرب ۱۹۷۱ء میں کھنڈر اصنام کتبات قدیمہ اور ان کے نتائج پیش کیئے گئے۔ جن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ جنوبی عرب ملل قدیمہ کا مولد ومسکن ہے۔

(۵) ڈاکٹر فلپ ہٹی تاریخ ملت عربی میں لکھتا ہے۔ ملک عرب کی وجہ سے کبھی ناقابل سکونت نہیں رہا۔ اس کی گہری وادیاں جو اب خشک پڑی ہیں۔ شہادت دیتی ہیں کہ بارش کا پانی جو ایک زمانہ میں ان کے اندر سے بہتا تھا۔ کٹاؤ ڈالنے کی کیسی قوت رکھتا ہے۔ پھر لکھتا ہے۔ حضرموت کی سرزمین پر گہری وادیاں نمایاں ہیں۔ اور ان میں زیر زمین پانی کی کچھ کمی نہیں ہے۔ عاد کے متعلق لکھتا ہے۔ کہ قوم عاد کی نسبت قیاس ہے۔ کہ وہ قدیم حضرموت پھلی پھولی ہیں۔

(۶) سمیری کتبات میں ادا ہمارا آقا

ادا شہزادہ

ادا بادشاہ

کا تکرار ہے۔ نوحا کریمر ماہر سمیریات لکھتا ہے کہ لفظ ادا ایک معما ہے اس سے پہلے کچھ ترمیم کے ساتھ اس کا ترجمہ باپ کیا جاتا رہا۔ یہ ترجمہ بالکل غلط ہے۔ جب تک یہ معما حل نہ ہوا سے ترجمہ کے بغیر رہنے دیا جائے۔ اس معمے کا حل تورات میں موجود ہے۔ عرب کے اہل خیام کا ذکر ان الفاظ میں ہے:
عادہ سے یابل پیدا ہوا۔ وہ ان کا باپ ہے۔ جو خیموں میں رہتے اور مویشی پالتے ہیں۔ تکوین ۲۰.۴
عرب کی امم بائدہ کا نسل عاد سے تعلق واضح ہے۔

(۷) اکادی تہذیب عرب سے نکل کر عراق میں پھیلی۔ اکاد کون تھے۔ اکاد دراصل اخا عاد ہے۔ گویا اکاد عاد ثانیہ سے تعلق رکھتے تھے۔ (۱) سید سلیمان ندویؒ نے ارض القرآن میں یہ بات بڑے پتے کی لکھی ہے۔ کہ

یمن و حضرموت کے حدود کے ساحل سمندر پر ایک مشہور شہر واقع ہے۔ اور اب تک اسی نام سے مشہور ہے۔ لفظ عدن کی حقیقت پر غور کیجئے۔ عہد قدیم میں عموماً سامی مذاق یہ رہا ہے۔ کہ شہر کا نام بعینہٖ بانی شہر کے نام نام پر رکھتے تھے۔ عرب کے شہر راقیم، سبا، حضرموت، عمان، مدین، تیما، وغیرہ اس قسم کے نام ہیں۔ اس بنا پر اگر یمن کے قدیم شہر عدن کو جس کے قرب میں وہ تمام عمارات واقع ہیں۔ جن کو عرب عادیات کہتے ہیں۔ اور تاریخ جس کے قرب میں قوم کی آبادی کا نشان بتاتی ہے۔ عادیین کا مخفف قرار دیا جائے تو غلط نہیں ہے۔ فارسٹر عدن کو عدنان سے متعلق بتاتا ہے۔ حالانکہ عدنان کو یمن سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

(۱) دائرۃ المعارف الاسلامیہ جلد ۱۲

وَلَمَّا جَآءَ أَمْرُنَا نَجَّيْنَا هُودًا وَّالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَنَجَّيْنَاهُم مِّنْ عَذَابٍ غَلِيظٍ ۝ وَتِلْكَ عَادٌ ۖ جَحَدُوا بِآيَاتِ رَبِّهِمْ وَعَصَوْا رُسُلَهُ وَاتَّبَعُوا أَمْرَ كُلِّ جَبَّارٍ عَنِيدٍ ۝ وَأُتْبِعُوا فِي هَٰذِهِ الدُّنْيَا لَعْنَةً وَيَوْمَ الْقِيَامَةِ ۗ أَلَا إِنَّ عَادًا كَفَرُوا رَبَّهُمْ ۗ أَلَا بُعْدًا لِّعَادٍ قَوْمِ هُودٍ ۝

ع ۱۱

اور جب اللہ کا حکم آگیا تو ہم نے حضرت ہود علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ نعمت ایمان سے مالا مال تھے۔ اپنی رحمت سے بچالیا اور ان کو ایسے عذاب سے بچایا جو بڑا ہی سخت تھا[۷۶] یہ داستان ہے۔ اس قوم عاد کی جس نے اپنے رب کی نشانیاں سرکشی اور ہٹ دھرمی سے جھٹلائیں۔ اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر متکبر و سرکش کے حکم کی پیروی کی[۷۸] اور ان کے پیچھے اس دنیا میں لعنت پڑی اور قیامت کے دن بھی۔ دیکھو قوم عاد نے اپنے رب کا انکار کیا اور سن لو کہ عاد، قوم ہود کیلئے رحمت سے دوری اور پھٹکار ہے۔[۷۹]

قوم عاد پرستش اور بندگی میں شرک کرتی تھی

اللہ سبحانہٗ کی دو شانیں ہیں۔ ایک شان اللہ سبحانہٗ کے محبوب ہونے کی ہے۔ اس شان کے تقاضے میں ساری کائنات اللہ سے محبت کرتی ہے۔ ساری کائنات کی محبت تسخیری ہے۔ جبکہ انسانوں کی محبت اللہ سبحانہٗ سے تسخیری نہیں بلکہ ارادی و اختیاری ہے۔ یہ اس کی محبت ہی کا تقاضا ہے۔ کہ اسے خلوت و جلوت میں بلکہ ہمہ اوقات یاد کیا جاتا ہے۔ اس کے لیے شب بیداری کی جاتی ہے۔ ہر قسم کی جسمانی مشقت برداشت کی جاتی ہے۔ دعاء الحاح گریہ وزاری اسی کی محبت میں کی جاتی ہے۔ محبت کی بنیاد پر جس قدر اعمال کیئے جاتے ہیں۔ اسی کا نام پرستش ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی دوسری حاکمیت ہے۔ یعنی ساری کائنات اللہ کی محکوم ہے۔ پوری کائنات کی محکومی تسخیری ہے۔ مگر انسانوں کی محکومی تسخیری نہیں۔ بلکہ ارادی و اختیاری ہے۔ اسی حاکمیت کا تقاضا ہے۔ کہ اس کے احکام کی اطاعت کی جاتی ہے انفرادی زندگی میں اور اجتماعی زندگی میں۔ اور پھر اجتماعی زندگی کے سارے گوشوں یعنی عائلی، معاشرتی، سیاسی اور قانونی نظام میں اس کی اطاعت کی جائے۔ اسی کا نام بندگی ہے۔ پرستش اور بندگی کے مجموعہ کو عربی میں عبادت کہتے ہیں۔ پیچھے پڑھ آئے ہو۔ کہ قوم عاد نے پرستش کے لیے ہیکل، اور بندگی کے لیے بیت الحکومت دو الگ ادارے قائم کر رکھے تھے۔ پہلی آیات میں اللہ سے الگ ہو کر پرستش میں ان کے باغیانہ تعلقات کا ذکر تھا۔ اور ان آیات میں بندگی میں ان کی ناخداشناسی اور اللہ سبحانہٗ کی کھلم کھلا بغاوت کا ذکر ہے۔ اور یہ بات اشارتاً نہیں بلکہ صراحت کی پوری قوت سے بتائی جا رہی ہے۔ واتبعوا امر کل جبار عنید۔

۶۸ اور جب اللہ کا حکم آ گیا تو ہم نے حضرت ہود علیہ السلام کو اور ان لوگوں کو جو حضرت ہود علیہ السلام کے ساتھ نعمت ایمان سے ہمدوش ہوئے تھے۔ اپنی رحمت سے بچا لیا۔ اور ان کو ایسے عذاب سے بچا لیا۔ جو بڑا ہی سخت تھا۔ یعنی سات رات اور آٹھ روز مسلسل آندھی کا طوفان آیا جیسا کہ سورۂ اعراف میں ہم ذکر کر چکے ہیں۔ مکان گر گئے، چھتیں اڑ گئیں۔ درخت جڑ سے اکھڑ کر کہیں کے کہیں پہنچ گئے۔ ہوا ایسی سموم تھی کہ آدمیوں کی ناک میں داخل ہو کر نیچے سے نکل جاتی اور جسم کو پارہ پارہ کر ڈالتی۔ اس ہولناک عذاب سے ہم نے حضرت ہودؑ اور انکے ساتھیوں کو جو آخر میں چار ہزار تک پہنچ گئے تھے۔ اور ایمان و عمل صالح کی بدولت آخرت کے بھاری عذاب سے بھی نجات دی۔[۱]

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

یہ خیال نہ کیجیے کہ یہ سارا کام ایک ہی دن، ایک ہفتہ، یا ایک ماہ، یا ایک سال میں ہو گیا۔ نہیں بلکہ حضرت ہود علیہ السلام نے ایک عرصہ دراز تک محنت کی، ہیکل والوں کو اور بیت الحکومت والوں کو دعوت پیش کی۔ اور اس دعوت کے نتیجے میں اہل ایمان کی ایک جماعت بھی پیدا ہو گئی۔ ظاہر ہے کہ پہلے صرف ہود علیہ السلام تھے۔ اب ان کے ساتھ اہل ایمان کی ایک جماعت بھی تھی۔ ان کے ساتھ ہیکل والوں اور بیت الحکومت کا جو طرز عمل ہو گا۔ جو مادہ پرست کا اہل حق کے ساتھ ہو گا۔ سب پیغمبروں کی طرح حضرت ہود علیہ السلام کی پکار ایک تھی۔ انہوں نے کہا کہ اللہ کی بندگی کرو۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ انہوں نے کہا ظلم و بدعملی سے باز آجاؤ۔ اس کا نتیجہ ہلاکت ہے۔ انہوں نے کہا ہماری جدوجہد ادائے فرض ہے، مزدوری کی کوئی طلب نہیں ہے۔ ہمارے سامنے علم و یقین ہے۔ ہم تمہیں افترائی زندگی سے بچانا چاہتے ہیں۔ ماننا نہ ماننا تمہارا کام ہے۔ جواب میں سب نے انکار کیا۔ سب نے دعوت کا مذاق اُڑایا۔ سرکشی اور گھمنڈ کی راہ پر چلے۔ جبر و تشدد سے راستہ روکنا چاہا۔ مانا چند بے نواؤں نے مانا۔ وہ تھوڑے سے تھے۔ بالآخر ساری کشمکش کے بعد نتیجہ بھی وہ نکلا جو ہمیشہ نکلا کرتا ہے۔ آخر وہ وقت آگیا جب سنت الٰہی نے اپنی زمین کے لیے ایک دوسری قوم کا انتخاب کر لیا۔ اور اس شریر قوم کو احقاف سے باہر تلوار سے اور احقاف کے اندر ہوا اور ریگ کے طوفان کے ذریعے برباد کر دیا۔ یہ سب اس کے ہتھیار ہیں۔ اس کا حکم انسانوں کے ساتھ بھی ویسا ہی کام کرتا ہے۔ جس طرح ہوا پانی اور آگ میں۔ اور ملکوں میں پانی کا دریا ہے۔ جس میں کبھی کبھی طوفان آتا ہے۔ عرب اور افریقہ میں ریگستان کا دریا ہے۔ کوسوں تک ریگستان ہے۔ احقاف وہ عظیم الشان ریگستان ہے۔ جو سینکڑوں میل تک وسیع ہے۔ اور اب اس کو الربع الخالی کہتے ہیں۔ اس میں جب تیز ہوا چلتی ہے۔ زندگی دشوار ہو جاتی ہے۔ ریگ کے پہاڑ کے پہاڑ ہوا پر اُڑتے ہیں۔ اور جہاں وہ تھمتے ہیں۔ اس کو دبا کر دفن کر دیتے ہیں۔ قافلے کا قافلہ گاؤں کا گاؤں اس کے نیچے دب کر موت سے پہلے مدفون ہو جاتے ہیں۔ پھر اتفاق سے وہاں سے ریت ہٹتی ہے۔ تو ہڈیوں کا ایک قلعہ نظر آتا ہے۔ ایک انگریز سیاح جس نے اس طوفان سموم کا عرب میں نمونہ دیکھا ہے۔ اس کی حقیقت یوں بیان کرتا ہے۔

> دوپہر تھی جنوب کی طرف سے دفعتہً جھونکے آنے لگے۔ ہوا کی تیزی رفتہ رفتہ بڑھتی گئی۔ میرے عرب رفیق نے چہرے کو کپڑے لپیٹ لیا۔ اور اونٹوں کو مار مار کر تیز کرنے لگے۔ لیکن اونٹ بار بار بیٹھنے کی کوشش کرتے تھے۔ میں نے رفیقوں سے واقعہ دریافت کیا۔ انہوں نے نہایت گھبراہٹ کے ساتھ کہا تو صرف اتنا کہ سامنے

کے خیمے میں اگر پہنچ گئے تو جان بچ جائے گی۔ اسی اثنا رمیں ہوا اور تیز و تند ہو گئی۔ گرمی کی یہ شدت ہو گئی۔ کہ معلوم ہوتا تھا۔ کہ آسمان سے دوزخ اتر آئی ہے۔ بالآخر کوشش کرکے ہم خیمے تک پہنچے وہاں ایک عورت منہ لپیٹے پڑی تھی۔ ہمارے اُونٹ ہوا کے رُخ سے منہ پھیر کر ناک کو ریت میں گاڑ کر مردے کی طرح گر پڑے ہم بھی خیمے میں جا کر منہ لپیٹ کر اوندھے پڑ گئے تاریکی اتنی شدید تھی کہ رات معلوم ہوتی تھی۔ دس منٹ تک یہی حالت رہی۔ پھر ہوا اور گرمی میں تخفیف ہوئی۔ جب ہم اُٹھے تو ہمارے چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ (ارض القرآن)

یہ اس طوفانی ہوا کی بات ہے۔ جو طبعی طور پر چلتی ہے۔ لیکن جو ہوا کا طوفان لما جاء امرنا کے مطابق طبعی نہیں بلکہ امری تھا۔ یعنی ہمارے حکم کے تحت آیا تھا۔ اور مسلسل سات راتیں اور آٹھ دن لگا تار آتا رہا اس کا کیا حال تھا۔ اس کی جو تفصیل قرآن حکیم کے دوسرے مقامات پر آئی ہے کہ اس کے زور سے لوگ اس طرح گر گر کر مر گئے اور مر مر کر گر پڑے جیسے کھجور کے کھوکھلے تنے گرے پڑے ہوں۔ (الحاقہ) جس چیز پر سے یہ ہوا گزر گئی۔ اس کو بوسیدہ کرکے رکھ دیا۔ الزاریات۔ جس وقت یہ ہوا آرہی تھی اس وقت قوم عاد خوشیاں منا رہی تھی۔ کہ بادل خوب اٹھا ہے۔ بارش ضرور ہوگی۔ بارش گھر آئی اور اس طرح آئی کہ پورے علاقے کی تباہی لے کر آئی۔ کہ پوری انسانی تاریخ میں قوم عاد تباہی کے لیے ضرب المثل بن کر رہ گئی۔

جاء امرنا کے بعد حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے اہل ایمان ساتھیوں کو بچانے کا خاص طور پر ذکر فرمایا اور اس اضافہ کے ساتھ کہ برحمۃ منا۔ سوچنے کی بات ہے کہ جب ایسا تھا کہ لوگ مر مر کر گر رہے تھے۔ ہوا جہاں سے گزر جاتی تباہی کے سوا کچھ باقی نہ رہتا۔ سوچنے کی بات ہے۔ کہ اس طوفانی بلا سے حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھی کیسے بچے۔ اس کی ایک ہی صورت ہے۔ کہ حضرت ہود علیہ السلام نے وہاں سے ہجرت کر لی ہو مگر اس کی صراحت کہیں دیکھنے میں نہیں آئی۔ چونکہ اسی طوفانی مقام پر رکھ کر حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بچایا اس لیے برحمۃ منا کا اضافہ کیا اور بتایا کہ عذاب جو پورے علاقہ پر آیا تھا۔ اس سے حضرت ہود علیہ السلام اور اہل ایمان کو اپنی خاص رحمت سے بچایا اور یہ عنایت خداوندی کا عظیم کرشمہ ہے۔ اور یہ اضافہ ونجینا ھم من عذاب غلیظ۔ یہ سمجھانے کے لیے کیا ہے۔ کہ ان کو کسی معمولی عذاب سے نہیں بلکہ سخت ترین عذاب سے بچایا ہے۔ جس نے پوری قوم کی جڑ کاٹ کر رکھ دی تھی۔ یہ کہہ کر اگر

ایک طرف عذاب کی ہولناکی کو بتادیا تو دوسری طرف اس عظیم رحمت کو بھی ظاہر کردیا ہے۔ جس کے ذریعے حضرت ہود علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو اللہ سبحانہٗ نے اسباب سے بالآخر ہو کر بچایا۔

(۶۹) قوم عاد جبابرہ کی پیروکار تھی

یہ داستان ہے اس قوم عاد کی جس نے اپنے رب کی نشانیاں سرکشی اور ہٹ دھرمی سے جھٹلائیں اور اس کے رسولوں کی نافرمانی کی اور ہر متکبر و سرکش کی پیروی کی۔ یعنی ان کے کھنڈرات کو چشم عبرت سے دیکھو کہ یہ وہ قوم عاد تھی جن کے بڑوں نے بڑے طمطراق سے اپنے پروردگار کی باتوں کا مقابلہ کیا۔ اور اس کے پیغمبروں کی نافرمانی کی اور چھوٹوں نے بڑے شیطانوں کی پیروی کی آخر دونوں تباہ و برباد ہو گئے[۱]

اس آیت میں قوم عاد کے تین جرائم بتائے گئے ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ وہ رب کی نشانیوں کے لیے کفر و جحود کر رہے تھے۔ یعنی جان بوجھ کر اور محض ہٹ دھرمی اور شرارت سے انکار کر رہے تھے۔ یعنی انہوں نے دیدہ دانستہ راہِ کفر اختیار کی۔ سنگین انکار کو جحود کہتے ہیں۔ یعنی انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کے ان معجزات کا جو ان کو اللہ کی جانب سے ملے تھے۔ اس طرح انکار کردیا۔ جیسے واقعات اور مشاہدات کا انکار کیا جاتا ہے۔

(۲) دوسرا جرم یہ بتایا کہ انہوں نے اللہ سبحانہٗ کے رسول کی نافرمانی کی۔ یہ بات کہ رسول تو قوم عاد میں صرف حضرت ہود علیہ السلام آئے۔ پھر جمع کی تعبیر کیوں ہے۔ اس لیے کہ ان کی تعلیم سب رسولوں کی تعلیم تھی۔ لہٰذا ایک کی نافرمانی سب رسولوں کی نافرمانی ہے۔ جیسے ایک کی تکذیب سب کی تکذیب ہے۔ گویا اعتبار علت فعل کا ہے۔ نہ کہ فعل کا۔ یعنی جس علت کی وجہ سے انہوں نے حضرت ہود علیہ السلام کی نافرمانی کی۔ اس کی موجودگی میں کسی رسول کے ساتھ بھی ان کا یہی معاملہ ہوتا۔ اس سے کچھ مختلف نہ ہوتا۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں۔

> رسلہٗ شاید اس لیے فرمایا کہ ایک کی تکذیب سب پیغمبروں کی تکذیب ہے کیونکہ توحید وغیرہ اصول میں سب متفق ہیں۔ اور ایک دوسرے کے مصدق ہیں۔

جزنا ویل رسلہٗ کی شیخ الاسلام نے کی ہے۔ یہی تاویل دوسرے شارحین قرآن نے بھی کی ہے۔ شاید یہ

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

تاویل اس مشہور عام کی وجہ سے کی گئی ہے۔ کہ قوم عاد میں حضرت ہود علیہ السلام کے سوا اور کوئی رسول نہیں آیا۔ حالانکہ یہ بات صراحتاً قرآن کے خلاف ہے۔ قرآن نے یہ بات صراحتاً بتائی ہے کہ قوم عاد میں حضرت ہود علیہ السلام سے پہلے اور بعد میں بہت رسول آئے ہیں۔ اور سب کی منادی یہ تھی۔ کہ ان لا تعبدوا الا اللہ۔

اذ جاءتھم الرسل من بین ایدیھم ومن خلفھم

ان کے اگاڑی اور پچھاڑی رسول آئے۔

یہ تو قوم کے تذکرے ہیں۔ بہت سے رسولوں کی روانگی کی صراحت دوسری جگہ احقاف میں خاص حضرت ہود علیہ السلام کے تذکرے میں ہے۔

اذ انذر قومہ بالاحقاف وقد خلت النذر من بین یدیہ ومن خلفہ ان لا تعبدوا الا اللہ۔

جب ہود علیہ السلام نے احقاف میں اپنی قوم کو ڈرایا۔ حضرت ہود علیہ السلام سے پہلے اور ان کے بعد بہت رسول گزرے کہ لوگو: نہ عبادت کرو اللہ کے سوا۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔ کہ

اللہ تعالیٰ نے ان کے شہروں کے ارد گرد رسول روانہ کیئے ہیں۔

قرآن کی ان تصریحات کی موجودگی میں اس تاویل کی کوئی حاجت نہیں ہے۔ کہ ایک کی تکذیب چونکہ سب کی تکذیب ہے۔ اس لیے جمع لے کر آئے ہیں۔ بہت ڈرانے والے آئے انہوں نے سب کی تکذیب کی ہے۔ یہاں جمع مکسر ہے۔ دوسرے موقعہ پر جمع سالم آئی ہے۔ کذبت عاد المرسلین۔ قرآن کی تصریح کے مطابق قوم عاد میں بہت رسول آئے ہیں۔ بہت ڈرانے والے آئے انہوں نے سب کی تکذیب کی ہے۔ عذاب کا حادثہ چونکہ حضرت ہود علیہ السلام کے زمانہ دعوت میں پیش آیا ہے اس لیے زعیم انبیاء کی حیثیت سے ان کا نام آیا ہے۔

(س) تیسرا جرم ان کا یہ بتایا گیا ہے۔ کہ انہوں نے سرکشوں اور متکبرین کے احکام کی پیروی کی اشارہ کر دیا کہ قوم عاد پر ظالم اور سرکش بادشاہ حکمرانی کرتے تھے۔ اور فراعنہ مصر کی طرح اپنی بندگی کراتے تھے۔ فرمایا کہ انہوں نے اللہ کے رسولوں کا کہا نہ مانا اور سرکش وظالم حکمرانوں کا کہا مانا یعنی جو حق وعدالت کی طرف بلاتے تھے۔ ان سے تو منکر ہوئے اور جو ظلم وسرکشی کرتے تھے ان کے پیچھے چلتے تھے۔

اس سے پہلی آیات میں ہے کہ قوم عاد نے پرستش میں اللہ سبحانہ سے عابدانہ تعلقات توڑ کر

ارواح، اجسام، آثار سے قائم کرلیے تھے۔ اس آیت میں بتایا کہ قوم عاد نے بندگی میں اللہ سبحانہٗ سے عابدانہ تعلقات یہ ہیں۔ کہ رسول کی اتباع کی جائے۔ اور اللہ کے اقتدار اعلیٰ میں اللہ کا نائب سمجھ کر اس کی اطاعت کی جائے۔ اور رسول کے مقابلے میں جو اپنی اطاعت اور اتباع کی دعوت دے وہ اپنے دور کا طاغوت ہے۔ اس کا کفر اس سے روگردانی عین ایمان ہے۔ یہ پہلے سُن آئے ہو کہ جیسے پرستش میں شرک غلط ہے۔ ایسے ہی بندگی میں بھی شرک غلط ہے۔ بندگی میں شرک چونکہ اطاعت و اتباع کے لیے ہے۔ اللہ کے رسول کی اتباع و اطاعت چھوڑ کر فراعنہ، نمار دہ کے ذریعے قانونی، سیاسی معاشی اور معاشرتی زندگی میں ہوتا ہے۔ اس لیے قرآن اس کے لیے مشاقہ اور محاورہ کی تعبیر اختیار کرتا ہے۔

پرستش اور بندگی کے مجموعہ کو عبادت کہتے ہیں۔ نبوّت جب اعلان کرتی ہے۔ یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہٍ غیرہٗ۔ تو وہ لوگوں سے جیسے یہ کہتی ہے۔ کہ لوگو! اللہ کے سوا کسی کی پرستش نہ کرو کیونکہ اس کے سوا تمہارا معبود کوئی نہیں ہے۔ ایسے ہی وہ یہ بھی کہتی ہے۔ کہ لوگو، اللہ کے سوا بندگی کسی کی نہ کرو۔ کیونکہ اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں۔ پرستش کی حدود میں مشرک قومیں جو اپنے معبودوں سے دعاؤں اور طلبگاریوں میں مانگتی تھیں۔ وہ عام طور پر اسی زندگی کی چیزیں ہوتی تھیں۔ مثلاً بارش برسائی جائے۔ مویشیوں کا دودھ اور نسل بڑھائی جائے۔ کھیتوں کی پیداوار میں برکت آفتوں سے محفوظ رکھ کر باغوں کو پھلوں سے بھر دیا جائے۔ قحط کو دُور کیا جائے۔ اور وباؤں سے محفوظ رکھا جائے۔ اقبال مند اولاد بخشی جائے۔ دشمنوں پر فتح ہو۔ غیر اللہ کی پرستش دعا، عبادت و نذر و قربانی سے عموماً اسی قسم کی چیزوں کا مطالبہ کیا جاتا تھا۔ اور غیر اللہ کو الٰہ بنا کر جو پوجتے تھے ان کی غرض یہی ہوتی تھی۔ اور اب بھی اس مسلک کے جو پابند ہیں۔ ان کی غرض یہی ہوتی ہے۔ اور بندگی کی حدود میں ارباب اقتدار کو الٰہ بنانے والوں کا مقصد ان کے ذریعے جاہ و اقتدار حاصل کرنا، عہدے اور مناصب کے لیے تگ و دو، متنازعات کا فیصلہ کرانا، مالیاتی مسائل اور فوجداری معاملات کو حل کرانا یہ اور اس قسم کے دوسرے مسائل بندگی میں شرک کرنے والوں کا پیش نہاد ہوتا ہے۔ نہ پرستش میں شرک کرنے والا اپنے الٰہ سے جنت مانگتا ہے۔ اور نہ بندگی میں شرک کرنے والے اپنے الٰہوں سے جنت مانگتے ہیں۔ کسی کو نہ دیکھا ہوگا کہ قبر پر کھڑے ہو کر یہ درخواست کرتا ہو۔ کہ اسے عذاب قبر سے بچایا جائے۔ حشر کی پریشانیوں میں مدد کی جائے۔ جہنم سے محفوظ رکھ کر جنت کی ابدی زندگی دی جائے۔

یہ صرف راہ نبوت ہے۔ جو بتاتی ہے کہ مالیاتی مسائل اور فوجداری مقدمات کا اللہ کے قانون کے مطابق فیصلہ کراؤ اور جبار وعنید کی اتباع نہ کرو بلکہ اللہ کے رسول کی پیروی کرو اور اس کی اطاعت کرو۔ اور پرستش میں شرک کرنے والوں کو بتاتی ہے۔ کہ جن حاجتوں اور ضرورتوں کے لیے تم نے اللہ کے سوا الٰہ بنا رکھے ہیں۔ ان ہی حاجتوں اور ضرورتوں کے لیے اللہ کو الٰہ بناؤ اور سب کچھ اس سے مانگو۔

اس پوری کائنات کا جس کا ہماری یہ دنیا بھی ایک چھوٹا سا حصہ ہے مقتدر اعلیٰ اللہ سبحانہٗ ہی ہے۔ حکم دینے منع کرنے اور اپنی مرضی پوری کرانے کا اصل مستحق صرف وہی ہے۔ حقیقی شارع اور قانون ساز بھی وہی ہے۔ کسی مخلوق کی زندگی کا فریضہ متعین کرنے، اس کے معاملے کا فیصلہ کرنے، اسے معاف کرنے یا سزا دینے کا اختیار بھی پورے کا پورا اُسی کے ہاتھ میں ہے۔

اللہ تعالیٰ کے سوا اور کوئی نہیں جو اپنے اندر شان معبودیت رکھتا ہو۔ جو پوجے جانے کا مستحق ہو۔ جس کی رضا چاہی جائے کوئی اور نہیں جو اس لائق ہو کہ اس کے سامنے پیشانیاں جھکیں، نذریں پیش کی جائیں۔ اعتراف نعمت کیا جائے، کوئی اور نہیں جسے والی کارساز حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے جس سے دعائیں اور حاجتیں مانگی جائیں اور جسے غیبی مدد کے لیے پکارا جائے، کوئی اور نہیں جس پر توکل کیا جائے۔ دل میں جس کا خوف رکھا جائے۔ جس سے امیدیں وابستہ کی جائیں اور جس سے حقیقی محبت رکھی جائے۔ کوئی اور نہیں جس کے ہاتھ میں حقیقی اقتدار کا کوئی ذرہ بھی ہو۔ نہ شخص نہ جماعت اور نہ خواص نہ عوام کوئی نہیں جو بال برابر بھی کسی کو بھی نفع یا نقصان پہنچا سکے جو کسی کے لیے قانون بنانے اور حکم چلانے کا ذاتی استحقاق رکھتا ہو اور جس کی بے قید اطاعت جائز ہو۔

یہ راہ نبوت ہے قوم عاد اس راہ سے بھٹک گئی تھی۔ اور ان کا علم اس موضوع پر گمراہیوں کا نشانہ بن گیا تھا۔ حضرت ہود علیہ السلام اسی علم کی تصحیح کے لیے تشریف لائے تھے۔ مگر انہوں نے علم کی تصحیح کی ہٹ دھرمی اور ضد سے کام لے کر حضرت ہود علیہ السلام کی تکذیب کی۔

(۷۰) عاد کی بدکرداری کا نتیجہ

اور ان کے پیچھے اس دنیا میں لعنت پڑ گئی اور قیامت کے دن بھی۔ دیکھو قوم عاد نے اپنے رب کا انکار کیا اور سن لو کہ عاد قوم ہود رحمت سے دور ہے۔ یعنی خدا کی لعنت دنیا میں ان کے پیچھے لگا دی گئی کہ جہاں جائیں ساتھ جائے اور قیامت کے بعد بھی وہ ان کا پیچھا نہ چھوڑے گی۔ لعنت کا طوق ان کے گلے میں پڑا رہے گا اور یہ جو فرمایا الا بعدا العاد قوم ھود۔ تو بعض مفسرین کہتے ہیں کہ قیامت

کے دن یوں پکارا جائے گا۔ الاان عاداکفروا ربھم ۔ عاد کے ساتھ قوم ہود کا لفظ یا تو اس لیے بڑھایا کہ دونوں کا تصور سننے والے کے ذہن میں ساتھ ساتھ آئے یعنی ہود علیہ السلام کا کیا حال ہوا اور یہ اسی کی قوم تھی جس کا حشر یہ ہوا۔ اور ممکن ہے کہ اس پر متنبہ کرنا ہو۔ کہ عاد دو ہیں۔ عاد اولیٰ عاد اخریٰ ۔ اسی لیے ایک جگہ فرمایا۔ اھلک عاد الاولی ۔ یہاں عاد اولیٰ مراد ہے۔ جس کی طرف ہود علیہ السلام مبعوث ہوئے تھے ۔ واللہ اعلم [1] ابن زید نے تصریح کی ہے۔ کہ ان کو عاد اولیٰ اس لیے کہا جاتا ہے کہ حضرت نوحؑ کے بعد پہلی ہلاک ہونے والی قوم یہی ہے۔ اور صالحین قوم ہود علیہ السلام جنہوں نے ایمان کی بدولت نجات پائی تھی۔ اور ان کی اولاد عاد ثانیہ کہلاتی ہے۔ اور بات بھی خود بخود سمجھ میں آرہی ہے۔ کہ عذاب سے نجات پانے والوں کا عاد ثانیہ نام ہے۔ بچنے والے کون تھے۔ نجینا ھودا والذین اٰمنوا معہ ۔ حیرت ہے کہ حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے تفسیر عزیزی میں دو عاد بنا ڈالے ایک تو عاد بن عوص ابن ارم ابن سام ابن نوح ۔ دوسرا ایک اور عاد جو کسی اور شخص کی اولاد ہے۔ قرآن میں عاد کا واقعہ تکرار کے ساتھ اسی دوسرے عاد کا ہے۔ اور پہلے عاد کا قصہ قرآن میں صرف دو جگہ آیا ہے۔ ایک احقاف میں اور دوسرا سورۂ نجم میں۔ لیکن حضرت شاہ صاحب کا یہ خیال چونکہ عام مفسرین اور مؤرخین کی تصریح کے خلاف ہے۔ اس لیے قابل قبول نہیں ہے۔ ہود علیہ السلام عاد اولیٰ میں مبعوث ہوئے ہیں۔ اور جہاں بھی عاد کا ذکر آیا ہے۔ اس سے عاد اولیٰ مراد ہے۔ سورۂ احقاف میں عاد کا ہی واقعہ ہے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

وَاِلٰى ثَمُوْدَ اَخَاهُمْ صٰلِحًا ۘ قَالَ يٰقَوْمِ اعْبُدُوا
اللّٰهَ مَا لَكُمْ مِّنْ اِلٰهٍ غَيْرُهٗ ؕ هُوَ اَنْشَاَكُمْ مِّنَ الْاَرْضِ وَ
اسْتَعْمَرَكُمْ فِيْهَا فَاسْتَغْفِرُوْهُ ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ قَرِيْبٌ
مُّجِيْبٌ ۝ قَالُوْا يٰصٰلِحُ قَدْ كُنْتَ فِيْنَا مَرْجُوًّا قَبْلَ هٰذَآ اَتَنْهٰىنَآ
اَنْ نَّعْبُدَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَا وَاِنَّنَا لَفِيْ شَكٍّ مِّمَّا تَدْعُوْنَآ اِلَيْهِ
مُرِيْبٍ ۝ قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ
وَاٰتٰىنِيْ مِنْهُ رَحْمَةً فَمَنْ يَّنْصُرُنِيْ مِنَ اللّٰهِ اِنْ عَصَيْتُهٗ ۫
فَمَا تَزِيْدُوْنَنِيْ غَيْرَ تَخْسِيْرٍ ۝

اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی حضرت صالح علیہ السلام کو روانہ کیا[۱] انہوں نے قوم کو مخاطب کر کے فرمایا: اے میری قوم کے لوگو! اللہ سبحانہ، سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو۔ اللہ کے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں ہے۔ اللہ نے تمہیں زمین سے نشو ونما دی ہے۔ اور پھر اسی نے تمہیں زمین میں بسایا ہے۔[۲] لہذا تم اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور آئندہ کے لیے اسی کی طرف رجوع کرو۔ یقین کرو میرا پروردگار ہر ایک کے پاس ہے اور ہر ایک کی دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔[۳] لوگوں نے

کہا! اے صالح علیہ السلام پہلے تو تو ایک ایسا آدمی تھا کہ ہم سب کی اُمیدیں تجھ سے وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں اس بات سے روکتا ہے۔ کہ ہم ان معبودوں کی پوجا نہ کریں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے چلے آئے ہیں۔ ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے۔ جس کی طرف تم ہمیں دعوت دے رہے ہو۔ ہمارے دل میں بڑا خلجان ہے[۳]۔ حضرت صالح علیہ السلام نے کہا: کہ اے میری قوم تم نے اس بات پر غور کیا کہ اگر میں اپنے پروردگار کی طرف سے ایک دلیل روشن پر ہوں۔ اور اس نے مجھے اپنی رحمت عطا فرمائی ہو۔ تو پھر کون ہے جو اللہ کے مقابلے میں میری مدد کرے گا اگر میں اس کے حکم سے سرتابی کروں تو تم مجھے تباہی کے سوا کوئی فائدہ نہیں دے رہے ہو[۴]۔

انسان کی پیدائش اور اس کی آبادکاری

آیت میں موقعہ استدلال میں دو لفظ آئے ہیں۔ ایک انشار، دوسرے استعمار۔ انشار تخلیق سے الگ ہے۔ خلق کے معنے پیدا کرنا ہیں جیسے ربکم الذی خلقکم۔ انشار کے معنے صرف پیدا کرنا نہیں بلکہ بڑھانا اور نشوونما دینا۔ اسی لیے یہ لفظ باغات، نباتات کے لیے استعمال ہوتا ہے۔ اس کے ایک معنے تو یہی ہیں جیسا کہ عام شارحین قرآن نے بتائے ہیں۔ کہ زمین سے غذائیں پیدا کیں۔ جن سے نطفہ بنایا جس نے زمین کے لیے جان ماددں سے تمہیں یہ وجود بخشا۔ لیکن قرآن ہی میں انشار کی تعبیر باغات کے لیے بھی آئی ہے۔ انشار جنات۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ انسان کو اللہ نے صرف مٹی سے پیدا ہی نہیں کیا ہے۔ بلکہ زمین ہی کو اس کی نشوونما کا ذریعہ بنایا ہے۔ گویا انسان پوری کائنات میں

شجر حیات کی مرکزی شاخ ہے۔ اور زمین کے ذریعے نشو و نما کے بعد اللہ نے انسان کو زمین کا آباد کار بنایا۔ قوم ثمود زمین کی آبادی زراعت کے ذریعے کرتی تھی۔ اتترکون فیما ھٰھنا اٰمنین فی جنات وعیون وزروع ونخل یعنی باغات، کھیتیاں، نخلستان کے ذریعے زمین کی آباد کاری کرتے تھے۔ ٹھیک ایسے ہی وہ پتھروں سے تراش کر عمارتوں کے ذریعے بھی زمین کی آباد کاری کرتے تھے۔ اور نرم زمین پر محلات اور قصور بناتے تھے یعنی ان کی شہری اور دیہاتی زندگی زمین کی آباد کاری کے ذریعے بہت اونچی اور بلند تھی۔ قرآن نے یہاں قوم ثمود کی اس تمدنی ترقی کو موقع استدلال میں پیش کیا ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ تمہاری ان ساری تمدنی ترقیوں کا ذریعہ خود یہ مادہ نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ ہے۔ تم اس مادیت میں پڑ کر صرف خدا فراموش نہیں ہوئے بلکہ اللہ سبحانہٗ کی کھلم کھلا بغاوت کر کے تم نے اپنے عابدانہ تعلقات اللہ سے توڑ کر پرستش اور بندگی میں غیر اللہ سے جوڑ لیے ہیں۔ یہاں قرآن یہ نہیں کہہ رہا ہے کہ اپنی معاش کے لیے تم نے باغات، کھیتیاں کیوں لگائی ہیں۔ یا اپنی بدنیت کی برتری کے لیے محلات کیوں بنائے ہیں۔ بلکہ یہ کہہ رہا ہے کہ اللہ کی ان نعمتوں میں مگن ہو کر تم نے اپنے مالک و خالق سے پرستش اور بندگی کا رشتہ توڑ کر مخلوق سے کیوں جوڑ لیا ہے۔ یعنی قوم ثمود کا پرستش و بندگی میں اگر اللہ سے رشتہ استوار ہوتا تو قرآن کو ان کے محلات و باغات پر کوئی اعتراض نہ ہوتا۔ یہ تو اینٹ پتھر اور مٹی کی بات ہے۔ اگر اللہ سے بندگی اور پرستش میں تعلقات صحیح ہوں تو قرآن کو حضرت سلیمان علیہ السلام کے شیش محل پر بھی کوئی اعتراض نہیں ہے۔

(۷۰) اور ہم نے قوم ثمود کی طرف ان کے بھائی حضرت صالح علیہ السلام کو روانہ کیا۔ سورۂ اعراف یعنی معالم القرآن کی آٹھویں جلد میں قوم ثمود اور حضرت صالح علیہ السلام کا اجمالی چہرہ پیش کیا جا چکا ہے۔ یہاں یہ بات یاد رکھنے کی ہے۔ کہ لفظ ثمود کو کچھ علماء عربی کہتے ہیں اور کچھ عجمی۔ دونوں صورتوں میں علم ہونے کی وجہ سے غیر منصرف ہے۔ اگر عربی ہے تو ثمر سے فعول کے وزن پر ہے۔ ثمر عربی میں تھوڑے پانی کو کہتے ہیں۔ سید سلیمان ندوی اس کو عربی نہیں عبرمی بتاتے ہیں۔ عبری میں اس کے معنے دائم اور خالد کے ہیں۔

اس سے پہلے عاد کے چہرے میں یہ بات بتائی جا چکی ہے۔ کہ وہ عرب میں جنوبی اور مشرقی حصہ پر جو خلیج فارس کے کنارے کنارے عراق تک وسیع ہے۔ اس پر قابض تھے۔ ثمود اس کے مقابل عرب مغربی و شمالی پر قابض ہوئے جس کا نام اس زمانہ میں وادی القریٰ تھا۔ وادی القریٰ اس لیے کہتے تھے۔ کہ اس زمانہ میں یہ وادی چھوٹی چھوٹی آبادیوں سے جا بجا آبادی تھی۔ ان آبادیوں کے سنگی کھنڈر اور آثار

مسلمان جغرافیین نے دیکھے تھے۔ اور اب بھی باقی ہیں۔

ثمود کے ملک کا دار الخلافہ حجر تھا۔ یہ شہر اس قدیم راستہ پر ہے۔ جو حجاز سے شام کو جاتا ہے۔ اسی راستہ پر ثمود کا ایک دوسرا مقام فج الفاقہ ہے۔ لیکن اصلی شہر حجر ہی تھا۔ اب عموماً اس شہر کو مدائن صالح کہتے ہیں۔

قوم ثمود کے سیاسی حالات بالکل نہیں معلوم۔ صرف اتنا معلوم ہے۔ کہ یہ شمالی عرب کی ایک زبردست قوم تھی۔ فن تعمیر میں عاد کی طرح اس کو بھی کمال حاصل تھا۔ پہاڑوں کو کاٹ کر بنانا، پتھروں کی عمارات اور مقبرے تیار کرنا اس قوم کا خاص پیشہ تھا۔ یہ یادگاریں اب تک باقی ہیں۔ ان پر آرامی ثمودی خط میں کتبے منقوش ہیں۔ لیکن ان میں سے اکثر آرامی کتبات نبطی اقوام کے ہیں۔ جنہوں نے مسیح سے پہلے اور بعد اسی مقام پر حکومت کی ہے۔

قوم ثمود کا زمانہ ترقی قوم عاد کے بعد ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے۔ کہ اس قوم کا نام اسیریا اور یونان نہایت صراحت کے ساتھ ملتا ہے۔ آٹھویں پارے کی یہ آیت واذکروا اذجعلکم خلفاء من بعد عاد کا مفہوم بھی یہی ہے۔ اور اس ترقی کی انتہا حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے ہوتی ہے کیونکہ شمالی عرب کے نام بڑے بڑے قبائل کے سیاسی تعلقات کی بنا پر تورات میں مذکور ہیں۔ لیکن اس فہرست میں ثمود کا ذکر نہیں ہے۔ قرآن سے یہی اشارہ مفہوم ہوتا ہے۔

یاقوم انی اخاف علیکم مثل یوم الاحزاب مثل داب قوم نوح و عاد و ثمود۔

حضرت صالح علیہ السلام

یہ قوم ثمود کے پیغمبر کا نام ہے۔ قوم کی آخری زندگی میں جو مرض عام پیدا ہو جاتا ہے۔ ثمود بھی اس سے مستثنیٰ نہ تھے۔ خدائے واحد کی پرستش چھوڑ کر انہوں نے ستاروں کے مادی ہیکلوں کے سامنے سر جھکایا۔ حسب سنت الٰہی ایک پیغمبر صالح علیہ السلام نبی مبعوث ہوئے۔ تورات میں ارم کے بھائی ارفخشد کے ایک بیٹے کا نام صالح علیہ السلام ہے۔ جو تمام اولاد ابراہیمؑ اور عرب یقطانی کا باپ ہے۔ نصرانی پادری جو بزرگان تورات کی تاریخی ہستی کے اثبات کے لیے کسی کوشش سے دریغ نہیں کرتے۔ روایات عرب اور قصص قرآن کا نام عام طور سے ان کی زبان میں افسانہ ہے۔ لیکن اگر خود ان کو ضرورت پیش آئے تو وہ تاریخ کی بلند ترین شہادت ہے۔ کہتے ہیں کہ صالح اور سالح ایک ہی شخص کے نام ہیں۔ تاریخ اگر اجازت دے تو اس اتحاد

کے تسلیم کرنے میں کوئی عذر نہیں ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ سبحانہٗ کا پیغام پہنچایا۔ پیغام کیا تھا۔ وہی جو سب پیغمبروں کا ہوتا ہے۔

(۱۷) اللہ سے عابدانہ تعلقات

حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اے میری قوم کے لوگو! اللہ سبحانہٗ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو۔ اللہ کے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں ہے۔ اللہ نے تمہیں زمین سے نشوونما دی ہے۔ اور پھر اسی نے تمہیں زمین میں بسایا ہے۔ یعنی اول آدم علیہ السلام کو مٹی سے پیدا کیا پھر زمین سے غذائیں پیدا کیں۔ جن سے نطفہ وغیرہ بنتا ہے۔ جو مادہ ہے آدمی کی پیدائش کا۔ اور پیدا کرکے باقی رکھا۔ بقا کا سامان کیا۔ زمین کے آباد کرنے کی ترکیبیں بتلائیں۔ اور تدابیر الہام فرمائیں [1] صرف اللہ سبحانہٗ سے عابدانہ تعلقات استوار کرنے کے لیے انسان کی نشوونما اور استعمار کو دلیل میں پیش کیا ہے۔ یہ توحید عبادت ہی کے لیے استدلال ہے۔ اور مطلب یہ ہے۔ کہ جو ذات گرامی تمہاری نشوونما کر رہی ہے۔ اور جس نے تمہارے وجود کا پورا پورا سامان کیا ہے۔ وہی تمہارے نیازمندانہ اور عبادت گزاریوں کی مستحق ہے۔ یہ انتہائی کور باطنی ہے۔ کہ وجود کا انعام کوئی کرے، بقائے وجود کا سامان کوئی کرے اور گن گانے کے موقع پر کسی اور کے گن گائے جائیں۔ یاد رہے کہ قوم ثمود اللہ سبحانہٗ کے وجود کی منکر نہ تھی۔ وہ اللہ سبحانہٗ کی خالقیت کو بھی مانتی تھی۔ اس کی شان ربوبیت کا اعتراف بھی اس کی رگ و ریشہ میں تھا۔ اس کی ناشکری یہ اور صرف یہ تھی کہ پرستش اور بندگی میں شرک کرتی تھی۔ پرستش میں شرک کے لیے وہ ارواح کی اور ستاروں کی پوجا کرتی تھی۔ ان کے معبود ان کی قوت واہمہ کی تخلیقات کے سوا کچھ نہ تھے۔ اِن یتبعون الا الظن۔ افکار میں وہ توہمات کی پرستاری کرتے تھے۔ اور اعمال میں وہ اپنے میلانات کو اور رجحانات کو معبود بنائے ہوئے تھے۔ پرستش میں ان کی دعاؤں، طلبگاریوں، نذروں، نیازوں اور قربانیوں کا مرکز افترائی ہستیاں تھیں۔ اور بندگی میں اللہ کو چھوڑ کر ان کے افترائی قواعد و رسوم تھے۔ قوم ثمود بھی اپنے پیشرو عاد کی طرح اللہ سبحانہٗ کے منکر نہ تھے۔ بلکہ اللہ سبحانہٗ کو مان کر اس کی پرستاری میں دوسرے معبودوں کو شریک کرتے تھے۔ اور یہی ساری بیماریوں کی جڑ ہے۔ اس لیے حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ کی توحید عبادت سے دعوت توحید کا آغاز کیا۔ آپ نے قوم کی نبض پر ہاتھ رکھا۔ اور ان کے لیے توحید عبادت کی دوا تجویز کی اور معبودان باطل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کے انکار کی تلقین کی اور طاغوت کی نافرمانی کی ہدایت کی۔ لوگوں میں علی رؤس الاشہاد فرمایا۔ یا قوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ۔ لوگوں نے اس پکار کو سمجھنے میں کوئی غلطی نہیں کی جیسے ہی آپ کی آواز سے سننے والوں کے کان آشنا ہوئے۔ وہ اچھی طرح سمجھ گئے۔ کہ یگانہ خدا کی عبادت کی دعوت ایسا تیر ہے جو شرک کے گھروندے کو مسمار کردے گا۔ مشرکانہ تہذیب، مشرکانہ تمدن، مشرکانہ معاشرہ، مشرکانہ معاش، مشرکانہ سیاست اور مشرکانہ قانون درہم برہم ہوجائے گا۔

زمین کی آبادکاری فرض ہے

اس آیت سے امام ابوبکر الجصاص نے یہ لطیف استدلال کیا ہے۔ کہ یہ آیت بتاتی ہے کہ زمین کا آباد کرنا کھیتی، باغبانی اور تعمیر کے ذریعے دین کے واجبات میں سے ہے۔

آیت سے یہ استدلال اس وقت صحیح ہے۔ جبکہ استعمار کے معنے کی وہ تفصیل پیش نظر ہو۔ جو ابوبکر بن العربی کے حوالہ سے علامہ قرطبی نے پیش کی ہے۔

> استفعال کا وزن عربی وزن میں ایک سے زیادہ معانی دیتا ہے۔ اول طلب فعل جیسے استحملتہ میں نے اس سے اٹھانے کی درخواست کی دوسرے اعتقاد کے معنے میں جیسے استہلت میں نے اس کو سہل وآسان سمجھا۔ التعظمتہ میں نے اس کو عظیم جانا تیسرے اجابت اور درستگی جیسے استجدتہ، میں نے اسے عمدہ پایا لہذا استعمرکم کے معنے یہ ہیں۔ کہ خلقکم لعمارتہا۔ اللہ نے تم کو زمین کی آبادکاری کے لیے پیدا کیا ہے اس کے اور کوئی معنے نہیں لیے جا سکتے ہیں۔

اب آیت کی مراد یہ ہوئی کہ زمین کی آبادکاری خواہ بہ شکل زراعت ہو یا بصورت باغبانی ہو یا عمارتوں اور مکانوں کی راہ سے ہو۔ انسان کا فرض ہے۔ گویا اس کام کی حیثیت از روئے قرآن وہی ہے جو نماز، روزہ، زکوٰۃ کی ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد شاید اسی آیت سے استنباط ہے۔ صحیح بخاری میں حدیث ہے۔

> فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو مسلمان کوئی کھیتی لگائے یا باغ لگائے پھر اس کھیتی اور باغ سے پرندے کھائیں یا آدمی یا جانور تو یہ باغ اور کھیتی لگانے والے کی جانب سے صدقہ ہوگا۔

وجہ ظاہر ہے کہ کھیتی یا باغ لگانے والے کو اگر نفع نہ ہوا تو کیا ہوا۔ اس نے اپنا فرض تو ادا کیا ہے اور جو اپنا فرض ادا کر رہا ہے۔ وہ ثواب کا ضرور مستحق ہے۔ اور اسی ارشاد سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے۔ کہ کاشتکار اور باغبان نے اللہ کی دی ہوئی طاقتوں سے کام لے کر معدوم کو موجود کے لباس میں جلوہ گر ہونے کا موقع دیا ہے۔ اس لیے اگر فرد کو نفع نہیں پہنچا تو عوام کی خدمت کا فرض تو وہ بجا لایا اور عوام انسان ہی نہیں بلکہ عام مخلوقات بھی اس سے بہرہ یاب ہوئی۔ اس طرح بلا ارادہ اپنے وجود اور اپنی توانائیوں سے عمومی فائدہ پہنچایا اور قرآن یہی چاہتا ہے کہ اللہ کی عطا کی ہوئی قوتوں کو بے کار اور ضائع ہونے سے بچایا جائے۔

مدارس، مساجد اور خانقاہوں کے متعلق آج جو غلط خیالات پھیلے ہوئے ہیں۔ ان کو پیش نظر رکھ کر کون یقین کر سکتا ہے۔ کہ جن مشاغل اور پیشوں کو خالص دنیا تصور کیا جاتا ہے۔ قرآن اور قرآن کو لانے والے نے ان کو بھی وہ مقام عطا کر دیا ہے۔ جو عام دینی فرائض و عبادت کا ہے۔ کہاں یہ نظریہ کہ جو جس حد تک دنیا اور اس کے مشاغل سے الگ ہو کر زندگی بسر کرے گا اتنا ہی وہ خدا رسیدہ ہوگا: اور کہاں یہ قرآن کا نقطۂ نظر کہ دنیا کے کاموں میں انہماک اور ان میں لگے رہنے ہی کو اللہ سبحانہ کی خوشنودی اور قرب کا ذریعہ بتایا جاتا ہے۔ مذاہب کے ان غیر فطری اور غلط رجحانات کو مٹانے میں قرآن نے کیا کام کیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس پر خاص علمی انداز میں کام کیا جائے۔

تاریخوں میں لکھا ہے کہ مشہور صحابی حضرت عمرو ابن العاص رضی اللہ عنہ فاتح مصر کا طائف میں رہط جو تاکستان تھا اس میں دس لاکھ ڈنڈے تھے۔ جن پر انگوروں کی بیلیں چڑھی ہوئی تھیں۔ تفصیل دیکھنی ہو شکیب ارسلان کے حواشی حاضر العالم الاسلامی میں پڑھیے۔ خیر یہ تو نبوت کے صحبت نافعہ اور پروردہ ہیں۔ ان کو جانے دیجیے۔ کہ ان کا دینی ذوق قرآن نے بتایا تھا۔ میں تو ان صوفیاء کرام کی بات سناتا ہوں۔ جن پر معاش گریزی کی پھبتی کسی جاتی ہے۔ یہ کوئی معمولی شخصیت نہیں۔ ان کا شمار اساطین صوفیہ میں ہے۔ میری مراد مشہور حضرت شیخ ابوالکارم علاء الدولہ سمنانی رحمۃ اللہ علیہ سے ہے۔ مولانا جامی نے نفحات الانس میں ان کا یہ ملفوظ نقل کیا ہے۔ فرماتے ہیں۔

> حق تعالیٰ شانہ، نے زمین اور کھیتوں کو حکمت سے پیدا کیا ہے۔ اور اللہ سبحانہ، چاہتا ہے۔ کہ یہ زمین اور کھیت آباد رہیں اور ان سے مخلوق کو نفع پہنچے۔ اگر لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ دنیا کی آباد کاری جس سے فائدہ اور آمدنی مقصود ہو۔ یعنی فضول خرچی کے طور آبادی نہ ہو۔ نفع اور آمدنی کے لیے آباد کاری کے کام میں کتنا ثواب ہے تو ہر گھر آباد کاری

کے کام کو نہ چھوڑے ۔ اسی طرح اگر لوگوں کو یہ پتہ ہوتا کہ آبادکاری کے کام کو چھوڑنے اور زمین کے بیکار پڑا رہنے میں کتنا گناہ ہے۔ تو ہرگز وہ یہ نہ کرتے کہ آبادی کے جو اسباب ہیں ان کو برباد ہونے کے لیے چھوڑ دیں ۔

آگے تمثیل سے اس قرآنی نظریہ کی تشریح اس طرح کی ہے ۔

جو کوئی زمین کا کوئی قطعہ رکھتا ہے ۔ کہ اس سے ہزار من غلہ سالانہ حاصل ہوسکتا ہے۔ اگر اس کی کوتاہی، کاہلی اور سستی سے بجائے ہزار من کے نوسو من غلہ پیدا ہوا تو قیامت کے روز اس سو من غلہ کے بارے میں اس سے پوچھا جائے گا ۔

اللہ اکبر وہی ثواب آخرت جسے ترک دنیا اور معاشی کاروبار سے گریز پائی کے لیے دنیا کے مذاہب نے استعمال کیا ۔ یہ قرآن کا معجزہ ہے ۔ کہ اسی ثواب آخرت کو حصول دنیا اور معاشی کاروبار کی گرم بازاری کے لیے کرتا ہے ۔ یقیناً یہ اسی قرآن کا پیغام ہے ۔ جس نے استعمار الارض یعنی زمین کی آبادکاری کو ان ہی فرائض میں داخل کیا ہے ۔ جس کی بجاآوری پر دوسرے مذاہب میں جنت کی آبادی کے وعدے ہیں ۔ قرآن کا نظریہ یہ نہیں کہ آخرت کی آبادکاری کے لیے ترک دنیا کرو بلکہ قرآن کا نظریہ یہ ہے کہ آخرت کی آبادکاری کے لیے دنیا کی آبادکاری کرو ۔ یا قوم اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہٗ ۔ کے لیے انشاکم من الارض واستعمرکم ۔ میں دلیل بننے کی صلاحیت اسی وقت ہوسکتی ہے ۔ جبکہ انسانوں کی تخلیق دنیا کی آبادکاری کے لیے ہوئی ہو ۔ اور بندگی و پرستش سے مقصود اللہ سبحانہٗ کی رضا کا حصول ہو ۔ قرآن میں عبادت کا بنیادی تقاضا یہی ہے ۔ کہ مومن اللہ کی بندگی اور عبادت کا فریضہ انجام دیتے وقت مقصود اپنے سامنے صرف اللہ سبحانہٗ کی رضا کو رکھے اور اس ادائے فرض منصبی کا نشانہ رضاء الٰہی کے سوا کچھ نہ ہو ۔ عبادت و طاعت کے تصور کے ساتھ اجر کا تصور اسی طرح لازم ہے ۔ جس طرح سورج کے ساتھ روشنی اور گرمی کا تصور اس لیے اگر نبوت کی دعوت کا بنیادی تصور اللہ کی عبادت ہے تو اس میں کوئی شک نہیں کہ اس عبادت سے مقصود اللہ رب العزت کی رضا ہے ۔ قرآن عزیز نے اس حقیقت پر ہر ضروری پہلو سے روشنی ڈالی ہے ۔ ویبتغون فضلا من اللہ ورضوانا ۔ اور یہ بھی کہ عابد جو کام کرتا ہے ۔ اس نیت سے کرتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ اس سے راضی ہوجائے ۔ الا ابتغاء وجہ ربہ الاعلیٰ ۔ اور آخری بات یہ کہ اللہ سبحانہٗ نے اس غایت و مقصد کو اپنے عمل عبادت کا ہدف بنانے کا صراحت سے حکم دیا ہے ۔

ما کتبنٰہا علیہم الا ابتغاء رضوان اللہ

س تصورِ عبادت کا لازمی تقاضا یہ ہے کہ انسان زندگی کے مسائل سے پوری طرح متعلق رہے، مناہل اور متمدن زندگی گزارے، اپنی ایک ایک فطری قوت کو زندہ و کارفرما رکھے۔ اپنے جبلی مطالبات کو مناسب حدود کے اندر پورا کرتا رہے۔ غرض آبادی سے جنگلوں کی طرف نہیں بلکہ جنگلوں سے آبادی کی طرف آئے اور یہ سب کچھ دینداری کا کام اور دین کا مطالبہ سمجھ کر کرے۔

(۷۲) فراخی دنیا کا قرآنی طریقہ

لہٰذا تم اللہ سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور آئندہ کے لیے اسی کی طرف رجوع کرو۔ یقین کرو میرا پروردگار ہر ایک کے قریب ہے اور ہر ایک کی دعاؤں کا قبول کرنے والا ہے۔ یعنی جب وہ ایسا منعم ہے اور محسن ہے تو چاہیئے کہ آدمی تو اسی کی طرف ایمان و طاعت کے ساتھ رجوع کرے اور کفر و شرک کے جو گناہ کر چکا ہے۔ ان کی معافی چاہے وہ ہم سے بالکل نزدیک ہے ہر بات خود سنتا ہے۔ اور جو توبہ و استغفار صدق دل سے کیا جائے اسے سن کر قبول کرتا ہے[1]

یہاں استغفار و توبہ کا حکم دیا ہے۔ اور بتایا ہے۔ کہ سب سے ہٹ کر اور سب کو چھوڑ کر براہ راست اپنے گناہوں کی اللہ سے معافی مانگو۔ یہ تنگ نظری چھوڑو کہ اللہ سبحانہٗ ہماری سنتا نہیں اور اس غلط فہمی میں نہ رہو کہ اللہ کی بارگاہ تک براہ راست رسائی نہیں ہے۔ پورے شعور و آمادگی اور سچی طلب کے ساتھ اس کی بارگاہ میں معافی کے لیے درخواست کرو۔ اور سب سے کٹ کر اسی کا ہو رہنے کا عہد کرو۔ قبولیت کا دروازہ کھلا ہوا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کو اپنے راجوں، مہاراجوں، بادشاہوں پر قیاس نہ کرو جو شہریوں سے دور اپنے محلوں میں داد عیش دیا کرتے ہیں۔ جن کے دربار تک عام شہریوں میں سے کسی کی رسائی نہیں ہو سکتی جن کے حضور میں کوئی درخواست پہنچانے کے لیے مقربین بارگاہ میں سے کسی کو درمیان میں ڈالنا پڑتا ہے۔ اور پھر اگر کسی کی درخواست ان کی بارگاہ میں پہنچ بھی جاتی ہے۔ تو وہ خود جواب دینا گوارا نہیں کرتا بلکہ مقربین میں سے کسی کے سپرد کر دیتا ہے۔ اللہ کی بارگاہ کو اور اس کی ذات گرامی کو بادشاہوں پر قیاس نہ کرو۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اس ساری عمارت کو صرف دو لفظ بول کر ان ربی قریب مجیب مسمار کر دیا۔ اللہ سبحانہٗ قریب ہے اور مجیب ہے یعنی تمہارا یہ خیال غلط ہے۔ کہ وہ دور ہے۔ وہاں تک کسی کی رسائی نہیں اور یہ خیال بھی غلط ہے کہ تم براہ راست پکار کر اپنی دعاؤں کا جواب حاصل نہیں کر سکتے وہ اگرچہ بہت بالا و برتر ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مگر اس کے باوجود اقرب من حبل الورید تمہاری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ تم اس سے سرگوشی کر سکتے ہو۔ خلوت وجلوت علانیہ اور چھپکے سے تم خود اپنی درخواستیں اس کی جناب میں پیش کر سکتے ہو۔ وہ براہ راست تمہاری دعاؤں کا خود جواب دیتا ہے۔ استغفار و توبہ کے لیے کسی واسطہ اور وسیلہ کی ضرورت نہیں ہے۔

اس سے معلوم ہوا کہ فراخی دنیا کی بے شمار تدبیروں میں سے ایک اہم تدبیر توبہ واستغفار بھی ہے۔ مطلب یہ ہے۔ کہ توبہ واستغفار اخروی منافع کے ساتھ قرآن کی اس آیت کی روشنی میں معاشی بہبود دنیوی فلاح وصلاح کے بھی وہ ذرائع اور اہم ومؤثر ذرائع ہیں۔

بہرحال جیسا البقاعی نے لکھا ہے کہ شیطان نے ان کے کان میں یہ بات پھونک دی تھی۔ کہ دنیا میں کامیابیوں کے لیے ہماری اللہ سبحانہٗ تک رسائی نہیں ہے۔ ان کی سرکار بڑی ہے۔ اس لیے ہم ان کے درباریوں کے ذریعے ان سے کچھ کہہ سکتے ہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے شرک کی اسی توجیہہ پر ضرب کاری لگائی ہے۔ اور فرمایا۔ ان ربی قریب مجیب۔ یعنی اس کو پانے کے لیے یہ کافی ہے۔ کہ تم اخلاص کے ساتھ اس کی طرف توجہ کرو۔ تمہارے ان واسطوں اور وسیلوں کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ جن کو تم اس کا قرب حاصل کرنے کے لیے شرط لازم سمجھتے ہو۔

عربی تعبیر کا یہ انداز بلاغت بے مثال ہے کہ ہوانشاکم من الارض واستعمرکم سے توحید عبادت پر استدلال کیا ہے۔ اور قصر کے ساتھ کیا ہے۔ یعنی چونکہ تمہارے انشا استعمار کی زمین میں ذمہ داری صرف اللہ سبحانہٗ نے لی ہوتی ہے۔ اس میں اس کا شریک کوئی نہیں ہے۔ اس لیے تمہارے عابدانہ تعلقات صرف اللہ سبحانہٗ سے ہونے چاہیں۔ اسی پر تفریع فا کے ذریعہ کی ہے کہ تمہیں اللہ سبحانہٗ سے اپنے گناہوں کی معافی طلب کر کے اس کی طرف آئندہ کے لیے لوٹ آنا چاہیئے۔ گویا انشا و استعمار جیسے علت ہے عبادت کی ایسے ہی علت ہے توبہ واستغفار کی۔ استغفروا پر اور توبوا پر ثم لانے میں بہت بڑی معنویت ہے۔ استغفار کی حیثیت دوا کی ہے۔ اور توبہ کی حیثیت غذا کی ہے۔ پہلے دوا استعمال کرو پھر ذرا دیر سے غذا استعمال کروگے تو صحت روحانی سے مالا مال ہو جاؤ گے۔ آخر میں ان ربی قریب مجیب۔ تسلی دی ہے۔ کہ بے شک تمہارے جرائم میں معافی قبول کرنی کی صلاحیت نہیں مگر ؟

تو بگو مارا بدان شہ بار نیست
باکریماں کارھا دشوار نیست

یہ استیناف ہے اور اسی شبہ کا جواب ہے۔ کہ اللہ کی مغفرت ورحمت کا پائیدار سمندر قریب ہے۔ وہ اپنی رحمت سے تمہاری طلبگاریوں کا جواب دے گا۔ مایوس ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔

ربّ رحمتک ارجی عندی من عملی و مغفرتک اوسع من ذنوبی

۳۷ حضرت صالح علیہ السلام کی شخصیت قوم کی نظر میں

لوگوں نے کہا اے صالح علیہ السلام ! پہلے تو ایک ایسا آدمی تھا۔ کہ ہم سب کی اُمیدیں تجھ سے وابستہ تھیں۔ کیا تو ہمیں اس بات سے روکتا ہے۔ کہ ہم اپنے ان معبودوں کی پوجا نہ کریں جنہیں ہمارے باپ دادا پوجتے تھے۔ ہمیں تو اس بات میں بڑا ہی شک ہے۔ جس کی تو دعوت دے رہا ہے۔ یہ بات تو ہمارے دل میں اترتی نہیں ہے۔ یعنی تجھ سے امید تھی کہ آگے چل کر بڑا فاضل اور نیک مرد ہوگا۔ جس کو معزز بزرگوں کا جانشین سمجھ کر قوم سر پر بٹھائے گی۔ تیری پیشانی سے رشد وصلاح کے آثار ہویدا تھے۔ سب کو توقع تھی۔ کہ مستقبل قریب میں تجھ سے بڑا فائدہ پہنچے گا۔ رائے تدبیر صلاح و مشورے سے اپنے قومی بھائیوں کی راہنمائی اور نہایت قوت قلب کے ساتھ آبائی مذہب کی حمایت و تائید کرے گا۔ یہ درست ہے کہ ابتدا سے تجھ کو بُت پرستی مبغوض تھی۔ اور عام قومی مذہب سے الگ تھلگ رہتا تھا۔ تاہم سمجھ اور فطری قابلیت پر اعتماد کر کے ہمیں اُمید رہی کہ آگے چل کر عقل و تجربے کی پختگی کے بعد یہ روش نہ رہے گی۔ لیکن افسوس یک بیک تو نے تمام اُمیدوں پر پانی پھیر دیا۔ تو نے ہمارے آباؤ اجداد کے قدیم مذہب کے خلاف علانیہ جہاد شروع کر کے سب توقعات خاک میں ملا دی ہیں۔ کیا تو یہ چاہتا ہے کہ ہم ایک خدا کو لے کر سارے پرانے دیوتاؤں کو چھوڑ بیٹھیں۔ ہمارے نزدیک، بزرگوں کی روش کے خلاف ایسا مسلک اختیار کرنا سخت شبہ کی چیز ہے جسے ہمارا دل کسی طرح نہیں مانتا۔ موضح القرآن میں ہے یعنی ہونہار لگتا تھا۔ کہ باپ دادے کی راہ روشن کرے گا۔ تو لگا مٹانے [1]

یہاں دو باتیں ہیں۔ ایک قوم کی نظر میں حضرت صالح علیہ السلام کی شخصیت دوسرے قوم کی نظر میں حضرت صالح علیہ السلام کی دعوت۔ حضرت صالح علیہ السلام کی شخصیت کی حد تک قوم کے احساسات کیا تھے۔ قرآن کا یہ فقرہ کنت مرجوًا قبل ھذا۔ اس ساری داستان کو اپنے اندر سمیٹے ہوئے ہے۔ ظاہر ہے کہ نبوت کے عہدے پر سرفرازی سے پہلے پورے چالیس سالہ زندگی کے شب و روز قوم کے سامنے تھے۔ ان کی عقلی معرفت، مشاہدے اور فطری قابلیت کو صحیح طریقہ پر استعمال کرنے کا انداز ان

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کی زندگی کی پاکیزگی، ان کے کردار کی بلندی، ان کے اخلاق کی بے مثال برتری لوگوں کے سامنے تھی۔ ان کو نظر آتا تھا کہ اس میں کوئی اخلاقی جرم نہیں۔ جھوٹ کا ان کو کوئی تجربہ نہ تھا۔ حضرت صالح علیہ السلام کی پوری اس فقرے میں سمٹی ہوئی ہے۔ اگر ان کی پاک مطہر زندگی میں کوئی داغ بھی نظر آتا تو ان کے مخالف دعوت کو رد کرنے کے لیے ان داغوں کو سامنے لاتے۔ اور یہ حضرت صالح علیہ السلام کی خصوصیت نہیں ہے بسب انبیاء کا نبوت سے پہلے یہی حال ہوتا ہے۔ یہ فقرہ اگر ایک طرف حضرت صالح علیہ السلام کی معصومیت کا اعلان کر رہا ہے۔ تو دوسری طرف یہ انداز حضرت صالح علیہ السلام کی محبوبیت کو بھی ظاہر کر رہا ہے۔ قبل ہذا کے زور پر غور فرمایئے یعنی دعویٰ نبوت سے پہلے یعنی بار بار کے تجربے سے حضرت صالح علیہ السلام کی سچائی، صداقت اور راست بازی کا ان کو یقین تھا۔ شخصیت کی اسی معصومیت اور محبوبیت کی وجہ سے وہ مستقبل میں قوم کی امیدوں کا مرکز بنے ہوئے تھے۔ نبوت پر سرفراز ہونے والی ذات نبی ہونے سے پہلے پوری قوم میں اپنی اعلیٰ صلاحیتوں اور اپنے پاکیزہ اخلاق و اوصاف کی وجہ سے نہایت ممتاز ہوتی ہے۔ اس لیے لوگوں کو اپنے ماحول اور گرد و پیش کے مطابق ان سے توقعات وابستہ ہوتی ہیں۔ لیکن جونہی وہ منصب نبوت پر سرفراز ہو کر دعوت نبوت پیش کرتے ہیں تو لوگوں کے توقعات کا بنا ہوا امکان گر جاتا ہے۔

حضرت صالحؑ کی دعوت قوم کی نظر میں

حضرت صالح علیہ السلام نے جب قوم کے سامنے۔ اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہٗ کا نعرہ بلند کیا۔ یعنی اللہ کے سوا تمہارا کوئی الٰہ نہیں۔ وہ بات کی تہہ کو پہنچ گئے۔ کیونکہ اس دعوت کا خطاب جن لوگوں سے تھا اور جن کی غلطی کی تصحیح مقصود تھی۔ چونکہ وہ غیر اللہ سے عابدانہ تعلقات معاشی مشکلات کی راہوں میں استعمال کرتے تھے۔ یعنی غیر اللہ کو الٰہ بنا کر جو کچھ مانگا جاتا تھا۔ وہ عام طور پر اسی زندگی کی چیزیں ہوتی تھیں۔ مثلاً بارش برسائی جائے، مویشیوں کا دودھ اور ان کی نسل بڑھائی جائے۔ کھیتیوں کی پیداوار میں برکت دی جائے، باغوں میں پھلوں کو آفتوں سے محفوظ رکھا جائے، قحط کا ازالہ ہو، بیماریاں دور رہوں وغیرہ وغیرہ۔ ان ہی کاموں کے لیے ایک سے زیادہ الٰہ بنا رکھے تھے۔ قوم ثمود کے لوگ اپنے الٰہوں کے نام پر جانور چھوڑ دیا کرتے تھے۔ ان کے نام کے چڑھاوے چڑھاتے، سفروں میں ان کے نام کی دھائی دیتے اور ہر کام کا الگ الٰہ بنا رکھا تھا۔ بارش کا الٰہ اور جانوروں کا محافظ اور بچوں کو بیماریوں سے بچانے والا اور ان ہی الٰہوں کی گرفت میں پوری قوم ثمود تھی۔ اور یوں ان الٰہوں سے

عابدانہ تعلقات نسل بعد نسل ان میں اس درجہ پیوست ہوچکے تھے کہ حضرت صالح علیہ السلام کی یہ دعوت اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ ۔ سنتے ہی بول پڑے ۔ اتنھانا ان نعبد مایعبد آباءنا ۔ اے صالحؑ تو ہمارے بزرگوں کے طریقے کو برا کہتا ہے ۔ اور ہمیں اس طریقہ سے ہٹانا چاہتا ہے ۔ گویا قوم ثمود اپنے بنائے ہوئے اور افترائی الہوں سے عابدانہ تعلقات قائم رکھنے کے جواز کی دلیل یہ ہے کہ باپ دادوں کے وقتوں سے یہ کام ہوتا آیا ہے ۔ یعنی مکھی پر مکھی اس لیئے مارنی چاہیئے کہ پہلے کسی بیوقوف نے اس جگہ ماری تھی ۔ ہر نبی کی دعوت کو دیکھو اس کے قبول کرنے میں جو چیز سب سے پہلے رکاوٹ بن کر آتی ہے ۔ وہ قومی رسم ورواج اور آبائی دین ومذہب کی پابندی ہے ۔ انسانیت کے پاؤں میں اس سے بھاری کوئی چیز نہیں ۔ دوست وآشنا کا چھوٹنا ، ماں باپ سے علیحدگی ، آل اولاد سے کنارہ کشی ، مال وجائداد سے دست برداری ، جماعت کی مخالفت ، قوم سے انقطاع ، وطن سے دوری ایسی چیزیں نہیں ہیں ۔ جن کو ہر انسان آسانی سے برداشت کر سکے ۔ ملکی رسم ورواج کی دیرینہ محبت اور آبائی کیش وآئین کی دیرینہ الفت ، حق وباطل کی تمیز اور نیک وبد کی پہچان کی حس مٹا دیتی ہے ۔ پہلے جس کو کنت مرجوا قبل ھذا کہہ رہے تھے ۔ لیکن جب ان کے منہ سے یاقوم اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ ۔ کی بات نکلی تو باپ دادا کے طریقے کے خلاف ہونے کی وجہ سے گردن موڑلی ۔ اور کہہ دیا کہ ہماری ساری امید تم نے خاک میں ملادی ہیں ۔ گویا بزرگی اور پیشوائی کا طریقہ یہ نہیں ہے ۔ کہ حق بات کی لوگوں کو دعوت دی جائے بلکہ یہ ہے کہ لوگ جسے دعوت سمجھتے ہوں اس کی پیروی کی جائے ۔ اور اسی کی طرف لوگوں کو دعوت دی جائے آخر میں دعوت کے بارے میں اپنا فیصلہ یہ سنایا ۔ واننا لفی شک مما تدعونا الیہ مریب ۔ اس بارے میں ہمیں سخت شبہ ہے جس نے خلجان میں ڈال دیا ہے ان کا شبہ اور خلجان کیا تھا ؟ یہاں اس کی وضاحت نہیں کی گئی ہے ۔ اس کی وجہ ظاہر ہے کہ خلجان میں تو سب پڑگئے تھے ۔ مگر ہر ایک خلجان الگ الگ نوعیت کا تھا ۔ یہ دعوت حق کی خصوصیت ہے کہ جب اس کا آوازہ بلند ہوتا ہے ۔ تو دلوں میں بے چینی پیدا ہوجاتی ہے ۔ اور ایک عام قسم کی دلوں میں ہلچل رونما ہوجاتی ہے ۔ سب سوچنے لگتے ہیں ۔ کہ یہ کیا ہے ؟ سوچ ہر ایک کی جدا ہوتی ہے مگر بے چینی میں سب ایک دوسرے کے شریک ہوتے ہیں ۔ وجہ ظاہر ہے کہ اس سے پہلے لوگوں کی گمراہانہ ڈگر ایک تھی ۔ ان کو اسی موضوع پر سوچنے کی کبھی ضرورت ہی پیش نہ آئی تھی ۔ کہ ہمارا کردار کیا ہے ۔ یکایک نبوت کی دعوت کا دھماکہ سب کا اطمینان ختم کرکے سب کے دلوں میں بے چینی ، بے قراری اور بے کلی پیدا کر دیتا ہے ۔ ان کے انکار ردِ اعمال پر نبوت کی بے لاگ تنقید حق کو بیان کرنے کے لیے اس کے دلائل

ان کی بے چینی میں اور اضافہ کرتے ہیں۔ دعوت سے ان میں بیزاری ضرور ہوتی ہے۔ مگر داعی کے بلند اخلاق، اس کا عزم، اس کا حلم، اس کی شرافت، اس کا صادقانہ رویہ بڑے بڑے ضدی کے دل پر بھی اثر انداز ہوتا ہے۔ پھر اسی ماحول میں سے صداقت پسند لوگوں کا اس سے متاثر ہونا ان کی بے چینی میں اور اضافہ کرتا ہے۔ اسی کیفیت، اسی حالت کو وہ اس انداز میں ظاہر کر رہے ہیں۔ کہ تو جس طریقے کی ہمیں دعوت دے رہا ہے۔ اس کے بارے میں صرف شک ہی نہیں ہے جس نے ہمیں خلجان اور بے چینی میں ڈال دیا ہے۔ اننا لفی شک مما تدعونا الیہ مریب۔ مریب ارابت سے ہے۔ اور یہ شک میں زور پیدا کرنے کے لیے صفت بنا کر لایا گیا ہے۔

(۷۴) حضرت صالحؑ کا جواب

حضرت صالح علیہ السلام نے کہا کہ اے میری قوم کیا تم نے اس بات پر غور کیا ہے کہ اگر میں اپنے پروردگار کی جانب سے ایک روشن دلیل پر ہوں۔ اور اس نے مجھے اپنی رحمت عطا کی ہو۔ تو پھر کون ہے۔ جو اللہ کے مقابلے میں میری مدد کرے گا۔ اگر میں اس کے حکم سے سرتابی کروں۔ تم مجھے تباہی کے سوا اور کوئی فائدہ نہیں دے رہے ہو۔ یعنی میں تمہارے شک و شبہ کی وجہ سے ایک صاف راستہ کیسے چھوڑ سکتا ہوں۔ اللہ سبحانہ نے مجھے سمجھ دی ہے اور اپنی رحمت عظیمہ سے مجھے منصب نبوت عطا کیا۔ اب اگر فرض کیجئے میں اس کی نافرمانی کروں اور جن باتوں کے پہنچانے کا حکم ہے نہ پہنچاؤں تو مجھ کو اس کی سزا سے کون بچائے گا۔ اور تم بجائے اس کے کہ اپنے سچے خیر خواہ اور محسن کے قدر کرتے مجھے فرائض دعوت و تبلیغ سے رک جانے کا مشورہ دے کر ناقابل تلافی نقصان پہنچانا چاہتے ہو۔ بعض سلف نے فما تزیدوننی غیر تخسیر کا یہ مطلب بتایا ہے کہ تمہاری گفتگو سے مجھ میں کوئی چیز نہیں بڑھتی ہے بجز اس یقین کے کہ تم اپنا سخت نقصان کر رہے ہو۔ مگر سیاق کے مناسب پہلے معنی ہیں [1]

بتانا یہ چاہتے ہیں کہ میں جو دعوت دے رہا ہوں وہ وحی الٰہی ہے جو براہ راست مجھے حاصل ہوتی ہے۔ اب اگر میں اس سے ہٹ کر تمہاری امنگوں کی راہ اپناؤں تو مجھے اللہ سبحانہ کی پکڑ سے بچانے والا کون ہے۔ فما تزیدوننی غیر تخسیر یعنی اگر میں یہ راہ چھوڑ دوں اور تمہاری توقعات پوری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرنے میں لگ جاؤں تو تم میری بد بختی اور نامرادی ہی میں اضافہ کرو گے۔ اور اللہ سبحانہٗ کے مقابلے میں میری کوئی مدد نہ کر سکو گے۔ گویا حضرت صالح علیہ السلام نے لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ تم غور نہیں کرتے کہ اگر ایک شخص پر اللہ نے علم و بصیرت کی راہ کھول دی ہے۔ اور وہ دیکھ رہا ہے کہ سچائی وہ نہیں جو لوگوں نے سمجھ رکھی ہے۔ تو کیا محض لوگوں کے پاس خاطر سے اس کا اظہار نہ کرے۔ اچھا بتلاؤ اگر وہ حکم حق سے سرتابی کرے تو کوئی ہے جو اللہ سبحانہٗ کے مواخذہ سے اسے بچائے گا۔ اگر میں محض اس خیال سے کہ تمہاری اُمیدوں کو ٹھیس پہنچے گی سچائی کا اعلان نہ کروں تو اس کا مطلب یہی ہوگا کہ میں اپنے آپ کو تباہی میں ڈال دوں۔

کچھ بزرگوں نے یہ تشریح بھی کی ہے کہ اگر تم میری نبوت کا انکار کرتے ہو اور تم مجھے دعوت کے کام پر دھمکی دے رہے ہو تو پھر یقین کرو کہ میرا ایمان رب کی بینہ کی وجہ سے قوی ہے اور مجھے اس میں کوئی شک نہیں ہے۔ کیا میں اپنا مقام یقین چھوڑ کر تمہارے شک کے مقام پر آجاؤں اور تم میرے سے اس بات کی کیسے توقع رکھتے ہو۔ حالانکہ تمہیں پتہ ہے۔ کہ میرا یقین خدا کی نافرمانی کی صورت میں مجھ سے کہہ رہا ہے کہ اس کا نتیجہ اللہ کی پکڑ ہے۔ اور اللہ کی پکڑ سے مجھے کوئی بچا نہیں سکتا۔ یعنی اگر میں اپنی بصیرت کے خلاف اور اس علم کے خلاف جو اللہ نے مجھے دیا ہے۔ محض تم کو خوش کرنے کے لیے گمراہی کا طریقہ اختیار کر لوں تو یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے تم مجھے بچا نہ سکو گے بلکہ تمہاری وجہ سے میرا جُرم اور زیادہ ہو جائے گا اور اللہ تعالیٰ مجھے اس بات کی مزید سزا دے گا کہ میں نے تم کو سیدھا رستہ بتانے کی بجائے جان بوجھ کر غلط راستہ بتایا ہے۔

وَيٰقَوْمِ هٰذِهٖ نَاقَةُ اللّٰهِ لَكُمْ
اٰيَةً فَذَرُوْهَا تَاْكُلْ فِيْٓ اَرْضِ اللّٰهِ وَلَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ
فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ قَرِيْبٌ ﴿۶۴﴾ فَعَقَرُوْهَا فَقَالَ تَمَتَّعُوْا فِيْ
دَارِكُمْ ثَلٰثَةَ اَيَّامٍ ؕ ذٰلِكَ وَعْدٌ غَيْرُ مَكْذُوْبٍ ﴿۶۵﴾ فَلَمَّا جَآءَ
اَمْرُنَا نَجَّيْنَا صٰلِحًا وَّالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مَعَهٗ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ
مِنْ خِزْيِ يَوْمِئِذٍ ؕ اِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ﴿۶۶﴾ وَ
اَخَذَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَاَصْبَحُوْا فِيْ دِيَارِهِمْ جٰثِمِيْنَ ﴿۶۷﴾
كَاَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيْهَا ؕ اَلَآ اِنَّ ثَمُوْدَا۠ كَفَرُوْا رَبَّهُمْ ؕ اَلَا بُعْدًا
لِّثَمُوْدَ ﴿۶۸﴾

اور لوگو: تمہارے لیے یہ اللہ کی اُونٹنی ایک نشانی ہے[۶۴] بس تم اسے چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی رہے اور تم بُرائی سے اسے نہ چھُونا تم نزدیکی عذاب کی گرفت میں آجاؤ گے[۶۵] بس لوگوں نے اس کے پاؤں کاٹ دیئے۔ پھر اس کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تمہیں تین دن کی مہلت ہے۔ اپنے گھروں میں فائدہ اٹھالو یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہے[۶۶] پھر جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے حضرت صالحؑ

اور اُن کے ساتھ اہل ایمان کو اپنی رحمت سے اور اس دن کی رسوائی سے بچا لیا بلاشبہ تیرا رب ہی زور اور دبدبہ والا ہے اور آپکڑا ظالموں کو ہولناک چیخ نے بس ہو گئے وہ اپنے گھروں میں اوندھے گویا وہ ان گھروں کے باسی ہی نہ تھے۔ خبردار! قوم ثمود نے بلاشبہ اپنے رب کا کفر کیا اور دیکھو قوم ثمود کے لیے اللہ کی رحمت سے دوری ہے ۶۸

مفردات کے معانی

عقروا۔ انہوں نے کونچیں کاٹ دیں۔ ماضی کا جمع مذکر غائب ہے۔ باب ضرب عقر سے جس کے معنے کونچیں کاٹنے کے ہیں۔ کونچیں کہتے ہیں۔ پاؤں کے پٹھوں کو جو پیچھے کی طرف ایڑی کے پاس ہوتے ہیں۔ عرب میں دستور تھا کہ عرب میں اُونٹ کو حلال کرنا ہوتا تو پہلے اس کی کونچیں کاٹتے تاکہ بھاگ نہ جائے پھر اس کو نحر کرتے۔ فیومی نے مصباح میں لکھا ہے۔ کہ عُقر کا استعمال صرف کونچیں کاٹنے کے لیے ہوتا ہے۔ اور کبھی کبھی نحر کے معنے میں بھی آتا ہے۔ ازہری نے اس کی وجہ بھی یہی لکھی ہے چونکہ نحر عام طور پر عُقر کے بعد ہی ہوا کرتا ہے۔ اس لیے اس سے نحر کرنا بھی مراد لے لیتے ہیں۔

حضرت صالحؑ کا معجزہ ہلاکت

نفسیات انسانی کا خاصہ ہے۔ کہ جب کسی کی طرف سے اس کے جذبات مخالفانہ ہوتے ہیں تو وہ کسی بات کو حُسن ظن پر محمول نہیں کرتا۔ اس کو اس کی ہر چیز میں شر، خبث اور بُرائی نظر آتی ہے جلی سے جلی واضح سے واضح برہان بھی اس کے دل کے ریب اور قلب کے شک کو دور نہیں کر سکتے۔ معاندین جو انبیاء کے مکارم اخلاق، حُسن تعلیم اور دیگر علمی وعملی تلقینات کو باور نہیں کرتے اور ان کے کھلے اور بدیہی دعوؤں کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے تو آخر المیں کے طور پر وہ اللہ کے رسول سے خارق

عادت معجزے کا مطالبہ کرتے ہیں۔ اور چونکہ انہیں بدگمانی سے یہ یقین ہوتا ہے۔ کہ ہماری ہی طرح کا ایک مدعی انسان کبھی ایسا عجیب و غریب کام نہیں کرسکتا۔ اس لیے وہ کبھی کوئی خارق عادت امر پیش نہ کرے گا اسی طرح اس کی رسوائی عالم آشکارا ہوجائے گی۔ لیکن اللہ سبحانہ آخری حجت کے طور پر ان کے سامنے خارق عادت پیش کرتا ہے۔ تاہم ان کو دیکھ کر معاندانہ روح ان کے دلوں میں رسول کی سچائی کا اعتبار نہیں ہونے دیتی۔ حضرت صالح علیہ السلام کے ساتھ بھی یہی صورت پیش آئی۔ قوم ثمود کو ان کی صداقت، امانت، دیانت ان کی فراست، دانائی ان کی فرزانگی اور قابلیت پر کوئی شبہ نہ تھا۔ بلکہ اس وجہ سے وہ مستقبل میں قوم کی اُمیدوں کا مرکز تھا۔ قوم کو ان کی دعوت اور دعویٰ سے اختلاف تھا۔ آغاز دعوت ہی میں دو فریق پیدا ہوگئے تھے۔ ایک گروہ ماننے والوں اور دوسرا منکرین کا۔ ماننے والے کمزور نادار اور غریب تھے۔ اور منکرین کے پاس بھرپور مادی طاقت تھی۔ قرآن نے دونوں کی گفتگو پیش کی ہے۔

قال الملاء الذین استکبروا للذین استضعفوا لمن امن منہم اتعلمون ان صالحا مرسل من ربہ قالوا انا بما ارسل بہ مؤمنون۔ قال الذین استکبروا انا بالذی امنتم بہ کافرون۔

اس قوم کے جو سردار اپنی بڑائی پر گھمنڈ رکھتے تھے۔ انہوں نے ان لوگوں سے جو کمزور بنا کر رکھے گئے تھے۔ اور حضرت صالح علیہ السلام پر ایمان رکھتے تھے۔ کہا کیا واقعی تم جانتے ہو کہ صالح علیہ السلام اللہ کے رسول ہیں۔ انہوں نے جواب دیا۔ ہمارا حضرت صالح علیہ السلام کی رسالت پر ایمان ہے۔ ان متکبرین نے آگے سے کہا کہ جس چیز کو تم مان چکے ہو۔ اس کو ہم نہیں مانتے ہیں۔

اسی نہ ماننے والے طاقتور گروہ نے حضرت صالح علیہ السلام سے کہا۔ کہ اگر تم دعویٰ رسالت میں سچے ہو تو کوئی نشانی پیش کرو۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان کو سمجھایا۔ لم تستعجلون بالسیئۃ قبل الحسنۃ۔ لوگو بھلائی سے پہلے برائی کے لیے کیوں جلدی مچاتے ہو۔ لولا تستغفرون اللہ لعلکم ترحمون۔ اللہ سے معافی کیوں نہیں مانگتے ہو تاکہ تم پر رحم کیا جائے لیکن وہ اسی پر اڑے رہے۔ یاصالح ائتنا بما تعدنا ان کنت من المرسلین۔ یہاں واؤ عاطفہ لاکر اسی صورت حال کی طرف اشارہ کیا ہے۔

(۷۶) اور لوگو: تمہارے لیے یہ اُونٹنی اللہ کی نشانی ہے۔ یہ بات معجزہ کے مطالبے کے جواب میں کہی تھی. جیسے سورۃ الشعراء میں ہے۔ فات بآیۃ ان کنت من الصادقین۔ قال ھذہ ناقۃ. معجزے کے مطالبے پر اونٹنی کے پیش کرنے سے ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ محض اونٹنی نہ تھی جیسا کہ بعض شارحین کے انداز بیان سے ظاہر ہوتا ہے۔

پالتو جانوروں کو اللہ کے نام پر چھوڑنے کا رواج بہت قدیم ہے۔ بابل اور ہندوستان میں اس کا سراغ ہزاروں برس پیشتر تک ملتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ قوم ثمود کے لوگ بھی اپنے بتوں کے نام پر جانور چھوڑ دیا کرتے تھے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے اللہ کے نام پر ایک اونٹنی چھوڑ دی اور اسی معاملہ میں قوم کے لیے اتباع حق کی میں آزمائش ہو گئی۔

آیت میں صراحت کے ساتھ اس اونٹنی کے وجود کو معجزہ کہا گیا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ضرور اس کی پیدائش اور اس کے ظہور میں یا اس کی خلقت میں ایسی بات تھی۔ جسے معجزہ اور نشانی کے مطالبے پر پیش کیا گیا ہے۔ اگر حضرت صالح علیہ السلام مطالبے کے جواب میں یوں ہی کسی بھی اُونٹنی کو پکڑ کر کہہ دیتے کہ یہ اللہ کی نشانی ہے۔ تو اس میں مخاطبوں کے لیے کوئی بات نہ ہوتی۔ آیت میں صراحتاً اونٹنی کو معجزہ کہا گیا ہے۔ اور سورۃ بنی اسرائیل میں آتینا ثمود الناقۃ مبصرۃً میں اونٹنی ہی کو بصیرت والی کہا ہے۔ اور یہ بات بھی اس اونٹنی کی اعجازی پیدائش کی نشان دہی کرتی ہے۔ کہ حضرت صالح علیہ السلام نے اونٹنی کو پیش کر کے لوگوں کو دھمکی دی جیسا کہ آگے آ رہی ہے۔ یہ سب باتیں بے غبار ہیں۔ مگر قرآن عزیز سے صراحتاً صرف دو باتیں ثابت ہیں۔ ایک یہ کہ ثمود نے حضرت صالح علیہ السلام سے ان کی صداقت کی نشانی مانگی۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ناقہ کو بطور نشانی پیش کیا۔ دوسری یہ کہ حضرت صالح علیہ السلام نے قوم کو ہدایت کی تھی۔ کہ وہ اسے نقصان نہ پہنچائیں اور پانی کی باری مقرر کر لیں۔ واقعہ کی حیثیت سے پوری تفصیل معالم القرآن کی جلد ہشتم نوٹ نمبر ۱۰۱ میں آ چکی ہے۔

یہاں تو صرف یہ بتانا ہے۔ کہ قرآن عزیز سے یہ تو یقین کے ساتھ ثابت ہے۔ کہ ناقہ ثمود کے لیے اللہ سبحانہ کی ایک نشانی تھی۔ اور اپنے اندر ضرور ایسی کوئی خصوصیت رکھتی تھی جس کی وجہ سے وہ ایسا اعجازی نشان بن سکے جس کا ذکر قرآن عزیز اس اہمیت کے ساتھ کر رہا ہے۔ اگر وہ عام اونٹنی تھی۔ اور حضرت صالح علیہ السلام نے سر راہے کسی اونٹنی کی نکیل پکڑ کر لوگوں سے کہدیا کہ یہ تمہارے لیے

اللہ کی نشانی ہے۔ تو اس میں نہ معقولیت ہے۔ اور نہ معنویت اور نہ اس میں مخاطبوں کے مطالبے کا جواب ہے اور نہ اس میں عقلی طور پر جواب بننے کی صلاحیت ہے۔ جو علماء یہ کہتے ہیں۔ کہ اونٹنی کا حضرت صالح علیہ السلام کی دعاء کے ذریعے پہاڑ کی چٹان سے پیدا ہونا اعجاز ہے۔ اس موضوع پر روایات کی حیثیت کچھ ہو مگر دعویٰ اور دلیل میں مطابقت ضرور ہے۔ اور قرآن میں واقعہ جس انداز میں پیش کیا گیا ہے۔ اس کے اشارات کا مقتضا یہی ہے۔ لیکن کچھ علماء اس اعجاز کی تاویل کرتے ہیں۔ جیسا کہ آپ آٹھویں جلد میں پڑھ چکے ہیں۔

(۷۷) عجیب و غریب اونٹنی

پس اسے تم چھوڑ دو کہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے اور تم اسے برائی سے نہ چھونا اگر ایسا کرو گے تو نزدیکی عذاب کی گرفت میں آجاؤ گے۔ ظاہر عبارت سے ظاہر ہے۔ کہ پہلے فقرے میں جس کھلی دلیل کا ذکر ہے اس سے مراد یہی اونٹنی ہے۔ جسے اس فقرے میں نشانی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ سورۃ الشعراء میں تصریح ہے۔ کہ حضرت صالح علیہ السلام کے مخاطبوں نے خود حضرت صالح علیہ السلام سے ایسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا۔ جو اللہ کا رسول ہونے کی کھلی اور واضح دلیل ہو اور اسی کے جواب میں حضرت صالح علیہ السلام نے اونٹنی کو پیش کیا تھا۔ اس سے یہ بات تو قطعی طور پر ثابت ہو جاتی ہے۔ کہ اونٹنی خرق عادت اور معجزے کے طور پر وجود پذیر ہوئی تھی۔ اور یہ اسی نوعیت کے معجزات میں سے ہے۔ جو اللہ کے رسول اپنی نبوت کے ثبوت میں پیش کرتے آئے ہیں۔ نیز یہ بات بھی اس اونٹنی کے معجزانہ طور پر پیدا ہونے کی دلیل ہے۔ کہ حضرت صالح علیہ السلام اسے پیش کر کے اپنے مخاطبوں سے علی رؤس الاشہاد فرمایا کہ اس اونٹنی کی جان کے ساتھ تمہاری زندگی وابستہ ہے۔ تاکل فی ارض اللہ۔ یہ آزادانہ اللہ کی زمین میں چرتی پھرے گی۔ سورۃ الشعراء میں ہے۔ کہ ایک دن یہ پانی پئے گی اور دوسرے دن پوری قوم کے جانور پانی پئیں لھا شرب ولکم شرب یوم معلوم۔ ظاہر ہے کہ اس شان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جاسکتی ہے جس کی تخلیق غیر معمولی اور غیر معتاد ہو۔ اگر غیر معمولی اور غیر معتاد پانی پینا تقاضاء عقل کے منافی نہیں تو غیر معتاد پیدائش کیوں تقاضاء دانش کے منافی ہے۔

مولانا سید سلیمان ندویؒ نے اس کی یہ تاویل کی ہے۔ کہ حضرت صالح علیہ السلام کی امت نے حضرت صالح علیہ السلام سے ایک نشانی طلب کی تھی۔ انہوں نے کہا کہ یہ اونٹنی تمہاری نشانی ہے جو ایک دن میں ان کے چشمے یا کنویں کا تمام پانی پی جاتی تھی۔ اور دوسرے روز ان کے جانوروں کو ملتا تھا۔ لیکن

اس نشانی کو دیکھ کر کہ اونٹنی تمام چشمے اور کنوئیں کا پانی پی جاتی ہے انہیں تسکین نہ ہوئی اور اس اونٹنی کو مار دیا۔ حالانکہ قرآن نے اونٹنی کو معجزہ قرار دیا ہے نہ کہ اونٹنی کے پانی پینے کو۔ اگر پانی پینا معجزہ ہے تو پھر تاکل فی ارض اللہ کی وجہ سے اس کا آزادانہ چرنا بھی معجزہ ہوگا۔ جس بنیاد پر اونٹنی میں یہ اوصاف پیدا ہوئے ہیں۔ ان کا انکار کرنا کون سی تحقیق ہے۔ اونٹنی کے یہ اعمال خود اونٹنی کے عجیب الخلقت ہونے کی دلیل ہے۔ اونٹنی میں یہ اوصاف اسی وقت متصور ہو سکتے ہیں۔ جب اس کی تخلیق میں اعجاز ہو۔ قرآن نے اونٹنی کو آیۃ کہا ہے اونٹنی کے پانی پینے اور چرنے کو آیۃ نہیں کہا ہے۔ اونٹنی میں شان اعجاز کی وجہ سے یہ حکم ہوا ولا تمسوھا بسوء فیاخذکم عذاب قریب۔ اگر تم نے اسے ہاتھ لگایا تو یکایک تم پر خدا کا عذاب آجائے گا۔ ظاہر ہے کہ اس شان کے ساتھ وہی چیز پیش کی جا سکتی تھی۔ جس کا غیر معمولی ہونا لوگوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا ہو۔

(۷۸) قوم ثمود کا اونٹنی کو ذبح کرنا

پس لوگوں نے اس کے پاؤں کاٹ دیئے پھر اس کے بعد حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تمہیں تین دن کی مہلت ہے۔ اپنے گھروں میں خوب فائدہ اٹھالو۔ یہ وعدہ جھوٹا نہیں ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام سے قوم نے معجزہ مانگا وہ انہیں دکھلا دیا۔ اس واقعہ کی پوری تفصیل اور الفاظ کی تشریح سورہ اعراف آٹھویں پارے کے ختم پر گزر چکی ہے۔ وہاں ملاحظہ کر لی جائے[۱] آٹھویں پارے میں ہے کہ انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور اپنے رب کے حکم سے سرتابی کی اور حضرت صالح علیہ السلام سے کہا کہ اگر تم واقعی اللہ کے رسول ہو تو ہمیں وہ چیز دکھاؤ جس کی تم ہمیں دھمکیاں دیتے رہے یہاں اس آیت میں ہے کہ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اس کے لیے تمہیں صرف تین دن کی مہلت ہے۔ تم شہر میں تین دن مزے کر لو۔ یہ وعدہ پورا ہو کر رہے گا جھوٹا نہیں ہے۔

قرآن کا بتایا ہوا ضابطہ ہے کہ انبیاء کے معجزات دو طرح کے ہوتے ہیں۔ معجزہ ہدایت اور معجزہ ہلاکت۔ انبیاء پہلے کفار کو ہدایت کی نشانیاں دکھلاتے ہیں۔ اور ان کو حق کی دعوت دیتے ہیں۔ کفار کی کثیر تعداد میں جس قدر صالح عناصر ہوتے ہیں وہ اس دعوت کو قبول کرتے جاتے ہیں۔ یہاں تک کہ بالآخر وہ وقت آجاتا ہے کہ جب مادہ فاسد کے سوا کفار کی جماعت میں کوئی صلاحیت پذیر عنصر باقی نہیں

[۱] افادات شیخ الاسلام

رہتا یعنی اس کثیف مادے سے چھٹ کر تمام اجزائے لطیفہ الگ ہو جاتے ہیں۔ اور کفر کے ڈھیر میں بھوسن کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا تو اس وقت معجزہ ہلاکت، آسمان کی بجلی، فضا کی آندھی، زمین کا سیلاب لوہے کی تلوار بن کر رونما ہوتا ہے اور زمین کو ان کے وجود کی نجاست سے پاک کر دیتا ہے۔

اونٹنی کی کونچیں کاٹنے والا اگرچہ ایک شخص ہے جیسا کہ سورہ قمر اور سورہ شمس میں ہے۔ لیکن چونکہ پوری قوم اس کی پشت پر تھی اور وہ دراصل اس جرم میں قوم کی مرضی کا آلہ کار تھا۔ اس لیے الزام پوری قوم پر عائد کیا گیا ہے۔ ہر وہ گناہ جو قوم کی خواہش کے مطابق کیا جائے یا جس کے ارتکاب کو قوم کی رضا اور پسندیدگی حاصل ہو۔ ایک قومی گناہ ہے۔ خواہ اس کا کرنے والا ایک فرد واحد ہو۔ گویا یہ قدم قوم کے متمردین کی جانب سے تمرد کا آخری قدم تھا۔ انہوں نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں۔ اور حضرت صالح علیہ السلام کو چیلنج کیا کہ لو ہم نے اونٹنی کی کونچیں کاٹ دی ہیں۔ اب وہ عذاب لاؤ اگر تم میں کوئی صداقت ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ناقہ کے قتل کا واقعہ معلوم ہونے کے بعد قوم کو بتایا کہ اب تمہاری زندگی کے صرف تین دن باقی ہیں۔ فتمتعوا فی دارکم ثلاثۃ ایام ذالک وعد غیر مکذوب۔ تین دن مزے کر لو اس میں خلاف کا امکان نہیں ہے اس کا نتیجہ کیا ہوا آگے بتایا جا رہا ہے۔

(۷۹) حضرت صالحؑ اور اہل ایمان کا بچاؤ

پھر جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے ساتھ اہل ایمان کو اپنی رحمت سے اور اس دن کی رسوائی سے بچا لیا بلاشبہ تیرا رب ہی زور اور زبردست والا ہے یعنی جب حکم عذاب پہنچا تو ہم نے حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے ساتھیوں کو بچا دیا اور کاہے سے بچا دیا اس دن کی رسوائی سے ومن خزی یومئذ نجینا کی شرح وتفصیل ہے۔ القوی العزیز یعنی جسے چاہے ہلاک کر دے اور جسے چاہے بچا لے۔[۱]

جب معجزہ ہلاکت ظاہر ہوتا ہے۔ تو نبی کو اپنے مومنین کی جماعت کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم ہوتا ہے حضرت نوح علیہ السلام کو اپنے رفقاء کے ساتھ کشتی پر سوار کر کے کفار سے الگ کیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں۔ انی مھاجر الی ربی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاتے ہیں۔ حضرت لوط، حضرت ہود، حضرت شعیبؑ

[۱] افادات شیخ الاسلام

سب نے اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر اپنی نافرمان قوموں سے علیحدگی اختیار کی اور جب تک یہ ہجرت نہیں ہو لیتی اور مومن و کافر الگ نہیں ہو جاتے ۔ معجزہ ہلاکت ظاہر نہیں ہوتا ہے ۔ اور جب وہ ہجرت کر جاتے ہیں ۔ تو یہ معجزہ ہلاکت مختلف صورتوں میں ان قوموں پر نازل ہوتا ہے اور مؤمنین کو نجات اور کافروں کو ہلاکت نصیب ہوتی ہے ۔ حضرت صالح علیہ السلام اور اہل ایمان کی ہجرت کا ذکر یہاں نہیں ہے مگر سورہ اعراف میں یہ تصریح ہے کہ

فتولی عنھم وقال یا قوم لقد ابلغتکم رسالۃ ربی ونصحت لکم ولکن لا تحبون الناصحین ۔

پس حضرت صالح علیہ السلام یہ کہتے ہوئے ان کی بستیوں سے نکلے کہ اے میری قوم میں نے اپنے رب کا پیغام تجھے پہنچا دیا اور میں نے تمہاری بہت خیر خواہی کی لیکن تمہیں اپنے خیر خواہ پسند نہیں ہیں ۔

اسی کو یہاں قرآن نے نجینا صالحا والذین اٰمنوا معہ برحمۃ منا ومن خزی یومئذ سے تعبیر کیا ہے ۔ یعنی اپنے خاص فضل سے حضرت صالح علیہ السلام اور ان کے ساتھ اہل ایمان کو بھی نجات دی ۔ ورنہ یہ آفت ایسی بے پناہ اور ہمہ گیر تھی کہ اللہ کی رحمت کے سوا اور کوئی چیز اس سے نجات دلانے والی نہیں ومن خزی یومئذ یعنی ونجیناھم من خزی یومئذ یہ انجار کا انجار پر عطف نہیں بلکہ احسان کا احسان پر عطف ہے ۔ اسی نکتہ کی وجہ سے فعل کا فعل پر عطف نہیں کیا بلکہ متعلق فعل کا عطف کیا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ یہ نہ سمجھو کہ کسی معمولی آفت سے نجات بخشی بلکہ اس دن کی رسوائی سے نجات بخشی ہے جس کی رسوائی کہ وہ سب کو معلوم ہے ۔

آخر میں فرمایا ہے ۔ ان ربک ھو القوی العزیز یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے ۔ اسے اللہ کے رسول آپ کا بھی وہی رب ہے جس نے قوم ثمود کے ساتھ یہ کچھ کیا ہے ۔ وہ قادر ہے کہ تیرے مخاطبوں کے ساتھ وہ ہی کچھ کرے جو قوم ثمود کے ساتھ ہو چکا ہے کہ قوت و عزت کا اصل مالک تیرا رب ہی ہے ۔ تم مطمئن رہو جس طرح اس نے صالح علیہ السلام کے دشمنوں کو تباہ کیا ہے ۔ اسی طرح تمہارے دشمنوں کو بھی ایک دن رسوا کر دیگا ۔ اور کوئی بھی اس کے ارادے میں رکاوٹ نہ ہوگا ۔

(۸۰) قوم ثمود پر عذاب کی نوعیت

اور آ پکڑا ظالموں کو ہولناک چیخ نے بس ہو گئے وہ اپنے گھروں میں اوندھے ۔ گویا وہ ان گھروں

کے باسی ہی نہ تھے ۔ خبردار قوم ثمود نے بلا شبہ اپنے رب کا کفر کیا اور دیکھو قوم ثمود کے لیے اللہ کی رحمت سے دوری ہے ۔ یعنی بے نام ونشان ہو گئے ۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں ان پر عذاب آیا اس طرح کہ رات کو پڑے سوتے تھے فرشتے نے چنگھاڑ ماری سب کے جگر پھٹ گئے بعض آیات میں رجفۃ آیا ہے یعنی زلزلہ یا کپکپی سے ہلاک ہو گئے ۔ سورہ اعراف میں ہم اس کے متعلق تطبیق کی صورت لکھ چکے ہیں ۔ جو بھی اپنے پروردگار کے آیات واحکام سے منکر ہوا اس کی یہ گت بنتی ہے ۔ اور ایسی پھٹکار پڑتی ہے کہ سن کر عبرت حاصل کرو[1] اس آیت میں صیحۃ فرمایا ہے دوسری جگہ رجیفہ کی تعبیر آئی ہے ۔ سورہ حاقہ میں اسی کو طاغیہ کہا ہے ۔ اور سورہ سجدہ میں اسی کو صاعقہ فرمایا ہے ۔ یہ تمام تعبیرات ایک ہی حقیقت کے مختلف اوصاف ظاہر کرنے کے لیے اختیار کی گئی ہیں ۔ تاکہ معلوم ہو جائے ۔ کہ اس عذاب کی ہولناکیاں کیسی گوناگوں تھیں ۔ صاعقہ کے معنی بجلی کی کڑک کے آتے ہیں ۔ یرسل الصواعق اور عذاب کے معنی بھی آتے ہیں ۔ کیونکہ صاعقہ فضائے آسمانی کی سخت آواز کا نام ہے ۔ یا تو اس میں صرف آگ ہوتی ہے ۔ یا عذاب امر موت بھی ۔ پھر صاعقہ اپنی ذات کے اعتبار سے ایک چیز ہے ۔ اور یہ چیزیں اس کے اثرات ہیں ۔ طاغیہ کے بارے میں کئی قول ہیں ۔ اول یہ کہ طاغیہ ایسا واقعہ ہے ۔ جو شدت وقوت میں حد سے بڑھ گیا ہو اس صورت میں طاغیہ کسی موصوف کی صفت کے لیے محذوف کیا ہے ۔ کچھ کے خیال میں صیحۃ ہے یعنی الصیحۃ الطاغیہ یعنی ایسی چنگھاڑ جو سب چنگھاڑوں سے قوت اور شدت میں زیادہ ہو ۔ ارشاد ہے ۔ انا ارسلنا علیھم صیحۃ واحدۃ فکانوا کھشیم المحتظر ۔ ہم نے بھیجی ایسی چنگھاڑ پھر رہ گئے جیسے روندی باڑ کانٹوں کی ۔ اور بعض موصوف رجفۃ کو محذوف مانتے ہیں ۔ زلزلہ اور بعض صاعقہ کی صفت بتلاتے ہیں ۔ بہر حال آپ ایسی کوندنے والی بجلی کا تصور کریں ۔ جو بار بار اضطراب کے ساتھ چمکتی ہو کڑکتی ہو اور گرجتی ہو اور اس طرح کوند رہی ہو کہ کبھی مشرق میں اور کبھی مغرب میں اور جب ان تمام صفات کے ساتھ چمکتی، کوندتی، گرجتی، لرزتی، لرزاتی کسی مقام پر ایک ہولناک چیخ کے ساتھ گرے تو اس مقام کا اور اس کے نواح کا کیا حال ہو گا ۔ یہ ایک معمولی سی جھلک ہے اس عذاب کی جو قوم ثمود پر آیا ۔ اور ان کو اور ان کی بستیوں کو تباہ و برباد کر کے سرکشوں کی سرکشی اور مغروروں کے غرور کا انجام ظاہر کرنے کے لیے آنے والی نسلوں کے سامنے عبرت پیش کر گیا ۔ بعض شارحین قرآن نے یہاں صیحۃ سے زلزلہ مراد لیا ہے اس لیے قرین قیاس ہے کہ یہ آتش فشاں کا زلزلہ ہو کیونکہ قدیم اور جدید جغرافیہ والوں کا اس پر اتفاق ہے کہ ارض ثمود آتش فشاں مادے

[1] افادات شیخ الاسلام

سے بھری ہوئی ہے۔

معجزے کی حقیقت

یہاں قرآن نے حضرت صالح علیہ السلام کی تقریر کا یہ جملہ پیش کیا ہے۔ یا قوم ھٰذہ ناقۃ اللہ لکم آیۃ۔ لوگو یہ اللہ کی اونٹنی تمہارے لیے آیت بن کر آئی ہے۔ اور یہ قوم ثمود کے اس مطالبے کے جواب میں ہے۔ فات بآیۃ ان کنت من الصادقین۔ آیت کے معنے نشانی اور علامت کے ہیں۔ آیات دو قسم کی ہیں۔ ایک وہ آیات ہیں جو اللہ سبحانہ، کے وجود اور اس کی صفات کمال کی علامتیں ہیں۔ جس طرح ویرانے کی عمارت معمار کے وجود کو اور ایک زخمی کی مرہم پٹی اور اس کے آرام و آسائش کا اہتمام تیماردار کے رحم و کرم کے صفات کو ظاہر کرتا ہے۔ اسی طرح اس عالم کی یہ عظیم الشان عمارت جس کی چھت آسمان اور صحن زمین ہے۔ ایک خالق و صانع کے وجود کو بتاتی ہے۔ اور زمین کے اندر و باہر بارش، دن رات، چاند، سورج، درخت، پھول، پھل اور غلہ کی اقسام وغیرہ زمین میں جانداروں کی زندگی کا سامان اس خالق کے رحم و کرم عطا بخشش اور دیگر اوصاف و کمالات کو ظاہر کرتے ہیں اور بتلاتے ہیں کہ خالق کو اپنی مخلوقات کے ساتھ ایک خاص تعلق اور اعتنا ہے۔ کفر اُن ہی دلوں میں پرورش پاتا ہے جو ان آیات الٰہی میں غور نہیں کرتے ہیں۔ اور ان کی جلوہ گری سے حقیقی جلوہ آرا ہستی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے جس طرح یہ آیات الٰہی عام بندے اور اللہ سبحانہ، کے تعلق کو نمایاں کرتی ہیں۔ اسی طرح اللہ اپنے کسی خاص بندے سے اپنے تعلق اور رابطہ کو اپنی مخصوص علامات و آیات کے ذریعے نمایاں کرتا ہے۔ یہ آیات دو قسم کی ہوتی ہیں۔ باطنی آیات اور ظاہری آیات۔

نبوّت کی باطنی آیات

باطنی اور روحانی آیات صاحب نبوت کی صداقت، معصومیت، تزکیہ، تاثیر، تعلیم، ہدایت، ارشاد و فلاح اور تائید ہے۔ اہل نظر اور حقیقت شناسوں کے لیے یہی باطنی آثار و روایات نبوت کی حقیقی نشانیاں ہیں۔

ظاہری اور مادی دلائل وہ خوارق ہیں جن کو لوگ عام طور پر معجزات کہتے ہیں۔ مثلاً مردے کا زندہ کرنا۔ عصا کا سانپ بن جانا، انگلیوں سے چشمہ اُبلنا، بیمار کو اچھا کرنا، پہاڑ کی چٹان میں اونٹنی کا پیدا ہونا تمام انبیاء کی سیرتیں بیک زبان اس کی تصدیق کرتی ہیں۔ کہ باطنی نشانیوں کے ساتھ ان کو ظاہری آیات بھی ملی ہیں۔

قرآن عزیز نے اکثر انبیاء کے واقعات کے ضمن میں ان کے ظاہری آثار و دلائل کو بھی تفصیل سے بیان کیا ہے لیکن یہ مادی اور ظاہری آیات نبوت کی اصل حقیقت سے خارج ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے کفار کی مادی نشانیوں کی طلب پر نبوت کی زبان سے یہ جواب دیا۔ هل كنت الا بشرا رسولا۔ اور اسی لیے حضرت امام بخاریؒ نے اپنی صحیح کے مقدمہ میں جہاں نبی کی تعریف کی ہے اور نبی کی قسمیں بتائی ہیں۔ اور نبی شناسی کے تین پیمانے بتلائے ہیں۔ ایک اخلاقی، دوسرا نوعی، تیسرا تعلیمی، لیکن نبوت شناسی کے لیے اعجازی پیمانہ کوئی نہیں بتایا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ معجزہ نبوت کی اصل حقیقت سے خارج ہے۔ مقصود یہ ہے۔ کہ نبوت کی حقیقت معجزہ نہیں۔ بلکہ تبشیر و انذار ہے۔ لغت میں معجزہ کے معنے عاجز کر دینے والی اور تھکا دینے والی چیز کے ہیں۔ اور اسلامی اصطلاح میں ایسے عمل کا نام ہے جو سلسلہ اسباب کے بغیر وجود پذیر ہو اسی کو لوگ خرق عادت بھی کہتے ہیں۔

کیا خرق عادت ممکن ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ معجزے کی یہ تعریف کہ وہ خرق عادت کا نام ہے غلط تعریف ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قوانین دو قسم کے ہیں۔ ایک وہ قوانین جو علل و معلولات اور اسباب و مسببات کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً آگ جلاتی ہے۔ پانی خنکی پہنچاتا ہے۔ دوسرے وہ قوانین ہیں جن میں اسباب و مسببات میں علاقہ پیدا کرنے کے لیے خالق اسباب نے سبب اور مسبب کے رشتہ کو کسی چیز سے ہٹا دیا اور یا بغیر سبب کے مسبب کو وجود بخش دیا جیسے جلنے کے اسباب موجود ہونے کے باوجود کسی جسم کا آگ سے نہ جلنا یا دو انسانوں کی خوراک کا ایک جماعت کو کافی ہو جانا۔

یہ دونوں باتیں چونکہ عام نگاہوں میں قانون قدرت کے خلاف ہیں۔ اس لیے جب یہ یا اس قسم کی کوئی چیز رونما ہوتی ہے۔ تو کہا جاتا ہے کہ یہ قانون قدرت کے خلاف ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ بلکہ صرف قوانین قدرت کی پہلی قسم کے خلاف ہے۔ لیکن قانون خاص کے خلاف نہیں ہے۔ اس کا انکار صرف وہ کرتے ہیں۔ جو یا تو قطعاً خدا کے منکر ہوتے ہیں۔ یا یہ کہ وہ اللہ سبحانہٗ کو قادر مطلق نہیں مانتے ہیں۔ اور علت و معلول اور سبب و مسبب کے گورکھ دھندے پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ اور یہ سمجھتے ہیں کہ تمام کائنات کا نظم باہمی تاثیر و تاثر کا نتیجہ ہے۔ غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ اس مذہب کے پیرو اس عقیدہ باطل کے ضمن میں چند اور موہوم باتوں کو بھی بلا دلیل تسلیم کئے بیٹھے ہیں۔ اور اس لیے خرق عادت کو قبول کرنے کی ان میں جرأت نہیں ہوتی۔ گویا انہوں نے یہ تسلیم کر لیا ہے۔ کہ کائنات کے جو علل اور اشیاء کے جو خواص انہوں نے دریافت کر لیے ہیں۔ وہ نظام کائنات چلانے کے لیے کافی ہیں۔ اس کے لیے کسی اور کی دست اندازی کی ضرورت نہیں

کائنات کے چہرہ اسرار کو انہوں نے تمام تر بے نقاب کر لیا ہے اور ہر شئی کی علت اور خاصیت انہوں نے دریافت کر لی ہے ۔ حالانکہ انسانی معلومات اس کے مجہولات کے مقابلے میں بہت کم ہیں۔ اس فضائے کائنات کی بے شمار آبادیوں میں زمین نام کی ایک آبادی کے چوتھے خشک حصے کے بعض اجزائے کائنات تک فقط ان کی رسائی ہو سکی ہے۔ اس مبلغ علم پر اتنا عظیم الشان دعویٰ کسی طرح زیب نہیں دیتا۔ حکماء اعتراف کرتے ہیں۔ کہ وہ صرف کیسے کا جواب دے سکتے ہیں کیوں کا جواب ان کے موضوع بحث سے خارج ہے۔ فلاسفہ کا حال یہ ہے ۔ کہ دو فلسفی بھی ایک نظام خیال پر متفق نہیں ہیں۔

حقیقی علت اللہ کی قدرت ہے

یہ ناممکن ہے اور اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے۔ کہ ایک قادر ذی ارادہ ہستی کو تسلیم کیجیے۔ جس کے ارادے اور مشیت سے سارا کارخانہ چل رہا ہے۔ اسباب وعلل صرف اس کی مشیت اور ارادے کے مظاہر ہیں۔ اور وہ اپنی عادت کے مطابق ایک طریق خاص پر اس کو چلا رہا ہے لیکن وہ اس کا پابند نہیں ہے۔ صدیوں میں جب اس نے ضرورت سمجھی انسانوں میں اپنا ایک نشان قائم کرنے کے لیے عادت کے خلاف کوئی بات ظاہری کر دی۔ علت ومعلولیت کا جو بظاہر نظر آتا ہے ہم نے اس کی عادت جاریہ کی یک رنگی اور یکسانی سے سمجھ لیا ہے ۔

بتانا یہ چاہتا ہوں۔ کہ اللہ سبحانہ کی ایک عادت عام ہے یعنی وہ قوانین جو باہم علت ومعلول کی زنجیر میں جکڑے ہوئے ہیں۔ مثلاً آگ جلاتی ہے ۔

عادت خاص یہ ہے۔ کہ اسباب ومسببات میں علاقہ پیدا کرنے والے نے کسی مقصد کے لیے علت اور معلول کے باہمی رشتہ کو کسی چیز سے جدا کر دیا جیسے جلنے کے اسباب موجود ہونے کے باوجود کسی جسم کا آگ سے نہ جلنا یہ بات چونکہ عام نگاہوں میں قانون قدرت کے خلاف ہے اس لیے جب یہ اور اس طرح کی کوئی شئے رونما ہوتی ہے یا اس کے وجود پذیر ہونے کی اطلاع دی جاتی ہے۔ اور کہا جاتا ہے کہ یہ قدرت کے قانون یا عادت اللہ کے خلاف ہے۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ وہ قانون قدرت کی پہلی قسم یعنی عام عادت کے خلاف ہوتا ہے مگر عادت خاص کے خلاف نہیں ہے۔ یہ بھی قانون قدرت ہی کی ایک کڑی ہے۔ جو عام حالات میں الگ ہو کر کسی خاص مقصد کو پورا کرنے کے لیے ظاہر کی جاتی ہے۔ اور مقصد یہ ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہ اپنے رسول کی صداقت وحقانیت سرعام بتائے اور مکذبین کو باور کرائے کہ یہ اپنے دعوی رسالت میں سچا ہے۔

کیونکہ اگر مدعی رسالت اپنے دعویٰ میں صادق نہ ہو۔ تو اللہ سبحانہٗ کی تائید کبھی ساتھ نہیں ہو سکتی۔ اسی لیے اعجاز خود نبوت کی ماہیت میں داخل نہیں ہے۔ معجزہ ہی نبی ہونے کے لیے کافی نہیں ہے معجزہ کے ساتھ مدعی نبوت کو انسانی اقدار، اخلاقی اقدار کے پیمانے میں رکھ کر دیکھا جائے گا۔ نبیوں کے ترازو میں تول کر دیکھا جائے گا۔ اور اس کے تعلیم یافتہ اور تربیت یافتہ لوگوں سے اس کو ناپا جائے گا۔

وَلَقَدْ جَآءَتْ رُسُلُنَآ اِبْرٰهِیْمَ بِالْبُشْرٰی قَالُوْا سَلٰمًا ؕ قَالَ سَلٰمٌ فَمَا لَبِثَ اَنْ جَآءَ بِعِجْلٍ حَنِیْذٍ ﴿۶۹﴾ فَلَمَّا رَاٰۤ اَیْدِیَهُمْ لَا تَصِلُ اِلَیْهِ نَكِرَهُمْ وَ اَوْجَسَ مِنْهُمْ خِیْفَةً ؕ قَالُوْا لَا تَخَفْ اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰی قَوْمِ لُوْطٍ ﴿۷۰﴾ وَ امْرَاَتُهٗ قَآىِٕمَةٌ فَضَحِكَتْ فَبَشَّرْنٰهَا بِاِسْحٰقَ ۙ وَ مِنْ وَّرَآءِ اِسْحٰقَ یَعْقُوْبَ ﴿۷۱﴾ قَالَتْ یٰوَیْلَتٰۤی ءَاَلِدُ وَ اَنَا عَجُوْزٌ وَّ هٰذَا بَعْلِیْ شَیْخًا ؕ اِنَّ هٰذَا لَشَیْءٌ عَجِیْبٌ ﴿۷۲﴾ قَالُوْۤا اَتَعْجَبِیْنَ مِنْ اَمْرِ اللّٰهِ رَحْمَتُ اللّٰهِ وَ بَرَكٰتُهٗ عَلَیْكُمْ اَهْلَ الْبَیْتِ ؕ اِنَّهٗ حَمِیْدٌ مَّجِیْدٌ ﴿۷۳﴾

اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے فرستادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر آئے انہوں نے کہا سلام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں سلام فرمایا۔ پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام فوراً ایک بُھنا ہوا بچھڑا لے آئے اور لا کر پیش کر دیا[۱] پھر جب حضرت ابراھیم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھتے تو حضرت ابراھیم علیہ السلام کچھ کھٹکے اور ان سے اپنے جی میں ڈرے۔ انہوں نے کہا کوئی اندیشہ نہ کرو ہمیں قوم لوط[۲]

کی طرف روانہ کیا گیا ہے۔[۸۲] اور اس کی بیوی بھی کھڑی تھی۔ وہ ہنس پڑی۔ ہم نے ابراھیم علیہ السلام کی بیوی کو اسحٰق علیہ السلام کی بشارت دی۔ اور اس کی کہ اسحٰقؑ کے بعد یعقوبؑ کا ظہور ہوگا۔[۸۳] بولی ہائے افسوس کیا میرے بچہ ہوگا حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور یہ میرا شوہر بھی بوڑھا ہے۔ یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے[۸۴] انہوں نے کہا کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ سبحانہ کے کام پر۔ اے ابراھیمؑ کے گھرانے والو تم پر اللہ کی رحمتوں اور برکتوں کا نزول ہو۔ بلاشبہ اللہ ہی کی ذات قابلِ ستائش اور بڑائیوں والی ہے[۸۵]

مفردات کے معانی

بشریٰ۔ خوشخبری، ایسی خبر جس کو سُن کر بشرے پر مسرت و خوشی کے آثار نمایاں ہو جائیں۔ نفس انسانی کا خاصہ ہے۔ جب اس کو کوئی خوش کن خبر پہنچے تو دفورِ مسرت سے اس کے جسم میں خون دورہ کرنے لگتا ہے۔ اسی لیے ایسی خبر کے سنانے کو جس کو سُن کر انسان کے چہرے پر فرحت و انبساط کے آثار ظاہر ہونے لگیں تبشیر کہتے ہیں۔

سلام۔ سلامتی، امان، سالم یہ سلم یسلم کا مصدر ہے۔ اس کے معنے عیوب و آفات سے محفوظ رہنے کے ہیں۔ اس کے معنے عیوب و آفات سے سالم رہنے ان سے چھٹکارا پانے اور بری ہونے کے ہیں۔ امام راغب مفردات القرآن میں رقم طراز ہیں۔ سلم اور سلام کے معنے میں ظاہری اور باطنی آفتوں سے الگ رہنے کے ارشاد ہے بقلب سلیم۔ یعنی ایسا دل جو دغا سے خالی ہو۔ یہ باطن کے بارے میں ہے اور مسلمۃ لاشیۃ فیھا۔ بے عیب ہے۔ کوئی داغ اس میں نہیں۔ یہ ظاہر کے بارے میں ہے۔ آیت قالو سلاما قال سلام میں دوسرا پیش کے ساتھ اس لیے ہے۔ کہ دعا کے

باب میں رفع زیادہ بلیغ ہے۔ گویا اس ادب کی رعایت رکھی۔ جس کی اس آیت میں ہدایت ہے۔
واذا حییتم بتحیۃ فحیوا باحسن منھا۔

حضرت لوطؑ کی دعوت اور اہل سدوم کی ہلاکت

قوم لوطؑ اس علاقہ میں رہتی تھی جسے آج کل مشرق اردن کہتے ہیں۔ اور عراق و فلسطین کے درمیان واقع ہے۔ بائیبل میں اس قوم کا صدر مقام سدوم بتایا گیا ہے۔ جو یا تو بحیرہ مردار کے قریب کسی جگہ واقع تھا۔ یا اب بحیرہ مردار میں غرق ہو چکا ہے۔ تلمود میں لکھا ہے۔ کہ سدوم کے علاوہ ان کے چار بڑے بڑے شہر اور بھی تھے۔ اور ان شہروں کے درمیان کا علاقہ ایسا گلزار بنا ہوا تھا۔ کہ میلوں تک بس ایک باغ ہی باغ تھا۔ جس کے جمال کو دیکھ کر انسان پر مستی طاری ہو جاتی تھی۔ مگر آج اس قوم کا نام و نشان دنیا سے بالکل ناپید ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی متعین نہیں ہے کہ اس کی بستیاں ٹھیک کس مقام پر واقع تھیں۔ اب صرف بحیرہ مردار ہی اس کی ایک یادگار باقی رہ گیا ہے۔ جسے آج تک بحر لوط کہا جاتا ہے۔

حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے بھتیجے تھے۔ اپنے چچا کے ساتھ عراق سے نکلے اور کچھ مدت تک شام و فلسطین اور مصر میں دعوت و تبلیغ کا تجربہ حاصل کرتے رہے۔ پھر مستقل پیغمبری کے منصب پر سرفراز ہو کر اس بگڑی ہوئی قوم کی اصلاح پر مامور ہوئے۔ چونکہ سدوم کی ہلاکت کی خبر پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دی گئی تھی۔ اس سرگزشت کی ابتدا بھی انہیں کے ذکر سے ہوئی۔

فرشتوں نے دو باتوں کی خبر دی۔ ایک یہ کہ قوم لوطؑ کی ہلاکت کا وقت آگیا دوسری یہ کہ سارہ کے بطن سے حضرت اسحٰق علیہ السلام کی پیدائش ہو گی اور ان سے حضرت یعقوب علیہ السلام پیدا ہوں گے۔

ان دونوں باتوں میں بظاہر کوئی علاقہ نظر نہیں آتا اس لیے خیال ہوتا ہے کہ کیوں دونوں کی خبر بیک وقت دی گئی؟ کیوں دونوں کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا؟ لیکن فی الحقیقت ایسا نہیں ہے دونوں باتیں ایک دوسرے کے ساتھ مربوط ہیں۔

حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہما السلام جب کسریوں کے ملک سے آکر فلسطین میں مقیم ہوئے تو یہ ملک ان کے لیے اجنبیوں کا ملک تھا۔ لیکن مشیت الٰہی کا فیصلہ ہو چکا تھا۔ کہ ایک دن اسی سرزمین پر ان کی نسل حکمرانی کرے گی۔ اس نسل کا ظہور کس سے ہوا۔ اسرائیل سے یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام سے وہ کس کے لڑکے تھے۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کے۔ بس فرشتوں نے بیک وقت دو باتوں کی خبر دی۔ ایک میں ایمان و نیک عملی کی کامرانیوں کا اعلان تھا۔ دوسری میں انکار و بدعملی کی ہلاکتوں کا۔ یعنی جس دن اس بات کی

خبر دی گئی کہ سدوم اور عمورہ کا علاقہ بدعملیوں کی پاداش میں ہلاک ہونے والا ہے۔ اسی دن اس کی بھی بشارت دے دی گئی کہ ٹھیک عملی کے نتائج ایک نئی نسل تیار کر رہے ہیں۔ اور وہ عنقریب اس تمام ملک پر حکمرانی کرنے والی ہے۔

پھر معاملہ کا ایک دوسرا پہلو بھی ہے۔ سدوم اور عمورہ کا علاقہ فلسطین کا سب سے زیادہ شاداب علاقہ تھا۔ اور معلوم ہے کہ سارہ تمام عمر اولاد کی تمنائیں کرتے کرتے بالآخر مایوس ہو چکی تھیں۔ قدرت الٰہی نے بیک وقت دونوں کرشمے دکھلا دیئے جو زمین سب سے زیادہ شاداب ہے وہ بدعملیوں کی پاداش میں ایسی اجڑے گی کہ پھر کبھی سرسبز و شاداب نہ ہو سکے گی۔ جو شجر امید بالکل سوکھ چکا ہے وہ اچانک اس طرح سرسبز ہوگا کہ صدیوں تک اس کی شاخیں بار آور رہیں گی۔ چنانچہ سدوم اور عمورہ کا علاقہ آتش فشاں مادے کے انفجار سے ایسا بنجر ہوا کہ آج تک بنجر ہی ہے اور بشارت پر پورا سال بھی نہیں گزرا تھا۔ کہ حضرت اسحٰقؑ کی پیدائش ہو گئی۔ اور پھر ان کی نسل روز بروز بڑھتی اور پھیلتی چلی گئی۔

(۸۱) اور یہ واقعہ ہے کہ ہمارے فرستادے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لیکر آئے۔ انہوں نے کہا سلام حضرت ابراہیم علیہ السلام نے جواب میں سلام فرمایا پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام فوراً ایک بھنا ہوا بچھڑا لے کر آئے اور لا کر پیش کر دیا۔ یہ اس سورت کے قصص کی ترتیب کے موافق ہے صرف قوم لوطؑ کے قصے سے پہلے یہاں ابراہیم علیہ السلام کا تھوڑا سا قصہ بیان فرمایا ہے۔ مگر تعبیر ایسی رکھی کہ جو ظاہر کرتی ہے کہ مقصود اصل لوط علیہ السلام کا قصہ بیان کرنا ہے۔ چونکہ اس میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے قصے میں کئی طرح کی مناسبت اور تعلق پایا جاتا ہے۔ اس لیے بطور تمہید و توطئہ ابراہیم علیہ السلام کا قصہ مذکور ہوا۔ لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خالہ زاد بھائی ہیں۔ جو آپ کے ہمراہ عراق سے ہجرت کر کے آئے۔ فرشتوں کی ایک ہی جماعت دونوں کے پاس بھیجی گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قوم لوطؑ کی ہلاکت کے مسئلے میں فرشتوں سے بحث کی جو آگے آئی ہے۔ یہ فرشتے نہایت حسین و جمیل نوجوانوں کی شکل میں لوط علیہ السلام کی طرف جاتے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس خوشخبری لے کر آئے کہ حق تعالیٰ نے ان کو اپنا خلیل بنایا۔ اور اس بڑھاپے میں حضرت سارہ کے بطن سے بیٹا عطا کرنے والا ہے۔ نیز یہ کہ قوم لوطؑ کے بدمعاشوں اور ظالموں کے وجود سے عنقریب دنیا پاک کر دی جائے گی۔ جس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کے متبعین کو کسی قسم کا ضرر نہ پہنچے گا۔ فرشتوں نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا آپ نے جواب دیا مگر اول وہلہ میں پہچان نہ سکے جیسے ابتدا میں حضرت لوط علیہ السلام نے بھی ان کو نہیں پہچانا بلکہ صحیحین کی روایت میں ہے کہ ایک بار جبرئیل علیہ آدمی کی شکل میں آئے اور حضور اقدسؐ

سے سوال وجواب کرتے رہے۔ جب اُٹھ چلے گئے تب آپ کو بتلایا گیا کہ یہ جبرئیل علیہ السلام تھے۔ گویا متنبہ کر دیا کہ نبی کو بھی فرشتہ وغیرہ کا علم ضروری اللہ سبحانہٗ کے دینے سے ہوتا ہے۔ وہ کسی وقت مخفی رکھنا چاہے توکسی کی قدرت نہیں کہ معلوم کر سکے۔ بہرحال حضرت ابراہیم علیہ السلام نے انہیں آدمی سمجھ کر مہمان نوازی کے لیے اُٹھے اور نہایت فربہ بچھڑا بھون تل کر سامنے حاضر کیا۔[1]

حضرت ابراہیم علیہ السلام کو حضرت اسحٰق علیہ السلام کی بشارت کا معاملہ اصل موضوع کی تمہید ہے اور موضوع کے ساتھ اس تمہید کو کیا مناسبت ہے۔ یہ پہلے بتایا جا چکا ہے۔ اصل موضوع تو بتانا یہ ہے کہ قوموں کا رسولوں کے ساتھ طرز عمل کیا رہا ہے۔ اور اس طرز عمل کا نتیجہ کیا رہا۔ لیکن چونکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی قوم پر کوئی عذاب نہیں آیا تھا۔ اس لیے یہاں انداز تعبیر تبدیل کر دیا۔ عام انداز تو یہی تھا۔ والی عاد اخاھم، والی ثمود اخاھم، والی مدین اخاھم مگر یہ انداز چھوڑ کر یہ انداز اختیار کیا۔ ولقد جاءت رسلنا ابراھیم بالبشری۔ واقعہ کی اہمیت کے پیش نظر ولقد تاکیدی تعبیر کا انداز اختیار کیا ہے۔ رسل رسول کی جمع ہے اور اس سے مراد فرشتے ہیں۔ یہ فرشتے کتنے تھے۔ قرآن نے تعداد کی کوئی تصریح نہیں کی۔ یہ تو ہم کہہ سکتے ہیں کہ ایک فرشتہ نہیں تھا بلکہ فرشتوں کی ایک جماعت تھی۔ اس کے دو قرینے ہیں۔ ایک انداز بیان میں جمع کے صیغے ہیں دوسرے ضیافت میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کا بچھڑے کو ذبح کرنا قرینہ ہے کہ ایک نہیں متعدد تھے۔ اور انداز تعبیر سے یہ بات بھی معلوم ہو رہی ہے کہ فرشتے جس قدر بھی تھے۔ انسانی شکل میں تھے۔ اور عذاب کے لیے نہیں بلکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خوشخبری دینے کے لیے آئے تھے۔ اور انہوں نے آداب ملاقات کے مطابق حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سلام کیا اور حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی ان کو سلام کا جواب دیا۔ الجصاص نے یہاں یہ لطیف نکتہ آفرینی کی ہے کہ اہل ایمان میں جو سلام رائج ہے یہ فرشتوں کا طریقہ ہے۔ چونکہ وہ انسانی لباس میں تھے اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام فوراً ان کی میزبانی میں لگ گئے۔

فرشتوں کا تجسم وتشکل

تورات میں انبیاء بنی اسرائیل کے قصوں میں فرشتے کے تجسم وتشکل کے بکثرت واقعات مذکور ہیں۔ انجیل میں ہے کہ روح القدس کبوتر کی شکل میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر اتری۔ حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ

[1] افادات شیخ الاسلام

فرماتے ہیں ۔ کہ ایک روز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے ساتھ باہر بیٹھے تھے کہ اتنے میں ایک شخص آکر آپ کے پاس بیٹھا اور سوال کیا کہ ایمان کیا ہے ؟ آپ نے فرمایا کہ ایمان یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ پر، اس کے فرشتوں پر، اللہ سبحانہٗ سے ملنے پر، اس کے پیغمبروں پر، اور قبر سے دوبارہ جی اُٹھنے پر تم یقین رکھو۔ اس نے پھر پوچھا کہ اسلام کیا ہے جواب میں فرمایا کہ اللہ کی عبادت کرو اور کسی کو اس کا شریک نہ بناؤ اور نماز پڑھو اور زکوٰۃ مفروضہ ادا کرو، روزے رکھو۔ اس نے پھر پوچھا کہ احسان کیا ہے ۔ ارشاد ہوا کہ احسان یہ ہے کہ اللہ سے عابدانہ تعلقات اس طرح رکھو کہ گویا تم خدا کو دیکھ رہے ہو کیونکہ اگر تم نہیں دیکھ رہے ہو تو یقین کرو کہ وہ تو تمہیں دیکھ رہا ہے ۔ اس نے پھر سوال کیا کہ قیامت کب آئے گی ۔ آپ نے فرمایا کہ مجیب اس موضوع پر سائل سے زیادہ واقف نہیں ہے ۔ البتہ میں تمہیں اس کی علامتیں بتاتا ہوں ۔ جب لونڈی اپنے آقا کو جنے اور جب اونٹوں کے چرانے والے بڑی بڑی عمارتیں بنانے لگیں ۔ قیامت کا علم ان پانچ باتوں میں سے ہے ۔ جن کو اللہ سبحانہٗ کے سوا کوئی نہیں جانتا ہے ۔ وہ شخص اس کے بعد اُٹھ کر چلا گیا ۔ آپ نے صحابہ سے فرمایا کہ اسے واپس بلاؤ لوگوں نے اِدھر اُدھر دیکھا تو کوئی نظر نہ آیا آپ نے فرمایا کہ یہ جبرئیل علیہ السلام تھے جو تمہیں تمہارا دین سکھانے آئے تھے ۔

صحابہ میں دحیہؓ نامی صحابی بہت حسین تھے ۔ جبرئیل علیہ السلام اکثر ان ہی کی صورت میں مجسم ہو کر آتے تھے ۔ اور اس حالت میں کبھی کبھی لوگوں کو نظر بھی آجاتے تھے ۔ حضرت ام سلمہؓ کہتی ہیں ۔ کہ ایک بار میں نے دیکھا کہ دحیہ آپ کے سامنے بیٹھے ہیں اور آپ سے باتیں کر رہے ہیں ۔ مجھے کچھ بھی شک نہیں ہوا کہ یہ دحیہ نہیں ہیں ۔ اتنے میں مسجد نبوی میں آپ کے خطبے کی آواز سنی کہ آپ فرما رہے تھے کہ ابھی میرے پاس جبرئیلؑ آئے تھے ۔ ام سلمہؓ کہتی ہیں کہ تب میں سمجھی کہ وہ اصل جبرئیل علیہ السلام نہیں دحیہ کلبی تھے ۔ چونکہ فرشتے انسانی شکل میں آئے تھے ۔ اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام فوراً ان کی میزبانی میں لگ گئے ۔

توریت میں یہ تفصیل درج ہے کہ

> یہ آنے والے تعداد میں تین تھے ۔ اور وہ دن کو گرمی کے وقت اپنے خیمہ کے باہر بیٹھا تھا ۔ اور اس نے اپنی آنکھیں اٹھا کر نظر کیا اور کیا دیکھا کہ تین مرد اس کے پاس کھڑے ہیں ۔ پیدائش ۱۸ ۔ ۱ ۔ ۲

لیکن قرآن نے کوئی تعداد نہیں بتائی ۔ بہمانوں کو دیکھتے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام نے مہمان نوازی اور اکرام مہمان کا اس طرح مظاہرہ کیا کہ ان جاء بعجل حنیذ اور زیادہ دیر نہیں گزری کہ انہوں نے ان کے آگے بھنا ہوا بچھڑا پیش کر دیا ۔

(۸۲) حضرت ابراہیمؑ کا ڈرنا

پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف نہیں بڑھتے ہیں تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کچھ کھٹکے ۔ اور ان سے اپنے جی میں ڈرے ۔ آخر یہ کون ہیں ؛ کس غرض سے آئے ہیں ؛ ہم کھانا پیش کرتے ہیں یہ اسے ہاتھ نہیں لگاتے ۔ اس وقت کے دستور کے موافق جو مہمان کھانے سے انکار کرتا سمجھا جاتا تھا کہ یہ کسی اچھے خیال سے نہیں آیا ۔ ابراہیم علیہ السلام گھبرائے کہ اگر آدمی ہیں تو کھانے سے انکار کرنا ضرور کچھ معنے رکھتا ہے ۔ اور فرشتے ہیں تو نامعلوم کس مطلب کے لیے بھیجے گئے ہیں ۔ آیا مجھ سے کوئی غلطی ہوئی یا میرے حق میں کوئی ناخوشگوار چیز لے کر آئے ہیں ۔ اسی حیص وبیص میں زبان سے اظہار بھی کردیا انا منکم وجلون ۔ یعنی ہم کو تم سے اندیشہ ہے ۔ عموماً مفسرین نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے خوف کی بھی توجیہات کی ہیں ۔ مگر حضرت شاہ صاحب نے میرے نزدیک لطیف توجیہہ کی ہے ۔ کہ فرشتوں کے ساتھ جو عذاب الٰہی تھا ۔ اور شان غضب وانتقام بن کر قوم لوطؑ کی طرف جارہے تھے ۔ اس کا طبعی اثر یہ تھا کہ ابراہیم علیہ السلام کے قلب پر ایک طرح کے خوف وخشیت کی کیفیت طاری ہوئی جس کا اظہار انہوں نے انا منکم وجلون کہہ کر کیا یعنی ہم کو تم سے ڈر لگتا ہے [1]

توریت نے اس مہمانی کی مزید تفصیل بھی درج کی ہے ۔

> اور ابراہیمؑ خیمہ میں سارہ کے پاس دوڑا گیا اور کہا کہ تین پیمانہ آٹا لے کر جلد گوندھ کے پھلکے پکا اور ابراہیمؑ گلے کی طرف دوڑا اور ایک موٹا تازہ بچھڑا لاکر ایک جوان کو دیا اس نے جلد اسے تیار کیا ۔ پھر اس نے گھی دودھ اور اس بچھڑے کو جو اس نے پکوایا تھا لے کر ان کے سامنے رکھا اور آپ ان کے پاس درخت کے نیچے کھڑا رہا اور انہوں نے کھایا ۔

لیکن فرشتوں کے کھانے کا تصور یہودی تصور ہے ۔ لیکن قرآن نے ملائکہ کا جو تصور پیش کیا ہے وہ یہ ہے کہ وہ انسانی خصائص اور میلانات سے پاک ہیں ۔ نہ وہ مرد ہیں ، نہ عورت ہیں ، نہ کھاتے ہیں ۔ نہ پیتے ہیں ، ۔ یہاں قرآن نے یہ تصریح کردی ہے کہ فرشتے انسانی ضروریات سے پاک ہیں چنانچہ جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے ان کے لیے دعوت کا اہتمام کیا مگر فلما رآ ایدیھم لا تصل الیہ ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرشتوں کو دیکھا کہ ان کے ہاتھ کھانے کی طرف بڑھتے نہیں ہیں ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام

[1] افادات شیخ الاسلام

کو وہ انجان معلوم ہوئے۔ اب تک حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خیال تھا۔ کہ قرب وجوار کے کسی علاقہ کے کچھ اچھے اور نیک آدمی ہیں لیکن ان کی اتنی محنت اور اتنے ذوق وشوق سے تیار کی ہوئی بھانی کی طرف جب انہوں نے ہاتھ بڑھایا نہیں تو قدرتاً انہوں نے کچھ بیگانگی محسوس کی اور دل ہی دل میں ڈرے۔ نکرھم واوجس منھم خیفۃ۔ یہاں کچھ شارحین قرآن کہتے ہیں۔ کہ یہ خوف اس لیے تھا کہ یہ کوئی دشمن یا کوئی ڈاکو تو نہیں۔ دستور یہ تھا کہ جو کوئی دشمن کسی کو اپنا ہدف بنانا چاہتا تھا۔ اس کے یہاں کھانا کھانے سے پرہیز کرتا تھا۔ اور جس کے ہاں کھانا کھا لیتے پھر اس کو نہ ستاتے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہی خیال گزرا اور ان سے خوف دہراس طبعی طور پر پیدا ہوا قرطبی لکھتے ہیں۔ وکانوا اذا نزل بھم الضیف لایا کل ظنوا بہ شراً۔ لیکن دوسرے شارحین قرآن کو اس سے اختلاف ہے وہ فرماتے ہیں کہ کھانے کی طرف ان کے ہاتھ نہ بڑھنے سے ہی حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے تھے۔ کہ یہ فرشتے ہیں آدمی نہیں۔ اور چونکہ فرشتوں کا انسانی شکل میں آنا غیر معمولی حالات میں ہی ہوا کرتا ہے اس لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو جس بات پر خوف ہوا۔ وہ یہ تھی کہ کہیں بستی کے لوگوں میں سے کوئی کسی سے قصور تو نہیں ہو گیا۔ جس پر گرفت کے لیے فرشتے اس صورت میں آئے ہیں۔ علامہ آلوسیؒ رقمطراز ہیں۔ کہ

سورہ ذاریات میں سلام قوم منکرون اس بات کی دلیل ہے۔ کہ یہ فرشتے ہیں۔ اور ابراہیم علیہ السلام کو خیال ہوا کہ ان کو قوم پر عذاب کے لیے روانہ کیا گیا ہے۔

یہ اگر بات وہ بات ہوتی جو کچھ شارحین قرآن نے لکھی ہے تو فرشتے یوں کہتے کہ ڈرو نہیں کہ ہم اللہ کی جانب سے آئے ہیں۔ ان کا یہ کہنا کہ انا ارسلنا الی قوم لوط۔ ہم تو قوم لوطؑ کی طرف بھیجے گئے ہیں۔ تو اس سے معلوم ہوا کہ ان کا فرشتہ ہونا تو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو معلوم ہو گیا تھا پریشانی صرف یہ تھی کہ یہ حضرات جو آئے ہیں تو آخر وہ بدنصیب کون ہے جس کی شامت آنے والی ہے۔ فرشتوں نے یہ دیکھ کر کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام پریشان ہیں ان کو تسلی دی کہ آپ کسی تشویش میں مبتلا نہ ہوں۔ ہم قوم لوطؑ کے لیے آئے ہیں۔ یعنی ڈرنے کی کوئی بات نہیں ہے۔ ہم فرشتے ہیں۔ جو قوم لوطؑ کو تباہ کرنے کے لیے بھیجے گئے ہیں۔ آپ کچھ اندیشہ ضرر کا نہ کیجئے [1]

(۸۴) حضرت اسحٰقؑ کی ولادت

اور اس کی بیوی بھی کھڑی تھی۔ وہ ہنس پڑی تھی۔ ہم نے ابراہیم علیہ السلام کی بیوی کو اسحٰق علیہ السلام

[1] افادات شیخ الاسلام

کی بشارت دی اور اس کی کہ اسحٰق علیہ السلام کے بعد یعقوب علیہ السلام کا ظہور ہوگا۔ یعنی حضرت سارہ جو مہمانوں کی خدمت یا اور کسی کام کے لیے وہاں کھڑی تھیں۔ اس ڈر کے رفع ہونے سے خوش ہو کر ہنسیں۔ حق تعالیٰ سے خوشی پر اور خوشیاں سنائیں کہ تجھ کو اس عمر میں بیٹا ملے گا۔ اسحٰقؑ اور اس کی نسل سے ایک پوتا یعقوبؑ عطا ہوگا۔ جس سے ایک بڑی بھاری قوم بنی اسرائیل اُٹھنے والی ہے یہ بشارت حضرت سارہ کو شاید اس لیے سنائی گئی۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ایک بیٹا اسماعیل علیہ السلام حضرت ہاجرہ کے بطن سے پہلے ہی موجود تھا۔ سارہ کو تمنا تھی کہ مجھے بھی بیٹا ملے مگر بوڑھی ہو کر مایوس ہو چکی تھیں۔ اس وقت یہ بشارت ملی۔ بعض علمار نے حضرت سارہ کے ہنسنے کی اور بھی توجیہات کی ہیں۔ مگر ظاہر وہی ہے جو ہم نے بیان کیا۔ علمائ نے ومن وراء اسحٰق ویعقوب سے استدلال کیا ہے کہ حضرت اسحٰقؑ ذبیح نہ تھے اسماعیلؑ تھے۔ ظاہر قرآن بھی ہے کہ حضرت سارہ پہلے اس جگہ موجودہ نہ تھیں۔ فرشتوں کے آنے کی خبر سُن کر سارا گھر پریشان ہو گیا حضرت سارہ بھی اسی گھبراہٹ میں نکل آئیں۔ جیسا سورہ ذاریات میں ہے۔ فاقبلت امرأتہ وہ بھی آکر کھڑی ہو گئیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ جب انہوں نے یہ سن لیا کہ ان کے گھر یا بستی پر فرشتوں کی جانب سے کوئی آفت آنے والی نہیں تو وہ ہنس پڑیں۔ علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں۔ کہ مہمانوں کی خدمت کا فرض انجام دینے کے لیے موجود تھیں۔ اور کچھ کی رائے میں حضرت سارہ بشارت سن کر ہنسیں۔ یہ ہنسی پیش پا افتادہ احوال وظروف میں حیرت، تعجب اور مسرت کے گوناگوں جذبات کو ظاہر کر رہی تھی۔ اس تعجب کا اظہار انہوں نے جس انداز میں کیا۔ آگے آرہا ہے۔ اللہ سبحانہ کی رحمت حضرت سارہ کے اس مسرت آمیز اظہار حیرت پر مزید جوش میں آگئی۔ فرشتوں نے ان کو مخاطب کر کے صرف بیٹے ہی کی نہیں بلکہ تعیین کے ساتھ بیٹے اور پھر پوتے کی بشارت دی۔ فبشرناها باسحٰق ومن وراء اسحٰق ویعقوب۔ یہ ایک بشارت نہیں متعدد بشارتیں ہیں۔ اول اسحٰقؑ کی ولادت ہوگی۔ دوم وہ جوان ہوگا۔ سوم اس کی شادی ہوگی، چہارم اسحٰقؑ کے بچہ ہوگا۔ جس کا نام یعقوب ہوگا۔ پنجم پوتے سے نسل چلے گی۔ فرشتوں نے یہ خوشخبری سارہ کو اس لیے سنائی کہ اس سے پہلے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاں ان کی دوسری بیوی حضرت ہاجرہ سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہو چکے تھے۔ مگر حضرت سارہ اس وقت تک بے اولاد تھیں۔ اور اس بنا پر ان کا دل زیادہ غمگین تھا۔ ان کے اس غم کو دور کرنے کے لیے فرشتوں نے ان کو ایک نہیں متعدد خوشخبریاں سنائیں۔

حضرت ابراہیم کی تین بیویاں

حضرت ابراہیم علیہ السلام کی تین بیویاں تھیں۔ سارا، ہاجرہ، قطورا۔ سارا کے بیٹے حضرت اسحٰقؑ

تھے۔ قطورا کے بطن سے مدین اور ہاجرہ کے بطن سے اسماعیل علیہ السلام ہوئے۔ ہاجرہ اصل میں عبرانی لفظ ہاغار ہے۔ جس کے معنے بیگانہ اور اجنبی کے ہیں۔ اصل میں ان کا وطن مصر تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اہلیہ جب مصر گئے تو فرعون مصر نے دیگر انعام واکرام کے ساتھ یہ لڑکی بھی ان کو دی۔ اسی سے حضرت اسماعیل علیہ السلام پیدا ہوئے تھے۔ اور سارہ سے حضرت اسحٰق علیہ السلام جن سے بنی اسرائیل کی نسل قائم ہوئی۔ بنی اسرائیل کہتے ہیں کہ ہاجرہ سارہ کی لونڈی تھیں۔ اس لیے بنی اسماعیل بنی اسرائیل کے برابر نہیں۔ عرب سامیہ اولی کی تاریخ پڑھیئے تو آپ کو معلوم ہوگا۔ کہ اس وقت مصر میں حکمران طاقت عرب کی ایک سامی قوم تھی۔ جس سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے نہایت قریبی نسبی تعلقات تھے۔ لفظ ہاجرہ کا عبرانی ہونا بھی اس کی دلیل ہے۔ اس بنا پر فرعون مصر کا ہاجرہ کو حضرت ابراہیم علیہ السلام کی خدمت میں پیش کرنا خود اس بات کی واضح دلیل ہے کہ فی الواقع فرعون کا مقصد اس شادی سے نسبی تعلق کا استحکام تھا۔ اس تاریخی قیاس کی یہودی روایات سے کماحقہٗ تصدیق ہوتی ہے۔ سفر ایشار میں جو یہودیوں کی ایک معتبر تاریخ ہے مذکور ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زمانہ میں مصر کا بادشاہ حضرت ابراہیم کا ہموطن تھا۔ ربی شلوم۔ تورات کا ایک مفسر تکوین کی تفسیر میں لکھتا ہے۔ کہ

> ہاجرہ فرعون کی بیٹی تھی۔ فرعون نے جب سارہ کی کرامات دیکھیں تو کہا کہ اس کے گھر میں لونڈی بن کر رہنا دوسرے کے گھر میں بی بی بن کر رہنے سے بہتر ہے۔

اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ بڑی بیوی ہونے کی حیثیت سے وہ سارہ کی خدمت گزار تھیں۔ سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی بیوی تھیں۔ مگر ان سے کوئی اولاد نہیں ہوئی تھی۔ الیعزر نامی ایک دمشقی خانہ زاد گھر کا مالک تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرزند کے لیے دعا کی۔ دعا قبول ہوئی اور حضرت ہاجرہ حاملہ ہوئیں۔ حضرت سارہ کو یہ دیکھ کر رشک آیا اور وہ ہاجرہ کو ستانے لگیں۔ ہاجرہ نے گھر چھوڑ کر کہیں اور جانے کا ارادہ کیا وہ ایک چشمہ تک جو شور کے راستہ میں ہے آکر ٹھہر گئیں۔ اس وقت ایک فرشتہ نے ہاجرہ کے سامنے آکر کہا۔

> ہاجرہ اپنی بی بی کے پاس جا۔ میں تیری نسل کو اتنا بڑھاؤں گا کہ وہ کثرت کی وجہ سے گنی نہ جائے گی۔ تو ایک بیٹا جنے گی تو اس کا نام اسماعیلؑ رکھنا کہ خدا نے تیرا دکھ سُنا۔

ہاجرہ کے بیٹا ہوا اور حسب تعلیم الہٰی اس کا نام اسماعیلؑ رکھا گیا۔ اس وقت حضرت ابراہیم علیہ السلام کی عمر ۸۶ سال تھی۔ ۹۹ سال کی عمر میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کو سارہ کے بطن سے بھی ایک فرزند کے تولد کی بشارت ملی۔ لیکن اس بشارت سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کوئی خوشی نہ ہوئی۔ اس بشارت

کے جواب میں انہوں نے یہ دعا کی ۔

اے کاش اسمٰعیل تیرے حضور زندہ رہے ۔ تکوین ۱۸

اللہ سبحانہٗ نے فرمایا ۔

اسمٰعیل علیہ السلام کے حق میں مَیں نے تیری سُنی ، دیکھ میں اسے برکت دوں گا اور اسے برومند کروں گا اور اس کو بہت بڑھاؤں گا ۔ اور اس سے بارہ سردار پیدا ہوں گے ۔ اور میں اس کو بڑی قوم بنا دوں گا ۔

تیرہ برس کی عمر میں باپ نے بیٹے کی ختنہ کی ۔ اسی حال میں حضرت اسحٰق علیہ السلام بھی پیدا ہوئے۔[۱]

(۸۴) ولادت پر حضرت سارہ کا استعجاب

بولی ہائے افسوس کیا میرے بچہ ہوگا حالانکہ میں بڑھیا ہوں اور میرے شوہر بوڑھے ہیں ۔ یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے یہاں یا ویلتی کا لفظ ایسا ہے ۔ جیسے ہمارے محاورات میں عورتیں کہہ دیتی ہیں ۔ کہ میں "نگوڑی" کیا اس بڑھاپے میں اولاد جنوں گی کہتے ہیں کہ حضرت سارہ کی عمر اس وقت ۹۹ سال تھی ۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام ۱۰۰ سال یا اس سے بھی زیادہ کے تھے ۔ مطلب یہ ہے کہ ایسا ہوا تو بالکل انوکھی اور عجیب وغریب بات ہوگی[۲] یہ حضرت سارہ کے اظہار تعجب کی تفصیل ہے ۔ یہ اعتبار ظاہر کے حضرت سارہ کا یہ خوشخبری سُن کر اسباب ظاہری اور مادی کے اعتبار سے اس پر تعجب کر بالکل قدرتی تھا ۔ مولانا اشرف علیؒ نے یا ویلتی کا ترجمہ ہائے خاک پڑے اور حضرت شاہ صاحب نے اسے خرابی کیا ہے توریت میں ہے ۔

ابراہیم اور سرّہ بوڑھے اور بہت دن کے تھے ۔ اور سرّہ سے عورتوں کی معمولی عادت موقوف ہوگئی تھی ۔ تب سرّہ نے اپنے دل میں ہنس کر کہا کہ بعد اس کے کہ میں ضعیف ہوگئی ہوں اور میرا خاوند بوڑھا ہے کیا مجھے خوشی ہوگی ۔ پیدائش ۱۸

یہ خالص زنانہ انداز میں کہا کیا میں نگوڑی بچہ جنوں گی یا ہائے خاک پڑے میرے بچہ ہوگا میں سن ایاس کو پہنچ گئی ہوں اور یہ میرے میاں بھی کھوسٹ ہو چکے ہیں ۔ یہ تو بڑے ہی اچنبہ کی بات ہوگی ۔ یعنی حضرت سارہ نے اولاد ہونے کی ساری رکاوٹیں اس فقرے میں بڑے بلیغ اور حکیمانہ انداز میں کہہ کر

---

[۱] ارض القرآن ۔ [۲] افادات شیخ الاسلام

یہ اطمینان کر لیا کہ ساری رکاوٹیں دور ہو کر اولاد ہو گی۔ حضرت سارہ نے جو باتیں کہی ہیں۔ وہ اولاد کے بارے میں اللہ سبحانہٗ کے قانونِ عام کی باتیں ہیں۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کی ولادت قانونِ عام کے خلاف قانون خاص کے مطابق ہوئی ہے۔ تخلیق میں اللہ کا قانونِ عام اور عادت جاریہ تو یہی ہے۔ کہ پیداوار ہوتی ہے جب بیج صحیح ہو۔ اور زمین میں قبول کرنے کی صلاحیت ہو۔ یعنی فاعل میں تاثیر ہو اور مفعول میں تاثرو انفعال ہو لیکن قانون خاص یہ ہے کہ نہ زمین ہو اور نہ بیج ہو۔ پھر پیداوار ہو جائے۔ جیسے آدم علیہ السلام کی تخلیق۔ صرف بیج سے بغیر زمین کے تخلیق ہو جائے جیسے حوا کی تخلیق۔ زمین بنجر ہو۔ بیج بیجا ہو پھر تخلیق ہو جائے جیسے عیسیٰ علیہ السلام اور حضرت اسحٰق علیہ السلام کی تخلیق۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اسباب ظاہری کے لحاظ سے تعجب کرنا مسبب الاسباب پر یقین کامل رکھنے کے منافی نہیں ہے۔

(۸۵) حضرت سارہ کو فرشتوں کا جواب

انہوں نے کہا۔ کیا تو تعجب کرتی ہے اللہ سبحانہٗ کے کام پر۔ اے ابراہیم علیہ السلام کے گھرانے والو تم پر اللہ کی رحمت اور برکتوں کا نزول ہو بلا شبہ اللہ ہی کی ذات قابل ستائش اور بڑائیوں والی ہے۔ یعنی جس گھرانے پر اللہ سبحانہٗ کی اس قدر رحمتیں اور برکتیں نازل ہو رہی ہیں۔ اور جنہیں ہمیشہ معجزات و خوارق دیکھنے کا اتفاق ہوتا رہا ہے ان کیلئے یہ کوئی تعجب کا مقام ہے انکا تعجب کرنا خود قابل تعجب ہے انہیں لائق ہے کہ بشارت سنکر تعجب کی جگہ اللہ سبحانہٗ کی تحمید و تمجید کریں۔ کہ سب بڑائیاں اور خوبیاں اسکی ذات میں جمع ہیں۔ بعض محققین نے لکھا ہے کہ نمازوں میں جو درود پڑھتے ہیں۔ اس کے الفاظ میں اس آیت سے اقتباس کیا گیا ہے[1] حافظ ابن کثیرؒ نے اس کی تشریح اس طرح کی ہے۔

> فرشتوں نے کہا کہ اے سارہ اللہ تعالیٰ کے کاموں پر حیران نہ ہو۔ اس کی شان تو یہ ہے کہ جب کسی کام کے کرنے کا ارادہ کرتا ہے۔ کہہ دیتا ہے کہ ہو جا پس وہ ہو جاتا ہے۔ اس پر حیران ہونے کی کوئی بات نہیں تم بوڑھی ہو۔ سن ایاس کو پہنچ گئی ہو اور تمہارے شوہر بالکل بوڑھے ہو چکے ہیں۔ اللہ ہر چیز پر قادر ہے۔ اللہ کے سارے اقوال و افعال قابل ستائش ہیں وہ اپنی ذات و صفات میں بزرگی والا ہے۔

اور قاضی بیضاویؒ لکھتے ہیں۔

> اے نبوت کے گھرانے والو تم بھی انکار کرتے ہو۔ حالانکہ معجزات و خوارق اور کرامات

---

[1] افادات شیخ الاسلام

میں تمہارے لیے یہ انوکھی بات نہیں ہے۔ اس معاملہ میں تو کسی عقل مند کو بھی حیرت نہیں ہو سکتی چہ جائیکہ تم جن کی نشوونما ہی معجزات و خوارق کی آغوش میں ہوئی ہے۔

علامہ آلوسیؒ کہتے ہیں کہ

فرشتوں کو حضرت سارہ کے تعجب پر حیرانی ہوئی کہ مہبط وحی، بیت النبوۃ، کرامات و معجزات کے گھرانے میں سے ہو کر اللہ کے الطاف پر حیران ہونا تمہارے شایان شان نہیں ہے۔ تمہیں تو اللہ کی رحمت اور برکتوں کا نزول سُن کر اس کی تحمید و تمجید کرنی چاہیئے۔

مطلب یہ ہے کہ فرشتوں نے حضرت سارہ کے اظہار تعجب پر بڑے ادب و احترام سے کہا کہ اے اہلبیتِ نبی اللہ سبحانہٗ کے کسی کام اور اس کے ارادے پر تعجب کی کہاں گنجائش ہے پھر آپ پر تو اس کے خاص الطاف اور بے پایاں رحمتیں اور برکتیں ہیں۔ وہ بڑا ہی سزاوار حمد اور بڑا ہی بزرگ و برتر ہے۔ بتانا یہ ہے۔ کہ اگرچہ یہ اللہ کی عادت عام اور سنت جاریہ کے خلاف ہے۔ اس عمر میں بلاشبہ اولاد نہیں ہوتی ہے۔ لیکن قانون عام اللہ کی شان حکیمی ہے۔ اور قانون عام کے خلاف ہو جانا اللہ سبحانہٗ کی شان قدیری ہے۔ اور جب یہ خوشخبری اللہ کی جانب سے دی جا رہی ہے تو تم جیسی کو جس کا تعلق نبوّت کے گھرانے سے ہے اس پر حیران نہ ہونا چاہیئے۔

ایک لطیف نکتہ

اس سے ایک لطیف بات یہ بھی معلوم ہو رہی ہے کہ جن راہوں سے چیزیں پیدا ہو رہی ہیں۔ اگرچہ وہ بھی اللہ سبحانہٗ کی بنائی ہوئی راہیں ہیں۔ اسی لیے قرآن میں ان کا نام سنۃ اللہ یعنی قانون عام ہے اور یہ حق تعالیٰ کی مہربانی ہے کہ قدرت کے باوجود بندوں کی آسانی کے لیے جس چیز کی پیدائش کا جو قانون بنا دیا ہے عموماً اسے بدلا نہیں جاتا ہے۔ اسی عدم تبدیلی پر ہمارے تمام عقلی قوانین کی قانونیت قائم ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ پیدائش کی عام راہوں کے متعلق ہماری جو معلومات ہیں۔ سنۃ اللہ کے تمام گوشوں پر ان کے حاوی ہونے کا دعویٰ نہیں کیا جا سکتا۔ آگ جلاتی ہے بے شک عام آدمیوں کے لیے یہی اللہ کی سنت ہے لیکن کون دعویٰ کر سکتا ہے کہ اپنے رسولوں کے ساتھ یہی خدا کی بھی سنت ہے۔ سنۃ اللہ کی عدم تبدیلی کے معنے یہ نہیں ہیں۔ کہ جو علم سنۃ اللہ کے بارے میں ہمیں حاصل ہوا ہے اس میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔ مگر اسی کے مقابلے میں جو پیدا کر رہا ہے وہ خود بھی غیر متبدل اور اس کے متعلق جو ہمارا علم ہے وہ بھی غیر متبدل

ہے۔ قرآن ان تدبیروں کا بھی احترام کرتا ہے جو تغیر پذیر معلومات پر قائم ہیں۔ جنہیں آپ عقلی تدبیریں کہتے ہیں۔ لیکن تدبیری کا وہ شعبہ جو ناقص معلومات پر نہیں بلکہ علم کے لازوال ٹھوس، غیر متبدل اساس پر قائم ہے۔ جس میں بہتوں سے نہیں بلکہ اس تدبیر میں صرف ایک ہی سے کہتا ہے۔ جو کچھ کہتا ہے ایک ہی سے پاتا ہے جو کچھ پاتا ہے اسی کے ساتھ اگر یہ بھی پیش نظر ہو کہ اس راہ میں جس سے ہمارا تعلق ہے وہ حمید مجید، حی قیوم زندہ و توانا، دانا و بینا ذات ہے صرف یہ ہی نہیں بلکہ رحم و کرم سے معمور ہے۔ اپنے رسول کے ذریعے اس نے خود اپنی اس خصوصیت کا اعلان کیا ہے۔ جو اللہ سے نہیں مانگتا اللہ سبحانہٗ اس پر غصہ فرماتے ہیں۔ جس کا کام ہی دینا ہے اگر اسی کے حکم کے مطابق

رب المشرق والمغرب لا الٰہ الا ھو فاتخذہ وکیلا۔

کی تعمیل کرتے ہوئے براہ راست اس سے مانگیں اور وہ اس کے جواب میں اپنے قانون قدرت کا ہم سے معاملہ کرے، بانجھ عورت کو بچہ دے دے۔ انگلیوں سے پانی کا چشمہ جاری کردے تو اس میں عقلاً، دیناً، ایماناً اور فطرۃً حیرت کی کون سی بات ہے۔ یہی بات فرشتوں نے حضرت سارہ سے نبوت کے گھرانے کا حوالہ دے کر فرمائی ہے۔

فَلَمَّا ذَهَبَ عَنْ اِبْرٰهِيْمَ الرَّوْعُ وَجَآءَتْهُ الْبُشْرٰى يُجَادِلُنَا
فِيْ قَوْمِ لُوْطٍ ۝ اِنَّ اِبْرٰهِيْمَ لَحَلِيْمٌ اَوَّاهٌ مُّنِيْبٌ ۝
يٰٓاِبْرٰهِيْمُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ۚ اِنَّهٗ قَدْ جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ وَ
اِنَّهُمْ اٰتِيْهِمْ عَذَابٌ غَيْرُ مَرْدُوْدٍ ۝

پھر جب حضرت ابراھیم علیہ السلام کی گھبراہٹ ختم ہو گئی اور ان کو خوشخبری مل گئی۔ تو ہم سے قوم لوطؑ کے بارے میں جھگڑنے لگے[۸۶] فی الواقع حضرت ابراھیمؑ علیہ السلام بڑے ہی بردبار بڑے ہی نرم دل اور اللہ کی طرف رجوع کرنیوالے تھے[۸۷] ہمارے فرشتوں نے کہا کہ اے ابراھیم علیہ السلام اس کا خیال چھوڑ دے تیرے رب کا حکم آچکا ہے۔ ان پر عذاب آ کر رہے گا جو کبھی ٹل نہیں سکتا۔[۸۸]

مفردات کے معانی

اوّاہ۔ نرم دل، بہت آہ کرنے والا اوہ سے جس کے معنے آہیں بھرنے کے ہیں۔ مبالغہ کا صیغہ بروزن فعال ہے۔ اوّاہ سے کیا مراد ہے۔ علامہ شوکانی نے فتح القدیر میں ۱۶ معانی لکھے ہیں۔ آخر میں لکھا ہے کہ لغت کے اعتبار سے اوّہ کے یہ معانی زیادہ مناسب معلوم ہوتے ہیں۔ کہ اوّاہ وہ ہے جو اپنے گناہوں پر

بہت زیادہ آہیں بھرے مثلاً یہ کہے کہ آہ میرے گناہ، آہ مجھے اس پر کیا سزا ملے گی۔ فراء کا بھی یہی بیان ہے اور حضرت ابوذر غفاریؓ سے بھی یہی منقول ہے۔ امام ابو جعفر محمد ابن جریر طبریؒ فرماتے ہیں کہ ان سب اقوال میں ادنیٰ اس شخص کا قول ہے جو اس کے معنے بہت زیادہ دعا کرنے والے کے بیان کرتا ہے۔ سیاق قرآنی کے بھی یہی مناسب ہیں۔

حضرت ابراہیمؑ کی سفارش

حسن ادب اور محبت و اعتماد کے ساتھ کسی سے اپنی بات اصرار اور الحاح کے ساتھ منوانے کی کوشش کرنا مجادلہ حسن کہلاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام پر جب تک اصل منصوبہ فرشتوں کے آنے کا واضح نہ ہوا تھا۔ اس وقت تک وہ متردد اور فکرمند رہے لیکن جب ان کو بیٹے کی بشارت مل گئی اور اپنے بارے میں اطمینان ہو گیا۔ تو اب ان کو حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کی فکر دامنگیر ہوئی۔ اور اللہ سبحانہ سے انکی سفارش شروع کر دی۔ اور اپنی بات کی پذیرائی کے لیے وہ سب کچھ کیا جو ایسے مواقع پر کیا جاتا ہے۔ یہاں ہم تورات سے مجادلہ کی تفصیل پیش کرتے ہیں۔ البقاعیؒ نے بھی تفسیر میں تورات سے نقل کیا ہے۔

> تب وہ مرد وہاں سے اٹھے اور انہوں نے سدوم کا رُخ کیا اور ابراہیمؑ ان کو رخصت کرنے کو ان کے ساتھ ہو لیا اور خداوند نے کہا کہ کیا جو کچھ میں کرنے کو ہوں کیا اسے ابراہیمؑ سے پوشیدہ رکھوں۔ ابراہیمؑ سے تو یقیناً ایک بڑی اور زبردست قوم پیدا ہو گی۔ اور زمین کی سب قومیں اس کے وسیلے سے برکت پائیں گی۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ وہ اپنے بیٹے اور گھرانے کو جو اس کے پیچھے رہ جائیں گے۔ وصیت کرے گا کہ وہ خداوند کی راہ پر قائم رہ کر عدل اور انصاف کریں تاکہ جو کچھ خداوند نے ابراہیمؑ کے حق میں فرمایا ہے اس کو پورا کرے۔ پھر خداوند نے فرمایا کہ چونکہ سدوم اور عمورہ کا شور بڑھ گیا ہے اور ان کا جرم نہایت سنگین ہو گیا ہے۔ اس لیے میں جا کر دیکھوں گا کہ کیا انہوں نے سراسر ویسا ہی کیا ہے جیسا شور میرے کان تک پہنچا ہے۔ اور اگر نہیں کیا تو میں معلوم کروں گا۔ سو وہ مرد وہاں سے مڑے اور سدوم کی طرف چلے پھر ابراہیمؑ خداوند کے حضور کھڑا رہا تب ابراہیمؑ نے نزدیک جا کر کہا کیا تو نیک کو بد کے ساتھ ہلاک کر دے گا۔ شاید اس شہر میں پچاس راستباز ہوں کیا تو انہیں ہلاک کر دے گا اور ان پچاس راستبازوں کی خاطر جو اس میں ہوں اس مقام کو نہ چھوڑے گا۔ ایسا کرنا تیرے سے بعید ہے کہ نیک

کو بد کے ساتھ مار ڈالے اور نیک بد کے برابر ہو جائیں۔ یہ تجھ سے بعید ہے۔ کیا تمام دنیا کا انصاف کرنے والا انصاف نہ کرے گا۔ اور خداوند نے فرمایا اگر مجھے سدوم میں شہر کے اندر پچاس راستباز ملیں تو میں ان کی خاطر اس مقام کو چھوڑ دوں گا۔ تب ابراہیمؑ نے جواب دیا اور کہا کہ دیکھئے میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی اگرچہ میں خاک اور راکھ ہوں شاید پچاس راستبازوں میں پانچ کم ہوں۔ کیا ان پانچ کی کمی کے سبب سے تو تمام شہر کو نیست کر دے گا۔ اس نے کہا کہ اگر مجھے وہاں پینتالیس ملیں تو میں اسے نیست نہ کروں گا۔ پھر اس نے اس سے کہا کہ شاید وہاں چالیس ملیں۔ تب اس نے کہا کہ میں ان چالیس کی خاطر بھی یہ نہ کروں گا۔ پھر اس نے کہا کہ خداوند ناراض نہ ہو تو میں کچھ اور عرض کروں شاید وہاں تیس ملیں۔ اس نے کہا اگر مجھے وہاں تیس ملے تو بھی میں ایسا نہ کروں گا۔ پھر اس نے کہا کہ میں نے خداوند سے بات کرنے کی جرأت کی۔ شاید وہاں بیس ملیں اس نے کہا کہ میں بیس کی خاطر بھی اسے نیست نہ کرونگا۔ تب اس نے کہا خداوند ناراض نہ ہو تو ایک بار اور کچھ عرض کروں شاید وہاں دس ملیں۔ اس نے کہا کہ دس کی خاطر بھی اسے میں نیست نہ کروں گا۔ جب خداوند ابراہیمؑ سے بات کر چکا۔ تو چلا گیا اور ابراہیمؑ اپنے مکان کو لوٹا۔ پیدائش۔ باب ۱۸ - ۱۶ تا ۳۳

تورات نے مجادلہ کی یہ تصویر پیش کی ہے۔ قرآن نے اس ساری داستان کو کیسے پیش کیا ہے یہ ہم آگے تشریح میں بتائیں گے۔

(۸۶) پھر جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کی گھبراہٹ ختم ہو گئی اور ان کو خوش خبری مل گئی۔ تو ہم سے قوم لوط کے بارے میں جھگڑنے لگے۔ تورات میں اس مجادلہ کی جو تصویر پیش کی گئی ہے۔ وہ آپ پڑھ چکے ہیں۔ عام شارحین نے مجادلہ کی بھی تشریح الفاظ کے اختلاف سے نقل کی ہے۔ کہیں سعید بن جبیرؓ کے حوالہ سے، کہیں قتادہ کے واسطہ سے لیکن خود قرآن نے اسی مجادلہ کی دوسری جگہ جو تفصیل دی ہے۔ وہ ہی صحیح ہے۔

ولما جاءت رسلنا ابراهيم بالبشرىٰ قالوا انا مهلكوا اهل هذه القرية ان اهلها كانوا ظالمين ۝ قال ان فيها لوطا۔ قالوا نحن اعلم بمن فيها لننجينه واهله الا امراته كانت من الغابرين۔

جب ابراہیمؑ کے پاس ہمارے رسول خوشخبری لے کر آئے تو رسولوں نے بتایا کہ ہم اس بستی کو ہلاک کرنے آئے ہیں کیونکہ اس کے باشندے سب ظلم کار لوگ ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرمایا کہ اس بستی میں حضرت لوط علیہ السلام بھی ہیں۔ فرشتوں نے کہا کہ اس بستی میں جو بھی ہیں۔ ہم ان کو خوب جانتے ہیں۔ ہم لوط علیہ السلام اور ان کے گھرانے کو ضرور بچائیں گے ہاں مگر لوط علیہ السلام کی بیوی کو نہیں بچایا جائے گا۔

تورات کے بیان کردہ اور قرآن کے پیش کردہ مجادلہ کا بغور تقابلی مطالعہ فرمایئے۔ دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ تورات جس بات کی نسبت اللہ سبحانہٗ کی طرف کر رہی ہے قرآن اسی کی نسبت ملائکہ کی طرف کر رہا ہے۔ تورات خود اللہ سبحانہٗ کے بار بار آنے اور سدوم جانے کی تصویر پیش کر رہی ہے۔ تعالیٰ عما یقول الظالمون علوا کبیرا۔ حضرت شیخ الاسلام نے اسی لیے گھبرا کر اپنے فوائد میں لکھا ہے۔ کہ

تفاسیر میں اس بحث کی جو تفاصیل بیان ہوئی ہیں۔ اللہ جانے کہاں تک صحیح ہیں۔

اور علامہ آلوسیؒ نے قرآن کے پیش کردہ مجادلہ کا حوالہ دے کر تورات کی تفصیلات کو ناقابل پذیرائی قرار دیتے ہوئے لکھ دیا ہے۔ وھذا القدر من القول ھو المتیقن۔

(۸۶) حضرت ابراہیمؑ کا مقام

فی الواقع حضرت ابراہیم علیہ السلام بڑے ہی بردبار، بڑے ہی رحمدل اور اللہ کی طرف رجوع کرنے والے تھے۔ بہرحال فرشتوں سے مکالمہ کو مبالغۃً مجادلنا سے تعبیر فرمایا۔ جس سے صاف مترشح ہوتا ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام اپنی فطری شفقت، نرم خوئی اور رحم دلی سے اس قوم پر ترس کھا کر حق تعالیٰ شانہٗ کی جناب میں کچھ سفارش کرنا چاہتے تھے[1]

یہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی کمال انابت کی مثال ہے یعنی حضرت ابراہیم علیہ السلام نہایت دردمند نہایت غمگسار تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا فرشتوں کے ساتھ مجادلہ ان کی صفات کا مظاہرہ تھا۔ اس مجادلہ میں حضرت ابراہیم علیہ السلام قوم لوط ناہنجار قوم کی سفارش اس طرح کرتے ہیں کہ اپنے دل کو نچوڑ کر رکھ دیتے ہیں۔ تو ان کے حلم اور ان کی دردمندی میں کیا شک ہو سکتا ہے۔ اور کمال انابت کی اس سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

سے بہتر اور کیا مثال ہو سکتی ہے۔ معلوم ہے کہ قوم لوط کا پیمانہ لبریز ہے۔ لیکن وہ برابر سرگرم التجا ہیں۔ التجا چونکہ اپنے اندر محبت، اعتماد، ناز اور دردمندی کے پہلو سمیٹے ہوئے ہے۔ اس لیے اسے بطور مبالغہ مجادلہ فرما دیا۔ بظاہر مجادلہ کے لفظ سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ بندے اور اللہ سبحانہٗ کے درمیان دیر تک ردوکد جاری رہی۔ بندہ اصرار کر رہا ہے کہ کسی طرح قوم لوط سے عذاب ہٹ جائے اور اللہ سبحانہٗ فرما رہے ہیں۔ کہ یہ قوم اب خیر سے بالکل خالی ہو چکی ہے۔ تورات میں اس مجادلہ کی جو تصویر پیش کی گئی ہے۔ وہ اللہ اور بندے کے درمیان مادی اور جسمانی تعلق کی تصویر ہے۔ اور قرآن نے اس کی جو تصویر پیش کی وہ اس سے دور ہے۔ اصل یہ ہے کہ انسان دوسرے غیر مادی خیالات کی طرح اللہ سبحانہٗ اور بندے کے باہمی مہر و محبت کے جذبات کو بھی اپنی ہی انسانی بول چال میں ادا کر سکتا ہے۔ محبت اور پیار کے یہ جذبات انسانوں کے اندر باہمی مادی اور جسمانی رشتوں کے ذریعے ہی سے نمایاں ہوتے ہیں۔ اس بنا پر تورات کے مصنفین نے اس طریقہ ادا کو خالق و مخلوق کے ربط و تعلق کے اظہار کے لیے بہترین اسلوب سمجھا چنانچہ تورات نے ابراہیمؑ اور اللہ کے مجادلہ کی ایک جسمانی اور مادی تصویر یہ کہہ کر پیش کی کہ ابراہیم خدا کے حضور کھڑا ہی رہا تب ابراہیم نے نزدیک جا کر کہا۔ واقعہ یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ اور بندے کے تعلق کو جسمانی اور مادی رشتوں کے ذریعے ظاہر کرنے ہی سے انسانی فکر میں بے راہ روی پیدا ہوئی ہے۔ اور لفظ کے ظاہری استعمال نے نہ صرف ان کے عوام بلکہ خواص تک کو گمراہ کر دیا جو لفظ کی اصلی روح چھوڑ کر جسمانیت کے ظاہری مغالطوں میں پڑ گئے۔ عیسائیوں نے واقعی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو اللہ سبحانہٗ کا بیٹا بنا دیا۔ قربان جائیے قرآن کی بلاغت کے حضرت ابراہیمؑ کی محبت کے اللہ سے تعلقات کو صرف اس ایک فقرے میں سمو دیا کہ

ان ابراھیم لحلیم اواہ منیب

اس فقرے کو پڑھیے اور تقابلی مطالعہ کے لیے تورات کے باب ۱۸ پیدائش کی ۸ سے آیت نمبر ۳۳ تک پڑھیے قرآن کے اس اجمال نے تمام معنوی وسعتوں کو اپنے اندر سمیٹ لیا ہے۔ حضرت ابراہیمؑ خطا کاروں سے انتقام میں جلد باز نہ تھے۔ حلم و وقار ان کی طبیعت تھی۔ حضرت ابراہیمؑ لوگوں کی خطاؤں پر بہت زیادہ آہیں بھرنے والے تھے۔ مخلوق کے لیے دردمندی اور دل سوزی ان کی عادت تھی۔ وہ اس کے ساتھ منیب تھے۔ یعنی اللہ سبحانہٗ کی جناب میں التجائیں کرنے والے دعائیں مانگنے والے تھے۔

(۸۸) قوم لوط پر عذاب آکر رہے گا

ہمارے فرشتوں نے کہا کہ اے ابراہیمؑ اس کا خیال چھوڑ دے تیرے رب کا حکم آچکا ہے۔ ان پر

عذاب آکر رہے گا جو کبھی ٹل نہیں سکتا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی بات کا یہ جواب ہے کہ اس خیال کو چھوڑ دیجئے ان ظالموں کا پیمانہ لبریز ہو چکا ہے۔ اب اللہ سبحانہٗ کا حکم واپس نہیں ہو سکتا عذاب آکر رہے گا۔ جو کسی سفارش وغیرہ سے ٹل نہیں سکتا[1] پہلا دارالجزا یہی دنیا ہے۔ اگرچہ ہر نیک و بد کو پوری جزا آخرت میں ملے گی۔ لیکن اس نیک و بد کے مماثل اس موجودہ زندگی میں مل جاتی ہے۔ انسان کی عزت، شہرت، ناموری، ہر دلعزیزی، محبوبیت، تسکین و اطمینان، سرور، فارغ البالی، حکومت یہ سب اس زندگی کے اعمال خیر کے نتائج ہیں۔ ان کے برخلاف ذلت و رسوائی، بے عزتی، کسمپرسی، پریشان حالی، بے اطمینانی، غم و خوف، محکومیت، آفات و زلازل اس کے اعمال بد کے اثرات ہیں۔ قوم لوط اپنے بھیانک کردار کی وجہ سے ایسے مقام پر پہنچ گئی تھی اور بدکاریوں میں مست ہو رہی تھی۔ اور نبوت کی نصیحتوں پر کان نہ دھرتی تھی۔ اللہ سبحانہٗ کا فیصلہ ہوا۔ کہ اس بدکار قوم کے وجود کی نجاست سے زمین کو پاک کر دیا جائے۔ اس واقعہ کو پیش کر کے قرآن اپنے مخاطبوں کے جملہ دماغ میں یہ بات اتارنا چاہتا ہے۔ کہ اللہ کا قانون جزا سب کے لیے یکساں اور برابر ہے اور اس میں کسی کی رعایت نہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جیسے پیغمبر کی سفارش التجا اور دعا بھی اسے روک نہیں سکتی۔ اس سے معلوم ہوا کہ اللہ سبحانہٗ کے قانون مکافات میں رنگ، نسل، وطن اور زبان بے معنے چیزیں ہیں۔ اصلی قیمت ایمان و عمل کی ہے۔ نہ نبی کی صاحبزادگی عذاب سے بچاتی ہے۔ اور نہ نبی کی شفاعت اور التجا۔ یہ قانون مکافات کا مظاہرہ ہے۔ کہ ایک طرف ابراہیم علیہ السلام ہیں۔ جو حق و صداقت کی خاطر گھر سے بے گھر ہوئے۔ ایک اجنبی ملک میں مقیم ہیں۔ اور بظاہر کوئی طاقت ان کے پاس نہیں ہے۔ مگر اللہ سبحانہٗ ان کے حسن عمل کی یہ جزا ان کو دیتا ہے۔ کہ بانجھ بیوی کے پیٹ سے بڑھاپے میں اسحاق علیہ السلام پیدا ہوئے ہیں۔ پھر ان کے ہاں یعقوب علیہ السلام اور ان سے بنی اسرائیل کی وہ عظیم الشان نسل چلتی ہے۔ جس کی عظمت کے ڈنکے صدیوں تک بجتے رہے۔ دوسری طرف قوم لوط ہے جو اسی سرزمین کے ایک حصہ میں اپنی خوشحالی پر مگن اور اپنی بدکاری میں مست ہے۔ دور دور تک کہیں اس کو اپنی شامت اعمال کے آثار نظر نہیں آتے مگر جس تاریخ کو ابراہیم علیہ السلام کی نسل سے ایک بڑی اقبال قوم اٹھانے کا فیصلہ ہوتا ہے۔ ٹھیک اسی تاریخ میں اس بدکار قوم کو دنیا سے نیست و نابود کیا جاتا ہے۔ اور وہ ایسے عبرتناک طریقے سے فنا کی جاتی ہے۔ کہ آج اس کی بستیوں کا نشان تک نہیں ملتا۔

اسی آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے۔ کہ مقبول سے مقبول بندے کی بھی دعا یا سفارش کا قبول ہو جانا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

لازمی نہیں ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت نوح علیہ السلام معمولی ہستیاں نہیں۔ حضرت نوح علیہ السلام کی دعا بیٹے کے بارے میں اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دعا قوم لوط کے بارے میں قبول نہیں ہوئی۔ خود سید الانبیاء والمرسلین کو خطاب کر کے قرآن ہی میں بتایا گیا ہے۔ کہ منافقین کی مغفرت کی درخواست اگر ستر بار بھی پیش کرو گے۔ تو اسے منظور نہیں کیا جائے گا۔ لیکن اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ حصول مقاصد کی دعائی تدبیر سے کسی درجہ میں غفلت کر لی جائے قبول کرنا نہ کرنا اللہ کا کام ہے۔ مانگنا بندے کا کام ہے۔ سب جانتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بدر میں نصرت کا وعدہ کر لیا گیا تھا۔ مگر باوجود وعدے کے صرف اس لیے کہ خدا خدا ہے بندہ نہیں ہے۔ سب اس کے محتاج ہیں وہ سب سے غنی ہے۔ کیا معلوم ایفائے عہد کب کیا جائے گا۔ کس حال میں کیا جائے گا۔ اللہ کے وعدوں پر سب سے زیادہ بھروسہ کرنے والی ہستی کو میدان بدر میں دیکھا گیا تھا۔ کہ سر مبارک خاک پر پڑا ہے۔ حضرت علیؓ فرماتے ہیں۔

میں نے بدر کے دن لڑائی میں حصہ لیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آیا تو کیا دیکھتا ہوں کہ رسول اللہ سجدے میں پڑے ہوئے کہہ رہے ہیں۔ یا حی یا قیوم میں پلٹ آیا اور لڑائی میں شریک ہو گیا۔ پھر آیا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی حالت میں پایا۔

سجدے سے سر اٹھایا جاتا ہے۔ ہاتھ آسمان کی طرف اٹھے ہوئے ہیں۔ تن بدن کا ہوش نہیں ہے۔ مونڈھے مبارک سے چادر ڈھلک کر گر گئی ہے۔ لیکن پورے انہماک کے ساتھ دل کی ساری قوت و توجہ الحاح و اصرار کے ساتھ زبان مبارک پر یہ الفاظ جاری ہیں۔

یا اللہ آپ کو آپ کا عہد آپ کا وعدہ یاد دلاتا ہوں اے اللہ اگر آپ چاہیں تو آپ کی عبادت نہ ہو اے اللہ اگر اہل ایمان کی یہ جماعت تباہ ہو گئی تو آپ کی زمین میں پوجا نہ ہو گی۔

وعدہ کے باوجود رب اور رب کی نصرت کو جس بے کلی اور اضطراب کے ساتھ آج مانگا جا رہا ہے۔ کہ بقول حضرت عبداللہ بن مسعودؓ

ہم نے نہیں سنا کہ اپنی گم گشتہ چیز کوئی تلاش کر رہا ہو اس طرح جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے رب کو تلاش کر رہے تھے۔ یعنی اس کی نصرت کو تلاش کر رہے تھے۔

اللہ سبحانہ کی بارگاہ میں آپ کی بے قراری دیکھ کر دیکھنے والوں سے رہا نہیں جاتا تھا۔ اور جیسا کہ صحیح بخاری میں ہے کہ

حضرت ابو بکرؓ نے آپ کے دست مبارک کو پکڑ لیا اور کہا کہ بس کیجئے۔

اسی کی تفصیل صحیح مسلم میں ہے ۔

حضرت ابو بکرؓ تشریف لائے اور آپ کی چادر پکڑلی ۔اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مونڈھے پر ڈال دی ۔اور پھر ابو بکرؓ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لپٹ گئے ۔آپ کے پیچھے سے اور یوں کہہ رہے تھے کہ اللہ کے رسول آپ سے کیا ہوا وعدہ ضرور پورا کیا جائے گا ۔

وعدہ تو جو کیا گیا تھا ۔بہرحال پورا ہونا تھا پورا ہو کر رہا ۔بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حصول مقاصد کی دعائی تدبیر کی جو تعلیم نبوت کی راہ سے ملی ہے اس کا مطلب یہی ہے کہ ہمیں اپنی معاشی ضرورتوں میں بھی دعائی طریقہ عمل کو پوری قوت کیساتھ استعمال کرنا چاہیئے ۔اسکا مطلب یہ نہیں کہ دعائی تدبیر میں لگ کر عقلی تدبیر سے تعلق ہو جائے ۔بدر کی جنگ میں دعائی تدبیر کیساتھ اتنا انہماک تھا مگر اسکے ساتھ دوسری طرف جن راہوں سے حق سبحانہٗ جنگ میں کامیاب ہونے والوں کو کامیابی عطا فرماتے ہیں ۔ان ضوابط و قوانین کے اختیار کرنے میں بھی آپ نے کوئی دقیقہ نہیں چھوڑا ۔میدان جنگ میں بہترین جگہ کا انتخاب، فوج کی صف بندی، صفوں میں ترتیب، اسلحہ کے استعمال کی ترکیب، تیر کب چلائے جائیں، تلوار کب نکالی جائے، پتھروں اور ٹیلوں کا استعمال کب کیا جائے ۔غنیم پر کس وقت حملہ کیا جائے ۔مادی ذرائع سے ممکنہ حد تک دشمن کی ہر حرکت کو منقطع کرنے کی تدبیر کی گئی ۔اس سارے کام کی نگرانی خود فرما رہے تھے ۔یہاں تک کہ دست مبارک میں تیر لے کر صفوں کی ترتیب درست فرما رہے تھے ۔

راہ حق اور راہ اعتدال یہی ہے کہ جو پیدا کر رہا ہے ۔اس سے بھی مانگا جائے اور جن راہوں سے چیزیں آرہی ہیں ۔ان میں بھی تلاش کیا جائے ۔تعلیم کی یہی جامعیت قرآن کی خصوصیت ہے ۔ہم اس پر تفصیلی بحث انشاء اللہ معالم القرآن کی تیرھویں جلد میں کریں گے ۔

وَلَمَّا جَاءَتْ رُسُلُنَا لُوطًا سِيءَ بِهِمْ وَضَاقَ بِهِمْ ذَرْعًا وَقَالَ هَٰذَا يَوْمٌ عَصِيبٌ ﴿٧٧﴾ وَجَاءَهُ قَوْمُهُ يُهْرَعُونَ إِلَيْهِ وَمِن قَبْلُ كَانُوا يَعْمَلُونَ السَّيِّئَاتِ ۚ قَالَ يَا قَوْمِ هَٰؤُلَاءِ بَنَاتِي هُنَّ أَطْهَرُ لَكُمْ ۖ فَاتَّقُوا اللَّهَ وَلَا تُخْزُونِ فِي ضَيْفِي ۖ أَلَيْسَ مِنكُمْ رَجُلٌ رَّشِيدٌ ﴿٧٨﴾ قَالُوا لَقَدْ عَلِمْتَ مَا لَنَا فِي بَنَاتِكَ مِنْ حَقٍّ وَإِنَّكَ لَتَعْلَمُ مَا نُرِيدُ ﴿٧٩﴾

اور جب ہمارے فرشتے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے سے غمزدہ ہوئے اور دل تنگ ہو گئے اور بولے کہ آج کا دن بڑا ہی سخت ہے [۸۹] اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے لوگ بے اختیار دوڑتے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے اور وہ پہلے ہی سے بدکاریوں کے متوالے تھے [۹۰] حضرت لوط علیہ السلام ان کی آمد کا مقصد بھانپ کر بولے لوگو! یہ میری بیٹیاں ہیں۔ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں اللہ کی نافرمانی سے بچو اور مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو کیا تم

میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں ہے[۹۱] وہ بولے تمہیں تو پتہ ہی ہے۔
کہ تمہاری بیٹیوں سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہے۔ اور تمہیں یہ بھی
علم ہے کہ ہم کیا چاہتے ہیں ہے[۹۲]

مفردات کے معانی

سیئ سار یسور سے قبل کے وزن پر ماضی مجہول کا واحد مذکر غائب ہے۔ اسی سے سوء اسم ہے۔ برائی، آفت، گناہ، برا کام، عیب علامہ سید مرتضیٰ زبیدی نے لکھا ہے۔ کہ آفات و امراض کا ایک جامع نام ہے امام راغب فرماتے ہیں۔ سوء ہر وہ چیز ہے جو آدمی کو غم میں ڈال دے خواہ دنیا کے کاموں میں سے ہو یا آخرت کے، احوال نفسیہ میں سے ہو یا احوال بدنیہ سے، یا ان حالات میں سے ہو جو جاہ و مال کے چھوٹ جانے اور دوست کے بچھڑ جانے سے پیدا ہوتے ہیں۔ سیئ کے معنے ہیں۔ وہ غمگین ہوا، اسے برا معلوم ہوا ہے۔

ضاق بھم ذرعًا۔ یعنی ان سے عاجز ہوگیا۔ عربی محاورہ ہے۔ علامہ جوہری فرماتے ہیں جب آدمی میں کام کرنے کی طاقت نہ رہے۔ تو بیچارگی کے اظہار کے لیے بولتے ہیں۔ ضقت بالامر ذرعًا۔ کام کرنے کی طاقت ہو تو محاورہ میں رحب الذراع۔ کہتے ہیں اور طاقت نہ ہو تو ضیق الذراع کہتے ہیں۔

یوم عصیب۔ سخت دن عصب سے ہے۔ جس کے معنے خوب کس کر باندھنے کے ہیں۔ عصیب فعیل کے وزن پر صفت مشبہ ہے۔ علامہ سید مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں لکھتے ہیں۔ فراء کہتے ہیں۔ کہ یوم عصیب کے معنے سخت گرم دن کے یا سخت دن کے ہیں۔ ازہری کہتے ہیں۔ کہ یہ عصب القوم امر یعصبھم عصبا سے بنا ہے۔ جس کے معنی ہیں۔ کسی سخت بات کا پیش آکر لوگوں کو اکٹھا کردینا اسی سے عصابۃ جماعت کو کہتے ہیں۔

یھرعون، جمع مذکر غائب مضارع مجہول اہراع باب افعال سے تیز دوڑتے ہوئے۔ اس کا مجرد ہرع ہے۔ اگر باب فتح سے ہو تو تیز چلانا اور اگر باب سمع سے ہو تو تیز چلنا اور خون بہنا۔

قوم لوطؑ اور اس کی بدکاری

یہ بات پہلے سُن چکے ہو کہ حضرت لوط علیہ السلام حضرت ابراہیم علیہ السلام کے برادر زادے ہیں۔ ان کے والد کا نام ہاران تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام کا بچپن حضرت ابراہیم علیہ السلام کے زیر سایہ گزرا ہے۔ اسی لیے وہ اور حضرت سارہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی امت میں پہلے مسلم ہیں۔ حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی اہلیہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ہجرتوں میں ہمیشہ ساتھ رہے ہیں۔ مصر میں بھی حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تھے۔

تورات میں ہے۔ کہ مصر کے قیام میں چونکہ دونوں کے پاس کافی سازوسامان اور مویشیوں کے بڑے ریوڑ تھے۔ اس لیے ان کے چرواہوں میں باہم کشمکش رہتی تھی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اس صورت حال کا اندازہ کرکے حضرت لوط علیہ السلام سے مشورہ کیا۔ اور طے یہ پایا کہ حضرت لوط علیہ السلام مصر سے ہجرت کرکے شرق اردن کے علاقے سدوم اور عامورہ میں چلے جائیں۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام واپس فلسطین چلے جائیں۔

حضرت لوط علیہ السلام نے جب سدوم آکر قیام کیا دیکھا کہ یہاں کے شہری بدکاریوں اور گناہوں کے اس قدر شکار ہیں۔ کہ دنیا کی کوئی برائی ایسی نہیں۔ جس کے وہ دلدادے نہ ہوں۔ دنیا کی سرکش ستمگر اور بداخلاق اور بد اطوار کے سارے عیوب کے علاوہ ان میں ایک خبیث عمل بطور فیشن اور تہذیب کے موجود ہے۔ اور اس کی ایجاد کا سہرا بھی ان کے سر ہے۔ یعنی وہ اپنی نفسانی خواہشات کو پورا کرنے کے لیے عورتوں کی جگہ مردوں اور لڑکوں کو استعمال کرتے ہیں۔ اور اس میں زیادہ شرارت اور خباثت یہ تھی کہ یہ بدکرداری اور خباثت ان میں ایک فیشن تھا وہ کرتے تھے اور علی الاعلان کرتے تھے۔ اور اس پر فخر کرتے تھے۔ یہ تو ان کی اخلاقی حالت تھی اور معاملات میں ان کا حال کیا تھا۔ عبدالوہاب نجار کی زبانی سنیئے وہ کہتے ہیں کہ میں نے عبرانی ادب کی ایک کتاب میں پڑھا ہے۔ کہ

> اہل سدوم کی یہ بھی عادت تھی۔ کہ وہ باہر سے آنے والے تاجروں اور سوداگروں کے مال ایک نئے اور اچھوتے انداز سے لوٹ لیا کرتے تھے۔ ان کا طریقہ یہ تھا۔ کہ جب کوئی سوداگر باہر سے سدوم آتا تو اس کے مال کو دیکھنے کے بہانے ہر شخص تھوڑی تھوڑی چیز اٹھاتا اور لے کر چل دیتا۔ بیچارہ تاجر حیران و پریشان ہو کر رہ جاتا۔ اب اگر وہ مال کے ضائع ہونے پر زبان سے شکوہ کرتا۔ روتا شور مچاتا تو یہ لٹیرے دوسری عیاری کرتے

ان میں سے ایک آتا اور لوٹی ہوئی ایک چیز دکھا کر کہتا کہ میں تو یہ لے گیا تھا ۔ تو یہ تمہاری چیز موجود ہے ۔ تاجر رنجیدہ آواز میں کہتا ۔ میں اسے لے کر کیا کروں گا ۔ جہاں میرا سارا مال لٹ گیا ہے وہاں یہ بھی سہی جا تو بھی اپنے پاس رکھ لے بعد دیگرے سب لٹیرے یہی پارٹ ادا کرتے بالآخر اس طرح سوداگر کا سارا مال ہڑپ کر جاتے ۔

یہ واقعہ تاریخی اور روایتی اعتبار سے کیا ہے یہ تو اللہ ہی جانتا ہے ۔لیکن اس سے یہ ضرور معلوم ہوتا ہے ۔ کہ سدوم کے شہری اس قدر ظلم ،فحش ،بے حیائی ، بداخلاقی اور فسق وفجور میں مبتلا تھے ۔کہ اس دور میں ان کے بارے میں لوگوں کے خیالات یہ ہیں ۔

اس شہر میں حضرت لوط علیہ السلام تبلیغ ودعوت کا کام کر رہے تھے ۔حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو ان کی بے حیائیوں اور بدکرداریوں پر ملامت کی اور شرافت وطہارت کی زندگی کی رغبت دلائی ۔

(۸۹) اور جب ہمارے فرستادے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے تو وہ ان کے آنے سے غمزدہ ہوگئے اور دل تنگ ہوگئے اور بولے کہ آج کا دن بڑا ہی سخت ہے ۔فرشتے نہایت حسین وجمیل بے ریش وبروت نوجوانوں کی شکل میں تھے ۔ ابتداءً حضرت لوط علیہ السلام نے نہ پہچانا کہ فرشتے ہیں ۔معمولی مہمان سمجھے ادھر اس قوم کی بے حیائی اور خوئے بد معلوم تھی ۔سخت فکرمند اور تنگ دل ہوئے کہ یہ بدمعاش ان مہمانوں کا پیچھا کریں گے ۔مہمانوں کو چھوڑنا بھی مشکل اور ان خبیثوں کے ہاتھ سے چھڑانا بھی مشکل ۔ گویا ساری قوم سے لڑائی مول لینا ہے[۱]

فرشتے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو بشارت پہنچانے اور قوم لوط کے انجام بد سے باخبر کرنے کے بعد حضرت لوط علیہ السلام کی خدمت میں آئے حضرت لوط علیہ السلام نے جب دیکھا کہ چند خوبرو چہرے دروازے پر ہیں ۔قرآن کے انداز بیان سے یہ بات معلوم ہو رہی ہے ۔کہ یہ فرشتے خوبصورت لڑکوں کی شکل میں حضرت لوط علیہ السلام کے پاس پہنچے تھے ۔ اور حضرت لوط علیہ السلام اس بات سے بے خبر تھے ۔ کہ یہ فرشتے ہیں ۔ انکم قوم منکرون ۔آپ لوگ اجنبی معلوم ہوتے ہیں ۔ان انجانے مہمانوں کی آمد سے آپ کو بہت پریشانی ہوئی ۔ پریشانی کی وجہ ظاہر ہے ۔کہ جب پوری قوم فسادِ اخلاق میں مبتلا ہے تو ایسے خوش شکل نوواردوں کا دروازے پر آنا گویا شہر کے سارے اوباشوں کو دعوت مبارزت دینے کے

[۱] افادات شیخ الاسلام

مترادف ہے۔ یعنی حالات کا مقابلہ کرنے میں حضرت لوط علیہ السلام کی بیچارگی اور اس بیچارگی میں دل کی پریشانی کی بھرپور نمائش ہو رہی تھی۔ پریشان تھے۔ کہ حالات کا مقابلہ کیسے کیا جائے اور کس تدبیر سے مہمانوں کو غنڈوں کی دستبرد سے بچایا جائے اسی بیچارگی اور دل کی پریشانی کا اظہار ان الفاظ میں فرمایا کہ ھذا یوم عصیب۔ یہ بات حضرت لوط علیہ السلام نے اپنے جی میں کہی۔ آیت میں حالات کی کیسی بلیغ انداز میں عکاسی کی گئی ہے۔ کسی بھی ناخوشگوار معاملے میں سب سے پہلی چیز اندر کی کڑھن اور گھٹن ہوتی ہے۔ سیئ بھم اسی کی تعبیر ہے۔ گھٹن ہوتی ہے تو آدمی بچنے اور چھٹکارے کیلئے پریشان ہوتا ہے پریشانی میں جب بیچارگی کا شدید دباؤ ہوتا ہے۔ تو بیچارگی اور پریشانی کو بہت زیادہ محسوس کرکے جی ہی میں کہتا ہے کہ دن بڑا کٹھن ہے۔ کیا کیا جائے

(۹۰) قوم لوط کی آوارگی

اور حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے لوگ بے اختیار دوڑتے ہوئے حضرت لوط علیہ السلام کے پاس آئے۔ اور وہ پہلے ہی سے بدکاریوں کے متوالے تھے یعنی اس قوم کو نامعقول حرکتوں اور خلاف فطرت فواحش کی جو عادت پڑی ہوئی تھی۔ کہاں چین سے بیٹھنے دیتی۔ وہ ایسے خوبصورت لڑکوں کی خبر پاتے ہی نہایت بے حیائی کے ساتھ لوط علیہ السلام کے مکان پر اندھا دھند چڑھ دوڑے اور قوت اور شدت سے مطالبہ کیا کہ مہمان ان کے حوالے کر دیئے جائیں کیونکہ ہم پہلے ہی منع کر چکے ہیں کہ تم کسی مرد کو اپنا مہمان نہ بنایا کرو۔ یہاں آنے والے مہمانوں کو ہم پر چھوڑ دو ہم جو چاہیں کریں[۱]۔ یہ دو فقرے یھرعون الیہ اور ومن قبل کانوا یعملون السیئات۔ قوم لوط کی بداخلاقی کی پوری تصویر پیش کر رہے ہیں۔ جو بات ان دو فقروں میں کہہ دی گئی ہے۔ وہ پوری ان کی زندگی کی تاریخ ہے۔ غور فرمایئے۔ کہ بستی میں ایک شخص کے گھر چند مہمان آئے ہیں خبر سنتے ہی میزبان کے گھر پر ہلّہ بول دینا، اوباشوں کے ایک گروہ کا آجانا اور بڑی ڈھٹائی اور بے حیائی کے ساتھ میزبان سے مطالبہ کرنا کہ اپنے مہمانوں کو بدفعلی کے لیے ہمیں دے دو۔ اور ان غنڈوں کی پوری شہری زندگی میں اتنی طاقت تھی کہ پوری آبادی میں کوئی ان کے خلاف کچھ نہیں کہہ سکتا تھا۔ جس کی وجہ سے ان لوگوں کو کھلم کھلا زیادتیاں کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہ ہوتی تھی۔ سوچیئے کہ جب حضرت لوط علیہ السلام جیسے معلم اخلاق اور پاکیزہ انسان کے گھر پر بدمعاشوں کا حملہ اس بے باکی کے ساتھ ہو رہا ہے تو عام شہریوں کے ساتھ ان کا طرز عمل کیا ہوگا۔ اس سے معلوم ہوتا ہے

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کہ سب ایک ہی حمام میں ننگے تھے۔ اور برائی کو برائی نہیں بلکہ اچھائی سمجھ رہے تھے۔ قرآن ومن قبل کانوا یعملون السیات کے ذریعے یہ انکشاف بھی کر رہا ہے۔ کہ ان میں صرف یہ ایک ہی برائی نہ تھی بلکہ اور بھی بہت زیادہ برائیوں کا گہوارہ بنے ہوئے تھے۔ ان برائیوں کا جو نقشہ تلمود میں پیش کیا گیا ہے۔ ہم ان کا خلاصہ پیش کرتے ہیں۔

ایک مرتبہ ایک عیلامی مسافر اُن کے علاقے سے گزر رہا تھا۔ راستہ میں شام ہو گئی اور اسے مجبوراً ان کے شہر سدوم میں ٹھہرنا پڑا اس کے پاس اپنا زاد راہ تھا۔ اس نے کسی سے میزبانی کی درخواست نہ کی ایک درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ ایک سدومی اصرار کے ساتھ اسے اپنے گھر لے گیا۔ رات اسے اپنے گھر رکھا اور صبح ہونے سے پہلے اس کا گدھا، اس کی زین اور مال تجارت چھین لیا۔ اس نے شور مچایا مگر کسی نے اس کی فریاد نہ سُنی۔

ایک مرتبہ حضرت سارہ نے حضرت لوط علیہ السلام کے گھر والوں کی خیریت معلوم کرنے کے لیے الیعزر نامی غلام کو سدوم روانہ کیا۔ الیعزر جب شہر میں داخل ہوا تو اس نے دیکھا کہ ایک سدومی ایک اجنبی کو مار رہا ہے۔ الیعزر نے اس کو شرم دلائی کہ بیکس مسافروں سے یہ سلوک کرتے ہو۔ جواب میں سر بازار الیعزر کا سر پھاڑ دیا۔

ایک بار ایک غریب آدمی کہیں سے ان کے شہر میں آیا۔ کسی نے اسے کھانے کو کچھ نہ دیا۔ فاقہ سے بدحال ہو کر ایک جگہ گر پڑا تھا۔ حضرت لوط علیہ السلام کی بیٹی نے اسے دیکھ لیا اور اسے کھانا پہنچایا۔ اس پر حضرت لوط علیہ السلام اور ان کی بیٹی کو سخت ملامت کی گئی۔ اور دھمکی دی گئی کہ اس طرح کہ ہمارے شہر میں نہیں رہ سکتے ہو۔

اسی طرح کے متعدد واقعات لکھنے کے بعد تلمود کا مصنف لکھتا ہے۔ کہ یہ لوگ اپنی روزمرہ کی زندگی میں سخت ظالم، دھوکہ باز، اور بدمعاملہ تھے۔ کوئی مسافر ان کے علاقے سے بخیریت نہ گزر سکتا تھا۔ کوئی فقیر ان کی آبادی سے روٹی کا ٹکڑا نہ پا سکتا تھا۔ بارہا ایسا ہوتا کہ باہر کا آدمی ان کے علاقے میں پہنچ کر فاقوں سے مر جاتا اور یہ اس کے کپڑے اتار کر اسے برہنہ دفن کر دیتے۔ بیرونی تاجر اگر شامت کے مارے وہاں چلے جاتے تو سرعام لُوٹ لیے جاتے۔ اپنی وادی کو انہوں نے ایک باغ بنا رکھا تھا جو میلوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس میں وہ انتہائی بے حیائی کے ساتھ علانیہ بدکاری کرتے تھے۔ اور حضرت لوط علیہ السلام کے سوا انکو کوئی ٹوکنے والا نہ تھا۔ اللہ سبحانہٗ نے اس تاریخ کی پوری داستان کو صرف ایک فقرے میں بیان کر دیا ہے۔ ومن قبل کانوا یعملون السیّات۔ وہ پہلے ہی سے بہت بُرے بُرے کام کرتے تھے۔

(۹۱) پوری قوم گندگی کا سنڈاس

حضرت لوط علیہ السلام نے ان کی آمد کا مقصد بھانپ کر فرمایا لوگو، یہ میری بیٹیاں ہیں۔ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں۔ اللہ کی نافرمانی سے بچو اور مجھے میرے مہمانوں میں رسوا نہ کرو۔ کیا تم میں کوئی بھی بھلا آدمی نہیں ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام نے مہمانوں کی آبرو بچانے کے لیے ہر قسم کی کوشش کی۔ آخری بات اس شہوت پرست قوم سے حضرت لوط علیہ السلام نے یہ کہی کہ ظالمو! یہ میری بیٹیاں تمہارے لیے حاضر ہیں نکاح ہونے پر بطریق حلال ان سے تمتع کر سکتے ہو۔ جو نہایت پاکیزہ اور شائستہ طریقہ ہے۔ اللہ سبحانہ سے ڈرنا چاہیئے۔ کہ پاک اور مشروع طریقے کو چھوڑ کر ایسے خلاف فطرت گندے کام میں مبتلا ہوتے ہو۔ کم از کم میری ہی رعایت کرو۔ کہ میں ان مقدس مہمانوں کے سامنے شرمندہ نہ ہوں۔ مہمان کی بے عزتی میزبان کی بے عزتی ہے۔ کیا تم میں ایک شخص بھی نہیں جو سیدھی سیدھی باتوں کو سمجھ کر نیکی اور تقویٰ کی راہ اختیار کرے۔[۱]

ھٰؤلاء بناتی ھن اطھر لکم ۔ حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا ۔ کہ یہ میری بیٹیاں ہیں۔ یہ تمہارے لیے زیادہ پاکیزہ ہیں ۔ اس کے مطالب میں شارحین قرآن نے ایک سے زیادہ باتیں کہی ہیں۔ لیجئے اس دسترخوان نعمت سے آپ بھی استفادہ کر لیجئے۔ آخر اس پیشکش کا مطلب کیا ہے۔ ایک باعصمت اور باعزت آدمی اور وہ بھی گناہوں سے پاک پیغمبر کس طرح گوارا کر سکتا ہے۔ کہ اپنی معصوم لڑکیوں کو غنڈوں کی ہوس رانی کے لیے پیش کرے؟

۱ ۔ یہ پیشکش نہیں بلکہ اپنی قوم کے ضمیر کو جگانے اور جھنجھوڑنے کے لیے گویا حضرت لوط علیہ السلام کی آخری بیتابانہ فریاد تھی۔ کہ وہ سوچیں کہ اللہ کا بندہ یہ ہے جو اپنے مہمانوں کی عزت کے معاملے میں اتنا حساس ہے۔ کہ اس کے لیے اپنی عزیز سے عزیز شئے کو بھی قربان کرنے کو تیار ہے۔ اور ایک ہم ہیں کہ اندھے ہو کر اس کے مہمانوں پر ٹوٹ پڑے ہیں۔ اسی طرح انہوں نے اللہ کا خوف بھی یاد دلایا اور آخر میں الیس منکم رجل رشید کہہ کر گویا پوری طرح ان پر حجت تمام کر دی۔ اس لیے کہ کسی کے اندر رائی برابر بھی حق کی حمیت و حمایت کا احساس ہوتا تو اس فقرے کے بعد تو اس کو ضرور حرکت میں آجانا تھا لیکن جب اس اس کے بعد بھی کوئی ضمیر بیدار نہ ہوا تو اس کے صاف معنے یہ ہیں کہ کسی کے اندر حس انسانیت و شرافت سرے سے باقی ہی نہ رہی تھی۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

۲۔ حضرت لوط علیہ السلام نبی ہیں اور ہر نبی اپنی قوم کا روحانی باپ ہوتا ہے۔ قوم مسلمان ہو کر اس کی اطاعت کار ثابت ہو یا انکار کر کے متمرد و منحرف دونوں صورتوں میں وہ نبی کی امت ہے۔ جو مان لیتی ہے وہ امت اجابت ہے اور جس نے نہیں مانا وہ امت دعوت ہے۔ اور اس لیے پوری امت بنی کی اولاد ہوتی ہے۔ اس لیے حضرت لوط علیہ السلام یہ کہنا چاہتے ہیں۔ کہ بدبختو تمہارے گھروں میں یہ سب میری بیٹیاں تمہاری رفیقۂ حیات ہیں۔ تمہارے لیے حلال ہیں۔ پھر تم ان کو چھوڑ کر اس ملعون اور خبیث کام پر اصرار کرتے ہو ایسا نہ کرو۔ اس بات میں اور زیادہ وزن ہو جاتا ہے۔ جب یہ بھی پیش نظر ہو۔ کہ اس بدکاری میں پڑ کر شہری آبادی نے عورتوں کو چھوڑ رکھا تھا۔

۳۔ تورات اور دیگر روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ فرشتے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کو اسحٰق علیہ السلام کی بشارت دے کر قوم لوط کو تباہ کرنے آئے تھے۔ تین تھے۔ یہ تو بالکل خلاف عقل ہے۔ کہ تین لڑکوں کے لیے پوری شہری زندگی طالب ہو بلکہ اصل یہ ہے۔ کہ قوم کے دو سردار تھے اور ان دونوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے مہمانوں کا مطالبہ کیا تھا۔ باقی قوم اپنی اس عام بدکاری کی وجہ سے ان کی حمایت میں آئی تھی۔ اور چونکہ حضرت لوط علیہ السلام کی دو بیٹیاں تھیں۔ اور دونوں غیر شادی شدہ تھیں حضرت لوط علیہ السلام نے ان دونوں سرداروں کو سمجھایا ہے کہ تم اپنے اس خبیث و شنیع مطالبہ سے باز آجاؤ۔ اور [illegible] کے لیے تیار ہوں۔ کہ اپنی دو لڑکیوں کا نکاح تم سے کر دوں۔ لفظ اطہر کا استعمال قرینہ ہے کہ آپ نے نکاح کی پیش کش کی مگر انہوں نے صاف انکار کر دیا۔

۴۔ حضرت لوط علیہ السلام نے یہ جملہ اپنی بیٹیوں ہی کے متعلق فرمایا تھا۔ مگر اس کی حیثیت اس بزرگ کے مقولے کی طرح ہے جو کسی کو ناحق پٹتا دیکھے اور کہے کہ اسے نہ مارو مجھے مار لو۔ اس کا مقصد مارنے والے کو عار اور شرم دلانا ہوتا ہے۔ اسی طرح حضرت لوط علیہ السلام نے ان کو عار اور شرم کرنے کے لیے یہ فقرہ فرمایا۔

افادات میں شیخ الاسلام مولانا عثمانی فرماتے ہیں۔

ھٰؤلاء بناتی الخ سے مراد عام طور پر اس قوم کی لڑکیاں ہیں جن کو تجوزا بیٹیاں کہہ دیا ہے کیونکہ پیغمبر امت کے حق میں روحانی باپ ہوتا ہے۔ اور ویسے بھی قوم کے بڑے بوڑھے سب کی بیٹیوں کو اپنی بیٹیاں کہہ کر پکارتے ہیں۔ اور اگر خاص لوط علیہ السلام کی بیٹیاں مراد ہوں تو شاید ان میں سے بعض ممتاز لوگوں کے نکاح کے لیے پیش کی ہوں گی۔ اس وقت کافر کا نکاح مسلمان عورت سے جائز تھا۔ بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ لوط علیہ السلام کا مقصود اس سے نکاح وغیرہ نہ تھا۔ بلکہ ان کی زیادتیوں سے عاجز آکر مہمانوں کی آبرو بچانے

کی دُھن میں انتہائی تواضع سے یہ بات فرمائی تاکہ ان میں غیرت وحیار کا کچھ شائبہ اور آدمیت کا کوئی ذرہ بھی موجود ہو تو یہ لفظ سُن کر جھینپ جائیں اور نرمی اختیار کرلیں مگر وہ ایسے حیادار کاہے کو تھے کان پر جوں بھی نہ رینگی۔ پہلے سے زیادہ بے باک ہوکر بے غیرتی کا مظاہرہ کرنے لگے۔[۱]

امام رازی اور ابوالسعود نے آخری توجیہہ کو پسند کیا ہے۔ مگر میرے خیال میں دوسری توجیہہ زیادہ صحیح اور قابل قبول ہے۔

(۹۲) قوم لوط کے اخلاق کی پوری تصویر

وہ بولے تمہیں تو پتہ ہی ہے کہ تمہاری بیٹیوں سے ہمیں کوئی غرض نہیں ہے۔ اور تمہیں یہ بھی علم ہے۔ کہ ہم کیا چاہتے ہیں۔ یعنی اتنی حجت وتکرار کیوں کر رہے ہو ہم اپنا ناپاک ارادہ پورا کیے بغیر نہ جائیں گے[۲]۔ یہ فقرہ ان لوگوں کے اخلاق کی پوری تصویر پیش کر رہا ہے کہ وہ بگاڑ میں کس حد تک پہنچ گئے تھے، بات صرف اتنی نہیں ہے کہ وہ فطرت اور پاکیزگی کی راہ سے ہٹ کر ایک گندے اور خلاف فطرت راستے کو اپنا چکے تھے۔ بلکہ نوبت یہاں تک پہنچ گئی تھی کہ ان کی ساری رغبت اور تمام دلچسپی اسی کی ہو کر رہ گئی تھی۔ اور وہ پاکیزگی کی راہ کے متعلق یہ کہتے ہوئے کوئی باک محسوس نہ کرتے تھے۔ کہ ما لنا فی بناتك من حق۔ حلال طریقہ اور فطرت کی پاکیزہ راہ ہمارے لیے نہیں ہے۔ یہ زوال اخلاق کا وہ آخری مقام ہے۔ جس سے کمتر کسی مقام کا تصور ہی نہیں ہوسکتا۔ اس شخص کی اصلاح تو آسان ہے جو محض طبیعت کے دباؤ سے حرام کا مرتکب ہوجائے مگر حرام کو حرام جانتا ہو مگر ایسے شخص کی اصلاح ناممکن ہے جس کا ذہن حرام کے تصور ہی سے خالی ہوجائے۔ اور سمجھ لے کہ حلال اس کے لیے نہیں ایسے شخص کو انسانوں میں ہی شمار نہیں کیا جاتا۔ یہ تو غلاظت کا جرثومہ خبیث ہے۔ گھر میں پیدا ہوجائے تو پہلی فرصت میں گھر میں صفائی کی جائے۔ اللہ سبحانہ کی ذات گرامی کب گوارا کر سکتی ہے کہ ان کیڑوں کو اپنی زمین میں پلنے اور پھولنے کا موقعہ دے۔

۱۔ افادات شیخ الاسلام ۲۔ افادات شیخ الاسلام

قَالَ لَوْ اَنَّ لِیْ بِکُمْ قُوَّۃً اَوْ اٰوِیْۤ اِلٰی رُکْنٍ
شَدِیْدٍ ﴿۸۰﴾ قَالُوْا یٰلُوْطُ اِنَّا رُسُلُ رَبِّکَ لَنْ یَّصِلُوْۤا اِلَیْکَ
فَاَسْرِ بِاَھْلِکَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّیْلِ وَ لَا یَلْتَفِتْ مِنْکُمْ اَحَدٌ
اِلَّا امْرَاَتَکَ ؕ اِنَّہٗ مُصِیْبُہَا مَاۤ اَصَابَہُمْ ؕ اِنَّ مَوْعِدَہُمُ
الصُّبْحُ ؕ اَلَیْسَ الصُّبْحُ بِقَرِیْبٍ ﴿۸۱﴾ فَلَمَّا جَآءَ اَمْرُنَا جَعَلْنَا
عَالِیَہَا سَافِلَہَا وَ اَمْطَرْنَا عَلَیْہَا حِجَارَۃً مِّنْ سِجِّیْلٍ ۬ۙ
مَّنْضُوْدٍ ﴿۸۲﴾ مُّسَوَّمَۃً عِنْدَ رَبِّکَ ؕ وَ مَا ھِیَ مِنَ الظّٰلِمِیْنَ
بِبَعِیْدٍ ﴿۸۳﴾

حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کاش تمہارے مقابلے کی مجھ میں طاقت ہوتی یا کوئی مضبوط سہارا ہوتا۔ جس کا میں آسرا لے لیتا[۹۲] فرشتوں نے کہا اے لوط علیہ السلام ہم آپ کے رب کے روانہ کردہ ہیں۔ ان لوگوں کی رسائی آپ تک ہرگز نہ ہوگی[۹۴] بس اب آپ کچھ رات رہے اپنے اہل وعیال کو لے کر چل دیں۔ اور آپ لوگوں میں سے کوئی مڑ کر نہ دیکھے مگر تیری

بیوی نہ جائے بلا شبہ اس پر وہی آفت آئے گی جو ان پر آئے گی ان کے وعدے کا وقت صبح ہے۔ کیا صبح قریب نہیں ہے ۹۵؎ پھر جب ہمارے حکم کا وقت آگیا تو ہم نے بستی کی بلندیوں کو پستی میں بدل دیا اور اس پر آگ میں پکے ہوئے پتھر لگاتار برسائے ۹۶؎ جن میں سے ہر پتھر تیرے رب کے حضور نشان کردہ تھا۔ اور یہ بستی ان ظالموں سے دُور نہیں ہے ۹۷؎

مفردات کے معانی

رکن۔ آسرا، زور، قوت کسی شئے کی وہ جانب جس کا آسرا لیا جائے۔ رکن کہلاتی ہے۔ استعارةً زور و قوت کے لیے اس کا استعمال ہوتا ہے رکن سے مراد قلعہ یا زور دار قبیلہ ہے۔
سجیل۔ کنکر یہ فارسی کا لفظ ہے۔ اصل میں سنگ وگل ہے۔ جو عربی میں آکر سجیل ہوگیا ہے۔ مجدالدین نے بصائر ذوی التمیز میں ایسا ہی لکھا ہے۔

قوموں کی ہلاکت کا پس منظر

قوموں پر عذاب ان کے اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری اور افراد کی سعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں۔ وہی جماعتوں اور قوموں کی صلاح و فساد اور سعادت و شقاوت کے بھی ہیں۔ جس طرح ایک حکیم کا کام ان مادی اصولوں کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی تعلیم کا نام ہماری اصطلاح میں حکمت اور سائنس ہے۔ اسی طرح ان روحانی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا انبیاء علیہم السلام کا کام ہے۔ انبیاء کی تعلیم کے مطابق ہم کو اعمال کے آثار روحانی اور نتائج کا وہی یقین ہونا چاہیے جو ایک حکیم کی

تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص و آثار کا ہوتا ہے جب کائنات کے ہر گوشہ میں نتائج اعمال کا قانون کام کر رہا ہے تو یہ کیوں کر ہوسکتا ہے ۔ کہ اعمال انسانی کا گوشہ اس سے باہر ہو۔ یہاں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں کام کر رہا ہے۔ اور یہاں کے بھی وہی احکام و نتائج ہیں جو دوسرے گوشوں میں ہیں ۔

جب ہم کائنات اور زندگی کے مظاہر پر اس نقطۂ نظر سے غور کرنا شروع کرتے ہیں ۔ کہ ہماری عقلی قوتیں ان کے جنم اور ادراک میں کہاں تک مدد دے سکتی ہیں ۔ تو ہمیں قرآن کے مطالعہ سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں دو مختلف میدان ہیں جو اپنی نوعیت اور فطرت میں بالکل ایک دوسرے سے جدا ہیں ۔ ایک عالم مادی دوسرا عالم انسانی ۔ دونوں کئی اعتبار سے مختلف ہیں ۔ عالم مادی بے جان اشیاء کے مجموعہ کو کہتے ہیں ۔ جو ارادے کی صفت سے محروم اور آزادئ عمل سے نا آشنا ہیں ۔ یہ عالم اپنے معین قوانین رکھتا ہے ۔ جنہیں تجربے اور مشاہدے سے معلوم کیا جاسکتا ہے ۔ اس کے برعکس عالمِ انسانی کے قوانین اتنے پیچیدہ مبہم اور غیر معین ہیں کہ تجربے اور مشاہدے کی گرفت میں مشکل سے آتے ہیں ۔ اسی وجہ سے مادی دنیا کے مظاہر کی صحیح توجیہہ ممکن ہے ۔ لیکن انسانی اعمال اخلاق اور تہذیب و تمدنی مظاہر کی توجیہہ صحت کے ساتھ دشوار بلکہ ناممکن ہے ۔ انسانی اعمال کی دنیا میں اگر کسی واقعہ کی مختلف توجیہیں کی جائیں تو یہ ناممکن ہے کہ ان میں سے کسی ایک توجیہہ کو ہم ٹھوس دلائل اور قطعی ثبوت کی بنا پر اس طرح ثابت کر دیں کہ آپ کا مد مقابل بے بس ہو کر مان لے ۔ مثلاً قوم لوط کی بربادی ایسا واقعہ ہے ۔ جس کے اسباب و علل پر مختلف رائیں ہوسکتی ہیں ۔ ان میں صحیح بھی ہوسکتی ہے ۔ اور غلط بھی ۔ قرآن کی شہادت اور وحی الٰہی کے سوا ہمارے پاس کوئی ذریعہ نہیں جس کے بل بوتے پر ہم کوئی رائے قائم کر سکیں ۔ یہ قرآن کا انکشاف ہے کہ اخلاقی انحطاط اور عیش پرستی میں آوارگی ان کی تباہی کی علت ہے ۔ بتانا یہ چاہتا ہوں ۔ کہ قوم لوط کی بربادی کی علت ان کا ظلم و فساد ان کی آوارگی اور ان کے اخلاق کا درجہ صفر کے درجہ سے بھی گر جاتا ہے ۔

(۹۲) حضرت لوط علیہ السلام نے فرمایا کہ کاش تمہارے مقابلے کی مجھ میں طاقت ہوتی یا کوئی مضبوط سہارا ہوتا جس کا میں آسرا لیتا ۔ لوط علیہ السلام کی زبان سے انتہائی گھبراہٹ اور پریشانی میں بے ساختہ یہ الفاظ نکلے کہ کاش مجھ میں بذاتِ خود تم سب سے لڑنے اور مقابلہ کرنے کی طاقت ہوتی ۔ یا کوئی طاقتور اور مضبوط پناہ دینے والا ہوتا یعنی میرا کنبہ اور قبیلہ یہاں ہوتا ۔ حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ۔ یرحم اللہ لوطا لقد کان یاوی الی رکن شدید ۔ اللہ سبحانہٗ حضرت لوط علیہ السلام پر رحم فرمائے بے شک وہ مضبوط اور مستحکم پناہ حاصل کر رہے تھے ۔ یعنی اللہ سبحانہٗ کی ۔ مگر اس وقت سخت گھبراہٹ اور بے حد ضیق کی وجہ

سے ادھر خیال نہ گیا بے ساختہ ظاہری اسباب پر نظر گئی ۔ لوط علیہ السلام کے بعد جو انبیاء مبعوث ہوئے سب بڑے جتھے اور قبیلے والے تھے ۔[1]

اس سے یہ بات پوری صراحت سے معلوم ہو رہی ہے ۔ کہ حضرت لوط علیہ السلام کو بدمعاشوں کے اس حملہ کے وقت تک یہ معلوم نہ تھا کہ ان کے مہمان فی الواقع فرشتے ہیں ۔ وہ اس وقت تک یہی سمجھ رہے تھے ۔ کہ یہ چند مسافر ہیں ۔ انہوں نے اپنے فرشتہ ہونے کو اس وقت ظاہر کیا جب بدمعاشوں کا ہجوم مہمانوں کی قیام گاہ پر پل پڑا ۔ اور حضرت لوط علیہ السلام نے بیقراری میں فرمایا لو ان لی بکم قوۃ او اوی الی رکن شدید۔ اس کے بعد فرشتوں نے اپنا فرشتہ ہونا ظاہر کیا ۔ یہ فقرہ حضرت لوط علیہ السلام کی زبان سے انتہائی اضطراب اور بے چینی میں نکلا ہے ۔ یہ فقرہ بھی حضرت لوط علیہ السلام نے قوم کے ضمیر کو جھنجوڑنے کے لیے فرمایا ۔ یہ فقرہ بول کر آپ نے گویا آخری حجت تمام کر دی ۔ حضرت لوط علیہ السلام کی زبان سے نکلے ہوئے اس فقرے پر شارحین قرآن نے بڑی دور رازکار بحثوں کا دروازہ کھول دیا ۔ کیا حضرت لوط علیہ السلام کو العیاذ باللہ اللہ سبحانہ کی قدرت پر بھروسہ نہ تھا ۔ شارحین قرآن نے اس کے متعدد جوابات دیئے ہیں۔
پہلا جواب یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے ۔

یغفر اللہ للوط ان کان لیاوی الی رکن شدید ۔
وھو ربہ وخالقہ ۔

اللہ سبحانہ لوط علیہ السلام کی بخشش کرے بلاشبہ وہ مضبوط سہارے کی پناہ میں تھے یعنی اللہ جو حضرت لوط علیہ السلام کا رب بھی ہے خالق بھی ۔

مطلب یہ ہے ۔ کہ حضرت لوط علیہ السلام اللہ سبحانہ کو بھول کر کسی اور قوت کے طالب نہ تھے ۔ بلکہ اس درجہ پریشان تھے کہ اس وقت ان کی یہ تمنا ہوئی کہ کاش اللہ سبحانہ مجھے ایسی قوت عطا کرتا کہ میں اسی وقت ان سب بدبختوں کو ان کی خباثت کا مزہ چکھا سکتا ۔ اور رکن شدید یعنی اللہ سبحانہ نے آخر ان کی مدد کی اور ان پر فرشتوں نے اپنا راز ظاہر کر دیا اور ان کو تسلی اور اطمینان بخشا ۔

دوسرا جواب یہ ہے کہ اَو اٰوی میں اَو بمعنے بل ہے مطلب یہ ہے کہ جب آپ کے منہ سے بیقراری میں لو ان لی بکم قوۃ نکلا تو اس سے ہٹ کر فرمایا نہیں بلکہ میں اپنے اس حال میں رکن شدید یعنی اللہ سبحانہ کو اپنا ماوی بناتا ہوں ۔ علامہ آلوسیؒ کہتے ہیں کہ اس کی تائید اس موضوع پر آئی ہوئی

---

[1] افادات شیخ الاسلام

روایات سے نہیں ہوتی ہے ۔

۹۴ فرشتوں نے اپنے کو ظاہر کر دیا

فرشتوں نے کہا اے لوطؑ ہم آپ کے رب کے روانہ کردہ ہیں ان لوگوں کی رسائی آپ تک ہرگز نہ ہوگی ۔جب لوط علیہ السلام کے اضطراب وقلق کی حد ہوگئی تب مہمانوں نے کہا کہ حضرت آپ کس فکر میں ہیں مطلق پریشان نہ ہوں ۔ ہم اللہ سبحانہ کے روانہ کردہ فرشتے ہیں ۔ ان کو تباہ وبرباد کرنے آئے ہیں ۔یہ خبیث ہمارا تو کیا بگاڑ سکتے ہیں آپ تک بھی ان کی رسائی نہ ہوگی ۔ تفاسیر میں ہے کہ وہ شریر لوگ دروازہ توڑ کر یا دیوار توڑ کر اندر گھسنا چاہتے تھے تب جبرئیل امین نے اللہ سبحانہ سے اجازت لے کر لوط علیہ السلام کو علیحدہ بٹھادیا ۔ اور ایک ذرا بازو ان کی طرف ہلایا تو سب کے سب اندھے ہوگئے اور کہنے لگے کہ بھاگو لوطؑ کے مہمان تو بڑے جادوگر معلوم ہوتے ہیں[1] مطلب یہ ہے کہ اس وقت مہمانوں کا فرشتہ ہونا حضرت لوطؑ کو معلوم ہوا ۔ یہاں تک تو قرآن کا انکشاف ہے ۔ کہ فرشتوں نے حضرت لوط علیہ السلام سے کہا کہ ہم تیرے رب کے فرستادے ہیں اور ان لوگوں کی رسائی کسی بھی نقصان کے لیے آپ تک نہ ہوگی ۔ اس کے بعد جو کچھ بتایا جاتا ہے وہ اسرائیلی علم ہے ۔ اور یہ داستان صرف اتنی نہیں جو تفاسیر کے حوالے سے شیخ الاسلام نے پیش کی ہے ۔ بلکہ اس سے بھی آگے کہ اندھا ہوجانے کے بعد لوگوں نے پھر حضرت لوط علیہ السلام سے گفتگو کی ۔ گفتگو میں لوگوں نے حضرت لوط علیہ السلام کو مخاطب کرکے کہا کہ اچھا جادوگر لے کر آئے ہو اور حضرت لوط علیہ السلام کو ڈرایا دھمکایا ۔ حضرت لوط علیہ السلام کو اپنا اندیشہ ہوگیا اور ڈر کر جی میں کہنے لگے کہ مہمان تو چلے جائیں گے اور مجھے یہاں چھوڑ جائیں گے ۔ اس وقت حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا لاتخف انا رسل ربک لیکن قرآن اس داستان کا مؤید نہیں ہے ۔ اس سلسلے میں تورات کی کتاب پیدائش میں جو کچھ ہے اس کی صحت کی کوئی ضمانت نہیں ہے ۔ تورات میں ہے ۔

> انہوں نے (حضرت لوطؑ) سے کہا کہ یہاں سے ہٹ جا پھر کہنے لگے یہ شخص ہمارے درمیان قیام کرنے آیا تھا ۔ اور اب حکومت جتاتا ہے ۔ سو ہم تیرے ساتھ ان سے زیادہ بدسلوکی کریں گے ۔ تب وہ اس مرد یعنی لوط پر پل پڑے اور نزدیک آئے تاکہ کواڑ توڑ ڈالیں لیکن ان مردوں نے ہاتھ بڑھا کر لوطؑ کو اپنے پاس کھینچ لیا اور دروازہ بند

[1] افادات شیخ الاسلام

کردیا۔ اور ان مردوں کو جو گھر کے دروازے پر تھے اندھا کردیا کیا چھوٹے کیا بڑے
سو وہ دروازہ ڈھونڈھتے ڈھونڈھتے تھک گئے۔ تب ان مردوں نے لوط سے کہا
کیا یہاں تیرا اور کوئی ہے۔

آپ غور کریں کہ برائی برائی میں فرق ہے ایک برائی تو وہ ہوتی ہے جو انسانوں میں پائی جاتی ہے یا پائی جاسکتی ہے خواہ کتنی سنگین ہو۔ دوسری برائی وہ ہے جس کا گھناؤنا پن اس قدر واضح ہے کہ کسی انسان کے اندر عادت کے طور پر اور کسی سوسائٹی میں فیشن کے طور پر اسکا پایا جانا اس کے بغیر ممکن ہی نہیں ہے۔ کہ اس انسان یا سوسائٹی کی فطرت بالکل مسخ ہوگئی جہاں اس قسم کے لوگوں سے سابقہ ہو وہاں اصل قابل توجہ وہی برائی ہوتی ہے۔ دوسری باتیں خواہ کتنی اہمیت رکھتی ہوں۔ سب ثانوی درجہ میں آجاتی ہیں۔ آپ ایک شخص کے پاس اس کی اصلاح کے لیے جائیں اور دیکھیں کہ وہ کھڑا ہوا میلا کھا رہا ہے تو کیا آپ اسے فضائل کی دعوت دیں گے۔ حضرت لوط علیہ السلام کو اسی صورت حال سے سابقہ پڑا۔ ان کی قوم میں شرک، کفر، تکذیب نبوت کی برائی بھی موجود تھی۔ اور دوسری تمام برائیاں بھی جو شرک و کفر کے لوازم ہیں۔ لیکن جن کی فطرت اتنی اندھی ہوچکی ہو کہ مرد مردوں ہی کو شہوت رانی کا محل بنائے ہوئے ہوں ان کو تو سب سے پہلے اس غلاظت کے دلدل سے نکالنے کی ضرورت ہوگی۔ قرآن کی نظر میں اس سے عمل قوم لوط کی شناخت کا اندازہ ہوسکتا ہے۔ اور یہی عمل آج بھی اسی طرح مغضوبیت کا سامان ہے۔ جیسے حضرت لوط علیہ السلام کے زمانہ میں تھا۔

(۹۵) حضرت لوطؑ کو ہجرت کا حکم

بس اب آپ کچھ رات رہے اپنے اہل وعیال کو لے کر چل دیں۔ اور آپ لوگوں میں سے کوئی پیچھے مڑ کر نہ دیکھے مگر تیری بیوی نہ جائے بلاشبہ اس پر وہی آفت آئے گی جو ان پر آئے گی۔ یعنی صبح کو عذاب آنے والا ہے تھوڑی رات رہے آپ اپنے متعلقین کو لے کر یہاں سے تشریف لے جایئے اور اپنے ہمراہیوں کو ہدایت کردیجئے کہ جلدی کریں اور کوئی پیچھے مڑ کر بھی نہ دیکھے ہاں تیری عورت کہ وہ ساتھ نہ جائیگی یا پیچھے پھر کر دیکھے گی: اس طرح اس عذاب کی لپیٹ میں آجائیگی۔ جو سب قوم کو پہنچنے والا ہے۔ کہتے ہیں کہ اسی عورت نے قوم کو مہمانوں کی آمد سے مطلع کیا تھا۔ آگے فرمایا کہ الیس الصبح بقریب۔ یعنی خوش ہو جایئے اب ان ظالموں کے ہلاک ہونے میں کچھ دیر نہیں ہے۔ صبح ہوتے ہی سب کا صفایا ہو جائے گا[1] سورہ حجر میں یہ اضافہ اور ہے۔ کچھ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رات رہے اپنے گھر والوں کو لے کر نکل جاؤ وا تبع ادبارھم ۔اور خود ان کے پیچھے پیچھے چلو یعنی اس لیے کہ ان میں کوئی رہ نہ جائے پلٹ کر نہ دیکھنے کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ پلٹ کر دیکھتے ہی تم پتھر بن جاؤ گے جیسا کہ تورات میں آیا ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ پیچھے کی آوازیں اور شور و غل سن کر تماشہ دیکھنے کے لیے نہ ٹھہر جانا۔ نہ تماشا دیکھنے کا وقت ہے اور نہ مرنے والوں پر آنسو بہانے کا۔ دراصل یہ حضرت لوط علیہ السلام کو ہجرت کا حکم ہو رہا ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں پہنچ کر اللہ کے رسول کو اپنے ساتھیوں کو ساتھ لے کر ہجرت کا حکم ہوتا ہے۔ حضرت نوح علیہ السلام کو کشتی پر چڑھا کر کفار سے الگ کیا جاتا ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نمرود کے ملک سے اپنی ہجرت کا اعلان کرتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر مصر سے نکل جاتے ہیں۔ حضرت ہود علیہ السلام حضرت صالح علیہ السلام حضرت شعیب علیہ السلام سب نے اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر اپنی نافرمان قوموں سے علیحدگی اختیار کی۔ اور جب تک یہ ہجرت ہو نہیں لیتی اور اللہ کا رسول کافروں سے الگ نہیں ہو جاتا معجزہ عذاب نہیں آتا۔ حضرت نوح علیہ السلام جب تک کشتی پر بیٹھ کر علیحدہ نہ ہوئے طوفان نہ آیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام جب تک کلدانیوں کے ملک عراق سے نکل کر شام اور مصر نہ چلے گئے ان پر عذاب نہ آیا اسی طرح حضرت ہود، حضرت صالح، حضرت شعیب علیہم السلام اپنی اپنی جماعتوں کو لے کر جب تک الگ نہ ہوئے ہلاکت کا عذاب نہیں آیا اسی قانون الٰہی کے مطابق یہاں حضرت لوط علیہ السلام کو حکم ہو رہا ہے۔ فاسر باھلک الخ۔ تورات میں ہے کہ حضرت لوط علیہ السلام مع اپنے خاندان کے سدوم سے ہجرت کر کے صغر کی بستی میں چلے گئے۔ جو سدوم سے قریب ہی تھی۔ تورات میں حضرت لوط علیہ السلام کی اس ہجرت کا تذکرہ اس انداز سے پیش کیا ہے۔

> جب صبح ہوئی تو فرشتوں نے لوط سے جلدی کرائی اور کہا کہ اُٹھ اپنی بیوی اور اپنی دونوں بیٹیوں کو جو یہاں ہیں لے جا ایسا نہ ہو کہ تو بھی اس شہر کی بدی میں گرفتار ہو کر ہلاک ہو جائے مگر اس نے دیر لگائی تو ان مردوں نے اس کا اس کی بیوی اور اس کی دونوں بیٹیوں کا ہاتھ پکڑا کیونکہ خداوند کی مہربانی اس پر ہوئی اور اسے نکال کر شہر سے باہر کر دیا۔ باب ۱۹ - ۱۵ - ۱۶

(۹۶) عذابِ الٰہی سر پہ آگیا

پھر جب ہمارے حکم کا وقت آ گیا تو ہم نے بستی کی بلندیوں کو پستی میں بدل دیا۔ اور اس پر آگ کے پکے ہوئے پتھر لگاتار برسائے۔ جبرئیل علیہ السلام نے ان بستیوں کو اٹھا کر آسمان کے قریب سے نیچے پٹک

دیا اس طرح سب بستیاں تہ و بالا ہو گئیں۔ پھر ان کی نکایت اور ذلت و رسوائی کی پوری تکمیل کے لیے اوپر سے جھانویں اور پتھر برسائے گئے شہر کی آبادی سے الگ جو افراد اس قوم کے جس جگہ تھے وہیں پتھروں سے ہلاک کیئے گئے العیاذ باللہ جو سزا اس قوم کو اوپر نیچے کرنے کی ملی وہ ان کی شرمناک حرکت سے ظاہری مناسبت بھی رکھتی ہے۔ منضود کے معنے مترجم نے تہ بر تہ کیئے ہیں۔ بعض نے معنے یہ لیئے کہ پتھر مسلسل یکے بعد دیگرے برس رہے تھے[1] شارحین قرآن نے تفصیل اس سے بھی زیادہ دی ہے۔ کسی نے کہا کہ حضرت جبرئیل نے قوم لوط کو ان کے مکانوں کو ان کے جانوروں کو اور ان کے سامانوں کو زمین سے اٹھایا اور آسمان والوں نے کتوں کے بھونکنے کی آواز بھی سنی وہیں سے سب کچھ الٹ دیا یہ اور اسی قسم کی تشریحات شارحین نے مجاہد، قتادہ اور سدی کے حوالہ سے پیش کی ہیں مگر ان کی پشت پر کوئی ارشاد نبوت نہیں ہے۔ صرف اسرائیلی داستانیں ہیں نہ عذاب کا انکار ہے۔ تورات میں ہے۔

تب خداوند نے اپنی طرف سے سدوم اور عمورہ پر گندھک اور آگ آسمان سے برسائی اور اس نے ان شہروں کے سب رہنے والوں کو ان شہروں کو اور اس ساری ترائی کو اور سب کچھ جو زمین سے اُگا تھا غارت کر دیا۔ باب ۱۹ - ۲۵ - ۲۶

اور قرآن میں ہے کہ ہم نے ان پر پتھروں کی بارش کی۔ دونوں بیانوں کے جمع کرنے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ایسی حالت پیش آئی ہوگی کہ ایک سخت زلزلہ آیا اور یہ آتش فشاں لاوے کی صورت میں تھا۔ زلزلے نے بستیوں کو زیر و زبر کر دیا اور آتش فشاں مادے کے پھٹنے سے ان کے اوپر زور کا پتھراؤ ہوا اور اس نے اتنی شدت اختیار کر لی کہ بستیاں تلپٹ ہو گئیں۔ آج تک بحر لوط کے جنوب اور مشرق کے علاقے میں اس انفجار کے آثار ہر طرف نمایاں ہیں۔

قوم لوط کے ساتھ جو کچھ ہوا یعنی آسمان سے گندھک اور آگ برسی، زلزلے نے آتش فشاں پہاڑوں سے لاوے نکالے ان لاوں سے پکی ہوئی مٹی کے پتھروں کا پتھراؤ ہوا۔ یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس لیے ہوا اعمال انسانی کے بھی نتائج ہوتے ہیں۔ یہاں بھی اللہ کا وہی قانون کام کر رہا ہے۔ جو عالم مادی کے تمام گوشوں میں کام کر رہا ہے۔ غور کرو قرآن نے ان کے اعمال کا کیا نقشہ پیش کیا ہے۔

۱۔ ایسی بدکاری اور قابل نفرت فعل میں اس قوم نے شہرت دوام حاصل کی ہے۔ کہ ما سبقکم بھا من احد من العالمین۔ پوری تاریخ انسانی میں اسکی مثال نہیں۔ یعنی عورتوں کو چھوڑ کر مردوں سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اپنی شہوانی خواہشات پوری کرتے تھے۔ اتاتون الرجال شھوۃ من دون النساء۔
۲۔ اس کام میں اس قدر وہ حد سے تجاوز کر گئے تھے کہ اس کے خلاف بھی سننے کو تیار نہ تھے بلکہ اس کے خلاف بات کرنے والوں کا بستی میں ہونا بھی ان کو برداشت نہ تھا۔ اخرجوھم من قریتکم ان پر پاکیزگی کی پھبتی کستے تھے انھم اناس یتطھرون۔ یعنی اخلاقی پستی میں اس قدر گر گئے کہ انہیں اپنے درمیان چند نیک انسانوں اور نیکی کی طرف بلانے والوں اور بدی پر ٹوکنے والوں کا وجود تک گوارا نہ تھا
۳۔ رہزنی، ڈاکہ زنی، لوٹ مار اور راہ گیروں اور مسافروں کی جان اور مال تک ان سے محفوظ نہ تھے وتقطعون السبیل۔

۴۔ بدکاری کا یہ فعل چھپ کر نہیں بلکہ علانیہ اپنی مجلسوں میں ایک دوسرے کے سامنے اس کا ارتکاب کرتے تھے۔ وتاتون فی نادیکم المنکر۔
۵۔ وہ خباثت نفس میں اس قدر ڈوب گئے تھے۔ اور نوبت یہاں تک پہنچ گئی کہ ان کی ساری رغبت اور اور تمام دلچسپی اب اسی گندی راہ میں تھی ان کے نفس میں اب طلب اس گندگی ہی کی رہ گئی تھی۔ اور فطرت اور پاکیزگی کی راہ کے متعلق یہ کہنے میں کوئی شرم محسوس نہ کرتے تھے۔ انک لتعلم ما نرید۔ ہماری پسند یہی ہے۔ ہماری چاہت یہی بدکرداری اور بدفعلی ہے۔ یہ اخلاق کے زوال اور نفس کے بگاڑ کا انتہائی مرتبہ ہے۔ جس سے فروتر مرتبہ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ وجعلنا عالیھا سافلھا ہم نے اس بستی ہی کو تلپٹ کر دیا اور ان پر تہ بر تہ سنگ گل کی بارش کی اور بالآخر یہ بستیاں صفحۂ ہستی سے ایسی ناپید ہو چکی ہیں کہ ان کا نام ونشان نہیں ہے۔ وہاں اب بحر لوط بہہ رہا ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ اعمال کے نتائج عالم انسانی سے تعلق رکھتے ہیں اور ان کے قوانین عالم غیب میں بنتے ہیں۔

(۹۷) اعمال کے نتائج کا ظہور

جن میں سے ہر پتھر تیرے پروردگار کے حضور نشان کردہ تھا۔ اور یہ بستی ان ظالموں سے دور نہیں ہے۔ یعنی کوئی خاص علامت ان پر تھی جو عام پتھروں سے ممتاز کر کے ظاہر کرتی تھی۔ کہ یہ عذاب الٰہی کے پتھر ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ ہر پتھر پر اس کا نام درج تھا جس کی ہلاکت کا وہ سبب بنا اور ماھی من الظلمین ببعید کا مطلب یہ ہے کہ باعتبار زمانہ کے قریب ہے کیونکہ عاد ثمود اور قوم نوح کے بعد یہ واقعہ ہوا اور باعتبار مکان کے بھی کیونکہ ان کی بستیاں شام اور مدینہ کے درمیان تھیں۔ گزرنے والے قافلے وہاں کھنڈرات کا مشاہدہ کرتے تھے۔ یا اس جملہ کا مطلب یہ ہے کہ اس قسم کا عذاب ایسے ظالموں سے کچھ دور نہیں

ہے۔ ہمیشہ اللہ سبحانہٗ کے غضب سے ڈرتے رہنا چاہیئے[1] مسومہ، اسم مفعول ہے۔ تسویم مصدر ہے معنے ہیں وہ پتھر جن پر خزانہ الٰہی میں علامت لگا دی گئی تھی۔ یعنی عالم غیب میں ان پر نشان لگائے گئے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ علم الٰہی میں پہلے سے مقدر اور مقرر تھے۔ گویا ان کا انبار لگا کر پہلے ہی سے ان پر نشان لگا دیئے گئے تھے۔ یا مطلب یہ ہے کہ ہر ہر پتھر اللہ سبحانہٗ کی جانب سے نامزد کیا ہوا تھا۔ کہ اسے تباہ کاری کا کون سا کام کرنا ہے۔ اور کس پتھر کو کس شخص پر پڑنا ہے۔ حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں۔ کہ نشان زدہ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان پر ان لوگوں کے نام کندہ تھے۔ جن کی ان کے ذریعے ہلاکت ہوتی تھی۔ گویا ان پتھروں کی یہ خصوصیات تھیں۔

۱۔ یہ سنگ گل کی آگ میں پک کر پتھر بنے تھے۔

۲۔ یہ مسلسل تہ بر تہ لگاتار تھے۔

۳۔ ان پر خاص نشانات تھے جو ان کو باقی پتھروں سے ممتاز کر رہے تھے ان پر مجرمین کے نام کندہ تھے۔

اس کے بعد ارشاد ہے۔ وما ھی من الظالمین ببعید۔ شارحین قرآن نے ہی ضمیر مؤنث کا رُخ مقرر کرنے میں تین راہیں اختیار کی ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ ضمیر کا مرجع حجارۃ ہیں مطلب یہ ہے کہ پتھروں کے یہ بجان ان ظالموں سے کچھ دور نہیں تھے۔ ان کو وہاں سے اٹھا کر لانے میں وقت لگتا بلکہ وہیں سے قدرت الٰہی نے اٹھا کر بارش بنا دیا۔

کچھ نے ضمیر کا مرجع مدینہ اور بستی کو قرار دیا ہے اور ظالمین سے اہل مکہ مراد لیے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ لوط علیہ السلام کی بستی قریش سے کچھ دور نہیں۔ وہ اپنے سفر شام میں برابر اسی راہ سے آتے جاتے تھے۔ اگر دیدہ عبرت نگاہ رکھتے ہیں تو اس سے عبرت حاصل کریں۔ ان آبادیوں کی آسمانی ہلاکت کا زمانہ وقوع جدید تحقیق کے مطابق ۲۰۶۱ء قبل مسیح ہے۔ افادات میں شیخ الاسلامؒ نے بھی ضمیر کا مرجع بستی ہی کو قرار دیا ہے۔

کچھ نے ضمیر کا مرجع عقوبت قرار دیا ہے۔ اور مطلب یہ ہے۔ کہ ظالموں سے یہ سزا دور نہیں ہے یعنی جو لوگ آج ظلم کر رہے ہیں وہ بھی اس عذاب کو اپنے سے دور نہ سمجھیں۔ عذاب اگر قوم لوط پر آسکتا تھا۔ تو ان پر بھی آسکتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کا مقابلہ نہ قوم لوط کر سکی تھی اور نہ یہ قریش مکہ کر سکیں گے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَإِلَىٰ مَدْيَنَ أَخَاهُمْ شُعَيْبًا ۚ قَالَ يَا قَوْمِ اعْبُدُوا
اللَّهَ مَا لَكُم مِّنْ إِلَٰهٍ غَيْرُهُ ۖ وَلَا تَنقُصُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ ۚ
إِنِّي أَرَاكُم بِخَيْرٍ وَإِنِّي أَخَافُ عَلَيْكُمْ عَذَابَ يَوْمٍ مُّحِيطٍ ﴿٨٤﴾ وَ
يَا قَوْمِ أَوْفُوا الْمِكْيَالَ وَالْمِيزَانَ بِالْقِسْطِ ۖ وَلَا تَبْخَسُوا النَّاسَ
أَشْيَاءَهُمْ وَلَا تَعْثَوْا فِي الْأَرْضِ مُفْسِدِينَ ﴿٨٥﴾ بَقِيَّتُ اللَّهِ
خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُم مُّؤْمِنِينَ ۚ وَمَا أَنَا عَلَيْكُم بِحَفِيظٍ ﴿٨٦﴾

اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی حضرت شعیب علیہ السلام کو روانہ کیا[98] انہوں نے فرمایا کہ اے میری قوم اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے[99] اور پیمانے اور ترازو میں کمی نہ کیا کرو[100] میں دیکھ رہا ہوں کہ تم خوشحال ہو مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آجائے جو سب پر چھا جائے[101] اور اے میری قوم ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا پورا کرو اور لوگوں کو چیزوں میں گھاٹا نہ دو[102] ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو[103] اگر تم ایمان والے ہو تو جو کچھ اللہ کا دیا

بچ رہے ۔ اسی میں تمہارے لیے بہتری ہے ۱۰۴ اور دیکھو میرا کام صرف تمہیں پیغام پہنچانا ہے میں تمہارا رکھوالا نہیں ۱۰۵

مفردات کے معانی

لا تعثوا تم فساد نہ کرو۔ مضارع مجزوم صیغہ جمع مذکر حاضر از باب سمع ، عُثیٰ سے جس کے معنے فساد کرنے کے ہیں ۔جس فساد کا ادراک حسی ہو ۔عیث اور عثو کہلاتا ہے ۔اور جس فساد کا ادراک حکمی ہو اسے عثی کہتے ہیں عیث اور عثو باب نصر کے مصدر ہیں ۔اور عثی باب سمع کا مصدر ہے ۔

شعیبؑ کا چہرہ

حضرت شعیب علیہ السلام کا نام تورات میں شیرو اور حوباب ہے ۔تورات کی شرحوں میں لکھا ہے کہ شیرو کے دس نام تھے ۔دس ہوں یا نہ ہوں دو نام تو خود تورات میں ہیں ۔ایک جرمن فاضل کہتا ہے کہ

اصلی نام حوباب تھا۔ اور شیرو ایک اعزازی لقب تھا۔جس کے لغوی معنے کامل کے ہیں۔ جس طرح یہودیوں کے ہاں اور مسلمانوں میں لفظ امام ہے ۔

دوسری جگہ لکھتا ہے ۔

حوباب کا نام قرآن میں اور عموماً مسلمانوں میں شعیبؑ ہے یہ نام حوباب کی تصحیف ہے ۔

مسلمان شارحین قرآن بھی علی العموم شیرو حوباب اور شعیبؑ کو ایک ہی سمجھتے ہیں ۔حافظ ابن کثیرؒ نے لکھا ہے ۔شعیب ابن یکمل ابن یشجر مدین ابن ابراہیم کی اولاد سے ہیں ۔سریانی میں انکا نام یثرون تھا۔ علامہ نوویؒ نے تہذیب الاسماء میں شعیب ابن میکیل ابن یشجر ابن مدین ابراہیم علیہ السلام لکھا ہے علامہ آلوسیؒ نے ابن عساکر کے حوالہ سے بتایا ہے ۔کہ شرقی ابن القطامی جو انساب کے بڑے ماہر تھے کہتے ہیں کہ آپ عبرانی میں یثروب اور عربی میں شعیب ہیں ۔صنعانی کہتے ہیں کہ یہ عربی نام ہے ممکن ہے کہ شعیب کی تصغیر ہو یا شعب بہت چوڑے سینے والا کی جیسے اہل عرب اسود کو سوید کہتے ہیں ۔صحیح ابن حبان میں حضرت

ابوذرؓ کے حوالہ سے ایک مرفوع حدیث میں ہے۔ کہ چار پیغمبر عربی ہیں۔ ہودؑ، صالحؑ، شعیبؑ اور تمہارے نبی علیہم السلام اے ابوذرؓ۔ حافظ ابن حجر عسقلانی لکھتے ہیں کہ اس حدیث کی رو سے حضرت شعیب علیہ السلام عرب عاربہ میں سے ہیں۔ آپ نے جس حسن اسلوب کے ساتھ قوم کے سامنے دعوت حق رکھی تھی اور پھر اس سلسلے میں جو کچھ باہمی سوال وجواب ہوئے اس کے لفظ لفظ سے آپ کی فصاحت وبلاغت اور حسن خطابت کے جوہر ٹپکتے ہیں۔ اسی لیے آپ کو خطیب الانبیاء کہا جاتا ہے۔

(۹۸) اور ہم نے مدین کی طرف ان کے بھائی حضرت شعیب علیہ السلام کو روانہ کیا۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ مدین قبیلے کا بھی نام ہے اور شہر کا بھی۔ سامی قومیں عموماً اپنی آبادی اور قومیت کو اپنے بزرگوں کے نام سے موسوم کرتی ہیں۔ مدین قبیلہ ہو یا شہر۔ اپنے بانی ومؤسس خاندان مدین ابن ابراہیمؑ کی طرف منسوب ہیں۔ مدین قطورا نامی عورت کے بطن سے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صاحبزادے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے حرم میں تین بیویاں تھیں۔ ایک ہاجرہ ان سے حضرت اسماعیل علیہ السلام دوسری سارہ ان سے حضرت اسحٰقؑ اور تیسری قطورا ان کے پیٹ سے مدین ہیں۔ انہوں نے اپنی آبادی اپنے ہی نام سے اپنے بھائی اسماعیلؑ کے پہلو میں قائم کی۔ یہ ملک طولاً خلیج عقبہ کے ساحل پر دہانہ خلیج سے بحر احمر تک واقع تھا۔ مدین کا آغاز ۲۰۰۰ء قبل مسیح ہے۔ مدین بن ابراہیم کا زمانہ ۲۱۰۰ء یا ۲۲۰۰ء قبل مسیح ہے۔ ایک خاندان کو قوم بننے کے لیے کم از کم سو دو سو سال کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لیے مدین سب سے پہلے حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانے یعنی ۲۰۰۰ء قبل مسیح میں سوداگروں کے بھیس میں نظر آتے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو جو کاروان تجارت کنعان سے مصر لے گیا تھا وہ بھی اہل مدین اور اسماعیلی عرب تھے۔ شارحین قرآن نے یہی سمجھا ہے تفصیل آپ سورہ یوسف میں آیت

وجائت سیارۃ فارسلوا واردھم فادلی دلوہ

کی تشریح میں پڑھیں گے۔ مدین کی قوم جو کاروبار کرتی تھی وہ وہی ہے جو تمام سامی قوموں کا ہمیشہ پیشہ رہا یعنی گلہ بانی یہی وہ شغل ہے جو ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کا پیشہ تھا۔ اور جو حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر کی متمدن زندگی میں میسر نہ تھا۔ اولاد سام کے عظیم الشان پیغمبر کے لیے ضروری تھا کہ وہ جہاں بانی سے پہلے گلہ بانی کا سبق لے اس لیے قضائے الٰہی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو مصر کے تمدن زار سے عرب کے بے تکلف اور سادہ ملک میں بھیج دیا۔ جہاں شرفاء سام نے اپنے آبائی عادات واخلاق کو نہیں چھوڑا تھا۔

مدین کے قبائل ایک باقاعدہ منظم زندگی رکھتے تھے۔ شہر میں مذہبی رسوم وآداب کی تلقین ومحافظت کے لیے کاہن ومذہبی عہدہ دار ہوتے تھے۔ اور اکثر حالات میں یہی کاہن شہر کے قانونی حاکم بھی ہوتے تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں اس کا نام تورات میں کہیں راعویل، کہیں شیرو کہیں حوباب ہے۔ اکثر شارحین قرآن کی رائے میں یہ حضرت شعیب علیہ السلام تھے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جب مصر سے ہجرت کر کے شہر مدین آئے تو حضرت شعیب علیہ السلام کے یہاں مہمان ہوئے اور ان کے ہاں بکریاں چرانے کی خدمت قبول کی اور اس کے عوض حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی ایک بیٹی حضرت موسیٰ علیہ السلام کی زوجیت میں دی۔

(۹۹) عبادت کا عہد و میثاق

انہوں نے فرمایا اے میری قوم اللہ سے عابدانہ تعلقات پیدا کرو اللہ کے سوا تمہارا حاکم کوئی نہیں ہے ان دو فقروں کے ذریعے ایک طرف توحید فی العبادت کا نقشہ کھینچ دیا کہ ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف اللہ سبحانہٗ کی ذات ہے اگر عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی دوسرے کے سامنے سر جھکا دیا۔ اگر اپنی دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسری ہستی کو بھی شریک کر لیا، دعا واستعانت رکوع و سجود، نذر و نیاز، اعتماد و توکل اور اس طرح کے تمام عبادت گزارانہ اعمال میں رشتہ کسی اور کے ساتھ قائم ہو گیا تو توحید عبادت کا تصور قائم نہ رہا دوسری طرف مالکم من الٰہٍ غیرہٗ۔ مقام علت میں لا کر اشتراکی تصور کا کلی انسداد کر دیا یعنی اللہ کی عبادت اس لیے کرنی چاہیئے کہ اگر اللہ سبحانہٗ اپنی ذات میں یگانہ ہے تو ضروری ہے کہ اپنی صفات میں بھی یگانہ ہو کیونکہ اس کی یگانگت قائم نہیں رہ سکتی اگر کوئی دوسری اس کی صفت الوہیت میں شریک وسہیم مان لی جائے۔ ۲۔ اعبدوا اللہ اگر ایجابی پہلو ہے تو مالکم من الٰہٍ غیرہٗ سلبی ہے۔ ایجابی پہلو یہ ہے کہ عبادت کے لائق اللہ ہے۔ سلبی پہلو یہ ہے کہ اللہ کے سوا عبادت کے لائق کوئی نہیں ہے۔ جب اس کے علاوہ الٰہ کوئی نہیں ہے تو صفت الوہیت میں کوئی دوسری شریک نہیں ہے۔ یعنی صفت الوہیت میں اس کا کوئی شریک نہیں ہے۔ اللہ اگر اسم ذات ہے۔ تو الٰہ اسم صفت ہے۔ پہلی توحید فی الذات ہے تو دوسری توحید فی الصفات ہے یہ صرف حضرت شعیب علیہ السلام کی پکار نہیں بلکہ سارے رسولوں کی ہمیشہ سے یہی ایک پکار رہی یہ پکار دراصل ایک معاہدہ اور میثاق ہے۔ غور فرمایئے کہ ایک شخص نبوت کی دعوت کو قبول کر کے اس کی امت میں کیسے داخل ہوتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی توحید عبادت کا اسے اقرار کرنا پڑتا ہے یعنی وہ ڈنکے کی چوٹ پہ کہتا ہے۔ لا الٰہ الا اللہ۔ یہ اقرار کرتا ہے اور اس اقرار کے لازمی نتائج کو بھی تسلیم کرتا ہے گویا اس اقرار کے بعد وہ اپنے نفس کے جملہ حقوق سے دست بردار ہو جاتا ہے۔ ایک شخص جب لا الٰہ الا اللہ کہتا ہے۔ تو اس بات کا وعدہ کرتا ہے کہ اس کا ارادہ، اس کی عقل، اس کے جذبات و خواہشات قانون اور احکام خداوندی

کی راہ میں رکاوٹ نہ بنیں گے۔ اللہ کے حکم کے مقابلے میں وہ ان سب کی قربانی دینے کو تیار رہے گا۔ اس اطاعت وسپردگی کے معاوضہ میں اسے رضائے الٰہی اور قرب خداوندی کی بشارت دی جاتی ہے۔ اس اعتبار سے کہا جاسکتا ہے کہ اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہٗ اللہ کی بندگی کرو اللہ کے سوا تمہارا کوئی حاکم نہیں ہے۔ یہ ایک عہد و میثاق ہے۔ یہ محض تخیل آرائی نہیں ہے۔ بلکہ ایک حقیقت ہے۔ جس کا ثبوت قرآن حکیم سے ملتا ہے۔ قرآن میں اکثر جگہ اس میثاق کا ذکر آتا ہے۔ جو اللہ سبحانہٗ نبیوں کی وساطت سے قوموں سے لیتا ہے۔ اس سلسلے میں سب سے پہلے ہماری نظر اس میثاق پر پڑتی ہے جو بنی اسرائیل اور اللہ سبحانہٗ کے درمیان واقع ہوا۔

واذ اخذنا میثاق بنی اسرائیل لا تعبدون الا اللہ

اور مسلمانوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے۔

واذکروا نعمۃ اللہ علیکم ومیثاقہ الذی واثقکم بہٖ اذ قلتم سمعنا واطعنا

مسلمانوں اللہ کی نعمت کو یاد کرو اور اس میثاق کو جو تم سے لیا گیا تھا جب تم نے کہا کہ ہم نے سنا اور اطاعت کی۔

ان آیات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ نے ہمیشہ انبیاء کے ذریعے قوموں سے اپنی عبادت کا عہد وپیمان لیا ہے۔ یعنی وہ اس قانونی نظام اور اخلاقی ضابطہ سے کبھی منحرف نہ ہوں گے۔ جو اللہ سبحانہٗ نے اپنے رسولوں کے ذریعے ان تک پہنچایا ہے اور جب تک وہ اس میثاق پر قائم رہیں گے۔ دنیا و آخرت کی نعمتوں سے سرفراز ہوں گے۔ یہی عہد و پیمان حضرت شعیب علیہ السلام اپنی قوم سے لے رہے ہیں۔ اور یہی عہد و پیمان حضرت نوح، حضرت صالح، حضرت ہود، حضرت ابراہیم اور حضرت لوط علیہم السلام نے اپنی اپنی قوموں سے اپنے اپنے وقت میں لیا ہے۔ بلکہ قرآن نے بتایا ہے۔ کہ ہر نبی یہی میثاق و معاہدہ لے کر آیا ہے۔

وما ارسلنا من قبلک من رسول الا نوحی الیہ انہ لا الٰہ الا انا فاعبدون۔

اور یہی عہد و میثاق محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم لے کر آئے ہیں۔ ان لا تعبدوا الا اللہ اننی لکم منہ نذیر وبشیر۔ فرق صرف یہ ہے۔ کہ مسلمانوں سے پہلے جس قدر میثاق لیے گئے تھے۔ وہ کسی خاص نسل قوم یا خطۂ ارض کے متعلق تھے۔ اور صرف اسی تک محدود تھے۔ اس کے برخلاف محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم جو میثاق لے کر آئے ہیں۔ اس کا دروازہ اس وقت بھی ہر اس فرد یا قوم پر کھلا ہوا تھا۔ اور

آج بھی کھلا ہوا ہے جو اس کے لازمی نتائج اور مضمرات کو تسلیم کرے۔ یہی وجہ ہے کہ اب کسی نئے میثاق کی ضرورت نہیں ہے۔ تاریخی حیثیت سے اسی میثاق کے نتیجہ میں اسلامی مملکت وجود پذیر ہوتی ہے۔ تفصیل انشاء اللہ سورت کے آخر میں آرہی ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ اللہ سے عابدانہ روابط قائم کرنے کا اور غیر اللہ سے عابدانہ روابط توڑنے کا ہر نبی اپنی قوم سے عہد و میثاق لیتا ہے۔ یہی نبوت کے مشن کا اہم اور بنیادی نصب العین ہے۔ اور اسی پر نبوت کی دعوت کی ساری عمارت بنتی اور اٹھتی ہے۔ اس آیت سے دو باتیں معلوم ہوئیں کہ مدین سے قوم مدین مراد ہے دوسرے یہ کہ حضرت شعیب علیہ السلام مدین کے خاندان سے نسبی تعلق رکھتے ہیں۔

(۱۰۰) معاملاتی بددیانتی

اور پیمانے اور ترازو میں کمی نہ کیا کرو۔ مدین قوم ایک تاجر قوم تھی اور غالباً دنیا کی تاریخ میں اس پیشہ کی سب سے پہلی قوم ہے۔ اس بنا پر ان میں کم دینے کی مذموم صفت ہوگی جو حالات کے لحاظ سے مطابقت رکھتی ہے۔ بنی اسرائیل جب مصر سے حدود عرب میں داخل ہوئے۔ تو اس کے ساتھ رسد کا سامان نہ تھا۔ قرب و جوار کی قوموں سے بقیمت خریدتے تھے یا بالجبر چھین لیتے تھے۔ شاید مدین کی صفت تجارت کا بنی اسرائیل کے اس واقعہ سے بھی تعلق ہو۔ تجارت پیشہ ہونے کی وجہ سے توحید عبادت سے روگردانی کا فساد سب سے زیادہ کاروبار میں نمایاں ہوا۔ انہوں نے ناپ تول میں کمی کرنے کو اپنا پیشہ ورانہ ہنر بنا لیا۔ اس فن کے ایک سے ایک ماہر ان میں پیدا ہو گئے اور کسی میں اس کا احساس بھی باقی نہ رہا کہ یہ ترقی اور کامرانی کی راہ نہیں بلکہ بگاڑ کی راہ ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو اس کی اصلاح کی دعوت دی۔ قرآن میں سورہ اعراف میں ان کے اس طرز عمل کو ملک میں فساد قرار دیا ہے۔ ولا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا۔ اس میں بعد اصلاحھا کی تعبیر بتا رہی ہے کہ کاروبار کی ترقی کی وجہ سے ملک میں خوشحالی تھی۔ چونکہ جہاں یہ رہتے تھے۔ یعنی خلیج عقبہ کے کنارے۔ چونکہ یہ جگہ شام، افریقہ اور عرب کے تجارتی قافلوں کا نقطۂ اتصال تھی۔ اس لیے اشیاء تجارت کے مبادلہ کی بڑی منڈی بن گئی تھی اور لوگ خوشحال ہو گئے تھے۔ اسی خوشحالی کو آگے آیت میں حضرت شعیب علیہ السلام نے علی رؤس الاشہاد فرمایا ہے۔

(۱۰۱) خوشحالی سے بدحالی کا انقلاب

میں تمہیں خوشحال دیکھ رہا ہوں۔ مجھے اندیشہ ہے کہ تم پر عذاب کا ایسا دن نہ آجائے جو تم سب پر

چھا جائے یعنی اللہ سبحانہٗ نے فراغت اور آسودگی عطا فرمائی تو ڈرتے رہو کہیں نافرمانی سے چھن نہ جائے اور آسائش وخوشحالی سلب ہو کر دینوی و اُخروی عذاب نہ مسلط کر دیا جائے ۔[1] اس کا مطلب یہ ہے کہ مدین قوم تجارت میں ترقی کی وجہ سے بہت زیادہ خوشحال تھی ۔قرآن نے بتایا ہے کہ صرف خوشحالی نہ تھی بلکہ اس خوشحالی کی وجہ سے ان کی عددی طاقت بھی زیادہ ہو گئی تھی ۔حضرت شعیب علیہ السلام کی تقریر کا یہ جملہ اگر ایک طرف حال کا نقشہ پیش کر رہا ہے کہ اس وقت اللہ نے تمہیں بہت کچھ دے رکھا ہے لہذا کفران نعمت سے بچو مقصد یہ ہے کہ اس وقت جو تمہیں رفاہیت اور خوشحالی حاصل ہے اس کا نظری تقاضا یہ ہے کہ تم زیادہ سے زیادہ اپنے رب کے شکر گزار بندے بنو اللہ سبحانہٗ رفاہیت وخوشحالی بخشتا ہی اس کام کو اس لیے ہے کر دیکھے کہ وہ قوم اللہ سبحانہٗ کی شکر گزار بنتی ہے یا ناشکری کی راہ اختیار کرتی ہے ۔ اگر وہ دوسری راہ اختیار کرلیتی ہے تو یہی خوشحالی و رفاہیت اس کے لیے عذاب کا بہانہ بن جاتی ہے جو اس طرح گھیر لیتا ہے کہ کوئی اس کے گھیرے سے باہر نہیں آسکتا ۔

یہ آیت بتا رہی ہے کہ تجارت کی وجہ سے یہ قوم بہت زیادہ متمول اور خوشحال تھی یہ ایک بڑی تجارت پیشہ قوم تھی ۔ قدیم زمانے میں جو تجارتی شاہراہ بحر احمر کے کنارے یمن سے مکہ اور ینبع ہوتی ہوئی شام تک جاتی تھی اور ایک دوسری شاہراہ جو عراق سے مصر کی طرف جاتی تھی ۔ اس کے عین چوراہے پر اس قوم کی بستیاں تھیں ۔اسی بنا پر عرب کا بچہ بچہ مدین سے واقف تھا اور اس کے مٹ جانے کے بعد بھی عرب میں اس کی شہرت برقرار رہی ۔کیونکہ عربوں کے تجارتی قافلے مصر اور شام کی طرف جاتے ہوئے رات کو اس کے آثار قدیمہ سے گزرتے تھے ۔ اس وجہ سے یہ قوم اپنے زمانہ عروج میں بہت زیادہ متمول اور خوشحالی تھی ۔

(۱۰۲) کاروباری بددیانتی

اور اے میری قوم ناپ تول انصاف کے ساتھ پورا کرو اور لوگوں کو چیزوں میں گھاٹا نہ دو یعنی اب تک جو ظلم وعدوان کا معیار و قانون تھا ۔اس کی اصلاح کرو اور صرف ناپ تول میں نہیں بلکہ کسی چیز میں بھی لوگوں کے حقوق تلف نہ کرو ۔[2]

عام شارحین قرآن نے اس کی تشریح میں صرف خرید وفروخت میں کمی و بیشی کا ذکر کیا ہے ۔ لیکن

[1] افادات شیخ الاسلام

[2] افادات شیخ الاسلام

حقیقت یہ ہے کہ ان آیات سے صرف خرید و فروخت کی کمی و بیشی مراد نہیں ہے بلکہ بٹہ اور دیگر اصناف تجارت ممنوعہ مراد ہیں۔ جن کے ذریعے سے تاجر و صاحب معاملہ لوگوں کو انکے حق جائز سے ہمیشہ کم مالیت دیتے ہیں۔ اس رائے کی تائید شارحین قرآن کی کچھ روایات سے بھی ہوتی ہے ۔ مثلاً محمد بن کعب القرظی کہتے ہیں ۔

مجھے معلوم ہوا ہے کہ قوم شعیب کو بٹادن لینے کے جرم میں عذاب ہوا ۔ پھر مجھے قرآن میں یہ آیت ملی ۔ (طبری)

یا حضرت زید بن اسلم کہتے ہیں ۔

حضرت شعیب علیہ السلام ان کو بٹاون لینے سے روکتے تھے ۔

امام بغویؒ نے بھی معالم القرآن میں اس آیت کی تشریح میں ایک رائے یہ بھی نقل کی ہے ۔

کہتے ہیں کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے ان کو درہم و دینار میں بٹہ لینے میں منع کیا تھا اور کہا تھا یہ حرام ہے ۔

بٹاون کا یہ معاملہ حکومت کے مختلف سکوں میں عدم مساوات کی وجہ سے ہوتا ہے۔ مثلاً کویت کے دینار سے اگر پاکستانی روپیہ کوئی خریدنا چاہے تو ایک دینار کے معاوضہ میں ۷۰ روپے دینے پڑتے ہیں۔ اور بٹاون کا یہ بھاؤ ایک حال پر نہیں ٹھہرتا ۔ کبھی کبھی بجائے ۷۰ روپے کے ۸۰ روپے دینے پڑتے ہیں۔ کبھی کبھی یہ گھٹ کر بٹاون کا یہ قصہ پندرہ اور تیرہ روپے تک آجاتا ہے۔ جس سے یہ ثابت ہوتا ہے ۔ کہ بٹاون کی زیادتی اور کمی کا مدار صرف چاندی یا سونے کی کمی اور زیادتی پر مبنی نہیں بلکہ دو حکومتوں کے لیسے دو سکے جن کی چاندی اور جن کا سونا برابر ہوتا ہے۔ مختلف اسباب کی وجہ سے تبادلہ کے وقت بسا اوقات بٹاون ادا کرنا پڑتا ہے۔ ایک حکومت کی قلمرو دوسری حکومت کی قلمرو میں آمد و رفت رکھنے والوں کو بھی اور تجارتی کاروبار رکھنے والوں کو بھی بٹاون کے جھگڑوں کی وجہ سے شدید نقصانات اٹھانے پڑتے ہیں۔ بلکہ ایک ہی حکومت کے لیسے دو علاقے جہاں مختلف سکے رائج ہیں وہاں بھی بٹاون اور ایکسچینج کی یہ دشواریاں پائی جاتی ہیں۔ اسلام سے پہلے عربوں میں عام طور پر چیز ہی چیز خریدنے یعنی بارٹر کا طریقہ یا فقہ کی زبان میں مقایضہ کا دستور تھا ۔ اسلام یہ کہہ کر الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ سواء بسواء مثل بمثل بتدریج اس رواج کو گھٹانا چاہتا تھا ۔ جیسے اس ارشاد کا انسداد ربوٰ اور دولت کے اکتناز سے تعلق ہے۔ لیسے ہی اس ارشاد سے سکہ کی برابری بھی منطوقاً نہ سہی مدلولاً معلوم ہو رہی ہے ۔

مدت ہوئی یعنی ۱۹۲۵ء مصر کے مشہور رسالہ الہلال نے فروری کی اشاعت میں ایک مضمون شائع

کیا تھا۔ مضمون نگار نے مرحوم انجمن اقوام جنیوا کو یہ تجویز پیش کی تھی ۔

انجمن اقوام کی وجہ سے اس کا امکان پیدا ہو گیا ہے کہ کوئی ایسا اساسی اور بنیادی سکہ ایجاد کیا جائے جس پر دنیا کی قوموں کا اتفاق ہو جائے ۔

آگے چل کر اس کا مشورہ دیتے ہوئے کہ امریکہ کے ڈالر کو اساسی سکہ مان لیا جائے لکھا ہے . کہ

سکوں کے معیاری اختلافات کی وجہ سے جو کھیل کھیلے جا رہے ہیں ۔اس کے انسداد کی یہی ایک شکل ہے ۔کہ ڈالر کو ایک ہی سکہ مان لیا جائے تاکہ دنیا کی ساری قوموں میں ایک ہی معیار کے سکہ کا رواج ہو جائے ۔

اسی مضمون میں یہ بھی ہے کہ آج مختلف ممالک اور حکومتوں کے مختلف معیار والے سکوں کی وجہ سے حال یہ ہے ۔

یہ بات قطعاً نہیں بتائی جا سکتی ہے کہ بازار میں سکہ کا بھاؤ کل کیا ہوگا ۔

مثال دے کر یوں سمجھایا ہے ۔

ایک شخص فرانس میں کوئی مال لیتا ہے اور فرانک اور ڈالر دونوں کا حساب کر کے خیال کرتا ہے کہ وہ نفع میں رہے گا کیونکہ مال اس نے امریکہ میں نہیں خریدا ہے ۔لیکن ایک ہفتہ بھی اس مال کی خریداری پر گزرنے نہیں پاتا کہ اب جو دوسری دفعہ حساب کرتا ہے تو دیکھتا ہے کہ اس نے سخت غلطی کی بجائے امریکن بازار کے فرانسیسی بازار پر اس نے اعتماد کیا ۔

بہرحال کرنسی کے اس اختلاف کی وجہ سے دنیا جن مصائب کو بھگت رہی ہے اس کا حل اس کے سوا کچھ نہیں ہے کہ تمام سکوں کا وزن اور معیار ایک کر دیا جائے اپنی اس تجویز کا نام اس نے نظریہ توحید نقد اساسی رکھا ہے آخر میں مضمون کو ختم کر کے لکھا ہے کہ اگر اس پر اقوام عالم کا اتفاق ہو جائے تو

دنیا میں لین دین اور کاروبار کا سارے عالم میں ایک نظام ہو جائے گا اور اس کی وجہ سے تجارت میں آسانیاں پیدا ہو جائیں گی اور بہت سے خسارے جو بیچارے تاجروں کو صرافوں کے دلالوں کی وجہ سے اٹھانے پڑتے ہیں اس سے دنیا محفوظ ہو جائے گی ۔

یہ لکھنے کے بعد حضرت مولانا مناظر احسن گیلانی نے اسلامی معاشیات میں جو بات لکھی ہے ۔ وہ بھی سنانا چاہتا ہوں ۔فرماتے ہیں ۔

کیا یہ سارا مشورہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارک الذھب بالذھب والفضۃ بالفضۃ سواء بسواء مثلا بمثل کا ترجمہ نہیں ہے۔

خیر یہ تو ایک جملہ معترضہ تھا۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ مدین والے صرف خرید و فروخت میں کمی بیشی نہیں کرتے تھے بلکہ سود بٹہ کا بھی کاروبار کرتے تھے اور لوگوں کو بٹاون کے ذریعے گھاٹا دیتے تھے۔ چیزوں میں گھاٹا دینے کا مطلب یہی ہے کہ ان کو قیمت کم دے کر گھاٹا نہ دو۔

(۱۰۳) حضرت شعیبؑ کی دعوتِ اصلاح

ملک میں فساد پھیلاتے نہ پھرو یعنی شرک و کفر سے یا کم ناپنے اور تولنے سے یا دوسری طرح اتلاف حقوق اور ظلم و ستم کرکے زمین میں فساد مت مچاؤ۔ کہتے ہیں وہ لوگ ڈکیتی ڈالتے تھے۔ اور امانت میں خیانت کرتے تھے[1] عام شارحین قرآن نے ملک میں فسادی بن کر رہنے کا یہی مطلب بتایا ہے کہ یہ لوگ چونکہ تجارت پیشہ تھے اس لیے ان میں اخلاقی بگاڑ ناپ تول میں خیانت کی صورت میں ظاہر ہوا۔ لیکن یہ خیانت صرف ناپ تول ہی تک محدود نہ تھی بلکہ اس سے ان کا پورا نظام تمدن و تہذیب متاثر ہوا۔ قرآن میں اسی کی طرف لا تعثوا فی الارض مفسدین کہہ کر اشارا کیا ہے۔ یعنی ظالمانہ طرز عمل اختیار کرکے سیاسی نظام کو لوگوں کے اموال پر غاصبانہ قبضہ، لوٹ مار، چوری اور راہزنی کا ذریعہ نہ بناؤ۔ فواحش کا ارتکاب کرکے نظام اخلاق تباہ نہ کرو۔ فساد سے مراد صرف فساد افکار نہیں بلکہ اخلاق معیشت، معاش، معاشرت، سیاست اور قانون کا فساد بھی اس میں داخل ہے۔ سورہ اعراف میں تعبیر اس طرح ہے۔ لا تفسدوا فی الارض بعد اصلاحھا۔ بعد اصلاحھا کی قید فساد کی شناعت کو بتانے کے لیے ہے۔ یعنی ملک میں فساد کرنا بجائے خود بڑا جرم ہے لیکن یہ جرم سنگین سے سنگین تر ہو جاتا ہے جب یہ اصلاح کے بعد واقع ہو۔ اس لیے کہ یہ بگڑی ہوئی چیز کو بگاڑنا نہیں بلکہ بنی ہوئی چیز کو اور درست اور صالح کو بگاڑنا ہے مطلب یہ ہے کہ دین حق اور اخلاق صالحہ پر زندگی کا جو نظام انبیاء سابقین کی ہدایت و راہنمائی میں قائم ہو چکا تھا۔ اب تم اسے اپنے اعتقادی، اخلاقی، معاشی، معاشرتی اور قانونی گمراہیوں سے خراب نہ کرو۔ یہ تعبیر لا تعثوا فی الارض مفسدین مفاسد کی ساری قسموں اور صورتوں کو اپنے دامن میں سمیٹے ہوئے ہے۔ بلکہ بعض نت نئی اور ناقابل تصور شکلوں میں آج دنیا کے ملکوں میں ظاہر ہو رہا ہے۔ انہیں کون گن سکتا ہے معصوم بچوں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کو اُڑا اُڑا کر لے بھاگتا اور ان کی ماؤں اور باپوں کو یہ دھمکی دے کر بڑی بڑی رقمیں طلب کرتا کہ اگر روپیہ نہ دیا جائیگا تو ان کا بچہ ذبح کر دیا جائے گا فساد فی الارض کی ایک نوع ہے۔

یہاں پیر محمد کرم شاہ بڑی اچھی بات فرما گئے۔ آپ بھی استفادہ کر لیجئے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کا یہ خطبہ کتنا حکیمانہ اور مدلل ہے پہلے فرمایا کہ ناپ تول میں کمی نہ کیا کرو کیونکہ یہ گھٹیا حرکت تو وہ کرتے ہیں۔ جو نادار و غریب ہوں۔ لیکن انی ارٰکم بخیر تمہاری مالی حالت بہتر ہے۔ تم آسودہ حال ہو، کاروبار بڑے عروج پر ہے۔ اتنے متمول ہونے کے باوجود تمہارا ان رذیل ہتھکنڈوں کو استعمال کرنا تمہارے شایان شان نہیں۔ کس عمدہ طریق سے انہیں شرم دلائی جا رہی ہے اور اس فعل سے انہیں روکا جا رہا ہے۔ غیرت و حمیت کو مہمیز لگانے کے ساتھ ہی یہ بھی تنبیہ کر دی کہ تم یہ بھی سمجھتے ہو کہ تم اس چابکدستی سے ڈنڈی مارتے ہو کہ تم لوگوں کی سادہ لوحی اور ناتجربہ کاری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے زیادہ سے زیادہ نفع کما لو اور تھوڑی سی مدت میں امیر کبیر بن جاؤ اور تمہارا خیال ہے کہ تم نے بہت دولت اکٹھی کر لی تو امن و سلامتی اور راحت و شادمانی کا دور دورہ ہوگا۔ لیکن تمہارا یہ خیال درست نہیں ناجائز معاشی استحصال کا نتیجہ ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ اس سے آخر کار فتنہ و فساد کی آگ بھڑک اٹھتی ہے وہ لوگ جو تمہیں کمزور اور بے زبان نظر آ رہے ہیں اور جن کے متعلق تمہارا یہ نظریہ ہے کہ ان کے جسم سے جتنا بھی خون نکال لیا جائے یہ اُف تک نہیں کرتے اُن میں تو احتجاج کی سکت بھی نہیں لیکن جب ظلم و تشدد کی انتہا ہو جائے گی تو ان کے ہاتھ سے صبر کا دامن چھوٹ جائے گا اور پھر خاموشی ٹوٹ جائے گی۔ ان کی بے نور آنکھوں سے غیظ و غضب کے انگارے چھوٹیں گے۔ ان کی زبان شعلہ نوا بنے گی اور تمہارے عشرت کدوں اور تمہارے سامان تعیش کو جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گی۔ تم انہیں باغی کہو گے۔ فسادی اور فتنہ باز کہو گے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ اس فتنہ و فساد کے باعث تم ہو۔ سارا ایندھن تم نے فراہم کیا انہوں نے صرف آگ لگا دی۔ یہ ہلاکت خیز بم تم نے تیار کیا انہوں نے تو جوشِ انتقام میں صرف اس کا بٹن دبا دیا۔

معاشی میدان میں ناجائز وسائل سے نفع اندوزی کرنے والوں کو فسادی کہہ کر ایک تلخ لیکن ناقابل انکار حقیقت سے پردہ اٹھایا۔ آج ہر ملک میں بے چینی اور بے اطمینانی کا سیلاب امڈا چلا آ رہا ہے۔

(۱۰۴) قناعت کی تعلیم

اگر تم ایمان والے ہو تو اللہ کا دیا جو کچھ بچ رہے اس میں تمہارے لیے بہتری ہے ایک ایماندار آدمی کے لیے اللہ کا دیا ہوا جو ٹھیک ٹھیک حقوق ادا کر کے بچ رہے۔ اس کثیر سے بہتر ہے جو حرام طریقہ سے حاصل کیا جائے یا جس میں لوگوں کے حقوق مارے جائیں مال حلال میں جو ٹھیک ناپ تول کر لیا دیا جائے فی الحال

برکت ہوتی ہے اور خدا کے یہاں اجر ملتا ہے[1] عام شارحین قرآن نے یہی مطلب بتایا ہے کہ وہ مال جو جائز طریقہ سے کمایا جائے اس مال سے اچھا ہے جو ناجائز ذرائع سے حاصل ہو اس میں برکت ہوتی ہے اور انجام بہتر ہوتا ہے۔ امام مجاہدؒ بقیۃ سے طاعت مراد لیتے ہیں۔ امام ربیعؒ اللہ کی وصیت بتاتے ہیں۔ اور ابن زیدؒ اللہ کی رحمت کہتے ہیں۔ ابن عباسؓ اللہ کا رزق بتاتے ہیں حاصل سب کا ایک ہے۔ تاجر اگر ناپ تول میں ٹھیک ٹھیک عدل کو پیش نظر رکھے جھوٹ، فریب، ملاوٹ اور اس قسم کے دوسرے ہتھکنڈوں سے بچے۔ دوسروں کی ریس میں غلط راستے نہ اختیار کرے تو گو وہ اتنا زیادہ منافع نہ لوٹ سکے جتنا دوسروں نے جنہوں نے حلال وحرام کی تمیز اٹھا دی۔ لیکن اس کا حاصل کیا ہوا منافع برکت بھی ہے، اللہ کی طاعت بھی ہے، اللہ کی وصیت بھی اگرچہ وہ قلیل ہی ہو دوسروں کے کثیر سے ہزار درجہ افضل ہے۔ عام شارحین قرآن نے یہی مطلب بتایا ہے لیکن مولانا سید سلیمان ندویؒ نے جو بات ارض القرآن میں فرمائی ہے وہ بھی قابل توجہ ہے فرماتے ہیں۔

ان آیات میں مدین کے جن حالات کی طرف تلمیح ہے۔ چونکہ مدین کی تاریخ ہمارے مفسرین کے پیش نظر نہ تھی اس لیے بہت سے عقدے ناکشورہ رہ گئے۔ سب سے اول یہ کہ وہ اہل مدین و بنی اسرائیل کے باہمی واقعات و منازعات سے بجز واقعہ قرابت حضرت موسیٰ و شعیب علیہما السلام ناواقف ہیں۔ اس بنا پر ان آیات کی تفسیر میں ان واقعات کا وہ کوئی تعلق ظاہر نہیں کرتے حالانکہ ہماری رائے میں یہ آیات تمام تر ان ہی واقعات سے متعلق ہیں۔ یہ پہلے بتایا جاچکا ہے کہ مدین ایک تاجر قوم تھی اس بنا پر اس میں یہ مذموم صفت ہوگی جو حالات کے لحاظ سے بالکل مناسب ہے۔ بنی اسرائیل جب مصر سے حدود عرب میں داخل ہوئے تو ان کے پاس رسد کا کوئی سامان نہ تھا۔ قرب وجوار کی قوموں سے بقیمت خریدتے تھے اس خرید وفروخت میں وہ صرف کمی بیشی نہیں کرتے تھے بلکہ سود، بٹہ اور دیگر اصناف محرمہ کے بھی مرتکب تھے۔

عموماً مفسرین تا آنکہ امام رازی بھی فتنہ وفساد سے کفر مراد لیتے ہیں حالانکہ اس سے بعد صلح وامان، بنی اسرائیل کے ساتھ مخالفت ومنازعت اور سازش وخونریزی ہے اور بقیہ کا مطلب بھی ہمارے مفسرین یہ بتاتے ہیں کہ حرام کے بعد جو حلال چیزیں باقی رہ گئی ہیں وہ تمہارے لیے کافی ہیں حرام کی طلب کیوں کرتے ہو لیکن اس صورت میں اول آیت لاتعثوا فی الارض الخ کا بقیۃ اللہ الخ سے تعلق کیا رہے گا۔ ملک میں فساد نہ کرو حلال چیزیں باقی تمہارے لیے کافی ہیں۔ ملک میں فساد اور حلال چیزوں پر قناعت دونوں بے ربط باتیں ہو جاتی ہیں۔
ہمارے نزدیک مدین کی تاریخ کو پیش نظر رکھ کر مطلب نہایت صاف اور واضح ہو جاتا ہے اہل مدین چاہتے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تھے کہ بنی اسرائیل نے مصر سے آکر ملک کا جو حصہ لے لیا ہے واپس لے لیں حضرت شعیب علیہ السلام فرماتے ہیں کہ فتنہ و فساد سے فائدہ نہیں خدا نے جو کچھ باقی رکھا ہے ۔ یہی تمہارے لیے بہتر ہے۔ جنگ کی غرضیں دو تھیں ۔

ایک یہ کہ اپنے دیوتا بعل فعور کی اہانت کا انتقام اسرائیل کے خدا کا مقابلہ ۔

دوسرے یہ کہ جن راہوں سے بھی ہو چاہے وہ حرام ہی ہوں بنی اسرائیل سے ملک و دولت کی واپسی ۔

⑩⑤ میں تمہارا نگران نہیں

اور دیکھو میرا کام پیغام پہنچانا ہے ۔ میں تمہارا رکھوالا نہیں ہوں یعنی میں نے تم کو نصیحت کر دی آگے اس کا ذمہ دار نہیں کہ تم سے زبردستی عمل کرا کے چھوڑوں[1] یعنی میں نے نیک و بد تمہیں اچھی طرح سمجھا دیا ہے اور یہی میری ذمہ داری تھی مانو گے تو اس میں تمہارا فائدہ ہے نہ مانو گے تو تم بھی اس کا انجام بھی دیکھ لو گے ۔ دیکھو مجھے اس سے کوئی نقصان نہ پہنچے گا ۔ میں تو صرف تمہیں اس کے نتائج سے خبردار کرنے والا ہوں ۔ تم پر نگران نہیں ہوں ۔ میرا تم پر کوئی زور نہیں ہے ۔ میں تو صرف ایک خیر خواہ ناصح ہوں ۔ زیادہ سے زیادہ اتنا ہی کر سکتا ہوں کہ تمہیں سمجھا دوں ۔ آگے تمہیں اختیار رہے چاہے مانو چاہے نہ مانو ۔ سوال میری بازپرس سے ڈرنے نہ ڈرنے کا نہیں ہے اصل چیز اللہ سبحانہٗ کی بازپرس ہے ۔ جس کا اگر تمہیں کچھ خوف ہو تو اپنی ان حرکتوں سے باز آجاؤ ۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قَالُوْا

يٰشُعَيْبُ اَصَلٰوتُكَ تَاْمُرُكَ اَنْ نَّتْرُكَ مَا يَعْبُدُ اٰبَآؤُنَآ اَوْ اَنْ
نَّفْعَلَ فِيْٓ اَمْوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا ؕ اِنَّكَ لَاَنْتَ الْحَلِيْمُ الرَّشِيْدُ ﴿۸۷﴾
قَالَ يٰقَوْمِ اَرَءَيْتُمْ اِنْ كُنْتُ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّيْ وَرَزَقَنِيْ
مِنْهُ رِزْقًا حَسَنًا ؕ وَمَآ اُرِيْدُ اَنْ اُخَالِفَكُمْ اِلٰى مَآ اَنْهٰىكُمْ عَنْهُ ؕ
اِنْ اُرِيْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ؕ وَمَا تَوْفِيْقِيْٓ اِلَّا بِاللّٰهِ ؕ
عَلَيْهِ تَوَكَّلْتُ وَاِلَيْهِ اُنِيْبُ ﴿۸۸﴾ وَيٰقَوْمِ لَا يَجْرِمَنَّكُمْ شِقَاقِيْٓ
اَنْ يُّصِيْبَكُمْ مِّثْلُ مَآ اَصَابَ قَوْمَ نُوْحٍ اَوْ قَوْمَ هُوْدٍ اَوْ
قَوْمَ صٰلِحٍ ؕ وَمَا قَوْمُ لُوْطٍ مِّنْكُمْ بِبَعِيْدٍ ﴿۸۹﴾ وَاسْتَغْفِرُوْا رَبَّكُمْ
ثُمَّ تُوْبُوْٓا اِلَيْهِ ؕ اِنَّ رَبِّيْ رَحِيْمٌ وَّدُوْدٌ ﴿۹۰﴾

قوم مدین نے کہا کہ اے شعیب ؑ کیا تیری نماز تجھے حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں سے عابدانہ تعلقات نہ رکھیں جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ اور ہم اپنے مالیاتی مسائل میں اپنی مرضی سے تصرف کرنا چھوڑ دیں۔ بلاشبہ تم تو بہت ہی بھولے بھالے اور راست باز ہو۔ حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا

کہ اے میری قوم کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے رب کی جانب سے واضح دلیل لے کر آیا ہوں اور اس نے مجھے اچھی روزی سے نوازا اور میں نہیں چاہتا ہوں کہ جس بات سے تم کو روکوں خود اس کے خلاف کروں ۸ میں تو صرف اپنی بساط کے مطابق تمہاری اصلاح چاہتا ہوں اور میرا یہ کام صرف اللہ کی توفیق سے ہوتا ہے۔ میرا بس اسی پر بھروسہ ہے اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں ۸۸ اے میری قوم میری مخالفت تمہیں ایسا نہ بنا دے کہ تم پر بھی قوم نوحؑ، قوم ہود، اور قوم صالح علیہم السلام کی افتاد کا سبق دہرایا جائے اور قوم لوط کا معاملہ تو تم سے زیادہ دور نہیں ہے ۸۹ اور تم اللہ سبحانہٗ کی جناب میں اپنے گزشتہ گناہوں کی معافی مانگ لو اور آئندہ کے لیے اللہ کی طرف پلٹ آؤ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت کار اور شفقت والا ہے ۹۰

مقاصد کی تکمیل کے لیے اللہ سبحانہٗ کی عبادت

اللہ سبحانہٗ کی عبادت مقصد تخلیق کی تکمیل کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا اس کے وجود کی بقا کے لیے غذا، پانی، ہوا ضروری ہے۔ لیکن اللہ سبحانہٗ کی عبادت کے کچھ متضمنات ہیں۔ جو اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ الوہیت کا ہر تصور اپنے ساتھ خیر و شر کا ایک خاص معیار اور اخلاقی اقدار کا ایک متعین نظام پیدا کرتا ہے۔ اور واقعہ یہ ہے۔ کہ اللہ سبحانہٗ کے الٰہ ہونے کا اعتقاد بے معنے ہے۔ اگر اس کی خوشنودی اور ناخوشی، اس کی

رحمت اور اس کے غضب کے اصول انسان پر واضح نہ ہوں۔ جس اللہ سبحانہٗ کی پسند اور ناپسندیدگی، جس کی خوشی اور ناخوشی کا کوئی اصول ومعیار نہ ہو۔ جس کے متعلق انسان یہ علم نہ رکھتا ہو۔ کہ وہ کس قسم کے اعمال سے خوش ہوکر انعام دیتا ہے اور کون سا اس کے غیظ وغضب کا موجب ہوتا ہے کہ اس کی طرف سے دلوں میں خوف ومحبت اور بیم ورجا کے جذبات کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں۔ اسی لیے اللہ سبحانہٗ کی الوہیت کا اعتقاد خیر وشر کا ایک مستقل معیار وجود میں لاتا ہے۔ اس لیے ہم اس نتیجے تک پہنچنے پر مجبور ہیں۔ کہ عبادت کا نظام الٰہی اساس پر مبنی ہوتا ہے۔ کیونکہ اللہ سبحانہٗ کی پسند اور ناپسندیدگی اور اس کی خوشنودی یا ناراضی کے اسباب کا علم انسان کو صرف نبوّت کے ذریعے حاصل ہوسکتا ہے۔ ان کنتم مؤمنین کی تعبیر بتا رہی ہے کہ مردم شماری کے مسلمان ہیں مادیت پہن کر نبوّت کی تعلیم سے اتنے بے خبر ہوچکے ہیں کہ اب ان کو یہ احساس بھی نہیں رہا۔ کہ اللہ کو ماننے کے تقاضے کیا ہیں۔ دو باتوں کا ان کے خیال میں ایمان سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

ایک یہ کہ ایک اللہ سبحانہٗ کی عبادت کے ساتھ کسی اور کی عبادت نہ کی جائے دوسری یہ کہ ہمارے مالیاتی معاملات پر بھی ہماری رضا اور ارادے کو کوئی دخل نہیں ہے۔ اور اس پر بھی کوئی قدغن ہے اس لیے وہ طنزاً کہتے ہیں کہ تمہاری نماز پڑھنے کا نتیجہ یہ کیوں ہے کہ ہمیں بھی اپنی راہ پر چلنے کی دعوت دیتے ہو۔ یعنی بنار نزاع نماز نہیں بلکہ یہ ہے کہ تم دوسروں کو کیوں دعوت دیتے ہو۔ یعنی اگر حضرت شعیب علیہ السلام ان کی آبائی رسوم عبادت اور ان کے مالیاتی معاملات پر حلال وحرام، جائز وناجائز کی بات نہ کریں تو ان کو ان کی نماز پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔

(۱۰۶) قوم مدین نے کہا اے شعیبؑ کیا تیری نماز تجھے یہ حکم دیتی ہے کہ ہم ان معبودوں سے عابدانہ تعلقات نہ رکھیں جن کی ہمارے باپ دادا عبادت کرتے تھے۔ اور ہم اپنے مالیاتی مسائل میں اپنی مرضی سے تصرف کرنا چھوڑ دیں بلاشبہ تم تو بہت ہی بھولے بھالے راست باز ہو۔ یہ بطور استہزاء وتمسخر کہہ رہے تھے۔ کہ بس زیادہ بزرگ بنے بیٹھے ہو۔ کیا ساری قوم میں ایک تم ہی بڑے عقلمند، باوقار، نیک چلن رہ گئے ہو۔ باقی سب ہم اور ہمارے بزرگ سب جاہل اور احمق ہی رہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام نماز کثرت سے پڑھتے تھے۔ رہتے لگے کہ شاید آپ کی نماز یہ حکم دیتی ہے۔ کہ ہم سے باپ دادا کا دین چھڑا دیں اور ہمارے اموال میں ہمارا مالکانہ اختیار نہ رہنے دیں۔ بس آپ اپنی نماز پڑھے جائیے۔ ہمارے مذہبی اور دنیاوی معاملات اور ناپ تول کے قصوں میں دخل نہ دیجئے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں" جاہلوں کا دستور ہے کہ نیکی کے کام آپ نہ کر سکیں تو انہی کو چڑانے لگے۔ یہ ہی خصلت ہے کفر کی۔ بعض مفسرین نے انک لانت الحلیم الرشید

کو استہزاء پر نہیں بلکہ واقعیت پر محمول کیا ہے ۔ یعنی تو ایک سمجھدار، باوقار اور نیک چلن آدمی ہے ۔ پھر ایسی بے موقع باتیں کیوں کرنے لگا ۔ جیسے صالح علیہ السلام کو کہا تھا ۔ قد کنت مرجوًّا قبل هذا اتنهانا ان نعبد ما یعبد آباء نا الخ [1] ۔

فی الواقع اکثر شارحین قرآن نے اسے استہزار تکلم، تعریض، طنز ہی پر محمول کیا ہے ۔ مگر قرآن کا سیاق و سباق اس کا ساتھ نہیں دیتا ہے ۔ اسی لیے کچھ شارحین نے عام شاہراہ سے ہٹ کر اسے واقعہ اور حقیقت قرار دیا ہے ۔ غالباً جن بزرگوں نے اسے طنز و تعریض قرار دیا ہے ۔ ان کی رائے میں حضرت شعیب علیہ السلام کے مخاطب ناخدا شناس اور منکرین حق ہیں ۔ حالانکہ ایسا نہیں ہے ۔ وہ خدا شناس ہیں اور حق کو مانتے ہیں لیکن علوم نبوّت سے ناآشنا ہونے کی وجہ سے مادی زندگی میں پھنسے ہوئے ہیں ۔ ان کنتم مؤمنین ۔ اس کا قرینہ ہے ۔ یعنی اخلاقی اور اعتقادی فساد میں مبتلا ہونے کے باوجود ان کے اندر نہ صرف ایمان کا دعویٰ تھا بلکہ اس پر انہیں فخر بھی تھا ۔ اسی لیے حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا کہ اگر تم مؤمن ہو تو تمہارے نزدیک خیر اور بھلائی راستبازی اور دیانت میں ہونی چاہیئے اور تمہارا خیر و شر ان دنیا پرستوں سے مختلف ہونا چاہیئے جو خدا اور آخرت کو نہیں مانتے وہ حضرت شعیب علیہ السلام سے کہہ رہے ہیں کہ بلاشبہ آپ راستباز اور عالی ظرف ہیں ۔ اس میں کوئی شبہ نہیں اور یہ ایک بے غبار حقیقت ہے ۔ جملہ انك لانت الحليم الرشيد پر غور فرمایئے ۔ کتنی تاکیدیں جمع کی گئی ہیں ۔ پہلے ان لائے پھر لام تاکید لائے پھر خبر کو معرفہ لا کر قصر پیدا کیا یعنی وقار، دانائی اور دیانت، راستبازی کا بلاشبہ صرف آپ کی ذات پوری قوم میں مرکز ہے ۔ اور آپ کی عابدانہ زندگی کا بھی ہمیں اعتراف ہے ۔ لیکن آپ کی عابدانہ زندگی آپ کو یہ بتا رہی ہے کہ آپ ہمیں بھی اپنے ہی جیسا بنالیں ۔ ہمیں آپ کی دیانت، آپ کی فراست، اور آپ کی عبادت کا انکار نہیں ۔ لیکن عبادت گزاری کا یہ مطلب کیوں ہے ؟ کہ آپ ہمیں بھی دعوت دیں ۔ یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی زندگی اور قوم کی زندگی کے باہمی اختلاف تفاوت کا ایک نمونہ ہے ۔ اس قسم کی باتیں وہ لوگ کیا کرتے ہیں جو خدا سے غافل اور فسق و فجور میں مبتلا ہوتے ہیں ۔ چونکہ نماز دینداری کا سب سے بڑا شاہکار ہے ۔ اس لیے وہ پوچھ رہے ہیں کہ نماز کا یہ مطلب کب ہے کہ ہمارے عابدانہ تعلقات اللہ کے سوا کسی سے نہ ہوں اور مالیاتی مسائل میں ہمیں اپنے منشار کے مطابق تصرف کرنے کا کوئی حق نہ ہو ۔ اس میں طنز اور تعریض اور استہزاء کی کون سی بات ہے ۔ یہ تو حقیقت اور واقعہ ہے اسی لیے علامہ قرطبی نے فرمایا ہے ۔۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اور اس سب سے اچھا اور جسے سیاق کی تائید حاصل ہے ۔ یہ ہے کہ جب تم عقلمند بھی ہو ، راست باز بھی ہو تو پھر ہم سے تم مطالبہ کیوں کرتے ہو کہ ہم اپنے باپ دادا کے معبودوں کو چھوڑ دیں ۔ کیا تمہاری نماز تم سے یہ کہہ رہی ہے ۔ استفہام انکاری ہے یعنی نماز تو یہ کام نہیں کرتی پھر خبر نہیں تم ہم سے یہ کیوں کہہ رہے ہو ۔

قوم مدین کے معبود

تورات بتاتی ہے کہ مدین بعل دیوتا کو پوجتے تھے ۔ اس دیوتا کا ذکر حضرت الیاس ؑ کے تعلق سے بھی قرآن میں آیا ہے ۔ شارحین قرآن نے عکرمہؓ ، مجاہدؒ ، اور قتادہؓ کے حوالہ سے بتایا ہے کہ بعل یمن کی زبان میں آقا ، مالک کو کہتے ہیں ، اسی لیے عربی میں شوہر کو بعل کہتے ہیں ۔ یہ صرف یمن کی زبان ہی کا لفظ نہیں بلکہ واقعہ یہ ہے کہ یہ لفظ تمام سامی زبانوں میں پایا جاتا ہے اور بعل اکثر مشرقی سامی قوموں میں پوجا جاتا تھا ۔ بعلبک ملک شام کا ایک مشہور قدیم شہر ہے ۔ جو اسی بعل دیوتا کی طرف منسوب ہے ۔ روایتوں میں ہے کہ یہ دیوتا سونے کا تھا ، چودہ ہاتھ لمبا تھا اور اس کے چار منہ تھے ۔ تورات میں اس کے تین نام آئے ہیں ۔ بعل ، بعل فغور اور بعل بریت ۔ بعل کے لیے مذبح ، قربان گاہ اور ہیکل بنتے تھے ۔ لوبان اور دیگر بخورات ان میں جلائے جاتے تھے ۔ اولاد کو اس کی خاطر آگ میں ڈال دیا جاتا تھا اور یہ بہترین قربانی سمجھی جاتی تھی ۔ بعل کی پوجا کے لیے خاص قسم کے برتن اور ظروف ہوتے تھے سامی قوموں میں اور مدین کے ہمسایوں میں بعل کی پوجا کی یہی رسوم تھیں ۔ غالباً مدین میں بھی رسوم عبادت ہوں گی ۔

مستشرقین یورپ کی تحقیق کے مطابق بعل ستارہ زحل کا نام تھا ۔ اس کی مدین میں پرستش کی جاتی تھی مدین اور مدین کے قریب موآب تھا ۔ مذہباً اور اخلاقاً دونوں قوموں کی بدترین حالت تھی ۔ تمدن کے جراثیم جن بیماریوں کو جنم دیتے ہیں ۔ وہ ایک ایک کرکے پیدا ہو چکے تھے ۔ بتوں کی پرستش اور ان کے لیے قربانی ان کا مذہب تھا ۔ تمام بتوں کا سردار بعل فغور تھا ۔ اخلاقی حالت اس قدر پست تھی کہ شرفاء خاندان کی لڑکیاں انسانیت کا بدترین نمونہ تھیں مردوں کا یہ حال تھا کہ ظلم و ستمگری ان کی زندگی کا معمولی پیشہ تھا ۔

بنی اسرائیل مصر سے نکل کر موآب و مدین کے میدانوں میں خیمہ زن تھے ۔ ان بدکاروں نے بنی اسرائیل کے لیے سازشوں کا جال پھیلایا ۔ عورتوں نے نوجوانان بنی اسرائیل کو جو اصل میں فوج کے سپاہی تھے اپنے قابو میں کر لیا ۔ ان حالات میں قوم مدین نے حضرت شعیب علیہ السلام کو مخاطب کرکے کہا کہ آپ ہیں تو بڑے زیرک ، عقلمند ، باوقار مگر یہ باتیں کیا کہہ رہے ہیں ۔ کہ ہم اپنے ان معبودوں سے عابدانہ تعلقات ختم کر دیں جن کی ہمارے باپ دادے

عبادت کرتے تھے۔ کیا آپ کی نماز آپ کی یہ راہنمائی کر رہی ہے۔ یہ بات اس وقت کہی جاتی ہے۔ جب عام زندگی اللہ سبحانہٗ سے غافل اور فسق و فجور میں مبتلا ہو جائے چونکہ نماز دینداری کا سب سے بڑا شاہکار ہے اور نماز پر مبنی دینداری کی عمارت کو فاسق و فاجر لوگ اپنی بدکار زندگی کے لیے سب سے زیادہ خطرہ محسوس کرتے ہیں فی الواقع نمازی کی نماز کا اولین مطالبہ یہ ہے کہ سوسائٹی کی برائیوں پر کھلی تنقید کرے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی نگاہ صرف پرستش کی حد تک ان کے مشرکانہ کردار پر ہی نہ تھی بلکہ بندگی کی حدود میں ان کی نظر ان تمام برائیوں پر جو تمدن، معاشرت، معیشت اور سیاست غرض زندگی کے تمام گوشوں میں پھیلی ہوئی تھیں۔ انہوں نے مدین قوم کے مالیاتی مسائل پر بھرپور تنقید کی اور بتایا کہ ناپ تول کی بے ایمانی سے خیر و برکت جاتی رہتی ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ بازار میں ایسے لوگوں کی جو ناپ تول میں کمی بیشی کرتے رہتے ہیں ساکھ جاتی رہتی ہے اور یہ بالآخر ان کے بیوپار کی تباہی کا باعث بن جاتا ہے۔ یہ چاہتے تو یہ ہیں کہ اس بے ایمانی سے کچھ اپنا سرمایہ اور نفع بڑھا لیں گے مگر ہوتا یہ ہے کہ ان کی یہ اخلاقی برائی ان کی اقتصادی اور معاشی بربادی کا پیش خیمہ ثابت ہو جاتی ہے۔ اسی کو حضرت شعیبؑ نے انی اخاف علیکم عذاب یوم محیط۔ مگر نشہ میں مخمور قوم مدین نے بجائے اس کے کہ اس سے باز آئے حضرت شعیب علیہ السلام سے کہا کہ کیا آپ کی نماز ہمیں اپنے مالیاتی مسائل میں اپنی چاہت اور مرضی کے مطابق تصرف سے روکتی ہے۔ ان نفعل فی اموالنا ما نشاء۔ یہ خرید و فروخت میں کمی بیشی کرکے لوگوں کو دھوکہ دیتے ہیں۔ یہ سود اور سٹے کے ذریعے تاجروں کو ان کے جائز حق سے محروم کرتے تھے۔

حضرت زید بن اسلمؓ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں۔

حضرت زید بن اسلمؓ آیت اصلاتک الخ کی تشریح میں فرماتے ہیں۔ کہ حضرت شعیبؑ ان کو ان کے بٹاون میں سے روکتے تھے۔

(۱۰۷) اللہ سبحانہٗ کی روشن دلیل

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا کہ اے میری قوم کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ اگر میں اپنے رب کی جانب سے واضح دلیل لے کر آیا ہوں اور اس نے مجھے اچھی روزی سے نوازا ہو۔ یا ظاہری روزی مراد ہے۔ یعنی ناپ تول میں کمی بیشی کے بغیر حلال و طیب طریق سے روزی عطا فرمائی یا باطنی روزی یعنی علم و حکمت اور نبوت عطا کی۔ خلاصہ یہ ہے کہ اگر حق تعالیٰ نے مجھ کو فہم و بصیرت دے کر وہ صاف راستہ دکھلا دیا جو تم کو نظر نہیں آتا اور اس دولت سے مالا مال کیا جس سے تمہیں حصہ نہیں ملا۔ تو کیا اس کا حق یہ ہے کہ میں معاذ اللہ تمہاری طرح اندھا ہو جاؤں اور خدا کے احکام سے روگردانی کرنے لگوں یا تمہارے استہزاء و تمسخر سے گھبرا کر نصیحت کرنا

اور سمجھانا چھوڑ دوں ہرگز نہیں [1]

یہ حضرت شعیب علیہ السلام کی جانب سے قوم کو جواب ہے ان کنت علی بینۃ الخ کی شرط ہے اور اس کا جواب محذوف ہے۔ پوری بات یوں ہے۔ لوگو! تمہاری کیا رائے ہے اگر میں فی الواقع اللہ کا رسول ہوں تو کیا میرے لیے اس کی گنجائش ہے کہ میں تمہیں غیر اللہ کی عبادت سے نہ روکوں اور گناہوں سے باز رہنے کی تلقین نہ کروں جبکہ تم مان رہے ہو کہ میں ہمیشہ سے تمہاری راہنمائی کا کام کر رہا ہوں اور حلم و وقار کا حامل ہوں۔ تم فوری انصاف کرو کہ اگر میں تمہارے لیے ارشاد کا کام نہ کروں تو اور کیا کروں۔ نبوت کا مقصد ہی یہ ہوتا ہے۔ اور پھر جبکہ صورت حال یہ ہے کہ اللہ سبحانہ نے مجھے دولت سے مالا مال کیا ہوا ہے۔ اور یہ مال و دولت مجھے راہ حلال سے ملی ہے۔ جن لوگوں نے پہلی آیت میں معنے مجازی لے کر آیت کو تعریض بتایا ہے۔ انہوں نے اس کے معنے نبوت اور علم حق کے کیئے ہیں۔ اور جن لوگوں نے آیت میں معنے حقیقی لیے ہیں۔ وہ رزق حسن سے وہی معنی مراد لیتے ہیں جو بالعموم اس لفظ سے سمجھے جاتے ہیں۔ قاضی بیضاویؒ نے بھی یہی معنے لیے ہیں۔ اور علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں۔

یہ ایک بے غبار حقیقت ہے کہ موقع و مقام کے مناسب یہی ہے کہ رزق حسن سے مراد وہ مال ہے جو اللہ سبحانہ نے ان کو دیا ہے۔

حضرت عبد اللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں۔ کہ شعیب علیہ السلام کثیر المال تھے۔ مطلب یہ ہے کہ میں اللہ کا رسول ہونے کے ساتھ کثیر المال بھی ہوں۔ دولت کی فراوانی کا اللہ کی جانب سے انعام یہی ہے۔ اب میرے لیے یہ کیوں کر ممکن ہے کہ جان بوجھ کر ان گمراہیوں اور بد اخلاقیوں میں تمہارا ساتھ دوں۔ جن میں تم مبتلا ہو۔ حضرت شعیبؑ نے ان کی بے رخی دیکھ کر یہ بات فرمائی۔ کہ تم مجھ سے بلا وجہ ناراض ہو رہے ہو۔ تمہیں شاید یہ غلط فہمی ہو گئی ہے کہ میں تمہاری دولت اور خوشحالی پر حسد کر رہا ہوں تمہارا یہ خیال غلط ہے مجھے تمہاری خوشحالی پر حسد کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ میں کوئی مفلس و نادار تو نہیں ہوں کہ تمہاری دولت کو دیکھ کر حسد کروں۔ مجھے اللہ سبحانہ نے اپنی رحمت کے خزانوں سے مالا مال کیا ہے۔

(۱۰۸) نبوت کی بے داغ زندگی

اور نہیں چاہتا ہوں کہ جس بات سے تمہیں روکوں خود اس کے خلاف کروں یعنی جن بری باتوں سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تم کو روکتا ہوں میری یہ خواہش نہیں ہے کہ تم سے علیحدہ ہو کر اس کا خود ارتکاب کروں ۔ مثلاً تمہیں تارک الدنیا بناؤں اور خود دنیا سمیٹ کر گھر بھرلوں ۔ میں جو نصیحت تم کو کرتا ہوں ۔ میں تم سے پہلے خود اس کا پابند ہوں تم یہ الزام مجھ پر نہیں رکھ سکتے کہ میری نصیحت کسی خود غرضی اور ہوا پرستی پر محمول ہے[1] بات تو اونچی ہے مگر شیخ الاسلام کا انداز تعبیر کچھ انوکھا سا ہے ۔ جن باتوں سے تم کو روکتا ہوں میری یہ خواہش نہیں کہ اس کا خود ارتکاب کروں مثلاً تمہیں تو تارک دنیا بناؤں اور خود دنیا سمیٹوں ۔ اسی بات کو اگر یوں کہہ دیا جاتا کہ تم کو مال حرام کھانے سے روکوں اور خود سرمایہ دار ہونے کی وجہ سے کاروبار میں بے ایمانیاں کروں ۔ تو بلا شبہ تم کہہ سکتے تھے کہ میں خود غرض ہوں ۔ تو اس میں کوئی وزن ہوتا ۔ شیخ الاسلام کی تعبیر سے محسوس ہوتا ہے کہ نبوت لوگوں کو تارک الدنیا بنانے آئی ہے ۔ حالانکہ صورت حال یہ نہیں ہے ۔ یہ نبوت کا قرآنی تصور نہیں اشتراقی تصور ہے اور اس تصور کا بنیادی تقاضا یہ ہے کہ انسان دنیا کو مایا کا جال سمجھ کر اس سے دور بھاگے ۔ اجتماعیت کا تصور تک اس پر بار ہو ۔ زندگی کے مسائل پر اک نگاہ غلط انداز ڈالنا بھی اس کے لیے گوارا نہ ہو ۔ بستیوں سے اسے وحشت اور وحشت کدوں سے اُنس ہو ۔ مادی رشتوں کو ، مادی ضرورتوں اور مادی خواہشوں کو سرتا سر شیطنت تصور کرے ۔ ایک ایک دنیوی نعمت کو اپنے لیے حرام قرار دے لے ۔ فلاطینوس صاف لفظوں میں لکھتا ہے ۔

> جب روح وجدان کی منزل میں پہنچتی ہے تو عالم معقولات کا تصور کرتی ہے لیکن جب اسے خدا کا شعور حاصل ہوتا ہے ۔ تو وہ ہر چیز ترک کر دیتی ہے ۔ (تاریخ تصوف قبل از اسلام) ص۶۳

اور یہ کہ

> حقیقی سعادت و فلاح تو صرف ان بندشوں سے مکمل آزادی سے حاصل ہو سکتی ہے ۔ ان میں تبدیلی سے نہیں آپ زنجیروں کو نرم اور ملائم کر دیں لیکن اس سے زنجیروں کی ماہیت نہیں بدل سکتی ۔ ۶۹

عرفانی حکما ، تو اس انداز فکر کے منطقی تقاضوں کی انتہا ر تک پہنچ گئے تھے ان کا کہنا یہ تھا کہ

> انسان کی روحانیت کی بہترین دلیل یہ ہے کہ وہ اس مادی دنیا سے مکمل بیزاری اور نفرت کا اظہار کرے ۔ ۶۷

---

[1] افادات شیخ الاسلام

قرآن اور ترکِ دُنیا

اس کے برعکس قرآن کا تصور یہ ہے کہ انسان دنیا کو اپنی دینی زندگی کے لیے قابل اجتناب نہ سمجھے مادے کو اپنی روح کا قفس گمان نہ کرے۔ اپنی جبلی ضرورتوں اور خواہشوں کی تکمیل کو خدا پرستی کی راہ کی آفت نہ خیال کرے دو لفظوں میں یہ کہ مسائل زندگی سے کنارہ کش ہو رہنے دنیا چھوڑ دینے اور اللہ کو پا لینے کے لیے گوشوں میں بیٹھ رہنے کی وہ روش اختیار نہ کرے جسے رہبانیت کہا گیا ہے۔ اس کے برعکس اسے چاہیئے کہ مسائل حیات سے پوری طرح متعلق رہے۔ متاہل اور متمدن زندگی گزارے اپنی ایک ایک فطری قوت کو زندہ و کارفرما رکھے۔ اپنے جبلی مطالبات کو قانون کی حدود میں پورا کرتا رہے۔ غرض آبادی سے جنگلوں کی طرف نہیں بلکہ جنگلوں سے آبادی کی طرف آئے۔ اور یہ سب کچھ دینداری کا کام اور دین کا مطالبہ سمجھ کر کرے اپنے فریضۂ حیات کی ادائیگی کے لیے ضروری سمجھ کر کرے۔ دینی ذوق کے ساتھ کرے اور اس یقین کے ساتھ کرے کہ اس کے خلاف کرنے میں دینداری کا نقص ہے۔ کمال بندگی سے محرومی ہے عتاب الٰہی کا اندیشہ ہے۔

قرآن کی اس آیت میں حضرت شعیب علیہ السلام کا جواب بتا رہا ہے کہ تمول و مالداری، منصب، رسالت اور مقام نبوّت کے منافی نہیں ہے۔ پھر مقام ولایت کے کیسے منافی ہو سکتی ہے۔ شیخ الاسلام بہاء الدین ذکریا بن وجیہ الدین ابو محمد ملتانی جن کی ولایت کے موضوع پر اُمت میں کبھی دو رائیں نہیں ہوئی ہیں۔ ان کے متعلق لکھا ہے منحہٗ اللہ اموالاً غزیرۃً۔ سرمایہ اور دولت اللہ کی جانب سے بڑی فراوانی سے ملا تھا۔ بہت زیادہ سرمایہ کے مالک تھے۔ شاید آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھرے کہ کتنا مال اور کس قدر دولت ان کو ملی تھی۔ لکھا ہے کہ جب ان کا انتقال ہوا تو وارثوں میں انہوں نے سات بیٹے اور کچھ بیٹیاں چھوڑی تھیں۔ جب ان کی میراث تقسیم ہوئی۔ تو گھروں اور گھروں کے سامان کو چھوڑ کر جو نقدی ان میں تقسیم ہوئی۔ وہ کس قدر تھی بتانے والوں نے بتایا ہے کہ ایک صاحبزادے کو صرف ستر لاکھ دینار ملے تھے یعنی ساتوں لڑکوں کو چار کروڑ نوے لاکھ ملے تھے۔ لڑکیاں الگ ہیں۔

قرآن دنیا سے نہیں دنیا کے غلط استعمال سے روکتا ہے۔ دنیا کے غلط استعمال کو دیکھ کر دنیا ہی کو ترک کرنا صحیح نہیں۔ دنیا جب بھی غلط ہاتھوں میں ہوگی غلط ہوگی۔ اور جب بھی دنیا خدا شناس لوگوں کے ہاتھوں میں ہوگی تو اچھی ہوگی۔ آخر قرآن نے سلیمانؑ، داؤدؑ اور یوسف علیہم السلام کا بطور بادشاہ کے ذکر کیا ہے۔

(۱۰۹) دعوت میں داعی کا سرمایہ

میں تو صرف اپنی بساط کے مطابق تمہاری اصلاح چاہتا ہوں اور میرا کام صرف اللہ کی توفیق سے ہونا

ہے میرا بس اسی پر بھروسہ ہے اور میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں۔ میری تو تمام تر کوشش یہ ہے کہ تمہاری دینی اور دنیاوی حالت درست ہو جائے۔ موجودہ ردی حالت سے نکل کر بام ایمان و عرفان پر چڑھنے کی کوشش کرو۔ اس مقصد اصلاح کے سوا دوسرا کوئی مقصد نہیں جسے میں اپنے مقدور و استطاعت کے موافق کسی حال میں چھوڑ نہیں سکتا باقی یہ کہ میری بات بن آئے اور اپنی کوشش میں کامیاب ہو جاؤں یہ سب اللہ سبحانہ کے قبضہ میں ہے۔ اسی کی امداد توفیق سے سب کام انجام پا سکتے ہیں۔ میرا بھروسہ اسی پر ہے۔ اور ہر معاملہ میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہوں [۱] اس سے معلوم ہوا کہ اتباع کے لیے صرف یہی کافی نہیں ہے کہ آدمی خود متبع ہو جائے بلکہ ضروری ہے کہ دوسروں کو بھی اس کی دعوت دے۔ دوسروں کو دعوت دینے کے لیے ان آیات سے جو کچھ منطوقاً، مدلولاً اور مفہوماً معلوم ہو رہا ہے اس کا خلاصہ یہ ہے۔

اول یہ کہ جو دعوت کی ذمہ داری لے کر عوامی زندگی کو مخاطب بناتا ہے۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ دعوت کے حق ہونے کا اس دلائل کی قوت سے بھرپور یقین ہو ایسا یقین کہ کسی پہاڑ کا وزن بھی اس کے یقین میں جنبش نہ پیدا کرے۔ کنت علی بینة من ربی کا یہی منطوق ہے یعنی اس معاملہ میں میرا موقف سرتاسر بصیرت ہے بینة کے معنے روشن دلیل اور واضح حجت کے ہیں۔ یہ روشن دلیل اذعان و یقین کا سرمایہ ہوتی ہے۔

دوم یہ آیت بتا رہی ہے کہ داعی اپنی معاشی زندگی میں اپنے مخاطبوں کا دست نگر نہیں ہوتا ہے وہ خود کفیل ہوتا ہے۔ اور مخاطبوں کی نظر میں معاش کے لحاظ سے کمتر نہیں ہوتا ہے۔ اللہ کا دیا اس کے پاس سب کچھ ہوتا ہے۔ وہ اپنے مخاطبوں سے کسی اجرت کا طالب نہیں ہوتا ہے وہ اس معاملے میں کھلے طور پر بے نیازی کا مظاہرہ کرتا ہے۔ رزقنی رزقا حسنا۔ میں اسی طرف اشارہ ہے۔

سوم داعی کے علم و عمل میں تضاد نہیں ہوتا ہے وہ جو کچھ کہتا ہے وہی کچھ کرتا ہے۔ اس کی دعوت کے پس منظر اور پیش منظر میں کوئی مادی غرض نہیں ہوتی ہے وہ لوگوں کو جس کام کے کرنے کا حکم دیتا ہے خود بھی اس کی عملی تصویر ہوتا ہے اور جس چیز سے روکتا ہے خود بھی اپنی زندگی کے کسی گوشہ میں اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا ہے۔ قاضی ضیاء الدین نصاب الاحتساب میں لکھتے ہیں۔

> اس آیت میں احتساب کے موضوع پر محتسب کے لیے یہ راہنمائی ہے کہ محتسب کے علم و عمل اور قول و فعل میں تضاد اور دو رنگی نہ ہو تاکہ محتسب لوگوں کی تنقیدات کا نشانہ نہ بنے قرآن

[۱] افادات شیخ الاسلام

میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ ما ارید ان اخالفکم الی ما انہٰکم عنہ۔ جن جن باتوں اور کاموں سے میں تمہیں روکتا ہوں اس کا خود ارتکاب کرنا نہیں چاہتا ہوں۔

علامہ عبدالرحمٰن بن نصر الشیزری المتوفی ۵۸۹ھ جنہوں نے احتساب کے موضوع پر کتاب نہایۃ الرتبۃ فی طلب الحسبۃ سلطان صلاح الدین ایوبیؒ کی درخواست پر لکھی ہے وہ اس کتاب میں لکھتے ہیں۔ کہ

محتسب کا اولین فرض یہ ہے کہ اس کے علم وعمل میں موافقت ہو اس کے منہ سے نکلی ہوئی بات اس کے کردار کے مخالف نہ ہو۔ قرآن میں علمار بنی اسرائیل کی مذمت میں آیا ہے۔ اتامرون الناس بالبر وتنسون انفسکم الخ انس بن مالکؓ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ میں نے معراج والی رات میں ایسے لوگوں کو دیکھا جن کے ہونٹ قینچیوں سے کاٹے جا رہے تھے۔ میں نے دریافت کیا کہ یہ کون لوگ ہیں۔ جبرئیل علیہ السلام نے جواب دیا۔ کہ یہ آپ کی اُمت کے وہ خطیب ہیں جو لوگوں کو نیکی کی تلقین کرتے تھے اور خود عمل نہیں کرتے تھے۔ قرآن میں اللہ سبحانہ نے حضرت شعیب علیہ السلام کی یہ بات نقل کی ہے۔ ما ارید ان اخالفکم الخ

چہارم یہ آیت بتا رہی ہے کہ داعی کا پیش نہاد اپنی دعوت میں صرف معاشرے کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور اصلاح بھی استطاعت کے موافق۔ علم الاحتساب کے علمار نے اسی محتسب کے لیے یہ نکتہ آفرینی کی ہے۔ کہ

محتسب کو چاہیئے کہ اس کا احتساب میں مقصود صرف اصلاح ہو۔ قرآن میں ہے۔ ان ارید الا الاصلاح الخ (نصاب الاحتساب)

اور اس اصلاح کا پس منظر رضار الٰہی کے سوا کچھ نہ ہو۔ اس کی عقل، اس کا ارادہ اور اس کے جذبات وخواہشات رضار الٰہی اور منشار خداوندی کی راہ میں حائل نہ ہو سکیں۔ علامہ شیزری لکھتے ہیں۔

محتسب کے فرائض میں داخل ہے کہ اس کی کوئی بات اور اس کا کوئی کام رضار الٰہی سے خالی نہ ہو۔ اس کی نیت خالص ہو، اس میں نمائش اور برتری کا نام ونشان نہ ہو۔ احتساب میں لوگوں سے مناقشہ اور معاشرے میں برتری سے بچ رہے۔

اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ

اللہ سبحانہ اسے عوامی زندگی میں شرف قبولیت عطا فرمائے گا۔ دلوں میں اس کی ہیبت ہوگی۔ لوگوں

کے دلوں کے دروازے اس کی پذیرائی کے لیے کھل جائیں گے ۔ (نہایۃ الرتبۃ)
کیونکہ نبوت کی دعوت کی اصل غایت یہ ہے کہ دنیا میں اخلاق و روحانیت کے اصولوں کو فروغ دیا جائے۔ اور انسان کو ایک ایسے آئین حیات اور ضابطۂ عمل کا پابند بنایا جائے جو اسے تسخیر نفس اور تسخیر فطرت کے نصب العین سے قریب تر کر دے۔ یہیں سے یہ بات بھی نکلتی ہے کہ وحی الہٰی پر مبنی نظام زندگی کا مقصد وجود انسان کی ایسی اخلاقی تربیت اور اس کی شخصیت کا ایسا ارتقا رہے جو بالآخر انفس و آفاق کی تسخیر پر مبنی ہو۔ محض مادی ترقی اور اقتصادی فلاح کا حصول نبوت کا مقصود نہیں ہے۔ مادی فلاح اور امن و فارغ البالی کا قیام و حصول اس اخلاقی تربیت کا لازمی نتیجہ ہے جو نبوت روحانی اقدار اور معاشی تقاضوں کو عبادت الہٰی کے ذریعے بروئے کار لانا چاہتی ہے۔ جہاں روحانی قدروں اور اقتصادی ضرورتوں میں عبادت کی پیوندکاری ہوگی وہاں یہ نتائج خود بخود حاصل ہو جائیں گے۔ یہی وجہ ہے کہ نبوت نے جس چیز کو جاہلیت سے تعبیر کیا ہے اس سے صرف وہی حالت مراد نہیں جس میں افراد کا ارادہ بالکل بے قید اور آزاد ہو بلکہ اس کا اطلاق اس تمدن و معاشرت پر بھی ہوتا ہے جس کے پیش نظر محض مادی ارتقا اور امن و فارغ البالی کا حصول ہو اور جس میں اللہ سبحانہٗ سے عبادت کے ذریعے قرب اور صفات الہٰی سے مشابہت پیدا کرنے کی خواہش انفرادی و اجتماعی اعمال کی محرک نہ ہو۔

پنجم یہ آیت بتا رہی ہے کہ دعوت کے کام میں داعی کو اپنی محنت عرق ریزی پر قطعاً اعتماد نہیں ہوتا خواہ محنت کتنی ہو اور کیسی ہو بلکہ اس میں اس کی نظر اللہ سبحانہٗ کی توفیق پر ہوتی ہے یعنی اسے یقین ہوتا ہے خیر کے لیے اسباب پیدا کرنا اللہ کا کام ہے۔ میرے کام اور محنت کی حیثیت اس راہ میں صرف ایک بہانے کی ہے اور اس بہانے کے لیے بھی توفیق دینا اللہ سبحانہٗ کا انعام ہے اگر اس کی رحمت یاوری نہ کرے تو یہ بہانہ بھی میرے بس سے باہر ہے۔ بہرحال داعی کی، محتسب کی اپنی جدوجہد، اپنی جانفشانی اور محنت پر نظر نہیں ہوتی بلکہ اللہ سبحانہٗ کی دین پر ہوتی ہے۔ مولانا سنائیؒ لکھتے ہیں۔

محتسب کو احتساب میں اللہ کی توفیق پر نظر رکھنی چاہیئے قرآن میں حضرت شعیب علیہ السلام کی زبانی ہے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

ام میں محنت کے ساتھ دلیری اور بے باکی بھی ضروری ہے۔ حضرت شعیب علیہ السلام کی اس ماستطعت میں اس طرف بھی اشارہ ہے یعنی بلا خوف لومۃ لائم۔ پوری دلیری اور بے باکی سے میں یہ کام اپنی استطاعت کے مطابق جان جوکھوں میں ڈال کر کروں گا۔ لکھا ہے۔

۵۵۵ھ میں اتابک طغتگین بادشاہ شام کو ایک محتسب کی ضرورت ہوئی بادشاہ کو بتایا گیا کہ ایک صاحب علم شخصیت شہر میں موجود ہے آپ ان سے یہ کام نہ کیتے ہیں۔ فرمایا بلاؤ۔ آئے۔

بادشاہ نے ان سے کہا کہ آپ کو محتسب مقرر کیا جاتا ہے آپ کا کام شہری زندگی میں لوگوں کو برائی سے روکنا اور نیکی کی تلقین کرنا ہے۔ بادشاہ ریشمین غالیچے پر ریشمیں تکیہ لگائے بیٹھے تھے بننے والے محتسب بولے اگر میں محتسب ہوں تو براہ مہربانی یہ ریشمیں گدا اور تکیہ ہٹایئے اور ہاتھ سے یہ سونے کی انگوٹھی اتار دیئے۔ حضور انور صلی اللہ علیہ وسلم نے مردوں کو اس کے استعمال سے منع کیا ہے۔ بادشاہ نے فوراً غالیچہ اور تکیہ اٹھا دیا اور ہاتھ سے انگوٹھی اتاری اور کہا کہ اب پولیس پر احتساب بھی آپ کا کام ہے لوگوں نے ایسا دلیر اور بے باک محتسب کوئی نہیں دیکھا تھا۔

ششم یہ آیت یہ بھی بتا رہی ہے کہ داعی میں کمال عبدیت ہونی چاہیئے نتائج کے معاملے میں نظر اپنے کام پر نہیں بلکہ اللہ سبحانہٗ کی ذات اور اس کی صفات پر ہونی چاہیئے۔ نبی اور سربراہ مملکت، داعی اور لیڈر میں یہی وہ جوہری فرق ہے۔ جس سے دونوں کی راہیں الگ الگ ہو جاتی ہیں۔ نبی اور داعی اسباب کی پوری پا بجائی کے بعد اور سب کچھ کرنے کے بعد نتائج کے لیے اللہ سبحانہٗ پر توکل و اعتماد کرتا ہے اور بیقراری و اضطراب کی تصویر بن کر اللہ سے بھیک مانگتا ہے۔ لیڈر کی نظر اپنے مجمع عوام، مادی طاقت، مالی وسائل پر ہوتی ہے برخلاف نبی اور داعی کے کہ اس کی نظر اول اور آخر اللہ سبحانہٗ پر ہوتی ہے علیہ توکلت والیہ انیب میں اسی طرف اشارہ ہے۔ جو بات یہاں حضرت شعیب علیہ السلام بتا رہے ہیں اسی کا عملی نمونہ آپ بدر میں دیکھ سکتے ہیں۔

(۱۱۰) تاریخ کے حوالہ سے تنبیہ

اے میری قوم میری مخالفت تمہیں ایسا بنا دے کہ تم پر بھی قوم نوحؑ، قوم ہودؑ اور قوم صالحؑ کی افتاد کا سبق دہرایا جائے اور قوم لوطؑ کا معاملہ تو تم سے زیادہ دور نہیں ہے یعنی میری ضد میں اور عداوت کے جوش میں ایسی حرکتیں مت کرنا جو تم کو گزشتہ اقوام کی طرح سخت تباہ کن عذاب کا مستحق بنا دیں۔ نوح، ہود، صالح علیہم السلام کی امتوں پر تکذیب و عداوت کی بدولت جو عذاب آئے وہ پوشیدہ نہیں اور لوط علیہ السلام کا قصہ تو ان سب کے بعد ماضی قریب میں ہوا ہے۔ اس کی یاد تمہارے حافظہ میں تازہ ہوگی ان نظائر کو فراموش نہ کرو[1] قرآن کی یہ آیت اپنے منطوق اور مدلول کے ذریعے دو تصویریں پیش کر رہی ہے۔ منطوق میں یہ آیت بتا رہی ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام قوم کے لیے دردمند تھے اور قوم کے لیے سراپا رحمت اور شفقت تھے۔ تعبیر

[1] افادات شیخ الاسلام

کا یہ انداز لا یجرمنکم شقاقی دل سوزی اور دردمندی کو ظاہر کر رہا ہے اور دوسری طرف آیت کا مدلول بتا رہا ہے کہ قوم شعیبؑ نہایت سرکشی اور تمرد کا مظاہرہ کر رہی تھی اور حضرت شعیب علیہ السلام سے انتہائی کدورت و عداوت رکھتی تھی۔ اور ان کی یہ سرکشی اور تمرد اس درجہ ترقی کر چکا تھا۔ کہ ان کے کردار کے آئینہ میں قوم نوحؑ، قوم ہود، قوم صالح علیہم السلام اور قوم لوطؑ کے مناظر حضرت شعیب علیہ السلام دیکھ رہے تھے۔ مطلب یہ ہے کہ میری ضد میں تم نے جو روش اختیار کی ہے کہیں یہ روش تمہارے لیے اس عذاب کا سبب نہ بن جائے جو تم سے پہلے قوم نوحؑ، قوم ہودؑ اور قوم صالحؑ پر آچکا ہے۔ اور قوم لوطؑ تو تم سے دور نہیں ہے یعنی قوم لوطؑ کا واقعہ تو ابھی تازہ ہے اور تمہارے قریب ہی کے علاقہ میں ہوا ہے۔ غالباً اس وقت تک قوم لوطؑ کی بربادی پر سات صدیاں نہ گزری تھیں اور جغرافیائی اعتبار سے بھی قوم لوطؑ کا مسکن اس علاقہ سے بالکل متصل تھا جہاں حضرت شعیب علیہ السلام رہتے تھے۔

(۱۱۱) قوموں کے فیصلہ کی بنیاد

اور تم اللہ سبحانہٗ کی جانب میں اپنے گزشتہ گناہوں کی معافی مانگو اور آئندہ کے لیے اللہ سے معافی مانگو۔ میرا پروردگار بڑا ہی رحمت کار اور شفقت والا ہے۔ کیسا ہی پرانا اور کٹر مجرم ہو جب صدق دل سے اس کی بارگاہ میں رجوع ہو کر معافی چاہے وہ اپنی مہربانی سے معاف کر دیتا ہے بلکہ اس سے محبت کرنے لگتا ہے[۱] محبت کا وہ جذبہ جو خالق کو مخلوق کے ساتھ نیکی، احسان، درگزر اور عفو و بخشش پر آمادہ کرتا ہے اس کا نام رحم اور رحمت والا ہے اللہ سبحانہٗ تمام تر رحم و شفقت ہے اس کی رحمت کے فیضان سے عرصہ کائنات کا ذرہ ذرہ سیراب ہے۔ اس کا نام رحمان و رحیم ہے۔ جو کچھ یہاں ہے: سب اس کی رحمت کا ظہور ہے وہ نہیں تو کچھ نہیں اسی لیے اس کی رحمت سے مایوسی جرم اور ناامیدی گناہ ہے۔ مجرم سے مجرم اور گنہ گار سے گنہ گار کو وہ نوازنے کے لیے ہر وقت تیار رہتا ہے۔ گنہ گاروں اور مجرموں کو وہ حضرت شعیب علیہ السلام کی زبان سے یہ پیام بھیجتا ہے۔ استغفروا ربکم ثم توبوا الیہ۔ اپنے رب سے اپنے گناہوں کی معافی مانگو اور اس کی طرف پلٹ آؤ۔ اس سے معلوم ہوا کہ آخرت ہی میں نہیں بلکہ دنیا میں بھی قوموں کی قسمتوں کا اتار چڑھاؤ اخلاق بنیادوں ہی پر ہوتا ہے۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

قَالُوا يٰشُعَيْبُ مَا
نَفْقَهُ كَثِيرًا مِّمَّا تَقُولُ وَإِنَّا لَنَرٰىكَ فِينَا ضَعِيفًا ۚ وَلَوْلَا
رَهْطُكَ لَرَجَمْنٰكَ ۖ وَمَا أَنْتَ عَلَيْنَا بِعَزِيزٍ ﴿۹۱﴾ قَالَ يٰقَوْمِ
أَرَهْطِي أَعَزُّ عَلَيْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ ۖ وَاتَّخَذْتُمُوهُ وَرَاءَكُمْ ظِهْرِيًّا ۖ
إِنَّ رَبِّي بِمَا تَعْمَلُونَ مُحِيطٌ ﴿۹۲﴾ وَيٰقَوْمِ اعْمَلُوا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ
إِنِّي عَامِلٌ ۖ سَوْفَ تَعْلَمُونَ ۙ مَنْ يَأْتِيهِ عَذَابٌ يُخْزِيهِ وَ
مَنْ هُوَ كَاذِبٌ ۖ وَارْتَقِبُوا إِنِّي مَعَكُمْ رَقِيبٌ ﴿۹۳﴾ وَلَمَّا جَاءَ
أَمْرُنَا نَجَّيْنَا شُعَيْبًا وَّالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ بِرَحْمَةٍ مِّنَّا وَ
أَخَذَتِ الَّذِينَ ظَلَمُوا الصَّيْحَةُ فَأَصْبَحُوا فِي دِيَارِهِمْ
جٰثِمِينَ ﴿۹۴﴾ كَأَنْ لَّمْ يَغْنَوْا فِيهَا ۗ أَلَا بُعْدًا لِّمَدْيَنَ كَمَا
بَعِدَتْ ثَمُودُ ﴿۹۵﴾

انہوں نے کہا کہ اے شعیب ؑ جو کچھ تم کہتے ہو اس میں سے زیادہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتیں ہیں[1] اور بلاشبہ ہماری رائے میں آپ ایک کمزور شخص ہیں[2] اگر آپ کی پارٹی موجود نہ ہوتی تو ہم آپ

کو سنگسار کر ڈالتے اور آپ کا ہماری نگاہ میں کوئی مقام نہیں ہے[۹۱]
حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا لوگو: کیا اللہ سبحانہ سے زیادہ
تمہارے نزدیک میری پارٹی کا دباؤ ہے اور اللہ کو تم نے پس پشت
ڈال دیا ہے۔ یقین کرو کہ میرا رب تمہارے اعمال کا گھیراؤ کیئے ہوئے
ہے[۹۲] لوگو، تم اپنی جگہ کام کرو میں بھی کام کر رہا ہوں۔ تمہیں مستقبل
میں پتہ لگ جائے گا کہ رسوا کن عذاب کی پکڑ میں کون آتا ہے
اور جھوٹا کون ہے۔ اور تم بھی باٹ دیکھو میں بھی باٹ میں ہوں[۹۳]
اور جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے شعیب علیہ السلام اور ان کے
ساتھی اہل ایمان کو اپنی خاص رحمت کے ذریعے بچا لیا۔ اور ظلم
پیشہ لوگوں کو کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا لہذا وہ اپنے گھروں
میں اوندھے پڑے ہوئے تھے۔ یوں لگتا تھا گویا وہ ان گھروں کے
کبھی آباد کار ہی نہ تھے۔ خبردار مدین کے لیے پھٹکار ہے جیسی پھٹکار
ہوئی قوم ثمود پر[۹۵]

مفردات کے معانی

رھط امام راغب اصفہانی اور علامہ زمخشری دونوں نے لکھا ہے کہ دس سے کم آدمیوں کی جماعت رھط کہلاتی ہے،
اور بعض کا قول ہے کہ چالیس تک کے لیے رھط کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ قرآن نے اسے قوم اور برادری کے

معنے میں بھی استعمال کیا ہے جس سے اس کی تائید ہوتی ہے کہ چالیس اشخاص تک کی تعداد کے لیے لفظ رھط استعمال ہوتا ہے۔ علامہ مجدالدین فیروز آبادی نے بصائر ذوی التمیز میں اس کے معنے جماعت، آدمی کی قوم اور قبیلہ بتائے ہیں اور لکھا ہے کہ رھط میں عورت داخل نہیں ہوتی۔

حق کے مقابلے میں باطل کا آخری ہتھیار

اتباع حق کی راہ میں ذاتی خصومت اور شخصی حسد سے بڑھ کر کوئی روک نہیں۔ مکالمہ سے یہ بات ٹپکتی ہے کہ قبیلہ کے سرداروں کو حضرت شعیب علیہ السلام سے ذاتی خصومت ہو گئی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا کہ میری ضد میں آکر ایسا نہ کرو کہ پیام حق کے مخالف ہو جاؤ اور اللہ سبحانہ کے مواخذہ میں گرفتار ہو جاؤ۔ اور اسی ذاتی خصومت کا نتیجہ ہے کہ انہوں نے کہا کہ ہم تجھے سنگسار کر دیتے لیکن تیری پارٹی کے خیال سے نہیں کرتے حضرت شعیب علیہ السلام نے کہا کہ افسوس ہے کہ انسانوں کا پاس کرتے ہو لیکن حق اور سچائی کا پاس نہیں کرتے ہو۔ انسانوں کے خیال سے ایک کام چھوڑتے ہو لیکن خدا کے خیال سے نہیں چھوڑتے ہو۔ طاقت کا نشہ انسان کی سب سے بڑی کمزوری ہے وہ انسان کو اندھا اور بہرہ بنا دیتا ہے۔ حق قبول کرنا تو بڑی بات ہے حق کو نہ صرف خود سننا گوارا نہیں کرتا بلکہ وہ دوسروں کو حق کی دعوت کو بھی برداشت نہیں کرتا۔ قوم شعیبؑ کو حضرت شعیب علیہ السلام کی نیکی سے کد نہ تھی بلکہ ان کو اس سے کد تھی کہ دوسروں کو دعوت کیوں دیتے ہو۔

(۱۱۲) انہوں نے کہا کہ اے شعیبؑ جو کچھ تم کہتے ہو اس میں سے زیادہ باتیں ہماری سمجھ میں نہیں آتی ہیں۔ سمجھتے تو سب کچھ تھے۔ لیکن عناد اور حق پوشی سے ایسا کہتے تھے۔ کہ تیری بات کچھ نہیں سمجھتے نہ معلوم کیا مجذوبوں کی بڑ ہانک رہا ہے (العیاذ باللہ) اور اگر واقعی وہ ایسی اور سیدھی صاف باتیں بے توجہی یا غباوت کی وجہ سے سمجھتے نہ تھے تو یہ کلام اپنے ظاہر پر محمول ہوگا ؏

حضرت شعیبؑ علیہ السلام کے دو مکالمے ہیں۔ ایک مکالمہ وہ ہے جو ارباب اقتدار اور حضرت شعیب علیہ السلام کے درمیان ہوا ہے۔ یہ قرآن نے نویں پارے میں ذکر کیا ہے۔

> طاقت کا گھمنڈ رکھنے والے قوم کے سربراہوں نے کہا اے شعیبؑ دو باتوں میں سے ایک بات ہو کر رہے گی۔ یا تو تجھے اور ان کو جو تیرے ساتھ ایمان والے ہیں ہم اپنے شہر سے نکال دیں گے اور یا تمہیں مجبور کر دیں گے کہ تم ہمارے دین میں لوٹ آؤ۔ ۷ - ۸۸

؏ افادات شیخ الاسلام

اس پر حضرت شعیب ؑ نے جواب دیا ۔

شعیب علیہ السلام نے کہا کہ اگر ہمارا دل تمہارے دین پر مطمئن نہ ہو تو کیا جبراً مان لیں ۔ اگر ہم تمہارے دین میں لوٹ آئیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہم نے اللہ کے بارے میں باتیں جھوٹ بولیں ہیں حالانکہ اللہ نے ہم کو تمہارے دین سے بچا لیا ہے لہ

یہ حضرت شعیب علیہ السلام اور ارباب اقتدار کے درمیان گفتگو تھی اب یہاں ان آیات میں جو مکالمہ قرآن پیش کر رہا ہے ۔ وہ حضرت شعیب علیہ السلام اور عام شہریوں کے درمیان ہے ۔ شہری حضرت شعیب علیہ السلام سے کہہ رہے ہیں ۔ کہ تمہاری بات کی تہہ کو ہم نہیں پہنچ رہے ہیں ۔ ان کی اس بات کا مطلب یہ ہے کہ تمہاری یہ باتیں بالکل بے جان اور دور از کار ہیں ۔ ورنہ ہم سے زیادہ سمجھدار کون ہو سکتا ہے ۔ مشرکین مکہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے یہی بات دوسرے پیرائے میں کہی تھی ۔

قالوا قلوبنا فی اکنۃ مما تدعونا الیہ وفی اذاننا وقر ۔

یعنی آپ کی بات کے لیے ہمارے دلوں تک پہنچنے کا کوئی راستہ کھلا ہوا نہیں ہے ۔ جیسے یہودیوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا وقالوا قلوبنا غلف ۔ یعنی آپ کی دعوت ہم پر کوئی اثر نہیں کر سکتی ہے یعنی کچھ بھی کہیں ہم پر کوئی اثر نہیں کر سکتی ہے یعنی کچھ بھی کہیں ہم آپ کے کہے میں نہیں آئیں گے ۔ یہی بات قوم شعیب ؑ حضرت شعیب علیہ السلام سے کہہ رہی ہے کہ آپ کی باتوں میں کوئی گہرائی نہیں ہے ۔ اس لیے ہماری گرفت میں نہیں آتی ہے ۔ اگر اس میں عقلیت کچھ بھی ہوتی تو بلاشبہ ہم اسے تاڑ جاتے ۔ یہ سمجھ نہ آنا کچھ اس بنا پر نہ تھا ۔ کہ حضرت شعیب علیہ السلام کسی غیر زبان میں باتیں کر رہے تھے ۔ یا ان کی باتیں بہت مغلق اور پیچیدہ ہوتی تھیں ۔ باتیں تو صاف اور سیدھی ہی تھیں اور اسی زبان میں کی جاتی تھیں جو یہ لوگ بولتے تھے لیکن ان کا ذہن مادیت کے سانچے میں اس طرح ڈھل گیا تھا اور ایسا ٹیڑھا ہو چکا تھا کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی سیدھی باتیں کسی طرح اس میں نہ اتر سکتی تھیں ۔ قاعدے کی بات ہے کہ جو لوگ تعصبات اور خواہش نفس کی بندگی ۔ میں شدت کے ساتھ مبتلا ہوتے اور کسی خاص انداز فکر کے ہو کر رہ جاتے ہیں وہ اول تو کوئی ایسی بات سن ہی نہیں سکتے جو ان کے خیالات سے مختلف ہو اور اگر سن بھی لیں تو ان کی سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کہاں کی باتیں ہو رہی ہیں ۔

لہ دیکھو پارہ ۹ سورہ اعراف ۔ قال الملاء الذین استکبروا من قومہ لنخرجنک یاشعیب والذین امنوا معک من قریتنا اولتعودن فی ملتنا قال اولو کنا کارھین قد افترینا علی اللہ کذبا ان عدنا فی ملتکم بعد اذ نجانا اللہ منہا

(۱۱۳) قوم مدین کی نظر میں حضرت شعیبؑ کا ضعف

اور بلاشبہ آپ ہماری رائے میں ایک کمزور شخص ہیں۔ یعنی ایک کمزور اور بے حقیقت آدمی خواہ مخواہ سارے جہاں کو اپنا دشمن بنا رہا ہے۔ اسے چاہیئے کہ اپنے حال پر رحم کرے۔ بیٹھے بٹھائے اپنے آپ کو موت کے منہ میں ڈالنے سے کیا فائدہ ہے۔ بعض سلف نے بمعنے ضعیف معنے نابینا کے لیے ہیں۔ شاید کسی وقت میں عارضی طور پر بینائی جاتی رہی ہو۔ جیسے یوسف علیہ السلام کے فراق میں حضرت یعقوب علیہ السلام کا حال ہوا تھا۔ مفسرین نے بعض روایات نقل کی ہیں۔ کہ حضرت شعیب علیہ السلام روتے بہت تھے حتی کہ نگاہ جاتی رہی حق تعالیٰ نے فرمایا کہ اس قدر کیوں روتا ہے۔ جنت کے شوق میں یا دوزخ کے خوف سے۔ عرض کیا پروردگار! تیری لقا کا خیال کر کے روتا ہوں کہ جس وقت آپ کا دیدار ہوگا نہ معلوم میرے ساتھ کیا برتاؤ کریں گے! ارشاد ہوا کہ تجھ کو ہماری لقا مبارک ہو اے شعیبؑ! اسی لیے میں نے اپنے کلیم موسیٰ ابن عمران کو تیری خدمت کے لیے کھڑا کر دیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اللہ نے بینائی واپس کردی۔ واللہ تعالیٰ اعلم بصحتہ [1]

بلاشبہ حمیری زبان میں ضعیف بمعنے نابینا استعمال ہوتا ہے۔ لیکن یہاں نابینا کے معنے میں ہونے کی حیثیت ایک وہم سے زیادہ کچھ نہیں ہے۔ اور اگرچہ شارحین قرآن نے اس کی تائید میں متقدمین کا روائتی سہارا بھی پیش کیا ہے لیکن بقول علامہ آلوسیؒ کہ ان روایات کی تاریخی اور روائتی حیثیت محتاج تصحیح ہے۔ عبداللہ بن عباسؓ کی روایت کے کچھ ذرائع کی حاکم نے تصحیح کی ہے لیکن حاکم کی تصحیح کو، ابن الجوزیؒ کی تضعیف کو محققین کی بارگاہ میں صف نعلین میں بھی جگہ نہیں ملتی ہے۔ اور پھر سوچنے کی بات ہے کہ قرآن کا سیاق بھی اس تشریح کا ہمنوا نہیں ہے اگر ضعیف سے نابینا مراد ہو تو انداز بیاں میں فینا لانے کی معقولیت نہ رہے گی۔ عام شہریوں کا تأثر یہ ہے کہ آپ کا شہری زندگی میں کوئی باوقار، باعزت مقام نہیں ہے بلکہ آپ کمزور ہیں۔ آپ کے پاس کوئی مادی طاقت نہیں اور آپ کو کوئی نفع و نقصان پر کوئی قدرت نہیں ہے۔ آپ نہ خود کسی پر حملہ کر سکتے ہیں اور نہ کسی حملے کا جواب دے سکتے ہیں۔ اس لیے آپ ہم سے نہ بگاڑیئے اور ہماری ناراضگی مول نہ لیجئے۔ آپ ہمارا کچھ بھی بگاڑ نہیں سکتے اور ہمارے وار کا جواب دینے کی آپ میں قدرت نہیں ہے۔

(۱۱۴) قوم کی جانب سے حضرت شعیب کو دھمکی

اگر آپ کی پارٹی موجود نہ ہوتی تو ہم آپ کو سنگسار کر ڈالتے اور آپ کا ہماری نگاہ میں کوئی مقام

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہیں ہے یعنی تیرے کنبہ کے لوگ جو ہمارے ساتھ ہیں۔ ان کا خیال ہے ورنہ اب تک تجھے سنگسار کر ڈالتے [1] یہاں رھط کے معنے شیخ الاسلام نے عام شارحین قرآن کی پیروی میں خاندان کے لیے ہیں۔ قرآن میں ایسی کوئی تصریح نہیں ہے۔ اور نہ ہی اس موضوع پر کوئی مرفوع روایت ہے۔ قرآن نے قوم مدین کے ذکر میں یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ قوم مدین میں حضرت شعیب علیہ السلام کے مخاطبوں میں سے ایک جماعت حضرت شعیب علیہ السلام پر ایمان لائی تھی۔ اور ایک جماعت نے راہ کفر اختیار کی تھی۔

وان کان طائفة منکم آمنوا بالذی ارسلت بہ
وطائفة لم یؤمنوا۔

اور یہ بات ہوئی ہے کہ تم میں سے اے اہل مدین ایک گروہ اس چیز پر ایمان لایا ہے جو میں خدا کی جانب سے لیکر آیا ہوں اور ایک گروہ نے اس کو نہیں مانا ہے۔

اسی طرح جب ارباب اقتدار نے حضرت شعیب علیہ السلام کو شہر بدر کرنے کی دھمکی دی تو صرف حضرت شعیب علیہ السلام کو ہی دھمکی نہیں دی بلکہ اس دھمکی میں اہل ایمان کا بھی پوری صراحت کے ساتھ تذکرہ کیا ہے۔

لنخرجنك یاشعیب والذین آمنوا معك من قریتنا

اے شعیب ؑ تجھے اور ان لوگوں کو جو تیرے اہل ایمان ہیں ہم ضرور اپنی آبادی سے نکال دینگے

اور یہاں بھی قرآن نے عذاب کے موقعہ پر حضرت شعیب علیہ السلام کے بچانے کا ذکر کیا ہے تو صرف حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر نہیں کیا بلکہ اہل ایمان کا بھی خاص طور پر ذکر کیا ہے۔

لما جاء امرنا نجینا شعیبا والذین آمنوا معہ برحمة منا۔

جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے شعیب ؑ اور انکے ساتھ اہل ایمان کو اپنی خاص رحمت سے بچا لیا۔

جب یہ تصریح قرآن میں موجود ہے تو رھط سے ان کا خاندان مراد لینا اور اس کو کافر کہنا کچھ بھی اپنے اندر معنویت نہیں رکھتا۔ اصل بات یہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام پر ایمان لانے والوں میں عام لوگوں کے ساتھ کچھ ارباب ثروت بھی تھے۔ جن کا عام شہری زندگی میں ایک ممتاز مقام تھا۔ ان ہی کی طرف قوم مدین کے عوام اشارا کرکے کہہ رہے ہیں کہ اگر تمہیں ان کی ہمنوائی حاصل نہ ہوتی تو ہم تمہیں سنگسار کر ڈالتے۔ تم تو ہمارے نزدیک کسی غلبہ، دبدبہ اور عزت والے نہیں ہو۔ ہماری راہ میں تمہاری عزت و جاہ رکاوٹ نہیں بلکہ اس تمہاری پارٹی کی عزت شہری زندگی، اس کا ممتاز مقام ہمارے راستہ کی رکاوٹ ہے۔ البقاعی لکھتے ہیں۔ ما

[1] افادات شیخ الاسلام

امنت علینا بعزیز میں اشارہ ہے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی پارٹی مخالفین کی نظر میں عزت وجاہ کا ممتاز مقام رکھتی ہے۔ ان کا یہ امتیازی مقام ہی قوم مدین کی راہ میں مانع ہے۔ اگر یہ مانع نہ ہوتا تو ہم تمہارا کام کر دیتے۔

(۱۱۵) حضرت شعیبؑ کا اللہ پر اعتماد

حضرت شعیب علیہ السلام نے فرمایا لوگو! کیا اللہ سبحانہٗ سے زیادہ تمہارے نزدیک میری پارٹی کا دباؤ ہے اور اللہ کو تم نے پس پشت ڈال دیا ہے۔ یقین کرو میرا رب تمہارے اعمال کا گھیراؤ کیئے ہوئے ہے یعنی افسوس اور تعجب ہے کہ خاندان کی وجہ سے میری رعایت کرتے ہو۔ اس وجہ سے نہیں کرتے کہ میں خدا کا بھیجا ہوا ہوں اور صاف وصریح نشانات اپنی سچائی کے دکھلا رہا ہوں گویا تمہاری نگاہ میں میرے خاندان کی عزت اور دباؤ خداوند قدوس سے زیادہ ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی عظمت وجلال کو ایسا بھلا دیا کہ کبھی تمہیں تصور بھی نہیں آتا جو قوم اللہ سبحانہٗ کو بھلا کر معاذ اللہ پس پشت ڈال دے اسے یاد رکھنا چاہیئے کہ اس کے تمامی اعمال وافعال اللہ تعالیٰ کے علم وقدرت کے احاطہ میں ہیں۔ تم کوئی کام کرو اور کسی حالت میں ہو ایک آن کے لیے بھی اس کے قابو سے باہر نہیں ہو[1] مطلب یہ ہے کہ اے میری قوم کیا میری پارٹی اور ساتھیوں کا خوف ولحاظ تمہیں اللہ سبحانہٗ سے زیادہ ہے کہ تم اشخاص کو تو اہمیت دیتے ہو اور اللہ سبحانہٗ کو نظر انداز کر رہے ہو یاد رکھو میرا رب جو کچھ تم کر رہے ہو سب کا احاطہ کیئے ہوئے ہے یعنی میرا بھروسہ افراد واشخاص پر نہیں اللہ سبحانہٗ پر ہے جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر لو۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ انسان انسانوں کا پاس کرتا ہے لیکن سچائی کا پاس نہیں کرتا ہے وہ لوگوں کے خیال سے ایک بات چھوڑ دیتا ہے لیکن اللہ سبحانہٗ کے خیال سے نہیں چھوڑتا ہے اصل چیز اشخاص نہیں حق ہے۔ حق کو اس لیے اختیار کیا جائے کہ حق حق ہے نہ اس لیئے کہ اس کی پشت پر افرادی قوّت ہے حق شناس نگاہ اہل حق کو تلاش کر لیتی ہے۔

(۱۱۶) نتیجہ کا انتظار کرو

لوگو! تم اپنی جگہ کام کرو میں بھی کام کر رہا ہوں تمہیں مستقبل میں پتہ لگ جائے گا۔ کہ رسواکن

[1] افادات شیخ الاسلام

عذاب کی پکڑ میں کون آتا ہے اور جھوٹا کون ہے ؟ اور تم بھی باٹ دیکھو میں بھی باٹ میں ہوں یعنی اچھا تم اپنی ضد اور ہٹ دھرمی پر جمے رہو میں اللہ تعالیٰ شانہ کی توفیق سے راہ ہدایت پر ثابت قدم ہوں عنقریب پتہ لگ جائے گا کہ ہم میں سے کس کو اللہ سبحانہٗ کا عذاب نصیحت کرتا ہے ۔ اور کون جھوٹا ثابت ہوتا ہے ۔

اب ہم اور تم دونوں آسمانی فیصلہ کا انتظار کرتے ہیں[1] مطلب یہ ہے کہ میں اپنی جگہ کام کر رہا ہوں ۔ تم میری ضد اور مخالفت میں جو کچھ کرنا چاہتے ہو کر گزرو ۔ اپنے رب کی جانب سے انذار و تبشیر کے جس مشن پر مامور ہوں کرتا رہونگا ۔ جلد ہی تمہیں معلوم ہو جائے گا کہ کس پر رسوا کرنے والا عذاب آتا ہے اور کون جھوٹا ہے ۔ تم بھی انتظار کرو میں بھی تمہارے ساتھ انتظار کرتا ہوں یعنی غیب کا علم تو مجھے بھی نہیں ہے کہ تعین کے ساتھ بتا سکوں کہ عذاب کس وقت آئے گا لیکن یہ واضح ہے کہ تم میں مستحق عذاب ہونے کی ساری علامتیں نمودار ہو چکی ہیں ۔ اس وجہ سے میں بھی اب اسکے ظہور ناگہانی کا منتظر ہوں ۔ بتانا یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں ہر چیز کی ایک خاصیت ہے اور وہ جب یہاں وجود پذیر ہوتی ہے ۔ تو اس کے ساتھ اس کے خواص و آثار بھی پیدا ہوتے ہیں ۔ اسی طرح انسان کے اعمال کے بھی کچھ آثار و لوازم ہیں جو اس سے الگ نہیں ہو سکتے اچھے نتائج اور بُرے اعمال کے بُرے نتائج ہوتے ہیں ۔ رسول بشیر اور نذیر ہوتے ہیں ۔ اچھے اعمال کے اچھے نتائج کی خوشخبری بشیر ہونے کی حیثیت میں دیتے ہیں ۔ اور بُرے اعمال کے برے نتائج سے آگاہ نذیر ہونے کی حیثیت سے کرتے ہیں ۔

(۱۱۷) قوم مدین پر عذاب

اور جب ہمارا حکم آیا تو ہم نے شعیبؑ اور ان کے ساتھی اہل ایمان کو اپنی خاص رحمت کے ذریعے بچا یا اور ظلم پیشہ لوگوں کو کڑک نے اپنی گرفت میں لے لیا ۔ لہذا وہ اپنے گھروں میں اوندھے پڑے ہوئے تھے ۔ یوں لگتا تھا کہ گویا وہ ان گھروں کے کبھی آباد کار ہی نہ تھے ۔ خبردار مدین کے لیے پھٹکار ہے جیسی پھٹکار ہوئی قوم ثمود پر ۔ یہاں قوم شعیبؑ کا کڑک (فرشتہ کی چیخ) سے ہلاک ہونا مذکور ہے ۔ اور اعراف میں رجفہ کا لفظ آیا ہے ۔ یعنی زلزلہ سے ہلاک ہوئے اور سورہ شعراء میں عذاب یوم الظلۃ جس کا مطلب یہ ہے کہ عذاب کے بادل سائبان کی طرح ان پر محیط ہو گئے ۔ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں کہ یہ تینوں قسم کے عذاب اس قسم کے حق میں جمع کر دیئے گئے ۔ پھر ہر سورت میں وہاں کے سیاق کے مناسب عذاب کے موافق عذاب کا ذکر کیا گیا ۔ اعراف میں تھا کہ ان لوگوں نے شعیب علیہ السلام سے کہا کہ ہم تم کو اور تمہارے ساتھیوں کو اپنی سرزمین سے نکال دیں گے وہاں بتلایا

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ جس زمین سے نکالنا چاہتے تھے اسی زمین کے زلزلہ سے ہلاک ہوئے۔ یہاں ان کے سخت گستاخانہ مقالات کا ذکر تھا اس لیے بالمقابل آسمانی صیحہ کڑک کا ذکر فرمایا۔ گویا عذاب الٰہی کی ایک کڑک میں سب آوازیں گم ہوگئیں۔ سورہ شعرار میں ان کا یہ قول نقل کیا ہے

فاسقط علینا کسفا من السماء ان کنت من الصادقین

اگر تو سچا ہے تو ہم پر آسمان سے کوئی ٹکڑا گرا دے

اس کے مقابلے میں عذاب یوم الظلۃ کا ذکر فرمایا ہے [۱]

شیخ الاسلام نے حافظ ابن کثیرؒ کی ہمنوائی میں عذاب یوم الظلۃ اور رجفۃ و صیحۃ کے عذاب کو اہل مدین کے لیے قرار دیا ہے اور اس کے لیے ایک سے زیادہ توجیہات کا سہارا لیا ہے اگرچہ یہ مقام تفصیل کا متحمل نہیں ہے پوری تفصیل توان شاء اللہ معالم القرآن جلد ۱۹ میں سورۃ الشعرار کی تشریحات میں آرہی ہے۔ مگر اتنی بات ضرور سمجھ لیجئے کہ ابن مردویہ اور ابن عساکر نے حضرت عبداللہ بن عمرو بن العاصؓ کے حوالہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل کیا ہے۔

مدین اور اصحاب الایکہ دو اُمتیں ہیں۔ جن کی طرف اللہ سبحانہٗ نے حضرت شعیب علیہ السلام کو روانہ فرمایا تھا۔ (فتح القدیر ج ۳ ص ۱۳۵)

متقدمین اور متاخرین شارحین قرآن کی اکثریت کا یہی میلان ہے کہ مدین اور اصحاب الایکہ دو جداگانہ قومیں تھیں۔ تاریخ طبری، مستدرک حاکم میں حضرت قتادہؓ کا بیان ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے شعیب علیہ السلام کو دو قوموں کی طرف مبعوث فرمایا۔ ایک اہل مدین جو خود ان کی قوم تھی دوسرے اصحاب الایکہ۔ جب اللہ نے اصحاب الایکہ کو عذاب دینا چاہا تو ان پر سخت گرمی مسلط کردی اور عذاب بادل کی شکل میں لایا گیا جیسے ہی بدلی قریب ہوئی لوگ اس کی طرف چل پڑے کہ شاید کچھ ٹھنڈک ملے جب اس کے نیچے پہنچے تو اس میں سے آگ برسنے لگی۔ فاخذھم عذاب یوم الظلۃ میں اسی کا بیان ہے۔ بعد کے علمار میں بغوی، خازن، بیضاوی، زمخشری، ابوحیان اندلسی، علامہ عینی، علامہ شوکانی، علامہ محمود آلوسیؒ، امام فخر الدین رازی اور سید رشید رضا کی یہی تصریح ہے۔ قرآن عزیز کے مطالعہ سے بھی بظاہر یہی معلوم ہوتا ہے۔ مولانا سید سلیمان ندویؒ نے ارض القرآن میں اسی کو تاریخی طور پر ثابت کیا ہے کہ اصحاب مدین اور اصحاب الایکہ دو الگ الگ قومیں ہیں۔ اور دونوں کا مقام سکونت الگ الگ ہے۔ متاخرین میں صرف حافظ ابن کثیرؒ اور حافظ حجر عسقلانیؒ کو اس پر اصرار

[۱] افادات شیخ الاسلام

ہے کہ اہل مدین اور اہل ایکہ دونوں ایک ہیں۔ حافظ ابن کثیرؒ سورۃ الشعراء کی تفسیر میں لکھتے ہیں کہ صحیح القول کے مطابق اصحاب الایکہ اور اہل مدین ایک ہیں اور وہ مفسرین کے استدلال کا کہ

> اصحاب الایکہ کے ذکر میں حضرت شعیب علیہ السلام کا ذکر بغیر برادرانہ نسبت کے ہونا اور اہل مدین میں برادری کی نسبت کا ذکر ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ اہل مدین اور اصحاب الایکہ دونوں الگ الگ ہیں۔

حافظ ابن کثیرؒ یہ جواب دیتے ہیں کہ

> ایکہ ایک درخت تھا جس کی یہ لوگ پرستش کرتے تھے۔ اسی لیے ان کو اصحاب الایکہ کہا گیا ہے اس وجہ سے قرآن میں ان کے تذکرے میں حضرت شعیب علیہ السلام کو ان کا بھائی نہیں کہا گیا ہے۔

مگر حافظ ابن کثیرؒ کی اس نکتہ آفرینی کا متقدمین شارحین قرآن کے اقوال میں کہیں کوئی اشارہ بھی نہیں ملتا ہے اور نہ کسی صحابی کے قول میں اور نہ کسی حدیث مرفوع سے اس کی تائید ہوتی ہے۔ ان کو اصحاب الایکہ اس لیے نہیں کہتے کہ وہ درخت ایکہ کے پرستار تھے بلکہ اس لیے کہتے ہیں کہ ایکہ کے معنے جنگل اور بن کے ہیں۔ اور ان کا مسکن جنگل میں تھا اس لیے ان کو اصحاب الایکہ کہا گیا ہے۔ مولانا شیخ الاسلامؒ نے اپنے افادات میں چونکہ حافظ ابن کثیرؒ سے ہمنوائی کی ہے۔ اس لیے ان کو ہر قدم پر قرآن کے مطالب کے لیے نیا جامہ اور نئے جامہ کے لیے نت نئی توجیہات سے کام لینا پڑا ہے۔ ہم اس پر انشاء اللہ ۱۴ ویں اور ۱۹ ویں جلد میں تفصیلی بحث کریں گے۔

وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مُوسٰى بِاٰيٰتِنَا وَ سُلْطٰنٍ
مُّبِيْنٍ ﴿۹۶﴾ اِلٰى فِرْعَوْنَ وَمَلَا۟ئِهٖ فَاتَّبَعُوْٓا اَمْرَ فِرْعَوْنَ وَ
مَآ اَمْرُ فِرْعَوْنَ بِرَشِيْدٍ ﴿۹۷﴾ يَقْدُمُ قَوْمَهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
فَاَوْرَدَهُمُ النَّارَ ؕ وَبِئْسَ الْوِرْدُ الْمَوْرُوْدُ ﴿۹۸﴾ وَاُتْبِعُوْا فِيْ
هٰذِهٖ لَعْنَةً وَّيَوْمَ الْقِيٰمَةِ ؕ بِئْسَ الرِّفْدُ الْمَرْفُوْدُ ﴿۹۹﴾

اور فی الواقع ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات اور واضح سند دے کر روانہ کیا فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف[۱۱۸] مگر انہوں نے فرعونی اقتدار کی پیروی کی اور فرعون کی حکومت حکومت راشدہ نہیں[۱۱۹] قیامت کے روز وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور انہیں دوزخ میں پہنچائے گا اور دیکھو وہ بُرا ہی گھاٹ ہے جس پر وہ جائیں گے[۱۲۰] اور اس دنیا میں بھی لعنت اُن کے پیچھے لگی ہے اور قیامت کے دن بھی۔ تو دیکھو! کیا ہی بُرا انعام ہے جو اُنکے حصہ میں آیا ہے[۱۲۱]

فرعون اور حضرت موسیٰؑ

فرعون شاہان مصر کا لقب ہے کسی خاص بادشاہ کا نام نہیں ہے۔ تین ہزار سال قبل مسیح سے

شروع ہو کر عہد اسکندر تک فراعنہ کی اکتیس خاندان مصر پر حکمران رہے ہیں ہیں۔ سب سے آخری خاندان فارس کی شہنشاہی کا تھا۔ ۳۳۲ قبل از مسیح اسکندر کے ہاتھوں مفتوح ہو گیا۔ ان میں سے حضرت یوسف علیہ السلام کا فرعون ہیکیس عمالقہ کے خاندان سے ہے جو دراصل عرب خاندانوں ہی کی ایک شاخ تھی۔

یہ سوال کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون کون ہے؟ اور اس کا تعلق کس خاندان سے ہے۔

عام مؤرخین اور مفسرین اس کو بھی عمالقہ ہی کے خاندان کا ایک فرد بتاتے ہیں۔ اور کوئی اس کا نام ولید بن مصعب بن ریان اور کوئی مصعب بن ریان بتاتا ہے۔ ان میں سے محققین کی رائے میں نام ریان ہے حافظ ابن کثیرؒ کہتے ہیں کہ اس کی کنیت ابو سدہ تھی۔

یہ سب قدیم مؤرخین کی تحقیق ہے مگر اب جدید مصر کی اثری تحقیقات کی وجہ سے جو رائے سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ کا فرعون رعمیسس ثانی کا منفتاح ہے جس کا دور حکومت ۱۲۹۲ قبل مسیح سے شروع ہو کر ۱۲۲۵ قبل مسیح پر ختم ہوتا ہے۔

اس تحقیقی رائے کے متعلق احمد یوسف احمد آفندی نے ایک مستقل مضمون لکھا ہے۔ یہ مصری دار الآثار کے مصور ہیں اور اثریات کے بہت بڑے عالم ہیں۔ ان کے اس مضمون کا خلاصہ عبد الوہاب النجار نے قصص الانبیاءؑ میں نقل کیا ہے۔

(۱۱۸) اور فی الواقع ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اپنی آیات اور واضح سند کے ساتھ روانہ کیا فرعون اور اس کے سرداروں کی طرف۔ نشانیوں سے غالباً معجزات اور وہ نو آیتیں مراد ہیں جن کا ذکر ولقد آتینا موسیٰ تسع آیات میں ہوا ہے۔ ان میں سے معجزہ عصا کو جو نہایت ظاہر و قاہر معجزہ تھا سلطان مبین، واضح سند فرمایا اور شاید سلطان مبین سے وہ روشن دلائل مراد ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کے سامنے اللہ سبحانہ کے وجود و توحید کے متعلق پیش کیے جن کا ذکر دوسرے مقامات پر آئے گا۔ اور ممکن ہے کہ سلطان مبین سے اس کے لغوی معنی مراد لیے گئے ہوں کیوں کہ فرعونیوں کے مقابلے پر بار بار حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نمایاں غلبہ اور فتح مبین حاصل ہوتی رہی تھی۔ یہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بارے میں دو باتیں بتائی ہیں ایک آیات دوسرے سلطان مبین۔

آیت کے معنے نشانی اور علامت کے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کو علم و احساس کے جو ذرائع عطا

لہ افادات شیخ الاسلام

فرمائے ہیں وہ فی الواقع صرف آیات وعلامات کی شناخت ہے ۔ دنیا میں جس قدر خبریں ہیں۔ سب کا علم صرف آیات وعلامات ہی کا علم ہے ۔ یہ گھوڑا ہے یہ انسان ہے نشانیوں کی مدد سے آپ کہتے ہیں کہ یہ رشید ہے یہ وحید ہے، یہ میرا گھر ہے، یہ میری کار ہے، یہی آیات وعلامات کی جان پہچان اور شناخت ہے جو حیوان وانسان اور عقل وبیوقوف میں فرق کرتی ہے ۔

ہمارا تمام فن استدلال دراصل ان آیات وعلامات کے گرد گھومتا ہے ۔

قرآن حکیم میں آیات کا لفظ اس معنے میں اس کثرت سے آیا ہے کہ ہم ان کو شمار بھی نہیں کرسکتے قرآن میں اس معنے میں آیات اللہ یعنی اللہ کے وجود کی نشانیاں اور اس کے صفات کمالیہ کی علامات ہیں جطرح ویرانہ کی عمارت معمار کے وجود کو اور ایک زخمی کی مرہم پٹی اور اس کے آرام وآسائش کا اہتمام تیماردار کے رحم وکرم کی صفات کو ظاہر کرتا ہے ۔ اسی طرح اس عالم کی یہ عظیم الشان عمارت جس کی چھت آسمان اور صحن زمین ہے۔ ایک خالق وصانع کے وجود کو بتاتی ہے اور زمین کے اندر وباہر ابر، بارش، دن رات، چاند سورج ، درخت ، میوے ، پھل، غلہ کے اقسام وغیرہ ، زمین کے جانداروں کی زندگی کے سامان، آرام وآسائش اس خالق عالم کے رحم وکرم ، عطا وبخشش اور دیگر اوصاف کمال کو نمایاں کرتے ہیں اور بتاتے ہیں کہ خالق کو اپنی تمام مخلوقات کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے ۔ کفران ہی دلوں میں پرورش پاتا ہے جو ان آیات الٰہی میں غور وفکر نہیں کرتے اور ان کی جلوہ گری سے حقیقی جلوہ آرا ہستی کو سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے ۔

جس طرح یہ آیات الٰہی عام بندے اور اللہ کے تعلق کو نمایاں کرتے ہیں اسی طرح اللہ کسی خاص بندے سے اپنے تعلق اور رابطہ کو اپنی مخصوص علامات وآیات کے ذریعے سے نمایاں کرتا ہے۔ نبوت اللہ سے اسی خصوصی تعلق کا نام ہے نبی نور الٰہی کی مشعل لیکر آتا ہے ۔ لوگوں کی مخالفت کے باوجود نور الٰہی کی یہ مشعل اپنی چمک پھیلاتی رہتی ہے۔ نبی کا صحیفہ زندگی ہر قسم کی اخلاقی آلائش سے پاک ہوتا ہے اس کی دعوت میں دین الٰہی کی نصرت کی خاطر مخالفین کی ناکامی اور ہزیمت کے لیے ساتھیوں کو مزید ایمان وتسکین کے حصول میں عجیب وغریب مافوق فہم نشانات ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ جن کو عرف عام میں معجزات کہتے ہیں ۔ غرض یہی وہ امور ہیں جو خالق فطرت اور داعی حق کے درمیان رابطہ خاص اور علاقہ مخصوص کو نمایاں کرتے ہیں اور جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ فرستادہ الٰہی ہے ۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو ایک سے زیادہ معجزات دکھائے مگر ہر ایک کے جواب میں ان کو یہی سننا پڑا کہ یہ کھلا جادو ہے ۔ ھذا سحر مبین ۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے معجزہ عصا کو دیکھ کر مصر کے جادوگر سجدے میں گر گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو نبی مان لیا مگر فرعون یہی کہتا رہا انہ لکبیرکم الذی علمکم السحر ۔

تورات میں یہ واقعہ پوری تفصیل کے ساتھ موجود ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کو جب کوئی معجزہ دکھاتے تھے۔ تو ہر معجزہ کے بعد فرعون کے دل کی سختی علیٰ حالہ باقی رہتی تھی۔ چنانچہ تورات میں تقریباً ہر معجزے کے بعد یہ مذکور ہے۔ لیکن فرعون کا دل سخت رہا اور ان کی نہ سنی۔ بلکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے صرف متعدد معجزے ہی نہیں دکھائے بلکہ قرآن نے بتایا ہے کہ ہر بعد میں آنے والا پہلے سے زیادہ عظیم ہوتا تھا۔ ومانریھم من آیۃ الاھی اکبر من اختھا۔ اسی آیت میں قرآن نے یہ بھی بتایا ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کے پاس ہماری آیات لے کر آئے تو فرعون اور اس کے ہمنواؤں نے اس کا مذاق بنایا فلما جاءھم بآیاتنا اذا ھم منھا یضحکون۔ گویا واقعہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا ہے مگر یہ مخصوص نہیں بلکہ ہر عہد کے فرعون اور ہر نبی کے مخالفین کی نفسی کیفیت یہی رہی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام جو نشانیاں لے کر آئے وہ صرف متعدد یا ایک سے زیادہ اور دوسری نشانی پہلی سے بڑی نہ تھی بلکہ ان آیات کی اہم خصوصیت یہ تھی کہ یہ سلطان مبین یعنی ایسی دلیل جو عقل انسانی پر چھا جائے۔ ایسی دلیل جو صحیح معنے میں سلطان مبین ہو۔ اس کی دو ہی صورتیں ہو سکتی ہیں یا ایسے مقدمات سے مرتب ہوتی جن کی بنیاد مشاہدات ومحسوسات پر قائم ہو یا وحی کے ذریعے جو باتیں حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیش فرمائی ہیں ان پر مبنی ہو۔ یہ واضح، کھلی اور عقل پر چھا جانے والی دلیل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے لگاتار اور تابڑ توڑ معجزات تھے۔ جن کی قوت کے سامنے ان کی عقلیں درماندہ اور ان کی طاقت بیچارہ تھی۔ اس درماندگی و بیچارگی کا مظاہرہ انہوں نے ان کو جادو کہہ کر کیا تھا۔ ان کا یہ کہنا ھذا سحر مبین۔ معجزات کی حیرت انگیز تاثیر کی شہادت ہے۔ یعنی ان معجزات کا اثر اس درجہ نمایاں اور قطعی تھا کہ باوجود انکار وجحود کے اس سے انکار نہیں کر سکتے تھے۔ اسے جادوگری سے تعبیر کرنے پر مجبور ہو جاتے تھے۔ علامہ بقاعیؒ نے یہ کہہ کر

والایۃ تعم الاسادۃ والدلیل القاطع والسلطان یخص القاطع والمبین یخص ما فیہ جلاء۔

اسی طرف اشارہ کیا ہے۔ یا یوں کہہ دیجئے کہ آیات سے مراد تو وہ عام نشانیاں ہیں جو حضرت موسیٰ علیہ السلام نے قدم قدم پر پیش کی ہیں اور سلطان مبین سے مراد خاص طور پر وہ نشانی ہے جس سے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو فرعون اور اس کے درباریوں اور جادوگروں پر کھلا ہوا غلبہ حاصل ہوا یعنی عصا گویا یہاں عام کے بعد خاص کا ذکر کیا ہے۔ اس کو سلطان مبین کہنے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی حیثیت ایک حجت قاہرہ کی تھی جس کے بعد فرعون اور اس کے درباریوں کی ساری ساکھ خود اپنے آدمیوں کی نگاہ میں اکھڑ گئی۔

بتانا یہ ہے کہ ایسی صریح علامات کے ساتھ جن سے یہ بات بے غبار ہو کر سامنے آگئی کہ وہ اللہ کی طرف سے بھیجے گئے ہیں اور ان کی پشت پر اللہ رب العالمین کی طاقت ہے۔ قرآن میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعات کی جو تفصیل آئی ہے اس کا غور سے مطالعہ کیجئے تو آپ کو معلوم ہو جائے گا کہ یہ کونسی آیات تھیں جن کو یہاں ان کے رسول ہونے کی کھلی سند دلیل قرار دیا جا رہا ہے۔ اول تو یہی بڑی حیرت انگیز بات ہے کہ جو شخص چند سال پہلے فرعون کی قوم کے ایک آدمی کو قتل کر کے ملک سے فرار ہو گیا تھا اور جس کی گرفتاری کے وارنٹ نکلے ہوئے تھے۔ وہ اچانک ایک لاٹھی لیے ہوئے سیدھا فرعون کے بھرے دربار میں چلا جاتا ہے۔ اور بڑی بے باکی کے ساتھ بادشاہ اور اس کے عیانِ حکومت کو مخاطب کر کے دعوت دیتا ہے کہ وہ اللہ سبحانہٗ کا نمائندہ تسلیم کر کے اس کی ہدایات پر عمل کریں اور کسی کو اس پر ہاتھ ڈالنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ حالانکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام جس قوم سے تعلق رکھتے تھے وہ اس بُری طرح غلامی کے جوئے تلے پس رہی تھی کہ اگر الزام قتل کی بنا پر ان کو فوراً گرفتار کر لیا جاتا تو اس بات کا کوئی اندیشہ نہ تھا تو ان کی قوم بغاوت تو درکنار احتجاج ہی کے لیے زبان کھول سکے گی۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ عصا اور ید بیضا کے معجزے سے پہلے فرعون اور اس کے اہل دربار محض حضرت موسیٰؑ کی باطنی نشانیوں سے مرعوب ہو چکے تھے۔ اور ان کو محسوس ہو گیا کہ اس شخص کی پشت پر کوئی اور ہی طاقت ہے۔ پھر جو معجزے پے در پے ان سے صادر ہوئے۔ اُن میں سے ہر ایک یقین دلانے کے لیے کافی تھا کہ یہ جادو نہیں ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی طاقت کا کرشمہ ہے۔

(۱۱۹) جبر و ظلم پر مبنی حکومت راشدہ نہیں

مگر انہوں نے فرعونی اقتدار کی پیروی کی اور فرعون کی حکومت قطعاً حکومت راشدہ نہ تھی یعنی کھلے کھلے نشان دیکھ کر بھی فرعونیوں نے اللہ کے رسول کی بات نہیں مانی بلکہ اسی دشمن خدا کے حکم پر چلتے رہے۔ حالانکہ اس کی کوئی بات ٹھکانے کی نہ تھی جسے مان کر انسان بھلائی حاصل کر سکتا [1] اصل ارشاد میں ما امر فرعون برشید ہے رشید غویٰ کی ضد ہے رشید کا لفظ ہر اس کام کے لیے استعمال ہوتا ہے جو قابل تعریف اور پسندیدہ ہو مطلب یہ ہے کہ فرعونی امر یعنی حکومت رشد و ہدایت سے بیگانہ تھی۔ اس کے طاغوت بننے سے لے کر بنی اسرائیل کے غلام بنانے تک کوئی چیز بھی ایسی نہ تھی جس میں اچھائی ہو یا جو عقل و دانش کے پیمانے پر پوری اترتی ہو۔ یعنی حکومت فرعون کی پالیسی ہر قسم کی خیر و صلاح سے خالی تھی۔ ابن کثیرؒ

[1] افادات شیخ الاسلام

لکھتے ہیں لیس فیہ رشد ولا ھدی اور علامہ شوکانی لکھتے ہیں ۔لیس فیہ رشد قط بل ھو غی وضلال یاد رہے کہ رشد کے معنے میں وسعت ہے ۔ فکر صحیح ، گفتار اچھی ، کردار میں صلاحیت ہو تو رشید بولا جاتا ہے ۔فکری غوایت ہو یا عملی ضلالت گمراہی ہو تو رشید نہیں ہوتا۔ مطلب یہ ہے کہ فرعونی حکومت فکری لحاظ سے غوایت عملی اعتبار سے ضلالت کا نمونہ تھی اور ضلالت وغوایت کے مجموعہ کو طغیان کہتے ہیں ۔اسی لیے ارشاد ہے ۔ اذھب الی فرعون انہ طغی ۔ تعبیر میں مجاز عقلی کا پیرایہ اختیار کیا ہے یعنی یہ کہنے کی بجائے کہ فرعون نہیں تھا فرمایا کہ فرعون کی حکومت راشدہ نہ تھی یا فرعون گمراہ تھا۔ یہ انداز تعبیر حکومت کی شناعت اور قباحت ظاہر کرنے کے لیے ہے ۔

اصل بات یہ ہے کہ یہاں عالم دو ہیں ۔ ایک عالم مادی دوسرا عالم انسانی عالم مادی بے جان چیزوں کے مجموعے کا نام ہے اور عالم انسانی اعمال وافکار اور اخلاق پر اُٹھی عمارت کو کہتے ہیں ۔ عالم مادی عقل انسانی کی جولانگاہ ہے ۔ یہ عالم ارادہ کی صفت سے محروم اور آزادئ عمل سے ناآشنا ہے اس کے معین قوانین ہیں جنہیں تجربے ، مشاہدے اور قیاس سے ٹھیک طور پر معلوم کیا جاسکتا ہے اس لیے اس عالم میں اختلاف رائے کا امکان اس قدر کم ہے گویا نہ ہونے کے برابر ہے اس کے برخلاف عالم انسانی میں اس قطعیت اور صحت کے ساتھ اسباب ونتائج کا تعین بہت دشوار ہے ۔ یہاں انسان کی آزاد فطرت ہے ۔ اور انسان اپنے اعمال میں مادے کی طرح اضطراری طور سے کسی معین قانون کا محکوم نہیں ہے ۔اس کا آزاد ارادہ ہر قانون توڑ سکتا ہے ۔ اور ہر نظریہ کو باطل کرسکتا ہے ۔علت ومعلول کا تعلق یہاں اس قدر پیچیدہ ہے کہ کسی واقعہ کے متعلق یہ حکم نہیں لگایا جاسکتا کہ وہ فلاں فلاں علت ہی سے ظہور پذیر ہوتا ہے ۔ انسانی امور ومعاملات اور تمدنی زندگی میں واقعات وہ ظاہر کی توجیہہ ایک دشوار عمل ہے ۔جس میں قدم قدم پر اختلاف رائے ہوسکتا ہے اور ایسی کوئی تدبیر نہیں کہ جس سے اس اختلاف کا سدّباب ہو سکے ۔اسباب وعلل کی طرح نتائج کی نسبت بھی عالم انسانی میں صحت اور قطعیت کے ساتھ کوئی بات نہیں کہی جاسکتی ۔عالم مادی اور عالم انسانی میں سب سے زیادہ نمایاں فرق یہ ہے کہ عالم مادی میں انسان شاہد کی حیثیت رکھتا ہے اور اشیاء عالم کی حیثیت مشہود کی ۔ برعکس عالم انسانی میں خود ہی انسان شاہد ہے اور خود ہی مشہود ۔اس فرق کی وجہ سے عالم طبعی اور مادی کے مشاہدات وتجربات اور نظریات وعقائد میں خالص معروضی نقطہ نظر اختیار کیا جاسکتا ہے اور نتائج کے استنباط میں عقل اپنی غیر جانبداری قائم رکھ سکتی ہے ۔لیکن انسانی امور ومعاملات میں اور تمدنی مسائل میں یہ معروضیت ناممکن ہے جہاں انسان خود اپنی زندگی اور تمدن کے مسائل پر غور کرنا شروع کرتا ہے تو اس کی ذہنی خصوصیات ، اس کا ماحول ، اور اسکے شخصی یا قومی جذبات ومیلانات کے عمل کی تشکیل پر

اثرانداز ہوتے ہیں۔

عالم انسانی اور عالم مادی کا فرق معلوم کرنے کے بعد کوئی دیانتدار اس بات کا انکار نہیں کرسکتا کہ عالم طبعی اور مادی دنیا میں صحت وصداقت کی تلاش اور اتفاق رائے کا اصول جتنا آسان ہے عالم انسانی اور تمدنی معاملات میں اتنا ہی دشوار ہے۔ تمدنی زندگی کے مسائل محض عقل کی وساطت سے حل نہیں ہوسکتے کیونکہ اس میدان میں عقلی استدلال نتائج کی صحت تک راہنمائی نہیں کرسکتے۔ آیت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور ان کے مقابلے میں فرعون اور اس کے ہمنوا۔ فرعون اور اس کے ہمنوا حریت فکر اور عقلیت کی نمائندگی کررہے ہیں۔ جبکہ موسیٰ علیہ السلام انسانی مسائل اور تمدنی معاملات میں الہامی ہدایات کی نمائندگی کررہے ہیں۔ قرآن بتارہا ہے کہ فرعون جو نظام حیات قائم کیے ہوئے ہے اور اس کے پیروکار فرعون کی جس میں پیروی کررہے ہیں اس میں انسانیت کے لیے کوئی صلاح ورشد اور خیر نہیں ہے۔ اس میں انسان انسان کی بندگی کرتا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام جن اصول وعقائد کی دعوت لے کر آئے ہیں اس میں انسان انسان کی بندگی نہیں کرتا کیونکہ وہ کسی انسان کے ساختہ پرداختہ نہیں بلکہ ان کا صدور ایک ایسی ذات سے ہوا ہے۔ جو ہمہ تن حق وصداقت ہے جس کی عقل کائنات کے ہر گوشہ پر حاوی اور جس کی ہمہ گیر آنکھ زمین وآسمان کی ہر شئے کو محیط ہے اس میں سراسر اللہ کی بندگی ہے یہ اس کی آزاد مرضی اور غیر جانبدار قوت فیصلہ پر مبنی ہے اور جبر وتشدد سے پاک ہے کیونکہ کوئی شخص اس یقین کے بغیر دعوت نبوت صداقت کے ساتھ قبول نہیں کرسکتا۔

(۱۲۰) نبوت کی اپوزیشن کا آخرت میں انجام

قیامت کے روز وہ اپنی قوم کے آگے آگے ہوگا اور انہیں دوزخ میں پہنچائے گا اور دیکھو وہ بڑا ہی گھاٹ ہے جس پر وہ جائیں گے یعنی جس طرح یہاں کفر وتکذیب میں فرعون ان کا امام تھا قیامت کے دن بھی امام رہے گا۔ جو لوگ دنیا میں اس کی اندھی تقلید کررہے تھے وہ اس کے پیچھے پیچھے آخری منزل تک پہنچ جائیں گے یہ ہی وہ گھاٹ ہے جہاں ٹھنڈے پانی کی جگہ بھسم کردینے والی آگ ہے۔[۱] ورد کے معنی کسی گھاٹ پر پانی پینے پلانے کے لیے اترنے کے ہیں مطلب یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ فرعون ان تمام لوگوں کا لیڈر ہوگا۔ جنہوں نے اس جہاں میں اس کی پیروی کی اور وہ ان کو دوزخ کے گھاٹ پر لاکے

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

گا جس سے زیادہ کوئی برا گھاٹ نہیں ہے۔

یہ آیت واضح طور پر بتا رہی ہے کہ اس دنیا میں جو لوگ عالم انسانی میں نبوت کی الہامی دعوت کے مقابلے میں عقلیت پر مبنی دعوت لے کر کھڑے ہوتے ہیں اور جو لوگ ان کی پیروی کرتے ہیں قیامت کے روز بھی ان کی راہ نمائی وہی کریں گے۔ اگر اس دنیا میں نبوت کی یا نبوت کو ماننے والوں کی پیروی کی ہے تو قیامت کے دن بھی انہی کے جھنڈے تلے ہوں گے اور ان کی راہ نمائی میں کامیابی سے ہمدوش ہوں گے۔ اور اگر دنیا میں نبوت کی الہامی دعوت سے ہٹ کر کسی عقلیت پر مبنی انسانی معاملات کو حل کرنے کی تحریک میں کا کام کیا ہے تو قیامت کے روز بھی وہ ان ہی کی راہنمائی میں ہونگے۔ اور ان ہی کی سرگردگی میں جہنم کی طرف جائیں گے۔ نبوت کے مقابلے میں ہر تحریک کا حکم یہی ہے خواہ اس کا عنوان کوئی ہو۔ قرآن عظیم عالم انسانی میں الہامی تحریک کے مقابلے میں ہر اس تحریک کے داعی کو طاغوت کہتا ہے جس کا آغاز عقلیت پرستی سے ہوا چاہے اسے نظریہ اضداد اور جدلی عمل کہا جائے اور چاہے اس کو حریت فکر کی تحریک کا نام دیا جائے۔ سب کا انجام یہی ہے۔ قیامت میں دونوں کی بھرپور نمائش ہوگی۔ ظاہر ہے کہ جن راہنماؤں، جن دانشوروں نے دنیا میں لوگوں کو گمراہ کیا اور نبوت کے مدمقابل بن کر رہے ان کے پیروان کے پیچھے پیچھے ہوں گے۔ اور سب دوزخ کا رُخ کریں گے۔

(۱۲۱) نبوت کے مخالفین پر پھٹکار

اور اس دنیا میں لعنت ان کے پیچھے لگی ہے اور قیامت کے دن بھی۔ تو دیکھو کیا ہی برا مقام ہے جو ان کے حصے میں آیا ہے یعنی رہتی دنیا تک لوگ فرعون اور فرعونیوں پر لعنت بھیجیں گے۔ اور بھیجتے رہیں گے پھر قیامت میں اللہ کے فرشتے اور اہل موقف کی طرف سے لعنت پڑے گی بغرض لعنت کا سلسلہ لگاتار ان کے ساتھ چلتا رہیگا۔ گویا یہ انعام ہے جو ان کے کارناموں پر دیا گیا ہے[۱] اس آیت میں ان لوگوں کو تنبیہ ہے جو دنیا میں آنکھیں بند کرکے ان سربراہوں، لیڈروں، دانشوروں کے پیچھے لگ جاتے ہیں۔ جو اس دنیا میں الہامی ہدایات کے مقابلے میں عقلیت اور حریت فکر پر مبنی نظام قائم کرتے ہیں اُن کو بتایا جا رہا ہے کہ ان پر دنیا میں بھی پھٹکار پڑتی ہے۔ اور قیامت کے روز بھی وہ پھٹکار سے دوچار ہوں گے۔ ان کو بتایا جا رہا ہے کہ کیا یہ تمہارے پیشوا تمہیں عالم انسانی کے نتائج اعمال سے بچا سکتے ہیں۔ نہ آج بچا سکتے ہیں اور نہ قیامت کے دن۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ذٰلِكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الْقُرٰى نَقُصُّهٗ عَلَيْكَ مِنْهَا قَآئِمٌ وَّحَصِيْدٌ ﴿۱۰۰﴾
وَمَا ظَلَمْنٰهُمْ وَلٰكِنْ ظَلَمُوْٓا اَنْفُسَهُمْ فَمَآ اَغْنَتْ عَنْهُمْ اٰلِهَتُهُمُ
الَّتِىْ يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مِنْ شَىْءٍ لَّمَّا جَآءَ اَمْرُ رَبِّكَ ۚ
وَمَا زَادُوْهُمْ غَيْرَ تَتْبِيْبٍ ﴿۱۰۱﴾ وَكَذٰلِكَ اَخْذُ رَبِّكَ اِذَآ اَخَذَ
الْقُرٰى وَهِىَ ظَالِمَةٌ ۚ اِنَّ اَخْذَهٗٓ اَلِيْمٌ شَدِيْدٌ ﴿۱۰۲﴾

اے اللہ کے رسول یہ آبادیوں کے حالات ہیں۔ جو ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں۔ ان میں سے کچھ تو دنیا میں اب تک موجود ہیں اور کچھ کی بالکل جڑ کٹ چکی ہے[۱۲۲] اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے جب اللہ کی گرفت میں آ گئے تو ان کے وہ معبود کچھ کام نہ آئے جن کو وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے تھے۔ اور ان کے حق میں انہوں نے ہلاکت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا[۱۲۳] اور دیکھو ایسے ہی آپ کے مالک کی گرفت ہوتی ہے جب وہ آبادیوں کی ظلم کی پاداش میں گرفت کرتا ہے اس کی گرفت بڑی ہی سخت ہوتی ہے[۱۲۴]

تاریخی واقعات سے استدلال

سورت کے آغاز میں قوم کو اتباع حق کی دعوت دی تھی ۔ اور سرکشی و فساد کے نتیجہ سے خبردار کیا تھا ۔ نیز واضح کیا تھا ۔ کہ اس موضوع پر بنیادی امور کیا ہیں ؟ پھر ان سب کا آیت نمبر ۲۴ میں خلاصہ بیان کیا ۔ یہاں راہیں دو ہیں ۔ ایک نبوت کی اور دوسری نبوت کے مخالفوں کی ۔ اور ضروری ہے کہ دونوں کے چلنے والے اپنی حالت اور اپنے نتیجہ میں ایک ہی طرح کے نہ ہوں ۔ پھر اس حقیقت پر دلیل پیش کی تھی ۔ یہ گزشتہ ایام و وقائع کا بیان تھا ۔ جو حضرت نوح علیہ السلام کے تذکرہ سے شروع ہوا اور حضرت موسیٰؑ کے تذکرہ پر ختم ہوا ۔ اب اس آیت سے لے کر آخر سورت تک ان نتیجوں اور عبرتوں کی طرف توجہ دلائی ہے ۔ جو اس سلسلہ استدلال سے واضح ہوتی ہے ۔ ان قوموں کو جو کچھ پیش آیا تو اس لیے پیش نہیں آیا ۔ کہ اللہ سبحانہٗ نے ان پر زیادتی کی ہے ۔ اس کا قانون جزا و سزا تو سرتا سر عدل و رحمت ہے ۔ بلکہ اس لیے کہ انہوں نے خود اپنے اُوپر ظلم کرنا چاہا اور نجات کی راہ سے منہ موڑ کر ہلاکت کی طرف چلنے لگے ۔ اس موضوع پر اللہ سبحانہٗ کا قانون ایسا ہی ہے ۔ اس کی رحمت نے مہلت پر مہلتیں دی ہیں ۔ اور روشنی کو تاریکی سے بالکل الگ کر دیا ہے ۔ لیکن اگر ایک قوم روشنی سے یک قلم منہ موڑ لے تو پھر نتائج و عواقب کا ظہور کبھی نہیں رک سکتا ہے ۔ ان کے ظہور کی شدت و دردناکی کبھی دور نہیں ہو سکتی ہے ۔ ہر اس انسان کے لیے جو آخرت کے خیال سے بے خوف نہ ہو ۔ اس بات میں حقیقت کی بڑی نشانی ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جزاءِ عمل کا قانون یہاں نافذ ہے اور اللہ کے رسُولوں کا پیغام جھوٹا نہیں ہے ۔

(۱۰۰) اے اللہ کے رسول یہ آبادیوں کے حالات میں سے کچھ حالات ہیں جو آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں ۔ ان میں سے کچھ تو دنیا میں اب تک موجود ہیں اور کچھ کی بالکل جڑ کٹ چکی ہے یعنی پچھلی قوموں کے جو قصے تم کو سنائے گئے ہیں کہ کس طرح انہوں نے پیغمبر کی تکذیب کی اور گستاخیاں کیں ۔ پھر کس طرح تباہ ہوئے ان میں سے بعض کی بستیاں ابھی آباد ہیں جیسے مصر جو فرعون کا مقام تھا اور بعض اُجڑ گئیں مگر ان کے کچھ کھنڈرات باقی ہیں ۔ جیسے قوم لوطؑ کی بستیاں اور بعض کا نشان بھی صفحۂ ہستی پر باقی نہ رہا [1]

بتانا یہ ہے کہ پیچھے جن قوموں کی تاریخی داستانیں سنائی گئی ہیں ۔ ان ہی کی طرف اشارا کرتے ہوئے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کر کے قریش کو توجہ دلائی ہے منها قائم وحصید یعنی ان بستیوں میں بعض قائم

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں۔ جن کو دیکھ سکتے ہو اور کچھ ان میں سے بالکل ملیا میٹ ہو گئیں۔ حصید کٹی ہوئی کھیتی کو کہتے ہیں جیسے حدیث میں ہے ما النار الا حصائد السنتکم۔ دوزخ تو نام ہی تمہاری زبانوں کی لگائی ہوئی کٹی ہوئی کھیتیوں کا ہے یہاں لفظ حصید ان بستیوں کیلئے استعمال ہوا ہے جو عذاب الٰہی سے یکقلم نیست و نابود ہو گئیں قائم کی ایک مثال مصر ہے جس سے فرعون اور اس کی فوج کو نکالا اور سمندر میں غرق کر دیا۔ مکان قائم رہ گئے مکین کا نام و نشان نہ رہا حصید سے مراد قوم ہود اور قوم لوط کی بستیاں ہیں جن کے مکان اور مکانوں کے ساتھ سارے مکین سب ملیا میٹ کر دیئے گئے۔ صرف کسی کے کچھ کچھ آثار اپنے مکینوں کی داستان عبرت سنانے کے لیے رہ گئے۔ یہ بات اہل مکہ حضور اقدس صلعم کے مخاطبوں کو سنا کر اس لیے کہی گئی کہ اگر انہوں نے ان قوموں کی روش کو اپنایا تو لازماً ان کا انجام بھی وہی ہوگا جو تاریخ میں ان قوموں کا ہوا ہے۔ کیونکہ قرآن نے تذکیر و موعظت کے لیے جو باتیں بطور دلائل پیش کی ہیں ان میں ایک نمایاں استدلال ایام و وقائع کا ہے۔ قرآن نے جہاں کہیں گزشتہ قوموں کے حالات بیان کیے ہیں ان کا مقصد یہ نہیں ہے کہ تاریخی داستان کو بیان کیا جائے بلکہ بتانا یہ ہے کہ قوموں اور جماعتوں کی سعادت و شقاوت اور حیات و ممات کا ایک قانون ہے اور جیسے اللہ سبحانہ کے تمام قوانین یکساں اور عالمگیر ہیں اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک طرح رہا ہے اور ہمیشہ ایک طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوئے ہیں زمانوں اور مکانوں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہوتی ہے۔ قانونِ الٰہی یہ ہے کہ ظالم قوموں کو اپنے ظلم کی لگائی ہوئی کھیتی کاٹنی پڑتی ہے۔

(۱۴۳) اللہ کا قانون مجازات

اور ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ انہوں نے خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ جب اللہ پاک کی گرفت میں آگئے تو ان کے وہ معبود کچھ کام نہ آئے جن کو وہ اللہ کو چھوڑ کر پکارتے تھے۔ اور ان کے حق میں انہوں نے ہلاکت کے سوا کسی چیز کا اضافہ نہیں کیا۔ یعنی اللہ سبحانہ نے کسی کو بے قصور نہیں پکڑا جو ظلم کا وہم ہو سکے۔ جب وہ جرائم کے ارتکاب میں حد سے نکل گئے اور اس طرح اپنے آپ کو سزا کا کھلم کھلا مستحق ٹھہرایا تب خدا کا عذاب آیا پھر دیکھو جن معبودوں دیوتاؤں کا انہیں بڑا سہارا تھا اور جن سے بڑی بڑی توقعات قائم کر رکھی تھیں وہ ایسی سخت مصیبت کے وقت کچھ بھی کام نہ آئے۔ باطل معبود کام کیا آتے الٹے ہلاکت کا سبب بنے جب انہیں نفع و ضرر کا مالک سمجھا، اُمیدیں قائم کیں، چڑھاوے چڑھائے، تعظیم اور ڈنڈوت کی تو یہ روز بد دیکھنا پڑا۔ تکذیب انبیاء وغیرہ کا جو عذاب ہوتا تھا شرک و بت پرستی کا عذاب اس پر مزید رہا[۱] یعنی یہ جو کچھ ہوا قانون مجازات

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

کا ناگزیر تقاضا تھا یہ ان کے ظلم کا نتیجہ تھا۔ اللہ کے ظلم نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ نے ان کو سننے کے لیے کان دیئے، دیکھنے کے لیے آنکھیں دی ہیں۔ اور سمجھنے کے لیے دل عطا فرمایا ہے۔ کوئی بھی ایسی چیز ان کو دینے میں کمی نہیں کی جو حق و باطل کا فرق سمجھنے کے لیے ضروری تھی۔ مگر لوگوں نے خواہشات کی بندگی اور دنیا کے عشق میں مبتلا ہو کر آپ ہی اپنی آنکھیں بند کر لی ہیں، اپنے کان بہرے کر لیے ہیں اور اپنے دلوں کو اتنا مسخ کر لیا ہے کہ ان میں بھلے برے کی تمیز، صحیح و غلط کے فہم اور روح کی زندگی کا کوئی اثر باقی نہ رہا۔

یہ اس بات کیلئے ایک قسم کا استدراک ہے کہ آخر ان لوگوں کا یہ حال کیوں ہوا کہ وہ ایسے اندھے بہرے ہو گئے کہ بالآخر اللہ سبحانہٗ کے ابدی عذاب کے مستحق ہوئے۔ فرمایا کہ یہ اس وجہ سے نہیں ہوا کہ اللہ نے ان پر کوئی ظلم کیا ہے بلکہ لوگ خود ہی اپنی جانوں پر ظلم کرتے رہے ہیں۔ اللہ نے تو انسان کو بہترین صلاحیتوں سے مالا مال کیا ہے۔ اگر وہ ان سے کام لے تو نبیوں اور رسولوں کی آواز اس کو اپنے دل کی آواز معلوم ہو لیکن اپنی اپنی چاہتوں کے پیچھے پڑ کر اندھے اور بہرے ہو جاتے ہیں اور اس طرح وہ خود اپنے آپ پر ظلم کرتے ہیں۔ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں۔

> ہم نے ان کو ہلاک کر کے ان پر ظلم نہیں کیا بلکہ خود انہوں نے اپنی ہلاکت کے اسباب فراہم کر کے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔

اور علامہ بقاعیؒ فرماتے ہیں۔

> ہم نے ان پر بالکل ظلم نہیں کیا ہے انہوں نے اپنے افترائی معبودوں پر سہارا کر کے اور ان کی عبادت کر کے اور ہم سے روگردانی کر کے اپنی جانوں پر ظلم ڈھایا ہے۔

اور علامہ محمد طاہر ابن عاشورؒ فرماتے ہیں۔

> اللہ کی جانب سے ان پر کوئی ظلم نہیں ہوا کیونکہ ان پر جو افتاد بھی پڑی ہے وہ ان کے اعمال بد کا ناگزیر نتیجہ ہے۔

اور علامہ آلوسیؒ نے اس سے زیادہ خوبصورت بات فرمائی ہے۔

> ان بستیوں کو ہلاک کر کے ہم نے ان پر ظلم نہیں کیا لیکن چونکہ انہوں نے خود ایسے جرائم کا ارتکاب کیا ہے جن کے نتیجے میں اللہ کے قانون حکمت کے مطابق ان کی ہلاکت ہوئی۔ تو ظلم خود کمانے والے وہ ہیں۔

ان بزرگوں کا منشا یہ بتانا ہے کہ جس طرح یہاں عالم مادی میں ہر بات میں اللہ سبحانہٗ کے مقرر کردہ قوانین ہیں اسی طرح عالم انسانیت میں بھی قوموں اور جماعتوں کے لیے سعادت و شقاوت حیات و ممات کے بھی

قوانین ہیں۔ اور جس طرح اللہ تعالیٰ کے سارے قوانین میں یکسانی ہے۔ عالمگیری ہے۔ اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ ایک ہی طرح کار رہا ہے اور ہمیشہ ایک طرح کے نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی ہے۔ جس طرح عالم مادی میں سنکھیا کا خاصہ ہلاکت ہی ہے خواہ کسی ملک اور کسی عہد میں کھائی جائے۔ اسی طرح عالم انسانی کے قانون کے احکام و نتائج بھی یکساں ہوں گے خواہ کسی ملک یا کسی عہد میں پیش آئیں۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ اب سے ہزار برس پہلے تو سنکھیا کا خاصہ کا ہلاکت رہا ہو اور اب زندگی ہو جائے جو کچھ ماضی میں پیش آچکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے۔ اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ کے قوانین میں تبدیلی نہیں ہوتی ہے ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا۔ یہاں ایک مرتبہ کا حادثہ ایک ہی بار کا حادثہ نہیں ہے۔ خواص و نتائج دائمی ہیں۔ یعنی جو بات ایک بار ظہور میں آتی ہے ہمیشہ ظہور میں آتی رہے گی۔ جب مادی عالم میں اس کا مشاہدہ ہو رہا ہے تو عالم انسانی یعنی اعمال کے لیے اس کا انکار کیسے کیا جا سکتا ہے اگر سنکھیا کا کھانا موجب ہلاکت ہے تو اعمال انسانی کا نتیجہ بھی یقیناً ہلاکت ہے۔ عالم مادی میں قانون عقلی کو ماننا اور عالم انسانی میں قانون معنوی سے روگردانی بہت بڑی بے انصافی ہے۔

آگے ان کے اپنی جانوں پر ظلم کو بنیاد بنا کر تفریع کی ہے کہ جب ان کی تباہی کا اللہ کی جانب سے حکم آیا تو ان کے وہ سارے افترائی معبود جن کو وہ حاجت روا سمجھ کر پکارتے تھے، دعائیں مانگتے تھے، دہائیاں دیتے تھے ان کے کچھ کام نہ آئے اور جن کے نام کے بکرے، بھیڑ اور اس قسم کی بیسیوں خرافات کر رہے تھے وہ بھی ان کے کچھ کام نہ آئے۔ کیونکہ وہ سب ان کے وہم کی ایجاد تھے اور وہمی تخلیقات حقیقت کے مقابلے میں کچھ کام نہیں آتے اس جملے پر غور کیجئے اور بار بار کیجئے فما اغنت عنھم الھتھم التی یدعون من دون اللہ من شیئ یعنی ان کے وہ سارے معبود جن سے وہ اللہ سے ورے دعائیں مانگتے تھے۔ ان کے کچھ بھی کام نہ آئے۔ عام شارحین قرآن نے یدعون کو یعبدون کا مترادف قرار دیا ہے۔ بتانا یہ چاہتے ہیں کہ عجز و نیاز اور دعا، وطلبگاری کے تعلقات قائم کرنے کو عبادت کہتے ہیں۔ ارشادات نبوت سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ حضرت انسؓ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے الدعاء مخ العبادۃ دعاء عبادت کا مغز ہے اور حضرت نعمان بن بشیرؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ الدعاء ھو العبادۃ دعا بھی عبادت ہے اس کے بعد آپ نے یہ آیت تلاوت کی۔

وقال ربکم ادعونی استجب لکم ان الذین یستکبرون

عن عبادتی سیدخلون جہنم داخرین۔

تمہارے رب نے فرمایا کہ مجھ سے دعا، مانگو میں قبول کروں گا بلاشبہ جو لوگ میری عبادت سے سرکشی کرتے ہیں وہ ضرور جہنم میں جائینگے۔

اگر یہ واقعہ ہے کہ زمان ومکان بدلنے اور قوموں کی تبدیلی سے قوانین نہیں بدلتے ہیں تو جو دعائیں، نیازیں، دہائیاں، نذریں اور چڑھاوے آج مسلمانوں میں دینداری کے نام پر رائج ہیں۔ قرآن کی آیت یدعون من دون اللہ کا ضرور مصداق ہیں۔

علماء کرام کا وہ طبقہ جو عام مسلمانوں میں شیخ سدو کے بکروں خواجہ خضر کے بیڑوں، شیخ جیلانیؒ کی گیارہویں، شیخ بلخیؒ کی سترھویں اور از من قبیل بیسیوں او ہامی خرافات کو دیکھ دیکھ کر کڑھتا رہتا ہے اور منبر ومحراب کو اپنی ڈانٹوں اور جھڑکیوں سے ہلاتا رہتا ہے اس کا پس منظر یدعون من دون اللہ کے سوا کیا ہے مگر ذرا دل پر ہاتھ رکھ کر سوچیئے کہ باوجود سب کچھ کہنے کے، سب کچھ سنانے کے ان کی تقریروں کا اثر ان کے مصلّوں سے باہر کیوں محسوس نہیں ہوتا ان کی آواز مساجد سے نکل کر مشاہد تک کیوں نہیں پہنچتی ہے ان کی دھمکیاں صرف مسجدوں کی دیواروں سے ٹکرا کر کیوں واپس ہو رہی ہیں کیا بات ہے کہ ایصال ثواب کی آڑ میں کرنے والے وہ سب کچھ کر رہے ہیں جو وہ کرنا چاہتے ہیں۔ یہ خیال تو یقیناً غلط ہے کہ مسلمانوں کی یہ عمومی زندگی جو ان خرافی اوہام میں مبتلا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کی توحید عبادت سے منکر ہے یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت میں ان کو شک ہو گیا ہے اور یا ان کے نزدیک قرآن اللہ کی کتاب نہیں ہے۔ مسلمانوں کے اس ارتداد کا میں قطعاً قائل نہیں ہوں۔ مرض کے اسباب کی یہ تشخیص غلط اور قطعاً غلط ہے مشاہدا اور معائنہ کے خلاف ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ ہمارے ان علماء نے مسلمانوں کے سامنے اللہ سبحانہٗ سے عابدانہ تعلقات کو صرف اور صرف آخرت میں نجات تک محدود کر رکھا ہے ان کو یہ بتانا گوارا ہی نہیں کیا کہ آخرت میں نجات کے ساتھ دنیا میں کامیابی کیلئے جو کچھ مانگا جائے مساجد میں اللہ سے مانگا جائے۔ مشاہد اور مقابر عبرت کی جگہ ہیں، طلب و دعاء کا مقام نہیں ہیں۔ صرف معاشی دشواریوں اور دنیاوی حاجتوں ہی نے عام مسلمانوں کا رُخ مساجد میں اللہ سبحانہٗ سے ہٹا کر مشاہد اور مقابر کی طرف کر دیا ہے۔ عموماً ساری بدعات اور مشرکانہ کاروبار کے پیچھے معاشی محرکات ہی کارفرما ہیں۔ یہ بے جان بات ہے کہ ان اعمال واشتغال کی پشت پر کوئی دینی یا اعتقادی، اخلاقی یا روحانی محرک ہے۔ محض ایک وسوسہ ہے یقین کیجئے اللہ سبحانہٗ کو جب تک مسلمانوں کے سامنے الٰہ المعاش بنا کر پیش نہ کریں گے اس وقت تک صرف الٰہ المعاد والے اللہ سے وہ تعلق ان کا قائم نہیں ہو سکتا جس کا سب

نبیوں نے اپنے مخاطبوں سے اور قرآن نے ہر مسلمان سے مطالبہ کیا ہے۔ جنت اور دوزخ کا مالک خدا ان اختراعی اور افترائی الٰہوں سے کیسے بے نیاز کر سکتا ہے جن کے متعلق بتانے والے بتاتے ہیں کہ ان میں کوئی نوکری دلاتا ہے کوئی اولاد تقسیم کرتا ہے، کوئی جنوں کو بھگاتا ہے، کوئی دشمنوں کو شکست دیتا ہے۔

تا نہ بیند کودکے کو سیب ہست

او پیاز گندہ را ند ہد ز دست

سیب دیئے بغیر آپ اگر چاہتے ہیں کہ بچہ بدبُودار پیاز کو چھوڑ دے تو یہ آپ کا غیر فطری مطالبہ ہے۔ اگر مسلمانوں کو واقعی ارحم الراحمین مالک الملک کے قدموں پر لوٹنے کی دعوت دی جائے۔ تو کیا وہ اس سے روگردانی کر سکتا ہے۔ لاپرواہیوں کی انتہا ہے کہ عوام ہی نہیں اچھے پڑھے لکھے مولویوں سے جب کلمۂ دعوت لا الٰہ الا اللہ کا مطلب پوچھا جاتا ہے تو بتا دیا جاتا ہے کہ اللہ ایک ہے بس یہی اس کا حاصل ہے۔ حالانکہ نہ یہ اس کا لفظی ترجمہ ہے نہ یہ اسکا مفاد ہے آخر اگر اللہ ایک ہے تو اس میں غریب بندوں کا کیا فائدہ! کس قدر عجیب بات ہے کہ بچھڑے ہوئے بندوں کو جس لفظ الٰہ کے ذریعے اللہ سے جوڑا گیا تھا اور اسے باور کرایا گیا تھا کہ زندگی کی تمام ضرورتوں اور کشمکش حیات کی تمام مشکلات اور دشواریوں میں انتہائی عاجزی اور نیازمندی، مسکنت وخاکساری، تذلل وابتہال کے ساتھ جان و دل کی پوری قوت سے جس کی طرف بھاگنا چاہیئے وہ اللہ سبحانہٗ کے سوا دوسرا کوئی نہیں ہے۔ لیکن اسی کلمہ دعوت کو جب سمجھا گیا تو بس یہی بتایا گیا کہ اللہ ایک ہے اور اس کی تعبیر واجب الوجود سے کر کے دلائل کا انبار لگا دیا۔ جس چیز کا کسی کو انکار نہ تھا ساری طاقتیں اسی ملنے ہوئے اقرار کے منوانے پر خرچ کر دی گئیں لیکن دعوت کے اس جملہ میں الٰہ کا لفظ طاق نسیاں بنا دیا گیا حالانکہ یہی لفظ اس سارے کلمے کی جان تھا، یہی عبد کو اپنے معبود سے ملاتا تھا۔ اسی کو ہر قسم کی تشریح سے بے نیاز سمجھ لیا گیا اور ساری توجیہات کا مرکز صرف یہ رہ گیا کہ اللہ ایک ہے گویا جس نے اللہ کو ایک مان لیا اس نے اپنے اس فرض کو ادا کر دیا جس کی ذمہ داری لا الٰہ الا اللہ کے ذریعے اس پر ڈالی گئی کیسی عجیب بات ہے کہ اسلام کی عمارت کی جو پہلی اینٹ تھی اسی کے متعلق غفلت سے کام لیا گیا حتیٰ کہ کچھ نے لا الٰہ الا اللہ کا ترجمہ ہی یہ کر دیا کہ خدا کے سوا کوئی خدا نہیں ہے اور مالکم من الٰہ غیرہٗ کے معنی یہ بتلائے گئے کہ اللہ کے سوا تمہارا خدا کوئی نہیں ہے۔ انا اللہ فالی اللہ المشتکیٰ۔

آخر میں فرمایا کہ ما زادوھم غیر تتبیب یعنی ان الٰہوں نے جن سے وہ دعائیں کرتے تھے لوگوں کی ہلاکت میں اضافہ کیا یعنی ان سے دعائیں مانگنا عذاب میں اضافہ کا سبب بنا کیونکہ جھوٹے سہارے ضرورت کے وقت میں مصیبت اور محرومی ہی میں اضافہ کرتے ہیں۔ آیت ایسی انداز تعبیر بتا رہا ہے کہ وہ جن سے دعائیں مانگ رہے تھے صرف دیوتا، بت ہی کے نام پر ڈھانچے اور اشخاص

نہ تھے بلکہ ان اشخاص کے پس منظر میں کچھ شخصیتیں تھیں۔ جن سے وہ عجز و نیاز دعا اور طلبگاری کی درخواستیں کرتے تھے اسی لیے علامہ آلوسیؒ لکھتے ہیں کہ التی اس آیت میں بمعنے الذین کے ہے پوری آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔ نہیں کام آئیں لوگوں کے وہ ہستیاں جن سے اللہ کے سوا دعائیں مانگتے تھے۔ کچھ بھی جب عذاب کے بارے میں حکم الٰہی آگیا۔ اور کام تو کیا خاک آتے بلکہ ان کا افترائی سہارا ان کی مزید تباہی کا سامان بن گیا۔

(۱۲۴) قریش مکہ کو تنبیہ

اور دیکھو ایسے ہی آپ کے مالک کی گرفت ہوتی ہے جب وہ آبادیوں کی ظلم کی پاداش میں گرفت کرتا ہے اس کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے یعنی ظالموں کو بڑی حد تک مہلت دی جاتی ہے جب کسی طرح باز نہیں آتے تو پکڑ کر گلا دبا دیا جاتا ہے۔ مجرم چاہے کہ تکلیف کم ہو یا اس کی پکڑ سے چھوٹ کر بھاگ نکلے این خیال است و محال است و جنوں[1] مطلب یہ ہے کہ جب اللہ سبحانہٗ آبادیوں اور آباد کاروں کو ان کے ظلم، ان کی سرکشی اور ان کے بن سرے ہونے کی سزا دیتا ہے تو اسی طرح دیتا ہے جس طرح ان قوموں کو دی جن کی تاریخی داستانیں پہلے بیان ہوئی ہیں۔ اس وقت اللہ سبحانہٗ کی گرفت بڑی سخت اور دردناک ہوتی ہے۔ یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے قریش مکہ کو سنائی گئی ہے کہ وہ آگاہ ہو جائیں اب ان کو بھی اسی میزان میں تولا جائے گا۔ جس میں پہلی قوموں کو تولا گیا ہے۔ اللہ سبحانہٗ نے جو معاملہ تاریخ میں ان قوموں کے ساتھ کیا ہے کوئی وجہ نہیں کہ قریش کے ساتھ اس سے الگ معاملہ ہو۔ اس باب میں اللہ کا قانون ایسا ہی ہے۔ اس کی رحمت نے مہلتوں پر مہلتیں دی ہیں اور روشنی کو تاریکی سے بالکل الگ کر دیا ہے۔ لیکن اگر کوئی قوم روشنی سے یک قلم منہ موڑے تو نتائج و عواقب کا ظہور بھی نہیں رک سکتا۔ ان کے ظہور کی دردناکی و شدت کبھی دور نہیں ہو سکتی حافظ ابن کثیرؒ نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے۔

> اللہ سبحانہٗ بتا رہے ہیں کہ جیسا ہم نے ان ظالم اور نبوت کی تکذیب کرنے والی قوموں کے ساتھ اہلاک کا معاملہ کیا ہے ایسے ہی ہم ان جیسوں کے ساتھ ہلاکت کا معاملہ کریں گے۔

[1] افادات شیخ الاسلام

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس آیت سے قانون امہال پر استدلال کیا ہے حافظ ابن کثیرؒ نے صحیحین کے حوالہ سے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کی یہ روایت پیش کی ہے ۔

قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان اللہ لیملی لاظالم حتی اذا اخذہ لم یفلتہ

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اللہ سبحانہ ظالم کو ڈھیل دیتا رہتا ہے تاآنکہ جب اس کی گرفت کرتا ہے تو ظالم اس کی گرفت سے بچ نہیں سکتا ۔

اس کے بعد ابو موسیٰؓ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے زیر تشریح آیت کی تلاوت فرمائی ۔ یعنی وکذالك اخذ ربك اذا اخذ القریٰ الخ اگر قوانین قدرت کی ان مہلت بخشیوں سے فائدہ اٹھا کر نقصان وفساد کی اصلاح کرلی جائے ۔قرآن اسی فائدہ اٹھانے کا موقع دینے، ڈھیل دینے، عفو ودرگذر کرنے اور ایک خاص مدت تک فرصت حیات بخشنے کو املا روامہال اور تمتیع کا نام دیتا ہے اور یہ اس لیے ہے کہ کائنات میں فضل ورحمت کام کررہی ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ ہر غلطی کو درستگی کے لیے، ہر نقصان کی تلافی کے لیے، ہر لغزش کو سنبھل جانے کے لیے زیادہ سے زیادہ مہلت اصلاح ملتی رہے اور اس کا دروازہ کسی پر بند نہ ہو۔ اسی لیے پیغمبروں کے مخاطبوں کے مطالبہ پر معجزات میں تاخیر کی جاتی ہے ۔اس کا بڑا سبب یہی ہے کہ مہلت اور فرصت کی گھڑیاں ختم ہوجاتی ہیں اور منکرین کو ہلاک کردیا جاتا ہے چنانچہ اس کی مثالیں قوم نوحؑ، نمرود اور فرعون سے لے کر قریش مکہ تک کی تاریخ پیش کرتی ہے۔ اور قرآن نے اسے بتصریح یہاں بیان کردیا ہے ۔جس طرح افراد کی موت وحیات کا ایک زمانہ مقرر ہے اسی طرح قوموں کی ہلاکت وبربادی کی بھی ایک خاص مدت متعین ہے ۔

إِنَّ فِي
ذَٰلِكَ لَآيَةً لِمَنْ خَافَ عَذَابَ الْآخِرَةِ ۚ ذَٰلِكَ يَوْمٌ مَجْمُوعٌ
لَهُ النَّاسُ وَذَٰلِكَ يَوْمٌ مَشْهُودٌ ﴿١٠٣﴾ وَمَا نُؤَخِّرُهُ إِلَّا لِأَجَلٍ
مَعْدُودٍ ﴿١٠٤﴾ يَوْمَ يَأْتِ لَا تَكَلَّمُ نَفْسٌ إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ فَمِنْهُمْ
شَقِيٌّ وَسَعِيدٌ ﴿١٠٥﴾ فَأَمَّا الَّذِينَ شَقُوا فَفِي النَّارِ لَهُمْ فِيهَا
زَفِيرٌ وَشَهِيقٌ ﴿١٠٦﴾ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ السَّمَاوَاتُ وَ
الْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۚ إِنَّ رَبَّكَ فَعَّالٌ لِمَا يُرِيدُ ﴿١٠٧﴾ وَ
أَمَّا الَّذِينَ سُعِدُوا فَفِي الْجَنَّةِ خَالِدِينَ فِيهَا مَا دَامَتِ
السَّمَاوَاتُ وَالْأَرْضُ إِلَّا مَا شَاءَ رَبُّكَ ۖ عَطَاءً غَيْرَ مَجْذُوذٍ ﴿١٠٨﴾
فَلَا تَكُ فِي مِرْيَةٍ مِمَّا يَعْبُدُ هَٰؤُلَاءِ ۚ مَا يَعْبُدُونَ إِلَّا كَمَا
يَعْبُدُ آبَاؤُهُمْ مِنْ قَبْلُ ۚ وَإِنَّا لَمُوَفُّوهُمْ نَصِيبَهُمْ غَيْرَ
مَنْقُوصٍ ﴿١٠٩﴾ ع

بلاشبہ اس میں بڑی عظیم نشانی ہے ہر اس شخص کے لیے جو آخرت
میں ہونے والی گرفت سے اندیشناک ہے[125] وہی تو ایک دن ہے جس
میں سب اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور وہی تو ایک دن جس میں

نمائش ہوگی [۱۲۶] اور ہم اس دن کے لانے میں صرف ایک مقررہ مدت کی
خاطر تاخیر کر رہے ہیں [۱۲۷] وہ دن جب آجائے گا تو کسی کو یارائے سخن بغیر
حکم الٰہی نہ ہوگا۔ لوگوں میں کچھ محروم و بدبخت ہوں گے اور کچھ بانصیب
اور نیک بخت [۱۲۸] بدبختوں کی آماجگاہ دوزخ ہے۔ اس میں اُن کی چیخ
اور دھاڑ ہوگی سدا رہیں گے اس میں جب تک آسمان و زمین قائم ہیں
مگر ہاں اس صورت میں کہ تیرا پروردگار چاہے بے شک تیرا رب جو
چاہتا ہے کر ڈالتا ہے [۱۲۹] اور بانصیب و سعادت مند لوگ جنت میں ہوں گے
جب تک آسمان و زمین قائم ہیں سدا اسی میں رہیں گے مگر ہاں اس صورت
میں کہ تیرا پروردگار چاہے۔ یہ دین اور عطا ایسی ہوگی جو کبھی ختم ہونے والی
نہیں ہے [۱۳۰] لہٰذا اے اللہ کے رسول تو ان معبودوں کی جانب سے کسی شبہ
میں نہ رہ جن کی یہ لوگ عبادت کر رہے ہیں ان معبودوں سے ان کے عابدانہ
تعلقات اپنے پہلے باپ دادوں کے عمل کی کاپی ہیں ہم ان کو بھی ان کا
حصہ پورا پورا دیں گے اس میں کوئی کمی نہ ہوگی [۱۳۱]

مفردات کے معانی

شقی بد بخت اور محروم شقاوت سے بروزن فعیل صفت مشبہ کا صیغہ ہے جمع اشقیا۔ سعید نیک بخت بانصیب سعادت سے جس کے معنے نیک بخت ہونے کے ہیں بروزن فعیل صفت مشبہ ہے جمع سعدا۔

زفیر چلانا زفیر یزفر کا مصدر ہے۔ علامہ خازن بغدادیؒ لکھتے ہیں کہ زفیر کی اصل سانس کی اتنی آمد رفت ہے کہ پسلیاں اس سے پھولنے لگیں۔ اور شہیق سینے کی طرف سانس کا لوٹانا ہے یا زفیر سانس کھینچ کر اس کو سینے سے نکالنا ہے۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں۔ زفیر زور کی آواز ہے اور شہیق پست آواز۔ ضحاک و مقاتل کا بیان ہے کہ زفیر گدھے کی پہلی آواز کو اور شہیق اس کی آخری آواز کو جب کہ وہ اسے سینے کی طرف لوٹاتا ہے۔ ابوالعالیہ کہتے ہیں کہ زفیر حلق سے ہوتی ہے اور شہیق پیٹ سے

آخرت کی یاد دہانی

یہاں کچھ شارحین قرآن نے غلط مبحث کر دیا ہے اور آیت قرآنی کا منشا یہ سمجھ لیا ہے کہ تاریخ کے ان واقعات میں ایک ایسی نشانی ہے جس پر اگر انسان غور کرے تو اسے یقین آجائے گا کہ عذاب آخرت ضرور پیش آنے والا ہے اگر یہ بات سمجھانی ہوتی تو تعبیر یہ ہوتی کہ ان فی ذالک لآیتا لعذاب الآخرۃ۔ کہا یہ جا رہا ہے کہ ان تاریخی واقعات میں اس شخص کے لیے جو آخرت کو مانتا ہے اور آخرت کے عذاب کا اندیشہ رکھتا ہے بہت بڑی نشانی اور عبرت ہے یعنی ہر اس شخص کے لیے جو آخرت کے خیال سے بے خوف نہ ہو اس میں حقیقت کی بڑی نشانی ہے کیونکہ اس سے ثابت ہوتا ہے کہ جزائے عمل کا قانون دنیا میں نافذ ہے اور اللہ کے پیغمبروں کا پیغام جھوٹا نہیں ہے۔ اس کے بعد سمجھایا ہے کہ ہر انسان کو آخرت کا خوف کیوں رکھنا چاہیئے۔ اس لیے کہ جس طرح دنیا میں ہر چیز کے خواص اور ہر حادثہ کے نتائج ہیں۔ ٹھیک اسی طرح اعمال انسانی کے بھی خواص و نتائج ہیں اور یہاں مادیات کی طرح معنویات کے بھی قوانین کام کر رہے ہیں۔ اچھے اعمال کا نتیجہ اچھا ہوگا۔ اور برے اعمال کا نتیجہ برا ہوگا۔ یہ اچھے برے نتائج کس شکل میں پیش آئیں گے۔ ان آیات میں بتایا ہے کہ سعادت مند جنت میں ہوں گے ان کے لیے اس زندگی میں خوش حالیاں ہوں گی اور لقاء الٰہی کی دائمی نعمت ہوگی۔ اہل شقاوت اور بدعمل انسان دوزخ میں ہوں گے ان کے لیے دوزخی زندگی کی بدحالیاں ہوں گی۔

یہ مادی و جسمانی زندگی علت و معلول اور عمل رد عمل کے جس اصول پر قائم ہے اس کی وسعت کے دائرے میں انسان کا ہر قول اور ہر عمل شامل اور داخل ہے یہی سبب ہے کہ گناہ کے لازمی نتیجہ کا نام قرآن میں عقاب اور اعمال صالحہ کے لازمی نتیجہ کا نام ثواب ہے۔ ان دو لفظوں ہی پر اگر غور کر لیا جائے تو آخرت میں جزا و سزا کے اصول سمجھنے میں کوئی دقت نہ ہو۔

اشخاص کی نیکوکاری و بدکاری کے باسعادت و شقاوت کے جو اصول ہیں۔ وہی جماعتوں کی صلاح و

فساد اور سعادت و شقاوت کے اصول ہیں ۔ جس طرح ایک حکیم کا ان مادی اصول کو جاننا اور بتانا ہے اور اس کی تعلیم کا نام ہماری زبان میں حکمت اور سائنس ہے اسی طرح عالم انسانیت میں اعمال کے معنوی اسباب و علل اور آثار و نتائج کو جاننا اور بتانا نبوت کا کام ہے اور ان کی اس تعلیم کا نام اسلام ہے نبوت کی راہنمائی میں عالم انسانیت کے متعلق اعمال سے روحانی آثار و نتائج کا وہی یقین ہوتا ہے ۔ جو ایک حکیم کی تعلیم کے مطابق ہم کو جسمانی اشیاء کے خواص و آثار کا ہوتا ہے ۔ بتانا یہ ہے کہ آخرت میں جزا و سزا ہمارے ہی اعمال کے ردعمل کا نام ہے قرآن عزیز کی یہ تصریحات گواہ ہیں ۔ الیوم تجزون ما کنتم تعملون اور لتجزی کل نفس بما تسعی ۔ ان میں یہ صاف تصریح ہے کہ آخرت کی اچھی یا بری جنت یا دوزخ والی زندگی تمام تر دنیاوی اعمال کے آثار و لوازم ہیں ۔ بہرحال آخرت نام اس زندگی کا ہے جہاں اجسام کی تخلیق مادی عناصر سے نہیں بلکہ اعمال و اخلاق سے ہوگی ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے گویا اسی اصول کی تشریح میں فرمایا کہ اللہ سبحانہ فرمائیں گے ۔ اے میرے بندو یہ تمہارے ہی اعمال ہیں جو میں تمہیں لوٹا کر دے رہا ہوں تو جو جزائے خیر پائے وہ اللہ کا شکر ادا کرے اور جس کو برائی ملے وہ خود ہی کو ملامت کرے [1]

(۱۲۵) بلاشبہ اس میں بڑی عظیم نشانی ہے اس شخص کے لیے جو آخرت میں ہونے والی گرفت سے اندیشناک ہے یعنی دنیا جو دار عمل ہے جب شرک ، کفر ، تکذیب انبیاء پر سزائیں ملتی ہیں اور اس قدر سخت ملتی ہیں ۔ تو یہ ایک نشان ہے اس بات کو معلوم کرنے کا کہ آخرت میں جو خالص دار جزا ہے کیا کچھ سزا ان جرائم پر ملے گی ۔ اور کیا صورت رستگاری کی ہوگی عقلمند آدمی کے لیے جو اپنے انجام کو سوچ کر ڈرتا ہے اس میں بڑی عبرت و نصیحت ہے [2] ۔

اس پر شارحین قرآن کا اتفاق ہے کہ ان فی ذالک میں مشار الیہ قوموں کی سرگزشتیں ان سرگزشتوں پر غور کرو جتنے رسول آئے وہ کیسے وقتوں میں پیدا ہوئے اور کن لوگوں میں پیدا ہوئے ان کی پکار کیا تھی اور پکار کی نوعیت کیا تھی ، ان کی دلیلیں کیا تھیں جن پر انہوں نے زور دیا ان کا طریق کار کیا تھا جس پر وہ برابر کاربند رہے ۔ انہوں نے اپنے قدم جہاں جمائے تھے وہ جگہ کون سی تھی اور سہارے کے لیے جس کی طرف ہاتھ بڑھایا تھا وہ کون تھا ۔ پھر ان میں اور ان کی قوموں میں جو معاملات پیش آئے وہ کس قسم کے تھے اور ان معاملات میں ان کا قول کیا تھا ۔ پھر ان قوموں کی طرف نظر اٹھاؤ جن میں ان دعوتوں کا ظہور ہوا ۔ کس طرح ہر قوم اپنے طرز عمل میں دوسری قوم کی کاپی ہے اور کس طرح گمراہی کا چہرہ ہمیشہ ایک طرح کا رہا ۔ سب نے دعوت

---

[1] صحیح مسلم [2] افادات شیخ الاسلام

کا انکار کیا، سب نے دعوت کا مذاق اڑایا۔ سب نے دلیلوں سے منہ موڑا سب نے روشنیوں سے آنکھیں بند کر لیں، سب نے جبر و تشدد سے راستہ روکنا چاہتا۔

پھر نتیجہ دیکھو ہمیشہ اللہ سبحانہٗ کے فیصلے کا انتظار کیا گیا۔ اور ہمیشہ فیصلہ یہی ہوا۔ کہ مؤمنون نے نجات پائی، سرکشوں کو ہلاک کیا ان سب میں آخرت کے عذاب سے اندیشہ رکھنے والوں کے لیے بہت بڑی عبرت اور نصیحت ہے ان کو سوچنا چاہیئے کہ عالم انسانی میں جب اعمال کے نتائج کا یہاں یہ حال ہے تو عالم آخرت میں جس کی ترکیب و تکوین ہی اعمال کے آثار و نتائج سے ہوگی وہاں صورت حال کیا ہوگی! خاف عذاب الآخرۃ کی قید لگا کر قرآن نے اشارہ کر دیا کہ یہاں سوچنے والے دو طرح کے ہیں۔

ایک عالم طبعی پر غور کرنے والے دوسرے عالم انسانی پر فکر کرنے والے عالم طبعی پر غور کرنے والے یعنی عقلیت پسند یقیناً ان حوادث و واقعات کا پس منظر یہی بتائیں گے کہ طبعی اسباب ایسے پیدا ہوئے کہ زلزلہ آیا اور آبادی کی بلند عمارتیں پیوند زمین ہو کر رہ گئیں۔ بارشیں کثرت سے ہوئیں، دریاؤں میں پانی آیا اور سیلاب بن گیا۔ جس نے تمام علاقہ کو ویرانہ بنا دیا۔ ہر زمانہ کے عقل پرستوں کا یہی انداز فکر رہا ہے۔ جیسا کہ قاضی بیضاویؒ نے لکھا ہے واقعی عقلیت کی گود میں بیٹھ کر ان مسائل پر جب بھی غور کیا جائے گا تو مادی نگاہ رکھنے والے اسی فکری آوارگی کا شکار رہوں گے۔ اصل میں ان مسائل کا تعلق مادیت سے نہیں بلکہ عالم انسانی سے ہے۔ اس میں عقل کی راہنمائی پر کلی اعتماد نہیں کیا جا سکتا عالم انسانی اور عالم مادی دونوں کے تقاضے الگ الگ ہیں۔ کوئی دیانت دار آدمی اس بات سے انکار نہیں کر سکتا کہ عالم طبعی میں اور مادی دنیا میں صحت و صداقت کی تلاش کا حصول جتنا آسان ہے عالم انسانی میں اتنا ہی دشوار ہے عالم انسانی کے مسائل محض عقل کی وساطت سے حل نہیں ہو سکتے کیونکہ اس میدان میں عقلی استدلال نتائج کی صحت تک راہنمائی نہیں کر سکتا ہے۔ عالم مادی اور عالم انسانی کے اسی فرق کو بتانے کے لیے خاف عذاب الآخرۃ کی قید لگا دی ہے اور بتا دیا ہے جن کی نگاہ مادی ہے وہ واقعات کے سربستہ راز کو عقل کے ذریعے نہیں حل کر سکتے ہاں جو اعمال کے آثار و نتائج سے آگاہ ہیں اور عالم انسانی میں اعمال کے لوازم سمجھتے ہیں اور جانتے ہیں کہ آخرت میں اعمال کے نتائج عذاب و ثواب کا لبادہ پہن کر اٹھیں گے ان کے لیے اس دنیا میں ہونے والے اعمال کے نتائج میں بہت بڑی عبرت ہے۔

آیئے اب ذرا شارحین قرآن کی زبانی بھی آیت کی تشریح سُن لیجئے۔ حافظ ابن جریرؒ اپنی تفسیر میں فرماتے ہیں۔

آبادیوں میں سے جن کی ہم نے گرفت کی ہے اور جن کے واقعات اور داستانیں سنائی ہیں ان

میں ان لوگوں کے لیے بڑی عبرت ہے جن کو آخرت میں ہونے والے عذاب کا اندیشہ ہے۔ یہ واقعات ان کے لیے اللہ کی جانب سے ایک حجت ہیں اور اس میں ان کو نصیحت ہے کہ دنیا کی زندگی میں اللہ کی نافرمانی سے بچ کر رہیں ۔

حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں۔ کہ

اللہ سبحانہٗ فرماتے ہیں ۔ ہمارے نبیوں کو بچانے اور ان کے مقابل طاقتوں کو ہلاک کرنے میں اس بات کی واضح دلیل ہے کہ آخرت میں ہونے والے واقعات صحیح ہیں

علامہ بقاعیؒ اپنی تفسیر نظم الدرر میں فرماتے ہیں ۔

اس خبر اور واقعات میں اس شخص کے لیے بہت بڑی علامت ہے جسے عذاب آخرت کا اندیشہ ہے کیوں کہ جب وہ ظالموں کی ہلاکت آنکھوں سے دیکھ رہا ہے تو یہ بات اس کی راہنمائی کرے گی کہ آخرت میں جزا یقینی ہے ۔

علامہ ابوحیان اندلسیؒ اور علامہ آلوسیؒ نے بھی اپنی اپنی تفسیر میں اسی کے قریب قریب کہا ہے لیکن علامہ شوکانیؒ نے اس کو دوسرے پہلو سے دیکھا ہے وہ فرماتے ہیں کہ

عذاب آخرت کا اندیشہ رکھنے والے کے لیے ان واقعات میں اس بات کی دلیل ہے کہ اللہ سبحانہٗ آخرت میں بھی اعمال کی جزا پر مبنی وعدہ کو وفا کریں گے جیسا کہ یہاں انبیاء سے اپنا وعدہ وفا کیا ہے ۔

(۱۲۹) آخرت سب کی حاضری کا دن ہے

وہ ہی تو ایک دن ہے جس میں سب اکٹھے کر دیئے جائیں گے اور وہی تو ایک دن ہے جس میں نمائش ہوگی یعنی تمام دنیا کا بیک وقت فیصلہ اسی دن ہوگا جب سارے اولین و آخرین اکٹھے کئے جائیں گے اور کوئی شخص غیر حاضر نہ رہ سکے گا گویا خدائی عدالت کی سب سے بڑی پیشی کا دن وہی ہوگا[۱] یعنی یہ ایسا دن ہوگا کہ جس میں سب اکٹھے کیئے جائیں گے ۔ نیکی کی دعوت دینے والے بھی اور برائی کی راہ دکھانے والے بھی ۔ حاکم بھی اور محکوم بھی، شاہد بھی اور مشہود بھی ۔ اسی لیے اس دن کو یوم الجمع کہا گیا ہے ۔ وتنذر یوم الجمع لاریب فیہ ۔ اس دن میں لوگوں کو حساب اور جزا و سزا کے لیے جمع کیا جائے گا ۔ قل

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ان الاولین والآخرین لمجموعون الی میقات یوم معلوم ۔ قرآن میں قیامت کے ناموں میں دوسرے ناموں کے ساتھ یوم الجمع بھی آیا ہے ۔ یوم یجمعکم لیوم الجمع ۔ قرآن میں قیامت کے ایک سے زیادہ نام آئے ہیں ۔ ان میں سے ہر نام قیامت کے ایک خاص پہلو کو نمایاں کرتا ہے سب سے پہلا نام سورۃ فاتحہ میں یوم الدین آیا ہے ۔ یعنی جزا کا دن جس سے معلوم ہوا کہ یہ جزا کا دن اور زبانی عدالت کا دن ہوگا ۔ اس کے علاوہ اور بھی اس کے چند نام قرآن میں جا بجا آئے ہیں ۔

یوم القیامۃ	کھڑے ہونے کا دن
الیوم الحق	سچا دن جس کے آنے میں کوئی شک نہیں ۔
یوم معلوم	جانا ہوا دن یا مقرر دن
الیوم الموعود	موعود دن
الیوم الآخر	پچھلا دن
یوم الآزفۃ	مصیبت کا دن
یوم عسیر	سخت دن
یوم عظیم	بڑا دن
یوم عصیب	دشوار دن
یوم البعث	اُٹھنے کا دن
یوم التغابن	افسوس کا دن
یوم التلاق	باہم ملنے کا دن
یوم التناد	پکار کا دن
یوم الحساب	حساب کا دن
یوم الحسرۃ	حسرت کا دن
یوم الخروج	قبروں سے نکلنے کا دن
یوم الفصل	فیصلہ کا دن
القارعۃ	کھڑکھڑانے والی
الغاشیۃ	چھا جانے والی
الطامۃ الکبریٰ	بڑی مصیبت

انباء العظیم	بڑی خبر
الحاقۃ	ضرور آنے والی
الواقعۃ	واقع ہونے والی
الصاخہ	بہرا کرنے والی

یہ تو وہ نام ہیں جو اسم مفرد یا اضافت یا صفت کی صورت میں آئے ان کے علاوہ فقروں اور جملوں کی ترکیبوں کے ساتھ بکثرت آئے ہیں۔ جن سے اس ہولناک دن میں انسان کی بے کسی عاجزی اور اپنے اعمال کے کسی دوسری چیز کے کام آنے سے قطعاً مایوسی ظاہر کی گئی ہے۔

اس موقع پر آخرت کا ذکر ذالک یوم مجموع لہ الناس سے کرکے قرآن نے اشارا کردیا ہے کہ آخرت کا معاملہ کائنات ہستی کے عام قوانین سے الگ نہیں ہے بلکہ اسی کے ماتحت ہے یعنی دنیا میں جس طرح ہر چیز کے خواص اور ہر حادثہ کے نتائج ہیں ٹھیک اسی طرح پوری انسانی زندگی کے اچھے بُرے اعمال کے بھی خواص اور نتائج ہیں نتائج کے اسی عمومی اور بلا استثنا ر ظہور کا نام قیامت ہے

دنیا میں باری باری بہت سی قومیں وجود میں آئی ہیں اور قوانین الٰہی کے مطابق انہوں نے جسمانی طاقت، مالی وسعت، تمدنی عظمت اور سیاسی قوت حاصل کی۔ پھر جب انہوں نے غرور و نخوت، ظلم و ستم اور دوسرے قوانین الٰہی کی جو قوموں کی ہستی اور بقا کے لیے ضروری نہیں مخالفت کی تو وہ فنا کردی گئیں اور ان کا نام و نشان بھی صفحۂ ہستی سے مٹ گیا۔ عربوں سے سوال کیا گیا کہ تمہارے عاد و ثمود جو کبھی بنو سام کے ممالک عراق، شام، مصر و عرب پر چھائے ہوئے تھے کیا ہوئے سبا اور تبع کی عظیم الشان حکومتیں، قوم لوط اور قوم مدین کی عظیم الشان حکومتیں کیا ہوئیں فرعون اور اس کی عظمت کا کیا حال ہوا ذالک من انباء القریٰ الخ جس طرح عوام جو صرف افراد کو مرتے اور جیتے دیکھتے ہیں وہ قوموں کے فنا کے مسئلہ کو نہیں سمجھتے اسی طرح جن کی نظر عالم انسانیت کی تاریخ خلق پر نہیں ہے وہ کائنات کے فنائے کامل پر اپنی نادانی سے اعتبار نہیں کرتے۔ حالانکہ جیسے فنا ہونے کے لیے یہ جغرافیائی اور تاریخی واقعات ایک حقیقت ہیں اسی طرح ایک دن آئے گا جب پوری دنیا اپنے وجود کی صلاحیت سے معرا ہو جائے گی۔ کائنات کا یہ نظام بدل جائے گا اس موجودہ عالم کا قانون طبعی دوسرے قانون طبعی سے منسوخ ہو جائے گا اور پوری انسانیت سمٹ کر آجائے گی ذالک یوم مجموع لہ الناس آگے فرمایا ذالک یوم مشہود یہ دن سب کی حاضری اور پیشی کا دن ہوگا کوئی بھی غیر حاضر نہ ہوگا تاکہ ہر معاملے کے سارے فریق سامنے موجود ہوں اور پورے انصاف کے ساتھ ان کا فیصلہ ہو سکے۔

(۱۲۷) ایک واقعہ ایک حقیقت

اور ہم اس دن کے لانے میں صرف ایک مقررہ مدت کی خاطر تاخیر کر رہے ہیں یعنی اللہ کے علم میں جو مدت مقرر ہے جب وہ پوری ہو جائے گی تب وہ دن آئے گا تاخیر سے یہ گمان مت کرو کہ یہ محض فرضی اور وہمی باتیں ہیں [1] مطلب یہ ہے کہ اللہ سبحانہ کے یہاں ہر بات کے لیے ایک حساب ہے اور ہر معاملہ کے لیے ایک مقررہ معیاد جب تک وہ وقت نہ آئے اس بات کا ظہور نہیں ہو سکتا۔ آخرت کے لیے یہی ایک اجل معدود ہے یعنی یہ مدت غیر محدود نہیں بلکہ شمار کی ہوئی مدت ہے۔ شمار کی ہوئی مدت سے ایک حقیقت نفس الامری کا اظہار ہے یہاں جیسے ہر فرد کی بھی اجل مقرر ہے اس میں بھی تاخیر نہیں ہو سکتی ہے۔ لن یؤخر اللہ نفساً اذا جاء اجلھا اور ہر امت اور ہر قوم کی بھی اجل مقرر ہے ولکل امۃ اجل۔ جب وہ وقت نمودار ہو جاتا ہے۔ تو اللہ سبحانہ کا آخری اور اٹل اور بے پناہ فیصلے کی گھڑی آجاتی ہے نہ تو اس میں ایک لمحہ کی تاخیر ہو سکتی ہے۔ اور نہ یہ اپنے وقت مقررہ سے ایک لمحہ پہلے آسکتی ہے۔ ٹھیک اسی طرح اس کائنات کی بھی ایک اجل مقرر ہے اور علم الٰہی نے یہ تقرر روز اول ہی میں کر دیا ہے فرد کی اجل اور قوموں کی طرح یہ بھی ایک روز ظاہر ہو کر رہے گی فرد کی اجل کی تاخیر سے جیسے استدلال اجل نہ ہونے کا غلط ہے ٹھیک اسی طرح کائنات کی اجل کی تاخیر سے قیامت نہ آنے پر بھی استدلال کرنا غلط ہے۔ جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشو و نما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح پورے عالم انسانی کے اعمال کے نتائج کے لیے یہی مقدار اور وقت کا پیمانہ ہے اور ضروری ہے کہ نتائج وقت مقرر پر ظاہر ہوں اس صورت حال سے تاخیر کی حالت پیدا ہو گئی ہے لیکن یہ تاخیر تاجیل کی وجہ سے ہے اللہ کی رحمت کا مقتضا یہی ہے کہ تاجیل ہو۔ اصل یہ ہے کہ مادی زندگی کے احساسات کی زنجیروں میں ہم اس طرح جکڑے ہوئے ہیں کہ ان سے آزاد ہو کر جمال حقیقت کا تصور ہی نہیں کر سکتے بس اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ جو کچھ بتلایا گیا ہے۔ اس پر یقین کریں اور بس

(۱۲۸) روز قیامت کی ہولناکی

وہ دن جب آئے گا تو کسی کو یارائے سخن بغیر حکم الٰہی نہ ہوگا لوگوں میں کچھ محروم و بد بخت ہوں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

گے اور کچھ بانصیب اور خوش بخت ہوں گے یعنی کوئی ایسی بات جو مقبول ونافع ہو بدون حکم الٰہی سے نہ کرسکے گا محشر کے بعض مواقف میں تو ایک حرف بھی اذن واجازت بدون منہ سے نہ نکال سکے گا۔[1] یہاں سب سے پہلے یہ بات ذہن نشین کر لیجئے کہ مکہ کے قریش جو قرآن کی اس سورت میں مخاطب ہیں وہ قیامت کے صرف منکر ہی نہیں بلکہ انہیں اپنے انکار پر شدید اصرار ہے۔ قرآن نے ان کے انکار کو پورے زور و قوت سے پیش کیا ہے اور انکار کی شدت اور اصرار ہی کے پس منظر میں قیامت کے موضوع پر بیانات میں انداز تعبیر وہ اختیار کیا ہے جو منکرین کے لیے ہوتا ہے قرآن نے قیامت کے موضوع پر تکرار کے ساتھ ان کا انداز فکر یہ بتایا ہے کہ أإذا متنا وكنا ترابا ذالك رجع بعيد یہ حقیقت ہے کہ قرآن کے اولین مخاطبوں کو مکہ میں توحید کے بعد جس عقیدے سے شدت کے ساتھ انکار تھا۔ جس کے ماننے پر وہ کسی طرح آمادہ نہیں ہوتے تھے اور جو ان کی عقل میں کسی طرح نہ آتا تھا وہ یہی قیامت اور حشر ونشر کا مسئلہ ہے اس لیے قرآن نے ان کے سامنے عقیدہ توحید کے بعد جس عقیدے کو سب سے زیادہ زور کے ساتھ پیش کیا وہ یہی تھا۔ قرآن عزیز کی مکی سورتوں میں سب سے زیادہ اسی موضوع کو مختلف تعبیروں اور مؤثر طریقوں روزمرہ کے عینی مشاہدات اور دلائل کے ساتھ بیان کیا ہے جب صورت حال یہ ہے کہ قرآن کے مخاطب قیامت کو مانتے ہی نہ تھے تو اس کہنے میں کوئی معنویت نہیں ہے کہ

> یہ مشرکین کے اس گمان کی تردید ہے کہ ان معبودوں کو خدا کے ہاں عزت واعتماد کا وہ مقام حاصل ہے کہ خواہ ان کے اعمال کچھ ہی کیوں نہ ہوں لیکن وہ اپنے پجاریوں کو بہر حال چھڑا ہی لیں گے ——— فرشتوں کی نسبت ان کا گمان تھا کہ یہ خدا کی چہیتی بیٹیاں ناز اور تدلل سے اپنی ہر بات اپنے باپ سے منوا لیتی ہیں۔ اس طرح یہ اپنے باپ یعنی خدا سے ان سارے لوگوں کو بخشوا لیں گے جو دنیا میں ان کی عبادت کرتے رہے۔ (تدبر قرآن)

سوال یہ ہے کہ جب وہ معبودوں کی عبادت کرنے والے اور فرشتوں کو خدا کی بیٹیاں کہنے والے قیامت ہی کو نہیں مانتے ہیں تو ان کے بارے میں یہ نظریہ کیسے قائم ہوسکتا ہے۔ اگر مان لیا جائے کہ ان کا اپنے معبودوں کے بارے میں یہ خیال ہے کہ قیامت میں وہ ان کو بخشوا لیں گے تو ثابت ہوا کہ مشرکین مکہ قیامت کا انکار نہیں کرتے بلکہ قیامت کو مانتے ہیں۔ یہ صریح منطوق قرآنی کے خلاف ہے قرآن کا دعویٰ ہے۔ انهم كانوا لا يرجون حسابا۔ ماننا تو بڑی بات ہے ان کو تو حساب ہی کی امید نہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے وہ قیامت کا انکار ہی نہیں کرتے بلکہ اس کی کھلم کھلا تکذیب کرتے ہیں جیسے آیت کی اس تشریح میں کوئی معنویت نہیں ہے ایسے ہی یہ تفسیر بھی بے موقعہ غیر مناسب اور بے معنی ہے۔

یعنی یہ بیوقوف لوگ اپنی جگہ اس بھروسہ میں ہیں کہ فلاں حضرت ہماری سفارش کر کے ہمیں بچا لیں گے۔ فلاں بزرگ اُٹھ کر بیٹھ جائیں گے اور اپنے ایک ایک متوسل کو بخشوائے بغیر نہ مانیں گے فلاں صاحب جو اللہ میاں کے چہیتے ہیں جنت کے راستہ میں مچل بیٹھیں گے اور اپنے دامن گرفتوں کی بخشش کا پروانہ لے کر ہی ٹلیں گے۔ (تفہیم القرآن)

یہ بھی مشرکین مکہ کے نظریات کی عکاسی نہیں ہے وہ قیامت ہی کو نہیں مانتے اس لیے قیامت میں بخشنے اور بخشوانے کا ان کے ذہن میں کوئی تصور نہیں ہے۔ قیامت میں بخشنے کا تصور قیامت کو ماننے کے لوازم میں ہے۔ دراصل ان بزرگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ مشرکین مکہ کے اپنے معبودوں سے عابدانہ تعلقات معادی تھے یعنی ان کا پس منظر آخرت میں نجات تھی حالانکہ ایسا بالکل نہیں ہے کیونکہ وہ قیامت کو، حشر کو، جنت کو، دوزخ کو سرے سے مانتے ہی نہیں اس لیے ان کے بتوں اور فرشتوں سے عابدانہ تعلقات جنت اور دوزخ کے لیے نہیں ہے۔

آپ پوچھ سکتے ہیں اور آپ کو پوچھنا چاہیئے کہ مشرکین کے اپنے معبودوں سے عابدانہ تعلقات کا پس منظر کیا تھا۔؟

مشرکین کا اپنی عابدانہ نیاز مندیوں میں پیش نہاد معادی نہیں بلکہ معاشی تھا یعنی غیر اللہ کو الٰہ بنا کر جو کچھ مانگا جاتا تھا وہ عام طور پر اسی زندگی کی چیزیں ہوتی تھیں مثلاً بارش برسائی جائے، مویشیوں کا دودھ اور ان کی نسل بڑھائی جائے۔ کھیتوں کی پیداوار میں برکت دی جائے، باغوں کے پھلوں کو آفتوں سے محفوظ رکھ کر ان میں اضافہ کیا جائے، قحط کا ازالہ ہو، بیماریوں اور وباؤں سے محفوظ رکھا جائے، صاحب نصیب اولاد بخشی جائے، دشمنوں پر فتح ہو الی غیر ذالک من الامور المعاشیۃ۔ بلاشبہ غیر اللہ کی عبادت سے ان کی غرض یہی ہوتی تھی۔ اور اسی لیے مشرک قوموں کا یہ نظام جس کا دوسرا نام اضافی نظام ہے۔ یہ اضافی نظام ان کا ایک مستقل معاشی نظام تھا اس کا معاد سے دور کا بھی تعلق نہ تھا۔ کوئی بت پرست ایسا نہ تھا جو اپنے معبودوں سے عذاب قبر سے خلاصی مانگتا ہو یا کہتا ہو کہ حشر کی پریشانیوں میں مدد کی جائے جہنم سے محفوظ رکھ کر جنت کی ابدی زندگی عطا کی جائے ان نیک کاموں کی توفیق دی جائے جن سے مرنے کے بعد سکون حاصل ہو بہرحال جو کچھ مانگا جاتا تھا وہ اسی دنیا کی ضرورتوں کے متعلق مانگا جاتا تھا خیر یہ تو سرراہ بات آگئی۔ آئیے اب آیت کی وہ تشریح سنیئے جو شارحین قرآن نے پیش کی ہے۔

دراصل جس روز کی ذالک یوم مجموع لہ الناس میں خبر دی گئی ہے اس جملہ میں اسی کے مدلول کی تفصیل بیان ہو رہی ہے یعنی جس وقت وہ دن آئے گا تو وہ اس قدر عظیم الہیبت اور دہشتناک ہوگا. کہ کسی بھی شخص میں کچھ کرنا تو بڑی بات ہے کچھ کہنے کا بھی یارا نہ ہوگا اور کسی میں مجال دم زدن نہ ہوگی یہ اس دن کی دہشت کے لیے تعبیر ہے. اس روز کی ہولناکی کی وجہ سے سب ہی دم بخود ہوں گے اور کوئی بھی بات نہ کر سکے گا اور کچھ بھی نہ کہہ سکے گا. یہ دن طویل بھی ہوگا. ایک سے زیادہ اس کے رُوپ ہوں گے. صرف وہی بات کر سکے گا جسے بات کرنے کی اجازت ہو گی دوسری جگہ فرشتوں کا ذکر ہے.

لا یتکلمون الامن اذن لہ الرحمان وقال صوابا .

یعنی فرشتوں میں سے بھی اس کے دربار میں جو بولے گا اس کے حکم سے بولے گا. اور بات وہی کہے گا. جو ٹھیک اور معقول ہوگی .

یہاں یہ سوال بے حد اہمیت رکھتا ہے کہ قرآن میں اس موضوع پر مختلف باتیں کہی گئی ہیں . یہاں لا تکلم نفس الا باذنہ دوسرے موقعہ پر ھذا یوم لا ینطقون ولا یؤذن لھم فیعتذرون یعنی یہ وہ دن ہے جس دن میں یارائے گفتگو نہ ہوگا اور نہ ان کو معذرت پیش کرنے کی اجازت ہوگی .

ایک اور جگہ ہے واقبل بعضھم علی بعض یتساءلون باہم متوجہ ہو کر ایک دوسرے سے پوچھیں گے ایک اور موقعہ پر ہے یوم تاتی کل نفس تجادل عن نفسھا جس روز ہر جان سوال و جواب کرے گی اپنی طرف سے . ایک اور جگہ ہے وقفوھم انھم مسئولون ان کو ٹھہراؤ ان سے سوال کیا جائے گا . ایک اور موقعہ پر ہے فیومئذ لا یسئل عن ذنبہ انس ولا جان . یعنی کسی انسان اور جن سے اس کے گناہ کے بارے میں نہ پوچھا جائے گا .

شارحین قرآن نے اس کے مختلف جوابات دیئے ہیں . علامہ آلوسیؒ اور علامہ قرطبیؒ نے اس مقام پر اچھی داد تحقیق دی ہے .

کچھ کی رائے یہ ہے کہ میدان حشر کا زمانہ ایک طویل زمانہ ہے اور اس میں مختلف منظر ہوں گے. سب سے پہلا منظر اس دن کی ہولناکی اور دہشت کا ہوگا. اس ہولناکی سے سب دم بخود ہو جائیں گے صرف وہی کچھ بول سکیں گے جن کو بولنے کا رب ذوالجلال حکم دے گا مثلاً

یوم یجمع اللہ الرسل فیقول ماذا اجبتم قالوا لا علم لنا انک انت علام الغیوب .

جس روز سب رسولوں کو اکٹھا کر کے پوچھے گا تمہاری دعوت کو لوگوں کی جانب سے

کس قدر پذیرائی ملی ۔ رسول جواب میں کہیں گے ہمیں کچھ علم نہیں ہے آپ ہی دانائے غیب ہیں ۔

ایک منظر وہ بھی ہوگا جس میں گنہگاروں کے لیے شفاعت کا حکم اللہ سبحانہ کی جانب سے ہوگا یہ شفاعت وہ کریں گے جن کو شفاعت کا حکم ہوگا اور ان کی شفاعت کریں گے جن کے لیے اللہ سبحانہ، شفاعت پسند کریں گے ۔ ولا یشفعون الا لمن ارتضیٰ ۔

ایک منظر وہ ہوگا جب حساب ہو رہا ہوگا اس وقت بھی وہ بولے گا ۔ جسے بولنے کا حکم ہوگا عذر و معذرت ناقابل قبول ہوگی ۔

علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں مطلق گویائی کی نفی نہیں ہے بلکہ اس گویائی کی نفی جو قابل قبول اور نافع ہو علامہ قرطبی نے بھی اس کو پسند کیا ہے اور شیخ الاسلام مولانا عثمانیؒ نے یہ کہہ کر اسی کو اپنے افادات میں اپنایا ہے کہ

کوئی شخص ایسی بات جو نافع اور مقبول ہو بغیر حکم الٰہی نہ کر سکے گا ۔

آگے ارشاد ہے عنھم شقی وسعید یعنی اس روز جو شقی ہوگا اس کے لیے شقاوت ہوگی ۔ جو سعید نکلیں گے ان کے لیے سعادت ہوگی ۔

(۱۲۹) اہلِ شقاوت کا انجام دوزخ ہے

بدبختوں کی آماجگاہ دوزخ ہے اس میں ان کی چیخ اور دھاڑ ہوگی ۔ سدا رہیں گے اس میں جب تک آسمان وزمین قائم ہیں ۔ مگر اس صورت میں کہ تیرا پروردگار چاہے بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے ۔ زفیر اور شہیق دونوں گدھے کی آوازیں ہیں ۔ زفیر اس کے شروع کی آواز شہیق اس کے آخر کی آواز ۔ مراد یہ ہے کہ اہلِ دوزخ طرح طرح کی بڑی بڑی دردناک آوازوں سے چیختے چلاتے رہیں گے ۔ مادامت السماوات والارض ۔ محاورہ ہے ۔ اس سے مراد ابدیت اور دوام ہے ۔ ورنہ ظاہر ہے کہ زمین و آسمان تو اس وقت ختم ہوں گے اس لیے لفظی معنی مراد ہو ہی نہیں سکتے ۔ زمخشریؒ ، آلوسیؒ ، بیضاویؒ اور ابن جریرؒ نے بھی بتایا ہے الا ما شاء ربك یہ استثناء الذین شقوا سے ہے یعنی ہر شقی دوزخ میں جائے گا اور ہمیشہ اس میں پڑا رہے گا عام قاعدہ اور ضابطہ تو یہی ہے لیکن فعال لما یرید کی مشیت اس پر بھی غالب ہے کہ وہ جس مجرم کو جس طرح جس حد تک چاہے بچائے ۔

یہاں یہ سوال کلامی کتابوں میں بڑے زور شور سے اٹھایا گیا ہے کہ کیا دوزخیوں کے عذاب کا بھی

کوئی آخر ہے۔ دوزخ جو عذاب الٰہی کا گھر ہے کیا ہمیشہ آباد رہے گا۔ یہ بات پہلے ذہن میں رکھیئے کہ آیت قرآنی کا مدعا یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے اختیارات غیر محدود ہیں۔ اس کا اقتدار اعلیٰ سب پر حاکم ہے اسکے ارادے کو قید میں رکھنے کی نہ کوئی اور قوت ارادی ہے نہ کوئی اور بے جان ضابطہ ہے کوئی قانون اس پر حاکم نہیں وہ خود قانون پر حاکم ہے اب یہ بات سمجھیئے کہ دوزخ جو عذاب الٰہی کا گھر ہے کیا ہمیشہ آباد رہے گا۔ ابتدائی اسلامی فرقوں میں جہنم کی ابدیت اور غیر ابدیت بہت سے مناظرے ہو چکے ہیں جن کی تفصیل ملل و نحل کی کتابوں میں موجود ہے ایک دو کو چھوڑ کر اس پر تو بلاشبہ قطعیت کے ساتھ سب کا اتفاق ہے کہ جنت کا وجود دائمی اور ابدی ہے لیکن جہنم کے دوام اور ابدیت میں قدرے اختلاف ہے عام اہل السنۃ کا عقیدہ یہ ہے کہ دوزخ اور جنت دونوں کا وجود دائمی ہے۔ لیکن اہل سنّۃ کا ایک مختصر سا گروہ جس میں صحابہ کرام اور تابعین کے نام بھی ہیں اور متاخرین میں جس کے پر جوش حامی حافظ ابن القیم جوزیؒ ہیں۔ یہ خیال ہے کہ جب گنہگار اپنے اپنے گناہوں کے بقدر عذاب پا چکیں گے تو جہنم فنا کر دی جائیگی۔ حافظ ابن القیمؒ نے اپنی دو کتابوں شفاء العلیل اور حادی الارواح میں قرآن حدیث آثار صحابہ اور بیسیوں عقلی دلائل سے اپنے موقف کو ثابت کیا ہے اور بقول حافظ ابن القیمؒ حافظ ابن تیمیہؒ نے بھی اس نظریہ کو سلف اہل السنۃ کے ایک فریق کا خیال بتایا ہے ایک زیدی یمنیؒ عالم شیخ مقبلی نے بھی اس کو قبول کیا ہے۔ صوفیاء میں شیخ محی الدین ابن عربیؒ اور ان کے متبعین یہ فرماتے ہیں کہ کافر و مشرک جن پر خلود نار کا حکم ہے وہ بالآخر دوزخ میں رہتے رہتے ایسے ہو جائیں گے کہ ان کو اسی دوزخ میں راحت و لذت محسوس ہوگی۔

آیئے اس موضوع پر جمہور کی ترجمانی کرتے ہوئے مولانا عثمانیؒ نے اپنے افادات میں جو تحقیق فرمائی ہے اس سے بہرہ اندوز ہو جایئے فرماتے ہیں۔

ان آیات کے دو معنے ہو سکتے ہیں ایک یہ کہ جس قدر مدت آسمان و زمین دنیا میں باقی رہے اتنی مدت تک اشقیا، دوزخ میں اور سعداء جنت میں رہیں گے مگر جو زیادہ چاہے تیرا رب وہ اسی کو معلوم ہے کیونکہ جب ہم طویل سے طویل زمانہ کا تصور کرتے ہیں تو اپنے ماحول کے اعتبار سے بڑی مدت یہی خیال میں آتی ہے اسی لیے مادامت السماوات والارض وغیرہ الفاظ محاورات عرب میں دوام کے مفہوم کو ادا کرنے کے لیے بولے جاتے ہیں۔ باقی دوام و ابدیت کا اصلی مدلول جسے لامحدود زمانہ کہنا چاہیئے وہ حق تعالیٰ ہی کے علم غیر متناہی کے ساتھ مختص ہے جس کو ماشاء ربک سے ادا کیا دوسرے معنی آیت کے یہ ہو سکتے ہیں کہ لفظ مادامت السماوات والارض کو کنایہ دوام سے مانا جائے یا آسمان

زمین سے آخرت کا زمین و آسمان مراد لیا جائے جیسے فرمایا یوم تبدل الارض غیر الارض والسماوات. مطلب یہ ہوا کہ اشقیاء دوزخ میں اور سعداء جنت میں اس وقت تک رہیں گے جب تک آخرت کے زمین و آسمان باقی رہیں یعنی ہمیشہ مگر جو چاہے تیرا رب موقوف کر دے وہاں ہمیشہ نہ رہنے دے کیونکہ جنتیوں اور دوزخیوں کا خلود بھی اس کی مشیت و اختیار سے ہے لیکن وہ چاہ چکا کہ کفار و مشرکین کا عذاب اور اہل جنت کا ثواب کبھی ختم نہ ہوگا چنانچہ فرما دیا وما ھو بخارجین من النار اور یریدون ان یخرجوا من النار وما ھم بخارجین منھا اور لا یخفف عنھم العذاب ولا ھم ینظرون اور ان اللہ لا یغفر ان یشرک بہ ویغفر ما دون ذالک لمن یشاء اسی پر تمام اہل اسلام کا اتفاق رہا ہے اور ہمارے زمانے کے بعض نام نہاد مفسرین نے جو کچھ اس کے خلاف چیزیں پیش کیں ہیں وہ یا روایات ضعیفہ و موضوعہ ہیں یا اقوال غریبہ و مؤولہ یا بعض آیات و احادیث ہیں جن کا مطلب کوتاہ نظری یا بدفہمی سے غلط سمجھ لیا گیا ہے اگر خدا کی توفیق سے مفصل تفسیر کا موقع ملا اس میں مفصل کلام کیا جائے گا اختصار کی وجہ سے یہاں گنجائش نہیں ہے رہا عصاۃ مؤحدین کا مسئلہ یعنی جو مسلم گناہوں کی بدولت دوزخ میں ڈالے جائیں گے العیاذ باللہ ان کے متعلق احادیث صحیحہ نے ہم کو اللہ سبحانہ کی مشیت پر مطلع کر دیا ہے کہ لیکن ضرور ان کو نکال کر جنت میں پہنچائیں گے شاید اسی لیے جنتیوں کے ذکر میں عطاء غیر مجذوذ اور اشقیاء کے ذکر میں ان ربک فعال لما یرید ارشاد ہوا. تاکہ معلوم ہو جائے کہ بعض اشقیاء دوزخ سے نکالے جائیں گے مگر سعید کوئی جنت سے نہیں خارج کیا جائے گا۔[1]

جو لوگ اللہ سبحانہ کی رحمت عمومی کے قائل ہیں ان کا اس آیت سے استدلال یوں ہے کہ اس آیت میں اللہ سبحانہ نے اپنی مشیت کو اپنی انتہا بتایا ہے اور اپنے کو لفظ رب سے تعبیر کیا ہے جس سے اشارا ملتا ہے کہ اس کی مشیت سے بالآخر اس عذاب کا ختم ہو جانا تقاضائے ربوبیت ہے۔

ان دونوں آیتوں یعنی فاما الذین شقوا اور واما الذین سعدوا میں اہل جنت اور اہل دوزخ کے لیے خلود کی تعبیر آئی ہے پھر ان دونوں میں اس کے بعد اپنی مشیت سے استثناء

---

[1] افادات شیخ الاسلام

فرمایا ۔ مگر اہل دوزخ کے دوام کے ذکر میں فرمایا مگر جو چاہے تیرا رب بے شک تیرا رب جو چاہتا ہے کر ڈالتا ہے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ وہ جو چاہے کر ڈالتا ہے اس سے معلوم ہوا کہ وہ چاہے تو دوزخ کے عذاب کو ختم کر دے اور چاہے تو قائم کر دے لیکن اہل جنت کے ذکر میں بتصریح فرمایا ہے مگر جو چاہے رب یہ غیر منقطع بخشش ہوگی ۔ اس سے معلوم ہوا کہ اہل جنت کے حق میں اس کی مشیت ہوگی کہ وہ بے انقطاع اور غیر منتہی دوام و تسلسل کے ساتھ ہمیشہ قائم و باقی رہے ۔ اس آیت کی تفسیر میں متعدد آئمہ سلف وغیرہ نے کہا ہے مثلاً ابن زیدؒ اور شعبیؒ کہ اللہ سبحانہٗ نے اہل جنت کے بارے میں تو اپنی مشیت ظاہر کر دی کہ وہ مسلسل اور غیر منقطع ہے لیکن دوزخ والوں کی نسبت اپنی مشیت کو کسی مصلحت سے پوشیدہ رکھا ۔ یہ اس آیت کے بارے میں ان بزرگوں کا خیال ہے جو اللہ سبحانہٗ کی رحمت عمومی کے معتقد ہیں جمہور کا مسلک وہی ہے جس کی ترجمانی شیخ الاسلامؒ نے اپنے افادات میں فرمادی ہے کہ جنت کی طرح دوزخ بھی ہمیشہ باقی رہے گی اور ان لوگوں کو جو شرک و کفر کے مرتکب ہوئے کبھی دوزخ سے نجات نہیں ملے گی ۔ رحمت عمومی کے معتقدین اس آیت سے جو معنے نکالتے ہیں وہ جمہور کے نزدیک صحیح نہیں ہیں وہ ان کے بیان کردہ مطالب کو تاویلات کا درجہ دیتے ہیں اور ان کی پیش کردہ روایات کو صحت اور قوت سے خالی جانتے ہیں ۔

(۱۴۰) اہل جنت کی ارتقائی منزل

اور بانصیب و سعادت لوگ جنت میں ہوں گے جب تک آسمان و زمین قائم ہیں ۔ سدا اسی میں رہیں گے مگر اس صورت میں کہ تیرا پروردگار چاہے یہ دین اور عطا ایسی ہوگی جو کبھی ختم ہونے والی نہیں ہے الا ماشاء ربک میں ارشارا کر دیا کہ اللہ سبحانہٗ کے ہمیشہ رہنے اور مخلوق کے ہمیشہ رہنے میں فرق ہے ۔ کسی مخلوق کا ہمیشہ رہنا بہمہ وجوہ اللہ کی مشیت پر موقوف ہے وہ جب چاہے فنا کر سکتا ہے نیز یہ بتلا دیا کہ جزاو سزا دینا اس کے اختیار و مشیت کے تابع ہے آریہ سماج وغیرہ کے عقیدے کے موافق وہ اس پر مجبور نہیں[1] یعنی اللہ سبحانہٗ کی مشیت کے سوا اس جنت سے کوئی الگ نہ کر سکے گا لیکن اس کی مشیت یہی ہوگی کہ ان کے لیے اس کی یہ بخشش دائمی اور غیر منقطع طریقہ سے ہمیشہ قائم رہے پھر جس کے متعلق اس کی مشیت کا یہ اعلان ہے وہ فنا کیونکر ہو سکے گی ۔ اکلها دائم و ظلها ۔ اور فاكهة كثيرة لا مقطوعة ولا ممنوعة ۔ فلهم أجر غير ممنون ۔ فنائے راحت اور انقطاع مسرت کی دو صورتیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں۔ایک یہ کہ راحت و مسرت کے اسباب ختم ہوجائیں اور دوسرے یہ کہ خود لذت اٹھانے والے کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے۔ پہلی صورت کی نفی تو ان آیات میں کردی گئی دوسری صورت تو گو خالدین فیھا کہہ کر زیر تشریح آیت میں کی گئی ہے مگر ایک جگہ صراحتاً لا یذوقون فیھا الموت الا الموتۃ الاولیٰ کہہ دیا ہے کہ اس کے احاطہ میں موت کا گزر نہ ہوگا لیکن تیسری صورت یہ بھی ممکن ہے کہ مسرت کے اسباب بھی بھی قائم ہوں اور اہل جنت کی زندگی بھی دائمی ہو مگر کچھ عرصہ رہنے کے بعد ان کو وہاں سے نکال دیا جائے تو اس کی تصریح بھی فرما دی کہ یہ بھی ممکن نہ ہوگا۔ لا یمسھم فیھا نصب وما ھم منھا بمخرجین یعنی اہل جنت کو ان کے عیش و راحت کی منزل گاہوں سے نہیں نکال سکے گا۔اور عطاءً غیر مجذوذ میں اس طرف اشارہ ہورہا ہے یہ بھی ممکن ہے۔ کہ خود جنتی جنت سے گھبرا کر نکل آئیں تو فرمایا ان کی طبعی افتاد ایسی ہوگی کہ وہ خود ہی جنت سے نکلنا پسند نہ کریں گے۔ خالدین فیھا لا یبغون عنھا حولا۔ نیز آیت میں الا ما شاء ربک سے یہ بھی اشارۃً معلوم ہورہا ہے کہ جنتیوں کے احوال و مراتب میں بھی ارتقاء ہوگا لیکن یہ ارتقائی منزلیں خوب سے خوب تر کی طرف ہوں گی۔

(۱۳۱) مشرکین کو سرکشی کے نتیجے سے دوچار ہونا ہے

لہٰذا اے اللہ کے رسول آپ ان کے معبودوں کی جانب سے کسی شبہ میں نہ رہیں جن کی یہ لوگ عبادت کررہے ہیں۔ان معبودوں سے ان کے عابدانہ تعلقات اپنے پہلے باپ دادوں کے عمل کی کاپی ہیں ہم ان کو ان کا حصہ پورا پورا دیں گے اس میں کوئی کمی نہ ہوگی۔یعنی اتنی مخلوق کا شرک و بت پرستی کے راستہ پر پڑنا اور اب تک سزایاب نہ ہونا کوئی ایسی چیز نہیں جس سے دھوکہ کھا کر آدمی شبہ میں پڑجائے یہ لوگ اپنے باپ دادا کی کورانہ تقلید کررہے ہیں وہ جھوٹے معبود ان کے کیا کام آئے جو ان کے کام آئیں گے۔ یقیناً ان سب کو آخرت میں عذاب کا پورا حصہ ملے گا جس میں کوئی کمی نہ ہوگی یا کبھی کم نہ کیا جائے گا گویا لفظ غیر منقوص یہاں عطاءً غیر مجذوذ کے مقابل ہوا بعض مفسرین کہتے ہیں کہ دنیا میں رزق وغیرہ کا جو حصہ مقدر ہے وہ پورا ملے گا پھر شرک کی سزا پوری بھگتیں گے[۱] مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کے شرک پر جماؤ سے تمہیں کہیں یہ غلط فہمی نہ لاحق ہو کہ ان کے پاس اس کے لیے کوئی دلیل موجود ہے بس جس طرح ان کے باپ دادا بے سمجھے بوجھے ان پتھروں اور خیالی دیویوں اور دیوتاؤں کو پوجتے آئے اسی طرح اپنی عقلوں پر پٹی باندھ کر

[۱] افادات شیخ الاسلام

یہ ان کو پوج رہے ہیں اور دلیل سے کام لینے کی زحمت نہ انہوں نے اٹھائی نہ یہ اٹھانا چاہتے ہیں اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم واقعی ان معبودوں کی طرف سے کسی شک میں تھے بلکہ دراصل یہ باتیں نبی کریم صلی اللہ علیہ کو خطاب کرتے ہوئے عامۃ الناس کو سنائی جارہی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ کسی معقول آدمی کو اس شک میں نہ رہنا چاہیئے کہ یہ لوگ جو ان معبودوں کی پرستش کرنے اور ان سے دعائیں مانگنے میں لگے ہوئے ہیں تو آخر کچھ تو انہوں نے دیکھا ہوگا جس کی وجہ سے یہ ان سے نفع کی اُمیدیں رکھتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ پرستش اور نذریں کسی علم کسی تجربے اور کسی حقیقی مشاہدے کی بنا پر نہیں ہیں بلکہ یہ سب کچھ اندھی تقلید کی وجہ سے ہورہا ہے آخر یہی آستانے پچھلی قوموں کے ہاں بھی موجود تھے مگر جب اللہ سبحانہ کا عذاب آیا تو وہ تباہ ہوگئیں اور یہ آستانے دھرے کے دھرے رہ گئے۔

اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی ہے اور آپ کے مخاطبوں کو دھمکی ہے یعنی آپ اس خیال میں نہ رہیں کہ مشرکین عرب کیوں شرک سے باز نہیں آتے اور کیوں انہیں مہلت مل رہی ہے جواب میں فرمایا وہ تو اسی راہ پر چل رہے ہیں جن پر ان کے باپ دادے چلے اور انہیں ان کی سرکشیوں کا نتیجہ پورا پورا ملنے والا ہے۔

وَلَقَدْ اٰتَيْنَا مُوْسَى الْكِتٰبَ فَاخْتُلِفَ فِيْهِ ؕ وَ
لَوْلَا كَلِمَةٌ سَبَقَتْ مِنْ رَّبِّكَ لَقُضِيَ بَيْنَهُمْ ؕ وَاِنَّهُمْ لَفِيْ
شَكٍّ مِّنْهُ مُرِيْبٍ ﴿۱۱۰﴾ وَاِنَّ كُلًّا لَّمَّا لَيُوَفِّيَنَّهُمْ رَبُّكَ اَعْمَالَهُمْ ؕ
اِنَّهٗ بِمَا يَعْمَلُوْنَ خَبِيْرٌ ﴿۱۱۱﴾

اور بلاشبہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی ہے پھر اس میں اختلاف کیا گیا اگر تیرے رب کی جانب سے پہلے ایک بات طے شدہ نہ ہوتی تو ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا اور یہی لوگ اس کتاب کے بارے میں بھی خلجان میں ڈالنے والے شک کا شکار ہو رہے ہیں[۱۴۳] اور بلاشبہ سب ہی کو تیرا رب ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا یقیناً وہ ان کے اعمال سے پوری طرح باخبر ہے[۱۴۴]

نتائج عمل کے قانون کی یکسانی

پہلی آیت میں انا لموفوھم نصیبھم اور اس آیت میں وان کلا لما لیوفینھم ربك اعمالھم ان دو فقروں کی یکسانی پر غور کرو۔ ان دو فقروں میں کس قدر بلیغ انداز میں وہ سب کچھ کہہ دیا جو جزاء عمل کے موضوع پر کہا جا سکتا ہے اور اس سے قرآن کی معجزانہ بلاغت کا اندازہ کیا جا سکتا ہے۔ جنہوں نے نبوت کو نہیں مانا اور اس لیے نبوت کی دعوت کو نہیں اپنایا اور جنہوں نے مان لیا

اور مان لینے کے بعد ان میں اختلاف کا شکار ہو گئے نتائج میں دونوں کے لیے ہم آہنگی ہے۔ نسب اور نسبت سے اعمال کے نتائج میں کوئی فرق نہیں آیا۔ قانون کی نظر اعمال پر ہوتی ہے۔ خواہ ماننے والے یا نہ ماننے والے ہوں۔ اگر ماننے کے بعد بدعملیوں کا رُخ کریں گے تو اللہ کا قانون مجازات بھی پاداش و عقوبت کی طرف لوٹے گا۔ عمل اور نتیجہ دو ایسی لازم و ملزوم حقیقتیں ہیں جو کسی حال میں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتیں نتیجہ عمل کا سایہ ہے۔ جہاں عمل آیا اس کا سایہ ساتھ آگیا۔ جنہوں نے اچھے اعمال کیے نتائج بھی اچھے رہے اور جنہوں نے بُرے اعمال اپنائے بُرے نتائج کے قدم بھی ان کی طرف اٹھ گئے قانون کی نظر اعمال اور صرف اعمال پر ہوتی ہے۔ خواہ کوئی ہو۔

انسان کا پہلا دارالجزاء دنیا ہے اگرچہ اس کے ہر نیک و بد کام کی پوری جزاء تو آخرت میں ملے گی۔ لیکن اس کے نیک و بد فعل کے مماثل اس موجودہ دنیا کی زندگی میں بھی اس کو اپنے اعمال کے نتائج سے ہمدوش ہونا پڑتا ہے۔ انسان کی عزت، شہرت ناموری، ہر دلعزیزی، محبوبیت، تسکین، اطمینان سرور، فارغ البالی، حکومت یہ سب اس زندگی کے اعمال خیر کے نتائج ہیں۔ ان کے برخلاف ذلت و رسوائی، بے عزتی، کسمپرسی، پریشان حالی، بے اطمینانی، غم خوف، محکومیت اس کے اعمال بد کے اثرات ہیں قرآن نے ایمان و عمل صالح کا نتیجہ اس دنیا میں کامیابی اور آخرت کی کامیابی بھی۔ زمین کی حکومت بھی، اور آسمان کی جنت بھی، یہاں کی سرسبزی و شادابی بھی اور وہاں کا باغ و بہار بھی۔

فاتاهم الله ثواب الدنيا وحسن ثواب الاخرة

بس اللہ نے ان کو دنیا کا بدلہ بھی دیا اور آخرت کا اچھا بدلہ بھی

لیکن اس میں بھی شک نہیں ہے کہ جس طرح اس دنیا کی فانی زندگی سے آخرت کی باقی زندگی زیادہ پائیدار ہے اسی طرح اس دنیا میں ہونے والے اعمال کے نتائج سے آخرت میں ہونے والے اعمال کے نتائج کی قدر و قیمت بھی زیادہ ہے۔

للذين احسنوا فى هذه الدنيا حسنة ولدار الاخرة خير

(۱۳۲) اور بلاشبہ ہم نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کتاب دی ہے پھر اس میں اختلاف کیا گیا۔ اگر تیرے رب کی جانب سے پہلے ایک بات طے شدہ نہ ہوتی۔ تو ان کا فیصلہ ہو چکا ہوتا۔ اور بلاشبہ یہ لوگ بھی اس کتاب کے بارے میں خلجان میں ڈالنے والے شک کا شکار ہو رہے ہیں۔ موسیٰ علیہ السلام کو تورات دے کر بھیجا تو آپس میں پھوٹ پڑ گئی۔ کسی نے قبول کیا اور کسی نے نہ کیا۔ جس طرح آج قرآن حکیم کے متعلق بھی اختلاف ہو رہا ہے بے شک خدا کو قدرت تھی کہ یہ اختلاف و تفریق نہ پیدا ہونے دیتا یا پیدا ہو چکنے

کے بعد تمام مکذبین کا استیصال کر دیتا اور سارا جھگڑا ایک دم چکا دیتا مگر اس کی حکمت تکوینی اس کو مقتضی نہ ہوئی۔ ایک بات اس کے یہاں پہلے سے طے شدہ ہے کہ انسان کو ایک خاص حد تک کسب و اختیار کی آزادی دے کر آزمائے کہ وہ کس راستہ پر چلتا ہے۔ آیا خالق و مخلوق کا ٹھیک ٹھاک حق پہچان کر اللہ سبحانہٗ کی رحمت و کرامت کا مستحق ہوتا ہے یا کجروی اور غلط کاری سے فطرت صحیحہ کی راہنمائی کو خیرباد کہہ کر اپنے کو غضب و سخط کا مظہر ٹھہراتا ہے۔ لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ اسی مقصد کو پیش نظر رکھتے ہوئے انسان کی ساخت ایسی بنائی کہ وہ نیکی یا بدی کے اختیار کرنے میں بالکل مجبور و مضطر نہ ہو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ دنیا میں خیر و شر اور نیکی و بدی کی باہمی آویزش جاری رہے بعدہٗ مرحوم و مغضوب علیحدہ کیے جائیں۔ تاکہ الا من رحم ربك کے ساتھ لاملئن جهنم من الجنة والناس اجمعين والی بات بھی پوری ہو غالباً یہی وہ کلمہ ہے جو اگر نہ فرما چکا ہوتا تو سب اختلافات کا ایک دم خاتمہ کر دیا جاتا۔ عام لوگ ان حکمتوں کو نہ سمجھنے کی وجہ سے شک میں پڑے ہوئے ہیں کہ آئندہ بھی ان اختلافات کا فیصلہ ہوگا یا نہیں[1]

اصل موضوع تو یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تسلی دی جا رہی ہے کہ جس طرح آپ کی قوم کے لوگ آپ کے اس کتاب کے پیش کرنے پر آپ سے اختلاف کر رہے ہیں اسی طرح حضرت موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے افراد نے بھی تورات کے معاملے میں حضرت موسیٰ علیہ السلام سے قدم قدم پر اختلاف اور جھگڑا کیا۔ مطلب یہ ہے کہ جس صورت حال سے آپ کو سابقہ پڑ رہا ہے اسی صورت حال سے آپ سے پہلے نبیوں کو بھی سابقہ پیش آیا ہے انسانی طبیعت و استعداد کا اختلاف فطری ہے اور اللہ کی مشیت یہی ہوئی کہ یہ اختلاف ظہور میں آئے اگر وہ چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک ہی طرح کی طبیعت ایک ہی طرح کی استعداد ایک ہی طرح کی فکری و عملی حالت پر مجبور کر دیتا مگر اس نے ایسا نہیں چاہا اس کی حکمت کا یہی فیصلہ ہوا کہ انسان میں ہر طرح کی حالت پیدا کرنے کی استعداد ہو۔ ہر طرح کی راہ اس کے آگے کھول دی جائے وہ اگر اُونچا ہونا چاہے تو زیادہ سے زیادہ اُونچا ہو سکے۔ پست ہونا چاہے تو زیادہ سے زیادہ پستی میں گر سکے۔ اسی تنوعِ استعداد کا نتیجہ ہے کہ فکر و عمل کے مختلف گوشوں میں مختلف حالتیں پیدا ہو گئیں۔ ایک فرد اور جماعت کا ذوق ایک طرح کا ہوا دوسرے کا دوسری طرح کا ایک کی سمجھ ایک طرف گئی دوسرے کی سمجھ دوسری طرف گئی۔ ایک نے ایک راہ پسند کی کہ حق ہے دوسرے نے اسی سے انکار کیا کہ حق نہیں

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے پھر اسی اختلاف فکر و عمل نے ہدایت و سعادت اور شقاوت و ضلالت کی وہ کشمکش پیدا کر دی جسے قرآن آزمائش حیات سے تعبیر کرتا ہے۔ لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ حاصل اس کا یہی ہے کہ زندگی کا کوئی خاص پہلو کوئی خاص رُخ ہی نہیں بلکہ پوری زندگی ہی آدمی کی امتحان اور ابتلا کی زندگی ہے۔ اور یہ کہا ہے کہ تمام آفاقی کائنات کے مقابلے میں انسان کی فطرت میں خواہ وہ کسی رنگ میں ہو دو راہوں میں سے کسی ایک راہ یا دو پہلوؤں میں سے کسی ایک پہلو کے انتخاب و اختیار کرنے کی جو خصوصیت رکھی گئی ہے۔ فی الواقع اسی اقتضا کے صحیح استعمال کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ آدمی کی پوری زندگی ہی امتحان کی زندگی ہے مطلب یہی ہے کہ دنیا کی زندگی میں سب کے سامنے سعادت و شقاوت کی راہیں کھول دی گئیں جس کا عمل جیسا ہوگا ویسے ہی نتائج رونما ہوں گے اور ان نتائج میں نہ آپ کے مخاطبوں میں کوئی کمی کی جائے گی اور نہ ان کے جو نبوت کو مان کر بدعملیوں کی راہ پڑ گئے۔ اسی ضمن میں یہ بھی بتا دیا کہ اہل ضلالت و شقاوت کو دنیا میں پنپنے کا موقعہ کیوں دیا جاتا ہے فرمایا ایسا بھی کر دیا جاتا اگر اللہ سبحانہٗ کا یہ قانون یہ نہ ہوتا کہ برائی ہو یا اچھائی انسان کے ارادہ و اختیار کے سائے میں اس کو پروان چڑھنے کا موقعہ دیا جائے تا آنکہ وہ اپنے بقا کی مقررہ مدت تک پہنچ جائے۔ عالم طبعی کی طرح عالم معنی میں بھی قانون ہے۔ یہاں بھی قضا و قدر ہے۔ جس طرح مادیات میں چھانٹی ہوتی رہتی ہے جو چیز نافع ہوتی ہے باقی رہتی ہے اور جو نافع نہیں ہوتی وہ محو ہو جاتی ہے ایسا ہی قانون معنویات میں بھی جاری ہے جو عمل حق ہوتا ہے قائم اور ثابت رہتا ہے جو باطل ہے وہ مٹ جاتا ہے اور جب کبھی حق و باطل میں مقابلہ ہوتا ہے تو بقا حق کے لیے ہوتا ہے نہ کہ باطل کے لیے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ ہر باطل عمل فوراً نابود ہو جائے اور ہر عمل حق فوراً فتح مند ہو جائے نہیں بلکہ جیسے مادیت تدریج و امہال کا قانون نافذ ہے ایسے ہی معنویات میں بھی تدریج و امہال کا قانون کام کر رہا ہے اور اس لیے جس طرح مادیات میں ہر حالت بتدریج نشوونما پاتی ہے اور ہر نتیجہ کے ظہور کے لیے ایک خاص مقدار، ایک خاص مدت اور ایک خاص وقت مقرر کر دیا گیا ہے ٹھیک اسی طرح عالم معنے میں اعمال کے نتائج کے لیے بھی مقدار و اوقات کے پیمانے مقرر ہیں اور ضروری ہے کہ ہر نتیجہ ایک خاص مدت کے بعد اور ایک خاص مقدار کی نشوونما کے بعد ظہور میں آئے۔ اسی صورت حال سے تدریج و امہال کی حالت پیدا ہوگی اور حق و باطل کے نتائج کے ظہور کے لیے تاجیل ضروری ہوگیا اسی تاجیل کا نام کلمہ رب ہے یہاں تو جملہ بلا قید ہے۔ ولولا کلمۃ سبقت من ربک لقضی بینھم۔ لیکن سورہ شوریٰ کی آیت نمبر ۱۴ میں الی اجل مسمی کا اضافہ ہے پوری آیت یہ ہے ولولا کلمۃ سبقت من ربک الی اجل مسمی لقضی بینھم۔ معلوم ہوا کہ کلمہ سے مراد اللہ سبحانہٗ کا قانون تاجیل ہے مطلب یہ ہے کہ اگر اعمال میں بھی مادیات کی طرح قانون تاجیل نہ ہوتا تو ان کا کام تمام کر دیا جاتا یعنی اللہ سبحانہٗ نے

ہر چیز کے لیے پہلے سے ایک وقت مقرر فرما دیا ہے اس وجہ سے ہر کام اس کے مقررہ پروگرام کے مطابق ہوگا آپ کی قوم کے لیے بھی ایک وقت مقرر ہے جب وہ مدت پوری ہوگی ان کا بھی فیصلہ کر دیا جائیگا۔ انھم لفی شك مرىب یعنی یہ لوگ آپ کی دعوت کے بارے میں شک میں پڑے ہوئے ہیں۔ شک بھی ایسا کہ جس نے آپ کو الجھن میں ڈال دیا ہے۔ مریب اراب یریب ارابۃ اسم فاعل ہے اس کے معنے الجھن میں ڈالنے والے کے ہیں۔ یہاں اس صفت کے لانے سے مقصود یہ بتانا ہے کہ انکار کا جو انداز انہوں نے اپنایا ہے اس کی کوئی بنیاد نہیں ہے اور آپ جو کچھ پیش فرما رہے ہیں اس کی قوت واضح ہے لیکن وہ اسے ماننا نہیں چاہتے ہیں کیونکہ اس سے ان کے مفادات خطرے میں پڑتے ہیں اس وجہ سے وہ سخت خلجان میں ہیں کہ کیا کریں اور کیا نہ کریں۔

(۱۴۳) بلا استثنار سب کو اعمال کی جزار

اور بلاشبہ سب ہی کو تیرا رب ان کے اعمال کا پورا پورا بدلہ دے گا یقیناً وہ ان کے عمل سے پوری طرح باخبر ہے یعنی ابھی وقت نہیں کہ ہر ایک کے عمل کا پورا بھگتان کیا جائے لیکن جب وقت آئے گا تو یقیناً ذرہ ذرہ کا حساب کر دیا جائے گا تاخیر عذاب سے یہ نہ سمجھو کہ اسے تمہارے اعمال کی خبر نہیں ہے[۱] آیت میں لمّا آیا ہے اس میں لام تاکید اور قسم کا ہے اور ما زائد بھی تاکید کے لیے آتا ہے اور یہ ما کبھی کبھی محض کے انداز کو ٹھیک کرنے کے لیے آتا ہے مثلاً ان کل ذالك لما متاع الحیاۃ الدنیا۔ بلاشبہ یہ سب دنیا کی زندگی کا سامان ہے۔ سورہ طارق میں ہے۔ ان کل نفس لمّا علیہا حافظ ہر جان پر ایک نگران مقرر ہے۔ سورہ یٰس میں ہے۔ وان کل لمّا جمیع لدینا محضرون۔ بے شک سب ہی کو ہمارے حضور میں پیش ہونا ہے۔ لفظ کل عام ہے۔ گزشتہ قومیں ہوں یا موجودہ قریش مکہ اور یہود ہوں۔ مطلب یہ ہے کہ کوئی ہو آپ کے مخاطب ہوں یا آپ سے پہلے انبیاء کے مخاطب ہوں سب کے اعمال کے نتائج رونما ہو کر رہیں گے اور سب کو اعمال کی جزار نتائج کے مطابق ضرور مل کر رہے گی اور پوری پوری مل کر رہے گی۔ ان کو ملی ہے ان کو بھی ملے گی۔ ہر بات کے لیے اللہ کے قوانین مقرر ہیں۔ قوموں اور جماعتوں کی سعادت و شقاوت ہدایت و ضلالت اور موت و حیات کا بھی ایک قانون ہے اور جیسے اللہ سبحانہ کے سارے قوانین میں یکسانی ہے عالمگیری ہے اور غیر مبدل ہیں۔ یہ قانون ہمیشہ ایک طرح

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

رہا ہے اور ہمیشہ ایک ہی طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوئے زبانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہو سکتی ہے لہذا جو کچھ جزائے عمل کا قانون ماضی میں پیش آچکا ہے ضروری ہے کہ مستقبل میں بھی پیش آئے اس میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی ۔ اسی قانون کا نام قرآن میں سنۃ اللہ ہے۔ قرآن میں سنۃ اللہ کا ایک خاص مفہوم ہے اور اسی اصطلاح خاص میں یہ لفظ کئی جگہ قرآن حکیم میں استعمال ہوا ہے خیر و شر حق و باطل نور و ظلمت اور ظلم و انصاف جب باہم ٹکراتے ہیں تو بالآخر اللہ سبحانہ خیر کو شر پر حق کو باطل پر نور کو ظلمت پر اور انصاف کو ظلم پر فتح و کامیابی عطا کرتا ہے ۔ گنہگار اور مجرم قومیں جب حق کی دعوت قبول نہیں کرتی ہیں اور پند و موعظت ان کے لیے مؤثر نہیں ہوتی تو اللہ تعالیٰ ان قوموں پر اپنا عذاب نازل کرتا ہے بالآخر بجلی کی کڑک، آسمان کی گرج، زلزلہ کی گڑگڑاہٹ، دریا کے طوفان، پہاڑ کی آتش فشانی یا دشمن کی تلوار سے ہلاک و برباد ہو جاتی ہیں یہی اعمال کے نتائج اور ان کی جزا ہے یہ سنت الٰہی ہے جو ہمیشہ سے قائم ہے اور ہمیشہ قائم رہے گی اس میں کبھی کوئی فرق نہ ہو گا ۔ سنۃ اللہ فی الذین خلوا من قبل ولن تجد لسنۃ اللہ تبدیلا ۔ قرآن کی یہ بات فی الواقع انسانی طبیعت کا وجدانی کمال ہے کیونکہ انسانی ذہن حوادث سے بالطبع متأثر ہوتا ہے اور اس کا اندرونی احساس پکارتا ہے ۔ کہ یہاں ایک مرتبہ کا حادثہ ایک ہی مرتبہ کا حادثہ نہیں ہے خواص و نتائج دائمی ہیں یعنی جو بات ایک بار ظہور میں آئے گی ہمیشہ ظہور میں آئے گی اور جس چیز کا خاصہ ایک مرتبہ ظاہر ہوا وہی ہمیشہ ظہور میں آئے گا۔ طبیعت انسانی کا یہی وجدانی تأثر ہے جس نے ہمارے ذہن میں استقرار کا اعتقاد پیدا کیا یعنی جزئیات کا تجربہ کرنا اور اس کے ذریعہ سے کلیات تک پہنچنا اب ہمارے تمام علوم و معارف کا سنگ بنیاد یہی ہے ۔

قرآن نے لیوفینھم ربک اعمالھم ۔ تیرا رب ضرور ان کے اعمال کی جزا دے گا کے ذریعے بتا رہا ہے کہ نتائج کا تسلسل ایک حقیقت ہے اور اعمال انسانی کے لیے یہ حقیقت معطل نہیں ہو سکتی یہی بات ہے کہ قرآن بتاتا ہے ۔ کہ تم سے پہلے بھی بے شمار قومیں ہوئی ہیں ۔ ان کی بھی آبادیاں تھیں، قوتیں اور شوکتیں تھیں، سربفلک عمارتیں تھیں، فکر و عمل کی سرگرمیاں تھیں ان کے اعمال کے نتائج کے مطابق ان کو جزا ملی ہے آئندہ بھی لوگوں کو ان کے اعمال کی پوری پوری جزا ملے گی بلا استثناء سب کو ملیگی خواہ نبی کو نہ ملتے ہوں جیسے قریش اور خواہ نبی کو مان کر اس کی دعوت سے ہٹ گئے ہوں سب برابر ہیں یہاں جزا اعمال کی ملتی ہے اور پوری پوری ملتی ہے ۔ نسب اور نسبت پر جزا کا مدار نہیں ہے ۔

فَاسْتَقِمْ كَمَآ أُمِرْتَ وَمَنْ تَابَ
مَعَكَ وَلَا تَطْغَوْا ۚ إِنَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿١١٢﴾ وَلَا تَرْكَنُوٓا
إِلَى الَّذِينَ ظَلَمُوا فَتَمَسَّكُمُ النَّارُ وَمَا لَكُم مِّن دُونِ
اللَّهِ مِنْ أَوْلِيَآءَ ثُمَّ لَا تُنصَرُونَ ﴿١١٣﴾

لہذا اے اللہ کے رسول آپ اور وہ جو راہ کفر سے توبہ کر کے آپ کے ہمنوا ہوئے ہیں جیسا حکم دیا گیا ہے اس پر جمے رہو اور حد سے نہ بڑھو یقین کرو کہ اللہ سبحانہٗ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے[۱۳۴] اور دیکھو ظلم کار لوگوں کی طرف نہ جھکنا اس کے نتیجے میں تمہیں بھی آگ چھو جائے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز نہ ہوگا پھر تمہاری کوئی مدد نہ کی جائے گی[۱۳۵]

مفردات کے معانی

لا تطغوا یہ طغیٰ مضارع مجزوم ہے طغیان اور طغی مصدر ہے اس کے معنی حد سے نکل جانا، سرکشی کرنا، سر اٹھانا، جب نگاہ اپنی حد سے گزر جاتی ہے تو بہکنے لگتی ہے۔ مازاغ البصر وما طغیٰ۔ اسی طرح جب پانی اپنی حد سے تجاوز کر جاتا ہے تو طغیانی آجاتی ہے۔ انا لما طغی الماء حملنٰکم فی الجاریۃ ۔ اور انسان اپنی بد عملیوں، بد اخلاقیوں اور فکری آوارگی میں حد سے گزر جاتا

ہے تو یہ اعمال کی طغیانی ہے ۔ اذھب الی فرعون انہ طغیٰ ۔ اسی لیے معصیت میں جھوٹ اور حد سے گزرنے والے کو طاغوت کہتے ہیں ۔

لاترکنوا یہ بھی صیغہ جمع مذکر حاضر ہے مضارع مجزوم بلائے نہی کارکن یرکن سے اس کے معنی مائل ہونے اور جھکنے کے ہیں ۔

سورت کی موعظت کا خلاصہ

اس آیت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وساطت سے اہل ایمان کو دعوت دین کی کامیابی کے لیے راہنما اصول بتائے ہیں اور ان کو لفظ استقامت سے تعبیر کیا ہے استقامت کے لفظی معنی سیدھا رہنے یا سیدھا چلنے کے ہیں ۔ قرطبیؒ لکھتے ہیں ۔

استقامت نام ہے دائیں بائیں سے ہٹ کر سیدھا چلنا اور بس اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس بات کو حق سمجھا جائے اس پر قائم رہا جائے اس سے ادھر اُدھر نہ ہو ۔ مشکلیں پیش آئیں ۔ مخالفتیں ہوں ۔ ستایا جائے ہر خطرے کو برداشت کیا جائے مگر حق سے منہ نہ پھیرا جائے اور اس راستے پر ثابت قدمی سے چلا جائے ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس اعلان کا حکم ہوتا ہے ۔

انما الھکم الہ واحد فاستقیموا الیہ واستغفروہ

تمہارا معبود ایک ہی ہے لہذا اس کی طرف سیدھے رہو اور اس سے معافی مانگو ۔

یعنی ہماری عبادتیں اسی ایک کے لیے ہوں اور ہماری توجہات کا وہی ایک مرکز ہو اس سے کسی حال میں ادھر اُدھر نہ ہو ۔ سیدھے اسی کی طرف چلے چلو ۔

عرب کا گرم ریگستان دینِ حق کی مخالفت میں غیظ وغضب کا بھڑکتا ہوا تنور بن گیا ۔ ذرہ ذرہ کی زبان سے رسولِ حق صلعم کی دشمنی کی آواز نکل رہی ہے اور عرب کی وسیع سرزمین مسلمانوں پر دم بدم تنگ ہو رہی ہے ۔ اس موضوع پر رسول اللہ صلعم کی وساطت سے مسلمانوں کو اعلان حق اور حق پر استقامت کی تاکید ہو رہی ہے اس لفظ استقامت کے ذریعے بتایا گیا کہ یہ راستہ خطرناک ہے کامیابی کی شرط یہ ہے کہ خشکلات وقت مصیبتوں میں اضطراب نہ ہو ۔ راہِ حق میں جو مشکلات پیش آئیں ، دشمن جو تکلیفیں پہنچائیں اور مخالفین جو طعن وتشنیع کریں ان میں کسی چیز کو خاطر میں نہ لاؤ ۔ درگذر کرتے جاؤ اور ثابت قدمی کا مظاہرہ کرو اپنے آپ پر قابو رکھو اور ضبط سے کام لو ۔ ہر طرح کی تکلیف اٹھا کر فرض کی بجا آوری کرو ۔ یہی وہ عناصر ہیں جن سے استقامت کی ترکیب ہوتی ہے اور یہی وہ عظیم راہنما اصول ہے جس کے ذریعے مقاصد پروان چڑھتے ہیں ۔ استقامت فتح مشکلات کی چابی ہے ۔ صحیح مسلم میں ہے ۔ سفیان بن عبداللہ الثقفیؓ کہتے

ہیں۔ کہ میں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ مجھے ایسی کوئی بات بتا دیجئے کہ آپ کے بعد میں کسی سے نہ پوچھوں فرمایا قل امنت باللہ ثم استقم۔ یعنی ایمان لانے کے بعد ایمان میں استقامت کا مظاہرہ کرو۔

(۱۳۴) لہٰذا اے اللہ کے رسول آپ اور وہ جو راہ کفر سے توبہ کر کے آپ کے ہمنوا ہوئے ہیں جیسا حکم دیا گیا ہے اس پر جمے رہو اور حد سے نہ بڑھو یقین کرو کہ اللہ سبحانہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے آپ ان مشرکین کے جھنجھٹ میں نہ پڑیئے آپ کو اور ان لوگوں کو جنہوں نے کفر سے توبہ کر کے آپ کی معیت اختیار کی ہے اور حق تعالیٰ کی طرف رجوع کیا ہے۔ احکام الٰہیہ پر نہایت پامردی اور استقلال کے ساتھ ہمیشہ جمے رہنا چاہیئے۔ عقائد، عبادات، اخلاق، معاملات، دعوت و تبلیغ وغیرہ ہر چیز میں افراط و تفریط ہے۔ علیحدہ ہو کر توسط و استقامت کی راہ پر سیدھے چلو۔ کسی معاملہ میں افراط و تفریط اختیار کر کے حد سے نہ نکلو اور یقین کرو کہ اللہ سبحانہ ہر آن تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے [1] خلاصہ یہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو انکے ان ساتھیوں کو جو ابتدائے عہد کی بے سروسامانیوں اور مظلومیتوں میں ایمان لائے تھے مخاطب کیا ہے اور حسب ذیل امور کی تلقین کی ہے۔ یہ ان کے لیے اس سورت کی موعظت کا خلاصہ ہے جو راہ بتلائی گئی ہے اس پر مضبوطی کے ساتھ قائم رہو اور اپنا کام کیئے جاؤ اپنی حد سے تجاوز نہ کرو یعنی استقامت کار کا نتیجہ یہ نہ ہونا چاہیئے کہ اپنے مخالفوں پر کسی طرح کی زیادتی کرنے کا خیال کرنے لگو یا لڑنے جھگڑنے لگو اپنے دائرے کے اندر رہو مگر اپنے طریقے پر قائم رہو۔

اس آیت کی پیشانی پر فا آئی ہے اور ظاہر ہے کہ یہ فا نتیجہ ہے مطلب یہ ہے کہ چونکہ ان تاریخی واقعات میں آپ سے پہلے تمام نبیوں نے اپنی اپنی قوموں میں جم کر اور ڈٹ کر کام کیا ہے آپ کو اور آپ کے ساتھیوں کو اس کام میں استقامت کا دامن تھامنا چاہیئے یہ بات کہ استقامت کا مظاہرہ کس بات میں ہو؟ ظاہر ہے کہ اس کا متعلق پورا دین ہے اور دین کی وہ اصلی بنیاد جو سارے نبیوں کا اشتراکی سرمایہ ہے توحید عبادت ہے یہ سب نبیوں کی دعوت کی بنیادی اینٹ ہے اس اینٹ کے ہل جانے کے بعد دین کی پوری عمارت درہم برہم ہو جاتی ہے۔ اسی لیے تاریخی حقائق میں سب سے زیادہ اہمیت جس بات کو دی گئی ہے وہ صرف اور صرف اعبدوا اللہ مالکم من الٰہ غیرہ اس معاملے میں نوح علیہ السلام جیسی استقامت ہو کر پورے ۹۵۰ سال اسی کی دعوت دیتے رہے اور سخت سے سخت حالات میں بھی اس پکار سے ایک لمحہ کے لیے بھی دستبردار نہ ہوتے یہاں تک کہ بیٹا بھی اس راہ میں چھوڑ دیا یہ پہاڑ جیسی استقامت ہے

[1] افادات شیخ الاسلام

توحید کی دعوت دن رات قوم کو دیتے رہے۔ دعوت قومی لیلا و نھارا ۔ قوم نے حضرت نوح ؑ
کی آواز سننی گوارا نہیں کی ۔ کانوں میں انگلیاں دے لیں ۔ جعلوا اصابعھم فی اذانھم حضرت
نوح علیہ السلام کا چہرہ دیکھنا گوارا نہیں کیا اور منہ پر پلہ لے لیا واستغشوا ثیابھم اور کسی طرح
اپنے طریقہ سے قوم نے ہٹنا پسند نہیں کیا واصروا اور قوم کے غرور نے اجازت نہیں دی کہ حضرت
نوح علیہ السلام کی بات پر غور کریں واستکبروا ان حالات میں حضرت نوح علیہ السلام کی دعوت
میں استقامت کا حال یہ ہے کہ فرداً دعوت دے رہے ہیں مجالس میں اور مجامع میں پکار رہے ہیں ۔
خلوت اور جلوت میں للکار رہے ہیں اور ایک دن ، ایک ہفتہ ، ایک ماہ اور ایک سال نہیں بلکہ پورے
۹۵۰ سال جم کر اور ڈٹ کر صرف شہری زندگی میں عوام ہی میں نہیں بلکہ ارباب اقتدار کے ایوانوں میں للکارتے
رہے ہیں ۔ ان لاتعبدوا الا اللہ ۔ یہ ہے دین کی دعوت میں استقامت ان ہی تاریخی واقعات
میں حضرت ہود علیہ السلام کی شخصیت آتی ہے حضرت ہود علیہ السلام نے عام شہری کو مخاطب کیا اور
بہت بڑی متمدن متمول اور طاقتور قوم کو بھی توحید عبادت کی دعوت دی ۔ اعبدوا اللہ مالکم من
الٰہ غیرہ ۔ ٹھاکروں نے اپنے وہمی معبودوں کی مار کی دھمکی دی لیکن حضرت ہود علیہ السلام کے پائے
استقامت میں کبھی جنبش نہیں آئی وہ لگاتار دعوت ہی دیتے رہے اور یہی کہتے رہے ۔ اعبدوا اللہ ۔

حضرت ہود علیہ السلام کے بعد قرآن نے حضرت صالح علیہ السلام کا ذکر کیا ہے ۔ یہ قوم ثمود میں
آئے ہیں پوری قوم مادیت میں غرق تھی ۔ فن تعمیر میں ان کو کمال حاصل تھا ۔ پہاڑوں کو کاٹ کر مکان بنانا
پتھروں کی عمارتیں اور مقبرے تیار کرنا اس قوم کا خاص پیشہ تھا ۔ حضرت صالح علیہ السلام نے ان کے سامنے
توحید عبادت پیش کی خوب زور سے پیش کی اور قوم کے ارباب اقتدار کی ساری دھمکیوں سے ان کے پائے
استقامت میں کبھی جنبش نہ آئی ۔ اس کے بعد قرآن نے حضرت لوط علیہ السلام کا واقعہ بیان کیا ۔ حضرت
لوط علیہ السلام کی ایک بگڑی ہوئی اُمت ہے اور خبیثانہ عمل کی گرویدہ ہے ۔ حضرت لوط علیہ السلام کو کن
کن حالات سے دوچار ہونا پڑا اور قوم نے کس کس انداز سے ان کو تکلیفیں دیں مگر دعوت کے میدان میں
حضرت لوط علیہ السلام نے جس استقامت کا مظاہرہ کیا وہ کوئی راز نہیں ہے ۔ آخر میں حضرت شعیب علیہ السلام
ہیں انہوں نے قوم کو دعوت توحید کے ساتھ مالیاتی مسائل کی طرف توجہ دلائی لوٹ مار ، ڈکیتی سے روکا ۔ قوم
نے ان کے ساتھ جو کچھ کیا اس کا ذکر قرآن میں ہے مگر حالات کی ساری سنگینی کے باوجود ان کی استقامت میں
کبھی بھی رخنہ نہیں آیا ہے ۔ یہی حال حضرت موسیٰ علیہ السلام کا ہے ۔ ان کا مخاطب خود اپنے کو لوگوں کے
سامنے بطور الٰہ پیش کر رہا ہے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے کٹھن حالات میں اس کا زندگی کے ہر موڑ پر مقابلہ

کیا اور پوری استقامت سے کیا۔ آپ ان کو تاریخی واقعات کہتے ہیں لیکن قرآن ان کو صرف تاریخی واقعات نہیں بلکہ وہ حقائق اور دلائل ثابت کرتا ہے جن کی روشنی میں ایک داعی کو دعوت کا کام کرنا چاہیئے اسی وجہ سے فا تفریعیہ لا کر فرمایا ہے فاستقم کما امرت یہاں صرف استقم ہے لیکن سورہ شوریٰ میں دعوت کی تصریح ہے۔ فلذالک فادع واستقم۔ بس اسی سے دعوت کا کام کیجئے اور استقامت کا مظاہرہ کیجئے۔ اِدھر اُدھر نہ دیکھئے۔ پوری لگن پورے دھیان اور پورے جوش سے لگاتار کام کرتے جائیے۔ ان دونوں مقامات میں یہ بات کھول کر نہیں بتائی ہے کہ استقامت کس بات میں ہو۔ کیونکہ حقائق و دلائل سے یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے۔ لیکن سورہ سجدہ میں یہ بات کھول کر بتائی ہے۔

یوحیٰ الیّ انما الٰھکم الٰہ واحد فاستقیموا الیہ

میرے پاس وحی آتی ہے کہ تمہارا الٰہ ایک ہی الٰہ ہے لہٰذا تم سیدھے اس کی طرف ہو جاؤ۔

معلوم ہوا کہ استقامت کے لیے اصلی اور بنیادی چیز توحید عبادت ہے اس میں اِدھر اُدھر نہ دیکھو یہی اسلام کی عمارت کی بنیادی اینٹ ہے اور یہی بس کی گانٹھ اور ریڑھ کی ہڈی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ توحید کی جو راہ آپ کو بتلا دی گئی ہے اس پر جمے رہو اور خوب جم کر لوگوں کو اس کی دعوت دو۔ کیونکہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت انسان کی تکمیل ذات کے لیے اتنی ہی ضروری ہے جتنا کہ اس کے بقاء وجود کے لیے عناصر کا ہونا ضروری ہے اللہ سبحانہٗ کی عبادت کا تصور اپنے متضمنات رکھتا ہے جو اس سے جدا نہیں ہو سکتے۔ الوہیت کا ہر تصور اپنے ساتھ خیر و شر کا ایک خاص معیار اور اخلاقی اقدار کا ایک متعین نظام پیدا کرتا ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت کا اعتقاد بے معنی ہے اگر اس کی خوشنودی، ناخوشی، اس کی رحمت اور اس کے غضب و انتقام کے اصول انسان پر واضح نہ ہوں، جس خدا کی پسند و ناپسندیدگی، جس کی خوشنودی و ناخوشی کا کوئی اصول معیار نہ ہو، جس کے متعلق انسان یہ علم نہ رکھتا ہو کہ وہ کس قسم کے اعمال سے خوش ہو کر انعام دیتا ہے اور کون سا اس کے غیظ و غضب کا موجب ہوتا ہے۔ اس کی طرف سے دلوں میں خوف و محبت اور بیم و رجاء کے جذبات کس طرح پیدا ہو سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ریگانہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت کا اعتقاد خیر و شر کا ایک مستقل معیار وجود میں لاتا ہے اگر استقامت کی ماہیت پر غور کیجئے تو معلوم ہوگا کہ استقامت نام ہے یمین و یسار سے بے نیاز ہو کر ناک کی سیدھ میں کام کرنے کا۔ استقامت کا تصور ہی نہیں ہو سکتا اگر اس میں یمین و یسار ہو۔ استقامت کا یمین و یسار استقامت نہیں زیغ ہے۔ یہاں سمجھنے کی ایک اور بات ہے وہ یہ کہ آیت میں کَمَا اُمِرْتَ کا مقصود کیا

ہے جیسا کہ تمہیں حکم دیا گیا ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے تو کچھ لوگوں کی طرف یہاں اس نکتہ کی نسبت کی ہے کہ مقصد
ہے کہ ایسی استقامت دکھاؤ جس قسم کی استقامت کا تمہیں حکم دیا گیا ہے اور ظاہر ہے کہ قرآن میں ایسی
ی آیت نہیں ہے سوائے ایک آیت کے جو سورہ شوریٰ میں ہے وہاں بھی تعبیر یہی ہے کہ واستقم کما
سورت اس لیے انہوں نے قرآن سے باہر دحی کا سہارا لیا۔ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اس آیت میں
ستقامت کا جو حکم دیا ہے وہ صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ آپ کے ساتھ اہل ایمان کو بھی ہے اور
رآن میں دونوں کو استقامت کا حکم سورہ حٰم السجدہ میں ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اسلام
نے سے پہلے نازل ہوئی ہے اس میں

یوحیٰ الیّ انما الٰھکم الٰہ واحد فاستقیموا الیہ

ہی وہ حکم ہے جسے شوریٰ اور ہود میں کما امرت سے تعبیر کیا ہے اور اسی سورت میں اہل استقامت
کی تعریف کی ہے۔

ان الذین قالوا ربنا اللہ ثم استقاموا

بلاشبہ جن لوگوں نے کہا کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ پھر اس پر استقامت دکھائی
یعنی ایک مرتبہ یہ عقیدہ قبول کر لینے کے بعد پھر ساری عمر اسی پر قائم رہے اس کے خلاف کوئی دوسرا عقیدہ
اختیار نہیں کیا نہ اس عقیدے کے ساتھ کسی باطل عقیدے کی آمیزش کی اور اپنی عملی زندگی میں عقیدہ توحید
عبادت کے تقاضوں کو پورا کرتے رہے توحید عبادت پر استقامت کی تشریح خود صحابہ سے منقول ہے حضرت
ابو بکر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں۔ جنہوں نے اللہ کی عبادت میں کبھی شریک نہیں کیا اللہ کے سوا کسی کے الٰہ ہونے
کا ان کو کبھی خیال نہیں آیا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایک بار منبر پر یہ آیت تلاوت کی اور فرمایا خدا کی قسم
استقامت اختیار کرنے والے وہ ہیں جو اللہ کی اطاعت پر مضبوطی کے ساتھ قائم ہو گئے۔ لومڑیوں کی طرح
ادھر سے اُدھر اور اُدھر سے اِدھر دوڑتے نہ پھرے۔ شاید اسی لیے علامہ آلوسیؒ نے دوسروں کی بات لکھ کر
اپنا یہ فیصلہ لکھا ہے کہ ارشاد گرامی کا مقصود یہ ہے کہ استقامت پر دوام اور ہمیشگی فرمائیے۔ کیونکہ سیدھی
راہ سے چمٹ جانے کا نام استقامت ہے اور لکھا ہے کہ لفظ استقامت میں بہت بڑی جامعیت ہے
اس میں علم، عمل، افکار، اعمال اور اخلاق غرض سب کو سمیٹے ہوئے ہے۔ شارحین قرآن نے یہاں
طویل مباحث سپرد قرطاس کیے ہیں۔

آگے ارشاد ہوا ہے ولا تطغوا حد سے نہ بڑھو یعنی اللہ سبحانہ کے اوامر کی مخالفت کی جرأت نہ کرنا،
اہل ایمان کو یہاں اللہ کے احکام کی مخالفت سے ایسا ہی روکا ہے جیسا بنی اسرائیل کو کہا گیا ہے۔

کلوا من طیبٰت ما رزقنٰکم ولا تطغوا فیہ فیحل علیکم غضبی .

جو کچھ ہم نے تمہیں اچھی چیزیں دیں ہیں ان کو استعمال کرو اور اس میں احکام کی مخالفت کی جرأت نہ کرو ۔

مطلب یہ ہے کہ حالات سے مرعوب ہو کر یا ترغیبات سے متاثر ہو کر ذرا اس راہ سے کج نہ ہونا. طغیان ہی سب صورتیں داخل ہیں ۔ سیدھی راہ سے دائیں یا بائیں ہو جانا اور سیدھی راہ سے آگے ہو جانا یا پیچھے رہ جانا جن کی نگاہ میں استقامت میں یمین ویسار کی طرف ہونا طغیان ہے ۔ انہوں نے اسے کجی کے معنے میں لیا. اس کجی کے پیٹ سے اختلاف جنم لیتا ہے. اسی لیے کچھ بزرگوں نے آیت کی تشریح کرتے ہوئے آیت کا مدلول یہ بتایا ہے کہ اتبع ولا تبتدع دین کی زندگی میں اتباع کو اپناؤ ابتداع سے بچ کر رہو اور جن کی نگاہ آگے ہونے پر گئی انہوں نے اس کے معنے ظلم وجبر کے کیئے اور بتایا کہ کسی پر زیادتی نہ کرو یعنی استقامت کا نتیجہ یہ نہ ہونا چاہیئے کہ مخالفوں پر کسی طرح کی زیادتی کرنے لگو ۔ بہرحال یہ آیت اس حیثیت سے اپنے اندر شان جامعیت رکھتی ہے ایک طرف اس میں اگر پوری زندگی میں اسلام پر جمنے اور ایمان کے تقاضے پورا کرنے کا حکم ہو رہا ہے تو دوسری طرف مصادر فساد سے دور رہنے کی ہدایت ہو رہی ہے. آخر میں فرمایا انہ بما تعملون بصیر اللہ سبحانہ تمہارے اعمال کو دیکھ رہا ہے. مطلب یہ ہے کہ نتائج کا فیصلہ دعوؤں، نعروں، تمناؤں، آرزؤں، نسبتوں اور نسبوں سے نہیں ہوگا بلکہ اعمال سے ہوگا جیسے اعمال ہوں گے ویسے ہی نتائج ہوں گے. یہ جملہ استیناف بیانی بھی ہے اور ان کو متنبہ کیا جا رہا ہے کہ دین کی زندگی میں علانیہ اور جلوت میں پارسائی اور دینداری کا لبادہ پہن لیں مگر خلوت میں دیندار نہ ہوں. فرمایا کہ اللہ سبحانہ تمہارے اعمال پر ہے تمہاری صورتوں پر نہیں ہے جو کچھ تم کر رہے ہو یا کرو گے سب کچھ دیکھ رہا ہے وہ مشکلات میں تمہاری راہنمائی فرمائے گا اور جب مدد کے محتاج ہو گے تو تمہاری مدد کرے گا ۔

یہاں اس فقرے کے ذریعے سے اشارہ کر دیا ہے کہ اعمال انسانی میں خواص ونتائج کا تسلسل و ہر ایک حقیقت ہے ۔ ان ہی کے ذریعے سعادت اور شقاوت اور حیات و ممات کا فیصلہ ہوتا ہے اور جیسے عالم طبیعت میں اللہ کے قوانین یکساں اور عالمگیر ہیں ایسے ہی عالم انسانی میں اللہ نے قوانین یکساں اور عالمگیر ہیں ان میں کبھی تبدیلی نہیں ہو سکتی ہے ۔

(١٣٥) ظالموں کی طرف جھکاؤ بھی نہ ہو

اور دیکھو ظلم کار لوگوں کی طرف تمہارا جھکاؤ نہ ہو اس کے نتیجے میں تمہیں بھی آگ چھو جائے گی اور اللہ کے سوا تمہارا کوئی کارساز نہیں ہے پھر تمہاری کوئی مدد نہ کی جائے گی پہلے لا تطغوا میں حد سے نکلنے کو منع کیا تھا اب بتلاتے ہیں کہ جو لوگ ظالم حد سے نکلنے والے ہیں ان کی طرف تمہارا میلان بھی نہ ہو انکی موالات، مصاحبت، تعظیم و تکریم، مدح و ثنا، ظاہری تشبہ، اشتراک عمل ہر بات سے حسب مقدور محترز رہو. مبادا آگ کی لپیٹ تم کو لگ جائے پھر نہ اللہ سبحانہ، کے سوا تمہیں کوئی مددگار ملے گا اور نہ اللہ کی جانب سے کوئی مدد پہنچے گی[1] یعنی مخالفوں پر کسی طرح کی زیادتی کرنے کا خیال نہ کرو لیکن یہ بھی نہیں ہونا چاہیئے. کہ ظالموں کی طرف جھک جاؤ اور نتیجہ یہ نکلے کہ ان کی گمراہی کی چھینٹیں تم پر بھی پڑ جائیں نہ تو بتائی ہوئی حد سے آگے اور ادھر ادھر ہونا چاہیئے اور نہ ظالموں کی طرف جھکنا چاہیئے. یہ اہل ایمان کو تنبیہ ہے کہ خوف یا طمع کسی چیز سے متاثر ہو کر ان کی طرف مائل نہ ہونا چاہیئے جنہوں نے ظلم کا ارتکاب کیا ہے. قرآن میں الذین ظلموا مطلق آیا ہے. یعنی وہ لوگ جن کے دامن ظلم سے داغدار ہوں خواہ کوئی ہوں. اس ممانعت میں سب چیزیں داخل ہیں. ان سے مداہنت کرنا قدرت کے باوجود ظلم کو تبدیل کرنے کے لیے تیاری نہ کرنا. ان سے ربط و ضبط رکھنا. مدار ممانعت ظلم ہے ظلم کار لوگوں کا طرف دار ہونے کا نہیں بلکہ ان کی طرف ذرا سا میلان ہونے کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ظلم کی پاداش میں جو آگ ان کی طرف آئے گی اس کی لپیٹ میں تم بھی آجاؤ گے پھر تمہیں نہ کوئی بچانے والا ہوگا اور نہ اللہ کی جانب سے تمہاری کوئی مدد ہوگی.

ظالموں سے کون لوگ مراد ہیں؟ ظاہر ہے کہ اس میں ہر ظالم داخل ہے خواہ مشرک ہو یا مسلم ہو ظلم خواہ خالق کا حق مار کر کیا جائے یا مخلوق کا مطلب یہ ہے کہ با انصاف لوگوں کو چھوڑ کر ظلم پیشہ اور ظلم کار لوگوں سے ربط و ضبط اور تعلقات نہ رکھو، ظالموں کے ظلم کی حمایت نہ کرو نہ کردار سے نہ گفتار سے اور نہ سکوت و خاموشی سے بلکہ اس کے خلاف جہاں تک ہوسکے کوشش کرو. نرمی و شفقت سے اسے سمجھاؤ. سختی کا موقعہ ہو تو لب و لہجہ کی سختی سے فہمائش کرو. اس طرح بھی نتیجہ نہ نکلے تو ظالم کے خلاف عملی قدم اٹھاؤ اور کسی طرح کوئی تدبیر بھی کارگر نہ ہو تو ترک تعلقا کرو. ظالم کو اچھا کہو گے اس کی حمایت میں آوازیں بلند کرو گے تو ظالم کے ساتھ تم بھی آگ کی لپیٹ میں آجاؤ گے علامہ آلوسیؒ نے یہ بات

---

[1] افادات شیخ الاسلام

بڑے درد انگیز لہجے میں لکھی ہے

آج اس آیت کی تشریح لوگوں کے لیے کس قدر دشوار ہے۔

پھر لکھتے ہیں کہ ظالموں کی طرف اگر صرف میلان کا نتیجہ دوزخ ہے تو پھر تمہارا ان لوگوں کے بارے میں کیا خیال ہے جو ظلم کار اور ظلم پیشہ لوگوں سے تعلقات رکھتے ہیں۔ مجالس میں ان کے ندیم وجلیس ہیں۔ از سرتاپا ان کی مسرتوں اور شادمانیوں کا سامان کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ ظالموں کی طرف میلان ہی رکھنے والے نہیں بلکہ ظالم ہیں اور ظالموں کے ساتھ ظلم میں برابر کے شریک ہیں۔ سفیان ثوری رضی اللہ عنہ امویوں کے زمانہ میں ہیں۔ امویوں کی ظالمانہ حکومت کا آنکھوں سے تماشا دیکھ رہے ہیں کسی نے حضرت سفیان ثوری رضی سے دریافت کیا کہ میں ان ظالموں کے کپڑے سیتا تو کیا میں بھی ان کے مددگاروں میں سمجھا جاؤں گا فرمایا کہ تو صرف مددگار نہیں بلکہ تیرا شمار ظالموں میں ہوگا اور جو کپڑے سینے کے لیے تیرے ہاتھ سوئی فروخت کرے گا اس کا شمار ظالموں کے مددگاروں میں ہوگا۔

اس آیت کی تشریح وتفسیر کو سمجھنے کے لیے ان حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے جن میں یہ آیات نازل ہو رہی ہیں۔ اہل ایمان بے بسی اور بے کسی کی حالت میں ہیں۔ اقتدار پر ظالمانہ قبضہ مشرکین کا ہے اور اقتدار کی ساری قوتیں اسلام، داعی اسلام اور مسلمانوں کو مٹانے کے درپے ہیں حالات کی ناخوشگواری کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ سورت کے آغاز میں قرآن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب بنا کر کہہ رہا ہے۔

فلعلك تارك بعض ما يوحى اليك وضائق به صدرك ان يقولوا لولا انزل عليه كنز۔

جن حالات میں یہ بات کہی گئی ہے۔ ان کو پیش نظر رکھیئے مکہ ایک ایسے قبیلے کا صدر مقام ہے جو تمام عرب پر اپنے مذہبی اقتدار، اپنی دولت وتجارت اور اپنے سیاسی دبدبے کی وجہ سے چھایا ہوا ہے۔ عین اس وقت جب یہ لوگ اپنے انتہائی عروج پر ہیں۔ اس بستی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم لوگوں کے سامنے آتے ہیں اور اعلان کرتے ہیں کہ جس مذہب کے تم پیشوا ہو وہ سراسر گمراہی ہے جس نظام تمدن کے تم سردار ہو وہ اپنی جڑ تک گلا اور سڑا ہوا نظام ہے۔ اللہ سبحانہ کی سنگین گرفت تم پر آنے والی ہے اور اس سے بچنے کی تمہارے لیے اس کے سوا کوئی صورت نہیں ہے کہ اس دین حق کو قبول کرو جو میں اللہ سبحانہ کی جانب سے لے کر آیا ہوں ایسے حالات میں یہ بات کہنے کا انجام اس کے سوا کچھ بھی نہیں ہوسکتا کہ کچھ صحیح الفطرت لوگوں کے سوا بستی کے سب ہی لوگ اس داعی کے پیچھے پڑ جائیں۔ کوئی ظلم وستم سے اسے دبانا چاہتا ہے، کوئی جھوٹے الزامات اس پر لگاتا ہے۔ کوئی متعصبانہ بے رخی سے اس کی ہمت شکنی کرتا ہے کوئی مذاق اڑا کر

آوازے کس کر اس کی باتوں کو ہوا میں اڑانا چاہتا ہے۔ یہ ایک دن، ایک ہفتہ، ایک ماہ یا ایک سال کی بات نہیں بلکہ کئی سالوں تک نبوت کی دعوت سے یہ سلوک ہوتا رہا۔ اسی صورت حال میں نبوت کو اور اس کی وساطت سے اہل ایمان کو یہ بات سمجھائی جارہی ہے کہ ان پر آشوب حالات کا جم کر اور ڈٹ کر پوری پامردی اور استقامت سے مقابلہ کریں اور بندگی کی حد سے تجاوز نہ کریں۔ ان ظالموں کی طرف اپنے اندر ذرا بھی جھکاؤ نہ آنے دیں۔ ظاہر ہے یہ کوئی انفرادی مسئلہ نہیں ہے جب سب نے مل کر اس دعوت کو بجبر د استبداد نابود کر دینے کا فیصلہ کر دیا اور اہل ایمان پر محض اختلاف عقائد کی بنا پر ظلم وستم کرنے لگے قدرتی طور پر دو کیمپ بن گئے۔ ایک کیمپ اہل ایمان کا تھا جو بچاؤ کر رہا تھا دوسرا ارباب اقتدار کا تھا جو ظلم کر رہا تھا ایسی حالت میں ناگزیر ہو گیا کہ اہل ایمان سے کہا جائے ولا ترکنوا الی الذین ظلموا۔ دشمنوں سے کوئی تعلق نہ رکھیں بلکہ اس کے لیے اپنے دل میں میلان بھی نہ آنے دیں، ورنہ جہاں تک ایک انسان کے دوسرے انسان سے معاملہ کرنے کا تعلق ہے اس میں قرآن نے سازگاری و باہمی تعاون کی تلقین کی ہے۔ معیشت و معاشرت کے احکام اور ہیں اور مبارزت کے احکام اور ہیں۔ الذین ظلموا کی قید سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اصل چیز ظلم ہے۔ غیر مسلم اور مسلم دونوں کا حکم ایک ہے۔ علامہ نیشاپوریؒ کی نگاہ اس نکتہ پر پہنچی ہے۔ وہ فرماتے ہیں۔

> جس میلان سے آیت میں ممانعت کی ہے اس سے مراد یہ ہے کہ ظالموں کی حالت کو پسند کیا جائے۔ دوسروں کو ظالموں کے قول وفعل کی خوبی سمجھائی جائے اس کے ساتھ ظلم میں شرکت کی جائے۔ رہے دنیوی تو کسی جائز فائدے کے لیے یا نفرت کو دُور کرنے کے لیے ظالموں سے تعلقات میں کوئی حرج نہیں ہے۔

قرطبیؒ کی بھی یہی تحقیق ہے۔

وَأَقِمِ الصَّلٰوةَ طَرَفَيِ
النَّهَارِ وَزُلَفًا مِّنَ الَّيْلِ ۚ إِنَّ الْحَسَنٰتِ يُذْهِبْنَ السَّيِّاٰتِ ۚ
ذٰلِكَ ذِكْرٰى لِلذّٰكِرِيْنَ ﴿۱۱۴﴾ وَاصْبِرْ فَإِنَّ اللّٰهَ لَا يُضِيْعُ
أَجْرَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۱۱۵﴾

اور اے اللہ کے رسول نماز قائم کرو اس وقت جب دن شروع ہونے کو ہو اور اس وقت جب دن ختم ہونے کو ہو۔ نیز اس وقت جب رات کا ابتدائی حصہ گزر رہا ہو[۱۳۶] یاد رکھو کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کے لیے[۱۳۷] اور صبر کرو یقیناً اللہ حسن کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے[۱۳۸]

مفردات کے معانی

طرفی طرف کا طرفین تثنیہ حالت نصبی میں مضاف ہو کر آیا ہے اس لیے نون گر گیا اس کے معنے دونوں طرف دونوں کنارے۔ طرفی النہار کو قرآن حکیم میں مختلف طریقوں سے ادا کیا گیا ہے۔ قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا۔ بالعشی والابکار۔ بالغدو والآصال۔ اس میں پہلا طرف فجر، بکرہ اور غدو ہے اور دوسرا طرف عصر، عشی اور اصیل ہے۔

زُلَفًا یہ زلفۃ کی جمع ہے۔ رات کی گھڑیاں، ساعات شب، ابو عبیدہ کہتے ہیں کہ زلف اللیل کے معنی ساعات کی گھڑیوں کے ہیں۔ اس کا واحد زلفۃ ہے۔ جس کے معنے ساعت منزلت اور قرب کے ہیں۔ امام بغوی لکھتے ہیں یہ اسم ہے بوصف مصدر اس میں تذکیر و تانیث واحد، تثنیہ اور جمع برابر ہیں۔

اسلام میں نماز کا مرتبہ

اسلام میں پہلا فرض ایمان اور اس کے لوازم ہیں اور اس کے بعد دوسرا فرض نماز ہے یا یوں کہہ دیجئے کہ نماز ہی ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہے۔ یہ گویا اس بات کی طرف اشارہ ہے کہ اگر انسان کے اندر ایمان موجود ہو۔ اور اللہ سبحانہ کی الہیت اور اپنی عبدیت پر اسے یقین ہو تو یہ یقین سب سے پہلے نماز کی شکل اختیار کرتا ہے۔ سورہ روم میں پہلا حکم دیا گیا۔ فاقم وجھك للدين حنيفاً۔ اپنا چہرہ ہر طرف سے موڑ کر دین توحید پر سیدھا کر۔ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا۔ یہی اللہ کی وہ فطرت ہے جس پر اللہ نے لوگوں کو بنایا ہے اس کے بعد دوسرا حکم اس سے ملحق یہ ہے۔

واقیموا الصلوۃ ولا تکونوا من المشرکین

اور نماز قائم کرو مشرکوں میں سے نہ ہو جاؤ۔

اس آیت سے ایک تو توحید و ایمان کے بعد سب سے اہم خبر نماز ثابت ہوتی ہے اور دوسری بات اس سے یہ معلوم ہوتی ہے کہ ترک نماز سے کفر و شرک میں مبتلا ہونے کا اندیشہ ہے۔ کیونکہ جب تک دل کی کیفیت کو ہم بیرونی اعمال کے ذریعے سے بڑھاتے نہ رہیں خود اس کیفیت کے زائل ہونے کا اندیشہ ہے یہی وجہ ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی اہمیت پر ہمیشہ خاص طور سے زور دیتے اور اس کے تارک کے متعلق کفر و شرک کا ڈر سناتے۔

قرآن عزیز نے جگہ جگہ ایمان کے بعد نماز ہی کا ذکر کیا ہے مثلاً ان الذین امنوا وعملوا الصلحت واقاموا الصلوۃ۔ اور والذین یمسکون بالکتاب واقام الصلوۃ۔ اور فلا صدق ولا صلی اس انداز بیان سے وہ درحقیقت یہی بتانا چاہتا ہے کہ دل میں اگر ایمان کا بیج پڑ چکا ہے تو اس سے عمل کا جو پہلا پودا نکلے گا وہ نماز ہوگا نہ صرف یہ کہ نماز ایمان کا سب سے پہلا مظہر ہوتی ہے بلکہ وہ ایمان کا لازمی مظہر بھی ہے۔ یہ ممکن نہیں کہ دل میں ایمان ہو اور سر میں رکوع اور سجدے کی تڑپ نہ ہو۔ ایمان دل کی ایک کیفیت کا نام ہے۔ یہی کیفیت ہے جو خارج میں نماز کی شکل اختیار کر لیتی ہے۔ اس لیے جہاں ایمان ہو وہاں نماز ضرور ہوگی۔ ٹھیک اسی طرح کہ جہاں سورج نکلا ہوا ہو وہاں روشنی اور گرمی ضرور ہوتی ہے۔

شاید آپ کے ذہن میں یہ سوال ابھر آئے کہ اسلام میں نماز کا یہ مقام کیوں ہے ؟ اس بات کو سمجھنے کے لیے پہلے یہ سوچیے کہ خود نماز کیا چیز ہے ؟ اور اس کی حقیقت کیا ہے ؟ قرآن عزیز بتاتا ہے کہ نماز اللہ کی یاد ہے ۔ اقم الصلوۃ لذکری ۔ اور یہ کہ نماز بندے کو اللہ سے قریب کر دیتی ہے اور اتنا قریب کر دیتی ہے کہ اتنی قربت کسی بھی دوسرے عمل کے ذریعے اور کسی بھی دوسری حالت میں اسے حاصل نہیں ہو سکتی ۔ وہ اس وقت ہر ما سوا سے کٹ کر اپنے آقا و مولیٰ کی حضوری میں پہنچا ہوتا ہے اور اس سے ہمکلامی میں مشغول ہوتا ہے ۔ اللہ کی یاد ، اس کا قرب اس کی حضوری اور اس کی ہمکلامی ہی دین کی روح اور بندگی کا معراج ہے ۔ خدا پرستانہ عمل ایمان ہی کا ثمر ہوتا ہے ۔ اور ایمان کی جڑوں کو نمی اور تازگی صرف اللہ کی یاد ہی سے ملتی ہے نماز نہ صرف یہ کہ اللہ کی یاد ہے بلکہ اس یاد کا سب سے بہتر ، سب سے کامل اور سب سے زیادہ مؤثر طریقہ ہے ۔ اس لیے نیکی اور خدا پرستی کے وجود کو نماز کے وجود پر منحصر ہونا چاہیئے ۔

(۱۳۹) اے اللہ کے رسول نماز قائم کر اس وقت جب دن شروع ہو اور اس وقت جب دن ختم ہونے کو ہو یعنی ظالموں کی طرف نہ جھکو بلکہ خدائے وحدہٗ لا شریک کی طرف جھکو ۔ یعنی صبح و شام اور رات کی تاریکی میں خشوع و خضوع سے نمازیں ادا کرو کہ یہی بڑا ذریعہ اللہ سبحانہٗ کی مدد حاصل کرنے کا ہے ۔

نمازوں کے اوقات تدریجی تکمیل

یہ تو سب ہی جانتے ہیں کہ اسلام کا آغاز غربت ، بے کسی اور مظلومی اور بے سروسامانی کے ساتھ ہوا ہے ۔ اس لیے ابتدائی زمانہ میں دن کے وقت کوئی نماز نہ تھی ۔ صحابہ کرامؓ صرف رات کو کہیں ادھر ادھر چھپ کر دیر تک نماز پڑھتے تھے ۔

سورہ مزمل میں جو مکہ کی نہایت ابتدائی سورتوں میں ہے یہ آیتیں آئی ہیں ۔

یا ایھا المزمل قم اللیل الا قلیلا نصفہٗ او انقص منہ قلیلا او زد علیہ ورتل القرآن ترتیلا انا سنلقی علیک قولا ثقیلا ان ناشئۃ اللیل ھی اشد وطأ و اقوم قیلا ان لک فی النھار سبحا طویلا ۔

اے کملی اوڑھ کر سونے والے تھوڑی دیر کے علاوہ ساری رات اٹھ کر نماز پڑھ آدھی رات یا اس سے کچھ کم یا اس سے کچھ زیادہ اور اس میں قرآن ٹھہر ٹھہر کر پڑھ ہم تجھ پر عنقریب بھاری بات ڈالنے والے ہیں ۔ یعنی شریعت کے مفصل احکام اتارنے والے ہیں بے شک رات کو

اُٹھ کر نماز پڑھنے میں طمانیت قلب کا زیادہ موقع ہے اور قرآن سمجھ کر پڑھنے کے لیے زیادہ مناسب ہے بلاشبہ آپ کو دن میں آرام کی فرصت حاصل ہے ۔

نماز کا یہ طریقہ غالباً ان تین برسوں تک رہا جب اسلام کی دعوت برملا نہیں دی جا سکتی تھی۔ اس کے بعد جب نسبتاً اطمینان حاصل ہوا اور دعوت کے اظہار کا وقت آیا تو رفتہ رفتہ اسلام کا قدم تکمیل کی طرف بڑھا اور رات کی طویل نماز تہجد کے علاوہ رات کے ابتدائی حصہ (عشار) اور تاروں کے جھلملاتے وقت بھی ایک ایک نماز فجر اضافہ کی گئی ۔

واصبر لحکم ربک فانک باعیننا وسبح بحمد ربک حین تقوم
ومن اللیل فسبحہ وادبار السجود

اور اپنے رب کے فیصلے کا انتظار کیجئے بے شک آپ ہماری آنکھوں کے سامنے ہیں اور اپنے رب کی تعریف کے ساتھ تسبیح کرو جس وقت رات کو تہجد کے وقت اٹھتا ہے اور رات کے کچھ حصے میں اس کی تسبیح کرو اور ستاروں کی پیٹھ پھرنے کے وقت ۔

یہ آیت سورہ طور کے آخر میں ہے اور سورہ طور کے متعلق معلوم ہے کہ وہ مکہ میں نازل ہوئی تھی۔ اور شاید اس وقت قریش مکہ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو تکلیف دینا شروع کر دیا تھا۔ ابھی تک یہ رات کی نمازوں کی تفریق نہ تھی۔ سورہ دہر میں جو جمہور کے نزدیک مکی سورت ہے اور غالباً سورہ طور کے بعد اتری ہے ان ہی معنے کی ایک اور آیت ہے جس میں ان اوقات کے علاوہ دن کے خاتمہ کے قریب ایک نماز جسے عصر کی نماز کہہ دیجئے اور بڑھتی ہے ۔

واذکر اسم ربک بکرۃ واصیلا

صبح کو اور تیسرے پہر کو اپنے رب کا نام لیا کرو

اب رات کی دیر تک کی نماز تہجد کے علاوہ تین وقتوں کی تصریح ہے۔ یعنی صبح، اخیر دن اور ابتدائی شب مگر ابھی اصیل میں ظہر و عصر اور من اللیل میں مغرب اور عشار کی تفریق نہ ہوئی تھی۔ کیونکہ کل نمازیں تین تھیں۔ ایک فجر کے وقت، ایک سہ پہر کو اور ایک رات کو۔ اسی لیے ابھی تک باقی دو نمازوں کی جگہ رات کو دیر تک نماز پڑھتے رہنے کا حکم تھا۔ جیسا کہ آیت بالا سے ظاہر ہے ۔

اب تین وقتوں کی تسبیح و تحمید باقاعدہ نماز کی صورت اختیار کرتی ہیں۔ زیر تشریح آیت اقم الصلوٰۃ طرفی النھار و زلفا من اللیل پہلی آیت ہے جس میں تسبیح کی بجائے لفظ صلاۃ کی اقامت کا حکم

آیا ہے اس وقت مسلمانوں کی کافی تعداد تھی۔ جیسا کہ ومن تاب معک سے معلوم ہو رہا ہے۔ اس آیت کے ذریعے اب دن کی تین نمازیں باقاعدہ فرض ہوئی ہیں، ایک دن کے کنارے پر، یعنی رات کے خاتمہ کے قریب تاروں کے جھلملاتے وقت دوسری دن کے دوسرے کنارے دن کے خاتمہ کے قریب اور تیسری رات کے ابتدائی حصے میں۔ پہلی سے صبح کی نماز، دوسری سے عصر کی نماز اور تیسری سے عشار کی نماز مراد ہے۔ ابھی تک دن اور رات کی نمازوں میں اجمال تھا۔ دوسری میں ظہر اور عصر کی اور تیسری میں مغرب اور عشار کی نمازیں چھپی ہوئی تھیں۔ اب رات کی نمازیں علیحدہ ہوتی ہیں۔ سورہ قاف جو مکی سورت ہے اس میں ہے۔

وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل الغروب ومن اللیل فسبحہ وادبار السجود۔

اور آفتاب کے نکلنے سے پہلے فجر اور اس کے ڈوبنے سے پہلے عصر کو اپنے رب کی تحمید و تسبیح کرو اور کچھ رات گئے ہر عشار کو اس کی تسبیح کرو اور آفتاب کے سجدہ کرنے کے بعد غروب کے بعد یعنی مغرب کے وقت اس کی تسبیح کرو۔

اس آیت میں رات کی نماز کا ابہام دور کر کے مغرب اور عشار کی تعیین کر دی گئی زوال آفتاب سے غروب آفتاب تک کی نماز جس کو پہلے اصیل اور پھر طرفی النہار کہا گیا ہے۔ ابھی تفصیل طلب ہے۔ سورہ روم میں جو مکہ ہی میں نازل ہوئی ہے اس کی بھرپور طریقے پر تفصیل کر دی گئی ہے۔ اس سورۃ کے اترنے کا وقت تاریخ سے ثابت ہے کہ وہ رومیوں کی پوری شکست کے بعد نازل ہوئی ہے جس کا زمانہ نبوت کے پانچویں سال سے لے کر نویں سال تک ہے۔

فسبحان اللہ حین تمسون وحین تصبحون ولہ الحمد فی السماوات والارض وعشیا وحین تظہرون

اس آیت میں زوال کے بعد ظہر اور غروب سے پہلے عصر کی مبہم نمازوں کی توضیح کی گئی ہے۔ ایک کو عشی عصر اور دوسری کو ظہر کہا گیا ہے۔

سورہ طٰہٰ میں بھی ایک آیت ہے جس میں پانچوں نمازوں کے اوقات کی تصریح ہے وہ یہ ہے۔

وسبح بحمد ربک قبل طلوع الشمس وقبل غروبہا ومن اناء اللیل فسبح واطراف النہار۔

آفتاب نکلنے سے پہلے فجر ہے، ڈوبنے سے پہلے عصر۔ رات کے کچھ وقت سے عشار مراد ہے اور

دن کے کناروں سے ظہر اور مغرب مراد ہے۔

یہ شبہ کیا جاسکتا ہے کہ زیر تشریح آیت میں طرفی النھار تثنیہ آیا ہے اور یہاں سورہ طٰہٰ میں اطراف جمع آیا ہے اور جمع کم سے کم تین پر بولا جاتا ہے اس لیے دن کے تین کنارے ہونے چاہئیں۔ دن کے کنارے یا تو دو ہی ہیں صبح و شام یا تین ہیں اگر وسط کا بھی اعتبار کیا جائے یعنی صبح دوپہر اور شام پہلی صورت لی جائے تو صبح کے ذکر میں تکرار ہو جاتا ہے۔ اور ظہر غائب ہو جاتی ہے۔ دوسری صورت میں ظہر آجاتی ہے مگر فجر کا تکرار بھی رہتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ اطراف اگرچہ جمع ہے مگر عربی زبان میں دو پر بھی جمع کا اطلاق ہوتا ہے۔ اور قرآن سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ دیکھئے ایک جگہ رب المشرقین و رب المغربین ہے دوسری جگہ رب المشارق و المغارب آیا ہے۔ سورۃ تحریم میں فقد صغت قلوبکما سے ظاہر ہے کہ دو آدمیوں کے دو ہی دل ہوتے ہیں۔ یہ زبان کا محاورہ ہے اس میں قیاس اور عقلیت کو دخل نہیں ہے اس لیے یہاں بھی اطراف سے مراد دو ہی طرفیں ہیں۔ یہ سب مانتے ہیں کہ دن کے دو ہی حصے ہوتے ہیں ایک صبح سے دوپہر تک، دوسرا دوپہر سے شام تک اطراف سے انہی دو حصوں کے آخری کنارے یہاں مراد ہیں۔ اس موضوع پر مزید بحث انشاء اللہ معالم القرآن کی پندرھویں جلد میں آرہی ہے۔ بہرحال بتایا جا رہا ہے کہ نماز کو ان اوقات میں ادا کرو تمہاری طاقت کا اصلی سرچشمہ یہی ہے۔ نماز پڑھنے کے لیے اقامت صلوۃ کی تعبیر آئی ہے۔ اقامت کے معنے ٹھہرنے اور درست کرنے کے ہیں اور کسی چیز کی اقامت کے معنے اس کو درست رکھنے، قائم کرنے اور اس کے حقوق کی بجا آوری کے ہیں۔ لہٰذا اس کے معنے صرف نماز پڑھنے کے نہیں بلکہ نماز کو اس کے آداب و ارکان، واجبات اور سنن کے ساتھ کرنے کے ہیں اس وجہ سے نماز میں اطمینان، ارکان کا اعتدال، باطنی خشوع و خضوع کی پابجائی اقامت میں داخل ہے۔ اس کے بغیر نماز ناقص ہے۔ نماز کے آداب باطنی میں نمازی کا نماز میں اللہ کے سامنے باادب کھڑا ہونا ہے وقوموا للہ قانتین۔ اسی میں ارکان اعتدال ہے۔ قنوت کے معنے ہیں۔ چپ رہنا، دعا مانگنا، کھڑے رہنا، دیر تک کھڑے رہنا، عاجزی کرنا یہ سارے معنے نماز میں مقصود ہیں۔ اقامت ہی کے نتیجے میں خشوع کی کیفیت ہے اور خشوع کے تضرع، اخلاق، یاد الٰہی اور فہم و تدبر خشوع کے لوازم ہیں قرآن میں اس کے اشارات ہیں۔ یہی نماز کے باطنی آداب ہیں۔

علامہ آلوسیؒ نے اقیموا الصلوۃ کے تین معنے کی نشان دہی کی ہے۔ اول یہ کہ فرض نماز کی ادائیگی کرو دوسرے یہ کہ نماز کی پوری پوری ادائیگی کرو تیسرے یہ کہ نماز پر مداومت کرو۔ قرآن میں یہ بات جگہ جگہ بتائی گئی کہ اللہ سبحانہ کی راہ میں شیطان اور اس کی قوتوں کی جانب سے جو مزاحمتیں ہوتی ہیں ان کے

مقابلے کے لیے روحانی طاقت نماز ہی سے حاصل ہوتی ہے۔ نماز ہی بندے اور اس کے مولیٰ کے درمیان رشتہ استوار کرتی ہے اور جب بندے کا اپنے رب سے تعلق ہوجاتا ہے تو اس پر اللہ سبحانہٗ کی جانب سے رحمتوں اور برکتوں کا فیضان ہوتا ہے۔ دل وسوسوں اور کمزوریوں سے پاک اور پورے حوصلے اور جرأت سے حالات کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار ہوجاتا ہے۔

(۱۳۷) نیکیوں سے برائیوں کا کفارہ

یاد رکھو کہ نیکیاں برائیوں کو دور کر دیتی ہیں۔ یہ نصیحت ہے یاد رکھنے والوں کے لیے یعنی نمازوں کا قائم رکھنا اللہ سبحانہٗ کی یادگاری ہے جیسے دوسری جگہ فرمایا۔ اقم الصلوٰۃ لذکری یا یہ مطلب ہے۔ کہ ان الحسنات یذھبن السیأت یاد رکھنے کی چیز ہے جسے کبھی فراموش نہ کرنا چاہیئے۔ کیونکہ اس سے مؤمن کو نیکیوں کی طرف خاص ترغیب ہوتی ہے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ "نیکیاں دور کرتی ہیں برائیوں کو تین طرح (۱) جو نیکیاں کرے اس کی برائیاں معاف ہوں (۲) جو نیکیاں اختیار کرے اس سے خو برائیوں کی چھوٹے۔ (۳) جس ملک میں نیکیوں کا رواج ہو وہاں ہدایت آئے اور گمراہی مٹے۔ لیکن تینوں جگہ وزن غالب چاہیئے جتنا میل اتنا صابون[1] چونکہ انسان کتنی ہی کوشش کرے اپنی فطری کمزوریوں کی حد سے باہر نہیں نکل سکتا۔ اس لیے جس طرح اس نے دنیا میں یہ فطری اصول ودیعت کر دیا ہے کہ جس کی نیکیوں کا پلہ بھاری ہو اس کی معمولی برائیوں سے چشم پوشی کی جاتی ہے یا یہ کہ آخر میں اس کا کوئی نیک کام اتنا زبردست ہوجاتا ہے کہ اس سے اس کی تمام اگلی برائیوں کی فرد ڈبل ہوجاتی ہے۔ ایسے ہی اس نے اصولی طور پر یہ حقیقت ان الفاظ میں پیش کی ہے۔ ان الحسنات یذھبن السیّأت۔ اس آیت گرامی کا یہ بھی منشا ہے کہ نیکیوں کی تدریجی ترقی بالآخر برائیوں کو کم کرتی جاتی ہے۔ یہاں تک کہ وہ پورا نیکوکار انسان بن جاتا ہے اور یہ بھی خوشخبری اس میں ہے کہ یہی نیکیاں اس کی پہلی برائیوں کے نتیجہ کو بھی انشاء اللہ مٹا دیں گی۔ اس معنے کی قرآن میں اور آیات بھی ہیں۔ آیت کا مدلول یہ بھی ہے کہ جو برائیاں دنیا میں پھیلی ہوئی ہیں ان کو دور کرنے کا اصلی طریقہ یہ ہے کہ تم خود زیادہ سے زیادہ نیک بنو اور اپنی نیکی سے اس بدی کو شکست دو اور تمہارے نیک بننے کا بہترین ذریعہ یہ نماز ہے جو اللہ سبحانہٗ کی یاد میں تازگی پیدا کرتی ہے اور اس کی طاقت سے تم بدی کے اس منظم طوفان کا نہ صرف مقابلہ کر سکو گے بلکہ اسے دفعہ کر کے دنیا میں عملاً خیر و صلاح کا نظام بھی قائم کر سکو گے آخر میں فرمایا ذالک

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ذکریٰ للذاکرین . یعنی یہ استقامت، اقامت صلوٰۃ، طغیان نہ کرنے اور ظالموں کی طرف نہ جھکنے کا حکم اللہ کو یاد رکھنے والوں کے لیے نصیحت ہے دراصل یہ اس ہدایت کی قدر قیمت کی طرف توجہ دلائی گئی ہے کہ اس کو معمولی بات نہ سمجھنا یہ سننے اور سمجھنے والوں کے لیے بڑی گراں مایہ موعظت ہے یہ تنبیہ اس لیے ضروری تھی کہ ہر شخص کے لیے آسان نہیں تھا کہ نماز راہ حق میں جہاد کا سب سے بڑا ہتھیار ہے۔

حسنات میں نماز کا مقام

شارحین قرآن نے تصریح کی ہے کہ ان الحسنات الخ کا جملہ مقام تعلیل ہے یعنی نماز قائم کرنے کی علت یہ ہے۔ کہ نماز حسنہ ہے اور حسنات برائیوں کو ملیا میٹ کر دیتی ہیں۔ اسی سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات معلوم کی ہے حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اے معاذ برائی کے پیچھے نیکی کر۔ نیکی برائی کو مٹا دے گی۔ لوگوں کے ساتھ اخلاق حسنہ کے ساتھ پیش آ۔ اور حضرت ابوذر غفاریؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ جہاں بھی ہو اللہ کی نافرمانی سے بچ، برائی کے پیچھے نیکی کر نیکی برائی کو مٹا دیگی اور لوگوں کیساتھ اخلاق حسنہ سے پیش آ حسنات سیأت کو کیسے مٹاتی ہیں؛ یہ بات حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک عامۃ الورود مثال کے ذریعے سمجھائی ہے۔ بخاری، مسلم، ترمذی اور نسائی نے حضرت ابوہریرہؓ کے حوالے سے یہ ارشاد نبوت پیش کیا ہے۔

> بتاؤ کہ اگر کسی شخص کے دروازے پر ایک نہر جاری ہو جس میں وہ پانچ مرتبہ روزانہ غسل کرتا ہے کیا اس کے بدن پر کچھ میل باقی رہے گا؟ صحابہ نے عرض کیا کہ کچھ بھی باقی نہ رہے گا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہی حال پانچوں نمازوں کا ہے کہ اللہ سبحانہ ان کی وجہ سے گناہوں کو زائل کر دیتے ہیں۔

صحیح مسلم میں حضرت جابرؓ کی روایت میں جاری کا معنے گہرا بھی ہے۔ جاری پانی گندگی وغیرہ سے پاک ہوتا ہے اور پانی جتنا گہرا ہوگا اتنا ہی صاف بھی ہوگا۔ اسی لیے جاری ہونا اور گہرا ہونا فرمایا ہے جتنے صاف پانی سے آدمی غسل کرے گا اتنی ہی صفائی بدن پر آئے گی۔ اسی طرح نمازوں کی وجہ سے اگر آداب کی رعایت رکھتے ہوئے پڑھی جائیں تو گناہوں سے صفائی حاصل ہو جاتی ہے۔ جو بات اس حدیث میں آئی ہے یہی بات کئی حدیثوں میں متعدد بار آئی ہے ابوسعید خدریؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا پانچوں نمازیں درمیانی اوقات کے لیے کفارہ ہیں یعنی ایک نماز سے دوسری نماز تک جو صغیرہ گناہ ہوتے ہیں وہ نماز کی برکت سے معاف ہو جاتے ہیں۔ اس کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا مثلاً ایک شخص

ایک کارخانہ ہے جس میں وہ کام کرتاہے جس کی وجہ سے اس کے بدن پر کچھ گردوغبار اور میل کچیل لگ جاتا ہے اور اس کے کارخانے اور مکان کے درمیان میں پانچ نہریں پڑتی ہیں جب وہ کارخانہ سے گھر جاتا ہے۔ تو ہر نہر پر غسل کرتاہے اسی طرح پانچوں نمازوں کا حال ہے کہ جب کبھی درمیانی اوقات میں کچھ خطا و لغزش ہوجاتی ہے تو نمازوں میں دعا و استغفار کرنے سے اللہ سبحانہٗ معاف فرما دیتے ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصود اس قسم کی مثالوں سے اس بات کو سمجھانا ہے کہ اللہ سبحانہٗ نے نمازوں کو گناہوں کی معافی میں بہت طاقتور تاثیر عطا فرمائی ہے اور چونکہ مثال سے بات زرا واضح ہوجاتی ہے اس لیے مختلف مثالوں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس بات کو سمجھایا ہے۔

(۱۴۸) کامیابی کی کنجی صبر اور دعا ہے

اور صبر کرو یقیناً اللہ سبحانہٗ حسن کاروں کا اجر ضائع نہیں کرتا ہے قرآن حکیم کا مطالعہ کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی امداد و اعانت حاصل کرتے میں دو چیزوں کا خاص دخل ہے۔ صلوٰۃ اور صبر۔ و استعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ یہاں صلوٰۃ کے ساتھ صبر کا حکم فرمایا۔ مطلب یہ ہے کہ مومن اللہ سبحانہٗ کی عبادت وطاعت میں ثابت قدم رہے اور کسی دکھ درد کی پرواہ نہ کرے تب اللہ سبحانہٗ کی مدد و نصرت حاصل ہوتی ہے۔ اس کے یہاں کسی نیکوکار کا اجر ضائع نہیں ہوتا ہے بلکہ اندازے سے زیادہ ملتا ہے[1] صبر دل کی کمزوری، بے بسی کی خاموشی اور بے کسی کی مجبورانہ درگذر کا نام نہیں بلکہ دل کی انتہائی قوت، ہمت کی بلندی، عزم کی استواری، اور مشکلات و مصائب کو اللہ سبحانہٗ کے بھروسہ پر خاطر میں لانے کا نام ہے۔ ایک صابر کا کام یہ ہے کہ مخالف حادثوں کے پیش آنے پر وہ دل برداشتہ نہ ہو، ہمت نہ ہارے اپنے مقصد پر جما رہے اور اللہ سبحانہٗ سے دعا کرتا رہے کہ وہ اس کی گزشتہ ناکامی کے قصور کو جو کمی یا زیادتی سے سرزد ہوا ہے معاف فرمائے اور اس کو مزید ثبات قدم عطا کرکے حق کے دشمنوں پر کامیابی بخشے اسی لیے یہاں دونوں باتوں کو یکجا کردیا۔ ایک طرف اقامت صلاۃ کے ذریعے اللہ کی طرف دل لگانا اور دوسرے مشکلات پر صبر و استقامت سے قابو پانا یہی دو چیزیں مشکلات کے طلسم کی کنجی ہیں۔ یہود جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے پیغام حق کو قبول نہیں کرتے تھے۔ اس کے دو سبب تھے ایک یہ کہ دلوں میں گداز اور تاثیر نہیں رہا تھا اور دوسرے یہ کہ پیغام حق قبول کرنے کے ساتھ ان کو جو جانی و مالی دشواریاں پیش آئیں ان کو برداشت نہیں کرسکتے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

تھے۔ اسی لیے قرآن نے ان کی بیماری کے لیے یہ نسخہ تجویز کیا واستعینوا بالصبر والصلوٰۃ۔ دعا سے دل میں اثر طبیعت میں گداز پیدا ہوگا اور صبر کی عادت سے قبول حق کی راہ کی مشکلیں دور ہوں گی۔ مسلمانوں کو بھی قرآن نے یہی ہدایت کی۔ یا ایھا الذین اٰمنوا استعینوا بالصبر والصلاۃ اسی لیے قرآن نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم دیا۔

واصبر نفسك مع الذين يدعون ربهم بالغداة والعشي يريدون وجهه ولا تعد عيناك عنهم۔

ظاہر ہے کہ صبر کا مطالبہ عموماً ناموافق اور نامناسب حالات ہی میں کیا جاتا ہے گویا شروع میں رفاقت کی زندگی اختیار کرنے والوں کو بتا دیا گیا کہ اس راہ میں قدم رکھنے کی پہلی شرط یہ ہے کہ صبر کے جذبے کو ہر رفیق دوسرے رفیق کے متعلق زندہ اور بیدار کرکے رفاقت کو قائم کرے اور آیت میں جن رفقاء کے انتخاب کا حکم دیا ہے وہ یہ ہیں الذين يدعون ربهم بالغداة والعشي یہ ان لوگوں کی شناخت کی پہلی قرآنی علامت ہے گویا مطلب یہ ہوا کہ خود بھی اقامت صلاۃ کے ساتھ حالات کی ناخوشگواری میں مشکلات کا صبر سے مقابلہ کرو اور رفاقت کا رشتہ بھی ان سے جوڑو جن کا اپنے رب سے تعلق ہو اور جن کا مقصد حیات يريدون وجهه ہو۔ آیت میں اشارہ ہے کہ جن لوگوں میں صبر و اقامت صلاۃ کی دو صفتیں ہوں وہ حُسن کار ہیں اور ان کا شمار محسنین میں سے ہے۔ آیت میں بلاغت یہ ہے کہ اوامر کے موقعہ پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کیا لیکن نواہی کے موقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو نہیں بلکہ آپ کے ساتھیوں کو مخاطب کیا علامہ آلوسیؒ نے ٹھیک لکھا ہے اس سے اندازہ ہوتا ہے بارگاہ رب العالمین میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت شان کا۔

فَلَوْلَا كَانَ مِنَ الْقُرُوْنِ مِنْ قَبْلِكُمْ
اُولُوْا بَقِيَّةٍ يَّنْهَوْنَ عَنِ الْفَسَادِ فِي الْاَرْضِ اِلَّا قَلِيْلًا
مِّمَّنْ اَنْجَيْنَا مِنْهُمْ وَاتَّبَعَ الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مَآ اُتْرِفُوْا فِيْهِ وَ
كَانُوْا مُجْرِمِيْنَ ﴿۱۱۶﴾ وَمَا كَانَ رَبُّكَ لِيُهْلِكَ الْقُرٰى بِظُلْمٍ وَّ
اَهْلُهَا مُصْلِحُوْنَ ﴿۱۱۷﴾ وَلَوْ شَآءَ رَبُّكَ لَجَعَلَ النَّاسَ اُمَّةً وَّاحِدَةً
وَّلَا يَزَالُوْنَ مُخْتَلِفِيْنَ ﴿۱۱۸﴾ اِلَّا مَنْ رَّحِمَ رَبُّكَ ؕ وَلِذٰلِكَ
خَلَقَهُمْ ؕ وَتَمَّتْ كَلِمَةُ رَبِّكَ لَاَمْلَـَٔنَّ جَهَنَّمَ مِنَ الْجِنَّةِ وَ
النَّاسِ اَجْمَعِيْنَ ﴿۱۱۹﴾

لہٰذا کیوں نہ ہوئے ان قوموں میں جو تم سے پہلے تھیں ایسے اہل خیر جو لوگوں کو ملک میں فساد سے روکتے سوائے ان تھوڑے سے لوگوں کے جن کو ہم نے ان میں سے بچا لیا اور ظلم کار لوگ تو اسی راہ پر چلے جس میں وہ مزے اڑا رہے تھے اور وہ جرائم پیشہ تھے ۱۳۹ اور یاد رکھو یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ کا رب آبادیوں کو ناحق تباہ کر دے ایسی حالت میں کہ آبادیوں والے دوسروں

کو صالح بنا رہے ہوں[۱۴۰] اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک امت بنا دیتا اور لوگ ہمیشہ ایسے ہی مختلف رہیں گے مگر جس پر تیرے رب کی مہربانی ہو۔ اور اسی لیے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے اور آپ کے رب کی بات پوری ہو کر رہی کہ میں دوزخ کو جن اور انسان سب سے بھروں گا[۱۴۱]

مفردات کے معانی

اترفوا۔ اتراف سے ماضی مجہول کا جمع مذکر غائب ہے اس کے معنے خوشحال بنا دیئے گئے اترفہ المال کے معنی ہیں کہ مال و اسباب نے اس کو طغیان و فساد میں مبتلا کر دیا۔

قوموں کی ہلاکت کے لیے اللہ کا قانون

اب تک جن قوموں کی ہلاکت کی داستان بیان ہوئی ہے ان آیات میں ہلاکتوں کے اسباب بتائے جا رہے ہیں یا دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیجئے کہ ان آیات میں قوموں کی ہلاکت کے بارے میں قانون الٰہی بتایا جا رہا ہے یعنی جو کچھ ان کے ساتھ ہوا ہے وہ صرف ان کے ساتھ خاص نہیں ہے بلکہ انسانی تاریخ میں جتنی قومیں تباہ ہوئیں اور آئندہ ہوں گی سب کے لیے اللہ سبحانہ کا ضابطہ یہی ہے۔ زمانوں، مکانوں اور قوموں کے بدلنے سے اللہ کا قانون نہیں بدلتا ہے اُن کو جب اللہ سبحانہ نے اپنی نعمتوں سے نوازا تو وہ خوشحالی کے نشہ میں مخمور ہو کر زمین میں ظلم و فساد کے رسیا ہو گئے اور ان کی اجتماعی زندگی اس قدر خراب ہوگی کہ ان میں اچھے لوگوں کا تناسب اس قدر گر گیا کہ بُرائی کو بُرائی کہنے والے ہی ختم ہو گئے اگر کچھ تھے تو وہ اس قدر کم تھے اور ان کی آواز اس قدر کمزور تھی کہ بُرائی کے طوفان کو نہ روک سکی۔ یعنی اہل خیر و صلاح معدوم تھے شر و فساد سے روکنے والا کوئی نہ تھا یہی چیز ہے جس کی وجہ سے یہ قومیں اللہ سبحانہ کے غضب کا نشانہ بنیں۔

اس ارشاد میں تین باتیں بتائی گئی ہیں اوّل یہ کہ ہر اجتماعی زندگی میں ایسے نیک لوگوں کا ہونا ضروری

ہے جو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے ہوں اس لیے کہ معروف وہ چیز ہے جو مطلوب خدا ہے مگر اجتماعی زندگی امر بالمعروف سے خالی ہو جائے اور اس میں صرف بُرے عناصر ہی باقی رہ جائیں اور پوری قوم کی قوم اخلاقی فساد کی راہ پر بڑھتی چلی جائے تو پھر خدا کا عذاب اس کے سر پر اس طرح آتا ہے کہ اسے پتہ ہی نہیں ہوتا اور آجاتا ہے۔ ثانیاً یہ کہ جو قوم اپنے درمیان سب کچھ برداشت کرتی ہو مگر چند اچھے لوگوں کو برداشت کرنے کے لیے تیار نہ ہو جو اسے برائیوں سے روکتے اور خوبیوں کی دعوت دیتے ہیں تو سمجھ لو کہ اس کے بُرے دن قریب آگئے ہیں۔ ثالثاً یہ کسی قوم کے مبتلائے عذاب ہونے یا نہ ہونے کا فیصلہ جس چیز پر ہو جاتا ہے وہ یہ ہے کہ اس میں معروف کو اپنانے والے لوگوں کا عددی تناسب کیا ہے! اگر اُس میں افراد کی عددی طاقت اتنی موجود ہو جو برائیوں کو ختم کر کے معروف پر مبنی نظام قائم کرنے کے لیے کافی ہو تو اس پر عمومی عذاب نہیں آتا بلکہ معروف کا کام کرنے والوں کو اصلاح کا موقعہ دیا جاتا ہے۔

۱۳۹ لہٰذا کیوں نہ ہوئے ان قوموں میں جو تم سے پہلے تھیں ایسے اہلِ خیر جو لوگوں کو ملک میں فساد سے روکتے سوائے ان تھوڑے سے لوگوں کے جن کو ہم نے ان میں سے بچا لیا اور ظلم کار لوگ تو اسی راہ پر چلے جس میں وہ مزے اڑا رہے تھے اور وہ جرائم پیشہ تھے۔ یہ پچھلوں کا حال سنا کر اُمت محمدیہ کو اُبھارا گیا ہے کہ ان میں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنے والے بکثرت موجود رہنے چاہییں گزشتہ قومیں اس لیے تباہ ہوئیں کہ عام طور پر لوگ عیش و عشرت کے نشے میں چور ہو کر جرائم کا ارتکاب کرتے رہے اور بڑے با اثر آدمی جن میں کوئی اثر خیر کا باقی تھا انہوں نے منع کرنا چھوڑ دیا۔ اس طرح کفر و عصیان اور طغیان میں دنیا کی جو حالت بگڑ رہی تھی اس کے سنوارنے والا کوئی نہ رہا۔ چند گنتی کے آدمیوں نے امر بالمعروف کی کچھ آواز بلند کی مگر نقار خانہ میں طوطی کی آواز کون سنتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہ منع کرنے والے عذاب سے محفوظ رہے باقی سب قوم تباہ ہو گئی۔ شاہ صاحب لکھتے ہیں" نیک لوگ غالب ہوتے تو قوم ہلاک نہ ہوتی تھوڑے سے تھے سو آپ بچ گئے" حدیث صحیح میں ہے کہ جب ظالم کا ہاتھ پکڑ کر ظلم سے نہ روکا جائے اور لوگ امر بالمعروف و نہی عن المنکر ترک کر بیٹھیں تو قریب ہے کہ خدا تعالیٰ ایسا عام عذاب بھیجے جو کسی کو نہ چھوڑے العیاذ باللہ[لے] گویا اب ان معذب قوموں کی طرف جن کا ذکر اوپر گزرا ہے اشارہ کرتے ہوئے بتایا ہے کہ کیا چیز ان کی تباہی کا باعث ہوئی ہے اور آیت کا مقصد قریش کو متنبہ کرنا ہے کہ اگر وہی روش تم نے اختیار کی تو کوئی وجہ نہیں ہے کہ تمہارا انجام ان کے انجام سے مختلف ہو فرمایا کہ ان میں ایسے لوگ باقی نہیں رہ گئے

لے افادات شیخ الاسلام

تھے جو لوگوں کو اللہ کی زمین میں فساد برپا کرنے سے روکتے ۔ ان کی اکثریت ایسے ہی لوگوں پر مشتمل تھی۔ جو اسی سرمستی میں مگن پڑے رہے جس میں مبتلا تھے بس تھوڑے ہی لوگ ان میں ایسے نکلے جو خدا سے ڈرنے والے تھے ان کو ہم نے نجات دی باقی جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم ڈھائے وہ اپنی مرغوبات کے پیچھے پڑے رہے ۔ اور ہلاک ہوئے اس لیے کہ وہ مجرم تھے ۔

اس میں مسلمانوں کو تنبیہ ہے کہ تم دنیا میں فساد کو روکنے اور صلاح کو قائم کرنے آئے ہو۔ گرتوں کو گرنے سے بچانا اور گرتوں کو سنبھالنا اور سہارا دینا تمہارا کام ہے اگر تم نے اس سے غفلت کی تو تمہارا وجود دنیا کے لیے بیکار ہو جائے گا اب تمہارا فرض ہے کہ معروف کے پھیلانے اور منکر کے مٹانے میں محنت کرو ، جانوں کو تیج کرو ۔ رب کے ساتھ فقر و احتیاج کا دوامی تعلق اور ہر حال میں اللہ کی رضا کو مراد بنائے رکھو۔ اس میں اشارہ ہے کہ برائی کو مٹانے کے لیے محنت کرنی پڑتی ہے اور یہ محنت ہی قوموں سے عمومی عذاب کو روکتی ہے اگر اس کے لیے کام نہ کیا جائے گا تو اعمال کے نتائج ضرور ظاہر ہو کر رہیں گے ۔ نتائج کے راستے میں جھوٹی آرزوئیں ، ولولے اور خواہشیں کوئی روک نہیں بن سکتی ہیں ۔

قرآن نے امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے دو درجے بتلائے ہیں ۔ ایک درجہ یہ ہے کہ پوری انسانی زندگی میں یا کمتر درجے میں پورے ملک میں معروف کا وزن غالب رکھا جائے اور منکرات کو مغلوب کیا جائے اس امت کا منشاء وجود یہی ہے کہ انسانی زندگی میں معروف کو پھیلائے اور برائیوں کو دور کرے اور یہ امت اسی کام کے لیے وجود میں آئی ہے اور اسی کام کی وجہ سے اسے خَیرُ اُمَّۃٍ کا لقب دیا گیا اور انسانیت کیلئے بھی اس کی افادی حیثیت ہے ۔

کنتم خیر امۃ اخرجت للناس تامرون بالمعروف
وتنھون عن المنکر

تم بہترین امت ہو انسانوں کے فائدے کے لیے تمہیں وجود میں لایا گیا ہے تمہارا کام نیکیوں کا حکم دینا اور برائیوں سے روکنا ہے ۔

اور انسانوں کی نسبت سے اسی کا نام شہادت علی الناس ہے ۔

وکذالک جعلناکم امۃ وسطا لتکونوا شھداء علی الناس
ویکون الرسول علیکم شھیدا

یہ تصریحات صاف صاف بتا رہی ہیں کہ یہ اُمت صرف اسی طرح کی ایک امت نہیں ہے جس طرح کی امتیں اب تک وجود میں آتی رہی ہیں بلکہ ایسی اُمت ہے جو باقی ساری نوع انسانی کی ہادی اور پوری انسانیت

کی پاسبان بنائی گئی ہے اور یہی اس کے وجود کا پہلا اور آخری مقصد ہے۔ قرآن نے صرف مسلمانوں کا ہی نہیں بلکہ ان کی سیاسی تنظیم کا بھی یہی مقصد بتایا ہے۔

الذین ان مکنٰھم فی الارض اقاموا الصلوٰۃ واتوا الزکوٰۃ و امروا بالمعروف ونھوا عن المنکر

یہی وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انکو زمین میں اقتدار بخش دیں تو نماز قائم کریں گے۔ زکوٰۃ دیں گے۔ بھلائی کا حکم کریں گے برائی سے روکیں گے۔

دوسرا درجہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا یہ ہے کہ مسلمان جماعت کے افراد پر دوسرے افراد کی نگرانی فرض ہے۔ قرآن نے مسلمانوں کی یہ تصویر پیش کی ہے وتواصوا بالحق و تواصوا بالصبر اور قرآن نے افراد امت کا یہ چہرہ بتایا ہے۔

والمومنون والمومنات بعضھم اولیاء بعض یامرون بالمعروف وینھون عن المنکر۔

مؤمن مرد اور مؤمن عورتیں ایک دوسرے کے رفیق ہیں وہ باہم بھلائی کا حکم دیتے ہیں اور بُرائی سے روکتے ہیں۔

اسی بات کو یہ حدیث بتاتی ہے جو مشکوٰۃ میں بحوالہ مسلم موجود ہے۔

مجھ سے پہلے جس نبی کو بھی اللہ تعالیٰ نے مبعوث کیا تھا۔ اس کو اپنی امت میں سے ایسے مخلص پیرو اور ساتھی ضرور ملے جو اس کے طریقے کو مضبوطی سے اختیار کیئے رہتے اور اس کے احکام کا اتباع کرتے۔ پھر۔ ان کے بعد ان کی جگہ ایسے ناخلف آئے جن کا حال یہ تھا۔ کہ وہ کچھ کہتے جس پر عمل نہ کرتے اور وہ کچھ کرتے جس کی انہیں ہدایت نہ ہوتی پس جس نے ان کے خلاف اپنے ہاتھ سے جہاد کیا وہ مؤمن ہے اور جس نے اپنی زبان سے جہاد کیا وہ بھی مؤمن ہے اور جس نے اپنے قلب سے جہاد کیا وہ بھی مؤمن ہے اس کے بعد رائی برابر بھی ایمان کا درجہ نہیں ہے۔

اس ارشاد سے دو باتوں کی راہنمائی ملتی ہے۔

ایک یہ کہ مسلم معاشرے میں جو بُرائی اور ضلالت بھی پیدا ہو اسے ختم کر دینے کی کوشش جہاد ہے۔

دوسری یہ کہ اس کوشش کی عملی صورتیں کیا کیا ہو سکتی ہیں اور ان میں سے ہر ایک کا

ایمانی مرتبہ کیا ہے۔

زیر تشریح آیت میں مسلمانوں کو پہلے درجہ کی طرف متوجہ کیا جارہا ہے کہ اب یہ تمہارا کام ہے کہ فساد کی ہر نوع کو روکو اور صلاح کا کام کرو اور اتنا کام کرو کہ صلاح کو فساد پر غلبہ ہو جائے یعنی عمومی زندگی میں معروف عام ہو اور منکر منہ چھپا کر رہے۔ یہ اللہ کا قانون ہے کہ منکر اس وقت ختم ہوتا ہے جب اس کے مدمقابل معروف تن کر رہے۔

بل نقذف بالحق على الباطل فيدمغه فاذا هو زاهق.

ہمارا قانون یہ ہے کہ حق باطل سے ٹکراتا ہے اور اسے پاش پاش کر دیتا ہے اور اچانک ایسا ہوتا ہے کہ وہ نابود ہو جاتا ہے۔

یہ کبھی نہیں ہوا کہ باطل خود بخود ختم ہو گیا ہو ہمیشہ یہی ہوا ہے۔ کہ باطل کا مقابلہ حق نے کیا اور اس مقابلہ میں حق کو کامیابی ہوئی۔ ایسے ہی تم حق پر اور قریش مکہ باطل کے علمبردار ہیں۔ تمہاری کامیابی یقینی ہے تمہیں اس کا مقابلہ استقامت، اقامت صلاۃ اور صبر کی قوتوں سے کرنا چاہیئے۔ اس میں اشارہ ہے کہ اگر ایک گروہ داعیان حق کا پیدا ہو گیا تو یہ سرزمین عذاب استیصال سے محفوظ رہے گی۔

(۱۴۰) قضاء بالحق کا قانون

اور یاد رکھو کہ یہ کبھی نہیں ہو سکتا کہ آپ کا رب آبادیوں کو ناحق تباہ کرے ایسی حالت میں کہ آبادیوں والے دوسروں کو صالح بنا رہے ہوں۔ یعنی جس بستی کے لوگ اپنی حالت درست کرنے کی طرف متوجہ ہوں، نیکی کو رواج دیں۔ ظلم و فساد کو ختم کریں تو خداوند قدوس کی یہ شان نہیں کہ خواہ مخواہ انہیں زبردستی پکڑ کے ہلاک کر دے۔ عذاب اسی وقت آتا ہے جب لوگ کفر و عصیان یا ظلم و طغیان میں حد سے نکل جائیں۔[1]

یہاں کچھ قرآن کے ترجمہ کرنے والوں نے ایسی سنگین غلطی کی ہے جس سے قرآن کے مطالب بالکل پامال ہو گئے۔ مثلاً آیت کا ترجمہ یوں کیا ہے۔

تیرا رب ایسا نہیں ہے کہ وہ بستیوں کو ہلاک کر دے کسی ظلم کی پاداش میں جب کہ ان کے باشندے اصلاح میں سرگرم ہوں۔

علماء نے تصریح کی ہے کہ بظلم ترکیب میں بھلک کی ضمیر سے حال ہے اور مطلب یہ کہ اللہ سبحانہ کسی

[1] افادات شیخ الاسلام

کو ناحق ہلاک نہیں کرتا ہے اس صورت میں آیت کا ترجمہ یہ ہے

اور یاد رکھو تیرا پروردگار آبادیوں کو ناحق ہلاک نہیں کرتا ہے ۔ جبکہ اس کے مکین اصلاح حال کر رہے ہوں ۔

بتانا یہ ہے کہ مصلحین کا ہلاک کرنا ظلم عظیم ہے اور بلیغ انداز میں سمجھایا جا رہا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی ظلم سے پاک ہے ۔ آیت کا مقصود صرف یہ ہے کہ قوم میں جب مجرمین اور مفسدین کی جگہ مصلحین کام کر رہے ہوں تو اللہ سبحانہٗ ان کو ناحق کبھی ہلاک نہیں کرتا ہے ۔ ایک دوسرے موقعہ پر قرآن میں ہے ۔

ذالک ان لم یکن ربک مھلک القریٰ بظلم و اھلھا غافلون ۔

اس آیت میں واقعی بظلم کی با رسببیہ ہے اور مطلب یہ ہے کہ تیرا رب بستیوں کو ان کے ظلم کی وجہ سے ہلاک نہیں کرتا جبکہ باشندے غافل اور بے خبر ہوں یعنی اللہ سبحانہٗ کی یہ عادت نہیں ہے کہ بدوں آگاہ اور خبردار کیئے کسی کو اس کے ظلم و عصیان پر دنیا میں ہلاک کر دے ۔ اور قاضی بیضاویؒ نے زیر تشریح آیت میں بظلم کی با سببیہ قرار دے کر یہ نکتہ آفرینی کی ہے کہ ظلم بمعنی شرک ہے ۔ اور مطلب یہ بتایا ہے کہ لوگوں کے عابدانہ تعلقات اللہ سبحانہٗ سے غلط ہوجائیں اور اس میں شرک بھی کرلیں تو اللہ سبحانہٗ لوگوں کو شرک کی وجہ سے ہلاک نہیں کرتا ۔ اگر وہ حقوق العباد میں عدل و انصاف کو قائم کرکے باہمی حقوق کی اصلاح کر رہے ہیں ۔ لیکن محققین اس مطلب کو پسند نہیں کرتے ہیں کیونکہ شرک کی موجودگی میں اصلاح کا تصور ہی نہیں ۔ شرک سب سے بڑا فساد ہے ۔ بات وہی ہے جو شیخ الاسلام نے فرمائی ہے کہ

اللہ سبحانہٗ لوگوں کو ناحق ہلاک نہیں کرتا ہے جبکہ بستیوں میں اصلاح کرنے والے لوگ موجود ہوں ۔

مطلب یہ ہے کہ سزا جرائم پر ملتی ہے ۔ جرائم کے بغیر ناحق اللہ سبحانہٗ کوئی سزا نہیں دیتے ہیں ۔ جیسے جرائم کے بغیر سزا نہیں ہوتی ہے ٹھیک اسی طرح اللہ کا قانون یہ بھی ہے کہ لوگوں کو بے خبری کی حالت میں ہلاک نہیں کرتا ۔ عذاب سے پہلے رسول روانہ کیا جاتا ہے جو گناہوں میں ملوث لوگوں کو آگاہ کرتا ہے صلاح حق عدل کی راہ بتاتا ہے یعنی اللہ سبحانہٗ کسی قوم کو اس کی بداعمالیوں ، بداخلاقیوں ، بدمعاملگیوں اور غلط افکار اس کے نتائج و عواقب سے آگاہ کیئے بغیر عذاب نہیں دیتا وہ کسی کو سزا دیتا ہے تو اس سے پہلے اس کو اچھی طرح آگاہ کر دیتا ہے ۔

حافظ ابن جریرؒ نے آیت کے دو مطلب بتائے ہیں ایک یہ کہ اے اللہ کے رسول جن قوموں کی بربادیوں

کی داستانیں آپ نے سنی ہیں ان کو اللہ سبحانہٗ نے ناحق ایسی حالت میں ہلاک نہیں کیا کہ وہ اعمال میں درست کار ہوں اگر ایسا ہوتا تو ان کی ہلاکت ناحق ہوتی بلکہ اللہ سبحانہٗ نے ان کو کفر میں جھوٹ، انبیاء کی تکذیب اور بدکاریوں کی وجہ سے ہلاک کیا ہے۔ دوسرا مطلب یہ بتایا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کسی کو صرف شرک کی وجہ سے ہلاک نہیں کرتا جبکہ وہ باہمی معاملات میں عدل و انصاف کا دامن تھامے ہوئے ہوں۔

(۱۴۱) ہدایت و ضلالت میں قانون الٰہی

اور اگر آپ کا رب چاہتا تو تمام انسانوں کو ایک اُمت بنا دیتا اور لوگ ہمیشہ ایسے ہی مختلف رہیں گے مگر جس پر تیرے رب کی مہربانی ہو اور اسی لیے اللہ نے ان کو پیدا کیا ہے اور آپ کے رب کی بات پوری ہو کر رہی کہ میں دوزخ کو جن اور انسانوں سے بھر دوں گا۔ یعنی جیسا بار بار پہلے لکھا جا چکا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کی حکمت تکوینی اس کو مقتضی نہیں ہوئی کہ ساری دنیا کو ایک ہی راستہ پر ڈال دیتا۔ اسی لیے حق کو قبول کرنے نہ کرنے میں ہمیشہ اختلاف رہتا ہے اور رہے گا مگر فی الحقیقت اختلاف اور پھوٹ ڈالنے والے وہ لوگ ہیں جنہوں نے صاف و صریح فطرت کے خلاف حق کو جھٹلایا۔ اگر فطرتِ سلیمہ کے موافق سب چلتے تو کوئی اختلاف نہ ہوتا اسی لیے الا من رحم ربك سے متنبہ فرما دیا کہ جن پر خدا نے ان کی حق پرستی کی بدولت رحم کیا وہ اختلاف کرنے والوں سے مستثنیٰ ہیں۔ دنیا کی آفرینش سے غرض یہ بھی ہے کہ حق تعالیٰ شانہٗ کی ہر قسم کی صفات جمالیہ و قہریہ کا ظہور ہو اس لیے مظاہر کا مختلف ہونا ضروری ہے تاکہ ایک جماعت اپنے مالک کی اطاعت و وفاداری دکھا کر رحمت و اکرام اور رضوان و غفران کا مظہر بنے جو الا من رحم ربك کا مصداق ہے اور دوسری جماعت اپنی بغاوت و غداری اس کی صفت عدل و انصاف کا مظہر بن کر حبس دوام کی سزا بھگتے۔ جس پر اللہ سبحانہٗ کی یہ بات پوری ہو لاملئن جهنم من الجنة والناس اجمعين۔ بہرحال آفرینش عالم کا تشریعی مقصد عبادت ہے۔ وما خلقت الجن والانس الا ليعبدون۔ اور تکوینی غرض یہ ہے کہ تشریعی مقصد کو اپنے کسب و اختیار سے پورا کرنے اور نہ کرنے والے دو گروہ ایسے موجود ہوں جو اللہ سبحانہٗ کی صفات جلالیہ و جمالیہ یا بالفاظ دیگر لطف و قہر کے مورد و مظہر بن سکیں۔

در کارخانہ عشق از کفر ناگزیر است
دوزخ کرا بسوزد گر بولہب نہ باشد

پھر لطف و کرم کے مظاہر بھی اپنے مدارج و استعداد کے اعتبار سے مختلف ہوں گے۔

گلہائے رنگا رنگ سے ہے رونق چمن
اے ذوق اس جہاں کو ہے زیب اختلاف سے[1]

کچھ بزرگوں نے اس آیت کا مقصود یہ بتایا ہے کہ دنیا میں فکر و عمل کا اختلاف ناگزیر ہے ایسا نہیں ہو سکتا کہ سب لوگ ایک ہی راہ پر چلنے والے ہو جائیں اور حق و باطل کی کشمکش باقی نہ رہے۔ پس اس بات سے مایوس نہ ہو کہ تمام آدمی کیوں دعوت حق قبول نہیں کرتے نہ تو پہلے ایسا ہوا ہے نہ اب اس کی توقع رکھنی چاہیئے۔ بہت سے مانیں گے اور بہت سے نہیں مانیں گے تم اپنے کام میں سرگرم رہو۔

اصل بات یہ ہے کہ اس تمام کائنات کی بنیاد صفات و کمالات کے اختلاف پر ہے۔ جمادات میں وہ صفات نہیں پائی جاتیں جن کا نباتات کو مالک بنایا گیا ہے۔ نباتات ان صفات سے مفلس ہیں۔ جن سے حیوانات سرفراز ہیں۔ حیوانوں کو ان کمالات سے بہرہ نہیں ملا ہے جن پر انسان کی انسانیت کی بنیاد ہے اور صفات و کمالات کے اختلاف کا یہ قصہ اتنا دراز ہے کہ کہنے والوں نے یہاں تک کہہ دیا ہے کہ گلاب کی دو پنکھڑیاں بھی ہر لحاظ سے یکساں نہیں ہو سکتی ہیں۔ اگر صفات کا یہ اختلاف نہ ہوتا تو اُن گنت اور بے شمار ہستیوں سے آج جو عالم بھرا ہوا ہے ظاہر ہے کہ کثرتوں کا یہ مجموعہ صرف ایک واحد شخص کی شکل اختیار کر لیتا۔ ایک چیز کو دوسری چیز سے ممتاز کرنے کی صورت اس کے سوا اور کیا ہو سکتی ہے کہ صفات و کمالات میں باہم اختلاف رکھا جائے لیکن بایں ہمہ اختلافات یہ بھی ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ موجودات کی مختلف قسموں میں جو صف بندی کی گئی ہے۔ کسی سلسلے کو نباتات، کسی کو جمادات، کسی کو حیوانات، کسی کو انسان، ہم جو کہتے ہیں تو اس کی وجہ یہی ہے کہ اس اختلاف کے باوجود کچھ چیزوں کے اندر مجانست اور مشابہت بہت ہی پائی جاتی ہے آدمی اور اس نوع کے افراد پر غور کیجئے۔ اس کی بھی مختلف قسمیں ہیں اور مختلف نسلوں میں بٹا ہوا ہے لیکن حال یہ ہے کہ دو نسلوں کو تو چھوڑیئے ایک ہی ماں باپ کے دو بچے ہوتے ہیں لیکن دونوں میں پیدائشی صفات و کمالات کے اعتبار سے اتنا اختلاف ہوتا ہے کہ یہ دیکھا جاتا ہے کہ ان میں سے ایک کو اگر انسان کہا جاتا ہے تو دوسرے پر حیوان کا لفظ بھی نہیں جچتا بظاہر دونوں پر ہی انسان کی کھال چڑھی ہوئی ہے۔ دونوں کے انسانی چہرے ہیں لیکن ذہنی، دماغی، جسمانی اندرونی و بیرونی، ظاہری و باطنی، صفات و کمالات کے اعتبار سے ایک بھائی اگر آسمان پر ہے تو دوسرا ٹھیک اس کے مقابلے پر پاتال میں ہے۔ ایک خوبصورت ہے اور اتنا خوبصورت ہے کہ دیکھنے والوں کی نظریں بندھ جائیں۔ دوسرا اس قدر بدصورت ہے۔ کہ دیکھ کر متلی آجائے۔ ایک غبی ہے دوسرا ذہین ہے ایک چست و چالاک ہے دوسرا سُست و کاہل۔ ایک فرشتہ خصلت ہے دوسرا شیطان سیرت ایک کو شاعری سے

[1] افادات شیخ الاسلام

لگاؤ ہے دوسرے کو ریاضی سے۔ کسی کا جی کاروبار کرنے کو چاہتا ہے تو دوسرا کتابوں کا کیڑا بنا ہوا ہے۔ اور ٹھیک جیسے جانوروں میں صفاتی اختلاف کی کمی نے ان کی زندگی کی سطح میں کوئی مخصوص فرق پیدا نہیں ہونے دیا۔ اس کے مقابلے میں افراد انسانی میں اندرونی و بیرونی ظاہری و باطنی اعتبار سے کمالات وصفات میں جو اختلاف پایا جاتا ہے۔ اسی نے زندگی کے ہر گوشہ میں ان کے مدارج کا اتنا اختلاف پیدا کر دیا ہے کہ انسان کے سوا مدارج و مراتب کے اس اختلاف کی نظیر بھی ملنی مشکل ہے چونکہ مدارج و مراتب کا یہ اختلاف افراد انسانی میں ان کمالات وصفات ہی کے اختلاف کا نتیجہ ہے اس لیے اکثر پیدائشی ہوتے ہیں۔ بہرحال صفات وکمالات کے اسی اختلاف اور اس اختلاف سے استعدادوں اور صلاحیتوں کا اختلاف نسل انسانی کے افراد میں جو پیدا ہو گیا ہے ۔ قرآن نے زیر تشریح آیت میں اسی کی طرف اشارہ کیا ہے۔ کہ اگر اللہ چاہتا تو جانوروں کی طرح انسانوں کو بھی ایک ہی امت بنا دیتا اور یہ نوع انسانی کی وہ خصوصیت ہے جس سے صرف ہدایت وضلالت ہی کا نہیں بلکہ انسانی زندگی کا پورا نظام متاثر ہوا ہے۔ معاشی زندگی کی وہ ہمواری جو گدھوں اور کتوں، بلیوں اور چوہوں اور ان جیسے مختلف حیوانات میں پائی جاتی ہے ۔ انسانی زندگی کا نظام اس سے بالکل مختلف ہے۔ اور اس اختلاف کو یعنی فطری کمالات کی کمی بیشی کی وجہ سے زندگی کے ہر شعبے میں جو نشیب و فراز پیدا ہو گیا ہے کوئی مانتا ہے کوئی نہیں مانتا ہے۔ کوئی اونچا ہے کوئی نیچا ہے۔ یہ قصہ تو اسی وقت ختم ہو سکتا ہے کہ نوع انسانی کے صفات وکمالات کو ختم کر کے جانوروں کی طرح ہمرنگی اور یکسانی پیدا کر دی جائے کہ سب ایک راہ کو ہی اپنانے پر مجبور ہو جائیں اوروں کا پتہ نہیں لیکن قرآن میں جہاں ولو شاء اللہ لجمعھم علی الھدیٰ ۔ فرمانے کے بعد جو یہ ارشاد ہوا ہے ۔ وما من دابۃ فی الارض ولا طائر یطیر بجناحیہ الا امم امثالکم ۔ یہ سب ہی امتیں ہیں مگر نوع انسانی ان سے صفات وکمالات میں جو امتیاز رکھتی ہے ۔ اس کا سب سے بڑا مظاہرہ ہدایت قبول کرنے نہ کرنے میں ہے۔ نوع انسانی دوسرے امتیازی کمالات کے ساتھ ارادہ و اختیار کا کمال بھی لے کر آئی ہے جس سے دوسری مخلوقات محروم ہیں۔ افراد انسانی میں صفات وکمالات کا یہ انعام اللہ سبحانہٗ کا عطیہ ہے اور جس طرح یہ اللہ سبحانہٗ کا کارنامہ ہے اسی طرح تفاوت صفات کی وجہ سے افراد انسانی میں مدارج اور مراتب کا فرق بھی اللہ سبحانہٗ کی حکمت تکوینی کا تقاضا ہے ۔ یہیں سے یہ شبہ بھی ختم ہو جاتا ہے جو کچھ لوگوں کو ولو شاء اللہ لجمعھم علی الھدیٰ کے سمجھنے میں پیش آیا ہے وہ غلطی سے یہ سمجھ گئے ہیں کہ کافروں کو اللہ سبحانہٗ ہدایت سے روکے ہوئے ہیں حالانکہ مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ خود الا یہ کہ خدا خود زبردستی ان کے حلقوم میں ایمان ڈالے یعنی ان کی جبلت بدل دے اور ان کے اوصاف وکمالات کو سلب کر کے

ان مخلوقات کی طرح بنا دے جو صفات و کمالات سے عاری ہیں ۔ نوع انسانی میں اوصاف و کمالات کا تقاضا یہ ہے کہ بندے کے ارادے اور کوشش کے بغیر از خود کسی کو ہدایت نہ ہو ۔ اگر ایسا ہو تو انسانی زندگی میں اوصاف و کمال کی کوئی قیمت نہ رہے گویا آیت بتا رہی ہے کہ انسانوں کے بارے میں اللہ سبحانہٗ کی یہ مشیت نہیں ہے کہ وہ اوصاف و کمال سے تہی دامن ہو اور دوسری مخلوقات کی طرح اس کو ایک مقرر راستہ کا پابند بنا دیا جائے جس سے ہٹ کر وہ چل ہی نہ سکے اگر یہ اس کی مشیت ہوتی تو انسان اوصاف و کمالات کا گہوارہ نہ ہوتا اور دوسری مخلوقات کے مقابلے میں اسے ارادہ و اختیار کی نعمت نہ ملتی سارے انسان فرشتوں کی طرح مسلم و مومن ہوتے اور کفر کا سرے سے کوئی امکان نہ ہوتا ۔ لیکن اللہ سبحانہٗ نے انسان کے بارے میں جو چاہا ہے وہ دراصل یہ ہے کہ اسے انتخاب و اختیار کی آزادی ہو ۔ اسے اپنی پسند کے مطابق راہوں پر چلنے کی قدرت دی جائے ۔

قرآن دو صداقتوں کا علمبردار ہے

حقیقت یہ ہے کہ صداقتیں دو ہیں اور دونوں اپنی اپنی جگہ صحیح ہیں ایک یہ کہ اللہ سبحانہٗ تمام دنیا اور اس کے ذرّے ذرّے پر قدرت مطلقہ رکھتا ہے ۔ آسمان و زمین اور بحر و برّ میں کوئی چیز نہیں جو اس کے ارادے اور مشیت کے بغیر حرکت کر سکے ۔ اس طرح انسان اور اس کے اعمال بھی اسی کی قدرت اور مشیت کے ماتحت ہیں ۔ یہ وہ عقیدہ ہے جو ہر مذہب کی خصوصًا اسلام کی جان ہے اگر یہ نہ ہو تو دین کی قوت بے اثر ہو کر رہ جائے ۔

دوسری طرف یہ بھی صداقت ہے ۔ کہ ساری مخلوقات میں سے انسان کو جن اوصاف و کمالات کے ذریعے ممتاز کیا گیا ہے ان میں انسان کو اعمال کرنے نہ کرنے کے لیے ارادہ و اختیار دیا گیا ہے ۔ اگر یہ اختیار تسلیم نہ کیا جائے اور انسان کو اسی طرح مجبور فرض کیا جائے جیسے دوسری مخلوقات ہے ۔ تو پھر انسان کے لیے خیر و شر کا امتیاز ، جزا و سزا ، شریعت ، کتاب ، تعلیم اور انبیاء کی بعثت یہ تمام چیزیں بے معنے ہو کر رہ جائیں ۔ ظلم و انصاف نام کی دنیا میں کوئی چیز باقی نہ رہے ۔ انسان کا اپنے کسی فعل پر قابل مدح یا قابل ملامت ہونا بے معنے ہو جائے ۔ الغرض یہ دونوں باتیں اپنی اپنی جگہ درست ہیں ۔ ایک یہ کہ اللہ سبحانہٗ کو اپنی مخلوقات پر قدرت تامہ حاصل ہے ۔ اور اس کی مشیت و ارادہ ہر خیر و کل پر حاوی ہے اور دوسری یہ کہ انسان کو بھی اپنے عمل کا کوئی نہ کوئی ایسا اختیار حاصل ہے جس کی وجہ سے اس پر ذمہ داری آتی ہے نیکی کے کام کرنے پر اس کی تعریف اور برائی کے کرنے پر وہ قابل ملامت ہوتا ہے ۔ قرآن نے ان دونوں صداقتوں کو پوری تفصیل کے ساتھ تسلیم کیا ہے ۔ ایک

طرف وہ کہتا ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے حکم کے بغیر پتا بھی نہیں ہلتا اور دوسری طرف وہ کہتا ہے کہ ہر جان اپنے کاموں کے ہاتھوں گرو ہے یعنی اللہ سبحانہٗ کی مشیت، قدرت اور ناقابل رد مشیت کے باوجود اس نے اپنے اختیار خود اپنی مشیت اور خود اپنی حکمت سے انسان کو ارادہ اور ارادے کے مطابق اپنے کام کرنے والے اعضاء کو ہلانے کی مشروط طاقت بخشی ہے۔ یہی ارادہ و اختیار انسان کی ذمہ داری، تکلیف اور باز پرس کی بنیاد ہے۔ فرمایا فمن شاء فلیؤمن ومن شاء فلیکفر۔

آیت کا مطلب یہ ہے کہ اللہ اگر سب کو ایک ہی امت بنانا چاہتا تو وہ سکتا تھا۔ کہ سب انسانوں کو حیوانوں کی طرح اوصاف وکمالات سے عاری کر کے ایک حالت پر مجبور کرتا لیکن اس نے ہدایت وضلالت کے معاملے میں اس جبر کو پسند نہیں کیا بلکہ انسانوں کو ارادہ و اختیار دے کر نیکی اور بدی کی دونوں راہیں اس کے سامنے کھول دی ہیں اور انہیں اختیار دیا ہے کہ جس کو چاہیں اختیار کر لیں اور اللہ نے جب اس ارادہ و اختیار کی خاطر انسانوں میں اوصاف وکمالات کا تفاوت رکھا ہے تو انسانوں میں اختلاف بھی رہے گا۔ لیکن ان میں نیکی کی راہ اختیار وہی کریں گے جن پر تیرے رب کی رحمت ہو گی۔ یعنی جو اپنے ارادہ و اختیار سے اپنی خداداد صلاحیتوں سے فائدہ اٹھائیں گے۔ ولذالك خلقهم یعنی نوع انسانی میں دوسری مخلوقات سے الگ ہو کر اندرونی و بیرونی، ظاہری و باطنی اعتبار سے کمالات وصفات کا جو اختلاف پایا جاتا ہے اسی اختلاف کی خاطر اللہ نے نوع انسانی کی تخلیق فرمائی ہے۔ اسی کی خاطر انسان کو ارادہ و اختیار دیا ہے اور اسی لیے انسان کی پوری زندگی ابتلائی ہے گویا نوع انسانی میں اوصاف وکمالات کا اختلاف بھی نوع انسانی کی تخلیق کی علت غائی ہے۔ علت غائی میں یہاں قصر نہیں ہے لذالك کی تقدیم قصر کے لیے نہیں بلکہ اہتمام علت کے لیے ہے۔ ایک فعل کی متعدد غایات ہو سکتی ہیں۔ اس لیے یہ آیت ما خلقت الجن والانس الا لیعبدون۔ اور لیبلوکم ایکم احسن عملا۔ کے منافی نہیں ہے۔ آخر میں فرمایا۔ و تمت کلمة ربك لاملئن جهنم من الجنة والناس اجمعین۔ اسی اختلاف اوصاف کمالات کے نتیجے میں قضاء وقدر الٰہی میں یہ فیصلہ ہو چکا ہے۔ کہ جہنم کو انسانوں اور جنوں سے بھرا جائے گا۔ من تبعیضیہ ہے۔ یعنی اختلاف اوصاف کے نتیجہ میں جو لوگ امتحان میں فیل ہو جائیں گے۔ ان کے حق میں تیرے رب کی یہ بات پوری ہو کر رہے گی۔ اس میں اشارہ ہے اس بات کی طرف جو اللہ سبحانہٗ نے تخلیق آدمؑ کے وقت ابلیس کو مخاطب کر کے فرمایا تھا۔ سورۃ ص کے آخری رکوع میں اور سورہ اعراف کے دوسرے رکوع میں اس وقت کا پورا قصہ بیان کیا گیا ہے۔ ابلیس نے آدم علیہ السلام کو سجدہ کرنے سے انکار کیا۔ اور نسل آدم کو بہکانے کے لیے قیامت تک مہلت مانگی جواب میں اللہ سبحانہٗ نے

فرمایا۔ فالحق والحق اقول لاملئن جھنم منک وممن تبعک منھم اجمعین
لفظ اجمعین یہاں اس معنے میں استعمال نہیں کیا گیا ہے کہ تمام جن اور تمام انسان جہنم میں ڈال دیئے جائیں گے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے۔ کہ شیاطین اور ان شیاطین کے پیروکار انسان سب ایک ساتھ واصل جہنم ہوں گے۔ شیطان دراصل قدرت کا ایک انتقامی تازیانہ ہے اللہ سبحانہٗ نے انسان کو جس نصب العین کی تکمیل کیلئے کرّے پر بسایا ہے۔ جو جس حد تک نصب العین سے ہٹتا ہے نہ رُکنے والے کوڑے کی شکل میں وہی ان پر برستا رہتا ہے ومن یعش عن ذکر الرحمان نقیض لہ شیطانا فھو لہ قرین۔ ورنہ جو نصب العین کی تکمیل کرتے رہتے ہیں ان کے متعلق قرآن میں بتایا گیا ہے۔ ان عبادی لیس لک علیھم سلطان ۔

بتانا یہ چاہتا ہوں کہ تماشا گاہ عالم کی بنیاد چونکہ صفات وکمالات کے اختلاف پر ہے اسی اختلاف نے نوع انسانی میں ابتلاء کو جنم دیا ہے۔ ابتلاء وامتحان کا نتیجہ لازماً کامیابی اور ناکامی ہے۔ ناکام وہ ہیں جو شیطان کے پیروکار ہیں اور شیطان کے پیروکاروں کے لیے ازل ہی میں اعلان ہو چکا ہے کہ لاملئن جھنم جنت ہو یا دوزخ دونوں انسانی اعمال کے نتائج کے مظاہر ہیں ۔

یہاں مولانا گیلانی کی یہ بات بے حد وزنی ہے ۔

جس آیت میں یہ بتایا گیا ہے کہ اللہ چاہتا تو افراد انسانی کو بھی ایک ہی اُمت بنا دیتا۔ آخر حیوانات و نباتات میں جو وحدت اس رنگ کو قائم کیے ہوئے ہے۔ ہاتھیوں کی ایک اُمت ہے۔ طوطوں کی ایک اُمت ہے سب کا کھانا پینا رہنا سہنا اور سب کے ادراک واحساس کا ایک حال ہے۔ جس نے یہ کرکے دکھایا کیا آدمی میں اسی رنگ کو اس میں پیدا کرنے کی اس میں قدرت نہ تھی۔ لیکن جب ایسا نہیں ہوا تو اس کے معنے یہی ہیں کہ افراد انسانی کا ظاہراً وباطناً مختلف ہونا ایک قدرتی بات ہے۔ بلکہ سورہ ہود کی آیت ولو شاء ربک لجعل الناس امۃ واحدۃ الخ آخری الفاظ ولذالک خلقھم۔ اسی لیے پیدا کیا ہے ان کو۔ اس کی تفسیر میں مفسرین کا ایک گروہ تو یہی کہتا ہے کہ اس سے مراد انسانوں کا باہم اختلاف ہے۔ بیضاویؒ نے اسی رائے کو نقل کرتے ہوئے لکھا ہے۔ الضمیر للناس فالاشارۃ الی الاختلاف یعنی خلقھم میں ھم کی ضمیر کا مرجع الناس ہے اور لذالک کا اشارہ اس صورت میں اختلاف کی طرف ہے۔ بہرحال افراد انسانی کا اختلاف مصنوعی نہیں بلکہ قدرتی ہے۔ بنانے والے نے آدمی کی ساخت ہی ایسی رکھی ہے کہ ان کا اختلاف ناگزیر ہے۔ اس کے ازالہ کا خیال قدرت سے مقابلہ کا خیال ہے۔ اس قسم کے جبلی مفاسد کے روکنے کی تدبیر ہمیشہ سے یہی ہے کہ اس کا ازالہ نہیں بلکہ امالہ کر

کے بجائے نقصان کے ان سے فائدہ اٹھایا جائے اور اسلام نے یہی کیا ہے۔ اس نے دین اسلام کے سرمایہ کو دو حصوں میں تقسیم کیا ہے ایک البینات یعنی دین کے وہ اجزا جن کی تبلیغ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کی ان کا انکار آدمی کے بس سے باہر ہے مثلاً قرآن اور وہ تمام چیزیں اسلام کی جو اسی راہ سے پہنچی ہیں جس راہ سے قرآن پہنچا ہے ان کے البینات ہونے کا مطلب یہ ہے کہ ان کا دین کے عناصر اور اجزا میں سے ہونا ایک ایسی واضح حقیقت ہے۔ جن کا انکار عقل و فطرت کے خلاف ہے۔ ان ہی کو البینات پر متحد و متفق کر کے مسلمانوں کے اختلافی امور کا امالہ ان امور کی طرف کر دیا گیا جن کی حیثیت دین میں البینات کی نہیں ہے اور یہی وہ بات تھی کہ ابتدا ہی سے مسلمان ان امور میں مختلف ہوتے رہے۔ لیکن نہ اس اختلاف کو انہوں نے چنداں اہمیت دی اور سچ تو یہ ہے کہ گزشتہ تیرہ صدیوں میں مختلف ممالک میں جن بزرگوں کے خداداد کمالات کا ظہور اسلامی زندگی کے مختلف شعبوں میں ہوتا رہا اس کا انکار نہیں کیا جا سکتا کہ ان کو بروئے کار لانے میں ان اختلافات ہی کا حصہ ہے ان ہی کی تحقیق و تفتیش، تنقید و تنقیح اور ان میں تطبیق و توفیق و ترجیح کی کوششوں ہی کا تو یہ نتیجہ ہے کہ دنیا میں مسلمانوں کی امامت کا منصب ان کو ملا۔

اور قاضی بیضاویؒ نے اس آیت میں بعض ارباب نظر کا جو یہ خیال نقل کیا ہے کہ ذالک کے اسم اشارہ کے مشار الیہ اختلاف ہی ہے اور رحمت بھی۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ میلانات و رجحانات کے نظری اختلاف کو البینات سے ہٹا کر جن لوگوں نے غیر بیناتی پہلو کی تحقیق و ریسرچ کی طرف پھیر دیا وہ اپنے اجتہاد کے صلہ سے محروم نہیں ہو سکتے یہی اختلاف ان کے لیے ذریعہ رحمت بن گیا۔ پس اختلاف انسانوں میں خواہ اس کا تعلق دنیا سے یا دین سے قدرتی ہے اس کے ازالہ کی کوشش ایک لاحاصل کوشش ہے۔

وَكُلًّا نَّقُصُّ عَلَيْكَ مِنْ اَنْۢبَآءِ الرُّسُلِ
مَا نُثَبِّتُ بِهٖ فُؤَادَكَ ۚ وَجَآءَكَ فِيْ هٰذِهِ الْحَقُّ وَمَوْعِظَةٌ
وَّذِكْرٰى لِلْمُؤْمِنِيْنَ ﴿۱۲۰﴾ وَقُلْ لِّلَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ
اعْمَلُوْا عَلٰى مَكَانَتِكُمْ ؕ اِنَّا عٰمِلُوْنَ ﴿۱۲۱﴾ وَانْتَظِرُوْا ۚ اِنَّا
مُنْتَظِرُوْنَ ﴿۱۲۲﴾ وَلِلّٰهِ غَيْبُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَاِلَيْهِ يُرْجَعُ
الْاَمْرُ كُلُّهٗ فَاعْبُدْهُ وَتَوَكَّلْ عَلَيْهِ ؕ وَمَا رَبُّكَ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۲۳﴾

ع ۱۴ ۱۰ ۱۰

اے اللہ کے رسول سب انبیاء کی سرگزشتیں ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں جن کے ذریعے ہم آپ کے دل کو تسکین دے رہے ہیں۔ اور آپ کے پاس ان واقعات میں حق یعنی اس کے دلائل آ گئے ہیں اور اس میں اہل ایمان کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے [۱۴۲] اور اے اللہ کے رسول آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے جو ایمان نہیں لاتے ہیں کہ تم اپنی جگہ کام کرو۔ ہم بھی کام کر رہے ہیں۔ اور نتائج کا تم بھی انتظار کرو۔ ہم بھی انتظار کر رہے ہیں [۱۴۳] اور آسمان و زمین میں پردہ غیب کی باتوں کا علم اللہ ہی کو ہے اور سارے معاملے کی چابی اسی کے پاس ہے۔ لہٰذا اے اللہ کے

رسول عابدانہ تعلقات اسی سے رکھو اور نتائج کے لیے اس پر بھروسہ کرو اور آپ کا رب آپ کے مخالفوں کے کردار سے بے خبر نہیں ہے ۔۱۴۴

واقعات حق کے دلائل ہیں

یہاں یہ بات کھول کر بتا دی ہے ۔ کہ گزشتہ رسولوں کی داستانیں جو اس صورت میں بیان کی گئی ہیں ۔ ان کی حیثیت دلائل کی ہے ۔ ان واقعات کا مقصد یہ نہیں ہے ۔ کہ تورات کی طرح دنیا کی تاریخ بیان کی جائے بلکہ کچھ باتیں ہیں جن کا وہ دلوں میں ادغان پیدا کرنا چاہتا ہے ۔ اور یہ تاریخی داستانیں اس کے لیے دلائل ہیں ۔ یہ دلائل کس طرح ہیں ۔ اس طرح کہ اس کائنات میں ہر جگہ یہ حقیقت بزبان حال بول رہی ہے کہ یہاں ہر جگہ ایک ہی قانون ایک ہی طرح پر کام کر رہا ہے کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جو اپنے قانون تعلقت و فعل میں دوسروں سے ذرا بھی الگ ہو ۔ بلاشبہ بھیس بہت سے ہو گئے ہیں اور نام بھی یکساں نہیں مگر حقیقت ایک ہی ہے اور جونہی سامنے کے پردے ہٹاتے ہیں ۔ اصلیت کھل کر سامنے آ جاتی ہے ۔ لہذا جب کائنات کے ہر گوشہ میں وحدت قانون کی بنیاد وہی اصل کام کر رہی ہے تو یہ کیونکر ہو سکتا ہے کہ اعمال انسانی میں یہ قانون کارفرما نہ ہو ۔ بلاشبہ اعمال انسانی میں بھی یہ قانون کام کر رہا ہے ۔ عالم انسانی میں بھی وہی قانون کام کر رہا ہے جو عالم مادی میں کر رہا ہے اور یہاں بھی وہی احکام ہیں جو دوسرے گوشوں میں نظر آ رہے ہیں یعنی مادیات کے خواص کی طرح معنویات میں بھی خواص ہیں اور خواص و نتائج کا ایک ہی قانون عالمگیر یکساں طور پر دونوں جگہ کام کر رہا ہے ۔

(۱۴۴) اے اللہ کے رسول سب انبیاء کی سرگذشتیں ہم آپ کے سامنے پیش کر رہے ہیں جس کے ذریعے ہم آپ کے دل کو تسکین دے رہے ہیں ۔ اور آپ کے پاس ان واقعات میں حق یعنی اس کے دلائل آ گئے ہیں اور ان میں اہل ایمان کے لیے نصیحت اور یاد دہانی ہے ۔ اور بہت سے انبیاء و رسل کے قصص مذکور ہو گئے تھے ۔ اب ختم سورت پر ذکر قصص کی بعض حکمتوں پر تنبیہ فرماتے ہیں ۔ یعنی گزشتہ اقوام کے واقعات سُن کر پیغمبر علیہ السلام کا قلب پیش از پیش ساکن و مطمئن ہوتا ہے ۔ اور اُمت کو تحقیقی باتیں معلوم ہوتی ہیں

جن میں نصیحت وتذکیر کا بڑا سامان ہے۔ آدمی جب سنتا ہے کہ میرے ابنائے نوع پہلے فلاں فلاں جرائم کی پاداش میں ہلاک ہو چکے ہیں تو ان سے بچنے کی کوشش کرتا ہے۔ اور جب دیکھتا ہے کہ فلاں راستہ اختیار کرنے سے پچھلوں کو نجات ملی تو طبعاً اس کی طرف دوڑتا ہے۔ فی الحقیقت قرآن کریم میں قصص کا حصہ اس قدر مذکر و مؤثر واقع ہوا ہے کہ کوئی شخص جس میں تھوڑا سا آدمیت کا جز ہو اور خوف خدا کی ذرا سی ٹھیس دل میں رکھتا ہو انہیں سن کر متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا باقی قصص اور بعض دوسرے مضامین کا تکرار جو قرآن کریم میں پایا جاتا ہے اس پر ہم نے رسالہ القاسم کے ابتدائی دور میں ایک مستقل مضمون لکھا ہے اسے ملاحظہ کر لیا جائے۔ [1]

اس آیت میں قرآن نے تاریخی واقعات وحقائق کی جو توجیہ پیش کی ہے اس کو چار میں محدود کر دیا ہے۔

اول حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تثبیت، دوم حق کے دلائل، سوم موعظت، چہارم تذکیر۔ تثبیت کا تعلق خود ذات نبوت سے ہے۔ یعنی قوم کو اعراض وسرکشی کی حالت میں دیکھ کر آپ کا دل بیقرار ہے مضطرب اور پریشان ہے۔ دعوت کا دلولہ اور اصلاح کا عشق آپ کو مضطرب رکھتا ہے۔ لعلك باخع نفسك ان لايكونوا مؤمنين۔ شاید تم اس غم میں اپنی جان کھو دو گے کہ یہ لوگ ایمان نہیں لاتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس دور میں اپنی قوم کی گمراہی وضلالت، اس کی اخلاقی پستی، اس کی ہٹ دھرمی، اور اصلاح کی ہر کوشش کے مقابلے میں اس کی مزاحمت کا رنگ دیکھ کر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اپنے شب و روز کس جان گداز وجاں گسل کیفیت میں گزارتے رہے ہیں۔ اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو رنج ان تکلیفوں کا نہ تھا جو آپ کو دی جا رہی تھیں۔ بلکہ جو چیز آپ کو اندر ہی اندر کھائے جا رہی تھی وہ یہ تھی کہ آپ اپنی قوم کو گمراہی اور اخلاقی پستی سے نکالنا چاہتے تھے۔ اور وہ کسی طرح نکلنے پر آمادہ نہ تھے۔ آپ کو یقین تھا کہ اس گمراہی کا لازمی نتیجہ تباہی اور عذاب الٰہی ہے۔ آپ ان کو اس سے بچانے کے لیے دن اور راتیں ایک کر رہے تھے مگر انہیں اصرار تھا کہ وہ اللہ کے عذاب میں مبتلا ہو کر رہیں گے اسی تناظر میں یہاں بتایا جا رہا ہے۔ کہ تاریخی حقائق کو آپ کے سامنے پیش کرنے کا اہم مقصد یہ ہے کہ ان سرگزشتوں کا مطالعہ وتفکر آپ کے لیے موجب تسکین ہو کہ آپ سے پہلے بھی ہمیشہ ایسا ہی ہوا ہے بلکہ اعراض و سرکشی کے اس سے زیادہ مظاہرے ہوئے ہیں۔ سب نے دعوت کی ہنسی اڑائی۔ سب نے دلیلوں سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

منہ موڑا۔ سب نے روشنیوں سے آنکھیں بند کرلیں۔ سب سرکشی اور گھمنڈ کی چال چلے سب نے جبر و تشدد سے راہ روکنی چاہی، سب نے موعظت و دعوت کا جواب ظلم و تعدی سے دیا۔ ان باتوں کو اس لیے سنایا جا رہا ہے تاکہ ان واقعات و حقائق کے ذریعے آپ کے قلب مضطر کا سامان ہو۔ نثبت بہ فوادک

حق کے حق ہونے کے دلائل

یہ سرگذشتیں حق کو واضح کر دیتی ہیں یعنی ان میں حقیقت و حقانیت کی دلیلیں اور روشنیاں ہیں۔ یہ واقعات بتلاتے ہیں کہ عالم مادی کی طرح عالم انسانی میں بھی اللہ کا قانون ہے جیسے ہر بات کیلئے اللہ کا قانون مقرر ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ جماعتوں کی سعادت و شقاوت، حیات و ممات کا بھی ایک قانون ہے۔ اور جس طرح اللہ کے سارے قوانین یکساں ہیں عالمگیر ہیں اور غیر مبدل ہیں اسی طرح یہ قانون بھی ہمیشہ سے ایک ہی طرح رہا ہے۔ اور ہمیشہ ایک طرح کے احکام و نتائج ظاہر ہوئے ہیں۔ زمانوں اور قوموں کے اختلاف سے اس کی تاثیر مختلف نہیں ہوتی ہے۔ یہ قرآن ہے جس نے عالم مادی کے ساتھ انسانوں کو عالم انسانی کے قوانین کی طرف متوجہ کیا۔ جب ہم کائنات اور زندگی کے مظاہر پر اس نکتہ نظر سے غور کرنا شروع کرتے ہیں۔ کہ ہماری عقلی قوتیں ان کے فہم و ادراک میں کہاں تک مدد دے سکتی ہیں تو ہمیں یہ محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے فکر کے دو مختلف میدان ہیں جو اپنی نوعیت اور فطرت میں ایک دوسرے سے بالکل جدا ہیں۔ ایک عالم مادی دوسرا عالم انسانی۔ دونوں کئی اعتبار سے مختلف ہیں۔ عالم مادی بے جان اشیاء کے مجموعہ سے عبارت ہے۔ جو ارادے کی صفت سے محروم اور آزادی عمل سے ناآشنا ہیں۔ یہ عالم اپنے معین قوانین رکھتا ہے۔ جنہیں تجربے، مشاہدے اور قیاس سے ٹھیک طور پر معلوم کیا جا سکتا ہے۔ اس کے برعکس عالم انسانی کے قوانین اتنے پیچیدہ مبہم اور غیر معین ہیں کہ تجربے اور مشاہدے کی گرفت میں مشکل سے آتے ہیں۔ اور آتے بھی ہیں تو ان پر وہ وثوق اور اعتماد نہیں کیا جا سکتا جو عالم مادی کے قوانین کی نسبت سے عام طور پر کیا جا سکتا ہے۔ اسی وجہ سے مادی دنیا کے مظاہر کی صحیح توجیہ ممکن ہے لیکن انسانی امور و معاملات اور تمدنی مظاہر کی توجیہ صحت کے ساتھ بلکہ ناممکن ہے بہر حال قرآن بتا رہا ہے کہ یہ واقعات، سرگذشتیں عالم انسانی میں قوانین حق کے نافذ ہونے کی دلیلیں ہیں۔ حجتیں ہیں اور براہین ہیں۔

سرگذشتیں موعظت ہیں

یہ سرگذشتیں اور تاریخی واقعات صرف عالم انسانی میں قوانین حق کے دلائل ہی نہیں بلکہ اہل

ایمان کے لیے موعظت ہیں یعنی ایسی باتیں ہیں جو سننے والوں کو عبرت دلاتی ہیں۔ نصیحت و پند کرتی ہیں۔ غرور نادانی سے بیدار کرتی ہیں۔ دراصل یہ وہ چیز ہے جس پر قرآن کے استدلال کی بنیاد ہے۔ قرآن انسانی تاریخ کو دو حصوں میں تقسیم کرتا ہے۔ ایک چھٹی صدی عیسوی سے قبل کی تاریخ جسے وہ اس انداز سے پیش کرتا ہے کہ وہ حق و باطل کی آویزش کی تاریخ ہے جس میں لازمی طور پر حق کو غلبہ ہوا ہے اور باطل کو شکست ہوئی ہے۔ قرآن کے مطابق چھٹی صدی عیسوی تک انسانی تاریخ جس انداز میں سفر کرتی رہی ہے وہ یہ ہے کہ زمین کے اوپر انسانوں نے جتنی آبادیاں قائم کیں ان میں اللہ سبحانہٗ کی جانب سے اللہ کی مرضی کی نمائندگی کرنے کے لیے ایک رسول آیا اس نے انسانوں کو ان کو زندگی کا مقصد بتایا اس نے کہا کہ اللہ سبحانہٗ نے مجھے یہ پیغام دے کر روانہ کیا ہے کہ تم اس کی بندگی کرو اور میں جو کچھ کہوں اسے مانو۔ اس نے بتایا کہ اگر میری بات کو پذیرائی نہ دوگے تو تباہی یقینی ہے۔ اس طرح اللہ کے رسول کا یہ چیلنج کہ زندگی و موت کا انحصار اس کی دعوت کے ماننے نہ ماننے پر ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ تاریخ بغیر کسی استثناء کے اس دعوے کے حق میں فیصلہ کرتی رہی ہے جب بھی کوئی رسول آیا تو کچھ لوگوں نے اس کی آواز پر لبیک کہی اور کچھ نے نہیں مانا۔ اگر نبوت کے ماننے والوں کی تعداد اتنی ہوتی کہ وہ ایک ایسی جماعت کی شکل اختیار کر سکے جس میں اتحاد ائتلاف اور نظم ہو تو اس کو منکرین کے گروہ سے ٹکرایا گیا اور انہیں شکست دے کر ختم کر دیا گیا اور اگر رسول کی ہمنوائی کرنے والے بہت کم ہوتے تو اللہ سبحانہٗ نے اپنی قدرت کا اظہار کر کے نبوت کو غالب کیا۔ حجت تمام کرنے کے بعد بالآخر رسول کی زبان سے یہ چیلنج دیا گیا۔

تمتعوا فی دارکم ثلاثۃ ایام ذالک وعد غیر مکذوب

یہ گویا تاریخ کی شہادت ہے اور اس میں اہل ایمان کے لیے عبرت ہے کہ پچھلی تاریخ میں جن لوگوں نے اپنے رب کو اللہ کے رسول کی حیثیت سے پیش کیا۔ وہ واقعی اللہ کے رسول تھے اور انسان کے لیے ضروری ہے کہ وہ ان کی تعلیمات کو اپنائے۔

تاریخ کی یہ نوعیت اہل ایمان کو نصیحت کرتی ہے کہ اللہ کے ان وعدوں کو سمجھ سکیں جو اس نے پچھلی قوموں کے بارے میں کیے ہیں۔

تاریخ کے واقعات میں یاددہانی

یہ تاریخی واقعات اہل ایمان کے لیے تذکیر ہیں یعنی سچائی کی یاد دلاتی ہیں اور غفلت سے روکتی ہیں اوائل دعوت کی ایک غفلت یہ بھی تھی۔ کہ کمزور اور بے سروسامان تھے۔ اور تمام ملک دشمنی پر تل گیا تھا۔ اس لیے

کبھی کبھی مایوسی کے خیال آنے لگتے تھے۔ یہ واقعات بتاتے ہیں۔ کہ تمام مادی اور عالمگیری حقیقتوں کی طرح وحی کی بھی ایک حقیقت ہے جو ماضی میں مختلف وقتوں اور مختلف قوموں میں ظاہر ہوئی اور آج عرب میں ظاہر ہوئی ہے۔ ایمان اور عمل صالح کی بھی ایک حقیقت ہے جس کی ہمیشہ تعلیم دی گئی ہدایت و ضلالت کی کشمکش کی بھی ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ نمودار ہوئی۔ تصدیق رسل کے نتائج کی بھی ایک حقیقت ہے جو ہمیشہ ظہور میں آئی۔ اور انکار و سرکشی کے نتائج بھی دنیا کی ایک ثابت شدہ حقیقت ہیں۔ کیونکہ ان میں کبھی تغیر نہیں ہوا۔ قرآن سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ ماضی میں جس قدر پیغمبر آئے سب کی پیغمبری میں ان کے ہمعصر مخاطبین نے شک کیا۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ابتداً یہی صورت حال پیش آئی۔ اس طرح کے خیالات لوگوں کے ذہن میں آتے رہیں۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھی نبی آیا وہ اپنی قوم کی نظر میں ایک نزاعی شخصیت بن گیا۔ دوسرے پیغمبر نزاعی دور میں شروع ہوئے اور نزاعی دور میں ہی ان کا اختتام ہوگیا کیونکہ ان کے بعد ان کی دعوت کی پشت پر ایسا گروہ جمع نہ ہوسکا جو ان کی سیرۃ اور ان کے کلام کو مکمل طور پر محفوظ رکھ سکے نبیوں کی فہرست میں اس اعتبار سے صرف حضور اقدس کا استثنار ہے اگرچہ دوسرے نبیوں کی طرح آپ کی نبوت کا آغاز نزاعی دور سے گزر کر محمودی دور میں داخل ہوگیا۔ ان واقعات نے حقیقت کھول دی ہے یہ واقعات دلیل ہیں دعوت کے کام میں معاملات کی وحدت اور ان کے عالمگیر تسلسل کو لیے۔ واقعات کی یہ وحدت جس انداز میں تذکیر کا کام کر رہی ہے۔ اس کے لیے یہ بات دھیان میں رکھنے کی ہے۔ کہ اس کے ذریعے سات وحدتوں کا علم یقین نمایاں ہو کر سامنے آتا ہے۔

اول یہ کہ دعوت کے معاملے میں تمام ملکوں، قوموں کی حالت یکساں رہی ہے کوئی ملک و قوم ہو لیکن واقعات بتلاتے ہیں کہ وہاں کچھ لوگ ایسے ضرور ہوئے ہیں۔ جنہوں نے اپنی قوم اپنے ہم وطنوں کو ایک خاص انداز سے تعلیم دی۔

دوسرے۔ یہ کہ یہ تعلیم اگرچہ مختلف وقتوں، مختلف ملکوں، مختلف پیرایوں اور مختلف زبانوں میں دی گئی لیکن ان اختلافات سے تعلیم مختلف نہیں ہوئی۔ وہ ہمیشہ ایک ہی رہی گویا ایک پیغام ہے جو بہت سے پیغامبروں کے ذریعے آیا ہے۔

تیسرے۔ تمام دعوتوں کی صرف تعلیم ہی یکساں نہیں رہی بلکہ تذکیر کے اصول بھی ہمیشہ ایک ہی رہے ہے۔

چوتھے۔ یہ کہ اگرچہ زمانے مختلف ہوئے، ملک مختلف ہوئے، قومیں مختلف ہوئیں، احوال و ظروف مختلف ہوئے مگر جو معاملات پیش آتے وہ اپنی نوعیت میں ہمیشہ ایک رہے۔

پانچویں۔ دعوت کی پذیرائی اور ناپذیرائی کے اعتبار سے حالت ہمیشہ ایک رہی۔ جیسے ماننے والوں کی فکری حالت بھی ایک ہی طرح کی رہی اور نہ ماننے والوں کی فکری حالت بھی ایک طرح کی رہی جنہوں نے ہمیشہ ایک ہی طرح سے مانا جنہوں نے نہیں مانا ایک ہی طرح نہیں مانا۔

ساتویں۔ نتیجہ بھی ایک ہی ہمیشہ رہا کبھی ایک سے دو نہیں ہوا۔

احوال و واقعات کی ہم آہنگی بتا رہی ہے کہ یہ ایک حقیقت اور واقعہ ہے ان کی قدامت ان کی عالمگیری۔ ان کا دائمی تسلسل۔ ان کی بے داغ وحدت ان کی واقعیت اور فطری صداقت کا اعلان کر رہی ہے۔

(۱۴۲) مخالفین کو فیصلہ کُن جواب

اور اے اللہ کے رسول آپ ان لوگوں سے کہہ دیجئے جو ایمان نہیں لائے ہیں کہ تم اپنی جگہ کام کرو۔ ہم بھی کام کر رہے ہیں۔ اور نتائج کا تم بھی انتظار کرو ہم بھی انتظار کر رہے ہیں۔ اس مضمون کی آیات پہلے اسی سورت میں گزر چکی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ اگر میری بات نہیں مانتے تو بہتر ہے کہ تم اپنی مسند پر جمے رہو۔ میں اپنے مقام پر مستقیم ہوں۔ نیز تم میرے لیے حوادث دھر کا انتظار کرتے رہو۔ میں تمہارے انجام بد کا منتظر ہوں۔ چند روز میں پتہ چل جائے گا کہ ظالموں کا اُونٹ کس کروٹ بیٹھتا ہے۔ یتربصون بکم الدوائر علیھم دائرۃ السوء سے بتانا یہ ہے کہ منکروں سے وہی بات کہلاؤ جو ہمیشہ کہی گئی ہے۔ یعنی تم اپنی جگہ کام کیے جاؤ ہم اپنی جگہ کام کر رہے ہیں۔ تم بھی نتیجہ کا انتظار کرو ہم بھی منتظر ہیں۔ نتیجہ فیصلہ کر دے گا کہ حق کیا اور کدھر ہے۔ علامہ بقاعیؒ فرماتے ہیں۔ کہ آیت قرآنی کا مفاد یہ ہے کہ

> جن لوگوں پر آپ کی تبلیغ و دعوت اور موعظت کا کوئی اثر نہیں ہوا اور اس وجہ سے وہ نعمت ایمان سے ہمدوش نہیں ہوئے آپ ان کو کہہ دیجئے کہ تم اپنے طریقے پر ڈٹ کر جو کچھ کر رہے ہو کرتے رہو لیکن جہاں تک ہمارا تعلق ہے تو تم کرو یا نہ کرو ہم تو اپنا فرض ضرور ادا کرتے ہی رہیں گے۔ اس میں کوئی تبدیلی نہ آئے گی۔ تم ہمیں مغلوب کرنے کا انتظار کرو کہ ہم اللہ سبحانہٗ کے وعدے کا انتظار کر رہے ہیں کہ وہ ہم کو کامیابی سے ہمدوش کر دے گا اور تمہیں ناکامیوں سے دوچار کرے گا۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ میں تیرہ برس تک دعوت دی، اور ان تیرہ سالوں کے اندر اس راہ

ـلہ افادات شیخ الاسلام

میں ہر قسم کی مصیبت اور تکلیف برداشت کی اور ہدایت کو مختلف انداز میں پیش کیا۔ سورہ ہود قیام مکہ کے آخری دور کی سورت معلوم ہوتی ہے کیونکہ اس کے انداز و اسلوب کلام سے محسوس ہوتا ہے کہ مخالفین دعوت کی طرف سے مزاحمت پوری شدت اختیار کر چکی ہے۔ وہ نبی اور نبی کے متبعین کو اپنے درمیان برداشت کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ ان سے اب یہ امید باقی نہیں رہی ہے۔ کہ تفہیم و تلقین سے راہ راست پر آجائیں گے۔ اور اب انہیں اس انجام سے خبردار کرنے کا موقعہ آگیا ہے جو نبی کو آخری اور قطعی طور پر رد کر دینے کی صورت میں انہیں لازمًا دیکھنا ہوگا۔ فانتظروا انا منتظرون۔ کی تعبیر بتا رہی ہے کہ یہ قریش کی مہلت اور فرصت کی آخری گھڑی تھی۔ اور اب معجزہ ہلاکت ان کے سر پر تھا۔ اور رحمت صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی کا صدمہ تھا۔ غالبًا اس حدیث میں جس میں بتایا گیا ہے کہ حضرت ابو بکرؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ کہ کیا بات ہے آپ بوڑھے ہوتے جا رہے ہیں۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ شیبتنی سورۃ ہود واخواتھا۔ مجھے سورہ ہود اور اس کی بہنوں نے یعنی اس جیسی سورتوں نے بوڑھا بنا دیا ہے۔ یہ صدمہ اور غم کی تعبیر ہے۔ ابن عساکرؒ کی روایت میں یہ اضافہ اس کی تائید کرتا ہے شیبتنی سورۃ ہود وما فعل بالامم قبلی مجھے سورہ ہود اور اس جیسی سورتوں نے اور پہلی امتوں کے ساتھ اللہ سبحانہ کے معاملہ نے بوڑھا بنا دیا ہے۔ اس سورت میں آخری اطلاع دے دی گئی تھی اور وہ نادان مذاق اڑاتے تھے۔ بس اسی کے غم نے آپ کو بوڑھا بنا دیا تھا۔

(۱۴۴) دانائے غیب صرف اللہ ہے

اور آسمان و زمین میں پردہ غیب کی باتوں کا علم اللہ ہی کو ہے۔ اور سارے معاملے کی چابی اسی کے پاس ہے۔ لہذا اسے اللہ کے رسول عابدانہ تعلقات اللہ سے رکھو۔ اور نتائج کے لیے اسی پر بھروسہ کرو اور آپ کا رب آپ کے مخلصانہ کردار سے بے خبر نہیں ہے یعنی آپ ان کے کفر و شرک سے دلگیر نہ ہوں اپنا کام کیے جائیں اور ان کا فیصلہ اللہ سبحانہ کے حوالہ کریں اس سے آسمان و زمین کی کوئی بات چھپی نہیں ہے۔ سب معاملات بنڈ پھر کر اسی کی طرف لوٹنے والے ہیں۔ وہاں ان کو پتہ لگ جائے گا۔ کہ وہ کس میں پڑے ہوئے تھے۔ آپ تو دل و جان سے اپنے پروردگار کی فرماں برداری میں لگے رہیے۔ اور تنہا اسی کی اعانت پر بھروسہ کیجیے وہ تمہارے مخلصانہ اعمال سے بے خبر نہیں ہے۔ ان کے مناسب تم سے معاملہ کرے گا۔ حدیث میں ہے کہ صحابہؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم آپ پر بڑھاپے کے آثار بہت جلد آگئے فرمایا شیبتنی سورۃ ہود واخواتھا۔ سورۃ ہود اور اس

کہ انہوں نے مجھے بوڑھا بنا دیا۔ بعض علماء نے لکھا ہے کہ سورۃ ہود کی جس آیت نے آپ کو بوڑھا کر دیا وہ یہ آیت ہے۔ فاستقم کما امرت ومن تاب معك ولا تطغوا انه بما تعملون بصير رزقنا الله سبحانه الاستقامة على دينه وسنة نبيه صلى الله عليه وسلم تمت سورة هود بفضله۔ یہ کچھ مفسرین کی رائے ہے۔ کہ سورۃ ہود میں استقامت کے حکم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو بوڑھا بنا دیا ہے لیکن روایات میں صرف سورۃ ہود کا ذکر نہیں ہے بلکہ دوسری سورتوں کا بھی ذکر ہے۔ مثلاً ابن المنذر اور طبرانی کی روایت میں ہود، واقعہ، مرسلات، عم یتساءلون اور اذا الشمس کورت آیا ہے۔ بزاز کی روایت میں ہود، واقعہ، الحاقہ، عم یتساءلون اور هل اتاك حديث الغاشية کا ذکر ہے۔ سنن سعید بن منصور میں ہود اور مفصلات سے اس کی اخوات کا ذکر ہے۔ ترمذی کی روایت میں ہود، واقعہ، مرسلات، عم یتساءلون، اور اذا الشمس کا ذکر ہے۔ علامہ شوکانی نے اس حدیث کی ساری روایات فتح القدیر میں جمع کر دی ہیں۔ ظاہر ہے کہ استقامت کا حکم سورۃ ہود کے علاوہ کسی سورت میں نہیں ہے۔ لہٰذا یہ کہنا کہ استقامت کے حکم نے آپ کو بوڑھا بنا دیا کچھ بے جوڑ ہے۔ دراصل بوڑھا بنا دینا تعبیر ہے۔ غم کے زیادہ ہونے اور صدمہ کے بہت ہونے کی۔ ان سب سورتوں میں جو بات مشترک ہے وہ دنیا میں قوموں کی ہلاکت ہے۔ اور اسی بات کے صدمہ نے آپ کو بوڑھا بنا دیا کہ قریش کی سرکشی کے نتیجہ میں تاریخ دہرائی جائے گی۔ ابن عساکرؒ کی روایت میں تصریح آئی ہے وما فعل بالامم قبل یعنی پہلی امتوں کے ساتھ جو کچھ ہو چکا ہے اسی بات نے آپ کو غمگین بنا دیا۔ اسی لیے علامہ آلوسیؒ نے لکھا ہے کہ اس استدلال میں جو کچھ ہے وہ کوئی راز نہیں ہے اور یہی آلوسیؒ نے صاحب کشف کا رجحان نقل کیا ہے کہ

> اس بات کے لیے ہود کی تخصیص واضح نہیں کیونکہ ہود کی اخوات میں استقامت کا ذکر نہیں ہے۔

یہ آیت ذہن میں اٹھے ہوئے اس سوال کا بھی جواب ہے کہ انتظار کی یہ گھڑیاں کب ختم ہوں گی اور اس کا بھی کہ انتظار کی گھڑیاں ختم ہونے پر منافقین کی تباہی تو ہو گی مگر اہل ایمان کا کیا بنے گا۔ حالات میں پیش رفت کیسے ہو گی؟ جواب میں فرمایا کہ اس کا تعلق عالم غیب سے ہے اور غیب کا علم اللہ کے سوا جاننے والا کوئی نہیں ہے اس میں اللہ کے ساتھ کسی کی شرکت نہیں ہے اس بات کو سمجھانے کے لیے قرآن نے قصر کے سارے اسالیب اختیار کیے ہیں قصر کے عربی میں ایک سے زیادہ انداز ہے۔

اول۔ انما کے ذریعے قصر ہوتا ہے۔ جیسے فقل انما الغيب لله اس کا مطلب یہی ہے کہ غیب

ؔ افادات شیخ الاسلام

دانی کی صفت کا موصوف اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

دوم۔ نفی واستثنار کے ذریعے قصر ہوتا ہے جیسے لا یعلم من فی السماوات والارض الغیب الا اللہ۔ یعنی دانائے غیب اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے۔

سوم۔ تقدیم ماحقہ التاخیر جسے بعد میں آنا چاہیے اسے پہلے لایا جائے جیسے ایاك نعبد۔ یہاں وللہ غیب السماوات الخ اسی کی مثال ہے۔ اصل انداز یہاں یوں ہے وغیب السماوات والارض للہ لیکن قصر کی خاطر للہ کو پہلے لاکر ذہنوں میں یہ بات اتار دی ہے کہ دانائے غیب اللہ کے سوا کوئی نہیں ہے یہ بالکل ایسا ہی ہے جیسے قرآن نے توحید عبادت کو سمجھانے کے لیے انداز اختیار کیا ہے کہیں فرمایا لا الٰہ الا اللہ اور کہیں بتایا اللہ لا الٰہ الا ھوالحی القیوم۔ اور کہیں ارشاد ہوا انما اللہ الٰہ واحد جیسے توحید عبادت میں یہ انداز بیاں یہ گوارا نہیں کرتا کہ اس میں بالذات کی قید لگا کر کسی نبی کو الٰہ مجازی یا بالواسطہ الٰہ قرار دیا جاسکے ٹھیک اسی طرح اللہ سبحانہٗ کی غیب دانی کی صفت میں بھی قصر کے مختلف انداز اسکی اجازت نہیں دیتے کہ مجازی اور بالواسطہ کی کسی قید کا اضافہ کیا جائے۔ اگر ایسا ہو تو قصر کی روح پامال ہو کر رہ جائے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے مستقبل میں کامرانیوں اور فتح مندیوں کی جو بشارت دی جارہی ہے وہ قابل توجہ ہے۔

جن ایام میں اس سورت کا نزول ہوا وہ دین اسلام اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے بڑے صبر آزما دن تھے۔ کفار کا غیظ وغضب شباب پر تھا۔ اسلام کی ترقی نے انہیں بھڑکا دیا تھا۔ وہ اسلام کے چمکتے چراغ کو بجھانے کے لیے مصروف کار تھے۔ بے چارے مسلمانوں پر عرصہ حیات تنگ سے تنگ ہو رہا تھا۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی دل آزاری کے لیے ہر قدم اٹھایا جارہا تھا بظاہر میں نگاہوں کو ہر سمت میں تاریکی ہی تاریکی نظر آرہی تھی اُمید کی کوئی کرن افق پر نظر نہ آتی تھی۔ ان حالات میں اللہ سبحانہٗ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو مخاطب کرکے فرمایا کہ آسمان وزمین میں سب کچھ جو پردے میں ہے اس کا علم اللہ کے سوا کسی کو نہیں۔ اور ہونے والے سارے معاملات کی چابی اللہ کے قبضے میں ہے۔ آپ کا کام اللہ سے عابدانہ تعلقات قائم کرنا اور اللہ پر بھروسہ کرنا ہے جو کچھ ہونا ہے وہ اسی راہ سے ہوگا۔ تاریکیوں کے بادل کیسے چھٹے۔ جونہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قدم مکہ سے باہر نکل کر مدینہ پہنچے یکدم آپ کی پشت پناہی کے لیے عجیب وغریب سیاسی قوت اللہ سبحانہٗ نے مہیا کردی اور اس کے ذریعے کیا عظیم تبدیلی آئی؟ عرفات کے میدان میں وصال مبارک سے چند ماہ پہلے جس وقت آپ وداعی خطبہ دے رہے تھے اس وقت اس ملک کی آزاد حکومت کے تنہا

فرماں روا تھے ۔ ملک کا حدود اربعہ یہ ہے ۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے مشاہدہ کیا کہ شمال میں تبوک سے ایلہ تک اور جنوب میں یمن کے ساحل سے مشرق خلیج فارس تک اور مغرب میں بحر قلزم تک حکومت پھیلی ہوئی ہے ۔ (التمدن الاسلامی)

خلاصہ یہ ہے کہ دوست دشمن سب کا اتفاق ہے کہ

۱۰ھ میں جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال مبارک ہوا تو اسلام کی حکومت سارے جزیرہ عرب پر چھائی ہوئی تھی ۔

وللہ غیب السماوات والارض والیہ یرجع الامر کلہ کو پڑھیئے اور دس لاکھ مربع میل زمین اس آبادی کا خیال کیجئے جو زمانہ نبوت ہی میں اسلام کے زیرنگیں آ چکی تھی ۔ اور زمانہ نبوت کے بعد دس بارہ سال کی تھوڑی سی مدت میں ۔ خلافت صدیقی و فاروقی میں ایران ، مصر ، شام ، الجزائرہ ترکستان تک اسلام کی جو حکومت پھیل گئی ۔ پھر عہد عثمانی کی فتوحات بھی ۔ اس میں انسانوں کی کتنی بڑی تعداد اسلام کے احاطہ میں داخل ہو گئی تھی ۔ اس کے اندازے کے لیے جرجی زیدان کا وہ بیان پڑھیئے جو اس نے التمدن الاسلامی میں لکھا ہے کہ

اسلامی حکومت کے مقبوضہ میں اس زمانے کی متمدن دنیا کا بڑا حصہ داخل ہو گیا تھا ۔ جس میں عرب بھی تھے اور ایران کے باشندے بھی ۔ ان میں کلدانی بھی تھے اور روم والے بھی ۔ گاتھ قوم کے لوگ بھی تھے قبطی بھی ، سوڈانی بھی ، بربر بھی جو زبانیں یہ بولتے تھے ان میں عربی ، فارسی ، ہندی ، رومی ، ترکی ، کردی ، آرمنی نیز قبطی اور بربری کے سوا بھی زبانیں تھیں ۔

جرجی زیدان نے قدیم معتبر وثائق سے یہ ثابت کیا ہے ۔ کہ اس زمانہ میں تین کروڑ کی آبادی تو صرف مصر کی تھی ۔ مجموعی طور پر پہلی صدی ہجری ممالک محروسہ کے متعلق پوری آبادی کا تخمینہ یہ لکھا ہے کہ

اسلامی قلمرو کی آبادی اپنے عنفوان شباب میں بیس کروڑ سے پچیس کروڑ تک تھی ۔

اسی مصنف نے اپنے اس بیان کو اس فقرے پر ختم کیا ۔

مردم شماری کی یہ تعداد وہی ہے جو اس وقت پورے یورپ کی ہے ۔

بہرحال پہلی صدی ہجری کے اختتام سے پہلے بتدریج ۲۵ سے ۳۰ کروڑ تک آبادی کا حلقہ بگوش اسلام ہو جانا اور اسلام کا ایک قانونی حکومت کی صورت میں چھا جانا کیا وللہ غیب السماوات والارض

والیہ یرجع الامر کلہ کی واقعاتی تفسیر نہیں ہے ۔ اور اس کے ساتھ اس واقعہ کو بھی اگر ملا لیا جائے
کہ ان اسلام میں داخل ہونے والوں کو صرف حلقہ بگوش اسلام نہیں کیا بلکہ ان کو روحانی نظام ، اخلاقی
نظام ، عائلی نظام ، معاشرتی نظام ، معاشی نظام ، سیاسی نظام اور قانونی نظام کا جدید نظام دیا تو آیت قرآنی
کی معنویت میں اور اضافہ ہوجاتا ہے ۔

یہ آخری سطریں ہیں جو سورۃ ہود کی تشریح میں اس نیاز آگیں کو حوالہ قرطاس کرنے کی
توفیق ہوئی ۔ الحمد للہ

اتوار مورخہ ۵ ا شعبان المکرم ۱۴۱۱ھ
۱۳ ، مارچ ۱۹۹۱ء

معالم القرآن

سورہ یوسف علیہ السلام مکّی ،

رکوع ۱۲

آیات ۱۱۱

نام

اس سورۃ کا نام سورۃ یوسف علیہ السلام ہے یہ نام اس لیے ہے کہ یہ پوری سورت حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کی عکاسی کرتی ہے۔

موضوع

اس سورت کا موضوع انسانی اعمال واخلاق ہیں۔ فضائل اور رذائل دونوں پر بھرپور تبصرہ ہے اس میں بتایا گیا ہے کہ نفس عمل مطلوب نہیں بلکہ وہ عمل مطلوب ہے جس کی غرض وغایت صحیح ہو۔ عمل قالب ہے تو صحیح غرض اس کی روح ہے۔ روح نہیں تو بے جان قالب کس کام آسکتا ہے۔ انسان کی نفسیاتی کیفیت کا وہ زندہ احساس جس کے ذریعے سے وہ برائی اور بھلائی میں تمیز کرتا ہے۔ اور جس کے سبب سے اس کے اندر سے خود نیکی کی دعوت کی آواز اُٹھتی ہے یہی عمل کی وہ روح ہے جس کے ذریعے فضائل اور رذائل لبادہ وجود پہنتے ہیں۔ سورہ یوسفؑ میں آپ چار کردار دیکھیں گے دو رذائل کا نمونہ ہیں اور دو فضائل کا۔

حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام اگر فضائل کا نمونہ ہیں تو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی اور امراۃ العزیز رذائل کا نمونہ ہیں۔

حضرت یعقوبؑ صبر جمیل، تحمل، حلم، سکینت کا اور حضرت یوسفؑ انسانی سیرت کی فضیلت کا۔ انسانی زندگی کی سب سے بڑی فضیلت اس کی سیرت کی فضیلت ہے۔ اس نقطہ نظر سے سورہ یوسفؑ کا مطالعہ کرو تو تمہیں محسوس ہوگا کہ سورہ یوسفؑ ایک آئینہ ہے جس میں دونوں اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ اچھے بھی اور بُرے بھی جس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنا حال و مستقبل اس میں دیکھا اسی طرح آپکے دشمنوں نے بھی ضرور دیکھا ہوگا

حضرت یوسف علیہ السلام

حضرت مسیح علیہ السلام سے تقریباً دو ہزار سال پہلے دنیا کے نقشہ کا حال یہ تھا کہ سرزمین مصر وقت کے تمدن و تہذیب کا مرکز بن چکی تھی۔ لیکن اس کے اطراف واکناف کی قومیں ابھی تمدن وحضارۃ سے آشنا نہ تھیں اور صحرانشینی اور بدویت کی زندگی بسر کر رہی تھیں۔ مصر کے قریب تر علاقہ وہ تھا جو آگے چل کر فلسطین کے نام سے مشہور ہوا اور جسے خاکنائے سینا نے سرزمین افریقہ سے ملا دیا ہے۔ اس علاقہ کی تمام پچھلی آبادیاں مٹ چکی تھیں۔ اب محض ایک صحرائی علاقہ تھا۔ جو مویشیوں کے لیے چراگاہ کا کام دیتا تھا۔ اور مختلف بدوی قبائل وہاں وہاں بودوباش رکھتے تھے۔ انہی قبائل میں ایک چھوٹا سا قبیلہ حضرت ابراہیمؑ کے خاندان کا تھا۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کا ظہور تمدن قدیم کے ایک دوسرے مرکز یعنی سرزمین دجلہ وفرات میں ہوا تھا۔ انہوں نے وہاں سے ہجرت کی اور کنعان میں مقیم ہو گئے کنعان سے مقصود وہ علاقہ ہے جو بحر میت کے مغربی جانب واقع ہے اور دریائے یردن سے سیراب ہوتا ہے۔ تورات میں ہے کہ انہوں نے یہ علاقہ وحی الٰہی سے منتخب کیا تھا۔ اور اللہ سبحانہٗ نے فرمایا تھا۔

> تو جس جگہ کھڑا ہے اس کے چاروں طرف دیکھ یہ تمام ملک میں تجھے اور تیری نسل کو دوں گا۔ اور تیری نسل کو خاک کے ذروں کی مانند بنا دوں گا۔ اگر کوئی خاک کے ذروں کو گن سکتا ہے تو تیری نسل بھی گن لی جائے گی۔ (پیدائش ۱۳۔ ۱۵)

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام یہاں مقیم ہو گئے تو وقتاً فوقتاً انہیں اور بشارتیں بھی ملتی رہیں۔ ان تمام بشارتوں کا خلاصہ یہ تھا کہ اللہ سبحانہٗ نے ان کو اُمتوں کا پیشوا بنایا۔ نسلوں کا مورث اور بادشاہوں کا جد بنایا اور ان کی نسل کو اپنی برکتوں کے لیے چن لیا ہے۔ جب تک ان کی نسل ظلم وضلالت سے آلودہ نہ ہو گی۔ وعدہ کی برکتوں کی مستحق رہے گی۔ یہ بشارتیں اس خاندان میں اللہ کا عہد سمجھی جاتی تھیں۔ خاندان کا ہر بزرگ اسے محفوظ رکھتا اور پھر اپنے وارث کو وصیت کرتا یہ عہد دو باتوں پر مشتمل تھا۔ ایک یہ کہ نسل ابراہیمی اللہ کے دین پر قائم رہے گی اور اس کے لیے دعوت کا کام کرے گی دوسرے یہ کہ اللہ سبحانہ اسے برکت دے گا اور اس کی دعوت کامیاب ہو گی۔

تورات سے یہ بات بھی معلوم ہوتی ہے کہ ایک موقعہ پر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو یہ خبر دی گئی تھی۔ کہ تیری اولاد ایک ایسے ملک میں جائے گی۔ جو تیرا ملک نہ ہو گا وہاں کے لوگ اسے غلام بنا لیں گے اور وہ چار سو برس تک وہاں رہے۔ (پیدائش ۱۵۔ ۱۳)

حضرت ابراہیم علیہ السلام سے حضرت اسماعیل اور حضرت اسحٰق علیہم السلام پیدا ہوئے۔ حضرت اسماعیل علیہ السلام حجاز میں بس گئے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کنعان میں خاندان کے جانشین ہوئے۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام سے حضرت یعقوب علیہ السلام پیدا ہوئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام سے بارہ لڑکے ہوئے۔

پہلی بیوی سے روبن ۱، شمعون ۲، لادی ۳، یھوداہ ۴، اشکارا ۵، زبلون ۶،

دو بلہا سے دان ۷ اور نفتالی ۸،

دو زلفہ سے جد ۹، اشر ۱۰،

دو راخل سے یوسف علیہ السلام ۱۱، بن یمین ۱۲

فلسطین میں تمام علاقے کی طرح حضرت یعقوب علیہ السلام کے خاندان کی زندگی بھی بالکل بدویانہ زندگی تھی۔ مویشی چراتے تھے۔ اوران کے گوشت، اُون اور دودھ پر گزران کرتے تھے۔

سورۃ یوسف علیہ السلام کا نزول

اس سورت کے مضامین کا اگر مطالعہ کیا جائے تو اس سے سورت کے قاری کو خود بخود محسوس ہوگا کہ یہ سورت بھی زمانہ قیام مکہ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوئی ہے بلکہ بتلانے والوں نے بتایا ہے کہ سورۃ ہود کے بعد نازل ہوئی ہے۔ اوراس کے ساتھ اگر یہ بات بھی ملالی جائے کہ حافظ ابن حجر عسقلانیؒ نے لکھا ہے۔ کہ

ابو رافعؓ ابن مالک پہلے وہ شخص ہیں جو مدینے میں سورۃ یوسف لے کر آئے۔

ابو رافعؓ ان میں سے ہیں جنہوں نے مکہ میں عقبہ میں اسلام قبول کیا تھا تو اس سے سورۃ یوسف کا زمانہ نزول کھل کر سامنے آجاتا ہے یہ بات تاریخی طور پر ثابت نہیں ہے۔ کہ قرآن میں سورۃ یوسف کے نزول کا پس منظر کفارہ مکہ کا قصہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں کوئی امتحانی سوالنامہ ہے۔ محققین نے اس کا ذکر نہیں کیا ہے اور نہ تشریح و تفسیر قرآن میں اس قسم کے واقعہ کی ضرورت ہے۔ اصلی پس منظر میں خود قریش کا کردار کافی ہے۔ ان کا طرز عمل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ برادران یوسف کا تھا۔ بالخصوص اس مرحلہ پر جبکہ وہ اس مسئلے پر غور کر رہے تھے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو قتل کردیں۔ یا جلاوطن کردیں اور یا قید کرلیں اس لیے برادران یوسف اور یوسف علیہ السلام کے تاریخی واقعہ کو چسپاں کرکے قریش کو بتایا ہے

کہ آج تم اپنے بھائی کے ساتھ وہی کچھ کر رہے ہو جو ماضی میں یوسف ؑ کے بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ کر رہے تھے وہ وقت قریب آرہا ہے کہ تم اپنی سازشوں میں ناکام ہو کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے قدموں میں گرو گے اور حضور اقدس صلی علیہ وسلم تمہارے ساتھ وہی سلوک کریں گے جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے بھائیوں کے ساتھ کیا۔

روحانی صداقت اور مادی ترقی کا مقابلہ

واقعہ کی اصلی شخصیتیں دو ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام اور حضرت یوسف علیہ السلام۔ سب سے پہلی بات جو سامنے آتی ہے وہ روحانی صداقت اور مادی ترقیات کا مقابلہ ہے۔ مادہ پرست انسانوں کی نظر کائنات اور اس کی چیزوں پر ہوتی ہے جبکہ نبوت کی نظر خود انسان پر ہوتی ہے۔ حضرت یعقوب ؑ کا گھرانہ دین حق اور توحید کی امانت رکھتا تھا۔ وحی الٰہی کی برکتوں سے مالامال تھا۔ لیکن مادی ترقیوں اور دنیوی شوکتوں میں سے کوئی بات بھی اسے میسر نہ تھی۔ حتیٰ کہ شہری زندگی کی ابتدائی خصوصیات سے بھی آشنا نہ تھے۔ اس کے تمام افراد صحرا میں رہتے تھے۔ مویشی چراتے تھے اور قدرتی زندگی کی سادگی پر قانع تھے۔ لیکن مصر کی حالت اس سے بالکل مختلف تھی۔ وہ دین حق کے علم و عمل اور وحی الٰہی کے فیضان سے محروم تھا لیکن وقت کی تمام مادی ترقیوں کا سرمایہ دار تھا۔ اس کے دارالحکومت کے لوگ لکھنے پڑھنے میں ماہر تھے۔ اس کے امراء و اشراف، حکمرانی و دانشوری میں ترقی یافتہ تھے اس کے مندروں کے کاہن حقائق اشیاء کے بھید جاننے والے تھے۔ اور اس کے حکیم علوم و صنائع کے عجائب و غرائب سکھلانے والے تھے۔ آج اثریات مصر نے ایک مدون علم کی حیثیت اختیار کر لی ہے اس کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ اس عہد کا فرعون غالباً وہ شخص تھا جسے آثار مصر میں آپونی کے نام سے پکارا جاتا ہے۔ اس کے عہد میں مصری تمدن پوری طرح ترقی کر چکا تھا۔

جب عجیب و غریب اتفاقات نے اس صحرائی گھرانے کے ایک فرد کو مصر پہنچا دیا اور ایسی حالت میں پہنچایا جو کسی حال میں بھی عزت و کامرانی کا ذریعہ نہیں ہو سکتی تھی تو پھر کیا نتیجہ نکلا؟ یہ نکلا کہ دونوں قوتوں میں مقابلہ ہوا اور بالآخر دین حق کے علم و عمل اور وحی الٰہی کے فیضان نے وقت کی تمام مادی فضیلتوں کو مسخر کر لیا۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس دین حق کے سوا اور کچھ نہ تھا مصریوں کے پاس دین حق کے سوا اور سب کچھ تھا۔ یہ صرف دین حق کی فضیلت سے آراستہ تھے۔ وہ ہر طرح کی مادی فضیلتوں میں تفوق

رکھتے تھے ۔ بایں ہمہ ہر مقابلہ میں فتح مندی حضرت یوسف علیہ السلام کی ہی سیرت و عمل کو ہوئی ۔ اور قدم قدم پر مادی فضیلتوں کو اپنے تفوق سے دست بردار ہونا پڑا ۔ حتیٰ کہ جب مملکت کی سلامتی خطرے میں پڑ گئی تو اس کی نجات کے لیے مادی فضائل کی کوئی پیداوار بھی کام نہ آئی حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے سر کو جھکنا پڑا کہ ملک کی سلامتی کی راہ نکال دے ۔

سورۃ یوسفؑ کے مضمرات

قرآن کے دوسرے واقعات میں تکرار ہے مگر حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ قرآن میں مکرر نہیں ہے پورا واقعہ تفصیل کے ساتھ ایک ہی جگہ پیش کیا گیا ہے ۔

اس پوری داستان میں قرآن حکیم جس گہری حقیقت کو انسان کے حجلہ دماغ میں اتارنا چاہتا ہے یہ ہے کہ کوئی معاملہ کتنا ہی عجیب معلوم ہوتا ہو اور کیسی ہی عجیب حالت میں پیش آیا ہو ۔ یہ قوانین الٰہی کے قدرتی نتائج کا ظہور ہے اور حقیقت شناسوں کے لیے اس میں کوئی اچنبھے کی بات نہیں ہے ۔ یہ سب کچھ عالم انسانی میں ایسا ہی ہوا جیسے عالم مادی میں آگ کے جلانے سے گرمی ہوتی ہے ۔ یا پانی پینے سے پیاس بجھتی ہے ۔ کیونکہ اللہ سبحانہ نے اشیاء کی طرح اعمال کے بھی خواص و نتائج مقرر فرما دیئے ہیں اور جب کبھی ایک خاص طرح کا عمل وجود میں آتا ہے ۔ ایک خاص طرح کا نتیجہ بھی ضرور وجود میں آجاتا ہے ۔ یہاں اشیاء کی طرح اعمال میں بھی علت کے ساتھ معلول کا دامن باندھ دیا گیا ہے برادران یوسفؑ نے حضرت یوسفؑ کے ساتھ جو کچھ کیا وہ خاص طرح کا انسانی عمل تھا ۔ خاص طرح کے عمل کا نتیجہ بھی خاص ہی طرح ظاہر ہوا ۔ حضرت یوسف علیہ السلام زندگی کی مختلف آزمائشوں میں جو کچھ کرتے رہے ہیں ۔ اس میں جھانک کر دیکھو تو تم محسوس کروگے کہ ایک خاص سیرت کے خاص اعمال تھے اور جب اعمال ہیں تو ضروری ہے کہ جیسے اعمال ہوں ویسے ہی نتائج بھی ہوں ۔

اسی طرح اس داستان کے تمام اعمال کا مطالعہ کرو ۔ ہر سیرت ایک خاص طرح کے عمل کا آئینہ ہے اور ہر عمل ایک خاص نتیجہ تیار کر رہا ہے ۔ لہٰذا جہاں تک اعمال و نتائج کا تعلق ہے یہ تاریخ انسانیت کا الگ واقعہ نہیں بلکہ قانون الٰہی کی وحی کارفرمائی ہے جو ہمیشہ سے کارفرما ہے ۔

بلا ریب یہاں واقعات کی نوعیت عجیب تھی ۔ اور ان کے نتائج بھی عجیب تھے ۔ لیکن قانون الٰہی کی نیرنگیوں کا ہمیشہ یہی حال رہا ہے اس کی ہر بات عجیب ہوتی ہے اور سر تا سر اس میں شان اعجاز ہوتی ہے ۔

یہی وجہ ہے کہ سورۃ یوسف میں جابجا اس حقیقت کی طرف اشارات کیئے ہیں ۔ واقعہ کا آغاز ہی یہ کہہ کر کیا ہے۔ لقد کان فی یوسف واخوتہ آیات للسائلین ۔ پھر خاتمہ میں یہی بات دوسرے عنوان سے دہرائی ۔ لقد کان فی قصصھم عبرۃ لاولی الالباب ۔ یعنی ارباب دانش کے لیے اس میں عبرتیں ہیں نشانیاں ہیں ۔ نیز متعدد آیات میں اہم واقعات کے بعد یہ تصریح کردی کذالک نجزی المحسنین ۔ انہٗ لا یفلح الظالمون ۔ انہٗ من یتق ویصبر فان اللہ لا یضیع اجر المحسنین یعنی یہ سب کچھ جسنے لبادہ پہنا ۔ اعمال کا نتیجہ ہے ۔ بدلا ہے ۔ مکافات ہے ۔

حسد و بغض کا نتیجہ وہی ہے ۔ جو بھائیوں نے پایا ۔ راست بازی اور نیک عملی وہی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا ۔ صبر جمیل کبھی اس نتیجہ سے محروم نہیں ہو سکتا جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے حصے میں آیا ۔ معصیت کے بیج سے ہمیشہ وہی پھل پیدا ہو گا جو امرأۃ العزیز کو ملا ۔ جھوٹ کتنا ہی غور و فکر کے بعد تراشا جائے سچ نہیں ہو سکتا ۔ سچ کتنی ہی ناگواریوں میں گھر جائے لیکن جھوٹ نہیں ہو سکتا ۔ علم و فضیلت ہر حال میں ایک حکمران قوت ہے سب کو اس کے آگے جھکنا پڑے گا ۔ حسن عمل ہر حال میں ایک فتح مند حقیقت ہے اس کا لوہا سب کو ماننا پڑے گا ۔

اس سورت میں سیرت یوسف عا کے مختلف مناظر پیش کیئے گئے ہیں ۔ آیئے تفصیلات پڑھنے سے پہلے ان مناظر پر ایک اجمالی نظر ڈال لیجئے ۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب اور اپنے والد کے سامنے اس کا بیان ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کو والد کی ہدایت کہ خواب کا ذکر بھائیوں سے نہ کرنا ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی سازش کا حضرت یعقوب ع کی جانب سے اندیشہ
حضرت یوسف علیہ السلام کو حضرت یعقوب علیہ السلام کا خواب کا پیش منظر بتانا ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے خواب کے پیش منظر میں نبوت اور تاویل الاحادیث کی بشارت ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف بھائیوں کی سازش اور بھائیوں کا حسد ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے بھائیوں کی اسکیم
حضرت یوسف علیہ السلام کے خلاف سازش کے لیے بھائیوں کی مشاورت مجلس مشاورت میں دو تجویزیں قتل یا ملک بدر کرنا ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کو کسی گمنام کنویں میں ڈالنے پر بھائیوں کا اتفاق
حضرت یوسف علیہ السلام کو لے جانے کے لیے بھائیوں کی حضرت یعقوب ع سے درخواست بھائیوں

کی حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے چرب زبانی
حضرت یوسف علیہ السلام کی جدائی پر حضرت یعقوب علیہ السلام کا اظہارِ غم اور بھیڑیئے کا اندیشہ
حضرت یوسف علیہ السلام کو بھائیوں کا گمنام کنویں میں ڈال دینا ۔ اور اللہ سبحانہٗ کی جانب سے
حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے سامانِ اطمینان
حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈالنے کے بعد بھائیوں کا بھیڑیئے کے حملہ کا جھوٹا افسانہ بنانا.
حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے جھوٹا افسانہ پیش کرنا ، رونا دھونا اور قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون ۔
حضرت یعقوب علیہ السلام کا ان کے کذب پر مطلع ہوجانا اور صبر جمیل کا شیوا اختیار کرنا، ایک عرب قافلہ کا کنویں سے گزرنا اور حضرت یوسف علیہ السلام کو نکالنا اور خوشی منانی ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کا قافلہ کے لیے تجارتی مایہ بننا اور قافلے کا ان کو مصر لے جانا قافلہ والوں کا بازار مصر میں حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کرنا ۔
بازار میں حضرت یوسف علیہ السلام کو عزیز مصر کا خریدنا اور ان کے اخلاق و فضائل سے متائثر ہونا ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کی مصری زندگی کا آغاز عزیز مصر کے گھر سے ہوا ہے ۔
عزیز مصر کی بیوی کا حضرت یوسف علیہ السلام پر فریفتہ ہونا اور ایک سخت آزمائش میں پڑجانا ۔
عزیز مصر کی بیوی کی کلی ناکامی، حیرت انگیز طریقہ الزام کا جھوٹا ثابت ہونا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی اخلاقی برتری ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کے جمال سیرت کا ایک اور منظر امرأۃ العزیز کی جانب سے مجلس کی آراستگی
حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب سے معصیت کے مقابلے میں مصیبت کو دعوت
حضرت یوسف علیہ السلام کی جیل کی زندگی کا آغاز اور جیل کے دو قیدیوں کا خواب کی تعبیر دریافت کرنا
حضرت یوسف علیہ السلام کا مقام نبوت اور قیدیوں کو دعوت الی اللہ ۔
بادشاہ کا خواب دیکھنا اور تعبیر کے لیے پریشانی
جیل کے قیدی کی تعبیر کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کی نشان دہی ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب کی تعبیر بتانا اور بادشاہ کو اس کی اطلاع ۔

جیل سے حضرت یوسف علیہ السلام کی رہائی کا سرکاری آرڈر ۔
حضرت یوسف علیہ السلام کا رہائی کا مژدہ سننا اور قید خانہ چھوڑنے سے انکار ۔
رہائی سے پہلے عزیز مصر کی بیوی کے الزام کی تحقیقات کا مطالبہ کرنا ۔
تحقیقات ہونا اور عزیز مصر کی بیوی کا اعتراف جرم اور حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت
رہائی کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کی دربار میں حاضری ۔
بادشاہ کا حضرت یوسف علیہ السلام کا اکرام اور حضرت یوسف علیہ السلام کے وزیر خزانہ بننے کا مطالبہ ۔
سیرت یوسف ع کے باقی مناظر انشاء اللہ تیرہویں جلد میں آئیں گے ۔

(۱۲) سُوْرَةُ يُوْسُفَ مَكِّيَّةٌ (۵۳)
رکوعاتہا ۱۲ — آیاتہا ۱۱۱

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

الٓرٰ تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ الْمُبِيْنِ ﴿۱﴾ اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ قُرْءٰنًا عَرَبِيًّا
لَّعَلَّكُمْ تَعْقِلُوْنَ ﴿۲﴾ نَحْنُ نَقُصُّ عَلَيْكَ اَحْسَنَ الْقَصَصِ
بِمَآ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ هٰذَا الْقُرْاٰنَ ۖ وَاِنْ كُنْتَ مِنْ قَبْلِهٖ لَمِنَ
الْغٰفِلِيْنَ ﴿۳﴾ اِذْ قَالَ يُوْسُفُ لِاَبِيْهِ يٰٓاَبَتِ اِنِّيْ رَاَيْتُ اَحَدَ
عَشَرَ كَوْكَبًا وَّالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ رَاَيْتُهُمْ لِيْ سٰجِدِيْنَ ﴿۴﴾
قَالَ يٰبُنَيَّ لَا تَقْصُصْ رُءْيَاكَ عَلٰٓى اِخْوَتِكَ فَيَكِيْدُوْا لَكَ
كَيْدًا ؕ اِنَّ الشَّيْطٰنَ لِلْاِنْسَانِ عَدُوٌّ مُّبِيْنٌ ﴿۵﴾ وَكَذٰلِكَ
يَجْتَبِيْكَ رَبُّكَ وَيُعَلِّمُكَ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ وَيُتِمُّ
نِعْمَتَهٗ عَلَيْكَ وَعَلٰٓى اٰلِ يَعْقُوْبَ كَمَآ اَتَمَّهَا عَلٰٓى اَبَوَيْكَ مِنْ
قَبْلُ اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْحٰقَ ؕ اِنَّ رَبَّكَ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ﴿۶﴾ ع ۱

الف، لام، را یہ کھلی اور واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔ بلاشبہ ہم نے
ہی اس کتاب کو عربی زبان میں قرآن بنا کر نازل کیا ہے تاکہ تم سمجھ

تو لے اللہ کے رسول اسی وحی کے مطابق جس کے ذریعے ہم نے آپ پر قرآن کی وحی کی ہے ہم آپ کو بہتر سے بہتر واقعہ سناتے ہیں۔ قرآن نازل ہونے سے پہلے آپ اس واقعہ سے بے خبر تھے[۲] تم بیان کرو اس واقعہ کو جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والد سے کہا کہ ابا جان میں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں[۳] حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا بیٹا اپنے اس خواب کو بھائیوں سے نہ بیان کرنا وہ تیرے خلاف کوئی سازش کرلیں گے یاد رکھ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے[۴]۔ اور بیٹے! اسی خواب کی طرح اللہ سبحانہٗ تجھے برگزیدگی عطا کرے گا۔ اور ہر بات کا علم عطا فرمائے گا۔ کہ باتوں کا نتیجہ کیا ہو۔ نیز جیسے تیرے بزرگوں ابراہیم و اسحٰق علیہم السلام پر اللہ اتمام نعمت کرچکا ہے۔ ایسے ہی تجھ پر اور آل یعقوب پر اتمام نعمت کرے گا بلاشبہ تیرا رب سب کچھ جاننے والا اور اپنے کاموں میں حکمت والا ہے۔[۵]

تاویل الاحادیث

حضرت یوسف علیہ السلام کے حالات میں ایک ۔۔۔ [illegible] ۔۔۔ تاویل احادیث کا لفظ آیا ہے۔ شارحین قرآن نے اس پر دل کھول کر داد تحقیق دی ہے۔ ہم ناظرین معالم القرآن کی ضیافت

طبع کے لیے ترجمان القرآن سے مولانا آزاد کی تحقیق پیش کرتے ہیں۔

عربی میں تاویل کے معنے کسی بات کے نتیجے اور مال کار کے ہیں اور باتوں کے مطلب و مقصد پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ چنانچہ سورۃ یونس کی آیت ۳۹ میں ولما یاتھم تاویلہ کے نزدیک میں اس کی تشریح کردی گئی ہے۔ احادیث یعنی باتیں تاویل الاحادیث کا مطلب یہ ہوا کہ باتوں کا مطلب نتیجہ اور مال بوجھ لینے کا علم یعنی انسان میں علم و بصیرت کی ایسی قوت کا پیدا ہوجانا کہ ہربات کے مطلب اور نتیجہ کا شناسا ہوجائے۔ امور و مہمات کے بھیدوں کا رمز شناس ہوجانا۔ ہربات کی نبض پہچان لینی۔ ہرواقعہ کا مطلب پالینا۔ کوئی بات کتنی الجھی ہوئی ہو لیکن اس طرح سلجھا دینا کہ ساری باتوں کی کل ٹھیک بیٹھ جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا ظہور کنعان کے صحرا میں ہوا تھا اور ایک ایسے خاندان میں جو پشتہا پشت سے صحرا کی بدویانہ زندگی بسر کررہا تھا۔ پیدائش سے لے کر عنفوان شباب تک اسی عالم میں زندگی بسر ہوئی نہ تو کسی طرح کی خارجی تعلیم و تربیت کا موقعہ ملا اور نہ شہری زندگی کی رسم و راہ سے واقف ہوسکے۔ جب شہری زندگی ہی سے آشنا نہ تھے، تو ظاہر ہے اجتماعی زندگی کی تمدنی خصوصیات سے کیوں کر باخبر ہوسکتے تھے۔ ملکی معاملات اور انتظامی مہمات کی تو ان کے کانوں میں بھنک بھی نہ پڑی ہوگی۔

بسا اوقات خاندان کے موروثی اثرات خارجی اثرات سے بے نیاز کردیتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کا خاندانی ورثہ نبوت تھا۔ شہریاری اور ملک داری نہ تھا۔ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کے توطن کنعان کے بعد سے تو شہری زندگی کا علاقہ ہی یکسر مفقود ہوگیا تھا۔ بایں ہمہ جب گردش حوادث نے انہیں مصر جیسی متمدن سرزمین پہنچا دیا تو وہ نہ صرف اس کے نظم و نسق کے لیے سب سے بہتر حکمران ثابت ہوئے بلکہ ان کی کارروائی و حقائق فہمی نے مملکت کو اس کی سب سے بڑی ہولناک بربادی سے بچالیا۔ اور ان کے فضل و کمال کے آگے سب نے سر جھکا دیا خود بادشاہ وقت کو اپنے عجز و درماندگی کا اعتراف کرنا پڑا۔ ایک ایسے شخص میں جو چند سال ہوئے صحرا کے ویرانوں سے نکل کر آیا تھا۔ یہ قوت علمی کیسے پیدا ہوگئی کہ تمام باتوں کا نبض شناس اور تمام معاملات و مہمات کی کل بٹھانے والا ہوگیا یقیناً مبدأ فیاض کرشمۂ فیضان ہے۔ لیکن اس کرشمۂ فیضان کا نام کیا ہے۔ علم تاویل الاحادیث کا سکھا دینا۔ اب جبکہ صناعی علوم کی تدوین اور فنی مصطلحات کی بناوٹوں نے طرح طرح کی تعبیرات سکھا دی ہیں۔ ہم اس طرح کے علم و بصیرت کے لیے بہت سے مصطلحہ الفاظ بولیں لیکن قرآن کی زبان صناعی مصطلحات کی زبان نہیں ہے۔ نہ علمی مصطلحات سے اس وقت عربی زبان آشنا ہوئی تھی۔ اس نے ان ساری باتوں کے لیے

ایک ایسی ترکیب استعمال کی جو ادائے مطلب کا قدرتی اندازہ ہو سکتا ہے۔ یعنی باتوں کے مطلب اور مآل پا لینے کا علم، تعلیم کی ساری کاوشیں، تربیت ذہنی کی ساری محنتیں، تجربہ و اختیار کی ساری کوششیں کس غرض سے ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ باتوں کا مطلب سمجھ لینے کی استعداد پیدا ہو جائے۔ علم و دانش کا تمام تر حاصل و مقصود کیا ہے۔ یہی کہ باتوں کی کل بٹھائی آجائے۔ جس مطلب کے لیے ہم نے بے شمار علمی اصطلاحیں بنائی ہیں۔ قرآن نے اسی کو بغیر کسی پیچ و خم کے اس طرح کہہ دیا جو ادائے مطلب کا صاف اور قدرتی طریقہ ہے اور یہ قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے۔

چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کی تعبیریں بتلائی تھیں۔ اس لیے مفسرین اس طرف گئے ہیں کہ یہ خواب کی سچی تعبیر معلوم کرنے کا علم تھا۔ بلا شبہ خواب کی بات بھی احادیث میں داخل ہے۔ اور کہا جا سکتا ہے کہ ایک گوشہ اس کا یہ بھی تھا۔ لیکن یہ بات درست نہیں معلوم ہوتی کہ براہ راست علم تعبیر منام پر اس کا اطلاق ہوا ہو۔ یہ ظاہر ہے کہ خواب کی سچی تعبیر معلوم کر لینا نبوت کے عام خصائص میں سے ہے اور ہر نبی وحی الٰہی سے مطلع ہو کر خواب کی حقیقت معلوم کر لیتا ہے۔ خود حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب سنتے ہی حقیقت معلوم کر لی تھی۔ اگر یہی بات مقصود ہوتی تو اس کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ کہ خصوصیت سے تاویل الاحادیث کا ذکر کیا جاتا۔ یہ نبوت کے اعمال و خصائص میں سے تھی اور جب نبوت کا مقام مل رہا ہے تو لازمی طور پر اس طرح کی تمام باتوں کی قابلیت بھی مل رہی ہے حضرت یعقوبؑ نے حضرت یوسفؑ کا خواب سن کر فرمایا۔ یجتبیک ربک ویعلمک من تاویل الاحادیث ویتم نعمتہٗ علیک۔ اس میں برگزیدگی ہے مقصود امتیاز و تفوق ہے۔ اور اتمام نعمت سے نبوت مراد ہے۔ لہٰذا تاویل الاحادیث سے کوئی تیسری چیز مقصود ہے۔ اگر خواب کی تعبیر ہی کی بات ہوتی تو وہ حصول نبوت کی بشارت میں آگئی تھی۔ علاوہ ازیں ایک نبی کے لیے تعبیر خواب کا ملکہ کوئی ایسی بڑی بات نہیں کہ خصوصیت سے اسے اللہ سبحانہٗ کا ایک خاص عطیہ قرار دیا جاتا۔

(۱) الف، لام، را یہ کھلی اور واضح کتاب کی آیتیں ہیں۔ بلا شبہ ہم نے ہی اس کتاب کو عربی زبان میں قرآن بنا کر نازل کیا ہے۔ تاکہ تم سمجھ لو۔ یعنی عربی زبان جو تمام زبانوں میں زیادہ فصیح، وسیع اور منضبط اور پرشوکت زبان ہے نزولِ قرآن کے لیے منتخب کی گئی۔ جب خود پیغمبر عربی ہیں تو ظاہر کہ دنیا میں اُس کے اولین مخاطب عرب ہوں گے۔ پھر عرب کے ذریعے سے چاروں طرف یہ روشنی پھیلے گی۔ اسی طرف لعلکم تعقلون میں اشارا فرمایا کہ تمہاری زبان میں قرآن اتارنے کی ایک وجہ یہ ہے کہ تم جو پیغمبر علیہ السلام کی قوم ہو اول اس کے علوم و معارف کا مزا چکھو پھر دوسروں کو چکھاؤ۔ چنانچہ

ایسا ہی ہوا۔ حافظ ابن کثیرؒ لکھتے ہیں۔

انزل اشرف الکتب اللغات علی اشرف الرسل بسفارة اشرف الملائکة وکان ذالك فی اشرف بقاع الارض وابتدأ نزوله فی اشرف شهور السنة وهو رمضان فکمل من کل الوجوه

سب سے اچھی کتاب سب سے اچھی زبان میں سب سے اچھے پیغمبر پر سب سے اچھے فرشتے کی وساطت سے سب سے اچھی جگہ میں اور سب سے اچھے مہینے یعنی رمضان میں نازل ہوئی۔ بس ہر پہلو سے مکمل ہے [1]

اس آیت میں اللہ سبحانہٗ نے قرآن کے بارے میں چار باتیں بطور راہنما اصول بتائی ہیں۔

اول قرآن کی ابانت
دوم قرآن کی قرآنیت
سوم قرآن کی عربیت
چہارم قرآن کے معانی کا سمجھنا۔

آیئے سب سے پہلے قرآن کی ابانت پر غور فرمایئے مبین کا لفظ ابان یبین سے لازم ہے یا متعدی۔ اگر لازم ہے تو ابان معنے میں بان کے ہے اور مطلب یہ ہے کہ جس کا منجانب اللہ ہونا واضح ہے۔ یا یہ کہ جس کا معجزہ ہونا سب کو معلوم ہے اور یا یہ کہ جس کے معانی کے حقائق و دقائق اہل عرب کے لیے صاف واضح اور کھلے ہیں۔ اور متعدی ہونے کی صورت میں مطلب یہ ہے کہ جو ہدایت و رشد کو بیان کرنے والی کتاب ہے۔ یا جو احکام و قوانین کو پیش کرنے والی کتاب ہے۔ زجاج کہتے ہیں کہ جو باطل کے مقابلے میں حق کو بیان کرنے والی ہے یعنی وہ کتاب جو اپنے بیان استدلال میں بالکل واضح ہے۔ جس کی ہر بات ناقابل انکار دلائل سے آراستہ ہے۔ جس کا انداز بحث و نظر دل نشین، طمانیت بخش اور تمام الجھنوں کو دور کرنے والا ہے مطلب یہ ہے کہ اس کتاب کی صداقت کی گواہی کے لیے کسی خارجی نشانی کی ضرورت نہیں ہے بلکہ اس کی حقانیت و صداقت کے دلائل سورج کی طرح روشن خود اس کے اندر موجود ہیں۔ بشرطیکہ لوگ کان کھول کر اس کو سنیں اور اس کے دلائل پر غور کریں یہ قرآن ہی کی ابانت کو بتانے کے لیے اسے دوسرے انداز میں ایجابی و سلبی انداز میں پیش کیا ہے۔ لم یجعل له

[1] افادات شیخ الاسلامؒ

عوجا قیما۔ نہیں رکھی اس میں کسی طرح کی کجی۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ عوج یعنی پیچ وخم کجی اور ٹیڑھ سے اس کتاب کا کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ خود واضح اور صاف ہے۔ صاف بتاتی ہے۔ سیدھی راہ پر چلتی ہے۔ فکر ونظر کی مصنوعی ورزشوں سے جن کے دل جن کے دماغ اُلٹے پلٹے نہیں۔ ان کے اندر یہ کتاب اتر جائے گی۔ ان کو محسوس ہوگا کہ وہ اس کتاب کے لیے پیدا کیے گئے۔ اور یہ کتاب ان کے لیے نازل ہوئی ہے۔ یہ منفی پہلو ہے دوسرا ایجابی پہلو یہ ہے کہ یہ کتاب قیم ہے، لازوال، غیر فانی اندٹ اٹل حقائق اور اصول پر یہ کتاب مشتمل ہے۔ قیام و بقا کی شدت اور حد سے زیادہ استواری استحکام دراہانت پر قیّم کا یہ لفظ دلالت کر رہا ہے۔

قرآن کی قرآنیت

دوسری بات جو الکتاب کے بارے میں بتائی گئی ہے وہ یہ ہے کہ یہ پڑھنے کی چیز ہے یعنی اس کتاب الٰہی کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کی قرأت اور تلاوت میں تعبدی شان ہے۔ یہ ضابطہ حیات اور روحانی ہدایت نامہ ہونے کے ساتھ افضل الاذکار بھی ہے یعنی اس کو پڑھنا بھی عبادت ہے کلام پاک چونکہ اصل دین ہے اس کی بقا راشاعت پر بھی دین کا مدار ہے۔ اس لیے اس کے پڑھنے اور پڑھانے کا افضل ہونا ظاہر ہے۔ کمال اس کا یہ ہے کہ مطالب سمیت پڑھے اور ادنیٰ درجہ اس کا یہ ہے کہ فقط الفاظ سیکھے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ قرآن کا ماہر ان فرشتوں کے ساتھ ہوگا جو میر منشی اور نیکو کار ہیں اور جو شخص قرآن کو اٹکتا ہوا پڑھتا ہے اور اس میں دقت اٹھاتا ہے۔ اس کو دوہرا اجر ہے۔ ایک اور ارشاد ہے۔ کہ حسد دو شخصوں میں ہوتا ہے۔ ایک وہ جس کو حق تعالیٰ شانہٗ نے قرآن شریف کی تلاوت عطا فرمائی اور وہ دن رات اس میں مشغول رہتا ہے اور دوسرے وہ جسے اللہ تعالیٰ نے مال کی بہتات عطا فرمائی اور وہ دن رات اس کو للّٰہ خرچ کرتا ہے۔ یہ حدیث بخاری میں بحوالہ عبداللہ بن عمرؓ آئی ہے۔ ایک اور ارشاد جو بخاری اور مسلم میں بحوالہ ابو موسیٰ اشعریؓ آیا ہے۔ کہ

> جو مسلمان قرآن پڑھتا ہے اور اس پر عمل بھی کرتا ہے وہ سنگترے کی طرح ہے جس کا ذائقہ بھی اور بو بھی اچھی ہے۔ اور جو قرآن نہیں پڑھتا اور اس کے حکموں پر عمل کرتا ہے وہ کھجور کی طرح ہے جس کا ذائقہ تو مزے دار مگر خوشبو کچھ نہیں۔ اور جو منافق قرآن پڑھتا ہے اس کی مثال نازبو کی طرح ہے خوشبو تو اچھی مگر مزا ناگوار اور جو قرآن

بھی نہیں پڑھتا اور عمل بھی نہیں کرتا اس کی مثال صندل کی سی ہے ذائقہ بھی کڑوا اور بُو بھی ناگوار۔

اس عامۃ الورود قدرتی مثال کے ذریعے یہ بات سمجھائی ہے کہ قرآن کے پڑھنے نہ پڑھنے میں کیا فرق ہے۔ ورنہ ظاہر ہے کہ ترنج اور کھجور کو کیا نسبت ہے قرآن پاک کی حلاوت سے۔

قرآن نے قرأت قرآن پر زور دے کر کہا قرآن کی حفاظت کا اللہ سبحانہ کی جانب سے انتظام کیا گیا ہے کہ قرآن کا حفظ کے ذریعے نادر طریقہ اختیار کیا اس سے پہلے معلوم تاریخ میں یہ طریقہ کسی کتاب کے لیے اختیار نہیں کیا گیا۔ ہزاروں لاکھوں کے دلوں میں یہ جذبہ ابھر آیا کہ وہ قرآن کے متن کو شروع سے آخر تک یاد کریں۔ یہ سلسلہ نزول قرآن سے شروع ہو کر آج تک جاری ہے۔ قرأت قرآن کا تسلسل اس بات کی دلیل ہے کہ قرآن خدا کی کتاب ہے وہ اسی ابتدائی صورت میں کامل طور پر محفوظ ہے جیسا کہ وہ ساتویں صدی عیسوی میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل ہوا تھا۔ اس خصوصیت نے قرآن کو اتنا طاقتور بنا دیا ہے کہ جب بھی وہ دنیا کے سامنے اپنی شکل میں لایا جائے گا وہ اقوام عالم کو مسخر کرے گا معلوم تاریخ کے مطابق دنیا میں کوئی دوسری کتاب نہیں جس کو ماننے والوں نے اس طرح کے یاد کرنے کا اہتمام کیا ہو جس طرح قرآن کے ماننے والے ہر دور میں کرتے رہے ڈیڑھ سال کی اسلامی تاریخ میں یہ جو کچھ ہوا ہے۔ انا انزلناہ قرآنا کی تفسیر ہے۔

قرآن کا عربی زبان میں نازل ہونا

تیسری بات کتاب الٰہی کے بارے میں جو فرمائی گئی ہے وہ کتاب کا عربی میں ہونا ہے یعنی یہ قرآن ہونے کے لیے عربی ہونا شرط ہے۔ ترجمہ قرآن روایت با معنے جبکہ عربی میں قرآن روایت باللفظ ہے۔ اسی لیے نظم و معنے کے مجموعہ کو قرآن بتایا گیا ہے۔ قرآن کی عربیت کے سلسلے میں شارحین قرآن تو اور وادیوں میں نکل گئے لیکن امام شافعی رحمۃ اللہ نے اپنی کتاب الرسالہ میں قرآن کے عربی میں ہونے سے جو بات معلوم کی ہے وہ اس لائق ہے کہ اسے پڑھا جائے اور اُس پر غور کیا جائے یہ طے کرنے کے بعد کہ قرآن عربی زبان میں نازل ہوا ہے اور اللہ سبحانہ نے قرآن کو عربی میں نازل کر کے اس کی دعوت کو سارے جہان کے لیے بنانے کی صورت یہ مقرر فرمائی ہے۔

اللہ سبحانہ نے قرآن کو ان کی قوم کی زبان یعنی عربی میں اتارا ہے نہ کہ دوسری زبانوں میں اس لیے لوگوں پر عربی زبان کا سیکھنا اس حد تک فرض ہے جہاں تک ان

کے بس میں ہو۔ (الرسالہ)

ظاہر ہے کہ عربی زبان بھی انسانوں ہی کی زبان ہے ایک انسان دوسرے انسان کی زبان سیکھ ہی لیتا ہے۔ بہرحال مجھے بتانا یہ ہے کہ حضرت امام شافعیؒ نے انزلناہ قرآناً عربیاً۔ کے زور سے جو بات سمجھی ہے وہ یہ ہے کہ

ہر مسلمان پر فرض ہے کہ عربی زبان کو اس حد تک سیکھنے کی کوشش کرے جہاں تک اس کے بس میں ہوتا کہ وہ اس بات کی گواہی دے سکے جیسے لا الٰہ الا اللہ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کلمہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اور اللہ کی کتاب پڑھ سکے اور ان الفاظ کو بول سکے جن کا بولنا اس پر فرض ہے یعنی تکبیر اور جن تسبیحوں کا حکم دیا گیا ہے اور تشہد اور اس کے سوا دوسری چیزیں اور جو اپنی کوشش کو زبان عربی کے سیکھنے میں بڑھائے گا جو اس نبی کی زبان ہے۔ جس پر نبوت ختم ہوئی ہے اور جن پر اللہ سبحانہٗ کی آخری کتاب نازل ہوئی ہے تو یہ اس کے لیے بہتر ہے بہرحال عربی سیکھنا اس پر اسی طرح فرض ہے جیسے نماز اور نماز کے اذکار کا سیکھنا۔

واقعہ یہ ہے کہ آیت قرآنی

لا تقربوا الصلوٰۃ وانتم سکاریٰ حتی تعلموا ما تقولون۔
نہ قریب جاؤ نماز کے نشہ کی حالت میں یہاں تک کہ تم سمجھنے لگو کہ منہ سے کیا کہہ رہے ہو۔

پر اگر غور کیا جائے اور یہ سوچا جائے۔ کہ مطالبہ یہ ہے کہ جو کچھ بول رہے ہو اس کو جان لو یہ نہیں کہ منطوق کو سُن لو تو یہ چیز قابل غور ہو جاتی ہے کہ عربی جانے بغیر نماز کے قریب آدمی کو جانے کی اجازت بھی ہے۔ آپ جو کچھ بول رہے ہیں میں اسے سمجھ رہا ہوں کیا یہ کہنا اس شخص کے لیے صحیح ہو سکتا ہے جو بولنے والے کی زبان تو نہیں سمجھتا لیکن منہ سے نکلنے والے الفاظ کو سُن رہا ہے اور بولے ہوئے الفاظ صرف سُننے کا نام جاننا رکھتا ہے یہ مسئلہ قابل غور ہے۔ دیکھئے تفسیر مظہری قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ زیادہ سے زیادہ یا کم سے کم تر یہ کہا جا سکتا ہے کہ سجدہ جیسے مطلوب فاسجدوا سے سجدہ کامل ہے جس میں اطمینان ہو۔ ساتوں ہڈیوں پر سجدہ ہو لیکن اگر حدیث کی تمثیل کے مطابق مرغ کے ٹھونگے مارنے کی طرح سجدہ کر کے نماز ادا کرے تو قانونی طور پر نماز کے مطالبے سے سبکدوش ہو جاتا ہے۔ لیکن اس کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اللہ سبحانہٗ نے جس سجدہ کا مطالبہ کیا ہے وہ یہی سجدہ ہے ایسے ہی

نماز میں مطالبہ تو یہی ہے کہ جو کچھ پڑھا جائے اسے پڑھنے والا سمجھے لیکن اگر یہ ممکن نہ ہو تو الفاظ بھی کان سنتے ہیں اور ایک لفظ کو دوسرے لفظ سے جدا جدا بھی جانتے ہیں تو نماز قانونی طور پر ہو جاتی ہے کہ یہ بھی علم ما تقولون کی ایک کمزور سی صورت ہے۔

بہر حال امام شافعیؒ نے قرآناً عربیاً سے یہ بات سمجھی ہے اور خوب سمجھی ہے۔

قرآن کا عربی زبان میں نازل ہونا انا انزلناہ قرآناً عربیاً ہم نے قرآن کو عربی میں نازل کیا۔ اس میں ایک بہت زیادہ وسیع اور گہری حقیقت مضمر ہے۔ اصل یہ ہے کہ عہد جاہلیت کی عربی اگرچہ صحرائیوں کی عربی تھی لیکن زبان کی نوعیت بول رہی ہے کہ یہ صحرائی قبائل کی پروردہ نہیں ہو سکتی اتنی وسیع، اتنی ہمہ گیر، اتنی دقیقہ سنج، اس درجہ متمول زبان ضروری ہے کہ صدیوں کی متوارث اور مسلسل ادبی زندگی سے ظہور پذیر ہوئی ہو۔ جو زبان قرآن کے معانی و دقائق کی متحمل ہو گی کیونکر ممکن ہے کہ اسے غیر متمدن قبائل کی ایک بدوی زبان تسلیم کر لیا جائے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ وثوق سے کہا جا سکتا ہے جس عربی میں امرأ القیس نے اشعار کہے ہیں اس عربی کی لغوی تاریخ اس سے بہت زیادہ قدیم اور بہت زیادہ متمدن ہونی چاہیئے جتنی اس وقت تک سمجھی گئی ہے۔

عربی زبان جس پر زندگی و خلود کی آخری مہر قرآن نے لگائی ہے دراصل بدنی نشوونما کے اتنے مراحل سے گزر چکی ہے کہ دنیا کی کوئی زبان بھی اس وصف میں اس کی شریک نہیں ہے ہمیری اور اکادی اقوام کا تمدن نینوا اور بابل کی علمی کامرانیاں، قدیم مصری لغات کا عمرانی سرمایہ، آرامی زبان کا عروج کلدانی اور سریانی ادبی تمول دراصل ایک ہی زبان کی لغوی تشکیل و تکمیل کے مختلف مراحل تھے اور اسی نے آگے چل کر عربی کا بھیس اختیار کر لیا۔ جو زبان حضارۃ و تمدن کی اتنی بھٹیوں سے پک کر نکلی ہو ظاہر ہے کہ اس کے اسمار و مصادر کسی مفلس اور خام زبان کے اسمار و مصادر نہیں ہو سکتے[1]

یہ بات بھی ذہن میں رکھنی چاہیئے کہ عربی زبان تمام زبانوں میں ایک حیرت انگیز استثنا ہے تاریخ بتاتی ہے کہ ایک زبان کی عمر پانچ سو سال سے زیادہ نہیں ہوتی۔ تقریباً پانچ سو سال میں ایک زبان اتنی زیادہ بدل جاتی ہے۔ کہ اگلی نسل کے لوگوں کے لیے پچھلے لوگوں کا کلام سمجھنا سخت مشکل ہو جاتا ہے۔ مگر عربی زبان کا مسئلہ استثنائی طور پر اس سے مختلف ہے۔ عربی زبان پچھلے ڈیڑھ ہزار سال سے یکساں حالت پر باقی رہی ہے اس کے اسلوب اور الفاظ میں یقیناً ارتقار ہوا ہے مگر یہ ارتقار

---

[1] ترجمان القرآن

اس طرح ہوا ہے کہ الفاظ اپنے ابتدائی معنے کو بدستور باقی رکھے ہوئے ہیں۔ قدیم عرب کا کوئی شخص اگر آج دوبارہ زندہ ہو تو آج کے عربوں میں بھی وہ اسی طرح بولا اور سمجھا جائے گا جس طرح چھٹی یا ساتویں صدی عیسوی کے عرب میں وہ بولا اور سمجھا جاتا تھا۔

یہ سراسر قرآن کا معجزہ ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ قرآن نے عربی زبان کو پکڑ رکھا ہے تاکہ جس طرح قرآن کو قیامت تک باقی رہنا ہے۔ اسی طرح عربی زبان بھی زندہ اور قابل فہم حالت تک باقی رہے۔

قرآن کے معانی کا سمجھنا

یہ بات لعلکم تعقلون کے ذریعے بتائی گئی ہے یعنی اس کتاب مبین کا عربی زبان میں نزول اس لیے ہوا ہے تاکہ اس کے اولین مخاطب اس کو سمجھیں۔ قرآن نے اس مقصد کے لیے صرف یہی تعبیر اختیار نہیں کی بلکہ اس مقصد کے لیے قرآن نے ایک سے زیادہ انداز اختیار کیئے ہیں۔ کہیں تدبر کی دعوت ہے اور کہیں تفکر کا مطالبہ ہے یہ انداز خطاب بتا رہا ہے کہ یہاں دو بعثتیں ہیں ایک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعے امت کی بعثت۔ یہ گویا دو بعثتیں ہیں اور دونوں حضور ہی کی بعثتیں ہیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی طرف اس آیت میں اشارا ہے۔

هو الذی بعث فی الامیین رسولا منهم یتلو علیهم آیاته ویزکیهم ویعلمهم الکتاب والحکمة۔

اور دوسری بعثت کی طرف اس آیت میں اشارہ ہے۔

کنتم خیر امة اخرجت للناس تامرون بالمعروف وتنهون عن المنکر

اس آیت سے معلوم ہوا کہ جس طرح محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیغمبرانہ بعثت ان کی امت کے لیے ہوئی ویسی ہی ان کی قوم کی بعثت دوسری قوموں کی طرف ہوئی اور اسی معنے میں قرآن کی یہ آیت بھی ہے۔

لیکونوا الرسول شهیدا علیکم وتکونوا شهداء علی الناس

اسی لیے احادیث میں ہے۔ کہ آپ نے صحابہ کرامؓ سے فرمایا۔ فانما بعثتم میسرین ولم تبعثوا معسرین تم آسانی کرنے والے بنا کر مبعوث ہوئے ہو سختی کرنے والے بنا کر نہیں۔ بہرحال

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جماعت کو بصیغہ جمع یہ مخاطبات اس بات کی دلیل ہیں۔ کہ یہ امت ہی مبعوث ہے۔ یہ شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں یہ کہہ کر "جب خود پیغمبر عربی ہیں تو ظاہر ہے کہ دنیا میں ان کے اولین مخاطب عرب ہوں گے۔ پھر عرب کے ذریعے سے چاروں طرف یہ روشنی پھیلے گی" اشارا کیا ہے۔

اس آیت میں لعلکم تعقلون کہہ کر قرآن نے اپنے مخاطبوں کو یہ بھی سمجھا دیا ہے کہ نبوت کا کام اللہ سبحانہٗ کے احکام کو تمہارے سامنے بیان کرنا اور تمہارا کام ان احکام کو سمجھنا اور ان پر غور و فکر کرنا ہے۔ قرآن میں ہے۔

وانزلنا الیک الذکر لتبین للناس ما نزل الیھم ولعلھم یتفکرون۔

اور ہم نے تمہاری طرف قرآن اتارا ہے تاکہ تم جو کچھ اتارا گیا ہے اسے لوگوں کے سامنے کھول کر بیان کر دو اور تاکہ لوگ اس پر غور و فکر کریں۔

اور غور و فکر کے ذریعے اللہ کے بیان کردہ احکام کی گہرائی تک پہنچنے کا نام تفقہ ہے یعنی حسی معلومات پر عقل جو کام کرتی ہے وہی کام وحی کے متعلق جب عقل انجام دیتی ہے تو اسی کا نام قرآن میں تفقہ اور اصطلاح اجتہاد ہے۔ السیوطیؒ نے اپنی کتاب الاشباہ والنظائر میں فقہ کے متعلق بالکل صحیح لکھا ہے۔

فقہ ایک عقلی علم ہے جو منقول سے حاصل کیا جاتا ہے

ان کے الفاظ یہ ہیں۔ الفقہ، معقول من منقول۔ فقہ احناف کی مشہور کتاب الحاوی قدسی سے لفظ فقہ کے معنے صاحب البحر الرائق نے یہ نقل کیے ہیں۔

لغت میں فقہ کے معنے واقف ہونے کے ہیں۔ اور اصطلاح میں خاص قسم کی واقفیت کا نام ہے یعنی نصوص کے معانی سے اور ان کے اشاروں سے ا ان کے مضمرات سے اور ان کے تقاضوں سے واقف ہونے کا نام فقہ ہے۔

اور جن کی عقل وحی کے معلومات سے نتائج اخذ کرتی ہے۔ ان کو فقیہ کہتے ہیں۔ جس کا حاصل یہ ہے کہ فقہ کے یہ معنے نہیں ہیں کہ اللہ کے دین میں عقل اپنی طرف سے کسی چیز کا اضافہ کرتی ہے۔ نہیں بلکہ نتائج و احکام کا جو روغن وحی قرآنی کی معلومات میں چھپا ہوا ہوتا ہے۔ عقل کی مشین ان کو اپنی طاقت کی حد تک ان سے نچوڑنے کی کوشش کرتی ہے۔ عقل کی اسی کوشش اور محنت کا نام تفقہ اور اجتہاد ہے۔

یہاں شیخ محی الدین ابن عربی کی فتوحات مکیہ میں یہ بات بالکل برمحل ہے۔ کہ شریعت میں جس اجتہاد کا اعتبار ہے وہ کتاب وسنۃ سے دلیل تلاش کرنے میں جدوجہد کرنا ہے یا اجماع یا زبان عربی کی راہنمائی میں خاص مسئلہ میں کسی ایسے حکم کو ظاہر کرنا جو اس دلیل سے معلوم ہوتا ہو جس کی تلاش میں تم نے محنت کی ہے۔ اور اپنے خیال میں اس حکم کا علم تمہیں اس دلیل سے ہوا ہے اسی کا نام اجتہاد ہے۔

اسلامی نظام میں عقل کا مقام

حسی معلومات سے متاثر ہونے کے بعد جس طرح عقل انسانی میں ہلچل مچ جاتی ہے۔ اسی ذہنی تلاطم عقلی کے ہلچل کے نتیجے میں ہماری لائبریریاں علوم وفنون کی کتابوں سے اٹی پڑی ہیں۔ تو کیا یہ کہنا صحیح ہو سکتا ہے۔ کہ قرآنی معلومات حاصل ہونے کے بعد وہی عقل بالکل کُند اور جامد بن کر رہ جاتی ہے جو کتاب لعلکم تتفکرون اور لعلکم تعقلون کے عقلی بیداری کے پیغاموں سے لبریز ہے اسی کتاب کے متعلق یہ دعویٰ صحیح ہو سکتا ہے کہ اس نے نازل ہونے کے بعد دماغوں کو مفلوج، عقلوں کو کُند اور ذہنوں کو کُند کر دیا۔ للعیاذ باللہ۔ نہیں بلکہ اس نے لعلکم تعقلون کے ذریعے مسلمان کو موقع دیا ہے کہ وہ اپنی عقل وفہم کو کام میں لائے جہاں کسی صورت حال کی نسبت قرآن وسنت دونوں خاموش ہوں۔ وہاں اسلامی معاشرے کے ان افراد کو عقل واستدلال کے استعمال کا حق دیا گیا ہے۔ جو اپنی فکری صلاحیتوں اور علم وفضل کی وسعت کے اعتبار سے اس حق کا صحیح استعمال کر سکتے ہیں۔ یعنی وحی ونبوت کی راہ سے آئی ہوئی معلومات کے استعمال صحیح اور ان سے آئندہ پیش آنے والے واقعات وحوادث کے متعلق جدید نتائج کو صحیح اصول پر مستنبط کر سکتے ہوں۔ اور اس کے مطابق امر وحکم دینے کی واقعی صلاحیت وقابلیت، ماہرانہ لیاقت واستعداد رکھتے ہوں۔
اللہ سبحانہ نے قرآن میں یہ آیت نازل فرما کر

فلولا نفر من کل فرقۃ طائفۃ لیتفقھوا فی الدین

کیوں نہیں چل پڑا ہر فرقہ سے ایک گروہ دین میں سمجھ پیدا کرنے کے لیے

اسلام میں حقداروں کے ایک مستقل باب کا افتتاح کر دیا۔ قرآن کی یہ آیت قیامت تک پیش آنیوالے دینی وقانونی حوادث کے حل کی اساسی بنیاد ہے۔ یہاں حافظ ابن حزم اندلسیؒ کا وہ بیان غور سے پڑھنے کے لائق ہے۔ جو انہوں نے اسی آیت کی روشنی میں اپنی کتاب الاحکام میں لکھا ہے۔
مسلمانوں کی جماعتیں خواہ وہ کسی گاؤں میں یا کسی بدوی منزل یا قلعہ میں جہاں کہیں بھی

اکٹھی ہو کر رہیں ان پر فرض ہے کہ ان میں کچھ لوگ دین کے احکام کی طلب وتلاش اور تحصیل کے لیے آمادہ ہو جائیں۔ یعنی اول سے آخر تک دین کے سارے مسائل سیکھیں ان کو پورے قرآن کی تعلیم حاصل کرنی چاہیئے اور احکام کی حدیثوں میں جو صحیح ہیں۔ ان میں کوئی کتاب پڑھیں۔

اسی آیت کے ذیل میں وہ یہ بھی لکھتے ہیں کہ

تمام مسلمانوں پر فرض ہے کہ ان کے ہر گاؤں ہر شہر میں ایسے آدمی ہوں جنہیں پورا قرآن یاد ہو اور وہ لوگوں کو قرآن کی تعلیم دیں۔

بتانا یہ چاہتے ہیں کہ قرآن خوانی، قرآن دانی کا دروازہ ان لوگوں کے لیے رہتی دنیا تک کھلا رہنا چاہیئے جو اسلامی نظام کے تحت زندگی گزارنے کا فیصلہ کر چکے ہیں۔ قرآن میں یہ واجب اور فرض قرار دیا گیا کہ ہر فرقہ اور ہر جماعت سے ایک گروہ وحی ونبوت کے علمی سرمائے کی سمجھ دار اور اس میں تفقہ پیدا کرنے کے لیے تیار رہو جائے۔ ظاہر ہے کہ اس کتاب کے پہلے مخاطب اور اس فرض کے سب سے پہلے مکلف وہی حضرات ہو سکتے ہیں جنہیں ہم صحابہ کرامؓ کہتے ہیں۔ اور جو لعلکم تعقلون کے اولین مخاطب ہیں۔

(۲) احسن القصص

اے اللہ کے رسول اسی وحی کے مطابق جس کے ذریعے ہم نے آپ پر قرآن کی وحی کی ہے۔ ہم آپ کو بہتر سے بہتر واقعہ سناتے ہیں۔ قرآن نازل ہونے سے پہلے آپ اس واقعہ سے بے خبر تھے یعنی اس وحی کے ذریعے سے جو قرآن کی صورت میں تم پر نازل ہوئی ہے۔ ہم ایک نہایت اچھا بیان نہایت حسین طرز میں سناتے ہیں۔ جس سے تم اب تک اپنی قوم کی طرح بے خبر تھے۔ گویا واقعہ کتب تاریخ اور بائبل میں پہلے سے موجود تھا۔ مگر محض ایک افسانہ کی صورت میں تھا۔ قرآن حکیم نے اس کے ضروری اور مفید اجزاء کو ایسی عجیب ترتیب اور بلیغ ومؤثر انداز میں پیش کیا جس نے نہ صرف پہلے تذکرہ نویسوں کی کوتاہیوں پر مطلع کیا بلکہ موقع بموقع نہایت ہی اعلیٰ نتائج کی طرف راہنمائی کی اور قصہ کے ضمن میں علوم و ہدایت کے ابواب مفتوح کر دیئے۔ یہ بات کہ خداوند قدوس کی تقدیر کو کوئی چیز نہیں روک سکتی اور خدا جب کسی پر فضل کرنا چاہے تو سارا جہان مل کر بھی اپنی ساری امکانی تدابیر سے اسے محروم نہیں کر سکتا۔ صبر، استقامت دنیوی واخروی کی کامیابی کی کلید ہے۔ حسد وعداوت کے انجام خذلان ونقصان کے سوا کچھ

نہیں۔ عقل انسانی بڑا شریف جوہر ہے، جس کی بدولت آدمی بہت سی مشکلات پر غالب آتا ہے۔ اور اپنی زندگی کو کامیاب بنا لیتا ہے۔ اخلاق، شرافت اور پاکدامنی انسان کو دشمنوں اور حاسدوں کی نظر میں بھی بالآخر معزز بنا دیتی ہے۔ یہ اور اس قسم کے بے شمار حقائق ہیں جن پر اس احسن القصص کے تضمن میں متنبہ فرمایا مفسرین نے اس آیت کے شان نزول میں کئی روایات نقل کی ہیں۔ سب کے ملانے سے یہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہود نے مشرکین کے ذریعے امتحاناً یہ سوال کیا کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام اور ان کی اولاد تو شام میں رہتی تھی۔ پھر بنی اسرائیل مصر میں کیسے پہنچ گئے۔ جو موسیٰ علیہ السلام کو فرعون سے مقابلہ کرنا پڑا۔ شائد مسلمانوں کو بھی ایک مفصل تاریخی واقعہ جو بصائر و عبر سے مملو ہو سننے کا اشتیاق ہوا ہوگا۔ ادھر اس قصّے کے ضمن میں جن احوال و حوادث کا تذکرہ ہونے والا تھا۔ وہ کئی طرح نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کی قوم کے حالات سے مشابہت رکھتے تھے۔ اور ان کا ذکر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حق میں موجب تسکین خاطر اور آپکی قوم کے حق میں موجب عبرت تھا۔ ان وجوہ سے یہ پورا واقعہ کافی بسط و تفصیل سے قرآن کریم میں بیان فرمایا تا کہ پوچھنے والوں کو معلوم ہو جائے۔ کہ اسرائیل یعنی حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کے اولاد کے شام سے مصر آنے کا سبب حضرت یوسف علیہ السلام کا واقعہ ہوا ہے۔ پھر وہیں ان کی نسل پھیلی اور بڑھتی رہے تاآنکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے آکر فرعون اور قبطیوں کی غلامی سے انہیں نجات دلائی[1]

واقعی شان نزول کے موضوع پر روایات مختلف ہیں۔ اور ان کی تاریخی حیثیت بھی پایہ صحت سے گری ہوئی ہیں۔ علامہ شوکانیؒ نے ان روایات پر تاریخی حیثیت سے بحث کی ہے۔ اس قصّے کے احسن القصص ہونے کا شارحین قرآن نے مختلف پہلوؤں سے جائزہ لیا ہے۔ اس واقعہ کی خوبصورتی کو جاننے کے لیے اس پہلو پر غور کیجئے کہ یوں تو قرآن میں انبیاء علیہم السلام اور ان کی قوموں کے درمیان کشمکش کے جتنے واقعات بھی بیان ہوئے ہیں۔ سب ہی عبرت و راہنمائی کے لیے بیان ہوئے ہیں۔ کہ ماضی کی ان سرگزشتوں سے حاضر اور مستقبل کے حالات سے عہدہ برآہ ہونے کے لیے سبق حاصل کیے ہیں لیکن خاص طور پر حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی یہ سرگزشت تو گویا ایک آئینہ ہے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو وہ تمام حالات بتا دیئے گئے۔ جو آپ کی قوم کی جانب سے پیش آنے والے تھے۔

ذرا اس پر غور فرمائیے کہ مکی زندگی میں معاندین آپ کے قتل کا مشورہ کر رہے ہیں۔ اللہ سبحانہٗ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس شر سے محفوظ رکھا۔ مکہ چھوڑ کر آپ غارِ ثور میں نگاہوں سے اوجھل

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہیں اور وہاں سے مدینہ کی طرف ہجرت فرما رہے ہیں۔ مدینہ پہنچ کر آپ کو آہستہ آہستہ وہ وقار و اقتدار حاصل ہوا کہ اس کی نظیر پوری تاریخ انسانی میں نہیں ملتی ہے۔ اہل ایمان کی مدینہ کی طرف ہجرت اور مدینہ میں اسلامی حکومت کا قیام، اس حکومت کا ترقی کرنا اور اہل مکہ کا حلقہ بگوش طاعت ہونا۔ اہل مکہ سے آپ کا یہ کہنا۔ اذھبوا انتم الطلقاء لا تثریب علیکم الیوم۔ جاؤ تم آزاد ہو آج تم پر کوئی الزام نہیں۔ ان تمام حالات کو پیش نظر رکھ کر سورۃ یوسف کا غور سے مطالعہ کیجئے تو آپ محسوس کریں گے کہ یہ ساری سرگزشت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کی کاپی اور ہو بہو نقل پیش کر رہی ہے۔ بس آپ کی زندگی کی مکمل اور بھرپور تصویر ہی اس قصّہ کے احسن القصص ہونے کی وجہ ہے۔ یوں تو قرآن حکیم میں پہلے نبیوں کی پُرنور اور درخشاں زندگیوں کے ایک سے زیادہ واقعات ذکر کیے گئے ہیں جو ہر پہلو سے رشد و ہدایت کے انوار ہی انوار ہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کے واقعہ کو جو احسن القصص کہا گیا ہے تو وہ قرآن میں مذکور انبیاء کے واقعات کے مقابلے پر نہیں بلکہ داستان سراؤں کے مقابلے میں ہے یعنی یہ واقعہ دنیا کے سارے واقعات کے مقابلے میں بہترین واقعہ ہے۔ وجہ بالکل ظاہر ہے کہ اس میں عالم مادی سے ہٹ کر عالم انسانی سے بھرپور بحث کی گئی ہے۔ اس کے سارے پیچ و خم، نشیب و فراز، پیش آنے والی دشواریاں، منزل سے دل برداشتہ کرنے والے سنگین حالات، غافل کرنیوالے دلربا مناظر اور دل چسپیوں کو اتنے بھرپور انداز سے بیان کیا گیا ہے کہ کسی ابہام کا نام و نشان نہیں۔ پھر اس جان گداز کٹھن اور دراز راستہ کی پامالی کے لیے راہ رو کو جس صبر، عزم، توکل، تقویٰ، عالی حوصلگی اور سیرچشمی کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کا ذکر اس قدر دل نشین اور مؤثر پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ سوچیئے جو واقعہ اور داستان ایسے حقائق سے لبریز ہو وہ داستان سراؤں کی داستانوں کے مقابلے میں احسن القصص نہیں ہے تو اور کیا ہے۔

قدرت الٰہی سے ایک عجیب و غریب واقعہ پیش آیا اور یہ عجیب و غریب واقعہ کن حالات میں ظہور پذیر ہوا ایسے حالات میں جو اصل معاملہ سے کہیں زیادہ عجیب و غریب تھے۔ سوتیلے بھائیوں نے ہلاک کرنے کے لیے کنوئیں میں ڈال دیا۔ کنواں خشک تھا۔ اور شاہراہ سے الگ۔ اتفاق سے ایک قافلہ راہ سے بے راہ ہو کر وہاں پہنچتا ہے پانی کے لیے کنوئیں میں ڈول ڈالتا ہے وہ اس میں بیٹھ جاتا ہے۔ باہر آیا بھائیوں نے اسے بھاگا ہوا غلام بنا کر قافلہ والوں کے ہاتھ فروخت کر دیا وہ اسے مصر کے بازار میں فروخت کر رہے ہیں ایک خریدار نے خرید لیا۔ تو زر خرید غلام نے آقا کے گھر میں اپنے حسن عمل سے خواجگی کا درجہ حاصل کر لیا۔ یہ انقلاب حال بجائے خود عجیب و غریب تھا۔ لیکن اس سے زیادہ عجیب و غریب

وہ معاملہ ہے جب اس زرخرید غلام کو بیک وقت دو باتوں سے دوچار ہونا پڑا نفسانی زندگی کی سب سے بڑی عشرت و کامرانی۔ اور انسانی زندگی کی سب سے بڑی محرومی وہ پہلی سے بھاگا کہ اس میں معصیت تھی۔ دوسری کو اپنایا کہ اس میں اطاعت تھی پھر اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ ایسا جوان ساری باتوں سے عجیب ہے۔ یعنی مصر کی حکومت کا تاج اس کے سر پر رکھ دیا۔ اس نے اپنے خاندان کو بلالیا عین دارالحکومت میں آباد ہوئے وہاں ان کی نسل میں اس قدر برکت ہوئی کہ جب چار سو برس کے بعد مصر سے نکلے تو کئی لاکھ تک تعداد پہنچ چکی تھی۔

اس آیت میں دو باتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ یہ احسن القصص ہے دوسرے یہ کہ یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی رسالت کی ایک نہایت واضح دلیل ہے۔ دونوں باتیں الگ الگ ہیں احسن القصص کی بات کی وضاحت ہو چکی ہے۔ یہ ایک سرگزشت ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی پوری زندگی کے لیے ایک آئینہ ہے جس میں وہ اپنی تمام زندگی کے نشیب و فراز کی کامیابی کی آخری منزل تک دیکھ سکتے ہیں تو اس سرگزشت سے زیادہ اچھی سرگزشت بابرکت اور قیمتی کوئی نہیں ہوسکتی۔ اس میں آپ کو آپ کے حاضر اور مستقبل کا پورا نقشہ دکھایا گیا ہے۔ رسالت کی دلیل اس طرح ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم غیب دانی کے مدعی نہ تھے۔ آپ نہ تو اس سرگزشت سے واقف تھے۔ اور نہ آپ کے پاس اس سے واقف ہونے کا کوئی ذریعہ تھا۔ یہ صرف اللہ سبحانہٗ کی وحی کا فیضان تھا کہ آپ اس سے واقف ہوئے اور اس صحت و صداقت اور ایسی وسعت و تفصیل کے ساتھ واقف ہوئے کہ یہود و نصاریٰ کے علماء بھی اس سے واقف نہ تھے۔ اس پہلو سے یہ آپ کی نبوت کی ایک نمایاں اور روشن دلیل ہے کہ اگر آپ وحی الٰہی سے مشرف نہیں ہیں تو یہ باتیں اس احاطہ اور صحت و صداقت کے ساتھ آپ کو کیسے معلوم ہوئیں۔ انما اوحینا الیک ھذا القرآن سے اسی طرف توجہ دلائی ہے اور وان کنت من قبلہٖ لمن الغافلین سے اس امر واقعی کی طرف توجہ دلائی ہے کہ آپ کا علمی ذریعہ صرف اللہ کی وحی ہے اس سے غیب دانی خود بخود نفی ہو گئی ہے۔ کیونکہ غیب تو وہ علم ہے کہ اگر تم غیب دان ہوتے تو اس وحی الٰہی سے پہلے کبھی تو کچھ بتلاتے۔ بلاشبہ یہ وحی الٰہی کا فیضان ہے اور یہی دعوت نبوت کی صداقت کی دلیل ہے۔

(۳) حضرت یوسفؑ کا خواب

تم بیان کرو اس واقعہ کو جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے والدِ گرامی سے کہا کہ ابا جان

مَیں نے خواب میں دیکھا ہے کہ گیارہ ستارے اور سورج چاند مجھے سجدہ کر رہے ہیں یعنی گیارہ ستارے اور سورج وچاند میرے آگے جُھک رہے ہیں۔ یہ خواب لڑکپن میں دیکھا تھا سچ ہے سے

ہونہار بروے کے چکنے چکنے پات [1]

یہ تمہید ہے اس واقعہ کی جسے قرآن نے احسن القصص کہا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک روز خواب دیکھا یہ ان کے لڑکپن کی بات ہے۔ اس خواب کو حضرت یوسف عؑ نے اپنے والد حضرت یعقوب عؑ سے اس طرح بیان کیا۔ کہ میں نے خواب میں دیکھا ہے۔ کہ گیارہ ستارے سورج اور چاند میرے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب کو سب سے پہلے اپنے والد کے علم میں لانا اس بات کی دلیل ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام غیر معمولی طور پر سلیم الطبع، نیک نیت اور سعادت کی بلندیاں پر تھے۔ چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام بچپن ہی سے نہایت متین، باوقار اور سنجیدگی کی نعمت سے مالا مال تھے۔ اس لیے آپ نے یہ خواب اپنے والد ماجد کو سنایا۔ انہوں نے خود ہی یہ محسوس کر لیا کہ یہ خواب پریشان نہیں ہے۔ بلکہ اُونچے درجہ کا خواب ہے۔ والد سے خواب کا ذکر کرنا بتا رہا ہے کہ خواب کو لبیب یا حبیب سے بیان کیا جائے۔ ارشاد نبوت کا شاید ماخذ یہی آیت ہے جس میں مسلمانوں کو ہدایت ہے کہ خواب دیکھو تو عقلمند صاحب الرائے یا پیار کرنے والے سے بیان کرو۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی نگاہ انتخاب نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو چنا۔ جن پر ہر پہلو سے ان کو اعتماد تھا۔ خواب والد کے سامنے پیش کر رہے ہیں مگر انداز میں تواضع ہے۔ سامنے جاتے ہی بے دھڑک نہیں کہا کہ میں نے گیارہ ستارے سورج اور چاند کو اپنے آگے سربسجود دیکھا ہے بلکہ خواب کا ابتدائی حصہ انی رأیت احد عشر کوکبا والشمس والقمر کہہ کر ذرا ٹھہر گئے کیونکہ آنے والی بات ان کی بڑائی ظاہر کر رہی تھی۔ اس کے اظہار سے ان کی تواضع طبعی رک رہی تھی۔ ذرا توقف کر کے فرمایا رأیتھم لی ساجدین۔ یہ بات رأیتھم کے تکرار سے معلوم ہو رہی ہے۔ رأیت کے تکرار میں یہی نکتہ بلاغت ہے۔

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ قصہ یوسف علیہ السلام کا آغاز خواب سے یہ بتانے کے لیے کیا گیا ہے کہ یہ خواب حضرت یوسف علیہ السلام کے سارے کمالات کے لیے تمہید اور مقدمہ تھا۔ جیسا کہ حدیث عائشہ رضؓ صدیقہ رضؓ میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے سارے کمالات کا مقدمہ رویائے صادقہ کو بتایا گیا ہے۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے کمالات نبوت یعنی وحی کی تمہید سچے خواب ہیں۔ آپ جو خواب بھی دیکھتے سپیدۂ صبح کی طرح اس کی نمائش ہوتی۔

یہاں بھی خواب حضرت یوسف علیہ السلام کے جملہ کمالات کی تمہید ہو کر آئی ہے آیت میں سجدہ سے اصلاحی و شرعی سجدہ مراد نہیں جس کے معنی ایک متعین و معروف طریقہ پر زمین پر ماتھا ٹیکنے کے ہیں بلکہ سجدہ یہاں اپنے اصلی اور لغوی مفہوم میں ہے۔ یعنی انقیاد و اطاعت و تذلل کے مترادف آیا ہے۔

انی رأیت یعنی خواب میں دیکھا رأیت رویۃ میں سے ہو سکتا ہے اور رؤیا سے بھی لیکن شارحین قرآن کا اس پر اتفاق ہے کہ یہاں رأیت رویا سے ہے زمخشری رقم طراز ہیں۔ رأیت من الرؤیا لامن الرویۃ اور شارحین قرآن کی تائید خود قرآن سے بھی ہوتی ہے۔ لاتقصص رؤیاك۔

خواب میں ستاروں سورج اور چاند کے اس سجدے کی کیفیت کے تفصیلی ذکر سے قرآن حکیم، حدیث نبوی اور تورات سب خاموش ہیں۔ لیکن یہ بات دھیان میں رہے کہ یہ بیداری کا ذکر نہیں ہے۔ بلکہ خواب کا ہے۔ جہاں ہر وہ چیز جو تصور یا تخیل میں آسکتی ہے جسم و مثال کی صورت میں واقعہ بن کر بھی سامنے آجاتی ہے اس لیے یہاں وہ ذہنی سوالات پیدا ہی نہیں ہو سکتے جو بیداری کے مشاہدے پر کیئے جا سکتے ہیں۔

یہاں کچھ شارحین قرآن نے ان ستاروں کے ناموں کی بھی ناکام کوشش کی ہے اور اس کے لیے ایک داستان بھی بنائی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت گرامی میں کوئی بستان نامی یہودی آیا۔ اور دریافت کیا۔ کہ جن ستاروں کو حضرت یوسف علیہ السلام نے سجدہ کرتے خواب میں دیکھا تھا۔ ان کے نام کیا ہیں؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے خاموشی اختیار کی۔ یہودی چلا گیا حضرت جبرئیلؑ آئے آپ نے یہودی کو طلب کیا۔ آپ نے فرمایا اگر نام بتا دوں تو کیا مسلمان ہو جاؤ گے؟ اس نے مان لیا۔ فرمایا ان ستاروں کے نام یہ ہیں۔ جریان، طارق، ذیال، قابس، ذوالکفین، وثاب، عمودان، خلیق، مصبح، ضروح، فرح، قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ نے تفسیر مظہری میں یہ واقعہ سنن سعید بن منصور۔ مسند بزاز، مسند ابو یعلی، ابن جریر، ابن المنذر، ابن ابی حاتم، ابوالشیخ ابن مردویہ، العقیلی، ابن حبان اور مستدرک کے حوالہ سے نقل کیا ہے۔ مگر سچی بات یہ ہے۔ کہ واقعہ نہیں افسانہ ہے۔ اور سارا کا سارا من گھڑت ہے۔ تمام کا مرجع سدی ہیں۔ صحیح احادیث میں کوئی حدیث اس کی مؤید نہیں ہے۔

(۴) حضرت یعقوبؑ کا یوسفؑ کو حکم

حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا بیٹا: اپنے اس خواب کو بھائیوں سے نہ بیان کرنا۔ وہ

تیرے خلاف کوئی سازش کرلیں گے ۔ یاد رکھ کہ شیطان انسان کا کھلا دشمن ہے ۔یعنی ۔یعنی شیطان ہر وقت انسان کی گھات میں لگا رہتا ہے ۔ وسوسہ اندازی کر کے بھائیوں کو تیرے خلاف اُکسادے گا ۔کیونکہ خواب کی تعبیر بہت واضح تھی ۔ اور یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کو جو بہر حال خاندان نبوت میں سے تھے ایسے واضح خواب کا سمجھ لینا کچھ مشکل نہ تھا۔کہ گیارہ ستارے گیارہ بھائی ہیں ۔اور چاند سورج والدین ہیں ۔گویا یہ سب کسی وقت یوسف علیہ السلام کی عظمت شان کے سامنے سر جھکائیں گے ۔چنانچہ سورت کے آخر میں ھذا تاویل رؤیای من قبل قد جعلھا ربی حقا ۔ کہہ کر اسی طرف اشارہ کیا ہے ۔

معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام خواب سے پیشتر ہی یہ محسوس کرتے تھے ۔کہ یوسفؑ کے ساتھ باپ کی خصوصی محبت کو دیکھ کر اس کے علاتی بھائی دل ہی دل میں کڑھتے ہیں ۔اب اُنہوں نے یہ خیال کیا ۔کہ اگر کہیں یہ خواب سُن پائے تو شیطان حسد کی آگ ان کے دلوں میں بھڑکا دے گا اور جوش حسد میں آنکھیں بند کر کے ممکن ہے وہ کوئی ایسی حرکت کر گزریں ۔جو یوسف علیہ السلام کی اذیت اور خود ان کی رسوائی اور بدانجامی کا موجب ہو اس لیے آپ نے یوسف علیہ السلام کو منع فرما دیا ۔کہ اپنا خواب بھائیوں کے رُوبرُو ذکر نہ کریں ۔یوسف علیہ السلام کا ایک حقیقی بھائی بن یامین تھا اس کے سامنے بھی ذکر کرنے کی اجازت نہیں دی گو اس سے بُرائی کا کوئی اندیشہ نہ تھا ۔لیکن یہ ممکن تھا کہ وہ سُن کر بے احتیاطی سے دوسروں کے سامنے تذکرہ کر دے ۔اور اس طرح یہ خبر لوگوں میں شائع ہو جائے [۱]

ان بھائیوں کے تعلقات جیسا کہ دنیا میں اکثر سوتیلے بھائیوں میں ہوتا ہے ۔آپ سے کشیدہ تھے ۔ اس کشیدگی کے صحیح اسباب کا علم تو اللہ ہی کو ہے البتہ تورات میں دو سبب بتلائے ہیں ۔ایک یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام بچپن ہی سے سلیم الطبع تھے ۔نہ صرف یہ کہ خود شرارتوں سے الگ رہتے تھے بلکہ اپنے بھائیوں کی شرارتوں کی رپورٹ بھی اپنے والد ماجد سے کر دیتے تھے ۔"یوسف ان کے باپ کے پاس ان کے بُرے کاموں کی خبر لاتا تھا۔ (پیدائش ۳۷۔۲) دوسری بات یہ کہ حضرت یعقوبؑ کو ان کے ساتھ محبت غیر معمولی تھی ۔یہ بات بجائے خود دوسروں کو ناگوار گزرتی تھی۔اس کے بھائیوں نے یہ دیکھ کر کہ اس کا باپ اس کے سب بھائیوں سے زیادہ اسے پیار کرتا ہے ۔اس کا کینہ پیدا کیا اور اس سے محبت کی بات نہ کر سکتے تھے ۔لیکن ایک وجہ تو بالکل کھلی ہوئی ہے ۔یعنی بچپن ہی سے آپ کا

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

سفید در شید ہونا ۔ گیارھواں بھائی جو سوتیلا نہیں حقیقی تھا ۔ مخالف نہ تھا ۔ لیکن اس کی کم سنی کی بنا پر ممکن تھا ۔ کہ بڑے بھائی اپنی سازشوں اور منصوبوں میں اس سے فائدہ اٹھائیں ۔ آخر میں فرمایا ۔ ان الشیطان للانسان عدو مبین ۔ اسے تمہارے بھائیوں کے دل میں وسوسہ ڈالنے میں کیا دیر لگتی ہے ۔ یعقوب علیہ السلام کا یہ خیال ہی خیال نہ تھا تورییت میں ہے کہ " بھائیوں نے یوسف کا خواب سُن کر زبان سے بھی اپنے غصّے کا اظہار کر ڈالا " تب اس کے بھائیوں نے اسے کہا کہ کیا تو سچ مچ ہمارا بادشاہ ہوگا ۔ یا تو ہمارا حاکم ہوگا ۔ انہوں نے اس کے خوابوں اور اس کی باتوں سے اس کا زیادہ کینہ پیدا کیا ۔ آیت اس بات کی کھلی راہنمائی کرتی ہے ۔ کہ شیطان کے اثر اور کینہ سے محفوظ رہنے کے لیے پیغمبر زادگی ہی کافی نہیں ہے ۔ قرآن کا انداز بیان تو یہی بتا رہا ہے ۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنا خواب بھائیوں کو نہیں بتایا ہے ۔ اور یہی ان کی شان کے مناسب ہے ۔ لیکن تورات کہتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کا ذکر بھائیوں سے کر دیا ۔ یہ تورات کی تحریفات میں سے ہے ۔

شارحین قرآن نے یہاں خواب کے موضوع پر اچھی خاصی سیر حاصل بحث کی ہے ۔ ہم اس سلسلے میں کچھ باتیں معالم القرآن جلد ۱۱ میں آیت ر۴۴" نوٹ ر" میں لکھ چکے ہیں ۔ یہاں صرف یہ بتانا ہے ۔ کہ رؤیا اور خواب درحقیقت نفس یا روح کے عجائبات کا ایک حیرت انگیز طلسم ہے ۔

خواب کی حقیقت

علمار نفس کہتے ہیں ۔ کہ اس کی حقیقت یہ ہے ۔ کہ انسان کے قوائے نفسی و دماغی ہر وقت ہر آن اپنے ذہنی اعمال میں مصروف رہتے ہیں ۔ جب وہ سو جاتے ہیں ۔ اور اس کے ظاہری حواس بیکار ہو جاتے ہیں ۔ اس وقت بھی ان کے فکر و نظر کا عمل جاری رہتا ہے ۔ مگر چونکہ انسان عموماً عمیق اور پرسکون نیند سوتا ہے اس لیے جاگنے کے بعد اس کو اپنی حالت خواب کا احساس نہیں ہوتا ۔ لیکن کبھی جب اس کی نیند گہری اور مستغرق نہیں ہوتی تو اس کو اپنی سیر دماغی کے مکمل یا نامکمل مناظر یاد رہ جاتے ہیں ۔ اسی کا نام خواب ہے ۔

یہ تو فلسفہ قدیم کا فرسودہ خیال تھا ۔ اب جدید زمانہ ترقی میں نفسیات کے علمار کا مشہور و مقبول نظریہ یہ ہے کہ ہم عالم بیداری میں اپنے جن خیالات جذبات اور ارادوں یا تمناؤں کو جان کر یا بے جانے کسی سبب سے دبا دیتے ہیں ۔ عالم خواب میں جب تعقل اور احساس کی جابرانہ حکومت ان سے اٹھ جاتی ہے ۔ تو ان کو ابھرنے کا موقعہ ملتا ہے ۔ اور وہ ہم کو خواب بن کر نظر آتے ہیں ۔ یہ شاید اس رؤیا کی توجیہہ

ہو گی۔ جن کو خواب پریشان یا اوہام دماغی کہنا زیادہ موزوں ہے۔

عرفائے روح اس خوب پریشان یا اوہام دماغی کے منکر نہیں ہے۔ لیکن رؤیا کی حقیقت ان کے نزدیک کچھ اور ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ انسان جسم و روح کے مجموعہ کا نام ہے۔ روح جب تک جسم کے اندر ہے اس کی جلوہ نمائی کے دو رُخ ہیں۔ جسمانی و روحانی۔ اپنے جسمانی دروازے سے وہ جھانکتی ہے تو اس کو جسم کے مادے کی سطح پر رنگا رنگ کے نقش و نگار اور گلکاریاں نظر آتی ہیں۔ یہ اس کے وہ تعلقات اور دلچسپیاں ہیں جو اس کے اس جسمانی و مادی عالم کے ساتھ قائم ہیں۔ لیکن اس کے پیچھے ایک دوسرا دروازہ ہے جہاں سے وہ عالم روحانی کی سیر کر سکتی ہے جس قدر اس کا تعلق اُنس و دلبستگی، شیفتگی اور مشغولیت عالم جسم سے زیادہ ہوگی۔ اسی قدر دوسرے کی طرف سے فراموشی و غفلت اور بے تعلقی زیادہ ہو گی۔ حالت خواب میں روح کی ظاہری و جسمانی مصروفیتیں چونکہ کم ہو جاتی ہے۔ اور پھر روح کو جس قدر تعلقات خارجی سے بیگانگی زیادہ ہوتی ہے۔ شہر ملکوت میں اس کی سیر بہت آگے تک اور بہت دور تک اور وہاں کے مناظر و مشاہدات سے اس کی اطلاع اور واقفیت زیادہ صحیح اور سچی ہوتی ہے۔ جو روحیں کہ اس عالم جسمانی کی بندشوں میں رہ کر بھی ان میں گرفتار و مقید نہیں ان کے لیے عالم بیداری بھی اقلیم روح کی گلگشت سے مانع نہیں اسی کا نام مکاشفہ ہے۔

انبیا رکرام علیہم السلام کے مقدس قالبوں میں جو ارواح طیبہ ہوتی ہیں۔ وہ عالم ظاہری کی گرفتاریوں کے بعد بھی جس قدر آزاد اور بے تعلق رہتی ہیں وہ عام حد انسانی سے بہت آگے اور بہت بلند ہے۔ اسی لیے عالم رؤیا اور عالم مشاہدہ دونوں میں حقائق و اسرار کی بستیاں ان کی نگاہوں کے سامنے ہوتی ہیں۔ بیداری تو بیداری وہ سوتے ہوئے بھی بیدار ہوتے ہیں۔ ان کے جسم سوتے ہیں۔ اور ان کی روحیں ہمیشہ جاگتی ہیں۔ صحیح بخاری میں شریک بن عبداللہ کے حوالے سے حضرت انس بن مالکؓ کی حدیث میں ہے۔ کہ

> وحی آنے سے پیشتر آپ کے پاس تین فرشتے آئے اس وقت آپ مسجد حرام میں تھے اور سو رہے تھے۔ ان میں سے پہلے نے کہا بھلا ان میں وہ شخص کون ہیں۔ درمیانی فرشتہ بولا جو درمیان میں لیٹے ہوئے ہیں۔ یہی سب میں افضل ہیں۔ آخری فرشتہ نے کہا اچھا جو ان سب میں بہتر ہیں ان کو لے چلو۔ اس شب تو اتنی بات ہو کر رہ گئی۔ پھر آئندہ کسی شب میں بھی فرشتے آپ کے خواب میں آئے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حالت یہ تھی۔ کہ جب سوتے تو صرف آپ کی آنکھیں سوتیں۔ دل بیدار رہتا تھا۔ اور تمام انبیا رکرام کا یہی حال ہوتا ہے۔ کہ جب سوتے ہیں تو صرف ان کی

آنکھیں سوتی ہیں۔ ان کے دل بیدار ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام نے آپ کو اپنی سپردگی میں لیا اور آسمانوں پر لے گئے۔ [1]

اصل حدیث میں الفاظ تنام اعینھم ولا تنام قلوبھم

موت اور نیند کم وبیش ایک ہی جنس کی چیزیں ہیں۔ فرق صرف اس قدر ہے کہ موت کی حالت میں جسم کو دائمی مفارقت ہو جاتی ہے۔ اور نیند میں عارضی ہوتی ہے۔ موت میں تمام تعلقات کے ظاہری بند ٹوٹ جاتے ہیں۔ اور نیند میں کچھ نہ کچھ گرہیں باقی رہتی ہیں۔ قرآن کی اس آیت میں اسی طرف راہنمائی ہے۔ اللہ یتوفی الانفس حین موتھا والتی لم تمت فی منامھا۔ یعنی اللہ ہی ہے جو روحوں کو موت کے وقت اور جن کی موت کا وقت ابھی نہیں آیا۔ ان کو نیند میں پورا پورا لے لیتا ہے۔

حضرت امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اس آیت کی تفسیر میں لکھتے ہیں۔

نیند میں توفی ایسی ہے۔ جیسے کوئی شخص شوق و ذوق کے ساتھ اپنے وطن مالوف سے سیر و تفریح کے لیے کہیں جائے اور سیر کے بعد خوش وخرم وطن واپس آجائے۔ یہ سیرگاہ عالم مثال ہے جس میں ملک و ملکوت کے عجائبات ہوتے ہیں۔

(مکتوب ۳۱ جلد سوم)

عربی زبان میں خواب کے لیے دو لفظ ہیں۔ ایک حلم جس کی جمع احلام آتی ہے۔ اس کے معنے خواب و خیال کے ہیں۔ دوسرا رؤیا یہ اس خواب کو کہتے ہیں۔ جس میں حقائق کی نمائش اور رمز شناسی ہو۔ ان دونوں

---

[1] شریک بن عبداللہ کی یہ روایت اگرچہ صحیح بخاری میں ہے مگر محدثین نے اس میں بہت سے اوہام شمار کیے ہیں۔ ازان جملہ یہ کہ اس میں معراج کا واقعہ نزول وحی سے پہلے بتایا گیا اور اس سے زیادہ یہ کہ واقعہ اسرا کو خواب کا واقعہ قرار دیا ہے۔ اسی لیے امام مسلمؒ نے لکھا ہے کہ شریک نے روایت میں واقعات کو گھٹا اور بڑھا کر اور آگے پیچھے کر دیا ہے۔ اس لیے آئمہ نے جیسا کہ قاضی عیاضؒ نے شفا میں اور امام نوویؒ نے شرح مسلم میں لکھا ہے۔ کہ شریک کی اس روایت میں بہت سے اوہام ہیں خیر اس پر تو تفصیلی بحث انشاءاللہ معالم القرآن کی پندرہویں جلد میں آرہی ہے یہاں تو صرف انبیاء علیہم السلام کی صفت تیقظ کو بیان کرنا مقصود ہے۔ یہ روایت بتا رہی ہے کہ یہ صفت تمام نبیوں میں ہوتی ہے اصل یہ ہے کہ جن قلوب کو اللہ سبحانہ مہبط وحی بناتا ہے ان کو عالم قدس سے ایک غیر معمولی اتصال میسر ہوتا ہے اسی بیداری کی وجہ سے انبیاء علیہم السلام کے خواب وحی ہوتے ہیں۔

میں ایک فرق ہے۔ حلم میں وسوسہ شیطانی کا دخل ہوتا ہے جبکہ رؤیا اس سے پاک ہوتا ہے۔

رؤیا کے مشاہدات کی حقیقی اور صحیح رؤیت ان ہی کے لیے ہوتی ہے۔ جن کی روح و دل کی بینائی تیز اور بصیرت کے آنکھیں روشن اور ادراک و عرفان کے حواس لطیف ہوں اور جن کے نفس کے آئینے میں صلاح و تقویٰ کا صیقل زیادہ ہو۔

دنیا کے تمام مذاہب نے رؤیا کو خاص اہمیت دی ہے۔ قرآن نے جس طرح دین کے دوسرے شعبوں کی تکمیل کی ہے۔ اس حقیقت کو بھی نہایت واضح اور روشن کر دیا ہے۔ معالم القرآن کی جلد گیارہ (۱۱) میں آیت لھم البشریٰ کے تحت پڑھ آئے ہو۔ کہ یہ آیت جب نازل ہوئی۔ صحابہ کرامؓ نے دریافت کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں بشارت کیا ہے۔ فرمایا وہ رؤیائے صالحہ ہے جو ایک مرد مسلم دیکھتا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ نبوت اور رسالت ختم ہو گئی ہے۔ لیکن صرف ایک چیز باقی رہ گئی اور وہ مبشرات ہیں۔ لوگوں نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مبشرات کیا ہیں۔ فرمایا مسلم کی رویائے صالحہ۔ یہ نبوّت کے اجزاء میں سے ایک جز ہے۔ بخاری و مسلم اور ترمذی کی متعدد روایتوں میں مختلف صحابہ سے مروی ہے۔ کہ آپ نے فرمایا کہ مومن کی رویائے صالحہ نبوت کے چھیالیس حصوں میں سے ایک حصّہ ہے۔ اس سے زیادہ رؤیا کی اہمیت اور کیا ہو سکتی ہے کہ وہ نبوّت کا ایک حصّہ ہے۔

خواب کے بشریٰ ہونے کا مطلب

یہ بھی سمجھ لو کہ خواب کے نبوت کا ۴۶ واں حصہ ہونے کا کیا مطلب ہے۔ بلا شبہ صحیح بخاری میں حضرت انسؓ سے ایک مرفوع روایت ہے۔ الرؤیا الحسنۃ من الرجل الصالح جزء من ستۃ واربعین جزء من النبوۃ۔ نیک آدمی کا اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ حدیث میں مسلم سے مراد فاسق و فاجر نہیں بلکہ صالح اور نیک شخص مراد ہے اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ نیک آدمی کبھی شیطانی خواب دیکھتا ہی نہیں بلکہ یہ مطلب ہے کہ جو شخص بیداری میں نبوّت کے نقش قدم پر چلتا ہے۔ صدق و اخلاص، امانت و دیانت داری اس کا شیوہ ہے۔ اندر باہر، دوست دشمن کسی کے ساتھ جھوٹ نہیں بولتا اس کی فطرت پر صدق و سچائی کا پورا نقش قائم ہو چکا ہے۔ وہ سونے کے بعد بھی شیطانی تسلط و حکومت میں نہیں آیا اس لیے اس کا جو خواب ہوتا ہے وہ اکثر اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس کے برخلاف جو شخص حالت بیداری میں جھوٹ اور دغا بازی کا عادی ہے وہ سونے کے وقت بھی شیطان ہی کے زیر اثر ہوتا ہے۔ اس کے خواب بھی اکثر شیطانی اتصال و تصرف

کا نتیجہ ہوتے ہیں۔ صحیح بخاری میں ہے۔

الرؤیا الصالحۃ من اللّٰہ والحلم من الشیطان

اچھا خواب اللہ کی جانب سے ہوتا ہے اور برا شیطان کی جانب سے

خلاصہ یہ کہ انسان بحالت خواب اپنی بیداری کے حالات کے تابع ہوتا ہے اگر اتنی بات معقول ہے تو یہ بھی سُن لیجئے کہ جس طرح انسان سونے کی حالت میں بیداری کے حالات کے تابع ہوتا ہے ٹھیک اسی طرح موت کے بعد اپنی حیات کے حالات کے تابع رہے گا۔ من کان فی ھذہٖ اعمیٰ فھو فی الآخرۃ اعمیٰ

خواب کے نبوت کا جز ہونے کا مطلب

یہ بھی سمجھ لینا چاہیئے کہ حدیث میں یہ دعویٰ نہیں ہے کہ ہر سچا خواب نبوت کا جز ہے۔ بلکہ اس کا خواب نبوت کا جز بتایا گیا ہے۔ جو شریعت کی زبان میں صالح ہو۔ علامہ قرطبیؒ شرح مسلم میں فرماتے ہیں کہ صالح سے مراد وہ شخص ہے کہ جو عبادات وعادات میں نبوت کے قدم بقدم ہو اطلاع علی الغیب نبوت کا خاصہ ہے۔ اس کی ابتداء اچھے اور سچے خواب ہیں۔ اور اس کی انتہا وحی ونبوت ہے یعنی بحالت بیداری اللہ سبحانہٗ یا فرشتہ کے ساتھ مکالمہ۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم بھی نبوت سے پہلے سچّے سچّے خواب دیکھتے تھے۔ چھ ماہ تک یہ سلسلہ جاری رہا ہے۔ اس کے بعد وحی آئی۔ نبوت کی مدت ۲۳ برس ہے۔ بعض علماء نے یہ دیکھ کر کہ ۶ ماہ ۲۳ سال کے مہینوں کا چھٹا حصّہ ہے۔ یہ کہہ دیا ہے کہ حضرت انسؓ کی حدیث میں رؤیائے مؤمن کو اسی لیے چھیالیسواں حصّہ بتایا گیا ہے۔ حافظ ابن حجرؒ نے فتح الباری میں اس پر مبسوط بحث کی ہے۔ باقی رہی یہ بات کہ اگر خواب نبوت کا حصّہ ہیں تو کیا خواب کو مختصر نبوت کہا جاسکتا ہے۔ تو اس سلسلے میں یہ بات پیش نظر رہنی چاہیئے کہ قرآن وحدیث دونوں متفق ہیں۔ کہ نبوت ختم ہوچکی ہے تشریعی یا غیر تشریعی نبوت کی کوئی قسم اب باقی نہیں ہے۔

رؤیا کو نبوت کا چھیالیسواں حصہ کہنے سے یہ سمجھنا کہ نبوت جاری ہے۔ صحیح نہیں ہے۔ کیوں کہ احادیث میں ایک طرف اگر رؤیا کو چھیالیسواں حصہ بتایا ہے تو دوسری طرف کچھ بلند اخلاقیوں کو چھبیسواں حصّہ قرار دیا گیا ہے۔ ارشاد ہے۔

التؤدۃ والاقتصاد وحسن السمت من ستۃ وعشرین جزءً من النبوۃ۔ بردباری، متانت، میانہ روی اور اچھی روشن نبوت کا چھبیسواں جزء ہے۔

بہر حال حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بتایا کہ بیٹا اس خواب کا ذکر بھائیوں سے نہ کرنا ممکن ہے کہ بھائی تمہارے خلاف کچھ کر بیٹھیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے خواب سنتے ہی یہ اندازہ فرما لیا۔ کہ یہ منصب نبوّت پر سرفرازی کا اشارہ ہے یا جیسا کہ القاشانی کی رائے ہے۔ کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو یہ بات الہاماً معلوم ہوئی۔ اور وجہ یہ بتائی۔ ان الشیطان للانسان عدو مبین۔ یعنی کھلا ہوا دشمن شیطان تو موجود ہی ہے۔

شارحین قرآن نے اس انداز بیان سے یہ بھی معلوم کیا ہے۔ کہ کسی وقت حسد کے اندیشہ سے لوگوں سے اچھائی اور خوبی کو چھپا لینا برتری ہے۔ اس سے یہ اجتماعی قانون بھی اشارۃً معلوم ہو رہا ہے کہ نیکی، خوبی اور حسن اگر کسی قبیح یا برائی کا ذریعہ بن جائے تو وہ قبیح اور برائی ہو جاتا ہے۔ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی قدس اللہ سرہٗ العزیز نے اس سے یہ بھی سمجھا ہے کہ مرید کو اپنے شیخ کے علاوہ کسی سے اپنے احوال بیان نہ کرنے چاہئیں۔ اس میں ضرر کا اندیشہ ہے۔ آیت سے یہ بھی معلوم ہو رہا ہے۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی خاندان نبوت سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر وہ نبی نہ تھے۔ محققین کی یہی رائے ہے۔ کہ برادران یوسف نبی نہ تھے۔ علامہ محمود آلوسیؒ لکھتے ہیں۔ کہ

صحابہ کرامؓ میں سے کسی سے برادران یوسف کے نبی ہونے کا نظریہ منقول نہیں ہے اور نہ ہی تابعین سے۔

حافظ ابن تیمیہؒ نے اس موضوع پر ایک رسالہ میں تفصیلی بحث کی ہے جس کی طرف شیخ الاسلام نے افادات میں اشارہ کیا ہے علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں اس کا خلاصہ پیش کیا ہے۔

قرآن و لغت بتا رہے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی انبیاء نہ تھے۔ قرآن، حدیث آثار صحابہ میں کوئی بات ایسی نہیں ہے۔ جس کے سہارے ان کی نبوت کو شرف پذیرائی دیا جائے۔ نبی کہنے والوں کا بڑے سے بڑا استدلال یہ ہے کہ البقرہ اور سورۃ یوسف میں والاسباط آیا ہے۔ اور اسباط سے مراد اولاد یعقوب ہے۔ لیکن یہ صحیح نہیں ہے۔ اسباط سے حضرت یعقوب علیہ السلام کی صلبی اولاد مراد نہیں ہے۔ بلکہ ذریت مراد ہے۔ ان کو بنی اسرائیل ایسے بولا جاتا ہے جیسے ذریت آدم کو بنو آدم کہا جاتا ہے۔ قرآن میں اللہ سبحانہٗ کا ارشاد ومن قوم موسٰی امۃ اور وقطعنا ھم عشرۃ اسباطا امما۔ یہ بات کھول کر بتائی گئی ہے۔ کہ اسباط بنی اسرائیل کی امتیں ہیں۔ علماء نے تصریح کی ہے کہ بنی اسرائیل میں اسباط کی وہی حیثیت ہے جو بنی اسمٰعیل میں قبائل کی ہے۔ لفظ سبط کے لغوی معنے ایک ایسے گھنے درخت کے ہیں۔ جس کی شاخیں زیادہ ہوں۔ لہذا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارہ بیٹوں کو اسباط کہنا بے معنے

ہے۔ اس لفظ کے استعمال کی تاریخ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ سے وابستہ ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانہ ہی سے بنی اسرائیل میں انبیاء آئے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کے علاوہ بنی اسرائیل میں کوئی نبی نہیں ہے۔ قرآن سے بھی یہی معلوم ہوتا ہے۔ قرآن نے ذریت ابراہیمؑ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت داؤد، سلیمان اور حضرت یوسف علیہم السلام کا ذکر کیا ہے۔ اگر یوسف علیہ السلام کے بھائی بھی نبی ہوتے تو قرآن ضرور ذکر کرتا۔ نیز ارشاد نبوت میں اکرم الناس یوسف بن یعقوب ابن اسحاق ابن ابراہیم آتا ہے۔ اگر بھائی بھی نبی تھے تو اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی کوئی کرامت نہیں ہے۔

اور اس پہلو پر غور فرمایئے کہ قرآن نے انبیاء کے محامد بیان کیے ہیں۔ اگر برادران یوسف نبی ہوتے تو کیا قرآن ان کی طرف ان جرائم کی فہرست بیان کرتا جو ان کے بارے میں قرآن نے پیش کی ہے۔ مثلاً والد کی نافرمانی، قطع رحمی، آزاد مسلم کو غلام بنانا اور اسے کافروں کے ہاتھ فروخت کرنا، جھوٹ بولنا اگر برادران کے نبی نہ ہونے کی کوئی بھی دلیل نہ ہو تو صرف ان جرائم سے ان کے دامنوں کا داغدار ہونا ہی ان کے نبی نہ ہونے کی سب سے بڑی دلیل ہے۔[1]

⑤ حضرت یوسفؑ کو نبوت کی بشارت

بیٹے اسی طرح اللہ سبحانہ تجھے برگزیدگی عطا کرے گا۔ اور اس بات کا علم عطا فرمائے گا کہ باتوں کا نتیجہ کیا ہو۔ نیز جیسے تیرے بزرگوں ابراہیم و اسحاق پر اللہ انعام کر چکا ہے ایسے ہی تجھ پر اور آل یعقوب پر اتمام نعمت کرے گا۔ بلاشبہ تیرا رب سب کچھ جاننے والا اور اپنے کاموں میں حکمت والا ہے۔ یعنی جس طرح ایسا خواب دکھلایا اسی طرح محض جاذبہ رحمت سے اپنی بارگاہ قرب میں تجھ کو خصوصی انعام و مقام عطا فرمائے گا۔ چنانچہ نبوت عطا فرمائی اور طرح طرح کی ظاہری و باطنی نوازشیں کیں۔ آگے حضرت یعقوب علیہ السلام نے یہ بھی بشارت دی ویعلمک من تاویل الاحادیث مثلاً تعبیر رؤیا یعنی خواب سن کر اس کے اجزاء کو ذہانت و فراست سے ٹھکانے لگا دینا۔ یا ہر بات کے موقع و محل کو سمجھنا اور معاملات کے عواقب و نتائج کو فوراً بھانپ لینا یا اللہ سبحانہ اور پیغمبروں کے ارشادات اور اقوام و امم کے سمجھنے اور کتب نزلہ کے مضامین کی تہہ تک پہنچ جانا یہ سب چیزیں تاویل الاحادیث کے تحت میں مندرج ہو سکتی ہیں۔ اس کے بعد یہ بشارت بھی دی۔ کہ ویتم نعمتہ علیک وعلی آل یعقوب۔ یعنی

---

[1] روح المعانی

ظاہر ہے کہ ان اخلاقی خوبیوں کی وجہ سے کسی کو نبی نہیں کہا جاسکتا ہے۔ جب چھبیسویں حصے کو نبوت نہیں کہا جاسکتا تو چھیالیسویں جزء کو نبوت کیسے کہا جاسکتا ہے۔ علامہ ابن جوزی کہتے ہیں کہ رُویائے صالحہ کو صرف تشبیہی لحاظ سے نبوت کا جزء کہا گیا ہے علامہ ابن الیقن کہتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو غیب کی خبریں وحی کے ذریعے دی جاتی ہیں۔ اب یہ سلسلہ تو منقطع ہوگیا ہے۔ خواب کا سلسلہ باقی ہے اس اعتبار سے رؤیا کو اجزاء نبوت کا حصہ شمار کیا گیا ہے۔ کچھ علماء کہتے ہیں۔ کہ جو خواب جزء نبوت قرار دیا گیا ہے۔ وہ ہر شخص کا خواب نہیں بلکہ نبوت کا خواب ہے۔ مگر یہ جواب کچھ بے وزن ہے۔

اصل بات یہ ہے کہ جزء ہمیشہ اپنے کل کے مغائر ہوتا ہے۔ دیکھ لیجئے یہی کلمات جو اذان میں بولے جاتے ہیں۔ مل کر اذان کہلاتے ہیں لیکن علیحدہ ہو کر اذان نہیں کہلاتے۔ عناصر اربعہ آگ، پانی، مٹی، ہوا انسان کے اجزاء ہیں۔ مگر ان میں سے کسی کو انسان نہیں کہتے ہیں۔ پانی اگر انسان کا چوتھا حصہ ہے مگر پانی انسان ہرگز نہیں ہے۔ اگر یہ خالص عقلی حقیقت ہے۔ تو پھر رؤیا اپنے کل سے الگ ہو کر نبوت کیسے ہوسکتا ہے؟ بات صاف ہے کہ رؤیائے صالحہ نبوت کے حقیقی اجزاء میں سے نہیں۔ بلکہ اس کے لوازم اور خصائص میں سے ہے کیونکہ نبوت کسی حقیقت مرکبہ کا نام نہیں ہے۔ جس کی تحصیل کی جاسکے وہ تو ایک منصب ہے۔ جس کا سرچشمہ اصطفاء و اجتباء خداوندی ہے۔ اس کے خصائص و لوازم کو مجازاً اجزاء بولا جاتا ہے۔ یہاں حضرت امام بخاری نے اپنی صحیح میں بڑی دقت نظر سے عجیب جدت طرازی کی ہے۔ پہلے ترجمۃ الباب میں یہ حدیث نقل کی ہے "اچھا خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہوتا ہے" اس کے بعد یہ حدیث لائے۔ الرؤیا من اللہ والحلم من الشیطان اچھے خواب اللہ کی جانب سے ہوتے ہیں اور بُرے شیطان کی جانب سے شارحین بخاری حیران ہیں کہ حدیث کا موضوع سے کیا جوڑ ہے۔ حافظ ابن حجرؒ لکھتے ہیں کہ یہاں امام بخاری رؤیائے صالحہ کے جزء نبوت ہونے کی ایک لطیف حکمت کی طرف اشارہ کرنا چاہتے ہیں۔

انما کانت جزءً من اجزاء النبوۃ لانہا من اللہ بخلاف التی من الشیطان فانہا لیست من الاجزاء۔

یعنی رؤیائے صالحہ کے اجزاء نبوت میں سے ہونے کی وجہ یہ ہے۔ کہ وہ اللہ سبحانہٗ کی جانب سے ہوتا ہے۔ اس کے برعکس وہ خواب جو شیطان کی جانب سے ہو اجزاء نبوت میں سے نہیں ہے۔ غالباً امام بخاری بتانا یہ چاہتے ہیں کہ جیسے وحی کی دو قسمیں ہیں۔ من اللہ اور من الشیطان ایسے ہی خواب بھی دو طرح کا ہوتا ہے۔ رحمانی اور شیطانی خواب رحمانی کا رشتہ نبوت سے ہے خواب شیطانی کا نبوت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

اخروی نعمتوں کے ساتھ دنیوی نعمتیں عطا فرمائے گا۔ نبوت کے ساتھ بادشاہت میں حصہ دے گا۔ اور شوائد و محن سے نجات دے کر خوشحالی و فروغ بالی کی زندگی نصیب کرے گا۔ جیسا کہ اللہ نے تیرے والدین اسحاق و ابراہیم پر اس سے پہلے اتمام نعمت کیا۔ حضرت یعقوبؑ نے تواضعا اپنا نام نہیں لیا۔ اپنے والد حضرت اسحٰقؑ اور ان کے والد حضرت ابراہیم علیہم السلام کا ذکر فرمایا۔ حضرت ابراہیم کو اللہ سبحانہٗ نے اپنا خلیل اور نبی بنایا۔ اور انکے ذریعے نمرود کو ہلاک کیا۔ آگ کے شعلوں کو ان کے لیے گلزار بنایا۔ حضرت اسحٰق علیہ السلام کو نبوت عطا کی۔ پھر ان کی صلب سے حضرت یعقوب علیہ السلام جیسا نبی پیدا کیا۔ جس سے تمام انبیاء بنی اسرائیل کا سلسلہ چلا۔ حدیث صحیح میں ہے۔ الکریم ابن الکریم ابن الکریم ابن الکریم یوسف ابن یعقوب ابن اسحٰق ابن ابراھیم علیہم السلام۔ حضرت یعقوبؑ نے جو پیشن گوئی کی تھی۔ اس کا کچھ حصہ تو غالباً حضرت یوسف علیہ السلام کے خواب سے سمجھے اور اس سے کہ اتنی چھوٹی عمر میں ایسا موزوں خواب دیکھا۔ اور کچھ حضرت یوسف علیہ السلام کے خصائل و شمائل سے یا وحی الٰہی کے ذریعہ سے مطلع ہوئے ہوں گے آخر میں فرمایا ان ربك علیم حکیم۔ یعنی وہ ہر ایک کی مناسبت اور استعداد سے باخبر ہے۔ اپنی حکمت سے اسی کے مناسب فیض پہنچاتا ہے۔[۱]

یہ تو ہے حضرت شیخ الاسلام کا تبصرہ۔ اب سنیے تفصیل۔ آیت قرآنی میں بنیادی اور اہم شہادتیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کو حضرت یعقوب علیہ السلام نے دی ہیں۔ یہ ہیں۔

اوّل۔ اجتبار، دوم تعلیم تاویل الاحادیث، سوم اتمام نعمت۔ سب سے پہلے کذالك پر غور فرمایئے۔ دو صورتیں ہیں۔ ایک یہ کہ جیسا اللہ سبحانہٗ نے اسحٰق و ابراہیم پر اپنی نعمتوں کا فیضان فرمایا ہے۔ ایسا ہی تجھے بھی اجتبار کی نعمت عطا فرمائے گا۔ دوسرے یہ کہ جیسے اللہ سبحانہٗ نے اس وقت رؤیا کی نعمت سے مالامال کیا ہے۔ ایسے ہی مستقبل میں تجھے اجتبار کی دولت سے ہمدوش کریگا۔ البقاعیؒ لکھتے ہیں۔

> اللہ سبحانہٗ نے اس رؤیا کی نعمت سے ہمدوش کیا ہے۔ اسی ہمدوشی کی طرح تجھے اللہ سبحانہٗ برگزیدگی عطا کرے گا اور بلند سے بلند تر مقامات کا تیری ذات کو مجمع بنائے گا۔

اور قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں۔

> جیسا کہ تجھے تیرے رب نے اس عظیم رؤیا سے برگزیدگی عطا فرمائی ایسے ہی تجھ کو تیرا رب نبوت اور حکومت کا شرف عطا کرے گا۔

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

مطلب یہ ہے کہ اس خواب کے ذریعے تمہاری آئندہ عزت افزائی کی ایک جھلک تمہیں دکھا دی گئی ہے۔ اسی طرح اور بھی عزتیں پردہ غیب میں تمہاری منتظر ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب خواب سنا تو چونکہ یہ بات ان کے علم میں تھی کہ نبوت کا آغاز رؤیائے صادقہ سے ہوتا ہے اور اس خواب کا ظاہر یہی بتا رہا تھا کہ یہ سچا خواب ہے اور خواب دیکھنے والے کے لیے ایک شاندار مستقبل کی پیشین گوئی کر رہا ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے فرمایا کہ جو کچھ تم نے دیکھا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ جلد وہ وقت آنے والا ہے جب تمہارا رب تمہیں منصب نبوت کے لیے منتخب فرمائے گا۔

اجتبار کے معنے

اجتبار جبی سے باب افتعال ہے۔ اس کے معنے برگزیدہ کرنے کے ہیں۔ اصل اس کی جبیت الشئی ہے۔ یعنی کسی چیز کو حاصل کر لینا۔ اسی سے عربی میں جبیت المار فی الحوض بولا جاتا ہے۔ اس جگہ کو جابیہ بولتے ہیں۔ اور اسی سے بطور استعارہ خراج کو جبابہ بولا جاتا ہے۔ اللہ سبحانہٗ کو مجتبی بنانا یہ ہے کہ ایسے فیضان الٰہی کے لیے اسے مخصوص کر لیا جائے کہ بغیر محنت اور تگ و دو کے چند در چند انعامات حاصل ہو جائیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام بتا رہے ہیں کہ اللہ سبحانہٗ مستقبل میں تجھ پر نبوت کا فیضان فرمائے گا۔ یہ گویا نبوت کی استعداد کا فیضان ہو رہا ہے۔ اور اس فیضان کی علامت حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب ہے۔ اسی لیے اس کے فوراً بعد ویعلمک آیا ہے۔ یہ اس علم کا ذکر نہیں جس کا منشار وحی موجب ہے۔ کیونکہ یہاں سیاق کلام میں علم کے یکبارگی دینے کا ذکر ہے۔ جو وحی موجب کی شان نہیں خصوصاً تاویل الاحادیث کا علم بیک وقت دیئے جانے کی تصریح ہے۔ اسی لیے حضرت یوسف علیہ السلام نے ایک خواب کی تعبیر بیان کر کے فرمایا۔ ذالکما مما علمنی ربی۔ یہ کہیں نہیں بتایا ہے کہ خواب کی تعبیر بتاتے وقت ان پر وحی آ کر ان کو حقیقت سے مطلع کرتی تھی۔ بلکہ ان کے اندر خود یہ علمی قوت ہمیشہ کے لیے ودیعت کر دی گئی تھی۔ اسی قسم کا وہ علم ہے جس کی نسبت سے بعض انبیار کو بچپن ہی میں علیم کا خطاب ملا۔ وبشرد ہٗ بغلام علیم۔ اس سے معلوم ہوا کہ وحی موقت جو گاہ گاہ آتی ہے اسکے علاوہ علم کا ایک دائمی عطیہ نبی کی شان ہے۔

تاویل الاحادیث پر ہم پہلے تبصرہ کر چکے ہیں اس کے تکرار کی ضرورت نہیں ہے۔

اتمام نعمت کا مطلب

ارشاد میں ویتم نعمتہٗ علیک وعلی آل یعقوب آخر تک آیا ہے۔ اس کا مطلب

شارحین قرآن نے یہ بتایا ہے۔ کہ اتمام نعمت نبوت ہے۔ بیضاویؒ اور قرطبیؒ کا بھی یہی خیال ہے اور قرآن میں تشبیہ کما اتمھا کا تقاضا بھی یہی ہے۔ اسی وجہ سے علامہ آلوسیؒ نے دین و دنیا کی ہم آہنگی کو اتمام نعمت قرار دیا ہے۔ لیکن قرآن میں جس سیاق میں یہ بات کہی گئی ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ تاویل الاحادیث اور اتمام نعمت دو الگ چیزیں ہیں۔ نبوت کا ذکر اجتبا ر میں ہو چکا ہے۔ تاویل الاحادیث کے بعد جو چیز ہے۔ وہ اقتدار ہے تحت اقتدار پر ممکن ہونے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے جو دعا فرمائی اس سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

رب قد اتیتنی من الملك وعلمتنی من تاویل الاحادیث

اے میرے رب تُو نے مجھے حکومت عطا فرمائی اور تُو نے مجھے تاویل الاحادیث سکھائی ہے

اس سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ نعمت اقتدار و حکومت ہے۔ اور یہ دین و شریعت کے ساتھ ملتا ہے۔ تو یہ اتمام نعمت ہے۔ نعمت تو واقعی دین و شریعت ہے اور دین و شریعت کے ساتھ جب اللہ سبحانہٗ حکومت بھی دے دیں تو یہ اتمام نعمت ہے۔ دین و آمیزش کے ساتھ دولت و حکومت سرتاسر رحمت ہے۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں قرآن نے تو سلیمانؑ و داؤدؑ کا بھی یہی چہرہ پیش کیا ہے۔ بلکہ اوروں کا تو پتہ نہیں مگر میں تو ایسا ہی سوچتا ہوں کہ سورۃ کہف میں ذوالقرنین کے نام سے جس تخیلی قصہ کا ذکر ہے اس کے متعلق یہ سوال کہ ذوالقرنین کون تھے؟ کہاں تھے؟ اور کب تھے؟ اس کی بجائے اگر یہ سوچا جاتا کہ ایک ایسی ہستی جسے زمین کے اتنے طول و عرض پر اقتدار بخشا گیا کہ گویا مغرب الشمس اور مطلع الشمس تک اس کی حکومت پہنچ گئی تھی۔ اور اتنی بولیاں بولنے والوں پر اس کا اقتدار تھا اور اتنی سائنسی ترقی اسے دے دی گئی تھی۔ کہ لوہے کی اینٹیں بنا کر بجائے گارے کے رنگ پگھلا کر ان اینٹوں کو جوڑ کر دیوار بنا رہا تھا۔ جس کے معنی یہی ہیں کہ ایسی ایجادات و اختراعات پر اسے بھرپور قدرت حاصل تھی۔ جسے سائنس اور کیمیا کے اس دور میں بھی حقارت کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ لیکن باوجود ان تمام سائنسی ترقیوں کے جب وہ دیوار بنا کر فارغ ہوئے تو بجائے کسی بڑائی یا کبریائی کے دیوار کی طرف اشارہ کر کے فرماتے ہیں۔ ھذہ رحمۃ من ربی۔ یہ میرے مالک کی مہربانی ہے۔ بتانا یہ ہے۔ کہ جب دین و دنیا میں ہم آہنگی ہوتی ہے تو یہ اللہ کی سب سے بڑی رحمت ہے۔

ذرا ٹھہر جایئے یہی بات جس کی بشارت مستقبل میں حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کو دے رہے ہیں۔ قرآن نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو دی ہے۔ ویتم نعمتہٗ علیك.

تاکہ ان کا رب آپ پر نعمت کا اتمام کرے۔ اور یہی بات اہل ایمان سے مستقبل کے بارے میں کہی گئی۔ ولاتم نعمتی علیکم۔ اور حجۃ الوداع میں اس وعدے کو پورا کرنے کا یہ کہہ کر اعلان کیا ہے۔

الیوم اکملت لکم دینکم واتممت علیکم نعمتی ورضیت لکم الاسلام دینا۔

آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارا دین کامل کر دیا۔ اور اپنی نعمت میں نے تم پر پوری کر دی۔ اور تمہارے لیے میں نے دین اسلام کو پسند کر لیا۔

ان آیات کو ملانے سے یہ بات کھل کر سامنے آجاتی ہے۔ کہ اتمام نعمت سے مراد یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام ہر جگہ، ہر خوف اور ہر مداخلت سے محفوظ ہو کر پوری طرح وحی الٰہی پر مبنی تمدن الٰہی کے قوانین کے مطابق زندگی بسر کرنے کے قابل ہو جائیں گے اور ان کو یہ طاقت بھی نصیب ہو جائے گی کہ نبوت کے قانونی اور سیاسی تقاضے پورے کر سکیں۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اور امت مسلمہ سے جن چھ آیات میں اتمام نعمت کا وعدہ کیا گیا ہے۔ وہاں بھی اتمام نعمت سے امت مسلمہ اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا مادی، قانونی، سیاسی اور اجتماعی غلبہ مراد ہے۔

لَقَدۡ
كَانَ فِیۡ یُوۡسُفَ وَاِخۡوَتِهٖۤ اٰیٰتٌ لِّلسَّآئِلِیۡنَ ﴿۷﴾ اِذۡ قَالُوۡا لَیُوۡسُفُ
وَاَخُوۡهُ اَحَبُّ اِلٰۤی اَبِیۡنَا مِنَّا وَنَحۡنُ عُصۡبَةٌ ؕ اِنَّ اَبَانَا لَفِیۡ
ضَلٰلٍ مُّبِیۡنِۣ ﴿ۚۖ۸﴾ اقۡتُلُوۡا یُوۡسُفَ اَوِ اطۡرَحُوۡهُ اَرۡضًا یَّخۡلُ
لَكُمۡ وَجۡهُ اَبِیۡكُمۡ وَتَكُوۡنُوۡا مِنۡۢ بَعۡدِهٖ قَوۡمًا صٰلِحِیۡنَ ﴿۹﴾ قَالَ
قَآئِلٌ مِّنۡهُمۡ لَا تَقۡتُلُوۡا یُوۡسُفَ وَاَلۡقُوۡهُ فِیۡ غَیٰبَتِ الۡجُبِّ
یَلۡتَقِطۡهُ بَعۡضُ السَّیَّارَةِ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِیۡنَ ﴿۱۰﴾

حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی داستان تاریخی میں ان لوگوں کے لیے جو حقیقت حال پوچھنے والے ہیں بڑی ہی عبرت و نصیحت کی نشانیاں ہیں [۶] جس وقت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا کہ بلاشبہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے ابا کا سب سے زیادہ لاڈلا ہے۔ حالانکہ ہم ان سے زیادہ طاقتور جماعت ہیں۔ یقیناً ہمارے والد اس معاملہ میں غلطی پر ہیں [۸] آؤ یوسف کو مار ڈالیں یا کسی ملک میں پھینک آئیں۔ تاکہ باپ کی توجہ کا مرکز باقی بھائی ہو جائیں۔ اور یوسف کے بعد سارے

ٹھیک ٹھاک ہو جائیں[8] ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا یوسف کو قتل نہ کرو اسے گمنام کنویں میں ڈال دو اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے تو یہ کر لو۔ اس طرح یوسف کو کوئی قافلہ اٹھا لے گا[9]

معانی مفردات

عصبۃ ۔ جماعت، گروہ۔ یہ عصب سے ماخوذ ہے جس کے معنے جمع ہونے اور گھیرنے کے ہیں، علامہ زمخشریؒ لکھتے ہیں عصبۃ اور عصابۃ۔ دس اور دس سے زیادہ اشخاص کو کہتے ہیں۔ ان کا یہ نام اس لیے پڑا کہ اتنے اشخاص سے سب کاموں میں قوت آجاتی ہے۔ اور وقت پڑنے پر یہ لوگ کافی سمجھے جاتے ہیں۔ اور امام ابن جریر طبریؒ نے تصریح کی ہے۔ کہ نفر اور رہط کی طرح اس کا بھی واحد نہیں آتا۔ اور مصباح میں ہے کہ عصبۃ مردوں کی جماعت ہے۔ اور اس کی جمع عصب ہے جیسے غرفۃ کی جمع غرف۔ راغب اصفہانی کہتے ہیں "عصبۃ وہ جماعت ہے۔ جو ایک دوسرے کی مددگار ہو۔ نحن عصبۃ یعنی ہماری بات ایک ہے اور ہم ایک دوسرے کے مددگار ہیں۔ عصبۃ کتنے افراد کی جماعت ہے۔ اس موضوع پر ابو حیان اندلسیؒ نے البحر المحیط میں متعدد اقوال پیش کیے ہیں۔

ضلال ۔ گمراہی، راہ سے بھٹکنا، راہ سے دور جا پڑنا، کھو جانا، ضائع ہونا، گم ہو جانا، ہلاک ہو جانا۔ جمال قریشی لکھتے ہیں" ضلال بالفتح ضائع ہونا، گم ہونا اور مغلوب ہو جانا ہے۔ ضل الماء فی اللبن۔ یعنی پانی اتنا مغلوب ہوا۔ کہ دودھ میں اس کا اثر ظاہر نہیں ہوا۔ اور اسی سے یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی زبانی یہ بات قرآن میں ہے۔ ان ابانا لفی ضلال مبین۔ ہمارے والد تو ان دونوں کی محبت میں مغلوب ہیں۔

غیابۃ الجب :۔ کنویں کی تہہ کو غیابۃ اور کچے کنویں کو جُب کہتے ہیں۔ صحرائی راہوں میں جن پر قافلے گزرتے ہیں۔ اس طرح کے کنویں ہوتے تھے۔

یہ داستان عبرتوں اور نصیحتوں کا خزانہ ہے

قرآن کی معجزانہ بلاغت یہ ہے۔ کہ وہ داستان سرائی نہیں کرتا۔ ایک دو لفظوں میں سب کچھ کہہ دیتا ہے۔ یہاں شروع میں قرآن نے اپنے مخاطبوں کو تنبیہ کی ہے کہ یہ صرف ایک کہانی نہیں ہے۔ بلکہ اس میں بہت سے سوالوں کے جوابات ہیں۔ جو دعوت محمدیہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دور میں بگانوں اور بیگانوں کے ذہنوں میں چٹکیاں لے رہے ہیں۔ اور سوال بھی ایک نہیں متعدد ہیں۔ حقیقت شناس کو اس میں ہر سوال کا جواب ملے گا۔ عائلی، اخلاقی، معاشرتی، معاشی، سیاسی اور قانونی غرض زندگی سے متعلق جو سوال بھی آپ کے ذہن میں اُبھرے گا حضرت یوسف علیہ السلام کی داستان آپ کو اس کا جواب دے گی۔

ذرا آپ سوچیں کہ

اگر حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی حسد کی چنگاری نہ بھڑکتی تو بلاشبہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں نہ ڈالتے۔ اور اگر وہ کنویں میں نہ ڈالتے تو قافلے والے کنویں کی جیل سے رہائی نہ دلاتے۔ لیکن کیسی رہائی؟ ایسی رہائی جس میں ایک ہلاکت سے نجات مل گئی لیکن دوسری ہلاکت نمودار ہو گئی۔ لیکن اگر یہ رہائی نہ ہوتی اور قافلے والے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نہ نکالتے تو حضرت یوسف علیہ السلام بازار مصر میں نہ جاتے۔ مصر میں داخلہ ایک غلام کا داخلہ تھا۔ اگر وہ غلام نہ بنتے مصر کے بازار میں نہ جاتے اور عزیز مصر تک ان کی رسائی نہ ہوتی یہ انقلاب حال بجائے خود عجیب تھا۔ لیکن اس سے عجیب تر وہ معاملہ تھا جب اس زرخرید غلام کے سامنے بیک وقت دو باتیں پیش ہوئی ہیں۔ نفسانی زندگی کی سب سے بڑی عشرت اور انسانی زندگی کی سب سے بڑی محرومی۔ اگر وہ پہلی سے بھاگ کر دوسری کو پذیرائی نہ دیتے تو جیل کے قیدی نہ بنتے اگر وہ جیل کے قیدی نہ بنتے تو بادشاہ کے ساقی سے ان کا تعارف نہ ہوتا اور تعبیر رؤیا کے فن کی نمائش نہ ہوتی اور ایک معبّر کی حیثیت سے بادشاہ مصر تک رسائی نہ ہوتی۔ اس سے بھی زیادہ عجیب یہ کہ بادشاہ مصر خواب دیکھتا ہے۔ تعبیر کے لیے تگ ودو ہوتی ہے۔ ساقی حضرت یوسف علیہ السلام کا نام بتاتا ہے۔ اور اس قیدی کے لیے اچانک قید خانے کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ بادشاہ مصر کو تعبیر بتلاتے ہیں۔ بادشاہ کو دعوت ایمان دیتے ہیں۔ بادشاہ مصر حکومت کے کاروبار میں شرکت کی پیش کش کرتا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کہہ رہے ہیں۔ اجعلنی علی خزائن الارض۔ یہ فی الحقیقت

دین حق اور فیضان وحی کا اعلان تھا۔ یعنی آج مملکت کی نجات کے لیے ایسے شخص کی ضرورت ہے جو علم وکار روائی کے ساتھ حفاظت کرنے والا ہو۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام اس منصب پر نہ پہنچتے تو حضرت یعقوب علیہ السلام کی صبر کی منزل، ناتمام راہنمائی، خواب کی تعبیر شرمندہ حقیقت نہ ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے اس واقعہ کے بارے میں یہ دعویٰ کیا ہے کہ پوچھنے والوں کیلیے اس میں عبرتیں ہیں۔

(۶) حضرت یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی تاریخی داستان میں ان لوگوں کے لیے جو حقیقت حال پوچھنے والے ہیں بڑی ہی عبرت اور نصیحت کی نشانیاں ہیں۔ یعنی جو لوگ اس طرح کے واقعات دریافت کر کے کسی نتیجے پر پہنچنا چاہتے ہیں۔ ان کے لیے یوسف علیہ السلام اور ان کے بھائیوں کی سرگزشت میں ہدایت اور عبرت کی بہت سی نشانیاں موجود ہیں۔ اس قصہ کو سن کر قلوب میں حق تعالیٰ شانہٗ کی عظیم قدرت وحکمت کا نقش جم جاتا ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت کا بین ثبوت ملتا ہے۔ کہ آپ باوجود اُمی ہونے کے اور کسی کتاب ومعلم سے استفادہ نہ کرنے کے ایسے منقح ومنضبط تاریخی حقائق کا انکشاف فرما رہے ہیں جن کے بیان کی بجز اعلام ربانی کے کوئی توجیہ نہیں ہو سکتی۔ خصوصاً قریش مکہ کے لیے جو یہود کے اکسانے سے اس قصے کے متعلق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کر رہے تھے۔ اس واقعہ میں بڑا عبرت آموز سبق ہے۔ کہ جس طرح حضرت یوسف ؑ کو بھائیوں کے گھر سے نکالا۔ ازراہ حسد قتل یا جلا وطن کرنے کے مشورے کیے۔ طرح طرح سے ایذائیں پہنچائیں۔ اہانت واستخفاف میں کوئی دقیقہ اُٹھا نہ رکھا۔ آخر ایک دن آیا کہ یوسف علیہ السلام کی طرح نادم ومحتاج ہو کر آئے۔ یوسف علیہ السلام کو اللہ سبحانہٗ نے دین ودنیا کے اعلیٰ مناصب پر فائز کیا۔ اور انہوں نے اپنے عروج واقتدار کے وقت بھائیوں کے جرائم سے چشم پوشی کی اور نہایت دریا دلی سے سب کے قصور معاف کر دیئے۔ ٹھیک اسی طرح حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی برادری نے آپ کے متعلق ناپاک منصوبے باندھے دکھ پہنچائے۔ عزت وآبرو پر حملے کیے۔ حتیٰ کہ وطن چھوڑنے پر مجبور کر دیا لیکن جلد وہ دن آنے والا ہے جب وطن سے علیحدہ ہو کر آپ کی کامیابی اور رفعت شان کا آفتاب چمکا۔ اور چند سال بعد فتح مکہ کا وہ تاریخی دن آن پہنچا جبکہ آپ نے اپنے قومی اور وطنی بھائیوں کی گزشتہ تقصیرات پر بعینہٖ حضرت یوسف علیہ السلام والے کلمات لَا تَثْرِيبَ عَلَيْكُمُ الْيَوْمَ۔ فرما کر قلم محو کھینچ دیا۔[1] حسد وبغض کا نتیجہ وہی ہے جو بھائیوں نے پایا۔ راست بازی اور نیک عملی کا نتیجہ وہی ہے۔ جو

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حضرت یوسف علیہ السلام کو ملا صبر جمیل کبھی اس نتیجہ سے محروم نہیں رہ سکتا جو حضرت یعقوب علیہ السلام کے حصے میں آیا۔ معصیت کے بیج سے ہمیشہ وہی پھل پیدا ہوگا جو امرأۃ العزیز کے نصیب ہوا تھا۔ جھوٹ کتنا ہی سوچ سمجھ کر بنایا گیا ہو سچ نہیں ہوسکتا۔ سچ کتنے ہی ناموافق حالات میں اپنے کو پائے لیکن جھوٹ نہیں ہوسکتا۔ علم وفضیلت ہر حال میں ایک حکمران قوت ہے۔ سب کو اس کے آگے جھکنا پڑے گا۔ حسن عمل ہر حال میں ایک فتح مند حقیقت ہے۔ سب کو اس کا لوہا ماننا پڑے گا۔ واقعہ میں چار کردار ہیں۔ دو فضائل اخلاق کے کردار ہیں۔ حضرت یعقوب اور حضرت یوسف علیہما السلام۔ اور دو رذائل اخلاق کے کردار ہیں۔ برادران یوسف اور امرأۃ العزیز۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی شخصیت میں درد وغم کی انتہا ہے مگر ساتھ ہی صبر ویقین کی روح بھی چھائی ہوئی ہے۔ اور اس طرح چھائی ہوئی ہے۔ کہ معلوم ہوتا ہے۔ کہ غم کے طوفان اُمڈ رہے ہیں۔ لیکن صبر ویقین سے ٹکرا کر رہ جاتے ہیں۔ یہی صورت حال اس سیرت مقدسہ کا اسوہ حسنہ ہے۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کی شخصیت آتی ہے۔ ان کی سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے۔ کہ انسانی زندگی کی سب سے بڑی قوت اس کی سیرت کی فضیلت ہے۔ اگر یہ موجود ہو تو پھر اس کے لیے فتح وکامرانی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ دنیا کی ساری رکاوٹیں اس کی راہ روک لیں جب بھی وہ اپنی راہ نکال لے گا۔ دنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اس کی راہ میں حائل ہو جائیں۔ جب بھی اس کی رفتار نہیں رُکے گی۔ حوادث و واقعات اس پر قابو نہیں پا سکتے۔ احوال وظروف اس پر غالب نہیں آسکتے۔ افراد وجماعات کی کوششیں اسے مسخر نہیں کرسکتیں۔ اس کے لیے ہر حال میں کامرانی ہے۔ اس کے لیے ہر گوشہ میں فتح مندی ہے۔ اور وہ اعمال ونتائج کی اس امتحان گاہ میں صرف اس لیے ہے کہ سربلند ہو۔ عجز ودرماندگی اسے کبھی چھو نہیں سکتی۔

آیئے اس کے مقابلے میں تصویر کا دوسرا رُخ بھی دیکھ لیجئے۔ برادران یوسف کا کردار رذائل کا کردار ہے۔ حسد، والدین کا عقوق، بھائی سے عداوت، جھوٹ، فریب، خباثت، بدیانتی، بہتان، بدگمانی، حرص و طمع، غیظ وغضب، بغض وکینہ ظلم کا کردار ہے۔ اس کا نتیجہ ناکامی ورسوائی کے سوا کچھ نہیں۔ انسانی زندگی کی سب سے بڑی برائی سیرت کی رذیلت ہے۔ اگر یہ رذیلت موجود ہو تو پھر اس کیلئے زندگی میں ویرانی اور فضیحت اور ناکامی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ دنیا اس کیلئے رکاوٹ ہے۔ رذائل کا دوسرا کردار امرأۃ العزیز انجام دے رہی ہے۔ دعوت عیش، بدکاری شوہر سے مجرمانہ خیانت کر رہی ہے۔ یہ جذبات کے سیلاب میں بہہ رہی ہے۔ انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائش جذبات میں ہی ہوتی ہے۔ اس کا کردار صرف یہ نہیں ہے کہ جذبات میں بہہ جاتی ہے۔

بلکہ اسکیلئے وہ ایک نمائش گاہ قائم کرتی ہے ۔ اور اپنے جذبات کے جواز کے لیے دارالحکومت مصر کے تمام فتنہ گراں حسن کو دعوت دیتی ہے کہ ان کی متاع ضبط و تحمل کی عارت گریوں میں حصہ لیں ۔ بس اخلاقی فضائل و رذائل پر جتنے سوالات آپ کر سکتے ہیں ۔ سب کا جواب سورۃ یوسف میں موجود ہے ۔

السائلین : سے مراد وہ لوگ ہیں ۔ جس سے جس قسم کے بھی سوال کی توقع کی جا سکتی ہے ۔ عربی میں یہ انداز مخاطبوں میں اشتیاق ابھارنے کے لیے ہوتا ہے جیسے عربی کا ایک شاعر کہتا ہے ۔

سَلِي إِن جَهِلْتِ النَّاسَ عَنَّا وَعَنْهُمُ
فَلَيْسَ سَوَاءٌ عَالِمٌ وَجَهُولُ

عربی میں اسی انداز کو قرآن نے یہاں اپنایا ہے ۔ سائل کی جمع لا کر اشارہ کیا ہے کہ سوال کرنے والے متعدد ہیں ۔ اور سوالوں کی نوعیت بھی مختلف ہو سکتی ہے ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی داستانِ حیات صرف انفرادی زندگی تک محدود نہیں ہے ۔ بلکہ یہ ایک مکمل زندگی ہے ۔ اور اس میں زندگی کے سارے گوشوں کے متعلق سوالوں کے جوابات ہیں ۔ روحانی زندگی سے لے کر قانونی نظام تک زندگی کے مختلف پہلوؤں پر اُٹھے ہوئے سوالوں کا اس میں بھرپور جواب ہے ۔ اس داستان میں کتنی روحانی انعامات اور باطنی علوم کی نیرنگیاں ہیں ۔ جو ذہنوں میں اُٹھے ہوئے سوالات کا جواب ہیں ۔ مثلاً حضرت یعقوب ؑ کا اپنے باطنی علم اور روحانی رفعتوں کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام کو خواب کی تعبیر بتانا ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنی روحانی قوت کے ذریعے برادران یوسف کے جھوٹ کو پکڑ لینا جب انہوں نے بھیڑیئے کی کہانی گھڑی ۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا اپنی بلند روحانی قوت کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیض کی بُو کو اتنی مسافت سے محسوس کر لینا ۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کا امرأۃ العزیز کی جانب سے عیش و عشرت کی دعوت پر برہان رب دیکھنا ۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے علم باطنی کے کمال کی نشانی ہے ۔ روحانی جوابات کے ساتھ اس واقعہ میں متعدد اخلاقی سوالات کے جواب بھی موجود ہیں ۔ اخلاق میں دونوں قسم کے اخلاق پر اس واقعہ میں بھرپور تبصرہ ہے ۔ فضائل میں صدق، عفت و پاکبازی، شرم و حیا، عدل و انصاف، احسان، عفو و درگذر، استقامت، حق گوئی، رفق و لطف، عہد کی پابندی، حلم و بردباری، خوش کلامی ۔ اور رذائل میں زنا، جھوٹ، خباثت، بددیانتی، غداری، بہتان، بدگوئی، حسد، فخر و غرور، ظلم، بے ایمانی، غیظ و غضب، بغض و کینہ کے موضوعات پر اُٹھے ہوئے سوالات کے اس واقعہ میں متفرق سوال کرنے والوں کے جوابات ہیں ۔ گویا یہ پورا واقعہ سوال کرنے والوں کے سوالات کے جوابات کا مرقع ہے ۔ اور یہ تو ایک سرسری ساخاکہ ہے ۔ ورنہ اگر آپ کے

ذہنوں میں عائلی زندگی، معاشرتی حالات، معاشی اتار چڑھاؤ، سیاسی نشیب وفراز اور قانونی نظام کے بارے میں سوالات اُبھریں تو سورۃ یوسف ان سوال کرنیوالوں کے جوابات کی بھی پوری پوری صلاحیت رکھتی ہے

قرآن جس وقت یہ بات کہہ رہا ہے یہ سوال سب کے ذہنوں میں اُبھر رہا ہے۔ کہ پورے ملک پر کفر کا غلبہ ہے۔ اس غلبہ میں یہ کوئی سوچ بھی نہ سکتا تھا کہ اس غلبہ کا کسی روز خاتمہ ہو جائے گا اور جو ذات گرامی مظلومیتوں کی تصویر بنی ہوئی اپنے مقہور ومغلوب ہمنواؤں کے ساتھ وقت کے ظالموں کے ہاتھوں ہر قسم کے مظالم اور مصائب کا شکار رہے۔ کیا ایک دن آئے گا کہ یہ سارے ظلم پیشہ لوگ نبوت کے سامنے گھٹنے ٹیک دیں گے؟

یہ سوال سب کے ذہنوں میں چٹکیاں لے رہا تھا قرآن نے انہی سوال کرنے والوں کو یہ سرگزشت سنائی تاکہ ذہنوں میں جس قدر سوالات پیدا ہو رہے ہیں یا آئندہ پیدا ہو سکتے ہیں ان کا جواب ہو جائے اور لوگوں کو پتہ لگ جائے کہ اللہ سبحانہ کے شان قدیری کے مظاہرے کیسے ہوتے ہیں اور اس کے ارادے اور فیصلے یوں بروئے کار آتے ہیں۔

(۷) برادران یوسف کا منصوبہ

جس وقت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے کہا کہ بلاشبہ یوسف اور اس کا بھائی ہمارے ابا کا سب سے زیادہ لاڈلا ہے۔ حالانکہ ہم ایک طاقتور جماعت ہیں۔ یقیناً ہمارے والد اس معاملے میں غلطی پر ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام یوسف ع اور اُنکے عینی بھائی بن یامین سے بہت زیادہ محبت کرتے تھے۔ کیونکہ یہ دونوں اپنے علاتی بھائیوں سے چھوٹے تھے۔ والدہ کا انتقال ہو چکا تھا۔ اور خاص حضرت یوسف علیہ السلام کی نسبت اپنے نور فراست یا الہام ربانی سمجھ چکے تھے۔ کہ ان کا مستقبل نہایت درخشاں ہے۔ اور نبوت کا خاندانی سلسلہ ان کی ذات سے وابستہ ہونے والا ہے۔ خود یوسف علیہ السلام کا حسن صورت وسیرت اور کمال ظاہری و باطنی پدر بزرگوار کی محبت خصوصی کو اپنی طرف جذب کر رہا تھا۔ دوسرے بھائیوں کو یہ چیز ناگوار تھی۔ وہ کہتے تھے۔ کہ وقت پر کام آنے والے تو ہم ہیں۔ ہمارا ایک طاقتور جتھا ہے۔ جو باپ کی ضعیفی میں کام آسکتا ہے۔ ان چھوٹے لڑکوں سے کیا اُمید ہو سکتی ہے۔ ان ہی خیالات کے تحت اپنے والد بزرگوار کی نسبت کہتے تھے۔ کہ وہ اس معاملہ میں سخت غلطی پر ہیں اپنے نفع ونقصان کا موازنہ نہیں کرتے[1] بدو یانہ زندگی میں جب نظم حکومت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نہ تھا۔ حمایت و مدافعت کا سارا دار و مدار خاندان اور قبیلہ ہی پر ہوتا تھا۔ سب سے زیادہ باعزت اور باثر وہ خاندان سمجھا جاتا جس کے اندر حمایت اور مدافعت کے لیے اُٹھنے والے نوجوان سب سے زیادہ ہوں۔ اسی خاندان کو قوم اور قبیلہ کی سربراہی حاصل ہوتی۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اسی ذہن کے تحت معاذ اللہ اپنے والد کی ناعاقبت اندیشی کا فتویٰ دیا۔ اور سوچا کہ جتھا کی حیثیت تو ہماری ہے۔ کام آنے والے تو ہم ہیں لیکن ہمارے والد کا حال یہ ہے کہ ان کو یوسف ؑ اور ان کے بھائی کی محبت ہے۔ اس سے بڑی غلطی کیا ہو سکتی ہے؟

یہ دراصل حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں کی حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں مشاورت ہے۔ لام تاکید تحقیق خبر کے لیے نہیں بلکہ لازم خبر کے لیے لایا گیا ہے۔ کیونکہ حضرت یوسف ؑ کے بھائیوں میں اس موضوع پر دو رائیں نہیں ہیں۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام سے حضرت یعقوب ؑ کو زیادہ محبت تھی۔ مگر سارے بھائی حسد میں یکساں نہیں تھے۔ باہم مشورہ اس لیے تھا کہ یوسف علیہ السلام کے معاملے میں سازش میں ہم آہنگی پیدا کر لی جائے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائی کا نام بنیامین ہے۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے سگے بھائی ہیں ان کی والدہ کا نام راحیل بنت لوبان ہے۔ باقی بھائی حضرت یوسف علیہ السلام کے ماں کی جانب سے سوتیلے تھے۔ ان کی بھی باتیں مختلف ہیں۔

بنیامین کی پیدائش کے وقت ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ حضرت یعقوب ؑ ان دونوں بے ماں کے بچوں سے زیادہ پیار کرتے تھے۔ اس کے علاوہ اس محبت کی وجہ یہ بھی تھی۔ کہ ان کی ساری اولاد میں صرف حضرت یوسف علیہ السلام ہی ایسے تھے جن میں حضرت یعقوب علیہ السلام کو رشد و سعادت کے آثار نظر آرہے تھے۔ یا نور نبوت کے ذریعے آپ پر منکشف ہو رہے تھے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا خواب سُن کر انہوں نے جو کچھ فرمایا اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے۔ کہ وہ حضرت یوسف علیہ السلام کی روحانی صلاحیتوں سے خوب واقف تھے۔ دوسری طرف ان دس (۱۰) بڑے صاحبزادوں کی سیرت کا جو حال تھا۔ اس کا اندازہ آنے والے حالات واقعات سے ہوتا ہے پھر کیسے توقع کی جا سکتی ہے۔ کہ ایک نیک سیرت انسان اور وہ بھی اللہ کا نبی ایسی اولاد سے خوش رہ سکے۔ باقی بھائیوں کا حضرت یعقوب علیہ السلام کے بارے میں یہ تاثر ان ابانا لفی ضلال مبین۔ شارحین قرآن کو اس پر حیرت ہے اور انہوں نے یہ بڑی چبھن محسوس کی ہے۔ کہ اگر بیٹے حضرت یعقوب علیہ السلام کی رسالت پر ایمان رکھتے تھے۔ تو ان کی زبان سے یہ بات کیسے نکلی۔ اور اگر رسالت

کی تکذیب اس راہ سے کر رہے تھے۔ تو ایسا سوچنا بھی غلط ہے چہ جائیکہ یہ بات زبان پر لانا بشارحین قرآن نے اس کی گرفت سے بچنے کے لیے یہ راہ نکالی ہے کہ برادران یوسف اسے حضرت یعقوبؑ کی اجتہادی غلطی سمجھتے تھے۔ اور اس فقرے کا مطلب یہی ہے۔ لیکن اصل بات یہ ہے۔ کہ اس فقرے کی روح سمجھنے کے لیے بدویانہ قبائلی زندگی کے حالات کو پیش نظر رکھنا چاہیئے۔ جہاں کوئی ریاست موجود نہیں ہوتی۔ اور آزاد قبائل ایک دوسرے کے پہلو میں آباد ہوتے ہیں۔ وہاں ایک شخص کی قوت کا سارا انحصار اس پر ہوتا ہے۔ کہ اس کے اپنے بیٹے، پوتے، بھائی، بھتیجے بہت سے ہوں جو وقت آنے پر اس کی جان و مال اور آبرو کی حفاظت کے لیے اس کا ساتھ دے سکیں۔ ایسے حالات میں عورتوں اور بچوں کی بہ نسبت فطری طور پر آدمی کو وہ جوان بیٹے زیادہ عزیز ہوتے ہیں۔ جو دشمنوں کے مقابلے میں کام آسکتے ہوں۔ اسی بنا پر ان بیٹوں نے کہا۔ ان ابانا لفی ضلال مبین۔ ہم جوان بیٹوں کا جتھا جو بُرے وقت پر ان کے کام آسکتا ہے۔ ان کو اتنا عزیز نہیں ہے جتنے کہ یہ چھوٹے بچے جو ان کے کسی کام نہیں آسکتے بلکہ اُلٹے خود بھی حفاظت کے محتاج ہیں۔ اس لیے یہاں انکار نبوّت کا سوال ہی نہیں ہے۔ یہ باپ بیٹوں کے درمیان طبعی تعلقات کے ناگزیر تقاضے ہیں۔ اسی لیے وہ ان ابانا کہہ رہے ہیں۔ اسی سے قاضی ضیاء الدین سنامی نے یہ لطیفہ استنباط کیا ہے کہ

> نبیوں کی اولاد بھی دوسرے لوگوں کی اولاد کی طرح ہوتی ہے۔ جیسے سب لوگ اپنے باپ کو ابا کہہ کر پکارتے ہیں ایسے ہی نبیوں کی اولاد بھی اپنے باپ کو ابا ہی کہہ کر پکارتی ہے چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو ابا ہی کہا ہے۔

(۸) مار ڈالنے اور مُلک بدر کرنے کی تجویز

آؤ یوسف کو مار ڈالیں یا کسی مُلک میں پھینک آئیں۔ تاکہ باپ کی توجہ کا مرکز باقی بھائی ہو جائیں۔ اور یوسف کے بعد تم سارے ٹھیک ٹھاک ہو جاؤ۔ یعنی رشک و حسد کی آگ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ آخر آپس میں مشورہ کیا کہ یوسف کی موجودگی میں ممکن نہیں کہ والد بزرگوار کی خصوصی محبت و توجہ کو ہم اپنی طرف کھینچ سکیں۔ اس لیے یوسف کا قصہ ہی یہاں سے ختم کر دیا جائے۔ خواہ قتل کر دو یا کسی دُور دراز مُلک کی طرف پھینک دو۔ جہاں سے واپس نہ آسکیں۔ جب وہ نہ رہیں گے تو باپ کی ساری توجہات اور مہربانیوں کے ہم ہی تنہا حقدار رہ جائیں گے۔ بنیامین کے معاملے کی غالباً ان

کے یہاں کوئی اہمیت نہ تھی۔ گویا اس کی محبت کو یوسف علیہ السلام کی محبت کا ضمیمہ سمجھتے تھے۔ سوچا یہ کہ ایک بار قتل وغیرہ کا گناہ کرنا پڑے گا اس سے فارغ ہو کر توبہ کر لیں گے اور خوب نیک بن جائیں گے۔ گویا رند کے رند رہے ہاتھ سے جنت بھی نہ گئی۔ بعض مفسرین نے وتکونوا من بعدہ قوما صالحین۔ کے معنے یہ لیے ہیں کہ یوسف کے بعد ہمارے سارے کام ٹھیک ہو جائیں گے۔ کیونکہ پدر بزرگوار کا دست شفقت یوسف سے مایوس ہو کر صرف ہمارے ہی سروں پر سایہ فگن ہوگا۔[1] واقعی شارحین قرآن نے لفظ صالحین کے دونوں معنے لیے ہیں۔ ٹھیک ہو جانے اور نیک ہونے جن لوگوں نے نیک ہونے کے معنے لیے ہیں۔ وہ مطلب یہ بتاتے ہیں کہ اس جرم کے کر لینے کے بعد ہم توبہ کر یں یا اس سے زیادہ طاقتور نیکی کر کے نیک وصالح بن جائیں گے۔ اگر یہی معنے ہوں تو یہ فقرہ ان کی نفسیات کی بہترین ترجمانی کر رہا ہے۔ جو برائیوں کے ارتکاب کے ساتھ ایمان اور نیکی سے کچھ رشتہ جوڑے رکھتے ہیں ایسے لوگوں کا قاعدہ یہ ہوتا ہے۔ کہ جب کبھی نفس ان کے کسی بُرے کام کا تقاضا کرتا ہے۔ تو وہ ایمان کے تقاضوں کو ملتوی کر کے پہلے نفس کا تقاضا پورا کرنے پر تل جاتے ہیں۔ اور جب ضمیر اندر سے چٹکیاں لیتا ہے تو اسے یہ کہہ کر تسلی دینے کی کوششیں کرتے ہیں کہ ذرا صبر کر یہ ناگزیر گناہ جس سے ہمارا کام اٹکا ہوا ہے کر گزرنے دے پھر انشاء اللہ ہم توبہ کر کے ویسے ہی نیک بن جائیں گے جیسا کہ تو ہمیں دیکھنا چاہتا ہے۔

لیکن اس جملے میں ان معنے کی سکت نہیں ہے۔ فقرے کی ساخت اور اس کا ترکیبی پیوند بھی اس کی اجازت نہیں دیتا۔ سب جانتے ہیں کہ اس کا عطف پہلے جملہ پر ہے۔ اور وہ جملہ جواب امر ہے۔ جو حکم اس کا ہے وہی حکم اس کا بھی ہوگا۔ مطلب یہ ہے۔ کہ حالات سب ٹھیک ہو جائیں گے۔ پریشانی دور ہو جائے گی۔ جو کانٹا چبھ رہا ہے وہ نکل جائے گا۔ یہ وہ علاج ہے۔ جو حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے اپنی پریشانی دور کرنے کے لیے سوچا۔ انہوں نے اسکیم یہ بنائی۔ کہ یوسف کو یا تو قتل کر دیں۔ یا کہیں دور دراز مقام میں لے جا کر پھینک دیں تاکہ ان کے باپ کی ساری توجہ انہی کی طرف ہو جائے۔ اقتلوا یوسف او اطرحوہ کی حیثیت ایک شورائی تجویز کی ہے۔ جس طرح کمیٹی یا مجلس شوریٰ میں مختلف تجویزیں اور مشورے پیش ہوتے ہیں۔ یہاں بھی مختلف سمتوں سے یہ تجویزیں پیش ہو رہی ہیں۔ اس مشورت سے یہ بات بالکل واضح ہو رہی ہے۔ کہ برادران یوسف کو اصلی کد

---

[1] افادات شیخ الاسلام

حضرت یوسف علیہ السلام سے ہے ۔اس میں ان کے چھوٹے بھائی داخل نہیں ۔ اور یوسف سے یہ کد سوتیلا ہونے کی وجہ سے نہیں بلکہ ان کی اصلی صلاحیتوں کی وجہ سے ہے ۔جن کی وجہ سے حضرت یعقوب علیہ السلام ان سے غیر معمولی محبّت کرتے تھے ۔ اگر صرف سوتیلے ہونا اس کا باعث ہوتا تو سوتیلے تو بنیا مین بھی تھے ۔عجیب بات ہے کہ بائیبل میں برادران یوسف کے اس کردار کی وجہ یہ بتائی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام بھائیوں کی اپنے والد سے چغلیاں کھاتے تھے ۔ اس وجہ سے اُن کے بھائی ان سے ناراض تھے ۔

۹ ایک بھائی کے دِل میں نرم گوشہ

ان میں سے ایک کہنے والے نے کہا کہ یوسف کو قتل نہ کرو اسے گمنام کنویں میں ڈال دو اگر تمہیں کچھ کرنا ہی ہے ۔تو یہ کر لو ۔ اس طرح یوسف کو کوئی قافلہ اٹھالے گا ۔ یہ کہنے والا یہودا تھا ۔یعنی قتل کرنا بہت سخت بات ہے ۔ اور ہمارا مقصد اس کے بغیر بھی حاصل ہو سکتا ہے ۔اگر تم یوسف کو یہاں سے علیحدہ کرنا چاہتے ہو تو آسان صورت یہ ہے کہ اس کو بستی سے دور کسی گمنام کنویں میں ڈال دو ۔ ابوحیان اندلسیؒ نے بعض اہل لغت سے نقل کیا ہے ۔کہ غیابۃ الجب اس طاقچہ کو کہتے ہیں جو کنویں میں یا باولی میں پانی سے ذرا اُوپر بنا ہوا ہو۔ غرض یہ تھی ۔کہ ہم خواہی نہ خواہی عمداً ہلاک کرنے کا گناہ اپنے سر نہ لیں ۔ ایسے کنویں میں ڈال دینے کے بعد بہت ممکن ہے کہ کوئی مسافر ادھر سے گزرے اور خبر پاکر کنویں سے نکال لے جائے اس صورت میں ہمارا مقصد حاصل ہو جائیگا ۔اور خون ناحق سے ہاتھ رنگین نہ کرنے پڑیں گے ۔گویا سانپ بھی مرجائے گا اور لاٹھی بھی نہ ٹوٹے گی[1] شارحین قرآن نے واقعی اس کہنے والے کے مختلف نام بتائے ہیں ۔کچھ کہتے ہیں کہ اس کا نام یہودا ہے ۔کچھ کی رائے میں شمعون ہے ۔اور کچھ کا خیال ہے کہ روبن ہے لیکن تورات میں نام روبین ہے ۔

> تب روبین نے یہ سُن کر ان کے ہاتھوں سے بچایا اور کہا کہ ہم اس کی جان نہ لیں ۔اور روبین نے ان سے یہ بھی کہا کہ خون نہ بہاؤ بلکہ اسے اس گڑھے میں جو بیابان میں ہے ڈال دو لیکن اس پر ہاتھ نہ اُٹھاؤ ۔

اور یہودا کے بارے میں تورات ہی میں ہے ۔کہ اس نے قافلہ والوں کے ہاتھ بیچ ڈالنے کا مشورہ دیا ۔

[1] افادات شیخ الاسلام

چنانچہ آیت ۲۶ میں ہے ۔

تب یہودا نے اپنے بھائیوں سے کہا کہ اگر ہم اپنے بھائی کو مار ڈالیں اور اس کا خون چھپائیں تو کیا نفع ہوگا ۔ آؤ اسے اسماعیلیوں کے ہاتھ بیچ ڈالیں کہ ہمارا ہاتھ اس پر نہ اٹھے کیونکہ وہ ہمارا بھائی اور خون ہے ۔

مطلب یہ ہے ۔ کہ اس بھائیوں میں سے ایک کے دل میں معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے کوئی نرم گوشہ تھا ۔ اس نے مشورہ دیا کہ قتل تو نہ کرو اگر کچھ کرنا ہی ہے ۔ تو یہ کرو ۔ کہ قافلوں کے راستوں کے کسی کنویں میں ڈال دو کوئی قافلہ گزرے گا اس کو نکال لے گا ۔ کنویں اس زمانہ میں عموماً ایسے موقعوں پر ہوتے تھے جو عام راہ گزر ہوں ۔ قافلے جب ان کنوؤں کے پاس گزرتے تو ضرور پانی بھرتے ۔ اور یہ تاریخ کی ایک معلوم حقیقت ہے ۔ کہ فلسطین کے جنوب مشرقی علاقہ میں تجارتی قافلوں کی آمد و رفت ایک طرف فلسطین اور مصر ۔ اور دوسری طرف عرب و مصر کے درمیان برابر رہتی تھی ۔ چونکہ اس زمانہ میں بردہ فروشی کا عام رواج تھا ۔ اس وجہ سے ممکن ہے کہ یہ خیال بھی ہوا ہو ۔ کہ قافلے والے اسے غلام بنالیں یا کسی شہر میں جا کر اسے فروخت کر دیں گے ۔ اس طرح حضرت یوسف علیہ السلام کی جان بھی بچ جائے گی اور بھائیوں کے منصوبہ کی تکمیل بھی ہو جائے گی ۔ منصوبہ یہی تھا ۔ کہ یوسف علیہ السلام کو باپ سے دور کر دیا جائے تاکہ باپ کی توجہات اور چاہتوں کا وہ مرکز بن جائیں ۔ بالآخر اسی مشورہ پر سب کا اتفاق ہو گیا جیسے آگے آ رہا ہے ۔

قَالُوا

يَٰٓأَبَانَا مَا لَكَ لَا تَأْمَ۫نَّا عَلَىٰ يُوسُفَ وَإِنَّا لَهُۥ لَنَٰصِحُونَ ﴿١١﴾

أَرْسِلْهُ مَعَنَا غَدًا يَرْتَعْ وَيَلْعَبْ وَإِنَّا لَهُۥ لَحَٰفِظُونَ ﴿١٢﴾ قَالَ

إِنِّى لَيَحْزُنُنِىٓ أَن تَذْهَبُوا۟ بِهِۦ وَأَخَافُ أَن يَأْكُلَهُ ٱلذِّئْبُ

وَأَنتُمْ عَنْهُ غَٰفِلُونَ ﴿١٣﴾ قَالُوا۟ لَئِنْ أَكَلَهُ ٱلذِّئْبُ وَنَحْنُ

عُصْبَةٌ إِنَّآ إِذًا لَّخَٰسِرُونَ ﴿١٤﴾

(تب سب مل کر آئے) بولے اے ہمارے ابا جان کیوں آپ یوسف کے بارے میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ ہم تو اس کے دل سے خیر خواہ ہیں۔ کل ہمارے ساتھ جانے دیجئے کھائے پیئے کھیلے کودے ہم اس کی حفاظت کریں گے۔[۱۰] باپ نے کہا کہ مجھے تو یہ غم لگ رہا ہے۔ کہ تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ گے اور مجھے اندیشہ ہے کہ اسے بھیڑیا کھا جائے اور تمہیں اس کا پتہ بھی نہ ہو۔ بولے یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ بھیڑیا اسے کھالے حالانکہ ہماری جماعت وہاں موجود ہو اگر ایسا ہوا تو پھر ہم تو نکمے ہی رہیں گے۔[۱۱]

برادران یوسف کی سازش کا پہلا مرحلہ

یہاں قرآن کا انکشاف یہ ہے کہ برادران یوسف منصوبے کی تکمیل کی خاطر حضرت یعقوب ؑ کی خدمت میں حاضر ہوئے ۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام سے درخواست کی کہ حضرت یوسف ؑ کو سیر کے لیے ہمارے ساتھ روانہ کر دیجئے ۔ قرآن کا یہ بیان تورات سے مختلف ہے ۔ تورات کی روایت یہ ہے کہ برادران یوسف اپنے مویشی چرانے کے لیے سکمؔ کی طرف گئے ہوئے تھے ۔ ان کے پیچھے خود حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی تلاش میں حضرت یوسف علیہ السلام کو روانہ کیا تھا ۔ مگر یہ بات بعید از قیاس ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے یوسف علیہ السلام کے ساتھ ان کا حال جانتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے پیچھے روانہ کیا ہو ۔

یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت یوسف علیہ السلام کو اپنے ہاتھوں موت کے منہ میں روانہ کریں ۔ اس لیے قرآن کا بیان ہی صحیح ہے ۔ بہرحال دو باتیں ہیں ان کو یاد رکھنا چاہیئے ۔ ایک یہ کہ قرآن میں کوئی ایسا اشارہ نہیں ہے ۔ جس سے حضرت یعقوب علیہ السلام کا بھائیوں کی تلاش میں یوسف علیہ السلام کو روانہ کرنا معلوم ہو ۔ بلکہ اس کا صاف اعلان ہے ۔ کہ بھائیوں نے خود اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے حضرت یعقوب علیہ السلام سے یوسف علیہ السلام کو سیر کے بہانے اپنے ساتھ لے جانے کی درخواست کی ۔ دشمنی کی حالت میں باتیں گھڑ لینا فطرت انسانی کے لحاظ سے مستبعد نہیں ہے ۔ دوسری یہ کہ تورات کے بقیہ اجزا کے بارے میں کچھ بھی کہا جائے لیکن موجودہ زمانہ میں علم و تحقیق کا قطعی فیصلہ ہو چکا ہے کہ کتاب پیدائش لائق اعتماد نہیں خصوصاً اس کا ابتدائی حصہ تفصیل انشاء اللہ آئندہ آئے گی ۔

(۱۰) تب سب مل کر آئے بولے اے ہمارے ابا جان کیوں آپ یوسف کے بارے میں ہم پر اعتماد نہیں کرتے حالانکہ ہم تو اس کے دل سے خیر خواہ ہیں ۔ کل ہمارے ساتھ جانے دیجئے کھائے پیئے کھیلے کودے ہم اس کی حفاظت کریں گے ۔ اس سے معلوم ہوا کہ پہلے بھی باپ سے اس قسم کی درخواست کر چکے تھے ۔ مگر ان کا دل ان کے ساتھ بھیجنے پر مطمئن نہیں ہوا ۔ یعنی ایسے خوبصورت بچے کے قوی گھر میں خالی پڑے رہنے سے بیکار ہوئے جاتے ہیں مناسب ہے کہ ہمارے ساتھ اس کو بکریاں چرانے کے لیے جنگل میں بھیج دیجئے ۔ وہاں جنگل کے پھل میوے خوب کھائے گا اور کھیل کود سے جسمانی ورزش بھی ہو جائے گی ۔ کہتے ہیں کہ ان کا کھیل بھاگ دوڑ، تیر اندازی تھی اور دیسے بھی

بچّوں کے لیے مناسب حد تک کھیلنا جیسا کہ ابو حیانؒ نے کہا ہے ۔ نشاط و شگفتگی کا باعث ہے بغرض یعقوب علیہ السلام سے یوسف کو ساتھ لے جانے کی پُرزور درخواست کی اور پُرزور طریقہ سے اطمینان دلایا ۔ ہم برابر اس کی حفاظت کریں گے ۔ مفسرین نے لکھا ہے کہ خود یوسف کو جداگانہ طور پر ساتھ چلنے کی باپ سے اجازت لینے کی ترغیب دی ۱؎ جو بات شیخ الاسلام نے فرمائی ہے اسی کی علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں نشاندہی کی ہے ۔ عربی بلاغت کی رو سے یہ انداز کلام موقعہ انکار میں استعمال ہوتا ہے ۔ انّ سے ، لام سے اور جملہ اسمیہ سے کلام کو مؤکد بنا کر پیش کرنا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ پہلے بھی یہ بات کہی جا چکی ہے ۔ اور حضرت یعقوب علیہ السلام ان کی درخواست کو ردّ کر چکے ہیں ۔ علامہ قرطبیؒ نے بھی علامہ آلوسیؒ کی ہمنوائی کی ہے ۔

آیت سے معلوم ہو رہا ہے کہ برادران یوسف گلے چرانے جنگل جایا کرتے تھے ۔ اس زمانے میں قبائل کی دولت و ثروت کا بڑا مدار مویشی پر تھا ۔ مرد سارا دن چراتے تھے ۔ شام کو خیموں میں آکر آرام کرتے تھے ۔ ایسی ہی زندگی حضرت یعقوب علیہ السلام کے گھرانے کی تھی ۔ یرتع و یلعب نہایت خوبصورت تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے پکنک منانے کی اختیار کی اپنے لیے نہیں کیونکہ خود تو وہ روزانہ جاتے تھے ۔ بدویانہ زندگی میں جی بہلانے کے جو طریقے بہت پسندیدہ رہے ہیں ان میں پکنک کو خاص اہمیت حاصل ہے ۔ شعرائے جاہلیت کا یہ خاص موضوع ہے ۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بھائیوں نے بھی مذکورہ بالا منصوبہ پر اتفاق رائے کر لینے کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام کو ہموار کرنے کے لیے پکنک کا سبز باغ دکھانے کی کوشش کی ۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس آئے ۔

پہلے اپنا اعتبار جتانے کے لیے کہا لاتامنّا علی یوسف ۔ کیا بات ہے کہ یوسف کے بارے میں آپ ہم پر اعتماد نہیں کرتے ہیں ۔ ہم تو اس کے بڑے خیر خواہ ہیں ۔ ہمیں تو اس سے بڑی محبت ہے ۔ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کی پکنک کا پروگرام پیش کیا ۔ ہمارے ساتھ جنگل روانہ کر دیجئے ۔ تفریح کرے گا ، کھیلے کودے گا ۔ آپ پوری طرح مطمئن رہیں ۔ کسی بات کا کوئی اندیشہ نہیں ہے ۔ ہم یوسف کی پوری پوری حفاظت کریں گے اور ہم اس کے ذمہ دار ہیں ۔

۱؎ افادات شیخ الاسلام

(۱۱) حضرت یعقوبؑ کا غم اور اندیشہ

باپ نے کہا کہ مجھے تو غم لگ رہا ہے کہ تم اسے اپنے ساتھ لے جاؤ گے۔ اور مجھے اندیشہ ہے کہ اسے بھیڑیا کھا جائے گا اور تمہیں اس کا پتہ بھی نہ ہو گا یعنی یوسف کی جدائی اور تمہارے ساتھ جانے کا تصور بھی مجھے غمگین بنائے دیتا ہے۔ اس پر یہ خوف مزید رہا کہ بچہ ہے تمہاری بے خبری اور غفلت میں بھیڑیا وغیرہ کوئی درندہ پھاڑ کھائے۔ لکھا ہے کہ اس جنگل میں بھیڑیئے کثرت سے تھے۔ حضرت شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ ان کو آگے چل کر بھیڑیئے کا بہانہ کرنا تھا۔ وہی ان کے دل میں خوف آیا۔ بعض محققین کا خیال یہ ہے کہ اخاف ان یاکلہ الذئب فرمانا حضرت یعقوبؑ جیسے پیغمبر کے درجہ توکل و تفویض سے نازل بات تھی۔ اس کا جواب یہ ملا کہ لڑکوں نے گویا ان کے منہ سے بات پکڑلی۔ جو اندیشہ ظاہر کیا تھا۔ وہ ہی واقعہ بنا کر لے آئے[1] یہ حزن و خوف طبعی ہیں طبعی حزن و خوف کا ہونا منافی کمال نہیں ہے۔ نہ نبوت کے منافی ہے۔ اور نہ ولایت کے۔ نبی ایک انسان ہوتا ہے اور عام انسانوں میں پھر اس کی برتری سمجھنے کے لیے یہ کافی ہے۔ کہ وہ اللہ سبحانہ کا فرستادہ ہے۔ اور اس کی جانب سے منصب اصلاح پر کھڑا کیا گیا ہے۔ اس لیے اس کا کمال یہ ہے کہ وہ ایک انسان ہو کیونکہ اصلاح کے لیے صرف علم کافی نہیں احساس کی بھی ضرورت ہے۔ جو غم نہیں کھا سکتا وہ ایک غمزدہ کی تسلی کیونکر کر سکتا ہے۔ جو بھوک سے آزاد ہے وہ ایک بھوکے کے ساتھ صحیح دل سوزی ہی نہیں کر سکتا۔ اسباب کو نظر انداز کرنا توکل نہیں ہے۔ توکل نام ہے کسی کام کو پورا پورا ارادہ عزم اور تدبیر و کوشش کے ساتھ انجام دینے کا۔ اور یہ یقین کرنے کا کہ اگر اس میں بھلائی ہے تو اللہ تعالیٰ ہمیں اس میں ضرور کامیابی دے گا۔ اگر تدبیر اور جدوجہد کوشش کا ترک کرنا ہی توکل ہوتا تو دنیا میں لوگوں کو سمجھانے کے لیے انبیاء رہی روانہ نہ کرتا اور نہ ان کو اپنی تبلیغ و رسالت کے لیے جدوجہد اور سعی و سرگرمی کی تاکید فرماتا اور نہ اس راہ میں جان و مال کی قربانی کا حکم دیتا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان دو لفظوں میں بھائیوں کی جانب سے ہونے والی ساری داستان کی تصویر پیش کردی۔ بھیڑیئے مویشی کے دشمن ہوتے ہیں۔ ہمیشہ کوئی نہ کوئی حادثہ ہوتا رہتا تھا۔ اس لیے بے اختیار حضرت یعقوبؑ کی زبان سے نکل گیا۔ کہ کہیں ایسا ہی حادثہ یوسف کو بھی پیش نہ آجائے۔ آیت کا مطلب یہ ہے:

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ مجھے غم اور اندیشہ اس بات کا ہے۔ کہ تم یوسف کو لے جاؤ اور تم تو اپنے کھیل کود اور دلچسپیوں میں لگ جاؤ اور تمہاری بے خبری میں اس پر بھیڑیا حملہ آور ہو جائے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کے اس اندیشے کا برادران یوسف نے جو جواب دیا ہے کہ ہماری پارٹی کی موجودگی میں اگر یوسف کو بھیڑیا کھا گیا تو ہم سے بڑھ کر بدبخت اور نکما کون ہوگا؟ آگے کی بات سے قرآن خاموش ہے مگر انداز اسلوب بتا رہا ہے۔ کہ ان کی اس یقین دہانی کے بعد حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بادل ناخواستہ ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دی اور برادران یوسف کے منصوبے کا پہلا مرحلہ کامیاب ہو گیا۔

آیت بتا رہی ہے کہ پُرفریب انسان دل میں نقصان اور عداوت کا الاؤ رکھ کر اس پر اصلاح اور درستگی کا لبادہ ڈال دیتا ہے۔ یہ تعبیر بالکل ایسی ہے جیسے پہلے وانا لہٗ لنا صحون کے ذریعے دل کی عداوت کو زبانی خیر خواہی کے پردے میں چھپایا گیا ہے۔ البقاعیؒ لکھتے ہیں کہ بھائیوں کی اس سازش پر مبنی تقریر کے بعد یہ سوال خود بخود اُبھرتا ہے کہ پھر حضرت یعقوب علیہ السلام نے کیا کہا؟ جواب مقدر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کی بات کو شرف پذیرائی دیا۔ اور حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے ساتھ روانہ کر دیا۔

شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں اسے اس طرح پیش کیا ہے۔ کہ اگر ہمارے جیسی طاقتور جماعت کی موجودگی میں چھوٹے بھائی کو بھیڑیا کھا جائے تو سمجھو کہ ہم بالکل ہی گئے گزرے ہیں۔ اس سے بڑھ کر کیا خسارہ ہوگا کہ دس گیارہ تنومند بھائیوں کی آنکھوں کے سامنے سے ایک کمزور بچہ بھیڑیئے کے منہ میں پہنچ جائے ایسا ہو تو کہنا چاہیئے کہ ہم نے اپنا سب کچھ گنوا دیا[1]

[1] افادات شیخ الاسلام

فَلَمَّا ذَهَبُوْا بِهٖ وَاَجْمَعُوْٓا
اَنْ يَّجْعَلُوْهُ فِیْ غَيٰبَتِ الْجُبِّ ۚ وَاَوْحَيْنَآ اِلَيْهِ لَتُنَبِّئَنَّهُمْ
بِاَمْرِهِمْ هٰذَا وَهُمْ لَا يَشْعُرُوْنَ ﴿۱۵﴾ وَجَآءُوْٓ اَبَاهُمْ عِشَآءً
يَّبْكُوْنَ ﴿۱۶﴾ قَالُوْا يٰٓاَبَانَآ اِنَّا ذَهَبْنَا نَسْتَبِقُ وَتَرَكْنَا يُوْسُفَ
عِنْدَ مَتَاعِنَا فَاَكَلَهُ الذِّئْبُ ۚ وَمَآ اَنْتَ بِمُؤْمِنٍ لَّنَا وَلَوْ كُنَّا
صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾ وَجَآءُوْ عَلٰى قَمِيْصِهٖ بِدَمٍ كَذِبٍ ۭ قَالَ بَلْ
سَوَّلَتْ لَكُمْ اَنْفُسُكُمْ اَمْرًا ۭ فَصَبْرٌ جَمِيْلٌ ۭ وَاللّٰهُ الْمُسْتَعَانُ
عَلٰى مَا تَصِفُوْنَ ﴿۱۸﴾ وَجَآءَتْ سَيَّارَةٌ فَاَرْسَلُوْا وَارِدَهُمْ فَاَدْلٰى
دَلْوَهٗ ۭ قَالَ يٰبُشْرٰى هٰذَا غُلٰمٌ ۭ وَاَسَرُّوْهُ بِضَاعَةً ۭ وَ
اللّٰهُ عَلِيْمٌۢ بِمَا يَعْمَلُوْنَ ﴿۱۹﴾ وَشَرَوْهُ بِثَمَنٍۢ بَخْسٍ دَرَاهِمَ
مَعْدُوْدَةٍ ۚ وَكَانُوْا فِيْهِ مِنَ الزّٰهِدِيْنَ ﴿۲۰﴾

پھر جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی اجازت کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کے بھائی لے گئے اور انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گمنام کنویں میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تو انہوں

نے جو کچھ کرنا تھا کر لیا۔ اور ڈال دینے کے بعد ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اشارہ سے بتایا کہ ایک وقت آئے گا۔ کہ تو ان کو ان کا یہ معاملہ ضرور جتائے گا۔ اور ان کو پتہ نہیں ہے کہ پردہ غیب میں کیا ہے [۱۲] اور برادران یوسف شام کو روتے ہوئے اپنے والد کے پاس آئے [۱۳] بولے ابا جان ہم دوڑ کے مقابلے میں گئے تھے۔ اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا تھا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا اور آپ ہماری بات کو مانیں گے تو نہیں چاہے ہم سچے ہی ہوں [۱۴] اور یوسفؑ کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے۔ یہ داستان سن کر حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کچھ تم بتا رہے ہو اس میں سے کچھ بھی نہیں بلکہ یہ تمہاری من گھڑت بات ہے۔ بس اب صبر ہی بہتر ہے اور تم جو داستان بیان کر رہے ہو۔ میں اس پر اللہ ہی سے مدد کا خواہاں ہوں [۱۵] اور ایک قافلہ آگیا اور قافلے والوں نے اپنا پانی لانیوالا کنویں پر بھیجا اس نے ڈول لٹکایا۔ بول پڑا واہ واہ خوشی کی بات ہے یہ تو ایک لڑکا ہے اور پھر قافلہ والوں نے اسے تجارتی مایہ بنا کر چھپا لیا اور جو کچھ وہ کر رہے تھے اللہ کو خوب معلوم ہے [۱۶]۔ اور پھر انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہت معمولی قیمت یعنی گنتی کے چند درہموں پر فروخت کر دیا وہ اس سے دل برداشتہ تھے [۱۷]

داستان یوسف کا ایک عجیب منظر

داستان یوسف کا یہ وہ مرحلہ ہے۔ جس میں یوسف علیہ السلام کو ہلاک کرنے کی سوتیلے بھائیوں نے منصوبہ بندی کی تھی۔ بھائیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں میں ڈال دیا۔ اور اپنے اس کردار پر پردہ ڈالنے کے لیے بھیڑیئے کے حملہ کا جھوٹا قصہ بنایا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام فراست نبوت سے ان کے افسانے پر مطلع ہو گئے ساری داستان سن کر فرمایا۔ فصبر جمیل۔ حضرت یعقوبؑ کو فراست نبوت سے یہ بات معلوم ہو گئی تھی۔ کہ پچھلی بشارتیں یوسف ہی کے ذریعے پوری ہوئی ہیں اسلیئے وہ کبھی باور نہیں کر سکتے تھے کہ اس طرح اس کی زندگی کا خاتمہ ہو جائے گا لہذا فرمایا فصبر جمیل یعنی اس معاملہ میں حکمت الٰہی کا ہاتھ صاف نظر آتا ہے لہذا میرے لیے اس کے سوا چارہ نہیں ہے کہ بغیر شکوہ و شکایت کے درد فراق جھیلتا رہوں اور اس کی کارفرمائیوں کے ظہور کا انتظار کروں۔ "صبر جمیل" میں جیسے درد و غم کی انتہا ہے ایسے ہی صبر اور یقین کی روح بھی پوری طرح کارفرما ہے اور اس طرح کارفرما ہے کہ معلوم ہوتا ہے کہ درد و غم کے طوفان اٹھ رہے ہیں لیکن صبر و یقین سے ٹکرا کر رہ جاتے ہیں اور اس پر غالب نہیں آسکتے اور یہی صورت حال اس سیرت مقدسہ کا اسوۂ حسنہ ہے۔ صبر کے معنے صرف شدائد ہی کے نہیں بلکہ جیسا کہ شیخ اکبر نے لکھا ہے۔ حبس النفس عن الشکوی لا الی اللہ جی کو اللہ کے سوا شکایت سے روکنا بھی صبر جمیل ہے یعنی ایسا صبر ہو جو بڑے ہی پسندیدہ طریقے پر ہو یعنی نہ صرف شدائد جھیلے جائیں بلکہ بڑی خوبی کے ساتھ جھیلے جائیں۔ شدائد کا شکوہ نہ ہو۔ درد و الم کی شکایت زبان پر نہ آئے۔ یہاں صبر جمیل فرما کر واللہ المستعان کا اضافہ بڑی گہری معنویت رکھتا ہے۔ یعنی ایسا سکون جس نے حضرت یعقوب علیہ السلام کو لوگوں کے سامنے پریشانی غم واندوہ کے اظہار سے بے نیاز بنا دیا۔ صرف اللہ کی طرف متوجہ کر دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی تلاش اور اس کے لیے جدوجہد کرنا اور اللہ سبحانہ کے سامنے عرض و معروض کرنا یعنی دعا کرنا صبر کے منافی نہیں ہے۔

۱۲ پھر جب حضرت یعقوب علیہ السلام کی اجازت کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے بھائی لے گئے۔ اور انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو گمنام کنویں میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا تو انہوں نے جو کچھ کرنا تھا کر لیا۔ اور ڈال دینے کے بعد ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اشارے سے بتایا کہ ایک وقت آئے گا کہ تو ان کو ان کا یہ معاملہ ضرور جتائے گا اور ان کو پتہ نہیں کہ پردۂ غیب میں کیا ہے مفسرین نے بہت سے درمیانی قصے نہایت دردانگیز، رقت آمیز پیرائے میں نقل کیئے

ہیں جنہیں سُن کر پتھر کا کلیجہ بھی موم ہو جائے ۔ اللہ جانے وہ کہاں تک صحیح ہیں ۔ قرآن کریم اپنے خاص نصب العین کے اعتبار سے اس قسم کی تفاصیل کو درخور اعتنا اور لائق ذکر نہیں سمجھتا کیونکہ ان اجزار سے کوئی اہم مقصد متعلق نہیں ہے ۔ قرآن عزیز اپنے سامعین کے دلوں میں وہ رقت پیدا کرتا ہے ۔ جس کا منشا رخاص ایمان و عرفان ہو ۔ عام رقت جو ہر کافر و مؤمن بلکہ حیوانات تک میں طبعاً مشترک ہے ۔ اس پر عام خطبار کی طرح زور ڈالنا قرآن کی عادت نہیں ہے ۔ یہاں بھی قرآن نے درمیانی واقعات حذف کر کے آخری بات بتلادی کہ برادران یوسف کو بلطائف الحیل باپ کے پاس سے لے گئے اور ٹھہری ہوئی قرار داد کے مطابق کنویں میں ڈالنے کا فیصلہ کر لیا ۔ اس وقت ہم نے یوسف کو اشارا کیا ۔ جس کی دوسروں کو مطلق خبر نہیں ہوئی ۔ کہ گھبراؤ نہیں ایک ایسا وقت آیا چاہتا ہے کہ یہ سب کارروائیاں تم ان کو یاد دلاؤ گے اور اس وقت تم ایسے بلند مقام اور اعلیٰ مرتبہ پر ہو گئے کہ یہ تم کو پہچان نہ سکیں گے یا طول عہد کی وجہ سے تم کو شناخت نہ کر سکیں گے ۔

یہ خدائی اشارہ خواب میں ہوا یا بیداری میں ، بطریق الہام ہوا یا فرشتے کے ذریعے سے ۔ اس کی تفصیل قرآن میں نہیں ۔ البتہ ظاہر الفاظ کو دیکھ کر کہا گیا ہے کہ وحی کا آنا چالیس برس پر موقوف نہیں ہے ۔ کیونکہ حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت بہت کم عمر تھے واللہ اعلم [1]

آیئے اس آیت کے اجزار پر الگ الگ غور فرمایئے ۔ پہلا فقرہ ہے ۔ فلما ذھبوا بہ واجمعوا ان یجعلوہ فی غیابۃ الجب یعنی جب برادران یوسف حضرت یوسف علیہ السلام کو باپ سے اجازت لے کر اپنے ساتھ لے گئے اور سب نے اس پر اتفاق کر لیا کہ یوسف کو کسی گمنام کنویں میں ڈال دیں اور وہ ایسا ہی کر گزرے ۔ اور آیت سے یہ بات مترشح ہو رہی ہے کہ اس معاملہ میں اختلاف آخر تک رہا کہ یوسف کو کنویں میں ڈالیں یا قتل کریں لیکن بالآخر کنویں والی تجویز ہی پر سب کا اتفاق اور اسی پر عمل ہوا ۔ توریت میں ہے ”

اور یوں ہوا کہ یوسف جب اپنے بھائیوں کے پاس آیا تو انہوں نے اس کی قبا کو یعنی بوقلموں قبا کو جو وہ پہنے ہوئے تھا ۔ اتار کے اسے ننگا کر دیا اور اسے لے کے کنویں میں ڈال دیا وہ کنواں اندھا تھا ۔ اس میں ایک بوند پانی نہ تھا ۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

شارحین قرآن نے یہاں طویل کہانیاں لکھی ہیں۔ لیکن محققین کے نزدیک ان کی تاریخی حیثیت قابلِ اعتبار نہیں ہے۔ علامہ آلوسیؒ فرماتے ہیں کہ یہ کہانیاں ہیں تو بڑی المناک اور دردانگیز لیکن لیس فیہا مالہٗ سند یعول علیہ لیکن ان کی پشت پر کوئی تاریخی سند نہیں ہے۔

آیت کا دوسرا جزء واوحینا الیہ لتنبئنھم بامرھم ھذا یعنی ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو وحی کی کہ مایوس نہ ہو ایک وقت آئے گا جب ان کا یہ معاملہ تو ان کو جتائے گا۔ انبیاء پر وحی آتی ہے نبوت ملنے کے بعد اور اس کے آنے کی عمر چالیس سال ہے حضرت یوسفؑ کو نبوت کے ملنے کا آگے ذکر آرہا ہے۔ ولما بلغ اشدہٗ اٰتینٰہ حکما وعلما اور جب یوسف اپنی جوانی کو پہنچا تو ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔ سوال یہ ہے کہ نبوّت سے پہلے یہ وحی کیسی ہے۔ سمجھئے پہلے وحی کے معنی سمجھ لیجئے۔ علامہ منظور افریقی نے لسان العرب میں وحی کے معنی یہ بتائے ہیں۔

اشارہ کرنا، لکھنا، پیغام دینا، دل میں ڈالنا، چھپا کر بولنا اور خیال میں ڈالنا۔

شعراء جاہلیت نے ان سب معنے میں لفظ وحی استعمال کیا ہے۔ لیکن اہل لغت کہتے ہیں۔ کہ وحی کے اصلی معنے دوسروں سے چھپا کر کسی سے چپکے چپکے بات کرنے کے ہیں۔ کسائی عرب کا محاورہ بتاتا ہے۔ وحیت الیہ بالکلام واوحیہ الیہ ھوان تکلمہٗ بکلام تخفیہ من غیرہٖ۔ یعنی کسی سے اس طرح باتیں کرو کہ اس کو دوسروں سے چھپاؤ۔ ابواسحاق لغوی کہتے ہیں۔ واصل الوحی فی اللغۃ کلھا اعلام فی خفاء۔ وحی کا اصل مفہوم اس کے تمام معنوں میں چھپا کر اطلاع دینے کے ہیں۔

قرآن میں لفظ وحی اپنے اصل مفہوم کے اندر تین معنوں میں آیا ہے

اول: فطری حکم جیسے شہد کی مکھیوں کے بارے میں ہے۔ واوحیٰ ربک الی النحل۔

دوسرے: دل میں بات ڈال دینا جیسے اذ اوحیت الی الحواریین۔

تیسرے: چپکے چپکے باتیں کرنا جیسے یوحی بعضھم الی بعض۔

وحی کے ان معنوں میں ایک مفہوم مشترک ہے اور وہ یہ ہے کہ منہ سے لفظ نکالے بغیر ایک شخص کا دوسرے شخص کو اپنا مفہوم سمجھا دینا۔ اس لئے اشارا کرنا، لکھنا، دل میں ڈالنا، حکم فطری، کتابت سب اس کے معنوں میں داخل ہیں۔ بہرحال اس تفصیل سے ظاہر ہوتا ہے کہ وحی اصطلاحی ہی وحی نہیں ہے۔ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز خواب سے ہوا ہے۔ صحیح بخاری میں حضرت عائشہؓ

کا بیان ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم پر وحی کا آغاز اچھے خواب سے ہوا۔
حدیثوں میں طریقہ وحی کی یہ صورت بھی بتائی ہے کہ ان روح القدس نفث فی روعی۔ روح القدس نے میرے دل میں پھونکا۔ اسی لیے شارحین قرآن نے یہاں اس آیت میں ایحار کے معنے الہام اور خواب میں دکھلانے کے بتلائے ہیں۔ حضرت شیخ الہندؒ نے ترجمہ کیا ہے۔ ہم نے اشارا کیا۔ حضرت شاہ صاحب نے یہی معنے کیئے ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے دل میں یہ بات ڈال دی کہ یہ آزمائش وقتی ہے وہ وقت آئے گا کہ تم ان بھائیوں کو ان کی کارستانیوں سے آگاہ کرو گے۔

آیت کا آخری حصہ وھم لا یشعرون ہے۔ یہ جملہ کچھ ایسے انداز سے آیا ہے کہ اس کے تین معنے ہو سکتے ہیں اور تینوں ہی اپنی جگہ درست ہیں ایک یہ کہ ہم یوسف کو یہ وحی کر رہے تھے اور یوسف کے بھائیوں کو کچھ پتہ نہ تھا۔ کہ اس پر وحی ہو رہی ہے۔ دوسرے یہ کہ تو ایسے حالات میں ان کو ان کے یہ کرتوت بتائے گا۔ جہاں تیرے ہونے کا ان کو بالکل پتہ نہ ہوگا۔ تیسرے یہ کہ آج یہ بے سمجھے ایک حرکت کر رہے ہیں اور نہیں جانتے کہ آئندہ اس کے نتائج کیا ہونے والے ہیں اور پردہ غیب میں کیا ہے؟

(۱۴) برادرانِ یوسف کے جھوٹے آنسو

اور برادران یوسف شام کو روتے ہوئے اپنے والد کے پاس آئے یا تو گھر پہنچتے پہنچتے اندھیرا ہو گیا یا جان بوجھ کر اندھیرے میں آئے کہ دن کے اجالے میں باپ کو منہ دکھانا زیادہ مشکل تھا۔ اور رات کی سیاہ چادر بے حیائی، سنگدلی اور جھوٹی آہ و بکا کی کسی حد تک پردہ داری کر سکتی تھی۔ امام اعمش نے خوب فرمایا کہ برادران یوسف کی گریہ و پکار سننے کے بعد ہم کسی شخص کو محض چشم اشکبار سے سچا نہیں کہہ سکتے[۱]۔ رات گئے آنے میں ممکن ہے یہ مصلحت پیش نظر ہو کہ اگر باپ کے دل میں تلاش و تحقیق کا کوئی خیال پیدا ہو تو اس کا بھی کوئی امکان باقی نہ رہے۔ البقاعیؒ نے یہ بات خوب لکھی ہے کہ آیت کا مدلول بتا رہا ہے کہ رونا صداقت کی نشانی نہیں ہے ایک جرم کو نباہنے کیلئے دوسرے جرائم تک فطرت بشری مجرم کو

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

ناگزیر طور پر لیجاتی ہے۔ بناوٹی مظلوموں کا یہ کردار ہوتا ہے۔ سمجھدار حاکم اس قسم کی فریب کاریوں کو تاڑ لیتا ہے۔ اور دھوکے میں نہیں آتا۔ کسی مقدمہ میں قاضی شریح کی عدالت میں عورت روتی پیٹتی بات کر رہی ہے۔ شریح کو اس کے دعویٰ پر اطمینان نہیں ہے۔ حاضرین میں سے کسی نے کہا کہ جناب وہ تو رو رہی ہے۔ شریح نے فوراً کہا کہ برادران یوسف ظالم ہونے کے باوجود حضرت یعقوب علیہ السلام کے پاس روتے ہی آئے تھے۔

(۱۴) برادران یوسف کی سخن سازی

بولے ابّاجان ہم دوڑ کے مقابلے میں گئے تھے اور یوسف کو ہم نے اپنے سامان کے پاس چھوڑ دیا کہ یوسف کو بھیڑیا کھا گیا۔ اور آپ ہماری بات مانیں گے تو نہیں چاہے ہم سچے ہی ہوں یعنی ہم نے یوسف کی حفاظت میں کوئی کوتاہی نہیں کی۔ ہمارے کپڑے لتے وغیرہ قابلِ حفاظت چیزیں جہاں رکھی تھیں وہیں یوسف کو بٹھایا اور ایک دوسرے سے آگے نکلنے کو بھاگ دوڑ شروع کی بس ذرا آنکھ سے اُوجھل ہونا تھا کہ بھیڑیئے نے یوسف کو آدبوچا۔ اس موقع پر اتنی ذرا سی دیر میں احتمال ہی نہ تھا کہ بھیڑیا آکر یوسف کا شکار کرے گا اور یوسف کے معاملہ میں پہلے ہی سے آپ کو ہماری طرف سے بدگمانی ہے اگر آپ کے نزدیک ہم بالکل سچّے بھی ہوں تب بھی اس معاملہ خاص میں کسی طرح آپ ہماری بات کا یقین نہیں کر سکتے[۱] برادران یوسف نے اپنے غلط کردار کے لیے عذر تلاش کرنے میں کچھ زیادہ ذہانت کا ثبوت نہیں دیا۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے سامنے اخاف ان یاکلہ الذئب میں بھیڑیئے کے اندیشہ کا ذکر کیا اسی کو انہوں نے اپنی بات کی بنیاد بنا لیا کہ ابّا نے بھیڑیئے کا ذکر تو کیا ہی تھا اسی کو اپنے لیے سپر بنا لیا۔ چنانچہ انہوں نے حضرت یعقوب علیہ السلام کی بات دہرا دی۔ کہ ہم تو یوسف کو سامان کے پاس چھوڑ کر دوڑ لگاتے ہوئے ذرا دور نکل گئے تھے۔ آکے دیکھا کہ یوسف پر بھیڑیا حملہ کر گیا۔ بات بنانے کو تو انہوں نے بنا دی مگر چور کی ڈاڑھی میں تنکا ان کو خود ہی محسوس ہوا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام انکی بات باور نہ کرینگے چنانچہ انکے دل کا چور لکھے منہ پر آگیا کہ ما انت بمؤمن لنا آپ ہماری بات کو باور نہ کرینگے ولو کنا صادقین۔ چاہے فی الواقع ہم سچے ہی ہوں انداز کلام یہی کہہ رہا ہے کہ برادران یوسف نے سخن سازی سے کام لیا ہے۔ ورنہ نہ واقع میں دوڑ کیلئے گئے اور نہ یوسف کو سامان کے پاس چھوڑا نہ بھیڑیا

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

آیا اور نہ یوسف پر بھیڑیا حملہ آور ہوا اور نہ بھیڑیئے نے کھایا۔ آدمی کی طبیعت ہے کہ ایک جرم پر پردہ ڈالنے کے لیے ان گنت جرائم کرتا ہے۔ اسی کو کہتے ہیں کہ ایک گناہ کئی گناہوں کا ذریعہ ہوتا ہے۔ اپنے جرم کو چھپانے کے لیے جرائم کی فرضی داستان بنا ڈالی۔ شارحین قرآن نے یہاں بے محل اسلام میں استباق کی بحث چھیڑ دی ہے آیت قرآنی سے اس کا دور کا بھی تعلق نہیں ہے۔

⑮ دروغ گورا حافظ نباشد

اور یوسف علیہ السلام کی قمیص پر جھوٹ موٹ کا خون لگا کر لے آئے یہ داستان سُنکر حضرت یعقوب علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کچھ تم بتا رہے ہو اس میں کچھ بھی نہیں بلکہ یہ سب تمہاری من گھڑت کہانی ہے بس اب صبر ہی اچھا ہے اور تم جو داستان بیان کر رہے ہو اس پر اللہ ہی سے مدد کا خواہاں ہوں۔ ایک بکری یا ہرن وغیرہ ذبح کر کے اس کا خون یوسف کی قمیص پر چھڑک لائے تھے۔ وہ جھوٹا خون آلود کُرتہ پیش کر کے والد کو یقین دلانے لگے کہ بھیڑیئے کے زخمی کرنے سے یہ کُرتہ خون آلود ہو گیا بھلا جس کو شام میں بیٹھ کر مصر سے یوسف کے کُرتہ کے خُوشبو آتی تھی وہ بکری کے خون پر یوسف کے خون کا کب گمان کر سکتا تھا۔ انہوں نے سُنتے ہی جھٹلا دیا اور جیسا کہ بعض تفاسیر میں ہے کہ وہ بھیڑیا بڑا ہی حلیم و متین ہو گا جو یوسف کو لے گیا اور خون آلود کُرتہ کو نہایت احتیاط سے صحیح و سالم اتار کر رکھ گیا سچ ہے۔ دروغ گورا حافظ نباشد۔ خون کے چھینٹے تو دیئے مگر یہ خیال نہ رہا کہ قمیص کو بے ترتیبی سے نوچ کر اور پھاڑ کر پیش کرتے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے صاف طور پر فرما دیا کہ یہ سب کچھ تمہاری سازش اور اپنے دلوں سے تراشی ہوئی باتیں ہیں بہرحال میں صبر جمیل اختیار کرتا ہوں جس میں نہ کسی غیر کے سامنے شکوہ ہو گا نہ تم سے انتقام کی کوشش صرف اپنے اللہ سے دعا کرتا ہوں کہ اس صبر میں میری مدد فرمائے اور اپنی اعانت غیبی سے ان باتوں کی حقیقت آشکارا کر دے جو تم ظاہر کر رہے ہو کہ سلامتی کے ساتھ یوسف سے ملنا نصیب ہو۔ معلوم ہوتا ہے کہ یعقوب علیہ السلام کو مطلع کر دیا گیا تھا۔ کہ جس امتحان میں وہ مبتلا کیے گئے ہیں۔ وہ پورا ہو کر رہے گا اور ایک معین مدت کے بعد اس سے نجات ملے گی۔ فی الحال ڈھونڈھنے یا انتقامی کارروائی سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ یوسف علیہ السلام ابھی نہیں ملیں گے ہاں دوسرے بیٹے ساری دنیا میں رسوا ہو جائیں گے۔ اور ممکن ہے کہ طیش میں آ کر خود حضرت یعقوب علیہ السلام کو ایذا پہنچانے کی کوشش کریں۔ کذا قال الامام الرازیؒ فی الکبیر واللہ اعلم۔ بکری

کا بچہ ذبح کرنے اور اس کے خون سے حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص کو رنگین کرنے کی کہانی شاید ہمارے مفسرین نے تورات سے لی ہے۔ تورات میں ہے۔

پھر انہوں نے یوسف کی قبا کو لیا اور ایک بکری کا بچہ مارا اور اسے اس کے لہو میں تر کیا اور انہوں نے اس بوقلموں قبا کو بھیجا اور اپنے باپ کے پاس لے آئے اور کہا کہ ہم نے اسے پایا۔ آپ اسے پہچانیے کہ یہ آپ کے بیٹے کی قبا ہے کہ نہیں اور اس نے اسے پہچانا اور کہا کہ یہ تو میرے بیٹے کی قبا ہے۔ کوئی بڑا درندہ اسے کھا گیا یوسف بے شک پھاڑا گیا۔

قرآن نے انکشاف کیا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھائیوں کی فسوں کاری کو نہیں مانا اور توریت کہہ رہی ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے بھائیوں کے اس افسانہ پر مشتمل دعوے کو تسلیم کر لیا۔ اس طرح قرآن نے تورات کی اس غلط بیانی کی تردید کر دی۔ سوچنے کی بات ہے کہ قرآن نے خون آلود قمیص کا خصوصیت سے کیوں ذکر کیا؟ اس لیے کہ اسی سے ان کا سارا جھوٹ کھل کر منظر عام پر آتا ہے۔ انہوں نے بڑی ہوشیاری سے اپنے خیال میں بات بنائی تھی کہ یوسفؑ کی قمیص پر خون لگا کر بطور شہادت لے آئے۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے جب کُرتہ دیکھا تو انہیں پورا یقین ہو گیا کہ کھیل دوڑ سامان پر یوسف کے چھوڑنے اور بھیڑیے کی ساری کہانی من گھڑت ہے۔ یہ قرآن کی معجزانہ بلاغت ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے ایک جملے سوّلت لکم { انفسکم امرا } کے ذریعے کہانی کے سارے گھروندے کو پاش پاش کر دیا۔ اور صبر جمیل کہہ کر اپنا واقعی مؤقف ظاہر کر دیا۔ یہ تو حضرت یعقوب علیہ السلام کا وہ تاثر ہے جو قرآن نے پیش کیا ہے۔ اس کے مقابلے میں تورات اور تلمود کے بیان کو دیکھئے تو آپ محسوس کریں گے کہ قرآن تو حضرت یعقوب علیہ السلام کے صبر جمیل کی تعریف کر رہا ہے اور یہ تاثر دے رہا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام صبر جمیل کا نمونہ ہیں۔ اس کے مقابلے میں تورات حضرت یعقوب علیہ السلام کے تاثر کا نقشہ ایسا کھینچتی ہے جو کسی معمولی باپ کے تاثر سے کچھ بھی مختلف نہیں ہے تورات کا بیان یہ ہے کہ۔

تب یعقوب نے اپنا پیراہن چاک کیا اور ٹاٹ اپنی کمر سے لپٹا اور بہت دنوں تک بیٹے کے لیے ماتم کرتا رہا۔

اس نقشے میں حضرت یعقوب علیہ السلام وہی کچھ کر رہے ہیں جو ہر باپ ایسے موقع پر کرتا ہے۔ لیکن قربان جائیے قرآنی بلاغت کے کہ وہ جو نقشہ پیش کر رہا ہے اس سے ہمارے سامنے

ایک ایسے غیر معمولی شخص کی تصویر آتی ہے جو کمال درجہ بردبار اور باوقار ہے اتنی بڑی غم انگیز خبر سُن کر بھی دامن استقامت نہیں چھوڑتا ہے۔ اپنی فراست سے معاملہ کی ٹھیک ٹھیک نوعیت کو بھانپ لیتا ہے کہ یہ ایک بناوٹی کہانی ہے۔ جوان فاسد بھائیوں نے بنا کر پیش کی ہے۔ عالی ظرف شخصیتوں کی طرح صبر کرتا ہے اور خدا پر بھروسہ کرتا ہے۔

ذرا ٹھہر جایئے سولت لکم انفسکم پر غور کیجئے اس جملہ کا انداز ہی ایسا ہے کہ بیٹوں پر سرزنش سے کہیں زیادہ رحم و تاسف پر مبنی ہے اور مخاطبوں کے لیے ایک طرح کی معذرت کا پہلو پیدا کر رہا ہے یعنی یہ نہیں فرمایا کہ تم جھوٹ بول رہے ہو یا تم نے یوسف کے خلاف سازش کی ہے۔ بلکہ فرمایا کہ تمہارے جی نے تمہارے لیے ایک بات بنا دی ہے اور اس سے تمہارے خیال میں خوشنما دکھا دیا ہے کیونکہ تسویل کے معنے یہ ہیں۔ کسی بات کا جما دینا۔ خوشنما بنا کر دکھانا اور اس کے لیے طمع یا خواہش کا پیدا ہو جانا۔ لہٰذا گویا یہ ایک ہمدرد دل کا تاسف تھا کہ افسوس کہ تم نفس کے دام میں پھنس گئے اور اس کے دھوکہ سے نہ بچ سکے۔ پھر ساتھ ہی ان کے طرز عمل کے لیے معذرت کے پہلو کا بھی اعتراف ہے۔ کہ طمع نفس میں آکر ایسا کر بیٹھے ہو اور انسان نفس کے ہاتھوں بے بس ہو جاتا ہے۔

ایک کامل صابر مؤمن کی زندگی

ایک ایسے صدمہ جانکاہ میں جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کو ناگہاں پہنچا تھا۔ اور کسی طرح کی بات کا زبان پر نہ آنا صرف اسی جملہ کا نکلنا۔ صبر کا کیا عظیم الشان مظاہرہ ہے یہ ممکن ہے کہ صدمہ کے فوری تاثر کے بعد ایک ضابط اور متحمل آدمی اپنے دل و زبان کی نگرانی کر سکے لیکن عین اس وقت جب صدمہ کی پہلی چوٹ لگ رہی ہو اور دل کی بے تابیاں بے اختیار زبان کی طرف اُٹھنے لگی ہوں ممکن نہیں کہ دل و زبان کی نگہداشت کی جا سکے۔ ضابط سے ضابط دل بھی ایسی حالت میں چیخ اُٹھتا ہے۔ مضبوط سے مضبوط طبیعتیں بھی بے اختیار ہو جاتی ہیں۔ لیکن حضرت یعقوب علیہ السلام کا مقام صبر ایسا نہ تھا جو کسی حال میں بھی بے اختیار ہو۔ ایسی حالت میں بھی زبان کھلتی ہے تو ایسا جملہ نکلتا ہے گویا بے حالی اور جانکاہی کا کوئی معاملہ بھی پیش نہیں آیا ہے یہی وہ صبر ہے جسے جمیل فرمایا ہے۔

صبر اور درد و غم کا اجتماع کیسے ؟

بظاہر خیال ہوتا ہے کہ یہ تینوں باتیں جمع نہیں ہو سکتی ہیں اگر صبر کامل ہے تو پھر درد و غم کی شدتیں کیوں ہیں ؟ اور اگر یقین موجود تھا تو درد و غم کو محو ہو جانا چاہیئے۔ اسی لیے کچھ شارحین قرآن نے یہاں بڑی مشکل محسوس کی اور اس کے لیے طرح طرح کی توجیہوں کا سہارا لینا پڑا۔ لیکن اگر دقت نظر سے کام لیا جائے تو صورت حال بالکل صاف ہے۔ اور کسی توجیہہ کی چنداں ضرورت نہیں ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کا مقام صبر کا مقام تھا۔ اور صبر اسی وقت ممکن ہے جب بے صبری کے اسباب موجود ہوں اور زیادہ سے زیادہ موجود ہوں۔ اگر درد و غم کی ٹیس نہیں اُٹھ رہی ہے تو کیسے کہا جا سکتا ہے کہ جھیلنے اور اُف نہ کرنیکی حالت موجود ہے۔ برداشت تو اسی کی برداشت ہو سکتی ہے جو آگ کی جلن محسوس کر رہا ہو لیکن زبان سے اُف نہ کرے اگر حضرت یعقوب علیہ السلام کا درد و غم اسی طرح محو ہو جاتا کہ اُسکی جلن ہی باقی نہ رہے تو یہ مقام صبر کا مقام نہ ہوتا۔ موجبات غم سے متاثر نہ ہونے کا مقام ہوتا اور یہ حالت یا تو فرشتوں کی ہو سکتی ہے۔ یا پھر اس شخص کی جس کے انسانی احساسات معطل ہو چکے ہوں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام انسان تھے۔ فرشتے نہ تھے۔ اور اسی حیثیت سے قرآن نے ان کا اسوۂ حسنہ پیش کیا ہے۔ ان کی روح صبر و یقین سے معمور تھی۔ وہ یوسف ؑ کے خواب میں اس کا مستقبل دیکھ چکے تھے۔ وہ جانتے تھے۔ کسی نہ کسی دن یہ جدائی ختم ہونے والی ہے۔ تاہم دل کے ہاتھوں مجبور تھے۔ جس کی جدائی ایک گھڑی کے لیے شاق تھی وہ برسوں کے لیے ان سے جدا ہو گیا تھا۔ یہ جاننے پر بھی کہ وہ زندہ و سلامت موجود ہے اس کے فراق کا زخم بھر نہیں سکتا تھا۔ بلکہ اس بات کے تصوّر نے کہ وہ زندہ موجود ہے مگر مجھ سے دور ہے درد فراق کو اور زیادہ کر دیا تھا۔

(۱۶) حضرت یوسف ؑ کنعانی غلام کی حیثیت سے

اور ایک قافلہ آیا۔ قافلے والوں نے اپنا پانی لانے والا کنویں پر روانہ کیا۔ اس نے ڈول لٹکایا۔ بول پڑا واہ واہ خوشی کی بات ہے۔ یہ تو ایک لڑکا ہے اور پھر قافلہ والوں نے اُسے تجارتی مایہ بنا کر چھپا لیا اور وہ جو کچھ کر رہے تھے۔ اللہ کو خوب معلوم ہے۔ کہتے ہیں کہ تین روز تک حضرت یوسف علیہ السلام کنویں میں رہے۔ قدرت الٰہی نے حفاظت کی ایک بھائی یہودا کے دل میں

ڈال دیا۔ کہ وہ ہر روز کنوئیں پر آئے اور کھانا پہنچائے۔ ویسے بھی سب بھائی خبر رکھتے تھے۔ کہ مریں نہیں بلکہ کسی دوسرے ملک کا مسافر نکال لے جائے۔ تو ہمارے درمیان سے یہ کانٹا نکل جائے۔ سچ ہے۔

گل است سعدی و در چشم دشمنان خار

آخر مدین سے مصر جانے والا قافلہ اُدھر سے گذرا۔ انہوں نے کنواں دیکھ کر اپنا آدمی پانی بھرنے کو روانہ کیا اس نے ڈول ڈالا۔ تو حضرت یوسف علیہ السلام چھوٹے تو تھے ہی ڈول میں بیٹھ گئے اور رسی ہاتھ سے پکڑلی۔ کھینچنے والے نے ان کا حسن وجمال دیکھ کر بے ساختہ خوشی سے پکارا۔ یہ تو عجیب لڑکا ہے۔ بڑی قیمت کو بکے گا ادھر کھینچنے والے نے اس واقعہ کو دوسرے ہمراہیوں سے چھپانا چاہا کہ اوروں کو خبر ہوگی تو سب شریک ہوجائیں گے۔ شاید یہ ظاہر کیا کہ یہ غلام اس کے مالکوں نے مجھ کو دیا ہے تا کہ مصر کے بازار میں فروخت کروں۔ آخر میں فرمایا۔ واللہ علیم بمایعملون۔ یعنی بھائی بے وطن کرنا چاہتے تھے۔ اور قافلہ والے بیچ کر دام وصول کرنا چاہتے تھے۔ اور خدا تعالیٰ خزائن مصر کا مالک بنانا چاہتا تھا۔ وہ اگر چاہتا تو ان کارروائیوں کو یکدم روک دیتا لیکن اس کی مصلحت تاخیر میں تھی اس لیے سب چیزوں کو جانتے اور دیکھتے ہوئے انہیں ڈھیل دی گئی[1]

اس آیت میں تین باتیں بتائی گئی ہیں ایک یہ کہ کوئی تجارتی قافلہ کنوئیں پر آیا۔ دوسری یہ کہ پانی بھرنے والے نے پانی کے ارادے سے کنوئیں میں ڈول ڈالا تیسری یہ کہ ڈول میں پانی کی جگہ حضرت یوسف علیہ السلام بیٹھ گئے۔ اس سے پانی کے لیے ڈول ڈالنے والے کو خوشی ہوئی۔ قافلہ والوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو مال تجارت سمجھ کر سامان میں چھپا لیا۔ یہ تجارتی قافلہ کہاں سے آرہا تھا اور کون تھا۔

اسماعیلی تاجروں کا قافلہ

حجاز کے اسماعیلی تاجروں کا ایک قافلہ شام سے مصر کو بخورات بلسان اور مسالہ لاد کر جارہا تھا۔ کنواں دیکھ کر انہوں نے وارد کو روانہ کیا۔ وارد کے اصلی معنے تو کسی گھاٹ یا چشمہ پر اترنے والے

[1] افادات شیخ الاسلام

کے ہیں۔ عرب میں یہ دستور تھا۔ کہ جس کنویں پر اترنا ہوتا ذرا پہلے ایک آدمی اس پر بھیجتے تاکہ وہ پانی وغیرہ کا انتظام کر رکھے۔ یہاں وارد سے وہی مراد ہے اسی وارد نے کنویں میں ڈول ڈالا۔ یوسفؑ اسی ڈول کے سہارے کنویں سے باہر آگئے جب قافلہ کے آدمی نے ڈول ڈالا تو یوسف علیہ السلام سمجھے کہ شاید کوئی آدمی مجھے نکالنے آیا ہے۔ اور ڈول میں بیٹھ گئے۔ ڈول کھینچنے والے نے اظہار تعجب کی جگہ اظہار مسرت اس لیے کیا۔ کہ غلامی کا رواج عام تھا اور کمسن اور خوبصورت لڑکے کا ہاتھ لگ جانا تو ایک قیمتی متاع سمجھی جاتی اور معقول قیمت وصول ہوجاتی اسی لیے فرمایا واسروہ بضاعۃ۔ قافلہ والوں نے سوچا کہ ایک نفع کی چیز مل گئی کہیں بیچ لیں گے اور اس خیال سے کہ کہیں دامنے بائیں کوئی مدعی نہ کھڑا ہوجائے اس واقعہ کو انہوں نے راز بنانے کی کوشش کی تاکہ اس کی تشہیر نہ ہوتے دیں۔ گویا سوتیلے بھائیوں نے ہلاک کرنے کے لیے کنویں میں ڈال دیا۔ کنواں خشک تھا اور شاہراہ سے الگ اس لیے بھائیوں کو یقین تھا کہ کوئی انسان وہاں نہیں پہنچ سکے گا۔ لیکن اتفاق سے ایک قافلہ راہ بھول کر وہاں آنکلتا ہے اور پانی کے لیے وارد ڈول ڈالتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام اس میں بیٹھ جاتے ہیں اور اس طرح ان کی رہائی کا سامان ہوجاتا ہے۔ لیکن کیسی رہائی؟ ایسی رہائی جس میں ایک ہلاکت سے جو تھوڑی سے دیر کی تھی نجات مل گئی۔ لیکن دوسری ہلاکت سے جو عمر بھر جاری رہنے والی تھی نمودار ہوگئی۔ معاملہ کی سادہ صورت تو یہی ہے کہ برادران یوسف حضرت یوسفؑ کو کنویں میں ڈال کر چلے گئے۔ بعد میں قافلے والوں نے آکر ان کو وہاں سے نکالا اور مصر لے جا کر بیچ دیا۔ یہ قافلہ جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو کنویں سے نکالا اسمٰعیلی تاجروں کا قافلہ تھا۔ یہ اہل مدین اسماعیلی عرب تھے۔ یہ تجارت کی تاریخ کا سب سے پہلا صفحہ اور اسمٰعیلی اور مدیانی عربوں کی تجارت کا سب سے پہلا قافلہ اور مصر ان کی تاجرانہ سفر کی اولین منزل ہے یہ حضرت مسیح علیہ السلام سے دو ہزار برس پہلے قدامت پرست عربوں کا تجارتی قافلہ ہے۔

قصص الانبیاء عبدالوہاب کو تورات کے بیان کی وجہ سے قافلہ کے متعلق یہ غلط فہمی ہوگئی ہے کہ انہوں نے اسماعیلی اور مدیانی کو دو جدا جدا قافلے سمجھا ہے حالانکہ یہ صحیح نہیں ہے بلکہ امر واقعہ یہ ہے شام سے مصر جانے والا یہ قافلہ ایک قافلہ تھا جو نسلی اعتبار سے حضرت اسمٰعیل سے تعلق رکھتا تھا اور وطنی اعتبار سے مدیانی تھا۔ جدید نسلی وجغرافیائی تحقیق نے یہ ثابت کردیا ہے کہ جس مقام کو تورات میں مدین یا مدیان کہا گیا ہے اس سے وہ علاقہ مراد ہے جو ساعیر (سراۃ) بحر احمر کے کنارے شام سے یمن تک چلا گیا ہے اس کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے زمانے سے

بنی اسرائیل مدین. اور آغاز میں اسماعیلی حجاز کہتے تھے۔ اس لیے ایک ہی مقام کے دو نام ہیں۔ مولانا سید سلیمان ندوی فرماتے ہیں۔

"ممالک عرب میں سب سے پہلا نام تورات میں مدیان نظر آتا ہے۔" (تکوین ۳۷-۲۸)

شہر مدیان تحقیقی اور یقینی طور پر حجاز میں ساحل بحر احمر عقبہ کے سرے پر واقع تھا۔ اور اب تک اسی نام سے وہیں موجود ہے۔ قدیم تاریخ میں جہاں کہیں بھی مدیانی لوگوں کا ذکر ہے ساتھ ہی اتحاد نام کے ساتھ اسماعیلیوں کا ذکر ہے۔ بلکہ تورات نے اکثر دونوں کو ایک سمجھا ہے۔ یہ اتحاد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی ایک پشت کے بعد تورات میں نظر آتا ہے۔ دراصل یہ تجارتی قافلہ نسلاً اسمٰعیلی اور وطن کے اعتبار سے مدیانی یعنی حجازی تھا۔ لہٰذا یہ دو قافلے نہیں بلکہ ایک ہی قافلہ تھا۔ یہ واقعہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے زمانہ کا ہے۔ اس لیے یہ قافلے والے حضرت اسماعیلؑ کے بیٹے اور پوتے ہوں گے۔

⑰ یوسفؑ اور غلامی

اور پھر انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو بہت معمولی قیمت پر یعنی گنتی کے چند درہموں میں فروخت کر دیا وہ اس سے دل برداشتہ تھے۔ بھائیوں کو خبر ہوئی کہ قافلے والے نکال لے گئے وہاں پہنچے اور ظاہر کیا کہ یہ ہمارا غلام بھاگ آیا ہے۔ چونکہ اسے بھاگنے کی عادت ہے اس لیے ہم رکھنا نہیں چاہتے تم خرید و تو خرید سکتے ہو۔ مگر سخت نگرانی رکھنا کہیں بھاگ نہ جائے کہتے ہیں کہ اٹھارہ درہم یا کم و بیش میں بیچ ڈالا اور نو بھائیوں نے دو دو درہم لے لیے۔ ایک بھائی یہودا نے نہیں لیے۔ آخر میں فرمایا وہ اس سے دل برداشتہ تھے۔ یعنی اس قدر ارزاں بیچنے پر تعجب نہ کرو وہ اتنے بیزار تھے کہ مفت ہی دے ڈالتے تو مستبعد نہ تھا۔ جو پیسے مل گئے غنیمت سمجھا کچھ مفسرین کہتے ہیں۔ آیت میں اس بیع کا ذکر ہے جو قافلہ والوں نے مصر پہنچ کر کی اگر ایسا ہو تو کہا جائے گا کہ پڑی ہوئی چیز کی قدر نہ کی اور یہ اندیشہ رہا کہ پھر آکر کوئی دعویٰ نہ کر بیٹھے نیز آبق بھگوڑا ہونے کا عیب سن چکے تھے اس لیے سستے داموں بیچ ڈالا وا لظاہر ھو الاول واللہ اعلم [1]

شیخ الاسلام نے جو تشریح کی عام شارحین قرآن نے یہی تشریح کی ہے۔ مگر اس تشریح کا قرآن ساتھ نہیں دیتا ہے۔ قرآن میں شروہ کی ضمیر کا مرجع قافلہ والے ہیں۔ قرآن میں صرف ایک ہی

[1] افادات شیخ الاسلام

فروختگی کا ذکر ہے ۔ دونوں باتیں پایہ تحقیق سے گری ہوئی ہیں ۔ یہ بھی مدین والوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو اسماعیلی تاجروں کے ہاتھ فروخت کیا اور یہ بھی کہ برادران یوسف نے اسماعیلی قافلے کے ہاتھ فروخت کیا تلمود کا بیان ہے کہ

> مدین کے سوداگروں نے یوسف کو کنویں سے نکال کر اپنا غلام بنا لیا ۔ پھر برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ان کے قبضے میں دیکھ کر ان سے جھگڑا کیا آخر کار انہوں نے بیس درہم قیمت ادا کرکے برادرانِ یوسف کو راضی کیا پھر انہوں نے بیس درہم میں یوسف کو اسماعیلیوں کے ہاتھ فروخت کیا اور اسماعیلیوں نے مصر لے جا کر فروخت کیا ۔

اسی تلمودی داستان سے عام شارحین قرآن میں یہ روایت مشہور ہوئی ہے کہ برادرانِ یوسف نے حضرت یوسف علیہ السلام کو فروخت کیا تھا ۔ لیکن واضح رہے کہ قرآن اس روائیت کی تائید نہیں کرتا ہے ۔

مطلب یہ ہے کہ اسمٰعیلی تاجروں نے مصر پہنچتے ہی حضرت یوسف علیہ السلام کو نہایت حقیر قیمت گنتی کے چند درہم کے عوض میں بیچ دیا انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے خریدنے پر کچھ رقم تو خرچ نہیں کی تھی کہ اپنی رقم وصول کرتے اور اس پر مزید نفع حاصل کرنے کی فکر ہوتی ایک چیز مفت ہاتھ آتی ہے وہ جس قیمت پر بھی بک جائے بیچنے والے کے لیے نفع ہی نفع ہے ۔

وَقَالَ الَّذِى اشْتَرٰىهُ مِنْ مِّصْرَ لِامْرَاَتِهٖٓ اَكْرِمِىْ مَثْوٰىهُ عَسٰٓى
اَنْ يَّنْفَعَنَآ اَوْ نَتَّخِذَهٗ وَلَدًا ۭ وَكَذٰلِكَ مَكَّنَّا لِيُوْسُفَ فِى
الْاَرْضِ ۡ وَلِنُعَلِّمَهٗ مِنْ تَاْوِيْلِ الْاَحَادِيْثِ ۭ وَاللّٰهُ غَالِبٌ
عَلٰٓى اَمْرِهٖ وَلٰكِنَّ اَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۲۱﴾ وَلَمَّا بَلَغَ
اَشُدَّهٗٓ اٰتَيْنٰهُ حُكْمًا وَّعِلْمًا ۭ وَكَذٰلِكَ نَجْزِى الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۲۲﴾

اور جس شخص نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قافلہ والوں سے
خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا اسے عزت کے ساتھ رکھو عجب
نہیں کہ یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے اپنا بیٹا بنالیں۔[۱۸] اور
اس راہ سے ہم نے یوسف علیہ السلام کیلئے سرزمین مصر میں
قدم جمانے کا موقعہ فراہم کر دیا اور یوسف علیہ السلام کی برگزیدگی
کے ساتھ تاکہ ہم یوسف علیہ السلام کو باتوں کا نتیجہ اور مطلب
نکالنا سکھادیں۔[۱۹] اور اللہ کو جو کچھ کرنا ہوتا ہے کر دیتا ہے۔
لیکن لوگوں کی اکثریت اس سے بے خبر ہے۔[۲۰] اور جب
یوسف علیہ السلام اپنی بھرپور جوانی کو پہنچے تو ہم نے اسے

کار فرمائی کی قوت اور علم کی فراوانی دی اور ہم حُسن کاروں کو اسی طرح جزا دیتے ہیں[۲۱]

حضرت یوسفؑ کی مصری زندگی کا آغاز

انسانی زندگی کی سب سے بڑی فضیلت اس کی سیرت کی فضیلت ہے اگر یہ فضیلت موجود ہو تو پھر اس کے لیے فتح و کامرانی ہے۔ دنیا کی ساری رکاوٹیں اس کی راہ روک لیں جب بھی اس کے لیے رحمت حق راہ نکال دے گی۔ دنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اس کی راہ میں رکاوٹ بن جائیں پھر بھی رحمت حق اسے ناکام نہ کرے گی حوادث واقعات اس پر قابو نہیں پا سکتے، احوال وظروف اس پر غالب نہیں آ سکتے، افراد و جماعات اسے مسخر نہیں کر سکتے۔ اس کے لیے اللہ کی جانب سے ہر حال میں کامیابی ہے، اس کے لیے ہر گوشہ میں فتح مندی ہے۔ اس کے لیے ہر طاقت پر فرماں روائی ہے وہ اعمال انسانی کی اس امتحان گاہ میں صرف اس لیے ہے کہ سربلند ہو۔ عجز و درماندگی کی آلودگی اسے کبھی چھو نہیں سکتی۔ غور کیجئے کہ سترہ برس کا ایک نوخیز لڑکا باپ کی آغوش محبت سے جبراً جدا کیا جاتا ہے اور اچانک وہ اپنے آپ کو ان لوگوں میں پاتا ہے جو چند سکّوں کے بدلے اسے غلام بنا کر بیچ رہے ہیں بھائیوں نے اس کے خلاف سازش کی۔ قتل کا ارادہ کیا۔ گمنام کنویں میں اسے ڈالا۔ قافلہ والوں نے کنویں سے نکالا۔ قرآن نے بھائیوں کے کردار کی المناک صورت پیش کی مگر حضرت یوسف علیہ السلام کی بے چینی، بے قراری، جزع اور فزع کی حالت کے بارے میں دور کا بھی اشارہ نہیں کیا۔ سوچو دنیا کی ایک لاکھ طبیعتیں اس موقعہ اور ایسی حالت میں کیا کرتیں مگر غور کرو کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے کیا کیا؟ اچانک ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جیسے ایک تجربہ کار دانشمند کی طرح انہوں نے صورت حال کا پورا پورا جائزہ لے لیا ہو اور پھر فیصلہ کر لیا ہو کہ جو حالت بھی پیش آجائے اسے صبر و سکون سے برداشت کرنا ہے اور اسی کے مطابق کام کرنا ہے۔ بھائیوں نے باپ سے چھینا، کنویں میں بے بسی اور بے کسی کی حالت میں قید کر دیا، قافلہ والوں نے کنویں سے نکالا اور انہیں غلام کی حیثیت سے پیش کیا وہ ایک غلام کی طرح پیش ہو گئے عزیز مصر نے غلام کی طرح خریدا انہوں نے غلام کی طرح اس کی خدمت کی۔ یہ ناگہانی مصیبت جو ہزاروں لاکھوں انسانوں کے لیے پوری

زندگی کی سوگواری بن جاتی۔ ان کے لیے کوئی مصیبت ہی نہ تھی۔ باپ کی آغوش سے نکل کر اچانک ایک اجنبی ملک میں ایک اجنبی کا غلام بن جانا ان کے لیے ایسی ہی بات ہوئی جیسے اپنی مرضی سے اپنی زندگی کا ایک عیش چھوڑ کر دوسرا عیش اختیار کر لینا۔ نہ پچھلی بات کا ماتم ہے نہ موجودہ حالت سے جھجک، نہ گزشتہ کی یاد میں سوگواری ہوئی نہ آئندہ کے اندیشے میں بدحالی۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے مصائب و محن کی پہلی ہی منزل میں صبر، عزم، اعتماد نفس، اور توکل علی اللہ کی روح عظیم اپنے اندر نہ پیدا کر لی ہوتی تو وہ منزل سامنے نہ آتی جس کی طرف ان آیات میں راہنمائی ہو رہی ہے۔

(۱۸) اور جس شخص نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قافلہ والوں سے خریدا اس نے اپنی بیوی سے کہا۔ اسے عزت کے ساتھ رکھو عجب نہیں کہ یہ ہمیں فائدہ پہنچائے یا ہم اسے بیٹا بنا لیں۔ کہتے ہیں کہ مصر پہنچ کر نیلام ہوا۔ عزیز مصر وہاں کا مدار المہام تھا۔ اس کی بولی پر معاملہ ختم ہوا اس نے اپنی عورت زلیخا یا راعیل سے کہا کہ نہایت پیارا مقبول صورت اور ہونہار لڑکا معلوم ہوتا ہے اس کو پوری عزت و آبرو سے رکھو۔ غلاموں کا معاملہ مت کرو۔ شاید بڑا ہو کر ہمارے کام آئے ہم اپنا کاروبار اس کے سپرد کر دیں یا جب اولاد نہیں تو بیٹا بنا لیں[1] تقریباً دو ہزار سال قبل مسیح مصر تمدن و تہذیب کا گہوارہ تھا۔ یہاں کے حکمران عمالقہ میں سے تھے۔ جبکہ حضرت یوسف علیہ السلام کنعان سے ایک بردی غلام کی حیثیت سے مصر میں داخل ہوئے۔ مصر کا دارالحکومت اس زمانہ میں رعمیس تھا۔ جہاں آج صان کی بستی آباد ہے۔ یہی غالباً وہ مقام ہے۔ جغرافی حیثیت سے اس کی جائے وقوع مشرق کی جانب دریائے نیل کے قریب بتائی جاتی ہے۔ مصری فوج کا ایک افسر شاہی خاندان کا ایک رئیس تھا جس کا نام فوطیقار تھا۔ تورات میں ہے کہ جس مصری نے خریدا تھا اس کا نام فوطیقار تھا اور وہ فرعون کا ایک امیر اور فوج کا سردار تھا۔ قرآن نے آگے چل کر اسے عزیز کہہ کر پکارا ہے اور آگے اسی واقعہ میں دربار میں حضرت یوسف علیہ السلام کو بھی یا ایها العزیز کہا ہے۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص مصر میں کوئی بڑا عہدے دار یا صاحب منصب تھا۔ کیونکہ عزیز کے معنے ایسے بااقتدار شخص کے ہیں۔ جس کا کوئی مدمقابل نہ ہو۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ کا بیان ہے۔ کہ وہ شاہی خزانہ کا افسر تھا۔ یہی افسر مصر کے بازار سے گزر رہا تھا۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر نظر پڑی اور اس نے معمولی قیمت پر قافلہ والوں سے حضرت یوسف علیہ السلام کو خرید لیا۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یہاں قرآن نے سب سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ عزیز مصر کے معاملہ کا ذکر کیا ہے۔ کہ اس نے اپنی بیوی سے کہا اکرمی مثواہ کہ اسے اچھی طرح رکھنا۔ عزیز مصر نے حضرت علیہ السلام کو بحیثیت غلام خریدا تھا۔ اور مصر کے آثار و نقوش بتاتے ہیں کہ مصریوں کا سلوک غلاموں کے ساتھ کیسا ہوتا تھا۔ وہ غلاموں کے لیے ویسے ہی سنگدل تھے جتنی سنگدل دنیا کی تمام پرانی قومیں رہ چکی ہیں۔ اس لیے اس نے اپنی بیوی سے خصوصیت سے کہا کہ یہ عام غلاموں میں سے نہیں۔ اسے عزت واحترام کا مقام دینا یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے اللہ سبحانہ کی جانب سے معجزانہ کارسازی تھی کہ ایک غلام جب ایک متمدن اور صاحب شوکت رئیس کے گھر پہنچتا ہے تو پاک زندگی حلم وقار اور امانت وسلیقہ کے پاک اوصاف کی وجہ سے عزیز مصر کی آنکھوں کا تارا اور دل کا مالک بن جاتا ہے۔ اور تھوڑے ہی عرصہ کے اندر حُسنِ کردار سے اس کا دل ایسا مسخر ہو جاتا ہے کہ غلامی کی جگہ آقائی کرنے لگ جاتا ہے۔ اور وہ اپنی بیوی سے کہتا ہے۔ اکرمی مثواہ عسٰی ان ینفعنا او نتخذہ ولدا۔ یہ انقلاب حال کیونکر ہوا۔ وہ کیسی وفاداری دیانت اور راست بازی وامانت شعاری ہوگی۔ جس نے ایک مصری امیر کو اس درجہ متاثر کر دیا کہ ایک عبرانی غلام کو اپنے فرزند کی طرح چاہنے لگا۔ تلمود کا بیان ہے کہ اس وقت حضرت یوسف علیہ السلام کی عمر ۱۸ سال تھی اور فوطیفار عزیز مصر ان کی شاندار شخصیت کو دیکھ کر ہی سمجھ گیا تھا کہ یہ لڑکا غلام نہیں ہے بلکہ کسی بڑے شریف خاندان کا چشم وچراغ ہے جسے حالات کی گردش یہاں کھینچ لائی ہے چنانچہ جب وہ انہیں خرید رہا تھا۔ اسی وقت اس نے سوداگروں سے کہہ دیا تھا کہ یہ تو غلام معلوم نہیں ہوتا مجھے شبہ ہوتا ہے کہ شاید تم اسے کہیں سے چرا کر لائے ہو۔ تورات کا بیان ہے کہ اس نے اپنا سب کچھ یوسف علیہ السلام کے ہاتھ میں چھوڑ دیا چنانچہ اس نے اپنی بیوی سے کہہ دیا کہ اس کو غلام کی طرح نہیں بلکہ عزت واحترام سے رکھنا ہے بہت ممکن ہے کہ یہ ہمیں نفع پہنچائے یا ہم اسی کو اپنی فرزندی میں لے لیں۔

(۱۹) حضرت یوسف کی مصری زندگی میں کامرانیوں کی ابتدار

اور اس راہ سے ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو برگزیدگی دی اور تاکہ ہم یوسفؑ کو باتوں کا نتیجہ اور مطلب نکالنا سکھا دیں یعنی ہم نے اپنی قدرت کاملہ اور تدبیر لطیف سے یوسفؑ کو بھائیوں کی حاسدانہ سختیوں اور کنوئیں کی قید سے نکال کر عزیز مصر کے یہاں پہنچا دیا پھر اس کے

دل میں یوسف علیہ السلام کی محبت و وقعت القا فرمائی۔ اس طرح ہم نے ان کو مصر میں ایک معزز جگہ دی اور اہل مصر کی نظر میں ان کو وجیہہ محبوب بنا دیا تاکہ یہ چیز آئندہ ترقیوں اور سربلندیوں کا پیش خیمہ ہو۔ اور بنی اسرائیل کو مصر میں بسانے کا ذریعہ ہو۔ ساتھ میں یہ بھی منظور تھا کہ عزیز مصر کے یہاں رہ کر بڑے سرداروں کی صحبت دیکھیں تاکہ سلطنت کے رموز و اشارات سمجھنے اور تمام باتوں کو ٹھکانے پر بٹھانے کا کامل سلیقہ اور تجربہ حاصل ہو۔[1] یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی مصری زندگی میں کامرانیوں کا نقطہ آغاز کا بیان ہو رہا ہے جب معاملہ یہاں تک پہنچ گیا تو گویا حضرت یوسف علیہ السلام کی مصری کامرانیوں کی بنیاد پڑ گئی اور وہ میدان پیدا ہو گیا جہاں ان کے جوہر کھلنے اور بتدریج تخت مصر تک پہنچانے کا اللہ سبحانہ کی جانب سے سامان ہو گیا کذالک مکنا لیوسف فی الارض۔ اس طرح ہم نے یوسف کے مصر میں قدم جما دیئے کہ غلام ہو کر بکا تھا لیکن معزز و محترم ہو کر زندگی بسر کرنے لگا نیز اس میں یہ بھی مصلحت تھی کہ ان پر اس تاویل الاحادیث کی راہ کھول دیں۔ جس کی خبر ستاروں والے خواب میں دی جا چکی تھی۔ اس آیت کی روشنی میں یہ بات واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی تربیت اس وقت تک صحرا میں نیم خانہ بدوشی اور گلہ بانی کے ماحول میں ہوئی تھی۔ کنعان اور شمالی عرب کے علاقے میں اس وقت نہ کوئی منظم حکومت تھی اور نہ تمدن و تہذیب کی ترقی کا کوئی نام و نشان تھا۔ کچھ آزاد قبائل تھے۔ جو وقتاً فوقتاً ہجرت کرتے رہتے تھے۔ اور بعض قبائل نے مختلف علاقوں میں مستقل سکونت اختیار کر کے چھوٹی چھوٹی ریاستیں بنا ہی لی تھیں۔ ان لوگوں کا حال مصر کے مقابلے میں غیر منظم اور غیر ترقی یافتہ قبائل کا تھا۔ یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کو جو تربیت ملی تھی اس میں بدویانہ زندگی کے محاسن اور خانوادہ ابراہیمؑ کی خدا پرستی اور دینداری کے عناصر تو ضرور موجود ہیں مگر اللہ سبحانہ اس وقت کے سب سے زیادہ متمدن اور ترقی یافتہ ملک یعنی مصر میں ان سے جو کام لینا چاہتا تھا۔ اور اس کے لیے جس واقفیت جس تجربے اور جس بصیرت کی ضرورت تھی۔ اس کی نشوونما کا بدوی زندگی میں کوئی موقع نہ تھا۔ اس لیے اللہ سبحانہ نے اپنی قدرت کاملہ سے یہ انتظام فرمایا کہ انہیں سلطنت مصر کے ایک بڑے عہدے دار کے یہاں پہنچا دیا۔ اس طرح یہ موقع فراہم ہو گیا کہ ان کی وہ تمام قابلیتیں پوری طرح نشوونما پا سکیں جو اب تک بروئے کار نہیں آئی تھیں۔ اسی بات کی طرف اس آیت میں یہ اشارہ ہے۔ سوچنے کی بات ہے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کہ ایک ایسے شخص میں جو ابھی چند سال ہوئے صحرا کے ویرانوں سے نکل کر آیا یہ قوت علمی کیسے پیدا ہوگئی کہ تمام باتوں کا نبض شناس اور تمام مہمات کی کل بٹھانے والا ہو گیا ۔ یقیناً مبدأ فیاض کے کرشمۂ فیضان ہیں ۔ لیکن اس کرشمۂ فیضان کا نام کیا ہے ؟ علم تاویل الاحادیث اب چونکہ علوم وضعیہ کی تدوین اور فنی اصطلاحات کے گورکھ دھندے نے ہمیں طرح طرح کی تعبیرات سکھا دی ہیں ۔ اس لیے ہم اس طرح کے علم و بصیرت کے لیے بہت سے اصطلاحی الفاظ بولتے ہیں ۔ لیکن قرآن کی زبان وضعی اصطلاحات کی زبان نہیں ہے ۔ نہ علمی اصطلاحوں سے اس وقت عربی زبان آشنا ہوئی تھی ۔ اس نے ساری باتوں کے لیے ایک ایسی ترکیب استعمال کی جو ادا ءِ مطلب کا قدرتی اور سیدھا سادھا مطلب ہو سکتا ہے ۔

تاویل الاحادیث یعنی باتوں کے مطلب اور مآل پا لینے کا علم ، تعلیم کی ساری کاوشیں تربیت ذہنی کی ساری محنتیں تجربہ و اختیار کی ساری کوششیں صرف اس لیے ہوتی تھیں کہ باتوں کی تاویل اور مطلب بوجھ لینے کی استعداد پیدا ہو جائے ۔ اس آیت میں اسی مقصد کو بتانے کے لیے لنعلمك من تاویل الاحادیث کی بلیغ معجزانہ تعبیر اختیار کی ہے اس آیت کے موضوع پر صرف یہ کہنا باقی ہے کہ آیت میں ولنعلمہ من تاویل الاحادیث کا معطوف علیہ موجود نہیں ہے ۔ قاضی بیضاوی نے معطوف علیہ یتصرف فیھا بالعدل بتایا ہے ۔ مطلب یہ بتایا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو ان گزشتہ ناخوشگوار حالات میں اس لیے محفوظ رکھا گیا ہے تاکہ حضرت یوسف علیہ السلام مصر میں اقتدار اعلیٰ پر پہنچ کر عدل و انصاف کا بے لاگ اسلامی نظام قائم کریں ۔ اور تاکہ ہم ان کو مملکت چلانے کے لیے اللہ کے قوانین اور اس کے احکام کی تعلیم دیں اور علامہ قرطبی نے معطوف علیہ فعلنا ذالك بتایا ہے ۔ مطلب یہ ہے کہ ہم نے یہ کام اس لیے کیا تاکہ ہم حضرت یوسف علیہ السلام کو حضرت یعقوب علیہ السلام کی بتائی ہوئی خواب کی تعبیر کا مشاہدہ کرائیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کو تاویل احادیث کی تعلیم دیں اور کچھ نے معطوف علیہ لنجتبیہ نکالا ہے پوری بات یوں ہے کہ اس طرح ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے ملک میں زمین ہموار کی تاکہ ہم ان کو اپنے کام یعنی اسلامی نظام قائم کرنے کے لیے برگزیدگی دیں اور تاکہ ہم ان کو احادیث کی تاویل سکھائیں ۔

اسی طرح کذالك کا شارحین قرآن نے اپنے اپنے مذاق کے مطابق مطلب مقرر کیا ۔ ایسے ہی ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو ملک مصر میں قدم جمانے کا موقعہ دیا ۔ کیسے دیا ؟ اس کے جواب میں مختلف باتیں کہی ہیں ۔ قاضی ثناء اللہ فرماتے ہیں ۔ جیسے ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل سے اور کنوئیں کی قید سے بچایا اور عزیز مصر کو ان پر مہربان کیا ایسے ہی ہم نے اپنی شان

قدیری سے ان کو مصر میں اقتدار کا موقعہ فراہم کیا قاضی بیضاوی اور علامہ قرطبیؒ کی بھی یہی رائے ہے

(۲۰) اللہ سبحانہٗ کی شانِ قدیری کا مظاہرہ

اور اللہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے کر دیتا ہے لیکن لوگوں کی اکثریت اس سے بے خبر ہے۔ یعنی بھائیوں نے یوسف علیہ السلام کو گرانا چاہا اللہ سبحانہٗ نے ان کو آسمان رفعت پر پہنچانا چاہا۔ اکثر لوگ کوتاہ نظری سے دیکھتے نہیں ہیں کہ انسانی تدبیر کے مقابلہ میں کس طرح اللہ سبحانہٗ کا بندوبست غالب رہتا ہے[۱] مطلب یہ ہے کہ دیکھو اللہ جو کچھ کرنا چاہتا ہے کس طرح کر کے رہتا ہے بھائیوں نے نامراد کرانا چاہا تھا لیکن انہوں نے جو کچھ کیا وہی حضرت یوسف علیہ السلام کی فتح و فیروزی کا ذریعہ بن گیا۔ گویا اب جو کچھ سرگزشت بیان ہوئی ہے۔ یہ آیت گرامی اس کا خلاصہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے ارادے اور اسکی اسکیمیں اس طرح بروئے کار آتی ہیں۔ لیکن جن لوگوں کی نظر صرف ظاہر پر ہوتی ہے۔ وہ اس کو نہیں جانتے۔ بتانا یہ ہے۔ کہ دنیا چل تو رہی ہے اللہ سبحانہٗ کے امر اور اس کے قانون کے تحت لیکن الٰہی نظام میں قانون اللہ کے تابع ہے اللہ قانون کے تابع نہیں بلکہ وہ اس پر غالب ہے۔ قرطبیؒ فرماتے ہیں

اللہ سبحانہٗ اپنے کاموں میں خود اپنے قانون پر غالب ہے۔

لیکن لوگ صرف عالم شہادت کو جانتے ہیں عالم غیب سے بالکل بے خبر ہیں۔ قرطبیؒ نے حکما کے حوالہ سے غالب علی امرہٖ کی جو تصویر پیش کی ہے وہ اس لائق ہے کہ اس کو پڑھا جائے فرماتے ہیں۔

> حضرت یعقوب علیہ السلام نے حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا کہ خواب بھائیوں سے بیان نہ کرنا امر الٰہی غالب رہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب کا ذکر بھائیوں سے کر دیا بھائیوں نے چاہا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو قتل کر دیں امر الٰہی غالب رہا کہ یوسف علیہ السلام کی شان بلند ہوئی۔ بھائیوں نے چاہا کہ باپ کی چاہتوں کا مرکز وہ ہوں۔ امر الٰہی غالب رہا کہ باپ ان سے کبیدہ خاطر ہوئے۔ مصنوعی آہ و بکا سے بھائیوں نے باپ کو دھوکا دینا چاہا امر الٰہی غالب رہا حضرت

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

یعقوب علیہ السلام دھوکہ میں نہیں آئے۔
بتانا یہ ہے کہ جو کام انسانی عقل بعید سمجھتی ہے اللہ سبحانہ' ان کا سامان بھی خفی اور لطیف طریقوں سے کر دیتے ہیں۔

(۲۱) حضرت یوسفؑ پر نبوّت کا فیضان

اور جب یوسف علیہ السلام اپنی بھرپور جوانی کو پہنچے تو ہم نے اس کو کارفرمائی کی قوت اور علم کی فراوانی دی اور ہم حُسن کاروں کو اسی طرح بدلہ دیتے ہیں یعنی جب یوسف علیہ السلام کے تمام قویٰ حدِ کمال کو پہنچ گئے تو اللہ سبحانہ' کی جانب سے عظیم الشان علم و حکمت کا فیضان ہوا۔ نہایت مشکل عقدے اپنی فہم رسا سے حل کرتے۔ بڑی خوبی و دانائی سے لوگوں کے نزاعات چکاتے، دین کی باریکیاں سمجھاتے، جو زبان سے کہتے وہ کرکے دکھاتے، سفیہانہ اخلاق سے قطعاً پاک وصاف اور علم شرائع کے پورے ماہر تھے۔ تعبیر رؤیا کا علم تو ان کا مخصوص حصّہ تھا۔ اور جو لوگ فطرت کی راہنمائی یا تقلید صالحین اور توفیق ازلی سے نوائب و حوادث پر صابر رہ کر عمدہ اخلاق اور نیک چال چلن اختیار کرتے ہیں حق تعالیٰ ان پر ایسے ہی انعامات فرماتے ہیں[1]

آیت میں لفظ اشد جوانی کے لیے بھی اور پختہ سن و سال کے لیے بھی آتا ہے مثلاً حتی اذا بلغ اشدہ' و بلغ اربعین سنۃ۔ یہاں تک کہ پہنچ گیا اپنی جوانی کو اور چالیس سال کا ہو گیا یہی عمر نبوّت کی بتائی گئی ہے۔ اٰتیناہ' حکما و علما۔ ہم نے اس کو حکم اور علم دیا۔ علم کے لغوی معنے جاننے کے ہیں مگر ہر فن کے تعلق سے جاننے کی نوعیت اور معلومات کی حیثیت مختلف ہوتی ہے۔ انبیاء کے تعلق سے جب اس کا استعمال ہوگا تو اس سے طبعاً نبوت کے علوم مراد ہوں گے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام توحید پر استدلال کرکے اپنے باپ سے فرماتے ہیں۔ قد جاءنی من العلم ما لم یاتک میرے پاس علم کا وہ حصّہ آیا ہے جو تیرے پاس نہیں حضرت خضرؑ کے متعلق قرآن میں ہے۔ وعلمناہ من لدنا علما۔ ہم نے اپنے پاس سے اسے علم سکھایا ہے۔ ہر چیز اللہ سبحانہ' کے پاس سے ہوتی ہے۔ پھر اپنے پاس سے علم کا مفہوم کیا ہے؟ ہر وہ شئی جو انسان کی ذاتی محنت، کوشش، جدوجہد وغیرہ معمول کے ذرائع کے بغیر حاصل ہوتی

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے۔ اس طرح اللہ سبحانہ کی جانب سے علم عطا ہونے کے معنے اس علم کے حاصل ہونے کے ہیں جو انسان کے طبعی ذرائع علم واستدلال اور تلاش و تحقیق کے بغیر خود بخود عطا ہو۔ یہی علم خداداد ہے۔ یہ علم کا ایک دائمی عطیہ نبی کی شان ہوتی ہے۔

آیت میں علم کے ساتھ حکم دینے کا بھی ذکر ہے۔ حکم کے معنے لغت میں فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کرنے کے ہیں۔ امام راغبؒ فرماتے ہیں۔

کسی شئے پر حکم کرنا یہ فیصلہ کرنا ہے کہ یہ شئے ایسی ہے یا ایسی نہیں ہے۔ خواہ اس فیصلے کا تم دوسرے کو پابند کر سکو یا نہ کر سکو۔

عربی لغت کی مشہور کتاب لسان العرب میں ہے۔

حکم کے معنے علم سمجھ اور منصفانہ فیصلہ کرنے کے ہیں۔

ان انبیاء کو جن پر کسی کتاب کا نازل ہونا ثابت نہیں اس علم اور حکم کا عطا ہونا ثابت ہے۔ حضرت لوط علیہ السلام کے بارے میں ہے۔ اٰتیناہ حکما وعلما۔ ہم نے ان کو علم اور حکم دیا۔ یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں بھی ہے لفظ حکم دینوی حکومت کے معنے میں قدیم عربی میں نہیں۔ یہ اہل عجم کا محاورہ ہے۔ قرآن نے ہر جگہ اس کو فیصلہ اور قوت فیصلہ کے معنے میں استعمال کیا ہے۔ جیسے فاحکم بیننا بالحق اور فاحکم بین الناس بالحق۔ سب سے بڑھ کر کتاب، حکم اور نبوت تین باتیں سورۃ انعام میں بہت سے پیغمبروں کے نام گنا کر کہی گئی ہیں۔ اولئک الذی اٰتیناھم الکتاب والحکم والنبوۃ۔ جن پیغمبروں کے نام اوپر گنائے گئے ہیں اور جن کی طرف اولئک کہہ کر اشارہ کیا گیا ہے یہ ہیں۔ ابراہیم، اسحٰق، یعقوب، نوح، داؤد، سلیمان، ایوب، یوسف، موسیٰ، ہارون، ذکریا، یحییٰ، عیسیٰ، الیاس، اسمٰعیل، الیسع، یونس، اور لوط علیہم السلام۔ ان اٹھارہ ناموں میں حکم بمعنے حکومت اگر ہو تو اس کے مستحق صرف دو ہیں۔ سلیمان و داؤد علیہما السلام۔ اور چاہیں تو آپ یوسف اور موسیٰ علیہما السلام کو بھی شامل کر لیجئے۔ باقی چودہ نام ان پیغمبروں کے ہیں جن کو اس کا کوئی حصہ نہیں ملا تھا۔ اس لیے لامحالہ حکم کا لفظ قرآن کی عربیت کے اصلی اور صریح معنے میں مستعمل ہے۔ اور اس لفظ سے اللہ سبحانہ کا جو مقصود ہے وہ کتاب کے ساتھ ان پیغمبروں کو برابر حیثیت میں ملا تھا۔ بہرحال حکم سے مراد وہی فیصلہ اور قضائے ربانی ہے۔ اس لیے اس میں کوئی شک نہیں کہ انبیاء کو منصب نبوت اور وحی کے ساتھ حکم کی سند بھی ملتی ہے۔ جس کے صاف معنی کلام عرب اور لغت اور قرآن کے

قرینوں سے علم، فہم، فیصلہ اور حق و باطل میں تمیز کے ہیں اور یہ لوازم نبوت ہیں اسی لیے محققین نے اس سے نبوت مراد لی ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں یعنی النبوۃ ہم نے حضرت یوسف علیہ السلام کو نبوت دی۔ آخر میں ارشاد ہوا ہے۔ وکذالک نجزی المحسنین۔ یعنی یہ انعام جو حضرت یوسف علیہ السلام پر ہوا ہے تو یہ اس لیے ہوا کہ وہ حسن کار تھے۔ انہوں نے اللہ سبحانہ کے حقوق و فرائض کی پا بجائی کی اور ہر امتحان میں پورے اُترے۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت پر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے جب سے عرصہ وجود میں قدم رکھا ہے۔ اسی زمانہ سے آنے والے وقت اور ملنے والے منصب کے آثار ان سے ظاہر ہونے لگے وہ حسب و نسب اور سیرۃ و صورت میں ممتاز ہیں۔ اخلاق حسنہ سے آراستہ ہیں۔ ان کی دیانت، امانت، سچائی، راست گفتاری مسلم ہیں۔ حضرت یعقوب علیہ السلام نے ان کے بچپن کے خواب کو اسی آئینے میں دیکھ کر فرمایا تھا۔ کذالک یجتبیک ربک۔ یعنی یہ تمہیدیں اس لیے ہیں کہ منصب نبوت ملنے والا ہے بچپن ہی میں رؤیائے صادقہ اور صبر و شکر اور پاکدامنی زبان حال سے بول رہی ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام پر نبوت کا انعام ہونے والا ہے یہی زندگی کی حُسن کاری ہے۔ یہ مطلب نہیں کہ ہر انسان اپنی محنت اور کوشش سے نبی بن سکتا ہے۔ بلکہ نبی وہی ہوتا ہے جس میں اللہ سبحانہ نبوت کے آثار و خواص اور کیفیات شروع ہی سے بالقوہ ودیعت فرماتے ہیں۔

وَرَاوَدَتْهُ الَّتِیْ هُوَ فِیْ بَیْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ
وَقَالَتْ هَیْتَ لَكَ ؕ قَالَ مَعَاذَ اللّٰهِ اِنَّهٗ رَبِّیْۤ اَحْسَنَ مَثْوَایَ ؕ
اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۳﴾ وَلَقَدْ هَمَّتْ بِهٖ ۚ وَهَمَّ بِهَا لَوْلَاۤ
اَنْ رَّاٰ بُرْهَانَ رَبِّهٖ ؕ كَذٰلِكَ لِنَصْرِفَ عَنْهُ السُّوْٓءَ وَالْفَحْشَآءَ ؕ
اِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِیْنَ ﴿۲۴﴾ وَاسْتَبَقَا الْبَابَ وَقَدَّتْ
قَمِیْصَهٗ مِنْ دُبُرٍ وَّاَلْفَیَا سَیِّدَهَا لَدَا الْبَابِ ؕ قَالَتْ مَا
جَزَآءُ مَنْ اَرَادَ بِاَهْلِكَ سُوْٓءًا اِلَّاۤ اَنْ یُّسْجَنَ اَوْ عَذَابٌ
اَلِیْمٌ ﴿۲۵﴾ قَالَ هِیَ رَاوَدَتْنِیْ عَنْ نَّفْسِیْ وَشَهِدَ شَاهِدٌ
مِّنْ اَهْلِهَا ۚ اِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ قُبُلٍ فَصَدَقَتْ وَ
هُوَ مِنَ الْكٰذِبِیْنَ ﴿۲۶﴾ وَاِنْ كَانَ قَمِیْصُهٗ قُدَّ مِنْ دُبُرٍ
فَكَذَبَتْ وَهُوَ مِنَ الصّٰدِقِیْنَ ﴿۲۷﴾ فَلَمَّا رَاٰ قَمِیْصَهٗ قُدَّ
مِنْ دُبُرٍ قَالَ اِنَّهٗ مِنْ كَیْدِكُنَّ ؕ اِنَّ كَیْدَكُنَّ عَظِیْمٌ ﴿۲۸﴾
یُوْسُفُ اَعْرِضْ عَنْ هٰذَا ٚ وَاسْتَغْفِرِیْ لِذَنْۢبِكِ ۚۖ
اِنَّكِ كُنْتِ مِنَ الْخٰطِـِٕیْنَ ﴿۲۹﴾ ع ۹

اور ڈورے ڈالے خود حضرت یوسف علیہ السلام کی ذات پر اس

عورت نے جس کے گھر میں حضرت یوسف علیہ السلام تھے اور اس عورت نے دروازے بند کر لیے اور بولی لے آ[۲۲] حضرت یوسف ع نے فرمایا اللہ کی پناہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا۔ تیرا شوہر میرا مالک ہے اس نے مجھے عزت و احترام کی جگہ دی ہے۔ یہ تو سر تا سر ظلم ہے اور ظلم کار لوگ کبھی بھی کامیاب نہیں ہوتے ہیں[۲۳]۔ بلاشبہ فی الواقع اس عورت نے بدکاری کا ارادہ کر لیا تھا۔ اور یوسف علیہ السلام کے پاس اگر اس کے رب کی برہان نہ ہوتی تو وہ بھی ارادہ کر ہی لیتا۔ ایسے ہی ہم ہٹاتے ہیں یوسف سے برائی اور بے حیائی کے کام کو بلاشبہ یوسف ع ہمارے مخلص بندوں میں سے ہے[۲۴] اور ایسا ہوا کہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے اسی حالت میں یوسف کی قمیص اس عورت نے پیچھے سے پھاڑ دی۔ اسی حال میں دونوں کا عورت کے خاوند سے آمنا سامنا ہو گیا، دروازے کے پاس۔ عورت نے شوہر کو مخاطب کر کے کہا بتاؤ جو شخص تمہارے گھر والوں سے برا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہے کہ اسے جیل بھیج دیا جائے یا کوئی اور دردناک سزا اسے دی جائے[۲۵] حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ خود اس عورت نے مجھ پر ڈورے ڈالے اور مجبور کیا کہ پھسل جاؤں۔ اور اس عورت ہی کے گھر والوں میں

سے ایک گواہ نے گواہی دی یہ کہ اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو عورت سچّی ہے اور یوسف جھوٹا ہے اور اگر یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو عورت جھوٹی ہے اور یوسف سچّا ہے۔ جب عورت کے شوہر نے یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی دیکھی تو بول پڑا کہ یہ سب تم عورتوں کا چلتر ہے اور تمہاری مکاری اور چلتر بڑا ہوتا ہے۔ اے یوسف تو اس معاملے کو نظر انداز کر اور بیوی سے کہا کہ تو اپنے گناہوں کی معافی مانگ۔ بلاشبہ تو ہی خطا کار ہے [۲۶]

حضرت یوسف کے جمال سیرۃ کا ایک اور منظر

زمانہ کی گردشیں کس طرح آزمائشوں پر آزمائشیں لاتی ہیں۔ پہلے مصیبتوں کا ابتلا تھا۔ اسے صبر و سکون کے ساتھ برداشت کیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے مصائب و محن کی پہلی ہی منزل میں صبر، عزم، اعتماد نفس اور توکل علی اللہ کی وہ روح عظیم اپنے اندر پیدا کرلی تھی کہ معصیت کا ابتلا عزیز مصر کی بیوی کی جانب سے جب پیش آیا۔ تو اس کے مقابلے میں کامیاب رہے۔ مصیبت کی ابتلا میں ذہن و دماغ کی آزمائش تھی اور معصیت کے ابتلا میں جذبات کی آزمائش تھی اور انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائش جذبات ہی کی آزمائش ہوتی ہے۔ وہ سمندر کی موجوں سے ہراساں نہیں ہوتا، پہاڑ کی چٹانوں سے نہیں گھبراتا، آسمان کی بجلیوں سے نہیں لرزتا، درندوں کے مقابلے سے منہ نہیں موڑتا، تلواروں کے سائے میں کھیلنے لگتا ہے۔ لیکن نفس کی ایک چھوٹی سی ترغیب اور جذبات کی ایک ادنیٰ کشمکش کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا لیکن حضرت یوسف علیہ کی سیرت کی چٹان یہاں بھی متزلزل نہ ہوسکی۔ ان کی بے داغ فضیلت پہ نفس انسانی کا سب سے بڑا فتنہ بھی دھبہ نہ لگا سکا۔

قرآن کی معجزانہ بلاغت نے ایک جملہ وھم بھالولا ان را برھان ربہ میں صورت حال کی

پوری تصویر کھینچ دی ہے۔ تم چشم تصور سے کام لو اور دیکھو ترغیبات کی قہر و سلطانی کا کیا حال تھا۔ اور عیش نفس کی یہ دعوت کیسے شکیب آزما سامانوں اور صبر ربا حالات میں پیش آئی تھی۔ عمر عین عروج شباب کی عمر اور معاملہ محبت کا نہیں محبوبیت، طلب کا نہیں مطلوبیت کا۔ اور طلب بھی کیسی؟ دیوانگی کی طلب اور دل باختگی کا تعاقب اور سب سے بڑھ کر یہ کہ مانع کوئی نہیں۔ کوئی انسانی آنکھ دیکھنے والی نہیں۔ کوئی پردہ حائل نہیں۔ کون ہے جو ایسی حالت میں اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔ عفت و پاکبازی کا کون سا پہاڑ ہے جو ان بجلیوں کی تاب لا سکتا ہے لیکن ایک پہاڑ تھا۔ جسے یہ بجلیاں بھی جنبش میں نہ لا سکیں۔ یہ برہان رب اور حضرت یوسف علیہ السلام کی پیغمبرانہ عصمت تھی جو کسی حال میں بھی متزلزل نہیں ہو سکتی تھی۔ پہلا ابتلاء مصیبت کا ابتلاء تھا۔ یہ دوسرا ابتلاء معصیت کا ابتلاء ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا جمال سیرت یہ ہے کہ دونوں میں کامیاب رہے۔

(۲۲) اور ڈورے ڈالے خود حضرت یوسفؑ کی ذات پر اس عورت نے جس کے گھر میں حضرت یوسف تھے۔ اور اس نے دروازہ بند کر لیا اور بولی لے آجا۔ ادھر تو الطاف غیبیہ حضرت یوسفؑ کی عجیب و غریب طریقے سے تربیت فرما رہے تھے۔ اِدھر عزیز کی بیوی زلیخا نے ان کے سامنے ایک نہایت ہی مزلۃ الاقدام موقع امتحان کا کھڑا کر دیا یعنی حضرت یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال پر زلیخا مفتوں ہو گئی۔ اور دلکشی و ہوشربائی کے سارے سامان جمع کر کے چاہا کہ یوسف کے دل کو ان کے قابو سے باہر کر دے۔ ایک طرف عیش و نشاط کے سامان۔ نفسانی جذبات پورے کرنے کے لیے ہر قسم کی سہولتیں۔ یوسف علیہ السلام کا ہر وقت زلیخا کے گھر میں موجود رہنا اس کا نہایت محبت اور پیار سے رکھنا۔ تنہائی کے وقت خود عورت کی طرف سے ایک خواہش کا بے تابانہ اظہار۔ کسی غیر کے آنے جانے کے سب دروازے بند۔ دوسری طرف جوانی کی عمر، قوت کا زمانہ، مزاج کا اعتدال، تجرد کی زندگی یہ سب دواعی و اسباب ایسے تھے جن سے ٹکرا کر بڑے سے بڑے زاہد کا تقویٰ بھی پاش پاش ہو جاتا مگر اللہ سبحانہ نے جس کو محسن قرار دیکر علم و حکمت میں رنگین کیا ہو اور پیغمبرانہ عصمت کے بلند مقام پہ پہنچایا۔ اس پر کیا مجال تھی کہ شیطان کا داؤ چل جاتا۔ اس نے ایک لفظ کہا کہ معاذ اللہ اور شیطانی جال کے سارے حلقے توڑ ڈالے۔ کیونکہ جس نے خدا کی پناہ لی اس پر کس کا وار چل سکتا ہے [1]

---

[1] افادات شیخ الاسلام

راودت ۔ اس نے پھسلایا، اس نے گفت وشنید کی، اس نے خواہش کی مراودۃ سے جس کے معنے دوسرے کو کسی کام پر جس کے کرنے کا وہ ارادہ نہ رکھتا ہو پھسلانے پر آمادہ کرنے اور اس کے متعلق گفت وشنید کرنے کے ہیں ۔

راغب لکھتے ہیں ۔ راودت یہ ہے کہ تمہاری اپنے بغیر سے ارادے میں نزاع اور تم اس بات کی خواہش کرو جو وہ نہیں چاہتا یا تم بسہولت اس چیز کے طالب ہو جس کا وہ بسہولت طالب نہ ہو۔ یہاں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا نیا دور شروع ہوتا ہے اب تک وہ بھائیوں کے حسد کی وجہ سے مصیبت میں مبتلا تھے ۔ اس سے وہ بچے تو ان کے سامنے ابتلاء کا دوسرا پرچہ آگیا ۔ پہلا ابتلاء مصیبت کا تھا اور یہ دوسرا ابتلاء معصیت کا ہے یہ امتحان پہلے امتحان سے کہیں زیادہ سخت ہے ۔ مصریوں میں جس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو خریدا تھا اس کی بیوی بھی حضرت یوسف علیہ السلام پر فریفتہ ہوگئی اور نوبت بایں جار سید کہ ایک دن اپنے دروازے بند کرلیے ابواب جمع باب کی ہے اور غلقت تغلیق سے ہے جو باب تفعیل سے ہے جس کی خاصیت تدریج بھی ہے اور مبالغہ بھی ۔ مطلب یہ ہے کہ سارے دروازے ایک ایک کرکے خوب بند کرتی رہی اور دروازے بند کرکے بولی ھیت لك اس کے معنے ہیں کہ لے آجا ۔

(۲۳) سیرت یوسفؑ کی لازوال صداقت

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا اللہ کی پناہ ایسا کبھی نہیں ہو سکتا (تین وجہ سے) اول یہ کہ تیرا شوہر میرا مربی ہے اور اس نے مجھے عزت واکرام کی جگہ دی ہے دوسرے یہ کہ سراسر ظلم ہے ۔ تیسرے یہ کہ ظلم کار لوگ کبھی کامیاب نہیں ہوتے یعنی خدا کی پناہ میں ایسی قبیح حرکت کیسے کرسکتا ہوں علاوہ ازیں عزیز میرا مربی ہے جس نے مجھے ایسی عزت وراحت سے رکھا کیا میں اپنے محسن کے ناموس پر حملہ کردوں ایسی محسن کشی اور بے انصافی کرنیوالے کبھی بھلائی اور کامیابی کا منہ نہیں دیکھ سکتے ۔ نیز جب ظاہری مربی کا ہم کو اس قدر پاس ہے تو سمجھ لو کہ اس پروردگار سے ہمیں کس قدر شرمانا اور حیاء کرنا چاہیئے جس نے محض اپنے فضل سے ہماری تربیت فرمائی اور اپنے بندوں کو ہماری خدمت کیلیے کھڑا کر دیا بعض مفسرین نے انہ ربی کی ضمیر کا مرجع اللہ کو قرار دیا ہے [1] ان مفسرین میں سے

---

[1] افادات شیخ الاسلام

علامہ بقاعیؒ بھی یہی وہ فرماتے ہیں کہ

انہٗ ربی احسن مثوای موقع تعلیل میں ہے معاذ اللہ کے لیے۔ مطلب یہ ہے کہ میں اس بُرے کام سے جس کی تو مجھے دعوت دے رہی ہے اللہ سے پناہ مانگتا ہوں۔ کیونکہ اللہ سبحانہٗ میرا رب ہے۔ میری ایجاد، میری زندگی کی تدبیر اور ہر معاملہ میں میرے ساتھ حُسن کاری کی ہے۔ یہ اسی کی حُسن کاری ہے کہ تیرے شوہر کے قلب میں میرا اونچا مقام بنایا اور اس وجہ سے تیرے شوہر نے مجھ پر بھرپور اعتماد کیا اگر میں اپنے رب کی نافرمانی کروں تو میں بلاشبہ اس شخص سے خیانت کروں گا جس نے مجھ پر اعتماد کیا اور میں ظلم کار بھی ہوں گا۔

اور جن لوگوں نے ضمیر کا مرجع عزیز مصر کو قرار دیا ہے ان کا کہنا یہ ہے کہ عزیز مصر کی بیوی کی دعوت عیش کے جواب میں جو کچھ ان کی زبان سے نکلا وہ یہ تھا۔ معاذ اللہ انہٗ ربی احسن مثوای۔ توبہ توبہ اللہ کی پناہ تیرا شوہر تو میرا آقا ہے۔ اس نے مجھ پر اعتماد کیا ہے۔ عزت و احترام کیساتھ مجھے رکھا ہے پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ اس کے حسن سلوک کے بدلہ میں یہ دوں کہ اس کی امانت میں خیانت کرنے لگوں۔ یہ برائی ایسی برائی تھی کہ اسے برائی دکھلانے کے لیے کتنی ہی باتیں کہی جاسکتی تھیں۔ لیکن ان کا ذہن اسی طرف گیا کہ اس کے شوہر کے حوالہ سے بات کہی جائے اور اسی کو قرآن نے بھی نمایاں کر کے پیش کیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ ان کی سیرت کا جوہر اسی میں تلاش کرنا چاہیئے۔ امانت داری، راست بازی اور ادائے فرض کی روح اس طرح چھائی ہوئی تھی کہ ہر موقع پر وہی پہلے سامنے آتی تھی۔ موقعہ کی مناسبت کا تقاضا بھی یہی ہے کہ امراۃ العزیز کو غیرت دلانے کے لیے اس کے شوہر کے حوالہ سے بات کی جائے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کا فقرہ بڑی نفسیاتی بلاغت رکھتا ہے۔ جذبات سے اندھی اور اللہ سبحانہٗ سے ایک بے خبر عورت کے سامنے اللہ سبحانہٗ کے حوالے سے وعظ کہنا بالکل بے معنی ہوتا۔ اس کے جذباتی ہیجان کو اگر کچھ ٹھنڈا کیا جاسکتا تھا تو صرف اسی فقرے سے کیا جاسکتا تھا جو حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا۔ پہلے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے مقام کے لحاظ سے بات فرمائی معاذ اللہ۔ بعد ازیں مخاطب کی رعایت سے بات کی یعنی پہلے سبب ذاتی اور واقعی اور پھر سبب خارجی کا ذکر کیا اور لطیف انداز میں اس پر چوٹ کر دی کہ تجھے بھی اس کے حق کی رعایت کرنی چاہیئے یہ کہنا بالکل بے محل ہے کہ

یہ بات نبی کی شان سے بالکل بعید ہے کہ وہ ایک گناہ سے باز رہنے میں اللہ تعالیٰ کی بجائے کسی بندے کا لحاظ کرے۔

واقعی ایک گناہ سے باز رہنے میں تو یہ انداز کلام بلیغ نہیں لیکن جب مقصد باز رہنے کے ساتھ مخاطب کو گناہ سے باز رکھنا بھی ہو تو بلاغت یہی ہے جو حضرت یوسف علیہ السلام نے اختیار کی۔

(۲۴) حضرت یوسفؑ کی عفت کاملہ

بلاشبہ فی الواقع اس عورت نے بدکاری کا ارادہ کرلیا تھا اور یوسف کے پاس اگر اسکے رب کی برہان نہ ہوتی تو وہ بھی ارادہ کرلیتا۔ ایسا ہی ہوا تاکہ ہم ہٹا دیں یوسفؑ سے برائی اور بے حیائی کے کام کو۔ بلاشبہ یوسف علیہ السلام ہمارے مخلص بندوں میں سے ہیں۔ یعنی عورت نے پھانسنے کی فکر کی اور اس نے فکر کی کہ عورت کا داؤ چلنے نہ پائے اگر اپنے رب کی قوت وقدرت نہ دیکھتا تو ثابت قدم رہنا مشکل تھا۔ بعض مفسرین نے وھو بھا کو ولقد ھمت بہ سے علیحدہ کرکے لولا ان رای برھان ربہ سے متعلق کیا ہے جیسے ان کادت لتبدی بہ لولا ان ربطنا علی قلبھا کی ترکیب ہے۔ اس وقت مقصود یوسف کے حق میں ہم کو ثابت کرنا نہیں بلکہ نفی کرنا ہے ترجمہ یہ ہوگا کہ عورت نے یوسفؑ کا ارادہ کیا اور یوسف بھی عورت کا ارادہ کرتا اگر اپنے پروردگار کی قدرت وحجت نہ دیکھ لیتا بعض نے لفظ ھم بھا میں ھم کو بمعنے میلان ورغبت لیا ہے۔ یعنی یوسف کے دل میں کچھ رغبت ومیلان بے اختیار پیدا ہوا جیسے روزے دار کو گرمی میں ٹھنڈے پانی کی طرف طبعاً رغبت ہوتی ہے لیکن نہ پینے کا وہ ارادہ کرتا ہے نہ بے اختیاری رغبت کچھ مضر ہے بلکہ باوجود رغبت طبعی کے اس سے قطعاً محترز رہنا مزید اجر وثواب کا موجب ہے اسی طرح سمجھ لو کہ ایسے اسباب ودواعی قویہ کی موجودگی طبع بشری کے موافق بلا اختیار وارادہ یوسفؑ کے دل میں کسی قسم کی رغبت ومیلان کا پایا جانا نہ عصمت کے منافی ہے نہ ان کے مرتبہ کو گھٹاتا ہے بلکہ صحیح مسلم میں حضرت ابوہریرہؓ کی حدیث ہے کہ اگر بندے کا میلان کسی برائی کی طرف ہوا لیکن اس پر عمل نہیں کیا تو اس کی فرد حسنات میں ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ خدا فرماتا ہے کہ اس نے باوجود رغبت ومیلان کے میرے خوف سے اس برائی کو ہاتھ نہ لگایا۔ بہرحال باوجود اشتراک لفظی کے زلیخا کے اور یوسفؑ کے "ھم،، میں زمین وآسمان کا فرق ہے اسی لیے قرآن کریم نے دونوں کے ھم کو ایک ہی لفظ میں جمع نہیں کیا اور نہ زلیخا کے ھم کی طرح یوسفؑ کے ھم

پرلام اور قد داخل کیا گیا بلکہ سیاق و لحاق میں بہت سے دلائل یوسف علیہ السلام کی طہارت و نزاہت پر قائم فرمائے جو غور کرنے والوں پر پوشیدہ نہیں تفصیل روح المعانی اور تفسیر کبیر میں ہے سلہ

اصل بات یہ ہے کہ نحویوں نے تصریح کی ہے کہ لولا کا جواب لولا سے پہلے نہیں آتا بلکہ بعد میں آتا ہے اسی لیے بعض مفسرین نے لکھا ہے کہ لولا ان رای برھان ربہ کا جواب لفعل ہے جسے ربہ کے بعد محذوف ماننا چاہیئے اس صورت میں آیت کا ترجمہ یوں ہوگا. کہ

اگر یوسف علیہ السلام نے اپنے پروردگار کی برہان نہ دیکھ لی ہوتی تو وہ فعل بد بھی کر بیٹھتے .

اور کچھ نے لولا کا جواب محذوف مان کر محذوف کی نشاندہی لجامعھا سے کی ہے اور کچھ نے محذوف لھم بھا مانا ہے. اور علامہ آلوسیؒ نے کچھ محققین کی طرف منسوب کرکے لکھا ہے کہ

لولا کا جواب محذوف ہے جملہ میں خود اس کی دلیل ہے. مطلب یہ ہے کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام برہان الٰہی نہ دیکھتے تو طبعی تقاضے پر عمل پیرا ہوتے. لیکن چونکہ برہان دیکھ لی اس لیے برہان کے تقاضے پر عمل پیرا ہوئے .

اس پر علامہ آلوسیؒ کا فیصلہ یہ ہے. کہ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے 'ہم' کو ثابت کیا گیا ہے دور از کار تاویلیں تو برداشت کی جا رہی ہیں مگر ان بزرگوں کا ذہن یہ ماننے کو تیار نہیں ہے کہ یہاں لولا کا جواب مقدم ہے حالانکہ علمار کوفہ اور بڑے بڑے بصری علمار مثلاً ابوزید انصاری اور ابوالعباس المبرد اس کے قائل ہیں. غالباً ان بزرگوں کا ذہن اس طرف منتقل نہیں ہوا کہ قرآن میں ایک سے زیادہ مقام پر لولا کا جواب مقدم آیا ہے. موسیٰ علیہ السلام کی والدہ ماجدہ کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ فرماتا ہے .

ان کادت لتبدی بہ لولا ان ربطنا علی قلبھا
ان سے بعید نہ تھا کہ وہ موسیٰ علیہ السلام کا حال ظاہر کر دیں
اگر ہم ان کا دل مضبوط کیئے نہ رہتے

اس جملے میں لولا کا جواب ان کادت لتبدی بہ جو لولا سے پہلے آیا ہے .
ایک دوسرے موقعہ پر ہے .

سلہ افادات شیخ الاسلام

ان کاد لیضلنا عن الھتنا لولا ان صبرنا علیھا
بلاشبہ وہ تو ہم کو ہمارے معبودوں سے پھسلا ہی دیتا اگر ہم جمے نہ رہتے

یہاں بھی کاد لیضلنا الخ لولا کا جواب پہلے آیا ہے۔

اسی نحوی اعتراض کی بنا پر قرآن کے ہندوستان میں مطبوعہ نسخوں میں ھم بھا پر وقف ج تجویز کرنے کی ضرورت لاحق ہوئی۔ یہ رموز اوقاف سجاوندی کی تصریحات پر مبنی ہیں۔ ان رموز کی موجودگی میں آیت کا ترجمہ یوں ہوگا۔ "عزیزہ مصر حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ ارادہ بد کر چکی تھی اور یوسف علیہ السلام نے بھی اس عورت کے ساتھ ارادہ بد کر لیا" ہمارے نزدیک یہ نحوی اعتراض قابل التفات نہیں۔ ہمارے نزدیک ھم بھا ہی لولا کا جواب مقدم ہے۔ اور بھا محل وقف نہیں۔ وقف حذف کر دیا جائے تو ترجمہ یوں ہوگا۔ "یوسف علیہ السلام بھی اس عورت کے ساتھ ارادہ بد کر لیتے اگر انہوں نے اپنے پروردگار کی برہان نہ دیکھ لی ہوتی۔ مصحف حکومت مصر میں بھی ھم بھا پر کوئی وقف نہیں ہے۔ علامہ اشمونیؒ نے الظالمون پر وقف کافی تجویز کے لکھا ہے کہ یہی وقف ھمت بھا پر بھی ہونا چاہیئے اس لیے کہ

> اس سے قرآن کا قاری ایک نبی کے متعلق اس سے چھٹکارا پا سکتا ہے کہ نبی معصوم ہو کر عورت کے ساتھ ارادہ بد کرے۔ یہ جملہ پہلے جملے ولقد ھمت بہ سے جدا ہو جائے گا اور ھم بھا جملہ مستانفہ ہوگا۔ کیونکہ آیت قرآنی میں حضرت یوسف علیہ السلام سے ھم کی نفی کی گئی ہے۔
>
> (منار الہدی فی بیان الوقف والابتداء)

موجودہ دور میں سعودی حکومت نے جو قرآن شائع کیا ہے اس میں بھی وھم بھا پر کوئی وقف نہیں۔

اس بات کو اپنانے کے بعد کسی تاویل کی ضرورت نہیں ہے۔ نہ امام رازیؒ کی اس تاویل کی ضرورت ہے کہ

> یہ تو ناممکن ہے کہ دونوں کا ھم ایک قسم کا ہو لہذا ضروری ہے کہ ہر ایک کے ھم کو اس قصد پر محمول کیا جائے جو اس کے مناسب ہو۔ بس عورت کے لائق یہ ہے کہ لقد ھمت بہ میں اس کے قصد کو تحصیل لذت پر محمول کیا جائے۔ اور ھم بھا خدا کے برگزیدہ بندے کے ھم کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر

پر محمول کیا جائے۔ (کبیر ص۱۲۴ ج ۵)

اور نہ ابوحیان اندلسیؒ کو اس تاویل کا سہارا لینا پڑے گا۔ کہ

اس کی حیثیت ایسی ہے جیسے کسی سے کہا جائے۔ قارفت الذنب لولا ان عصمك الله۔ تو گناہ کی لپیٹ میں آجاتا اگر تجھے اللہ نہ بچاتا۔

اور نہ علامہ آلوسیؒ کو یہ بتانے کی تکلیف گوارا کرنی پڑتی۔

حضرت یوسف علیہ السلام کا بمقتضائے طبعیت بشری عزیزہ مصر کی طرف میلان ایسا ہی تھا جیسے گرمی میں روزے دار کا ٹھنڈے پانی کی طرف میلان ہوتا ہے۔

اور نہ علامہ شوکانیؒ کو یہ کہنے کی ضرورت پیش آتی کہ

یہ تو صرف بغیر ارادے کی پختگی کے جی کی بات تھی اور صرف ھم عصمت کے منافی نہیں ہے۔

خواہ کوئی تاویل کی جائے اس نحوی قاعدے کی حمایت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے کسی نہ کسی درجے ھم کو ماننا پڑتا ہے۔ حالانکہ قرآن سرے سے ھم ہی کا انکار کر رہا ہے۔ کیونکہ یہ منافی عصمت ہے۔

اسی پریشانی میں پڑکر بعض متنورین نے عصمت ہی کے معنے کو بدل دینے کی ناروا کوشش کی ہے۔ یہ بات یاد رکھیئے کہ ھم بہا جملہ مستانفہ ہے اور لولا کا جواب مقدم ہے اور ترجمہ یہ ہے کہ

یوسف ارادہ کر لیتا اگر اپنے رب کی برھان نہ دیکھتا۔

اور اگر لولا کے جواب کو محذوف مانا جائے تو محذوف ہونے والا فعل لوگوں کی نگاہ میں عصمت یوسفؑ کے لیے ایک چیلنج بن جائے گا بلکہ جتنے منہ اتنی بولیاں بن کر دامان عصمت کو تار تار کر دے گا۔ اور جب دامان عصمت تار تار ہو کر رہ جائے تو متنورین کو عصمت کے معنے ومفہوم پر نئے انداز میں بحث کرنے کا موقعہ ملے گا۔

آیئے پہلے مختلف شارحین قرآن کی زبان میں فعل محذوف معلوم کیجئے۔ قاضی بیضاویؒ فرماتے ہیں۔

امرأۃ العزیز نے حضرت یوسف علیہ السلام سے مخالطت کا ارادہ کیا اور حضرت

یوسف ؑ نے امرأۃ العزیز سے مخالطت کا ارادہ کیا ۔
قاضی ثناء اللہ پانی پتیؒ فرماتے ہیں ۔

لولا کا جواب محذوف ہے اور پوری بات یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام امرأۃ العزیز سے جماع کر لیتے ۔

یہ ان ساری تشریحات کا معمولی سا نمونہ ہے جو لولا کا جواب محذوف مان کر لوگوں نے کی ہے اور یہ تشریح کرنے کے بعد پھر تاویلات کا دریا بہنے لگا ۔ تاویل پر تاویل کی گئی یہ سب کچھ گوارا ہے مگر یہ کہنے کو کوئی تیار نہیں کہ یہاں لولا کا جواب لولا سے پہلے آیا ہے کیونکہ یہ بصری نحویوں کے بنائے ہوئے نحوی قانون کے خلاف ہے ۔ علامہ طاہرؒ نے التحریر والتنویر میں یہ بات خوب لکھی ہے ۔ کہ

ھم بھا کا عطف ولقد ھمت بہ پورے جملہ پر ہے ۔ جواب قسم پر نہیں ہے ۔ کیونکہ اس جملے کے بعد جب جملہ شرطیہ حضرت یوسف علیہ السلام سے ھم کو نفی کے لیے لایا گیا تو شرط کی جزا اہتمام کی وجہ سے پہلے لائے ۔ یہ دوسرا جملہ مستقل ہے کیونکہ اس میں شرط مسند الیہ کے ساتھ خاص ہے اصل بات یوں تھی لولا ان رای برھان ربہ لھم بھا جواب شرط کو شرط سے پہلے اہتمام کی خاطر لائے ہیں ۔ اس میں بتایا ہے کہ حضرت یوسف ؑ نے ارادہ نہیں کیا

قرآن اس آیت میں صرف یہ بتا رہا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت قطعاً بے داغ ہے ان سے کسی قسم کے ھم کا صدور نہیں ہوا ۔

رہا یہ سوال کہ شرط میں جس برہان کا ذکر کیا گیا ہے وہ کیا ہے ؟ شیخ الاسلام نے اپنے افادات میں لکھا ہے کہ " برہان دلیل وحجت کو کہتے ہیں یعنی اگر حضرت یوسف علیہ السلام اس وقت اپنے رب کی دلیل نہ دیکھتے تو قلبی میلان پر چل پڑتے دلیل کیا تھی ؟ زنا کی حرمت و شناعت کا وہ عین الیقین جو حق تعالیٰ نے ان کو عطا فرمایا وہی دلیل جو خود انہوں نے زلیخا کے مقابلے میں ۔

انہ ربی احسن مثوای انہ لا یفلح الظالمون ۔
کہہ کر پیش کی ۔ بعض کہتے ہیں کہ خدا کی قدرت سے حضرت یعقوب علیہ السلام نظر آئے کہ

انگلی دانتوں میں دبائے سامنے کھڑے ہیں بعض کہتے ہیں کہ کسی غیبی تحریر پر نظر پڑی جس میں اس فعل سے روکا گیا۔[1]

برہان کی یہ تشریح صرف مفروضہ پر ہے کہ لولا کی خبر محذوف ہے اور پہلے ہم کو وقف کے ذریعے لولا ان رای برھان ربہ سے جدا کر دیا گیا ہے ورنہ ظاہر ہے کہ جس ذات گرامی کے بارے میں ابھی آپ پڑھ آئے ہیں کہ جب یوسف علیہ السلام جوان ہوئے تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دانائی اور علم عطا کیا اور اللہ تعالیٰ نیکوکاروں کو اسی طرح نیکی کا بدلہ دیتا ہے۔ آیت قرآنی پھر پڑھیے۔

ولما بلغ اشدہٗ اٰتینٰہُ حکما وعلما وکذالک نجزی المحسنین

اسی کو دوسرے لفظوں میں یوں کہہ دیجئے کہ حضرت یوسف علیہ السلام مقام نبوت پر فائز ہوئے کیونکہ قرآن کی زبان میں ان الفاظ سے مراد بالعموم نبوت عطا کرنا ہوتا ہے مطلب یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو نبوت سے پہلے مصیبت کا ابتلا پیش آیا اور اب نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد معصیت کا ابتلاء پیش آیا۔ اس ابتلاء میں حضرت یوسف علیہ السلام کو جس چیز نے بچایا وہ ان کا مقام عصمت ہے جو لازمہ نبوت ہے اور یہی وہ برہان ہے جسے حضرت یوسف علیہ السلام نے دیکھا اور جسے دیکھ کر حضرت یوسف علیہ السلام کا دامن اس ارادے سے محفوظ و مصؤن رہا اسی خدا داد حکمت وعلم کا اثر تھا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو جب عزیزہ مصر نے ورغلانا چاہا تو وہ بول اُٹھے معاذاللہ۔ تیرا شوہر میرا آقا ہے اس نے مجھے نہایت عزت واحترام سے رکھا۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں امانت میں خیانت کروں ایسے نمک حرام تو کبھی کامیاب نہیں ہوتے زیر بحث آیت میں مذکور ہے کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے برہان الٰہی نہ دیکھ لی ہوتی تو وہ بھی عزیزہ مصر سے ارادہ بد کر لیتے۔ یہ برہان الٰہی جسے حضرت یوسف علیہ السلام اس واقعہ سے پہلے دیکھ چکے تھے وہ بھی خدا داد حکمت وعلم سے یعنی نبی کے اندر کی وہ پیغمبرانہ عقلی قوت جو بشری عقل سے برتر ہے اور جس کے ذریعے سے وہ منصب نبوت پر سرفراز ہونے کے بعد مقام نبوت کے تقاضے پورے کرتا ہے۔ انبیاء کرام کے ان ربانی انعامات کی فہرست پڑھیے۔ جن کا تذکرہ قرآن نے جا بجا کیا ہے تو وحی کی مخصوص نعمت کے بعد فہرست میں جو چیز

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نظر آئے گی وہ علم نبوت ہے۔ جس کو کہیں ذکر، کہیں حکم، کہیں حکمت، کہیں تفہیم، کہیں تعلیم، کہیں ارادت کہا گیا ہے۔ ان سب الفاظ کا مفہوم وحی سے نیچے اور عقل بشری سے اوپر عقل نبوی کے سوا اور کیا ہے۔ اس سے مراد وحی اس لیے نہیں کہ ان کا ذکر وحی سے الگ ہوتا ہے اور عقل بشری اس لیے نہیں کہ عقل بشری خاص نبی پر کوئی انعام نہیں کہ یہ نعمت تو ہر انسان کو کچھ نہ کچھ تو ملی ہے۔ اس بنا پر اس سے مراد عقل نبوی اور حکمت نبوی کے سوا کچھ نہیں ہوسکتا۔ قرآن نے یہاں اسی کو بیان برہان رب کہا ہے۔ اگر یہ واقعہ ہے تو اس کہنے کا یہاں کوئی وزن نہیں ہے۔ کہ برہان رب سے مراد وہ نور یزدانی ہے جو اللہ تعالیٰ ہر انسان کی فطرت کے اندر ودیعت کرتا ہے۔ جو خیر و شر میں تمیز کا ذریعہ بھی ہے اور جو خیر پر ابھارتا بھی ہے اور برائی سے روکتا بھی ہے یہ نور اللہ تعالیٰ بخشتا تو ہر ایک کو ہے لیکن سنت الٰہی یہ ہے کہ جو اس کی قدر کرتے ہیں ان کے اندر تو یہ برابر قوی سے قوی تر ہوتا رہتا ہے۔ یہاں تک کہ اتنا قوی ہوجاتا ہے کہ نہایت سخت آزمائش کے موقعہ پر وہ انسان کو نفس شیطان کے فتنوں میں مبتلا ہونے سے بچا لیتا ہے۔

اس پیچدار بات کہنے کی جگہ یوں کہہ دیا جائے کہ یہ وہ نور نبوت اور عقل نبوی ہے کہ برائی کو نبی کے راستہ ہی سے ہٹا دیتی ہے اور برائی میں اس نور نبوت کے مقابلہ کرنیکی تاب ہی نہیں ہوتی۔ اگر صرف انسانی طبیعت میں ودیعت کی ہوئی خیر و شر میں قوت تمیز ہوتی تو قرآن یہ نہ کہتا لنصرف عنہ السوء الخ کہ ہم برائی اور بدکاری کو ان سے ہٹادیں۔ بلکہ یوں کہتا کہ لنصرفہ عن السوء الخ کہ ہم ان کو برائی اور بدکاری سے ہٹادیں پہلی حالت کا نام عصمت ہے جو نور نبوت کا نتیجہ ہے دوسری حالت کا نام حفاظت ہے جو عقل بشری کا تقاضا ہے قرآن نے موجودہ اسلوب اختیار کرکے بتادیا کہ برائی تو یوسف علیہ السلام کے قریب بھی نہیں پھٹکی۔ وہ بری کا ارادہ کریں اس کی نوبت کیسے آسکتی تھی۔ یہ آیت نبی ہونے کی وجہ سے حضرت یوسف ؑ کی عصمت کی دلیل ہے۔ عام انسان ہونے کی وجہ سے گناہ سے محفوظ ہونے کی دلیل نہیں ہے۔ حالتیں دو ہیں۔ ایک یہ کہ گناہ کو راستہ سے ہٹا دیا جائے دوسری یہ کہ گنہگار کو گناہ کے راستہ سے ہٹادیا جائے یہاں قرآن نے لنصرف عنہ السوء والفحشاء کہہ کر واضح کیا ہے کہ نورِ نبوت کی وجہ سے ہم نے گناہ کو حضرت یوسف علیہ السلام کے راستہ سے ہٹا دیا یہ نہیں ہوا کہ ہم نے یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچالیا پہلی حالت عصمت ہے دوسری حالت کا نام حفاظت ہے دونوں کو ایک قدرتی مثال کے ذریعے سمجھئے :

سڑک پر نابینا جارہا ہے ادھر سے معصیت کی کار آرہی ہے آپ نابینا کو بچانے کے لیے ہاتھ پکڑ کر سڑک سے ہٹا دیتے ہیں یہ ہے حفاظت ۔ اگر حضرت یوسف علیہ السلام کو گناہ سے بچانے کی صورت ہوتی تو قرآن کی تعبیر یہ ہوتی ۔ لنصرفہا عن السوء والفحشاء تاکہ ہم یوسف کو گناہ سے بچائیں، دوسری صورت یہ ہے کہ آفیسر آرہا ہے اور پیادے آگے جا کر سڑک سے ہر سواری کو ہٹا دیتے ہیں کہ راستہ میں برائی نہ ہو قرآن نے یہاں تعبیر اختیار کی ہے ۔ کذالك لنصرف عنہُ السوء والفحشاء ۔ ایسے ہی برہان رب کی وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا دامن عصمت بے داغ رہا ہے ۔ تاکہ ہم حضرت یوسف علیہ السلام سے بدی اور بدکاری کو دور ہٹا دیں ۔

اس موقعہ پر علامہ بقاعیؒ کی یہ بات بالکل برمحل ہے ۔ کہ جن لوگوں نے آیت قرآنی میں لولا کا جواب محذوف مانا ہے قرآن کا سیاق وسباق ان کی تائید نہیں کرتا ہے ۔ البحر المحیط ابو حیان اندلسیؒ اور ان سے پہلے مفاتیح الغیب میں امام رازیؒ نے یہ بات کھول کر بتائی ہے کہ یہی مفسرین میں سے محققین کی رائے ہے اور جواب شرط کو مقدم لانے کی وجہ یہ ہے کہ یہ سب کچھ حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب سے پوری قوت کے باوجود ہوا ہے اور اس ارادے سے باز رکھنے والی چیز صرف علم حکمت اور مقام نبوت تھا ۔ گویا کہنے والا کہہ رہا ہے یہ ثبات قدم بڑا کارنامہ ہے جواب میں بتایا گیا ہے کہ یہ لازم نبوت ہے اور یہی شان عصمت ہے ۔ نبوت کی یہی شان ہوتی ہے تاکہ ہم نبی سے برائی کے ارادے اور برائی کو ہٹا دیں ۔ پھر سوال ابھرا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ یہ معاملہ کیوں ہوا ؟ فرمایا اس لیے ہوا کہ یوسف علیہ السلام کا شمار ان لوگوں میں ہے جن میں خیر ہی خیر ہے کسی قسم کی ملاوٹ کا وہاں شائبہ بھی نہیں ہے ۔

آخر میں فرمایا انہُ من عبادنا المخلصین ۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت کی بھی دلیل بیان کردی ہے ۔ انہ من عبادنا المخلصین ۔ وہ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے تھے ۔ جب شیطان کو اللہ سبحانہُ نے اپنی بارگاہ سے نکالا تو اس نے کہا ۔ لاغوینھم اجمعین الاعبادك منھم المخلصین ۔ میں تمام اولاد آدم کو گمراہ کروں گا سوائے تیرے برگزیدہ بندوں کے ۔ شیطان کو اعتراف ہے کہ اللہ کے برگزیدہ بندوں پر میرا داؤ نہیں چل سکے گا اور اللہ سبحانہُ اعلان کر رہے

ہیں. کہ حضرت یوسف علیہ السلام ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں. پھر کیسے گمان ہو سکتا ہے کہ یوسف علیہ السلام نے ارادہ بد کر لیا تھا۔ یہ گویا دو شہادتیں ہو گئی ہیں۔ ایک اللہ سبحانہ کی شہادت کہ یوسف علیہ السلام ہمارے برگزیدہ بندے تھے۔ دوسری ابلیس کی شہادت کہ اللہ کے مخلص اور برگزیدہ بندوں کو میں گمراہ نہ کروں گا۔ یہاں امام رازیؒ نے یہ بات بھی خوب لکھی ہے کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے ارادہ بد کر لیا اگر وہ اللہ کے دین کے پیروکار ہیں تو ان کو اللہ کی شہادت قبول کر لینی چاہیئے۔ اور اگر شیطان کے اتباع میں سے ہیں. تو حضرت یوسف علیہ السلام کی طہارت پر ابلیس کی شہادت قبول کر لینی چاہیئے۔

آگے چلنے سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کی نزاہت سیرت اور عصمت پر قرآن کی روشنی میں ایک نظر ڈال لیجئے۔

۱۔ یوسف علیہ السلام کو اللہ سبحانہ نے علم و حکم سے سرفراز فرمایا۔

۲۔ یوسف علیہ السلام صرف صالح نہیں بلکہ صالح زندگی میں حُسن کار ہیں اور حُسن کاری کی جزا اللہ سبحانہ کے یہاں سے آپ کو ملی ہے۔

۳۔ یوسف علیہ السلام پر عزیزہ مصر نے یوسف علیہ السلام کو اپنے مقام بلند سے ہٹانے کے لیے ڈورے ڈالے

۴۔ عزیزہ مصر نے دروازے بند کیئے اور یوسف علیہ السلام دعوت نشاط دی۔

۵۔ یوسف علیہ السلام نے عزیزہ مصر کی دعوت کے جواب میں اللہ سبحانہ کی معاذ اللہ کہہ کر پناہ لی۔

۶۔ یوسف علیہ السلام نے عزیزہ مصر کو بتایا کہ تیرا شوہر مجھے خرید کر لایا ہے اس نے میرا احترام کیا ہے اور مجھ پر اعتماد کیا ہے میں امانت میں خیانت کر کے ظالم نہیں بن سکتا۔

۷۔ اللہ سبحانہ نے فیصلہ دیا ہے کہ عزیزہ مصر نے بدی کا بھرپور ارادہ کر لیا تھا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے نبی ہونے کی وجہ سے ارادہ نہیں کیا۔

۸۔ یہ واقعہ اور حقیقت ہے ایسا ہی ہوا ہے۔

۹۔ ایسا ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے یوسف علیہ السلام سے بدی کے ارادے اور بدکاری کو پرے ہٹا دیا تھا۔

۱۰۔ ہٹایا اس لیے تھا کہ حضرت یوسف ؑ ہمارے برگزیدہ بندوں میں سے ہیں۔ (تلک عشرۃ کاملۃ)

قرآن کی معجزانہ بلاغت نے چند جملوں میں حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت اور مقام نبوت کی پوری تصویر پیش کردی ہے۔ ان جملوں کو اگر تشریح کا پورا جامہ پہنایا جائے تو پوری کتاب بن جائے۔ ذرا چشم تصور سے کام لو اور دیکھو کہ ترغیبات کی قہر سلطانی کا کیا حال تھا اور عیش نفس کی یہ دعوت کیسے شکیب آزما سامانوں اور صبر ربا حالتوں کے ساتھ پیش آئی تھی۔ عمر عین عروج شباب کی عمر۔ معاملہ محبت کا نہیں محبوبیت کا، طلب کا نہیں مطلوبیت کا پھر سب سے بڑھ کر یہ کہ رکاوٹ کوئی نہیں، کوئی انسانی آنکھ دیکھنے والی نہیں، کوئی پردۂ حجاب حائل ہونے والا نہیں۔ نبی کے سوا کون ہے جو ایسے حالات میں اپنے آپ کو قابو میں رکھ سکے۔ یہی نبوت کا مقام عصمت ہے جو ان بجلیوں کی تاب لاسکتا ہے۔ علامہ آلوسیؒ نے خوب لکھا ہے۔

وایاک والھم بنیۃ تلک الشنیعۃ الی ذالک الجناب بعد ان کشف اللہ سبحانہ عن بصر بصیرتک فرایت برھان ربک بلاحجاب۔

۲۵ طہارت نفس کا درجہ کمال

اور ایسا ہوا کہ دونوں دروازے کی طرف دوڑے اسی حالت میں یوسف علیہ السلام کی قمیص اس عورت نے پیچھے سے پھاڑ دی۔ اسی حال میں دونوں کا دروازے پر عورت کے خاوند سے آمنا سامنا ہوگیا۔ عورت نے شوہر کو مخاطب کرکے کہا۔ بتاؤ جو تمہارے گھر والوں کے ساتھ برائی کا ارادہ کرے اس کی سزا اس کے سوا کیا ہے؟ کہ اسے جیل بھیج دیا جائے یا اسے کوئی اور دردناک سزا دی جائے۔ آگے یوسف علیہ السلام تھے کہ جلدی دروازہ کھول کر نکل جائیں اور پیچھے زلیخا انہیں روکنے کے لیے تعاقب کررہی تھی اتفاقاً یوسف علیہ السلام کی قمیص کا پچھلا حصہ زلیخا کے ہاتھ میں آگیا اس نے پکڑ کر کھینچنا چاہا۔ کھینچا تانی میں کُرتہ پھٹ گیا مگر یوسف علیہ السلام جُوں توں کرکے مکان سے نکلنے میں کامیاب ہوگئے۔ ادھر یہ دونوں آگے پیچھے دروازے تک پہنچے۔ اُدھر عورت کا خاوند عزیز مصر بھی پہنچ گیا۔ عورت نے فوراً بات بنانی شروع کی۔ عورت نے الزام یوسف علیہ السلام پر رکھا کہ اس نے مجھ سے بُرا ارادہ کیا ایسے شخص کی سزا یہ ہونی چاہیئے کہ جیل خانہ بھیجا جائے یا اور کوئی سخت سزا دی جائے[۱] مطلب

[۱] افادات شیخ الاسلام

یہ ہے کہ جب عزیز مصر نے ناجائز مطلب برآری پر اصرار کیا تو یوسف علیہ السلام کمرے سے باہر ہونے کے لیے دروازے کی طرف لپکے۔ عزیزہ مصر ان کے پیچھے دوڑ پڑی۔ اس کشمکش میں یوسفؑ کے کُرتہ کا پچھلا دامن پھٹ گیا۔ قرآن میں قدت کی تعبیر آئی ہے یعنی عزیزہ مصر نے حضرت یوسفؑ کا کُرتہ پھاڑ دیا۔ اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی قوت مدافعت نے بھی کام کیا۔ عزیزہ مصر نے حضرت یوسف علیہ السلام کو روکنے کے لیے قمیص کا پچھلا حصہ پکڑا حضرت یوسف علیہ السلام نے بچنے کے لیے آگے کی طرف زور لگایا۔ اس کے نتیجے میں قمیص پیچھے سے پھٹ گئی۔ اس سے مصری تہذیب کی جھلک بھی ٹپک رہی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت مصر میں بالعموم صنفی آزادی قریب قریب اسی پیمانے پر تھی۔ جس پر ہم اپنے زمانے کے مغرب زدہ طبقوں کو دیکھتے ہیں۔

ساتھ ہی یہ واقعہ پیش آگیا کہ دروازہ جو کھلا تو دیکھا کہ عزیزہ مصر کا شوہر دروازے پر کھڑا ہے اس کو دیکھتے ہی سارا نشہ عشق ہرن ہوگیا جلدی سے چڑھ کر بولی کہ تمہاری بیوی کے ساتھ جو بُرائی کا ارادہ کرے یا تو وہ جیل کا قیدی بننے کا حق دار ہے اور یا اس کو کوئی اور دردناک سزا دی جائے اس طرح اس نے شوہر کی نظروں میں اپنے کو بری اور یوسف علیہ السلام کو مجرم ثابت کرنے کی کوشش کی۔

(۲۶) حضرت یوسف کی برائت کیلئے غیبی شہادت

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ خود اس عورت نے مجھ پر ڈورے ڈالے اور مجبور کیا کہ پھسل جاؤں اور اس عورت کے گھر والوں میں سے ایک گواہ نے گواہی دی یہ کہ اگر یوسف کی قمیص آگے سے پھٹی ہوئی ہے تو عورت سچّی ہے اور یوسف جھُوٹا ہے اور اگر یوسف کی قمیص پیچھے سے پھٹی ہوئی ہے تو یوسف سچّا اور عورت جھُوٹی ہے۔ جب عورت کے شوہر نے یوسفؑ کی قمیص پیچھے سے پھٹی دیکھی تو بول پڑا کہ یہ سب تم عورتوں کا چلتر ہے اور تمہاری فریب کاری بڑی ہوتی ہے۔ اے یوسف تو اس معاملہ کو نظر انداز کر اور اپنی بیوی سے کہا کہ تو اپنے گناہ کی معافی مانگ بلاشبہ تو ہی خطا کار ہے۔ اب یوسف علیہ السلام کو واقعہ ظاہر کرنا پڑا۔ کہ عورت نے میرے نفس کو بے قابو کرنا چاہا میں نے بھاگ کر جان بچائی۔ یہ جھگڑا ابھی چل رہا تھا کہ خود عورت کے خاندان کا ایک گواہ عجیب طریقے سے یوسف علیہ السلام کے حق میں گواہی دینے لگا۔ بعض روایات سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ شیر خوار بچہ تھا جو خدا کی قدرت سے حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت و

وجاہت عنداللہ ظاہر کرنے کو بول پڑا اور بعض علماء کہتے ہیں کہ بچہ نہیں مرد دانا تھا جس نے ایسی پتے کی بات کہی۔ اگر شیر خوار بچہ تھا جیسا کہ بعض معتبر روایات میں ہے تب تو اس کا بولنا اور اس کی ایسی گواہی دینا جو انجام کار یوسف علیہ السلام کے حق میں مفید ہو خود مستقل دلیل یوسف علیہ السلام کی سچائی کی تھی۔ کُرتہ کا آگے پیچھے سے پھٹا ہونا شہادت سے زائد بطور ایک علامت اور قرینہ کے سمجھنا چاہیئے۔ اور اگر گواہ کوئی مرد دانا تھا تو بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ وہ خارجی طریقہ سے حقیقت حال پر مطلع ہو چکا تھا مگر اس نے نہایت دانائی سے ایسے پیرائے میں شہادت دی جو دفعۃً کسی کی جانبداری ہی پر محمول نہ ہو اور آخر کار یوسف علیہ السلام کی برارت ثابت کر دے جو پیرایہ اظہار واقعہ کا اس نے اختیار کیا وہ غیر جانبداروں کے نزدیک نہایت معقول تھا۔ کیونکہ اگر عورت کے دعوے کے موافق یوسف علیہ السلام نے معاذ اللہ اس کی طرف اقدام کیا تو ان کا چہرہ عورت کی طرف ہو گا تو ظاہر یہ ہے کہ کُرتہ بھی سامنے سے پھٹے اور اگر یوسف علیہ السلام کا کہنا صحیح ہے کہ عورت مجھے اپنی طرف بلاتی تھی۔ میں دروازے کی طرف بھاگا ہوں اس نے پکڑنے کے لیے میرا تعاقب کیا تو کھلی ہوئی بات ہے کہ کُرتہ پیچھے سے پھٹا ہو گا کیونکہ اس صورت میں یوسف علیہ السلام اس کی طرف متوجہ نہیں تھے بلکہ ادھر سے پیٹھ پھیر کر بھاگ رہے تھے بہرحال جب دیکھا گیا کہ کُرتہ آگے سے نہیں پیچھے سے پھٹا ہوا ہے تو عزیز مصر نے سمجھ لیا کہ یہ سب عورت کا مکر و فریب ہے۔ یوسف قصوروار نہیں ہے چنانچہ اس نے صاف کہہ دیا کہ زلیخا کی پُرفریب کارروائی اسی قسم کی ہے جو عموماً عورتیں کیا کرتی ہیں۔ اس نے یوسف علیہ السلام سے استدعا کی کہ جو ہونا تھا ہو چکا۔ آئندہ اس کا ذکر مت کرو کہ سخت رسوائی اور بدنامی کا موجب ہے اور عورت کو کہا کہ یوسفؑ سے یا خدا سے اپنے قصور کی معافی مانگ یقیناً قصور تیرا ہی تھا[۱] یہ بھی حضرت یوسف علیہ السلام کی نزاہت وعصمت کی دلیل ہے۔ یوسف علیہ السلام نے جواباً فرمایا۔ کہ خود اسی نے مجھے ورغلانا چاہا تھا۔ بات کے لیے یہ انداز جو حضرت یوسف علیہ السلام نے یہاں اختیار کیا ہے بڑا ہی لطیف ہے۔ ھی راودتنی عن نفسی۔ انداز خطاب سے ہٹ کر غیبت کا انداز اختیار کرنا انتہائی وقار اور انتہائی شرم وحیا کا انداز ہے۔ حاضرین میں عزیز مصر کی بیوی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام ہیں اور خود عزیز مصر ہے۔ یہ عزیز مملکت میں ایک

---

۱ افادات شیخ الاسلام

بڑا عہدیدار تھا۔ بیوی حضرت یوسف علیہ السلام پر الزام لگا رہی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے نہایت مختصر الفاظ میں اصل حقیقت ظاہر کر دی کہ میرا قصور نہیں ہے یہی میرے پیچھے پڑی ہوئی ہے۔ اب گویا یہ ایک مقدمہ بن گیا۔ عورت کا بیان کچھ، یوسف علیہ السلام کا بیان کچھ، جھوٹا کون ہے! سچا کون ہے؟ اس کا فیصلہ کرنے میں اگر حالات و قرائن میں سے کوئی چیز مددگار ہوسکتی تھی تو کُرتہ پھٹنے کا واقعہ تھا۔ عزیزہ مصر ہی کے خاندان کے لوگوں میں سے ایک شخص نے انکشاف حقیقت کا طریقہ بتلایا اسے قرآن نے شاہد کہا ہے۔ کیونکہ اس نے کُرتہ دیکھ کر حقیقت پالی تھی اور حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکی کی شہادت دی تھی۔ اور پھر ثبوت میں کہا تھا کہ تم ہی دیکھو ان کے کُرتہ کا کیا حال ہے۔ یہ کون شخص تھا خود اس عورت کے عزیزوں میں سے تھا اس سے زیادہ قرآن نے تصریح نہیں کی۔ کیونکہ جو بات واضح کرنی تھی وہ صرف یہ تھی کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی پاکی اور راست بازی نے گھر کے تمام آدمیوں کو اُنکا معتقد بنا دیا تھا۔ حتیٰ کہ خود عورت کے ایک رشتہ دار نے اپنی رشتہ داری کا لحاظ نہیں کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام کی حمایت میں سچائی ظاہر کر دی۔ عورت کے رشتہ دار کی گواہی سُن کر شوہر کو اس پر اطمینان ہوگیا کہ دامن یوسفؑ بے داغ ہے اس نے صاف صاف کہہ دیا انہٗ من کیدکن۔ لیکن شوہر نے معاملے کو اس سے زیادہ اہمیت نہ دی کہ بیوی سے کہا۔

استغفری لذنبک انک کنت من الخاطئین

اور پھر اسی طرح آزاد و مختار چھوڑ دیا۔ جس طرح پہلے تھی۔ یہ انداز بیاں اس وقت کی مصری معاشرت اور اس کے اخلاقی احساسات کی پوری طرح غمازی کر رہا ہے۔ اس وقت کی مصری معاشرت کی ٹھیک حالت ویسی ہی تھی جس کی تصویر قرآن عزیز نے پیش کی ہے۔ امراء کے طبقہ کی معاشرتی اور ازدواجی حالت عام شہریوں سے بالکل مختلف تھی۔ ان کی عورتیں اپنے اعمال و تصرف میں بالکل آزاد تھیں۔ مردوں کے دباؤ میں رہنا پسند نہیں کرتی تھیں۔ ازدواجی زندگی میں پلہ ان کا ہی بھاری تھا اخلاقی حیثیت سے معاملہ نے ایسی صورت اختیار کر لی تھی کہ عصمت اور بے عصمتی کی قدریں بھی باقی نہ رہی تھیں۔ لوگ سب کچھ جانتے تھے اور پھر اسے ناگزیر حالات سمجھ کر برداشت کر لیتے تھے۔ مصر کی یہ حالت برابر رہی وہ صرف نسوانی حسن و جمال ہی میں نہیں بلکہ ازدواجی زندگی کی بے باکیوں اور مطلق العنانیوں میں شہرہ آفاق رہا۔ قرآن میں اس کی اندرونی شہادت موجود ہے۔ عزیز مصر پر جب معاملہ کھل گیا تو جو بات اس کی زبان

سے بے اختیار نکلی وہ صرف یہ تھی ۔ انہ من کیدکن ان کیدکن عظیم ۔ معلوم ہوگیا کہ یہ تم عورتوں کا چلتر ہے۔ تمہارے چلتر بڑے ہوتے ہیں۔ معلوم ہوا کہ اس وقت عورتوں کے بارے میں سوسائٹی کے خیالات کیا تھے۔ اور کس طرح یہ بات دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی۔ کہ عورتیں مکروفریب میں طاق ہیں۔ ان کے فریب سے عہدہ برآہ ہونا آسان نہیں ہے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو ممکن نہ تھا کہ اس موقع پر اس طرح کی بات بے اختیار عزیز کی زبان پر آتی۔ چلتر جو کچھ بھی کیا تھا۔ اس کی بیوی نے کیا تھا تمام عورتوں نے نہیں کیا۔ لیکن چونکہ وقت کی معاشرتی زندگی عام طور پر ایسی ہی ہورہی تھی۔ اس لیے جب ایک عورت کا معاملہ سامنے آیا تو بے اختیار زبان سے نکل گیا۔ کہ

تم سب کا یہی حال ہے۔ تمہارے مکروفریب سے اللہ کی پناہ

یہ تو قرآن کا بیان کردہ واقعہ ہے۔ آیئے یہی واقعہ تورات میں پڑھیئے اور اندازہ لگایئے کہ تورات کے مصنفین اپنے مخاطبوں کو کیا بتانا چاہتے ہیں۔

جب اس عورت نے حضرت یوسف علیہ السلام کا پیراہن پکڑ کر کہا کہ میرے ساتھ ہم بستری کر وہ اپنا پیراہن اسکے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگا اور باہر نکل گیا۔ جب اس نے دیکھا کہ وہ اپنا پیراہن اسکے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگ گیا تو اس نے اپنے گھر کے آدمیوں کو بلا کر ان سے کہا کہ دیکھو وہ ایک عبری کو ہم سے مذاق کرنے کیلئے ہمارے پاس لے آیا ہے۔ یہ مجھ سے ہمبستر ہونے کو اندر گھس آیا اور میں بلند آواز سے چلانے لگی جب اس نے دیکھا کہ میں زور زور سے چلا رہی ہوں تو اپنا پیراہن میرے پاس چھوڑ کر بھاگا اور باہر نکل گیا اور وہ اس کا پیراہن اس کے آقا کے گھر لوٹنے تک اپنے پاس رکھے رہی۔ جب اس کے آقا نے اپنی بیوی کی وہ باتیں جو اس نے اس سے کہیں سُن لیں کہ تیرے غلام نے مجھ سے ایسے ایسے کیا تو اس کا غضب بھڑکا اور یوسف کے آقا نے اس کو لے کر قید خانے میں جہاں بادشاہ کے قیدی بند تھے ڈال دیا۔

خلاصہ اس عجیب وغریب روایت کا یہ ہے۔ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے جسم پر لباس کچھ اس قسم کا تھا کہ ادھر زلیخا نے اس پر ہاتھ ڈالا ادھر وہ پورا لباس خود بخود اتر کر اس کے ہاتھ میں آگیا۔ پھر لطف یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام وہ لباس چھوڑ کر یوں ہی برہنہ بھاگ نکلے۔ ان کا لباس یعنی ان کے قصور کا ناقابل انکار ثبوت اس عورت کے پاس ہی رہ گیا۔ اس کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کے مجرم ہونے میں کون شک کرسکتا تھا۔

یہ تو ہے تورات کی روایت۔ رہی تلمود تو اس کا بیان ہے کہ فوطیفار نے جب اپنی بیوی سے یہ شکایت سنی تو اس نے یوسف علیہ السلام کو خوب پٹوایا پھر ان کے خلاف عدالت میں استغاثہ دائر کیا اور عدالت نے یوسف علیہ السلام کی قمیص کا جائزہ لے کر فیصلہ کیا کہ قصور عورت کا ہے کیونکہ قمیص پیچھے سے پھٹی ہے۔

یہ ایک نمایاں ترین مثال ہے۔ قرآن اور اسرائیلی روایات کے فرق کی جس سے مغربی مستشرقین کے اس الزام کی لغویت واضح ہو جاتی ہے کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے بنی اسرائیل سے نقل کیے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ قرآن نے تو ان کی اصلاح کی ہے اور اصل واقعات دنیا کو بتلائے ہیں[1]

---

[1] تفہیم القرآن

وَقَالَ نِسْوَةٌ فِي الْمَدِينَةِ امْرَأَتُ
الْعَزِيزِ تُرَاوِدُ فَتَاهَا عَنْ نَفْسِهِ ۖ قَدْ شَغَفَهَا حُبًّا ۖ إِنَّا لَنَرَاهَا
فِي ضَلَالٍ مُبِينٍ ۝ فَلَمَّا سَمِعَتْ بِمَكْرِهِنَّ أَرْسَلَتْ إِلَيْهِنَّ
وَأَعْتَدَتْ لَهُنَّ مُتَّكَأً وَآتَتْ كُلَّ وَاحِدَةٍ مِنْهُنَّ سِكِّينًا وَ
قَالَتِ اخْرُجْ عَلَيْهِنَّ ۖ فَلَمَّا رَأَيْنَهُ أَكْبَرْنَهُ وَقَطَّعْنَ أَيْدِيَهُنَّ
وَقُلْنَ حَاشَ لِلَّهِ مَا هَٰذَا بَشَرًا إِنْ هَٰذَا إِلَّا مَلَكٌ كَرِيمٌ ۝
قَالَتْ فَذَٰلِكُنَّ الَّذِي لُمْتُنَّنِي فِيهِ ۖ وَلَقَدْ رَاوَدْتُهُ عَنْ
نَفْسِهِ فَاسْتَعْصَمَ ۖ وَلَئِنْ لَمْ يَفْعَلْ مَا آمُرُهُ لَيُسْجَنَنَّ
وَلَيَكُونًا مِنَ الصَّاغِرِينَ ۝ قَالَ رَبِّ السِّجْنُ أَحَبُّ إِلَيَّ
مِمَّا يَدْعُونَنِي إِلَيْهِ ۖ وَإِلَّا تَصْرِفْ عَنِّي كَيْدَهُنَّ أَصْبُ
إِلَيْهِنَّ وَأَكُنْ مِنَ الْجَاهِلِينَ ۝ فَاسْتَجَابَ لَهُ رَبُّهُ
فَصَرَفَ عَنْهُ كَيْدَهُنَّ ۚ إِنَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ ۝ ثُمَّ
بَدَا لَهُمْ مِنْ بَعْدِ مَا رَأَوُا الْآيَاتِ لَيَسْجُنُنَّهُ حَتَّىٰ حِينٍ ۝ ع ۶ ۱۴

اور کہنے لگیں عورتیں شہر میں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے
ڈال رہی ہے کہ اسے رجھائے ۔ وہ اس کی محبت میں دل ہار

بیٹھی۔ ہم تو اسے کھلی غلطی پر سمجھتے ہیں[۲۶] جب عزیز کی بیوی نے عورتوں کی یہ پُرفریب باتیں سُنی تو اس نے عورتوں کو دعوت نامہ بھیجا۔ اور ان کے لیے مسندیں تیار کیں اور ہر ایک کے لیے ایک ایک چھری پیش کی۔ اور اس کے بعد یوسف سے کہا کہ ان کے سامنے باہر آ۔ جب عورتوں نے یوسف کو دیکھا تو ششدر رہ گئیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور بول پڑیں واہ واہ یہ تو انسان نہیں ضرور فرشتہ ہے بڑے مرتبے والا[۲۸] عزیز مصر کی بیوی بولی تم نے دیکھ لیا یہ ہے وہ شخص جس کے بارے میں تم مجھے طعنے دیتی تھیں۔ ہاں بے شک میں نے اس کا جی اپنے قابو میں لینا چاہا تھا مگر وہ بے قابو نہ ہوا اور اب اسے سُنا کے کہے دیتی ہوں کہ اگر اس نے میرا کہا نہ مانا تو ضرور ایسا ہوگا کہ قید کیا جائے اور ضرور بے عزت ہو[۲۹] یوسف علیہ السلام نے سُن کر اللہ کے حضور میں دعا کی خدایا مجھے قید میں رہنا اس بات سے کہیں زیادہ پسند ہے جس کی یہ عورتیں دعوت دے رہی ہیں۔ اگر تو نے میری مدد نہ کی تو عجب نہیں کہ میں ان کی طرف جھک جاؤں اور ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جو ناآشنا ہوتے ہیں[۳۰] اللہ سبحانہٗ نے حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا

قبول کی اور ان سے عورتوں کا فریب ہٹا دیا۔ بلاشبہ وہی دعاؤں کا قبول کرنیوالا اور سب کچھ جاننے والا ہے[۱۲۳] پھر ایسا ہوا کہ اگرچہ وہ لوگ یعنی عزیز اور اس کے خاندان کے آدمی نشانیاں دیکھ چکے تھے پھر انہیں یہی بات سمجھ میں آئی کہ ایک خاص وقت تک یوسف کو قید میں رکھا جائے[۱۲۴]

حضرت یوسف ؑ کے جمال سیرۃ کا ایک اور منظر

حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ عزیز کی بیوی کے اس عشق کا چرچا آہستہ آہستہ افسانہ بزم و انجمن بن گیا۔ شہر کی کچھ عورتوں نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام کے عشق میں دیوانی ہو رہی ہے اس پر ڈورے ڈال رہی ہے۔ لیکن بس سے باہر ہے۔ ہم تو اس کو صریح غلطی میں مبتلا دیکھ رہے ہیں۔ ان کے اس آخری فقرے میں ملامت، شماتت اور ازعا کے بہت سے پہلو پوشیدہ ہیں۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے جمال سیرۃ کا ایک اور مظاہرہ ہے۔ اور پہلے سے زیادہ عظیم ہے پہلے صرف امراۃ العزیز کا فتنہ تھا اب دارالحکومت کے تمام فتنہ گران حسن جمع ہو گئے کہ حضرت یوسف ؑ کی متاع ضبط و تحمل کی غارتگریوں میں حصہ لیں مگر یہاں بھی کیا نتیجہ نکلا۔ سب نے بیک زبان کہا

حاش للّٰہ ما ھذا بشرا ان ھذا الا ملک کریم

راست بازی اور حق پرستی کی آزمائش نے اچانک کیسی صورت اختیار کرلی۔ دنیا میں انسانوں کو سزائیں اس لیے بھگتنی پڑتی ہیں کہ جرم و معصیت سے اپنے کو نہیں روک سکتے۔ لیکن اب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے قید کی سزا اس لیے لائی جا رہی ہے کہ جرم و معصیت سے کیوں اپنے آپ کو روک رہے ہیں۔ لوگوں کو قید و بندگی مصیبت اس لیے برداشت کرنی پڑتی ہے کہ عیش حیات ڈھونڈھتے ہیں اور جب نہیں ملتا تو جبراً لینا چاہتے ہیں لیکن حضرت یوسف ؑ کو اس لیے قید خانہ کی دھمکی دی جا رہی ہے کہ عیش حیات نے اپنی ساری دلفریبیوں اور

رعنائیوں کے ساتھ انہیں دعوت دی اور انہوں نے اس سے انکار کر دیا۔
یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کا سب سے زیادہ عظیم مظاہرہ ہے یہ عشق حق کا نمونہ ہے۔ یہ پرستاری صدق کا دستور العمل ہے۔ یہ ایمان کامل کا معیار ہے۔ جب ان کے سامنے دو باتیں پیش کی گئیں۔ زندگی کا عیش مگر معصیت کی راہ میں، زندگی کی سختی راست بازی کی راہ میں تو ان کا فیصلہ قطعی یہ تھا کہ السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ۔

(۲۷) اور کہنے لگیں عورتیں شہر میں کہ عزیز کی بیوی اپنے غلام پر ڈورے ڈال رہی ہے کہ اسے رجھائے وہ اس کی محبّت میں دل ہار بیٹھی۔ ہم تو اسے کھلی غلطی پر سمجھتے ہیں یعنی شدہ شدہ شہر کی عورتوں نے کہنا شروع کر دیا کہ عزیز کی عورت اپنے نوجوان غلام پر مفتون ہو گئی۔ چاہتی ہے کہ اس کے نفس کو بے قابو کر دے۔ غلام کی محبت اس کے دل کی تہہ میں پیوست ہو چکی ہے۔ حالانکہ ایسے معزز عہدیدار کی بیوی کے لیے یہ سخت شرمناک بات ہے کہ وہ ایک غلام پر یوں گرنے لگے۔ ہمارے نزدیک اس معاملہ میں وہ سخت غلطی پر ہے۔ یہ عزیز مصر کی بیوی کے بارے میں قرآن کا فیصلہ نہیں بلکہ شہر کی عورتوں کا فیصلہ ہے۔ اس عورت میں عشق و ہوس کے مختلف مراتب یکے بعد دیگرے پیدا ہوئے اور قرآن عزیز نے ایک عجیب اسلوب بلاغت کے ساتھ انہیں ہر جگہ ابھارا ہے اور ہر مرتبہ کی خصوصیت واضح کی ہے۔ سب سے پہلے وہ موقع سامنے آتا ہے جب اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دعوت عیش دی۔ اور ناکام رہی ولقد ھمت بہ، وھم بھا لولا ان راٰ برھان ربہ۔ یہ سب سے پہلی شکست ہے کہ قرآن نے عورت کے ارادے کو ثابت کیا اور حضرت یوسف علیہ السلام سے ارادے کی نفی کی۔ دوسرے مرحلہ پر جب اس کی عشق بازی کا راز فاش ہو گیا اور شوہر سامنے کھڑا نظر آیا تو اپنی ذلت و رسوائی برداشت نہ کر سکی جھٹ اپنا جرم دوسرے کے سر ڈال دیا اور پھر کس دوسرے کے سر؟ اسی کے سر جس کی محبت و شیفتگی کی مدعی بنی تھی۔ قالت ماجزاء من اراد باھلک سوءا الا ان یسجن او عذاب الیم۔ اس سے معلوم ہوا کہ محبّت میں جھوٹی تھی اور معاملہ ہوس سے آگے نہ بڑھا تھا کیونکہ اگر محبّت سچی ہوتی تو محبّت کی راہ میں ذلت و رسوائی سے نہ ڈرتی اور خود محبوب کے سر جھوٹا الزام نہ لگاتی۔

(۲۸) عزیز مصر کی بیوی کی جانب سے ضیافت کی محفل

جب عزیز کی بیوی نے عورتوں کی یہ پُرفریب باتیں سنیں۔ تو اس نے عورتوں کو دعوت نامہ

بھیجا۔ اور ان کے لیے مسندیں تیار کیں اور ہر ایک کو ایک ایک چھری پیش کی اور اس کے بعد یوسف علیہ السلام سے کہا کہ ان کے سامنے باہر آ۔ جب عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو دیکھا تو ششدر رہ گئیں اور انہوں نے اپنے ہاتھ کاٹ لیے اور بول پڑیں سبحان اللہ یہ تو انسان نہیں ضرور فرشتہ ہے بڑے مرتبے والا۔ عورتوں کی گفتگو کو مکروفریب اس لیے کہا کہ مکاروں کی طرح چھپ چھپ کر باتیں کرتی تھیں۔ اور زلیخا پر طعن کر کے گویا اپنی پارسائی کا اظہار مقصود تھا۔ حالانکہ یوسف علیہ السلام کے بیمثال حُسن و جمال کا شہرہ جس عورت کے کان میں پڑتا تھا۔ اس کی دید کا اشتیاق دل میں چٹکیاں لینے لگتا تھا۔ کچھ بعید نہیں کہ زلیخا پر طعن و تشنیع اور نکتہ چینیاں کرنے والیوں کے دلوں میں بھی غرض پوشیدہ ہو کہ زلیخا کو غصہ دلا کر کسی حرکت پر آمادہ کریں جو یوسف علیہ السلام کے دیدار کا سبب بن جائے۔ یا زلیخا کے دل میں اس کی نفرت بٹھا کر اپنی طرف مائل کرنے کا موقعہ نکالیں اور یہ بھی ممکن ہے کہ زلیخا نے بعض عورتوں کو اس معاملہ میں اپنا راز دار بنایا ہو اس نے راز داری کی جگہ پردہ دری اور خوردہ گیری شروع کر دی ہو۔ بہر حال ان کی گفتگو کو لفظ مکر سے ادا کرنے میں یہ سب احتمالات ہیں۔ بہر حال عزیز کی بیوی نے دعوت کر کے ان کو بلا بھیجا اور کھانے پینے کی ایک مجلس ترتیب دی جس میں بعض چیزیں چاقو سے تراش کر کھانے کی تھیں۔ چنانچہ کھانے اور میوے ان کے سامنے چن کر ہر ایک عورت کے ہاتھ میں ایک چاقو دے دیا۔ تا کہ تراشنے کے قابل چیزوں کے کھانے میں کسی کو کلفت انتظار نہ اٹھانا پڑے۔ یہ سب سامان درست کر کے اس نے حضرت یوسف علیہ السلام کو آواز دی کہ ادھر نکل آئے۔ نکلنا تھا کہ بجلی سی کوند گئی۔ تمام عورتیں یوسف علیہ السلام کے حسن و جمال کا مشاہدہ کرنے سے ہوش و حواس کھو بیٹھیں اور مدہوشی کے عالم میں چھریوں سے پھلوں کی جگہ ہاتھ کاٹ لیے گویا قدرت نے یہ ایک مستقل دلیل یوسف علیہ السلام کی صداقت و نزاہت پر قائم فرما دی۔ کہ جس کے جمال بے مثال کی ذرا سی جھلک نے دیکھنے والی عورتوں کے حواس گم کر دیئے۔ بحالانکہ یوسف علیہ السلام نے آنکھ اٹھا کر بھی انکے حُسن و خوبی کیطرف نہ دیکھا تو یقیناً واقعہ یوں ہی ہوا ہوگا کہ زلیخا اُسکے جمال ہوشربا کو دیکھ کر ہوش و حواس کھو بیٹھی اور وہ معصوم فرشتہ کی طرح اپنا دامن عفت بچاتا ہوا صاف نکل گیا۔ حُسن و جمال اور نورانی صورت کے اعتبار سے فرشتہ معلوم ہوتے تھے۔ کسی نے خوب کہا ہے

قوم اذا موبلو کانوا ملائکة
حسنا وان موتلوا کانوا عفاریتا

باحیا، وپاکدامنی جو چہرہ اور چال ڈھال سے ٹپک رہی تھی اسے دیکھ کر کہا کہ یہ آدمی نہیں کوئی معصوم فرشتہ معلوم ہوتا ہے[1] ان آیات میں ایک طرف اگر حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت بیان ہو رہی ہے اور عورتوں کی پوری جماعت حضرت یوسف ؑ کی نزاہت، سیرت کی بلندی اور ان کی پاکدامنی کا ایک زبان ہو کر اعلان کر رہی ہیں اور کہہ رہی ہیں۔ ان ھذا الا ملك کریم۔ اس سے ضمناً یہ بھی معلوم ہو رہا ہے کہ اس دور کی مصر کی مذہبی زندگی میں ملائکہ کا تصور موجود تھا۔ یعنی وہ ایک روحانی مخلوق کو مانتے تھے۔ اگرچہ ان کے یہاں ملائکہ کی حیثیت الٰہ کی تھی اور ان کے یہاں ان کی خیالی تصویروں کی پرستش ہوتی تھی۔ اس طرح یہ تشبیہ محسوس کی متخیل کے ساتھ ہے۔

دوسری طرف اس آیت سے ضمناً یہ بات بھی معلوم ہوگئی کہ اس زمانے کی مصری معاشرت کس درجہ شائستہ ہو چکی تھی۔ ضیافت کی مجلسیں خاص طور پر آراستہ کی جاتی تھیں نشست کے لیے مسندیں لگائی جاتی تھیں۔ کھانے کے لیے ہر شخص کے سامنے چھری رکھی جاتی تھی مسندوں کے اہتمام کا حال اعتدت لھن متکا، سے معلوم ہو رہا ہے مصر کے آثار قدیمہ اور یونانی مؤرخوں کی شہادت سے جو حالات روشنی میں آئے ہیں۔ ان سے بھی اس متمدن معاشرت کی تصدیق ہوتی ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس وقت مصر کے اونچے طبقوں کی اخلاقی حالت کیا تھی۔ ظاہر ہے کہ عزیز کی بیوی نے جن عورتوں کو بلایا ہوگا وہ امراء و رؤساء اور بڑے گھر کی بیگمات ہی ہوں گی ان عالی مرتبہ خواتین کے سامنے وہ اپنے محبوب نوجوان کو پیش کرتی ہے اور اس کی خوبصورت جوانی دکھا کر انہیں قائل کرنے کی کوشش کرتی ہے کہ ایسے جوان رعنا پر مر نہ مٹتی تو آخر اور کیا کرتی۔ پھر یہ بڑے گھروں کی بہو، بیٹیاں خود بھی اپنے عمل سے گویا اس امر کی تصدیق فرماتی ہیں کہ واقعی ان میں سے ہر ایک ایسے حالات میں وہی کچھ کرتی جو عزیز کی بیوی نے کیا۔ خواتین کی اس بھری مجلس میں معزز میزبان کو علانیہ اپنے اس عزم کا اظہار کرتے ہوئے کوئی شرم محسوس نہیں ہوتی کہ اگر اس کا خوبصورت غلام اس کی خواہش نفس کا کھلونا بننے پر راضی نہ ہوا تو وہ اسے جیل بھجوا دے گی۔

دعوت کے پس منظر میں یہ بات بھی بتائی گئی ہے کہ جب عزیز مصر کی بیوی نے سُنا کہ

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ان عورتوں کو اپنی عشوہ طرازیوں، دلربائیوں اور کارفرمائیوں پر یہ ناز اور غرّہ ہے تو اسکے دل کو بڑی چوٹ لگی۔ اور اس نے چاہا کہ یہ بھی ذرا یوسف علیہ السلام پر اپنے تیر آزمالیں تاکہ ان کو بھی اپنی قدر و قیمت کا پتہ لگ جائے چنانچہ عزیز مصر کی بیوی نے عورتوں کی دعوت کا سامان کیا لیکن محققین کے نزدیک اس خیال کی کوئی قدر و قیمت نہیں ہے۔

دعوت میں عورتیں آئیں۔ انہوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کو دیکھا قرآن نے ان کے بارے میں انکشاف کیا ہے۔ اکبرنہ۔ یہ اکبار سے ہے۔ اکبار کے معنے کسی کو بڑا سمجھنا اور دل میں اس کی عظمت اور بڑھائی کا قائل ہونا۔ یعنی جب حضرت یوسف علیہ السلام سامنے آئے تو ان کی نورانی صورت اور ان کی تابناک پیشانی اور ان کا پاکیزہ چہرہ دیکھ کر عورتیں مبہوت ہوگئیں اور اس حیرت میں ان پر ایسی بدحواسی چھاگئی کہ بے خبری میں چاقو ہاتھ پر چل گیا جیسا کہ اکثر خیال دوسری طرف بٹ جانے کے وقت ہوتا ہے۔ سیرت و اخلاق کی پاکیزگی بجائے خود بڑی ہی دلربا چیز ہے اور جب یہ ایک جوان و رعنا میں ہو جو خوبصورت بھی ہو تو اس کی دلربائی دوچند ہوجاتی ہے۔ ہوسکتا ہے کہ یہ کوئی معجزہ یوسفی ہو جیسا کہ کچھ بزرگوں کی رائے ہے لیکن حالات کا طبعی تقاضا بھی یہی تھا۔ اس کے لیے مجلس کا نقشہ ذرا وضاحت کے ساتھ سامنے رکھیے۔ دعوت و ضیافت کا اہتمام شاہی پیمانے پر ہے۔ قہرمان وزیر حکومت کی بانوئے محترم ہیں۔ عشوہ و ناز سے لبریز وزیرزادیاں اور امیرزادیاں جمع ہیں۔ میووں اور پھلوں سے شغل ہو رہا ہے۔ چھری کانٹے کے رواج سے یوں بھی مصری تمدن ناآشنا نہ تھا۔ ہاتھوں میں چھریاں ہیں گپ شپ ہو رہی ہے۔ یک بیک ایک ڈرامائی انداز میں ایک نور پیکر سامنے آجاتا ہے۔ نظریں نیچی، آنکھوں پر حیا کے پردے، چہرے پر عصمت کے سہرے جن کے چہرے خود ہی دعوت نظارہ کے عادی تھے وہ آپ اس وقت تماشائی بنی ہوئی اس حسن و جمال، عصمت و عفاف کے پتلے کے نظارے میں محو۔ اور وہ نہ کسی کی طرف نظر اٹھاتا ہے نہ کسی سے دلچسپی لیتا ہے۔ ایسے بھی عجب کیا۔ جو ٹکٹکی لگ گئی ہو اور پلک جھپکانا تک بار ہو رہا ہو۔ اور چھریاں بجائے پھلوں کے ہاتھوں پر چل گئی ہوں پھر قطعن کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہاتھ سب کے کٹ گئے ہوں چند کا زخمی ہوجانا بھی صیغہ جمع لانے کے لیے کافی ہے علامہ آلوسیؒ نے تصریح کی ہے کہ جرحنها بما فی ایدیهن من السکاکین قطعن ایدیهن کا ایک مطلب تو یہی ہے کہ مبہوت و حیران ہو کر بجائے پھل کاٹنے کے انہوں نے اپنے

ہاتھ کاٹ لیے ۔ مولانا اشرف علیؒ فرماتے ہیں ۔

جس وقت یہ باہر آئے وہ عورتیں کوئی چیز مثل ترنج تراش رہی تھیں ان کو دیکھ کر ایسی بدحواسی چھا گئی کہ اس بے خبری میں وہ چاقو ہاتھ پر چل گیا جیسا کہ اکثر دوسری طرف خیال بٹ جانے کی وجہ سے ایسا اتفاق ہو جاتا ہے ۔

عام طور پر مفسرین اس کی تفسیر یہی بیان کرتے ہیں کہ جمال یوسف سے مدہوش ہو کر واقعی ان کی یہ حالت ہو گئی تھی کہ ان کو اپنے تن بدن کا ہوش نہیں رہا تھا اور کاٹنے والی چیز کی بجائے ہاتھوں کو کاٹ لیا ۔

کچھ شارحین قرآن نے مصری عورتوں کے اس کردار کو ان کے کید ی کا حصہ بتایا ہے یعنی یہ بھی ان کی حضرت یوسفؑ کو اپنی طرف مائل کرنے کے لیے ایک تدبیر تھی ۔ وہ یہ بتانا چاہتی تھیں کہ ہم تیرے حسن کے اس قدر متوالے ہیں کہ تیری صورت دیکھ کر ہوش و حواس بھی جاتے رہے اور ہاتھوں کو زخمی کر لیا اور اپنی اس تفسیر کی تائید میں اس آیت سے استدلال کیا ہے ۔ الا تصرف عنی کیدھن یعنی یوسف علیہ السلام نے عورتوں کی اس حالت کو مکر سے تعبیر کیا ہے ۔ اگر یہ حالت اضطراری ہوتی تو پھر وہ بے قصور نہیں ۔ ایسی حالت میں ان کے اس طرز عمل کو کید کہنے کے کیا معنی ۔ بہرحال اس پر تفصیلی بحث پارے کے آخر میں زیر تفسیر فسئلہ ما بال النسوۃ التی قطعن ایدیھن ان ربی بکیدھن علیم میں آرہی ہے ۔

(۲۹) عصمت یوسفؑ کی پاکدامنی پر مزید بلیغ شہادت

عزیز مصر کی بیوی بولی تم نے دیکھ لیا یہ ہے وہ شخص جس کے بارے میں تم نے مجھے طعن و تشنیع کا نشانہ بنایا ۔ ہاں بے شک میں نے اسکا جی اپنے قابو میں لینا چاہا تھا ۔ مگر وہ بے قابو نہ ہوا ۔ اور اب اسے سنا کے کہے دیتی ہوں کہ اگر اس نے میرا کہا نہ مانا تو اسے ضرور قید کیا جائے گا اور وہ ضرور بے عزت ہوگا ۔ اب زلیخا کو موقع ملا کہ عورتوں کے طعن و تشنیع کا تیر ان ہی کی طرف لوٹا دے گویا اس وقت فذالک الذی لمتننی کہہ کر وہ اس شعر کا خلاصہ ادا کر رہی تھی ۔

ایں است کہ خون خوردہ دل بردہ بسے را
بسم اللہ اگر تاب نظر ہست کسے را

مجمع کا رنگ دیکھ کر زلیخا بالکل ہی کھل پڑی اور واقعہ کا صاف صاف اظہار کردیا کہ بے شک میں نے ان کا دل لینا چاہا تھا مگر اس بندہ خدا نے ایسا مضبوط تھامے رکھا کہ کسی طرح نہ دیا۔ یہ اللہ سبحانہ نے شہر کی عورتوں کے مجمع میں حضرت یوسف علیہ السلام کی کمال عصمت وعفت اور غایت نزاہت وطہارت کا اقبالی ثبوت پیش کر دیا۔ زلیخا کا حال اس وقت وہی تھا جو کسی نے کہا ہے۔

لاتخف ماصنعت بك الاشواق
واشرح هواك فكلنا عشاق

زلیخا کی اس گفتگو میں کچھ تو عورتوں پر اپنی معذوری اور نامرادی کا اظہار تھا تاکہ ان کی ہمدردی حاصل کر سکے۔ اور کچھ یوسف علیہ السلام کو تحکمانہ دھمکیوں سے مرعوب کرنا تھا تاکہ وہ خوفزدہ ہو کر آئندہ اس مطلب برآری کے لیے آمادہ ہو جائیں حالانکہ

عنقا شکار کس نہ شود دام باز چیں
کانجا ہمیشہ باد بدست است دام را[1]

مطلب یہ ہے کہ میں یوسفؑ کو محبت سے رام نہ کر سکی تو یہ نہ سمجھے کہ اس کی جان چھوٹ گئی۔ اب جیل کی ہوا کھائے گا اور ذلیل ہو گا یہاں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی آزمائش ایک نئی شکل اختیار کرتی ہے۔ ہوس کی محبت اپنی ناکامی کا انتقام لینے پر آمادہ ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مصر میں غلاموں پر ان کے آقاؤں کو غیر محدود اختیار حاصل تھے۔ وہ ان سے ناراض ہونے کی صورت میں بے تکلف ان کو جیل بھجوا سکتے تھے۔ پھر یہاں تو معاملہ ایک اعلیٰ سرکاری عہدیدار کی بیگم صاحبہ کا تھا۔ کس کی مجال تھی کہ ان کے ارادے میں مزاحم ہو سکے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں عزیز مصر کی بیوی کا یہ اعلان فاستعصم، حضرت یوسفؑ کی عصمت کی بہت بڑی شہادت ہے۔ اور ایسی دلیل ہے جس سے زیادہ واضح اور صاف دلیل کوئی نہیں۔ استعصم استعصام سے ماضی ہے۔ اس میں علماء کی تصریح کے مطابق س اور تا مبالغہ کے لیے ہے اس نے تھام رکھا، بچا لیا، یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے کمال عصمت و نزاہت پر خود عزیز مصر کی بیوی کی شہادت ہے۔ کیونکہ عزیزہ مصر نے خواتین مصر کی بھری

---

[1] افادات شیخ الاسلام

مجلس میں یوسفؑ کی موجودگی میں اعتراف کیا کہ فی الواقع میں نے یوسف علیہ السلام کو ہر طرح سے ورغلایا لیکن حضرت یوسف علیہ السلام بالکل بچے رہے۔ علامہ قاسمی نے یہاں یہ بات بہت اچھی لکھی ہے کہ عام شارحین قرآن نے اسرائیلی روایات کی وجہ سے ھم اور برھان کی معنویت کو جس انداز سے لغویت کا لبادہ پہنا کر حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت کو پامال کرنے کی لایعنی اور بیکار باتیں بنائی ہیں۔ یہ آیت ان کی صاف اور کھلی تردید ہے۔

عصمت نبوت کی خصوصیات میں سے ایک اہم اور بڑی خصوصیت ہے نبی کی بے گناہی اور معصومیت کا مطلب یہ ہے کہ ان سے بمقتضائے بشریت بھول چوک ہو سکتی ہے۔ مگر اللہ سبحانہٗ اپنی وحی سے ان غلطیوں کی بھی اصلاح کرتا رہتا ہے نبوت کے متعلق عقلی حیثیت سے بھی جب تک عصمت کا اصول مان نہ لیا جائے نبی اور عام حکیم و مصلح میں فرق نمایاں نہیں ہو سکتا اور نہ نبیوں اور رسولوں کی کامل صداقت اور صحت پر اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ اسی قرآن نے اس عقیدے کا بڑا اہتمام کیا ہے۔ ایک ایک کر کے تمام انبیاؑ کے مقدس احوال کا تذکرہ کیا ہے اور ان واقعات کی تردید کی ہے جو شان عصمت کے خلاف ہیں اور جن کو لوگوں نے ان کی سوانح میں شامل کر دیا ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے قرآن نے بار بار اجتبا حق کو پسند کرنے کا لفظ استعمال کیا ہے۔ جو سرتا سر ان کی عصمت اور گناہوں سے پاک ہونے پر دلالت کرتا ہے۔ اسی سورت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے محسن کا لفظ آیا ہے۔

سورۃ انعام میں حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ حضرت اسحٰقؑ، حضرت یعقوبؑ، حضرت نوحؑ، حضرت داؤدؑ، حضرت سلیمانؑ، حضرت ایوبؑ، حضرت موسیٰؑ اور حضرت ہارون علیہم السلام کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا وکذالک نجزی المحسنین۔ کیا اس سے زیادہ ان کی عصمت اور بے گناہی کی کوئی اور شہادت ہو سکتی ہے۔ سورۃ انعام ہی میں اور پیغمبروں کا ذکر کر کے فرمایا کل من الصالحین۔ پھر آگے چل کر فرمایا کلا فضلنا علی العالمین۔ ہم نے ہر ایک کو دنیا والوں پر فضیلت دی۔ پھر ان کا ذکر کر کے فرمایا واجتبیناھم وھدیناھم الی صراط مستقیم۔ ہم نے ان کو برگزیدہ کیا اور ان کو سیدھی راہ پر چلایا۔ صالح ہونا، برگزیدہ ہونا اور راہ راست پر ہونا سراسر عصمت اور بے گناہی ہے۔ اسی لیے قرآن نے واقعہ یوسف میں بار بار ان کی بے گناہی اور عصمت کے لیے صرف اشارات ہی نہیں کیے بلکہ پوری صراحت اور زور سے فرمایا کہ انہٗ من عبادنا المخلصین۔ پھر صاف اور واضح طور پر فرمایا

کہ ہم یوسف سے بدکاری و برائی کو ہٹا دیتے ہیں۔ بدکاری تو بدکاری ہے اور بد کا ارادہ ھو ہے۔ یہ نہیں فرمایا کہ یوسف علیہ السلام کو گناہوں سے بچاتے ہیں بلکہ فرمایا کہ گناہوں کو یوسف علیہ السلام سے ہٹا دیتے ہیں۔ پھر عزیزہ مصر کی زبانی حضرت یوسف علیہ السلام پر الزام کو نقل کیا اور ساتھ خود عزیزہ مصر کے گھر والوں میں سے حضرت یوسفؑ کی برأت کیلئے شہادت پیش فرمادی جسکی روشنی میں عزیز مصر نے فیصلہ دیا کہ یہ یوسف پر الزام ہے اصلی مجرم خود عزیزہ مصر ہے اب یہاں عورتوں کی محفل میں خود عزیزہ کی زبانی یہ اقرار پیش کیا کہ انا راودتہ' میں نے یوسف کو ورغلایا۔ لیکن یوسف اپنی جگہ عصمت کی چٹان بنا رہا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کا مطالعہ بتاتا ہے کہ نبوت کی زندگی کی سب سے بڑی قوت اس کی سیرت کی فضیلت ہے۔ اگر یہ فضیلت موجود ہو تو پھر اس کے لیے فتح و کامرانی کے سوا اور کچھ نہیں ہوسکتا۔ دنیا کی ساری رکاوٹیں اس کی راہ روک لیں جب بھی وہ اپنی راہ نکالے گا۔ دُنیا کے سارے سمندر اور پہاڑ اس کی راہ میں حائل ہو جائیں پھر بھی اس کی رفتار نہیں رکتی ہے۔ حوادث و وقائع اس پر قابو نہیں پا سکتے۔ احوال وظروف اس پر غالب نہیں آسکتے۔ افراد و جماعات کی کوششیں اسے مسخر نہیں کرسکتیں۔ وہ تنہا ہوتا ہے ہر حال میں کامیاب ہوتا ہے اسکے لیے ہر گوشہ میں فتح مندی ہے۔

عزیزہ مصر کی یوسفؑ کو دھمکی

حضرت یوسف علیہ السلام کی استقامت کو عزیزہ مصر نے تشدد کی راہ سے زیر کرنے کی کوشش کی اور کہا کہ لئن لم یفعل ما آمرہ لیسجنن ولیکونن من الصاغرین۔ اگر کہا نہ مانو گے قید میں ڈالے جاؤ گے۔ عزیز مصر پر حضرت یوسف علیہ السلام کی سچائی ظاہر ہوگئی تھی اسی لیے ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی تھی لیکن اس کی بیوی کا عشق ایسا نہ تھا۔ جو اس ناکامی سے سرد پڑجاتا وہ اور زیادہ بڑھ گیا اور جب دیکھا کہ طلب و الحاح سے کسی طرح کام نہیں بنتا تو سختی پر اُتر آئی اور یوسف سے کہا کہ یا تو میرا کہا مانو نہیں تو قید ہونے کی ذلت و رسوائی گوارا کرو۔

یہاں سے حضرت یوسف علیہ السلام کی آزمائش ایک نیا رُخ اختیار کرتی ہے۔ ہوس کی محبت اپنی ناکامی کا انتقام لینے پر آمادہ ہوتی ہے اور معلوم ہوتا ہے۔ کہ مصر میں غلاموں پر ان کے آقاؤں کو غیر محدود اختیارات حاصل تھے وہ ان سے ناراض ہونے کی صورت میں بے تکلف

ان کو جیل بھجوا سکتے تھے۔ اور یہاں تو معاملہ ہی بڑی بیگم صاحبہ کا تھا۔ کسی کی کیا مجال تھی کہ ان کے ارادے میں مزاحم ہوسکے۔ اس سے ضمناً یہ بھی مترشح ہو رہا ہے کہ مصری معاشرت کے اس تہذیبی دور میں عورتوں کو مردوں پر دیسی ہی برتری حاصل تھی جیسے آج یورپ کی تہذیب۔ ایک طرف عزیز مصر سے ان کی بیگم حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ کہہ کر شکایت کر رہی ہے۔ ماجزاء من اراد باھلك سوءً اور ساتھ ہی اس کی سزا بھی بڑی ڈھٹائی سے تجویز کر رہی ہے۔ الا ان یسجن او عذاب الیم۔ مگر عزیز مصر کے سامنے جب حضرت یوسف علیہ السلام نے اس الزام کے جواب میں یہ کہا۔ ھی راودتنی عن نفسی۔ اور ساتھ ہی ایک تجربہ کار دانا آدمی نے عزیز مصر کی یہ کہہ کر راہنمائی کی کہ دیکھ لیا جائے کہ اگر کُرتہ آگے سے پھٹا ہو تب تو عورت سچی ہے اور اگر پیچھے سے پھٹا ہو تو یوسف علیہ السلام سچا ہے۔ یہ بات نہایت معقول تھی اس وجہ سے عزیز مصر کو اس پر اطمینان ہوگیا۔ جب اس نے دیکھا کہ یوسفؑ کا کُرتہ پیچھے سے پھٹا ہے تو اس نے عورت کو مجرم گردانا اور ڈانٹا کہ یہ سب تیرا فریب ہے۔ اور ان کیدکن عظیم۔ اس کے باوجود عزیزہ مصر نے عزیز مصر سے الگ ہو کر عورتوں کی دعوت کی اور اس دعوت میں عورتوں کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام کی بے گناہی اور اپنے مجرم ہونے کا اعلان کیا اور بڑی بے حیائی اور ڈھٹائی سے حضرت یوسف علیہ السلام کو یہ دھمکی دی۔ لئن لم یفعل ما آمرہ لیسجنن ولیکونن من الصاغرین راست بازی اور حُسن پرستی کی آزمائش نے اچانک کیسی صورت اختیار کرلی۔ دنیا میں سزائیں اس لیے ملتی ہیں کہ جرم و معصیت کے مرتکب ہوتے ہیں۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو سزا اس لیے مل رہی ہے کہ جرم و معصیت سے اپنے آپ کو کیوں روک رہے ہیں۔ لوگوں کو قید و بند کی مصیبت اس لیے برداشت کرنی پڑتی ہے۔ کہ عیش حیات ڈھونڈھتے ہیں اور جب نہیں ملتا تو جبراً لینا چاہتے ہیں لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کو قید کی دھمکی اس لیے دی جا رہی ہے کہ عیش حیات کو کیوں نہیں قبول کرتے۔

(۳۰) سیرت یوسفؑ کا سب سے عظیم مظاہرہ

یوسف علیہ السلام نے سُن کر اللہ کے حضور میں دعا کی خدایا مجھے قید میں رہنا اس بات سے کہیں زیادہ پسند ہے جس کی یہ عورتیں دعوت دے رہی ہیں اگر تو نے میری مدد نہ کی

تو عجب نہیں کہ میں ان کی طرف جھک جاؤں اور ان لوگوں میں سے ہو جاؤں جو ناآشنا ہوتے ہیں معلوم ہوتا ہے کہ زلیخا کا مایوسانہ رویہ اور مظلومانہ انداز بیان اس کی ہم جنسوں پر اثر کر گیا یا پہلے ہی سے کچھ ملی بھگت ہو گی۔ بہر حال لکھا ہے کہ اب عورتوں نے یوسف علیہ السلام کو سمجھانا شروع کیا کہ تم کو اپنی محسنہ اور سیدہ کا کہا ماننا چاہیئے۔ آخر اس غریب پر اتنا ظلم کیوں کرتے ہو۔ پھر یہ بھی سوچ لو کہ نافرمانی کا نتیجہ کیا ہو گا۔ خواہ مخواہ مصیبت سر پر لینے سے کا کیا فائدہ۔ کہتے ہیں کہ بظاہر زبان سے وہ زلیخا کی سفارش کر رہی تھیں۔ مگر دل ہر ایک کا یوسف علیہ السلام کو اپنی طرف کھینچنا چاہتا تھا۔ یوسف علیہ السلام نے جب دیکھا کہ یہ عورت بے طرح پیچھے پڑی ہوئی ہے اور شیطان ہر طرف اپنا جال بچھانے لگا ہے تو نہایت عزم و استقلال اور پیغمبرانہ استقامت سے بارگاہ احدیت میں درخواست کی کہ مجھے اس مکر و فریب سے بچایئے، اگر اس سلسلے میں قید ہونا پڑا تو میں قید کو ارتکاب معصیت پر ترجیح دیتا ہوں۔ اگر آپ میری دستگیری نہ فرمائیں گے تو ڈر ہے کہ کہیں بے عقل ہو کر انکی ابلہ فریبیوں کی طرف نہ جھک پڑوں۔ یہاں یوسف علیہ السلام کی زبانی یہ جتلا دیا کہ انبیاء کی عصمت بھی حق تعالیٰ کی دستگیری سے ہے اور یہ کہ وہ اپنی عصمت پر مغرور نہیں ہوتے بلکہ عصمت کا جو منشا ہے حفاظت و صیانت الٰہی اسی پر نظر رکھتے ہیں[1]

یہ عشق حق کا نمونہ ہے۔ یہ پرستاری صدق کا دستور العمل ہے۔ یہ ایمان کامل کا معیار ہے۔ جب حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے دو باتیں پیش کی گئیں۔ زندگی کی عیش اللہ کی نافرمانی کر کے۔ زندگی کی سختیاں اللہ کی فرماں برداری کر کے تو دونوں میں سے آپ نے جو راہ اختیار کی وہ دوسری تھی یعنی رب السجن احب الیّ الخ اے میرے آقا مجھے جیل کی سختیاں گوارا ہیں اور ان عورتوں کے نفسانی مشوروں پر عمل گوارا نہیں ہے اللہ اکبر کیا مقام ہے عصمت یوسف علیہ السلام کا بعض عرفا نے لکھا ہے کہ مصیبت کو معصیت پر ترجیح دینا صدیقین کا مقام ہے آیت بتا رہی ہے کہ کمال عبدیت یہ ہے۔ کمال تقوی پر بھی ناز اپنی ذات پر نہیں ہوتا۔ دعا بس اللہ سبحانہ سے ہی ہے کہ بس آپ ہی مجھے سنبھالے رہیئے جیسے اب تک سنبھالے رکھا ہے ورنہ میری کیا مجال ہے کہ ان ترغیبات کے ہجوم میں ثابت قدم رہ سکوں۔ حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز نے یہاں یہ خوب نکتہ آفرینی فرمائی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ دعا عصمت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

نبوت کی منافی نہیں ہے کیونکہ نبوت کی عصمت بھی اللہ کی حفاظت کا نتیجہ ہے۔ نبوت کی نظر اصل مؤثر کی طرف ہوتی ہے۔ اس لیے ان کو اپنی عصمت پر ناز نہیں ہوتا ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ فرماتے ہیں کہ یہ مقام کمال صدیقیت ہے جوان اور حسین امیر زادی اپنی طرف بلا رہی ہے اور خود بھی جوان اور حسین ہیں۔ اس پر بھی خشیہ خداوندی اس قدر غالب ہے کہ ان لذتوں کو چھوڑ کر جیل جانا پسند کرتے ہیں۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کا سب سے عظیم مظاہرہ ہے۔ انیس[19] بیس سال کا ایک خوبصورت نوجوان ہے جو بدویانہ زندگی سے بہترین تندرستی اور شاندار جوانی لے کر آیا ہے۔ غریبی، جلاوطنی اور اضطراری غلامی کی منزلوں سے گزر کر دنیا کی سب سے بڑی متمدن حکومت کے دارالخلافہ میں ایک بڑے رئیس کے ہاں آگیا۔ یہاں پہلے تو خود اس امیر کی بیگم اس کے عشق کا دم بھرنے لگتی ہے۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام کا چرچا ہوتا ہے اور پورے شہر کی امیر گھرانوں کی عورتیں ان پر فریفتہ ہو جاتی ہیں۔ اب ایک حضرت یوسف علیہ السلام ہیں اور دوسری طرف حسن وجمال کی رعنائیاں اور دلفریبیاں ہیں ہر طرح کی تدبیریں جذبات کو بھڑکانے اور نبوت کی عصمت کو تار تار کرنے کی ہو رہی ہیں۔ نبوت جدھر جاتی ہے یہی دیکھتی ہے کہ گناہ اپنی ساری خوشنمائیوں کے ساتھ دروازہ کھولے کھڑا ہے۔ یعنی گناہ اور بدکاری اس تاک میں ہے کہ نبوت کے ارادے میں برائی کی طرف میلان کب ہوتا ہے۔ اس حالت میں نبوت کی یہ عصمت جس کامیابی کے ساتھ ان شیطانی ترغیبات کا مقابلہ کرتی ہے۔ اس کا منفرد مقام ہے۔ مگر ضبط نفس کے اس حیرت انگیز کمال پر عرفان نفس اور طہارت فکر کا مزید کمال یہ ہے کہ اس پر بھی حضرت یوسف ؑ کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ یہ میرا کارنامہ ہے اسکی جگہ بشری کمزوریوں کا خیال کر کے کانپ اٹھتا ہے اور لرزتی ہوئی زبان میں وہ اللہ سبحانہ سے التجا کرتا ہے کہ اے میرے رب میں ایک کمزور انسان ہوں۔ مجھ میں اتنی طاقت کہاں کہ ان بے پناہ ترغیبات کا سامنا کر سکوں۔ تو ہی میری مدد کر۔ فی الواقع یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت کا اہم ترین اور نازک ترین مرحلہ تھا۔ عصمت کی وجہ سے دیانت، امانت، عفت، حق شناسی اور راست روی کی غیر معمولی صفات جو اب تک چھپی ہوئی تھیں وہ سب کی سب منصہ شہود پر آگئیں اور پورے زور سے کام کرنے لگیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی اس دعا کے بارے میں یہ سوچ کہ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی بدشگونی تھی کہ انہوں نے خود اللہ سبحانہ سے قید خانہ کی بات کہہ دی۔ اگر جلدی میں آکر وہ ایسا نہ کہتے تو جیل کی زندگی کا ابتلا پیش نہ آتا۔ افسوس کہ یہ مقام صدیقیت سے کیسی ناآشنائی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی جو بات ان کی پاکی وعظمت کا سب سے بڑا جوہر تھی وہ ہی ان کی نظر

میں لغزش ہوگئی گویا حضرت یوسف علیہ السلام کا معصیت کے مقابلے میں مصیبت کا استقبال اور اسے خوشی خوشی اختیار کرلینا کوئی ایسی بات تھی جو نہ ہونی چاہیئے تھی۔ اور صرف اس لیے ہوگئی کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جلدی کی۔

(۳۱) حضرت یوسفؑ کی دعا اور اس کی پذیرائی

اللہ سبحانہ، نے حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا قبول کی اور ان سے عورتوں کا فریب ہٹادیا بلاشبہ وہی دعاؤں کا قبول کرنے والا اور سب کچھ جاننے والا ہے یعنی ان کو عصمت و عفت پر پوری طرح ثابت قدم رکھا کسی کا فریب نہ چلنے دیا کیونکہ اللہ سبحانہ، سب کی دعائیں سُنتا، قبول کرتا اور خبر رکھتا ہے حضرت شاہ صاحبؒ لکھتے ہیں "ظاہر معلوم ہوتا ہے کہ اپنے مانگے سے قید میں پڑے لیکن اللہ تعالیٰ نے اتنا ہی قبول فرمایا کہ ان کا فریب دور کردیا باقی قید ہونا تھا قسمت میں۔ آدمی کو چاہیئے کہ گھبرا کر اپنے حق میں بُرائی نہ مانگے پوری بھلائی مانگے گو ہوگا وہی جو قسمت میں ہے"۔ ترمذی میں ہے کہ ایک شخص کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دعا مانگتے سنا۔ اللّٰھم انی اسألك الصبر۔ اے اللہ میں تجھ سے صبر مانگتا ہوں آپ نے فرمایا۔ سألت اللہ البلاء فاسألہ العافیۃ۔ تو نے اللہ سے بلاء مانگی۔ کیونکہ صبر تو بلاء پر ہوگا اب تو اس سے عافیت مانگ [1] جوبات شیخ الاسلامؒ نے لکھی ہے یہی بات کچھ شارحین قرآن نے بھی لکھی ہے۔ ان میں علامہ آلوسیؒ، قاضی بیضاویؒ، قاضی ثناء اللہؒ پانی پتی بھی ہیں۔ اور یہ بات اس لیے لکھی ہے کہ ان بزرگوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اللہ سبحانہ، سے جیل جانے کی دعا مانگی تھی ان کو یہ دعا نہ مانگنی چاہیئے تھی اگر وہ یہ دعا نہ مانگتے تو جیل نہ جاتے حضرت مولانا اشرف علی قدس اللہ سرہ العزیز نے ان بزرگوں کے اس خیال کو یہ کہہ کر رد کردیا

اور سجن میں جانا جزو استجابت نہیں جیسا مشہور ہے کہ قید کی دعا کی

اس لیے قید میں گئے۔ کیونکہ قید کی درخواست تو نہیں کی صرف فعل قبیح

کا سجن سے اقبح ہونا بیان کیا ہے۔

اور مولانا حفظ الرحمٰن صاحب فرماتے ہیں۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہمیں مولانا عثمانی اور حضرت شاہ صاحب کی جلالت قدر کے پیش نظر اگرچہ جرأت گویائی نہیں ہے۔ لیکن یوسف علیہ السلام جیسے عظیم المرتبت پیغمبر کی زندگی اس عدیم النظر کارنامہ کو ایک لطیفہ کی نذر ہوتے دیکھ کر رہا نہیں جاتا اور بے اختیار یہ کہنے کو جی چاہتا ہے کہ حضرت یوسف ؑ کا یہ جملہ السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ ۔ ان کے علو شان، تقرب الی اللہ، استقامت فی الدین، عزیمت فی الحق اور رضا و تسلیم کا وہ بے نظیر مظاہرہ ہے جو ان جیسے اولوالعزم پیغمبروں ہی کا حصہ ہے۔

غور فرمایئے عزیز کی بیوی اور گھر کی مالکہ نے خوشامد و چاپلوسی کی کون سی راہ نہیں اختیار کی جس سے حضرت یوسف علیہ السلام کو رام کیا جا سکے پھر اس میں ناکامی کے بعد دوسری عورتوں کی مدد حاصل کی اور انہوں نے اپنے ممکن داؤ اور گھات حضرت یوسف علیہ السلام پر استعمال کیئے پھر بھی ناکامی رہی۔ اب آخری درجہ یہ تھا کہ اس نے دھمکی دی کہ یا یوسف علیہ السلام اسے شاد کام کرے ورنہ قید خانہ میں ڈالا جائے گا۔ ایسی حالت میں ایک باخدا انسان، صاحب عزیمت و استقامت ہستی اور خوف خدا کو تمام کائنات کے غیظ و غضب پر غالب رکھنے والا انسان اس سے بہتر اور کیا جواب دے سکتا ہے کہ "خدایا میں اس عمل بد کے مقابلے میں زنداں کو ترجیح دیتا ہوں مجھے قید و بند سب کچھ منظور ہے مگر تیری نافرمانی منظور نہیں" کون کہہ سکتا ہے کہ یہ قید کی طلب ہے۔ زنداں کے شوق کا اظہار ہے، بلاؤ مصیبت کو دعوت ہے۔ ہرگز نہیں بلکہ یہاں تو لطیف پیرائے میں وہ کہا جا رہا ہے جو اعلان حق اور نڈرسی کا صحیح درجہ ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بھی گوارا نہیں کیا کہ عزیز کی بیوی کو مخاطب کرتے یا مہمان عورتوں کو اپنی گفتگو میں مخاطب بنا لیتے بلکہ آپ نے اللہ سبحانہٗ کو پکارا اور ان گمراہ و بدقماش عورتوں پر یہ ظاہر کر دیا کہ جس طرح ان کے تمام مکر و فریب، خوشامد اور چاپلوسی ناکام رہی۔ اسی طرح ان کی دھمکی، اور ان کی سزا بھی میرے پائے استقامت میں تزلزل پیدا نہیں کر سکتی۔ اس کا مطالبہ ہے کہ یوسف علیہ السلام مجھے یا شاد کام کرے ورنہ جیل جائے تو میں جیل کو اس کے ارادہ بد کے مقابلے میں لاکھ بار ترجیح دیتا ہوں۔ رب السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ۔

اب فرمایئے کہ اس اعلان حق اور اظہار استقامت کا اس دعا سے کیا تعلق جو ایک شخص خواہ مخواہ اپنے لیے صبر مانگ کر خود کو آزمائش میں پڑنے کی دعوت دے رہا تھا۔ وہاں نہ آزمائش تھی نہ امتحان بلکہ مفت میں بلاؤ مصیبت کا داعی بن رہا تھا اور یہاں امتحان سر پر ہے آزمائش

موجود ہے مصیبت کی دھمکی دی جارہی ہے ۔ بلا نازل کرنے کا خوف دلایا جارہا ہے کیا ایسے نازک موقعہ پر صرف یہ جواب کافی ہوتا کہ یوسف علیہ السلام گڑگڑا کر جناب باری میں امرأۃ العزیز سے چھٹکارا پانے کی دعا کرتے اور بس ۔ اگر ایسا ہوتا تو امتحان، آزمائش اور بلاؤ مصیبت کے وقت استقامت اعلان حق، بے خوفی اور تمام دنیوی رعونتوں کے مقابلے میں اعلاء کلمۃ اللہ کا سبق کون سکھاتا ۔ عزیمت کی زندگی کون دیتا، باطل سے بے خوفی کی تعلیم کیسے ملتی اور حق و باطل میں امتیاز کی شان کون پیدا کرتا ؎

سوچنے کی بات ہے ۔ کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام نے مصائب ومحن کی پہلی ہی منزل میں صبر، عزم، اعتماد نفس اور توکل علی اللہ کی روح عظیم اپنے اندر نہ پیدا کرلی ہوتی تو کیا ممکن تھا کہ اس منزل مقصود تک پہنچ سکتے جو بالآخر ان کی منزل مقصود ثابت ہو ۔ امرأۃ العزیز کا معاملہ حضرت یوسفؑ کو اس وقت پیش آتا ہے جبکہ دنیا کی مصیبتوں اور ناموافقتوں میں پہلے اپنی راہ نکال چکے، مصیبتوں کی آزمائش ذہن ودماغ کی آزمائش ہوتی ہے اور امرأۃ العزیز کا سارا معاملہ جذبات سے تعلق رکھتا تھا ۔ اور انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائش جذبات ہی کی آزمائش ہے ۔ وہ سمندر کی موجوں سے نہیں گھبراتا، پہاڑ کی چٹانوں سے ہراساں نہیں ہوتا، آسمان کی بجلیوں سے نہیں لرزتا درندوں کے مقابلے سے نہیں ڈرتا، تلواروں کے سائے میں کھیلنے لگتا ہے ۔ لیکن نفس کی ایک چھوٹی سی ترغیب اور جذبات کی ایک ادنیٰ سی کشش کا بھی مقابلہ نہیں کرسکتا ۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کی عصمت کی چادر یہاں بھی تارتار نہیں ہوئی ۔ ان کی بے داغ فضیلت پر نفس انسانی کا سب سے بڑا فتنہ بھی دھبہ نہ لگا سکا ۔

قرآن کی معجزانہ بلاغت نے چند لفظوں کے اندر پوری صورت حال کی تصویر کھینچ دی ہے ذرا چشم تصور سے کام لو اور دیکھو ترغیبات کی قہرو سلطانی کا کیا حال تھا اور عیش نفس کی یہ دعوت کیسے شکیب آزما ساماناوں اور صبر ربا حالتوں کے ساتھ پیش آئی تھی ۔

امرأۃ العزیز کی جانب سے چیلنج دیا جارہا ہے ۔ لئن لم یفعل ما آمرہ لیسجنن اگر میرا کہا نہ مانوگے تو جیل کی ہوا کھانی پڑے گی اور ذلت وخواری سے دوچار ہونا پڑے گا ۔ اس چیلنج پر جو کچھ ان کی زبان سے نکلا وہ کیا تھا ۔ رب السجن احب الیّ مما یدعوننی الیہ ۔

؎ قصص القرآن

خداوندا زندگی کا عیش مگر تیری معصیت میں، زندگی کی سختیاں مگر تیری فرماں برداری میں ان کا فیصلہ قطعی اور بغیر کسی تامل کے یہ تھا ۔ کہ قید خانہ مجھے محبوب جہاں تیری رضا ہے معصیت مجھے منظور نہیں جہاں تیری ناراضگی ہے ۔ جب مصیبت اور معصیت کا ابتلاء ہوتا ہے تو نبوت مصیبت کو ترجیح دیتی ہے اور یہ اور صرف یہ کہتی ہے ۔ لك العتبیٰ حتی ترضیٰ ۔ مجھے تو تجھے اور صرف تجھے منانا ہے تا آنکہ تیری جانب سے مجھے رضا کا پروانہ مل جائے یہ حضرت یوسف علیہ السلام کے عشق الٰہی کا نمونہ ہے ۔ یہ پرستاری حق کا دستور العمل ہے ۔ یہ عصمت کاملہ کا معیار ہے ۔ یہاں حافظ ابن تیمیہؒ کی یہ بات بڑی بصیرت والی ہے ۔

اس دعا میں دو عبرتیں ہیں پہلی عبرت یہ ہے کہ معصیت اور مصیبت کا جب مقابلہ ہو جائے تو مصیبت کو اپنانا چاہیئے ۔

دوسری عبرت یہ ہے کہ اللہ سے دعا مانگنی چاہیئے کہ شدائد میں دل کو دین پر جمائے رکھے اور دل کا میلان طاعت خداوندی پر رہے ۔

اس دعا میں اللہ پر توکل و اعتماد بھی ہے اور اللہ سبحانہٗ سے ایمان و طاعت پر ثبات اور جہاد کی دعا بھی ہے اور آزمائش و امتحان میں ثابت قدمی کی جو درخواست ہے ۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ دعا ایسی ہے جیسے موسیٰ علیہ السلام نے فرعونیوں کے شدائد کے ہجوم میں بنی اسرائیل سے کہا تھا ۔ (استعینوا باللہ واصبروا)

لہٰذا اموں کی بابجائی کیلئے جیسے تقویٰ ضروری ہے ایسے ہی مقدور پر صبر بھی ناگزیر ہے ۔ یہی کردار حضرت یوسف علیہ السلام کا ہے ۔ بدکاری سے بچنے کے لیے قید و بند کی سختیاں برداشت کیں ۔ اور دامن پر آنچ نہ آنے دی عورتوں کے بہلانے اور قید کی تکلیف پر صبر کیا عفت و عصمت پر جماؤ کے لیے اللہ سے دعا مانگی اور ان کی فریب کاریوں کو دور کرنے کے لیے اللہ پر توکل کیا ۔ بہر حال طاعت خداوندی میں تکلیفوں کو برداشت کرنا اور اس عزت کی پرواہ نہ کرنا جو اللہ کی نافرمانی کے نتیجے میں ملتی ہے یہ صرف حضرت یوسف علیہ السلام کا کردار نہیں بلکہ تمام انبیاء کا اسوۂ حسنہ ہے ۔ حضرت یوسفؑ کو جو کچھ ملا ہے اسی کے نتیجے میں ملا ہے زمانہ کی گردشیں کس طرح آزمائشوں پر آزمائشیں پیدا کرتی رہیں اور حضرت یوسف علیہ السلام کی غیر متزلزل اور بے داغ عصمت کس طرح فتحمندیوں پر فتح مندیاں حاصل کرتی گئی ۔

علامہ ابو السعودؒ نے اسی دعا کے سلسلے میں اپنی تفسیر میں جو بات لکھی ہے وہ بھی اس لائق ہے کہ اسے پڑھا جائے

انبیاؤ رسل کی سنت کے مطابق یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب سے جناب الٰہی میں درخواست ہے کہ بھلائیوں تک رسائی اور برائیوں سے بچاؤ کا مدار صرف اللہ سبحانہٗ کی ذات گرامی ہے۔ اللہ کے الطاف کریمانہ کے ذریعے عورتوں کی فریب کاریوں سے حفاظت ہوسکتی ہے بندے میں مدافعت کی کوئی طاقت نہیں ہے یہ ایسا ہی ہے جیسے بیقرار کہتا ہے۔ بچا لو ورنہ مرجاؤں گا۔ یہ مطلب نہیں ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام میں خود تو عورتوں کی طرف میلان ہے اور جناب الٰہی میں جبری عصمت وعفت کی درخواست کر رہے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی زبان پر یہ دعا اس وقت آئی ہے جب وہ اپنی پوری طاقت اپنے ایمان واخلاق کی حفاظت کے لیے نچوڑ چکے ہیں۔ یہاں تک کہ وہ ان بیگمات کی پیدا کی ہوئی پرفتن زندگی کے مقابلہ میں جیل کی پرمحن زندگی کو قبول کرنے پر راضی ہیں۔ جب بندہ اس حد تک اپنی استقامت دکھلانے کے بعد اپنے آپ کو اپنے رب کے سامنے ڈال دیتا ہے اور اس سے مدد مانگتا ہے تو اس کی دعا ضرور قبول ہوتی ہے اور فوراً قبول ہوتی ہے چنانچہ حضرت یوسف علیہ السلام کی دعا قبول ہوئی۔

(۴۲) حضرت یوسفؑ کی آزمائش کا نیا دور

پھر ایسا ہوا کہ اگرچہ وہ لوگ یعنی عزیز اور اس کے خاندان کے لوگ باوجود یہ کہ نشانیاں دیکھ چکے تھے پھر بھی ان کو یہ بات سمجھ میں آئی کہ ایک خاص وقت تک یوسف علیہ السلام کو قید میں رکھا جائے یعنی باوجود یہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی برأت ونزاہت کے بہت سے نشان دیکھ چکے تھے۔ پھر بھی ان کی مصلحت یہ ہوئی کہ یوسف علیہ السلام کو ایک مدت تک قید میں رکھا جائے۔ تاکہ عام لوگ سمجھیں کہ قصور یوسف ہی کا تھا۔ عورت بے چاری مفت میں بدنام ہوئی۔ گویا عورت نے قید کی جو دھمکی دی تھی اسے پورا کرا کے چھوڑا۔ ان لوگوں کی غرض تو یہ ہوگی کہ عورت سے یہ بدنامی زائل ہو نیز ایک مدت تک یوسف علیہ السلام اس کی نظر سے دور رہیں۔ اور عورت کا مطلب یہ ہوگا کہ شاید قید کی سختیاں اٹھا کر یوسف علیہ السلام کچھ نرم پڑجائیں اس طرح اپنا مطلب نکال سکوں [1]

ایک عبرانی غلام کے ہاتھوں ایک مصری امیر کی بیوی کی کتنی بدنامی ہوچکی تھی اسی کی خاطر انتظاماً یہ ضروری ہوا کہ ایک مدت تک کے لیے خود اس غلام کو عام نگاہوں سے دور رکھیں بد الخ۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

یعنی خود عزیز اور اس کے مشیروں کو محسوس ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کا اس وقت جیل جانا حالات کی سازگاری کے لیے ضروری ہے باوجود یہ کہ انہیں یوسف علیہ السلام کی پاکدامنی اور بے قصوری کی شہادتیں مل چکی تھیں اور خود بھی اس پر یقین کر چکے تھے۔ جیل خانہ کوئی عام نہ تھا بلکہ خاص قسم کا تھا۔ سخت اور خاص مجرموں کے لیے تھا توریت میں ہے۔

اور یوسف کے آقا نے اسے پکڑا اور ایک جگہ جہاں بادشاہ کے قیدی بند تھے قید میں ڈالا۔

بہرحال یوسف علیہ السلام کو جیل خانے بھیج دیا گیا اور اب حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی ایک قیدی کی زندگی میں تبدیل ہوگئی لیکن یہ قید کسی جرم کی پاداش میں نہیں بلکہ راست بازی اور حق پرستی کی آزمائش نے اچانک یہ صورت اختیار کرلی۔ دنیا میں انسانوں کو سزائیں اس لیے ملتی ہیں کہ جرم و معصیت سے اپنے کو روک نہیں سکتے لیکن عزیز مصر اور اس کے ساتھیوں نے اب حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے قید کی سزا اس لیے پیش کی ہے کہ جرم و معصیت کوئی نہیں ہے۔ سزا شواہد کے باوجود گناہ کی نہیں بے گناہی کی دی جارہی ہے اس لیے یہ سزا دراصل حضرت یوسف علیہ السلام کی اخلاقی فتح ہے اور مصری حکومت کی بہت بڑی اخلاقی شکست ہے اب حضرت یوسف علیہ السلام کوئی غیر معروف اور گمنام آدمی نہ رہے تھے سارے ملک میں اور مصر کے دارالخلافہ میں خاص و عام سب ہی ان سے واقف ہوچکے تھے جس ذات گرامی کی باعصمت اور پاکیزہ شخصیت پر ایک دو نہیں اکثر و بیشتر بڑے گھرانوں کی رئیس زادیاں فریفتہ ہوں اور جس کے فتنہ روزگار حسن سے اپنے گھر بگڑتے دیکھ کر مصر کے حکام نے ان کو قید کیا ہو۔ ظاہر ہے کہ ایسا شخص چھپا نہیں رہ سکتا بلا ریب ان کی شہرت ہوگئی ہوگی۔ عام طور پر لوگ اس بات سے بھی واقف ہوگئے ہوں گے کہ یہ شخص کیسے بلند، مضبوط اور پاکیزہ اخلاق کا انسان ہے اور یہ بھی جان گئے ہوں گے کہ اس شخص کو جیل کسی جرم کی پاداش میں نہیں بھیجا گیا بلکہ محض اپنی ناک بچانے کے لیے ان کو مصلحت اسی میں نظر آئی کہ کچھ عرصہ کے لیے حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل بھجوادیں۔ انہوں نے خیال کیا ہوگا کہ اس طرح کچھ مدت کے بعد زلیخا کے دماغ سے یوسف علیہ السلام کا خبط بھی نکل جائے گا اور جو لوگ اس قصہ میں دلچسپی لے رہے ہیں ان کی توجہ بھی ہٹ جائے گی۔

وَدَخَلَ مَعَهُ السِّجْنَ فَتَيٰنِ ؕ قَالَ اَحَدُهُمَآ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَعْصِرُ خَمْرًا ۚ وَقَالَ الْاٰخَرُ اِنِّيْٓ اَرٰىنِيْٓ اَحْمِلُ فَوْقَ رَاْسِيْ خُبْزًا تَاْكُلُ الطَّيْرُ مِنْهُ ؕ نَبِّئْنَا بِتَاْوِيْلِهٖ ۚ اِنَّا نَرٰىكَ مِنَ الْمُحْسِنِيْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ لَا يَاْتِيْكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقٰنِهٖٓ اِلَّا نَبَّاْتُكُمَا بِتَاْوِيْلِهٖ قَبْلَ اَنْ يَّاْتِيَكُمَا ؕ ذٰلِكُمَا مِمَّا عَلَّمَنِيْ رَبِّيْ ؕ اِنِّيْ تَرَكْتُ مِلَّةَ قَوْمٍ لَّا يُؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَهُمْ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ كٰفِرُوْنَ ﴿۳۷﴾

اور یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں دو نوجوان بھی داخل ہوئے۔ ان دونوں میں سے ایک نے کہا کہ میں خواب میں اپنے آپ کو شراب کے لیے انگور کا عرق نچوڑتا دیکھ رہا ہوں، دوسرے نے کہا مجھے ایسا دکھائی دے رہا ہے کہ سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اسے کھا رہے ہیں۔ آپ ہمیں اس کی تعبیر بتائیے۔ بلاشبہ ہماری رائے میں آپ بڑے نیکوکاروں میں سے ہیں [۳۶] حضرت یوسف ؑ نے فرمایا گھبراؤ نہیں پہلے اس کے کہ تمہارا مقررہ کھانا تم کو ملے گا میں تمہیں

خواب کی تعبیر ضرور بتادوں گا ۔ اس بات کا علم بھی منجملہ ان باتوں کے ہے جس کی مجھے میرے پروردگار نے تعلیم فرمائی ہے ۔ مَیں نے ان لوگوں کی ملّت چھوڑ دی ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت والی زندگی کے منکر ہیں ۳۷

ہر نبی کی زندگی ایک دلیل اور برھان حق ہے

قرآن عزیز کا کھلا کھلا دعویٰ یہ ہے کہ ہر نبی کی زندگی جس طرح شروع ہوئی اور جس طرح ختم ہوئی ۔ اور جو کچھ اس پر گزرا اور قولاً و فعلاً جو کچھ اس سے تعلق رکھتا ہے ۔ ان میں سے ہر بات بجائے خود ایک دلیل اور اللہ سبحانہٗ کی برھان ہے اس سے بڑھ کر اس حقیقت کے اثبات کیلئے اور کوئی دلیل قطعی اور یقینی نہیں ہو سکتی ۔ کہ اللہ سبحانہٗ ہے اور ساری اچھی اور حسین صفتوں سے متصف ہے اور اس نے جس طرح عالم ہستی کو بنایا اسی طرح اس کے لیے قوانین و آئین عمل و نتائج بھی بنائے اور وہ ہر حال میں اٹل ہیں ۔ دنیا میں انسان زیادہ سے زیادہ اور قطعی سے قطعی یقین جن چیزوں پر رکھتا ہے اور جن وسائل سے ان کے یقینی ہونے کو جانتا ہے ۔ قرآن کی یہ دلیل ان سب سے زیادہ روشن اور قطعی ہے ۔ اگر یقین کے لیے یہ دلیل کافی نہیں ہے تو پھر اس دنیا میں یقین کا وجود ہی نہیں ہے حتیٰ کہ دوپہر کے وقت چمکتے ہوئے سورج کا بھی نہیں اور جسم کے ایک ایک مسام سے چھوتی اور لگ کر چلنے والی ہوا کا بھی نہیں ۔ اگر تم کہتے ہو کہ دنیا میں صرف ان باتوں کو ہی ماننا چاہیئے جو یقینی ہوں اور ثابت شدہ یعنی تم اعتقاد کے لیے صرف امکان کو کافی نہیں سمجھتے "اثبات" کے طلبگار ہو تو جب بھی دنیا میں الکلم الطیب اور العمل الصالح سے بڑھ کر اور کون سی ثابت اور واقع حقیقت ہو سکتی ہے ۔ خود تمہارا وجود اور اثبات "انا" بھی اس سے زیادہ ثابت و مشہود نہیں ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن عزیز نے جا بجا دعوت الی الوحی کو القول الثابت ، الدین القیم اور الواقع اور الثابت وغیرھا سے تعبیر کیا ہے کہ لوگ دوسری طرف چلے گئے ۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام خود اپنی ذات کے اندر ایک حجت قائمہ اور آیت کاملہ ہیں

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی پوری زندگی صرف ایک لفظ میں بتلائی جا سکتی ہے۔ برہان، محکم، دلیل ثابت نبی ہونے کی حیثیت میں حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی ہے۔ قرآن اسی لیے آپ کی زندگی کے سارے گوشوں کو پیش کرتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام کی ساری زندگی کے مختلف مناظر سینکڑوں دلیلوں اور ہزاروں شہادتوں کا مجموعہ ہے۔ ان کی زندگی کے تمام وقائع بجائے خود ایک مستقل دلیل اور برہان حق ہیں۔ اسی لیے قرآن عزیز ان کو استشہاداً اور استدلالاً ذکر کرتا ہے۔ اور ان کو آیات سے تعبیر کرتا ہے اور اس طرح گویا زندگی کا ہر منظر دنیا کے سامنے صدہا دلیلیں اور روشنیاں چمکا دیتا ہے علی الخصوص یہی وجہ ہے کہ قرآن حکیم نے جا بجا حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کے مناظر میں یہ بات دہرائی۔ کہیں فرمایا۔ ویعلمک من تاویل الاحادیث کہیں ارشاد ہوا ولنعلمہ من تاویل الاحادیث اور کہیں حضرت یوسف علیہ السلام کی زبانی بتایا۔ ذالکما مما علمنی ربی۔ اور کسی جگہ اسی کو دعائی پیمانہ بنا کر پیش کیا۔

رب قد اتیتنی من الملک وعلمتنی من تاویل الاحادیث

اور اس کو بطور ایک مستقل دلیل وشاہد کے پیش کیا ہے اور نہایت کثرت کے ساتھ ان کی سیرت و سوانح، وقائع و ایام پر مختلف پیرایوں اور مختلف لواحق وسوابق کے ساتھ بار بار توجہ دلائی ہے۔

۳۶ اور یوسف علیہ السلام کے ساتھ جیل میں دو نوجوان بھی داخل ہوئے ان دونوں میں سے ایک نے کہا میں خواب میں اپنے آپ کو شراب کے لیے انگور کا عرق نچوڑتا دیکھ رہا ہوں دوسرے نے کہا کہ مجھے ایسا دکھائی دے رہا ہے کہ سر پر روٹی اٹھائے ہوئے ہوں اور پرندے اسے کھا رہے ہیں۔ آپ ہمیں اس کی تعبیر بتایئے۔ بلاشبہ ہماری رائے میں آپ بڑے نیکوکاروں میں سے ہیں یعنی اسی زمانے میں دو نوجوان قیدی جیل خانے میں لائے گئے جن میں سے ایک بادشاہ مصر کا نانبائی اور دوسرا ساقی شراب پلانے والا تھا۔ دونوں بادشاہ کو زہر دینے کے الزام میں ماخوذ تھے۔ قید خانہ میں یوسف علیہ السلام کی مروّت و امانت، راست گوئی، حُسنِ اخلاق، کثرت عبادت، معرفت تعبیر اور ہمدردیٔ اخلاق کا چرچا تھا۔ یہ دونوں قیدی حضرت یوسف علیہ السلام سے بہت مانوس ہو گئے۔ اور بڑی محبت کا اظہار کرنے لگے۔ ایک روز دونوں نے اپنا اپنا خواب بیان کیا۔ ساقی نے کہا کہ میں خواب میں دیکھتا ہوں کہ بادشاہ کو شراب پلا رہا ہوں نانبائی نے کہا کہ میرے سر پر کئی ٹوکرے ہیں جس میں سے پرندے نوچ نوچ کر کھا رہے ہیں۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو بزرگ

دیکھ کر تعبیر مانگی لہ

تورات میں ہے کہ جب یوسف علیہ السلام کو قید خانہ میں ڈالا گیا تو قید خانہ کا داروغہ ان پر مہربان ہوگیا اور تمام قیدیوں کا انتظام ان کے سپرد کر دیا وہ قید خانہ کا بالکل مختار ہوگیا تھا اور خداوند نے وہاں بھی اسے تمام کاموں میں اقبال مند کیا۔ (پیدائش)

قرآن کی اس آیت میں اس کے اشارات موجود ہیں۔ اوّل تو دو قیدیوں کا خواب کی تعبیر پوچھنا ہی اس کی دلیل ہے کہ انہیں غیر معمولی علم و فضیلت کا آدمی سمجھا جاتا تھا۔ پھر ان دونوں کا یہ کہنا انا نراك من المحسنين۔ صاف طور پر واضح کر دیتا ہے کہ قید خانہ میں ان کا تقدّس عام طور پر تسلیم کیا جاتا تھا۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ جیل کی زندگی میں حضرت یوسف علیہ السلام کس نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ سوچنے کی بات ہے کہ آخر ان دو قیدیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام ہی سے آکر اپنے خواب کی تعبیر کیوں پوچھی؟ اور ان کی خدمت میں یہ نذرانہ عقیدت کیوں پیش کیا۔ انا نراك من المحسنين۔ جیل کے اندر اور باہر سب لوگ جانتے تھے کہ یہ شخص کوئی مُجرم نہیں ہے بلکہ ایک نہایت نیک نفس انسان ہے سخت ترین آزمائشوں میں اپنی پرہیزگاری کا ثبوت دے چکا ہے۔ آج پُورے ملک میں اس سے زیادہ نیک انسان کوئی نہیں ہے۔ حتیٰ کہ ملک کے مذہبی پیشواؤں میں اس کی نظیر مفقود ہے یہی وجہ تھی کہ نہ صرف قیدی ان کو عقیدت کی نگاہ سے دیکھتے تھے بلکہ قید خانہ کے حکام اور اہل کار تک ان کے معتقد ہو گئے تھے۔ متقی کہیں بھی ہو۔ کسی فضا و ماحول میں ہو آثار تقویٰ ظاہر ہو کر رہتے ہیں۔ چند ہی روز میں ان قیدیوں نے حضرت یوسف علیہ السلام میں بزرگی کے آثار پا لیے تھے۔ اور ان کے سامنے اپنے خواب عرض کیے پہلا خواب شاہی ساقی کا ہے۔ تورات میں ہے۔

> وہ بولے ہم نے ایک خواب دیکھا ہے جس کی تعبیر کرنے والا کوئی نہیں یوسف نے ان سے کہا۔ کیا تعبیر کی قدرت خدا کو نہیں ہے مجھ سے بیان کیجئے۔ تب سردار ساقی نے اپنے خواب یوسف سے بیان کیا اور اس نے کہا کہ دیکھ میرے خواب میں ایک تاک میرے سامنے تھی۔ اس تاک میں تین ڈالیاں تھیں ان

لہ افادات شیخ الاسلام

میں کلیاں نکلیں۔ ان میں پھول آئے اور اس کے سب گچھوں میں انگور پکے
اور فرعون کا پیالہ میرے ہاتھ میں تھا سو میں نے ان انگوروں کو لیکر فرعون
کے جام میں نچوڑا اور وہ جام میں نے فرعون کے ہاتھ میں دیا۔

عربی زبان میں یہ اسلوب موجود ہے کہ بعض اوقات کسی چیز کو اس کی غایت سے تعبیر کرتے ہیں۔ انگور نچوڑنے کا مقصد اگر اس سے شراب بنانا ہے تو اس کو یوں کہہ سکتے ہیں کہ میں شراب نچوڑ رہا ہوں۔ اگر ترجمہ یوں کیا جائے کہ میں شراب بنانے کی خاطر انگور نچوڑ رہا ہوں تو پھر اس میں کوئی مجاز نہیں ہے۔ دوسرا خواب شاہی طباخ کا ہے تورات میں اسکی زبان سے ہے

میں بھی خواب میں تھا اور دیکھا کہ سر پر تین ٹوکریاں روٹی کی تھیں اوپر کی
ٹوکری میں فرعون کے لیے سب قسم کا پکا ہوا سال تھا اور پرندے میرے سر پر
اس ٹوکری میں سے کھاتے تھے۔ پیدائش ۴۰۔۱۶۔۱۷

حسن وجمال کی طرح فضل وکمال بھی چھپنے والی چیز نہیں اور اس کا اثر کا فرتک محسوس کر لیتے ہیں۔ توریت میں ہے۔

وہ وہاں قید خانہ میں رہتے تھے لیکن خداوند یوسف کے ساتھ تھا۔

حضرت قتادہؓ کہتے ہیں کہ آپ بیماروں کا علاج کرتے تھے۔ غمگینوں کو تسلی دیتے اور عبادت میں منہمک رہتے۔ اس فقرے میں حضرت یوسف علیہ السلام کی پوری زندگی جھلک رہی ہے۔ سورۃ میں حضرت یوسف علیہ السلام کے لیے اس کا تکرار ہے۔ کہیں اللہ سبحانہٗ کا اعلان ہے۔ کذالك نجزی المحسنین۔ کہیں قیدی جیل میں کہہ رہے ہیں انا نراك من المحسنین۔ کہیں اقتدار ملنے پر کہا جا رہا ہے۔ لا نضیع اجر المحسنین۔ اور تخت اقتدار پر متمکن ہونے کے بعد بھائی کہہ رہے ہیں۔ انا نراك من المحسنین۔ بتانا یہ چاہتا ہوں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی حسن کاری ان کی زندگی کے سارے گوشوں پر چھائی ہوئی ہے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہی سیرت ہے جو قید خانے کی تنگ وتاریک کوٹھری کو بھی اسی طرح روشن کرتی ہے جس طرح عزیز مصر کے ایوان عزت واقبال کو روشن کر دیا۔ کیونکہ چراغ جہاں کہیں بھی رکھ دیا جائے روشنی ہی دے گا اور ہیرے کی چمک اس سے کم نہ ہو جائے گی کہ جواہر خانہ شاہی میں رہنے کی جگہ جیل میں ڈال دیا جائے۔ تورات کی تصریح پڑھ چکے کہ جیل کا داروغہ ان کا معتقد ہو گیا تھا۔ اور قید خانہ میں ان کی حسن کاری کی قیادت قائم ہو گئی تھی۔

بہر حال مصائب میں اور معاصی میں ہر جگہ حضرت یوسف علیہ السلام نے حُسن کاری کا نمونہ قائم کیا۔ السید انور شاہ کشمیری قدس اللہ سرہ العزیز احسان کے معنے حسن پیدا کردن کرتے تھے۔ آپ کا یہ بھی دعویٰ تھا کہ قرآن پاک میں المحسنین کا لفظ جہاں بھی آیا ہے اس کے معنی یہی ہیں کہ جو اپنے ایمان وعمل میں حسن کار واقع ہوئے ہیں یعنی ایمان وعمل کے ادنیٰ درجہ پر قانع نہ ہوں بلکہ ان امور کے حسن کا جو درجہ ہے اس کے حصول میں کوشاں ہوں۔ گویا محسنین وہ طبقہ ہے جو زندگی کے تمام مطلوبہ شعبوں میں حسن کار ہو۔ ظاہر ہے کہ یوں سر کا بوجھ اُتارنے کے لیے جو کام کیے جاتے ہیں۔ اس میں نہ زیادہ مشقت ہوتی ہے نہ زیادہ وقت لگتا ہے نہ زیادہ محنت صرف ہوتی ہے لیکن اگر یہ ارادہ کر لیا جائے کہ جو کام بھی کیا جائے پورے حُسن و سلیقے کے ساتھ کیا جائے اس کے لیے سب ہی کچھ کرنا پڑتا ہے پھر ان حُسن کاروں اور محسنوں کو جمال مطلق کی محبوبیت کا مقام اگر حاصل ہو جس کا قرآن میں بار بار اعلان کیا گیا ہے تو اپنی محنت ومشقت اور جانفشانی کی بنیاد پر یقیناً وہ اس کے مستحق ہیں۔ میں تسلیم کرتا ہوں کہ قرآن کے محسنین سے مراد ان ہی لوگوں کا گروہ ہے جن کی زندگی خالق ومخلوق کے باہمی معاملات کی تصحیح میں حسن کارانہ مجاہدوں کے ساتھ بسر ہوتی ہے اور احسان کی تشریح جو خود زبانِ نبوت نے پیش کی ہے۔

الاحسان ان تعبد اللّٰہ کانک تراہ فان لم تکن تراہ فانہ یراک
اللہ سے عابدانہ تعلقات اس طرح قائم کرو گویا تم اسے دیکھ رہے ہو پس اگر
تم اس کو دیکھ نہ پاؤ تو اتنی بات تو یقینی ہے کہ وہ تمہیں دیکھ رہا ہے۔

اس سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے۔ اس کا مطلب یہی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا کوئی شعبہ حُسن کاری سے خالی نہ تھا۔ بچپن کے خواب سے شروع ہو کر بھائیوں کے ظلم و ستم، کنویں کی تنہائی، قافلہ والوں کی غلامی، غلام کی حیثیت سے بازار میں ان کی فروختگی، امرأۃ العزیز کی دعوت عیش مصر کے معزز گھرانوں کی عورتوں کی فریفتگی اور ان کی فریبکاری، قیدی کی حیثیت سے جیل کی زندگی، وزیر مال کی حیثیت سے اقتدار میں شرکت اور خود مختار مصر کے فرماں روا ہونے کی حیثیت سے ان کا اقتدار۔ ان میں سرتا سر حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی حُسن کاری ہی حُسن کاری ہے اور اب یگانوں اور بیگانوں کی نظر میں مُحسن ہیں۔

(۴۴) خواب کی تعبیر اور دین کی دعوت

حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا گھبراؤ نہیں پہلے اس کے کہ تمہیں مقررہ کھانا ملے گا میں تمہیں خواب کی تعبیر بتا دوں گا۔ اس کا علم بھی منجملہ ان باتوں کے ہے جس کی میرے پروردگار نے تعلیم فرمائی ہے میں نے ان لوگوں کی ملت چھوڑ دی ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت والی زندگی کے منکر ہیں۔ یوسف علیہ السلام نے ان کو تسلی دی کہ بے شک خوابوں کی تعبیر تمہیں بہت جلد معلوم ہوا چاہتی ہے روز مرہ جو کھانا تم کو ملتا ہے اس کے آنے سے پیشتر میں تعبیر بتلا کر فارغ ہو جاؤں گا لیکن تعبیر خواب سے زیادہ ضروری اور مفید ایک چیز پہلے تم کو سناتا ہوں وہ یہ کہ تعبیر وغیرہ کا یہ علم مجھ کو کہاں سے حاصل ہوا۔ یاد رکھو کہ میں کوئی پیشہ ور کاہن یا منجم نہیں ہوں بلکہ میرے علم کا سر چشمہ وحی اور الہام ربانی ہے جو مجھ کو حق تعالیٰ نے اس کی بدولت عطا فرمایا کہ میں نے ہمیشہ سے کافروں اور باطل پرستوں کے دین و ملت کو چھوڑ دیا اور اپنے مقدس آباؤ اجداد حضرت ابراہیمؑ، حضرت اسحٰقؑ اور حضرت یعقوب علیہم السلام جیسے انبیا و مرسلین کے دین توحید پر چلا اور ان کا اسوۂ حسنہ اختیار کیا ہمارا سب سے بڑا اور مقدم مطمع نظر یہی رہا کہ دنیا کی کسی چیز کو کسی درجہ میں بھی خدا کا شریک نہ بنائیں نہ ذات میں نہ صفات میں نہ افعال میں نہ ربوبیت میں نہ معبودیت میں۔ صرف اسی کے آگے جھکیں، اسی سے محبت کریں۔ اسی پر بھروسہ کریں اور اپنا جینا مرنا سب اُسی ایک پروردگار کے حوالہ کر دیں بہرحال یوسف علیہ السلام نے موقع مناسب دیکھ کر نہایت مؤثر طرز پہ ان قیدیوں کو ایمان و توحید کی دعوت دی پیغمبروں کا کام یہی ہوتا ہے کہ دعوت و تبلیغ حق کا کوئی مناسب موقع ہاتھ سے نہ جانے دیں۔ یوسفؑ نے دیکھا کہ ان قیدیوں کے دل میری طرف متوجہ اور مجھ سے مانوس ہیں۔ قید کی مصیبت میں گرفتار ہو کر شاید کچھ نرم بھی ہوئے ہوں گے۔ لاؤ ان حالات میں فرض تبلیغ ادا کرنے میں فائدہ اٹھائیں لوں انکو دین کی باتیں سکھلائیں پھر تعبیر بھی بتلا دینگے۔ یہ تسلی پہلے کر دی کہ کھانے کے وقت تعبیر معلوم ہو جائیگی تاکہ وہ نصیحت سے اکتائیں نہیں[1] اس آیت میں حضرت یوسفؑ کی سیرت کا کیسا عجیب منظر سامنے آتا ہے قید خانہ کی زندگی میں دعوت حق کا داعیہ ان کے قلب مبارک میں اٹھتا ہے۔ اس وقت انہوں

[1] افادات شیخ الاسلام

نے نبی ہونے کی حیثیت میں دعوت کا کام شروع نہیں کیا تھا لیکن اب وقت آگیا تھا کہ دعوت کا کام شروع ہو اسی کا نتیجہ ہے کہ یکایک ان کا قلب ولولہ تبلیغ سے معمور ہو گیا۔ لیکن آپ تو قید کی زندگی بسر کر رہے تھے یہاں اس تبلیغ کا مخاطب کون تھا۔ صرف قید خانہ کے چند ساتھی تھے۔ جو طرح طرح کے جرموں کی پاداش میں یہاں آئے ہوئے تھے۔ ان کو بھی رہائی کا انتظار تھا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے قید خانہ میں بھی قیدیوں کے اندر تبلیغ شروع کر دی۔ اب مصر کا قید خانہ دعوت حق کی تعلیم و تربیت کی ایک درسگاہ بن گیا۔

قید خانے میں دو نئے قیدی آتے ہیں جو بادشاہ کے خاص پیش خدمتوں میں سے ہیں اور اپنا اپنا خواب بیان کرتے ہیں۔ خواب سن کر حضرت یوسفؑ معلوم کر لیتے ہیں کہ ایک کی رہائی قریب ہے اور دوسرے کی موت قریب ہے۔ چاہتے ہیں کہ فرصت کا ایک لمحہ بھی ضائع نہ ہو اور تعلیم حق سے ان کو آشنا کر دیں۔ ممکن ہے کہ جو رہا ہونے والا ہے وہ حق کا بیج اپنے ساتھ لے جائے اور دربار شاہی میں تخم ریزی کر سکے۔ جس کی موت قریب ہے ممکن ہے سچائی قبول کر لے اور دنیا سے جائے تو راہ حق پر جائے حضرت یوسف علیہ السلام نے خواب سنتے ہی تعبیر نہیں بتائی بلکہ انکی توجہ و رجوع سے فائدہ اٹھا کر ایک دعوت کا وعظ شروع کر دیا۔ انی ترکت ملۃ قوم لا یؤمنون باللہ وھم بالآخرۃ ھم کافرون۔ نبوت کی دعوت کے تین اہم اور بنیادی اصول ہیں۔ ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخرہ اور ایمان بالرسالت۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے دعوت میں علمنی ربی کہہ کر سب سے پہلے دعوت، رسالت پھر ایمان باللہ اور پھر ایمان بالیوم الآخر۔

رسالت کا چہرہ آپ نے سب سے پہلے ان دونوں قیدیوں کے سامنے اس طرح پیش کیا کہ تعبیر بتانے سے پہلے آپ نے اپنا مقام ظاہر کیا۔ اور بتایا کہ میرے علم کا ماخذ علم الٰہی ہے جس کی بنا پر میں تعبیر بتاؤں گا۔ اپنی رسالت کی بات حضرت یوسف علیہ السلام نے جس بلیغ انداز میں پیش کی ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ فی الواقع جس شخص کے دل میں تبلیغ حق کی دھن ہو اور ساتھ ہی علیم ہونے کے ساتھ حکیم بھی ہو تو کیسی خوبصورتی کے ساتھ وہ دعوت کو پیش کرتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ کھانا تقسیم ہونے سے پہلے پہلے میں تم کو ان خوابوں کی تعبیر بتا دوں گا۔ کھانے کا حوالہ دے کر خواب کی تعبیر کو کچھ وقت کے لیے ٹال دیا۔ اسی حوالہ سے حضرت یوسفؑ نے دین حق کی تبلیغ کے لیے ایک نہایت اچھا موقع پیدا کر لیا انہوں نے جب دو دلوں کو اپنی طرف مائل دیکھا تو چاہا کہ ان کو اللہ کی بندگی کی دعوت پہنچا دیں اگر وہ قبول کریں تو ان کی دنیا و آخرت

دونوں سنور جائیں۔ چنانچہ انہوں نے پہلی یہ بات فرمائی۔ علمنی ربی۔ میں کوئی کاہن اور نجومی یا رمال وجفار نہیں۔ میرے علم کے ڈانڈے علم الٰہی سے ملے ہوتے ہیں۔ اسی نے مجھے علم عطا فرمایا ہے یہ گویا ان کے سامنے حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنی نبوت کو پیش کیا ہے۔ نبی ہونے کے ناطے سے ساتھ ہی یہ اعلان کردیا۔ انی ترکت ملۃ قوم۔ میں ان لوگوں کی ملت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور جو آخرت کے منکر ہیں۔ یہی باتیں دین کی بنیادی باتیں ہیں یعنی ایمان باللہ، ایمان بالیوم الآخر اور ایمان بالرسالۃ۔ حضرت یوسفؑ نے سب سے پہلے اپنے مخاطبوں کے ذہن میں ان کی تخم ریزی کی اور ساتھ ہی یہ بھی بتایا کہ اس راہ کے اختیار کرنے کے لیے ان لوگوں کی راہ چھوڑنی پڑے گی جو ان پر ایمان نہیں رکھتے ہیں۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت ہمارے لیے یہ راہنما اصول بھی بتا رہی ہے کہ دعوت حق کا فریضہ کیونکہ ادا کرنا چاہیئے۔ امیری ہو یا فقیری آزاد ہو یا قیدی، مقیم ہو یا مسافر، اکیلا ہو یا جماعت کے ساتھ دعوت حق کے ادا فرض سے کوئی حالت مستثنیٰ نہیں ہے۔ دیکھیئے کہ قید کی حالت میں فکر اس بات کی ہے کہ اللہ کے بندوں کے اللہ سے عابدانہ تعلقات کیسے قائم ہوں فکر اس بات کی نہیں کہ قید سے میری رہائی کیسے ہو مہلت جب ملی اور جس حال میں ملی اس کو ادا فرض کے کام میں لایا گیا اور جس طرح اس آدمی کی ہدایت میں جلدی کی جو ابھی مدتوں زندہ رہنے والا ہے اسی طرح اس کی ہدایت کے لیے بھی صبر نہ کرسکے جس کے سر پر موت منڈلا رہی ہے کیونکہ ہدایت پانا ہر انسان کا قدرتی حق ہے۔

اس آیت نے یہ بات بھی کھول دی ہے کہ تاویل الرؤیا ایک علم تھا جو اللہ سبحانہٗ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو سکھایا تھا دو باتیں ہیں اور دونوں الگ الگ ہیں۔ ایک تاویل الرؤیا دوسری تاویل الاحادیث اور دونوں کا علم اللہ نے حضرت یوسف علیہ السلام کو عطا کیا تھا۔

آیت کا ایک اور مطلب

شارحین قرآن نے لا یأتیکما طعام ترزقانہٖ الا نبأتکما بتاویلہٖ کا مطلب ایک تو وہی ہے جو ابھی ابھی آپ کے سامنے پیش کیا گیا ہے کہ میں تم کو روزانہ کا مقررہ کھانا آنے سے پہلے تم کو خواب کی تعبیر بتا دوں گا لیکن کچھ شارحین قرآن نے اس کا ایک اور مطلب بتایا ہے۔ شیخ الاسلام فرماتے ہیں۔

بہت سے مفسرین نے لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهٖ کے معنے یہ لیے ہیں کہ کبھی کھانا تمہارے پاس نہیں آتا ہے مگر میں آنے سے پہلے اس کی حقیقت پر تمہیں مطلع کر دیا کرتا ہوں یعنی آج کھانا کیا آئیگا. کس قسم کا ہوگا۔ پھر تعبیر بتلانا کیا مشکل گویا اول حضرت یوسف علیہ السلام نے معجزہ کی طرف توجہ دلا کر انہیں اپنی نبوّت کا یقین دلایا تاکہ آئندہ جو نصیحت کریں زیادہ مؤثر واقع فی النفس ہو۔ اس تقریر پر حضرت یوسف علیہ السلام کا یہ معجزہ ایسا ہی ہوگا جیسا کہ حضرت مسیح علیہ السلام نے فرمایا تھا۔ وَاُنَبِّئُكُمْ بِمَا تَاْكُلُوْنَ وَمَا تَدَّخِرُوْنَ فِيْ بُيُوْتِكُمْ ۔ مگر مولانا شیخ الہند محمود الحسنؒ نے اپنے ترجمۃ القرآن میں پہلی صورت اختیار کی ہے واللہ اعلم۔ حضرت شاہ عبدالقادرؒ لکھتے ہیں حق تعالیٰ نے قید میں یہ حکمت رکھی کہ ان کا دل کافروں کی محبت سے ٹوٹا تو دل پر اللہ کا علم روشن ہوا ۔ چاہا کہ پہلے ان کو دین کی بات سنا دیں پیچھے تعبیر خواب کہیں اس واسطے تسلی کر دی تاکہ نہ گھبرائیں کہا کہ کھانے کے وقت تک وہ بھی بتا دوں گا۔[1] مولانا اشرف علیؒ اور کچھ دوسرے اکابر کا رجحان اس طرف ہے کہ کھانا آنے سے پہلے وہ اس کی حقیقت بتا دیتے۔ شارحین قرآن میں سے بیشتر کا یہی خیال ہے لیکن شاہ عبدالقادرؒ اور حضرت شیخ الہندؒ کا رجحان پہلے کی طرف ہے ۔

یہاں سے یہ بات بھی صاف ہوگئی کہ قیدیوں کا خواب سُن کر آپ نے تعبیر فوراً کیوں نہ بیان کر دی؟ شارحین قرآن کہتے ہیں کہ تاخیر اس لیے کی کہ وحی کا انتظار تھا لیکن اگر آپ انتظار کی حالت میں ہوتے تو اس وثوق کے ساتھ کیونکر وعدہ کرتے کہ لَا يَأْتِيكُمَا طَعَامٌ تُرْزَقَانِهٖ الخ بلاشبہ آیت کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے جس میں اسے معجزہ بتایا جائے اور وہ بھی ہو سکتا ہے کہ کھانا آنے سے پہلے خواب کی تعبیر بتا دوں سیاق بیان پہلی بات کے حق میں ہے دوسرے مطلب کی حد تک لفظ تاویل طعام کے ساتھ بے معنے ہو کر رہ جاتا ہے ۔صاف صاف بات یہی ہے کہ تعبیر بتانے میں تاخیر قصداً کی تھی اور اس خیال سے کی تھی کہ تعبیر کی احتیاج نے ان دونوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کی طرف متوجہ کر دیا تھا ۔ انہوں نے اس توجہ سے فوراً فائدہ اٹھایا اور دین کی دعوت چھیڑ دی۔

---

[1] افادات شیخ الاسلام

وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ اٰبَآءِیْٓ اِبْرٰهِیْمَ وَاِسْحٰقَ وَیَعْقُوْبَ ؕ
مَا کَانَ لَنَآ اَنْ نُّشْرِکَ بِاللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ ؕ ذٰلِکَ مِنْ فَضْلِ اللّٰهِ
عَلَیْنَا وَعَلَی النَّاسِ وَلٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَشْکُرُوْنَ ﴿۳۸﴾
یٰصَاحِبَیِ السِّجْنِ ءَاَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَیْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ
الْقَهَّارُ ﴿۳۹﴾ مَا تَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِلَّآ اَسْمَآءً سَمَّیْتُمُوْهَآ
اَنْتُمْ وَاٰبَآؤُکُمْ مَّآ اَنْزَلَ اللّٰهُ بِهَا مِنْ سُلْطٰنٍ ؕ اِنِ الْحُکْمُ
اِلَّا لِلّٰهِ ؕ اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِیَّاهُ ؕ ذٰلِکَ الدِّیْنُ الْقَیِّمُ وَ
لٰکِنَّ اَکْثَرَ النَّاسِ لَا یَعْلَمُوْنَ ﴿۴۰﴾

اور میں نے اپنے باپ دادوں ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کی ملت کی پیروی کی ہے۔ ہم انبیاء کی جماعت ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں، یہ توحید کی راہ اللہ کا ایک فضل ہے۔ ہم پر اور عام انسانوں پر لیکن لوگوں کی اکثریت اس نعمت کا شکرادا نہیں کرتی ۳۸ اے جیل خانے کے دونوں ساتھیو! اس بات پر غور کرو کہ چند در چند معبود اچھے ہیں یا اللہ جو یگانہ ہی ہے۔ اور جس کا سب

پر دباؤ ہے ۔ ۳۶ اس ذات گرامی سے ورے ورے تم نے جن سے عابدانہ تعلقات قائم کیے ہیں ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ محض چند نام ہیں جو تمہارے اور تمہارے باپ دادے کے مقرر کردہ ہیں اس بارے میں اللہ نے ان کے لیے کوئی سند نازل نہیں کی ۔ ۳۷ فیصلہ اللہ کے سوا کسی کا نہیں ہے اس کا حکم یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے سوا، کسی سے عابدانہ تعلقات نہ رکھو۔ ۳۸ یہی پائیدار اور صاف دین ہے لیکن اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے ۔ ۳۹

ھدایت اللہ کا فضل ہے

قرآن حکیم نے ہدایت کو زمین کی زندگی کہاہے اور گمراہی کو زمین کی موت سے تعبیر کیا ہے بہار کا جب موسم آتا ہے تو گو زمین کے ہر گوشہ کو روئیدگی اور سرسبزی سے مالا مال کر دینا چاہتا ہے مگر سب سے پہلے اس کی آمد کی برکتیں باغ و چمن میں ہی ظاہر ہوتی ہیں اور صبح کا طلوع اگرچہ دنیا کے گوشے گوشے کے لیے پیام نور ہوتا ہے مگر سورج کی پہلی کرنیں اونچی دیواروں اور بلند میناروں پر پڑتی ہیں گو بعد کو نچلے سے نچلے تہہ خانے بھی روشن ہوجائیں گے ۔ یہی حال عید برات اور دور فیوض و برکات سماویہ کا بھی ہے ۔ اس عالم میں ہی خزاں و بہار کے موسم آتے ہیں اور دن رات کا اختلاف موجود ہے ، اگرچہ بہار سعادت کا موسم سارے جہاں اور ساری زمین کے لیے موسم حیات و کامرانی ہے لیکن اس کی سب سے پہلی برکت ان دلوں اور روحوں پر ہوتی ہے جن میں اسے قبول کرنے کی صلاحیت ہوتی ہے ۔ اگرچہ آفتاب فیضان الٰہی کی تجلی تمام بروبحر کو ظلمت و غفلت سے نجات دلانا چاہتی ہے مگر اس کی سب سے پہلی کرنوں سے

درخشندہ ہونے کا حق صرف انہی مستعد طبیعتوں اور صاف دلوں کو حاصل ہوتا ہے۔ جنہوں نے اپنی استعداد سے اوّلیت کا درجہ حاصل کر لیا ہے۔ اور سب جانتے ہیں کہ موسمِ بہار ہر پھُول کو لالی اور ہر پتے کو سبزی بخشتا ہے اور صبح کی تجلّی ہر ذرّے کو چمکیلا اور ہر آنکھ کو بینا بنا دے گی مگر دیکھنا یہ ہے کہ جس وقت باغ و چمن میں ہدایت کے پھُول کھِل رہے تھے اس وقت اموات صحرا کا کیا حال تھا۔

(۳۵) اور مَیں نے اپنے باپ دادوں ابراہیم اسحاق اور یعقوب کی ملّت کی پیروی کی۔ ہم انبیاء کی جماعت ایسا نہیں کر سکتے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو شریک ٹھہرائیں یہ ہدایت کی راہ اللہ کا ایک فضل ہے۔ ہم پر اور عام انسانوں پر، لیکن لوگوں کی اکثریت اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتی ہے۔ یعنی ہمارا خالص توحید اور ملّت ابراہیمی پر قائم رہنا نہ صرف ہمارے حق میں رحمت و فضل ہے کیونکہ خاندان ابراہیمی ہی کی شمع سے سب لوگ اپنے دلوں کے چراغ روشن کر سکتے ہیں، لیکن افسوس ہے کہ بہت سے لوگ خدا کی اس نعمت عظیمہ کی قدر نہیں کرتے، چاہیئے یہ تھا کہ اس کا احسان مان کر راہ توحید پر چلتے وہ اُلٹی ناشکری کر کے شرک وعصیان کی راہ اختیار کرتے ہیں[1]، دین کی دعوت کے موقع پر ان بزرگوں کے تذکرے سے مقصود اپنی عالی نسبی کا اظہار ہے دوسری طرف سُننے والوں کے دل میں جذبہ شوق کو اُبھارنا ہے۔ اب تک حضرت یوسف اپنے مخاطبوں کی نظر میں ایک معمولی اور گمنام شخص ہے۔ بخلاف اس کے ان کے آباؤ اجداد کا نام اس وقت بحیثیت موحد و داعی دین توحید مشہور ہو چکا تھا اور ان کی شہرت حدود کنعان سے اچھی خاصی پھیل چکی تھی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ حضرت یوسف دین حق کی تبلیغ کر رہے ہیں، اس سے پہلے ان کی داستان حیات کے جو ابواب قرآن نے پیش کیئے ہیں ان میں صرف اخلاق فاضلہ کی مختلف خصوصیتیں مختلف مرحلوں پر اُبھرتی رہی ہیں، مگر تبلیغ دین کا کوئی تذکرہ نہیں، اس سے معلوم ہوتا ہے کہ منصب نبوّت پر گامزن ہونے کے باوجود مقام نبوّت یعنی کار نبوّت عملاً قید کی زندگی میں اُن کے سپرد ہوا ہے۔ اور نبی کی حیثیت سے یہ ان کی پہلی تقریر ہے، بات کو مؤثر بنانے کے لیے پہلے اہل حق سے اپنی بستگی کو ظاہر کیا ہے اور بتایا ہے کہ میرا دین ان بزرگوں کی پیروی ہے۔ توحید کی دعوت میں زیادہ اہمیت

---

[1] افادات شیخ الاسلام

چونکہ لاَ اِلٰہ کو۔ یعنی شرک کو ہے اس لیے فرمایا۔ ما کان لنا ان نشرک باللہ ذہنوں میں کوئی تصور واضح اسی وقت ہوتا ہے جب اس کے مخالف تصوّر کو بھی ساتھ کے ساتھ بیان کردیا جائے اس لیے اہم اُصول و نظریات کی وضاحت کے وقت عموماً اس بات کا اہتمام کیا جاتا ہے کہ ان کے مخالف اُصولوں اور نظریوں کو ان کے بالمقابل رکھ دیا جائے عقیدہ توحید سے زیادہ اہمیت کس نظریئے اور عقیدے کو حاصل ہوسکتی ہے اس لیے نبوّت کی دعوت میں ضروری ہے کہ اس کے مخالف نظریئے یعنی شرک کو پہلے بتایا جائے تمام نبیوں کی دعوت میں قرآن نے پوری وضاحت سے بتایا ہے کہ توحید کی تعلیم صرف یہ نہیں ہے کہ توحید اسے کہتے ہیں اور اس کے دلائل یہ ہیں بلکہ پوری تفصیل کے ساتھ یہ بتانا بھی ضروری ہے کہ شرک کیا ہے اس کے اعمال کیا ہیں اس کی علامتیں کیا ہیں اس کی مضرتیں کیا ہیں اور وہ کیوں ایک سراسر بے اصل نظریہ ہے قرآن نے نبیوں کی دعوت میں توحید کی تعلیم کے لیے جو ضابطے کا جملہ استعمال کیا ہے، اس میں توحید کا اثبات اور شرک کی نفی دونوں ساتھ ساتھ موجود ہیں یعنی اس نے بات یوں نہیں فرمائی ہے کہ اللہ اکیلا معبود ہے بلکہ یوں فرمائی ہے کہ نہیں ہے کوئی معبود سوائے اللہ کے لاَ اِلٰہ اِلاَّ اللہ اس اندازِ بیاں سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ توحید کا بے امیز تصوّر پیدا نہیں ہوسکتا، جب تک شرک کی نفی پوری طرح نہ ہوجائے اور جب شرک کی نفی ضروری ہے تو اس کا سمجھ لینا بھی ضروری ہے۔

شرک کے معنی ساجھے پن کے ہیں اور دین کی اصطلاح میں شرک نام ہے اس بات کا کہ اللہ کی ذات یا اس کی صفات میں یا ان صفات کے لازمی تقاضوں میں کسی کو اس کا ساجھی ٹھہرایا جائے۔ گویا شرک کی تین قسمیں ہیں۔

ایک وہ شرک جس کا تعلق اللہ سبحانہ کی ذات سے ہوتا ہے۔

دوسرا وہ شرک جس کا تعلق اللہ سبحانہ کی صفات سے ہوتا ہے۔

تیسرا وہ شرک جس کا تعلق اس کی صفتوں کے لوازم سے ہوتا ہے۔

دین کی دعوت سے پہلے حضرت یوسف نے اپنا تعارف کرایا اور لوگوں کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر کی اور نام لے کر بتایا کہ میرا تعلق حضرت ابراہیم اسحاق اور حضرت یعقوب سے ہے۔ قاضی ثناء اللہ پانی پتی کا یہ استنباط لطیف ہے جب لوگ کسی عالم کے علمی مقام سے ناواقف ہوں تو عالم کو اپنے علمی مقام سے واقف کرانے میں کوئی حرج نہیں تاکہ لوگ مقام آشنا ہوکر

اس کے علمی فیوض سے پورا استفادہ کر سکیں۔

اس سے پہلے انہوں نے اس کا اظہار نہیں کیا کسی موقع پر بھی انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ میں حضرت ابراھیم اور حضرت اسحاق کا پوتا اور حضرت یعقوب کا بیٹا ہوں. قافلہ والے خواہ اہل مدین ہوں یا اسماعیلی دونوں حضرت یوسف کے خاندان سے قریبی تعلق رکھتے تھے۔ اہل مصر بھی حضرت ابراہیم سے ضرور واقف تھے. بلکہ یہاں حضرت یوسف کا انداز کہہ رہا ہے کہ تینوں بزرگوں کی شہرت مصر میں ہو چکی تھی. مگر حضرت یوسف نے کسی جگہ اپنے خاندان کا ذکر نہیں کیا، لیکن اب دعوت دین کی خاطر انہوں نے اس حقیقت سے پردہ اٹھایا اور بتایا کہ میرا تعلق دعوت توحید کی اسی عالمگیر تحریک سے ہے جس کی قیادت حضرت ابراہیم، اسحاق اور یعقوب کر رہے تھے، ایسا کرنا اس لیے ضروری ہوا کہ داعی حق کبھی اس دعوے کے ساتھ نہیں اُٹھا کرتا کہ وہ ایک نئی بات پیش کر رہا ہے جو اس سے پہلے کسی کو نہ سُوجھی تھی۔ بلکہ پہلے قدم پر یہ حقیقت کھول دیتا ہے کہ میں اس ازلی اور ابدی حقیقت کی دعوت دے رہا ہوں جو ہمیشہ سے تمام اہل حق پیش کرتے رہے ہیں۔ اپنے کو انبیاء کی صف میں کھڑا کر کے سب کا نصب العین، پیش نہاد یہ بتا رہے ہیں ما کان لنا ان نشرک باللہ من شئی، یہ ہمارا کام نہیں ہے کہ اللہ کے ساتھ کسی چیز کو بھی شریک کریں شرک پر قدغن سب نبیوں نے لگائی ہے اور تمام نبیوں کی دعوت کا آغاز ہی شرک پر نکیر سے ہوتا ہے۔ لیکن اس کی تکمیل مُحمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی ہے، دین وہی ہے جو پہلے سے تھا مگر اس میں کمال پیدا ہو گیا۔ ہر نبی نے توحید کا عقیدہ سکھلایا کسی نبی نے شرک کی تعلیم نہیں دی سب نے یہی کہا کہ اللہ سبحانہٗ ذات و صفات میں یگانہ ہے لیکن اس کی تکمیل حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کی کہ اللہ کو ایک جانو اس کی ذات کو یکتا اس کی شان یکتا اس کے افعال یکتا۔ جب اس کی ساری شانوں میں یکتائی ہے پھر عبادتیں اتنی ہی ہوں گی کہ قلب سے یوں عبادت کرو زبان سے یوں عبادت کرو قالب سے۔

اسی طرح اور انبیاء نے شرک سے روکا لیکن مُحمّد رسُول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف شرک سے نہیں روکا بلکہ اسباب شرک سے بھی روکا۔

(۳۶) دعوت توحید

اے جیل خانے کے دونوں ساتھیو اس بات پر غور کرو کہ چند در چند معبود اچھے ہیں یا اللہ جو یگانہ ہی ہے۔ اور جس کا سب پر دباؤ ہے یعنی مختلف انواع واشکال چھوٹے بڑے دیوتا جن پر تم نے خدائی اختیارات تقسیم کر رکھے ہیں ان سے لوگانا بہتر ہے یا اس اکیلے زبردست خدا سے جس کو ساری مخلوق پر کلی اختیار اور کامل تصرف وقبضہ حاصل ہے اور جس کے آگے نہ کسی کا حکم چل سکتا ہے نہ اختیار نہ اسے کوئی بھاگ کر ہرا سکتا ہے نہ مقابلہ کر کے مغلوب کر سکتا ہے خود سوچو کہ سر عبودیت ان میں سے کسی کے سامنے جھکایا جائے[1]

ارباب کی جمع بتا رہی ہے کہ مصریوں کے عابدانہ تعلقات متعدد معبودوں سے تھے۔ مصری جیسے علوم وفنون میں ترقی یافتہ قوموں میں سے تھے۔ ایسے ہی شرک میں بھی وہ دوسری قوموں سے آگے تھے، شرک کی گمراہی میں بھی ان کا تغلب مشہور تھا۔ دُنیا نے خدا کا تعدد بہت کم کیا ہے دنیا کی گمراہی خدا کے تعدد میں نہیں معبودوں کے تعدد میں ہے، مصر والے بھی اسی گمراہی میں ترقی کر کے دُنیا کی قیادت کر رہے تھے۔

انسان کی جس قدر اُمنگیں خواہشیں اور ضرورتیں ہیں ان ہی کے مطابق انسان گمراہی میں معبود بھی بناتا ہے۔ ہوا کا معبود، بچوں کی ولادت کا معبود، ان کی صحت کا معبود۔ عزت واقتدار کا معبود، کاروبار چلانے کا معبود، سفر کا معبود، دن کا معبود، رات کی تاریکی کا معبود۔ بتانا یہ ہے کہ جب انسان کا ایک اللہ سے عبادت میں رشتہ ٹوٹتا ہے تو اس کی ہر ضرورت نت نئے معبود جنم دیتی ہے لفظ متفرقون اختلاف ضروریات کے نتیجہ میں متفرق معبودوں کو بتانے کے لیے آیا ہے۔ یعنی متفرق حاجتوں کے لیے اہلِ مصر نے متفرق الٰہ بنا لیے تھے اسی تردید میں سب نبیوں کی دعوت کا پہلا کلمہ یہ رہا ہے۔

اعبدوا اللہ ما لکم من الٰہ غیرہ

اللہ سے عابدانہ تعلقات قائم کرد اللہ کے سوا تمہارا الٰہ کوئی نہیں ہے۔

اس کا یہی مطلب ہے اور یہی ہو سکتا ہے کہ جن راہوں سے عمل پیدائش کا ظہور ہو رہا

---

[1] افادات شیخ الاسلام

ہے۔ وہ تو ٹھیٹھ عقلی بات ہے لیکن اللہ سبحانہٗ سے استفادہ جس فطری جذبے کی رہنمائی میں دعاؤ عبادت نذر قربانی وغیرہ مختلف اعمال کی صورت میں کیا جاتا ہے
اس جذبے کے تعلق کا مستحق اللہ کی ذات مبارکہ کے سوا کوئی نہیں اسی کی دوسری تعبیر یہ ہے کہ اللہ کے سو تمہارا کوئی الٰہ نہیں ہے مطلب یہی ہے کہ اللہ سبحانہٗ ہمارا الٰہ ان حاجتوں اور ضرورتوں میں بھی ہے جس کے ہم دُنیا کی زندگی میں محتاج ہیں اور ان میں بھی جو آخرت کی زندگی میں پیش آنے والی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ اللہ ہی ہمارا الٰہ الدنیا بھی ہے اور الٰہ الآخرت بھی۔ بلاشبہ انبیائے کرام نے حق سبحانہٗ کی الوہیت کو دنیا یا آخرت کسی ایک کی ضرورتوں کے ساتھ خاص نہیں کیا ہے عموماً اس دعوت کے مخاطب وہ ہی لوگ رہے ہیں، آیت میں۔ یا صاحبی السجن کہہ کر ان خواب کی تعبیر پُوچھنے والوں کو مخاطب کرنا بڑا بلیغ اور دل نواز خطاب ہے، بسا اوقات مصیبت کا اشتراک ساتھیوں کے دلوں میں ہمدردی، محبت، اخلاص اور باہمی خیر خواہی اور خیر سگالی کے جذبات نہایت زور وقوت سے اُبھار دیتا ہے حضرت یوسف علیہ السلام نے اس خطاب سے اپنے ساتھیوں کے ان ہی جذبات کو اُبھارا ہے تاکہ وہ ساتھیوں کی توجہات کا بھرپور انداز میں مرکز بن جائیں اور ان کی وہ بات گوش دل سے سُنیں۔ خواب سُن کر حضرت یوسف علیہ السلام کو معلوم ہوگیا کہ دونوں ساتھیوں میں سے ایک کی رہائی قریب ہے اور دوسرے کی موت قریب ہے اب فرصت کا ایک لمحہ بھی ضائع کرنا نہیں چاہتے ہیں، اور چاہتے ہیں کہ تعلیم حق سے اُنہیں آشنا کردیں۔ ممکن ہے کہ جو رہا ہونے والا ہے وہ حق کا بیج اپنے ساتھ لے جائے، اور دربار۔ شاہی میں تخم ریزی کرسکے جس کی موت قریب ہے ممکن ہے کہ سچائی قبول کرے اور دنیا سے تو راہِ حق پر جائے، حضرت یوسف علیہ السلام نے یہاں جیل کے ساتھیوں سے خواب سُن کر فوراً تعبیر نہیں بتائی بلکہ ان کی توجہ اور رجوع سے فائدہ اُٹھا کر ایک دوسرا ہی بیان شروع کردیا۔

انی ترکت ملۃ قوم لا یومنون باللہ وھم
بالاخرۃ ھم کافرون

میں نے ان لوگوں کا طریقہ چھوڑ دیا ہے جو اللہ پر ایمان نہیں رکھتے اور آخرت کا انکار کرتے ہیں

اور اعلان کیا کہ

اتبعت ملۃ آبائی ابراھیم واسحاق ویعقوب

میں نے اپنے باپ دادوں ابراہیم واسحاق ویعقوب کی پیروی کی ہے.

حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ تقریر اگر ایک طرف یہ بتا رہی ہے کہ دعوتِ حق کا فریضہ کیونکر ادا کرنا چاہیئے اور داعی حق کے جوش وطلب دعوت کا کیا حال ہوتا ہے، تو دوسری طرف یہ تقریر یہی بتا رہی ہے اب یہ پہلا موقع ہے جب کہ حضرت یوسف علیہ السلام دین حق کی دعوت دے رہے ہیں اس سے پہلے ان کی زندگی کے جو مناظر قرآن نے پیش کیے ہیں، ان میں صرف اخلاق فاضلہ کی مختلف خصوصیات مختلف مراحل پر نظر آتی ہیں مگر دعوت وتبلیغ کا ذکر اشارتاً بھی نہیں اس سے معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مراحل صرف اس مقصد کی بنیادی تربیت کے تھے اور نبوت کی دعوت کا کام یہاں سے شروع ہوتا ہے اور نبی کی حیثیت سے یہ ان کی پہلی تقریر ہے۔

۲ یہ بھی پہلا موقع ہے کہ انہوں نے لوگوں کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر کی اس سے پہلے وہ نہایت صبر وشکر کے ساتھ ہر اس حالت کو قبول کرتے رہے جو ان کو پیش آئی مصائب کی ایک سے زیادہ گھاٹیوں سے گزرے کسی موقع پر انہوں نے یہ نہیں بتایا کہ میں حضرت ابراہیم اور اسحاق کا پوتا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا بیٹا ہوں. مگر اب انہوں نے اپنی دعوت کی خاطر اس حقیقت کو بے نقاب کیا کہ میرا تعلق توحید کی اس عالمگیر دعوت سے ہے جس کے آئمہ حضرت ابراہیم، حضرت اسحاق اور حضرت یعقوب علیہ السلام ہیں. ایسا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ حق کا داعی کبھی اس دعوے کے ساتھ نہیں اُٹھتا کہ وہ ایک نئی بات پیش کر رہا ہے بلکہ پہلے ہی قدم پر یہ بات کھول دیتا ہے کہ میں ازلی اور ابدی حقیقت کی طرف بلا رہا ہوں جو ہمیشہ سے تمام اہل حق پیش کرتے رہے ہیں۔

۳ حضرت یوسف علیہ السلام نے جس طرح دعوت کے لیے موقع تلاش کیا اس میں حضرت یوسف علیہ السلام کی حکمت وتبلیغ ہمیں میدان دعوت میں ایک اہم سبق دے رہی ہے اس معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع کسی شخص کے دل میں اگر تبلیغ حق کا جوش ہو اور اس کا دماغ حکمت سے مالا مال ہو تو کیسی خوبصورتی کے ساتھ وہ گفتگو کا رُخ اپنی دعوت کی طرف پھیر سکتا ہے۔ جسے دُھن لگی ہوتی ہے وہ موقع کی تاک میں لگا رہتا ہے۔

اور اُسے پاتے ہی اپنا کام شروع کر دیتا ہے یہی فرق ہے حکیم اور موقع شناس اور ناداں مبلغ کی دعوت میں ۔

۴ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ لوگوں کے سامنے دعوت حق پیش کرنے کا صحیح طریقہ کیا ہے ۔آپ نے ان کے سامنے دین کے اس نقطہ آغاز کو پیش کیا ہے۔جہاں سے اہلِ حق کا راستہ اہلِ باطل کے راستے سے جدا ہوتا ہے یعنی توحید۔ اس کو وہ ایسے معقول انداز میں پیش کرتے ہیں کہ عقل عام رکھنے والا شخص اسے ماننے بغیر نہیں رہ سکتا ہے ۔ایک آقا کا غلام ہونا بہتر ہے یا بہت سے آقاؤں کا ایک دروازے سے مانگ لینا اچھا ہے یا چند در چند دروازوں پر دھکے کھانا سارے جہانوں کے آقا کی بندگی بہتر ہے یا بندوں کی بندگی ۔ دعوت کا یہ کس قدر لطیف انداز ہے وہ فرماتے ہیں کہ اللہ کا یہ بہت ہی بڑا انعام ہے کہ اس نے اپنے سوا ہمیں کسی کا بندہ نہیں بنایا ۔ مگر لوگ اس انعام پر اللہ کا شکر نہیں ادا کرتے ہیں، اس فقرے میں

ءَ اَرْبَابٌ مُّتَفَرِّقُوْنَ خَيْرٌ اَمِ اللّٰهُ الْوَاحِدُ الْقَهَّارُ

وہ اپنے مخاطبوں پر تنقید کرتے ہیں مگر نہایت معقولیت کے ساتھ، اور دل آزاری کے کے ہر شائبہ سے پاک وہ فرماتے ہیں کہ جہاں تک ایک اللہ سبحانہٗ کا تعلق ہے وہ تو ایک بدیہی حقیقت ہے مشرک اور موحد سب اس کو مانتے ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ اس کے سوا اور بھی کچھ اس کے شریک ہیں تو اس کے لیے بہت بڑی طاقتور دلیل کی ضرورت ہے ۔اگر اس کی کوئی دلیل نہیں تو صرف امانی اور خواہشوں کی وجہ سے کسی کو اپنے اُوپر خدا بنا کر مسلط کر لینا کہاں کی دانشمندی ہے ۔ایک غلام کے سامنے اگر یہ سوال رکھا جائے کہ اسے ایک آقا کی غلامی پسند ہے یا متعدد آقاؤں کی تو وہ متعدد آقاؤں کے مقابلے میں ایک کی غلامی کو ترجیح دے گا یہی انسان کی فطرت ہے ۔

(۴۷) بے حقیقت ناموں کی پوجا

اس ذات گرامی سے درے ورے تم نے جن جن سے عابدانہ تعلقات قائم کر رکھے ہیں ان کی حقیقت اس سے زیادہ کچھ نہیں کہ محض چند نام ہیں جو تمہارے اور تمہارے باپ دادوں کے مقرر کردہ ہیں اس بارے میں اللہ نے کوئی سند نہیں اُتاری ہے ۔یعنی یوں ہی

بے سند اور بے ٹھکانے نام رکھ چھوڑے ہیں۔ جن کے نیچے حقیقت ذرہ برابر نہیں ہے۔ ان ہی نام کے خداؤں کو پوج رہے ہیں ایسے جہل پر انسان کو شرمانا چاہیئے [۱]

مطلب یہ ہے کہ یہ معبود جن میں سے کسی کو ان داتا کسی کو خداوند نعمت کسی کو مالک زمین کسی کو ربّ دولت یا مختار صحت و مرض اور بچے دینے والا کسی کو ان کا محافظ کہتے ہو یہ سب خالی نام ہیں ان ناموں کے نیچے کوئی حقیقی ان داتائی و خداوندی اور مالکیت و ربوبیت موجود نہیں ہے۔ علامہ آلوسی لکھتے ہیں کہ یہ صرف الفاظ ہی الفاظ ہیں جن کا خارج میں کوئی مصداق نہیں ہے، ان کی پشت پر کوئی سلطانی دلیل نہیں ہے یہ نام محض تمہارے وہم کی ایجاد ہیں۔ ان ناموں کا کہ کوئی بارش برسانے والا، کوئی ہوا چلانے والا، کوئی بیماریاں دُور کرنے والا، کوئی جانوروں کا محافظ، کوئی جنگ میں محافظ، کوئی مسمّیٰ موجود نہیں ہے تمہارے باپ دادا جس لکیر کو پیٹتے آئے اسی لکیر کو تم بھی پیٹ رہے ہو اللہ نے اس بارے میں کوئی دلیل نہیں اُتاری ہے۔

سلطانی اور غیر سلطانی قوانین

یہاں سلطانی اور غیر سلطانی کے موضوع پر مولانا مناظر احسن گیلانیؒ نے بڑی لطیف بحث کی ہے وہ اس لائق ہے کہ معالم القرآن میں ناظرین کی ضیافت طبع کے لیے پیش کی جائے۔ فرماتے ہیں۔

البتہ ایک چیز جس کا ذکر یہاں ضروری ہے وہ یہ ہے کہ پیدائش کی جن راہوں کے متعلق باور کرانے والے یہ جو باور کراتے رہے ہیں کہ جو کچھ تم نے جانا ہے وہی واقع میں بھی اللہ سبحانہٗ کی بتائی ہوئی قطعی راہیں ہیں۔ یہ مسئلہ اتنا آسان نہیں جتنا باور کرانے والے اپنے تئیں اسے خیال کرتے ہیں ابھی عرض کیا گیا تھا کہ واقعی جو خدا کی بنائی ہوئی مقررہ راہ ہے اس سے اعراض یا اس کی خلاف ورزی تو خُدا کی، خُدا کی مرضی کی۔ خُدا کے قانون کی خلاف ورزی ہے۔ ایک ایسی چیز کے توڑنے کی یہ کوشش ہے جس کے توڑنے کی درخواست خود پیدا کرنے والے سے بھی اسلام جائز قرار نہیں دیتا لیکن عام طور پر جن نظریات و مسلمات کے

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

متعلق دعویٰ کیا جاتا ہے کہ وہ فطرت کے قوانین اور قدرت کے آئین ہیں۔ ظلم ہوگا اگر ہر شخص کو اس کا حق نہ دیا جائے کہ بجائے خود وہ بھی اس کی تحقیق کرے کہ واقع میں وہ خدا کی مقرر کردہ راہیں ہیں بھی یا نہیں۔ محض دوسروں کے قول پر بھروسہ کرکے ان کی ناقص معلومات کے متعلق یہ اصرار کرنا کہ انہیں خدائی قانون یقین کرلیا جائے۔ ظاہر ہے کہ نہ یہ عقلاً درست ہوسکتا ہے۔ اور نہ مذہباً۔ قرآن مجید میں متعدد مقامات پر انسانوں ہی کے مسلمات ان ہی کے نظریات کے متعلق۔

ما انزل اللّٰہ بہا من سلطان
نہیں اُتارا خدا نے اس کے لیے سلطان

کا اعلان، یا

فاتوا بسلطان مبین
لاؤ کوئی کھلا ہوا سُلطان

وغیرہ کے مطالبات جو پائے جاتے ہیں ان سے میں اسی نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مختلف چیزوں کی پیدائش کی جو مختلف راہیں اس عالم میں پائی جاتی ہیں۔ اور ہم اپنے معلومات وتجربات کی بنیاد پر ان کے متعلق جو نظریات و قوانین بناتے رہتے ہیں قرآنی تعلیم کے لحاظ سے ان قوانین کے ایک سلسلہ کو تو ہم سلطانی قوانین کہہ سکتے ہیں اور اسی کے مقابلے میں دوسرے سلسلہ کا غیر سلطانی قوانین نام رکھا جاسکتا ہے۔

لفظ سلطان اور نزول کی تحقیق

سلطانی قوانین کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ بادشاہی قوانین ہیں، یعنی حق تعالیٰ کو بادشاہ اور سلطان قرار دے کر ان کے بنائے ہوئے قوانین کو سلطانی قوانین کے نام سے میں موسوم کررہا ہوں۔ اُردو میں سلطان کے معنیٰ چونکہ بادشاہ ہی سمجھے جاتے ہیں اس لیے قدرتاً لوگوں کا ذہن شائد اسی طرف منتقل ہوجائے ضرورت ہے کہ عربی لغت کے اعتبار سے قرآن کی مندرجہ بالا آیتوں کی جن سے قوانین کی یہ تقسیم پیدا ہوتی ہے شرح کرلی جائے۔ واقعہ یہ ہے کہ عربی زبان میں سلطان کے لفظی معنیٰ غلبہ اور تسلّط کے ہیں چونکہ سلاطین کو بھی ملک پر غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے سلطان کے لفظ کا ان پر بھی اطلاق ہونے لگا۔ مگر ان آیتوں میں سلطان کا لفظ دراصل غلبہ اور استیلاء۔ تسلّط ہی کے معنیٰ میں استعمال کیا گیا ہے یہ

تو سلطان کے لفظ کی تحقیق ہوئی ۔

دوسرا لفظ جو یہاں قابل غور ہے وہ ما انزل اللہ میں انزل کا لفظ ہے۔ انزل کا مادہ نزول ہے نزول کے معنیٰ اترنا اور انزال کے معنیٰ اتارنا ہے۔ عام طور پر قرآن کی طرف بھی تنزیل و انزال کے الفاظ قرآن میں چونکہ منسوب کیئے گئے ہیں، اس لیے دوسری چیزوں کی طرف بھی جب اس لفظ کو حق تعالیٰ کی نسبت سے منسوب کیا جاتا ہے تو پہلا خیال اسی تنزیل اور انزال کے معنیٰ کی طرف چلا جاتا ہے۔ جو قرآن کے متعلق سمجھے جاتے ہیں۔ مثلاً

ما انزل اللہ بہا من سلطان: نہ اتارا خدا نے اس کے لیے سلطان۔ کے متعلق عموماً ذہن ادھر منتقل ہو جاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اُنکے متعلق کوئی وحی نہیں ہوئی یا پیغمبروں کو کوئی علم اس کے متعلق عطا نہیں ہوا، اگر اس آیت میں انزل کے یہی معنیٰ لیے جائیں گے تو ظاہر ہے کہ اس صورت میں سلطانی قوانین سے مراد وہ قوانین ہوں گے جن کے قانون الٰہی ہونے کی تصریح قرآن میں ہے۔ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حدیث میں کی گئی ہو۔ اور غیر سلطانی قوانین سے مراد وہ باتیں ہوں گی جن کی تصریح شریعت میں نہ پائی جاتی ہو۔ لیکن سچ یہ ہے کہ محض انزل کے لفظ کی بنیاد پر اگر ایسا سمجھا جاتا ہے تو خود قرآن سے اس کی تائید نہیں ہوتی کون نہیں جانتا کہ قرآن میں الحدید، لوہے کے متعلق بھی یہ آیت پائی جاتی ہے ۔

وانزلنا الحدید فیہ باس شدید

اتارا ہم نے لوہے کو جس میں بہت زیادہ زور بھرا ہوا ہے

ظاہر ہے کہ الحدید، یعنی لوہے کے متعلق یہ باور کرنا کہ حق تعالیٰ نے کسی پیغمبر پر اس کی بھی وحی کی۔ نہ عقلاً صحیح ہے نہ نقلاً بلکہ اس کا صاف کھلا ہوا سلفاً عن خلف یہی مطلب سمجھا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے لوہے کو پیدا فرمایا ہے جس سے معلوم ہوا کہ انزل کے لفظ کو صرف الہام و وحی کے ساتھ مختص کرنے پر اصرار کرنا صحیح نہیں ہے۔ اب لغوی تشریحات کو پیش نظر رکھتے ہوئے بہ ظاہر خیال میں یہی بات آتی ہے کہ اس دُنیا کے کچھ قوانین تو ایسے ہیں جن میں خدا نے سلطانیت کی صفت پیدا کی ہے یعنی اپنے آثار و نتائج کے لحاظ سے انسانی فطرت پر ان کا تسلط اور ان کی گرفت اتنی سخت اور مضبوط ہے کہ ان کی واقفیت اور انکار آدمی کے بس سے باہر ہو جاتا ہے مثلاً آگ جلاتی ہے۔ مرچ تلخ ہے۔ سنکھیا قاتل ہے

آفتاب روشن ہے. گرم ہے. قدرت کے انہی قوانین کو قرآن کی مذکورہ بالا آیت کی اصطلاح کی بنیاد پر میں سلطانی قوانین قرار دیتا ہوں. اور ان کے بالمقابل ایسی چیزیں جن کیساتھ انسان کی فطرت کا یہ تعلق نہیں ہے وہ ہی غیر سلطانی باتیں سمجھی جائیں گی. اس تقسیم کے بعداب باآسانی ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ پیدائش و تخلیق کی وہ واضح اور کھلی ہوئی راہیں جن کے آثار و نتائج کا کسی حال میں کسی طرح انکار ممکن نہ ہو، انسانی فطرت پر جن قوانین کی سلطانیت اور تسلّط کی یہ کیفیت ہوگی، خدا کے ان سلطانی قوانین کا سنتہ اللہ ہونا یقینی ہے اسی لیے اس کو چھوڑ کر کسی اور راہ سے ان چیزوں کی پیدائش اور حصول کی کوشش کرنے والے. مثلاً بغیر بیوی کے اولاد کو ڈھونڈھنے والے. جوتے بوئے بغیر. لہلہاتی فصلوں کی آس لگانے والے. سنکھیا کھا کر زندگی کی اُمید رکھنے والے. خدا کے مقرر کردہ قوانین کے متعلق باغیانہ اعتدائی طرز عمل اختیار کرکے گویا اس سے لڑنے اور جنگ کرنے پر آمادہ ہیں لیکن معاشیات ہو، یا سیاسیات، طبیعات ہو یا عمرانیات، یا اسی قسم کے عام عقلی و ذھنی علوم ان کے تمام نظریات و مسلمات کے متعلق یہ فیصلہ کہ ان میں سے کسی نظریہ یا کسی مُسلمہ کی خلاف ورزی خدا کی سُنت یا سُلطانی قوانین کی خلاف ورزی ہے. اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ یہ کتنی بڑی زبردستی ہے

جزئیات تو خیر جزئیات ہیں ان عقلی علوم و فنون کے کلیات بلکہ اساسی مقدمات تک بھی ابھی مشتبہ اور محل نظر و بحث ہیں. طبیعات کو ہی لیجئے جن پر ہزار ہا ہزار سال سے انسانی عقل مسلسل کام کرتی چلی آرہی ہے لیکن تفصیلات سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو نظر آئے گا کہ اس علم کے مختلف دبستانوں مثلاً، ایلوپیتھک، ہومیوپیتھک کے بنیادی مقدمات ہی میں آسمان و زمین کا فرق ہے ایک میں ضد کو ضد سے دفع کرنے کا تجربہ پیش کیا جاتا ہے. اور اس کا سارا معالجاتی نظام اسی اساس پر مبنی ہے. دوسرے میں بالکل اس کے خلاف علاج بالمثل کے نظریہ پر اصرار کیا جاتا ہے علاج کے ان دونوں متصادم و تخالف نظاموں سے لوگوں کو شفا بھی ہوتی ہے اور نہیں بھی ہوتی، اب فرض کیجئے کہ ایلوپیتھک طریقہ علاج کو ترک کر کے کوئی ہومیوپیتھک والوں کی طرف رجوع کرتا ہے. تو کیا اس پر یہ الزام لگانا درست ہوگا کہ وہ قدرت کے قانون سے جنگ کرتا ہے، سچ تو یہ ہے کہ ہمارے طبّی تجربات اور علاجی نظریات اس وقت تک اپنے تاثیری نتائج کے لحاظ سے عموماً ایسے حال میں ہیں کہ ان کی غیر قطعی یا غیر سلطانی کیفیت کی وجہ سے اگر کوئی علاج د

معالجہ کی نفع بخشی کا بھی فکر ہو جائے تو جہاں تک واقعات کا تعلق ہے۔ ایسے آدمی پر بھی سُنت اللہ کی خلاف ورزی کا الزام شاید قرین انصاف نہ ہوگا۔ ایسی صورت میں غور کرنے کا مقام ہے کہ پیدائش کی راہوں کے متعلق غور و فکر کا جو سلسلہ جاری ہے اور اس وقت تک ان ہی کو پیش نظر رکھ کر انسانی زندگی کے معاشی پہلو کے متعلق جو قوانین اور کلیات آئے دن بن رہے ہیں کبھی سرمایہ داری کے نظام میں انسان کی فردوس گم گشتہ کا سراغ لگایا جاتا ہے۔ اور مشورہ دیا جاتا ہے کہ سود خواری یا ادلا دکبیر کی توریث، الغرض گنج سے گنج کھینچنے میں جس قوم کے افراد جس حد تک کامیاب ہوں گے۔ اسی حد تک اس قوم کا معاشی نظام ترقی کی منزلوں کو طے کرے گا۔ کبھی فیصلہ کر دیا جاتا ہے کہ انسان اگر اپنی کھوئی ہوئی جنت کو پھر پانا چاہتا ہے تو ان تمام راہوں کو بند کرے جن سے ملک و قوم کے خاص خاص افراد کی جیبوں میں دولت سمٹتی ہو۔ حکم دیا جاتا ہے کہ جو ہم میں غریب ہیں۔ وہ تو خیر غریب ہی ہیں لیکن آدم کی اولاد میں تھوڑے بہت امیروں کی جو مقدار ہے۔ بزورِ شمشیر ان کو بھی غریب بنا دیا جائے۔ مجھے اس سے ابھی بحث نہیں کہ سرمایہ دوستی اور سرمایہ دشمنی ان دونوں متخالف نظریات معاشی فلاح و بہبود کے لحاظ سے صحیح کون ہے اور غلط کس کو قرار دیا جائے۔ بلکہ کہنا صرف یہ ہے کہ جن علوم و فنون میں آئے دن ایسے متناقض نظریات بنتے اور بگڑتے رہتے ہیں ان ہی نظریات کو سلطانی فیصلوں کے رنگ میں پیش کرنا خود بھی ان پر حد سے زیادہ اصرار کرنا اور دوسروں کو بھی ان کے ماننے پر مجبور کرنا اور اس حد تک مجبور کرنا کہ جس بدقسمت کو تھوڑا بہت بھی ان سے کچھ اختلاف ہو۔ ان پر سُنت اللہ کی خلاف ورزی کا الزام لگا دینا کہاں تک درست ہو سکتا ہے بلکہ حکیمانہ تحقیق سائنٹیفک ریسرچ کا اقتضار تو یہ تھا کہ لفظی سطوتوں، لسانی طنطنوں، افسانی مغالطوں شاعرانہ پتیروں سے دماغوں کو بالکلیہ آزاد کر کے اعتمادی کیفیت کو قوانین کے سلطانی رنگ کے ساتھ وابستہ کر دیا جاتا۔ جن چیزوں میں سلطانیت کا رنگ تیز نظر آتا اسی حد تک اعتماد و وثوق کی کیفیت میں بھی تیزی پیدا کرنے کی کوشش کی جاتی۔ اور جس میں جس حد تک سلطانیت کا رنگ دھیما محسوس ہوتا، اعتمادی کیفیت کے احساس پر بھی اسی حد تک کم زور دیا جاتا۔ اصل حقائق کی واشگافی کا یہی اور صرف یہی محتاط اور محفوظ ترین طریقہ

ہے۔ اور یہی آزاد تنقیدی ذہنیت ہو سکتی تھی جس کے پیدا کرنے کے لیے قرآن میں اس قسم کی آیتوں کا مثلاً۔

ان ھی الا اسماء سمیتموھا انتم وآباؤکم ما انزل اللہ بھا من سلطان ان یتبعون الا الظن وما تھوی الانفس، نہیں ہے وہ (یعنی جن چیزوں کو کفار پیدائش و تخلیق کا وسیلہ و ذریعہ خیال کرتے تھے) لیکن چند نام یا الفاظ۔ جسے رکھ لیا ہے تم نے اور تمہارے باپ دادوں نے نہیں اتارا اللہ نے ان کے لیے سلطان نہیں پیروی کرتے ہیں وہ لیکن صرف اٹکل کی اور ان باتوں کی جنہیں ان کا جی چاہتا ہے۔ ما لھم بہ من علم ان یتبعون الا الظن وان الظن لا یغنی من الحق شیئاً؛ نہیں ہے ان کو اس کی دانش (صحیح) نہیں پیروی کر رہے ہیں وہ لیکن اٹکل کی۔ اور اٹکل واقعہ سے آدمی کو بے نیاز نہیں کر سکتا۔ بار بار اعادہ مختلف پیرائیہ بیان سے کیا گیا ہے ورنہ صرف اس لیے کہ جو روٹی اچھی پکاتا ہے وہ خیالی میں بھی ضرور ماہر ہوگا۔ یا صنعتی دستکاریوں، میکانیکی اولو العزمیوں میں جس نے حذاقت کا ثبوت دیا ہے کوئی وجہ نہیں ہو سکتی کہ اجتماعی مسائل اور معاشی نظریات میں عقل غلطی کرے گویا جس کے شعر اچھے ہوتے ہیں اس کے دماغ کے ریاضیاتی نتائج کو بھی یقیناً صحیح ہونا چاہیئے۔ واقعہ یہ ہے کہ سلطانیت کے قدرتی معیار سے ہٹ کر تحقیق و تلاش کے باب میں جہاں کہیں ان غیر منطقی تقلیدوں کی وبا پھوٹی ہے۔ یا اسی طرح اس راہ میں جہاں ناموں کو پوجا گیا ہے بڑائی کے ساتھ اس کا چرچا کیا گیا اس کی ہر بات بڑی سمجھی گئی ہے خدا ہی جانتا ہے کہ قوموں کے اس طرز عمل نے لوگوں کو کن کن چیزوں کے ماننے پر مجبور نہیں کیا ہے۔ بلکہ سچ تو یہ ہے کہ انہیں بے احتیاطیوں کی بدولت قوموں اور اُمتوں کو قرنہا قرن تک غیر سلطانی کیا۔ افترائی قوانین تک کی جکڑ بندیوں میں پھڑ پھڑانا پڑا ہے اور کتنے ہیں جو انہیں زنجیروں میں جکڑے ہوئے ہیں، آخر ان ہی انسانوں میں کتنے ہیں جنہیں بدھ کے دن میں مصائب کا طوفان نظر آیا غریب تیرہ کے عدد میں اتنی قوت لوگوں کو محسوس ہوئی کہ کسی سخت سے سخت حادثہ کو واقع کر دینے کے لیے وہ کافی ہے فاتحانہ اقدام کو بدبختانہ انجام سے بدلتے ہوئے کتنوں نے

راہ کاٹنے والی غریب کالی بلی کو دیکھا : الی غیر ذلک من الخرافات والاوھام ۔ حالانکہ سلطانی معیار سے جانچنے کا اصول اگر اختیار کیا جاتا تو ایک ان دیکھے فرضی دن یا تیرہ اکائیوں کے مجموعہ میں کیا واقعی یہ کرامتیں باقی رہ سکتی تھیں ۔ راہ کاٹ کر گزر جانے والی بلی کی مجال تھی کہ کسی فرد کو نہیں ۔ بلکہ قوم کو حرمان نصیبی کے خندقوں میں میں ہمیشہ کے لیے جھونک دے ، لیکن کیا تماشا ہے کہ سلطانی راہوں میں معاشی پیداواروں کو ڈھونڈھتے ہوئے جو ایمان وتقویٰ ، دعا ، واستغفار ، صبروشکر ، توکل وتسلیم کے مختلف ناموں سے ان تدبیروں کو بھی اختیار کرتا چلا جاتا ہے جن سے خود پیدا کرنے والے کی رضا مندی حاصل ہوتی ہے ۔ حصول معاش کی راہ میں اس طرز عمل کے نتیجہ خیز ہونے پر جو بھروسہ کرتے ہیں انہیں دیکھ دیکھ کر وہی طبقہ گھبرایا جاتا ہے ۔ بلکہ کبھی کبھی سر پیٹ لیتا ہے جس نے خدا جانے کتنی غیر سلطانی راہوں کو پیدائش کی سلطانی راہ محض اس لیے باور کرلیا ہے ۔ انجن بنانے والے ، ہوائی جہاز اڑانے والے ، ریڈیو بجانے والے یورپ کا یہی عقیدہ ہے[۱]

خیر یہ تو مولانا گیلانی کی علمی جولانیاں ہیں جو معالم القرآن کے پڑھنے والوں کے لیے فائدے سے خالی نہیں ہیں ، بات تو حضرت یوسف علیہ السلام کی تقریر پر ہو رہی تھی اس تقریر کے متعدد پہلو ایسے ہیں جن پر توجہ اور غور وفکر کی ضرورت ہے ۔

حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی میں یہ پہلا موقع ہے کہ وہ دین حق کے داعی کی حیثیت سے بات کر رہے ہیں ۔ اس سے پہلے ان کی زندگی کی جو داستان قرآن نے سنائی ہے اس میں صرف اخلاق فاضلہ کے مختلف پہلو نمایاں ہیں ، مگر دعوت کا کوئی ذکر نہیں ہے ۔ داعی کی حیثیت سے ان کی یہ پہلی تقریر ہے اور جیسے دعوت کے موضوع پر ان کی یہ پہلی تقریر ہے ایسے ہی اپنے تعارف میں بھی ان کا پہلا بیان ہے ۔ اس سے پہلے مصائب کے ہجوم میں اپنے بچانے کے لیے انہوں نے کہیں لوگوں کے سامنے اپنی اصلیت ظاہر نہیں کی ، کسی موقع پر یہ نہیں فرمایا کہ میں حضرت ابراھیم اور حضرت اسحاق علیہ السلام کا پوتا اور حضرت یعقوب علیہ السلام کا بیٹا ہوں ۔ یہ قدم بھی انہوں نے دعوت ہی کی خاطر اپنایا کہ میں کوئی نئی نرالی دعوت پیش نہیں کر رہا ہوں بلکہ میرا تعلق دعوت توحید کی اس عالمگیر تحریک سے ہے جس کی قیادت ورہنمائی حضرت ابراھیم علیہ السلام

---

[۱] اسلامی معاشیات

حضرت اسحاق علیہ السلام اور حضرت یعقوب علیہ السلام کرتے ہیں۔

یہاں یہ بات بھی دھیان میں رکھنے کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے دعوت کے لیے جو موقع تلاش کیا ہے وہ ہی امر بالمعروف اور دعوت کے میدان میں گہری معنویت رکھتا ہے۔

دو آدمی جیل کی زندگی کے ساتھی اپنی عقیدت مندی کا اظہار کرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام سے خواب کی تعبیر دریافت کر رہے ہیں آپ اسی موقع کو دعوت کیلئے مفید سمجھ کر بات کا رُخ موڑ دیتے ہیں اور فرماتے ہیں کہ تعبیر تو تمہیں ضرور بتاؤں گا مگر پہلے یہ سمجھو کہ اس تعبیر رؤیا کے علم کا مأخذ کیا ہے۔ جس کی بنا پر میں خواب کی تعبیر بتاؤں گا فرمایا اتبعت ملة آبائ ابراهيم واسحاق ويعقوب۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ فی الواقع کسی شخص کے دل میں دعوت کی دُھن ہو تو کیسی خوبصورتی سے وہ گفتگو کا رُخ اپنی دعوت کی طرف پھیر لیتا ہے، یہیں سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے جیل کی زندگی کس طرح گزاری ہوگی۔ پوری زندگی دعوت کے لیے ان تھک محنت میں گزاری جو صرف میرا قیاس نہیں ہے بلکہ قرآن کا مدلول بھی ہے کہ جس شخص کی تبلیغ دین کی دُھن کا یہ حال ہے کہ دو آدمی خواب کی تعبیر دریافت کرتے ہیں وہ اس موقع سے فائدہ اُٹھا کر دعوت کا کام شروع کر دیتا ہے۔ اس سے یہ کیسے توقع کی جا سکتی ہے کہ جیل کی ساری زندگی خاموشی سے گزار دی ہوگی۔

(۳۸) عبادت صرف اللہ کی کرو

فیصلہ اللہ کے سوا کسی کا نہیں اس کا حکم یہ ہے کہ اللہ سبحانہٗ کے سوا کسی سے عابدانہ تعلقات نہ رکھو۔ یعنی قدیم سے انبیاء علیہم السلام کی زبانی یہی حکم پہنچتا رہا کہ اللہ سبحانہٗ کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔

وسئل من ارسلنا من قبلك من رسلنا
اجعلنا من دون الرحمن الهة يعبدون

اور دریافت کر لیجئے ان لوگوں سے جن کو ہم نے آپ سے پہلے روانہ کیا ہے۔ کہ کیا ہم نے ان کے لیے اللہ سے ورے کوئی معبود مقرر کیئے ہیں جن سے

عابدانہ تعلقات قائم کیئے جائیں ۔ لہ

آئیت کے مطالب پر تبصرہ سے پہلے شارحین قرآن نے اس نکتے پر بحث چھیڑ دی ہے کہ ان دو فقروں ان الحکم الا للہ اور دُوسرے فقرے ۔ امر ان لا تعبدوا الا ایاہ ۔ میں باہم تعلق کی نوعیت کیا ہے ۔ زیادہ تفصیلی گفتگو علامہ آلوسیؒ نے روح المعانی میں فرمائی ۔ فرماتے ہیں کہ دوسرا جُملہ استیناف ہے اور ایک اُٹھتے ہوئے سوال کا جواب ہے ۔ ان الحکم الا للہ پڑھنے کے بعد یہ سوال خود بخود اُبھر آتا ہے کہ اللہ سبحانہ کا عبادت کے بارے میں کیا حکم ہے جواب میں ارشاد ہوا ہے کہ امر ان لا تعبدوا الا ایاہ ۔ اللہ کا حکم یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ کی کی جائے اس کے سوا کسی کی نہ کیجائے ۔ عابدانہ تعلقات صرف اللہ کے ساتھ ہونے چاہئیں اسی سے حاجتوں میں دعا مانگنی چاہیئے اسی کیلئے عجز و نیاز کی خاطر رکوع و سجود ہونا چاہیئے صرف اسی کو اپنی توجہات کا مرکز بنانا چاہیئے نہ فرشتے کو ۔ نہ بادشاہوں میں سے کسی بادشاہ کو نہ معتبدین میں سے کسی کاھن سے نہ سورج سے نہ چاند نہ ستارے سے نہ درخت سے اور نہ کسی مقدس نہر سے سب سے کٹ کر اور سب سے ہٹ کر صرف اللہ کی عبادت کرنی چاہیئے ۔

کچھ کی رائے میں امر ان لا تعبدوا الا ایاہ موقع تعلیل میں ہے پُوری بات یوں ہے کہ چونکہ عبادت کے موضوع پر اللہ کا فیصلہ یہ ہے کہ عبادت صرف اللہ کی ہونی چاہیئے یا اس کی جس کی عبادت کا اللہ حکم دے ، اللہ کسی کی عبادت کا اپنے سوا حکم نہیں دیتا ہے کیونکہ اس کا حکم یہی ہے کہ صرف اس کی عبادت کی جائے لیکن یہ بات تشریح قرآن میں کچھ بے وزن سی ہے کچھ شارحین قرآن نے ما انزل اللہ سے لے کر امر ان لا تعبدوا الا ایاہ تک مشرکانہ ذھن کی تردید کا حسین شاھکار قرار دیا ہے ۔ اشتراکی ذھن اگر یہ کہے کہ شرک کے موضوع پر اللہ سبحانہ نے حجت و دلیل آتاری ہے تو ما انزل اللہ بھا الخ سے اس مشرکانہ ذھن کو جواب دیا ہے اور اگر یہ کہے کہ ہمارے بڑے کرتے رہتے ہیں اور انہوں نے ہمیں ایسا کرنے کا حکم دیا ہے اس کی تردید میں فرمایا ان الحکم الا للہ اگر اشتراکی ذھن بھی یہ بات بتلائے کہ یہ ٹھیک ہے کہ اس موضوع پر کوئی حجت اللہ کی جانب سے نازل نہیں ہوئی اور یہ بھی درست ہے کہ اس

لہ افادات شیخ الاسلام

موضوع پر اللہ کے سوا کسی کو یارائے سخن نہیں ہے مگر اللہ کی جانب سے کسی حجت کا نازل نہ ہونا اس بات کی غمازی کر رہا ہے کہ ایسا کرنا منع نہیں ہے اس کے جواب میں فرمایا امران لا تعبدوا الا ایاہ اس ترتیب سے اشتراکی ذہن کی ساری راہوں پر اللہ سبحانہ نے قدغن قائم کر دی۔

(۳۹) دائمی اور واضح دین

یہی پائیدار اور صاف دین ہے لیکن اکثر لوگوں کو اس کا علم نہیں ہے۔ یعنی توحید خالص کے راستہ میں کوئی ایچ پیچ نہیں سیدھی اور صاف سڑک ہے جس پر چل کر آدمی بے کھٹکے خدا تک پہنچتا ہے لیکن بہت سے لوگ حماقت یا تعصب سے ایسی سیدھی بات کو بھی نہیں سمجھتے[لہ] مطلب یہ ہے کہ یہی راہ عمل تمام انسانوں کے لیے اللہ سبحانہ کا ٹھہرایا ہوا دین ہے۔ یعنی سیدھا اور درست دین جس میں کسی طرح کی کجی اور خامی نہیں ہے۔ یہی دین حنیف ہے جس کی دعوت حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دی تھی۔ اسی کا نام قرآن کی زبان میں اسلام ہے۔ یعنی اللہ کے ٹھہرائے ہوئے قوانین کی فرماں برداری۔ اس کے سوا جو کچھ بنا لیا گیا ہے وہ انسان کی فکری گمراہی کی جولانیاں ہیں۔ ہر طرح کی عبادت اور نیاز کی مستحق صرف اللہ کی ذات ہے، عابدانہ عجز و نیاز کے ساتھ کسی کے سامنے سر جھکانے سے توحید کا اعتقاد درہم برہم ہو جاتا ہے۔ صرف اس کی ذات پکار سنتی اور دعائیں قبول کرتی ہے۔ دعاؤں اور طلبگاریوں میں کسی دوسرے کو شریک کرنا اللہ کی خدائی میں شریک کرنا ہے۔ اگر آپ دعا و استعانت، نذر و نیاز ذکر و درود رکوع و سجود اعتماد و توکل اور اس قسم کے تمام عبادات گزارانہ اور نیازمندانہ اعمال میں اللہ سے رشتہ قائم رکھیں تو یہی دین قیم ہے، اتنی موٹی سی بات لوگوں کی سمجھ میں نہیں آتی،

لہ افادات شیخ الاسلام

يٰصَاحِبَيِ السِّجْنِ اَمَّآ
اَحَدُكُمَا فَيَسْقِيْ رَبَّهٗ خَمْرًا ۚ وَاَمَّا الْاٰخَرُ فَيُصْلَبُ فَتَاْكُلُ
الطَّيْرُ مِنْ رَّاْسِهٖ ۭ قُضِيَ الْاَمْرُ الَّذِيْ فِيْهِ تَسْتَفْتِيٰنِ ۝۴۱
وَقَالَ لِلَّذِيْ ظَنَّ اَنَّهٗ نَاجٍ مِّنْهُمَا اذْكُرْنِيْ عِنْدَ رَبِّكَ ۡ
فَاَنْسٰىهُ الشَّيْطٰنُ ذِكْرَ رَبِّهٖ فَلَبِثَ فِي السِّجْنِ بِضْعَ
سِنِيْنَ ۝۴۲ ع ۵

اے جیل کے ساتھیو! (تمہارے خوابوں کی تعبیر یہ ہے کہ تم دونوں میں سے ایک (وہ جس نے خواب میں انگور نچوڑتے دیکھا ہے وہ رہا ہو گا اور بدستور سابق) اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور دوسرا آدمی (وہ جس نے سر پر روٹی دیکھی ہے) تو وہ سُولی چڑھایا جائے گا اور پرندہ اس کا سَر نوچ نوچ کر کھائیں گے جس بات کے بارے میں تم پُوچھ رہے ہو وہ فیصل ہو چکی ہے اور فیصلہ یہی ہے [۱] اور حضرت یوسف علیہ السلام نے جس شخص کے بارے میں سمجھا تھا کہ بچ جائے گا اس سے کہا کہ اپنے آقا کے پاس

جب جاؤ وہاں میرا ذکر کرنا [۲] لیکن رہائی کے بعد شیطان نے اُسے یہ بات بھلا دی کہ اپنے آقا کے رُو برو حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرے لہٰذا حضرت یوسف علیہ السلام کئی سال تک جیل کی زندگی گزارتے رہے [۳]

مفردات کے معانی

خمر شراب انگوری، اصل میں تو انگور کے کچّے پانی کا نام ہے جبکہ وہ نشہ آور ہو۔ لیکن مجازاً ہر نشیلی شراب کو خمر کہتے ہیں۔ علامہ مرتضیٰ زبیدی تاج العروس میں رقم طراز ہیں۔

یہ جان لینا چاہیئے کہ آئمہ لغت کا اس پر اتفاق ہے کہ انگور کے کچّے پانی کا نام جب کہ وہ نشہ آور ہو خمر ہے حقیقت میں تا آنکہ خمر کا استعمال اس میں مشہور ہے لیکن دوسری شرابوں میں جو مختلف ناموں سے موسوم ہیں خمر کا استعمال مجازاً ہے۔ خمر یا تو اخمار سے بنا ہے جس کے معنیٰ خمیر اُٹھنے کے ہیں چونکہ خمر میں بھی خمیر اُٹھ کر جوش پیدا ہوتا ہے اور جھاگ آنے لگتے ہیں اس لیے اس کا نام خمر ہو گیا۔ اور مخامرہ سے خمیر بنا ہے جس کے معنیٰ چھپا لینے کے ہیں اسی لیے خمار اوڑھنی کو کہتے ہیں۔ چونکہ یہ وسواس کو گم کر دیتی ہے۔ اور عقل پر پردہ ڈال دیتی ہے اس لیے اسے خمر کہا گیا۔ ابو عبید نے ضحاک تابعی سے اعصر خمرا کی تفسیر میں یہ بات بتائی ہے کہ خمر اہل عمان کی زبان میں انگور کو کہتے ہیں۔ طیر پرندے، پرندہ، علامہ احمد فیوحی المصباح المنیر میں رقم طراز ہیں۔ طائر کی جمع طیر ہے جیسے کہ صاحب اور صحب راکب اور رکب اور طیر کی جمع طیور اور اطیار بھی آتی ہے۔ ابو عبیدہ اور قطرب کی رائے ہے کہ طیر واحد اور جمع دونوں کے لیے آتا ہے اور ابن الانباری نے کہا ہے کہ طیر جمع ہی ہے اور اس کی تانیث بہ نسبت تذکیر کے زیادہ استعمال ہے اور واحد کے لیے طیر نہیں بلکہ طائر آتا ہے۔ اس آیت میں بہر حال جمع ہے خواہ طائر کی

جمع ہے یا طیر خود ہی جمع ہے لیکن فیکون طیرا باذن اللہ میں طیر واحد کے لیے استعمال ہوا اس سے ابو عبیدا ور قطرب کے بیان کی تائید ہوتی ہے۔
بضع، چند، کئی دس سے جو کم کردیا جائے بضع کہلاتا ہے۔ کچھ کی رائے میں تین سے لے کر نو تک بضع میں داخل ہے۔ یہاں حضرت یوسف علیہ السلام کے ذکر میں جو بضع سنین آیا ہے اس کے متعلق اکثر مفسرین سات برس کی مدت بتاتے ہیں اور سورہ روم میں دس سال سے کم کی مدت مراد ہے:

جیل کے دونوں ساتھیوں کے خواب کی تعبیر

دونوں قید کے ساتھیوں کو دونوں کے خوابوں کی تعبیر نہیں بتائی جارہی ہے بلکہ ان کو سُنایا جارہا ہے کہ یہ صرف تعبیر ہی نہیں ہے بلکہ قضی الامر الذی فیہ تستفتیان تمہارے دونوں کے بارے میں فیصلہ ہی ہے کہ تم میں سے ایک تو شاہِ مصر کو شراب پلائے گا اور دوسرے کو سولی پر چڑھایا جائے گا۔ اور پرندے اس کا سر نوچ کر کھائیں گے۔ یہ گویا ان کے ذہنوں میں اُٹھے ہوئے سوال کا جواب ہے، اس معاملہ میں وسوسوں کا شکار نہ ہو جو کچھ بتارہا ہوں وہ ہو کر رہنا ہے، یہاں سے پتہ لگتا ہے کہ دعوتِ حق کا فرض کیسے انجام دینا چاہیئے۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو قید خانے کی زندگی بھی ادا فرض دعوت سے مانع نہ ہوئی۔ اس حالت میں بھی فکر اس کی نہ تھی کہ قید سے رہائی کیسے ہو مہلت جب ملی دعوت ہی کے کام میں لائی گئی۔ اور جس طرح اس آدمی کی ہدایت میں جلدی کی جو ابھی عرصہ دراز تک قید حیات میں رہنے والا تھا۔ اسی طرح اس شخص کو راہِ حق دکھانے میں بھی دیر نہ کی جس کے ارد گرد موت منڈلا رہی تھی۔ کیونکہ ہدایت پانا ہر انسان کا حق ہے دعوت کا معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہو جاتا بلکہ حضرت یوسف علیہ السلام کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک کلمۂ حق پہنچا سکتے ہیں پہنچا دیں جونہی یہ بات معلوم ہوئی کہ ایک آدمی بادشاہ کے ساقیوں کا سردار ہے اور پھر اسی منصب پر سرفراز ہونے والا ہے یکبارگی انہوں نے فیصلہ کرلیا کہ ایسے آدمی کو جو خلوت وجلوت میں بادشاہ کے حضور رہنے والا ہے کتنا اچھا موقع حاصل ہوگا کہ پیامِ حق بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دے۔ چنانچہ خواب کی تعبیر بیان کرنے کے بعد اس سے فرمایا اذکرنی عند ربک۔ یعنی اپنے آقا کے پاس جاؤ تو

میری اس تعلیم و دعوت کو یاد رکھیو ممکن ہے کہ پیام حق کام کر جائے۔

یہ بات بھی صاف ہو گئی کہ قیدیوں کا خواب سُن کر آپ نے فوراً تعبیر کیوں بیان نہیں کی۔ تاخیر قصداً کی گئی اور اس خیال سے کی تھی کہ تعبیر کی احتیاج ان دونوں کو میری طرف متوجہ کر دیا ہے۔ ضرورت ہے کہ اس توجہ سے فائدہ اٹھایا جائے اور دینِ حق کی دعوت دی جائے۔ چنانچہ اس کا ذکر اسی مناسبت سے شروع کر دیا۔ ذالکما مما علمنی ربی انی ترکت ملة قوم لا یومنون باللہ وھم بالاخرة ھم کافرون یعنی خواب کی تعبیر میں جلدی بتاؤں گا کیونکہ اللہ سبحانہ نے مجھے اس کا علم دیا ہے۔ لیکن پہلے یہ سمجھو کہ میرے علم کا سرچشمہ کیا ہے اس طرح بات سے بات نکالتے ہوئے دینِ حق کی دعوت شروع کی۔

یا صاحبی السجن أأرباب متفرقون الخ

(۱) اے جیل کے ساتھیو! تمہارے خواب کی تعبیر یہ ہے کہ تم دونوں میں سے ایک جس نے خواب میں انگور نچوڑتے دیکھا ہے وہ رہا ہو گا اور بدستور سابق اپنے آقا کو شراب پلائے گا اور دوسرا آدمی جس نے سر پر روٹی دیکھی ہے وہ سولی پر چڑھایا جائے گا۔ اور پرند اس کا سر نوچ نوچ کر کھائیں گے۔ جس بات کے بارے میں تم پوچھ رہے ہو وہ فیصل ہو چکی ہے۔ اور فیصلہ یہی ہے۔ فرض تبلیغ ادا کرنے کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام نے ان کے خوابوں کی تعبیر بیان فرمائی کہ جس نے خواب میں شراب پلاتے دیکھا ہے اس کی تعبیر یہی ہے کہ وہ بیداری میں بادشاہ کو شراب پلائے گا۔ اور جس نے سر پر سے جانوروں کو روٹیاں کھاتے دیکھا ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ سولی چڑھایا جائے گا پھر جانور اس کے سر سے نوچ نوچ کر کھائیں گے قضا و قدر کا فیصلہ یہی ہے جو کسی سے ٹل نہیں سکتا۔ جو بات تم پوچھتے تھے وہ میں نے بتلا دی یہ بالکل طے شدہ امر ہے جس میں تخلف نہیں ہو سکتا چنانچہ ایسا ہی ہوا ساقی زہر خورانی کی تہمت سے بری ہو گیا اور خباز نان بائی کو جرم ثابت ہونے کی وجہ سے سزائے موت ہو گئی[۱] اس آیت میں فقرہ قضی الامر الذی فیہ تستفتیان۔ شارحین قرآن میں بہت

---

[۱] افادات شیخ الاسلام

بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ منقول اور معقول دونوں راہوں سے اُسے موضوع بحث بنایا گیا ہے کچھ نے اس فقرے کی ماثور تفسیر یہ بتائی ہے یہ تفسیر حافظ ابن کثیر نے ابراہیم بن عبداللہ اور عبداللہ بن مسعودؓ سے نقل کی ہے امام مجاہد اور عبدالرحمٰن بن زید بن اسلم کے حوالہ سے اس کی تائید کی ہے حافظ ابن کثیر کی تصریح کے مطابق اس کا خلاصہ یہ ہے کہ جو شخص جھوٹا خواب بیان کرکے تعبیر دریافت کرے تو تعبیر کے ذریعے خواب کا نتیجہ ناگزیر ہو جائے گا۔ ابراہیم کے حوالہ سے یہ بھی بتایا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے سامنے جب دونوں خواب بیان کر چکے اور حضرت یوسف علیہ السلام نے تعبیر بتائی تو دونوں بول پڑے کہ ہم نے خواب میں کچھ بھی نہیں دیکھا۔ اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ جو کچھ ہونا تھا ہو چکا یہی فیصلہ ہے خواب دیکھا ہو یا نہ دیکھا ہو فیصلہ یہی ہے۔ لیکن ابن کثیر کی یہ روایات تاریخی اعتبار سے ضعیف ہیں۔ اس لیے ان کی بنیاد پر آیت کی تشریح نہیں ہو سکتی۔ دوسرے شارحین قرآن نے بھی یہاں داد تحقیق دی ہے لیکن اصل بات یہ ہے کہ یہ فقرہ قضی الامر الذی فیہ تستفتیان۔ خواب کی تعبیر نہیں بلکہ تعبیر سے زائد بات ہے۔ یہ فقرہ دراصل استیناف بیان ہے۔ مخاطبوں کے ذہنوں میں اُٹھے ہوئے سوالوں کا جواب ہے۔ تعبیر سُن کر ان کے ذہنوں میں یہ سوال اُٹھا کہ کیا اس میں واقعیت ہے یا وقتی بات ہے، ممکن ہے کہ ایسا نہ ہو اور اگر ہو تو پتہ نہیں کب ہو۔ اسی سوال کے جواب میں حضرت یوسف علیہ السلام نے بذریعہ وحی معلوم کرکے بتایا۔ قضی الامر الذی الخ تاکہ مخاطبوں کو حضرت یوسف علیہ السلام کے علم پر بھرپور یقین واعتماد ہو جائے مطلب یہ ہے کہ وحی کے ذریعے معلوم کرکے بتایا کہ تم دونوں کے بارے میں فیصلہ ہو چکا ہے۔ مشہور مفسر قرآن ابوحیان اندلسی نے اسی تشریح کو اپنایا ہے فرماتے ہیں۔ پھر حضرت یوسف علیہ السلام نے ان دونوں کو اللہ کی جانب سے آئے ہوئے غیبی علم کے ذریعے بتایا کہ اس معاملہ کا فیصلہ ہو چکا ہے انجام یہی ہے اس کے سوا کچھ نہیں ہے۔

(۲) پیامِ حق بادشاہ تک

اور حضرت یوسف نے جس شخص کے بارے میں سمجھا تھا کہ بچ جائے گا اس سے

کہا کہ اپنے آقا کے پاس وہاں میرا ذکر کرنا یہاں ظن یقین کے معنیٰ میں ہے۔ جیسے الذین یظنون انھم ملاقو ربھم میں، یعنی یوسف علیہ السلام کو دونوں میں سے جس شخص کی بابت یقین تھا کہ بری ہو جائے گا۔ جب وہ قید خانے سے نکلا تو فرمایا کہ اپنے بادشاہ کی خدمت میں میرا بھی ذکر کرنا کہ ایک ایسا شخص بے قصور قید خانے میں برسوں سے پڑا ہے۔ مبالغہ کی ضرورت نہیں میری جو حالت تم نے دیکھی ہے۔ بے کم و کاست بیان کر دینا [1]

عام شارحین قرآن کا خیال ہے کہ اذکرنی عند ربک کے ذریعے حضرت یوسف علیہ السلام اپنی رہائی کی تدبیر فرما رہے ہیں۔ مگر سوچنے کی بات یہ ہے کہ معصیت کے مقابلہ میں جیل جانے کی دعا تو حضرت یوسف علیہ السلام نے جناب الٰہی میں کی رب السجن احب الی مما یدعوننی الیہ۔ اور جیل سے رہائی کے لیے رہا ہو کر جانے والے قیدی کو سہارا بنا رہے ہیں۔

یہ بات مقام نبوت کے مناسب نہیں ہے۔ اگرچہ کرنے والوں نے اس کی تاویل کی ہے۔ کہ کسی جائز مقصد کے لیے جائز تدابیر و وسائل کا اختیار کرنا توکل اور اعتماد علی اللہ کے منافی نہیں ہے۔

توکل کے منافی یہ ہے کہ آدمی حالات سے دل برداشتہ ہو کر نا جائز تدابیر کے اختیار کرنے پر اُتر آئے۔ اور اس داستان کو مضبوط بنانے کے لیے ایک ارشاد نبوت کا بھی سہارا لیا ہے۔ حافظ ابن جریر نے تفسیر میں حضرت عبداللہ بن عباس کے حوالہ سے لکھا ہے کہ۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام وہ بات نہ کہتے جو انہوں نے فرمائی تو جیل میں اس قدر عرصہ نہ ٹھہرتے وہ اللہ کے علاوہ دوسروں کا سہارا رہائی کیلئے تلاش کر رہے تھے، اس حدیث کے بارے میں حافظ ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ حدیث بیحد کمزور ہے اس کی روایتی حیثیت سفیان بن وکیع کی وجہ سے داغدار ہے اور ابراھیم بن یزید سفیان سے بھی ضعیف ہے۔ میرے خیال میں یہ معاملہ ہی دوسرا ہے۔ قید کی زندگی میں حضرت یوسف علیہ السلام کو اس کی فکر نہ تھی کہ میں قید سے رہائی کیونکہ پاؤں بلکہ تمام تر

---

[1] افادات شیخ الاسلام

اس کی فکر تھی کہ اللہ کے بندے جہل و گمراہی سے نجات کیسے پائیں مہلت جب کبھی ملی اور جس حال میں ملی اسی مقصد کے لیے کام میں لائی گئی اور جس طرح اس آدمی کی ہدایت میں جلدی کی جو ابھی مدتوں زندہ رہنے والا تھا اسی طرح اس کی ہدایت کے لیے بھی صبر نہ کرسکے جس کے سر پر اجل کی تلوار لٹک رہی تھی۔ معاملہ صرف یہیں ختم نہیں ہوتا بلکہ حتی الوسع کوشش کرتے ہیں کہ جہاں تک پیغام حق پہنچا سکتے ہیں پہنچا دیں جونہی یہ بات معلوم ہوئی کہ ان میں سے ایک آدمی بادشاہ کے ساقیوں کا سردار ہے۔ اور پھر اسی منصب پر مامور ہونے والا ہے معاً ان کا ذہن اس طرف چلا گیا کہ ایسا آدمی جو خلوت و جلوت میں بادشاہ کے حضور رہنے والا ہے کتنا اچھا موقعہ ہوگا کہ پیام حق بادشاہ کے کانوں تک پہنچ جائے، چنانچہ تعبیر بیان کرنے کے بعد اس سے فرمایا۔ اذكرني عند ربك۔ اپنے آقا کے پاس جائیو تو مجھے یاد رکھیو یعنی میری یہ تعلیم و دعوت یاد رکھیو اور اپنے آقا سے بعنوان مناسبت اس کا تذکرہ کرنا۔ ممکن ہے کہ پیامِ حق کام کر جائے۔ عام طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے اس قول کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی رہائی کے لیے کہا تھا یعنی اپنے آقا سے میری سفارش کرنا لیکن جس محل میں یہ بات کی گئی ہے۔ اس سے اس کی تائید نہیں ہوتی ہے قیدیوں سے جو کچھ بھی ان کی گفتگو ہوئی ہے وہ یا تو تعبیر کے بارے میں ہے یا دینِ حق کے بارے میں ہے اس کا دور کا بھی کوئی اشارہ نہیں ہے، کہ انہوں نے اپنے قید و محن کے مصائب کا ذکر کیا ہو۔ پس مطلب یہی ہے کہ تم نے جو کچھ یہاں دیکھا سنا اور توحید کا جو علم تم نے حاصل کیا اور تعبیر رؤیا کا جو حال ہوا اور کھانا آنے سے پہلے کھانے کی خبر اور اپنی قید کے بارے میں میرا فیصلہ ضرور ذکر کرنا، یہی بات حضرت یوسف علیہ السلام کے مقامِ نبوت کے مناسب ہے۔ علامہ ابوحیان اُندلسی نے بھی البحر المحیط میں اسی مطلب کو اپنا مختار اور پسندیدہ قرار دیا ہے۔ فرماتے ہیں میرے نزدیک مختار اور پسندیدہ بات یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے بادشاہ کے ساقی سے فرمایا کہ اپنے آقا سے میرا ذکر کرنا تا کہ میرا ذکر اس کی ہدایت اور ایمان باللہ کا ذریعہ بن جائے جیسے دونوں قیدیوں ساقی اور نان بائی کے لیے حق کی رونمائی کا ذریعہ بنا ہے بات واضح اور صاف ہے کہ میرے مقام نبوت میری دعوت۔ میرے معجزات وحی کے ذریعے میری بتائی ہوئی باتیں بادشاہ سے کرنا شاید اس راہ سے بادشاہ کا قلب اس طرف مائل ہو جائے اور راہ حق کو

قبول کرے یہی بات علامہ بقاعی نے اپنی تفسیر نظم الدرر میں بھی لکھی ہے کہ اپنے آقا بادشاہِ مصر سے جو کچھ تم نے میرے عالی اخلاق پاکیزگی سیرت دیکھی ہے اُسے بیان کرنا:

۳ ساقی اور حضرت یوسف علیہ السلام کی دعوت

لیکن رہائی کے بعد شیطان نے اُسے یہ بات بھلا دی کہ اپنے آقا کے رُوبرو حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرے لہٰذا یوسف علیہ السلام کئی سال تک جیل کی زندگی گزارتے رہے یعنی شیطان نے چھوٹنے والے قیدی کے دل میں مختلف خیالات و وساوس ڈال کر ایسا غافل کیا کہ اُسے بادشاہ کے سامنے اپنے محسن بزرگ یوسف علیہ السلام کا تذکرہ کرنا بھی یاد نہیں رہا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کئی سال اور قید میں رہنا پڑا بمدت دراز کے بعد جب بادشاہ نے ایک خواب دیکھا اور اس کی تعبیر کسی کی سمجھ میں نہ آئی تب اس شخص کو یوسف علیہ السلام یاد آئے جیسا کہ آگے آتا ہے۔ وقال الذی نجا منهما وادّکر بعد اُمّة ۔ بھلانے کی نسبت شیطان کی طرف اس لیے کی گئی وہ القائے وساوس کا ذریعہ ہے جو نسیان کا سبب ہوتا ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے رفیق سفر نے کہا تھا۔

وما انسانيه الا الشيطان ان اذكره

لیکن ہر ایک شر میں حق تعالیٰ شانہ' خیر کا پہلو رکھ دیتے ہیں۔ یہاں بھی گو اس نسیان کا نتیجہ طویل قید کی صورت میں ہے تاہم حضرت شاہ صاحب کی نکتہ آفرینی کے موافق اس میں یہ تنبیہ ہوگی کہ پیغمبر کا دل ظاہری اسباب پر نہ ٹھہرنا چاہیئے بلکہ ابن جریر اور بغوی وغیرہ نے بعض سلف سے نقل کیا ہے کہ وہ فانساه الشيطان ذكر ربه کی ضمیر یوسف علیہ السلام کی طرف راجع کرتے ہیں۔ گویا اذكرنی عند ربك کہنا ایک طرح کی غفلت تھی جو حضرت یوسف علیہ السلام کو عارض ہوئی انہوں نے قیدی کو کہا کہ اپنے رب سے میرا ذکر کرنا۔ حالانکہ چاہیئے تھا کہ سب ظاہری سہارے چھوڑ کر اپنے ربّ سے فریاد کرتے۔ بے شک کشف شدائد کے وقت مخلوق سے ظاہری استعانت اور اسباب کی مباشرت حرام نہیں ہے لیکن ابرار کی حسنات مقربین کی سیئات بن جاتی ہیں۔ جو بات عامۃ الناس بے کھٹکے کر سکتے ہیں۔ انبیاء علیہم السلام کے منصب عالی کے اعتبار سے وہی بات ایک قسم کی تقصیر بن جاتی

ہے۔ امتحان و ابتلاء کے موقع پر انبیاء کی شان رفیع اسی کو مقتضی ہے کہ رخصت پر نظر نہ کریں۔ انتہائی عزیمت کی راہ چلیں چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کا اذکرنی عند ربک کہنا خلاف عزیمت تھا۔ عتاب آمیز تنبیہ ہوئی کہ کئی سال تک مزید قید اُٹھانی پڑی اسی لیے الانساء کی نسبت شیطان کی طرف کی گئی واللہ اعلم بالصواب زیادہ تفصیل رُوح میں ہے [1]

شارحین قرآن نے اس آیت کی تشریح میں جو دو راہیں اپنائی ہیں شیخ الاسلام نے دونوں ہی حسین طریقے پر پیش کر دی ہیں۔

ایک تو یہ کہ ساقی کو بادشاہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کا تذکرہ کرنا یاد نہ رہا اور شیطان کا وسوسہ اس کا سبب بنا اس وجہ سے حضرت یوسف علیہ السلام کو جیل میں ایک عرصہ رہنا پڑا۔ قرآن سے اس کی تائید ہوتی ہے۔

وادکر بعد امۃ میں یہ تصریح ہے کہ ساقی کو ایک عرصہ کے بعد حضرت یوسف علیہ السلام کا تذکرہ کرنا یاد آیا۔ یہ بات کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے رہا ہونے والے قیدی سے کیا کہا تھا اور اذکرنی عند ربک کے ذریعے وہ قیدی سے کیا کہہ رہے تھے۔ عام شارحین قرآن کہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے یہ بات قیدی سے اپنی رہائی کے بارے میں کہی۔ لیکن قرآن کے سیاق و سباق سے اس کی تائید نہیں ہوتی۔ سیاق میں اس کا اشارہ بھی موجود نہیں ہے۔ قیدیوں سے ان کی جو کچھ گفتگو ہوئی ہے یا تو تعبیر کے بارے میں ہے یا دین حق کی دعوت کے بارے میں۔ اس کا کوئی اشارہ نہیں پایا جاتا کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے اپنے قید و محن کے مصائب کا ذکر کیا ہو۔ اذکرنی عند ربک موقعہ و محل کے اعتبار سے مطلب بھی موزوں معلوم ہوتا ہے کہ اپنے آقا کے پاس جاؤ تو میری اس دعوت و تعلیم کو ضرور یاد رکھنا اور اپنے آقا سے بعنوان مناسب اس کا تذکرہ کر دینا ممکن ہے کہ پیام حق کام کر جائے۔

عام طور پر حضرت یوسف علیہ السلام کے اس ارشاد کا مطلب یہ سمجھا گیا ہے کہ انہوں نے اپنی رہائی کے لیے کہا تھا یعنی اپنے آقا سے موقعہ ملنے پر میری رہائی کی سفارش

---

[1] افادات شیخ الاسلام

کرنا۔ لیکن جس موقع و محل پر یہ بات فرمائی گئی ہے اس سے اس کی تائید نہیں ہوتی قیدیوں سے اُن کی جو گفتگو ہوئی ہے یا تو تعبیر کے بارے میں ہے یا دین حق کی دعوت کے موضوع پر ہے۔ اس کا کوئی اشارہ نہیں ملتا کہ انہوں نے اپنی قید کے مصائب کا کوئی ذکر کیا ہو۔ لہٰذا اس کا مطلب وہی موزوں اور مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام نے رہا ہونے والے قیدی سے کہا کہ پیامِ حق بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دے اور بس۔

کچھ شارحین قرآن نے فأنساه الشیطان ذکر ربه کی تشریح اس طرح کی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو شیطان نے اللہ تعالیٰ کی یاد سے غافل کر دیا اور انہوں نے ایک بندے سے چاہا کہ وہ بادشاہ سے ان کا ذکر کرے رہائی کی کوشش کرے اس لیے اللہ سبحانہٗ نے ان کو یہ سزا دی کہ وہ کئی سال تک جیل میں رہے۔ یہ تفسیر بالکل مہمل ہے۔ صحیح یہی ہے جیسا کہ حافظ ابن کثیر اور متقدمین سے مجاہد اور محمد بن اسحاق نے بتائی ہے کہ فأنساه الشیطان ذکر ربه میں ضمیر کا مرجع رہائی پانے والا قیدی ہے نہ کہ حضرت یوسف علیہ السلام اور آیت کے معنیٰ یہ ہیں کہ شیطان نے رہائی پانے والے قیدی کو اپنے آقا سے حضرت یوسف علیہ السلام کا ذکر کرنا بھلا دیا، یہ تشریح ظاہر قرآن کے خلاف ہے کیونکہ اوّلاً فانساه الشیطان کی تفریع الذی ظن انه ناج پر ہے تفریع بتلاتی ہے کہ شیطان کے انساء کا عمل بطور نتیجہ اس کہنے کے بعد ہوا ورنہ اس سے پہلے حضرت یوسف علیہ السلام کو اللہ سبحانہٗ یاد تھے۔ اگر ان کا یہ کہنا کہ اذکرنی عند ربك قابل سزا جرم ہوتا تو تعبیر یوں ہوتی۔ وقد انساه الشیطان ذکر ربه۔

ثانیاً یہ بات حضرت یوسفؑ نے قانون اسباب کے تحت فرمائی ہے۔ کیونکہ آپکی رہائی بادشاہ کے حکم سے ہوئی اور بادشاہ نے رہائی کا حکم رہا ہونے والے قیدی کی زبان سے داستان سُننے کے بعد دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے پیش افتادہ کے حالات سے جو نقاب کشائی فرمائی ہے۔ اس کا تعلق علمِ نبوت سے ہے۔ اور آپ نے یہ بات اللہ تعالیٰ کو یاد کر کے ہی فرمائی ہے یہی منصب نبوت کا تقاضا ہے۔ اس پر کسی سزا کا ترتب ناقابلِ فہم ہے۔

ثالثاً یہ کہنا بالکل بے جان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو اس وقت تو اللہ یاد تھا۔ جب رہا ہونے والے قیدی سے بات کر رہے تھے۔ لیکن اس کے بعد آپ کو اللہ تعالیٰ یاد نہ رہا۔ کیونکہ یہ خیال نبی کی ذات پر ایک اتہام ہے یہ بات تو

ایک معمولی ایمان سے مالا مال مومن کی شان کے خلاف ہے چہ جائے کہ پیغمبر۔
اس کی تردید خود قرآن کر رہا ہے۔ قرآن کا اعلان ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام محسنین میں سے ہیں اللہ سبحانہ، کے منتخب بندوں میں سے ہیں اور واللّٰہ غالب علیٰ امرہٖ حضرت یوسف علیہ السلام کے سارے معاملے کی باگ ڈور اللہ کے قبضے میں ہے اللہ تعالیٰ نے ان کو صرف سوءٔ اور فحشا سے محفوظ نہیں رکھا بلکہ سوءٔ اور فحشا کو ان کے راستہ ہی سے ہٹا دیا ہے ان حالات میں عقلِ انسانی یہ باور نہیں کرتی ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اللہ سبحانہ، کو بھول گئے ہوں اور اس بھول کے نتیجے میں سات سال جیل میں رہے ہیں۔
فانا للّٰہ والی اللّٰہ المشتکی

رابعًا شیطان کے بارے میں اللہ سبحانہ، کا اعلان ہے۔

ان عبادی لیس لک علیھم من سلطٰن

اور خود ابلیس کا دعویٰ ہے کہ

لاغوینھم اجمعین الا عبادک منھم المخلصین

سوچنے کی بات ہے کہ قرآن نے حضرت یوسف علیہ السلام کے بارے میں یہ اعلان کیا ہے انہ من عبادنا المخلصین۔ پھر بھی اس پر اصرار کیا جا رہا ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو شیطان نے یادِ الٰہی سے بیگانہ کر دیا معاذ اللہ۔

خامسًا۔ نسیان ارادی اور اختیاری نہ ہونے کی وجہ سے قابلِ عقوبت گناہ نہیں ہے اور عقوبت بھی ایسی سنگین۔ قرآن نے محض سہو و نسیان سے جو مواخذہ اٹھایا ہے اس کا ذکر اس آیت میں ہے۔

واما ینسینک الشیطان فلا تقعد بعد الذکریٰ
مع القوم الظالمین

اور اگر شیطان تجھے بھلا دے تو یاد آجانے کے بعد ایسے ظلم کار لوگوں کے پاس نہ بیٹھ۔

امام رازی فرماتے ہیں کہ یہ آیت بتا رہی ہے کہ بھولنے والا مکلف ہی نہیں ہے۔ بات بھی پتے کی ہے کہ نسیان ارادی اور اختیاری چیز نہیں ہے اور غیر ارادی اور غیر اختیاری چیز پر کوئی مواخذہ نہیں ہے۔ بے خیالی کی وجہ سے اگر ایسا ہو جائے تو اس پر

قانونی مواخذہ نہیں ہے۔

سادساً۔ حضرت یوسف علیہ السلام کو یاد الٰہی سے غافل بنانے کے شوق میں ایک روایت کا سہارا بھی لیا گیا ہے کہ عبداللہ ابن عباسؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلّم کا ارشاد ہے کہ اگر حضرت یوسف علیہ السلام وہ بات نہ فرماتے جو انہوں نے کہہ ڈالی تو جیل میں قیدی کی حیثیت سے رُکے نہ رہتے۔ یعنی رہائی کے لیے اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر غیر اللہ کا سہارا تلاش کرنا۔ یہ روایت تاریخی اعتبار سے بے بنیاد ہے۔ حافظ ابن کثیرؒ نے اسے بے حد ضعیف قرار دیا ہے۔ ان دونوں تشریحوں میں ایک بات قدر مشترک کی حیثیت رکھتی ہے۔ چاہے بھلا دینے کا مفعول رہا ہونے والے قیدی کو قرار دیا جائے اور خواہ حضرت یوسف علیہ السلام کو۔ قدر مشترک یہ ہے کہ حضرت یوسف علیہ السلام اپنی رہائی کے جوش اور شوق میں اللہ کو بھلا بیٹھے۔ خبر نہیں کہ ان بزرگوں نے رہائی کے شوق کی کہانی کہاں سے لی ہے ورنہ حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کی فضیلت کا جو منظر قرآن پیش کر رہا ہے اس میں اس کا اشارہ تک نہیں ہے۔ غور فرمایئے جب بادشاہ مصر خواب دیکھتا ہے اور وہی رہا ہونے والا قیدی آکر یہ معاملہ حضرت یوسف علیہ السلام کو سناتا ہے۔ دنیا کا ہر انسان ایسے موقعہ پر کیا کرتا ہے۔ دُنیا کا ہر وہ قیدی کیا کرتا ہے جسے بغیر کسی جُرم اور گناہ کے جیل میں قیدی بنا دیا گیا ہو اور سالہا سال سے اس حالت میں بے یار و مددگار پڑا ہو یقیناً اُسے تائید غیبی سمجھ کر فوراً کہتا کہ میں یہ مشکل ضرور حل کر دوں گا مگر مجھے رہائی کا موقعہ دیا جائے وہ کہتا کہ پہلے رہائی پھر خواب کی تعبیر مگر آپ قرآن میں پڑھ رہے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کی جانب سے کوئی اس طرح کی خواہش کا اظہار نہیں کیا گیا۔ انہوں نے خواب سُنتے ہی اس کی تعبیر بیان کر دی۔ اس کا خیال بھی نہیں آیا کہ اپنی رہائی کی بات کریں۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ دُنیا نے ان کے ساتھ کچھ بھی کیا ہو وہ دُنیا کی ہدایت کے سوا اپنے پیش نظر کوئی مقصد نہ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنا فرض ادا کیا اور دستگیری کی۔ اگر نہ کرتے تو داعی حق نہ ہوتے۔ ان کا بے لوث جذبہ ہدایت اس خود غرضانہ مطلب براری کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا کہ ایک انسان کی مشکل اور ضرورت مندی اپنی رہائی کا ذریعہ بنائیں۔ اسی لیے صحیحین بخاری و مُسلم کی بیان کردہ روایت میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اس واقعہ کا ذکر کرتے ہوئے حضرت یوسف علیہ السلام کے صبر و ضبط کی تعریف

کی ہے ۔اور تواضع وکسرِ نفسی کی حد تک اسے بڑھا کر اس طرح بیان فرمایا ۔

لو لبثت فی السجن ما لبث یوسف لاجبت الداعی.

اگر میں اس قدر لمبی مدت تک قید میں رہتا جس قدر یوسف علیہ السلام رہے تو بلانے والے کی دعوت کو فوراً قبول کر لیتا ۔

اسی پر بس نہیں آگے آپ پڑھیں گے کہ جب بادشاہ حضرت یوسف علیہ السلام کی ملاقات کا مشتاق ہوا تو چاہیئے تھا کہ جوشِ مسرت سے اس کا استقبال کرتے کیونکہ اب رہائی خود بخود سامنے آگئی ہے ۔لیکن حضرت یوسف علیہ السلام نے ایسا نہیں کیا اور رہائی سے صاف انکار کر دیا ۔

غور کرو کہ جس کی سیرت ایسے جوہروں سے گوندی گئی ہو اور صبر و ضبط کی عدیم النظیر قوتوں کے ساتھ خود داری اور عزتِ نفس کی روح اس میں رچی ہوئی ہو آپ اس کے بارے میں یہ سوچ بھی نہیں سکتے کہ وہ جانے والے قیدی سے اپنی رہائی کی بات کرے ۔یہ عزتِ نفس اور استقامت حق کا کیسا بلند مقام ہے ۔اور اخلاقی سیرت کی کیسی عجیب مضبوطی ہے ۔ جس میں کہیں سے کوئی لچک پڑتی دکھائی نہیں دیتی جس رُخ سے دیکھو اور جہاں کہیں دیکھو اس کی بے داغ خصوصیتیں یکساں طور پر نمایاں ہیں ۔

آیئے قرآن کے اس صاف اور بے داغ بیان کے مقابلے میں روایات کی روشنی میں حضرت یوسف علیہ السلام کا چہرہ پڑھیئے آپ کو محسوس ہوگا کہ کوئی داغ نہیں جو حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت میں آپ کو نظر نہ آئے ساری سیرت داغ داغ ہے ۔اور جمال یوسف علیہ السلام کی ساری رعنائیاں بیک جنبشِ قلم مٹا دی گئیں ۔ پڑھیئے اور داد دیجئے اس ذہن کی جس نے یہ المناک داستانیں تنہائیوں میں بیٹھ کر گڑھی ہیں ۔

آیئے سب سے پہلے مشہور صوفی علامہ علاء الدین علی بن محمد بغدادی خازن ۷۲۵ھ کی زبانی سُنیئے وہ فرماتے ہیں کہ مالک بن دینار کہتے ہیں کہ جب یوسف علیہ السلام نے رہا ہونے والے قیدی ساقی سے کہا اذکرنی عند ربک تو حضرت یوسف علیہ السلام سے کہا گیا کہ یوسف علیہ السلام تُو نے مجھے چھوڑ کر کسی اور کو کارساز بنایا اس لیے اب میں تیری قید کا عرصہ طویل کروں گا ۔حضرت یوسف علیہ السلام رو پڑے اور بولے کہ یا اللہ مصائب و بلایا کے ہجوم نے میرے دل سے تیری یاد فراموش کرا دی تھی اس لیے میں نے یہ بات

کہہ دی کہ اذکرنی عند ربک۔ یہ بھی اس کی تشریح میں کہا گیا ہے کہ جیل میں حضرت یوسف علیہ السلام کے پاس حضرت جبریل تشریف لائے جبریل نے حضرت یوسف علیہ السلام سے فرمایا اے پاک پاکوں کے فرزند تیرا رب تجھے سلام کہتا ہے اور تیرے رب کا پیغام یہ ہے کہ کیا تجھے رہائی کے لیے آدمیوں کا سہارا لیتے شرم نہ آئی قسم ہے میری عزت و جلال کی اب میں تجھے چند سال جیل ہی میں رکھوں گا حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ کیا میرے رب کی یہی خوشی ہے۔ جبریل نے ہاں میں جواب دیا اس پر حضرت یوسف علیہ السلام نے فرمایا کہ کوئی پرواہ نہیں ہے۔

کعب احبار کہتے ہیں کہ حضرت جبریل نے یوسف علیہ السلام سے کہا کہ تیرا رب کہتا ہے کہ یوسف علیہ السلام تیرا خالق کون ہے یوسف علیہ السلام نے کہا اللہ، پھر فرمایا کہ تجھے روزی کس نے دی یوسف علیہ السلام نے جواب دیا کہ اللہ نے، پھر فرمایا کہ تجھے باپ کا محبوب کس نے بنایا یوسف علیہ السلام نے جواب دیا اللہ نے، پھر پوچھا کہ کنویں کی مصیبت سے کس نے بچایا حضرت یوسف علیہ السلام فرمایا کہ اللہ نے پھر پوچھا کہ تجھے تاویل الرویار کا علم کس نے دیا۔ جواب میں فرمایا اللہ نے، پھر پوچھا فحشا اور سوء سے کس نے بچایا فرمایا اللہ نے۔ ان سب باتوں کے باوجود اسے یوسف علیہ السلام تو نے اپنے ہی جیسے آدمی سے مدد طلب کی۔

یہ اور اس قسم کی بے سروپا روایات کی مدد سے حضرت یوسف علیہ السلام کی عزت نفس اور استقامت حق کے بے مثال مقام کو پارہ پارہ کر دیا اور اخلاقی سیرت کی اس عجیب و غریب مضبوطی کو داغ دار بنا دیا جس میں کہیں سے بھی کوئی لچک پڑتی دکھائی نہ دیتی تھی جس رُخ سے دیکھو اور جہاں کہیں دیکھو اس کی بے داغ خصوصیتیں یکساں طور پر نمایاں ہیں اور اس سُورج کی روشنی کہیں مدھم نہیں پڑ سکتی۔

جب روایات کے ہجوم نے جمال یوسف علیہ السلام کی ان رعنائیوں کو داغ دار بنا دیا تو اس کے دفاع کے لیے تاویل کا سہارا لیا گیا۔

کسی نے کہا کہ کشف شدائد میں بندوں سے مدد لینا کوئی گناہ نہیں ہے مگر یہ بات حضرت یوسف علیہ السلام کے مقام کے خلاف تھی۔

کوئی بولا اسباب ظاہرہ سے غرض محمود کے لیے استعانت و استمداد بلاشبہ جائز

ہے عصمت کے منافی نہیں مگر نبی اور صدیق کے لیے اولی اور افضل یہ تھا کہ اسباب ظنیہ سے اعراض کرتے چونکہ حضرت یوسف علیہ السلام کی یہ تدابیر اسباب یقینیہ عادیہ سے نہ تھی اس لیے عتاب آیا اس قسم کی تاویلوں سے دل کو بہلا لیا گیا حالانکہ بالکل واضح اور صاف ہے کہ اُذکرنی عند ربك کا مطلب یہ ہے ہی نہیں کہ رہا ہو کر اپنے آقا سے میری رہائی کے بارے میں ذکر کرنا بلکہ بات صاف ہے کہ رہائی پانے کے بعد اپنے مالک سے میری دعوت حق اور میری باتوں کا بھی ذکر کرنا کیونکہ قیدیوں سے ان کی جو گفتگو ہوئی ہے وہ یا تو تعبیر کے بارے میں ہے یا دین حق کے بارے میں اس ساری گفتگو میں رہائی کا اشارہ تک بھی نہیں ہے لہذا اس کا مطلب یہ اور صرف یہ ہے کہ میری یہ دعوت اور تعلیم یاد رکھنا اور اپنے آقا سے بعنوان مناسب اس کا ذکر کرنا، ممکن ہے کہ پیام حق دل میں اتر جائے ۔ یہ صرف میری رائے نہیں بلکہ مشہور مفسر قرآن ابوحیان اُندلسی نے بھی یہی موقف اپنایا ہے ان کے الفاظ ہیں ۔

لیتوصل بذالك الی هدایة الملك وایمانه باالله تعالی کما توصل الی الیضاح الحق لصاحبه

تاکہ اس ذریعہ سے بادشاہ کی ہدایت اور ایمان کا سامان ہو جائے جیسا کہ جیل کے دو ساتھیوں کے حق کی وضاحت ہو گئی ۔ علامہ آلوسی نے روح المعانی میں اسے خلاف ظاہر قرار دیا ہے مگر ساتھ ہی یہ کہہ کر ابوحیان کی تشریح کی داد دی ہے ۔

نعم انه اللائق بمنصبه علیه السلام

ہاں یہی مطلب یوسف علیہ السلام کے منصب کے لائق ہے ۔

علامہ بقاعی نے نظم الدرر میں اسی کی ہمنوائی کی ہے فرماتے ہیں ۔"اذکرنی عند ربك ای سیدك ملك مصر بما رایت منی من معانی الاخلاق طهارة الشیم"

اپنے سردار بادشاہ مصر سے وہ باتیں ضرور بیان کرنا جو تم نے مجھ میں دیکھی ہیں یعنی اخلاقی بلندیاں اور کردار کی پاکیزگی وغیرہ ۔

بتانا یہ چاہتے ہیں کہ حضرت یوسف علیہ السلام کے اس ارشاد کا منشا یہ ہے کہ حتی الوسع کوشش کر رہے ہیں کہ پیغام حق جہاں تک پہنچا سکتے ہیں پہنچا دیں ۔ جونہی ان کو یہ بات

معلوم ہوئی کہ ان میں ایک آدمی بادشاہ کے ساقیوں کا سردار ہے اور پھر اسی منصب پر فائز ہونے والا ہے۔ معاً ان کا ذہن اس طرف چلا گیا کہ ایسے آدمی کو جو خلوت وجلوت میں بادشاہ کے حضور رہنے والا ہے کتنا اچھا موقع حاصل ہوگا کہ دعوت حق بادشاہ کے کانوں تک پہنچا دے چنانچہ جانے والے سے فرمایا اذکرنی عند ربك اپنے آقا کے پاس جاؤ تو مجھے یاد رکھنا یعنی میری یہ دعوت وتعلیم یاد رکھنا اور اپنے آقا سے مناسب موقعہ پر اس کا ذکر کرنا ممکن ہے کہ حق کا پیغام اثر کر جائے۔ لیکن جانیوالے کو حضرت یوسف علیہ السلام کی بات یاد نہ رہی اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ حضرت یوسف علیہ السلام کو کئی سال تک جیل میں رہنا پڑا۔

کاغذ کے سات سو چالیس صفحے میرے قلم سے سیاہ ہو چکے ہیں۔ ناظرین کے ہاتھ ان اوراق کی گرانباری سے اور آنکھیں ان سطور کی کم سوادی سے تھک چکی ہوں گی اس لیے بہتر ہے کہ رہرو قلم کے ساتھ قافلہ نظر کچھ دیر آرام کرے۔ اگرچہ

رہروان راخستگی راہ نیست

عشق ہم راہ است وہم خود منزل است

فی سیرت یوسف علیہ السلام کی رعنائیاں تین حصوں پر مشتمل ہیں۔

اوّل دنیا کی مصیبتوں اور ناموافقتوں میں مصائب ومحن کی پہلی منزل جس میں حضرت یوسف علیہ السلام نے صبر، عزم، اعتماد اور توکل علی اللہ کی روح عظیم کا نظارہ پیش کیا۔

دوم معصیت کی دعوت امرأۃ العزیز کا معاملہ۔

مصیبت کی آزمائش ذہن ودماغ کی آزمائش تھی۔ اور امراۃ العزیز کی جانب سے معصیت کی دعوت میں حضرت یوسف علیہ السلام کے جذبات کی آزمائش تھی۔ اور انسان کے لیے سب سے بڑی آزمائش جذبات ہی کی آزمائش ہوتی ہے۔ لیکن حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کی چٹان یہاں متزلزل نہ ہوسکی ان کی بے داغ سیرت پر نفس انسانی کا سب سے بڑا فتنہ بھی دھبہ نہ لگا سکا۔ یہ حضرت یوسف علیہ السلام کی سیرت کا سب سے عظیم مظاہرہ ہے یہ عشق حق کا نمونہ ہے یہ پرستاری صدق کا دستور العمل ہے۔ یہ ایمان کامل کا معیار ہے۔ جب اُنکے سامنے دو باتیں پیش کی گئیں۔ زندگی کا عیش مگر معصیت حق کی راہ میں زندگی کے شدائد مگر راست بازی کی راہ میں حضرت یوسف علیہ السلام نے رب السجن احب الی فرما کر دوسری راہ اپنائی۔

سوم. حضرت یوسف علیہ السلام کی زندگی کا وہ نظارہ ہے جب کہ آپ مظلومی و بے چارگی کی زندگی سے نکل کر طاقت و اختیار کی طرف قدم اٹھا رہے ہیں طاقت و اختیار حکومت واقتدار ہی کے لیے مصر کا بادشاہ خواب دیکھتا ہے اور اس کی تعبیر حضرت یوسف علیہ السلام بتا رہے ہیں کہ ایک ہولناک اور خوفناک حالت پیش آنے والی ہے اور ساتھ ہی یہ بھی بتا رہے ہیں کہ اس ہولناکی سے مستقبل میں بچنے کی تدبیر یہ ہے چونکہ طاقت و اقتدار کے انتقال کے لیے مصر کے بادشاہ کا خواب مقدمہ اور تمہید ہے اس لیے ہم نے اس پارے کی تشریحات کو حضرت یوسف علیہ السلام کی جیل کی زندگی پر ختم کر دیا اور تیرھویں جلد کا آغاز بادشاہ مصر کے اسی خواب سے ہوگا۔

الحمد للہ آج مورخہ ۲۳ جمادی الاولی ۱۴۱۲ھ موافق یکم دسمبر ۱۹۹۱ء بروز یکشنبہ بوقت ۷ بج کر ۴۵ منٹ صبح پارہ دوازدھم کی تفسیر ختم ہوئی۔

رب تقبل منی انک انت السمیع العلیم